جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد مقبول سلسلہ
ایک کفن بردوش نوجوان کی داستان حیرت
معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں کا مرقع عبرت
شکاری
راوی :
سکندر بخت
مصنف :
احمد اقبال

حاصل کریں

شکاری

معاشرے کے ان ناسوروں کی روداد جو گوشت پوست سے گزر کر انسانی ... ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے روز و شب صعوبت کی بستی میں گزر رہے تھے ... چلتے دن ... تشنگی ... راتیں ... خوف ... خواب ... حقیقت

نئی سوچ۔ نیا رنگ۔ نیا لہجہ۔ نیا آہنگ

اب میں بالکل مطمئن اور پرسکون تھا۔ بے یقینی، ذہنی انتشار اور خوف کے سلسلے وار مرحلوں سے گزر جانے کے بعد میں اس فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس انتہائی اقدام پر تاسف کا اب کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ وقت کی بساط پر عقل کی ہر بڑی مات ہو چکی تھی۔ سازگار حالات کی امید میں سختی تمام کو جھیلنے کا حوصلہ تمام ہو چکا تھا۔ اور خلش جو آزار جسم و جان بن گئی تھی انتہا کو آن پہنچی تھی کہ اس پر آشوب داستان کا آخری باب میں اپنے خون سے لکھوں۔ تقدیر نے مجھے اس کے قتل کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری شرافت علی کی فرصت عمر لمحہ لمحہ تمام ہو رہی تھی۔ اور شاید میری بھی۔ جہاز اب لاہور کی طرف اڑ رہا تھا اور یہ ثبوت تھا ایک زبردست غیب کے انتظام کا جس نے میری منزل کی مسافت کو سمیٹ کر مزید مختصر کر دیا تھا یا بالفاظ دیگر میری شرافت کی زندگی کو مزید مختصر کر دیا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے لاؤڈ اسپیکر کی زبانی سے ایئر ہوسٹس نے اپنی بات کا آغاز کیا تھا تو مجھے اس کی آواز خلاف معمول مترنم، شہد میں ڈوبی اور ریشم کی طرح ملائم لگی تھی۔ "خواتین و حضرات ہم بے حد معذرت خواہ ہیں کہ خراب موسم اور باراں کے سبب طیارہ اسلام آباد ائیرپورٹ پر اترنے کے بجائے لاہور میں اترے گا لیکن حالات موافق ہوتے ہی ہم جلد از جلد آپ کو منزل مقصود تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ ہم آپ سے تعاون کے طلب گار ہیں اور ایک بار پھر معذرت چاہتے ہیں۔ شکریہ!"

"ڈیم اٹ" میرے دائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے کالے صاحب نے کہا جو ولایت میں سات سال رہ کے خود کو گورا سمجھنے لگا تھا اور کوا تھا جو ہنس کی چال چلنے کی مضحکہ خیز کوشش کر رہا تھا۔ "صاف کیوں نہیں کہتے یہ لوگ کہ طیارہ کریش کر رہا ہے۔" پھر اس نے منہ بنا کے کھڑکی سے باہر دیکھا اور شاید بادلوں کے غبار سے جہاز کی بلندی کے فرق کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنے کی کوشش کی کہ اب تک جہاز کتنا گر چکا ہے۔ دوران سفر اس نے مجھ سے بعد افسوس کہا تھا کہ انڈوپاک میں موڈ بگڑ گیا ہے۔ ویلیوز گر گئی ہیں۔ آدمی کے ساتھ پیسے کی قدر گر گئی ہے پیداوار کی صلاحیت گر گئی ہے۔ اور اب اس کا خیال تھا کہ جہاز گر رہا ہے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا۔

میرے دوسرے پڑوسی ایک معمر ہیرالڈ کے اصل باشندے تھے اور ولایت کے ایک بہت بڑے ہوٹل میں ڈش واشر کے منصب اعلیٰ ... پر بیس قناعت سے ریٹائر ہو کر وطن کو مراجعت پر مجبور ہو گئے تھے۔ پھر بھی سر منڈاتے اولے پڑنے کے مصداق ... ان کی دو بیبیاں اور دو وقت ... زندگی ... عزم کا اظہار کیا تھا

www.paksociety.com

اتنی زوجہ نے جو افلائٹ سیاں کی ہمنفس تھی اور سامنے کی جن نشستوں پر
بیٹھا ہوا وہ خوش تھی اپنے ولی فالی سرتاج سے اعلان کو سلیس اردو
میں ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔ "سرتاج مذکر نے فرمایا" لاہور جانا تھا..... پہلے
کپتان کو یاد نہیں رہا اور دوسری طرف تائید طلب نظروں
سے دیکھا۔ میں نے ان سے بھی اتفاق کیا۔ زوجہ مذکورہ نے
اس فروگذاشت پر کپتان نامراد، بزبان سیرابو کوسنا
شروع کیا۔ بقیہ مسافروں کا رد عمل بھی ان کی اپنی ذہنی
کیفیت کا عکاس تھا۔ معقول امید پرست اور
پُراعتماد قسم کے لوگوں نے اس اعلان کو زیادہ اہمیت
نہیں دی تھی کیونکہ عقل۔ قنوطیت اور ناتجربہ کار
مسافروں نے جن کی اکثریت خواتین پر مشتمل تھی۔ واویلا
شروع کیا کہ اسلام آباد کے ٹکٹ پہ ان کو عدم آباد بھیجا یا جا رہا
ہے۔ اور پھر جہاز کے علاوہ جہاز کے موجد کو اور کپتان تک سب
کو ایک جیسی گالیاں دیں۔ جہاز کا واحد مسافر جسے منزل کی یہ
تبدیلی بھی نوشتہ تقدیر لگی تھی میں تھا۔ میں نے افسوس سے ان
بے گناہ مسافروں کو دیکھا جو شامت اعمال کے باعث میرے
ہمسفر ہونے کے مارے گئے۔ مجھے فلموں اور جرائم کی کہانیوں کے
علاوہ حقیقی زندگی کے بہت سے ڈراموں کے بہت سے واقعات
یاد تھے جن میں ایک آدمی کی جان لینے کے لیے جہاز گرا دیا گیا تھا۔
امکانات لامحدود تھے۔ ممکن ہے پائلٹ کو جہاز میں کسی ٹائم بم
کی موجودگی کا شبہ ہو گیا ہو اور ٹائم صرف اتنا ہو کہ جہاز کو لاہور
میں گرنے کو ترجیح دی ہو یا ایسی ہی کوئی نامعقول وجہ ہو۔ لیکن
یہ بات علی الاعلان کہہ دیتا تو کالے صاحب کی نظروں میں گر جاتا۔
جسے یقین تھا کہ جہاز کے ساتھ ہی وہ بھی گر رہا ہے۔

ایسا ہی خیال مجھے لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ پر روانگی کے
وقت آیا تھا یعنی یہ کہ جہاز سفر آخرت پر روانہ ہو رہا ہے۔ میں
حقیقت پسند آدمی ہوں اور میری سوچ میں مقتول ہونے کی تخیلاتی
خواہش کو قطعی دخل نہیں تھا۔ ان تمام واقعات کے باعث
جو ایک مختصر مدت میں مسلسل پیش آئے۔ مجھے ہر قدم پر خطرہ نظر
آنے لگا تھا۔ ایک بار کی تو کوئی بات نہیں لیکن سانپ بار بار
کاٹنے لگے تو کیا رسی سے ڈرنے کا جواز پیدا نہیں ہو جاتا۔
بقول غالب "رو رہا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں"۔ تو اس
کے ذمے دار حالات ہیں۔ سر منڈے گورے جو رنگدار ایشیائی
کو ملک میں اپنی بے روزگاری کا ذمے دار قرار دیتے تھے۔
میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھے۔ کیونکہ تعلیم کی تکمیل کے بعد
میرا قطعی ارادہ نہ تھا کہ کسی گورے کے پیٹ پر لات ماروں۔
نسلی منافرت سے بڑھتی ہوئی کشیدگی کے باعث میں نے
فارغ التحصیل ہو کے واپس وطن لوٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا اور
ڈگریوں کے فیصلے تک میرے قیام کی مدت سال بھر بھی نہیں تھی
میرے ذہن میں بہت سے منصوبے تھے۔ کثیر المقاصد
منصوبے ان سے بیک وقت ملک و قوم اور خلق خدا کے علاوہ
اپنی ذات کو بھی فائدے حاصل ہوتے تھے مثلاً میں ایک پولٹری
فارم بنانا چاہتا تھا اور اس کے منافع سے مری میں ایک گردش
پذیر ریسٹورنٹ بنانا چاہتا تھا جیسے میں نے باہر دیکھے تھے
کہ آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر شفاف شیشوں کی عمارت میں بیٹھے
ہیں اور آپ کو قطعی احساس نہیں کہ وہ پوری عمارت کچھوے
کی چال سے اپنے مدار پر گھوم رہی ہے تاکہ وہیں بیٹھے بیٹھے آپ
ملاقات اور مدارات کے ساتھ مضافات کو ہر سمت سے گھوم
کر دیکھ لیں۔ پھر میرا خیال اس ریسٹورنٹ کی آمدنی سے
وادی کاغان میں جھیل سیف الملوک کے برفپوش رہنے والے
کناروں پر ہوٹل تعمیر کرنے کا تھا اور پھر ہوٹل اور ریسٹورنٹ
کے مشترکہ منافع سے کراچی میں ساحل سے دور سمندر کی تہہ
میں شفاف شیشے کا واٹر پروف دیواروں والا کیفے بنانا تھا
جہاں سے آبی دنیا کے حسن کا نظارہ ہو۔ علیٰ ہذالقیاس یہ
سب ایک انڈے سے ملک کا سب سے بڑا پولٹری فارم بنانے
کے اور کروڑپتی بننے کے خواب تھے۔ لیکن انڈا ٹوٹ گیا چنانچہ
خواب بھی ٹوٹ گیا اور پھر حقیقت کا وہ روپ سامنے آیا جو
موت کی طرح خوفزدہ کرنے والا اور ناقابل فہم تھا اور حالات و
واقعات کا وہ ناقابل یقین سلسلہ شروع ہوا جس نے میری منزل
ہی نہیں راستے بھی بدل دیے سارے گڑبڑ یہیں سے شروع ہوتی
ہے کہ آدمی خود اپنی منزل کا اور اپنے راستوں کا تعین کرنے
لگتا ہے جبکہ یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے "تدبیر کند بندہ
تقدیر کند خندہ"!

اگر میں دائیں بائیں بیٹھے ہوئے کالے صاحب یا
معزز خاتون واشر کو بتاتا کہ میں جو صورت سے اتنا محترم اور معتبر
نظر آتا ہوں بحکم سرکار برطانیہ۔ بصد ذلت و رسوائی اپنے
ناکردہ گناہوں کی پاداش میں ولایت سے واپس بھیجا گیا ہوں
اور یہ سب چکر ایک لڑکی نے چلایا تھا۔ تو کیا وہ مانتے کہ میں
بے گناہ ہوں؟ اور یہ برطانوی حکومت کی انتقامی جیت ہے کہ اس
نے مجھے زبردستی پارسل کر دیا ہے سر منڈے گوروں کی
بات الگ ہے۔ برطانوی جمہوریت میں کسی قانون کے بغیر محض
رنگ دار ہونے کے جرم میں جلا وطن کرنے کی گنجائش نہیں۔
لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آلام و مصائب اور آفات و حادثات
کا یہ سلسلہ جس کا تجربہ ادھوری تعلیم چھوڑ کے حدود سلطنت

برطانیہ سے میرے اخراج کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ ایک ایسی
پگڈنڈی سے شروع ہوا تھا جسے میں صورت آشنائی نہیں کہہ سکتا تھا
یہ قریباً چھ ہفتے پہلے کی بات تھی۔ ہوسٹل میس میں
ناشتے کی ٹرے اٹھا کر میں ہال کی ہر میز کا جائزہ لے رہا تھا اور
سوچ رہا تھا کہاں بیٹھوں۔ اکا دکا کرسیاں تو بہت خالی تھیں
لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس وقت میرے بے تکلف دوستوں
میں سے کون کہاں موجود ہے۔ اچانک کسی نے چلا کے کہا۔
"کبیر داس..... تمہارا فون ہے"۔

میں نے چونک کر کبیر داس کہنے والے کو گھورا وہ میرے قریب
سے گزرنے والا میرے بچپن کا دوست سید محسن رضا زیدی سے
جس اور اس نے ٹرے میرے ہاتھ سے لے لی "کبیر خاں صاحب
شوق فرمائیے اور بات کیجئے۔ ناشتہ میں کرتا ہوں....."
محسن نے کہا اور میں نے مجبوراً ٹرے اسے تھما دی اور اسے وہیں
میز پر بیٹھ کے ناشتہ کرتا چھوڑ کر منہ بسورتا آگے بڑھا۔
سلف سروس کے اس نظام میں ٹرے اٹھا کے لائن میں کھڑے
رہنا اور باری آنے پر ناشتہ لے کر آنا اور پھر جگہ بنا کے بیٹھنا
یہ سب مرحلے وار عمل تھا جو اب مجھے پھر شروع کرنا تھا۔ تاہم
فون کال کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کون جانے شام کی ہر تفریح
جسے کی دعوت کسی نے قبول کر لی ہو۔ درخواست تو کوئی نصف
درجن کے قریب حسین اور ولایتی لیلاؤں کے زیر غور تھی اور میں ان
سب کا اکلوتا مجنوں تھا۔ چنانچہ میں نے آخری گوشے میں رکھے
ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کے محتاط لہجے میں کہا۔ "ہیلو"
خلاف توقع ایک اجنبی مردانہ آواز نے کہا "تم کبیر خاں
ہو؟ وزیر خاں کے بیٹے؟"
"ہاں" میں نے کہا۔ "تم کون ہو؟ میرا مطلب ہے میرے
اس نام سے کیسے واقف ہو؟"
"کیوں؟" جواب ملا "کیا تمہارا یہ نام نہیں تھا؟ مسٹر
سکندر بخت"

"تھا" میں نے فکرمند ہو کے کہا "بچپن میں تھا اور یہ
بہت پرانی بات ہے۔ یہاں لوگ مجھے سکندر بخت کے نام
سے جانتے ہیں"
"میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا" وہ ہنسا۔ "میں نے یہی
کہا تھا کہ مجھے سکندر بخت سے بات کرنی ہے"۔
میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے کبیر داس
یا کبیر خاں کہنا سننے والے مذاق کی بات سمجھتے ہوں۔ "خیر یہ
بتائیے بات کیا ہے۔ مگر نام پہلے"
"نام میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ اصرار کرو گے تو کچھ بتا بھی دوں
گا" وہ بولا "تمہارے لیے بات زیادہ اہم ہے"
"پہلے تو میں سمجھا کہ کوئی دوست آشنا ہی مذاق کے موڈ میں ہے لیکن
سنجیدگی سے مجھے کبیر کے نام سے مخاطب کرنے والا یہاں
کوئی نہ تھا۔ سوائے میرے باپ کے جو بہت دور پاکستان
میں بیٹھا اس دن کے خواب کی تعبیر کیلئے عمر کے بوجھ گھسیٹ
رہا تھا جب میں کامیاب انجینئر بن کے لوٹوں گا اور وہ
زندگی کے رہے سہے ارمان پورے کرے گا۔ گھر میں بہو
لانے کے۔ پوتوں کو کھلانے کے۔ اور مرنے سے پہلے مجھے
خوشحال مستقبل کی راہ پر گامزن دیکھنے کے۔ زمانہ لاکھ بدلے
والدین کے خواب وہی پرانے ہوتے ہیں"
"میر شرافت علی کو جانتے ہو تم؟"
"ہاں۔ اس حد تک کہ وہ میرے والد کا بزنس پارٹنر ہے
اسلام آباد میں رہتا ہے"۔ میں نے کہا۔
"کب سے پارٹنر ہے وہ؟ اور اس کاروبار کی نوعیت
کیا ہے؟" وہ بولا۔
"یہ مجھے..... مجھے نہیں معلوم..." میں نے کہا "مجھے والد
نے یہی بتایا تھا کہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے"
"اس کا آفس کہاں ہے؟" وہ بولا "میر شرافت علی رہتا
کہاں ہے؟"
"دیکھو یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ میں نے اپنے والد سے
قبل از وقت پوچھنی ضروری نہیں سمجھیں" میں نے کہا۔
"قبل از وقت؟" وہ ہنسا "خدانخواستہ آج اگر تمہارے
والد کو کچھ ہو جائے۔ تو تم کیا کرو گے؟ تم وزیر خان کے
اکلوتے بیٹے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم نے کبھی اس مسئلے
پر غور ہی نہ کیا ہو"
"آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔ "اور یہ سب
باتیں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟"
"حقیقت یہ ہے کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں....." اس نے
میری بات نظرانداز کر دی "تمہیں عمداً بے خبر رکھا گیا ہے"
میں الجھن میں پڑ گیا۔ عمداً..... میرے والد نے تو ہمیشہ
بزنس کی بات ٹال دی تھی۔ ..... ابھی پڑھو کبیر خاں.....
عمر پڑی ہے ان فکروں کے لیے..... جب تک میں ہوں
یہ سوچنا تمہارا کام نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ ہوتا وہی ہے جو منظور
خدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات واقعی عجیب تھی۔ کل کے بارے
میں جانتا تو کوئی نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ مگر کل کی فکر تو سب ہی کرتے
ہیں اور یہ بات اتنے وثوق کے ساتھ کون کہہ سکتا ہے کہ اس
کے مقدر میں آنے والے دن کے سورج کا اجالا بھی ہے جب

www.paksociety.com

آدمی وقت کی راہ گزر پر چلتا ہے تو موت کے نام بے لیے ہوساتھ رکھتا ہے اور اجل کا انتظار ہر سانس کے ساتھ کرتا ہے۔

میرا تجسس اب تشویش میں بدلنے لگا تھا۔ "میں تمہارے پُراسرار انداز گفتگو سے کیا نتیجہ اخذ کروں۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ یہ کیا ڈرامہ ہے آخر؟" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "اپنا نام تک نہیں بتایا ہے تم نے۔"

"نام کچھ بھی فرض کر لو... مثلاً فوبا مچو۔ نام میں کیا ہے سکندر بخت۔ میری بات دھیان سے سنو۔ ورنہ بعد میں افسوس کرو گے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میر شرافت علی ایبٹ روڈ پر قدیم طرز کی ایک کوٹھی میں رہتا ہے جو تمہارا املاک تھی۔ جس جنہوں نے یہ کوٹھی بنوائی تھی وہ اب شرافت علی کی میر بخش والی کوٹھی میں رہتا ہے۔ ایبٹ روڈ کی کوٹھی کا نام ہے زرین بسیرا تم دیکھنی اور سفید رنگ کی ہے۔"

"شرافت علی بھی میرٹھ سے آیا تھا" میں نے اس انکشاف پر چونک کے کہا۔ "اور اس نے جائداد کا تبادلہ کر لیا تھا!"

"ہاں اب اس کا دفتر میکلوڈ روڈ پر امرتسری حلوائی کی دکان سے ذرا آگے دائیں جانب ہے۔ اوپر کی دوسری منزل پر میر ورز اینڈ کو۔ تمہیں بورڈ نظر آجائے گا۔ اس سے تمہیں کاروبار کی نوعیت معلوم ہو سکتی ہے۔"

"تم بہت کچھ جانتے ہو۔" میں نے اعتراف کیا۔ "جو مجھے واقعی معلوم نہیں۔ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ کہیں مجھ سے مل لو ہم اطمینان سے بیٹھ کے باتیں کریں گے۔"

"سوری۔ بوئنگ میں ایئرپورٹ پر ہوں اور میرے جہاز کی روانگی میں چند منٹ رہ گئے ہیں۔" وہ بولا۔ "ورنہ میں آجاتا۔"

"اچھا تو اپنا پتہ بتا دو... میں تم سے خط و کتابت رکھوں گا" میں نے کہا۔ "تم مجھے تفصیل سے وہ باتیں لکھ کر بتا سکتے ہو..."

"میں دوبارہ کہوں گا سوری۔ میں لکھ کر کچھ نہیں دے سکتا۔ میرا اصول یا میری مجبوری۔ جو چاہو سمجھ لو۔ اور میں نہیں صرف راستہ دکھا رہا ہوں۔ باقی سب تمہاری عقل اور محبت پر چھوڑ رہا ہوں۔" میرے خیر خواہ نے کہا۔

"اچھا تم کس فلائٹ سے جا رہے ہو؟ اور کہاں؟" میں نے مایوسی سے کہا... مجھے اب اس شخص پر اعتبار آنے لگا تھا۔

وہ ہنسا "تم واقعی ذہین ہو مگر میں بھی اتنا بیوقوف نہیں سکندر بخت۔ ایک آخری بات۔ یہ بتاؤ تمہارے والد کا آخری خط کب آیا تھا!"

"ابھی چند روز پہلے۔" میں نے حیران اور کچھ پریشان ہو کے جواب دیا۔

"اس میں کیا لکھا تھا انہوں نے؟ کوئی قابل تشویش بات تھی؟"

"نہیں... بالکل خیریت کا خط تھا۔" میں نے کہا۔ "صحت اچھی ہے۔ کاروبار چل رہا ہے۔ خوش رہو اور کسی بات کی فکر مت کرو... وغیرہ وغیرہ... ان کے سب خط ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"اور آخری بار تم نے انہیں کب دیکھا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"یہی کوئی سال بھر پہلے۔" میں نے جواب دیا۔ "عید... تو میں بقر عید پر گیا تھا میں۔ گویا سوا سال ہو گیا۔"

"اچھا نوٹ کر لو... تمہارے والد بالکل خیریت سے نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔ "اور تم خود بھی محتاط رہو۔"

"کون ہے تم؟ ارے بولو؟ میں نے کہا۔ ہیلو... ہیلو۔" میں نے چلا کے کہا مگر لائن کٹ چکی تھی۔ میں کچھ دیر ریسیور ہاتھ میں تھامے کھڑا رہا۔ اس اجنبی کی آواز اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ "تمہارے والد بالکل خیریت سے نہیں ہیں۔" اب میں اس نادیدہ خیر خواہ کی بات کو مذاق سمجھ کے نہیں ٹال سکتا تھا کہ اس کو میری نجی زندگی کے بارے میں وہ باتیں معلوم تھیں جو خود میں نہیں جانتا تھا۔ لیکن تصدیق کیے بغیر میں کیسے کہہ سکتا تھا کہ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔

میر ورز اینڈ کمپنی کا دفتر مجھے معلوم تھا۔ مگر میر شرافت علی کے بارے میں اس کی فراہم کردہ معلومات نئی تھیں کسی خاص مقصد کے تحت اس نے مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا اور میرے تجسس کو ایک سمت عطا کر کے باقی سب مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ لہجے سے سنجیدہ اور ذہین آدمی لگتا تھا۔ چنانچہ میرا ذہن ہر بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

میں کچھ دیر خیال میں ڈوبا رہا۔ بے وقوف کی طرح بے کار بیٹھا سوچتا رہا کہ اتنی خوشگوار صبح کا یہ آغاز مبارک ہے یا کسی نحوست کا پیش خیمہ۔ پھر میرے پیچھے والے لڑکے نے مجھے آگے دھکیلا...

"یہ قطار موسیقی کا ریاض کرنے کی جگہ نہیں ہے سرکار۔ آپ ایک طرف بیٹھ کے شوق سے گانے بجائیے۔ ورنہ ناشتہ لیجئے۔" وہ ایک ہندوستانی طالب علم تھا۔ جس کے ساتھ میری کبھی کبھی بنی تھی۔ وہ باکسر تھا اور جوڈو اور کراٹے کے ایک جاپانی استاد سے تربیت کے آخری مرحلے میں تھا۔ اور آئے دن ایسی ہی فضول باتوں پر ہماری ٹھن جاتی تھی پہلے میں ہارتا تھا۔ مگر اب برابر کی ٹکر تھی۔

"یہ طبل جنگ بج رہا تھا۔ بلجیوسے؟" میں نے کہا۔ "مگر اچھا کیا جو مجھے یاد دلا دیا کہ مجھے ناشتہ بھی کرنا ہے۔"

ناشتہ اٹھا کے میں اس میز پر جا بیٹھا جہاں محسن اب ایک ویٹرس سے گویا ہوا تھا جس کی چکنی چپڑی باتیں کر رہا تھا۔ "آپ کہیں اور تشریف رکھ سکتے تھے۔" اس نے چاپس میں جزبز ہو کے کہا۔

"جی نہیں۔ ہم یہاں اس لیے تشریف لائے ہیں کہ نہایت اہم اور سنگین نوعیت کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں جو واحد حاضر فرنگن کے عشق خانہ خراب سے زیادہ آپ کی توجہ کے طالب ہیں" میں نے کہا۔ فرنگن اردو کی گفتگو کو بدتہذیبی کی علامت قرار دیتے ہوئے اٹھ گئی۔

"کر دیا آپ نے سب معاملہ چوپٹ۔ اب فرمائیے معاملہ کیا ہے؟" محسن نے جل بھن کے کہا۔

"معاملہ بہت عجیب ہے۔" میں نے ناشتے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "عرض کرتا ہوں۔ تو جہ ذرا میری طرف رکھیے۔ ٹھیک ہے۔"

اس کے بعد میں نے عرض کیا اور محسن سنتا رہا۔ اسی روز میں نے محسن سے طویل صلاح مشورے کے بعد ٹرنک کال بک کرائی جو لندن میں آدھی رات کے وقت اور پاکستان کے وقت کے مطابق ساڑھے پانچ بجے ملی۔ میرے والد بالکل خیریت سے تھے اور میرے بار بار پوچھنے پر کہ تشویش کی کوئی بات تو نہیں۔ خاصے تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔

"تشویش سے کیا مراد ہے بیٹا تمہاری؟" انہوں نے کہا۔ "یہ اچانک تمہاری زبان تشویش کی تکرار کیوں کرنے لگی ہے؟"

خواہ مخواہ نے مجھے متنبہ کر دیا تھا کہ اصل سبب نہ بتانا۔ لہٰذا چنانچہ میں نے کہا "دیکھئے نا۔ آپ سے اتنی دور ہوں۔ تشویش تو ہر وقت رہتی ہے۔ آپ کی صحت کیسی ہے۔ کاروبار کیسا ہے؟"

"دونوں ٹھیک ہیں۔ الحمدللہ۔" والد نے کہا۔ "خرابی ہوگی تو تمہیں ہی لکھوں گا نا۔"

ایک شبہ نے میرے ذہن میں سر اٹھایا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ مجھے ان کے لہجے میں اعتماد کی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔ "آپ میری پریشانی کے خیال سے کچھ چھپا تو نہیں رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو آج! پیسے کی ضرورت ہے کیا؟ یہ بہ دستور گھما رہا تھا۔ یا صرف میرے وہم کی بات تھی!"

"جیسے آپ سمجھیں" میں نے کہا۔ "یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے ابا جی۔"

"آج تک کوئی طے نہیں کر سکا کہ پیسے کی ضرورت ختم ہوتی ہے تو کہاں! معاشیات میں یہ ضروریات کی تعریف ہے..."

"اچھا اچھا میں ڈرافٹ بھیج دوں گا۔" انہوں نے کہا جو وقت ختم ہو گیا۔ میں نے اور محسن نے تبادلۂ خیال کیا اور فیصلہ دیکھا جو ہم پہلے ہی کر چکے تھے یعنی میرا وہ نادیدہ خیر خواہ جس نے فون پر سنسنی خیز مکالمے بولے تھے کوئی شر پسند تھا جس کا مقصد مجھے پریشان کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ مذاق میں بعض لوگ حد سے بڑھ جاتے ہیں۔

لیکن اس فیصلے کے باوجود میں چند روز اطمینان قلب سے محروم رہا۔ کیونکہ ایک بے نام سی خلش کا آزار ختم نہیں ہوا تھا۔ دن تو معروفیت کی نذر ہو جاتا تھا۔ مگر جب میں رات کو سونے کے لیے لیٹتا تھا تو میرے ذہن میں وہی سوالات گردش کرنے لگتے تھے جن کا جواب کہیں نہ تھا کہ وہ اجنبی کون تھا اور اگر وہ اتنا جانتا تھا تو اسے کیا ضرورت تھی مجھ سے اس قسم کی باتیں کرنے کی۔ اس نے کیوں کہا تھا کہ محتاط رہو... تمہیں عمداً بے خبر رکھا گیا ہے... جھوٹ اس نے بولا تھا یا میرے والد نے اور اگر وہ سچا تھا تو نام تک بتانے سے گریز چہ معنی دارد۔ اتنے کم وقت میں بھلا میں کیا بتاتا کہ اپنے والد کے کاروباری امور سے ناواقفیت کے اسباب کیا ہیں۔ برسوں پر محیط داستان چند منٹ میں کیسے سنائی جا سکتی تھی۔ اگر وہ مجھے بتاتا یا مجھا اپنا پتہ ہی دے جاتا تو صورت حالات کو سمجھنے اور سلجھانے میں مدد ملتی مگر وہ تو اپنی بات کہہ کر اڑن چھو ہو گیا تھا۔ ایک شعر سو فیصد حسب حال تھا۔ گئے دنوں کا سراغ لے کر کہاں سے آیا۔ کدھر گیا وہ۔ اور... اسے پتہ نہیں کیا... عجیب گمنام اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ۔

ایک ماہ بعد جب میں اس واقعے کو بالکل بھول چکا تھا دوسرا واقعہ پیش آیا یعنی فوبا مچو کی واپسی۔ مگر مجھے ہر حال میں ایک لڑکی سے ملاقات کے لیے جانا تھا وہ ایک انتہائی خود دماغ۔ متعصب اور تنگ نظر لارڈ کی بیٹی تھی۔ جس کا باپ غلام ہند کے کسی صوبے میں لفٹیننٹ گورنر رہ چکا تھا۔ میری اور محسن کی مکتب علمی کا خلاصہ یہ تھا کہ ڈیڑھ سو سال ان گوروں نے ہم پر حکومت کی۔ اب ہم کو ڈیڑھ سو سال تک انہی کے ملک میں رہ کے ان کے غرور کو شکست دینے کا حق حاصل ہے۔ وہ تجارت کے بہانے آئے تھے۔ ہم تعلیم کے بہانے آئے ہیں۔ اب وہ نفرت کرتے ہیں تو ہم محبت کا چکر چلائیں گے اور منزل ہماری تھی بکنگھم پیلس اب بھی اس وقت جیب میں ہیلمٹ کو تاج شاہی کی طرح سر پر سجا کے نکل رہا تھا۔ ایک اور لڑکی نے پکار کے کہا: "مسٹر الیگزینڈر... فون پلیز..." اور مالک نے ریسیور کو لہرا کے مجھے بلایا اور خود بھی لہرائی۔

"ہیلو، نام ہے الیگزینڈر دی گریٹ" میں نے اپنے تعین کی اور پھیرے کر انگریزی قاعدے کے مطابق کہا۔ "بخت بول رہا ہوں۔"

www.paksociety.com

مسٹر گیبرو میرے لیے یہ مانوس آواز اس بجلی کی طرح تھی جس کا جھٹکا پہلے بھی لگ چکا ہو۔

تم.....! میں نے چلا کر کہا اور گالی دینے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ "تم پھر آ گئے؟"

"ہاں۔" وہ بولا "میرا خیال ہے تم بہت بدگمان ہو گئے ہو اس لیے کہ میں نے جھوٹ بولا تھا؟"

"ہاں..... اور اس جھوٹ پر مجھے ٹرنک کال کرنی پڑی۔ میں پہلے ہی کنگال تھا، میرا بھرا ہو گیا۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"اچھا اب میں وضاحت کر سکتا ہوں۔" وہ میری بات کاٹ کے بولا "میرا اسنیپ اور سب۔ ایک رات کے لیے، تم مجھ سے مل لو۔" اس نے مجھے ہوٹل کا نام اور کمرے کا نمبر بتایا۔

"سوری۔" میں نے کہا "بیٹے..... مجھے اس وقت بہت بڑا معرکہ درپیش ہے۔ کل آ سکتا ہوں؟"

"بے وقوف مت بنو۔ میں تمہیں بہت سے خطرات سے خبردار کرنا چاہتا تھا۔" وہ بولا "صبح تو میری فلائیٹ سات بجے ہے۔" پھر فون میرے جواب سے قبل ہی بند ہو گیا۔ میں کشمکش میں پڑ گیا۔ ایک طرف اس الزبتھ ٹیلر سے زیادہ حسین اور پرکشش حسینہ کے قرب کی سدا بہار آرزو تھی، دوسری طرف بہت سے سوالات کا جواب ملنے کی امید تھی۔ اور اس پراسرار شخص سے مل کر وہ حالات جاننے کی خواہش تھی جن سے مجھے عمداً بے خبر رکھا گیا تھا۔ حسب معمول میں نے سید محسن رضا سے رجوع کیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مشیر اعلیٰ بھی تھے، معاون و محافظ بھی تھے۔ ناصح بھی تھے غمگسار بھی تھے اور بقول شاعر ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز۔ دیار غیر میں تو سب ہم زبان ایک ہو ہی جاتے ہیں۔ پھر محسن سے رشتہ ایک تناور درخت تھا جس کی جڑیں گزرتے ہوئے وقت کی زمین میں ہر طرف جیسی برسوں کی گہرائی تک اتری ہوئی تھیں۔

محسن کہیں جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا "مسئلہ اگر اس لیفٹیننٹ گورنر کی اولاد سے آبا و اجداد کی غلامی کا انتقام لینے کا ہے تو اس محاذ پر میں بھی لڑ سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے تو جا۔"

"محسن رضا۔ مجھے اس سے سچا عشق ہونے کا اندیشہ ہے۔" میں نے کہا "میں صرف اطلاع دینے آیا تھا کہ مسئلہ ہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ اگر میں لوٹ کر نہ آؤں تو پتہ کر لینا۔" وہ بولا "مجھے فرمائیے آپ لگتے ہے۔ نام پوچھا تو بتایا نہیں۔ یاد ہے مجھے؟"

"فرمائیے آپ ہیں قبلہ۔" محسن نے کہا "یہ بات اپنی سمجھ میں تو نہیں آئی کہ ایک آدمی ہوٹل کا نام کمرے کا نمبر بتائے اور اپنا نام نہ بتائے کیا معلوم نہیں ہو سکتا اس سے..... یہ کوئی

چکر ہے سکندر بخت اور مجھے تیری یہ مارگریٹ بھی بالکل پسند نہیں۔" مجھے اپنی نادانی پر حیرت ہوئی "یار یہ تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔ مارگریٹ کا مسئلہ یہ ہے دوست کہ میں کمبل کو چھوڑتا ہوں کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔" میں نیچے آیا تو چند منٹ قبل تک بجتا بولتا فون مر چکا تھا۔ یعنی ڈیڈ تھا۔ میں نے باہر آ کے موٹر سائیکل نکالی اور ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ مجھے ایک پبلک ٹیلی فون کا بوتھ خالی مل گیا۔ میں نے ایک سکہ ڈالا اور ہوٹل کا نمبر ملایا۔ "روم نمبر تھری زیرو ٹو" بلیز سے لگا کر بڑی لفظ ریزہ آواز میں کہا۔

"واٹ" آپریٹر نے یوں کہا۔ جیسے میں نے اس کو تخت ترین گالی دے دی ہو "کس سے بات کرنی ہے؟ کیا کام ہے؟"

"کام میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔" میں نے خفگی سے کہا۔ لیکن اس دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ آپریٹر نے کسی سے کہا تھا کہ کمرہ نمبر ۳۰۲ کی کال ہے۔ کیا کروں۔

میرے خدشات درست ثابت ہوئے "آپ کون ہیں اور کہاں سے بول رہے ہیں؟" ایک مردانہ آواز نے کہا جس میں تحکم نہیں تھا۔ مگر شائستگی ضرور تھی جو یہاں پولیس کا طرۂ امتیاز تھی مگر اس کے باوجود لہجہ تفتیش کی چغلی کھاتا تھا۔

میں نے "میں نے سوچ کر کہا "میں مسٹر فرمائیو کا بھانجا بول رہا ہوں اور عالم بالا سے بول رہا ہوں۔"

"دیکھیے....." ایک سخت اور کرخت آواز آئی..... "مذاق بعض اوقات خطرناک بھی ہو جاتا ہے۔ اگر تم پبلک کال آفس سے نہ بول رہے ہوتے تو ہم تمہیں عملی سبق دیتے..... یہ قتل کا کیس ہے۔ سمجھے.....؟"

"قتل!" میں نے چیخ کر کہا..... "کس کا قتل!..... کمرہ نمبر تین سو دو میں رہنے والے کا؟" مگر وہ پولیس مین جو شاید تفتیش پر مامور تھا فون پٹخ کے جا چکا تھا..... میں نے ریسیور پھینکا اور باہر نکلتے ہی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گیا کہ کال پولیس والے پانچ منٹ میں پبلک کال آفس بھی پہنچ سکتے تھے یہ بھی ممکن تھا کہ مجھ سے بات کرتے کرتے وہ کسی کو پیغام دے چکا ہو۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے واقعی بہت کائیاں لوگ ہوتے ہیں۔ ذرا سی عقل مندی سے کام نہ کرتا تو بال بال بچا تھا۔ خطرے کی حدود سے دور آ کے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگر یہ فون میں نے ہوسٹل سے کیا ہوتا تو آدھ گھنٹے بعد یقیناً سازش کے اس جال میں گرفتار ہو جاتا جو کسی نے بہت ہی چالاکی سے بچھایا تھا۔ غلطی اس سے صرف یہ ہوئی تھی کہ اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ ورنہ میں سیدھا ہوٹل جاتا اور تفتیش

کے چکر میں آ جاتا۔ اسی بھول نے جو نادانستگی میں ہوئی تھی مجھے بچا لیا تھا۔

موٹر سائیکل کو پارکنگ ایریا میں چھوڑ کے میں اوپر گیا تو محسن رضا کے کمرے کا دروازہ بند تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی انگریزوں سے اس کے دور حکومت کے مظالم کا بدلہ لینے جا چکا ہے۔ انگریزوں نے ہماری نسلوں کو، ہماری اخلاقی اقدار کو اور ہماری تہذیب کو خراب کیا تھا۔ اب ہماری باری ہے۔ یہ بات میں نے اور محسن نے سرعام اتنی بار کہی کہ بالآخر ہوسٹل کے سخت گیر، بڈھے اور بطالوی قدامت پسندی کے علمبردار سپرنٹنڈنٹ تک پہنچ گئی تھی اور اس نے دو بد باطن گوروں کی تحریری شہادت پر مجھے اور محسن رضا کو تحریری وارننگ دی تھی کہ ہم نسلی منافرت اور تشدد پسندانہ سیاسی خیالات کے اظہار سے باز نہ آئے تو ہمیں ہوسٹل سے خارج کر دیا جائے گا۔ نسلی منافرت کی فضا تو تھی مگر اس کا الزام صرف ہم پر نہیں آتا تھا۔ دوسری بات سراسر لغو اور بے بنیاد تھی۔ غیر سنجیدگی سے کہی جانے والی بات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ایک متعصب ذہنیت کی مذموم سازش تھی۔ دو لوٹ بد باطن گورے گواہوں کی گوشمالی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ کی گئی تھی۔ اور اس کا نتیجہ یہ

تمام اختلافات بھلا کے سب ایشیائی طالب علموں نے بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا تھا۔ اگلے دن گوروں کی ایک ٹیم نے جوابی کارروائی کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر نسلی فسادات پھیل جانے کے ڈر سے پرنسپل اور مقامی انتظامیہ نے بیچ بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع کرا دیا تھا۔ اس امکانی فساد کا فوری وار بھی ہم بک گئے تھے لیکن سزا سے محفوظ رہے تھے۔ ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ اور کالج کے پرنسپل کو بھی یقین دلا چکا تھا کہ ہم دونوں خطرناک ایشیائی ہیں جو برطانیہ کی ساکھ کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ اگر آج میں قتل کے اس کیس میں ملوث ہو جاتا تو میرا سابقہ ریکارڈ دیکھ کر وہ دونوں اتفاق رائے سے تسلیم کر لیتے کہ قتل کی واردات میں ہمارے ملوث ہونے کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پلٹنے کر کے دروازے پر پہنچ کے میرے قدم رک گئے۔ دروازہ جسے میں مقفل کر کے گیا تھا کھلا ہوا تھا۔ اس کے ڈور لاک میں ایک معمولی سی خرابی یہ پیدا ہو گئی تھی کہ اگر اسے شرافت سے بند کیا جاتا تھا تو چند سیکنڈ بعد پٹ اور چوکھٹ جدا ہو جایا کرتے تھے۔ صحیح طرح سے بند کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ دروازے کو دھکیل کر زور سے مارا جائے۔ اس وقت پٹ اور چوکھٹ جدا تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اندر جانے والا دروازہ

دلچسپ ترین سلسلے، کتابی شکل میں

شیخ کرامت کی سرگزشت جو اس نے بستر مرگ پر بیان کی

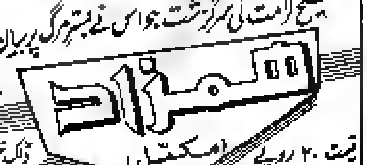

قیمت ۲۰ روپے
ڈاک خرچ ۵ روپے

○— ایک پراسرار شخصیت کی کہانی جس کے لیے کوئی بھی کام ناممکن نہیں تھا
○— اس شخص کا قصہ جس کے چہرے کی عمر ۱۲۰ سال تھی اور بقیہ جسم کی عمر ۲۵ سال
○— ہمزاد مسخر کرنے کے طریقے۔

ہیرو اعجوبہ شخصیت جمیلہ بانو کے قلم سے ایک عشق کی سرگزشت

○— ایک ایسے انسان کی کہانی جسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔
○— جب اس نے آنکھ کھولی تو ایک ٹیکسی میں سفر کر رہا تھا۔
○— دنیا کی بڑی بڑی تنظیمیں اس کے تعاقب میں تھیں۔
○— اس پر نہ کوئی گولی اثر کرتی تھی اور نہ ہی کوئی زہر۔

دونوں کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف

بند کرنے کے متعلق ہو گیا تھا اور اسے احساس بھی نہیں تھا کہ دروازہ پھر کھل گیا ہے۔ میرے کمرے کی واحد چابی میرے ہاتھ میں تھی۔ جس کے بغیر دروازہ کھل ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے آہستہ سے پٹ کو دھکا دیا۔ دروازے کے زنگ خوردہ پرانے قبضے چرچرائے۔ اور میں اندر داخل ہوا، تو ایک لڑکی جو میری میز کی درازوں میں کچھ تلاش کر رہی تھی تیزی سے پلٹی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا۔

"ہیلو۔ کون ہو تم؟" میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں کیا کر رہی ہو؟"

وہ لڑکی شش و پنج میں کچھ دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ اس کی عمر پچیس سال سے کم تھی۔ مگر آنکھوں کے گرد قبل از وقت نمودار ہو جانے والے حلقوں، چہرے کی پژمردگی، بھونڈے میک اپ کی دبیز تہہ سے جھانکتے دانوں اور چھائیوں کے نشانات اور ڈھلکے ہوئے جسم کے باعث وہ تیس سال سے زائد کی لگتی تھی۔ پھر اس کی صورت پر وہ بے باک حیا سے عاری اور گناہ آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی جو اس کے لباس کی طرح اس کے پیشے کا اشتہار دیتی تھی۔ میں ایک ایک قدم آگے بڑھتا گیا۔ "میری میز کی درازوں میں سے کیا نکالا ہے تم نے؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اس نے اچانک دونوں ہاتھ بڑھا کے مجھے دھکا دیا۔ میں لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا اور اسٹول سے ٹکرا کے نیچے گرا۔ اس عورت نے جست لگا کے مجھ پر سے گزر جانے کی کوشش کی۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ لیکن میں نے لیٹے لیٹے اس کا ایک پاؤں گرفت میں لے لیا۔ میرے ہاتھ میں ایک زنانہ جوتا آیا لیکن وہ عورت منہ کے بل گر گئی۔ اس کے حلق سے ایسی زبردست چیخ برآمد ہوئی کہ میں حیران رہ گیا۔ مگر اسے اٹھنے کا موقع دیے بغیر میں اس پر جا پڑا۔ وہ عورت شیرنی کی طرح مجھ سے گتھم گتھا ہو گئی۔ اس کے لمبے لمبے ناخنوں سے میرے چہرے پر خراشیں پڑ گئیں۔ میرے کپڑے تار تار ہو گئے۔ اور میرے بال اس کے ہاتھوں میں آ گئے۔ غصے نے مجھے پاگل کر دیا۔ میرے ہاتھوں کی وحشی قوت نے چند منٹ میں اسے زیر کر لیا مگر اس جدوجہد میں عورت کے کپڑے بھی پھٹ گئے اور اس کے جسم پر بھی خون کی سرخ لکیریں پھیل گئیں۔ میں تہیہ کر چکا تھا کہ اس عورت کو فرار نہیں ہونے دوں گا۔ اور پولیس خود ہی معلوم کرے گی کہ یہ چوروں کی طرح میرے کمرے میں کیا لینے آئی تھی۔ عورت مسلسل چیخ رہی تھی "بچاؤ۔ بچاؤ" اور میں ادھر ادھر سے دوڑ کر آنے والوں کے قدموں کی آواز سن رہا تھا۔ پھر ایک عجیب بات ہو گئی۔ وہ عورت پلک جھپکنے میں میری گرفت سے نکل گئی۔ اور دروازے کی طرف بھاگنے کی بجائے میرے بستر پر جا گری۔

دروازہ دھڑ سے کھلا اور بیک وقت بہت سے لوگ اندر آ گئے۔ یہ سب ہوسٹل میں رہنے والے ملکی اور غیر ملکی باشندے تھے۔ دو افراد نے مجھے قابو کر لیا کیونکہ میں پھر اس عورت کی طرف لپکا تھا۔ اس نے آخری دلدوز چیخ ماری اور دو لڑکوں نے آگے بڑھ کے اسے سنبھال لیا۔ "خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔ یہ دیوانہ مار ڈالے گا۔ یہ کالا مجھے دھوکے سے لے آیا۔ یہ میری آبرو لوٹنا چاہتا تھا۔" وہ دہاڑیں مار مار کے روتے ہوئے بولی۔

میں خوف اور صدمے سے سن کھڑا رہ گیا۔ اس فاحشہ کو سنبھالنے والے وہی دونوں بدباطن گورے تھے جنہوں نے ایک بار میرے اور محسن کے خلاف تحریری شہادت دی تھی۔

میرے حامی وہ سب ایشیائی طالب علم تھے جو مجسم سوال بنے بے بس کھڑے تھے۔

"خدا کی قسم یہ جھوٹ ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "میں ابھی ابھی باہر سے آیا ہوں تو یہ میرے کمرے میں گھسی ہوئی کچھ تلاش کر رہی تھی۔ میں نے اسے پہلے کبھی دیکھا تک نہیں۔"

لیکن صاف ظاہر تھا کہ میری اس وضاحت نے کسی کو مطمئن نہیں کیا ہے۔ میری قوت آزمائی کے نشانات اس کا تار تار لباس اور خود میری حالت میرے جرم کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ وہ عورت جسے یقیناً کسی سازش کے تحت بھیجا گیا تھا اپنے مقصد میں کامیاب رہی کیونکہ وہ بہت اچھی اداکارہ بھی تھی۔ وہ اب ہسٹریا کی کیفیت میں چلا رہی تھی "خدا کے لیے۔ یسوع مسیح کے لیے مجھے اس کالے حیوان سے بچاؤ۔" اور اس پر واقعی بے ہوشی غالب آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا یہ مکر و فریب کے حربے ہیں لیکن دیکھنے والے حالات کی پوری تصویر دیکھ رہے تھے اور انہیں عورت کی مظلومیت کا اور میری فطری خباثت کا یقین آ رہا تھا۔

دونوں بدباطن گوروں نے مجھے ایک غلیظ گالی دی اور دانت پیس کر آگے بڑھے۔ دو ایشیائی ان کی راہ میں فوراً حائل ہو گئے۔ عین ممکن تھا میرا وہ کمرہ نسلی فساد کی جولان گاہ بن جاتا مگر اسی وقت مجمع کو چیرتا ہوا ہوسٹل کا یہودی سپرنٹنڈنٹ اندر آ گیا۔ اس نے ایک نظر میں بھانپ لیا کہ معاملہ کیا ہے۔

"مسٹر حجت۔" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی اور رک گیا پھر اس نے پلٹ کر ایک گورے سے کہا "جاؤ اور پولیس کو اطلاع دو۔ باقی لوگ باہر۔" اس نے چیخ کر کہا "آؤٹ!"

"ٹھیک ہے مسٹر" میں نے تلخی سے کہا۔ "میں بھی یہی چاہتا تھا۔ اور اپنے کپڑے بدلنے کے لیے پلٹا مگر سپرنٹنڈنٹ نے مجھے روک دیا۔ کمرے سے آخری لڑکا بھی باہر نکل گیا تھا۔

"پہلے پولیس کو یہ سب کچھ دیکھ لینے دو۔ جیسا ہے۔ جہاں ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے طنز سے کہا۔ صورت حال اتنی سنگین ہو گئی تھی کہ اب میرے لیے بڑھے یہودی کو دھکا دے کر باتھ روم میں گھس جانا۔ اور باقوت دھوکے کپڑے بدلنا کوئی مشکل کام نہ تھا اور اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں برطانوی پولیس کے سامنے شریفانہ حلیے میں جانا چاہتا تھا۔ مگر مجھے اس کی مہلت ہی نہیں ملی۔ سپرنٹنڈنٹ کے احکامات ملنے سے قبل ہی کوئی پولیس کو فون کر چکا تھا اور وہ برطانوی پولیس تھی۔ جائے واردات پر پہنچنے کو چند منٹ لینے والی۔ دروازہ اسی وقت کھلا اور دو پولیس مین اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک نے عادتاً ریوالور نکال لیا تھا۔ وہ بھی مجھے اسی مضحکہ خیز حلیے میں لے جانا چاہتے تھے۔ مگر میں نے سفارتخانے سے رجوع کرنے کی دھمکی دی تو انہوں نے مجھے لباس تبدیل کرنے کی اجازت دے دی۔ نہ جانے کس نے اس عورت کو بھی زنانہ کپڑوں کا ایک جوڑا لا دیا تھا۔ جب ہم پولیس کی معیت میں روانہ ہوئے تو چشم دید گواہوں کا ایک ہجوم ہمرکاب تھا۔

اس وقت تک میں پرسکون ہو گیا تھا اور مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہ لگی کہ مجھے فون کر کے بلانے کا مقصد ایک تیر سے دو شکار کرنا تھا۔ ایک طرف میں قتل کی واردات کی تفتیش میں پھنس جاتا۔ دوسری طرف یہ عورت اپنا کام کر کے نکل جاتی۔ اسے بھیجنے والوں کو کہاں معلوم تھا کہ میں پہلے بھی ایک چکر لگا کر واپس آ جاؤں گا۔ آدھی رات سے پہلے میرے لوٹنے کا امکان نہیں تھا۔ مگر میرا دشمنوں نے کمرے سے میری عدم موجودگی کو یقینی بنانے کے لیے ٹیلی فون کیا تھا۔ کون جانتا ہے کہ ہوٹل میں پہنچ جاتا تو کمرہ نمبر تین سو دو میں ہونے والے ایک ایسے شخص کے قتل کا الزام بھی مجھ پر ثابت ہو جاتا جسے میں نے کبھی دیکھا تک نہ تھا اور جس کے نام سے بھی میں ناواقف تھی۔ قانون تو اندھا ہوتا ہے اور ثبوت و شہادت کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ نہ جانے وہاں میرے خلاف کتنے ثبوت ملتے اور کتنے گواہ پیدا ہو جاتے۔ محض تصدیق کرنے کے باعث میں بچ گیا تھا اور آدھے راستے ہی سے لوٹ آیا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ میں نے کمرے میں غیر متوقع طور پر پہنچ کر اس عورت کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا جو میرے کمرے میں کسی کی ہدایت پر کچھ رکھنے آئی تھی۔ یا درازوں میں سے کچھ نکال کر لے جانے کے لیے۔ خود کو معصوم ظاہر کرنے کے لیے اس نے جو کچھ کیا تھا۔ اس کا اپنا فعل تھا۔ لیکن یہ نام ظاہر ہو گیا تھا کہ میرے دشمن چاہتے تھے۔ میں اب پولیس کی تحویل میں تھا۔ اور مجھ پر عصمت دری کی کوشش کا انتہائی سنگین جرم تھا۔ ثابت مجھ پر قتل کا الزام بھی نہ ہوتا۔ ثابت یہ بھی نہ ہو گا کہ میں اس پیشہ ور عورت کو خود دھوکے سے اپنے کمرے میں لایا تھا۔ لیکن فیصلہ ہونے تک جتنا نقصان ہونا تھا ہو جائے گا۔

محسن کو میں نے پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بعد دیکھا۔ ہم نے اس سے چند منٹ تنہائی میں بات کرنے کی اجازت مانگی تو مجھے تھوڑے سے تامل کے بعد مل گئی۔ "تو یہاں کیسے پہنچ گیا؟" وہ بولا۔

میں نے اسے مختصراً ساری بات بتا دی۔

"ٹھیک ہے" وہ بولا "یہ تیرا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ بس اس پراسرار شخص کے ٹیلی فون کی بات مت کرنا۔ یہ کہنا تو میرے ایما پر تھا۔"

"اور تو کہاں تھا؟" میں نے اس نکتے پر غور کرتے ہوئے کہا۔

محسن نے جیب سے آپیرا کے دو ٹکٹ نکالے۔ "دو تین آدمی نامہ!" اس نے فرط مسرت سے کہا "مگر اب بتا یہ بات ثبوت ہے ہم دونوں آپیرا دیکھ رہے تھے۔ تو ضمانت میں ابھی جا کے پھینک دوں گا۔ اور صبح ہونے دے۔ یک وکیل کے ساتھ آؤں گا۔ اس سے پہلے اسکاٹ لینڈ یارڈ کا چیف بھی آ سکے تا قربات کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان سب کی ایسی تیسی۔"

ضمانت کے بعد صبح مجھے ایک مقامی جج کے سامنے پیش کیا گیا سب سے پہلے میرا بیان ہوا۔ پھر پہلی گواہی ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ نے دی۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کرنے کے بعد میرے ساتھ شورش پسند ریکارڈ کا حوالہ دیا۔

"جناب والا" میرے وکیل نے اعتراض اٹھایا۔ "مقدمہ زیر بحث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔" عدالت نے اعتراض تسلیم کر لیا اور سپرنٹنڈنٹ کو خاصی سبکی ہوئی۔ اس کے بعد چھ گواہوں کی فہرست پیش کی گئی۔

"جناب والا" وکیل صفائی نے دوسرا اعتراض کیا۔ "ان میں سے دو گواہ ناقابل اعتبار ہیں۔ ان کے اور میرے مؤکل کے درمیان عناد اور اختلافات کے اسباب پہلے سے موجود ہیں۔" دونوں بدباطن گوروں کا نام گواہوں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ باقی چار گواہ بھی صرف یہی بتا سکے کہ انہوں نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کے واقعات کے بارے میں وہ کسی سوال کا جواب نہ دے سکے۔ جس سے ثابت ہوتا کہ میں عصمت دری کی کوشش کا مرتکب بھی ہوا تھا۔ آخری اور سب سے اہم بیان محسن رضا کا تھا۔ جس نے دو نصف ٹکٹ پیش کیے اور ثابت کیا کہ میں اور وہ آپیرا دیکھ کے ۱۰۰۰ بجے واپس آئے تھے وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا اور میں اپنے کمرے کی طرف۔ دو منٹ بعد ہنگامے کی آواز آئی تو وہ دوسروں کے ساتھ پہنچے۔ اس نے بھی وہی دیکھا جو سب نے دیکھا تھا۔

پھر میڈیکل رپورٹ پیش کی گئی جس سے مجھ پر دست درازی ثابت ہوتی تھی یا مدافعت۔

اس کے بعد وکیل صفائی نے جو خود ایک پاکستانی تھا۔ اور محسن رضا کا کزن تھا۔ اپنی آتش فشانی شروع کی "جناب والا میرے مؤکل کی گرفتاری کا یہ رسواکن اقدام سراسر بدنیتی پر مبنی ہے" اس نے کہنا شروع کیا۔ "اس اقدام سے میرے مؤکل کو شدید ذہنی اذیت اٹھانی پڑی ہے۔ پولیس نے ایک قانون پسند شہری کو تحفظ فراہم کرنے کی بجائے ہراساں کیا۔ پولیس نے ایک بدکردار عورت سے ناجائز طور پر میرے مؤکل کے کمرے میں داخل ہونے پر باز پرس نہیں کی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ مؤکل کی تصویر کیوں چرا لے آئی تھی جو اس کے ہینڈ بیگ سے برآمد ہوئی ہے۔ صرف اس لیے کہ میرا مؤکل ایک رنگدار ایشیائی ہے اور اس پر الزام عائد کرنے والی ایک سفید فام عورت ہے کیا قانون.....؟"

استغاثہ کے وکیل نے ان ریمارکس پر شدید احتجاج کیا۔

میرے وکیل نے اپنے الفاظ واپس لے کر اس عورت کو جرح کے لیے طلب کر لیا۔ اس نے اپنا نام اور پتہ خود بتایا۔ پھر وکیل کے سوالات کی یلغار نے اسے بوکھلا دیا۔ بہت جلد اس نے تسلیم کر لیا کہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ اور پھر مجھ پر غلط الزام لگایا تھا۔

"مجھے مسٹر بخت کی تصویر لانے کا معاوضہ پچاس پونڈ ادا کیا گیا تھا۔" اس نے اعتراف کیا۔

"یہ معاوضہ ادا کرنے والا کون تھا؟" وکیل نے کہا جو اتنی جلدی کامیابی حاصل کرنے پر پرجوش تھا۔

"میں انہیں جانتی نہیں۔ ایک ایشیائی تھا۔ دوسرا اس کا نوکر لگتا تھا۔ انہوں نے میرے گھر آ کے مجھے ایک چابی دی اور کہا تھا یہ معمولی کام ہے۔ چابی سے کمرے کا قفل کھل جائے گا۔ انہوں نے بعد میں مزید پچاس پونڈ دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔" اس نے روتے ہوئے بتایا۔

"وہ تصویر کو کس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے؟"

"میں نے نہیں پوچھا۔ انہوں نے تو اپنا نام تک نہیں بتایا تھا اور کہا تھا اپنے کام سے کام رکھو۔" وہ بولی۔

"اور تم نے ناجائز ہونے کے باوجود یہ کام کرنا قبول کر لیا؟"

"میں سو پونڈ کو کیسے ٹھکراتی۔ میں غریب ..... عورت ہوں ..... اب میری آمدنی بھی نہیں رہی۔ اس کے علاوہ مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ مسٹر بخت کے آجانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"مسٹر بخت پر عصمت دری کا الزام بھی تم نے ان کے کہنے پر لگایا تھا؟"

عورت نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس نوکر ٹائپ نے کہا تھا کہ بلفرض محال مسٹر بخت آجائیں تو میں دوسرا حربہ استعمال کروں۔ کامیابی کی صورت میں مجھے مزید سو پونڈ ملیں گے۔"

"پھر اب تم ان کے خلاف بیان کیوں دے رہی ہو؟" وکیل نے کہا۔

"اس لیے کہ وہ دونوں پچاس پونڈ دے کر غائب ہو گئے ہیں۔" وہ چلا کے بولی "ان میں سے کوئی میری خبر لینے تک نہیں آیا۔"

عدالت نے مجھے باعزت طور پر بری کر دیا اور اس عورت کو جیل بھیج دیا۔ مجھے تھوڑا سا رنج ہوا کہ وہ پچاس پونڈ کی خاطر میرے دشمنوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گئی۔ جسم کے خریدار ملتے تو وہ ضمیر کیوں بیچتی۔ اب وہ لندن کے لاکھوں ایشیائی باشندوں کی آبادی میں گم ہو گئے تھے اور قانون کی سزا اس کا مقدر بن گئی تھی۔

"میں اب تک نہیں سمجھ سکا سکندر کہ وہ بدمعاش کون ہیں اور کیا دشمنی ہے ان کو تیری ذات سے۔" محسن رضا نے عدالت سے نکل کے ہوسٹل کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں بھائی محسن رضا کہ اگر میں اس عورت کے کمرہ نمبر تین سو دو میں پہنچ جاتا تو کیا ہوتا؟" میں نے کہا۔ "کیا اس قتل کے ذمہ دار بھی وہی تھے؟"

"نہیں۔" محسن رضا نے کہا۔ "اخبار میں اس قتل کی تفصیل آ چکی ہیں۔ قاتل اس ہوٹل کا ایک ویٹر تھا جس نے کافی میں خواب آور دوا ملائی تھی۔ مقدار کچھ زیادہ ہو گئی۔ مقتول ایک جوہری تھا جسے ویٹر نے لوٹ لیا تھا۔"

"مگر مجھے وہاں بھیجنے کا مقصد کیا تھا؟ ... قتل کا الزام مجھ پر ثابت کرنا!"

محسن ہنسا۔ "نہیں یار۔ اب اتنی وضاحت بھی نہیں ہے۔ میرا تو خیال ہے وہ دونوں اسی ہوٹل میں مقیم ہیں یا تھے اور قتل کے بارے میں ان کو سب سے پہلے اطلاع مل گئی تھی۔ انہوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ تو وہاں پہنچ جاتا تو تفتیش وغیرہ کے چکر میں پھنس جاتا اور خاصی دیر کے بعد باہر رہتا۔ اب لعنت بھیج سب پر۔ آئندہ کی سوچ جو اس حد تک درپے آزار ہیں۔ کیا وہ ایک ناکامی پر حوصلہ ہار کے بیٹھ جائیں گے؟ وہ پھر کچھ کریں گے سکندر بخت۔"

اس نے موٹر سائیکل ہوسٹل کے دروازے پر روکی۔ میرا سامان دروازے کے باہر ڈھیر ہوا پڑا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے چوکیدار سے کہا۔ حالانکہ سوال کرنے سے پہلے ہی بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ چوکیدار نے ایک ٹائپ کیا ہوا کاغذ مجھے تھما دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ نے اپنے مخصوص اختیارات سے کام لیتے ہوئے مجھے ہوسٹل سے خارج کر دیا ہے۔ کیونکہ میں فتنہ و فساد کا باعث اور بدنامی کا سبب بن رہا ہوں۔

"آئی ایم سوری سر!" چوکیدار نے کہا "میں آپ کو ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ آپ کو کالج سے بھی نکال دیا گیا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ کے مشورے پر۔ کل آپ کالج جائیں گے تو شرمندہ ہوں گے۔ لوگ ویسے بھی آپ کے دشمن ہو رہے ہیں۔"

"ہم اب عدالت میں جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور اس گورا شاہی نظام کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔"

لیکن کل دور تھی اور ہم جانتے تھے کہ اپنے حقوق کے تحفظ کی یہ طویل قانونی جنگ ہم نے جیت لی تب بھی اس کالج اور ہوسٹل میں رہنا شیر کے کچھار میں رہنے کے مترادف ہو گا۔ چنانچہ ہم نے سامان اٹھایا اور محسن نے مجھے اپنے ایک جنتی دوست کے ساتھ ایک کمرے کے فلیٹ میں فٹ کر دیا۔ اگلا غور طلب مسئلہ تعلیم جاری رکھنے کا تھا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے تیرے لیے کسی اور کالج میں داخلہ لینا خاصا مشکل مرحلہ ہو گا۔" محسن رضا نے کہا۔ "ہاں اگر مارگریٹ تیری مدد کرے۔ وہ اس لارڈ کی بیٹی کا باپ انڈیا کے کسی صوبے کا لفٹیننٹ گورنر تھا۔ اور وہ تجھ پر مرتی ہے۔"

"مگر یہ واقعے سے بھی مشکل کام ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کینہ، تعصب پیدا ہوا تو مجھے بطلا خیر سے نکلوا دے۔ میں ابھی ابا جی کو کچھ نہیں لکھوں گا۔ بے کار بیٹھنے کی بجائے میں کالج اور ہوسٹل سے اخراج کے خلاف اور پولیس کے خلاف مقدمات لڑوں گا۔ اور مقدمات کی فیس ادا کرنے کے لیے نوکری کروں گا۔"

اس پروگرام پر عملدرآمد کی نوبت اس لیے نہیں آئی کہ اگلے ایک ماہ میں میرے ساتھ مسلسل ایسے واقعات پیش آئے جو بالآخر برطانیہ سے مجھے ڈی پورٹ کرنے کے احکامات کا سبب بنے۔ سب سے پہلے تو ہوسٹل کے اس کمرے میں بم پھٹا جہاں میں مقیم تھا۔ بم معمولی تھا۔ مگر دھماکے سے قدیم سالخوردہ عمارت کی خستہ حال دیواریں گر گئیں اور دو افراد ہلاک ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ محسن یہ خبر مجھے پہنچاتا۔ پولیس کے دو سراغرساں آ پہنچے اور مجھے ساتھ لے گئے۔ دو دن تک وہ مجھ سے پوچھ گچھ کرتے رہے کہ یہ میری انتقامی کارروائی تو نہیں ہے۔ کچھ اخبارات نے حادثے کی خبر دیتے ہوئے میرا تذکرہ بھی کر دیا تھا چنانچہ یہ تفتیش ناگزیر ہو گئی تھی جب مجھے اس جج کے سامنے پیش کیا گیا تو غیر جانبدار اور فراخدل ہونے کے باوجود مجھ سے پوچھنے پر مجبور ہو گیا

"مسٹر بخت۔ کیا اس واردات کا تمہارے ساتھ پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات سے کسی قسم کا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"یہ معلوم کرنا پولیس کا کام ہے یور آنر۔" میں نے کہا۔ "میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایک باقاعدہ سازش کے تحت مجھے ان واقعات میں ملوث کیا جا رہا ہے۔"

"کیوں مسٹر بخت؟" جج نے کہا۔ "کیا تمہارے پاس یہ فرض کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی تک میں کسی پر الزام نہیں عائد کر سکتا اور اس کا کوئی سبب بتانے سے بھی قاصر ہوں۔"

جج نے مجھے بری کر دیا لیکن اس مرتبہ باعزت طور پر نہیں شک کا فائدہ دیتے ہوئے۔

میری پریشانی تو برحق تھی۔ مگر محسن مجھ سے زیادہ پریشان تھا۔

"یار سکندر..... یہ کیا چکر ہے؟" اس نے شام میرے ساتھ ایک پارک میں بنچ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ آئے تو بتاؤں۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو اندیشہ یہ لاحق ہو رہا ہے کہ پاکستان میں میرے والد بھی کسی مصیبت میں مبتلا نہ ہوں۔ مجھے یاد ہے اس نوابزادے نے پہلی بار فون پر کیا کہا تھا۔ اس نے یہ اطلاع دی تھی کہ تمہارے والد بالکل خیریت سے نہیں ہیں۔ اور اس نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ محتاط رہو۔ اس کی یہ وارننگ غلط نہیں تھی تو وہ اطلاع کیسے غلط ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے ابا جان نے مجھے صحیح بات نہ بتائی ہو۔"

"میرا خیال ہے تو واپس چلا جا۔" محسن نے کہا۔ وہ خاصا متفکر نظر آتا تھا۔

"واپس چلا جاؤں! یعنی ڈر کے بھاگ جاؤں؟ یہ معلوم نہ کروں کہ یہ سب کون کر رہا ہے اور کیوں؟" میں نے کہا۔

محسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم رات کا اندھیرا پھیل جانے تک وہیں بیٹھے مختلف خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ اپنی اپنی عقل کے مطابق توجیہات تلاش کرتے رہے اور غیر یقینی مستقبل کے لیے بے بنیاد منصوبے بناتے رہے۔ اچانک بارش شروع ہو گئی۔ اور ہم دونوں اٹھ کر بھاگے۔ میرے کمرے تک پہنچتے پہنچتے بارش نے شدت اختیار کر لی۔ میں نے محسن کو اپنے کپڑے دیے۔ اور اس نے رات وہیں رک جانے کا فیصلہ کیا۔ کمرے کا مالک یعنی محسن کا وہ جنتی دوست غائب تھا۔ اور اس کے آنے یا نہ آنے کے امکانات برابر تھے۔ وہ اکثر راتوں کو غیر حاضر ہو جاتا تھا۔ رات گئے تک ہم نے فریج میں رکھی ہوئی چیزوں سے اپنا پیٹ بھرا۔ اور کافی پیتے رہے۔ ٹی وی

www.paksociety.com

دیکھتے رہے۔ اور پھر سو گئے۔ محسن نے بیڈ پر قبضہ کر لیا اور مجھے صوفے کے ساتھ قالین پر جگہ بنانی پڑی۔

آدھی رات کے بعد محسن کی زبردست چیخ سے میری آنکھ کھلی میں ہڑبڑا کے اٹھا تو اندھیرے میں ایک سایہ لپکا۔ اور مجھ پر سے گزر گیا۔ میں نے دروازے کی طرف جست لگائی۔ دروازہ دھڑ سے بند ہوا اور کسی نے باہر سے کنڈی لگا دی۔ محسن نے صرف ایک بار چلا کے مجھے آواز دی تھی اور خاموش ہو گیا تھا۔ خوف سے ڈوبتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے میں نے لائٹ آن کی۔ ایک لمحے کے لیے وہ کمرہ میری نظر سے اوجھل ہو گیا اور میں نے محسوس کیا کہ میں نے تیزی سے چلتی ہوئی گاڑی سے زمین پر چھلانگ لگا دی ہے۔ میں نے بڑی سخت جدوجہد سے اپنا توازن بحال کیا اور دوڑ کر بیڈ تک پہنچا۔ محسن! میں نے چیخ کر کہا۔ پھر میں نے وہ خنجر دیکھا جو محسن کے سینے میں پیوست تھا۔ لیکن نشانہ خطا ہو جانے کے باعث دل سے بہت اوپر شانے کے قریب لگا تھا۔ خون تیزی سے بہہ کر لیٹے کو تر کر رہا تھا۔ میں نے پھر دروازے کی طرف دوڑ لگائی اور اسے زور زور سے ہلانے لگا۔ دو منٹ بعد کسی نے کنڈی کھول دی۔ اس عمارت کے دوسرے مکین بھی شور پر متوجہ ہو کے باہر آنے لگے تھے میں نے بلا توقف نیچے کا رخ کیا جہاں ہال میں فون رکھا تھا۔ پہلے ڈاکٹر کو اور پھر پولیس کو بلانے کے بعد میں واپس کمرے میں آیا۔ اس وقت تک کمرے میں چار افراد جمع ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے زخم پر تولیہ رکھ کے خون روکنے کی واجبی سی کوشش کی تھی۔ باقی لوگ وہ تفصیلات جاننا چاہتے تھے جو خود مجھے معلوم نہیں تھیں۔

محسن کا زخم خطرناک نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے بعد مجبوراً میں نے اسے ہسپتال میں چھوڑا کیونکہ پولیس مجھ سے تفتیش کے لیے بے چین تھی۔ ایک بار پھر میرا واسطہ اسی سراغرساں سے پڑا جس نے مجھے پہلی مرتبہ گرفتار کیا تھا۔ "مسٹر بخت؟" وہ مجھے غور سے دیکھ کر بولا۔ "تم شیطان کی طرح شہرت حاصل کرنے لگے ہو۔ یہ چکر کیا ہے؟"

"چکر کچھ نہیں" میں نے تلخی سے کہا۔ "لندن کی پولیس نااہل ہے تم سب کالوں کے قاتل ہو۔"

اس نے سوچے سمجھے بغیر میرے تھپڑ رسید کر دیا۔ میرا دماغ آؤٹ ہو گیا۔ اور میں نے جواب میں اس کے جوڈو کا ایک ہاتھ مار دیا۔ وہ کرسی پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ اور مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ صبح میں دوسری بار اس جج کی خدمت میں حاضر ہوا جس نے مجھے دوبارہ رہا کیا تھا۔ وکیل نے یہ تو ثابت کر دیا کہ محسن پر حملہ دراصل مجھ پر حملہ تھا۔ محسن میرے کمرے میں میرے بستر پر اور میرے کپڑوں میں تھا۔ چنانچہ وہ نامعلوم حملہ آوروں کا نشانہ بنا۔ لیکن خوش قسمت تھا کہ زندہ بچ گیا۔ تاہم وہ عدالت کو یہ نہ بتا سکا کہ حملے کا شک کس پر کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر واقعی میں سازش کا شکار ہوں تو سازش کا مقصد کیا ہے۔ بغیر وجہ کے کوئی کسی سے دشمنی کیسے کر سکتا ہے۔ محسن کے بیان سے میری پوزیشن مزید صاف ہو گئی۔ مگر ایک پولیس افسر پر حملہ کرنے کے جرم میں مجھے ایک ماہ قید محض کی سزا سنا دی گئی۔ جسے جج نے معطل رکھا۔ اور کہا کہ اگلی مرتبہ ایسی ہی واردات میں ملوث ہونے پر مجھے سیدھا جیل بھیج دیا جائے گا۔

عدالت سے باہر آتے ہی مجھے وکیل نے روک لیا۔ "مسٹر سکندر بخت!" اس نے کہنا شروع کیا۔ "یہ... یہ جو کچھ ہو رہا ہے میں نہیں کہتا کہ اس میں تمہاری نیت کو دخل ہے... یا تم غلط کہتے ہو۔ مگر میں اب آئندہ تمہارے کسی معاملے میں وکالت نہیں کر سکوں گا۔ پولیس کے پاس تمہاری فائل موٹی ہوتی جا رہی ہے اور وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن حقیقت وہی ہے جس کے اظہار پر کل تم نے اس پولیس افسر کو ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ تم واقعی شیطان کی طرح شہرت حاصل کر رہے ہو۔"

"مجھے معلوم ہے" میں نے تلخی سے کہا۔ "اب تک تم نے میری مدد کی اس کا شکریہ۔"

"ایک اور بات" وکیل نے کہا۔ "میں محسن کا کزن ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری وجہ سے اس کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔ وہ کم از کم اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا ہے۔ تعلیم محض شوقیہ حاصل کر رہا ہے۔ شوق کی خاطر جان سے جانے میں کوئی عقلمندی نہیں۔ میں اس کے والدین کو فون کر رہا ہوں کہ وہ محسن کو لے جائیں۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

"محسن میرا بچپن کا سب سے عزیز دوست بھی ہے اور محسن بھی۔ میں اعتراض کیسے کر سکتا ہوں" میں نے کہا۔ "میرے بجائے شاید وہ مارا جاتا۔ اچھا ہے۔ اس کے والد آ کے اسے زبردستی لے جائیں۔"

تین دن بعد محسن کے والد یعنی انکل شیر والا خود چلے آئے تھے محسن کو اس کے احتجاج کے باوجود اپنے ساتھ لے گئے۔ میں ان کے جہاز کی پرواز کے بعد بھی ائیرپورٹ پر یوں کھڑا رہ گیا جیسے میرے ارد گرد سنسان جنگل ہے جس سے میرے لیے سلامتی کی منزل کا ایک ہی راستہ تھا جو اب نہیں رہا۔ پہلی بار میں نے خود کو تنہا، بے بس اور خوفزدہ محسوس کیا۔

آخری واقعہ دو ہفتے بعد آیا۔ میں بارش سے بے نیاز سردی میں بھیگتا ہوا آدھی رات سے کچھ پہلے ایک جگہ ملازمت کی کوشش میں کامیاب ہو کے لوٹ رہا تھا۔ ایک پاکستانی تاجر نے جس کا لندن میں بہت بڑا اسٹور تھا۔ اور دوسرے شہروں میں برانچیں تھیں، میرے حالات سن کر مجھے سیلز مین رکھنا منظور کر لیا تھا۔ اس سے پہلے انگریز تو انگریز خود میرے ہم وطن اور بہت سے ایشیائی بڑی شرافت اور اخلاق کے ساتھ "سوری" کہہ کے یہ واضح کر چکے تھے کہ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے لیکن یہ ہیرا فراخ سوچ رکھنے والا اور جرأت مند آدمی تھا۔ اس نے کہا۔ "سکندر بخت! ابتدا میں مجھے بھی ان گوروں کی متعصبانہ ذہنیت کا سخت مقابلہ کرنا پڑا تھا لیکن میں ایک معزز شہری ہوں۔ میں ان کے ہتھکنڈے سمجھتا ہوں۔ اس لیے ان کی پروا نہیں کرتا۔ تم فکر مت کرو۔ ایک بار یہ معلوم ہو جائے کہ تمہارے دشمن کون ہیں۔ پھر میں ان کا بندوبست کروں گا کہ سب کا دماغ درست ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے وہ کرائے کے آدمی ہیں۔ یہ چکر یہاں بہت عام ہے لیکن لوٹ کر کھا کا تماشا ہے۔ اتنی جلدی یہ بھی یہاں سمیٹ گئے۔ جو نوٹ دیکھتے ہی گورے کالے کا فرق بھول جاتے ہیں۔" میں اپنے خیالات میں غلطاں تیز تیز قدموں سے چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک ویران موڑ پر مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ہی تھا کہ ایک سایہ سا مجھ پر لپکا۔ میرے سر پر لوہے کی سلاخ جیسی کوئی چیز پڑی اور ذہن پر چھانے والی بے ہوشی کی کیفیت کا آخری احساس یہ تھا کہ مجھے زمین پر گرتے ہی اٹھا لیا گیا ہے۔

آہستہ آہستہ میرے حواس بحال ہوئے تو میں بالکل دوسری جگہ سڑک پر پڑا تھا۔ آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجھے کچھ لوگ نظر آئے جو حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں چھتری تھی۔ سوائے ایک پولیس مین کے جو میرے سر کے قریب بجلی کے کھمبے کی طرح استادہ تھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اور بارش اس کے ساکت و جامد جسم پر مسلسل گر رہی تھی۔ اس کی کھلی آنکھیں مجھے اپنی طرف دیکھتی محسوس ہوئیں۔ پھر اسٹریٹ لائٹ کے مدھم دھندلے اجالے میں میری یادداشت نے ایک صورت کے خد و خال تراشنے شروع کر دیے۔ بالآخر میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی عورت تھی جس نے ہوسٹل میں مجھ پر عصمت دری کی کوشش کا الزام لگایا تھا۔ اس کے آس پاس خون کا نام و نشان نہیں تھا اور اس کے جسم پر کسی زخم یا چوٹ کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ مگر اس میں شک کی کوئی بات نہ تھی کہ وہ مر چکی ہے۔

میں نے سر اٹھانے کی کوشش کی مگر اسی وقت سائرن سنائی دیا اور مجھ پر غنودگی چھٹ گئی۔ ایک ایمبولینس اور ایک پولیس کار میرے بہت قریب آ کے ٹھہری۔ مستعد ہاتھوں نے پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ مجھے اسٹریچر پر ڈالا اور ایمبولینس میں سرکا دیا۔ پھر دوسرا اسٹریچر اندر آیا اور ایمبولینس کا پچھلا دروازہ بند ہو گیا۔ اب میں ایک لاش کے ساتھ مسلح محافظوں کی نگرانی میں سفر کر رہا تھا۔

اور مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ میری منزل کیا ہے۔ اپنی بے گناہی کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرنے تک میں قانون کی نظر میں اس عورت کا قاتل تھا۔ ہسپتال پہنچنے کے بعد مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا اور وہ بدبخت عورت جو چار پاؤنڈ کے چکر میں جان سے گئی تھی شاید مردہ خانے پہنچی۔ طبی معائنے کے دوران اور بعد میں ایک پولیس افسر اور سراغرساں ہمہ وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہے۔

ایک ہفتے کی تفتیش کے دوران میں نئے انکشافات نہیں ہوئے۔ اس عورت کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا مگر اس کی گردن پر میری انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے تھے۔ میں نے الزام کی صحت اور اعتراف جرم سے صاف انکار کر دیا لیکن اس بات کی وضاحت نہیں کر سکا کہ مجھے بے ہوش کر کے لاش کے قریب ڈال جانے کی کارروائی بھی میرے خلاف سازش تھی تو سازش کے محرکات کیا تھے اور سازش کرنے والے کون تھے۔

اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ایک انتہائی سرد مزاج، صورت سے بے وقوف نظر آنے والے مگر بہت ذہین اور عیار سراغرساں نے میرے خلاف تمام واقعات کی ایک ضخیم فائل مرتب کر لی تھی جس میں ترتیب وار ہوسٹل میں مقتول عورت کی ہنگامہ آرائی سے قبل تک کے تمام واقعات اور بیانات وغیرہ شامل تھے۔

میرے خلاف الزامات کی فہرست بہت طویل تھی۔

"مسٹر سکندر بخت!" اس نے صبح موقع پاتے ہی فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ہوسٹل میں نسلی منافرت اور تشدد پسندانہ خیالات کے اظہار پر وارننگ دی گئی تھی۔"

"وہ ایک تنگ نظر متعصب بوڑھے یہودی کی معاندانہ کارروائی تھی" میں نے کہا۔

"پھر یہ مقتول عورت کا ہنگامہ تمہارے کمرے میں ہوا جو ہوسٹل کی تاریخ میں کبھی نہ ہوا تھا" سراغرساں نے بات جاری رکھی۔

"عدالت نے مجھے اس مقدمے سے باعزت طور پر بری کر دیا تھا۔ سزا مقتول... اس عورت کو ہوئی تھی۔"

"لیکن اس کے بعد چلا شک کیوں اس کمرے میں چھپا جہاں سے تم کو نکالا گیا تھا اور تم شک کے فائدے پر چھوٹ گئے۔" سراغرساں نے صفحہ پلٹ کے کہا۔ "واردات میں دو افراد ہلاک ہوئے تھے۔ ہوسٹل کی تاریخ میں ایسی واردات بھی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔"

میرا ضبط کا حوصلہ جواب دینے لگا۔ "گویا میری تاریخ ساز شخصیت..."

"پلیز شٹ اپ" سراغرساں نے کہا۔ "اس واردات کے

www.paksociety.com

بعد میں تمہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا لیکن ہوسٹل سے نکال دیا گیا تھا۔ تم نے ایک منشیات کے عادی اور منشیات کے دھندے میں ملوث شخص کے گھر میں پناہ لی۔"

"یہ میرے لیے ایک انکشاف ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اس شخص کو جانتا نہیں تھا۔"

"وہیں تم نے تلاشی کی ایک اور واردات میں ملوث ہونے پر تم نے تفتیش کرنے والے پولیس آفیسر پر حملہ کیا چنانچہ تمہیں ایک ماہ قید کی سزا دی گئی جو معطل رکھی گئی تھی۔" اس نے مزید چند صفحات پلٹ کے کہا۔

"اس پولیس افسر نے مجھے گالی دی تھی۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "اور جو شخص زخمی ہوا تھا وہ میرا عزیز ترین دوست تھا۔ حملہ مجھ پر کیا گیا تھا۔"

"تم جج کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکے تھے کہ تمہارے خلاف سازش کا جواز کیا ہے؟" وہ اسی سرد مہری سے بولا۔ "اور خود تمہارے وکیل نے آئندہ کے لیے تمہاری پیروی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

"اس کی خدمات رضاکارانہ تھیں۔" میں نے بے رخی سے کہا۔

"اب تازہ ترین حادثہ اس عورت کا قتل ہے جس نے پہلی بار تم پر ایک سنگین الزام عائد کیا اور اس طرح وہ تمہارے ہوسٹل سے اخراج کا اور تمہارے تعلیمی کیریئر کے خاتمے کا سبب بنی تھی۔" سراغرساں نے فائل دکھا کے اور مجھ پر نظر جما کے کہا۔ "کیا یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ تم نے انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ تم اب تک یہ ثابت نہیں کر سکے ہو کہ تم پر کسی نامعلوم شخص نے جائے واردات سے دور حملہ کیا تھا۔"

"تو میرے سر پہ ڈنڈا یا سریا کس نے مارا تھا؟ خود میں نے؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

سراغرساں نے نفی میں سر ہلایا اور فائل کا ایک اور صفحہ پلٹا۔ "میڈیکل رپورٹ میں سریے ڈنڈے کا کوئی ذکر نہیں۔ تمہارے سر پہ چوٹ لگا تھا۔ غالباً یہ چوٹ گرنے سے آئی تھی۔ تم مسٹر اقبال سے واقف ہو؟"

"ہاں۔" میں نے جوش سے کہا۔ "وہ بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ انہوں نے مجھے سیلز مین کی جگہ دی تھی۔"

"اور تم رات گیارہ بجے کے قریب ان کے گھر سے رخصت ہوئے تھے۔" سراغرساں نے مزید صفحات پلٹے۔ "ان کے بیان کے مطابق تم گیارہ بج کر بائیس منٹ پر گئے تھے۔ یہ واردات ان کے گھر سے دو سو گز کے فاصلے پر ہوئی ہے، اور میڈیکل رپورٹ میں واردات کا وقت گیارہ سے بارہ کے درمیان متعین کیا گیا ہے۔ تمہارا کمرہ اس جگہ سے دو میل دور ہے۔ ٹیکسی سے صرف دس منٹ کی مسافت پر۔ مگر تمہارا بیان ہے کہ تم بے گلہ بارہ بجے کے قریب ہوا۔"

"میں پیدل گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور ٹیکسی کی طرح دوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں سیر کرنا چاہتا تھا۔"

"بارش کے باوجود؟" سراغرساں طنز سے مسکرایا۔ "شاید یہ بات تمہیں یاد نہیں رہی؟"

"مجھے بارش میں پیدل چلنے کا خبط ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا میرا شوق خلاف قانون ہے؟ ویسے میں ٹیکسی تلاش کر رہا تھا۔"

سراغرساں مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ "تم نے اس عورت کو قتل کیا ہے۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

"تم کسی طرح مجھے اعتراف جرم پر مجبور نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔ "میرے وکیل نے سفارت خانے کو بھی مطلع کر دیا ہے۔ تم اپنے تھرڈ ڈگری کے طریقے استعمال نہیں کر سکو گے۔ آخر تم شرلاک ہومز کے طریقے کیوں نہیں استعمال کرتے؟"

"تمہارے لیے ایک اطلاع ہے۔" اس نے جیب سے سگریٹ نکال کے جلایا۔ "سفارت خانے کی رضا مندی سے برطانوی حکام تمہیں ڈی پورٹ کرنے کے امکانات کا جائزہ لے رہے ہیں۔"

"سفارت خانے والے ایسے کسی انتقامی اقدام کی حمایت نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔

"انہیں تمہاری حکومت کے ایک اعلیٰ افسر کی طرف سے یہ درخواست موصول ہوئی ہے۔" وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ "وہ افسر تمہاری وزارت خارجہ کا ڈپٹی سیکرٹری ہے اور تمہارے دوست سید محسن رضا کا باپ ہے جو پہلے ہی پاکستان جا چکا ہے۔"

یہ انکشاف واقعی افسوسناک تھا۔ محسن نے خلوص نیت سے میری ذلت و رسوائی کا سامان کر دیا تھا۔

"اگر تم پہ یہ الزام ثابت نہ ہوا، جس کا امکان بہت کم ہے، تو تم رہائی کے فوراً بعد ناپسندیدہ شخص قرار دے کر نکال دیے جاؤ گے ورنہ جیل کاٹنے کے بعد۔" اس نے اپنے لہجے کی بے نیازی کا انداز برقرار رکھا۔ "ایک بات اور بھی ہے۔ مقتول عورت سوہو کے علاقے کی ایک تھرڈ ریٹ کسبی تھی اور ایک ماہ کی جیل کاٹ کے پیرول پہ رہا ہوئی تھی۔ صرف ایک دن پہلے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ سزا اس کو تم پہ الزام تراشی کے جرم میں ہوئی تھی۔"

"تم نے اپنے نظام انصاف کی غیر جانبداری دیکھی ہے؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "جرم مجھ پر ثابت ہو جاتا یا کر دیا جاتا تو مجھے کتنی لمبی جیل کاٹنی پڑتی؟ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ مقتول عورت نے خود ہی اقبال جرم کر لیا تھا۔ مگر اس کے باوجود ایک سازش میں ساتھ دینے، میری رسوائی کا سبب بننے، میرے کمرے میں ناجائز طور پر داخل ہونے اور دیگر جرائم کی مرتکب ثابت ہونے کے باوجود اسے کتنی کم سزا دی گئی جو اس نے نصف کاٹی۔"

"کل رات دو افراد اس سے ملنے آئے تھے۔" سراغرساں نے میری بات سننے کے بعد کہا۔ "پڑوس کی ایک مخبوط الحواس بڑھیا نے ان کو دیکھا تھا جس کی بصارت اور سماعت بھی قابل اعتبار نہیں۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ دونوں ایشیائی تھے۔ ایک دراز قد اور خوشحال۔ دوسرا پستہ قد اور کرخت۔ جھگڑے کی آواز پہ بڑھیا متوجہ ہوئی تھی۔ اس نے چیخ کر کہا تھا کہ ہاں۔ میں نے سب کچھ بتا دیا ہے کیونکہ تم نے بد عہدی کی تھی۔ جواب میں دراز قد نے کہا تھا کہ ہم بہت جلد تمہارا حساب بے باق کر دیں گے۔ ان دونوں کا حوالہ مقتولہ نے مقدمے کی سماعت کے دوران بھی دیا تھا۔ کیا تم اس سلسلے میں کچھ بتا سکتے ہو۔ تمہاری ذات ان معاملات سے متعلق رہی ہے۔"

"متعلق تو اس جج کی ذات بھی رہی ہے۔ تم نے اس سے پوچھا؟" میں نے جل بھن کر کہا۔

ایک ہفتے بعد تفتیش کے مراحل تقریباً مکمل ہو چکے تھے اور مجھے فرد جرم کے ساتھ عدالت میں پیش کرنے کے انتظامات ہو رہے تھے۔ کرسمس کے وقت مجھے ملاقات کے لیے علیحدہ کمرے میں لے جایا گیا۔ اس کمرے میں صرف وکیل کو مجھ سے تنہائی میں بات کرنے کا حق حاصل تھا اور وکیل ایک بار مجھ سے ملاقات کر کے جا چکا تھا۔ اس وقت یوں بھی ملاقات خلاف ضابطہ تھی چنانچہ میں سوچ رہا تھا کہ آنے والا کون ہو سکتا ہے۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی میں نے ستر برس کے دراز قامت اور دبلے پتلے انگریز کو دیکھا جس نے انتہائی قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا اور جو ہاتھ میں عصا لیے بالکل سیدھا کھڑا تھا جس کا سرخ و سفید متکبر چہرہ حاکمیت کے جلال اور دولت مندی کے۔۔۔ نسلی برتری کے احساس کا آئینہ دار تھا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ سابق غلام ہندوستان کے ایک صوبے کا مذہبی متعصب اور تنگ نظر لیفٹیننٹ گورنر تھا۔ "مسٹر سکندر بخت!" اس نے بڑی نخوت کے ساتھ مصافحہ کیے بغیر کہا۔ "تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں؟"

"میں نے پہچان لیا ہے اور اس لیے میں حیران ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ کیا تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے آئے ہیں؟"

اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ "کاش یہ ممکن ہوتا۔" وہ بولا۔ "لیکن میری ایک لڑکی ہے، صرف ایک۔"

"میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "اس کا نام مارگریٹ ہے۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"یہی تو میری بدقسمتی ہے۔" اس نے منہ دیوار کی طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "مگر وہ اپنی ماں پر گئی ہے۔ اس کی ماں بھی ایک سینئر پرنس کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ اب زندگی میں دوسری بار میری عزت خطرے میں ہے۔"

"تم اس خطرے کا تدارک کر سکتے ہو۔ پہلی بار عزت کیسے بچائی تھی تم نے؟"

اس کی صورت پہ ایک تاریک سایہ پھیل گیا۔ "بیوی کو میں نے باعزت طور پہ دفن کرا دیا تھا۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ اب بیٹی کو زیادہ باعزت طور پہ دفن کرا دو۔" میں نے تلخی سے کہا۔

اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ "شادی تو میں نے دوسری کر لی تھی۔ اب میں مجبور ہوں اتنی بڑی بیٹی کہاں ملے گی؟"

"افسوس کہ برطانیہ کے عام شہری قوانین تم کو حاکم تسلیم نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "اور تم مجھے دفن نہیں کرا سکتے۔ وہ غلام ہندوستان تھا جہاں تم حاکم تھے اور قانون سے بالاتر تھے۔"

اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ فرط اشتعال سے اس کا بدن لرزنے لگا تھا مگر وہ ضبط کر رہا تھا۔ "سکندر بخت! میں اب بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ آدمی جو کرنا چاہے ہر جگہ ہر وقت کر سکتا ہے۔ کوئی قانون کسی سزا کا خوف اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ میری زندگی کے کتنے دن باقی ہیں؟ میں تمہیں اسی وقت شوٹ کر کے خودکشی بھی کر سکتا ہوں مگر اس کا فائدہ بھی کیا؟ بے وقوف لڑکی سمجھے گی اور جب اسے تم سے بچانے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔ تو۔۔۔ مگر خیر۔۔۔ یہ بتاؤ کیا وہ تم کو اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ تم بھی شادی کرنا چاہتے ہو اس سے؟"

[illegible]
مکتبہ [illegible] پوسٹ بکس نمبر ۹۲۳ کراچی

www.paksociety.com

میں نے اس کی تجویز پر تذلیل کے لیے قہقہہ مارا۔ "میں اب غلام نہیں آزاد ملک کا خود مختار شہری ہوں سر! میں کسی بھی تم جیسے لارڈ کی بیٹی سے جوتے تو صاف کرا سکتا ہوں مگر شادی کا شوق اسے ہے۔"

"شٹ اپ!" وہ چلایا۔ "یہ مت بھولو کہ میں ایک باپ بھی ہوں۔ میں تم سے ایک سودا کرنے آیا ہوں اور اس لیے تمہاری بکواس سن رہا ہوں کہ مجھے تم جیسے شیطان سے نجات کی دو صورتیں نظر آتی ہیں جس میں میری عزت بھی محفوظ رہے گی اور تم پر میرا احسان بھی رہے گا۔ مسٹر حیدر، میں تمہیں اس الزام سے بچا سکتا ہوں۔ سمجھے؟"

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ "میں تمہارے احسان کے مقابلے میں سزائے موت کو ترجیح دوں گا۔"

"آل رائٹ۔ گویا بدلہ احسان کو تم" وہ چیخ کر بولا اور سنتری نے دروازہ کھول کے اندر جھانکا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی وہ دروازہ بند کر کے غائب ہو گیا۔ "اگر تم یہاں سے دفع ہو جاؤ، اس ملک سے نکل جاؤ تو میں گواہی دے سکتا ہوں کہ جب تم پر حملہ کیا گیا تھا تو دھوپ سے گزر رہا تھا۔ میں نے کسی کو تم پر حملہ کرتے اور پھر اسے گاڑی میں ڈال کر لے جاتے دیکھا تھا لیکن میں دور تھا اور پیدل تھا۔ آس پاس کوئی پولیس مین نہیں تھا اور جائے واردات پر کوئی فون وغیرہ نہیں تھا اس لیے میں خاموش رہا۔"

"ایک عیار سراغ رساں تم سے پوچھے گا سر! شاید آپ کو یاد نہیں رہا اس وقت بارش ہو رہی تھی، اور آپ لارڈ ہیں آپ پیدل کیوں تھے؟" میں نے طنز اور تمسخر کے ساتھ کہا۔

"مائی فٹ۔ کوئی سراغ رساں مجھ سے کچھ نہیں پوچھے گا۔ مجھے خود سے بارش میں پیدل چلنے کا۔ ستر سال کا بوڑھا خبطی اور سنکی ہوتا ہے۔ اب بولو، تم یہاں جیل میں رہنا چاہتے ہو یا ڈی پورٹ ہونا؟" وہ بولا۔

"ڈی پورٹ ہونا میرے لیے باعث مسرت ہوگا۔" میں نے کہا۔ "بشرطیکہ مارگریٹ میرے فراق میں خودکشی نہ کر لے۔"

اس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور چھڑی کو بڑے وقار سے گھماتا دروازے کی طرف بڑھا۔ "اسے میں سمجھا لوں گا۔"

"لارڈ جیمز!" دروازے کے قریب میں نے اسے روک لیا۔ "آئی ایم سوری سر!" میں نے صدق دل کے ساتھ کہا۔ "اور میں آپ کے اس احسان کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ انسانی دشمنوں کی آبرو کا رنگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

اس نے رک کر مجھے دیکھا۔ ہاتھ بڑھا کے مجھ سے مصافحہ کیا اور باہر نکل گیا۔

❋

جب مجھے ڈی پورٹ کیا گیا تو الوداع کہنے کے لیے آنے والے افراد صرف دو تھے۔ ایک لارڈ جیمز اور دوسری اس کی بیٹی مارگریٹ۔ اور وہ اتنی افسردہ تھی کہ میرے لیے اس سے نگاہ ملانا بھی دشوار تھا۔ میرے ذہن میں وہ شام تھی جب ایک احمقانہ کمینی خواہش کے تحت میں نے اس سے اپنے آباؤ اجداد کی غلامی کا انتقام لینے کے بارے میں سوچا تھا۔ جہاز کے ٹیک آف کرنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا جب اچانک اناؤنسر کی آواز نے ہر سمت سے مجھے پکارنا شروع کیا۔ "مسٹر سکندر بخت جہاں بھی ہوں پی آئی اے کے کاؤنٹر پر آ جائیں۔ ہیلو، اٹینشن مسٹر سکندر بخت...!"

کاؤنٹر پر ایک نک چڑھی لڑکی نے غور سے مجھے دیکھا۔ "آپ سکندر بخت ہیں؟" وہ تقریباً ڈانٹ کر بولی۔

"جی۔ اپنا پاسپورٹ دکھاؤں؟" میں نے کہا۔ "یا حلف نامہ داخل کروں؟"

جواب دیے بغیر اس نے ایک لمبا سا خاکی لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ "آپ کے لیے۔"

میں نے لفافہ لے لیا۔ اس پر میرا ہی نام لکھا ہوا تھا۔ "یہ کس نے دیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ایک بچہ تھا۔" نک چڑھی لڑکی نے کہا۔ "میں نے اس کا نام نہیں پوچھا!"

"یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس کو یہ خط کس نے دیا تھا؟" میں نے کہا۔

"جی نہیں، ویسے آپ اس کو لینے کے پابند نہیں ہیں!" نک چڑھی لڑکی نے کہا۔

اس منطق کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے میں نے لفافہ جیب میں ڈال لیا۔ اس میں صرف کاغذات تھے چنانچہ تشویش کی بات کوئی نہیں تھی۔ لفافے کی بجائے پیکٹ ہوتا تو میں خود اس نک چڑھی سے کہتا کہ میں اسے لینے کا پابند نہیں اور اگر بعد میں وہ پارسل دھماکے سے پھٹ جاتا تو مجھے قطعی افسوس نہ ہوتا۔ شاید سے کاؤنٹر پر آنے والی یہی لڑکی زیادہ خوبصورت اور کم بد اخلاق ہوتی۔ جہاز جب برطانیہ کے قیام کی خوشگوار اور ناخوشگوار یادوں کی سرحد سے بھی دور نکل گیا تب مجھے وہ لفافہ یاد آیا۔

لفافے میں سے ٹائپ کیے ہوئے چند صفحات پر مشتمل

ایک خط برآمد ہوا جو مجھے مخاطب کر کے لکھا گیا تھا لیکن خط کے آخر میں لکھنے والے نے اپنا نام و نشان کچھ نہیں دیا تھا۔ چند سطور پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ ٹائپ کرنے کا مقصد اپنے ہاتھ کی تحریر دینے سے گریز کے سوا کچھ نہیں تھا۔ عبارت ٹھیک تھی مگر ٹائپ کی غلطیاں بے شمار تھیں۔ اس نے لکھا تھا۔

"ڈیئر کبیر خان!

میں نے ایک بار ٹیلیفون کر کے تمہیں بتانے کی کوشش کی تھی کہ تمہارے والد خیریت سے نہیں ہیں اور تمہیں فوراً وطن جا کے حالات کو سنبھالنا چاہیے لیکن تم نے میری بات پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ میں نے تمہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا جسے تم نے اہمیت نہیں دی۔ نتیجہ یہ کہ تمہارے خلاف سازش کا جال پھیلانے والے تمہارے لیے مسلسل پریشانی کے اسباب پیدا کرتے رہے۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اندازوں کی غلطی اور اتفاقات کے باعث تم خیر و عافیت کے ساتھ واپس لوٹ رہے ہو۔ تاہم تمہارے عزم و ہمت اور صبر و استقامت کی آزمائش کے مرحلے تمام نہیں ہوئے اور تم بدستور خطرات کے حصار میں ہو۔ اگر تم میرے دوسری بار فون کرنے پر ہوٹل کے کمرہ نمبر دو سو تین میں آ جاتے تو یہ خط لکھنے کی ضرورت نہ پڑتی اور میں بالمشافہ تمہیں بہت کچھ بتا دیتا۔ شاید بروقت اصل حقائق سے باخبر ہو جانے کے بعد تمہارے شکوک رفع ہو جاتے اور تم فوری طور پر کوئی قدم اٹھاتے تو بہتری کی صورت پیدا ہو جاتی۔ افسوس یہ ہے کہ تم نے مجھے اپنا خیر خواہ تسلیم نہیں کیا۔ ممکن ہے تمہیں بدظن کر دیا گیا ہو۔ لندن سے آتے جاتے میں نے بہت سے خطرات مول لے کر تمہیں خبردار کرنا چاہا تھا مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ اب تیسری بار لندن سے گزرتے ہوئے مجھے تمہارے حالات کے مزید ابتر ہو جانے کی اطلاع ملی تو میں افسوس کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ مجبوراً یہ خط ارسال کر رہا ہوں جس کے بارے میں مجھے بہت کم امید ہے کہ تم تک پہنچ جائے گا۔ اور اگر پہنچا تو لیکن ممکن ہے اس کی خبر بھی دشمنوں تک پہنچ جائے۔ خط کو پڑھ کے جلا دینا اور میرے لیے مغفرت کی دعا کرنا۔ بشرط زندگی تم سے کبھی نہ کبھی ملوں گا تو وہ باتیں بھی بتا دوں گا جو اس وقت نہیں بتا سکتا کیونکہ وقت بہت کم ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہارے سلسلے میں ایک کرائے کے قاتل کو روانہ کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں تفصیلات کا مجھے علم نہیں کہ وہ کون ہے یا اس کا حلیہ کیا ہے اور وہ اپنا کام سفر کے دوران کرے گا یا منزل پر پہنچنے کے بعد۔ ہر صورت تمہیں ہر اجنبی سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

دوسری اطلاع تمہارے لیے زیادہ افسوسناک ہے۔ تمہارے والد جن کو تم ماڈل ٹاؤن کی کوٹھی میں چھوڑ کر گئے تھے اب اس کوٹھی میں نہیں ہیں۔ وہ کوٹھی بھی ان کی نہیں ہے۔ تمہارے جانے کے بعد رفتہ رفتہ کاروبار ان کے ہاتھ سے نکل گیا اور ان کی آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے۔ مجبوراً انہوں نے کوٹھی فروخت کر دی اور قلعہ گوجر سنگھ کے ایک کرائے کے مکان میں اٹھ گئے۔ کوٹھی کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم بھی زیادہ عرصہ ساتھ نہ دے سکی۔ انہوں نے تمہاری تعلیم کی تکمیل کے لیے کچھ رقم ایک غیر ملکی بینک میں جمع کرا دی تھی جو ان کی ہدایات کے مطابق ہر ماہ تم کو ایک بندھی رقم بینک ڈرافٹ کی صورت میں بھیجتا رہا۔ ذاتی ضروریات کی تکمیل کے لیے انہوں نے ایک سیٹھ کے پاس چوکیدار کی ملازمت قبول کر لی۔ یہ سیٹھ ایک زمانے میں تمہارے والد کا ملازم تھا اور غبن کے بعد روپوش ہو گیا تھا۔ جب بعد میں وہ پکڑا گیا تو اس کے خلاف کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا اور اسی رقم سے کاروبار کر کے وہ کھرب پتی بن گیا تاہم وہ قدرت کے نظام انصاف سے نہ بچ سکا اور جب تمہارے والد اس کے پاس نوکری کے لیے گئے تو وہ دنیا میں تنہا تھا۔ اس کے بیوی بچے مری سے لوٹتے ہوئے کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اس نے ترس کھا کر اپنے سابق آقا کو نوکر رکھ لیا۔ بیماری کے باعث وہ کوئی سخت محنت طلب کام نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ان کو کوٹھی کی اور فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کے کام پر لگا دیا گیا۔ اس کے عوض وہ نمک حرام تمہارے

www.paksociety.com

والد کو تین سو روپے دیتا تھا اور یہ کبھی کوئی انہیں وہاں سرونٹ کوارٹر کا ایک کمرہ مل گیا تھا جس میں وہ اب بھی رہائش پذیر ہوں گے۔ میری آخری اطلاع کے مطابق ایک مہینہ پہلے وہ اسی کمرے میں اور شدید علیل تھے۔ ان کو گٹھیا کا مرض لاحق تھا لیکن علاج معالجے کے لیے اچھے ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کرنا ان کی استطاعت سے باہر تھا۔ وہ پیدل ایک سرکاری ڈسپنسری تک جاتے تھے اور اس برائے نام علاج سے فائدے کی بجائے الٹا نقصان ہو رہا تھا۔ یہ سب کچھ قبل از وقت جان لینا تمہارے لیے بے حد ضروری ہے تاکہ خدا نخواستہ تم [illegible] کالج ہوسٹل اور نواب مظفر علی قزلباش کے محل کے درمیان واقع چوہدری سراج دین کی کوٹھی میں کے ڈرائیو وے پر سی۔ سی۔ ڈین کی تختی لگی ہوئی ہے کے سرونٹ کوارٹر میں پہنچو اور تمہیں معلوم ہو کہ وزیر خان کا انتقال ہو چکا ہے اور تمہارے لیے یہ صدمہ غیر متوقع نہ ہو۔ خدا کرے وہ زندہ ہوں اور تمہیں وہ سب کچھ بتا سکیں جو میں نہ بتا سکا۔ انہوں نے یہ سب کچھ تمہیں صرف اس لیے نہیں لکھا تھا کہ تمہاری تعلیم میں ہرج واقع نہ ہو اور یہ نہ ہو کہ تم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے واپس لوٹ آؤ۔ اس طرح ان کی تمام ریاضت رائیگاں جاتی۔ ان کی زندگی کی واحد قابل فخر کامیابی تم ہو۔

گیرا ان کی موجودہ حالت کا سبب صرف ایک شخص ہے، میر شرافت علی۔ جو ان کا بزنس پارٹنر تھا۔ شاید تمہیں علم ہو گا کہ یہ شخص ۱۹۵۰ء میں پاکستان پہنچا تھا۔ اس وقت تک کاروبار کے مالک صرف تمہارے والد تھے۔ تین سال کے مختصر عرصے میں انہوں نے کلیم میں ملنے والی ایک دکان کے اندر لوہا کوٹتے کوٹتے برانڈرتھ روڈ پر وہ فاؤنڈری قائم کر لی تھی جہاں لیتھ مشین کے پلیٹ بنانے سے کام شروع ہوا تھا اور پھر مکمل لیتھ مشین تیار ہونے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پاور ٹول اور متعلقہ آلات بھی بنتے تھے اور ان مصنوعات کی ساکھ بہت اچھی تھی۔ اس کی آمدنی سے تمہارے والد نے کلیم میں ملنے والے مکان کو چھوڑ کر کینال بنک کی کوٹھی کرائے پر لی تھی اور پھر ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی خریدی تھی۔ میر شرافت علی کے آنے کے تین سال بعد ہیرفورڈ اینڈ کمپنی ۱۹۵۹ء میں قائم ہوئی اور جیسے انگریز تجارت کے بہانے ہندوستان آئے تھے اور ہندوستان کے مالک بن بیٹھے تھے۔ ایسے ہی شرافت علی پارٹنر بن کے شامل ہوا اور سارے کاروبار پہ قابض ہو گیا۔ کاغذی دستاویزات میں ہر سال درج ہونے والے منافع کا آدھا حصہ تمہارے والد کو ملتا رہا لیکن صرف اس حد تک کہ وہ منافع کی وصولی کے کاغذات پر اپنے دستخط ثبت کرتے تھے۔ منافع کی رقم شرافت علی کے کسی اکاؤنٹ میں چلی جاتی تھی جو اس نے مختلف بینکوں میں اپنی بیوی کے اور بچوں کے نام سے کھول رکھے تھے۔ اس طرح میر شرافت علی پر بینکنگ کر کے کوئی رقم وصول کرنے کا الزام نہیں آتا تھا۔ تمہارے والد نے ۳۰ جون ۱۹۶۵ کو آخری بار کمپنی کے حسابات میں بحیثیت پارٹنر اپنے دستخط ثبت کیے تھے۔ نفع نقصان کی جعلی شیٹ دیکھی تھی جس کے مطابق ان کے حصے کا منافع تمام اخراجات منہا کرنے کے بعد نقد ساڑھے تین لاکھ روپے بنتا تھا اور اپنے سرونٹ کوارٹر میں آ گئے تھے۔ تیس ہزار ماہانہ کی آمدنی کا مالک تین سو روپے ماہوار پر اپنے ایک ملازم کا اصلی ملازم تھا۔ تمہارے والد نے اپنے حالات کو سب سے چھپائے رکھا اور کمپنی کے نمک خوار بھی یہی سمجھتے ہیں کہ بڑے مالک بیماری کے باعث معذور ہو گئے ہیں چنانچہ سب کاروبار میر شرافت علی کے سپرد کر چکے ہیں جو غلط بھی نہیں لیکن اصل اسباب کا کسی کو علم نہیں ہے۔

مجھے امید ہے اسباب تم خود معلوم کر لو گے اور میر شرافت علی سے اپنے والد کی حق حلال کی کمائی کے اس پیسے کا حساب لے سکو گے جس پر تمہارا حق تھا مگر جو میر شرافت علی نے بلیک میلنگ سے ہتھیا لیا۔ وقت آنے پر میں بتاؤں گا کہ تمہارا یہ خیر خواہ کون تھا۔"

جب میں یہ خط پڑھ رہا تھا تو میرا وجود اس جہاز میں دوسروں کے لیے اس نوجوان آدمی کی صورت میں موجود باقی رہ گیا تھا جو اب سکتے ہوئے چند صفحات پر نظر جمائے ساکت و صامت بیٹھا تھا۔

اور ایک بار عبارت کو آخر تک پڑھ لینے کے بعد پھر حرف آغاز پر آ جاتا تھا۔ صدمے سے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ماؤف ہو گئی تھی اور میرا تن بدن جیسے حقائق کے جوالا مکھی کے پھٹنے سے جھلس رہا تھا۔ میرے خون کا ہر قطرہ تیزاب بن کے لاوے میں آگ کی طرح پگھل رہا تھا اور انتقام۔ انتقام پکارنے لگا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر سڑکوں اور دنیا کو بتا دوں کہ میں وہ بد نصیب اور جنتی بیٹا ہوں جس کے لیے دنیاداری میں صدمہ سیاہی کے سوا کچھ نہیں۔ خون کا یہ آخری رشتہ تھا جو سلامت رہ گیا تھا۔ میں نے اس کی قدر نہ کی۔ ایک بار تقدیر نے جدا کیا تھا تو ملا بھی دیا تھا۔ دوسری بار میں نے اپنا مستقبل سنوارنے کی تدبیر کی اور سات سمندر پار سفید فاموں سے دو سو سال پہلے کے مظالم کا بدلہ لینے کے بہانے انگریز لڑکیوں سے معاشقے لڑاتا رہا۔ یہاں اپنے ہم وطن جو میرے باپ کے دشمن تھے اس پر انسانیت سوز مظالم ڈھاتے رہے۔ اس نے اپنی زندگی کے تمام مصائب اور آلام یوں پیے کہ حرف شکایت زبان پر نہ لایا کہ کہیں اس سے میرے مستقبل کے خواب پریشان نہ ہو جائیں۔ وہ مجھے باقاعدگی سے اتنی رقم بھیجتا رہا جو میری تعلیم کے علاوہ میری عیاشی کے لیے بھی کم نہ تھی اور خود محرومیوں کے عذاب میں گرفتار رہا۔ بچے کھچے ٹکڑوں سے پیٹ بھرتا رہا اور اپنے نوکروں کا نوکر بن کے صبر و شکر کے ساتھ ہر ذلت برداشت کرتا رہا۔ تمہیں عمر بھر خبر نہ ہونے دی تھی۔ ایک نادیدہ خیر خواہ کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ صحت اور کاروبار دونوں ٹھیک ہیں الحمدللہ۔ میرے والد کی آواز نے ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے ٹیلی فون کی زبان سے جھوٹ بولا۔ خدا نخواستہ آج تمہارے والد کو کچھ ہو گیا تو تم کیا کرو گے، اس نادیدہ خیر خواہ نے کہا۔ جب تک میں یہ سوچتا تمہارا کام نہیں کر کل کیا ہو گا۔ میرے والد نے ہنس کر ٹال دیا۔ تیس ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی کا مالک۔ وہ بڈھا جس کا اکلوتا بیٹا لندن میں اعلیٰ تعلیم کے بہانے عیش کر رہا تھا، وزیر خان جو ماڈل ٹاؤن کی ایک کوٹھی سے کار میں بڑی شان سے نکلتا تھا جو ہیرفورڈ اینڈ کمپنی کا مالک تھا۔ مالک جو میر شرافت علی نے غصب کر کے کہا۔ وہ بوڑھا جو کندھے پہ جھاڑن رکھے سالوں صوفے اور کرسیاں، گلدان اور سامان آرائش، کھڑکیوں کے شیشے اور فانوس جھاڑتا پھرتا ہے، جو گٹھیا کے مرض میں مبتلا ہے خیراتی شفا خانے سے بگڑا ہوا اور اسپرین کی گولیاں لا کے شفا کی امید کرتا ہے جو امید لگائے بیٹھا ہے خود غرضی کا جال۔ وہ بوڑھا اپنے اکلوتے بیٹے کے سنہرے مستقبل کے لیے زمانے کی ٹھوکروں میں رہا۔ مستقبل تو سراب تھا۔ اور ان حالات کا ذمہ دار صرف ایک شخص تھا۔

بہت دیر بعد جب غیظ و غضب، تاسف اور ملال اور پشیمانی و پریشانی کے جذبات کی تباہ کن لہر کا زور ٹوٹا تو میں ایک بالکل مختلف اور بدلا ہوا انسان تھا۔ میرے خیالات و احساسات بدل چکے تھے۔ میری ذہنی کیفیت میں وہ انقلاب آ چکا تھا جس نے مجھے زندگی کے مقاصد کا نئے سرے سے تعین کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پہلے میں خوابوں کے محل تعمیر کر رہا تھا۔ اب میرے لیے وہ محلات کی آندھی میں منہدم ہو جانے والے گھروں کے ویران کھنڈر پر نوحہ خواں تھا۔ مجھے اسی ویرانے میں اپنی گمشدہ جنت بنانی تھی اور تعمیر کے خواب کو تعبیر دینے سے پہلے ان سب کے خون سے بنیادوں کی آبیاری کرنی تھی جو اس تباہی و بربادی اور تخریب کے عمل میں شریک تھے اور بھول گئے تھے کہ آنے والا دن یوم مکافات بھی ہو سکتا تھا۔ میری فہرست میں پہلا نام میر شرافت علی کا تھا اور دوسرا چوہدری سراج دین کا جو اب سی۔ سی۔ ڈین ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ اگر تمام خط کے مندرجات درست ثابت ہوئے اور مجھے اپنے باپ کی قدم بوسی کے لیے سی سی ڈین کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر کی بجائے اس کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے کے لیے جانا پڑا تو میر شرافت علی کو اس قتل پر اپنے ہاتھوں سے مرنے موت دوں گا اور چوہدری سراج دین سے سی سی ڈین بن کے میرے باپ کی تذلیل کرنے والے کو وہ سزا دوں گا کہ اس کی ذلت کا تماشا باعث عبرت ہو۔ اس فیصلے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ تمام اندر کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے کوہ گراں کا بار اتنا ہلکا ضرور ہو گیا ہے کہ میں سانس لے سکوں۔

میرے پہلو کے اصیل باشندے یعنی محترم برٹش وائٹ نے میری حالت کے تغیر کو محسوس نہیں کیا تھا یا اس نے غور نہیں کیا تھا مگر کالا صاحب میرے انہماک اور میری صورت کے تاثرات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ "آر یو آل رائٹ؟" اس نے بہت دیر بعد کہا جب میں خط کو جیب میں رکھنے کے بعد آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ "اس خط میں کوئی بہت تشویش کی بات تھی؟" اس نے کہا۔ "مجھے اندیشہ تھا کہیں تمہیں ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔"

"میرا دل پتھر کا ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں خود ایک پتھر ہوں۔ شیشے کے انسانوں کو مجھ سے ڈرنا چاہیے۔"

کالے صاحب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے باہر دیکھنے کو ترجیح دی۔ میں نے اس کا نام مشتبہ افراد کی فہرست میں درج کرنے کے بعد باقی مسافروں پر ایک نگاہ ڈالی کہ ان میں سے کون صورت سے کرائے کا قاتل لگتا ہے۔ لیکن سب چہرے ایک جیسے اجنبی تھے۔ ملکی و غیر ملکی۔ سفید فام۔ گندمی رنگ والے۔ لمبے قد والے یا سیاہ

فاسم۔ جوان اور بوڑھے۔ سب اپنے اپنے خیالات میں گم تھے مگر کسی صورت پر قاتل کا گمان نہ ہوتا تھا اور سب قاتل لگتے تھے۔

"بائی دی وے" کالے صاحب نے اچانک کہا۔ "کیا میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں؟" یہ مدد کے جذبے سے زیادہ تجسس کا جذبہ تھا جو اسے دخل در معقولات پر اکسا رہا تھا۔

"ہاں۔" میں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "آپ بتا دیں کہ میں نے کروڑ میں سو تین کو تین سو دو سمجھنے کی غلطی کیوں کی تھی اور اگر ادھر کا چند سو ادھر نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اور کیا نہ ہوتا؟"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" کالے صاحب نے چکرا کے کہا۔

"ادھر کا چند سو ادھر ہوتا۔"

"میں بھی نہیں سمجھا تھا کہ تو ما نکو میرا خیر خواہ ہے۔" میں نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ "کاش میں تو ما نکو سے مل لیتا۔"

راستے میں گفتگو تو درکنار میں نے سوچنا تک ترک کر دیا تھا۔ کالے صاحب کے لیے مجھے تشنے میں ذرح کرنا محال تھا۔ اس نے مجھے مخبوط الحواس حد تک نامعقول انسان قرار دیتے ہوئے مزید گفتگو سے احتراز کرنا بہتر سمجھا۔ کئی گھنٹے بعد جب جہاز کا رخ اسلام آباد سے لاہور کی طرف کیا گیا تو انہوں نے مزید ایک جملہ ارشاد کیا تھا کہ میں کوشش کر رہا ہے تو صاف کیوں نہیں بتایا جاتا مگر مجھ سے مخاطب ہو کے نہیں۔ آخری بات لاہور ایئر پورٹ پر ہوئی جب انہوں نے ناگواری سے کہا کہ اگر میرا ارادہ جہاز ہی میں بیٹھے رہنے کا ہے تو میں ان کو گزرنے کا راستہ دے دوں۔ بعد میں نے حیران ہو کے دیکھا تو جہاز واقعی لاہور ایئر پورٹ پر کھڑا تھا۔ سیٹ بیلٹ جو میں نے غیر شعوری طور پر باندھ لی تھی ابھی تک میرے جسم پر کسی ہوئی تھی۔

میں نے اپنے سفر کو لاہور ہی میں ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب میں نے اپنا اسباب اور دستاویزات وغیرہ کو کسٹم کی چیکنگ کے لیے پیش کیا تو مجھے اپنے ساتھ چند اور مسافر بھی نظر آئے۔ ایک بوڑھا انگریز اور اس کی نسبتاً جوان بیوی۔ وہ سیاح یا ریسرچ اسکالر وغیرہ ہو سکتے تھے جو موہنجوڈرو یا ٹیکسلا کے گڑے مردے اکھاڑتے پھرتے ہیں۔ دوسرا ولایتی جوڑا انداز و اطوار کی بے فکری اور لاابالی پن سے ہنی مون منانے کے موڈ میں نظر آتا تھا اور انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ جہاز کہاں اترا ہے۔ وہ بچہ کابل یا ماؤنٹ ایورسٹ پر بھی اتنے ہی خوش نظر آتے۔ باقی دو انگریز مشکل صورت اور معزز قسم کے کاروباری یا سفارتی حلقے کے اعلیٰ ارکان ہو سکتے تھے۔ ان کو میں نے فرسٹ کلاس سے برآمد ہوتے دیکھا تھا۔ ان میں سے کسی کو کرائے کا قاتل سمجھنا ذہنی غیر منطقی سی بات لگتی تھی۔ ان سے دو گنی تعداد میں پاکستانی مسافر تھے جن کو شاید میری طرح لاہور ہی آنا تھا۔ صرف تین کے ساتھ ان کا کنبہ بھی تھا۔ باقی میری طرح تنہا ہی تھے۔ میں نے بغور ان کی صورتوں کو ملاحظہ کیا مگر قاتل اگر پیشہ ور ہو تو چہرہ وہ ہوتے نقاب میں رکھتا ہے۔ اپنی باری آنے پر میں نے کسٹم کی رسمی کارروائی پوری کی۔ میرے پاس ڈیکلیئر کرنے کو کچھ بھی نہ تھا۔

"کمال ہے۔ آپ تین سال لندن میں رہے اور اپنے ساتھ کچھ نہیں لائے؟" محکمے کے ایک رکن نے ناقابلِ یقین مشتبہ لہجے میں کہا۔

"مثلاً کیا؟ الکوحل، کیمرے وغیرہ؟" میں نے کہا۔ "میں نے سنا تھا اس پر ڈیوٹی بہت زیادہ ہے بلکہ خواہ مخواہ ضبط ہو جاتی ہے۔"

با دل نخواستہ انہوں نے مجھے جانے کی اجازت دی۔

"ٹیکسی سر؟" ایک مستعد قسم کے شخص نے مجھے کارڈن آف ایریا کراس کرنے کے بعد کہا۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ صرف تین سال میں میرے ملک کے ٹیکسی ڈرائیور اتنے مہذب اور شائستہ ہو چکے ہیں۔ لیکن ریلوے اسٹیشن جانے کا کرایہ اس نے سو روپے مانگا اور سرزدار لہجے میں کہا کہ زرمبادلہ کی صورت میں پانچ پونڈ بھی قبول ہوں گے۔ تو میری خوش فہمی دور ہو گئی۔ اسی وقت دوسری ٹیکسی میرے سامنے آرکی۔ اور ایک بار پھر مجھے تعجب ہوا۔ کیونکہ دوسرے ٹیکسی ڈرائیور نے کوئی سودا نہیں کیا۔

"جو میٹر بتلائے گا جناب عالی وہی لیں گے۔" اس نے کہا۔ راستے میں اس نے ملک کو بدنام کرنے والے لٹیرے ٹیکسی ڈرائیوروں کے خلاف لیکچر دیا۔ لیکچر کا حصہ دوم جس میں رزق حلال کی اہمیت کا ذکر تھا، ابھی جاری تھا کہ ٹیکسی نے شملہ پہاڑی کا موڑ کاٹا تو میرے دل کی دھڑکن یکلخت تیز ہو گئی۔

ابھی ایک ہفتہ قبل میں نے فون پر ان سے بات کی تھی اس کے بعد مجھے ڈرافٹ موصول ہوا تھا۔ محسن یہاں آکے میرے والد سے ضرور ملا ہوگا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ ضرور لکھ دیتا۔ مگر اس نے تو ایک خط بھی نہیں لکھا تھا۔ اور خود میرے والد کا آخری خط کب آیا تھا؟

"کہاں جانا ہے آپ کو جناب عالی؟" ٹیکسی ڈرائیور نے آہستہ سے بریک لگائی اور پلٹ کر کہا۔

میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ یکلخت میری نگاہ سیاہ پلاسٹک کی تختی پر ابھرے ہوئے سفید پلاسٹک کے روشن حروف پر گئی۔ "میں سی ڈین" — میں نے زیر لب کہا۔ "بس یہیں جانا تھا۔" پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ "تم نے یہاں ٹیکسی کیوں روکی؟ میں نے تو ریلوے اسٹیشن کہا تھا۔"

"تو ریلوے اسٹیشن ہی چلتے ہیں جناب عالی۔" ٹیکسی ڈرائیور نے ٹھیٹھ لاہوری لہجے میں کہا۔ "ناراض ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ آپ نے جہاز سے اتر کر گاڑی پر چڑھنا تھا۔"

میں نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو دو پونڈ دیے جو اصل کرائے کے دگنے سے بھی زیادہ تھے۔ چنانچہ اس نے خوشی خوشی رکھ لیے اور میرا سامان اتروا کر کوٹھی کے دروازے تک بھی لے گیا۔ ابھی میں کال بیل بجا کے کسی کے نمودار ہونے کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو انجن اسٹارٹ کرنے کی ناکام کوشش کے بعد بونٹ کھولتے اور بڑبڑاتے دیکھا۔ دو منٹ بعد میں نے چوتھی بار گھنٹی کا بٹن دبا دیا تو وہ بونٹ بند کر کے راہگیروں سے درخواست کر رہا تھا کہ گاڑی کو دھکا لگا دیں۔

گیٹ کے اندر کا ایک چھوٹا گیٹ کھول کر جو شخص سخت برافروختگی کے عالم میں باہر آیا اس کے کپڑوں کے داغ اور اس کے جسم سے پھوٹنے والی بو خبر دیتی تھی کہ وہ خانساماں ہے۔ وہ پچاس پچپن سال کا پہلوان ٹائپ شخص تھا۔

"گھنٹی پر گھنٹی۔ گھنٹی پر گھنٹی۔ بندے کو اندر سے باہر آنے میں وقت تو لگتا ہے۔ کچھ صبر بھی کرنا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے ولایت سے آرہی ہے سواری۔" اس نے طنز سے کہا۔

"میں واقعی ولایت سے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے وزیر خاں سے ملنا ہے۔"

اس کی صورت کے تاثرات ایک لمحے میں بدل گئے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اگر تمہیں معلوم ہو کہ وزیر خاں کا انتقال ہو چکا ہے تو تمہارے لیے یہ صدمہ غیر متوقع نہ ہو۔ مجھے خط کے الفاظ یاد آئے مگر اس کے باوجود صدمہ غیر متوقع ثابت ہو رہا تھا۔

"کون ہو تم برخوردار؟" خانساماں نے نرمی سے کہا۔ "بڑی دیر سے آئے۔"

میں نے سہارے کے لیے ادھر ادھر ہاتھ پھیلائے۔ میری نظروں کے سامنے سرخ اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور ذہن ڈوبنے لگا تھا۔ گیٹ پوسٹ کی دیوار نے مجھے سہارا فراہم کر دیا۔ "میں ان کا بدبخت بیٹا ہوں۔" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"کون؟ سکندر بخت؟ جو ولایت میں پڑھ رہا تھا؟" بوڑھے خانساماں نے اپنا لہجہ ہمدردانہ رکھنے کی واجبی سی کوشش کی مگر اس لہجے میں ملامت کا رنگ غالب تھا۔ "اب آنے کی کیا ضرورت تھی برخوردار! اس غریب کو ہم ایک ہفتہ پہلے میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر چکے ہیں۔"

"مجھے... مجھے بالکل معلوم نہیں تھا۔" میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ آنسو میری آنکھوں سے نکل کر فرش خاک پہ گرتے رہے۔ "انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔"

"یہی تو فرق ہے زمانے کا۔" خانساماں بولا۔ "اس نے سارے دکھ اٹھائے اور اس لیے خاموش رہا کہ بیٹے کی تعلیم میں خلل نہ پڑے۔ بیٹا تھا کہ شوق سے ولایت جا کے بیٹھ گیا۔ صاحب بننے کے لیے۔ سالوں میں ایک بار بھی خبر لینے نہیں آیا۔ قصوروار تو مرنے والا ہی ہوا نا۔ کہ تم کو بے خبر رکھا۔ تمہارا فرض کہاں تھا اس کی خبر رکھنا۔" اس نے ایک گہری سانس لی اور میرے دونوں سوٹ کیس اٹھا لیے۔ "خیر اب صبر کرو۔ رونے کی بجائے اس کی مغفرت کی دعا کرو۔ آؤ میرے ساتھ۔ چلو شاباش۔ صبر کرو۔"

میں نے آستین سے آنسو خشک کیے اور اس کوٹھی میں داخل ہو گیا جو میرے والد نے ایک عمر حرام ملازمت سے بچ کے حلال کی کمائی سے تعمیر کی تھی اور جہاں ملازم نے آکر تین سو روپے ماہانہ پر ذلیل کرنے کے لیے رکھ لیا تھا۔ وہ میری وجہ سے مجبور نہ ہوتا تو بے خبری کی اس زندگی پر بہت پہلے موت کو گلے لگا چکا ہوتا۔ لیکن زندگی کے سارے سہاروں کی شکست کے باوجود وہ میرے لیے زندہ رہا۔ میرے نادیدہ خیر خواہ کے خیال کے مطابق ان کی زندگی کی واحد قابل فخر کامیابی میں تھا۔

اس خانساماں ٹائپ شخص کے پیچھے چلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ میرے نام اور میرے لندن میں زیر تعلیم ہونے کے علاوہ اس کو حقائق کا علم کس حد تک ہے۔ کیا وہ جانتا ہے کہ وزیر خاں بیٹے کیا تھا اور چراغ دین یا شرافت علی جیسے لوگوں نے ضمیر فروشی سے اس لیے ہیں کیا کردار ادا کیا ہے؟ اگر وزیر خاں نے حالات پر راضی برضا رہنے کی مجبوری کو میری وجہ سے قبول کیا تھا تو کیا اس نے یہ دکھڑا دوسروں کے سامنے رویا ہوگا؟ نہیں۔ ایسے تو بات پھیل جاتی اور کوئی چھٹی نکلوا لیتا تو اس کی ریاضت واقعی رائیگاں جاتی۔

خانساماں نے کہا۔ "یہ اپنا کوارٹر ہے برخوردار۔ میں باورچی ہوں۔ سلامت شاہ۔ اس کے ایک کمرے میں وزیر خاں میرے ساتھ رہتا تھا۔"

میں نے کوٹھی کے عقب میں بنے ہوئے ویران اور خستہ حال سرونٹ کوارٹر کو دیکھا اور اس کوٹھی کا تصور کیا جس میں میرے ولایت جانے سے پہلے میرے والد مقیم تھے۔ میرے ذہن میں ایک تصویر ابھر آئی جس میں پوری کوٹھی کے ہر کمرے کا نقشہ تھا اور میرے والد کے تمام معمولات تھے۔ پرانی وضع کی کھڑکیاں۔ نیم دائرے کی شکل کے رنگین شیشوں والے دروازے۔ محرابی دروازے جن کی پالش سے دمکتی سطح پر

www.paksociety.com

جڑی ہوئی پیتل کی کیلیں سونے کی لگتی تھیں۔ عشق پیچاں کی چھت تک پہنچنے والی بیلیں جن کے تنے موٹی رسیوں کی طرح آپس میں بل کھا کے الجھ گئے تھے اور جن میں جیسے پھول مسکراتے رہتے تھے۔ اس کے سامنے والا لان جس پر بیٹھ کے میرے والد صبح سویرے اور پھولوں کی مہک میں لیے لیے سانس لے کر بڑی فرحت محسوس کرتے تھے۔ اخبار پڑھتے تھے اور شام کی چائے پیتے تھے جو ٹرالی میں سجا کے ایک ملازم ان کے پاس چھوڑ جاتا تھا۔ میں اکثر دیکھتا تھا کہ خدا کی عطا کی ہوئی ان سب نعمتوں کا احساس ان کو کتنی طمانیت اور مسرت بخشتا تھا۔ وہ کوٹھی کو۔ پورچ میں کھڑی ہوئی کار کو۔ آراستہ کمروں کے نوادرات کو اور زندگی کے اس حسن انتظام کو دیکھ دیکھ کر زیر لب مسکراتے رہتے تھے لیکن کبھی کبھی میں دیکھتا تھا کہ یہ مسکراہٹ شگفتہ کافور ہو گئی ہے۔ یوں جیسے چودھویں شب کی چاندنی کو بادل کا ایک ٹکڑا چھپا دے۔ وہ کہتے تھے "سکندر۔ کتنا اچھا ہوتا اگر آج ہم دونوں کے ساتھ وہ سب بھی ہوتے۔ ان کی خوشی سے ہماری خوشی میں کتنا اضافہ ہوتا۔" وہ سب میرے بھائی بہن تھے اور میری ماں تھی اور ایک بوڑھی دادی تھی۔ موت سے کس کو رستگاری ہے مگر وقت کی اس بے رحمی کا داغ کہاں جاتا ہے جس کا ایک قاتل لمحہ زندگی کے سفر میں ساتھ دینے والوں کو یوں سمیٹ کے لے جائے جیسے تیز آندھی خشک پتوں کو اڑا کے لے جاتی ہے۔

میں اس ویران مدفن جیسے کمرے کی سپاٹ دیواروں پر اس زندگی کا ہر عکس دیکھ رہا تھا جو خواب زوال کی طرح بکھر چکی تھی اور میرے لیے یہ تصور کرنا دشوار تھا کہ جس شخص نے اپنے عزم و استقلال سے تنہا اور بے سہارا رہ جانے کے باوجود جد و جہد کا آغاز ملبے کے ڈھیر سے کیا ہو اور کامیابیوں کی قابل رشک عمارت کھڑی کی ہو وہ ایسی کسمپرسی، بے چارگی، معذوری اور مجبوری اور ذلت و رسوائی کے ساتھ اس کال کوٹھڑی میں مفلسی کا عذاب جھیلتے جھیلتے چپ چاپ مر گیا۔ اس نے ایک بار بڑی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ "اب میں بوڑھا ہوں اور بیمار ہوں اور ہر طرف سے دشمنوں کا حصار تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ جوان بیٹا بوڑھے باپ کی لاٹھی ہوتا ہے۔ آؤ اب مجھے سہارا دو اور یہ محاذ سنبھالو۔" یہ توقعات تو سب ہی والدین رکھتے ہیں کہ اولاد بڑی ہوگی تو ان کے ہر دکھ کو سکھ میں بدل دے گی۔ وزیر خان تم نے ایسا کیوں نہیں کیا! میں اتنے بڑے احسان کی سزا کا مستحق تو نہ تھا۔

"بس کرو برخوردار۔" سلامت شاہ نے ہمدردی سے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ "آؤ ادھر میرے کمرے میں بیٹھو۔"

آدھے گھنٹے بعد وہ میرے لیے چائے بنا کے لا چکا تھا اور اپنی جھلنگا چارپائی پر میرے سامنے بیٹھا تھا۔ کیبن میں لکڑی کی ایک ہی کرسی تھی جس پر تکیہ رکھ کے اس نے مجھے بٹھا دیا تھا۔

"میرے والد کے آخری ایام میں آپ ہی ان کے سب کچھ تھے۔" میں نے طبیعت سنبھل جانے کے بعد کہا۔ "آپ نے جتنا بہت کچھ کیا ہوگا اور اس احسان کا اجر خدا دے سکتا ہے۔ میں یہ دعویٰ کیسے کروں کہ اس کا بدلہ چکا دوں گا۔"

"اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔" سلامت شاہ نے کہا۔ "خدا کو یہی منظور تھا۔ ورنہ ان کا سب کچھ میرے ساتھ ہوتا تو وہ میرے کام آتا اور وہ لڑکا کیا کرتا جو ولایت میں ۔۔۔ [illegible]"

میں چونکا۔ "آپ کا بھی کوئی لڑکا ہے باہر؟"

"ہاں جی۔ ایک ہی بیٹا ہے۔ ڈاکٹری کر چکا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے گیا ہوا ہے۔" وہ فخر سے بولا اور اس کی آنکھوں میں غرور کی وہی پر مسرت چمک اتر آئی جو میں نے اپنے والد کی آنکھوں میں بھی دیکھی تھی۔ "ہمارے حالات بہت حد تک ایک جیسے تھے۔ میرا بھی اس بیٹے کے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔ لیکن میں نے وہ دکھ نہیں جھیلے جو وزیر خان نے اٹھائے۔ میرا ایک بیٹا جس کی ماں بدبخت میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ ایک سیٹھ کا بگڑا ہوا لونڈا اسے ورغلا کے لے گیا تھا۔ معلوم نہیں وہاں اس پر کیا بیتی۔ مجھے اس کا کوئی رنج نہیں۔ یوں پل بھر میں میرا پورا خاندان چھٹ پٹ ہو جاتا تو میں دیوانہ ہو گیا ہوتا۔"

اس کے بعد وہ مجھے اپنے والد کے آخری ایام کی روداد سناتا رہا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ جو کچھ اسے معلوم ہے وہ حقیقت کا ایک حصہ ہے۔ بے حد پراسرار وہ واقعات۔ جو سوال میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا وہ یہ تھا کہ میرے والد نے آخری ایام میں اس بے ضمیر شخص کے پاس ملازمت کیوں کی جو ان کے اعتماد کو دھوکا دے چکا تھا اور قانون کی گرفت سے بچ گیا تھا لیکن ان کا مجرم تو تھا۔ سارے شہر میں ان گنت لوگ ایسے ہی کوٹھیوں میں آباد تھے اور ان میں سے کوئی بھی ترس کھا کے ان کو گھر میں ملازم رکھ سکتا تھا۔ چراغ دین سے نوکری کی بھیک مانگنے اور کل تک اپنے ٹکڑوں پر پلنے والے ایک معمولی ملازم کے ہاتھوں ذلت قبول کرنے میں انہوں نے کیا مصلحت دیکھی تھی۔ کیا وہ چراغ دین کو سزا دینا چاہتے تھے۔ جو اس دنیا کا نظام انصاف نہ دے سکا کیونکر شہادت ناکافی تھی۔ مگر وہ خود تو بیان کی نہیں دل کی گواہی سے قائل تھے کہ چراغ دین مجرم ہے اور عمر بھر نہ ملی تو اسے یہ سزا ضرور ملنی۔ میرے والد ہمیشہ کہتے تھے۔ "اعتماد کو دھوکا دینے سے بڑھ کے گناہ کوئی نہیں۔ ہمت ہے تو دن دھاڑے ڈاکہ ڈالو مگر معاملہ اعتماد کا ہو تو پائی پائی کی حفاظت امانت جان کے کرو۔" چراغ دین نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ کیا انہوں نے محض انتقام سے مغلوب ہو کے اس کے پاس ملازمت قبول کی تھی کہ موقع ملے تو۔ اس خیال پر مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ میرے والد اس قماش کے آدمی نہ تھے۔

"سلامت چاچا۔" میں نے کہا۔ "میرے ابا جی نے کبھی یہ بتایا تھا کہ وہ یہاں آ کے کیوں نوکر ہو گئے تھے؟"

"جہاں پر تو روزہ جس سیٹھ کے پاس وہ پہلے ملازم تھے اس سنگدل نے وزیر خان کی خدمت گزاری کا یہ صلہ دیا تھا کہ گٹھیا کا عارضہ لاحق ہوتے ہی جواب دے دیا تھا۔" سلامت شاہ نے آہ بھر کے کہا۔ "پیٹ کی خاطر کہیں تو نوکری کرنی ہی تھی۔ خدا بھلا کرے چراغ دین صاحب کا۔ انہوں نے وزیر خان کو رکھ لیا۔"

میرے دل میں ایک خلش خار خار کی اٹھی۔ "آپ کب سے ہیں یہاں؟ سیٹھ چراغ دین پہلے کیا کرتے تھے؟"

"میں سات سال سے یہاں ہوں برخوردار۔ اس سے پہلے سیٹھ صاحب لاہور میں تھے اور کوئی کاروبار کرتے تھے۔" سلامت شاہ بولا۔

"اب ان کا کیا کاروبار ہے؟" میں نے کہا۔

"پہلے تو شاید سے میں تولیے اور کھیس بنانے کی فیکٹری تھی۔ اب کپڑے کا ایک بڑا مل بھی قائم کر لیا ہے۔" سلامت شاہ بولا۔

"اچھا اگر میں تمہارے سیٹھ صاحب سے ملنا چاہوں تو کس وقت مل سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"آج کل تو وہ مری گئے ہیں۔ ہر سال وہ مع اہل و عیال بچوں کی چھٹیاں وہیں گزارتے ہیں۔" سلامت شاہ نے کہا۔ [illegible] نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"میں نے سنا ہے چراغ دین کا سارا خاندان ایک حادثے کی نذر ہو گیا تھا۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"ہاں برخوردار بڑا خوفناک حادثہ تھا۔ گاڑی تو چراغ دین سیٹھ کا چھوٹا بھائی چلا رہا تھا۔ بیوی بچے سب ہی ساتھ تھے۔ بچے سب اسکول میں پڑھتے تھے اور ان کی ماں تھی جو ایک بہت بڑے افسر کی بیٹی تھی شیروانی صاحب کی۔ وہ بیچارے مر گئے ہوں گے۔ ایک دن کے بچے وہ بھی جاتے ہیں۔"

"شیروانی صاحب؟ کون شیروانی؟ کچھ معلوم ہے کہ کس محکمے کے افسر تھے؟" میں نے سر اٹھا کے پوچھا۔

سلامت شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "ٹھیک تو میں نہیں جانتا۔ یہ سنا ہے کہ وہ کسی ملک میں سفیر ہو کے چلے گئے ہیں۔"

"ان کا تعلق وزارت خارجہ سے ہے؟" میں اٹھ بیٹھا۔ "کوئی لڑکا ہے ان کا محسن رضا؟"

"ایک لڑکا ولایت میں پڑھتا تھا۔" سلامت شاہ نے کہا۔ "وہاں کسی گورے نے اس کو چاقو مار دیا۔ شیروانی صاحب نے واپس بلا لیا۔ اس کی سب سے بڑی بہن تھی۔"

میرے ذہن میں بم کا دھماکا ہوا جس نے میرے وجود کی پوری عمارت کو اندر سے تہس نہس کر دیا۔ چراغ دین کی بیوی کی

محسن رضا کی بہن تھی۔ یہ کیسے کمال کی بات ہے کہ مجھے محسن سے جنون کا نام معلوم نہ تھا۔ تین سال پہلے یہ اطلاع لندن پہنچی تھی کہ اس کا رشتہ ایک ٹھیکیدار سے طے کر دیا گیا ہے تو میں نے محسن سے پوچھا تھا کہ یہ رشتہ مریم کو پسند ہے؟ اور محسن رضا نے تلخی سے کہا تھا۔ "مریم کو پسند ہو نہ ہو ڈیڈی کو پسند ہے تو بات ختم۔ شادی اختلاف کر سکتی ہیں نہ میں بول سکتا ہوں۔ ڈیڈی خود سر آدمی ہیں اور ان کی مرضی کے آگے کسی کی مرضی نہیں چلتی۔ میں نے تو صرف اتنا سنا ہے کہ لڑکا اچھا ہے اور کما رہا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"یار محسن۔" میں نے تھوڑے سے تامل کے بعد کہا تھا۔ "مریم تو شاید اس پروفیسر کو پسند کرتی تھی جو شاعر اور کچھ افسانہ نگار وغیرہ تھا۔"

"پھر کیا ہوا۔ وہ تو اس عمر میں سب لڑکیاں کسی نہ کسی دانشور، کرکٹر یا شہزادہ گلفام کو پسند کرنے لگتی ہیں کیونکہ ناولوں کے مطالعے سے مثالی شریک حیات کی یہی تصویر بنتی ہے۔" محسن رضا نے اسی تلخی سے کہا تھا۔ "بعد میں سب کچھ بھول جاتی ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کر لیتی ہیں کہ کامیاب ازدواجی زندگی کا تصور اس چیز کے بغیر ناممکن ہے جسے تقدیر یا ہاتھ کا میل کہتے ہیں اور دولت مند اپنی جدوجہد کا انعام۔ رومانٹک ہیرو بدقسمت ناولوں میں خوبصورت ڈائیلاگ بول رہے ہیں اور آسمان کے چاند تارے توڑ کر لانے کے دعوے کر رہے ہیں۔ ان کی ساتھی تیرہ بختی کا رونا میں گم صم رہتی ہیں اور ٹھیکیدار ٹائپ شوہروں کی دولت سے گرمیوں کا سیزن مری میں گزار رہی ہیں۔"

ہم لوگ اس شادی میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔

ایک سال قبل جب مجھے مریم کی موت کی خبر ملی تھی تو مجھے محسن کی تین سال پہلے کی بات یاد آئی تھی۔ مریم سیزن گزارنے مری

سے لوٹتے ہوئے کار کے کھڈ میں گر جانے سے ہلاک ہو گئی تھی بعد میں لوگوں نے ہمیں بتایا کہ اس کی کار بریک فیل ہو جانے کے باعث کئی ہزار فٹ گہرے کھڈ میں لڑھکتی ہوئی نیچے پہنچی تھی تو اس میں آگ لگ چکی تھی۔ تلاش کرنے والوں کو ادھر ادھر سے لاشوں کے پرزے اور چار مختلف جسموں کے اعضا ملے تھے جن کو اکٹھا کر کے اندازے سے چار قبروں میں دفن کر دیا گیا تھا۔ محسن بہت رو رہا تھا۔ بڑی بہن اسے تمام بہن بھائیوں سے زیادہ چاہتی تھی۔ شادی کے کارڈ میں مریم کے ہونے والے شوہر کا کیا نام لکھا ہوا تھا۔ اس پہ میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اہم صرف مریم کا نام تھا جس سے میری جذباتی وابستگی صرف ایک یاد سے وابستہ تھی۔

ایک بار اس نے کھانے کی میز پر سب کے درمیان بیٹھ کر مجھ سے سرگوشی میں کہا تھا۔ "سکندر میں شرط لگا سکتی ہوں کہ تم اور فوزیہ ایک دوسرے کو چاہتے ہو۔"

"جی" میں اچھل پڑا تھا۔ "جی ہاں" میں نے ادھر ادھر دیکھ کر اور ہکلا کے کہا تھا۔ اس ہڑبڑاہٹ میں میرے ——— ہاتھ سے چمچہ گر گیا تھا۔ ایک گلاس الٹ گیا تھا اور نوالہ میرے حلق میں یوں پھنس گیا تھا کہ سانس رکنے سے میرے آنسو نکل آئے تھے۔ چنانچہ سب لوگ ہنسنے لگے تھے جن میں فوزیہ بھی شامل تھی۔ جب مریم کے مرنے کی خبر ملی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا، جیسے مجھے فوزیہ سے ملانے والا ایک قابل اعتماد پل ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے بڑے حیلوں بہانوں سے یہ پوچھا تھا کہ مرنے والوں میں فوزیہ تو نہیں تھی۔ اور اس وقت بھی مریم کے شوہر کا نام اگر سنا تھا تو غیر اہم سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا تھا۔ مجھے محسن رضا کی ایک اور بات یاد تھی جو وہ بار بار کہتا تھا۔ "یار سکندر۔ گاڑی نئی تھی۔ ابھی دو مہینے پہلے ہی خریدی گئی تھی۔ چند دن قبل پنڈی کی سروس ورکشاپ گئی تھی اس کے بریک کیسے فیل ہو گئے" متعلقین سے بے خبری کے باعث اس وقت میں نے روایتی جواب یہ دیا تھا کہ موت کا ایک دن معین ہے جو کسی طرح بھی ٹالا نہیں جا سکتا۔

سلامت شاہ میرے خیالات کی رو سے بے خبر اس حادثے کی تفصیلات بتانے میں مگن تھا جو مجھے پہلے ہی معلوم تھیں۔

"سلامت چاچا" میں نے کہا۔ "میرے والد نے کچھ سامان تو چھوڑا ہوگا؟"

سلامت شاہ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ "ہاں۔ ایک بستر اور چند کپڑے تو اب بھی کمرے میں موجود ہیں۔ چند دن پہلے اس نے مجھے ایک لاکر کی چابی دی تھی جو میرے پاس محفوظ ہے۔ دوسری چابی صندوق کی تھی۔ مجھے نہیں معلوم اس صندوق میں کیا تھا جو وزیر خان کے پلنگ کے نیچے ہمیشہ مقفل رہتا تھا اگر میں نے کھول کر دیکھ لیا ہوتا تو اچھا تھا۔" وہ اچانک چپ ہو گیا۔

"پھر کیوں نہیں دیکھا؟" میں نے غور سے اس کی صورت دیکھ کر کہا۔

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی برخوردار۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "عجیب سی باتیں ہیں۔ ایک تو یہ وزیر خان کی صحت تو اس کی ناہموار گٹھیا کے عارضے سے خراب تھی۔ لیکن جوڑوں میں درد کے سوا جو سردیوں میں بڑھ جاتا تھا اور گرمیوں میں کبھی کبھار تکلیف دیتا تھا اسے اور کوئی مرض لاحق نہیں تھا۔ اس کا بھی وہ عادی ہو گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا تھا اور سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتا تھا لیکن معذور نہیں ہوا تھا۔ وہ تو سرکاری ڈسپنسری تک لاٹھی ٹیکتا پیدل ہی جاتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رات کو وہ بھلا چنگا سویا تھا۔ جیسے کیوں مر گیا۔ مرنے والی کوئی بات تو نہ تھی۔"

میں کچھ دیر اس انکشاف پر انگشت بدنداں بیٹھا رہا۔ میرے ذہن میں امکانات کے ہزار در وا ہو گئے تھے جو سب شکوک و شبہات کے آسیب زدہ اندھے تہ خانوں میں اترتے تھے۔ "چاچا سلامت۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے ابا جی کی موت کے اسباب طبعی نہ ہوں۔ انہیں قتل کیا گیا ہو۔"

سلامت شاہ بھونچکا رہ گیا۔ "قتل ۔ ۔ ۔ یہ کیا کہہ رہے ہو برخوردار۔" اس نے گھبرا کے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں قتل۔ میں پوسٹ مارٹم کروا سکتا ہوں۔ لاش دوبارہ قبر سے نکالی جا سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"توبہ۔ توبہ۔ استغفار" وہ دہشت زدہ ہو کے بولا۔ "یہی سب کرنے آئے تھے تم ولایت سے؟ کہ مرنے کے بعد بھی اس کو چین نہ ملے۔ اس کی لاش کی بے حرمتی ہو۔ خدا کا خوف کرو سکندر۔ ۔ ۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا ہارٹ فیل ہو گیا۔"

میرے لیے سلامت شاہ سے نظر ملا کے بات کرنا دشوار ہو گیا۔ جذبات کی رو میں بہہ کر میں یہ بھول گیا تھا کہ میں لندن میں نہیں ہوں لاہور میں ہوں اور کسی سراغ رساں سے نہیں ایک خانساماں سے مخاطب ہوں جس کے لیے عام آدمی کی طرح لاش کو تدفین کے بعد پھر چیر پھاڑ کے لیے نکالنے کا تصور ہی لرزہ خیز تھا۔ میرے شکوک بے بنیاد تھے مگر مصلحت کا تقاضا تھا کہ میں اپنے ولایت پلٹ ذہن کے قابل مذمت خیالات کا اظہار نہ کروں۔ اگر بعد میں مجھے اس اچانک موت کو قتل ثابت کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کرنا پڑا اور لاش نکلوانے کے لیے حکم نامہ حاصل کرنے کی ضرورت ہوئی تو یہ کام خود مجھے اپنی ذمے داری پر کرنا ہو گا۔

"میں معافی چاہتا ہوں چاچا سلامت۔ صدمے سے میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ خدا مجھے معاف کرے۔" میں نے کہا۔ "تم اس صندوق کا ذکر کر رہے تھے؟"

"ہاں۔" سلامت شاہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ "سوئم کے بعد اگلے دن میں نے صبح اٹھ کر دیکھا تو وزیر خان کے کمرے کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ میں حیران اور پریشان کمرے میں گیا تو مجھے کمرے میں ہر چیز بے ترتیب نظر آئی۔ صندوق کا تالا بھی ٹوٹا ہوا تھا اور تمام سامان باہر بکھرا پڑا تھا۔ پرانی تصویریں تھیں۔ ریشمی اور زری کے کام کے پرانے جوڑے تھے۔ میرا خیال ہے تمھاری ماں کے ہوں گے جن کو آج کوئی استعمال نہیں کر سکتا۔ مگر زری کا گوٹا خاصا مہنگا بک جاتا ہے۔ اس سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ صندوق میں بہت قدیم زیورات تھے۔ پرانا سونا تو میں انگوٹھی دیکھ کر پہچان سکتا ہوں۔ وہ سب فرش پر پڑے تھے۔ معلوم نہیں کوئی کیا لینے آیا تھا اور کیا لے گیا۔ تم دیکھ کر اندازہ کر سکتے ہو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے کبھی اس صندوق میں کبھی جھانکا نہیں تھا جب میں اپنے باپ کے ساتھ پاکستان آیا تھا تو ابا جی کے ساتھ یہی صندوق تھا جو مدت رہا تا انہوں نے سنبھال کے رکھ لیا تھا۔ بچا تو بہت کچھ تھا مگر ابا جی نے پرانے وقتوں کی ان یادوں کو سمیٹ کر ایک صندوق میں ڈال لیا تھا اور یہ اندوختہ میری زندگی کے بعد ان کو سب سے عزیز تھا۔ یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔"

"مجھے وزیر خان نے اس بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔" سلامت شاہ نے کہا۔ "جب بھی بیوی بچوں کی بات کی تو ایک آہ بھر کے یہی کہا کہ سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

اس کے بعد میں نے سلامت کو وہ سب بتایا جو شنیدہ بھی تھا اور دیدہ بھی۔ اس دوران میں سلامت شاہ نے کھانا بھی پکایا اور میری بات بھی سنی۔ میں نے بتایا کہ سیاہ بختی کے سائے کب سے میرے تعاقب میں ہیں اور شفق ایام کے ایک دور سے اس وقت بھی گزر رہا ہوں۔ جب میں حالات سے شناسا ہو کیا حالات کو سمجھنے کا ذرا بھی شعور نہیں رکھتا تھا۔ شنیدہ یہ ہے کہ غلام ملک تقسیم ہوا تو بہت کچھ تقسیم ہو گیا۔ خاندان تقسیم ہو گئے۔ آزادی کی جنگ میں انگریز کے خلاف شانہ بشانہ لڑنے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ مذہب اور اخلاق پر مبنی دوستی، ہمسائیگی اور انسانیت کے معیار تقسیم ہو گئے۔ اور جب تقسیم کا یہ عمل جشن آزادی کے بعد کرب ناک صورت میں جاری تھا تو میں آٹھ سال کا تھا۔ میری یادداشت میں کسی پیر پھ چھاؤنی کا وہ گھر موجود ہے جہاں میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ مقیم تھا۔ شنیدہ یہ بھی ہے کہ ایک رات بلوائیوں نے اس گھر کو مسلم لیگی یعنی میرے والد کا خانہ خراب کرنے کا فیصلہ کیا جو مصلحت کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھنے کا مشورہ دینے پر برہم ہو جاتا تھا اور جان دینے پر تیار تھا مگر مسلم لیگ کا جھنڈا اتارنے پر تیار نہ تھا۔ میں اپنے ایک غیر مسلم دوست کے گھر میں ریڈیو کے سامنے انگشت بدنداں بیٹھا تھا۔ ریڈیو ان دنوں بہت کمیاب تھا اور سائنس کی یہ انقلاب آفریں ایجاد صرف امراء کا ایک تحفہ تھی جس کے سینکڑوں ہزاروں میل دور کے انسانوں کے ہنسنے بولنے اور گانے بجانے کی اور کوئل کی کوک سے بادلوں کی گرج تک ہر آواز برآمد ہوتی تھی۔ میری ناقص عقل کے مطابق ریڈیو کی زبان یعنی لاؤڈ اسپیکر اس عقل کے تخلیق کا کارنامہ تھا کہ آدمی کی زبان بھی بولتی ہے اور کبھی اردو کبھی لاطینی انگریزی بھی بول سکتی ہے، ساز بجا سکتی ہے اور ہر جانور کی اور ہر چیز کی آواز بھی نکال سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت میں یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ سب سے برتر وہ عقل سلیم ہے جو تخلیق کے وقت انسان کو عطا کی گئی۔ شنیدہ یہ بھی ہے کہ بلوائیوں نے میرے تمام خونی رشتوں کو خنجر زنی سے منقطع کیا۔ میرے پانچ بھائی اور میری ماں سرخرو ہو گئے۔ چھوٹی بہن ہماری سب سے بڑی اور اکلوتی بہن تھی جو یوں سرخرو ہوئی کہ موقع پاتے ہی آنگن کے کنویں میں اتر گئی اور اس کی متعفن لاش سات دن بعد نکال کے بے گور و کفن بے نشان قبروں میں دفن کر دی گئی۔ شنیدہ یہ بھی ہے کہ اس فتح و کامرانی کے بعد بلوائی جاتے وقت وہ جھنڈا اتارنا بھول گئے جس کی آبرو پر ایک خاندان نے قربان ہونا منظور کیا تھا۔

میرے والد اور بڑے بھائی سے جلسے میں گئے تھے اور خبر یہ آئی تھی کہ ریلوے اسٹیشن پر وہ ٹرین آنے سے پہلے پہنچ گئے جس میں وہ ہلاک ہو گئے۔ اور شنیدہ یہ بھی ہے کہ اس قتل و غارت گری کو میرے دوست کے باپ نے چشم تر دیکھا اور گھر پہنچتے ہی مجھے اس کمرے میں سلا دیا گیا جہاں میرا دوست موہن اور اس کی بہن موہنی سوتے تھے۔ میں اپنے گھر کے خوف سے واپس جانا چاہتا تھا مگر موہن نے کہا کہ ہم بات کرتے ہیں اور دشمنوں کے خوف سے وہ ریڈیو اٹھا کے اس کمرے میں رکھ دیا جہاں مجھے سونا تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد ان کی جھڑکیوں کا خوف دل سے نکل گیا اور رات بھر اس طلسمی ڈبے کے کان مروڑ کے ہر طرح کی آوازیں نکالنے کا شوق غالب آ گیا۔ میں اور موہن متعجب تھے کہ کیا دنیا میں رات بھر لوگ سوتے نہیں ہیں کیونکہ ہم نے جب بھی سوئی کو گھمایا کہیں نہ کہیں سے مضحکہ خیز ناقابل فہم باتوں یا دلکش موسیقی کی آواز آنے لگی۔ مجھ پر موہن کے باپ پنڈت دیانا تھ کا یہ احسان ہے کہ انہوں نے مجھے اپنے خاندان کے تمام افراد کی سربریدہ خون آلود اور مسخ شدہ لاشوں کا دل دہلانے والا نظارہ نہیں کرنے دیا۔ ورنہ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس بھیانک منظر کا نقش میرے ذہن

www.paksociety.com

پر اور بعد میں میری شخصیت پر کیا منفی اثرات مرتب کرتا۔ اس نے تین دن مجھے اپنے گھر میں مقید رکھا۔ دوست کے دن ریڈیو کی شریت نہیں چل سکتی تھی چنانچہ انھوں نے طاقت استعمال کی۔ میں نے موہن کی ماں جسے میں چاچی کہتا تھا کا یہ بیان مسترد کر دیا تھا کہ میرے گھر والے مجھے چھوڑ کر دلی چلے گئے ہیں اور یہ کہ گئے ہیں کہ کبیر کو بعد میں بھیج دینا۔ جب میں نے گلا پھاڑ کر رونا شروع کیا تو چاچا دیا ناتھ نے میرے ایک چانٹا لگایا۔ میری آواز فوراً بند ہو گئی۔ وہ بڑے دبنگ قسم کے آدمی تھے۔ چھ فٹ قد۔ کسرتی بدن۔ لمبی لمبی مونچھیں۔ پولیس میں حوالدار تھے اس لیے اُن سے میں بہت ڈرتا تھا۔ "اب اگر آواز بھی نکلی تو ہتھکڑی لگا کے حوالات میں بند کر دوں گا۔" انھوں نے گرج کر کہا۔ میری سسکی گم ہو گئی اور میں نے موہن اور موہنی کے ساتھ راوی اس ریڈیو کے ساتھ، تین دن ایک کمرے میں گزارنے کو ترجیح دی۔

پنڈت دیا ناتھ بڑے سیدھے قسم کے انسان تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جھوٹ زیادہ دن نہیں چلے گا اور خود اُن کے لیے مجھے چھپائے رکھنا مشکل سے مشکل تر ہو جائے گا۔ تیسرے دن جب حالات سے عارضی سمجھوتے کے خاصا مطمئن اور خوش تھا۔ انھوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا کے بہت سی باتیں سمجھائیں۔ مثلاً یہ کہ میرے گھر والے دلی کیوں گئے ہیں۔ "یہاں اُن کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے۔" انھوں نے کہا۔ "اگر وہ یہاں رہتے تو مار دیے جاتے۔" دراصل رات شام کے وقت وہ مجھے گھر کا مقفل دروازہ دکھانے بھی لے گئے جہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔

"دلی میں میرے چچا کا گھر ہے۔" میں نے کہا۔ "ابا وہیں گئے ہیں۔"

"اچھا!" انھوں نے خوش ہو کر کہا۔ "پھر تو کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ پتہ معلوم ہے تمھیں؟"

"جی۔" میں نے کہا۔ "نگم میں بیٹھک کے چاتے ہیں۔ اُن کے گھر کے سامنے رنگریز کی دکان ہے جہاں ہر وقت رنگ برنگے کپڑے سوکھتے رہتے ہیں۔ اور اُن کے گھر کا دروازہ نیلا ہے۔ اوپر کبوتروں کی چھتری ہے۔"

موہن جو عمر میں مجھ سے بڑا تھا ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ موہنی احمقوں کی طرح دیکھتی رہی۔

"نہیں بیٹا کبیر۔" چاچا دیا ناتھ نے کہا۔ "نام کیا ہے اُس محلے کا۔ یا سڑک کا۔ گلی کا اور مکان کا نمبر۔"

ظاہر ہے یہ سب مجھے یاد ہوتا تو میں ایسا اوٹ پٹانگ پتہ کیوں بتاتا۔

"اچھا اب یوں کرتے ہیں۔" چاچا دیا ناتھ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تمھیں موہن کے ماما کے گھر بھیج دیتے ہیں۔ وہ بہت قابل ہیں اور تمھارے چچا کا مکان تلاش کر لیں گے۔ وہ بھی دلی میں رہتے ہیں۔ جاؤ گے نا؟"

"میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔" میں نے اعلان کیا۔ "موہن اور موہنی بھی میرے ساتھ جائیں گے اور وہ ریڈیو بھی۔" میں نے صورت حال سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ معلوم نہیں اُس رات میاں بیوی کے درمیان کانفرنس کب تک جاری رہی لیکن صبح ہوئی تو مجھے بتایا گیا کہ میری سب شرائط انھیں منظور ہیں لیکن اُن کی بھی ایک شرط ہے۔ جب تک میرے چچا کا پتہ نہیں چلے گا میں کسی کو اپنے گھر والوں کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ نہ یہ کہ میرے ابا کا نام کیا ہے اور چچا کون ہیں۔ بھائی بہن کے نام بھی کسی کو معلوم ہوئے تو وہ جو میرے گھر والوں کے دشمن ہیں فوراً پہنچ جائیں گے۔ اور وہ بہت بے رحم لوگ ہیں۔ "آدمی کو تندور میں ڈال کر قیمہ نکال لیتے ہیں اور اُسے بند کر دیتے ہیں اور پھر وہ ڈبے ادھر اُدھر بک جاتے ہیں اور کھانے والے سمجھتے ہیں کہ گوشت کا قیمہ سمجھ کر کھا جاتے ہیں۔" چاچا دیا ناتھ نے وضاحت کی۔

میں دہلی گیا اور پورا ایک سال دلی میں موہن کے ماما کے گھر رہا۔ جو دہلی میں کہیں راستے کے ایک چھوٹے سے قصبے راؤ محل میں تھا اور ایک آرٹی تھیں جیوری کی وجہ سے مشہور تھا۔ پوری آبادی کا سرمایہ ملازمین کی تھی چنانچہ نسبتاً فسادات سے محفوظ ایک الگ تھلگ جگہ تھی۔ یہ باتیں میری سمجھ میں بہت بعد میں آئیں کہ میری جان بچانے کے لیے اس چھوٹے سے خاندان کی مشترکہ کوشش کتنی زبردست تھی۔ موہن اور موہنی کے والدین نے سال بھر کے لیے بچوں سے دوری قبول کی۔ خطرات مول لیے۔ میری ہر ضد پوری کی۔ یہ ڈیڑھ سال ریڈیو ساتھ لے جانے کی جو انھوں نے بڑی مشکل سے خریدا تھا اور فیصلہ بچوں کے ساتھ ریڈیو کے چلے جانے سے خود اُن کا گھر سنسان ہوا مگر انھوں نے اپنے مقصد کو عزیز تر جانا اور کامیاب رہے۔ موہن کے ماما جی نے سال بھر تک مجھے بہلانا جاری رکھا اور روز نت نئے بہانوں سے میرے چچا اور ابا کی تلاش میں ناکامی کا اعتراف کرتے رہے لیکن مجھے اپنے بھی والدے رہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آہستہ آہستہ انھوں نے شبہات کا اظہار شروع کر دیا کہ کہیں وہ پاکستان تو نہیں چلے گئے۔ جہاں میں رو دھو کے خاموش ہونے کے سوا کیا کر سکتا تھا مگر سال بھر بعد موہن کے ماما جی کو یہ خطرہ لاحق ہونے لگا کہ کہیں میں بھاگ نہ جاؤں یا اعلان جنگ نہ کر دوں چنانچہ موہن کے پتا ہم سب کو واپس لے گئے۔ مجھے بتایا گیا کہ اپنے لاہور سے خط لکھا ہے اور وہ بہت جلد مجھے لینے آئیں گے مگر اُن کے آنے تک مجھے اپنی زبان ویسے ہی بند رکھنی ہوگی ورنہ وہ قیمہ بنا کے پیک کرنے والے دشمن۔۔۔

اس کے بعد ایک معجزہ رونما ہوا۔ جو بات شاید نہیں دیکھتے۔ تقریباً سوا سال بعد جب میں تقریباً ناامید ہو کے موہن کے خاندان کا ایک مستقل فرد بنتا جا رہا تھا اور اُن کی کوششوں سے مجھے بھول جانے والوں کو تقریباً بھول چکا تھا، میرے ابا مجھے لینے آ گئے۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں خود دیکھنے گیا تھا۔

"چاچا دیا ناتھ۔۔۔!" میں نے چیخ کر کہا۔ "ابا آ گئے۔۔۔ ابا مجھے پاکستان سے لینے آ گئے۔" پھر میں اُن سے لپٹ گیا اور چلا چلا کے رونے لگا۔ پنڈت دیا ناتھ اچھل دیکھتے دیکھتے بھاگے۔ دوسری طرف سے اُن کی پتنی دہی کا نہتی آئیں۔

"وزیر خاں۔۔۔!" پنڈت دیا ناتھ کے حلق میں آواز پھنس گئی۔ "تم۔۔۔ تمھارے۔۔۔ تو۔۔۔"

"مجھے سب معلوم ہو گیا ہے۔" ابا نے آنسو پونچھ کے مجھے الگ کیا۔ "نور محمد نے سکون سے کہا۔ "میں اپنے گھر گیا تھا۔" پھر وہ اور چاچا دیا ناتھ بغل گیر ہو کے رونے لگے۔ چاچی دہی، گھر کی ملازمہ تھی اور ہم سب ایک طرف کھڑے یہی حیرانی نظروں سے دیکھتے رہے۔

"تم۔۔۔ تم زندہ ہو وزیر خاں۔" دیا ناتھ نے بہت دیر بعد کہا۔ "ہم نے سُنا تھا تم سب کے دعا کے سے مارے گئے۔"

"دعا بہو بیٹی ایک شستون کی ادث میں تھا اس لیے بچ گیا تھا۔" ابا نے کہا۔ "پھر دھکا شروع ہوئی تو میں بھی دھر لیا گیا۔ دو سال کی قید با مشقت کاٹ کے سیدھا جیل سے رہا ہوا ہوں۔"

"جو اپنے مکان میں کوئی اور رہتا ہے ابا!" میں نے کہا۔ پنڈت دیا ناتھ نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ان کا خیال تھا میں حالات سے بالکل بے خبر ہوں مگر میں اپنی عمر کے بچوں سے کچھ زیادہ ہی ہوشیار تھا۔ میں نے موہن اور اس کی بہن موہنی سے بہت کچھ پوچھ لیا تھا۔ اکثر وہ اسے جو کچھ چوری چھپے اور کسی سے نہ کہنے کے وعدے پر۔۔۔ اپنی ماں سے سُنا تھا مجھے بتا دیا تھا چنانچہ میں نے بہت سے حقائق کو تسلیم کر لیا تھا۔ مثلاً یہ کہ ہندو مسلم فسادات جس میں میرے ابا کے سوا سب مارے گئے تھے کیوں ہوئے تھے۔ میرے ابا کے بارے میں موہن اور موہنی کا خیال تھا کہ وہ واقعی پاکستان چلے گئے تھے اس لیے بچ گئے ہوں گے اور کسی نہ کسی دن ضرور واپس آئیں گے لیکن اُس وقت تک مجھے چھپ کر رہنا ہوگا کیونکہ میں مسلمان ہوں۔ کسی بدمعاش ہندو کو معلوم ہو گیا تو مجھے بھی مار ڈالے گا اور ایک مسلمان کو چھپانے کے جرم میں چاچا دیا ناتھ کو بھی مار ڈالے گا۔ اس زمانے میں میرا نام بہت کام آیا۔ کبیر کو کثیر لوگ کبیر داس سمجھتے تھے اور بعد میں تو خود مجھ میں اتنی عقل آ گئی تھی کہ کوئی اجنبی پوچھ بیٹھتا تو اپنا پورا نام بتاتا تھا۔

"تم نے اپنی ماں اور اپنے بہن بھائیوں کے بارے میں نہیں پوچھا کبیر!" چاچا دیا ناتھ نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔

"مجھے معلوم ہے چاچا وہ سب مارے جا چکے ہیں۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ ایک بار پھر ابا کا حوصلہ جواب دے گیا اور پنڈت دیا ناتھ بھی گلے لگ کے رونے لگے۔ بہت رونے دھونے کے بعد بالآخر تیسرے دن ہم رخصت ہوئے تو دیا ناتھ نے وہ صندوق ابا کے آگے رکھا جو ابا نے بہت سی چیزوں میں سے کچھ چیزیں منتخب کر کے بھرا تھا۔ پنڈت دیا ناتھ نے ہمارا زیادہ تر سامان نکال لیا تھا لیکن ابا نے کہا۔ "اب اس کا میں کیا کروں گا۔ تم نے ایک بیٹے کو بچا کے مجھے زندہ رہنے کا سہارا فراہم کر دیا ہے۔ اتنی یادیں ہی جو میں ساتھ لے جا رہا ہوں۔ زندگی دو دن کی رہ گئی ہے اور فاصلے اتنے بڑھ گئے ہیں دیا ناتھ کہ میں اس احسان کے بدلے کچھ کرنے کی بات بھی نہیں کر سکتا۔"

اور آج بھی وہ وقت میری نظر میں تصویر کی طرح محفوظ ہے جب تانگہ روانہ ہوا تھا اور میرا ماضی اُن مورتوں کی طرح مجھ سے دور ہوتے ہوئے کھو گیا تھا جو دروازے میں اشکبار تھیں۔

اس وقت تک حالات بہت حد تک معمول پر آ گئے تھے اور مذہب کے مقدس نام پر انسانیت کا لہو بہانے والے درندے جو سڑکوں پر دندناتے پھرتے تھے اب چھپ چھپا کر اکا دکا وارداتیں کر رہے تھے۔ کشیدگی برقرار تھی مگر قتل و غارت گری کا پُر آشوب دور گزر چکا تھا۔ چنانچہ ہم خیر و عافیت لاہور پہنچے تو ایک سال پریشانیوں کی نذر ہو گیا۔ پنڈت دیا ناتھ نے اپنے طور پر مجھے انگریزی حساب اردو وغیرہ پڑھا کے اس قابل کر دیا تھا کہ میں نے دو سال بعد میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ مشن اسکول کے بعد ابا نے مجھے نارمن کالج گھوڑا گلی بھیجا اور وہاں سے فارغ ہوا تو میں ولایت چلا گیا۔"

"تمھارا باپ بڑا صابر آدمی تھا۔" سلامت شاہ نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔ "کہتا تھا پاکستان قربانی مانگتا تھا۔ میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اب رونا کس بات کا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ صدمہ اسے پاگل کر دیتا مگر اس نے جتنے حوصلے سے حالات کا مقابلہ کیا اور جیسے تمھیں اعلیٰ ڈگری دلوائی یہ اُسی کا دم تھا۔۔۔ جو بات میری سمجھ میں نہیں آئی برخوردار، یہ ہے کہ تم کو اس نے ہمیشہ دور کیوں رکھا۔ ایک بیٹا تو اُنھوں کا نور ہوتا ہے۔ تعلیم کیا لاہور کے کالج میں پوری نہیں ہو سکتی تھی کہ تم۔۔۔ بیٹا"

"وہ۔۔۔ میرا خیال ہے ابا کو کچھ شوق تھا۔ جنون کی حد تک کہ تعلیم کا معیار اعلیٰ ہو۔" میں نے وضاحت کرنی چاہی۔

"تو اپنے لاہور کا یہ گورنمنٹ کالج کیا کم ہے۔ حیدر علامہ اقبال صاحب نے پڑھا اور بڑے بڑے لوگوں نے پڑھا۔ اور ایف سی کالج ہے۔ چیف کالج سے بڑا کالج ہے کیا لارنس کالج ہے انگریز لوگ یہاں

www.paksociety.com

بھی ہن لیے ہیں۔

اصل صورت حال خود مجھ پر اس وقت عیاں ہوئی تھی جب کف افسوس ملنے کے سوا میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ ابا نے محض مجھے حالات سے بے خبر رکھنے کے لیے یہ چال چلی ہے تو میں لاہور سے جانے سے انکار کر دیتا۔ انھوں نے مجھے مجبور کر دیا... اور ان کے جذبات کے سامنے میری عقل کی دلیل نہ چلی۔ انھوں نے کہا اعلیٰ تعلیم انسان کو بناتی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ یہ مقصد یہاں رہ کے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے اور میرا حکم ہے کہ جاؤ۔ میں نے ان کی بات مان لی۔ انھوں نے کہا کل کی فکر مت کرو۔ ابھی میں زندہ ہوں اور خدا کارساز ہے۔ میں نے یہ بات بھی مان لی۔ انھوں نے کہا اب خیر خیریت ہے۔ میں نے یہ بات بھی مان لی۔ انھوں نے کہا صحت اور کاروبار دونوں اچھے ہیں الحمدللہ۔ اور میں نے یہ بات بھی مان لی۔ وہ تو صرف اپنے حالات کی مجبوریوں سے لڑ رہے تھے، اپنے دشمنوں سے نبرد آزما تھے اور مجھے اس جنگ کی پرچھائیوں سے بھی دور رکھا۔ آخر کیوں؟ ایسی کیا مجبوری تھی انہیں! کس بات کا ڈر تھا انہیں؟

رفتہ رفتہ یہ خیال میرے دل میں جڑ پکڑ رہا تھا کہ میر شرافت علی کے پاس ناقابل تردید حقائق کی کوئی ایسی زنجیر تھی جس میں اس نے وزیر خان کو بری طرح جکڑ رکھا تھا اور وزیر خان بے بس نہ ہوتا تو اس زنجیر کو توڑنے کی کوشش ضرور کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کوشش بے سود ہوگی۔ تمام عمر کون بلیک میل ہو سکتا ہے۔ تنہا آدمی کا جینا کیا اور مرنا کیا۔ زندگی یوں بھی بے مشقت تھی۔ اگر وہ میر شرافت علی کو قتل کرکے جیل یا تختۂ دار پر پہنچ جاتا تو اس طویل پُرعذاب انجام سے بچ جاتا۔ اس میں اتنی ہمت بھی تھی کہ اسے قتل کر سکتا۔ میں جانتا تھا میرے باپ کے خون میں بزدلی کے جراثیم نہیں تھے۔ پھر وہ کیوں خاموشی سے بلیک میل ہوتا رہا؟ اس کا جواب صرف ایک ہی ممکن تھا کہ اسے اپنی نہیں میری زندگی عزیز تھی۔ بات کوئی ایسی تھی کہ جس کے تباہ کن اثرات میرے مستقبل پر نحوست کے سائے پھیلا سکتے تھے۔

بہت سوچنے کے باوجود میں کبھی نہ سمجھ پایا تھا کہ میرا باپ جو اصول پرست، متقی اور ایماندار تھا کس جرم کا مرتکب ہوا تھا جس کی سزا اس کو میر شرافت علی نے دی۔ اس کی زندگی کا کون سا گناہ تھا جس کی پاداش میں وزیر خان کو اپنا سب کچھ دے کر راز داری کا سودا کرنا پڑا۔ وہ کون سا راز تھا جو وہ اپنے ساتھ لے کر قبر میں چلا گیا۔ کیا اس راز سے پردہ اٹھانے کا نتیجہ مرنے کے بعد اس کی رسوائی اور میری تباہی کی صورت میں نکلے گا؟ کیا انکشاف راز کے بعد میری نظر جس اصل وزیر خان کو دیکھے گی وہ میرے لیے قابل صد احترام انسان کے برعکس کسی شیطان کا روپ ہوگا؟ نہیں، یہ ناممکن ہے۔ میں نے طے کیا۔ وہ گردش حالات کا شکار ہو سکتا ہے۔

سازش کا شکار ہو سکتا ہے اور غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ شکاری چراغ دین جیسے لوگ تھے۔ شکاری میر شرافت علی تھا جس نے موت کی حد تک اس کا تعاقب کیا۔ اور شکاری وہ نادیدہ دشمن تھے جو اب بھی پیچھے لگے تھے اور ہر طرف جال پھیلا رہے تھے۔ ان شکاریوں نے اپنے ایک مقصد میں کامیابی حاصل کر لی تھی یعنی وزیر خان کو بڑھاپے میں انتہائی رسوا کن طریقے سے نکلوا کے اپنی شکار گاہ تک لے آئے تھے۔ جیسے ہانکا کرنے والے شیر کو گھیر کر مچان پر بحفاظت بیٹھے ہوئے شکاری کے نشانے پر لے آتے ہیں۔

اور تب وہ لمحہ میرے مقابل آ کھڑا ہوا جو فیصلے کا طلبگار تھا۔ کہ سکندر بخت فیصلہ کرو۔ کیا تم میں حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے؟ مرنے والے کی نیکی بدی اس کے ساتھ گئی۔ روز محشر میں وہ اپنی فرد عمل خود پیش کرے گا۔ لیکن کیا تم انہیں معاف کر دو گے جو اس کے قاتل ہیں؟ جو اس کے ہر قطرۂ خون سے کسی مجبوری کا خراج وصول کرتے رہے۔ کیا تم ایک شکست خوردہ کی طرح بھاگ جاؤ گے جبکہ شکاری تو اب بھی تمہارے تعاقب میں ہیں اور اس وقت تک رہیں گے جب تک تمہارا وجود ان کے لیے باعث خطر ہے۔ وہ خود کو اسی وقت محفوظ خیال کریں گے جب تمہیں بھی شکار کر لیں گے۔ بولو تم کیا ہو؟ شکار... یا شکاری؟

"میں؟" میں نے اس لمحے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "میں شکاری ہوں۔ ان سب کا جواب جو اب تک خود کو شکاری سمجھتے آئے ہیں۔ خیر وہ آئیں... کہ اب وہ میرا شکار ہیں۔ مطلب یہ کھلی جنگ ہے۔ وقت بتلائے گا کہ شکاری کون تھا اور شکار کون۔" یہ عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا، گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔ یہی ہار جیت تو زندگی ہے۔

"چچا سلامت۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "شام ہو رہی ہے۔ مجھے ایک ٹرنک کال کرنی تھی اسلام آباد۔"

"شوق سے کرو۔" سلامت شاہ نے کہا۔ "ٹیلی فون کوٹھی میں ہے۔ میں چوکیدار سے کہہ کے تالا کھلوا دیتا ہوں۔"

تقریباً آدھے گھنٹے بعد محسن رضا نے چلا کر کہا۔ "کون؟ کبیر؟ کس جہنم میں چلا گیا تو؟ کب آیا؟"

"آیا نہیں لایا گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آج ہی پہنچا ہوں۔ مجھے ڈی پورٹ کر دیا گیا تھا۔ تیرے ڈیڈی نے تجھے کچھ نہیں بتایا؟"

"ڈیڈی نے؟" وہ حیران ہو کر بولا۔ "کیا تو نے ان کو فون پر اطلاع دے دی تھی؟"

"نہیں۔" میں نے بات کو گول کر دیا۔ "وہ خارجہ امور سے منسلک ہیں نا! میں نے سوچا شاید سفارت خانے نے ان کو مطلع کر دیا ہو۔ میرا مطلب ہے انھی کے تھرو۔"

"نہیں یار۔" محسن بولا۔ "وہ تو خود بہت حیران ہوں گے سن کے۔ کیا حالات بہت بگڑ گئے تھے؟"

"ہاں... کچھ ایسی ہی بات تھی۔" میں نے کہا۔ "چچا کی موت کی خبر ملی... حالات کی خرابی کے باعث اسلام آباد میں نہیں اتر سکا اور لاہور آ گیا۔ وہاں سے سیدھا تیرے پاس پہنچتا۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں تجھ سے جو فون پہ نہیں کی جا سکتیں۔ میں کل پنڈی آ رہا ہوں۔ مری چلیں گے۔"

"مری؟" محسن رضا نے کہا۔ "کوئی خاص کام ہے؟"

"ہاں۔ وہ تیرے بہنوئی ہیں نا... چراغ دین۔ وہ بھی وہیں ہیں اتفاق سے۔" میں نے کہا۔ "مجھے مریم باجی کی اور ان کے بچوں کی قبر پر فاتحہ بھی پڑھنی ہے۔"

"یار سکندر! ابا کی اس چوہدری چراغ دین سے کبھی نہیں بنی تھی۔ اور اب تو کوئی رشتہ ہی نہیں۔ اس سے کیا ملنا۔ پھر کبھی چلے جائیں گے جب وہ نہیں ہوگا۔" محسن رضا نے کہا۔

"نہیں یار۔ اس سے ملنا ضروری ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک پرانا حساب چکانا ہے۔ وہیں آ کے بتاؤں گا۔"

"تیری مرضی۔" محسن نے مجبور ہو کے کہا۔ "یہ بتا ابا کا کیا حال ہے؟"

"ابا۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ "ان کے انتقال کو ایک ہفتہ ہو گیا ہے محسن رضا!"

"کیا؟" وہ چیخا۔ "وزیر چچا فوت ہو گئے؟ کب؟ کیسے سکندر؟"

"میں آ رہا ہوں تو سب بتا دوں گا محسن! مجھے بھی یہاں پہنچ کے بعد ہی علم ہوا۔ اگر میں نہ آتا تو شاید کوئی بھی مجھے اطلاع نہ دیتا۔" میں نے مضمحل لہجے میں کہا۔

"دیکھ سکندر! تو مجھ سے گلا کر رہا ہے؟ خدا کی قسم میرا دماغ ابھی تک بالکل متوازن نہیں ہوا ہے۔ اگر میں ٹھیک ہوتا تو ضرور ان سے ملتا۔" محسن نے کہا۔

"چھوڑ محسن! ابھی تجھ سے کیا گلا کروں گا۔ گلا زیادہ سے زیادہ تقدیر سے کیا جا سکتا ہے مگر اس سے بھی کیا حاصل۔ میں تو کہتا ہوں اچھا ہی ہوا کہ تو ان سے نہیں ملا۔" میں نے کہا۔ "اب میں قبرستان جاؤں گا اور پھر میر شرافت علی سے ملنے جاؤں گا۔"

"کاروباری معاملات طے کرنے ہیں یا کوئی اور مسئلہ ہے؟" محسن نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"مسئلہ کوئی نہیں۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "اور یہ تو اتنا آسان نہیں کہ ایک ملاقات میں طے ہو جائے۔"

"سکندر! اس وقت تیرا دماغ ٹھکانے پہ ہے یا نہیں؟ میری مان، تو ابھی اسلام آباد آ جا۔ میر شرافت علی سے ملنا ہو تو میرے ساتھ چلنا۔ تو اکیلا جائے گا تو نہ جانے کیا ہو جائے۔"

"کچھ بھی نہیں ہوگا محسن۔" میں نے کہا۔ "کیا میری باتوں سے تجھے شبہ ہو رہا ہے کہ میں ہوش میں نہیں؟"

"ان حالات میں کوئی بھی ہوش میں ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔" محسن نے کہا۔ "مجھے خطرے کی بو محسوس ہو رہی ہے۔"

"پاگل کے بچے! ابھی وہ ٹیلی فون ایجاد نہیں ہوئے جن پر خوشبو بھی آنے لگے۔ اور بدبو تو اس سے زیادہ تصوراتی ہے۔" میں نے کہا۔ "تو فکر مت کر۔ میں صبح کی ریل کار سے آ رہا ہوں۔ خدا حافظ۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

سلامت شاہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ "آپ سیٹھ صاحب کو پہلے سے جانتے ہیں؟"

برخوردار اور تم سے اچانک آپ ہو جانا اس کے رویے کی نمایاں تبدیلی تھی۔ "ہاں، بس ایسے ہی۔ اب تم میرے ساتھ قبرستان چلو گے سلامت چاچا۔ وہاں سے میں چلا جاؤں گا میر شرافت علی سے ملنے۔"

"یہ میر شرافت علی کون ہے؟ تمہارے ابا کا کوئی دوست؟" سلامت شاہ نے کہا۔

"دوست؟" میں نے کہا۔ "یہ لفظ تو بہت بدنام ہو گیا ہے سلامت چاچا۔ دشمن جو سامنے آ کے وار کرتا ہے اس دوست سے تو اچھا ہوتا ہے جو دوستی کا فریب دے کر مارتا ہے۔ مگر یہ بات تمہارے سمجھنے کی نہیں ہے۔"

قبرستان جاتے ہوئے میں نے سلامت شاہ سے کہا کہ وہ فی الحال بنک کے لاکر کی چابیاں ابھی اپنے پاس رکھے کیونکہ وراثت کا سرٹیفکیٹ حاصل کیے بغیر میں لاکر نہیں کھول سکتا تھا۔ صندوق کے بارے میں بھی کہا کہ اسلام آباد سے واپس آ کے طے کروں گا کہ کیا کرنا ہے۔ میرا اسباب ساتھ نہیں جائے گا۔ اور میں صرف ایک بریف کیس لے کر جاؤں گا۔ مختصر سے دو دن میں لوٹ آؤں گا۔ چابی کپڑوں کے دو جوڑے بہت ہوں گے۔ البتہ صبح ریل کار پکڑنے کے لیے اسٹیشن پہنچنے کا مسئلہ ہوگا۔ وقت پر تانگہ مل گیا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ اسٹیشن تک پیدل بھی چند منٹ کی مسافت ہے۔ سلامت شاہ نے کہا کہ وہ فجر کی نماز کے لیے لازمی اٹھتا ہے، مجھے بھی اٹھا دے گا۔ اس نے چراغ دین سے میرے تعلق کے بارے میں بھی پوچھا تو میں نے بتا دیا کہ محسن جو میرا بچپن کا دوست ہے، چراغ دین اس کا بہنوئی تھا۔ سلامت شاہ نے حیرانی کا اظہار کیا کہ وزیر خان نے کبھی نہیں بتایا۔ میں جب قبرستان سے نکلا تو شام کا آنچل اندھیری رات کے گھونگھٹ میں ڈھل رہا تھا۔ میں اب بہت پُرسکون تھا لیکن یہ سکون اس خاموشی کی طرح تھا جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جب میں اپنے باپ کی قبر پر فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا تو ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرکے میں نے ان کی صورت کا تصور کیا جو میں نے سال بھر پہلے دیکھی تھی اور اس وقت جیسے کانوں میں ان کی مانوس آواز آئی۔ بالکل واضح اور صاف۔ "اپنے فیصلے پر قائم

www.paksociety.com

رہنا سکندر۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

میں چونک پڑا اور میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو سلامت شاہ نزار اور خوف زدہ سا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی حیران آنکھوں میں ایک سوال تھا جیسے وہ پوچھنا چاہتا ہو کہ کیا تم نے کچھ کہا؟ ارد گرد ویران قبرستان پر شہر خموشاں کا سکوت طاری تھا اور ہم دونوں کے آس پاس فاتحہ پڑھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ شاید آواز صرف میرا ہی وہم نہیں تھی، سلامت شاہ بھی اسے اپنا وہم سمجھ رہا تھا۔ وہم کیا ہے اور حقیقت کیا ہے۔ عقل کا پھیر۔ فریب نظر۔ فریب سماعت۔ فریب خیال۔ کون کس سے پوچھے کہ وہ سب جو نظر آتا ہے اور سنائی دیتا ہے اور احساس پر چھا جاتا ہے ہمیشہ سچ کیوں نہیں ہوتا اور سراب کیوں نظر آتے ہیں؟ خواب کیوں بکھر جاتے ہیں اور کیسے سچ ہو جاتے ہیں۔

ہسپتال کے پیچھے ایبٹ روڈ کے چوراہے سے میں نے پیدل چلنا شروع کیا۔ یہ سڑک جو آگے جا کے میکلوڈ روڈ سے مل جاتی تھی سینما گھروں کی وجہ سے نصف شب کے بعد بھی آباد رہتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کھمبوں پر ٹیوب لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ اور ٹریفک کی ہیڈ لائٹس سے بھی اتنی روشنی تھی کہ میں نے گلی اور سفید رنگ کی کوٹھی کو آسانی سے تلاش کر لیا۔ قریب جا کے دیکھنے پر مجھے گیٹ لائٹس کے نیچے آدمی کے قد سے ذرا بلند ستون پر نصب سنگ مرمر کی تختی بھی نظر آ گئی۔ جس پر اردو میں لیبرانسے کے حروف زیادہ نمایاں تھے۔ دوسرے ستون کی تختی پرانی تھی اور اس پر بھی حروف ہندی رسم الخط میں سابق مالک کے نام اور سن تعمیر کے ساتھ موجود تھے۔ آس پاس دوسری کوٹھیاں بھی ایسی ہی تھیں چار چار کنال پر پھیلی ہوئی اور پرانے درختوں میں گھری ہوئی۔ گیٹ سے ذرا فاصلے پر ٹیلی فون کا کھمبا نصب تھا اور ایک تار آٹھ فٹ اونچی فصیل کے اوپر درختوں میں سے گزرتا ہوا اندر کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ۱۲ بج کے بیس منٹ ہو چکے تھے۔ ٹریفک میں تھوڑا سا وقفہ آیا جب فٹ پاتھ پر بھی کوئی میرے قریب نہ تھا۔ میں ایک ہی بار میں دیوار پر چڑھ گیا۔ ٹیلی فون کی لائن اب بھی میری دسترس سے چند انچ اوپر تھی۔ دیوار کی دوسری جانب نیچے دیکھنے پر مجھے پھولوں کے تختے نظر آئے۔ میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اوپر چھلانگ لگائی اور دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ ٹیلی فون کا تار میری گرفت میں آ گیا میرے وزن سے جوڑ اور جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ میں سیدھا کیاری میں اترا۔ تار کے جھٹکے سے میرے گرنے کی رفتار کم ہو گئی تھی اور میرے قدموں سے دب جانے والے پھول نرم مٹی میں آ گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ میں توازن برقرار رکھنے میں کامیاب رہا ورنہ میرے کپڑے مٹی میں بکھر جاتے۔

لان عبور کر کے میں اطمینان سے کوٹھی کے برآمدے میں پہنچا جہاں ایک ریسپشنسٹ بڑی رعونت سے ٹیوب لائٹ کی روشنی میں جھلمل کر رہی تھی۔ ایک کتا بہت چھوٹے قد کا لمبے لمبے سفید بالوں اور لمبے کانوں والا۔ مجھے دیکھ کر بھونکا۔ اندر سے کسی نے کہا "کیا ہے ٹائیگر" پھر جالی والا دروازہ کھلا اور سفید نائٹ کی پتلون اور گرم کوٹ پہنے شوفر ٹائپ آدمی باہر آ گیا۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی مگر صحت میں میرے جیسے نوجوانوں سے بہتر تھا۔ "کون ہو تم" اس نے مشتبہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے گستاخانہ لہجے میں کہا۔

"تمہیں کیا نظر آتا ہوں، انسان یا چھلاوہ؟" میں نے ناراضگی سے کہا "اپنا لہجہ درست رکھو اور یہ بتاؤ مسٹر کہ اپنا یار میر شرافت علی گھر پر ہے؟"

شوفر ٹائپ آدمی محتاط ہو گیا "جی... وہ تو ہیں..." اس نے ایک نظر بند گیٹ کو دیکھا "آپ کا نام؟"

"سید سکندر بخت لندن والا" میں نے کہا "نام سنا ہے تمہیں۔ خیر چلو بتاؤ وہ کہاں ہے؟"

"وہ... جناب... میرا مطلب ہے میں ان کو بتا دوں پہلے..." شوفر نے تھوڑا سا تامل کیا۔

"ابے چل" میں نے بے تکلفی سے کہا "میں اس سالے کو حیران کرنا چاہتا ہوں۔"

شوفر ٹائپ شخص میرے لہجہ اور انداز سے آگے جا کے تیسرا کمرہ انہی کا ہے۔ وہ ناراض ہونے لگے جناب، میرا ذکر مت کیجئے گا۔" وہ بولا اور پلٹ کر غائب ہو گیا۔ میں نے دس قدم چل کے نیم دروازے سے پردہ ہٹانے کی بجائے جواب کا انتظار کیے بغیر ہینڈل گھمایا اور اندر داخل ہو گیا۔

یہ میر شرافت علی کا شاہانہ بیڈروم تھا۔ وہ مسہری پر نیم دراز اخبار دیکھ رہا تھا۔ پچاس سال کے لگ بھگ عمر کا اور دراز قد تھا مگر اس کا ابھرا ہوا سا آدمی تھا ناک پر موٹے شیشوں والی سیاہ فریم کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کے سر کے بال ہیئر کلر کے استعمال سے سیاہ اور چمکیلے تھے۔ چنانچہ اس کی عمر دیکھنے میں چالیس سال بھی نہیں لگتی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے سر گھما کے دیکھا اور کسی نوکر کے بجائے ایک اجنبی کو دیکھ کر حیران ہوا۔ اس وقت مجھے چہرے پر طوطے جیسی خمیدہ ناک اور عقاب جیسی تیز آنکھوں کی چمک نظر آئی۔ بیڈروم تک کمرے میں ایئر کنڈیشنر کی ہلکی سی سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دی۔ پھر میں نے مسکرا کے کہا "ہیلو شرافت علی! آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" اور ہاتھ پھیلا کے گلے لگنے کے لیے آگے بڑھا۔

میر شرافت علی کی جھنجھلاہٹ پر ناگواری کے آثار زیادہ نمایاں ہو گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے مجھے روک لیا اور صرف ہاتھ ملانے پر اکتفا کی۔ "معاف کیجئے، میں مجموعی طور پر یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں آپ؟" لیکن بے تکلفی سے میرے بیڈروم تک بہت کم لوگ

www.paksociety.com

آتے ہیں۔ اور اگر میری آپ سے پہلے کبھی ملاقات ہوئی ہے تو مجھے یاد نہیں۔" اس نے میری صورت پر نظر جما کے کہا۔ پھر اس نے سائڈ پر لگا ہوا ایک بٹن دبا دیا۔

"کمال ہے انکل! میں نے آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ آپ تو مجھے بچپن سے جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔

ایک خادم اندر داخل ہوا۔

"تم... تم وزیر خاں کے بیٹے ہو... سکندر بخت..." اس نے اچانک کہا۔ پھر وہ خادم کی طرف متوجہ ہوا۔ "مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کے مجھے اطلاع دینے کا دستور کب سے ختم ہوا ہے؟" وہ گرج کر بولا۔ "کیا اس سے پہلے لوگ بتائے بغیر سیدھے میرے بیڈ روم تک آتے ہیں؟"

حواس باختہ ملازم نے بمشکل تمام جواب دیا کہ اسے بالکل خبر نہیں شاید چوکیدار بتا سکے۔

"دروازے پر کوئی چوکیدار نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "میں گھنٹی بجاتا رہا اور پھر گیٹ کھول کے اندر آ گیا۔"

"وہ گیا ہوگا نماز پڑھنے کے لیے۔" میر شرافت علی نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ "خیر۔ اب آپ تشریف لے چلیے ڈرائنگ روم میں۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔ کمال ہے برسوں ولایت میں رہ کے بھی تم ادب آداب کے کورے ہی رہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ خوف سے وہ نروس ہو گیا ہے۔ خادم نے لپک کر دروازہ کھولا اور میں اس کے پیچھے پیچھے راہداری میں نکل آیا۔ جس کی بلند چھت میں تین فانوس معلق تھے۔

"بے تکلفی اور بدتمیزی میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ وہاں تو باپ بیٹا بھی دستک دیے بغیر ایک دوسرے کے کمرے میں داخل نہیں ہوتے۔" وہ اس انداز سے بولا جیسے اپنی پریشانی میں حق بجانب تھا۔ میں یہ ظاہر کرتا رہا جیسے میں سخت شرمندہ ہوں۔ ڈرائنگ روم پہلا دروازہ تھا اور وسیع و عریض ہال تھا جس میں قدم رکھتے ہی سامان آرائش میں نوادرات کی کثرت حیران کرتی تھی۔ خادم نے ایک بٹن دبا کے چار وال لائٹیں روشن کر دیں پھر درمیان کا عظیم الشان فانوس جلا دیا۔ ایئر کنڈیشنر آن کیا اور دبے پاؤں قالین پر بلی کی طرح چلتا نکل گیا۔

"بیٹھو اور بتاؤ کب آئے تم؟" میر شرافت علی نے صوفے کی طرف اشارہ کیا لیکن خود دوسری طرف بیٹھ گیا۔

"میں؟... میں آج ہی آیا ہوں۔" میں نے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑا اور ادھر ادھر دیکھا۔

"اچھا... وزیر سے نہیں ملے ابھی؟" اس نے میرا خوشگوار موڈ دیکھ کر اندازے کی بنیاد پر کہا۔

"مل آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میاں صاحب کے قبرستان میں بیٹھے تھے وہ۔"

میر شرافت علی چونکا اور اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کے لیے اس نے میز پر سے سگریٹ اٹھا کر جلائی۔ "تو گویا تمہیں ان کے انتقال کی خبر مل گئی تھی؟" اس نے اخروٹ کی لکڑی کا منقش بکس میری طرف کھسکا دیا۔

میں نے بکس میں سے دوسری سگریٹ اٹھائی۔ صوفے کے ہاتھ سے لائٹر سے جلائی اور لائٹر جیب میں رکھ لیا۔ "نہیں۔ بلکہ مجھے یہاں آ کے معلوم ہوا کہ تم نے انہیں قتل کر دیا ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

میر شرافت علی بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ "تمہارا... تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟"

"ہاں۔ میرا بھی یہ سنتے ہی یہی حال ہو گیا ہے۔ اور اب میں تمہارا دماغ درست کرنے آیا ہوں۔"

اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر دیوار پر لگی کال بیل کی طرف دیکھا جو میری پشت پر تھی چنانچہ اس کی دسترس میں نہ تھی اور پھر چلا کر کسی کو بلانے کے لیے منہ کھولا مگر میں نے ایک جست میں اس کی گردن دبوچ لی۔ اس کا بدن میرے ہاتھوں کی گرفت میں لرزنے لگا اور خوف سے اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔

"میر شرافت علی!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "میری جیب میں بھرا ہوا ریوالور ہے۔ ابھی تک کسی کو معلوم نہیں کہ میں پاکستان آیا ہوں۔ میں تمہیں اور تمہارے مددگاروں کو ختم کر کے صبح کی فلائٹ سے لندن واپس جا سکتا ہوں لیکن میں ابھی ایسا نہیں کروں گا بشرطیکہ تم شرافت سے بیٹھے رہو اور جو پوچھوں سچ سچ بتاتے رہو۔" میں نے اسے دھکا دیا اور وہ صوفے پر گر کر ہانپنے لگا۔

"تم... تم میرے گھر میں ہو۔" میر شرافت علی نے بہت جلد خود کو سنبھال لیا۔ "اس گھر میں تین نوکر موجود ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی شبہ ہوا تو وہ پولیس کو فون کر دے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہارا فون خراب ہے۔ اور اس بات کا خیال تم خود رکھو کہ اندر کوئی نہ آنے پائے ورنہ ممکن ہے کہ میں انتہائی اقدام پر مجبور ہو جاؤں۔ پولیس کا ابھی کوئی کام نہیں۔ مناسب وقت پر میں خود بھی پولیس سے ہی رجوع کروں گا اور اس وقت تم چاہو گے کہ ایسا نہ ہو۔ بہتر ہے تم سچ بولو کیونکہ میرے اور تمہارے درمیان جو گفتگو ہوگی اس میں جھوٹ بالکل نہیں چلے گا کیونکہ بیشتر حقائق وہ پردہ اٹھ جانے کے بعد سامنے آ گئے ہیں جو میری عقل پر اور نظر پر پڑا ہوا تھا۔"

"سکندر... تم آخر چاہتے کیا ہو؟" میر شرافت علی نے بے بسی سے کہا۔

"چاہتا تو میں یہ تھا کہ تمہارا خون پی جاؤں۔" میں نے کہا۔ "بالکل اسی طرح جیسے تم نے میرے باپ کا خون پیا۔ اس کے وجود کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا۔ تمہاری قسمت نے تمہارا بہت ساتھ دیا شرافت لیکن تم سے رہ گئے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ میں ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہوں ورنہ اب تک تمہاری گردن توڑ کے جا چکا ہوتا۔ ابھی میں بس یہ پوچھنا چاہتا ہوں تاکہ تمہارا جرم دنیا پر ثابت کر سکوں اور تمہیں تختہ دار تک پہنچنے سے پہلے ذلت و رسوائی کے طویل ترین عذاب سے گزرنا پڑے۔"

"یہ... یہ تم کیا کہہ رہے ہو... میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کسی نے غلط بتایا ہے تمہیں..." وہ ہکلا کر بولا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلتا ہوا اس شوکیس تک گیا جس پر مہاتما بدھ کا ایک قدیم مجسمہ رکھا ہوا تھا۔

"میر شرافت علی! تم اب میر وزیر اینڈ کمپنی کے بلاشرکت غیرے مالک ہو؟"

"ہاں۔ تمہارے والد کے انتقال کے بعد میں ہی بلاشرکت رہ گیا ہوں۔ یہ مجسمہ رکھ دو... بہت قیمتی ہے۔" وہ بولا۔

"اچھا!" میں نے مجسمے کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ "میرے والد نے حسابات پر آخری بار جون میں دستخط کیے تھے یعنی تین ماہ قبل۔ ان کے حصے کا منافع تقریباً ساڑھے تین لاکھ تھا۔ یہ رقم انہیں ادا کر دی گئی تھی؟"

"ہاں... وصولیابی کے دستخط..."

"دستخط؟" میں نے مجسمہ دیوار پر دے مارا۔ "میں ادائی کی بات کر رہا ہوں۔ دستخط تو تم نے بہت لیے ہیں۔"

میر شرافت علی پھر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ مجسمے کے ٹکڑوں کو گھور رہا تھا۔ "تم... تم بدمعاشی سے مجھے ہراساں کرنے آئے ہو... تمہیں معلوم ہے اس مجسمے کی قیمت کیا ہے؟"

"پتھر کا مجسمہ تھا جیتا جاگتا آدمی تو نہیں تھا۔ تم بتاؤ میرے باپ کی زندگی کی کیا قیمت تھی؟" میں نے جیڈ کا بنا ہوا نفیس گلدان اٹھا لیا جس کے آگے دو منہ زور گھوڑے بنے ہوئے تھے۔

"اسے رکھ دو خبیث!" شرافت علی چلایا۔ "یہ بہت نایاب ہے... بیس ہزار کا ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے اسے اوپر اٹھایا۔ اس کا وزن دو سیر کے قریب تھا۔ "یہ ہے تو میرے باپ کا مال۔ تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔" [illegible]

میں نے دستہ کو اوپر ہاتھ کے زور سے مارا۔ شرافت علی کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور وہ دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ رسید کیا۔ وہ گھوم کر واپس صوفے پر گرا۔ اس کے ہونٹ کا ایک کنارا پھٹ گیا تھا اور خون رسنے لگا تھا۔

"میں اپنے تمام سوالات کا جواب لیے بغیر نہ جاؤں گا اور نہ جانے دوں گا۔" میں نے کہا۔ شور سن کر ایک شخص ایک دم دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ ایک نظر میں اس نے صورت حال کو بھانپ لیا۔

"پکڑ لو اس بدمعاش کو رشید!" شرافت علی نے چیخ کر کہا۔ "یہ مجھے قتل کرنے آیا تھا خالی ہاتھ... دیکھو کتنا نقصان کر دیا ہے اس نے کہتا تھا یہ سب باپ کا مال ہے۔"

رشید نے فلمی بدمعاشوں کی طرح آستین سے منہ صاف کیا اور جیب سے ایک کمانی دار خنجر نکال لیا۔ میں اس وقت تک جیڈ کا ایک اور مجسمہ اٹھا چکا تھا۔ اگر میں خنجر کے جواب میں اس مجسمے سے وار کرتا تو رشید کا سر پھٹ جاتا۔ چنانچہ میں نے مجسمہ کو مشتعل ہو کر فانوس کی طرف اچھال دیا۔ ایک زبردست چھناکا ہوا اور کمرے میں ہر طرف شیشہ بکھر گیا۔ شرافت علی کے حلق سے ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح آواز نکلی۔ اور رشید کے ساتھ ہی اس نے دیوانہ وار مجھ پر جست لگائی۔ میں نے رشید کے وار کو دائیں ہاتھ سے اس کی کلائی تھام کے روکا اور کلائی کو ذرا سا جھٹکا دیا۔ ہڈی کے چٹخنے ہی رشید بلبلایا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نیچے گرا اور وہ درد سے دہرا ہوا تو میں نے نیچے سے گھٹنا مار کر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ کی ضرب سے الٹ کر دور پھینک دیا۔ وہ تقریباً اڑتا ہوا گیا اور شیشے کے ایک اور شوکیس سے ٹکرایا۔ شفاف شیشے کے بکھرتے ہی اندر رکھے ہوئے نوادرات اس کے اوپر گرے پھر اس کے بھاری وجود کے تصادم سے شوکیس کا توازن بگڑ گیا۔ شوکیس پیچھے کی دیوار سے ٹکرا کر آگے آیا اور اوپر رکھے ہوئے نوادرات سمیت رشید پر الٹ گیا۔

شرافت علی جو میری طرف لپکا تھا صدمے سے سن پتھر کے بت کی طرح منجمد کھڑا رہا۔ اس کے نوادرات کا بیش بہا ذخیرہ جو شاید اس نے برسوں میں جمع کیا تھا پل بھر میں نیست و نابود ہو گیا تھا۔ اگر وہ ایک مجسمہ واقعی بیس ہزار کا تھا تو اس حساب سے میں نے اس کا لاکھوں کا نقصان کر دیا تھا اور یہ ذہنی اذیت اسے پاگل کر دینے کے لیے کافی تھی۔ وہ پھر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کے ہونٹوں سے کف جاری تھا اور اس کی زبان سے فحش ترین گالیوں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ میں نے اطمینان سے دونوں ہاتھوں سے اس کو کندھوں سے اٹھا کر اوپر اٹھایا اور پھر صوفے پر پھینک دیا۔

انجینیئر بننے کے ساتھ ساتھ میں نے جوڈو اور کراٹے

www.paksociety.com

بھی سکھ رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور میں کوئی بلیک میلر تو نہیں ہوں۔ مگر ایک ماہر فن کا ساتھ ہے جو تمہارے گرد موجود تھا۔ اب میں پھر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔۔۔ مٹی ڈیئر میر شرافت علی! تم کب سے وزیر خان کو بلیک میل کر رہے ہو؟" میں نے شیشے کا خنجر اٹھایا۔۔۔ اور ایک آئل پینٹنگ کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ "یہ مصوری کا شاہکار بھی بہت بیش قیمت ہوگا۔"

"سکندر! خدا کے لیے تم مجھے مار دو۔" وہ گڑگڑا کر بولا۔

"میں بوڑھا آدمی ہوں۔ تمہارے باپ کا ہم سن۔۔۔ اپنے جوان بازوؤں کی طاقت سے میری ہڈیاں توڑ دو۔ مگر ان چیزوں کو تباہ مت کرو۔"

"کیوں؟" میں نے تصویر کو نوکِ خنجر سے چاک کر دیا۔ ایک کونے سے دوسرے مخالف کونے تک۔ تصویر کی صورت میں کٹ جانے والا کینوس بوسیدہ ٹاٹ کی طرح لٹکنے لگا۔

میر شرافت علی بلک بلک کر رونے لگا۔ "یہ۔۔۔ یہ میری تمام عمر کی کمائی ہے۔۔۔"

"میرے باپ کی تمام عمر کی کمائی کیا تھی؟ رسوائی اور ذلت۔ مفلسی اور فاقہ کشی اور بے چارگی کی موت؟ مجھے معلوم ہے میر وزیر اینڈ کمپنی قائم ہونے کے بعد اس نے اپنے حصے کے منافع پر صرف دستخط ثبت کیے ہیں۔ رقم تمہارے حساب میں جمع ہوتی رہی۔ حسابات دیکھ کر میں معلوم کر لوں گا کہ کل رقم کتنی بنتی ہے جو اس کو ملنی تھی۔ یہ رقم معہ سود تم مجھے ادا کرو گے۔ یہ وصول کرنی ہے۔ آج کا سارا نقصان اس میں سے منہا کر دو۔ باقی بشرطِ زندگی میں تم سے پھر لے لوں گا۔"

اسے اپنے نقصان پر اتنے عذاب سے روتے دیکھ کر مجھے بڑی تسکین حاصل ہو رہی تھی۔ غالباً شور پر متوجہ ہو کے دوسرا خادم اندر آیا جو ابھی ڈرائنگ روم تک پہنچ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ فرار ہوتا، میں نے ہاتھ بڑھا کے اسے کھینچ لیا۔ وہ دہشت سے چلایا۔ مگر میں نے اس کی کنپٹی پر ایک ہلکا سا ہاتھ مارا اور چھوڑ دیا۔۔۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح گر کے ڈھیر ہو گیا۔ میر شرافت علی کے حلق سے نکلنے والی آواز بند ہو گئی۔

"تم نے کوٹھی میں تین ملازموں کا ذکر کیا تھا۔" میں نے ہاتھ جھاڑتے کہا۔ "دو یہاں لیٹے ہیں۔ تیسرا چوکیدار نماز پڑھ کے لوٹ آیا ہوگا تو دروازے پر کھڑا ہوگا۔ جناب! اب کسی کی مداخلت کا خدشہ نہیں رہا اور ہم اطمینان سے بات کر سکتے ہیں۔ یہ بتاؤ قانونی طور پر تم فرم کے مالک بن چکے ہو؟"

میر شرافت علی نے اقرار میں سر ہلایا۔

"جھوٹ۔" میں نے خنجر سے ایک اور پینٹنگ کے پرخچے اڑا دیے۔ "یہ قانونی کارروائی اتنے کم وقت میں مکمل نہیں ہو سکتی۔ میرے والد اپنی زندگی میں اس حق سے دستبردار ہوتے ہوئے تو تین مہینے پہلے حسابات پر دستخط کرنے کیوں آتے۔ اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ قانونی دستاویزات میں وہ اب بھی فرم کے ایک مالک ہیں۔"

میر شرافت علی نے اقرار میں سر ہلایا اور پینٹنگ کو گھورتا رہا۔ یوں جیسے یہ اس کے جوان بیٹے کی لاش ہو۔

"پارٹنر شپ کے معاہدے کی دستاویزات وزیر خان کے پاس بھی ہوں گی؟" میں نے کہا۔ "مت سر ہلاؤ۔ جواب دو۔"

"ہاں۔" میر شرافت علی کے حلق سے خوفزدہ آواز نکلی۔ "اس کی موت کے بعد۔۔۔"

"اس کے قتل کے بعد۔" میں نے بات کاٹ کر تصحیح کی۔ "کہو اس کے قتل کے بعد۔"

"اچھا۔ اچھا۔" میر شرافت علی تھر تھر کانپتے ہوئے بولا۔ خوف سے زیادہ یہ صدمے کا اثر تھا۔ "اس کے قتل کے بعد میں نے عدالت میں درخواست دائر کی تھی۔"

"وہ اب غیر مؤثر ہو جائے گی۔ وزیر خان کا قانونی وارث اب تمہارا پارٹنر ہوگا یعنی میں۔" میں نے کہا۔ "انہی دستاویزات کے لیے تم نے اس کے سرونٹ کوارٹر کا تالا توڑا اور اس کے صندوق کی تلاشی لی تھی۔"

"کیسا سرونٹ کوارٹر کا تالا؟ کیسا صندوق؟۔۔۔" اس نے جھوٹ بولنے کی فضول سی کوشش کی۔ میں نے ایک تصویر کو فریم سمیت کھینچ لیا۔ گھٹنے پر مار کے فریم کے ٹکڑے کیے اور اس کی طرف اچھال دیے۔

"بے وقوف!" وہ پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ "یہ ایک ڈیڑھ لاکھ کی تھی۔"

"ایک بے جان تصویر کے لیے اتنا رونا؟" میں نے کہا۔ "اور ایک زندگی کی تباہی پر اظہار ندامت تک نہیں میر شرافت علی! وہ دستاویزات ایک بینک کے لاکر میں محفوظ ہیں۔ میرا وکیل عدالت میں پیش کرے گا۔ تم اس تمام نقصان کی تلافی کر کے جانے کا معقول الگ کر سکتے ہو۔ اب ایک آخری سوال۔ میرے والد کو کس بات پر تم ساری عمر بلیک میل کرتے رہے؟ کیا کیا تھا اس نے جس کی اتنی بڑی قیمت تھی؟"

میر شرافت علی نے روتے روتے سر اٹھایا اور ایک قہقہہ مارا۔۔۔ وہ صدمے سے پاگل ہو چکا تھا۔ "سکندر بخت تمہارے ہاتھ میں خنجر ہے۔" وہ اچانک اٹھا اور میرے سامنے دو زانو ہو گیا۔ "جیسے چاہو مجھے قتل کر دو۔ میرے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے پھینک دو۔ میرا قیمہ کر دو۔۔۔ لیکن یہ بات تم مجھ سے معلوم نہیں کر سکو گے۔ تم چاہو تو اس گھر کو آگ لگا دو۔ اس گھر کی ایک ایک چیز کو تباہ کر دو۔ مگر میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" اس نے پھر قہقہہ مارا۔ "یہ بات اپنے باپ کی قبر پر جا کے پوچھو۔ چلا چلا کے۔ شاید وہ بتا دے۔"

اس کی دیوانی ہنسی کسی ویران مرگھٹ میں چڑیلوں کی ہنسی کی طرح پھیلتی رہی۔ خنجر میرے ہاتھ سے گر گیا۔

"اچھا میر شرافت علی!" میں نے کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔ اس وعدے کے ساتھ کہ میں پھر آؤں گا۔ یہ سب معلوم کر لینے کے بعد کہ تم نے میرے والد کو قتل کیا تھا۔ اس کی سزا تمہیں قانون دے گا۔ میں ثابت کروں گا کہ تم قاتل ہو۔ میں خود تمہیں مار کے یہ موقع ضائع نہیں کروں گا کہ میرے پھانسی پر چڑھ جانے کے بعد تمہارے وارث سارے کاروبار کے بلاشرکت غیرے مالک بن جائیں۔ میں تمہارا پارٹنر ہوں اور مجھے تم سے اپنا آبائی قرض وصول کرنا ہے۔"

میں نے دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ باہر آنے کے بعد میں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ باہر سے بند کیا اور بیرونی دروازے سے گزر کر پورچ میں پہنچا۔ اطمینان سے چلتا ہوا گیٹ تک گیا، جہاں اب چوکیدار موجود تھا۔ اس نے ادب سے مجھے سلام کیا اور گیٹ کھول دیا۔ پریشانی کی کوئی بات نہ تھی۔ میر شرافت علی کے چیخنے چلانے کی آواز گیٹ تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور وہ فون کر کے پولیس کو طلب نہیں کر سکتا تھا۔

باہر نکل کے میں نے میکلوڈ روڈ کا رخ کیا جہاں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ اب کم ہو گئی تھی کیونکہ آخری شو شروع ہو چکے تھے۔ میر شرافت علی کی کوٹھی 'ریٹا ہسپیلز' سے چند قدم کے فاصلے پر مجھے ٹیکسی نظر آئی جس کا ڈرائیور بونٹ اٹھائے انجن میں سر ڈالے کھڑا تھا۔

"ماڈل ٹاؤن تک جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"جانا تو اس وقت ہوگا جناب عالی! جب گاڑی جائے گی؟" وہ سر نکال کے بولا۔

"تم؟" میں نے اس اتفاق پر حیران ہو کے کہا۔ "ابھی تک گاڑی دھکے پر چل رہی ہے!"

"اب تو دھکے پر بھی نہیں چل رہی ہے جناب عالی! ابھی بوڑھی کو تھکن آ جائے۔" وہ پھر سے انجن میں غرق ہو گیا۔۔۔ اس وقت ایک دوسری ٹیکسی خالی گزر رہی تھی جسے میں نے دس روپے زیادہ دینے کے وعدے پر ماڈل ٹاؤن کے لیے راضی رضامند کر لیا۔ رات کے وقت ٹیکسی والے ادھر جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ عموماً انہیں خالی واپس آنا پڑتا تھا اور لٹنے کا ڈر الگ رہتا تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے میں اس کی کوٹھی کے دروازے پر اترا اور ٹیکسی ڈرائیور کو بتانے والے میٹر سے بھی دس روپے زیادہ دے کر عقبی حصے کے سرونٹ کوارٹر میں پہنچا تو سلامت شاہ کھانا لیے بیٹھا تھا اور میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے بھوک نہیں تھی مگر اس کا دل رکھنے کو میں نے چند نوالے لیے۔ پھر سکون آور گولیاں کھائیں اور۔۔۔ سلامت شاہ کو صبح جلدی اٹھنے کی ہدایت کر کے سو گیا۔ سکون بخش گولیوں کا سہارا میں نے پہلے کبھی نہیں لیا تھا چنانچہ آدھے گھنٹے بعد مجھے نیند نے آ لیا جو تقریباً بے ہوشی جیسی تھی۔

صبح سلامت شاہ نے مجھے فجر کے وقت جگایا تو میری آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور بدن تکان سے ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے بغیر دودھ کی چائے کے دو کپ پیے اور بریف کیس اٹھا کے روانہ ہو گیا۔ ریل کار کا ٹکٹ ایک قلی کی عنایت سے عین اسی وقت دستیاب ہوا جب اس کی روانگی میں صرف دس منٹ رہ گئے تھے۔

ابھی میں سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ مجھے شیخ کے ساتھ میر شرافت علی کا دوسرا ملازم نظر آیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا مگر اس سے پہلے کہ میں اٹھتا، دونوں جانب سے پولیس اندر آ گئی۔

"یہی ہے وہ شخص؟" انسپکٹر نے شیخ کو مخاطب کر کے کہا۔

"جی سر!" شیخ نے کہا اور دوسرے ملازم کی طرف دیکھا۔ اس نے تائید میں سر ہلایا۔

"آپ سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم ہیں؟" انسپکٹر نے کہا۔

"ہاں۔ کیا بات ہے؟" میں نے دوسرے مسافروں سے نظریں چرا کے کہا۔

"تم پر الزام ہے کہ تم نے گزشتہ رات میر شرافت علی کو خنجر کے وار کر کے قتل کر دیا۔" انسپکٹر نے کہا اور اپنے ساتھ آنے والوں کو اشارہ کیا کہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دیں۔

خواب سب دیکھتے ہیں۔
لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں؟ سچے خواب کیا ہوتے ہیں؟ خوابوں کی تشریحات کیسے کی جا سکتی ہیں؟ ان کی تعبیریں کیا ہیں؟ خواب آدمی کی زندگی میں کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ ان کی راہنمائی سے مستقبل کی تعبیریں کیا بدلی جا سکتی ہیں؟ کیا وہ ہماری الجھنوں کے عکاس ہوتے ہیں؟ یا وہ ہماری الجھنوں کا حل بھی پیش کرتے ہیں؟
خوابوں کے بارے میں ماہرین نفسیات کیا کہتے ہیں؟
خوابوں کے بارے میں مذاہب عالم کیا کہتے ہیں؟ یہ اور ایسے لاتعداد سوالوں کے مکمل جواب کے لیے ۔۔۔ پڑھیے:
خوابوں کے اسرار
قیمت دس روپے
ڈاک خرچ ۵ روپے
اے ایس صدیقی کے قلم سے
اردو میں پہلی بار ۔۔۔ ایک معلوماتی منفرد کتاب
مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس ۔۔۔ کراچی

www.paksociety.com

تھانیدار کی آمد اور میری گرفتاری ان سب کے نقطۂ نظر سے بے حد سنسنی خیز واقعہ تھی جو مجھے بھی اپنے جیسا شریف مسافر سمجھ رہے تھے اور انھوں نے بعد میں بارہا ایک قاتل کے فرار کی ناکام کوشش کا آنکھوں دیکھا حال حاشیہ آرائی اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ سنایا ہوگا اور ہر ایک نے داستان کے لیے ڈرامائی تاثرات کا اضافہ کیا ہوگا تو سامعین دم بخود رہ گئے ہوں گے۔ تھانیدار کے ساتھ چشم دید گواہ بھی تھے جن پر مزاحمت بے سود تھی اور اس کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ اس کا فرض تھا کہ قتل جیسی سنگین واردات میں ہر مشتبہ شخص سے پوچھ گچھ کرے اور پھر معاملہ نظام انصاف کے سپرد کر دے۔ سب انسپکٹر چنیالیس پچاس سال کا خرانٹ آدمی تھا۔ عمر کا اندازہ خاصی میل اپ کے نیچے دکھائی دینے والی ...... سفید بالوں کی جھالر سے ہوتا تھا۔ اس کی شخصیت میں مونچھوں کے بعد سب سے زیادہ متاثر کرنے والی چیز اس کے پیٹ کی جسامت تھی جس کے نشیب پر [illegible] بیلٹ مسلسل جھولتی رہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک مستقل شکن بے حسی تھی جس پر بے رحمی کا گمان ہوتا تھا اور اس کی صورت کے نقوش میں وہ کرختگی تھی جو عمر کے تجربات نے عطا کی تھی۔ جس شخص کا واسطہ ہی ہر قسم کے قاتل اور دل فریب بدمعاشوں سے ہو، وہ فرض کی ادائیگی میں تہذیب اور شائستگی کے تقاضے کیسے پورے کر سکتا ہے۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ بیس پچیس سال قبل وہ کانسٹیبل بھرتی ہوا ہوگا۔ اس طویل عرصے میں اگر وہ صرف سب انسپکٹر کے عہدے تک ترقی پا سکا تو یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس کی ذہانت اور کارکردگی کا معیار کیا ہوگا۔ اگر افسران بالا خفا نہ ہوں تو مدت ملازمت کو دیکھتے ہوئے از راہ بندہ پروری بھی ترقی بخش دی جاتی ہے اور اس نے بھی شاید ایسے ہی ترقی پائی تھی۔

تجسس، حیرت اور سوالیہ نظروں کی پروا کیے بغیر جب ریلوے اسٹیشن کی عمارت سے باہر آیا تو میری منزل بدل چکی تھی۔ وہیں کچھ دیر پہلے میں اسی راستے پر چلتا ہوا آیا تھا تو میرے تصور میں حسن کا مخلص چہرہ تھا اور فوزیہ کی آواز میں حسن تھی اور میری جلد کے مرہم کی تحریر پڑھنے کے علاوہ جہانگیر ذہن سے بہت سے تصفیہ طلب امور پر گفتگو کی صورت رہا تھا۔ اب میرے تصور میں سوالات تھے۔ ولیسی پولیس کے طریقۂ تفتیش کے لرزہ خیز مناظر تھے۔ عدالتی کارروائی کے صبر آزما مرحلے تھے اور وہ انجام تھا جس کا خیال بھی روح فرسا تھا۔ میرے ہاتھوں میں اب بریف کیس نہیں تھا ہتھکڑی تھی۔ بریف کیس حوالدار نے تھام رکھا تھا جس کی پیٹی سے ہتھکڑی کی زنجیر کا دوسرا سرا بھی منسلک تھا۔ حوالدار اپنے باس سے عمر میں بھی کم تھا اور جسم میں بھی۔ شاید کسی پارٹی کے جھگڑے میں وہ سکڑ گیا تھا کہ وردی بھی اس کے جسم سے بہت بڑی لگتی تھی۔ کانسٹیبل بالکل نو عمر تھا اور کسی دیہات سے وارد ہوا تھا۔ شہر میں اس اعلیٰ اختیارات کے حامل منصب پر فائز ہونے سے اس کی گردن اکڑ گئی تھی۔ جب تھانیدار نے اسے ٹیکسی رکنے کے لیے کہا تو اس نے بڑے بارعب انداز میں ایک ڈرائیور کو اشارہ کیا لیکن ڈرائیور بھاگ گیا۔ اس قانونیت کے اس مظاہرے پر وہ بہت جز بز ہوا اور دوسری ٹیکسی کے سامنے خودکشی کے انداز میں کھڑا ہوگیا چنانچہ ٹیکسی رک گئی۔

"تھانیدار صاحب" میں نے مصلحت کے تقاضے کو مد نظر رکھتے ہوئے عاجزی سے کہا۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، سامنے ہی ایک کوٹھی ہے۔ اس میں ایک خاندان سلامت [illegible] رہتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے دو باتیں کر لوں۔"

"وہ تمہیں وہیں باتیں کر لینا شہزادے۔" تھانیدار نے ایک مونچھ کو بل دے کر میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اسے بھی تھانے منگوا لیں گے۔"

مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ یہ لندن کی پولیس نہیں تھی۔ ان سے بحث نہیں کی جا سکتی تھی۔ کسی عمل کا جواز نہیں پوچھا جا سکتا تھا اور انھیں اپنے ولایت پلٹ ہونے کا حوالہ دے کر متاثر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنے تعلیم یافتہ ہونے کا ذکر ان کو جاہل کہنے کے مترادف تھا اور ولایت کی بات کرنا ان کے احساس محرومی میں اضافہ کرتا تھا جو مختلف قصبوں کے تھانوں کے علاوہ کہیں نہیں گئے تھے اور سب تھانے اتنے ہی بیزار کن اور جہالت کدے ہیں کہ اس ماحول میں بیس پچیس سال گزارنے والا ان ملزموں کو خوش قسمت سمجھتا ہوگا جو چند دن حوالات میں یا چند ہفتے جیل میں کاٹ کے رہا ہوگئے۔

"بندہ دیکھ لیا ہے نا اچھی طرح؟" تھانیدار نے ٹیکسی کے اگلے دروازے سے خود کو سیٹ پر گرانے کے بعد کہا۔ "زیادہ بعد میں وقت نہ ضائع کرنا [illegible]" آخری جملہ [illegible] سواری یعنی ٹیکسی رکنے والے [illegible] کانسٹیبل سے کہا گیا تھا۔

"اوجی تھانیدار صاحب غلطی کیسے ہو سکتی ہے۔" چشم دید گواہ نے یقین کامل سے کہا۔ "اس بدمعاش نے تو کل رات اپنا بھی خانہ خراب کر دیا تھا۔ آپ تو دیکھئے ہیں جناب [illegible] چمکی [illegible]" پھر اس نے [illegible] کہ [illegible] کہاں مارا تھا اور ہاتھ کہاں [illegible]

جانب بیٹھے والے حوالدار نے فخر سے کہا کہ چودھری صاحب جتنی بات پوچھیں اتنا ہی جواب دیا جائے اور سکے کی طرح بھونکنے سے گریز کیا جائے۔ کانسٹیبل دم دبا کے بیٹھ گیا۔

"لو جی چودھری صاحب۔ اب اس کارکٹ والے سے جھگڑا شروع ہے۔" حوالدار نے مڑ کے پیچھے دیکھا۔

"او وئے یار خواجہ۔ کیا نام ہے اپنے اس منشی کا؟" تھانیدار نے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔ "اس کو سمجھا دو۔ [illegible] تمیز نہیں ہوگیا ہے۔ جیسی کوئی طریقہ ہوتا ہے بات کرنے کا۔ [illegible] پڑھ چکے سے [illegible] خراب ہوتی ہے۔" وہ عادتاً قاف کی جگہ کاف بولتا تھا چنانچہ طریقہ اس کے لہجے کے باعث "طریکا" سنائی دیتا تھا۔

خلاف توقع تھانے کی بجائے ٹیکسی [illegible] گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ اندر پولیس کی ایک جیپ، ایک ایمبولینس اور ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ دونوں گاڑیوں کے ڈرائیور باہر کھڑے گپ لگا رہے تھے۔ وہ [illegible] پولیس [illegible] کوٹھی کے دائیں بائیں جانب [illegible] اس رسمی کارروائی کو دیکھ رہے تھے جو ان کے لیے نئی نہ تھی۔ گیٹ سے گزرتے ہوئے میں نے ٹیلی فون کا وہ تار بھی دیکھ لیا تھا جو [illegible] گر گیا تھا۔ مجھے یہاں لانے کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ ابتدائی تفتیش جائے واردات پر ہی مکمل کی جائے اور وہاں میری موجودگی سے مزید ثبوت حاصل کیے جائیں۔ [illegible] میں بنے والے نقش پا بالکل واضح ہوگئے۔ شاید لان کے [illegible] ہو کے اندر جانے [illegible] میں نے کوٹھی کے صاف فرش پر بھی قدموں کے نشان چھوڑے ہوں گے۔ ان سے میرے جوتوں کا موازنہ ضروری ہوگا۔ فنگر پرنٹ تو میں نے اس خنجر کے دستے پر بھی چھوڑے تھے جو میں نے ایک صوفے سے کھینچا تھا اور [illegible] کا کیمرہ [illegible] استعمال کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جانے سے پہلے میں نے وہ خنجر خود ہی قالین پر پھینک دیا تھا۔ اس وقت میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میرے جانے کے بعد کوئی میر شرافت علی کو قتل کر دے گا اور حالات و واقعات، ثبوت اور گواہ سب مل کر قانون کی نظر میں مجھے مجرم بنا دیں گے۔

ڈرائنگ روم کی بجائے مجھے سامنے والے دروازے سے ایک ایسے کمرے میں لے جایا گیا جو مہمانوں کا بیڈ روم بھی تھا اور مقتول میر شرافت علی کا پرائیویٹ آفس بھی۔ دائیں جانب مسہری پر ایک شکن بھی نہ تھی مگر سیاہ فارمیکا والی سائڈ ٹیبل پر گرد کی تہہ تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مدت سے اس بیڈ کو کسی نے استعمال نہیں کیا۔ بائیں جانب کمرے میں ٹیک وڈ کی کرسی اور ٹیبل کی میز تھی جس کی سبز مخمل کی سطح پر [illegible] کا [illegible] رائٹنگ سیٹ موجود تھا۔ وسیع کمرے میں باتھ روم کا دروازہ تھا اور درمیان میں دیوار کے ساتھ [illegible] جیسے کپڑے کے کور اور قیمتی کپڑے کے گدوں والا صوفہ سیٹ تھا۔ درمیانی صوفے پر ایک جوان اور اسمارٹ آدمی ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی متانت سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ پولیس کی وردی کی بجائے اس نے دھاری دار قمیص اور خاکی کلر کی پتلون پہن رکھی تھی۔

ایس آئی چودھری نے جس کا نام اس کی وردی کی جیب پر حشمت خان لکھا ہوا تھا پتلون کو سنبھالا اور جوتوں کی ایڑیاں ملا کے سلیوٹ کیا۔ اس کے پیچھے آنے والے اور مجھے لے کر آنے والے حوالدار نے زیادہ آواز سے [illegible] مارا۔

"ملزم حاضر ہے جناب۔" ایس آئی حشمت نے کہا اور اسی وقت حوالدار نے مجھے دھکیل کر آگے کیا۔ صوفے پر بیٹھا ہوا شخص اسی اطمینان سے سگریٹ پیتا رہا اور مجھے دیکھتا رہا۔ بہت دیر بعد اس نے مجھ سے میرا نام پوچھا اور پھر خاموش ہوگیا۔

"میرا نام طارق جمیل ہے۔" اس نے بالآخر کہا۔ "اور میں اس علاقے کا اے ایس پی ہوں۔ اس قتل کی تحقیقات کے لیے مجھے خصوصی طور پر نامزد کیا گیا ہے۔"

"یہ [illegible] بڑے اطمینان کی بات ہے۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

"بلاوجہ انگریزی مت بولو۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم ہے تم کئی سال لندن میں رہ کے آئے ہو۔ یہ قتل کیوں کیا ہے تم نے؟"

"میں نے یہ قتل نہیں کیا ہے۔" میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "اور اس بیان کی صداقت [illegible] تمہیں [illegible] سکتی ہے۔"

"اس گھر میں [illegible] چشم دید گواہ نے بیان دیا ہے کہ تم نے رات کو زبردستی گھر میں گھس کے بہت توڑ پھوڑ کی۔ سب کو مارا پیٹا اور پھر میر شرافت علی کو قتل کر کے فرار ہوگئے۔" اے ایس پی نے کہا۔

"ان گواہوں نے مجھے توڑ پھوڑ کرتے یقیناً دیکھا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میں نے مار پیٹ بھی کی تھی لیکن ان میں سے کس نے کہا ہے کہ قتل بھی میں نے کیا تھا؟ کسی نے واقعی مجھے قتل کرتے اور فرار ہوتے دیکھا تھا یا ان کا خیال ہے کہ قاتل

www.paksociety.com

میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا؟"
"ان کے خیال میں قاتل تمہارے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔"
ایس پی نے کہا۔ "تمہارے خیال میں قاتل کون ہے؟"
"فی الحال میں کسی کا نام نہیں لے سکتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ کسی نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے جانے کے بعد قتل کر دیا۔"
"مگر یہاں آنے کا کسی کو علم تھا؟ قاتل اگر اس گھر کے نوکر نہیں تھے تو وہ ہوگا جو یہ بات جانتا تھا۔"
میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ "صرف دو افراد یہ بات جانتے تھے۔ ان میں سے ایک محسن رضا ہے جو لندن میں میرا کلاس فیلو تھا اور اسلام آباد میں ہے۔ اس کے والد مسٹر شیروانی ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔ محسن کو یہ بات میں نے کل رات بتائی تھی۔ وہ اڑ کے بھی یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کے پاس میں نے لندن سے واپسی پر قیام کیا تھا۔ مسٹر چراغ دین کا خانساماں سلامت شاہ۔ وہ میر شرافت علی کے نام سے بھی واقف نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ محسن کو اور سلامت شاہ کو میری گرفتاری کی اطلاع مل جائے۔ ان کے بیانات سے آپ کو بھی تفتیش میں مدد ملے گی اور مجھے بھی ان سے مشورہ کرنا ہے۔"
"ان کا پتہ لکھوا دو۔" ایس پی نے رک کے مجھے دیکھا۔ "وہ اگر مناسب سمجھیں گے تو بلا لیں گے۔ یہ بتاؤ۔ تمہارے والد کیا کرتے تھے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ بھی اسی چراغ دین کے ایک ملازم تھے۔" یہ سب معلومات وہ پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔
"بدقسمتی سے یہ بات ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ 'میر وزیر اینڈ کمپنی' میں میر شرافت علی کے پارٹنر تھے۔" ایس پی کے لیے یہ انکشاف تھا۔ "پارٹنر؟ بزنس پارٹنر؟"
"جی۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "کاروبار میرے والد مرحوم کا ہی تھا۔ میر شرافت علی بعد میں شامل ہوا تھا۔ مرتے وقت تک وہ برابر کے پارٹنر تھے۔"
"تو اس کوٹھی میں تمہارا باپ چپڑاسی کے کام پر کیوں ملازم تھے؟" ایس پی نے طنز آمیز بے یقینی سے کہا۔
"جب میں انگلینڈ گیا تھا۔ وہ ماڈل ٹاؤن کی کوٹھی میں رہتے تھے جو ان کی ذاتی ملکیت تھی۔ ان کے پاس کار تھی اور تمہارا کاروبار سب کچھ تھا جو انھوں نے مسلسل محنت سے ترقی کر کے حاصل کیا تھا۔ میں تحریری طور پر اپنے بیان میں سب کچھ بتاؤں گا کہ وہ کس زمانے میں کہاں رہتے تھے۔ ان کے پاس کون سی گاڑی تھی۔ ان کا ٹیلی فون نمبر کیا تھا اور اب کیا ہے۔ آپ دستاویزات سے بھی تصدیق کر سکتے ہیں اور ان لوگوں سے بھی جو میرے والد کو جانتے تھے۔ ان میں 'میر وزیر اینڈ کمپنی' کے پرانے ملازم بھی ہیں جو پچیس سال سے فرم میں ہیں۔"
ایس پی کی تیوریاں مجھے دیکھتی رہیں۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ میری بات کس حد تک قابل اعتبار ہے اور یہ سب سچ ہے تو کیسے سچ ہے۔ "تصدیق تو کرنی پڑے گی کہ ایک فرم کا مالک اس گھر میں ایسی نوکری کیوں کر رہا تھا۔" ایس پی نے کہا۔ "کیا فیلیر ہے۔ وہ کاروبار کوٹھی دو مہینے میں کیسے ختم ہو گئے؟ تم کہتے ہو وہ اب بھی پارٹنر تھے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ان کی سالانہ آمدنی کیا تھی؟"
"جی۔ ان کا اس سال کا منافع تمام اخراجات منہا کرنے کے بعد ساڑھے تین لاکھ بنتا تھا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "مگر کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس شخص کو گزر اوقات کے لیے گھر کی صفائی کا حقیر کام قبول کرنا پڑا۔ وہ بیماری میں خیراتی شفاخانوں سے علاج کراتا رہا۔"
"کیوں؟" ایس پی نے میز پر ہاتھ مارا۔ "کہاں گئے وہ ساڑھے تین لاکھ؟ وہ کاروبار کوٹھی؟" وہ اب مشتعل ہو رہا تھا اور اس کی جھنجلاہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے۔ "تو بتاتے ہو مجھے؟"
"اڑا دیا ہوگا عیاشی میں جناب عالی۔" سب انسپکٹر نے پھبتی کسی۔ "شوقین مزاج آدمی ہوگا۔ جوئے میں اڑا دیا ہوگا یا کسی رنڈی کے کوٹھے پر لٹا دیے ہوں گے۔"
"بکواس بند کرو۔" میں نے غصے کو ضبط کر کے کہا۔ "اگر میرے ہاتھ آزاد ہوتے اور یہ بات کسی دوسرے شخص نے کہی ہوتی تو میں ۔۔۔۔"
"تو میں اس کو بھی قتل کر دیتا۔ ہیں؟" تھانیدار نے میری بات کاٹ کے میرے منہ پر الٹا ہاتھ مارا۔ اس کے بھاری ہاتھ میں بلا کی قوت اور پھرتی تھی جو برسوں کی مشق اور تمرین کا نتیجہ تھی۔ نمکین ذائقہ مجھے اپنے ہونٹوں پر محسوس ہوا اور میں لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا ہی تھا کہ حوالدار نے مجھے آگے دھکا دے دیا۔ ایس پی یوں بیٹھا رہا جیسے اس نے کچھ نہیں دیکھا اور نہ کچھ سنا۔
"میرا باپ تمام عمر فیاض اور بردبار رہا۔" میں نے تھانیدار کو خون آشام نظروں سے گھور کے کہا۔ "اس کو جاننے والے سب زندہ ہیں اور میری بات کو جھوٹ یا مجھ پر الزام دینے سے پہلے ان سے پوچھ لو کہ وہ کیسا آدمی تھا۔ معلوم کرو اس نے ساڑھے تین لاکھ کی آمدنی کا انکم ٹیکس ادا کیا یا نہیں؟ اس کی کوٹھی کس نے خریدی ہے اور کار کس نے؟

کیا یہ سب ریکارڈ پر نہیں ہوگا۔ لاہور میونسپل کارپوریشن، انکم ٹیکس، موٹر وہیکل آفس اور پارٹنرشپ ڈیڈ۔ ان دستاویزات کو میرا وکیل عدالت کے سامنے بھی پیش کرے گا۔ بہت ممکن ہے انسپکٹر تم کسی لاوارث، جاہل اور غریب آدمی کے ساتھ جو سلوک کرتے ہو وہی میرے ساتھ بھی کر سکو گے۔ باپ کی موت کے بعد میں قانونی طور پر 'میر وزیر اینڈ کمپنی' کا مالک ہوں۔ واحد مالک۔ کیونکہ میر شرافت جو میرا پارٹنر تھا وہ اب نہیں ہے۔ میں انگلینڈ میں انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا اور کسی وظیفے پر نہیں۔ مجھے میرے والد نے اپنے خرچ پر بھیجا تھا۔ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ سمجھے؟ ایک معزز اور تعلیم یافتہ شہری ہوں۔"
ایس پی کی صورت پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔
"اس کی آواز کم کرو۔ اور اسے بتاؤ کہ یہ ولایت نہیں ہے۔" وہ سگریٹ کو مسل کر بجھاتے ہوئے بولا۔ سب انسپکٹر حشمت نے ادھر ادھر دیکھا اور باتھ روم کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ حوالدار نے مجھے یوں دھکیلا کہ میں منہ کے بل گرا۔
"آخر کیا ہے؟ تم تشدد سے اعتراف جرم کرانا چاہتے ہو؟" میں نے گھٹنوں کے بل اٹھ کے کہا۔ "تمہیں اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ عدالت میں اس بیان کی کوئی حیثیت نہیں۔" انسپکٹر حشمت اور حوالدار نے مجھے گھسیٹ لیا۔ ایک کانسٹیبل نے بڑی مستعدی سے باتھ روم کا دروازہ کھول دیا تھا۔
"ایس پی صاحب۔ آپ کی موجودگی میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے؟" میں نے چیخ کر کہا اور خود کو چھڑانے کے لیے حشمت کو اپنی قوت سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کے دیوار سے ٹکرایا۔ مشتعل حوالدار کو میں نے یوں کھینچ لیا جیسے انجن کسی بوگی کو کھینچتا ہے۔ بیک جھٹکے میں ہتھکڑی سمیت ایس پی کے سامنے تھا۔ "ابھی مجھ پر الزام ہے۔ میرا جرم ثابت نہیں ہوا۔ تم نے میرا بیان تک نہیں لیا ہے۔" میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ "میں تم پر کیس کروں گا۔ میں بڑے سے بڑا وکیل رکھ سکتا ہوں۔ مسٹر شیروانی میرے انکل ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔" لیکن اس سے زیادہ بولنے کی مجھے مہلت نہ ملی۔ حشمت نے مشتعل ہو کے مجھے پیچھے سے پکڑا اور حوالدار نے زنجیر کو جھٹکا دیا تو میں گرا۔ میرا سر بیڈ کے کنارے سے ٹکرایا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ مجھے مردہ کتے کی طرح گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ میرے جسم پر حوالدار کے سخت اور کرخت کنکری جیسے ہاتھ اور سب انسپکٹر حشمت کے گرز جیسے ہاتھ بھی مسلسل پڑ رہے تھے۔ باتھ روم کا دروازہ بند کر کے انھوں نے ہتھکڑی سے پیچھے بندھے ہوئے ہاتھوں کو پانی کے نل سے باندھ دیا۔ اس وقت میں ہوش میں آ چکا تھا اور اس ذلت آمیز سلوک پر غصے سے پاگل ہو کے پولیس کو ان سے بڑھ کر گالیاں اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا لیکن وہ اس کے عادی تھے اور میں بے بس تھا۔ حوالدار نے بڑی پھرتی سے کونے میں رکھی ہوئی ٹین کی بالٹی اٹھائی اور میرے سر پر ٹوپی کی طرح الٹی رکھ دی۔ میرا سر گردن تک بالٹی میں غائب ہو گیا۔ اب میرے چلانے کی آواز اسی بالٹی میں گونج رہی تھی اور میرے کانوں تک بھی یوں پہنچ رہی تھی کہ خود میں بھلے بھلے شور میں کسی لفظ کو واضح طور پر نہیں سن سکتا تھا اور وہ دو سن سکتے تھے۔
"کتے۔ ہمارے افسروں کے سامنے بھونکتا ہے ۔۔۔؟" انسپکٹر حشمت نے میرے پیٹ میں مکا مارا۔ میں درد کی شدت سے دوہرا ہو گیا۔ "دھمکی دیتا ہے کیس کرنے کی ۔۔۔" اس نے چند مغلظات کا اضافہ کیا اور تابڑ توڑ میرے پیٹ پر مکے مارنے لگے۔ اعلان کیا کہ وہ عدالت میں لے جائے بغیر میری قبر تھانے کے احاطے میں بنا سکتے ہیں جہاں فرش کے نیچے ان گنت مرحوموں کے ڈھانچے ہیں۔ آج تک کسی کو معلوم نہیں کہ پولیس کی حوالات سے فرار ہو کے وہ کہاں گئے۔ ابھی تک میرا حوصلہ برقرار تھا چنانچہ میں بالٹی کے اندر سے چیختا رہا کہ تم بھی پچھتاؤ گے اور تشدد کے الزام میں ان سب کو نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور ایک بے گناہ کو قتل کا مجرم بنانے کی اس غیر قانونی کوشش کا خمیازہ جیل جا کے بھگتنا پڑے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر حوالدار نے میری پتلون اتارنے کی کوشش کی اور میں نے اس کے ایک لات رسید کی۔ وہ طبلے کے فرش پر لڑھک گیا لیکن اس کے بعد میرے پاؤں بھی باندھ دیے گئے اور ان دونوں نے مل کر میرے کپڑے اتار دیے۔ میری ہمت جواب دینے لگی۔ اپنی حالت کے تصور نے مجھے خود اپنی نظر میں رسوا کر دیا۔ میں کوئی معروف قانون پرست شہری یا شریف آدمی نہیں تھا۔ پولیس کے لیے میں صرف ایک قاتل تھا اور کسی طرح بھی ایک بستری قیمتی بدمعاش کے ساتھ ہونے والے سلوک سے بہتر سلوک کا مستحق نہ تھا۔ اچانک بالٹی پر کسی ڈنڈے کی ضرب پڑی اور ٹین کی چادر دیوار ہی میں اس کا شور بم کے دھماکے سے زیادہ محسوس ہوا۔ میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے اور میرا دماغ سن ہو گیا۔ پھر دوسری بار بالٹی پر ڈنڈا پڑا اور اس کے بعد بالٹی کوٹنے کا عمل تیز ہو گیا۔ شور سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ "خدا کے لیے بس کرو۔" میں چلایا مگر اس شور میں میری

www.paksociety.com

آواز دب کے رہ گئی۔ میرے بائیں بالشت کی بجائے مجھے اپنے سر پہ
محسوس ہو رہی تھی اور میرے کان کے پردوں سے درد کی شدت
میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں دیوانہ وار چیخنے لگا اور اچھلنے لگا
مگر میرے ہاتھ بہت مضبوط زنجیر کے ساتھ لوہے کے کڑے سے
بندھے ہوئے تھے۔ اب میں ان کو خدا رسول کے واسطے دے رہا تھا۔
وعدہ کر رہا تھا کہ کوئی بدتمیزی نہیں کروں گا۔ ان کی ہر بات مانوں
گا اور کوئی دھمکی نہیں دوں گا لیکن وہ ایسا نہیں سن رہے تھے۔
مجھے یقین تھا کہ بہت جلد میرے دماغ کی کوئی رگ پھٹ جائے
گی اور وہ مجھے واقعی تھانے کے قبرستان میں کھونٹے گاڑ دیں گے۔ ابھی
ایک ریل کار میں جانے والے مسافروں کے سوا کسی کو میری گرفتاری
کا علم نہیں تھا۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے گواہ صرف چار افراد تھے۔
ایک اے ایس پی، ایک سب انسپکٹر، ایک حوالدار اور ایک
کانسٹیبل۔ محسن یا سلامت شاہ کو کچھ خبر نہیں۔ یہ سلسلہ وہ ختم
ختم گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا سارا جسم لرز رہا ہے اور میں اپنے
پیروں پہ سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا۔ میں نیچے گر گیا تھا لیکن زنجیر
سے بندھے ہوئے ہاتھوں کے باعث فرش پر نہیں لیٹا تھا
بلکہ سر جھکائے رکوع کی حالت میں جھول رہا تھا۔ اعصاب پر شدید
کا کنٹرول ختم ہو جانے کے باعث میرے لبوں سے ٹوٹے پھوٹے
مبہم الفاظ رک رک کر یوں نکل رہے تھے جیسے میری زبان پر فالج
کا اثر ہے۔ جب بالٹی میرے سر پہ سے ہٹائی گئی تو مجھے دنیا
کو پہچاننے میں بڑی دقت پیش آئی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میرا
سر کدھر ہے اور میرے پیر کدھر ہیں۔ فرش نیچے ہے یا
اوپر اور چھت بار بار نیچے آ رہی ہے یا فرش اوپر اٹھ رہا ہے۔
حوالدار نے مجھے دوبارہ کھینچ کے بٹھانے تک میرے ہاتھ پیر جواب
دے چکے تھے۔ آہستہ آہستہ میرے حواس بحال ہونے لگے اور
میں سہارے سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ سب انسپکٹر حشمت خان
کچھ دور کھڑا مونچھوں کو بل دے رہا تھا اور حسب عادت پتلون
کی بیلٹ سنبھالنے میں لگا ہوا تھا۔ حوالدار نے میرے ہاتھوں
کو بالٹی کے کڑے سے بندھی ہوئی زنجیر کھول کے آزاد کیا مگر کرسی کے
پیچھے ہتھکڑی سے باندھے رکھا۔

"کیوں شہزادے؟" سب انسپکٹر حشمت خان نے کہا۔ "آواز
کچھ کم ہوئی؟ سمجھ آگئی ہے کہ یہ ولایت نہیں ہے؟" میرے
بشمول تمام افراد میں سے اب یہ دو ہاتھ روم کا دروازہ کھول کے
مجھے باہر لے آئے۔ اے ایس پی بدستور اسی پوز میں بیٹھا سگریٹ
کے کش لگا رہا تھا اور تازہ اخبار دیکھ رہا تھا۔ بند کمرے کے
دروازے کے باہر پولیس کے کسی آدمی یا میر شرافت علی کے ان
تین نوکروں کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا جو سب کے سب
تھمتاں میں شامل تھے چنانچہ میری فریاد و فغاں بے اثر رہی تھی۔

"یس مسٹر سکندر بخت" اے ایس پی نے متانت سے آمیز
خوش دلی سے کہا۔ "کیا حال ہے اب؟ ولایت کا نشہ کچھ اترا؟"

"آئی... آئی ایم... سو... سوری... سر" میں نے
لڑکھڑاتی زبان سے الفاظ کے ٹکڑوں کو جوڑ کر سخت کوشش
کے بعد جملہ مکمل کیا۔ سب انسپکٹر حشمت خان نے اپنی کارکردگی
پر تعریف طلب نظروں سے اپنے افسر اعلیٰ کو دیکھا اور حوالدار
خفیف سا مسکرایا۔

"دیٹس رائٹ۔ بیٹھ جاؤ" اس نے کھڑکی کی میز کے ساتھ
پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں کرسی پہ گر پڑا اور لمبے
لمبے سانس لینے لگا۔ کسی نے ہاتھ بڑھا کے پانی کا ایک گلاس
میرے لبوں سے لگا دیا۔ میں نے شکر گزار ہو کے آدھا پانی پیا اور
آدھا گرا دیا مگر اس سے میری حالت میں نمایاں تبدیلی آئی۔ میری
آنکھیں اس منظر کو واضح طور پہ دیکھنے لگیں جو پس منظر میں تھا۔
میرے کان بہتر طور پر کام کرنے لگے... اور سمجھنے لگے۔ میرے ذہن نے
صورت حال کی سنگینی کو قبول کرنا شروع کیا اور مجھ پر یہ حقیقت
روشن کی طرح عیاں ہونے لگی کہ اب برطانوی پولیس کی
تحویل میں نہیں ہوں اور یہاں کا قانون جو کتابوں میں لکھا ہے
مجھے کوئی تحفظ فراہم نہیں کر سکتا کیونکہ ہم قانونی طور پر جب بھی
آزاد نہیں اور دھن دھاندلی یا دھونس کے تحت قانون کی بے بسی
کا آج بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ قانون تو آدمی خود اپنے آپ پر نافذ
کر سکتا ہے۔ قانون تو اپنا ضمیر ہے اور جو اپنے ضمیر کی آواز کا احترام
نہیں کر سکتا وہ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے جائز
اور ناجائز سب طریقے اختیار کر سکتا ہے۔ میں اذیت رسانی
کے ان چھپا کے طریقوں سے واقف تھا جو کسی میڈیکل رپورٹ سے
ثابت نہیں کیے جا سکتے۔

"مسٹر سکندر بخت۔ کیا تم کسی عدالت میں ثابت کر سکتے
ہو کہ ہم نے تم پر تشدد کیا ہے؟" اے ایس پی نے کہا۔

میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ انہوں نے ابھی صرف
ڈیمونسٹریشن کیا تھا تاکہ میں قائل ہو جاؤں۔ وہ اس سے
کہیں زیادہ کرنے کے اہل تھے۔ "ویری گڈ۔ تم بہت جلد بات
سمجھ لیتے ہو" اے ایس پی نے کہا۔ "اب ایک اور بات سمجھنے کی
کوشش کرو۔ بیان میں ملازموں نے یہ بیان دیا ہے کہ تم تیمار داری کی
عدم موجودگی میں دیوار پھلانگ کر آئے اور اندر آئے۔ تمہارے
فٹ پرنٹ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ اندر آکے تم پہلے بیڈ
میر شرافت علی کے بیڈ روم میں گئے اور پھر اس کے ساتھ ڈرائنگ
روم میں گئے تو وہاں تم نے بہت سے نوادرات کو تباہ کیا، شور سن

کو آنے والے دو خادموں کو مارا۔ اس وقت تمہارے ہاتھ میں
ایک خنجر تھا جس سے تم نے متعدد تصاویر پھاڑ دیں اور پھر اسی
خنجر کے وار سے میر شرافت علی کو قتل کر کے نکل گئے۔ میر شرافت
علی نے مرنے سے پہلے پولیس کو ٹیلی فون کیا تھا بتایا تھا کہ ایک
شخص جس کا نام سکندر بخت ولد عزیز خان ہے اچانک لندن سے
آ گیا اور اس نے کوٹھی میں گھس کے بہت ہنگامہ کیا۔ لاکھوں کے
نوادرات کا نقصان کیا۔ اس نے گھر کے دو ملازموں کو بھی بہت
مارا جو شور سن کے جان بچانے آئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک
خنجر تھا اور اس پہ خون سوار تھا۔ اس نے جاتے جاتے قتل کی دھمکی
بھی دی تھی۔ میر شرافت علی نے اس اندیشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ
سکندر بخت گیا نہیں ہے بلکہ ممکن ہے وہ کوٹھی کے آس پاس
کہیں نا کہیں چھپا ہوا ہو۔ تھانے سے اسے کہا گیا تھا کہ وہ باضابطہ
رپورٹ لکھوائے تو مزید کارروائی کی جا سکتی ہے اور شرافت علی
نے کہا تھا کہ پہلے وہ ملازمین کے لیے ڈاکٹر کو طلب کرے گا اور پھر
خود تھانے آ کے رپورٹ لکھوائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی
فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور رپورٹ لکھنے والے کا خیال ہے کہ
اس نے کچھ چیخنے چلانے یا کراہنے کی آوازیں سنی تھیں جو غالباً
ریسیور کے لٹکے رہ جانے سے سنائی دی ہوں گی۔ رات کے ڈھائی
بجے سب انسپکٹر حشمت خان گشت سے واپس آیا تو یہ بات اسے
بتائی گئی اور وہ سوا تین بجے جائے واردات پر پہنچا تو ایک
ملازم کو ہوش میں آنے لگا تھا مگر شرافت علی کی لاش خون میں
لت پت شکستہ اور تباہ شدہ سامان کے درمیان پڑی تھی۔ لاش
پر خنجر کے پچیس زخم تھے اور خنجر دل کے مقام پہ پیوست تھا۔ خوش
قسمتی سے تھانے کے محرر کو شرافت علی نے یہ بتا دیا تھا کہ تم کہاں
مقیم ہو اور اس نے پتہ نوٹ کر لیا تھا۔ حشمت بیگ اس پتے پہ
پہنچا تو معلوم ہوا کہ تم چند منٹ پہلے ریلوے اسٹیشن جا چکے ہو۔
تم چاہو تو سول اسپتال جا کے لاش کو دیکھ سکتے ہو۔"

بجلی کی طرح میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے شرافت
علی کو کب بتایا تھا کہ میں سلامت شاہ کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔

"جناب والا" میں نے اپنی زبان کی لکنت پہ قابو پانے
کی کوشش کرتے ہوئے کہا "لاش کو چھوڑیے۔ کیا مجھے ایک
بات پوچھنے کی اجازت ہے؟" اے ایس پی نے سر ہلایا "آئی
ڈونٹ مائنڈ۔"

"میر شرافت علی کا پیغام کس نے وصول کیا تھا؟ اور کتنے
بجے؟" میرا لہجہ کمزور تھا مگر ایک غیر متوقع بات نے مجھے نیا حوصلہ
عطا کر دیا تھا۔ "نائٹ ڈیوٹی پہ موجود ایک محرر نے" اے ایس پی
نے کہا "رات کے ایک بجے۔ قتل غالباً ایک اور ڈیڑھ بجے کے
درمیان ہوا۔"

"کیا وہ محرر میر شرافت علی کی آواز پہچانتا تھا؟" میں
نے کہا "اور اس نے چیخنے کراہنے کی جو آوازیں سنیں وہ
شرافت علی ہی کی تھیں؟"

"نادان شخص" اے ایس پی نے کہا "کیا اس نے غلط
سنا تھا؟"

"یس سر... اس نے بالکل غلط سنا تھا۔ رات نو بجے سے
پہلے جب میں اس گھر کے اندر داخل ہوا تھا تو میں نے باہر
کی دیوار کے اوپر سے آنے والا ٹیلی فون کا تار توڑ دیا تھا۔ میر
شرافت علی یہاں سے فون کر ہی نہیں سکتا تھا" میں نے کہا۔
اے ایس پی کی صورت کا تاثر یک لخت بدل گیا۔ وہ
کچھ دیر میری صورت کو گھورتا رہا اور کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس
نے سب انسپکٹر حشمت کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ "حشمت
خان۔ کیا ٹیلی فون کی لائن ڈیڈ ہوئی ہے؟"

"میں چیک کرتا ہوں جناب" حشمت خان نے پتلون
سنبھالی اور پلٹ کر کہا "حوالدار۔ جا کے دیکھو۔" حوالدار
اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی جا چکا تھا۔

"ٹیلی فون کرنے والا میر شرافت علی نہیں تھا سر" میں
نے کہا "یہ قتل کرنے کے بعد قاتل نے کسی اور جگہ سے فون
کیا۔ اور آپ کے محرر کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا ہے
کہ وہ شرافت علی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے تو شرافت علی کو
نہیں بتایا تھا کہ میں کہاں مقیم ہوں۔"

"اگر شرافت علی زندہ ہوتا تو ہم تصدیق کر لیتے" اے ایس
پی نے طنز اور تمسخر سے کہا۔

"ایک آخری سوال جناب" میں نے کہا "قتل کی واردات
تو ایک بجے کے بعد ہوئی ہے۔ چوکیدار کا کیا بیان ہے؟
انہوں نے مجھے کس وقت آتے جاتے دیکھا تھا؟"

"انہیں وقت کا اندازہ نہیں" اے ایس پی نے کہا۔
"وہ تمہارے آنے کے کچھ دیر بعد سو گئے تھے اور پھر شور سے
جاگے تھے۔"

"وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ چوکیدار بتا سکتا ہے کہ جب
میں گیا تھا تو وہ عشا کی نماز پڑھ کے آیا ہی تھا" میں نے
کہا "اس وقت نو بھی نہیں بجے تھے۔ اسی نے مجھے سلام
بھی کیا تھا۔"

دس منٹ بعد صورت حال خاصی بدل چکی تھی۔ چوکیدار
نے تصدیق کر دی تھی کہ میں نو بجے کے قریب کوٹھی کے گیٹ سے
باہر گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بات کرتے بھی

www.paksociety.com

دیکھی تھی لیکن میں اس ٹیکسی میں بیٹھا نہیں تھا۔ سب انسپکٹر کے سوال پر اس نے تسلیم کیا کہ میرے یہودی بچے کو کوٹھی میں کسی اور سمت سے کود جانے کے امکانات کو بعید از قیاس نہیں کہا جا سکتا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرا اصلاحیہ گیٹ سے باہر جانا اور ٹیکسی ڈرائیور سے بات کرنا محض ڈرامہ ہو۔ تاہم حوالات کی رپورٹ نے اسے ایس پی کو مزید الجھن میں ڈال دیا۔ ٹیلی فون کی لائن ایک ایسی جگہ سے کوئی گئی تھی کہ تار کا وہ حصہ جو کوٹھی کے اندر سلاخوں سے اور درختوں میں سے گزرتا تھا اب بھی سلامت نظر آتا تھا اس کو کسی درخت کی شاخ نے گرنے نہیں دیا تھا۔ نسبتاً چھوٹا حصہ دیوار کے باہر بیلوں کے ساتھ لٹکا ہوا تھا جیسے نقش قدم دیکھنے والوں کو دیوار کے اوپر تار کی عدم موجودگی کا احساس نہیں ہو سکا تھا اور چونکہ کسی نے بعد میں ٹیلی فون بھی استعمال نہیں کیا تھا اس لیے اب تک یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی۔ ایس پی نے اس کے باوجود یقین نہیں کیا کہ ٹیلی فون لائن نو بجے سے پہلے کٹ چکی تھی۔ اگر میرا مجرم پھر کے دوبارہ کوٹھی میں داخل ہو جانا ممکن تھا تو کیا یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ جیسے ہی میر شرافت علی پولیس کو فون کر کے فارغ ہوا میں نے اسے قتل کر دیا اور جاتے جاتے ٹیلی فون کا تار کاٹ گیا۔ "قتل تم نے اس وقت کیا جب تم پہلے سے اندر آ چکے تھے۔" وہ بولا۔

"میں نے بحث نہیں ہاری۔" ابھی ایک گواہ باقی ہے مسز چراغ دین کا خانساماں۔ سلامت شاہ۔ وہ آپ کو بتا سکتا ہے کہ میں کس وقت اس کے کوارٹر میں پہنچا تھا۔ ہم نے کھانا ایک ساتھ کھایا تھا۔"

"یہ سب تو بعد میں ہوتا رہے گا۔" ایس پی نے کہا۔ "فی الحال ہمارے پاس تمہیں گرفتار رکھنے کی معقول وجہ ہے۔ میرا گواہوں کے بیانات کے علاوہ خود تمہارے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر شرافت علی کے مر جانے سے تم پورے کاروبار کے مالک بن گئے ہو۔ اگر وہ زندہ رہتا تو تم بے روزگار ہو جاتے۔ تم خود اعتراف کر چکے ہو کہ تم نے توڑ پھوڑ اور مار پیٹ کی۔"

"اس کی وجہ کچھ اور ہے جناب۔ میں میر شرافت علی کو سزا دینا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس نے میرے والد کو بلیک میل کیا تھا اور ان سے وہ سب کچھ چھین لیا تھا جس کے وہ مالک تھے۔ کار، کوٹھی، ساڑھے تین لاکھ کا منافع۔"

"اچھا؟ مگر بلیک میلر تو ہمیشہ مجرم ہوتے ہیں۔" ایس پی نے کہا۔ "خواہ یہ جرم کسی نے دانستہ کیا ہو یا اس سے نادانستگی میں سرزد ہوا ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میر شرافت علی نے تمہارے والد کو کیوں بلیک میل کیا تھا؟"

میں نے سخت حیرت سے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ اور ایسی بہت سی باتیں ابھی مجھے معلوم نہیں۔ جن کا میرے پاس ثبوت تک نہیں ہے۔"

"جب تفتیش ہو گی تو سب معلوم ہو جائے گا۔" سب انسپکٹر حشمت خاں نے موقع پا کے یہ بھی کہا اور ابھی ایک مرتبہ گھور دیا۔

"مجھے اپنا بیان ریکارڈ کرانا ہے۔" میں نے کہا۔ "تفتیش کرنے والے افسر کی حیثیت سے آپ کے لیے یہ بیان بہت اہم ہو گا کیونکہ بہت سے واقعات جن کا تعلق اس واردات کے پس منظر سے ہے میں نے ابھی بیان نہیں کیے۔"

"آل رائٹ۔ مگر یہ بیان میں کل ریکارڈ کروں گا۔" ایس پی نے گھڑی پر نگاہ ڈال کے کہا۔ "ابھی مجھے ڈی آئی جی صاحب کو رپورٹ دینی ہے۔ اور اخبار والوں کے سوالات کا جواب دینا ہے۔ وہ یقیناً اب تک پہنچ چکے ہوں گے۔ میر شرافت علی مشہور آدمی تھا۔ ایک بار پھر میں تم سے پوچھوں گا کیا تم نے میر شرافت علی کو قتل کیا ہے؟ اگر تم اعتراف کر لو گے تو خود بھی پریشانی سے بچ جاؤ گے اور ہمیں بھی بچا لو گے۔"

"میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "میں اسے سزا دینا چاہتا تھا اور مجھے یہ خیال بار بار آیا تھا کہ اسے قتل کرا دوں مگر میں نے اسے بخش دیا تھا۔ یہ کسی اور نے مجھے مجرم بنانے کی سازش کی ہے۔ اعتراف جرم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ایس پی جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ میں نے کہا۔ "جناب عالی ایس پی صاحب۔ میرے والدین اور بہن بھائی تو ہیں نہیں۔ یہاں جو کچھ ہیں مسز شیروانی ہیں اور سلامت شاہ ہے۔ میں چاہتا ہوں ان کو اطلاع دے دی جائے۔"

"مسز شیروانی؟ وہی ڈپٹی سیکرٹری۔" جاتے جاتے ایس پی رک گیا۔ "اچھا کوئی فون نمبر ہے تو سب انسپکٹر حشمت خاں کو دے دو۔" وہ چلتے چلتے حشمت خاں سے مخاطب ہوا۔ "کل سلامت شاہ کو بلا کے اس کا بیان بھی لے لو۔ اور ملازم کو مقتول کی لاش دکھاؤ۔ اس کے فنگر پرنٹ وغیرہ فائل میں رکھو۔ ہو سکتا ہے آلہ قتل کے بارے میں فنگر پرنٹ رپورٹ کل مل جائے۔ سائٹ پلان بالکل مکمل ہونا چاہیے۔ جائے واردات پر موجود ہر چیز کا بیان تفصیل سے ہو۔" تقریباً دس منٹ تک تفتیش کے دیگر امور سے متعلق ہدایات دیتا رہا اور پھر باہر نکل گیا۔

جب آدھے گھنٹے بعد میں پولیس کی جیپ میں بیٹھ رہا تھا تو گیٹ پر ایک فوٹوگرافر نے میری تصویر اتار دی۔ میں نے

تصور سے اگلے دن کے اخبار کی ایک ایک سنسنی خیز سرخی دیکھی "میر شرافت علی کا قاتل گرفتار کر لیا گیا۔"

"خود شرافت علی کا قاتل فرم کے ایک پارٹنر کا بیٹا ہے۔"

"چیئرمین سے ملزم کی دو رنگی گرفتاری۔ فرم پر قبضہ کرنے کے لیے مرحوم باپ کے پارٹنر کو قتل کرنے والا لندن سے آیا تھا۔" چشم تصور سے میں نے خبر کے ساتھ شائع ہونے والی تصویر دیکھ کر فرزانہ کو چونکتے اور خبر پڑھ کے لاش کی طرح سفید پڑتے دیکھا۔ وہ کسی خیالی کی طرح ڈولتی اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ دروازہ بند کر کے وہ بستر پر اوندھی گر گئی اور وہ منہ میں تکیہ ٹھونس کر زار و قطار رونے لگی۔ میں نے محسن کی ماں کو بھی دیکھا جس نے بیٹی کی حالت میں اس تشویشناک تغیر کو دیکھ کر اخبار اٹھا لیا تھا اور اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے قتل کی اس لرزہ خیز واردات کی تفصیلات پڑھ رہی تھی۔ میں نے محسن کے پاپا کا چہرہ بھی دیکھا۔ وہ سخت متفکر تھے اور سگار لبوں میں دبائے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اپنی اسلام آباد والی کوٹھی کے لان میں کچھ سوچ رہے تھے کہ اب وہ کیا کریں۔ میں ان دونوں میاں بیوی کے خیالات کا بھی اندازہ کر سکتا تھا۔ کل تک ان کی بیٹی انگلینڈ میں زیر تعلیم ایک انجینئر سے منسوب تھی اور ان کے لیے بڑے فخر کی بات تھی کہ ہونے والا داماد اپنی انجینئرنگ فرم کا مالک ہو گا کیونکہ وہ باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ آج ان کی بیٹی ایک مبینہ قاتل کی منگیتر بن گئی تھی۔ چونکہ یہ کتنا قبل از وقت تھا لیکن انہیں دنیا کو بہر حال منہ دکھانا تھا۔ جس میں حاسد زیادہ ہیں اور خیر خواہ کم ہیں جو خوشی میں دل کی کدورت پر مسکراہٹ کی روشنی چھاپ ڈال کے شریک ہوتے ہیں تو دکھ میں دل کی مسرت پر غم زدہ چہرہ سجا کے ہمدردی کرنے آ جاتے ہیں۔ "مسٹر شیروانی۔ میں نے سنا ہے۔ اوہ آف کورس یہ سب غلط ہو گا۔ آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ یہ تو قانونی معاملات ہیں اور یہاں تو سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کرنا کوئی مشکل نہیں۔ بس ذرا دباؤ پڑنا چاہیے یا سفارش کا۔ پولیس سب کچھ کر لیتی ہے۔ گواہ منحرف ہو جاتے ہیں۔ شہادت بے بنیاد ثابت ہوتی ہے اور جانے کیا تضاد نکل آتا ہے۔ وکیل اچھا ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے وہ عدالت میں اچھی شہرت ہو۔ اور سپریم کورٹ تک جا سکے۔ بے شک وہ اب لڑکے کو کیا کہیے گا مگر یہ مجھے نا مناسب آپ کی لڑکی کے مستقبل کا ہے۔ بات وہی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ نہیں نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں جانتا ہوں آپ نے بچی سے اس کی منگنی بغیر سوچے سمجھے نہیں کی ہو گی۔ ماشاء اللہ

انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گیا ہوا تھا۔ سنا ہے باپ بھی فیکٹری کا مالک ہے؟ نہیں بھائی ماں باپ کوئی نہیں؟ بچارہ واقعی آپ کی خوش قسمتی ہے ورنہ آج کل اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں۔ لڑکی راج کرے گی۔ ایک طرح سے گھر داماد ہی ہو گا۔ ابھی نہیں۔ یہ میرا خیال نہیں ... وہ مرحوم ڈیپارٹمنٹ کے شیخ صاحب ہیں نا۔ اچھا بھی کم ظرف آدمی ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کا رشتہ مانگا تھا نا؟ وہی کہتا پھرتا ہے کہ شیروانی صاحب کی تو لاٹری نکل آئی ہے۔ ہمارے ڈاکٹر بیٹے میں کیا خرابی تھی۔ مگر ایک طرف صنعت کار ہو تو ڈاکٹر کو کون پوچھتا ہے اور سچ پوچھیے تو شیروانی صاحب یہ سب مقدر کے کھیل ہیں۔ اس نے اپنے بیٹے کا جہاں رشتہ کیا وہ بھی صنعت کار کی بیٹی ہے۔ فیصل آباد کی ٹیکسٹائل مل کے مالک ہیں۔ وہ تو بہت خوش ہو گا۔ آدمی ہی ... یہ مجبوری ہے۔ مبینہ قاتل آپ کے مرحوم دوست کا بیٹا ہے اور بچپن کی منگنی ہے؟ اور یہ سب لوگ جو ایک ہی قبیل کے کم ظرف اور تنگ نظر لوگ ہیں۔ بے خبر لوگ اور متعصب اور پست ذہنیت رکھنے والے لوگ جو رشتوں کو دولت کے پیمانوں سے پرکھتے ہیں۔ ظاہر کو باطن سے بہتر سمجھنے والے یہ ریاکار اور منافق لوگ جو اخلاق کے دوہرے معیار پر یقین رکھتے ہیں۔ ایک وہ جو ان کی اپنی زندگی کے لیے ہے۔ دوسرا وہ جس پر باقی سب کو پورا اترنا چاہیے۔ ان کو بھلا کیا معلوم کہ محبت ہمارے معصوم دلوں کی زمین سے پھوٹنے والی کونپل تھی جسے ہم نے برسوں زمانے کی ہوا سے بچا کے رکھا اور اس کی آبیاری کر کے اپنی زندگی بنا لیا۔ یہ تقاضا تھا ہمارے خلوص کی اجلی دھوپ میں پروان چڑھا۔ اسے ہمارے ارمانوں کی مہکار نے سینچا اور ہم نے اس کے گرد خوابوں کا وہ حصار قائم کیا جس پر ہمیں زندگی کے آخری سانس کی رفاقت تک بھروسہ ہے۔ ایک روشن مستقبل اور پرامید مستقبل کی ضمانت اسی میں تھی۔ اپنے بچوں کے لیے۔ پھر ان کے بچوں کے لیے۔ دو بچپن کے دوستوں نے یہ منگنی طے کرتے وقت سوچا ہو گا کہ وہ دوستی کے رشتے کو ایک انشورنس پالیسی دے رہے ہیں۔ جو پندرہ بیس سال بعد ان کی خوشیوں کو دو چند کر دے گی لیکن انھوں نے اس جذباتی فیصلے کے منفی پہلوؤں پر بھی غور کیا ہو گا۔ آنے والے دن کا کیا بھروسہ۔ لڑکا نالائق نکلے۔ لڑکی نافرمان ہو۔ دونوں اس صدی کی پیداوار ہیں۔ آج ایک صدی پہلے کے دقیانوسی طریقے پر ہونے والی منگنی کو تسلیم کریں۔ آخر کیا بھی سکتا ہے آپ نے میں ... ہم کوئی جذباتی تھے کہ آپ نے ہم سے پوچھے بغیر یہ سودا کر لیا۔ آپ اپنی دوستی کو اپنی ذات تک محدود رکھتے اور اپنے جذبات ہم پر مسلط نہ کرتے

www.paksociety.com

"زندگی قربان نہ کرنے تو اچھا تھا۔" یہ سب باتیں اس دور میں بعید از امکان تو تھیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ جذبات کے شعلوں کا وہ تعلق جو بچپن کی سی فوزیہ کے ساتھ تھا۔ عہد شباب میں محبت کا وہ لازوال خزانہ بن گیا تھا جسے میں اپنی خوش نصیبی کا انعام سمجھتا تھا۔ وہ تعلق مٹی کا نہیں اب ایک تناور درخت تھی جسے بڑے سے بڑا طوفان نہیں جھکا سکتا تھا۔ اس محبت نے مخالفت اور مخاصمت کے اتنے صبر آزما دور دیکھے تھے کہ اب میری آزمائش بے معنی تھی۔ لیکن شیروانی صاحب جو اعلیٰ افسر ہیں، عزت دار ہیں اور زمانے کے نشیب و فراز دیکھ چکے ہیں، مگر کیا وہ اس آزمائش میں پورے اتریں گے جب کہ انہیں اپنے فیصلے پر ناز تھا۔ اپنی قوت فیصلہ پر غرور تھا اور اپنی دور اندیشی کا ذکر وہ یوں کرتے تھے جیسے انہیں غیب کا علم تھا۔ ان کی بیوی کو اس سے بڑی مایوسی ہوئی تھی کیوں کہ ان کے بھائی کا لڑکا جو پروفیسر تھا، قسم کھا چکا تھا کہ اس کی شادی فوزیہ سے نہ ہوئی تو وہ تمام عمر شادی نہیں کرے گا اور اس شادی کا کوئی امکان اس لیے نہ تھا کہ میں اور فوزیہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ بلکہ والد ایک دوسرے کے تمام عمر کے رفیق تھے۔ فوزیہ کو مجھ سے بہتر شوہر اور مجھے فوزیہ سے بہتر شریک حیات نہیں مل سکتی تھی۔ مگر میں کسی طرح بھی معیار پر پورا نہ اترتا۔ بالفرض محال میں اعلیٰ تعلیم یافتہ، دولت مند، اکلوتا لڑکا اور دنیا کے نقطہ نظر سے بہترین شوہر اور سعادت مند ہوتا تو محسن ایک بھائی پر بھی وہ مجھے مسترد کر کے فوزیہ کا ہاتھ اپنے مرحوم بھائی کے بیٹے ایاز کے ہاتھ میں دینا پسند کرتیں جس کو فوزیہ سے محبت بھی تھی۔ بس وہ تنخواہ دار کم آمدنی والا شخص تھا مگر یہ خامی ایسی تھی کہ قابل درگزر نہ ہو۔ پروفیسر کی تنخواہ معقول ہوتی ہے اور تنخواہ دار تو شیروانی صاحب بھی تھے بلکہ جب ان کی شادی ہوئی تھی تو وہ درجہ دوم کے اکاؤنٹ آفیسر تھے۔ میرے لیے ایک بڑا نکتہ یہ شیروانی صاحب کی بیگم کا خیال تھا۔ کیا اب وہ موقعے سے فائدہ نہیں اٹھائیں گی۔ شیروانی صاحب کو قائل نہیں کر سکیں گی کہ چھوڑو بچپن کی منگنی کا احمقانہ خیال۔ اس کو تو پھانسی ہونی ہی ہے۔ ہماری بیٹی کیوں سولی چڑھے۔ کل پرسوں تک یہ دولہا بنتا اور منحوس قرار مغضوب ٹھہرا۔ پہلے ولایت چلا گیا۔ اب آیا تو قتل کے الزام میں پکڑا گیا۔ یہ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔ یہ مقدمہ نہ جانے کتنے سال چلے اور انجام پھانسی نہ ہوا، عمر قید تو ہو گی۔ کیا اس وقت تک فوزیہ بیٹھی رہے گی؟ آج تو ایاز بھی کہتا ہے کہ عمر بھر شادی نہیں کروں گا مگر آدمی کے جذبات ہمیشہ ایک نہیں رہتے۔ سال دو سال بعد وہ بھول گیا یہ بات اور اس نے فوزیہ کا خیال چھوڑ دیا تو رشتہ نہیں ملے گا۔ سب کہیں گے لڑکی منحوس ہے۔ شادی سے پہلے ہی منگیتر کو پھانسی کروا دی۔ جس گھر پر اپنا نحس سایہ ڈالے گی وہاں قبرستان بنائے گی۔ عورتوں کی زبان اور عورتوں کی منطق اور ان کی باتیں۔ کیا شیروانی صاحب ان دلائل کا مقابلہ کر لیں گے؟ مصلحت کے تقاضوں کو جذباتی رشتے پر قربان کر دیں گے؟ حقیقت سے نظریں چرا کے ایک موہوم سی امید کا دامن تھامے بیٹھے رہیں گے؟ زمانے کی ہرزہ سرائی اور انگشت نمائی سے بے نیاز نہیں ہو جائیں گے؟ میں نے محسوس کیا کہ زمین میرے قدموں کے نیچے ایک خلا میں تبدیل ہو گئی ہے اور میں اس سنسان، تاریک اور لامحدود خلا میں گرتا جا رہا ہوں۔ میرا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہیں اور میری مدد کی پکار بے صدا ہو گئی ہے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ تھانے جاتے ہوئے میں اپنے انجام کے بارے میں نہیں، اپنی محبت کے انجام کے بارے میں سوچ سوچ کر خوف زدہ ہو رہا تھا۔

ہم تھانے پہنچے تو سب انسپکٹر حشمت خاں کے رویے میں ایک خوش گوار تبدیلی رونما ہوئی جس کا اثر دوسروں کے رویے پر بھی پڑا۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی کیونکہ میر شرافت علی کے گھر پر جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا، تھانے میں اس سے کہیں زیادہ ہو سکتا تھا۔ تھانہ چودھری حشمت خاں کی سلطنت تھی جہاں اس کا حکم قانون تھا اور تھانے میں آنے والے خراج گزار رعیت تھے جو اس کی مخالفت اور دبدبے کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ میر شرافت علی کے گھر میں ایک افسر اعلیٰ کے سامنے وہ مکمل طور پر بااختیار نہ تھا مگر اس کے باوجود حشمت نے مجھ پر چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ مجھے امید تھی کہ اپنی تمام سرکشی، گستاخی اور خوش فہمی کی اصل سزا مجھے تھانے کی حدود کے اندر اور قانون کی دسترس سے باہر ہو جانے کے بعد ملے گی۔ لیکن گاڑی سے اترنے کے بعد تھانے دار نے نرمی سے چلنے کے لیے مجھ سے کہا۔

"آیئے حوالدار صاحب۔ ذرا ان کو ادھر لاؤ۔ کیا نام ہے جناب کا۔ اپنے سکندر صاحب کو۔" اور وہ سیدھا چلتا ہوا تھانے کے ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ حوالدار نے زنجیر کھینچ کر مجھے تصورات کی اور غیر موجود اندیشوں کی دنیا سے حقائق کی زمین پر لا کھڑا کیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے گاڑی سے نکلا تو مجھے تھانے کی آسیب زدہ ہیبت ناک اور خستہ حال عمارت نظر آئی۔ پولیس اسٹیشن میں نے لندن میں بھی دیکھے تھے جہاں لوگ مدد کے لیے پورے اعتماد کے ساتھ آتے تھے۔ یہ سوچ کے قدم نہیں رکتے تھے کہ یہ جواب

بھلا کب ہو گا۔ بچے ہوا دلانے لینے کے لیے نہ پڑھائیں وہاں پہنچ جاتے تھے کہ آفیسر! میری گیند بچا لیں، بہت گم ہو گئی ہے اور میرا ہاتھ اوپر تک نہیں پہنچتا، کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟ عام طرح عورتیں آتی تھیں کہ آفیسر مجھے اچانک جانا پڑ رہا ہے۔ میری عدم موجودگی میں ڈرائی کلینر کپڑے لائے گا وہ لے کر رکھ لینا۔ میں واپسی میں لے لوں گی۔۔۔۔ رات کو مجھے ایک میٹنگ کے لیے باہر جانا ہے۔" ان سپاہیوں کا تصور یہاں کتنا افسانوی اور مبالغہ آمیز لگتا تھا۔

تھانے کی سیڑھیوں کے پاس ایک کانسٹیبل دقیانوسی رائفل کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے مجھے قطعی لفٹ نہیں دی۔ برآمدے میں دائیں جانب بیٹھے ہوئے محرر اور ایک اے ایس آئی نے دو زیر حراست قیدیوں کو مرغا بنا رکھا تھا اور ان کے پھٹے ہوئے کپڑے اور پریشان بال گواہی دیتے تھے کہ ان سے تفتیش کی گئی ہے۔ بنچ پر بیٹھے ہوئے تین افراد نے جو خود بھی سہمے ہوئے تھے اور شکایت کنندہ معلوم ہوتے تھے مجھے قابل رحم نظروں سے دیکھا۔ یہی لوگ جو عام زندگی میں ہر چور، ڈاکو اور بدمعاش کے دشمن تھے تھانے میں ان کی حالت دیکھتے تو ان پر ترس کھاتے تھے اور ان کے ہمدرد بن جاتے تھے۔ حوالات کی سلاخوں کے پیچھے دو افراد گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔ ایک مزے سے سگریٹ پی رہا تھا اور دوسرا فرش پر یوں پڑا تھا جیسے مر چکا ہو۔ بہت جلد مجھے بھی انہی کے ذیل میں پہنچنا تھا اور آج کی رات اپنے پریشان کن خیالات کی تنہائی میں بسر کرنی تھی۔ حوالدار نے چین اٹھائی اور میرے ساتھ اندر قدم رکھا۔ نیم تاریک کمرے میں بھدی سی میز کی دوسری طرف سب انسپکٹر کا بھاری بھرکم وجود ایک چرچراتی کرسی میں پھنس چکا تھا۔ حوالدار نے سامنے کی دو کرسیوں میں سے ایک اپنے لیے منتخب کی اور دوسری پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تسلی سے بیٹھو اپنے سکندر صاحب۔" حشمت خاں نے ٹوپی اتار کے میز پر رکھی۔ "اب تھانے تو پہنچ ہی گئے ہیں۔ ہوتی رہے گی تفتیش بھی۔ یہ بتاؤ کچھ کھایا پیا ہے؟ صبح سے یہ وقت ہو گیا۔"

"ہاں جی۔ دھکے کھائے ہیں۔۔۔ خالص مار کھائی ہے اور گالیاں کھائی ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "اور بھی مقدر میں جو ہے وہ مقدر سے ملے گا۔" میں اتنا کند ذہن نہیں ہوں کہ ان کی بات نہ سمجھ پاتا۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ بتاؤ کیا کھلا پلا سکتے ہو؟

"بات کو سمجھنے کی کوشش کریں سکندر صاحب۔" حشمت خاں نے برا مانے بغیر کہا۔ "اپنے افسر اعلیٰ کے سامنے ہم بھی مجبور ہوتے ہیں ورنہ ہمارا دل تو نہیں چاہتا کہ کسی شریف آدمی کی بے عزتی خراب کریں۔ اب اپنے حوالدار صاحب۔ یہ بیچارے تو ایس پی صاحب ہیں نا۔ کتنے سخت آدمی ہیں۔ اونچی بات بھی نہیں سنتے۔ کیا کہا تھا آپ نے انھوں نے؟ کوئی گالی تو نہیں دی تھی۔ مگر ان کا پارا چڑھ گیا۔ ہم تو اشارہ سمجھتے ہیں ان کی نظر کا۔ ماتحت جو ہوئے۔"

"ہاں چودھری صاحب۔ نوکری تو کرنی ہے جی۔ بیوی بچوں کی خاطر۔" حوالدار نے ایک سرد آہ بھری۔

"چلو جی ابھی جاؤ۔ اپنے سکندر صاحب کے لیے چائے وائے کا انتظام کرو۔ بھئی یہ بڑے آدمی ہیں ولایت سے آئے ہیں اور بے چارے یہاں آتے ہی مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔"

تھانیدار کا لہجہ ناقابل یقین حد تک دوستانہ ہو گیا تھا اور میں اس کا سبب سمجھ رہا تھا۔ "کیا نام بتایا تھا جی آپ نے۔ کس کمپنی کے مالک ہیں آپ؟"

"میرو زیرا اینڈ کمپنی۔ لیتھ مشین، ہینڈ پریس اور ڈرل مشین وغیرہ کا کارخانہ ہے۔" میں نے لہجے میں وقار پیدا کیا۔

"اچھا اچھا۔" اس نے یوں سر ہلایا جیسے سمجھ گیا ہو۔ "چلیے حوالدار صاحب۔ اوئے یار! ان کے ہاتھ تو کھول دو۔ یہ کیا کس چلے ہیں۔"

بات صرف اعتبار کی نہیں تھی۔ میں پس کے بھی بھاگ کے جا ہی نہیں سکتا تھا۔ میری راہ میں متعدد رکاوٹیں تھیں۔ خود حشمت خاں کے پاس ریوالور تھا۔ جسے وہ ضرورت پڑنے پر بلا تردد استعمال کر سکتا تھا اور ایک سپاہی باہر بھی مسلح کھڑا تھا۔ حشمت خاں نے ایک قاتل کو فرار کے مواقع فراہم کر کے معطل ہونے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ اس نے حفاظتی انتظامات کو کافی سمجھتے ہوئے مجھے یہ رعایت اس لیے دی تھی کہ اب مجھ سے سودا کیا جا سکتا تھا۔ تھانے میں کوئی تکلیف اٹھائے بغیر زیر تفتیش رہنے کا معاوضہ وصول کیا جا سکتا تھا اور بہتر رویے کی قیمت مانگی جا سکتی تھی۔ ان کے نقطہ نظر سے میں موقع آیا تھا۔ سونے کا انڈا دینے والی مرغی۔ جتنا نچوڑو یا جان بھی خوش رہیں گے "راضی ہے صیاد بھی" والے مقولے پر عمل ہو رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد میں ہوٹل سے بہترین کھانا منگوا کے کھا چکا تھا اور کھلا چکا تھا جو حوالدار سائیکل پر جا کے لایا تھا۔ اور اس قدر احساس تھا کہ اسیری کی مجبوری نہ ہوتی تو میں بھوکا رہنے کو ترجیح دیتا مگر میں نے سوچا کہ دوبارہ نہ جانے

www.paksociety.com

کب موقع ملے۔ زندہ لوٹ جانا ہی ہے اور تفتیش کا سامنا بھی کرنا ہے۔ ذہن کے ساتھ جسم کی توانائی بھی برقرار رہنی چاہیے۔ میں نے پچاس روپے کا بل ادا کرتے ہوئے سوچا کہ یہ کھانا "لارڈز" یا شیزان سے تو نہیں آیا تھا؟ پھر مجھے خیال آگیا کہ تھانے میں ہر چیز کی قیمت میں سو دو سو یا ہزار فیصد تک "رعایتی سرچارج" بھی تو شامل ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے بریف کیس میں سے سو سو کے پانچ نوٹ ایک لفافے میں ڈال کے سب انسپکٹر حشمت خان کو اور ایسے ہی دو نوٹ حوالدار کو پیش کیے کہ آپ نے آج جو کارنامہ سرانجام دیا ہے اور میرا جو حشر کیا ہے اس کی خوشی میں یہ حقیر نذرانہ بچوں کی مٹھائی کے لیے حاضر ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ اس کے بعد میں نے اطمینان سے تھانے کے فون پر پہلے محسن سے بات کی۔

"کبیر داس!" محسن نے کہا۔ "خبیث میں تیرے انتظار میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔"

"دیکھ محسن۔ میں صبح ریل کار سے پنڈی جانے کے لیے روانہ ہونے والا تھا مگر ایک آفت میں پڑ گیا۔" میں نے تمہید کے طور پر کہا۔

"آفت؟ پھر کوئی آفت آگئی۔ ؟"

"ہاں محسن۔ مجھے ریل کار میں پولیس نے گرفتار کر لیا۔"

"گرفتار کر لیا؟" وہ چلایا۔ "وہ کیوں؟ کس الزام میں؟"

"مجھ پر الزام ہے کہ میں نے میر شرافت علی کو قتل کر دیا ہے۔" میں نے سکون سے کہا۔

"سکندر۔ خدا کی قسم مجھے کچھ ہو گیا ہے میرے کان غلط سننے لگے ہیں۔ دیکھ یہ مذاق ہے تو۔۔۔۔"

"محسن میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں اس وقت پولیس کی تحویل میں اور زیر تفتیش ہوں۔"

"اوہ۔ اور سکندر۔" محسن نے بہت دیر بعد کہا۔ جبکہ میں سمجھ رہا تھا کہ لائن کٹ گئی۔ "تو نے یہ قتل کیا ہے؟"

"نہیں۔ میں نے یہ قتل نہیں کیا۔ میں اس سے ملنے ضرور گیا تھا اور میں نے اس کے دو ہاتھ بھی رسید کیے تھے۔ بالکل معمولی سے ہاتھ جن سے اس کے خراش تک نہیں آئی تھی اور جب میں رخصت ہوا تھا تو وہ سو فیصد زندہ اور تندرست و توانا تھا۔ یہ حرکت کسی نے بعد میں کی اور مجھے پھنسا دیا۔ تو سارے حالات سے باخبر ہے۔ مجھے یہ دہرا چکر لگتا ہے میں تفصیل سے فون پر نہیں بتا سکتا۔ مجھے تیری مدد کی ضرورت بھی ہے اس لیے تو فوراً آجا۔ تیرا زخم ٹھیک ہے نا۔ چلنے پھرنے میں کوئی خرابی تو نہیں ہوگی؟" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ وہ سب ٹھیک ہے۔ سکندر اس وقت ساڑھے نو بجے ہیں۔ اگر میں پانچ بجے والی بس یا ویگن پکڑ لوں تو رات بارہ بجے لاہور پہنچ کے تجھ سے مل سکتا ہوں۔" محسن نے کہا اور میں نے اسے متعلقہ تھانے کا نام پتہ لکھوا دیا۔ "اچھا سکندر۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اگر تو بے گناہ ہے تو کوئی تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ ہم اوپر تک جا سکتے ہیں۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ تک جھوٹ سچ سامنے آجاتا ہے اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہو سکتی۔ بس ذرا صبر و تحمل سے حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔"

"صبر و تحمل کے علاوہ مقابلے کے لیے مال و وسائل بھی ضروری ہونے چاہئیں۔" میں نے کہا۔ "نیچے سے اوپر تک قدم قدم پر پیسہ چلتا ہے۔ جتنا بڑا وکیل ہوگا اتنی بڑی فیس لے گا۔ ابھی تو اپنی پوزیشن یہ ہے کہ تقریباً پانچ ہزار میں نکال لوں گا۔ کچھ زیور ہے وہ بیچ دوں گا۔ وراثت کا سرٹیفکیٹ ملنے کے بعد "میر فرنیچر ہاؤس" "کمپنی" میری ہوگی اور میں اس کے اکاؤنٹ میں سے جتنا پیسہ چاہوں گا نکلوا لوں گا لیکن سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے ہائی کورٹ میں اتنا خرچ رقم دینی ہوگی اور وقت بھی چار لگے گا۔"

"ان سب باتوں کو چھوڑ۔ بعد میں سوچیں گے۔ ابھی تو بینک بند ہیں مگر میں چیک کیش کرا کے ادھار لے سکتا ہوں۔ میرے حساب میں تقریباً چودہ ہزار جمع ہوں گے۔ میں پندرہ ہزار لے کر آؤں گا۔" محسن نے کہا۔ "صبح میں سارے معاملات کو سنبھال لوں گا۔ تجھے شاید علم نہیں۔ وہیں لاہور میں میرے دو کلاس فیلو بڑے اچھے وکیل ہیں۔ ایک تو لڑکی تھی ہمارے ساتھ رابعہ۔ اب رابعہ قادری ہے۔ دوسرا وہ ہمارا ہی پڑوسی تھا مسعود میاں منور اور صدیقی تو وہ مشہور ہے۔ یاد آیا اس قتل سے ان سے بات کریں گے تو امید ہے فیس وغیرہ کا مسئلہ بھی نہیں بنے گا۔ دنیا کا خون سفید ہو گیا ہے مگر دوستی کا تا ابھی زندہ ہے۔"

"محسن میں لمبی بات نہیں کر سکتا۔ یہ بتا۔۔۔ فوزیہ تو نہیں ہے اس کے پاس؟"

"فوزیہ؟" محسن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "نہیں۔ کیوں کیا ہے اس سے؟"

"نہیں۔۔۔ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ جو کہنا ہے تو خود کہ کے سامنے بتانا ہے کہ میں بے گناہ ہوں اور یہ بھی بتانا ہے کہ ساتھ کیا چکر ہے۔ کل وہ اخبار میں میری تصویر اور خبر دیکھ کر صدمے سے زیادہ صدمہ ہوگا۔ تو آج ہی اسے سمجھا دے اور یقین دلا دے کہ میں نے واقعی کچھ نہیں کیا ہے۔"

"الو کے پٹھے۔ میرے یقین دلانے یا نہ دلانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر ساری دنیا ایک جرأت ہو کے کہے کہ تو نے قتل کیا ہے تب بھی وہ نہیں مانے گی۔ ان لڑکیوں کی عقل ایسی ہی ہوتی ہے۔ خیر میں اسے بتا دوں گا۔" محسن نے کہا۔

"بتا دینا کافی نہیں۔ اسے اعتماد اور حوصلے سے کام لینے کی تاکید کرنا۔ اس کی دعا ہر دوا سے زیادہ کارگر ہوگی۔"

محسن ہنسا۔ "اچھا تو یہ بات ہے۔ یہ بھی سنا دوں گا اسے بھول جا سکندر یہ جو کچھ ہوا۔ غلط اور بے بنیاد ہی سہی۔ اچھا نہیں ہوا۔"

"تو اپنی لمبی کی بات کر رہا ہے؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "کہ اب وہ کیا کریں گی۔"

"ہاں۔ بات میرے دل میں بھی تھی اور تو نے سمجھ لی؟" محسن نے حیرانی سے کہا۔ "میں واقعی سوچ رہا ہوں کہ اب وہ کیا کریں گی۔"

"یہ میں نے بھی سوچا تھا۔ مگر مجھے فوزیہ پہ۔ تجھ پر اور میرے پاپا پر اعتماد ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی اس فکر میں مبتلا ہونے سے کچھ حاصل بھی نہیں ہوگا۔ تو اپنے پاپا سے بات کر سا اور ان سے کہہ کہ وہ اپنے تعلقات اور اثر و رسوخ کو کام میں لائیں۔ کم سے کم بیان تفتیش میں کسی کا رویہ مخالفانہ نہ ہو اور میرے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔ تو جانتا ہے ثبوت و شہادت کے مرحلے کیسے سر ہوتے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ وہ میں کر لوں گا۔" محسن نے کہا۔ "اب باقی باتیں ملاقات پر۔ اور کچھ تو نہیں کہنا ہے نا؟"

"نہیں۔ تجھ سے بات ہو گئی۔ آدھا مسئلہ حل ہو گیا۔ تو آجائے گا تو میں اکیلا نہیں رہوں گا ورنہ یہاں کون ہے میرا۔ خدا حافظ۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"آپ نے تو سو روپے کی ٹرنک کال کر لی سکندر صاحب۔" تھانیدار حشمت خان نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے کہا۔ وہ اب تک میری گفتگو کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہا تھا۔ میں نے فوراً سو کا ایک نوٹ شکریے کے ساتھ آگے بڑھا دیا اور دوسرا نمبر ملانے لگا۔

"ہیلو۔" کسی نے تیسری گھنٹی بجنے کے بعد ریسیور اٹھایا۔

"میں سنگین ہوں۔" چراغ دین مری سے واپس آگیا تھا۔

"مسٹر سنگین!" میں نے محتاط ہو کے کہا۔ "آپ کے بنگلے میں ایک خانساماں ہے سلامت شاہ۔ مجھے اس سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"کون ہو تم؟" چراغ دین نے کہا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"میں؟ میرا نام ہے کبیر۔" میں نے سوچ کر کہا۔ اس امید میں کہ شاید میرے والد نے اپنی داستان حیات کے اوراق سے اقتباسات سناتے ہوئے سلامت شاہ کو یہ بھی بتا دیا ہو کہ میرے چچا کا نام کبیر تھا۔ "میں اس کا بھتیجا ہوں۔"

"اپنا نمبر بتاؤ۔ وہ بات کر لے گا۔" چراغ دین نے کہا۔ "بازار گیا ہوا ہے۔ آئے گا تو میں بتا دوں گا۔"

سلامت شاہ کا فون آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد آیا۔ اس نے کبیر کو پوچھا اور حشمت خان نے ریسیور مجھے تھما دیا۔

"سکندر بخت۔" اس نے کہا۔ "تم تو اسلام آباد گئے تھے مگر صبح پولیس تمہیں پوچھتی ہوئی آئی تھی۔ تمہارے جانے کے بعد ہی۔ کیا۔۔۔۔"

"ہاں چاچا۔" میں نے کہا۔ "میری بدقسمتی ہے کہ جا نہیں سکا۔ اس وقت تھانے میں بند ہوں۔ تم یہ نمبر لکھ لو اور فوراً آجاؤ۔ کوئی ایسا بہانہ کرو کہ چراغ دین کو شبہ نہ ہو۔ یہاں آؤ گے تو سب بتا دوں گا۔ اور ہاں اپنے ساتھ وہ چابیاں لیتے آنا۔ وہی جن کے بارے میں پہلے میں نے کہا تھا کہ ابھی اپنے پاس رکھو۔ ہاں۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"حاجی تو آج دوہری ڈیوٹی ہو گئی ہے۔" سب انسپکٹر حشمت نے منہ پھاڑ کے جمائی لی۔ "آدھے دن وخت پڑ گیا ہے۔ اس بنگلے کا۔ میری جگہ میر محمد کو آنا تھا مگر نہیں آیا۔ کہیں اس کو پتا؟ او یار حوالدار۔ اور دیکھو میاں میر محمد صاحب کیوں نہیں آئے؟ آج کون مر گیا سجان کا۔ یا مالک ماشے کا ماما۔" اس کی پکار پر ایک نئے حوالدار نے جی اچھا کے جیسا نکالا اور غائب ہو گیا۔

"بس جی آپ کی قسمت اچھی ہے کہ ہم بیٹھے ہیں۔" حشمت خان نے کہا۔ "میر محمد ہوتا تو آپ کو کب کا اندر کر چکا ہوتا اور مار بیٹھا۔ ہے۔" اس نے ایک فحش گالی سے میر صاحب کا تعارف مکمل کیا۔ "وہ اپنے باپ کو بھی نہ چھوڑے۔ یہ جو آپ کا دوست آرہا ہے نا اپنے اسلام آباد سے۔ اس کو بھی ٹرک دیتا۔ اور تمہارا چاچا سلامت شاہ کرتا بھی۔ اس کا تو کام ہی یہ ہے کہ پہلے سب کو ٹرک دو۔ جو سامنے آئے بند کر دو۔ بعد میں چھوڑنے والے کیا کیا لیں گے۔ زیادہ سے زیادہ چھڑا کے لے جائیں گے۔ تو ایسے میں یہ ہے کہ پہلے سب کو ٹرک دو۔ آزادی کی قیمت دیں گے تو لے جائیں گے۔ منہ کو حرام لگ گیا ہے اس کے سکندر صاحب۔ اللہ معاف کرے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو چھوا۔

سلامت شاہ پندرہ منٹ بعد پہنچا۔ سلامت شاہ کا سرخ چہرہ زرد تھا۔ اس وقت تک میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے بھی تھک چکا تھا۔

www.paksociety.com

سلامت شاہ نے ڈرتے ڈرتے تھانیدار کو دیکھا اور سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ "مائی باپ! اسے کیوں پکڑ لیا ہے آپ نے؟" اس کی صورت رُلا دینے والی ہو رہی تھی۔

"تو یہ ہے تمہارا چاچا سلامت شاہ؟" تھانیدار نے سلامت شاہ کو بغور دیکھا۔ "اسی نے تو ہمیں بتایا تھا کہ تم ریلوے اسٹیشن گئے ہوئے ہو۔"

میں نے سلامت شاہ کو مختصر طور پر سب کچھ بتا دیا جو میرے نقطۂ نظر سے اس پر اپنی گرفتاری کے اسباب واضح کرنے کے لیے ضروری تھا۔ تقریباً یہی باتیں میں نے ٹیلی فون پر محسن سے بھی کی تھیں۔ انداز میں کوئی بات تھانیدار کے لیے نئی نہ تھی چنانچہ وہ بیزار ہو رہا تھا۔ چند منٹ بعد جب اسے یقین آ گیا کہ میں ایک معمولی حوالاتی کے ساتھ مل کر فرار ہونے کا کوئی منصوبہ نہیں بنا رہا ہوں تو اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر میرے ہاتھوں کو پھر مقفل کیا اور کہا کہ ایس ایچ او صاحب تو کیا ہے کسی وقت بھی آ جائیں۔

"ایس ایچ او کون ہے؟" میں نے رضاکارانہ طور پر ہاتھ آگے بڑھا کے کہا۔

"آج کل تو دھامل میں میر محمد بنا ہوا ہے۔" وہ ہتھکڑی کا قفل لگا کے مطمئن ہو گیا۔ "اصل ایس ایچ او کو لائن حاضر کر دیا گیا تھا۔"

"لائن حاضر؟" میں نے اس اطلاع سے بے خبری کے باعث کہا۔ "یعنی معطل؟ کیا غلطی ہوئی تھی ان سے؟"

"غلطی تو کوئی نہیں ہوئی تھی۔ تفتیش کے دوران ایک بندہ مر گیا تھا۔ وہ تھا بھی اتنا کمزور اور بیمار۔ اخبار والوں نے کیس خراب کر دیا۔" اس نے ٹوپی اٹھا کے سر پر جمائی۔ پھر اونچا حوالدار سے کہا کہ باہر بیٹھ کے حرام خوری کرنے کی بجائے اندر آ کے بیٹھے اور خود باہر نکل گیا۔

میں نے چند منٹ کے اس وقفے سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ "وہ چابیاں لائے ہو؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

سلامت شاہ نے اقرار میں سر ہلایا اور جیب سے چابیاں برآمد کیں۔ "تم اپنے پاس رکھو گے؟"

"سب نہیں۔" میں نے کہا اور صرف لاکر کی چابیاں اٹھا کے اپنی پینٹ کی سامنے والی خفیہ جیب میں رکھ لیں۔ اسی وقت حوالدار اندر آ گیا اور سب انسپکٹر حشمت خان کی کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ نیا آدمی تھا اور اسے کوئی شناسا نہیں ملا تھا چنانچہ اس کا انداز بہت جارحانہ تھا۔

"یہ چابیاں تم اپنے ہی پاس رکھو۔" میں نے کہا۔ "اس میں صندوق کی چابیاں ہیں نا۔ کل صبح تم صندوق میں سے سارا زیور نکال کے بیچ دو اور رقم اپنے پاس رکھو۔"

"کیسا زیور؟" حوالدار نے کہا۔ "مال مسروقہ تو نہیں جسے ٹھکانے لگا رہے ہو؟"

"زیور میری ماں کا ہے اور اسے میری دادی نے جہیز میں دیا تھا۔ وہ دونوں فوت ہو چکی ہیں۔" میں نے سکون سے کہا۔ "ورنہ معلوم ہو جاتا۔"

اسی وقت حشمت خان جیسے ٹہلتا ہوا اندر آیا۔ اس نے اپنی کرسی کو ایک غلیظ گالی دی اور ٹوپی اٹھا کے میز پر دے ماری۔

"چلو بس کرو۔" وہ گرج کے بولا۔ "چل بڈھے! دفع ہو۔ بہت باتیں کر لیں۔ اور کل صبح تھانے حاضر ہو جانا۔ ابھی ایس پی صاحب کے سامنے بیان ہوگا۔ آ جائے گا یا ڈولی لاؤں اسی وقت؟"

"آؤں گا کیوں نہیں مائی باپ! آنکھ کھلتے ہی سیدھا آ جاؤں گا۔" سلامت شاہ نے عاجزی سے کہا۔ وہ پولیس والوں کے عتاب سے محفوظ رہنے کا گر جانتا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی اس کے آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ ناشتہ وغیرہ بنا کے پھر زیور فروخت کرنا تھا چنانچہ وہ دس گیارہ بجے سے پہلے حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔ تھانیدار نے کہا کہ وہ سات بجے یہاں آ جائے اور ایک بار پھر اسے دفع ہو جانے کا حکم دیا۔

"کیا بات ہے تھانیدار صاحب؟" میں نے اس کی واپسی اور بوکھلاہٹ دیکھ کے کہا۔

"تمہارا باپ ایس ایچ او آ رہا ہے۔" اس نے غرا کے کہا۔ "اٹھو اوئے بدمعاش ادھر سے۔ چل حوالات میں بند کر دیتے ہیں۔" اس نے حوالدار کو مخاطب کر کے کہا۔ خلوت میں تھانے کی بدولت حاصل ہونے والی مراعات کا وقت ختم ہو گیا تھا اور اب میں سکندر صاحب سے ملزم بن گیا تھا۔ سلامت شاہ نے مجھے خدا حافظ کہا اور بڑی بے بسی میں روانہ ہو گیا۔ تھانیدار اسے بند کر دیتا تو کام خراب ہو جاتا۔

"تھانیدار صاحب! میرا یہ بریف کیس۔۔۔" میں نے کہا۔ "یہ کس کی تحویل میں رہے گا؟"

"اسے امانت خانے میں رکھوا دیتے ہیں۔" اس نے بریف کیس کو دلچسپی سے دیکھا جس میں سے اس کے سامنے میں نے پانچ جمع دو پورے سات سو کے نوٹ نکالے تھے اور اب بھی کم سے کم دس گنا مالیت کے نوٹ ایک گڈی کی صورت میں موجود تھے۔

"اس میں چار ہزار تین سو روپے ہیں۔ میرا پاسپورٹ ہے۔" میں نے کہا۔

"فکر مت کرو۔ کوئی چیز ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتی۔ یہ تھانہ ہے، مخول نہیں۔" وہ مونچھ پر ہاتھ پھیر کے بولا اور پھر حوالدار پر بگڑ گیا۔ "چل تو کیا منہ دیکھ رہا ہے۔ ابھی وہ میر محمد آ گیا تو سب کا خانہ خراب کرے گا۔"

چند منٹ بعد میں حوالات کی آہنی سلاخوں کے پیچھے تھا اور فرش خاک پر آلتی پالتی مارے یوں بیٹھا تھا جیسے لندن میں اپنے فلیٹ کے قالین پر دوستوں کے ساتھ مل کر تاش کی بازی جمانے کے لیے بیٹھتا تھا۔ میری جیب میں چالیس پچاس روپے تھے اور سگریٹ کا آدھے سے زیادہ پیکٹ تھا۔ میں نے سگریٹ جلانے کا ارادہ کیا اور ترک کر دیا۔ کون جانے میر محمد کو یہ بھی ناگوار گزرے۔ اصولاً سگریٹوں کا پیکٹ بھی سرکار ضبط کرے تو رقم بھی ساتھ جائے۔ رات گزارنے کا یہ سہارا بھی نہ ہے اور رات کے کھانے کا بل تو شاید ادا ہو جائے۔ مگر ایک پیکٹ سگریٹ کا منگوانا پڑے گا۔ اور وہ بھی رات کے وقت تو شاید میں کاٹ دوں۔ مجھے بریف کیس میں سے مزید رقم نکلوانی پڑے گی۔ یکلخت مجھے احساس ہوا کہ بریف کیس پولیس کی تحویل میں چھوڑ کے میں نے عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ کم سے کم نوٹوں کی وہ گڈی مجھے اپنی جیب میں رکھ لینی چاہیے تھی مگر اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

سب انسپکٹر میر محمد جو قائم مقام ایس ایچ او بھی تھا، حشمت خان کے مقابلے میں جوان آدمی تھا چنانچہ مجھے حشمت خان کی معاندانہ گفتگو اور جھنجھلاہٹ کی شکایت کا سبب معلوم ہو گیا۔ میر محمد بہت مضبوط قد اور کاٹھی کا جیالا وصفت آدمی تھا جس کی صورت سے کمینگی جھلکتی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا کے خلاف بغض، حسد اور عداوت کے جذبات سے اس کی آنکھوں میں نفرت کا ایک جوالا مکھی بھڑک رہا ہے جس کے تاریک سایوں نے اس کے چہرے کو مسخ کر دیا ہے۔ اس نے حوالات میں موجود سب لوگوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ سرسری نگاہ سے مجھے کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر اس کمرے میں گھس گیا جس پر ایس ایچ او کی تختی لگی ہوئی تھی۔ چند منٹ بعد میں نے حشمت خان کو ٹوپی جمائے اور بیلٹ کستے اسی کمرے میں جاتے دیکھا اور سمجھ گیا کہ میر محمد اب میرے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔ پھر آدھے گھنٹے تک میں گرد و پیش کا مشاہدہ کرتا رہا۔ وہ دونوں زیر تفتیش ملزم جو غائب ہو گئے تھے اب اندر ڈھکیل دیے گئے تھے۔ دنگا فساد اور مارپیٹ کے مقدمات میں ملوث ہونے والوں کے دو گروہ اجتماعی طور پر ایک سو سات ستر کے تحت رپورٹ لکھوا کے زیر دفعہ ایک سو اکیاون بند ہوئے تھے۔ مدعی اور مدعا علیہ میں کوئی فرق نہ رہا اور میں اس نظام انصاف کا معترف و قائل ہوا جس میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ کا پانی پیتے ہیں۔ بعض حالات میں بیٹھے ہوئے ڈرم کا پانی پی رہے تھے۔ دو افراد ایک سو نو میں آوارہ گردی کے ملزم بن کر مہمان سرکار ہوئے اور رات ہونے تک اس حوالات میں جملہ حاضرین کی تعداد میرے تک تنگ ہو گئی۔ تھانے پہنچتے ہی میں نے جس شخص کو مردے کی طرح پڑا دیکھا تھا وہ چوری کے شبے میں تین دن سے زیر تفتیش تھا۔ جو حضرات گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے سٹہ کھیلتے پکڑے گئے تھے اور وہ جو مزے سے سگریٹ پی رہا تھا بینک ڈکیتی کی ایک واردات میں ملوث تھا۔ سنگین ترین جرم یعنی قتل کا اعزاز میرے ہی حصے میں آیا تھا اور جب میں نے دوسری سگریٹ سلگائی تو بینک ڈکیتی کے ملزم نے مجھ سے دوستانہ مراسم استوار کرتے ہوئے ایک سگریٹ مانگا۔ مجھ سے پوچھا کہ مجھ پر کیا الزام ہے اور قتل کی بات سن کے متاثر ہوا۔ تاہم مذہب نے گنہگاری پر اس نے کہا کہ یہ تو سب کو کتا پڑتا ہے مگر جو کچھ لکن۔۔۔ کو کھلوانا ہوتا ہے۔ اس نے اسم صفت کے طور پر پولیس کے لیے اپنی لغت سے ایک نئی گالی کا استعمال کیا۔ وہ یہ کھلوا لیتے ہیں اور اگر آدمی سادے کاغذ پر انگوٹھا لگا دے تو بڑی بچت ہو جاتی ہے۔ اس نے مجھے بہت سے مفید مشورے بھی دیے جو اس کے تجربات کا ماحصل تھے اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے اپنا بریف کیس چار ہزار تین سو روپے سمیت پولیس کے امانت خانے میں رکھوا دیا ہے تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔

"اوئے مجھے شہنشاہو! یہاں سالم بندا جیسے کی طرح غائب ہو جاتا ہے، تمہارا بریف کیس کیا ہے۔ اوئے کھوتے۔۔۔ وہ چار ہزار تو اپنے سامنے میر کو دیتا تو تیری مشکل آسان ہو جاتی۔ تو آج رات تفتیش سے بچ جاتا۔" وہ پھر قہقہے لگانے لگا۔

"تو کیا وہ امانت خانے میں محفوظ نہیں رہے گا؟" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

"کیسا امانت خانہ، کہاں کا امانت خانہ۔ وہ دونوں۔۔۔ کے خصم آپس میں بانٹ لیں گے۔" وہ بولا۔ "سات سو حوالدار کے، باقی تھانیدار کے۔ تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ تو کوئی بریف کیس لایا تھا اور لایا تھا تو اس میں رقم بھی تھی؟"

www.paksociety.com

میرے اندیشے بہت جلد درست ثابت ہو گئے تھے۔

"کیا یہاں رات کو بھی تفتیش ہوتی ہے؟" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔

ڈکیتی کا ملزم پھر ہنسا۔ "کہاں سے آ رہا ہے تو؟ پاگل ہے یا پھر تو ولایت سے آیا ہے۔ تفتیش رات کو نہیں تو کیا دن میں ہوگی سب کے سامنے؟"

اس گرگ باراں دیدہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ حشمت خاں کے جانے کے بعد میر ایک گھنٹے بیٹھا ضابطے کی کارروائی میں مصروف رہا۔ پھر اس نے کہا کہ وہ گشت پر جا رہا ہے اور ایک گھنٹے کے بعد آئے گا۔ ایس پی یا ڈی ایس پی صاحب کا فون آئے تو انہیں بتا دیا جائے کہ ڈکیتی کے باقی ملزموں کے بارے میں ایک مخبر کی اطلاع پر گئے ہیں۔ آٹھ بجے کے قریب حوالاتیوں کا کھانا آیا جسے کسی نے کھانا قبول نہیں کیا۔ بیشتر لوگوں نے گھر سے آئے ہوئے کھانے بھی لوٹا دیے جو ان کے عزیزوں نے رشوت دے کر اندر پہنچائے تھے۔ پکڑے جانے والوں کے عزیز و اقارب مسلسل آتے جاتے رہے اور تھانے کے باہر جمع رہے۔ ساڑھے نو بجے میر پھر نمودار ہوا اور اس نے بہت سے افراد کو شرف باریابی بخشا۔ ڈکیتی کے ملزم نے مجھے مطلع کیا کہ یہ آج رات تفتیش سے بچ جانے کے مذاکرات ہو رہے ہیں۔ دس بجے کے قریب میں نے ایک شخص کو اندر جاتے دیکھا جس نے اپنا چہرہ دوسری جانب کر لیا تھا مگر وہ برآمدے کا زینہ چڑھ رہا تھا تو مجھے اوپر لگے ہوئے بلب کی مدھم روشنی میں ایک لمحے کے لیے اس کی صورت دکھائی دی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اس کو پہلے بھی دیکھا ہے۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا۔ جب دس منٹ بعد وہ چق اٹھا کے باہر نکلا تو میں نے اس کی صورت پھر غور سے دیکھی۔ وہ پھر چہرہ چھپا کے تیزی سے برآمدہ عبور کر گیا تھا مگر اب میں نے اسے شناخت کر لیا۔ یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور تھا جو مجھے ایئرپورٹ سے چراغ دین کی کوٹھی تک لے گیا تھا اور پھر میر شرافت علی کی کوٹھی کے باہر نظر آیا تھا تو میں نے اسے اتفاق سمجھا تھا۔ یکلخت میری آنکھوں پر سے وہ پردہ ہٹ گیا جو مفروضات اور حقائق کے درمیان حائل تھا۔

"سنتری! سنو! اس شخص کو" میں نے حوالات کی سلاخوں کو تھام کر چلاتے ہوئے کہا۔ تھری ناٹ تھری کی رائفل کو لاٹھی کی طرح تھام کر کھڑا ہوا سنتری اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ حوالات میں موجود بہت سے لوگوں نے دیوانگی

سے اس نظارے پر مسکرا کر مجھے دیکھا۔ "میر صاحب!" میں چلایا۔ "یہ شخص کون تھا... یہ جو ابھی ابھی نکلا ہے؟"

"حوالدار!" میر شیر کی طرح گرجتے ہوئے دہاڑا۔ "کون کتا بھونک رہا ہے؟" پھر وہ چق اٹھا کے باہر نکلا اور سیدھا میری طرف آیا۔ کچھ پوچھے بغیر اس نے باہر سے ہی میرے منہ پر ایک مکا رسید کیا۔ میں اپنا توازن کھو کر گرا اور سنبھلا۔ جب میں اٹھا تو میری ناک سے بہنے والا خون ٹپ ٹپ میری قمیص پر ٹپک رہا تھا۔

"یہ کس گستاخی کی سزا ہے؟" میں نے خون کو ہاتھ سے صاف کیا۔ "میں نے صرف یہ پوچھا تھا کہ جو شخص ابھی ابھی آپ کے پاس سے اٹھ کر گیا ہے وہ کون تھا؟"

"کیوں پوچھا تھا؟ کون ہے تو؟ میرا باپ یا افسر؟" میر نے حسب عادت درمیان میں گالیوں کا اضافہ کرتے ہوئے گرج کر کہا۔

"اس شخص کا میرے مقدمے سے براہ راست تعلق ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھ پر قتل کا الزام ہے اور مجھے شبہ ہے کہ اصل قاتل یہ ہے۔"

میر نے مجھے ایک درجن خوفناک گالیاں دیں۔ "تو نے کیا سمجھا ہے خود کو... تفتیشی افسر ہے تو یا ملزم؟ تیرے جیسے دس تھانے میں آنے والے ہر معزز شریف آدمی کو پکڑ کے بند کر دوں؟ تیرا کیا ہے، تو ڈی ایس پی صاحب کو کہہ دے گا کہ یہ اصل قاتل ہے۔"

"کیا یہ شخص ڈی ایس پی تھا؟" میں نے کہا۔ ڈکیتی کے ملزم نے میرا ہاتھ دبا کے مجھے خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔

"کون شخص؟" وہ دہاڑا۔ "یہاں تو میں پچاس آدمیوں سے مل چکا ہوں اور پچاس ابھی باہر کھڑے ہیں۔"

"یہ جو بھاری بدن والا، گھنگھریالے بالوں اور گول مول مونچھوں والا ابھی ابھی نکلا تھا، جس نے ایک کان میں بُندا پہن رکھا تھا۔ کالی لال دھاریوں والی قمیص اور شلوار..." میں نے یہ تفصیل بتاتے ہوئے کہا اور خطرے کے سگنل نمبر دو کو بھی نظرانداز کر دیا۔ "کیا نام تھا اس کا؟ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور ہے اور اس کی ٹیکسی کا نمبر ہے فور تھری ٹو تھری سی ایل ای..."

میرے سر پر کوئی چیز توپ کے گولے کی طرح لگی۔ میر نے قریب سے گزرنے والے ایک کانسٹیبل سے لکڑی کا ڈنڈا لے کر اتنی پھرتی سے کھینچ مارا تھا کہ مجھے حیران ہونے کی فرصت بھی نہ ملی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میری نظروں کے سامنے اندھیرے کے سوا کچھ نہ رہا۔ میری آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "اس... کو لاؤ ذرا... یہ کیا کتا ہے۔ سدھا ہم اچھی طرح سمجھ لیں اور یہی بات بھی سمجھا دیں۔"

حوالات کا قفل کھلا اور دو ہاتھوں نے مجھے اٹھا لیا۔ میں نے سر کو جھٹکا اور دھندلکا کچھ کم ہوا۔ ڈکیتی کے ملزم کی آواز آئی۔ "اوئے کھوتے! کتنی دیر سے سمجھا رہا تھا میں۔ پہلی بار تھانے آیا ہے۔ کچھ اپنی عقل سے نہیں تو دوسروں کی عقل سے کام لے۔"

میں نے محسوس کیا کہ حوالات میں رہ جانے والوں کی وحشت زدہ نظریں مجھے یوں دیکھ رہی ہیں جیسے مجھے تختہ دار کی جانب لے جایا جا رہا ہے۔ سفر کا انجام بھی فرش برآمدے کے آخری دروازے پر ہوا جو ایک طرح سے تفتیش کی لیبارٹری تھی اور جو سامان میں نے وہاں مستعمل دیکھا اگر وہ لندن کے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغرساں بھی دیکھتے تو ہماری پولیس کی ذہانت، جدت طبع اور صلاحیت پر دنگ رہ جاتے۔ مجھے وہاں لانے والے کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل سادہ کپڑوں میں تھے اور اپنی صورت شکل سے بالکل آدم خور لگتے تھے۔ انہوں نے مجھے دھکا دے کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ یہ لوہے کی مضبوط کرسی تھی جس کے پائے سیمنٹ کے فرش میں نصب تھے۔ میرے احتجاج اور سوال کرنے سے ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ گالیاں ان کے لیے زبان و کلام کا ناگزیر جزو تھیں اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ فحش زبان استعمال کر رہے ہیں۔ ماں کے ساتھ ساتھ مجھ پر مکوں اور تھپڑوں کی بارش بھی ہو رہی تھی۔ اگر میں مشتعل ہو جاتا تو جوڈو کے ایک معمولی سے داؤ سے ان دونوں کو لٹا دیتا مگر اس کے بعد میرے لیے اس عذاب سے کہیں مفر نہ تھا جس کا معمولی سا نمونہ میں دیکھ چکا تھا۔ میں تھانے سے نکل کے بھاگ نہیں سکتا تھا اور بفرض محال بھاگ جاتا تو چھپ کے کہیں بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

ایک بار پھر مجھے تمام کپڑوں سے محروم کر کے کرسی کے ساتھ یوں جکڑ دیا گیا کہ سر کے سوا میں جسم کے کسی حصے کو جنبش تک نہیں دے سکتا تھا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ سرعام بے لباس ہوتے ہی آدمی خود اپنی نظر میں کتنا بے آبرو ہو جاتا ہے، کتنا گر جاتا ہے اور عزت نفس نہ رہے تو خود اعتمادی بھی نہیں رہتی۔ بے عزت کر کے ننگا کر دینے کا یہ نفسیاتی حربہ کسی بھی شریف آدمی کی ذہنی قوت مزاحمت کو شکست دے سکتا ہے۔ بات صرف جگر کی یا روئیے کی ہے ورنہ کسی ڈاکٹر کے سامنے میڈیکل چیک اپ کے لیے کپڑے اتارنے والا میرے جیسا شخص اپنے عصمت مند جسم پر کسی احساس ندامت میں نہیں احساس تفاخر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کمرے میں دو کرسیاں اور بھی تھیں جو ایک چھوٹی سی میز کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ وسط میں بینچ نما ایک لمبی سی میز تھی اور اس کے پائے بھی فرش میں پیوست تھے۔ ایک کونے میں خون آلود رسیاں اور زنجیریں پڑی تھیں۔ وہیں ایک گز لمبے دستے والا ایک چمچ بھی کھڑا تھا۔ چمچے کی جگہ اس کے آخری حصے میں لوہے کا گول پیالہ تھا۔ اس کے علاوہ لکڑی کے چھوٹے بڑے پتلے اور موٹے ڈنڈے اور چمڑے کے ہر قسم کے ہنٹر رکھے تھے۔ ایک جانب مجھے لوہے کی چار بالٹیاں بھی معلق نظر آئیں جن کے سرخ پینٹ پر سفید رنگ سے "فائر" لکھا ہوا تھا مگر ان میں سے کسی میں ریت نہ تھی اور پانی نہ تھا کہ ان کو آگ بجھانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا۔ یہ سب 'سامان تفتیش' تھا، جس کا تھانے کے باہر سڑک پر گزرنے والا آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے فرش اور دیواروں پر مختلف قسم کے داغ نظر آئے جو اس نیم روشن کمرے کے آسیب زدہ ماحول میں مجھے لہو کے داغ لگے۔ ان سب کا لہو جو یہاں تفتیش کے لیے لائے اور لے جائے گئے، مردہ یا نیم مردہ۔ اسٹریچر پر یا مرے ہوئے کتے کی طرح ٹانگ سے گھسیٹ کر۔ مجھے دیواروں کے وجود میں ان گنت چیخوں اور کراہوں کے خونی عکس دفن نظر آئے۔

اسی وقت میر اندر آیا اور اس نے دروازے کو اندر سے بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ میں اب ذہنی طور پر تشدد کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے بعد محسن آ جائے گا۔ اس کے باپ نے اب تک یقیناً کسی نہ کسی کو فون کر دیا ہوگا اور محسن خود کسی کے نام رقعہ لے کر آئے گا۔ صبح وکیل آ جائے گا اور لاقانونیت کا یہ سلسلہ میرے لیے تمام ہو جائے گا۔ دوسروں کے لیے چلتا رہے گا۔

"میر صاحب!" میں نے کہا۔ "صبح تک آپ کو معلوم ہو جائے گا..." ابھی میرا جملہ بھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ اس کا ہاتھ میرے منہ پر پڑا۔ میرا سر جھٹکے سے کرسی کی پشت پر لگا اور کمرہ میرے سامنے ڈولنے لگا۔

"ہاں بھئی، کیا پتہ چل جائے گا؟" وہ بولا۔ اس نے ترین میز سے ایک ڈنڈا اٹھایا اور اپنے دونوں مددگاروں کو اشارہ کیا جو اس کی خاموش زبان کا مفہوم سمجھتے تھے۔ ان میں سے ایک نے دونوں ہاتھوں سے میری ناک دبوچی

www.paksociety.com

www.paksociety.com

کو کھینچ کر میرا منہ کھولا۔ میر نے وہ ڈنڈا میرے حلق میں ٹھونس دیا۔

"ہاں بول استاد! کیا معلوم ہوگا جو سچ تو بہت دور ہے ابھی بتاوے...." وہ ڈنڈے پر دباؤ بڑھاتا گیا۔ ڈنڈا اب میرے حلق میں پھنس گیا تھا اور اذیت سے میرا جسم اینٹھ رہا تھا۔ ڈنڈے کا سرا گول اور چکنا تھا چنانچہ میرے حلق میں کہیں زخم نہیں آیا تھا مگر مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے معدے سے ہر چیز حلق کے راستے باہر آ جائے گی۔ ایک منٹ بعد اس نے ڈنڈا واپس کھینچا تو میں نے گہرا سانس لیا اور بے سدھ ہو گیا۔ تھک کر میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا تھا جیسے میں نے چلچلاتی دھوپ میں پہاڑ کی چوٹی تک سفر کیا ہے۔

"میر محمد...." میں نے کہا۔ "تمہیں کتنا پیسہ چاہیے... بولو اس آدمی کا نام بتانے کی قیمت کیا ہے۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور...."

"میں ایسے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔" وہ چیخ کر بولا۔ "کون ٹیکسی ڈرائیور؟ آج کوئی مندری والا، کوئی لال کالی دھاریدار قمیص والا مجھ سے ملنے نہیں آیا۔" اس نے میرے منہ پر تھوک دیا۔

"تم جان بوجھ کے اس کی پشت پناہی کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "جتنا پیسہ اس نے دیا ہے میں اس سے دگنا دوں گا۔"

اس کے بعد میرے ساتھ وہ ہوا جس کا ذکر ہی ذلت آمیز ہے۔ غصے اور صدمے سے میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔ میں نے خود کو اس غلاظت سے بچائے رکھنے کی بھرپور جدوجہد کی مگر میں بندھا ہوا تھا اور میرا چہرہ میرے ماتحت کو ریشم نے آہنی سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں بھول گیا کہ میں لندن میں انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والا عزیزیہ کا ہونے والا شوہر، میر وڈ ایڈ کمپنی کا ہونے والا مالک ہوں۔ میں حیوانیت کی نچلی سطح سے بھی نیچے ہو گیا جب یہ سزا تمام ہوئی تو الٹیاں کرنے سے میرا سارا جسم غلاظت سے لتھڑ چکا تھا اور میرے جسم کی توانائی اس حد تک زائل ہو چکی تھی کہ میرے لیے سر کو سیدھا رکھنا دشوار تھا۔

"ہاں بھئی! کس کا پوچھ رہا تھا تو؟" میر نے اطمینان سے سگریٹ جلائی اور جلتی ہوئی تیلی کو میری ٹانگوں کے درمیان لے آیا۔ میرے نتھنوں میں بال جلنے کی بو آئی۔

"وہ... میں... اسے ہی... اسے میں پوچھ رہا ہوں میر صاحب...." میں نے بمشکل تمام کہا۔

"میر شرافت علی کو کیوں قتل کیا تھا تو نے؟" وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ "کیا دشمنی تھی تیری، اور کون تھا تیرا ساتھی؟"

"کوئی... کوئی نہیں... وہ... وہ میرے باپ کا قاتل... تھا... بلیک میلر تھا... مگر میں نے اسے نہیں مارا۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

ربڑ کی ایک بالٹی میرے سر پہ آ گئی۔ میں نے کسی کمسن بچے کی طرح رونا شروع کیا۔ میں جانتا تھا اب کیا ہوگا اور اس بے بسی کے عالم میں گالیاں اور دھمکیاں دینے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا لیکن اس مرتبہ کسی نے بالٹی کو منہ کو تالاب میں بیلچہ کے انتظار میں ہی رہا۔ مگر میرا یہ انتظار ایک گھڑی کا اندوہناک عذاب بن گیا۔ پھر ایک عجیب سی بو آئی۔ بالٹی کے کنارے میرے کندھوں پر آ گئے تھے چنانچہ میں اس رنگ ساز فولادی ٹوپی کے اندر سر کو ادھر ادھر گھمانے کے باوجود کچھ نہیں دیکھ سکتا کہ کیا ہو رہا ہے اور مجھ پر کیا تازہ ستم ٹوٹنے والا ہے۔ پھر وہ ایک دستے والا چمچہ بالٹی کے نیچے آ گیا جس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ یہ دھواں سیدھا اوپر اٹھا اور بالٹی میں بھرنے لگا۔ کڑچھے کے دہکتے ہوئے انگاروں کی حدت میرے پیروں تک پہنچ رہی تھی اور میں سرخ انگاروں کی چمک دیکھ بھی رہا تھا لیکن سر کو ادھر ادھر ہلا کے دھوئیں سے بچنا محال تھا۔ اس دھوئیں کی بدبو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ بالٹی میں دھواں ہی دھواں ہو گیا تو تازہ ہوا کی جدوجہد میں میرا سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ میرا جسم دم گھٹنے سے اینٹھنے لگا اور میں سر کو اس قاتل دھوئیں سے بچانے کے لیے ادھر پٹخنے لگا جیسے مجھ پر حال طاری ہو لیکن اس طرح اپنے سر کو بالٹی کے اندر بچانے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجھ پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ یا شاید میری زندگی کا چراغ گل ہونے لگا۔ اس نزع کے عالم میں ایک آواز مسلسل مجھ سے سوال کر رہی تھی کہ میں نے میر شرافت علی کو کیوں قتل کیا؟

چند منٹ بعد مجھے پھر ہوش آیا تو وہ بدبودار دھواں ختم ہو چکا تھا مگر بالٹی اسی طرح میرے سر پر سوار تھی۔ وہ بو میرے حواس پہ چھا گئی تھی اور میرے دماغ میں ایسی بس گئی تھی کہ مجھے متلی سی محسوس ہوئی تھی لیکن میرے پیٹ میں جو کچھ تھا وہ پہلے ہی نکل چکا تھا۔ اب میرا حلق خشک ہو رہا تھا اور میں "اوق... اوق..." کر کے ابکائیاں لے رہا تھا۔

"میر صاحب... میر صاحب...." میں نے بالٹی کے اندر گڑگڑا کر کہا۔ "قسم خدا کی... اس کے رسول کی... اور اس کی کتاب کی... اگر آپ مسلمان ہیں... تو یقین کیجیے میں نے میر شرافت علی کو قتل نہیں کیا۔" ہر لفظ میں نے رک رک کر بڑی کوشش سے ادا کیا تھا۔

جواب میں مغلظات کا سیلاب امڈ آیا۔ "یہی بکواس کیے جاتا ہے۔ اے ایس پی صاحب کا حکم ہے کہ ملزم جب تک قتل کا اعتراف نہ کرے اور تحریری بیان نہ دے پوچھ گچھ جاری رکھو اور اگر تو نے اقبال جرم نہ کیا تو اندر باہر سے فرق نہیں پڑتا۔ تجھے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔"

"یہ دھمکی ہے یا اے ایس پی صاحب کا حکم ہے؟" میں نے اپنی ذہنی توانائی کو مجتمع کر کے سوچا۔ کیوں؟ کیا انہیں علم نہیں کہ زبردستی حاصل کیے جانے والے اس اعتراف جرم کی کوئی اہمیت نہیں؟ اور انہیں صرف اقبال جرم ہی سے کیوں دلچسپی ہے، اصل قاتل کی گرفتاری سے کیوں نہیں...؟

"میں... میں بات کروں گا... میر صاحب... آپ بتائیں...." میں نے گڑگڑا کے کہا۔ "کیا کہنا ہے... کیا لکھنا ہے مجھے؟"

بالٹی میرے سر سے اتر گئی اور میں نے دیکھا کہ کمرے میں اب چار ملزم اور بھی لائے گئے ہیں جو کھڑے کانپ رہے ہیں۔ ان میں دو وہی تھے جن کو میں نے مرغا بنا دیکھا تھا اور دو میری آمد کے وقت حوالات میں گھٹنوں پہ سر رکھے بیٹھے تھے۔ میر محمد نے ایک پیر کرسی کی بجائے میری ران پر رکھا۔

"میر شرافت علی تیرے باپ کو بلیک میل کرتا تھا اس لیے تو نے اسے قتل کر دیا۔ یہ بیان نہیں چلے گا۔ بیان یہ ہوگا کہ میں پوری فرم کا مالک بننا چاہتا تھا۔ اس کے سوا ایک لفظ نہیں۔ کسی کا نام کسی کا حوالہ نہیں۔"

اتنے لوگوں کی موجودگی میں اپنی قابل رحم حد تک مضحکہ خیز حالت کے احساس نے مجھے پھر مشتعل کر دیا۔ "میر صاحب۔" میں نے کہا۔ "بیان آپ دس بار مجھ سے اپنی مرضی کا بیان لے لیں عدالت میں میرا بیان وہی ہوگا جو حقیقت پر مبنی ہوگا اور اس میں بہت سے نام اور بہت سے حوالے آئیں گے۔ بہت سے واقعات کا تذکرہ ہوگا۔ میرے باپ کو بلیک میل ہی نہیں قتل بھی کیا گیا ہے۔ میں یہ بھی معلوم کروں گا کہ وہ مندری والا کون تھا۔ جس کی تلوار مار کر مونچھیں تنی تھیں اور جو سرخ اور سیاہ دھاریوں کی قمیص پہن کے آیا تھا۔ میں اس کی ٹیکسی کا نمبر نہیں بھول سکتا...."

میر بڑا اچھا ایکٹر تھا۔ وہ میری ساری بات یوں سنتا رہا جیسے میں کوئی دلچسپ لطیفہ سنا رہا ہوں اور مسکراتا رہا۔ پھر اس نے اچانک میرے بال پکڑ کے مجھے جھٹکے دینے شروع کیے اور میرے سر کو کرسی کی پشت سے ٹکرانے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ نے میرے جسم کے حصوں کو شکنجے کی طرح جکڑ کے مروڑنا شروع کیا۔ میں بری طرح بلبلایا لیکن اس نے اپنا عمل جاری رکھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ میرے سر کے بال ٹوٹ کر اس کے ہاتھ میں آ جائیں گے اور میں ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو جاؤں گا۔ وہ اپنے کام کا ماہر تھا اور جانتا تھا کہ آدمی کی قوت برداشت کہاں تک ساتھ دیتی ہے۔ میں بری طرح چیخنے اور اچھلنے لگا تو کسی تیسرے ہاتھ نے میرے حلق سے نکلنے والی آوازوں کو روکنے کے لیے میرے منہ میں کوئی چیز ٹھونس دی۔ میں نے دیکھا تو وہ گوبر سے بنے ہوئے خشک اپلے تھے جو تھانے میں حقہ گرم کرنے کے علاوہ اس دوسرے کام کے لیے بھی جمع رہتے تھے۔ خشک گوبر میرے حلق سے سانس کی نالی میں بھی اتر گیا اور میں سانس لینے کی جدوجہد میں بری طرح کھانسنے چھینکنے لگا۔ پھر وہ عذاب ایک دم تمام ہو گیا۔

جب میں نے پھر آنکھیں کھول کے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میں جہنم میں جنت کا خواب دیکھ رہا ہوں۔ صحرا میں پیاس سے دم توڑنے والے کو بھی تو پانی نظر آتا ہے۔ جب کہ اس کی حد نگاہ میں جھلستی ریت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے آنکھیں پھر بند کر لیں اور دوبارہ کھولیں تو منظر وہی تھا۔ میں اسی کمرہ تفتیش میں لکڑی کی بنچ پر الٹا پڑا تھا اور میر محمد کے دونوں معاون پانی کی بالٹی سے لوٹا بھر بھر کے مجھ پر ڈال رہے تھے۔ یہ نیم گرم پانی تھا جو میرے جسم سے ٹوٹتے بدن کو بڑی راحت دے رہا تھا اور میرے بندھے ہوئے جسم کے وہ اعضا جو اب تک زندہ لگنے سے بچے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھتے تھے اس غسل صحت سے شفا پا رہے تھے۔ بڑی پھرتی سے انہوں نے میرے جسم سے ساری غلاظت دھو ڈالی۔ پھر ایک نے کسی زیر تفتیش ملزم کے کپڑوں سے رگڑ کے میرے بدن کو خشک کیا۔ میں نے ان کے کام میں کسی قسم کی مداخلت یا مزاحمت نہیں کی۔ میرا ناک منہ چہرہ سب صاف ہو گئے تھے لیکن میرے احساس میں ہر جگہ اور تمام غلاظت بدستور موجود تھی۔ میں خود کو آدمی کے بجائے گٹر کے گندے پانی کا کیڑا سمجھ رہا تھا اور قطعی بے حسی کے ساتھ اس انسانیت سوز منظر کو دیکھ رہا تھا جو میرے روبرو تھا۔ آہنی کرسی پر اب میری جگہ دوسرا شخص بیٹھا تھا اور جو کچھ میرے ساتھ ہو چکا تھا وہ اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

میر جا چکا تھا اور تفتیش کا سلسلہ اب ایک نئی ٹیم کی نگرانی میں چل رہا تھا جس کی قیادت رات کے آخری حصے میں ڈیوٹی پر آنے والے ایک باریش اے ایس آئی نے سنبھال رکھی تھی۔ اس کمرے کے دوسرے کونے میں بیک وقت دو زیر

www.paksociety.com

سے تفتیش ہو رہی تھی۔ یہ وہی دونوں تھے جن کو میں نے غور سے نہ
دیکھا تھا۔ تفتیش کے اس عمل میں پسی ہوئی سرخ مرچ، سرسوں
کا تیل اور وہ ڈنڈے جس طرح استعمال ہو رہے تھے اس کو
دیکھ کر ہی میرے بدن پر لرزہ طاری تھا مگر وہ جو تختۂ مشق
بنے ہوئے تھے چلا بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کے منہ میں کپڑا
ٹھونس دیا گیا تھا اور ان کو بالکل گٹھری بنا کے باندھ دیا گیا تھا۔
یوں کہ ان کے پیر ان کی گردن کے ساتھ جا لگے تھے اور جب
انھیں چھوڑا جاتا تھا تو وہ فرش پر اوندھے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔
میرے مددگار اس سب سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف
تھے۔ ان میں سے ایک کپڑے لے کر آیا۔ دوسرے نے جیب سے
دو گولیاں نکالیں اور پانی کے ایک گلاس کے ساتھ ہتھیلی پر
رکھ کے آگے بڑھائیں۔ میں نے ہاتھ مار کے گلاس اور گولیاں
نیچے گرا دیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی ایسا زہر ہو گا جس سے
میرے جسم کے اندرونی اعضا کو ناقابلِ تلافی نقصان ہو گا یا
میں ان کو کھا کے سخت اور ناقابلِ برداشت قسم کی تکلیف میں
مبتلا ہو جاؤں گا۔ کانسٹیبل نے مجھے گندی گالی دی اور پھر پانی
کا گلاس بھر کے لایا۔ جیب سے مزید دو گولیاں برآمد کیں اور
اس بار میرے جبڑے کھول کے زبردستی حلق سے یوں اتار دی
گئیں جیسے جانوروں کو دوا دی جاتی ہے۔
"یہ زہر نہیں اسپرین ہے۔ درد ختم کرنے والی گولی۔"
دوسرے شخص نے نہایت معقولیت سے کہا جو میرے کپڑے اٹھا
کے لایا تھا۔ میرے سامنے اس نے جیبوں کی تلاشی لے کر تمام
رقم اپنی جیب میں منتقل کی۔ سگریٹ کی ڈبیہ اور لائٹر اس
نے دوسرے ساتھی کو پیش کر کے اپنی سخاوت کا مظاہرہ کیا
اور مجھ سے کہا کہ میں کپڑے پہن لوں۔ وہ دونوں میری ڈبیہ سے
ایک ایک سگریٹ سلگا کے کھڑے ہو گئے اور میں نے اس قدم
پر بھی لعنت بھیجی کیونکہ اصل چیز یعنی لاکر کی چابی بچ گئی تھی اور
میری کلائی کی گھڑی موجود تھی۔ ابھی میں کپڑے پہن رہا تھا
کہ ایک شخص چائے کی ٹرے لیے اندر آیا۔ چائے کے ساتھ
بسکٹ بھی تھے۔ "یہ کھا پی لو فٹافٹ۔" وہ بولا۔
کپڑے پہنتے ہی میری حالت میں زبردست انقلاب
رونما ہوا۔ میں ایک بار پھر خود کو آدمی سمجھنے لگا۔ معزز، تعلیم یافتہ
اور شریف آدمی۔ اسپرین کی گولیوں کے 'علاجِ' شافی نے عملی
اپنا اثر دکھایا اور میرے جسم کا درد کم ہونے لگا۔ میں نے بڑا لقمہ
بسکٹ نگلے اور گرم چائے ایک سانس میں چڑھا گیا۔ میرے
سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تیزی سے بحال ہونے لگی اور جب
میں نے گھڑی دیکھی تو 'تفتیش' کے تمام ہو جانے کا اور

اس مہمان نوازی کے بدلے ہوئے انداز کا مطلب میری سمجھ میں
آ گیا۔ رات کے ایک بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ یقیناً محسن
آ پہنچا تھا اور اب پولیس مجھے اس کے سامنے بالکل تر و تازہ
اور صحت مند حالت میں پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتی تھی
کہ میرے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوئی۔ یہ ان کے لیے
روز کا معمول تھا اور میرے جیسے لوگ جو کبھی اس تجربے
سے نہیں گزرے تھے اس وقت بھی اپنے اپنے گھروں میں بے خبر
سو رہے تھے یا بڑے بڑے ہوٹلوں اور کلبوں میں بیٹھے
تھے یا کسی لالہ رخ کے کاشانے میں دادِ عیش دے رہے تھے یا
کاروں میں ان خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ گھوم رہے
تھے جن کے رنگ برنگے پیرہن سے رات کا سر بھی رنگین تھا اور
جن کی زلفوں کی مہک سانسوں میں نشہ بن کے اتر آتی تھی
معصوم بچے سوتے میں خواب دیکھ کر ہنس رہے تھے اور
ٹرینوں میں خوابیدہ مسافر، ہوائی جہازوں میں محو پرواز
مسافر اور سمندری جہازوں پر محو تماشا مسافر سب اپنی اپنی
منزلوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کارخانوں کی مشینیں
چل رہی تھی، ہسپتالوں میں انسان مر رہے تھے اور جنم
لے رہے تھے اور یہ سب کل بھی ایسے ہی تھا جیسے آج ہے اور
پھر کل ہو گا۔ سوائے ان سب کے جو زیرِ تفتیش نہیں ہیں اور
بدستور خوبصورت اور یہ زندگی جینے کی آرزو کے قابل ہے
میرے جسم پر ایک خراش بھی نہیں تھی۔ کسی چوٹ
کا نشان نہیں تھا اور کوئی نیل نہیں پڑا تھا۔ میرے بالوں
میں کنگھی کر دی گئی تھی۔ میں اپنے کپڑوں میں بالکل ویسا ہی
چست تھا جیسے ریل کار سے اتارا گیا تھا۔ جیب میں دو سپاہیوں
کی معیت میں اس کمرے سے نکلا اور برآمدے میں آیا تو
میرے ہاتھوں پر ہتھکڑی تھی۔ وہ مجھے حوالات کی طرف لے
جانے کی بجائے ایس ایچ او کے آفس کی طرف لے گئے
جہاں میری توقعات کے عین مطابق محسن رضا موجود تھا
وہ بڑی بے تابی سے اٹھا اور میرے گلے لگ گیا۔ "سکندر!
تو ٹھیک ہے نا...؟" اس نے مجھے اپنے ہاتھوں سے ٹٹول
کر دیکھا۔ "تجھے کچھ ہوا تو نہیں ہے نا؟ میں ذرا دیر سے پہنچا
لیکن تو فکر نہ کر۔ میں نے سب ٹھیک کر لیا ہے۔" وہ مجھے
بولنے کا موقع دیے بغیر بولتا جا رہا تھا اور اس کی حرکات
سکنات سے اس کی دلی بے قراری کا اظہار ہوتا تھا۔ "آخر
یہ ہوا کیا تھا؟"
"آپ خواہ مخواہ پریشان تھے۔" میں نے بڑی شائستگی
سے مسکرا کے کہا۔ "ہم پہ خواہ مخواہ گرم ہو رہے تھے۔ دیکھو نا

کچھ نہیں ہوا ہے ان کو۔"
"محسن!" میں نے اطمینان اور سکون کی گہری سانس لے کر
کہا۔ "جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے وہ میں تجھے بعد میں تفصیل سے
بتاؤں گا۔ تو آ گیا، یہ میرے لیے سب سے بڑا سہارا ہے ورنہ
تُو نے بہت سے موذی اور سفاک درندوں اور بے ضمیر دشمنوں
کے درمیان میں بہت اکیلا تھا۔ میں ان سب سے تن تنہا
جنگ لڑ سکتا ہوں اور وہ سامنے آ کے مقابلہ کریں تو اکیلا ہی
دس سے نمٹ سکتا ہوں مگر وہ دوسرے ہتھکنڈے آزما رہے
ہیں۔ سازش کا مقابلہ سازش اور جوڑ توڑ کا مقابلہ جوڑ توڑ
سے کیا جا سکتا ہے لیکن جس شخص کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے
وہ آدھا آدمی بھی نہیں ہے بلکہ میرے سے آدمی ہی نہیں ہے
صرف مجرم ہے۔ تو ابھی باہر ہے اور آزاد ہے، چنانچہ تجھے بہت
کچھ کرنا ہے۔ آج تو میں مجبور تھا۔ کل پھر بھی دشمن وحوش
اور وحشانی کی طاقت آزمائیں گے اور قانون کا سہارا لیں گے
پھر پتہ چلے گا کون ہو رہا ہے اور کون کتنے پانی میں ہے۔"
میر بالکل بے تعلق بیٹھا زیر لب مسکرا رہا تھا جیسے وہ کچھ
اور سوچ رہا ہے اور یہ بات نہیں سن رہا ہے جس کا تعلق اس
کی اپنی ذات سے ہے۔ میرے لہجے میں غیر ارادی طور پہ وہ درد و
کرب اتر آیا تھا جو تفتیش کے عذاب نے دیا تھا اور یہ بات
محسن سے چھپی نہ رہ سکی۔
"مسٹر میر محمد!" وہ بولا۔ "کھل کے بات کرو۔ کیا تم نے
سکندر پہ تشدد کیا ہے؟ بقسم خدا کی...!"
"بیٹھ جاؤ محسن!" میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔
"اکیلا چنا بھاڑ کو نہیں پھوڑ سکتا۔ جو ہونا تھا ہو چکا اور تو اب
اپنی توانائی کو اور اپنی صلاحیت کو آئندہ کے لیے محفوظ رکھ یہ
کیا کم ہے کہ میں اس وقت زندہ و سلامت تیرے سامنے موجود
ہوں اور تجھے سب کچھ بتا سکتا ہوں ورنہ تیرے باپ کی قبر
نے تجھے کچھ نہیں بتایا۔ تجھے بھی میری لاش مردہ خانے میں
ملتی تو کیا بتاتی۔ حشمت کی طرح میر صاحب بھی یہی کہیں
گے کہ افسرانِ بالا کے حکم کے سامنے ہم مجبور ہیں اور انہیں بھی
نوکری تو کرنی ہے۔ اپنا پیٹ اور بیوی بچوں کو تو پالنا ہے۔
ان سے کچھ نہ پوچھ۔ یہ بے چارے ہم سے زیادہ مظلوم اور
بے بس ہیں۔ ناحق ان مجبوروں پہ یہ تہمت بے اعتمادی کی—
الزام بے اعتباری کی بات"
"مسٹر میر محمد! میں سکندر بخت سے علیحدگی میں بات
کرنا چاہتا ہوں۔" محسن نے اسے گھور کے کہا۔
میر نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب تک ملزم یہاں ہماری تحویل
میں ہے قواعد و ضوابط ہے۔"
"کون سے قواعد و ضوابط؟" محسن نے سو کا ایک نوٹ
میز پہ رکھا اور ایک ہاتھ سے دبا لیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ ٹیلیفون
کی طرف گیا۔ "فیصلہ کر لو کر لیتے چلے گا، یہ... یا یہ؟"
میر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے اطمینان سے نوٹ
جیب میں رکھا اور زیر لب مسکرایا اور باہر نکلنے ہی والا تھا کہ
میں نے اسے روک لیا۔
"انسپکٹر میر محمد!" میں نے کہا۔ "جب میں یہاں آیا تو میرے
پاس ایک بریف کیس تھا جو میں نے سب انسپکٹر حشمت خان
کے کہنے پر امانت خانے میں رکھوا دیا تھا اس میں چار ہزار
تین سو روپے نقد تھے، میرا پاسپورٹ تھا اور کچھ کپڑے تھے۔"
میر رک گیا اور اس کی صورت بگڑنے لگی کہ چار ہزار
تین سو کی خطیر رقم نہ ملے گا اور حشمت خان کے ہاتھ لگ
جانے کا اسے کتنا صدمہ ہوا ہے۔ "تھانے میں تو کوئی امانت
خانہ نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "حشمت صبح آ جائے گا، اسی سے
پوچھ لینا۔"
"اس کا جواب غالباً یہ ہو گا کہ وہ بریف کیس گھر تو
نہیں لے گیا تھا، تھانے ہی میں تھا۔ میرے بار بار پوچھنے پر اس نے
تلخی سے کہا تھا کہ مجھے ایک قانون شکن مجرم نے بتا دیا تھا
کہ یہاں کا قانون کیا ہے اور مجھے اب اس رقم سے ہاتھ دھو
لینے چاہئیں، لیکن ذرا اپنے ان دونوں آدمیوں کو بلاؤ جو
مجھے لائے تھے۔"
میر نے بادلِ ناخواستہ ان کو طلب کیا۔ "اس شخص کی
جیب میں وہ رقم ہے جو میری اس جیب میں تھی۔" میں نے
اشارے سے واضح کیا۔ "اور اس دوسرے کی جیب میں میرا
سگریٹ کا پیکٹ ہے لیکن میں دونوں چیزوں کی ملکیت
کا دعویٰ نہیں کروں گا کیونکہ ان پر میرا نام نہیں لکھا ہوا ہے
لیکن ان کو چور ثابت کرنے کے لیے وہ سگریٹ لائٹر ضرور
مانگوں گا جس پہ میرا نام ہے۔" میں نے چٹکی بجائی۔ "لاؤ۔"
آہستہ آہستہ اس شخص کا ہاتھ جیب میں گیا اور اس
نے لائٹر نکال کے مجھے تھما دیا۔ میر نے ان سے کوئی بازپرس
نہیں کی، جاتے جاتے وہ ایک حوالدار کو حکم دے گیا کہ دروازے
پہ موجود رہے اور کسی قسم کا اندیشہ محسوس کرے تو لحاظ کیے بغیر
گولی مار دے۔ ایک گھنٹے بعد ملزم کو واپس حوالات میں پہنچا
دے اور صبح رپورٹ دے۔ میر محمد آسانی سے مرعوب ہو
جانے والا آدمی نہیں تھا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب وہ
میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، مجھے دبانے کے نفسیاتی حربے آزما

www.paksociety.com
www.paksociety.com

رہا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے حوالدار کو طلب کیا۔
سو کے ایک اور نوٹ کے عوض اس نے ایک گھنٹے کے لیے
میرے ہاتھوں کو آزاد کر دیا اور کہیں سے اسپیشل چائے
بھی منگوا دی۔ میں نے اسے یقین دلانے میں کوئی کسر نہیں
چھوڑی کہ میں فرار ہونے کی کوشش کر کے اس کی نوکری کو خطرے میں
ڈالنے کی قطعی نیت نہیں رکھتا اور اتنا احسان فراموش
نہیں کہ اس کی 'شرافت' کا بدلہ یوں دوں۔ میں نے یہ
بھی وعدہ کیا کہ میر صاحب یا کسی اور صاحب کے آنے کی
خبر ملتے ہی از خود ہتھکڑی اپنے ہاتھوں میں ڈال لوں گا۔
محسن کی دی ہوئی سگریٹ سلگا کے میں نے اپنی بپتا
یعنی گذارش احوال واقعی شروع کی اور وہ سب کچھ بتا دیا جو
میں نے سلامت شاہ سے سنا تھا۔ جو گزشتہ رات چراغ دین
کے گھر سے محسن کو فون کرنے کے بعد پیش آیا تھا اور پولیس کار
میں اپنی گرفتاری سے اب تک کے یہ سب واقعات بیان
کرنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ صرف ہو گیا۔ حوالدار نے
اس دوران میں صرف ایک بار جھانک کے دیکھا اور ہماری
طرف سے "سب خیریت ہے" کا سگنل پا کے لوٹ گیا۔
ساری بات سننے کے بعد محسن بہت دیر تک خاموش بیٹھا
کچھ سوچتا رہا۔

"سکندر!" اس نے بالآخر کہا۔ "تیرا کیا خیال ہے قتل اس
مندی والے ٹیکسی ڈرائیور نے کیا ہے جو وہ میر محمد سے ملنے
آیا تھا؟"

"سو فیصد یقین کے ساتھ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"
میں نے کہا۔ "لیکن اس مندی والے کا اس واردات سے
اور تمام معاملات سے قریبی تعلق ہو سکتا ہے۔ آخر اسے کیا ضرورت
تھی تھانے آنے کی اور میر کیوں انکار کرتا ہے کہ اس حلیے کا
کوئی آدمی ہی نہیں آیا۔ اگر وہ کہتا کہ ایک ایسا شخص آیا
تو تھا لیکن مجھے نہیں معلوم وہ کون تھا، تو شاید مجھے شبہ نہ
ہوتا۔ صرف مایوسی ہوتی لیکن اس صریح انکار سے اور
سفید جھوٹ سے تو میرے شبہات اور بڑھ گئے ہیں۔"

"کیا شناخت میں غلطی کا کوئی امکان نہیں، ممکن ہے
وہ ملتی جلتی صورت کا کوئی آدمی ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے اسے ایک ہی
دن میں دو بار دیکھا۔ ایکبار اس کی ٹیکسی میں ایئرپورٹ
سے چراغ دین کی کوٹھی تک گیا۔ اس سے باتیں بھی کیں اور جب
اس نے میرا سامان اتار کے رکھا اور میں نے اسے کرایہ ادا
کیا تب بھی اس کی صورت مجھے روز روشن کی طرح صاف نظر

آتی تھی۔ دوسری بار میں نے اسے رات کے وقت دیکھا
مرکری لیمپ کی روشنی میں تھا اور میں نے چہرہ اس
تھی تو اس نے بونٹ سے سر نکال کے دیکھا تھا
اسے پہچان لیا تھا۔ آج بھی میں نے اس کی صورت
دیکھی ہے۔ ایکبار اس کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے
دوسری بار باہر نکلتے وقت۔ چیل یا سمے کی
واضح کان کی نوک ہے۔ اس کی مونچھیں تلوار مارکہ
ہوئے گال تھوڑی کی سی آنکھیں، مسکراہٹیں جیسے
کچھ میں نے نوٹ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ اب
تو مجھے بہت سی باتیں جو پہلے غیر اہم تھیں اپنی واقعات
سلسلے کی کڑیاں لگتی ہیں۔ مثلاً ایئرپورٹ پر اس
کا رضاکارانہ طور پر آگے آکے جائز کرایہ طلب کرنا
یہ کہ میں اس کی ٹیکسی میں بیٹھ جاؤں۔ پھر اس کا
کے بنگلے پر رک جانا۔"

"تیرا مطلب ہے وہ پہلے سے ایئرپورٹ پر
موجود تھا؟" محسن نے کہا۔ "اسے پہلے سے معلوم ہوا کہ تو لاہور
رہا ہے؟"

"کچھ لوگوں کو یہ بات یقیناً معلوم تھی۔" میں نے کہا
گمنام مسٹر فومانچو نے اپنے خط میں مطلع کیا تھا کہ
کا قاتل جہاز میں میرے ساتھ ہے۔ غالباً اس کی معلومات
تھیں یا انتظامات بدل گئے۔ جہاز پر دشمنوں کا ایک
جس نے راستے میں مجھ پہ نظر رکھی۔ اسے معلوم تھا کہ
سے لاہور جاؤں گا۔"

"تجھے پاکستان پہنچنے سے پہلے یہ خبر کہاں ملی کہ
خان کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی
نہیں ہیں بلکہ چراغ دین کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر
اطلاع مجھے جہاز میں ایک گمنام خط کے ذریعے ملی
پھر اس خط میں لکھا تھا وہ تو تیرے سوا کوئی نہیں جانتا
محسن نے کہا۔

بجلی کی طرح میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ "کالا
میں نے کہا۔

"کالا صاحب؟" محسن نے حیرانی سے کہا۔ "کون کالا

"وہ جہاز میں میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ جب میں خط
رہا تھا تو وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے
میں رونما ہونے والے تغیر کو بھی محسوس کیا تھا اور میری
بھی پوچھی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن محسن! میرا خیال ہے
بھی پورا خط پڑھ لیا تھا۔ دوسری جانب تو وہ میرے

واشر تھا جسے بیوی کے نخروں اور بچوں کی شرارتوں پہ باغ باغ
ہونے سے فرصت نہ تھی لیکن وہ کالا صاحب میری طرف
متوجہ تھا۔ اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور
جب میں خط پڑھ رہا تھا تو خط میرے سامنے کھلا ہوا تھا۔
اس نے یقیناً سب کچھ دیکھا ہو گا۔ دو گھنٹے پہلے ہی یہ بات
معلوم ہو گئی تھی کہ جہاز اسلام آباد میں نہیں اتر سکے گا۔
ممکن ہے اس نے لاہور ایئرپورٹ پہ پیغام بھجوا دیا ہو۔ کسی
بھی کوڈ میں۔ مثلاً یہ کہ مال لاہور پہنچ رہا ہے اور اگر کوئی
شخص اسلام آباد میں مال کی وصولیابی کے لیے نامزد کیا گیا تھا تو
یہ انتظام بے مصرف ہو گیا تھا۔ فوری طور پہ لاہور میں میرے
استقبال کے لیے وہ انتظامات کیے گئے جو شاید چند گھنٹے بعد
کیے جاتے۔ جب میں دوسری فلائٹ سے لاہور پہنچتا۔ آنا
مجھے بہرصورت لاہور تھا۔ فرض کرو کالے صاحب نے یہ بھی
بتا دیا کہ مال اب ماڈل ٹاؤن نہیں چراغ دین کی کوٹھی پہ جائے
گا اور شاید اس کے بعد میر شرافت علی کے گھر۔ یہی وجہ ہے کہ
ٹیکسی ڈرائیور مجھے سیدھا ریلوے اسٹیشن نہیں لے گیا۔ میں نے
اس سے پوچھا بھی تھا مگر اس نے گول مول جواب دے کر
مجھے مطمئن کر دیا۔ دراصل میں اپنے خیالات میں گم تھا اور
ٹیکسی ڈرائیور پریشانی میں مبتلا ہو گیا کہ چراغ دین کی کوٹھی
آ گزرنے والی ہے اور سواری چپ بیٹھی ہے۔ اس نے ٹیکسی
روک کے جلد بازی سے اپنی حماقت کا ثبوت دیا ورنہ وہ
سیدھا اسٹیشن جا رکتا تو کیا تھا۔ میں کہتا کہ سوری بھئی واپس
چلو، اور پھر لوٹ کر چراغ دین کی کوٹھی پہ ہی آتا۔ اس کے بعد
دین ٹیکسی کا خراب ہو جانا بھی بے سبب نہیں تھا۔ اسے مجھ
پہ نظر رکھنی تھی۔ وہ یقیناً رات تک کسی نہ کسی بہانے آس
پاس ہی منڈلاتا رہا اور میرا خیال ہے قبرستان تک اس نے
ہمارا تعاقب کیا۔ پھر چراغ دین کی کوٹھی تک میرے پیچھے
پیچھے گیا۔ مجھے شبہ ہوتا تو میں دھیان دیتا کہ کوئی میرا تعاقب
کر رہا ہے۔ عین ممکن ہے اس نے پہلے چراغ دین کی کوٹھی کے
اندر گھس کے میری اور سلامت شاہ کی ساری باتیں سنی ہوں
اور اس کے بعد میر شرافت علی کی کوٹھی میں کسی کھڑکی سے لگا
سب دیکھتا اور سنتا رہا ہو۔ جب میں باہر نکلا تو وہ پھر ٹیکسی
کے بونٹ میں سر چھپائے کھڑا تھا۔ اس کا خیال ہو گا کہ میں
بونٹ اٹھا ہوا دیکھوں گا تو ٹیکسی کو خراب سمجھ کے اس کی
طرف جاؤں گا ہی نہیں لیکن اس کی بدقسمتی کہ میں نے ادھر اُدھر
کوئی ٹیکسی نہ دیکھی تو اس سے بات کرنے چلا گیا۔ اس امید
پر کہ ٹیکسی دھکا دینے سے یا کسی معمولی خرابی کے دور ہو جانے

سے اسٹارٹ ہو جائے تو اچھا ہے۔ اور میں نے اسے پہچان لیا۔
اس سے وہ یقیناً تشویش میں مبتلا ہوا ہو گا لیکن یہ بات اس
نے اپنی ذات تک محدود رکھی ہو گی۔ اگر اس کی خدمات حاصل
کرنے والے شکاریوں کو معلوم ہو جاتا کہ شکار نے صیاد کو پہچان
لیا ہے تو ٹھیک ٹھیک فرق ہو جاتا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو میر شرافت علی کے
قتل کا معاوضہ مل جاتا اور عین ممکن ہے اس کا اپنا کام تمام کرنے
کا سامان کیا جاتا۔ اس کا وجود شکاریوں کے لیے خطرے کی بات
ہے۔ میں اب اس کو جہاں دیکھوں گا پہچان لوں گا مگر یہ
بات شکاری نہیں جانتے۔ انہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ ان
کا مقصد پورا ہوا اور جس شخص کو معاوضہ ادا کیا گیا تھا اس نے
اپنا کام بخیر و خوبی انجام دیا۔ یوں کہ سارا الزام میری ذات
پہ گیا۔ ہر شہادت میرے خلاف ہے۔ آلۂ قتل پہ میرے
فنگر پرنٹ موجود ہوں گے۔ وجۂ قتل جو خود میں نے فراہم
کی تھی یعنی یہ کہ میر شرافت علی میرے والد کو بلیک میل کر رہا تھا
اپنی جگہ۔ ایک وجہ وہ پہلے ہی ایجاد کر چکے تھے یعنی یہ کہ میں
پیسے کا دربار پہ تابعی ہونا چاہتا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میر شرافت علی کا قتل کیا جانا
طے تھا۔" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ اگر اس نے میرے والد کو بلیک میل کیا اور مجھے
ٹھکانے لگانے کا پروگرام بنایا تو دوسری طرف کچھ اور لوگ
بھی تھے جو میر شرافت علی کو قتل کر کے ایک تیر سے دو شکار
کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ ایک شکاری میرے پیچھے تھا
اور اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ دوسرے زیادہ عیار شکاری
اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میر شرافت علی کے پیش نظر ایک
مقصد تھا یعنی میرا اغوا۔ دوسرے شکاری کئی مقصد بہتر طور
پہ حاصل کرنا چاہتے تھے یعنی میر شرافت علی کا قتل اور اس
قتل میں میری پھانسی۔ اس خیال کو یوں بھی تقویت پہنچتی ہے
کہ جب میں خود میر شرافت علی کے گھر پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر
بھونچکا رہ گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں
پاکستان آ پہنچا ہوں۔ لیکن کچھ لوگ یقیناً یہ جانتے تھے اور
اپنے منصوبے پہ عمل پیرا ہو گئے تھے۔ غالباً انہی لوگوں نے ایس پی
سے بھی رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ ایس پی کا رویہ اس بات
کا غماز ہے۔ میر محمد نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ ایس پی
صاحب کیا چاہتے ہیں۔ اعتراف جرم۔ تھانے میں بھی اور
باہر بھی۔ بصورت دیگر مجھے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ ایک
غیر جانبدار پولیس افسر یہ دھمکی کیوں دے گا؟"

"ہم ان سب سے نمٹ لیں گے۔" محسن نے کہا۔ "میں

www.paksociety.com

رابعہ قاری سے ملتا ہوں اور منظر سے بھی۔ صبح مجسٹریٹ کے سامنے پولیس تیرا جسمانی ریمانڈ حاصل کرنے کی کوشش کرے گی ہم جوڈیشل ریمانڈ پر زور دیں گے۔ پھر ضمانت کی درخواست داخل کریں گے اور چالان پیش ہونے تک صورت حال اور واضح ہو جائے گی۔ مقدمے کی باقاعدہ سماعت شروع ہونے پر ہم یہ سارے حقائق عدالت کے سامنے رکھیں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ قتل رات ایک بجے کے قریب ہوا ہے تو دس بجے چراغ دین کی کوٹھی کے شفٹ کار گھر میں واپس پہنچ چکا تھا اور اس کی گواہی سلامت شاہ دے گا۔ باقی معاملات وکیل سنبھال لیں گے۔"

"محسن! عدالت شخصی ضمانت مانگے گی اور نقد بھی۔۔۔"

میں نے متذبذب سے کہا۔ "تو کتنی رقم لایا ہے؟"

"پچاس ہزار۔" محسن نے کہا۔ "تیرے پاس کچھ ہے جو ہو سکتا ہے نقد پچاس ہزار کی ضرورت پڑے۔"

"میرے پاس ابھی تو کچھ نہیں۔ وہ چار ہزار گئے سلامت شاہ سے امید ہے کہ میری ماں کے پرانے زیورات بیچ کر دس ہزار ضرور دے گا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "ویسے کروڑوں کا مالک ہوں مگر اس وقت نہیں۔"

"اچھا تو فکر نہ کر۔ میں بابا سے بات کروں گا۔ ورنہ ایک اور ذریعہ بھی ہے۔ پہلے میں وکیلوں سے بات کروں۔" محسن نے کہا۔

"ان سے دو اور معاملات کی بات بھی کر لینا۔" میں نے کہا۔ "ایک یہ کہ مجھے وراثت کا سرٹیفکیٹ چاہیے۔ فوراً۔ جتنی جلدی ممکن ہو۔ اس سے مجھے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ میں کمپنی کے حسابات میں سے رقم نکلوا سکوں گا، دوسرا یہ کہ وہ لاکر کھول سکوں گا جس کی چابی سلامت شاہ کے پاس تھی اور اب میرے پاس ہے۔ اس لاکر میں بہت اہم دستاویزات ہو سکتی ہیں۔"

"اور دوسرا، بلکہ تیسرا مقصد؟" محسن نے کہا اور ایک سگریٹ جلا کے باقی پیکٹ مجھے تھما دیا۔

"تیسری درخواست کل ہی لگائی جا سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے شبہ ہے کہ میرے والد کی موت طبعی نہیں تھی۔ ان کو قتل کیا گیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ قبر کھود کے لاش نکالی جائے اور پوسٹ مارٹم کیا جائے۔"

محسن کا چہرہ فکر و تردد کا آئینہ بن گیا۔ "سوچ لے سکندر! یہ بہت۔۔۔ مشکل اور خطرناک کام ہے۔۔۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے اور میں نے بہت سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا ہے۔" میں نے کہا۔

حوالدار نے دوسری بار یاد دہانی کی کہ ملاقات کا وقت ختم ہونے لگا تھا۔ میں نے پتلون کی جیب سے لاکر کی چابی نکالی اور محسن کے ہاتھ پر رکھ دی۔ "یہ میں نے سلامت شاہ سے لے لی تھی۔ تجھے معلوم کرنا ہوگا کہ کس برانچ کا ہے۔ میرا خیال ہے قریب ہی کی برانچ ہوگی۔ بحفاظت اپنے پاس رکھنا یا وکیل کے پاس رکھوا دینا۔ رقم اپنے پاس رکھ۔ سلامت شاہ جو کچھ لائے گا وہ تجھے دے دے گا۔ اس سے پہلے تم کو ساتھ لے کر مستم بیڈن روڈ پر میرا ایک بہت پرانا اکاؤنٹ ہے میرے نام ہے۔ فریدہ بیگم کی برانچ حبیب بینک کی ہے جو میں نے اسی زمانے میں کھولا تھا جب۔۔۔ باجی مریم ہوئی تھی، بلکہ ہونے والی تھی۔"

"لیکن ہم تو شادی میں شریک نہیں ہوئے۔" وہ اداسی سے بولا۔

"ہاں ہم مارچ میں گئے تھے۔ شادی ستمبر میں ہوئی۔ سکندر بخت نام کے دو چار ہی اکاؤنٹ ہوں گے، جو تلاش کرنے سے کوئی مشکل نہیں۔ وہ اکاؤنٹ تیرے پاس رقم اس میں جمع کرا دینا تاکہ محفوظ رہے اور اس دوران سے بھی کوشش کر لینا۔" میں نے کہا۔

"دوسرا ذریعہ؟" اس نے خالی خالی نظروں سے دیکھا اور پھر چونک کر خفت سے مسکرایا۔ "ہاں۔۔۔ وہ میں کر لوں گا۔"

"محسن! شخصی ضمانت کا کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "بابا نے کیا کہا ہے؟"

"ایک ضامن تو خود بابا ہو گئے۔" محسن نے کہا۔ "دوسرے کا انتظام وہ یہاں آ کے کر لیں گے۔ وہ کل آ گئے تھے یعنی صبح۔ انہوں نے مجھے ایس ایس پی ضامن رضوی کا دیا تھا۔ یہاں آتے ہی میں نے ان سے بات کی۔ وہ تو بہت سخت بد معاش ہے۔ خود رضوی صاحب سے بات کر کے اور جھاڑ کھا کے سیدھا ہوا۔ اچھا اب میں چلتا۔" اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی جس پر صبح کے ساڑھے چار بجے تھے۔ "یہ سو روپے اپنے پاس رکھو اور یہ سگریٹ کا پیکٹ۔" اس نے نوٹ اور اپنے والد کا کارڈ مجھے تھما دیا۔ "ایسی کوئی بات ہو تو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اچھا وقت کم ہے، اب عدالت میں ملوں گا۔" وہ دروازے تک گیا اور واپس آیا۔ "ایک بات تو میں بھول ہی گیا۔ فون پر کہا ہے۔ ایسی کی تیسی۔ کہا گیا ہے یہ رقعہ دیا ہے۔" اس نے میرے ہاتھ میں تھما دیا اور نکل گیا۔ اس پر فیض کا ایک قطعہ لکھا ہوا تھا۔

عمر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا
چند روزہ خدائی تو کوئی بات نہیں
جدا ہیں آج اگر ہم تو کل بہم ہوں گے
یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں

جب حوالدار نے مجھے پھر ہتھکڑی لگائی تو مجھے یوں لگا جیسے یہ فولاد و آہن کی زنجیر گراں بار نہیں، کچے سوت کے دھاگے ہیں اور اب مجھ میں اتنی قوت ہے کہ در و دیوار زنداں اور طوق و سلاسل مجھے اس زندگی سے جدا نہیں کر سکتے جو میرا حق ہے۔ جو انصاف کی علامت ہے اور فوزیہ کی محبت ہے۔ میں اب اکیلا نہیں تھا۔ محسن تھا، مسٹر شیرازی ڈپٹی سیکرٹری، ایس ایس پی ضامن رضوی۔ میرے دو کلاس فیلو جو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے وکیل ہیں۔ رابعہ قاری اور عبدالودود منظر، سلامت شاہ کی گواہی۔ وہ سب رقم جو میری دسترس میں ہے، میرا دیرینہ ہیڈ کمپنی کا حق وراثت اور فوزیہ کا تجدید وفا۔ ایک پُر عذاب شب کی سحر ہونے تک میں کتنا طاقتور ہو چکا تھا۔ مجھے اپنے خلاف سازش کرنے والے اور ان کے زر خرید سب بہت حقیر اور بہت چھوٹے محسوس ہو رہے تھے۔

علی الصبح میں نے پچاس روپے کے عوض ناشتہ حاصل کیا۔ حوالات میں شب بھر کے درماندہ، وہ سب جو مراعات کا استحقاق خرید نہیں سکے تھے، نیم جاں لاتے جا رہے تھے اور ٹھنڈے فرش پر سسک رہے تھے۔ ڈکیتی میں ملوث ملزم لمبی تان کے سو رہا تھا اور بالکل بے فکر تھا۔ میں نے محسن کے دیے ہوئے سگریٹ پھونک پھونک کے صبح کی اور اپنے کان اور اپنی آنکھیں ان سب کا رُخ سے بند کر لیں جو میرے اردگرد ظالم و مظلوم کا فرق کوئی ثبوت کے بغیر ثابت کر رہے تھے۔ رات بے ملن کا اجالا حوالات کی ستم رسیدہ دنیا کے مکینوں پر بھی اترا اور نئی امیدوں کے ساتھ وہ دن شروع ہوا جس سے آنے والی رات کا دامن بندھا ہوا تھا۔ میری طرح اور بھی تھے جو عدالت کے روبرو پیش ہونے کی آس لگائے وقت گزار رہے تھے۔ پھر اچانک نمودار ہوا۔ اس وقت وہ قیص پتلون کی بجائے پولیس وردی میں تھا۔ اس نے حوالات کا رخ کیا اور میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"چلا گیا تمہارا وہ صحافی تیس مار خاں؟" وہ طنز سے بولا۔

میں نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور اس کی طرف دھواں چھوڑ دیا۔ "ابھی وہ تیس مار خاں ہے۔" میں نے کہا۔ "تیوں نمبر تمہارا ہے۔"

"سکندر بخت! اس نام کی کوئی بھی کا شکار مت رہنا۔" وہ آگ بگولا ہو کے بولا۔ "سکندر دنیا کو فتح کرنے نکلا تھا مگر جب دنیا سے گیا تو اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ میں ایک بار پھر ایس پی صاحب کا پیغام دینا چاہتا ہوں۔ تم اعتراف جرم کر لو گے تو تمہاری ہر ممکن مدد کی جائے گی اور تمہیں کم سے کم سزا ملے گی۔ جیل میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، بصورت دیگر تمہارا انجام برا ہوگا۔"

"تم اپنی کہہ چکے؟" میں نے کہا۔ "اب دفع ہو جاؤ اور اپنے اس ایس پی سے کہہ دو کہ یہی بات عدالت میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہے اور اگر کل کو خدانخواستہ تمہاری یا خود اس ایس پی کی نوکری نہ رہے تو میرے پاس آ جانا۔ میری ہیڈ کمپنی میں چپڑاسی رکھ لوں گا۔ سمجھے؟"

"سمجھ گیا۔" وہ خون آشام نظروں سے مجھے گھور کر بولا۔ "تم زندہ رہنا نہیں چاہتے۔" اور چٹ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد حشمت خاں نمودار ہوا اور میں نے ان کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سنی۔ نزاع کا سبب میرا بریف کیس تھا۔ ابھی یہ جھگڑا چل ہی رہا تھا کہ اسے ایس پی کی جیپ تھانے کے احاطے میں داخل ہوئی اور داخلی دروازے کا کانسٹیبل نے اسے پھر بجا کے زبردست سلیوٹ جھاڑا۔

www.paksociety.com

دس منٹ بعد مجھے اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ آج وہ وردی میں تھا مگر اس کی پُرسکون متانت میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ شاید یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ تفتیش کی شکست و ریخت کے آثار تو نہیں نظر نہیں آتے۔

"تو تم اپنے موقف پر قائم ہو۔" اس نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اس کے دونوں کنارے ٹھونکتے ہوئے کہا۔ یہ سوال نہ تھا بلکہ اظہار عدم اطمینان تھا۔ "کہ تم نے قتل نہیں کیا۔ کسی اور نے قتل کر کے تمہیں پھنسا دیا ہے۔۔؟"

"جی۔۔ اور اگر سب انسپکٹر میرا اس شخص کا نام پتا بتا دیں جو کل شام اندھیرا ہونے کے بعد ان سے ملنے آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "جو دائیں کان میں پیتل یا سونے کی مندری پہنے ہوئے تھا۔ گہرا سانولا رنگ۔ بھینی آنکھیں تلوار جیسی مونچھیں۔ بکھرے نیوں جیسے بال۔ کالی لال دھاریوں کی قمیص پہنے ہوئے۔ تو شاید یہ بھی معلوم ہو جائے کہ میرے خلاف سازش کرنے والے کون ہیں۔"

اے ایس پی طارق فیصل نے اسی پُرسکون انداز میں میر محمد کی طرف دیکھا۔ "یہ کون شخص تھا؟"

میر محمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے تو نہیں معلوم سر۔ نہ ہی سنا ہے میں نے اس کی زبان سے پہلی بار۔ مجھ سے کل تو کوئی ایسا آدمی نہیں ملنے آیا تھا۔"

"تم بکواس کرتے ہو جھوٹ بولتے ہو۔" میں نے بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے جس کی ٹیکسی کا نمبر میں تمہیں بتا چکا ہوں۔"

"تمہیں اس کی ٹیکسی کا نمبر کیسے معلوم ہوا؟" اے ایس پی نے کہا۔ "اور اس کے بعد کیا ہے۔۔؟"

"اس کے بعد اے بی سی ڈی۔ کچھ تھا جو مجھے یاد نہیں مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فور تھری فور تھری نمبر سیریز میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ آپ بخوبی جانتے ہوں گے کہ موٹر سائیکلوں کی اور پرائیویٹ کاروں کی سیریز الگ ہے کمرشل گاڑیوں میں بھی آپ کو صرف ٹیکسی دیکھنی ہے۔ بس یا ٹرک اور ویگن نہیں۔ لاہور میں شاید اس نمبر کی ایک ہی ٹیکسی ہو گی۔ وہ یا بالفرض محال چار بھی ہوں تو میں ان سب کے ڈرائیوروں کو دیکھ کر اندھیرے میں بھی بتا سکوں گا کہ وہ شخص کون ہے۔" میں نے کہا۔

"آل رائٹ۔ میر محمد۔ حلیہ اور نمبر لکھ لو۔"

"ایک منٹ سر۔" میر محمد نے سر پر یوں ہاتھ رکھا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ "اس نمبر سے مجھے شبہ ہوتا ہے شاید ہمارے پاس چوری کی ایک رپورٹ ہے۔" حالانکہ فائل کا حصہ نہیں تھا۔ "میں نے سنا تھا کہ چند روز پہلے اس نمبر کی ٹیکسی ہمارے علاقے میں چوری ہو گئی ہے۔ میں ابھی دیکھتا ہوں۔" وہ واقعی اچھا اداکار تھا۔ اسے شروع سے معلوم تھا کہ اس ٹیکسی کی چوری کی رپورٹ تھانے میں درج ہے مگر یہ بات اس نے مجھے نہیں بتائی۔ یہ ترپ کا پتا اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا تاکہ میری چال کو ناکام بنا سکے۔

"حشمت خان! تم نے سلامت شاہ کا بیان لیا؟" اے ایس پی نے میر شرافت علی کے قتل کی فائل دیکھتے ہوئے کہا۔ "ملزم نے اس کا حوالہ دیا تھا اور ملزم اس کے پاس ٹھہرا ہوا بھی تھا۔"

"وہ۔۔ دراصل سر۔ سلامت شاہ تو کل آیا تھا۔ میں نے اسے تاکید کی کہ صبح آ جائے اور آپ کے سامنے بیان دے۔" حشمت نے کہا۔

"کیوں؟ کیا تمہیں بیان لینا نہیں آتا؟" اے ایس پی نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا۔ "کتنی نوکری ہو گئی ہے تمہاری؟"

"سر تفتیشی افسر تو آپ ہیں۔" حشمت خان نے کہا۔ "اس بڈھے سے کہا تھا کہ وہ آٹھ بجے ہی سیدھا تھانے آ جائے۔"

"گڈ۔" اے ایس پی نے کہا۔ "اور کتنے بجے کھولتا ہے وہ اپنا۔۔ یہ پوچھا تھا تم نے؟"

حشمت نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ "میں نے اس سے کہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ سات بجے پہنچ جائے۔"

"اب کیا وقت ہوا ہے حشمت خان؟" اے ایس پی نے کہا اور فائل رکھ کے میر محمد کی طرف متوجہ ہو گیا جو خالی ہاتھ لوٹ آیا تھا۔

"وہ مجھے غلط فہمی ہوئی سر۔ کیس ہمارا نہیں تو کہاں کا ہے۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "میں پوچھتا ہوں۔" اس نے ٹیلی فون نمبر ملانا شروع کیا۔ حشمت خان نے مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک حوالدار اور ایک کانسٹیبل کو روانہ کر دیا تھا کہ اس خبیث بڈھے کو باندھ کر جوتے مارتے ہوئے اٹھا لائیں۔ باہر سے اس کی آتش فشانی کا تھوڑا سا شور اندر بھی پہنچ رہا تھا۔

میر محمد نے نمبر ملا کے کہا کہ اے ایس پی طارق فیصل بات کریں گے اور ریسیور آگے کر دیا۔ چند منٹ کی گفتگو کے بعد جو حقائق سامنے آئے وہ میرے اندازے سے مختلف نکلے۔ ٹیکسی کا اصل مالک ساٹھ سال کا ایک پابند صوم و صلوٰۃ بوڑھا تھا جو ظہر کے وقت نماز پڑھنے کی غرض سے ٹیکسی مسجد کے دروازے پر کھڑی کر گیا تھا مگر واپس آیا تو ٹیکسی غائب تھی۔ ٹیکسی کا ابھی تک سراغ نہیں ملا تھا۔

"اے ایس پی صاحب۔" میں نے ٹیلی فون کی گفتگو ختم ہوتے ہی کہا۔ "آپ خود بھی ایک ذہین پولیس افسر ہیں۔ اتنا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ٹیکسی کسی نے ایک واردات کے لیے چرائی تھی اور کل پرسوں تک کہیں لاوارث کھڑی ہوئی مل جائے گی۔ ایسا عموماً ہوتا ہے۔ میں اس ٹیکسی کے مالک کی نہیں اس شخص کی بات کر رہا ہوں جو ٹیکسی چلا رہا تھا جس کا حلیہ میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔"

اے ایس پی نے ایک دم اٹھ کے میرے منہ پر تھپڑ رسید کیا اور پھر فوراً بیٹھ گیا۔ "تم پڑھے لکھے اور چالاک آدمی ہو۔ واقعات ہی نہیں کردار بھی بنا لیتے ہو۔ اسی خوش فہمی کے باعث کہ اس طرح تفتیش کو غلط رخ پر ڈالا جا سکتا ہے۔"

"غلط رخ؟" میں نے طنز سے کہا۔ "تفتیش کا صرف ایک رخ ہوتا ہے اور اس کا مکمل مظاہرہ کل رات سے بعد آپ نے ابھی ابھی کیا ہے۔"

"اگر تم چاہو تو ایس ایس پی ضامن زمخشری کو بتا سکتے ہو کہ میں نے تمہیں تھپڑ مارا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے یہ تھپڑ تم نے خود اپنے منہ پر مارا ہے۔ یہ تمہاری بے بسی کا مظہر ہے کیونکہ کل کے اور آج کے سکندر بخت میں بہت فرق ہے۔ آج تم سکندر بخت کا منہ بند نہیں کر سکتے کیونکہ وہ لاوارث نہیں۔ میری پیروی کے لیے دو بہت بڑے وکیل پیش ہوں گے۔ رابعہ قاری اور عبدالودود منظر۔ وہ پچاس ہزار تک نقد ضمانت داخل کر سکیں گے اور شخصی ضمانت دینے والا ایک تو ہو گا ڈپٹی سیکرٹری حکومت پاکستان۔ دوسرا ضامن شاید اس سے بھی بڑا ہو۔ سلامت شاہ کے بیان کے بعد کیس کتنے دن چلے گا لیکن پھر اور کیس چلیں گے جن کی تفصیل میں فی الحال نہیں بتاؤں گا۔"

"یو باسٹرڈ۔" اے ایس پی نے چیخ کر کہا۔ "تم دھمکی دے رہے ہو مجھے؟ کیا کر لو گے تم؟ ہتک عزت کا، حبس بے جا کا، ذہنی و جسمانی اذیت کے مر جانے کا دعویٰ؟ مجھے نوکری سے نکلوا دو گے؟ جیل بھجوا دو گے؟ مائی فٹ۔ تم ہو کیا؟"

"میں کیا ہوں، وزیر اینڈ ٹیکسی کا مالک ہوں جس میں تمہارے برابر تنخواہ پانے والے بد بات میں یاد رکھو فرق ہے۔" میں نے غرور سے کہا۔

اے ایس پی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اسے یوں ذلیل کر کے مجھے بڑی تسکین ملی۔ گزشتہ چوبیس گھنٹوں کے دوران جتنی ذلت اور بے آبروئی میں نے برداشت کی تھی۔ یہ اس کے عشر عشیر کا عشر عشیر بھی نہیں تھی مگر تسکین اس احساس میں تھی کہ وقت کی بساط پر میں اب کوئی بے حیثیت پیادہ نہیں ہوں۔ حشمت خان نے واپس آ کے مطلع کیا کہ سلامت شاہ بہت جلد حاضر کر دیا جائے گا مگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ "میر محمد۔" اے ایس پی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم ملزم کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرو اور اس کا چودہ دن کے لیے جسمانی ریمانڈ حاصل کرو۔ اس وقت تک تفتیش مکمل ہو گئی تو چالان پیش کر دیا جائے گا ورنہ ریمانڈ مزید چودہ دن کے لیے بڑھایا جا سکتا ہے۔"

"جناب اے ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "کل گرفتاری کے وقت میرے پاس ایک بریف کیس تھا جس میں پانچ ہزار روپے نقد تھے۔"

"پانچ ہزار۔" حشمت خان نے غیر ارادی طور پر کہا اور پلکیں جھپکا کے مجھے دیکھا۔

"ہاں۔" میں مسکرایا۔ "مگر شام تک میں سات سو روپے خرچ کر چکا تھا۔ چنانچہ اس میں چار ہزار تین سو بچے تھے۔ اس میں میرا پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات کپڑے اور سامان ضرورت تھا۔ یہ بریف کیس آپ کے سب انسپکٹر حشمت خان نے مجھ سے امانت خانے میں رکھوانے کے لیے لیا تھا۔ مجھے یہ بریف کیس کسی تحریری درخواست کے بغیر ہی واپس دیا جائے گا یا اس کے لیے بھی عدالت سے رجوع کرنا ہو گا؟"

"واٹ نان سنس؟" اے ایس پی نے کہا۔ "یہاں کوئی امانت خانہ نہیں ہوتا۔ امانت خانے کی کوئی رسید ملی تھی؟"

"نہیں۔ مگر آپ کے انسپکٹر حشمت خان نے تو کہا تھا کہ ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے بریف کیس اسی کے حوالے کیا تھا۔"

"حشمت خان۔" اے ایس پی نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ "یہ کیا چکر ہے؟"

"بریف کیس۔۔ وہ۔۔ میرا خیال ہے۔۔" حشمت خان نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "تھا تو سہی ان کے پاس جب میں گیا تو یہاں میز پر رکھا تھا۔"

میر محمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب میں نے چارج لیا تو میز پر ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔"

www.paksociety.com

"تم تسلیم کرتے ہو حشمت خاں کہ بریف کیس ان کے پاس تھا۔" اے ایس پی نے کہا۔ "اور ملزم لاک اپ میں تھا؟"
"یس... یس سر" حشمت خاں کو لبوں سے نکل جانے والے غلط لفظ پر افسوس ہو رہا تھا اس کے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل تھا کہ میں شام تک اس کے کمرے میں بیٹھا رہا تھا میں نے وہیں کھانا کھایا اور کھلایا تھا۔ وہیں سے فون کیے تھے اور سلامت شاہ بھی وہیں ملا تھا۔
"حشمت خاں۔ دیکھو وہ بریف کیس کہاں ہے۔" اے ایس پی نے مختصراً کہا۔
"بریف کیس کہاں جائے گا سر" حشمت خاں نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر یہ دس کہتے تو ہم دس بریف کیس ان کو دیدیتے۔" مطلب صاف ظاہر تھا۔ اپنی پوزیشن بچانے کے لیے مجھے نیا بریف کیس خرید کے دینا بھی کیا مشکل تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس ہزاروں کی رقم میں سے دو سو خرچ ہو جاتے۔ تھانے میں بہر صورت حشمت خاں رہتا۔ باہر سے ایک کار کے رکنے اور پھر دروازے کھلنے بند ہونے کی آواز آئی۔ چند منٹ بعد دروازے کی چق ہلی اور ایک عورت اندر آگئی۔ اس نے سفید شلوار قمیص پر سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا اور سنہرے فریم کی نازک سی عینک لگا رکھی تھی۔ وہ تیس سال کی بھرپور عورت تھی جس کے بدن کی اٹھان اس کاروباری قسم کے غیر دلکش لباس میں بھی نمایاں تھی۔ اس کا قد ساڑھے پانچ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا تھا۔ صحت مند چہرہ میک اپ کے بغیر بھی حسین تھا بے داغ رخسار کی جلد اتنی صاف اور ریشمی تھی کہ حسن افزا صابن بنانے والے اسے بخوشی اپنے اشتہار میں پیش کر سکتے تھے۔ غیر معمولی طور پر سیاہ روشن آنکھیں اس کے چہرے کی مناسبت سے کچھ بڑی تھیں مگر اس کے کندھوں تک پہنچ کے ختم ہو جانے والے سرسراتے چمکیلے کالے بالوں سے بہت میچ کرتی تھیں۔ میری یادداشت سے اس عورت کے نقوش مٹ چکے تھے مگر اس کے پیچھے محسن کو آتے دیکھ کر میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ رابعہ تاری ہے۔ اے ایس پی سمیت تھانے کا تمام عملہ یکلخت چوکنا ہو گیا۔
"رابعہ تاری" میں نے مسرت سے کہا۔ یوں لگا جیسے میرے اور اس کے تعلقات بے تکلفانہ ہیں۔ اس حد تک کہ میں اس کو مس یا مسز کہنے کا تکلف بھی نہیں کرتا جب کہ حقیقت یہ تھی کہ مجھے اس کے شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونے کے بارے میں بھی معلوم نہیں تھا اور نہ یہ کہ تاری اس کا باپ تھا یا شوہر ہے۔

"سکندر بخت" اس نے عینک ہٹا کے کہا۔ "تم نے پہچان لیا مجھے رنال کوارٹرز والے۔ تم کلاس میں مانیٹر ہوتے تھے اور سب سے زیادہ رعب مجھ پر جھاڑتے تھے" اس کے لہجے میں اعتماد تھا اور یگانگت کی خوش دلی تھی۔ محسن کا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا۔ میں ہنس پڑا۔ "اچھا! مجھے یاد تو نہیں لیکن اگر تم کہتی ہو تو اب سوری۔ شہزادوں کا انجام دیکھ لو" میں نے بندھے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھائے۔
"ویلیم پاٹ" وہ بولی "یہ سب ٹھیک ہو جائے گا کل تک" پھر وہ ایس پی سے مخاطب ہوئی۔ "طارق جمیل صاحب۔ آپ اس کیس کی تفتیش کر رہے ہیں آپ کے علم میں ہو گا کہ ملزم کی گرفتاری کو چوبیس گھنٹے سے زائد ہو گئے ہیں۔ مجسٹریٹ کے سامنے کیس کیوں نہیں پیش ہوا؟"
"ایف آئی آر میں کیا وقت لکھا ہے میرے" طارق جمیل نے سکون سے کہا۔ "وکیل صاحبہ کے سوال کا جواب دو۔"
"ابھی چوبیس گھنٹے نہیں ہوئے سر" میر محمد نے کہا۔ "گرفتاری رات کو عمل میں آئی تھی۔ بارہ بجے کا اندراج ہے ایف آئی آر میں۔"
"انسپکٹر حشمت۔ تم نے رپورٹ میں یہ تو یقیناً لکھا کہ ملزم کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ ریل کار سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔" رابعہ نے اپنی چھوٹی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "اس وقت ساڑھے نو ہو رہے ہیں۔"
"ریل کار کا میں نے ذکر کیا ہے" حشمت خاں نے کہا۔ "پلیٹ فارم نمبر کا حوالہ بھی ہے۔"
"ویری بیڈ" رابعہ نے اے ایس پی کی طرف دیکھا۔ "میر محمد آپ کے سامنے جھوٹ بولتا ہے۔ اے ایس پی صاحب! ایک ریل کار صبح جاتی ہے جس کے حساب سے چوبیس گھنٹے ہو چکے۔ دوسری دوپہر کے بعد جاتی ہے جو ایف آئی آر کے اندراج کے مطابق بعد میں گئی۔ اب آپ ملزم کو فوراً مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیں۔ ورنہ ہم حبس بے جا کا دعویٰ کرتے ہیں۔" اس نے بریف کیس میز پر رکھ کے کھولا۔ ایک کاغذ نکالا۔ "سکندر یہ وکالت نامہ ہے۔ دستخط کرو۔" اس نے مجھے اپنا قلم پکڑایا اور میں نے جھک کر بدقت تمام وکالت نامے پر اپنے دستخط ثبت کر دیے۔
حشمت خاں کا رنگ اڑ گیا تھا اور اے ایس پی یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ دنیا کا سب سے بڑا احمق ہے جہاں تک کسی مرحلے پر ان کے لیے یہ وضاحت مشکل ہو گی کہ ملزم کو صبح گرفتار کیا گیا تھا تو ایف آئی آر میں دوپہر کا وقت کیوں ہے۔ رابعہ نے وکالت نامے کو فائل میں لگایا اور

فائل پھر بریف کیس میں رکھ لی۔ "دوسرے وکالت نامے پر مجسٹریٹ کے سامنے دستخط کر دینا۔" وہ بولی۔ "منظر صاحب تمہاری طرف سے ضمانت کی درخواست دائر کر رہے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے سامنے پیش کر دی جائے گی۔ محسن رضا نے مجھے خاص معلومات فراہم کر دی ہیں جو کیس کے لیے اس مرحلے پر کافی ہیں۔ باقی تفصیلات بعد میں۔ اب میں چلتی ہوں۔ اے ایس پی صاحب آپ کتنی دیر میں علاقہ مجسٹریٹ کے پاس پہنچ رہے ہیں؟"
"میں تو شاید آؤں مس تاری" طارق جمیل نے شائستگی سے کہا۔ "میر محمد ایک گھنٹے تک ملزم کو لے آئے گا۔"
رابعہ نے اطمینان سے سر ہلایا۔ مسکرا کے میری طرف دیکھا اور ساتھ ہاتھ ہلا کے باہر نکل گئی۔ "یہ تو بالکل تمہیں بدل چکی ہے" میں نے محسن سے مخاطب ہو کے کہا۔
"مگر وہ منظر تو بالکل گینڈا ہو گیا ہے" محسن نے کہا "منظر اینڈ کمپنی بنائی ہے۔ مجھے ماتحت وکیل ہیں اور کچھ بچے بھی ہیں اس کے۔ مگر درخواست ضمانت کی پیروی کرنے وہ خود آئے گا۔"
عین روانگی سے قبل سلامت شاہ کو لانی چیک کر کے لانے والی پولیس پارٹی لوٹ آئی اور اس حوالدار نے جو گزشتہ روز میری گرفتاری میں پیش پیش تھا اسے مشن کی ناکامی کا اعلان کیا۔ "وہ... صبح صبح تالا مار کے کہیں بھاگ گیا ہے۔ چراغ دین کو بھی معلوم نہیں جس کے پاس وہ کام کرتا ہے۔"
"اس سے ہم نمٹ لیں گے" انسپکٹر حشمت خاں نے فلمی ولن کی طرح کہا۔ "بچ کے کہاں جائے گا۔ تم دیکھو ملزم کا بریف کیس کہاں ہے۔ اے ایس پی صاحب کا حکم ہے کہ فوراً لایا جائے۔" اس نے لفظ حکم پر زور دے کر کہا۔ حوالدار نے مجھ پر ایک نگاہ قہر و غضب ڈالی اور چند منٹ بعد بریف کیس لیے نمودار ہوا۔ بریف کیس کو اس نے برآمد ہونے والے مال مسروقہ کی طرح سب کے درمیان میز پر رکھ دیا۔
"پہلے پہچان لیجیے یہی ہے آپ کا بریف کیس؟" اے ایس پی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"بظاہر تو میرا ہی ہے" میں نے کہا۔ "لیکن کھول کر دیکھے بغیر یقین سے کیسے کہہ سکتا ہوں۔ بازار میں ایسے بریف کیس عام ہیں۔"
بریف کیس میں سب کچھ تھا سوائے نقد رقم کے۔ "اس میں چار ہزار تین سو روپے کم ہیں۔" میں نے کہا۔ "حساب تو لیجئے۔"
"تم نے بہت بڑے وکیل کیے ہیں" اے ایس پی نے چلتے چلتے کہا۔ "اگر وہ عدالت کے سامنے اس رقم کی موجودگی بھی ثابت کر سکے تو میں یہ رقم خود ادا کروں گا! وہیں چیک کاٹ کے دوں گا تمہیں۔"
"یہ جذبہ قابل قدر ہے" میں نے کہا۔ "لیکن عدالت شاید پوچھے کہ ایک نئے اے ایس پی نے اتنی کم مدت ملازمت میں اتنا پیس انداز کر لیا تو تنخواہ سے سینتالیس ہزار مجھے دے کر تم جیل کے چکر میں آ جاؤ گے۔ اس لیے میں یہ پیشکش مسترد کرتا ہوں۔"
مجسٹریٹ کے سامنے میری پیشی کا جلوس تین ٹیکسیوں میں روانہ ہوا۔ پہلی ٹیکسی میں دونوں انسپکٹر ان کے ساتھ ملزم یعنی یہ خاکسار تھا اور ایک مسلح سپاہی تھا جس نے ہتھکڑی کو اپنی بیلٹ سے باندھ رکھا تھا۔ دوسری ٹیکسی محسن رضا نے کی تھی۔ اس میں حوالدار کے ساتھ ایک اور کانسٹیبل بھی بیٹھ گیا تو محسن اتر گیا اور اس نے تیسری ٹیکسی کر لی۔ محسن رضا ساری رات جاگا تھا اور معلوم نہیں اس نے ناشتہ بھی کیا تھا یا ایسے ہی کھائے پیے بغیر بھاگ دوڑ میں مصروف تھا۔ تھکن یا ذہنی کشیدگی کے آثار اس کی صورت سے ہویدا تھے۔ چار پانچ گھنٹوں میں اس نے دونوں وکیلوں سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔ شاید اسے منہ اندھیرے ہی دونوں کے گھر جانا پڑا ہو گا۔ پرانی دوستی کے نام پر یا بعد میں منہ مانگا معاوضہ ادا کرنے کے وعدے پر اس نے دونوں وکیلوں کو تیار کر لیا ہو گا کہ وہ میرے کیس پر فوری توجہ دیں۔ اسی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ رابعہ پولیس اسٹیشن آ پہنچی تھی اور منظر نے گیارہ بجے تک ضمانت کی درخواست سیشن کورٹ میں پیش کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔
"ملزم سکندر بخت" انسپکٹر حشمت خاں نے ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہی تمسخر آلود لہجے میں کہا۔ "اے ایس پی صاحب کے سامنے تم نے پانچ ہزار روپے کا مسئلہ اٹھا کے اچھا نہیں کیا۔"
"مسئلہ چار ہزار تین سو کا تھا" میں نے کہا۔ "سات سو تو خرچ ہو گئے تھے۔ خرچ کی نوعیت میں نے کہاں بتائی؟"
"تم اے ایس پی کو گدھا سمجھتے ہو؟" حشمت خاں برافروختہ ہو کے بولا۔ "ملزم حوالات میں بند ہو سات سو روپے کہاں خرچ کر سکتا ہے۔ اس شکایت کا انعام ہم تمہیں واپسی پر دیں گے۔ آج رات بھی تو تم ہمارے مہمان رہو گے۔"

www.paksociety.com

"آج ہی کیوں نہیں؟ پہلا ریمانڈ مہینے بھر کا ضرور ملے گا۔ چودہ دن کا اور پھر مزید چودہ دن کا۔ اس عرصہ میں آٹھ میں تیج بولنا آجائے گا۔ تمہارے ایسے بڑے وکیل تمہاری مدد نہیں کر سکیں گے سکندر بادشاہ۔"

"ہم نے بڑے بڑے طرم خاں دیکھے ہیں۔ چالان پیش ہونے تک ان کا سارا کس بل نکل جاتا ہے۔" حشمت خاں نے کہا۔ "اور چالان کا کیا ہے۔ ہم دو دو سال پیش نہیں کر پاتے۔ تفتیش ہوتی رہتی ہے۔ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل کاٹتے رہو گے۔"

"سال سال تو ہم حاضری نہیں دیتے۔" میر محمد نے غرور سے کہا۔ "عدالت سمن جاری کرتی رہتی ہے جو وصول نہیں ہوتے۔ پھر وارنٹ نکال دیتی ہے جو دو چار مہینے بعد ناقابل ضمانت ہو جائیں تو ہم ایک پیشی بھگت لیتے ہیں کہ تفتیش مکمل نہیں ہوئی۔"

"اس خوش فہمی میں مبتلا نہ رہنا کہ تمہاری ضمانت ہو جائے گی۔" حشمت خاں نے کہا۔

"یہ تم دونوں کیا قوالی گا رہے ہو۔" میں نے تنگ آکے کہا۔ "دیکھو ٹیکسی والے نے کیا حسب حال شعر لکھا ہے۔

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے"

ضلع کچہری کے پر ہجوم احاطے میں تینوں ٹیکسیاں آگے پیچھے رک گئیں۔ زیر سماعت مقدمات میں پیش ہونے والے ملزموں کے گواہوں، ضمانتیوں، وکیلوں اور خیر خواہوں کا ہر عدالت کے سامنے اژدہام تھا۔ ان سب نے صرف ایک بار مجھے دلچسپی سے دیکھا اور پھر بے نیاز ہو گئے جو اس ماحول کے عادی تھے ان کے لیے ایک اور زنجیر بدست ملزم کی تشریف آوری کوئی واقعہ ہی نہ تھی۔ باقی لوگوں کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ مجھے برآمدے میں چھوڑ کے انسپکٹروں کی جوڑی عدالت کے آفس میں داخل ہو گئی۔ محسن نے ریڈر سے معلوم کیا اور پانچ روپے کے عوض اس نے یہ اطلاع فراہم کر دی کہ مس رابعہ قاری ساڑھے گیارہ کا ٹائم لکھوا گئی ہیں۔ میرے محافظ سخت بیزار کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"یار محسن۔" میں نے کہا۔ "یہ سلامت شاہ نہیں آیا ابھی تک۔"

"آجائے گا۔" محسن نے جھکتے ہوئے لہجے میں کہا اور دو سگریٹ جلانے لگا۔ ایک اس نے میرے منہ میں لگا دی۔ "آج کون سی گواہی ہے اس کی۔"

"یہ بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ [illegible] دین کو بتا سکے لٹیرا کہاں گیا ہوگا۔ اسے میری ماں کا وہ [illegible] پہچانا تھا جو میرے باپ نے اس بڑے صندوق میں چھپا [illegible]"

"اتنی جیج ستاروں کی دکانیں کہاں کھلتی ہیں۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سونا لینے ہی کوئی خریدے [illegible] نے کہا۔ "پرانا سونا ہے جس میں کھوٹ نہیں ہوتا تھا [illegible] تو ایک آنہ دو آنہ بیٹیوں کا جہیز بنوانے والے شوق سے خریدتے ہیں۔ سنار جوائی اور گلائی وغیرہ کے حساب [illegible] رقم کاٹ لیتے ہیں۔"

"پھر پریشانی کی کیا بات ہے۔" محسن نے کہا۔ "اچھا ہے اگر زیادہ پیسے مل جائیں۔"

"یار تو سمجھتا کیوں نہیں۔ سلامت شاہ کو تھانے [illegible] تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ بعد میں پہنچا تو وہاں جو لوگ بیٹھے [illegible] وہ اس کو دس جوتے مار کے فارغ کر دیں گے۔ اور پھر اس کا وہی انجام ہوگا جو میری بریف کیس والی رقم کا ہوا۔"

محسن کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا [illegible] اور پھر وہ بھی غائب ہو گیا۔ دس منٹ بعد وہ پھر نمودار ہوا [illegible] نے تھانے فون کیا ہے کہ سلامت شاہ آئے تو اسے یہاں بھیج دیا جائے۔" میں نے کہا۔ [illegible] کی نقل کی تھی جو کامیاب رہی۔" میں نے واقعات نکال کے کہا۔

دونوں انسپکٹر ایک طرف سے منظر اور رابعہ قاری دوسری طرف سے نمودار ہوئے۔ سعید الودود منظر کلاس میں میرا [illegible] دوست تھا اور تقدیر مشترک تھی ہم دونوں کی چلبلی طبیعت جس سے سب عاجز تھے مگر ہماری متحدہ قوت کے سامنے کم کی نہ چلتی تھی۔ جب ہم لڑتے تھے تو میرا پلڑا بھاری رہتا تھا۔ چنانچہ ہمارے درمیان طاقت اور سرمائے کے استعمال کا ایک ایسا معاہدہ طے پا گیا تھا جس میں دونوں کا فائدہ تھا۔ وہ [illegible] ان باپ کا بیٹا تھا اور میری عیاشی کے اخراجات بھی برداشت کر سکتا تھا۔ (عیاشی یعنی کھانا پینا، تفریح، چائے اور سینما) [illegible] مانیٹر تھا اور جسمانی طور پر اس کی حفاظت کے علاوہ وہ اس کے دشمنوں کی گوشمالی کر سکتا تھا۔ اور میں نے اسے نالائقی کے باوجود سیکنڈ مانیٹر بھی بنوا لیا تھا۔ بچپن کی یہ سیاست اب مجھے عملی زندگی میں ہر قدم پر کار فرما نظر آتی تھی مگر اب واقعی بہت پھیل گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے حلق سے خاص وحشیانہ [illegible] نکالی۔ "ابے سکندر، مانیٹر کی دم۔" پھر اس نے قہقہے کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "یہ کیا روتی شکل بنا رکھی ہے۔ [illegible]

کر دیا ہے۔ پھر کیا ہوا قتل ہر روز ہی کرتے ہیں۔ [illegible] کے بیٹے تو تمہیں بچایا تھا۔ اب دیکھو ہم احسان کا بدلہ کیسے چکاتے ہیں۔" محسن اور رابعہ پاس کھڑے مسکراتے رہے۔ میر محمد اور حشمت خاں اپنی متانت اور دبدبے کو برقرار رکھنے کی بے سود کوشش میں مصروف رہے۔ عدالت میں جانے سے پہلے منظر نے وکالت نامے پر میرے دستخط لیے۔

بڑے وکیلوں کی موجودگی چھوٹی عدالت میں کیا نفسیاتی اثر ڈالتی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے پیشی کے بعد ہوا۔ ان کے مقابل بھی ایک وکیل ہی تھا مگر وہ پراسیکیوشن سب انسپکٹر ہونے کے باعث اسے اپنی بدبختی سمجھتا تھا کہ وہ پولیس کے ساتھ ہے اس نے واجبی سے دلائل دیے جو رابعہ اور منظر نے چٹکیوں میں اڑا دیے۔ پی ایس آئی میں برابر کا مقابلہ کرنے کی نہ ہمت تھی اور نہ وہ اس کی ضرورت محسوس کرتا تھا کیونکہ حکومت اسے تنخواہ دیتی تھی فیس نہیں۔ میر محمد اور حشمت خاں پیچ و تاب کھاتے رہے اور خون کے گھونٹ پیتے رہے کیونکہ میں نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ حوالات میں مجھ پر کس قسم کا غیر انسانی تشدد کیا گیا تھا کس طرح میری رقم خرد برد کر لی گئی تھی اور مجھے کیسی دھمکیاں دی گئی تھیں۔ میر محمد نے ان الزامات کی صحت سے انکار کیا اور میرے وکیلوں نے کہا کہ ثبوت ناکافی ہونے کے باعث ان تمام الزامات کے تحت ہم کسی قسم کی قانونی کارروائی کا ارادہ تو نہیں رکھتے مگر ان حالات میں ملزم کو پولیس کے ریمانڈ پر رکھنا ظلم ہوگا اور اگر ایسا کیا گیا تو اس کے خلاف سیشن کورٹ کے بعد ہائی کورٹ میں بھی درخواست ضرور دی جائے گی۔ نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا اور مجسٹریٹ نے مجھے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا بریف کیس محسن کے حوالے کر دیا گیا۔

"مجھے افسوس ہے انسپکٹر میر اور حشمت خاں کو تمہیں مایوسی ہوئی اور آج تمہیں میری میزبانی کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔" میں نے باہر آتے ہی کہا۔ "انشاء اللہ کل پرسوں تک میری ضمانت کے بعد تمہاری وہ سب قوالی بکواس ہو جائے گی جو تم نے رٹ رکھی تھی۔"

"ابے چھوڑ۔ ان کے منہ مت لگ۔" منظر نے فوراً مداخلت کی۔ "مجھ سے بات کر۔ تیری ضمانت کی درخواست کا وقت ساڑھے بارہ بجے ہے۔ انشاء اللہ آج ہی ایس پی کو نوٹس جاری ہو جائے گا۔ آج کی رات ذرا جیل دیکھ آ۔ کل سماعت ہوگی اور اس کے بعد ضمانت۔ محسن نے سب انتظام کر لیا ہے۔"

"درخواست میں کیا لکھا ہے منظر؟" میں نے کہا۔

"ایک دو دن کا ایک جھانسہ ہے۔ یہ وکیلوں کے معاملات ہیں۔ ہم پر چھوڑ دے۔" منظر بولا۔ "مختصراً بتا دیتا ہوں۔ بنیاد تیرے خلاف ایک سازش کو بنایا گیا ہے جس کا مقصد تجھے سزائے موت یا عمر قید دلانا ہے اور ناکامی کی صورت میں قتل کر دینا ہے اور اس ضمن میں مختلف واقعات کا حوالہ ہے جو لندن میں پیش آئے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ تیرے والد کو جیل کے بعد قتل کیا گیا اور یہ بھی انہی سازشی عناصر کی کارروائی تھی جو ہنوز روپوش ہیں اور اس ضمن میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ لاش کو نکلوا کے پوسٹ مارٹم کرانے کی درخواست الگ سے ڈی ایم کی عدالت میں پیش کی جا رہی ہے۔ تیسرا نکتہ سلامت شاہ کی گواہی کا ہے جو سب سے اہم ہے اور جس کے مطابق واردات کے وقت تیرا جائے واردات سے بہت دور ہونا ثابت ہوتا ہے۔"

"منظر صاحب، یہ سب مفروضات ہیں۔" میر محمد نے مداخلت کی۔

"یار تھانیدار بادشاہ۔" منظر نے پلٹ کر کہا۔ "تم دخل در معقولات مت کرو۔ مجھے تمہیں کیا معلوم کیا ہوگا کیا نہیں۔ اگر ابھی خواہ مخواہ تمہارے خلاف تشدد، حبس بے جا، غبن اور اختیارات کے ناجائز استعمال کی عدالتی تحقیقات کا چکر چل گیا تو لائن حاضر ہو گے۔ کیا فائدہ اس تھانیداری سے بھی جاؤ گے۔ جاؤ عیش کرو۔" اس کے بعد ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا۔ منظر مجھے اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں بتاتا رہا۔ خصوصاً اپنی بیوی کے بارے میں جو بقول اس کے شادی سے پہلے مغل حسینہ تھی تو اب تجریدی آرٹ کا نمونہ۔ "غضب خدا کا یار۔ شادی کو ہوئے ہیں صرف پانچ سال۔ پہلے جوڑی لڑکوں کی۔ پھر دو لڑکیاں۔ پچھلے سال ڈبل لڑکے۔ حجم میں اور وزن میں میری برابری پر آمادہ ہے چنانچہ مستقبل سخت مخدوش ہے۔ میں تو سوچ سوچ کے ہلکان ہوتا ہوں۔ بیویاں شادی کے بعد بیس بیس سال تو ساتھ نبھا ہی جاتی ہیں۔" محسن بیکا اور رابعہ جلتے رہے۔ "ہنستے ہو؟ کچھ شرم کرو یار۔ [illegible] کوئی پوچھتا نہیں۔ ارے بھائی آپس میں ہی ٹائس کر دو اچھی خاصی فلمی سچویشن ہے۔ ہیرو، ہیروئن، ولن۔"

ساڑھے بارہ بجے سیشن جج کی عدالت میں میری پیشی ایک رسمی کارروائی تھی جس کے بعد ایس پی کو نوٹس جاری کرنے کے احکامات صادر ہو گئے اور جیل سے سماعت کے لیے ملزموں کو لے کر آنے والی گاڑی مجھے بھی لے کر روانہ ہو گئی۔ محسن نے کہا کہ وہ سلامت شاہ سے رابطہ قائم کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ شام کو اسے اپنے پاپا سے بھی ایئرپورٹ پر ملنا تھا اور پھر دوسرے

www.paksociety.com

شامل کا انتظام کرنا تھا۔ میں نے اسے پھر یاد دلایا کہ اس نے ایک اور ذریعے سے رقم کی فراہمی کا ذکر بھی کیا تھا۔ نہ جانے کیوں پھر محسن کا چہرہ اتر گیا اور اس نے صرف اقرار میں سر ہلا دیا۔ اس سے اگلے دن صبح عدالت میں ہی ملاقات کا امکان تھا مگر رابعہ نے کہا کہ وہ شام کو مجھ سے جیل میں ملے گی۔ اور اس پورے کیس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرے گی۔

پھر دلیو کٹل بس ٹائپ ٹرک کا آہنی دروازہ بند ہو گیا جس کے باہر دو مسلح سپاہی پرسکون انداز میں بیٹھے تھے اور پھر دوسرا دروازہ تھا۔ اس ڈبے میں بیس کے قریب قیدی بھر دیے گئے تھے اور گرمی سے سب کا برا حال تھا۔ ہوا کا راستہ ان آہنی جالیوں کے سوا کہیں نہ تھا جو آٹھ فٹ لمبے چھ فٹ چوڑے اور مشکل سے پانچ فٹ اونچے ڈبے کی چھت کے ساتھ ساتھ چند انچ چوڑے روشندانوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ اگر قیدیوں نے دم گھٹ کے مر جانے کا ڈر نہ ہوتا تو شاید اتنی تکلیف بھی محسوس نہ کی جاتی۔ جب دروازہ کھلا اور لاری سے باہر آکے میں نے کھلی ہوا میں سانس لیا اور کمر سیدھی کر کے دیکھا تو مجھے جیل کا احاطہ دکھائی دیا۔ وقتی طور پر تھا مشکل عقوبت گاہ کے مقابلہ میں یہ پناہ گاہ مزید تھی مگر فوری طور پر جو خیال مجھے آیا وہ کم لرزہ خیز نہ تھا۔ کون جانے اس جیل ہی میں کسی صبح سورج کے طلوع ہونے سے قبل تختہ دار پہ میری زندگی کا سفر تمام ہو اور میری لاش اندھے کنویں سے نکال کے محسن رضا کے حوالے کر دی جائے۔ کہ صف دشمناں کو خبر کر دو میرے چارہ گر کو نوید ہو۔ اور فوزیہ سے کہو کہ وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ بھی قرض آج چکا دیا۔ اور یہ بھی نہ ہوا تو ایک عذاب ہی دیواروں کے بے رحم حصار میں گذر جائے۔ وہ عمر جو زندگی کا سب سے گریز پا لمحہ تھی اور جس کا ایک ایک لمحہ خواہشات کا خزینہ تھا خواہش ستاروں کو پکڑ ڈالنے کی خواہش خوشبوئے گل کو زیرِ دام کر لینے کی۔ خواہش قوس قزح کے رنگ سمیٹ لینے کی جیسے وفا خواہش جو صرف جوانی دل میں گھر کرتی ہے اس عمر کے گذر جانے کے بعد کہاں ہوگی کسی اور دل میں جیسے فوزیہ کسی اجنبی گھر میں ہوگی اس گھر سے بالکل مختلف گھر میں جس کی حسرت تعمیر ہمارے خواب عشق کا حاصل تھی میں نے دل ہی دل میں خدا سے پناہ مانگی پناہ ان خیالات کی یلغار سے۔ پناہ اندیشوں سے اور وسوسوں سے جو مجھے تنہا پاتے ہی شیاطین کے لشکر کی طرح مجھ پر یلغار کریں گے۔ مجھے سکون دے۔ یقین دے اور استقامت دے میرے معبود!

شام کو رابعہ جب میں جیل کی روٹی کا ذائقہ چکھ کے سوچ رہا تھا کہ ابھی سورج کو آسمان کی کتنی مسافت طے کرنی ہے اور کل کا دن کتنی صدیوں کے فاصلے پر ہے مجھے جیلر کے آفس لے جایا گیا۔ وہاں ایک کرسی پر رابعہ بیٹھی تھی۔ صبح کی اور اس وقت کی رابعہ میں اتنا فرق تھا کہ میں دنگ رہ گیا۔ اس نے گلابی ساری باندھ رکھی تھی جس میں آتشیں سرخ گلاب کھلے ہوئے تھے۔ شعلہ رنگ بلاؤز اس کے گداز صحت مند جسم پر خوب سج رہا تھا اور اس کا مرمر جیسا بے داغ رنگ کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا اور نظر کی عینک کی جگہ ہلکے سبز رنگ کے شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کی شخصیت میں ایسا وقار اور ایسی تمکنت تھی کہ عام آدمی اس کے رعبِ حسن کے مقابل گستاخ نگاہی کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس پیشے نے تعلیم نے اور اعلیٰ خاندانی پس منظر نے اس کے انداز و اطوار میں بے پناہ اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ میں نے اس کے مقابلے میں فوزیہ کا تصور کیا جو ایک بہت گھریلو قسم کی، سادہ لوح و سادہ دل، خوبصورت خوابوں سے بہل جانے والی۔ بے بنیاد اندیشوں پہ رو دینے والی تصورات کی دنیا میں گم رہنے والی۔ جذباتی۔ بزدل اور کم ہمت جس کے لیے گھر کے باہر ہوس پرست شکاری مردوں کی دنیا ایسی ہی تھی جیسے معصوم ہرنی کے لیے خونخوار بھیڑیوں کا جنگل۔ رابعہ حسین ہونے کے باوجود فوزیہ کا پاسنگ بھی نہ تھی کم از کم میری نظر میں۔ مگر حسن کے انداز کا فرق تھا۔ فوزیہ بے خبر اور بے التفات سیاہی تھی جو گود کی پناہ میں دبک کے صرف پیار مانگتی ہے۔ رابعہ جوان شیرنی تھی جو اپنے رنگ روپ کی چمک دمک۔ چال کے بانکپن اور قوتِ تسخیر کے غرور میں کسی طرف نظر اٹھا کے دیکھے تو اسے مسحور کر کے شکار کر لے۔۔۔۔ فوزیہ بارش کی رات میں طوفانی ہواؤں سے محفوظ گھر کی دیواروں میں نرم روشنی دینے والی موم بتی کا اجالا تھی۔ رابعہ اسی رات کے آسمان پر کوندنے والی بجلی۔

"ایسے کیا منہ اٹھائے کھڑے ہو" وہ مسکرا کے بولی۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں" میں نے ہمت سے کام لے کر سچ بول دیا۔ "صبح کی اور اس وقت کی رابعہ کا فرق دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ لوگ کتنا غلط سوچتے ہیں جن کا خیال ہے کہ وکالت اور انجینئرنگ جیسے پیشوں سے عورت کی نسوانیت کا حسن مجروح ہوتا ہے۔"

اس نے بے تکلفی سے ہاتھ ملایا اور میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "شاعری پھر کبھی کر لینا میں تم سے مفصل گفتگو کرنے کے لیے آئی ہوں۔ ذرا اپنے جانے اور نکالے جانے کا قصہ مختصراً۔ آخر یہ سازش کا کیا چکر ہے۔"

ایک گھنٹے تک میں بولتا رہا اور وہ سنتی رہی میں نے ان تمام واقعات کا ذکر کر دیا جو میرے ساتھ لندن میں پیش آئے تھے اور جن کی ابتدا میرے کمرے میں ایک اجنبی لڑکی کی ہنگامہ آرائی سے ہوئی تھی اور انتہا میرے لندن سے ڈی پورٹ کیے جانے پر۔ میں نے اس شبے کا اظہار بھی کیا کہ وہ لڑکی میری تصویر لینے ہرگز نہیں آئی تھی۔ تصویر ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہو سکتی اور راہ چلتے یوں کھینچی جا سکتی تھی کہ مجھے خبر بھی نہ ہوتی۔ میں نے کہا۔ "غالباً وہ میرے خطوط کی تلاش میں تھی۔"

"تمہارے خطوط سے اس کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی" رابعہ نے کہا۔

"رابعہ اگر میں یہ فرض کر لوں میرے پاس تو یقین کرنے کی وجوہات بھی معقول ہیں کہ میرے والد کو بلیک میل کرنے کے بعد قتل کر دیا گیا" میں نے کہا۔ "تو ذرا مجرموں کے نقطۂ نظر سے سوچو۔ کسی مجبوری یا کمزوری کا۔ ماضی کی کسی ایسی غلطی کے باعث جس کا اثر مستقبل پر بھی پڑ سکتا ہو۔ خواہ یہ غلطی وابستہ ہو یا نا وابستہ میں مزید رد و بدل ہو۔ مگر میرے والد کا خود پوچھتے ہیں میرے والد فرشتہ نہیں تھے انسان تھے چنانچہ کسی داغ گناہ سے ان کے دامن کی آلودگی کو میں ناممکن نہیں سمجھتا لیکن جو بات غور طلب ہے وہ بلیک میلنگ پر ان کی خاموشی ہے۔ انہوں نے کسی قابلِ اعتماد دوست پر مثلاً شیروانی صاحب پر کیا مجھ پہ بھی اعتماد نہیں کیا۔ جو شخص زندگی میں ایک مقصد کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر چکا ہو اور جدوجہد آزادی کو اپنے تمام آدرشوں کا محور بنا چکا ہو اور اتنا باہمت ہو کہ ... ہوا ہو بلکہ مجھ سے زندگی کی دوڑ میں شریک ہو گیا ہو اور جس نے اپنی دنیا کو ایک بار مکمل تباہی سے دو چار ہوتے دیکھ کر بھی مایوسی کا شکار نہ ہوا ہو اور جس نے گردشِ روزگار سے شکست قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو جو تعمیرِ نو کے مقصد میں کامیابی حاصل کر چکا ہو اسے بے بسی کے ساتھ سب کچھ دے دینا کیوں قبول ہوگا؟ اس لیے کہ وہ بزدل تھا یا اسے زندگی سے بہت پیار تھا؟ نہیں رابعہ نہ وہ بزدل تھا اور نہ خود غرض۔ اس کی جدوجہد کا حاصل اور اس کا سرمایہ حیات میں تھا اس لیے اسے اپنا نہیں میرے مستقبل کا تحفظ عزیز ہو سکتا تھا۔ وہ یوں مرنے کی بجائے ایک ہی بار مر کے یا مرنے کو ترجیح دیتا وہ اپنی بدنامی اور رسوائی کے خیال سے یا اپنے ماضی کے کسی جرم کے افشا ہونے کے احساس سے یا کسی گناہ کی تشہیر کے خوف سے بھلا کیوں بلیک میل ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی خاموشی کا سبب یہی تھا کہ وہ مجھے بچائے رکھنا چاہتا تھا۔ اسے یہ منظور نہیں تھا کہ اس کے ماضی کا آسیب میری زندگی پہ سایہ فگن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مجھے اپنے سے دور رکھا۔ اگر میں قریب ہوتا تو یہ سب کچھ کہاں برداشت کرتا اور دشمنوں کے ہاتھوں اس کی تباہی کا خاموش تماشائی کیسے بنا رہتا۔ میں اس سے پوچھتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ مجھے پتا نہ چلتا۔ وہ نہ بتاتا تو میں خود معلوم کر لیتا۔ اسی مجبوری کے باعث اس نے مجھے بہت دور کے کالج میں پڑھایا اور انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے برطانیہ بھیج دیا۔ ذرا خود سوچو۔ کیا لاہور میں اچھے کالج نہ تھے اور اب وہ پرانا زمانہ تو ہے نہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے رئیس زادے ولایت چلے جاتے تھے۔ اب زیادہ سے زیادہ تعلیم کے مواقع ملک میں ہی حاصل ہیں۔ انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم بھی ملک ہی میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ بہت اعلیٰ سطح پہ ڈاکٹر یا انجینئر کسی فیلڈ میں اسپیشلائز کرنے کی خاطر تو باہر چلے جاتے ہیں لیکن میں نے تو انجینئرنگ کی سند بھی حاصل نہیں کی تھی۔ صرف بی ایس سی کیا تھا کہ ابا نے مجھے چلتا کیا۔ جانتی ہو کہ اعلیٰ تعلیم کا جو معیار اور تصور رہا ہے یہاں نہیں، میں کم عقل اور ناتجربہ کار تھا اور میرے ذہن میں یہ سب کچھ نہیں تھا جو آج ہے کہ مجھے باہر بھیجنا حالات سے لاعلم رکھنے کی سازش ہے۔ میں لاڈلا تھا یہ کہ چلو ولایت میں عیش کریں گے اور دنیا دیکھیں گے آج یہ سوچ کر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے کہ میرے باپ نے کس طرح میری زندگی کے لیے تھوڑا تھوڑا کر کے قتل ہونا قبول کیا۔ اس نے اپنی ساری کمائی لٹا دی اور مجھے خبر نہ ہونے دی۔ اس کا متاع ایک دستخط پر دوسروں کے کھاتے میں چلا گیا۔ وہ مجھے لکھتا رہا سب خیریت ہے۔ اس کی کوٹھی کار سب بک گئے۔ اس نے لکھا کہ کوئی بات نہیں۔ وہ ایک نمک حرام خادم کے ادنیٰ خادم کی حیثیت سے ملازم ہو گیا مگر اس نے مجھے لکھا کہ ملازمت بدل لی ہے۔ ... وہ گھر میں جھاڑو دیتا رہا ... سمیٹتا رہا اور گٹھیا میں مبتلا ہونے کے باوجود علاج کو ترستا رہا مگر اس نے مجھے محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ یہ کیسے ممکن ہے رابعہ کہ کوئی شخص اتنا بڑا راز سینے میں لے کر قبر میں جا سوئے۔ مجھے یقین ہے ابھی اس کا مرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ جب اجل کے نامہ بر کے آنے کا وقت ہوگا اور

www.paksociety.com

www.pbksociety.com

چھوڑ دے گا اور مجھے مصیبت میں چھوڑ کے بھاگ جائیگا۔"
میں نے قتل ہی سر لیا یا۔" اس سے زیادہ امکانات مجھے یہ نظر آتے ہیں کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا۔ ٹریفک کا حادثہ نہیں وہ حادثہ جو میرے کسی بھی مددگار کے ساتھ پیش آ سکتا ہے۔ خصوصاً اس گواہ کے ساتھ جس کی گواہی پر مقدمے کے فیصلے کا دارومدار ہے۔ اس کا پتا آج نہیں تو کل تک بہرحال چل جائیگا یہ بتا پانچ ہزار کے علاوہ کتنے ہوئے؟"

"دس ہزار ڈیڈی نے دیئے ہیں۔" وہ بولا۔ "شاور کہا ہے کہ تمہاری ممی کو پتا نہ چلے۔" وہ طنز سے مسکراتے ہوئے "پچیس ہزار۔"

"تو نے اپنے کسی قریبے کا ذکر بھی کیا تھا۔" میں نے کہا۔

محسن کا رنگ ایک بار پھر متغیر ہوا مگر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ "اس ذریعے سے بھی دس ہزار مل گئے ہیں۔" اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"محسن۔" میں نے کہا۔ "مجھ سے نظر ملا کے بات کر۔ یہ ذریعہ کون سا ہے؟ اس کے ذکر سے تیرے چہرے پہ ہوائیاں کیوں اڑنے لگتی ہیں۔ تو نے قرض لیا ہے کسی سود خور پٹھان سے؟ کوئی چیز گروی رکھی ہے۔ کچھ بیچا ہے؟ تجھے قسم ہے اس دوستی کے رشتے کی۔ سچ سچ بتا بات کیا ہے؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "قسم مجھے فوزیہ نے بھی دی تھی۔ دیکھ کی جیسی تم دونوں کی قسم کی خاطر میں کیا کروں؟"

"کچھ نہیں۔ تو مجھے بتا دے۔ میں فوزیہ کو نہیں بتاؤں گا کہ تو نے اس سے کیا ہوا وعدہ نہیں توڑا۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔ "قسم کھا۔ فوزیہ کی، میری دوستی کی۔ یہ بات تیرے اور میرے درمیان رہے گی۔"

"میں قسم کھاتا ہوں۔" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔ "اس کا ذکر تک کسی کے سامنے نہیں کروں گا۔"

"فوزیہ نے مجھے اپنا تمام زیور دے دیا تھا۔" وہ مسکرا کے بولا۔ "اور کہا تھا کہ ضرورت پڑنے پر سب بیچ دوں مگر تجھے نہ بتاؤں۔"

مجھے یوں لگا جیسے ایک آتشیں تیر میرے دل میں پیوست ہو گیا ہے اور اس کی انگارہ نوک میرے دل میں ٹوٹ گئی ہے میں نے صدمے اور اشتعال کے آتش فشاں کا دہانہ بڑی سخت جدوجہد کے بعد بند کیا ورنہ میرا دل چاہتا تھا کہ میں محسن سے لڑ پڑوں اور اس رقم کی ضمانت پر رہا ہونے سے انکار کر دوں اس سے کہوں کہ وہ واپس جائے اور اس کے بارے میں پتہ کر بھی فوزیہ کا زیور واپس لے آئے۔ "محسن۔" میں نے کہا۔

"تو قسم کھا چکا ہے سکندر۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "ہم تینوں اپنی اپنی جگہ مجبور ہیں۔"

اسی وقت میں نے ہجوم میں ایک آشنا صورت دیکھی۔ "محسن۔" میں چلایا۔ "وہ دیکھ، اُدھر۔ وہ... وہ جو [illegible] جیکٹ [illegible] پتلون میں ہے۔ یہ وہی ہے۔" مگر اسے میری بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ زرد جرسی والے نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے مکروہ چہرے بالوں اور تیز آنکھوں سے زیادہ اس کے دائیں کان میں پڑی ہوئی سونے کی مندری دیکھ کے محسن چونکا۔

مندری والا یکلخت خطرے کے احساس سے مغلوب ہو کے بھاگا۔ محسن نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی اور [illegible] ٹکراتا ہوا دھکیلتا ہوا بھیڑ میں سے راستہ بناتا اور راستے کی رکاوٹوں کو پھلانگتا اس کی جانب لپکا۔ مگر مندری والا ٹیکسی ڈرائیور بہت پھرتیلا تھا اور کچہری کے پر پیچ راستوں سے واقف تھا۔ وہ لوگوں کی اور عدالت کے اہلکاروں کی پروا کیے بغیر انہیں گراتا ہوا گزر گیا اور محسن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دس منٹ بعد محسن کو ایک حوالدار نے پکڑ لیا اور وہ بڑی مشکل سے پیچھا چھڑا کے واپس ہوا۔ عدالتوں کو بطور ریس کورس استعمال کرنے کا جرمانہ پچاس روپے ادا کرنے کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ "یار" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "اگر تو خاموشی سے بتا دیتا تو میں اس کو پیچھے سے جا کے دبوچ لیتا۔"

"بس میں جذبات پہ قابو نہ رکھ سکا۔" میں نے افسوس سے کہا۔ اب میرا شبہ ایک ناقابل تردید حقیقت میں بدل گیا تھا کہ اس مندری والے کا میرے معاملات سے کوئی قریبی تعلق ضرور ہے۔ وہ عدالت کے ریڈر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ریڈر کے گرد پانچ چھ آدمی کھڑے تھے چنانچہ اسے موقع نہیں مل رہا تھا کہ آگے جا کے بات کرے میں ذرا ضبط سے کام لیتا اور محسن کو اشارہ کر دیتا تو وہ چپکے سے پیچھے جا کھڑا ہوتا۔ یہ بھی سن لیتا کہ وہ کیا کہنے آیا ہے اور پھر اسے پکڑ لیتا۔ خود ریڈر کو بتانا پڑتا کہ وہ کیا چاہتا تھا مگر میری غلطی سے اس کو فرار کا موقع مل گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہم اسے پہچانتے ہیں۔ اب وہ حلیہ بدل لے گا یا غائب ہو جائے گا یا غائب کر دیا جائے گا۔

دس بجے شیروانی صاحب اپنے دوست کے ہمراہ کار سے اترے اور انہوں نے بڑی شفقت اور محبت سے مجھے تسلی دی کہ فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بات ایک رسمی ضرورت کے تحت سب کو کہنی پڑتی تھی۔ ان کو بھی جو وکیل کلائنٹس تھے اور انہیں بھی جو دوست تھے نہ دشمن۔ مگر یہ بات ہر بار میرے حوصلے کو تھوڑا سا بڑھا دیتی تھی۔ گیارہ بجے رابعہ اور منظر ایک ساتھ نمودار ہوئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ درخواست ضمانت کی ایڈیشنل سیشن جج کی عدالت میں ہے۔ اے پی پی نے بارہ بجے کا وقت دیا تھا اور رابعہ نے مجھے چپکے سے بتایا کہ اس سے بات ہو گئی ہے۔ اس کے بعد مجبوری ضمانت تو آج ہی ہو جائے گی۔ تو تشویش ہوتی رہے گی ایک مہینے بعد ہو یا دو مہینے بعد۔ یہ بڑی حوصلہ افزا خبر تھی جو ایک گھنٹے بعد سچ ثابت ہوئی۔ اے پی پی نے بس بے دلی سے مخالفت کی اور بالآخر رابعہ اور منظر کے دلائل سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے اعتراضات واپس لے لیے۔ عدالت نے مجھے پچاس ہزار روپے کی مالی ضمانت کے ساتھ دو افراد کی شخصی ضمانت فراہم کرنے کا حکم دیا۔ نقد رقم اسی وقت جمع کرا دی گئی اور شیروانی صاحب اور ان کے دوست نے ضمانت نامے داخل کر دیے۔ دستاویزات کی تصدیق اور تکمیل ہونے تک میں قید رہا اور ہتھکڑی سمیت عدالت کے باہر محسن کے ساتھ کھڑا رہا۔ بالآخر یہ قانونی کارروائی مکمل ہوئی اور میرے ہاتھوں سے وقتی طور پر وہ زنجیر جدا ہو گئی جس نے اڑتالیس گھنٹے تک میری آزادی کو سلب رکھا تھا۔ [illegible] رخصت ہو گئے۔

"جا بھئی عیش کر۔ ایک قتل اور کر لے۔" منظر نے عدالت سے باہر آتے ہی میرے کندھے پہ ہاتھ مار کے کہا اور رخصت ہو گیا۔ اسے دوسری عدالت میں جانا تھا۔

پھر مجھے [illegible] نظر آیا جو اے ایس پی کے ساتھ جیپ میں بیٹھنے جا رہا تھا۔ ان دونوں کی صورت شکست خوردگی کے احساس کی غماز تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور ان کی راہ میں حائل ہو گیا۔ "السلام علیکم حضرات۔" میں نے بڑی جرأت سے کہا۔ اگر رابعہ میرے ساتھ نہ ہوتی تو شاید اس سلام کے جواب میں وہ مجھے گالی دیتے اور مجھ سے مصافحہ کیے بغیر نکل جاتے۔ "آپ میں سے کسی نے مجھے ضمانت پر رہا ہونے کی مبارک باد نہیں دی۔"

"مسٹر سکندر بخت۔" اے ایس پی نے متانت سے انگریزی میں کہا۔ "مجبوری کی ضمانت سے باعزت رہائی کی منزل بہت دور ہے۔ بہرحال تم اصرار کرتے ہو تو۔ مبارک ہو۔" وہ جیپ میں بیٹھا اور اس کا [illegible] سے کسی طرف دیکھے بغیر عدالت کے احاطے سے نکل گیا۔ شیروانی صاحب اپنے دوست کے ہمراہ چلے گئے اور تاکید کر گئے کہ میں محتاط رہوں۔ کسی مرحلے پہ عدم دلچسپی اور عدم توجہی کا ثبوت نہ دوں اور شام کو ان سے ہوٹل کے کمرے میں مل لوں۔ وہ رات کی فلائٹ سے واپس چلے جائیں گے۔ رابعہ نے مجھے بتایا کہ ابھی دو مقدمات اور دائر کرنے ہیں۔ وراثت کے سرٹیفکیٹ کا مقدمہ وہ خود دائر کرے گی۔ والد کی لاش کو نکلوا کے دوبارہ پوسٹ مارٹم کرانے کا کیس منظر نے لے لیا ہے چنانچہ میں ملاقات دونوں سے رابطہ قائم رکھوں۔ اس نے مجھے اپنا کارڈ دینے کے بعد یہ بھی کہا کہ مجھے جب بھی فرصت ملے میں اس سے گھر آ کے ملوں۔ شام سات آٹھ بجے تک وہ اپنے آفس میں رہتی ہے جو کورٹ کے ایک حصے میں ہے مگر اس کے بعد [illegible] ہے اس کے دو ماتحت وکیل ہیں جو اس کی ہدایات کی روشنی میں اگلے دن کے کیس تیار کرتے ہیں اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ خود اسے بھی رات گئے تک ان کے ساتھ ٹک کے کام کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اور محسن نے اس کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی اور شرمندہ ہوتے۔ وہ اپنی کار میں بیٹھی مال پہ چھوڑ کے چلی گئی۔

دنیا کے حیرت انگیز فن تحریر شناسی کی مدد سے
دوسروں کی شخصیت کو کھلی کتاب کی طرح پڑھیں،

تحریر شناسی کے فن پر ایک نادر رہنما کتاب

تحریر اور شخصیت

قیمت ۱۲۰/- روپے
ڈاک خرچ ۱۲/- روپے

○ آپ کو بتائے گی کہ آپ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔
○ آپ کن صلاحیتوں کے مالک ہیں ○ تحریر کے ذریعے اپنی کمزوریاں اور خامیاں کیسے دور کی جا سکتی ہیں!

ملنے کا پتہ: مکتبہ تنفیذ ضیاء ○ پوسٹ بکس ۹۴۴ کراچی

www.paksociety.com

"یار محسن" میں نے ـــــــــ بھرائی آواز سے کہا
پاسے ماں کی خوبصورت دنیا میں سانس لیتے ہی کہا۔ "یہ دنیا کتنی بدل گئی ہے بلکہ میں نے تو محسوس کیا ہے کہ دنیا ہر روز بدلتی رہی ہے۔ جب میں لندن سے واپسی پر لاہور ایئرپورٹ پر اترا تھا تو یہ دنیا کچھ اور تھی پھر ایک گھنٹے میں دنیا وہ نہ رہی۔ اس سے اگلے دن جب میں حوالات میں تھا تو دنیا کا رنگ کچھ اور تھا اور آج پھر یہ دنیا عجیب سی لگ رہی ہے۔"

"یہ احساس کی عینک کا کمال ہے۔" محسن نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "بچپن میں ہم ایک سیدھے سادے کھلونے میں بھی تماشا دیکھتے تھے۔ بڑا مشکل سا نام ہے اس کا۔ کلیڈو اسکوپ مگر وہ ہے کیا۔ وہ نلکی جس کے اندر شیشے کے رنگین ٹکڑے بھر دیئے جاتے ہیں اور اس نلکی کے تین طرف آئینہ جڑا ہوتا ہے۔ رنگ برنگے بے ترتیب کناروں والے شیشے کے ٹکڑوں سے تینوں آئینوں کا عکس ایک جیسا نظر آتا ہے تو کیسا خوبصورت پیٹرن بنتا ہے۔ ادھر نلکی ذرا سی گھمائی اور پیٹرن بدل گیا۔ نئی ترتیب سے نیا ڈیزائن۔ ۔ ۔ تو یار دنیا بھی ایسا ہی کلیڈو اسکوپ ہے۔ اور واقعات و گردش حالات سے پیٹرن بدلتے ہیں تو دنیا کبھی کچھ لگتی ہے کبھی کچھ۔"

میرا بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا اور میں آزاد تھا مگر اس آزادی کے احساس میں اعتماد کا فقدان تھا۔ رسن و دار کے سائے میرے ہمرکاب تھے اور وقت کا نقیب صدا دیتا تھا کہ یہ مہلت بے ثبات ہے۔ میرے سامنے بہت سے چیلنج تھے۔ مجھے زندگی کا حق یوں نہیں حاصل کرنا تھا۔ نظروں سے اوجھل رہ کے میرے لیے ہر قدم پر دام تزویر بچھانے والے شکاریوں کو بھی تلاش کرنا تھا۔ مجھے ثبوت فراہم کرنا تھا کہ میرا باپ ان ہی کی شیطانی چالوں کا شکار ہوا اور شاید پھر اپنے دام میں صیاد آ گیا۔ شرافت علی انہی کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوا جنہوں نے اس کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلائی تھی۔ چنانچہ اب مجھے وزیر خان کے ۔ ۔ ۔ ۔ قاتلوں کو تلاش کرنا تھا اور ان سے پوچھنا تھا کہ وہ وزیر خان کو کیوں ڈراتے تھے اور اب اس کے بیٹے سے کیوں ڈرتے ہیں۔ ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دار و گیر۔

"کیا سوچ رہا ہے سکندر؟" محسن نے کہا۔ "چل کہیں بیٹھ کے کھانا کھاتے ہیں۔ پھر میں فوزیہ کو فون کروں گا اور اس کے بعد ہم سلامت شاہ کی خبر لینے چلیں گے۔ شام کو ڈیڈی کا لیکچر بھی سننا ہے۔"

"رات کو ہم کسی کسی ڈین سے ملیں گے۔" میں سوچ رہا تھا کہ کہاں رہے گا اپنا؟"

ابھی محسن نے میرے سوال کا جواب بھی نہیں دیا تھا کہ پیچھے سے دوڑتا ہوا آیا۔ "بوٹ پالش سر؟" وہ تقریباً بولا۔ اس نے کندھے پر ایک چھوٹا سا لکڑی کا صندوق رکھا تھا اور بارہ تیرہ سال کے اس بچے کے میلے کپڑوں اور جسم سے پالش کی بو اٹھ رہی تھی۔

"نہیں بھئی" میں نے کہا۔ "یہ جوتے اس قابل نہیں" مگر وہ بچہ ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہم اب بیڈن روڈ پر تھے۔ "پالش کرا لیجئے صاحب۔ صرف ایک روپیہ۔ اچھا آٹھ آنے" وہ بولتا گیا۔ پھر اچانک اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ "یہ لیں صاحب۔"

اس نے سرگوشی میں کہا۔ "بس ذرا سی دیر رک جائیے۔ آپ کے جوتے مفت پالش کرتا ہوں۔"

محسن اور میں ٹھٹک کر رک گئے۔ اس نے اپنا باکس گلے سے اتار کے نیچے رکھا اور جوتے پالش کا سامان نکال لیا۔ "یہ تو ایک صاحب نے دیا تھا جو ابھی چلے گئے ہیں۔" اس نے محسن کے پاؤں کو جوتے سمیت باکس پر رکھا۔ ہم دونوں نے کہا۔ "وہ جو صاحب جا رہے ہیں انہوں نے؟ مگر دراز داڑھی سے کیسے کر پتا نہ چلے۔ انہوں نے مجھے بتایا اور ویلا دے کے کہا آپ فکر کیوں نہیں دیتے ہیں غریب آدمی کوئی چکر تو نہیں ہے سر؟ انہوں نے کہا بیٹا مجھے تم سے کوئی دشمنی ہے۔ اس میں کوئی خطرے کی بات نہیں۔ بس میرا سلام دعا کہنا ہے ان صاحب سے۔ پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ میرا خیال ہے انہوں نے جھوٹ بولا تھا صاحب۔ لائیے پیر۔ دیکھئے کیا شکار مار رہا ہے بوڑھا۔ پچاس روپے کا نوٹ بہت بڑا ہوتا ہے اور بلاوجہ کوئی نہیں دیتا۔"

میں اور محسن ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ "جوان تھے۔ صحت مند۔ کان میں مندری۔ گھنگھریالے بال؟"

"نہیں صاحب" لڑکے نے زور زور سے جوتا رگڑتے ہوئے کہا۔ "ساٹھ ستر سال کا دبلا پتلا بڈھا تھا۔ شیروانی اور ترکی ٹوپی میں۔ کارٹون لگتا تھا۔ آپ جانتے ہیں ان کو صاحب؟ میں کسی چکر میں تو نہیں پڑ جاؤں گا۔ بچا لینا صاحب۔ ایسا تو فلموں میں ہوتا ہے۔"

"اللہ پر بھروسہ رکھو۔ کچھ نہیں ہوگا" محسن نے دلاسہ دیا۔ "وہ بڑے اچھے آدمی تھے اور ان سے واقعی ہماری سلام دعا ہے۔"

ہنسی محسن کی آواز میں دبی تھی۔ لفافہ محسن نے یوں کھولا کہ کوئی نہ دیکھے۔ اس پر صرف تین سطریں بال پوائنٹ سے گھسیٹی گئی تھیں۔

"آج رات کو دس بجے دھرم پورہ سے باغبانپورہ جانے والی سڑک کے کنارے پر موجود ایک اخبار کے دفتر میں ملاقات ہو یا نہ ہو سکی، بہرصورت کل کی ڈاک سے جواب دینے کے لیے حجت خاں کی معرفت تمہیں ایک لفافہ ملے گا جس پر تمہاری بجائے گلاب خاں کا نام ہوگا۔ جو کیا رہے یہ لفافہ لے لینا مگر اس طرح کہ کسی کو معلوم نہ ہو ...... تو ما بچو!"

میں نے رقعے کو منہ میں رکھ لیا اور چیونگم کی طرح چبانے لگا۔ "تم بہت اچھے ایکٹر ہو بیٹا! اس لیے تم کسی مشکل میں نہیں پڑو گے" میں نے کہا۔

"کدھر کے ایکٹر ہیں صاحب! اچھے ایکٹر ہوتے تو جوتے پالش کرتے؟ ہیرو نہ بن جاتے" وہ محسن کے جوتوں پر پالش ختم کرتے ہوئے بولا۔ "دن بھر میں دس جوڑے پالش کرتے ہیں تو مشکل سے دس روپے ملتے ہیں۔ پچاس کا نوٹ دیکھ کر لالچ میں آ گیا ورنہ انکار کر دیتا۔"

میں نے اپنا پاؤں اس کے باکس پر رکھ دیا۔ "اب اچھے بچوں کی طرح اس پر پالش کرو اور بعد میں ہم جو کچھ دیں وہ سلام کر کے رکھ لینا۔"

"جی صاحب!" وہ بولا اور پورے انہماک سے جوتوں پر پالش لگانے لگا۔ "بدمعاشی کے دھندے تو بہت ہیں جو آپ جیسے لوگ کرتے ہیں۔ راکٹ گولی اور سفید چڑیا بیچتے ہیں۔ چرس کے سگریٹ فراہم کرتے ہیں اور دوسرا مال بھی۔ مال سمجھتے ہیں نا صاحب آپ؟ مگر وہ پکڑے بھی جاتے ہیں۔ میں پکڑے جانے سے ڈرتا ہوں۔ اندھی ماں ہے۔ ایک چھوٹا بھائی ہے اسکول میں پڑھتا ہے۔"

محسن نے اسے سو کا نوٹ یوں تہہ کر کے دیا کہ ایک کا نوٹ نظر آئے۔ "یہ تو تمہارا انعام۔ اس نوٹ پر ایک ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ کبھی ضرورت پڑے تو بات کر لینا۔ کوئی بھی مسئلہ ہو۔ ملازمت کا یا پڑھائی کا تعلیم کا۔"

"اچھا صاحب" لڑکے کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا۔ "مگر آپ اتنا گارنٹی کریں کہ ہمیں اپنی کوٹھری سے کوئی نہ نکالے۔ باپ کے مرنے کے بعد یہ بدمعاش ہماری جگہ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے تو شریف آدمی کہلاتے ہیں مگر بدمعاش بھی ہوتے نا جی! بیوہ اور یتیم کو پریشان جو کرتے ہیں۔ کہتے ہیں پانچ سو ہزار لے کر گھر خالی کر دو۔ نہیں اپنے گھر کو ڈبا کرتا ہے۔ کیرج نکالا ہے۔ ہم پانچ سو ہزار لے کر کہاں جائیں گے صاحب! وہ دھمکی دیتے ہیں کہ شرافت سے جگہ نہ دی تو بند کرا دیں گے۔ چوری کا الزام لگا دیں گے۔ آپ کچھ مدد کر سکتے ہیں صاحب؟"

"تم فون پر بات کر سکتے ہو نا؟ بات کر لینا۔ تمہارا گھر تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" محسن نے کہا۔ لڑکے نے پالش ختم کی سلام کیا اور لوٹ گیا۔ اس لڑکے نے ذرا سی دیر کے لیے مجھے اپنے آپ کو بھول جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"نوابزادہ" میں نے محسن کے ساتھ کیری ہوم ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "شیروانی اور ترکی ٹوپی والا کارٹون! کتنی عجیب بات ہے یار محسن رضا! بڈھا نہ وہ دل ہے کیا زمین نام بتایا تھا اپنا۔ خود کو ابن بطوطہ یا حاجی لق لق بھی تو کہہ سکتا تھا۔"

"ہاں۔ آدمی وضعدار بھی ہے۔ وضعدار لوگ عموماً تخلص بھی ہوتے ہیں" محسن نے کہا۔ "آج رات مل کے معلوم ہو جائے گا۔"

"اسی ہرشک پر نہ آگے میری کیفیت کا۔ بلکہ یوں کہیے" محسن

www.paksociety.com

صاحب کو میرا آفس ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ جانتے ہیں نا کہ میں میرو وزیرانہ کمپنی کا چیف اکاؤنٹنگ ڈائریکٹر ہوں۔ میرا خیال ہے اس کا نام اب وزیر اینڈ سنز کر دیا جائے اور آپ کو وائس چیئرمین بنا دیا جائے۔"

"میرا خیال ہے کہ بیڑا اس کو تمہاری عقل تو پہلے ہی گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ تم بھی چلے جاؤ۔" محسن نے کہا۔ "وہ کھانا کھا کر آ رہا ہے۔"

چراغ دین کہیں گیا ہوا تھا چنانچہ ہمیں چوکیدار سے بات کرنے کا موقع مل گیا اور اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ صورت سے تو جتنا بھولا نظر آتا ہے، کیونکہ اس نے سلامت شاہ کے کہنے پر کوٹھی کا تالا کھول کے ہمیں تلاش کرنے کا موقع فراہم کیا تھا مگر اس کے بعد کے واقعات کا کچھ علم نہیں۔ سلامت شاہ کے غائب ہو جانے پر وہ تھوڑا سا فکرمند تھا۔

"جب ہمارا سمجھ میں نہیں آتی صاحب کہ شاہ جی کدھر گیا۔" اس نے کہا۔ "ادھر تو اس کا باپ بھائی چاچا کوئی نہیں۔"

"خان صاحب!" میں نے کہا۔ "وہ پہلے کبھی اس طرح بغیر بتائے کہیں گیا ہے؟"

محبت خان نے نفی میں سر ہلایا اور ہمیں مزید معلومات فراہم کیں۔ خلاصہ یہ کہ گزشتہ تین سال کے عرصے میں جب سے وہ ملازم ہوا ہے سلامت شاہ سال کے سال بری امام صاحب کے مزار پر حاضری دینے ضرور جاتا رہا ہے مگر اور کہیں نہیں گیا۔ اس کا لاہور میں کوئی دوست رشتے دار ایسا نہیں جس کے پاس وہ قیام کر سکے۔ میری ہدایت پر محسن نے کہا کہ کل گلاب خان کے نام اس کی معرفت ایک خط آئے گا اسے وہ سنبھال کے رکھے کیونکہ اس میں بہت اہم کاغذات ہیں۔ میں نے مزید وضاحت یوں کی کہ گلاب خان ایک زمین والے کے مقدمے میں پیش ہونے کے لیے پنڈی سے آیا تھا اور یہاں اس کا کوئی ایسا پتہ نہیں جس پر وہ ڈاک منگوا سکے۔ چند کاغذات رہ گئے تھے جو اس نے ڈاک سے منگوانے کے لیے میرا پتہ دے دیا تھا مگر مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا چنانچہ میں نے سلامت شاہ سے ذکر کیا تو اس نے کہا محبت خان کی معرفت منگوا لو۔ ڈاکیہ آتا ہے تو گیٹ پر ہی ڈاک دے جاتا ہے۔ محبت خان مطمئن ہو گیا اور اس نے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں، کاغذات بالکل محفوظ رہیں گے۔ اس نے محسن سے بحیثیت گلاب خان مصافحہ بھی کیا۔ پھر میں نے کہا کہ میں ایک نظر سلامت شاہ کا کوارٹر دیکھنا چاہتا ہوں۔ محبت خان نے کہا کہ اسے کوئی اعتراض نہیں۔

کوارٹر بستی سے متصل تھا۔ صحن کی دیوار کے اوپر سے جھانکنے کے لیے میں نے منڈیر تھام کر خود کو اوپر کھینچا۔ اندر سناٹا تھا۔ کوارٹر کا کمرہ بھی کھلا پڑا تھا اور وہ کمرہ بھی جو وزیر خان کا کمرہ تھا۔ کھلے دروازے سے مجھے وہ صندوق بھی نظر آیا جو میرے والد نے چھوڑا تھا۔ فوری طور پر مجھے خیال آیا کہ میں چند منٹ میں اندر جا کے سونے کا وہ زیور لے کر واپس آ سکتا ہوں جو میری ماں کی ملکیت تھا۔ قانونی طور پر میں اس کا مالک تھا اور اپنی ہی چیز کو جائز ضرورت کے لیے حاصل کرنے کا یہ طریقہ غلط ضرور تھا مگر اسے چوری یا کوئی اخلاقی جرم نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ چوکیدار پر نگاہ رکھے اور اندر کود گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں واحد خیال یہ تھا کہ میں اس زیور کے بدلے فدیہ کا زیور واپس حاصل کر لوں تو میرے سر پر رکھا ہوا دس ہزار کی رقم کا یہ بوجھ اتر جائے۔ اگر میں اپنی ماں کی یہ نشانی تحفے میں فدیہ کو دے سکتا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی لیکن یہ ابھی ناممکن تھا چنانچہ اس زیور کا بہترین استعمال یہی ہو سکتا تھا جو میں نے سوچا تھا۔ فدیہ کا زیور لینے والا بخوشی یہ پرانا سونا قبول کر لیتا جس کی مالیت بھی کہیں زیادہ ہو۔ خلاف توقع مجھے قفل کھلا نظر آیا اور مجھے ایک لمحے کے لیے مایوسی ہوئی۔ کیا سلامت شاہ زیور نکال کے جا چکا ہے۔ میں نے بے خیالی میں ڈھکنا اٹھایا اور چھوڑ دیا۔ وہ ایک جھٹکا میری ناک سے ٹکرایا اور میں بے تحاشا پیچھے ہٹا۔ تک پہنچنے سے رکا اور واپس گیا۔ لرزتے ہاتھوں سے میں نے وہ مال نکالا اور اس صندوق کے ہینڈل کو صاف کر دیا۔ پھر متلی کے احساس کو روکتا واپس ہوا اور دیوار پھاندنے کی کوشش میں جھوٹ سے پیچھے گرا۔ محسن نے دوڑ کر مجھے اٹھایا۔

"سکندر..." وہ میری صورت دیکھ کے بولا۔ "کیا... کیا بات ہے، کیا ہوا ہے تجھے؟"

میں نے محسن کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "محسن... چل یہاں سے نکل... اندر... اندر لاش... سلامت شاہ کی لاش..."

"کیا؟" محسن نے مجھے جھنجھوڑا۔ "تو ہوش میں ہے نا؟"

"ہاں..." میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔ "میں جھوٹ نہیں کہتا۔ سلامت شاہ کی لاش اس صندوق میں ہے... جو میرے والد نے چھوڑا تھا... میں نے ڈھکنا کھول کے دیکھا تھا... وہ... وہ مجھے گھور رہا تھا۔ اس کا سر... ہاتھ پیر الگ تھے..."

چند لمحے ہم دونوں پتھر کے بت کی طرح کھڑے رہے پھر محسن نے کہا۔ "دیکھو، اگر چوکیدار نے تیری یہ حالت دیکھ لی تو اسے شک ہو جائے گا۔" زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا بھی ہمارے حق میں خطرناک تھا۔ میں نے کپڑوں کی گرد جھاڑی۔ ایک نل سے چند گھونٹ پانی کے پیے اور اپنے دلی جذبات کو شگفتہ مسکراہٹ کے نیچے چھپا کے محبت خان کو خدا حافظ کہتا ہوا باہر نکل آیا۔ مرکزی سڑک پر چلنے کے بعد مجھے اسٹیشن کی طرف سے خالی ٹیکسی آتی دکھائی دی اور ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ "باغ جناح۔" محسن نے کہا اور ڈرائیور نے اتنے تھوڑے سے فاصلے کی تھوڑی سی آمدنی کو ناکافی سمجھتے ہوئے واضح کیا کہ دس روپے ہوں گے۔ محسن کا اور میرا موڈ سخت آف ہو رہا تھا چنانچہ باغ کے دروازے پر اتر کے میں نے اس کے ہاتھ پر پانچ روپے رکھے اور ابھی اس نے احتجاج کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے پھاڑ کھانے کے انداز میں کہا کہ بکواس کی ضرورت نہیں۔ ہم بار بار لیں گے اور یہ پانچ روپے بھی چھین کر تھانے میں بند کرا دیں گے تو ایک ایک سو کا پتا لیے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ اس نے ہمیں غور سے دیکھا اور بھانپ لیا۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ آج اس نے پولیس افسران سے کرایہ لینے کے علاوہ بدتمیزی کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ بہت سنگین جرائم میں شمار ہوتا ہے۔ میں اور محسن شعلہ بیانی کے نیچے ایک بنچ پر بیٹھے رہے۔ پھر اٹھ کر اوپن ایئر ریسٹورنٹ کی آخری میز پر چلے گئے۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی چنانچہ ہمارے علاوہ صرف ایک لڑکا اور ایک لڑکی بہت دور پہاڑی کے دامن میں بیٹھے تھے۔ خلوت کی ضرورت انہیں بھی تھی اور ہمیں بھی گو اسباب جدا تھے۔

"یار محسن!" میں نے بالآخر لب کھولے۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہمیں پہلے ہی اندازہ کر لینا چاہیے تھا، ایسا ہو سکتا ہے۔ سلامت شاہ دفاع کا سب سے اہم اور شاید واحد گواہ تھا۔ میر شرافت علی کے اور ویسے بھی دشمن ہو رہے ہیں۔ ان سے کچھ کی توقع عبث ہے۔ وہ پولیس کے لیے چشم دید گواہ بھی بن جائیں گے اور شاید پولیس کے دباؤ میں یہ بیان دینے پر مجبور ہو جائیں کہ انہوں نے تمہیں جرم کا ارتکاب کرتے دیکھا ہے۔"

"مجھے تو تیری فکر لاحق ہو رہی ہے محسن! تو بہت بڑھ چڑھ کے میری مدد کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"مدد تو بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔" وہ بولا۔ "مگر وہ اصل مجرموں کے لیے خطرے کا سبب نہیں بن سکتے۔ سلامت شاہ بہت سی ایسی باتیں جانتا ہو گا جو کسی کو معلوم نہیں مثلاً یہ کہ آخری دنوں میں چچا وزیر خان سے کون لوگ ملنے آتے تھے۔ وہ انہیں شناخت کر سکتا تھا۔ اس کی موت کا فوری سبب بہرحال یہ ہے کہ صفائی کا واحد گواہ ختم کر دیا جائے۔"

چشم تصور سے میں ابھی تک اس صندوق میں بند لاش کے ٹکڑے دیکھ رہا تھا اور میرے دماغ میں سڑتی ہوئی لاش کا وہ تعفن بس گیا تھا جس کا پہلا جھونکا صندوق کھولتے ہی مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ "میرا خیال ہے محسن کہ پرسوں رات جب سلامت شاہ مجھ سے تھانے میں مل کر گیا تو قاتل اس کے منتظر تھے۔ انہوں نے سلامت شاہ سے پوچھا ہو گا کہ وہ مجھ سے کیوں ملا تھا اور اس نے مجھے کیا کچھ بتا دیا ہے۔ اسی رات وہ قتل کے بعد سلامت شاہ کو صندوق میں ڈال گئے ہوں گے اور وہ سب زیور بھی لے گئے ہوں گے جو سلامت شاہ کو فروخت کرنا تھا۔ اس صندوق کا سامان نکالے بغیر اس میں لاش نہیں ڈالی جا سکتی تھی۔ وہ سامان ان کے کام کا نہیں تھا۔ ممکن ہے وہیں پلنگ کے نیچے ڈھیر ہو۔ میں نے دیکھا نہیں۔ میں تو لاش دیکھتے ہی بدحواس ہو کے بھاگا تھا۔ غنیمت ہے مجھے فنگر پرنٹ صاف کر دینے کا خیال رہا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قتل پر سے پردہ کب اٹھے گا؟ جب لاش کا تعفن پھیلے گا اور گرد و نواح تک بسنے والوں کو بھی محسوس ہونے لگے گا؟"

"ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج کل میں چراغ دین اپنے خانساماں کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دے اور پولیس وہاں جا پہنچے۔"

"ہمارا پھر وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر محبت خان نے آج ہی چراغ دین سے ذکر کر دیا تو بعد میں ہمارے لیے وضاحت مشکل ہو جائے گی۔ اور کل ہم گلاب خان معرفت محبت خان کے پتے پر آنے والا خط کیسے وصول کریں گے؟"

ویٹر کو آتا دیکھ کر محسن خاموش ہو گیا۔ جب وہ چائے کے برتن رکھ کے چلا گیا تو محسن نے کہا۔ "خط کے سلسلے میں تو اب کوئی نیا چکر چلانا پڑے گا، یا تو ڈاک خانے جا کے سارٹنگ میں اس علاقے کے پوسٹ مین کا پتا کرنا پڑے گا اور جھوٹ بولنا پڑے گا کہ میں گلاب خان ہوں۔ میرا ایک خط ہو گا ڈاک میں وہ مجھے دے دو۔ مجھے ابھی ٹرین سے کراچی جانا ہے۔ دس بیس خرچ کرنے سے کام چل جائے گا ورنہ یہ

www.paksociety.com

کرڈاک کی تقسیم کے وقت اس کا انتظار کرنا ہوگا۔ چہ جائیکہ وہاں کا چوکیدار دروازے پر موجود نہ ہوا۔ پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ پھر گیٹ پہ خود ڈاک وصول کر لیں گے۔ وہ موجود ہوا تو پوسٹ مین کو راہ میں روک لیں گے۔ ویسے میرا خیال ہے کل تک قتل کا راز افشا نہیں ہوگا۔"

"اور اگر ہو گیا؟" میں نے کہا۔ "گلاب خان تو بچ جائے گا لیکن یہ بدبخت کیا دوسرے مقدمۂ قتل میں ملوث ہو جائے گا؟"

محسن نے اچانک ہنسی بجھائی۔ "اب تو بچ گیا صاف بچ گیا۔ کیسا گلاب خان اور کہاں کا گلاب خان۔ چوکیدار محبت خان نشے میں ہوگا۔ میرا نام ہے سید محسن رضا۔ میں کسی جائیداد کے مقدمے میں پنڈی سے یہاں آیا۔ شام کو ڈیڈی سے ملنا ہے۔ انہیں یہ صورت حال بتا دیں گے۔ ایمبیسیڈر ہوٹل میں ان کا نام پتا لکھا ہوا ہے۔ سیدھی بات ہے کہ ہم دو بجے سے رات تک ہم وہیں تھے۔ وہ خفا تو ہوں گے کہ ہم کیا ہر مشکل کو گلے لگاتے پھرتے ہیں مگر ہمارا کیا قصور ہے یار۔ کیا ہمیں معلوم تھا کہ سلامت شاہ ہمیں اس صندوق میں ٹکڑے ٹکڑے ملے گا۔ وہ معاملے کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے ضرورت پڑنے پر بیان دے دیں گے کہ عدالتی کارروائی کے بعد باقی پورے ہی دن ان کے بیٹے محسن رضا کے ساتھ گیا تھا۔ ہم نے اکٹھے کھانا کھایا تھا اور رات کی فلائیٹ سے ان کے اسلام آباد واپس جانے تک ہم انہی کے ساتھ رہے تھے۔ ایک مجھ کے لیے ادھر ادھر نہیں ہو سکتے تھے۔ رابعہ یا شکور سے یہ بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

"جھوٹ بھی بعض اوقات باعث رحمت بن جاتا ہے۔" میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ "اب ایک بات اور رہ گئی ہے۔ انکل شیرازی سے بھی فوزیہ کے رقعے اور اس کی موت کا بالکل تذکرہ مت کرنا ورنہ وہ کہیں گے کوئی ضرورت نہیں اس سے ملاقات کے لیے جلدی پہنچ جانے کی۔ پولیس کو اطلاع کر دیتے ہیں۔ وہ فوزیہ کو اٹھا لائے گی اور پھر جو کچھ اس سے پوچھنا ہے پوچھ لیا جائے گا لیکن محسن رضا! پولیس کی موجودگی میں وہ سچ کہاں بولے گی۔ وہ سب کچھ کہاں بتائے گی جس کے بتانے سے زندگی کے لالے پڑ جاتے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا یہ کوئی عقلمندی ہے؟" محسن بولا۔ "میرا مطلب ہے ان حالات میں ہمارا اس ویران علاقے میں جانا اور وہ بھی خالی ہاتھ۔ اگر یہ دشمن کی چال ہوئی تو ہماری لاشیں کل بمشکل برآمد ہوں گی۔"

"مجھے یہ چال اس لیے نہیں لگتی کہ وہ رقعہ فوزیہ کا ہی

تھری پیس تھا۔ میں اسے پہچان گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمیں خطرہ درپیش ہوگا۔ خدانخواستہ کسی نے فوزیہ کو بھی دیکھ لیا ہوگا تو ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی قصہ پاک ہو جائے گا اور ہم بہادروں کے شیر کی طرح جا کر لگے تو پہچان یہ ہو گی پہ قائم کرنے والے شکاری کی طرح بڑی بہادری سے مار ڈالیں گے۔"

"کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ" میں نے کہا۔
"مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی"

"علامہ مرحوم نے ذکر کیا ہے مومن کا جو سپاہی ہو۔ آپ جتنے بہادر ہیں اتنے بھی نہیں ہیں۔ پچیس فیصد احمق ہیں، پچیس فیصد مجنوں ہیں اور باقی پچیس فیصد تخیر ہیں تو پچیس فیصد شاعر وغیرہ۔" محسن رضا نے جل کر کہا۔

"تو نے ٹھیک حساب کے نمبر بالکل نہیں دیے" میں نے کہا اور ہاتھ کو سیدھا گھما دیا۔ "جو مجھے ملی تو ہم منگو مل سکتی تھی اگر اجازت ہو تو مظاہرہ کر دوں۔ ایک ہی میز کے دو ٹکڑے ہیں۔"

"میں نے پچیس فیصد حماقت کے نمبر دے دیے تھے اس لیے مظاہرے کی ضرورت نہیں۔" وہ بولا۔ "اگر تم ڈیڈی کی ڈانٹ ڈپٹ سن آئیں اور انہیں بھی آن کا ایئرپورٹ سے واپس ہو جائیں گے۔"

"ایک دو مسائل اور بھی توجہ طلب ہیں۔" میں نے کہا۔ "مثلاً ایک تو یہی کہ ہمیں یا کم سے کم مجھے غیر مسلح نہیں جانا چاہیے لیکن ریوالور سے پہلے لائسنس حاصل کرنا آسان کام نہیں۔ بغیر لائسنس کا ریوالور لے کر پھرنا جرائم میں ایک اور جرم کا اضافہ کرنا ہے۔ دوسرا مسئلہ قیام کا ہے۔ تیسرا یہ کہ سلامت شاہ کے بعد کون گواہی دے گا کہ میری قبر کون سی ہے؟"

"آج رات تو ہم بھی ایمبیسیڈر ہوٹل میں قیام کر سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "میں کوشش کرتا ہوں کہ کمرہ گزشتہ دن سے نام ایک نہ ہو سکے تو آج دوپہر سے بک دکھا دیا جائے۔ آج ایک بجے کے بعد کوئی نیا مسافر نہیں آیا ہوگا تو یہ کام مشکل نہیں ہوگا اور بعد میں ہمارے لیے ایک دستاویزی ثبوت بن جائے گا۔ ہم ثابت کر سکیں گے کہ عدالت سے سیدھے یہاں آئے تھے۔ رات کو میں ایئرپورٹ پر دیکھوں گا۔ واقف مل گیا تو ہمارا گواہ بن جائے گا۔ قیام کا مستقل بندوبست کہیں کوئی کرائے کی جگہ دیکھی جائے جب تک پہنچے گا ہمیں یہاں رکنا ہوگا اور اس پتے سے عدالت

www.paksociety.com

مطلع کرنا ہوگا۔ ہم ہیں چھوٹے چھانٹ۔ کوئی شریف آدمی جس کی بھتیجی یا لڑکی جوان اور خوبصورت ہوگی وہ ہمیں کب گوارا رکھے گا۔ یہ مسئلہ منظر یار اہم حل کر سکتے ہیں۔ مدد یا اولاد کے حصول میں ایس ایس پی ضامن رضوی سے مدد لی جا سکتی ہے۔ مخبر کی نشاندہی کرنے والے تین گواہ جنازے کے شرکا ہوتے ہیں۔ ان کے نام چراغ دین بتا سکتا ہے۔"

شیروانی صاحب کے پاس ہم لیفے پیے کرو بک کرا کے پہنچے۔ محسن نے انہیں لندن کے واقعات بھی تفصیل سے بتائے تھے اور جو کچھ لاہور پہنچنے کے بعد ہوا تھا وہ بھی بتا دیا تھا مگر ان کے نقطۂ نظر سے بہت سی باتیں وضاحت طلب تھیں۔ میرے والد کی موت کے بارے میں انہوں نے بہت افسوس کا اظہار کیا۔ "اگر وہ بندۂ خدا مجھے اشارہ بھی کر دیتا کہ... کہ اس کے حالات اس حد تک دگرگوں ہیں تو میں کچھ نہ کچھ کر پاتا۔"

"میرا خیال ہے انکل کہ اس صبر و تحمل کے ساتھ تمام معاملے کو لپیٹے رکھنے کی کوئی معقول وجہ ضرور ہوگی۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ انہوں نے مجھے یا آپ کو بھی اعتماد کے قابل کیوں نہیں سمجھا؟ میرا مطلب ہے وہ اعتماد کرتے ہوئے کیوں ڈرتے تھے؟ آپ انہیں ایک زمانے سے جانتے ہیں، کیا آپ کے علم میں کوئی ایسی بات ہے؟ مثلاً یہ کہ ان سے کبھی نادانستگی میں کوئی ایسی غلطی ہوئی ہو جس کا کفارہ ادا نہ ہوا ہو؟ اور ان کے بچے خواہ یہ بات جانتے ہوں کہ وہ غلطی کیا تھی؟"

شیروانی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "وزیر خان نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں چھپایا۔ بالکل اسی طرح جیسے تم اور محسن ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپاتے۔ لیکن میں اسے امکان کو یکسر مسترد نہیں کرتا۔ آدمی خطا کا پتلا ہے اور بعض اوقات حالات اس کے خلاف سازش کر لیتے ہیں تو سوچ سمجھ کر ہر قدم اٹھانے والے کی عقل بھی ساتھ نہیں دیتی۔ کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ کیا غلطی تھی جو اس نے مجھ سے بھی چھپائی؟"

"آپ ان کے پرانے دوست احباب کو اور ملنے والوں کو جانتے ہوں گے۔ ان میں سے پاکستان آنے والے کون تھے اور کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ لوگ کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔ "مثلاً میر شرافت علی کے بارے میں آپ کی معلومات کیا ہیں؟"

"زیادہ نہیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولے۔ "میر شرافت میں بھائی وزیر خان مرحوم کے پاس آتا جاتا تھا لیکن وہ اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کمینہ آدمی تھا مگر کیا کرتے، گھر آئے بچے کو دھتکارا بھی تو نہیں جا سکتا۔"

"اس تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ میرا مطلب ہے..."

پاس پڑوس میں رہتا تھا۔ والد مرحوم کے ساتھ... کسی دوست کا دوست تھا۔ سنا ہے میر شرافت اس کی...

"ہاں کوٹھی تو تھی۔" شیروانی صاحب نے...

کل مجھے اس لیے علم نہیں کہ میر شرافت نے یہ ایام... کے سلسلے میں بہت مختصر رہا۔ پھر میری ایک... گئی اور اس نے مجھے دلی تبادلہ کرا دیا۔ نئی تنخواہ... ہندو اعلیٰ ملازمتوں پر قابض تھے اور ان کی... میں مخالفت پال رہا۔ ایک کلرک میں ادھر... ہر سال بستر باندھنا پڑتا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک... کی مداخلت پہ یہ چکر ختم ہوا۔ تقریباً چھ سال بعد... مرحوم سے کوئی تعلق نہ رہا۔ پھر انہوں نے میر شرافت... کے نام بتائے جو والد صاحب کو جانتے تھے۔ ان میں سے... مر چکے تھے۔ ایک کے بارے میں انہیں خبر تھی کہ... چلا گیا۔ باقی نہ جانے کہاں تھے کہ پھر کبھی نہیں ملے۔... نے میرے دوبارہ پوسٹ مارٹم کے خیال کو پسند... مگر انہوں نے کہا کہ دوبارہ کیا ان کا تو پہلے سے پوسٹ مارٹم ہی نہیں ہوا تھا اور قبرستان میں گورکن کے رجسٹر میں موت کا... "ہارٹ فیل" لکھی ہوئی ہے جو بظاہر غلط ہے... مرحوم کو گٹھیا کا عارضہ تو تھا مگر بلڈ پریشر جیسی کوئی... نہ تھی۔ تو شیروانی صاحب نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے۔"... بعد میں نے تازہ ترین واردات سے پیدا ہونے والے مسئلے کا ذکر کیا۔ وہ سب توقع کے مطابق توجہ سے سنتے رہے اور پھر برہم ہوئے کہ آخر اس حماقت کی کیا ضرورت تھی۔ موجودہ حالات میں تو تمہیں نامعقولیت سے قطعی اجتناب کرنا چاہیے اور تجربات سے سبق حاصل کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ پھر انہوں نے کہا کہ اب مجبوری ہے تو وہ جھوٹ بھی بولیں گے... اس سے فائدہ ہو یا نہ ہو۔

"مجھے تو بہت افسوس ہے کہ تم نے اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کی۔" انہوں نے کہا۔ "محسن خود اپنی ضد سے گیا تھا کیونکہ تم والد کی ضد سے مجبور تھے۔ میں اس کو ہرگز واپس نہ بلاتا مگر اس کی ماں... تم جانتے ہو عورتوں کے لیے منطق بے معنی ہے۔ اس کو یقین تھا کہ محسن لندن میں رہا تو قتل ہو جائے گا۔ پھر میں کیا کرتا۔ وہ تو اب بھی مصر تھی کہ وہ... ساتھ لے آتا مگر میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ تم دونوں نے رہائش کا کیا انتظام کیا ہے؟"

ہم نے انہیں مطلع کیا کہ آج رات تو اسی ہوٹل میں...

کریں گے کل بندوبست ہو جائے گا۔ ایک دوست کے مکان کا اوپر والا حصہ خالی ہے۔" محسن نے ان کی نظر بچا کے مجھے انگوٹھی... اور جب شیروانی صاحب نے پتا نہیں مانگا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر گھڑی دیکھ کے انہوں نے ملازم سے تین افراد کا کھانا طلب کیا اور جب کھانا آ گیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے مسئلہ بیان کیا۔ خلاف امید وہ خفا نہیں ہوئے اور کہا "کہ ان حالات میں اپنی حفاظت کا انتظام ضروری ہے... لائسنس کے لیے میں ضامن رضوی سے بات کر لوں گا۔" انہوں نے کہا۔ "مگر یہ ریوالور ہاتھ میں آ جائے تو دنیا دان کو یہ بال مت جلاتے پھرنا۔ جب آدمی کے ہاتھ میں طاقت ہو تو اسے زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔" اس کے بعد ہم انہیں سی آف کرنے ایئرپورٹ گئے اور چلتے چلتے انہوں نے پھر تاکید کی کہ ہم عقل اور احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ وکیلوں سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہ اٹھائیں اور انہیں وقتاً فوقتاً فون کرتے رہیں۔ جب جہاز ٹیک آف کر گیا تو ہم واپس آئے۔ ایئرپورٹ پر تلاش کرنے کے باوجود کوئی آشنا نہ ملا جسے ہم گواہ بنا سکتے۔

"یار سکندر!" محسن نے ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل کے کہا۔ "واقعی اس وقت ڈیڈی کو بتاتے کہ خیر سے واپسی پہ ہم ایک اور معرکہ سر کرنے کا پروگرام رکھتے ہیں تو وہ ضامن رضوی کو فون کرتے اور کہتے کہ ان دونوں کو آج رات کہیں بند رکھو اور کل فوراً ادھر ادھر نکلوا دو۔ مگر اب یہ سوچ لے۔ خدانخواستہ وہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی تو ڈیڈی کی حمایت حاصل نہیں رہے گی۔"

"ایسے ہی باپ ہوتے ہیں سب۔ باہر سے سخت ہوتے ہیں اندر سے ان کا دل اولاد کے لیے موم ہوتا ہے۔ بالکل تربوز کی طرح۔" میں نے کہا۔ "ان کی سب سے بڑی مجبوری ہی یہ ہوتی ہے کہ اکلوتے ہوں یا بڑے کسی بیٹے کو چھوڑ نہیں سکتے اور اس کمزوری کے باعث بلیک میل بھی ہوتے ہیں۔"

"مگر وہ بھی ہوتے ہیں جو ہر جبر بافرمانی جائیداد منقولہ غیر منقولہ سے عاق کر دیتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"نہ وہ انکل شیروانی جیسے والد ہوتے ہیں اور نہ تم جیسے بیٹے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ اسی وقت میری نگاہ میر پر پڑی جو ٹیکسی میں بیٹھنے والا تھا۔

"ارے میر صاحب!" میں نے چلا کر کہا اور اس کی طرف یوں دوڑا جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست سے بغلگیر ہونا چاہتا ہوں۔ میر محمد ٹھٹھک کر رہ گیا۔

"تم... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ فرار ہونا چاہتے تھے لاہور سے؟"

"فرار تو واقعی ہونا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر لاہور سے نہیں لاہور کی طرف۔ یہاں محسن کے والد کو سی آف کرنے آئے تھے۔ وہی جو وزارت خارجہ کے ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔ وہی شیروانی صاحب جو میرے ضامن تھے۔ دیکھا تو جیب میں پیسے نہیں ہیں۔ اچانک تم نظر آ گئے اور ہمارا مسئلہ حل ہو گیا۔ ہمیں ایمبیسیڈر ہوٹل چھوڑ دینا۔ ہم وہیں مقیم ہیں۔ مہنگا ہے مگر اچھا ہوٹل ہے۔ بڑے بڑے لوگ وہیں ٹھہرتے ہیں۔"

"بڑی اچھی بات ہے۔" وہ ٹیکسی میں بیٹھ کے بولا۔ "ایمبیسیڈر ہوٹل تک مارچ کرنے سے بڑے لوگوں کی صحت بھی اچھی رہتی ہے۔"

ٹیکسی کے جاتے ہی میں نے قہقہہ مارا اور محسن سے ہاتھ ملایا۔ "کیسی بے سروپا بکواس کی میں نے۔ یہ سوچتا ہو گا کہ ہم نرے بے وقوف جھک مارتے پھرتے ہیں۔ مگر میں نے سب کچھ بتا دیا۔"

"یار یہ قابل اعتبار گواہ نہیں۔" محسن نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "لیکن چالاکی سے کام لے کر اس کی گواہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ مثلاً کسی معتبر شخص کے سامنے اس سے پوچھیں کہ رات کو ایئرپورٹ پہ کیوں گھوم رہے تھے؟ یہ چڑ جائے گا اور جواب بیٹھ جائے گا تو وہ اعتراف کرے گا کہ ہم سے ایئرپورٹ پہ ملا تھا اور اگر ہم کہیں کہ ہمیں ایمبیسیڈر ہوٹل چھوڑ دیتے تو کیا ٹیکسی گھس جاتی، ظاہر ہے وہ کہے گا تمہارے ہوتے گھس گئے کیا؟ یا ایسی ہی کوئی بات۔ مگر وہ معتبر شخص گواہ ہو گا تو میر کیسے انکار کرے گا کہ ہم سے ایئرپورٹ پہ ملاقات ہوئی تھی۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے اور بعد کی بات ہے۔" میں نے ایک ٹیکسی کا دروازہ کھول کر بلا اجازت بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی کی فکر کرو۔"

"کہاں جانا ہے جی آپ کو؟" ڈرائیور نے ناگواری سے کہا۔ "پہلے پوچھ لینا چاہیے..."

"پوچھیں گے تم سے بعد میں۔" میں نے غرا کر کہا۔ "چلو دھرمپورہ پولیس اسٹیشن۔ اور میٹر ڈاؤن کر لو۔"

سو روپے کی سواری اٹھانے کی امید میں کھڑے ہوتے ڈرائیور نے میٹر ڈاؤن کر کے اپنی تقدیر کو یقیناً کوسا ہوگا کہ پلے بھی تو پولیس والے، اور خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ اصول پسند تھے ورنہ میٹر کا کرایہ دینے کی بجائے کسی سالے کا نذرانہ بھی وصول کر لیتے۔ دھرمپورہ پولیس اسٹیشن پر ڈرائیور کو بیس روپے دے کر ہم نے پیدل چلنا شروع کیا۔ بہت پہلے ہی

www.paksociety.com

یہاں اپنے ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ یادداشت پر زور دیتے ہوئے میں نے دھرمپورہ کے بازار کو عبور کیا جو چھوٹی سی تنگ سڑک تھی۔ پھر ایک لق و دق میدان آگیا جس میں لکڑی کی ایک ٹال موجود پا کر میں نے اپنی سمت کے صحیح ہونے کا اندازہ کیا۔ موڑ پر مجھے رتن اسٹریٹ نمبر 19 کا نیلا بورڈ نظر آیا جس پر سفید حروف چمک رہے تھے۔ ہم پرانی اینٹوں کے فرش والی گلی سے گزرے۔ محسن کچھ تشویش کا شکار تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں مگر میں نے کہا کہ یہ راستہ شارٹ کٹ ہی نہیں بلکہ ہمارے لیے بہت محفوظ بھی ہے۔ اگر ہمارے دشمن منتظر ہوئے تو سڑک پر ہوں گے، ہم پیچھے سے ان کو جا لیں گے۔ گلی کے اختتام پر بائیں جانب دیوار تھی جو نہر کے فاؤنڈر کے عقبی حصے کو دھرمپورے کی اس آبادی سے جدا کرتی تھی مگر بیرل نہر بچ رہنے والوں نے اس دیوار میں ایک شگاف بنا لیا تھا اور اس غار کے دہانے جیسے شگاف سے گزر کے وہ براہ راست سڑک پر طلوع ہوتے تھے جہاں سے دن میں رکشہ وغیرہ مل جاتے تھے۔ کبھی نہر کے والے مستعد ہوتے تھے تو شگاف بند کر دیا جاتا تھا اور لوگوں کو تقریباً پون میل چل کے سڑک تک پہنچنا پڑتا تھا لیکن خود نہر کے محکمے کے اپنے ملازم جو مرمت کوارٹرز میں رہتے تھے چند روز بعد لاپروائی سے اینٹیں پھر نکال دیتے تھے کیونکہ خود انہیں دھرمپورے کے بازار تک پہنچنے کے لیے دیوار پر سے کودنا یا ایک میل کا چکر کاٹنا گوارا نہ تھا۔

میں اور محسن سر جھکا کے دیوار کے خلا سے گزر گئے۔ وہ ... سروس کوارٹرز کی پتلی سی گلی کو طے کر کے ہم عین اس جگہ پہنچے جہاں نواب چوہدری نے ہمیں بلایا تھا۔ نہر کے دونا تو بند تھے اور لوگ باہر چارپائیاں ڈالے سو رہے تھے۔ نہر کا گدلا پانی جس میں بہار دن بچے پڑے نہاتے تھے اور ہوا بجری کی بو سے گرم تھی اب سکون سے بہہ رہا تھا۔ مخالف کنارے پر صرف ایک آدمی تھا جس نے تن کے کپڑے دھو کر پھیلائے تھے اور خود اندھیرے کی ستر پوشی سے مطمئن بیٹھا تھا۔ میں نے دائیں جانب چلنا شروع کیا۔ آگے نہر کا کنارہ بالکل سنسان ہو جاتا تھا اور کچی سڑک پر جھاڑ جھنکاڑ بڑھ جاتے تھے۔ مغلپورہ جانے والے دوسرے کنارے کی بڑی سڑک پر سفر کرتے تھے۔ نواب چوہدری نے ملاقات کے لیے بہت محفوظ اور بہت خطرناک جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ الگ ہو جائے اور دس قدم پیچھے چلے۔ میں اب بہت محتاط تھا اور کوئی غیبی آواز یا میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں آر کی ٹوپی اور شیروانی پہننے والا وضعدار بوڑھا نواب چوہدری آج دیکھنے والوں

کو کارٹون لگتا ہے مجھے مل سکتا ہے۔ زندہ یا مردہ۔ رات بالکل سیاہ اور ویران تھی۔ اور یہ ستارے بکھرے ہوئے تھے اور چند جھاڑیوں میں جگنو یوں چمک رہے تھے جیسے آسمان کے کچھ ستارے پتوں میں الجھ گئے ہیں۔ خاموشی میں جھینگروں کے وائلن بجانے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ کبھی کبھی جھینگر کی آواز لمبی مونچھوں کو تو کچھ پر رگڑنے سے پیدا ہوتی ہے اور آدمی نے اسی کو دیکھ کر وائلن ایجاد کیا۔ اچانک پیچھے سے محسن نے چلا کر مجھے پکارا۔

میں نے پلٹ کر دیکھنے میں دیر نہیں لگائی تھی مگر حملہ آور جو نہر کے کنارے کی جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے تھے ایک جست میں اتنے قریب آگئے تھے کہ محسن نے وارننگ دینے میں ایک لمحے کی تاخیر کی ہوتی تو وہ مجھے بے خبری میں پیچھے سے آ لیتے اور مجھے مقابلے کی مہلت نہ ملتی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر محسن کا دس قدم پیچھے چلنا ہماری زندگی کا ضامن بن گیا تھا۔ محسن کی آواز پر ان تینوں میں سے ایک لٹو کی طرح گھوم کر محسن کی طرف لپکا۔ دو نے مجھے یوں گھیرا کہ ایک میرے دائیں ہاتھ پر تھا تو دوسرا بائیں جانب اور میرے پیچھے نہر اور جھاڑی تھی۔ اندھیرے میں ان کی صورتوں کے نقوش واضح نہ تھے۔ ان میں سے ایک نے اچھل کے میری گردن دبوچنی چاہی۔ میں نے اس کو غوطہ دے کے ایک ہاتھ سے اوپر اچھالا اور وہ نہر کے کنارے پر گرا۔ دوسرے نے لات گھمائی جو میرے منہ پر پڑ جاتی تو میرے جبڑے ٹوٹ جاتے یا دانت نکل جاتے مگر تھوڑا سا جھک جانے کے باعث بوٹ کی ٹھوکر میرے شانے پر لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو مگر میں نے درد کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے اس شخص کی ٹانگ پکڑی۔ پنجہ گرفت میں آتے ہی میں نے اسے پوری قوت سے گھمایا اور وہ دھڑام سے پیٹ کے بل گرنے کی طرح اپنے اس ساتھی سے ٹکرایا جو نہر کے کنارے سے اٹھ کر مجھ پر پیچھے سے حملہ کرنے آ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ گرے اور ان کے اٹھنے تک میں نے ایک نظر محسن کو دیکھا۔ اس کا حریف کچھ بھاری پڑ رہا تھا اور محسن پسپا ہوتے لگتا تھا۔ دونوں حریف بجلی کی طرح پھر اٹھے اور ان میں سے ایک نے ہاتھ گھمایا تو مجھے اندھیرے میں بھی خنجر کے آبدار پھل کی دبی دبی چمک نظر آئی۔ میں نے اس کے وار کو کلائی پر روکا اور اپنی لات نصف دائرے میں گھمائی جو اس کے دوسرے ساتھی کے پیٹ پر پڑی۔ وہ کراہ کر پیچھے گرا اور میں نے خنجر بدست حملہ آور کے شانے پر کھڑی ہتھیلی کا بھرپور وار کیا۔ "ہا۔"

خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور میں نے ... ملایا... ٹھوکر ماری تو خنجر چھپاک سے پانی میں ڈوب گیا۔ وہ دونوں اچھل کے چند قدم دور جا کھڑے ہوئے اور مجھے نرغے میں لینے کے لیے میرے گرد گھومنے لگے۔ اب دوسرے بدمعاش نے اپنا خنجر نکال لیا تھا۔ اس نے زمین پر تھوک کے مجھے ایک غلیظ گالی دی۔ "تم اس منشی سے ملنے آئے تھے تاکہ وہ" حقارت آمیز تمسخر سے بولا۔ "وہ تو گیا۔ نمک حرام تھا" اور اس وقت میں نے دیکھا کہ ان کے چہروں پر سیاہ جالی دار نقاب چڑھے ہوئے ہیں۔

"اور یہ خط دے گیا۔" دوسرے نے میری نظر کے سامنے ایک لفافہ لہرایا۔ "ہمت ہے تو چھین لو۔"

"لفافے کی قیمت گر دو۔" میں نے ان پر نظر رکھتے ہوئے کہا کہ کہیں وہ باتوں میں لگا کے میری توجہ نہ ہٹانا چاہتے ہوں۔ "اس کی ایک نہیں دو نقلیں کل ڈاک سے مل جائیں گی۔" میں سمجھ گیا تھا کہ منشی سے ان کی مڈبھیڑ ہو چکی ہے۔ کنکھیوں سے میں نے محسن کو دیکھا اس نے اپنے مقابل کو ایک بار پیچھے دھکیل دیا تھا مگر دوسری بار اس نے سر جھکا کے محسن کو بیل کی طرح ٹکر ماری۔ محسن ایک جھٹکے سے پیچھے ہوا اور نہر میں جا گرا۔ اسی وقت وہ دونوں پھر ایک ساتھ حملہ آور ہوئے۔ خنجر والے کر جھپٹا، ٹانگ لگانے والا ذرا آگے تھا۔ میں نے عین وقت پر غوطہ مارا اور وہ میرے سر پر سے گزرتا ہوا جھاڑی میں جا گرا۔ دوسرے کا مکا میرے سر پر لگا اور اسی وقت مجھے نیچے سے اٹھتی ہوئی نظر آئی۔ پھر میں نے سر کو جھٹکا اور اس کے پیٹ پر لات ماری۔ وہ کراہ کر دوہرا ہوا تو میں نے دونوں ہاتھ ملا کر اس کی ٹھوڑی پر نیچے سے اوپر کی جانب ضرب لگائی۔ وہ اچھلا اور سر کے بل نہر میں گیا۔ جھاڑی میں گھس جانے والا اب محتاط تھا اور خنجر کی نوک سامنے کیے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں ایک ایک قدم پیچھے ہٹتا گیا تاکہ محسن کے قریب ہو سکوں جسے اس کا حریف نہر کے پانی سے نکلنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ جیسے ہی وہ کنارے کی طرف آتا تھا وہ لات مار کے محسن کو پھر پانی میں گرا دیتا تھا۔ شاید محسن نے اس کا پاؤں پکڑنے کی کوشش کی تھی کہ اس کا جوتا اتر گیا تھا ورنہ جوتوں سمیت ہر ٹکر سے محسن کا حلیہ بگڑ جاتا۔

خنجر والے نے اچانک جھک کر زمین پر سے کوئی چیز اٹھائی "یہ ... یہ دیکھو..." وہ خباثت سے بولا "کیا ہے یہ؟"

میرا خیال تھا اس نے زمین پر سے کوئی پتھر اٹھایا ہے اور میں نے خود کو ضرب سے بچانے کے لیے سر کے سامنے ایک ہاتھ کو ڈھال بنا لیا تھا مگر میری نظروں کے سامنے دو ہاتھ تھے۔ ایک ہاتھ میرے دشمن کا تھا۔ دوسرا ہاتھ کسی کا بھی نہیں تھا۔ صرف ایک ہاتھ تھا۔ کلائی کے پاس سے کٹا ہوا۔ میں نے نظر جما کے دیکھا۔ شاید مجھے ایک کے دو نظر آنے لگے ہیں مگر یہ نگاہ کا دھوکا نہیں تھا۔ میرے مقابل کے ایک ہاتھ میں خنجر تھا اور دوسرے ہاتھ میں اس نے انگلی کی پور سے ایک سالم انسانی ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ ہاتھ جو کسی بازو سے منسلک رہا ہوگا اور وہ بازو کسی جسم کا حصہ ہوگا اور وہ جسم کسی میرے جیسے ہی انسان کا ہوگا۔ مگر اب میری نظروں کے سامنے وہ ایک ہاتھ تھا جو نقش فریادی تھا۔ انصاف کا طالب تھا۔ ظلم و بربریت پہ نوحہ کناں تھا۔

"کس کا ہاتھ ہے یہ... پہچانا؟" وہ بولا۔ "یہ ایک غدار نمک حرام کا ہاتھ ہے۔ اس ہاتھ سے اس نے خط لکھا تھا۔ تمہیں رقعہ بھیجا تھا۔" وہ ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ آسمان کی طرف اٹھا۔ فریاد کرتا ہوا، احتجاج کے انداز میں۔ مڑ کے نیچے۔ پھر نیچے آیا اور پانی میں یوں گرا کہ آواز پہ مجھے قہقہے کا گمان ہوا۔ "دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ میں صرف ایک ہاتھ ہوں۔ ستر سال تک میں نے منشی گیری کی۔ قلم سے یہی کماتے لکھتا رہا۔ اعداد و شمار سے نفع و نقصان کے گوشوارے بناتا رہا۔ میں نے کسی کا حق نہیں چھینا۔ کسی کی عزت نہیں لوٹی اور کسی کی جان نہیں لی۔ میں سقراط کا ہاتھ ہوں جس نے سچ بولنے پر زہر کا پیالہ اٹھایا تھا۔ میں نے یہی جرم کیا تھا کہ سچ لکھا تھا۔ سچ کیا ہے یہ تم کیا جانو گے مگر کل صرف تمہارے لیے آنے کی پاداش کے لیے جنہوں نے مجھے جسم سے اور جسم کو جان سے جدا کیا۔"

صدمے اور اشتعال کی ایک لہر نے مجھے پاگل کر دیا۔ میں بجلی کی طرح اس سفاک درندے پر ٹوٹ پڑا جس کے ہاتھ میں ایک انسانی ہاتھ کسی آدم خور بھیڑیے کے منہ میں دبا ہوا نظر آتا تھا۔ مجھے خنجر کی نوک اپنے شانے سے بازو تک خراش ڈالتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن اب وہ میری گرفت میں تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کے کلائی پر سے موڑا اور اس کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ وہ چلایا اور میں نے اس کی پسلیوں پر گھٹنا مارا۔ "خونی درندے" میں نے کانپتے ہوئے کہا اور پلک جھپکتے میں اس کو سر پر سے گھما کر نیچے دے مارا۔ میرے متواتر مکوں نے اسے نیم جان کر دیا۔

www.paksociety.com

میں اب اس کے سینے پر سوار تھا اور عین ممکن تھا کہ میں اس وحشت کے عالم میں اس کا گلا گھونٹ دیتا یا اس کی گردن توڑ دیتا مگر اسی وقت محسن نے چلا کے مجھے پکارا اور میں ہوش میں آ گیا۔ محسن زمین پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور اس کا حریف گھٹنوں سے اس کی گردن دبائے محسن کا سر اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو محسن کی گردن ٹوٹ جاتی۔ میں نے گھما کر اس کے سر پر لات ماری اور وہ بھد سے منہ کے بل گرا۔ میں نے اسے مردے کی طرح ساکت پڑا دیکھا اور محسن کو اٹھایا۔

"تو... تو ٹھیک ہے نا؟" میں نے کہا اور محسن نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کو پھر زمین پر لٹا کے میں نے پیچھے دیکھا مجھ سے گتھم گتھا ہونے والا پہلا شخص نہر میں گرا تھا تو پھر نہیں نکلا تھا۔ وہ ڈوب گیا تھا یا پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرتا ہوا فرار ہو گیا تھا۔ دوسرا شخص مہلت سے فائدہ اٹھا کے نہر میں کود گیا تھا اور تیرتا ہوا دوسرے کنارے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے محسن کو سیدھا کر کے بٹھایا اور اس سے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں وہ میرا یہیں انتظار کرے۔ پھر کچھ سوچ کے میں نے بے ہوش پڑے ہوئے شخص کو جھاڑی کے پیچھے ڈالا اور محسن کو دوسری جھاڑی کے پیچھے بٹھایا۔ اب اتفاق سے کسی گزرنے والے کو کچھ دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ پھر میں نہر میں کود گیا۔

وہ شخص نہر کے دوسرے کنارے پہ اتر کے سڑک عبور کر چکا تھا اور اس میدان کی طرف بھاگ رہا تھا جس میں جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان ایک پرانے مقبرے کی خستہ حال عمارت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک کمرہ اور اس پر ایک گنبد۔ دروازوں کی جگہ خلا اور پرانی اینٹوں کی بوسیدہ دیواریں جن کا مسالا نکلتا جا رہا تھا اور اینٹوں کے درمیان گہری لکیریں سی نمودار ہو رہی تھیں۔ یہ جگہ میں نے پہلے بھی دیکھی تھی مگر یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ مقبرہ کس کا ہے جسے آثار قدیمہ والوں نے بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ اس ویرانے میں رات کے وقت وہ تنہا عمارت بھوتوں کا مسکن لگتی تھی اور اندھیرے میں مجھ سے سو قدم کے فاصلے پر وہ شخص دوڑ رہا تھا جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہی منڈی والا ہے۔ اس کے چہرے کی نقاب میرے مکوں سے پھٹ گئی تھی اور جب میں نے اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر جھٹکا تھا تو مجھے وہ بال گھنگھریالے لگے تھے۔ ایک بار مجھے یہ شبہ بھی ہوا تھا کہ میرا ہاتھ کان کی لو پر کسی دھات سے ٹکرایا ہے جو کانوں کے مقابلے میں ٹھنڈی تھی۔ یہ دھات وہی پیتل یا سونے کی ونگی ہو سکتی تھی۔ اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں لڑکھڑا کے ایک گڑھے میں گرا۔ میرے پیر میں موچ آ گئی تھی ... قریب سے بے ہوش گیا تھا کہ میں نے اٹھنے کی کوشش کی ... نے میری ٹانگ کو مفلوج کر دیا۔ میں ... سے نکلا اور اس ویران مقبرے کی طرف بڑھا۔ دشمن کی تاریکی میں نہیں تھا تو فرار ہو چکا تھا۔ چند قدم آگے پر مجھے مقبرے کے سیاہ وجود میں دھندلے سے ... ہوا نظر آیا۔ اس کے بغیر چوکھٹ والے دروازے کے خلا ... تھا۔ میں لنگڑاتا ہوا چبوترے پر چڑھا تو مجھے ... مقبرے میں کسی موم بتی کا یا دیے کا اجالا تھا۔ ... کے جلانے اور پھر لے کے اڑنے کی روایتیں ... یاد آیا کہ آج جمعرات ہے۔ یہ کسی فقیر کا مسکن تھا ... نے اپنی مراد مانگنے کے لیے اس قبر پر ٹیکے ... جلا دیا تھا۔

دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دیا آخری گوشے میں روشن تھا اور ... کے سرہانے رکھا تھا جو فرش خاک پہ گھاس پھوس ... اور مٹکوں پر چت لیٹی تھی۔ یوں جیسے کوئی ... سکون کی گہری نیند میں ہو۔ ساٹھ ستر سال کے اس بڈھے نے میلی سیاہ شیروانی پہن رکھی تھی جس کے بٹن ... تھے۔ علی گڑھ کٹ پاجامہ اور پالش سے بے نیاز ... سر کو ڈھلنے سے رکھنے والی ترکی ٹوپی ڈبے کے قریب پڑی ... اور لاش کا دایاں ہاتھ غائب تھا۔ میں اپنی جگہ ... اور میری رگوں میں دوڑنے والا لہو بھی منجمد ہو گیا ... ہو گیا اور اچانک اس لاش نے قہقہہ لگایا ...

"السلام علیکم جناب سکندر بخت صاحب ... کر دیا۔ یقینی یہ خوب ہے کہ کرو تم دو سو میں کی ... تین سو دو سمجھتے رہے۔ کبھی خوب سیکھا ماشاء اللہ ... دوبئی کا کیس تھا۔ خوب رہی یہ ملاقات بھی۔ اچھا ... کیا سوچ رہے ہیں حضرت، یہ پہچان نہیں پائے مجھے ... خاکسار کو تو ماچو کہتے ہیں۔ منشی بھی کہتے تھے لوگ ... تھا پورا کارٹون۔ ہاہا... کیا خیال ہے آپ کا قبلہ ...

میں پلٹ کر بھاگا۔ ٹمٹماتی روشنی چیخ چیخ کر ہنسنے لگیں۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی ... پھرتی میں مجھ پر حملہ کرتے مگر وہ ... میں تحلیل ہو چکا تھا۔ میں نے لنگڑاتے ہوئے نہر تک فاصلہ طے کیا اور ایک بار پھر چند گز کا فاصلہ تیر کر طے

کر کے دوسرے کنارے پر پہنچا جہاں محسن آنکھیں کھولے لیٹا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ میں دھڑام سے اس کے پاس گر گیا۔

"سکندر!" اس نے مجھے جھنجھوڑا۔ "سکندر... کیا بات ہے... تو زخمی ہے؟" اس نے میرے بازو سے ہاتھ پر ٹپکنے والے خون کو دیکھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ آہستہ آہستہ میرے ہوش و حواس بحال ہونے لگے۔ میں نے اپنے وجود کو گھسیٹ کر نہر کے قریب کیا اور سبزے پر پیر پھیلا دیے۔ "محسن!" میں نے کہا۔ "محسن انہوں نے... انہوں نے نواب بچو کو بھی مار دیا۔"

"مار دیا؟" محسن کے حلق سے دہشت آمیز سرگوشی نکلی۔ "کب... کہاں... ؟"

میں نے اسے کم سے کم الفاظ میں تعاقب کی روداد سنا دی۔ "میرا خیال ہے محسن! یہ وہی منڈی والا تھا... ڈرائیور تھا۔"

محسن خاموش بیٹھا رہا۔ میرے اور اس کے خیالات، وسوسے اور اندیشے ایک سے تھے جن کی بازگشت ہمارے کان ہر سمت سے سن رہے تھے۔ "اس خط کا کیا ہوا سکندر جو... جو نواب بچو نے لیا چاہا تھا؟" اس نے بالآخر کہا۔

"وہ... وہ لے گیا۔" میں نے کہا۔ "اس نے مجھے خط دکھایا تھا... اور نواب بچو... اس غریب منشی کا ہاتھ۔ صرف ہاتھ۔ اگر وہ میرے ہاتھ آجاتا تو میں اسے قتل کر دیتا۔"

دس منٹ بعد ہم نے تمیز کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ تین دشمنوں میں سے ایک نہر میں ڈوب گیا تھا یا تیر کر نکل گیا تھا۔ دوسرا مقبرے کی جانب فرار ہوا تھا اور تیسرا ابھی تک کنارے پہ بے ہوش پڑا تھا۔ میرے شانے پہ گہری خراش آئی تھی جس میں سے اب بھی لہو رس رہا تھا اور میرے پیروں کو تر کر رہا تھا۔ محسن کو بھی چوٹیں آئی تھیں اور اس کا ایک بازو بے کار ہو رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے میرا ایک پاؤں بے کار ہو گیا تھا۔ ہمارے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور اس حالت میں ہم سڑک تک چل کے جاتے تو یقیناً پکڑے جاتے۔ کوئی گشت کرنے والا سپاہی یا چوکیدار ہماری حالت دیکھ کر ہمیں سیدھا تھانے لے جاتا۔ ہمارا کسی رکشے میں بیٹھ کے ایمبیسیڈر ہوٹل جانا بھی ناممکن تھا۔ رکشہ بھی ہمیں علامہ اقبال روڈ پہ پل تک پہنچے بغیر نہیں مل سکتا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میرے پاس رابعہ کا کارڈ ہے۔ اسے فون کرنا ممکن ہوتا تو کوئی مسئلہ نہ تھا مگر اس وقت قریب و جوار میں فون کہیں نہ تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر میں نے محکمہ نہر کے ان دفتروں کو دیکھا جن کے دروازے بند پڑے تھے اور برآمدوں میں بلب جل رہے تھے۔

"محسن!" میں نے کہا۔ "ان دفتروں کا کوئی چوکیدار ضرور ہوگا اور اس کے پاس کرانی کی چابی ہوگی جس افسر کے کمرے میں ٹیلیفون بھی ہوگا۔ میں چل نہیں سکتا۔ تو ہمت کر اور کسی چوکیدار کو دیکھ۔ وہ کسی برآمدے میں پڑا سو رہا ہوگا۔ اسے پچاس روپے یا سو روپے دے اور کسی افسر کا کمرہ کھلوا۔ میرے بریف کیس میں رابعہ کا کارڈ ہے۔ اسے فون کر دے۔ آدھے گھنٹے تک گھنٹی بجنے دینا۔ کوئی تو اٹھے گا۔ اگر رابعہ خود آئے تو اس کو بتا دینا کہ ہم کہاں ہیں ورنہ اسے بلوا لینا۔ کہنا زندگی اور موت کا مسئلہ ہے... وہ کار سے کر آ جائے گی اور ہمیں لے جائے گی۔ اس کے سوا ہمارے یہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔"

محسن نے بریف کیس کھولا لیکن اندھیرے میں ایک کارڈ کو تلاش کرنا مشکل تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ بریف کیس ساتھ لے جائے اور برآمدے کی روشنی میں اطمینان سے کارڈ تلاش کرے۔ اس نے سر ہلایا اور بریف کیس بند کر کے چل پڑا۔ میں اسے سو گز دور نہر کے دفتر کی جانب بڑھتے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ جب رابعہ آئے گی تو ہم اسے کیا بتائیں گے کہ اپنی اس حالت کا کیا سبب بیان کریں گے؟ کیا اسے تمام واقعات سے باخبر رکھنا دانشمندی ہوگی؟ ہم ڈاکٹرز اور وکیل سے بات چھپائی جائے تو کہیں بگڑ جاتا ہے۔ رابعہ خاموش رہنے پہ رضامند نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟ وہ پولیس کو فون کرے گی کہ فلاں جگہ مقبرے میں ایک لاش پڑی ہے۔ فلاں جگہ دیکھو شاید نہر میں ایک آدمی ڈوبا ہوا ملے۔ وہیں کنارے پر تیسرا آدمی بے ہوش پڑا ہوگا۔ پھر پولیس آئے گی، تفتیش شروع ہوگی اور ہم کیا بتائیں گے کہ ہم اس میں کیسے ملوث تھے۔ شیروانی صاحب تو بعد میں پوچھیں گے کہ مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی تھی۔ پہلے پولیس سوال کرے گی کہ ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ اگلا مرحلہ سلامت شاہ کی لاش کے بارے میں انکشاف کا ہوگا۔ مجھے تسلیم کرنا پڑے گا کہ میں اس گھر میں گودا تھا اور محبت خان گواہی دے گا۔ پھر اس خط کا کیا ہے گا جو کل کی ڈاک سے آنے والا ہے؟ میں نے محسوس کیا کہ سوالات کی بھرمار سے میرا دماغ ماؤف ہونے لگا ہے۔

میں نے اٹھ کر اس شخص کو دیکھا جو میری لات لگنے سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میں

www.paksociety.com

نے جھک کر اس کی نبض دیکھی۔ اس کی نبض ساکت تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن بھی خاموش تھی۔ اس کی سانس کی آمد و رفت بھی بند تھی۔ دنیا میری نظروں کے سامنے یوں گھومنے لگی جیسے میں چکر کھانے والے جھولے میں بیٹھا ہوں۔ پھر میں نے اپنی حالت پر قابو پایا اور لڑکھڑاتا ہوا اس جگہ سے دور جانے لگا جہاں میرے ہاتھوں مارے جانے والے کی لاش پڑی تھی۔ ایک قتل کا الزام مجھ پر پہلے ہی تھا۔ یہ دوسرا قتل میں نے واقعی کیا تھا۔ اپنے دفاع میں کیا جانے والا قتل بھی تو قتل ہی ہوتا ہے۔ صفائی تو بعد میں پیش ہوگی۔ پہلے تو میری ضمانت منسوخ ہو جائے گی اور میں پھر جیل میں بند ہو جاؤں گا۔ محسن مجھے راستے میں ملا۔ وہ آ رہا ہے۔" محسن نے مجھے مطلع کیا۔ "چوکیدار نے سو روپے لیے ہیں۔"

"تم نے اسے تفصیلات تو نہیں بتائی ہیں؟" میں نے کہا۔ محسن نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے صرف یہ کہا تھا کہ بدمعاشوں سے مقابلے میں ہم زخمی ہو گئے ہیں۔" محسن بولا۔

"ٹھیک ہے۔ اس سے زیادہ کچھ بتانا بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ شخص جو نہر کے کنارے پڑا تھا... وہ مر گیا ہے۔"

"یہ تو بہت برا ہوا یار۔" محسن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "اگر وہ نہر میں گرنے والا بھی ڈوب گیا ہوگا تو یہ دونوں قتل ہماری فردِ جرم میں شامل ہو جائیں گے۔"

"ہماری نہیں صرف میری۔" میں نے کہا۔ "ان دونوں کی موت کا سبب میں ہوں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" محسن نے کہا۔ "حملہ ہم دونوں پر ہوا تھا۔ ہم نے اپنا دفاع کیا۔ جنگ میں دشمن کی جان لینے میں قانون کے خوف سے تامل کرنے کا مطلب ہے خودکشی۔ جیسے تم نے میرے دشمن کو مار کے میری جان بچائی ایسے ہی یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے موقع ملتا تو تجھ پر دشمن کو غالب پاتا تو اس کو مار دیتا یا انہیں موقع ملتا تو صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی اور اس وقت ہم دونوں کی لاشیں یہاں پڑی ہوتیں۔ ہمارے دشمن ایک سے زیادہ تھے۔ ان کے خلاف ہماری جنگ بھی ایک تھی۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بچ جانے والا بے گناہ ٹھہرے اور بچانے والا مجرم بن جائے۔"

"تیری دلیل مان لی جائے تب بھی دفاع میں قتل کرنے پر قانون کی رعایت حالات کی شہادت پر ملتی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ کیسے ثابت ہوگا کہ ہم پر حملہ کیا گیا تھا اور حملے کے دوران دو مارے گئے۔ کون گواہ ہوگا اس بات کا اور اس کے لیے سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ ہم یہاں سے تھانے جائیں۔ تمام واقعات بیان کریں اور خود کو قانون کے حوالے کر دیں۔ اس کے بعد قانونی کارروائی کا سلسلہ شروع ہوگا اور پولیس کا ردِعمل کیا ہوگا۔ میر شرافت علی کے مبینہ قاتل نے ضمانت پر رہا ہونے کے چند گھنٹے بعد دو افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس بار میری ضمانت نہیں ہو سکے گی محسن۔ اس کے بعد مقدمے کی سماعت کے دوران میرا سابقہ ریکارڈ بھی عدالت کے سامنے رکھا جائے گا۔ میری وجہ سے لندن میں ایک قتل ہو چکا ہے اور میں ایک گواہ کی حیثیت سے شہادت پیش کرنے کے لیے ہوٹل کے کمرے میں بند رکھنے کا الزام ناکافی ثبوت کی بنا پر ثابت نہ ہو سکا۔ مجھے لندن سے ڈی پورٹ کیا گیا اور اپنے وطن پہنچتے ہی میں نے میر شرافت علی کے گھر میں گھس کر ان کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ انصاف کرنے والے مجھے ترچھی نظر سے ضرور دیکھیں گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جہاں سے دھواں اٹھتا ہے وہاں آگ تو ہوتی ہی ہے۔ آخر میرے ساتھ ہی پے در پے ایسے اتفاقات کیوں پیش آتے ہیں؟ کہاں سے میری معصومیت کی دلیل ملتی ہے۔ شریف آدمی تو بلاوجہ ایسے معاملات میں ملوث نہیں ہوتے۔"

"پھر اب کیا کریں؟" محسن نے کہا۔ "رابعہ کو کچھ بتانا بھی مشکل ہے، اور بتانا بھی ہے۔"

"میرے ذہن میں نجات کی ایک ترکیب ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اس دوسرے شخص کو بھی نہر میں ڈال دیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" محسن نے کہا۔ "لاشیں تو پرسوں کل ایک ساتھ مل جائیں گی۔ یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ قتل ایک ہی وقت میں ہوئے تھے۔"

"ہاں، مگر کسی نے قتل ہوتے تو نہیں دیکھا۔" میں نے کہا۔ "کسی نے ہمیں لڑتے ہوئے تو کیا آج سے پہلے ان کے ساتھ تک نہیں دیکھا۔ اگر ان کے جسم پر ہمارے فنگر پرنٹ وغیرہ ہوں گے تو پانی میں مٹ جائیں گے۔ دوسری بات یہ کہ کسی خنجر پر ہمارے فنگر پرنٹ نہیں ہیں۔ ایک خنجر نہر کے کنارے پڑا ملے گا تو اس پر انہی میں سے کسی کے فنگر پرنٹ ہوں گے۔ دوسری بات یہ کہ ان میں سے کوئی خنجر کے یا گولی کے زخم سے ہلاک نہیں ہوا۔ ایک مار پیٹ کے دوران نہر میں جا گرا اور دوسرا غالباً سر کی اندرونی چوٹ سے... پوسٹ مارٹم میں یہی بات سامنے آئے گی کہ دونوں کے سر پر چوٹ کے نشانات پائے گئے۔ غالباً ان کا آپس میں کسی بات پر جھگڑا ہوا جس میں ایک نے خنجر بھی نکالا مگر اس کے حریف نے وار کامیاب نہ ہونے دیا اور کلائی کی ہڈی توڑ دی۔ پھر ان میں سے ایک پانی میں جا گرا اور شاید دوسرا سر کی چوٹ سے بے ہوش ہوا اور کیونکہ وہ کنارے پر تھا اس لیے مرا تو نہر تک نہ گیا۔ نہ ان کے پاس ہماری کوئی چیز تھی اور نہ جائے واردات پر ہماری موجودگی ثابت ہوتی ہے۔ پولیس جو نتیجہ چاہے اخذ کرے۔ جس شخص کے پاس فوما پچو کا خط تھا وہ تو خط لے کر بھاگ گیا ہے اور ظاہر ہے ہمارے خلاف رپورٹ نہیں کر سکتا اس لیے وہ سامنے آنے پر مجبور ہوگا اور یہ معاملات اس کے گلے پڑ جائیں گے۔"

"کل صبح تین لاشوں کے قتل ہونے کی خبر عام ہو چکی ہوگی۔ اور اگر سلامت شاہ کی لاش بھی مل گئی تو چار قتل۔"

"میرا خیال ہے پہلے یہی دو لاشیں نہر سے ملیں گی۔" میں نے کہا۔ "فوما پچو کی لاش شاید کل نہ ملے یا دیر سے ملے تو خبر شاید کل نہ آسکے۔ یہی صورتِ حال سلامت شاہ کی ہے۔ ہو سکتا ہے کل پرسوں تک کسی کو تعفن کا احساس نہ ہو۔ لاش صندوق میں بند ہے اور کوٹھیاں ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ ان چاروں کے درمیان پولیس کوئی تعلق قائم نہ کر سکے گی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" محسن نے سوچ کر کہا۔ "تو چلیں پھر اسے ٹھکانے لگا دیں۔ رابعہ آتی ہی ہوگی۔"

ہم دونوں واپس ہوئے۔ چند قدم کے فاصلے پر وہ شخص ابھی تک جھاڑیوں کے پیچھے اوندھا پڑا تھا۔ ہم نے اٹھا کے اسے نہر میں پھینکا اور وہ لکڑی کے لٹھے کی طرح پانی میں گرا۔ ہم نے اپنی پوری قوت صرف کر دی تھی۔ چنانچہ وہ کنارے سے کچھ دور ہو گیا تھا اور اب نہر کے خاموش بہتے پانی کے رحم و کرم پر تھا جو دوسری لاش کو بہا کر آگے لے جا چکا تھا۔ واپس ہونے سے پہلے میں نے خنجر تلاش کیا اور اسے بھی نہر میں پھینک دیا۔

"رابعہ کو اب صرف یہ بتانا ہے کہ حملہ آور ہمیں لوٹنا چاہتے تھے مگر کامیاب نہ ہو سکے اور ہم نے مقابلہ کیا تو بھاگ گئے۔" میں نے کہا۔

"اور پرسوں صبح کے اخبار میں وہ دیکھے گی کہ دو لاشیں نہر سے دستیاب ہوئی ہیں جہاں سے وہ ہمیں لینے آئی تھی تو کیا اسے یہ خیال نہیں آئے گا کہ دونوں مقتول وہی لوگ ہیں جو ہمیں لوٹنا چاہتے تھے۔" محسن نے کہا۔ "اسے شک نہیں ہوگا کہ ہم نے جھوٹ بولا تھا اور ڈاکو فرار نہیں ہو سکے تھے بلکہ ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "پہلی بات تو یہ کہ اب دونوں لاشیں ایک جگہ نہیں رہیں گی۔ آدھے پونے گھنٹے کے فرق سے آگے پیچھے بہتی جا رہی ہیں۔ صبح کا اجالا پھیلنے تک لاشیں اس آباد علاقے سے گزر کے جھاڑیوں کی طرف جانے والی نہر میں ایک دو میل مزید جا چکی ہوں گی۔ اور صبح ہونے تک نہ جانے کہاں ہوں گی۔ یہاں ہر شخص اتنا فرض شناس اور قانون پرست شہری نہیں ہے کہ لاشوں کو دیکھتے ہی سیدھا پولیس اسٹیشن جا کے رپورٹ کرے۔ زیادہ تر لوگ دہشت زدہ ہو کے بھاگ لیں گے اور خواہ مخواہ پولیس کے چکر میں پڑنے سے گریز کریں گے۔ بالآخر لاشیں مال روڈ کے پل کے جنگلے میں اٹک جائیں گی اور وہاں مجمع اکٹھا ہوگا تو کوئی پولیس کو بھی بلا لے گا۔ پولیس سے یہ توقع مت رکھو کہ وہ نہر کے ساتھ ساتھ کئی میل واپس آ کے ایک ایک انچ کا علاقہ اس امید میں چھان مارے گی کہ کہیں جدوجہد کا سراغ ملے۔ لہو کے داغ یا شکستہ جھاڑیاں اور روندی ہوئی زمین دکھائی دے تو وہ اصل جائے واردات کا تعین کر لے گی۔ نہر میلوں لمبی ہے اور دونوں کنارے ملا کر سینکڑوں میل کا علاقہ خوردبین سے نہیں دیکھا جا سکتا۔"

"میرا خیال ہے اس سے آگے جانا ٹھیک نہیں۔" محسن نے رکتے ہوئے کہا۔ "نہر کا پل اب مشکل سے سو گز دور رہ گیا تھا۔ رابعہ ادھر آئے گی تو کار کی ہیڈ لائٹس میں ہمیں دیکھ لے گی۔"

"مجھے تو فوما پچو کی موت کا افسوس ہے۔" میں نے رکتے ہوئے کہا۔ "آخر وہ دشمنوں کے ہتھے کیسے چڑھ گیا۔"

"انہوں نے یقیناً عدالت سے ہمارا تعاقب کیا ہوگا۔" محسن بولا۔ "یہ دیکھنے کے لیے کہ ضمانت پر رہائی کے بعد ہم کدھر جاتے ہیں۔ ہم رابعہ کی کار میں تھے۔ شاید فوما پچو ٹیکسی میں ہمارے پیچھے تھا اور وہ فوما پچو کے پیچھے۔ انہوں نے دیکھ لیا ہوگا کہ فوما پچو نے ہمیں کوئی پیغام دیا ہے اور وہ اسے پکڑ کے لے گئے ہوں گے۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو ہماری لاشیں بھی وہیں پڑی ملتیں۔ وہ دراصل انہوں نے اسی لیے دشمن کیا ہوگا کہ ہمیں اس ویرانے میں لے جا کر اذیت دیں۔ ہم سے پوچھیں کہ ہم کیا کچھ جانتے ہیں اور پھر قتل کر کے چھوڑ جائیں۔ اس جیسے کی روشنی بائیں سڑک پہ سے گزرنے والا کوئی شخص دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہماری فریاد و فغاں کسی کے

www.paksociety.com

کانوں تک کہاں پہنچتی ہے؟"

"معلوم نہیں تو ہا بچو مرحوم کس کا منشی تھا؟" محسن نے کہا۔ "اگر یہ بات معلوم ہو جائے تو کچھ پیش رفت ہو سکتی ہے۔"

اسی وقت گردشی شاہراہ کی طرف سے ایک کار نمودار ہوئی جو اس سے پہلے نظر آنے والی اکا دکا کاروں کی طرح دھڑ سے چیکوں کی طرف جانے کی بجائے سڑک پار عبور کرتے ہی بائیں جانب مڑ گئی اور ٹیلی پول پر لگی ہوئی اسٹریٹ لائٹ کے اجالے میں رابعہ کی مرسڈیز فاکس ویگن کو پہچان لیا۔ ہم دونوں نے کار کے قریب آتے ہی سڑک کے وسط میں آ کے ہاتھ کا اشارہ دیا اور کار ہمارے پاس آ کے رک گئی۔

رابعہ سوتے سے اٹھ کر آئی تھی چنانچہ اس کی آنکھوں میں نیند کا اثر باقی تھا۔ سیٹ کیے ہوئے بالوں کو برش کیے بغیر وہ سادہ سوتی شلوار قمیص میں چپل پہن کے نکل آئی تھی۔ کار کو پچاس پچپن سال کا ایک بوڑھا شوفر چلا رہا تھا۔

"تم... تم تو زخمی ہو... بہت زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ہیں کیا؟" وہ اترتے ہی بولی۔ پھر اس نے ہمارے بھیگے ہوئے کپڑوں کا جائزہ لیا جو مار پیٹ میں کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے۔

"تشویش کی کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "پہلے ہمیں گھر لے چلو۔ پھر سب بات بتا دیں گے۔"

"میں تمہیں گھر لے جانے کے لیے ہی آئی ہوں۔" وہ بولی۔ "مگر مجھے یہ تو بتاؤ کہ ہوا کیا تھا؟"

"ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ بدمعاش تھے، ہمیں لوٹنا چاہتے تھے۔"

"مگر تم آدھی رات گئے یہاں کیا کر رہے تھے؟" وہ مشتبہ لہجے میں بولی۔ "اور وہ بدمعاش کہاں گئے؟"

"ہم نے مقابلہ کیا تو وہ بھاگ گئے۔" محسن نے کہا۔ "انہوں نے دور سے ایک تانگہ آتے دیکھ لیا تھا۔"

"یہاں میرا ایک دوست رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم محسن کے ڈیڈی کو ایئرپورٹ چھوڑنے گئے تھے۔ واپسی پر اس سے ملنے چلے گئے تھے۔"

رابعہ نے دروازہ کھول کے سیٹ آگے کی اور ہم دونوں پیچھے والی نشست پر بیٹھ گئے تو رابعہ پھر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ "زخم خطرناک نہیں ہیں تب بھی پولیس میں رپورٹ لکھوانی ضروری ہے۔" وہ بولی۔ "پولیس سرجن سے میڈیکل رپورٹ لینی ہو گی۔"

"نہیں مس رابعہ!" میں نے کہا۔ "اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

"لیکن کیوں؟ یہ راہزنی اور اقدام قتل کا کیس ہے۔" وہ اصرار کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں مگر ہمیں نقصان تو کوئی نہیں ہوا۔ بلکہ آج ہی... میرا مطلب ہے گزشتہ روز ہی میری رہائی ہوئی ہے۔ اب میں کسی کیس میں ملوث نہیں ہونا چاہتا۔ تمہارے گھر میں ڈیٹول وغیرہ تو ہو گی۔ ہم خود مرہم پٹی کر لیں گے۔"

وہ مطمئن نہیں ہوئی لیکن خاموش ہو گئی۔ میں اور محسن اپنے اپنے خیالات کے سمندر میں غوطہ زن رہے۔ رات کے آخری پہر میں شہر کی فراواں مخلوق فکر و تردد اور غم سے بے نیاز لذت خواب سحر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گردشی شاہراہ کی دکانوں کے تھڑوں پر چارپائیاں ڈال کے لیٹے ہوئے لوگ، بازار کے تمام دروازے، ساکت پوسٹ اور اسٹریٹ لائٹ کے ٹمٹماتے بلب، درخت اور بجلی کے کھمبے، فٹ پاتھ، گلیاں اور چوراہے سب سوتے پڑے تھے۔ کبھی کبھار دودھ کے ڈرم لے جانے والا کوئی ریڑھا گزر جاتا تھا۔ گھوڑے کے سموں کی آواز خالی سڑک پر دیر تک گونجتی رہتی تھی۔ جا بجا آوارہ کتے اور فقیر فرش خاک پر لیٹے ہوئے تھے۔ بس سروس کی ایک بس دھواں چھوڑتی گزر گئی۔ گشت کرنے والے سپاہی بھی اپنے ٹھکانوں پر اونگھ رہے تھے۔ دو نوجوان سڑک خالی پا کے سائیکل پر تیز رفتاری کے مقابلے میں مصروف بڑے جوش و خروش سے پیڈل چلاتے گزرے۔ دونوں اخبار فروش لگتے تھے۔ کار کراؤن سینما کے چوک سے بائیں جانب مڑی۔ سینما کی رنگین روشنیاں اور تماش بینوں کے اژدہام سے گونجنے والی اور پرکشش پوسٹروں سے مزین عمارت سنسان پڑی تھی اور احاطے میں صرف ایک لائٹ جل رہی تھی۔ کار کر لا تک پھر چینے کے بعد ایک کوٹھی کے گیٹ پر رکی۔ شوفر نے نیچے اتر کے جلدی جلدی گیٹ کھولا۔ کار کو آگے لے گیا۔ اتر کے واپس پھاٹک بند کرنے گیا اور کار کو پورچ میں لے جا کر روک دیا۔

"بابا!" رابعہ نے شوفر سے کہا۔ "دیکھو مہمانوں کا کمرہ صاف کر دیا گیا ہے یا نہیں۔" اور نیچے اتر گئی۔ پھر سیٹ کو آگے کیا اور باری باری باہر آ گئے۔ رابعہ کا گھر پرانی وضع کی کوٹھی تھی۔ پورچ کے دونوں طرف تین تین کمرے تھے۔ ہر کمرے کی ایک کھڑکی اور ایک دروازہ پورچ کی جانب کھلتا تھا۔ [illegible] ہوتی تھی۔ کمرے کے پیچھے رنگین شیشوں کے ٹکڑوں سے سجے نصف دائرے جیسے روشن دان تھے۔ اوپر کی منزل شاید بعد میں تعمیر ہوئی تھی چنانچہ نقشہ بھی تھا مگر اوپر کے ہر کمرے میں لوہے کی گرل والی اور بڑے بڑے شیشوں کے پٹ ڈالی جدید وضع کی ایک ایک کھڑکی تھی۔ پوری عمارت کا رنگ ایک طرح کا یعنی ہلکا نیلا تھا مگر کہیں کہیں سے نیچے کا پرانا پیلا رنگ بھی جھانکنے لگا تھا۔ پورچ میں ایک ٹیوب لائٹ تھی جس کا اجالا سامنے پھیلے ہوئے مختصر سے باغ اور لان پر بھی پھیل گیا تھا۔ نیچے کے دو اور اوپر کے ایک کمرے میں بھی ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ کار کی آواز پر پچاس پچپن برس کی ایک فربہ بدن اور صحت مند عورت باہر آئی جس نے سر کو پیشانی تک دوپٹے میں لپیٹ رکھا تھا۔

"یہ میری ماں ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "اور ماں! یہ دونوں اسکول اور کالج میں میرے ساتھ تھے۔ یہ محسن ہے۔ اس کے ڈیڈی وزارت خارجہ میں ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔ اور یہ سکندر ہے۔ اس کے والد مرحوم پرائیڈ کمپنی کے مالک تھے۔ حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ یہ دونوں لندن میں تھے۔"

ہمارے سلام کا شفقت سے جواب دے کر رابعہ کی ماں نے اطمینان کا سانس لیا کہ رات کے آخری پہر میں وارد ہونے والے مہمان جیل سے فرار ہونے والے قیدی نہیں ہیں یا کوئی سنگین جرم کر کے اس کی وکیل بیٹی کے پاس مدد کے لیے پہنچنے والے لوگ نہیں بلکہ اچھے گھروں کے شریف اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد ہیں۔ اس کی ابتدائی تشویش بے وجہ نہ تھی۔ رابعہ کتنی ہی بڑی وکیل کیوں نہ سہی تھی تو ایک جوان لڑکی اور اگرچہ ابھی تک یہ بات کسی نے نہیں بتائی تھی لیکن اندازہ یہی تھا کہ رابعہ کا باپ نہیں ہے۔ ہوتا تو سامنے ضرور آتا۔ زیادہ امکانات یہی تھے کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے لیکن اس کے دوسرا گھر بسانے کے بعد پہلی بیوی اور بیٹی کو چھوڑ دینے کے خیال کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ رابعہ نے وکالت شروع ہی کی تھی کہ وہ مر گیا اور رابعہ کے حالات کے پاس کوئی نہیں تھا۔ اس کا ایک بھائی تعلیم کے لیے لندن گیا تھا مگر اس نے روایت نبھاتے ہوئے ایک انگریز لڑکی سے شادی کر لی تھی اور وہیں آباد ہو گیا تھا۔ بوڑھے شوفر کی بیوی بھی اسی گھر میں ملازم تھی اور باورچی خانہ سنبھالتی تھی۔ گھر کی صفائی دونوں مل کر کرتے تھے۔ اکثر رابعہ یا اس کی ماں بھی ان کا ہاتھ بٹا دیتے تھے۔ دونوں میاں بیوی بیس برس سے اسی گھر کا نمک کھا رہے تھے چنانچہ بے حد قابل اعتماد تھے۔ ان کی حیثیت بھی نوکروں کی نہیں گھر کے افراد جیسی تھی۔

رابعہ روانگی سے پہلے ہی کہہ گئی تھی کہ مہمانوں والا کمرہ کھول کے صاف کر دیا جائے۔ رابعہ کی ماں ہمیں خود وہاں تک پہنچانے گئی اور ہم سے کہا کہ پہلے ہم غسل وغیرہ کر لیں اور کپڑے بدل لیں۔ رابعہ ڈاکٹر کو فون کرنے گئی ہے۔ ہم نے واجبی سا احتجاج کیا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر اس نے کہا کہ معمولی زخموں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے ہم سے یہ نہیں پوچھا کہ آخر یہ زخم کیسے آئے۔ جب وہ دروازہ بند کر کے چلی گئی تو میں نے محسن سے کہا۔ "یار کپڑوں کا تو مسئلہ ہو گا۔ میرے بریف کیس میں صرف دو جوڑے ہیں۔ ایک پتلون قمیص، ایک شلوار قمیص۔"

"پھر مسئلہ کیسا؟" محسن نے کہا۔ "شلوار قمیص مجھے دے دو۔ تیرے میرے سائز میں فرق تو نہیں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے بریف کیس کھولتے کہا۔ "اس کے بعد کیا ہو گا؟ میرا تمام سامان تو سلامت شاہ کے کوارٹر میں پڑا تھا۔ معلوم نہیں اب ہے یا نہیں۔ خیر دیکھا جائے گا۔ تو سنبھالو۔" میں نے اسے شلوار قمیص تھماتے کہا۔ محسن نے غسل خانے کی طرف اشارہ کیا اور بریف کیس میں سے اپنا شیونگ کا سامان بھی نکالا۔

"پہلے تو جا کے اپنا اس زخم کو دھو۔" محسن نے کہا۔ "دیر کی تو خراب ہو جائے گا۔ شاید اندر ڈیٹول ہو گی ورنہ صابن سے صاف کر لینا۔ ابھی ڈاکٹر آ ہی رہا ہو گا۔ میرا خیال ہے رابعہ نے سوچ سمجھ کے کسی قابل اعتبار آدمی کو ہی بلایا ہو گا۔"

غسل خانے میں ٹھنڈے اور گرم پانی کے نل الگ الگ تھے۔ میں نے کپڑوں کو جسم سے الگ کیا تو قمیص کی آستین بازو پر خون کے خشک ہو جانے سے چپک گئی تھی۔ میں نے اسے گرم پانی ڈال کے الگ کیا اور آہستہ آہستہ مل کے خون کے سارے داغ دھو ڈالے۔ میرا زخمی ہاتھ درد کے باعث پوری طرح حرکت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ مجھے غسل کے دوران ایک ہی ہاتھ پر انحصار کرنا پڑا۔ باتھ روم میں ڈیٹول موجود تھی۔ اس جراثیم کش محلول سے زخم کو دھوتے ہوئے میں نے زخم کی کیفیت دیکھی۔ خنجر کی نوک نے شانے کے گوشت کو تقریباً آٹھ انچ تک بڑی صفائی سے کاٹ دیا تھا اور اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ خنجر کی دھار شیونگ بلیڈ کی طرح تیز تھی۔ زخم کی گہرائی آدھے انچ کے قریب تھی۔ گوشت کے دونوں جدا ہونے والے حصے انجماد خون کے بعد آپس میں مل گئے تھے۔ دھونے سے زخم کا منہ پھر کھل گیا اور خون رسنے لگا۔ میں نے اتاری ہوئی قمیص میں سے کپڑے کی ایک پٹی پھاڑ کے واش بیسن میں دھوئی، اور

www.paksociety.com

ڈیٹول کے پانی میں بھگو کے ہاتھ پر مضبوطی سے باندھ لی۔ تھوڑا سا خون پٹی کے باہر تک پہنچا مگر اس کے بعد لہو کے داغ کا پھیلاؤ رک گیا۔ میں نے آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ کی تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اب تک مجھے اندازہ نہ تھا کہ گزشتہ تین دن میں میرا چہرہ کتنا بدل گیا ہے۔ میری شیو بڑھنے سے باقاعدہ داڑھی کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے اور میرے جھاڑ جھنکاڑ بالوں میں گرد کے علاوہ خس و خاشاک نظر آتے تھے۔ واہ میاں سکندر بخت! دیکھو فلک کج رفتار کی گردش نے تمہیں کیا سے کیا کر دیا اور کہاں پہنچا دیا۔ عبرت پکڑو، تم خود دنیا کو تماشا گاہ اور خود کو تماشائی سمجھتے تھے، آج خود تماشا ہو اور سوچو کہ آنے والے دن کے لیے تقدیر کا نوشتہ سرخروئی ہے کہ روسیاہی!

شیو اور غسل کے دوران میں مجھے نوباجو یعنی منشی کی لاش کا خیال بھی آیا جو ایک مجرم کی طرح محروم بے گور و کفن پڑی تھی۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ سچ پر اڑا ہوا تھا۔ محض اس لیے کہ بچپن میں ماں باپ نے کہا تھا بیٹا ہمیشہ سچ بولو۔ بزرگوں کا قول تھا کہ سچ عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ مذہب نے حق گوئی کو جہاد قرار دیا تھا اور کتابوں میں لکھا تھا کہ سچ کا بول بالا ہوتا ہے۔ اگر وہ مذہب و اخلاق کی تعلیم کا علمبردار اور عقل و دانش کے اقوال زریں پر یقین نہ رکھتا تو وہ مرنے والوں کی بجائے مارنے والوں میں شامل ہوتا۔ اس کی شیروانی بوسیدہ اور اس کی قمیص پھٹی ہوئی نہ ہوتی اور وہ اس وقت بہترین سوٹ پہنے کار میں نئی خریدی سیم تن کے ساتھ مال روڈ سے گزر رہا ہوتا یا فلیٹیز جیسے کسی ہوٹل کے لاؤنج میں ایک نئے پُرمسرت اور کامیاب دن کے آغاز کا جام تجویز کر رہا ہوتا یا اپنے عالی شان گھر کی آراستہ خواب گاہ میں سویا پڑا ہوتا۔ مگر اس نے سچ بولا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کوئی اسے سچ کا کوئی انعام نہ دے سکے گا۔ کوئی خلعت یا جاگیر عطا نہیں کرے گا اور نہ اس کا نام اس کی لوح مزار پر سنہرے حروف سے نہیں لکھا جائے گا۔ اس سے میرا کوئی جذباتی رشتہ نہیں تھا اور اسے میرے یا میرے آباؤ اجداد کے کسی احسان کا قرض نہیں چکانا تھا مگر اس نے سچ بولا۔ اور اب میرے لیے اسے عام آدمی کی طرح عزت و احترام کے ساتھ آغوش لحد کے سپرد کرنا بھی ممکن نہیں۔ جب اس حق پرست کی لاش سڑنے لگے گی اور اس پر چیل کوے منڈلانے لگیں گے تو پولیس اپنے ساتھ بھنگی لے کر آئے گی جو اس کوڑے کو سمیٹ کر گاڑی میں ڈال دیں گے اور پوسٹ مارٹم کی قانونی یا کاغذی کارروائی کے بعد لاوارث لاش [illegible] ان طلبا کے حوالے کر دی جائے گی جو مستقبل کے انسان کی بہتری اور درازی عمر کے لیے جد و جہد اور تحقیق میں مصروف ہیں۔ [illegible] لاش لے گئے تو بامر مجبوری تدفین میں شریک ہوں گے اور منہ پھیر کر کہیں گے کہ بھائی آدمی کو اس کے کیے کی سزا اور ملتی ہے۔ خدا معاف کرے، مخبری کرنے والے کو دیکھو موت آئی تو کہاں اور کس حال میں۔ یہ منافق انسان جو یہ نہیں کہتے نیکی و بدی کے ثبوت کتنے اعتماد سے دیتے ہیں۔ مجھے اس بوٹ پالش کرنے والے لڑکے کا بھی خیال آیا۔ اور میں نے خدا سے دعا مانگی کہ ایک اندھی ماں اور ایک چھوٹے بھائی کی پرورش کرنے والا وہ چھوٹا سا جوان زندہ رہے۔ مجھے ضرور تھی کہ شخص ایک رقعہ پہنچانے پہ میرے دشمن اس کا [illegible] نہیں کریں گے جسے یہ بھی علم نہ تھا کہ مکتوب کیا ہے اور مکتوب الیہ کون ہے۔ اسے کون بھیج رہا ہے اور کون دیکھ رہا ہے۔

جب میں نے لباس بدلنے کے بعد پھر آئینہ دیکھا تو اپنے آپ کو پہچان کر خوش ہوا۔ پرانا سکندر بخت جو گرد و غبار اور جھاڑ جھنکاڑ کے صاف ہو جانے کے بعد غسل خانے سے برآمد ہوا کمرے میں موجود کم سے کم دو افراد یعنی رابعہ اور محسن کے لیے بھی باعث حیرت و مسرت بنا۔ رابعہ مسکرائی اور محسن نے ہنس کر کہا۔ "بھیا اب تو پھر شریف آدمی نظر آنے لگے۔"

"نظر آنے لگا ہوں کا کیا مطلب؟" میں نے خوش دلی سے احتجاج کیا۔ "کیا میں پہلے نہیں تھا؟"

کمرے میں موجود تیسرے شخص کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں پڑا جو اپنی متانت سے ہی نہیں انداز اور ساز و سامان سے بھی ڈاکٹر لگتا تھا۔ وہ محسن کا معائنہ کر چکا تھا اور اس کا تجویز کردہ نسخہ میز پر رکھا تھا۔ اب اس نے مجھے بٹھا کے زیادہ تفصیل سے دیکھا کیونکہ میں واقعی زخمی تھا۔ اس نے بازو پر لپٹی ہوئی پٹی کی فرسٹ ایڈ پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور پھر نئے سرے سے زخم کی صفائی کے بعد کوئی پاؤڈر لگایا۔ "نیومائی سین" جو کہ باقاعدہ احتیاط سے زخم کی حفاظت کو پٹی باندھی۔ ایک انجکشن لگایا اور اپنے بیگ میں سے ایک شیشی نکال کے نسخے پر رکھ دی۔ شیشی میں کیپسول تھے جو میرے اندازے کے مطابق اینٹی بایوٹک تھے اور زخم کے زہریلے اثرات کو جسم میں پھیلنے سے روکنے کے لیے تھے۔ پھر اس نے چاندی کی طرح چمکتا ہوا ایک انگلی جتنا لمبا المونیم کا ٹیوب نکالا جس کے شفاف پلاسٹک کور میں دس گولیاں مقید تھیں۔ یہ محض سکون آور "ڈائزاپام" فائیو ملی گرام [illegible]

محسن کا نسخہ ایک سری تھا۔ چلتے چلتے اس نے عادتاً کہا کہ انشاء اللہ تشویش کی کوئی بات نہیں اور چند دن کی باقاعدہ ڈریسنگ سے زخم ٹھیک ہو جائے گا بشرطیکہ اس دوران میں آپ بازو کا غیر ضروری مظاہرہ نہ کریں۔ وہ انتہائی کم گو، خلیق اور صورت سے قابل اعتماد نظر آنے والا بوڑھا آدمی تھا جو رابعہ نے مجھے بعد میں بتایا، عرصے تک اس کے والد کا دوست رہا تھا جسے وہ بچپن سے "ڈاکٹر انکل" کہتی آئی تھی۔ چنانچہ رابعہ کا فون ملتے ہی وہ آ پہنچا تھا اور رابعہ کے اس بیان سے مطمئن ہو گیا تھا کہ ہم اس کے دوست ہیں جو راہ چلتے ایک مظلوم کی حمایت کے لیے لڑائی میں کود پڑے تھے اور اب خود بھی مظلوم تھے تاہم غنیمت ہے کہ مقتول نہیں تھے۔

محسن کا ہاتھ دوسرے نکلا تو رابعہ نے بورڈ پہ لگی ہوئی ایک گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ گھنٹی شاید باورچی خانے میں بجی جہاں اس کی ہدایات کے مطابق کافی پہلے ہی تیار تھی۔ چند منٹ کے بعد شوفر کی زوجہ "ماسی" ٹرے اٹھائے نمودار ہوئی، اور درمیان کی میز پر رکھ کے رخصت ہو گئی۔ جاتے جاتے اس نے پھر ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا اور زیر لب وظیفہ پڑھنے کے انداز میں کوئی بات کی جو یہ بھی ہو سکتی تھی کہ موئے خدائی خوار دن دیکھیں نہ رات منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ اور کوئی دعائے خیر بھی۔ کافی وقت کی اہم ترین ضرورت تھی، جسے میں نے اسپرین نگلنے کے لیے بھی استعمال کیا۔ پھر میں نے رابعہ سے معذرت کی کہ ہم ایسے غلط وقت یہاں آ کے باعث زحمت بنے اور اس کی مدد اور مہمان نوازی پر شکر گزاری کا اظہار کرنے کے بعد میں نے تجویز کیا کہ صبح ہونے والی ہے مگر ایک دو گھنٹے آرام کر لینا ہم سب کے لیے بہتر ہوگا۔ رابعہ نے اپنی اعصابی مریض ماں کو پہلے ہی سلا دیا تھا۔ وہ ناشتے کی میز پر دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر کے رخصت ہوئی اور جاتے ہوئے دروازہ بند کر گئی۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ خدا کا شکر بجا لایا جس نے ہمیں تحفظ و عافیت کے ساتھ اس گھر کی چھت کے نیچے پہنچایا اور آسمان پہ نہیں اٹھایا۔

"مسٹر محسن رضا!" میں نے بیڈ پہ نیم دراز ہو کے سگریٹ سلگایا اور تکیے کو سر کے نیچے ایک فٹ اونچی بیڈ سائڈ پہ رکھ لیا۔ "کتنی خوشی کی بات ہے کہ اس وقت تمہاری لاش نہر میں بہتی ہوئی نہیں جا رہی ہے۔"

"جی" محسن نے دوسری طرف کی بیڈ سائڈ پہ دوسرا تکیہ رکھ کے میری تقلید کی اور پیر میری طرف پھیلا دیے۔ اب ہم آمنے سامنے اور ایک دوسرے کے متوازی نیم دراز تھے۔ "یہ کیا کم خوشی کی بات ہے کہ تمہاری لاش اس ویران مقبرے میں نوباجو کی لاش کے ساتھ نہیں لیٹی ہوئی ہے۔"

"اب ہم فوری توجہ طلب مسائل پر مذاکرات کا آغاز کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ اب تک ہم نے سو فیصد جھوٹ بولا ہے اور ہر جھوٹ بولنے والے کی طرح اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ یہ سب سچ لگتا ہے۔ رابعہ احمق نادان نہیں ہے۔ ہمیں اس جھوٹ میں پچاس فیصد تخفیف کرنی ہوگی۔"

"کیا مطلب؟" محسن نے کہا۔ "یعنی اب نئے بیان میں تسلیم کرنا ہوگا کہ حملہ آور ایک تھا؟ یا یہ کہ حملہ ہم میں سے ایک پر ہوا تھا؟"

"جھوٹ میں پچاس فیصد تخفیف کا مطلب بات میں پچاس فیصد صداقت کا اضافہ ہرگز نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "بہت غور و خوض کے بعد میں نے طے کیا ہے کہ صبح پہلے تو رابعہ کے سامنے ڈھٹائی سے تسلیم کیا جائے کہ اس وقت ہم ہوش میں نہیں تھے اور مصلحت کے غلط تقاضے کے پیش نظر ہم نے جھوٹ بولا تھا۔ اس کا ایک نفسیاتی فائدہ یہ ہوگا کہ بعد میں ہم جو کچھ بقائمی ہوش و حواس کہیں گے رابعہ کے لیے واقعی سچ بن جائے گا۔ اب اصل کہانی یوں ہوگی کہ ہم نے سلامت شاہ سے کہا تھا کہ وہ زیورات فروخت کر کے رقم ہمیں پہنچا دے۔ پھر ہم نوباجو کا حلیہ بیان کر کے کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم مقبرے پر کھانا کھانے جا رہے تھے تو بیڈن روڈ پر اس نے ہمیں پک اپ کیا تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو بجائے سلامت شاہ کے تین افراد ہمارے منتظر تھے اور بظاہر وہ ہمارے قتل پر مامور کیے گئے تھے۔ ایک زبردست معرکے میں ہماری مختصر کمان نے وہ داد شجاعت دی کہ دشمن فرار ہونے پر مجبور ہوئے۔ دشمنوں میں سے ایک شخص کو ہم نے پہچانا۔ وہ گھنگھریالے بالوں، بھوری آنکھوں اور داہنے کان میں پیتل یا سونے کی مندری پہننے والا ٹیکسی ڈرائیور۔۔۔"

"زبردست۔" محسن نے کہا جو میری بات بہت غور سے سن رہا تھا۔ "یہ کثیر المقاصد بیان واقعی خوب رہے گا۔"

"ہاں۔ ایک تو اس سے سلامت شاہ کے نہ آنے پر تشویش کا اظہار کرنا ممکن ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اور لعنتی آج کل یا پرسوں جب بھی اس کی لاش ملے گی تو رابعہ کو

www.paksociety.com

اس حادثے اور ہمارے بیان میں مطابقت نظر آنے لگی۔ دوسری بات یہ کہ جب نوابجو کی لاش مل جائے گی تو رابعہ قیاس آرائی کی بنیاد پر سمجھے گی کہ وہ کیوں مارا گیا، ورنہ ہم سمجھا دیں گے کہ نوابجو کو ہمارے خلاف سازش کرنے والے دشمنوں نے آلۂ کار بنایا اور مقصد پورا ہونے کے بعد اس لیے مار دیا کہ وہ سازشیوں کو پہچانتا تھا، یا اسے معلوم ہو گیا تھا کہ سازش کے عزائم کیا ہیں۔ چنانچہ اس کا وجود یقیناً باعث خطر تھا۔ تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ منصوبہ الا ٹیکسی ڈرائیور راس آ تا ملانہ ملنے کا ایک ملزم قرار پائے گا۔ ہم بتائیں گے کہ وہ کس سمت میں فرار ہوا تھا۔ اسی سمت سے نوابجو کی لاش کی دستیابی ہمارے مفروضات کی صداقت کا ثبوت بن جائے گی، لیکن ان حالات کے پیش نظر ہم رابعہ سے کہہ سکیں گے کہ فی الحال کسی قانونی چارہ جوئی کی ضرورت نہیں۔ ہم پر ناکام قاتلانہ حملہ ہوا تھا جس میں مارا کوئی نہیں گیا۔ گزشتہ را الصلوٰۃ و آئندہ را احتیاط۔"

"اور ان دو لاشوں کا کیا بنے گا جو سفر سے برآمد ہوں گی؟" محسن نے کہا۔

"وہ پولیس کا کام ہے کہ واردات کو جو رنگ چاہے دے۔" میں نے کہا۔ "ہمارا ان سے کیا تعلق۔ جب نوابجو کی لاش ملے گی تو مدعی خود پولیس ہو گی اور رابعہ رضاکارانہ طور پر بیان دے کر اپنے لیے اور ہمارے لیے قانونی الجھن پیدا کرنے سے گریز کرے گی۔ اس کے بعد سلامت شاہ کی لاش دریافت ہو گی تو اسباب رابعہ کے سامنے ہوں گے مگر ہمارا موقف یہ ہے کہ وہ صفائی کا واحد گواہ تھا چنانچہ ہمارے دشمنوں نے اسے مروا دیا۔ پولیس کو رپورٹ وغیرہ کا حوالہ دینے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ یہ تو تھا مسئلہ نمبر ایک اور اس کا قابل تعریف حل۔ دوسرا مسئلہ ہے سرگوشی کہ میرے سارے کپڑے سلامت شاہ کے کوارٹر میں رکھے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ابھی لے آؤں۔ اسی وقت جا کے۔"

"تجویز یہ بھی قابل تعریف ہے۔" محسن نے طنز سے کہا۔ "جاتے وقت آپ رابعہ کو بتا جائیں کہ کہاں جا رہے ہیں۔ سی سی ٹی کے دروازے پر آپ کو محبت خان نام کا ایک چوکیدار ملے گا اور چونکہ چراغ دین مری سے واپس آ چکا ہے اس لیے وہ بقلم خود آپ کے استقبال کے لیے حاضر ہو گا۔ آپ عرض مدعا کیجیے اور وہ آپ کو بڑی نیاز مندی سے سلامت شاہ کے سرونٹ کوارٹر میں لے جائے گا۔ آپ اس کے سابق آقا کے فرزند ارجمند ہیں نا۔ آپ کے بارے میں اخبارات کی باتصویر خبروں کا کوئی اثر نہیں رہے گا۔ آخر مروت اور اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔ آپ کا تمام اسباب وہ خود اپنی کار میں رکھے گا اور پیش کریں گے تو وہ صندوق بھی جو چچا وزیر خان مرحوم چھوڑ گئے تھے کہ سلامت شاہ کا تابوت بنے اور آپ اسے چھوڑ کر ہنسی خوشی لوٹ جائے گا۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے کہا۔ "ابھی پانچ بجے سے پہلے چراغ دین بھی سو کر نہیں اٹھے گا۔ بعض عمارات کو گیٹ کے پاس یا برآمدے میں ڈال کے سو جاتے ہیں۔ بہرحال وہ فرش پر ڈنڈا لیے دروازے پر کھڑا ملا تو میں ساتھ والے گھر میں داخل ہو جاؤں گا۔ چراغ دین کے گھر سے پہلے والے گھر میں۔ ضروری تو نہیں کہ ہر گھر میں چوکیدار موجود ہو۔ چراغ دین کے گھر اور ساتھ والے گھر کے بیچ میں دائیں بائیں دو دیواریں حائل ہیں۔ دیوار کے آخری حصے کو پھلانگ کر کوٹھی کے عقبی حصے میں سلامت شاہ کے کوارٹر کے قریب پہنچ جاؤں گا۔ کوارٹر کے اندر اترتا تو ذہنی طور پر دس ہی جسمانی طور پر زندہ سلامت شاہ کسی کے لیے کچھ نہ کر سکا تو بے جان اور مقید جسم کیا کرے گا۔ دیکھنے میں ادھر ادھر بھی نہیں اور سلامت شاہ مرحوم کے کمرے سے سوٹ کیس جیسے ہی جھانک آؤں گا۔ آنے جانے کا ایک ہی ہوگا اور دس منٹ بعد بھی حالات یہی۔"

"اگر تو ساتھ والے گھر میں پکڑا گیا تو کس سے ملاقات ہو گی؟" محسن نے کہا۔

"کیوڑے کا کون ہے؟" میں نے کہا۔ "کوٹھیوں کے مالک تو سوئے پڑے ہوں گے۔ نوکر ہوتے تو باورچی خانے میں ہوں گے۔ کسی کتے یا چوکیدار کا احتمال ہے تو فکر نہ کرو میں اپنی آنکھیں اور اپنے کان کھلے رکھوں گا۔"

"اور رابعہ سے کیا کہا جائے گا؟ یہ سوٹ کیس دے گیا ہو وہی حملہ آور تھا۔"

"اب بیچ میں بولا تو جان نچوڑ دوں گا۔" میں جھنجھلا کر کہا۔ "پہلے پوری بات سن لے۔ رابعہ کا کوارٹر صبح پانچ بجے کھلتا ہے اور چراغ دین کی کوٹھی سے کار پانچ منٹ کی مسافت پر ہے۔ رابعہ سے کہا جائے گا کہ پنڈی جانے سے پہلے فاضل سامان کلاک روم میں رکھ دیا تھا تو یہ بالکل منطقی بات ہو گی۔ ہم آج

سوٹ کیس اٹھا لائیں گے۔ فی امان اللہ۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور کھڑکی کھول کے باہر اتر گیا۔

باہر رات کا اندھیرا اب بھی صبح کے شکوک کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میں نے گیٹ تک کا فاصلہ کسی آہٹ کے بغیر طے کیا اور چار فٹ کی دیوار سے سڑک پر کود گیا۔ واپس کراؤن سینما والی سڑک سے علامہ اقبال روڈ کے چوک تک پہنچنے میں مجھے دس منٹ لگے۔ پھر اسٹیشن کی سمت جانے والے ایک رکشا نے اس تھوڑے سے فاصلے کے عوض پانچ روپے کی شرط پر مجھے بٹھا لیا اور مزید دس منٹ بعد میں سی ٹی ڈی کی کوٹھی سے چند قدم کے فاصلے پر جا اترا۔ سڑک پر ٹریفک کچھ بڑھ گئی تھی مگر زیادہ تر رکشا اور تانگے اسٹیشن کی جانب رواں تھے۔ مجھے یاد آیا کہ یہی وقت تھا جب میں راولپنڈی جانے کے لیے پورے اعتماد کے ساتھ اس گھر سے نکلا تھا۔ جس میں اب مجھے چوروں کی طرح داخل ہونا تھا اور وہ سلامت شاہ جس نے مجھے جگا کر چلتے بنا کر دی تھی صرف تین دن قبل فجر کی نماز پڑھ کے فارغ ہوا تھا تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے لیے کتنی بھیانک موت گھات میں ہے۔ میں نے سڑک سے ہٹ کے فٹ پاتھ کے بعد ہر کوٹھی کے احاطے کے سامنے پھیلے ہوئے گھاس کے تنگ قطعے پر چلنا شروع کیا جس میں جھاڑیاں اور درخت بے ہنگم طریقے پر اگے ہوئے تھے۔ اب میں سڑک سے کافی دور تھا اور دیوار کے سائے میں ہونے کے باعث... نمایاں نہ تھا۔ چراغ دین کے گھر سے پہلے والے گھر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر کوٹھی میں مکمل سکوت تھا اور اندھیرا تھا۔ پورچ میں کھڑی ہوئی کار بھی سوئی سوئی لگتی تھی۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہوا ہی تھا کہ قریب کی مسجد سے مؤذن کی صدا بلند ہوئی۔ آؤ نیکی کی طرف۔ آؤ نماز کی طرف۔ کوٹھی کے پورچ میں ایک لائٹ جلی اور دروازہ کھول کے چند لمحے میں جبوں ایک سفید ریش شخص سر پہ کپڑے کی گول ٹوپی رکھے نمودار ہوا۔ میں تیزی سے واپس ہوا اور مخالف سمت میں چلنے لگا۔ چراغ دین کی کوٹھی کے چند گیٹ اور احاطے کی دیوار کو عبور کر کے میں نے گھوم کر دیکھا وہ شخص جو نماز کے لیے مسجد جانے کے ارادے سے نکلا تھا دروازے کے باہر کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک اجنبی کو گیٹ کے اندر آتے اور پلٹ کر جاتے دیکھ لیا ہوگا اور شبے میں پڑ گیا ہوگا کہ آنے والا چور تھا یا غلطی سے اندر آ گیا تھا۔ نماز قضا ہو جانے کے خیال نے اسے میرے تعاقب یا ہنگامہ آرائی سے باز رکھا اور وہ سڑک عبور کر کے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ اس وقت تک میں چراغ دین کی کوٹھی سے متصل دوسری کوٹھی کے دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ گیٹ کے اوپر سے جھانکنے پر مجھے اپنا منصوبہ چوپٹ ہوتا نظر آیا۔ گیٹ کے اندر بڑے جثے کا السیشن کتا بڑے وقار سے ٹہل رہا تھا۔ تقریباً اتنے ہی وقار سے لان پر ایک پہلوان نما شخص ورزش میں مصروف تھا۔ میں فوراً واپس ہوا اور اب میں نے چراغ دین کے گھر کے پھاٹک کی جھری میں سے اندر جھانک کے دیکھا۔ محبت خان اپنا بستر بچھائے چارپائی پر گیٹ کے عقب میں دیوار کی طرف منہ کیے سو رہا تھا۔ یہ طے کرنا مشکل تھا کہ وہ تھک کر لیٹا ہے یا گہری نیند میں ہے۔ ہمت کر کے میں گیٹ کے ستون پر چڑھا اور کوئی آواز کیے بغیر اندر اتر گیا۔ پھونک پھونک کر ہر قدم رکھتے ہوئے میں نے چند قدم کا وہ فاصلہ طے کیا جو خطرناک علاقہ تھا۔ کوٹھی کی سائڈ میں پہنچ کے میں چوکیدار کی نظر کے دائرے سے محفوظ ہو گیا اور کسی پریشانی کے بغیر سلامت شاہ کے سرونٹ کوارٹر تک جا پہنچا۔ صبح کاذب کا اجالا اٹھنے لگا تھا اور چند منٹ میں اس رات کی سحر کا آغاز ہونے کو تھا۔ میں نے بلا تذبذب کوارٹر کی دیوار پھاندی اور چند سیکنڈ صحن میں کھڑا رہا۔ میرے سامنے دونوں کمروں کے دروازے کھلے پڑے تھے۔ ایک دروازے میں سے مجھے وہ صندوق بھی صاف نظر آ رہا تھا جس میں آباؤ اجداد کی نشانیوں کی جگہ سلامت شاہ کے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔ گھر میں گھسنے والا آسیب میرے رگ و پے میں کمزوری کی لہروں کے چھلکے لگا۔ تاریکی میں سلامت شاہ کا ہیولا سا ابھرا اور دروازے کے فریم میں ٹھہر گیا۔ "سکندر بخت!" اس نے کہا۔ "ڈرتے کیوں ہو، یہ اس گھر کے دروازے اسی لیے تو کھلے چھوڑ رکھے تھے میں نے۔ مجھے معلوم تھا تم آؤ گے۔ ان دونوں کمروں میں سے کسی میں بھی داخل ہونے کے لیے تمہیں کسی کی اجازت مطلوب نہیں۔ ایک میں تمہارا باپ رہتا تھا، دوسرے میں اس کا دوست، رازدار اور تمہارا چچا۔ اب یہ دونوں کمرے خالی ہیں۔ ایک کا مکین تمہیں چھوڑ کر جا چکا ہے۔ دوسرا اس کے انتظار میں ہے۔ تم اپنی امانت سمیٹو اور جاؤ۔ دیر مت کرو۔ تمہیں ہمارا نہیں اپنی زندگی کے وقت کا ساتھ دینا ہے۔" میں چونکا اور آگے بڑھا۔ سلامت شاہ کے کمرے کی دیوار کے ساتھ میرے دونوں سوٹ کیس کھڑے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ان دونوں کو اٹھایا۔ کمرے کی

ویرانی میں اس کی تاریک دیواریں مجھ پر جھک آئیں اور انگنت غیر مرئی آنکھیں ہر سمت سے مجھے گھورنے لگیں اور باہر اچانک پرندوں نے ہر درخت کی شاخ سے چلانا شروع کیا۔ چور... چور۔ چور، قاتل... پکڑو۔ پکڑو۔ میں سوٹ کیس لے کر بھاگا اور یکے بعد دیگرے دونوں سوٹ کیس دیوار پر رکھے۔ مجھے یوں لگا جیسے حیرت زدہ کوئی میرے تعاقب میں تھا اور مجھے گردن سے دبوچنے ہی والا تھا۔ میں نے ایک بار پلٹ کر دیکھا اور دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسرے لمحے میں اس پُر اسرار علاقے کی حدود سے باہر تھا۔ سوٹ کیس اٹھا کے میں نے کوٹھی کی طرف دیکھا۔ ایک باتھ روم کے روشن دان میں لائٹ نظر آ رہی تھی جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ چراغ دین جاگ گیا ہے اور یہ بھی کہ چوکیدار باتھ روم میں گیا ہو۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ جو گیٹ کی جانب جا رہا تھا سیدھا چلتا والا بیٹا اور ہی حد سے نکل رہا تھا اور اس کی نگاہ گیٹ کی طرف تھی۔

پوری احتیاط کے ساتھ میں واپس ہوا۔ سوٹ کیس سرونٹ کوارٹرز کی دیوار کے ساتھ رکھ کر میں نے ریسا تھوڑا کی چھلانگ کوٹھی کی دیوار پر سے جھانکا جس میں سے نکل کے ایک شخص نماز پڑھنے گیا تھا۔ وہ مجھے دس منٹ پہلے ملا تھا۔ دس منٹ میں اس کا مسجد تک جانا، وضو کرنا، نماز پڑھنا اور واپس آنا۔ نہیں... میں نے حساب لگایا۔ وہ بیس منٹ سے پہلے واپس نہیں آ سکتا تھا۔ باقی کوٹھی پر آغازِ صبح کا سکوت طاری تھا اور درختوں میں چہچہانے والے پرندوں کے سوا کوئی آواز کہیں سے سنائی نہ دیتی تھی۔ بظاہر اس ایک پابند صوم و صلوٰۃ شخص کے سوا دوسرے گھر والے خوابِ غفلت میں تھے۔ میں نے دونوں سوٹ کیس دیوار پر رکھے اور دوسری طرف کود گیا۔ پھر خشک پتّوں اور سوکھی ٹہنیوں پر سے سوٹ کیس لے کر گزرا اور ایک جھاڑی کے پیچھے چلنے لگا جو قد آدم انتہائی گھنی اور ہموار تراشی ہوئی تھی۔ گیٹ تک میں سرسبز دیوار کے پیچھے چل سکتا تھا۔ ابھی میں گیٹ سے چند قدم دور تھا کہ میں نے اسی ٹوپی والے سفید ریش شخص کو سڑک عبور کر کے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ میں سانس روک کر منجمد ہو گیا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا اور ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ شاخوں اور پتّوں کی گھنی جالی کے پیچھے بھی اس نے مجھے دیکھ لیا ہے لیکن بالکل قریب آ کے وہ مڑ گیا۔ اس نے تازہ کھلے ہوئے گلاب کا ایک پھول توڑا اور اسے سونگھتا ہوا ٹہلتا ہوا اندر چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد میں جھاڑی کے پیچھے سے نکلا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ آخری وقت تک مجھے دھڑکا لگا رہا کہ کہیں پیچھے سے کوئی چلانے نہ لگے یا چراغ دین کا چوکیدار گیٹ کھول کر باہر نہ آ جائے۔

پچاس قدم دور آ جانے کے بعد میں نے خود کو محفوظ سمجھا کیونکہ اب میں ایک مسافر نظر آتا تھا جو فاصلہ کم ہونے کے باعث کوٹھی سے نکلا تھا اور اسٹیشن کی جانب پیدل روانہ ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر مجھے تین دن پہلے کی وہ صبح یاد آئی جب میں ایسے ہی صرف اپنا بریف کیس لیے آیا تھا اور آفات و حادثات کے ایک ایسے جال میں گرفتار ہو گیا تھا جو بڑے شاطر، مکر و فریب کے ہتھکنڈوں سے آشنا اور اپنی طاقت کے زعم میں مبتلا شکاری نے بچھایا تھا۔ یہ سامنے آ کر مقابلہ کرنے والا نہیں چھپ کر وار کرنے والا کینہ پرور شکاری تھا جسے میری ناکامی نے جھنجھلاہٹ کے اشتعال میں زیادہ خطرناک بنا دیا تھا مگر شکاری خوفزدہ بھی تھا کہ کہیں ذرا سی بھول چوک کے نتیجے میں وہ خود شکار نہ ہو جائے۔

کلاک روم تک دس منٹ میں پیدل پہنچ جانے کے بعد، میں سامان کو محسن رضا کے نام سے جمع کرا کے اور اس کا پتہ لکھوا کے باہر نکلا تو افق پر سورج کے اجالے کا سنہرا پن شفق کے سنہرے اور سرخ قرمزی بادلوں کے رنگ میں اتر رہا تھا۔ میں نے رسید سنبھال کے جیب میں رکھی اور پھر پانچ کے نوٹ کی ضمانت پر ایک رکشا والے کو کوٹھی تک چلنے پر رضامند کیا۔ عین رابعہ کی کوٹھی کے دروازے پر اترنے کی بجائے میں نے کراؤن سینما سے ذرا آگے رکشا رکوا لیا اور باقی فاصلہ پیدل طے کرتے ہوئے احتیاطاً سگریٹ کا ایک پیکٹ خرید لیا۔

جب میں نے رابعہ کے گھر کی دیوار پھاندی تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔ رابعہ کو لان میں ٹہلتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے نظر اٹھا کے حیرانی سے دیکھا اور دوسرے لمحے میں نے خود کو سنبھال لیا۔ میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سنہرے ہلکے جیسی سیل کے کنارے کو کھینچ کر بیرونی شفاف پلاسٹک کی جھلی کو الگ کیا۔ رابعہ نے وہی رات والے کپڑے پہن رکھے تھے اور قریب پہنچ کے میں نے دیکھا کہ اس کے جوتے لان کے کنارے ساتھ ساتھ یوں رکھے تھے جیسے سبز گھاس پر سفید کبوتروں کا جوڑا بیٹھا ہو۔ اس کے گلابی پاؤں شبنم سے بھیگے ہوئے تھے۔ "میں ذرا سگریٹ لینے چلا گیا تھا" میں نے معذرت اور وضاحت کے طور پر کہا۔

"میں تو سمجھی تھی تم سو رہے ہو" وہ بولی۔ "آنے جانے کے لیے ملک میں گیٹ کا استعمال آؤٹ آف فیشن ہو گیا ہے کیا؟"

"وہ... دراصل..." میں نے کہا "میرا خیال تھا آپ سب کی نیند خراب ہوگی، اب صبح صبح پھر کال بیل بجا کے سب کو جگا دینا مناسب نہیں۔"

اخلاقاً وہ خاموش ہو گئی۔ یہ میرے دل کا چور تھا یا اس کی خاموشی سے واقعی یہ تاثر ملتا تھا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ قابلِ یقین تو نہیں مگر وہ بے یقینی کے اظہار کو ادب آداب، مصلحت یا مروت کے تقاضوں کے خلاف سمجھتی ہے۔ "تم ہمیشہ اسی وقت اٹھتی ہو؟" میں نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"نہیں" وہ بولی "عموماً سات بجے سے پہلے آنکھ نہیں کھلتی۔ بس نیند نہیں آئی بعد میں۔"

"کیوں؟ کیا سوچتی رہیں؟" میں نے کہا "اور کس کے بارے میں؟"

وہ میرے لہجے کی شوخی سے متاثر نہیں ہوئی اور اسی متانت کے ساتھ ٹہلتی رہی۔ "سکندر! ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گے؟"

"دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد نصف درجن بھی نہیں جن کی کسی بات کا میں برا مان ہی نہیں سکتا" میں نے جواب دیا "ان میں ایک تم ہو۔"

"میرا خیال ہے سکندر، تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو" وہ رک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "حقیقت وہ نہیں جو تم نے بیان کی تھی۔"

"اس شک کی وجہ؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور شبنم سے بھیگی گھاس پر بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح ٹہلتی رہی۔ "وجہ... وجہ بظاہر تو کوئی نہیں" وہ بولی "احساس بعض اوقات بے سبب بھی ہوتا ہے۔ بس مجھے یوں لگتا ہے جیسے تمہارے لہجے میں قائل کر دینے والی صداقت نہیں ہے۔ بڑے لوگ مثلاً میرے ابا کھرے کھوٹے چاندی کے سکے کو اچھال کے آواز سے پہچان جاتے تھے۔ تمہاری آواز میں کھرے پن کی وہ کھنک نہیں ہے۔ یا شاید میرے کان زیرِ سماعت کا شکار ہیں مگر میں نے تم سے جیل میں ملاقات کے دوران ایسا محسوس نہیں کیا تھا۔"

"قصور تمہارے کانوں کا نہیں ہے" میں نے چند سیکنڈ کے بعد ایک طویل کش کا دھواں خارج کرتے ہوئے کہا "میں تمہاری جھوٹ سچ کو پرکھنے کی اس صلاحیت کا اعتراف نہ کروں تو یہ ایک اور جھوٹ ہوگا۔ اس صلاحیت کی بدولت تو تم کو فوراً معلوم ہو جاتا ہوگا کہ اپنی بے گناہی کا مقدمہ تمہارے پاس لے کر آنے والا کوئی موکل جھوٹا ہے یا سچا؟"

وہ ہنسی "ایسی بات بھی نہیں ہے۔ دنیا میں ایک سے ایک ایکٹر پڑا ہے۔"

میں نے اس کی بات میں چھپے ہوئے لطیف سے طنز کو محسوس کر لیا۔ "وسیع تر فلسفیانہ نقطۂ نظر شیکسپیئر کا تھا جس نے کہا تھا کہ دنیا اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹرز ہیں لیکن جھوٹ بولنے والے اور ایک ایکٹر میں فرق ہے۔ ایکٹر یہ اصرار تو نہیں کرتا کہ اس کے ڈائیلاگ کو سچ سمجھ کے قبول کرو۔ میں ایکٹر نہیں ہوں، جھوٹ میں نے عمداً بولا تھا۔ اس وقت ذہنی طور پر میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ مجھے جھوٹ بولنے سے فائدہ ہوگا یا نقصان اور میں اس جھوٹ کو نبھا بھی سکوں گا یا نہیں۔ جو بات میں نے سوچے سمجھے بغیر کی غلط تھی۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ یہ بے ضرر سا جھوٹ بولنے سے معاملہ ختم ہو جائے گا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں تمہیں قائل نہ کر سکا۔ خود مجھے بعد میں احساس ہوا کہ تمہارے اعتماد کے جواب میں یہ عدمِ اعتماد کا مظاہرہ بہت نامناسب ہے۔ اس کا ذکر میں نے محسن سے بھی کیا تھا اور اس نے مجھے شرمندہ کیا چنانچہ میں نے محسن سے وعدہ کر لیا تھا کہ صبح ناشتے کی میز پر یا اس کے بعد موقع ملتے ہی تمہیں اصل حالات بتا دوں گا۔"

"ڈاکٹر اور وکیل سے حقیقت نہ بتائی جائے تو کیس بگڑ جاتا ہے۔ یہ بات تو سنی ہوگی تم نے" وہ بولی۔

"ہاں۔ اور اسی لیے میں یہ سب کچھ بتا رہا ہوں" میں نے کہا۔

پھر میں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق جھوٹ میں پچاس فیصد تخفیف کی اور وہ کہانی سنائی جو سچ اور جھوٹ کے تانے بانے سے تیار کی گئی تھی۔ یہ کہانی سناتے ہوئے میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا کہ میں ایک جھوٹ پر دوسرے بہت بہتر سمجھ کے جھوٹ کا پیوند ڈال رہا ہوں، اور مجھے اعتماد سے بے وقوف بناتے ہوئے شرم بھی آئی لیکن میں نے مصلحت کے تقاضے کو پیشِ نظر رکھا اور خود کو اس دلیل سے مطمئن کیا کہ ناگزیر حالات میں انتہائی مجبوری کے تحت ناجائز کو جائز اور حرام کو حلال سمجھنے میں کوئی گناہ

www.paksociety.com

نہیں ہوتا۔ رابعہ انتہائی ذہین عورت تھی اور اس کی زندگی کے شب و روز بھی کہانیوں میں جھوٹ اور جھوٹے واقعات میں سچ کے عنصر کی تلاش کا عملی تجربہ کرتے گزرتے تھے۔ وہ جانتی تھی کتنے ہی ایسے جو اپنی مظلومیت اور معصومیت کو صورت سے اور لہجے سے ثابت کرتے ہیں در اصل کتنے سفاک اور بے ضمیر مجرم ہوتے ہیں اور کتنے گواہ جو مقدس کتاب کو ہاتھ میں لے کر بڑے خشوع و خضوع سے حلف اٹھاتے ہیں کتنے جھوٹے ہوتے ہیں اور کتنے بے گناہ ہوتے ہیں جو ایسی ہی شہادتوں کے باعث ہر نگاہ میں مجرم ٹھہرتے ہیں میں نے اداکاری کا بہترین مظاہرہ کیا اور اپنی آواز میں کھرے پن کی کھنک بھی پیدا کی تاکہ اس نے پوری توجہ اور یقین کے ساتھ میری بات سنی۔ تاہم میرے یقین میں آئینے کی طرح بال تھا اور جب میں نے رابعہ کی آنکھوں سے خود کو دیکھا تھا تو رابعہ کے الفاظ کی بازگشت سنائی دینے لگی تھی دنیا میں ایک سے ایک ایکٹر پڑا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ جیسے ہی گردش ایام نے مہلت دی میں رابعہ سے صدق دل اور خلوص نیت کے ساتھ معافی مانگ لوں گا کہ یہ عدم اعتماد کا مظاہرہ نہیں مجبوری کی بات تھی اور میں کیونکہ کم ظرف یا احسان فراموش نہیں ہوں۔ رابعہ عام عورت نہیں ہے۔ وہ مجبوری کی ہر صورت کے تقاضے کو سمجھنے کی اہل ہے۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ مجھ سے کچھ دور بیٹھی گھاس کا تنکا چباتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔

"تمہارے خیال میں سلامت شاہ کے غائب ہونے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟" اس نے بالآخر کہا۔

"حقیقت یہ ہے تسلیم کرتے ہوئے میرا دل ڈرتا ہے" میں نے کہا۔ "سلامت شاہ کی پراسرار گمشدگی بے سبب نہیں۔ ہو سکتا ہے تھانے میں ملاقات کے بعد رات کو وہ گھر پہنچا تو یہی لوگ اس کے انتظار میں ہوں جو آج یہاں منتظر تھے۔ وہ کسی بہانے سے یا زبردستی سلامت شاہ کو اپنے ساتھ لے گئے اور اس سے پوچھ لیا۔ بوڑھے آدمی کی قوت برداشت زیادہ نہیں ہوتی۔ شاید انہوں نے سلامت شاہ سے ایک پیغام لکھوایا اور اپنے نامہ بر کے ہاتھ ارسال کر دیا۔ گمان غالب یہ ہے کہ بعد میں سلامت شاہ اور وہ نامہ بر دونوں ختم کر دیے گئے۔ اس لیے کہ ان کا بے مصرف وجود باقی رکھ کے خطرہ مول لینے میں کوئی فائدہ نہ تھا۔ یہ امکان مجھے بہت کم نظر آتا ہے کہ سلامت شاہ زندہ ہو اور کہیں محبوس ہو۔ وہ آج تک بتائے بغیر یوں غائب نہیں ہوا۔"

"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" رابعہ نے اچانک کہا۔

"میں نے چراغ دین سے فون پہ بات کی تھی۔" میں نے کہا اور اپنا لہجہ بالکل نارمل رکھا۔ "اگر میں فوراً ہی تجزیہ کرتا تو ناواقفیت میں منہ سے نکل جانے والے غلط الفاظ میرے جھوٹ کی قلعی کھول دیتے۔ "کل شام کو اسے پتا چلا تھا کہ سلامت شاہ تو کہیں دوپہر کے بعد گیا تھا۔"

اس نے سر ہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "سلامت شاہ ہمارا سب سے اہم گواہ ہے۔ اس کے بیان کے بغیر ملزم کے خلاف ہمارا موقف بے بنیاد ہو جاتا ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مصلحت کے پیش نظر غائب ہو گیا ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں خوش فہمیوں سے اپنا دامن باندھنے کو دانشمندی نہیں سمجھتا۔ وہ ایک معمولی آدمی ہے۔ کوئی سیاست داں نہیں۔" ہم دونوں ساتھ ساتھ گاڑی کی طرف چلنے لگے۔

"اگر... اگر فی الحقیقت ویسا ہی ہوا۔" اس نے تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "جیسا تم نے سوچا ہے... تو اچھا نہیں ہو گا۔ میں آج حق وراثت کے سرٹیفکیٹ کے لیے کاغذات تیار کر لوں گی اور کل یہ کیس فائل کر دیا جائے گا۔ منظر صاحب بھی آج کل میں ایس ڈی ایم کے سامنے قبر کھود کے لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے کی درخواست لگا دیں گے مگر یہ سب کیس ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔"

"کیوں؟" میں نے کہا۔ "کیا لاکر سے کوئی ایسی دستاویز برآمد نہیں ہو سکتی جس سے میرے والد کے اور میرے خلاف سازش کا اور سازش کرنے والوں کا پتہ چل جائے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے قتل ثابت ہو گیا تو یہ زبردست واقعاتی شہادت ہو گی۔"

وہ کوئی تبصرہ کیے بغیر گھر میں داخل ہو گئی۔ "میں نہا رہی ہوں گی۔ ناشتہ تو آٹھ بجے کے قریب ہو گا۔ کہو تو تمہارے لیے بھی چائے بھجوا دوں۔ یا کافی۔" وہ مہمانوں کے بیڈ روم کے دروازے پہ رک کے بولی۔ میں نے کہا کہ چائے کافی ہو گی اور اسے متوازن قدم اٹھاتے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ باوقار انداز سے گزرتے ہوئے اور زینے اوپر جاتے دیکھتا رہا۔ یہ بات بڑی عجیب لگتی تھی کہ میں عام عورت کی طرح رہنے والی مگر ادائے حسن اور شباب میں عام عورت سے کہیں زیادہ پرکشش نظر آنے والی یہ حسین و جمیل لڑکی ابھی سفید شلوار قمیض پہن کر بیاہ کے اور بد نیت کیس میں فاتحین سے کر عدالت میں حاضر

ہوگی آج پہلی بار کسی قتل اغوا اور آبرو ریزی کے مقدمات پہ بحث کرے گی۔ ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کے اقتباسات پیش کرے گی اور دنیا بھر کی اعلیٰ ترین عدالتوں کے مقدمات کو نظیر بنا کے لائے گی۔ وکیل استغاثہ کی ہر دلیل پہ اعتراض اٹھائے گی اور اپنے موکل کے خلاف پیش ہونے والے ہر گواہ کے جھوٹ کا اپنی جرح سے پوسٹ مارٹم کر کے رکھ دے گی۔ یہ عورتوں اور افسانہ نگاروں کی تصوراتی عورت سے اور فلموں کی تخلیق کردہ ہر صفت محبوب سے عورت کتنی مختلف ہے جو زندگی کی عملی جدوجہد میں شریک سب سے آگے گیا اس سے رابعہ کی نسوانیت کی دلآویزی اور حسن کی ساحری اور فطرت کی تو مطلق کا طلسم مجروح ہوا؟ نہیں۔ اگر کسی کو علم نہ ہو کہ وہ اٹارنی جنرل یا ایڈووکیٹ ہے تو وہ اس کے عشق میں آشنائی رسوا و خراب ہو سکتا ہے جتنا کہ میلے کے بیچ مجنوں ہوا۔ میں نے اس کمال بے مثالی اور جمال با کمال سے غیرت کے طور پہ سر ہلایا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ محسن پلنگ کے آسن میں آلتی پالتی مارے بستر پہ سیدھا بیٹھا تھا اور یوں لگتا تھا کہ جو دھواں اس کے نتھنوں سے خارج ہو رہا ہے سگریٹ کا نہیں اس کے دل سے اٹھ رہا ہے "یہ منہ کیوں سوجا ہوا ہے؟ معلوم ہوتا ہے تو چھپ کر دیکھ رہا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ صبح صبح باغ میں کیا خوشگپیاں ہو رہی تھیں؟" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "کیا نظر نواز فلمی سیٹ تھا۔ عالم خلوت ہے۔ سبز شبنمی گھاس ہے۔ شفق کا سنہرا اجالا ہے۔ گل پیراہن ہے اور عارض کے گلاب ہیں۔ میں تنگ آ گیا ہوں ایسے رنگین فلمی مناظر کو دیکھ دیکھ کر۔ ایک گھنٹے سے برداشت کر رہا تھا میں۔"

"یہ مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ اور ملزم سکندر بخت کی سو فیصد قانونی اور جائز ملاقات تھی۔" میں نے کہا۔ "جو بدقسمتی سے جیل کی بجائے صحن چمن کے رومان پرور ماحول میں ہو گئی۔ قصور رابعہ کا ہے کہ جب میں اندر گیا تو وہ لان پہ ٹہل رہی تھی۔"

"اور اس نے تجھے پکڑ لیا رنگے ہاتھوں؟ پوچھا تو ہو گا کہ یہ کیا غیر شریفانہ آمدورفت ہے؟" محسن اچانک نارمل ہو گیا۔

"ہاں۔" میں نے کہا اور اسے ساری بات بتا دی۔

اس کا ردعمل "ماسٹر" غیر ارادی اور چائے کی ٹرے بیچ میں ہی نے پھر زیر لب کچھ کہا جو اس کی بولی جلی گئی۔ محسن کا خیال تھا کہ وہ کوئی وظیفہ پڑھتی ہے۔ میں نے کہا کہ وظیفہ نہیں ہم پر تعلی عمل کرتی ہے۔ اسے ہماری صورت اچھی نہیں لگی۔"

"سوٹ کیس تو اب میں ہی اٹھاؤں گا۔" محسن نے چائے پیتے ہوئے فرمایا۔ "لیکن برادر نسبتی! اس خط کا حصول مسئلہ ہو گا۔"

"سالار جنگ!" میں نے کہا۔ "یہ خیال مجھے بار بار آ رہا تھا کہ ابھی تک ہم نے رابعہ کو اس خط کے بارے میں کچھ نہیں بتایا حالانکہ وہ خط ہمارے لیے بے حد اہم ہے۔ اگر ہم اس کے حصول میں کامیاب رہے تو رابعہ سے کیا کہیں گے کہ خط کہاں سے آیا اور کیسے آیا؟ نوابزادہ اگر دشمن کا نامہ بر بنا تھا تو ہمارا مددگار کیوں ہوا؟"

"جیسے۔" میں نے کہا۔ "اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ نوابزادہ غریب مگر باضمیر آدمی تھا۔ کچھ لوگوں نے پیسے کا لالچ دے کر اسے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر استعمال کیا مگر اس نے ضمیر کی آواز پہ بیک کی ملک شفقی کی خط ہمیں ہوٹل میں ملا۔ تو یہ قبول رہا ہے کہ امپیریل ہوٹل میں ابھی تک ہمارا کمرہ بک ہے۔"

"مگر مقفل پڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور کسی نتیجے پہ ہم نہیں پہنچ سکے۔ ثابت نہیں کر سکتے کہ گزشتہ شب ہم پر جانے واردات سے وہ اپنے ہوٹل کے کمرے میں مقیم تھے۔ ابھی آج قیام کا مستقل بندوبست بھی کرنا ہے۔ ہم یہاں زیادہ نہیں ٹھہر سکتے۔"

"رابعہ کی ماں نے ہمارا استقبال بڑی شفقت اور محبت سے کیا تھا۔" محسن بولا۔

"جب کسی ماں کی بیٹی رابعہ کی عمر کی ہو جاتی ہے اور اس کا گھر آباد نہ ہو تو ہم جیسے ہر مہمان کی ایسی ہی پذیرائی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"تیری تو اپڈ والس کینگ ہو چکی ہے۔" محسن بولا۔ "مگر میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل کے مکان پر "فلیٹ" کا بورڈ آویزاں ہے۔"

"TO LET" کے بورڈ پر بیچ میں آئی لگا دے۔" میں نے کہا۔ "پھر شاید کوئی آ جائے۔ ویسے تو مشکل ہے۔"

ناشتے کی میز پر رابعہ کی ماں سے پھر ملاقات ہوئی اور اس نے تفصیل سے ہمارا حسب نسب پوچھا۔ مختصراً وہ بھی سنی جو ہم پہ بیت چکی تھی اور گزشتہ شب کی واردات کا احوال بھی دریافت کیا۔ پھر گفتگو رنگ آہنگ ہونے لگی۔ رابعہ نے مجھے بتایا کہ منظر صاحب کو کیس فائل کرنے کے لیے تین افراد کے حلف نامے درکار ہوں گے جو تدفین میں شریک رہے ہوں اور قبر کی نشاندہی کر سکیں اور یہ کام ایس ڈی ایم

www.paksociety.com

تب موجودگی میں ہوگا۔ میڈیکل بورڈ جس میں پولیس سرجن کے علاوہ بھی دو ڈاکٹر ہوں گے عدالت نامزد کرے گی اور وہ وہیں قبرستان میں پوسٹ مارٹم کر لیں گے جس کی رپورٹ بعد میں براہ راست عدالت کو دی جائے گی۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ فنگر پرنٹ کی رپورٹ عموماً چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تیار کر لی جاتی ہے مگر اس کے بعد کا مرحلہ لا متناہی بھی ہو سکتا ہے تاہم کوشش سے کیا نہیں ہوتا۔ رپورٹ سماعت کی اگلی تاریخ پر چالان کے ساتھ بھی پیش کی جا سکتی ہے بشرطیکہ چالان چودہ دن میں مکمل ہو جائے جس کا امکان بہت کم ہے۔ اگر ایک مہینے کے بعد چالان پیش کرانا مقصود ہو تو اس کے لیے خصوصی وسائل کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ محسن اس عرصے میں رابعہ کی ماں سے باتیں کر رہا تھا۔ جب ہم متوجہ ہوئے تو وہ میری اور فوزیہ کی نسبت کا ذکر بڑی معصومیت سے کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس بات کا مقصد شوشہ چھوڑنے کے سوا کچھ نہیں لیکن اس کا ردعمل دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ سب سے پہلے تو میں نے رابعہ کی صورت کے تغیر کو محسوس کیا۔ اس کا نکھرا ہوا گلابی رنگ صرف ایک لمحے کے لیے بے رنگ ہوا۔ یوں جیسے بجلی کے دباؤ میں کمی سے بلب کی روشنی کم ہو اور بڑھ جائے۔ اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور مسکرائی۔

"کمال ہے امی!" وہ بولی۔ "ابھی تک ان دونوں میں سے کسی نے اعتراف نہیں کیا تھا کہ دوستی کے علاوہ بھی ان کا کوئی رشتہ ہے۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔" میں نے جھینپ کر کہا۔

"اور اس کا موقع بھی کہاں ملا۔"

رابعہ اپنی ذہنی و جذباتی کیفیت کو چھپانے پر پوری طرح قادر تھی اور اب اس کی صورت یا اس کے رویے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا مگر میں اس ایک لمحے کے تغیر پر غور کر رہا تھا اور دبانے کی پوری کوشش کے باوجود ایک سوال میرے ذہن میں سر اٹھا رہا تھا۔ کیا یہ مایوسی کا ردعمل تھا اور رابعہ کو اس اطلاع سے صدمہ ہوا تھا۔ اس ایک سوال کے کشکول میں بہت سے سوال تھے جو سنپولیوں کی طرح کلبلا رہے تھے اور دیکھتے دیکھتے بڑھ رہے تھے۔ یہ مایوسی کیوں؟ یہ صدمہ کیسا؟ کیا اس نے مجھ سے توقعات وابستہ کر لی تھیں؟ نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں فقط ایک ملزم زیر سماعت ہوں۔ اس کا ایک موکل۔ ماہ و سال کے پرانے رشتوں کے درمیان وقت کی خلیج حائل ہے۔ تمہارا مجھ سے کوئی ذاتی تعلق کبھی نہ تھا۔ رابعہ نے کہا تھا یا ایسا ہی کچھ [illegible] یکطرفہ؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ یکطرفہ تعلق ختم نہ ہو۔ اگر [illegible] میں آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ کیا تجھ بے تکلفی [illegible] ان نامساعد حالات سے بھی تائید اور جواز حاصل کر سکتا [illegible] رابعہ نے کورٹ جانے کے لیے تیاری کرنے کا عذر [illegible] اور اٹھ گئی۔ رابعہ کی ماں کی دلچسپی کا محور محسن کی ذات [illegible] میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور اس نئی صورت حال پر [illegible] لگا جو محسن کی شرارت سے یک لخت سامنے آ گئی تھی۔ [illegible] کوئی شرارتی بچہ اپنا [illegible] کر کے جو دری پیچھے [illegible] اجنبی کو دیکھنے والی لڑکی کو سب تقاب کرے۔ [illegible] رابعہ سے اپنی ملاقات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ [illegible] ٹھیک بھی کہتے ہو اور غلط بھی۔ اس بات کا کیا مطلب [illegible] اس نے یہ بھی کہا تھا کہ لمبی بات ہے پھر کبھی بتا دوں گی۔ تنہائی آرائی کی مدد سے اس لمبی بات کا اندازہ کر سکتا تھا [illegible] میں نے محسن کی اس حرکت کو دوسرے زاویے سے دیکھا [illegible] کیا کہیں محسن سچ مچ رابعہ میں دلچسپی تو نہیں لینے لگا ہے جبھی اس نے مجھے اور رابعہ کو ایک جھٹکے سے [illegible] دیکھا تھا تو کوفت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں [illegible] ردعمل کی غماز تھیں۔ اسے اپنی بہن کے مستقبل اور [illegible] دوسری حسین و پرکشش عورت سے ایسے ماحول میں [illegible] کس قدر ناگوار گزر رہا تھا۔ اسے فوزیہ کا خیال تھا یا خود اپنا [illegible] لاحول ولاقوۃ۔ میں نے تو ذہن کے دامن خیالات پر [illegible] یہ کیا فضول بات بن رہی ہے۔ خدانخواستہ یہ اندیشے [illegible] درست تھے تو افسوسناک صورت حال پیدا ہو گی۔ محسن کو احساس [illegible] تھا کہ رابعہ میری وجہ سے اس کو نہیں چاہتی۔ رابعہ کو احساس تھا کہ فوزیہ کی وجہ سے میں اس کی چاہت کا جواب نہیں دے سکتا۔ فوزیہ کو احساس ہوگا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی عورت ہے جو دل سے مجھے چاہتی ہے۔ [illegible] بے یقینی کے شعلوں میں دب کے پڑ سکتے ہیں۔ [illegible] الاؤ بھڑک سکتے ہیں اور نفرتوں کی باد سموم انہیں [illegible] ہے۔ نہیں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ صرف میرے [illegible] ذہن کے بے سروپا خیالات کی بے مہار پرواز ہے اور میری [illegible] حقیقت پسندانہ سوچ ہے جس کا سبب میری [illegible]

اور کچھ دیر بعد جب محسن نے کمرے میں داخل ہو [illegible] ہنستے ہنستے کہا۔ "اور تنہا مسکرا رہا ہے۔ [illegible] ورنہ قسم سے ایک ہوا سا جھٹکا۔ وہ بڑھیا تو مجھ پر [illegible] ہوئی ہے کہ میں چلے آ اپنا نکاح پڑھوا [illegible]

تمام اوٹ پٹانگ خیالات جھاگ کی طرح ختم ہو گئے اور میں نے حق کو غرق شدہ ہوا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں کیا سوچ رہا تھا۔

"شرم کرو محسن۔" میں نے کہا۔ "وہ تیری اماں سے بھی بڑی ہے۔ اور رابعہ بھی تیری مرحوم باجی کے برابر تو ہو گی۔" معلوم نہیں یہ آخری بات میں نے کیوں کہی۔ محسن سے مریم صرف دو سال بڑی تھی لیکن رابعہ کے بارے میں کہنا مشکل تھا کہ وہ محسن سے دو سال بڑی ہے یا دو سال چھوٹی۔

رابعہ روانہ ہونے سے پہلے خدا حافظ کہنے آئی تو اس نے پوچھا کہ آج ہمارا پروگرام کیا ہے۔

"سب سے پہلے تو مجھے لاک روم سے اپنا سوٹ کیس لینا ہے۔ محسن کا سوٹ کیس بھی وہیں جمع ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد میرا ارادہ ہے کہ چراغ دین سے شرف ملاقات حاصل کروں۔"

"وہ کس لیے؟" رابعہ نے حیرانی سے کہا۔ "کوئی نئی مصیبت کھڑی کرنی ہے؟"

"نہیں بھئی۔" میں نے کہا۔ "اس سے پوچھنا ہے کہ والد مرحوم کے جنازے میں کون لوگ شریک تھے؟ سلامت شاہ بتا سکتا تھا اور ایک گواہ بھی بن سکتا تھا مگر وہ لاپتہ ہے۔ مجھے ایک بار وہی میانی صاحب کے قبرستان لے گیا تھا اور وہ بھی شام کے وقت جب اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ شاید میں خود دوبارہ وہاں نہ پہنچ سکوں۔ قانوناً بھی میری نشاندہی کی کوئی حیثیت نہیں۔"

"اس کے علاوہ ہمیں اپنی مستقل رہائش کے لیے بھی کچھ کوشش کرنی ہے۔" محسن نے کہا۔

"کیوں؟" وہ بولی۔ "یہاں کوئی تکلیف ہے تمہیں؟ گھر میں جگہ ہے۔ اور امی کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

"وہ سب ٹھیک ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "لیکن ہمارا یہاں رہنا ناممکن ہے۔ یہ عقل کے اور مصلحت کے تقاضوں کے سخت خلاف ہوگا اور اخلاقاً بھی یہ غلط سی بات ہے۔ جتنی مدد تم نے کی اور آئندہ کرو گی وہی بہت ہے۔ ہم اس سے زیادہ تمہارے لیے باعث زحمت نہیں بن سکتے۔"

"تم بھی باتوں کے ایکسپرٹ ہو۔" رابعہ نے مسکرا کے کہا۔ "مجھے ایسی باتیں بالکل بناوٹی لگتی ہیں۔"

"دیکھو رابعہ۔" میں نے لاجواب ہو کے کہا۔ "ہمارا تعلق کاروباری ہے تو اچھا ہے۔ ہم سب کا مفاد اسی میں ہے۔"

"شاید تم ہی ٹھیک کہتے ہو۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ "اس کاروباری دنیا میں مفاد پرستی کے سوا تعلق کی کوئی بنیاد نہیں ہونی چاہیے۔" وہ پلٹی اور ایک بار پھر سے مجھے حیرانی اور پریشانی میں مبتلا چھوڑ کے چلی گئی۔ اس مرتبہ اس کے طنز کی نوک اتنی واضح تھی کہ خود محسن بھی ہکا بکا کھڑا رہا۔ بلکہ اس نے اپنی پیشکش منسوخ کیے جانے پر پیام دیا تھا لیکن اس بات سے شعوری طور پر انکار کیے جا سکتے تھے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی تھیں اور ان گنت مشکل مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ جذباتی، معاشرتی یا قانونی مسائل چنانچہ ہم نے اتفاق رائے سے اپنے فیصلے پر قائم رہنا منظور کیا خواہ اس سے رابعہ کی یا اس کی ماں کی حوصلہ شکنی ہو یا دل آزاری۔

پہلا اہم ترین مسئلہ اس خط کے حصول کا تھا جو "گلاب خان معرفت محبت خان" ارسال کیا گیا تھا۔ اصل خط وہ مندی والا لے کر بھاگ گیا تھا اور منشی مرحوم یعنی فوما نچو نے جو کچھ بیان کیا تھا وہ ہمارے دشمنوں کو ہم سے پہلے معلوم ہو گیا تھا۔ فوما نچو کی دانش مندی اور دور اندیشی شبہے سے بالاتر تھی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے خط کی ایک نقل بنا کے ہمیں ڈاک سے بھیج دی تھی لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ فوما نچو اپنی ذات کو لاحق خطرات سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے دفتر میں ملاقات نہ ہونے کے امکان کی طرف بھی اشارہ کیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ حصار کو اپنے گرد تنگ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ شاید کسی مرحلے پر اس کا راز فاش ہو گیا تھا اور اس کی کسی حرکت نے دشمنوں پر واضح

سب رنگ ڈائجسٹ میں چھپنے والی سلسلے وار کہانی

سب رنگ ڈائجسٹ کے مشہور سلسلے بھی منگوا سکتے ہیں۔

انکا | اقابلا | غلام روحیں

کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس نمبر ۲۳-کراچی

www.paksociety.com

کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے مل گیا ہے۔ اس نے صرف دو بار مجھے فون کیا تھا اور وہ بھی لندن میں ہی۔ کیا اس وقت کوئی سن رہا تھا اور کیا سننے والے کو محض قرۃ النجر کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔؟ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ خود قرۃ النجر بھی دشمنوں کا ایک آلۂ کار تھی اور یہی سچ ہو سکتا تھا۔ ایک بہت بڑی سازش کا بہت چھوٹا سا حصہ تھی وہ۔ معاشی مجبوری یا کسی اور دباؤ کے باعث وہ ان کے لیے کام کرنے پر مامور تھی اور لندن میں اس کے آقا وہ تھے جو پیچھلے تباہی و بربادی اور ذلت و رسوائی کا سامان فراہم کرنے پر مامور تھے حتیٰ کہ انھی میں سے کسی نے اس کی گفتگو سن لی تھی اور منشی زیر عتاب آ گیا تھا۔ مندوبی والے ٹیکسی ڈرائیور نے اسے دو بار نمک حرام کہا تھا شاید ایک بار غدار بھی کہا تھا۔ اگر وہ چاہتے تو لندن ہی میں اس کو سزا دے سکتے تھے اور جیسے اب اس کی لاش ایک گمنام اور ویران مقبرے میں سامانِ عبرت بنی پڑی ہے۔ ایسے ہی لندن کی کسی سڑک پر بھی پڑی مل سکتی تھی مگر شکاری چالاک تھے۔ انھوں نے منشی کو جال کے طور پر استعمال کیا۔ اسے موقع فراہم کیا کہ وہ ہم سے رابطہ قائم کرے اور اس پر نگاہ رکھی۔ مجھے شک تھا پھر انھوں نے منشی کو اٹھا لیا اور اس سے سب کچھ پوچھ لیا۔ اس کے بعد ان کی ضرورت ختم ہو گئی اور منشی کا مقدر وہ سزا ہوئی جو ایک ضرورت کے باعث التوا میں تھی۔

دوا فروش کے محلے پر مشتمل ایک ڈاک خانے سے ہمیں اس پوسٹ آفس کا پتہ معلوم ہوا جہاں سے علاقے کی ڈاک تقسیم ہوتی تھی۔ جب ہم نے اس پوسٹ آفس میں قدم رکھا تو ساڑھے نو بج چکے تھے۔ کاؤنٹر سے ہٹ کر بائیں جانب ایک دروازے سے اترنے والا زینہ جیل ساز ڈاک آفس کا راستہ ثابت ہوا۔ نیچے ایک خاصے بڑے ہال میں دیوار کے ساتھ لکڑی کے خانوں والے شیلف لگے ہوئے تھے جو بالکل کبوتر خانے لگتے تھے۔ شیلف کے ساتھ ساتھ میز کی اونچائی کے برابر کاؤنٹر تھا جو کمرے کی تین دیواروں پر محیط تھا۔ اس کاؤنٹر کے سامنے لکڑی کے اسٹولوں پر پوسٹ مین اور خاکی وردی کی پتلون والے دو چپڑاسی پوسٹ مین بیٹھے تھے اور ڈھیروں خطوط کو ادھر سے ادھر خانوں میں ڈال رہے تھے یا نکال رہے تھے اور ترتیب سے رکھنے میں مصروف تھے۔ ان کی باتوں کے شور سے کمرہ گونج رہا تھا اور جب ہم ان کے درمیان سے گزرے تو کسی نے نظر اٹھا کے بھی ہماری طرف نہیں دیکھا حالانکہ اوپر زینے کے شروع میں ہی لکھا تھا کہ غیر متعلقہ افراد کا داخلہ منع

ہے۔ ایک ہیڈ پوسٹ مین نے چلا کر دوسرے سے کہا۔ "یار محمد بھائی۔ یہ محلے علاقے کا خط پڑا ہوا ہے ابھی میں نے ادھر رکھا تھا۔" محمد بھائی نے خط کے پتے کو علاقے میں شامل سمجھنے سے انکار کیا۔ ان کی بحث سے پہلے ہی میں نے وہ مل و معقولات کرنے وہ پوسٹ مین کہاں ہے؟ کیا نام ہے اس کا۔ وہ جو ادھر جاتا ہے؟" میں نے چراغ دین کی کوٹھی کا پتہ بتایا۔

"بابو!" محمد بھائی نے ادھر اُدھر نظر دوڑا کے وہاں دیکھو۔" اس نے انگلی سے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا جو مقتول کے برابر تھا۔ ہم اس کونے میں پہنچے اور میں نے فارغ ہو جانے والے یا سب سے کام شروع بھی نہ کرنے والے اس پوسٹ مین کو مخاطب کیا جو اسٹول کے مختصر سے آلتی پالتی مارے اور اپنا توازن برقرار رکھے۔ اس نے ہمیں مطلع کیا کہ بابو جا چکا ہے لیکن اس کا مطلب سمجھا جائے کہ وہ اس وقت ڈاک تقسیم کر رہا ہوگا۔ اگر وہ میں نہ ہوا تو مستری سائیکل والے کے پاس اخبار پڑھ رہا ڈاک تو وہ بارہ بجے دے گا۔ یہ صورت حال جاننے تشویش ہونے لگی کہ کہیں بابو نام کا کوئی پوسٹ مین نہیں ملا تو ہم نے مستری سائیکل والے سے دریافت کیا۔ قسم کھا کے کہا کہ بابو ادھر کا رخ بھی کرے تو وہ اس باعث کر دے۔ اخبار پڑھنے کے بجائے خبریں پانے غائب ایک بلاس۔ ہے۔ چیکنگ کرا اور چیکنگ کرنے والے کو بھاڑ میں ڈال ارشاد کیا۔ اس بیان سے بابو ڈاکیے کی فطرت کا ایک پہلو سامنے آ گیا یعنی یہ کہ وہ کوئی ایمان دار فرض شناس قسم کا آدمی نہیں ہے اور ایسا آدمی دس بیس روپے کے لالچ میں آسانی سے وہ خط لاتے ہی ہمیں دے دے گا۔ ساری ڈاک دے دے کہ جاؤ عیش کرو۔ ہم بھی گھوم ہیں اور اس کا کام کرتے ہیں۔

ہم نے مزید وقت ضائع کیے بغیر چراغ دین کی کوٹھی کا رخ کیا۔ دو گھنٹے میں یہ میرا دوسرا پھیرا تھا اور کے آثار نا پید تھے سلامت شاہ کی لاش تھی ورنہ کوٹھی کے دروازے پر پولیس کی ایک ہوتی یا کوئی کانسٹیبل کھڑا ہوتا اور اندر آنے جانے والا کے علاوہ دروازے کے سامنے پر تجسس اور اجتماع ہوتا۔ محسن کو چراغ دین کی صورت دیکھنا تھا۔ "تم اندر جا کے اس سے بات کرو۔" وہ بولا۔

ہی کا انتظار کرتا ہوں۔ اول تو راستے ہی میں خط اچک لوں گا ورنہ بجت خان کے سامنے جا کے لوں گا۔ بجت خان تو مجھے گلاب خان ہی سمجھے گا نا۔ اس کا خیال تو یہ ہے کہ چراغ دین سے کوئی رشتہ نہیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر یہ رشتہ باقی نہ ہوتا۔" اس نے نفرت کے زہر سے بھری نظر اس کی کوٹھی پر ڈالی۔ پھر ہم دونوں بجائے قدم دور خشک گھاس پر بیٹھ گئے۔

"یار محسن!" میں نے کہا۔ "جب یہ رشتہ ہو رہا تھا تو تو اتنا مشتعل نہیں تھا۔ اعتراض اگر تھا تو صرف اس بات پر کہ شادی مریم کی پسند سے نہیں ہوئی تھی۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس نے مریم کو کسی قسم کی ذہنی اور جسمانی اذیت نہیں دی اور مریم کو بھی اس سے کوئی شکایت نہیں تھی بلکہ خود تو نے ایک بار حیرت کا اظہار کیا تھا کہ وہ خوش ہے۔ اب یہ رشتہ ختم ہو جانے کے بعد چراغ دین کے خلاف تیرے دل میں کیا کدورت آ گئی ہے۔ اس کے نام سے تو نفرت کے سخت شدید رد عمل کا اظہار کیوں ہو جاتا ہے۔"

محسن خلا میں دیکھتا رہا۔ "مجھے شک ہے کہ چراغ دین نے اسے قتل کیا تھا۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تیرا دماغ جرائم کی فلموں اور جاسوسی ناولوں نے خراب کر دیا ہے۔ آخر شک کی کوئی وجہ بھی ہوتی ہے۔"

"لوگ بیویوں کو کیوں قتل کرتے ہیں؟" وہ بولا۔ "میرے ذہن میں اس کے تین ہی اسباب آتے ہیں ایک یہ کہ خود کسی دوسری عورت کے چکر میں پڑ جائیں دوسرے یہ کہ بیوی کو بدچلن سمجھتے ہوں۔ چراغ دین کے بارے میں میرا خیال ہے کہ وہ کسی عورت کے چکر میں ہوتا تو اب تک دوسری شادی کر چکا ہوتا۔ کیا تیرے خیال میں مریم باجی کے کردار کی خرابی اس کا سبب ہو سکتی ہے؟"

"ناممکن!" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں وہ کیسی کردار کی عورت تھی۔ اس کا اپنی ذات پر اعتماد قابل رشک تھا۔"

"اگر یہ ناممکن ہے تو تیسری وجہ ہی رہ جاتی ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔" محسن بولا۔ "مریم باجی کی زندگی کا بیمہ لاکھ روپے کا تھا اور حادثاتی موت کی صورت میں رقم دگنی ہو جاتی ہے ایک لاکھ۔ گاڑی کا اس نے الگ سے بیمہ کرا رکھا تھا انشورنس تھی۔ چنانچہ کمپنی نے اسے نئی کار لے دی۔ ایک لاکھ کیا ہوتے ہیں مگر تو چراغ دین کو جانتا ہے پیسے کے لیے اس نے وزیر خان پچا کے ساتھ

کیا کیا؟"

"مگر محسن اس حادثے میں چراغ دین کا اپنا بھائی بھی ہلاک ہوا تھا۔" میں نے اس کی دلیل کو بے اثر کرتے ہوئے کہا۔

"وہ ایک اتفاق تھا۔ جسے قدرت کے نظام انصاف کا نمونہ بھی کہا جا سکتا ہے۔" محسن تلخ لہجے میں بولا۔ "اس حادثے کے بعد شوفر نے روتے روتے مجھے بتایا تھا کہ مالک مجھ بدبخت کو حادثے کا ذمے دار سمجھتے ہیں۔ اس کی بدبختی یہ تھی کہ پروگرام کے مطابق جس روز انھیں روانہ ہونا تھا وہ ملیریا میں مبتلا ہو گیا۔ اس کو ایک سو چار ڈگری بخار تھا لیکن ملیریا تو ایک دن میں ٹھیک ہو جاتا ہے۔ سفر ایک دن کے لیے ملتوی بھی کیا جا سکتا تھا۔ چراغ دین کا بھائی صرف دو دن کے لیے مری گیا تھا۔ اس نے خود کار ڈرائیو کرنے کا فیصلہ کیا اور اصل شوفر سے کہہ دیا گیا کہ وہ بعد میں بس سے آ جائے۔ چراغ دین بعد میں اس بات کو رد کرتا تھا کہ بھائی نے یہ بات کہی تھی اور اس نے شوفر کو بہت گالیاں دی تھیں۔ اور پھر اسے برطرف کر دیا تھا۔ حالانکہ اس کا قصور کوئی نہ تھا۔ بیمار وہ اپنی مرضی سے تو نہیں ہوا تھا مگر چراغ دین نے اس سے چیخ چیخ کر کہا کہ مرنا تجھے تھا بدبخت۔ قضا تیری آئی تھی۔ تو نے میرے جوان بھائی کی جان لے لی۔ بیچارے بچوں کو مار ڈالا۔ اس نے شوفر کو مریم کی موت کا ذمے دار قرار نہیں دیا۔ بعد میں مجھے ایک اور عجیب بات معلوم ہوئی۔ چراغ دین نے بھائی کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ بچوں کو نتھیا گلی تک لے جائے اور وہ سب دو دن بعد یعنی پانچ دن بعد نتھیا گلی سے لاہور آ جائیں۔ شوفر کو کہا کہ وہ تمام سامان سمیت صرف مریم کو لے کر روانہ ہو۔ شوفر کی بیماری سے یہ پروگرام گڑبڑ ہو گیا۔ نتھیا گلی جانا اتنا اہم نہیں تھا۔ مریم نے اور چراغ دین کے بھائی نے کہا کہ چلو آئندہ سال سہی اور وہ سب کو لے کر چل پڑا۔ اسے نئی کار کو مری سے لاہور لانے کا بہت شوق تھا کہتے ہیں مقدر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ بچوں کے اور چراغ دین کے بھائی کی جگہ شوفر بس سے آیا اور بچ گیا۔ جن کو چراغ دین بچانا چاہتا تھا وہ مارے گئے۔ یہ بات مجھے خاص طور پر کھٹکتی ہے کہ جب سیزن ختم ہو رہا تھا تو چراغ دین نے اپنے بھائی کو نتھیا گلی کا خصوصی پروگرام بنا کے کیوں بھیجا۔ پھر یہ کہ اس نے صرف بچوں کو نتھیا گلی لے جانے کی بات کیوں کی۔ اگر مریم بھی دو چار دن کے لیے نتھیا گلی ہو آتی تو کیا ہوتا۔ سامان واپسی میں بھی اٹھایا جا سکتا تھا۔ بچے تنگ کر رہے تھے۔ ستمبر تک کا لوا لیا گیا تھا مگر سیزن کے لیے

www.paksociety.com

کوٹھی لینے والے دو چار دن اوپر گزار لیں تو کوئی برا نہیں مانتا۔ وہ کوٹھی اس نے بعد میں خریدی تھی۔ قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے ہیجان میں مریم سے نہیں کہا کہ چلو نتھیا گلی گھوم آئیں یا یہ کہ تم بچوں کو نتھیا گلی دکھا لاؤ۔ مریم یا بچی خود بھی جتنی پریکٹس کر رہی تھیں آخری دنوں میں یہ پروگرام بنانے کا مقصد آخر کیا تھا؟ میری سمجھ میں صرف ایک بات آئی ہے۔ وہ اپنے بچوں کو بچانا چاہتا تھا چنانچہ اس نے بھائی کو بھیج دیا تھا۔ مریم اور شوفر حادثے کا شکار ہو جاتے تو اس کے لیے صدمے کی بات نہ ہوتی۔ جو کار نیچے گر کر چور ہو جائے اس کے بارے میں کون ماہر یہ رپورٹ دے سکتا ہے کہ اس کے بریک فیل ہو گئے تھے۔ چراغ دین کو یہ بات کس نے بتائی؟ بچنے والا تو کوئی تھا نہیں۔"

"یہ سوال تم نے کبھی چراغ دین سے کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مگر اس سے پہلے میں نے شوفر سے پوچھا تھا۔" محسن بولا۔ "وہ خود حیران تھا کہ بریک کیوں فیل ہو گئے۔ پولیس کی تفتیش میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا اور صرف یہ بتایا گیا تھا کہ مری سے راولپنڈی آتے ہوئے سترہویں میل کے قریب کار حادثے کا شکار ہوئی جس کا عینی گواہ کوئی نہیں مگر دو منٹ کے وقفے سے دوسری کار آئی جس میں ایک اور فیملی مری سے لوٹ رہی تھی۔ انھوں نے کار کو قلابازیاں کھاتے نشیب کی طرف جاتے دیکھا۔ ظاہر ہے وہ اوپر سے یہ وحشت ناک منظر دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ چند منٹ میں مخالف سمت سے دوسری کار نمودار ہوئی جو مری جا رہی تھی اس کے مسافروں نے مری پہنچ کر ہی پولیس کو اطلاع دی اور پولیس وہاں حادثے کے ایک گھنٹے بعد پہنچی تو کچھ نہیں بچا تھا۔ جلی کار اس وقت تک ٹھنڈی پڑ چکی تھی اور وہاں بھی پولیس کو مطلع کر دیا گیا تھا چنانچہ دو مری پولیس پارٹی پونے دو گھنٹے بعد پہنچی۔ یہ سب تو رپورٹ میں ہے۔ وقت، تاریخ، دن اور نقشے کے مطابق حادثے کا صحیح مقام۔ حادثے کے عینی شاہدوں کے بیانات۔ انشورنس کمپنی کی طرف سے حادثے کے ممکنہ اسباب۔ لیکن کہیں بھی یقین کے ساتھ بریک فیل ہو جانے کی بات نہیں کی گئی ہے۔ یہ بات صرف چراغ دین نے کی۔ جب میں نے اس سے پہلی بار پوچھا تھا کہ حادثہ کیسے ہوا تو اس نے دلاور کو گھورتے ہوئے کہا تھا کہ گاڑی کے بریک فیل ہو گئے تھے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ حادثے کے ممکنہ اسباب تو بہت سے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً گاڑی تیز رفتاری کے باعث بے قابو ہو جائے۔ آگے کا کوئی ٹائر برسٹ ہو جائے۔ ٹائی راڈ کھل جائے۔ بریک فیل ہو جائے۔ جب کسی نے حادثے کے سبب کا تعین کیا ہی نہیں تھا تو چراغ دین نے کیسے کہہ دیا کہ بریک فیل ہو گئے تھے۔ مجھے لگا کہ اس کے ذہن میں یہ بات تھی جس کا اسے پورا یقین تھا کہ حادثہ کیسے ہوا اور غیر شعوری طور پر اس نے یہ بات کہہ دی۔ میں نے ڈیڈی سے ذکر کیا۔ انھوں نے کہا اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ حادثے کا اصل سبب کیا سمجھا تھا جو گیا اور موت ایسے ہی بہانے ڈھونڈ لیتی ہے۔ شوفر بد بخت نہیں خوش قسمت تھا جو طرفین کے بیچ اور ملازم ہو گیا تھا۔ مجھے اس کا پتا بھی تب لگا کہ میں اور تفتیش کرنے والوں نے قتل کے امکان کو مد نظر رکھا ہی نہیں تھا چنانچہ لاشوں کی تدفین ہو گئی۔ گاڑی کا ملبہ انشورنس کمپنی والے اٹھا کے لے گئے اور اس کے پرزے کباڑ میں کر دیے گئے۔ کیس ضروری رسمی کارروائی کے بعد ختم ہو گیا [illegible]۔ گویا قصاب [illegible]

یہ بات جو اب تک محسن کے دل میں کانٹے کی طرح موجود تھی آج اچانک اس کی زبان پر آ گئی تھی اور اب بھی اس حادثے کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا تھا چراغ دین کے خلاف نفرت کا لاوا میرے دل میں بھی پک رہا لیکن مجھے علم نہ تھا کہ ایسے ہی نفرت کے بگولے محسن کے دل میں بھی چکر کھا رہے ہیں۔ میری نظر میں وہ اس کا مجرم تھا کہ میرے باپ کی پیٹھ میں سب سے پہلے خنجر گھونپنے والا ہاتھ اسی کا تھا اور اس کا یہ ہاتھ بالکل ویسے ہی تھا جو میرے باپ کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھانے [illegible] چراغ دین نے اس کی تجوری سے چرایا تھا۔ وہ قانون کے سامنے چور ثابت نہیں ہو سکا تھا لیکن اس سے چراغ دین کے جرم کی سنگینی ختم نہیں ہوئی تھی۔ محسن کی نگاہ میں وہ اس کی بڑی بہن کا قاتل تھا جس نے اس کی زندگی کے عوض لاکھوں روپے وصول کر لیے تھے۔ قدرت نے اسے بہت [illegible] دے دی تھی لیکن دنیا کی نظر میں وہ دستور معزز اور معتبر تھا ہماری نگاہ میں وہ اتنا ہی بے گناہ تھا جتنے ہم سمجھتے تھے وہ بدترین سزا کا مستحق ہے۔ چراغ دین کے بارے میں ہماری جذباتی کیفیت ایک جیسی تھی۔ ہم دونوں کو اس کے منہ سے اعتراف جرم سننا تھا اور پھر وہ حساب بے باق کرنا تھا جو کسی کتاب میں نہ تھا۔

"محسن!" میں نے کہا۔ "ابھی تو میں چراغ دین سے ملوں گا جیسے مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں۔ مجھے اس کی [illegible]

ہے اور عیار آدمی کے خلاف موثر حربہ عیاری کو ہی ہو سکتا ہے۔ اگر میں نے کھل کر اس سے عداوت کا اظہار کیا تو وہ میرے دشمنوں میں شامل ہو جائے گا۔ ابھی اس کو میری ذات سے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں ہونا چاہیے۔ میں اس سے طول بکلام ہوں گا تو یہ تاثر دوں گا جیسے میں کچھ نہیں جانتا۔ پہلے والا بے وقوف ہوں اور حالات کا تجزیہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ اپنے عاجزانہ لہجے اور مسکین صورت سے میں اسے اپنے بے ضرر ہونے کا پورا یقین دلا دوں گا تو وہ بہت سی باتیں بتائے گا۔ جو اس کے نقطہ نظر سے غیر اہم ہوں گی۔ وہ حتی الامکان میری مدد سے بھی گریز نہیں کرے گا لیکن وہ بدک گیا تو مجھ سے بات بھی کرنے کا روادار نہ ہوگا اور الٹا مجھے پھنسائے گا۔ جو شخص پہلے ہی ملزم رہ چکا ہو اس پر کون ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ مناسب وقت پر ہم اس سے ایک ساتھ ملیں گے اور وہ حقیقت کا اعتراف خود کرے گا۔ اب پوسٹ مین کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ میں چراغ دین کو باتوں میں لگانے کی کوشش کروں گا تم وجاہت خان کو بھی الجھائے رکھو۔ تو خط لینے میں کامیاب ہو جائے تو انتظار ہے۔ تم کسی بہانے اپنی پتلون کی جیب میں سے لاک روم کی چابی نکال کر اسے دو گی۔"

"دونوں صورت کیس لے کر [illegible] پہنچ جانا [illegible] ہو کے سیدھا اپنی [illegible] شام کو [illegible] کا انتظام [illegible] ایک دن ایمبیسیڈر ہوٹل میں اور سہی۔ مگر شام کو [illegible] خان صاحب [illegible] کر دونوں باتیں کر لیں گے [illegible] کے لائسنس کا بھی اور [illegible] کے مسئلے کی بھی۔ وہ بہت [illegible] جانے آدمی ہیں، کچھ نہ کچھ کر دیں گے۔"

جب میں پورے اعتماد سے [illegible] کرتا [illegible] کی نیم پلیٹ والی کوٹھی پر پہنچا تو میری بیل کی بیل کے جواب میں خود وجاہت خان دروازہ کھول کے [illegible] آئے اور [illegible] بڑے اخلاق سے کہا "تم اس چٹھی کا واسطے آیا ہے نا؟ ابھی وہ [illegible] بابو پوسٹ مین نہیں آیا۔ مرتضیٰ کا بابو تا ہے۔ خو ابھی آجائے گا۔ تم بیٹھو۔" وہ مجھے برآمدے میں لے گیا۔

"وجاہت خان" میں نے کہا "وہ چٹھی گلاب خان خود لے جائے گا۔ میں یہ کہتا ہے صاحب چراغ دین سے ملنے آیا۔" وجاہت خان کی صورت پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ "کیا صاحب ملے گا؟ تم جانتا ہے اس کو؟ کیا کام ہے؟"

"کام میں انھی کو بتاؤں گا" میں نے مسکرا کے کہا۔

"وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم انھیں بتاؤ کہ [illegible] آیا ہے۔"

"خو، ہم بتائے گا کس کو بتائے" وہ بولا۔ "دین صاحب کدھر ہے کہ بتائے۔ ابھی رب کی کا واسطے تم نے کا تو بتائے گا۔"

"اچھا اچھا" میں نے سر ہلایا۔ "لنچ کے وقفے میں آ جائیں گے وہ۔ اچھا سلامت شاہ سے مل لیتا ہوں میں۔ وہ بھی ہیں ہو گا نا؟" وجاہت خان نے سر پر ہاتھ مارا۔ "کدھر ہیں؟ خو یارا سلامت شاہ کا تم کو پتا ہے۔ غریب زندہ ہے مر گیا۔ کتنا روز ہو گیا آج اس کو؟" اس نے انگلیوں پر گن کے حساب لگایا۔ "دین صاحب اس کا کوارٹر میں دیکھا۔"

"اچھا!" میں نے چونک کر کہا۔ "کوارٹر میں تو تالا پڑا ہوا تھا۔" اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں۔ وہ ہم کو بولا۔ ہم اوپر سے دیکھا سب سامان موجود۔ دروازہ کھلا پڑا ہے۔ ہوتا تو سامنے نظر آتا۔ خو آدمی ہے جو ہے کا۔ بچہ تو نہیں ہے۔ ہم صاحب کو بولا صاحب پولیس کو بولو اس کا پتا چلائے۔ اتنا بڑا شہر ہے۔ ورنہ غریب لوگ لاری کے اور انجن کے یا کار کے نیچے آ کے مرتا ہے۔ عجیب [illegible] کا لاش مردہ گھر میں پڑا ہو۔ لاوارث ہم ادھر کب تک انتظار کرے گا؟" وجاہت خان اپنی رو میں بولتا گیا۔ "دین صاحب نے کہا آج یہ چلا گئے گا۔"

مجھے محسوس ہوا جیسے یہ ضرورت سے زیادہ عقلمند بننے کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ میں خود جیل کے خطرے کے اس حصار میں داخل ہو گیا ہوں اور پولیس کسی بھی لمحے پہنچ سکتی ہے۔ اگر چراغ دین نے فون کیا ہو گا تب بھی وہ کوارٹر کو ایک نظر دیکھنے ضرور آئیں گے اور اندر قدم رکھتے ہی تعفن خود سلامت شاہ کی لاش کا پتا دے گا۔ آنے والے اسی تھانے کے لوگ ہوں گے جو مجھے پہچانتے ہیں۔ وہ پھر مجھے لے جائیں گے شبہے میں نہ سہی عینی گواہ بنا کے۔ میرا جان بچنے کے لیے وہ سوالات سے میری زندگی عذاب کر دیں گے۔ تم وہاں کیا لینے گئے تھے؟

ائیرپورٹ سے تم سیدھے سلامت شاہ کے پاس پہنچے تھے۔ کیا سامان تھا تمھارے ساتھ؟ وہ سامان اب کہاں ہے؟ گرفتاری کے وقت تو تمھارے پاس صرف ایک بریف کیس تھا۔ لاک روم والی بات نہیں چلے گی۔ اس پر محسن رضا کا نام اور آج ہی کی تاریخ ہے۔ میں انکار بھی نہیں کر سکتا کہ لندن سے صرف بریف کیس لایا تھا۔ محسن رضا تو بعد میں آیا تھا۔ سامان اس کے پاس کیسے پہنچا؟ آج لاک روم تک سامان رکھنے کا کیا مقصد تھا؟ اب تک یہ سامان کہاں تھا؟

www.paksociety.com

جس صندوق میں لاش ہے وہ تمہارے والد کی ملکیت تھا۔ اس میں کیا سامان تھا؟ تم نے نہیں دیکھا تھا؟ صندوق مقفل تھا تو چابیاں - چابیوں کے بارے میں تو شاید میں نے تھانے میں بھی بات کی تھی - محبت خان تپاک سے کہ میں ایک دن پہلے بھی گلاب خان نام کے ایک شخص کے ساتھ سلامت شاہ کے کوارٹر کی طرف گیا تھا۔ گلاب خان بعد میں محسن رضا ثابت ہوگا تو اس جھوٹ کا بھرم کیا جواز پیش کریں گے - میرا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ سوالات ذہن میں گن سے فائر ہونے والی گولیوں سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ نکلتے چلے آرہے تھے اور میرے لیے دلی خوف و اضطراب کی کیفیت کو چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ چراغ دین خود پولیس کے ساتھ نمودار ہونے ہی والا ہے۔ میں نے ایسے وقت میں یہاں آ کے سخت حماقت کی تھی۔ اب بچت کی یہی ایک صورت تھی کہ میں بھاگ جاؤں اور بعد میں ہر بات سے صاف انکار کر دوں۔ نہ میں نے وانڈا؟ بوڑھا صندوق دیکھا۔ نہ سلامت شاہ نے اس کی بات کی اور نہ میں نے تھانے میں اس کی چابیوں کا ذکر کیا۔ نہ میں یہاں آیا۔ میں کسی گلاب خان کو نہیں جانتا۔ میرا سامان اسی روز محسن نے سلامت شاہ سے لے کر ہوٹل میں رکھ لیا تھا۔ آج کمرہ خالی کرنا تھا۔ اس لیے لاک روم میں عارضی طور پر رکھوا دیا تھا۔

"خانہ خراب ابھی تک نہیں آیا۔" چوکیدار نے داڑھ میں نسوار دبا کے کہا۔

"کو... کون؟" میں چونک پڑا لیکن محبت خان نے مجھے چونکتے نہیں دیکھا۔ وہ نسوار کی ڈبیا کے آئینے میں خود کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ بابو۔" محبت خان نے نسوار کی ڈبیا واسکٹ میں رکھ کے کہا۔ "اب نہیں آئے گا۔ تمہارا بھتیجا۔"

"میرا نہیں خان۔ وہ گلاب خان کا بھتیجا ہے۔ مجھے اس سے کیا۔" میں نے کہا۔ "میں اب چلتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ محبت خان میری بات پر تبصرہ کرتا کار کا ہارن بجا اور میرا دل اچھل کے حلق میں آگیا۔ "آگیا چراغ دین صاحب۔" محبت خان دروازہ کھولنے لپکا۔ جب کار میں وہ اکیلا اترا تو میری جان میں جان آئی۔

"السلام علیکم جناب۔" میں نے آگے بڑھ کے چراغ دین سے مصافحہ کیا اور بڑی عقیدت سے ایک ہاتھ سینے پر رکھا۔

"وعلیکم السلام۔" چراغ دین نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم... تم سکندر بخت ہو؟ وزیر خان... کے بیٹے...؟"

"جی جناب عالی۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "میں شکریہ ادا کرنے بھی آیا تھا۔"

"شکریہ؟" چراغ دین نے متعجب لہجے میں کہا۔ "کس بات کا شکریہ...؟"

"جی - وہ آپ نے آخری دنوں میں والد صاحب کی بہت مدد کی..." میں نے غمزدہ لہجے میں کہا۔ "ان کو چھپنے کی جگہ دی۔ وہ آپ کی شرافت کے بہت قائل تھے۔ میرے پاس لندن میں ان کے خط آتے رہتے تھے۔ لکھا تھا اس پریشانی کے زمانے میں ایک شخص کے سوا کوئی کام نہ آیا۔ دوستوں نے بھی نظریں پھیر لیں۔ مگر وہ شخص جس نے ہمیشہ غلط سمجھا میرا سہارا بنا۔"

چراغ دین کے لیے یہ سب باتیں بہت انوکھی تھیں مگر وہ میری صورت پا رہے تھے ... شک میں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ سب اداکاری ہے میں طنز اور تمسخر سے ایسی گفتگو کر رہا ہوں۔ وہ محبت کا شکار رہا تھا۔

"پریشانی تو بہت اٹھائی انھوں نے۔" وہ بولا۔ بعد میں بتلایا۔ "انھیں اور کیا لگی تھی اپنی پریشانی کے آگے۔ میں کاروبار چوپٹ ہو گیا ہے اور گھر کے علاوہ ایک ایک چیز قرض خواہوں کی نذر ہو چکی ہے۔ تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں بچا اور اوپر سے بیماری نے آلیا ہے۔ پہلے تو نمک خوار نے دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کا ٹھکانہ دے دیا ہے اور اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ جسے میں کوڑا سمجھتا تھا وہ ہیرا تھا اور جن کو ہیرے کی طرح عزیز رکھا تھا پتھر تھے۔" میں نے سب درد دکھی لہجے میں کہا۔ "انھوں نے لکھا تھا کہ بیٹا میرا اب کوئی بھروسہ نہیں۔ میں تمہارے اخراجات کہاں سے پورے کروں۔ جتنا زیور تھا سب بیچ کے میں تمہیں بھیجتا رہا لیکن اب کوئی صورت نہیں۔ تم واپس آجاؤ۔ میں نے واپسی میں کچھ دیر کی... کیا خبر تھی..." میں نے جس جس کرکے...

"اچھا اچھا۔" چراغ دین نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے تھپکی دی۔ "صبر کرو۔ خدا کو یہی منظور تھا۔ آؤ۔" وہ پوری طرح مطمئن ہو گیا تھا کہ مجھے یہاں کے حالات کی رتی بھر خبر نہیں اور میرے والد نے کچھ نہیں بتایا۔ نہ اپنے بارے میں اور نہ اس چراغ دین کے بارے میں جو فون کر کے توکر سے آ تا لا گیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وزیر خان نے اپنا دکھ اپنی ذات تک محدود رکھا اور اپنے بیٹے کو اپنے مصائب کے اصل اسباب اور زندگی کے آخری پیچ و تاب دور کی تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا تاکہ بیٹا تفکرات سے محفوظ رہے۔ اسے میری اور سلامت شاہ کی گفتگو کا یا میری، میر شرافت علی سے آخری ملاقات میں ہونے والی باتوں کا کیسے علم ہو سکتا تھا۔

"وہ... میں نے اخبار میں دیکھا تھا۔" اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر کہا۔ "تم پر کوئی مقدمہ وغیرہ قائم ہو گیا ہے میر شرافت علی کے قتل کا۔ اور تم نے کہا کہ میر شرافت علی نے تمہارے والد کو بلیک میل کیا تھا۔ اور یہ کہ ان کی موت بھی طبعی نہیں۔ یہ کیا چکر ہے؟"

"میں کیا عرض کروں جناب عالی۔" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔ "مجھے لوگوں نے پھنسا دیا۔ معلوم نہیں کسی کو مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ جب میں لندن سے روانہ ہونے والا تھا تو ایک شخص مجھ سے ملنے آیا۔ صورت سے بھلا مانس لگتا تھا۔ شیروانی اور ترکی ٹوپی لگا کے آیا تھا۔ بوڑھا آدمی تھا پھر بھی سب لحاظ لوگ اس کے حلیے پر ہنسنے لگے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میر شرافت علی نے میرے والد کو بلیک میل کر کے ان سے سب کچھ چھین لیا ہے۔"

"تم نے اس سے پوچھا نہیں کہ میر شرافت علی نے کیسے بلیک میل کیا۔ کوئی وجہ تو ہوگی۔"

"میں نے پوچھا تھا جناب۔ مگر اس نے کہا وجہ تو مجھے نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔ "وہ یہاں تھانے میں بھی مجھ سے ملنے آیا تھا اور اس نے یہی کہا تھا کہ تمہارے والد کو قتل کیا گیا ہے۔ اس نے قسم کھا کے کہا تھا کہ یہ بات جھوٹ نہیں۔"

"اور اسی شخص کے کہنے پر تم نے عدالت میں بیان دے دیا؟" چراغ دین نے مجھے افسوس سے دیکھا۔

"اور میں کیا کرتا۔ مجھ پر قتل کا جھوٹا الزام جو لگا دیا گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے قسم کھا کے ایک بات کہی تھی۔ میں نے وہی بات کہہ دی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ تم تو عقل سے بالکل پیدل ہو بیٹا۔" چراغ دین بولا۔ "اگر ایسی بات ہوتی تو والد تمہیں نہ لکھتے۔ تم نے تو خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی ہے۔ قتل کا ایک جھوٹا الزام کوئی معمولی چیز ہوتی ہے۔ اور قتل کا کیا سوال۔ تمہارے والد بیمار تھے۔ میں خود گواہ ہوں اس بات کا کہ ان کی موت بیماری کا نتیجہ تھی۔ مگر ان کی کوئی کم تھی ان کی — جب میرے پاس آئے تو ان کی حالت تباہ تھی۔ میں جانتا تھا ایک زمانے میں وہ مجھ سے کتنے بدگمان تھے۔ شاید انھیں علم نہیں کہ بدخواہوں کی باتوں میں آکے انھوں نے مجھ پر کتنے سنگین الزام عائد کیے تھے مگر اب اس کا کیا ذکر۔ میں نے ان کا نمک کھایا تھا۔ سب نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا لیکن میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا۔ یہ تو وقت کا الٹ پھیر ہے۔ عزت اور ذلت۔ تقدیر کے کھیل ہیں۔ میں اس شخص کو کیسے دھتکار دیتا جو میرے پاس پناہ کے لیے آیا تھا۔ میں نے ان سے کہا یہ گھر حاضر ہے شوق سے رہیے مگر وہ خوددار آدمی تھے اور خیرات لینا قبول نہ کرتے تھے چنانچہ مجبوراً میں نے ان کو گھر میں معمولی سا بچا تو... کا کام دے دیا اور اس کے عوض وہ مجھ سے ایک حقیر رقم بطور قرض قبول کرتے تھے..."

میں نے دل ہی دل میں اس جھوٹ پر چراغ دین کو ایک بڑی گالی دی۔

"... اس کے علاوہ بھی مجھ سے جو بن پڑا میں نے کیا۔ دوا علاج... ہمدردی... حوصلہ افزائی۔" وہ بولتا رہا۔ "مگر ان کی حالت دن بدن بگڑتی چلی گئی۔ سلامت شاہ سے چھپ کر میں انھیں اپنے ساتھ کھانا کھلاتا تھا... مجبوری تھی... دوسرے نوکر اصل بات کہاں جانتے تھے۔ وہ اس سلوک کی توقع رکھتے تو غلط ہوتا۔ تاہم مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ ان کے دن پورے ہو چکے ہیں... میں نے انھیں مشورہ دیا کہ اب بیٹے کو بلوا لو۔ کچھ تو سہارا ہوگا۔ یہ سب مجرم ... کر انھیں قتل کیا گیا۔ تم کیسے ثابت کرو گے؟ لاش نکلواؤ گے؟ ... توبہ کرو یار تم۔ لاش کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ ان کی مغفرت کی دعا کرو۔" اچانک اسے کچھ خیال آیا۔ "محبت خان!" اس نے صدا لگائی۔

محبت خان نے دروازے میں سے جھانکا۔ "کیا ہے صاحب جی؟"

"دیکھو وہ گاڑی میں کچھ رکھا ہے۔ وہ یہاں ... کے لیے نکال لاؤ۔ سلامت شاہ کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں صاحب۔ آج ہم ادھر کوارٹر کا طرف گیا تو ہم کو بدبو آیا۔" محبت خان نے کہا۔ "خبر نہیں کوئی کتا بلی مر گیا ہے۔ خیر یا کوارٹر میں سے آتا ہے۔ کل تھانے سے ایک آدمی اس کو بلانے کو آیا تھا۔ بیان کا واسطے۔"

"اچھا؟" چراغ دین نے تشویش میں مبتلا ہو کے کہا۔ "مجھے یاد نہیں رہا۔ اب واپسی پر پہلے پولیس اسٹیشن جاؤں گا۔ خدا خیر کرے کوئی اور مصیبت نہ نازل ہو جائے۔" اور

www.paksociety.com

کا لفظ یہ ظاہر کرتا تھا کہ میرا لندن سے سیدھا اس کے پاس آنا پہلی مصیبت تھا۔

کچھ نا کھاتے ہوئے میں نے برشستہ دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "آپ تو والد مرحوم کی تدفین میں شریک ہوئے ہوں گے جناب؟"

"میں؟ نہیں یار۔" وہ کچھ اور سوچ رہا تھا اس لیے میرے سوال پر چونک پڑا۔ "بدقسمتی سے میں مری جا چکا تھا۔ اسی روز۔"

"محبت خان تو جنازے میں شامل ہوگا!" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس نے کہا۔ وہ کچھ چوکنا ہوگیا تھا۔

"وہ جناب عالی، میں ابھی تک والد کی قبر پر حاضر نہیں ہو سکا۔ کیسا بدبخت بیٹا ہوں جسے باپ کی قبر کا بھی علم نہیں۔ سوچا تھا اگلے روز سلامت شاہ کے ساتھ چلا جاؤں گا مگر اس کا موقع ہی نہ ملا۔ اب موقع ملا ہے تو سلامت شاہ غائب ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "یہ بڑی عجیب بات ہے۔ محبت خان نے مجھے اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے کہ ادھر سے بدبو آ رہی ہے۔ ابھی میں خود جا کے دیکھتا ہوں۔ کہیں کسی نے اسے مار کے اندر نہ ڈال دیا ہو۔"

"کیا جی؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور یوں ظاہر کیا کہ خوف سے میرا حلق میں پھنس گیا ہے۔ میں نے فوراً پانی کے دو گھونٹ لیے۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تم... نہیں سمجھتے یار۔ دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔" وہ جھنجلا کے بولا۔ "میرا خیال ہے میرا اندر جانا ٹھیک نہیں۔ پولیس خود دیکھ لے گی۔ بڑی غلطی ہوئی مجھ سے کہ رپورٹ لکھوانے میں دیر کی۔ پھر میں ابھی فون کرتا ہوں۔"

میں نے آخری لقمہ حلق کے پار کیا اور کھڑا ہوگیا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ جناب عالی۔" میں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کے اس کا ہاتھ تھاما اور مصافحے کے بعد ایک ہاتھ پھر سینے پر رکھا۔ "آپ اجازت دیں تو میں محبت خان کو اپنے ساتھ قبرستان لے جاؤں۔۔۔؟"

"ابھی؟۔۔ اسی وقت؟ ۔ خیر لے جاؤ۔" وہ بولا۔ "مگر دیکھو۔ اس سے کہنا کہ تمھیں قبر تک پہنچا کے فوراً لوٹ آئے۔ میں اب واپس نہیں جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے پولیس فوراً آ جائے۔"

میں وہاں سے جان بچا کے نکلا تو میری پریشانی کم ہوگئی تھی۔ اب اس بات کے امکانات پیدا ہو چکے تھے کہ چراغ دین میرے کرتوت کا پولیس سے ذکر ہی نہ کرے۔ اس کے خیال کے مطابق میں اس کا شکریہ ادا کرنے آیا اور محبت خان کو ساتھ لے جانے کے لیے تاکہ باپ کی قبر تک پہنچ سکوں۔ اس بات کا سلامت شاہ کے غائب ہونے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور چراغ دین یا محبت میں سے کسی کو یہ خیال آ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے اس اندوہناک واقعے کی پہلے سے خبر تھی۔ پولیس کے سامنے کہیں اسے یہ پوچھنا ہوا آیا تھا کہ کوئی خطرے کی بات تو نہیں تھی۔ ظاہر ہے وہ میرے لیے صفائی کا واحد گواہ تھا جو والد کے آخری ایام کا ساتھی تھا اور یہاں اس کے سوا کوئی نہیں تھا چنانچہ اس کی گم شدگی سے میں بھی پریشان تھا۔ مجھ پر الزام آنے کا کیا سوال۔ اس کے قتل سے میرے خلاف سازش کے موقف کی تائید ہوگی۔ ابھی میں راہ میں ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور پھر چراغ دین کی: "کون۔۔۔ سب انسپکٹر حشمت خان؟" یہ نام سنتے ہی میرے قدم رک گئے۔ "ہاں۔۔۔ میں بول رہا ہوں چراغ دین" اس نے کہا۔ "ہاں کل کوئی آیا تھا۔ نہیں میں نہیں تھا۔ مجھے چوکیدار نے ابھی ابھی بتایا ہے۔ اسے یاد تھا نے دار صاحب۔ ٹھیک ہے آپ کو بیان لینا ہے مگر میں اسے کہاں سے بھیج دوں۔ ہاں۔ ابھی تک اس کا کوئی پتا نہیں۔ میں تو خود رپورٹ لکھوانے کے لیے آ رہا تھا۔ اچھا کیا آپ نے فون کر لیا۔۔۔"

میں تیزی سے آگے بڑھا اور محبت خان کے پاس جا پہنچا جو کار کی غیر ضروری صفائی سے فارغ ہوا ہی تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ دین صاحب سے میری بات ہو گئی ہے اور انھوں نے اجازت دے دی ہے کہ میں چوکیدار کو قبرستان تک اپنے ساتھ لے جاؤں کیونکہ مجھے اپنے والد کی قبر نہیں ملی۔ اس نے واسکٹ میں سے نسوار کی ڈبیا نکالی، چٹکی نسوار کی داڑھ میں دبائی۔ آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ کی اور کچھ سوچتا رہا۔ "تم سلامت شاہ کے ساتھ نہیں گیا تھا قبرستان؟" میرے انکار پر اس نے تعجب ظاہر کیا اور بدستور تذبذب میں مبتلا رہا۔ اندر چراغ دین مسلسل اونچی آواز میں ٹیلی فون پر حشمت خان کو رپورٹ لکھوا رہا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ محبت خان کا

اجازت نامہ منسوخ نہ کر دے۔ پولیس والے ٹیلی فون پر رپورٹ کہاں لکھتے ہیں۔ وہ چراغ دین سے کہیں گے تھانے آؤ۔ میں نے محبت خان کو بتایا کہ دین صاحب کا واپس جانے کا ارادہ نہیں ہے اور اسی لیے انھوں نے تمھیں یہ اجازت دی ہے۔ اس نے سر ہلایا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ محبت خان کو میری بات کا یقین آ گیا۔ وہ تصدیق کے لیے جاتا تو چراغ دین یقیناً اسے روک لیتا اور کہہ دیتا کہ کل چلے جانا۔ سڑک پر آ کے میں نے اپنے سامنے سے ایک رکشا کو گزرتے دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ رکشا ابھی روانہ ہوا ہی تھا کہ پلٹ کر دیکھنے پر مجھے چراغ دین نظر آیا جو کوٹھی کے دروازے پر کھڑا تھا اور اس میں سمجھ کی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ چوکیدار کو منع کرنے آیا تھا۔ اس کے بعد بھی مجھے اندیشہ لاحق تھا۔ اگر کہیں وہ کار لے کر پیچھے نہ آ جائے مگر ٹریفک میں جس طرح رکشا نکل جاتا ہے کار نہیں نکل سکتی شاید یہی سوچ کے وہ رک گیا۔ اسے یہ بھی امید ہوگی کہ میں کہہ گیا تھا ایک ڈیڑھ گھنٹے میں لوٹ آئے گا۔

قبرستان کے طویل راستے کو طے کر کے ہار پھول اور اگر بتیاں خرید کے میانی صاحب کے وسیع و عریض قبرستان میں آخری قبر تک پہنچنے میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ اس ایک گھنٹے میں محبت خان سے مجھے بہت سی کارآمد باتیں معلوم ہوئیں مثلاً یہ کہ میرے والد آخری وقت تک کسی ڈاکٹر کے زیر علاج رہے تھے۔ وہی ڈاکٹر اس روز صبح کے وقت آیا ہوگا جب وزیر خان کی موت کا انکشاف ہوا تھا لیکن وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ ڈاکٹر کو لانے والا سلامت شاہ تھا۔ اس نے صرف یہ بتایا تھا کہ ڈاکٹر نے دیکھتے ہی موت کی تصدیق کر دی تھی۔ کفن دفن کا انتظام ان دونوں نے مل کر کیا تھا اور تدفین شام کے وقت ہوئی تھی۔ مجھ سے ذرا پہلے۔ چراغ دین اسی روز صبح سات بجے مری جانے کے لیے راولپنڈی گیا تھا۔ ایک حادثے کے بعد وہ کار میں مری جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ وزیر خان کی موت کا پتا آٹھ نو بجے چلا تھا۔ پھر سلامت شاہ نے فون کیا تھا اور جنازے میں جو لوگ شریک ہونے آئے تھے ان میں سے محبت خان کسی کو نہیں پہچانتا تھا کیونکہ وہ پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ وہ سب کسی کمپنی کے لوگ تھے جو بہت افسردہ تھے۔ محبت خان نے ایک دو کو روتے بھی دیکھا تھا۔ اکثر لوگ افسوس کر رہے تھے کہ بیچارے کا بیٹا بھی لندن میں بیٹھا ہے۔

"محبت خان!" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ "جنازہ کہاں سے اٹھایا گیا تھا۔ کوٹھی سے کہ سرونٹ کوارٹر سے؟"

"کوٹھی سے۔" محبت خان نے جواب دیا جو میری توقعات کے عین مطابق تھا۔ "دین صاحب تو ادھر تھا نہیں۔ سلامت شاہ نے خود ہی میت کو ادھر رکھوا لیا۔ بولتا تھا ادھر جگہ کم ہے۔"

سلامت شاہ کچھ دار آدمی تھا۔ اس نے مرنے والے کی عزت کا بھرم نہیں ٹوٹنے دیا۔ اس کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے آنے والے بھی یہ سمجھے ہوں گے کہ میرو وزیر اینڈ کمپنی کا ایک پارٹنر جو مدت سے بیمار تھا اور وہ قریباً کاروبار میں نظر تک نہیں آیا تھا اب اس کوٹھی میں مقیم تھا۔ اگر وہ سرونٹ کوارٹر میں دیکھتے تو یقیناً شکوک میں مبتلا ہو جاتے اور تجسس انھیں مجبور کرتا کہ وہ وزیر خان کی زبوں حالی کے اسباب معلوم کریں مگر......

وہ ایک شایانِ شان کوٹھی میں مرا تھا چنانچہ وہ سب مطمئن ہو کے لوٹ گئے تھے کہ بیماری کی خبریں بے بنیاد نہ تھیں۔ اگر کسی نے گیٹ پر "سی سی ڈین" کے نام کی تختی دیکھی ہوگی تو کہاں سمجھا ہوگا کہ یہ وہی نمک حرام چراغ دین ہے شاید انھوں نے سوچا ہوگا کہ وزیر خان نے اتنی بڑی کوٹھی کو اپنی ضروریات سے زائد سمجھتے ہوئے اس کا ایک حصہ کسی انگریز یا کرسچین اینگلو انڈین کو کرائے پر دے رکھا ہے۔ تاہم اس سے ایک بات ثابت ہوتی تھی۔ وزیر خان نے سلامت شاہ کو بتا دیا تھا کہ وہ کون ہے۔ چراغ دین کون تھا اور حالات کے کس انقلاب نے اسے نوکر کا نوکر بنا دیا ہے۔ ممکن ہے بلیک میلنگ والی بات نہ بتائی ہو اور اپنی تباہی کو اپنی حماقت سے ہونے والے کاروباری نقصان کا نتیجہ قرار دیا ہو مگر یہ بات سلامت شاہ کو یقیناً معلوم تھی کہ وزیر خان اب بھی اس کمپنی کے مالکوں میں شامل ہے مگر عملی طور پر اس کی حیثیت کچھ نہیں۔ سلامت شاہ نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا تھا تو اس کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ وزیر خان نے اسے بہت سخت قسم دے رکھی تھی کہ اس بات کو وہ اپنی ذات تک محدود رکھے گا۔ پھر بھی مرنے کے بعد وزیر خان کا جنازہ اسی شان سے اٹھا جس شان سے مالکوں کے جنازے اٹھتے ہیں۔ کوٹھیوں کی جھاڑ پونچھ کرنے والوں کے نہیں۔ ایک بار پھر مجھے سلامت شاہ کے ناقابل تلافی نقصان کا شدت سے احساس ہوا۔

محبت خان مجھے قبر تک پہنچا کے اور فاتحہ پڑھ کے رخصت ہو گیا تو میں ایک پختہ قبر کے کتبے پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ تدفین میں شریک ہونے والوں سے رابطہ کیسے قائم کروں۔ اگر میرو وزیر اینڈ کمپنی کا دفتر مقفل نہ ہوتا تو میں خود

www.paksociety.com

وہاں پہنچ جاتا یا فون پر بات کر لیتا اور وہاں زیادہ تر بیٹھے رہتے تھے۔ وہ میری مدد کرتے ہوئے شدید ہو چکے تھے۔ شرافت علی کی موت کے بعد کمپنی لاوارث ہو گئی تھی اور تاوقتیکہ نئے وارث انتظام سنبھالیں آفس اور فیکٹری کے ملازمین اپنے مستقبل کے بارے میں بے یقینی کا شکار رہیں گے۔ ان میں سے بیشتر نوکری کی اس مدت سے گزر چکے ہوں گے کہ کسی نئی ملازمت کے لیے اہل سمجھے جائیں۔ قانونی طور پر وہ برطرف بھی نہیں کیے جا سکتے اور اپنے واجبات وصول کرنے کے مجاز تھے لیکن ابھی تک ان میں سے کسی نے عدالت سے رجوع کرنے کا سوچا بھی نہیں ہوگا۔ انہیں امید ہوگی کہ منیجر وغیرہ پھر کاروبار کو سنبھال لیں گے جو بڑے منظم طریقے پر چل رہا تھا اور ایک امیر شرافت علی کے نہ ہونے سے اس نظام کا شیرازہ نہیں بکھر سکتا تھا جس سے سب کا معاشی مفاد وابستہ تھا۔ انہیں یہ بھی امید ہوگی کہ میں لندن سے واپسی پر وزیر خان کے وارث کی حیثیت سے کاروبار کی نگرانی کی ذمے داری سنبھال لوں گا مگر میں نے آتے ہی اس شخص کو بھی قتل کر دیا تھا جو اکیلا کاروبار کو چلا رہا تھا اور اب ضمانت پر رہائی کے بعد لاپتا تھا۔ میر شرافت علی کا کوئی دور کا وارث ہے یا نہیں اس کا علم مجھے نہیں تھا تو ملازموں کو کیا ہوگا۔ وہ دعا کرتے ہوں گے کہ میری بیچ نہیں تو شرافت علی کا کوئی بھانجا بھتیجا یا پوتا یا نواسے کا بھائی ہوگا۔ کوئی تو سامنے آئے گا۔ ممکن ہے اسی امید میں وہ سہروردی دیکھنے آتے رہیں کہ کسی نے تالا بندی کا خاتمہ کیا یا نہیں۔ یہ خیال بڑا حوصلہ افزا تھا۔ میں دفتر کے اوقات میں سہروردی پر اینڈ کمپنی کے دروازے پہ یا سامنے کھڑا رہ کے ان پر نظر رکھ سکتا تھا۔ عموماً دفاتر آٹھ سے نو بجے کے درمیان شروع ہوتے ہیں۔ آٹھ سے دس بجے تک انتظار کرنے میں ایک دو افراد سے ملاقات یقینی تھی۔ ان سے دوسرے ساتھیوں کے پتے معلوم کیے جا سکتے تھے اور یہ پوچھا جا سکتا تھا کہ آخری رسوم میں کون شریک ہوا تھا جو بطور گواہ پیش ہو کے وزیر خان کی قبر کی نشان دہی کر سکے۔

مسئلہ حل ہو گیا تھا چنانچہ میں نے قبر کی جانب توجہ مرکوز نہیں کیا اور پھر قبروں کے درمیان سے طویل پر پیچ راستہ طے کر کے آخر میں صاحب کے بڑے دروازے سے باہر آ گیا جہاں پھول بیچنے والوں کی بہت سی دوکانیں تھیں اور کتبہ آگے کھڑے رہتے تھے۔ ایک میت گاڑی سے جنازہ اتارا جا رہا تھا۔ دوسرا لوگوں کے کندھوں پر جامع مسجد میں نماز کے لیے پہنچ چکا تھا۔ شام کے چار بجنے والے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ محسن کو میرا انتظار کرتے تین گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اس میں شبہے کی کوئی بات نہ تھی کہ وہ بالم پوسٹ میں خط حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میری واپسی میں تاخیر سے وہ یقیناً اندیشوں کا شکار ہو گا۔ اب مجھے تشویش لاحق ہونے لگی کہ کہیں وہ چراغ دین کی کوٹھی پر نہ چلا جائے جہاں پولیس پہنچ گئی ہوگی تو سلامت شاد کی لاش کی دریافت سے کہرام بپا ہو گا۔ میں نے ٹیکسی پکڑی اور سیدھا رابعہ کی کوٹھی پر پہنچا۔ رابعہ کی کار اندر پورچ میں کھڑی تھی اور رابعہ لان پر کرسی ڈالے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ کوٹھی کا رخ مشرق کی جانب تھا چنانچہ دو منزلہ عمارت کا سایہ لان پر پھیل جاتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی اور میں نے اسے سر تا پا زرد لباس میں دیکھا۔ چہرے پر بیلے اور گلابی شگوفے کھلے ہوئے تھے تو مجھے گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں سرسوں کے پھولوں کی یاد آئی۔ لباس کے رنگ کا عکس اس کی صورت پر محسوس ہوا۔ رنگ بڑے نظر فریب ہوتے ہیں۔ بے داغ سفید طہارت، پاکیزگی اور معصومیت کا احساس جگاتا ہے۔ گہرے سرخ رنگ حیوانی جذبات کو ابھارتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ یہ رنگ حنا اور لباسِ عروسی کا رنگ ہے۔ نیلا فرحت اور تازگی عطا کرتا ہے تو سیاہ رنگ حسن کی اور متانت کے تاثر کو گہرا کرتا ہے۔ یہ میری تنہائی کی تجربات کی بات تھی۔ زرد رنگ میں رابعہ مجھے کچھ زیادہ ہی اداس لگی۔ "میں سخت تھکا ہوا ہوں اور چائے نہ ملی تو ... تو باقی پی کے گزارا کر دوں گا۔" میں نے کرسی پر گر کے کہا۔

وہ ہنس پڑی۔ "میں بھی چائے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ بھلا۔ تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

"قبرستان سے۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں چراغ دین سے کیسے ملا تھا۔ وہ جستجو سے سنتی رہی۔ ذکر پہلے میں نے خط کی اور سلامت شاد کی بات گول کر دی۔ میں نے یہ بھی بتا دیا کہ میں جنازے میں شریک ہونے والوں سے کیسے رابطہ قائم کروں گا۔ پھر میں نے محسن کے بارے میں پوچھا اور مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ وہ دوپہر کے کھانے کے لیے آیا تھا مگر دو بجے واپس چلا گیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ منظر صاحب نے قبر کشائی اور پوسٹ مارٹم کرانے کی درخواست لگا دی ہے اور امید ہے کہ اس کی سماعت کل ہی ہو جائے۔ ایک گواہ اگر ثبوت فراہم کر

تو باقی گواہ بھی کل ہی شناخت کر لینے چاہئیں جو عدالت میں حاضر ہو کے بیان اور حلف نامہ دے سکیں۔ وہ تین دن بعد جب میڈیکل بورڈ پوسٹ مارٹم کرے گا تو ان سب کو گورکن کے ہمراہ قبرستان میں موجود رہنا ہوگا۔ میں نے کہا کہ ان شاء اللہ کل صبح مجھے گواہ مل جائیں گے اور ممکن ہے کہ ان کے ذریعے میں اس ڈاکٹر کو بھی طلب کروں جس نے عدالت کے سرٹیفکیٹ کا حوالہ دیا تھا۔ وزیر خان کا علاج اور آخری بار معائنہ کیا تھا۔ آخر قبرستان کے رجسٹر میں یہ لکھا ہے کہ ان کی موت دل کی حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث ہوا۔ پھر میں نے رابعہ سے کہا کہ میں جلد از جلد ہوٹل پہنچنا چاہتا ہوں جہاں مجھے جانا ہے پھر بھی۔ میں اس خط کے بارے میں تفصیلات جاننے کے لیے سخت بے چین تھا۔

"کیا افراتفری ہے؟" وہ حیران ہو کے بولی۔ "محسن ایسے بھاگا جیسے یہاں پولیس چھاپہ مارنے والی ہے۔ تم بھی آئے تھے کہ فوراً چلے۔ دل تو چاہا نہیں کیا ہو جائے گا۔ اب چائے چھوڑ کے بھاگنا چاہتے ہو۔ ایسی کیا جلدی ہے؟"

"اچھا۔" میں نے ہتھیار ڈالنے کے انداز میں کہا۔ "اس سے فون پہ تو بات کر لوں۔ اس کے بعد جب تک تم نہیں کہو گی میں نہیں جاؤں گا۔"

"ابھی وقت ہے اپنے الفاظ واپس لے لو۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "تم یہ قول نبھا نہیں سکو گے۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ رابعہ نے میرے الفاظ کے جال میں مجھے فوراً بند کر لیا تھا۔ میں نے اس کی نظروں کے سوال کو پڑھ لیا اور اس بات کو سمجھ لیا جو الفاظ کے پردے میں نہاں تھی۔ اگر میں نے نہ کہا تو؟ تو کیا تم یہیں رہ جاؤ گے؟ مطلب بالکل صاف تھا اور میرے لیے اپنے الفاظ کو واپس لینے کے سوا چارہ نہ تھا۔

"میرا مطلب صرف آج سے تھا۔" میں نے خفت سے ہنس کے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

وہ ہنسی۔ "نہیں تو تم شروع سے ہو۔ بڑی جلدی فرار کی راہ نکال لی۔ اچھا جلدی سے بات کر لو۔ بابا چائے لاتا ہی ہوگا۔"

اندر جا کے میں نے ماسی سے پوچھا کہ ٹیلی فون کس کمرے میں ہے اور اس نے کہا۔ "اوپر بھی ہے بی بی کے کمرے میں اور نیچے ڈرائنگ روم میں بھی ہے۔" اور ہاتھ سے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس دروازے کی طرف جانے سے پہلے میں نے حسب عادت ماسی کو زیر لب کچھ کہتے سنا۔

وہ فطرتاً خوش کلامی کی عادی تھی اور ہر بات مسکرا کر کرتی ہوتی تھی۔ وہ اپنے آپ سے کہہ کے مطمئن ہو جاتی تھی۔ البیلا ہوٹل کا نمبر ملا کے میں نے آپریٹر سے کمرہ نمبر تین سو تیرہ مانگا۔ ایک منٹ بعد محسن نے ہیلو کہا۔

"محسن میں سکندر بول رہا ہوں۔ رابعہ کے گھر سے۔" میں نے کہا۔ "تم ہوٹل کیوں بھاگ گئے؟"

"میں نے مناسب سمجھا کہ لاک روم سے سامان سیدھا ہوٹل پہنچا دوں۔ رابعہ کو تکلیف نہ ہو۔" وہ بولا۔

"وہ خط مل گیا ہے نا تمہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔" وہ بولا۔ "خط آج کی ڈاک میں نہیں تھا۔ بالم پوسٹ مین کا خیال ہے کہ وہ خط دیر سے پوسٹ کیا گیا ہوگا۔ آج شکے تک تو مل جائے گا۔ تو بتاؤ وہاں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں جو ابھی تم کو ملاقات پر بتاؤں گا۔"

"ابھی آنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟" وہ بولا۔ "وہاں کیا کر رہے ہو؟"

"رابعہ سے باتیں۔" میں نے کہا۔ "سوتی صورت قانونی مسائل پر۔ اس کے بعد مجھے ایک ڈاکٹر سے ملنے جانا ہے۔ میں رات کھانا آؤں گا۔ ظاہر ہے فکر کرنے کی ضرورت نہیں رہ سکتا۔ تو شام میں وہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے چلا جا۔ دونوں باتیں کر لے۔ میں آٹھ بجے سے نو بجے کے درمیان ضرور آ جاؤں گا۔"

میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ رابعہ کی آواز آئی۔ "یہ وعدہ خلافی تھی۔ ابھی کہا تھا کہ مطلب آج سے تھا۔ آج کا دن آٹھ نو بجے تو ختم نہیں ہوتا۔"

میں نے خفت سے سر کھجایا۔ غلطی ہو گئی۔ میں بھول گیا تھا کہ عہد ایک وکیل سے کیا تھا۔ بقول چچا کے۔ بیان سے قانون اس کی ہر بات۔ عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا۔"

وہ ہنسی۔ "چلو اب زیادہ باتیں مت بناؤ۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" اور یہ بات کہتے کہتے اس کے رخساروں کا رنگ گلابی ہوا تو میں نے احمقوں کی طرح دیکھنا رہا۔ آخر اس اچھی بھلی ذہین، باشعور، سنجیدہ اور پرکشش عورت کو کیا ہو رہا ہے؟ یہ آغاز شباب کا پہلا عشق کرنے والی لڑکی کی طرح میرے الفاظ کو غلط معانی کیوں پہنانے لگی ہے اور باتوں کا وہ مطلب کیوں نکالنے لگی ہے جو میرے ذہن میں نہیں مگر اس کے دل میں ہے۔ کیا عورت واقعی عورت

www.paksociety.com

رہتی ہے۔ جذباتی طور پر آتش فشاں جو برسوں اندر ہی اندر سلگتا رہتا ہے اور کسی روز اچانک پھٹ پڑتا ہے۔ وہ بھی بہتری کے تمام بلند بانگ دعووں کے باوجود جذباتی طور پر بے حد کمزور۔ دل کے معاملات میں عقل کو بالائے طاق رکھ دینے والی۔ محبت دلنواز اور رنگ روپ کی دہکتی آگ جس کی تپش قریب آنے والوں کی نظروں کو خیرہ کر دیتی اور بے خطر اس آگ میں بھی کود پڑنے پر مجبور کر دیتے۔ وہ وکیل ہو، ڈاکٹر، انجینئر، جنرل یا خاکروب۔ خود سپردگی کے سیل بے عناں میں فقط عورت ہے۔ اس کے ساتھ واپس لاتی ہوئے ہوئے میں نے سوچا کہ اگر ایسا ہے تو کیا غلط ہے۔ جنس تو ایک حیوانی جذبہ ہے۔ آبروریزی کے واقعات کی خبریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس جذبے کی درندگی سے مغلوب اور عقل و ہوش سے بیگانہ ہو جانے والے وہ سب کر گزرتے ہیں جس پر انسانیت کا سر شرم سے جھک جائے۔ مگر جنسی تشدد کے واقعات میں عورت کی ذات کہاں ملوث ہوتی ہے۔ اسے تو اپنے جذبات کی سرکشی پر پورا اختیار حاصل ہے مگر اس کے باوجود وہ مجبور بھی ہے۔ جیرالڈ نے کہا میاں سکندر اعظم۔ ہوش کے ناخن لو۔ یہ تم کیا طور کر یوسف ثانی اور زبردست لیڈی کلر سمجھ بیٹھے ہو۔ ہو سکتا ہے سب تمہاری اپنی عقل و فہم کا پھیر ہو۔ بھلا رابعہ تم پر کیوں مرنے لگی۔ اس پر مرنے والے کیا کم ہوں گے۔

تجدید تعلق کو جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ پھر مجھے یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ وہ برسوں سے جس یوسف گم گشتہ کی بازدید کے لیے چشم براہ تھی وہ میں ہی ہوں۔ میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں، وہ تبسم وہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو!

ان ملاقات کے بعد میری عقل جو گھاس چرنے چلی گئی تھی لوٹ آئی۔ میں نے رابعہ سے کہا۔ "تمہاری امی نظر نہیں آ رہی ہیں؟"

"ان کو کبھی کبھی ڈپریشن کا دورہ پڑتا ہے۔" وہ بولی۔ "قنوطیت۔ مایوسی۔ بے زاری اور مکمل عدم دلچسپی۔ یہ سب کیفیات مل کر بھی اس ایک لفظ کا متبادل فراہم نہیں کرتیں۔ ڈپریشن۔"

"کب سے ہے یہ شکایت؟" میں نے رسماً پوچھا۔ "اس کی وجوہات تو صرف نفسیاتی ہوتی ہیں۔"

"ہاں۔ وہ نفسیاتی ہی ہیں۔" وہ بولی۔ "اور یہ شکایت انہیں اس وقت سے ہے جب مجھے …" اس نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی۔

"وہ پوری بات کرتے ہوئے تم جس سے ڈرتی ہو۔" میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔ "مجھ سے یا اپنے آپ سے؟ ان کے مرض کی وجہ کیوں ہو؟"

"اس لیے کہ باجماعت اردو کے مطابق ابھی کمال کی وجہ کے ہاتھ پیلے نہیں ہوئے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"اگر مرض یہ ہے تو علاج کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ قصور پھر کس کا ہے؟"

"ہاں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ قصور پھر کس کا ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔ "یہ سوال اکثر عدالت میں اٹھتا ہے۔ عدالت میں ہر قسم کے کیس آتے ہیں۔ اغوا اور آبروریزی کے بھی۔ اور ان سب کی پیروی کرتے ہوئے میں صرف وکیل رہ جاتی ہوں۔ بڑی بے شرمی سے میں اپنے موکل کا دفاع کرتی ہوں اور میرے دلائل ان کے مردہ ذہنوں کے … لیتے ہیں اور بڑی بے حیائی سے ہنستے ہیں اور ایک وقت کو فحش اشارے کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر اور وکیل کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ حقائق کو بے لباس کر کے تلاش کرنا پڑتا ہے اور دوسروں کو بھی دکھانا پڑتا ہے۔ تم نے جو سوال کیا ہے اس میں اپنی موکل بھی خود ہوں اور اپنا کیس تمہاری عدالت میں ایک وکیل کی طرح پیش کروں تو مجھے کہنا ہوگا کہ حضور والا۔ میں ایک بہت فرماں بردار۔ نیک اور مشرقی ماحول کی پروردہ لڑکی تھی جس کی شادی میرے والدین نے روایتی طور پر مجھ سے پوچھے بغیر طے کر دی تھی اور میں نے ان کے فیصلے کو بلا چون و چرا قبول کیا تھا۔ حالانکہ اس وقت بھی میں وکیل تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنے ہونے والے شوہر کو دیکھا تک نہ تھا۔ منگنی کے ایک سال بعد نکاح ہوا۔ پھر دوسرا سال گزر گیا۔ پھر تیسرا… پھر چوتھا… رخصتی کی نوبت نہ آئی۔ پانچویں سال میں اس نے مجھے طلاق بھیج دی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "کیوں۔؟ اس کا دماغ خراب تھا؟"

"نہیں مائی لارڈ۔ وہ بہت ذہین سی ایس پی افسر تھا۔ اس نے بعد میں بہت ترقی کی۔ اس کا دماغ خراب کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ اسی سپاٹ اور تند لہجے میں بولتی گئی۔ "مدعا علیہ کے اس انداز کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں۔ اسے یہ … یعنی میری موکلہ پسند نہ تھی۔ اسے میری موکلہ کے کردار کے بارے میں کچھ غلط اطلاعات فراہم کی گئیں۔ بدخواہوں نے … کے ذریعے علیحدگی کرا دی۔ مدعا علیہ کسی اور سے عقد کرنا خواہش مند تھا۔"

"لیکن ان میں سے ایک وجہ صحیح ہوگی۔" میں نے کہا۔

"صحیح وجہ یہ ہے جناب والا کہ مدعا علیہ شادی کے قابل ہی نہیں تھا۔" اس نے فضا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ نااہلی کی اطلاع پا کر اس نے عقد ثانی بھی نہیں کیا ہے۔ ماں باپ کے دباؤ میں آ کے اس نے یہ شادی کی تھی اور اس وقت وہ ذہنی طور پر اتنا بالغ نہیں تھا کہ اس حقیقت کا اعتراف کر سکے۔ وہ رخصتی کو ٹالتا رہا یہاں تک کہ ماں باپ اسی حسرت کو دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پھر اس نے میری موکلہ کو طلاق دے دی۔ بے شک وہ شریف آدمی تھا کہ اس نے جیتے جی مجھے آزاد کر دیا۔" اس نے اپنا لہجہ بدل لیا۔ "اس نے کہا کہ ابھی چند روز پہلے میں نے اسے فون کیا تھا۔ تمہاری ضمانت کے سلسلے میں مجھے اس کے اثر و رسوخ سے کام لینا تھا۔ اس نے یہ کام کر دیا۔"

میں اس انکشاف پر ہکا بکا بیٹھا رہا۔ "اس طلاق کے بعد…؟"

"اس کے بعد میں شادی کے نام سے متنفر ہو گئی۔" وہ بولی۔ "یہ ایک فطری ردعمل تھا۔ میرے لیے کئی پیغام آئے جو میں نے مسترد کر دیے اور اب بھی میں کسی رشتے کو نامنظور کرتی ہوں تو امی کو ڈپریشن کا دورہ پڑ جاتا ہے۔"

"کیا آج بھی تم نے کوئی رشتہ نامنظور کیا ہے؟" میں نے ہمت سے کام لے کر پوچھ لیا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "ماں نے کہا تھا محسن اچھا لڑکا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"محسن واقعی اچھا لڑکا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ بہترین شریک حیات بن سکتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مگر اس نے کہا میری تو نسبت طے ہو چکی ہے۔" وہ تلخی سے ہنسی۔ "اس نے جھوٹ بولا اور وہاں سے بھاگ گیا۔ تو قصور کس کا ہے؟"

میں ایک دم گھبرا گیا۔ "رابعہ۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "میں اب چلتا ہوں۔" اور وہاں سے بھاگ آیا۔ … نے بہت احمقانہ سوال کیا تھا کہ قصور کس کا ہے۔ قصور کبھی کسی کا نہیں ہوتا۔ تقدیر کا بھی نہیں کیونکہ جو کچھ تقدیر میں ہے وہ ناگزیر ہے۔ … رابعہ۔ اس کی ماں۔ اس کا سابق شوہر۔ محسن … سب اپنی اپنی مجبوریوں کے باعث قصور وار ہیں۔ کیا میں خود رابعہ کی ماں کا ڈپریشن ختم نہیں کر سکتا تھا؟

لیکن میرے پاس تو ویسے جذباتی وابستگی کا عذر تھا۔

محسن کے پاس عذر تھا کہ بیشتر وہ اپنے والدین خصوصاً اپنی ڈکٹیٹرشپ ماں کی رضامندی کے بغیر کوئی فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں اور ان کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ وہ رابعہ کی عمر کو اور اس کے پیشے کو ملحوظ رکھ کر قبول کر لیتیں تو اس لڑکی کو کبھی قبول نہ کرتیں جسے شوہر نے گھر بیٹھے بیٹھے طلاق بھیج دیا ہو خواہ یہ بچی بھی ان کے لیے قابل قبول نہ ہوتا کیونکہ اس معاشرے میں قصوروار صرف عورت ہے۔ رابعہ ہی میں کوئی نہ کوئی ایسی خامی اور بے حیا اب اپنے منہ کی سیاہی اس کی صورت پر ملتی پھرتی ہے۔ سارے زمانے کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے۔ ان کا حتمی فیصلہ ہوتا۔ محسن نے رابعہ کو تقریباً پسند کیا تھا مگر … حقیقت نے اسے فرار پر مجبور کر دیا۔ مجھے رابعہ پر ترس آیا۔

ترس کھانے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔ اس نے متعدد مقدمات میں دوسروں کی مظلومیت کے مقدمات جیتے ہوں گے تاکہ ان کو ان کا حق دلوایا ہوگا اور ناانصافی کا مرتکب ہونے والے کو سزا دلوائی ہوگی مگر خود اپنے حق کی خاطر وہ کسی عدالت میں اپنا مقدمہ نہ لے جا سکی۔ اپنی زندگی کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر کسی کو فریق بنا کے کٹہرے میں نہ لا سکی۔ مجھے اس کی بزدلانہ بے بسی پر سخت جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ کیوں خاموش رہی۔ معاشرتی اقدار کی ان زنجیروں کو توڑ کے اس سی ایس پی افسر کا گریبان کیوں نہیں تھاما اور اسے کھینچ کر عدالت تک کیوں نہیں لے گئی؟ اس نے پانچ سال کے انتظار کے کرب کا ہرجانہ کیوں نہیں وصول کیا؟ اس کو دنیا کے سامنے ننگا کیوں نہیں کیا جس نے اپنی عزت پر پڑا پردہ ڈالے رکھنے کے لیے منگنی اور نکاح کا ڈھونگ رچایا۔ کیا اور پانچ سال لوگوں کی امیدوں سے ارمانوں سے اور جذبات سے کھیلتا رہا۔ لوگ جن میں اس کے اپنے ماں باپ رابعہ اور اس کی ماں سب شامل تھے۔ شاید رابعہ اپنی ماں کی وجہ سے مجبور تھی ورنہ کسی گناہ کے بغیر پانچ سال کی نظربندی کے خلاف آواز ضرور اٹھاتی۔ یہی تو مشرقی عورت کا المیہ ہے۔ ہوتی امریکی معاشرے کی کوئی لڑکی تو اسے شوٹ کر دیتی اور معاشرہ اس فعل کے جواز کو تسلیم کرتا۔ رابعہ کہتی ہے کہ وہ شریف آدمی ہے۔ کون شریف ہے اور کون نہیں ہے۔ اگر اس کی سند دینے والوں کے معیار ہی غلط ہیں تو پھر خود وہ غلطی کیوں کرتی ہے۔ میں نے رابعہ کو بہت سی مروجہ گالیاں دیں۔ احمق۔ عاقبت نااندیش۔ بزدل۔ عورت ذات ناقص العقل

www.paksociety.com

وغیرہ وغیرہ۔

جب میں نے ریلوے ہوسٹل کے پاس ڈاکٹر کے پرائیویٹ کلینک میں قدم رکھا جس نے آخری ایام میں میرے والد کا علاج کیا تھا تو شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔ اس کا یہ کلینک کوٹھی نما ہوگی ایک بغلی سڑک پر ایسے ہی گھر کے ایک کمرے میں واقع تھا۔ ابھی مریضوں کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا یا اس کی پریکٹس ہی کم چلتی تھی کہ کمرے میں صرف ایک عورت اپنے بچے کو دکھا رہی تھی۔ جب وہ فارغ ہوا تو اس نے مجھے دوسرا مریض سمجھ کے اپنے قریب پڑے ہوئے اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسٹول پر بیٹھ کے میں نے اپنا تعارف کرایا۔

"اچھا اچھا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "تم پر تو قتل کا ایک مقدمہ بھی چل رہا ہے۔ میں نے اخبار میں دیکھا تھا۔ مگر تم نے یہ کیا احمقانہ بیان دیا ہے کہ وزیر خان کو قتل کیا گیا تھا اور ان کی موت طبعی نہیں تھی۔"

"ڈاکٹر صاحب۔" میں نے سکون سے کہا۔ "عدالت کا فیصلہ ہونے سے قبل کسی مقدمے پر ایسا تبصرہ توہین عدالت کے زمرے میں آتا ہے۔ میں نے لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم کرانے کے لیے درخواست دے دی ہے۔ ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ میرا خیال احمقانہ تھا یا نہیں۔" اس کے جارحانہ رویے نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں بھی شرافت کو بالائے طاق رکھ دوں۔

"خیر چھوڑو اس بات کو۔ یہاں کیوں آئے ہو؟" وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے یہ پوچھنا تھا کہ کیا میرے والد وزیر خان مرحوم کو گٹھیا کے سوا بھی کوئی عارضہ لاحق تھا!" میں نے کہا۔

"اگر تھا تو اس کا علاج میں نہیں کر رہا تھا۔" وہ بولا۔

"آپ کے خیال میں گٹھیا سے کسی کا ہارٹ فیل ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہارٹ فیل کسی کا بھی ہو سکتا ہے۔ گٹھیا اس کی کوئی شرط نہیں۔" اس نے عمداً اصل بات کے اعتراف سے گریز کیا۔

"مجھے ان ایک ہزار ایک اسباب سے سروکار نہیں۔" میں نے سخت لہجہ اختیار کیا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ کیا گٹھیا کے باعث کسی کی حرکت قلب بند ہو سکتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے یہ بیماری بھی ابتدائی مرحلے میں تھی اور وہ خود چل کے آپ کے پاس آتے تھے۔"

"میرے پاس نہیں۔ ریلوے کے ہسپتال۔" وہ طنز سے بولا۔ "تمہارے سوال کا جواب ہے کہ نہیں۔ گٹھیا ہارٹ فیل ہونے کا سبب نہیں بن سکتی۔"

"ان کے انتقال کے بعد آپ ہی ان کو دیکھنے گئے تھے۔ آپ کے خیال میں ان کی موت کا سبب کیا تھا؟"

"میں نے کوئی رائے نہیں دی تھی۔ موت کو دو گھنٹے ہو چکے تھے۔"

"قبرستان میں یعنی لاہور میونسپل کارپوریشن کے دفتر پیدائش و اموات کے ریکارڈ پر موت کا سبب ہارٹ فیل درج ہے۔"

"وہ میں نے نہیں لکھی۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔"

"اس بات کے گواہ موجود ہیں۔" میں نے اسے بتایا۔ "ہو سکتا ہے تمہیں عدالت میں وضاحت کرنی پڑے۔"

"جب وقت آئے گا تو میں عدالت کو جواب دوں گا۔" وہ چراغ پا ہو کے بولا۔ "تم کون ہوتے ہو مجھ سے پوچھنے والے۔ گیٹ آؤٹ۔" میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ "میں مرنے والے کا وارث ہوں۔ اس کا بیٹا۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن چھڑالی۔ "تم پاگل ہو۔ او بدمعاش۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا اور ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں کہ میرے کلینک میں آ کے غنڈہ گردی کی۔"

میں نے بات اور کے ٹیلی فون کا تار توڑ دیا۔ "میرے یہاں سے چلے جانے کے بعد اس تار کو جوڑ کے پولیس سے کہنا۔ خود کشی کرکے کہہ دینا کہ وزیر خان کا بیٹا قتل کر گیا۔ یہاں سے نکل جانے کے بعد میں بالکل محفوظ ہوں۔ ہائی کورٹ، سپریم کورٹ کے دو بہت سینئر وکیل گواہی دیں گے کہ میں ان کے پاس بیٹھا اپنے کیس کی بات کر رہا تھا۔ ایس ایم ظفر، خالد رضوی بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ تھا اور وہ میرے وکیل کے دوست ہیں جو وزارت خارجہ کے ڈپٹی سیکرٹری اور میرے ضامن ہیں۔ اس کے علاوہ میں ان کے فلیٹ کے سوٹ نمبر چار میں موجود ہوں۔" میں نے [illegible] کا نام غلط بتایا اور اسے چھوڑ دیا۔ "اگر تمہارے حلق سے آواز نکلی تو بات سمجھ لو۔ میں جوڈو جانتا ہوں۔ ایک معمولی سا ہاتھ گھماؤں گا اور تم آدھے گھنٹے کے لیے جام ہو جاؤ گے۔ اس لیے اب میں چلتا ہوں۔ پھر کورٹ میں ملیں گے۔"

میرا خیال ہے وہ واقعی ڈر گیا تھا۔ چنانچہ وہ مجھے جاتے دیکھ کر بھی نہیں بولا اور میرے رخصت ہو جانے کے بعد بھی اس نے چیخ پکار نہیں مچائی۔ مدد تک مجھے واقعی جرتے بغل میں [illegible]

پڑے اور شاید وہاں میری موجودگی کے عینی گواہ پیدا ہو جاتے۔ وہ بہت خبیث آدمی تھا اور اسی سلوک کا مستحق تھا۔ میں نے خطرناک علاقے سے نکل کے طے کیا اور کراؤن سینما کے راستے رابعہ کی کوٹھی کے سامنے سے گزر کر پیدل چلتا ہوا ایمبیسیڈر ہوٹل پہنچ گیا۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بہت سے لوگ موجود تھے مگر مجھے ان میں محسن کا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ وہ اوپر کمرے میں بھی موجود نہیں تھا اور کاؤنٹر کلرک نے بورڈ پر نگاہ ڈال کے مجھے مطلع کیا کہ وہ چابی چھوڑ کے کہیں گئے ہیں۔ میں نے بھی انتظار کا فیصلہ کیا اور ڈائننگ ہال کے ایسے حصے میں جا بیٹھا جہاں سے میں باہر بھی دیکھ سکتا تھا اور دروازے سے اندر آنے والوں کو بھی۔ دن بھر کی مشقت کا حاصل جسمانی تھکن اور کوفت کے سوا کچھ نہ تھا۔ چراغ دین نے کوئی کام کی بات نہیں بتائی تھی۔ محسن کو وہ خط نہیں مل سکا تھا جو گلاب چند کے نام پر آنے والا تھا۔ رابعہ کی داستان حیات کا المیہ مجھے بھی ڈپریشن میں مبتلا کر رہا تھا اور اب اس ڈاکٹر نے عملاً انکار کر دیا تھا کہ وزیر خان نام کے کسی مریض کو اس نے موت سے پہلے اور وفات کے بعد بھی دیکھا ہی نہیں۔ اپنا غم تیرا غم جہان کا غم۔ ہم بھی سمجھتے ہیں زاد راہ عدم کا اپنی کیفیت کے سبب حال یہ شعر یاد کرکے میں نے سوچا کہ منزل عدم کی طرف سفر جدا ہونے سے مسافت [illegible] نہیں ہوتی۔ آنے والے دن سے کیا ملے گا۔ رنج یا راحت۔ دکھ سکھ — امید و ناامیدی۔ کامیابی یا ناکامی۔ یہ آج کیسے طے کیا جا سکتا ہے۔ وہ خط پوسٹ ہوا تھا یا نہیں۔ پوسٹ ہوا تھا تو کل کیسے ملے گا۔ نہیں ملا تو جاننے والوں میں الجھن پیدا کرنے والے سوالات کا کوئی جواب فراہم کرے گا یا نئے سوالوں کو جنم دے گا۔ رابعہ جو خوابوں کے طلسم اور خواہشوں کے فریب میں مبتلا ہے، اس حقیقت کو تسلیم کرے گی کہ ڈپریشن کا شکار اس کی ماں نہیں وہ خود ہے اور آخر کب تک وہ سوالوں سے بچنے کے لیے گریز [illegible] کرتی رہے گی؟ سلامت شاہ کی عدم موجودگی میں [illegible] شاید اب تک صندوق سے نکال کے [illegible] گئی ہوگی۔ میں کیسے ثابت کروں گا کہ وزیر خان کا قتل کرنے والا اور موت کے بعد ان کی موت کے غلط اسباب لکھنے والا ڈاکٹر کون تھا۔ اور یہ ثبوت کیسے فراہم کروں گا کہ جس رات میر ترابت علی کا قتل ہوا میں سلامت شاہ کے ساتھ تھا [illegible] یہ سوال وحشت کی تنہائی میں [illegible] والے غول بیابانی کی طرح تھے جو فرار [illegible] — لاشعور کے نہاں خانے

سے نمودار ہو جاتے تھے اور ان کا سلسلہ سرطان کے خلیوں کی طرح پھیلتا تھا۔ ایک سے دو۔ دو سے چار۔ چار سے آٹھ۔ سولہ۔ بتیس۔ پھر چونسٹھ۔ میرے لیے امان کہیں نہ تھی اور اپنے دفاع کی سب سے مؤثر صورت یہ تھی کہ خود کو مصروفیت کے حصار سے باہر نہ آنے دوں۔ بقول انگریز کے خالی دماغ شیطان کی ورکشاپ بن جاتا ہے — تو دماغ کو حتی الامکان کام سے لگائے رکھوں۔ میں نے مینو کا یوں مطالعہ شروع کیا جیسے اول تا آخر حفظ کرنے کا ارادہ ہے اور جب مشرق و مغرب کے طعام کی چٹپٹی کھانوں کی ترجیح کا فیصلہ ہوا تو دس منٹ گزر چکے تھے۔ آرڈر کی تعمیل تک میں نے صورتوں کا مطالعہ کیا۔ ہر چہرہ ایک کتاب تھا۔ کچھ کتابی چہرے تھے۔ کچھ آفتابی۔ چہرہ دائرہ میں اور رنگ لب و رخسار میں لندن پیرس اور ٹوکیو کے میک اپ کا طلسم تھا۔ سولہ سنگھار جب محاورے تھے تو مبالغہ سمجھے جاتے تھے۔ اب ہیلن کرٹس۔ الزبتھ آرڈن۔ میکس فیکٹر اور دیگر سامان آرائش بنانے والوں کی مصنوعات کی فہرست حیران کرتی ہے۔ پیر کی چھوٹی انگلی سے لے کر زلفوں تک سنگھار ہے سولہ سو سنگھار۔ سولہ سو سنگھار مسلسل سو انداز۔ ایک بار کسی کیٹلاگ کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ کیا یہ سب اشیا ایک عورت استعمال کر سکتی ہے اور پھر کسی تقریب میں شرکت کے لیے چوبیس گھنٹے میں تیار ہو سکتی ہے۔ ایسا ہی احمقانہ خیال مجھے کھانے کا اور محسن کا انتظار کرتے ہوئے پھر آیا۔ کاش میرے لیے کسی غیبی قوت کے ذریعے ہر چہرہ پڑھنا ممکن ہوتا اور میں دیکھ سکتا کہ ہر شوخ ادا کے پیچھے کتنا کرب ہے اور ہر مسکراہٹ کے پیالے میں نفرت کا کتنا زہر ہے اور مسرت میں ڈوبی آنکھوں میں ستارہ سحری کی طرح جھلملاتی ہے کتنے دکھوں کا نوحہ ہے۔ باوردی مہذب ویٹر بڑی مستعدی سے ہر ٹیبل پر سے برتن ہٹا رہے تھے اور بیرا آرڈر لیے سر کئے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ کوئی ان کی صورت نہیں دیکھتا تھا۔ ہر ٹیبل کا ایک نمبر تھا اور یہ نمبر پلاسٹک کے رنگین خوبصورت ٹکڑوں سے بنے چھوٹے سے اسٹینڈ پر سفید حروف میں نمایاں تھے۔ بارہ نمبر ٹیبل پر کون ہے؟ — ویٹر۔ ویٹر۔ ادھر بیس نمبر کا آرڈر کس نے لیا تھا؟ مثلاً مجھے یاد آیا کہ مجھے بھی آرڈر دیئے ہوئے دس منٹ ہو چکے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ معلوم نہیں کون تھا وہ — آخر یہ سب بیرے وردی میں ایک جیسے کیوں ہو گئے ہیں۔ لمبا سا جیسا سادہ جیسا ہے کہ بہت لمبا ہے۔ بال لمبے ہیں اور لمبی لمبی مونچھیں ہیں۔ نگاہ مینو پر رہتی ہے۔ ایک چکن کارن سوپ۔ ایک چکن۔ نہیں فرائیڈ مٹن اینڈ رائس۔ ابھی آگر میں اس

www.paksociety.com

سے پوچھا کہ میاں ذرا اپنا نام تو بتایئے کہ پھر بلانا ہو تو کیسے پکاروں۔ تو ویٹر کتنے افسوس سے سر ہلا کر لیے اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں کیسے کیسے کباڑی لوگ آنے لگے ہیں۔ ایک نام چنیدہ۔ کیا آواز لگانے کا خیال ہے کہ جیتا اسلم۔ ارے بھئی جیو دھرمی اسلم صاحب۔ وہ میں نے کچھ فرمائش کی تھی۔ ابھی آرڈر دیا تھا آپ کو۔ کیا بھول گئے! تو اب وہ بھول بھی گیا تھا تو میرے لیے میز پر کچھ بجانے اور "ویٹر ویٹر" پکارنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ لیکن اسی وقت ویٹر نے میز پر کھانا لگانا شروع کیا اور میں نے چکن تکوں کو چھیلتے ہوئے ویٹر سے تاخیر کی شکایت کرنے کی بجائے کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو سے مجبور ہو کے چھری کانٹا اٹھایا اور کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانا بہت اچھا تھا پھر بھی میری نظر گردوپیش پر رہی۔ میں نے شیشوں سے باہر بھی نہیں دیکھا اور دروازے پر بھی نگاہ نہیں رکھی جس سے مجھے محسن کے آنے کا علم ہوتا۔ جب میں کھانے سے فارغ ہوا تو ساڑھے نو بج چکے تھے۔ تشویش کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ محسن میرے خیال کے مطابق ایس ایس پی خان رضوی صاحب سے ملنے گیا تھا جو اس کے ڈیڈی کے دوست تھے۔ یقیناً ممکن ہے انھوں نے کام کی بات سننے کے بعد محسن کو کھانے پر روک لیا ہو۔ دس ساڑھے دس بجے تک اس کا انتظار کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اطمینان سے بیٹھ کے سگریٹ سلگائی اور ویٹر کو کافی کے لیے کہا۔ ہال میں اب پہلے جتنے لوگ نہیں تھے پھر بھی اس کے باوجود آدھے سے زیادہ ہال بھرا ہوا تھا۔ یہ سب سوسائٹی میں اعلیٰ مقام رکھنے والے شریف لوگ تھے جو بڑی اور کاروباری قسم کی گفتگو میں مصروف تھے اور کسی کو کسی دوسرے کے معاملات سے سروکار نہ تھا میرے جیسے تو ہونے کے برابر تھے جو اکیلے بیٹھے تھے چنانچہ دوسروں کو دیکھ رہے تھے دوسروں کی سن رہے تھے اور دوسروں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

دس منٹ انتظار کرنے کے بعد میں نے ویٹر کو یاد دلایا کہ میں نے کافی کے لیے کہا تھا۔ اس نے شائستگی سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ دوسری ٹیبل کا ویٹر ہے تاہم وہ چوبیس نمبر کو بتائے گا۔ مزید دس منٹ کے بعد میں نے کاؤنٹر کا رخ کیا۔ آخر یہ کیا بدنظمی ہے بیس منٹ پہلے میں نے کافی کا آرڈر دیا تھا۔ کیا کافی برازیل سے امپورٹ کی جائے گی؟ میں نے منیجر کے شفاف شیشوں والے کیبن میں جا کے کہا اور ہاتھ اٹھا کے انگلی سے اس میز کی طرف اشارہ کیا جہاں میں بیٹھا تھا۔ لیکن پلٹ کر دیکھتے ہی مجھے کافی میز پر رکھی ہوئی نظر آئی۔ میں نے تھوڑا سا خفیف ہو کے کہا کہ غالباً [illegible] تھا کہ میں شکایت کرنے اٹھوں اور وہ کافی لے کر [illegible] نے میری مسکراہٹ کے جواب میں مسکرا کے [illegible] کہا کہ مجھے زحمت ہوئی۔ واپس لوٹتے ہوئے میں [illegible] کاؤنٹر کے پیچھے بورڈ والے اس بورڈ پر نگاہ ڈالی [illegible] خانوں میں کچھ لوگوں نے اپنے کارڈ لگا دیے تھے تاکہ [illegible] کو علم نہ ہو تو ہو جائے کہ فلاں صاحب کس کمرے میں [illegible] ہیں۔ وہیں خالی کمروں کی چابیاں لٹک رہی تھیں [illegible] چابیاں بھی جو مہمان جاتے ہوئے چھوڑ گئے تھے۔ محسن [illegible] کی چابی اب غائب تھی جس کا مطلب یہی نکالا [illegible] تھا کہ وہ آیا اور ڈائننگ ہال پر نگاہ ڈالے بغیر [illegible] چلا گیا۔ اور کیا نا تو وہ کیسے آیا ہو گا جیسا [illegible] لیتا چھت کو ملاحظہ کر رہا ہو گا اور میری طرح انتظار [illegible] ہو گا۔ سبحان اللہ۔ کیا بے خبری ہے کہ ایک چھت [illegible] موجود ہے دو مسلم چھت کے نیچے اور دونوں ایک دوسرے [illegible] باہر سے واپسی کے منتظر ہیں۔ میں نے خاصی عجلت [illegible] کافی ختم کی جو عجیب بد ذائقہ جوشاندے جیسا [illegible] یہ [illegible] لیے ہوٹل کی ہدایات کی صریح خلاف ورزی [illegible] میں نے منیجر کو اور ساری انتظامیہ کو معاف کر دیا [illegible] خطا کا پتلا ہے۔ کیا معلوم کافی برازیل کی بجائے [illegible] منگوائی گئی ہو اور بنانے والے نے عشق یا کسی ذہنی [illegible] میں مبتلا ہو کر اس میں سفید مرد بھی ڈال دیا ہو [illegible] میں نے چلتے کے کہا "بل لاؤ" اور چونکہ ویٹر کا [illegible] کہیں وجود نہ تھا اس لیے [illegible] چھوڑے۔ کافی ٹھنڈی تھی۔ خیر ٹھنڈے [illegible] کافی اور کیا ہو گی۔ یہ خالی علامتی کی کافی تھی۔ میں نے [illegible] کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے ایک [illegible] جس کا موضوع تھا ویٹر نمبر چوبیس جو چوبیس منٹ [illegible] کافی اس وقت لایا تھا جب میں حکام بالا سے [illegible] تھا۔ پھر جو کافی وہ لایا اگر وہ واقعی برازیل کی تھی [illegible] سے چینی کے اور برازیل کے تعلقات پر برا اثر پڑ سکتا [illegible] انقلاب میں بل کے لیے گلا پھاڑ رہا ہوں [illegible] ابھی تک لبیک نہیں کہا۔ وغیرہ وغیرہ۔ کاؤنٹر کلرک [illegible] رہا تھا شائستگی سے معذرت چاہی اور کہا کہ بل [illegible] کے کمرے میں بھجوا دیا جائے گا۔ انشاء اللہ آئندہ [illegible]

محسن کے کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن مقفل [illegible] اور اندر لائٹ نظر آ رہی تھی۔ میں نے قفل کے کھلنے [illegible]

کھلا پا اور دروازہ کسی تردد کے بغیر وا ہو گیا۔ "مسٹر محسن رضا!" میں نے جوتوں سمیت بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا "تو نے رابطہ کا رشتہ منقطع کر دیا۔ الطاف" محسن رضا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ باتھ روم میں تھا اور واش بیسن میں ہاتھ یا منہ دھو رہا تھا۔ "قطع نظر اس بات کے کہ بالعموم بہت اچھی لڑکی ہے بہت اچھی وکیل بھی ہے اور بڑا انکار کرنا بہت سے قانونی مسائل پیدا کر سکتا ہے مثلاً یہ ہتک عزت کا کیس ہے — کاروباری کا کیس بن سکتا ہے کہ تو نے اسے ورغلا کے شادی کا جھانسا دیا اور بھاگ گیا۔ وہ ذہنی اذیت کا ہرجانہ طلب کر سکتی ہے۔ اور چاہے تو دیگر نا شائستہ الزامات کے تحت تم پر وہ مقدمات قائم کر سکتی ہے جو تم پر بھی نہیں۔ پھر ہم سب ساتھ ہوں گے۔ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ آخر یہ کیا چیز ہے کہ میں مسلسل بکواس کر رہا ہوں اور اندر مسلسل پانی گر رہا ہے مگر محسن باہر آ کے خاموشی کا جواب آتا ہے۔" میں نے اٹھ کے غسل خانے کا رخ کیا۔ ابھی میں باتھ روم کی دہلیز پر ہی تھا کہ کسی نے مجھے پیچھے دھکا دیا اور میں روم کے اندر گیا تو پیچھے کھٹ سے دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے خود کو تصادم سے بچانے کی خاطر زیادہ سے زیادہ بریک لگائے مگر غسل خانے کا فرش گیلا اور پھسلواں تھا۔ میں پھسلتا ہوا گیا اور دیوار پر منطبق ہو گیا۔ اسی وقت مجھے اپنے جسم میں پیچھے کی طرف کولہے کے پاس چبھن سی محسوس ہوئی میں نے سنبھلنے کے لیے ہاتھ پھیلائے اور تیزی کو پکڑ لیا۔ واش بیسن کے اوپر سے پیشانی کو سہلاتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا تو باتھ روم میں محسن کی جگہ مجھے ایک اجنبی چہرہ نظر آیا۔ وہ تقریباً میرا ہم عمر آدمی تھا جو صورت سے ہی بانس لگتا تھا اس کی صحت بھی مجھ سے بہت بہتر تھی اور وہ یقیناً پھرتیلا بھی تھا۔ جیسے ہی میں دیوار سے ٹکرا کے واپس ہوا تھا اس نے انجکشن کی سوئی آگے کر دی تھی اور سوئی خود ہی گوشت میں اتر گئی تھی میرے پلٹ کر دیکھنے تک اس نے انجکشن کا زہر میرے جسم میں اتار دیا تھا۔ بات فوراً میری سمجھ میں آ گئی۔ اس کا ایک ساتھی کمرے میں موجود تھا اور شاید کسی پردے کے پیچھے چھپا ہوا تھا اس نے دبے پاؤں پیچھے سے [illegible] دی تھی دوسرا باتھ روم کے اندر مجھے دروازے کے پیچھے انجکشن [illegible] کھڑا انتظار میں تھا کہ پانی گرنے کی آواز اور محسن کا جواب نہ ملنے پر میں باتھ روم میں جھانکنے اندر قدم رکھوں [illegible] ہی وہ اپنا کام کر گزرے۔ ان دونوں کے [illegible] میں داخل ہونے کی ایک صورت یہ تھی کہ وہ چابی لے [illegible] سے کھڑکی کا شیشہ توڑ کے کمرے میں کود جاتے مگر اس میں پکڑے جانے کے خطرات بھی تھے چنانچہ زیادہ جرأت اور چالاکی سے کام لے کر انھوں نے ریسپشن میں کاؤنٹر کلرک سے چابیاں لے لی تھیں جو یوں بھی محسن رضا کو کہاں شناخت کر سکتا تھا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ محسن رضا کے پیچھے پیچھے کمرے میں آگئے اور اسے کھٹکھٹا کے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ شکار نے نکلنے کا مطلب اسے بے ہوش یا بے بس کر کے بیڈ کے نیچے یا الماری میں ڈالنا بھی ہو سکتا تھا اور اس کو ختم کرنا بھی۔

یہ سب خیالات چند سیکنڈ کی پیداوار تھے۔ جیسے بہت سی جزئیات پر مشتمل ایک منظر لمحہ بھر کے لیے ٹیلی ویژن کے اسکرین پر دکھائی دیتا اور غائب ہو جاتا ہے۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ مرنے سے پہلے میری حیوانی جبلت نے مغلوب کر لیا۔ مجھے احساس ہوا کہ دشمن بالآخر اپنی چالاکی سے مجھے اسیر کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ زہر میرے وجود میں خون کی گردش کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ میری زندگی کے صرف چند منٹ باقی رہ گئے ہیں اور میں کسی کو مدد کے لیے بھی نہیں پکار سکتا کیونکہ دروازہ باہر سے بند ہے میرے چلانے کی آواز دوسرے کمروں کے مکینوں تک نہیں پہنچے گی اور کون جانے ساتھ والے کمرے خالی ہیں کہ مکین باہر گئے ہوئے ہیں۔ دروازہ توڑ کے باہر نکلنا اس سے بھی زیادہ مشکل کام تھا اور میرے لیے چند منٹ کی مہلت بہرحال اتنی کم تھی کہ نہ میں خود اپنی کوئی مدد کر سکتا تھا اور نہ کوئی دوسرا۔ میں نے اس وحشی درندے کی طرح حملہ کیا جس کے لیے فرار کے تمام راستے مسدود ہوں مگر شکاری سامنے ہو۔ شکاری کے لبوں پر ظالمانہ مسکراہٹ تھی مگر وہ مقابلے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ اس نے بڑی صفائی سے خود کو بچا لیا اور میں اپنے ہی زور میں باتھ ٹب کے اندر جا گرا جو لبالب بھرا ہوا تھا اور اسی میں پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی جس پر مجھے گمان گزرا تھا کہ محسن منہ ہاتھ دھو رہا ہے۔

شکاری نے قہقہہ لگایا۔ "اگر ٹب خالی ہوتا تو تمہارا سر پھٹ جاتا۔ تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے ہمارا۔"

میں نے اسے ایک غلیظ گالی دی اور ٹب میں سے نکل آیا۔ میری حالت سوٹ بوٹ سمیت سوئمنگ پول میں غوطہ مارنے والے شخص کی طرح ہو رہی تھی۔ پانی میری جیبوں میں۔ میرے جوتوں میں اور بالوں میں بھر گیا تھا اور سوٹ گیلا ہونے کے بعد بھاری ہو کے میرے جسم سے چپک گیا تھا چنانچہ میرے لیے آزادانہ نقل و حرکت کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا تھا۔ اس کے باوجود نہ میرا حوصلہ کم ہوا تھا اور نہ اعتماد۔ مگر دوسرے اس وقت

www.paksociety.com

ہوئی جب میں نے اچانک قدموں کے نیچے زمین کو ہلتا محسوس کیا اور مجھے زلزلے کا خیال آیا۔ میں نے پھر ہاتھ پھیلائے اور گرنے سے بچ گیا۔

شکاری پھر ہنسا۔ "آؤ۔ جتنا سے جو کرو حملہ۔" اس نے مجھے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ میں نے پھر جست لگائی مگر خود میں نے یہ محسوس کیا کہ میری حرکت سلو موشن کا نمونہ تھی۔ اتنی مضحکہ خیز کہ میں حیران رہ گیا۔ میرے ہاتھ پیر میرے قابو میں نہ رہے تھے اور کرکٹ کی اصطلاحات کے مطابق میری "لینگتھ اور ڈائریکشن" دونوں غلط ہو گئی تھیں۔ چنانچہ میرے حریف نے بولڈ ہونے کی بجائے مجھے زبردست قلابازی لگائی اور میں بال بوائے کی طرح دروازے کی طرف بڑھا جو باتھ روم کی دیوار تھی اور اس سے ٹکرا کے رک گیا۔ زمین کے ساتھ ساتھ اب آسمان بھی جلنے لگا تھا اور دیوار و در شرابی کی طرح جھوم رہے تھے۔ اس انجکشن کا اثر اتنی جلدی کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ اگر زہریلے انجکشن ہوتا یعنی دوا براہ راست شریان میں داخل کر دی جاتی تو دماغی تین منٹ میں دوران خون مکمل ہونے تک میرا کام تمام ہو جاتا مگر گوشت میں اتنی سرعت سے نہیں ہوتا۔ میں آہستہ آہستہ اٹھا۔ باتھ روم کے میدان کارزار میں ہم دو ہی حریف تھے۔ یہ کوئی ملٹری تھی نہ میانڈاد جیسی "قاتل پٹے" کا شکار ہوا تھا لیکن قاتل کون دیتا۔ کافی۔ مجھے اچانک خیال آیا۔

"سور کے بچے... تم... تم نے کافی میں کچھ ملایا تھا۔"

میں نے مکا تان کے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔

شکاری میری لڑکھڑاتی چال پر ہنسا۔ "ہاں۔ اچھا ہوا تم خود ہی اٹھ کے آگئے ورنہ ہم تمہیں محسن کا پیغام دے کر جاتے۔ یہ انجکشن تو اضافی تھا کسی وجہ سے تم نے کافی نہ پی ہوتی تو تم کو یہاں قابو کیا جا سکتا تھا۔"

"اوہ۔ اور محسن۔ کیا تم نے... اسے..." اب میری زبان بھی لڑکھڑانے لگی تھی۔

جواب میں اس کا ایک اور قہقہہ سنائی دیا۔ باتھ روم کا بلب میری نظروں کے سامنے جلنے بجھنے لگا اور میں ڈگمگایا۔ میرے ہاتھوں نے کسی غیر موجود شے کو تھامنے کی بے سود کوشش کی۔ فرش تیزی سے اوپر آیا اور میں نے گرتے ہوئے آخری جدوجہد اپنے سر کو ضرب سے بچانے کے لیے کی۔ میں گھٹنوں کے بل بیٹھا اور چت ہو گیا۔ چھت آسمان سے بھی اوپر نکل گئی اور میرے گرد وہی رات محیط ہو گئی جو مشرق اور مغرب میں اور شمال و جنوب میں سیکڑوں میل تک پھیلی ہوئی تھی۔ آخری احساس یہ تھا کہ منزل راہ عدم آ گئی جس کے بارے میں ابھی کچھ

ویر پہلے میں نے سوچا تھا کہ کل کی بات ہے تو اس سلسلے میں تردد کیوں۔ اپنا غم، تیرا غم، جہاں کا غم۔ زاد راہ ہے۔

جب مجھے رفتہ رفتہ ہوش آنے لگا تو مجھے خیال آیا میرا جنازہ میرے لواحقین کے کندھوں پر ہے اور مجھے تابوت کے بیچ تابوت میں ڈال کے شہر خموشاں کی جانب لے جایا جا رہا ہے۔ مگر تابوت چہ معنی دارد۔ میں عیسائی تو نہیں اور میری وفات لندن میں نہیں ہوئی تھی۔ افسوس مجھے کفن پوش ہونا چاہیے۔ ایسے سلسلہ وار شب فضل جن کو ہمارا کلام بول بھی نہ سکے کہ عرصہ ابھی تو میں جوان ہوں اور لقمہ اجل ہوں۔ لیکن ایسے ہرگز نہیں ہوتے۔ میں نے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی لیکن میں واقعی سلسلہ میں ملفوف تھا مگر اس لیے کہ یہ سلسلہ زمین کا یا کسی دھات کا نہیں تھا بلکہ اونی ریشمی قسم کی ساخت کا تھا جیسے میرے گرد لپیٹ دیا گیا تھا کہ میں الف کی طرح سیدھا لیٹا تھا۔ اور الف کا تھا۔ یہ جاننے سے پہلے تو میں نے اپنی وفات کے خیال کو رد کیا اور اس خیال سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میرے حواس آہستہ آہستہ بحال ہوتے گئے۔ بعد لحظہ بیدار ہو گئے اور کا منظر میرے تصور سے غائب ہو گیا جو عجیب طلائی منقوش کر آگے سیاہ جنازہ گاڑی ہے جس کے گھوڑے اور کوچ بان تک سب سیاہ ہیں اور تابوت کے گرد اقربا کی عدم موجودگی میں فرزند اور لواحقین ہیں۔ سیاہ لباس میں ان کے حسن کا دیکھ نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے اور دوسری طرف تعزیت کے لیے آئے صاحب ہیں۔ جنازہ گاڑی کے دونوں جانب پھول کی طباق جیسی پچھلوں سے بنی ہوئی چادریں آویزاں ہیں۔ تاہم کفن کے کلاں جنرل منظر صاحب۔ چراغ دین۔ بابو پوسٹ اور حشمت خان اینڈ کمپنی جیسے سرنگوں ملبوس بھی ہیں۔ تصور میں محصور لندن کے قیام کا تھا جس میں ایسے ہی مناظر دیکھنے کو ملتے تھے۔ اب میں نے آوازوں پر غور کیا۔ آواز انجن کی تھی جو کار کا انجن نہیں ہو سکتا تھا اور یہ یا جنازہ کا بھی نہیں۔ یہ ٹرک کا انجن تھا۔ میں ایک قالین میں لپٹا ہوا تھا اور قالین ٹرک میں رکھا تھا اور ٹرک نہ جانے کدھر جا رہا تھا۔ سمت کا یا وقت کا تعین نا ممکن تھا۔ میں کیسے اندازہ کرتا کہ میں اس حالت میں کتنا سفر کر چکا ہوں۔ میں نے منتشر خیالات کی سپاہ کو منظم کیا اور واقعات کے مطابق یاد کرنے کی کوشش کی۔ دو شخصوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں کہاں قیام پذیر ہوں۔ انھوں نے دو یا زیادہ افراد کو میرے اغوا پر مامور کیا۔ ان افراد نے مجھے کافی میں بے ہوشی کی دوا دی۔ ایمبیسیڈر ہوٹل کا عملہ اس میں براہ راست ملوث تھا یا

تھا چنانچہ یہ حرکت کسی غیر ذمہ دار شخص نے بھاری معاوضہ لے کر کی یا کسی نے نظر بچا کے کافی میں دوا ڈال دی۔ یا اور چی خانے میں یا پہنچنے سے قبل۔ ان ہی افراد نے محسن کو کسی تک رسائی حاصل کی۔ ناجائز طریقے سے تالا کھول کے کیسے سب کچھ کرنے کی کوشش کرنے کے بعد انھوں نے مجھے کے باوجود بھی محسن کو قابو کرنے کی کوشش کی تھی۔ شامت اعمال کے باعث میں خود بلانے کا انتظام کیا تھا۔ پھر باتھ روم میں جا پہنچا۔ کمرے کی پڑے کسے بیچ لے اور پھر ایک فرد نے مجھے قتل کرنے میں دھکیلا اور کے پیچھے پیچھے دروازہ بند کیا تو دوسرے کمرے نے مجھے انجکشن دیا لیکن اس وقت کافی کی دوا کا اثر ہو چکا تھا چنانچہ میں مقابلہ نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ کہ اب مجھے قالین میں لپیٹ کر کہیں لے جایا جا رہا ہے۔ اس کے بعد سوالات تھے۔ نمبر ایک یہ کہ کیا محسن بھی زندہ ہے اور کیا وہ قالین میں میرے ساتھ ہی ٹرک میں لپٹا ہوا ہے۔ تم کو کیا وہ بھی بے ہوش ہے یا مر چکا ہے۔ نمبر تین۔ یہ ہوٹل کے قالین ہیں تو ہوٹل والوں نے ان کی نگرانی کیوں نہیں کی۔ تمہیں یہ قالین کسی کی نظر بچا کے کیسے نکالے جا سکتے ہیں۔ خصوصاً وہ قالین جن میں سالم آدمی لپیٹے گئے ہوں اور ہر آدمی کا وزن بھی ڈیڑھ سو پونڈ ہو۔ ایسے ایک قالین کو اٹھانے کے لیے اور لے جانے کے لیے ٹرک میں چڑھانے کے لیے بھی چار آدمی درکار ہوں گے اور یہ جلوس کاؤنٹر کے سامنے سے گزرتا ہوگا۔ ہوٹل کے عملے کا اس سازش میں شریک ہونا بعید از قیاس تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انھوں نے قالین کی قیمت ادا کر کے قالین لے جانے کی اجازت حاصل کر لی ہو۔ ایسے تو جس کو جو چیز پسند آئے گی وہ اٹھا کے لے جائے گا اور معاوضہ ادا کر دے گا۔ ہوٹل والے از سر نو سامان خرید کے کمروں کی آرائش کرتے رہیں گے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انھوں نے دلوا کر کہا کہ یہ اسباب نکالا گیا۔ ہوٹل کے اندر اور باہر اتنے لوگ ہوتے ہیں اور ٹریفک کا اتنا شور ہوتا ہے کہ یہ کام اسٹین گن کی مدد سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بینک لوٹنے والے صرف ایک راستے کو کنٹرول کرتے ہیں اور ایک ہال کے محدود سے مجمع کو۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوا؟

اب میں پوری طرح ہوش میں تھا چنانچہ میں نے شکست اور ناممکنات کے اسباب پر غور ملتوی کیا۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب غور طلب مسئلہ مستقبل کا تھا۔ یعنی کیا ہونے والا ہے۔ کیا اغوا کرنے والے مجھے اور محسن کو قتل کر دیں گے۔ نہیں، قتل کرنا مقصود ہوتا تو کافی میں بے ہوش کرنے والی دوا کی بجائے زہر بھی ملایا جا سکتا تھا۔ اور انجکشن سے ہلاک کرنے کے بعد تو لاش اٹھانے کا تردد بھی فضول تھا۔ وہ

مجھے وہیں باتھ روم میں چھوڑ کے رخصت ہو جاتے۔ محسن کا مسئلہ غیر یقینی تھا۔ کہیں وہ مزاحمت کرتا ہوا مارا گیا ہو یا چشم دید گواہ ہونے کے باعث سزائے موت کا مستحق نہ ٹھیرا ہو۔ اصل شکار میں تھا اور شکاری مجھے بالا خر باہر لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ مجھے مارنا نہیں زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ مجھے زندہ رکھنے کا بھی کوئی مقصد یقیناً ہو گا۔ تفتیش بالتفصیل۔ کہ مجھے کیا معلوم ہے اور کیا نہیں معلوم یا کسی دستاویز یا میرے دستخطوں کا حصول۔ مجھے کسی بات کے اقرار پر مجبور کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میرے انجام کے بارے میں آخری فیصلہ بھی ابھی کا تھا اور علم غیب سے محرومی کے باعث میں قبل از وقت معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں شروع سے ہوش میں رہتا تو شاید وقت کی مدد سے اندازہ کر سکتا کہ مجھے ایمبیسیڈر ہوٹل سے کتنی دور لے جایا گیا ہے اور ممکن ہے ٹرک کے دائیں بائیں مڑنے سے اندازہ کر سکتا کہ ٹرک کس سڑک سے گزر کے کس سمت رواں ہے۔ مگر اپنی موجودہ کیفیت میں یہ سب اندازے میرے اختیار کی بات نہ تھے۔ میں انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہرچند کہ اس سے امید کا دامن باندھے رکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا اور مارنے والے سے بچانے والے کے ہاتھ کے زبردست ہونے پر یقین رکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں چلا بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔

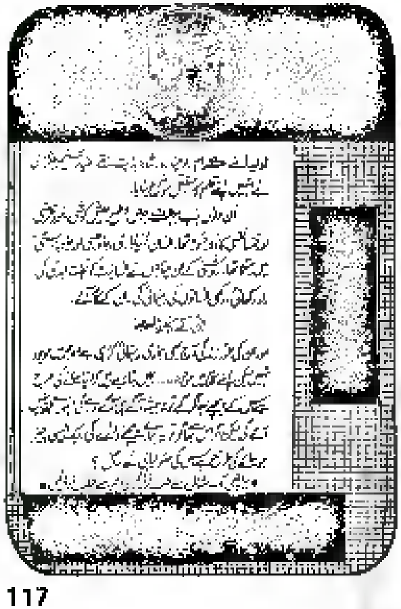

www.paksociety.com

ٹرک بالآخر رک گیا اور مجھے اس تھیلے سمیت گھسیٹا گیا جس کے اندر میں یوں بند تھا۔ جیسے ریشم کا کیڑا کوئے میں۔ قالین کو آگے پیچھے سے اٹھایا گیا تو میں کمان ہو گیا۔ قالین بعد سے پیچھے گرا اور بیک وقت دو افراد نے ایک دوسرے کو حرام خوری کا الزام دیا۔ قالین کی کئی تہوں میں لپٹے ہونے کے باعث مجھے چوٹ نہیں آئی تھی۔ کسی تیسرے شخص نے غرا کے کہا کہ یہ دو بیلوں نہیں کا شاندار قالین ہیں اور دوسری بار مجھے اٹھایا گیا تو اس کے درمیان میں سہارا فراہم کیا۔ میں نے قلوپطرہ کا تصور کیا جسے اسی طرح قالین میں لپیٹ کر شاہی دربار میں پیش کیا گیا تھا۔ قالین کا ایک کنارہ تھام کے جھٹکا دیتے ہیں تو وہ کاغذ کے لچھے کی طرح لڑھکتی ہوئی عین شاہ کے قدموں میں پہنچی تھی اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ چند منٹ بعد مجھے پوری احتیاط کے ساتھ فرش پر رکھ دیا گیا اور مجھے لانے والوں نے اجرت پر احتجاج کیا۔ وہ کرایہ کے ٹرک کے ڈرائیور اور کلینر تھے جو سو کے بجائے دو سو کا مطالبہ کر رہے تھے۔ "اتنا قیمتی قالین ہے بادشاہو۔ اپنے تو مونڈھے بھی وزن سے ٹوٹ گئے ہیں۔ کچھ نکل آیا ہے۔ اماں ڈنگیاں ہو گئیاں ہے" انھوں نے عاجزی سے دلائل اور فریاد کا سلسلہ دراز کیا تو انھیں سو سو کا نوٹ بھی مل گیا۔ مجھے مشکل کہنے والے اب جلد از جلد ان سے نجات پانا چاہتے تھے۔ کسی نے ٹھوکر مار کے قالین کو دھکیلا اور میں گھومنے لگا۔ آخری بل کھلتے ہی میں نے دیکھا کہ میں ایک کوٹھی کے برآمدے میں لیٹا ہوا ہوں برآمدہ عقبی حصے کا تھا کیونکہ مجھے وہ سیڑھیاں نظر آئیں جن کے سامنے ٹرک رکا تھا۔ مجھے اٹھانے والوں نے تین زینے طے کیے تھے۔ کہیں نہ کہیں وہ دروازہ بھی ہونا چاہیے تھا جس سے گزر کے ٹرک اندر آیا تھا۔ اس برآمدے کے گرد لکڑی کا جنگلا باقی جو عام سا پرانا اور بے رنگ تھا۔ اوپر چھت میں گول ٹیوب لائٹ کا روشن حلقہ تھا۔ میرے پیروں میں ہاتھ پر وہی شخص ریوالور لیے کھڑا تھا جس نے مجھے باتھ روم میں انجکشن لگایا تھا۔ بائیں جانب کھڑا ہوا شخص فلموں میں دکھائے جانے والے الہ دین کے طلسماتی چراغ کے جن کا نسبتاً چھوٹا ماڈل تھا لیکن اس کے باوجود دیوزاد لگتا تھا۔ اس کا قد سوا چھ فٹ کے لگ بھگ تھا اور وزن کسی صورت ساڑھے تین سو پونڈ سے کم نہ تھا یعنی مجھ سے دگنا۔ وزن اور قد کی مناسبت سے اس کے جسمانی اعضا بھی جناتی قسم کے تھے۔ مزید نمائش کے لیے اس نے محض ایک جانگیا پہنے پر اکتفا کی تھی چنانچہ اس کا لق و دق چٹان جیسا سینہ، مشک

جیسا پیٹ، کسی رومن عمارت کے ستونوں جیسی ٹانگیں اور بازو جیسے ہاتھ بہت نمایاں تھے۔ اس نے سر منڈوا کے خود کو اور نمایاں کیا تھا کیونکہ اتنے بڑے جسم پر اتنا چھوٹا سا سر بہت عجیب لگتا تھا۔ لمبی لمبی مونچھوں اور ٹھوڑی تک گھنی داڑھی نے اسے بچوں کے لیے تو واقعی خوفناک بنا دیا تھا مجھے وہ کارٹون لگا۔ ریوالور والے کے اشارے پر وہ آگے بڑھا اور اس نے ہاتھوں میں پہلے بڑے خنجر کو ہاتھ میں تھام کے ایک ہی وار سے وہ رسیاں کاٹ دیں جو میرے ہاتھوں اور پیروں کے گرد لپٹی ہوئی تھیں۔ یہ بھی ڈرامائی حالات میں کیا گیا کہ یہ گرز محض نمائشی چیز ہے۔ اس کا بدن ٹھوس نہیں تھا۔ اس کا جسمانی حجم دیکھنے سے زیادہ فعال ثابت ہوا ہے جیسا جو نوجوان کے بھی وہ بہت پھیلا تھا۔ اس جسمانی پھیلاؤ کو بہ آسانی کم کیا جاسکتا ہے جو آدمی کو چربی بنا دیتا ہے۔ گوشت کا یہ پہاڑ خوراک کا ذخیرہ نگلنے سے قائم تھا۔ جب اس نے میرے منہ پر سے بھی ٹیپ نکال دیا تو میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے ہاتھ پیروں پر رسی کے بل سے پڑ جانے والے نشانات کو ملا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ میرے جسم پر لباس کا ایک تار بھی نہ تھا چنانچہ میں کھڑا نہیں ہوا۔ "چلو" میں نے ریوالور والے سے کہا "کیا دوسرا راؤنڈ شروع ہوگا۔ آؤ مجھے میری طرح پیدائشی"

ریوالور والے نے مجھے گالی دی "دوسرا راؤنڈ تیرے باپ سے ہوگا۔"

"اس کے لیے تمھیں قبر میں گاڑنا پڑے گا۔" میں نے کہا "میانی صاحب کے قبرستان میں۔"

"ماسٹر" وہ دیوزاد سے مخاطب ہو کے بولا "اس کو سنبھالنا۔ میں اس کے کپڑے لاتا ہوں۔" وہ برآمدے کے ایک دروازے سے اندر چلا گیا۔ اندر کسی کمرے میں ایک بج رہا تھا۔ پھر کوئی عورت کھل کھلا کے ہنسی۔ میں نے کان لگا کے آس پاس کی آبادی کا تعین کرنا چاہا مگر باہر اندھیرا اور تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا اور رات کا سکوت اتنا گہرا تھا کہ دور سے ایک مینڈک کے ٹرانے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

"ماسٹر" میں نے کہا "کیا نام ہے تمہارا؟ پہلے سرکس میں رہتے تھے کیا؟"

"تجھ کو کیا ضرورت نہیں" ماسٹر نے مجھے خونخوار نظروں سے گھورا۔

"ماسٹر میرے ایک کتے کا نام تھا۔ جو خارش میں مبتلا ہوا اور پاگل ہو کے مرا" میں نے کہا "یہ بالکل تمھارا ہم شکل تھا۔ اس کی روح تم میں سما گئی ہے شاید۔ تم غرانے بھی لگے ہو مرتے بھی ویسے ہی"

"بکواس بند کرو نہیں تو تھپڑ مار کے تمھاری بتیسی ہاتھ میں رکھ دوں گا" وہ مشتعل ہو کے بولا۔

چونکہ میرا مقصد ہی اسے مشتعل کرنا تھا اس لیے میں نے کہا "ویسے وہ بھی دیکھنے ہی دیکھنے کا تھا۔ بزدل اتنا تھا کہ بلی سے ڈرتا تھا۔ اور اس بلی سے نہیں جو شیر کی خالہ تھی۔ بلکہ وہ جو نو سو چوہے کھا کے حج کو گئی تھی۔ تم بھی اس چوہے سے ڈرتے ہو کیا نام ہے اس کا؟"

"دلاور" ماسٹر نے مجھے ایک غلیظ گالی دی اور آگے بڑھا۔ میرے خیال میں وہ مجھے تمام بتا چکا تھا۔

"بیٹھ کے بچے۔ قریب آیا تو مکا مار کے یہ ڈھول جیسا پیٹ پھاڑ دوں گا۔" میں نے اسے چیلنج کیا۔

وہ یکلخت مجھ پر لپکا اور اس کے حلق سے چیخ جیسی آواز نکلی۔ میں بالکل تیار تھا۔ ابھی وہ مجھ تک پہنچا ہی تھا کہ میں گھٹنوں کے بل کھڑا ہوا اور میں نے اس کے پیٹ پر دھکا دے کر دونوں ہاتھوں پر سنبھال کے اوپر سے گزار دیا۔ وہ اپنے ہی زور میں آگے گیا اور برآمدے کی دیوار سے ٹکرایا۔ دھماکے سے دیوار ہل گئی اور ماسٹر کے حلق سے جو کراہ بلند ہوئی وہ بھینسے کے ڈکرانے سے مشابہ تھی۔ وہ دو فٹ کی بلندی سے فرش پر گرا اور ساکت ہو گیا۔

"یہ کیا ہوا ہے" دلاور نے اچانک دروازے میں نمودار ہو کے کہا "مجھے حکم ہے کہ بلا تامل گولی مار دوں"

"ضرور مارو دلاور بھائی" میں نے ماسٹر کی طرف دیکھ کے کہا "مجھے خطرہ لگا ہوا تھا کہ ماسٹر کی ٹکر سے دیوار گر سکتی ہے۔ غنیمت ہے یہ مضبوط تھا ورنہ ابھی تم اندر ملبے میں دفن ہو جاتے"

"میں تمہاری بات کر رہا تھا" دلاور نے میرے کپڑے میرے منہ پر کھینچ مارے۔

"اچھا اچھا" میں نے کپڑے کھینچ لیے اور پہننے لگا "گولی میں ریوالور ہے۔ گولی میں ریوالور؟ لاحول ولا قوۃ۔ دماغ الٹ گیا ہے میرا۔ ابھی اگر قمیص کی جگہ پتلون اور پتلون کی جگہ قمیص پہن لوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ بتاؤ میرا محسن کہاں ہے"

"تمھارا کون محسن ہے۔ ہم بھی محسن کو نہیں جانتے۔ زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں" دلاور چراغ پا ہو کے بولا مگر مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ محسن سے واقف نہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ محسن خیریت سے ہے اور جب مجھے لایا گیا اس وقت تک وہ آیا ہی نہیں تھی۔

"سوری مسٹر دلاور" میں نے کہا "اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں؟ یہ مجھے اور میرے کپڑوں کو الگ الگ کیوں لایا گیا ہے؟"

"اس لیے کہ کپڑوں کے بغیر تم راستے میں کہیں فرار نہیں ہو سکتے تھے" دلاور بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "اگر میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے نہ ہوتے تو تمھارا اندازہ غلط ہو جاتا۔ میں بغیر کپڑوں کے میراتھن ریس لگاتا تو پوری انارکلی اور پوری مال روڈ پر سے گزر جاتا۔ اب لگاتے ہو شرط؟"

دروازہ پھر کھلا اور اس بار جو شخص نمودار ہوا اسے دیکھ کر میں ساری شوخی بھول گیا۔ میرا خیال تھا کہ ماسٹر سے نمٹنے کے بعد دلاور کو بھی چت دیا جا سکتا ہے مگر مدد ہی تھی کیسی ڈرائیور کو دیکھ کے مجھے اندازہ ہوا کہ میں پوشیدہ اور سفاک قاتلوں کے ٹھکانے پر ہوں جہاں میری موجودگی کی خبر کسی کو نہیں اور نہ ہو گی۔ یہ شہر کی چار دیواری میں سے کسی ایک سمت کا مضافاتی علاقہ تھا جہاں ایک کوٹھی کا دوسری سے فاصلہ بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کوٹھی کے ارد گرد محض جنگل ہو اور صبح کا اجالا پھیلنے کے باوجود اس ویرانے میں امید کی ایک کرن بھی نہ ملے۔

سسپنس ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ
جسے قارئین آج تک نہیں بھولے
طاغوت
۳ حصوں میں مکمل!
قیمت فی حصہ ۵۰ روپے — ڈاک خرچ فی حصہ ۵ روپے
☐ پُراسرار کہانیوں کے شائقین کے لیے
☐ طنز و مزاح پسند کرنے والوں کے لیے
☐ جاسوسی کہانیوں کے پرستاروں کے لیے
ایک دلچسپ داستان جو آج تک آپ نے نہ پڑھی ہوگی!
کتابی شکل میں دستیاب ہے
اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہ راست ہم سے منگوائیں
تینوں حصے ایک ساتھ منگوانے پر محصول ڈاک معاف
کتابیات پبلیکیشنز پوسٹ بکس ۲۳ کراچی

www.paksociety.com

"ماسٹر کو کیا ہوا ہے؟" منڈی والے نے اپنا ریوالور بھی نکال لیا۔

"میں نے دیوار کو ٹھوکر ماری تھی۔ شاید وہ ٹوٹ گیا" میں نے کہا۔ اسی وقت ایک فائر ہوا اور میں غیر ارادی طور پر جھک گیا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ منڈی والے نے عمداً میرا نشانہ نہیں لیا تھا یا خوش قسمتی سے گولی سیدھی نکل گئی۔ اس وقت مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ جیسے منڈی والے نے مشتعل ہو کے میرے سر پر گولی چلا دی تھی میرے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ منڈی والا آگے بڑھا۔ اس کی گنجی آنکھیں نفرت سے دہکتے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میرا خیال تھا ابھی وہ اسی رفتار سے دو قدم اور اٹھائے گا مگر اس نے اچانک اچھل کے میرے منہ پر پوری قوت سے تھپڑ مارا۔ میرا گال جلنے لگا۔ ماسٹر نے کراہ کر کروٹ لی اور اٹھ بیٹھا۔ اندھا اسٹریچر پہ ہو گیا۔

"یہ چودھری ولاور کے سامنے اتنی ہی بات کرنا جتنی ضروری ہو" منڈی والا بولا۔ "چلو اندر"

تھپڑ کے ردعمل کے طور پر میں اپنا ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے رہ گیا۔ ایک نہیں دو دو ریوالوروں کی سرد سفاک نالیں مجھے گھور رہی تھیں اور ان کے اندر شیطان کی منتظر بیٹھی ہوئی سیسہ گولی تیر چل اور میرے سر میں اتر جانے کے لیے تیار تھی۔ میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا اور وہ دونوں میرے پیچھے ہو گئے۔ یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ چودھری ولاور وہ ہے جس کے سامنے مجھے اب پیش ہونا ہے۔ وہ نہیں جسے میں ولاور سمجھ رہا تھا مگر شاید اس نے میری بات کا مطلب غلط سمجھا تھا وہ بھی تو میں کوٹھی کے مالک کا نام پوچھ رہا ہوں اور اس کے آقا کو جو ہاکیہ رہا ہوں۔ لکڑی کا پالش کیا ہوا بیرونی دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ اندر کے جالی والے فولادی پٹ والے دروازے کو دھکیل کر میں نے خود کو ایک خواب نگر میں پایا جس کی تزئین و آرائش سے دنیا کی ٹھاٹ باٹ کا پتا چلتا تھا لیکن اس ہیڈ روم میں کوئی نہیں تھا۔ میں کمرے کے وسط میں رک گیا۔

"سیدھے آگے چلو دائیں جانب" منڈی والے نے حکم دیا جو مجھ سے چار قدم پیچھے تھا۔

میں نے دائیں ہاتھ کے دروازے کا پردہ ہٹایا اور ایک کشادہ و عریض ڈرائنگ روم میں پہنچا اس میں ... پر شکوہ محل کے ڈرائنگ روم کی طرح نوادرات کا ذخیرہ تو نہ تھا مگر قالین، فرنیچر، فانوس اور دوسرا سب سامان انتہائی بیش قیمت تھا۔ ڈرائنگ روم کا آخری حصہ کچھ دائیں جانب پھیلا ہوا تھا اور یہ کچھ انگریزی حرف ایل کی شکل بنتی تھی۔ چھوٹے حصے میں کھانے کی طویل میز کے گرد قیمتی کرسیاں تھیں۔ دونوں حصوں کو ایک محرابی دروازہ جدا کرتا تھا اور اس پر بڑے بڑے رنگین منکوں کی مالائیں پردے کے طور پر استعمال کی گئی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ" منڈی والے نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ "اور اس بات کا خیال رکھو کہ تم چودھری ولاور کی کوٹھی میں ہو۔ اگر بیہودہ ہو گے تو تمہاری موت ملے گی اور تمہاری بوٹیاں کتوں کو ڈال دی جائیں گی۔"

"اگر یا تم تینوں مل کے مجھے کھا جاؤ گے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "چودھری صاحب ابھی آرام سے رہیں ہیں؟"

منڈی والا ایک قدم آگے بڑھا اور رک گیا۔ میری خواہش تھی کہ ان میں سے کوئی قریب آ کے مجھ پر حملہ کرے تو میں اسے ڈھال بنا کے باقی سب کو ختم کر دوں مگر وہ میرے عزائم کو سمجھ گیا تھا اور اگر وہ حکم سے مجبور نہ ہوتا تو کب کا مجھے قتل کر چکا ہوتا۔

"تم نے سلامت شاہ کا انجام نہیں دیکھا ابھی" منڈی والا بولا۔ "مگر قسمتی کا حشر دیکھ چکے ہو"

"ہاں اور اسی لیے میں حشر سے نہیں ڈرتا" میں نے کہا۔ "میدانِ حشر میں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہو گی"

منڈی والے نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا کہ وہ آ جائے۔ ماسٹر میرے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ منڈی والے نے اس سے کہا کہ اگر میں صوفے سے اٹھنے کی کوشش بھی کروں تو مجھے گولی مار دی جائے یا ماسٹر ڈنڈے سے میرا سر پھاڑ دے۔ شاید اس نے جوش میں آنے کے بعد اندر ... اٹھا لیا تھا یا اس کا حوالہ محض مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ چودھری ولاور کے حکم کے بغیر وہ مجھے نہیں مار سکتے ——— چودھری ولاور نے کسی خاص مقصد کے تحت مجھے ملاقات کے لیے بلایا تھا اور اس مقصد کو حاصل کیے بغیر مجھے قتل کرنا ہوتا تو وہ اتنا تردد بھی کیوں کرتے۔

"میں نے غلط سمجھا تھا تم تو واقعی ولاور نہیں ہو" میں نے ریوالور والے سے کہا۔ "چاہوں تو ابھی تمہیں اٹھا کے پھینک دوں اس ترپ پہ مگر مجھے اب چودھری سے ملنے کا واقعی اشتیاق ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے سب ڈھونگ ہے۔ تمہیں اختیار ہی نہیں کہ کچھ کر لو"

"... اور اس تر نوالہ کا ذائقہ آتو میں۔" میری بات نامکمل رہ گئی۔ منڈی والا ایک سرخ لائٹ اٹھانے کے لیے نمودار ہوا جو اس نے دیوار کے پاس سے لگا دی۔ ایسی لائٹس میں نے فلم اسٹوڈیوز میں دیکھی تھیں یا فوٹوگرافروں کی دکان پر۔ سرخ لائٹ ایک اسٹینڈ پر نصب تھی اور جب منڈی والے نے اس کو اوپر نیچے کرنے کے بعد صحیح زاویے پر لا کے آن کیا تو مجھے یوں لگا جیسے آدھی رات کو سورج سوا نیزے پر آ گیا ہو۔ اس روشنی کے پیچھے کیا اس کے دائیں بائیں کیا ہو رہا تھا مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ منڈی والے نے چند منٹ کے بعد سرخ لائٹ بند کر کے دوسری لگائی اور میرے سامنے دونوں کونوں سے آنسو نکالنے والے تیز روشنی کے اس سیلاب نے مجھے اندھا کر دیا۔ روشنی میری آنکھوں میں یوں چبھی جیسے آنکھوں میں شیشے کا برادہ پڑ گیا ہو۔ ان کی تمازت مجھے محسوس ہونے لگی اور اگرچہ کمرہ ایئرکنڈیشنڈ تھا مگر میرے جسم پر پسینہ اتر آیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی بے سہارے ڈرائنگ روم میں نہیں لق و دق صحرا کی تپتی دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ "تم ایسے ہی بیٹھے رہو گے تو کچھ نہیں ہوگا" ایک اجنبی نے کہا جس کا لہجہ ٹھہرا ہوا پُر اعتماد اور فصیح تھا۔

"تم چودھری ولاور ہو؟" میں نے کہا۔ "یا ان کے نقیب؟"

"میں ہی چودھری ولاور ہوں" وہ بولا۔ "کیا تم نے کبھی میرا نام سنا ہے؟"

"ولاوروں کا نام تو اکثر سنا ہے" میں نے کہا۔ "مگر تم نام کے ولاور ہو۔ درحقیقت بزدل جو اندھیرے کی پناہ میں رہتا ہے اور روشنی سے ڈرتا ہے۔"

کوئی چیز گولی کی طرح میرے سر سے ٹکرائی اور ... میں نے اس کو روشنی کے اس بحرِ زخار میں کسی سیاہ چٹان کی طرح سایہ بن کے نمودار ہوتے دیکھا اور یہ سایہ ایک لمحے کو پل جھپکنے سے پہلے میری بند آنکھوں کے سامنے پھیلا۔ سرخ لائٹس کی روشنی آنکھیں بند کر لینے کے باوجود پپوٹوں کے سامنے اجالے کی ایک دیوار کی طرح موجود تھی اور یہ سیاہ ہیولا اسی میں ابھرا تھا۔ اس کی ضرب اتنی شدید تھی کہ میرے دماغ کے اندر دھماکا سا ہوا اور وہ سب مادہ جو قدرت نے کاسہ سر میں بھرا تھا ابل کے ادھر سے ادھر ہو گیا۔ اگرچہ ایسا ہوا نہیں ہے مگر مجھے ضرب کے بعد یہی لگا تھا کہ میرا مغز ابل گیا ہے۔ میں نے آنکھوں کے سامنے رنگین نقشے بنتے بگڑتے اور ایک دوسرے میں خلط ملط ہوتے دیکھے۔ اس طرح جیسے دنیا کے نقشے میں ملکوں کی نشان دہی الگ الگ رنگوں سے کی جاتی ہے مگر تجریدی آرٹ بے ہنگم اور بے ترتیب رنگین دھبوں کا ہوتا ہے۔ میرے کانوں میں شور گونجنے لگا۔ چٹانوں پر سمندر کے منہ زور تھپیڑوں کا شور، طوفان کی رات میں پاگل ہوا کے شاخوں سے چیختے ہوئے گزرنے کا شور، زلزلے سے منہدم ہونے والی عمارتوں کا شور اور مکینوں کی آہ و بکا کا شور، یک بیک بریک لگنے سے جام ہونے والے پہیوں کے آہنی پہیوں کی ریلوے لائن پر رگڑ کا شور اور تصادم میں تباہ ہو جانے والی گاڑیوں کے مسافروں کی چیخ پکار کا شور۔ میں خلا میں قلابازیاں کھاتا رہا۔ جیسے ساری کائنات کسی قیامت آفریں زلزلے سے تہ و بالا ہو رہی ہو۔ پھر رفتہ رفتہ آوازوں کا مجموعہ مٹنے لگا۔ رقص کرتے ہوئے رنگ ساکت ہونے لگے اور زمین آسمان ٹھہر گئے۔ صرف وہ روشنی باقی رہی جو ناقابل برداشت ہو جا سکتی تھی۔ ایک اور چیز تھی جو اس روشنی میں سے پل بھر کے لیے ابھرتی تھی اور ان سے میری آنکھوں پر سایہ کرتی گزر جاتی تھی۔ میرے چہرے سے صرف چند انچ کے فاصلے سے یہ سخت قسم کے ربڑ کی ٹھوس گیند تھی جو کرکٹ کی بال سے کچھ چھوٹی ہو گی اور اس کا رشتہ نائلون کی ایک مضبوط ڈوری سے قائم تھا۔ روشنی کے پیچھے کوئی ہاتھ اس گیند کو مسلسل دائرے میں حرکت دے رہا تھا اور بال کے زور سے ڈوری تنی ہوئی تھی۔ یہ دو متضاد قوتوں کا توازن تھا۔ ایک وہ جو بال کو دور پھینکتی ہے اور دوسری وہ جو اسے ایک محدود دائرے سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔ بال مجھے صرف اسی لمحے کے دوران نظر آتی تھی جب سرخ لائٹس کے پیچھے سے روشنی میں طلوع ہوتی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے سے تیرتی ہوئی پھر اسی تیرگی میں ڈوب جاتی تھی۔ بال گھمانے والا ہاتھ بڑی طاقت رکھتا اور زبردست نشانے باز اور ماہر تھا کہ بعض اوقات گیند چھ انچ کے فاصلے سے گزرتی رہتی تھی اور یہ فاصلہ ایک سوت کم ہوتا تھا نہ زیادہ۔ پھر اچانک کھٹ کر وہ آتی وہ جاتا تھا لیکن میں سر کو پیچھے نہیں ہٹا سکتا تھا کیونکہ سر کے پیچھے صوفے کی پشت تھی۔ میں دیکھتا تھا کہ وہ متحرک گیند جس کی ضرب شاید باکسنگ کے عالمی چیمپئن کے مکے سے بھی زیادہ تباہ کن تھی صرف دو انچ دور ہے اور اگر میں ذرا بھی ہلا تو میری ناک کا چورا ہو جائے گا یا میرے جبڑے ٹوٹ جائیں گے اور میرے ایک طرف کے دانت جبڑے سے اکھڑ جائیں گے۔ پھر اچانک بال کی گردش ختم ہو گئی۔

"کیا حال ہے اب؟" ولاور کی آواز آئی۔ "میں نے تم

www.paksociety.com

سے شرافت کی زبان میں بات کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"میں نے بھی کرنل افضل کو شریفانہ جواب نہیں دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہی کہا تھا کہ ولادر خود سامنے آکے بات کرے۔"

"فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔" وہ بولا۔ "تمہیں اب تک بخوبی اندازہ ہو چکا ہوگا کہ میں سامنے آئے بغیر بھی کیا کچھ کر سکتا ہوں۔"

"ہاں۔ مگر مجھے حیرت ہے کہ تم نے سب کچھ نہیں کیا۔ مثلاً یہ کہ مجھے اٹھوانے کے بجائے تم نے میرا جنازہ نہیں اٹھوایا۔" میں نے کہا۔

"بات ضرورت کی ہے۔" وہ بولا۔ "میں کوئی غیر ضروری قدم نہیں اٹھاتا۔"

"فی الحال میرے سامنے آنا قطعی غیر ضروری ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں جانتا ہوں نہ پہچانتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تمہارا اصل نام چوہدری ولادر ہے یا نہیں اور یہ جگہ کون سی ہے جہاں تم نے ملاقات کا اتنا اہتمام کیا۔"

"میرے نقطہ نظر سے جو کچھ میں کرتا ہوں وہی ضروری ہے۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ "آج تم واقعی نہ مجھے جانتے ہو نہ پہچانتے ہو لیکن کل کا کیا بھروسہ کہ تم غلط جگہ اور غلط وقت پر مجھے پہچان لو۔"

"تم اتنے طاقتور ہو پھر یہ ڈر کیسا؟ اگر میں تم کو شناخت کرنے کی غلطی کروں تو کیا تم مجھے سزا نہیں دے سکتے؟"

"سکندر بخت۔" وہ چڑ کے بولا۔ "میں نے تمہیں فضول بحث کے لیے نہیں بلایا ہے۔ تم ابھی جوان ہو اور جذباتی ہو۔ زندگی کے بہت سے نشیب و فراز اور نفع نقصان دیکھنے کے لیے پڑے ہیں۔ تو آج اگر تمہیں اتنی سی بات کا ایک موقع دیا جائے کہ ایک طرف تمہاری زندگی ہے جو بہت کم گزری ہے اور بہت سی باقی ہے۔ اور دوسری طرف وہ سب کچھ ہے جو آج تمہارے پاس ہے۔ تو تم کیا دینا پسند کرو گے؟"

"ظاہر ہے زندگی۔" میں نے غور کرنے کے بعد کہا۔ "اس لیے کہ زندگی بے ثبات، غیر یقینی اور اختیار سے باہر ہے۔ اس کا لینا دینا بھی مشکل ہے۔ اگر وہ طے ہے کہ کاتب تقدیر نے تمہارا انتقام لکھا ہے تمہارے تصرف میں ہے تو میں اپنے انتخاب کے جیسے کا حق نہیں پا سکتا اور اگر وہ وقت ابھی دور ہے تو میرے دینے کے باوجود تم میری زندگی نہیں لے سکتے۔"

"تم فلسفی بھی اور احمق بھی ہو۔" ولادر نے برہمی سے کہا۔ "مجھے سیدھا صاف جواب چاہیے۔" ورنہ میں نے تمہاری بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ فقروں دہری بحث گیند اس میں گے

اچانک وہ منحرف ہوئی اور میری طرف بڑھی۔ میں سنبھل نہ سکا۔ مجھے کہنا چاہیے مگر گیند تیر کی طرح سنسناتی ہوئی میری طرف لگ گئی تھی۔ میرے سنبھلنے سے پہلے دوبارہ روشنی میں آکر زیادہ تیز رفتاری سے میرے بالوں کو مس کر کے گزر گئی تھی۔ وہ گیند ایک ایک سیکنڈ کے وقفے سے جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی تھی۔ میں اس کی رفتار مجھے پہلے بتا چکی تھی اور مجھے اتنی مہلت نہ ملتی تھی کہ اس کے عرصے کے پیچھے جا گروں۔ انگلی کو مسلنے والے لیمپ میں لے لوں اور اس شخص سے فٹ لوں جو ریوالور لیے کھڑا تھا اور مجھے ایمبیڈ ہوٹل سے لانے کا ذمہ دار اس میں خطرہ یقیناً تھا اور اس کے ریوالور کی گولی میرا کام کر سکتی تھی۔ مگر نشانہ خطا ہو جانے کی صورت میں بچ نکلنے کے امکانات بھی تھے۔ اس کے برعکس میرے سر اور چہرے پر اس گیند کا میرے سر، منہ یا سینے پر لگ جانا یقینی تھا۔ جو ضرب لگی تھی وہ شدید نہیں تھی ورنہ سر کی ہڈی ٹوٹ جاتی اور دماغ سے نکلنے والا خون میری کھوپڑی میں منجمد ہو جاتا تو میں بے ہوشی کے عالم میں دو چار گھنٹے دو چار دن یا ہفتے گزار کے آنکھیں بند کر جاتا۔ سینے پر چوٹ لگتی تو صرف پسلیاں ہی نہیں پھیپھڑے بھی سب ٹوٹ پھوٹ جاتے۔ چہرے پر پڑتی تو دونوں آنکھیں تا ابد ناکارہ ہو جاتیں۔ چنانچہ میں دم سادھے جوں کا توں رہا۔ گیند کی حرکت جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح ختم ہو گئی۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں مگر مجھے اس کا علم تھا۔

"تم چاہتے ہو کہ میں ہیرو بن کے کرسی پر کود جاؤں اور تمہارے اس دھوکے سے دستبردار ہو جاؤں؟" میں نے اطمینان کا سانس لینے کے بعد کہا۔ "یہ تم نے پہلی معقول بات کی۔ اچھی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔" ولادر نے پرمسرت لہجے میں کہا۔ روشنی ایک دم بہت کم ہو گئی جس سے میری آنکھ کو بڑا سکون ملا لیکن اس کے باوجود میں روشنی کے پیچھے کی صورت دیکھنے سے قاصر رہا۔

"اور اسی مقصد کے حصول کی خاطر تم نے مجھے لندن ڈی پورٹ کرا کے یہاں بلایا تھا؟" میں نے کہا۔ دکھتی ہوئی آنکھیں ملیں۔ "بہت سے نتائج تم اپنی عقل سے اخذ کر سکتے ہو۔" ولادر نے کہا۔

"کیا یہ بھی اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میرے والد کو قتل کیا گیا؟" میں نے کہا۔

"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہو جانا چاہیے کہ تمہارے والد کو قتل کیا گیا تھا؟" وہ سکون سے بولا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم اس تکلیف دہ روشنی کو گل کر دو؟" میں نے کہا۔ "مجھے وحشت زدہ کیے بغیر تم بات جاری رکھو۔"

"کیوں نہیں۔" وہ بولا اور اس کے ساتھ ہی دونوں سرچ لائٹس آف ہو گئیں۔ کمرے میں صرف وال لائٹس کی نرم روشنی رہ گئی۔ میں نے کچھ دیر کے لیے ہتھیلیوں سے دونوں آنکھیں بند رکھیں۔ جب میں نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر آنکھیں کھولیں تو مجھے یہ جان کے اطمینان ہوا کہ میری بصارت کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا ہے۔ میں اب اپنے سامنے بالکل صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ کمرہ وہی تھا جیسا میں نے اندر قدم رکھتے ہی دیکھا تھا مگر بیچ کے محرابی دروازے کی لائن کے سامنے ایک اسکرین رکھ دیا گیا تھا۔ لکڑی کے فریم کا وہ اسٹینڈ جسے عموماً پارٹیشن کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک لائٹ آخری دیوار پر بھی تھی جس کی وجہ سے ولادر کا سایہ اس ریشمی نازک اسکرین پر صاف پڑ رہا تھا اور میں اس کے جسمانی خدوخال کو اور حرکات و سکنات کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ بھاری بھرکم آدمی تھا۔ اوسط قد و قامت کا مالک وہ بازوؤں والی کرسی پر بیٹھا تھا لیکن اس کا سر پشت کے سہارے سے زیادہ اونچا نہیں تھا۔ اس نے سگریٹ کا کش لیا اور اس کی راکھ جھاڑی تو سفید اسکرین پر سیاہ سائے کی ایک ایک حرکت کا تاثر ڈرامائی طور پر نمایاں رہا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کو اور چہرے کو حرکت کرتے صاف دیکھا اور پھر دھوئیں کا مرغولہ اسکرین کے اوپر نمودار ہوا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ولادر انتہائی عیار اور خطرناک حد تک ذہین شخص ہے جو عام ریسرچ کرنے والوں کے کلینک کی مخصوص نفسیاتی فضا پیدا کرنے کے حربے جانتا ہے اور ذہن یا ہاتھ کی قوت سے کام لینے اور طاقت سے یا تشدد سے مطلب نکالنے کے بجائے اپنے حریف کو ذہنی طور پر مفلوج، سکڑ ور اور بے بس بنا کے فائدہ اٹھانے کا ماہر ہے۔

سرچ لائٹ کے پیچھے اس شخص کا کہیں پتا نہ تھا جو موت کا ہرکارہ تھا لیکن منڈیری والا موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔

"مسٹر ولادر۔" میں نے بالآخر کہا۔ "تمہارے خیال میں ایک آدمی کی زندگی کی قیمت کیا ہوتی ہے؟"

"یہ سوال احمقانہ ہے۔" ولادر نے کہا اور کرسی پر پہلو بدل کر "فٹ پاتھ پر لیٹے ہوئے نیم مردہ بھیک مانگنے والے لاوارث بوڑھے کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ تمہاری زندگی اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ میرے کسی پیادے سے میری اپنی زندگی تمہارے مقابلے میں زیادہ بیش قیمت ہے اور یقیناً ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کی زندگی مجھ سے کہیں زیادہ قیمت کی ہے۔"

"اچھا۔ میں براہ راست ایک سوال کرتا ہوں۔ کیا یہ سودا تم میرے باپ سے نہیں کر سکتے تھے؟" میں نے کہا۔

"کر سکتے تھے۔ اگر وہ رضامند ہو جاتا تو اپنے لیے تمہارے لیے اور ہمارے لیے بہت سے مسائل پیدا نہ کرتا۔" ولادر نے کہا۔ "مگر وہ ضد پر قائم رہا کہ سب کچھ دے سکتا ہوں مگر وہ کاروبار نہیں دے سکتا جس سے میرے بیٹے کا مستقبل وابستہ ہے۔"

"چنانچہ تم نے اسے قتل کرا دیا؟" میں نے اچانک کہا۔

"اس سوال کا جواب میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔" وہ اسی سکون سے بولا۔ "اگر اس کی جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟"

"میں بے معنی مفروضات پر کیا جواب دوں۔" میں نے کہا۔ "جو ہونا تھا ہو چکا۔"

"اچھا تو بامعنی مفروضات پر بات کرو۔" وہ طنز سے بولا اور قدرے مسکرایا۔ "تم کیا کرو گے؟ فرض کرو انتخاب تمہارے ہاتھ میں ہو۔"

"میں وہی کروں گا جو میرے باپ نے کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یعنی انکار۔ میں اپنے وعدے سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔"

"تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ تمہارے مستقبل کا دارومدار اس کاروبار پر ہے؟" ولادر نے سگریٹ کا کش لیا اور چٹکی بجا کے راکھ جھاڑی۔

"میں تقدیر کو تدبیر سے وابستہ رکھنے کا قائل نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن انکار کا مطلب ہوگا میرے والد کی روح کے لیے شکست کا وہ صدمہ جو انہوں نے زندگی میں نہیں اٹھایا تھا۔ میں ان کے نقش قدم پر چلنے کا پابند ہوں خواہ یہ طریق مجھے بھی اسی منزل تک لے جائیں۔"

"اس نے تو صرف اپنی زندگی گنوائی تھی۔" ولادر نے کچھ دیر بعد کہا۔ "کیونکہ اس کے پاس گنوانے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ تم زیادہ نقصان اٹھاؤ گے۔ مثلاً تمہارا ایک دوست ہے۔ محسن رضا۔ اگر تمہیں اس کے جنازے کو کندھا دینا پڑا؟"

میرے ذہن میں ایک تصویر سی ابھری اور مٹ گئی۔ اس کے باوجود میں خاموش رہا۔

"اور بقول تمہارے تم نے جواں مردی سے یہ صدمہ بھی جھیل لیا۔" ولادر نے مناسب وقفے کے بعد کہا۔ "تو وہ لڑکی ہے جس سے تم واقعی محبت کرتے ہو۔ فوزیہ۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے

کہ ہم اسی اسٹیج پر اس کو تمہارے سامنے پیش کریں — اور تمہیں وہ مناظر دیکھنے کو ملیں کہ تم ہزار بار مرنے کی آرزو کرو اور موت نہ آئے۔"

میرے دل کی دھڑکن رک گئی اور میری نظریں پتھرا گئیں۔ اسی وقت دونوں سرخ لاشیں جل اٹھیں اور میں نے بے اختیار دونوں آنکھیں بند کر لیں مگر وہ مناظر جن کا ذکر ولاور نے کیا تھا میرے تصور میں زندہ ہے اور وحشت سے میرے جسم کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ فوزیہ کی جگر خراش چیخیں سے میری روح کے عذاب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بے ضمیر سفاک درندوں کے ہاتھ میں تھی اور میں اتنا بے بس تھا کہ نہ اسے قتل کر سکتا تھا نہ اپنی جان دے سکتا تھا اور نہ ان شیطان صفت جلادوں کا کچھ بگاڑ سکتا تھا جو اپنے مقصد کے حصول کی خاطر فوزیہ پر ہر انسانیت سوز، ناقابلِ بیان حد تک شرمناک اور موت سے زیادہ عذاب دہ ظلم کر رہے تھے — وہ اسے جلاتے تھے، نوچ لیتے تھے، کاٹ لیتے تھے اور اس کے حسن و شباب کے آئینے کو کرچی کرچی کر رہے تھے۔ خوب صورت، نازک اندام اور گل بدن فوزیہ ایک مکروہ، بدہیئت اور مسخ شدہ لاش بن رہی تھی۔ زخم — زخم — زخم — وہ گندہ میری ناک کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ میں بے بسی کی برف کے نیچے دفن ہونے لگا تھا۔ عقل نے بڑی قوت سے جذبات پر قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ سوچو — سوچو — لوہے کو لوہا کاٹتا ہے — بہادر دشمن کا مقابلہ ہو تو بہادری کام آتی ہے۔ دشمن مکر و فریب کے سب جائز و ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرتا ہو اور اخلاقیات کے اصولوں کو جنگ میں حماقت قرار دیتا ہو تو بہادری کے روایتی معیارات سے ہٹ کے لڑنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیا تمہارے پاس عیاری کا اسلحہ نہیں ہے؟ تم کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا نہیں آتا؟ تم ذہانت سے اور سیاست سے کام نہیں لے سکتے؟ مصلحت کے تقاضوں کو نہیں سمجھ سکتے؟؟؟

لاشیں یکایک گل ہو گئیں اور جب میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو ولاور اسی طرح سایہ بن کے اسکرین پر موجود تھا۔

"ولاور" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "فیصلہ تم اسی وقت چاہتے ہو؟ کیا تم مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت نہیں دے سکتے؟"

"نہیں... میرا مطلب ہے کہ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن غور کرنے کے لیے قابلِ غور مواد بھی تو ہونا چاہیے۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتا ہے تو جیسے بتا دوں اور حقائق کو سامنے دیکھو۔ ایک یہ کہ میرو ز برادرز کمپنی سے دستبرداری کی صورت میں تمہارے خلاف تمام مقدمات ختم ہو جائیں گے۔ نمبر دو یہ کہ تمہیں پانچ لاکھ روپے نقد یا اس کے مساوی [illegible] کرنسی اور شہریت کے حقوق دلوا دیے جائیں گے [illegible] واپس لندن جاکے تعلیم مکمل کرنا چاہو تو اس کا انتظام [illegible] گا اور بعد میں تمہارے لیے وہیں ملازمت اور قیام کا [illegible] رقم بڑھائی بھی جا سکتی ہے۔"

"اگر میں ان سب قانونی دعووں سے دستبردار ہو گیا تو کاروبار تمہارے ہاتھ میں کیسے آئے گا؟" میں نے کہا۔

"ہم میر شرافت علی کا ایک وارث سامنے لے آئیں گے وہ ہمارا اپنا آدمی ہے۔" ولاور نے کہا۔

"تم جمع کا صیغہ استعمال کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "[illegible] مطلب کیا ہے؟"

"ہم کا مطلب ہے ہم — اس سے زیادہ کچھ نہیں" اس نے کہا۔ "تیسری بات یہ کہ تم کاروبار سے الگ ہو جانے کے بعد بھی کاروبار میں شریک رہو گے۔ اس سے کہیں زیادہ کما سکتے ہو جو میرو ز برادرز کمپنی کے مالک کی حیثیت سے کماؤ گے۔ [illegible] میں ہماری نمائندگی کر سکتے ہو اور سالانہ دس لاکھ [illegible] حاصل کر سکتے ہو۔ مگر یہ ہماری رضامندی کی بات ہے [illegible] تم خاموشی سے الگ بھی رہ سکتے ہو۔"

میرا دماغ چکرا گیا۔ "میری سمجھ میں تمہاری بات آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے [illegible] سے کہ الگ بھی کرنا چاہتے ہو اور مجھے دس لاکھ سالانہ منافع کمانے کی پیشکش بھی کر رہے ہو۔ جہاں تک میرا [illegible] کا تعلق ہے میرے والد کو ان کے حصے کا منافع سالانہ [illegible] لاکھ روپے ملتا تھا جو ایک جعلی پارٹنر شپ اور وراثت کے [illegible] لے کر ہضم کر گیا۔ اب یہ منافع بڑھ کے دس لاکھ [illegible] جائے گا اور تم دس لاکھ تو مجھے دینے کی بات کر رہے ہو [illegible] منافع کم سے کم دگنا تو ضرور ہوگا — بیس لاکھ کی کسی [illegible] ہم سے تمہاری مراد کیا ہے مگر میں فرض کر لوں کہ تمہارا ایک ساتھی اور ہے تو اس کے بیس لاکھ ملا کر سالانہ [illegible] کم سے کم پچاس لاکھ ہو جاتا ہے۔ یہ کاروبار اتنا بڑا [illegible]"

"تم نے ابھی تک صرف کتابیں پڑھی ہیں" ولاور [illegible] "اور کتابی علم صرف راستہ دکھاتا ہے — منزل تک [illegible] راستے پہ چلنا پڑتا ہے جو عملی تجربہ ہے اور اس کے بغیر [illegible] بے صرف ہے۔ یہ دنیا بھی ویسی نہیں ہے جیسی تمہیں [illegible] ہے — ایک دنیا کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے اور [illegible] ہے جیسا دنیا کو ہونا چاہیے۔ دوسری دنیا کا ذکر کہیں نہیں تھا اور اس میں تم نے ابھی تک قدم نہیں رکھا۔ یہ وہ دنیا ہے جو حقائق سے اور گرد موجود ہے۔ میرو ز برادرز کمپنی کے کاروبار کی بڑی اچھی ساکھ ہے۔ گڈ ول۔ اس انجینئرنگ فرم کے تیار کردہ آلات کی مانگ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ میرو ز برادرز کمپنی کے روابط دنیا کے مختلف ممالک میں ہیں۔ لیکن انجینئرنگ کے آلات میں ہم کیا کما سکتے ہیں۔ ہمارے مقابل جاپان ہے۔ جرمنی اور فرانس ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ ہیں۔ ان کی ساکھ ہم سے بہت بہتر ہے اور معیار کے علاوہ بہت سے سیاسی تعلقات کے ہیں۔ ہم دنیا کے بازار میں ایک نام ضرور ہیں مگر اپنا مال ان کی قیمت پر نہیں بیچ سکتے۔ خریدار کے سامنے ایک ہی قیمت ہو تو وہ جرمن یا جاپانی سامان کو معیار کی بنیاد پر ترجیح دے گا۔ قیمت کا مسئلہ ہو گا تو ہمیں جاپان سے بھی پیچھے جانا پڑے گا۔ یہ مقابلہ دن بہ دن سخت تر ہوتا جا رہا ہے لیکن فائدہ اٹھانے کے مواقع ان کے لیے کم نہیں جو فائدہ اٹھانا جانتے ہیں۔ اس کاروبار کے روابط سے اور اپنی ساکھ سے ہم بے شمار فوائد حاصل کر سکتے ہیں — اور کر رہے ہیں۔ میرو ز برادرز کمپنی کا نام ایک جائز کاروبار کا پردہ ہے جس کی آڑ میں زیادہ منافع بخش کاروبار چلتے ہیں۔"

"اسمگلنگ؟" میں نے چلا کر کہا۔ "تم اسمگلر ہو؟ میرو ز برادرز کمپنی کے نام پر اسمگلنگ کرتے ہو؟ اور مجھے بھی اپنا پارٹنر بنانا چاہتے ہو۔ کیا اسمگل کرتے ہو تم؟ سونا؟ منشیات؟ اسلحہ؟؟"

وہ ہنسا۔ "تم واقعی بچے ہو۔ عمر کا عقل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کی زندہ مثال۔ تمہیں ابھی معلوم ہی نہیں کہ اسمگلنگ کسے کہتے ہیں۔ میں نے تو زیادہ منافع بخش کاروبار کا ذکر کیا تھا۔ تمہارا ذہن اسمگلنگ کی طرف کیوں چلا گیا؟ کاروبار تو صرف کاروبار ہوتا ہے۔ اس میں جائز کیا ہے اور ناجائز کیا۔ یہ تفریق کا معیار ہر جگہ الگ ہے نیکی بدی یا حسن کے معیار کی طرح۔ مثلاً ترکی میں افیون کی کاشت حکومت کی نگرانی میں ہوتی ہے۔ بہت سے ممالک میں شراب کی کشید اور فروخت پر پابندی نہیں۔ مونٹی کارلو دنیا کے سب سے بڑے جوئے خانے ہیں جو حکومت کی اجازت اور سرپرستی میں چلتے ہیں اور اس چھوٹی سی ریاست کی بیشتر آمدن جواریوں کی بدولت ہے۔ بہت سے ممالک میں طوائفوں کو کاروبار کے لیے باقاعدہ لائسنس جاری کیے جاتے ہیں۔ لیکن پاکستان اور دنیا کے بیشتر ممالک کے نقطہ نظر سے یہ کاروبار ناجائز ہیں۔ اخلاقاً، مذہباً اور قانوناً افیون کی پیداوار، شراب کی کشید، جوا اور عصمت فروشی ممنوع ہیں۔ یہی صورتِ حال عام کاروبار کی ہے۔ ایک ملک کی تجارتی یا معاشی پالیسی میں کسی چیز کی درآمد یا برآمد پر پابندی عائد ہو تو کاروبار ناجائز ہو جاتا ہے۔ پالیسی بدل جائے تو جائز کہلانے لگتا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ سب بکواس ہے۔ اس نے اندازہ کرنا چاہا تھا کہ میں اس ناجائز کاروبار میں شرکت کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو سکتا ہوں یا نہیں لیکن میں ایک دم بدک گیا۔ یہ میری غلطی تھی۔ اگر میں عیاری سے کام لیتے ہوئے دلچسپی کا اظہار کرتا تو شاید وہ کاروبار کی اصل نوعیت بتانے پر بھی رضامند ہو جاتا مگر بُرا ہو میری تربیت کے مزاج کا۔ میں دو میر [illegible] بلال کو کبھی کہہ نہ سکا تھا۔ میری اخلاقیات میں ولاور کے اصولوں کے لیے صرف نفرت تھی چنانچہ میں نے جس رد عمل کا مظاہرہ کیا وہ غیر ارادی تھا۔ ولاور نے فوراً سمجھ لیا کہ میں اپنی سوچ کے اعتبار سے کبھی اس کا ہم خیال نہیں ہو سکتا۔ اس نے جو تمام حقیقت کو خوب صورت لفظوں کے ہیر پھیر میں گم کر دیا اور اصل بات گول کر گیا جو اب بھی وہی تھی یعنی میرو ز برادرز کمپنی کے جائز کاروبار کی آڑ میں ناجائز

جہنم کی بلائیں
پکارتی لاشیں
تیسرا روپ
مسٹر چکرم
کتابیات پبلی کیشنز، پوسٹ بکس [illegible]، کراچی!

www.paksociety.com

کاروبار چل رہا تھا اور اس انکشاف کے بعد بہت سی باتیں اظہر من الشمس ہو گئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ وزیر خان کی عملی طور پر کاروبار سے علیحدگی کا سبب کیا تھا۔ وہ کاروبار میں مختارِ کل ہو کے رہنا چاہتے تھے اور وزیر خان کی اخلاقی اقدار کو اپنے منافع کی راہ میں حائل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ وزیر خان کو حقیقت کا علم ہوا تو دھندا چوپٹ کر دے گا۔ اس کا وجود کروڑوں روپے سالانہ کی آمدنی کے لیے ایک مستقل خطرہ تھا۔ عین ممکن ہے کہ وزیر خان کے شکوک ہی اس کی بے وجہ اور ناوقت موت کا سبب بنے ہوں۔ تاہم ایک بات اب بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ولاور نے یہی فراخ دلانہ پیشکش میرے والد کو کیوں نہیں کی تھی۔

"ولاور،" میں نے کہا۔ "شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ عملی زندگی کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ یہ بتاؤ مجھے پانچ لاکھ دے کر الگ کر دینے کے بجائے تم مجھے ایک پارٹنر کیوں نہیں بنا لیتے۔ تم مجھے دس لاکھ سالانہ لندن میں دے سکتے ہو تو یہاں کیوں نہیں دے سکتے؟"

"تمہیں آم کھانے سے غرض ہونا چاہیے۔ پیڑ کے گننے سے نہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں تم سے ایک رعایت ہی تو چاہ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کہ میں کاروبار سے مکمل طور پر دستبردار نہیں ہوتا۔ تمہیں اپنے ساتھ شریک کر لیتا ہوں۔ خود ایک تہائی یا ایک چوتھائی کا مالک رہ جاتا ہوں۔ تم بھی مالک ہو جاؤ گے اور میں جو ستو ایک بے خبر مالک بن کے تمہارا ساتھ دیتا رہوں۔ اس میں کیا قباحت ہے۔ خواہ میرا منافع دس لاکھ ہی کیوں نہ ہو مگر ذہنی طور پر مجھے یہ احساس تو رہے گا کہ میں تمہارا ملازم یا کمیشن ایجنٹ نہیں ہوں۔ جو کچھ مجھے ملے گا میرا حق ہوگا اور یہ میرے لیے تھوڑے سے اطمینان کی بات ہوگی۔"

اسکرین پر سائے نے نفی میں گردن ہلائی۔ "کاروبار سے عملی طور پر تمہارا کوئی تعلق ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں۔ ایک فیصد بھی نہیں۔"

"پھر مجھے واقعی سوچنا پڑے گا کہ دونوں تجاویز میں سے میرے لیے کون سی زیادہ قابلِ قبول ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "بمبئی میں دس لاکھ روپے سالانہ کے منافع پر تمہارے لیے کام کروں۔ یا پانچ لاکھ لے کر لندن واپس چلا جاؤں۔ اگر پانچ کی جگہ دس لاکھ ہوتے تو میں ابھی قبول کر لیتا۔"

"دس لاکھ۔" اس نے کہا۔ "گویا تم دگنی رقم مانگ رہے ہو۔ خیر۔ اس پر غور کریں گے۔ میرا خیال تھا پانچ لاکھ بآسانی تک تو ممکن ہے۔ شاید میں بھی اسی وقت طے کر لیتا۔ مگر دس لاکھ کے مسئلے پر مجھے مشورہ کرنا ہوگا۔"

"میرا خیال ہے ہمارے درمیان مذاکرات تسلی بخش طور پر آگے بڑھتے رہیں۔" میں نے کہا۔ "آئندہ ملاقات کب اور کہاں ہوگی؟"

"تمہیں سوچنے کے لیے ایک ماہ کی مہلت کافی ہوگی۔" فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "اس کے بعد ہم خود تمہیں بلا لیں گے۔ جہاں مناسب سمجھیں گے۔"

"ایک دو باتیں میرے لیے وضاحت طلب ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک یہ کہ کاروبار سے باعزت طور پر علیحدہ ہونے کی یہ پیشکش میرے والد کو کیوں نہیں کی گئی تھی؟ وہ پانچ لاکھ لے کر میرے پاس لندن آجاتے تو کیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم میر شرافت علی سے ان کی کیا بات ہوئی تھی۔" ولاور نے کہا۔ "اور حقیقت یہ ہے کہ میرا ان سے کبھی براہِ راست تعلق ہی نہیں رہا۔ ممکن ہے اس پیشکش کو رد کر چکے ہوں۔"

"اور خطرے کا باعث بن گئے ہوں؟" میں نے کہا۔ "چنانچہ میر شرافت علی نے انہیں قتل کرا دیا تاکہ زبان بند کی جا سکے۔"

"میں نے کہا تھا کہ میر شرافت علی اور وزیر خان کے معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔" وہ بیزاری سے کام لیتے ہوئے بولا۔ "اگر اس نے قتل کرایا ہوگا تو معلوم ہو جائے گا۔ تم نے تو اس پر بلیک میلنگ کا الزام بھی عائد کیا ہے۔"

"ولاور۔ تم ایسے انجان بن رہے ہو جیسے میر شرافت علی کی اصلیت کو بالکل نہیں سمجھتے۔" میں نے کہا۔ "جب تمہارے اور اس کے درمیان اتنا قریبی کاروباری تعلق تھا تو کیا یہ باتیں تم سے پوشیدہ تھیں؟"

"ہمارا میر شرافت علی یا کمپنی کے اصل کاروبار سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جو کچھ وزیر خان بھی غیر متعلق رہا اس لیے مجھے یہ سب واقعی معلوم نہیں۔" ولاور نے کہا۔ "میر شرافت علی زندہ ہوتا تو بتا سکتا تھا۔ وہ چالاک ایک بزنس پارٹنر تھا۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ اسے قتل کرنے والا میرے علاوہ کون ہو سکتا ہے؟" میں نے اچانک کہا۔

سامنے سے پھر انکار میں گردن ہلائی۔ "میری معلومات

اخبار کی حد تک ہیں۔ اور اخبارات سے پتا چلتا ہے کہ قتل تم نے کیا ہے۔"

"کیا کاروباری رقابت میں قتل ناممکن ہے؟" میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ اسے خود تم نے قتل نہیں کیا؟"

"ثبوت ذرا بھی نہیں۔" وہ سکون سے بولا۔ "میرے پاس ثبوت ہے۔ لیکن یہاں تمہارے سامنے مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر میں تم سے کہتا ہوں تو مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میرے اعتراف جرم کا کوئی گواہ پیدا ہو جائے گا۔ اس لیے یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ میر شرافت علی کو میں نے قتل کیا ہے یا قتل کرایا ہے۔ اس سے ہمیں کوئی مسئلہ یا پریشانی نہیں تھی۔ کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔"

"اگر وہ زندہ ہوتا تو خود مجھ سے بات کرتا۔" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ میرا تو تم سے کبھی واسطہ نہیں رہا۔" ولاور نے پھر کرسی پر پہلو بدلا۔

میں پھر ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے اس کے جھوٹ نے نہیں اس کے اعتماد نے حیران کیا۔ جتنے اعتماد سے اس نے جھوٹ بولا تھا اتنے یقین کے ساتھ میں سچ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ میر شرافت علی کے لیے میری آمد قطعی غیر متوقع تھی۔ وہ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اگر وہ مجھے بلانے والوں میں شامل ہوتا اور اسے مجھ سے یہی بات کرنا ہوتی جو ولاور نے کی تو وہ اس کے لیے تیار ملتا۔ اب میرے لیے یقین مشکل تھا کہ ولاور کی بات میں جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا؟ اس نے سب جھوٹ بولا تھا۔ وہ یقیناً جانتا تھا کہ وزیر خان کیوں مارا گیا۔ اسے علم تھا کہ قاتل کون ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ میر شرافت علی کو قتل کس نے کیا۔ اور کیوں؟ مگر وہ بہت شاطر آدمی تھا اور اپنی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ پر اتنا ہی غور کرتا تھا جتنا شطرنج کا کھلاڑی کسی چال پر کرتا ہے۔ اس کا کھیل دفاعی نوعیت کا اور محتاط تھا۔ وہ کاروباری بات کے علاوہ کوئی بات کرنا چاہتا ہی نہیں تھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ وہ بہت خطرناک دشمن تھا۔

"گویا میر شرافت علی کا قتل تمہارے لیے بھی غیر متوقع تھا۔" میں نے کہا۔ "میں بھی تمہارے سامنے بےخوفی سے ایک بات کہہ سکتا ہوں۔ میں نے شرافت علی کو قتل نہیں کیا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے؟ تمہیں اس کے دوستوں اور دشمنوں کا علم ہوگا۔ کاروبار میں اس کی رقابت کس سے تھی۔ اس کا حریف کون تھا۔ کیا کبھی اس کے کاروبار سے کسی کے مفادات مجروح ہوئے تھے؟ کسی کے دل میں اس کے خلاف رنجش تھی؟"

"میرا خیال ہے میر شرافت علی کا قتل ذاتی دشمنی کا نتیجہ تھا اور اس کے اسباب بھی ذاتی ہیں۔" وہ سوچ کر بولا۔ "مجھے اس کے نجی معاملات کی زیادہ خبر نہیں تھی۔ کاروبار میں تو اس کی کسی سے رنجش تھی اور نہ دشمنی۔ حریف تو سب ہی ہوتے ہیں اور دنیا میں کسی کاروبار پر ایک ہی فرد کی اجارہ داری نہیں ہے۔ مگر وہ ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوتے۔"

ولاور سے سچ اگلوانا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا اس کے منہ پر طمانچہ لگانا۔

"تم نے ابھی کہا تھا کہ میں نے تمہاری تجاویز سے اتفاق کیا تو مجھے ایک فائدہ ہوگا کہ میرے خلاف مقدمات ختم ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ کیسے ممکن ہے جب کہ تم نہ اصل قاتل سے واقف ہو نہ قتل کے اسباب سے۔"

"میں تمہیں پھر مشورہ دوں گا کہ آم کھانے سے غرض رکھو، پیڑ مت گنو۔" وہ بولا۔ "ضروری نہیں کہ ہم اپنے قول و فعل کی وضاحت بھی کریں۔ ہر بات کا جواز بھی فراہم کریں اور تمہیں مطمئن کرنا لازمی سمجھیں۔ اب تم جا سکتے ہو۔ اس گفتگو کا حوالہ کہیں نہیں دو گے تو فائدے میں رہو گے۔ ورنہ تم دیکھ چکے ہو کہ میری رسائی ہر جگہ ہے۔ میرے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ تمہیں لندن سے کھینچ لائے۔ تم مجھ سے بچ کے کہیں نہیں جا سکتے اور کرۂ ارض پر تمہیں چوہدری ولاور کے عتاب سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ ایک مہذب بہت بولا ہو۔ تم آج کی بات کے ہر لفظ پر اچھی طرح غور کر سکتے ہو اور مجھے امید ہے تمہارا حافظہ اچھا ہے۔ اس لیے تم کوئی لفظ بھولو گے نہیں۔" وہ ایک دم پلٹا۔ پھر پیچھے والی روشنی گل ہو گئی اور اسکرین پر سے اس کا سایہ بھی مٹ گیا۔ وہ اندھیرے ہی کہیں گم ہو گیا اور میرے سامنے وہ مسندی والا کمرہ رہ گیا۔ پیچھے مجھے اردلی کے چراغ کا جن تھا اور وہ شخص جو مجھے اٹھا کے لایا تھا۔

"کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "سنا نہیں چوہدری صاحب کا حکم۔۔؟ ہمیں اسی تزک و احتشام کے ساتھ واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچا دیا جائے۔" پھر میں نے اطمینان سے سگریٹ نکالی اور جلانے کے بعد دیا سلائی کو پھونک مار کر بجھانے کے بجائے اسی نوکر کے پیٹ میں لگا دیا۔ وہ بلبلایا اور اپنے عظیم الشان پیٹ کو یوں ملنے لگا جیسے اس

www.paksociety.com

کی املاک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے" میں نے قہقہہ مارا۔ "ابھی یہ غبارہ پھٹ جاتا" نجیب پھر بھی منڈی والے نے آگے بڑھ کے میرے لبوں سے سگریٹ نکال لی اور فرش پر ڈال کے مسل دی۔ "مجھے بداخلاق لوگ برے لگتے ہیں"۔ "بچانے کو پوچھا اب سگریٹ بھی چھین لی"۔

"چلو" اس نے مجھے گالی کے ساتھ ایک دھکا دیا۔ "پہلے جو میں تمہاری زبان ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں"۔

"چودھری دلاور کے کہنے پر" میں نے چلتے ہوئے کہا۔ "تو صرف بھونک سکتا ہے۔ مجھے کاٹ نہیں سکتا۔ ناشکرا تیرا نام ہونا چاہیے۔" یہ دوسرا تو کتا ہے اور وہ کمپاؤنڈر تھا! اس کی شکل بن مانس سے ملتی ہے" منڈی والے نے پیچھے سے میرا ایک زبردست لات رسید کی۔

"افسوس یہ ہے" میں نے رک کر اور گھوم کر کہا "کہ میں لڑنے جھگڑنے کے موڈ میں نہیں ہوں ورنہ چودھری دلاور کو دلچسپی بنا تا اور تم جیسوں کو ایک ساتھ لڑنے کی دعوت دیتا۔ ویسے تم میرے ہاتھوں پٹنا چاہو تو تمہاری مرضی۔ کہاں پٹو گے؟ یہاں یا باہر؟"

منڈی والے نے تیسری بار حملہ کیا تو میں بالکل تیار تھا بلکہ جھکنے میں وہ قالین پر چت پڑا تھا۔ "چلو اٹھ جاؤ۔ شاباش" میں نے کہا اور دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ میرے لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ جب کم میں ان کی جان کے لیے خطرہ نہ تھا۔ وہ میری جان نہیں لے سکتے تھے۔

خلافِ توقع واپسی پر میرا سفر باعزت حالت میں نہیں ہوا۔ میری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی گئی لیکن میرے ہاتھ باندھے گئے اور منہ میں کپڑا بھی ٹھونسا گیا۔ میں نے قطعی مزاحمت نہیں کی۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک ٹیکسی نمودار ہوئی اور میں اس کی پچھلی سیٹ پر بن مانس ٹائپ کمپاؤنڈر اور منڈی والے کے ساتھ تشریف رکھنے پر مجبور کر دیا گیا۔ میں نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں غور سے کوٹھی کے محل وقوع کو دیکھا اور فوری طور پر مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ سچ جانتے ہوں گے چودھری دلاور کی کوٹھی کا راستہ دیکھنے کا موقع کیوں فراہم کر رہے ہیں۔ وہ مجھے بے لباس نہیں آنکھوں پر پٹی باندھ کے تو لا سکتے تھے۔ جواب فوراً میری سمجھ میں آ گیا۔ یہ کوٹھی چودھری دلاور کی ہرگز نہیں تھی۔ شاید ان میں سے کسی کی بھی نہیں تھی۔ انھوں نے کسی بھی خالی کوٹھی پر قبضہ کر لیا تھا جس کے مکین کراچی سے باہر یا بیرونِ ملک کہیں بھی ہو سکتے تھے۔ اگر کوئی چوکیدار ہو گا تو صبح بندھا پڑا ملے گا لیکن میں کسی کو ساتھ لے کر

آیا تو وہ اصل مجرم کہیں نہ ہوں گے۔ میں خود مجرم بن جاؤں گا۔ ہاتھوں پیروں کا باندھنا ضروری تھا تاکہ میں راستے میں کوئی مسئلہ نہ بنوں اور میرا منہ بند رکھنا بھی ضروری تھا۔ میں شور نہ مچا سکوں مگر میری آنکھیں بند رکھنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ ان کے لیے مجھے ہوٹل سے نکال کے لانا مشکل تھا۔ یہاں سے واپس ہوٹل بھیجنا مشکل کام نہ تھا۔ ٹیکسی جس راستے سے بھی گزری وہ میرے ذہن میں رہا۔ سگریٹ کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ فلاں روڈ کی اس کوٹھی پر مجھے لوٹ کر نہیں آنا تھا۔ ٹیکسی سلطان آباد کی طرف سے ہوٹل پاکستان کی عمارت سے ذرا آگے ایک درخت کے نیچے رکی تھی۔ منڈی والا باہر نکلا اور اس نے مجھے باہر نکال کر سڑک کے کنارے ڈال دیا۔ پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور ہوا ہو گئی۔ میں نے سر اٹھا کے اس کا نمبر دیکھنے کی کوشش کی لیکن ٹیکسی کی لائٹس آف تھیں۔ مجھے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا۔ رات کے دو بج رہے تھے اور سڑک بالکل سنسان تھی لیکن مجھے امید تھی کہ چند منٹ میں کوئی نہ کوئی ادھر سے گزرے گا۔ میں نے خود کو گھسیٹ کر فٹ پاتھ پر لے جانے کے بجائے سڑک پر ہی پڑے رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں ایک طرف پڑا تھا اور اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ کوئی گاڑی مجھے کچل کر چلی جائے۔

تقریباً دس منٹ بعد ہوٹل پاکستان کی پرانی عمارت کی جانب سے ایک کار نمودار ہوئی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی سیدھی مجھ پر پڑ رہی تھی اور جب کار سیدھی آ کے میرے قریب پہنچی اور آہستہ ہوئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کار سے اترنے والا نوجوان کچھ دیر مجھے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ اس کے ساتھ کار میں ایک لڑکی یا نوجوان عورت بھی تھی۔ پتہ نہیں گاڑی کیوں روک لی۔ خواہ مخواہ کوئی مشکل نہ گلے پڑ جائے، وہ سمجھ کر بولی۔

"تم ٹھہرو ڈارلنگ" نوجوان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ "میں دیکھتا ہوں یہ کیا گڑبڑ ہے" پھر اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے میرے ہاتھوں اور پیروں کی رسیاں کھولنے سے پہلے میرے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا۔ میں نے ایک طویل گہری سانس لی۔

"تھینک یو" میں نے کہا "میں کسی فرشتۂ غیب کے نمودار ہونے کا انتظار ہی کر رہا تھا" عورت نے پیچھے سے خاتون سے کہہ دیجیے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بس آپ ہاتھ کھول دیجیے اور جائیے پھر اس بات کو بھول جائیے۔

www.paksociety.com

کو میں یاد رکھوں گا۔"
نوجوان کچھ نروس سا تھا۔ اس نے فقط سر ہلایا اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد میرے ہاتھوں کو آزاد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی بیوی یا محبوبہ آدھی رات کے وقت اس سنسنی خیز منظر سے خاصی پریشان اور دہشت زدہ تھی اور اسے بار بار مجبور کر رہی تھی کہ خدا کے لیے یہاں سے نکل چلو۔ معلوم نہیں یہ کیا چکر ہے۔ میری بات سن کے اس نے بھی بہتر سمجھی کہ وہ جلد از جلد جائے واردات سے فرار ہو جائے۔

اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا کہ میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے اور اس حرکت کے ذمے دار کون لوگ ہیں۔ بظاہر میں نہ زخمی تھا اور نہ چاہا کہ وہ مجھ سے مزید ہمدردی کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے رکتا۔ میں نے اس کا دوبارہ شکریہ ادا کیا اور وہ کار میں بیٹھ کے رخصت ہو گیا۔ میں نے تمام رسمی تکلفات سے گریز کیا تھا۔ اس کا نام پوچھا اور نہ اسے اپنا نام بتایا۔ پیدل کراس کرنے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ قریب ترین ٹیلی فون

ریڈیو پاکستان میں تھا مگر وہاں داخلہ مشکل تھا۔ میں نے رکشہ کیا اور ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر اور دروازے پر کھڑے ہوئے پہرے دار سے کہا کہ مجھے ایک انتہائی ضروری فون کرنا ہے۔ اس نے پہلے تو پس و پیش کیا کہ یہ سرکاری ٹیلی فون ہے اور عام لوگوں کے لیے نہیں ہے مگر میں نے کہا کہ بھیا ایک موت کی خبر دینا ہے۔ آخر تم بھی تو مسلمان ہو۔ تمھیں بھی تو مرنا ہے ہم سب کی طرح۔ تو اس نے میرے ساتھ چل کے قریب کے ایک آفس کا دروازہ کھول دیا لیکن خود میرے سر پہ سوار رہا۔ میں نے ایمبیسڈر ہوٹل کا نمبر ملایا اور محسن کے کمرے کی لائن مانگی۔ مجھے امید تھی کہ وہ جاگ رہا ہو گا۔ پہلی گھنٹی پر ہی اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"محسن" میں نے کہا۔ "میں تمھارا ماما بول رہا ہوں سکندر بخت"

"سکندر بخت" محسن نے چلا کر کہا اور جواب میں دو ناقابل تحریر گالیاں دیں جو چوکیدار نے نہیں سنیں۔ "کہاں مر گیا تھا تو۔؟"

"بیٹا میں یہاں ریڈیو پاکستان سے بول رہا ہوں" میں نے غمزدہ لہجے میں اداس صورت بنا کے کہا۔

"ریڈیو پاکستان!" محسن نے کہا۔ "اے بھائی یہ رات دو بجے کون سی محفل چل رہی ہے۔ دن میں کوئی موقع نہیں ملا کہ رات کو گانے بیٹھ گیا ہے بے وقت کی راگ؟ معلوم ہے میں کتنا پریشان ہوں۔ رابعہ کتنی پریشان ہے۔ اور"

"وہاں بیٹا۔ بڑی پریشانی کی بات ہے۔ اللہ بخشے یہ ریڈیو پاکستان کے سنٹری صاحب ہیں۔ انھوں نے اجازت دے دی کہ تم سے فون پر بات کر لوں۔ اپنے پیر شاہ کے چچا سسر تھے نا میر شرافت علی۔ وہ فوت ہو گئے ہیں"

"سکندر۔ تو ہوش میں ہے نا۔؟" محسن کی تشویش میں ڈوبی ہوئی آواز آئی "کسی نے کچھ کھلا پلا دیا ہے یا مارا ہے؟"

"نہیں سکندر۔ میر شرافت علی صاحب کا وقت پورا ہو گیا تھا" میں نے کہا "بس بیٹھے بیٹھے جھپک آئی پھر نہ زمین پہ گرے اور ختم۔ اب تو ایسا کر کہ فوراً آ جا۔ ریڈیو پاکستان سے ذرا آگے ڈین صاحب کی کوٹھی سے تیسرا مکان۔ وہاں۔ میں وہیں ہوں" میں نے فون بند کر دیا۔ محسن سمجھ گیا تھا کہ میرا مقصد اسے بلانا ہے اور کوئی بات ایسی ہے جو میں ٹیلی فون پر نہیں کر سکتا۔ چوکیدار نے میرے شکریے کے جواب میں زور سے انا للہ پڑھی اور دروازہ بند کر دیا وہ کچھ حیران ضرور تھا کہ وہ بھانجا کتنا بڑا ہے جسے میں نے بڑے بوڑھوں کی طرح بیٹا کہہ کے فون کیا تھا۔ میں خود کیا بوڑھا کہاں لگتا تھا۔ باہر آ کے میں نے وہ رکشہ پکڑا تھا

سکندر آدھے گھنٹے بعد نمودار ہوا جب میں ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ ذرا دیر پہلے گشت کرنے والے دو سپاہی گزرے تھے اگر وہ مجھے بے مقصد کھڑا دیکھ لیتے تو دفعتاً ایک سو نو میں چالان کر کے حوالات پہنچا دیتے محسن پیدل آیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے اپنے اغوا کی، چودھری دلاور سے مذاکرات کی اور واپسی کی روداد مختصر الفاظ میں سنا دی۔ وہ غور سے سنتا رہا اور خاموشی سے میرے ساتھ اسٹیشن کی جانب رواں رہا۔ اسٹیشن کے ایک معمولی سے ہوٹل میں بیٹھ کے ہم نے وہ چائے پی جو عام حالات میں ہمارا معدہ کبھی قبول نہ کرتا لیکن اس وقت یہی گرم چائے بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ محسن میرے اغوا کے بعد پہنچا تھا اور اسے حیران پریشان کاؤنٹر کلرک نے بتایا کہ چابیاں تو ابھی کچھ دیر پہلے آپ لے گئے تھے۔ محسن کو بھی معلوم ہوا کہ بعد میں سکندر صاحب نے کہا تھا کہ کمرے کا اور کاؤنٹر کا بل کمرے میں بھجوا یا جائے لیکن بیرا پلٹ کے کہہ گیا تو کمرے میں کوئی نہیں تھا چنانچہ وہ لوٹ آیا تھا کلرک خود محسن کے ساتھ گیا اور جب محسن کو اطمینان ہو گیا کہ اس کی کوئی چیز غائب نہیں ہے تو اس نے کلرک کی

درخواست قبول کر لی کہ اس بات کا ذکر منیجر سے نہیں کیا جائے گا۔ اس کا عذر قابل قبول تھا کہ ہم سب مسافروں کو صورت سے کہاں پہچان سکتے ہیں اور پھر شکل سے میں کوئی بھی آدمی اطمینان سے کسی کا نام لے کر چابی مانگے تو چابی موجود ہو اور نام بھی درست ہو تو یہ شبہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چابی مانگنے والا غلط آدمی ہے۔ اس کے علاوہ چابیاں بھی کمرے میں موجود تھیں جس کا مطلب یہ نکالا جا سکتا تھا کہ کسی نے محض شرارت کی یا کرنا چاہتا تھا مگر کسی وجہ سے ناکام لوٹ گیا۔ خیر گزشت والی بات تھی۔ محسن نے کہا کہ جاؤ معاف کیا لیکن بعد میں کمرے کے اندر کوئی دم تم بیٹھے تو تمہاری مغفرت کی دعا کرتا۔ مگر اس بات پر کلرک شکریہ ادا کر کے لوٹ گیا تھا۔ محسن کو قطعی اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ مجھے اس کمرے سے ہائی جیک کیا گیا ہے۔

"سوچنے کی بات یہ ہے محسن کہ مجھے قالین میں لپیٹ کر کیسے لے گئے؟" میں نے کہا۔ "وہ کاؤنٹر کے سامنے سے گزرے ہوں گے۔ کسی نے ان کو دیکھا بھی ہو گا۔ پھر ان کو کسی نے روکا کیوں نہیں گیا۔ اس کا جواب صرف ایک ہو سکتا ہے۔ وہ قالین ان کا اپنا تھا اور وہ پہلے سے ہوٹل کے کسی کمرے میں موجود تھا۔ میرا اشتباہ کرتے ہیں اب میں ثابت کیسے کر سکتا ہوں کہ قالین کے اندر میں بھی تھا۔ اور ثابت کرنے کا فائدہ بھی کیا۔ لیکن مجھے دوسری بات معلوم کرنا ہے۔ آخر کافی میں بے ہوشی کی دوا کس نے ملائی تھی اور کس کی مدد سے ملائی تھی۔ اس میں مجھے کسی ویٹر یا کسی باورچی خانے کے کارکن کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے جس نے پیسے کے لالچ میں یہ حرکت کی۔ یا اس حرکت سے چشم پوشی کی۔"

"ہوٹل والے کبھی نہیں مانیں گے" محسن نے کہا۔ "ان کی نیک نامی متاثر ہوتی ہے۔"

"لیکن میں معلوم کر کے رہوں گا۔ اسی لیے میں نے تمھیں بلایا ہے۔ ورنہ آزادی کے بعد تو میں خود بھی ہوٹل پہنچ سکتا تھا۔ میرے ذہن میں ایک اسکیم ہے۔ ابھی ڈیوٹی پر بھی وہی لوگ ہوں گے جو رات کے وقت تھے۔ ویٹر، کلرک، منیجر سب کی شفٹ صبح چھ بجے سے پہلے ختم نہیں ہو سکتی۔! اب تو ایک کام کر۔ ہم اکٹھے چلتے ہیں۔ تو مجھے کسی کمرے میں ہاتھ پاؤں باندھ کے ڈال دینا اور اپنے کمرے میں جا کے سو جانا۔ اگر نیند آ رہی ہے تو پھر بھی لائٹ آف کر دینا۔ میں اپنی رسٹ واچ اور والٹ وغیرہ سب تیرے حوالے کر دوں گا۔"

"یہ کیا ڈرامہ ہے برادر نسبتی؟" محسن رضا نے سگریٹ نکال کے مجھے پیش کی۔

"سالا اعظم۔ ذرا صبر و تحمل سے کام لیجیے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟" میں نے سگریٹ لے کر کہا۔ "جو ہو گا آپ کے سامنے آ جائے گا۔"

"برادر نسبتی۔ میں ایسے کسی ڈرامے میں کوئی پارٹ نہیں لے سکتا جس کے پلاٹ کا مجھے علم نہ ہو۔ اور انجام کے بارے میں اطمینان نہ ہو" محسن نے کہا۔ "اگر وہ کوئی طبعی حماقت ہوئی جسے آپ اپنی ذہانت سمجھتے ہیں تو کیا ہو گا۔ ابھی تو میں صبح منہ دھو سکتا ہوں۔ بعد میں رونا ثابت ہو گا۔" میں نے بتا دیا کہ میرا ارادہ کیا ہے۔ پلاٹ سے مطمئن ہو کے محسن نے اتفاق کیا اور مسرت سے کہا۔ "وہ ٹائل اور میرے کمرا ایک وضع اپنا لیا۔" پھر ہم دونوں نے کچھ اور سیر کی یعنی ایمبیسڈر ہوٹل تک مارچ کیا۔ صبح کے ساڑھے چار بجے تھے اور یہی وقت تھا جب میں رابعہ نے فون کر کے پل پر سے کیسا اپ کیا تھا۔ محسن نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہم اسی طرح علی الصبح سیر کرتے رہے تو خدا ہمیں صحت عقل اور دولت سب عطا کرے گا۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ انگریزی محاورے کے مطابق عقل مند دولت مند اور تندرست بننے کے لیے صبح دم جاگنا ہی نہیں سرِ شام سو جانا بھی ضروری ہوتا ہے۔

ایمبیسڈر ہوٹل میں داخلے کے لیے ہم نے شریفانہ راستہ اختیار نہیں کیا۔ دروازے پر سیلوٹ کرنے والا دربان موجود تھا جو ہمیں آتی صبح غلط سمت سے آتے اور غلط سمت میں جاتے دیکھتا تو شکوک میں مبتلا ہو جاتا۔ ہم نے ایک دیوار پھاندی اور باغیچے میں گرے جہاں اس وقت کوئی بھی موجود نہ تھا۔ تھوڑا سا مشورہ کرنے کے بعد میں نے "جائے واردات" تلاش کی اور میرے ساتھ دوست لیٹ کر محسن کو مجبور قرار تم کیا کہ وہ مجھے باندھ دے اور میرے منہ میں رومال بھی ٹھونس دے۔ محسن نے دو منٹ میں یہ کارروائی مکمل کی اور غائب ہو گیا۔ کمرے میں پہنچتے ہی اسے کاؤنٹر کلرک کو فون کرنا تھا کہ سکندر نام کے جو مہمان اس کی معیت میں آئے تھے اور اپنا بل بھجوانے کے لیے کہہ گئے تھے کیا وہ جاتے وقت کوئی پیغام دے گئے تھے۔ اور کلرک کا جواب سن کے اسے حیرانی پریشانی اور تشویش کا اظہار کرنا تھا اور سو جانا تھا۔ پانچ بجنے والے تھے۔ مجھے امید تھی کہ چھ بجے تک صبح کا اجالا نمودار ہو جائے گا اور اس کے بعد کوئی نہ کوئی مجھے ضرور دیکھ لے گا۔ لان پر لیٹنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے جھونپڑا پھولوں کے درمیان صبح کی خنک فضا میں جو مہک ہوتی ہے اس کا

مقابلہ کوئی فرنچ پرفیوم اور ٹیڈی کلون نہیں کر سکتے مگر اس حالت میں لیٹنا ایک مختلف تجربہ تھا۔ جسے قطعی خوش گوار نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے خود ہی محسن سے کہا تھا کہ رعایت نہ برتنے ورنہ ڈرامہ حقیقی نہیں لگے گا چنانچہ اس نے میری مشکیں بہت کسی تھیں جیسے قربان شاہ پر معتوب حضرات کی کسی جاتی ہوں گی۔ اتنا سخت تو مجھے چودھری دلاور کے چمچوں نے بھی نہیں باندھا تھا لیکن اب مجھے یہ ایک گھنٹہ اسی کسمپرسی اور بے بسی کے عالم میں گزارنا تھا۔ اس رات کا تجربہ بھی نوعیت کے اعتبار سے منفرد تھا سوائے ان کے جو میری زبان پر اعتبار کرتے تھے کوئی یہ نہ مانتا کہ میں نے رات کہاں اور کیسے گزاری۔ نہ کوئی اس بات کا گواہ تھا کہ مجھے اغوا کر کے کیسے لے جایا گیا تھا اور نہ اس بات کا شاہد تھا کہ چودھری دلاور سے میری کیا بات ہوئی تھی اور کیسے ماحول میں ہوئی تھی۔ میں پھر اسی ہوٹل کے کمرے میں پہنچ جاتا تو یہ بھی ثابت نہ ہوتا کہ میں کمرے سے گیا تھا۔ میں پولیس کو رپورٹ کرتا تو پولیس میری رہنمائی میں قربان شاہ کی اس کوٹھی تک جاتی لیکن وہاں کون ملتا جو میری کہانی کو سچ مانتا۔ اگر مجھے اس ٹرک کا نمبر یاد ہوتا جس میں قالین سے جایا گیا تھا اور پولیس اسے ڈھونڈ نکالتی تو وہ ڈرائیور اور کلینر کب تسلیم کرتے کہ قالین میں کوئی آدمی بھی تھا۔ وہاں لیٹے لیٹے میں نے یہ بھی سوچا کہ منڈی والے ٹیکسی ڈرائیور کے مجھ سے ایک رات پہلے کے واقعات کے بارے میں کوئی بات کیوں نہیں کی۔ شاید ابھی خود اسے بھی معلوم نہ ہو کہ میں کے ساتھ آنے والے وہ تینوں نہر میں ڈوب مرے ہیں۔ فوٹو جینی منشی کے اور سلامت شاہ کے حشر کا حوالہ دے کر دھمکی کے طور پر فیڈ دیا تھا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ سلامت شاہ کی لاش برآمد ہو چکی ہے اور یہ خبر بھی پھیل گئی ہے یا منڈی والے کو علم ہے کہ میں لاش دیکھ چکا ہوں۔؟ مگر اسے کیسے علم ہو سکتا ہے؟ شاید وہ بھی یہی سمجھے گیا ہو کہ لاش ہر جرثومے یا غائب ہو گئی؟ اور اس نے میرا سامان غائب پایا ہو تو سمجھ گیا ہو کہ میں آیا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ واردات میں داخل ہونے والا لاش دریافت نہ کرے۔

میں خیالات کی رو میں بہتا جا رہا تھا کہ کوئی چیز دھڑام سے مجھ پر گری۔ اگر میں بندھا ہوا نہ ہوتا تو اچھل پڑتا اور میرا منہ بند نہ ہوتا تو میرے حلق سے کوئی صدائے احتجاج بھی بلند ہوتی۔ اسی طرح جیسے مجھ سے ٹکرا کے سجدہ ریز ہو جانے والے نے بلند کی تھی۔ وہ ہوٹل کا ہی کوئی ملازم تھا جو ہاتھ پہ چائے کی ٹرے اٹھائے نہ جانے کس کو بیڈ ٹی پہنچانے کو شارٹ کٹ سے کہیں جا رہا تھا۔ ٹھوکر کھا کے ٹرے اس کے ہاتھ سے اڑ گئی اور برتن ایک چھناکے سے بکھر گئے۔ چمچے کپ اور پیچ زمین پہ پھیل گئے۔ ایک کپ میرے سر پر لگا۔ چائے دانی مجھ سے چند فٹ دور اوندھی ہو گئی اور چند لمحوں میں مہکتی چائے کی دل نواز خوشبو آئی۔

"ہائیں... یہ کیا..." ٹکرانے والے نے سنبھل کے کہا اور مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اس نے زور سے چیخ کی۔ اگر رات کا اندھیرا ہوتا تو یہ چیخ ایک چیخ بن جاتی۔ وہ سمجھا کہ اس کی راہ میں کوئی لاش حائل ہو گئی ہے لیکن کپڑے پہنا کھو کے اسے پھر پڑے دیکھ رہا تھا۔

"اوہ... او بھائی صاحب... آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟" وہ ہکلا کے بولا۔ پھر اسے اپنے احمقانہ سوال کا احساس ہوا۔ "میرا مطلب ہے کہ جناب... یہاں کیوں پڑے ہیں۔ کس نے باندھ کے ڈالا ہے آپ کو؟..." یہ سارے سوال اس کے لبوں پہ آ گئے تھے اور اسے یہ خیال نہ رہا تھا کہ میں جواب دے ہی نہیں سکتا۔ بقول شاعر

وال لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں۔ یاں ایک خامشی تری سب کے جواب میں۔ اس کا ہاتھ رسیوں کی گرہ کی بجائے میرے منہ کی طرف۔ کپڑا نکلتے ہی میں نے تیسرا لمبا سکون کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے بہت اچھا گواہ فراہم کیا۔

"بس... تھینک یو۔" میں نے کہا۔ "کون ہو تم؟ ابھی رسیاں مت کھولو۔"

"جی... میں ویٹر ہوں سر۔ عبداللہ۔" اس نے بہت عاجزانہ لہجے سے مرعوب ہو کے کہا۔

"اچھا عبدل۔ شور مچانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "جاؤ اپنے مینیجر صاحب کو خاموشی سے بلا لاؤ۔ فوراً کسی اور نے دیکھا تو ہوٹل کی بدنامی ہوگی۔ میں اس ہوٹل میں مقیم ہوں۔ اور کاؤنٹر کلرک سے کہو مسٹر محسن رضا کو بھی لے آئے۔"

"یس... یس سر..." حواس گم کردہ عبدل نے دوڑ لگائی اور چند منٹ میں مینیجر کے ساتھ آ پہنچا۔ یہ وہی مینیجر تھا جس سے میں نے گزشتہ رات کافی دیر سے آنے کی شکایت کی تھی۔

"آپ؟... یہ کیا معاملہ ہے سر؟..." مینیجر نے گھبرا کے بلکہ بوکھلا کے پریشانی سے ادھر ادھر دیکھا۔ "دیکھو عبدل کوئی

آ تو نہیں رہا ہے۔ آخر آپ بندھے رہنے پہ کیوں مصر ہیں سر؟"

"میں یہ چاہتا تھا کہ پہلے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔" میں نے ریلیکس ہو کے کہا۔ "اب تم میری رسیاں کھول سکتے ہو۔ اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تمہیں کیا، میں پولیس کو بتاؤں گا۔ وہ خود معلوم کر لیں گے۔"

"او گاڈ۔" مینیجر نے مزید پریشان ہو کے کہا۔ "عبدل۔ جلدی... صاحب کی رسیاں کھولو۔"

ابھی وہ دونوں رسیاں کھول رہے تھے کہ محسن اور کاؤنٹر کلرک آ پہنچے۔ "مسٹر سکندر بخت۔" محسن نے چلا کے کہا۔ "یہ کیا ہے؟"

"پلیز... پلیز... ذرا آہستہ..." مینیجر نے کہا۔ "مہمان جاگ جائیں گے۔ کوئی آ جائے گا... او گاڈ۔" اس نے آخری گرہ بھی محسن کے ساتھ مل کر کھولی۔ "آئیے... میرے آفس میں۔ وہاں بتائیے مجھے کہ بات کیا ہے۔ اس کے بعد پولیس کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں خود طلب کروں گا۔ مگر پہلے..."

"یہ پولیس کیس ہے۔" محسن رضا نے چراغ پا ہو کے کہا۔ "مسٹر سکندر بخت رات کو مجھ سے ملنے آئے تھے۔ یہ کلرک جانتا ہے۔ انہوں نے کھانا بھی کھایا تھا۔ اور کہا تھا کہ کافی کمرے میں بھجوا دیا جائے۔" اس آخری بات پہ کلرک کا رنگ فق ہو گیا۔

"یس سر... یس سر... مجھے سب معلوم ہے... لیکن انڈرسٹینڈ... پلیز... یہ گڈ ول کا معاملہ ہے۔ ہوٹل کی بدنامی ہوتی ہے اگر کوئی اسکینڈل بنے۔ میں آپ کو پوری طرح مطمئن کروں گا... جیسے آپ چاہیں گے۔" مینیجر نے کہا۔ "میں آپ سے پوری طرح تعاون کروں گا۔ آپ مجھ سے تعاون کیجیے۔ یہ فرسٹ کلاس ہوٹل ہے۔ آئی ایم ویری سوری۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا..."

دو منٹ بعد ہم مینیجر کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ائیرکنڈیشنڈ کمرے میں شیشے کا بہت زیادہ استعمال ہوا تھا۔ چنانچہ اندر آواز باہر جانا ناممکن تھی۔ عبدل کو کافی اور سینڈوچ لانے کا حکم دے کر اس نے کلرک سے کہا کہ وہ کاؤنٹر سنبھالے اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "یس سر۔ اب بتائیے۔ آپ کے ساتھ یہ زیادتی کس نے کی؟"

"مینیجر۔" میں نے کہا۔ "شاید تمہیں یاد ہو گا کہ میں کچھ دیر پہلے ایک شکایت لے کر آیا تھا۔"

"جی ہاں۔ کافی آنے میں کچھ "تاخیر" کا مسئلہ تھا۔" اس نے کہا۔ "مگر کافی آ گئی تھی۔"

"یس۔ کافی آ گئی تھی۔ اس کافی کا ذائقہ بہت عجیب تھا۔" میں نے کہا۔ "بالکل جوشاندے کی طرح۔ جوشاندہ پیا ہے کبھی؟"

"یس... یس سر... مگر ہم تو بہترین کافی استعمال کرتے ہیں۔ میکسویل ہاؤس۔"

"ہاں۔ آپ لوگوں کی کافی ہمیشہ بہت اچھی ہوتی ہے کل اس کے بدذائقہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس میں بے ہوشی کی دوا ملا دی گئی تھی۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

مینیجر اچھل پڑا۔ "بے ہوشی کی دوا...؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن۔"

"ہاں۔" میں نے میز پہ ہاتھ مارا۔ "مجھے کافی میں بے ہوشی کی دوا دی گئی تھی۔ تم چیلنج کرتے ہو تو میں ابھی پولیس کو رپورٹ ـــــ کرتا ہوں۔ وہ مجھے میو اسپتال بھیج دیں گے۔ وہاں میرے معدے میں موجود غذا کا کیمیائی تجزیہ ہو گا تو یہ ثابت ہو جائے گا..."

"نو... نو سر۔" مینیجر نے بوکھلا کے کہا۔ "میں قطعی چیلنج نہیں کر رہا ہوں۔ میرا مطلب تھا یہ کیسے ممکن ہے۔ خیر میں ابھی پوچھتا ہوں... آپ آگے بتائیے... اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد مجھے کاؤنٹر کلرک نے بتایا کہ مسٹر محسن رضا آ گئے ہیں۔ اس نے خود مسٹر محسن رضا کو جانا ہی۔ میں چنانچہ میں اوپر گیا اور کمرے میں جا کے بے ہوش ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے مجھ پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔"

"میں رات کو گیارہ بجے آیا تھا تو کاؤنٹر کلرک نے اپنی غلطی تسلیم کی تھی۔ وہ میرے ساتھ کیسے گیا بھی تھا مگر میرا نقصان کوئی نہیں ہوا تھا اور چابیاں بھی موجود تھیں اس لیے میں نے شکایت نہیں کی۔" محسن نے کہا۔ "وہ بے چارا معقول کلرک ہے۔"

"مگر یہ اصولاً غلط ہے۔" مینیجر نے ایک بٹن دبایا اور کاؤنٹر کلرک کو انٹرکام پہ بات کر کے طلب کیا۔ "مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ اچھا ہوا۔ لیکن فرض کیجیے وہ چابیوں کے پیچھے پڑ گئے۔ یا فرض کیجیے وہ تمام جم لگا جاتے تو آپ کو رپورٹ کرنا چاہیے تھی۔"

"فرض کرنے کی بات چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "جو ہوا ہے اس کی بات کرو۔ کمرے میں دو افراد موجود تھے۔ وہ مجھے ایک قالین میں لپیٹ کر باہر لے گئے۔ میں نہیں جانتا وہ

www.paksociety.com

کمان لگ گئے تھے مگر کاؤنٹر کلرک نے ان کو یقیناً دیکھا ہوگا۔ ایک تولیہ جس میں سالم آدمی لپٹا ہوا ہو معمولی سا پارسل نہیں ہوتا کہ کوئی جیب میں ڈال کے گزر جائے۔"

مینیجر نے پھر انٹرکام کا بٹن دبایا۔ "یو باسٹرڈ۔ میں تمھیں برطرف نہیں کروں گا گولی مار دوں گا۔ ابھی تک آئے نہیں تم؟"

"باہر ایک ٹرک تھا۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تولیہ ٹرک میں رکھا گیا اور ٹرک چلا گیا۔ معلوم نہیں کہاں۔ اس وقت تک مجھے کچھ ہوش تھا۔ دوبارہ ہوش میں آنے پر میں نے دیکھا کہ میں ہوٹل کے باغیچے میں لیٹا ہوں۔ میری جیب میں دس ہزار رکھے تھے جو اب نہیں ہیں۔ علاوہ رسٹ واچ کے اور کچھ رقم کے جو پرس میں تھی۔ تقریباً بچاس ساٹھ روپے۔ مجھے شک ہے کہ اس ڈکیتی میں وہ ویٹر شامل ہے جس نے مجھے چوبیس نمبر ٹیبل پر سرو کیا تھا۔"

"کیا؟" مینیجر ایک دم اچھلا اور پھر بیٹھ گیا۔ میرے اس آخری جملے کا اثر بجلی کے جھٹکے سے کم نہیں ہوا تھا۔ "چوبیس... مجھے یاد ہے آپ نے چوبیس نمبر ٹیبل کی طرف اشارہ کیا تھا۔ او مائی گاڈ۔ یہ سب کیا ہے... وہ... وہ تو غائب ہے۔ بالکل غائب ہے۔"

کاؤنٹر کلرک مجرموں کی طرح اندر داخل ہوا اور سر جھکا کے کھڑا ہوگیا۔ اسی وقت عدیل کافی اور سینڈوچ لے کر اندر آیا۔ "غائب ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا مطلب؟ عدیل، چوبیس نمبر ٹیبل پر رات کون تھا؟"

"مطلب یہ کہ وہ اس واقعے کے فوراً بعد غائب ہوگیا۔ بغیر بتائے کہیں چلا گیا۔" مینیجر نے سر جھٹک کے کہا۔ "تم جاؤ۔" اس نے عدیل کو اشارہ کیا۔ پھر وہ کلرک پر برس پڑا۔ "گدھے۔ نالائق آدمی کو دیکھے بغیر چابی تھما دی۔ میں تمھیں پولیس کے حوالے کردوں گا۔ کون تھے وہ۔ ہوٹل میں ڈکیتی۔ مائی گڈنس۔ کسی بھی مہمان کے کمرے میں جو چاہے گھس جائے گا؟"

"میرا خیال ہے اس کا قصور نہیں۔" محسن نے کہا۔ "اس وقت رش تھا۔ میں کل ہی آیا ہوں۔ یہ مجھے پہچانتا نہیں۔"

کاؤنٹر کلرک نے شکرگزار ہو کے محسن رضا کو دیکھا۔ "ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا سر۔ اور آئندہ بھی نہیں ہوگا۔"

"یہ بتاؤ تمھارے سامنے سے کوئی تولیہ لے کر گزرا تھا لپٹا ہوا تولیہ؟" مینیجر نے کہا۔

"کاؤنٹر کلرک بولا۔ "ایک صاحب صبح آئے تھے وہ چیک کے لیے گئے تو کارپٹ خرید کے لائے تھے۔ اور چ

کمرہ نمبر تین سو دس میں پہنچایا تھا۔ وہ رات کو کمرہ خالی کر گئے۔ جاتے وقت تولیے بھی لے گئے تھے۔ جیسا اندازہ لگایا تھا۔ وہ کسی ٹرک کے ڈرائیور اور کلینر تھے۔ چہرہ میں نے نہیں دیکھا۔ تولیہ دوسری طرف تھا۔"

میری کہانی واقعات کی شہادت اور گواہوں کی گواہی سے درست ثابت ہو رہی تھی۔ "اچھا تم جاؤ۔" مینیجر نے کاؤنٹر کلرک سے کہا۔ "اس بار صاحب کے کمرے کے بیرے کو اور ذرا چوکیدار کو بلاؤ۔ اور دیکھو وہ شریف کہاں ہے جو رات کو چوبیس نمبر ٹیبل پر تھا۔ اس کا کچھ پتا چلا کہ اس کے گھر بھیجو۔"

بعد میں چوکیدار نے بھی تصدیق کر دی کہ ایک ٹرک میں خاصا بڑا لپٹا ہوا تولیہ لے جایا گیا تھا لیکن اس نے ٹرک کا نمبر وغیرہ نوٹ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ ویٹر جس کا نام شریف تھا، بدستور غائب تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ جب وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر گیا تھا تو کسی نے اس کو جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے لیے باہر جانے سے سروس کا راستہ نکل پڑتا تھا۔ مینیجر برہم ہوا تھا۔ اس نے سب سے پوچھا تھا لیکن کسی کو کچھ معلوم ہوتا تو بتاتا۔ نام کا کوئی مہمان آیا تھا۔ تیمور ... اور آج بھی وہ اتنا ذمے دار ہرگز نہیں تھا کہ ڈیوٹی پر لعنت بھیج کے چلا جائے۔ میں نے مینیجر کو مشورہ دیا کہ باہر کے بجائے شریف ویٹر کو بھی تلاش کیا جائے اور اگر کمرہ نمبر تین سو دس خالی ہے تو اس کے باتھ روم میں بھی جھانک لیا جائے۔

مینیجر نے تشویش سے میری تجویز پر غور کیا۔ ایک کاؤنٹر کلرک کو طلب کیا اور اسے مکمل رازداری کے ساتھ نمبر تین سو دس کا جائزہ لینے کا اور پھر خاموشی سے رپورٹ دینے کا حکم دیا۔ "مجھے بھی اب وہاں میں کالا نظر آتا ہے... وہ جو آپ کو لے گئے تھے۔ انھوں نے ویٹر شریف کی وردی پہن لی۔ پھر کافی میں دوا ملائی۔ اپنے تولیے میں لپیٹ لیا اور... مگر سوال یہ ہے سر کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟" اس نے کافی کے ساتھ سینڈوچ آگے بڑھائے۔

"کیا اب بھی شک کی گنجائش ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ مجھے لوٹنا چاہتے تھے۔"

"لوٹنے کا یہ طریقہ بہت عجیب... اور ذرا مشکل۔ خدانخواستہ آپ کے کوئی دشمن تو نہیں تھے؟" وہ بولا۔

"دشمن ہوتے تو مجھے زندہ چھوڑتے؟" میں نے کہا۔ "میں نہ کسی قبیلے کا سردار ہوں۔ نہ سیاسی لیڈر۔

بزنس میں کون ہوگا۔ یہ صرف ڈکیتی کی منظم واردات تھی۔ بظاہر انھوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کام کیا۔ شاید ان کا طریقہ واردات یہی ہو۔" "ہوگا۔ یہ کیس بہت سنگین ہے اور پولیس کو نہیں اسپیشل پولیس کو اس کی تحقیقات کرنا چاہیے۔ ہوٹل کی بدنامی کا مسئلہ ہے۔ کون جانے ویٹر شریف یا کوئی اور ان سے مل گیا ہو۔ لالچ بری بلا ہے۔ گھر کے بھیدی لنکا ڈھاتے ہیں۔"

مینیجر نے بڑے انداز سے نفی میں سر ہلایا۔ "ویٹر شریف واقعی شریف ہے۔ پرانا آدمی ہے۔ اور ہم آدمی دیکھ کر رکھتے ہیں۔ ہوٹل کے عملے کا کوئی رکن یہ جرأت نہیں کر سکتا۔"

"پولیس خود معلوم کرے گی۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "بعض اوقات اندازے غلط ہو جاتے ہیں۔"

"دیکھیے۔ یہی میں عرض کر رہا ہوں۔" مینیجر نے جلدی سے کہا۔ "پولیس اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتی۔ آپ کے لیے تو صرف یہ مزید پریشانی کا باعث بن سکتی ہے اور وہ بدمعاش تو گئے۔ پولیس انھیں کہاں تلاش کرے گی؟ آپ تو جانتے ہیں پولیس والے کتنے بدنام ہیں۔ خود مجرموں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ بفرض محال پولیس نے انھیں پکڑ لیا تب بھی مال کہاں برآمد ہوگا۔ اور ہوا تو آپ کو کہاں ملے گا۔ دوسرے میں ذاتی طور پر اس کے حق میں نہیں کہ پولیس کو رپورٹ کی جائے۔ وہ تو شریف ویٹر کو بھی نہیں، کاؤنٹر کلرک کو بھی پکڑ کے لے جائیں گے۔ بے چارا معمولی کلرک ہے۔ اور پولیس تو آدمی اٹھاتی ہے۔ وہ مجھے بھی لے جائیں گے۔ باورچی خانے والوں کو بھی اٹھا لیں گے۔ جتنے آدمی پکڑے جائیں گے اتنا ہی ان کا فائدہ ہے۔ ہوگا کچھ نہیں۔ وہ سب کو حسب حیثیت جوتے ماریں گے اور پیسے لے کر چھوڑ دیں گے اور کیس داخل دفتر کر دیں گے مگر اس چکر میں ہوٹل کی کتنی بدنامی ہوگی۔ اور مالک کو علم ہوگا تو حساب مجھ سے برابر کیا جائے گا۔ آپ اگر اتفاق کریں تو... تو میری ایک تجویز ہے۔ باہمی مفاد کی بات ہے۔ میں آپ کا سب نقصان پورا کر دیتا ہوں۔ کتنی رقم تھی؟ دس ہزار۔ رسٹ واچ اور پرس کی رقم ملا کے مزید ایک ہزار، کل گیارہ ہزار۔ اگر میں کیا چیک پیش کر دوں؟"

"اور جو پریشانی مجھے اٹھانا پڑی؟ لاؤ نفسیات متقدم... گری اور بدنظمی کے باعث۔" میں نے میز پر ہاتھ مارا۔

"وہ... وہ میں... میں اس پر معافی کا خواستگار ہوں۔ انشورنس بہرحال... بس بات یہیں ختم کیجیے۔" مینیجر نے کہا۔

"آپ کے قیام و طعام کے تمام اخراجات ہمارے ذمے۔ جب تک آپ کا دل چاہے رہیے۔ میں آپ کو دوسرا بہتر کمرہ دے دیتا ہوں۔ پورا سوئٹ۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔" میں نے گویا اس کی مجبوری کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ "آپ جیسے لوگ بدنامی کے خوف سے پولیس کیس نہیں بننے دیتے۔ اور وہ بدمعاش اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اب کسی اور ہوٹل میں چلے گئے ہوں گے۔ پاکستان میں ایک ہزار ہوٹل تو ہوں گے سب میں واردات کر لیں گے۔ خبر ایک بھی نہیں آئے گی۔ سب کہیں گے آج تک ایسا نہیں ہوا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سر۔ لیکن ہماری مجبوری بھی دیکھیے۔ سارا کاروبار متاثر ہوتا ہے۔ اور پھر یہ اخبارات والے جو صرف سنسنی خیز خبریں چھاپتے ہیں۔ خیر میں چیک پیش کرتا ہوں۔" اس نے کھٹ سے دراز کھول کے چیک بک نکالی اور گیارہ ہزار کی رقم کا بیئرر چیک بنا کے مجھے پیش کیا جسے میں نے محسن کی طرف دیکھ کے بادل ناخواستہ اور تذبذب کے ساتھ قبول کیا۔ مینیجر ہمارا بہت احسان مند بھی ہوا مگر میں جانتا تھا کہ اتنی بڑی واردات پر اپنی نااہلی کے باعث پیدا ہونے والی ہرجانے کی رقم وہ مالک سے وصول کرے گا اور مالک اس کی معاملہ فہمی اور تدبر کا معترف ہو جائے گا کہ گیارہ ہزار میں ہوٹل کی ساکھ بچالی۔ میں نے چیک جیب میں رکھا ہی تھا کہ کاؤنٹر کلرک پھولی سانس کے ساتھ آیا۔ جیسے اس کے تعاقب میں بھوت ہو۔ بمشکل تمام اس نے بتایا کہ ویٹر شریف واقعی کمرہ نمبر تین سو دس کے باتھ روم میں سولہ بجے سے بے ہوش پڑا ہے یا وفات پا چکا ہے۔ وردی اور نیکر غائب ہے۔ صرف بنیان پہنے لیٹا ہے۔

ویٹر شریف صرف بے ہوش تھا۔ ہوش میں آنے پر اس نے بتایا کہ کمرہ نمبر تین سو دس میں ٹھہرنے والوں نے اسے طلب کیا تھا۔ معلوم نہیں انھیں نام کس نے بتایا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ چوبیس نمبر ٹیبل پر سروس کر رہا ہے تو اسے کہا گیا کہ بل کی رقم کمرے سے ملے گی۔ وہ لوگ کھانا کھا کے اٹھے ہی تھے چنانچہ شریف دو منٹ بعد ان کے کمرے میں جا پہنچا۔ انھوں نے سو کا نوٹ دیا اور پھر کہا کہ کافی لاؤ۔ اس نے کہا کہ چوبیس نمبر ٹیبل پر جو صاحب کھانا کھا رہے ہیں ان کو کافی پہنچاتے ہی وہ روم سروس سے کافی لے کے آئے گا اور بل کی باقی رقم بھی لوٹائے گا۔ اتنا سنتے ہی ان میں سے ایک نے شریف کو دبوچ لیا اور بے ہوش

www.paksociety.com

پر ڈال دیا۔ دوسرا اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ میں نے شریف کا منہ دبا رکھا تھا کہ وہ آواز نہ نکال سکے۔ دوسرے نے جیب سے انجکشن سرنج نکال کے شریف کا بایاں بازو دبایا اور اس کی نس میں کوئی انجکشن لگا دیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا اور ہوش آیا تو باتھ روم میں تھا۔ اس کی وردی اوپر ٹنگی ہوئی تھی اور کمال یہ کہ اس میں وہ سو کا نوٹ بھی تھا۔ ویٹر شریف یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے ساتھ یہ شریفانہ سلوک کیوں کیا گیا اور منیجر سمجھنے سے قاصر تھا کہ باورچی خانے میں یا ہال میں کسی نے ویٹر کی صورت پر غور کیوں نہیں کیا۔ میں نے اسے بھی نے ٹکیلے شریف سے ایک سوال کیا اور شریف نے تسلیم کیا کہ ان میں سے ایک اپنے قد و قامت اور رنگ کے اعتبار سے شریف جیسا تھا۔ اس کی مونچھیں بھی ویسی ہی تھیں۔ یہ بات منیجر اپنے تجربے کے باعث جانتا تھا کہ رش کے اوقات میں کوئی کسی کی طرف نگاہ اٹھا کے نہیں دیکھتا۔ سب کے ہاتھ پر ٹرے اس طرح رکھی ہوتی ہے کہ پورا چہرہ نظر بھی نہیں آتا اور بالکل ایک جیسی وردی میں اسی قد و قامت اور رنگ کا آدمی آ جائے تو خوب صورت دیکھے بغیر کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتا۔ رات کے کھانے کے دوران جب ہال بھرا ہوا تھا لوگ آ جا رہے تھے اور ویٹر مصروف تھے کمرہ نمبر تین سو دس والے میرے قریب ہی بیٹھے تھے چنانچہ انھیں بھی شریف ویٹر نے ہی سرو کیا۔ میں اپنے خیالات میں اتنا منہمک تھا کہ میں نے کسی پر توجہ نہیں دی۔ میرا مطلب ہے سوائے ان چہروں کے جو توجہ کے مستحق تھے۔ کافی دیر میں آنے کا سبب یہ تھا کہ ویٹر تبدیل ہوا۔ پھر اس جعلی ویٹر نے کافی میں ملاوٹ کی اور میری عدم موجودگی میں کافی میز پہ رکھ کے چلا گیا۔ وہ اسی انتظار میں رہا کہ میں آخیر کی شکایت کرنے اٹھوں تو وہ ٹرے رکھ جائے۔ اس نے دس منٹ کے لیے شریف کی وردی استعمال کی۔ پھر واپس اپنے کمرے میں جا کے لباس بدلا اور شریف کی وردی وہیں باتھ روم میں رہ گئی۔ انھوں نے شریف کو بھی باتھ روم میں پہنچایا اور میرے کمرے میں جا پہنچے۔

مجھے بے ہوش کرنے کے بعد وہ یقیناً اپنے کمرے میں اٹھا کے لے گئے ہوں گے جہاں انھوں نے دن میں ایک تابوت لا کے رکھ دیا تھا۔ اپنے کمرے سے سامان اور تابوت اٹھا کے وہ کمرہ خالی کر گئے اور جس نے چارج لیا اس نے کمرے پر ایک تالا ان کے کمرہ مقفل کر دیا۔ جب کاؤنٹر کلرک نے مجھے بتایا کہ کمرہ چودھری ملاور کے نام سے بک کرایا گیا تھا تو مجھے فوراً ایک خیال آیا لیکن میں نے بات کو زبان تک آنے سے پہلے روک لیا۔ جب اس تمام پس منظر سے فارغ ہو کے ہم کمرے میں پہنچے تو صبح کے پونے آٹھ بج رہے تھے۔ منیجر نے اپنے طور پر تمام معاملات طے کر لیے تھے اور بہت مطمئن تھا۔ فوراً فوراً اس نے بیلا اور شریف کو اور کاؤنٹر کلرک کو بھی سمجھا دیا کہ انھوں نے کوئی بات کی تو اچھا نہیں ہو گا۔ یہ بات وہ خود بھی سمجھتے تھے چنانچہ منیجر کے لیے تشویش کی کوئی بات نہ رہی تھی۔

"واہ برادر نسبتی!" محسن نے کمرے کا دروازہ بند کر کے بھی ایک زبردست قہقہہ اور دھپ مار کے کہا۔ "ایسا صدمہ ہو عمر بھر!"

"سالا ایک نمبر!" میں نے کہا۔ "عقل مندوں نے کہا ہے لالچ بری بلا ہے۔ سامان اٹھائیے اور خیریت سے نکل چلیے۔"

"کیوں؟" محسن نے حیرانی سے کہا۔ "ہم نے کوئی دھوکا بازی نہیں کی۔ اس ہوٹل میں مجھے جس مصیبت کا سامنا پڑا اس کا معاوضہ گیا وہ تیرا کچھ نہیں۔"

"یہ بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے کچھ اندازہ ہے کہ شریف کی وردی پہننے والا کون ہو سکتا ہے؟ وہی تم والا ہے۔"

"تم نے تو دیکھا ہی نہیں، تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" محسن بولا۔

"آخر وہ میرے سامنے آنے سے کیوں گریز کر رہا تھا؟" میں نے کہا۔ "اسے ڈر تھا کہ کہیں میں اسے شناخت نہ کر لوں اور یہ خود صرف ایک ہی شخص کر ہو سکتا تھا جسے میں دیکھ چکا تھا۔ انجکشن لگانے والا تو میرے لیے اجنبی تھا البتہ منڈی والا باپ دل کے چہرے سے ذرا باقی تھا۔ شاید ویٹر کی پگڑی کے نیچے آگئی ہو گی سو وہ نمایاں ہو جاتا مگر اس کے باوجود وہ انتظار کرتا رہا کہ انھیں تو کافی رکھی جائے۔ وہی میرے کمرے میں پیچھے چھپا ہوا کھڑا رہا ہو گا اور اس نے ہی مجھے باتھ روم میں کیا ہو گا۔"

"تیری بات سمجھ میں آتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن اب فرار ہونے کا مقصد!"

"میں بہت گمنام آدمی نہیں ہوں محسن!" میں نے کہا۔ "میرا نام اور میری تصویر اخبارات کی زینت بن چکی ہے۔ آج اگر سلامت شاہ کے بارے میں خبر آئی تو بھی کوئی رپورٹر اس کا رشتہ ڈھونڈ نکالے اور پھر تصویر لے کہ میر شرافت علی کے مبینہ قاتل کو پناہ دینے والا

ہمارے مقدمے کے سب سے اہم گواہ کو قتل کر دیا گیا تو حقیقت کبھی پولیس تک نہیں پہنچے گی مگر مزید خطرہ مول لینے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ ابھی ترپ کا پتا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم واک آؤٹ کر جاتے ہیں کہ جس ہوٹل میں شرفا محفوظ نہیں وہاں ہم مفت نہیں رہ سکتے۔ تو بے چارے منیجر کی کرا جلد سے جلد ہو سکے ٹھکانے پر پہنچا دے جانے کے بعد سب ہمیں بھول جائیں گے مگر یہاں بیٹھے ہوئے پولیس آگئی تفتیش کے لیے تو سب کھیل بگڑ جائے گا۔ حشمت خان اینڈ کمپنی کا کوئی اعتبار نہیں۔"

آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہم تیار ہو کے کاؤنٹر پہ پہنچ چکے تھے جہاں صبح کی شفٹ میں آنے والا کلرک بیٹھا تھا۔ صبح کی شفٹ کا منیجر بھی اپنے کمرے میں موجود تھا اور انھیں ساری بات بتائی گئی تھی یا نہیں مگر اتنا ضرور بتا دیا گیا تھا کہ ہم انتظامیہ کے مہمان ہیں چنانچہ ہم ہاتھ ملا کے رخصت ہو گئے۔ ٹیکسی نے تو بجے ہمیں پھاٹک کے دروازے پہ اتارا۔ میں ٹیکسی میں بیٹھا رہا اور محسن دس منٹ بعد کچھ خوش وار ہوا تو ہم نے ٹیکسی کو پوسٹ آفس کی طرف لے چلنے کا حکم دیا۔ فاصلے بہت کم تھے چنانچہ ٹیکسی ڈرائیور کو انتظار اور ہمارا ٹھکانہ بہت گراں گزر رہا تھا مگر وہ اسی لالچ کے باعث دبا ہوا تھا۔ پوسٹ آفس پہنچ کے ہم نے اسے دس کا نوٹ دیا تو اس کی شکایت رفع ہو گئی اور اس نے ہمیں سلام بھی کیا۔ یہ وہی وقت تھا جب ہم گزشتہ دفعہ آئے تھے۔ میں نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ بابو تو شاید چھٹی پر نکل گیا ہو مگر وہ موجود تھا۔ ایک پوسٹ مین نے ادھر ادھر دیکھ کے ایک دبلے پتلے جوانی میں بوڑھا نظر آنے والے پوسٹ مین کی طرف اشارہ کیا جو سامنے زمانے سے بیزار اسٹول پر اکیلا بیٹھا تھا اور کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔

"السلام علیکم بابو بھائی!" میں نے قریب جا کے کہا۔ "ہم کل بھی آئے تھے۔"

بابو نے سر گھما کے ہمیں دیکھا اور محسن کو پہچان لیا۔ "ہاں ہاں۔ کل بھی ملے تھے تم۔ اسی چٹھی کے لیے آئے ہو گے۔"

"بابو بھائی یہ کیا ہوا؟" میں نے اس کی سوجی ہوئی ناک اور آنکھ کے نیچے نظر آنے والے نیل کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ مستری سائیکل والے سے جھگڑا ہو گیا کیا؟"

"اچھا" وہ چونکا۔ "اس نے تمہیں بھی بتا دیا؟" پھر اس نے خالص با محاورہ گالی دی۔

"وہ بڑا کمینہ ہے بابو بھائی!" میں نے کہا۔ "کہتا تھا بابو اخبار پڑھنے کے بہانے پانے چلاس اور پیچ کس وغیرہ مار لاتا ہے۔ ہم نے کہا جانے دو استاد! بابو شریف آدمی ہے۔ اگر اسے معلوم ہوا تو تمہیں چھوڑے گا نہیں۔"

بابو نے مستری سائیکل والے کو مزید بے نقط سنائیں اور دعویٰ کیا کہ وہ اس کا طلب گار ہے۔ ہم نے اس دعوے کی صداقت کو چیلنج نہیں کیا اور کہا کہ زمانہ شرافت کا نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم بابو کو چائے پلانے کے لیے کینٹین لے گئے اور مجبوراً اس کے ساتھ غلیظ ٹیبل پر بیٹھ کے وہ بد ذائقہ محلول زہر مار کیا جسے سب لوگ چائے سمجھ کر نوش جان کر رہے تھے۔ اس مرحلے کے بعد بابو بھائی سے ہمارے مراسم اتنے پکے ہو گئے کہ ہم نے صرف دس روپے دے کر وہ خط حاصل کر لیا اور ابھی ہم دھڑکتے دل کو سنبھالے خط بریف کیس میں رکھ کے فرار ہونے ہی والے تھے کہ بابو بھائی نے ایک انکشاف کیا۔ "ابھی کوئی اور بھی آیا تھا اسی خط کے لیے۔ مگر میں نے کہا چلو چلو۔ ہم ایسے ڈاک نہیں دیتے پھرتے۔ گھر پہ مل جائے گی رجسٹری!"

ہمارے قدم رک گئے۔ میں نے محسن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "اس نے اپنا نام بتایا تھا؟" محسن نے پوچھا۔

بابو نے نفی میں سر ہلایا۔ "پوچھ رہا تھا گلاب خان معرفت حشمت خان جو رجسٹری ہے وہ کس کے پاس ہے۔ مجھے شریف آدمی نہیں لگا۔ غنڈے موالی کا کام ہے نا جی!"

"اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔ "وہ اصل ایک راستہ ہے جو یہ حرکت کر سکتا ہے۔ غلط قسم کا آدمی۔"

بابو بھائی نے اس کا جو حلیہ بتایا وہ میرا خون خشک

سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول ترین سلسلے
مفرور
طالوت
صندلوں کا بیٹا
کتابی شکل میں تیار ہیں
آج ہی خط لکھ کر طلب فرمائیں یا اپنے قریبی بک اسٹال سے حاصل کریں
کتابیات پبلی کیشنز ۰ پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی نمبر ۱

www.paksociety.com

کر دینے کے لیے کافی تھا۔ یہ حلیہ اس منڈدی والے ٹیکسی ڈرائیور کا تھا۔ اب شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ اکیلا یا اپنے ساتھیوں سمیت باہر ہمارے انتظار میں ہوگا۔ خط لینے میں ناکامی کے بعد وہ ہمیں آتا دیکھ چکا ہوگا اور وہ ہر قیمت پر یہ خط حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ وقت بہت کم تھا اور ہم مشورہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ محسن بھی یہ بات سمجھ گیا تھا کہ اب ہم اس راستے سے نہیں جا سکتے جس راستے سے آئے تھے۔ جہاں سے ملیے انتظار کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ دس منٹ بعد میں نے بابو بھائی سے کہا کہ وہ ہماری وجہ سے کام کا حرج نہ کریں۔ ہم تو ابھی کچھ دیر یہیں بیٹھ کے انتظار کریں گے اسی بدمعاش دوست کا۔

بابو بھائی نے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئے۔

"محسن!" میں نے موقعہ پاتے ہی کہا۔ "اس کیبن سے نکلنے کا دوسرا راستہ بھی ہوگا۔ تم بریف کیس لے کر پیچھے سے نکل جاؤ۔"

"اور اگر وہ ادھر بھی موجود ہوئے تو؟" محسن نے کہا۔

"تو کہیں پناہ لے لینا۔ کسی بھی دکان میں یا دفتر میں گھس جانا۔ رکشا ٹیکسی جو نظر آئے پکڑ لینا۔" میں نے کہا۔ "مجھے جان بچا کے بھاگنا ہے۔ یہ مناسب ہو کہنا تو خود بھی عقل مند ہے۔"

"اور تو — تو کیا کرے گا؟" محسن نے اٹھتے اٹھتے کہا۔

"میں واپس ڈاک خانے میں جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "انھیں یہ تاثر دینے کے لیے کہ ابھی خط ہمیں نہیں ملا۔ ہم یہاں خط کی بات کر رہے تھے۔ اگر یہ چال کامیاب رہی تو میں بھی کسی اور طرف سے نکل آؤں گا۔ اس وقت ہم مقابلے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ تمہیں تو خود کو اور خط کو بحفاظت نکال کے لے جانا ہے اور رابعہ کے گھر پہنچنا ہے۔ مگر ایسے نہیں کہ کوئی تعاقب میں ہمارے ساتھ پہنچے۔" محسن فوراً

میں کیبن سے نکلا اور ادھر ادھر دیکھے بغیر پھر ڈاک خانے کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ ابھی میں نے پہلے زینے پہ قدم رکھا ہی تھا کہ مجھے منڈدی والا نظر آ گیا۔ وہ بابو بھائی سے بات کر رہا تھا اور ظاہر تھا اس نے کوئی دھمکی دے دی تھی کہ بابو بھائی برہم تھے۔ مستری سائیکل والے نے بھی ان کی ڈیوٹی بانٹ کر دی ہوگی۔ یعنی یہ منڈدی والا پہلی بار ناکام لوٹا تھا مگر ہم نے چالاکی سے کام لے کر پہلے بابو بھائی کا موڈ ٹھیک کیا تھا اور پھر خط لے لیا تھا۔ میں فوراً الٹے قدم واپس ہوا۔ منڈدی والے کے گرد دوست لپٹ ہی رہے تھے

ہونے لگے تھے اور ہنگامہ بڑھ جاتا تو منڈدی والا ضرور علاقے میں داخل ہونے پر پھنس جاتا۔ اس نے بھی نکلنے کی کوشش کی۔ اس نے مجھے اوپر سے پیچھے آنے والے زینے پر دیکھ لیا۔ میں بے تحاشا بھاگا۔ منڈدی والا پیچھے پیچھے دوڑا۔ تاہم اب میرے لیے فکر کی بات نہیں رہی تھی۔ مجھے یہ اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ محسن خط سمیت بخیریت نکل گیا۔ میں خالی ہاتھ بھی تھا اور تھوڑا سا آگے بھی تھا۔ ذرا دیر میں منڈدی والا زینے چڑھ کر اوپر آ گیا۔ میں بہت سے لوگوں سے ٹکراتا۔ ایک شخص کو چت کرتا اور ہنگامے کو نظرانداز کرتا باہر آ چکا تھا۔ سڑک عبور کرتے ہی مجھے ایک بس اپنے سامنے سے گزرتی دکھائی دی۔ میں بس کے پیچھے دوڑا اور ڈنڈا پکڑ کے چلتی بس میں سوار ہو گیا۔ بہت سے لوگوں نے مجھے اس طرح جان پہ کھیل کے بس پکڑنے پر شرمندہ کیا لیکن کوئی اصل بات کو نہیں سمجھا۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو مجھے منڈدی والا سڑک پہ کھڑا نظر آیا۔ وہ کسی ٹیکسی کی تلاش میں تھا یا دیکھ رہا تھا کہ میں کدھر غائب ہو گیا ہوں۔

"شاہ نور اسٹوڈیو۔" میں نے کنڈکٹر کو پانچ کا نوٹ تھما کے کہا۔ مجھے معلوم تھا بس آدم لے بازار جا رہی ہے۔

"لو جی کرلو بات۔ کدھر ہے شاہ نور اسٹوڈیو۔ بیٹھے ہیں نہ پوچھتے ہیں اور چڑھ جاتے ہیں۔" کنڈکٹر نے بگڑ کر کہا۔ "اگلے اسٹاپ پہ اتر کے دوسری طرف چلے جانا۔" اس نے مخالف سمت میں اشارہ کیا۔ میں نے خفت سے ان سب کو دیکھا جو مجھے احمق سمجھ رہے تھے اور اگلے اسٹاپ پہ اتر گیا۔ وہیں ایک اخبار فروش اخبار پھیلائے بیٹھا تھا۔ میں نے ہر اخبار کی ایک ایک کاپی لے لی۔ پھر میں ایک ہوٹل میں بیٹھ گیا اور مزے سے اخبار پڑھنے لگا۔ مطلوبہ خبر یہ تھی دو لاشیں برآمد ہوئی تھیں۔ پولیس کا بیان ہے کہ دونوں عادی پیشہ ور تھے۔ ایک اخبار نے ان کو مستری شیشہ بھی لکھا تھا۔ سلامت شاہ کی لاش ملنے کی خبر شاید اخبار چھپنے تک کسی کو نہیں ملی تھی اور غالباً نو بینی فنشی کی لاش بھی ابھی تک دریافت نہیں ہوئی تھی۔ رابعہ کے گھر کے سامنے میں نے رکشا روک لیا۔ اندر محسن میرا منتظر تھا اور رابعہ کی ماں سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ آگے بڑھا۔ مجھے اس کی صورت پہ وحشت کے آثار دکھائی دیے۔

"یار سکندر بخت!" وہ آہستہ سے بولا۔ "اس لفافے میں تو سادہ کاغذ ہیں۔ کوئی فل اسکیپ سائز کے کاغذ

"سادے کاغذ ہیں؟" میں نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

رابعہ کی ماں کچھ فاصلے پر حیران کھڑی ہم دونوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی محسن نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور میری طرف یوں لپکا تھا جیسے میری صورت اسے برسوں بعد نظر آئی ہے یا میں کوئی بدتمیز بھک منگا ہوں جو صدا لگانے کے بجائے سیدھا اندر آ گیا ہو۔ محسن کا یہ رد عمل فطری تھا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو شاید میں بھی سکون سے نہ کھڑا رہتا۔ اس کے ذہن کو پہلا صدمہ تو لفافے سے برآمد ہونے والے سادہ کاغذ کو دیکھ کر ہوا تھا۔ پھر وہ میری طرف سے تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا کہ میں دشمنوں کو دھوکا دے کر یا ان سے مقابلہ کر کے نکل آنے میں کامیاب ہوتا ہوں کہ نہیں۔

"یہ تم دونوں نے کیا کانفرنس شروع کر دی ہے؟" رابعہ کی ماں نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"ہم بعد میں بات کریں گے۔" میں نے آہستہ سے کہا اور ہم پلٹ کر رابعہ کی ماں کے پاس چلے گئے۔ وہ ہمیں اندر لے گئیں۔

"اس وقت رابعہ تو ہوتی نہیں۔" وہ بولیں۔ "پھر تم کیسے آ گئے؟"

"بس ایسے ہی۔" میں نے کہا۔ "ادھر سے گزر رہے تھے سوچا آپ سے ہی مل لیں۔"

"جھوٹ۔" وہ بولی۔ "مجھ بڑھیا سے کون ملنے آتا ہے۔"

"رابعہ نے بتایا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" محسن نے یقین دلانے کے لیے کہا۔

"طبیعت کا کیا ہے بیٹا!" وہ سرد آہ بھر کے بولی۔ "عمر کے روگ ہیں۔ ایک بار لگ جاتے ہیں تو جان لیے بغیر کہاں چھوٹتے ہیں۔"

"ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "ابھی آپ کی اتنی زیادہ عمر تو نہیں ہوئی ہے۔"

"تم نہیں سمجھو گے بیٹا!" وہ بولی۔ "عورت جب اکیلی رہ جاتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔ زندگی کا ایک دن گزرتا ہے تو اس کی عمر کے دو دن گھٹ جاتے ہیں۔ رابی کے ابا کا صدمہ اسے پہلا تھا کہ اب عمر کا ساتھ جو حوصلہ دیتا ہے اور پناہ دیتا ہے جوان بیٹا ہوتا تو شاید میں بہت سکھی ہوتی۔"

"آپ کی رابعہ دو جوان بیٹوں سے زیادہ ہمت اور حوصلے والی ہے۔" محسن نے کہا۔ "بیٹے نکمے اور ناخلف ہوں تو بہت دکھ دیتے ہیں۔"

"تم تو ایسی باتیں کرتے ہو جیسے میری طرح جوان بیٹی کے باپ ہو۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔ "تمہارے لیے باتیں کرنا بہت آسان ہے۔ یہ بتاؤ کیا عورت کو ذمے داریوں کا بوجھ اٹھاتے دیکھنا چاہیے۔ کیا مجبوری کو خوشی سمجھنے سے مجبوری ختم ہو جاتی ہے؟ میری تو جیسے گزرنا تھی گزر گئی کہ میں نے بیک وقت رابعہ کے باپ کی ذمے داریوں کا بوجھ بھی اٹھایا لیکن مجھے بتاؤ کیا رابعہ کے لیے کامیاب زندگی کا تصور یہی ہے کہ وہ اپنے پیشے میں کامیاب ہے؟ وہ کل اگر ماڈل بھی بن گئی اور پھر سپر ماڈل بن گئی تو اس کی خوشیوں کی تکمیل ہو جائے گی؟ کیوں؟ کیا وہ عورت نہیں ہے۔ اس پیشے میں کامیاب عورتوں کو دیکھو کیا ان کے گھر نہیں ہیں؟"

میں اور محسن ایک مجرمانہ خاموشی کے ساتھ سنتے رہے اور ایک دوسرے سے اور رابعہ کی ماں سے نظریں چراتے رہے۔ پھر میں نے جانتے بوجھتے انجان بن کے ڈھٹائی سے کہا۔ "رابعہ جیسی لڑکی کو رشتوں کی کمی تو ہونا نہیں چاہیے۔ ہاں ایسا شخص جو ہر لحاظ سے اس جیسی خوبیوں کا مالک ہو۔"

"بیٹا! مرد میں عورت جیسی خوبیاں کہاں تلاش کرتا ہے کوئی۔" رابعہ کی ماں بولی۔ "مرد کو تو مرد ہونا چاہیے۔ وہ عورت کا ساتھ دے سکے۔ اس کی حفاظت کر سکے۔ گھر بنا سکے عزت دار ہو اور عزت کرنا جانتا ہو۔ رشتے مل جائیں گے مگر رابعہ بھی مانے۔"

یہ جھوٹ قابل احترام تھا کیونکہ یہ حالات کا المیہ تھا۔ معاشرے کی ناانصافی کا شکوہ تھا اور اپنی بے چارگی کا اعتراف تھا چنانچہ یہ ضروری تھا کہ ہم اس کا بھرم رکھیں اور کچھ نہ کہیں۔ ہم خود مسائل کی دلدل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ہم سے دستگیری کی توقع کسی راہ گم کردہ مسافر سے منزل کا پتا پوچھنے کے مترادف تھی۔ شاید خود رابعہ کی ماں نے بھی محسوس کر لیا کہ ہم رابعہ کے کلاس فیلو اور اس کے موکل ہیں جو اس سے مدد لینے آئے ہیں، اس کی مدد کرنے نہیں۔ اس نے خفت آمیز ہنسی میں اپنے جذبات کو چھپا لیا۔

"میں بھی کیا باتیں لے بیٹھی۔ تم آئے ہو گے اپنے کسی کام سے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے لیے چائے منگواتی ہوں۔"

جب وہ چلی گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "محسن وہ خط کہاں ہے؟"

محسن نے بریف کیس کھولا اور لفافہ نکال کے مجھے

www.paksociety.com

تھما دیا۔ یہ تقریباً دس انچ لمبا اور آٹھ انچ چوڑا ایئرلون پیپر کا لفافہ تھا جس پر اضافی وزن کے لیے عام رجسٹرڈ لفافے سے زیادہ کی مالیت کے ٹکٹ لگائے گئے تھے۔ اس کے اندر سے فل اسکیپ سائز کے کاغذات کا پلندہ برآمد ہوا جو دوہرے کر کے لفافے میں ڈالے گئے تھے۔ کاغذات کو دائیں جانب اوپر کے کونے پر اسٹیپل کیا گیا تھا جس کا مطلب یہ نکالا جا سکتا تھا کہ تحریر ہوتی تو اردو میں ہوتی۔ لیکن تمام صفحات اوّل تا آخر کورے تھے۔ میں نے ایک ایک صفحہ پلٹ کر دیکھا مگر مجھے کہیں پنسل سے لکھی ہوئی سطر بھی دکھائی نہ دی۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ لکھنا ختم کرنے سے پہلے کوئی صفحات کو اسٹیپل نہیں کرتا اور مخصوص تعداد میں صفحات اسٹیپل کر کے کوئی لکھنا شروع نہیں کرتا۔ سادہ اسٹیپل کیے ہوئے صفحات کو دیکھ کر یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ یہ اصل مسودے کی جگہ لفافے میں اس لیے ڈالے گئے ہوں گے کہ جب لکھنے والا رجسٹری کرانے جائے تو اسے وزن یا حجم کے فرق کا پتہ نہ چلے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ نواب نیلی تعلق مرحوم نے تقریباً اتنے ہی صفحات میں کوئی سرگزشت لکھی تھی اور لفافہ بند کر دیا تھا؟ یہ فرض کیا جا سکتا تھا کہ اس نے رات کو مضمون مکمل کیا اور سو گیا۔ یا مضمون مکمل کر لینے کے بعد وہ نامعلوم اسباب کی بنا پر خط کو فوراً پوسٹ نہ کر سکا اور درمیانی وقفے میں کسی نے موقع پا کے اصل تحریر کی جگہ سادہ کاغذ رکھ دیے اور لفافہ پھر پہلے کی طرح بند کر دیا۔ میں نے اور محسن نے ایسے ہی متعدد مفروضات پر بحث کی اور بالآخر کاغذات کو واپس لفافے میں ڈال دیا۔

"غور طلب بات یہ ہے محسن کہ جب لفافے میں کچھ بھی نہیں تھا تو ہمارے دشمن اس کے حصول کے لیے اتنے پریشان کیوں تھے؟" میں نے کہا۔

"ہاں یار!" محسن نے کہا۔ "اس سے تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس حقیقت سے وہ بھی بے خبر ہیں۔"

"ہاں۔ اور اسی لیے وہ بدستور ہم سے یہ خط حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔" میں نے کہا۔

"اور ہماری زندگی اس خط کے باعث بدستور خطرات کے حصار میں رہے گی۔" محسن نے کہا۔ "اور بفرضِ محال وہ ہمیں پکڑ کے لے جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ہم سے خط کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں یا ہم سے پوچھتے ہیں کہ اس خط میں کیا تھا تو ہم انہیں کیا بتائیں گے؟"

"وہ کبھی نہیں مانیں گے کہ اس تمام جدوجہد کا مقصد سادہ کاغذوں کے ایک پلندے کا حصول تھا۔" میں نے کہا۔ "خواہ سچ اگلوانے کی کوشش میں وہ ہماری جان لے لیں انہیں کبھی اعتبار نہیں آئے گا کہ ہم سچ بول رہے ہیں۔"

"خط میں یقیناً کوئی ایسی بات لکھی گئی تھی جس نے انہیں تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ ہم سے زیادہ فکر مند ہیں کہ خط انہیں مل جائے۔" محسن نے کہا۔ "اپنی کوشش میں ناکامی کے بعد وہ ہمیں اس وقت تک نہیں مار سکتے جب تک وہ خط ان کو نہیں مل جاتا اور ہم انہیں دھوکے میں رکھ سکتے ہیں کہ ہمیں بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے اور صرف ہمیں ہی نہیں ہماری زبانی دوسروں کو بھی اصل حالات کا علم ہو چکا ہے۔"

"جبکہ اصل حالات ایک رازِ سربستہ ہیں۔" میں نے کہا۔ "تاہم یہ تاثر دینا کہ خط حاصل کرنے کی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا ہمارے تحفظ کی ضمانت بھی ہو سکتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خط ان کی دسترس سے باہر ہے اور بالکل محفوظ بھی۔ اس کی ایک نہیں دس نقلیں ہو کے دس جگہ فراہم کی جا سکتی ہیں۔ پھر اس خط کو ہمیں چھوڑ دینا چاہیے۔"

"لیکن سکندر! یہ خطرہ اب بھی ثابت ہو سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "وہ طے کر سکتے ہیں کہ پہلے ان دونوں کا کام تمام کر دیا جائے۔ دوسرے مرحلے سے بعد میں نمٹ لیا جائے گا۔"

"یار محسن!" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تیرے نکلنے کے بعد اس منڈی والے نے مجھے کب میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ اگر اس نے تعاقب کیا ہوگا تو... تو اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم کہاں ہیں اور خط کہاں ہے۔ اور ممکن ہے وہ باہر ہمارے منتظر ہوں۔ ہم نے اپنے ساتھ رابعہ کے لیے بھی خطرات پیدا کر دیے ہیں۔"

"انہیں پہلے سے علم ہوگا کہ ہمارے سر پر کون ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور رابعہ سے ہی کیا۔ عبدالودود ... سے ہیں۔ ضامن رضوی ایس ایس پی سے ہیں۔ مگر یہ سب معمولی حیثیت کے لوگ نہیں ہیں۔ یہ اور تو عام آدمی جو اغوا بھی ہو جاتے ہیں اور قتل بھی ہو جائیں تو اخبار کے صفحے پر دو سطروں کی خبر لگتی ہے لیکن سپریم کورٹ کے کسی ایڈووکیٹ کا مسئلہ ہو تو ہر جگہ بار ایسوسی ایشن ہنگامہ برپا کر سکتی ہے اور پولیس کے نیچے بھی حکومت اور اس کے اعلیٰ حکام پر زبردست دباؤ پڑتا ہے۔ ضامن رضوی جیسے سینئر پولیس آفیسر پر بھی کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے پھر بھی خطرہ ہمیں دکھائی دیتا ہے۔" میں نے کہا۔ ایک بے نام سی خلش تھی جو کہتی تھی کہ

سے کیا فرق پڑتا ہے۔ عورت تو عورت ہی رہتی ہے مگر میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ اسی وقت رابعہ کی ماں ایک خادمہ کے ساتھ چائے کی ٹرے لے کر آئی اور ہم نے جلد از جلد چائے ختم کی۔ محسن نے وہ لفافہ جا کے رابعہ کی ماں کے حوالے کیا اور کہا کہ اسے بحفاظت رابعہ کو دے دیا جائے۔

"اتنی جلدی کیا تھی؟" رابعہ کی ماں نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور رکھ لیا۔ "رابعہ کچھ دیر میں آ جائے گی۔ تم خود ہی دے دیتے۔"

"ہمیں ایک ضروری کام نہ ہوتا تو ضرور ٹھہر جاتے۔" میں نے کہا۔ "اس لفافے کے بارے میں رابعہ کے سوا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص فون پر بھی پوچھے تو لاعلمی کا اظہار کیجیے۔ کوئی ہمارا نام لے کر مانگنے آئے یا ہمارا رقعہ لائے تو یہ لفافہ کسی کو واپس نہیں کرنا ہے۔ لینا ہوگا تو ہم دونوں میں سے کوئی آئے گا۔"

رابعہ کی ماں نے صرف سر کو ہلایا اور کسی تجسس یا تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ یہ بات مجھے بڑی عجیب لگی تھی کہ رابعہ کی ماں نے کبھی ہم سے ہمارے مسائل کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ یہ نہیں پوچھا کہ ہم کیا کرتے ہیں اور کس چکر میں ہیں۔ یقیناً اسے رابعہ نے منع کر دیا ہوگا کہ ہم سے ایسی باتیں نہ پوچھیے۔ موکل کے اور وکیل کے درمیان کا رازداری کا وہی رشتہ ہوتا ہے جو ڈاکٹر اور مریض کے درمیان ہوتا ہے اور جس کی مکمل رازداری شرط اوّل رہتی ہے۔ گیٹ تک آتے ہوئے میں نے محسن سے کہا۔ "اگر وہ منڈی والا باہر موجود ہوا تو ہمارے لیے اس کی شناخت کرنا مشکل نہیں ہوگا مگر اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی ہوں گے تو ہم انہیں پہچان نہیں سکیں گے۔ وہ ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔ ان کو نظر انداز کرکے نکلنے کی ایک صورت ہے۔ ہم راؤن سیٹھا کے چوک تک نکلے پیدل جائیں گے۔ وہاں عموماً رکشا کھڑے مل جاتے ہیں۔ اگر ایک بھی رکشا ہوا تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہم آگے نکل جائیں گے لیکن دو رکشا ہوں تو ہم الگ الگ اور مخالف سمتوں کو روانہ ہوں گے۔"

ہم دونوں بے نیازی سے چلتے ہوئے باہر آئے۔ دائیں بائیں طور پر ہم دونوں نے ماحول کا بغور جائزہ لیا۔ بظاہر سب خیریت تھی اور دنیا کے کاروبار معمول کے مطابق چل رہے تھے مگر خطرے کا احساس تو ہمارے دل میں تھا چنانچہ ہمیں ہر گام پر خطرہ صدا دیتا سنائی دیتا تھا۔ اگر اتفاق سے کوئی رکشے یا کوئی ٹیکسی بھی موجود ہوتی تو انتظار کرنا تو ٹھیک ہو جاتا مگر دو سواریاں نہ رہ جاتیں اور جب ہم الگ ہوں تو تعاقب کرنے والوں کو فوراً ایک نہ ملے۔ ہم دوبارہ ٹاؤن مارکیٹ کے اسٹاپ پر چلیں گے مگر وہاں پہنچنے کے لیے سیدھا راستہ مت اختیار کرنا۔"

"یار! شفیق! میں بچہ نہیں ہوں۔" محسن نے کہا۔ "اپنی عقل کا اسٹاک ایسے ہی مت ضائع فرمائیے۔ میں ان کو چکر دے سکتا ہوں۔"

"سالارِ اعظم! تقدیر کا چکر بُرا ہے۔ احتیاط لازم ہے۔ اچھی چیز ہے۔" میں نے کہا اور ایک دکان سے سگریٹ لینے کے بہانے رک گیا کیونکہ چوک پر ایک قطار میں تین رکشے کھڑے تھے۔ سگریٹ لینے اور پیکٹ کھول کے ایک ایک سگریٹ جلانے تک ایک رکشا کم ہو گیا۔ محسن اور میں ایک ساتھ آگے بڑھے۔ محسن نے ایک رکشا پر قبضہ کیا اور مجھے نہیں معلوم اس نے رکشا والے سے کہاں چلنے کے لیے کہا۔ میں دوسرے رکشا میں بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ دوسری طرف سے ایک اور شخص تیزی سے آگے آیا اور مجھے تقریباً دھکا دے کر رکشا میں سوار ہونا چاہا۔ "معذرت۔" میں نے کہا۔

"ایمرجنسی ہے۔" دوسرے شخص نے مایوس ہونے کے باوجود کہا اور رکشا والے نے ایمرجنسی کی سواری کو زیادہ فاصلے کے باعث اور میٹر سے زیادہ کرائے کی امید میں ترجیح دینے کی کوشش کی لیکن میں اڑ گیا۔ رکشا والے نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ میں نے بیٹھنے سے پہلے اس سے پوچھا کیوں نہیں تھا۔ "دیکھو پہلے میں بیٹھا تھا، اور میں اس لیے بیٹھا تھا کہ تم میٹر اپ کیے کھڑے تھے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے بہ شرافت سے چلو۔ میں تمہیں ایمرجنسی کا کرایہ دے دوں گا۔" میرے لہجے اور میری پیشکش کے بعد رکشا والا مجبور ہو گیا اور اس نے رکشا کو اسٹارٹ کر کے موڑا۔ میں نے ناکام ہو جانے والے شخص کو غور سے دیکھا۔ وہ سخت جھنجھلاہٹ کا شکار تھا۔ اضطراب کے عالم میں اس نے دونوں طرف سے آنے والے ہر رکشا کو دیکھا مگر مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ ہر رکشا اس کے اشارے کے باوجود سیدھا گزر گیا۔ مزید کے پل پر پہنچ کے میں نے رکشا والے سے کہا کہ وہ سیدھا چلے اور انفنٹری روڈ کے راستے مال روڈ پر فورٹریس اسٹیڈیم سے سیدھے چھاؤنی گھوم جائے۔ رکشا والے نے صرف ایک بار حیرانی سے مجھے دیکھا اور ذہن میں آنے والے سوالات کو غیر ضروری قرار دے کر خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ رکشا نے دو پل عبور کیا

www.paksociety.com

جس پر سے بائیں جانب لاہور کینٹ کا پورا اسٹیشن نظر آتا تھا۔ اور پھر مال روڈ کی پوری مسافت طے کر کے انارکلی مارکیٹ پہنچا تو محسن میرا منتظر تھا۔ رکشا والے کو اب کوئی شکوہ نہ تھا کہ میں نے مغلپورہ جانے کا ارادہ کیوں ترک کیا اور اتنے لمبے راستے سے انارکلی جانے میں کیا مصلحت دیکھی۔ اتفاق راستے سے ہم نے ملتان روڈ جانے کے لیے ٹیکسی لی اور کئی بار پلٹ کر دیکھنے کے بعد بالآخر ہمیں یقین آیا کہ ہمارے تعاقب میں کوئی نہیں ہے۔ راستہ میری یادداشت میں محفوظ تھا اور مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی وہ کوٹھی دکھائی دی جہاں مجھے قالین میں لپیٹ کر لایا گیا تھا میں اسے پہچان لوں گا۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے رفتار کم رکھنے کے لیے کہا اور غور سے دونوں جانب کی کوٹھیوں کو دیکھتا رہا۔ مطلوبہ کوٹھی پر نگاہ پڑتے ہی میں نے محسن کا ہاتھ دبایا اور ایک فرلانگ آگے جانے کے بعد ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر چلتا کیا۔ پھر ہم ویران سڑک پر پیدل چل کے اس کوٹھی تک پہنچے جس کے گیٹ پر سیاہ بھاری قفل پڑا ہوا تھا۔ دروازے پر سرخ پلاسٹک کی دو انچ چوڑی پٹی پر ڈیڑھ انچ کے سفید حروف سے صاحب خانہ کا نام لکھا گیا تھا۔ مجھے یہ نام کچھ مانوس لگا۔ ذہن پر زور دینے سے مجھے یاد آیا کہ یہ فلمی دنیا کے ایک نامور کیمرہ مین کا نام ہے جو ترقی کر کے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بن گیا تھا اور بلاشبہ بلیک اینڈ وائٹ فلموں کی عکاسی میں اس کے کمال فن کا ثانی نہیں تھا مگر پھر وہ دور تمام ہوا اور رنگین عکاسی میں دوسرے لوگ زیادہ کامیاب ہوتے اور اس نے فوٹوگرافی چھوڑ کے ہدایت کاری کو اپنا لیا۔ اس میدان میں بھی وہ کئی کامیاب فلمیں بنا کے شہرت حاصل کر چکا تھا۔ کوٹھی کے اندر فلیش لائٹس کی موجودگی کا سبب مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ اس سے میرے خیال کی تائید بھی ہوتی تھی کہ ولادر نے کوٹھی خالی پا کے ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اب اس کے یہاں ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہدایت کار شاید کسی لوکیشن شوٹنگ پر گیا ہوگا اور ولادر کو اطمینان ہوگا کہ اس کی ڈرامائی کارروائی میں خلل انداز ہونے کے لیے کوئی نہیں آسکتا۔ بڑے گیٹ میں ایک چھوٹا گیٹ اکیلے آدمی کے آنے جانے کے لیے تھا اور یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی چوکیدار اس کو اندر سے بند کیے بیٹھا ہو۔ میں نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ کوٹھی کے اندر کہیں سے گھنٹی جیسے مدھر بول سنائی دیے لیکن دروازہ کھولنے کوئی نہیں آیا۔ میں نے چھوٹے گیٹ کو آہستہ سے دھکیلا۔ گیٹ کھل گیا اور اس پٹ کے وا ہو جانے سے بڑے گیٹ میں دو فٹ چوڑا اضافہ ہو گیا۔ میں نے پہلے محسن کی طرف اور پھر آس پاس دیکھا۔ ہم بھی ویران نظر آنے والی کوٹھیوں، ایک پھل فروش اور دو راہ گیروں کے سوا جو بہت دور تھے، سڑک پر کوئی نہ تھا اور ہماری طرف کون متوجہ ہوتا جبکہ ہم صورت اور حلیے سے شریف اور معزز نظر آتے تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی میں نے گیٹ اندر سے بند کر دیا۔ پورچ کی سیڑھیوں کے بعد برآمدے میں وہ دروازہ جس سے گزر کے میں گزشتہ شب باہر لایا گیا تھا، بند نظر آنے والا یہ دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ میں اور محسن چھپکلی کی طرح محتاط اور گوش برآواز تھے لیکن کوٹھی پر خاموشی تھی جو آسیب زدہ لگتی تھی۔ اچھے خاصے آراستہ کمروں کی دیواریں بھی مجھے سوگوار لگیں۔ اس گھر کی ویرانی اس طرح جہاں سے کوئی جنازہ اٹھا ہو۔ یہ سب مجھے اپنے ناخوشگوار یادوں کی کرشمہ سازی محسوس ہوئی۔ محسن کے ساتھ میں نے ایک ایک کمرہ دیکھا۔ میں نے وہ قالین بھی پہچان لیا جس میں لپیٹ کر مجھے لایا گیا تھا۔ ڈرائنگ روم کا اور ایل شکل کے ڈائننگ روم کا پورا نقشہ وہی تھا اور میں نے محسن کو وہ صوفہ بھی دکھایا جس پر بیٹھ کے میں نے ولادر سے بات کی تھی اور وہ جگہ بھی دکھائی جہاں سرخ لائٹس لگی ہوئی تھیں اور ولادر بیٹھا تھا۔ اندر ایک خواب گاہ میں مجھے عالی شان ڈبل بیڈ کی سبز ریشمی چادر پر شکنیں نظر آئیں جو رات کا افسانہ سنانے لگیں۔ سرہانے کی میز پر جام و سبو رکھے تھے۔ پی کے داد عیش دینے والے اس زندگی کے قائل تھے چنانچہ انھوں نے مفت کی سمجھ کے بے حساب پی تھی۔ ایک بوتل آدھی سے کچھ زیادہ اور دوسری کچھ کم خالی تھی۔ کانچ کے دو ساغر اب بھی پہلو بہ پہلو رکھے تھے۔ کمرے کے گوشوں میں وہ اعلیٰ قسم کے اسپیکر بھی رکھے تھے جن کی آواز میں نے رات کو سنی تھی۔

ایش ٹرے میں بجھے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کا ڈھیر تھا اور ایک خالی پیکٹ مروڑ کے ڈال دیا گیا تھا۔ میں نے جاسوسی کی کہانیوں میں اکثر پڑھا تھا کہ جائے واردات پر ملنے والے کسی ایک سگریٹ کے ٹکڑے یا کسی ٹوٹے ہوئے بٹن سے سراغ رساں نے مجرم کو پکڑ لیا۔ حقیقی زندگی میں صورت حال مختلف تھی۔ نہ میں پولیس کو بلا کے بتا سکتا تھا کہ یہاں کیا ہوا تھا اور نہ ان کے لیے ولادر کا سراغ لگانا ممکن تھا۔ سگریٹ والے تو لاکھوں تھے جو ہر قدم پر بکتے ہیں اور ہر کوئی پیتا ہے۔

ملتے تھے۔ چند ٹکڑوں پر لپ اسٹک کا رنگ ہونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شراب کی بوتلوں پر شیشے کے جام پر انگلیوں کے واضح نشانات موجود ہوں گے لیکن اول تو پولیس کے پاس ہر چھوٹے بڑے جرم میں ملوث ہونے والے کا کوئی ایسا ریکارڈ نہیں جیسا ایف بی آئی یا اسکاٹ لینڈ یارڈ جیسے اداروں کے پاس ہے اور لاکھوں فنگر پرنٹس میں سے ایک نکالنا ہو تو یہ کام کمپیوٹر ایک سیکنڈ میں انجام دیتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ولادر یا وہ مندری والا کسی جرم میں پکڑے ہی نہیں گئے ہوں گے تو ان کا نام پتہ اور حلیہ بھی پولیس کی کسی فائل میں نہیں ملے گا اور آخری بات یہ کہ پولیس ان کو پکڑے گی کیوں؟ بڑے مجرم زبان عامہ کے مطابق خود پولیس کی سرپرستی میں اپنا کاروبار جاری رکھتے ہیں اور اس چشم پوشی کا معاوضہ ادا کرتے رہتے ہیں۔ بڑے پیمانے پر جوئے اور سٹے کے اڈے چلانے والے، منشیات کا دھندا کرنے والے، اسمگلر اور نامی گرامی بدمعاش، پولیس ان کا دیا کھاتی ہے چنانچہ ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ پکڑے جاتے ہیں چھوٹے موٹے چور، اٹھائی گیرے، لفنگے اور لاوارث، یا وہ شریف لوگ جو اپنے جان و مال یا عزت و آبرو کی خاطر مرنے مارنے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔

میں اپنے خیالات میں اس قدر محو تھا کہ میں نے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنی تو یہی سمجھا کہ محسن ہوگا جو ساتھ والے کمرے کا سرسری جائزہ لے رہا تھا اور اس خیال کا اظہار کر چکا تھا کہ ہمارا تجسس بے سود ہے۔ معمولی مجرم بھی کہیں اتنے واضح سراغ نہیں چھوڑتے کہ ان کی نشاندہی کر دیں اور پولیس مارچ کرتی ہوئی سیدھی ان کے دروازے پر دستک دینے آ جائے۔

"میرا خیال ہے محسن کہ یہاں مزید وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم پہلے ہی غیر قانونی طور پر اندر داخل ہونے کا جرم کر چکے ہیں۔ کوئی آ گیا تو مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔"

"وہ تو تم ہو چکے ہو۔" ایک اجنبی آواز نے پیچھے سے کہا اور میں تیزی سے پلٹا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک شخص ڈھاٹا باندھے کھڑا تھا۔ اس کا منہ سر چادر میں لپٹا ہوا تھا اور آنکھوں کے سوا اس کے چہرے کا کوئی حصہ نظر نہ آتا تھا لیکن میں نے اسے کپڑوں سے شناخت کر لیا۔ میں نے آج ہی صبح اس کو پوسٹ آفس میں دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نالی پر سائلنسر فٹ تھا۔ سوچے سمجھے بغیر اس پر حملہ کر دینا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ چنانچہ میں نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"تو تم یہاں بھی آ گئے؟" میں نے کسی قسم کی گھبراہٹ کے بغیر کہا۔ "منہ چھپانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم کو میں اتنی مرتبہ دیکھ چکا ہوں کہ اب تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔"

"وہ خط کہاں ہے؟" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"خط بھی مل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے کچھ باتیں ہو جائیں۔ آج ہی تو موقع ملا ہے مجھے اور تمہیں آمنے سامنے ہو کے اکیلے میں بات کرنے کا۔"

"میں فضول بکواس سننے نہیں آیا ہوں۔" وہ غرا کے بولا۔ "سیٹھ ولادر نے کہا ہے کہ خط واپس نہ کیا گیا تو ایک مہینے کی مہلت نہیں ملے گی۔ فیصلہ آج کسی وقت ہو جائے گا۔"

"اچھا؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے معلوم نہیں تم کس خط کی بات کر رہے ہو؟"

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔" وہ لہجے کو خطرناک بنا کے بولا۔ "جب تم نے بابو پوسٹ مین سے خط لیا تھا تو ہم دیکھ رہے تھے۔ یہ تم جانتے ہو۔"

"وہ خط میرے پاس نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم چاہو تو میری تلاشی لے سکتے ہو۔"

"استاد پیڈ..." ساتھ والے کمرے کے دروازے میں نمودار ہونے والا ایک دم رک گیا۔ غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے مندری والے کا نام نکلنے والا تھا۔ "دوسرا آدمی تو یہاں نہیں ہے۔"

مندری والے نے اسے ایک گالی دی۔ "زبان پر قابو رکھ۔ تیرا باپ اندر آیا تھا تیرے سامنے یا نہیں؟"

"آیا تو تھا استاد۔" گالی کھانے والے نے ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مگر اب نہیں ہے۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ محسن کسی اجنبی کی آواز سنتے ہی کہیں چھپ گیا تھا۔ وہ مسلح تو نہیں تھا لیکن عقل سے کام لینا جانتا تھا۔ "استاد پیڈرو۔" میں نے نامکمل نام کو مکمل کیا اور مندری والے کو چونکتے دیکھا۔ بہت پہلے میں نے اس نام کی ایک ہندوستانی فلم دیکھی تھی جس میں شیخ مختار نے استاد پیڈرو کا کردار ادا کیا تھا اور یہ نام خاصا مقبول ہوا تھا۔ "اب تو تمہارا نام بھی معلوم ہو گیا۔"

www.paksociety.com

وہ مسکرایا لیکن اس کا پتہ صرف آنکھوں کے بجائے چہرے کے تاثر سے چلتا تھا۔ "تم لگتے چالاک نہیں ہو جتنا خود کو سمجھتے ہو۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "میں اس سے کچھ زیادہ ہی چالاک ہوں۔ طبیعت میں انکساری ہے اس لیے بڑائی نہیں جتاتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارا اصل نام کچھ اور ہو، مثلاً محمد یا شیخ مختار۔ عرف استاد پیڈرو۔" میں نے محسوس کیا کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ منڈی والا کچھ نروس ہو رہا تھا۔

"جا کے دیکھو اسے وہ کہاں ہے۔" وہ اپنے ساتھی پر برس پڑا جو اپنی غلطی کے نتائج پر حیران پریشان کھڑا تھا۔

"وہ آدمی ہے، جن بھوت نہیں کہ دیوار میں گھس گیا۔ باہر بھی وہ جانے سے رہا۔ کیبنٹ کے اندر..." جملہ اس کے لبوں پر نامکمل رہ گیا۔ کوئی چیز تو پھٹے کی طرح اس کے سینے پر لگی۔ اس کا سانس رک گیا اور وہ لڑکھڑا کے ایک قدم پیچھے ہٹا۔ یہ وقفہ مجھے متحرک کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے غوطہ مارا اور ایک گولی میرے سر کے اوپر سے گزر کے شیشے کے بہت بڑے گلوب پر لگی جو عین وسط میں چھت سے معلق تھا۔ استاد پیڈرو یعنی منڈی والے کے اور میرے درمیان چند قدم کا فاصلہ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے لڑنے والے بیل کی طرح اس کے پیٹ میں ٹکر ماری اور پلک جھپکتے میں پیڈرو کو اوپر اٹھا کے پھینک دیا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کے نیچے گرا اور ابھی اٹھا بھی نہ تھا کہ دوسرے نے مجھ پر حملہ کیا۔ اس نے بیڈ کے سرہانے سے شراب کی ایک بوتل گردن سے پکڑ کے اٹھائی اور پوری قوت سے میرے سر کا نشانہ لے کر پھینکی۔ پیڈرو جیسے بھاری بھرکم آدمی کو پھینکنے کے لیے مجھے خاصی جسمانی قوت صرف کرنا پڑی تھی اس لیے قدرتی طور پر میں خود بھی جھٹکے سے پیچھے ہو گیا تھا۔ شراب کی بوتل راکٹ کی طرح سنسناتی ہوئی میری ناک کے قریب سے گزری اور دیوار سے ٹکرا کے پاش پاش ہو گئی۔ شراب کے چھینٹے میرے منہ پر بھی آئے اور کمرے میں گلوب کے ٹکڑوں کے ساتھ ہی مئے ارغوانی کی بوتل کے ٹکڑے بھی پھیل گئے۔ اس شخص نے بیڈ سائڈ سے لکڑی کا ٹیبل لیمپ اٹھا لیا اور اس کا تار کھینچ کر توڑ دیا۔ ٹیبل لیمپ کا نچلا حصہ لکڑی سے تراشا گیا تھا لیکن بالکل چٹان کی طرح نظر آتا تھا۔ اوپر کا حصہ قصے کہانیوں کی طرح افسانوی مخلوق جیسا تھا جسے انگریزی میں "مرمیڈ" کہتے ہیں اور جس کا آدھا نچلا دھڑ مچھلی کا ہوتا ہے تو اوپر کا آدھا جسم کسی انتہائی حسین عورت کا۔ مجھ پر حملہ کرنے والے نے ٹیبل لیمپ کا بلب نکال کے پھینک دیا تھا جو موم بتی جیسا تھا اور وہ ٹیبل لیمپ کو اس طرح پکڑ کے آگے بڑھ رہا تھا کہ جب یہ وار کرے تو چٹان کی طرح نظر آنے والے لکڑی کے نچلے حصے کی ضرب ہتھوڑے کی طرح پڑے۔

پیڈرو فرش پر گرتے ہی قلابازی کھا کے بیڈ کے نیچے ہونا چاہتا تھا مگر محسن اسی دروازے سے جس دروازے سے پیڈرو کا ساتھی اندر آیا تھا اور اس نے ایک جست بیڈ پر لگائی۔ اگر ریشمی چادر پر اس کا پیر نہ پھسلتا تو وہ اسی جست میں بیڈ عبور کر کے پیڈرو پر جا پڑتا لیکن پیر پھسلا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نہایت بے ڈھب طریقے پر پیڈرو کے سامنے جا لیٹا۔ پیڈرو نے چیتے والی مہارت کے ساتھ اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا اور میں نے محسن کے کراہنے کی آواز سنی۔ پیڈرو کا ساتھی پینترا بدل کے آگے آیا لیکن میں اس سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار تھا اور اگر مجھے اس پر ایک بھرپور وار کرنے کا موقع مل جاتا تو اس کا کام تمام ہو جاتا لیکن پیڈرو نے مسہری کے نیچے سے گولی چلائی جس کا نشانہ یقیناً میں تھا۔ پیڈرو کا ساتھی آگے ہونے کے باعث بر وقت سامنے آ گیا اور گولی اس کے شانے میں لگی۔ اس نے کراہ کر دونوں ہاتھ جھٹکے اور ٹیبل لیمپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کھڑکی کی طرف گیا۔

"بس۔" میں نے کھڑکی کا شیشہ بکھرنے کی آواز کے ساتھ ہی پیڈرو کی آواز سنی۔ "اب تم نے ذرا بھی حرکت کی تو سر میں سوراخ کر دوں گا۔" میں جہاں تھا وہیں منجمد ہو گیا اور پیڈرو مسہری کے نیچے سے نکل کے میرے مقابل آ گیا۔ اس کا ڈھاٹا کھل گیا تھا اور منڈی والے ٹیکسی ڈرائیور کا چہرہ اب میرے سامنے بے نقاب تھا۔ اس کا ساتھی اپنے زخم سے بہنے والے خون کو روکنے کی کوشش میں مصروف تھا اور اس نے ایک رومال کو کھینچ کر زخم پر رکھ کے ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ اس کے حلق سے درد کی ٹیس کے ساتھ خود بخود سسکی نکل جاتی تھی۔

"زیادہ نخرے مت کرو۔" پیڈرو نے غرا کے کہا۔ "معمولی سا زخم ہے۔ مرے گا نہیں تو۔ ادھر آ کے کسی چیز سے اس کے ہاتھ پیر باندھ دے۔" اس نے بے ہوش پڑے ہوئے محسن کی طرف اشارہ کیا۔

بازو کی تکلیف کے باوجود اس کے ساتھی نے پیڈرو کے حکم کی تعمیل کے لیے ریشمی چادر اس کو لمبی پٹیوں میں پھاڑا۔ گولی اگر شانے کی ہڈی میں لگی ہوتی تو وہ ہاتھ کو حرکت تک نہیں دے سکتا تھا لیکن زخم غالباً سرسری تھا اور گوشت تک محدود رہا تھا۔ ریشمی چادر کی پٹیاں بہت مضبوط تھیں مگر اس نے کناروں کو ڈریسنگ ٹیبل پر سے بلیڈ لے کر کاٹا اور کونے کو پیر کے نیچے دبا کے اس ہاتھ سے کھینچ لیا جو زخمی نہیں تھا۔ ان پٹیوں سے جو ریشم کی رسی جیسی تھیں اس نے محسن کے ہاتھوں کو کمر کے پیچھے کر کے کئی بل دے کے پھر دوسری پٹی سے پیروں کو ملا کر باندھا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میرے علاوہ پیڈرو نے بھی اس تمام کارروائی کو بغور دیکھا تھا لیکن ایک لمحے کے لیے بھی وہ دوسری طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔

"اب تم اپنا منہ دیوار کی طرف کر لو۔" پیڈرو نے حکم دیا۔ "مجھے قتل کرنے کا شوق نہیں ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں اپنی جان دے کر تمہیں بچاؤں۔ دیر مت کرو۔"

میں نے اپنا منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ "تمہیں یقین تھا کہ ہم یہاں آنے کی حماقت ضرور کریں گے۔"

"ہم اس وقت سے تمہارے پیچھے ہیں جب سے تم وہ لفافہ لے کر فرار ہوئے تھے۔" وہ بولا۔

"اب تمہارا سیٹھ والا اس لفافے کے لیے اتنا فکرمند کیوں ہے۔ اس میں جو کچھ تھا وہ تو تمہیں معلوم ہو گیا۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔" پیڈرو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "چلو پھر تو تمہارے لیے بھی وہ خط اہم نہیں رہا۔ لاؤ وہ لفافہ ہمیں دے دو۔"

"تم بھی اسے لے کر کیا کرو گے؟" میں نے کہا۔ "اس کی ایک ایک نقل بہت سے لوگوں کے پاس پہنچ چکی ہے۔"

"وہ کون کون لوگ ہیں؟" پیڈرو نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں بھی تو پتا چلے۔"

"تم مذاق سمجھ کے خوش ہو تو۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم ان لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ایک نقل ہے ہمارے وکیل... مسٹر منظور ایڈووکیٹ کے پاس۔ ایس ایس پی صاحب رضوی کو ایک نقل شام تک پہنچ جائے گی۔"

"گولی مارو نقلوں کو۔" وہ یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ "سارے شہر میں بانٹ دو اس کی نقلیں۔ ہمیں اصل چاہیے۔"

"اصل... وہ تو ہمارے پاس نہیں ہے۔ میں کہیں بتا چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "محسن سے پوچھ کے دیکھو۔"

"جب یہ اندر داخل ہوئے تھے تو محسن کے پاس بریف کیس تھا۔" پیڈرو نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "تو ادھر آ کے اسے سنبھال۔ میری طرف سے کھلی چھٹی ہے۔ اگر یہ سر گھما کے بھی دیکھے تو گولی چلا دینا۔"

میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ میرا اندازہ تھا کہ پیڈرو سے اس کا نائب زیادہ خطرناک ہے۔ ایک تو اسی وجہ سے کہ وہ مجھے بچاتے ہوئے زخمی ہو گیا تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی کہ

دیانت، ذہانت، چالاکی اور بہادری کی کہانیاں

بکسوارٹ کی چوریاں بھی محدود تعداد میں دستیاب ہے

قیمت ۲۰/ روپے

پیشگی رقم بھیجنے پر ڈاک خرچ معاف

کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

www.paksociety.com

وہ نسبتاً نوآموز تھا، ناتجربہ کار اور نوجوان آدمی جسے اپنے جذبات پر بیڈرو کی طرح قابو رکھنے کی مشق نہ تھی۔ وہ ذرا بھی مشتعل ہوتا تو بیڈرو کے عطا کردہ خصوصی اجازت نامے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے شوٹ کر دیتا۔ میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ انتظار کا ایک ایک منٹ ایک گھنٹے کے برابر ہو گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا بیڈرو بریف کیس تلاش کر لے گا۔ محسن کو اتنا وقت ضرور ملا تھا کہ اجنبی آواز سنتے ہی وہ ساتھ والے کمرے میں روپوش ہو گیا تھا، کسی پردے کے پیچھے۔ بیڈ کے نیچے یا وارڈ روب میں اور بیڈرو کے ساتھی نے پوری کوٹھی کے ہر کمرے میں سرسری نگاہ ڈال کے اپنا اطمینان کر لیا تھا۔ اگر وہ تفصیل سے اور اطمینان سے تلاشی لیتا تو محسن کہاں چھپا رہ سکتا تھا۔ یہی اس کے ناتجربہ کار ہونے کی دلیل تھی۔ محسن نے بالکل مناسب وقت پر ایش ٹرے پھینکی تھی جو بیڈرو کے سر پر لگی تو اس وقت وہ لیٹا ہوا تھا۔ اس کا نشانہ خطا گیا تھا یا اس نے عمداً سر کو نشانہ نہیں بنایا تھا کہ کہیں سر پھٹنے سے وہ مر ہی نہ جائے۔ اس کی کارروائی کے خاطر خواہ نتائج نہیں نکلے تھے تو یہ ہماری بدقسمتی تھی۔ بریف کیس چھپانے کی مہلت اسے کہاں ملی ہو گی، میں نے سوچا۔ اور میرا خیال درست تھا۔ اسی وقت بیڈرو نمودار ہوا اور اس نے محسن کا بریف کیس بیڈ پر الٹ دیا۔ کاغذات کے الٹنے پلٹنے اور اس کے بڑبڑانے کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ لفافہ نہ ملنے پر وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہے۔

"میں جھوٹ نہیں بولتا۔" میں نے دیوار کو مخاطب کر کے کہا۔ "لفافہ ہمارے پاس نہیں ہے۔"

بیڈرو نے مجھے گالی دی اور میرے پیچھے آ کے میرے سر پر مکا رسید کیا۔ میری پیشانی دیوار سے ٹکرائی اور ذرا سی دیر کے لیے مجھے اپنا وجود اندھیرے میں ڈوبتا محسوس ہوا۔ زمین میرے قدموں کے نیچے ہلنے لگی تو میں نے ہاتھ پھیلا کے دیوار کا سہارا لینا چاہا۔ اسی وقت بیڈرو نے میرے سر پر ریوالور کا دستہ مارا اور میں کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر گرا۔ اس ضرب نے پل بھر میں مجھے ہوش سے بیگانہ کر دیا۔ یہ میرا تجسس تھا جس نے میرے ساتھ محسن کو بھی گرفتارِ بلا کیا تھا۔

پھر مجھے احساس ہوا کہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور پانی مجھے اور میرے کپڑوں کو تر کرتا ہوا جسم پر بہہ رہا ہے۔ رفتہ رفتہ حواس بحال ہونے لگے۔ یہ کوئی خواب نہیں تھا لیکن یہ بارش نہیں تھی باتھ روم کے شاور کا پانی تھا جو مجھ پر گر رہا

تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کے سر کو جھٹکا اور اٹھ بیٹھا۔ محسن نے مجھے سہارا دینے کی کوشش کی اور شاور کو بند کر دیا۔ "کیا حال ہے برادر نسبتی؟" محسن بولا۔

"حال... ٹھیک ہے۔" میں نے سر کے زخم کو دباتے ہوئے کہا۔ "مگر سالار اعظم..." میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"سوالات کی ضرورت نہیں۔" محسن بولا۔ "جواب یہ ہیں۔ ہم اسی کوٹھی کے باتھ روم میں تشریف فرما ہیں۔ استاد بیڈرو اور اس کے دونوں رفیق جاتے وقت ہمیں بند کر گئے تھے۔ پہلے میں بے ہوش ہوا تھا اس لیے ہوش بھی پہلے آیا۔ تم آدھے گھنٹے بعد..."

"اس کے ساتھ دو آدمی تھے؟" میں نے کہا۔ "تیسرا کون تھا؟"

"وہ باہر موجود رہا تھا۔" محسن بولا۔ "جب انہوں نے مجھے گھسیٹ کر اندر ڈالا تو مجھے تھوڑا تھوڑا ہوش آ رہا تھا۔ میں نے باہر سے اس کی آواز سنی تھی۔ غالباً وہ جیپ چلا کے لایا ہو گا۔ باہر سے جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز بھی آئی تھی۔"

"تیرے تو ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔" میں نے کہا۔

"اور اس موذی کے بچے نے باندھا بھی بہت سخت تھا۔"

"میں نے پرانا طریقہ استعمال کیا۔" محسن نے کہا۔ "کموڈ کے گرد سیمنٹ کے کنارے کافی تیز ہیں۔ میں وہاں سے پشت لگا کے ہاتھوں کو اوپر نیچے رگڑتا رہا۔ تھوڑی کھال بھی چھل گئی مگر کپڑا تھا، جلد کٹ گیا۔ ایک بار پڑا تو ہاتھ خود ہی آزاد ہو گئے۔"

"اور اب کیا پوزیشن ہے؟" میں نے کہا۔ "ہمارے نکلنے کے امکانات کیا ہیں؟"

"امکانات بہت روشن ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم روشن دان میں منہ ڈال کے واویلا شروع کر دیں۔ ہماری آواز کسی نہ کسی کے کانوں تک پہنچ جائے گی اور فی الحال تو ہمیں آزادی مل جائے گی۔ دوسری بات ہے کہ اس کے بعد ہمیں حوالات جانا پڑے اور ثابت کرنا پڑے کہ ہم اس باتھ روم میں کیسے بند ہوئے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم کوئی دیوار توڑ کے نکل جائیں یا دروازہ اکھاڑ دیں لیکن ہم دونوں میں سے کوئی شاندان... نہیں، کسی کے پاس کوئی مافوق الفطرت قوت نہیں۔ دروازے کو باہر سے ٹھوکر مارنے سے اندر کی چٹخنی نکل جاتی ہے اور دروازے کھل جاتے ہیں مگر اندر سے ٹھوکر مار کے تو پوری چوکھٹ

کرانا پڑتی ہے جو ناممکن ہے۔"

"روشن دان میں یہ سلاخ نہ ہوتی تو ہم اس میں سے گزر سکتے تھے۔" میں نے اوپر نگاہ ڈالی۔ "کیا اس سلاخ کو باہر نکالا نہیں جا سکتا؟"

محسن نے مایوسی سے انکار میں سر ہلایا۔ "یہ مسئلہ عقل سے حل ہو گا طاقت سے نہیں۔" اس نے باتھ روم کیبنٹ کو کھولا۔ "اس میں کچھ دوائیں ہیں۔ میں نے سر کے زخم پر آیوڈین لگالی ہے۔ معمولی زخم ہے۔ تیرے سر پر صرف گومڑ بنا ہے۔" اس نے ایک بیگ میں سے اسپرین کی تین گولیاں نکالیں اور ہتھیلی پر رکھ کے مجھے پیش کیں۔ "یہ نگلیے اور نل سے پانی نوش فرمائیے۔ میں کھا چکا ہوں اور یقین کیجیے اس وقت یہ جادو کی گولیاں بڑی موثر ثابت ہوئی ہیں۔"

اسپرین نگلنے کے بعد میں نے اور محسن نے دیوار سے ٹیک لگا کے پیر فرش پر پھیلا دیے اور ایک دوسرے کو سگریٹ پیش کی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ڈھلنے لگا تھا۔ خالی پیٹ میں سگریٹ کا تلخ دھواں تیر کی طرح لگا۔ مجھے بھی یہ فکر نہیں تھی کہ ہم اس قید خانے سے کیسے نکلیں گے۔ زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ گھر کے مکین لوٹ آئے تو کمرے کی حالت دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ ان کی عدم موجودگی میں وہاں کیسی دہشت اور جنگ و جدل کے کیسے مناظر کی شوٹنگ ہوئی ہے اور اس کے بعد ہمیں پولیس نکالے گی تو پھر بند کرنے کے لیے۔ میں نے باتھ روم کے اسباب کا جائزہ لیا۔ روشن دان والی دیوار کے مقابل دوسری دیوار کے ساتھ باتھ ٹب تھا جس پر گرم اور ٹھنڈے پانی کی ٹونٹیاں نصب تھیں۔ فلش کے ایک طرف کموڈ تھا اور شاور۔ اس کے سامنے واش بیسن اور واش بیسن کے اوپر پلاسٹک کے سلائیڈنگ ڈور والا باتھ کیبنٹ۔ باتھ کیبنٹ میں بھی صابن، شیمپو اور ٹوتھ پیسٹ جیسی چیزوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کوئی ہتھوڑی، کلہاڑی یا سریا جیسی چیز یہاں سے مفقود تھی۔ بلیڈ یا ریزر سے نہ دروازہ توڑا جا سکتا تھا اور نہ دیوار میں شگاف کیا جا سکتا تھا۔ پھر کیبنٹ کے اوپر ہاتھ ڈالنے کے شوق سے مجھے انگلیوں پر لوہے کے سرد لمس کا احساس ہوا۔ دوسرے لمحے میں نے وہ چیز اٹھا لی اور مجھ پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ میرے ہاتھ میں اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور آ گیا تھا۔

"محسن..." میں نے کہا۔ "یہ... یہ تو اصلی ریوالور ہے۔"

میں نے ریوالور اس کی طرف بڑھا دیا۔ "اور بھرا ہوا ہے۔"

"ہاں یار۔" محسن نے ریوالور کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔

"کسی نے خاص محفوظ جگہ سمجھ کے چھپایا تھا۔"

"سوال یہ ہے کہ کس نے؟" میں نے کہا۔ "خود صاحب خانہ نے یا اس کے گھر کے کسی فرد نے یا کسی ملازم نے یا آنے جانے والے نے؟"

"اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ریوالور کس کا ہے۔" وہ بولا۔ "فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ جائز ملکیت ہے یا ناجائز۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ بغیر لائسنس کا ہو گا اور اسی لیے باتھ روم میں چھپایا گیا تھا۔ لائسنس ہو تو لوگ ریوالور ساتھ رکھتے ہیں یا دراز میں مقفل کر کے۔"

"اور اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہم اسے لے جا سکتے ہیں۔ اس سے مالک کو مالی نقصان کے سوا کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے صاحب خانہ کو علم ہی نہ ہو کہ اس کے گھر میں ناجائز اسلحہ پوشیدہ ہے۔" محسن بولا۔

"ہم اسے پریشانی سے بچا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور اگر یہ اسی کا ہوا تو اس کے لیے نہ مسئلہ پیدا ہو گا نہ پریشانی ہو گی۔" محسن بولا۔ وہ دوسرا حل پیش کرنے لگا۔ ہمیں جیسے ہاتھ ملا یا۔ اس وقت جب ہم معمولی چیزوں پر تجویز کر رہے تھے ایک ریوالور کا مل جانا ایسا ہی تھا کہ ہم آگ لینے کو جائیں اور پیغمبری مل جائے۔ دست غیب نے ہمیں بن مانگے اپنے دشمنوں سے لڑنے کے لیے مسلح کر دیا تھا۔ حوصلے کے ساتھ طاقت بھی دس گنا ہو گئی تھی اور غیر متوقع خطرات کے خلاف تحفظ کا ایک وسیلہ فراہم کر دیا تھا لیکن میرے اور محسن کے ذہن میں یہ احساس بھی تھا کہ ریوالور اپنے قبضے میں کر کے ہم اخلاقی اور قانونی طور پر خود بھی مجرم بن رہے ہیں۔ ہم کسی اور کے گھر میں تھے جہاں ہم اس نیت سے ہرگز نہیں آئے تھے کہ صاحب خانہ کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ اٹھا لے جائیں۔ قطع نظر اس سے کہ ریوالور کسی نے جائز طور پر اور جائز مقصد کے لیے حاصل کیا یا نہیں ہم خود بھی اس کو ناجائز طریقے پر حاصل کرنے کی سوچ رہے تھے۔

شرافت کا تقاضا تو یہی تھا کہ ہم نے اسے جہاں سے اٹھایا ہے پھر وہیں رکھ دیں اور بھول جائیں۔ دوسری طرف ہمارے حالات تھے جو سنگین تر ہوتے جا رہے تھے اور ہمارے مقابل خطرناک مجرم تھے جن کا مقابلہ خالی ہاتھ اور شرافت سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ضامن رضوی کی سفارش کے باوجود مجھے ریوالور کا لائسنس ملنے کے بارے میں بہت زیادہ پُر امید

www.paksociety.com

نہیں تھا۔ ایسے ہی یہ ریوالور محض اتفاقی امداد کے سوا کیا سمجھا جا سکتا تھا۔ اتفاقات کا یہ طویل سلسلہ کس کا انتظام تھا جس نے ہمیں دوبارہ اس کوٹھی میں آنے پر مجبور کیا۔ دشمنوں کو ہمارے تعاقب میں بھیج دیا۔ وہ جاتے ہوئے ہمیں اسی جگہ بندھا ہوا نہیں چھوڑ گئے جہاں سے ہم ہوش میں آتے ہی اٹھ کر باہر جا سکتے تھے اور انہوں نے ہمیں قید بھی کیا تو اسی باتھ روم میں۔

میرا ذہن ان دلائل کو تسلیم کرنے پر بضد تھا لیکن ایک خلش سی باقی تھی کہ کوئی جواز ہمارے جرم کو بے گناہی کی سند نہیں دے سکتا۔ حالات خواہ کیسے بھی ہوں چوری اور ناجائز اسلحہ رکھنے کی سزا پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ شاید میں ریوالور کو واپس وہیں رکھ دیتا مگر محسن نے اچانک کہا۔ "یہ سکندر! میرا خیال ہے یہ وہی ریوالور ہے جو استاد بیلا کے ہاتھ میں تھا۔ تو نے تو زیادہ قریب سے دیکھا تھا۔"

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ یہ تو مجھے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ سائلنسر لگا دیا جائے تو یہ وہی ریوالور ہے۔"

"اتنا تو مجھے بھی خیال ہے کہ وہ اعشاریہ تین دو کا تھا۔ اسی قسم کا ریوالور تھا۔" محسن نے کہا اور ریوالور میری طرف بڑھایا۔ "بس سائلنسر ہٹا لیا گیا ہے۔"

میں نے ریوالور کو غور سے دیکھا۔ "اس نے دو گولیاں چلائی تھیں۔ اگر اس کے چیمبر میں دو گولیاں کم ہوئیں تو یہ ایک ثبوت ہوگا۔" لیکن چیمبر کھول کر دیکھنے پر مجھے دو کی جگہ تین گولیاں کم نظر آئیں۔ پھر میں نے ریوالور کا دستہ دیکھا تو مجھے اس پر خون کا ہلکا سا نشان نظر آیا۔ یہ خون مکمل طور پر خشک نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کو انگلی سے چھو کر دیکھا اور میرا شک یقین میں بدل گیا۔ میری انگلی پر ایک بال بھی آ گیا جس کا رنگ ہلکا بھورا تھا بالکل محسن کے بالوں جیسا۔

"یہ ہم بعد میں سوچیں گے محسن کہ وہ لوگ ریوالور یہاں کیوں چھپا گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "ریوالور وہی ہے۔"

"اس سے وہ مسئلہ تو حل نہیں ہوتا جو فوری طور پر درپیش ہے یعنی بخیر و عافیت باہر نکلنے کا۔" محسن نے کہا۔

"دروازے کے نٹ بولٹ اڑا سکتے ہیں۔" میں نے جھوٹ موٹ کا نشانہ لیا۔ "اس سے باہر کی کنڈی ٹوٹ جائے گی لیکن فائر کی آواز پر کوئی آ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ہمیں خاموشی سے نکلنا ہے اور باہر سے اپنا سامان بھی سمیٹنا ہے۔ وہ سب کچھ جو انہوں نے تلاشی میں

بریف کیس میں سے میز پر الٹ دیا تھا۔"

"تیرا کیا خیال ہے وہ سب چیزیں لے گئے؟" محسن نے کہا۔ "وہ نقد رقم تو ضرور لے اڑے ہوں گے۔"

"یہ سب تو باہر نکل کے پتا چلے گا۔" میں نے کہا اور دروازے کی ساخت پر غور کرنے لگا۔ اس میں نیچے سے اوپر تک بارہ پینل بنے ہوئے ہیں۔ ہر پینل تقریباً ایک فٹ لمبا اور چوڑا ہے۔ درمیان میں ابھرا ہوا اور کناروں پر سے کچھ گہرا۔ اگر ہم کنڈی کے نیچے والے کسی پینل کو توڑ سکیں تو ہاتھ باہر نکال کے کنڈی کھول سکتے ہیں اور پینل کے کنارے کچھ پتلے ہیں۔"

"ہاں۔ مگر اس کے باوجود مکا مارنے سے نہیں ٹوٹ سکتے۔" محسن نے کہا۔ "اگر ہمارے پاس کوئی چیز ہوتی..." اس کی نظر غسل خانے کا طواف کرتے ہوئے ایک جگہ ٹھہر گئی۔ آگے بڑھا۔ "ڈیلیوری" کے اوپر فلش ٹینک اسٹیل کا تھا۔ محسن نے اس کا ڈھکن اوپر اٹھایا تو ٹینک کا پانی تیزی سے خارج ہوا۔ ڈھکن خاصا وزنی تھا اور اس کے نیچے کی طرف ربڑ کے واشر والا وہ پسٹن جیسا اسٹاپ تھا جو ایک بار ہینڈل گھمانے سے اٹھتا تھا تو ٹینک کا پانی نیچے والے پائپ سے بہنے لگتا تھا۔ خالی ہو جانے کے بعد پسٹن پھر سوراخ کو بند کر دیتا تھا اور ٹینک دوبارہ بھرنے لگتا تھا۔ اندر والے حصے میں لمبی سی ڈنڈی سے منسلک وہ المونیم کا ہلکا پھلکا گولا بھی تھا جو پانی کی سطح کے ساتھ بلند ہوتا تھا اور ایک خاص سطح تک اٹھنے کے بعد پانی بند کرتا تھا مگر اس نازک سی چیز کو مگدر کی طرح استعمال کیا جاتا تو گولا پچک جاتا۔ فلش ٹینک کا ڈھکن موزوں ترین چیز ثابت ہوا۔ محسن نے اس کے ہینڈل جیسے حصے کو موڑ دیا اور ڈھکن کو لمبائی کے رخ پکڑ لیا۔ اس کے مڑے ہوئے کناروں نے ڈھکن کو خاصی مضبوطی عطا کر دی تھی۔ محسن نے ناپ تول کے پہلی ضرب لگائی اور اس سے اتنی آواز ہوئی کہ ایک لمحے کے لیے ہم خود ٹھٹک کر رک گئے۔

میں نے پینل کو دیکھا۔ اس کی لکڑی پر چوٹ سے نشان پڑ گیا تھا۔ میں نے محسن سے کہا کہ شور تو ہوگا لیکن احتیاط سے کام لیا تو دیر ہوگی اور اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ محسن نے سر ہلایا اور پوری قوت کے ساتھ لکڑی کے پینل پر حملہ آور ہوا۔ پینل درمیان میں سے کریک ہوا اور پھر اس کا آدھا حصہ ٹوٹ کے باہر جا گرا۔

محسن نے جلدی سے ڈھکن نیچے رکھا اور باہر ہاتھ نکال کے کھٹ سے کنڈی کھول دی۔ شور نے ابھی تک کسی کو متوجہ نہیں کیا تھا۔ ہم نے تیزی سے بیڈ کا رخ کیا جس پر بریف کیس اوندھا پڑا تھا اور تمام سامان بکھرا ہوا تھا۔ خلاف توقع وہ سب کچھ چھوڑ گئے تھے۔ استاد بیلا اور وہ مجرم تھا جو ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کام کرتے ہیں اور ایک وقت میں ایک مقصد کے لیے۔ اس کو نقدی کی ضرورت تھی تو بھی اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کی جگہ دوسرا ہوتا تو جاتے جاتے مال مفت ضرور سمیٹ کر لے جاتا۔ میں نے سب چیزوں کو بریف کیس میں ڈالا اور ہم اس کمرے سے نکل آئے جو زلزلے کے بعد کی تباہی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ شام کے چار بجنے والے تھے۔ بیرونی دیوار اور کوٹھی کی دیوار کے درمیان ایک گلی تھی جس میں ایک رنگین طوطوں کے دو پنجرے تھے لیکن ایک پنجرہ خالی تھا۔ دوسرے میں زرد اور نیلے پروں والا ایک ہی طوطا اداس بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں وہ نر تھا یا مادہ تھی جس کا ساتھی داغ مفارقت دے گیا تھا۔ قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔ مرزا غالب نے مجھے یاد دلایا۔ اسیر ہم سب ہیں۔

"السلام علیکم۔" کسی نے تیز باریک آواز میں یوں کہا کہ میں اچھل پڑا۔ مگر سلام کرنے والا ایک دیسی طوطا تھا جو گنبد نما پنجرے میں جھول رہا تھا۔ اس نے جواب نہ پا کے پھر حیرت انگیز طور پر انسانی آواز سے ملتی جلتی آواز میں کہا۔ "السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" میں نے پنجرے کے قریب جا کے کہا۔ "کیا حال احوال ہیں جناب کے؟"

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟" طوطے نے فوراً جواب دیا۔ کسی نے بڑی محنت سے یہ جملے رٹائے تھے۔

"اس طوطے کو ریسپشن پر بیٹھ کے آنے جانے والوں کو گائیڈ کرنے کی تربیت دی گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"خدا حافظ۔" طوطا بولا۔ "گھر پہ تو کوئی نہیں ہے۔"

میں اور محسن ہنس پڑے۔ "کمال ہے یار!" میں نے کہا۔ "دروازے کے باہر کوئی سنے تو یہی سمجھے کہ اندر کوئی بچہ بول رہا ہے۔"

"ہاں بہت سے لوگ کال بیل کے ساتھ ہی یہ سسٹم رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تاکہ گیٹ تک بلاوجہ نہ آنا پڑے اندر ہی سے سب پوچھ لیا جائے۔ یہ کام یہاں طوطا کر رہا ہے۔" ہم اللہ کا نام لے کے چل پڑے۔ طوطے نے مزید کچھ نہیں کہا۔

"لیکن یار! آج جب ہم اندر آئے تھے تو اس نے کچھ نہیں پوچھا تھا۔" محسن بولا۔ "میں نے تو اس کی آواز بھی نہیں سنی۔"

"میرا خیال ہے پنجرہ پہلے گیٹ کے پاس ہوگا۔" میں نے کہا۔ "کل رات دلاور اینڈ کمپنی نے اس کو وہاں سے ہٹا کے ادھر لٹکا دیا ہوگا۔ طوطے نے ان سے بھی بات کی ہو گی۔" میں چلتے چلتے رک گیا۔ آٹھ فٹ چوڑی گیلری میں انڈر گراؤنڈ ٹینک بھی تھا لیکن اس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا جو غیر معمولی بات تھی۔ لوگ ٹینک کے پانی کو گرد و غبار اور کوڑے کچرے سے صاف رکھنے کے لیے ہمیشہ بند رکھتے ہیں۔ میں نے دو فٹ کے مربع سوراخ سے اندر جھانکا تو مجھے پانی میں آسمان کی نیلاہٹ اور درختوں کی سرسبزی کے درمیان اپنا عکس دکھائی دیا۔ پھر میرے ذہن کو بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ میں نے اپنی صورت کو پہچاننے میں غلطی کی تھی۔ وہ میرا چہرہ نہیں تھا۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔

"محسن!" میں نے کہا۔ "تو جھانک کے دیکھ اس میں۔ یہ میری نظر کا دھوکا ہے یا..."

محسن نے جھانک کر دیکھا اور میں نے اس کی صورت کے تغیرات کو دیکھا۔ ایک منٹ بعد وہ سیدھا ہوا تو میں نے پھر جھانکا اور اس مرتبہ مجھے پانی میں تیرتے ہوئے شخص کا چہرہ صاف دکھائی دیا۔ اس کی کھلی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ وہ چالیس پینتالیس سال کا اور اوسط قد و قامت کا آدمی تھا جس نے خاکی رنگ کی واسکٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ ٹینک چھ فٹ گہرا تھا مگر اس میں پانی کی گہرائی آدھی بھی نہ تھی۔ چنانچہ اس کی لاش بڑے مضحکہ خیز انداز میں تہہ سے جا لگی تھی۔ یوں کہ اس کے دونوں پیر ایک دیوار پر ٹک گئے تھے اور پانی سے باہر تھے۔ غور سے دیکھنے پر مجھے پانی کا رنگ بھی سرخی مائل نظر آیا اور میں نے اس کی کنپٹی کے پاس سیاہی مائل سرخ دھبہ صاف دیکھا۔ چیمبر میں تین گولیاں کم ہونے کی وجہ اب میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ تیسری گولی کا نشانہ گزشتہ رات یہ چوکیدار بنا تھا جو خالی کوٹھی کی حفاظت پر مامور تھا۔

"السلام علیکم۔" طوطے نے کہا اور ہم یوں چونکے جیسے اس نے ہمیں گھر کے کسی فرد نے نہیں اس فرض شناس جاں نثار کی لاش کا تماشا کرتے پکڑ لیا ہے۔ ہم تیز تیز قدموں سے دروازے کی طرف لپکے۔ "کس سے ملنا ہے آپ کو؟" طوطے نے چلا کر کہا۔ ہم گیٹ کھول کر باہر آ گئے اور خاموشی سے

www.paksociety.com

رشک پر چلنے لگے۔ دور سے طوطے کی آواز آئی: "گھر پر کوئی نہیں ہے۔" "ہاں۔ گھر پر کوئی نہیں ہے۔ سوائے ایک لاش کے۔"

"اب تو ساری بات صاف ہو گئی ہے۔" محسن نے کافی دور نکل آنے کے بعد کہا۔ "ڈولاور نے اچھی بے خوفی کے ساتھ یہاں تمہارے ساتھ ڈرامہ کھیلا تھا۔ چوکیدار کو شاید مزاحمت کا موقع ہی نہیں ملا ہوگا۔ کسی نے پیچھے سے آ کے اسے دبوچ لیا ہوگا اور کنپٹی پر ریوالور رکھ کے فائر کر دیا ہوگا۔ غریب کے حلق سے آواز بھی نہ نکل سکی ہوگی۔"

"اور ریوالور کو باتھ روم میں چھپانے کا مقصد بھی اب سمجھ میں آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے چوکیدار کو مار کے ٹینک میں ڈال دیا اور ریوالور باتھ روم میں ایسی جگہ رکھ گئے کہ لاش کی دریافت کے بعد پولیس تلاشی لے تو آلۂ قتل برآمد ہو جائے۔ الزام کسی پر نہ آئے۔ گھر کا مالک تو ثابت کر سکتا ہے کہ وہ کہاں تھا لیکن شوٹنگ میں مصروف تھا اور اس کے کئی گواہ ہیں۔ پولیس عموماً ذاتی دشمنی کا کیس بنا کے نامعلوم قاتلوں کو تلاش کرتی ہے اور دو ایک سال کی کارروائی کے بعد داخل دفتر کر دیتی ہے۔"

"ڈولاور کو یہ بات معلوم ہو گی کہ صاحب خانہ کے کب تک لوٹنے کا امکان نہیں۔" محسن بولا۔ "عموماً فلمی صفحے پر اخبارات مختصر خبریں دیتے ہیں کہ فلمی دنیا کی مصروفیات کیا ہیں۔ شاید اس ہدایت کار کے بارے میں بھی خبر ہو گی کہ ان کا یونٹ کہاں گیا ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ کسی نے ہمیں اس واردات میں ملوث کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پیٹرسن اور اس کے ساتھی ناکام ہو کے جاتے وقت ہمیں قتل بھی کر سکتے تھے یا ہمیں اس طرح باندھ کے جا سکتے تھے کہ ہم ہل بھی نہ سکتے اور پولیس آ جاتی۔ وہ جانتے ہوں گے کہ ہم ہوش میں آ کے نکل جائیں گے لیکن فوراً نہیں۔"

"ڈولاور نے مجھے ایک مہینے کی مہلت دی ہے۔ آدمی قول کا پکا معلوم ہوتا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ ایک فرلانگ سے زیادہ پیدل سفر کرنے کے بعد ہمیں جھونپڑی جیسا ایک مطعم ملا جو ایک خالی پلاٹ پر ناجائز قبضہ کر کے تعمیر کیا گیا تھا۔ عارضی قسم کی دیواریں جو دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں اور ٹین کی پرانی چادروں کی چھت جس پر خالی کریٹ، پرانے ٹائر اور خشک پتوں کے ڈھیر تھے۔ مطعم کے مالک کو خبر ہو گی کہ کبھی بھی پلاٹ کا مالک کسی کا نقشہ لے کر آ پہنچے گا تو تعمیر سے پہلے تخریب کا عمل شروع ہوتا ہے اور جو کسی کو کسی

قدر سے خالی پلاٹ پر سے جانا پڑتا ہے چنانچہ بانیز کی تزئین و آرائش پر وقت، توانائی اور پیسہ صرف کرنا فضول تھا۔ اس نے ایک ٹین پر "خانہ بدوش ہوٹل" بقلم خود لکھ کر لگا دیا تھا۔ باقی اشتہار وہ خود تھا۔ جب ہم نے اس جائے سر لئے خالی میں قدم رکھا تو مزدور اور فقیر ٹائپ لوگ ناشتہ کر کے جا چکے تھے اور اندر مکمل تخلیہ تھا۔ بنچوں پر اکڑوں بیٹھ کے ہم نے مدہوش شرابی کی طرح ڈولتی میز پر پہلا کا میلا جگ اٹھایا اور اس سے پیچ کرتے ہوئے گلاس بھر پانی پیا جسے مالک ہوٹل نے جھٹ نیپ سے نکال کر برآمد کیا تھا۔ وہاں بچی ہوئی نیم گرم روٹیاں اور چنے کی دال "فرائی" کھا کے ہمیں جو لطف آیا وہ اچھے سے اچھے ریستوران میں پرتکلف لنچ کھا کے نہیں آیا تھا۔ بھوک سے ہمارا حال پتلا تھا اور نفسیاتی محاذ پر دشمنوں کو ایک شکست دے کر ہم خاصے مطمئن تھے۔ ہم ایک خطرناک صورت حال سے نکل آئے تھے اور اب تھکے بھی نہیں تھے۔ کھانے کے بعد ہم نے چائے پی جس میں ہر چیز خوب تھی۔ اسے خوب ابالا گیا تھا۔ اس میں خوب چینی ڈالی گئی تھی اور خوب دودھ ڈالا گیا تھا۔ مضر صحت ہونے کے بجائے ایک ٹانک بنا دیا تھا۔ ہم نے چائے کی جگہ مجبوراً یہ ٹانک پیا جس کی طاقت ہمارے جسم میں منتقل ہوئی تو ہم نے خود کو بہت توانا محسوس کیا۔ اس دوران ہم نے ملک بھر کا مسئلہ ہوا اخبار سمیٹا ہوا اٹھایا۔ پیسٹ کر کھلا ہوا داغ دار، شکن شکن اور تر اخبار دیکھا اور میں نے محسن کی توجہ ان دو بدمعاشوں کی موت سے برآمد ہونے والی لاشوں کی خبر کی طرف دلائی۔

محسن نے خبر کو دو مرتبہ غور سے پڑھا اور اخبار رکھ دیا۔

"یار سکندر، وقت کتنا ستم ظریف ہے۔" محسن مسکرا کے کہا۔ "کتنے دن کی بات ہے کہ ہم بے فکری سے لندن میں تعلیم کے نام پر عیش کرتے تھے اور اپنی خوش بختی پر ناز کرتے تھے۔ انگریز لڑکیوں سے معاشقے رچاتے تھے اور اردو شعر و ادب کی دنیا سے ناآشنا تھے۔"

"ہاں۔" میں نے گزرے ہوئے وقت کی یادوں کے بیچ گم ہو کے کہا۔ "اور اب میں ایک قاتل ہوں۔ قانون کی نظر میں صرف ایک میر شرافت علی کا، لیکن درحقیقت لوگوں کا خون ناحق میری گردن پر ہے۔ سلامت شاہ میرے ہاتھ سے مارا گیا۔ فشی جیسے ہم کسی آشنائی کے بغیر سے مذاق میں فوراً چھوڑ کے رہتے تھے میری خاطر جان سے گیا۔ یہ بدمعاش بھی انسان تو تھے جو میرے ہاتھوں قتل ہوئے۔

وہ چوکیدار جس کی لاش اس وقت بھی..."

"سکندر، دل چھوٹا کر کے اور مایوسی کی باتیں نہ کرو۔" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "حالات پر کس کا اختیار ہے۔ ہم مجبور تھے یا کر دیئے گئے تھے۔ بقا کی جنگ ہو تو ہر قانون ہمیں اپنے تحفظ کے لیے جدوجہد کا حق دیتا ہے خواہ وہ ملک کا ہو یا معاشرے کا۔ اخلاقی ہو یا مذہبی۔ ہم آج بھی کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ انصاف ہو۔ ظالموں کو سزا ملے اور ہمیں ہمارا حق مل جائے۔ کیا ہم غلط کر رہے ہیں؟ ہم نے کب چاہا تھا کہ اس زندگی کی روش بدلے جو انہیں گزر رہی تھی۔ آج بھی اگر کوئی غیبی قوت اس سب کو بے وجود اور بے حقیقت کر دے جو ہو چکا ہے اور ہمیں وہی زندگی لوٹا دے۔ سب پہلے جیسا ہی ہو جائے جیسا تھا۔ آنکھ کھلے تو ہم کہیں کراچی ہوٹل کے کمرے میں ہوں اور صبح ہو چکی ہے۔ جیل کے گھنٹے بج رہے ہیں اور شب گزشتہ کا خواب پریشان ہو چکا ہے۔ تو کیا اس احساس سے حاصل ہونے والے اطمینان کی مسرت سے بڑی دولت کوئی ہو سکتی ہے؟"

"ہاں۔ یہی تو ہمارا عذاب ہے کہ ہم خواب سے نہیں گزر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں تو آنے والے دن سے بہت ڈرنے لگا ہوں محسن۔ معلوم نہیں مقدر کی یہ سختی اور آزمائش، ابتلا کا یہ دور مستقبل پر کہاں تک محیط ہے۔"

"ہماری نیت صاف ہے اور ہمارے عزائم غلط نہیں۔ ہم اپنے دفاع کی جنگ لڑ رہے ہیں لیکن سفاک خون آشام درندوں سے الجھ بیٹھے ہیں۔ ہم اندر سے آج بھی وہی ہیں۔ ہمارے یقین اور اعتقاد کے سب معیار پرانے ہیں اور ہمارے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔"

"اپنے آپ کو خود اپنی نظر سے مت دیکھو۔" میں نے کہا۔ "یہ دیکھو کہ دنیا کو ہم کیا نظر آتے ہیں اور دنیا ہمیں کس نظر سے دیکھتی ہے۔ تیرا تو پھر بھی ایک گھر ہے اور تجھے رشتوں کا تحفظ حاصل ہے۔ میری دنیا کیا ہے۔ خوف اور بے یقینی اور عدم اعتماد۔ اگر میں اپنے آپ کو قانون کی نظر میں بے گناہ ثابت نہ کر سکا تو یہ سہارے بھی موت کے دھاگے ثابت ہوں گے جو آج میسر ہیں۔ سزائے موت شاید

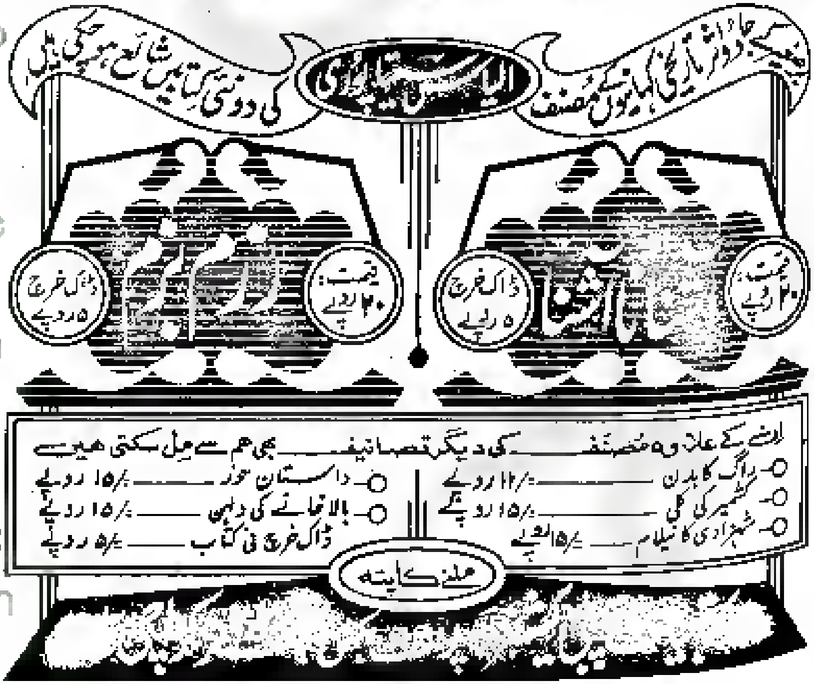

بچے نہ ہو، عمر قید یا سات سال کی قید بامشقت تو ضرور ہوگی۔ سات سال تک کون سا رشتہ استوار رہے گا۔ ایک تیری دوستی کا تو مجھ سے ملنے آتا رہے گا۔ ہفتے میں ایک بار، پھر مہینے میں ایک بار، پھر سال چھ مہینے میں ایک بار اور جب بالآخر میری رہائی کا دن آئے گا تو میں باہر کی دنیا میں آکے سوچوں گا کہ اب کدھر جاؤں۔ تو اپنے گھر میں آباد ہوگا۔ تیرے بیوی بچوں کے سامنے شرمسار کروں؟ نہیں۔ فہد، یہ اپنے شوہر کے ساتھ مطمئن زندگی بسر کر رہی ہوگی اور سکندر بخت کے خیال سے خوف زدہ رہنا بھی بھول گئی ہوگی۔ اس کے سامنے جا کے اسے دہشت زدہ کروں؟ نہیں۔ مجید اور وہ دونوں ہائیکورٹ کا جج ہوگا۔ سزا کاٹ کے جیل سے نکلنے والا مجرم اس سے چیمبر میں جا کے برسوں پرانے تعلق کی بنیاد پر گلے ملنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ نہیں۔ اور رابعہ۔ اس کی ماں نے کہا تھا وہ بھی تو عورت ہے۔ اگر اسے کوئی شریک سفر نہ ملا تو وہ پتھر کی چٹان بن چکی ہوگی۔ جذبات سے عاری اور بے حس۔ پی ایل ڈی کی ایک جلد۔ ضابطہ فوجداری و تعزیرات کی دفعات کا چلتا پھرتا مجموعہ۔“

”جیل اٹھ یہاں سے۔ تجھ پہ شدید قنوطیت کا دورہ پڑ گیا ہے۔“ محسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”قنوطیت؟ کیا تیرا خیال ہے میں حقیقت کی بات نہیں کر رہا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟“ میں نے اسے روک لیا۔ ”یا نہیں ہوگا؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ ”ہو سکتا ہے۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام کے کہا۔ ”لیکن پرامید رہنا اچھا ہے کہ ہوگا نہیں۔“

شام تک ہم اس سرونٹ کوارٹر میں منتقل ہو گئے جو ضامن رضوی صاحب کی کوٹھی کے عقب میں گیراج کے ساتھ واقع تھا۔ دو کمروں کے اس کوارٹر میں تمام ضروریات زندگی فراہم تھیں۔ ایک کمرہ پہلے سے ان کے ڈرائیور کے تصرف میں تھا چنانچہ ہم دونوں کو ایک ہی کمرے میں دو چارپائیاں ڈالنا پڑیں۔ بستر اور تکیے خریدنے پڑے۔ اپنی ضرورت کا بہت سا اسباب ہم نے رات ہونے سے پہلے فراہم کیا جس میں چائے وغیرہ بنانے کا سامان شامل تھا۔ اتفاق رائے سے ہم نے طے کیا کہ ناشتہ خود بنائیں گے اور دونوں وقت کا کھانا باہر کھائیں گے۔ ضامن رضوی کا ڈرائیور ایک کانسٹیبل تھا جو رات تک غیر حاضر رہتا تھا اور اس کا کھانا پینا شاید رضوی صاحب کے گھر پر تھا چنانچہ باورچی خانہ خالی تھا۔ ہم نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ ان پر بوجھ بنیں۔ وہ اخلاقاً بھی جگہ دینے پر رضامند ہو گئے تھے لیکن ان سے زیادہ توقع رکھنا غلط ہوتا کیونکہ وہ بہرحال ایک ذمے دار پولیس افسر تھے اور اپنی حدود سے تجاوز کر کے ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ کھانے پکانے کا جھنجھٹ ہمارے بس کی بات نہ تھی لیکن ناشتہ آسان تھا اور وقت بے وقت چائے یا کافی کی خاطر خود کہیں جانے سے یا دوسری جگہ جانے کے بجائے اپنی ضرورت پوری کرنا بھی آسان کام تھا۔ کوٹھی اس پرسکون چھوٹی سی سڑک پر واقع تھی جسے کچھ لوگ بالائی والی سڑک بھی کہتے تھے اور جو دھرم پورہ ریلوے کراسنگ کے بعد دائیں طرف نکلتی تھی تو سیدھی گورنر ہاؤس تک جاتی تھی۔ اس سڑک پر سب کوٹھیاں وسیع و عریض باغیچوں اور چار دیواری کے حصار میں تھیں اور سڑک کے بائیں طرف واقع تھیں۔ دائیں جانب میو گارڈن کی سرسبز فصیل تھی جس میں عمارت تاؤں کی باڑھ اگی ہوئی تھی اور یہ ریلوے کے اعلیٰ افسروں کی سرکاری رہائش گاہوں کا علاقہ تھا۔ صاف ستھری سڑکوں پر مرکری لائٹس جلتی تھیں اور داخل ہونے والے ہر راستے پر ”پرائیویٹ روڈ“ یا ”یہ شاہراہ نہیں ہے“ کے بورڈ نظر آتے تھے۔ قریب ترین چائے خانہ ریلوے کے [?] اسکوائش کورٹس کے پاس تھا اور گڑھی شاہو کا بازار تقریباً ایک میل دور تھا تاہم یہ جگہ رابعہ کے گھر، ریلوے اسٹیشن اور مال روڈ سے دور نہیں تھی اور تھوڑا سا چل کے ہمیں ضلع کچہری جانے کے لیے سواری مل سکتی تھی۔

رات نو بجے کھانے سے فارغ ہو کے میں نے محسن سے کہا کہ کیوں نہ رابعہ کو فون کر لیں۔ اس وقت جانا تو ٹھیک نہیں معلوم ہوگا۔ دو جگہ سے مایوس ہونے کے بعد ایک کیمسٹ نے ہمیں ایک سو روپے کر فون استعمال کرنے کی اجازت دی۔ گھنٹی دو بار بجی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو رابعہ کو دے دیا۔ ”سکندر!“ وہ بولی۔ ”عجیب آدمی ہو تم بھی۔ تمہیں اس طرح غائب نہیں ہونا چاہیے۔ اگر مجھے رابطہ قائم کرنا ہو تو کیسے کروں؟“

”آئی ایم سوری۔“ میں نے کہا۔ ”دن میں جب آیا تھا تو بہت جلدی میں تھا۔“

”کیوں آج کہاں پہنچنا تھا؟“ وہ بولی۔ ”میرا مطلب ہے کون سا معرکہ سر کرنا تھا؟“

”مجھے رہائش کا انتظام کرنا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اب میں ضامن رضوی ایس ایس پی کی کوٹھی میں ہوں۔ تم فون پر رابطہ قائم کر سکتی ہو۔“

”یہ بتاؤ اس لفافے کا کیا چکر ہے جو تم امی کے پاس چھوڑ گئے تھے؟“ وہ بولی۔ ”اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

”ہاں بظاہر کچھ بھی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اسے چھاپے میں ضبط کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔“

”کیوں؟ تمہارے خیال میں اس پر نظر نہ آنے والی سیاہی سے کچھ لکھا ہوا ہے؟“ رابعہ نے کہا۔

اس بات نے کچھ دیر کے لیے مجھے مبہوت کر دیا۔ ”یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا۔ یہ تو واقعی ہو سکتا ہے، لیکن نہیں ہے۔“

وہ ہنسی۔ ”مگر اس میں کوئی نظر نہ آنے والی تحریر بھی نہیں ہے۔ میں اسے گرم کر کے دیکھ چکی ہوں۔ عموماً لوگ پیاز کا عرق استعمال کرتے ہیں جو گرم کرنے سے براؤن ہو جاتا ہے۔“

”تم نے تو میرے ذہن کو اس مسئلے کا حل بتا دیا ہے جو اک معمہ تھا مجھے لفافے کا۔“ میں نے کہا۔ ”اب میں دوسرے امکانات پر بھی غور کر رہا ہوں۔“

”ٹیلی فون لائن پہ کب تک غور کرو گے؟“ وہ ہنسی۔ ”یہاں کیوں نہیں آ جاتے۔ ہم دونوں مل کے غور کریں گے۔“

جس انداز سے اس نے ”ہم دونوں“ کے الفاظ استعمال کیے تھے وہ ایک واضح اشارہ تھا کہ دعوت صرف مجھے دی گئی ہے اور عقلمند را اشارہ کافی است۔ چنانچہ مجھے محسن کو ساتھ نہیں لانا چاہیے۔ لیکن میں اس قسم کی صورت حال سے بچنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے کہا۔ ”اس وقت؟ تمہیں کوئی کام نہیں ہے یا نیند نہیں آ رہی ہے؟“

”دونوں باتیں ہیں۔“ وہ بولی۔ ”امی کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ شاید مجھے رات بھر جاگنا پڑے۔“

”اچھا۔“ میں نے مجبور ہو کے کہا۔ ”میں آتا ہوں۔“ میں نے ریسیور رکھ دیا۔ دکان سے باہر آکے میں نے محسن سے کہا کہ مجھے رابعہ نے بلایا ہے۔

محسن ذہین آدمی ہے اس نے نوٹ کر لیا کہ میں نے ”ہم“ کے بجائے ”مجھے“ کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اس نے صورت سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

”تو چلا جا بھیا۔“ اس نے جماہی لے کر کہا۔ ”ہم تو تھک گئے ہیں، [?] سو جائیں گے۔ ویسے بھی وہ صرف تیرے چکر میں ہے۔“

میں چلتے چلتے رک گیا۔ ”کیا بکواس کر رہا ہے؟“ میں نے کہا۔

محسن ہنسا۔ ”کیا چور کی داڑھی میں تنکے والا کیس ہے۔ دیکھ، میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ اسے صرف تجھ سے کام ہے۔“

”نہیں۔ تو جھوٹ بول رہا ہے۔ تیرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ شک مجھے بھی ہے کہ رابعہ میرے چکر میں ہے۔“

”یہ بڑا غلط چکر ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”تو پہلے ہی بہت سے چکروں میں ہے۔ مجھے تو اعتماد ہے تجھ پر لیکن...“

”لیکن کیا محسن؟“ میں نے کہا۔ ”لیکن کے بعد کیوں رک گیا تو؟ اس کے بعد بھی جو کہنا تھا کہہ دے۔ مجھے ڈر ہے کہ میرے حوصلہ شکن رویے کا اثر مقدمے پر پڑے گا؟ اول تو یہ بات بعید از قیاس ہے کہ رابعہ مجھ سے مایوس ہو تو مجھے بچانے کی کوشش ترک کر دے اور خدانخواستہ اس کی محبت نفرت میں بدل جائے تو وہ میری دشمن جاں ہو جائے۔ بلاشبہ عورت ذات سے اس قسم کے انتقامی رد عمل کی توقع کی جا سکتی ہے، لیکن رابعہ اول تو اس قسم کی لڑکی نہیں۔ اس کے علاوہ مرد ہو یا عورت، کوئی وکیل اپنے ذاتی جذبات کو اپنی اخلاقی و قانونی ذمے داریوں پر حاوی نہیں آنے دیتا۔“

”یہ سب ٹھیک ہے۔ پھر بھی تیرے لیے ایک جذباتی الجھن تو پیدا ہو سکتی ہے۔“

”الجھن ہمیشہ قربت، فیصلہ یا خود اعتمادی میں کمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں ابھی تک کسی الجھن کا شکار نہیں۔ جب تک خود فریبی کی طرف سے یا اس کے والدین کی طرف سے الجھن پیدا کرنے والی بات نہیں ہوگی، میں یہ سوچوں گا بھی نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ سیدھی صاف بات ہے محسن کہ میں اس معاشرے کے ہر فرد کی مجبوریوں کو سمجھتا ہوں۔ میں کسی سے یہ توقع نہیں رکھتا کہ وہ ——— مروجہ اخلاقی نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کرے۔ مجھے سزا ہو گئی تو یہ قصور میرا ہوگا۔ ایک سزا یافتہ شخص سے کوئی بھی عہد وفا استوار رکھنے کا پابند نہیں۔ کچھ رشتوں کی آبرو ہی سب کچھ ہوتی ہے اور اس کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ کسی کی خاطر بھی نہیں۔“

”تیری حقیقت پسندی پہ مجھے رشک آتا ہے سکندر! تو ہر صدمہ جھیلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خوابوں کی جنت میں رہنے والے عملی زندگی کے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں تو جی نہیں پاتے۔“ محسن نے کہا۔ ”ایک بات کہتا ہوں جو تیرے [?] کی ہے۔ اس سے کوئی غلط مطلب نہ نکالنا۔ ابھی رابعہ کے جذبات کی دنیا پر اپنی حقیقت پسندی کا ایٹم بم مت پھینکنا۔ یہ دنیا، کوئی بھی دنیا جب تک آباد رہے اچھا ہے۔“

”تیرا مطلب ہے کہ اسے جھوٹی امیدوں کے طلسم میں گرفتار

www.paksociety.com

رکھوں۔ میں نے یہ دھوکا دینا نہیں سیکھا محسن۔"

"کوئی جھوٹی امیدوں کے آسرے پر زندہ ہو تو اسے قبل از وقت نا امیدی کا زہر دے کر مارنے سے کیا حاصل۔ سرطان کے مریض کو یہ کون بتاتا ہے کہ اسے کتنے دن بعد چلے جانا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور کیا جھوٹی امیدوں کا سچ ہونا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سورج کا مغرب سے طلوع ہونا؟"

وہ اچانک اٹھا اور چلا گیا۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور اس کی بات کا صحیح مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ غالباً اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ فوزیہ نہیں ہو گی تو ابدیہ میرا سہارا بن سکے گی۔ فوزیہ کا نہ ہونا بعید از امکان نہیں۔ محسن کے الفاظ میں اتنا ناممکن نہیں جتنا سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔ مجھے محسن پر ترس آیا جو دوستی کے رشتے اور خون کے رشتے کی کشاکش میں خود کو سلامت رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بے وقوف۔ دنیا کی سوچ کا دھارا حالات کے ساتھ بدلتا ہے۔ اس کا ذمہ دار وہ خود کو کیوں سمجھتا ہے۔

عابدہ کے گھر میں اوپر کے ایک کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ نیچے اس کے آفس اور اسٹڈی روم میں روشنی تھی مگر وہ خود لان پر کرسی ڈالے اور دوسری کرسی پر پاؤں پھیلائے بیٹھی تھی۔ برائے نام اجالے میں جو ادھر ادھر سے منعکس ہو رہا تھا میں نے اسے دیکھا ہی نہیں اور سیدھا اندر جانے کی کوشش کی۔ اس نے مجھے آواز دی تو میں چونک کر پلٹا اور لان پر جا پہنچا۔

"یہ اندھیرے میں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "گیان دھیان یا فکر سخن؟"

"اس وقت تو دل چاہ رہا تھا کہ بالکل خالی الذہن ہو کے بیٹھوں۔" وہ ہنسی۔ "آدمی کبھی کبھی اپنے خیالات سے بھی نجات چاہتا ہے۔"

"لوگ تو زندگی کے مسائل سے گھبرا کے خیالوں کی دنیا میں پناہ لیتے ہیں۔" میں نے کہا اور دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ان کے خیالوں کی دنیا مختلف ہوتی ہے۔" وہ بولی۔ "میں سارا دن جن مسائل پر سوچتی ہوں وہ ذہن کو ماؤف کر دیتے ہیں۔ جب ان مسائل سے فرصت ملتی ہے تو میرے پاس کوئی بھی دوسری زیادہ خوبصورت خیالات کی دنیا نہیں ہوتی جو مجھے پناہ دے سکے۔ تنہائی میں ذہن پر یلغار کرنے والے خیالات کون سا سکون دیتے ہیں یا خوشی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اس سے تو کچھ نہ سوچنا اور خالی الذہن رہنا کہیں بہتر رہتا ہے۔ ویسے بھی مجھے اندھیرے سے پیار ہے۔"

"اس گھر میں تمہارے منہ سے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں رابعہ!" میں نے کہا۔ "اندھیرا خود تم نے اپنے گرد مسلط کر رکھا ہے۔ اجالا اگر تمہاری دسترس میں ہے تو اسے کیوں دور رکھو۔ نکل کے دیکھو دنیا کتنی خوبصورت ہے اور خوبصورتی ان نعمتوں کا نام ہے جو تمہیں میسر ہیں۔ عزت، دولت، ساز و سامان۔ ان چیزوں کے حصول کے لیے دنیا دیوانہ وار دوڑ رہی ہے۔ تمہارے پاس کار ہے، کوٹھی ہے، دولت ہے۔ جانے کتنے لوگ تمہاری خوش قسمتی پر حسد کرتے ہوں گے۔ تم نے یہ رہبانیت کیوں اختیار کر لی ہے؟"

"اپنی زندگی کے تجربات کے آئینے میں تم میری زندگی کا عکس مت دیکھو سکندر!" وہ بولی۔ "تم مرد ہو۔ تمہارے لیے اکیلا رہنا آسان ہے۔ میرے ارد گرد کی دنیا میں اکیلی لڑکی کی حیثیت بھیڑیوں میں گھر جانے والی بھیڑ جیسی ہے۔ کیا کروں۔ کلاسز کروں، پکنک پر جاؤں، گھومنے جاؤں یا کلب میں جا بیٹھوں؟ کسی کلب میں لاوارث پھروں۔ میں نے ایک بار یہ غلطی کی تھی۔ میں بھی سمجھی تھی کہ پڑھے لکھے لوگ فراخدل ہوتے ہیں اور عورت کی عزت کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم پیشہ افراد واقعی تعلیم یافتہ، روشن خیال اور شریف تھے۔ ان کے ساتھ میں نے کبھی شام کی چائے پی لی یا رات کا کسی ہوٹل میں کھا لیا تو کیا بہت غیر اخلاقی اور غیر شریفانہ حرکت کی؟ جو کیا انہوں نے اخلاقاً اپنا فرض سمجھتے ہوئے ادا کر دیا تو اس کا یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ مجھے توفیق نہیں؟ لیکن مشہور یہی ہوا، گویا میں نے خود کو ایک وقت کے کھانے کے عوض بیچ دیا۔ کمینے لوگوں نے جو باتیں کیں وہ الگ، پھر یہ انکشافات ہونے لگے کہ میرے فلاں جج سے اور فلاں جج کے وکیل بھائی سے مراسم ہیں، اس لیے میں فلاں مقدمہ جیتی تھی۔ اس کے علاوہ ہمارے جاہل اور دولت مند رشتے دار ہیں۔ میرے فرسٹ اور سیکنڈ کزن۔ انہوں نے کبھی اپنا منہ نہیں لگایا تھا اور میں ان کے کردار سے بخوبی واقف تھی۔ بعد میں وہ ڈھیٹ پن سے آ پہنچے اور میں نے ان کو روکا نہیں۔ ان کی ہر ممکن مدد کی اور ان کے وقت بے وقت آ جانے کا برا نہیں مانا۔ اس حوصلہ افزائی کا غلط نتیجہ نکلا۔ ان کی مائیں پیغام لے کر آ گئیں۔ ان کے گھروں کا ماحول ایسا تھا کہ وہاں میں شوہر کے پاؤں کی جوتی ہوتی۔ ساس کی اور نندوں کی خانہ جنگی کا شکار ہوتی اور دو چار سال بعد دو چار بچے ہو جاتے تو شوہر بہادر حکم صادر فرماتے کہ بس بہت ہو چکی وکالت۔ اب گھر کی ذمہ داریاں سنبھالو۔ وہ وعدہ

کہ یہ نہیں تھا کہ پریکٹس پر پابندی نہیں ہو گی۔ میں کیا کرتی؟ اپنا طلاق کا حق مہر کا اور بچوں کی ملکیت کا مقدمہ مرتی ہوئی وکالت کے لیے سب کو چھوڑتی یا سب کے لیے وکالت کو؟ ان سب کو انکار کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پہلے سے زیادہ ہماری عزت کے دشمن ہو گئے اور جس نے جو چاہا مشہور کیا۔ میں نے کسی کی پروا نہیں کی لیکن اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اکیلی رہوں گی۔"

"میں اس فیصلے کے خلاف نظرثانی کی اپیل دائر کرتا ہوں!" میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ یہ لڑکی واقعی مظلوم اور میری مدد کی مستحق ہے۔ یہ قنوطیت اس کو زمانے نے عطا کی تھی اور اس کو رہبانیت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پند و نصائح اور نفسیاتی عوامل کا زبانی تجزیہ کرنے کے بجائے اسے عملی طور پر زندگی کے حسن کا احساس دلانے کی ضرورت تھی۔ میرے اس فیصلے کا محرک کوئی جذباتی رد عمل نہیں تھا۔ میرے ذہن میں ایک سوال عقل کی پوری توانائی اور منطقی استدلال کی ساری قوت کے ساتھ ابھر آیا تھا اگر یہ عورت کسی غرض کے بغیر تمہاری زندگی بچانے کی بھرپور جدوجہد کر سکتی ہے تو کیا تم اس کی زندگی بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟ میں اتنا خود غرض اور احسان فراموش نہیں تھا کہ اس سوال سے روگردانی کر سکتا اور اس ذمہ داری سے بچ سکتا۔

رابعہ نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ "تم یہ تم یہ اپیل کہاں کر رہے ہو؟ اور فیصلہ تو خود میری اپنی عدالت کا ہے۔"

"آئی سی!" میں نے کہا۔ "یہ قانونی نکتہ ہے۔ گویا سماعت تم خود نہیں کرو گی۔ آل رائٹ۔ میں تمہاری طرف سے اپیل دائر کرتا ہوں اور خود اس مقدمے کی سماعت کرتا ہوں۔ تو سماۃ رابعہ قادری! تم جو مدعی اور مدعا علیہ ہو یہ بتاؤ تم دنیا سے کیوں ناراض ہو۔ اس دنیا کے چند بے ضمیر کمینے اور گھٹیا کردار کے مالک افراد نے تمہیں بدنام کیا۔ کیا اس بدنامی سے تم نے کچھ کھویا؟ اپنی نظر میں اپنا مقام؟ اپنا عزم اور حوصلہ؟ اپنی ذہانت اور صلاحیت؟ اپنے ضمیر پر اعتماد؟"

"نو مائی لارڈ!" رابعہ ہنسی۔ "مجھے اس قسم کا کوئی نقصان نہیں ہوا کیونکہ یہ بدنامی بے بنیاد تھی۔"

"دیٹس رائٹ۔ سماۃ رابعہ قادری! کیا کتوں کے بھونکنے سے قافلہ رک جاتا ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا یہ بہتر نہ ہوتا اگر تم کتوں کے بھونکنے کو نظر انداز کر دیتیں؟"

"مجھے کتوں سے بہت ڈر لگتا تھا مائی لارڈ۔" وہ مسکرائی۔ "خصوصاً بھونکنے والے کتوں سے۔"

"گویا تمہیں علم نہیں تھا کہ جو بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں؟" میں نے کہا۔ "کیا تمہارا اس بات پر اعتقاد نہیں کہ عزت ذلت منجانب اللہ ہے اور چاند پر تھوکا جائے تو تھوک اپنے منہ پر آتا ہے؟ دنیا میں کون ہے جس کی کامیابی پر حسد کرنے والوں کی تعداد خوش ہونے والوں سے زیادہ نہیں؟ لیکن بدخواہوں کی بددعا میں اثر ہوتا تو کسی ماں کا بیٹا زندہ نہ رہتا۔"

"تجربہ بہت بڑا استاد ہے یور آنر! سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے تو ٹھیک کرتا ہے۔"

"وہ غلط کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ اگر وہ کہے کہ مجھے رسی نے کاٹ لیا ہے اور میں زہر پھیلنے سے مر رہا ہوں تو دنیا اس پر ہنستی ہے لیکن وہ واقعی مر جاتا ہے۔ کیا تم میں اتنی عقل نہیں ہے کہ رسی سے ڈرنا چھوڑ دو؟ بھونکنے والے کتوں سے ڈر کے پیچھے مت ہٹو۔ آگے بڑھ کے ان کو دھتکار دو۔ وہ سب بھاگ جائیں گے۔ بدنام کرنے والوں سے کہو تمہیں ان کی پروا نہیں۔ مجھے ناکامی نہیں چاہیے۔ وہ سخت مایوس ہوں گے۔ اپنی نظر آسمان کے ستاروں پر رکھو۔ زمین کے کیڑوں کی طرف مت دیکھو۔ دنیا پر ثابت کر دو کہ اکیلی عورت بھی معاشرے میں اپنا مقام خود پیدا کر سکتی ہے اور اس کی ترقی کی راہ میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔ تم اکیلی بھی کمال ہو۔"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" رابعہ نے کہا۔ "ان باتوں کا مقصد کیا ہے؟ محض باتیں؟"

"نہیں، در اصل آج مجھ پر بھی قنوطیت سوار تھی۔" میں نے کہا۔ "اس کا احساس مجھے محسن نے دلایا۔ یہاں آ کے دیکھا تو تم قنوطیت میں مبتلا ہو۔ دو منفی قوتیں مساوی ہیں، ایک مثبت قوت کے۔ چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔ ایک مدت سے میں نے بھی دنیا کے حسن کو نظر بھر کے نہیں دیکھا۔" میں نے بہت ہمت کر کے یہ بات کہہ دی تھی۔ "ان اندھیروں کو یہیں چھوڑ دو۔"

رابعہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی اور دوسری طرف دیکھتی رہی۔ "اندھیرا تو کل بھی ہو گا۔"

"صاف کہتے ہوئے ڈرتی ہو کہ تمہیں اتنی رات گئے ایک غیر مرد کے ساتھ جانا منظور نہیں۔" میں نے کہا۔ "اعتماد تمہیں کس پر نہیں ہے؟ مجھ پر یا اپنے آپ پر؟ ایڈووکیٹ رابعہ قادری؟"

"مجھے تم پر اعتماد ہے لیکن..."

"لیکن باہر کوئی دیکھے گا کہ رابعہ قادری ایک ایسے شخص کے ساتھ پھر رہی ہے جو قتل کے الزام میں ملوث ہے..."

www.paksociety.com

"وہاں کھڑی ہوئی" بہت فرق نکلی میں دیکھا ہے۔ اور تم نے ٹھیک کہا ہے کہ میں اسی طرح قدرتی رہی تو جنگی کے کانٹے سے بھی مرجھا جاؤں گی۔ چلو، لیکن ایک نظر ماں کو دیکھ لوں اور ذرا یہ کپڑے بھی بدل لوں۔"

"ماں کو کیا ہوا ہے؟" میں نے کہا۔ "اسی ڈپریشن کا شکار ہیں۔"

"ماں کی طبیعت دو بار بگڑ چکی ہے۔ دل گھبراتا ہے اور کمزوری محسوس ہوتی ہے۔" وہ بولی۔ "میں نے سلیم دے کر سلا دیا ہے۔ تم یہیں بیٹھو۔"

میں نے انتظار میں دس منٹ صرف کیے اور ایک سگریٹ ختم کی۔ میرے جذبات کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ ایک بار تو مجھے یوں لگا جیسے فوزیہ میرے سامنے کھڑی مجھے ملامت آمیز نظروں سے دیکھ رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں جو چھلکنے ہی والے ہیں۔ "بے وقوف لڑکی! یہ جو کچھ کر رہا ہوں میرا فرض ہے۔ اس کا تعلق دماغ سے ہے دل سے نہیں۔ وہ آدمی قابل نفرت ہوتا ہے جو خود غرضی کے باعث چاہتا ہے کہ سب اس کے لیے سب کچھ کریں مگر وہ کسی کے لیے کچھ نہ کرے۔" میں نے فوزیہ کو سمجھایا۔ "تمہارے حقوق الگ ہیں مگر اس احسان کے بدلے جو رابعہ مجھ پر کر رہی ہے اس کا بھی کچھ حق بنتا ہے۔" فوزیہ نے بالکل زنانہ بات کی۔ "فرض کیا جائے تو رابعہ جیسی عورتیں غرض کے بغیر کوئی احسان نہیں کرتیں۔" میں نے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ مجھے ہو جانے دی جیل تو رابعہ کو مجھ سے کیا ملے گا؟ اسے تو فیس ملنے کی امید بھی نہیں۔" وہ کہنے لگی۔ "خواہ مخواہ یہ فرض اور محبت کا چکر مت چلاؤ۔ یہ دماغ اور دل کے رشتے ایک ہی ہو جاتے ہیں۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "اچھا دیکھوں گا تم میرا انتظار کرتی ہو یا نہیں سات سال تک۔"

"کس سوچ میں ہیں جناب؟" رابعہ نے کہا اور میں چونکا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اتنے کم وقت میں وہی ساری باندھ لی ہے جو باندھ کے وہ مجھ سے جیل میں ملنے آئی تھی اور میں حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کر لیا تھا اور جب میں کار میں اس کے ساتھ بیٹھا تو مجھے ایک سحر آفریں خوشبو کا احساس ہوا۔ گاڑی سڑک پر آ گئی تو رابعہ نے کہا۔ "کہاں چلیں؟"

"کہاں چلیں؟" میں نے کہا۔ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ باغ جناح چلو۔ وہاں اچھا موسم ہوگا۔ یا ایسے ہی سڑک پر چلتی رہو۔"

وہ ہنسی۔ "مجھے اپنی ہنسی بھی اجنبی لگ رہی ہے۔ ہنسی کیوں؟ کبھی تمہیں ایسا احساس ہوا ہے زندگی میں؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ ایک متعصب انگریز لارڈ مجھ سے کافی جیل گیا تھا اور جیسے اس نے مجھ سے ایک سودا کیا تھا۔ "اس روز مجھے اپنی ہنسی اجنبی لگی تھی۔ معلوم نہیں میں اپنے آپ پر ہنس رہا تھا یا اس لارڈ کے غرور کی شکست پر۔"

"تمہیں اس کی بیٹی سے واقعی محبت تھی یا صرف الٹ ورڈ؟"

"اس کی بیٹی مجھے واقعی چاہتی تھی۔" میں نے اعتراف کیا۔ "لیکن۔۔۔ لیکن ہندوستان میں رہتا تھا۔ تمہاری ان متعصب اور تنگ نظر لوگوں کے درمیان کیسے رہ سکتا تھا جو میرے رنگ سے نفرت کرتے تھے اور ایسے ماحول میں نہیں رہ سکتی تھی۔" میں بولتا رہا اور وہ سنتی رہی، پھر وہ بولتی رہی اور میں سنتا رہا۔ ہم نے گاڑی باغ جناح میں پارک کی اور اس کی ٹھنڈی مہکتی سڑکوں پر چلتے رات کا حسن جوان ہوتے دیکھتے رہے۔ وہاں ہم جیسے اور بھی تھے لیکن ہم سب کے درمیان اور سب سے الگ باتیں کرتے رہے۔ اس نے مجھے اپنی گزشتہ زندگی کی یادوں کے البم سے ان گنت تصویریں نکال کے دکھائیں۔ میں نے محسوس کیا کہ بہت عرصے بعد آج اسے باتیں کرنے کا ملا ہے۔ یوں تو وہ بہت بولتی تھی اور بھری عدالت میں بہت بولتی تھی مگر باتیں کسی سے نہیں کر سکتی تھی۔ وہ باتیں میں محسوس کر لیتا تھا اس کے دل میں جمع ہو رہی تھیں، برسوں کا غبار تھا جو آہستہ آہستہ نکل رہا تھا اور میں اس کا اعتماد کا اہل ثابت ہونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے اسے فوزیہ کے بارے میں بھی بتا دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ میں اس سے منسوب ہوں اور اس کے انکار کا اظہار کر دیا کہ یہ نسبت اب خطرے میں پڑ گئی ہے اور میں فوزیہ سے یہ توقع بالکل نہیں رکھتا کہ وہ فلمی ہیروئن کی طرح ظالم سماج کے یا والدین کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرے گی۔ رات کے بارہ بجے ہم ایک اعلیٰ قسم کے ہوٹل میں گئے اور اوپن ایئر گارڈن لاؤنج میں بیٹھ کے کافی پی۔ میں نے محسوس کیا کہ غلط فہمی پیدا کیے بغیر میں اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب رہا ہوں۔

رابعہ خوش تھی اور اس خوشی کا تعلق اسی رابعہ کا تھا۔ اس کی مسکراہٹ نئی تھی اور اس کی آنکھوں میں

والی مسرت کی چمک تھی۔ مسرت جس کا سرچشمہ دل کی گہرائی سے پھوٹتا ہے عورت کی ہر ادا میں رنگ بکھیر دیتا ہے۔ اس وقت وہ صرف ایک عورت تھی، حسین اور جوان۔ پُرکشش اور نازک ادا۔ صرف خوشبو اور رنگ اور نغمگی۔ اپنی قوت تسخیر پہ نازاں پُر اعتماد۔ چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش سے مغلوب اور حسن کو خراج تحسین پیش کرنے والی ہر نگاہ سے آشنا۔ اس وقت کوئی رابعہ سے پوچھتا کہ تم کون سی عورت رہنا چاہو گی؟ وہ جو تم اس وقت ہو یا وہ جو سیاہ کوٹ پہن کے قانون کی ضخیم کتابوں کے حوالے دیتی ہے اور اپنے موکل کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے دلائل اور اپنے زور خطابت سے، اپنی صلاحیت اور اپنی استعداد سے اور اپنی ذہانت سے سب پہ چھا جاتی ہے۔ تو وہ یقیناً اس لمحے کی سب کو مسحور کر لینے والی فاتح عورت بننا پسند کرتی۔ وہ عدالت میں اپنی کامیابی پر اس کامرانی کو ترجیح دیتی جس نے اسے ایک کھوئی ہوئی مگر بہت خوبصورت مسرت عطا کی تھی۔ جو اس کا حق تھی مگر اس نے اپنے احساس محرومی کو اپنا مقدر جان کے قبول کر لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ذہنی سطح پر وہ عام عورت سے بہت اوپر ہے۔ شاید اسی لیے وہ تک پہنچی اس کے دماغ اور معقولیت مشہور تھی۔ اس کی کلاس فیلوز نے ہمیشہ اسے افلاطون بننے کا طعنہ دیا اور اپنے احساس کمتری کے باعث اس کا بائیکاٹ کیے رکھا۔ یہی صورتحال اس کے خاندان کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ بھی پیدا ہوئی جو ایف اے، بی اے کر کے بھی نکل اور فیشن سے آگے بات ہی نہیں کرتی تھیں۔ بعد میں یہ لڑکیاں دولت مند گھروں میں بیاہی گئیں اور ان کی زندگی کے زاویے کچھ اور بدل گئے چنانچہ ان کے اور رابعہ کے درمیان فاصلہ بھی بڑھ گیا اور وہ تنہا رہ گئی۔ مردوں سے جتنے واسطے جن کے لیے وہ واقف ہے کر ہائیکورٹ کی ایڈووکیٹ تک ہر عورت ان کی جائز و ناجائز خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ تھی۔ محکوم تھی اور ان سے کمتر درجے کی مخلوق تھی۔ مردوں کا یہ فطری احساس برتری اس معاشرے کی اقدار پہ حاوی تھا اور جو عورت اس کو قبول نہیں کرتی تھی وہ اپنی ذات کے حصار میں قید ہو کے تو رہ سکتی تھی مگر ہر خوشی کو اپنا حق سمجھ کے نہیں حاصل کر سکتی تھی۔

"کیسی عجیب بات ہے۔" اس نے واپسی پہ کہا جب ہم باتیں کر کے تھک چکے تھے اور خاموشی سے اپنے اپنے خیالات کی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ "برسوں میں ذہنی ہم آہنگی اور رفاقت کا یہ احساس مجھے کبھی نہیں ہوا جو تم سے بولتے بعد مل کے اور تین گھنٹے تک تم سے باتیں کرنے کے بعد آج ہوا ہے۔ کیا یہ احساس کل بھی باقی رہے گا جب میرے اور تمہارے درمیان صرف وکیل اور موکل کا رشتہ رہ جائے گا؟"

"کیوں نہیں رہے گا؟" میں نے بے خیالی میں کہا۔ "کیا احساس کبھی فنا ہو سکتا ہے؟ میں اور تم تو وہی ہوں گے جو اس وقت ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ میرے ایک بازو پر ہاتھ رکھ کے بولی۔ "میں یہی چاہتی ہوں۔ تم مجھے صرف ایڈووکیٹ نہ سمجھو، مجھے ایک قابل اعتماد ساتھی کی ضرورت ہے۔ میرا دوست کوئی نہیں۔ مجھے کوئی اپنا نہیں سمجھتا۔ بس ایسے ہی کبھی کبھی مجھ سے باتیں کر لیا کرو۔ میری سن لیا کرو اور جب مجھ پر مایوسی اور قنوطیت طاری ہو تو اسی طرح سہارا فراہم کر دیا کرو جیسے آج کیا۔ میں اس سے زیادہ تم سے کچھ نہیں طلب کروں گی اور اس سرحد کو عبور کرنے کی کوشش بھی نہیں کروں گی جہاں سے فوزیہ کی ملکیت کی حد کا آغاز ہوتا ہے۔ میں تم سے فوزیہ کو نہیں چھینوں گی۔ وعدہ!"

"مگر کیا یہ ممکن ہوگا؟" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ "میں تو اس وقت بھی رابعہ کی گرفت میں ہوں مگر فوزیہ میری گرفت سے آزاد ہونے لگی ہے۔ حالات میرے گرد مکڑی کے جالے کی طرح مجبوریوں کا جال بن رہے ہیں۔" محسن نے کہا تھا۔ "ابھی رابعہ کے جذباتی دنیا پہ اپنی حقیقت پسندی کا ایٹم بم نہ پھینکنا۔" رابعہ وعدہ کر رہی ہے کہ وہ مجھ سے فوزیہ کو نہیں چھینے گی۔ وہ کسے دھوکا دے رہی ہے اور کیوں؟ محسن کے دھوکا دے رہا ہے۔ میں کسے دھوکا دے رہا ہوں؟ میں نے محسوس کیا کہ رابعہ کے ساتھ آ کے میں نے ایک جذباتی حماقت کی ہے۔ مجھے صرف اپنی زندگی سے سروکار رکھنا چاہیے تھا۔ انگریزی محاورے کے مطابق دو کشتیوں میں قدم رکھنے والا ڈوب جاتا ہے۔

گاڑی پھر رابعہ کی کوٹھی میں داخل ہوئی تو میں چونکا۔

"یہ تم... میرا مطلب ہے اگر مجھے راستے میں ڈراپ کر دیتیں تو اچھا تھا۔" میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی جس میں رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔

"اگر تمہیں ایک رات بھی گیسٹ روم میں گزارنے پہ شدید اعتراض ہے تو میں تم کو چھوڑ آتی ہوں۔" وہ کچھ بُرا مانتے ہوئے بولی۔ اور میں نے ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو جانے کے سوا چارہ نہ دیکھا۔ لیکن گاڑی کے رکتے ہی خادمہ بدحواسی کے عالم میں باہر نکلی۔

www.paksociety.com

"چھوٹی بی بی! کہاں چلی گئی تھیں آپ؟" اس نے ملامت آمیز خفگی سے کہا۔ "بیگم صاحبہ کی طبیعت بہت خراب ہے۔" میں نے رابعہ کے دمکتے ہوئے شگفتہ چہرے کو یوں مرجھاتے اور بے رنگ ہوتے دیکھا جیسے پھول کو شاخ گل سے جدا کر کے انگاروں پہ پھینک دیا جاتا ہے۔

"کیا ہوا ہے امی کو؟" اس نے خادمہ کو جھنجھوڑا جو دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کے آنسو صاف کر رہی تھی۔

"پتہ نہیں جی۔ ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہیں۔ آپ دیکھ لیں اوپر جا کے۔" وہ بولی۔

رابعہ مجھے بھول کے اندر لپکی اور میں اس کے ساتھ رہا۔ زینے سے اوپر جاتے ہوئے ایک بار اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اس ایک نظر میں سوال بھی تھا کہ کیا میں نے مسرت کے تین گھنٹے مانگ کے کوئی گناہ کیا تھا جس کی سزا قدرت اب دے رہی ہے؟ اس نظر میں التجا بھی تھی کہ مجھے سہارا دو۔ ندامت بھی تھی اور دکھ بھی تھا۔ پریشانی بھی تھی اور پشیمانی بھی۔ میں نے فقط سر ہلایا اور اس کے ساتھ ساتھ اوپر چلتا گیا۔ کمرے کا دروازہ کھول کے وہی ڈاکٹر باہر آیا جس نے میرے زخم کی ڈریسنگ کی تھی۔ اس نے ایک نظر ہم دونوں کو غور سے دیکھا۔

"فون کرو اور ایمبولنس طلب کرو۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "تمہاری امی پہ دل کا دورہ پڑا ہے۔"

"دل کا دورہ؟" رابعہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "شدید یا معمولی؟"

"میں اسے معمولی بھی نہیں کہہ سکتا۔" وہ اسی خشک لہجے میں بولا۔ "اہمیت اس بات کی ہے کہ ان کو جلد از جلد ہوسپٹل پہنچا دیا جائے۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ بے وقوف لڑکیوں کی طرح رونے دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"فون کدھر ہے؟" میں نے کہا اور رابعہ نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اسے اپنی ماں کی خواب گاہ میں داخل ہوتے دیکھا۔ ایک نظر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور رابعہ کے بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔ ٹیلیفون اس کے بیڈ سائڈ کی ٹیبل پر رکھا تھا۔ دوسری طرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ میں نے ایک ٹیوب لائٹ جلا کے اور رابعہ کے بستر پر بیٹھ کے وہ ڈائریکٹری اٹھائی جو ٹیلی فون کے نیچے والے خانے میں رکھی تھی۔ کمرے میں عجیب سی خنک فضا تھی۔ اس کی پردوں کے رنگ، قالین اور انداز آرائش میں نسوانیت کا سحر انگیز تاثر تھا اور حواس پہ چھا جانے والی نرم و لطیف خوشبو بسی ہوئی تھی۔ وہی جو رابعہ کے ساتھ اس کی گاڑی میں بھی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے شروع کے صفحات پر ایمرجنسی نمبر دیکھے اور ایک نمبر ڈائل کر کے ایمبولنس طلب کی۔ پھر رابعہ کی ماں کے کمرے میں پہنچا تو رابعہ بستر کے سرہانے کھڑی رومال سے آنسو خشک کر رہی تھی اور ماں کو دیکھ رہی تھی، جو آنکھیں بند کیے سیدھی لیٹی کراہ رہی تھی۔

"ایمبولنس ابھی آ جاتی ہے۔" میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔ "ماں ٹھیک ہو جائے گی۔ خدا پہ بھروسہ رکھو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور میرے کندھے پہ سر رکھ کر رونے لگی۔ "یہ سب تو میری غلطی ہے سکندر! مجھے ماں کو اس حالت میں ہرگز چھوڑ کے نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں سیر کے گھومنے نکل گئی حالانکہ مجھے معلوم تھا ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ اب آہستہ آہستہ ہسٹریا کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے اس کا سر اپنے کندھے پر سے ہٹایا اور اس کا بازو تھام کے جھٹکا دیا۔

"رابعہ! تمہارا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ اس وقت میں تمہیں سنبھالوں؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "یا تمہارا فرض ہے کہ میرے ساتھ مل کے ماں کو سنبھالو۔ کیا میں چلا جاؤں؟"

"نہیں نہیں۔" وہ فوراً سنبھل گئی۔ "آئی ایم سوری... ہونے والی بات تو ہوتی ہے۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "لیکن سکندر، خدا نخواستہ ماں کو کچھ ہو گیا تو کیا میں تمام عمر اپنی کوتاہی پہ خود کو مورد الزام نہیں ٹھہراؤں گی؟"

"پھر وہی حماقت کی بات۔ زندگی اور موت تمہارے ہاتھ میں ہے کیا؟" میں نے کہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تم اپنے کمرے میں سوتی پڑی رہ جاتیں۔ تمہاری عدم موجودگی میں یہ تو ہوا کہ خادمہ نے ماں کا خیال رکھا اور ڈاکٹر کو بلایا۔ اب دعا کرو اور خدا سے نیک امید رکھو۔"

بیس منٹ بعد جب ہم نے رابعہ کی ماں کو اسٹریچر پر ڈالا اور ایمبولنس میں منتقل کیا تو وہ بدستور بے ہوش تھیں۔ ایمبولنس نے سائرن بجاتے ہوئے لاہور کی سڑکوں پر دوڑنا شروع کیا۔ یہ آواز سکوت شب میں بالکل موت کی بھیانک پکار بن کے گونجنے لگی اور ویران راستوں سے چلنے والوں کا حق مانگنے لگی۔ ڈرائیور نے عادتاً سائرن کو آن کر دیا تھا ورنہ اس وقت زندہ اور صحت مند انسان ایمبولنس کی راہ میں حائل نہیں ہو رہے تھے۔ اس سے فضا کچھ اور دہشت ناک ہو رہی تھی اور یہ بین کرتی ہوئی آواز خود میرے اعصاب کو متاثر کر رہی تھی۔ بالآخر ایمبولنس میو ہوسپٹل میں ایمرجنسی

کے روشن سائن بورڈ والے دروازے پر جا رکی۔ رابعہ قادری کے نام سے زیادہ اس کے کارڈ پر لکھے ہوئے "ایڈووکیٹ ہائیکورٹ" کے الفاظ نے جادو کا اثر کیا۔ ایک کے بعد دوسرے ڈاکٹر نے ای سی جی کا معائنہ کیا اور آدھے گھنٹے بعد رابعہ کی ماں کو داخل کر لیا گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی حالت تشویشناک ہے، چنانچہ چوبیس گھنٹے تک انہیں خصوصی توجہ اور مشاہدے کے وارڈ میں رکھا جائے گا اور اگر اس مدت میں کوئی شدید تر دورہ نہ پڑا تو ان کے جانبر ہونے کے خاصے روشن امکانات ہوں گے۔ تاہم اس کے بعد بھی ان کو بہت عرصے تک مکمل آرام اور علاج کی ضرورت ہو گی۔ اس وارڈ میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی چنانچہ رابعہ نے ڈاکٹروں کو اپنے گھر کا فون نمبر دیا اور ہم ہسپتال سے نکلے تو صبح کاذب کا اجالا پھیل رہا تھا۔ میں نے رابعہ سے کہا کہ مجھے محسن رضوی کی کوٹھی پہ ڈراپ کر دے۔ مجھے احساس تھا کہ محسن میری رات بھر کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہو گا۔

"میں آج شاید کورٹ نہ جا سکوں۔" وہ مجھے اتار کے بولی۔ "آج تمہارا حق وراثت کا کیس فائل کرنا تھا۔"

"وہ سب ہوتا رہے گا۔" میں نے کہا۔ "تم چلو۔ ہم دونوں اگلے دو گھنٹے کے اندر اندر آتے ہیں۔ پھر ہسپتال چلیں گے۔"

اس نے احسان مند نظروں سے مجھے دیکھا اور کار آگے بڑھا دی۔ میں اس کی گاڑی کو خالی سڑک کے آخری موڑ تک جاتا ہوا دیکھتا رہا اور پھر اندر چلا گیا۔ حسب توقع محسن جاگ رہا تھا۔

"برادر نسبتی! پھر ایک پرمحل سفر یاد آ گیا ہے؟" وہ اٹھ بیٹھا۔ "یہ اڑی اڑی سی رنگت...؟"

"یار کیا بتاؤں۔" میں نے دوسری چارپائی پہ دھم سے گر کے کہا۔ "رابعہ کی ماں پہ میری موجودگی میں ہی خاصا شدید دل کا دورہ پڑ گیا اور اب اسے ہسپتال میں داخل کرا کے آ رہا ہوں۔"

"یہ تو بڑی تشویش کی بات ہے۔" محسن سنجیدہ ہو گیا۔ "اگر بڑی بی کو کچھ ہو گیا تو رابعہ اکیلی رہ جائے گی۔"

"یہ خیال اب آیا ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے کیوں نہیں آیا۔ اس وقت تو جان بچا کے بھاگ آیا تھا جب بڑی بی نے..."

"دیکھو سکندر!" محسن نے میری بات کاٹ دی۔ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ رابعہ سے اچھی رفیق حیات تجھے نہیں مل سکتی لیکن ایک تو انتخاب کا حق تجھے حاصل نہیں۔ میرے باپ سے زیادہ میری ماما کو ہے۔ اس کے علاوہ کیا رابعہ سے کسی نے پوچھا ہے کہ اس کے ذہن میں مثالی شوہر کا تصور کیا ہے؟"

"کتابی فلسفہ مت جھاڑو۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "کیا اب تجھے مثالی شریک حیات ملے گی جو تیری اماں تجھ سے پوچھے بغیر کسی کا ہاتھ بھی تیرے ہاتھ میں تھما دیں گی کہ لے بیٹا اب گزار مثالی ازدواجی زندگی۔ یہی رابعہ کی ماں نے کیا تھا۔ اور جب تجھ میں ہمت نہیں ہے اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق مانگنے کی تو لڑکیوں سے کیوں توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنا حق حاصل کر سکتی ہیں۔ نہ فوزیہ نہ رابعہ۔ یہ سب اللہ میاں کی گائے سے زیادہ بے بس اور بے زبان مخلوق ہیں اور ان کی خرید و فروخت کے جملہ حقوق بحق والدین محفوظ ہیں۔ مگر ہمت ہے تو مجھ سے بات کر۔ میں بات کرتا ہوں انکل تیمرانی سے اور وہ بات کریں گے رابعہ کی ماں سے۔ رابعہ کی ماں بات پکی کر دے گی اور اس کے بعد میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بہترین رفیق زندگی ہو گے اور تمہاری ازدواجی زندگی پر دنیا رشک کرے گی۔ بول منظور؟"

محسن کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ "نہیں سکندر! مجھ میں اس کی ہمت نہیں ہے۔"

"جب تک تو لندن میں تھا تیرے خیالات کچھ اور تھے۔" میں نے کہا۔ "مریم کی شادی پہ تو نے ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا اور احتجاجاً شریک بھی نہیں ہوا تھا۔ تو کہتا تھا کہ شادی کے بعد والدین کتنے دن ساتھ رہتے ہیں۔ دو چار یا زیادہ سے زیادہ دس بیس سال۔ پھر وہ خود تو قبر میں جا لیٹتے ہیں اور والدین کی پسند کا عذاب بھگتنے کے لیے بیٹیاں پچاس سال تک ان کو دعائیں دیتی رہتی ہیں؟"

"میرے خیالات اب بھی وہی ہیں سکندر! لیکن حالات وہ نہیں ہیں۔" محسن بولا۔ "اب میں مجبور ہوں ورنہ تیری بات مان لیتا!"

"تجھے کیا مجبوری ہے۔ تو لڑکی ہے کیا؟" میں نے کہا۔ "بیٹے تو ضد کر کے بھی ماں کو منا لیتے ہیں۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ان سے ضد کر کے کوئی حق نہیں چھین سکتا۔ جو بات مجھے یہاں آ کے معلوم ہوئی ہے اس نے مجھے ہی نہیں ہم سب کو۔ ہمارے گھر کے سب افراد کو مجبور کر دیا ہے کہ ان کی زندگی کے آخری چند ایام میں ان کو ہر خوشی فراہم کریں۔"

"آخری چند ایام؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "کیا ہوا ہے انہیں؟"

"وہی مرض جس کا علاج نہیں اور جس میں بچا کوئی بھی جو امید شفا نہیں دیتا، یہ بتا دیتا ہے کہ رخصتِ سفر باندھنے کے لیے قدرت زیادہ سے زیادہ کتنی مہلت دے گئی ہے۔"

محسن نے کہا۔ "ممی کو دو ماہ قبل حتمی طور پر بتا دیا گیا تھا کہ ان کو مہلک قسم کے سرطان کا عارضہ لاحق ہے اور ان کی زندگی کے چھ مہینے باقی ہیں۔ آٹھ بھی ہو سکتے ہیں لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ دو مہینے تو گزر چکے ہیں اور باقی ہیں وہی چھ ماہ۔ وہ سخت گیر ماں اور گھر میں ڈکٹیٹر قسم کی حاکم ضرور رہی ہیں مگر انہوں نے ہم سب کے مفادات کی نگرانی نہ کی ہوتی تو ہم سب وہ نہ ہوتے جو آج ہیں۔ ڈیڈی اپنی کارکردگی کے اعتبار سے اچھے افسر یقیناً ہوں گے لیکن ایک فائل اور ایک گھر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو گھر کی خوشحالیوں سے بکھر دفتر کی امور کو یکسوئی سے نمٹانے میں بھی ممی کی مدد شامل تھی۔ پاپا گھر کی طرف سے ہمیشہ بے فکر رہ کر اپنے کام میں لگے رہے اور ترقی کرتے گئے۔ ہمیں کبھی توجہ یا محبت کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ اب ممی چاہتی ہیں کہ وہ اپنا آخری فرض بھی اپنی زندگی میں ہی پورا کر دیں تو ہم انہیں کیسے روک سکتے ہیں۔ یہ تو خودغرضی اور کمینگی کی انتہا ہوگی کہ جب تک وہ ہم سب کی زندگی سنوارنے کی جدوجہد کرتی رہیں اور ہمارے مستقبل کی خوشی کو یقینی بنانے کے لیے کوشاں رہیں ہم نے ان کے اختیارات کو چیلنج نہیں کیا۔ اور اب وہ مرنے سے پہلے ایک خوشی مانگتی ہیں تو ہم یہ سوال کریں کہ تم مرنے والی ہو تمہیں زندہ رہنے والوں پر اپنی مرضی مسلط کرنے کا کیا اختیار ہے؟"

میں ہکا بکا بیٹھا رہا۔ محسن کی صورت پر اس کا سارا دکھ سمٹ آیا تھا۔ "تو نے اب تک مجھے کیوں نہیں بتایا تھا؟"

"مجھ میں اس کی ہمت نہیں تھی۔" محسن نے دیوار کو گھورتے ہوئے کہا۔ "ابھی تک کسی نے ممی کو بھی کچھ نہیں بتایا ہے۔"

یکلخت ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میری نظریں حقیقت کو روزِ روشن کی طرح دیکھنے لگیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی مجبوری کے سامنے میں خود بھی بے بس ہوں۔ فوزیہ، محسن اور شیروانی صاحب کی طرح میں بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ محسن نے کہا تھا کہ ہم یہ سوال کیوں کریں۔ اس نے اپنی ہی بات نہیں کی تھی۔ اپنے ساتھ فوزیہ کی بات بھی کی تھی۔ میں اس بات کا مطلب سمجھ گیا جو محسن نے گزشتہ شب کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ایک بات کہتا ہوں جو تیرے مفاد میں ہے۔ اس نے کہا تھا سرطان کے مریض کو یہ کوہ، بتا ہے کہ اسے اب کتنے دن اور جینا ہے۔

"صاف بات یہ ہے سکندر کہ ممی نے میری اور فوزیہ کی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" محسن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "اس فوری فیصلے کا سبب یہ نہیں کہ ان کو اپنے انجام کی خبر مل گئی ہے۔ اگر تو ان الجھنوں میں نہ پڑتا اور تیرے لیے قانونی مسائل زندگی کو لاحق خطرات اور سوالیہ نشان نہ ہوتے تو اس سال اپنی تعلیم مکمل کر کے لوٹ آنے کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق سب کچھ ہوتا مگر اب ان کا ذہن حالات سے خوفزدہ ہے۔ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ انکل وزیر خان کا انتقال کسمپرسی کے عالم میں اور ایسے پراسرار حالات میں ہوا کہ تجھے قتل کا شبہ ہے اور اس پولیس نہیں خود تجھ پر قتل کا الزام ہے اور ممی سارے معاملات کو میری باتوں کی رو سے نہیں ایک بیٹی کی ماں کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ انہیں یقین نہیں کہ تو سزا سے بچ جائے گا لیکن وہ کہتی ہیں کہ سزا سے بچ بھی جائے تو رسوائی تو ہو چکی۔ لوگ تمام عمر میری بیٹی کو طعنے دیں گے کہ اس کا شوہر قاتل تھا۔ دنیا یہ سمجھتی ہے قاتل ثبوت نہ ہونے کے باعث یا جھوٹی شہادتوں سے اور دس چکر چلا کے قانون کی گرفت سے نکل جاتے ہیں۔ انہوں نے فوری طور پر فوزیہ کی شادی پروفیسر ایاز سے کرنے کا فیصلہ اسی لیے کیا ہے۔ تین مہینے کے اندر اندر۔ ابھی تک فوزیہ کو اس فیصلے کا علم نہیں ہے مگر ممی جانتی ہیں کہ وہ اس فیصلے کے خلاف آواز اٹھا ہی نہیں سکتی۔ تیرے خلاف دینے کے لیے ان کے پاس دلائل کی کمی نہیں اور فوزیہ کسی دلیل سے یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ پروفیسر ایاز میں کوئی خامی ہے۔ ابھی تو انہوں نے میرے کندھے پر بندوق رکھ کے چلائی ہے یعنی میرے رشتے کی بات کی ہے اور کہا ہے کہ لڑکی والے اس شرط پر راضی ہیں کہ منگنی اور شادی سب فوراً کر دی جائیں۔ تیاری لڑکی والے کرتے ہیں۔ ممی یہ شرط قبول کر لیں گی مگر یہی شرط بیان کی جائے گی فوزیہ کی ڈولی بھی ساتھ ہی اٹھانے کا۔ بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ بہن بیٹھی رہ جائے اور بھائی کی برات آ جائے۔ دونوں کام ایک ساتھ نمٹائے جائیں گے۔ وہی انداز تو ایمرجنسی والا۔" وہ کچھ دیر کے لیے رکا۔ "ظاہر ہے ہم حقیقت سے زیادہ باخبر ہیں۔ اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتے۔ یہ دل ہے جو آدمی کو بزدل بنا دیتا ہے اور قدم پیچھے ہٹانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ خود ایسا کون چاہتا ہے۔"

مریضہ جان کا سوچ پہلے بھی ان گنت انسانوں کی زندگی کا فیصلہ کرتا تھا۔ آج کے دن کے سوچ نے مجھے خبر دی کہ کی زندگی کا فیصلہ ہو چکا۔ فوزیہ کی ممی کے علاوہ اور بھی بہت سے فیصلے ہو چکے تھے جن سے میں بے خبر تھا۔ ان میں فوزیہ بھی تھی اور میں خود بھی تھا۔ محسن بھی تھا۔ شاید رابعہ بھی تھی اور اس کی ماں بھی تھی۔ وقت کے منصف نے یہ فیصلہ محفوظ کر لیا تھا لیکن مجھے کوئی بات نہ تھی کہ یہ فیصلہ کیا ہے۔ اس کے کسی اعلان کا انتظار باقی تھا مگر اس کے خلاف اپیل کی گنجائش باقی نہ تھی۔ میں بہت دیر تک دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے لیٹا رہا اور چھت کو گھورتا رہا جو سینما کے اسکرین کی طرح خالی تھی جب یہ فلم ٹوٹ جانے سے بالکل حقیقی زندگی کی طرح دکھائی دینے والا رنگین منظر یکلخت غائب ہو جائے اور ذہن ایک جھٹکے سے تاریکی میں خلا کی ویرانی پر مرتکز رہ جائے۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ اب اس کا کیا ذکر کہ کیا دیکھا تھا اور کیا سنا تھا۔ آدمی اگر اپنے نوشتۂ تقدیر کو خود پڑھ سکتا تو خدا ہوتا۔ اس کی خدائی کو نہ مانتا۔ وہ صرف محسوس کر کے ان کی شناخت کر سکتا ہے۔ کسی کمپیوٹر سے یہ نہیں پوچھ سکتا کہ آنے والا لمحہ اس کا دوست ہے یا دشمن۔ قاتل ہے یا مسیحا۔ بس میں نے فقط یہ کہ اس فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہوں کیونکہ میں آنے والے لمحے سے بچ کے نہیں نکل سکتا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ وہ سنتے ہوئے خاموش اور شرمندہ بیٹھا تھا۔ آہستہ سے اس نے ایک قطرۂ اشک کو انگلی پہ لے کر جھٹک دیا۔

"محسن!" میں نے کہا۔ "تجھے کیا ہوا ہے بھائی؟ یہ سب یہاں ہونا تھا تو یوں ہی ہونا تھا۔ تو نے تو کچھ نہیں کیا جو شرماتا ہے۔"

محسن زبردستی مسکرایا۔ "میں کہاں رو رہا ہوں۔ مجھے تجھ پر اعتماد تھا۔ میں نے کل کہا تھا نا کہ تجھ میں ہر صدمہ جھیلنے کی قابلِ رشک صلاحیت ہے۔ میں نے سوچا تھا رات کو تو واپس آئے گا تو تجھے سب بتا دوں گا۔"

"سوری یار! میں نے رات بھر تجھے انتظار کے عذاب میں جکڑ کر رکھا۔" میں نے دل شکستگی کے درد کو دبا کے خوشدلی سے کہا۔ "بہتر ہوتا اگر تو اسی اعتماد کا اظہار دیر سے نہ کرتا۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں بتایا۔ تو غم کے اس پہاڑ کو اکیلا کیوں اٹھائے پھرتا رہا۔ میرے ستارے گردش میں تھے اور مجھے پہلے سے اندازہ ہونے لگا تھا کہ تقدیر میرے ساتھ آخری سنگین مذاق کیا کرتی ہے۔ اس لیے میں یہ صدمہ اٹھانے کے لیے بھی تیار تھا۔ جینے والوں کے لیے کھونے کے پھول اور دکھ کے کانٹے چننا اپنے اختیار کی بات نہیں۔ چل اب بھول جا اس بات کو۔ یہ بتا وہ بدبخت کون ہے جس پر تجھے تھوپا جا رہا ہے؟"

محسن مسکرایا۔ "مجھے نہیں معلوم یار! ہوگی کسی ڈپٹی سیکریٹری کی یا امپورٹر ایکسپورٹر کی بیٹی۔ انہی کے حلقے میں سے کوئی۔ اتنا میں جانتا ہوں کہ ممی کی ترجیحات کیا ہوں گی۔ پہلے خاندان، پھر شکل صورت، پھر تعلیم اور سلیقہ وغیرہ۔ اب میں کیا بولوں!"

"انہیں خوش رکھنا ایک مقدس فریضہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس میں تھوڑی سی شرکت میں بھی چاہتا ہوں۔ اس طرح کہ ان کے دل میں فوزیہ کے معاملے میں میرے ساتھ ہونے والی کسی زیادتی کا احساس بھی نہ رہے اور خود فوزیہ کے دل میں یہ خلش نہ رہے کہ وہ میرا ساتھ نہ نبھا سکی۔ میں تو ہوں ہیڈ آف ٹیکنیکل قسم کا آدمی۔ لڑکیاں، خصوصاً فوزیہ جیسی لڑکیاں خلش کو روگ بھی بنا لیتی ہیں۔"

"کیا چاہتا ہے تو؟" محسن نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں سمجھا نہیں۔"

"ڈرامہ!" میں نے کہا۔ "ابھی فوزیہ کو تیری ممی کے فیصلے کا علم نہیں ہے نا۔ کسی طرح اس کو بتا دے کہ میں رابعہ کے چکر میں پڑ گیا ہوں۔ اپنی ممی سے فون پر بات کرتے ہوئے یہ بات کہہ دے۔ وہ خود فوزیہ کو بتا دیں گی۔ فوزیہ مجھ سے بات کرے گی۔ یا مجھ سے۔ اور میں یہ کہہ دوں گا کہ سوری۔ شریکِ حیات کے بارے میں میرے تصورات بدل گئے ہیں۔ اور میں گھر گھسنے ٹائپ دیسی لڑکیوں سے الرجک ہو گیا ہوں جو امورِ خانہ داری کے سوا کچھ نہیں جانتیں اور شوہر کو مجازی خدا اور خود کو اس کے پاؤں کی جوتی سمجھتی ہیں۔ مائی فٹ! مجھے الٹرا ماڈرن قسم کی بیوی چاہیے۔ بیسویں صدی کا تازہ ترین ماڈل جس کے ساتھ مجھے کہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ تو کہہ سکتا ہے کہ رابعہ کس قماش کی عورت ہے۔ دلیل ہے، کالا چلا ہی ہے۔ بس اتنا کافی ہوگا۔ یہ پرانا مجرب نسخہ ہے جو ہمیشہ کارگر ثابت ہوا ہے۔ میرے سر الزام ہوگی میری ذات مگر ایک عورت کی زندگی پُرسکون رہے گی دوسری کی موت۔ یہ کوئی مشکل کام تو نہیں۔"

"ہاں!" محسن نے بے خیالی میں دہرایا۔ "یہ کوئی مشکل کام تو نہیں۔ ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔"

"چل اب رابعہ کی خبر لینی ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے ماں کی ملکیت کے ساتھ ہی یہ بھی فکر تھی کہ میرے سے وراثت کے سرٹیفکیٹ کا مقدمہ آج فائل نہ ہو سکے گا۔ اخبار دیکھنا ہے کہ سلامت

www.paksociety.com

مشتاق کیس کا کیا بنا۔ منظر صاحب سے پوچھنا ہے کہ پوسٹ مارٹم کرانے کے کیس کا کیا بنا۔ لیکن سب سے پہلے آج مجھے میرز یڈ اینڈ کمپنی جانا ہے۔ ابھی ہم یہاں سے نکلیں گے تو ساتھ ہی تم رابعہ کے ساتھ ہسپتال چلے جانا۔ میں وہیں آجاؤں گا اور اس کے بعد باقی پروگرام۔"

ساتھ والے کمرے سے کانسٹیبل اٹھ کے ہم سے شرف ملاقات حاصل کرنے آیا اور اس نے چند منٹ تک ہمیں اپنے نام، جائے سکونت، تعداد ازدواج و پیداوار، بحیثیت ڈرائیور ایس پی صاحب کے پاس اپنی اہمیت اور اپنی نظر میں ہماری حیثیت کے بارے میں مختصر سی معلومات فراہم کیں۔ یہ کہا کہ وہ ہمارے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ پھر زیدی کا مدعا ترتیب کر کے اس نے ہمیں بخشا اور وہ غسل خانے میں گھس گیا جہاں سے اس کے حلق میں سے برآمد ہونے والی عجیب و غریب آوازیں چند منٹ تک سنائی دیتی رہیں۔ صفائی کے اس پرشور عمل سے فارغ ہو کے اس نے کمرہ مقفل کیا اور ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم بھی تیار ہو کے نکلے تو وہ جیپ کے قریب ٹہل رہا تھا اور سگریٹ کو چلم کی طرح انگلیوں میں پھنسا کے کش لے رہا تھا۔ اسی وقت حفاظت رضوی صاحب برآمد ہوئے اور انہوں نے ہمیں بلا لیا۔ بڑے مشفقانہ انداز میں ہاتھ ملانے کے بعد انہوں نے شکایت کی کہ کل سے اب تک ہم ملنے کیوں نہیں آئے۔ یہ پوچھا کہ ہم نے کھانے کا کیا انتظام کیا ہے اور خفا ہوئے کہ ہم نے باہر... کھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہماری ایک نہ چلی... انہوں نے اپنے خانساماں کو طلب کیا اور اسے احکامات جاری کیے کہ چار بجے ناشتے اور دونوں وقت کے کھانے کا بندوبست رکھے۔ ناشتہ تو صبح پہنچا دے اور کھانا جس وقت بھی ہم آئیں طلب کیے بغیر لے جائے۔ میں نے ایک مرتبہ نظر بچا کے گھڑی دیکھی۔ ہمیں کھڑے کھڑے باتیں کرتے بیس منٹ ہو گئے تھے۔ ان کے دو بچے بستے لیے نکلے اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ حفاظت رضوی صاحب نے ان کو ڈانٹا کہ انکل کو سلام نہیں کیا۔ بچوں کو اور شوہر کو سی آف کرنے کے لیے ان کی بیگم نکلیں تو ہم نے آداب کیا — حفاظت رضوی صاحب نے کہا کہ اس وقت تو انہیں جانا ہے مگر وہ شام کو ہم سے مفصل ملاقات کریں گے چنانچہ ہم رات کا کھانا ان کے ساتھ ان کے گھر پہ کھائیں۔ پھر انہوں نے ہمیں بھی ساتھ بٹھایا اور رابعہ کے گھر کے دروازے پہ ڈراپ کر کے سیدھے نکل گئے۔ اس وقت تک ان کا کانسٹیبل ڈرائیور ان تمام حالات سے پہلو تہی کر چکا تھا جن کا اظہار اس نے نادانستگی میں تسلیم کیا تھا۔ اب حیثیت اور اہمیت کے بارے میں اپنی معلومات کے اس حد تک ناقص ہونے پر سخت شرمندہ تھا۔ آسمان پر اب گہرے سیاہ بادل پھیل گئے تھے اور بارش کے آثار بھی۔ میں نے رابعہ سے ہسپتال میں ملنے کا وعدہ کیا اور محسن کو وہیں چھوڑ کے میڈن روڈ پہنچا۔ رکشا کو میں نے زیڈ اینڈ کمپنی والے کنارے پر روکا اور باقی فاصلہ پیدل طے کر کے ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے اس جگہ پہنچا جہاں "میرز یڈ اینڈ کمپنی" کا سائن بورڈ آویزاں تھا۔ وہ ایک دو منزلہ عمارت کے اوپر والے حصے میں واقع تھا۔ نیچے چار دکانیں تھیں جو ابھی بند تھیں۔ دروازہ انہی کے بیچ سے نکالا گیا تھا۔ اس طرح کہ دو دکانیں ایک طرف تھیں تو دو دوسری طرف۔ زینے میں کھلنے والے دروازے کا ایک پٹ تھا جو جدید قسم کا فلش ڈور تھا۔ اس کا آدھا پٹ شفاف شیشے کا تھا جس کے گرد بالشت بھر چوڑا لکڑی کا حاشیہ تھا اور اس کی لکڑی کے رنگ سے فارمیکا کی طرح پالش چمک رہی تھی۔ ڈور لاک بھی خودکار ٹائپ تھا لیکن حفاظتی انتظامات کی تکمیل باہر کی جانب لوہے کی سمت والی گرل لگا کے کی گئی تھی جو اس وقت مقفل تھی۔ پرانی عمارت میں یہ نیا انتظام بالکل الگ نظر آتا تھا۔ اوپر کی منزل میں بھی کھڑکیاں تبدیل کی گئی تھیں۔ یعنی بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکیوں کی جگہ پہلے پرانی طرز کی لکڑی کے پٹ والی اور سلاخوں والی کھڑکیاں ہوں گی جو آس پاس کی دوسری عمارتوں میں اب بھی موجود تھیں۔ "میرز یڈ اینڈ کمپنی" کے دفاتر کے باہر گرل لگائی گئی تھی جس پر سلور کلر تھا۔ کسی امپورٹ ایکسپورٹ کمپنی کے آفس میں یہ غیر حفاظتی انتظام مجھے غیر معمولی لگا۔ شاید اس کی وجہ وہ شکوک تھے جو کاروبار کی نوعیت کے بارے میں پہلے سے میرے ذہن میں موجود تھے۔ سائن بورڈ آفس کی کل طوالت کے برابر کھڑکیوں کی دہلیز تک چوڑا تھا۔ گہرے نیلے رنگ پہ چمکنے والے فلورسینٹ زرد رنگ کے حروف میں کمپنی کا نام تھا۔ نیچے سائز میں آدھے اور سفید رنگ کے حروف میں "امپورٹرز اینڈ ایکسپورٹرز۔ ٹولز اینڈ مشینری" لکھا گیا تھا۔ بارش جب شروع ہوئی اور میں نے ایک بند دکان کے چھجے سے بنے سائبان کے نیچے پناہ لی جو اس زینے کے بالکل مقابل تھا۔ دس منٹ تک میں اپنے سامنے سے گزرنے والے

سائیکل اور موٹر سائیکل سواروں اور پیدل چلنے والوں کو دیکھتا رہا جو سب اپنے اپنے دھیان میں مگن تھے۔ بارش سے بچنے کے لیے کسی کی طرف دیکھے بغیر جلد از جلد منزل تک پہنچنے کی فکر کر رہے تھے اور ادھر ادھر پناہ لے رہے تھے۔ پھر ایک شخص میرے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ وہ نوجوان تھا لیکن اس کی صحت اچھی نہیں تھی۔ ستے ہوئے چہرے پر بڑھی ہوئی شیو کے باعث وہ کچھ بیمار سا لگتا تھا۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا دھاری دار قمیص اور سرج کی گہرے نیلے رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی اور اس بات سے خاصا مطمئن تھا کہ دونوں چیزیں اس کو فٹ آنے کے بعد دیکھنے والوں کو لنڈا بازار کی نظر نہیں آتی ہوں گی۔ ہم نے صرف ایک بار ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اپنے جیسا پناہ گزین سمجھ کے نظر انداز کر دیا۔ کچھ دیر بعد میں مایوس ہونے لگا۔ یہ مفروضہ تھا کہ میرز یڈ اینڈ کمپنی کے ملازم آتے ہوں گے اور چلے جاتے ہوں گے۔ اگر کسی کو آنا ہوتا تو اب تک ضرور آتا۔ نو بجے کے بعد تو کوئی دفتر نہیں کھلتا۔ "کیا مصیبت ہے۔" میرے قریب کھڑے ہوئے نوجوان نے بڑبڑا کے اپنے آپ سے کہا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" میں نے اس کی طرف دیکھا مگر وہ سامنے کے مقفل گرل والے دروازے کو دیکھ رہا تھا کہ اسے میرا بات کرنا بھی ناگوار گزرا۔ اس نے جھنجلا کے نفی میں سر ہلایا اور اس کا متفکر اور پریشان چہرہ دیکھ کر مجھے فوری طور پر ایک خیال آیا۔

"میرا خیال ہے آپ اس کمپنی میں کام کرتے ہیں؟" میں نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

"کرتا تھا جی۔" وہ مایوس اور شکایت آمیز لہجے میں بولا۔ "بڑی مشکل سے یہ نوکری ملی تھی۔ چھ مہینے بھی نہیں رہی۔"

"کیوں؟" میں نے محتاط لہجے میں کہا تاکہ میرے شوق اور تجسس سے وہ شک میں مبتلا نہ ہو۔ "نکال دیا ہے تمہیں؟"

"نہیں جی، کمپنی ہی بند ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ چھوٹی سی دکان ہے۔ مالک مر جاتے ہیں تو کوئی کمپنی بند ہوتی ہے؟" وہ بولا۔

"نہیں۔ مالکوں کے وارث چلاتے رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ منیجر ہوتے ہیں۔ مالک نہ ہو تو کاروبار جاری رکھتے ہیں۔"

"یہی تو مصیبت ہے جی۔" وہ بولا۔ میرے ہمدردانہ لہجے نے اسے اپنی پریشانی بیان کرنے پر مجبور کر دیا۔ "منیجر صاحب دو ہفتے کے دورے پر باہر گئے ہوئے تھے۔ یہاں مالک کا کسی نے خون کر دیا۔ منیجر کو کل آجانا چاہیے تھا مگر یہاں تو تالے پڑے ہوئے ہیں۔"

"تم تو خواہ مخواہ مایوس ہو رہے ہو۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "منیجر آجائے گا آج کل میں۔"

"سب جانتے ہیں جی۔ آفس کی چابیاں ان کے پاس ہوتی تھیں یا منیجر کے پاس۔" وہ بولا۔ "ایک چلا گیا باہر، دوسرا اوپر۔ میں گھر چلوں۔ کل دیکھوں گا۔" اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش کچھ کم ہو گئی تھی۔ اس نے سر جھکایا اور تیز تیز قدموں سے روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ چند ہی قدم گیا ہوگا کہ اسے ایک اور شخص نے روک لیا جو نسبتاً عمر رسیدہ تھا۔ انہوں نے آپس میں کوئی بات کی۔ نوجوان نے نفی میں سر ہلایا اور چل پڑا۔ دوسرا شخص تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا میرے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ وہ چالیس سے زیادہ عمر کا فربہ بدن آدمی تھا۔

"آپ مجھے پرانے آدمی لگتے ہیں۔" میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "کب سے ملازم ہیں یہاں؟"

وہ شخص چونک گیا۔ "جی... جی ہاں، سات سال ہو گئے ہیں مجھے۔ میں یہاں اکاؤنٹنٹ ہوں۔" وہ شخص مجھے غور سے دیکھنے لگا۔

"کیا منیجر کو کسی نے اطلاع نہیں دی کہ مالک کے انتقال کے بعد آفس بند پڑا ہے۔ اسے اپنا دورہ مختصر کر کے واپس آجانا چاہیے تھا۔" میں نے بڑے وقار اور متانت کے ساتھ اپنے لہجے کو کچھ تحکمانہ رکھتے ہوئے کہا۔ "لوگ آ کے واپس جا رہے ہیں۔ کیا نام ہے آپ کا اکاؤنٹنٹ صاحب؟"

"غلام علی... غلام علی جناب!" وہ بولا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں اور یہ سب... میرا مطلب ہے آپ کا ان معاملات سے کیا تعلق ہے؟" وہ ضرورت سے زیادہ تابعدار قسم کا غریب اور مسکین نظر آنے والا منکسر مزاج شخص تھا۔ کچھ زود حس ٹائپ۔

"اس کمپنی کے ایک مالک تھے وقار خان۔" میں نے نگاہ روبرو رکھتے ہوئے کہا۔ "ان سے واقف ہیں آپ؟"

"کیوں نہیں جناب۔ وہ تو بڑے مہربان تھے۔ میرے محسن تھے۔ اللہ جنت نصیب کرے ان کو۔ مجھے انہوں نے بڑے وقت میں سہارا دیا تھا۔" غلام علی نے کہا۔ "میں بیروزگار تھا۔ دس سال کی ملازمت کے بعد ایمانداری کے جرم میں مجھے نکال دیا گیا تھا۔ میں پی ڈبلیو ڈی میں ملازم تھا۔ میری

بدقسمتی کہ مجھے اسٹور میں بھیج دیا گیا میرے انکار کے باوجود۔ میں جانتا تھا یہ سازش ہے۔ وہاں سب کھاتے تھے اور خوب عیش کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے جیسا بنانے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنا ایمان کبھی نہیں بیچا تھا۔ میں نے کھانے والوں کی شکایت کی نیچے سے اوپر تک سب کو بتایا۔ مگر کچھ نہیں ہوا۔ الٹا میرے خلاف محاذ بن گیا۔ میں اکیلا کیا کرسکتا تھا۔ انہوں نے مجھے متعدد الزامات میں لپیٹ کر دیا اور تحقیقات ان کے سپرد ہوئی جو پیچھے والوں سے مل کر کھاتے تھے۔ انہوں نے مجھے خطرناک سمجھتے ہوئے بدعنوانی کا مرتکب قرار دیا اور برطرف کر دیا۔ میں نے مرحوم وزیر خان کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ آدمی کو پہچانتے تھے۔ انہوں نے کہا فکر نہ کرو غلام علی! بندے کا قدر جب تک ہے اس کا رزق کون بند کرسکتا ہے۔ اگلے دن سے مجھے اتنی ہی تنخواہ پر نوکری مل گئی۔"

"آپ ان کے جنازے میں تو شریک ہوئے ہوں گے" میں نے کہا۔

"اب اتنا بھی بے مروت کرتے تو لعنت ہمارے انسان ہونے پر۔" اس نے الفاظ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ "آدمی احسان مند ہو، نمک کھایا ہو اس نے اور اس میں اتنی شرافت بھی نہ ہو تو اس سے کتا ہونا اچھا۔" وہ ضرورت سے زیادہ باتونی اور جذباتی آدمی تھا اور غالباً ہائی بلڈ پریشر کا شکار۔

"اچھا غلام علی صاحب! مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں کہیں بیٹھ سکتے؟" میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "آپ غائبانہ طور پر مجھ سے متعارف ہوں گے۔ میں سکندر بخت ہوں۔ مرحوم وزیر خان کا بیٹا۔"

"آپ..." وہ چلایا اور اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ لندن سے آئے ہیں... مگر میں نے تو سنا تھا..."

"آپ نے ٹھیک سنا تھا" میں نے کہا۔ "لیکن جو کچھ سنا تھا اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسے آپ ایک سازش کا شکار ہوئے تھے ایسے ہی میں بھی ایک سازش کے جال میں پھنس گیا ہوں۔ اور مجھے شبہ ہے کہ میرے والد مرحوم بھی کسی سازش کا شکار ہوئے تھے۔ میں اصل حالات پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں اور خاصا پُر امید بھی ہوں کیونکہ مجھے والد کے مخلص دوستوں کا تعاون حاصل ہے اور کچھ میرے ہمدرد بھی ہیں جو مجھے پیش کر رہے ہیں۔ کیا آپ میری کچھ مدد کریں گے؟"

"کیوں نہیں جی۔ اپنے سکندر صاحب! مجھ پر تو ایک احسان کا قرض ہے۔ میرا بال بال اس قرض میں بندھا ہوا ہے اور میرے بیوی بچے بھی دعا دیتے ہیں اس نیک بندے کو، جس نے مجھے ایسے وقت میں پناہ دی جب سارا زمانہ سمجھ رہا تھا کہ میں بے ایمان اور بددیانت ہوں اور مجھے چپراسی کی جگہ رکھنے کو بھی تیار نہ تھا۔ کسی کو مجھ پر اعتبار نہ تھا۔" غلام علی نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"یہی پوزیشن آج میری ہے غلام علی!" میں نے کہا۔

کوئی منگل شیراز ان قریب ترین ریسٹورنٹ تھا۔ چند منٹ بعد ہم اس کی پرسکون فضا میں گرم گرم چائے کا لطف اٹھا رہے تھے اور میں اسے بتا رہا تھا کہ میرے والد کے خلاف سازش کی نوعیت کیا ہے۔ میں نے اسے تمام واقعات نہیں سنائے بلکہ وہی باتیں بتائیں جن کا تعلق میرے والد یا کمپنی کے حالات سے تھا۔ میں نے بتایا کہ کس طرح میر شرافت علی نے کاروبار میں ایک شریک کی حیثیت سے داخل ہو کے تمام کاروبار پر قبضہ کیا ہے۔ میرے والد کو کسی نامعلوم طریقے پر بلیک میل کیا اور انہیں عضو معطل بنا کے الگ کر دیا۔ ان کے بارے میں مشہور کیا گیا کہ وہ بیماری کے باعث معذور ہیں اور ان سے حلفیہ پر دستخط لے کر ان کا منافع ہضم کر لیا گیا۔ کسی کو یہ بات معلوم نہ ہوسکی مگر وزیر خان مرحوم کوٹھی کو محتاج ہو کے اس کوٹھی میں معمولی ملازم کی حیثیت سے کام کرتے رہے جہاں ہے ان کا خاندانی اثاثہ۔ اس پرانے نمک خوار کے لیے یہ بات ناقابل یقین ثابت ہوئی کہ وہ کوٹھی جہاں وزیر خان کا انتقال ہوا تھا ان کی ملکیت نہیں تھی تاہم میں نے اسے یقین دلایا کہ اب میں آگیا ہوں تو سب معلوم کر لوں گا کہ ایسا کیوں ہوا جبکہ اگر سچ کی ہوتی ہے تو مجھ پر قتل کا جھوٹا مقدمہ کرنے والے ناکام ہوں گے اور میں تمام حرامیوں کو بے نقاب کر کے عبرتناک سزا دوں گا۔ مجھے اب شک نہیں یقین ہے کہ وزیر خان مرحوم کے انتقال کا سبب گٹھیا کا مرض نہیں تھا جیسا کہ اب ان کے دشمنوں نے مشہور کیا ہے بلکہ انہیں قتل کیا گیا ہے۔ اس راز پر سے پردہ اٹھانے کے لیے میں نے عدالت میں درخواست دی ہے کہ لاش کو قبر سے نکال کے اس کا پوسٹ مارٹم کیا جائے۔ عدالت میں مجھے تین گواہ پیش کرنے ہوں گے جو حلفیہ بیان دے سکیں کہ وہ تدفین کے وقت موجود تھے اور قبر کی نشاندہی کرسکیں۔ ایک گواہ چراغ دین کا مجھے پتا ہے۔ اگر دوسرا گواہ غلام علی ہو جائے تو صرف ایک اور گواہ کی کمی رہ جاتی ہے۔ اسے یقیناً علم ہوگا کہ جنازے میں اور کون لوگ شریک تھے اور کس کی گواہی

دیا جاسکتا ہے۔ غلام علی نے کہا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ کمپنی کے تمام پرانے نمک خوار میرے ساتھ ہوں گے اور عدالت کی تاریخ پر گواہی کے لیے بھی حاضر ہو جائیں گے۔ غلام علی کے لیے یہ انکشافات اتنا سنسنی خیز اور ناقابل یقین تھا کہ احمقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا تھا اور بار بار مجھے اس کو متوجہ کرنا پڑتا تھا کہ جانے قسمت ہی ہو رہی ہے۔ ایک بار اس نے کہا "گولی مار دی جائے ان کو سکندر صاحب! میرا تو خون کھول رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ یہ مسئلہ جذبات پر قابو رکھ کے اور عقل سے کام لے کر حل ہوگا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ یہ سارا چکر اس لیے چلایا گیا تھا کہ مجھے اس کاروبار سے الگ کر دیا جائے۔ مرحوم وزیر خان کے بعد میں ہی کاروبار کا وارث ہوں اور کچھ لوگ جو اس جائز کاروبار کی آڑ میں ناجائز کاروبار کر رہے ہیں اس لیے خوفزدہ ہیں کہ کہیں مجھے ان ناجائز کاروبار کی نوعیت کا علم نہ ہو جائے۔" وہ بھونچکا رہ گیا۔

"بے شک آپ کو کیسے ہوا جناب کہ کمپنی کوئی ناجائز کاروبار کر رہی ہے؟" غلام علی نے کہا۔

"مجھے ایک پیشکش کی گئی تھی" میں نے سوچ کے کہا "کہ میں کاروبار پر اپنے قانونی حق سے دستبردار ہو جاؤں تو مجھے ایک معقول رقم دی جائے گی۔ مجھے واپس لندن جا سکنے کا موقع فراہم کر دیا جائے گا اور میرے خلاف تمام شہادات بھی ختم کر دی جائیں گی۔"

"کس نے کی تھی یہ پیشکش؟ میر صاحب نے؟" غلام علی رازدارانہ انداز میں آگے جھک کے بولا۔

"ہاں..." میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "یہی سمجھ لو۔"

"اور اس کے بعد ان کو قتل کرا دیا گیا۔ سب ایک ہی بات ہے" وہ پرجوش لہجے میں بولا۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے" میں نے والد کے ذکر کو ٹال کر کہا۔ "عدالت میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ مجھے تو لندن میں پارٹنر بننے کے لیے بھی کہا گیا تھا کہ میں ایک طرح سے ان کا ایجنٹ بن کے ان کے ناجائز دھندے میں شامل ہو جاؤں۔ ظاہر ہے میں نے انکار کر دیا اور اب وراثت کا سرٹیفکیٹ لینے کے لیے مقدمہ کر رہا ہوں۔ بہت جلد کھیتی دیسے ہی چلے گی جیسے مرحوم والد کے زمانے میں چلتی تھی۔ یہ بتاؤ میر شرافت علی نے کس کس کو برطرف کیا تھا۔ تمہارے سامنے وہ اپنے کون کون سے آدمی لایا ہے اور کیسے لوگ ہیں؟"

"لوگ تو میر شرافت علی کے رویے سے بھی نالاں تھے" غلام علی نے کچھ دیر بعد بات شروع کی۔ "وہ ان کے ساتھ بہت ذلت کا سلوک کرتا تھا۔ وفاداری کا مطلب اس کے نزدیک غلامی تھا۔ وزیر خان مرحوم کہتے تھے تم سب اس عمارت کے ستون ہو۔ وہ سب کو اپنا ساتھی سمجھتے تھے ملازم نہیں۔ ان کے زمانے میں منیجر تھے علوی صاحب۔ ان کے مستعفی ہونے کے بعد یہ منیجر آیا ہے۔ یہ بھی بس میر شرافت علی کی طرح ہے۔ آدمی کو آدمی نہیں سمجھتا۔ کسی کی عزت نہیں کرتا۔ ظاہر ہے اس کی عزت بھی کچھ نہیں۔ سب ڈرتے ضرور ہیں مگر پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے ہیں۔ جوان اور اسمارٹ آدمی ہے لیکن عیاش ہے۔ پینے پلانے کا شوقین۔ شادی نہیں کی ہے مگر ہر وقت کسی نہ کسی کو ساتھ رکھتا ہے۔ ایک تو یہاں رہتی ہے۔ سیکریٹری بن کے۔ سال بھر بعد رخصت کر دی جاتی ہے۔ بہت سے قصے مشہور ہیں کہ کس کس نے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کہاں گئیں۔"

"اچھا؟" میں نے دلچسپی اور حیرانی سے کہا۔ "کس بات پر بلیک میلنگ کرنے پر اتر آتی تھیں وہ؟"

"بہت بھولے ہیں آپ سکندر صاحب" وہ ہنسا۔ "ابھی جب ایک جوان خوبصورت سیکریٹری ہر وقت کمرے میں رہے گی تو آخر کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ کس بات پہ بلیک میل کرے گی وہ؟"

"اچھا اچھا، میں سمجھ گیا۔ کیا نام ہے اس منیجر صاحب کا۔ کہاں رہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "اور کتنا عرصہ ہوا ہے ان کو آئے ہوئے؟"

"ان کو آئے ہوئے دو سال ہوئے ہیں یا ہونے والے ہیں" غلام علی نے کہا۔ "گوا کے رہنے والے ہیں۔ مسٹر ڈی سلوا۔ اسی زمانے میں پاکستان آئے تھے جب انڈین گورنمنٹ نے گوا کا الحاق کیا تھا۔ چھاؤنی کے علاقے میں کہیں رہتے ہیں۔"

"اچھا غلام علی! مجھے تم سے مل کر اس لیے بہت خوشی ہوئی ہے کہ تم صحیح معنوں میں قابل اعتماد دوست ہو۔ باخبر انسان ہو اور معاملات سے خاصے باخبر ہو۔" میں نے کہا۔ "مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ اگر تم واقعی اس احسان کا قرض اتارنا چاہتے ہو جو میرے والد نے تم پر کیا تھا تو مجھ پر احسان کر کے اتار سکتے ہو۔ وقتاً فوقتاً تمہیں مجھ سے رابطہ قائم کرنا ہوگا اور وہ باتیں معلوم کرنا ہوں گی جو میں براہ راست معلوم نہیں کرسکتا۔ آفس میں یقیناً ایسے لوگ ہوں

www.pakSociety.com

گئے جو وہاں میری موجودگی برداشت نہیں کریں گے تاوقتیکہ میں قانونی طور پر مالک بن کے قدم نہ رکھوں۔ اب تم ایک کام کرو۔ مجھے تمام سے پرانے کارکنوں کے نام اور پتے لا دو۔"

"لیکن آفس تو بند پڑا ہے سر!" اس نے پہلی بار مجھے سر کہا۔ ذہنی طور پر اس نے مجھے وزیر خان کی طرح کمپنی کا مالک مان لیا تھا۔

"بھئی غلام علی صاحب! یہ سر وغیرہ نہیں چلے گا میرے ساتھ۔" میں نے کہا۔ "آپ والد کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ وہ آپ پر اعتماد کرتے تھے اور آپ وفادار اور وضعدار آدمی ہیں۔ میرے لیے آپ قابل تعظیم ہیں۔ مجھے صرف سکندر کہیے۔ آفس تو ایک دو دن میں کھل جائے گا۔ ہر دفتر کی طرح یہاں اسٹاف کے بارے میں تمام کوائف کسی رجسٹر میں موجود ہوں گے۔ میرا خیال ہے یہ رجسٹر شروع سے اب تک وہی ہوگا۔ اس کی نقل بنا دیجیے تو مشکل ہوگا۔ اگر آپ فوٹو اسٹیٹ کاپی بنوا لیں تو آدھے گھنٹے میں یہ کام ہو سکتا ہے۔ آپ کو رجسٹر باہر لانے میں دشواری تو نہیں ہوگی؟"

"دشواری کیسی سکندر صاحب!" وہ بولا۔ "سب میرے پاس ہے۔"

"اس میں ان لڑکیوں کے نام بھی ہوں گے نا؟" میں نے کہا۔ "جو منیجر کے ساتھ رہیں اور پھر بدنام ہو کے چلی گئیں یا نکالی گئیں۔"

"سب ہے جناب! نام، پتا، تقرری کی تاریخ، دفتر چھوڑنے کی تاریخ اور اسباب۔ استعفیٰ، برطرفی یا انتقال وغیرہ۔ یہاں تک کہ تاریخ پیدائش اور ولدیت بھی ہے۔" غلام علی نے کہا۔

"اب میرا پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھ لو۔" میں نے کہا۔ "ایک نمبر ہے ایس ایس پی خان رضوی صاحب کے گھر کا۔ دوسرا امر عبدالودود منتظر کا اور تیسرا مس رابعہ قادری کا۔ یہ دونوں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ایڈووکیٹ ہیں اور میرے مقدمات کے وکیل ہی نہیں میرے کلاس فیلوز اور دوست بھی ہیں۔"

"واہ سکندر صاحب! اتنے بڑے بڑے لوگ آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔" اس نے جیب سے ایک پرس نکالا۔ اس میں سے ایک خستہ حال ٹیلی فون نمبر بک برآمد کی اور بہت سے نمبروں کی قطار کے آخر میں میرا نام اور میرے دیے ہوئے نمبر لکھ لیے۔ پھر اس نے ایک پرزے پر اپنا نام پتا لکھ کے میرے حوالے کیا۔ "میں تو غریب آدمی ہوں جی۔ گھر پر کوئی فون نہیں لیکن میں نے جو فون نمبر لکھا ہے وہ اس کے قریب ایک کیمسٹ کا ہے۔ یہ میرے بھائی کی ہے۔" میں نے پرزے کو دیکھا۔ اس پر "انعام کیمسٹ" کا فون نمبر تھا جو کرشن نگر میں سعدی بلڈنگ کے پاس تھا۔ وہیں اس کا مکان بھی تھا۔ میں نے پرزے کو احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ پھر مجھے ایک اور بات یاد آئی۔

"غلام علی! یہ کمپنی اب کس قسم کی مشینیں امپورٹ کر رہی ہے؟" میں نے کہا۔ "فیکٹری کہاں ہے۔ فیکٹری تو بند ہوگی؟"

"فیکٹری کیوں بند ہوگی جناب!" غلام علی نے کہا۔ "فیکٹری کے مالک تو فوت نہیں ہوئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے کہا۔ "فیکٹری کا مالک کوئی اور ہے؟"

"آپ کو تو کچھ بھی معلوم نہیں۔" اس نے حیرت سے دیکھا۔ "جناب فیکٹری اب ختم ہو چکی ہے لیکن اسے دو سال پہلے فروخت کر دیا گیا تھا۔ معلوم نہیں ایسا کیوں کیا گیا۔ پہلے ہم خود اپنی مشینیں اور آلات بنا کے بیچتے تھے۔ خراد مشین، ڈرل مشینیں اور ان کے پرزے اور آلات۔ اب ہم صرف برآمد کرتے ہیں اور ایک طرح ڈسٹری بیوٹر بن گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے فروخت کے معاہدے میں کوئی ایسی شق ہو کہ کمپنی کے سوا کوئی ان مشینوں کو فروخت یا برآمد نہیں کرے گا۔"

"اگر فیکٹری واقعی بک چکی ہے تو معاہدے میں ایسی کوئی شق نہیں رکھی جا سکتی جس کی رو سے نیا مالک اپنا مال باہر سے نکالنے کا پابند ہو۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ جیسے کہ جناب فیکٹری کو کسی پارٹنر کے سپرد کر دیا گیا ہو جو اپنے طور پر فیکٹری کے امور چلاتا ہو۔ فرض کرو میر شرافت علی نے کاروبار کے تین حصے کیے اور ہر حصے کا نگراں الگ کر دیا۔ پروڈکشن الگ، سیلز الگ، اکاؤنٹس الگ۔ سیلز، مارکیٹنگ اور سیل پروموشن اس نے اپنے پاس رکھا ہو اور اکاؤنٹس کا شعبہ والد مرحوم وزیر خان کو بنا دیا ہو۔ صرف دستاویزات، حسابات پر دستخط کرنے کے لیے۔ سیکریٹری اکاؤنٹس کے پاس اپنی میز پر بیٹھ کے جمع تفریق کے اعداد و شمار دیکھتے رہنے کے سوا کچھ کام نہیں ہوتا اور یہ کام بھی ماتحت کرتے ہیں یا مشینیں کرتی ہیں۔ اہم شعبے پروڈکشن اور سیلز کے ہیں۔ سیل پروموشن کے نام پر وہ دنیا میں ہر جگہ جا سکتا تھا۔ ایجنٹ مقرر کر سکتا تھا اور اس طرح اپنے رابطے استوار کر سکتا تھا تاکہ اس کا ناجائز کاروبار چلتا رہے۔ پروڈکشن والے مشینوں کی جگہ کچھ اور باہر بھیجتے ہوں گے۔ ناجائز کاروبار اسمگلنگ کا ہی ہو سکتا ہے اور یہاں سے یورپ اور امریکہ کیا اسمگل کیا جا سکتا ہے؟"

"میری عقل تو اندازہ کرنے سے قاصر ہے جناب!" غلام علی نے خشک حلق کو تر کرنے کے لیے تھوک نگلا۔ "کتنے اطمینان سے میں یہاں ملازمت کر رہا تھا اور خوش تھا کہ رزق حلال کما رہا ہوں۔ بدبختوں نے اپنے ساتھ میری عاقبت بھی خراب کی۔ اسمگلنگ! توبہ توبہ۔"

"تم نے نادانستگی میں ایسا کیا تھا غلام علی! خدا نیت کو دیکھتا ہے اور تم اسمگلنگ میں ملوث نہیں ہوئے۔" میں نے کہا۔ "یہاں سے نہ سونے کی اسمگلنگ ہوتی ہے نہ ملکی مصنوعات کی نہ نوادرات کی۔ ملک دشمن عناصر کرنسی کی اسمگلنگ کرتے ہیں اور سماج دشمن بلکہ انسانیت دشمن عناصر منشیات کی اسمگلنگ۔ منشیات میں خطرات زیادہ ہیں مگر یہی کاروبار اتنے منظم پیمانے پر ہوتا ہے اور اس میں منافع بھی اتنا ہی زیادہ ہے۔ چرس، افیون، ہیروئن کے دھندے میں لاکھوں سے کروڑوں بنائے جاتے ہیں اور یہ ہو سکتا ہے کہ مشینوں کے کریٹ کی طرح منشیات باہر بھیجنے کے لیے استعمال ہو رہے ہوں۔"

"یا میرے معبود!" غلام علی نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے فریادی لہجے میں کہا۔ "مجھے ہر آفت سے بچا۔ میرے بچے چھوٹے ہیں۔ ان کا واحد وارث تو میں ہی ہوں۔"

"گھبراؤ نہیں غلام علی! اطمینان سے کام کرتے رہو جیسے اب تک کرتے آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "اب تک تم بے خبری کے اندھیرے میں رہتے تھے۔ اب خدا نے تمہیں موقع دیا ہے کہ اس برائی کا خاتمہ کرنے کے لیے اپنی عقل اور توانائی کا صحیح استعمال کرو۔ تم میرے ہاتھ مضبوط کرو۔ انشاء اللہ تم کو اس کا صلہ خدا کی طرف سے بھی ملے گا اور میں... میں اسے صلہ تو نہیں کہوں گا لیکن میں کامیاب ہوا تو مجھے پھر 'وزیر خان اینڈ کمپنی' قائم کرنے کے لیے ایک مخلص، ایماندار اور قابل اعتماد آدمی کی ضرورت ہوگی جس کی کمان تم کرو گے۔ تقدیر نے ساتھ دیا اور میں مالک بنا تو تم منیجر ہو گے۔"

غلام علی کا چہرہ فرط جذبات سے تمتمانے لگا۔ "انشاء اللہ۔ انشاء اللہ۔" اس نے بمشکل تمام کہا۔

"میں نے جو کام بتائے ہیں یاد رکھنا۔ فون تم کسی بھی وقت کر سکتے ہو اور پیغام چھوڑ سکتے ہو۔ اگر میں نہ ملوں تو انتظار کرنا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہاں، یہ بتاؤ تمہیں کچھ معلوم ہے فیکٹری کا مالک کون ہے؟"

"جی..." اس نے پھر جیب میں سے وہی اڑے ہوئے رنگ والا چرمی پرس نکالا۔ "ان کا یہ کارڈ ہے۔ اس میں سب کچھ ہے۔ نام، پتا، فون نمبر۔"

کارڈ پر نظر ڈالتے ہی میری نگاہوں کے سامنے ایک خیرہ کن روشنی آ گئی۔ پھر وہ سرچ لائٹ کی چکاچوند بن کے میرے سامنے اندھیرے کی چادر تان دی اور اس چادر سے ایک ہاتھ نکلا جو نامعلوم کی ڈوری سے بندھی ہوئی کارک کی سخت گیند کو بڑی مہارت سے ایک دائرے میں گردش دے رہا تھا۔ میں پھر بیٹھ گیا۔ کارڈ پر لکھا تھا۔ "چودھری دلاور زبیر، ایم ڈبلیو وی انجینئرنگ کمپلیکس۔"

"سکندر صاحب!" غلام علی کی پرتشویش آواز آئی۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

میں فوراً سنبھل گیا۔ "ہاں... طبیعت کو کیا ہونا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کارڈ کو جیب میں رکھ لیا۔ "دراصل مجھے خیال آ گیا کہ ہم لیا اور کچھ بغیر جانے کے لیے کہ سے ہو گئے بیٹھے۔ بات تو کچھ نہیں مگر سبکی ہوتی ہے۔"

"درست فرمایا صاحب۔" غلام علی نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ آسانی سے شک میں مبتلا ہو جانے والا شخص تھا اور اتنا صاف دل اور سادہ لوح کہ آسانی سے مطمئن بھی ہو جاتا تھا۔ جب ویٹر بل کی بقایا رقم لانے گیا ہوا تھا تو یکلخت مجھے ایک اور خیال آیا اور میں نے کارڈ نکال کے دیکھا۔ "غلام علی! یہ ایم ڈبلیو تو پہلے بھی تھا۔ میر وزیر۔ ڈی اے۔ میں والد کے نام کا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایم ڈبلیو وی ایک ہی کمپنی ہے اور یہ تینوں اس کے حصے دار ہیں۔ میرا اندازہ درست تھا۔ تم اپنا کام کل تک مکمل کر لو گے؟"

"وہ تو جناب منیجر کے آنے پر ہے۔" غلام علی نے کہا جو میرا اندازہ درست ہونے سے بھی متاثر ہوا تھا۔ "دیکھتے ہیں اگر وہ آج آ گیا تو کل تک فہرست آپ کو مل جائے گی۔"

منیجر آ گیا تھا جب ہم واپسی پر میر وزیر اینڈ کمپنی کے سامنے سے گزرے تو پیچھے سڑک کے کنارے ایک نیلے رنگ کی ٹویوٹا کراؤن کار کھڑی تھی۔ غلام علی نے مجھے بتایا کہ یہ جو دکانیں آفس کے پیچھے ہیں ابھی تک ہیں اور گودام کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ پہلے ان کو کرائے پر حاصل کیا گیا تھا۔ پھر خاصی قیمت دے کر خرید لیا گیا لیکن ان کو آج تک کھلتے بند ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ غالباً آفس کے اندر

www.paksociety.com

ہی سے کوئی راستہ سے نیچے اترنے کا۔ میں نے یہ بات نوٹ کر لی اور غلام علی سے کہا کہ وہ ایک گھنٹے بعد آئے کیونکہ میں منیجر سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ غلام علی سیدھا نکل گیا تو میں نے دروازے کو دھکیل کر زینے پر قدم رکھا اور اوپر پہنچا۔ زینے کے دائیں بائیں دو دروازے تھے۔ دونوں ایک جیسی پالش کی ہوئی چلائی وڈ کے بنے ہوئے تھے۔ دونوں میں اوپر صرف ایک فٹ چوڑا شیشے کا فریم تھا۔ بائیں جانب کے شیشے پر سرخ رنگ سے لکھا ہوا تھا "آفس" اور دائیں طرف والے دروازے پر "ڈائریکٹرز"۔ میں نے ڈائریکٹر کے کمرے کا دروازہ دھکیلا اور اندر سے بند پاکے دستک دی۔ دو منٹ بعد ایک لڑکی نے دروازہ کھول کے مجھے حیرانی اور خفگی سے دیکھا۔ وہ کوئی اینگلو انڈین تھی یا گوا کی رہنے والی۔ اسکرٹ پہنے ہوئے بائیس تیئیس سال کی سانولی سی اور بھرے بھرے بدن والی لڑکی جس کے لیے لباس بدن کی نمائش کا ذریعہ تھا۔ اس کے بال شانوں تک کٹے ہوئے اور کسی ماہر ہیئر ڈریسر کی محنت سے بنا ہوا مصنوعی ریشم کا ڈھیر تھے جو پھسل کر پھیلتا تھا اور سر کی ایک جنبش سے پھر سمٹ جاتا تھا۔ اس نے لپ اسٹک ابھی ابھی ٹھیک کی تھی۔

"یس؟" وہ انگریزی میں بولی۔ "کیا چاہیے تمہیں؟"

"مجھے مسٹر ڈی سلوا سے ملنا ہے۔" میں نے کہا۔

"سوری۔ وہ ابھی یورپ کے دورے سے واپس آئے ہیں اور آج کسی سے نہیں مل سکتے۔" وہ بولی۔ "لیکن میں ان سے پوچھ کے آپ کو کل کے لیے اپائنٹمنٹ دے سکتی ہوں۔ آپ یہاں انتظار کریں گے؟"

"کرنا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا اور وہ تھوڑا سا مسکرا کے واپس ہوئی۔ دس سیکنڈ بعد میں اندر داخل ہو گیا اور اس طرح کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ قالین پر بے آواز قدموں سے چلتا ہوا میں تقریباً اس کے ساتھ ہی ڈی سلوا کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ڈی سلوا گھومنے والی کرسی پر بیٹھا تھا اور اس کے پاؤں میز پر رکھے تھے۔ اس نے کوٹ اتار کے کرسی کی پشت پر لٹکا دیا تھا اور ٹائی ڈھیلی کر کے قمیص کا اوپر والا بٹن کھول لیا تھا۔ اس کی سیکرٹری نے ایک دبی سی چیخ ماری جو بیک وقت افسوس اور پریشانی کی علامت تھی۔ وضاحت کرنا چاہی کہ مجھے اس نے روکا تھا پھر مجھ سے مخاطب ہوئی کہ میں نے نامعقولیت کا ثبوت کیوں دیا۔ پھر ڈی سلوا نے اسے روک دیا۔ میز پر سے پیر نیچے کیے اور سیدھا بیٹھ گیا۔ "تم پڑھے لکھے اور مہذب آدمی نظر آتے ہو۔" اس نے ایک گلاس کے باقی ماندہ مشروب کو حلق سے اتار کر کہا۔ "تمہیں تجربہ نہیں ہوا ابھی کسی بزنس ایگزیکٹیو کے کمرے میں جانے کا؟"

"اکثر ہوا ہے۔" میں نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں چار سال انگلینڈ میں بھی رہا ہوں اور وہاں میں نے یہی دیکھا ہے کہ مالک کبھی اپنے ماتحتوں کے کمرے میں جانے کے لیے ان سے اپائنٹمنٹ نہیں لیتے۔"

"واٹ ڈو یو مین؟" اس نے برا سا منہ بنایا۔ "تمہیں کوئی کام ہے مجھ سے تو بولو۔"

"مسٹر ڈی سلوا۔" میں نے اسی بے نیازی کے ساتھ جیب سے سگریٹ نکال کے لائٹر سے جلائی۔ "مجھے یہاں کی صورت حال دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ آہنی جذبے، انسان تمام تب ہے۔ کیا تمہیں وہاں والوں نے اطلاع نہیں دی تھی کہ شرافت علی کو قتل کر دیا گیا ہے اور تمہیں فوراً واپس آنا چاہیے۔ اگر تمہیں دی تھی تو وہ سخت غیر ذمے دارانہ ہے اور دی تھی تو تم....."

"واٹ از آل دس نان سنس؟" وہ میز پر مکا مار کے بولا۔ "ہو دی ہیل آر یو؟"

"ٹیک اٹ ایزی مسٹر ڈی سلوا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں اس کمپنی کا مالک ہوں۔ وزیر خان کا بیٹا سکندر بخت۔"

حسب توقع یہ ڈرامائی اعلان بم کا دھماکا ثابت ہوا۔ ایک لمحے کے لیے ڈی سلوا کا سانس رک گیا اور اس کی آنکھیں مجھ پر جمی رہ گئیں۔ اس کی سیکرٹری کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے فوراً مراجعت اختیار کی اور نکلتے ہوئے دروازہ بند کر گئی۔ ایئر کنڈیشنر ابھی ابھی چلایا گیا تھا چنانچہ کئی دن بند رہنے والے آفس میں محبوس ہوا کا اثر باقی تھا۔ "تمہیں یقین نہیں آ رہا ہے کیا؟" میں نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔

ڈی سلوا ہوشیار اور ذہین آدمی تھا۔ اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور مسکرایا۔ "نہیں، یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں مسٹر سکندر۔" اس نے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور ہاتھ بڑھایا۔ "ویلکم ٹو پاکستان۔" وہ بڑا اچھا اداکار بھی تھا۔

"اوہ نو۔" میں نے ہاتھ ملا کے کہا۔ "کاش میں پہلے آ گیا ہوتا۔ مسٹر شرافت علی کا قتل..."

"مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔" وہ ہاتھ ملا کے بولا۔ "جب ہیمبرگ میں مجھے والد کا کیبل ملا کہ اس کو کسی نے قتل کر دیا ہے تو مجھے بالکل یقین نہیں آیا۔ اس کا تو کوئی دشمن نہیں تھا۔ ویری نائس مین۔ پرفیکٹ جنٹل مین۔ مگر میں فوراً واپس نہیں آ سکا تھا۔"

میں نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس کے قتل کا الزام مجھ پر ہے؟"

ڈی سلوا اچھل پڑا۔ "آپ پر... ہوا دو تو!" اس نے سینے پر انگلی سے صلیب کا نشان بنایا لیکن اداکاری اچھی ہونے کے باوجود میں سمجھ گیا کہ وہ جانتے بوجھتے انجان بن رہا ہے۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ تو لندن میں تھے؟"

"ہاں وہ پرانی بات ہے۔ تازہ ترین بات یہ ہے کہ پولیس نے قتل کا الزام مجھ پر عائد کیا تھا اور مجھے گرفتار کر لیا تھا لیکن میں ضمانت پر رہا کر دیا گیا اور اب مقدمہ چلے گا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "لیکن اس سے یہ حقیقت نہیں بدلتی کہ میں اس کمپنی کا مالک ہوں۔"

"آف کورس..." وہ بولا۔ "لیکن مسٹر سکندر! آپ میری قانونی مجبوریوں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اگر آپ نے قانونی کارروائی کے بعد عدالت سے وراثت کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا ہے تو میں آپ کو مالک تسلیم کرتے ہوئے آپ کا ہر حکم ماننے کا پابند ہوں۔ آپ وہ سرٹیفکیٹ مجھے دکھا دیجیے۔ اس کی عدم موجودگی میں اگر میں آپ کو اس دفتر کی حدود میں قدم رکھنے سے بھی روک دیتا ہوں تو اس کا مجاز ہوں۔"

"آف کورس۔" میں نے اسی کے لہجے میں کہا۔ "میں خود کوئی غیر قانونی کام پسند نہیں کرتا اور اس فرض شناسی کے مظاہرے کا بالکل برا نہیں مانوں گا۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے... وراثت کے سرٹیفکیٹ کے لیے کیس فائل کر دیا گیا ہے۔ اس میں وقت تو لگے گا مگر زیادہ نہیں۔ بہت سینئر ایڈووکیٹ میری پیروی کر رہے ہیں۔"

"وہ سب ٹھیک ہے۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "آپ کے حق ملکیت کو کوئی چیلنج نہیں کر رہا ہے، لیکن وہ مرڈر چارج بہت سیریس ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ فیصلہ کیا ہو گا۔ میری خواہش ہو گی کہ آپ باعزت طور پر بری ہو جائیں مگر یہ قانونی معاملہ ہے کہ اس بات کا قبل از وقت آپ بھی نہیں کہہ سکتے۔"

"ہاں پھانسی ہو گئی تو اور بات ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن زندہ رہنے کی صورت میں بھی مالک ہی رہوں گا۔"

"تو ہم بھی کسی الجھن یا قانونی چکر میں نہیں پڑنا چاہتے۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "آج تو آپ یہ ملاقات کر چکے لیکن اگلی مرتبہ یہ خیال رکھیے کہ وراثت کا سرٹیفکیٹ ہاتھ میں ہونا چاہیے ورنہ آپ کو ٹریسپاس کرنے کے جرم میں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"ایک موقع کیوں دے رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "اسی وقت کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جھک کر کسی دراز میں سے کوئی چیز اٹھائی۔ جب اس کا ہاتھ سامنے آیا تو اس میں ایک ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور کو میز پر رکھ دیا۔ "ناؤ۔ پلیز گیٹ آؤٹ۔" وہ بولا۔

"جیسی تمہاری مرضی۔" میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کے اٹھتے ہوئے کہا۔ "پھر آؤں گا باس۔"

میرا لہجہ اتنا نارمل اور شریفانہ تھا کہ میں نے اچانک میز الٹی تو وہ سنبھل نہ سکا۔ ریوالور پھسل کر نیچے گرا اور میز کا کنارہ لگنے سے وہ کرسی سمیت پیچھے گیا مگر کرسی کے گھوم جانے سے گرا نہیں۔ میز پھر سیدھی ہو گئی لیکن اس پر رکھا ہوا تمام سامان ٹیلیفون سمیت نیچے گیا تو آوازوں کا ملا جلا شور بلند ہوا۔ ڈی سلوا نے چیخ کر کہا۔ "یو باسٹرڈ۔" لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکا۔ میں میز کے گرد گھوم کر اس کے مقابل جا کھڑا ہوا تھا اور اس نے جھک کر پھر ریوالور اٹھانا چاہا تو میں نے اپنا پاؤں اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ اوپر اٹھ گیا تھا۔ میں نے اس ہاتھ کو پکڑ کے جھٹکا دیا تو وہ الٹ کر کرسی سے پیچھے جا گرا۔ اسی وقت دروازہ دھماکے سے کھلا اور اس کی سیکرٹری بدحواسی کے عالم میں اندر داخل ہوئی۔ ڈی سلوا نے اٹھنے میں بڑی پھرتی دکھائی اور اٹھتے ہوئے..... میرے پیٹ میں مکا مارا جو کسی پیشہ ور باکسر کا مکا تھا اور کسی عام آدمی کے پیٹ پر پڑتا تو وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا لیکن میں بروقت یہ وار سہنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ مجھے بدستور اپنے قدموں پر کھڑا دیکھ کے ڈی سلوا حیران ہوا۔ اسی وقت میں نے الٹے دائیں ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی سے اس کے شانے پر وار کیا۔ وہ کراہا اور اس کا دایاں آدھا جسم درد کی شدت سے مفلوج ہو گیا۔ وہ سامنے کے بل جھکا اور کرسی پر گر گیا۔ اس کی سیکرٹری کو اچانک احساس ہوا کہ اس کے فرائض چیخ مارنے پر ختم نہیں ہو جاتے۔ وہ واپس پلٹ کے بھاگنے والی تھی کہ میں نے اس کو جا لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے ڈی سلوا کی طرف پھینک دیا۔ اس نے دوسری چیخ بلند کی جو بالکل حقیقی خوف کی وجہ سے نکلی تھی۔ وہ میز سے ٹکرائی اور قالین پر گر گئی۔ "تمہاری سیکرٹری نازک اور نابالغ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کو باہر کے کمرے سے ہی پولیس کو فون کرنا چاہیے تھا اور تم مالکوں کو بھی شہزادہ بنت

www.paksociety.com

سمجھو مسٹر منیجر! بعض مالک اپنی حیثیت کو قانون کی مدد۔ ۔ ۔
کے بغیر بھی تسلیم کرا جانتے ہیں۔ لیکن بازو سے۔ میں نے ٹیک جیٹ کے پیچھے کوشش نہیں کی ورنہ تمہیں سکتا تھا مگر میں ہتھیار کے بغیر لڑنے کے فن سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"مجھے اب یقین آ گیا ہے کہ تم نے میر شرافت علی کو ضرور قتل کیا ہوگا۔" وہ مجھے خون آشام نظروں سے گھورتا ہوا "لیکن میں تم سے سمجھ لوں گا۔ میرا نام ڈی سلوا ہے۔"

"اور میرا نام سکندر ہے۔ انسپکٹر ہوں کی ٹیبلٹ کے نام پتہ میں نے ریوالور اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم اگر اس یقین کی بنیاد پر عدالت میں میرے خلاف بیان دینے کے لیے آ جاتے ہو تو حیرت ہوتی۔ تمہاری یہ سیکرٹری دس منٹ میں اٹھ کھڑی ہوگی اس وقت تک تم بھی چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے جاؤ تو پولیس کو فون کر دینا۔ تمہارے لیے کچھ ثابت کرنا ذرا مشکل ہوگا کیونکہ اس وقت میں دوسری جگہ ہوں جہاں میری موجودگی کے گواہ وکیل اور ڈاکٹر جیسے معتبر لوگ ہیں۔" میں نے ریوالور کو خالی کر کے گولیاں جیب میں ڈالیں۔ ریوالور کو رومال سے صاف کیا اور ڈی سلوا کی طرف پھینک دیا۔ اشتہارات جیسی کی یہ گولیاں ہمارے کام آ سکتی تھیں مگر اس وقت تک نے ان کو مٹھی میں یوں رکھا جیسے میرا ارادہ باہر جا کر ان کو پھینک دینے کا ہے۔ اس کے بعد میں اطمینان سے نیچے اتر گیا۔ مال روڈ چند قدم کے فاصلے پر تھی اور رنگل کے بس اسٹاپ پر مجھے رکشا مل گیا جس نے گیارہ بجے مجھے میو ہسپتال پہنچا دیا۔ ہسپتال کے اندر پھرنے والے ایک بچے سے میں نے دواؤں کے اندر ایک انگریزی کا اخبار خریدا اور امراض قلب کے وارڈ میں پہنچا تو مجھے محسن اور رابعہ برآمدے میں کھڑے دکھائی دیے۔

"ابھی تک تو سب خیریت ہے۔" رابعہ نے میرے پوچھنے پر کہا۔ "ڈاکٹر چوبیس گھنٹے پورے ہونے سے قبل کوئی بات یقین کے ساتھ بتانے کے لیے تیار نہیں اور نہ ایک نظر دیکھنے کی اجازت دینے کے لیے ہے۔"

"میرا خیال ہے تم گھر جاؤ۔ کچھ دیر آرام کر لو۔" میں نے کہا۔ "رات پھر جاگنی پڑے گی جب شام کو آ جانا۔"

"جاگتے تو تم بھی رہے ہو۔" وہ بولی۔ لیکن میرے اور محسن کے اصرار پر وہ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ میں نے کہا کہ ہم ابھی تو یہاں موجود ہیں اور اگر گئے بھی تو ایک ساتھ نہیں جائیں گے یا وقفے وقفے سے چکر لگاتے رہیں گے۔"

اس کے جانے کے بعد محسن اور میں برآمدے کے سامنے مختصر سے پارک میں لگی ہوئی بینچ پر جا بیٹھے جس کے اوپر ایک درخت چھتری کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اختصار پسند بتانے میں نے اسے ڈی سلوا سے اپنی مڈبھیڑ اور غلام علی سے حاصل ہونے والی معلومات کے بارے میں بتایا۔ "مجھے پہلے شک تھا اب یقین ہے کہ منیجر اسی گروہ کا ایک رکن ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر شرافت علی اور دلاور ملک کے معاملات کو سنبھالتے تھے تو ڈی سلوا آگے لائن اور کلیئر رکھتا تھا۔ وہ یورپ کا دورہ کر کے لوٹا ہے جو ظاہر ہے اپنے ناجائز کاروبار کے فروغ کے لیے ہوگا۔ اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسے میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم یا جب وہ تسلیم کرتا ہے کہ اسے دلاور کا کیبل مل گیا تھا جس میں قتل کی اطلاع دی گئی تھی تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ واپس آ کے وہ دلاور سے نہ ملے۔ تفصیلات نہ پوچھے اور اطمینان سے اپنے پرائیویٹ آفس میں شراب و شباب کا شغل فرمانے لگے۔ مجھے ڈی سلوا بھی دلاور سے کم خطرناک نہیں لگا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ڈی سلوا نوجوان اور جوشیلا ہے اور دلاور ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی ہے۔ اگر اس نے فون کر کے دلاور کو بتایا کہ سکندر سے مار پیٹ ہو گئی ہے تو دلاور اسے قصوروار ٹھہرائے گا کہ مشتعل ہونے کی کیا ضرورت تھی اور وہ معاملے کو آگے نہیں جانے دے گا۔ ڈی سلوا سے ملنے کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ غلام علی نے جو کچھ بتایا ہے اس کی تصدیق ہو جائے۔"

"ہاں یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ جھوٹا آدمی ثابت ہوتا۔" محسن نے کہا۔ "مگر غلام علی سے ملنا بہت اچھا رہا۔ میں نے یہاں سے فون پر بات کی تھی منظور صاحب سے۔ ہے کہ پوسٹ مارٹم کے لیے کیس فائل کر دیا گیا ہے اور عدالت میں سماعت ہوگی۔ گواہ تیار رہیں۔ ویسے سکندر جانے کیوں یہ مجھے ٹھیک نہیں لگتا۔ ایک اندیشہ ہے پوسٹ مارٹم سے کچھ ثابت نہیں ہوگا۔ اور فرض کرو ہو بھی تو قتل کا شبہ کس پر ظاہر کیا جائے گا؟ میر شرافت علی تو مر گیا۔ دلاور یا ڈی سلوا وغیرہ کو براہ راست ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے خلاف ہمارے پاس کوئی شہادت نہیں۔ مجھے بھی زیادہ بڑی امید نہیں۔"

"مسئلے کے دو پہلو ہیں محسن۔" میں نے کہا۔ "ایک یہ کہ کیا نذیر خان کی موت طبعی اسباب کا نتیجہ تھی یا نہیں اور دوسرا یہ کہ موت طبعی نہیں تھی تو قاتل کون ہے۔ دوسرے سوال کا جواب اتنا اہم نہیں جتنا ایک سازش کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے میرے والد کی موت کا قتل ثابت ہونا۔ اس سے میرے کیس کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ یہ تو ثابت ہو چکا ہے کہ ایک کھیتی کیسی غربت میں مرا اور کس طرح مالک کے پرانے نمک خواروں کو اندھیرے میں رکھا گیا۔ اس کا فیصلہ کون کرتا؟"

"ہاں اور جب یہ طے ہو جائے گا کہ میر شرافت علی تھا آپ پر تیرے خلاف انتقامی کارروائی کے الزام کا ناقابل تردید ثبوت بھی بن جائے گا تو یہ سوچ کر جی بیٹھے کہ اچانک معلوم ہو کہ ایک شخص نے بلیک میل کر کے اس کے بوڑھے باپ کو کھیتی سے نفرت دیا۔ ذلت و رسوائی کی اس حد تک پہنچایا اور پھر قتل کرا دیا۔ اس کا رد عمل کیا ہوگا؟" محسن نے کہا۔

"مجھے خدا پر بھروسہ ہے۔" میں نے کہا۔ "مظلوم میرا باپ بھی تھا اور میں بھی ہوں۔ ظالم کی رسی کہاں تک دراز ہو گی۔"

محسن نے مزید کچھ نہیں کہا اور مجھ سے ایک اخبار لے لیا دوسرا اخبار میں نے دیکھا۔ اس میں شہر کی خبروں کے صفحے پر دو خبریں تھیں۔ ایک میں چراغ دین کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر سے ملنے والی سلامت شاہ کی لاش کا ذکر سابق کے حوالے سے تھا چنانچہ اس میں میرا نام بھی آیا تھا۔ بالکل یہ کسی شبہے کا اظہار نہ پولیس نے کیا تھا جن کے نزدیک لا وارث کا سب سے اہم گواہ تھا اور چراغ دین کے اس کے انقلاب خان جو کیلاش نے اپنے بیان میں بھی کہا تھا کہ متوفی بہت ہی شریف النفس انسان تھا اور اس سے کسی کی دشمنی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حسب معمول پولیس نے نامعلوم قاتلوں کے خلاف مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی تھی۔ دوسری بہت مختصر خبر ایک گمنام مزار کے کھنڈر سے ملنے والی کسی فقیر کی مسخ شدہ لاش کے بارے میں تھی جس کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ فقیر۔ نوابچو نے میرے کان میں کہا: فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے۔ لوگ انہیں منشی اندر بچہ بچو کو نوابچو کہتے تھے۔ ویسے تھے فقیر۔ مزاج کے اعتبار سے بھی۔ مالی طور پر بھی۔ حلیے سے بھی اور صورت سے بھی مجھے لگے تم جو رسوا تو کیا ہوا۔ زندگی میں کون سے عزت دار تھے۔

"سکندر!" محسن نے اخبار رکھ کے کہا۔ "تم نے علاالدین کی صورت تو نہیں دیکھی تھی نا! پھر تو اسے کیسے پہچانے گا؟"

"پہچان لوں گا۔ وہ آواز سے شناخت ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "بے شک وہ اس وقت آواز بنا کے بول رہا ہوگا مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں لہجہ بھیل کھا جائے گا۔ اس کے علاوہ وہ میں دیکھوں گا کہ وہ کس حد تک شاک پروف ہے۔"

"میرا خیال ہے اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "اول تو مجھے تیرا یہ دعویٰ مبالغے پر مبنی نظر آتا ہے کہ تو اسے آواز اور لہجے کی کسی لغزش سے پہچان لے گا۔ پھر یہ کہ تو نے اسے پہچان لیا اور اس نے مان لیا کہ میں ہی چوہدری دلاور ہوں۔ فرمائیے آپ کی کیا خدمت کروں تو تو کیا کرے گا۔ اس سے کہے گا کہ آپ سے کچھ اعتراف جرم کرانا ہے۔ کیا ثبوت ہے تیرے پاس کہ اس رات مجھے ہوٹل سے اٹھا کے لے جانے والا یہی چوہدری علاالدین تھا۔ وہ کہے گا جناب آپ بہکے ہوئے تو نہیں ہیں۔ اس رات میں فلاں جگہ پر تھرڈ یا پارٹی میں شریک تھا اور اس ہدایت کار سلیمی کو کہا گیا ہے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس نام کا کوئی ہدایت کار ہے۔ ہدایت کار ہوتا کیا ہے۔ وہ کیا جواب دے گا تو اسے یہ اگر حماقت میں آ کے تو نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے یہ کہا کہ بدمعاش اس پیکٹ اور کس نے مارا تھا جس کی لاش اندر [illegible] کے شیڈ [illegible] میں پڑی ہے تو وہ کہے گا اچھا! آپ نے دیکھی ہے؟ پھر تو فوراً پولیس کو بتانا چاہیے۔"

میں ہنس پڑا۔ "یہ سب امکانات میرے ذہن میں تھے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گا۔ میں اس سے خود کو متعارف کراؤں گا اسی طرح جیسے میں نے خود کو ڈی سلوا سے متعارف کرایا تھا۔ اس سے معلوم کروں گا کہ ایم ڈی ویڈیو [illegible] کی قانونی پوزیشن کیا ہے۔ اس کے کتنے مالک ہیں یا تھے۔ اسد نذیر خان مرحوم اگر پارٹنر تھے تو ظاہر ہے ان کا وارث میں ہوں اور میں اس لیے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے وراثت کے سرٹیفکیٹ کے لیے کیس فائل کر دیا ہے۔ اداکاری مجھے کرنی ہے اور اسے یقین دلانا ہے کہ میں جانتے بوجھتے اسے یہ بتانے آیا ہوں کہ میرا حق وراثت سے دستبردار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں اس کی دی ہوئی ایک جیسے کی مہلت کی پرواہ نہیں کرتا چنانچہ میں نے حق وراثت کا کیس فائل کر کے اسے چیلنج کر دیا ہے کہ اب وہ جو چاہے کر لے میں اس سے نہیں ڈرتا۔ وہ مشتعل ہوگا اور اس کا رد عمل کوئی بھی ہو تو وہ مجھے بتا دے گا۔ وہ بار بار مجھے دھمکی دے گا کہ برخوردار! میں نے کہا تھا کسی خوش فہمی میں مبتلا مت ہونا کہ ایک بار یہاں سے نکل گئے تو ہماری دسترس میں نہیں رہو گے۔ قانون کا تحفظ تمہیں بچائے گا یا تم اپنی ذہانت اور چالاکی سے کام لے کر بچ جاؤ گے۔ وہ اپنا کروہ چہرہ کر کے مجھ سے یہ بات کر سکتا ہے لیکن وہ بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لے گا تو اس وقت کچھ ظاہر نہیں ہونے دے

www.paksociety.com

گا مگر آج کل میں پھر کوئی قدم اٹھائے گا۔"

"یعنی تو چاہتا ہے کہ استاد پیڈرو اینڈ کمپنی تجھے پھر اٹھا لے جائے اور ایک مرتبہ پھر بہتر طور پر سمجھا سکے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ پہلی بار انہوں نے بے خبری میں مجھے آ لیا تھا۔ اور میں خالی ہاتھ تھا۔" میں نے کہا۔ "اس مرتبہ میں ان کا انتظار کروں گا اور میرے پاس بھی بھرا ہوا ریوالور ہوگا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ناجائز طور پر حاصل ہونے والا اسلحہ استعمال کرنے سے ایک اور مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے چنانچہ میں اس سے فائر کروں گا بھی تو کسی کو نشانہ نہیں بناؤں گا مگر فائدہ پورا اٹھاؤں گا۔ ہاتھ میں ریوالور ہو تو گولی چلائے بغیر بھی حریف پر غلبہ حاصل رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں ان میں سے کوئی میرے ہاتھ لگ جائے تو میں بھی اس سے کچھ پوچھوں۔ وہ سب باتیں جو میرے لیے جواب طلب ہیں۔ قانون کی مدد سے میں ان کو اعتراف جرم پر مجبور نہیں کر سکتا اور ان کو کسی انصاف کی عدالت میں کھینچ کر نہیں لے جا سکتا اس لیے کہ میرے پاس ثبوت، شہادت اور گواہ نہیں۔ میں ان کو انہی کے طریقے اپنا کے زیر دام لانا چاہتا ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ بڑا شکاری کون ہے۔ اگر ملاقات کے دوران میں خود دلاور نے اپنے آپ کو مجھ پر ظاہر کر دیا تو یہ کھلی جنگ ہوگی ورنہ اگلی مرتبہ کی ٹکر کہیں اور ہوگی محسن! کردار جگہ بدل لیں گے۔ استاد پیڈرو کی جگہ کوئی اور لے سکتا ہے۔ دلاور کی جگہ میں اور میری جگہ دلاور۔ ہم بھی کوئی خالی کرسی تلاش کر لیں گے۔"

"تو دلاور کو اغوا کرنے کا پروگرام بنا رہا ہے؟" محسن نے کہا۔ اس کی دلچسپی اچانک بڑھ گئی تھی۔

"ابھی تک بنایا تو نہیں مگر بنایا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے میں اسے پہچان لوں۔ شکاری کو بہت محتاط ہو کے جال پھیلانا چاہیے اور اپنے شکار کی نفسیات کو سمجھ کے وقت اور مقام کا انتخاب کرنا چاہیے ورنہ وہ خود شکار ہو جاتا ہے۔ یہ آنکھ مچولی ہے جو شکار اور شکاری کے درمیان آخری معرکے تک چلتی ہے۔ پہلے میں شکار تھا اب شکاری ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ زبردست ہوں۔ دلاور چیتے کی طرح چالاک، عیار اور سفاک ہے لیکن میں خود کو اس سے کمتر نہیں سمجھتا۔ وہ نہ سہی استاد پیڈرو میرے ہاتھ آ جائے۔ تفتیش کے سارے طریقے میں جانتا ہوں۔ دیکھ چکا ہوں اور بھگت چکا ہوں۔ کتابوں میں پڑھ چکا ہوں اور ایجاد کر سکتا ہوں۔ قسم خدا کی اگر وہ پتھر کا بت بھی ہو تو میں اسے سچ بولنے پر مجبور کر دوں گا۔ ان حرامزادوں نے ایک بوڑھے بیچارے کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کے بعد شرافت سے کسی سلوک کی گنجائش نہیں رہی ہے۔" میں بات کرتے ہوئے سخت مشتعل ہو گیا تھا۔ میرے کانوں کی لویں گرم ہو گئی تھیں اور خون کے سر میں کھولنے کی آنچ سے میرا چہرہ دہکنے لگا تھا۔

"تیرے دماغ کا ریڈی ایٹر گرم ہو گیا ہے۔" محسن ہنسا۔ "ایسے گاڑی نہیں چلے گی۔ بات کرتا ہے عقل اور ذہانت کے کھیل کی اور جذبات کی لہر آتی ہے تو خود بے قابو ہو جاتا ہے۔ شکاری کی رسم؛ پہلے اپنی نفسیات تو ٹھیک رکھ۔ کسی کی نفسیاتی کمزوری سے فائدہ اٹھانے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ تیری اپنی کمزوری کیا ہے ورنہ یہ بھی ہوگا کہ شکاری کہلانے والا شکار ہو کے چلے۔"

"معاف کرنا یار، آج پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے۔" میں بولا۔ "پہلے کبھی مجھے مشتعل ہوتے دیکھا ہے تو نے؟ مگر آدمی ہوں یار، خطا سے مبرا نہیں۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ سالار اقبال نے فرمایا ہے کہ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل۔ تو میرا پاسبان عقل ہے۔"

"مگر اگلے مصرعے میں شاعر نے فرمایا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔ تو برادر نسبتی! دلاور کے ملتے آپ لپیٹے جائیں گے۔ اسے براہ راست مجھ سے غرض نہیں اور تیرے ساتھ جا کے میں اعلانیہ اس جنگ میں شریک ہونا اچھا نہیں سمجھتا۔"

"میں جاؤں گا کھانے کے وقفے کے بعد۔" میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ "ابھی ایک بجا ہے۔ چل پھر بھی کھانا ماحضر تناول فرماتے ہیں۔ اس کے بعد تو واپس اسپتال یا شاید سو جاؤں گا مگر پہلے بڑی بی کے بارے میں پوچھ لیں۔"

ہم نے ایک ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ اس نے کہا کہ ان کا حال زیادہ تبدیل تو نہیں ہوا ہے لیکن کچھ امید پیدا ہو چلی ہے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ رات تک افاقہ جاری رہا تو کل صبح ان کو اس یونٹ سے پرائیویٹ وارڈ میں منتقل کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد ایک آدھ دن دیکھنے کی اجازت ہوگی مگر بات کرنے کی نہیں۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ شاید دو دن بعد ان کی حالت اس حد تک بہتر ہو جائے کہ وہ بات کر سکیں لیکن کم سے کم ایک مہینے تک ان کو بستر سے اٹھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہ مدت چھ ماہ بھی ہو سکتی ہے۔ سیڑھیاں چڑھنے، وزن اٹھانے، محنت مشقت کا کوئی کام کرنے اور فکر و غم سے بچنے کی احتیاط تو تمام عمر کرنی ہوگی۔

میں اور محسن ہسپتال کے عقبی دروازے سے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی طرف والی سڑک سے نیلا گنبد تک گئے۔ نعمت کدہ بنانے کے لیے انار کلی کے دوسرے کنارے تک جانے کے بجائے ہم نے پاک ٹی ہاؤس کو ترجیح دی اور پھر بائیں جانب کی طرف ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بینک اسکوائر کی طرف سے گاڑیاں مسلسل آ جا رہی تھیں۔ اچانک میرے قدم رک گئے۔ میں پلٹ کر نیلے رنگ کی اس ٹویوٹا کرولا کو دیکھنے لگا جو چند سیکنڈ میں مال روڈ کی طرف سے آ کے سیدھی انار کلی کے چوک کی طرف نکل گئی تھی۔ آگے بھیڑ تھی چنانچہ میں یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ کار دائیں جانب مڑ گئی یا سیدھی اس سڑک پر گئی جو لاء کالج کے سامنے سے گزر کے ضلع کچہری والی سڑک سے جا ملتی تھی اور پھر بائیں طرف وہی راستہ تھا جو بادشاہی مسجد اور مینار پاکستان کی طرف سے راوی کے پل کی طرف جاتا تھا۔ پل کے دوسری طرف سے شاہدرہ کا علاقہ شروع ہوتا تھا جہاں "ایمرڈ بیوڈی" انجینئرنگ کمپلیکس بھی تھا۔

"کیا بات ہے؟" محسن نے اخبار لپیٹ کر ڈنڈے کی طرح میرے شانے پر بجایا۔

"ابھی ایک کار گزری تھی نیلے رنگ کی ٹویوٹا کرولا۔" میں نے کہا۔ "غالباً وہ ڈی سلوا کی کار تھی۔ ڈی سلوا کو میں نہیں دیکھ سکا مگر مجھے شک ہے کہ وہ اس میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔"

"نیلے رنگ کی ٹویوٹا کرولا؟ ایسی گاڑیاں تو شہر میں دو چار دکھائی دیں گی۔ اگر ایک ہی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔" "نمبر یاد نہیں؟"

"نمبر یاد ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس وقت نہیں دیکھ سکا۔"

دو بجے میں نے محسن سے کہا کہ اب تم جاؤ اور چوہدری دلاور سے ملاقات کرنے میں زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے صرف ہوں گے اور میں شام پانچ بجے تک لوٹ آؤں گا۔ امید ہے اس وقت تک رابعہ بھی آ جائے گی اور پھر رات کو رابعہ کو اس کے گھر چھوڑنے کے بعد رضوی صاحب سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق رات کا کھانا ان کے گھر پر ان کے ساتھ کھانا ہوگا۔ مجھے محسن نے ایک جیل پڑا اور میں نے وہیں سے رکشا لیا۔ [illegible] پچیس روپے [illegible] اس وقت علاوہ دو گھنٹے کے انتظار کر لوں تو وہ مقبرہ جہانگیر کے باہر ایک گھنٹہ میرا انتظار کر سکے گا مگر میں نے کہا کہ مجھے شاید [illegible] جب تک جی چاہے جہانگیر کے مقبرے کے باہر انتظار کرے۔ چونکہ مجھے جہانگیر کے مقبرے جانا ہی نہیں۔ اس لیے میں کرایہ بمطابق میٹر ہی ادا کر سکتا ہوں اور کچھ نہیں۔ بعد میں یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میٹر کی رفتار رکشا کی رفتار سے کتنی زیادہ تھی اور میٹر بھی حسب منشا مالک کے ذہن کے تابع تھا۔ اس نے جو کرایہ ظاہر کیا وہ اصل سے تقریباً پچیس روپے زیادہ ہی تھا۔ ابھی میرا احتجاج اور اس احتجاج پر ڈرائیور کا احتجاج شروع ہی ہوا تھا کہ ایک سارجنٹ نمودار ہوا جسے میں نے فوراً پہچان لیا۔ "ارے حشمت خان!" میں نے صدا لگائی اور ڈرائیور نے بعجلت تمام فرار ہونے میں بہتری دیکھی۔ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ حشمت خان نے اس بے تکلفی سے پکارے جانے کا کتنا برا منایا ہے۔ اس نے دھواں دھار گالی بکی اور پھر موٹر سائیکل ایک طرف روک لی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے خالص پٹھانی لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بس تمہاری خیریت پوچھنی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس سے رکشا والے کا نقصان ہو گیا۔ جائز کرایہ تک چھوڑ کے بھاگ گیا ورنہ پچیس روپے زیادہ مانگ رہا تھا۔"

حشمت خان نے رکشا والوں کی شان میں چند الفاظ کہے۔ مجھے خوشخبری دی کہ انشاءاللہ چودہ دن بعد چالان پیش کر دیا جائے گا اور امید ظاہر کی کہ اب فیصلے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ اسے سلامت شاہ کے مارے جانے کے بعد میرے تختہ دار تک پہنچنے کے امکانات خاصے روشن نظر آنے لگے تھے۔ پھر چلتے چلتے اس نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو اور میں نے کہا "مقصد ایصال ثواب و فاتحہ خوانی ہے کہ مزار مبارک میرے جد امجد کے آقائے ولی نعمت فرمانروائے اقلیم ہند شیخو عرف سلیم پسر جلال الدین المرحوم ہے..."

"اچھا اچھا!" حشمت خان نے کہا۔ "بابا شیخو کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جاتے ہو۔ یہاں کسی سے پوچھ لو۔ مجھے تو معلوم نہیں۔" اور روانہ ہو گیا۔ میں نے مقبرہ جہانگیر کے پرشکوہ میناروں پر نگاہ ڈالی جن کی رعنائی درختوں کی سرسبزی اور سرفرازی میں بھی نمایاں تھی اور ہندوستان کے اس عظیم خاندان پرور شہنشاہ کی روح سے معذرت چاہی کہ اگر میری سمجھ کا ایک سپاہی اتنا جاہل ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ پھر میں نے "ایمرڈ بیوڈی" انجینئرنگ کمپلیکس کی جستجو کا آغاز کیا۔ اکثر لوگ بی آر بیوڈی کا پتا بتانے پر آمادہ ہوتے

www.paksociety.com

ٹیکسی بالآخر ایک خضرِ راہ نے میری منزل تک رہنمائی کی اور مجھے تقریباً ایک ایکڑ پر محیط کارخانے کے دروازے تک پہنچا گیا۔ فیکٹری آدھے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اور مخروطی چھت والی چار لمبی لمبی بیرکوں کے علاوہ سرخ اینٹوں کی ایک عمارت پر مشتمل تھی۔ جس کا رنگ گہرا سرخ تھا۔ بند گیٹ کے اوپر نیم دائرے کی صورت میں سائن بورڈ نصب تھا اور بائیں طرف کی دیوار پر "کوئی جگہ خالی نہیں ہے" کا بورڈ آویزاں تھا جو کافی بے حسی کے ساتھ تمام بیروزگار اور تلاشِ معاش میں سرگرداں لوگوں کو کسی اور در پر جانے کا مشورہ دے رہا تھا جہاں اسی قسم کے بورڈ پہلے سے موجود تھے۔ گیٹ کے باہر آٹھ فٹ لمبا چوڑا پختہ کیبن تھا جس کی کاؤنٹر ٹاپ کھڑکی کے پیچھے ایک اسمارٹ نوجوان بیٹھا جیمز ہیڈلے چیز کا ناول پڑھ رہا تھا۔

"مجھے چوہدری دلاور سے ملنا ہے۔" میں نے صاحب کے لفظ کو عمداً گول کر دیا اور بلاوجہ مسکرایا۔

نوجوان نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "کیا نام ہے آپ کا؟" اس نے ناول رکھ کے انگریزی میں کہا۔ "اور کام کیا ہے ان سے؟"

"کیا؟" میں نے کہا۔ "ذرا اردو میں یا پنجابی میں بتاؤ۔ مجھے انگریزی نہیں آتی۔"

نوجوان نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھا اور اپنی بات دہرائی اور میرے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"نام اور کام بتلائے بغیر ملاقات نہیں ہو سکتی؟" میں نے کہا۔ نوجوان نے نفی میں سر ہلایا۔

"ابھی یہاں نیلے رنگ کی ایک کار آئی تھی ٹویوٹا کراؤن؟" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا جو نشانے پر بیٹھا۔

"وہ ڈی سلوا صاحب کی کار تھی۔ وہ چلے گئے۔" نوجوان نے مجھے مطلع کیا۔ میرا رویہ اس کے لیے پُراسرار ہونے لگا تھا۔

"ہاں۔ ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ تم نے دیکھا تھا؟" میں نے اپنے پُراسرار رویے کو برقرار رکھا۔

"کوئی تھا تو سہی۔ میں نے غور نہیں کیا کون تھا۔" نوجوان بولا۔

"تمہیں غور کرنا چاہیے۔ تمہیں یہاں اسی لیے بٹھایا گیا ہے۔ آئن فلیمنگ کے جاسوسی ناول ضرور پڑھو مگر غور ضرور کرو۔ وہ آدمی میں تھا۔ کیا اب میں جا سکتا ہوں؟"

نوجوان نروس ہو گیا تھا۔ اس نے کھڑکی سے منہ نکال کے چوکیدار کو آواز دی کہ صاحب کو جانے دو۔ میں گیٹ کے درمیان کھل جانے والے چھوٹے گیٹ سے احاطے میں داخل ہوا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا سرخ عمارت کے برآمدے میں پہنچ گیا جہاں ایک دروازے پر "ڈائریکٹر" کا بورڈ تھا۔ میں نے دروازے کو دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے کا دروازہ کسی آواز کے بغیر آہستہ آہستہ خود بند ہو گیا۔ کمرہ ہال کے چوتھائی حصے کے برابر لمبا تھا جسے لکڑی اور دھندلے شیشے کی پارٹیشن سے چھوٹا کر دیا گیا تھا اور میرے سامنے پندرہ فٹ تک پھیلا ہوا فرش کے حصے میں قالین والے فرش پر دو نوادر کے ساتھ ایک صوفہ سیٹ تھا اور اس کے مقابل آخری حصے میں چھ فٹ چوڑی گلاس ٹاپ ٹیبل پر کاغذات پھیلے ہوئے تھے اور دو ٹیلی فون رکھے تھے، انٹرکام تھا اور ایک ٹائپ رائٹر۔ ٹیوب لائٹ میز کے وسط میں چھت سے آویزاں تھی۔ خود میز پر بیٹھے تھا۔ اس کی خالی کرسی کے پیچھے اسٹیل کی ایک الماری اور فائل کیبنٹ تھے۔ میں نے پارٹیشن وال کے دروازے سے بقیہ تین چوتھائی ہال میں قدم رکھا جو اب پندرہ فٹ چوڑا اور بیس فٹ لمبا کمرہ بن گیا تھا۔ اس کمرے میں تو دال کارپٹ تھا جس کا رنگ ملتا تھا اور اس میں پھول تھے۔ کھڑکیوں اور دروازے پر گہرے نیلے پردے تھے جن میں سرخ کشیدہ کاری تھی اور رنگ کی جھالر تھی۔ بائیں ہاتھ کے گوشے میں ٹیبل کے گرد دو صوفہ سیٹ لگے ہوئے تھے اور گل دستہ رکھا تھا ——— بائیں گوشے میں تین فٹ چوڑی میز تھی جس کی شکل کچھ انسانی گردے سے ملتی جلتی تھی۔ اس کے پیچھے ایک گھومنے والی کرسی تھی اور سامنے میری طرف مہمانوں کے لیے چھ کرسیاں خالی تھیں۔ ایک شخص میز پر ہاتھ رکھ کے جھکا ہوا کچھ سمجھا رہا تھا جو کرسی پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے باتوں کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ جو شخص کھڑا تھا وہ سیکریٹری ہی ہو سکتا تھا۔ یعنی باہر کے کمرے میں بیٹھنے والا۔ بیٹھے ہوئے شخص نے اطمینان سے پشت کا سہارا لے لیا۔

میرے ذہن میں دلاور کی صورت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ میں نے صرف اس کا متحرک سایہ دیکھا تھا جس کی حرکات واضح تھیں۔ اس کے سگریٹ پینے، سر ہلانے کا اور بولنے کا انداز میرے ذہن میں تھا اور ان سب باتوں کو ذہن میں رکھ کے میں یہ کہہ سکتا تھا کہ کرسی پر بیٹھا ہوا شخص قد و قامت اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے وہی چوہدری دلاور ہے۔

"چوہدری دلاور!" میں نے اس کے سوالیہ نشان بن جانے والے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ "میں سکندر بخت ہوں۔"

کلین شیو سرخ و سفید صحت مند چہرے پر آہستہ آہستہ مسکراہٹ پھیلی اور وہ اطمینان بلکہ کاہلی سے تھوڑا سا اٹھا۔ "بیٹھیے آپ بیٹھیے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کے نیم خواندہ پنجابی لہجے میں کہا۔ "ابھی ابھی آپ جیسے وہ آئے تھے۔ کی ناں اسے افضال ہوا۔ ڈی سلوا صاحب۔" اس نے میز پر ہاتھ مارا اور نام بروقت یاد آ جانے پر داد طلب نظروں سے سیکریٹری کو دیکھا۔ "وہ آئے تھے۔ بوت کچھ۔ کیوں بھئی؟" سیکریٹری نے اقرار میں سر ہلایا۔

"اچھا اچھا۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ شکایت کرنے آئے ہوں گے۔"

دلاور بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔ "شکایت تو سارے زمانے کو سارے زمانے سے ہے۔ کیوں بھئی؟" اس نے سیکریٹری کی طرف دیکھا اور وہ عادی معلوم ہوتا تھا چنانچہ اکتائے ہوئے انداز میں سر ہلا کے تائید کی۔ "چھڈو پراں۔ میں نے کہا اوئے تو بھی تو ٹھنڈی گرمی کھاتا ہے۔ تھوڑی نرمی بھی ہونی چاہیے۔ پر وہ تھوڑا اثر ہوا میں تھا۔ سمجھ گئے ناں آپ جو اپنا ڈی سلوا صاحب ہے نا۔ جنکی مشکی لگا لیتا ہے کبھی۔"

"مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "جنکی اور مشکی دلاور صاحب بھی شوق کرتے رہے تھے۔ غالباً یورپ میں رہتے رہے۔"

دلاور نے فلک شگاف قہقہہ مارا۔ "او بھئی کمال کر دیتی ہے۔ جنکی اور مشکی۔ ہاہاہا۔" پھر اس کی ہنسی اچانک یوں بند ہو گئی جیسے بجلی جانے سے ریڈیو بند ہوتا ہے۔ "تو کی سن رہیا ایں بھئی؟ جا چائے پانی۔ اپنا کام کر باہر بیٹھ کے اور کوئی لسی پانی بھیج اندر۔ کیوں بھئی سکندر صاحب آپ ولایت سے آئے ہو۔ لسی تو ہم لسی پیتے ہیں۔ یہ آپ ادھر جا کے چیلے گی کر کافی؟"

"اگر کافی مل جائے تو۔۔۔" میں نے سیکریٹری کی طرف دیکھ کے کہا جو دروازے پر ہو کے رک گیا تھا۔ میری بات سن کے پھر چل پڑا۔

"اس کو سمجھا دیا ہے میں نے۔ آپ بالکل فکر مت کرو۔" دلاور نے پھر مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔ "میں نے کہا او یار! پہلے ہی آئی تھانے کچہری ہو رہی ہے اس غریب کے ساتھ۔ چھڈو پراں۔ بات ختم کرنی چاہیے۔ اب اپنی سمجھ میں تو کچھ آتی نہیں۔ تھانوں کی معاملہ ہے۔ قانونی معاملہ اس نے یوں کہا کہ مجھے کوئی مامالا سنائی دیا۔ ہم کیا بولیں کیوں جی یہ وہ جو آپ کے والد صاحب تھے نا۔ ان سے اپنی بس ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔ ادھر میر صاحب مرحوم کے دفتر میں۔ مجھے مالش لگے ہیں تو اور لوگ بڑی تعریف کرتے تھے۔ اللہ جنت نصیب کرے۔ بڑا افسوس ہوا تھا ان کے فوت ہونے کا۔ اور ابھی کچھ دنوں کی بات ہے۔ اس کے بعد میر صاحب۔" اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری۔ "آدمی کا کچھ بھروسہ نہیں جی۔ شام کو ہے صبح نہیں ہے۔ جو مرضی مولا کی ہو تو بندہ کیا کرے۔"

دلاور کے بارے میں پہلی ملاقات کے دوران میرا تاثر یہ تھا کہ وہ بڑا اچھا اداکار ہے اور اس نے جس پُراسرار ڈرامائی ماحول میں ڈرامائی انداز میں مکالمے بولے تھے وہ اس کی اداکارانہ صلاحیت کا ثبوت تھے۔ اگر یہ دلاور ہی تھا تو میرا تاثر بھی پھر یہی تھا کہ اس کے بولنے کا، بیٹھنے کا، آہ بھرنے کا، بے تکلف گفتگو کا اور نیم خواندہ لہجے میں بات کرنے کا سارا انداز اس کا اصل انداز نہیں بلکہ اداکاری ہے۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ اگر وہ اداکاری تھی تو یہ اداکاری نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک شخص جو فیکٹری میں مالک کی حیثیت رکھتا ہو سرِ دست اپنے تمام ماتحت ملازموں کے سامنے اداکاری کیوں کرے گا۔ عقلاً یہ ناممکن سی بات تھی اور قطعی غیر ضروری بھی۔ دلاور کی اصل شخصیت یہی تھی جو اس وقت میرے سامنے تھی۔ اگر اس نے اپنے سیکریٹری کے سامنے اچانک لہجہ، آواز یا انداز بدلے ہوتے تو سیکریٹری ضرور حیران ہوتا مگر وہ بالکل نارمل رہا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ جس دلاور کا تاثر میرے ذہن میں تھا اس پر میرے مقابل بیٹھے ہوئے دلاور کی شخصیت کسی زاویے سے منطبق نہیں ہوتی تھی۔ میری ساری خوش فہمی ختم ہو گئی تھی۔ میں نے محسن سے کہا تھا کہ میں انداز و اطوار کی ذرا سی مماثلت بھی دیکھوں گا تو چوہدری دلاور کو شناخت کر لوں گا۔ اس نے میرے دعوے کو مبالغہ آمیز قرار دیا تھا اور یہ بات صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ اگر اس رات دلاور نے اپنی شخصیت بدلی تھی تو یہ تبدیلی ناقابلِ یقین حد تک مکمل تھی۔ اس رات مجھ سے پسِ پردہ رہ کے بات کرنے والے دلاور کی شخصیت

www.paksociety.com

سو فیصد مختلف تھی۔ وہ مہذب، تعلیم یافتہ، پرسکون رہ کر نرم لہجے میں بڑے اچھے انداز میں بات کرنے والا دلاور تھا۔ اس کی کوئی جھلک مجھ سے مخاطب دلاور میں نہیں تھی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اس رات چوہدری دلاور نے اداکاری کا بہترین نمونہ پیش کیا تھا یا کسی اور کی خدمات حاصل کی تھیں کہ وہ مؤثر طریقے پر مجھے سب سمجھا دے یا وہ کوئی اور تھا جس نے چوہدری دلاور کا نام استعمال کیا تھا۔ لیکن کوئی اور چوہدری دلاور مجھ سے یہ مطالبہ کیوں کرے گا کہ میں حق وراثت سے دستبردار ہو جاؤں۔ دو مالک مر گئے تھے۔ ان میں سے ایک لاوارث تھا۔ چوہدری دلاور کے بلا شرکت غیرے کاروبار پر قابض ہونے کے لیے یہ ضروری تھا کہ دوسرے وارث کو راستے سے ہٹنے پر مجبور کر دیا جائے یا ہمیشہ کے لیے ہٹا دیا جائے۔

"لو جی اپنے سکندر صاحب! آپ بھی کس خیال میں گم ہو گئے۔ کوئی شاعری ماعری کرتے ہوں گے۔" دلاور ہنسا۔ "ہم تو ٹھیٹھ ان پڑھ لوگ ہیں لٹھ کاٹنے والے۔"

"معاف کیجیے گا۔" میں نے کہا۔ "آپ نے والد صاحب کا ذکر کیا تو مجھے ان کی یاد آ گئی۔ اب یہ تمام کاروبار آپ ہی کو سنبھالنا پڑ رہا ہو گا۔ آپ کی ذمے داریوں میں تو بہت اضافہ ہو گیا ہے۔"

"دقت پڑ گیا ہے جی! اپنے وزیر خان مرحوم حساب کتاب دیکھ لیتے تھے۔" اس نے کافی بناوٹی حزن سے کہا۔ "جو نہ جانے کون اندر رکھ کے چلا گیا تھا۔ میر صاحب تھے، باہر کا سارا بزنس سنبھالتے تھے۔ ہم ادھر ہی سے فیکٹری کو دیکھتے تھے اور بس۔ اب معلوم نہیں کیا ہو گا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں بہت جلد آپ کی مدد کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ چوہدری دلاور نے حیران سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ "میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ آپ یہ پوچھنا چاہتے ہوں گے کہ مجھ پر تو قتل کا مقدمہ چل رہا ہے، میں کاروبار کیسے سنبھال سکتا ہوں۔ آپ کا اندیشہ بجا لیکن مجھے میرے وکیلوں نے یقین دلایا ہے کہ کیس بوگس ہونے کی وجہ سے اتنا کمزور ہے کہ سزا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بے شک بیشتر وکیل موکل سے ہمیشہ یہی کہتے رہتے ہیں۔"

"ہاں جی۔" وہ ہنسا اور اس نے کان میرے سامنے کھجائے۔ "وہ ایک لطیفہ ہے نا جناب کہ تھا کوئی ہمارے جیسا جٹ ویسا اور اسے وکیل مل گیا کوئی چلتا پرزہ۔ تین سو سات کا کیس تھا جو اس کی پیروی سے تین سو چار کا بن گیا۔ موکل نے دہائی دی تو اس نے کہا دیکھو اب جیل میں کیا ہوتا ہے۔ اپیل میں تین سو دو کا ہو گیا اور پھانسی کی سزا ہو گئی تو موکل چلانے لگا۔ وکیل نے کہا او بے وقوف! تیرے سامنے میری کوشش سے پانچ دفعات کم ہو گئیں۔ خدا مہلت اور دیتا تو باقی دو دفعات بھی ختم کرا دیتا مگر تیرا ٹائم اور تیری فیس دونوں ختم ہو گئے۔"

جب وہ لطیفہ سنا رہا تھا تو میں نے اس کی چالاکی پکڑ لی۔ ابھی وہ خود کو "چٹا ان پڑھ" کہہ رہا تھا اور لطیفے میں اس نے قانون کی دفعات کے حوالے بڑی روانی سے دے دیے۔ تین سو سات کا مطلب تھا اقدام قتل۔ تین سو چار غیر ارادی قتل اور تین سو دو قتل عمد کی دفعات تھیں۔ کوئی بالکل جاہل شخص ان سے کیسے واقف ہو سکتا ہے اور لطیفے میں حوالے کے طور پر کسی غلطی کے بغیر کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ یہ لطیفہ وہ بعد میں کسی کو نہیں سناتا ہو گا۔ یہ کوئی ایسی مؤثر دلیل نہ تھی جس سے میری بے یقینی ختم ہو جاتی۔

لطیفہ ختم ہوا تو میں یوں ہنسا جیسے میں نے واقعی یہ لطیفہ پہلی بار سنا ہو۔ "دراصل وکیل میرے بچپن کے دوست ہیں۔" میں نے کہا۔ "دونوں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے وکیل ہیں اور فیس دینے کا کیا سوال۔ میں فیس کی بات بھی کروں تو ناراض ہو جاتے ہیں۔"

"اچھا اچھا۔" اس نے عدم دلچسپی سے اظہار کیا۔ "اچھا ہے جی آپ آ جاؤ تو کچھ کام بنے۔ آپ ولایت سے آئے ہو۔ ماشاء اللہ نوجوان اور پڑھے لکھے ہو۔ ڈی سلوا تو ہے ملازم۔ آپ کی بات اور ہے۔ سب کر کے یہ سب جھوٹ ہو۔"

"دلاور صاحب!" میں نے کہا۔ "جب میں انگلینڈ گیا تھا تو کاروبار کے دو شریک تھے۔ میرے والد اور میر ذوالفقار علی۔ آپ میرے شریک کی حیثیت سے اس کاروبار میں کب شامل ہوئے۔ پہلے آپ کیا کرتے تھے؟"

چوہدری دلاور کا چہرہ یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی حالت کے تغیر کا سبب میرا سوال ہے۔ "وہ جی میں نے کہا تھا نا کہ ہم تو ان پڑھ بندے ہیں۔ تو سچی بات ہے کہ لوہا کوٹتے کوٹتے مستری بن گئے۔ فورمین ہو گئے۔ سب اللہ کی دین ہے کہ جو بھی مشین ہو، سمجھ میں آ جاتی ہے اور فٹ ہو جاتے تھے۔" اس نے سر کو انگلی سے کھجایا۔ "مشین کے پرزے ایک دفعہ کھول کے ڈال دیے تو جوڑنے میں کبھی دشواری نہیں ہوتی۔ یہ لونڈے جو انگریزی کتابیں مشینوں میں پڑھ کے انجینئر صاحب بن جاتے ہیں، پیسے جیتے صاف کرنے کے قابل نہیں تھے۔ مشین بگڑ جائے تو ان کو دیکھنی پڑتی ہیں کتابیں۔ نقشے، چارٹ اور ڈایاگرام۔ پھر بھی یہ کبھی مار کھا کے خراب پرزے کی جگہ نیا پرزہ لگا دیا۔ پرزہ تو خود ایک مشین ہوتا ہے۔ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کی شکل صورت، ناک نقشہ بدل کے اچھا کیا جا سکتا ہے جس سے کام اور اچھا ہو۔ کبھی پرزہ نخرے کرتا ہے تو اس کی مدد کے لیے اپنی طرف سے کوئی پرزہ بھی جوڑنا پڑ جاتا ہے جیسے گھوڑا جاتا ہے اکیلا چلتے ہوئے۔ کیا کہتے ہیں اس کو رد و بدل۔ ہاں جی بہت مشینوں میں رد و بدل کر کے اصل سے بہتر بنا دیا۔ سوچو ذرا ہر ایک قسم کے ماڈل اور سائز میں مختلف ملکوں کی مختلف مشینوں کے۔ سب تجربے اور اللہ کی مہربانی سے سمجھ میں آتے تھے۔ آپ دیکھ لیں۔ یہ جو پرانے استاد ہوتے ہیں نامور مکینک۔ جو بچپن سے گیراج میں جوتیاں سیدھی کرنی شروع کرتے ہیں اور مار کھا کھا کے سیکھتے ہیں ایسے ماہر ہو جاتے ہیں کہ ہر ماڈل کی کار کا انجن تصویر کی طرح ان کی کھوپڑی میں رہتا ہے۔ یہ پڑھے لکھے بابو ٹائپ ڈگری انجینئر کہلانے والے لونڈے ان کے مقابلے میں ایسے لگتے ہیں جیسے... جیسے بچے۔" اس کے دماغ میں فوراً کوئی مناسب تشبیہ نہیں آئی تھی۔ "تو جناب ہم نے بھی ایسے ترقی کی تھی۔ میر صاحب نے کہا، ادھر فیکٹری لگائی ہے کچھ مال ہے تو لگا لو۔ لیں جی ہم نے جو تھوڑا بہت بچایا تھا وہ دے کر پارٹنر بن گئے۔"

میں بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور میرا یقین متزلزل ہو چکا تھا کہ میں اسی دلاور سے ہم کلام ہوں جس نے مجھے اغوا کیا تھا۔ جو ایک نامعلوم شخص کی کوٹھی پر مجھے لا کر قتل کرنے کا قائل ہوا تھا۔ جو اس رات اس کوٹھی میں رہ رہا تھا اور کسی عورت کے ساتھ داد عیش دے رہا تھا، اور جس نے مجھے انتہائی خطرناک انداز میں کھلی دھمکی اور ایک ماہ کی مہلت دی تھی۔ یہ سیدھا سادا۔ مستری سے خود ہی اپ گریڈ ہو کر انجینئر بن کے فیکٹری کا مالک بن جانے والا ان پڑھ اور صاف گو آدمی کوئی اور تھا۔

"چوہدری صاحب!" میں نے کہا۔ "پہلے آپ نے کہاں کہاں سے تجربہ حاصل کیا تھا؟ میرا مطلب ہے آپ مستری کہاں کہاں رہے؟"

اس سوال کا جواب وہ اپنی باتوں میں گول کر گیا تھا۔ "اب کیا بتاؤں جی سکندر صاحب! پرانی باتیں ہیں جہاں کام آیا وہاں رہے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ لاہور، فیصل آباد، کراچی۔" اس نے بڑی صفائی اور پورے اعتماد کے ساتھ سابقہ حوالے بتانے سے گریز کیا۔ یہ شک پیدا کرنے والی دوسری بات تھی۔ اتنی صاف بات کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ میں فلاں فونڈری میں اتنے سال مستری رہا۔ پھر اس نے "بیکو" یا "اتفاق" جیسے اداروں میں بحیثیت فورمین کام کیا ہوتا یا ورکشاپ میں رہا ہوتا تو فخر سے بتاتا مگر نام لینے سے اس کا ماضی کریدا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے ماضی کا سراغ دینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا اور میں یہ بات اس سے زبردستی نہیں پوچھ سکتا تھا۔

"ڈی سلوا صاحب کو کون لایا تھا؟" میں نے کہا۔ "کوالیفیکیشن کیا ہے ان کی؟"

"میں نے سنا ہے کہ وہ ڈگری ہے۔ کئی سال انگلینڈ رہا۔ ایم بی اے۔" وہ بولا۔ "اپنے میر صاحب لائے تھے۔"

پھر وہ بات ہوئی جس نے ایک دم میرے شکوک کی تصدیق کر دی۔ "ابھی ان کے ساتھ کون آیا تھا؟"

"ہاں جی وہ بی مسکی۔" وہ ہنس کے بولا اور میں نے فوراً اس کا جھوٹ پکڑ لیا۔ میں نے پنجاب اسکوائر کی طرف سے آنے والی نیلے رنگ کی ٹویوٹا کراؤن گاڑی کو ادھر ہی آتے دیکھا تھا اور مجھے اس میں بیٹھی ہوئی صورت دکھائی دی تھی۔ گیٹ پر چیز بوڑھا کا ناول پڑھنے والے نوجوان نے تصدیق کی تھی کہ ان کے ساتھ کوئی تھا۔ چوکیدار نے یقیناً گاڑی کو دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا اور گاڑی رکے بغیر سیدھی گزر گئی تھی۔ ڈی سلوا کے ساتھ غیر متعلقہ شخص اندر کیسے جا سکتا تھا تو چوہدری دلاور یہ بات کیوں چھپاتا۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ ان کے ساتھ ان کے کوئی دوست تھے۔ میں نہیں جانتا۔ لیکن اس نے جھوٹ بولا حالانکہ وہ جانتے بوجھتے۔ میں نے گیٹ پر روکنے والے نوجوان سے کہا تھا کہ وہ شخص میں ہوں اور اس نے مان لیا تھا۔ وہ صورت نہیں دیکھ سکا تھا مگر اس نے یقیناً دیکھا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی مرد تھا۔ اگر لڑکی ہوتی تو وہ مجھے میرے جھوٹ پر بے عزت کر دیتا۔ چوہدری دلاور نے اپنی طرف سے ذہانت کا مظاہرہ کیا تھا۔ آخر مجھے کے ساتھ کون آئے گا؟ اس کی سیکرٹری جسے جھجکی ہی کے ذکر پر میں نے جھجکی سے الگ کر کے مشکی کہا تھا تو بہت لطف اندوز ہوا تھا۔ اب میرے لیے شک کی قطعی گنجائش نہ رہی کہ میری آنکھوں نے غلط نہیں دیکھا تھا۔ ڈی سلوا

www.paksociety.com

کے ساتھ چھوڑ دیا تھا اور دلاور نے یہ بات چھپائی تھی۔ بے شک میں گیٹ کے چوکیدار سے پوچھ کے مزید تصدیق کر سکتا تھا مگر میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔

"اچھا دلاور صاحب! میں ایک نظر فیکٹری دیکھنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم کیا بناتے ہیں کیسے بناتے ہیں؟"

"ہم ہم دیکھو جی۔ آپ مالک ہو، پوچھنا کیسا۔" وہ بولا۔ "مگر آج نہیں۔ میں نے اپنی وڈی منشی سے کہا تھا کہ جلدی آجاؤں گا تو اس کو داتا صاحب لے جاؤں گا۔ اس نے چادر چڑھانی ہے۔ آپ کل پرسوں جب دل کرے آ جاؤ۔ ویسے بھی اب چھٹی ہونے والی ہے۔ آپ کیسے آئے ہیں؟ میرا مطلب ہے... مطلب ہے کہاں قیام ہے آپ کا اگر گاڑی نہیں ہے تو میں چھوڑ دیتا ہوں۔"

بے شک میں مشینوں کی تیاری۔ پیکنگ، اسٹور اور گودام کے تمام شعبے دیکھ کر اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ گڑبڑ ہو رہی ہے تو کہاں مگر ملاقات کا اصل مقصد کچھ اور تھا جو پورا ہو چکا تھا۔ دوسرا مقصد اب پورا ہو سکتا تھا کہ میں چوہدری دلاور کا گھر دیکھ لوں۔

"یہ تو بڑا اچھا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "آپ مجھے اپنا گھر بھی دکھا دیں اور پھر مجھے میرے گھر پر ڈراپ کر دیں۔ میں ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں۔" کنکھیوں سے میں نے اس نام کا ردعمل دیکھا مگر اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"وہ کہاں رہتے ہیں؟" اس نے میز کی دراز میں سے گاڑی کی چابیاں نکالتے ہوئے کہا۔

"پانسوں والی سڑک پر میو گارڈن کے پیچھے۔" میں نے کہا اور اس نے فقط سر ہلایا۔ باہر آ کے اس نے سیکرٹری کو ٹھیٹھ لاہوری پنجابی میں بتایا کہ وہ گھر جا رہا ہے اور دفتر بند کر کے وہ بھی جانا چاہے تو چلا جائے۔ "اور دیکھ نذیر! لوہ ڈرائیور کہتے اسے۔ او توں لب کے لیا۔" اس نے چابیاں سیکرٹری کی طرف اچھال کے کہا۔ "اوس نواب دے پتر نے سے آ نا اسے اپنے ٹیم تے۔" اور سیکرٹری نے پانچ بجے گاڑی لے کر آنے والے ڈرائیور کو چار بج کے دس منٹ پر حاضر کر دیا۔

میں دلاور کے ساتھ پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور جب گیٹ کھلا تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ چوکیدار کے علاوہ وہ جیمز بونڈ کا ناول پڑھنے والے نوجوان نے بھی بڑی مستعدی سے اٹھ کے سلام کیا اور یہ دیکھا کہ میں واقعی

کوئی وی آئی پی ہوں جسے چوہدری صاحب اپنی گاڑی پر اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں اور وہ بھی قبل از وقت۔ یقین تھا کہ آئندہ کوئی ان میں سے میرا راستہ نہیں روکے گا۔ میری یہ خوشی اس وقت خاک میں مل گئی جب لوہاری ٹیکسیوں کی تو پ کی طرف بھیجے گا رسال روڈ پر آئی اور اس نے اپنے شوفر کو حکم دیا کہ سیدھا چلے اور کشمیر روڈ پا جائے۔ پہلے سکندر صاحب کو چھوڑنا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے ٹالنا چاہتا ہے چنانچہ میں نے بھی اس کا گھر دیکھنے پر اصرار نہیں کیا۔ یہ کسی سے بھی معلوم کیا جا سکتا تھا کہ چوہدری صاحب کی رہائش کہاں ہے جب کہ مجھے ضامن صاحب کی کوٹھی کے دروازے پر چھوڑ کے سیدھی نکل گئی میں واپس ہوا اور جو کچھ تک پہنچا بھی نہ تھا کہ پیچھے سے خالی رکشا آیا جسے میں نے گزرنے سے پہلے روک لیا اور ہوسپٹل چلنے کے لیے کہا۔ رکشے کی سواری کرنا خاصی جسمانی مشقت کا صبر آزما کام تھا مگر لاہور میں ٹیکسیوں کی تعداد ہونے کے برابر تھی۔ کم سے کم مجھے کبھی ضرورت پڑنے پر نظر ہی نہیں آئی۔

ہسپتال میں مجھے محسن کو تلاش کرنا پڑا کیونکہ ملاقاتیوں کے آنے کا وقت ہو چکا تھا اور میو ہسپتال کے پرائیویٹ سینکڑوں کے حساب سے ہر بیمار کو دیکھنے کے لیے آنے والے مردوں، عورتوں اور بچوں کا ہجوم تھا جو برآمدوں میں بھی جمع تھے۔ محسن نے خود ہی مجھے دیکھ لیا اور تیر کی طرح میری طرف آیا۔ "رابعہ نہیں آئی؟" میں نے پوچھا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "تیری ملاقات ہوگئی چوہدری دلاور سے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "میں نے غلط نہیں دیکھا تھا۔ نیلی کار میں جو لڑکی سوار تھی وہ بی اے ساد پیچھے بیٹھا تھا۔" پھر میں نے اسے چوہدری دلاور سے ملاقات کا حال سنایا۔ اس وقت وہ بیچ خالی نہیں تھی جہاں ہم دوپہر کے وقت بیٹھے تھے۔ لان پر بھی حضرات اور خواتین تھے جو نسبتاً صحت مند مریضوں کو وارڈ سے باہر لے آئے تھے اور انہیں درمیان میں بٹھا کے ان سے اپنا دکھ اور اپنی لائی ہوئی چیزیں کھلانے میں مصروف تھے۔ محسن ان سے دور ایک درخت کے گرد بنی ہوئی اینٹوں کی دو فٹ اونچی اور ایک فٹ چوڑی بیچ پر بیٹھے۔ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا اور نرسنگ آرڈرلی سیٹیاں بجا بجا کے لوگوں کو روانگی اختیار کرنے کا حکم دینے لگے۔ اکثریت معقول لوگ

تھی جو سیٹی سنتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ ڈھیٹ قسم کے لوگ اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک کہ ہسپتال کے عملے نے ان کو بے عزت کرنا شروع نہیں کیا۔ وہ جوابی تیزی دکھاتے لیکن بالآخر تمام مریض وارڈوں میں پہنچ گئے اور ہسپتال خالی ہو گیا۔ میں نے اور محسن نے اندر رہنے کا راستہ دریافت کر لیا تھا۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے طلبا بھی ہر وقت وارڈوں تک پھرتے تھے جہاں میں نے نرسوں کو دیکھا ڈاکٹروں کی مدد کرنا ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا ایک حصہ تھا نرسیں بھی زیادہ تر وہ تھیں جو نرسوں کے انتخاب میں دکھائے گئے معیار ایک جیسی تھیں وہ فاتح ایم کے لڑکوں میں سے کسی کو پیار کر کے شادی کرنے میں کامیاب ہوتی تھیں تو باقی عمر عیش کرتی تھیں۔ ناتجربہ کار اور بے وقوف قسم کی نرسیں اس امید میں کبھی ایک کے ساتھ اور کبھی دوسرے کے ساتھ دل لگی کے سبب بدنام ہوتی تھیں اور دل لگی ختم ہوتی تھی تو روتی تھیں کہ:

اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

انہی کی حوصلہ افزائی کے باعث وہ لڑکے بھی بے مقصد گھومتے پھرتے نظر آتے تھے جو پہلے یا دوسرے سال کے طالب علم ہوتے تھے اور ان کی کسی وارڈ میں ڈیوٹی نہیں ہوتی تھی۔ میں اور محسن بصورت شکل جیسے اور عمر کے باعث بہت سینئر طلبا میں شامل ہو سکتے تھے چنانچہ جب بھی کسی نے پوچھا تو ہم نے جنس سے ٹال دیا کہ ہم ڈیوٹی پر ہیں۔ اس وقت بھی ایک چوکیدار ٹائپ شخص نے ہمارے قریب آ کے کہا۔ "ٹائم ختم ہو گیا ہے جی، آپ جائیں۔"

"کہاں جائیں؟ ہوسٹل؟" میں نے کہا۔ "ہم ڈاکٹر صاحب کا کہا ماننے کے ویٹنگ کر رہے ہیں۔" میں نے اپنے جھکے سے ان کی چھٹی کر دی۔ وہ کچھ شرمندہ ہو کے واپس نکلتا ہوا چلا گیا۔ "یار عائشہ اور رابعہ کیوں نہیں آئی؟"

"ٹیلیفون کر لیتے۔" میں نے کہا۔ "کسی وارڈ سے ڈائریکٹ رابطہ کی نہیں۔ ہسپتال کا ایکسچینج ملانے گا۔"

ہم دونوں اندرونی تلاش کے جنرل وارڈ میں گئے۔ ایمرجنسی نے ہمیں گھور کے دیکھا مگر جب اعتماد سے ہم نے ٹیلیفون اٹھا لیا تھا اس سے وہ کشمکش میں پڑ گئی۔ دائیں ہاتھ ملانے کے بعد نمبر مانگ کے محسن نے نرس سے کہا کہ لائٹ رابطے کرے۔ ہمیں بلا کے اور بلا وجہ دانتوں کا ایک چکر لگایا۔ جب ہم واپس آئے تو نرس نے ہمیں مطلع کیا کہ نمبر نہیں ملا۔ گھنٹی بجنے کے کر رنگ جا رہی ہے لیکن ریسیور کوئی نہیں اٹھاتا۔

ہم نے سر ہلایا اور باہر چلے گئے۔

"رابعہ کے نہ آنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" محسن نے باہر نکل کے کہا۔

"میری سمجھ میں تو کوئی وجہ نہیں آتی۔" میں نے کہا۔ "وہ ماں کی طرف سے بہت زیادہ فکرمند تھی۔ ہو سکتا ہے خود اس کی اپنی طبیعت بگڑ گئی ہو۔"

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی مشکل میں پڑ گئی ہو۔" محسن نے کہا۔ "اس خط کی وجہ سے۔"

"مجھے بھی ایک خلش سی ہے کہ یہ اتحاد ثلاثہ بے مقصد نہیں۔ قوی سلوا، ییٹ، اور دلاور..." میں نے کہا۔ "ان کا ہنگامی اجتماع بے معنی وارد ہے۔"

میں اور محسن فکروں اور اندیشوں کا شکار ٹہلتے ہوئے کینٹین تک گئے اور دگنی قیمت پر چائے کھلانے والا ایک گرم مشروب پی کے واپس آ گئے۔ رابعہ ابھی تک نہیں آئی تھی اور ہمارے پاس سوائے خود گھر جا کے اس کی خیریت پوچھنے کے سوا چارہ نہ رہا تھا۔

"میں رابعہ کی طرف جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تو گھر جا اور ریوالور لے آ۔ ذرا احتیاط سے چھپا کے۔"

"ریوالور تو میرے پاس ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور میں نے کتنی احتیاط سے چھپا رکھا ہے اسی سے اندازہ کر لے کہ تو نے تجھے معلوم نہیں۔"

ایک بار پھر ہم نے رکشا میں تہ و بالا ہوتے ہوئے میو ہسپتال کے دروازے سے کراؤن سینما تک کا سفر کیا اور سینما کے باہر شوق نظارہ جمال سکھنے والوں کے ہجوم میں شامل ہو کے ایک دروازے سے اندر گئے اور دوسرے سے باہر آ گئے۔ چند قدم پیدل چلنے کے بعد ہم نے رابعہ کی سرخ فاکس ویگن دیکھی جو اپنی کوٹھی کے گیٹ سے تقریباً سو گز دور فٹ پاتھ سے لگی ہوئی دوسری کوٹھی کے احاطے کے سامنے کھڑی تھی۔ اسکے آگے پرائیویٹ ٹائپ کی کار تھی اور پیچھے ٹویوٹا کرولا کے نئے ماڈل کی ٹیکسی۔ فاصلے سے اندازہ ہوتا تھا کہ پرائیویٹ کار بعد میں آ کے رکی تھی۔ ٹیکسی البتہ چند انچ کے فاصلے پر تھی چنانچہ ظاہر تھا کہ بعد میں فاکس ویگن کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ ڈرائیور کسی گاڑی میں نہیں تھا۔ میں نے کوٹھی کے گیٹ پر لکھے ہوئے نمبر کو اور نام کی تختی کو دیکھا اور میں گھنٹی کا بٹن دبا کے یہ پوچھنے ہی والا تھا کہ مس رابعہ یہاں ہیں؟ ہیں تو انہیں بتا دیجیے کہ سکندر بخت صاحب اور محسن صاحب ہسپتال سے آئے ہیں اور وہ جب بھی فارغ

www.paksociety.com

ہوں اپنے گھر آ جائیں۔ مگر اسی وقت محسن نے مجھے روک لیا۔

"سکندر! یہ دیکھو۔" اس نے چابیوں کی طرف نگاہ ڈال کے مجھے بلایا اور میں نے دوسری طرف جا کے بند شیشے سے جھانکا تو مجھے محسن کی تشویش کا سبب معلوم ہو گیا۔ چابیاں کار ہی میں تھیں اور اگنیشن سوئچ سے جھول رہی تھیں۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟"

"اس کا مطلب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ رابعہ چابیاں نکالنی بھول گئی ہو۔" میں نے کہا۔

محسن نے انکار میں سر ہلایا۔ "گاڑی بند کر کے چابی نکال لینا ایک لاشعوری عادت بن جاتی ہے۔ ذہنی پریشانی میں بھی چابیاں کوئی نہیں بھولتا۔"

ایک فوری خیال کے تحت میں نے پیچھے والی ٹیکسی میں جھانکا اور جب مجھے اس کی چابیاں بھی سوئچ سے لگی ہوئی نظر آئیں تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ اب بجا طور پر یہ فرض کیا جا سکتا تھا کہ رابعہ کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہے۔

میں اور محسن کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ہمارا ذہن اس خیال کو قبول کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ رابعہ اغوا ہو گئی ہے لیکن آثار یہی تھے کہ وہ اپنے گھر سے نکلی تو کسی نے ٹیکسی میں اس کا پیچھا کیا اور اسے یہاں رکنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ٹیکسی چوری کی تھی چنانچہ اغوا کرنے والے اسے بھی چھوڑ گئے اور کسی تیسری گاڑی میں رابعہ سمیت روانہ ہو گئے جو پروگرام کے مطابق یہاں موجود ہو گی۔ یہ سب کچھ اتنے کم وقت میں ہوا ہو گا کہ کسی نے کچھ نہیں دیکھا ہو گا یا دیکھا ہو گا تو پھر اسے نظر انداز کر دیا ہو گا۔ آمنے سامنے صرف کوٹھیاں تھیں چنانچہ کچھ دیکھنے والے راہرو ہی ہو سکتے تھے۔ کاروں والے ڈرائیونگ کرتے ہوئے نگاہ سڑک پر رکھتے ہیں اور ان کو عموماً گرد و پیش کی خبر نہیں ہوتی۔ پیدل چلنے والے یا سائیکل سوار کار کا تعاقب کرنے کی سوچتے بھی نہیں۔ دال میں کالا نظر آئے تب بھی کوئی کسی کے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔

"کیا خیال ہے محسن! اس کوٹھی والوں سے پوچھیں؟" میں نے کہا۔ "لیکن اس طرح بات پھیل جائے گی۔ وہ پوچھ سکتے ہیں کہ کون رابعہ قادری ایڈووکیٹ۔ جن کی یہ کار ہے؟ اور وہ نہ ہوئی تو مسئلہ الجھ جائے گا۔"

"پھر کیا کریں؟" محسن بولا۔ "انتظار کریں یا پولیس سے رابطہ قائم کریں؟ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔"

"ہاں لیکن پولیس کو ابھی ہم کیا بتا سکتے ہیں۔ ہمارے

مفروضات ان کے لیے حقائق تو نہیں ہو سکتے۔

"اغوا وہ بھی ایک عورت کا، اور عورت بھی وہ جو ایڈووکیٹ ہے۔ مسئلہ بہت سنگین ہو جائے گا اور ہم سے ایسے سوالات کے جوابات دینے پڑیں گے جو ہمیں معلوم نہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ گھر سے کب نکلی، ساتھ تھی یا گھر پر اسے کوئی پیغام ملا تھا یا کوئی گھنٹہ بھر پہلے کی بات ہوئی تو پولیس ہمیں صبر کرنے کا مشورہ دے گی۔ اتنی جلدی اغوا کا کیس درج کرانے آ پہنچے، لوگ ہو کیوں؟ کس نے دیکھا تھا اغوا ہوتے؟ آپ کو کسی طرف سے اندیشہ تھا؟ کسی نے دھمکی دی تھی؟ کیوں نہیں بتایا؟ یہ لمبا چکر ہے محسن! اور خطرناک بھی۔"

"ہاں۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اگر اسے اغوا کر لیا گیا ہے تو پولیس کی مدد لینا خطرناک ہو سکتا ہے۔ مگر ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تو نہیں رہ سکتے۔"

"میرا خیال ہے اغوا کنندہ وہی ہوئے تو جلد ہم سے رابطہ قائم کریں گے۔" میں نے کہا۔

باہمی صلاح مشورے کے بعد میں نے کار کا دروازہ کھولا۔ میری ناک میں رابعہ کی خوشبو کے بجائے ایک عجیب سی ناگوار گزرنے والی چبھتی ہوئی تیز بو آئی۔ "یہ کیسی بو ہے محسن؟" میں نے چابیاں نکال کے کہا۔

"کلوروفارم!" محسن نے کہا۔ دروازہ کھلتے ہی بو اس کے نتھنوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ میں نے اسٹیئرنگ کے نیچے کلچ پیڈل کے پاس سے ایک رومال اٹھایا۔ وہ خشک ہو چکا تھا لیکن یہ مردانہ رومال تھا اور وہ تیز بو اسی میں سے اٹھ رہی تھی۔ یہ رومال رابعہ کے ساتھ پیش آنے والے سانحے کی پوری روداد سنا رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کار ہمیں مقفل کر دینی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اور گھر چل کے فادر سے پوچھتے ہیں، لیکن اور کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔" محسن نے اتفاق میں سر ہلایا۔ میں دروازہ بند کرنے لگا تو مجھے رابعہ کے ہینڈ بیگ نے متوجہ کر لیا جو معمول کے مطابق ساتھ والی سیٹ پر نہیں بلکہ پیچھے رکھا ہوا تھا۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ محسن گھوم کر دوسری طرف سے آیا اور آگے والی سیٹ کو جھکا کے پیچھے جا بیٹھا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور احتیاط سے یوٹرن لے کر گھمائی۔ وہاں ٹھہرنے کے بجائے میں کار کو مخالف سمت میں لے گیا۔ محسن نے اس اثنا میں ہینڈ بیگ کھول لیا تھا۔

رکتے ہی اس نے ایک کاغذ کا پرزہ آگے بڑھایا۔ "یہ ہینڈ بیگ میں سے نکلا ہے۔" محسن نے کہا۔ "باقی سب چیزیں موجود ہیں۔"

میں نے کاغذ پر پنسل سے لکھے ہوئے پیغام کو پڑھا۔

"رابعہ ہماری تحویل میں ہے۔ اگر تم نے ہماری ہدایات پر عمل کیا اور پولیس سے رجوع نہ کیا تو رابعہ کو کچھ نہیں ہو گا۔ ہدایات کی خلاف ورزی کرو گے تو خود بھی نقصان اٹھاؤ گے اور رابعہ بھی محفوظ نہیں رہے گی۔ تمہارے مقابلے میں اس کی ذات دہرے خطرات سے دوچار ہے جان کے اور آبرو کے۔ کس کا نقصان ناقابل تلافی ہے؟ امید ہے تم جرأت اور ذہانت کا کوئی ایسا مظاہرہ نہیں کرو گے جو بعد میں حماقت ثابت ہو۔ سکون سے رابعہ کے گھر بیٹھ کے ہمارے دوسرے پیغام کا انتظار کرو۔"

میں نے پیغام کے مضمون کو اتنی مرتبہ پڑھا کہ اس کا ایک ایک لفظ مجھے ازبر ہو گیا۔ میرے جسم کا سارا خون کھنچ کر میرے سر میں آ گیا اور آتش غضب سے میرا چہرہ دہکنے لگا۔ میرے کانوں کی لویں جلنے لگیں اور کنپٹی پر ایک رگ پھڑکنے لگی۔ میں کاغذ کے اس پرزے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا رہا اور وہ چار انچ چوڑا چھ انچ لمبا سفید کاغذ پھیل کے سینما کا اسکرین بن گیا۔ میرے تصور میں ایک پروجیکٹر چلنے لگا اور اس نے وہ مناظر دکھانے شروع کیے جو میں نے جرائم کی اور گینگسٹر فلموں میں دیکھے تھے اور میرے لاشعور کا ایک حصہ تھے۔ زیر زمین تہہ خانہ اور وہ متعفن اور تنگ و تاریک تہہ خانے، سنسان پہاڑوں کے اندر چھپے ہوئے خوفناک غار جن کی سیاہ پتھر کی دیواروں پر بڑے بڑے عقرب رینگ رہے تھے اور وحشت ناک مکڑیاں جالے بنتی ہوئی چل رہی تھیں۔ سائیں سائیں کرتے ہوئے ویران جنگل جن میں بد روحیں اور عفریت شیطانی رقص کرتے ہیں۔۔۔ اور رابعہ۔۔۔ دیوانہ بندوں کے طوق سلاسل میں اسیر۔ فرش خاک پر بے لباس، کسی درخت سے بندھی ہوئی۔ خاموش۔ فریاد طلب۔ نیم جاں۔ مناظر بدلتے گئے۔ ہر منظر ایک سلائیڈ کی طرح آتا تھا اور غائب ہو جاتا تھا۔ "تم ہماری مٹھی میں ہو۔" بے رحم بدی والوں نے انتہائی شگفتہ انداز میں اور ہنستے ہوئے بڑے اعتماد سے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ لے کر پہلو بدلا۔ "ہم تمہیں حقیر چیونٹی کی طرح مسل دینے پر قادر ہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ ہم نے تمہیں ایک ہفتے کی مہلت دی تھی۔

تم نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس لیے تمہیں یہ دوسرا سبق دینا ضروری ہو گیا تھا۔" سامنے کی جگہ دوسرے حقیقی چیف ہی کی والدہ نے لے لی۔ "لو جی اپنے سکندر صاحب!" اس نے قہقہہ مار کے کہا۔ "آپ بھی کس خیال میں گم ہو گئے۔ کوئی شاعری مارزی کرتے ہو گے۔ ہم تو جیتے ان پڑھ ہیں۔ لوہا کوٹنے والے۔ مگر لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ کیوں بھئی؟" سیکرٹری نے فوراً تائید میں سر ہلایا۔ اسکرین پر چہرہ ابھرا نمودار ہو گیا۔ "او باسٹرڈ! میں تم سے سمجھ لوں گا۔ میرا نام ڈی سلوا ہے۔"

"حرامزادو۔ سور کے بچو۔ نامرد بزدلو! عورت کو ڈھال بنا کے لڑتے ہو؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"سکندر!" محسن نے مجھے جھنجھوڑ کے کہا۔ "پاگل ہو گیا ہے تو! کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ ہوش میں آ۔"

میں ہوش میں آ گیا۔ میرا بدن غصے سے لرز رہا تھا اور میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ "میں ان سب کو قتل کر دوں گا محسن!" میں نے کہا۔

"کر دینا لیکن وہ ہیں کہاں؟ کون ہیں؟" محسن نے کہا۔ "پہلے یہ تو معلوم ہو جائے۔ یہ چیخنے چلانے سے معلوم نہیں ہو گا۔ تیری آواز ان کے کانوں تک کیا، اگلی گلی تک بھی نہیں پہنچی۔ عقل اور اعصاب پر قابو رکھ۔ ہم ابھی بالکل بے بس ہیں۔ کوئی غلط قدم اٹھایا تو نقصان رابعہ اٹھائے گی۔ فی الحال خاموشی سے انتظار کرنے کے سوا ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ چل اندر چلتے ہیں۔"

"اگر ان کو ہم سے وہ خط ہی حاصل کرنا تھا تو رابعہ کو یرغمال بنائے بغیر بھی کر سکتے تھے۔" میں نے کہا۔

"خط تو وہ رابعہ سے بھی لے سکتے تھے۔" محسن نے کہا۔ "اس کو ساتھ لے جانا ضروری نہیں تھا۔"

"ہاں، اور ابھی تک تو وہ خط بھی ایک معمہ ہے۔ بظاہر سادہ کاغذ۔ اس پر نظر نہ آنے والی کوئی تحریر ہے تو ابھی تک ہم اسے پڑھنے کا راز معلوم نہیں کر سکے۔" میں نے کہا۔ "پھر وہ رابعہ کو کیوں لے گئے؟"

"ہو سکتا ہے رابعہ نے یہ راز معلوم کر لیا ہو۔ اگر رابعہ کا وجود ان حقائق سے آگاہی کے بعد ان کے لیے باعث خطرہ ہو گیا ہے تو اب وہ اسے زندہ چھوڑنے کا خطرہ ہرگز مول نہیں لیں گے۔" محسن نے کہا۔ "انہیں جلانے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ تشدد کے ذریعے ہم سے سچ اگلوایا جائے۔ رابعہ نے تو کہا ہو گا کہ انہیں کچھ نہیں معلوم، گروہ

www.paksociety.com

کب اعتبار کریں گے۔ وہ ہم سے ہی پوچھیں گے۔"

"ابھی تک رابعہ کو اس خط کی تحریر پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس نے مضمون پڑھ لیا ہوتا یا اسے کسی طریقے معلوم ہو جاتا تو وہ مجھ سے ذکر نہ کرتی؟ میرا تو خیال ہے اس نے خط دینے سے انکار کیا ہوگا۔ کہا ہوگا کہ خط کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں۔"

"شاید تم ٹھیک کہتا ہے۔" محسن بولا۔ "رابعہ نے خط کو کہیں چھپا دیا ہوگا یا کہا ہوگا کہ خط اس نے واپس کر دیا اگر یہ بات ہوگی تو معلوم ہو جائے گی۔ انہوں نے رابعہ کو لے جانے سے پہلے گھر کی تلاشی ضرور لی ہوگی۔"

"اور ناکام ہو جانے کے بعد یہی طے کیا ہوگا کہ رابعہ کو یرغمال بنا کے لے جائیں اور پھر ہم سے سودا کریں۔" میں نے کہا۔ "لیکن محسن! خود ہمیں بھی تو معلوم نہیں کہ رابعہ نے خط کہاں رکھا ہے۔ ہم کیا بتائیں گے انہیں؟"

"اس کی تو یہی ایک صورت ہے کہ ہم رابعہ سے ملیں اور اسے کہیں کہ وہ خط کی خاطر جان کی بازی نہ لگائے اور خط واپس کر دے۔" محسن نے کہا۔

"رابعہ سے کیسے ملیں گے؟" میں نے کہا۔ "ہمیں کیا معلوم وہ رابعہ کو کہاں لے گئے ہیں۔" اور گاڑی سے اتر آیا۔ محسن نے میری تقلید کی۔

"ہاں مگر انہوں نے پیغام میں کہا ہے کہ وہ پھر رابطہ قائم کریں گے۔" محسن نے کہا۔ "اس کی ایک صورت تو یہی ہے کہ وہ فون کریں۔ یہاں وہ برطانیہ امریکہ کی پولیس تو ہے نہیں کہ ٹیلیفون کال سے تین منٹ میں ملزم کو جا پکڑے۔ وہاں بھی اغوا کرنے والے ہیں جو بھاری معاوضہ طلب کرتے ہیں ورنہ جان سے مار دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ وہ کہیں سے بھی کال کریں ایک منٹ سے زیادہ بات نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ٹیلی فون ایکسچینج والے فوراً پولیس کو بتا دیں گے کہ فون کہاں سے کیا گیا تھا اور قریب ترین پولیس کار کو وائرلیس پر پیغام ملے گا تو وہ بات ختم ہونے سے پہلے مجرم کو جا لے گی۔"

"یہ سب یہاں کہاں محسن؟" میں نے مایوسی سے کہا۔ "اول تو ٹیلی فون والے ہی اس وقت تک کچھ نہیں کریں گے جب تک پولیس نہیں کہے گی۔ پولیس رپورٹ لکھے بغیر کچھ کرنے کو تیار نہیں ہوگی۔ رپورٹ ہم لکھوا نہیں سکتے۔ پھر خاص درخواست سے مدد لیں تب بھی کیا ہوگا۔ جب وہ فون کریں گے تو ٹیلی فون ایکسچینج میں آپریٹر سوتے رہ جائیں گے۔ نمبر نوٹ کر لیا انہوں نے تو پولیس کو بتلانے سے کیا ہو؟ وہ کون سے وائرلیس پہ ہدایات جاری کر دیں گے۔ تھانے میں کسی نے سن بھی لی تو آدھے گھنٹے بعد پل کر کمرے سے نکلنے کے قابل ہوگا اور کمرے سے نکلا تو سڑک پر کھڑا ہو جائے گا کہ بیگار میں کسی رکشا ٹیکسی کو پکڑے۔ تھانیداروں تک کے پاس گاڑی نہیں۔ کسی کے پاس اپنا پرائیویٹ اگر نظر آ جاتا ہے وہ نہ سرکاری موٹر سائیکل ہے بھی تو ٹریفک کے کسی سارجنٹ کے پاس۔ میرا خیال ہے وہ کسی بھی صورت حال سے بے خبر نہیں ہوں گے اور اطمینان سے فون پہ ہی بات کریں گے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔" ہم دونوں رابعہ کے گھر کی طرف چلنے لگے۔

"کمال ہے کہ یہاں کے مجرم ذہانت میں غیر ملکی مجرموں سے کم نہیں۔" محسن نے چلتے چلتے کہا۔ "وہ جدید ترین وسائل سے استفادہ کرتے ہیں۔ پبلک شور مچاتی ہے کہ فلموں سے اسی ذہنی سے جرائم کا رجحان پھیل رہا ہے اور غیر ملکی لٹریچر سے نوجوانوں کے ذہن متاثر ہو رہے ہیں۔ یہ سوال کوئی نہیں کرتا کہ پولیس متاثر کیوں نہیں ہوتی ہے۔ جرائم کی فلموں میں سدباب کے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اور پولیس یا سراغرساں جس طرح کام کرتے ہیں تا اس سے پولیس میں بہتری کا رجحان کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ وہ دن بدن زیادہ نااہل اور بدعنوان کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا وہ فلمیں نہیں دیکھتے اور ان کے گھروں میں ٹی وی نہیں ہیں؟ یہ ماننے کی بات کہ مجرم تو بہت کچھ سیکھ رہے ہیں اور پولیس وہ بھی بھول رہی ہے جو انہیں سکھایا گیا تھا۔"

گھنٹی بجانے کے دو منٹ بعد رابعہ کی خادمہ نے دروازہ کھولا۔ ہمیں دیکھتے ہی ایک لمحے کے لیے اس کا رنگ اڑ گیا۔ "آپ... صاحب جی؟ خیریت تو ہے بڑی بی بی... آپ ہسپتال سے آ گئے ہیں نا؟" وہ ایک طرف ہو گئی اور ہم گزر گئے تو اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"ہاں ہاں۔" میں نے اس کو تسلی دی۔ "وہ خیریت سے ہیں۔ رابعہ بی بی کہاں ہیں؟"

اس کی صورت پر پریشانی کی جگہ حیرانی کی خبر پھیل گئی۔ "وہ بھی ہسپتال گئی ہیں۔ آپ کو نہیں ملیں؟ ایک [illegible] ہو گیا۔"

"ہم جا رہے ایک کام سے چلے گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "اس لیے ملاقات نہیں ہو سکی۔ تم ایک کام کرو

چائے بنا کے لاؤ اور اگر کچھ کھانے کو ہے تو وہ بھی۔ ہم نے دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا۔"

"ہم اوپر بڑی بی بی کے کمرے میں ہیں۔ ہسپتال سے کوئی فون آئے تو..." محسن نے کہا۔

خادمہ کے لیے شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ ہماری حیثیت اس گھر کے ایک فرد کی سی ہے اور اس وقت ہم ہی حالات کو سنبھال رہے ہیں۔ گھر کی خادمہ ہونے کے باعث اسے یہ معلوم نہ تھا کہ گھر میں ہماری آمد و رفت کیوں شروع ہوئی اور رابعہ سے رابطے کے اسباب کیا تھے۔ وہ یہی فرض کر سکتی تھی کہ مجھ پر قتل کا الزام ہے اور رابعہ میری وکیل ہے۔ وہ بے تجسس خشکی مزاج اور کوئی چالاک قسم کی عورت نہیں تھی جو معلوم کر لینے اور جاننے کی کوشش کرے کہ اچانک نمودار ہو کے اتنی اہمیت حاصل کرنے والے یہ اجنبی کون ہیں؟ اگر اس نے پوچھا ہوگا تو اسے مطمئن کر دیا گیا ہوگا اور جو بات بھی اسے بتائی گئی ہوگی اس نے بلا چون و چرا قبول کر لی ہوگی۔

جب وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی تو میں نے آہستہ سے رابعہ کے بیڈروم کا دروازہ کھولا۔ لائٹ جلانے سے پہلے ہی میری نظر نے کمرے کی حالت دیکھ لی تھی۔ کمرے کی تلاشی لی گئی تھی اور سارا سامان بڑی بے دردی سے تباہ کیا گیا تھا۔ میز کی درازیں کھینچ کر نیچے الٹ دی گئی تھیں۔ سب درازیں اور درازوں کا تمام سامان قالین پر بکھرا ہوا تھا۔ بک شیلف کی تمام کتابیں باری باری کھول کے دیکھی گئی تھیں کہ ان کے درمیان وہ خط تو چھپا دیا گیا ہو۔ کتابوں کے گرد پوش تک پھاڑے گئے تھے اور تمام کتابیں کسمپرسی کے عالم میں بے قدروں کے ہاتھوں اٹھا کر زمین پر نوحہ کناں تھیں۔ تلاشی لینے والوں نے بستر بھی الٹ دیا تھا۔ اس کا استر تک ادھیڑ دیا تھا۔ تکیوں کے غلاف بھی پھاڑ دیے گئے تھے کہ ان میں وہ صفحات چھپائے گئے ہوں تو برآمد ہو جائیں۔ وہ اپنے کام کے ماہر تھے اور ان کا ذہن تلاشی کے دوران میں پوری طرح مستعد رہا تھا۔ انہوں نے تمام امکانات کو مدنظر رکھا تھا۔ چند صفحات پر مشتمل ایک خط کو چھپانے کی ہر ممکنہ جگہ ادھیڑ ڈالی تھی یہاں تک کہ انہوں نے قالین کے نیچے کسی خفیہ خانے کی موجودگی کو بھی بعید از قیاس نہیں سمجھا تھا۔

"وہ لوگ کافی دیر یہاں مصروف رہے۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔ "آخر کس وقت ہو؟ اگر رابعہ کو غائب کرنے کے بعد یہ نقشہ نظر آتا تو وہ فوراً پولیس کو رپورٹ نہ کرتی ہمیں ضرور بتاتی۔ خادمہ سے تو پوچھتی لیکن خادمہ کو کسی بات کی خبر نہیں ہے۔"

"ہاں، اور اس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا ہے کہ جب وہ یہ کارروائی کر رہے تھے تو رابعہ ان کے قبضے میں تھی۔" محسن نے کہا۔ "گن پوائنٹ پر یا بیہوش یا بندھی ہوئی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "کلوروفارم والا رومال ہمیں گاڑی میں ملا تھا۔ وہ اسے یہاں سے بے ہوش کر کے کیسے لے جا سکتے تھے۔ ایک گھنٹہ پہلے جب رابعہ گھر سے نکلی تو باہر نکلتے ہی اسے کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ شاید وہ شخص جس نے یہ کارنامہ سرانجام دیا پہلے سے گاڑی کی پچھلی سیٹ کے اور اگلی سیٹ کے درمیان فرش پر موجود تھا۔ فاکس ویگن میں اتنی جگہ تو نہیں ہوتی، مگر جلدی میں کوئی پیچھے نگاہ ڈالے بغیر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ جائے تو اسے معلوم نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہو جاتا تب بھی وہ شخص رابعہ کو دبوچ لیتا۔ اب اس نے باہر جا کے اطمینان سے اپنا کام کیا ہوگا۔

باقی لوگ بھی اگر پہلے سے گھر میں موجود تھے تو رابعہ بے خبر تھی۔ اتنے بڑے گھر میں جہاں صرف دو عورتیں ہوں کوئی بھی چھپا رہ سکتا ہے یا جو شخص رابعہ کے ساتھ تھا وہ رابعہ کو دوسروں کے سپرد کر کے لوٹ آیا۔ رابعہ کو وہ اپنی گاڑی میں ڈال کر لے گئے اور تلاشی لینے والے اطمینان سے اپنا کام کرتے رہے۔ خادمہ کچن میں نہ ہو تو اپنے کمرے میں رہتی ہے جو کچن کے ساتھ ہی ہے۔ اتنی احتیاط انہوں نے ضرور کی ہوگی کہ آواز نہ ہو۔ دو افراد ایک گھنٹے میں پورا گھر الٹ کے دیکھ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہی کیفیت دوسرے کمروں کی بھی ہوگی۔"

"ہاں اور خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک خادمہ نے کچھ نہیں دیکھا۔" محسن بولا۔ "کیوں نہ ہم اس کی حالت درست کر دیں؟"

"اگر ہم کچھ دیر پہلے آ گئے ہوتے تو ہماری ان سے ملاقات ہو سکتی تھی۔" میں نے افسوس سے کہا۔ "یہیں تصفیہ ہو جاتا۔"

محسن نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے ایک دراز میں بکھرا ہوا سامان ڈالنا شروع کیا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور خادمہ اندر آ گئی۔ اس وقت میں سوچ ہی رہا تھا کہ محسن کو اس کام میں وقت ضائع کرنے سے منع کر دوں۔ اس سے زیادہ آسان تو یہ ہوتا کہ ہم تمام کمرے مقفل کرا دیتے۔ خادمہ اسے حسب الحکم انتظام سمجھتی اور رابعہ کے کمرے کھول کر کبھی نہ دیکھتی۔ اب رابعہ کے بیڈروم میں داخل ہوتے ہی یہ منظر اس نے دیکھا

www.paksociety.com

وہ اسے دہشت زدہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ کچھ دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے کی حالت دیکھتی رہی۔

"صاحب جی...!" وہ چلائی۔ "یہ... یہ آپ نے کیا... کیا چاہیے آپ کو؟" اس کے بے ربط الفاظ اس کی گھبراہٹ کا نتیجہ تھے مگر یکلخت مجھے احساس ہوا کہ وہ اس تمام کارروائی کا ذمے دار ہمیں سمجھ رہی ہے۔ اور اس کا ایسا سمجھنا جائز بھی تھا۔ گھنٹہ بھر پہلے رابعہ نے جاتے وقت اس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس دوران میں کوئی آیا بھی نہیں تھا۔ ہم غیر متوقع طور پر آ پہنچے تھے۔ ہم نے اسے چائے کے بہانے کچن میں بھیجا تھا۔ اس سے کہا تھا کہ ہم بڑی بی بی کے کمرے میں ہوں گے لیکن ہم رابعہ کے بیڈروم میں گھس آئے تھے۔ اصولاً ہمیں ڈرائنگ روم یا آفس میں بیٹھنا چاہیے تھا۔ فون وہاں بھی تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محسن ایک دراز اپنے سامنے رکھے بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں رابعہ کے زیورات تھے جو خط کی جستجو میں آنے والوں نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے نکال کے باہر پھینک دیے تھے کیونکہ انہیں اس مال کی ضرورت نہیں تھی۔ محسن نے پہلے انہی چیزوں کو سمیٹ کر محفوظ کرنا چاہا تھا مگر خادمہ نے دیکھا تو وہ اس کو زیورات رکھنے کی بجائے نکالتا ہوا دکھائی دیا۔ خادمہ کے آتے ہی محسن ہکا بکا ہو گیا تھا اور میں اپنی جگہ بت بنا رہ گیا تھا۔ ہماری حالت اچانک پکڑے جانے والے چوروں سے مختلف نہیں تھی۔

"آپ... آپ لوگ چوری کر رہے ہیں؟" خادمہ نے ہسٹریا کے عالم میں چلاتے ہوئے کہا۔ "گھر کے مالک مر گئے ہیں اور گھر کے بھیدی ڈاکا ڈال رہے ہیں۔ ہمدرد بن کے لوٹ رہے ہیں۔ بے غیرتو! شیطانو! ڈوب مرو شرم سے۔ اس گھر میں ایک بڑھیا بیوہ ہے۔ وہ بھی ہسپتال میں پڑی ہے۔ اسی لیے آتے تھے تم اسے... اس کی بیٹی پر اسی لیے ڈورے ڈال رہے تھے۔ مار ڈالا سب نے..."

وہ دھاڑیں مار کے رونے لگی تھی۔ اسے سمجھانے کے لیے کوئی دلیل مؤثر ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے تمام شکوک اور اندیشے الفاظ میں ڈھل کے زبان تک آ رہے تھے۔ وہ گھر کی پرانی نمک خوار تھی لیکن اسے احساس تھا کہ وہ خود بھی ایک بوڑھی اور بے بس عورت ہے جو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہسٹریا کا سیلاب اس کی عقل اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بہا لے گیا تھا۔

میں نے آہستہ سے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ رسید کیا اور وہ پیچھے گر گئی۔ اس کی آواز ایک دم بند ہو گئی اور وہ قالین پر گر کے اٹھی تو اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید تھا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ "خدا کے لیے مجھے مت مارو..." وہ گڑگڑا کے بولی۔

"معاف کرنا ماسی!" میں نے کہا۔ "تم نے بات ہی ایسی کی تھی کہ مجھے غصہ آ گیا۔ تمہاری جگہ کوئی مرد ہوتا تو میں اس کی زبان گدی سے کھینچ لیتا اور اس قسم کی بات کہنے پر پچھتانے کے لیے اسے زندہ نہ چھوڑتا۔ تم بوڑھی عورت ہو اس لیے تھوڑا سا خیال رہا۔ تم بہت وفادار اور نمک خوار ہو لیکن ہم اس گھر کے مالک ہیں۔ اگر شک ہے تو چھوٹی بی بی سے یا ان کی امی سے واپسی پر پوچھ لینا۔"

"مجھے... مجھے معاف کر دیں صاحب جی! غلطی ہو گئی۔ میں غلط سمجھی تھی۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

میں نے اسے بازو پکڑ کے سہارا دیا اور بستر پر بٹھایا۔ محسن کی نگاہیں مجھ سے سوال کر رہی تھیں کہ اس عورت کو جسے حالات کی خبر ہی نہیں مطمئن کرنے کے لیے کس قسم کی وضاحت مطلوب ہو گی۔

"دیکھو ماسی! جو تم نے کہا غلط تھا اور ہم نے اسے غلطی مان کے معاف بھی کر دیا مگر اب جو کچھ میں بتانا چاہتا ہوں وہ بھی غور سے سنو۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اوپر آئے ہوئے کتنی دیر ہوئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔ کیا اتنی دیر میں ہم یہ سب کچھ کر سکتے تھے جو تمہیں نظر آ رہا ہے؟ یہ سب تمہاری رابعہ بی بی کے جانے کے بعد کسی نے کیا تھا۔ ہم صرف دروازہ کھلا دیکھ کر رک گئے تھے۔ پھر ہماری نظر نے کمرے کی یہ حالت دیکھی۔ ہم نے ابھی دوسرے کمرے نہیں دیکھے۔ تم نے بھی نہیں دیکھے ہوں گے لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ بڑی بی بی کے کمرے، ڈرائنگ روم اور رابعہ بی بی کے آفس کی حالت بھی ایسی ہی ہو گی۔ ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہو تو ہمارے ساتھ چلو۔ تم خوش قسمت ہو کہ جب یہاں کچھ لوگ گھسے تھے تو تم نہیں آئیں۔ اگر تم آ جاتیں تو اس وقت کمرے میں سامان کے درمیان تمہاری لاش بھی پڑی ہوتی۔"

خادمہ کے بدن میں ایک لرزش پیدا ہوئی۔ "وہ... وہ لوگ صاحب جی! کون آیا تھا یہاں؟" وہ کانپتے ہوئے بولی۔ وہ ایک وکیل کی خادمہ تھی اور یہ جانتی تھی کہ اس کی مالکن قتل جیسے معاملات میں ملوث لوگوں سے ملتی ہے۔ لاشیں دیکھنے جاتی ہے اور کہیں قتل ہو جاتے تو وہ وہاں قتل ہونے والی چیزوں کا معائنہ کرتی ہے۔ چوروں ڈاکوؤں کے

مقدمات لڑتی ہے اور مجرموں کو بچانا اس کا پیشہ ہے جس کی خاطر وہ مجرموں سے تعلق رکھنے پر مجبور ہے مگر یہ خیال اس کے لیے انتہائی روح فرسا تھا کہ اسی کے گھر میں مجرم دن دھاڑے یہ تباہی پھیلاتے رہے اور وہ گھر میں موجود ہو کے بھی بے خبر رہی تھی۔

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا کہ وہ کون لوگ ہیں؟" میں نے کہا۔ "پہلے دوسرے کمروں کی حالت دیکھ لو تاکہ تمہیں یقین آ جائے کہ میں نے غلط نہیں کہا۔" وہ اب خاصی شرمسار تھی مگر میں اسے اپنے ہمراہ رابعہ کی ماں کے کمرے میں لے گیا۔ دروازہ کھلتے ہی جو نظارہ اس نے دیکھا وہ رابعہ کے کمرے کے نظارے سے مختلف نہیں تھا۔ پھر ہم نیچے گئے اور میں نے اسے ڈرائنگ روم کی حالت دکھائی۔ تلاشی کے دوران توڑ پھوڑ سے نقصان نہیں ہوا تھا مگر سامان کے الٹنے پلٹنے سے ترتیب و آرائش کا بیڑہ غرق ہو گیا تھا۔ سب سے بری حالت آفس کی ہونی چاہیے تھی مگر رابعہ نے آفس کے لیے خصوصی حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے۔ لکڑی کا فلش ڈور بھی بہت مضبوط تھا۔ پھر اس میں خودکار قفل تھا اور باہر کی طرف لوہے کی پھیلنے والی گرل تھی جس میں سیاہ رنگ کا مضبوط تالا لگا ہوا تھا۔ باقی کھڑکیوں میں بھی اندر کی طرف گرل تھی، چنانچہ تلاشی لینے والے لائبریری میں داخل ہی نہیں ہو سکے تھے۔ ان کے لیے زیادہ دیر ٹھہرنا بھی مشکل تھا۔ رابعہ کے معمولات پر نگاہ رکھنے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہ ہو گی کہ تمام کاروائی کا ایک معاون وکیل اس سے اگلے دن پیش ہونے والے مقدمات کی فائلوں پر بریفنگ لینے آتا ہے۔ رابعہ کا چیمبر جہاں موکل اس سے رابطہ قائم کرتے تھے اور اپائنٹمنٹ لیتے تھے ایک کمرشل بلڈنگ کی دوسری منزل پر تھا اور وہاں اس کے دو معاون وکیل اور عملے کے دیگر ارکان ہر شام پانچ بجے سے نو بجے تک موجود رہتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو خادمہ اور خادمہ کے بعد آنے والے مددگار وکیل کو قابو میں کر کے لائبریری کی تلاشی بھی لے سکتے تھے مگر یہ کام آسان نہ تھا۔ لائبریری میں سینکڑوں مجلد اور غیر مجلد قانونی کتب کے علاوہ بہت سی فائلوں کے ڈھیر تھے جو الماریوں میں بند تھے اور درازیں بھی جو کاغذات سے پر تھیں۔ انہوں نے مجبوراً وہ مشکل لیکن مؤثر طریقہ اختیار کیا جس میں کامیابی یقینی ہو جاتی تھی۔ اس کا بندوبست وہ کر کے آئے تھے لیکن ان کو خطرہ تھا اگر وہ رابعہ کو مرے جانے کا خطرہ مول نہ لیتے۔ خادمہ کو وہ بھی شرمندگی تھی۔ ایک سوچے سمجھے بغیر پہنچنے پر

اور دوسری جگہ سے ایک چھاپہ پڑ گیا ہے۔ اس نے بمشکل تمام وضاحت کی کہ وہ تو ہم سے چائے کے بارے میں پوچھنے آئی تھی اور یہ اس کی بے وقوفی تھی کہ اس نے غلط سمجھا اور اس کی سزا بھی بھگت لی۔ اب اس بات کا ذکر رابعہ بی بی اور بڑی بی بی سے نہ کیا جائے۔ میں نے کہا کہ یہ تو معمولی بات تھی زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ جو کچھ اس نے دیکھا وہ کسی کو معلوم نہ ہو۔

"تم جانتی ہو ماسی کہ رابعہ بی بی عدالتوں میں مجرموں کی پیروی کرتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "یعنی ان کو چوری ڈاکے قتل اور اغوا کے علاوہ ایسے ہی بہت سے الزامات سے بچاتی ہیں۔ بعض اوقات یہ الزامات درست ہوتے ہیں تو مجرموں کو سزا ہو جاتی ہے اور وہ بے گناہ ہوں تو بچ جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی مجرم خود بھی شریف آدمیوں کو پھنسا دیتے ہیں۔ شریف اور بدمعاش ہوں تو ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ دوسرا اندر ہو۔ یہ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ رابعہ بی بی ایک ایسے شخص کو بچا رہی ہیں جس کے پیچھے بدمعاش لگے ہوئے ہیں اور جو ثبوت رابعہ بی بی کو ملے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ان کی کامیابی یقینی ہے۔ وہ بدمعاش اسی لیے آئے تھے کہ چند اہم کاغذات چرا کے لے جائیں مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ کاغذات دوسرے دفتر میں تھے یا اس دفتر میں جو محفوظ رہا۔ چوری کچھ نہیں ہوا ہے اس لیے پولیس کو رپورٹ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ رابعہ بی بی تو آج راولپنڈی گئی ہیں۔"

"رابعہ بی بی پنڈی گئی ہیں؟" خادمہ نے حیرانی اور پریشانی سے کہا۔ "مجھے کیوں نہیں بتایا انہوں نے؟"

"نہیں بتایا تو..." میں نے بے حد تعجب کا اظہار کیا۔ "کمال ہے۔ بھول گئی ہوں گی جلدی میں۔ وہاں ایک بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔ ان کو لے کر آئیں گی۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب ایک دم نہ آ سکیں۔ کل کے بجائے پرسوں آئیں۔"

"مگر صاحب جی! میں یہاں اکیلی کیسے رہوں گی؟" خادمہ نے پریشان لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ تو مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم رات کو ہسپتال چلے گئے تو تم بالکل اکیلی رہ جاؤ گی۔ یہ بتاؤ تمہارا کوئی رشتے دار ہے یہاں؟"

"میرا داماد ہے جی!" وہ بولی۔ "میں اس کے پاس چلی جاتی ہوں دو دن کے لیے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر پہلے وہ جائے جب تک ہے سہارا ہے۔ اور ایک بار پھر معافی۔ تم میری ماں کے برابر ہو۔"

www.paksociety.com

اس کے جانے کے بعد میں نے اور محسن نے اطمینان کا سانس لیا۔ "یہ خواہ مخواہ کی مصیبت گلے پڑ گئی۔" محسن بولا۔
"شکر کرو ٹل گئی۔" میں نے کہا۔ "ماسی کی سمجھ میں آگئی ورنہ ایک مسئلہ بن جاتا۔ اس کی زبان بند رکھنے کے لیے کوئی تدبیر تو کرنی ہی تھی۔ خواہ اسے دوزن اٹھو میں بند کرنا پڑتا۔"
"اس سے بڑا مسئلہ رابعہ کی ماں کا ہے سکندر!" محسن نے کہا۔ "جب وہ ہوش میں آئے گی تو پوچھے گی کہ میری بیٹی کہاں ہے۔ ایک دن تو ٹال سکتے ہیں۔ دوسرے دن کیا بہانہ کریں گے کہ وہ کیوں نہیں آئی؟"
"مجھے امید ہے کہ دوسرے دن کی نوبت نہیں آئے گی۔" میں نے کہا۔ "رابعہ اس سے پہلے لوٹ آئے گی۔ یا پھر کبھی نہیں آسکے گی۔"
"فرض کرو اس میں تین چار دن لگ گئے؟" محسن نے کہا۔ "ایک ہفتہ لگ گیا۔ ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔"
"تو ہم ڈاکٹروں سے مدد لیں گے۔ بڑی بی کوئی صدمہ جھیلنے کے قابل کہاں ہیں۔ ہم کوشش کر سکتے ہیں کہ انھیں سلائے رکھیں۔ اگر ڈاکٹر نہ مانے تو کسی نرس سے مدد لی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹری پام کا ایک انجکشن ملادو۔ کبھی صبح کبھی دوپہر، کبھی شام اور جب وہ مسلسل کئی گھنٹے سونے کے بعد سوال کریں تو ان سے کہا جا سکتا ہے کہ ابھی نیند آئی ہے۔ ابھی ابھی گئی ہے۔ اگر جائز طریقے سے یہ کام نہ ہوا تو میں ناجائز طریقے سے کرا لوں گا ورنہ خود کر لوں گا۔ مجھے انجکشن دینا آتا ہے۔ ڈاکٹری پام کے زیر اثر سوتے رہنے سے نقصان نہیں فائدہ ہو سکتا ہے۔ جاگ کے تشویش میں مبتلا ہونے سے نقصان یقینی ہے۔ میں خطرہ لگاتا ہوں کہ اس وقت بڑی بی کو اغوا کی خبر ملے تو اسی وقت ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ میں یہ خطرہ کیسے مول لے سکتا ہوں؟"
"سکندر!" محسن نے کان لگا کے کہا۔ "لائبریری میں گھنٹی بج رہی ہے فون کی۔ گھنٹی اوپر بھی بج رہی ہو گی۔"
گھنٹی واقعی بج رہی تھی لیکن ہمارے اوپر پہنچنے تک خاموش ہو گئی۔ میں نے مایوسی سے محسن کی طرف دیکھا۔ "دیر ہو گئی ہمیں۔"
"کوئی بات نہیں۔ وہ پھر فون کریں گے۔" محسن نے کہا اور ہم رابعہ کے بیڈ پر بیٹھ گئے۔ مجھے ... کا بستر بچھا ہوا تھا لیکن اندر کا نظم سلامت تھا۔ مجھے یاد آیا گزشتہ رات دو بجے میں نے اسی کمرے میں قدم رکھا تھا تو مجھے اس کی نظر نواز فضا نے اور دلنواز مہک نے کس طرح مسحور کر لیا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ

کچھ دیر پہلے میں محسن کے ساتھ آیا تھا تو مجھے اس خوشبو کا احساس کیوں نہیں ہوا تھا۔ ساری بات احساس کی تھی۔ اس وقت میرے حواس پر مختلف کیفیت کا غلبہ تھا۔ میرا دھیان رابعہ اور اس کی سحر آگیں خوشبو کی طرف نہیں تھا۔ اب پھر مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا کہ محسن کسی اور خیال میں گم ہے۔ وہ خوشبو نہیں اس پیغام کی نوعیت پر غور کر رہا تھا جو موصول ہونے والا تھا۔ رابعہ کے گھر میں دو ٹیلیفون تھے۔ ایک فادر ایڈووکیٹ کے نام پر تھا۔ نیچے آفس میں لگا ہوا اور اسی کی ایکسٹینشن اوپر رابعہ کے بیڈ روم میں تھی۔ رابعہ کے والد کے نام پر تھا جو ان کے گھر کا پرائیویٹ تھا اور اس کی متوازی لائن ڈرائنگ روم اور رابعہ کے کمرے میں تھیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی کے انتظار میں ہم کی نگاہ بار بار اس بے جان آلے کی طرف جاتی تھی جس نے یکلخت زندگی اور موت کے نامہ بر کی حیثیت اختیار کر لی تھی لیکن فون خاموش تھا۔ وقت۔ سیکنڈ، منٹ، گھنٹے، دن، ہفتے اور ماہ و سال۔ یہ سب احساس کے پیمانے ہیں جو ذہن کی بدلتی ہوئی کیفیت کا نام ہے۔ جیل میں پھانسی کی تاریخ کا انتظار کرنے والے کے لیے وقت پر لگا کے اڑتا ہے۔ محبوب کے ایفائے عہد کی امید میں منتظر دید کے لیے وقت کتنا سست خرام ہو جاتا ہے اور جب وصل کی ساعت نایاب میسر آتی ہے تو وہی وقت یکلخت برق رفتار ہو جاتا ہے۔ میں نے ایک سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔ محسن نے ایک اور سگریٹ سلگایا۔
خادمہ چائے کی ٹرے رکھ گئی جس میں حلوہ تھا جو اس نے ابھی ابھی بنایا تھا۔ شاید وہ یہی پوچھنے آئی تھی کہ کھانے کی کوئی چیز نہیں جو چائے کے ساتھ رکھی جا سکے۔ میں نے چائے بنائی اور محسن کو دی۔ محسن نے بُرا سا منہ بنایا اور چائے میں چینی ڈالنے لگا جب میں نے چائے کا گھونٹ لیا تو میں نے بھی بُرا سا منہ بنایا۔ محسن کے کپ کی چینی بھی میں نے اپنے ہی کپ میں ڈال لی تھی۔ وہ شیرا پی لیا اور دوسرا کپ بنایا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی نہیں بجی۔
"کیا مصیبت ہے۔" محسن نے کہا اور خود بھی چائے کا ایک اور کپ تیار کرنے لگا۔ چائے بنیا وقت گزاری کا ایک ذریعہ بھی تھا۔
"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے دوسرا کپ خالی کر کے

گھڑی کے بعد ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ اسی وقت گھنٹی بج اٹھی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ہاتھ بڑھایا لیکن ریسیور میرے ہاتھ آیا۔ "کراچی سے خبر ... ٹیلی وقت پر آ رہی ہے۔" کسی عورت نے کہا۔
"رانگ نمبر۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ محسن کا چہرہ اتر گیا۔ میں اسی اعصابی کشیدگی کا شکار تھا کہ عورت نمبر ملتی تو میرے منہ سے گالی نکلتی۔
خادمہ اسی وقت اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ "یہ دے گیا ہے کوئی صاحب جی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔
"کون تھا؟" میں نے لفافہ جھپٹتے ہوئے کہا۔ "کب آیا تھا؟ کیا کہا تھا اس نے کہ دینا ہے لفافہ؟ ہمیں کیوں نہیں بتایا تم نے؟"
خادمہ بوکھلا گئی۔ "وہ... صاحب جی! مجھے وقت ہی نہیں ملا۔ کوئی بچہ تھا دس بارہ سال کا۔ مجھے تو نوکر لگا تھا کسی کا۔ اس نے لفافہ دے کر کہا کہ یہ رابعہ بی بی کے لیے ہے۔ وہ اگر نہ ہوں تو گھر میں کسی کو بھی دے دینا۔"
"اچھا آئندہ احتیاط ہو تو خود اس سے بات کرلینا۔ ضرورت نہیں پکڑا جائے گا کوئی مجرم اور تم بے وقوف ہو گی۔" محسن نے جھاڑ کر کہا۔
خادمہ کی پریشانی اور خراب ہو گئی تھی۔ "صاحب جی! آپ اجازت دیں تو میں جاؤں اپنے داماد کے گھر۔ میرا دل ٹھیک نہیں ہے۔" وہ بولی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کی حالت واقعی خراب ہو رہی ہے۔
"جاؤ" میں نے کہا۔ "چابیاں دے جاؤ تاکہ ہم کو جانا ہو تو گھر کھلا نہ پڑا رہے۔"
سادہ لفافے پر کسی کا نام نہیں تھا۔ اس کے اندر سے کاغذ کا ایک پرزہ برآمد ہوا جو اسی چار انچ چھ انچ سائز کا تھا اور اس پر پنسل سے وہ تحریر تھی جس کا خط پہلے بچگانہ لگتا تھا۔ لکھائی سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی نے عمداً سیدھے ہاتھ کے بجائے الٹے ہاتھ سے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ خط کسی تمہید کے بغیر شروع ہوتا تھا۔
"ابھی تک تم نے عقل سے کام لیا ہے اور پولیس کو رپورٹ نہیں کی۔ اس لیے رابعہ بھی خیریت سے ہے۔ غلطی سے بھی فون کا غلط استعمال مت کرنا ورنہ ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ یہ بات ابھی تک رابعہ کی ماں کو معلوم نہیں۔ وہ

اسے معلوم ہو جائے گی۔ خدانخواستہ اس کا دل یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا تو رابعہ قصوروار تمہیں سمجھے گی۔
اب تک تم نے اندازہ یقیناً کر لیا ہو گا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ ہمیں وہ لفافہ چاہیے جو تم نے بابو پوسٹ مین سے ہتھیا لیا تھا۔ اس میں سے سادہ کاغذات برآمد ہوئے تھے تو یہ کوئی بات نہیں۔ وہی سادے کاغذات ہمارے حوالے کر دو۔ رابعہ پر آنچ نہیں آئے گی اور یہ سمجھ لو کہ وہ تمہارے خیال کی دسترس سے بھی باہر ہے اور پولیس کیا، جتنے بھی سراغ لگانے والے ادارے ہیں سب مل کر بھی ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔ اگر تم نے ضد میں رابعہ کی ماں کو اور رابعہ کو قربان کر دیا تب بھی یہ کامیابی عارضی ہو گی۔ پھر وہ لفافہ لے کر کیا حاصل کر لیں گے جس کے بارے میں ابھی تک تمہیں کچھ نہیں معلوم کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ تمہاری وہ بات مضحکہ خیز تھی کہ بہت سے لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں اور تم نے اس کی نقلیں بنوا کے تحفظ کی ضمانت حاصل کر لی ہے۔ اس خط کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی سادہ کاغذ کے سوا کیا ہو گی جس پر کچھ لکھا ہوا نظر ہی نہ آتا ہو۔ منشی مرحوم نے مرتے وقت اعتراف کیا تھا کہ اس سے ایک بھول ہو گئی تھی یعنی وہ لفافے میں یہ پرچہ ترکیب استعمال ڈالنا بھول گیا۔ یہ بھول کی بات نہیں تھی۔ وہ شاید تمہیں ٹیلی فون پر بتا دیتا یا الگ خط ڈالتا۔ تاہم اس نے وہ بات نہیں بتائی جو تمہیں نہیں بتا سکا تھا۔ تم اسے اب بھی کسی کیمسٹری کے پروفیسر یا کسی کیمیکل لیبارٹری میں لے جاؤ تو وہ یقیناً پورا مضمون پڑھنے میں تمہاری مدد کر سکیں گے لیکن اب وقت نہیں رہا۔ رابعہ کے کہنے کے مطابق وہ خط گھر میں ہی موجود ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں ہوئی سوائے دفتر اور لائبریری کے۔ ہم نے گھر کا کونا کونا دیکھ لیا تھا۔ ہمارا خیال ہے تم رابعہ سے بہتر طور پر یاد کر سکتے ہو کہ خط لائبریری کی

www.paksociety.com

میں ہے تو کہاں ہے اور اگر وہاں بھی نہیں ہے تو اس نے کس کے پاس رکھوایا ہے۔ بہتر ہے تم نے اس لیے کہا کہ ہمارے پوچھنے کے طریقے ذرا مختلف ہیں۔ رابعہ سمجھتی تو ہے مگر وہ بہادر بن رہی ہے اور اسے خوش فہمی ہے کہ وہ اپنی ضد پر قائم رہ سکتی ہے۔ اسے سمجھاؤ کہ یہ نا ممکن ہے یہ تم سب کے مفاد میں ہے کہ پوچھے بغیر وہ لفافہ ہمیں دے دو۔

گھر سے نکل کے رابعہ کی خالہ کی ویگن تک جاؤ جو کراؤن سینما کی طرف سڑک کے کنارے کھڑی ہے اس کے پیچھے ایک ٹیکسی ہے ٹیکسی میں چابیاں موجود ہوں گی۔ اسی ٹیکسی کو گڑھی شاہو کی طرف لے جاؤ اور دائیں طرف مڑ کے ریلوے کراسنگ تک سیدھے جاؤ۔ پھر مڑ کے بائیں کنارے پر اسی شکستہ منزل کی طرف دیکھو جہاں سے پولیس کو نعش کی (ایک گمنام فقیر کی مسخ شدہ) لاش ملی تھی۔ اس سڑک پر دو افراد تمہیں روک لیں گے۔ ان کے لباس ایک جیسے ہوں گے۔ کسی اور کو بٹھاؤ گے تو قدرتی طور پر ہم شک میں مبتلا ہو جائیں گے۔ مزید ہدایات وہ دونوں مسافر دیں گے۔

یہ مت بھولنا کہ تم ہر لمحہ ہماری نگاہ میں ہو۔

میں نے خط کو محسن کی طرف بڑھا دیا۔ کاغذ کا پرزہ دونوں طرف لکھنے سے بھر گیا تھا لیکن میری طرح محسن نے بھی اس عبارت کو پانچ منٹ میں دوبارہ پڑھ لیا۔ "یہ لوگ ڈرامہ کر رہے ہیں سکندر!" محسن نے کہا۔ "ابھی تک انہیں علم نہیں کہ رابعہ کی خالہ کی ویگن اب وہاں نہیں ہے جہاں یہ لوگ سمجھ رہے ہیں۔ ان کے کسی آدمی کی ہم پر نگاہ نہیں۔ یہ سب ہمیں نفسیاتی طور پر مرعوب کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔"

"کیا اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ ٹیلی فون بھی کوئی ٹیپ نہیں کر رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "کیونکہ فون یا تو ایکسچینج میں ٹیپ ہوتا ہے یا گھر کی قریب ترین لائن سے مگر اس کے لیے پول پر چڑھنا پڑتا ہے اور پول پر کوئی کب تک منڈلاتا رہ سکتا ہے۔ یہ تو تم فوراً باہر نکل کے بھی دیکھ سکتے ہو۔"

"فون ٹیپ کرنے کے بہت سے سائنٹیفک طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔" محسن بولا۔ "لائن کے علاوہ جنکشن باکس بھی ہوتے ہیں۔ بہر حال تو یہ بھی نہیں دیکھا کہ باہر کہ فون کی لائن سے تار تو نہیں جوڑ رکھا ہے۔"

"ہو سکتا ہے خط بھی رابعہ کی خالہ کی ویگن کے پہلے لکھا گیا ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم خطرات مول لینے میں نہیں رہے محسن! انہوں نے ایک دھمکی دی کہ رابعہ کی ماں کو رابعہ کے اغوا کے بارے میں بتا دو گے تو وہ واقعی مر جائے گی اور آج خط کے خلاف والی رابعہ کو بھی کل یہ خیال ضرور آئے گا کہ اس نے ماں کو اپنی ضد پر قربان کر دیا۔"

"بعض اوقات حصولِ مقصد میں کامیابی یقینی ہو تو آدمی اپنی پیاری سے پیاری چیز قربان کر کے بھی" محسن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ محسن کی بات کا مطلب کیا ہے۔ "رابعہ کا دماغ خراب ہو رہا ہے تو کیا میں تو ہو" میں نے کہا۔

"اچھا خدا حافظ۔" محسن نے کہا۔ "یہ تمہارا رابعہ نہ مانی۔ لفافے کا پتا دے بتایا تو کیا ہو گا؟"

"یہ میں جانے سے پہلے ہی کیسے بتا سکتا ہوں؟" نے کہا۔ "تو میرا یہیں انتظار کرنا۔ صبح تک ماسی کو"

"اس سے پہلے یا اس کے بعد جو کچھ کرنا ہو گا وہ اپنی پرائیویٹ عقل کی مدد سے کروں گا۔ آپ تشریف لے جائیں۔" محسن چڑ کے بولا۔

"صاحب جی! میں جا رہی ہوں۔" خادمہ نے منہ پر رکھ کے کہا۔ وہ اپنا بوسیدہ برقع اور میلی پوٹلی لیے دہلیز پہ کھڑی تھی۔

"تمہارا داماد کہاں رہتا ہے ماسی؟" محسن نے سے دیکھ کے کہا۔ "کیسے جاؤ گی؟"

"چلی جاؤں گی بس سے۔ وہ صمد میں رہتا ہے کے پیچھے والی گلی میں۔" وہ بولی۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم سکندر صاحب کے ساتھ چلی جاؤ۔ یہ تمہیں ٹیکسی میں لے جائیں گے۔"

"اس تکلیف کی ضرورت نہیں صاحب جی! آتی جاتی رہتی ہوں۔" خادمہ نے عاجزی سے کہا۔

"تکلیف کیسی۔ یہ بھی ادھر ہی جا رہے ہیں۔" نے کہا۔ "سکندر! ماسی کو علی ان کے گھر کے دروازے تک پہنچانا ہے۔ آج تم نے ان کے ساتھ بہت بد تمیزی کی" کا انداز تحکمانہ اور فیصلہ کن تھا۔ خادمہ کی نظر بچا کے

نے مجھے آنکھ ماری تو میں سمجھ گیا کہ اس کے ذہن میں کچھ اور ہے۔ میں اسے منع بھی کرنا چاہتا تھا کہ وہ کسی چکر میں نہ پڑے اور پوچھنا بھی چاہتا تھا کہ اس نے کیا سوچا ہے لیکن میں مجبور تھا کہ خاموشی سے اس کی بات مانوں۔ نہ وہ ماسی کے سامنے کچھ بتاتا اور نہ میرے منع کرنے سے مانتا۔ میں نے ماسی کو ساتھ لیا اور کوٹھی سے باہر آیا تو وہ ذرا سی دیر کے لیے رکی۔ اس خیال سے کہ شاید میں کسی گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روکوں لیکن میں نے بتایا ٹیکسی آگے کھڑی ہے تو وہ پھر چل پڑی۔

محسن نے ماسی کو کیا سوچ کے میرے ساتھ کیا تھا، یہ میں ابھی طے نہیں کر سکا تھا۔ شاید اس کا مقصد نگرانی کرنے والوں کو گمراہ کرنا تھا۔ اگر وہ واقعی دیکھ رہے ہوں گے تو فوراً چوکنے ہو جائیں گے اور تعاقب کیا تو صمد تک جا کے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ کیا محسن اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں کوئی فیصلہ کر چکا ہے جو یقیناً بات یہی ہو گی۔ میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے سوچا۔ ماسی کو پیچھے والی سیٹ پر بٹھا کے میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور انجن اسٹارٹ کیا۔

یہ احساس بہت عجیب تھا کہ میں ایک چوری کی ٹیکسی میں اتنے اعتماد کے ساتھ دن دہاڑے شہر کی سڑکوں پر رواں ہوں۔ چوری کی رپورٹ اب تک درج کرا دی گئی ہو گی۔ باعثِ اطمینان پولیس کا روایتی نااہل انتظام تھا۔ ابھی چوری ہونے والی ٹیکسی کا نمبر تھانے کو بتایا جائے گا اور وہ مجبوراً لکھ لیں گے "تفتیش ہو رہی ہے" اور ٹریفک پولیس کی چوکیوں میں آرام سے بیٹھ کے گپ لگانے والے بھی نمبر نوٹ کر کے مطمئن ہو جائیں گے۔ یہ نہیں ہو گا کہ وہ فوراً سڑک پر نکل کھڑے ہوں اور سڑک پر سے گزرنے والی ٹیکسی کا نمبر دیکھیں لیکن ان کے پاس تو ایک طویل فہرست ہوتی ہے جو ہر روز چوری ہونے والی اور بہت کم پھرنے والی گاڑیوں کی تعداد کے باعث طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی ہے۔ ان کا ذہن کون سا خود کار کمپیوٹر ہے کہ سارے نمبر یاد رکھے اور جیسے ہی کوئی مسروقہ کار سامنے سے گزرے کھٹ سے سگنل دے دے۔ خود کوئی موٹر سائیکل سوار ٹریفک سارجنٹ دیکھ کر پیچھے لگ جائے تو الگ بات ہے ورنہ چوراہوں پر کھڑے ہوتے عام سپاہی تو کھڑے کھڑے بھی منہ پھیر لیتے ہیں۔ وہ کیا کر سکتے ہیں۔ تاہم ایک اندیشہ اپنی جگہ تھا کہ میں پکڑا گیا تو کیا جواب دوں گا۔ ماسی کی نظر میں تو میری حیثیت مشکوک ہو کے مجرم کی ہو جائے گی۔ پولیس والے گمشدہ کار کی تلاش میں اس امید کے ساتھ شروع کرتے ہیں کہ چوری یا تو کسی لونڈے نے ایڈونچر کی خاطر کی ہو گی یا پیشہ ور مجرموں نے کسی خاص مشن کی خاطر اور کار کہیں نہ کہیں لاوارث کھڑی مل جائے گی۔ پچاس فیصد صورتوں میں ان کا اندازہ درست ثابت ہوتا ہے۔ باقی پچاس فیصد اندازوں کے غلط ہونے کے بعد وہ مالک کو شہر کی سڑکوں اور گلیوں کی سیر کراتے ہیں اور خود بھی پھرتے ہیں چنانچہ کھانے اور چائے سگریٹ پان وغیرہ کے اخراجات شکایت کنندہ سے وصول کرتے ہیں۔ ظاہر ہے آدمی خالی پیٹ تو کے بغیر تو گشت نہیں کر سکتا۔ مشین بھی آرام اور ایندھن مانگتی ہے۔ جو گاڑیاں نہیں ملتیں وہ مشتبہ طور پر غیر علاقے پہنچا دی جاتی ہیں یا ان کے اجزائے ترکیبی منتشر ہو کے بصورت اسپیئر پارٹس چور بازار میں پہنچ جاتے ہیں اور مالک کو صبر کرنے یا دوسری گاڑی خریدنے کا مشورہ دے کر پولیس اپنے فرائض منصبی سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہو جاتی ہے۔

"بس بیٹا ادھر ہی روک لینا ٹیکسی۔" ماسی نے پیچھے سے کہا اور میں نے ٹیکسی روک لی۔ ماسی کے اترتے ہی ایک بالشتیے بڑے میاں اپنے مچھندر بیٹے کے ساتھ لپکے۔ دونوں میں فرق صرف عمر اور مونچھوں کا تھا۔

"لے اسٹیشن جانا ہے۔ چھاؤنی کے اسٹیشن۔" بڑے میاں نے کہا اور چیخ کر اپنے مچھندر بیٹے سے کہا کہ وہ ٹین کے صندوق کا بوجھ اپنے سر پہ سے ٹیکسی کی چھت پہ رکھ دے۔ لیکن بیٹا ابھی سڑک کے دوسرے کنارے پہ کھڑا تھا۔

"میں ٹیکسی ڈرائیور نظر آتا ہوں تمہیں؟" میں نے غرا کے کہا۔ بڑے میاں نے منہ دوسری طرف کر کے صدا لگائی۔ ایک فارغ کھڑا ہوا سپاہی ڈنڈا ہلاتا، وقت گزاری اور آمدنی کا وسیلہ پیدا ہونے پر مسکراتا آگے آیا۔ مچھندر بیٹے نے اتنی دیر میں ٹین کا صندوق چھت پہ پھینک دیا تھا۔

"اے اٹھاؤ اس مصیبت کو۔" میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ "ورنہ اسے بھی لے جاؤں گا۔"

"کیا؟" بڑے میاں نے چیخ ماری۔ "دیکھ رہے ہیں آپ سنتری صاحب! یہ دیدہ دلیری۔ مسافر کو بٹھانے سے انکار۔ اور پھر یہ دھمکی۔"

"اٹھاؤ۔" میں نے دھاڑ کر کہا۔ "مجھے ایس ایس پی صاحب رضوی کی بیگم کو لینے جانا ہے۔ یہ ان کی ٹیکسی ہے۔ تمہارے باپ کی کار نہیں ہے۔"

سنتری کی پیش قدمی اور جارحانہ عزائم کا خاتمہ ہو گیا۔ "ارے چچا! ہم دلواتے ہیں آپ کو دوسری ٹیکسی۔" اس نے خود باکس اتارتے ہوئے کہا اور اس کی یہ بات نہیں

www.paksociety.com

سی کر گھنٹے بھر کے بعد تو ایک ٹیکسی آئی تھی وہ دوسری
کہاں سے رولنے لگا۔ میں نے میٹر ڈاؤن کیا اور کسی کی طرف
دیکھے بغیر طوفانی رفتار سے ٹیکسی موڑ دی۔ حالات کی سنگینی کے
باوجود مجھے اس ایکٹ کے چھوٹے سے مزاحیہ ڈرامے
پر ہنسی آ گئی۔ واپس دھرم پورے کی طرف مڑتے ہی مجھے ریلوے
کراسنگ پر انتظار کرنا پڑا۔ یہ پھاٹک شاذونادر ہی بند ہوتا
تھا۔ دس منٹ بعد جب مال گاڑی کے چند ڈبوں کو بادل
ناخواستہ کھینچ کر لے جانے والا کالا انجن دھواں چھوڑتا گزر
گیا تو میں پھر آگے بڑھا۔ اگلا ریلوے کراسنگ جس پر سے
گزر جانے اور آنے والی گاڑیاں گزرتی تھیں پھر بند تھا مگر
مجھے اس سے پہلے ہی سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ جانا تھا۔
میں نے اپنی رفتار کم کر دی۔ اب شام کا دھندلکا گہرا ہونے
لگا تھا اور کچھ گاڑیاں پارکنگ لائٹ جلا کے چل رہی
تھیں۔ میں نے اپنی نگاہ سڑک پر رکھی جس پہ پیدل چلنے
والے ناپید تھے۔ سامنے سے ایک کار نمودار ہوئی اور زن دم
سے گزر گئی۔ یا خواجہ پورے یا مغلپورے جانے والا ٹخ ٹخ کرتا
ایک تانگہ پیچھے رہ گیا۔

وہ دونوں مخالف سمت سے نمودار ہوئے۔ سڑک
کے دونوں کناروں پر آمنے سامنے دو درخت تھے۔ وہ انہی
کے پیچھے چھپے کھڑے تھے۔ مجھے بے ساختہ ہنسی بھی آئی اور
مجھے فوراً بریک بھی لگانے پڑے۔ ان کے ایک جیسے لباس
پرانی وضع کے سفید لٹھے کے شٹل کاک ٹائپ برقعے تھے
اور وہ سڑک کے بیچ میں کھڑے ہوئے بھوت نظر آتے
تھے۔ پلک جھپکتے میں وہ دونوں کار کے پچھلے دروازے کھول
کے بیٹھ گئے۔

"چلتے رہو" ان میں سے ایک نے کہا "پلٹ کر
مت دیکھنا"

"صاحب ٹیکسی ڈرائیور پردہ نشین بیبیوں کو آنکھ
اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے" میں نے کہا "ریوالور کی دھمکی کی
ضرورت نہیں"

یہ فرض کرنا محال تھا کہ وہ پہلے سے برقعے اوڑھے
کھڑے تھے۔ ہر راہگیر سڑک کے دونوں طرف کھڑی ہوئی
خواتین کو دیکھ کر شک میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ وہ برقعے بغل
میں دبا کے کھڑے ہوں گے۔ ٹیکسی کو دیکھتے ہی انہوں نے
پیراشوٹ کی طرح کھٹ سے برقع کھول کے سر پہ ڈال لیا۔
جدید وضع کا ٹوپیس برقع ہوتا تو ان کو بند باندھنے پڑتے
اور بٹن بند کرنے پڑتے۔ یہ پرانا کام آنے والا آسانی سے
دستیاب ہونے والا اور پوری طرح چھپا لینے والا لباس ہر
قسم کے نقاب یا ماسک سے بہتر تھا جو ہمارے ملک کے
اور یورپ کے مجرم استعمال کرتے تھے۔ شالیمار سے مجھے
ٹکسال کی طرف چلنے کا حکم دیا گیا۔ ٹکسال سے پہلے اسی قسم
کے برقعے والی ایک خمیدہ کمر بڑی بی نے مجھے روکنا چاہا جو
کوئی پوٹلی یا باسکٹ رکھے کھڑی تھیں۔ "ارے اماں" میں نے
کہا "ایک نقشہ بند شدہ والا گیس پہلے ہی ہے۔ تم تیسری کیا
کرو گی" یہ دارو غہ والا کا علاقہ گزر گیا۔

"ٹیکسی کو بائیں سڑک کے کنارے روک لو" مجھے حکم ملا
"چابیاں اسی میں چھوڑ دو"

دارو غہ والا کے بعد آبادی اب بہت کم رہ گئی تھی اور
جو گھر بنے ہوئے تھے وہ بھی دور دور تھے۔ ان میں جدید طرز
کی کوٹھیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ان کی ہدایات کے مطابق میں
نے آگے آگے چلنا شروع کیا۔ برقع پوش خواتین میرے پیچھے
رہیں کہ شرفاء کا قاعدہ یہی ہے۔ اگر یہاں مجھے اپنا کوئی ملنے
والا دوست دیکھ لے تو ہکا بکا رہ جائے کہ وہ میاں جو روشن
خیالی اور آزادی کا آتا جرا مبلغ تھا اپنے وطن جا کے کیا ہو
گیا۔ اس کے پیچھے دو عورتیں علانیہ قدامت پسندی کا نشان بنا
ہو چل رہی تھیں۔ مائی گوڈنس۔ ان میں سے ایک تو اسی
کی بیوی ہو گی اور کون جانے دونوں ہوں۔ اولڈ فیشن مسلم
چار بیویوں پہ یقین رکھتے ہیں آج بھی۔ اور وہ مائی لارڈ، شاید
میری انگریز کلاس فیلو لڑکیاں صدمے کی شدت سے بیہوش
ہو جائیں اور اس لانڈ کی بیوی کا کیا حال ہوتا۔ اس کا باپ
کہتا دیکھو! یہ حشر ہوتا تمہارا اس پاجی مولوی کے ساتھ جا کے
اصل صورت حال کتنی مختلف تھی۔ یہ میں کسی کو بتا بھی نہیں
سکتا تھا کہ اس بندۂ مجبور کے پیچھے اس کی زندگیاں نہیں،
اس کے قاتل ہیں اور برقعے کے اندر عورت نہیں مرد ہیں
اور وہ بھی مسلح۔ کسی کو شک ہونے کا سوال ہی نہ تھا اور
میرے لیے کوئی کارنامہ سرانجام دے کر ان کو بے نقاب کرنا
محال تھا۔ میں روبوٹ کی طرح ان کے اشارے پر چلتا ہوا
ہوتا گیا اور کھیتوں کی منڈیر پہ چلتا گیا۔ انہوں نے وسیع میدان
کے وسط میں کھڑی ہوئی ایک کوٹھی کے نامکمل ڈھانچے
کی پہلے ہی نشاندہی کر دی تھی۔ کوٹھی کا نچلا حصہ مکمل تھا لیکن
اس پہ پلاستر کی نوبت نہیں آئی تھی۔ انہوں نے اپنی خباثت
کے مظاہرے کے لیے جو جگہ منتخب کی تھی وہ ہر لحاظ سے
موزوں تھی۔

کوٹھی کے گیٹ کے اندر داخل ہو کے بھی انہوں نے

برقعوں کے نقاب نہیں اٹھائے۔ میرے سامنے ایک
عقبی برآمدہ تھا جس کے دونوں دروازے بند تھے۔ کوٹھی
کے بائیں ہاتھ پر سامنے کی طرف جو جگہ لان کے لیے چھوڑی گئی
تھی اس میں دیوار کے ساتھ ساتھ سیمنٹ کی دو سو سے زائد
بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ سریا پڑا تھا جو ابھی استعمال ہونا
باقی تھا اور درمیان میں پانی کا وہ عارضی تالاب تھا جو تعمیر
کے لیے پانی ذخیرہ رکھنے کی غرض سے بنایا جاتا ہے۔ اس طرف
نچلی منزل میں کھڑکیوں کی چوکھٹ موجود تھی لیکن پٹ لگنے
باقی تھے چنانچہ خالی کمروں کا اندھیرا اور پلاستر کا رنگ ایک
نظر آتے تھے۔ اوپر کی منزل پر سریے دیواروں میں لگے ہوئے
تھے اور ایک جانب چھت کی شٹرنگ کو سہارا دینے
والے بے شمار لکڑی کے ستون نہ جانے کب سے ایسے ہی کھڑے
تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ تعمیر کا کام رکا ہوا ہے۔ اکثر لوگ عمارت
بنواتے وقت جو تخمینہ ذہن میں رکھتے ہیں وہ تکمیل کے آخری
مراحل طے کرتے کرتے غلط ہو جاتا ہے اور پھر مزید سرمایہ فراہم
ہونے تک تعمیر کے عمل کو ایسے ہی روکنا پڑتا ہے۔ کوٹھی کا مالک
اپنی پریشانی میں مبتلا ہو گا اور شاید دن میں ایک بار چکر
لگا کے نامکمل گھر پہ حسرت کی نظر ڈال کے لوٹ جاتا ہو گا۔
وہ ملک سے ہی باہر ہوا تو یہاں اس کے بھائی، ماں باپ
یا بیٹے خط پہ خط ڈال رہے ہوں گے کہ جو پیسہ تم نے بھیجے تھے
وہ تو ختم ہوا اب اور بھیجو کہ باقی رہ جانے والا کام بھی
پورا ہو۔ لیکن باہر جا کے کمانے والے بھی ڈالر تو نہیں ڈال
سکتے، انہیں بھی پیسہ کما کے بچانے میں وقت لگتا ہے۔

"سیدھے ہاتھ والے دروازے سے اندر چلو" ایک
برقع پوش نے مجھے دھکیلا اور میں لڑکھڑا کے گرتے گرتے بچا،
کیونکہ فرش بہت ناہموار تھا اور ادھر ادھر آدھی پونی اینٹوں
کے علاوہ پتھر بھی پڑے تھے۔

"اندر آٹھ دس دروازے ہیں۔ چار ایک طرف چار
دوسری طرف۔ تم الٹے ہاتھ کے آخری دروازے سے اندر جاؤ
گے" دوسرے نقاب پوش نے کہا۔

گھر آتے راستے میں بھی ان کی آواز اور لہجے پر غور کیا
تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ان میں سے ایک یقیناً استاد
بشیر تھا لیکن وہ بھی اصل آواز اور لہجے میں بات نہیں کر
رہا تھا۔ دوسرے کے بارے میں ابھی تک میں بے یقینی کا
شکار تھا کہ وہ دلاور یا ڈی سلوا میں سے کوئی ہے یا شیڈ مرد کا
ساتھی ملک۔ برقعے نے ان کی صورت کو ہی نہیں قد و قامت
اور کاٹھی کو بھی خوبی سے چھپا لیا تھا اور ان کے لباس کو بھی۔ میں
لے ان میں سے ایک کو ریوالور لے کر دائیں طرف کی گلی میں
جاتے دیکھا اور دروازے کے قریب رک کے پیچھے نگاہ ڈالی۔
ایک برقع پوش مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ریوالور کا رخ
میری طرف کیے فائر کرنے کی پوزیشن میں تیار کھڑا تھا۔ اگر میں
چاہتا تو راستے میں کوئی موقع پیدا کر سکتا تھا۔ یہی برقع جس نے
ان کو چھپائے رکھا تھا ان کے لیے وبال جان بن جاتا اور وہ
اس میں الجھتے تو آسانی سے قابو میں آ جاتے مگر میں نے عمداً
ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ اس سے رابعہ کو فائدہ
کے بجائے نقصان ہو سکتا تھا۔ اگر میں ان دونوں کو یرغمال
بنا لیتا تب بھی بے کار تھا۔ وہ دونوں بے وقعت لوگ تھے
جن کی خدمات منہ مانگے معاوضے ادا کرنے کے بعد حاصل کی
جاتی ہیں۔ تحفظ کی کسی ضمانت کے بغیر۔ اگر وہ مارے جاتے
تو کسی کو فرق نہیں پڑتا۔ ان کی جگہ دوسروں کی خدمات حاصل
ہو جاتی ہیں۔ جو ان کا نعم البدل ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی
حیثیت استعمال کی چیز سے زیادہ نہیں ہوتی جو خریدی اور
بیچی جاتی ہیں۔ ٹوٹ جاتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں اور ناکارہ
ہوں تو بدل دی جاتی ہیں لیکن میرے لیے رابعہ صرف رابعہ تھی۔
اس کے بدلے میں دلاور سمیت ایک ایک بدمعاش کو بھی
جہنم کے مار ڈالتا تب بھی رابعہ کا نقصان پورا نہیں ہو سکتا تھا
خواہ وہ جان کا ہو یا آبرو کا۔ چنانچہ میں نے ان کی ہدایت پہ
عمل کیا تھا اور جرأت یا ذہانت کا کوئی ایسا مظاہرہ نہیں کیا
تھا جو میری حماقت کا ثبوت بن جاتا۔ میں مسکرایا اور ہینڈل
گھما کے اندر داخل ہو گیا۔ اب میرے سامنے ایک نیم تاریک
گلی تھی۔ اس کاریڈور میں جو کوٹھی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا
تھا واقعی آٹھ دروازے تھے جو سب کے سب بند تھے۔ کاریڈور
کی اونچائی کمروں کی چھت کے برابر یعنی بارہ فٹ تھی لیکن
چوڑائی صرف چھ فٹ تھی۔ بجلی کے پوائنٹ یہ ظاہر کرتے تھے
کہ بعد میں راہداری کو دن میں بھی سیلنگ لائٹ سے روشن
رکھنا ضروری ہو گا۔ ابھی سیمنٹ کے سیاہ رنگ کے باعث
بھی روشنی کم ہو گئی تھی۔ اس راہداری کے آخر میں بھی ایک
دروازہ تھا جو کھلا پڑا تھا اور عقبی حصے کے مختصر سے صحن کا
نظارہ پیش کرتا تھا۔ دوسرا برقع پوش جو بائیں جانب چلا گیا
تھا اب گھوم کر اس دوسرے دروازے کے سامنے آ کھڑا ہوا
تھا۔ اس نے برقعے کے اندر ہی سے ریوالور میری طرف تان
رکھا تھا۔

میں نے کسی اور دروازے کو کھول کر جھانکنے کی کوشش
نہیں کی اور بائیں ہاتھ کے آخری دروازے کے ہینڈل کو گھما

www.paksociety.com

کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا جس میں چند لمحوں کے لیے مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ ابھی میں اس تاریکی سے مانوس ہونے کی کوشش ہی کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کمرے میں اتنی تاریکی کیوں ہے کہ ایک ہاتھ نے مجھے آگے دھکیلا۔ میرے پیچھے دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا اور میں نے محسوس کیا جیسے دن کے اجالے سے ایک دم میں آدھی رات کی ایسی تاریکی میں دھکیل دیا گیا ہوں جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ماچس نکالی اور دیا سلائی روشن کرنے سے پہلے میں نے گہری سانس لے کر سونگھا لیکن کمرے میں صرف تازہ پلاسٹر کی اور چھپکلی ہوئی کوٹھری کی خوشبو تھی کسی گیس کی بو نہیں تھی۔ اندھیرا یقیناً مصنوعی تھا اور کمرے کی دروازے بند کر کے اور شیشوں پر سیاہ پردے یا رنگ پھیلا کے پیدا کیا گیا تھا اور ایسا کمرہ کون بنانا چاہے جس میں صرف ایک دروازہ ہو۔ میں نے ایک دیا سلائی روشن کی اس کی مدھم روشنی میں مجھے اندازہ ہوا کہ کمرے میں واقعی روشندان کے سوا یا اس دروازے کے سوا باہر کے اجالے کے اندر آنے کی کوئی راہ نہیں۔ دروازہ بند ہو گیا تھا اور شاید باہر سے مقفل بھی کر دیا گیا تھا۔ روشندان میں چوکھٹ پہ تختے جڑ دیے گئے تھے۔ پہلی دیا سلائی بجھ گئی۔ میں نے دوسری تیلی جلائی۔ کمرہ آٹھ فٹ چوڑا اور پندرہ فٹ لمبا اسٹور تھا جس میں دیوار کے ساتھ ساتھ شیلف بنے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے آخر میں دروازے جیسا خلا تھا۔ میں نے قدم آگے بڑھائے اور تیلی بجھنے سے پہلے اس خلا تک پہنچ گیا۔ خلا سے تہ خانے میں سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ میں تیسری تیلی جلانے ہی والا تھا کہ کسی نے صاف آواز میں کہا۔ "نیچے اتر جاؤ۔ رابعہ تمہارا منتظر ہے۔"

میں اچھل پڑا۔ آواز کی گونج بتاتی تھی کہ مجھ سے بات کرنے والا کوئی انسان نہیں لاؤڈ اسپیکر ہے۔ اور یہ لاؤڈ اسپیکر میرے سر پہ روشندان میں نصب تھا۔ میں نے اوپر دیکھا اور پھر تیسری دیا سلائی کی روشنی میں تہ خانے کی تقریباً پلاسٹر والی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ زینے پر ایک موڑ آیا اور دیا سلائی ختم ہو گئی۔ میں نے باقی زینہ مکمل اندھیرے میں سنبھل سنبھل کے قدم اٹھاتے ہوئے طے کیا۔ آخری زینے سے فرش پہ قدم رکھتے ہی میں نے کہا "رابعہ!" اور میری آواز اس تہ خانے میں گنبد کی طرح گونجی "رابعہ"۔ میں نے پھر کہا اور ماچس جلائی مگر وہ تیلی خراب تھی۔ "کیا بات ہے رابعہ جواب دو۔ کدھر ہو تم؟"

"ابھی تک تمہاری نظر رابعہ کو نہیں دیکھ سکی؟" لاؤڈ اسپیکر نے میرا استہزا اڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے خوف کی سرد لہر کو ریڑھ کی ہڈی میں اترتے محسوس کیا اور دوسری تیلی روشن کی۔ یکلخت میری نظروں نے اسے دیکھ لیا۔

وہ فرش خاک پہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ پہلی نظر میں ہی اس کے تار تار لباس پہ خون کے دھبے نظر آئے۔ "رابعہ!" میں چلایا اور میری آواز کی بازگشت کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر بڑی خباثت سے ہنسا۔ میں نے دو قدم کا فاصلہ طے کیا اور نیم پختہ فرش کی گرد پر بیٹھ گیا۔ "رابعہ! میری جان! کیا ہوا ہے تمہیں؟" میں نے اس کا سر گود میں رکھ لیا اور اندھیرے میں اس کے گالوں کو آہستہ آہستہ تھپکنے لگا۔ "رابعہ.... دیکھو میں سکندر ہوں۔" لیکن رابعہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اس کے سینے پہ ہاتھ رکھ کے اور پھر کان لگا کے دیکھا۔ اس کے دل کی دھڑکن ٹھیک تھی۔ پھر میں نے اس کی نبض دیکھی۔ یوں جیسے میں واقعی نبض دیکھ کے اس کی حالت کا صحیح اندازہ کر لوں گا۔ میرے ہاتھوں پہ اس کے خون کی نمی آ گئی اور میری انگلیاں چپکنے لگیں۔ میں نے رابعہ کا سر آہستہ سے زمین پر رکھ دیا۔ اس کے پریشان بال خاک میں پہلے ہی اٹے ہوئے تھے۔ پہلی نظر میں مجھے رابعہ کی ظاہری حالت کے صدمے نے وقتی طور پر بے حواس کر دیا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ اس کے پھٹے ہوئے کپڑے اور خون میں لتھڑے ہوئے جسم کو لاش کی طرح پڑا دیکھ کر میں اور کیا اندازہ کر سکتا تھا۔ اب مجھے یکلخت یہ اطمینان حاصل ہو گیا کہ وہ زندہ ہے اور یہ اطمینان بہت حوصلہ افزا ثابت ہوا۔

"کیا بات ہے؟ رابعہ نے کچھ بتایا نہیں کہ اسے کیا ہوا ہے؟" لاؤڈ اسپیکر بولا۔

"حرامزادو!" میں نے چیخ کر کہا۔ "تم نے مجھے بتایا تھا کہ رابعہ خیریت سے ہے۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اس پہ آنچ نہیں آئے گی۔"

"تو ہم نے کون سی وعدہ خلافی کی ہے؟" لاؤڈ اسپیکر نے جواب دیا۔ "رابعہ صحیح سالم اور زندہ ہے۔"

"تم سب نامرد ہو۔ عورت پہ یہ ظلم کر کے خود کو دلاور کہتے ہو۔" میں نے کہا۔ "چوہدری دلاور! تمہارا باپ بھی کون ہے جو سامنے آ کے مجھ سے بات کرنے کی ہمت رکھے۔ بے غیرت شیطانو! تم خود کو بدمعاش کہتے ہو۔ بدمعاش

سمجھتے ہو۔ بدمعاش کے لیے بہت بڑا دل چاہیے، ظرف چاہیے اور حوصلہ چاہیے۔ کیا ملا تمہیں اس عورت کے ساتھ یہ سلوک کر کے۔ کیا مقابلہ اس کا اور تمہارا؟"

"کوئی مقابلہ نہیں۔ یہ بات ہم نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔" لاؤڈ اسپیکر ہنسا۔ "مگر عورت ذات ہوتی ہی ناقص العقل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم خود بھی اپنے آپ کو بدمعاش نہیں سمجھتے۔ کیا ہم نے کبھی یہ دعویٰ کیا ہے۔ اگر یہ ہم سے تعاون کرتی تو اس کی یہ حالت کیوں ہوتی؟ ہم کبھی اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتے۔"

میں نے سخت جدوجہد کے بعد پاگل کر دینے والے جذبات کی سرکش لہر پہ قابو پایا۔ "کیا چاہتے تھے تم لوگ؟"

"ہم چاہتے تھے کہ ہمیں وہ لفافہ واپس مل جائے۔" لاؤڈ اسپیکر نے کہا۔ "لفافہ رابعہ کے پاس ہی تھا نا؟"

میں نے محسوس کیا کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز اسی چوہدری دلاور کی آواز ہے۔ اس نے پہلے بھی مجھے نفسیاتی طور پر متاثر کرنے کے لیے ایک ڈرامائی طلسماتی ماحول پیدا کیا تھا اب پھر اس نے مجھے ایک دہشت زدہ کرنے والے ماحول میں بات کرنے کے لیے قید کر لیا تھا۔ اس کا پُرسکون ٹھہرا ہوا لہجہ اعتماد بھرا تھا۔ آواز کا فرق اس لیے محسوس ہوتا تھا کہ وہ براہ راست مجھ سے مخاطب نہ تھا۔ لاؤڈ اسپیکر سے نکلنے والی آواز خاصی بدل جاتی ہے۔ تہ خانے اور کمرے کی دیواریں بالکل سپاٹ تھیں۔ اندر ایک کنکر بھی نہ تھا جو میں لاؤڈ اسپیکر پہ مار سکتا۔ میری آواز باہر کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور میں دلاور کی اجازت کے بغیر اس قید خانے سے تاقیامت نہیں نکل سکتا تھا۔ محسن کو اور دنیا میں میرے یا رابعہ کے کسی جاننے والے کو معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں۔ انہوں نے ٹھیک لکھا تھا کہ رابعہ تمہارے خیال کی دسترس سے بھی باہر ہے۔ اگر وہ ہمیں چھوڑ کر چلے جاتے تو ہم یہیں بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کے مر جاتے اور ہماری لاشیں نہ جانے کب دریافت ہوتیں لیکن میں جانتا تھا ان کا مقصد ہمیں قتل کرنا نہیں ہے۔

"وہ لفافہ میں نے رابعہ کی والدہ کو دیا تھا۔" میں نے کہنا شروع کیا۔

"ہاں۔ رابعہ بھی یہی کہتی ہے کہ لفافہ امی کے پاس ہے۔" لاؤڈ اسپیکر نے کہا۔ "لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ جھوٹ بولتی ہے۔ ماں نے تسلیم کیا کہ لفافہ اور سادے کاغذ حال ہی میں لے دیے گئے تھے۔ اس نے کاغذات کو گرم کر کے پڑھنے کی کوشش بھی کی تھی اور ہم سے اسی موضوع پہ بات بھی کی تھی لیکن اسے یا تمہیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر ان کاغذات پر کوئی نظر نہ آنے والی تحریر ہے تو ہم ابھی تک اسے پڑھ نہیں سکے ہیں۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہے اور تمہاری خوش قسمتی ہے ورنہ تمہیں جو ایک ماہ کی مہلت ملی تھی وہ آج تمام ہو جاتی۔" لاؤڈ اسپیکر بولا۔ "بہتر یہی ہے کہ پڑھے بغیر وہ خط ہمیں واپس کر دو۔"

"میں کوشش کر سکتا ہوں کہ رابعہ ہوش میں آ جائے تو اس کو لفافہ اور وہ کاغذات واپس کرنے پر رضامند کر لوں۔ اور مجھے امید ہے رابعہ مان جائے گی۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔ جتنا سچ ہم اس سے اگلوا سکتے تھے ہم نے اگلوا لیا۔" لاؤڈ اسپیکر نے کہا۔ "اب رابعہ کہتی ہے کہ لفافہ اس نے اپنی ماں کو واپس دے دیا تھا حفاظت سے رکھنے کے لیے۔"

"تمہارا خیال ہے رابعہ جھوٹ بول رہی ہے؟" میں نے خلاء سے مخاطب ہو کے کہا۔

"نہیں، رابعہ سچ بول رہی ہے۔" اسپیکر نے کہا۔ "اس کے لیے جھوٹ بولنا ممکن ہی نہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ رابعہ کی ماں سے لفافہ کیسے حاصل کیا جائے اور اسی لیے تمہیں بلایا گیا ہے۔ تم اس بڑھیا سے پوچھ سکتے ہو کہ لفافہ کہاں رکھا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "جیسے ہی اسے ہوش آیا میں اس سے یہ بات معلوم کروں گا۔ کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ اس کے بعد ہمیں رہا کر دو گے اور جب تک میں تمہیں لفافہ لا کر نہ دوں تم رابعہ کا خیال رکھو گے؟ اسے میڈیکل ایڈ دو گے؟"

"رابعہ کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ واپسی پر وہ تمہیں مسکرا کے خوش آمدید کہے گی۔" لاؤڈ اسپیکر نے کہا۔ "اس کے بعد تم جا سکو گے۔ ہم خود تمہیں بحفاظت پہنچا دیں گے۔"

"ٹھیک ہے چوہدری جی۔" کسی اور کی آواز نے کہا۔ "میرا خیال ہے نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہاتھ ذرا اوپر رکھو۔"

میں یوں اچھل پڑا جیسے کسی نے اس تہ خانے میں بم پھینک دیا ہو کیونکہ یہ تیسری آواز محسن کی تھی!

www.paksociety.com

میری ذہنی کیفیت اس مسافر سے مختلف نہ تھی جس کی پیاسی آنکھیں تاحدِ نظر پھیلے ہوئے ریگ زار میں پانی کے سراب کا شکار ہوں۔ کیا یہ آرزو کا فریب ہے، مایوسی کی اس تاریکی میں کہیں امید کی ایک کرن اب بھی روشن تھی کہ شاید کوئی معجزہ رونما ہو، "آسیب زدہ" زندگی سے اچانک کوئی فرشتہ غیب بن کے پہنچے جو مجھے اس بے بسی کی قید سے اور اس بےبسی کے دام سے چھڑا کے لے جائے، لیکن اس وقت یہاں کسی کا میری مدد کے لیے آجانا اتنا ہی بعید از امکان تھا جتنا ان دیواروں کو قوتِ ارادی سے گرا کے رابعہ سمیت اس زندان سے نکل جانا۔

"کون ہو تم؟" مجھ سے گفتگو کرنے والے نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کہا۔ اس کا لہجہ بدستور پُرسکون رہا۔ "اس طرح چھپ کر کسی کے گھر میں گھس آنے اور اس لہجے میں بات کرنے کا مقصد کیا ہے؟"

"میں ان دونوں برقع پوش خواتین کی والدہ ہوں جن کے ساتھ سکندر بخت دس منٹ پہلے یہاں پہنچا ہے۔" محسن نے کہا۔

"تم بہت بےوقوف آدمی ہو۔" اس شخص نے کہا۔

"ہم یہاں ایک سودا کر رہے تھے۔ تمہارے دخل در معقولات سے خرابی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بہتر ہوگا اگر تم آئے قدم لوٹ جاؤ اور ہمیں معاملے کی بات کرنے دو۔"

"شریفانہ معاملات پر شرافت سے بات کی جا سکتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "اس کے لیے ہم باہر کہیں بھی بیٹھ کے معاملات طے کر سکتے ہیں۔ تم ہمیں بلاؤ گے تو ہم سر سے کفن باندھ کے بھی آئیں گے اور سر کے بل بھی۔ اور تم غریب خانے کی عزت بڑھانے آؤ گے تو ہم چشم براہ پاؤ گے لیکن جو طریقہ تم نے اپنایا ہے وہ نامردوں کا طریقہ ہے اور ہم اپنی عزت و غیرت کے بدلے کوئی سودا کر ہی نہیں سکتے۔ تم سکندر بخت اور رابعہ کو نکل جانے دو، پھر میں تم سے بات کروں گا۔"

"تم آخر کیا ہو، سکندر بخت کے وکیل؟" اس شخص نے تحقیر اور تمسخر کے ساتھ کہا۔ "یہ دعویٰ کس ضمانت اور کس برتے پر ہے؟ تم ہو کون؟"

"تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ میں کون ہوں۔" محسن نے کہا۔ "ضمانت جان کی ہے۔ میری زبان پر اعتبار کرو گے تو میں سکندر اور رابعہ کے جاتے ہی ہتھیار ڈال دوں گا اور خود کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔ سکندر اس سودے کا پابند ہوگا جو تم مجھ سے کرو گے۔ قول مرداں جان دارد۔"

وہ شخص ہنسا۔ "اور اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں؟ تمہیں یقین ہے کہ تم بچ کے نکل جاؤ گے؟"

"اپنی زندگی کے بارے میں تو مجھے بھی کوئی خوش فہمی نہیں ہونی چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "تم اس وقت بھی میرے ریوالور کی زد میں ہو اور مجھے اس بات کی بالکل فکر نہیں ہے کہ بعد میں میرا اپنا انجام کیا ہوگا۔ ممکن ہے تمہارے ساتھی مجھے مشین گن سے بھون کے رکھ دیں لیکن وہ تمہیں اس گولی سے نہیں بچا سکتے جو تمہاری کھوپڑی کے پرخچے اڑا چکی ہوگی۔ میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ اپنی جگہ سے ہلنے کی یا غیر ضروری تحفظ کا مظاہرہ کرنے کی حماقت مت کرنا۔ اگر تم نے کسی کو مدد کے لیے پکارا یا اشارہ کیا تو میں بلا تامل تمہیں شوٹ کر دوں گا۔ جہاں میں ہوں وہاں سے تم میری آواز تو سن سکتے ہو لیکن سامنے آئے بغیر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ جب تک میرے ریوالور کی گولیاں ہیں کوئی میرے سامنے آکے زندہ نہیں بچ سکتا۔ میرا نشانہ آج تک خطا نہیں ہوا۔"

میں مارے حیرت کے غوطہ زن تھا اور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ محسن یہاں کیسے آیا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ محسن کو دخل در معقولات سے روکوں اور کہوں کہ وہ لوٹ جائے۔ یہ لوگ جیسے بھی تھے اپنی بات کے پکے تھے۔ والد نے مجھے ایک ماہ کی مہلت دی تھی اور بظاہر اس مہلت کے تمام ہونے سے پہلے ملاقات کا ارادہ میرا کام تمام کرنے کا نہیں تھا۔ رابعہ کے بدلے وہ مجھ سے اس خط کی واپسی چاہتے تھے اور میں فیصلہ کر چکا تھا کہ خط واپس کر دوں گا۔ اس خط کے اسرار و رموز میرے لیے رابعہ کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں تھے لیکن ایک تو محسن کے آ جانے سے یہ مقابلہ شکست تسلیم کر لینے کا ارادہ متزلزل ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ محسن کے پُراعتماد لہجے نے میرا اعتماد بحال کر دیا تھا اور اگر وہ دشمن کے مقابلے میں بہتر پوزیشن لیے بیٹھا تھا تو یہ میرے لیے اطمینان اور مسرت کی بات تھی کہ اس کی اپنی زندگی کو خطرہ درپیش نہیں اور دشمن اپنی تمام عیار فطرت اور بےضمیری کے باوجود اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہماری زندگی لینے سے پہلے دشمن کو اپنی زندگی پر لگانی ہوگی۔ محسن نے ایک کمال یہ کیا تھا کہ پہلی بات سے ہی دشمن کو نفسیاتی طور پر مرعوب اور دہشت زدہ کر لیا تھا ورنہ میں جانتا تھا کہ اس کا نشانہ اتنا بےخطا نہیں۔ مجھے یہ بھی یقین نہ تھا کہ محسن نے پہلے کبھی ریوالور چلایا ہے۔ اس نے شکار کے دوران میں میرے ساتھ شکاری رائفل ضرور چلائی تھی لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ریوالور اور بندوق میں کتنا فرق ہے۔ تاہم دشمن اپنی بےخبری کے باعث محسن کی دھمکی کو سچ ماننے پر مجبور تھا۔

"ہم اس مکان کو بم سے بھی اڑا سکتے ہیں۔" دشمن نے ذرا سے توقف کے بعد کہا لیکن یہ لہجہ کھوکھلا تھا۔

"اپنا بُرا بھلا تم خود سوچ سکتے ہو۔" محسن نے بےنیازی سے کہا۔ "ہم ایک ساتھ دفن ہو کے مر جائیں گے ورنہ ملبے سے نکال کر لے جائے گئے تو قانون کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ تم نے سوچ لیا ہے کہ تمہارا جواب کیا ہوگا؟ میرا خیال ہے تم بلف کر رہے ہو مسٹر جشید احمد خان! تم نے اس زیر تعمیر کوٹھی پر بظاہر عارضی اور ناجائز قبضہ کیا ہے جو تمہارے باپ کی جاگیر نہیں ہے۔ تمہارے پاس شیخو اور ریوالور کے علاوہ زیادہ سے زیادہ سب مشین گن ہو سکتی ہے۔ تم کچھ نہ کرنے کے باوجود گرفتار ہو گے تو ناجائز اسلحہ رکھنے کے علاوہ ایک عورت اور بہت سیرئر وکیل کے اغوا اور حبسِ بےجا میں رکھنے کے سنگین جرائم میں ملوث ہوگے۔ سکندر بخت کا اغوا، حبسِ بےجا، کسی اور کے گھر میں بلا اجازت داخل ہونا، تشدد، قتل کی دھمکی اور ایسے ہی متعدد دیگر جرائم کے مقدمات الگ ہوں گے۔ اس کے برعکس اپنے دفاع میں گولی چلانا۔۔۔"

اس کا جملہ نامکمل رہ گیا اور تہہ خانے میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے فائر کی آواز پہنچی۔

"محسن۔۔۔!" میں نے چیخ کر کہا۔

"کون ہے، سکندر!" محسن کی آواز آئی۔ اسے میری آواز نے حیران کر دیا تھا۔ "تم کہاں ہو؟"

"میں ایک تہہ خانے میں ہوں۔ رابعہ کے ساتھ۔" میں نے کہا۔ "تم خیریت سے ہو نا؟"

"ہاں مجھے کیا ہونا ہے۔ میں نے وارننگ فائر کیا تھا۔" محسن بولا۔ "شاید ان حرامزادوں کو غلط فہمی ہو گئی تھی کہ میرے پاس ریوالور نہیں ہے یا میں اس کھلونے کا استعمال نہیں جانتا۔" پھر وہ میری بجائے ان سے مخاطب ہو گیا جن کی کامیابی کا سارا غرور اس غیر متوقع دخل اندازی سے ناکامی میں ڈھل گیا تھا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ میری عقل ٹھکانے رہی اور میں نے عمداً نشانہ لے کر فائر کرنے سے گریز کیا ورنہ اس وقت تمہاری جگہ فرش پر تمہاری لاش پڑی ہوتی۔ دوسری غلطی کو میں غلطی شمار نہیں کروں گا چنانچہ معاف بھی نہیں کروں گا۔"

"تم۔۔۔ تم کو ابھی اندازہ نہیں ہے کہ تم خود بھی میرے ایک آدمی کے نشانے پر بیٹھے ہو۔" وہ بولا۔ "جسے تم نہیں دیکھ سکتے۔"

محسن ہنسا۔ "میں کھلی چھت پر ہوں اور روشندان میں سے تمہیں دیکھ سکتا ہوں تو اپنے اردگرد دور فرلانگ تک

www.paksociety.com

اڑتی چڑیا کے پر بھی گن سکتا ہوں۔ اگر تمہارا کوئی آدمی بھیل کا پیڑ بنے کر آ جائے تو الگ بات ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ رابعہ اور سکندر بخت کو اس کمرے میں میری نظروں کے سامنے لاؤ۔ دیر کرو گے تو نقصان میں رہو گے۔ ابھی گھنٹے آدھے گھنٹے میں کوئی میرے قریب سے گزرا تو میں چلا کے اسے متوجہ کروں گا اور کہوں گا کہ ایس پی ضامن رضوی صاحب کو فون کر دے۔ فون نہ کر سکا تو کسی بھی پولیس مین کو بتا دے کہ ایس پی ضامن رضوی کے بیٹے کو یہاں ڈاکوؤں نے قید کر رکھا ہے۔ ان کو آنے میں اور تمہیں محصور کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔"

"رابعہ اور سکندر بخت جس تہہ خانے میں قید ہیں، وہاں گیس چھوڑی جا سکتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ زندگی اور موت کی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں۔" محسن نے غرا کے کہا۔ "اگر وہ دونوں بخیر و عافیت نہ ملے تو تمہارے بعد میں ایک ایک کو چن چن کر ماروں گا۔ تم نہیں یہ جو تمہارے سے کی اولاد تمہارے سامنے موجود ہے وہ ہماری دار بنیان والا، اس سے کہو ان دونوں کو لے کے تم اسی طرح لیٹے پڑے رہو۔ اٹھنے کی کوشش بھی کی تو دنیا سے اٹھ جاؤ گے۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ محسن کے پہلے فائر کے ساتھ ہی وہ شخص فرش پر گر گیا تھا جس سے محسن مخاطب تھا۔ یہ ایک قدرتی ردِعمل تھا مگر اب وہ اسی حالت میں لیٹا ہوا خود کو زیادہ بےبس محسوس کر رہا ہوگا۔

"ٹھیک ہے، میں تم سے بعد میں بھی نمٹ لوں گا۔" اس نے جملے کا اختتام ایک غلیظ گالی پر کیا۔ "آج تم بچ کر نکل گئے تو کیا۔ اس شہر، اس ملک اور اس پوری دنیا کے کسی بھی گوشے میں تم ہماری دسترس سے دور نہیں رہ سکتے۔ تمہیں یہ بہادری بہت مہنگی پڑے گی۔ پیڈرو! جا ان دونوں کو لے آ۔ میرا منہ کیا دیکھتا ہے۔" اس نے ماں کی گالی دی۔

صورتِ حال ڈرامائی طور پر بدل گئی تھی۔ بظاہر محسن کا مورچہ بہت مضبوط تھا اور اس نے دشمن کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا مگر اس کے باوجود میرے دل کے کسی گوشے میں خوف کے مہیب سائے اب بھی منڈلا رہے تھے اور مجھے یوں لگتا تھا کہ عارضی کامیابی کا یہ طلسم جھوٹا ہے اور فریب خیال ہے۔ صورتِ حال جو ہمارے حق میں ہے شکست سے خلاف ہو جائے گی۔ محسن کی آواز کچھ ہلکی سنائی دے رہی تھی۔ شاید اسی طرح محسن بھی میری آواز دور سے سن رہا ہوگا۔

"سکندر!" محسن نے کہا۔ "اپنے استاد پیڈرو تیرے کے

پاس آ رہے ہیں۔ ہوشیار رہنا اور کسی قسم کی گڑبڑ ہو تو۔۔۔"
اس کی آواز اچانک بند ہو گئی۔ ایمپلی فائر بند کر دیا گیا تھا
اور اب میرا محسن سے مواصلاتی رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ اس کا
واضح مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ استاد پیڈرو کی نیت
میں فتور ہے اور وہ محسن کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے
ہمیں اس کمرے تک پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میں
چوکنا ہو گیا۔ اب دوسرے محاذ پر مجھے اپنی عقل اور ہمت
سے کام لینا ہو گا۔ یہ تو محسن نے بھی سمجھ لیا ہو گا کہ براہ راست
گفتگو کے ذریعے سے محروم کرنا کسی شر انگیز کارروائی کا پیش
خیمہ ہے اور اپنے طور پر اس نے بھی طے کر لیا ہو گا کہ وہ دھمکی کارگر
نہ ہوئی تو اسے کیا مؤثر جوابی اقدامات کرنے ہوں گے۔ یہ کھیل
ایک ایسا جنگل تھا جس میں خون آشام درندے ایک دوسرے
کی گھات میں تھے۔ یہ تقدیر کا کھیل تھا اور فنا و بقا کی جنگ
تھی جس کے کوئی اصول نہیں ہوتے۔ وہ فیصلہ کن لمحہ کسی کی
گرفت میں نہ تھا اور ہنوز سفر میں تھا جسے فیصلہ دینا تھا کہ
شکار کون ہوا اور شکاری کون بنا۔ میں نے ایک نظر رابعہ
کو دیکھا اور اوپر کی طرف جانے والے زینے کی طرف لپکا۔
مجھے یقین تھا کہ پیڈرو کو دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی
قابو کیا جا سکتا ہے۔ وہ سمجھے گا کہ میں تہہ خانے میں بے بس
لاچار اور بے ہوش رابعہ کو سنبھالے ہوئے ملوں گا۔ وہ محتاط
ہو گا بھی تو زینے سے اترتے ہوئے لیکن زینے پر اس کی نگاہ
مجھے بلندی سے دیکھے گی۔ اگر اس کے پاس ٹارچ لائٹ بھی ہوئی
تو میں براہ راست اس کے ریوالور کی زد میں آ جاؤں گا۔ میں
نے دیا سلائی جلائے بغیر ایک جست میں دو دو سیڑھیاں طے
کر لیں۔ جب میں تہہ خانے میں اترا تھا تو میری آنکھیں
اندھیرے میں دیکھنے کی عادی نہیں تھیں اور مجھے آگے بڑھتے
ہوئے ہر قدم پر تاریکی گہری ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اب معاملہ
برعکس تھا اور مجھے اوپر کے خلا سے اترنے والی روشنی کے
پس منظر میں راستہ زیادہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ ابھی میں
دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ پیڈرو اندر آ گیا۔ ریوالور اس کے
ہاتھ میں تھا مگر وہ مجھ سے براہ راست تصادم کے لیے تیار نہیں
تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے غوطہ مارا اور پیڈرو سمیت
دروازے سے جا لگا۔ دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوا اور
اس کے ریوالور سے نکلنے والی گولی کی آواز کے ساتھ مل کر یہ
دھماکہ اس ویران کمرے کی اور تہہ خانے کی دیواروں میں یوں
گونجا جیسے دستی بم پھٹ گیا ہو۔ پیڈرو نے خود کو سنبھالا
اور میرے سر پہ ریوالور کا دستہ مارنا چاہا۔ میں نے پیڈرو کو
سر کے اوپر سے اچھال کے پیچھے پھینک دیا۔ اس کے ریوالور کی
ضرب میری کمر کے نچلے حصے پر پسلیوں کے قریب پڑی اور
درد کی شدت سے مجھے یوں لگا جیسے میری ہڈی چور چور ہو گئی
ہے۔ ایک لمحے کے لیے میرا سانس رک گیا اور میری آنکھوں
کے سامنے اندھیرے میں جگنو سے اڑنے لگے۔ میں نے اپنی قوت
ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے درد کو نظر انداز کیا اور تمام
جسمانی قوت کو مجتمع کر کے پیڈرو پر جا پڑا جو پہلے فرش پر چت
گرا تھا اور اب اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری ٹھوکر اس
کے منہ پر پڑ جاتی تو اس کے دانت باہر آ گرتے لیکن اس نے
بروقت سر کھینچ لیا اور ایک ہاتھ سے میرے پنجے کو پکڑ کے
کھینچ لیا۔ میں اپنے ہی زور میں اس کے سامنے گرا اور خود بخود
میرے ہاتھ نے اس کی کلائی تھام لی۔ ایک جھٹکے میں وہ
بل کھا کے الٹا ہوا اور ریوالور اس کی گرفت سے نکل گیا۔ اس
کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں میرے ہاتھ میں آ گئیں اور وہ درد
سے بلبلایا۔ میں نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر اس کی گردن
پر کھڑی ہتھیلی کا وار کرنا چاہا مگر اس کا دوسرا ہاتھ بیچ میں
آ گیا اور ضرب اس کی کہنی سے ذرا نیچے پڑی۔ وہ ایک جھٹکے
سے اوپر اٹھا اور اس نے اپنا گرز جیسا مکا میرے پیٹ پر
رسید کیا۔ میں پیچھے گرا تو وہ لپک کر اوپر آ گیا۔ میں نے دونوں
پیر ہوا میں اٹھائے اور پیڈرو کے وجود کو لپیٹے اوپر سے یوں
گزار دیا کہ وہ اپنے ہی زور میں تیرتا ہوا گیا اور دیوار سے ٹکرا
کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ ریوالور ایک کونے میں جا گرا تھا۔ میں
نے ایک جست میں اس پر قبضہ کیا اور تیزی سے اس کا رخ
پیڈرو کی طرف کر دیا لیکن وہ بالکل بے حس و حرکت ہو چکا تھا
اس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ پیڈرو نے پہلے ہی
نے ایمپلی فائر آف کر دیا تھا ورنہ مار پیٹ اور فائرنگ کی
آوازیں میرے دوست اور دشمن دونوں سن لیتے۔ نہ جانے
محسن ان آوازوں کا کیا مطلب نکالتا اور مشتعل ہو کے کیا کر
بیٹھتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پیڈرو کو حکم دینے والا اپنی چال کے
ناکام ہو جانے کے بعد کوئی انتہائی قدم اٹھاتا لیکن اب
فکر کی کوئی بات نہ تھی۔ دشمن یہی سمجھ بیٹھے تھے کہ پیڈرو
اپنے زور بازو اور اپنے ریوالور کی مدد سے مجھے بہ آسانی زیر کر
لے گا۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو مجھے اس
کمرے میں پہنچا دیا جاتا جہاں محسن مجھے دیکھنا چاہتا تھا لیکن
رابعہ کو شاید وہ کسی دوسرے کمرے میں لے جاتے جہاں اس پر وحشت
اور بربریت کے تمام انسانیت سوز حربے آزمائے جاتے
اور اسے ہوش میں لانے کے بعد اس کی دلخراش چیخوں کی

[illegible] محسن کو ہتھیار ڈال دینے پہ مجبور کر دیا جاتا۔ ایک عورت
پر ایسی حیوانیت کے مظاہرے میں آدمی شیطان کو بھی پیچھے چھوڑ
جاتا ہے۔ میں خود رابعہ پہ ہونے والے لرزہ خیز مظالم کی تاب نہ
لا سکتا [illegible] کر دیتا کہ وہ چلا جائے۔ وہ دھمکی دیتے کہ ہم رابعہ
[illegible] آنکھ کر دیں گے یا اس کے ہاتھوں کی اور
پیروں کی انگلیاں کاٹتے جائیں گے اور رابعہ کو مار دیں گے تب میں
ساری عمر کے لیے جیتے جی کا عذاب سہنے کے لیے تو نے
[illegible] اور نامکمل اعضا پہ مشتمل گوشت کا ڈھیر بنا کے
پھینک دیں گے تو اس دھمکی کے بعد یہ ناممکن تھا کہ میں فراغت
رکھتا۔ میں اپنی جان پہ یہ ظلم جھیل جاتا مگر رابعہ کو اپنے تحفظ
[illegible] انتقام کی بھینٹ بھی نہ چڑھنے دیتا۔ اس وقت تک
[illegible] میں دشمن کا یہی منصوبہ تھا جسے میں نے ناکام بنا
دیا تھا۔

ریوالور کو جیب میں اڑس کر میں پھر تہہ خانے کا رخ
کرنے ہی والا تھا کہ مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے دو منٹ
[illegible] پیڈرو کے کپڑے پہنے۔ پہلے اس کو اپنے کپڑے
پہنانے کا سوچا مگر اسے تضیع اوقات سمجھ کے چھوڑ دیا۔ تاہم
[illegible] قمیض کو پھاڑ کے دو حصے کر لیے۔ ایک سے میں نے
پیڈرو کے پاؤں باندھے اور دوسرے سے اس کے ہاتھوں کو کمر
کے پیچھے باندھ دیا۔ پھر میں تہہ خانے میں اترا اور بے ہوش رابعہ
کو اپنے بازوؤں پہ سنبھال کے اوپر لے آیا۔
اچانک اسپیکر جاگ اٹھا۔ "پیڈرو! کیا بات ہے؟
[illegible] ایک فائر کی آواز آئی اور پیڈرو کو مخاطب
[illegible] کر کے گالی دی۔ میں نے پیڈرو کی آواز پہلے بھی سنی تھی
[illegible] ایمپلی فائر تک پہنچنے والی آواز لاؤڈ اسپیکر
[illegible] آ کر کسی حد تک بدل جاتی ہے۔ اس کا بھی مجھے
[illegible] تھا۔ "استاد۔۔۔" میں نے آواز کو [illegible] پیڈرو کی
[illegible] کر کے اس طرح بچا لیا۔ پھر حلق سے یوں آواز
[illegible] زبردست [illegible] سے وہ بات پوری نہیں کر سکا اور
[illegible] ہو گیا ہو۔
"[illegible] اور میرے استاد کی ایسی تیسی۔" میں نے اپنی اصل
[illegible] "آج تمہیں سب معلوم ہو جائے گا۔" پھر میں نے
[illegible] کے سامنے ہی دروازہ کھول کے دھڑ سے
[illegible] گیا۔ سور کا بچہ۔" میں نے اپنی آواز میں کہا اور
[illegible] محسن! پیڈرو مجھے بند کر کے نکل گیا ہے۔" جواب
[illegible] لاؤڈ اسپیکر کی ہلکی سی سرسراہٹ بتاتی تھی
[illegible] اب بھی آن ہے۔ "محسن!" میں نے چلا کے کہا۔
خاموشی کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میرا دل ڈوبنے لگا کیا
محسن ان مکار مجرموں کی کسی سازش کا شکار ہو گیا ہے۔ میں نے
دروازہ کھول کے باہر جھانکا۔ کوٹھی کے نیم تاریک در و دیوار کا
سناٹا کسی ویران مقبرے کی طرح لگتا تھا۔ میں دبے پاؤں آگے
بڑھا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں فائر کے لیے بالکل تیار تھا۔ پہلے
کمرے کا دروازہ کھولنے کے لیے میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور
پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر کچھ
بھی نہیں تھا۔ فرش پہ مٹی میں لکڑی کے گول سفید چھلکے سے پڑے
تھے اور خالی دیواریں جو انتظار میں تھیں کہ کب کوئی آئے اور
دیواروں کو خوبصورت رنگوں، روغن، تصاویر اور ——
پھولوں سے سجائیں۔ گھر کو اجالا اور زندگی کا احساس
دیں۔ وہ اب اجنبی دشمنوں کو ایک خونی کھیل کھیلتے دیکھ کر
دکھ اور حیرت سے دم بخود کھڑی تھیں۔ میں نے دروازہ بند کیا
اور مقابل کے دوسرے دروازے کو کھول کے اندر جھانکا۔ اس
میں دیواروں کے ساتھ ساتھ سیمنٹ کی بوریاں چنی ہوئی تھیں۔
میں تیسرے دروازے کی طرف لپکا اور پھر چوتھے کی طرف جو
آخر میں تقریباً وسط میں تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میرے ذہن کو ایک
جھٹکا سا لگا اور میں یوں رک گیا جیسے دیوار سے ٹکرا گیا ہوں۔
کمرے کے درمیان میں ایک خون آلود لاش پڑی تھی۔ سامنے
کی دیوار کی کھڑکی کے قریب فرش پہ ایک چھوٹا سا ایمپلی فائر
اور سیٹ رکھا تھا اور اس کی تاریں کھڑکی سے باہر جا رہی
تھیں۔ یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ تاروں کا سلسلہ اس کمرے
کے مائیکروفون اور اسپیکر سے جا ملتا ہو گا جہاں سے میں نے پہلے
دشمنوں سے اور پھر محسن سے گفتگو کی تھی۔ میں نے جھک کر
لاش کی صورت کو قریب سے دیکھا۔ میرے لیے اس کی صورت اجنبی
تھی۔ یہ شاید انہی دونوں میں سے ایک تھا جو برقعے پہن کر مجھے
اغوا کرا لائے تھے۔ میں نے اس کے کپڑوں کی تلاشی لی مگر اس
کے پاس سے کسی قسم کا اسلحہ یا کاغذ کا ایک پرزہ تک برآمد
نہ ہوا۔
خطرے کی گھنٹی مجھے صاف سنائی دینے لگی تھی۔ وہ رابعہ
کو چھوڑ گئے اور محسن کو لے گئے۔ ایک خطرے کے مقابلے میں میرے
لیے ان دونوں کی زندگی کا کوئی سوال نہ تھا۔ دشمن جانتے تھے کہ
مجھے رابعہ کی طرح محسن کی دوستی بھی کتنی عزیز ہے۔ "تم کو ابھی
اندازہ نہیں ہے کہ تم خود بھی میرے ایک آدمی کے نشانے پر
بیٹھے ہو جسے تم نہیں دیکھ سکتے۔" ان الفاظ کی بازگشت ابھی
تک میرے ذہن میں موجود تھی۔ محسن نے اسے کھوکھلی دھمکی
سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا تھا۔ خلوص، وفا اور دوستی کے نام پر

جان کی بازی لگا دینے والا محسن بے خطر آتشِ نمرود میں کود گیا تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ مجھے اپنے انجام کی پروا نہیں ہے۔ شاید اس کی جگہ میں بھی یہی کرتا اور میرا انجام بھی یہی ہوتا۔ اس کی نظر چھپ کر حملہ کرنے والے کو نہ دیکھ سکی ہوگی۔ یہ میرے صبر، حوصلے اور استقامت کا ایک اور سخت ترین امتحان تھا۔ محسن دنیا میں میرا سب کچھ تھا۔ بھائی، دوست، ناصح، غمگسار، رازداں، اور راہ نما۔ وہ فوزیہ کا بھائی تھا اور شیروانی صاحب کا بیٹا تھا۔ جن کو میں بچپن سے انکل کہتا آیا تھا اور جو میرے محسن بھی تھے۔ میں اتنا کمینہ اور خود غرض نہیں تھا کہ جان سلامت لے کر رابعہ کے ساتھ نکل جاتا تو خدا کا شکر ہی ادا کرتا اور فکر کے سوا محسن کے لیے کچھ نہ کرتا۔ میں اس کے بدلے بخوشی اپنے آپ کو پیش کر سکتا تھا اور اس میں مبالغے کی کوئی بات نہیں۔ اب ایک طرف مجھے رابعہ کی فکر لاحق تھی جو اسٹور روم کے ٹھنڈے، سخت اور مٹی سے اٹے ہوئے فرش پر لیٹی تھی اور میری نظر میں اس کے لہو آلودہ پیرہن کا منظر تھا جو زخموں سے لالہ زار بدن پر ڈھائے جانے والے مظالم کی پوری تصویر پیش کر رہا تھا۔ کمرے سے باہر آ کے میں نے چند سیکنڈ تذبذب اور کشمکش میں گزارے پھر میں نے اوپر جا کے دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ گفتگو سے میں نے اندازہ کیا تھا کہ محسن چھت پر ہے اور کسی روشن دان سے دشمن کو نشانے پر رکھے ہوئے اور گروہ فرار تک دیکھنے کی پوزیشن میں ہے۔ رابعہ نہ جانے کب سے بے ہوش تھی اور اس کی سانس کی اور نبض کی رفتار دیکھ کے میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی حالت تشویشناک نہیں۔ اسے چند منٹ اور اسی حالت میں چھوڑا جا سکتا تھا۔ راہداری سے باہر آ کے میں نے اوپر جانے کا راستہ تلاش کیا۔ آر سی سی کے تختے کا اسٹرکچر مکمل تھا اور باقی کے مختصر سے عارضی تالاب کے بعد عمارت کے آخری گوشے میں نظر آ رہا تھا۔ وہیں سیمنٹ کی کرسی کے گرد سو بوریاں ایک دیوار کی طرح چنی ہوئی تھیں۔ میں اینٹوں اور سریوں کو پھلانگتا آگے بڑھا۔ ابھی میں نے زینے کا پہلا موڑ ہی کاٹا تھا کہ مجھے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ میرے قدم رک گئے اور میں نے پلٹ کر نیچے دیکھا لیکن کراہنے والا مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ چند سیکنڈ کے توقف کے بعد میں نے باقی ماندہ زینہ طے کیا اور اس چھت پر پہنچا جو لینٹر سے محروم سیمنٹ کی ناہموار کھردری سطح تھی اور جس میں جگہ جگہ عمارت کو سنبھالنے والے ستونوں کے سریے کسی صحرا میں اگے ہوئے کیکٹس لگتے تھے۔ چھت کے چاروں طرف چھجے کا دو فٹ چوڑا حاشیہ تھا لیکن روشن دان کوئی نہیں تھا۔ یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ ایک روشن دان تو خود

میں نے دیکھا تھا جس میں لاؤڈ اسپیکر فٹ تھا اور وہ کون سا تھا جس میں سے محسن ریوالور نکالے دشمن کو اسے اپنے احکامات کی تعمیل پر مجبور کر رہا تھا۔ میں نے لینٹر کے نیچے جھانکا اور اپنی عقل پر ماتم کیا۔ بھی اس لیے چھوڑتے ہیں کہ روشن دان اس کی رہیں۔ چھجے کے نیچے سے ہر کمرے کا کھلا روشن دان ایک خلا کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے وہ تار بھی نظر آئے جو ایک کھڑکی سے نکل کے اسٹور روم کے روشن دان تک پہنچ رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ کھڑکی اسی کمرے کی تھی جہاں ایک شخص کی لاش پڑی تھی۔ میں نے چند فٹ کے فاصلے سے اسی کمرے کے روشن دان سے جھانک کے دیکھنا چاہا۔ نیچے جھکتے ہی مجھے اس جگہ محسن کی موجودگی کے ثبوت ملے۔ ناہموار سطح پر تقریباً آدھی ہی جگہ صاف نظر آ رہی تھی جہاں ایک آدمی کا جسم پھیلا ہے۔ محسن اسی جگہ لیٹا تھا اور اس کے بعد سر جھکا کے کمرے کے روشن دان میں سے کمرے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ عملی تجربے سے میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ روشن دان میں سے مجھے وہ لاش نظر آ گئی جو کمرے کے وسط میں پڑی تھی۔ محسن کھلی چھت پر تھا۔ غالباً وہ روشن دان کی دیوار سے دشمن کو زد میں لیے بیٹھا رہا تھا۔ اس کی نظر میں بھی تھا چنانچہ اسے یقین تھا کہ کوئی اس تک نہیں پہنچ سکتا اور یہ بھی غلط نہ تھا کہ وہ اور گروہ کا منتظر رہ سکتا تھا لیکن محسن نے ایک امکان کو نظر انداز کر دیا تھا کہ زینے کے علاوہ بھی چھت پر چڑھنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ شاید کوئی پچھلی طرف سے رسی کا پھندا ستون کے اوپر نکلے ہوئے سریوں میں ڈال کر چھت پر جا پہنچا تھا اور لیٹے بیٹھے ہوئے محسن کو خبر بھی نہ ہو سکی۔ میں نے تقریباً دوڑتے ہوئے چھت کے دوسرے کنارے کا جائزہ لیا اور ایک جگہ مجھے وہ رسی نظر آ گئی جس کا پھندا پیچھے سے کونے والے ستون کے دو سریوں میں پھنس گیا تھا۔ رسی ابھی تک لٹکی ہوئی تھی لیکن محسن غائب تھا۔ اس کی بنیاد پر میں یہ نتیجہ اخذ کر سکتا تھا کہ محسن کو حملہ آور کے آنے کی خبر بہت دیر سے ہوئی اور اسے اٹھنے یا پلٹ کر وار کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

مزید وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔

میں زینے سے اترنے لگا تو مجھے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی اور اس مرتبہ میں آواز کی سمت کا تعین کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آواز سیمنٹ کی بوریوں سے پیچھے ہوتی ہوئی

کے پیچھے سے آئی تھی۔ آخری سیڑھی سے کود کر میں سیدھا وہاں گیا اور سیمنٹ کی بوریوں پر چڑھنے لگا۔ بوریوں کو اس طرح چنا گیا تھا کہ آخری گوشے کی دو دیواریں مل گئی تھیں اور پیچھے ایک تکونی خلا خالی رہ گئی تھی۔ جیومیٹری کی زبان میں دو دیواریں ایک زاویہ قائمہ بنانے والی مثلث کے دو ضلعے تھیں تو سیمنٹ کی بوریوں نے تیسرے ضلعے یعنی وتر کو مکمل کیا تھا۔ اوپر سے دیکھنے پر مجھے محسن نظر آیا جو ریت کے ڈھیر پر پڑا تھا۔ اس تکونی خالی جگہ کو غالباً ریت جمع رکھنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا اور محسن کو اوپر سے اچھال دیا گیا تھا لیکن ریت پر گرنے سے جو تقریباً چار فٹ کی اونچائی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسے چوٹ نہیں آئی تھی۔ میں نیچے کودنے ہی والا تھا کہ نامکمل عمارت کے اندر ہی سے کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پھر عمارت کے پچھلے حصے سے ایک نیلے رنگ کی ٹویوٹا کرولا کار گولی کی طرح نکلی اور کھلے گیٹ سے سیدھی گزر گئی۔ میں نے سیمنٹ کی بوریوں کے اوپر سے چھلانگ لگانے سے پہلے ریوالور نکال کے فائر کیا مگر گولی گیٹ سے ٹکرائی اور میرے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے کار کچے راستے پر دوڑتی ہوئی آتی وہ دور جا چکی تھی۔ میں اس کے پیچھے اٹھتی ہوئی دھول کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکا تھا۔ نمبر پلیٹ موجود ہی نہ تھی اور ہوتی بھی تو میں اتنے فاصلے سے نمبر نہیں پڑھ سکتا تھا۔ کار کے شیشوں پر پردے نہیں تھے مگر بند شیشوں کے اندر اجالا کم تھا چنانچہ میں کسی کی صورت کو شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے صرف اتنا احساس تھا کہ کار میں چار افراد تھے اور اب میں بے وقوفوں کی طرح ریوالور ہاتھ میں لیے سڑک پر پہنچ جانے والی کار کو تک رہا ہوں جو اوجھل ہو چکی تھی۔ چالاک مجرم مجھے دھوکا دے کر نکل گئے تھے اور میں محسن کو قصوروار سمجھ رہا تھا جس نے ان کو یہ مہلت فراہم کی۔ میں محسن کو دیکھنے کے لیے اوپر نہ جاتا تو انہیں خاموشی سے فرار کی تیاری مکمل کرکے فرار ہونے کا موقع کہاں ملتا۔ لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ رابعہ کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد میں محسن کی خبر نہ لیتا۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا اور اس کا ردِ عمل اتنا شدید تھا کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ "رابعہ!" میں چیخا اور اس دروازے میں سے طوفان کی طرح گزر گیا جو راہداری میں کھلتا تھا۔ آخری کمرے تک کا فاصلہ مجھے ایک جست کا فاصلہ لگا۔ لیکن دروازہ کھولتے ہی میری نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ میں نے آنکھیں مل کے دیکھا اور خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں گھبراہٹ اور پریشانی میں وہ دیکھ رہا ہوں

جو حقیقت نہیں ہے اور یہ میرا خوف ہے جو غیر یقینی اور بے بنیاد خیالات کا عکس بن کے سامنے آ گیا ہے مگر اس تلخ اور بے رحم سچائی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کمرے میں اب کوئی نہیں تھا۔ وہ رابعہ اور بیڈ سرو کو نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جیسے کسی نے آتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا ایسے ہی کسی نے ان کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ کسی نے دور سے ایک نیلے رنگ کی کار دیکھی بھی ہوگی تو وہ کیا بتائے گا کس کو شناخت کرے گا اور کیسے شناخت کرے گا؟

وہ اپنی موجودگی کے تمام آثار بھی مٹا گئے ہوں گے۔ بازار میں ملنے والے ایک عام قسم کے ایئر گن اور اسپیکر سے کسی کے جرم کی گواہی تو نہیں ملتی۔ فنگر پرنٹس اول تو ملیں گے نہیں اور ملے تو ان کا موازنہ کس کے فنگر پرنٹس سے کیا جائے گا؟ پولیس کے ریکارڈ پر دلاور، بیڈ سرو یا ڈی سلوا کے فنگر پرنٹ تو ہونے سے رہے۔ لاش بھی کسی لاوارث غیر معروف سے بدمعاش کی ثابت ہوگی جس کی خدمات معاوضے پر حاصل کی گئی ہوں گی۔ رپورٹ کے بغیر پولیس اس مکان میں آنے کی نہیں اور زیر تعمیر مکان پر چھاپہ مار کے انہیں کیا ملے گا۔ اصل مالک کے فرشتوں کو خبر تک نہ ہوگی کہ اس کے گھر میں کیا خونی ڈرامہ کھیلا جا چکا ہے۔ کسی ثبوت کے بغیر دلاور کے خلاف رپورٹ لکھوائی جا سکتی ہے نہ ڈی سلوا کے خلاف۔ وہ با اثر اور پیسے والے لوگ ہیں۔

محسن کی کوشش کے باوجود بازی مات ہو گئی تھی۔ میں شکست خوردہ اور تھکے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا واپس ہوا۔ میرا ذہن یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ محسن نے مداخلت کرکے اچھا کیا یا برا۔ اس کی نیک نیتی پر شک نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اس کے آ جانے سے وہ بات ختم ہو گئی تھی جو نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی تھی۔ رابعہ کی وجہ سے میں مجبور ہو گیا تھا کہ انتقام کی راہ چھوڑ کے ان کے جائز و ناجائز ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دوں اور اس خط کے بعد وہ جان بھی مانگیں تو نذر کر دوں۔ شاید وہ مجھ سے معاہدہ کر لیتے کہ میں ہسپتال جا کے رابعہ کی ماں سے اس خط کے بارے میں معلومات حاصل کروں اور اپنے وعدے کے مطابق کسی کو اطلاع دیے بغیر واپس آ کے خط ان کے حوالے کر دوں تو وہ بھی ایفائے عہد کرتے ہوئے مجھے رابعہ کے ساتھ نکل جانے دیں گے۔ میرا ان سے مقابلہ کرنے کا یا پولیس سے مدد حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا چنانچہ مجھے توقع تھی کہ خط مل جانے کے بعد وہ رابعہ کو یرغمال نہیں رکھیں گے کیونکہ اس سے انہیں مزید کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

www.paksociety.com

انہیں اس بات کا خطرہ تھا کہ ایک سینئر خاتون ایڈووکیٹ کی پراسرار گمشدگی کا مسئلہ کوئی سنگین صورت حال پیدا نہ کر دے لیکن اب بات پھر وہیں آ پہنچی تھی جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ وہ پھر رابعہ کو اغوا کر کے لے گئے تھے اور جاتے جاتے ایک لاش چھوڑ گئے تھے۔ محسن کے دامن پر ایک قتل کا داغ آ گیا تھا اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اب جلد از جلد یہاں سے نکل جانے میں ہی خیریت تھی۔ اس کے بعد ہمیں پھر انتظار کرنا تھا۔ انتظار کہ وہ ہمیں ایک موقع اور فراہم کریں۔ ہم سے پھر رابطہ قائم کریں اور ملاقات کے لیے سخت ترین شرائط پیش کریں اور زیادہ محفوظ مقام کا انتخاب کریں۔

میں گیٹ بند کر کے واپس آیا۔ محسن اسی طرح پڑا تھا۔ لیکن اس کے کراہنے اور ہلنے جلنے سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کچھ کچھ ہوش میں آنے لگا ہے۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کے سیمنٹ کی بوریوں کے اوپر رکھنے کی کوشش کی مگر دیوار بہت اونچی تھی۔ میں نے محسن کو پھر ریت پر لٹا دیا اور دوبارہ سیمنٹ کی بوریوں کی دیوار پر چڑھا۔ ایک قطار کی سب سے اوپر والی بوری کو دھکیل کر گرانے سے اس کی بلندی تقریباً ایک فٹ کم ہو گئی۔ چار بوریاں گرانے سے اس دیوار میں ایک کھڑکی سی بن گئی جو ریت کی سطح سے تقریباً چار فٹ اونچی تھی۔ دوسری کوشش آسان ثابت ہوئی اور میں محسن کو کندھے پر ڈال کے پانی کے ٹینک کے کنارے لے آیا جس کے اوپر پانی کا نلکا موجود تھا۔ کھولنے پر نلکے سے صاف پانی بہہ کر ٹینک میں گرنے لگا۔ میں نے محسن کے سر پر پانی ڈالا اور اسے چلو سے پانی پلانے کی کوشش بھی کی۔ اس کی بے ہوشی کا سبب سر کی چوٹ تھی اور پچھلی جانب ہاتھ لگانے سے بالوں کے درمیان ابھار سا محسوس ہوتا تھا لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ سر کی چوٹ سے خون نہیں نکلا تھا۔ عدم اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ اندرونی چوٹ سے دماغ کے متاثر ہونے کی صورت میں سنگین نتائج چوبیس گھنٹے میں کسی بھی وقت ظاہر ہو سکتے تھے۔

آہستہ آہستہ محسن نے آنکھیں کھولیں۔ وہ کچھ دیر مجھے اجنبی نظروں سے تکتا رہا۔ جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ "محسن!" میں نے کہا۔ "میں سکندر ہوں۔ پہچانا مجھے؟" میں نے اس کے گالوں کو تھپکا۔

محسن نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ "سکندر... بیوی یار..." اس نے کراہ کر اپنا سر تھام لیا۔

"ایسی باتیں مت کر۔ وہ لوگ جا چکے ہیں اور اب ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔" میں نے اسے سہارا دے کر بٹھا دیا۔

"وہ... رابعہ... رابعہ کہاں ہے..." اس نے لمبے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ وہ خود کو سنبھالنے کی بھرپور جدوجہد کر رہا تھا اور بظاہر صدمے کے سوا چوٹ کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔

"وہ بدمعاش پھر اسے لے گئے محسن!" میں نے کہا۔ "ان میں سے ایک کی لاش اندر پڑی ہے۔ تو نے مارا ہے اسے؟"

محسن نے پھر سر ہلایا۔ "میں اور کیا کرتا۔ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی... اتفاق ہے کہ اسے گولی لگ گئی۔"

"میں نے پیڈرو کو قابو کر لیا تھا۔" میں نے ہولے ہولے کراہتے ہوئے کہا۔ "مگر ذرا سی چوک ہو گئی۔ میں تجھے تلاش کرنے نکلا تھا۔ وہ عقبی حصے میں ڈی سلوا کی گاڑی لیے کھڑے تھے۔ وہ دوسری طرف سے پیڈرو اور رابعہ دونوں کو اٹھا کے لے گئے۔ انہوں نے رابعہ پر بہت تشدد کیا ہے محسن! اس کا سارا جسم لہولہان تھا۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور وہ بے ہوش تھی۔"

"تو نے انہیں روکنے کی کوشش بھی نہیں کی؟"

غصے سے سوگوار وقفے کے بعد محسن نے سر اٹھایا۔

"کی تھی۔ لیکن تنہا مجبور ہو گیا۔" میں نے افسوس سے کہا۔ "میں کچھ نہیں کر سکا۔"

"میں بھی کچھ نہیں کر سکا یار!" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "نہ جانے کس نے اچانک پیچھے سے آ کے مجھ پر وار کر دیا۔"

"وہ پچھلی طرف سے رسی کے سہارے اوپر آ گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "رسی ابھی تک موجود ہے۔"

اسی وقت کسی نے زور زور سے دروازہ بجانا شروع کر دیا۔ "سائیں... او سائیں! کی گل اے جی... اج بڑا..."

"یہ سائیں کون ہے؟" میں نے سرگوشی میں کہا۔ میرا خیال تھا جو الفاظ میں ڈھل گیا تھا۔

"سائیں شاید کوئی بدنصیب چوکیدار ہو گا۔" محسن نے اظہار خیال کیا۔

"اچھا تو ٹھہر۔ میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا اور رک گیا۔ میں نے پیڈرو کے کپڑے ابھی پہنے ہوئے تھے۔ اس لباس میں اعتبار قائم کرنا مشکل کام تھا۔ میں نے محسن کی طرف دیکھا اور وہ سمجھ گیا کہ میں کس تذبذب کا شکار ہوں۔ وہ کھڑا ہو گیا اور گیٹ تک گیا۔ اس عرصے میں باہر والا مسلسل سائیں کو پکارتا رہا اور دروازہ بند ملنے پر تعجب کا اظہار کرتا رہا۔ محسن نے گیٹ کھول کے باہر جھانکا۔

"کیا بات ہے بھئی! کس سے ملنے آئے ہو؟" محسن نے تحکمانہ اور وقار سے کہا۔ "کیا ہنگامہ ہے یہ؟"

"وہ... وہ جی میں سائیں چوکیدار..." ملاقاتی نے بوکھلا کر ادب اور معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ شہر گیا تھا جناب!"

"وہ ابھی واپس نہیں آیا ہے۔" محسن نے کہا۔

"اچھا جی معاف کرنا۔ میں نے سوچا تھا بڑے شاہ صاحب کی خیریت معلوم کر لوں۔ اللہ شفا دے۔ بڑی لمبی بیماری لگ گئی ہے ان کی جان کو۔" وہ بولا۔ "آپ کا کیا رشتہ ہے جی بڑے شاہ صاحب سے؟"

"میں ان کے بھائی کا لڑکا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "ابا آتے تھے۔ میں انہی کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"معاف کرنا جی! اتنی غیر حاضری ہوتی ہے۔ چھوٹے شاہ صاحب کو دیکھتے ہی رہتے ہیں یہاں۔ آپ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ میں یہیں رہتا ہوں۔" اس نے ہاتھ سے اپنے پیچھے اشارہ کیا۔ "اچھا جی سلام علیکم۔"

ہم اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ "گویا بڑے شاہ صاحب اس زیر تعمیر کوٹھی کے مالک ہیں۔" میں نے گیٹ بند کر کے کہا۔ "اور تعمیر کے رک جانے کا سبب ہے ان کی طویل علالت۔ ان کا بیٹا وقتاً فوقتاً آتا رہتا ہے۔"

"اور سائیں چوکیدار ہے۔ سائیں اگر اس کا نام رکھ گیا ہے تو وہ یقیناً عمر رسیدہ آدمی ہو گا۔" محسن نے کہا۔ "آدمی نمک حلال ہو گا کہ یہاں سے شہر جا کے مالک کی خیریت معلوم کرتا ہے۔"

"اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اکیلا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بیوی بچے ہوتے تو وہ اس خالی کوٹھی میں اپنے ساتھ رکھ سکتا تھا جس کی عقب باقی ہے۔ تاہم اس میں رہائش اختیار کی جا سکتی ہے۔ اب یہاں سے نکل چلو... صاحبزادے!" نہ جانے کیوں پہلی مرتبہ اس کو سالا اعظم کہتے ہوئے میری زبان رک گئی۔ میرے لاشعور پر غالب آ جانے والے اس خیال کو احساس محسن اب صرف میرا دوست رہ گیا ہے۔ یہ بہت بڑا بہت مقدس اور بہت مضبوط رشتہ تھا مگر اس احساس نے مجھے جھٹلا دیا کہ اب تو یہ میری منگیتر نہیں رہی، جواب میں میری شریک حیات نہیں ہو گی اور محسن اور میں سالے بہنوئی کے رشتے سے ایک نہیں ہوں گے۔ میں نے زبان کے لڑکھڑا جانے کے باوجود بات بنانی چاہی تھی لیکن یہ احساس مجھے بہرحال ہو گیا کہ بات بنی نہیں۔ محسن نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور ہم گیٹ سے باہر آ کے ویران کھیتوں کی پگڈنڈی جیسے راستے پر چلنے لگے۔

رکشا ہمیں سڑک پر پہنچتے ہی مل گیا اور چالیس منٹ بعد ہم رابعہ کی کوٹھی میں تھے۔ ہمارے آنے سے پہلے بھی اس گھر میں رہنے والوں کی زندگی نفسیاتی مسائل کے تانے بانے میں الجھی ہوئی تھی مگر یہ مسائل ہی تو زندگی کی جدوجہد میں کامیابی کی امنگ پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے آنے کے چند دن کی گھڑیوں سے سلوٹ تھی۔ آباد گھر ویران ہو گیا اور اب اس پر موت کے آسیب زدہ سایوں کا راج تھا۔ وہ عورت جس نے یہ گھر بنایا تھا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا اسپتال کے بستر پر پڑی تھی اور ان تمام واقعات سے بے خبر تھی جو اس کی بے ہوشی کے دوران میں پیش آئے۔ اگر وہ ہوش کی کیفیت میں اپنی بیٹی کے اغوا کی خبر سن لیتی یا اپنی آنکھوں سے اس کی وہ حالت دیکھ لیتی جو میں نے دیکھی تھی تو اس کا کلیجہ پھٹ جاتا اور کسی مسیحا کی چارہ گری سے پہلے ہی وہ دکھ کی آخری سرحد سے گزر جاتی۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ اب اگر خدا کو منظور ہوا تو اس کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی بیٹی بھی گھر واپس آ جائے گی۔ بصورت دیگر ہم تمام عمر اس دہرے قتل کا بار اپنے ضمیر پر لیے پھرتے رہیں گے اور اس احساس سے دامن نہ چھڑا سکیں گے کہ جو بھی ہوا ہماری وجہ سے ہوا۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں سہی مگر نہ جانے یہ ہمارے کون سے اعمال کی سزا تھی کہ ہم تباہی و بربادی کے نامہ بر ہوتے۔ میں نے محسن کو بستر پر ان کے قریب لٹا دیا۔ دشمنوں کی طرف سے دوسرا پیغام کسی بھی وقت موصول ہو سکتا تھا۔ میں نے واپسی پر اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ ان کے کسی آدمی نے ہمارا تعاقب ضرور کیا ہو گا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم کدھر جاتے ہیں اور محسن نے اتفاق کیا تھا مگر راستہ تو دور دور تک ہمارے پیچھے آتی ٹریفک تھی کہ کسی رکشا، ٹیکسی یا کار پر شبہ کرنا اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف تھا۔ نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے کے علاوہ اقبال روڈ سے ملنے والی سڑک پر ٹریفک بہت کم رہ گئی تھی مگر اس کے باوجود ایک ٹیکسی نے ہمیں اوور ٹیک کیا اور ایک رکشا تقریباً فرلانگ بھر کے فاصلے سے پیچھے چلتا رہا۔ دوسرا اس سے بھی سو گز پیچھے آیا اور جب ہم ریلوے کراسنگ کی طرف مڑ گئے تو پھر ریلوے اسٹیشن اور صدر کی طرف سے آنے اور جانے والی ٹریفک کے رش میں سب گڈ مڈ ہو گیا۔

"اگر انہوں نے ہمیں رابعہ کے گھر تک آتے دیکھ لیا ہو گا تو یہ خبر بہت جلد اوپر پہنچا دی جائے گی۔" میں نے اسپتال کا ٹیلیفون نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ "اور وہ ہم سے فون پر بات کریں گے انہیں علم ہو گا کہ گھر میں ہمارے سوا کوئی نہیں اور

www.paksociety.com

ہم پولیس اسٹیشن بھی نہیں گئے۔ وہ ہم سے ایک بار پھر سودا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"اور اب ہم سودا کرنے پر پہلے سے زیادہ مجبور ہوں گے" محسن نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ہیلو" میں نے کہا۔ "دیکھیے میں کارڈیالوجی میں ڈاکٹر ان ڈیوٹی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے آپریٹر کے جواب دیتے ہی کہا۔ "مجھے نہیں معلوم اس وقت جو ڈاکٹر موجود ہے اس کا نام کیا ہے۔"

"اس وقت تو بہت سے ڈاکٹر ڈیوٹی پر ہیں سر!" جھنگی آپریٹر نے بیزار لہجے میں کہا۔

"مجھے انٹینسیو کیئر یونٹ کا نمبر دے دو۔" میں نے جھلا کر کہا۔ "میں خود بات کروں گا۔"

خصوصی نگہداشت کے شعبے میں ریسیور فوراً اٹھا لیا گیا۔

"دیکھیے مجھے ایک خاتون کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ وہ مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ ـــــ کی والدہ ہیں۔ انہیں دل کے شدید دورے کے بعد داخل کر لیا گیا تھا۔ میں ان کے گھر سے بول رہا ہوں۔"

"آئی سی! میں ڈاکٹر قدائی بول رہا ہوں۔ کیا نام بتایا آپ نے اپنا؟"

"معذرت... میں نے ابھی تک نام نہیں بتایا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں سکندر بخت ہوں۔"

"تو مسٹر سکندر بخت!" ڈاکٹر قدائی نے کہا "مجھے آپ لہجے سے معقولیت پسند اور تعلیم یافتہ آدمی لگتے ہیں۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ صاف بات سننا پسند... میرا مطلب ہے صاف بات سننے کو ترجیح دیں گے۔ ٹھیک؟"

میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ "آپ کا مطلب ہے تو نہیں... کہ خدانخواستہ..."

"نہیں، وہ ابھی زندہ ہیں اور ہوش میں بھی ہیں۔" ڈاکٹر قدائی نے کہا۔ "لیکن آئی ایم سوری۔ ان کی حالت انتہائی نازک ہے۔ ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ غالباً یہ کہنا درست ہوگا کہ اب انہیں دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت ہے۔"

"ڈاکٹر قدائی!" میں نے چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "کیا میں... ہم ان سے بات کر سکتے ہیں؟"

"میں اجازت تو نہیں دے سکتا۔ اگر آپ خطرہ مول لینا چاہتے ہیں تو... ویل... اٹ از یور اون چانس۔" وہ بولا۔

"میں سمجھ گیا ڈاکٹر صاحب! لیکن انتہائی مجبوری کے باعث میں یہ درخواست کر رہا ہوں۔ دراصل یہ ایک ... کا معاملہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ان سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر نے مختصراً کہا۔ "آپ آ جائیے۔" ... ریسیور رکھ دیا۔

"تقدیر کی کیا ستم ظریفی ہے محسن!" میں نے ... کہا۔ "ماں مر رہی ہے اور بیٹی اس کو مرنے سے پہلے دیکھ بھی نہیں سکتی۔"

"قصور میرا ہے سکندر! اگر میں مداخلت نہ کرتا تو اس وقت تک وہ رابعہ کو رہا کر چکے ہوتے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تو نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ تیری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ تقدیر کے نوشتے ٹالے نہیں جا سکتے۔ اگر رابعہ کی ماں بتا دیتی کہ خط کہاں ہے اور ... حال میں وہ خط ان کو پہنچا دیتا تب بھی اس بات کی ضمانت کوئی نہیں تھی کہ وہ مجھے اور رابعہ کو چھوڑ دیتے۔ اگر وہ ... تب بھی بے ہوش کر کے ضرور ڈال جاتے تاکہ ہم ان کا ... ذکر سکیں اور پھر کون جانے ہم کتنی دیر وہیں کسمپرسی کے عالم میں پڑے رہتے۔ اگر ہمیں ہوش بھی آ جاتا تو ... آ جاتا تو پولیس کا لمبا چکر پڑ جاتا جس سے پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔ تیرے آ جانے سے یہ تو ہوا کہ ہم بخیر و عافیت ... آ گئے اور ان کو بھی اندازہ ہو گیا کہ ہم آسانی سے شکار ہونے والے نہیں ہیں۔"

"یہ اندازہ تو ان کو پہلے بھی تھا۔" محسن بولا۔ "لیکن اب رابعہ کی زندگی کو لاحق خطرات بہت بڑھ گئے ہیں۔"

"رابعہ کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "... ظلم و تشدد کر سکتے تھے سو کر چکے اور انہیں معلوم ہو گیا ... کو کچھ معلوم نہیں۔ اگر کچھ معلوم ہے تو رابعہ کی ماں کو۔ اب رابعہ کو اس خط کے حصول کا ذریعہ ضرور بنائیں گے لیکن ... قتل نہیں کریں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک سینئر ایڈووکیٹ کا قتل ایسا معاملہ نہیں ہوگا جسے دبایا جا سکے ... مجھے بھی قتل نہیں کریں گے۔ گھی اگر سیدھی انگلیوں سے نکل ... ہو تو بلا وجہ ٹیڑھی انگلیوں سے کیوں نکالا جائے۔ اگر ... مرضی سے یا دباؤ میں آ کر اپنے قانونی حق وراثت سے ... قبول کر لیتا ہوں یا ان کا پارٹنر بن کے لندن میں رہنا منظور کر لیتا ہوں تو ان کے لیے بھی قانونی مسائل پیدا ... ہوتے۔ بصورت دیگر ان کو ایک جھوٹا وارث پیدا ... گا اور اسے سچا ثابت کرنا ہوگا۔ یہ معاملہ اتنی آسانی ... نہیں ہوگا چنانچہ وہ مجھے مہلت دے رہے ہیں۔ وہ چاہتے

ہیں کہ میں اپنے اور ان کے فائدے کو دیکھتے ہوئے اس غیر قانونی کاروبار میں ان کا معاون مددگار بن جاؤں۔ وہ نفسیاتی طور پر دباؤ بڑھاتے جا رہے ہیں اور مجھ پر اپنی طاقت ـــــ کی دہشت بٹھا کے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں۔ میں اتنی آسانی سے خوف زدہ ہونے والا نہیں ـــ مجھے وہ قتل تو کر سکتے ہیں لیکن اپنی بات ماننے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ پہلا مسئلہ رابعہ کی رہائی کا ہے۔ میں اب ہسپتال جا رہا ہوں اور ان سے یہ پوچھتا ہوں کہ خط کو انہوں نے کہاں چھپا رکھا ہے۔ خدا ان کو زندگی کی اتنی مہلت دے اور اتنی قوت گویائی ضرور عطا کرے کہ وہ چند الفاظ بول کے اپنی بیٹی کو اس مصیبت سے نجات دلا سکیں جس کے ذمہ دار ہم ہیں۔ تو یہاں ہشیار رہ۔ وہ آج ہی پھر بات کریں گے۔ ان کو بتا دینا کہ میں کہاں اور کس کام سے گیا ہوں۔ جانے سے پہلے میں دیکھتا ہوں کچن میں چائے کافی اور کھانے پینے کے لیے کچھ ہے یا نہیں۔"

کچن میں سب کچھ تھا۔ میں نے الیکٹرک کیتل کا پلگ لگایا اور پلاسٹک ... والی کیبنٹ میں سے دو مگ نکالے۔ کافی کی شیشی تو مجھے فوراً نظر آ گئی۔ چینی کے لیے مجھے کئی ڈبے کھول کر دیکھنے پڑے۔ فریج میں انڈے تھے جو ابالے جا سکتے تھے یا فرائی کیے جا سکتے تھے مگر میں نے آدھی بچی ہوئی ڈبل روٹی اور مکھن کو ترجیح دی۔ مجھے الماری میں سے کریم بسکٹ کا ایک پیکٹ بھی مل گیا۔ یہ سب سامان میں نے ایک ٹرے میں سجایا اور محسن کے پاس آ گیا جو رابعہ کے بیڈ پر لیٹا تھا۔

"محسن!" میں نے کافی بناتے ہوئے اور بسکٹ کی نازک مخملیں مٹھاس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "تو وہاں کیسے آ پہنچا تھا؟ یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔"

"جب تو شالیمار سے آگے نکل گیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "تو ایک برقع پوش عورت نے تجھے ہاتھ دے کر روکنے کی کوشش کی تھی۔ کچھ یاد ہے؟ خمیدہ کمر بڑھیا تھی۔ ایک ٹوکری رکھے ہوئے تھی؟"

"ہاں" میں بھونچکا رہ گیا۔ "وہ تو تھا؟"

محسن ہنسا۔ "ہاں۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ وہ تجھے باغبانپورہ کی طرف نہیں لے جا سکتے۔ انجینئرنگ یونیورسٹی سے آگے کا تمام علاقہ آباد ہے لیکن دوسری طرف شالیمار باغ سے آگے پاکستان منٹ اور ... والی جانب آبادی کم ہونے لگتی ہے۔ میں تیرا تعاقب کر لیتا لیکن تعاقب آسان نہ تھا۔ وہ فوراً مجھے پہچان جاتے اور اپنا پروگرام بدل دیتے۔ رابعہ کی خاطر میں تیرا پیچھا کرتا بھی ناممکن تھا۔ جس میں بدلنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ اس وقت اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ تجھ سے میں نے اس لیے ذکر نہیں کیا کہ تو میرے ارادے کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرتا۔ رابعہ کے گھر کے بکھرے ہوئے کپڑوں کا اور سامان کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے ایک برقع بھی باہر پڑا دیکھا۔ سفید ٹوپی والا برقع جو پرانے وقتوں کی بڑی بی پہلے استعمال کرتی ہوں گی۔ تجھے رابعہ کی خادمہ کے ساتھ بھیجنے کا مقصد یہی تھا کہ دشمن جو تجھ پر نگاہ رکھے کھڑے ہوں تیرے پیچھے پیچھے صدر تک جائیں۔ ان کے لیے تشویش کی بات تو ہوتی کہ تو ایک برقع پوش کے ہمراہ کہاں روانہ ہو گیا ہے مگر تو نے ماسی کو اس کے گھر کے دروازے پر اتار کے واپسی اختیار کی ہوگی تو ان کی تشویش دور ہو گئی ہوگی۔ اسی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے رابعہ کی ماں کا برقع سر پر ڈالا اور گھر سے نکل آیا۔ اپنی چال ڈھال اور ہاتھوں کو چھپانے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ میں بوڑھی عورتوں کی طرح کمر جھکا کے چلوں۔ باہر آتے ہی مجھے رکشا مل گیا اور میں نے اس سے باغبانپورہ کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ میرا ارادہ تھا کہ شالیمار باغ سے ذرا آگے جا کے رکشا روک لوں گا اور اسے دس بیس روپے کا لالچ دے کر انتظار کرنے کو کہوں گا اور جب تیری ٹیکسی گزرے گی تو رکشا والے سے کہوں گا کہ چل بھائی رکشا والا مجھے کوئی خبطی بڑھیا سمجھتا۔ میری بلا سے۔ فکر کی بات یہ تھی کہ کہیں وہ میرے بنائے ہوئے زنانہ لہجے سے شک میں مبتلا نہ ہو جائے لیکن بوڑھی عورتوں کی آواز میں وہ نرمی لوچ اور شعلہ سا لپک جاتا ہے آواز تو دیکھو والی بات کہاں ہوتی ہے ـــ ابھی میں نے نہر کے کنارے کنارے جانے والی سڑک آدھی طے کی تھی کہ مجھے ایک رکشا سڑک کے کنارے رکا دکھائی دیا۔ رکشا میں کوئی سواری نہیں تھی اور رکشا والا حاجت رفع کرنے کی غرض سے نیچے اتر رہا تھا۔ میں نے اپنا رکشا روک لیا اور رکشا والے کو دس کا نوٹ دے کر چلتا کیا۔ وہ حیران تو ہوا مگر دو روپے کی جگہ دس روپے کا نوٹ مل جانے کی خوشی اس حیرت پر غالب آ گئی۔ وہ بھی کچھ اپنے کام سے کام رکھنے والا بھلا چنگا قسم کا شخص تھا ـــ اس نے دس کا نوٹ جیب میں رکھا اور روانہ ہو گیا۔ اس کے ایک فرلانگ دور چلے جانے کے بعد میں نے دیکھا تو سڑک سے نیچے اتر جانے والا رکشا والا تو ایک جھاڑی کی طرف منہ کیے بیٹھا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں رکشا اسٹارٹ کیا اور روانہ ہو گیا۔ رکشے والا ازار بند تھامے شور مچاتا رہ گیا مگر فوری طور پر اس کی مدد کرنے والا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ بعد میں کسی نے اسے لفٹ دی ہوگی یا کسی چنگ چی ...

www.paksociety.com

ڈرائیور نے اس کی فرمائش پوری کی تو وہ تھانے گیا جو گلی کی سڑک پر رکشا کو ان تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ تھانے والوں نے اسے گھنٹہ بھر تو بٹھائے رکھا ہو گا اور بڑی مشکل سے اس کی بات پر یقین کیا ہو گا کہ ایک بڑھیا اس کا رکشا لے گئی جو سفید لٹھے کا شٹل کاک برقع اوڑھے ہوئے تھی۔ رکشا میں بیٹھتے ہی میں نے برقع سر سے ہٹا کے پیچھے ڈال دیا اور الہ دین کی طرح یا غائب سے شاید جانے والی سڑک پر جا پہنچا۔ شاید ادھر سے آگے جہاں تو نے مجھے دیکھا تھا میں نے رکشا کو سڑک سے دور جا کے کھڑا کیا اور ادھر دیکھ کر موقع ملتے ہی پھر برقعے میں روپوش ہو گیا۔ ڈرائیور تو گھر سے کر نکلا تھا۔ جب میں نے تجھے ٹیکسی میں آتے دیکھا تو تجھے روکنا چاہا مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں بھی میرے جیسی ہی دو برقع پوش خواتین تشریف فرما ہیں۔ میرے لیے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ برقعے میں مسلح افراد ہیں۔ اس اتفاق پر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ دشمن بھی بھیس بدلنے کے لیے وہی طریقہ اختیار کریں گے جو میں نے کیا۔ اور ان کو بھی خیال تک نہ آیا ہو گا کہ انہی کی طرح میں برقعے میں چھپ کر ان کے پیچھے ان کے پیچھے لگ جاؤں گا۔ جب ٹیکسی گزر گئی تو میں پھر رکشا کی طرف بڑھا۔ مجھے معلوم نہیں اس وقت کوئی مجھے دیکھ رہا تھا یا نہیں۔ میں نے برقع پہن کے رکشا کو دوڑایا اور چند منٹ میں ٹیکسی کو جا لیا۔ جب ٹیکسی رکی تو میں سو گز پیچھے تھا۔ میں نے تجھے اترتے دونوں برقع پوشوں کے آگے جاتے دیکھا۔ بخدا یہ اتنا عجیب منظر تھا کہ کوئی شک کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک شریف آدمی مع شریف پردہ نشین بیبیوں کے ساتھ جا رہا ہے۔ اس میں عجیب بات کیا ہے مرد آگے ہی چلتے ہیں۔ یہ تو میں ہی جانتا تھا کہ مرد آگے چلنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور پیچھے برقعے کے اندر دو مرد ہیں جو ریوالور تانے ہوئے ہیں۔ ان کی چال ذرا بھی زنانہ نہیں تھی لیکن وہاں اس بات پر غور کرنے والا کون تھا اور جو تھا اس نے دیکھا نہیں۔ ادھر ادھر نگاہ ڈال کے میں نے جیسے ہی موقع پایا دوبارہ برقع اوڑھ کے میں اسی راستے پر ہو لیا جس پر تو گیا تھا۔ مجھے تھوڑی سی دیر اس لیے ہوئی کہ میں سو گز پیچھے تھا اور روانہ بھی اس وقت ہوا جب تو اس زیر تعمیر گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ اندر ایک شخص نے جو برقع پہن کے باہر آ رہا تھا مجھ سے پوچھا تھا کہ تم کون ہو مگر میں نے غرا کے کہا تمہارا باپ۔ تو وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے باہر نکل جانے کے بعد میں نے عمارت کا جائزہ لیا۔ وہ نیلی کار وہاں نہیں طرف نکل کے ذرا سی موجود تھی ___ کہا ہے کہ تو نے نہیں دیکھی تھی ___ نہ جانے کیوں سب مجھے خیال ___

آیا کہ اندر داخل ہونے کے بجائے میں چھت پر جا کے اندر اترنے کا راستہ تلاش کروں یا اوپر مورچہ قائم کروں تاکہ وہ رابعہ کو اور تجھے لے جانے کی کوشش کریں یا فرار ہونا چاہیں تو میں خود کو بچاتے ہوئے ان کا راستہ روک سکوں۔ اوپر سے اندر اترنے کا راستہ تو مجھے نہیں ملا مگر ایک روشن دان میں سے مجھے آوازیں سنائی دیں۔ میں نے جھک کر دیکھا اور تار کی کھڑکی سے نکل کر روشن دان تک پہنچتے دیکھا تو سب سمجھ گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا تو جانتا ہے۔"

اس سرگزشت کے دوران کئی بار مجھے بے اختیار ہنسی آئی اور صورت حال کی سنگینی کے باوجود ہم نسوانیت کے پردہ دار برقعے کے اس بے دردانہ استعمال پر محظوظ ہوتے رہے۔ کالی اور اسپرسات نے عمل کو نارمل کر دیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ رات کا کھانا ہمیں منان رضوی صاحب کے ساتھ کھانا تھا جس کے لیے انہوں نے ہمیں خصوصی تاکید کی تھی۔ اب رات ہو چکی تھی۔ ہم اب بھی پہنچ سکتے تھے اور دیر سے پہنچنے پر کوئی معقول سا عذر پیش کر کے معافی مانگ سکتے تھے مگر بات صرف کھانے کی نہیں تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ کھانے کے بعد جو نشست چلے گی وہ گھنٹوں برخاست نہیں ہو گی اور ہمارے پاس سب سے اہم مسئلہ وقت کا تھا۔ ٹیلیفون کال تو محسن بھی ریسیو کر سکتا تھا اور ایک "آخری موقع" فراہم کرنے والوں کو بتا سکتا تھا کہ سکندر بخت اسی کام سے ہسپتال گیا ہوا ہے لیکن دوسری طرف رابعہ کی ماں کی زندگی تمام ہو رہی تھی اور یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ میرے پہنچنے سے پہلے ان کی آخری سانسوں میں ہوش و حواس کس حد تک ان کا ساتھ دیں گے۔

میں ہسپتال پہنچا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر وقار الدین کے بارے میں دریافت کیا اور اپنا نام بتایا۔

"اوہ مائی گاڈ!" ڈاکٹر نے سر پہ ہاتھ مار کے کہا۔ "آپ نے اتنی دیر کیوں کی؟"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ "کیا ... ؟" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"نہیں نہیں، آپ آئیے میرے ساتھ۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "رابعہ کون ہے؟"

"رابعہ قادری ... وکیل۔" میں نے کہا۔ "میں نے آپ کو بتایا تھا۔"

"اوہ یس۔ مگر وہ خود کہاں ہیں؟" ڈاکٹر نے برآمدے میں میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "بیہوشی میں وہ بھی بار ان کو یاد کر چکی ہیں۔"

"بدقسمتی سے وہ ایک قانونی معاملے میں اپنے ذکر

کے لیے راولپنڈی چلی گئی ہیں۔" میں نے مجبوراً جھوٹ کا سہارا لیا۔ "میں نے فون تو کر دیا تھا لیکن ان کا کل سے پہلے آنا مشکل ہے۔"

ڈاکٹر نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اچھا ہوتا اگر آخری وقت بیٹی بھی ماں کے سرہانے ہوتی۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ رات نہیں کاٹ سکیں گی؟"

میں نے ناامیدی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر نے جواب میں نفی میں سر ہلایا۔ "تو جو ہو۔" اور انتہائی نگہداشت کا دروازہ کھولا۔ ہر بستر پر لیٹے ہوئے مریض صبح کے انتظار میں تھے لیکن کسی کو خبر نہ تھی کہ آنے والی صبح کا سورج کسے دیکھنا نصیب ہو گا اور اس کے بعد وہ کون سی ایسی ہی رات ہو گی جس کا سورج سب کے لیے طلوع ہو گا۔ سوائے ان کے۔ ہر بستر پر موت سایہ کیے تھی۔ ان کی زندگی مانگنے والوں کی عقیدت اور امید اور دعا زدہ خوابوں سے بے نیاز۔ میں دونوں جانب کھینچے ہوئے پردوں کے اندر آنے والے مناظر دیکھتا چلا گیا۔ خون، گلوکوز اور آکسیجن کی نالیاں اپنے اپنے آلات کا حل ہے جسم کے ساتھ ہر جگہ ایستادہ تھے۔ شاید اندر کی آنکھوں نے ان گنت مریضوں کو اٹھتے بیٹھتے بڑھتے جاتے دیکھا تھا۔ اس وارڈ میں آنے والوں میں بہت کم ہوتے تھے جو اپنے جسم و جان کا رشتہ سلامت لے جانے میں کامیاب ہوتے تھے۔ بیشتر کے صرف جسم لے جائے جاتے تھے۔

ڈاکٹر وقار الدین رک گیا۔ اس نے پردہ کھینچا اور برابر کر دیا۔ رابعہ کی ماں کا چہرہ ڈھلتے سنگ سی تھی۔ اس کے سرہانے کوئی بڑا ایک الیکٹرانک مشین کے گول ڈائل پر روشنی کا ایک نقطہ اوپر نیچے ہوتا ہوا بائیں سے دائیں جانب سفر کرتا ہوا دل کی کمزور اور معدوم ہوتی کارکردگی کی خبر دے رہا تھا۔ بیپ ... بیپ ... کی ہلکی سی آواز اس خبر کو نشر کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے چارٹ اور گراف دیکھے۔ نرس سے کچھ کہا اور رابعہ کی ماں کی آنکھوں کے بند پپوٹے کھول کر دیکھے۔

"مسٹر سکندر بخت! میں ایک رسک لے رہا ہوں۔ آپ مجھے اپنی مجبوری کی نوعیت بتا سکتے ہیں؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"میں تفصیل میں تو نہیں جا سکتا۔" میں نے تھوڑے تذبذب کے بعد ڈاکٹر کے سامنے جزوی حقیقت کا اعتراف کرنے کا فیصلہ کیا۔ "ان کے پاس ایک خط ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ انہوں نے اسے کہاں رکھا ہے۔ ہم پورے گھر میں ہر جگہ

تلاش کر چکے ہیں۔ اس خط سے ان کی اکلوتی بیٹی کے مستقبل کا تحفظ وابستہ ہے۔ کچھ لوگ اس خط کو حاصل کرنے کی ناکام کوشش کر چکے ہیں۔ اگر اس خط کے بارے میں کچھ بتائے بغیر ان کا انتقال ہو گیا تو رابعہ کے لیے بہت خطرات پیدا ہو جائیں گے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ خط انہوں نے کہیں چھپا رکھا ہے یا بصورت دیگر جلا دیا ہے تو یہ ہمارے لیے اطمینان کی بات ہو گی۔ پھر وہ خط جلا دیں گے۔ مگر خط ہمیں نہ مل سکا تو ممکن ہے دشمن اس کا سراغ لگا لیں۔"

"آپ کا ان سے اور مس رابعہ قادری سے کیا رشتہ ہے؟" ڈاکٹر وقار الدین نے یکلخت سوال کر دیا جو میری بات بڑے غور سے سن رہا تھا۔

اور تب مجھے وہ جھوٹ بولنا پڑا جو ناگزیر تھا۔ اس کے بغیر ڈاکٹر وقار الدین میری مدد کرنے کے لیے کوئی رسک لینے پر تیار نہ ہوتا۔ میں نے کہا۔ "میں مس رابعہ کا منگیتر ہوں اور فرسٹ کزن۔ چار سال انگلینڈ میں رہ کے ابھی کچھ عرصہ پہلے واپس آیا ہوں۔"

ڈاکٹر وقار الدین کو میرے جواب نے پوری طرح مطمئن کر دیا۔

"انگلینڈ میں کاروبار تھا آپ کا؟"

"نہیں، میں انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میرا بزنس یہیں ہے۔ ایم ڈی بیوڈی انجینئرنگ کمپلیکس۔"

"آپ کو اندیشہ ہے کہ وہ خط غلط لوگوں کے ہاتھ میں پڑ گیا تو وہ مس رابعہ قادری کو بلیک میل کریں گے؟" ڈاکٹر وقار الدین نے کہا۔ "وہ بہت سینئر ایڈووکیٹ ہیں۔ کیا پولیس ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی؟"

"بدقسمتی سے وہ وکیل ایک عورت بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور ہماری اخلاقی اقدار کے پیمانے مرد اور عورت کے لیے الگ الگ ہیں۔ عورت کی عزت شیشہ ہے جس میں بال بھی پڑ جائے تو نہیں جاتا۔ پھر ہمارے ملک کی زرد صحافت کے علمبردار ہیں جو خبر میں تشہیر کے سامان تلاش کرتے ہیں یا فراہم کرتے ہیں۔ رابعہ کے ساتھ ایک مسئلہ اس کی پریکٹس کے متاثر ہونے کا بھی ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" ڈاکٹر وقار الدین نے کہا۔ "اور اس لیے میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ اس خط میں کیا ہے۔ ہم سب انسان خطاکار ہیں اور کبھی کبھی حالات کی سازش کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔"

اسی وقت نرس اندر آئی اور اس نے ڈاکٹر کو ایک انجکشن تھما دیا۔

www.paksociety.com

"اب آپ اچھی طرح ایک بات سمجھ لیجیے مسٹر سکندر بخت!" اس نے انجکشن سرنج کو اوپر کی طرف کر کے پسٹن کو تھوڑا سا دبایا۔ "میں آپ کی مدد کر رہا ہوں، آپ پر اعتماد کرتے ہوئے۔ اس انجکشن کے بعد تین منٹ کے اندر اندر یہ ہوش میں آجائیں گی اور آپ سے چند منٹ باتیں کر سکیں گی یقینی ہوش و حواس۔ لیکن یہ چند منٹ کا وقفہ ان چند گھنٹوں کے بدلے ملے گا جن کے بعد خاتون کو ہر حال جینے کے حق سے دستبردار ہونا ہی تھا۔ میں ان کی نزع کی تکلیف کے چند گھنٹوں کو سمیٹ کر مختصر کر رہا ہوں۔ ایک مقصد کے حصول کے لیے۔"

"اور چند منٹ بعد؟" میں نے کہا۔ "ہوش کے اس وقفہ کے بعد؟"

"قوی خاتمہ۔" ڈاکٹر وردانی نے کہا۔ "انتخاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جلدی بولیے۔ اگر ان کی بیٹی صبح تک پہنچ سکتی ہیں اور یہ رسک لیے بغیر کام چل سکتا ہے تو اس انجکشن کی ضرورت نہیں۔"

وحشت اجل نے میری بے بسی پر قہقہہ لگایا "فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ وقت کا تعین تو بہت پہلے ہو چکا تھا مجھے روح قبض کرنے کا حکم تو بہت پہلے دیا جا چکا تھا۔ تم کیا سوچ رہے ہو۔ کیا زندگی اور موت تمہارے قبضۂ قدرت میں ہے؟"

"آل رائٹ۔" میں نے رابعہ کی ماں کی موت کے فرمان پر دستخط ثبت کر دیے۔ زندگی کے یہ چند بے مصرف لمحات اگر اس عورت کی اپنی بیٹی کی زندگی بچانے کے کام آ سکتے ہیں تو مضائقہ کیا۔ رابعہ کے لیے آخری وقت میں ماں کے طرف موجود ہونا تو بعید از قیاس ہے۔ شاید اولاد کو ... ماں کا یہ آخری نذرانہ ہے کہ اس کی روح کو سکون ملے۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگا دیا۔

"آپ اگر اکیلے میں بات کرنا چاہیں تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔" ڈاکٹر وردانی نے نرمی سے کہا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں آپ گواہ رہیں کہ میں نے آپ سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔"

چپ... چپ... چپ... ہر لمحہ صدا دیتا گزرتا گیا۔ دل اب بھی دھڑک رہا تھا۔ اس مشین نے بہت پہلے ایک نوزائیدہ بچے کے جسم میں خون پمپ کرنا شروع کیا تھا۔ اب اس کی مشینری پرانی اور ناقص ہو چکی تھی۔ ناقابلِ مرمت اور ناکارہ قرار دی جا چکی تھی۔ اب یہ مشین بند ہونے والی تھی۔ ایک بار میں نے اپنے دوست سے سنا تھا کہ اس کے باپ نے نیویارک سے ایک بحری جہاز خرید لیا ہے جو بمبئی ... کراچی آ رہا ہے جہاں گڈانی میں اسے توڑ کر ... جائے گا اور میں نے حیران ہو کے کہا تھا۔ اچھے بھلے جہاز کو توڑ دیا جائے گا۔ اس میں کون سی عقلمندی ہے ... میرے دوست نے مجھے سمجھایا تھا کہ عالمی قوانین کے مطابق ہر بحری جہاز کی ایک لائف ہوتی ہے۔ جب لائف پوری ہو جائے تو اس کا وجود ختم کر دیا جاتا ہے ... ابھی مزید دس سال تک یہ سفر کے قابل ہو۔ یہ دل بھی ایسا ہی ... تھا۔ اس کی لائف پوری ہو چکی تھی۔ یہ دل آخری ... کے لیے خون کو جسم کی شریانوں کے سفر پر روانہ کر چکا تھا ... بہت دور نہیں تھا جب یہ مشین رک جائے گی اور ہر زندہ جہاں ہو گا وہیں ٹھہر جائے گا۔

رابعہ کی ماں نے حرکت کی اور کراہی۔ ڈاکٹر ... آکسیجن ماسک ہٹا دیا۔ "اب آپ ان سے بات کر سکتے ہیں۔"

"آنٹی!" میں نے جھک کر کہا اور فرش پر گھٹنوں ... بیٹھ کے ان کے کانوں کے قریب اپنے منہ کو لے جا کر ... "دیکھیے... دیکھیے میں سکندر بخت ہوں...۔"

رابعہ کی ماں نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں ...

اس نے سرگوشی میں کہا۔ "رابعہ...۔"

"دیکھیے آنٹی! رابعہ آنے والی ہے۔" میں ...

"اس نے آپ کو ایک خط دیا تھا... وہ خط کہاں ہے ... سنا آپ نے، میں کیا کہہ رہا ہوں، جو آپ کو معلوم ہے ... کہاں ہے جو یاد کیجیے... مجھے بتائیے۔"

رابعہ کی ماں نے کرب میں سر کو ادھر سے ادھر ...

"رابعہ... میری بچی! اسے بلاؤ... رابعہ کو بلاؤ۔"

"رابعہ... رابعہ!" میں نے پکار کے کہا ...

"وہ باہر کھڑی ہے۔ دیکھو وہ بلا رہی ہیں ... بے آنٹی! آپ نے سنی اس کی آواز؟ ... ابھی آتی ہوں۔ اب مجھے بتائیے وہ خط..."

"رابعہ... یہ رابعہ کی ماں چلائی ... تھی۔ شکایت تھی اور مایوسی تھی۔ [illegible] باہر نکل آیا۔" ڈاکٹر وردانی آ... نے کہا۔ "ایک منٹ ..."

ڈاکٹر وردانی پردہ ہٹا کے نمودار ہوا۔ ... کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "نام اندر ہی ..."

"آئی نو۔" میں نے کہا۔ "پلیز میری تھوڑی سی ... آپ نے اتنا کچھ کیا ہے تو یہ بھی سہی۔ آپ جانتے ... یہاں نہیں ہے مگر وہ رابعہ کے سوا کسی کو کچھ ..."

"نہیں۔ کیا آپ کسی رابعہ کو لا سکتے ہیں؟"

"کسی رابعہ کو؟" ڈاکٹر وردانی نے مجھے غور سے دیکھا...

"واٹ ڈو یو مین؟"

"ہر لڑکی رابعہ ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "شاید اس وقت وہ جھوٹ اور سچ میں تمیز نہ کر سکیں گی۔"

"یہ صرف آپ کا خیال ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ پہچان جائے۔ آخری وقت میں اس سے جھوٹ بول کے اسے دھوکا دینے سے کیا فائدہ؟"

"واٹ از دی ... آف چانس؟" میں نے ڈاکٹر ہی کے الفاظ میں کہا۔ "میں یہ رسک لینا چاہتا ہوں۔ پلیز، کسی نرس یا کسی مریض کی وارث کوئی عورت یہاں آکر ایک جملہ بولنے پر تیار ہو جائے۔ وہ یہ جملہ ... وہ خط کہاں ہے؟"

ڈاکٹر خاموش کھڑا میری صورت دیکھتا رہا۔ "میں کسی نرس کو یہ حکم نہیں دے سکتا۔ تمہاری یہ مدد کر سکتا ہوں کہ تمہیں ایک لڑکی کے بارے میں بتا دوں۔" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "باہر برآمدے میں ایک لڑکی کھڑی ہے۔ وہ ... کے ساتھ ہے مگر اسے اندر آنے کی اجازت نہیں۔ وہ نیک دل لڑکی ہے۔ اس سے بات کر کے دیکھو۔ اگر وہ آ جائے تو مجھے اعتراض نہیں۔"

میں باہر بھاگا۔ وارڈ سے باہر نکلتے ہوئے میں نے پھر گھڑی دیکھی۔ چار منٹ گزر چکے تھے۔ وہ لڑکی برآمدے کے آخر میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ کچھ نروس ہو گئی۔

"خاتون! آپ میری مدد کر سکتی ہیں نا؟" میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

"جی ہاں جی؟" وہ بولی اور اس کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے متغیر ہوا۔ "وہ میرے والد ہیں۔"

"اندر ایک بوڑھی خاتون ہیں۔ میری والدہ ہیں۔" میں نے جھوٹ بولتے ... ان کا آخری وقت آ گیا ہے۔ صرف چار منٹ باقی ہیں اور وہ اپنی بیٹی کو یاد ... میں آپ کو انسانیت اور شرافت کا واسطہ دیتا ہوں ... ان سے صرف ایک بات کر لیجیے۔ ڈاکٹر وردانی اندر ... میں آپ کو بعد میں ساری بات بتا دوں گا۔ آپ ... صرف اتنا کہہ دیجیے کہ ماں، میں رابعہ ہوں۔ وہ پہچان نہیں سکیں گی۔ ان سے اتنا پوچھ لیجیے کہ وہ خط کہاں ... اس نے ... میں نے اس کا ہاتھ پکڑ ... تھی مگر میں اسے گھسیٹ کر لے گیا۔

اور اس نے معمولی سی کوشش کے بعد مزاحمت ترک کر دی۔ ... میرے چہرے پر پڑھی جا سکتی تھی اور اس نے پڑھ لی تھی۔

"ویری لیٹ۔" ڈاکٹر وردانی نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "سات منٹ ہو چکے ہیں۔"

میں نے پردہ ہٹایا اور اس اجنبی وحشت زدہ لڑکی کو رابعہ کی ماں کے بیڈ پر بٹھا دیا۔ "رابعہ آ گئی ہے۔ دیکھیے۔"

"امی! لڑکی نے میرے ساتھ جھک کر کہا۔ "میں آ گئی ہوں... آپ کی بیٹی رابعہ... مجھے بتائیے وہ خط کہاں ہے؟"

رابعہ کی ماں نے آنکھیں کھولیں۔ اب اس کی سانس اکھڑ چلی تھی۔ اس نے نظر جما کے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور اس کی کھلی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ آخری سانس جسم سے رخصت ہوئی۔ آخری جھوٹ رائیگاں گیا۔ دنیا کے تمام ماہرین جو الیکٹرانک آلات سے بال کی کھال نکال لیتے ہیں اور ذرے کا دل چیر کے دیکھ لیتے ہیں اور آدمی کے وجود میں یوں جھانک لیتے ہیں جیسے کھلی کھڑکی سے تاروں بھری رات کا ہر ستارہ دیکھا جا سکتا ہے۔ نفسیات داں، دنیا کے سارے علوم پر عبور رکھنے کا دعویٰ کرنے والے اس آخری لمحے میں یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ رابعہ کی ماں نے مرتے وقت اپنے مقابل کسے دیکھا تھا۔ رابعہ کو یا ایک اجنبی لڑکی کو جو رابعہ کا نام لے کر اسے دھوکا دینا چاہتی تھی۔ وہ لڑکی یکلخت اٹھی اور ہسٹریا کی کیفیت میں روتی ہوئی باہر بھاگ گئی۔

"آئی ایم سوری... کہ تم نے یہ سب کیا۔" ڈاکٹر وردانی نے کہا۔ "یہ جھوٹ کس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا؟"

میں نے اپنا سر بستر پہ ٹکا دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ "مجھے معاف کر دینا آنٹی! مجھے معاف کر دینا میرے معبود!"

"میں ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنا دیتا ہوں۔" ڈاکٹر وردانی نے کہا۔ "لاش تم لے جاؤ گے؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور ڈاکٹر کو پردے پار کر کے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ پانچ منٹ بعد جب وارڈ بوائے ایک اسٹریچر لیے نمودار ہوئے تب بھی میں اسی طرح بیٹھا تھا اور مجھے معلوم نہ تھا کہ میں رو رہا ہوں۔ انہوں نے رابعہ کی ماں کو بستر پر سے اٹھا کے اسٹریچر پر لٹایا اور بے آواز قدموں سے اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے لے گئے۔ میں خالی بستر پر نظریں جمائے کھڑا رہ گیا۔ میں نے رابعہ کی ماں کی زندگی کے آخری چند گھنٹوں کو سمیٹ کر چند منٹوں میں ختم کر دیا تھا۔ میں نے ایک عورت کو مرتے وقت دھوکا دینے کی کوشش کی

www.paksociety.com

تھی۔ میں نے ایک اجنبی اور بے گناہ لڑکی کو ایک ایسا جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیا تھا جس کا بوجھ وہ ہمیشہ اپنے ضمیر پر محسوس کرے گی۔ میں نے ایک شریف النفس ڈاکٹر کو خلافِ اصول دھوکہ دینے پر آمادہ کر لیا تھا اور احساسِ جرم و پشیمانی کے سوا کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ ایک نرس آ کے بستر کو ٹھیک کرنے لگی۔

"آپ کو ڈاکٹر درانی بلا رہے ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اپنا سامان ساتھ لیتے جایئے۔"

میں نے سر ہلایا اور آفس کی طرف چل پڑا۔ جب ایک گھنٹے کی کارروائی کے بعد ڈیتھ سرٹیفکیٹ لے کر باہر نکلا تو لاش ایمبولنس میں رکھی جا رہی تھی اور وہ اجنبی لڑکی اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ میں جھجکتے جھجکتے قدموں سے اس کی طرف گیا۔ "مجھے معاف کر دینا بہن! خدا نیتوں کا حال جانتا ہے۔ وہ میرے گناہ کی سزا تم کو نہیں دے گا۔" میں نے کہا۔ وہ اسی طرح بت بنی کھڑی خلاء میں دیکھتی رہی۔ میں آج بھی تصور میں ایک مجسم صورت کو دیکھتا ہوں۔ نہ جانے وہ لڑکی کب تک اس دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی رہی ہو گی۔ میں سوچتا ہوں، پتھر کی دیواروں نے اسے کب تک سہارا دیا ہو گا۔

ایمبولنس کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا مگر اسٹریچر لانے والے کچھ سوگوار اور کچھ پُرامید نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اوہ! مجھے بروقت خیال آ گیا اور میرا ہاتھ پرس نکالنے کے لیے جیب میں گیا۔ پرس میں ایک ایک سو کے دو نوٹ تھے اور سو کا ایک نوٹ تھا۔ میں نے رابعہ کی ماں کا ہینڈ بیگ کھولا جسے میں تھرماس اور ایک باسکٹ میں موجود دوسری چیزوں کے ساتھ ٹھنسا کے رکھا تھا۔ اس میں سے دس دس کے نوٹ نکالتے ہوئے مجھے اچانک کسی جانی پہچانی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے اسے نکال کے دیکھا۔ یہ وہی خط تھا۔ میں چند سیکنڈ ساکت و صامت کھڑا رہا۔ پھر میں نے دونوں اسٹریچر لانے والوں کو دس دس کا ایک ایک نوٹ دیا اور ایمبولنس میں آ کے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایک بار پہلے بھی میں نے رابعہ کے ساتھ آدھی رات کے بعد شہر کی ان ویران سڑکوں پر اسی ایمبولنس میں سفر کیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس روز ایمبولنس کا سائرن چلا چلا کے راستہ مانگ رہا تھا کیونکہ اسٹریچر میں ایک زندگی کے زیاں کا امکان تھا۔ اب سائرن خاموش تھا۔ اس خاموشی میں میرے ساتھ صرف میرے خیالات تھے۔ وہ خط میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر رابعہ کی ماں بقائمی ہوش و حواس بتا دیتی کہ خط اس کے ہینڈ بیگ میں ہے اور میں سب کے سامنے خط نکال لیتا تو کیا ہوتا۔ شاید میں فوراً اندر کے کاغذات بھی نکال کے دیکھتا اور جب ڈاکٹر درانی دیکھتا کہ اس لفافے میں سادہ کاغذ بھی نہیں تو وہ مجھے کیا سمجھتا؟ جھوٹا، دھوکے باز یا پاگل؟

لاش کو اتروانے کے بعد میں نے اور محسن نے اس نئی صورتِ حال پر غور کیا جس کی توقع ایک ٹیلیفون کال سے ہوئی تھی اور محسن نے جواب میں وہی کہہ دیا تھا جو بتایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم پھر رابطہ قائم کر لیں گے مگر اس بات کو دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اگر اب ان کا پیغام موصول ہو جاتا تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا جس میں ہماری پوزیشن عجیب تھی۔ ہم اب کفن دفن کے انتظامات کی ذمے داری قبول کر چکے تھے۔ ہمارا کام تھا کہ رابعہ کے اور اس کی ماں کے رشتے داروں کو اطلاع دیں۔ ان سے رابعہ کی ماں کے تعلقات اچھے تھے یا برے۔ یہ ممکن تھا کہ ان کو بتا کے کرا دیں لیکن ہمیں ان میں سے کسی کا نام پتہ معلوم نہ تھا۔

"ان کی ملازمہ کو خبر کرنی بھی ضروری ہے۔" محسن نے مندی سے کہا۔ "اس کی نظر میں ہم پہلے ہی مشتبہ ہیں۔"

"خصوصاً میں۔" میں نے کہا۔ "رابعہ کی ماں کو جب دل کا دورہ پڑا تھا رابعہ اس کے پاس موجود نہ تھی۔ میں اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا اور زبانی عقیدہ اپنی جگہ کہ زندگی اور موت خدا کے اختیار کی بات ہے، وہ موت کا یہی سبب بتائے گی کہ بڑی بیگم صاحبہ کو وقت پر ہسپتال نہیں پہنچایا گیا تھا ورنہ وہ بچ جاتیں۔"

"رابعہ کے تعلقات جہاں ہیں کس کس سے تھے؟"

بولا۔ "یہ بھی خادمہ ہی بتا سکتی ہے اور تم لے آئے۔ شاید اسے ایک آدھ رشتے دار کا گھر بھی معلوم ہو۔ آگے دوسروں کا پتہ معلوم ہو جائے گا۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن سوال کا کیا جواب دیں گے کہ رابعہ کہاں ہے؟ جھوٹ بولیں گے اور کیا سب ہمارے جھوٹ کو تسلیم کر لیں گے؟ رابعہ بہت بڑی وکیل ہے۔ اس کے ماتحت وکیل ان کو بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے علاوہ ہم پیشہ وکیلوں کو اطلاع دینی ہو گی۔ صبح نو بجے کورٹ کے بار روم میں یہ خبر پہنچ گئی تو وہ ہم سے پوچھیں گے کہ تدفین کس وقت ہو گی۔ ان میں سے بہت سے کر جنازے میں شرکت کے لیے آ جائیں گے۔ اس وقت رات کا ایک بجا ہے۔ اگر ہم صبح ہوتے ہی تدفین کی تیاری شروع کریں تب بھی دو پہر سے پہلے تدفین مشکل ہے۔

لوگوں سے پہلے تو ہمسائے آ جائیں گے۔ دوسرے سب لوگوں سے تو یہی کہا جا سکتا ہے جو ڈاکٹر درانی سے کہا تھا کہ رابعہ کسی کیس کے سلسلے میں راولپنڈی گئی ہے مگر اس کے ماتحت وکیل سمجھ جائیں گے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ان کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ انہیں ہر شریف آدمی مجرم نظر آتا ہے اور اگر انہیں شک ہو تو ان کے لیے پولیس کو بلا کے تفتیش کا چکر چلانا مشکل نہیں ہوتا۔ ہم پہلے ہی اتنے چکروں میں پڑے ہوئے ہیں کہ مزید چکروں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

"اگر ہم وکیلوں کو اطلاع ہی نہ دیں۔" محسن نے کہا۔ "یہ کہہ دیں کہ آخری رسوم میں خاندان کے افراد شریک تھے۔"

"خاندان کے افراد کا مسئلہ پھر بھی باقی رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر صبح سے پہلے پہلے ہم خط دے کر رابعہ کو لانے میں کامیاب ہو گئے پھر تو کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔ میں رابعہ کو اس کے کمرے میں سلا دوں گا۔ میں ڈاکٹر کو بلا کے بتا دوں گا کہ ابھی رابعہ کو ماں کی موت کا علم نہیں ہونا چاہیے اور بہتر یہی ہے کہ وہ سوتی رہے۔"

"بات آ گئی سمجھ میں۔" محسن نے اچانک کہا۔ "رابعہ اپنے کمرے میں سوتی رہے گی۔ ہم کسی کو اس کے کمرے میں نہیں جانے دیں گے کہ ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ رابعہ پر صدمے کا شدید اثر ہے۔"

میں کچھ دیر محسن کی بات سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ "لیکن رشتے دار خواتین یا اس پڑوس کی عورتیں یا خادمہ اگر کمرے میں جا کے صرف ایک نظر دیکھنے پر مصر ہوئیں تو کیا ہو گا؟"

"ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے دوسرے جھوٹ کا سہارا تو لینا ہی پڑتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور جھوٹ تو جھوٹ کہلاتا ہے، کیا بڑا کیا چھوٹا۔ ہم کمرے کا دروازہ کھول کے بھی دکھا سکتے ہیں لیکن دروازے سے دیکھنے والوں کو رابعہ واقعی سوتی ہوئی نظر آئے گی۔"

"اوہ شٹ۔" میں نے چونک کے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "وقت بہت کم ہے۔ ہمیں کام فوراً شروع کر دینا چاہیے۔"

رابعہ کے بیڈ روم کو سیٹ کر دینے کے بعد میں نے کسی فلم کے ہدایت کار کی طرح سوچنا شروع کیا جو غیر حقیقی مناظر کو اس انداز سے فلماتا ہے کہ دیکھنے والے اسے حقیقت سمجھ کے تسلیم کرتے ہیں جیسے باغ میں پانی دینے والے فوارے سے بارش کا منظر فلمانا۔ رابعہ کے بیڈ پر چادر کے نیچے تکیے اور دوسرے رکھ کے یہ تاثر دینا بہت آسان تھا کہ یہ رابعہ ہے جو لیٹی ہے۔ ہم یہ بھی دکھا سکتے تھے کہ وہ چادر تک منہ سر لپیٹے سو رہی ہے مگر میں نے زیادہ حقیقی تاثر دینے کا انتظام کیا۔ رابعہ کی وارڈروب میں سے میں نے ایک وگ نکالی۔ اس میں مصنوعی بالوں کے بنے بنائے جوڑے بھی رکھے تھے جو رابعہ نے میرے سامنے تو کبھی استعمال نہیں کیے تھے۔ شاید یہ اس دور کی یادگار تھے جب اس کی شادی ہوئی تھی۔ صرف شادی جسے خانہ آبادی ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہر سہاگن کی طرح وہ سولہ سنگھار کرتی ہو گی۔ بالوں کی آرائش کے انداز بدلتی ہو گی اور خود کو آئینے میں دیکھ کے اپنے حسن کی قوتِ تسخیر پر غرور کرتی ہو گی اور اپنے خیالوں، خوابوں اور تصورات کا عکس دیکھ کے شرم و حیا سے اس کا چہرہ گلنار ہو جاتا ہو گا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!
مگر سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

میں نے ایک مردانہ تکیے پر لمبے سیاہ چمکیلے بالوں کی وگ کو پھیلایا۔ پھر تکیے پر چادر کے اوپر وگ کے نیچے ایک جوڑا رکھا اور چادر کا کونا تھوڑا سا آگے کھسکایا۔ پھر میں نے دروازے کے قریب جا کے دیکھا۔ محسن نے تائید میں سر ہلایا۔ تاثر مکمل تھا۔ دن میں ہمارے پردے برابر ہوں گے اور ٹیبل لیمپ بھی آف ہو گا تو کمرے کا دروازہ کھول کے اندر آنے والے کو بھی یہی نظر آئے گا کہ رابعہ کروٹ لیے اور منہ دیوار کی طرف کیے سو رہی ہے۔ کیا کہا تھا امیر خسرو نے؟ گوری سووے سیج پہ مکھ پہ ڈالے کیس۔ چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چوندیس۔ رابعہ اٹھ بیٹھی۔ یہ سب نظر کا دھوکا ہے۔ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔ رابعہ نہیں ہے۔ یہ سب دامِ خیال ہے اور میں نے کہا۔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔

محسن نے میرا کندھا پکڑ کے ہلایا۔ "کس سوچ میں پڑ گیا ہے سکندر! وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔"

میں چونکا۔ "ہاں۔" میں نے کہا۔ "ہاں۔ ہم سب کے پاس وقت نہیں ہے۔ نہ جینے کا نہ مرنے کا۔"

محسن نے فائنل ٹچ یہ دیے تھے کہ رابعہ کی ایک ساڑھی اور بلاؤز بیڈ کے قریب کرسی پر یوں ڈال دیے تھے جیسے سونے سے پہلے رابعہ نے اسی لباس کو بدلا تھا۔ بیڈ کی دوسری جانب سائیڈ ٹیبل سے میچ کرتے ہوئے سینڈل رکھ دیے تھے جو دروازے میں سے داخل ہونے والے کو سامنے نظر آ جاتے تھے۔ بیڈ کے سرہانے ٹیبل لیمپ کے ساتھ ہی ایک ہینڈ بیگ رکھا تھا اور کلائی کی ایک گھڑی رکھی تھی۔ یہ سب کچھ محسن نے وارڈروب میں سے نکالا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے باہر کھینچ لیا۔

www.paksociety.com

"میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ یہ ڈرامہ چل جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "اس وقت رات کا ایک بجا ہے۔ اگر انہوں نے چھ گھنٹے کے اندر اندر رابعہ کو واپس کر دیا تو ہم خیالی رابعہ کی جگہ حقیقی رابعہ کو سُلا دیں گے۔ باقی انتظامات اپنے جی ہی گے یعنی ہم رابعہ سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں دیں گے اور رابعہ کو بھی معلوم نہیں ہونے دیں گے کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔"

"وہ بیٹی کو رخصت کرنے کے لیے زندہ تھی۔" میں نے کہا۔ میرا موڈ سخت قنوطی ہو رہا تھا۔ "اور اب بیٹی زندہ ہے، ماں رخصت ہو رہی ہے۔"

"یہ تقدیر کے کھیل ہیں سکندر!" محسن نے کہا۔ "خدا جانتا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اور کر رہے ہیں، خلوص نیک نیتی اور راستی کے ساتھ کر رہے ہیں۔"

"رابعہ مجھے معاف کر دے گی محسن؟" میں نے کسی بچے کی طرح سوال کیا جس سے نادانستگی میں کوئی سنگین جرم سرزد ہو گیا ہو۔

"نہیں۔" محسن بولا۔ "معاف تو اسے کیا جاتا ہے جس پر کوئی الزام ہو۔ کیا تو نے ابھی تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ وہ تجھ سے محبت کرتی ہے اور وہ تیری خاطر دنیا کو الزام تو دے سکتی ہے مگر ساری دنیا کے کہنے سے بھی تجھے موردِ الزام نہیں سمجھ سکتی۔"

میں ڈرائنگ روم کی طرف جاتے جاتے پلٹ گیا ... میں ماں کے کمرے کی طرف چلنے لگا جہاں اس کا جسدِ خاکی اپنے اور رابعہ کے اور سارے جہاں کے اندیشوں سے بے نیاز "انتظارِ سفر" میں تھا۔ میں نے محسن کی آواز سنی جس نے کہا تھا کہ وہ کچن سے کافی بنا کے لا رہا ہے اور میں ٹیلیفون کا خیال رکھوں۔ پُر آسیب ماحول کی کشیدگی نے مجھے ذہنی و جسمانی طور پر بڑی طرح تھکا دیا تھا۔ میں ایک کرسی پر گر پڑا اور اپنے پیر دراز کر کے دوسری کرسی پر رکھ لیے۔ سر سے پیر تک سفید چادر میں چھپی ہوئی لاش میرے بائیں ہاتھ پر تھی اور ٹیلی فون دائیں جانب اسٹینڈ پر رکھا تھا۔ دونوں کی خاموشی کا انداز ایک جیسا اعصاب شکن تھا۔ کمرے کا سناٹا اتنا بوجھل تھا اور میں اپنے خیالات میں اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ گھنٹی بجی تو میں اچھل پڑا۔ رابعہ کا تصور ایک آندھی میں ڈھل گیا اور میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو۔" میں نے کہا اور اس وقت مجھے اپنی آواز بھی اجنبی لگی۔

"دیکھیے، مجھے سکندر بخت سے بات کرنی ہے۔" ایک عورت نے کہا۔ "کیا وہ یہاں ہیں؟"

میں نے ریسیور کو ہٹا کے غور سے دیکھا حالانکہ اس میں کچھ ... کا کوئی قصور نہیں تھا۔ "میں ... میں بول رہا ہوں۔"

"سکندر! میں نے پہلے شاہین رضوی صاحب کو فون کیا تھا۔ انہوں نے کہا وہ تو غائب ہے۔ رات کے کھانے کا وعدہ کر کے گیا تھا مگر آیا نہیں۔ پھر انہوں نے یہ فون نمبر دیا۔"

"اس وقت ایسی کون سی ضروری بات کرنی تھی آپ کو؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "آدھی رات کو...؟"

"وہ بات ایسی ہی تھی سکندر کہ میں تیرے انکل کے سامنے کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس وقت سو چکے ہیں۔ مجھے... مجھے محسن سے معلوم ہوا تھا کہ... کہ تو... تجھ کو رشتہ منظور نہیں۔" شیرازی صاحب کی بیگم نے کہا۔ "... بہت دکھ کا احساس ہوتا تھا ... جانتا تھا کہ کیسے ... میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا ... تیرے انکل کو معلوم ہو جاتا تو بہت برا ہوتا۔ وہ بلڈ پریشر کے مریض ہو گئے ہیں۔" میں نے محسن سے کہا ایسا کیسے ہو سکتا ہے ...

میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا۔ میرا نفس ... میں دل زدہ اور پشیمان رابعہ کی ماں کے بے جان جسم کے سامنے مجرم بنا بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ نہ جانے اس وقت رابعہ پر کیا بیت رہی ہوگی، وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ میرے لیے یہ خیال ہی محال بلکہ ناممکن تھا کہ ایسے وقت میں ... کے فاصلے سے ایک آواز میرے دل کے ان زخموں پر انگارے بھرنے آ جائے گی جن کی کسک کو بدلے ہوئے حالات اور وقت نے دبا رکھا تھا۔ مجھے ایک جنازہ اٹھانے سے پہلے اپنی ازدواجی زندگی کے مستقبل کا فیصلہ کرنا ہوگا اور ... محبت کو دفن کرنا ہوگا جسے میں نے خود اپنے ہاتھوں موت کی نیند سُلا دیا تھا۔

"بولو سکندر! کیا یہ سچ ہے؟" فوزیہ کا چہرہ ... میں سولھویں رات کے چاند کی طرح ابھرا ... اجالے سے بھرے ہوئے دکھتا ہوا۔ پھر اس کی جگہ رابعہ کی صورت نے لے لی۔ "بولو سکندر! کیا یہ سچ نہیں ہے ... تم مجھے چاہتے ہو نا؟"

"نہیں سکندر! تم مجھ سے محبت کرتے تھے، تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور کرتے رہو گے۔" فوزیہ نے ...

"سکندر! کہو وہ اس لڑکی سے ... صرف ... تھا۔" رابعہ نے ...

"یہ جھوٹ ہے۔ سکندر اور میں بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔" فوزیہ کا چہرہ اب بھی ... اعتماد تھا۔

"سچ یہ بھی ہے کہ میں نے تم سے پہلے سکندر کو چاہا ..."

رابعہ نے اس کی دلیل مسترد کر دی ہے۔

"وہ بیٹے کیوں نہیں ہو سکتے! کون ہے یہ رابعہ؟" فوزیہ کی ماں نے کہا۔ "کیا تو واقعی اس سے محبت کرنے لگا ہے بیٹے؟"

"جی۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں واقعی اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔ میں کہہ دوں گی میں اپنی بیٹی کی شادی سکندر سے نہیں کرنا چاہتی..."

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ کہنے سننے کو اب کچھ نہیں رہا تھا۔ میرے دل پر رکھا ہوا سنگِ گراں ایک کوہِ گراں میں بدل گیا۔ مجھے احساس تھا کہ میں نے ایک معصوم سیرت، محبت کی ... پر ایمان رکھنے والی اور اعتماد کے رشتوں کا دامن تھامے اپنے خوابوں کے ہفت رنگ آسمان پر اڑنے والی لڑکی سے اس کا سب کچھ چھین لیا ہے۔ اس کے خوابوں کا شیش محل چکنا چور ہو گیا ہے جس میں وہ خود کو سارے زمانے کی دسترس سے دور، محبت کے سایۂ تحفظ میں تمام اندیشوں سے بے نیاز سمجھتی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے صرف اس ظلم کا احساس تھا جو اس پر ہوا۔ مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میں نے جھوٹ ... سچ کیا ہے جو وقت اور حالات کے بدلتے ... بن جاتے۔ پھر کیا ازلی و ابدی سچائی کچھ نہیں؟ کہیں نہیں ... ایک رات میں سچ اور جھوٹ کا مفہوم کتنی بار بدلا تھا ... جھوٹ سچ تھا۔ سچائی کو کس نے پہچانا ہے۔ اگر تم ... میں نے محسوس کیا ... انتشار مجھے پاگل کر دے گا۔

"کس کا فون تھا؟" محسن نے کافی کے دو مگ سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"رانگ نمبر۔" میں نے جیسے زخم ... کی طرح کہا۔

"... رانگ نمبر ... رانگ نمبر تھا۔"

"پھر تو کیا باتیں کر رہا تھا اتنی دیر تک؟" محسن نے ... کہا۔

"کچھ نہیں، دامن جھاڑ رہا تھا۔" میں نے کہا اور کافی کا ... ارادوں کو کامیاب کہوں یا کس حقیقت کو ... خواب کہوں ... سر ... کو اب کچھ بھی نہیں رہا۔

ایک بار پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اس ... دیکھا جس نے فاصلوں کو بے جان کر دیا تھا ... کو لازوال کر دیا تھا۔ جو محبتوں کا قاتل تھا اور دلوں میں نفرتوں کا زہر گھولتا تھا۔ جو نحوست کی زبان تھا اور اجل کی آواز تھا۔ جس نے مقدس رشتوں کو قتل کیا تھا اور خواب سے خوبصورت جذبوں کو بے رحم حقائق کی لحد میں اتار دیا تھا۔ مگر یہ سب میری اپنی ذہنی کیفیت کا عکس تھا۔ کیا اسی ٹیلی فون پر لوگ اظہارِ محبت نہیں کرتے اور دائمی رفاقتوں کے عہد و پیمان نہیں کرتے؟ خوشیوں کے سندیسے نہیں دیتے۔ امید، حوصلہ اور اعتماد عطا کرنے والے الفاظ نہیں سنتے اور دور ہو کے بھی اپنوں کے قریب نہیں رہتے؟ ریسیور میں نے اٹھایا تھا لیکن مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"سکندر!" محسن نے مجھے جھنجھوڑ کے کہا۔ "کیا ہو گیا ہے تجھے؟ ... بات کر ... رہے ہیں۔"

میں چونکا تو کرسی کے بازو پر رکھا ہوا کافی کا مگ نیچے گرا اور ٹوٹ گیا۔ "ہیلو۔" میں نے میکانکی انداز میں کہا۔

"دیکھو سکندر بخت!" ایک مردانہ بھاری بھرکم آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ "میں نے پہلے بھی فون کیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "مطلب کی بات کرو۔"

"مطلب کی بات کرنے سے پہلے تعزیت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے رابعہ کی ماں کی موت کا افسوس ہے۔"

"اچھا!" میں نے کہا۔ "وہ کیوں؟ تم تو رابعہ کو بھی موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے ہو۔"

"نہیں! ہم یہ بالکل نہیں چاہتے۔" وہ بولا۔ "اگر ہم ایسا چاہتے تو تمہیں رابعہ کی جگہ اس کی لاش ملتی اور ہم نہ ملتے۔ ہم ایک آخری موقع دینا چاہتے ہیں۔ ہم سے سودا کر لو۔ صبح ہونے میں ابھی دیر ہے۔ اگر وہ خط ہم تک پہنچ جاتے تو رابعہ اپنی ماں کا آخری دیدار کرنے کے لیے پہنچ جائے گی۔"

"خط میرے پاس ہے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ کہاں ہے؟"

"رابعہ ہمارے پاس ہے۔" وہ بولا۔ "تم خط لے کر آ جاؤ اور اسے لے جاؤ۔ لیکن اپنے اس بے وقوف دوست سے کہو کہ ... ٹانگ اڑا کے تمہارے اور رابعہ کے لیے مشکلات پیدا کرے۔ ہمارا اس سے کوئی جھگڑا نہیں۔ وہ خودکشی پر کیوں کمربستہ ہے؟"

"وہ مداخلت نہیں کرے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ میرا وعدہ ہے اور یہ وعدہ میں رابعہ کی ماں کی لاش کے سامنے بیٹھ کے کر رہا ہوں۔ اگر تم میں ذرا سی بھی شرافت اور انسانیت ہے تو..."

"سکندر بخت! ڈائیلاگ مت بولو۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ "یہ عقل کا سودا ہے، جذبات کا نہیں۔ خط تمہیں مل گیا ہے تو دیر مت کرو۔ اکیلے خالی ہاتھ اور پیدل روانہ ہو جاؤ۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر۔ راستہ وہی ہوگا۔ ہم تمہیں پک ... کر لیں گے۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے..."

www.paksociety.com

"حفاظت کسی بات کی نہیں دی جا سکتی۔ جیسے خیرات اپنی مرضی سے نہیں ملتی۔" اس نے کہا اور فون بند ہو گیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں رابعہ کو لینے جا رہا ہوں محسن۔" میں نے جیب سے پیڈ وہ کاغذ اور نکال کے اس کے حوالے کیا۔ "میرے قریب مت آنا۔" پھر میں باہر نکل آیا۔ سڑک سنسان تھی اور دور دور تک میرے سوا کوئی راہ گیر نہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ذرا بھی نروس نہیں ہوں اور بالکل خوف زدہ نہیں ہوں۔ مجھے کسی خطرے کے وجود کا احساس نہیں اور یہ فکر نہیں کہ میرے بڑھتے ہوئے قدم مجھے کس منزل پر پہنچا دیں گے۔ جال پھیلانے والے بہت ہوشیار شکاری تھے۔ اور انہیں اپنی ذہانت اور طاقت پر ناز تھا تو بجا تھا۔ میں جانتے بوجھتے شکار ہونے کے لیے جا رہا تھا اور ان کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہونے کے خیال سے قطعی پریشان نہیں تھا۔ اس اطمینان کی وجہ بھی مجھے معلوم تھی۔ اگر دشمنوں نے خط لینے کے بعد مجھے اور رابعہ کو قتل کر کے نہر میں پھینک دیا تو نہ ہم ہوں گے نہ غم ہوگا۔ ہمارے ساتھ دنیا چلی جائے گی اور ہمارے بغیر جو چاہے کرے۔ بصورت دیگر انہوں نے وہ منحوس خط لے کر رابعہ کو واقعی آزاد کر دیا تو یہ میری کامیابی ہوگی، ناکامی نہیں۔

میں کراؤن سینما کے سامنے سے گزرا اور دائیں طرف گھوم کے سڑک کے کنارے کنارے چلتا گیا۔ ایک سگریٹ سے دوسری سگریٹ جلاتا گیا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے خیالات میں کھویا ہوا قدم بڑھاتا گیا۔ ریلوے کراسنگ کے بعد نہر آ گئی جس کا خاموش گدلا پانی آہستہ آہستہ دونوں کناروں کی قید میں سفر کر رہا تھا۔ اس میں لہو کی سرخی تھی جسے صرف میری نگاہ دیکھ سکتی تھی۔ ایک رات اس کے دوسرے کنارے پر رابعہ مجھے لینے آئی تھی اور اس وقت میں لہولہان تھا۔ اب میں رابعہ کو لینے آیا تھا اور میرے تصور میں اس کا وہی لہو سے لالہ زار بدن تھا جسے میں نے ایک قبر خانے کے اندھیرے میں فرش خاک پر سے اٹھایا تھا۔ وقت کی بساط الٹ گئی تھی۔

میرے سامنے دور سے ایک کار کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں روشنی تیزی سے میری طرف آئی۔ میں رک کر انتظار کرنے لگا مگر کار سیدھی نکل گئی۔ میں کچھ دیر اندھیرے کو گھورتا رہا اور پھر چل پڑا۔ دوسری بار ایک اور کار کی روشنی میرے پیچھے جھلملائی میں نے گھوم کر ایک نظر دیکھا لیکن میرے قدم نہیں رکے۔ یہ کار بھی میرے پاس سے گولی کی طرح گزر گئی مگر جب پچاس گز دور جا کے کار نے زبردست بریک لگائے تو مجھے یقین آیا کہ یہی کار ہے جو پہلی بار سامنے سے آئی تھی۔ کار کی پچھلی والی … روشن ہوئیں اور کار تیزی سے ریورس گیئر میں میری طرف … چند سیکنڈ بعد کار کے رکتے ہی اس کا پچھلا دروازہ کھلا … ایک شخص نے پیچھے ہاتھ کے دروازہ تھام لیا۔ وہ شخص … کا چیلا لگتا تھا۔ اس نے چست پتلون اور بنیان کے ساتھ … جوتے پہن رکھے تھے اور اس کے منہ پر سیاہ نقاب … میں بلا تامل بیٹھ گیا۔ سیٹ پر دوسرا بھی ویسا ہی سیاہ پوش … لگا بیٹھا تھا۔

دروازہ کھولتے ہی کار کے اندر کوئی لائٹ نہیں … غالباً اس کی سیلنگ لائٹ کا کنکشن نکال دیا گیا تھا۔ … پوش کے بیٹھتے ہی کار روانہ ہو گئی۔ مجھے کار کی اگلی … بھی بالکل ایسی جیسے کالی مٹی کے مجسمے رکھے دکھائی دیے … سب کے مسلح ہونے کے بارے میں مجھے قطعی کوئی شبہ … "خط لائے ہو؟" میرے دائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے … پوش نے کہا۔

"ہاں۔" میں نے کہا اور جیب کے اندر ہاتھ ڈالا … طرف بیٹھے ہوئے سیاہ پوش نے ایک تیز دھار والا … سا خنجر میری پسلیوں کے درمیان دل کے مقام پر … کے ہاتھ کا ذرا سا دباؤ خنجر کو میرے دل میں پیوست … تھا۔ اس شخص کو لفافہ دے دیا گیا جو آگے ڈرائیور کے ساتھ … پر بیٹھا تھا۔ اس نے کھولے بغیر لفافے کو ڈیش بورڈ … رکھ دیا۔ کار تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑتی رہی۔

"تم دیکھو گے نہیں کہ یہ وہی لفافہ اور خط ہے…" میں نے کہا۔

"دیکھیں گے۔" اس شخص نے میری بات کاٹ … "تمہاری موجودگی میں دیکھیں گے مگر یہاں کیا دکھائی … نظر آئے گا یہاں؟"

وہ جانتے تھے کہ لفافے میں سادہ کاغذ … پر لکھی ہوئی تحریر نظر نہیں آتی۔

دائیں جانب بیٹھے ہوئے سیاہ پوش نے … اور ایک سیاہ کپڑا نکالا۔ "ہم نہیں چاہتے کہ تم راستہ … یہ نقاب ڈال لو گے جیسے پر اپنی مرضی سے یا ہم زبردستی … آنکھوں پر پٹی باندھ دیں؟"

"تم کو پٹی باندھنے کی اجازت ہے۔" میں نے … اس وقت راستہ نوٹ کرنے سے قطعی دلچسپی نہیں … ہو گی تو میں پٹی باندھ کے یہ راستہ تلاش کر لوں گا … رہنمائی اس کی چھٹی حس کرتی ہے۔ اور شکار خود اپنا …

جاتا ہے۔" دنیا میری نظر سے اوجھل ہو گئی۔ صرف حرکت کا احساس باقی رہ گیا۔ ان دونوں میں سے ایک نے جو میرے ساتھ بیٹھے تھے، وہی کپڑا میری آنکھوں پر باندھ دیا۔ میں نے کار کو بائیں طرف موڑ کاٹتے محسوس کیا اور اندازہ لگایا کہ اس مرتبہ وہ شالیمار کی طرف نہیں بلکہ باغبانپورہ کی طرف جا رہے ہیں۔ اس کے بعد کار نے اتنے موڑ کاٹے اور اس کی رفتار میں اتنی مرتبہ کمی بیشی ہوئی کہ میرے تمام اندازے غلط ملط ہو گئے۔ تین بار مجھے ایسا لگا جیسے کار مسلسل دائیں طرف گھومی ہے اور کسی ایک مقام سے دوبارہ گزری ہے۔ دس منٹ بعد کار ایسے ہی تین مرتبہ بائیں جانب مڑی۔ وہ باغبانپورہ کی خالی گلیوں میں سے گزر رہے تھے اور غیر ضروری پیچ دار راستہ اختیار کر رہے تھے تاکہ میں وقت یا رفتار سے فاصلے کا اندازہ کر سکوں اور یادداشت کی مدد سے موڑ کاٹتا ہوا اس کے قرب و جوار میں بھی نہ پہنچ سکوں، جہاں وہ مجھے لے جا رہے تھے۔ اس کے باوجود میں سمت کا تعین کرنے اور کسی حد تک فاصلے کا حساب رکھنے کی کوشش میں مصروف رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہم گھوڑے والے پیر کے مزار سے آگے نکل آئے تھے۔ گھوڑے والے پیر کا مزار انسان کی لامحدود خواہشات اور بے حساب تمناؤں کا مظہر ہے۔ وہ سب جو اپنی کوششوں سے بامراد نہ ہوتے اور دعاؤں کے مستجاب نہ ہونے کے اندیشے میں مبتلا ہوتے، اس مزار پر ایک گھوڑا لے کر حاضر ہوتے۔ ہر گھوڑا ایک منت کا مادی پیکر تھا۔ یہ زندہ گھوڑے نہیں، دو ڈھائی انچ کے ننھے منے کھلونے تھے۔ مٹی سے لے کر سونے چاندی تک ہر چیز کے بنے ہوئے۔ سونے چاندی کے گھوڑے میں نے دیکھے نہیں تھے۔ شاید مجاوران کو اپنی تحویل میں رکھتے ہوں گے۔ مٹی کے لاکھوں گھوڑے مزار کی دیوار کی ہر منڈیر پر، ہر گوشے ہر کونے ہر محراب اور ہر دروازے پر، سایہ دار دیوار میں اور فرش پر ڈھیر نظر آتے تھے۔ انگلی کے برابر چار پیروں اور ایک گردن نما حصے پر مشتمل جسے علامتی طور پر گھوڑا فرض کر لیا جاتا تھا ورنہ وہ پیپا یا کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے کتنے من کی مراد پا کے شاد کام ہوئے اور وہ کون سا گھوڑا تھا جس کی نذر قبول ہوئی۔

کار یکلخت رک گئی۔ میری آنکھوں پر سے پٹی ہٹاتے ہی دونوں سیاہ پوش بڑی پھرتی سے نکل کے باہر کھڑے ہو گئے۔ اگر میں چاہتا تو ان کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر چت کر دیتا جب وہ سر جھکا کے دروازے سے اتر رہے تھے تو دونوں ہاتھ کے ایک ایک وار سے ان کی گردنیں بھی توڑی جا سکتی تھیں اور ایک بار ان کا دیا اور ہاتھ میں آ جاتا تو آگے بیٹھے ہوئے دونوں سیاہ پوش کچھ نہ کر پاتے کیونکہ ان کو اترنے میں وقت لگتا تھا مگر اس سب کا نتیجہ رابعہ کے حق میں برا نکلتا۔ میں ایک عہد کر چکا تھا اور تاوقتیکہ دشمن بد عہدی کا مرتکب نہ ہو میں وعدہ خلافی کا گنہگار ہونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ یہ وعدہ میں نے ظلم اور جیسے کسی بد معاش کو نہیں بلکہ رابعہ کی ماں کے بے جان جسم کو گواہ بنا کے کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ رابعہ جلد از جلد اپنے گھر پہنچ جائے تاکہ اس کی عدم موجودگی سے شکوک و شبہات پیدا ہونے کی نوبت نہ آئے۔ میرے اردگرد رات کی تاریکی میں کسی احاطے کی دیوار پھیلی ہوئی تھی۔ احاطے میں مختلف قسم کے وزن اٹھانے والے ٹرک، فورک لفٹ ٹرک، ڈمپر ٹرک، کرین اور کنکریٹ مکسر کھڑے تھے جو اندھیرے میں سائنس فکشن فلموں کی عجیب و غریب اعضا والی مخلوق دکھائی دیتے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ خالی ڈرم، ناکارہ ٹائر اور متفرق ساز و سامان کا ڈھیر تھا۔ یہ کسی کنسٹرکشن کمپنی کا یارڈ تھا جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرا جغرافیائی اندازہ غلط ہو گیا تھا اور چاردیواری کے باعث گرد و پیش کو دیکھ کر بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ کار کو میں نے اترتے ہی دیکھ لیا تھا۔ یہ ڈی سلوا کی نیلی ٹویوٹا کراؤن یا ڈاٹسن کی گاڑی نہیں تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ جگہ بھی ان کی نہیں۔

"یہاں بھی کوئی چوکیدار تو ہوگا؟" میں نے طنز سے کہا۔ "تمہارے آنے سے پہلے۔"

"اب بھی ہے۔" کار چلانے والے سیاہ پوش نے کہا۔ "یہ چوکیدار زیادہ سمجھدار ثابت ہوا اور ہم سے تعاون کرنے پر تیار ہو گیا۔ جاتے وقت ہم اسے معقول انعام دے کر جائیں گے لیکن بالفرض محال تم دوبارہ یہاں آئے تو چوکیدار آج کی رات کے تمام واقعات سے قطعی لاعلمی کا اظہار کرے گا۔"

وہ اس بیرک کی طرف چلنے لگے جو تقریباً احاطے کے وسط میں بنی ہوئی تھی۔ اٹھارہ فٹ لمبی اور نو دس فٹ چوڑی جس کے دو حصے تھے اور اس پر ٹین کی عارضی چھت ڈال دی گئی تھی۔ دو بند کھڑکیاں شاید مزدوروں کی تھیں اور ان میں سے ایک کے شیشے روشن تھے۔ دروازہ بجانے پر کسی نے اندر سے سوال کیا۔ "کون ہے؟" اور لے جواب ملا۔ "تمہارے باپ۔" دروازہ کھل گیا اور میں نے دیکھا کہ اندر ایک چارپائی پر بستر لگا ہوا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ میز تھی جس پر سے تمام سامان ہٹا دیا گیا تھا۔ یہ سب سامان اب میز کے نیچے فرش پر پڑا تھا۔ کھانے پکانے کے چند برتنوں اور مٹی کے تیل سے جلنے والے

ایک چوپلے کے ساتھ کمرے میں اس شخص کے سوا کوئی نہیں تھا جس نے دروازہ کھولا تھا اور وہ بھی ویسا ہی سیاہ لباس پہنے ہوئے تھا جیسا مجھے ساتھ لانے والے چاروں افراد نے پہن رکھا تھا۔ اس میں ان کی آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میں نے رابعہ کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور اس بند مقفل دروازے کو دیکھا جو دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" ایک سیاہ پوش نے کہا۔ اب یہ تخصیص بھی نہ رہی تھی کہ ان میں سے کون میرے ساتھ بیٹھا تھا اور کون کار کی اگلی سیٹوں پر تھا۔ وہ سب قد و قامت میں بھی برابر تھے اور مجھے شک یہ تھا کہ سب کو آواز بدل کے بات کرنے کی ہدایت تھی تاکہ ان کی شناخت محال تھی۔ "جب ثابت ہو جائے گا کہ خط وہی ہے جو تمہیں منشی نے بھیجا تھا تو رابعہ بھی آ جائے گی۔"

"یہ کیسے ہوگا؟" میں نے کہا۔ "اور کتنی دیر میں ثابت ہوگا؟"

"آنجہانی منشی نے ویسے تو زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہوں گی۔" ایک سیاہ پوش نے لفافے میں سے کاغذات کا پلندا نکالا۔ "مگر مرتے وقت جس غلطی کا ان کو بہت ملال تھا وہ یہی تھی کہ انہوں نے بڑے شوق سے آپ کو ایک تحریر تو لکھ دی جسے کوئی نہ دیکھ سکتا تھا اور نہ پڑھ سکتا تھا مگر وہ یہ ترکیب استعمال کرنا بھول گئے۔ وفات سے قبل انہوں نے علاوہ دیگر باتوں کے اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا کہ زندگی نے وفا نہ کی ورنہ وہ دوسرا خط بھی پوسٹ کر دیتے جس میں خفیہ تحریر کو پڑھنے کی ہدایات ہوتیں اور تمہیں ان پر مطلع کر دیتے کہ خط آ رہا ہے۔ مگر اس میں خود کو الزام دینا تو غلط ہے کہ یہ سب باتیں انہوں نے ہمیں بتائیں اور مر گئے۔ یہ سب تو نوشتہ تقدیر تھا اور ایسے ہی ہونا تھا۔ اب تو دیکھو ہم منشی کے آخری الفاظ پر عمل کر کے تمہارے سامنے جادو کا کیا کھیل دکھاتے ہیں۔"

اس نے خط کے صفحات دوسرے سیاہ پوش کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے ایک بیگ کھولا جسے میں نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ یہ ڈاکٹروں کے استعمال میں آنے والا سیاہ چمڑے کا ڈبے جیسا بیگ تھا۔ اس نے بیگ میں سے ایک اسپرٹ لیمپ نکالا اور میز پر رکھ کے روشن کر دیا۔ پھر اس نے ایک شیشی نکالی جس میں کوئی بے رنگ محلول تھا۔ محلول کو اس نے ایک فرائی پان میں انڈیل دیا۔ جو کچن کے سازو سامان میں شامل تھا لیکن اس مقصد کے لیے خاص طور پر صاف کیا گیا تھا۔ چند منٹ میں محلول اٹھنے لگا اور کمرے میں عجیب سی ناگوار بو پھیل گئی۔ سائنسی تجربہ کرنے والے نے بیگ میں سے صاف روئی اور ایک چمٹی نکالی۔ چمٹی کی مدد سے روئی کو محلول میں ڈبو کر اس نے کاغذات کا پلندا پکڑا اور پہلے صفحے پر بڑی احتیاط سے روئی پھیرنے لگا۔ اس سے کاغذ گیلا نہیں ہوا۔ وہ کیمیائی محلول بہت تیزی سے اڑ جاتا تھا۔ کاغذ پر ابھی تک کسی تحریر کے نقوش نمایاں نہیں ہو سکے تھے لیکن وہ سب صبر و سکون اور خاصی دلچسپی کے ساتھ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے دو میرے دائیں بائیں پہلے ہی کھڑے تھے اور ان کو یقیناً حکم ہوگا کہ گڑبڑ کی صورت میں بلا تامل مجھے شوٹ کر دیں۔ درمیان میں ایسے متعدد وقفے آئے جب میں نے نوٹ کیا کہ ان کی توجہ مجھ پر نہیں ہے مگر میں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اگر مجھے رابعہ کے دوسرے کمرے میں بحفاظت موجود ہونے کا یقین ہوتا تو میں زندگی کی بازی لگا کر یہ جوا ضرور کھیلتا اور شاید جیت بھی جاتا۔ اس کے لیے تو میں اب بھی تیار تھا کہ خدانخواستہ میں نے کسی کی نیت میں فتور دیکھا تو مرنے سے پہلے ایک ایک سے نمٹنے کی کوشش ضرور کروں گا۔

یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کمرے میں کل پانچ افراد تھے وہ تو اس مسلح محافظ میرے ہاتھوں اور پیروں کی ایک جنبش میں لیٹ جاتے۔ باقی کو اپنا اسلحہ نکالنے میں کچھ وقت لگتا اور اس بات کے امکانات نفی نفی تھے کہ میں ان کی گولی کا نشانہ بن جاتا یا وہ اس سے پہلے ہی میرا شکار ہو جاتے۔ مجھے گولی لگنے کی صورت میں بھی ہر شے ختم ہونے کے امکانات پچاس فیصد تھے جنہیں بخوشی مول لیا جا سکتا تھا۔ لیکن رابعہ نہ جانے کہاں تھی۔ میری ایک غلط حرکت کا خمیازہ اسے نہ جانے کیا بھگتنا پڑتا اور بات بنتے بنتے ایک بار بگڑ جاتی تو شاید پھر نہ بنتی۔

سائنسی تجربے میں مصروف سیاہ پوش نے احتیاط سے لیمپ کو بجھایا۔ فرائی پان کے باقی محلول کو واپس بوتل میں ڈالا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر فرائی پان کو تھوڑا سا پانی ڈال کے کھنگالا اور پانی کو بھی بوتل میں ڈال دیا۔

"یہ سب بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔" اس سیاہ پوش نے غرا کے کہا جس نے کاغذات کا وہ پلندا لیا تھا۔

"نہیں... یس باس۔" سائنسدان سیاہ پوش بولا۔ "احتیاط ابھی ضروری ہے۔ بس اب دو منٹ کی بات ہے۔" اس نے فرائی پان کو بھی بیگ میں محفوظ کرنا چاہا مگر اس کا ہینڈل اڑ گیا۔ اس نے ہینڈل کو موڑ کے کام چلایا اور بیگ میں سے ایک اور بوتل نکالی۔ اس کا منہ بند کرنے والا کارک ہٹا کے اس نے تھوڑی سی روئی کو منہ پر رکھا اور بوتل کو الٹا۔ پھر اس نے بھیگی ہوئی روئی کو اسی کاغذ پر آہستہ آہستہ پھیرنا شروع کیا اور میں نے دیکھا کہ

کاغذات پر سطریں نمایاں ہونے لگیں۔ یوں جیسے ہوا اور زمین کے سینے پر ان کے چلنے سے لکیریں بنتی جا رہی ہوں۔ دس منٹ بعد وہ کاغذات اس شخص کے ہاتھ میں آ گئے جسے باس کہہ کے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس نے پلنگ پر بیٹھ کے پہلا صفحہ پڑھنا شروع کیا۔ دور سے میں سرخی مائل سبز روشنائی سے لکھے ہوئے باریک حروف کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"اگر تمہارا ارادہ یہ داستان امیر حمزہ پڑھ کے فیصلہ کرنے کا ہے..." میں نے کہا۔

باس ہنس پڑا۔ "لاتعلق بے تاب کیوں ہو؟ میرے لیے بھی اس میں کوئی نئی اور دلچسپی کی بات نہیں۔" اس نے ایک صفحہ الٹ کے چند سطریں پڑھیں۔ پھر دوسرا اور تیسرا صفحہ الٹ کے محض ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ "پاگل کا بچہ۔" اس نے زیر لب کہا۔ یہ بات اس نے منشی مرحوم کے بارے میں کہی تھی۔ "وقت اور محنتوں کو ضائع کیا۔" اس نے جیب سے لائٹر نکالا اور ایک ایک کاغذ کے کونے کو الگ الگ کر کے جلانے لگا۔ کاغذ کے پورا جل جانے تک وہ انتظار کرتا تھا اور پھر راکھ کو جوتے سے مسل دیتا تھا۔

تو یہ تھا انجام۔ اس تمام جدوجہد کا جو منشی مرحوم نے مجھے ماضی کے رازہائے سربستہ سے آشنا کرنے کی خاطر کی تھی۔ نہ جانے منشی نے کتنا عرصہ بڑی کشمکش، خلفشار، بے یقینی اور خوف کے عالم میں گزارا ہوگا۔ وہ یقیناً کوئی ایسا شخص تھا جسے اب اس کا ضمیر پریشان کرنے لگا تھا۔ ممکن ہے وہ وزیر خان مرحوم کے نمک خواروں میں شامل نہ ہوا اور ان کا دوست بھی نہ ہو۔ وہ کسی الجھن یا مجبوری کے باعث وزیر خان کے خلاف سازش کا جال پھیلانے والوں کا ساتھی رہا ہو مگر ظلم کی انتہا اور وزیر خان کی ناگہانی موت نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہو کہ خدا ظالم کی رسی کہاں تک دراز کرے گا اور یوم حساب سے پہلے دنیا میں ہی مکافات آ گیا تو اس کا انجام کتنا عبرتناک ہوگا۔ یہ عمر کا تقاضا تھا یا حالات کی تبدیلی جس نے اسے عاقبت کے خوف میں مبتلا کر دیا ہوا اور وہ سوچنے لگا ہو کہ کسی طرح اپنے نامہ اعمال کی سیاہی اور اپنے بارِ گناہ کو کچھ تو کم کر لے۔ اور جب اس نے یہ فیصلہ کیا ہوگا تو اسے یہ خیال بھی ضرور آیا ہوگا کہ یہ نیکی اس کا جرم بن گئی تو سازش کے راز داروں کی نظر میں غداری سمجھنے والے اسے کیا سزا دیں گے اور اس پر سابقہ غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کا جذبہ غالب آیا ہوگا کہ اس نے سوچ سمجھ کے عملی قدم اٹھایا ہوگا۔ ایک بار اس نے مجھ سے ملنا چاہا مگر وہ مجھ سے نہ مل سکا تو دوسری بار وہ ہوٹل میں انتظار کرتا رہا اور مکرر کے فیصلے کا وقت غلط یاد رہ جانے کے باعث اس سے رابطہ قائم نہ ہوا۔ پھر اس نے طے کیا ہوگا کہ ماضی کی کتاب میں سے تمام یادداشتوں کے اقتباسات ترتیب کے ساتھ لکھ دینا بہتر ہوگا جن سے مجھے اپنا حق حاصل کرنے، اپنا تحفظ کرنے اور ظالموں کے خلاف انتقام کے عمل کو مؤثر بنانے میں عملی مدد مل سکے۔ اس نے تمام ممکنہ احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں مگر ایک چھوٹی سی بھول نے اسے شکست سے دوچار کر دیا۔ جب جسمانی اذیت کی تاب نہ لا کے اس نے اعتراف جرم کیا ہوگا تو اس کے لیے یہ ذہنی عذاب کتنا شدید ہوگا کہ وہ سب جدوجہد رائیگاں گئی جو اس نے دیر آید درست آید کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے کی تھی اور مرتے وقت اسے یقین ہوگا کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا وہی دنیا میں اس کے اعمال کی سزا تھی۔ جس سے بچا نہیں جا سکتا تھا۔ آخرت کا عذاب اس زندگی کے بعد شروع ہونا تھا۔

مجھے وہ تمام تگ و دو یاد آئی جو میں نے اور جمیلہ نے دشمنوں سے اس خط کے حصول کی خاطر کی۔ جس میں بابو پوسٹ مین سے لے کر قادری ایڈووکیٹ تک سب نے ہمارا ساتھ دیا مگر انجام کیا ہوا۔ اس سعی لاحاصل اور گزرے ہوئے وقت کے مکروہ چہرے سے نقاب اٹھانے کی کوشش میں منشی اور بہت سے دوسرے رزق خاک ہوئے۔ ان کا نشان بھی ایسے ہی مٹ گیا تھا جیسے اس بے نشان تحریر کا اور فرش پر مسل جانے والے سیاہ راکھ کے ذرے کسی کے ہونے کا سراغ نہیں دے سکتے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے قدیر یاد آئی جس نے لکھا تھا ؎

گر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا
یہ چار روزہ خدائی تو کوئی بات نہیں

کتنا حوصلہ عطا کیا تھا مجھے اس کی بات نے۔ ناکامیوں سے دل آزردگی کیسی، خدا کی خدائی میں دیر تو ممکن ہے اندھیر ممکن نہیں۔

"تمہیں یقین ہے کہ جو کچھ اس خط میں لکھا تھا وہ کسی اور ذریعے سے معلوم نہیں ہوا ہے؟" میں نے کہا۔ "اور یا یہ کہ تمہارے پاس اس کی دوسری نقل موجود نہیں ہے؟"

"ہاں۔" سیاہ پوش بولا۔ "منشی میں جھوٹ بولنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ اس کی قوت برداشت بہت پہلے جواب دے گئی تھی۔ بعد میں اس نے جو کچھ بتایا اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس کے سوا یہ باتیں تمہارے کسی خیر خواہ کو معلوم نہیں۔ اس نے کسی اور کو نہیں بتائیں کہ تمہیں بعد میں بتا دے اور اس خط کی نقل کوئی بنا ہی نہیں سکتا۔"

"اس اطمینان کے بعد تمہارے پاس میری بیوی کو یرغمال رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"اگر ہم اپنے وعدے سے پھر جائیں تو تم کیا کرو گے؟" سیاہ پوش نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"زندہ رہوں گا تو یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "مرنا پڑا تو اکیلا نہیں مروں گا۔"

سیاہ پوش ہنس پڑا۔ "فکر مت کرو۔ ہم بزدل نہیں ہیں کہ وعدہ خلافی کریں۔ ہم نے ویسے بھی تمہیں ایک ہفتے کی مہلت دے رکھی ہے۔" اس نے سائنسی تجربات کرنے والے کو اشارہ کیا۔ "ڈاکٹر! اپنا سامان اٹھاؤ اور باہر گاڑی میں میرا انتظار کرو۔ یہ دونوں تمہارے ساتھ جائیں گے۔" اس نے دونوں سیاہ پوشوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک میرے ساتھ بیٹھ کر آیا تھا اور پہرا لیے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ دوسرا شاید گاڑی کا ڈرائیور تھا۔ تین سیاہ پوش نکل گئے۔ کمرے میں ایک تو وہی رہ گیا جسے سب باس کہہ کے مخاطب کر رہے تھے۔ دوسرا میرے بائیں ہاتھ پر ریوالور لیے کھڑا رہا۔

"تم نے میرے کپڑے کہاں رکھے ہیں؟" باس کہلانے والے سیاہ پوش نے کہا۔ "انہیں اتار دو۔"

"انہیں اتار دوں؟" میں نے برافروختہ ہو کے کہا۔ "اور خود کیا کروں؟ ننگا کھڑا رہوں؟"

"ہم چوکیدار کو بھی ننگا ہی لے کر آئے تھے۔" وہ بولا۔ "تمہارے کپڑے وہیں پڑے ہیں جہاں سائیں کی لاش پڑی ہے۔"

"سائیں کی لاش؟" میں اچھل پڑا۔ "اس کمرے میں تو کوئی لاش نہیں تھی۔ تم نے مار دیا تھا اسے؟"

"ہاں! لاش دوسرے کمرے میں تھی جہاں سے ہم بات کر رہے تھے جہاں پستول فائر ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "لیکن اب اسٹور میں پڑی ہے۔"

میرا خون خشک ہونے لگا۔ صبح کے بعد جب اس چوکیدار کی لاش ملے گی تو پولیس میرے کپڑوں کو بھی قبضے میں لے لے گی۔ ان کپڑوں میں میرا پتہ دینے والی کوئی چیز نہیں تھی، سوائے میرے بدن کی بو کے۔ شہر میں مسلسل ہونے والی قتل کی پراسرار وارداتوں کے بعد پولیس نے اخبار والا جا پایا تھا کہ پولیس کی خصوصی ماہرین پر مشتمل تفتیش ان کا سراغ لگانے کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔ اگر انہوں نے تربیت یافتہ کتے استعمال کیے تو وہ کپڑوں کی بو سونگھ کے میرا نشان تلاش کر لیں گے۔ میں نے سنا تھا کہ پولیس کے پاس ایک خصوصی قسم کے ایسے کتے ہیں جو کئی دن بعد بھی آدمی کی بو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں خواہ وہ آدمی سیکڑوں کے مجمع میں سے گزر کے مہینوں دور کیوں نہ چلا گیا ہو۔ یہ انتہائی تشویش کی بات تھی تو دوسری طرف قابل اطمینان بات یہ تھی کہ جو شخص مارا گیا تھا وہ محسن کی گولی کا نشانہ نہیں بنا تھا۔ غالباً اس کا نشانہ خطا گیا تھا اور وہ شخص بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا جسے محسن ریوالور لیے کھڑا تھا۔ مرنے والا چوکیدار سائیں تھا جسے خود وہ لوگ لے آئے تھے۔

"تم اگر صبح تک ایسے ہی کھڑے سوچتے رہو گے تو ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔" سیاہ پوش بولا۔

میں نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ اس امید پر کہ شاید بعد میں مجھے پہننے کے لیے چوکیدار کے کپڑے مل جائیں گے۔ انہوں نے غالباً وہاں سے سب کپڑے ہٹا دیے تھے۔ کوئی چادر، میز پوش یا پردہ تک نہیں چھوڑا تھا۔ مقصد صاف ظاہر تھا۔ میں بغیر کپڑوں کے ان کا پیچھا نہیں کر سکتا تھا اور کسی کے پیچھے سڑک پر دوڑ نہیں لگا سکتا تھا۔

"تم نے... تم نے یہاں کے چوکیدار کو بھی مار دیا؟" میں نے ایک نئے خیال کے تحت کہا۔

سیاہ پوش ہنسا۔ "تمہیں شاید یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس نے ہم سے تعاون کیا ہوگا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ پہلوان سے مل لو۔" وہ درمیانی دروازے کی طرف بڑھا اور اس کے قفل کو ایک چابی سے کھول دیا۔ کنڈی کھول کے وہ پیچھے ہٹ گیا۔ "آ جاؤ بھئی پہلوان! ہمارا کام ختم ہو گیا۔"

دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک شخص تھر تھر کانپتا ہوا آ گیا جسے پہلوان کہنا "برعکس نہند نام زنگی کافور" والی بات تھی۔ اس کا اصل نام یقیناً کچھ اور ہوگا اور سیاہ پوش اسے تضحیک سے پہلوان کہہ رہا تھا۔ وہ بائیس تیئیس سال کا لاغر اور پست قامت مختصر جسم کا نوجوان تھا جس کی جوانی بھی بیماری کے باعث شرم تھی مگر اس سے زیادہ شرمناک بات یہ تھی کہ وہ مادر زاد برہنہ تھا۔

"دیکھا تم نے؟" سیاہ پوش نے قہقہہ لگایا۔ "اس نے کوئی کیا تعاون کرے گا؟"

"جناب عالی!" پہلوان نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب تو میرے کپڑے دے دیں۔"

"کیا کرو گے اب تم کپڑوں کا پہلوان؟" سیاہ پوش نے جیب سے سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ [illegible]

اس نے نوٹوں کی گڈی اپنے پیروں کے پاس ڈال دی۔ "دس ہزار ہیں۔ نئے کپڑے سلوا لینا۔" اس کے لہجے میں کوئی بات ایسی تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے چلا کر اس عاقبت نااندیش اور لالچی نوجوان کو خبردار کرنا چاہا مگر وہ ...

ہو چکا تھا اور اس کی پھٹی ہوئی نظر ... گڈی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ گڈی اٹھانے کو جھکا ہی تھا کہ سیاہ پوش کا ہاتھ اس کی گردن پر پڑا۔ میں نے واضح طور پر گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز سنی اور اس جواں مرگ کو فرش پر ڈھیر ہوتے دیکھا۔ صدمے سے میرا ذہن ماؤف ہو گیا اور میں نے ... کپڑوں کی خواہش پر بڑی سختی سے قابو پایا۔ لیکن اس قتل نے میرے اندر کے اس آدمی کو جھنجھوڑ دیا جو اب تک رابعہ کی خاطر مصلحت کے تقاضے اور مجبوری کے باعث خاموشی سے ہر جارحانہ بات مان رہا تھا۔ کمرے میں اب دو ہی آدمی تھے اور ان کو جارحیت سے قابو کیا جا سکتا تھا۔ مجھے صرف اتنی تسلی چاہیے تھی کہ رابعہ بھی یہیں دوسرے کمرے میں موجود ہے۔ یہ بات مجھے فوراً ہی معلوم ہو گئی۔

"رابعہ کے پاس جانے میں تم خود دیر کر رہے ہو۔" چوکیدار کا قاتل سیاہ پوش ہنس کر بولا۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ وہ ... اور کسی کو کچھ معلوم نہ ہو تو جاؤ رابعہ ساتھ والے کمرے میں موجود ہے۔ مگر پہلے اپنے کپڑے ہمارے حوالے کر جاؤ۔"

میں نے تعمیل کا ارادہ کیا اور آہستہ آہستہ جرسی اتارنے لگا۔

"ادھر پھینک دو احتیاط سے۔" سیاہ پوش نے کہا۔

میں نے جرسی کے بعد بنیان کو اس کی طرف اچھال دیا اور اس وقت میرا ذہن مسلسل مصروف عمل رہا لیکن حالات کے سامنے میں بے بس تھا۔ ایک شخص ریوالور کا رخ میری طرف کیے ... کھڑا تھا اور ... نکال لیا تھا۔ میں نے پتلون اتار کے اس کی طرف پھینکی جو اس نے مجھ پر سے نظر ہٹائے بغیر اچک لی۔ اب میرے جسم پر ایک مختصر سا انڈرویئر رہ گیا تھا یا میرے جوتے ... انڈرویئر سے پہلے میں نے جوتے اور موزے اتارے۔ اچانک میرے دماغ میں کوئی ترکیب نہیں آئی تھی جس سے ... پر غلبہ حاصل کر سکتا اور اس کے مواقع بھی ناپید تھے۔ مگر اسی وقت باس نے اپنا ریوالور جیب میں رکھا اور میرے کپڑوں کی گٹھری لے کر دروازے کی طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے اس نے اپنے آخری ساتھی کو حکم دیا۔ "وہ مجھ سے میرا انڈرویئر ... اور پھر دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کے آ جانا۔" ... نے میری طرف رکھا اور گھوم کر دروازے ... جہاں سے اس کا باس نکل کر باہر جا چکا تھا۔

"دیکھو! کچھ تو شرم و حیا کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ ایک کپڑا ..."

"... ضرورت نہیں۔ باس جو کہہ گیا ہے ...

ہوگا۔" سیاہ پوش غرایا۔ باس کے جاتے ہی وہ خود باس ہو گیا تھا۔

"تمہاری مرضی۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے تھوڑا سا جھکتے ہوئے اپنا انڈرویئر بھی اتارا اور یہ دیکھا کہ وہ کچھ جھینپ گیا ہے۔ اس کی نظر ایک پل کے لیے ہٹی تھی کہ میں نے انڈرویئر اس کے منہ پر کھینچ مارا اور غوطہ لگا گیا۔ باہر سے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز ریوالور کے فائر کے ساتھ ہی سنائی دی۔ سیاہ پوش نے میز اور بل کے کونے کی طرف ہونا چاہا مگر میں نے اسے مہلت نہ دی۔

"یہ کیا ہے...؟" باہر سے کسی نے چیخ کر جملے کا اختتام ایک غلیظ گالی پر کیا۔ اس وقت تک میں نے سیاہ پوش کو دبوچ لیا تھا۔

میں نے ایک غلیظ تر گالی دی۔ "ابھی بتاتا ہوں کہ کیا ہوا ہے..." میں نے سیاہ پوش کے کچھ بولنے سے پہلے چلا کر کہا۔ سیاہ پوش نے ایک اور گولی چلائی جو زمین پر لگی۔ میں نے سیاہ پوش کو اٹھا کے دیوار پر دے مارا۔ وہ بلبلایا۔ اس کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ باہر گاڑی میں بیٹھے ہوئے باقی افراد نے فرض کر لیا کہ ان کا ایک ساتھی میرے ہاتھوں مارا گیا۔

"گاڑی چلاؤ۔" اسی شخص نے چیخ کر کہا جو باس بنا ہوا تھا۔ "مرنے دو اس حرامزادے کو۔"

گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز سنتے ہی پیچھے رہ جانے والے کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر میری لات اس کے سینے پر پڑی اور وہ دیوار کے پاس لاش کے قریب جا گرا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے پہلے ہی نکل گیا تھا۔ وہ عوامل بہت سے تھے جنہوں نے مجھے پاگل کر دیا۔ میرے ذہن میں رابعہ پر ہونے والے تشدد کی یاد بھی تھی۔ وہ صدمہ بھی تھا جو رابعہ کی ماں کے بیٹی کو دیکھے بنا مر جانے سے ہوا تھا۔ اپنی بے بسی اور بے چارگی کا رد عمل بھی تھا۔ اپنی بے حجابی سے ہونے والی تذلیل کا احساس بھی تھا۔ میں نے اس پر تابڑ توڑ حملے کیے۔ لاتیں اور گھونسے مار مار کے میں نے اسے تقریباً مار ڈالا تھا کہ اچانک میرے ایک وار سے وہ اچھل کر ریوالور کے قریب جا پڑا۔ لیکن ریوالور پر قبضہ کرتے ہی اس کے ہاتھ نے میرا نہیں خود اپنا نشانہ لیا۔ میں اس وقت بھی حرکت میں تھا اور اس پر جھپٹ چکا تھا۔ اس نے خود کو میرے مقابلے میں بہت کمزور اور تنہا پا کے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے مگر میں نے اس کی یہ آرزو بھی پوری نہیں ہونے دی۔ جو گولی وہ اپنی کنپٹی پر چلانے والا تھا وہ میرے اس پر جا پڑنے سے ...

www.paksociety.com

میں لگی رہی اور پھر اس کی گرفت سے نکل گیا — میں نے اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کے فرش پر مارا۔ وہ آخری بار کراہا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

میری وحشت اور دیوانگی اس خیال کے ساتھ ہی کافور ہو گئی کہ وہ مر چکا ہے — میں اسے چھوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ اس کے شانے کے زخم سے بہنے والا لہو میرے سب لباس پر، بدن پر لگ گیا تھا اور خود سیاہ پوش کے لبادے کو تر کر رہا تھا۔ ایک بار پھر مجھے گرم انسانی خون کی مہک سے ابکائی آئی اور میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک کھڑکی پر چھوٹا سا مٹکا اور ڈھکنے پر پیالہ رکھا تھا۔ میں نے مگ سے پانی نکالا اور اپنے جسم پر سے خون کو دھو دیا۔ نشان دھبنے کے باوجود وہ بو میرے دماغ میں بسی رہی۔ پھر میں نے اندھیرے میں پہنا اور اس سیاہ پوش کو چیک کر کے دیکھا۔ وہ زندہ تھا اور گولی سے صرف شانے کا گوشت ادھڑا تھا۔ میں نے پھر کھڑکی کے پاس آ کے ایک مگ بھرا اور دو گھونٹ پانی پی کے باقی سے اپنے منہ پر چھینٹے مارے۔ میرا دہکتا ہوا چہرہ ٹھنڈا پڑنے لگا اور میں سر جھٹک کے دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازے سے کمرے میں قدم رکھتے ہی میں نے رابعہ کو دیکھا۔ وہ ایک کرسی سے یوں بندھی بیٹھی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ ایک ساتھ باندھ کے کرسی کی سلاخوں کے ساتھ جکڑ دیے گئے تھے۔ پیر دوسری رسی سے باندھے گئے تھے اور دوسری رسی کا آخری سرا ایک دروازے کے ہینڈل میں بندھا ہوا تھا۔ دروازہ بند تھا اور غالباً دوسری طرف سے باہر جانے کا راستہ تھا۔ اس پوزیشن میں رابعہ کے لیے دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھنا ہی ممکن تھا۔ نہ وہ لیٹ سکتی تھی اور نہ کھڑی ہو سکتی تھی۔ اس کے منہ میں ایک میلا سا کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا چنانچہ اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکل سکتی تھی لیکن سب سے زیادہ شرمناک اور باعث ذلت بات یہ تھی کہ وہ رابعہ کو بے لباس چھوڑ گئے تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے جسم پر نام کو سہی ستر پوشی کے لیے کچھ تو تھا ورنہ میرے لیے رابعہ کا سامنا کرنا کہیں زیادہ دشوار ہوتا۔

اس کمرے میں آنے والی روشنی دبی دبی تھی جو دوسرے کمرے سے دروازے کے راستے پہنچ رہی تھی۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے رابعہ کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ رابعہ نے ایک گہری سانس لی اور کچھ کہا جو میں نے نہیں سنا۔ میں لپک کر واپس دوسرے کمرے میں جا پہنچا تھا۔ وہاں میں نے میز کے نیچے پڑے ہوئے سامان میں سے چھری اٹھائی اور واپس بھاگا۔ ذرا سی دیر میں ساری رسیاں کٹ گئیں۔ جس بات نے مجھے حیران کیا وہ یہ

تھی کہ رسی کی ہر گرہ تو سخت تھی مگر کلائی پر یا ٹخنوں پر کہیں رسی ڈھیل رکھی گئی تھی۔ صرف اس حد تک کہ جلد پر نشان نہ پڑیں مگر حلقہ اتنا بڑا بھی نہ ہو کہ رابعہ وہ ٹخنے یا ہاتھ کو نکال لے۔

"رابعہ! میری جان!" میں نے بے اختیار اس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ "مجھے معاف کر دو۔ میری وجہ سے تمہیں یہ ظلم سہنا پڑا۔ بہت دکھ اٹھانے پڑے۔ میں سخت گنہگار ہوں، تمہارا مجرم ہوں۔"

"سکندر..." وہ آہستہ آہستہ سسکتے ہوئے بولی۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔ تمہارا کیا قصور ہے اس میں؟"

"یہ سب میرا قصور ہے۔ میری وجہ سے تم پر یہ افتاد آ گئی۔ ورنہ میں تمہارے پاس آ کر یہ سب کچھ ہوتا نہ دیکھتا۔" اس کی بند آنکھوں سے بہتے ہوئے خاموش آنسوؤں کو میں نے صاف کیا۔ اس وقت ہم میں سے کسی کو احساس تھا تو اپنے جذبوں کی صداقت کا اور اپنے خلوص کا اور اپنی نیک نیتی کا۔ ہمارے جذبات میں پاکیزگی اور طہارت کی خوشبو تھی اور وہ آلائش کہیں نہ تھی جو جسموں کے بے حجابانہ اتصال سے جنم لیتی ہے۔ مجھے خوشی تھی کہ میں نے رابعہ کی زندگی بچالی اور خود اپنی نظر میں رسوا نہیں ہوا۔

"میں تمام عمر خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔" میں نے اس کے سر کو تھپکا۔ "میری وجہ سے تم پر یہ ظلم ہوا۔ لیکن رابعہ قسم ہے مجھے تمہارے جسم سے بہنے والے ہر قطرہ خون کا انتقام لوں گا۔ میں ان درندوں کو معاف نہیں کروں گا۔"

رابعہ نے نظر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ "تم جذبات میں بہہ رہے ہو۔ مجھ پر کسی نے تشدد نہیں کیا۔ انہوں نے صرف کلوروفارم سنگھا کے بیہوش ضرور کیا تھا۔ ایک اغوا کے وقت، ایک مرتبہ بعد میں، یا اس وقت..." اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ "مگر اس وقت بھی انہوں نے باندھنے کے سوا کچھ نہیں کیا، بھی بہت معذرت کے ساتھ۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "میں نے تمہیں دوسری جگہ دیکھا تھا۔ ادھر دلاور [illegible] ایک زیر تعمیر کوٹھی کے تہہ خانے میں، تو تم لہولہان تھیں۔"

"لہولہان؟" وہ مجھ سے زیادہ حیران ہو کے بولی۔ "کسی نے مجھ پر انگلی بھی نہیں اٹھائی۔ مجھے بہت آرام سے رکھا اور بار بار معافی مانگتے رہے کہ وکیل صاحب ہم اس خط کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو لانے پر مجبور تھے۔ خط مل جاتا تو ہم آپ کو کبھی چھوڑ دیتے۔ انہوں نے کہا کہ سکندر پر کسی طرح دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا۔ میں نے تو انہیں جتا دیا تھا کہ سکندر اس طرح دباؤ میں نہیں آئے گا مگر تم تو زور زبردستی مزاحمت بھی نہیں کر سکتے۔"

"مزاحمت میں کیسے کرتا رابعہ؟" میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تمہارا لباس تار تار تھا اور خون میں تر تھا۔"

"تمہیں دھوکا ہوا ہو گا سکندر!" وہ بولی۔ "یا انہوں نے تمہیں دھوکا دینے کے لیے مجھے بے ہوش کرنے کے بعد مجھ پر رنگ، سرخ روشنائی یا کسی جانور کا خون وغیرہ ڈال دیا ہو گا۔ مجھے تو جب دوبارہ ہوش آیا تھا تو میں نے دیکھا کہ میں یہاں تھی جہاں مجھے پہنچا دیا گیا تھا اور میرے کپڑے بھی مری پر تھے۔ بالکل صاف۔ میرے جسم پر یا لباس پر خون کا ایک داغ تک نہیں تھا۔"

"تو امر..." میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔ "یہ سب مجھے دہشت زدہ کر کے اپنی بات منوانے کے لیے کیا گیا تھا۔" یقیناً دلاور کا شاطر ذہن ہی ایسی اسکیم سوچ سکتا تھا۔ وہ نفسیاتی حربے استعمال کر کے ذہن پر مسلط ہونا جانتا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بار بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ مگر اب ان باتوں کا وقت نہیں تھا۔

"وہ خط تو میں نے ان کو دے دیا۔" میں نے کہا۔

"خط دے دیا؟" رابعہ نے کہا۔ "لیکن خط تو انہی کے پاس تھا۔"

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "لیکن [illegible]... ان سے لے لیا تھا۔ اور اب اس کی آنکھ بھی نہیں کھلی تھی۔"

"لیکن کیوں سکندر؟" وہ میرا ہاتھ تھام کے بولی۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"میں مجبور تھا رابعہ!" میں نے کہا۔ "اس لیے کہ مجھے تمہاری سلامتی کا احساس تھا۔ بلکہ اس لیے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ تمہیں صرف تمہاری خاطر چاہنے لگا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر یہ وقت آنا ہے تو ایک دن ضرور آ جائے گا۔ ایک بار میں نہ سہی، ایک سال میں نہ سہی، ایک عمر میں سہی۔ مجھے اپنے آپ پر اعتبار نہ تھا مگر آج میں یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔"

"مجھے معلوم تھا ایک دن تمہیں یہ احساس ضرور ہو گا۔" وہ بولی۔ "لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ ایسے غلط وقت اور ایسی غلط جگہ پر ہو گا۔"

میں غفلت زدہ ہو کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "وہ لوگ جا سکتے وقت میرے اور تمہارے کپڑے بھی لے گئے ہیں تاکہ ہم فوراً ان کا تعاقب کرنے کے لیے نہ نکل سکیں۔"

"یہاں کوئی چیز تو ہو گی؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہاں ایک چوکیدار تھا۔ وہ اسے بھی مار گئے ہیں اور اس کے کپڑوں کے علاوہ بالشت بھر کا رومال تک چھوڑ کر نہیں گئے تھے، لیکن میں نے تھوڑی سی ہمت کر کے ان کا ایک آدمی دھر لیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس کے کپڑے پہن کے میں باہر نہیں نکل سکتا۔ وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس میں تھا اور یہ لباس بھی اب خون آلود ہے۔ مجھے پولیس گھیر کر تھانے لے جائے گی تو خواہ مخواہ وقت ضائع ہو گا۔"

"اور اس لباس میں ناخرہ میں باہر نکلو گے تو کوئی کچھ نہیں کہے گا؟" وہ بولی۔

"نہیں۔ وہ میں نے سوچ لیا ہے۔ اب تم اطمینان سے یہاں بیٹھو۔ میں آدھے پون گھنٹے میں واپس آتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "دوسرے کمرے میں مت جانا۔ وہاں ایک لاش پڑی ہے اور ایک یرغمالی بیہوش پڑا ہے۔ اس کا میں بندوبست کر جاؤں گا۔"

میں نے سیاہ پوش کو انہی رسیوں سے باندھا جو میں نے رابعہ کے ہاتھوں اور پیروں پر سے کھولی تھیں۔ اس کے زخم سے رسنے والا خون منجمد ہو کے رک گیا تھا اور اس کی موت کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ البتہ یہ خطرہ ضرور تھا کہ وہ ہوش میں آ جائے تو فرار ہونے کی کوشش کرے یا اس کے وہ ساتھی جو افراتفری میں فرار ہو گئے تھے لوٹ کر اس کی لاش لے جانے کے لیے نہ آ جائیں۔ جلدی میں انہوں نے فرض کر لیا تھا کہ وہ مارا گیا۔ بعد میں ان کو خیال آ سکتا تھا کہ وہ مرا نہ ہو صرف زخمی ہوا ہو۔ ایسی صورت میں وہ اسے زندہ یا مردہ ہر صورت میں ساتھ لے جانے کی کوشش کریں گے اور لے جا نہ سکے تو مار جائیں گے۔ پکڑا پولیس کے یا ہمارے ہاتھ نہیں پڑنے دیں گے کہ وہ کسی ساتھی کے بارے میں کچھ بتا نہ سکے۔ میں نے اس کا دیوا اور لیا اور پھر رابعہ کے پاس آ گیا۔

"افسوس یہ ہے کہ یہاں تاریکی کے سوا تمہارے لیے کوئی لباس نہیں۔" میں نے کہا۔ "اندھیرے میں تمہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا لیکن تم باہر دیکھ سکتی ہو۔ یہ جاؤ ذرا دیوار سے لگ کر [illegible] ہے۔"

"آ رہا ہے؟" وہ بولی۔ "میرے پاس اپنا [illegible] بھی ہے اور لائسنس بھی۔"

"تو یہاں کھڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ۔" میں نے ایک کھڑکی

www.paksociety.com

کی جلدی سی کرسی گھسیٹ کر کہا۔ "یہاں سے تم گیٹ پر نظر رکھ سکتی ہو۔ اگر وہ اپنے ساتھی کو لے جانے کے لیے آئیں گے تو گاڑی میں آئیں گے اور اسی راستے سے آئیں گے۔ میں باہر سے دروازہ مقفل کر جاؤں گا تاکہ وہ آسانی سے اندر نہ آسکیں۔ جو بھی دروازے کے قریب آئے گی اور تالا توڑنے کی کوشش کرے اسے بے دریغ گولی مار دینا۔ غنیمت ہے کہ اس میں سائلنسر لگا ہوا ہے ورنہ اب تک تو یہاں مجمع لگ چکا ہوتا۔ نشانہ کیسا ہے تمہارا؟"

"نارگٹ شوٹنگ کلب کے مقابلوں میں گزشتہ سال میرا دوسرا نمبر تھا۔" وہ بولی۔

"تو یہ دیکھنا کتنے آدمی آتے ہیں۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ریوالور میں چار گولیاں ہیں۔ اگر دو ہی آدمی آئے تو تم باقی دو گولیاں گاڑی کو ناکارہ بنانے میں صرف کرنا۔ دونوں ٹائر فلیٹ کر دینا کم سے کم۔ تین ہوں تو ایک ٹائر پھاڑ دینا۔ ویسے تو مجھے امید ہے کہ ایک کے گرتے ہی وہ بھاگنے کی کوشش کریں گے لیکن گاڑی کو روکنا بے حد ضروری ہے۔ وہ اگر مارے نہ جائیں اور زخمی ہو کر بھاگ جائیں تو مزید بہتر ہے۔ یہ تمہاری نارگٹ شوٹنگ پریکٹس کا امتحان ہوگا۔ جرأت اور ہمت تو تم میں اچھے اچھے مردوں سے زیادہ ہے۔ اب میں جاتا ہوں۔ واپسی پر سب انتظام کر کے لوٹوں گا۔ اس وقت صبح کے چار بجے ہیں۔ اگر پانچ کے بجائے چھ بھی بج جائیں تو گھبرانا نہیں۔ میرا خیال ہے آٹھ نو بجے سے پہلے یہاں کوئی نہیں آتا ہوگا۔"

لائٹ آف کرنے کے بعد جب میں چوکیدار کی چابی سے دروازے کو مقفل کر کے باہر نکلا تو میں نے آسمان پر صبح کے ستارے کو روشن دیکھا۔ "خداوندا!" میں نے دعا مانگی۔ "تیری مدد سے میں ایک آزمائش سے کامیاب گزرا۔ مجھے استقلال اور استقامت دے کہ میں اس امتحان میں پورا اتروں جو مجھے درپیش ہے۔ ابھی رابعہ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کی ماں مر گئی ہے اور اسے یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق دینے والا بھی تو ہی ہے۔ اسے زندگی کے لیے حوصلہ اور صبر دے اور مجھے اس کا ساتھ دینے اور اس کی حفاظت کرنے کے قابل بنا۔" دعا مانگ کے میں نے منہ پر ہاتھ پھیرا اور پلٹ کر دیکھا تو مجھے کھڑکی کے اندھیرے خلا میں ایک سائے کے وجود کا احساس ہوا جو محض میرے تصور کا کرشمہ تھا ورنہ وہاں پر کچھ نظر آ ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے لیے رابعہ کا حوصلہ انتہائی حیرت انگیز تھا۔ اتنا کچھ برداشت کر لینے کے بعد بھی وہ کسی خوف کے سرسام میں مبتلا نہیں ہوئی تھی

اور اس وقت بھی ایک اندھیرے اور مقفل کمرے میں اور ایک زخمی مجرم کے ساتھ جس حالت میں بیٹھی ہوئی تھی وہ اس کی مزاجی اور قوت برداشت کے ساتھ اس کی جرأت کا ثبوت تھی۔ حالات کا مقابلہ کر رہی تھی۔ وہ کسی عام عورت کے بس کی بات نہ تھی جو ان حالات میں خود بے ہوش پڑی ہوتی۔ عورت خاصے مردوں کی اس وقت گھگھی بندھ جاتی ہے جب ان کے لیے مسلح ہو کے آنے والے دشمنوں سے اکیلی نمٹنے کو بیٹھی تھی۔ بے بیاس آدمی کا اعتماد تھا کم ہو جاتا ہے۔ تلخ تجربہ ایک رات مجھے ہو چکا تھا۔ رابعہ عورت تھی لیکن بہ ہیں زیادہ صبر آزما مرحلہ تھا۔ مگر اس نے جان کر لیا تھا کہ یہ بقا اور فنا کی جنگ ہے جس میں وہ ایک فریق ہے۔ اور ہم دونوں میں اب کوئی فرق نہیں۔

احاطے سے نکلتے ہوئے مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے گیٹ کو اندر سے بھاری کنڈی لگا کے بند کیا اور دروازے کے اوپر سے باہر کود گیا۔ اب کوئی گاڑی کار لے کر آئے گا تو سیدھا اندر نہیں جا سکے گا۔ اسے روک کر دروازہ کھولنا ہوگا اور رابعہ کو تیار ہونے کے لیے وقت مل جائے گا۔ باہر آ کے میں نے دونوں طرف نگاہ دوڑائی۔ تاحد نگاہ کوئی ذی روح متحرک نہ تھا۔ صرف ایک تھا جو ایک آوارہ کتے کی طرح پیچھے ہٹا ہوا جھاڑیوں کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر چل رہا تھا۔

ابھی میں نے سو گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ مجھے ٹیلیفون کا کھمبا نظر آیا۔ میری نظر نے ٹیلیفون لائن کے ساتھ ساتھ لائن ایک دو منزلہ مکان تک گئی تھی جو باہر سے ہی بڑا تھا۔ میں نے ہمت کر کے کال بیل دبا دی۔

"ڈونگ ڈانگ..." اندر سے میوزیکل بیل کی آواز سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ میں نے مسلسل کال بیل کے بٹن کو بار بار دبایا۔ بالآخر اوپری منزل کی کھڑکی کے پٹ روشن ہوئے۔ کسی نے ایک پٹ کھول کر کہا۔ "کون ہے اس وقت بھائی؟ ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں۔" لہجہ کچھ جھلایا ہوا اور غنودگی بھرا تھا۔

بولنے والا وہیں کھڑکی میں سے سر نکال کے دیکھ سکتا تھا ورنہ میری ہیئت کذائی دیکھتے ہی وہ مجھے پولیس کو فون کر دیتا۔ "مجھے ڈاکٹر صاحب سے نہیں، ایک ضروری فون کرنا ہے۔" میں نے منہ اوپر اٹھا کے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ بھی کوئی پبلک کال آفس ہے؟ آگئے شریفوں کی نیند حرام کرنے۔" کھڑکی دھڑ سے بند ہوئی۔ میں نے پھر بیل بٹن کو دبایا۔ کھڑکی جست برسی کے بلند کھولی گئی۔ "اب جاتے ہو یا..."

"حضور مجھے کسی کے انتقال کی خبر دینی تھی۔" میں نے بزرگوار کے کچھ اور ارشاد فرمانے سے پہلے کہا۔

انہوں نے بڑی قرأت کے ساتھ انا للہ پڑھی اور لہجہ بدل کے بولے۔ "معاف کرنا بھائی! فون خراب ہے۔ ذرا آگے تھانیدار حشمت خان رہتا ہے۔ اس کے گھر سے کر لو۔" کھڑکی پھر بند ہو گئی۔

تھانیدار حشمت خان یہ وہی خبیث ہے جو وہاں رہتا ہے میں نے اس انکشاف پر حیران ہو کے سوچا۔ ان بزرگوار نے ذرا ناقابل تردید اور معقول عذر پیش کر کے مجھے فون تو نہیں کرنے دیا تھا مگر بڑی کار آمد بات بتا دی تھی۔ اب یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ حشمت خان کا پتہ معلوم کیا جا سکتا تھا اور اس کے گھر سے سو گز دور وہ یارڈ تھا۔ میں کچھ دیر تذبذب کی کیفیت میں کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ اس وقت حشمت خان کو جگانا مناسب ہوگا یا نہیں۔ وہ فون تو کرنے دے گا مگر تفتیش بھی کرے گا اور بہت سی باتیں جو میں کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا اسے بتانی پڑیں گی۔

میں نے چلتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ کوئی شریف آدمی نظر آ جائے تو اسے اپنی "بپتا" سنا کے اس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کروں لیکن سڑک پر کوئی تھا ہی نہیں۔ ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ میرے کانوں نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی ہلکی سی آواز سنی۔ آواز قریب ہوتی گئی اور پھر اندھیرے میں گھڑ سوار گشتی پولیس کے دو سپاہی نمودار ہوئے۔ میں گردن ہاتھ رکھ کے سڑک کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ چونکتے ہوئے۔

"کون ہے میاں؟" ان میں سے ایک نے قریب آ کے اترتے ہوئے کہا۔ دوسرے نے تکلفاً رائفل کا رخ میری طرف رکھا۔

"تمہیں کیا نظر آتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "آدمی یا گھوڑا؟"

"بک بک کرتا ہے حرامی۔" پیچھے اتر آنے والے نے مشتعل ہو کے کہا۔ "صورت سے ہی چور لگتا ہے۔"

"آج ہاتھ آیا ہے۔" دوسرے نے بڑی موٹی گالی دے کر کہا۔ "کیونکہ اس کا عہدہ ایک لال فیتے کے برابر اونچا تھا۔ "ہم بھی کہتے تھے اس علاقے میں اچانک چوری کی وارداتیں کیوں بڑھ گئی ہیں۔"

"اور تمہیں افسوس ہوگا کہ یہ کون ہے جو تمہارا حصہ نہیں پہنچا رہا ہے۔" میں نے طنز سے کہا۔ "بڑا زبردست اور کامیاب چھاپہ مار کر تم نے بالآخر اسے گرفتار کر ہی لیا۔ آفرین ہے تمہاری ذہانت اور فرض شناسی کو۔"

اب ہیڈ کانسٹیبل بھی نیچے اتر آیا۔ "بہت کھتا ہے۔" کہتے کہتے اس نے رائفل کا بٹ اٹھایا۔

"بکواس بند کرو۔" میں ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ "اور تھوڑے ہوش میں رہ کے بات کرو۔ میں ایس پی ضامن رضوی کا چھوٹا بھائی ہوں۔ تھانیدار حشمت خان یہیں رہتا ہے۔ اس سے پوچھنا چاہتے ہو تو پوچھ لو۔ یہ میں تم سے بعد میں پوچھوں گا کہ تم گشت کر رہے تھے یا کہیں سو رہے تھے۔"

ان دونوں نے بے وقوفوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھا۔ "کوئی واردات ہو گئی ہے جناب؟" کانسٹیبل نے لہجہ فوراً بدل لیا۔

"جی جناب!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اس سڑک پر ڈاکو راہگیروں کو ایک گھنٹے تک لوٹتے رہے۔ انہوں نے میرے کپڑے تک اتروا لیے۔ تم اتنی دیر تک کہاں رہتے ہو اور اب آئے ہو تو ایک شریف آدمی کو گالی دے کر بات کرتے ہو۔"

"ہم... ہم معافی... معافی چاہتے ہیں جناب عالی!" ہیڈ کانسٹیبل کی سٹی گم ہو گئی۔ اسے فوراً اپنی لال پٹی کے چھن جانے اور اپنے دوبارہ کانسٹیبل کے عہدے پر مراجعت کے خیال نے ہراساں کر دیا تھا۔ "ہم آپ کی کیا مدد کریں؟"

"کچھ نہیں، بس مجھے تھانے لے چلو۔ مجھے گھر فون کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے فوراً مجھے اپنا گھوڑا پیش کیا لیکن میں نے اس کے پیچھے بیٹھنا بہتر سمجھا۔ راستے میں انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کے غلط رویے کی کسی سے شکایت نہ کروں۔ "ہم بیوی بچوں والے ہیں۔ نوکری سے جاتی رہے گی تو فاقے کرنے پڑیں گے۔" ہیڈ کانسٹیبل بولا۔

"کیوں؟" میں نے کہا۔ "محنت مزدوری کرتے شرم آتی ہے کیا؟ یا تن آسانی اور حرام خوری کی عادت ہو گئی ہے؟"

"آپ کا جتنا نقصان ہوا ہم پورا کر دیتے ہیں جناب عالی! بس ہمیں معاف کر دیں۔" ہیڈ کانسٹیبل پر رقت طاری ہونے لگی اور میں نے انتہائی فراخدلی سے کام لیتے ہوئے ان کو معاف کر دیا۔

دس منٹ بعد میں جس شان سے تھانے میں اترا اس نے ڈیوٹی پر متعین عملے کو بھی حیران کیا اور اندازہ تو انہوں نے بھی کیا — لگتا تھا کہ گشتی پولیس کے مستعد جوان کسی شرابی آوارہ گرد یا چور کو پکڑ لائے ہیں مگر مجھے لے کر آنے والوں نے نظروں ہی نظروں میں ان کو ایسا اشارہ کیا جو میں نہ دیکھ سکا اور استقبال کے لیے آگے بڑھنے والے یکلخت محتاط ہو گئے۔ میں نے سیدھا انچارج کے کمرے کا رخ کیا جہاں ایک

سب انسپکٹر ڈیوٹی پر تھا۔ مجھے یوں بے باکانہ اور اس حلیے میں اندر آتے دیکھ کر اس کا منہ بگڑ گیا مگر میں نے کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا۔

"کون ہو تم؟" وہ غرا کے بولا۔

"ایس پی ضامن رضوی صاحب کے گھر کا نمبر ملاؤ۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "میں ان کا بھائی ہوں۔" سب انسپکٹر کا موڈ مجھ سے فون نمبر پوچھنے کے بعد بدلا۔ نمبر ملا کے اس نے ریسیور مجھے تھما دیا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔

تقریباً تین منٹ بعد رضوی صاحب نے ریسیور اٹھایا اور ان کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ "ضامن رضوی۔"

"میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"سکندر؟" وہ چونک کر بولے۔ "کہاں سے بول رہے ہو اس وقت...؟"

"میں پولیس اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔ باغبانپورہ..."

"آخر یہ کیا مصیبت ہے؟" ان کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ "آدھی رات کو تم وہاں کیا کر رہے ہو؟ شام سے رات تک ہم کھانے پر تمہارا انتظار کرتے رہے۔ اسلام آباد سے شیروانی صاحب کی والدہ نے فون کیا تھا۔"

"وہ جو ڈپٹی سیکرٹری ہیں؟" میں نے سب انسپکٹر کو سنانے کے لیے ایک احمقانہ بات کی۔

"لاحول ولا قوۃ۔ اور کتنے شیروانی ہیں جن کی بیویاں مجھے فون کر کے تمہارا پتہ پوچھیں گی؟"

"ان سے بات ہو گئی تھی میری۔" میں نے کہا۔ "دراصل مجھے موقع ہی اب ملا ہے آپ کو اطلاع دینے کا کہ میں رات کو کھانے کے وقت گھر کیوں نہیں پہنچ سکا۔ آپ رابعہ مختاری ایڈووکیٹ سے واقف ہیں نا ۔۔۔ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ جنازہ دو بجے اٹھایا جائے گا۔"

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔" ضامن رضوی صاحب نے کچھ دیر بعد کہا۔ "وہ کیسے؟"

"ان پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ ہسپتال میں تھیں۔ میں لاش لے کر بہت دیر سے پہنچا مس رابعہ کے گھر۔" میں نے کہا۔

"اور اب وہاں تھانے میں کیا کر رہے ہو؟"

"مجھے مجبوراً یہاں آنا پڑا۔" میں نے کہا۔ "آپ کو فون کرنے کے لیے۔ میں انتقال کی اطلاع دینے آیا تھا ادھر۔ واپسی پر سواری نہیں ملی اور ایک چھوٹی سی واردات ہو گئی۔"

"کیسی واردات؟" وہ پریشانی سے بولے۔ "تم خیریت سے ہو نا؟"

"جی میں بالکل خیریت سے ہوں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ دو بدمعاشوں نے مجھے اکیلا پا کے لوٹ لیا تھا۔"

"تو میں گاڑی بھیج دیتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"نہیں آپ گاڑی نہ بھیجیں۔ میں محسن سے کہہ دیتا ہوں وہ رابعہ کی گاڑی لے کر آ جائے گا۔ بس آپ کو اطلاع دینی تھی۔" میں نے کہا۔ "میں یہاں سے رابعہ کے گھر جاؤں گا اور تدفین تک وہیں رہوں گا۔ آپ آئیں گے؟"

"میں تدفین میں ضرور آؤں گا۔ کون ہے ڈیوٹی پر [illegible]"

"ایس پی صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے ریسیور انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ واردات کے ذکر سے ہی وہ پریشان ہو گیا تھا۔ ریسیور لیتے ہی وہ بوکھلا گیا اور معلوم نہیں رضوی صاحب نے اس سے کیا کہا اس کے حلق سے "یس سر" کے سوا کچھ نہ نکلا۔ ریسیور رکھ کے اس نے اطمینان کا سانس لیا اور مجھ سے واردات کی تفصیل پوچھنی چاہی تاکہ رپورٹ لکھی جا سکے لیکن میں نے کہا کہ میرا ارادہ کوئی رپورٹ لکھوانے کا نہیں ہے۔ ایک کپڑوں کے جوڑے اور ڈیڑھ سو اور دو سو روپے کی خاطر کسی جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ پھر میں نے سب انسپکٹر کی اجازت کے بغیر رابعہ کے گھر کا نمبر ملایا۔

"محسن؟" میں نے ریسیور اٹھانے کی آواز سنتے ہی کہا۔ "میں سکندر بول رہا ہوں۔"

"سکندر!" محسن نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "کیا ہوا، کہاں ہے تو؟ [illegible]"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "اب تو ایسا کر کہ رابعہ کی گاڑی لے کر آ جا۔ چابیاں گاڑی ہی میں موجود ہوں گی۔ آتے وقت میرے لیے کپڑوں کا ایک جوڑا لیتے آنا اور ایک جوڑا اپنا [illegible]۔ کتنی دیر میں آ جائے گا تو؟"

"میں؟ میرا خیال ہے زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ۔ بشرطیکہ گاڑی وہیں ملی جہاں کھڑی تھی اور چابیاں بھی موجود ہوئیں۔ بصورت دیگر ٹیکسی لینے میں دیر ہو جائے گی۔" محسن نے کہا۔

محسن کے آنے تک تھانے میں خاصا ہنگامہ رہا۔ سب انسپکٹر نے گشت کرنے والے سپاہیوں کو ان کی غفلت پر جھاڑ پلا کے اپنی افسرانہ ذمے داری پوری کی۔ پھر میرے لیے اسپیشل چائے منگوائی۔ مجھے یہ پیش کش بھی کی گئی کہ میں چاہوں تو [illegible] گاڑی کا اور ضرورت کی تمام چیزوں کا بندوبست کر دیا جائے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ شاید تھانے کی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہو گا جب ایک ننگ دھڑنگ شخص کے ساتھ [illegible]

جیسا سلوک کیا گیا اور اس کی واقعی عزت افزائی ہوئی ورنہ مجھے وہ رات بھی یاد تھی جب میں انتہائی شریفانہ اور معزز حلیے میں خان اینڈ کمپنی کے ہاتھوں دوسرے تھانے میں ذلیل ہوا تھا۔

محسن ٹھیک چالیس منٹ بعد فاکس ویگن کو ریس کار کی طرح دوڑاتا تھانے میں داخل ہوا تو آواز پہ میں کمرے سے باہر آ گیا۔ میرا حلیہ دیکھ کر محسن بھونچکا رہ گیا۔ لیکن میں نے اسے تسلی دی کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ لباس تبدیل کیا اور سب انسپکٹر سے ہاتھ ملا کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"اب ادھر۔" میں نے محسن کو اشارے سے بتایا۔ "رابعہ [illegible] ریوالور لایا ہے تو؟"

"ہاں۔ کوئی خطرے کی بات ہے کیا؟" وہ بولا۔

"ہو بھی سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ فاکس ویگن اتنی دیر میں یارڈ تک پہنچ چکی تھی۔ خلاف توقع مجھے بیرونی پھاٹک کھلا ہوا نظر آیا۔ "ٹھیک ہے۔ تو کار یہیں روک لے۔ اور ریوالور مجھے دے دے۔"

"آخر بات کیا ہے؟" محسن نے جھنجھلا کے کہا۔

"بات لمبی ہے۔ پھر بتاؤں گا۔" میں نے کہا اور ریوالور لے کر دیوار پر چڑھ گیا۔ اندر اترتے ہی مجھے وہ گاڑی دکھائی دی جس میں مجھے یہاں لایا گیا تھا۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا۔ گاڑی ایسی پوزیشن میں کھڑی تھی کہ صاف معلوم ہوتا تھا گاڑی میں آنے والے بھاگ جانا چاہتے تھے مگر اگلا ٹائر برسٹ ہونے سے گاڑی بے کار ہو گئی اور جھاڑیوں میں سے گزر کے خالی ڈرم کے ڈھیر میں گھس گئی تھی۔ اگر اس میں کوئی ہوتا تو مجھے آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا کیونکہ میں کھلے میدان میں تھا اور صبح کاذب کے اجالے میں صاف نظر آتا تھا۔ قریب جا کر دیکھنے پر مجھے کار کے اندر بھی کوئی نہیں ملا۔ میں نے اس کا گلوز کمپارٹمنٹ کھولا اور اس میں سے تمام کاغذات نکال لیے۔ پھر میں گیٹ سے باہر گیا اور محسن کے ساتھ کار میں اندر پہنچا۔ بنگلے کا دروازہ بدستور مقفل دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ رابعہ نے شاید اپنی فاکس ویگن [illegible] تھی۔ اس کی روشنی بہت کم تھی لیکن پھر بھی مجھے دروازے کے قریب خون نظر آ گیا اور میں سمجھ گیا کہ [illegible] شوٹنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی نہ کسی کو زخمی کر دیا ہو گا۔ باقی جان بچا کے بھاگ گئے اور انہوں نے [illegible] جلنے کی کوشش کی۔ [illegible] تالا کھول کے اندر جانے کے بعد جب لائٹ جلائی تو محسن بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے رابعہ [illegible] دروازے میں سے اندر پھینک دیے۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" محسن نے کہا اور فرش پہ سے دس ہزار کے نوٹوں کی گڈی اٹھائی۔

"ایک آوارہ لڑکی ہے جو انہی نوٹوں کی خاطر مارا گیا۔" میں نے کہا۔ "میں نے ابھی تک نوٹ نہیں کیا تھا کہ وہ جاتے وقت یہ رقم اٹھانا بھی بھول گئے ہیں۔ خیر... حق بحقدار رسید۔ ہم معلوم کر لیں گے کہ جو کچھ ہوا اس کے ذمہ دار کون ہیں اور یہ رقم ان کو پہنچا دیں گے۔ دوسرا شخص اب تک شکاری تھا لیکن اب ہمارا پہلا شکار ہے۔ اسے ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے اور دیکھیں گے کہ ہم اپنے طریقہ تفتیش سے کیا کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔"

رابعہ کچھ دیر بعد کچن کے دروازے میں نمودار ہوئی۔ اس کا رنگ اب بھی حیا سے لال ہو رہا تھا۔

"وہ آئے تھے اپنے ساتھی کو لے جانے کے لیے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "میں نے ایک کی ٹانگ میں گولی ماری۔ باقی اسے لے کر بھاگ گئے۔ ٹائر برسٹ ہو جانے کے باوجود وہ نکل گئے۔"

"محسن!" میں نے کہا۔ "اگر اس وقت میں یہ کہوں کہ رابعہ سے زیادہ حوصلہ مند عورت میں نے نہیں دیکھی تو یہ مبالغہ نہیں ہو گا۔ اب ذرا میری مدد کر۔ پہلے تو جنگی قیدی کو شفٹ کر دیں اور پھر خود بھی فوراً نکل جائیں۔"

"اسے ہم رکھیں گے کہاں؟" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہم پولیس کے پاس تو جا نہیں سکتے۔"

"میرے خیال میں رابعہ کا گھر کافی بڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ کے دل کی طرح۔ مگر اسے وہاں رکھنا ٹھیک نہیں۔"

"دل میں تو کوئی خوش قسمت ہی رہ سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "گھر میں بھی چوری کا مال رکھنا شاید ایک وکیل کے اصولوں کے خلاف ہو۔"

"عمر کے ایک حد تک ہر شخص اصولوں کے معاملے میں بڑا آئیڈیلسٹ ہوتا ہے۔" رابعہ بولی۔ "میں بھی سمجھتی تھی کہ اصول ہی سب کچھ ہوتے ہیں اور دنیا اصولوں پہ ہی چل رہی ہے۔ بے اصول لوگ بہت کم ہیں چنانچہ ترغیب، لالچ اور استقامت سے ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ باتیں کتنی کتابی ہیں۔ اس کا تجربہ عملی زندگی میں آ کے ہوا۔ زندگی صرف اپنی ذات کے مفادات کے تحفظ کی جنگ ہے اور آدمی ایک خودغرض حیوان سے زیادہ کچھ نہیں جسے اپنی بقا سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ محبت اور جنگ میں سب اصول خارج از نصاب ہو جاتے ہیں، وہ غلط نہیں

www.paksociety.com

کہتے تھے۔"

"بالفاظ مختصر مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائیکورٹ کو یہ مال غنیمت اپنے گھر میں رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں۔" محسن نے کہا۔

"مجھے یہ تو بتا دو کہ تم اس شخص کا کرو گے کیا؟ میرا مطلب ہے تفتیش کے بعد؟" رابعہ نے کہا۔

"ایک بار میں ڈیرہ اسماعیل خان گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہاں شکاری کھیتوں سے تیتر پکڑتے ہیں اور اس کے لیے بڑے عجیب طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ تربیت یافتہ مادہ کو پکڑ کر کھڑی فصلوں میں چھپا جاتے ہیں اور یہ مادہ وہ آوازیں نکالتی ہے جس سے نر تیتر متوجہ ہوتے ہیں اور شکاری کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ پھر نر تیتر اپنی آواز سے ترغیب دیتا ہے اور مادہ تیتر اس پر فریب آواز کا شکار ہونے آ جاتی ہیں تو ہم بھی تفتیش کے بعد اسے بھی کام میں لگے جو ڈیرہ اسماعیل خان کے شکاری استعمال کرتے ہیں۔ اس پر شکاری کو بلا لیں گے۔ یہ خطرناک کام ہے۔ ممکن ہے وہ ہمارے دام میں نہ آئیں۔ الٹا اسے چھڑا کر لے جانے کے لیے طاقت کا استعمال کرنے کی کوشش کریں۔ ہم جو بھیس بدل کے مورچے سنبھالے تو ہمیں پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔"

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے سکندر بابا ان کے لیے یہ آدمی غیر اہم ہو۔" محسن نے کہا۔ "نچلی سطح کا کوئی معمولی سا کارکن جو بیچارہ اوپر والوں کے بارے میں زیادہ معلوم ہی نہ ہو۔"

"اگر ایسا ہوتا تو وہ اسے چھڑا کر لے جانے کے لیے دوبارہ آنے کا خطرہ مول نہ لیتے۔" میں نے کہا۔

"پھر تو یہی بہتر ہو گا کہ ہم اسے کل کہیں اور شفٹ کر دیں۔" محسن نے کہا۔ "آج تو وہ لوگ آنے سے رہے۔ کل تک دیکھیں گے کہ کون سی جگہ مناسب رہے گی۔ آج اسے میڈیکل ایڈ وغیرہ کی ضرورت بھی ہو گی۔"

آج کے ذکر پر مجھے خیال آیا کہ آج کے دن ہمیں رابعہ کی ماں کو سپرد خاک کرنا ہے اور یہ خبر رابعہ کو دینی ہے۔ پھر اور بہت سے لوگوں کو دینی ہے۔ وقتی کامیابی کی خوشی میں ہم یہ بھول گئے تھے کہ رابعہ کے گھر میں بھی ایک لاش پڑی ہے جس کو سفر آخرت درپیش ہے اور ہمارے لیے آج کا دن بہت سی اعصاب شکن آزمائشوں کا دن ہے۔ صبح صادق کا اجالا پھیلنے لگا تھا اور ہمیں جلد از جلد گھر پہنچنا تھا۔

"رابعہ!" میں نے کہا۔ "تم نے ابھی تک امی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔"

"اس لیے کہ تم خود اس ذکر سے گریز کر رہے تھے۔" رابعہ نے سکون سے کہا۔ "تم نے بہت کچھ کہا مگر ان کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ جانتے بوجھتے۔ کیا ان کی حالت بگڑ گئی ہے؟"

میں نے مجرموں کی طرح محسن کی طرف دیکھا اور ہم دونوں نے سر جھکا لیا۔ خاموشی کا ایک طویل سوگوار وقفہ آیا۔

"تو گویا وہ اب دنیا کے غم و اندوہ، ساری مصیبتوں اور تمام الجھنوں سے نجات حاصل کر چکی ہیں۔" رابعہ نے اس سکوت کو توڑا اور ایک بار پھر ہماری خاموشی کو جواب سمجھ کر "خدا کو یہی منظور تھا سکندر۔ ڈاکٹروں نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کوئی چانس نہیں۔"

"تمہیں ڈاکٹروں نے بتا دیا تھا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "تم نے اصرار کیا ہو گا؟"

"میں جھوٹی تسلیوں کی قائل نہیں۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "جب تک میں اسیر رہی مجھے ہر طرح ان کا خیال تھا اور میں نے ان سے صرف ایک درخواست کی تھی۔ ان کے شریفانہ طرز عمل کو دیکھتے ہوئے۔ اور انہوں نے میرے بے پناہ اصرار کرتے ہوئے مجھے فون پر ڈاکٹر سے بات کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ کوئی ڈاکٹر رضائی تھا۔ میری ان سے نو بجے کے قریب بات ہوئی تھی۔"

میں احمقوں کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ "تم نے کیا بتایا تھا اسے۔ تم کہاں سے بول رہی ہو اور کون ہو؟"

"میں نے اسے اپنا صحیح نام بتایا تھا۔ رشتہ بھی بتایا تھا اور یہ بھی کہ میں گھر سے بات کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "بڑا اچھا آدمی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھ میں ہر تلخ اور سنگین حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت ہے۔ اس لیے بے خوف و خطر مجھے سچ بتا دو۔ میں بستر پر ہسپتال نہیں ہوں گی اور انہوں نے مجھے صاف بتا دیا کہ وہ رات نہیں کاٹ سکیں گی۔ اس کے بعد میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر بوجوہ کی بنا پر میں شاید ہسپتال نہ پہنچ سکوں اگر خدانخواستہ امی کا انتقال ہو جائے تو سکندر بخت یا محسن نام کے کسی بھی شخص کو لاش دے دی جائے۔ اس نے پوچھا تھا یہ آپ کے کون ہیں۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا تھا کہ میرے کزن ہیں۔"

میں سکتے کا کھڑا رہا۔ ڈاکٹر رضائی کو سب معلوم تھا مگر اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا اور خود ہی سب کچھ سمجھ لیا مگر اپنے رویے سے کسی شک کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ کچھ لوگ کتنے معقولیت پسند اور اعتماد کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس نے بلا چوں و چرا مجھے بھی قانونی وارث مان لیا تھا۔ لیکن اپنی تسلی کے لیے یا محض تجسس کے باعث یہ بھی پوچھا تھا کہ آپ کا مس رابعہ سے کیا رشتہ ہے اور میں نے جو رشتہ بتایا تھا وہ رابعہ نے نہیں بتایا تھا۔ پھر اس نے یقین اس لیے کر لیا تھا کہ لڑکیاں ایسی باتیں خود نہیں بتاتیں اور کزن بھی منگیتر ہو سکتے ہیں۔ تو یہ وہ رابعہ کو سب کچھ بتا چکا تھا۔ میں نے اسے اور بھی بہت کچھ بتایا جو رابعہ نے نہیں بتایا تھا اور وہ انجان بنا رہا جیسے وہ کچھ نہیں جانتا اور جاننا چاہتا ہے تو صرف مدد کرنے کے لیے۔ عجیب آدمی تھا۔ رابعہ نے بھی اس سے کہا تھا کہ میں گھر سے بول رہی ہوں۔ میں نے بھی کہا تھا میں رابعہ کے گھر سے بول رہا ہوں۔ رابعہ نے کہا تھا کہ میں نہیں آ سکتی اور میں نے کہا تھا وہ دارالحکومت چلی گئی ہیں۔ کہیں نہ کہیں تو میرے اور رابعہ کے بیانات کے درمیان عدم مطابقت کا پوشیدہ راز ہو گیا تھا۔ باقی باتیں اس کے لیے غیر اہم تھیں مگر کسی نتیجے پر پہنچ کے وہ میری مدد کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

"اب کیا سوچ رہے ہو؟" رابعہ نے کہا۔

"یہی کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "سوچ رہا تھا کہ تمہارا رویہ کتنا مختلف ہے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی غیر جذباتی انداز میں بھی سوچ سکتی ہو اور تمہارے اعصاب اتنے مضبوط ہیں۔ میرا خیال تھا تم وکیل ہونے کے باوجود ایک کمزور اور جذباتی لڑکی ہو۔"

"یہ تو ایک حیوانی جبلت ہے۔" وہ بولی۔ "خطرے کے وقت اور ہنگامی حالات میں قدرت کا فراہم کردہ دفاعی نظام بیدار ہو جاتا ہے۔ بلی بھی شیر ہو جاتی ہے۔"

ہم تینوں ایک ساتھ باہر نکلے۔ میں نے پچھلا دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور میں نے گیٹ بھی تاکہ لوگ جلد از جلد متوجہ ہو جائیں اور اس نوجوان کی لاش بے گور و کفن نہ پڑی رہے جس نے نجانے کتنی آرزوؤں کی تکمیل کا رنگ دیکھنے کے لیے دس ہزار روپے پکڑنے چاہے تھے اور جب وہ اپنے ہر خواب کی تعبیر کو دسترس میں دیکھ رہا تھا تو قدرت نے اس کی زندگی کو ختم کر دیا۔ پلک جھپکتے میں وہ دس ہزار سمیٹنے سے پہلے مادی خواہشات کی اس دنیا سے وہاں پہنچ گیا جہاں کوئی آرزو، کوئی احساس، کوئی امید نہیں ہوتی۔ رابعہ ڈرائیو کرنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے اجازت نہیں دی۔ وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ محسن پچھلی سیٹ پر اس سیاہ پوش کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جو اب کراہنے لگا تھا اور ہوش میں آ رہا تھا۔ محسن نے اسے سیدھا کر کے بٹھا دیا ورنہ وہ آگے کی طرف جھک جاتا۔

"ہم پہلے رابعہ کو گھر پر چھوڑ دیں گے۔" میں نے کہا۔ "اس شخص کو کسی ایسی جگہ بند کرنا ہے جہاں اسے کوئی نہ دیکھ سکے اور جہاں سے اس کی آواز بھی کسی کے کانوں تک نہ پہنچے۔ پھر تم گھر پہنچ کر خادم کو لے کر بیٹھ جاؤ گے۔ خادم کو رابعہ کے پاس پہنچا کے ہم دونوں ذرا سی دیر کے لیے وہیں جائیں گے۔ وارد غور والا سے آگے اسی زیر تعمیر کوٹھی میں۔"

"وہ کیوں؟" رابعہ نے کہا۔ "کسی نئی مشکل میں گرفتار ہونے کے لیے؟" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔

"دراصل میں نے ایک حماقت کی تھی۔" میں نے کہا۔ "میں اپنے کپڑے وہاں چھوڑ آیا تھا۔ وہاں ایک لاش پڑی ہے جو شاید چوکیدار کی ہے۔ میرے کپڑوں کا وہاں موجود ہونا میرے لیے مشکلات کا باعث بن سکتا ہے۔"

"وہ... وہ وہاں چوکیدار تھا؟" محسن نے پیچھے سے کہا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے انہی لوگوں نے بتایا تھا جو اسے قتل کر کے ڈال گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "جو ہر جگہ یہی کرتے ہیں۔ تو نے جس کو فرار ہوتا دیکھ کر گولی چلائی تھی وہ تو بچ کے نکل گیا تھا۔"

گھر پہنچنے تک ہم میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ اس وقت تک افق پر صبح کے آثار پیدا ہو چلے تھے اور اجالا پھیل گیا تھا۔ آسیب زدہ نظر آنے والی کوٹھی پر موت کا سایہ لگ رہی تھی۔ در و دیوار سوگوار دکھائی دیتے تھے اور لان میں درخت بھی اداس اور سرنگوں کھڑے تھے۔ میں رابعہ کو لے کر اوپر گیا اور محسن نے سیاہ پوش کو اتارا جس کی صورت نقاب ہٹ جانے کے بعد سامنے آ گئی تھی لیکن ہمارے لیے اجنبی تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی رابعہ کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ وہ بے اختیار ماں کی لاش پر گر گئی اور اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ اس کے دکھ کی شدت اسی طرح کم ہو سکتی تھی۔ اس نے پہلے ہی بہت سے جسمانی و ذہنی عذاب برداشت کر لیے تھے مگر انسانی جسم فولاد کی مشین نہیں ہے کہ ٹوٹتا ہی نہ ہو۔ قوت برداشت سے کام لے کر مرحلے جھیل جانا واقعی بہادری ہے مگر غم سے ذہن کو متاثر نہ ہونے دینا گوشت پوست کے بنے ہوئے آدمی کے لیے ناممکن ہے۔ رابعہ کے دل میں بھی غم اور رنج و الم کے جذبات کا آتش فشاں ابل رہا تھا جو پھٹ گیا اور وہ روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور اس کے اپنے بیڈروم میں لے گیا۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" محسن دروازے سے نمودار ہوا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "شدت غم سے بے ہوش ہو گئی ہے۔ تو ایسا کر، کافی بنا لا اور رابعہ کے لیے چینی کی بجائے گلوکوز ڈال کے لانا۔ شاید کچن یا فریج میں ہو۔ میں اس کے پاس بیٹھا ہوں۔"

محسن کے کافی لے کر آنے سے پہلے ہی رابعہ کو ہوش آ گیا۔ میں نے زبردستی کی حد تک اصرار کر کے اسے کافی پلائی جس سے

www.paksociety.com

اس کی طبیعت فوری طور پر سنبھل گئی۔" سکندر! میں بہت بدبخت ہوں۔ ماں نے آخری وقت میں مجھے یاد تو کیا ہوگا؟"

میں نے کسی تذبذب کے بغیر نفی میں سر ہلا دیا۔" میں انتقال کے وقت وہیں تھا۔ انہیں ہوش ہی نہیں تھا۔" یہ جھوٹ اس کے احساسِ جرم میں اضافہ کرنے والے سچ سے بہتر تھا اور مجھے یقین تھا کہ خدا نے اسے جھوٹ شمار نہیں کیا ہوگا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" محسن نے کہا۔" ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں۔"

"تو نے اس شخص کو کہاں رکھا ہے؟" میں نے کہا۔" اس کے نکل بھاگنے کا تو کوئی امکان نہیں؟"

"میں نے اسے اسٹور میں ڈال دیا ہے، ہاتھ پیر باندھ کے۔" محسن نے کہا۔" لیکن اسے علاج معالجے کی ضرورت ہے سکندر! ورنہ وہ ہمیں کچھ بتانے سے پہلے ہی مر جائے گا۔"

"یہ تو بڑا مسئلہ ہوگا۔" میں نے کہا۔" ڈاکٹر آئے گا تو بہت سے سوالات کرے گا۔"

"ڈاکٹر کو میں بلا رہی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔" ہم اسے جو کچھ بتائیں گے وہ مان لے گا۔ بشرطیکہ وہ خود نہ بولے۔"

"اس کو خاموش رکھا جا سکتا ہے اگر مارفیا وغیرہ کا ایک انجکشن اسے دیا جائے۔" میں نے کہا۔

"مارفیا تو نہیں لیکن ڈائزی پام کا انجکشن ہے۔" رابعہ نے کہا۔" سرنج وغیرہ بھی ہے۔ جب امی پر ڈپریشن کا شدید دورہ پڑتا تھا اور وہ سو نہیں پاتی تھیں تو... تو میں لگا دیتی تھی۔ وہ کسی حد تک اس کی عادی ہو گئی تھیں۔ میں مجبور تھی۔"

میں نے اور محسن نے پیچھے آ کے اس سیاہ پوش کے کپڑے بدلے اور اسے شریفانہ لباس میں لاتے ہوئے ہمارے ہاتھ خون میں بھر گئے۔ یہ خون محسن کی قمیص کے شانے پر بھی تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ رابعہ کی گاڑی کی سیٹ پر داغ نہ آئے اور اس کوشش میں کامیاب رہا تھا۔ وہ شخص اب بولنے لگا تھا اور جاری منت سماجت کر رہا تھا کہ وہ اسے جانے دیں لیکن اس کے ہونٹوں سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔" خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو... وہ مجھے مار ڈالیں گے...۔" کے سوا وہ کچھ نہیں کہہ پا رہا تھا۔ میں نے اس کو بڑی احتیاط سے انجکشن دیا اور وہ چند منٹ کے اندر اندر بے سدھ ہو گیا۔ میرے کہنے پر محسن نے اسے گیسٹ بیڈ میں منتقل کیا اور اتفاق رائے سے ایک کہانی تیار کی کہ یہ شخص ہمیں دروازے پر اسی طرح پڑا ملا تھا۔ معلوم نہیں کوئی اسے وہاں ڈال گیا تھا یا وہ خود چل کے رابعہ کے گھر تک آ پہنچا تھا۔ ہوش میں آئے گا تو معلوم ہوگا کون ہے؟

پولیس کو ہم اس لیے رپورٹ نہیں کرنا چاہتے کہ آج بھی تمام دن رابعہ کی ماں کے کفن دفن کے انتظامات میں گزرنا ہے۔ تب تک یہ ہوش میں آ جائے گا تو خود ہی بتا دے گا۔

رابعہ اس عرصے میں اپنے کچھ رشتہ داروں کو فون کر رہی تھی اور ان سے درخواست کر رہی تھی کہ وہ اپنے قریب رہنے والے دوسرے لوگوں کو اطلاع کر دیں۔ جب ہم پھر اس کے بیڈ روم میں پہنچے تب بھی وہ فون کر رہی تھی۔

"اب میں جا کے ماسی کو لاتا ہوں۔" میں نے کہا۔" مجھے آنے جانے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا اور اس وقت صبح کے ساڑھے چھ بجے ہیں۔ سات بجے تک میں اور محسن گئے تو ساڑھے آٹھ تک واپس آ جائیں گے۔"

"میرا تو خیال ہے تم غلطی کر رہے ہو۔" رابعہ نے کہا۔" پتا نہیں پیچھے کیا ہوتا ہے؟"

"جس انداز سے انہوں نے مجھے یہ اطلاع دی تھی اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔" میں نے کہا۔" مگر ہم یہ بات پولیس کو بتا سکتے ہیں اور پولیس کھوج لگا کر ان کی مدد سے سیدھی یہاں آ سکتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ایک شخص انہیں وہاں دیکھ چکا ہے۔ اس نے محسن سے باتیں بھی کی تھیں۔"

"ٹھیک ہے۔" رابعہ نے کہا۔" جاؤ۔ مگر دیکھو خدا کے لیے عقل سے کام لینا۔ اس وقت میں کوئی اور صدمہ برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں اکیلی رہ گئی ہوں۔"

"یہ کیسی باتیں شروع کر دیں تم نے؟" میں نے کہا۔" تم تو ہماری مددگار ہو۔ ہمیں بچانے والی ہو۔"

"میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اس شخص کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔" وہ بولی۔" وہ خود معلوم کر لیں گے کہ مجھے اغوا کر کے لے جانے والے کون تھے؟"

"وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ پوچھیں گے۔ مثلاً اغوا کا مقصد۔ اور ہمیں بہت سی ایسی باتیں بتانی پڑیں گی جو ہم چھپانا نہیں چاہتے۔" میں نے کہا۔" خط کا معاملہ ختم ہوا۔ تم خیر و عافیت واپس آ گئیں۔ اب ہمیں بلا وجہ خبر کا عنوان بنانے سے کیا حاصل ہوگا۔ اگر پولیس کے حوالے کرنا ہی ہے تو ہم کوئی کہانی بنا دیں گے جس میں تمہارا نام نہ آئے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرے دشمنوں کا آدمی ہے اور اس نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اس کے ساتھی اس کو زخمی چھوڑ کے فرار ہو گئے۔ ابھی تم اپنی فکر مت کرو۔ تمہاری ذات کو فی الحال کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ یہی بہت اطمینان کی بات ہے۔ ہم نے وہ خط تمہارے پاس

رکھوانے میں غلطی کی تھی اور تمہیں بھی اپنے ساتھ براہِ راست ملوث کر دیا تھا۔ میں اس غلطی کا اعادہ نہیں کروں گا۔ کل میں ان کو کسی ایسی جگہ شفٹ کر دوں گا۔ ممکن ہوا تو آج ہی شام کو۔ جہاں وہ تمہاری سے نہ پہنچ سکیں اور تم محفوظ رہو۔ تم عدالت کی حد تک میرے قانونی معاملات کی مشیر رہو گی۔ باقی معاملات سے تمہارا دور رہنا اچھا ہے کیونکہ جو کھیل ہم کھیل رہے ہیں وہ بہت خطرناک ہے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی طرح تم خطرات کے اس جنگل سے نکل آؤ؟" رابعہ بولی۔" عزت اور حفاظت کے ساتھ؟"

"اگر یہ میرے اختیار کی بات ہوتی تو میں تمہارا حکم مان لیتا۔" میں نے کہا اور یہ نہیں دیکھا کہ محسن مجھے کتنے غور سے دیکھ رہا ہے۔" جتنی ضرورت تمہیں میری ہے اتنی ہی مجھے تمہاری بھی ہے۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ابھی تمہیں معلوم نہیں۔ کسی دن میں سب کچھ تمہیں بتا دوں گا لیکن ابھی نہیں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے تم پر اعتماد نہیں۔ نہیں! میں تمہارے لیے مزید پریشانیاں پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں ناگزیر مجبوریوں کی زنجیر سے بندھا ہوا ہوں اور یہ معاملات ایسے ہیں جن میں قانون میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اپنی مدد میں آپ کر سکتا ہوں چنانچہ مجھے یقین ہے کہ خدا میری مدد کرے گا۔ بات صرف صبر، حوصلے اور استقامت کی ہے۔"

"اب تو جاؤ۔" محسن نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ میں نے سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"محسن! تم یہیں رہو۔" میں نے دروازے کے قریب رک کر کہا۔" عین ممکن ہے وہ ہمارے تعاقب میں آئے ہوں یا ان کے کسی آدمی نے ہمیں دروازے سے کار میں اندر آتے دیکھا ہو اور انہیں اطلاع کر دی ہو۔ اگر وہ میری عدم موجودگی میں آ گئے تو حالات کو سنبھال لینا اور رابعہ کو محفوظ رکھنا۔"

"میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔" رابعہ نے ٹیبل کی دراز سے ریوالور نکالا۔" اور میرا نشانہ محسن سے اچھا ہے۔"

"اگر قتل و خونریزی نہ ہو تو آج کا دن بہت اچھا ہے۔" میں نے کہا۔" تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ آس پاس کے گھروں میں ابھی اطلاع کر دو۔ کچھ لوگ آ جائیں گے تو ان کی موجودگی میں کسی کی ہمت نہ ہوگی۔"

"تم باہر جاتے ہوئے ساتھ والی دونوں کوٹھیوں میں بتا جاؤ۔" رابعہ نے کہا۔" جب ماسی آ جائے گی تو میں باقی گھروں میں بھی خبر پہنچا دوں گی۔"

چند منٹ بعد میں نے ماسی کے دروازے پر کار روکی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ میرے آنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ اور اس کا رنگ اڑ گیا۔ جب میں نے اس کے خدشات کی تصدیق کی تو اس نے رونا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ گھر کی دیگر عورتیں بھی۔ ایک جواں سال لڑکے کو لے کر کار میں بیٹھ گئیں۔ ماسی تمام راستہ روتی رہی اور اس کے ساتھ آنے والی ایک ہم عمر اور ایک نوجوان عورت اسے تسلی دیتی رہیں۔ میں نے یہ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کہ باقی لوگ کون ہیں اور دس منٹ بعد ان کو رابعہ کی کوٹھی پر اتار دیا جہاں ابھی خیریت تھی۔ ماسی کے چیخنے کی آواز سے گھر کی فضا یکلخت ماتمی ہو گئی۔ اندر مجھے دو اجنبی خواتین کے چہرے بھی دکھائی دیے جو غالباً پاس پڑوس سے آئی تھیں۔

محسن مجھے پیچھے ہی ملا اور گیسٹ بیڈ روم میں لے گیا جہاں ڈاکٹر ہمارے جنگی قیدی کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔

"یہ... یہ تو گولی کا زخم ہے۔" ڈاکٹر نے ہم میں سے کسی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ہم دونوں خاموش رہے۔" لیکن کیا یہ بات عجیب نہیں ہے کہ دروازے پر خون کا کوئی داغ نہیں۔ کس نے اٹھایا تھا اسے؟"

"میں نے۔" محسن نے کہا۔" میں نے غور نہیں کیا تھا۔ اس وقت اندھیرا ابھی تھا۔"

"رابعہ نے مجھے فون پر ہی بتایا تھا۔" وہ پٹی لپیٹتے ہوئے بولا۔" چنانچہ میں نے آتے وقت دروازے کو غور سے دیکھا تھا۔"

ہمارے بیان کی ایک فاش غلطی کو ڈاکٹر نے پکڑ لیا تھا لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ گھر کا ڈاکٹر تھا۔ اس سے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہ ہم سے بات کیے بغیر پولیس کو فون کرنے لگے گا۔ جیسے کہا کہ اصل بات کچھ اور ہے جو ہم بعد میں بتائیں گے کیونکہ آج اس کا موقع نہیں اور اندیشہ یہ ہے کہ اس سے رابعہ کی بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس نے ناگواری سے سر ہلایا اور کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس کا بیگ لے کر دروازے تک گیا۔ محسن میرے ساتھ رہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کار میں بیٹھنے کے بعد کہا۔" ایک بات یاد رکھو۔ ڈاکٹر اور وکیل سے حقیقت چھپائی جائے تو کیس بگڑ جاتا ہے اور وہ صحیح مدد بھی نہیں کر سکتے۔ میں پھر آؤں گا دو بجے جنازے میں شرکت کے لیے۔" اس نے کار کو بیک کیا اور ابھی اس کی گاڑی باہر نکلی ہی تھی کہ ایک ٹیکسی اندر آ گئی۔ اس میں رابعہ کے کچھ رشتہ دار آئے تھے۔ میں نے ٹیکسی کو روک لیا۔ محسن نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں نے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کی ہے۔" میں نے کہا۔" میں رابعہ کی کار لے کر جاؤں گا۔ کار کو سڑک پر چھوڑ دینا

www.paksociety.com

گا اور گھوم کر پچھلی طرف سے اس زیرِ تعمیر کوٹھی میں جاؤں گا۔ تو ٹیکسی میں میرے پیچھے رہنا لیکن رکنے کی بجائے ٹیکسی کو آخر تک لے جانا۔ فوراً پچھلے راستے پہ جانے کے لیے تیار رہو تو اسے کچھ نہ دینا۔ وہ مسلح ہیں اور مسلح ہم دونوں ہوں گے۔"

"اس کا فائدہ؟" محسن نے کہا۔ "تیرا خیال ہے وہاں اب بھی کوئی خطرہ ہے؟"

"ہاں، میں نے رابعہ کے سامنے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کے سامنے تو میں نے کہا تھا کہ دشمنوں نے دھمکی کے انداز میں بات کی ہے لیکن حقیقت مجھے برعکس لگتی ہے۔ انہوں نے جال پھیلایا ہے۔ میرے ذہن سے کپڑوں کا خیال نکل گیا تھا۔ انہوں نے مجھے یاد دلایا کہ میرے کپڑے ایک چوکیدار کی لاش کے پاس پڑے ہیں۔ یہ یاد دلانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ یہی کہ میں اپنے کپڑے لینے جاؤں اور پکڑا جاؤں۔ انہیں یقین ہوگا کہ اب میں ضرور آؤں گا اور وہ میرے منتظر ہوں تو تعجب کی بات نہیں۔"

"الگ الگ جانے میں کون سی عقلمندی ہے؟" محسن بولا۔ "ایک ساتھ ہوں گے تو مقابلہ کریں گے۔"

"میں ایک چانس لے رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ان کو یہی خیال ہوگا کہ میں آیا تو صبح دم آؤں گا۔ اس سے پہلے کون چڑھے اور کوئی اندر آ کے لاش کو دیکھے۔ آٹھ بجے تک کوئی خطرہ نہیں، اور ہم وہاں آٹھ بجے تک ہی پہنچیں گے۔ وہ بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے اور جب رابعہ کی فاکس ویگن کو سڑک پر رکتے اور مجھے گاڑی سے اتر کر اکیلا آتے دیکھیں گے تو مطمئن ہو جائیں گے کہ میرے ساتھ اور کوئی نہیں۔ انہیں یہ خیال بھی آئے گا کہ محسن کو میں نے رابعہ کے پاس یا اس جنگی قیدی کی حفاظت کی خاطر پیچھے چھوڑا ہے۔ ایسے میں اگر تیری ٹیکسی بعد میں نمودار ہوئی اور پچھلے راستے پہ چل کے ادھر آئی تو انہیں یہ شک نہیں ہوگا کہ اس میں تو ہوگا۔ ادھر دو سے گھر بھی ہیں جو ذرا فاصلے پہ ہیں۔ وہاں بھی لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ تو ٹیکسی کو کسی اور مکان کی طرف لے جانا اور پھر وہاں سے سیدھا کوٹھی کے پچھلے راستے اندر۔ امید ہے کہ میں تجھے ان سے مذاکرات میں مصروف ملوں گا یا پھر اپنے کپڑے سمیٹ کر نکلنے والا ہوں گا۔ خدا نے چاہا تو ہم نو بجے تک واپس آ جائیں گے۔"

روانہ ہونے سے پہلے حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے اپنا ریوالور خالی کیا اور محسن نے اپنا ریوالور پورا لوڈ کر لیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرے اندیشے درست ثابت ہوئے اور دشمن مجھے منتظر ملا تو اندر قدم رکھتے ہی مجھے ہتھیار ڈالنے پڑ جائیں گے۔ میرا ارادہ ایک چھوٹا سا جوا کھیلنے کا تھا۔ اگر میرے ہاتھ میں اندر جاتے وقت ریوالور ہوا تو وہ سب سے پہلے مجھے محصور کر لیں گے اور پھر کہیں گے ریوالور پھینک دو۔ ممکن ہے وہ شخص جو اپنے ریوالور کے زور پر مجھے اس حکم کی تعمیل پہ مجبور کرے، میرا ریوالور اٹھا لے۔ دونوں ہاتھ میں دو ریوالور کون رکھتا ہے۔ اگر اس نے اپنا ریوالور جیب میں ڈال لیا اور میرا اسلحہ میرے ہی خلاف استعمال کر کے اسے ایک ... کی تو دھوکے میں مارا جائے گا۔ علاوہ وہ غیر مسلح ہوگا لیکن یہ بات اسے گولی چلانے کی نوبت آنے تک معلوم نہیں ہوگی۔ میں یا محسن محفوظ رہیں گے اور جتنی دیر میں اسے ریوالور کے خالی ہونے کا احساس ہوگا اور کوئی دوسرا اپنا ریوالور نکالے گا، ہمیں کافی وقت مل جائے گا۔ میرے حریف جوڈو یا کراٹے کے داؤ پیچ نہیں جانتے تھے جو میں جانتا تھا۔ میں دو منٹ میں چار افراد کو کسی بھی طور طریقے پہ لٹا بھی سکتا تھا اور کسی مہلک وار سے ختم بھی کر سکتا تھا۔

دوسری احتیاط محسن نے کی۔ اس نے اپنا حلیہ تھوڑا سا بدل لیا۔ گھر کے اندر ہی اسے چار خانے کی ایک لنگی مل گئی تھی جسے اس نے پتلون کے اوپر لپیٹ لیا۔ جوتوں کی جگہ اس نے چپل پہن لی۔ رابعہ پڑھتے وقت عینک استعمال کرتی تھی۔ محسن نے اس کے شیشے توڑ کے خالی فریم کو ناک پر فٹ کر لیا اور یہ نشانہ اس کے مردانہ چہرے پہ بہت مضحکہ خیز نظر آنے لگا۔ اس کے بعد قمیص اتار کے وہ صرف بنیان میں رہ گیا۔ یہ ساری کارروائی اس نے تمام لوگوں سے چھپ کر گیسٹ بیڈ روم میں کی۔ یہاں تک کہ رابعہ کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی۔ پھر وہ بڑی پھرتی سے ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ میں نے پڑھنے رعب سے ٹیکسی ڈرائیور کو پچاس روپے کا نوٹ دیا اور اسے بتایا کہ کہاں جانا ہے۔ "باقی پیچھے رکھ لو۔" اس نے بے نیازی سے کہا اور ڈرائیور نے منہ بنا کر جیسے کو پیش کیا جس کے لیے شب کی یہ رقم کرایے سے زیادہ ہو گئی تھی۔

میں نے ایک کام یہ بھی کیا کہ اپنے اسیر کو دوبارہ اسٹور روم میں شفٹ کر دیا اور اسے باندھنے کے علاوہ اس کے حلق میں کپڑا بھی ٹھونس دیا تاکہ خدانخواستہ وہ ہوش میں آ جائے تو چیخ نہ سکے۔ اس کے سیاہ نقاب اور خون آلود لباس کو جو اب تک میں نے ردی کاغذ میں لپیٹا اور مٹی کے تیل میں بھگو کر پلاسٹک کی ایک تھیلی میں ڈال لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے راہ میں کہیں جہاں موقع ملا نذرِ آتش کر دوں گا۔

جب میں کار سے نکلا تو ٹیکسی غائب ہو چکی تھی۔ محسن کا حلیہ بہت اطمینان بخش تھا۔ بنیان، چار خانے کی دھوتی، چپل اور عینک میں وہ ایک کاروباری مزدور نظر آ رہا تھا۔ اسے اس وقت تک نہیں پہچانا جا سکے گا جب تک سامنے آ کے وہ بولے نہیں۔ نکال لے گا۔ نہر کے کنارے چلتے ہوئے ایک مختصر وقفہ آیا

تا جب مجھے آگے پیچھے کوئی گاڑی دکھائی نہ دی۔ میں نے ماچس جلا کر ردی کاغذ اور تیل میں تر کپڑوں کی تھیلی سڑک سے ذرا دور پھینک اور اس کو تیلی دکھاتے ہی بھک سے آگ بھڑک اٹھی۔ دو منٹ بعد جب میں نے کار اسٹارٹ کی تو مجھے دور سے آتے ہوئے ریلوے کے افسروں کے بنگلے میں سے کوئی شخص اس آگ کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ مجھے خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ فاکس ویگن اتنی دور جا چکی تھی کہ وہ نمبر نوٹ نہیں کر سکتا تھا اور اس کے پہنچنے تک آگ کا سب کچھ جلا کے خاک کر دینا یقینی تھا۔

بیس منٹ بعد میں نے سڑک پہ ایسی جگہ کار روکی جہاں سے وہ زیرِ تعمیر عمارت صاف نظر آ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ بے یقینی ہو چلا تھا کہ دشمن کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ شاید کسی درخت کے پیچھے، کسی روشن دان، دیوار یا کسی دروازے کی جھری سے شکاری کی نظریں اپنے شکار کو دامِ فریب میں گرفتار ہونے کے لیے قدم قدم آگے بڑھتا دیکھ کر مطمئن ہیں۔ ایک بے خیالی کو میں چھوڑ کے مسکرانے لگے تھے اور اب انشاء دشمن کا ایک آدمی ہمارے قبضے میں تھا۔ اس کی رہائی کے لیے وہ مجھے یا محسن کو روک کے یہ سودا کر سکتے تھے کہ ہم جا کر آدمی چھوڑ دو۔ ہم تمہارا آدمی چھوڑ دیتے ہیں۔

مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ محسن کے روانہ ہو جانے کے بعد میں نے رابعہ کے گھر پہ چند ضروری انتظامات میں اور پھر راستے میں رک کر کپڑوں کے بنڈل کو جلانے میں تھوڑا سا اضافی وقت لیا تھا لیکن اس چند منٹ کی تاخیر نے مجھے بچا لیا۔ اگر میں نے ٹیکسی کے ساتھ اپنی کار دوڑائی ہوتی تو میں اور محسن تقریباً ساتھ ساتھ اس نامکمل گھر تک پہنچتے جہاں سائیں چوکیدار کی لاش پڑی تھی لیکن ہوا یہ کہ محسن وہاں پہلے پہنچا اور اس نے خطرے کو فوراً محسوس کر لیا۔ ابھی میں فاکس ویگن سے اتر کے چند قدم ہی چلا تھا کہ میں نے اسے تیز تیز قدموں سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ بے ہودہ حلیے کے باعث میں اسے فوراً پہچان نہ سکا۔ پھر کوٹھی کے اندر سے ایک مختصر سا جلوس برآمد ہوا۔ اس میں چار پولیس والوں سمیت شکل سے مجرم نظر آنے والے افراد ہوں گے جو اس کے پیچھے پیچھے سڑک کی طرف بڑھے۔ محسن نے ایک بار پلٹ کے دیکھا اور اپنی رفتار تیز کر دی۔ میں بھی اب رک گیا تھا اور اس کے قریب آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے واپس جانے کا اشارہ کیا اور میں الٹے پاؤں واپس ہوا۔ میرے بیٹھتے ہی محسن نے کار کا دوسرا دروازہ کھولا۔ "چل یہاں سے۔" وہ میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ان لوگوں نے قریب سے تجھے دیکھا تو پہچان جائیں گے۔"

میں نے کار کو اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھمائی۔ انجن ایک دفعہ جھٹکے سے غرایا اور خاموش ہو گیا۔ دوسری اور تیسری بار میں بھی میری کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ محسن نے تشویش سے میری صورت کو اور پھر جلوس کو دیکھا جو آہستہ آہستہ سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے چابی گھمانے کا عمل جاری رکھا لیکن اس سے بیٹری کمزور پڑنے لگی۔ انجن اسٹارٹ ہوتا تھا اور پھر بند ہو جاتا تھا۔

"معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے۔" میں نے پریشانی سے کہا۔ "غالباً اوور ہیٹ ہو گئی ہے۔" بیٹری کی بجائے میں یہی اندازہ کر سکتا تھا۔

"ٹھہر جا۔ سیلف مارنے سے بیٹری بالکل بیٹھ جائے گی تو دھکے سے بھی فائدہ نہیں ہوگا۔" محسن نے اترتے ہوئے کہا۔ پولیس والے اور چار دیگر افراد اب اتنے قریب آ گئے تھے کہ میں ان کی صورتوں کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ پولیس والوں نے ایک ایسے شخص کو ہتھکڑی ڈال رکھی تھی جو میرے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اور دیوانہ تھا۔ اس کے لمبے جٹا دھاری بال جو الجھے ہوئے اور دھول سے خاکستری ہو رہے تھے، داڑھی کے بالوں سے جا ملے تھے اور بالوں کے اس خودرو جنگل میں اس کے وحشت زدہ چہرے پہ متحرک آنکھیں بہت بے قرار لگتی تھیں۔

"او سے بابا۔" دیوانے نے اچھل کے ایک نعرۂ مستانہ لگایا۔ "سب نوں چھٹے۔" معلوم نہیں وہ دینے والے سے سب کے لیے کیا طلب کر رہا تھا۔ یہی دیوانگی جس نے اسے فکر و غم سے بیگانگی عطا کی تھی، وہ دولتِ فقر جس کی نگاہ میں شانِ سکندری کچھ نہیں۔ سنگ، دشنام اور ذلت کا آزار دینے والوں کے لیے بھی کوئی آزار ہے یا ان سب کے لیے عفو و درگزر جو نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟

محسن نے دھکا لگایا اور چھوٹی سی کار سڑک کے معمولی سے نشیب پہ رواں ہو گئی۔ میں نے کلچ چھوڑا تو کار نے ایک جھٹکا لیا۔ انجن کھانسا اور پھر یوں گرجا کہ کار نے ایک دم اسپیڈ پکڑی۔ میں نے بریک پہ پاؤں رکھا اور محسن لڑکھڑاتا ہوا آ کے پھر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ "خدا کا شکر ہے۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے سر گھما کے دیکھا۔ مجھے اپنے سامنے لگے ہوئے شیشے میں نظر آ رہا تھا کہ ایک دیوانے کو قاتل سمجھ کے پکڑنے والے سڑک تک پہنچ چکے تھے۔ وہ اب کسی ٹیکسی کے انتظار میں تھے۔

"او سے مولا۔۔۔ سب نوں چھٹے۔" دیوانے کی صدا آئی اور زنجیر نے کھنک کر اس کا ساتھ دیا۔ وہ اب رقص کے انداز میں پیر پٹخ رہا تھا۔ مجھے اس کی دیوانگی پہ رشک آ رہا تھا جسے نہ الزام کی خبر تھی نہ انجام کا اندیشہ۔ نہ غمِ دوش تھا نہ فکرِ فردا تھی اور جسے زندگی کے متاعِ بے بہا ہونے کا احساس ہی نہ تھا کہ موت کا ڈر

www.paksociety.com

ہوتا۔ کار گھوم کے تیزی سے ان کے سامنے سے گزر گئی اور اس ایک لمحے میں جب کسی کی نظر مجھے دیکھ سکتی تھی، ہمارے درمیان ایک ڈبل ڈیکر بس حائل ہو گئی جو دوسری طرف سے آ گئی تھی۔

"اس پاگل کو پکڑ لیا ہے قتل کے الزام میں؟" میں نے خطرے کی حدود سے نکل آنے کے بعد کہا۔ "اس لیے کہ وہ میرے کپڑے پہن چکا تھا۔"

"ہاں۔" محسن بولا۔ "جس شخص نے تجھ سے بات کی تھی اس نے کچھ بعد کہا کہ یہ پاگل بندہ تو وہی لگتا ہے۔ پولیس کو خدا موقع دے اپنی کارکردگی اور مستعدی دکھانے کا۔ اسی گواہی پر ان کے لیے فیصلے کی کارروائی پوری ہو گئی اور انہوں نے گویا قاتل کو جائے واردات پر ہی پکڑ لیا حالانکہ وہ خود بھی جانتے ہوں گے کہ اگر یہ شخص پاگل ہے تو عدالت سے اسے کوئی سزا نہیں ہو سکتی۔ ایک شخص نے کہا بھی تھا کہ یہ تو پاگل ہے۔ کل تک ننگا گھومتا تھا۔ پولیس والوں نے کہا تھا کہ یہ سب معلوم ہو جائے گا۔ ایسے تو سب ہی پاگل بن کے چھوٹ جاتے ہیں۔ شامت کا مارا ہوا کسی کے اندر جا گھسا ہو گا اور کپڑے پڑے دیکھے ہوں گے تو اچھا سمجھ کے پہن لیے ہوں گے۔"

"مگر پولیس کا اس وقت موجود ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ قتل کی اطلاع انہیں بہت پہلے ٹیلیفون پر دی گئی ہے۔ میرا اندازہ درست تھا۔" میں نے کہا۔ "اور میرا خیال ہے کہ رابعہ کو اسیر رکھنے والوں نے فرار ہونے کے بعد کہیں سے پولیس کو فون کیا ہوگا تاکہ یقین ہو گا کہ میں اپنے کپڑے لینے پہنچوں گا تو میر شرافت علی کے بعد قتل کے اس دوسرے الزام میں ملوث ہو جاؤں گا۔ یہ۔ نہ خود ہو شیدہ والی بات ہو گی۔ بوجھ بڑھتا چلا جائے گا اور میرے لیے تمام مقدمات ختم کرا دینے کی پیشکش کو قبول نہ کرنا دشوار تر ہو جائے گا مگر ایک دیوانے نے ہماری بلا اپنے سر لے لی۔"

رابعہ کے گھر میں تعزیت کے لیے آنے والوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور لان پر جمع تھے۔ میں نے کار کو دروازے کے سامنے روکا تو بہت سے لوگوں کی نظریں اٹھیں۔ وہ رابعہ کی کار کو پہچانتے تھے لیکن مجھے نہیں جانتے تھے۔ خود میرے لیے سب نا آشنا چہرے تھے جن میں رابعہ کے عزیز، ہمسائے، جان پہچان رکھنے والے اور دفتر کے کارکن سب شامل ہوں گے۔ میں کسی کی طرف دیکھے بغیر رسماً اور اخلاقاً "السلام علیکم" کہتا گزر گیا۔ سوالیہ نگاہیں میرے تعاقب میں رہیں کہ گھر کے ایک فرد کی طرح گھر میں گھس جانے والا یہ شخص کون ہو سکتا ہے جسے پہلے کبھی گھر میں نہیں دیکھا گیا۔ پانچ منٹ کے وقفے سے محسن آ گیا جو ابھی تک خیال اور ہمدردی میں [illegible] میری طرح وہ بھی سلام کرتا گزرا مگر قابل غور نہیں سمجھا گیا کہ اپنے حلیے سے وہ گھر کا ملازم لگتا تھا۔

میں نے سب سے پہلے اپنے جنگی قیدی کے زنداں میں موجود ہونے کا یقین کیا اور پھر محسن کے ساتھ مل کر تجہیز و تکفین کے انتظام کی طرف متوجہ ہوا لیکن ہماری عدم موجودگی میں وارد ہونے والے دو بوڑھوں اور دو نوجوانوں کی کمیٹی تشکیل پا چکی تھی اور فطرتاً انہوں نے اپنا آئینی حق سمجھتے ہوئے سنبھال لی تھی۔ بڑے کر رشتے سے رابعہ کے چچا اور ماموں ثابت ہوئے اور نوجوان ان کے کزن جن کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات مجھے خود رابعہ نے فراہم کی تھیں۔ اس غرض سے کہ دشمن ہمارے حق میں [illegible]

اب ہم جس منظر تک محدود کر آنے جانے والوں پر نظر رکھ سکتے تھے۔ مجھے یہ اندیشہ لاحق تھا کہ مجمع عام میں وہ لوگ بھی شامل ہو سکتے ہیں جو جنازے میں شرکت کے بہانے اپنے قیدی کو چھڑا لے جانا چاہتے ہوں تاہم ان لوگوں کو شناخت کرنا بھی اتنا ہی ناممکن تھا جتنا کسی ثبوت کے بغیر ان کو الگ کر کے نکالنا۔ ہر شخص زیادہ سے زیادہ غمزدہ نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھا اور آنے والوں کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ تعزیت کس سے کریں۔ رابعہ اوپر اپنے کمرے میں تھی اور غالباً صدمے کے باعث اس کی حالت غیر تھی چنانچہ ڈاکٹر نے انجکشن دے کر سلا دیا تھا۔ بلاشبہ رابعہ ذہنی و جسمانی اذیت کے جن مراحل سے گزری تھی وہ ایک عام عورت کے اعصاب کو اس حد تک متاثر کر سکتا تھا کہ اس کا بستر یا عارضی طور پر دماغ کی خرابی کا سبب بن جائے مگر رابعہ نے غیر معمولی عقل، جرأت اور حوصلے کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اتنی حقیقی ہوتی تھی کہ اس نے ہر ایک سے ملنے اور اول تا آخر ماں کی موت کے اسباب و واقعات اور ملاقات کی تفصیلات بار بار سنانے اور سب کے ساتھ رونے کی ہمت کی تھی۔ میں نے اسے کمرے میں محصور کر کے چلتے اور اسیر [illegible] کی۔ دونوں چیزیں مجھے بار بار ملاتی تھیں۔ وہ اکیلی بڑی تھی اور دو گھنٹے بعد کمرے سے نکلی تو اس کی حالت قدرے بہتر تھی۔ محسن نے اسٹور روم کے آس پاس پہرہ دینا جاری رکھا۔ [illegible] اس کے پاس ہی تھا۔ وہ ادھر ادھر [illegible] کی اوٹ سے پائپ پیتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ تعزیت کے لیے آنے والوں میں سے کون گھر کے اس حصے تک آتا ہے۔ ایک گھنٹے بعد اس نے بتایا اور مجھے تسلی دی [illegible] میں جا بیٹھا۔ ہر گز [illegible] سے کوئی ایسی مسلسل غیر موجودگی [illegible] پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ محسن نے اپنے پرانے کپڑے [illegible]

ہے۔ اس شریفانہ لباس میں دیکھ کر بہت سے لوگ چونکے ہوں گے کہ یہ دیرینہ خادم تھا تب ہی شخص ہے جو جنیاں اور [illegible] یا اس کا کوئی ہمشکل۔ دو نوجوان جو تدفین کے انتظام [illegible] آؤٹ ڈیوٹی کے لیے موٹر سائیکل لے کر جا چکے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کفن دفن کا سامان لانے کے لیے رابعہ کی کار مل جائے مگر چابی کا مسئلہ پیدا ہوا تو انہیں [illegible] چنانچہ وہ بادل نخواستہ اپنی پرانی موٹر سائیکل پر گئے۔ [illegible] صاحب اور رابعہ کے ماتحت وکیل کے آنے کے بعد ہماری پوزیشن بہتر ہو گئی۔ انہوں نے ہم سے تفصیلی معلومات حاصل کیں جو وہ سرسری کا فون تک ہی پہنچیں۔ رفتہ رفتہ تمام حاضرین پر واضح ہو گیا کہ رابعہ کی ماں کی تیمارداری اور خبرگیری کی ذمہ داری آخر تک ہماری خدمات کیا تھیں۔

جنازے کی روانگی میں کچھ وقت باقی تھا جب میں نے ایک شخص کو خاصے پراسرار انداز میں نمودار ہوتے دیکھا۔ میں تیہ خانے کے طور پر استعمال ہونے والے اسٹور روم کے سامنے والے کمرے کا دروازہ کھولے کھڑا تھا کہ وہ شخص دبے پاؤں آیا اور اس نے مقفل دروازے سے کان لگا کے کچھ سننے کی کوشش کی۔ [illegible] میں اسے گردیکھتا رہا اور کچھ سوچتا رہا۔ میں نے اس کی صورت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ میں اسے مزید کارروائی [illegible] دیا جاتا تھا اور میری عقلی خواہش تھی کہ وہ قفل کھولے [illegible] جاؤں۔ اس کے حلق سے آواز تک نہ نکلتی [illegible] لیکن اسی وقت کہیں کھٹکا ہوا اور کسی [illegible] دی کہ وہ چونک کر پلٹا اور جدھر سے آیا تھا ادھر غائب ہو گیا۔ میں نے پوری احتیاط برتی اور اس کو نکل جانے [illegible] جب میں نے باہر نکل کے دیکھا تو وہ لان پر کھڑا [illegible] سے بات کر رہا تھا۔

[illegible] کے بہت قریب ہو جانے کے باوجود میں ان کی باتیں [illegible] بہت آہستہ بول رہے تھے لیکن ماحول ایسا تھا [illegible] دبے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ میں نے کچھ [illegible] چاہا لیکن عبدالودود منظر کی مداخلت نے مجھے [illegible] رابعہ سے ملنا چاہتا تھا چنانچہ میں اسے اوپر لے [illegible] تفصیلات اور دوسرے مسائل پر بات کرنے کا [illegible] ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا اور منظر [illegible] کی پال پر بڑنے والے جان پہچان کے دوست کے بیٹے [illegible] ایک دم مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے [illegible] پلٹ کر دیکھا اور پھر چل پڑا۔

"منظر!" میں نے کہا۔ "ابھی پیچھے مڑ کے دیکھنا ہے۔ پیچھے لان پر ایک شخص کھڑا ہے۔ تقریباً وہیں جہاں میں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سلیٹی رنگ کی قمیص اور پتلون پہن رکھی ہے۔ اس کے مقابل ایک وکیل کھڑا ہے۔ تم اس وکیل کو جانتے ہو؟ نام سے یا صورت سے؟"

منظر نے سر ہلایا اور برآمدے میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کھڑا ہو گیا۔ بڑی صفائی سے پہلو بدل کے اس نے دیوار سے ٹیک لگائی اور بظاہر مجھ سے محو گفتگو رہا مگر اس کی آنکھوں نے لان کا سروے کر لیا۔

"میں نے اسے بار روم یا کسی کورٹ میں تو نہیں دیکھا۔" منظر بولا۔ "لیکن ایسے تو بہت سے وکیل آتے رہتے ہیں اور میں سب کو نہیں پہچانتا۔ دو چار سال پرانے ہوں تو صورت آشنا ضرور ہو جاتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ بھیڑ کی کھال اوڑھ کے بھیڑیے بھی آ گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صرف کالا کوٹ پہن لینے کے بعد ان وکیلوں میں کوئی بد معاش آ جائے تو یہ کیا مشکل ہے؟"

"یہ تو مشکل ہے۔" منظر بولا۔ "مگر ناممکن نہیں۔ میں نے دیکھ لیا ہے اسے۔ رابعہ کے ماتحت وکیلوں سے پوچھتا ہوں۔ وہ بھی اپنے دوستوں سے معلوم کر سکتے ہیں۔ فراڈ ہو گا تو [illegible]

www.paksociety.com

ہیں گے بعد میں۔ پہلے ذرا رابعہ سے مل لوں۔"

رابعہ کے پاس دس منٹ ٹھہرنے کے بعد میں نیچے آ گیا۔ میں اسے تسلی دیتے ہوئے ادھر سے ادھر جا کے مختلف لوگوں سے باتیں کرتے دیکھتا رہا۔ ان میں سے بیشتر وکیل ہی تھے۔ مزید دس منٹ بعد میں اور وہ ایک دوسرے کے سامنے سے گزرے تو اس نے کہا۔ "ابھی تک تو کسی نے اسے شناخت نہیں کیا ہے۔ تمہارا خیال ٹھیک ہی لگتا ہے مجھے، وہ کوئی جعلساز ہے۔" میں صورت سے کسی تاثر کا اظہار کیے بغیر مخالف سمت میں نکل گیا اور گیٹ کے بالکل سامنے سے ٹاکس دیکھتا ہوا لوٹ آیا۔ دوبارہ دیکھنے پر مجھے وہ سلیٹی پتلون قمیص والا اور نقلی وکیل ایک دوسرے سے بہت دور بالکل اجنبی کی طرح کھڑے نظر آئے۔

اچانک کسی نے میری قمیص کی آستین پکڑ کے کھینچی۔ میں نے گھوم کے دیکھا تو وہ آٹھ دس سال کا بچہ تھا۔ تعزیت کے لیے آنے والی بہت سی عورتوں کے ساتھ بچے بھی آ گئے تھے۔

"کیا بات ہے بیٹے؟" میں نے جھک کر کہا۔ بچے نے جواب دینے کے بجائے کاغذ کا ایک پرزہ میری طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنا فرض پورا کر کے جانے ہی والا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔ اس غیر متوقع گرفتاری سے وہ کچھ گھبرا گیا۔

"ایک بات بتاؤ بیٹے؟" میں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کے نرمی سے کہا۔ "کس نے دیا ہے یہ تمہیں؟" بچے نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا اور اس عرصے میں میرے ہاتھ نے پرچے کو کھول لیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"اگر جنازہ اٹھنے سے پہلے ہمارے آدمی کو نہ چھوڑا گیا تو ہم گھر کو اڑا دیں گے۔"

میں نے پرچہ جیب میں رکھ لیا اور بچے کی طرف دیکھا۔ اس کی نظر کالے کوٹ والوں پر جا رہی تھی مگر اس صورت کو تلاش کرنے میں ناکام تھی جس نے اسے یہ پیغام پہنچانے کی خدمت سونپی تھی اور غائب ہو گیا تھا۔ شاید اس نے بچے کو ایک روپیہ دیا ہو گا کہ وہ دیکھو، وہ جو سفید پتلون اور گہری نیلی قمیص والے انکل کھڑے ہیں نا۔ یہ ان کو دے آؤ شاباش۔ اور اب بچہ پریشان تھا کہ میرے سوال کا کیا جواب دے۔ میں نے اس کو تھپکی دی۔ "جاؤ کھیلو، کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ بچے نے اطمینان کا سانس لیا اور دوڑ کر بھاگ گیا۔ میرا ذہن ایک ایک لفظ کو دہراتا اور صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کرتا رہا۔ جنازہ اٹھنے سے پہلے۔ یہ کسے معلوم ہے کہ جنازہ اٹھنے میں کتنی دیر ہے۔ چند منٹ یا آدھا گھنٹہ۔۔۔ اور یہ مہلت اسی تناسب سے بہت کم رہ گئی تھی۔ "اڑا دیں گے" سے بھی

کچھ واضح نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کریں گے۔ کیا وہ اسے ڈائنامیٹ لگا چکے ہیں۔ باہر کاریں بھی کافی تعداد میں تھیں۔ بہت سے لوگ بریف کیس لے کر آئے تھے اور ان میں وہ جعلی وکیل بھی تھا۔ اس گھر میں کسی کا کوئی کیسے کسی حصے میں پہنچ کے اپنی کارروائی میں مصروف رہنا ناممکن نہیں تھا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ دستی بم پھینک کے نکل جائیں گے۔ انسان کا آدمی کچھ بتانے سے پہلے غائب ہو جائے گا مگر اس کے ساتھ یہ گھر اس کے سوگوار اور وارثوں کے ہمراہ "میں اور محسن" یہ سب بھی نیست و نابود ہو جائیں گے۔ رابعہ کی ماں کا جسد خاکی عزت و آرام کے ساتھ اپنی ابدی آرام گاہ تک پہنچنے سے پہلے ہی پرزے پرزے ہو کے بکھر جائے گا۔ میرے لیے اس منظر کا تصور ہی اتنا لرزہ خیز تھا کہ چند سیکنڈ میں مفلوج کھڑا رہا۔ وقت بہت کم تھا اور میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ حفاظتی اقدامات نہ تحقیق، نہ مقابلہ اور نہ بات چیت۔ انہوں نے واضح الفاظ اور دو ٹوک لہجے میں تعلق توڑ دیا تھا اور مہلت کی بالکل گنجائش نہیں رکھی تھی۔ حامد رضوی صاحب کا چہرہ امید کی کرن بن کے میرے سامنے آ گیا۔ وہ ایک گوشے میں کھڑے سگار جلانے میں مصروف تھے۔ میں نے کوئی بات کیے بغیر پرچہ ان کے سامنے کر دیا۔

"تفصیل میں بعد میں بتاؤں گا انکل۔" میں نے کہا۔ "آپ اسے مذاق یا محض دھمکی نہ سمجھیں۔ کچھ لوگ گھر کے اندر موجود ہیں اور انہوں نے ایک بچے کے ذریعے یہ پیغام پہنچایا ہے۔ ان میں سے دو کو میں شناخت کر سکتا ہوں۔ ملزم ان کے پاس قید ہے۔"

حامد رضوی پرانے ذہین اور جہاندیدہ پولیس افسر تھے اور ہر قسم کی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تربیت یافتہ ذہن کے ساتھ فوری فیصلے کرنے اور صحیح قدم اٹھانے کی قابل رشک صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے میری صورت سے میری پریشانی کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے سگار جلانے کا عمل جاری رکھا مگر ایک سطر کی وہ عبارت پڑھتے ہی میں نے خدا اسی دیر کے لیے چیلا کے سیٹ لیا تھا۔

"تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے والوں سے کہو جنازہ ایک گھنٹے کے بعد اٹھے گا۔" انہوں نے بالآخر سگار سلگا لیا۔ "اسلام آباد سے مسٹر اور مسز شیروانی کے آ جانے کے بعد۔ چیلا اور فون کہاں ہے؟"

"اوپر رابعہ کے کمرے میں۔" میں نے چلتے چلتے کہا۔ بظاہر اتنے کم وقت میں، میں نے ان کو کچھ دکھایا تھا اور

بتایا تھا لیکن حامد رضوی صاحب نے بھی کمال کیا تھا کہ لمحے بھر سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ پانچ منٹ بعد بھی میں نے دیکھا تو وہ اسی جگہ منہ میں سگار دبائے کھڑے تھے اور جانے کس گفتگو میں مصروف تھے۔ ایک منٹ بعد میں نے دیکھا تو وہ غائب تھے۔ میں نے قریب ہی حلقہ بنا کے کھڑے ہوئے وکیلوں سے کہا۔ "آپ لوگ تشریف رکھیں نا۔" میں نے گھڑی دیکھی۔ "میں اسلام آباد کی فلائٹ پہنچنے ہی والی ہے۔"

"کون آ رہا ہے اسلام آباد سے؟ کوئی عزیز؟" ایک شخص نے سوال کیا۔ کچھ اور لوگ بھی متوجہ ہو گئے۔

"اسلام آباد سے مسٹر اور مسز شیروانی پہنچ رہے ہیں۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "محسن کے والدین۔ بس انہی کا انتظار ہے۔"

"اس کا مطلب ہے گھنٹہ بھر تو اور لگے گا۔" کسی نے اظہار خیال کیا۔ پھر کسی اور نے پوچھا کہ کیا ابھی ایک گھنٹہ اور لگے گا؟ میں نے پھر وضاحت کی بات اب لان میں پھیلنے لگی تھی۔ میں نے ذرا ڈرامائی رسم کا رخ کیا اور اسی معذرت آمیز انداز میں تاخیر کی وجہ بیان کی۔ تجہیز و تکفین کمیٹی کے دو بزرگ ارکان میں سے ایک نے مجھے آ لیا۔ "میاں برخوردار کیا نام ہے تمہارا؟ یہ تم سے کس نے کہا ہے کہ جنازہ تو تیار ہے۔"

"مگر چچا! رابعہ اجازت نہیں دے گی جب تک انکل شیروانی نہیں آ جاتے۔" میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "اور پھر ایک گھنٹے کی تاخیر سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

تدفین کمیٹی کے دوسرے عمر رسیدہ رکن نے تدفین میں جلدی کرنے کے مسائل کا حوالہ دیتے ہوئے شرع کے مطابق اس کے نقصانات بیان کیے۔ میں نے سعادت مندی سے اتفاق کرتے ہوئے اختلاف جاری رکھا۔ یہاں تک کہ وہ اسلام آباد سے آنے والوں کا انتظار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر موقع پاتے ہی میں نے محسن سے رابطہ قائم کیا اور اسے پوری بات بتائی۔

"میرا خیال ہے اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہو گا۔" محسن نے تشویش سے کہا۔ "ایک گھنٹے کی مہلت سے کیا ہو گا۔ ہمیں رابعہ کو نکالنا چاہیے ورنہ ہمیں تب ہی ممکن ہے جب میت کے ساتھ یہ سب لوگ بھی گھر سے نکل جائیں۔"

"ان کے بعد بھی گھر میں عورتیں موجود ہوں گی۔" میں نے کہا۔ "وہ تو جاتے جاتے ہی جائیں گی۔ کیا یہ زیادہ آسان نہیں کہ وہ اپنے آدمی کو نکال کر ہمیں اور لے جائیں اور خطرہ یہاں سے ٹل جائے۔ میں نے انکل رضوی سے بات کی ہے۔ دیکھیں وہ کیا کرتے ہیں۔"

رضوی صاحب نے اچانک کمرے میں قدم رکھا۔ "ان

www.paksociety.com

کہ وہ آدمی کہاں ہے جو اسٹور میں بے ہوش پڑا ہے؟"

"جی۔" میں نے کہا۔ "اور میرا خیال ہے اسے یہاں سے منتقل کر دیا جائے۔ مثلاً آپ اسے اپنی تحویل میں لے لیں۔"

"میں یہی کر رہا ہوں۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "لیکن یہ بتاؤ کہ اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد وہ کیا کریں گے؟ ظاہر ہے وہی جس کی انہوں نے دھمکی دی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ دو افراد کو شناخت کر سکتے ہو۔ اگر ان سے رابطہ قائم کیا جائے؟"

"ان میں سے ایک تو وکیل ہے۔ بظاہر چلبلی، دوسرا اصل آدمی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ مجھے نظر آیا تو میں سامنے آئے بغیر اس بچے کے ذریعے یا کسی اور بچے کے ہاتھ جواب ارسال کر کے ردعمل دیکھ سکتا ہوں۔"

"ابھی کچھ دیر بعد سادہ کپڑوں والے پولیس مین ہر طرف پھیل جائیں گے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "وہ اپنے کام کے ماہر ہیں۔ سیکیورٹی والے جو حفاظتی انتظامات کے وقت پورے مجمع پر نظر رکھ سکتے ہیں۔ ذرا سی مشتبہ حرکت بھی ان سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ تم اس آدمی کو لے کر جاؤ۔ اگر ممکن ہو تو پیغام بھیجنے والا اپنے آدمی کو کہیں وصول کر لیں۔ ظاہر ہے کسی کو روکو تو دشمنی ہے وہ سے ان کی بات ماننے پر مجبور ہو۔ وہ تمہارے پیچھے آئیں گے اور تم انہیں دور لے جاؤ گے۔ آگے میرے آدمی تیار رہیں گے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آدمی کو یہیں ٹھکانے لگا دیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ابھی تک ہمیں پوچھ گچھ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے مگر وہ پولیس کے پاس ہوگا تو ان کی دسترس میں نہیں رہے گا۔" میں نے کہا۔

"یہاں گڑبڑ پھیلانے والا بچ کے نہیں نکل سکے گا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "وہ تم کو مجھ سے بات کرتے دیکھ چکے ہیں۔ سادہ کپڑوں کے باوجود وہ سیکیورٹی والوں کو پہچان جائیں گے اور یہ حماقت نہیں کریں گے کہ ایک کو چھڑانے آئیں تو چار پکڑے جائیں۔ انہیں جو کچھ کرنا ہوگا باہر کچھ دور جا کے کریں گے۔ جب وہ مطمئن ہو جائیں گے کہ واقعی کوئی ان کا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔ یہ اطمینان دلانا بہت ضروری ہے۔ اس لیے میرے آدمی تمہارے جانے کے بعد اندر آئیں گے۔ وہ دو کام کریں گے۔ ایک تو یہ چیک کریں گے کہ گھر میں کہیں آتش گیر مادہ تو موجود نہیں، دوسرا یہ کہ جنازہ فوراً باہر پہنچا دیں گے۔ تم نے ایک گھنٹے کی بات کی ہے، جنازہ پندرہ منٹ بعد باہر ہوگا۔ باقی لوگوں کے روانہ ہو جانے کے بعد وہ خود آئیں گے گھر خالی کرا لیں گے۔ رہا بو کو میں لے جاؤں گا۔ میرا مطلب ہے شوفر میرے گھر لے جائے گا۔"

"اور میں اس شخص کو لے کر کہاں جاؤں؟" میں نے پوچھا۔

اسکیم پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"انسپیکٹر ہوٹل کی طرف۔ ذرا آگے کوڑے کا ایک بڑا ڈرم سڑک کے کنارے الٹا پڑا ہے۔ میرے آدمی اس کے اندر ہوں گے اور ٹھیک وقت پر باہر نکلیں گے جب انہیں یقین ہو گا کہ اب تمہارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں اور ملزم گرفتار ہوں گے۔ حراست میں لیے جا سکتے ہیں۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوں گے اور میری بات سنتے رہیں گے۔ ملزمان کا راستہ اور ساتھی دیکھا جائے گا جب وہ اپنے آدمی کو لے کر روانہ ہو جائیں گے۔ اگر وہ تمہیں بھی لے جائیں تو تم خطرہ مول کر اپنی جان بچانے کی خود بھی کوشش کرنا۔ بس اب یہ رسمیں ادا ہوں… اسے یعنی اپنے قیدی کو ذرا چھپا کے نکالنا، لیکن دیکھنے والے دیکھ سکیں۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

"یار میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اگر ہم معاملات کو اپنے ہاتھ ہی میں رکھتے تو بہتر تھا۔"

"سوچا تو میں نے بھی یہی تھا مگر… ایک تو بچے کو مشکل لگا۔ پھر میں نے رضوی صاحب سے بات کر لی… اب اور کچھ نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔ "بظاہر تو کوئی خامی نہیں مگر دشمن بھی بے وقوف نہیں ہے۔ فقشی فقشی کا جال ہے، سمجھ لینا ہی بہتر ہے۔"

میں نے دو سطر کا جوابی پیغام لکھا۔

"ہم اس وقت مجبور ہیں۔ تمہارا آدمی رہا کیا جا رہا ہے۔ کوئی ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

گھر میں بہت سے بچے ایسے بھی تھے جو ماحول سے اور بڑوں کی ڈانٹ ڈپٹ سے بے نیاز کھیل کود میں مصروف تھے۔ ظاہر ہے ان کے لیے ٹکا بیٹھنا مشکل تھا۔ ایک بچہ زینے کی ریلنگ پر گھوڑے کی طرح سوار پھسلتا ہوا نیچے آیا۔ یہ ریلنگ کی ڈھلان سے آخری کنارے پر اس نے بریک لگائی اور لکڑی کے ستون سے نہیں ٹکرایا۔ میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ بچے کا رنگ اڑ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب میں بھی دوسروں کی طرح سرزنش کرنے پر اسے شرمندہ کروں گا۔ لیکن میں نے کہا۔ "تم تو بڑے بہادر بچے ہو۔" پھر میں نے جیب سے ایک دس روپے کا نوٹ نکالا۔ "میرا بھی ایک چھوٹا سا کام کر دو۔ یہ پرچہ ایک آدمی کو دینا ہے۔ اسے کچھ نہیں بتانا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

بچہ خوشی خوشی میرے ساتھ چل پڑا۔ وکیل کی صورت مجھے کہیں دکھائی نہ دی لیکن سیلیٹی رنگ کے کپڑوں والا نظر آ گیا۔ وہ لان کے آخری حصے پر کھڑا کوٹھی کے عقبی حصے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ بچے نے اس مرتبہ چالاکی سے کام لیا، اس کو تھماتے ہی بھاگ نکلا۔ میں نے دیکھا کہ [illegible]

www.paksociety.com

والے نے ایک سطر کے جواب کو پڑھا اور کاغذ کو جیب میں ڈال دیا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔ شاید اس کے ساتھی بھی وہیں تھے اور اشارہ ان کے لیے تھا کہ جواب مثبت ہے۔ یا وہ مجھے بتانا چاہتا تھا کہ ٹھیک ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں۔ میں لوٹ کر اندر گیا۔ رضوی صاحب کی دی ہوئی پندرہ منٹ کی مہلت میں سے پانچ منٹ گزر چکے تھے۔

میں کاریڈور میں کھڑا رہا اور محسن نے اسٹور کا دروازہ کھولا۔ میری نگاہ ہر طرف تھی اور خیال یا ہاتھ ہونے کے باوجود میں پوری طرح بے بس تھا۔ اگر دشمن اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تو انہیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اعصاب وہی ہوئی۔ پھر رضوی صاحب نے کہی تھی کہ وہ ایک کو چھڑانے کے لیے جان کے بجائے کم سے کم دو کو ہاتھوں ہیروں سے معذور یا بے ہوش کر جائے۔ شاید یہ بات وہ بھی سمجھتے تھے کہ آتشیں اسلحہ استعمال کیے بغیر وہ مجھ پر قابو نہیں پا سکتے تھے لیکن فائر تک سے وہ سب کو متوجہ کر لیتے تو محصور ہو جاتے۔ یہاں سب دہشت زدہ اور سراسیمہ ہو کے بھاگنے والے نہیں تھے۔

چند منٹ بعد ہمارا حبشی قیدی دروازے سے نمودار ہوا۔ اب بے ہوش نہیں تھا مگر اس کے لیے سیدھا کھڑا رہنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ محسن اسے مقابل کے کمرے میں لے گیا اور دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "دیکھو تمہارے ساتھی تمہیں لینے آئے ہیں۔ یہاں بہت سے لوگ جمع ہیں لیکن ان کو شناخت کرنے والا کوئی نہیں۔ انہوں نے دھمکی دی ہے کہ تم کو رہا نہ کیا گیا تو وہ اس گھر کو اڑا دیں گے۔ یہاں ایک بہت بڑا ٹکراؤ ہے اس لیے ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ باوقار طور اور اطمینان سے اپنے پیروں پر چل کے باہر جاؤ تو آگے پیچھے ہم ہوں گے۔ باہر سرخ رنگ کی ایک گاڑی کھڑی ہے۔ تم کو اس میں لے جایا جائے گا۔ ایسی کوئی حرکت نہ کرنا جس سے صورت حال مشتبہ ہو جائے۔"

"لیکن… لیکن وہ… وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" وہ دہشت زدہ لہجے میں بولا۔ "میں… نہیں جاؤں گا۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے محسن کو دیکھا۔ یہ بات قطعی غیر متوقع تھی مگر غلط نہیں تھی۔ "تمہارے ساتھ وہ کیا کرتے ہیں، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ہمیں یہاں امن و امان رکھنا ہے۔ تمہیں تو جانا پڑے گا۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" وہ ذبح ہونے والے بکرے کی طرح بلبلایا اور دروازے کی طرف لپکا۔ محسن نے بڑی پھرتی سے ٹانگ اڑائی اور وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے اسے دبوچ لیا۔ اس کے حلق سے دوسری آواز نہ نکل سکی۔ میں نے ایک وار میں اس کو پھر عالم بے ہوشی میں پہنچا دیا اور اسے بے حس و حرکت پڑا چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ عام حالات میں ہم اسے زبردستی جلادوں کے حوالے نہ کرتے لیکن ہم اس سے زیادہ مجبور اور بے بس تھے۔

"اب تو اسے اٹھا کے ہی لے جانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "اور سب کے بیچ میں سے گزر کے۔"

"پچھلے حصے میں ایک طرف تو کچن ہے۔" محسن نے کہا۔ "دوسری طرف ماسی کا کمرہ ہے اور اس کا ایک دروازہ پیچھے کھلتا ہے۔ اس گلی میں جو مشکل سے دو گز چوڑی ہے۔ اس کے بعد ساتھ والے گھر کی دیوار ہے۔ اگر میں اس کو لے کر دوسری طرف اتر جاؤں اور ساتھ والی کوٹھی کے دروازے سے نکلوں تو کوئی نہیں دیکھے گا۔"

"ساتھ والی کوٹھی میں رہنے والے تو دیکھیں گے۔" میں نے کہا۔ "اگر کسی نے شور مچا دیا؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ سب یہاں موجود ہوں گے۔ کوئی نوکر دیکھ سکتا ہے مگر یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "میں ادھر سے آتا ہوں۔ سب کے بیچ میں سے گزر کے۔ جو لوگ الیاف کے عہد کے منتظر ہیں، وہ دیکھ ہی لیں گے اور تیار ہو جائیں گے۔ اتنی دیر میں تو اس حرامزادے کو لے کر آ جائے تو میں خاموشی سے روانہ ہو سکتا ہوں۔"

مین گیٹ سے نکل کر میں گلی میں آ گیا۔ اس دوران محسن اسے گلی میں لے آیا تھا۔ اس نے بے ہوش آدمی کو میرے حوالے کر دیا۔ درمیانی دیوار آٹھ فٹ کے قریب اونچی تھی۔ محسن اس پر سے ایک جھٹکے میں کود گیا۔ میں نے اس کی سیٹی سنی جو "آل کلیئر" کا سگنل تھی۔ میں نے کندھے پر جھولتے والے شخص کو اوپر اٹھایا اور اچھال دیا۔ وہ تقریباً دیوار کو چھوتا ہوا گیا اور میں نے اس کے دوسری طرف دھپ سے گرنے کی آواز سنی۔ پھر میں گیٹ کے اندر گیا اور تیزی سے دروازہ بند کر کے راہداری کو عبور کیا اور کسی کی طرف دیکھے بغیر شاندار ڈرائنگ روم سے گزر گیا۔ مجھے یقین تھا کہ دشمنوں کی نگاہیں میرا تعاقب کر رہی ہوں گی اور انہوں نے مجھے مین گیٹ سے باہر جاتے دیکھا ہوگا۔ میں نے خاص وقفہ رکھا — دروازہ کھولا جو اب ساتھ والی کوٹھی کے گیٹ سے قریب تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر اتنی کاریں کھڑی تھیں اور ان میں اتنے لوگ مصروف انتظار تھے کہ میں کسی کو ہوشیار ہوتے نہ دیکھ سکا۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ دوسرے

گیٹ سے محسن نمودار ہوا۔ فاصلہ بہت کم تھا پھر بھی بہت سی نظروں نے ایک بے ہوش آدمی کو رابعہ کی گاڑی میں ڈالنے کا منظر دیکھا۔
"محسن!" میں نے کار کو اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر رضوی صاحب کے آدمی جنازہ چھوڑ کر عافیت اٹھانے میں کامیاب ہو جائیں تو سب سے پہلے رابعہ کی فکر کرنا۔ اسے رضوی صاحب کی گاڑی میں پہنچانا تیرا کام ہے۔ ہم تدفین میں شرکت کی کوشش کریں گے لیکن بدقسمتی سے بات شریک نہ ہو سکے تو کوئی بات نہیں، دوسرے لوگ بہت ہیں۔ تجھے میری واپسی کا انتظار کرنا ہے۔"
محسن نے سر ہلایا اور سیدھا نکل گیا۔ میں نے کار کو سٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھمائی۔ انجن صبح کی طرح غرایا اور خاموش ہو گیا۔ دوسری اور تیسری بار کی کوشش بھی بے سود ثابت ہوئی۔ میں نے پریشانی سے اپنے ہمسفر کو دیکھا جو پچھلی سیٹ پر لاش کی طرح پڑا تھا اور گاڑی کو دھکا نہیں لگا سکتا تھا۔
گاڑی میں اسٹارٹنگ کی کوئی معمولی سی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نیچے اترا اور آگے پیچھے کی گاڑیوں کا جائزہ لیا۔ ایک گاڑی خالی تھی۔ دوسری میں دو نوجوان پچھلی والی سیٹ پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ میں نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور انہوں نے مجبوراً دھکا لگایا۔ میں نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی تو مجھے اندازہ ہوا کہ رضوی صاحب کی دی ہوئی مہلت سے بھی پانچ منٹ زیادہ گزر چکے تھے۔ کلچ چھوڑتے ہی انجن نے جھٹکا لیا اور اسٹارٹ ہو گیا۔ جنازہ ابھی تک باہر نہیں آیا تھا۔ میں نے کار کو سڑک کے وسط میں روکا۔ نیچے اترا اور ان نوجوانوں کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے مزید دو منٹ ضائع کیے۔ جب میں نے پھر اپنی جگہ بیٹھ کے پیڈل دبایا تو فاکس ویگن آگے بڑھی اور اسی وقت مجھے سامنے کے آئینے میں پیچھے کا منظر دکھائی دیا۔ جنازہ باہر آ گیا تھا اور لوگ بڑی عجلت میں کاروں سے نکل نکل کے ان لوگوں میں شامل ہو رہے تھے جو رابعہ کی کوٹھی کے دروازے سے ہجوم کی شکل میں نکل رہے تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور کار آگے بڑھائی۔ جنازے کو میاں میر صاحب کے قبرستان جانا تھا چنانچہ سب خالی کاریں وہیں کھڑی رہ گئی تھیں۔ سوائے ایک کار کے جو قطار میں سے نکل کے میرے پیچھے آ رہی تھی۔ کسی نے اس پر غور نہیں کیا تھا کیونکہ وہاں کھڑی ہوئی سب کاریں جنازے میں شرکت کے لیے آنے والوں کی نہیں تھیں۔
میں نے محسن سے بھی نہیں کہا تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت تک خود مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کیا کروں گا لیکن میرے ذہن میں محسن کی بات ثبت کر رہ جانے والے کلمے کی شکل بن کر موجود تھی۔ خود میں بھی محسن کا ہم خیال تھا کہ رابعہ اگر ہمارے ہاتھ میں رہتی تو بہتر تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل بھی کہتا تھا کہ رضوی صاحب کے حفاظتی اقدامات آخری وقت میں بے کار ثابت ہوں گے۔ اب جنازہ آ رہا تھا کہ ساتھ آ چکا تھا اور مجھے یقین آنے لگا تھا کہ محسن نے بھی رابعہ کو نکال لیا ہوگا۔ کسی بہانے سے قائل کر کے یا زبردستی۔ اور باقی گئی ہوں گی وہ عورتیں جو سوائے چند ایک کے خود بھی رابعہ کی ہم درد ہوں گی۔
میں نے اس کار کو دیکھا جو میرے پیچھے آ رہی تھی۔ اس کا ماڈل نہیں دیکھ سکا تھا لیکن وہ سفید رنگ کی ٹویوٹا تھی۔ دور سے میں نے کارپوریشن کے کوڑا اٹھانے والے اس ٹرک کو دیکھا جو نہ جانے کب سے ایسے ہی سڑک کے کنارے اٹھا پڑا تھا۔ کسی لاوارث لاش کی طرح۔ فیصلہ میرے ذہن میں یوں آیا جیسے زلزلہ آتا ہے کہ لمحہ بھر پہلے ذہن میں سکوت اور پر سکون ہے اور دوسرے لمحے دست غیب سب کچھ تہہ و بالا کر جاتا ہے۔ میں نے گاڑی کو تیزی سے ایک کوٹھی کے گیٹ میں موڑ لیا۔ سفید ٹویوٹا نے یک لخت رفتار میں اضافہ کیا اور گولی کی طرح میرے پیچھے آئی۔ کوٹھی کا صرف ایک ہی گیٹ تھا۔ یوں لگتا کہ ایک منزلہ کوٹھی کے برآمدے میں دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ درمیان میں چائے کے برتن رکھے بیٹھی تھیں۔ ان دونوں نے بیک وقت حیرانی و پریشانی سے سرخ فاکس ویگن کو دیکھا لیکن میں پورچ تک جانے والے راستے کو چھوڑ کر دائیں طرف گھوم گیا۔ اس وقت تک میں طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں کیاریوں کو بیدردی سے روندتا ہوا لان پر سے گزرا جو گھر کی مناسبت سے مختصر تھا۔ عورتوں نے بیک وقت خوفزدہ ہو کے چیخ ماری۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ایکسیلیٹر کو دبا دیا۔ کار نے ایک قوت کے ساتھ جست لگائی اور اس کا انجن زبردست احتجاج کا اظہار کرتے ہوئے گرجا۔ گاڑی توپ سے فائر ہونے والے گولے کی طرح بڑھی اور میں نے خود کو سنبھال کے اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ احاطے کی دیوار سے تصادم کی آواز کے ساتھ ہی مجھے جھٹکا لگا مگر میں نے پرانی دیوار کو ریت کے گھروندے کی طرح گرا دیا تھا اور اینٹوں کے ڈھیر ہونے سے پہلے گاڑی سڑک پر آ پہنچی تھی۔ اس وقت میں نے یہ نہیں دیکھا کہ بونٹ یا پچھلے حصے پر اینٹوں سے کتنے ڈینٹ پڑے ہیں اور پچھلی سیٹ پر لیٹے ہوئے شخص کا کیا حال ہوا ہے۔ سب سے پہلے میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا تھا اور ونڈ اسکرین سلامت رہا تھا اور نہ اس کا شیشہ بکھرا تھا۔

مجھے زخمی کر سکتا تھا اور میرے چہرے پر لگتا تو مجھے اندھا بھی کر سکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے سفید ٹویوٹا کو اسی کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوتے دیکھا اور مسکرایا۔ ان کے راستے میں ٹوٹی ہوئی دیوار کا ملبہ حائل تھا اور ان کے لیے باہر نکلنے کے دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ ریورس گیئر میں واپس ہوں اور پھر گیٹ سے نکلیں۔ یا وہ میری جگہ سے دیوار شق کر کے میری تقلید کرتے ہوئے سڑک پر آ جائیں لیکن میرے مقابلے میں ان کی مشکلات زیادہ تھیں۔ لان پر پانی دیا گیا تھا اور اس بات کا امکان تھا کہ ریورس گیئر میں گاڑی کے پہیے دھنس جائیں اور وہیں گھومتے رہیں تو کار دھنس نہ جائے۔ فاکس ویگن کے پہیے بڑے تھے اور میں پوری رفتار سے گزر گیا تھا۔ ٹویوٹا کے ڈرائیور نے تذبذب کا مظاہرہ کیا اور رک کر واپس ہونا چاہا تو شاید کامیاب نہ ہو۔ اگر اس نے بھی دیوار سے گزرنا چاہا تو میرے مقابلے میں ان کے لیے خطرات کہیں زیادہ ہوں گے۔ ٹویوٹا لمبی کار تھی اور اس کی ہر ایک فاکس ویگن جتنی نہیں تھی کہ ملبہ اوپر گرنے سے پہلے کار نکل جائے۔ اس کا ونڈ اسکرین ٹوٹنے اور توازن بگڑنے کے امکانات بھی زیادہ تھے۔ مجھے فاکس ویگن کے نمبر نے بھی بچایا تھا جو کافی آگے نکلا ہوا ہوتا ہے اور ایک فائدہ مجھے یہ بھی حاصل تھا کہ انجن پیچھے تھا جسے نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ٹویوٹا کا انجن آگے تھا چنانچہ تصادم کے بعد اس کا بند ہو جانا بھی ممکن تھا۔ ان باتوں کے علاوہ مجھے یقین تھا کہ عورتیں فاکس ویگن کا نمبر تو شاید نہ دیکھ سکی ہوں مگر ٹویوٹا کا نمبر وہ یقیناً دیکھیں گی کیونکہ وہ اندر بھاگ گئی ہوں گی۔ دشمن کی کار پھنس گئی تو وہ اسے چھوڑ کر جانے پر مجبور ہوں گے اور مجھے کچھ مہلت مل جائے گی۔ میں نے کسی کا برا کبھی نہیں چاہا تھا لیکن اس وقت بے اختیار میرے دل سے دعا نکلی جو بددعا تھی کہ کاش ان کی گاڑی پھنس جائے اور وہ زخمی ہو جائیں۔
جب میں ٹیڑھی میڑھی کار کو دوڑاتا ہوا واپس جا رہا تھا تو مجھے سڑک کے کنارے ایک سپیرا نظر آیا۔ وہ مزے سے بین بجاتا اپنی پٹاری کو ہلاتے پیدل جا رہا تھا۔ بجلی کی طرح میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے بریک لگا کے گاڑی کو بالکل سپیرے کے پاس روک لیا۔ وہ کچھ سہم کر ایک طرف ہو گیا اور اس کی رنگت اڑ گئی۔
"دیکھو۔ ادھر آؤ۔" میں نے اسے انگلی کے اشارے سے قریب بلایا۔ "یہ جو سانپ ہیں تمہارے پاس یہ خطرناک ہیں؟"
سپیرا ڈرتا ڈرتا قریب آیا۔ "نہیں بادشاہو! ہم پیٹ پالنے کے لیے تماشا کرنے والے جوگی ہیں۔ سانپ کا زہر پہلے ہی ختم کر دیتے ہیں۔ بچوں کو ڈرانے کو ہم سے اور ہمارے سانپ سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اور ہمارے پاس تو ایک ہی سانپ ہے سرکار!" وہ مجھے مجسٹریٹ یا پولیس افسر وغیرہ سمجھ کے وضاحت کر رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی ایسا سانپ نہیں جس سے کسی کی جان جانے کا اندیشہ ہو۔
"اچھا اچھا!" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کتنے میں بیچو گے۔ مجھے ایک ہی سانپ چاہیے۔"
وہ کچھ دیر ہکا بکا کھڑا میری صورت دیکھتا رہا۔ "یہ بیچ دیں؟ ہم جوگی ہیں۔ یہ تو اپنی روزی ہے۔"
"ارے بابا! تم دوسرا لے لینا، جہاں سے یہ بھی لے آئے تھے۔ معلوم ہوگا کہاں ملتے ہیں۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "قیمت بتاؤ جو تم خود سوچ رہے ہو۔" اس کی آنکھیں حیرت سے اور پھیل گئیں۔ میرا اندازہ تھا کہ اس نے سانپ جنگل سے پکڑا ہوگا اور وہ دوسرا بھی آسانی سے حاصل کر لے گا۔
لیکن اس نے دیکھا کہ میری ضرورت شدید ہے اور میں منہ مانگی قیمت بھی دے سکتا ہوں۔ "دو سو ... جاؤ ... پورے ایک ہزار!" اس نے انگلی اٹھائی۔
میں نے اپنا پرس نکالا۔ اس میں صرف سات سو روپے تھے۔ حرامزادہ ... میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ پھر مجھے اس شخص کا خیال آیا جو پیچھے لیٹا تھا۔ جب ہم اسے قیدی بنا کے لاتے تھے تو محسن نے دس ہزار کی ایک گڈی بھی اٹھا لی تھی۔ یہ رقم ہمیں مقتول چوکیدار کے وارثوں کو ارسال کرنی تھی۔ محسن نے یہ گڈی گلوز کمپارٹمنٹ میں ڈال دی تھی۔ ایک منٹ بعد میں سو سو کے دس نوٹ دے کر اور پٹارا لے کر پھر روانہ ہو چکا تھا اور سپیرا ہاتھ میں نوٹ پکڑے وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ ایک فضول سے بے ضرر سانپ کے بدلے اسے منہ مانگی دولت مل گئی تھی۔ جتنی شاید وہ پورا مہینہ بھیک مانگ کر بھی نہ کما پاتا۔ اسے افسوس ہو رہا ہوگا کہ کاش وہ تجھے ملتا اور اس نے دس ہزار یا دس ہزار حاصل کرنے کا سنہری موقع گنوا دیا۔
گاڑی کو پھر اسی جگہ روک کے میں نے پیچھے دیکھا۔ کوئی شکستہ حال ٹویوٹا سڑک پر دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کے اس شخص کو گھسیٹا اور نشے میں دھت کی طرح ڈال کے ساتھ والی کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ قدرت مجھ پر مہربان تھی۔ برآمدہ سنسان تھا۔ باہر کوئی نہیں تھا اور مجھے اس بے ہوش شخص کو جھاڑیوں کے پیچھے ڈالتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ رابعہ کی کوٹھی کے دروازے سے اکا دکا خواتین باہر آ رہی تھیں۔ میں

www.paksociety.com

پھر باہر بھاگا۔ کار کا بونٹ بھک گیا تھا اور ہاتھ لگاتے ہی اٹھ گیا۔ فاضل ٹائر اور جیک وغیرہ کے علاوہ اس میں سے مضبوط نائلون کی رسی بھی برآمد ہوئی جو شاید اس لیے رکھی گئی تھی کہ کہیں گاڑی بالکل ہی جواب دے جائے تو اس کو کسی دوسری گاڑی کے پیچھے باندھ کر لایا جا سکے۔ میں نے بڑی پھرتی سے بے ہوش شخص کی مشکیں کسیں اور پیادوں کی سمت رابعہ کے گھر میں کود گیا۔ رضوی صاحب کے آدمی اگر پوزیشن سنبھال چکے تھے تو شاید کمرے میں اور کوٹھی کے سامنے والے حصے میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے اوپر جاتے دیکھا اور میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں گھر کا آدمی ہوں اور وہ رضوی صاحب کی ہدایات کے مطابق اپنا کام جاری رکھیں۔ یہ حوالہ مجھے معتبر ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ پیادوں کو میں نے پیچھے کر دیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس پیٹی میں کتنا بڑا سانپ ہے لیکن وزن سے اندازہ ہوتا تھا کہ سانپ چھوٹا ہی ہے۔ تاہم اس کی دہشت خواتین کے مجمع کو جتنی جلدی منتشر کر سکتی تھی، اتنی جلدی اسٹین گن بھی نہیں کر سکتی تھی۔ موقع پاتے ہی میں نے رابعہ کے کمرے کا دروازہ کھولا اور سانپ کو باہر نکالا۔ وہ مٹیالے سے رنگ کا چار فٹ لمبا اور ایک انچ سے کچھ موٹا سانپ تھا۔ میں نے اسے گردن سے دبوچ لیا اور اس کی دُم کو دوسرے ہاتھ میں پکڑ کے باہر دیکھا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ میں نے سانپ کو رابعہ کے کمرے کی سمت اچھال دیا جہاں سب خواتین جمع تھیں۔ صرف ایک منٹ بعد کسی عورت نے دہل کر دل ہلا دینے والی چیخ ماری۔ "سانپ ...!" اس کا ساتھ دیگر دو عورتوں نے دیا۔ پھر بھگدڑ مچ گئی۔ سانپ بے حس و حرکت پڑا تھا لیکن عورتیں اپنے بچے اور برقعے سمیٹ کر سخت بدحواسی کے عالم میں فرار ہو رہی تھیں۔ تاہم کچھ خوف کے باعث کمرے سے ہی باہر نہیں آ رہی تھیں۔ میں اطمینان سے آگے بڑھا اور میں نے خواتین کے سامنے سانپ کو لات مار کے دور پھینک دیا۔

"اب آپ لوگ نکل جائیں۔" میں نے سانپ کے اور دروازے کے درمیان کھڑے ہو کر کہا۔ چند منٹ میں گھر کے اندر ماسی سمیت کوئی عورت نہیں رہی تھی۔ صرف ضامن رضوی صاحب کے چار آدمی مجھے گھور رہے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میں نے سانپ کا چکر کیوں چلایا تھا۔

"کہیں کوئی آتش گیر مادہ۔" ماتم برپا ہوا تو آنا مت ملانا۔" میں نے اطمینان سے پوچھا جیسے میں ان کا افسر ہوں۔

ایک شخص نے نفی میں سر ہلایا۔ دوسرے نے کہا۔ "ہم نے چیک کر لیا ہے۔"

"اچھا، تو آپ لوگوں کا کام ختم۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ وہ دھمکی جھول ثابت ہوئی کیونکہ میرے لہجے سے وہ کچھ دب گئے تھے۔ "کیا ہم باہر ٹھہریں جناب؟"

"نہیں، تم لوگ جاؤ۔" میں نے مزید تحکمانہ انداز اپنایا۔ "میں کوٹھی کو لاک کر رہا ہوں۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نیچے اتر گئے۔ میں نے نیچے جا کے دیکھا تو وہ دروازے پر کھڑے ہوئے لوگوں کو بھگا رہے تھے جو حواس باختہ خواتین کو فرار ہوتے دیکھ کر تجسس کے باعث رک گئے تھے۔ محسن نے ان کے نکلتے ہی گیٹ بند کر دیا۔

"تو نے رابعہ کو نکال دیا ہے نا؟" میں نے کہا۔

"اسے تو رضوی صاحب کا شوفر لے گیا۔" وہ بولا۔ "لیکن یہ کیا ڈراما کیا ہے؟"

"میں سب کو چکر دے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "قیدی بدستور ہمارے پاس ہے۔ برابر والی کوٹھی میں جھاڑیوں کے پیچھے پڑا ہے۔ وہ ..."

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا، کوٹھی کی دیوار پر یکے بعد دیگرے تین افراد نمودار ہوئے۔ ان میں وہ سلیٹی پتلون قمیص والا بھی تھا لیکن اس کے چہرے پر خون کی لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ انہوں نے بھی میری طرح گاڑی نکالنی چاہی تھی مگر ناکام رہے تھے۔ شاید ان کے اتنی دیر سے پہنچنے کا سبب یہی تھا کہ وہ پیدل دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ میں نے چلا کر محسن سے بھاگنے کو کہا مگر ہمارے بھاگنے سے پہلے سلیٹی قمیص والے کے ہونٹوں سے ایک غلیظ گالی نکلی اور اس نے اندر کودتے کودتے پستول نکال کر فائر کر دیا۔ گولی نہ جانے کدھر گئی۔ اگلے فائر سے پہلے ہم دونوں چھپ چکے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور محسن نے ایک جھٹکے میں ریوالور مجھے تھما دیا۔ میں نے کھلے دروازے سے ایک فائر کیا جس کا مقصد محض دشمن کی پیش قدمی کو روکنا تھا۔ پھر میں زینے کی طرف لپکا۔ میں آدھے راستے میں تھا کہ وہ آ گئے۔ محسن بالکل دروازے کے پیچھے تھا۔ اس نے پہلے شخص کو اڑنگا دے کے گرا دیا۔ وہ جیسے کے پیچھے فرش پر یوں گرا کہ اس کے پیچھے آنے والا بھی نہ سنبھل سکا۔ لیکن پہلے والے نے اٹھ کر میرا نشانہ لیا اور میں نے دو زینے کودتے کودتے گولی چلائی۔ وہ چیخ کے ساتھ تیورا کے گرا۔ دوسرے نے محسن کی طرف گھومنا چاہا تھا کہ میں نے لات دے

مار کے گرا دیا۔ گولی اس کے شانے پر لگی اور اس کا اپنا نشانہ خطا ہو جانے سے محسن کی جان بچ گئی۔ محسن بھاگا اور اس نے پہلے چیت ہو جانے والے کے ریوالور کو فٹ بال کی طرح کک ماری۔ ریوالور چکنے فرش پر تیز آواز کے ساتھ دور تک پھسلتا گیا۔ تب میں نے دشمنوں میں پوزیشن سنبھالے کے محسن کو بچانے کے لیے دوسرے کا نشانہ لیا جو ایک شانہ زخمی ہو جانے کے باوجود ریوالور اٹھا رہا تھا۔ اگر وہ حرکت نہ کرتا تو گولی اس کے دوسرے شانے میں لگتی مگر اس کے ذرا جھک جانے کے باعث گولی اس کے سر میں گھس گئی۔ محسن سیدھا نکل گیا تھا اور میں سمجھ گیا کہ وہ پھر آخری جھٹکے میں ماسی کے کمرے سے عقبی گلی میں نکل جائے گا اور پھر ساتھ والی ہی کوٹھی میں کود جائے گا جہاں ہمارا قیدی بندھا پڑا تھا لیکن اب صورت حال خاصی مخدوش ہو گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ گولیاں چلنے کی آواز سڑک تک ضرور پہنچی ہوگی۔ ممکن ہے ساتھ والی کوٹھی میں رہنے والے بھی باہر نکل آئیں اور محسن کو اندر کودتا دیکھ لیں۔ اس کا راستہ تو شاید کوئی نہ روکے مگر اس قیدی کو وہاں سے نکالنا مسئلہ بن جائے گا۔ میں نے سوچا۔ اسی وقت ایک اور شخص اندر آیا۔ سلیٹی رنگ کی قمیص پتلون والا تھا۔ اس نے کارتوس بدل کر ریوالور نکالی اور میں نے زینے پر سے جھک کے فائر کیا مگر وہ اسٹور روم کے دروازے تک جا چکا تھا جو پھر مقفل تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے غلط فہمی ہے۔ اس کے خیال میں ان کا آدمی ابھی تک اسی قید خانے میں موجود تھا۔ تالا توڑنا یا کھولنا ناممکن تھا چنانچہ مجھے امید تھی کہ وہ گولی چلا کے تالے کو اڑا دے گا مگر گولی کی آواز کے بجائے ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ گرد اور دھوئیں کا طوفان سا اٹھا اور مجھے اس گھر کی دیواریں گرتی نظر آئیں۔ میں دوسری طرف بھاگا۔ دھماکا دستی بم کا تھا جس نے اسٹور روم اور اس سے ملحق کمروں کی چھت اڑا دی تھی۔ میں ایک کھڑکی میں سے باہر لٹک گیا جو رابعہ کے کمرے سے ملحق غسل خانے کے پیچھے پر کھلتی تھی۔ اسی وقت دوسرا دھماکا ہوا اور میرے ہاتھ خود بخود چھوٹ گئے۔ میں بارہ فٹ کی بلندی سے نیچے گرا۔ میری نظروں کے سامنے ذرا سی دیر کے لیے اندھیرا پھیل گیا۔ گرد اور دھوئیں میں مجھے سانس لینا دشوار ہونے لگا۔ میں دیوار کا سہارا لے کر بھاگا اور سوچے سمجھے بغیر ساتھ والے گھر کی دیوار پھاند گیا۔ رابعہ کا گھر اب شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ اتفاق نے رابعہ کے ہوتے اور ایک آدمی کے لیے دشمنوں نے ایک گھر تباہ کر دیا تھا مگر مجھے کامیابی نے نیا حوصلہ عطا کر دیا تھا۔ میت اپنے مدفن کی طرف جا رہی تھی، سکون کے ساتھ سو رہی تھی۔ رابعہ ضامن رضوی کے گھر کی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ چکی تھی اور دشمن جن نے اپنے تین آدمی گنوا دیے تھے، ایک اسیر کو چھڑانے میں ناکام رہا تھا۔

دوسری طرف کودتے ہی مجھے محسن نظر آیا۔ ہم ایک ساتھ گیٹ کی طرف لپکے۔ کوٹھی کے مکین شاید خوف زدہ ہو کے اندر جا چھپے تھے۔ میں نے جھاڑیوں کے پیچھے پڑے ہوئے شخص کو رسی تھام کے گھسیٹ لیا۔

"خیال رکھنا محسن! جو قریب آئے گولی مار دینا۔" میں نے ریوالور اس کی طرف اچھال دیا اور اس شخص کو اٹھا کے گاڑی کی طرف دوڑا۔ رابعہ کی کوٹھی کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم ہو رہا تھا اور شعلے مزید بلند ہو گئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ کوئی ہماری طرف متوجہ ہوتا، میں اور محسن اپنے جنگی قیدی کو لے کر محاذِ جنگ سے فرار ہو چکے تھے۔ رابعہ کے گھر کے کھنڈر کو شعلے کھا رہے تھے لیکن اس کو اب یہاں واپس کب آنا تھا۔

"تو نے رابعہ کو سب بتا دیا تھا؟" میں نے خطرے کی حدود سے نکلتے ہی کہا۔

"مجبوری تھی۔" محسن بولا۔ "وہ تیرے بارے میں متفکر تھی۔ کہنے لگی یک دم کا جانا کیا ضروری تھا۔ ضامن رضوی صاحب کا کوئی آدمی بھی تو یہ کام کر سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ شاید دشمن اعتبار نہ کرتے۔ پولیس کے درمیان میں پڑ جانے سے شکوک پیدا ہو جاتے۔ تو اب کیا وضاحت پیش کرے گا؟ تدفین کے بعد یہ لوگ واپس جائیں گے اپنی اپنی کاروں میں تو وہ گھر جہاں سے جنازہ اٹھا تھا، جل کے راکھ ہو چکا ہوگا۔"

"میں قبرستان میں رضوی صاحب سے بات کر لوں گا۔" میں نے کہا۔ "بہتر یہی ہے کہ وہ اور ہم سب کسی سے کچھ نہ کہیں۔ پولیس کو تفتیش کرنے دیں۔ حقائق جو سب کے سامنے آئیں گے، ہمیں بھی معلوم ہو جائیں گے۔"

"لیکن انہوں نے تو ان پر احکامات لیے تھے۔"

"اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے کے بعد وہ مجبور ہوں گے کہ ان احکامات سے بھی لاتعلقی ظاہر کر دیں۔" میں نے کہا۔ "جو انہوں نے اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے جاری کر دیے تھے۔ سرکاری طور پر ان احکامات کا جواز پیش کرنا ان کے لیے اختیارات کے ناجائز استعمال کا مسئلہ بھی کھڑا کرے گا۔ وہ اور ان کے ماتحت ملوث ہونے سے گریز کریں گے۔ یہ معاملات ہی ایسے ہیں۔"

میں نے گاڑی کو میاں میر صاحب کے قبرستان جانے والے انفنٹری روڈ کی طرف موڑنے کے بجائے اس کا رخ دھرم پورہ والی سڑک کی طرف کر دیا۔ فائر بریگیڈ والوں کی دو گاڑیاں گھنٹی

www.paksociety.com

بجاتی ہمارے سامنے سے نمودار ہوئیں اور سیدھی گزر گئیں۔ میں نے جنگڑ و کھیڑ کر کار کو موڑا اور ایک بینک کے بند دروازوں سے چند قدم کے فاصلے پر دیوار سے یوں لگا دی کہ کھولا گیا کار کا دروازہ کو میری طرف والے دروازے سے باہر آنا پڑا۔ کار کسی تھڑے کے سامنے نہیں تھی اور سڑک سے بھی دور تھی۔ ہمارا قیدی اگلی اور پچھلی سیٹوں کی درمیانی جگہ پر پھنسا پڑا تھا اور فوری طور پر اس کے ہوش میں آنے کا خطرہ نہیں تھا — تاوقتیکہ بلاوجہ کوئی منچلا شیشوں سے ناک چپکا کے نہ دیکھتا کسی کو کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ اینگ تھنگ کھڑی ہوئی خستہ حال کار میں کوئی آدمی بھی پڑا ہے۔ مزید احتیاطاً میں نے یہ کی کہ پچھلی سیٹ کو نکالا اور الٹی کر کے رکھ دیا اور پھر کچھ آگے بڑھا کے آگے والی سیٹوں سے ملا دیا۔ ہمارا قیدی اس کے نیچے آ گیا اور گاڑی یوں نظر آنے لگی جیسے زیر مرمت ہے۔ سیٹ کے اسپرنگ دکھائی دے رہے تھے۔ پیچھے سے بہت بڑی نمودار ہو گئی تھی اور سامنے کی ٹوٹ پھوٹ دیکھ کر بھی خاطر کچھ ایسا ہوتا کہ گاڑی مدت سے چلی نہیں۔ میں نے رومال سے چہرہ صاف کیا لیکن اس سے کام نہ بنا۔ ایک گلی سے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہوئے مجھے مسجد نظر آئی اور میں وضو کرنے والی جگہ سے ہاتھ منہ دھو کے گرد و غبار صاف ہوا جو بال جسے کھرنگی میرے چہرے اور بالوں پر بیٹھ گیا تھا۔ چلتے چلتے میں نے بالوں میں کنگھی پھیری اور پھر چند منٹ بعد الفتح روڈ پر طلوع ہوئے۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہی ہمیں دو جگہ اجتماع دکھائی دیے۔ دونوں کے اجتماع میں کالے کوٹ نمایاں تھے۔ میں اور محسن خاموشی سے مجمع کے گرد حلقہ بنا کے کھڑے ہونے والوں میں شامل ہو گئے۔ میری نظر نے ضامن رضوی صاحب کو تلاش کیا۔

وہ مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سوال دیکھ کر میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ رضوی صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ نامعلوم طریقے پر وہ پیچھے ہٹے اور ان کی نظر کا اشارہ پاتے ہی میں پیچھے ہوا اور گھوم کر ان کے قریب جا پہنچا۔ اب ہم لوگوں سے چند قدم دور کھڑے تھے۔ "سوری انکل!" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "آپ کا انتظام فیل ہو گیا۔"

"کیا مطلب؟" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر کہا اور دونوں ہاتھ باندھے پیر پھیلائے سکون سے کھڑے رہے۔

"انہوں نے مجھے گھر سے نکلتے ہی آ لیا تھا۔" میں نے کہا۔ "سفید رنگ کی ٹویوٹا کار تھی۔ مجھے روکنے کے لیے انہوں نے فائرنگ کی تو مجھے جان بچا کے فرار ہونا پڑا۔"

"تم وہاں تک بھی نہیں پہنچے جہاں میرے آدمی موجود تھے جو اس لیٹے ہوئے ٹرک تک؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اس سے پہلے ایک کوٹھی میں گھس گیا تھا۔ اس کا دوسرا گیٹ ہی نہیں تھا۔ مجھے دیوار توڑ کے نکلنا پڑا کیونکہ وہ بھی آ گئے تھے اندر آ گئے تھے۔ غالباً ان کی کار میں پھنس گئی۔ میں واپس گھر گیا۔"

"وہاں بھی کوئی نہیں تھا؟" رضوی صاحب کے ماتھے کی شکنیں گہری ہو گئیں۔

"وہاں چار آدمی تھے۔ میں نے انہیں رخصت کر دیا۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال تھا اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔ کوٹھی میں ایک سانپ نکل آنے سے عورتیں خوفزدہ ہو کے بھاگ گئی تھیں۔"

"سانپ؟" رضوی صاحب نے حیرانی سے کہا۔ "سانپ کہاں تھا؟"

"اوپر جہاں چھت رکھی تھی۔ وہیں برآمدے میں کسی نے دیکھا تھا۔ بے ضرر سا سانپ تھا۔ میں نے مار دیا مگر عورتیں چلی گئیں تو میں نے مناسب سمجھا کہ گھر کو لاک کر دوں۔"

"اور وہ آدمی جو تیسے وہ مانگ رہے تھے؟" رضوی صاحب کا ذہن تمام صورت حال کو سمجھنے کے لیے پریشان تھا۔

"وہ ہمارے پاس ہی تھا... ہے..." میں نے کہا۔ "ہم چلنے ہی والے تھے کہ وہ اندر آ گئے۔ انہوں نے گھر تباہ کر دیا۔ غالباً دستی بم مارے تھے۔ ہم بڑی مشکل سے یہاں پہنچے ہیں۔"

فکر و تردد کے آثار رضوی صاحب کی صورت سے عیاں تھے۔ "یہ معاملہ تو بہت سنگین ہو گیا ہے۔ مجھے بھی مشکل میں ڈال دیا ہے تم نے۔" ان کا موڈ خراب ہونے لگا تھا۔ "میں کیا جواب دوں گا؟"

"کچھ نہیں انکل! آپ نے زبانی احکامات دیے تھے۔" میں نے کہا۔ "وہ لوگ بعد میں پہنچے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اسے بھی دشمن کی چال کہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی پوچھے تو قطعی لاعلمی کا اظہار کر دیجیے۔ کسی نے آپ کی آواز بنائی ہو گی۔"

"بالفاظ دیگر میں جھوٹ بولوں۔" رضوی صاحب نے خفگی سے کہا۔ "قصوروار ماتحتوں کو بنا ڈالوں کہ وہ تصدیق کیے بغیر کیوں آ گئے۔ یا پھر ان سے بھی کہوں کہ وہ میرے احکامات اور تعمیل کرنے کے معاملات سے لاعلمی کا اظہار کر دیں۔ تم نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔"

"دشمن تو وہ میری جان کے ہو رہے ہیں انکل! آپ کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔" میں نے جانتے بوجھتے برا مانتے ہوئے کہا۔ "اگر آئندہ میں آپ سے مدد کی درخواست کروں تو آپ

انکار کر دیں۔" میں آگے بڑھ کے لوگوں میں شامل ہو گیا۔ غالباً رضوی صاحب کو بعد میں احساس ہوا کہ قصوروار میں نہیں اور جو کچھ ہوا اس کا اندازہ تو وہ خود بھی نہیں کر سکتے تھے۔

جب تدفین سے فارغ ہو کے لوگ واپس ہو رہے تھے تو وہ عمداً پیچھے رہے۔ "سکندر!" انہوں نے میرے ساتھ چلتے چلتے کہا۔ "میں تم سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ میں تم سے بے تعلق بھی نہیں رہ سکتا۔ گھر چل کے تم مجھے تفصیل سے بتاؤ گے کہ یہ آدمی تمہارے ہاتھ کیسے آیا۔ کون ہے اور اب اس کا کیا کرو گے؟"

"اسے تو میں اب آپ کے حوالے نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ آپ کے گھر پر بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اب وہ لوگ مطمئن ہو چکے ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ وہ آدمی رابعہ کی کوٹھی میں ہی ہلاک ہو گیا۔ جل گیا یا دفن ہو گیا۔ یہ تو آپ کو البتہ بہتر طور پر بتا سکتی ہے کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اسے سب معلوم ہے۔"

وہ مطمئن تو نہیں ہوئے لیکن مجھ سے مزید گفتگو کو انہوں نے نامناسب سمجھا۔ محسن نے مجھے اور ان کو باتیں کرتے دیکھ لیا تھا اور دور دور چلتا رہا تھا۔ رضوی صاحب کے جدا ہوتے ہی وہ قریب آیا لیکن دوسری طرف سے منظر نے مجھے پہلے دبکا لیا۔

"میلا! میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔" وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔ وہ اتنا پیدل چلنے کا عادی نہیں تھا اور اپنے بھاری بھرکم وجود کا بوجھ گھسیٹنا اس کے لیے محنت طلب کام تھا۔ "رابعہ کے گھر پر موقع نہیں تھا لیکن یہ تو دنیا کے معاملات ہیں۔ ایسے ہی چلتے ہیں۔ تمہارا وہ کیس تھا، والد مرحوم کا پوسٹ مارٹم کروانے کی درخواست۔ اس پر احکامات صادر ہونے سے پہلے تمہارا بیان ہوگا اور تین گواہ....."

"گواہوں کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک تو پرانی حویلی کا چوکیدار ہے گلاب خان۔ دوسرا ایم ڈبلیو ڈی کا ایک اکاؤنٹنٹ مل گیا ہے غلام علی۔ وہی تیسرا گواہ بھی لے آئے گا۔"

"ایم ڈبلیو ڈی کے اکاؤنٹنٹ کا اس کیس سے کیا تعلق؟" منظر بولا۔ "کوئی جاننے والا تھا؟"

"ایم ڈبلیو ڈی نہیں، ایم ڈبلیو ڈی سی۔" میں نے کہا۔ "میر شہر لالہ والا اینڈ کمپنی۔ فرم میں ایک تیسرا پارٹنر بھی شامل ہو گیا تھا، میر شرافت علی۔ وزیر خان اور چوہدری ولایت غوری اب ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کہلاتی ہے اور شاہدرہ میں ہے۔"

منظر نے سر ہلایا۔ "برسوں کی تاریخ پڑی ہے۔ تم کو بڑا کمیت حاضر ہونا ہے۔ ان کی نشاندہی پر قبر کھودی جائے گی۔"

"کہاں حاضر ہونا ہے؟" میں نے کہا۔ "اور کس وقت؟"

"صبح نو بجے ڈی ایم کی کورٹ میں۔" وہ بولا۔ "پھر میڈیکل بورڈ تشکیل دے گی اور ایس ڈی ایم کی موجودگی میں قبرستان میں دوبارہ پوسٹ مارٹم کرنے کے لیے تاریخ دی جائے گی۔ دو چار دن کے اندر اندر۔"

ہم سب سے پیچھے تھے۔ آگے چلنے والے رابعہ کے مکان پر پہنچے تو وہاں ایک ہجوم تھا جو سڑک کے دوسرے کنارے پر کھڑا فائر بریگیڈ کو پانی پھینکتے دیکھ رہا تھا۔ پورا گھر ایک جلا ہوا کھنڈر بن گیا تھا جس کے گرد پولیس نے محاصرہ قائم کر رکھا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا لیکن جواب دینے والا صرف وہی پولیس انسپکٹر تھا جس کی کمان میں ایک حوالدار اور دو کانسٹیبل آئے تھے۔ وہ سب قریب آنے والوں کو منتشر کرنے میں مصروف تھے تاکہ آگ بجھانے والوں کے کام میں خلل نہ پڑے لیکن اب انسپکٹر اچانک وکیلوں کے مجمع میں گھر گیا تھا اور اس کی نفری کے لیے ان کو ڈنڈے مار کے بھگانا مشکل تھا۔ اسے بار بار بتانا پڑ رہا تھا کہ اسے کچھ نہیں معلوم۔ وہ نہیں جانتا کہ مکان کس کا ہے اور مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ کا ہے تو وہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ وہ اندر تھیں یا نہیں۔ اسے تو اطلاع ملی تھی کہ کراؤن سینما سے ذرا آگے ایک کوٹھی میں گولیاں چلی ہیں اور دو دھماکے ہوئے ہیں اور یہاں آ کے اس نے دیکھا تو فائر بریگیڈ پہنچا ہی تھا۔ اس وقت آگ بڑی تھی۔ یہ غنیمت ہے کہ دور تک نہیں پھیلی ورنہ یہاں اتنی گاڑیاں کھڑی تھیں کہ ایک کا پٹرول ٹینک پھٹ جاتا تو دوسری کا بھٹ بیٹھ جاتا اور دوسری سے تیسری کا کونڈا ہو جاتا۔ بظاہر اسے یہ شکایت تھی کہ آخر لوگوں کے پاس اتنی گاڑیاں کیوں ہیں اور آگ سے ہونے والے نقصان کی فکر نہیں تھی۔ پھر اس نے ضامن رضوی صاحب کو دیکھ لیا اور اس کا رویہ "اٹن شن" والا ہو گیا۔ رضوی صاحب کی نظریں مجمع کا جائزہ لے رہی تھیں اور خاموشی کے باوجود میں ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ دوسرے لوگوں کو تشویش تھی، ان کو پریشانی بھی تھی اور غصہ بھی تھا۔ ان پر جو لاقانونیت کا یہ مظاہرہ کر کے قانون کو چیلنج دیے گئے تھے تو مجھ پر اور محسن پر جنہوں نے اپنی "حماقت" سے اس مصیبت کو دعوت دی تھی

www.paksociety.com

اور پھر اپنے انتظامات کے ناکافی ثابت ہونے پر انھوں نے لوگوں کو مطلع کیا کہ غالباً رابعہ کو ان کا شوہر لے گیا ہوگا، کیونکہ انھیں اپنی گاڑی نظر نہیں آ رہی ہے اور رابعہ کے شیطانی رجحانات کے خیال سے وہ ہدایات دے گئے تھے کہ وہ ان کی واقفیت کے ساتھ چلی جائے۔ ایک ہمسائے نے تصدیق کی پیشکش کی اور رضوی صاحب نے اسے اپنے گھر کا نمبر بتایا۔ دس منٹ بعد یہ بات سب کو معلوم ہو چکی تھی کہ مس رابعہ خیریت سے ہیں۔ جانے والے اب سو باتیں کر رہے تھے۔ عام خیال یہی تھا کہ اس موقعے پر یہ انتقامی کارروائی انتہائی خطرناک حرکت ہے اور نجانے وہ کون ایسا موکل ہوگا جس کا مقدمہ رابعہ جیت نہیں سکی ہوگی۔ ممکن ہے کسی پھانسی پر لٹک جانے والے قاتل کے وارثوں نے وکیل صاحبہ کو ان کی نااہلی کی سزا دی ہو جن کو فیس اس لیے دی گئی تھی کہ موکل کی جان بچائیں۔ وکلاء کی برادری کا نقطۂ نظر اور مطالبہ تقریباً ایک ہی تھا اور وہ بار کے اجلاس میں احتجاج کی اور پریس کانفرنس کی، غنڈہ گردی کے بڑھتے ہوئے واقعات کی، پولیس کی نااہلی کے مقابلے میں قانون شکن عناصر کی روز افزوں وارداتوں کی باتیں کر رہے تھے۔

دوبارہ خان رضوی صاحب کے روبرو ہونے سے بہتر ہمارا غائب ہو جانا بہتر تھا۔ سب لوگوں کی طرح ہم بھی حیرت اور غم و غصے کے اظہار میں پیش پیش تھے اور ان معتبر گواہوں کی تعداد کافی تھی جو پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے تھے کہ ہم تدفین سے پہلے یہاں موجود تھے۔ جو وقت جنازے کے ساتھ رہے اور سب کے ساتھ واپس آ رہے تھے۔ خان رضوی صاحب اب تفتیش کے لیے ہدایات جاری کر رہے تھے اور ایک اخبار کے رپورٹر بھی موجود تھے جو خبر پا کے یا محض اتفاق کے باعث آ پہنچا تھا۔ میں اور محسن ان کی نظر بچا کے ایک وکیل کی کار میں بیٹھ گئے۔ "ہمیں ذرا نہر کے پل پر اتار دیجیے گا۔" میں نے کہا۔ اس شریف آدمی کو جانا تو مخالف سمت تھا لیکن اتنے کم فاصلے کے لیے وہ اخلاق اور مروت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

نہر کے پل پر اتر جانے کے بعد ہم نے تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کیا اور اس مقام تک پہنچے جہاں ہم نے رابعہ کی کار چھوڑی تھی۔ اس کو نمایاں کرنے والا ایک تو تماشہ جیسا چمکتا ہوا گہرا لال رنگ تھا۔ اب سامنے سے بمپر کے پچک جانے، بونٹ کے دب جانے اور ڈینٹوں کے بدنما ہو جانے سے اس کار کو شہر میں ہر جگہ دور سے پہچانا جا سکتا تھا۔ کار وہیں

موجود تھی اور اسی حالت میں کھڑی تھی جس طرح ہم نے چھوڑا تھا۔ دروازہ کھولنے تک مجھے یہ شک نہیں ہوا کہ کسی نے کار کا دروازہ کھولا ہوگا۔ اب شام کے سائے پھیلنے لگے تھے اور کار کے شیشوں سے اندر کا منظر نسبتاً کم روشنی کے باعث دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مجھے اور محسن کو تشویش لاحق ہو چکی تھی کہ ہمارا قیدی زخمی ہونے کے علاوہ وہ صبح سے بھوکا پیاسا سامنے بند تھا۔ پڑا ہے اور پچھلا جا رہا ہے کچھ جاننے سے پہلے ہی جس کی تاب لانے کی ہمت نہ دے۔ لیکن سیٹ کو اٹھاتے ہی پیچھے کی گنجائش نہ رہی۔ میں نے پلٹ کر محسن کو دیکھا اور میری صورت دیکھتے ہی محسن گھبرا گیا۔ اندیشے سچ ہو گئے ہیں۔ میں نے سیٹ کو سیدھا کر کے ڈھک دیا اور محسن نے میری جگہ آ کے وہ خون دیکھا جو اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان بچھے ہوئے قالین پر جمع ہو گیا تھا۔

خون اس زخم سے نکلا تھا جو دل کے مقام پر نظر آ رہا تھا اور اب بھی رس رہا تھا۔ زخم اس خنجر کا تھا جس کا صرف دستہ سینے کے باہر تھا۔ اس کا پھل سینے سے گزر کے دل میں پیوست ہو چکا تھا۔ عالم بیہوشی میں ہی دستِ قاتل اپنا کام کر گیا تھا۔

"یہ حرکت کسی نے ابھی ابھی کی ہے۔" محسن سناٹا زدہ جھک کے دیکھنے لگا۔ "یہ... یہ ابھی مرا نہیں ہے۔" وہ کچھ دیر بعد چلایا۔ "بس اب یہاں سے بھاگنے کی کرو۔ کوئی دیکھ لے گا تو ہم مارے جائیں گے۔"

محسن نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور انجن فوراً اسٹارٹ ہو گیا۔ تب مجھے خیال آیا کہ کچھ دیر پہلے ہم جان بچا کے اور اس قیدی کو لے کر رابعہ کے گھر سے فرار ہوئے تھے تب بھی کار کو دھکا لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی حالانکہ صبح سے دو بار ایسا ہو چکا تھا۔ وہ نقص جو وقتی تھا دور ہو گیا تھا مگر مجھے یوں لگا جیسے وفادار گاڑی صورتِ حال کی نزاکت سمجھتی ہے اور وقت کے تقاضے کے مطابق ساتھ دیتی ہے۔ محسن نے کار نہر کے کنارے سے بائیں جانب موڑ دیا۔ ہمارا پہلا مقصد اس جگہ سے دور نکل جانا تھا۔

"گھر کو تباہ کر دینے کے باوجود وہ مطمئن نہیں ہوئے تھے۔" محسن نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کے بعد بھی ہمارا تعاقب جاری رکھا۔" میں نے کہا۔

"لیکن یار! میں نے کسی کو پیچھے آتے دیکھا نہیں تھا۔" محسن بولا۔

"انھوں نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ بھاگ کر ہم کہاں جا سکتے تھے۔" میں نے کہا۔ "باقی سب لوگ اپنی گاڑیاں چھوڑ کر پیدل گئے تھے۔ ہم یہ گاڑی لے کر قبرستان جاتے تو سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی واحد کار کو سب دیکھتے اور پہچان کے حیران بھی ہوتے۔ شاید انھوں نے ہمیں پیدل قبرستان تک جاتے بھی دیکھا ہو تو انھیں اس تلاش سے کار ان کو مل گئی ہوگی۔"

"پھر وہ اپنے آدمی کو کیوں نہیں لے گئے؟" محسن نے پوچھتے ہوئے کہا۔

"ایک تو ان کے لیے یہاں اس کار میں سے کسی بے بس آدمی کو نکالنا آسان نہیں تھا۔ ٹریفک آتی جاتی ہے کوئی بھی دیکھ سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ "دوسری بات یہ کہ ان کو یہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے زیادہ آسان کام خنجر گھونپ کے نکل جانا تھا۔ اس آدمی کا وجود ان کے لیے خطرناک ہو گیا تھا۔ جب دیکھا تو ہم نے ہی تھا مگر دشمن کا خیال ہوگا کہ پولیس والے بھی دیکھ چکے ہیں اور ہو سکتا ہے تصویریں اور فنگر پرنٹ لے چکے ہوں۔ ایسے بے مصرف اور بے وقعت آدمی کے زندہ رہنے میں خطرہ تھا مگر اسے مار کے یہ خطرہ بھی ختم کیا جا سکتا تھا اور ہمارے لیے ایک مصیبت بھی کھڑی کی جا سکتی تھی۔"

"تیرا مطلب ہے وہ پولیس کو فون کر چکے ہوں گے؟" محسن نے چونک کر کہا۔ "کہ فلاں جگہ گاڑی میں لاش پڑی ہے۔"

"دشمن کو بے وقوف سمجھنا بے وقوفی ہے محسن! اتنے تجربات کے بعد بھی ان کی ذہنیت کا اندازہ کرنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ہم وہاں سے فرار نہ ہوتے تو خدا جانے اس دیر میں پولیس پہنچ جاتی اور ہم وضاحت کرتے۔ سارا زمانہ دیکھ چکا ہے کہ صبح سے ہم یہ لاش لیے پھر رہے ہیں۔ ہم کیا بتاتے کہ باندھ کر قتل کرنے کے بعد ہم یہ لاش کہاں لے جانا چاہتے تھے اور ہم نے اسے مارا کیوں تھا۔"

"اصولی کا ڈرا، ہم تو اس شخص کا نام بھی نہیں جانتے۔" محسن نے کہا۔ "ذرا دیکھو، ہمارے پیچھے کوئی ہے؟"

ہمارے پیچھے کوئی نہیں تھا چنانچہ میں نے محسن کو سڑک کے کنارے گاڑی روک لینے کے لیے کہا۔ سڑک پر سے کبھی کبھار اِکا دُکا گاڑی گزر جاتی تھی ورنہ سڑک ویران ہی تھی۔ میں نے اور محسن نے اس شخص کو اٹھا کے باہر نکالا اور کار کے پیچھے زمین پر لٹا کر اس کی رسیاں کھول دیں۔ وہ قریب المرگ تھا اور لمبے سانس لے رہا تھا۔ میں دوڑ کر نہر تک گیا اور دونوں ہاتھوں کے پیالے میں پانی بھر لایا۔ ایک کار ہمارے پیچھے سے گزر گئی۔ کسی نے رک کر پیچھے کا منظر نہیں دیکھا۔ میں نے زخمی شخص کے حلق میں پانی ٹپکایا اور باقی اس کے منہ پر گرنے دیا۔ وہ کراہنے لگا اور چند بار ادھر سے ادھر جھٹکے کے بعد اس نے نیم وا آنکھوں سے ہمیں دیکھا۔

"دیکھو... میری بات سنو... میری آواز آ رہی ہے نا؟" میں نے جھک کر کہا۔ اس شخص نے بمشکل تمام اقرار میں سر ہلایا۔ "ایک بات سمجھ لو... تم بہت زیادہ زخمی ہو... تم جانتے ہو کہ تمہیں مارنے والے کون ہیں... ہم تمہارا انتقام لے سکتے ہیں۔ ہمیں ان کا نام بتا دو۔ کون لوگ ہیں وہ؟ تمہارا بچنا بہت مشکل ہے... لیکن مرنے سے پہلے تم ایک نیکی کر سکتے ہو۔"

ایک بار پھر اس نے جسم کی ختم ہوتی ہوئی قوت کو جمع کیا۔ اس کے لب کانپے مگر الفاظ اس کے حلق سے خرخراہٹ بن کے نکلے۔ ایک مرتبہ پھر میں پانی بھر کے لایا مگر میرے ہاتھوں کا کاسۂ گدائی کا پانی موت سے مزید مہلت حاصل نہ کر سکا۔ محسن نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا اور میں نے ہاتھ چھوڑ دیے۔ پانی خشک زمین میں جذب ہو گیا۔ اس خون کی طرح جو پہلے ہی خاکِ راہ گذر کو سیراب کر رہا تھا۔ ایک آدمی کے خون سے کبھی بھی زمین کی پیاس نہیں بجھتی ہے۔ زمین تو ازل سے ہر جگہ ہر وقت وہ خون پیتی رہی ہے جو آدمی نے بہایا اور آدمی کا تھا۔ پتھر کے زمانے سے ایٹم بم کے زمانے تک لاکھوں کروڑوں اربوں مرنے والوں کا خون مٹی کا رنگ تک نہیں بدل سکا۔

"کچھ نہیں بتایا اس نے؟" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"بتایا ہے۔" محسن بولا۔ "معلوم نہیں میں نے غلط سنا یا صحیح — اور وہ دمِ آخر ذہن میں آنے والے بے ربط خیالات تھے یا ان الفاظ سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ایک لفظ تو راج یا راجہ تھا۔ راج گڑھ یا راجہ گڑھ تھا۔"

"راج گڑھ ایک محلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اور دوسرا؟"

"کرامت... دوسرا لفظ مجھے کرامت سنائی دیا تھا۔ تیسرا لفظ غالباً سراج تھا۔ سراج تو ہو نہیں سکتا۔ سراب بھی مشکل ہے۔"

"کرامت اور سراج۔" میں نے کہا۔ "یہ تو نام ہو سکتے ہیں مگر راج گڑھ تو بہت بڑا علاقہ ہے۔ وہاں صرف نام سے کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ معلوم نہیں وہاں کتنے کرامت علی، کرامت حسین اور کرامت دین ہوں گے۔"

سڑک کو خالی پا کے ہم نے لاش کو وہیں چھوڑا اور کار لے کر چل پڑے۔ یہ کار بھی اب ہمارے لیے چلتا پھرتا خطرہ بن گئی تھی۔ ایک اندیشہ یہ تھا کہ دشمنوں نے پولیس کو فون کیا ہوگا اور کار کا نمبر وغیرہ ضرور لکھوایا ہوگا۔ دوسرا اندیشہ یہ بھی تھا کہ ہم جس بنگلے کی دیوار توڑ کے نکل آئے تھے وہاں بھی کسی نے نمبر دیکھ لیا ہو۔ اس خطرے سے نجات کی بہترین صورت یہی ہو سکتی تھی کہ گاڑی سے نجات حاصل کر لی جائے — میں نے اسے تقریباً دو میل آگے لے جا کر سڑک سے نیچے اتار دیا۔ اس کے گلوز کمپارٹمنٹ

www.paksociety.com

میں سے نو ہزار روپے کی گڈی کے علاوہ ہم نے کچھ نہیں نکالا تاکہ پولیس کو مالک کا سراغ لگانے میں آسانی ہو۔

رابعہ نے رضا حسن رضوی صاحب کو اپنے اغوا کیے جانے کی اور بازیابی کے لیے ہماری کوششوں کا تمام ماجرا بتا دیا تھا۔ ہم رکشا سے اترے تو سورج غروب ہو چکا تھا مگر رضوی صاحب لان پر بیٹھے تھے۔ بالکل اکیلے اور اپنے خیالات میں غرق۔ ان کے سامنے کی تین کرسیاں خالی تھیں اور میز پر چائے کے برتن رکھے تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ رابعہ آرام کر رہی ہے۔ اور بہتر ہوگا اگر ہم اسے مزید پریشان کرنے کے بجائے ہاتھ منہ دھو کے یا غسل کر کے چائے کے لیے حاضر ہو جائیں۔ چائے کا تو بہانہ تھا وہ ہمیں جھاڑ پلانا چاہتے تھے جس کے ہم مستحق تھے چنانچہ میں نے اور محسن نے سعادت مندی سے "جی" کہا اور اندر چلے گئے مگر نہانے دھونے کے بجائے رابعہ کے پاس جا پہنچے۔ اس وقت رضوی صاحب سے کہنا مشکل تھا کہ وہ رابعہ کی کار کے چوری ہونے کی رپورٹ لکھوانے میں ہماری مدد کریں۔ رابعہ ہماری بات سمجھ سکتی تھی اور رضوی صاحب کو سمجھا سکتی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد ہم غسل وغیرہ سے فارغ ہو کے اور کپڑے بدل کے حاضر ہوئے تو رابعہ بھی ایک کرسی پر بیٹھی تھی اور تازہ چائے آ چکی تھی۔ رضوی صاحب نے ٹیلی فون کر کے اپنے علاقے کے ایک تھانیدار کو بلوا لیا تھا اور بہت برہم تھے۔ ان کی تمام برہمی کا نشانہ ہم ہی بن سکتے تھے۔ وہ خوب گرجے برسے "مذاق بنا لیا ہے تم نے قانون کو ہیرو بن گئے۔ یہ کل کے لونڈے حضرت فلمیں دیکھ دیکھ کے۔ جیمز بانڈ بنے ہوئے ہیں۔ کیا ضرورت تھی قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی۔ وہ خط اگر فوراً پولیس کے حوالے کر دیا جاتا تو پولیس پارٹی میں کوئی نہ کوئی اسے پڑھ لیتا۔ معلوم ہو جاتا کہ کیا سازش ہے۔ سب دھر لیے جاتے۔ کیا بلا ضرورت جان خطرے میں ڈالی۔ رابعہ کا گھر تباہ ہو گیا، ایک اسکینڈل کھڑا ہو گیا۔ کل اخبارات میں سنسنی خیز سرخیاں بھری پڑی ہوں گی۔ تحقیق و تفتیش کرنے والے جھک مارتے رہیں گے۔ ہم جانتے بوجھتے حقائق کی پردہ پوشی کریں گے۔ آئندہ کے لیے نوٹ کر لو...!"

ایک ایس ایچ او نے مودبانہ سلیوٹ مار کے ہماری جان بخشی کرا دی۔ رضوی صاحب کو خاموش ہونا پڑا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ آخری رپورٹ جو چوری کے بارے میں تھی وہ درج کر دس منٹ پہلے درج کی گئی تھی۔ رابعہ کی کار کی چوری کی رپورٹ کا وقت تین بجے کے قریب لکھا گیا۔ کار جنازہ اٹھ جانے کے بعد رضوی صاحب کے گھر کے دروازے سے چوری ہوئی تھی بعد کے واقعات بعد میں پیش آئے تھے۔ رپورٹ خود مس رابعہ نے لکھوائی تھی۔ ایس ایچ او نے رابعہ کے دستخط لیے سلیوٹ کیا اور رخصت ہو گیا۔

"ایک اور جھوٹ" رضوی صاحب نے چائے کا پیالہ اٹھاتے ہوئے کہا "یہ چیز بڑا غلط ہے۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے کئی جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور کبھی نہ کبھی ایک جھوٹ پکڑا جاتا ہے تو جھوٹ کا پورا قلعہ ریت کی دیوار کی طرح گر پڑتا ہے۔" میں اور محسن یہ سوچتے رہے کہ جب رضوی صاحب کو معلوم ہوگا کہ کار میں قتل ہوا ہے اور جو خون اس میں ہے وہ اسی شخص کا ہے جس کی لاش نہر کے کنارے پڑی پائی گئی تو کیا ہوگا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ بات ان سے چھپائی نہ جائے۔ چھپانا ان کی نظر میں بھی شبہ ہو جانے کے مترادف ہوگا اور ہمیں ان کی مدد کی آئندہ بھی ضرورت تھی۔ میں نے جرأت کر کے اس بدبخت شخص کے انجام کے بارے میں بھی بتا دیا۔

"آئی سی" انہوں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ تم اس شخص کو لے کر فوراً کسی ہسپتال لے جاتے۔ شاید اس کی جان بچ جاتی اور پولیس کو بتا دیتے جو سچ تھا۔"

"اس کی جان بچنے کا امکان ہوتا تو ہم یہ حماقت ضرور کرتے" میں نے کہا "لیکن ہمارے حق سے نقصان کے سوا کیا ہوتا اور فرض کیجیے وہ شخص ہوش میں آ کے ہمارے خلاف بیان دیتا کہ مرنے والے کا بیان سچ سمجھا جاتا ہے۔ قانون ہم پر فرد جرم عائد کر دیتا۔ رابعہ کے اغوا کی کہانی بھی سنسنی خیز صحافت کو فروغ دینے والے نمک مرچ لگا کے چھاپتے۔ رنگین داستان کے لیے سب کچھ ملتے اور رائی کا پہاڑ بنا دیتے۔ میں یا آپ کس کس کی تردید کرتے۔ کس کس کو ہتک عزت کا نوٹس دیتے اور کیا … بچی زندگی کے علاوہ رابعہ کی … ساکھ کو ختم … ہے۔ مجھ پر ایک قتل کا الزام پہلے سے ہے۔ دشمن … پیچھے لگے ہوتے ہیں اور آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ دشمن خود پیدا کیے ہیں۔ حقیقت حال سے واقف ہونے کے باوجود آپ سمجھتے ہیں کہ میری وجہ سے آپ کی نیک نامی متاثر ہوئی تو صاف بتا دیجیے۔ میں اپنا سامان اٹھا کے کہیں اور چلا جاتا ہوں۔"

میری بات کا خاطر خواہ اثر ہوا رضا حسن رضوی صاحب کھڑے ہو گئے۔ چلتے چلتے انہوں نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "تم نوجوان ہو جوشیلے اور جذباتی ہو۔ میری بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں تم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جاؤ … میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ قانونی، اخلاقی اور گھریلو۔ بس ان کا لحاظ کرو۔ اور مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔" وہ جانے کے لیے مڑے اور پھر رکے "یہ غلام علی کون ہے؟ دو مرتبہ فون آ چکا ہے اس کا۔ تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔"

"میرا ایک دوست ہے" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "میں خود بات کر لیتا ہوں۔"

اندر جا کے میں نے غلام علی کے کیسٹ ہاؤس کی دکان کا نمبر ملایا۔ "انعام کیسٹ" کسی نے کہا۔

"مجھے مسٹر غلام علی سے بات کرنی ہے" میں نے کہا "میں … بول رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا جی، بڑا اچھا ہوا آپ نے فون کر لیا۔ بھائی جان پھر آئے بیٹھے تھے، آپ سے بات کرنے کے لیے۔"

"… صاحب!" چند سیکنڈ بعد غلام علی نے … سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "مجھے وہ سب مل گیا ہے۔"

"اچھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے" میں نے رضا حسن رضوی صاحب کو موجود پا کے گول مول بات کی "کل پھر کہاں مل رہے ہو؟"

"جہاں آپ کہیں سر! … تو آج ہی حاضر ہو جاتا مگر آپ سے بات ہی نہ ہو سکی۔"

"ہاں بھئی وہ ہماری ایک عزیزہ ہیں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ سارا دن وہیں گزر گیا۔ خیر کل … گارڈینیا میں آ جاؤ… ہاں … شام کا وقت رکھ لو یا صبح کا … گیارہ بجے ٹھیک رہے گا … تو پھر خدا حافظ" اگرچہ اس کے بعد غلام علی نے ریسیور رکھ دیا تھا مگر میں نے ظاہر کیا کہ بات جاری ہے۔ "ہاں … اچھا … کل ہی چلے جاؤ گے … ایک آدھ دن اور ٹھہر جاتے یار … گنجائش نہیں … پھر تو مجبوری ہے" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ رضوی صاحب مطمئن ہو کے جا چکے تھے۔ انہیں یقین آ گیا تھا کہ غلام علی واقعی کوئی ایسا دوست ہے جو رخصت ہونے سے پہلے آخری ملاقات کرنا چاہتا ہے۔

میں باہر آیا تو رابعہ اندھیرا ہو جانے کے بعد بھی وہیں بیٹھی تھی اور اکیلی تھی۔ "محسن کہاں گیا؟" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا لیکن رابعہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ الفاظ کی تسلی بے معنی تھی۔ اس کے نقصانات کی تلافی ہو سکتی تھی اور نہ اس کے دکھ کا مداوا مل سکتا تھا۔ وقت کے یہ زخم وقت ہی کے … مندمل ہو سکتے تھے چنانچہ میں خاموش بیٹھا رہا۔ خاموشی … رفاقت اور غمگساری کے … دکھ کو سمجھنے اور بانٹنے کی خواہش کے اور … ہم آہنگی کے احساس نے ہمیں جذبات کی زبان میں بات کرنا اور سمجھنا سکھا دیا تھا۔ یہ زبان صدا نہیں سکوت مانگتی ہے جس میں دل کا ہر خیال وسیلہ اظہار کے بغیر دوسرے کے دل میں اتر جاتا ہے۔ بقول شاعر ؎

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے ——

والی بات ہو —— میری ایک مجبوری یہ بھی تھی کہ میں بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ آخر میں کہا کہ رابعہ مجھے معاف کر دو۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا ذمے دار میں ہوں۔ میں نے وہ خط تمہارے پاس پہنچایا تھا جس نے تمہیں ذہنی و جسمانی اذیت میں مبتلا کیا۔ تمہاری عدم موجودگی میں تمہاری ماں مر گئی اور ابھی جسد خاکی اپنی ابدی قیام گاہ تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ وہ گھر جل گیا جس میں اس کی زندگی کا سب سے طویل اور عزیز عرصہ گزرا۔ اس سب کی سزا مجھے ملنی چاہیے تھی۔" رابعہ کی … "کیا نعوذ باللہ تم خود کو … سمجھتے ہو کہ میرا نوشتہ تقدیر تمہاری تحریر تھا یا تم اس کو بدلنے پر قادر تھے۔ کیا میں فرض کر لوں کہ تمہاری نیت کے خلوص میں کھوٹ ہے اور تم میرے خیر خواہ نہیں تھے۔ اگر تم مجھے اور دکھی دیکھنا نہیں چاہتے تو ایسی فضول باتیں کیوں سوچتے ہو۔" جو میں نے کہا "احساس کے عذاب سے میں کیسے نجات پاؤں؟" وہ بولی "کوئی بات کرو۔ کب تک چپ بیٹھے میری صورت دیکھتے رہو گے۔" اس نے اب اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔

"تم نے کچھ سوچا ہے رہائش کے مسئلے پر؟" میں نے کہا۔

"سوچا تھا لیکن رضوی صاحب نے مجبور کر دیا کہ مت سوچو" وہ بولی "وہ مجھے اس گھر سے جانے نہیں دیں گے۔"

"اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہو سکتی" میں نے کہا "یہاں تم محفوظ رہو گی۔"

"جب یہ تفتیش وغیرہ ختم ہو جائے گی اور حالات معمول پر آ جائیں گے تو میں اس گھر کا ملبہ صاف کرا دوں گی" وہ بولی "ایک نہ ایک دن میں وہاں پھر اپنا گھر بناؤں گی۔ بنا تو کل بھی سکتی ہوں لیکن ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں" میں نے پھر زبان خاموشی میں کہا "جب اس کی ضرورت پیدا ہوگی تو میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔ وہ تمہارا نہیں ہمارا گھر ہوگا۔"

اس رات میں اور محسن لائٹ آف کیے اپنے اپنے بستر پر خاموش لیٹے رہے۔ ہم اپنے اپنے خیالات کے جنگل میں بھٹک رہے تھے مگر اس کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ محسن کیا سوچ رہا ہے اور محسن کو یہ بتانا ضروری نہیں

www.paksociety.com

تھا کہ میرے خیالات کا دھارا کس سمت میں بہہ رہا ہے۔ صرف ایک بار میں نے کہا تھا یار سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔ محسن نے کہا تھا چلو یار! سگریٹ ختم ہو گئے تو ہم دونوں ایک ساتھ اٹھے اور باہر آ گئے۔ نصف شب کی چاندنی اپنا جادو جگا رہی تھی مگر میرا تصور ویرانوں میں بھٹک رہا تھا۔ مجھے چاندنی ایک قبر کے مرجھائے ہوئے پھولوں پر نظر آئی۔ میں نے چاندنی کو ایک جلے ہوئے مکان کے کھنڈر پر روتے دیکھا۔ پلٹ کر دیکھنے پر مجھے دوسری منزل پر خوابگاہ کی ایک کھڑکی کھلی نظر آئی۔ اس کے فریم میں ایک سایہ رابعہ کے خدوخال کی تصویر بنا رہا تھا۔ شاید وہ بھی چاندنی کو وہیں دیکھ رہی تھی اور جیسے ہی دیکھ رہی تھی جیسے میں نے دیکھا تھا۔ میں اور محسن مضمحل اور بے حد تھکے ہوئے تھے اور ہمارے جسم سکون کی نیند مانگتے تھے مگر نیند تو ذہن کے دریچوں سے اترتی ہے اور یہ دریچے منتشر خیالات کی کثرت سے بند تھے۔ افریقہ کے جنگلوں کی زمین کی طرح جہاں درختوں اور شاخوں پر برگ و بار کی کثرت سورج کی ایک کرن کو بھی راہ نہیں دیتی۔ ہم ریلوے اسٹیشن تک گئے۔ چائے کے دو کپ پی کر بھی بنچوں پر بیٹھے رہے اور پھر سگریٹ کے پیکٹ خرید کے لوٹ آئے۔ میری آنکھ لگی تو دور سے صبح کی اذان کی آواز آ رہی تھی۔ پھر ایک لمحے کو دو حصے ہو گئے۔ پہلے حصے میں فوزیہ نے میرے سامنے آ کے کہا: سکندر! کیا یہ سچ ہے کہ تم رابعہ کو چاہنے لگے ہو؟ مگر دوسرے حصے میں فوزیہ کی جگہ رابعہ آ گئی: آخر تم کب تک جھوٹ بولتے رہو گے اور بھاگتے رہو گے۔ آگے تو راستے بھی بند ہیں اور خوابوں کے کواڑ مقفل ہیں۔ آؤ بھلائی کی طرف آؤ... آؤ بھلائی کی طرف، سچائی کی طرف۔ اس کی رحمت کے دروازے تو کھلے رہتے ہیں! میں اٹھ بیٹھا۔ وضو کر کے قبلہ رو ہو گیا۔ اس روز نماز کے اعجاز مسیحائی نے مجھے وہ سکون دیا جس کا میں طالب تھا اور جو مجھے کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا خواہ اس کے اختیار میں تمام دنیاوی وسائل ہوتے۔

ساڑھے دس بجے میں ریگل کے اسٹاپ پر اترا تو زندگی کی ہر رونق اور ہنگامہ اپنے عروج پر تھا۔ گزرتے ہوئے دن اور یادوں کی رنگینی کا خیال کسی کی راہ میں حائل نہ تھا اور میں نے بھی سڑک عبور کی تو میں صرف غلام علی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ "گارڈینیا" کے شفاف شیشوں والے دروازے پر ابھی تک پلاسٹک کی سفید تختی آویزاں تھی جس پر سرخ حروف سے "کلوزڈ" لکھا ہوا تھا۔ اس معیار کے ریستوران ساڑھے گیارہ بجے تک ہی کھلتے ہیں۔ میں ایک بک اسٹال پر کتابیں دیکھتا رہا۔ دس منٹ بعد میں نے ہر اخبار کی ایک ایک کاپی طلب کی اور کاؤنٹر نے مجھے غور سے دیکھا اور زیر لب مسکرایا۔ میں پروا کیے بغیر اس سمت کے بس اسٹاپ پر مردانہ حصے کی بینچ پر جا بیٹھا۔ ہر اخبارات نے شہر کے مشہور وکیل کے مکان میں دھماکوں کا اور آتش زدگی کا ذکر کیا تھا۔ تصاویر شائع کی تھیں اور واردات کے پُر اسرار ہونے پر تبصرہ کیا تھا کیونکہ یہ سب کچھ وکیل رابعہ قادری کی والدہ کا جنازہ اٹھتے ہی ہوا تھا۔ اتفاق سے وہ عزیز گھر سے جا چکی تھیں۔ اخبار میں رابعہ کی تصویر تھی۔ علاوہ ازیں صاحب کی تصویر بھی ایک اخبار نے الگ چھاپی تھی کہ انھوں نے تفتیش کے موقع پر نگرانی کی اور مس رابعہ قادری کی صورت ایک ساتھ قیام پذیر ہیں۔ مزید تصویریں تین سوختہ لاشوں کی تھیں جو ملبے سے برآمد ہوئی تھیں اور پہچانے جانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ گولیاں چلنے کا ذکر کہیں نہیں تھا اور یہ غالباً پولیس کی ذاتی کوشش کے طفیل ممکن ہوا تھا۔ اخبارات نے اسے بھیڑیوں کی انتقامی کارروائی قرار دیا تھا اور حکومت سے سخت اور فوری اقدامات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ صرف ایک اخبار نے قادری ایڈووکیٹ کی کار کے چوری ہونے کی خبر کے ساتھ کار کا نمبر بھی چھاپ رکھا تھا اور قیاس آرائی کی بنیاد پر کار میں ملنے والے خون کے نشانات کو اس لاش سے منسوب کر دیا تھا جو اسی دن کو اسی سڑک پر دو میل دور ملی تھی۔ رپورٹر نے خیال ظاہر کیا تھا کہ حملہ آور بھاگتے وقت گاڑی بھی لے گئے اور کسی آپس کے اختلاف کے باعث انھوں نے اپنے ہی ایک ساتھی کو گولی مار کر کے پھینک دیا۔ صرف ایک اخبار نے اس بنگلے کی تصویر چھاپی تھی جس میں ایک چوری کی سفید ٹویوٹا میں آنے والے ایک قاتل کو دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچے تھے لیکن کار چھوڑ کر بھاگ نکلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

جب میں نے اخبار سمیٹے تو گیارہ بج کے دس منٹ ہو چکے تھے۔ "گارڈینیا" کے بند دروازوں پر جو تختی لٹک رہی تھی اس پر اب "اوپن" کے الفاظ خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ میں نے اخبار کو وہیں چھوڑا اور ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا جہاں اندھیرے اجالے کا نرم امتزاج بڑا سکون بخش تھا۔ ہر میز خالی تھی اور میں اندر قدم رکھنے والا پہلا شخص تھا۔ مجھے پہلا شاک ہوا کہ میرا خیال تھا غلام علی مجھے انتظار کرتا ملے گا مگر وقت کی پابندی نہ کرنا ہماری قومی عادت ہے۔ خود میں بھی دس منٹ دیر سے پہنچا تھا۔ غلام علی کو آدھے گھنٹے کی دیر ہو چکی تھی۔ میں نے چائے کا ایک کپ ختم کیا اور سگریٹ جلائی تو ساڑھے گیارہ میں پانچ منٹ کم تھے۔ میری نظر شیشوں سے گزر کے مال روڈ کی ٹریفک پر جمی تھی اور اچانک میں نے غلام علی کو دیکھا۔ وہ سڑک پار کرنے کے لیے ایک بس کے گزر جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی بغل میں نسواری رنگ کا ریگزین کا ایک بیگ تھا جسے اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے آدھی سڑک عبور کی اور ایک کار کو گزر جانے کا موقع دینے کے لیے رک گیا۔ پھر میری نظروں کے سامنے اس کار نے یکلخت رخ بدلا اور غلام علی کو خبر تک نہ ہوئی۔ کار نے اسے ٹھوکر مار کے اچھالا۔ وہ مضحکہ خیز طریقے سے اوپر گیا اور پھر سڑک پر گرا۔ کار ایک جھٹکے میں اس کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے جیب سے ایک نوٹ نکال کے رکھا اور باہر بھاگا۔ میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ دس کا نوٹ تھا یا سو کا۔ میرے پہنچنے سے پہلے غلام علی کے گرد مجمع اکٹھا ہو گیا تھا لیکن وہ کار غائب ہو چکی تھی۔

ادھر ادھر سے دوڑ کر آنے والے سب کے سب خاک و خون میں غلطاں اس ٹوٹے پھوٹے بدنما گوشت کے ڈھیر کو تکتے ہوئے ٹھہر اور رکے ہوئے تھے جو ابھی چند لمحے پہلے انہی کی طرح صحیح سلامت جیتا جاگتا آدمی تھا مگر اب سے قطعی مختلف تھا کہ ان کی موت کا خوف بھی ایک دم اور یہی کائنات میں سے ایک فرشتۂ اجل کا دھوکا دینے والا تماشہ ہے۔ موت آتی ہے کتنی مکروہ اور بدصورت ہوتی ہے۔ وہ مجبور کر دیتی ہے اور ان بہت سی کاروں کو دیکھ رہے تھے جو اب بھی بچ بچ کے گزر رہی تھیں۔ یہ کون سوچ سکتا ہے کہ آدمی کا قتل کار سے بھی ہو سکتا ہے۔ خنجر، سنان، چاقو، بلیڈ، بم، بندوق، زہر، پھندا یا خون آشام لفظوں سے تو موت کا تصور ہوتا ہے مگر کار جس میں خوش نصیب خوش پوش اور خوش باش لوگ، خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ بیٹھے ہیں اور جسے خریدنے کے لیے ہزاروں لاکھوں جمع کرنے پڑتے ہیں، جائز و ناجائز ذرائع کا خیال کیے بغیر اور جس سے آدمی کو عزت اور خود پر غرور کی مسرت ملتی ہے اس کار کا اور دل میں پیوست ہو جانے والے خنجر میں اور مرگ پاش نیزے والی گولیوں میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ اسے حادثہ کہہ کے جیسے ہر لحظہ ہر گاڑی سے منزل تک پہنچنے والے ہزاروں مسافروں کا حساب ان گاڑیوں کے پیچھے آ جانے یا کسی اسی طرح کچلے جانے سے ہلاک ہو جانے والے آپریشن تھیٹر میں جان نکلنے والوں کے تقریباً برابر ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے سڑک پار کرنے کی کوشش کرتے بھی دیکھا تھا اور ان کا خیال تھا کہ غلام علی نے بلاوجہ گھبرا کر مرنے کی غلطی کی۔ حالانکہ آدمی مرنے میں اتنا وقت کم ہی محسوس کرتا جب تک کہ اس کا خیال خودکشی کا نہ ہو۔ خیال کی تکمیل معلوم نہ ہو۔ باقی لوگ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ بلاشبہ پہلے سے طے شدہ وقت پر سب کو ایسے ہی اچانک ناگہانی حادثات کا نشانہ بننے والے مجھے کے سامنے زندگی کا سفر ختم کرنا ہے جو کہیں بھی آ سکتا ہے اور اس کا کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آدمی منتظر ہے یا نہیں اور بستر پر لیٹا مستقبل کے خواب دیکھ رہا ہے یا سڑک پر چل رہا ہے۔ بہت سے لوگ کار والوں کو گالیاں دے رہے تھے کہ اندھے ہو کے چلاتے ہیں اور آدمی کو زمین پر رینگنے والا کیڑا سمجھتے ہیں اور افسوس کر رہے تھے کہ کسی نے کار کا نمبر تک نہیں دیکھا تھا۔

اس مجمع میں شاید میرے سوا کوئی نہیں تھا جس کو یقین ہو کہ غلطی کسی کی نہیں تھی۔ غلام علی نے وہ کار دیکھ لی تھی اور رک گیا تھا۔ کار والے نے غلام علی کو دیکھ لیا تھا اور اس کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ دونوں نے وہی کیا جو ان کو کرنا تھا۔ میرے پہنچنے تک سڑک کے وسط میں بیس پچیس افراد جمع ہو چکے تھے۔ موٹر سائیکل پر گزرنے والے گردن بڑھا کے ذرا سی دیر کے لیے یا فون نکال کے سکتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ سڑک پر لوگوں کا مرنا معمول ہے۔ کسے فرصت ہے کہ غور کرے وہ ہو یا تنگ ساری اور تعزیت کرتا پھرے، مغفرت کی دعا مانگے یا لواحقین کے لیے صبر جمیل۔ آدمی کا آدمی سے رشتہ ایک لفظ واقعی بات ہے۔ آخری وقت پر پہنچ کر صرف ایک عملی حقیقت بنتی ہے۔ ایک سارجنٹ کو دیکھا جو ٹریفک میں پڑنے والے خلل سے پریشان تھا اور لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کے بھگا دینا چاہتا تھا: "چلو دفع ہو جاؤ، کوئی تماشا ہو رہا ہے یہاں؟" اس نے گرج کے کہا۔ تماشا تو تھا مگر خدا جانے ان پولیس والوں سے جو ذرا جینے دیتے ہیں نہ مرنے دیتے ہیں۔ مرنے کا تماشا تک مفت نہیں دیکھنے دیتے۔

لپٹا ہونے والوں میں ایک دبلا پتلا نوجوان بھی تھا جس کی ناک طوطے کی طرح تھی۔ اس کی بغل میں مجھے نسواری ریگزین کا لمبے والا بیگ نظر آیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور ایک لمحے کے لیے ہماری نگاہیں ملیں۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور وہ نامعلوم طریقے پر مجھ سے الگ ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا شک یقین میں بدل گیا۔ میں اس کی طرف بڑھا تو وہ بس اسٹاپ کی طرف چلنے لگا۔ میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ وہ تقریباً دوڑنے لگا۔ اس کی نگاہیں کسی رکشا یا ٹیکسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں اس کے پیچھے دوڑا تو وہ بے تحاشا بھاگا مگر مجھ سے بیس قدم آگے ہونے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ ایک بس میں چڑھ گیا جو روانہ ہونے کے بعد رفتار پکڑ چکی تھی۔ میں نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی مجھے لفٹ دینے کو بھی تیار نہ تھا۔ چوراہے پر موٹر سائیکل والے نے رفتار کم کی، پتہ کہاں تک جانا ہے تو اس نے کہا۔ اس کی موٹر سائیکل بہت پرانے ماڈل کی تھی۔

"بس نمبر... تک پہنچا دیں۔ میری بس نکل گئی ہے" میں نے

www.paksociety.com

جواب دینے سے پہلے پیچھے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ناشتن مارکیٹ کے اسٹاپ تک پہنچا سکتا ہوں۔" وہ بولا اور موٹر سائیکل نے دو افراد کا بوجھ اٹھا کے دوڑنا شروع کیا تو مجھے اس کی رفتار سے مایوسی ہوئی لیکن ناشتن مارکیٹ سے پہلے اس بس کو کم سے کم دو جگہ رکنا پڑتا جبکہ میری اطلاع کے مطابق تین جگہ وہ ایک اسٹاپ پر موٹر سائیکل اور بس ساتھ ساتھ پہنچے تھے۔ پھر بس پیچھے رہ گئی اور میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اترنے والوں میں وہ شخص نہیں تھا۔ یونیورسٹی کے سامنے ناشتن مارکیٹ کے بس اسٹاپ پر میں پہلے پہنچا اور جب ایک ہجوم بس پر حملہ آور ہوا تو میں نے ادب و آداب کو بالائے طاق رکھ کر بیرونی بازو پھیلا جانی اور دروازے کے قریب کھڑے رہنے کی جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ بس کو گن آباد تک جانا تھا چنانچہ میں نے آخری اسٹاپ کا انتظار کیے بغیر اس شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ پنجوں کے بل اونچا ہو کر دیکھنے سے بھی میرے لیے سب کے سروں پر سے آخری سیٹ تک ہر چہرہ دیکھنا مشکل ثابت ہوا۔ مزید یہ کہ لوگ مخالف سمت میں یعنی ادھر ہی منہ کیے کھڑے تھے جدھر بس جا رہی تھی۔ اسٹاپ گزرتے گئے۔ میں نے اوپر سے آنے والوں پر بھی نگاہ رکھی اور اس گول ہے کی طرح تاکتے ہوئے آئینے میں بھی جھانکا جس سے اوپر کی منزل کی ہر سیٹ دکھائی دیتی تھی۔ مجھے کچھ مایوسی ہونے لگا تھا کہ وہ اچانک اوپر سے نیچے آیا اور میں دبک کر پیچھے ہو گیا کہ اس کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ وہ اگلے اسٹاپ پر اترنے کی تیاری کر رہا تھا اور مطمئن تھا کہ مجھے پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ یہ خیال اسے مزید ہوگا کہ میں رکشا یا ٹیکسی سے کر تعاقب کر سکتا ہوں لیکن چنانچہ وہ مطمئن تھا۔

اس نے بس کے رکنے سے پہلے ہی چھلانگ لگا دی اور میں عین وقت پر دو پہلوان نما ٹپ افراد کے درمیان پھنس گیا۔ جو میری راہ میں چٹان کی طرح کھڑے تھے اور ہٹنے پر آمادہ نہ تھے۔ میں نے غیر ارادی طور پر ان کے درمیان کی دیوار کو شق کیا۔ دونوں نے گھنی مار کے مزید گنجائش پیدا کی۔ ایک پہلوان نے جھنکار کے کہا۔ "ابے کون ہے تو؟ اندھا ہے؟" اور دوسرے نے کہا۔ "خیر ہو چاچے پہلوان جی!" اور مجھے دبوچنے کی فضول سی کوشش کی۔ ایک منحنی نوجوان کو دھکیل کر میں نے دروازے میں سے چھلانگ لگائی تو بس کافی آگے جا چکی تھی۔ "سالا جیب کترا۔" منحنی نوجوان نے کہا۔ میرے اترنے کا انداز واقعی جیب کتروں جیسا تھا۔ میں سڑک پر گرا اور قلابازی کھا کے کھڑا ہو گیا۔ زرد بیگ والا پچاس قدم پیچھے مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ اچانک اس نے پلٹ کر دیکھا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی بھاگا۔ یہ سراسر حماقت تھی، جہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک گلی میں مڑ کر کئی موڑ مڑنے کے بعد درمیانی فاصلہ آدھا ہو گیا تھا کہ وہ گلیوں کا بیک اس موڑ تک پہنچا تو وہ یوں غائب ہو گیا تھا جیسے ہوا میں تحلیل ہو چکا ہو۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی گھر میں گھس گیا ہے۔ ایک منٹ کے فرق سے وہ زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا لیکن میرے لیے ہر گھر کے دروازے پر جا کر پوچھنا ناممکن تھا کہ یہاں کوئی زرد بیگ والا آیا ہے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں گلی کے جس موڑ پر ہوں اس مکان کے سامنے کا مکان متصل ہے اور غیر آباد لگتا ہے۔ گلی میں ایک طرف دروازے بنے تھے۔ دوسری طرف ایک سبزی والا اپنی ریڑھی پر اپنی آمد کا اعلان کرتا جا رہا تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ کسی بھی دروازے سے کوئی عورت سبزی خریدنے نکل سکتی تھی۔ میں نے خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اوپر سے نیچے آنے والے پائپ کو دیکھا اور دو منٹ بعد چھت پر تھا۔ نیچے گلی میں سبزی والے کو دو عورتوں نے گھیر لیا تھا جن کی توجہ آلو بینگن وغیرہ کی طرف تھی۔ ادھر گرد چھتوں پر کپڑے سوکھ رہے تھے۔ میں نے فوراً کوٹھے کی تین دیواروں کے حصار میں پناہ لی جو بیت الخلا تھا اور ہونے کے اکثر پرانے مکانوں کی طرح چھت پر اوپن ائیر بنایا گیا تھا۔ گلی کی طرف کی دیوار کے ایک سوراخ سے میں نے زرد بیگ والے کو سر نکال کر جھانکتے دیکھا اور گھروں کے درمیان واقع چھوٹی سی مسجد میں گھس گیا تھا۔ اس کے حیران ہونے کی باری تھی کہ تعاقب کرنے والا کہاں چھلاوہ بن کے کہاں غائب ہو گیا۔ میں دلچسپی سے اس کا مشاہدہ کرتا رہا۔ چند منٹ بعد جب اسے یقین آ گیا کہ میں جا چکا ہوں تو وہ مسجد کے عقبی دروازے کی پناہ سے نکلا۔ میں نے موقع کا خیال کیے بغیر پھر پائپ کی مدد سے نیچے اترنے کی کوشش کی۔ چڑھنے کی نسبت اترنے کا عمل بہت آسان تھا۔ کسی نے چلا کے مجھے کہا پھر زرد بیگ والے کے پیچھے دوڑا اور اس ریس میں دخل انداز ہونے کی کوشش سب سے پہلے سبزی والے نے کی لیکن آگے والا بلا کا پھرتیلا تھا۔ سبزی والا ایک دھکے میں نیچے گرا۔ زیادہ مشتعل ہو کے اس نے ریڑھی کی مدد سے راستہ بلاک کرنا چاہا۔ مجبوراً مجھے ریڑھی الٹ کے راستہ بنانا پڑا۔ وہ چیخ پکار کرتا ہوا ایک دو قدم دوڑا پھر رک گیا۔ دوڑ میں شریک ہو کے ناکام واپس لوٹتا تو تمام خواتین سیلف سروس کر کے ایک دن کی سبزی مفت لے جاتیں۔

وہ ایک بغلی سڑک پر طلوع ہوا اور میں نے ایک لانگ جمپ

تب اس کا پیچھا کیا۔ اس کا اسٹیمنا بھی کمال تھا کہ ایک میل سے زیادہ دوڑنے کے باوجود تھکن سے اس کی رفتار میں کمی نہیں آئی تھی، میرا سانس پھولنے لگا تھا۔ بغلی سڑک ایک اور سڑک سے جا ملی جو کچھ بڑی تھی اور پھر ایک دلچسپ اتفاق ہوا۔ وہ شخص ایک موٹر سائیکل سے بچنے کی کوشش میں مجھ سے ٹکرایا اور گر گیا۔ موٹر سائیکل دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی "ٹرائمف" ماڈل تھی اور اسے ایک پولیس والا چلا رہا تھا جس نے موٹر سائیکل روک کے مشتبہ طور پر فرار ہونے والے کو روک لیا۔ میں نے غور سے دیکھا تو پولیس مین حشمت خان تھا۔ حالانکہ غیر معمولی حالات میں میری اس سے یہ دوسری ملاقات تھی۔ وہ اب زرد بیگ والے نوجوان سے کچھ پوچھ رہا تھا اور اس کا زرد بیگ ہاتھ میں لے چکا تھا۔ زرد بیگ والے نے میری طرف دیکھا تو میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ سخت تذبذب میں پڑ گیا۔ اس کے لیے آگے کھائی پیچھے خندق والا مسئلہ تھا۔ پھر شاید اس کو بڑی مصیبت سمجھتے ہوئے اس نے مجھ سے چھوٹنے کو ترجیح دی۔ میرے اشارے کا مطلب کچھ یہی نکلتا تھا کہ اگر مجھ پر معلوم نہ ہونے پائے اور اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا تھا کہ میں اسے پولیس سے نجات دلانے کے موڈ میں ہوں۔ ہم دونوں کا مشترکہ دشمن تھا اور ہمارا وقتی اتحاد اس کا تقاضا کرنے کے لیے ضروری تھا۔ زرد بیگ والے نے یہ بات سمجھ لی اگر وہ الٹا مطلب نکالتا اور تعاون نہ کرتا تو مجھے کوئی نقصان نہ ہوتا۔ میں نے پاس جا کے کہا۔ "ہیلو حشمت خان! بھئی خوب ملے۔ کیا حال ہے؟" حشمت خان سودا کرنے والا آدمی تھا۔ اس سے بیگ کا سودا کیا جا سکتا تھا اور اس چور کو چھڑا لے جانے کا بھی۔

جب میں نے حشمت خان کو پیچھے سے دبوچا اور اس کی آنکھوں پر ہاتھ مار کے بے بس کر دیا تو اسے بالکل خبر نہ ہوئی کہ اس کا مددگار کون تھا۔ بیگ قابو میں کر کے میں نے اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ "بیٹھو میرے ساتھ ورنہ دونوں پکڑے جائیں گے۔" میں نے چلا کر کہا اور حشمت خان کی موٹر سائیکل پر جا بیٹھا جس کا انجن چل رہا تھا۔ نوجوان خوفزدہ اور بھونچکا تھا اور لنگڑاتے ہوئے حشمت خان کے ڈھیر کو گھور رہا تھا۔ دوسری طرف سے دو آدمی ادھر چلے آ رہے تھے۔ "پاگل کے بچے تم بھی مارے جاؤ گے۔" میں نے موٹر سائیکل کو گیئر میں ڈالا اور وہ اچھل کر پیچھے بیٹھ گیا۔ اس عجیب الخلقت موٹر سائیکل کو سنبھالنا اور چلانا آسان نہیں تھا مگر میں نے اسے جان ہتھیلی پر رکھ کے یوں چلایا جیسے بازیگر موت کے کنویں میں چلاتے ہیں۔ سمت کا خیال کیے بغیر میں تین میل دور نکل گیا۔ اتنی دیر میں مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ میرے ساتھ بیٹھا ہوا نوجوان نوآموز ہے، پیشہ ور نہیں ورنہ اب تک وہ خنجر یا پستول نکال چکا ہوتا۔ ایک سنسان جگہ موٹر سائیکل روک کے میں نے اس نوجوان کو دیکھا۔

"تم نے اس پولیس والے کو کچھ بتایا تھا اپنے بارے میں؟" میں نے پوچھا۔

"صرف نام، مگر وہ بھی غلط تھا۔" وہ بولا۔ "خدا کے لیے یہ بیگ مجھے دے دو۔"

"خدا کے لیے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "خدا کو اس بیگ کی کیا ضرورت ہے۔ جن کو ضرورت ہے ان کو خدا کا خوف ہے۔ تمہیں کچھ معلوم ہے کہ وہ کون لوگ ہیں اور اس بیگ میں کیا ہے؟"

"مجھے... مجھے کچھ نہیں معلوم۔" وہ بولا۔

"جھوٹ بولو گے تو اس سے زیادہ برا حشر کروں گا۔" میں نے حشمت خان کے حوالے سے کہا۔ "ایک وار میں گردن بھی توڑ سکتا ہوں۔ میں ... تو اتنا کچھ ہوگا تھوڑی دیر میں۔ تم بیہوش پڑے رہ جاؤ گے۔" میں نے ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخ کو جھکایا اور اس پر ہاتھ مارا۔ شاخ درمیان سے ٹوٹ گئی۔

وہ خوف سے کانپنے لگا۔ "قسم خدا کی، میں کسی کو نہیں جانتا، کچھ نہیں جانتا۔ مجھ سے تو ایک آدمی نے کہا تھا کہ ... کے بس اسٹاپ پر کھڑے رہنا ساڑھے دس بجے۔ وہاں ایک حادثہ ہوگا۔ جو شخص حادثے کا شکار ہوگا اس کے پاس ایک فائل ہوگی۔ فائل کسی بیگ یا بریف کیس میں بھی ہو سکتی ہے۔ تم کو وہ فائل لے کر بھاگنا ہے۔ کامیاب ہوئے تو دس ہزار روپے ملیں گے۔"

"کہاں ملیں گے، کون دے گا؟" میں نے کہا۔ "کیا تم اسی کے پاس جا رہے تھے؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ ہم خود تمہارے گھر آ کے فائل لے لیں گے مگر میں نے کہا میں گھر کا پتہ نہیں بتا سکتا۔ وہاں ایک تو میرا چھوٹا بھائی ہے جس کی ٹانگیں... اسے پولیو ہو گیا تھا اور ٹانگیں بیکار ہو گئیں۔ ڈاکٹروں نے کہا علاج سے کوئی فائدہ نہیں بیساکھیاں ہی لینی ہیں۔ ایک ماں ہے۔ میری آمدنی سے گزارا نہیں ہوتا..." وہ رونے کے قریب ہو گیا تھا۔

"تم خود کچھ نہیں کرتے؟" میں نے کہا۔

"صبح اخبار تقسیم کرتا ہوں جی، اس کے بعد کالج جاتا ہوں، شام کو ٹیوشن بھی پڑھاتا ہوں۔" وہ بولا۔

www.paksociety.com

"اور یہ دس ہزار لے کر تم کیا کرتے؟" میں نے کہا۔

"بھائی نے کہا تھا کہ کان لے دو۔ کام زیادہ ملے گا تو زیادہ آمدنی ہوگی، تم پڑھتے رہنا۔" وہ رونے لگا۔ "اب وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ یہ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

میں نے بیگ کی زپ کھولی۔ اس میں کوئی فائل نہیں تھی۔ صرف مختلف فل اسکیپ سائز کے صفحات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں تھیں۔ فوراً مجھے وہ ترکیب سوجھ گئی جس سے کالج میں پڑھنے والے اس ناتجربہ کار اور کم عقل لڑکے کا مستقبل اور اس کی زندگی سب محفوظ رہتے تھے اور ہم دونوں کے مقاصد بھی پورے ہو جاتے تھے۔ میں نے اسے پھر موٹر سائیکل پر بٹھایا اور دس منٹ بعد ہم ایک فوٹو اسٹیٹ مشین شاپ کے سامنے جا رکے۔ میں نے تمام صفحات کی دو دو نقلیں بنوائیں۔ ایک نقل اسی نیلے بیگ میں رکھی جس کے بدلے نوجوان کو دس ہزار مل سکتے تھے۔ "اب تم اطمینان سے گھر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "وہ خود تمہارے گھر آئیں گے اور یہ کاغذات لے جائیں گے۔ تمہارے نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہیں تمہارے گھر کا پتہ معلوم ہے۔ ان کو ہر سوال کا جواب پورے اعتماد کے ساتھ دینا کہ بیگ کسی نے بیگ اٹھاتے دیکھا تھا؟ نہیں۔ غائب ہوتے دیکھا تھا؟ نہیں۔ کوئی تعاقب میں آیا تھا؟ نہیں۔ تمہیں کوئی پولیس سارجنٹ نہیں ملا؟ نہیں نہیں ملا۔ میرے اور تمہارے درمیان کوئی لین دین نہیں ہوئی۔ سب گول۔ بس تم ٹریفک سے بس پر سوار ہوئے اور گھوم پھر کے گھر آ گئے اور تم کر بھی کیا سکتے تھے۔ تم نے اپنے طور پر تسلی کر لی تھی کہ کوئی بھی پیچھے نہیں آیا ہے۔ اس امتحان میں پورے اترے تو دس ہزار مل جائیں گے کسی پریشانی کے بغیر لیکن ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ خوش نصیبی بار بار ساتھ نہیں دیتی اور خدا ایک غلطی کو تو معاف کر دیتا ہے بشرطیکہ بندہ صدق دل سے اس کا اعادہ نہ کرنے کا عہد کرے۔ پھر ایسے کسی معاملے میں پڑ گئے تو بوڑھی ماں اور معذور بھائی کو اپنے سہارے سے محروم کر دو گے۔ تم مارے نہ گئے تو جیل جاؤ گے اور یہ مارے جائیں گے۔ محنت کرتے رہو گے تو کامیابی دیر سے ہوگی مگر باعزت ہوگی اور بے خطر ہوگی۔ اب جاؤ، بھاگ جاؤ۔"

"یس... یس سر!" اس نے بیگ لیا اور ایک قدم چل کے رکا۔ "مگر وہ حقانی صاحب... وہ مجھے دیکھ چکا ہے۔"

"اس کا باپ بھی صرف ایک بار کسی کی صورت دیکھ کر اس شہر میں تلاش نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن خدانخواستہ ایسی ویسی کوئی بات ہو تو میں ایک فون نمبر بتا رہا ہوں [illegible] صرف یاد رکھو، لکھنا نہیں۔ کہنا..." میں سوچ میں پڑ گیا [illegible] "کیپٹن سے بات کرنی ہے۔ میں نہ ملوں تو پیغام چھوڑ دینا کہ نیلے بیگ کی بات کرنی تھی۔ میں سمجھ جاؤں گا اور پھر سے [illegible] کروں گا۔ گڈ لک۔"

میں اسے ڈگمگاتے قدموں سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے کئی بار مجھے پلٹ کر دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ حقانی [illegible] کا علاوہ محسن کے کسی ایجنٹ کو نہیں۔ اگر وہ [illegible] اسٹاپ پر [illegible] تھا تو وہ مجھ سے مطمئن ہو کے چلا گیا تھا کہ لڑکا [illegible] الٹی راہ لگ گیا۔ اس کے گھر کا پتہ میں نے اس لیے نہیں پوچھا تھا کہ بعد میں میرا اور اس کا تعلق اس خاندان کے لیے مصیبت کا باعث نہ بنے جو بڑی ہمت کے ساتھ سخت حالات کا مقابلہ کر رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس سبق کے بعد یہ محنت کرنے والا لڑکا کبھی [illegible] آ کے راہ مستقیم کو نہیں چھوڑے گا۔ [illegible] ہزار تو اسے مل ہی جائیں گے۔ اس نے حماقت ضرور کی تھی مگر خطرہ بھی مول لیا تھا اور محنت بھی کی تھی۔ واپس آتے ہوئے مجھے حشمت خان کا خیال کر کے بے اختیار ہنسی آئی۔ میں اس پر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا تھا۔ وہ ہوش میں آئے گا تو اسے اپنے گرد مسخرے اڑانے والے چہرے نظر آئیں گے جو ہمدردی بھی کریں گے تو یوں کہ بے عزتی محسوس ہو۔ وہ چیخے گا، چلائے گا اور گالیاں دے گا۔ میں جانتا ہوں اس علاقے کے ایک ایک بدمعاش کو۔ مجھے معلوم ہو جائے گا یہ کون حرام زادہ تھا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

حشمت خان سے ہٹ کے میرا دھیان غلام علی کی طرف چلا گیا۔ ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ ہم جو خلوص اور جذبۂ احسان مندی کے اظہار کے مجرم تھے۔ [illegible] وفادار سمجھے جاتے تھے اور دشمن کسی کے نہ تھے۔ حق نمک کا قرض تھا جو ہم نے اپنے خون سے ادا کر دیا جس میں وہ نمک شامل تھا۔ غلام علی کے انجام نے مجھے اداس کر دیا تھا اور یہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیا تھا کہ دشمن کو اس کی اور میری ملاقات کا اور مقصد ملاقات کا علم کیسے ہوا؟ کیا وہ غلام علی پر نظر رکھے ہوئے تھے؟ ڈی سلوا کو شک ہو گیا تھا کہ یہ [illegible] سے باہر لے جائی گئی ہیں جیسے غلام علی نے جذباتی [illegible] احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ کسی نے [illegible] واپس لاتے ہوئے اور اپنی اپنی جگہ رکھتے دیکھ لیا ہو [illegible] اسے خبر ہوئی ہو۔ یہ سب قیاس آرائی تھی۔ [illegible] پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا یہ تھی کہ [illegible] رضوی صاحب

[illegible] کیا گیا ہے۔ ورنہ کسی کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ آج صبح گیارہ بجے میں نے کسی کو گارڈن [illegible] میں ملنے کا وقت دیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ فکر کی بات یہ تھی کہ میرے لیے گواہوں کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ غلام علی وہ گواہ تھا جس نے مزید گواہ دینے کا وعدہ کیا تھا جو مجھے اگلے ہی روز پیش کرنے تھے۔ یہ شاید خود غرضانہ سوچ تھی اور مجھے اپنی کمینگی پر شرم بھی آئی۔ غلام علی اپنی جان سے گیا اور وہ بھی میری خاطر۔ وزیر خان مرحوم کی خاطر جن کا وہ احسان مند تھا اور مرتے مرتے اپنا فرض ادا کر گیا۔ لیکن مجھے خیال تھا تو ایک گواہ کے نہ رہنے کا۔ حقیقت بہرحال ناقابل تردید تھی۔ غلام علی کے مرنے کا دکھ اپنی جگہ کم نہ تھا مگر مجھے آنے والے دن کی فکر بھی کرنی تھی۔ اب خان چوکیدار کے علاوہ بھی مجھے دو گواہ مطلوب تھے۔ میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں "ایم ڈی جیولرز" کے [illegible] اور [illegible] معلوم کروں کہ وزیر خان مرحوم کے جنازے میں [illegible] کون کون نمک حلال شریک ہوا تھا۔ جو اب سامنے آنے کی ہمت رکھتا ہو۔

لیکن ڈی سلوا مجھے دھمکی دے چکا تھا کہ قانونی حق [illegible] کے بغیر میں نے دفتر میں قدم رکھا تو وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دے گا۔ اس جیسا شخص مجھے واقعی دفعہ [illegible] ضابطہ فوجداری کے تحت بند کرا سکتا تھا [illegible] میرے دل کی آواز نے کہا جائز ذرائع سے [illegible] کا حق بھی نہ ملتا ہو تو ناجائز ذرائع بھی جائز ہیں۔

میں گھر پہنچا تو محسن رات بھر جاگنے کے بعد اب سو رہا تھا۔ بستر کو دیکھ کر خود میرا دل بھی چاہتا تھا کہ آنکھیں موند کر لیٹ جاؤں مگر میں جانتا تھا کہ آنکھ لگ گئی تو وہ وقت [illegible] جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ [illegible] میں نے محسن کو جگایا اور اسے غلام علی کی [illegible] موت کی خبر دینے کے بعد اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ [illegible] اندر جا کے کھانا کھانے سے پہلے میں نے باہر کا ایک [illegible] اور ٹیلیفون لائن کا معائنہ کیا۔ ٹیلیفون لائن سے ایک [illegible] سے بچایا گیا تھا۔ تار ایک درخت کی [illegible] سے چپکا ہوا تھا اور پتوں میں گم ہو گیا تھا۔ [illegible] کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ ضروری تھا کہ [illegible] آنکھوں سے یہ حسن انتظام دیکھ لیں۔

ساڑھے دو بجے ہم ایک ساتھ باہر نکلے۔ غلام علی کے فراہم کردہ کاغذات کی ایک نقل ہمارے پاس تھی، دوسری کو میں نے [illegible] صاحب کی [illegible] کی سب سے نیچے والی دراز میں ڈال دیا تھا۔ محسن نے اخبارات دیکھ لیے تھے اور گھر سے [illegible] کے قریب واقع کمپنی کے [illegible] سے ملنے والی [illegible] کی لاش کا احوال بھی پڑھ لیا تھا۔ اس نے دس ہزار روپے ایک لفافے میں ڈال لیے تھے۔

"بیڈن روڈ پر تمہارا کام بہت مختصر ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اوپر جا کے یہ فوٹو اسٹیٹ کاغذات ڈی سلوا کی سیکرٹری کو دے دینا کہ صاحب کو پہنچا دے۔ جتنی دیر میں وہ اندر جا کے آئے تم غائب ہو جانا۔ وہ تمہیں نہیں پہچانتی۔ اس کے بعد تم یہ دس ہزار اس چوکیدار کے گھر دیتے چلے جانا۔ وہاں کے معاملات میں طے کر لوں گا۔"

"میں کچھ دیر نیچے انتظار کروں گا۔" جب کر کے محسن بولا۔ "خطرے کی کوئی بات تو نہیں...؟"

"خطرے کی کوئی بات نہیں ہوگی۔" میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "مجھے اپنے والد کے پرانے وفاداروں سے ہی تو ملنا ہے۔"

ساڑھے تین بجے محسن نیچے اترا تو میں نے بیڈن روڈ کے ایک پبلک ٹیلیفون بوتھ سے ڈی سلوا کا نمبر ملایا۔

"ڈی سلوا صاحب؟" میں نے اس کی آواز پہچان کے کہا۔ "کیا حال ہے۔ میں نے ایک تحفہ ارسال کیا تھا، مل گیا؟"

"کیا مقصد ہے اس کا؟" ڈی سلوا نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔ "بلیک میلنگ؟"

"وہ بعد میں دیکھی جائے گی۔" میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "ابھی تو یہ تمہارے رویے پر منحصر ہے۔ اس مرتبہ میں نے احتیاطاً آٹھ کاپیاں بنوائی ہیں اور ایسی ایسی جگہ رکھوا دی ہیں جہاں تمہارے خیال کی بھی رسائی نہیں۔"

"فضول بکواس کے بجائے یہ بتاؤ کہ چاہتے کیا ہو؟"

"کچھ نہیں۔ ابھی میں آفس میں قدم رنجہ فرماؤں گا۔" میں نے کہا۔ "وزیر خان مرحوم کے پرانے ملازموں سے ملاقات کے سوا کوئی مقصد نہیں۔ تم خوش آمدید کہو۔ اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔"

"تم کیوں ملنا چاہتے ہو ان سے؟" وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "کیا بات کرنی ہے؟"

"بات میں تمہاری موجودگی میں بھی کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے معلوم کرنا ہے کہ میرے والد کے جنازے میں کون کون شریک ہوا تھا اور کون نہیں۔"

"یہ معلوم کر کے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟" وہ مشتبہ لہجے میں بولا۔ "تمہارے ارادے کچھ اور معلوم ہوتے ہیں۔"

www.paksociety.com

"میں نے شرافت سے تمہیں بتا دیا ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں تو تم مجھے زبردستی غلط سمجھنے پر تلے ہوئے ہو۔" میں ایک بار پھر جھک کر کہا۔ "میں آ رہا ہوں اور دیکھتا ہوں تم مجھے کیسے روکتے ہو۔"
میں نے ریسیور رکھ دیا۔ ایک روپیہ اس باکس میں ڈال چکا جو کارلو نے اسی مقصد کے لیے رکھا تھا۔ اس طرح یہ وہ یقیناً فائدے میں رہتا ہوگا خواہ ٹیلیفون والے بھی بل بناتے ہوئے اپنے حق خود ادیت کا بھرپور مظاہرہ کریں۔ پانچ منٹ بعد میں نے نیچے پر قدم رکھا اور میں ولیانی کمپنی کے آفس میں دائیں طرف مڑنے کے بجائے بائیں دروازے سے داخل ہو گیا۔ یہ کمرہ ہیں ہال تھا جس میں میزوں کی دو قطاریں تھیں۔ بالکل اسکول میں لگی ہوئی ڈیسکوں کی طرح۔ ان سب کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ آخری ایک میز تھا یا انچارج کے لیے تھی کہ اس کا رخ مخالف سمت میں تھا تاکہ وہ اپنی قطار کے سربراہ کی حیثیت سے نظر رکھ سکے۔ میزوں پر دس کلرک مصروف کار تھے مگر انچارج نائب شخص ایک ہی تھا۔ اس کے ساتھ والا دوسرا انچارج موجود نہیں تھا اور اس کی عدم موجودگی کے اسباب ابھی صرف میں جانتا تھا۔ دوسرے انچارج کی مسخ شدہ لاش میو ہسپتال کے مردہ خانے میں پڑی تھی اور چند قدم دور ریگل بس اسٹاپ پر اس کے لہو کا سرخ داغ تارکول کی سیاہ سڑک پر گزرنے والی گاڑیوں کی گرد سے مٹتا جا رہا تھا۔

بیک وقت کئی نظریں سوالیہ انداز میں میری طرف اٹھیں۔ ان میں انچارج کی نظر بھی شامل تھی۔ میں کچھ دیر تذبذب اور الجھن کی کیفیت کا اظہار کرتا رہا اور ہاتھ باندھے بہ طرف اس دیہاتی کی طرح دیکھتا رہا جو بیل گاڑی سے اتر کے کاروں کے شوروم میں آ گھسا ہو یہ دیکھنے کو کہ وہاں کوئی چیز نہ تھی۔ ماحول کسی بھی آفس سے مختلف نہ تھا۔ فائلیں، فائل کیبنٹ اور الماریاں۔

"جی؟" انچارج سے بالآخر صبر نہ ہو سکا۔ "کیسے تشریف لانا ہوا؟" اس کے طنزیہ مسخرہ آمیز انداز پر اس کے ماتحت مسکرا دیے۔

"یہاں ایک غلام علی صاحب ہیں؟" میں نے خالی کرسی کی طرف دیکھا۔ "آج ان کا انتقال ہو گیا۔"

کاروں کے شوروم میں داخل ہونے والے دیہاتی نے یکلخت فائر کر کے سب کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور کرسی پر بیٹھنے کے بجائے واحد انچارج کے سامنے اس کی میز پر ٹک گیا۔

"لیں جنٹلمین!" میں نے ان سب کو مخاطب کیا جو میری طرف منہ اٹھائے بیٹھے تھے۔ "وہ ایک حادثے میں مارا گیا۔ [illegible] ریگل پر ایک کار کے نیچے آ گیا۔ یہ آدمی عموماً ایسے ہی مارے جاتے ہیں۔"

پیچھے کا دروازہ کھلا اور پلٹ کر دیکھنے پر مجھے [illegible] کا چہرہ نظر آیا۔ اس کی خون آشام نظریں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے اسے قطعی نظرانداز کر دیا اور اپنی بات جاری رکھی۔ "یہ بات تو آپ کو آج نہیں تو کل معلوم ہو جاتی۔" [illegible]

"یہ اتفاق ہے کہ جس وقت غلام علی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا تو میں وہاں موجود تھا۔ وہ میرا رشتے دار یا دوست کچھ نہیں تھا۔" میں فوراً مالی طور پر گھوم کر ڈی سلوا سے مخاطب ہوا۔ "مسٹر ڈی سلوا! آپ کو نہ حیرانی ہوئی ہے نہ صدمہ ہوا۔ کیا آپ غلام علی کو نہیں جانتے ہیں یا اس ہولناک حادثے کا مطلب نہیں سمجھے؟ آپ نے حادثے کی نوعیت بھی نہیں پوچھی۔"

ڈی سلوا کا رنگ لمحہ بھر کے لیے اڑا اور بحال ہو گیا۔ "پولیس نے فون کر کے بتا دیا تھا۔"

"اچھا تو" میں نے حیرانی سے کہا۔ "اور یہ اتنی اہم اطلاع تھی کہ آپ نے اپنی ذات تک محدود رکھی۔ اس کے ساتھیوں کو نہیں پہنچائی؟"

دفتر والوں کے لیے ڈی سلوا کے ساتھ میرا رویہ ناقابلِ فہم تھا۔ ڈی سلوا نے محسوس کیا کہ ہچکچانے سے سب کے سامنے اس کی اہمیت کم ہو گی۔ اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے انتہائی پرسکون رکھا۔ "میں بتانے ہی والا تھا۔ مجھے بھی ابھی معلوم ہوا ہے۔"

"خیر!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میرے آنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ میں سے کسی نے مجھے نہیں پہچانا۔ اس لیے میں خود بتا دیتا ہوں۔ میں اس فرم کے مالک وزیر خان کا واحد وارث ہوں۔ میرا نام سکندر بخت ہے۔"

صورتوں کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ یہ دوسرا دھماکا پہلے انکشاف سے زیادہ سنسنی خیز رہا۔ "اپنی قانونی حیثیت کی اب میں بھی ایک مالک ہوں۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اور حق وراثت کے لیے۔۔۔"

"کیا تم یہی اعلان کرنے آئے تھے؟" ڈی سلوا نے میری بات کاٹ دی۔

"مسٹر ڈی سلوا!" میں نے پرسکون رہتے ہوئے بھی نگاہوں سے کہا۔ "میں مداخلت پسند نہیں کرتا۔ اگر آپ خاموش نہیں رہ سکتے تو اپنے کمرے میں جا کر بیٹھیے۔" میں مجبور ہو کر مخاطب ہو گیا جو میرے "انکشاف" رویے سے پوری طرح مرعوب ہو چکا تھا۔ "تو میں کہہ رہا تھا کہ میں نے حق وراثت کے لیے قانونی کارروائی کر دی ہے اور میرے مشیران قانونی اس مد میں کی کارروائی بہت جلد مکمل کر لیں گے تاہم اس وقت آنے کا مقصد یہ اعلان کرنا بھی نہیں تھا۔" اعلان کے لفظ پر میں نے ذرا سی دیر کے لیے ڈی سلوا کو دیکھا۔ "وزیر خان کے انتقال کے وقت میں لندن میں زیر تعلیم تھا اس لیے جنازے میں شرکت نہ کر سکا۔ آپ سب انہیں یقیناً جانتے ہوں گے؟"

"بالکل سر!" میرے پیچھے سے انچارج نے کہا۔ "اس کا رشتہ [illegible] ابن الوقت کا انداز قطعی مختلف تھا ہم سب جانتے تھے۔"

"اچھا۔ جانا بھی چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔ "[illegible] کا بھی تو اب ہے کیا نام ہے آپ کا؟" میں نے نوٹ بک نکالی۔ "ذرا یہ بھی لکھوا دیجیے۔"

اس وقت کسی کو اندازہ نہ تھا کہ نام پتے لکھ لینے میں کیا کمال تھا۔ ان کا خیال یہی تھا کہ میں سب سے واقفیت حاصل کرنے یا ان کے بارے میں مفصل معلومات رکھنے کے شوق میں تھا۔ صرف ڈی سلوا جانتا تھا کہ اس کارروائی کا مقصد کیا ہے لیکن وہ مجھے روک نہیں سکتا تھا۔ مقصد کا اعلان میں نے نوٹ بک جیب میں رکھنے کے بعد کیا۔

"اب میں آپ میں سے صرف تین حضرات کو زحمت دوں گا۔" میں نے کہا۔ "کل مجھے ڈی ایم کے سامنے تین گواہیاں کرنے ہیں جو کہہ سکیں کہ وہ آخری رسوم میں شریک تھے اور قبر کی نشاندہی کر سکیں۔ دراصل میں نے عدالت سے لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم کروانے کی درخواست کی تھی کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ان کی موت کے اسباب طبعی نہیں تھے بلکہ ان کو قتل کیا گیا تھا۔"

یہ دھماکا سب سے بڑا تھا۔ میرے سامنے [illegible] افراد بیٹھے تھے ان سب کا رنگ اڑ چکا تھا اور آنکھوں سے زیادہ ان کے لیے اپنے کانوں پر اعتبار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ غلام علی کی ہلاکت، وزیر خان کا قتل، قبر سے لاش نکالنا، یہ سب بہت ہولناک باتیں تھیں۔۔۔ ابھی میرے اس کمرے میں قدم رکھنے سے پہلے وہ کتنے انہماک اور اطمینان سے اپنی مقررہ کارکردگی میں مصروف تھے۔

"آپ لوگوں کے لیے یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس گواہی کے بعد آپ میں سے کسی کو کہیں بیان نہیں دینا ہوگا اور کسی عدالت میں نہیں جانا پڑے گا۔ اخلاقاً بھی [illegible] کی تفتیش میں مدد کرنا آپ کا فرض ہے اور قانوناً بھی آپ سب [illegible] طلب کرائے جا سکتے ہیں۔ اس سے تاخیر تو ہو سکتی ہے [illegible] تعاون نہ کرنے والے کے بارے میں میری رائے اچھی نہیں رہے گی۔"

"کسی کو دھمکی دینے کی ضرورت نہیں۔" ڈی سلوا کے لیے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔

"تم عادی معلوم ہوتے ہو مالکوں کی بات کاٹنے کے اور غالباً وزیر خان کے شریفانہ رویے نے تمہیں بدتمیز بنا دیا ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں تو سبیلن مانگتا ہوں مسٹر ڈی سلوا۔"

"آج تمہیں یہاں حکم چلانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔" وہ انگریزی میں بولا۔

"یہ حق مجھے بہت جلد حاصل ہو جائے گا اور اس وقت تم فائدے میں نہیں رہو گے مسٹر ڈی سلوا۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "میں چار سال لندن میں رہ کے آیا ہوں۔ دو باتوں کی کوشش کبھی مت کرنا۔ ایک مجھ سے بہتر انگریزی بولنے کی اور دوسری مجھے بے عزت کرنے کی۔ میں ہتک عزت کا مقدمہ دائر نہیں کرتا، موقع پر فیصلہ کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے تم اس کا عملی ثبوت مانگنے کی حماقت نہیں کرو گے۔"

ڈی سلوا کا رنگ غصے اور ذلت کے احساس سے زرد پڑ گیا۔ وہ پلٹا اور دروازہ دھڑام سے مار کے چلا گیا۔ کمرے میں مکمل سکوت غالب رہا۔ میں پھر ان سب سے مخاطب ہوا۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ "ایک تو آپ تشریف لے آئیے۔" میں نے انچارج سے کہا۔ "اور آپ۔۔۔ آپ اور آپ۔۔۔" میں نے جیسے چن کے تین افراد کو کھڑا کر لیا۔ "ایک کا زیادہ ہونا بہتر ہے۔ میں صبح گاڑی بھیجوا دوں گا اور [illegible] آفس کی فکر مت کریں۔ عدالت میں حاضری ڈیوٹی شمار کی جائے گی۔"

ڈی سلوا کی غیر موجودگی نے ماحول کی کشیدگی کو کم کر دیا تھا۔ پہلے انچارج نے اور پھر دوسرے لوگوں نے باری باری اٹھ کے مجھ سے مصافحہ کیا۔ وہ سب بہت سے سوالات کرنے کے لیے بے تاب تھے مثلاً یہ کہ مجھے اپنے والد کی موت پر قتل کا شبہ کیوں ہے اور کس پر ہے۔ میرے بارے میں جو کچھ اخبارات میں آ چکا ہے کس حد تک درست ہے کہ میں نے میر شرافت علی کو قتل کیا۔ کیا مجھے میر صاحب پر بھی شک ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اور بہت کچھ بتانا بھی چاہتے تھے مثلاً یہ کہ مرحوم وزیر خان بہت سے بیمار تھے اور بزنس کے معاملات سے بے تعلق ہو چکے تھے اور سنا ہے وہ کوٹھی ایک نمک حرام چراغ دین کی تھی جہاں ان کا انتقال ہوا، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میں نے ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا اور کہا کہ وقت آنے پر حقائق سب کے سامنے آ جائیں گے کیونکہ معاملات عدالت میں زیر سماعت ہیں۔

www.paksociety.com

اس لیے ان پر اظہار رائے بھی توہین عدالت کے زمرے میں آتا ہے۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد حالات درست ہو جائیں گے اور میں کمپنی کو بہتر خطوط پر منظم کروں گا۔ مالی حالات کا جائزہ لوں گا اور انشاء اللہ منافع کمانے دینے والوں کو اس میں سے زیادہ حصہ ملے گا۔ بونس کے علاوہ میں گرانی کو مدنظر رکھتے ہوئے تنخواہوں میں بھی کمپنی کی مالی استطاعت کے مطابق معقول اضافہ کروں گا۔ ان سب باتوں کا مجموعی تاثر خوشگوار ہوا اور جب میں ان سے رخصت ہوا تو وہ ذہنی طور پر مجھے ایک اچھا مالک تسلیم کر چکے تھے۔

میں باہر نکلا ہی تھا کہ ڈی سلوا کی خوش شکل، خوش لباس اور خوش اطوار سیکرٹری نے ریشم جیسے ملائم لہجے میں مجھ پر برق تبسم گراتے ہوئے درخواست کی کہ میں مسٹر ڈی سلوا سے ملاقات کرتا جاؤں۔ ڈی سلوا نے اسے دروازے پر اسی کام کے لیے مامور کر رکھا تھا کہ میں نکلنے نہ پاؤں۔ میں نے اس کو بے رخی کے انداز میں یکسر نظر انداز کرتے ہوئے متانت سے سر ہلایا اور دوسرے کمرے سے گزر کے ڈی سلوا کے پاس جا پہنچا۔ اس کا رویہ سابقہ ملاقات کے رویے سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے مہذب بلکہ مؤدب طریقے پر مجھے ریسیو کیا اور تشریف رکھنے کو کہا۔ پھر انٹرکام پر بولنے کے لیے کہا اور اس وقت غیر ارادی طور پر وہ ایک غلطی کر بیٹھا جس نے مجھے ہوشیار کر دیا کہ یہ تبسم، تکلف، عادت کی بات نہیں بلکہ شکاری نے میرے لیے جال پھیلایا ہے۔ انٹرکام پر بات کرنے کے لیے سیٹ کا ایک بٹن دبانا پڑتا ہے اور جب اسے چھوڑا جاتا ہے تو ہلکی سی آواز آتی ہے۔ ایک شبہ تو مجھے یہ ہوا کہ ڈی سلوا نے بٹن دبایا ہی نہیں۔ پھر مجھے آواز سنائی نہیں دی اور میں نے ڈی سلوا کی نظر بچا کے دیکھا تو مجھے انٹرکام کا وہ بٹن ایک پیپر ویٹ سے دبا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے میرے سامنے فائلوں کا انبار رکھ دیا تھا کہ مجھے یہ انتظام نظر نہ آئے اور میں بے خوف ہو کے جو کچھ کہوں اس کی دلربا سیکرٹری اپنے کمرے میں سنے اور ریکارڈ کرے۔ مجھے سیکرٹری کی "یس سر" کے بعد کوئی آواز سنائی نہ دی۔ کوئی آہٹ بھی نہیں تھی۔ وہ دم سادھے خاموش بیٹھی تھی۔

"مسٹر سکندر بخت!" ڈی سلوا نے بڑی نرمی سے کہا۔ "آخر ان کاغذات کو بھجوانے کا مقصد کیا تھا؟"

"کاغذات؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "کون سے کاغذات؟"

"وہ فوٹو اسٹیٹ کاغذات جو ابھی کچھ دیر پہلے مجھے ملے ہیں جن کے بارے میں آپ نے فون بھی کیا تھا؟" وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہیں کوئی غلط فہمی ہے۔"

"غلط فہمی کیسی مسٹر سکندر؟" وہ بولا۔ "آپ میری سیکرٹری کو وہ کاغذات دے کر غائب ہو گئے تھے۔ اس کے بعد آپ نے فون پر پوچھا تھا۔"

"نادان شخص!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں یہاں پہلے آیا اور نہ میں نے آج تم سے فون پر بات کی۔ کہاں ہے تمہاری وہ سیکرٹری۔ بلاؤ اسے۔ میرے سامنے بات کرو اس سے۔"

سیکرٹری فوراً حاضر ہو گئی۔ "کیا میں تمہیں کچھ دیر پہلے کاغذات دینے آیا تھا، مسٹر ڈی سلوا کے لیے؟ یہ غور سے دیکھ کر بتاؤ کیا وہ آدمی میں ہی تھا؟"

سیکرٹری کے لیے مجھ سے نظر ملا کے جھوٹ بولنا مشکل تھا۔ "تو... نو سر... آپ تو نہیں آئے تھے۔ ایک اور شخص تھا۔"

"ڈیم اٹ!" میں نے میز پر مکا مارا۔ "میں نے صرف اپنے بارے میں پوچھا تھا۔ یہ نہیں کہ آج کون آیا، کون گیا۔ جاؤ۔"

سیکرٹری کا رنگ فق ہو گیا تھا کیونکہ وہ ڈی سلوا کی آنکھوں کی شرر افشانی بھی دیکھ چکی تھی۔

"تم چالاک بننے کی کوشش کر رہے ہو۔" ڈی سلوا غرایا۔ "وانٹ ٹو پلے اے ڈرٹی ٹرک..."

"شٹ اپ!" میں نے کہا۔ "مجھے دکھاؤ وہ کون سے کاغذات ہیں؟"

عالم اشتعال میں ڈی سلوا نے لفافہ میری طرف پھینک دیا۔ "تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔ میں پولیس کو رپورٹ کر دوں گا۔"

میں نے لفافہ اٹھایا۔ پھر خود اٹھا اور ہاتھ مار کے پہلے انٹرکام پر رکھا ہوا پیپر ویٹ ہی نہیں انٹرکام بھی نیچے گرا دیا۔ "یو فول! سوائن!" میں نے کہا۔ "تم مجھے ٹریپ کرنا چاہتے تھے۔ ہاں میں نے یہ کاغذات بھجوائے تھے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں نے فون پر کہا تھا وہ الگ بات ہے۔ ابھی مجھے بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔ تم نے غلام علی کو مروا دیا مگر تمہارے سیاہ کارناموں کی تفصیل مجھے معلوم ہو چکی ہے۔ میں قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے والا آدمی نہیں ہوں۔ جس روز تم عدالت میں ملزموں کے کٹہرے میں پہنچو گے تو تمہارے خلاف گواہی دینے والے سب بتا دیں گے۔" میں کھڑا ہوا تھا اور بالکل مستعد تھا۔ ڈی سلوا سمجھ گیا تھا کہ اس کی چال الٹی ہو گئی ہے لیکن وہ ایک بار پہلے جسمانی مقابلے کا انجام دیکھ چکا

تھا۔ تب وہ اکیلا تھا مگر اس وقت دوسرے کمرے میں پورا اسٹاف موجود تھا۔ ان سب کے سامنے وہ تماشا بننا نہیں چاہتا تھا۔

"یہ تم نے اچھا کیا کہ اپنی زبان کے سوا کچھ استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔" میں نے دروازے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں تمہاری بلڈنگ کی ہڈیاں توڑ دیتا۔ اور مسٹر ڈی سلوا! تم کو معلوم بھی نہ ہو گا کہ تمہاری مدد کے لیے آیا یا تمہارا گواہ بنا۔" میں باہر والے کمرے میں آیا اور سیکرٹری نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اپنے کام میں مصروف ہے۔ اس کی میز پر ایک ٹیپ ریکارڈر موجود تھا۔ "تم کو بہت جلد فیصلہ کر لینا چاہیے مس! کہ تم اس آدمی سے وفادار رہنے کو ترجیح دو گی یا فرض سے وفاداری کو۔" میں نے اسے مخاطب کر کے کہا اور باہر نکل گیا۔ پھر اندر آیا اور وہ لفافہ اس کے سامنے پھینک دیا۔ "یہ اپنے باس کو دے دینا۔ چاہے تو مزید فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بنوا لے۔ یہ اسی کا ریکارڈ ہے جو میری تحویل میں نہیں۔ اس سے میرے خلاف کوئی کیس نہیں بنتا۔"

واپسی پر میں نے گلاب خان سے ملاقات کی اور بتایا کہ اسے گواہی کے لیے جانا ہے۔

"ہم جائے گا، ضرور جائے گا۔ جان کا کیسا خطرہ؟" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "اس خانہ خراب کو پھانسی ہو گا تو ہمارا دل کو ٹھنڈک پڑے گا اور ہم اس سے پوچھے گا خنزیر! تیرا کیا نقصان کیا تھا وزیر خان نے۔ وہ بڈھا آدمی ادھر اکیلا رہتا تھا۔ پانچ وقت نماز پڑھتا تھا۔ وہ کسی کا دل بھی نہیں دکھاتا۔ اللہ سلامت رکھے، اللہ مغفرت کرے۔ وہ اتنا نیک آدمی۔ جس شیطان ناگ نے اس کو مارا وہ ہم کو مل جائے تو خدا کا قسم ہم اس کا تکہ بوٹی کر دے۔ تم نہیں دیکھا سکندر بابو! ہم اپنی گناہگار آنکھوں سے دیکھا۔ اس نے تو ہمارے دونوں کانوں کو... ہم بزدل نہیں ہے صاحب! دشمن کا سینے میں گولی مار سکتا ہے۔ ہمارا باپ دس فرنگی قتل کیا، سب کو جہنم میں بھیجا، پھر شہید ہو گیا۔ گلاب خان کے سامنے آئے کوئی بہادر ہے تو مقابلہ کرتا ہے۔ یہ چھپ کر بوڑھا آدمی کو ایسے ذبح کرتا ہے جیسے وہ جانور ہے۔ اس کا خون کر کے کمبل میں ڈال دیا اور بھاگ گیا۔ خانہ خراب ہووے اس کا۔ ادھر ہمارا ساتھی وہ آدمی تھا، اب ہم اکیلا ہے۔ ہم کو دل تنگ کرتا ہے۔ یہ تو ہے گلاب خان کا... ادھر چند دن سے گرگٹ کی طرح گھر اجاڑا اور ایک کے بعد ایک دو آدمی کا قتل ہو گیا۔ لعنت تمہارا دوستی پر اور تمہارا شیطانی پہ ہے۔" وہ سخت مشتعل اور جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ خدا انصاف کرنے والا ہے اور ظلم کی رسی دراز

نہیں ہوگی۔ جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی اس کا پھل بھی پاتا ہے۔ اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی۔ پولیس نے گلاب خان کو بھی بہت پریشان کیا تھا مگر چراغ دین نے آ کے جان بچائی تھی کہ یہ آدمی قابل اعتماد اور بھروسے کا ہے۔ چراغ دین گھر پر نہیں تھا۔ گلاب خان نے مجھے مطلع کیا کہ ہمارا صاحب شادی کر رہا ہے۔

"چراغ دین شادی کر رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "دوسری شادی؟ خود اس نے بتایا ہے تم کو؟"

"ہاں۔ اچھا ہے نا۔ ابھی کتنے دن اکیلا رہے گا؟" گلاب خان بولا۔ "پہلا بی بی مر گیا اللہ کا مرضی۔" اس نے مرا اور بڑا اچھا کہا۔ "شادی تو سنت رسول ہے۔ گناہ سے بچاتا ہے۔ گھر آباد ہو گا تو ہم بھی خوش ہو گا۔ ابھی تو ہم سارا دن دیواروں کی رکھوالی کرتا ہے۔ بی بی ہو گا تو ہم خدمت کرے گا۔ پھر اس کا بچہ ہو گا تو ہم اس کو کھلائے گا۔ وہ ہمارے ساتھ کھیلے گا۔ ہمارا روح خوش ہو گا۔ ابھی ہمارا روح بہت دکھی ہے۔ ہم قبرستان کا چوکیدار ہے۔ ادھر کوئی زندہ نہیں رہتا۔ ہم گھر میں رہنا چاہتا ہے جدھر کوئی انسانوں کا آبادی ہو، رونق ہو۔"

چوکیدار کی جذباتی آسودگی بجا تھی۔ خود کو قبرستان کا چوکیدار کہہ کے اس نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ گھر کی مالکن اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ اس کے بچے بھی لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ وہ نیک دل بڈھے اس کی تنہائی کے رفیق تھے۔ وہ بھی ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑ گئے تو وہ اس گھر کی ویرانی، نحوست اور آسیب کی طرح ڈرانے والی یادوں کے درمیان اکیلا رہ گیا۔ اکیلے آدمی کے لیے دکھ کا عذاب بھی شدید تر ہوتا ہے۔ اب خانہ آبادی چراغ دین کی ضرورت بھی تھی اور خوش چوکیدار تھا۔ وہ مجھے چائے پلانے پر بھی مصر تھا مگر میں ضروری کام کا بہانہ کر کے چلا آیا۔ ابھی میں چند قدم دور ہی گیا تھا کہ مجھے گلاب خان نے آواز دی اور واسکٹ کی جیب میں کچھ ٹٹولتا میری طرف بڑھا۔

"ہم باتوں میں بھول گیا صاب!" وہ ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "آپ کا نام پہ خط دے گیا تھا ایک شخص، گاڑی میں آیا تھا۔ بولتا تھا صرف انہی کا ہاتھ میں دینا ہے۔"

میں نے جیب میں پڑے رہنے سے چڑمڑ ہو جانے والے لفافے کو دیکھا۔ اس پر میرا ہی نام لکھا ہوا تھا۔ اندر سے ایک لیٹر پیڈ کا کاغذ برآمد ہوا۔ یہ اسی ڈاکٹر کا لیٹر پیڈ تھا جس نے میرے والد کی وفات پر ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری

www.paksociety.com

کیا تھا۔ گو یہ بھی سنا ہوگا وہ بدتمیز اور بدزبان ڈاکٹر جس نے دیکھے بغیر لکھ دیا تھا کہ موت طبعی حالات میں ہوئی ہے۔ اس کا پیغام چند سطروں پر مشتمل تھا۔ انگریزی میں اس نے لکھا تھا:

"ڈیئر مسٹر سکندر!
مجھے اپنے اس دن کے رویے پر افسوس ہے
کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ایک بار پھر زحمت
کریں۔ میرا خیال ہے ہم اس مسئلے پر مصالحانہ
گفتگو کر سکتے ہیں۔"

"حرام زادہ!" میں نے خط پڑھ کے اسے بے اختیار گالی دی۔ اس نے اب بھی عیاری سے کام لیا تھا۔ حوالہ "اس دن" کا تھا۔ ذکر صرف "مسئلے" کا تھا اور اس نے اپنے دستخط بھی نہیں کیے تھے۔ یہ خط ٹائپ کیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے کوئی ایسی تحریر نہیں دینا چاہتا تھا جسے میں کسی بھی مرحلے پر قانون کی جنگ میں اس کے خلاف استعمال کر سکوں۔ اس کے باوجود وہ مصالحانہ "گفتگو" کرنا چاہتا تھا جس کا مطلب تھا مجھ سے سودے بازی۔ شاید اسے معلوم ہو گیا تھا کہ لاش واقعی دوبارہ پوسٹ مارٹم کے لیے نکالی جا رہی ہے۔ میں نے اس خط کو پرزہ پرزہ کر کے پھینک دیا۔ پھر ان پرزوں کو سمیٹا اور لفافے میں ڈال کے حیرت زدہ چوکیدار کو وہ لفافہ تھما دیا۔

"اب وہ آئے نا تو اس سے کہنا کہ یہ ہے خط کا جواب اور میری طرف سے اجازت ہے کہ اسے بے عزت کر کے بھگا دو۔" میں نے کہا۔

محسن مجھ سے پہلے گھر پہنچ چکا تھا۔ جتنی دیر میں، میں غسل سے فارغ ہوا اس نے مجھے چوکیدار کے گھر جا کے دس ہزار روپے دینے کی افسوسناک روداد سنائی۔ ایک آدمی کتنے کا ہوتا ہے؟ ایک بار کسی عقلمند نے حساب لگا کے بتایا تھا کہ ڈھائی روپے کا۔ اس میں جسم کے فاسفورس، کیلشیم، فولاد و دیگر معدنیاتی اجزاء اور چربی وغیرہ سب کی قیمت شامل تھی۔ پھر وہ کیا چیز ہوتی ہے جس کے لیے لوگ ہی آدمی مانگتے ہیں، ڈھائی روپے کا۔ اس کے عوض ڈھائی لاکھ ڈھائی کروڑ کچھ قبول نہیں کرتے۔ نہ ڈالر نہ پونڈ۔ محسن کو وہ دس ہزار روپے دینے کے لیے جھوٹ بولنا پڑا تھا کہ یہ مرحوم کی امانت تھی جو انھوں نے اسی خیال سے رکھوائی تھی کہ بیوی بچوں کے کام آئے۔ بینک میں اس لیے نہیں رکھی تھی کہ وہ سود کے قائل نہیں تھے۔

میں خاموشی سے بس محسن کی آواز سنتا رہا جو ایک خاندان کی تباہی کا نظارہ کر کے لوٹا تھا اور بہت اداس تھا۔ باہر آ کے میں نے ڈی سلوا سے ملاقات کی روداد سنائی اور ہم تھوڑا سا ہنسے۔ اور اس ہنسی پر حیران بھی ہوئے اور شرمندہ بھی۔ کتنے دن سوگ اور غم کے گزرے تھے کہ ہم ہنسنا تک بھول گئے تھے اور ہنسنے پر شرمندہ ہوتے تھے۔ جتنی دیر میں محسن نے پرائیویٹ کچن میں چائے بنائی، میں نے اسے چوکیدار سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنایا اور یہ اطلاع دی کہ چراغ دین دوسری شادی کر رہا ہے۔

محسن نے اسے بے اختیار گالی دی۔ "کس بدبخت کی شامت آئی ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں اس لڑکی کو بتا دیتا کہ نیک بخت کوئی اور بر دیکھ لے، چراغ دین آدم خور ہے جو قانون کی آڑ لے کر بچ گیا۔ مگر مجھ سے بچ کر کہاں جائے گا وہ۔ یہ شہ پا کر مزا لے چراغ دین کو اور گھر خراب ہوا سے شادی..."

"کس کی شادی کی بات ہو رہی ہے؟" رابعہ نے کمرے میں نمودار ہو کے کہا۔ "کہاں ہو تم دونوں صبح سے؟"

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ کل کی نسبت آج اس کی حالت بہت بہتر تھی۔ مگر اس کے حسن میں سوگواری کا تاثر دل پر اثر کرتا تھا۔ جیسے سولھویں اور سترھویں شب کو طلوع ہونے والے ماہ کامل کا بجھا بجھا چہرہ۔ جس کی چاندنی برف باری کی رات کو سنسان پہاڑوں پر اترے۔

"ہم آج مصروف رہے۔" میں نے سنبھل کر کہا۔ "ابھی گھر آئے ہیں۔ بیٹھو، تم بھی چائے پیو۔"

وہ ایک پلنگ پر بیٹھ گئی۔ "گھر میں سوئم کے لیے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ان سے نہیں ملو گے؟"

"کل ہوگا نا سوئم؟" محسن نے کہا۔ "میرا خیال ہے جان پہچان والے محدود لوگوں کو بلایا جائے۔"

"جان پہچان والے ہی ہوں گے۔" وہ بولی۔ "مثلاً چچا بھی اسلام آباد سے پہنچے ہیں۔"

"امی اور بابا؟" محسن نے کہا۔ "وہ آ گئے ہیں اور کون کون آیا ہے؟"

"مسٹر اور مسز شیرازی آئے ہیں اور فوزیہ آئی ہے۔" رابعہ نے کہا۔ چائے کا مگ میرے ہاتھ سے گر گیا۔

رابعہ نے صرف ایک نظر میری طرف دیکھا اور محسن سے مخاطب ہوئی۔ "تمہاری یہ چھوٹی بہن مجھے بڑی پیاری لگی۔ بڑی محبت کرنے والی۔"

محسن چونکا۔ "ہاں... ہاں۔" اس نے میری طرف دیکھا۔ میں ٹوٹے ہوئے مگ کے ٹکڑے چن رہا تھا۔ "سکندر بھائی! امی اور بابا کو سلام کر آؤں۔"

مجھے جواب کا موقع دیے بغیر وہ نکل گیا۔ مجھے معلوم تھا وہ اس صورت حال سے فرار چاہتا تھا۔ جذبات کا بھنور ہر طرف میرے گرد بن گیا۔ خود غرض! میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ اگر مجھے اکیلا نہ چھوڑتا تو کیا تھا۔ میں نے دوسرے تک کو جانے سے پہلے خاموشی گہری اور طویل ہوتی گئی۔ برف کی طرح اندر باہر جمتی گئی۔ شیشے کی دیوار کی طرح اٹھتی گئی۔ احتیاط! مبادا ایک غلط لفظ کا پتھر دونوں کے شیشے توڑ دے۔ اور شیشوں کا ٹوٹنا کوئی معنی نہیں۔ جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا۔ خاموشی پھر زبان بن گئی۔ رابعہ نے کہا۔ "یوں چپ کیوں بیٹھے ہو۔ کچھ تو کہو۔" میں نے کہا۔ "مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ اعتراف جرم کروں یا اقرار وفا۔ محبت کیا ہے؟ یہ خزاں کی باد سموم جو امید دل کی فصل اجاڑ دیتی ہے یا خزاں رسیدہ شاخوں کے سر غنچوں کو بہار کا سندیسہ دینے والی ہوا؟" رابعہ ہنسی۔ "کیا عجیب سوال ہے۔ پوچھ رہے ہو کہ محبت زہر ہے یا امرت۔" میں نے کہا۔ "ہاں ہاں، یہی پوچھ رہا ہوں۔ بقائمی ہوش و حواس پوچھ رہا ہوں۔ آدھے سوال کا جواب فوزیہ ہے تو باقی آدھے کا تم۔ غلط نہ تم ہو گی نہ وہ جائے گی۔ آدمی اکثر تو میری ہے جو پل صراط کے درمیان ہے اور نہیں دیکھ سکتا کہ میرے لیے جنت کدھر ہے اور جہنم کس طرف۔" رابعہ نے کہا۔ "ہر آدمی کی اپنی جنت ہے اور اپنا جہنم۔ ہے تو میں نے فیصلہ کر کے کہا ہے مجھے معلوم نہیں، اور یہی خیال تو مجھے کچھ کہنے نہیں دیتا۔ تم بھی تو کچھ کہو۔"

وقت اگر احساس کا نام ہے تو اس کا احساس نہ مجھے تھا نہ رابعہ کو۔ ہم ایک مختصر سے کمرے میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر آمنے سامنے بیٹھے رہے تھے اور اندھیرا چپکے چپکے ہمارے گرد حصار قائم کرتا گیا تھا۔ اچانک دروازے کے فریم میں ایک سایہ سا نمودار ہوا جس کے خدوخال جانے پہچانے تھے۔ اس کے سراپا کی خوشبو اس کے وجود کی طرح مجسم ہو گئی تھی جو ٹوٹ کر جانے ہی والی تھی کہ میں نے کہا۔ "فوزیہ!" اور سوئچ دبا کے لائٹ آن کر دی۔ فوزیہ ٹھٹک گئی۔ اس کی آنکھوں میں نہ کوئی شکایت تھی نہ سوال تھا۔ "آ کے جا رہی ہو؟"

"مجھے... مجھے معلوم نہیں تھا..." فوزیہ نے کہا اور سنبھل گئی۔ "میرا مطلب ہے آنٹی نے بتایا تھا تم یہاں ہو گے۔"

رابعہ نے خالی مگ نیچے رکھا۔ اس کا چہرہ اپنے جرم کی تشہیر دیکھنے لگا تھا۔ "آؤ فوزیہ... میں تو بس جا ہی رہی تھی۔"

میں نے بھی اپنا خالی مگ نیچے رکھا اور کہا۔ "میں بھی بس آنے ہی والا تھا فوزیہ۔"

رابعہ یوں نکل گئی جیسے وہ غلطی سے کسی دوسرے کے گھر میں داخل ہو گئی ہو۔ وضاحت بے سود تھی۔ عذر گناہ بدتر از گناہ۔ فوزیہ نے بھی اندھیرے میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے وہ گفتگو بھی سن لی تھی جو پہیلیوں کی زبان میں کر رہے تھے۔ فوزیہ کے دل میں بھی جذبات کی لہروں کو ریسیو کرنے کا بڑا حساس نظام تھا جس کی فریکوئنسی بدلی نہیں تھی۔ فوزیہ دیر تک دروازے میں کھڑی رہی۔

"وہ... بس اتنی دیر ہو گئی۔" میں نے خفت سے کہا۔ "اور معلوم ہی نہیں ہوا۔"

"مگر مجھے معلوم ہو گیا ہے۔" فوزیہ نے دوپٹے کو انگلی پر بل دے کے لپیٹتے اور کھولتے ہوئے کہا۔ "واقعی بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"فوزیہ!" میں نے درد کی ٹیس سے تڑپ کر کہا۔ "اور شرمندہ کرنے آئی ہو؟"

"نہیں سکندر!" وہ سر جھٹک کے بولی۔ "اب تو میں اپنے آپ سے بھی شرمندہ ہوں۔"

"ایسا مت کہو فوزیہ! زندگی کے دکھوں کے ساتھ جینا سیکھو۔ آدمی خود اپنی تقدیر کا خالق نہیں ہے۔ دکھ سب کا مقدر ہیں۔"

"دکھ کے کنکر مارنے والوں کو تو معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔" وہ اسی کھوکھلے لہجے میں بولی۔ "سنگسار کرنے والوں سے معافی نہیں مانگی جا سکتی۔ غم کا پہاڑ اگر ٹوٹ پڑا ہو کہ آدمی اس کے نیچے دب کر سانس بھی نہ لے سکے تو جینے کی آرزو سے کیا ہوتا ہے۔"

"تم کو جو کچھ کہنا ہے صاف کہو۔" میں نے دل کے ایک نامعلوم خوف کو دبا کر کہا۔

"صاف بات ہے سکندر کہ میں تمہاری بے وفائی کا صدمہ جھیل کر اکیلی تو جی سکتی تھی۔ اس خیال سے کہ میں نہ سہی تم تو خوش ہو۔ لیکن میں چراغ دین سے شادی نہیں کروں گی۔ میں مر جاؤں گی سکندر! مر جاؤں گی، تم دیکھ لینا۔" اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور وہ دیوار پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

صدمے نے مجھے زلزلے کے پہلے جھٹکے کی طرح مفلوج سا کر دیا تھا۔ "چراغ دین؟" میں نے جھپٹ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔

"ہاں، چراغ دین۔ اس نے میرا رشتہ مانگا تھا۔" فوزیہ نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

www.paksociety.com

"اور تمہارے ممی پاپا؟ انھوں نے منظور کر لیا؟" میں نے اسے جھنجوڑ کر کہا۔ "تم نے..."

فوزیہ نے خود کو چھڑا لیا۔ "تم بھول رہے ہو کہ میں وہ لڑکی ہوں جس کی نسبت ٹوٹ چکی ہے۔ ٹھکرائی ہوئی بے وقعت چیز۔"

"لیکن تمہاری ممی اس پروفیسر کو بھی ترجیح دیتی تھیں۔"

"ترجیح دینے والوں کا معیار کسی آسمانی صحیفے میں ہے؟" وہ تلخی سے بولی۔ "چراغ دین سب سے بہتر ہے کیونکہ وہ زیادہ دولت مند ہے۔ وہ میری بڑی بہن سے بہت محبت کرتا تھا۔ اب تک اس کی قبر کا مجاور ہے۔ اس سے زیادہ محبت مجھ سے کون کرے گا۔ مریم بہت خوش تھی۔ میں بھی بہت خوش رہ سکتی ہوں۔"

"اس... اس حرام زادے کے ساتھ؟ جس نے نمک حرامی کی، میرے باپ کو لوٹا۔ جس تھالی سے کھاتا تھا اسی میں چھید کیا اور آج اس کی دولت باعث فخر ہے؟" میرے غصے کا آتش فشاں یک لخت پھٹ گیا۔ "وہ عزت دار ہے جس نے میرے باپ کی عزت کو خاک میں ملایا۔ اسے تباہ کرنے والوں [illegible] پھیلا وار کیا۔ مریم خوش تھی؟ مجھے تو اس کے دامن پر مریم کے خون کے داغ بھی نظر آتے ہیں۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا فوزیہ! میں اسے قتل کر دوں گا۔"

"تم پاگل ہو رہے ہو سکندر!" وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ "خدا کے لیے آہستہ بولو۔"

"نہیں فوزیہ! مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ میں تم کو اس لیے بتا رہا ہوں فوزیہ کہ جو کچھ مجھے کرنا ہے وہ میں ضرور کروں گا۔ تم نے کہا تھا مجھے آزمائش میں مت ڈالنا کہ ایک طرف میرے باپ کے لہو کا قرض ہو اور دوسری طرف تمہارے سہاگ کی آبرو اور میں فیصلہ نہ کر پاؤں۔"

"فیصلہ تو میں کر چکی ہوں اور تمہیں یہی بتانے آئی تھی۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ "میں اس سے شادی نہیں کروں گی، خودکشی کر لوں گی۔"

وہ لڑکھڑاتی ہوئی اندھیرے میں گم ہو گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ میری حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی۔ میری مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور دانت آپس میں جڑ گئے تھے۔ نفرت کے دھوئیں سے میرا بدن سلگ رہا تھا۔ یہ خبر تو مجھے چراغ دین کے چوکیدار گلاب خان نے ہی دی تھی۔ اس وقت میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ جس دوسری شادی کا ذکر کر رہا ہے وہ فوزیہ سے ہونے والی ہے۔ "نہیں گلاب خان! تم اگر قبرستان کے چوکیدار نہیں رہ سکتے تو کسی دوسرے گھر کی دربانی کرو۔ تم جس مالکن کی خدمت کرنا چاہتے ہو وہ فوزیہ نہیں ہو سکتی۔ جن بچوں کے ساتھ کھیلنا چاہتے ہو، جن بچوں کو کھلانا چاہتے ہو وہ چراغ دین اور فوزیہ کے بچے نہیں ہو سکتے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ ابھی اس کی باری نہیں لیکن اب مجھے پہلے اس سے [illegible] اس سے پائی پائی کا حساب پہلے لینا ہوگا جو اس نے میرے باپ کی محنت کی کمائی سے چرائی اور جس سے اس نے انصاف خریدا، عزت خریدی اور مریم کے بعد اب فوزیہ کو خریدنا چاہتا ہے۔"

اس فیصلے کے بعد میں پرسکون ہونے لگا۔ میں باہر آیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ صحن سے باہر قدم رکھتے ہی میں نے محسن کو دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اندھیرے میں سیاہ بھوت کا بت نظر آتا تھا۔

"محسن!" میں نے اس کا کاندھا ہلا کے کہا۔ "تو کب سے کھڑا ہے؟"

محسن چونکا۔ "میں بہت دیر سے۔" وہ گھگھیا کے بولا۔ "تم باتیں کر رہے تھے۔ میں رک گیا۔"

"تو... تو نے وہ سب سن لیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "جو کچھ فوزیہ نے کہا۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "سکندر! میری ایک ہی بہن ہے۔ اس کی زندگی میری زندگی ہے اور میں جانتا ہوں وہ کتنی ضدی لڑکی ہے۔ اسے ضدی میں نے بنایا ہے۔ اس کی ہر بات مان کے، ہر خواہش پوری کر کے۔ اس نے جو مانگا میں نے اسے دیا۔ اگر وہ میری جان بھی مانگتی تو میں انکار نہ کرتا لیکن اب وہ موت مانگ رہی ہے۔ ضد سے بڑھ گئی ہے۔"

"فکر کیوں کرتا ہے محسن! فوزیہ میرے لیے نہ سہی تیرے لیے زندہ رہے گی۔" میں نے اس کے شانے پر اعتماد کے ساتھ ہاتھ رکھا۔

"ہاں سکندر! اگر وہ بے بس اور بے زبان ہے تو کیا میں تو بے بس نہیں ہوں۔ چل آ، ممی اور پاپا سے مل لے! انھوں نے ہی مجھے بھیجا تھا کہ تجھے بلا لاؤں۔" محسن نے کہا۔ "تیری صورت سے کچھ پتہ نہیں چلنا چاہیے۔"

جب میں نے رابعہ اور فوزیہ دونوں کی موجودگی میں انکل شیروانی اور ان کی بیگم کی خدمت میں حاضر ہو کے آداب عرض کیا تو میری صورت سے واقعی کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ میری آواز اور میرا لہجہ نارمل تھے اور میں بالکل پرسکون تھا۔ مسز شیروانی بڑے غور سے مجھے اور رابعہ کو دیکھتی رہیں۔ رابعہ کے چہرے پر اداسی کے سوا کوئی تاثر نہ تھا۔ میرے جذبات کا اندازہ

کرنے کی کوشش بھی رائیگاں گئی اور وہ کچھ دیر بعد اٹھ گئیں۔ اگر موقع ہوتا تو وہ خود مجھے بتاتیں کہ انھوں نے فوزیہ کے سلسلے میں کتنا دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے کہ انہوں کو صرف فوزیہ کی خوشی کے لیے چھوڑ دیا اور چراغ دین کو قبول کر لیا۔ مریم کی جدائی کے غم کا مرہم فوزیہ کو بنا دیا اور فوزیہ کا مقدر بھی سنوار دیا۔ تعزیتی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے وہ کسی اور موضوع پر بات نہیں کر سکتی تھیں تاہم مجھے یقین تھا کہ واپسی سے قبل وہ مجھے یہ "خوشخبری" میرے منہ پر جوتا مارنے کی حیثیت سے ضرور سنائیں گی۔ کھانے کے بعد رابعہ اور فوزیہ نے اپنے اپنے بیڈ روم کا رخ کیا۔ میں اور محسن، رضوی صاحب اور شیروانی صاحب نصف شب تک ان تمام مسائل پر اظہار خیال کرتے رہے جو میری واپسی سے پیدا ہوئے تھے۔ بہت سی باتیں شیروانی صاحب کے لیے انکشاف سے کم نہ تھیں مثلاً چوہدری والا کا کردار، ڈبل ایجنٹ کی حیثیت، خصوصاً ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کے نام پر ہونے والے ناجائز کاروبار کی نوعیت۔ باتیں ساری رات میں ختم نہ ہوتیں مگر مجھے صبح عدالت میں حاضر ہونا تھا۔ میں نے رضوی صاحب سے کہا کہ مجھے ایک دن کے لیے گاڑی چاہیے۔ اپنے گواہوں کو لانے لے جانے اور وقت پر حاضر کر دینے کے لیے۔ انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ وہ سرکاری جیپ میں چلے جائیں گے لیکن کار کو ان کا شوفر ڈرائیو نہیں کرے گا۔ اس شرط کی وجہ صاف ظاہر تھی۔ قانون کی نگاہ میں میں ایک مجرم تھا اور اگر اس حیثیت کا پولیس چیف کی وردی والا ڈرائیور مجھے لے کر پکڑا جاتا تو رضوی صاحب کی پوزیشن جو پہلے ہی خراب تھی مزید خراب ہو جاتی۔ انھوں نے مجھے جگہ دے رکھی تھی اور اب [illegible] بھی سے آئے تھے جو میری وکیل تھی۔ کسی اخبار والے کے لیے جو ان کو بدنام کرنا چاہتا یہ اجتماع ایک سنسنی خیز انکشاف اور دلچسپ خبر کا عنوان بن سکتا تھا۔ رضوی صاحب وضع دار، با اصول اور جرأت مند آدمی تھے کہ انھوں نے ملازمت کے تحفظ پرستوں کی آبرو کو قربان نہیں کیا۔ انھوں نے جو کچھ کیا تھا وہ اس سے مطمئن تھے اور کوئی غلط کام ابھی نہیں کیا تھا اس لیے مخالفت یا بدخواہوں کے خوف سے بے نیاز تھے۔

اچانک مجھے ٹیلی فون کو ٹیپ کرنے والے تاروں کا خیال آیا جو میں نے اور محسن نے دریافت کیے تھے۔ اس خیال سے میرا دل ڈوبنے لگا کہ ممکن ہے ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ ان کے کانوں نے سن لیا ہو جن کے بارے میں ہم بے خوفی سے اظہار خیال کر رہے تھے۔

"انکل رضوی!" میں نے کہا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا فون ٹیپ ہو رہا ہے؟"

"نہیں بھئی! معلوم تو نہیں تھا مگر آج شام محسن نے بتایا۔" وہ بولے۔ "میں تو حیران رہ گیا۔ اس سے پہلے متعدد بار ایسا ہوا تھا کہ میں نے خفیہ طور پر ہدایات جاری کیں اور وہ مجرم متعلقہ لوگوں تک پہنچ گئیں۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "اس درخت پر کیا تھا جس پر تار جا رہا تھا؟ کوئی ٹرانسمیٹر؟"

"ہاں۔ بہت چالاکی سے سب کچھ نصب کیا گیا تھا۔" وہ بولے۔ "تار نظر آتے تھے۔ ان پتوں میں چھپا ہوا چھوٹا سا ٹرانسمیٹر۔ اور اس کا ایریل جو درخت کی چوٹی کے قریب تھا۔ اس سے ٹرانسمیٹر کی رینج بہت بڑھ گئی ہوگی۔ دس میل کے دائرے میں وہ کسی بھی ریڈیو سیٹ پر ٹیلی فون کے ذریعے ہونے والی سب گفتگو سن سکتے تھے۔ تم دیکھو گے، صبح میں پولیس کے حوالے کر رہا ہوں۔" انھوں نے ایک شوکیس پر رکھا ہوا چھوٹا سا پورٹیبل ٹرانسمیٹر دکھایا۔ اس کا ایریل ٹرانسسٹر ریڈیو کے ایریل کی طرح تھا کہ کھینچنے سے ایک میٹر سے زیادہ باہر نکل آتا تھا۔

"یہ یہاں تو نہیں ملتا۔" شیروانی صاحب بولے۔ "اور اس کا رکھنا بھی سخت جرم ہے۔"

رضوی صاحب ہنسے۔ "تو بھائی یہ سب بھی کسی مجرم کا۔ وہ کیا چیز اسمگل کر کے نہیں لا سکتے۔" شیروانی صاحب نے اشتیاق کا مظاہرہ کیا تو رضوی صاحب نے اسے آپریٹ کر کے دکھایا۔ "تم دوسرے کمرے میں جا کے سنو۔ ٹرانسسٹر ریڈیو پر وہ رکھا ریڈیو۔"

میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور انکل شیروانی کو ٹرانسسٹر ریڈیو کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل والے کمرے میں لے گیا۔ وہاں میں نے ٹرانسسٹر ریڈیو کو آن کیا۔ ایک دم اچانک رضوی صاحب کے بولنے کی آواز آئی، پھر محسن ہنسا۔ شیروانی صاحب بچوں کی طرح خوش ہو گئے۔

"بڑے کام کی چیز ہے۔ واقعی لوگ ایسے ہی کام کرتے ہوں گے۔" انھوں نے کہا اور میں نے ان سے اتفاق کیا۔ جب وہ واپس ڈرائنگ روم کی طرف جا رہے تھے تو میں نے اجازت لی اور باہر جانے کے لیے مخالف سمت کے دروازے کی طرف بڑھا۔ شیروانی صاحب کے نکلتے ہی میں پلٹا اور میں نے میز کی سب سے نیچے والی دراز میں سے وہ فوٹو اسٹیٹ کاغذات نکال لیے جن کی قیمت غلام علی نے جان دے کر ادا کی تھی۔ اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے مجھے وہ ڈائیلاگ یاد آئے جو میں

www.paksociety.com

www.paksociety.com

نے کیطرز طور پر بولے تھے۔ غلام علی اس وقت ریسیور کو جھکا
تھا جب میں رضوی صاحب کو مطلع کرنے کے لیے بول رہا تھا
کل ہی چلے جاؤ گے۔ ایک آدھ دن اور ٹھہر جاتے یار! خواہش
تھی۔ یہ پھر تو مجبوری ہے۔ رات کے سناٹے میں یہ الفاظ بازگشت
کی طرح میرے کانوں میں گونجے اور خوف کی ایک سرد لہر میری
ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔ میرا اندازہ سچ ہو گیا تھا۔ اس کے بس
واقعی ایک مکان اور اس دنیائے آب و گل میں کوئی گنجائش
نہ تھی۔

اپنے کمرے میں آنے کے بعد میں سونے کے ارادے سے
لیٹ گیا۔ گزشتہ رات بھی پلک جھپکائے بغیر گزری تھی اور
آج مجھے نیند کی اشد ضرورت تھی۔ شاید میں کوشش کرتا تو کچھ
دیر بعد فوزیہ اور رابعہ کے تصور سے اور تمام پریشان کن
خیالات سے دامن چھڑا کے سو بھی جاتا۔ میں نے سگریٹ نہیں
جلائی تھی اور لائٹ آف کر کے لیٹتے ہی آنکھیں موند لی تھیں
مگر یکلخت ایک خیال مجھے ایسا آیا کہ نیند کا خیال غائب
ہو گیا۔ میں اٹھ بیٹھا اور بہت دیر تک سوچتا رہا۔ تمام دلائل
جو میرے ذہن نے دیے تھے میرے حق میں تھے۔ پھر بھی تسلی
کیسے نہ ہوتا۔ میں دوبارہ اس وقت لیٹا جب مجھے باہر سے محسن
کے قدموں کی آہٹ سنائی دی: "سکندر!" محسن نے اندر آ کے
کہا۔ "سو گیا کیا؟"

میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ اب میں چاہتا تھا کہ محسن بھی
سو جائے۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ سگریٹ جلائے لیٹا رہا۔
پھر میں نے اسے کروٹ بدل کے سوتے دیکھا اور انتظار کرتا
رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں اٹھا تو چارپائی چرچرائی لیکن
محسن نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میں نے سگریٹ کا پیکٹ میز پر
سے نیچے گرایا۔ محسن بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر میں نے اسے
آواز دی لیکن وہ سو رہا تھا۔ میں دبے پاؤں اٹھا اور آہٹ
کیے بغیر باہر نکل گیا۔ سرونٹ کوارٹر سے کوٹھی تک میں اطمینان
سے چلا گیا۔ مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ گھر میں میزبان
اور مہمان سب سو چکے تھے۔ میری توقع کے مطابق وہ دروازہ
کھلا رہ گیا تھا جس سے میں باہر آیا تھا۔ میں نے دروازے کو
آہستہ سے دھکیلا۔ وہ کسی آواز کے بغیر وا ہو گیا۔ اندر کاریڈور
میں بلب لائٹ جل رہی تھی اور اس کا مدھم سا اجالا اس
کمرے تک بھی پہنچ رہا تھا۔ روشنی رضوی صاحب کے کمرے
میں بھی تھی اور فوزیہ کے کمرے میں بھی لیکن باہر سے نظر نہیں
آتی تھی۔ غالباً فوزیہ جاگ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ اچانک
رضوی صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ لباس شب

خوابی میں باہر آئے۔ میں کاریڈور سے پلٹا اور پھر اسی کمرے میں
چلا گیا۔ رضوی صاحب نے مجھے نہیں دیکھا تھا کیونکہ باتھ
روم مخالف سمت میں تھا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ لوٹے
اور ان کے کمرے کی لائٹ آف ہو گئی۔ میں اطمینان سے
ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ وہ پورٹیبل ٹرانسمیٹر پھر وہیں
رکھا تھا جہاں سے اس کو رضوی صاحب نے اٹھایا تھا۔

ٹرانسمیٹر کو پلاسٹک شیٹ میں یا سیلوفین میں لپیٹنا
ضروری تھا اس کے لیے میں نے ڈرائنگ ٹیبل پر پڑی ہوئی
شیٹ استعمال کی جو ٹرانسمیٹر سے سوگنا بڑی تو ہو گی لیکن
میرے نقطۂ نظر سے فائدہ مند تھی۔ میں نے ٹرانسمیٹر کو اس
میں اچھی طرح لپیٹ لیا اور بغل میں دبا کے ڈرائنگ روم کے
اس دروازے سے باہر آ گیا جو برآمدے کی جانب کھلتا تھا۔
یہ ڈبل دروازہ تھا۔ ایک فولادی پروف جالی والا اور دوسرا
گلاس ڈور۔ فولادی پروف دروازے اندر کی طرف کھلتے تھے۔
چنانچہ ان کی چٹخنی عموماً نہیں لگائی جاتی تھی لیکن اس کو بھی
سے باہر کے گلاس ڈور کی کنڈی کا کھلا رہ جانا بعید از امکان
نہ تھا۔ مجھے اپنے نقش قدم کا خیال آیا۔ پھر مجھے اس بات سے
اطمینان حاصل ہوا کہ رضوی صاحب صبح اٹھتے ہی ڈرائنگ
روم میں نہیں آئیں گے اور ان کے آفس جانے سے پہلے ملازم
پورے فرش کو گیلا کپڑا مار کے صاف کر چکی ہو گی۔

اب مجھے زمین کھودنے کے لیے کسی اوزار کی ضرورت تھی
خواہ وہ لوہے کی سلاخ ہی کیوں نہ ہو۔ عقبی حصے میں دیوار کے
ساتھ باغبانی کے آلات موجود تھے۔ میں نے صرف ایک
کھرپی لی اور سرونٹ کوارٹر کے پیچھے چلا گیا۔ نرم زمین تلاش
کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ شاید پہلے کسی نے
اس حصے میں دھنیا پودینا وغیرہ کاشت کیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی
کیاریوں میں اب صرف گھاس رہ گئی تھی یا ٹماٹر کے پرانے
بے ثمر پودے۔ میں نے پوری احتیاط کے ساتھ زمین کھودنا
شروع کی۔ ایک فٹ گہرا گڑھا لمبائی میں ڈیڑھ اور چوڑائی
میں تقریباً اتنا ہی تھا۔ پلاسٹک شیٹ کے کفن میں لپٹے ہوئے
ٹرانسمیٹر کو اس لحد میں اتار کے میں نے مٹی برابر کی اور بیچ میں
سے دبا کے اوپر خشک پتے بکھیر دیے۔ اب یہیں کی نم آلود
مٹی صبح سورج طلوع ہونے کے بعد ایک گھنٹے میں باقی
زمین سے الگ نظر نہیں آ سکتی تھی۔ اپنے کام سے فارغ
ہو کے میں نے اس جگہ کی نشانی تلاش کی۔ سرونٹ کوارٹر
کی عقبی دیوار کے ایک کنارے سے یہ پندرھویں اینٹ کے
سامنے کی جگہ تھی۔ دیوار سے چار فٹ کے فاصلے پر۔

گھڑی کو صاف کر کے اپنی جگہ رکھنے کے بعد میں کوارٹر میں
پہنچا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ میں اطمینان سے باتھ روم
گیا اور ہاتھوں کو دھو کر صاف کیا۔ باتھ روم کی روشنی میں
جوتوں اور کپڑوں پر سے مٹی جھاڑی۔ اب کسی کے جاگ اٹھنے
کا کوئی خطرہ نہیں رہ گیا تھا۔ رات کو کسی کا سوتے سے اٹھ کر باتھ
روم جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ تولیے سے ہاتھ صاف کر کے
میں واپس بستر تک میں بہت مطمئن اور خوش تھا۔ جو
چیز میں نے حاصل کی تھی وہ بہت کارآمد تھی۔ کسی مرحلے پر
رسائی کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتی تھی اور بالکل
بے ضرر تھی۔ مجھ پر کسی کے شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں
ہوتا تھا۔ چوری کو اسی سے منسوب کیا جائے گا جو غائب ہو
چکا تھا۔ رضوی صاحب ایک منطقی نتیجہ اخذ کر لیں گے
کہ ٹرانسمیٹر کی نشریات کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو وہ سمجھ گئے
ہوں گے کہ یہ فنی خرابی کا نتیجہ نہیں ہے۔ ان کے آلات برآمد کر
لیے گئے ہیں اور وہ تصدیق کے لیے آتے ہوں گے تو گھر کی تلاشی
کی صورت میں انہیں مطلوبہ چیز صاف سامنے رکھی ہوئی مل گئی
ہو گی۔ وہ تو یہ تصور کر کے سمجھیں گے کہ انہوں نے ایسی چیز کو حفاظت
سے کیوں نہیں رکھا اور پھر شامت آئے گی نوکر کی
یا خانساماں کی جس کی شکل چور جیسی یا سنتری کی جو حرام خوری سے
مست ہوتا رہ گیا۔ تاہم ڈانٹ ڈپٹ سے زیادہ ان کو سزا
نہیں ملے گی۔ وہ عادی ہیں اتنا کھانے کو تیار ہو جائیں گے کہ ان
کی بدنیتی تو کچھ نہیں ہوئی۔ ویسے آدمی خطا کا پتلا ہے۔ اتنا تو
رضوی صاحب بھی سمجھتے ہیں۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی میری نظر محسن کے بستر پر گئی۔
مجھے کوئی جھٹکا سا لگا اور میرے قدم رک گئے۔ یہ میری
نظر کا دھوکا نہیں تھا۔ محسن کا بستر واقعی خالی پڑا تھا۔ اس کے
جوتے بھی موجود نہیں تھے۔ وہ کہاں جا سکتا ہے؟ میں
نے بستر پر بیٹھ کے سوچا۔ کیا اس کے ذہن میں بھی یہ خیال
آیا تھا کہ ایک ٹرانسمیٹر حاصل کرنے کا یہ مناسب ترین موقع
ہے۔ اگر وہ بھی اسی نیت سے نکلا ہوتا تو اب تک
واپس آیا ہوتا۔ اگر اتفاق سے میں اور وہ کوٹھی کے اندر نہیں
ملے تو زیادہ سے زیادہ دس منٹ بعد اس کو لوٹ آنا چاہیے
تھا۔ ممکن ہے کہ وہ ابھی تک کوٹھی کے ایک ایک کمرے
میں جھانکتا پھر رہا ہو۔ میں نے ٹرانسمیٹر کو دفن کرنے میں آدھا
گھنٹہ لگایا تھا۔ مجھے غائب پا کے اس کا حیران ہونا اور
میری واپسی کا انتظار کرنا لازمی تھا۔ مجھ سے چھپ کے وہ
کہاں جا سکتا ہے؟ ایک جگہ، صرف ایک جگہ کسی غیبی آواز

نے کہا تھا "اس کے پاس بھرا ہوا ریوالور بھی ہے۔ وہ اپنی بہن کے
لیے زندہ رہنے کا حق حاصل کرنے جا سکتا ہے۔ وہ چراغ دین
کو آج رات ہی قتل کر دے تو کیا عجب۔ اس کی جذباتی کیفیت
کا بحران خطرناک تھا۔"

اس خیال نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ حالانکہ میں خود بھی
یہی کرنا چاہتا تھا مگر میں محسن کو اس کی اجازت نہیں دے
سکتا تھا۔ چراغ دین میرا دشمن تھا اور اس کی دشمنی مجھے ورثے
میں ملی تھی۔ اس کے ناپاک وجود کو ختم کرنے کا حق پہلے مجھے ملنا
چاہیے۔ محسن کا حق میرے بعد آتا ہے۔ وہ چراغ دین کو اس
کے ارادے کی سزا دینا چاہتا تھا جس کی تکمیل ایک جان کے
زیاں کا سبب بن سکتی ہے۔ میں اسے ایک جرم کی سزا دینا
چاہتا ہوں جو ایک جان کے زیاں کا سبب بن چکا ہے اور
ایک خطرے کا انسداد کرنا ہے۔ مجھے ایک ظلم کا انتقام لینا
ہے۔ وہ مجھ سے میرا حق کیسے چھین سکتا ہے۔ میں بگولے کی طرح
اٹھا اور طوفان کی طرح باہر نکل گیا۔ ڈھائی میل کی مسافت
میرے قدموں نے آدھے گھنٹے میں طے کی۔ پونے چار بجے
میں چراغ دین کی کوٹھی کے سامنے تھا۔ گلاب خان برآمدے
میں چارپائی پر سو رہا تھا۔ چراغ دین کی کار پورچ میں کھڑی
تھی۔ اندر کوٹھی پر مکمل سکوت تھا۔ مجھے کوئی ایسی ترکیب نہیں
سوجھ رہی تھی جس سے میں کوٹھی کے اندر چراغ دین کے زندہ
یا مردہ ہونے کا یقین کر سکوں۔ میں چوکیدار کو جگا نہیں
سکتا تھا کہ جا کے دیکھو تمہارا صاحب سو رہا ہے یا مر چکا ہے۔ مجھے
یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ چراغ دین کی خواب گاہ کون سی ہے اور
وہاں تک میری رسائی ممکن ہے یا نہیں۔ بفرض محال میں
خواب گاہ میں داخل ہو جاتا تب بھی چراغ دین کو جگائے
بغیر کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ کی نیند نہیں سو چکا ہے۔

طریقہ مجھ پر وحی کی طرح نازل ہوا۔ چند قدم کی مسافت
پر ریلوے اسٹیشن تھا اور وہاں ایک پبلک بوتھ تھا۔ ٹیلیفون
نمبر مجھے یاد تھا۔ اس نمبر کو اپنے والد کی کوٹھی کا نمبر سمجھتے ہوئے
میں نے فون ... سے کئی بار ٹرنک کال کی تھی۔ سٹی فون بوتھ کے باہر
"آؤٹ آف آرڈر" کا نوٹس آویزاں نہیں تھا۔ یہ بڑی غیر معمولی
بات تھی۔ ایک غیر معمولی بات یہ ہوئی کہ بوتھ خادم کے
کاؤنٹر سے مجھے ایک روپے کا نوٹ لے کر خوش اخلاقی کے ساتھ
سکے بھی دے دیے گئے۔ حالانکہ میری معلومات کے مطابق ریلوے
کوئی "ہفتہ خوش اخلاقی" نہیں منا رہی تھی۔ میں نے چراغ دین
کا نمبر ملایا اور ریسیور تھامے کھڑا رہا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ پورے
دو منٹ بعد چراغ دین کی آواز آئی "... سی ..."

"چراغ دین!" میں نے آواز بدل کے کہا۔ "تو زندہ ہے ابھی تک۔ سچ بول۔ آج تیری زندگی کی آخری رات تھی؟"

"یہ... یہ کیا بکواس ہے؟" چراغ دین نے نروس لہجے میں کہا۔ "کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟"

"تمہارا باپ۔" میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ "اور تمہارا قاتل ان چیف۔" پھر میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ ابھی تک قتل نہیں ہوا تھا اور اب اس کا صبح تک قتل ہونا بھی ناممکن تھا۔ میں جانتا تھا اب وہ سو نہیں سکے گا۔ میں نے محسن کے عزائم کو ناکام بنانے کی جو کوشش کی تھی وہ کامیاب رہی تھی۔ یا محض غلط فہمی کے باعث میں نے ایک بے مقصد حرکت کی تھی؟ محسن اگر ادھر نہیں آیا تو کدھر گیا تھا؟ یہ سوال واپسی پر میرے ذہن میں گردش کرتا رہا۔

مزید حیرانی مجھے اس وقت ہوئی جب واپس پہنچنے پر مجھ سے محسن نے سوال داغ دیا۔ "کس مشن پر تشریف لے گئے تھے جناب؟" وہ بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا جاگ ہی رہا تھا۔

"تمہیں ڈھونڈ رہا تھا۔" میں نے سچ بولتے ہوئے کہا۔ "جناب کی سواری آدھی رات کو کہاں گئی تھی؟"

"میں؟ میں تو کہیں بھی نہیں گیا تھا۔" محسن نے حیران ہو کے کہا۔

"تو جھوٹ بول رہا ہے۔ تیرا بستر خالی تھا۔ مجھے تشویش لاحق ہو رہی تھی۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بستر تیرا خالی تھا۔" محسن نے کہا۔ "میں دیکھنے اٹھا تھا۔ ویسے بھی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ تو باتھ روم میں تھا نہ باہر، گھوم کے لوٹ آیا اور بس، تب سے جاگ رہا ہوں اور انتظار کر رہا ہوں۔ ابھی چائے بنائی ہے، گرم ہو گی۔" میں نے سر ہلایا اور وہ باورچی خانے میں جا کے اپنے لیے چائے بنانے لگا۔ اس کی وضاحت سے مجھے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا۔ میں واقعی باتھ روم میں تھا اور عین اسی وقت محسن باہر نکل گیا۔ لیکن نجانے کیوں مجھے یوں لگا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ واپسی پر میں نے اسے ٹرانسمیٹر کے حصول کے مشن میں کامیابی کی اطلاع دی۔ اس نے شدید مسرت کا اظہار کیا۔

"اب ہم باقاعدہ ... ایجنٹ ... ہیں۔" اس نے اعلان کیا۔ "میدان پاکستان۔ ہمارے پاس ریوالور بھی ہیں اور خفیہ پیغام رسانی کے لیے ٹرانسمیٹر بھی۔"

"اس کے بعد ضرورت رہ جاتی ہے ایک کوڈ کی۔" میں نے چائے پیتے ہوئے ارشاد کیا۔ "ایک خفیہ زبان ایجاد کرنی پڑے گی تاکہ ہمارا سگنل کہیں اور ریسیو ہو جائے تو مخبروں کی سمجھ میں نہ آئے کہ کیا مطلب ہے۔ یہ مسئلہ سنجیدگی سے غور طلب ہے مگر آسان بھی نہیں۔"

"ہاں! کافی ریسرچ اور غور و خوض کرنا پڑے گا۔" محسن نے تائید کی۔ "رازداری کی شرط بھی بے حد اہم ہے۔ ہم دونوں کے سوا کسی کو اس کوڈ کا پتہ نہیں چلنا چاہیے اور ہمیں بھی زبانی یاد ہونا چاہیے۔ تحریر کے چوری ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے۔"

صبح ہونے تک ہم صبح کا اجالا پھیلنے تک اسی پر غور کرتے رہے۔ مثلاً سکندر اعظم مقدونیہ کا رہنے والا تھا چنانچہ پیغام دیتے وقت میں کہوں۔ "ریڈیو مقدونیہ۔"

"اور ٹرانسمیٹر میرے پاس ہو گا۔" محسن نے کہا۔

کچھ دیر غور فرمانے کے بعد ... مقصد یہ تھا کہ ہم سنجیدہ مسائل پر بات کرنے سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ یہ مسائل عظیم تر شکار کی طرح ہمارے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔ میر شرافت علی کا قتل، وزیر خان کی موت، ایم پی ٹی وی کے معاملات، انعم کے گھر کی تباہی۔ فوزیہ کا قتل، پوسٹ مارٹم۔ بے فکری کی پرانی زندگی خواب و خیال ہو گئی تھی۔

آٹھ بجے میں عثمان رضوی صاحب کی کار سے کورٹ روانہ ہوا تو شیروانی صاحب میرے ساتھ تھے۔ پہلے بھی گلاب خان کو لینا تھا جو چراغ دین کی کوٹھی میں ... صورت حال ... ہو گئی۔ شیروانی صاحب جو سابق سفیر تھے ایک بار پھر اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کی سوچ رہے تھے اور سارے ... کا رشتہ میرے اور محسن کے درمیان قائم ہونے والا تھا۔ اب دوبارہ محسن اور چراغ دین کے درمیان قائم ہو رہا تھا مگر اس کی تجویز ضرور زیر غور تھی۔ چراغ دین نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ وہ شیروانی صاحب کے قدموں میں لوٹے جا رہا تھا اور میں محسن کی صورت سے بدلتے ہوئے رنگ دیکھ رہا تھا۔ بیٹھنے کے لیے وقت نہیں تھا جس کا اسی پی ٹی کو بڑا ملال تھا۔ اس نے کہا۔ "جناب آپ نے بڑی غیریت برتی کہ آنے کی اطلاع نہیں دی۔ میں لینے حاضر ہو جاتا اور یہ آپ کس کی گاڑی میں پھر رہے ہیں؟ گھر کی گاڑی ہے۔"

اس سے پہلے شیروانی صاحب انکار کرتے، میں نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے انکل، واپسی ایک ... کی کار بھی نہ ہو تو اچھا ہے۔ اسے واپس کر دیتے ہیں۔ ہم چراغ دین صاحب کی گاڑی لے لیتے ہیں۔" چراغ دین کی پیشکش رسمی اخلاق کا مظاہرہ تھی مگر شیروانی صاحب قائل ہو گئے۔ محسن نے مجھے حیرانی سے دیکھا مگر خاموش رہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس بات کا بھی کوئی مقصد ہے۔ میں نے چراغ دین سے چابیاں لیں اور اپنے ساتھ شیروانی صاحب کو اور پیچھے گلاب خان کو بٹھا لیا۔ محسن سے میں نے کہا کہ وہ رضوی صاحب کی گاڑی گھر چھوڑ کے سیدھا کورٹ آ جائے۔ اس کے بعد میں کار کو سیدھا شمالی ناظم آباد کی طرف لے گیا۔ ... گھوم کر ... پیچھے سے مالی ... ہوئے۔ ... صرف دو گواہ تھے۔ باقی وہ ... سے آفس ہی نہیں آئے تھے۔ ان میں اس وقت انچارج بھی شامل تھا تاہم مجھے تین ہی گواہوں کی ضرورت تھی جو فراہم ہو گئے تھے۔

عدالت ... منظر نے قانونی کارروائی کے مراحل میں بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا اور دو بجے کے بعد عدالت سے ڈاکٹر نامزد کر دیے گئے اور اگلے روز صبح نو بجے پوسٹ مارٹم کے لیے احکامات صادر ہوئے۔ ایک اے سی اور ایم کی موجودگی میں گواہوں کو قبر کی نشاندہی کرنی تھی۔ ڈاکٹروں کو قبرستان میں ہی لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم کرنا تھا۔ جب ہم عدالت سے نکلے اور گواہ رخصت ہو گئے تو مجھے فضا بوجھل سی لگی۔ سوگوار اور ماتم کناں سکوت جس میں موت کی ہیبت تھی۔ درختوں کی سرسراہٹ میں آسیب پکار رہے تھے۔ گاڑیاں بے آواز گزر رہی تھیں اور لوگ سہمے سہمے چل رہے تھے۔ میرے دل پر ایک بوجھ تھا اور میرے تصور میں اپنے باپ کا وہ چہرہ تھا جو میں نے آخری بار دیکھا تھا لیکن یہ چہرہ ایک جھلک دکھا کے اندھیرے میں غائب ہو جاتا تھا۔ پھر اندھیرے میں ایک ڈھانچہ جھلکنے لگتا تھا۔ اس کی ہڈیاں لرزتی تھیں، کڑکڑاتی تھیں۔ یوں جیسے وہ ڈھانچہ بول رہا ہو۔ "پہچانا مجھے؟ سکندر! میں ہی تمہارا باپ ہوں، جب تم نے دیکھا تھا۔ اب تو میں وہی ہوں اور ویسا ہی ہوں جیسے میرے اردگرد بسنے والے شہر خموشاں کے باسی ہیں۔" بچپن میں قبرستان سے گزرتے ہوئے ڈر لگتا تھا اور وحشت ہوتی تھی۔ قبریں جن کے تاریک خلا میں جھانکنے پر شوق مجبور کرتا تھا اور خوف منع کرتا تھا۔ پرانی قبروں میں ... روشنی نظر آتی ہے۔ ہڈیوں کا فاسفورس چمکتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ میاں اعمال نیک ہوں تو قبر میں اجالا رہتا ہے۔ ... گناہوں کا اندھیرا ... قصے۔ ... کی علامت ... بزرگ کی قبر جو تقریباً ہر شہر قصبے میں دستیاب تھی اور اب یہ ... خود سرہانے موجود ہو گا۔ ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں لاش نکلوائے گا اپنے باپ کی۔ اکثر لوگوں کے نقطہ نظر سے لاش نکلوانا بے حرمتی تھی۔ مرنے والے کی روح کے لیے عذاب۔ مگر ... ایک ضرورت۔ کیسا اسرار اور کمال کا آسیب ہے۔ جو حقیقت زندگی میں دفن ہو گئی تھی اب عیاں ہو گی۔ سب کے سامنے ...

کام کا ایک وقت مقرر ہے۔"

یہی اداسی اور بوجھل پن سب کے مزاج پر حاوی تھا۔ محسن چپ تھا اور شیروانی صاحب اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ میری طرح وہ بھی ان یادوں کی پرچھائیوں میں گم تھے جو مرنے والے اور خود ان کے اپنے ماضی کا مشترک سرمایہ تھیں۔

"سکندر! تم نے یہ سب نہ کیا ہوتا تو اچھا تھا۔" وہ اچانک بولے۔ پھر انہوں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی اور پھر وہ خاموش ہو گئے۔

"پہلے کبھی بھی ایسا ہوا تھا صاحب!" گلاب خان نے کہا۔ "ہمارا علاقہ میں اب بھی یہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ ہم سب کو معاف کرے۔"

حسب توقع ضامن رضوی صاحب اپنے گھر میں ہونے والی چوری پر برافروختہ تھے۔ انہوں نے چوری کی باقاعدہ رپورٹ درج کرائی تھی۔ اور تفتیش کرنے والوں نے ہر جگہ دیکھی تھی۔ وہ جہاں سے تاروں کو ٹیپ کیا گیا تھا، وہ جہاں سے تار زمین میں دبائے گئے تھے اور وہ درخت جہاں سے ٹرانسمیٹر برآمد ہوا تھا۔ تفتیش کرنے والوں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا تھا۔ رضوی صاحب نے مقفل الماریوں اور صندوقوں کے سوا ان کو ہر جگہ دیکھنے کی اجازت دی تھی۔ الماریاں اور صندوق انہوں نے خود دیکھے تھے مگر کہیں سے کچھ نہیں ملا تھا۔ ان کی بیگم ... ان کی بیوی ہونے کی

www.paksociety.com

وجہ سے ضابطے کی کارروائی تو مکمل تھیں لیکن شیروانی صاحب
کی بیوی حیران تھیں کہ سیل فون جیسی کوئی چھوٹی سی چیز گم ہو
گئی ہے تو اتنا ہنگامہ کس لیے۔ بازار میں مل جائے گی اور اب تو
خیر سے باہر کی ہر چیز دستیاب ہے۔ ہماری عدم موجودگی میں
سرونٹ کوارٹر کی تلاشی بھی لی گئی تھی جس کا ہمیں ڈر تھا چنانچہ ہم
ریوالور اپنے ساتھ چھپا کے لے گئے تھے۔ رابعہ کو کچھ شک تھا
چنانچہ اس نے مجھ سے علیحدگی میں پوچھا بھی تھا کہ یہ حرکت
ہماری تو نہیں ہے۔ میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ میں کوئی غیر ملکی
ایجنٹ ہوں۔ میں ٹرانسمیٹر کا کیا کروں گا۔"
اس نے کہا "تم ہو تو بڑے چھپے رستم۔ ایڈونچر میں شوق"
میں نے کہا "ہاں، وہ تو ہم ہیں لیکن
فلمی ہیرو نہیں ہیں۔ دل کا ٹرانسمیٹر استعمال کرتے ہیں اور ٹیلی
پیتھی سے وائرلیس کا کام لیتے ہیں جس سے دل ملا ہوا اس سے
بات ویسے ہی ہو جاتی ہے۔" عجیب وہ مسکرائی تو مجھے دلی مسرت ہوئی۔
رابعہ ایک گھر میں تھی اور اداس نہیں لگ رہی تھی۔ اگر اس کا پرانا گھر
جل کے خاک نہ ہوتا تب بھی وہ کہیں وہاں سے ہی تو باقی ہو
جاتی۔ اس کی کار مل گئی تھی مگر ابھی پولیس کے قبضے میں تھی۔
اسے کسی ایم سے ڈیفنس آسکوٹر وہ چار دن میں مل جانے کے بعد وہ
اس کو ٹیسٹ جینٹ کرنے کی سوچ رہی تھی۔ میں نے کہا کہ میں سے تو
تو ہوں میں خود قدامت پسند ہوں، خصوصاً رشتوں کے معاملے میں
خواہ وہ انسانوں سے ہوں یا چیزوں سے۔ اس کا ایک ثبوت میں
خود بھی تھا جس سے اپنے جذباتی رشتے کو وہ برسوں سے دل میں
یوں چھپائے بیٹھی تھی جیسے خزانے میں کوئی صدف ایک موتی
لیے برسوں سے موجود ہو مگر کسی کو اس کی خبر نہ ہو۔
علاقائی پولیس افسر اس سے تفتیش کے سلسلے میں بیان لینے
آتے تھے اور وہ گھنٹے تک اس سے مختلف نوعیت کے سوالات
کرتے رہتے تھے۔ رابعہ نے کہا تھا کہ میرا کوئی دشمن نہیں۔ میں کسی
پر شک نہیں کر سکتی۔ انہوں نے ملبے سے برآمد ہونے والوں کی
تصویریں بھی دکھائی تھیں۔ رابعہ نے کہا تھا کہ میں ان میں سے کسی
کو نہیں جانتی۔ نوزیہ اور اس کی ماں نے یہ کام بڑی ہوشیاری سے
کیا تھا چنانچہ بعد میں نوزیہ کی ماں نے رابعہ کے بارے میں کہا تھا
کہ کمال عورت ہے۔ کیسی فر فر انگریزی بولتی ہے اور پولیس والوں
سے کیسے بات کرتی ہے جیسے ان کی افسر ہے۔ رضوی صاحب کی
بیگم نے اس میں تعریف کے پہلو کو نوٹ کیا تھا اور کہا تھا کہ
آخر بڑی وکیل ہے تو ہے گی کیوں اور ساتھ ہی رابعہ کی شرافت،
نیکی اور سادگی کی خوبی کو سراہا تھا جس کا مسز شیروانی نے مزید برا
مانا تھا۔ ان کے لیے رابعہ کو آوارہ، بدکردار اور بے شرم کہنے تو

کہنے کے مواقع تو ختم ہو ہی گئے تھے۔ بحیثیت شریک حیات
اس کو میرے مقصد کی خرابی قرار دینا بھی ممکن نہ رہا۔ اس کا جواز
تھا جس میں عورتوں کے لیے آزادانہ مردوں سے میل کے لیے الگ انتظام
کیا گیا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ شریک ہونے والے مردوں کی
تعداد بہت زیادہ ہے مگر ان میں سب وکیل نہیں تھے کوئی
وکیل اور دو جج تھے لیکن خود رابعہ کے خاندان نے سوئم کا
بائیکاٹ کیا تھا صرف اس لیے کہ اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی
غیروں کے گھر کیوں منتقل ہوئی۔ رابعہ نے افسوس کے ساتھ ان
کا اظہار کیا وہ آ گئے تو اپنی جہالت اور تنگ نظری کے مظاہرے
کے سوا کیا کرتے۔ ان کی بے سروپا قیاس آرائیوں پر مبنی باتیں
کی دل آزاری کے سوا کیا حاصل ہوتا اور طعنوں کے سوا وہ کیا دیتے
تعزیت کے لیے آنے والوں میں ہائی کورٹ کے جج
صاحبان بھی تھے جو نہیں آ سکے تھے انہوں نے ٹیلی فون پر اظہار
ہمدردی کیا تھا۔ رابعہ کو دوستوں اور مخلص مددگاروں کی کمی نہ
تھی۔ مسز شیروانی اس سے مرعوب ہونے کے بعد اپنی بہو کے
بارے میں شدت سے احساس کمتری کا شکار ہو گئیں۔ ان کو
میرا نوزیہ کو چھوڑ کے رابعہ کو اپنانے کا فعل بھی شرمناک نظر آتا
مگر بے جواز نہیں چنانچہ انہوں نے خود کو بے عزت محسوس کیا۔
وہ نوزیہ کو چراغ دین سے بیاہ دینے کی خبر ایسے سنا چکی تھیں
کہ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو اور میں خود کو بے عزت محسوس
کروں لیکن معاملہ الٹا نکلا تھا۔ ان کے معیار سے رابعہ بہت
اعلیٰ درجے کی خاتون ہوتی تھی۔ تعلیم، دولت، حسن صورت سیرت
میں انہوں نے رابعہ کو نوزیہ سے بہتر دیکھا۔ یہ ان کی عقل کا تقاضا
تھا۔ نہ میں انہیں سمجھا سکتا تھا کہ دل کے معاملات میں عقل کے
معیار نہیں چلتے اور نہ اپنا دل چیر کے دکھا سکتا تھا کہ وہ میری
مجبوریوں کو اپنی نظر سے دیکھیں۔ وہ لوگ رات کی فلائٹ سے
جانے والے تھے۔ محض نوزیہ کے مقابل نہ ہونے کی خاطر میں گھر
سے نکل گیا اور قبرستان جا پہنچا۔ بوڑھے گورکن نے جیسے کسی
انعام کی امید میں قبر پہ پانی کا ایک ٹین چھڑکا [illegible]
دس روپے دیے۔ پھر میں نے گلاب کے پھولوں کی پتیاں قبر
پر ڈالیں۔ اگربتیاں سلگائیں اور دست بدعا ہو گیا۔ پھر نجانے
کتنی دیر میں عالم استغراق میں آنکھیں بند کیے ہاتھ اٹھائے کھڑا
رہا۔ یہ ایک وجدانی روحانی کیفیت تھی جس میں میرا رابطہ مادی
دنیا کے گرد و پیش سے کٹ گیا تھا اور میں [illegible]
سے اپنے والد سے ہم کلام تھا۔ ان سے اس گستاخی پر معافی کا
خواستگار تھا کہ میں نے انہیں مرنے کے بعد بھی چین نہ لینے دیا
میں بھی میں ان کے لیے کچھ نہ کر سکا تھا خدمت گزاری کی بجائے

کا وقت آنے سے پہلے وہ بہو تیار ہے اور مجھ سے بہت دور چلے
گئے تھے۔ میرے والد کا خیال یہ بکر میرے مقابل تھا اور وہ مجھے
تسلی دیتے رہتے تھے، حوصلہ دیتے رہتے تھے اور سمجھا رہے تھے کہ انہیں
مجھ سے کوئی شکایت نہیں۔ انہیں مجھ پر فخر ہے۔ بوڑھے گورکن
نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں نے آنکھیں کھولیں۔ میں
اسی قبرستان میں قبر کے سرہانے کھڑا تھا۔ میرے اپنے دل کی
بات تھی جو تصور میں ڈھل گئی۔ میں کیسے فرق کر سکتا تھا کہ وہ
برحق ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ خبردار جو قبر تک مجھے چھوڑ آنا۔ آنسو
میری آنکھوں سے بہہ کر رخساروں پر سے پھسل کر قبر کی مٹی پر گر
رہے تھے۔
"صبر بیٹا!" بوڑھے گورکن نے کہا۔ "صبر کرو۔ مردے کے
سرہانے رونے سے اس کی روح کو تکلیف ہوتی ہے۔"
"یہ میرے والد تھے بابا! میں اپنی بدقسمتی پر رو رہا ہوں کہ
ان کی خدمت نہ کر سکا۔" میں نے کہا۔
"چلو اب ان کی مغفرت کے لیے جو کچھ کر سکتے ہو کرو۔
باپ کا سایہ سر سے اٹھ جائے تو سب کو یہی احساس ہوتا ہے۔
زندگی میں بیٹے بہت کچھ کر سکتے ہیں مگر نہیں کرتے۔" گورکن بولا۔
مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے حالات سے واقف ہے۔ جانتا
ہے کہ میں کیا کر سکتا تھا جو میں نے نہیں کیا۔
صبح نو بجے پولیس نے قبر کے گرد قناتوں کی عارضی دیوار کھڑی کر
دی تھی۔ ڈیوٹی مجسٹریٹ ساڑھے نو بجے پہنچا اور اس نے متعلقہ
گواہوں کو قبر کی نشاندہی کے لیے کہا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ
اپنی آنکھوں سے قبر کھودنے والوں کو ایک ڈھانچہ نکالتے
دیکھوں اور تمام عمر اس کے تصور کی اذیت اٹھاؤں چنانچہ میں
قنات سے باہر ان کے ساتھ کھڑا رہا۔ ڈاکٹر حضرات میں سے ابھی
کوئی نہیں پہنچا تھا۔ وہ ہمارے پاس آ کھڑا ہوا۔ گلاب خان، پولیس
والے اور مجسٹریٹ کے علاوہ دونوں قبر [illegible] گواہ
ثابت کیا گیا تھے۔
"ڈاکٹر صاحب!" میں نے کہا۔ "میں آپ کی پیشہ ورانہ
ذمہ داریوں میں مداخلت نہیں کر سکتا اور نہ آپ کی رائے پر
اثر انداز ہونے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ صرف معلومات کے لیے کچھ
پوچھنا چاہتا ہوں۔"
نوجوان ڈاکٹر بڑی بے نیازی سے سگریٹ پی رہا تھا لیکن
"ضرور، کوئی جذباتی مسئلہ نہیں تھا؟ پوچھیے" وہ بولا۔
"اس قسم کے پوسٹ مارٹم میں" میں نے کہا۔ "جہاں صرف
ڈھانچہ ملتا ہو، اگر کسی مہلک ضرب وغیرہ کا نشان مل جائے
تو اور بات ہے لیکن کیا موت کے دیگر اسباب کا تعین بھی آسانی

سے ہو جاتا ہے؟"
"میڈیکل سائنس اب بہت ترقی کر گئی ہے۔" وہ بولا۔
"ہمارے پاس جدید ترین طریقے ہیں۔ آدمی کے ناخن اور بال
بہت عرصے تک باقی رہتے ہیں اور زہر خورانی وغیرہ کا پتہ دے
سکتے ہیں مثلاً آرسینک کے اثرات۔"
"کتنے عرصے تک؟" میں نے کہا۔
"پانچ سے دس سال بعد تک۔ اس کا انحصار حالات
پر ہے۔" وہ بولا۔ اسی وقت دوسرا ڈاکٹر نمودار ہوا اور پھر گورکن کی
تلاش شروع ہوئی۔ اس وقت تک دس بج چکے تھے۔ ایک
کانسٹیبل قبرستان میں اس کے خستہ حال مکان تک گیا اور گورکن
کے بجائے ایک نوجوان کے ساتھ واپس آیا۔ "یہ گورکن کا لڑکا ہے
جناب۔" کانسٹیبل نے مجسٹریٹ سے کہا۔ "وہ بڈھا تو معلوم نہیں
کہاں چلا گیا ہے۔"
"کیوں؟" مجسٹریٹ نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا۔ "کیا اسے
احکامات نہیں پہنچائے گئے تھے کہ قبر کھودنی ہے؟"
کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ متعلقہ تھانے کا
ایس ایچ او بہتر طور پر بتا سکتا تھا مگر وہ موجود نہیں تھا۔ گورکن
کا لڑکا آگے آیا۔ "بابا کا شام کو جی خراب تھا سرکار، وہ دوا لینے شہر
گئے تھے۔ رات ہو گئی تھی، صبح ہو گئی ہیں..."
"تم کر سکتے ہو یہ کام؟" مجسٹریٹ نے دست بستہ نوجوان
کی طرف دیکھا۔ سر کے اشارے سے اس نے اپنی رضامندی ظاہر
کی۔
"اب تو میں ہی کرتا ہوں سرکار! بابا بوڑھے ہو گئے ہیں۔"
نوجوان نے گورکنی کے آلات سنبھالتے ہوئے کہا۔ مٹی پر پڑنے والی
کدال کی ہر ضرب مجھے اپنے دل پر محسوس ہوتی تھی جس نے کئی بار
مجھے ہمت سے کام لینے کی تاکید کی حالانکہ اس کی اپنی حالت غیر تھی۔
آدھے گھنٹے تک مکمل خاموشی میں صرف قبر کے کھودے
جانے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ پھر ایک چیخ سنائی دی۔

www.paksociety.com

پُرسکوت

قبرستان کے دہشت زدہ کر دینے والے ماحول میں یہ چیخ مجھے زیادہ بھیانک محسوس ہوئی۔ صرف ایک لمحے کے لیے میں نے حیران ہو کے سوالیہ نظروں سے محسن کو دیکھا۔ جو لوگ اس کارروائی میں شریک تھے عاقل و بالغ تھے اور اگر ان کو یہ کام آدھی رات کے ویران سناٹے میں کرنا پڑتا تب بھی کسی قبر میں سے برآمد ہونے والے ڈھانچے کو دیکھ کر کوئی اس طرح چیخ نہ مارتا۔ پھر ایک گورکن کا جوان بیٹا جو اسی شہر خموشاں کا ایک مکین تھا اور جس کا پیشہ ہی انسانوں کو سپردِ خاک کرنا تھا، کس بات سے خوف زدہ تھا؟

میں اور محسن ایک ساتھ قنات کی عارضی چار دیواری میں داخل ہوئے تو میں نے مجسٹریٹ اور ڈاکٹروں کو تازہ مٹی کے ڈھیر پر سے قبر میں جھانکنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ ان کی حیرت اور تجسس کے جذبات ان کی صورتوں پر تحریر تھے۔ نوجوان گورکن کا متوحش چہرہ مجھے ان کی ٹانگوں کے درمیان دکھائی دیا۔ وہ باری باری سے جھانکنے والوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں پوری احتیاط کے ساتھ ایک ایسی جگہ جا کھڑا ہوا جہاں سے مجھے قبر کے اندر کی گہرائی صاف نظر آتی تھی۔ زمین ابھی مشکل سے تین فٹ کھودی گئی تھی اور مٹی میں سے دو انسانی ہاتھ نمودار ہو گئے تھے۔ یہ کسی ڈھانچے کے نہیں، جیتے جاگتے انسان کے ہاتھ لگتے تھے۔ گوشت پوست کے بنے ہوئے اور بے کفن۔ ہاتھوں سے عمر کا یا رنگ کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ جلد پر مٹی کی تہ تھی جس نے ان ہاتھوں کو ہم رنگِ زمین کر دیا تھا۔

نوجوان گورکن ابھی قبر کے تختوں پر کھڑا اٹھا، مجھے اس کے خوف کا سبب جاننے میں دیر نہ لگی۔ یہ میرے والد کی نہیں کسی اور شخص کی لاش تھی جسے اس قبر میں ڈال کے مٹی میں دبا دیا گیا تھا۔

"میں... میں نے تو پہلے ہی کہا تھا جناب عالی..." گورکن نے فریاد کناں لہجے میں کہا۔ "کہ مٹی نرم ہے..."

ایک ڈاکٹر نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "گھبراتے کیوں ہو، ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ کیا چکر ہے۔" اسی ڈاکٹر نے کہا جو کچھ دیر پہلے مجھ سے بات کر رہا تھا۔ "مجسٹریٹ صاحب موجود ہیں۔"

"گڑا ہوا ہے۔ قبر کی شناخت میں غلطی کی ہے۔" مجسٹریٹ نے گویا فیصلہ صادر کیا۔

"اس کا فیصلہ تو بعد میں بھی کیا جا سکتا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "پہلے آپ یہ تو دیکھیے کہ برآمد کیا ہو رہا ہے اور کس طرح؟" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

مجسٹریٹ نے اپنے وقار اور متانت میں فرق نہیں آنے دیا۔ "ہاں ہاں۔ پہلے اسے نکالو، یہ جو بھی ہے۔ لیکن ذرا احتیاط سے۔"

"سلیو کھرکے باقی مٹی ہاتھ سے ہٹاؤ۔" دوسرے ڈاکٹر نے حکم دیا۔ گورکن نے تعمیل کی۔ ہاتھوں کے آس پاس سے مٹی سرکتے ہی ایک انسانی سر نمودار ہوا جس کے بالوں نے بھی مٹی کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ ابھی مجھے یہ خیال ہی آیا تھا کہ نوجوان گورکن چلایا۔

"یہ تو... یہ تو میرا بابا ہے۔" اس نے سر کو اوپر اٹھایا۔ چہرہ پوری قوت سے چیخا۔ "بابا!" اور دیوانہ وار مٹی ہٹانے لگا۔ بوڑھا گورکن قبر کے ایک گوشے میں یوں بیٹھا تھا کہ گھٹنوں پر تھا اور گھٹنے سینے کے قریب تھے۔ اپنے دونوں ہاتھ اس نے سر پر یوں اٹھا کے رکھ لیے تھے جیسے سر کو مٹی کے بوجھ سے اور ضربات سے بچانا چاہتا تھا۔ مجسٹریٹ کے حکم پر دونوں سپاہیوں نے گورکن کی مدد کی اور ان سب نے مل کر بوڑھے کو اوپر کھینچا۔ اس کے جسم، کپڑوں اور بالوں میں مٹی یوں بھر گئی تھی کہ وہ مٹی کا مجسمہ لگتا تھا، لیکن اس کا چہرہ صاف رہا تھا کیونکہ اس کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ حیرانی مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ بوڑھے کی لاش اکڑ کر سخت نہیں ہوئی تھی اور جب اسے اٹھایا گیا تو وہ یوں اٹھا جیسے وہ مرا نہیں ہے، صرف بے ہوش ہے۔ چند منٹ بعد دونوں ڈاکٹروں نے اس بات کی تصدیق کر دی۔ بوڑھے کی نبض اور سانس کی رفتار بہت مدھم تھی لیکن وہ زندہ تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ سب جو ایک پرانی لاش کا ڈھانچہ نکالنے اور اس کی موت کے اسباب کا تعین کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے سب کچھ بھول کے اس ناقابلِ یقین حد تک سنسنی خیز واقعے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نوجوان گورکن جو باپ کی موت پر چلا چلا کے رونے لگا تھا اب اس کو زندہ پا کے خوشی سے رو رہا تھا اور گھٹنوں کے بل زمین پر ڈاکٹروں کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا۔ التجا کر رہا تھا کہ اس کے باپ کی زندگی بچا لی جائے۔ بالآخر ڈاکٹروں نے ذرا سے دھکیل کر ایک طرف کیا۔

"اگر تم نے ہمیں کچھ نہ کرنے دیا تو یہ مر جائے گا۔" ایک ڈاکٹر نے سخت لہجے میں کہا۔ "زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہوتی تو یہ اب تک کب کا مر چکا ہوتا۔" سوائے ان دو ڈاکٹروں کے جو بوڑھے کو بچانے کے لیے واقعی کوشاں تھے باقی سب اس غیر متوقع صورتِ حال پر حیران و پریشان کھڑے تھے۔ تینوں گواہ بوڑھے گورکن کے قبر میں سے زندہ نکلنے کو خدا کی قدرت کا معجزہ قرار دے رہے تھے لیکن دل کی بات کو زبان پر لانے سے گریز کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے صحیح قبر کی نشاندہی کی ہے مگر وزیر خان مرحوم کی لاش سے پہلے ایک زندہ لاش کا نکلنا چہ معنی دارد۔ جو کیا اس سے میرے شبہات کی تصدیق نہیں ہوتی ہو اور کیا مجھے اپنے والد کے انتقال پر قتل کا جو گمان تھا وہ بے سبب تھا؟ اس پراسرار واردات نے ایسے بہت سے سوالات کو جنم دیا تھا جو میرے ذہن سے بالواسطہ طور پر دوسروں کے ذہن میں منتقل ہو گئے تھے۔

ڈاکٹروں نے ہنگامی طور پر ایک زندگی کو بچانے کے اقدامات کیے اور انہوں نے اپنے ماتحت عملے کو حکم دیا کہ گورکن کو فوراً گاڑی میں پہنچا دیا جائے۔ نگرانی کرنے والے مجسٹریٹ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد باقی لوگوں کو انتظار کرنے کے لیے کہا اور خود بھی ڈاکٹروں کے ساتھ ہو لیا۔ "باقی کارروائی آج ہی مکمل ہو گی۔" اس نے چلتے چلتے کہا۔ "ہم ابھی واپس آ رہے ہیں۔"

"ہم یقیناً اسے ایمرجنسی کے سپرد کرنے سے پہلے واپس نہیں جا سکتے۔" ایک ڈاکٹر نے گھڑی دیکھی۔ "اس کے بعد لنچ کا وقت ہو جائے گا۔"

"مجھے بھی تو ایمرجنسی وارڈ میں پولیس کا پہرہ بٹھانا ہے۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "کہ کوئی غیر متعلقہ شخص اس کے قریب نہ جائے لہٰذا اس سے بات کرے۔ اس مقدمے کی تفتیش الگ ہو گی۔"

"پولیس سرجن اپنی ذمے داریاں سمجھتا ہے۔" اسی ڈاکٹر نے کہا۔ ان کے درمیان یہ اختلافِ رائے صرف اس بات پر تھا کہ مجسٹریٹ بھی ڈاکٹروں کے ساتھ جانے پر مصر تھا۔ میں ان کے پیچھے ہو لیا اور ساتھ چلنے لگا۔

"میں عینی شاہد ہوں۔ مجھے پولیس سرجن کو نہیں متعلقہ افسر کو ہدایات دینی ہیں۔ ایف آئی آر کے سلسلے میں۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "اگر خدانخواستہ یہ راستے میں یا ہسپتال میں پولیس کے آنے سے پہلے مر گیا اور مرنے سے پہلے اس نے کوئی بیان دینا چاہا تو میرے سامنے لیں گے نا۔"

"مجسٹریٹ صاحب!" میں نے کہا۔ "جس نے بھی اس بوڑھے گورکن کی جان لینی چاہی تھی وہ ہسپتال میں بھی اس کو قتل کر سکتا ہے، یا کرا سکتا ہے۔ خدا کرے یہ زندہ بچ جائے تاکہ چند صورتوں کی شناخت کر سکے۔"

"کن صورتوں کی؟" مجسٹریٹ نے میرے دخل در معقولات پر برا مانتے کہا۔ "تم جانتے ہو کسی کو؟"

"فی الحال میں کسی کا نام نہیں لے رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ زندہ رہا اور اس کی جان کی حفاظت کے انتظامات غیر موثر ثابت نہ ہوئے تو میں کچھ لوگوں کو یا ان کی تصویریں پیش کر سکوں گا۔"

"واٹ نان سینس۔" ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "ہسپتال میں قتل کرنا اور کرانا، یہ سب فلموں میں ہوتا ہے۔"

"دس از واٹ آل نان سینس۔" میں نے کہا۔ "آپ کو اصل حقائق کا علم ہوتا تو آپ کبھی ایسی بات نہ کہتے لیکن آپ کا کیا قصور۔ آپ نے صرف فلمیں دیکھی ہیں یا پوسٹ مارٹم کیے ہیں جن سے زندگی کے حالات کا پتہ نہیں چلتا۔"

"شٹ اپ مسٹر سکندر۔" مجسٹریٹ نے اپنے قانونی اختیارات استعمال کیے۔ "یہ ٹھیک ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو ان حالات کا علم نہیں جن کی وجہ سے یہ قبر دوبارہ کھودنے کے احکامات جاری کیے گئے تھے، لیکن ذرا عقل سے کام لیجیے۔ ہسپتال میں پولیس کی موجودگی میں کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ میں جو حفاظتی انتظامات کروں گا وہ کیسے غیر موثر ہو سکتے ہیں؟"

"اس کا بہتر جواب ایس ایس پی خاص طور پر دے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور وہ مجسٹریٹ اور جج صاحبان بھی دے سکتے ہیں جنہوں نے مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ کے گھر کی تباہی کا منظر دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے خبر تو آپ نے پڑھی ہو گی؟"

"آل رائٹ۔" مجسٹریٹ نے لاجواب ہو کے کہا۔ "کیا چاہتے ہیں آپ؟"

"جو کچھ میں چاہتا ہوں بتا چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس شخص کو ابھی زندہ رکھنا آپ کی ذمے داری ہے۔ یہ خود اپنے کیس میں اور میرے کیس میں استغاثہ کا سب سے اہم گواہ ہے اور اسی لیے مجھے اندیشہ ہے کہ قاتل پھر کوشش کریں گے۔"

"کس کے قاتل؟ کون قاتل؟" مجسٹریٹ نے کہا۔ "نام بولو ان کا۔ میں ان کو ہسپتال بلوا لیتا ہوں، تمہاری موجودگی میں۔"

ایک ڈاکٹر کی کار بوڑھے گورکن کو لے کر جا چکی تھی۔ دوسرے ڈاکٹر نے مجسٹریٹ کے لیے اپنی کار کا دروازہ کھول رکھا تھا اور انجن اسٹارٹ کیے منتظر تھا۔ میں نے اشارے سے اس کو جانے کے لیے کہا۔ "میں مجسٹریٹ صاحب کو اپنی گاڑی میں لے کر آتا ہوں۔" میں نے کہا۔ مجسٹریٹ نے تھوڑا سا منہ بنایا مگر ڈاکٹر نے فوراً دروازہ بند کیا اور کار روانہ ہو گئی۔

"میں ڈاکٹر کے سامنے کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمام واقعات کا خلاصہ پیش کرنا بھی ناممکن ہے لیکن میں ایک بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے والد کے قاتل اور گورکن کو زندہ در گور کرنے والے ایک ہی ہیں۔ اس کا ثبوت میں بعد میں دوں گا اور گورکن زندہ رہا تو

www.paksociety.com

عین ممکن ہے وہ ان کو پہچان بھی لے۔ میں ان کے نام آپ کو لکھ دوں گا اور آپ اگر قانون کی طاقت اور تمام وسائل استعمال کر کے انہیں گورکن کے سامنے لے آئے۔۔۔"

"اگر کا کیا سوال ہے؟" مجسٹریٹ نے چڑ کر کہا۔

"مجسٹریٹ صاحب! میں بڑے تلخ تجربات کے بعد یہ بات کہہ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اول تو وہ آئیں گے نہیں، شاید ملیں گے ہی نہیں اور اگر ملیں گے تو اس وقت جب وقت گزر چکا ہوگا۔ وہ گورکن کی زندگی میں اس کے سامنے نہیں آئیں گے۔ وہ اس کے مرنے کے بعد تو آ سکتے ہیں مگر اس سے پہلے نہیں۔ اب آپ کوشش کر دیکھیے۔ گورکن کو زندہ رکھنے کی اور انہیں بلوانے کی۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں ویسے تو آپ کو دیر ہو ہی گئی ہے۔ چند منٹ کی تاخیر اور سہی۔"

مجسٹریٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ لوگ ہسپتال پہنچ جائیں گے۔ میں ابھی یہیں کھڑا ہوں۔"

"میں آپ کو بلاوجہ نہیں روک رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میری باتوں کو اہمیت دیں اور یہ سمجھ لیں کہ معاملات کتنے سنگین ہیں۔ اس بات کو اپنی ذات تک محدود رکھیے گا۔ حفاظتی انتظامات مس رابعہ قادری کے گھر کو بچانے کے لیے بھی کیے گئے تھے اور بظاہر بہت اطمینان بخش تھے۔ نامعلوم افراد نے دھمکی دی تھی کہ وہ رابعہ قادری ایڈووکیٹ کی والدہ کا جنازہ اٹھنے سے پہلے ہی گھر کو اڑا دیں گے اور یہ دھمکی خاموشی سے دی گئی تھی چنانچہ حفاظتی انتظامات بھی رازداری سے کیے گئے تھے لیکن وہ سب بے سود ثابت ہوئے۔"

"تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟" مجسٹریٹ اب برہم ہونے لگا تھا۔ "میں خود توپ لے کر کھڑا ہو جاؤں یا فوج کو طلب کر لوں؟"

"یور آنر! آپ ایک نظر قبر میں جھانک لیں۔" میں نے یکلخت لہجہ بدل کے کہا۔ "میرا خیال ہے پھر آپ کو واپس نہیں آنا پڑے گا اور یہ لوگ بھی سمجھ جائیں گے۔ قبرستان میں کھڑے رہنے اور بلاوجہ انتظار کرنے کی تکلیف سے بچ جائیں گے۔ قبر میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔"

مجسٹریٹ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا اور اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میری ذہنی کیفیت کے نارمل ہونے پر شبہ ہے۔ "قبر تقریباً کھودی جا چکی ہے۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "ایک تختہ ہٹا کے دیکھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ میری بات کس حد تک درست ہے اور اس کے بعد آپ کے لیے میرے اندیشوں پر اعتبار کرنا ضروری ہو جائے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے۔۔۔ تمہارے والد کی لاش قبر میں نہیں ہوگی۔۔۔؟"

"جی۔" میں نے کہا۔ "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ گزشتہ رات کچھ لوگ گورکن کے پاس آئے تھے۔ انہوں نے غالباً زرِ کثیر دے کر گورکن کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ قبر کھودے اور میرے والد کی لاش کا ڈھانچہ ان کو نکال دے۔ ان کو خبر مل چکی ہوگی کہ صبح قانونی طور پر لاش کو نکال کے دوبارہ پوسٹ مارٹم کرنے کے احکامات جاری کیے جا چکے ہیں۔ دوبارہ پوسٹ مارٹم ہوتا تو یہ ثابت ہو جاتا کہ میرے والد کی موت طبعی نہیں تھی بلکہ ان کو واقعی قتل کیا گیا تھا۔ گورکن نے ایک دو تختے ہٹا کے ڈھانچہ کفن سمیت کھینچ لیا ہوگا اور ان لوگوں کے حوالے کر دیا ہوگا مگر بوڑھا گورکن خود باہر نہ آ سکا۔ اگر یہ کام اس نے لالچ میں کیا تھا تو انعام کی جگہ اس کو یہ صلہ ملا کہ اپنے ہی بیلچے کی ایک ضرب نے اسے بے ہوش کر دیا اور مارنے والے اس پر مٹی ڈال کے اور قبر کو پھر برابر کر کے چلے گئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ گورکن خود ہی مر جائے گا مگر قدرت کے کسی معجزے نے اسے زندہ رکھا۔ عین ممکن ہے گورکن سے یہ کام زبردستی کروایا گیا ہو۔ دیر اور وجہ کچھ بھی ہو جب وہ ہوش میں آئے گا تو اس کا بیان میرے خیال کی تائید کرے گا۔ مگر اس کا ہوش میں آنا اور زندہ رہنا یقینی نہیں۔ کم از کم میرے لیے۔ لیکن قبر میں دیکھنے کے بعد تو آپ کو یقین کر لینا چاہیے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بقائمی ہوش و حواس کہہ رہا ہوں۔"

مجسٹریٹ کچھ دیر میری صورت دیکھتا رہا اور تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔ "بات ایک نظر دیکھنے کی ہے تو میں پانچ دس منٹ کی تاخیر کا خطرہ مول لے سکتا ہوں۔" اس نے قبرستان کی طرف چلتے ہوئے کہا۔ جو لوگ ہمارے قبرستان سے رخصت ہو جانے کے بعد مایوسی اور ناگواری کے جذبات کا شکار رہتے تھے اور یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اب دو گھنٹے سے پہلے ہماری واپسی کا کوئی امکان نہیں، کچھ حیران ہوئے۔ ان سب کی موجودگی میں قبر کے وہ تختے ہٹائے گئے جن پر سے گورکن کو نکالا گیا تھا۔ تاریک خلا میں جھانکنے والا پہلا شخص خود مجسٹریٹ تھا۔ اس نے چند منٹ اندھیرے میں گھورنے کے بعد جیب سے لائٹر نکال کر سلگایا اور ہاتھ نیچے لے گیا۔ پھر اس نے سر کو خالی جگہ میں ڈالا۔ یوں کہ وہ خود گھٹنوں کے بل اوپر کے تختوں پر جھکا

ہوئے ایک ہاتھ سے قبر کی دیوار کا سہارا لیے رکھا اور اس نے لائٹر کی روشنی میں باقی ماندہ تختوں کے نیچے جگہ دیکھی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ باہر آ کے اس نے میری طرف دیکھے بغیر صرف سر ہلایا اور دوسرے گواہوں کو طلب کیا۔

"آپ لوگوں کے حلفیہ بیان کے مطابق یہ قبر وزیر خان مرحوم کی ہے۔" اس نے فائل میں سے پڑھنا شروع کیا جو پیشکار نے آگے بڑھا دی تھی۔ "لیکن واقعاتی شہادت سے بات ثابت نہیں ہوتی۔ میں دیکھ چکا ہوں اور اب آپ باری باری نیچے اتر کے میری طرح دیکھ سکتے ہیں کہ قبر میں مدفون نہیں ہے۔"

باقی کارروائی دس منٹ میں پوری ہو گئی۔ مجسٹریٹ نے فائل پر نوٹ لکھا کہ عدالت کے حکم پر وزیر خان ولد رئیس خان کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے کے لیے قبر کھودی گئی تھی۔ میڈیکل بورڈ کے ارکان اور قبر کی نشاندہی کرنے والے تینوں افراد کی موجودگی میں قبر کے اندر سے گورکن برآمد ہوا جسے نامعلوم افراد نے قبر کھود کے دبا دیا تھا۔ وہ زندہ پایا گیا چنانچہ ہسپتال لے جایا گیا اور اس سلسلے میں مزید کارروائی جاری رکھی گئی جس کے نتیجے میں تمام گواہوں نے وزیر خان مرحوم ولد رئیس خان مرحوم کی لاش کو غیر موجود پایا چنانچہ پوسٹ مارٹم کے احکامات منسوخ کیے جاتے ہیں۔ لاش کی عدم موجودگی اور گورکن پر اقدام قتل کے سلسلے میں نامعلوم افراد کے خلاف تفتیش اور مقدمہ درج کرنے کے احکامات صادر کیے جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔

فائل پر باری باری ہم سب نے اپنے دستخط ثبت کیے لیکن سب سے پہلے حشمت خان نے کہا۔ "قسم خدا کا، ہم پاگل ہو جائے گا۔ اللہ ہم سب کو معاف کرے۔ بندہ مر سکتا ہے لیکن ہم تو رات کا وقت بھی اس قبر پہ آیا ہے۔ ایسا دھوکا نہیں کیا جا سکتا۔" تقریباً انہی خیالات کا اظہار دوسرے گواہوں نے بھی کیا لیکن حشمت خان زیادہ ہی مشتعل ہو رہا تھا۔ اس نے مجسٹریٹ کی طرف سے کارروائی ختم ہونے کا اعلان ہو جانے کے بعد بھی بولنا جاری رکھا۔ "اوبابا! قیامت آ جائے گا۔ وزیر خان مر گیا، سلامت شاہ قتل ہو گیا۔ اس کو ظالموں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکس میں ڈال دیا۔ اب وزیر خان غائب ہو گیا۔ ملعون، خنزیر، شیطان کا بچہ۔ قسم خدا کا، ہم کو مل جائے تو ہم اس کا ایک ہزار ٹکڑا کر دے۔ اس کی ہڈی کو توڑ ڈالے، اس کا خون پی جائے، اس کا سارا خاندان خراب ہو۔۔۔"

دوسرے لوگوں نے اسے خاموش رکھنے کی بے سود کوشش کی مگر مجسٹریٹ نے اس کی باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ دھمکیاں ذہن کے شدید صدمے سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہیں۔ وہ سیدھا صاف دل صاف گو آدمی تھا جو مصلحت کے تقاضے سمجھنے سے زیادہ اپنے حقیقی جذبات کے اظہار پر مجبور تھا۔ اس کا دل انسان کی بے ضمیری اور اخلاقی دیوالیہ پن پر خون کے آنسو رو رہا تھا تو وہ کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔

دوسری بار قبرستان سے باہر آ کے میں نے اپنے گواہوں سے معذرت چاہی کہ میں ان کو واپس کار میں نہیں لے جا سکتا کیونکہ مجھے مجسٹریٹ صاحب کے ساتھ جانا ہے۔ میں نے انہیں ٹیکسی کا کرایہ پیش کیا اور شرمندہ ہوا۔ انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور توبہ توبہ کرتے چلے گئے۔ قبرستان میں پولیس والے قناتیں سمیٹ رہے تھے اور باہر ایک ٹرک کھڑا تھا۔ میں نے پیچھے کا دروازہ کھولا اور شمس نے ڈرائیونگ شروع کی۔ میں مجسٹریٹ کے ساتھ پیچھے کی سیٹ پر اس لیے بیٹھا تھا کہ مجھے اس سے باتیں کرنی تھیں۔

"تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم ذہین آدمی ہو۔" مجسٹریٹ نے کہا۔

"ذہین یا بدقسمت؟" میں نے تلخی سے کہا اور جھنجھلایا۔ "کس باپ کے بیٹے نے یہ ذہنی اذیت برداشت کی ہوگی۔"

"میرا مطلب کچھ اور تھا۔" مجسٹریٹ نے جلدی سے کہا۔ "تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تمہارے اندازے غلط نہیں ہیں۔ اب مجھے اس گورکن کی حفاظت کے لیے واقعی سخت اقدامات کرنے پڑیں گے۔"

"خود توپ لے کر بیٹھنا پڑے گا یا فوج کو طلب کرنا پڑے گا؟" میں نے طنز سے مجسٹریٹ کے الفاظ دہرائے۔

"تم مجھے وہ نام تو بتا دو۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ مشتبہ افراد کو گورکن کے ہوش میں آتے ہی طلب کر لوں۔" مجسٹریٹ نے خفت سے بچنے کے لیے میری بات کو نظرانداز کر دیا۔ "اگر تم ایف آئی آر میں ان کے نام لکھوانا چاہو۔۔۔"

"نو سر!" میں نے کہا۔ "میں کسی کا نام ابتدائی ایف آئی آر میں نہیں لکھواؤں گا۔ اس لیے کہ مجھے اپنی توانائی اور ذہنی و جسمانی صلاحیت مزید مشکلات اور الجھنوں میں پڑنے کی خاطر صرف کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ میں جانتا ہوں اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ہوگا وہی جو میں بتا چکا ہوں۔ یہ علم غیب کا دعویٰ نہیں، قیاس آرائی کی بات ہے۔ نام آپ کو بتا دیتا ہوں۔ آپ چاہیں تو یہ بھی نوٹ کر لیں لیکن ایک بات ذہن میں رکھیں۔ میں نے آپ سے کوئی بات نہیں کی۔۔۔ د

www.paksociety.com

قبرستان میں نہ باہر آسکے۔ میں تو آپ کے ساتھ کار میں بھی اس لیے بیٹھ گیا تھا کہ مجھے بھی ہسپتال جانا تھا اور محسن میرا دوست ابھی کسی سے یہ کار مانگ لایا تھا۔"

"پھر میں کسی کو کیسے بلا سکتا ہوں؟" مجسٹریٹ نے بے بسی سے کہا۔ "میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھ پر وحی نازل ہوئی تھی۔"

"اگر وہ گورکن ہوش میں آجائے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے یہ نام خود دیے تھے اور اس نے ایک کار کا نمبر بھی یاد رکھا تھا جو آپ نے نوٹ کر لیا۔ آپ چند منٹ اس کے ساتھ اکیلے میں باہر آسکتے ہیں۔ کوئی آپ کی بات کو غلط نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔

مجسٹریٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ "گورکن کہہ سکتا ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے کیونکہ نہ اس نے کسی کا نام لیا تھا نہ کسی کار کا نمبر بتایا تھا۔ پھر میں کیا جواز پیش کروں گا؟" مجسٹریٹ نے سگریٹ جلائی۔ "کہ میں نے ان لوگوں کو کیوں بلایا تھا۔ اگر تم بلا وجہ مشکل میں پڑنے سے ڈرتے ہو تو مجھ سے کیوں توقع رکھتے ہو کہ میں اپنے اختیارات سے تجاوز کا خطرہ مول لوں گا۔ میں سرکاری ملازم ہوں لیکن اس سے پہلے میں ایک منصف ہوں۔ میرا کام انصاف کرنا ہے۔ تم انصاف مانگ سکتے ہو اگر تم میں ہمت ہو۔ ہمت نہ ہونے کا مطلب ہے کہ تمہیں خود اپنی بات پر یا اپنی ذات پر اعتماد نہیں ہے۔ پھر میں تم پر کیسے اعتبار کر لوں؟"

منطقی اعتبار سے مجسٹریٹ کی بات غلط نہیں تھی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ میرا ذہن یہ جوا کھیلنے سے پہلے ہار جیت کے امکانات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ اگر میرا اندازہ غلط ہوا تو کیا ہوگا؟ اگر وہی سسوا، چوہدری والا یا استاد پیڈرو سامنے آگئے اور گورکن نے ان کو شناخت نہ کیا۔ جانتے بوجھتے بھی وہ انکار کر سکتا ہے۔ اسباب یہی ہو سکتے ہیں یعنی وہ بک گیا ہو یا خوف سے مجبور ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان تینوں نے چہرہ چھپائے رکھا ہو یا وہ خود واقعی سامنے نہ آئے ہوں۔ انہوں نے کسی اور کو بھیجا ہو۔ آخر وہ تینوں کیا کریں گے؟ یہی کہیں گے کہ میں نے ذاتی دشمنی کی بنا پر ان کا نام لیا۔ زیادہ سے زیادہ مجھ پر ہتک عزت کے پرچے کا ایک اور کیس کر دیں گے۔

"آپ نام پتہ نوٹ کر لیں۔" میں نے اچانک کہا۔ "میں اس کی ذمے داری قبول کرتا ہوں۔ میرا ایف آئی آر میں بھی ان کا نام مشتبہ افراد کی فہرست میں لکھوانے کے لیے تیار ہوں۔ اس لیے کہ وہ مشتبہ ہیں۔ میرے خیال کے مطابق یہ حرکت انہی میں سے کسی کی ہو سکتی ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ میرے والد کو قتل کروانے

والوں میں بھی وہی لوگ شامل ہیں۔ ایک نہ ایک دن مجھے دنیا کے سامنے اور عدالت میں اپنی انگلی اٹھا کے ان پر الزام عائد کرنا ہی ہے۔ خواہ میں نظام انصاف کے تقاضوں کے مطابق ان کو ملزم ثابت نہ کر سکوں۔"

"کسی بھی معزز اور شریف یا بے قصور آدمی پر الزام عائد کرنا اور ثبوت پیش نہ کرنا بھی جرم بن جاتا ہے مسٹر سکندر۔" مجسٹریٹ نے کہا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھ پر قتل کا الزام ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ جرم کیا ہے۔ جہاں سیر وہاں سوا سیر۔"

"سکندر!" محسن نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔ "کوئی لاش کو لے کر کہاں جا سکتا ہے؟"

"کہیں بھی جا سکتا ہے۔ ہڈیاں دریا میں بہائی جا سکتی ہیں۔ جلائی جا سکتی ہیں۔ دبائی جا سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"مسئلہ آسانی سے حل ہونے والا ہو تو مشکل طریقہ کوئی اختیار نہیں کرتا۔" محسن بولا۔ "آدھی رات کو دریا کے کنارے کسی ویران کنارے پر جانا یا کسی جگہ ہڈیوں کا الاؤ روشن کرنا دونوں مشکل کام ہیں۔ دفن کر دینا زیادہ آسان ہے اور اگر کھدی ہوئی قبر مل جائے تو یہ بوجھ ڈھونے کی بھی کیا ضرورت ہے۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟" انہوں نے ہڈیاں اسی قبرستان میں دفن کر دی ہوں گی؟" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں نے ایک بات نوٹ کی تھی۔" محسن نے سڑک پر نظر رکھی۔ "جب تو کچھ دیر کے لیے باہر آگیا تھا تو میں تھوڑا آگے چلا گیا تھا۔ میرا خیال تھا سب لوگ دو گھنٹے سے پہلے کیا واپس آئیں گے۔ آگے دو تیار قبریں ہیں۔ کھدی ہوئی مگر خالی۔ یوں سمجھ لے کہ ریڈی میڈ قبریں۔ اگر اچانک کوئی میت آجائے یا کوئی قبر کھدوانے کے لیے آئے تو اسے دکھا دی جائیں۔ گورکن فارغ ہوں تو یہ کام کرتے ہیں۔ بعض اوقات تمام دن خالی گزر جاتا ہے۔ کسی دن چار چھ جنازے آجاتے ہیں تو مشکل پڑ جاتی ہے۔ اوسطاً ساڑھے چھ فٹ لمبی قبریں تھیں۔ یہ بات گورکن بتا سکتا ہے کہ کل شام ریڈی میڈ قبروں کی تعداد کیا تھی۔ تین یا چار؟"

کار کے میو ہسپتال کے احاطے میں داخل ہونے تک ہم میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ محسن نے جو کچھ کہا بالکل واضح تھا۔ میرے والد وزیر خان مرحوم کی لاش قبر سے نکال کے دوسری جگہ دفن کر دی گئی تھی لیکن اس

دوسری قبر کو کھودنا تقریباً ناممکن تھا۔ یہ صرف قیاس آرائی کی بات تھی میرے یا محسن کے یقین سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ تین گواہ حلفیہ بیان دے کر وزیر خان کی قبر کی نشاندہی کر چکے تھے۔ دوسری قبر کے بارے میں حلفیہ بیان دینے کون آتا کہ یہ بھی وزیر خان کا مدفن ہے۔ میں کیسے ثابت کر سکتا تھا کہ لاش منتقل کر دی گئی ہے۔ عدالت ثبوت مانگتی ہے، شہادت طلب کرتی ہے اور قانون بہرحال ضابطوں کا پابند ہے۔ بالفرض محال یہ سارے مرحلے طے ہو جاتے تو اس دوسری قبر سے نکلنے والے ڈھانچے کو وزیر خان مرحوم کون ثابت کرتا اور کیسے۔ باہر کے ملکوں میں تو ماہرین کے پاس ریکارڈ ہوتا ہے۔ فنگر پرنٹ زندگی میں ثبوت فراہم کرتے ہیں تو مرنے کے بعد ہڈیوں کے خاک ہونے تک دانتوں کی ساخت سے شناخت کی جاتی ہے اور ہر شخص کے دانتوں کی ساخت کی نقلیں ڈینٹسٹ کے پاس رہتی ہیں بلکہ جدید طریقہ فنگر پرنٹ کا نہیں ڈی این اے ٹیسٹ کا ہے۔ ریکارڈ کا ہے۔ یہاں کا حیاب دیکھنا شاذ و نادر پیش آتے ہیں اور پولیس کی گھاس کھودتے ہیں۔ فلسطینی مجرمین بھی اس وقت لگایا جاتا ہے جب دانت کا دربات پھر دوسروں کو جگاتے ہیں۔ پولیس کے پاس شناخت کا کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ نہیں۔ میں نے ڈینٹل ہسٹری کی بات کی تو اچھے خاصے معقول لوگ تمسخر کریں گے کہ میاں لندن میں نہیں بیٹھے ہو۔

محسن نے میرے کندھے پر تھپکی دی تو میں چونکا۔ کار ایمرجنسی وارڈ کے پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی اور مجسٹریٹ مڑ کر مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ "محسن!" میں نے کہا۔ "وہ بات کی تھی نا تو نے؟ تین ریڈی میڈ قبریں تھیں کل رات یا چار؟ اس کو بھول جا۔ میں تجھے بتا سکتا ہوں کہ کل رات تین قبریں تھیں مگر فائدہ؟ یہ جھوٹ تو خود بخود ثابت ہو جائے گا کہ لاش کسی نے دوسری قبر میں منتقل نہیں کی لیکن یہ بات سچ ہو تب بھی سچ نہیں ثابت کی جا سکتی۔"

"آف دی ریکارڈ!" مجسٹریٹ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "مجھے تم سے ہمدردی ہے اور میرا بھی خیال یہی ہے کہ تمہارے دوست نے صحیح سمت میں قیاس آرائی کی ہے لیکن... یہ میرے لیے اطمینان کی بات ہے کہ تمہیں میری مجبوریوں کا احساس ہے۔ آئی ڈو وش... کہ میں کچھ کر سکتا۔" وہ اچانک پلٹا اور تیز تیز قدموں سے چلتا اندر چلا گیا۔ وہ بھی عام انسانوں کی طرح اچھا آدمی تھا جسے سچ بولنے پر مجبور تھا۔

بڑھے گورکن کو اس عرصے میں صاف ستھرے بستر پر منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس کے جسم کی ساری غلاظت صاف کی جا چکی تھی اور اس کا غلیظ لباس اتار کے اسے ہسپتال کے کپڑے پہنا دیے گئے تھے۔ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے اس کی جان بچالی تھی اور اسے آکسیجن دی جا رہی تھی۔ وہ ایک علیحدہ کمرے میں تھا جہاں دو ڈاکٹروں کی مدد کے لیے تین نرسیں موجود تھیں اور ان میں سے ایک گلوکوز کی ٹیوب لگانے کے بعد آکسیجن سے متعلق کچھ ٹھیک کر رہی تھی۔ دونوں ڈاکٹروں میں سے ایک پولیس سرجن تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوا۔

"ڈاکٹر صاحب! پولیس کو طلب کیا ہے آپ نے؟"

مجسٹریٹ نے کہا۔ "میں اس علاقے کا مجسٹریٹ ہوں۔"

ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ "میں نے حالات معلوم ہوتے ہی کیس درج کر لیا تھا۔ لیکن یہ آپ کے تھانے والے... میں نے یہاں فون کیا تو جواب ملا کہ واردات میانی صاحب کے علاقے میں ہوئی ہے۔ وہاں کے تھانے میں رپورٹ درج کرائی جائے۔ ابھی تک تو کوئی آیا نہیں ہے۔"

"ان کو میں بلوا لیتا ہوں ابھی۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "یہ بتائیے مریض کی کیا پوزیشن ہے؟"

"اوہ ہی از آؤٹ آف ڈینجر۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "بڈھا سخت جان ہے۔ شام تک بات کر سکے گا۔"

"آپ کے خیال میں یہ کتنی دیر تک دفن رہا؟" میں نے انگریزی میں کہا۔ "اور بچ کیسے گیا؟"

ڈاکٹر نے پلٹ کر مجھے غور سے دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں کندھے ہلائے۔ "کیا کہا جا سکتا ہے اسے یا معجزہ یا خدا کی قدرت۔ ایسے غیر معمولی واقعات ہوتے رہتے ہیں جن سے آدمی کو زندگی اور موت پر اپنا اختیار نہ ہونے کا احساس ہے۔ زلزلے میں عمارت مسمار ہو جاتی ہے اور ملبے میں سے ایک بچہ انگوٹھا چوستا برآمد ہوتا ہے جسے خراش تک نہیں آتی۔ گھر میں آگ لگ جاتی ہے اور سب کچھ جل کے راکھ ہو جاتا ہے سوائے ایک قرآن مجید کے۔ اس کیس میں بھی عقل کی مدد سے کوئی یقینی وضاحت ناممکن ہے۔ صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زمین میں کہیں کسی جانور نے سرنگ بنائی تھی۔ مثلاً بجو نے یا نیولے نے یا کسی چوہے نے یا گرگٹ نے بل بنایا تھا جس میں سے تازہ ہوا پہنچتی رہی۔ لیکن اصل مدد تقدیر نے کی۔ اس کا چہرہ صاف تھا اور مجھے بتایا گیا کہ یہ کس پوز میں بیٹھا تھا۔ اس کے منہ پر مٹی نہیں پڑی تھی اور

www.paksociety.com

سانس لینے کے لیے اس کی ناک اور منہ کے راستے نکالے گئے تھے اگر یہ تیر سیدھا کر کے نکال لیتا ہوتا تو چند منٹ میں دم گھٹنے سے ہلاک ہو جاتا مگر وہ جو کہتے ہیں نا کہ جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ صورت اندیشناک ہے۔"

"میں فون کہاں سے کر سکتا ہوں؟" مجسٹریٹ نے پوچھا۔ "میرے آنے تک آپ کسی کو یہاں مت آنے دیں۔"

"میں نے ابھی تک کسی کو نہیں آنے دیا ہے۔" پولیس سرجن نے کہا۔ "فون باہر کاؤنٹر پر بھی ہے اور میرے کمرے میں بھی۔"

"میں مسلح گارڈ طلب کر رہا ہوں۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "یہ بہت پراسرار کیس ہے۔ کسی غیر متعلقہ شخص پر شبہ بھی ہو تو..."

"یہاں کوئی غیر متعلقہ شخص نہیں۔ آپ لوگوں سے تو میں ناواقف ہوں۔" پولیس سرجن نے میری اور محسن کی طرف دیکھا۔ "مگر آپ مجسٹریٹ صاحب کے ساتھ آئے ہیں تو متعلقہ افراد ہی ہوں گے۔ باہر ایک شخص خود کو اس کا بیٹا بتاتا ہے۔ بظاہر غلط نہیں کہتا۔ یہاں میرے ساتھی دوسرے ڈاکٹرز ہیں۔ ان کو میں دو سال سے جانتا ہوں۔ آئی سی یو میں دو نرسیں ہیں۔"

"تین نرسیں۔" میں نے کہا۔ "جب میں کمرے میں آیا تھا تو یہاں تین نرسیں تھیں!"

"یہ غلط ہے۔" پولیس سرجن نے سخت لہجے میں کہا۔ "ایک نرس شہلا گل ہے، دوسری تہمینہ، تیسری کوئی نہیں۔ کیوں ڈاکٹر صدیقی؟ کیا میں غلط بیانی کر رہا ہوں؟" دوسرے ڈاکٹر نے جو زیادہ عمر رسیدہ تھا حیرانی سے انکار میں سر ہلایا۔

"غالباً یہ ٹھیک ہے۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "میں نے بھی تین نرسیں دیکھی تھیں۔"

"او کے۔ وہ تیسری نرس کون تھی، کہاں گئی؟ یہاں تو ان دو کے سوا کوئی نہیں اور ہم نے صرف دو ہی کو ساتھ رکھا تھا۔ شاید ان دونوں میں سے کسی نے دیکھا ہو۔ مس تہمینہ! مس شہلا! اور کون آیا تھا یہاں؟" پولیس سرجن نے برہمی سے پوچھا۔

"ہم نے تو کسی کو نہیں دیکھا سر۔" ان دونوں نے ایک ساتھ کہا اور مسکرائیں۔

"آپ سب کی توجہ مریض پر مرکوز تھی۔ آپ نے نہیں دیکھا مگر پیچھے وہ تیسری نرس گلوکوز کی تھیلی ٹھیک کر رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "آپ لوگوں نے اس لیے بھی نوٹ نہیں کیا کہ آپ سب کے لباس ایک جیسے ہیں مگر میں اپنے اندیشوں کا اظہار کر چکا ہوں۔ آپ مریض کو پھر دیکھیے، پلیز۔" میں نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھا اور اس نے میرے لہجے سے مجبور ہو کے میری تائید میں سر ہلایا۔ اور اس وقت اچانک مجھے خیال آیا کہ اس تیسری نرس کو دیکھتے ہی مجھے ایسا کیوں لگا تھا جیسے اس کی صورت میں نے پہلے بھی دیکھی ہے۔ سب نرسیں اپنی سفید وردی میں ایک سی لگتی ہیں اور میرا ذاتی تجربہ ہے کہ بہت کم واقعی حسین ہوتی ہیں۔ وہ تیسری نرس بلاشبہ حسین تھی مگر وہ کون تھی، صورت آشنا کیوں لگی تھی اور پھر کہاں غائب ہو گئی۔ میں سوچنے پر مجبور تھا اور میرے اندیشے یقین میں ڈھل رہے تھے۔

ڈاکٹروں نے اولین ترجیح بیڈ کا رخ کیا۔ "ڈاکٹر صدیقی ابھی چند منٹ پہلے ہی تو چیک کر کے گئے ہیں مگر آپ لوگ مصر ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" پولیس سرجن نے کہا۔ دونوں نرسیں خود بخود بیڈ کے دوسرے کنارے کی طرف ہو گئیں اور میں بیڈ کی طرف کھسکا۔ مجسٹریٹ فون کرنے کے لیے جا چکا تھا۔ پولیس سرجن نے گورکن کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ جسم گرم ہے یا نہیں۔ لیکن میری نظریں گورکن کے ساکت جسم پر تھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے پڑا تھا اور کمبل کے نیچے اس کے سانس کا خفیف سا زیروبم بھی محسوس نہ ہوتا تھا۔ پولیس سرجن نے گورکن کی نبض دیکھنے کے لیے اس کی کلائی پر انگلیاں رکھیں۔ پھر اس نے ڈاکٹر صدیقی کی طرف دیکھا اور ایک جھٹکے سے کمبل ہٹا دیا۔ "اچھی طرح سے چیک کیجیے۔" پولیس سرجن نے کہا۔ تشویش کے آثار اس کی صورت سے بھی عیاں تھے اور اس کے لہجے سے بھی۔

دوسرے ڈاکٹر نے جھک کر سینے کے اندر دھڑکنے والے دل کی آواز سننے کی بے سود کوشش کی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ آواز خاموش کی جا چکی ہے۔ نرسوں نے بھی اندازہ کر لیا تھا کہ صورت حال یکلخت بدل گئی ہے۔ ان کی وہ مسکراہٹ کافور ہو گئی جو ایک بے بنیاد اعتماد کی مظہر تھی۔ ڈاکٹروں کے یقین کی طرح جو کسی تیسری نرس کی موجودگی سے یکسر منکر تھے لیکن وہ غیب کی نرس اپنا کام کر گئی تھی جسے صرف میری نگاہ نے دیکھا تھا یا مجسٹریٹ کی آنکھوں نے۔ وہ بھی اس لیے کہ ہم اچانک اور غیر متوقع طور پر آ پہنچے تھے۔ اگر ہم دو چار منٹ بعد آتے تو ہم بھی صرف دو ہی نرسوں کو دیکھتے۔ اسے کمرے سے جاتے ہوئے ہم نہیں دیکھ سکے تھے۔ میرے لاشعور نے ہنگامی طور پر ایک نقطہ کو ذہن کے پردے پر پھیلا دیا۔

"ہی از ڈیڈ۔" پولیس سرجن نے کسی سے مخاطب ہوئے بغیر کہا۔ کمرے میں خاموشی کے چند ہولناک لمحات ان الفاظ کی بازگشت بن کے موجود رہے۔

www.paksociety.com

"آپ نے چند منٹ پہلے کی بات کی تھی ڈاکٹر صاحب!" میں نے انگریزی میں کہا۔ "آدمی تو چند سیکنڈ میں بھی مر جاتا ہے۔"

"ہاؤ ڈو یو مین۔۔۔" وہ ایک قدم میری طرف چلا۔ یوں جیسے میں نے اس کی تذلیل کر دی ہو۔ پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ "وہ تیسری نرس کون تھی۔ میں معلوم کروں گا اور تم اسے شناخت کرو گے۔ میں پورے ہوسپٹل کی تمام نرسوں کو، وارڈ بوائز، ٹریٹمنٹ اسٹاف، سویپرز اور وارڈ کی جھاڑو تک کو لائن اپ کروا دوں گا۔"

"اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "وہ ان میں نہیں ملے گی۔ وہ جان بچانے والوں میں سے نہیں تھی۔ جان لینے والوں کی آلہ کار تھی۔ وہ اپنا کام کر کے جا چکی ہے۔ وہ بے حد فرض شناس ڈاکٹروں اور بے حد اسمارٹ نرسوں کی بے حد چوکس آنکھوں میں دھول جھونک کے۔ تمہارا خیال تھا وہ میری نظر کا دھوکا تھی؟ میں ہیلوسی نیشن (HALLUCINATION) میں مبتلا نہیں تھا ڈاکٹر صاحب! اور ثبوت تمہارے سامنے ہے۔ اس گلوکوز کی تھیلی کو اتار لو اور تجزیے کے لیے بھیج دو۔ لیکن رپورٹ ابھی اسی وقت مجھ سے لے لو۔ اس میں کوئی مہلک زہر شامل کر دیا گیا تھا جو قطرہ قطرہ گلوکوز کے ساتھ خون میں شامل ہوتا رہا۔ پانچ سی سی کا ایک انجکشن اگر سائنائیڈ ہو تو کتنی دیر میں ایک آدمی کی جان لے سکتا ہے جبکہ وہ اس محلول میں شامل ہو تو یہ زیادہ سے زیادہ ایک منٹ۔"

پولیس سرجن نے گلوکوز کی تھیلی اتار لی۔ "او مائی گاڈ!" ڈاکٹر وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"نو۔ بٹ آئی ایم ناٹ این ایڈیٹ۔" آہستہ سے میں نے کہا "چیک اٹ۔ کیا اس میں کوئی سوراخ ہے انجکشن کا اور کیا اس محلول میں سے کڑوے باداموں کی بو آ رہی ہے؟ یہ قتل محض کا کیس ہے اور قتل آپ سب کی موجودگی میں ہوا ہے لیڈیز اینڈ جنٹلمین!"

سوراخ ڈاکٹر صدیقی نے دریافت کیا۔ ننھا سا یہ سوراخ محلول کی سطح سے ذرا اوپر تھا۔ پولیس سرجن نے تھیلی کا کنارہ کاٹ کے محلول کو سونگھا۔ "سائنائیڈ!" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ دونوں نرسوں کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا۔

"تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے مس شمیلا اور مس تہمینہ کہ میں نے اس تیسری نرس کو دیکھ لیا تھا ورنہ یہ قتل کا الزام تم پہ ہی آتا۔" میں نے کہا "کسی ڈاکٹر پہ نہیں۔"

اسی وقت میں نے مجسٹریٹ کو دیکھا۔ وہ دروازے میں منہ کھولے کھڑا تھا۔ اس نے میری بات سن لی تھی اور ایک نظر میں مجموعی صورت حال کو بھانپ لیا تھا۔ اس کی صورت پر بھی شکست خوردگی کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے اسے مختصراً بتا دیا تھا کہ بوڑھے گورکن کی جان کو ہسپتال میں کیے جانے والے حفاظتی انتظامات کے باوجود خطرہ لاحق ہے۔ ڈاکٹروں کی بات پہ ایک ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ہسپتال میں قتل کرنا ناممکن ہے۔ اب وہ حفاظتی انتظامات کے لیے اپنے اختیارات استعمال کر کے احکامات جاری کر کے لوٹا تھا مگر ان پر عمل درآمد سے پہلے ہی بوڑھا گورکن قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ تقدیر کا کتنا بے رحم مذاق تھا کہ وہ مردوں کی طرح دفن کیے جانے کے باوجود زندہ رہا اس لیے کہ کاتب تقدیر نے اس کی زندگی کے اختتام کا جو وقت مقرر کیا تھا وہ ابھی نہیں آیا تھا۔ اس کو چند گھنٹے بعد مرنا تھا چنانچہ وہ مرا تو وہاں جا کے جہاں فانی انسان ہر زندگی کو بچانے کی بھرپور جدوجہد ہر وقت جاری رکھتے ہیں اور کامیابی کو اپنی لیاقت سے منسوب کرتے ہیں تو ناکامی کو مشیت ایزدی سے۔

"پولیس آ رہی ہے۔" مجسٹریٹ نے آ کے کہا۔ "حفاظت کا مقصد تو ختم ہوا لیکن اس قتل کے مقدمے کی رپورٹ ہاں آپ اور میں ایف آئی آر میں آپ جانس کا نام لکھوانے پر مجبور ہوں جن کی غفلت کے باعث قاتل کو موقع ملا۔"

"یہ زیادتی ہے مجسٹریٹ صاحب!" پولیس سرجن نے کہا۔ "ہم اپنے کام میں اتنے منہمک تھے... ہم پہ غفلت کا الزام کیسے آ سکتا ہے جبکہ قتل ایک نرس نے کیا ہے جسے آپ نے بھی دیکھا تھا۔" اس نے مختصراً مجسٹریٹ کو گورکن کی موت کا سبب بتایا۔

"مگر وہ نرس کہاں ہے؟ کیا نام تھا اس کا؟ آپ نے تو اس کے وجود سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اگر وہ مل جاتی ہے تو فرد جرم اس پہ عائد کرنے کے بعد یہ ثابت کرنا استغاثہ کا کام ہے کہ وہ قاتل تھی لیکن وہ نہ ملی تو الزام کس پہ عائد کیا جائے گا؟ یہ طبعی موت تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! آپ نے بتایا دیں۔ نرسوں نے گلوکوز لگایا۔ اس میں آپ کی تجویز کردہ دوا شامل کیں اور یہ سب آپ کی نگرانی میں ہوا۔ سائنائیڈ کہاں سے آیا اور کیسے گلوکوز میں شامل ہو گیا؟ اگر کسی غیر متعلق فرد نے یہ حرکت کی تو آپ لوگوں نے دیکھا کیوں نہیں؟ اسے منع کیوں نہیں کیا؟ اسے جانے کیوں دیا؟ آپ نے میرے سامنے دو غلط اور متضاد بیانات دیے ہیں۔ ایک یہ کہ کمرے میں کوئی غیر متعلق شخص نہیں آیا اور دوسرا یہ کہ کمرے میں صرف دو نرسیں تھیں۔ بعد میں آپ کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع ملے گا لیکن اس وقت میں حقائق سے روگردانی نہیں کر سکتا۔" مجسٹریٹ نے وقار اور متانت کے ساتھ کہا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"میں نے ابھی مسٹر ڈی سلوا کو فون کیا تھا۔ وہ استاد نام کے کسی شخص سے واقف نہیں لیکن وہ خود آ رہا ہے کیونکہ وہ قانون کی مدد کے لیے ہر وقت ہر جگہ حاضر ہو سکتا ہے۔"

"پرفیکٹ۔" میں نے تلخی سے ہنس کر کہا۔ "ہر مہذب، باشعور اور تعلیم یافتہ شخص کی طرح وہ قانون سے تعاون کو اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے۔ اس لیے کہ اب قانون سے اس کو کوئی خطرہ نہیں اور خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ مجسٹریٹ صاحب میرے لیے سمن یا وارنٹ بھیجے بغیر آپ مجھے طلب کر کے کیا آپ اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کر رہے؟"

"اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور کیس کی تفصیلات کے بارے میں اور نہ میرے بارے میں۔" مجسٹریٹ بولا۔ "... یہ بات میرے لیے واقعی حیران کن تھی۔ اس نے مجھے چوہدری دلاور کے آفس کا نمبر بھی دیا۔"

"اور چوہدری دلاور نے بھی کہا ہو گا کہ جناب عالی ہم تو آپ کے غلام ہیں لیکن یہ استاد ہے کون؟ کیا بلا ہے؟" میں نے کہا۔

"آپ ان کے کردار... میرا مطلب ہے ان کو ابھی نہیں جانتے ہیں۔" مجسٹریٹ بولا۔

"اگر میں دعویٰ کروں کہ مجھ سے بہتر ان کو کوئی جان نہیں سکتا ہے تو اس میں قطعی مبالغہ نہ ہو گا۔" میں نے کہا۔

آدھے گھنٹے بعد جب لاش مردہ خانے پہنچائی جا چکی تھی اور پولیس والے ضابطے کی کارروائی میں مصروف تھے پہلے ڈی سلوا نمودار ہوا۔ اس نے بہترین سوٹ پہن رکھا تھا اور میچ کرتی ہوئی ٹائی بڑے سلیقے سے باندھ رکھی تھی۔ وہ کار کی چابیاں گھماتا ہوا وارڈ میں قدم رکھا اور بے نیازی سے ادھر ادھر دیکھتا ہمارے قریب آ کے رک گیا۔

"تم؟" اس نے تھوڑا سا حیران ہو کے کہا۔ "تم مجسٹریٹ کب سے بن گئے؟ تم نے فون کا بیہودہ مذاق کیا تھا؟"

"مجسٹریٹ میں ہوں۔ میں نے فون کیا تھا۔" مجسٹریٹ نے کہا۔

"اوہ" وہ تیزی سے پلٹا۔ "معاف کیجیے گا۔ میں سمجھا آپ ڈاکٹر ہوں گے۔ یہ تو کوئی پولیس کیس لگتا ہے؟"

"جی۔ در اصل یہاں ایک مریض کو کسی نے دوا میں زہر ملا کے ہلاک کر دیا ہے۔" مجسٹریٹ بولا۔ "وہ ایک بوڑھا گورکن تھا جسے کل رات کسی نے قبر میں زندہ دفن کر دیا تھا۔ آج اس قبر کو کھودا گیا تو وہ زندہ نکلا۔ چنانچہ اسے یہاں بھیج دیا گیا تھا۔"

"یہ تو معجزہ ہو گیا۔" ڈی سلوا بولا۔ "قبر کس سلسلے میں کھودی گئی تھی؟"

"مسٹر سکندر بخت کے والد کی لاش نکال کے پوسٹ مارٹم کرنا تھا۔" مجسٹریٹ بولا۔ "لیکن لاش نہیں ملی۔"

"نہیں ملی کا کیا مطلب؟" ڈی سلوا نے اپنا پرسکون اور بے نیازی کا انداز برقرار رکھا۔ "وہ کسی اور کی قبر تھی؟"

"چشم دید گواہوں کے بیان کے مطابق قبر کی نشاندہی غلط نہیں ہوئی تھی۔" مجسٹریٹ بولا۔ "ان کو اب بھی یقین ہے کہ قبر وہی تھی۔ کسی نے اس میں سے لاش... یوں سمجھیے چرا لی اور یہ کام گورکن سے کرانے کے بعد اس کو دفن کر دیا۔"

"آئی سی۔" ڈی سلوا نے حیرت سے سیٹی بجائی اور چابی جیب میں ڈال لی۔ میں نے اس کی اداکاری اور خود اعتمادی کا دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ خوف زدہ یا پریشان ہونا تو درکنار وہ بہت زیادہ حیران تک نہ تھا۔ اتنی حیرت واجبی سی تھی جیسے یہ روز ہونے والے جرائم میں سے ایک جرم کی خبر ہے۔ لوگ ہر روز قتل ہوتے ہیں اغوا کرتے ہیں۔ حادثات میں مارے جاتے ہیں اور اندر کے صفحے پر اخبار میں چند سطروں کی خبر کسی کے لیے صدمے، تعجب یا دلچسپی کا باعث نہیں ہوتی۔ وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا اور اس کا لہجہ اینگلو انڈین سے زیادہ برطانوی نژاد انگریز کا تھا۔ "مجھے مسٹر سکندر بخت سے ہمدردی ہے۔ لیکن یہ بتایئے مجھے کس سلسلے میں طلب کیا گیا ہے؟"

"مسٹر ڈی سلوا!" مجسٹریٹ نے کہا۔ "یہ سوال آپ نے فون پہ کیوں نہیں کیا تھا؟"

"کیوں نہیں کیا تھا؟" وہ ماتھے پہ شکن ڈال کے بولا۔ "کیا میں نے غلطی کی تھی؟ اگر میں اختیارات یا جواز کا مسئلہ اٹھائے بغیر یہاں آ گیا تو کیا میرا یہ تعاون قانونی طور پہ کوئی جرم بھی بن سکتا ہے؟"

"یقیناً آپ اخذ کر سکتے ہیں مسٹر ڈی سلوا!" مجسٹریٹ نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہر شخص جو آپ کی طرح ذہین اور تعلیم یافتہ ہو گا وہ قدرتی طور پہ اپنا اطمینان کیے بغیر ڈرائیو کر کے اتنی دور نہیں جائے گا۔"

"آل رائٹ! میں نے غلطی کی۔ آئی ایم سوری۔" ڈی سلوا نے بھی لہجہ بدل لیا۔ "اب مجھے مطمئن کیا جاتا ہے۔"

"مسٹر سکندر بخت نے الزام عائد کیا ہے کہ یہ سب کچھ آپ نے کیا ہو گا۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ ماحول کی کشیدگی

www.paksociety.com

اور یہ تلخ گفتگو سب کے اعصاب کو متاثر کرنے لگی تھی۔

"سب کچھ کیا تو۔" ڈی سلوا نے گھوم کر ایک بار مجھے خون آشام نظروں سے دیکھا اور پھر مجسٹریٹ سے مخاطب ہو گیا۔

"یہ... لاش کی چوری، گورکن کو مار کر دفن کرنا اور یہاں اس کو قتل کروانا؟" مجسٹریٹ کچھ پریشان ہو گیا۔

ڈی سلوا قہقہہ مار کے ہنسا۔ اس کی ہنسی میں تمسخر، تضاد، اپنی طاقت کے غرور اور ہماری بے بسی پر مسرت کے جذبات شامل تھے۔ "یور آنر! کیا آپ جانتے ہیں کہ مسٹر سکندر کے دل میں میرے لیے کس قسم کے جذبات ہیں؟ وہ ان پر اپنے والد کے پارٹنر کو قتل کرنے کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے اور دوسرا مقدمہ چلا رہے ہیں کہ ہم نے یعنی باقی بزنس پارٹنرز نے مل کر ان کے والد کو بلیک میل کیا اور قتل کر دیا یا کروا دیا۔ انگلینڈ میں تعلیم کے بعد سے جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں اس کا ریکارڈ الگ ہے لیکن میں اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ تاہم یہ گلی میں مرنے والے کتے سے لے کر سڑک پر کار کے نیچے آنے والے کسی آدمی کی موت کا ذمہ دار بھی مجھے قرار دیں تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ یہ الزام آپ تو لگانے سے رہے۔ ابھی حال ہی ہماری فرم کا ایک اکاؤنٹنٹ غلام علی حادثے میں مارا گیا تھا۔ یہ الزام عائد کر سکتے ہیں کہ مار کے بھاگ جانے والا ڈرائیور میں ہی تھا۔"

"ویل از اے ڈیم فیکٹ۔" میں نے شدت جذبات سے بے قابو ہو کے کہا۔ "اور فرم تمہاری نہیں ہے۔ تم پارٹنر نہیں ملازم ہو۔ سمجھے؟"

"مسٹر فیکٹ، جو تم کہتے ہو وہ فیکٹ ہوتی ہے؟" وہ پھر حقارت سے ہنسا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ حقیقت کی تعریف اب یہ ہو گئی ہے کہ جو کچھ مسٹر سکندر بخت فرمائیں۔"

"آپ دونوں بکواس بند کریں۔" مجسٹریٹ نے برہمی سے کہا۔ "مسٹر ڈی سلوا! میں جانتا ہوں کہ حقیقت کا ثبوت ملنا چاہیے اور کسی کے الزام عائد کر دینے سے کوئی مجرم نہیں بن جاتا۔ مجھے صرف جوابی بیان چاہیے۔ یس یا نو۔"

"نو... سو مرتبہ نو۔ ایک ہزار مرتبہ نو۔" ڈی سلوا نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"واہ جی واہ۔ سو مرتبہ نو ہو گئے نو سو۔ سو مرتبہ ہزار ہو گئے کتنے؟ ہاں، نو ہزار۔" چوہدری ولاور نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا اور تب مجھے احساس ہوا کہ وہ کمرے میں موجود ہے۔ کسی کو اس کے اندر آنے کی خبر نہیں ہوئی تھی اور میرا یہ خیال ہے کہ وہ دروازے سے داخل ہوتے ہی اسکرین کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔ ہسپتال کے عملے نے لاش کے گرد لکڑی کا اسٹینڈ والا پردہ کھڑا کر دیا تھا جو لاش کے گرد گھیرا بنائے ہوئے تھا۔ بعد میں بھی موجود تھا۔ نہ جانے کب سے وہ تمام گفتگو سن رہا تھا اور بالکل صحیح وقت پر اس نے ڈرامائی انداز میں سامنے آ کے یہ ظاہر کیا جیسے وہ ابھی ابھی پہنچا ہے۔ اس کردار کی طرح جو پس پردہ ڈائلاگ سنتا رہے اور عین اس وقت نمودار ہو جب اس کے ڈائلاگ بولنے کی باری آ جائے۔ "کیا قصہ ہو رہا ہے یہاں؟ اوہ۔" اس نے اوہ کو کھینچ کر حیرانی اور شرمندگی کا اظہار کیا۔ "یہاں تو اپنے سکندر صاحب بھی موجود ہیں، مجسٹریٹ؟ پھر آپ بھی ہوں گے، کیوں جناب عالی؟"

مجسٹریٹ نے یہی سوال دوبارہ ولاور سے پوچھنے کی غلطی نہیں کی جو اس نے ڈی سلوا سے کیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ سنجیدہ رہ کے بھی غیر سنجیدگی سے بات کرنے والا یہ شخص اس کو چٹکیوں میں اڑا دے گا۔ اس نے کم سے کم الفاظ میں بتا دیا کہ اسے کیوں طلب کیا گیا ہے۔

وہ کچھ دیر یوں کھڑا رہا جیسے بات کو ذہن میں بٹھانے کی محنت کوشش کر رہا ہے اور وہ معمولی عقل و ذہانت کا مالک شخص ہے جس کے لیے غیر معمولی بات کو سمجھنا مشکل مسئلہ بن جاتا ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ میری طرف پلٹا۔

"اپنے سکندر صاحب! مجسٹریٹ صاحب فرماتے ہیں تو میں کہتا ہوں آپ بجا ارشاد فرما رہے ہیں۔ مگر یہ گستاخی میں ان کی شان میں کیسے کر سکتا ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں رک رک کے بولا۔ "پھر بھی آپ سے تو پوچھ سکتا ہوں ناں؟ غلام کے بارے میں آپ نے یہ کیسے فرما دیا؟ یہ بڑے جناب کی میرے بارے میں؟ آپ تو میرے برابر کے پارٹنر ہیں۔ میری خلافت عدم اعتماد کا اظہار ہے۔" اس نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔ "اللہ مجھے معاف کرے کہ خلق خدا مجھے کیا سمجھتی ہے اور آپ کو... آپ کو بھی معاف کرے۔ معلوم نہیں کس نے آپ کو ورغلایا ہے تاکہ شراکت ٹوٹ جائے۔ یا آپ خود اتنے عاقبت نااندیش ہیں۔ میں اتنا ذلیل اور بے ضمیر نہیں ہوں اپنے سکندر صاحب۔" اس کا دکھ بھرا لہجہ اور رقت آمیز انداز گفتگو ڈرامہ تھے۔ اس کی پوری شخصیت ایک ڈرامہ تھی مگر اس کو حقیقت سے الگ کر کے دیکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ مجسٹریٹ اب مجھے ملامت آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کو یقین آنے لگا تھا کہ میں واقعی ایک کم عقل، نوجوانی کے جذبات سے مغلوب ہو جانے والا کینہ پرور آدمی ہوں۔ اس وقت مزید مشتعل ہونا بھی

اس کا اعتراف کرنے کے مترادف تھا چنانچہ میں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

"ولاور صاحب! یہ جذبات کا نہیں قانون کا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس میں ہمارے ذاتی تعلقات یا کاروباری تعلق کہیں نہیں آتے۔ ایک بیان میں نے دیا تھا، دوسرا آپ نے دے دیا۔ یہ صرف ابتدائی تفتیش ہے۔ آپ کو پورا حق حاصل ہے کہ مجھ پر بحیثیت ازالہ حیثیت عرفی کے ہرجانے کا دعویٰ دائر کر دیں اور مدعا علیہ کی حیثیت سے ثبوت اور دفاع کے معاملات کو مجھ پر چھوڑ دیں۔" پھر میں مجسٹریٹ سے مخاطب ہوا۔ "میرا خیال ہے اب آپ مجھے اجازت دیں گے۔ ضابطے کی اس کارروائی میں میری موجودگی کی اب ضرورت نہیں رہی۔" محسن نے جو بالکل خاموش اور الگ تھلگ کھڑا رہا تھا میرے اشارے کے جواب میں سر ہلایا اور ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔

"مجسٹریٹ صاحب!" محسن نے دروازے میں رک کر کہا۔ "میں نے ابھی ایک نرسنگ آرڈرلی سے سنا ہے کہ نرس کی جیب میں سے ایک ہزار روپے نکلے ہیں۔ سو سو کے دس نوٹ۔ آپ ان کو سائن کر دیں کیونکہ ہو سکتا ہے ان پر فنگر پرنٹ مل جائیں۔"

بیک وقت ڈی سلوا اور چوہدری ولاور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے کے لیے ان دونوں کا رنگ اڑ گیا تھا۔

"اور اگر فنگر پرنٹ ملیں تو موازنے کے لیے آپ تیسری نرس کے وجود کو ذہن میں رکھیں۔" میں نے اس انسپکٹر سے کہا جو محسن کی بات پر ہماری طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ "ہو سکتا ہے اتفاقاً فنگر پرنٹ مسٹر ڈی سلوا کی سیکرٹری کے ہوں جو کسی سرنج یا گلوکوز کے بیگ یا کمرے میں اور دروازے کے ہینڈل پر مل جائیں۔ کیا نام ہے ان کا ڈی سلوا صاحب؟ ذرا بتا دیجیے گا پولیس کو۔ خدا حافظ۔"

میری آخری بات کے ردعمل کو مجسٹریٹ نے بھی نوٹ کیا۔ چوہدری ولاور کو اپنے اعصاب پر زیادہ قابو تھا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا لیکن اس کا چہرہ ویران ہو گیا تھا۔ ڈی سلوا چونکا اور اس کی آنکھوں میں آتش غضب کا کوندا سا لپکا۔ ان دونوں کی نگاہوں نے ڈیوڑھی کے باہر قدم رکھنے تک میرا تعاقب کیا۔ میرے لاشعور کے نہاں خانوں سے نکل کر وہ تصویر اچانک سامنے آ گئی تھی جس کی تلاش میں میرا حافظہ سرگرداں تھا۔ مجھے اس تیسری نرس کی صورت سے آشنائی کا احساس بے سبب نہیں ہوا تھا۔ وہ ڈی سلوا کی نظر نواز سیکرٹری تھی اور نرس کا لباس پہن کے نرسوں میں یوں شامل ہو گئی تھی جیسے بھیڑ کا لبادہ اوڑھ کے بھیڑیا گلے میں شامل ہو جائے اور میں اسے فوراً اسی لیے شناخت نہیں کر سکا تھا۔ بے وقوف لڑکی! میں نے افسوس سے سوچا۔ اپنی جذباتی کمزوری کے باعث ڈی سلوا جیسے گرگ باراں دیدہ کی آلہ کار بن گئی تھی اور قتل جیسا سنگین جرم کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ شاید اسی ایک وعدے پر جو ڈی سلوا پہلے بھی ایسی ہی عاقبت نااندیش لڑکیوں سے کئی بار کر چکا تھا اور کئی بار توڑ چکا تھا مگر اسے یہ سب کہاں معلوم ہو گا۔ اسے تو یقین ہو گا کہ اگر وہ اپنے باس کو یعنی اپنے مستقبل کے شریک حیات کو دشمنوں سے بچانے میں کامیاب ہو گئی تو اس کا انعام بہت بڑا ہو گا۔ شاید ڈی سلوا نے کہا ہو گا کہ ڈارلنگ تم یہ کام کر دو تو سارے بگڑے کام بن جائیں اور اس خطرے کے دور ہوتے ہی ہم جیون ساتھی بن جائیں۔ ہنی مون کے لیے پیرس روانہ ہو جائیں یا تمہیں سوئٹزرلینڈ پسند ہو تو... یا ممکن ہے اس نے اپنی سیکرٹری کو کسی سابقہ جذباتی غلطی کے حوالے سے بلیک میل کیا ہو۔ "دیکھو ڈیئر! ابھی تک تو کسی کو معلوم نہیں کہ تم ایک جرم پہلے بھی کر چکی ہو اور معلوم ہو گا بھی نہیں اگر تم یہ آخری بات مان لو۔ بس اس کے بعد ہم اور تم ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔" وہ مجبور ہو گئی ہو گی۔

"یہ تو بہت برا ہوا سکندر۔" محسن نے اچانک ڈرائیونگ کرتے کرتے کہا۔ "اب تو وزیر خان چچا کی قبر بھی نہیں رہی۔"

میں اپنے خیالات سے چونکا۔ "قبر؟ قبر کیا ہوتی ہے محسن! ٹوٹے ہوئے جذباتی رشتوں کو استوار رکھنے کا ایک ذریعہ۔ آدمی کے ساتھ تو اس کے اعمال جاتے ہیں اور رہ جاتی ہے تو یاد۔ مگر وہ قبر میں نہیں، دل میں رہتی ہے۔ یاد دل میں نہ ہو تو قبر پر بھی کوئی نہیں آتا۔ مٹی کے ان ڈھیروں کا کیا ہے جو بارش میں بیٹھ جاتے ہیں اور زلزلوں سے مٹ جاتے ہیں۔ لندن سے واپس آنے کے بعد اگر مجھے کسی غلط قبر پہ لے جا کر کھڑا کر دیا جاتا تو میں پوری جذباتی وابستگی کے ساتھ وہیں دست بدعا رہتا۔ باپ کی مغفرت کے لیے دعائیں اب بھی کرتا رہوں گا اور میرا عہد قائم رہے گا جو میں نے ان کا ان سے انتقام لینے کے لیے کیا ہے۔ البتہ مجھے بوڑھے گورکن کی موت کا افسوس ہے۔"

"مجھے اس کی موت کا کوئی افسوس نہیں۔" محسن نے کہا۔ "وہ اپنے لالچ کے باعث اس انجام کو پہنچا۔ یہ کتنی بے خبری کی بات ہے سکندر کہ انسان اب مردوں کے ساتھ بھی دھوکا

www.paksociety.com

کرنے لگا ہے۔ سبز لورڈ بیچ میں ان کی ڈیڑیاں اور اپنا ایمان بیچ دیتا ہے۔ دوسرے پیشوں میں تو بد معاشی ہوتی ہی تھی، یہ گورکن بھی اب کتنی برائیوں میں ملوث ہو گئے ہیں۔ قبر کی زمین کے لیے ایک کے ہزار وصول کرنا، ایک ہی قبر کو کئی کئی بار فروخت کرنا، لاشیں میڈیکل کے طلبہ کو بیچنا، کفن چرانا۔ بیشک اکثریت اب بھی خدا سے ڈرتی ہے مگر ایسے بھی کم نہیں جن کے گناہ دیکھ کر شیطان کا سر بھی شرم سے جھک جائے۔"

"میرا خیال ہے محسن کہ اب ڈی سلوا کی زندگی غیر یقینی ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔"

"کیا ہم یہ بات اسے بتا کے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے؟" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ ہم پر اعتماد کر لے۔"

"اگر اس نے اعتماد کر لیا تو وہ بہت سی ایسی باتیں بتا سکے گی جو ہمیں معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور استغاثہ کی ایک اہم گواہ ہو جائے گی۔"

"اسے یقین دلایا جا سکتا ہے کہ اس نے ہماری زبانی تو اس کا انجام کیا ہوگا۔" محسن بولا۔ "ہمارے پاس دستاویزی ثبوت ہیں۔ ہم اسے بتا سکتے ہیں کہ اب تک ڈی سلوا کتنی بار سیکریٹری بدل چکا ہے۔"

"میں نے ابھی تک وہ فائل دیکھی تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر غلام علی نے جو کچھ زبانی بتایا تھا، غلط نہیں تھا۔ اگر ہم کسی طرح ان لڑکیوں سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں...."

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کچھ نہیں مانیں گی۔ وہ اپنے گنہگار ماضی سے تمام رشتے توڑ چکی ہیں اور اس ماضی کے آسیب سے نکل چکی ہیں۔ شاید ان میں کچھ نئے سرے سے نئی زندگی کا آغاز کر چکی ہوں گی اور نئی امیدوں کے ساتھ نئے ہمسفر منتخب کر چکی ہوں گی۔ وہ یہ خطرہ کیوں مول لیں گی کہ ہم گڑے مردے اکھاڑ کے ان کے مستقبل کا خانہ خراب کر دیں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے محسن کہ ان میں سے کچھ آرزوئے انتقام سے مغلوب ہوں لیکن اپنی بے بسی اور کمزوری کے باعث کچھ نہ کر سکی ہوں۔ اگر انہیں اعتماد ہو کہ.... کہ ہم سے تعاون میں ان کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں اور ہم ان کی مدد سے بہت کچھ کر سکتے ہیں... تو شاید وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا افسانہ کہہ سکیں۔" میں نے کہا۔ "اب تو نے ایک بات کہی ہے تو اس سے مجھے ایک لائن مل گئی ہے۔ فرض کرو میں کسی طرح ڈی سلوا کی سیکریٹری سے رابطہ قائم کرتا ہوں، کسی طرح اسے تنہائی میں ایک بار ملنے پر رضامند کر لیتا ہوں۔ خوفزدہ وہ یقیناً ہوگی کیونکہ اس نے ایک قتل کیا ہے اور وہ ایک نادان لڑکی ہے کوئی پیشہ ور مجرم نہیں ہے۔ ایک بار وہ ملنے آ گئی تو میں اسے بہت کچھ بتا دوں گا، مثلاً یہ کہ میں نے اسے فوزیہ کے روپ میں بھی شناخت کر لیا تھا اور اب اس کی ذات کو کتنے سنگین خطرات لاحق ہیں۔ ڈی سلوا کے کردار کو بے نقاب کر کے میں اسے سمجھا سکتا ہوں کہ اب خدا کے بعد ہمارے سوا اس کو بچانے والا کوئی نہیں۔ اگر اس نے اعتبار نہ کیا تو میں اس کو ڈی سلوا کی کسی سابقہ سیکریٹری سے ملوانے کا انتظام کر لوں گا اور اس کے بعد وہ ہمارا ساتھ دینے پر مجبور ہوگی۔"

"اور ہم اسے تحفظ، یا تحفظ کی ضمانت کیسے فراہم کریں گے؟"

"یہ بعد میں سوچیں گے۔" میں نے کہا۔ "خدا کی دنیا بہت بڑی ہے۔ ایک لڑکی کو چھپانا مقصود ہو تو ایک گوشہ کافی ہوتا ہے جو کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔ ویسے بھی مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہوتا ہے۔ ہم نیک نیتی سے اس لڑکی کو بچانا چاہتے ہیں جو نادانی کے باعث سفاک اور پیشہ ور مجرموں کے جال میں پھنس گئی ہے۔ اگر ہم اس کی مدد سے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتے ہیں تو یہ بھی کوئی غلط مقصد نہیں۔ خدا پر بھروسہ رکھو اسی نے ہی اب تک ہماری حفاظت کی ہے ورنہ ہم کیا کر سکتے تھے۔ وہ ہمارا مددگار ہوگا۔"

ظاہر ہے اس کے بعد محسن کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ چراغ دین کی کوٹھی میں کار داخل ہوئی تو میں نے سب سے پہلے گلاب خان کو دیکھا اور پھر چراغ دین کو جو برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھا تھا اور گلاب خان سے قبرستان میں پیش آنے والے واقعات سن رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس وقت اپنے رقیب روسیاہ کی صورت بھی نہ دیکھوں مگر وہ مجھے زبردستی ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ محسن نے بہت کوشش کی کہ وہیں سے کار کی چابی اس کے حوالے کر کے نکل جائے لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ چراغ دین دوبارہ ملنے کے منصب پر فائز ہو جانے والے محسن کی خاطر مدارت پر کمربستہ تھا۔ طوعاً و کرہاً ہم نے چائے پی اور اس دوران میں چراغ دین کے سوالات کے جوابات بھی مجبوراً دیے۔ وہ سخت حیرانی اور پریشانی کا اظہار کرتا رہا۔ محسن کا موڈ چراغ دین کے خوشامدانہ اخلاق کے باعث زیادہ خراب ہوتا جا رہا تھا

اور خود میں نفرت کے دوہرے جذبات کا شکار تھا۔ اس شخص نے میرے باپ کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔ وہ دنیا میں اس کی خرابی، رسوائی اور تباہی کا منتظر رہتا تھا لیکن میرے سامنے اپنی شرافت کا ڈھونگ رچا کے اپنے جرائم پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے میرے باپ کی کمائی سے غبن کر کے سب کچھ حاصل کیا تھا جو دنیا میں شرافت اور عزت کی سند تھا اور پھر اس نے اپنے آقا کو اپنا ملازم بنانے کی مزید تحقیر و تذلیل کا ناقابل معافی جرم کیا تھا اور اب میری محبت کا خون کرنا چاہتا تھا۔ بے شک فوزیہ کو ایک بالغ زندگی پر اختیار سے محروم کرنے کے بعد مجھے یہ حق حاصل نہیں رہتا تھا کہ اس کے مستقبل کے کسی فیصلے کی راہ میں حائل ہو سکوں مگر فوزیہ نے کہا تھا کہ وہ مجھے بھول کے جینے کی مجبوری کو قبول کر سکتی مگر چراغ دین سے شادی کر کے جینا قبول نہیں کرے گی۔ میں نے فوزیہ کے ارمانوں کا خون کیا تھا تو ایک عظیم تر مقصد کی خاطر لیکن میں کسی اور کو فوزیہ کی زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ میرے باپ کے بعد چراغ دین کو فوزیہ کی جان لینے کی مہلت دینا میرے لیے ناممکن تھا۔ ابھی تک میں نے طے نہیں کیا تھا کہ چراغ دین کو سزا کیا دی جائے کیونکہ اس سے پہلے دوسرے مجرم تھے جن سے نمٹنا ضروری تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ چراغ دین کی ہزار اداؤں میں رکھنا بھی مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ محسن کے جذبات بھی مجھ سے مختلف نہ تھے اور وہ صاف کہہ چکا تھا کہ فوزیہ کو زندہ رکھنے کے لیے وہ چراغ دین کو قتل کر دے گا۔ ابھی تک اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ وہ اس مشغلے سے کیسے نمٹنا چاہتا ہے مگر اس کے عزائم بھی خطرناک تھے۔

اچانک محسن نے گلاب خان کو دس کا نوٹ دے کر کہا۔ "ایک پیکٹ سگریٹ کا لے آؤ۔ خدا معلوم یہ تم کون سے سگریٹ پیتا ہوں۔ بہ قمری کا اسل۔ بیس کا پیکٹ ملے گا دس کا نہیں۔"

"قمری کا اسل؟" گلاب خان نے تذبذب کے ساتھ کہا۔

"اصغر تو شاید یہی ملے۔"

"تو اسٹیشن تک چلا جا۔" محسن نے کہا۔ "تکلیف تو ہوگی تمہیں..."

بات تکلیف کی نہیں تھی، سگریٹ میری جیب میں موجود تھے قمری کا اسل ان دنوں ناپید ہو گئے تھے چنانچہ محسن کا مقصد صرف بکھیڑا کو گھر سے رخصت کرنا تھا۔

"مسٹر چراغ الدین!" محسن نے بکھیڑا کے جاتے ہی کہا۔ "مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی اس لیے میں نے گلاب خان کو باہر بھیج دیا ہے۔"

چراغ دین پہلے تو ذرا سا برا ماننے کے باوجود مسکرایا پھر اس نے محسوس کیا کہ یہ معاملے کا مذاق نہیں تھا اور محسن کے لہجے کی سختی اور اس کی صورت دیکھ کر وہ چوکنا ہو گیا۔ "ایسی کون سی بات ہے محسن میاں؟"

"میں لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔" محسن نے اسی لہجے میں کہا۔ "اس لیے صاف بات سن لو۔ مجھے فوزیہ سے تمہاری شادی منظور نہیں۔" چراغ دین کی صورت پہ بارہ بج گئے تھے۔ وہ کچھ دیر محسن کو یوں دیکھتا رہا جیسے اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر اس کی نگاہ مجھ پہ آ کے ٹھہر گئی لیکن اسے زیادہ مایوسی ہوئی۔ میری آنکھوں میں اس کے لیے نفرت کے جذبات شدید تر تھے۔

"میں تمہاری بات سمجھا نہیں محسن میاں!" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ وہ اب سنبھل گیا تھا۔

"مسٹر سی ڈین! میں نے انگریزی میں تو بات نہیں کی۔" محسن نے تلخ طنزیہ لہجے میں کہا۔

"سوال یہ ہے مسٹر محسن کہ آپ کون ہوتے ہیں یہ رشتہ منظور یا نامنظور کرنے والے؟" چراغ دین نے تیز ہو کر کہا۔

"میں فوزیہ کا بڑا بھائی ہوں۔" محسن نے سکون سے کہا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں؟"

"لیکن تم اس کے سرپرست نہیں ہو۔ تم والدین کے فیصلے کو نہیں بدل سکتے اور نہ میرے فیصلے کو۔" چراغ دین بولا۔

"سمجھ گیا۔" محسن نے کہا۔ "اور تم بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ میرا فیصلہ کیا ہے۔ مریم کے معاملے میں بھی مجھے والدین سے اختلاف تھا مگر میں چھوٹا بھائی تھا۔ اس کے علاوہ خود مریم کو اعتراض نہیں تھا لیکن اب فوزیہ کو یہ رشتہ منظور نہیں، اس لیے میں خاموش نہیں رہ سکتا۔"

"فوزیہ کو رشتہ منظور نہیں؟" چراغ دین نے ہانپ کے کہا۔

"ہاں۔ یہ بات خود اس نے مجھ سے کہی ہے کہ وہ مر جائے گی لیکن تم سے شادی نہیں کرے گی۔ اس لیے میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں تم کو قتل کر دوں گا لیکن یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔" محسن اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے اپنی بہن کی زندگی بچانے کے لیے والدین سے نافرمانی کا الزام اور پھانسی دونوں منظور ہیں۔"

چراغ دین کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا۔ "تم... تم نے ہی مجھے ٹیلیفون پہ بھی دھمکی دی تھی؟"

www.paksociety.com

"تمہیں فون پر؟" محسن نے حیرانی سے کہا۔ "کیوں جھوٹ بول رہی ہو! کیا میں تم سے ڈرتا ہوں؟ میں یہ دھمکی تمہارے منہ پر دے رہا ہوں اور یہ بھی بتا رہا ہوں کہ اسے خالی دھمکی مت سمجھنا۔"

میں اور محسن اسے پتھر کے بت کی طرح ساکت بیٹھا چھوڑ کے باہر آ گئے۔ میں نے اپنی زبان بند رکھنے کی سخت جدوجہد کی تھی اور کامیاب رہا تھا ورنہ میرا دل چاہتا تھا کہ میں بھی اس سے دل کی بات صاف صاف کہہ دوں۔ اسے بتا دوں کہ بالفرض محال محسن نے تمہیں بخش بھی دیا یا خود تم نے زندگی کو اس رشتے سے عزیز تر سمجھتے ہوئے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا تب بھی میرے ارادے میں فرق نہیں آنے گا۔ میں تمہارے کا وہ قرض ضرور وصول کروں گا جو میرا باپ وصول نہ کر سکا۔ صاحب نہ بلنے کو چھوڑ کر اس نے تم جیسے ٹھگ حرام کی ملازمت کی ذلت قبول کی تھی تو اس کی صرف ایک ہی وجہ میری سمجھ میں آتی ہے۔ وہ تمہیں سزا دینا چاہتا تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ اب اس کا وارث میں ہوں تو یہ سب ذمہ داریاں بھی مجھ کو ہی پوری کرنی ہیں جو میرا باپ پوری نہ کر سکا۔ میں نے اس بات کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھنا بہتر خیال کیا کیونکہ یہ لمبی بات تھی اور گلاب خان آنے ہی والا تھا۔ جب ہم کوٹھی سے نکلے تو شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔

رابعہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ دوپہر کے بعد خاص رضوی صاحب نے پولیس سرجن کو فون کیا تھا اور انہیں تمام واقعات کا علم ہو گیا تھا۔ شام سے پہلے ہی انہوں نے رابعہ کو فون کر دیا تھا مگر وہ خود کسی مصروفیت کے باعث ابھی تک گھر نہیں پہنچے تھے۔ ان کی بیگم لان کی کاشانی چیئر پر بیٹھی تھیں۔ میں ہاتھ کو سرہانے رکھ کے گھاس پر لیٹ گیا اور گہرے نیلے آسمان کی وسعت کو گھورنے لگا۔ محسن نے خواتین کو ہسپتال میں پیش آنے والے واقعات بتانے شروع کیے جو بیگم رضوی کے لیے سنسنی خیز کہانی کی طرح تھے اور رابعہ کے لیے ایک تازہ الجھن۔ اس کا سارا دن اپنے گھر کی آتش زدگی اور کار کی چوری کے معاملات کی تفتیش کرنے والوں کے سوالوں کے جواب اور بیانات دیتے گزر گیا تھا۔ میرے اپنے سر میں شدید درد تھا چنانچہ جب چائے آئی تو میں نے پوچھا کہ کیا گھر میں اسپرین مل سکے گی؟ پوچھنے پر اسپرین لا کے دی جو میں نے پانی کے پورے گلاس کے ساتھ نگل لی اور پھر وہیں بیٹھا چائے پیتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد بیگم رضوی معذرت کر کے اٹھ گئیں۔ وہ کم گو اور کم آمیز مگر طبعاً نیک اور خاتون تھیں جو نوکروں کے ہوتے ہوئے بھی شوہر کے تمام خانگی کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں اور اس وقت بھی ان کو دیکھنا تھا کہ رضوی صاحب کا جو سوٹ ڈرائی کلین ہو کے آیا ہے اس پر استری ٹھیک ہے یا نہیں، انہیں رات کو کسی تقریب میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ محسن کے بھی سر میں درد تھا مگر وہ اسپرین کے استعمال کے خلاف تھا اور اس کا علاج نیند سے کرتا تھا۔ میں اپنے منتشر خیالات سے بچنے کی جدوجہد میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا اور سکون چاہتا تھا۔ سر کا درد کم ہوا تو تھکن کا احساس غالب آ گیا اور نہ جانے کیسے میری آنکھ لگ گئی۔ میری آنکھوں نے ایک خواب دیکھا۔ خواب بڑے جادوگر ہوتے ہیں، کبھی حال کے رشتے ماضی سے جوڑ دیتے ہیں تو کبھی مستقبل سے۔ خواب پر ریسرچ کرنے والوں نے یہ تو معلوم کر لیا کہ خواب ناکام آرزوؤں کا ردعمل ہوتے ہیں مگر یہ سوال اب بھی جواب طلب ہے کہ خوابوں میں وقت کتنا صرف ہوتا ہے۔ گھنٹوں یا دنوں پر محیط مناظر کو خواب میں دیکھتے ہوئے چند منٹ لگتے ہیں یا کیسے اور ایک رات میں ایک عمر کے خواب کیسے سما جاتے ہیں؟

میں نے دیکھا کہ میرے چاروں طرف حد نگاہ تک سرسوں کے زرد پھولوں کا ایک سمندر سا تھا جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور میرے سر پر شوخ نیلا آسمان ہے جس میں صرف ایک بادل کا ٹکڑا تیر رہا ہے۔ پھر وہ ٹکڑا نیچے اترا اور میرے گرد پھیل گیا۔ وہ خوشبو کا بادل تھا اور یہ خوشبو ہوا کے جھونکے کی طرح مجھے اڑا کے لے گئی۔ یکلخت مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میں رابعہ کا ہاتھ ہے اور وہ بھی میرے ساتھ بادل پر بیٹھی ہے۔ اداس اور دل گرفتہ۔ "تم؟" میں نے کہا۔ "تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"اور کہاں جاؤں؟" وہ بولی۔ "میرا کوئی گھر موجود نہیں ہے۔"

"تمہارا کوئی بھی گھر نہیں ہے؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا۔ "تو کیا اب تم بادلوں میں رہو گی؟ پہلے کہاں رہتی تھیں تم؟"

رابعہ نے نیچے دیکھا۔ "وہاں۔" اس نے انگلی سے دھوئیں کے ایک مرغولے کی طرف اشارہ کیا جو اوپر اٹھتا چلا آ رہا تھا۔ "دیکھو سکندر! یہ دھواں مجھے نگل لے گا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ چلائی۔

"ڈرو نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" میں نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ "مگر یہ دھواں کیسا ہے؟ کیا تھا وہاں؟"

"یہاں میرا گھر تھا۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"جھوٹ۔" میں نے قہقہہ لگا کے کہا۔ "تمہارا گھر تو وہ ہے۔" میں نے انگلی سے دوسری جانب اشارہ کر کے کہا۔

"وہ سفید اجلی دھوپ میں جگمگانے والا سبز وادی گھر جس کے شفاف شیشوں والے دریچوں کے پیچھے ریشمی پردے پڑے ہیں۔ جس کے گرد ہفت رنگ پھولوں کی بہار ہے اور سبزے کا قالین بچھا ہوا ہے۔ جہاں وہ دونوں عزیز رہتے ہیں خصوصاً لڑکی۔"

"مگر... مگر یہ تو گھر تمہارا ہے...؟" رابعہ نے پلک جھپکائے بغیر دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے دیکھا نہیں! اس بچی کی صورت تم سے کتنی ملتی ہے؟" میں نے دلیل دی۔

"لیکن لڑکا تو ہو بہو تم جیسا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

پھر خواب ختم ہو گیا اور میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ وہ خوشبو کا بادل اب بھی میرے آس پاس ہی کہیں موجود تھا اور یہ خوشبو مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ رابعہ میرے قریب لان پر بیٹھی تھی اور اس کا ایک ہاتھ میری پیشانی پر تھا۔ اس نے جو لباس پہن رکھا تھا اس پر پیلے رنگ کی زمین میں سرسوں جیسے زرد پھول چھاپے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ مل کے میرا خواب بن گئے تھے۔ میں اٹھ بیٹھا۔ "کتنی دیر تک سوتا رہا ہوں میں؟" میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ پانچ منٹ پہلے محسن سونے گیا تھا تب بھی میں نے گھڑی دیکھی تھی۔

"تم سو رہے تھے پر میں کبھی سر میں زیادہ درد ہے۔" وہ شفقت سے بولی۔ "اندر جا کے سو جاؤ، تمہیں سکون کی ضرورت ہے۔"

"سکون تو اسے زیادہ مل رہا تھا۔" میں نے کہا اور رابعہ کے چہرے کو سرخ پڑتے دیکھا۔ "سر کا درد ٹھیک ہو گیا ہے اور سونا میں چاہتا نہیں ہوں ابھی۔ مجھے تم سے باتیں کرنی ہیں۔ ضروری یا غیر ضروری، جو چاہو سمجھ لو۔"

"اچھا۔" وہ بولی۔ "تو یوں کرتے ہیں باہر چلتے ہیں، بہت ساتھ دینے کی۔"

بات کے ذو معنی ہو جانے کا احساس رابعہ کو دیر سے ہوا۔ "میری ہمت تو تمہارے ساتھ چلنے کا ہی نام ہے۔" میں نے کہا۔ "تم بتاؤ؟"

"میں کیا بتاؤں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے تو ہمت آزمانے والے ہی ملے ہیں جیسے ملے ہیں۔ تم بھی آزما لو۔"

"تم سیریس ہونے لگی ہو۔" میں بھی کھڑا ہو گیا۔ "میں تو تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ ابھی میں کتنا خوبصورت خواب دیکھ رہا تھا، بالکل فلمی۔"

"تم بھی خواب دیکھتے ہو اور وہ بھی... فلمی قسم کے؟" وہ مسکرائی۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمہارے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آئی۔" میں نے کہا۔ "یہ بڑی نیک فال ہے۔ گردش حالات کا شکار ہم دونوں رہے ہیں رابعہ! اور تقدیر کے عطا کردہ غم ہم دونوں کا مقدر ہیں۔ کون جانے ابھی اس کے ترکش میں کتنے تیر باقی ہیں مگر جو کچھ ہونا ہے اس سے مفر نہیں اور قبل از وقت پریشانی اس کا علاج نہیں ہے۔ اب ایک شاعر نے تو فرمایا ہے کہ آخر غریب کل کے لیے کریں آہ و زاریاں۔ جو میرے خیال میں وقت اور انرجی ضائع کرنے والی بات ہے۔ چنانچہ دوسرا نقطہ نظر مثبت ہے یعنی عرض کیا ہے۔

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسین خواب بن سکیں

رابعہ ہنس پڑی۔ "تم بھی کمال آدمی ہو کہ ان حالات میں شاعری سوجھ رہی ہے۔ مگر اب چلو گے بھی یا...؟"

"بس دو منٹ۔ ذرا میں شیو کر لوں اور کپڑے بدل لوں۔" میں نے کہا۔ "یہ تو بتاؤ جانا کہاں ہے؟"

"میں جانا چاہتی تھی جہاں آشیاں رکھنے نگری تھی جس پہ کل بجلی۔"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم گزرے ہوئے کل پر آنسو بہانے کہیں نہیں جائیں گے۔ ہم امید کی جانب سفر کریں گے۔ ایک دوسرے کا سہارا بن کے۔ تم یہاں بیٹھو میرا خیال کہیں اور جانے کا ہے۔"

غسل کے دوران ہی میں نے شیو بنائی اور دس منٹ بعد کپڑے پہن کے تیار ہو گیا۔ اس عرصے میں میرے خیالات کا محور رابعہ کی ذات رہی۔ وہ واقعی بہت غیر معمولی لڑکی تھی نہ صرف یہ کہ اس نے تن تنہا اپنے حالات کا مقابلہ کیا تھا بلکہ میرا ساتھ دینے کی سزا کو بھی انتہائی صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کیا تھا۔ ماں کی موت کے ساتھ ہی اس کا گھر تباہ ہو گیا تھا مگر وہ ان صدمات سے پاگل نہیں ہوئی تھی اور اتنی پرسکون تھی کہ اس کا حوصلہ کسی بھی عزم و امید کا رخشندہ ستارہ ثابت ہوتا تھا۔ وہ رابعہ جو باہر سے دنیا کو ایک کامیاب وکیل اور پتھر کی چٹان جیسی سخت جان لگتی تھی اندر سے ایک عام عورت تھی جو اپنے وجود کی زمین میں پیار کو یوں چھپائے رکھتی ہے جیسے صدف کی آغوش میں کوئی قطرۂ شہوار اور انتظار کرتی رہتی ہے کہ کوئی آئے اور اس کے دل کی گہرائی میں اتر کے اس گوہر نایاب کو حاصل کرے۔ جیسے زمین اپنی کوکھ میں بیج دبائے منتظر ہو کہ گھٹا برسے اور دھوپ اترے تو تخلیق آرزو مچلے۔ زندگی کے

www.paksociety.com

بے سمت سپاٹ صحرا میں چلتے چلتے رابعہ کو یکلخت میں نے ایک نخلستان کا ٹھنڈا پرسکون سایہ فراہم کر دیا تھا اور اب وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ میرے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔ میری خوشی کے لیے اس نے اپنا غم بھلا دیا تھا اور مجھے بتا دیا تھا کہ مجھ سے زیادہ وہ اسے اپنی ذات پر بھی اعتماد نہیں۔ اگر اندر سے اس کا دل رو رہا تھا تب بھی وہ میری خاطر مسکرا رہی تھی۔ وقت ہر دکھ کا درماں ہے مگر وقت کو چارہ گری کا موقع ہی کہاں ملا تھا۔ رابعہ کو میرے مصائب و آلام کا اندازہ تھا اور وہ مجھے ہر احساس جرم و پشیمانی سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی چنانچہ وہ ظاہر کر رہی تھی کہ اس میں ہر صدمہ جھیلنے کا حوصلہ ہے اور یہی حوصلہ مجھ میں بھی ہونا چاہیے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اسے مایوس کر دیتا۔

میرا دل چاہتا تھا کہ اس وقت رابعہ کے ساتھ باغ جناح کے کسی معطر اور سرسبز گوشے میں کسی پہاڑی پر نصب خیل گون روشنی بکھیرنے والے کھمبے کے نیچے پتھر کی بنچ پر جا بیٹھوں یا جھیل کے کنارے جا نکلوں اور درختوں کے سایوں میں ٹھہری ہوئی کشتی لوں اور دریا کی نرم لہروں پر بہتا کامران کی بارہ دری تک چلا جاؤں جزیرے پر جا اتروں جس کے ہر طرف دلداری بجتی ہے۔ یا کسی ہستی سے جگمگ کرتے قمقموں سے معمور اور نکہت و رنگ سے معمور فضاؤں والے ہوٹل کی گہما گہمی میں کھو جاؤں لیکن وقت کے تقاضے تلوار بن کے میرے سر پر لٹک رہے تھے۔ ثمن گہری نیند میں تھا۔ میں نے غلام علی مرحوم کی دی ہوئی فائل نکالی اور اس کے چند اوراق پر سرسری نگاہ ڈالی۔ اس نے بہت سی کارآمد معلومات کو یکجا کرنے کے لیے سخت محنت کی تھی اور وفا شناسی میں احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا بھی بھول گیا تھا۔ وہ خود کو مقروض سمجھتا تھا کیونکہ میرے باپ نے اس کے ساتھ ایک نیکی کی تھی۔ اب نیکی کا یہ قرض وہ مجھ پر چھوڑ کے مر گیا تھا۔ ابھی میں کاغذ کے ایک پیڈ سے مزید تفصیلات نوٹ کر رہا تھا کہ رابعہ دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔

"ابھی تک جناب کے دو منٹ پورے نہیں ہوئے؟"
وہ بولی اور میں جواب دینے کے بجائے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے لباس بدل لیا تھا اور وہی ساڑھی باندھ لی تھی جو اس نے پہلی بار مجھ سے جیل میں ملاقات کرتے وقت باندھی تھی اور جسے دیکھ کر مجھ کو صبح بہاراں اور صحن گلشن جیسے استعارے ذہن میں آتے تھے۔ بھولی بسری بھول کھل اٹھے میرے ویرانے میں جیسے شعر یاد آتے تھے اور کلیاں گل پیراہن جیسے منظوم

واضح ہوتے تھے۔

"ایسی حیرانی سے کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ بولی۔ "ہم جو قیدی کے معاملے میں خواہ مخواہ بدنام ہیں۔"

"تم میں جو بات ہے وہ کچھ اور ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اور تیار کیا ہم نہیں ہیں؟"

رابعہ کو ابھی تک کار واپس نہیں ملی تھی۔ اسے کار پولیس سے ریلیز آرڈر دیر سے ملے تھے اور پولیس کی کوشش کے باوجود اسی دن ضابطے کی کارروائی پوری نہ ہو سکی تھی۔ کار کا حلیہ تو ٹریفک حادثے سے بگڑ چکا تھا اور ڈینٹنگ پینٹنگ کرائے بغیر اس کو دن کے وقت چلانا لوگوں کو خاصی توجہ فراہم کرنا تھا۔ مگر رات کو یہ کار وسیلۂ سفر بننے کے علاوہ خلوت فراہم کر سکتی تھی۔ کار میں بیٹھا ہوا آدمی ہجوم سے الگ ہو جاتا ہے اور خود کو اتنا ہی محفوظ تصور کرنے لگتا ہے جتنا اپنے کمرے کی چار دیواری پر قائم چھت کے نیچے۔ ہم باہر نکلے اور میں نے احتیاطاً خالی سڑک پر دونوں جانب نگاہ ڈالی لیکن رات کا اندھیرا اتنا گہرا ہو چکا تھا کہ مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ رابعہ سے چھپا کے میں نے بھرا ہوا ریوالور ساتھ رکھا تھا مگر کوئی بے خبری میں آ لیتا تو یہ حفاظتی انتظام بے مصرف ثابت ہوتا۔ اسی احتیاط پسندی کے باعث میں نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو غور سے دیکھا جس نے ہمیں دیکھ کر ٹیکسی روک لی تھی۔ رابعہ کے ساتھ پیچھے بیٹھ کے میں نے ڈرائیور کو تبت روڈ چلنے کے لیے کہا اور اگرچہ وہ صحیح راستے سے جا رہا تھا لیکن میں ریوالور نکالنے کی پوزیشن میں مستعد بیٹھا رہا۔ جب وہ ہمیں تبت روڈ پر اتار کے اور کرایہ لے کر رخصت ہو گیا تب بھی میں ٹیکسی کو دور جاتے دیکھتا رہا۔

"کیا بات ہے سکندر؟" رابعہ نے کہا۔ "راستے بھر تم بہت خاموش اور کشیدگی کا شکار لگتے رہے ہو۔"

"سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے۔ یہ بات بڑے تلخ تجربات کا نتیجہ ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے ایک قدر تو اپنی جان کا تھا اور دوسرا جان جاناں کا۔"

"کیا اس بات کو تبت روڈ سے کوئی نسبت ہے؟ میں نے راستے میں پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"یہاں ہم کسی سے ملنے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک لڑکی سے جو پہلے ڈی سلوا کی سیکرٹری تھی۔"

"بہت خوبصورت تھی کیا؟" رابعہ نے شوخی سے کہا۔ "ہم ساتھ ساتھ چلنے لگے۔" یہ عالم شوق کا۔

"خوبصورت تو یقیناً ہو گی وہ ڈی سلوا کی سیکرٹری

www.paksociety.com

ڈھونڈ لی۔" میں نے کہا۔ "لیکن دیکھے بغیر میں یہ فرض ہی کر سکتا
سکتا ہوں کہ تم سے زیادہ حسین نہیں ہوگی۔ دیکھنا اب یہ ہے کہ وہ
کس حال میں ہے۔ ممکن ہے وہ کسی کی بیوی ہو۔ یا ایک مجبوری
لبری کہانی کے سوا کچھ بھی نہ ہو جسے کوئی گوارا نہ کرے۔
جب اسے ڈی سلوا نے رخصت کیا تھا تو اس کے ماتھے پر
کلنک کا ایک ٹیکہ سجا دیا تھا۔ لوگ وفادار ملازم کو
ملازمت سے الگ کرتے ہیں تو کوئی سرٹیفکیٹ ضرور دیتے ہیں۔ لیکن
ڈی سلوا کی عطا کردہ سند نے اس لڑکی کو کیا دیا ہوگا۔ بدنام مستقبل کا
اکیلا پن یا بے غیرتی کی موت۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی
سے کام لیا ہو تو اس لڑکی نے کلنک کے ٹیکے کو ماتھے کا جھومر
بنا لیا ہو اور اپنے ماضی سے دامن چھڑا کے بھاگ گئی ہو کسی ایسی
جگہ جہاں اس ماضی کی پرچھائیاں بھی نہ پڑیں۔ لیکن وہ مل
جائے تو اچھا ہے۔ میں اس سے مکمل رازداری کے وعدے کے ساتھ
یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ڈی سلوا نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔
اس کا سارا کچا چٹھا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور تمہارا خیال ہے وہ تمہیں خود بتا دے گی؟"

"نہیں مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اسی
لیے میں تم کو ساتھ لایا ہوں۔ اپنا اعتبار قائم کرنے کے لیے۔"
میں نے کہا۔

"بالفرض محال اس نے بتا دیا کہ ڈی سلوا شیطان ہے اور
اس کی خباثت کی داستان بھی سنا دی تو اس کا فائدہ؟"

"میں اس کو بطور گواہ استعمال کروں گا۔ کسی قانونی عدالت
میں نہیں، ایک اور لڑکی کے سامنے جو اب ڈی سلوا کی سیکریٹری
ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی زندگی کا انجام بھی
ہوگا بلکہ بدترین ہوگا۔ وہ کل تک زندہ رہی تو ڈی سلوا کی
اصلیت معلوم ہو جانے کے بعد سمجھ جائے گی کہ اس نے جو توقع
یا نادانستگی میں ڈی سلوا کے لیے ایک قتل کر دیا ہے، جو ڈی سلوا
نے اس سے محبت کے نام پر جو وعدے کیے ہیں وہ کتنے بے
حقیقت ہیں۔ اور جیسے لوگ آلۂ قتل کو فوراً ٹھکانے لگانے
کی فکر کرتے ہیں، ایسے ہی ڈی سلوا کے لیے اس کو ٹھکانے
لگانا ضروری ہو گیا ہے کیونکہ نہ صرف یہ کہ میں نے اسے شناخت
کر لیا تھا بلکہ شدت جذبات میں اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔"

"سکندر! تم اس لڑکی، ڈی سلوا کی موجودہ سیکریٹری کو
ابھی خبردار نہیں کر سکتے؟" رابعہ پریشان ہو کے بولی۔ "تمہیں
پتہ معلوم ہے اس کا؟"

"اس کا نام ہے شہلا۔ معلوم نہیں کہ وہ بے اینڈ بے
مسلمان۔ ماں اور ایک چھوٹے بھائی کے ساتھ گلبرگ میں رہتی

ہے۔ باپ شاید مر چکا ہے یا الگ ہو گیا ہے۔"
کاغذ کا پرزہ نکالا جس پر دونوں پتے لکھے ہوئے تھے۔
"الماس یعنی اس سابقہ سیکریٹری سے بات کرنے کے لیے اگر
ہو سکے تو گلبرگ بھی چلے جائیں گے۔ وہاں بھی تمہیں ہی اس
سے بات کرنی ہوگی۔ مجھے تو وہ دیکھتے ہی بدک جائے گی۔ وہ
سمجھ لو کہ میں بھی تمہیں اسی لیے ساتھ لایا ہوں کہ
میرے مقاصد نیک ہیں۔ اگر ڈی سلوا کی موجودہ سیکریٹری شہلا
اس سے بدظن ہو گئی تو وہ ہمارا ساتھ دینے پر مجبور ہوگی۔
ایسی بہت سی باتیں بتا سکے گی جو ڈی سلوا کو بے نقاب کرنے
میں معاون ثابت ہوں۔ بشرطیکہ ہم اسے تحفظ کی ضمانت
فراہم کر سکیں اور یقین دلا سکیں کہ ہم واقعی اس کی حفاظت
کر سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں آج تمہارا موڈ تفریح کا تھا اور
خود میں بھی یہی چاہتا تھا کہ ان مسائل سے دامن چھڑا کے
تمہارے ساتھ رہوں اور دوسری باتیں کروں۔ مگر یہ بات
ایک لڑکی کی زندگی اور موت کے درمیان حائل ہے۔ اگر میں
یہ کام کل پر اٹھا کے رکھتا تو شاید میری محنت رائیگاں جاتی۔
مجبوراً میں تفریح کے ساتھ اس مقصد کو شامل کر رہا ہوں۔"

"پھر تمہاری وضاحت میں معذرت کا انداز کیوں ہے؟"
رابعہ نے کہا۔ "تفریح ایک زندگی کو بچانے کے مشن سے زیادہ
اہم تو نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے تمہیں پہلے یہاں آنے کے
بجائے شہلا کے پاس جانا چاہیے تھا۔ فوری خطرہ تو اس کی
ذات کو لاحق ہے۔ اگر تم اسے شناخت کر چکے ہو تو ڈی سلوا
کو پہلے اس کی طرف سے تشویش لاحق ہوگی۔ الماس ابھی
محفوظ ہے۔"

میں چلتے چلتے رک گیا۔ "کہتی تو تم ٹھیک ہو لیکن شہلا
مجھے جانتی ہے۔ وہ تمہیں بھی جانتی ہے۔ اگر کسی طرح الماس
خود اس سے بات کرنے پر رضامند ہو جائے تو کہانی بنانے
کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔"

"مگر کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟" وہ میرا بازو
تھام کے بولی۔ "دلائل دینا تو میرا پیشہ ہے اور تم بھی قائل
کرنا جانتے ہو۔ وہ ذرا بھی سمجھدار ہوگی تو یقین کرے گی کہ
اس کی پوزیشن کتنی خراب ہو چکی ہے۔ وہ ڈی سلوا کی سیکریٹری
ہے، اس کے کردار کو پہچانتی ہوگی۔"

"قائل از حد ہے۔" میں نے کہا۔ "میں یہ جانتا تھا بھولا
لیکن میری صورت دیکھتے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا تو؟"

"یہ اس کی بدبختی کی دلیل ہوگی۔ ہم لوٹ آئیں گے۔"
رابعہ بولی۔ "ویسے تدبیر چاہیے اگر ہو تو ہر بند دروازہ کھل

جاتا ہے۔"

رابعہ نے میری سوچ کی سمت بدل دی تھی۔ اس نے
ٹھیک کہا تھا کہ خطرے میں شہلا کی زندگی ہے تو مجھے پہلے اس
کی فکر کرنی چاہیے۔ ابھی الماس کی طرف ڈی سلوا کا دھیان
کیسے جا سکتا ہے۔ اس کی گواہی شہلا کو قائل کرنے کے لیے
ضروری تھی لیکن یہ ناممکن نہیں تھا کہ شہلا اس کے بغیر ہی قائل
ہو جائے۔ بصورت دیگر ہم الماس کو شہلا کے بعد پکڑ سکتے
ہیں۔ دوبارہ ٹیکسی میں بیٹھ کے گلبرگ جاتے ہوئے میں طے
کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ سوالات نہ پوچھنے کے وقت آنے
کا خیال میرے لیے ناقابل قبول تھا لیکن میں نے اس کا
اظہار رابعہ پر نہیں کیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے ٹیکسی کو موڑ
پر چھوڑا اور ہم ایک "بائی لین" میں پیدل گئے۔ متمول
لوگوں کی یہ بستی ویران پڑی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں
انسان نہیں رہتے کاریں رہتی ہیں جو ہر گھر کے سامنے کھڑی
تھیں اور مسلسل آ جا رہی تھیں۔ بستی کے مکین اپنے پرتکلف
پرآسائش گھروں کے بیڈ روم میں محو استراحت تھے۔ ڈائننگ
روم میں انواع و اقسام کے کھانوں سے ڈائننگ ٹیبل سجائے بیٹھے
تھے اور ڈرائنگ روم میں مہمانوں کی مدارات کر رہے تھے یا

ٹیلی ویژن پر پروگرام دیکھنے میں محو تھے۔ ایک ایک اور دو
دو کنال کی شاندار کوٹھیاں مکمل... لاتعلقی اور غرور
کے ساتھ ایک دوسرے سے اتنی ہی دور تھیں جتنی ان کے
اندر رہنے والے ہمسائیگی کے احساس سے دور تھے۔ کسی فرم کے
منیجر کی سیکریٹری کا ایک معقول تنخواہ کے ساتھ یہاں رہنا بعید از قیاس
تھا لیکن شہلا کے بارے میں فرض کیا جا سکتا تھا کہ اس کے
اخراجات کی عاشقانہ ذمے داری ڈی سلوا نے قبول کر رکھی ہوگی
یا خود شہلا کو بھی اس ناجائز کاروبار کی آمدنی میں شریک کار
کی حیثیت سے معقول منافع مل رہا ہوگا۔ شہلا کا گھر دوسروں سے
بڑا تھا مگر اس کے باوجود نیا اور خوبصورت تھا۔ گیٹ لائٹس
آف تھیں لیکن پورچ میں روشنی تھی جہاں بند جیلے رسانی کی
اور ایک پرانی فیئٹ کار کھڑی تھی۔ دروازے کے باہر کوئی نیم
پلیٹ نہیں تھی مگر کال بیل کا بٹن موجود تھا۔

"معلوم نہیں یہ کار کس کی ہے؟" میں نے تھوڑے
سے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "اگر مہمان موجود ہوئے تو معاملہ بگڑ
جائے گا۔"

"کار شہلا کی بھی تو ہو سکتی ہے۔" رابعہ نے کہا۔ میں نے
سر ہلایا اور بٹن پر انگلی رکھ دی۔ چند سیکنڈ بعد گیٹ

لائٹ جل گئی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ گھنٹی کی آواز جو باہر سنائی نہیں دی تھی اندر کسی نے سن لی ہے۔ پھر میں نے کار کے عقب سے شہلا کو نمودار ہوتے دیکھا۔ میں پیچھے ہٹ گیا اور رابعہ نے ہینڈ بیگ میں سے اپنا کارڈ نکال لیا۔ شہلا نے گیٹ کو تھوڑا سا کھول کے رابعہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ رابعہ نے اپنا کارڈ آگے بڑھا دیا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ آپ کو پہلے کہاں دیکھا ہے۔" شہلا نے کارڈ کو دیکھ کر کہا۔ "آپ سکندر بخت کی وکالت کر رہی ہیں نا؟ پھر یہاں کس لیے تشریف لائی ہیں؟"

"مجھے تم سے بات کرنی تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "اور بات ایسی تھی کہ۔۔۔"

"بات کچھ بھی ہو۔" شہلا نے کہا۔ "میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔"

"لیکن اس بات کا تعلق سکندر بخت سے نہیں تمہاری اپنی ذات سے ہے۔ یہ تمہارے فائدے کی بات ہے۔"

"میں کوئی بات یہاں کرنے کے لیے تیار نہیں۔" شہلا نے بے رخی سے کہا۔ "نفع کی نہ نقصان کی۔ تم چاہو تو کل دفتر آ سکتی ہو۔"

"یہ بات دفتر میں کرنی ہوتی تو میں تمہیں گھر سے فون کر لیتی۔" رابعہ نے کہا۔

"آئی ایم سوری۔" شہلا نے کہا اور گیٹ بند کرنا چاہا۔ اسی وقت میں ساتھ کی دیوار سے نکل آیا اور میں نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ گیٹ کو فوراً سا دھکیلنے سے شہلا پیچھے ہٹی۔ اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا اور میرے ایک ہاتھ نے اس کی آواز کو حلق سے نہیں نکلنے دیا۔ میرا یہ اقدام رابعہ کے لیے بالکل غیر متوقع تھا مگر اس نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے گیٹ کو اندر سے بند کر لیا۔

"ہم بات کرنے آئے ہیں تو بات کر کے ہی جائیں گے مس شہلا!" میں نے کہا۔ "تم جانتی ہو میں کس قسم کا آدمی ہوں۔" اسے یقیناً میری اور ڈی سلوا کی ملاقات یاد آ گئی ہوگی کیونکہ اس نے خود کو چھڑانے کی معمولی سی جدوجہد کے بعد مزاحمت ترک کر دی۔

"میں اس شخص کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں جسے آج تم نے زہر دے کر قتل کر دیا ہے۔" میں نے شہلا کے منہ سے ہاتھ ہٹائے بغیر کہا۔ "میں نے تمہیں نرس کے لباس میں بھی پہچان لیا تھا مس شہلا! ابھی تک یہ بات کسی کو معلوم نہیں لیکن تم نے میری بات نہ سنی تو زمانہ سنے گا۔ پولیس سنے گی اور وہ بڈھا بھی سنے گا جس کی خاطر تم نے عاقبت نااندیشی کا یہ ثبوت دیا ہے کیونکہ تمہیں یقین تھا کہ وہ تمہیں بچا لے گا۔ وہ تو خود کو بھی نہیں بچا سکتا مس شہلا! مجھ سے بات کرو کہ تم بچ گئی ہو ورنہ وہ خود تمہیں مار ڈالے گا۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے میں نے تمہیں شناخت کر لیا ہے۔ اگر تم اطمینان سے میری بات سننے کا اور شور نہ مچانے کا وعدہ کرو تو میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں ورنہ یقین کرو میں تم کو یہیں سے اٹھا کے لے جاؤں گا اور وہ سب کچھ ضرور کہلواؤں گا جو مجھے کہنا ہے۔"

شہلا نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور میں نے اپنی احتیاط سے کام لیتے ہوئے اس پر اپنی گرفت کم کی۔ شہلا نے ایک لمبی گہری سانس لی۔ پھر اس نے سر کو ایک مغرورانہ ادا سے جھٹک کر مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ "تم واقعی بہادر ہو۔ افسوس یہ ہے کہ میرے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے جو زورِ بازو سے تمہیں منہ توڑ جواب دے سکے۔ البتہ یہ وعدہ کرو کہ بات زبان سے کرو گے ہاتھوں سے نہیں۔"

"اس کا انحصار تمہارے رویے پر ہے۔" میں نے چلتے ہوئے کہا۔ "اگر مجھے تم سے یا کسی اور سے خطرہ محسوس ہوا تو میں اس کا سدباب ضرور کر لوں گا۔" میں نے اطمینان سے ریوالور نکالا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر جیب میں رکھ لیا۔ "میرے حفاظتی اقدامات مکمل ہیں اس لیے تم اپنی یا کسی اور کی زندگی کو داؤ پر لگانے کی حماقت نہ کرنا۔ ہم ایسے دوستانہ ماحول میں بھی بات کر سکتے ہیں کہ تمہاری ماں اور چھوٹے بھائی کو بھی پتہ نہ چلے اور تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ ان کو کچھ معلوم نہ ہو ورنہ وہ خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔"

ریوالور دیکھتے ہی شہلا کا رنگ فق ہو گیا تھا اور خود رابعہ چلتے چلتے ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ "ہم تمہارے دوست بن کر آئے ہیں شہلا! دشمن بن کر نہیں۔" رابعہ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "یقین کرو، بات کرو۔"

شہلا کے ساتھ ہم ایک ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے جو زیادہ بڑا تو نہیں تھا مگر خوبصورت اسباب سے آراستہ اور فرنیچر سے بھرا پڑا تھا۔ "یہاں کسی کے آنے کا امکان تو نہیں ہے؟" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میری ماں یا بھائی جاگ رہے ہوتے تو خود آ جاتے۔" شہلا مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "بھائی سرِ شام سو جانے کا عادی ہے اور ماں بیمار ہے۔"

"بہتر۔۔۔ جب کوئی آئے گا تو تم سے پہلے ہم دیکھیں گے۔ کہیں آنے والا ڈی سلوا تو نہیں؟" میں نے کہا۔ "تم بہت بے وقوف ہو مس شہلا! وہ یہاں آئے گا تو تمہیں قتل کرنے کے لیے کیونکہ اس کے لیے تمہاری افادیت ختم ہو چکی ہے۔ الٹا تمہارا وجود اس کے لیے باعثِ خطر ہے۔"

"ایسی باتیں کر کے تم مجھے ڈی سلوا سے بدظن نہیں کر سکتے۔" شہلا نے کھڑے کھڑے کہا۔ "اس سے حسد کرنے والے بہت ہیں اور تم تو اس کے دشمن ہو۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ میں اس کا دشمن ہوں مگر میں تمہارا دشمن نہیں ہوں اور نہ تم دشمنی کا سبب ہو۔" میں نے کہا۔ "تم کو جذبات نے اندھا کر دیا ہے اس لیے تم ڈی سلوا کا اصل چہرہ دیکھنے سے قاصر ہو۔ تمہیں اس کی محبت کے وعدوں پر یقین ہے لیکن ایسے ہی وعدے وہ پہلے بھی کئی لڑکیوں سے کر چکا ہے۔ میں تمہیں ان سب سے ملوا سکتا ہوں۔ وہ تمہیں بتائیں گی کہ ڈی سلوا نے ان کے ساتھ کیا دھوکا کیا۔ کس طرح ان کو سنہرے خوابوں اور میٹھی باتوں کے جال میں گرفتار کیا اور ان کو عقل و ہوش سے اس حد تک بیگانہ کر دیا کہ وہ اس کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہو گئیں۔ پھر تمہاری طرح ان سے بھی کوئی ایسا جرم سرزد ہوا کہ ڈی سلوا نے ان کو بلیک میل کیا۔ وہ اپنے تمام وعدوں سے پھر گیا اور ان لڑکیوں کو نکال باہر کیا۔ وہ رونے دھونے کے سوا کچھ نہ کر سکیں کیونکہ وہ مجبور تھیں۔ ڈی سلوا کا آلۂ کار بن کے وہ قانون کی نگاہ میں مجرم ہو گئی تھیں۔"

"لیکن... لیکن میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا۔" وہ بے خوفی سے بولی۔ "مجھے کوئی کیسے بلیک میل کر سکتا ہے؟"

"یہ جھوٹ تم اتنی بے باکی سے میرے سامنے تو بول سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن پولیس کے پاس اقبالِ جرم کرانے کے لیے صرف ہاتھ نہیں ہوتے اور وہ باتوں یا لاتوں پر ہی اکتفا نہیں کرتے۔ مجھے اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ تم تو ایک عورت ہو۔ تمہاری قوتِ مزاحمت تو ریت کی دیوار سے بھی زیادہ ناپائیدار ثابت ہوگی۔ وقتی طور پر تم نرس کے لباس میں ان سب کی نظروں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئی تھیں جنہوں نے تم کو پہلے نہیں دیکھا تھا لیکن تمہاری بدقسمتی کہ عین وقت پر میں پہنچ گیا اور میں نے تمہیں اپنا کام کرتے دیکھ لیا۔ تم نے اس بڈھے کو دیے جانے والے گلوکوز میں سائنائیڈ ملا دیا تھا۔ ایک انجکشن کے ذریعے۔ پوسٹ مارٹم ہو چکا ہے اور اس کی موت کا سبب بھی معلوم ہو چکا ہے۔ تمہارے بھاگنے اور واردات سے فرار ہونے کے بعد بڈھے کی موت ایک معمہ بن گئی تھی اور الزام ان پر آ رہا تھا جو اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ یقیناً کامیاب ہو جاتے۔ یہ نہ ہوتا تو ڈی سلوا تمہیں ایسے سنگین اقدام پر مجبور کرتا؟"

"یہ جھوٹ ہے۔" شہلا نے بازو کا سہارا لیا اور صوفے پر ٹک گئی۔ "میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

"غلط فہمی تو اس وقت ہوئی۔ پہلے تو مجھے یاد ہی نہیں آیا تھا کہ ایک نرس کی صورت مجھے جانی پہچانی کیوں لگی تھی اور جب وہ نرس پراسرار طور پر غائب ہو گئی جس کا شعبے سے کوئی تعلق نہیں تھا تو مجھے اچانک یاد آ گیا کہ نرس کے بھیس میں تم اپنا کام کر گئی ہو۔ اب تک اس کمرے میں سب کے فنگر پرنٹ لے لیے گئے ہوں گے۔ اگر ان میں تمہارے فنگر پرنٹ بھی ملے تو تم کیسے انکار کرو گی کہ تم نے اس کمرے میں قدم ہی نہیں رکھا۔ میں نے اپنے شک کا اظہار کر دیا تھا۔ اس لیے پولیس موازنے کے لیے تمہارے فنگر پرنٹ لینے ضرور آئے گی۔"

"پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" شہلا نے خود سری کے لہجے میں کہا۔ "تم ڈی سلوا کو نہیں جانتے۔"

"میں جانتا ہوں تم نہیں جانتیں مس شہلا!" میں نے طنز اور تلخی سے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ اب تک وہ تم کو یہ سب کچھ بتا چکا ہوگا لیکن وہ ابھی تک آیا نہیں تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پورا بندوبست کر کے آئے۔ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا مس شہلا! کیا ضرورت ہے اسے اپنی سیکرٹری کے لیے بدنام ہونے کی۔ وہ اپنا اثر و رسوخ، اپنے تعلقات اور اپنی دولت تم جیسی لڑکیوں کو بچانے میں کیوں صرف کرے گا جو ایک ڈھونڈو ہزار ملتی ہیں۔ پہلے بھی مل رہی ہیں اور آئندہ بھی ملتی رہیں گی۔ وہ اپنا دامن بچا لے گا اور اس کے لیے تمہارا منہ ہمیشہ کے لیے بند کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔"

"تم جھوٹ کہتے ہو۔ تم مجھے دہشت زدہ کرنا چاہتے ہو۔ ڈی سلوا مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ شادی کے بعد ہم اس ملک سے ہی چلے جائیں گے۔ ڈی سلوا کو ہر جگہ بڑی اچھی ملازمت مل سکتی ہے۔" وہ ہسٹریا سے مغلوب ہونے لگی تھی۔ "تمہارے یا پولیس کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تم اعتبار نہیں کرو گی۔ اعتبار تو تمہیں اس وقت آئے گا جب ڈی سلوا خود تمہارے خلاف گواہی دے گا۔" میں نے اپنے لہجے کے طنز کو برقرار رکھا۔ "وہ

www.paksociety.com

سکتا کہ مجھے تو اس لڑکی کے کردار پر ابتدا ہی سے شبہ تھا اور میں اسے برطرف کرنے والا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے ایک بوڑھے کو کیوں قتل کیا۔ یہ نرس کا لباس کہاں سے لائی اور اس نے سائنائڈ کیسے حاصل کر لیا۔ میرا تو اس سے تعلق دفتری معاملات کی حد تک تھا اور اب وہ بھی نہیں۔ آپ کو اختیار ہے جیسے چاہیں تفتیش کریں۔ مس شہلا! وہ عزت دار آدمی ہے۔ اپنے اثر و رسوخ اور پیسے کی طاقت کو اپنی عزت داری کا بھرم رکھنے کے لیے استعمال کرے گا۔ تمہارے بچاؤ کے لیے نہیں۔ کل تمہاری جگہ کوئی

اور لڑکی لے لے گی۔ جیسے تم سے پہلے بہت سی آئیں اور چلی گئیں اور وہ ان سب کو بھول گیا۔ اب شاید اسے کسی کا نام تک یاد نہ آتا ہوگا۔ ایسے ہی تم بھی اس کے لیے ایک داستانِ ماضی بن جاؤ گی۔ تمام عمر اپنی حسرتوں پر آنسو بہاتی رہو گی جو پوری نہ ہو سکیں اور اپنی جذباتی حماقت پر احساسِ پشیمانی میں مبتلا رہو گی اور ایک جھوٹے دغاباز اور مکار آدمی سے انتقام لینے کی خواہش میں تڑپتی رہو گی مگر اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گی۔ مگر یہ سب کچھ بھی اس وقت ہوگا جب تمہیں جینے کی مہلت ملے۔ سب سے پہلے تو خود ڈی سلوا تمہارے وجود کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دے گا لیکن اس نے کچھ نہ کیا تب بھی قانون کے لمبے ہاتھ تمہاری گردن تک پہنچ جائیں گے اور ڈی سلوا... وہ قانون کے ساتھ ہوگا تمہارے ساتھ پیرس یا سوئٹزرلینڈ میں ہنی مون نہیں منا رہا ہوگا۔"

میں نے نوٹ کر لیا تھا کہ شہلا کے ذہن کی مزاحمت بھی ختم ہونے لگی ہے اور جذبات پر عقل کے دلائل غالب آنے لگے ہیں۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی تلخ حقائق کو سمجھنے اور قبول کرنے کی بھرپور سعی کر رہی تھی اور اس کا چہرہ بالکل سپاٹ، جذبات سے عاری اور لاش کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہیں وہ بے ہوش نہ ہو جائے۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اس بات کا کہ... کہ جو کچھ تم نے ڈی سلوا کے بارے میں کہا ہے وہ تمہاری ذاتی دشمنی کے جذبات پر مبنی نہیں ہے؟" اس نے بمشکل تمام کہا۔ "میں کیسے مان لوں؟"

"ثبوت تو وہ لڑکیاں بھی فراہم کر سکتی ہیں جو ڈی سلوا کی بے ضمیری کا شکار ہو چکی ہیں، لیکن تمہیں انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ بہت جلد۔ شاید آج ہی رات کو وہ خود تمہیں ثبوت فراہم کرنے آئے گا۔"

اور اس وقت ایک حیرت انگیز اتفاق ہوا۔ باہر سے کسی کار کے اندر آ کر رکنے کی آواز آئی۔

"غالباً وہ آ گیا ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "اسے بالکل معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم یہاں ہیں۔ اگر تم تھوڑے سے صبر و تحمل سے کام لو تو وہ خود ان سب باتوں کی تصدیق کر دے گا۔"

"تم اس ساتھ والے کمرے میں چلے جاؤ۔ خدا کے لیے جلدی کرو۔" شہلا گھبرا کے بولی۔

"یہ بات یاد رکھنا کہ ڈی سلوا کے آنے کا مقصد غلط بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے رابعہ کے ہمراہ ساتھ والے کمرے میں غائب ہوتے ہوتے کہا۔ "لیکن ڈرنا نہیں اور بالکل نارمل نظر آنے کی کوشش کرنا۔ ہمارے ہوتے ہوئے ڈی سلوا تمہیں گزند نہیں پہنچا سکتا۔" شہلا نے اقرار میں سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھی جب کہ ڈی سلوا مسلسل دستک دے رہا تھا۔ وہ اسی طرح خود گیٹ کھول کر اندر پہنچ جانے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ جب شہلا نے دروازہ کھولا تو ہم ڈرائنگ روم سے متصل کمرے کی تاریکی میں روپوش ہو چکے تھے لیکن ڈرائنگ روم کا پورا منظر میری نظروں کے سامنے تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیے

www.paksociety.com

ساز

سو بار تجھے دوست کو جب چھیڑی غرض کیسے
سو بار ترا یہ تھے دل میں جب ہم نے آتش تاب

○ ○

معاشرے کے ان ناسوروں کی روداد جو کہ بظاہر دوست سے لگ کر نوجوانوں میں زہر گھولتے رہتے تھے۔ ایک کمزور برداشت نوجوان لڑکی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے جینے کی نئی امنگ ... خوف و ہراس ... خواب حقیقت

○

نئی سوچ، نیا رنگ، سب کی پسند، شبا آہنگ

"کیا بات ہے؟" ڈی سلوا نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "تم سو رہی تھیں یا رو رہی تھیں؟ یا دونوں کام ایک ساتھ کر رہی تھیں؟"

"میں... دراصل میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔" شہلا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور زبردستی مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

"تمہاری حالت سے تو یہ لگتا ہے کہ تم برسوں کی بیمار ہو۔" ڈی سلوا بے تکلفی سے ایک صوفے پر دراز ہو گیا۔ "یا خدانخواستہ کوئی بھوت وغیرہ دیکھ لیا ہے۔"

"پریشانی تو مجھے تمہارے چہرے پر بھی نظر آ رہی ہے۔ خیریت تو ہے نا؟" شہلا بولی اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی ناخوشگوار صورت حال پیدا نہیں ہوئی، ورنہ وہ ڈی سلوا کے اندر قدم رکھتے ہی اس کو ہمارے بارے میں بتا دیتی تو مجھے فوراً سامنے آنا پڑتا۔ میری باتوں نے شہلا کو اس حد تک ضرور قائل کر لیا تھا کہ وہ خود ڈی سلوا کی زبان سے کچھ سننا چاہتی تھی۔

"پریشانی تو پیدا ہو گئی ہے ڈیئر!" ڈی سلوا نے جیب سے سگریٹ نکالی اور لائٹر سے جلائی۔ اس کے ماتھے پر تفکرات کی شکنیں اس کے ذہنی انتشار کی آئینہ دار تھیں۔ وہ سگریٹ کے دھوئیں سے چھلے بناتا رہا اور انہیں اوپر اٹھ کے ہوا میں بکھرتے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"پریشانی بہت بڑی ہے شہلا ڈارلنگ! اس لڑکے نے مصیبت کھڑی کر دی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں!" شہلا نے سب کچھ سمجھنے کے باوجود معصومیت سے کہا۔

"وہ بدمعاش سکندر بخت!" اس نے پلٹ کر تیز لہجے میں کہا۔ "معلوم نہیں وہ ہسپتال کیسے آ پہنچا اور اس نے عین وقت پر تمہیں دیکھ لیا۔"

"میں تو اس کے آتے ہی نکل گئی تھی۔" شہلا نے گھبرا کے کہا۔ "اس کی طرف میری پشت تھی۔ اس نے میری صورت کہاں دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ میرا لباس...!"

"یہ صرف تمہاری خوش فہمی ہے!" ڈی سلوا نے برہمی سے کہا۔ "وہ بہت چالاک شخص ہے۔ تمہیں معلوم نہیں ہوا لیکن اس نے تمہارے چہرے کی ایک جھلک دیکھ لی اور پہچان گیا۔ زیادہ گڑبڑ اس لیے ہوئی کہ اس کمرے میں ڈاکٹر کے ساتھ صرف دو نرسیں تھیں، تیسری کوئی نہیں تھی لیکن سکندر نے اور اس کے ساتھ آنے والے مجسٹریٹ نے اصرار کیا کہ نرسیں تین تھیں۔ تمہارے غائب ہو جانے سے معاملہ اور پُراسرار ہو گیا۔ میں سکندر بخت کو تو جھٹلا دیتا مگر اس مجسٹریٹ کو کیسے جھٹلاتا۔ اب قتل کا مقدمہ درج کر

بنا گیا ہے جس میں ہسپتال کے عملے کے ساتھ میں اور تم بھی ملوث ہو گئے ہیں۔"

"وہ کیسے ڈی سلوا؟" شہلا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ اب وہ اداکاری نہیں کر رہی تھی بلکہ واقعی خوفزدہ تھی۔

"وہ ایسے کہ سکندر نے براہ راست مجھ پر شبہ کا اظہار کیا۔" ڈی سلوا کمرے میں چکر لگاتا رہا۔ اس کی حرکات و سکنات سے شدید بے چینی اور اضطراب کا اظہار ہوتا تھا۔ "مجھ پر وہ کیا ثابت کرے گا لیکن تمہارا نام لے کر اس نے مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا ہے اور تمہارے لیے بہت بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے اور یہ سب تمہاری تھوڑی سی بے احتیاطی کا نتیجہ ہے کیا تم یہ کام جلدی ختم کر کے وہاں سے نہیں نکل سکتی تھیں؟ کیا ضرورت تھی اتنی دیر کرنے کی؟" اس کے لہجے پر جھنجھلاہٹ غالب تھی۔ "وہ دو منٹ کا کام تھا۔"

"لیکن ڈی سلوا میں سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم کیسے اٹھاتی؟" شہلا نے کہا۔ "دو منٹ کا کام بھی اتنا آسان تو نہیں تھا۔ میں مناسب موقع کے انتظار میں رہی تھی۔"

"تم کب انتظار میں رہیں؟" ڈی سلوا مشتعل ہو کے بولا۔ "اگر تمہیں موقع کا خیال ہوتا تو تم ایسے وقت میں نہ جاتیں جب وہاں پہلے سے دو نرسیں موجود تھیں۔ اگر معاملہ بجائے تین کا چکر نہ ہوتا تو الزام تمہارے بجائے ان دونوں نرسوں یا دونوں ڈاکٹروں پر آجاتا مگر اب وہ شک کی بنا پر صاف بچ گئے ہیں کیونکہ ایک تیسری نرس کی موجودگی کا گواہ خود مجسٹریٹ ہے۔ ان پر زیادہ سے زیادہ فرائض میں غفلت برتنے کا یا بے پروائی کا الزام آجائے گا لیکن میں جانتا ہوں اس سے ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ نرسوں کی حمایت ڈاکٹر کریں گے اور ڈاکٹروں کے خلاف قتل کا الزام ثابت کرنا بہت مشکل ہے جبکہ جانو کی تم جس کا نام سکندر نے لکھوا دیا ہے۔"

"لیکن کسی کے کہنے سے تو کوئی مجرم نہیں بن جاتا۔ قتل کے الزام کو ثابت بھی کرنا پڑتا ہے۔" شہلا نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"فضول باتیں مت کرو۔" ڈی سلوا نے سگریٹ کو فرش پر ڈال کر جوتے کی ایڑی سے مسل دیا۔ "ایک قانون وہ ہے جو کتابوں میں لکھا ہے۔ دوسرا قانون پولیس کا اپنا وضع کردہ ہے انہیں اختیار حاصل ہے کہ وہ جسے چاہیں شک میں پکڑ لیں اور تفتیش کے لیے تھانے لے جائیں۔ خصوصاً قتل جیسے سنگین...

"تم جانتی تو ہو تھانے میں کیا ہوتا ہے اور وہاں تفتیش کیسے کی جاتی ہے جو وہاں وہ لندن یا امریکہ کی پولیس کے افسر دماغ رساں نہیں بیٹھے ہیں جلاد بیٹھے ہیں جو کسی بھی شخص سے کسی بھی جرم کا اعتراف کرا سکتے ہیں۔ تم کیا اور تمہاری اوقات کیا۔ بڑے بڑے جی دار اور پیشہ ور قسم کے بدمعاش ایک رات کا عذاب نہیں جھیل سکتے۔ تم فوراً سب کچھ تسلیم کر لو گی اور اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دو گی۔"

"لیکن... لیکن تم نے تو... تم نے تو کہا تھا کہ پولیس کچھ نہیں کر سکتی۔" شہلا پر بری طرح دہشت سوار تھی۔ "تم نے کہا تھا کہ میرے بہت تعلقات ہیں اور میں پیسے سے سب کا منہ بند کر سکتا ہوں۔"

"ہاں لیکن اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم اپنی حماقت کے باعث سکندر بخت کے سامنے آجاؤ گی۔" ڈی سلوا نے مشتعل ہو کے کہا۔ "میں نے تمہیں ایک نرس کی یونیفارم فراہم کی۔ زہر لا کے دیا اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھے اگر تم نے ذرا بھی عقل اور احتیاط سے کام لیا ہوتا...."

"میں نے اپنی طرف سے پوری احتیاط کی تھی۔" شہلا نے دونوں ہاتھوں میں منہ کو چھپا کر رونا شروع کر دیا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ سکندر ایک مجسٹریٹ کے ساتھ وہاں پہنچ جائے گا۔ مجھے تم پر بھروسہ تھا۔"

"دیکھو یہ رونے دھونے کا ڈرامہ مت کرو۔" ڈی سلوا چراغ پا ہو کے بولا۔ "تمہاری وجہ سے میں بھی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اس کیس میں میرا نام بھی آجائے گا تو میری کتنی بدنامی ہوگی۔ ایف آئی آر سے نام خارج کرانا کوئی آسان کام ہے؟"

"یہ تو تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ معاملہ الٹا گلے بھی پڑ سکتا ہے۔" شہلا نے روتے روتے سر اٹھایا۔ "مجھے بتاؤ کہ اس بڈھے کورن نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو ویسے بھی لب گور تھا؟"

"اگر میں اسے نہ مرواتا تو خود مارا جاتا اور پہلے خود میں نے ہی کوشش کی تھی مگر وہ خبیث قبر میں دفن ہونے کے بعد بھی زندہ نکل آیا اور میرے لیے جان کا خطرہ بن گیا۔" ڈی سلوا نے کہا۔

"چنانچہ تم نے اپنی جان کا خطرہ میری جان کو منتقل کر دیا۔" شہلا نے آنسو پونچھ کر کہا۔ "میں نے تمہارے لیے سب کچھ کیا اور اب تم مجھے ہی الزام دے رہے ہو کہ غلطی میں نے کی۔ مجھے یہ بتانے آئے ہو کہ تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ تمہیں ایف آئی آر میں سے اپنا نام خارج کرانے کی فکر ہے لیکن میرے انجام کی فکر نہیں ہے۔ نہیں ڈی سلوا! یہ قتل تمہارے ایما پر ہوا ہے۔ تم بھی برابر کے شریک جرم ہو۔ پھانسی کے

پھندے تک تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔"

میں اور رائیڈ دم سادھے یہ سب گفتگو سن رہے تھے اور اس جیوری میں سے سب کچھ ریکارڈ ہو رہا تھا جو تمہارا اور شہلا کے درمیان تھی۔ نتائج میری توقعات سے بہتر نکلے تھے اور مجھے افسوس تھا تو ایک ٹیپ ریکارڈر کے موجود نہ ہونے کا، ورنہ میں اس پورے اعتراف جرم کو ریکارڈ کر لیتا۔ شہلا کی بات کا رد عمل فوراً ہوا۔ ایک لمحے کے لیے ڈی سلوا کا چہرہ سرخ پڑ گیا مگر اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔ "دیکھو ڈیئر! یہ ہم دونوں کا مسئلہ ہے ایسے حل نہیں ہو گا۔" وہ شہلا کے پاس بیٹھ کے بولا۔ اب اس کا لہجہ قطعی بدلا ہوا تھا۔ اس کا غصہ کافور ہو گیا تھا اور یہ تبدیلی بے سبب نہیں تھی۔ ڈی سلوا جانتا تھا کہ شہلا کا ایک بیان اسے تباہ کر سکتا ہے۔ "تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ میں کتنا بڑا خطرہ مول لے کر یہاں آیا ہوں۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرے آنے سے پہلے پولیس یہاں نہ پہنچ چکی ہو۔ میں نے اور وارڈن نے کہہ دیا تھا کہ دفتری کاغذوں میں مس شہلا کا پرانا پتہ لکھا ہوا ہے۔ حال ہی میں وہ بادامی باغ کے علاقے سے گلبرگ کی طرف کہیں چلی گئی ہے جو کوئی غلط بات بھی نہیں مگر یہ پولیس والے بڑے کائیاں قسم کے ہوتے ہیں۔ کوئی پتہ نہیں وہ اسی وقت نازل ہو جائیں۔ میری کار باہر کھڑی ہے۔ میں کیا جواز پیش کروں گا اس وقت یہاں اپنی موجودگی کا؟ میں تو کہہ چکا ہوں کہ مجھے مس شہلا زیدی کا پتہ معلوم نہیں ہے اور میرا ان سے تعلق بھی دفتر کی حد تک ہے۔"

"شہلا زیدی؟" رائیڈ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "یہ تو مسلمان ہے۔"

"عشق کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔" میں نے جواب میں کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "خدا کے لیے خاموش رہو۔"

"تمہارے پاس آج رات کی مہلت ہے شہلا۔" ڈی سلوا نے دوسری سگریٹ جلا کے اپنی بات جاری رکھی۔ "ظاہر ہے کہ تم صبح دفتر آؤ گی تو گرفتار ہو جاؤ گی اور معاملہ سنگین ہو جائے گا۔ کیونکہ جہاں تک مجھے یقین ہے تم نے ہسپتال میں اس کمرے کے اندر کہیں نہ کہیں اپنے فنگر پرنٹ ضرور چھوڑے ہوں گے۔ تم نے دستانے پہننے کی احتیاط تو نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ دفتر کے کچھ لوگ تمہارے... تمہارے پتے سے مزید واقف ہوں گے۔"

"چنانچہ تو خود میں نے اپنی پرسنل فائل پہ لکھ دیا تھا۔" شہلا نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح پولیس یہاں بھی آ پہنچے گی۔" ڈی سلوا نے فکرمندی سے کہا۔ "دفتر کھلنے کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کے اندر اندر۔ تمہارے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ تم غائب ہو جاؤ۔"

"غائب ہو جاؤں؟" شہلا نے بے یقینی سے دہرایا۔ "کہاں؟ اور کیسے؟ میں اکیلی تو نہیں ہوں۔ میرے ساتھ وہ بھی ہیں جن کو میں اپنی ماں اور اپنا بھائی کہتی ہوں۔"

"مگر تم جانتی ہو کہ وہ تمہارے کچھ بھی نہیں ہیں۔" ڈی سلوا نے چڑ کر کہا۔ "تمہیں ان کی فکر کیوں ہے۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑو اور اپنی جان بچاؤ۔ وہ تمہارے والدین کے ادنیٰ ملازم تھے۔"

"میں اتنی کم ظرف اور بے ضمیر نہیں ہوں ڈی سلوا۔" شہلا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اس وقت جب دنیا میں میرا کوئی نہ تھا سوائے میری جان کے دشمنوں کے جو میری جائداد ہتھیانا چاہتے تھے، تو انہی نمک خواروں نے میری جان بچائی اور مجھے زندہ رکھا۔ آج بھی جب میں اپنے پاؤں پہ کھڑی ہو گئی اور بالغ ہو چکی ہوں، میں ان سہاروں کے بغیر نہیں رہ سکتی کیونکہ تمہارا یہ مہذب معاشرہ اکیلی عورت کو عزت سے جینے کا حق نہیں دیتا۔ انہوں نے مجھے ماں کا اور بھائی کا پیار ہی نہیں دیا تحفظ بھی فراہم کیا ہے۔ مجھے بتاؤ اگر میرے آس پاس بسنے والے شریف اور عزت دار لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ میں ایک نوکرانی اور اس کے لڑکے کے ساتھ اس کوٹھی میں اکیلی رہتی ہوں تو کیا وہ مجھے یہاں اسی طرح رہنے دیتے؟ کبھی نہیں۔ اب تک نہ جانے کتنے ہوس پرست ہاتھ میرے دامن عزت کو تار تار کرنے کے لیے بڑھ چکے ہوتے۔ مشہور کر دیا جاتا کہ میں بدکردار اور فاحشہ ہوں۔ قحبہ خانہ چلاتی ہوں اور نوکری کرنے نہیں عزت بیچنے جاتی ہوں اور یہ جائداد جو میرے باپ نے چھوڑی ہے حرام کی کمائی کا نتیجہ ہے حالانکہ اس کی ... میں انہی کے طفیل ہوں جن کے بارے میں تم کہہ رہے ہو کہ میں ان کو چھوڑ کے اپنی فکر کروں۔ مجھے بتاؤ کیا بعد میں پولیس ان کو پریشان نہیں کرے گی؟ محلے والے تو کہیں گے کہ یہ شہلا کی ماں ہے اور اگر میں ان سب کے ساتھ غائب ہو جاؤں تو غائب ہو کے کہاں جاؤں؟ مجھے مفرور قرار دے دیا جائے گا۔ پولیس آفس سے میری تصویر حاصل کرے گی اور ہر اخبار چھاپ دے گا۔ میں کب تک چھپی رہ سکوں گی؟"

ڈی سلوا کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ "پھر تم کیا کرو گی؟ انتظار کرو گی کہ پولیس آئے اور تمہیں لے جائے؟"

"اس کے سوا میں اور کر ہی کیا سکتی ہوں۔" شہلا نے کہا۔ "باقی تو تمہیں کرنا ہے جس کا تم نے وعدہ کیا تھا۔"

www.paksociety.com

"میں نے تم سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔" ڈی سلوا نے جھڑک کر کہا۔

میری توقع کے طور پر اور اچانک شملا کا تھپڑ ڈی سلوا کے چہرے پر پڑا۔ "ذلیل... کمینے... اتنی جلدی سارے وعدے بھول گیا؟" لیکن اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ڈی سلوا کا بھرپور ہاتھ شملا کے منہ پر لگا اور وہ صوفے سے نیچے جا گری۔ اس کا سر میز کے کونے سے ٹکرا گیا۔

"ذلیل لڑکی!" ڈی سلوا نے حقارت اور نفرت کے زہر سے بجھے لہجے میں کہا۔ "مجھے اندازہ نہیں ہے کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میرا اپنی سیکرٹری کی نجی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

شملا زخم خوردہ ناگن کی طرح اس پر جھپٹی اور بولی۔ "بدمعاش کتے! میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ اس قتل پر تو نے مجھے مجبور کیا تھا۔ میں ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتا سکتی ہوں..."

ڈی سلوا نے اس کے منہ پر ہاتھ رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی اور دیوار سے ٹکرائی۔ سنبھلنے کی کوشش میں اس کا ہاتھ کونے کے اونچے اسٹول پر لگا جس پر وینس کا مجسمہ تھا۔ انداز شکست اور بے حسی کے ساتھ اٹھا دو تھا۔ پلک جھپکنے میں شملا نے تڑپتے ہوئے مجسمے کو پکڑ لیا اور ڈی سلوا پر کھینچ مارا مگر اس کا نشانہ خطا گیا اور دیوار سے ٹکرانے والا مجسمہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ ڈی سلوا اتنی دیر میں ریوالور نکال چکا تھا۔ "مجھ کو مجھے سے پہلے ہی میں تیری زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دوں گا کتیا! اور پولیس میرے بیان پر یقین کرے گی کہ کسی آشنا نے تجھے رقابت میں یا انتقام کی خاطر مار ڈالا ہوگا کیونکہ تو اپنی نوکرانی کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔"

"بس مسٹر ڈی سلوا!" میں نے دروازے کے پیچھے سے کہا۔ "اب اپنا ریوالور نیچے پھینک دو کیونکہ تم براہ راست میرے نشانے کی زد میں ہو۔ اگر تم نے ذرا بھی غلط حرکت کی تو میں تمہاری کھوپڑی کے پرخچے اڑا دوں گا اور یہاں سے نکل جاؤں گا۔ یہ معمہ بعد میں پولیس حل کرتی رہے گی کہ تم اپنی کار میں اکیلے یہاں کیوں آئے تھے۔ قانوناً مس شملا کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی عزت پر حملہ آور ہونے والے کسی بھی شخص کو گولی مار دیں۔ میرے ہاتھ میں جو ریوالور ہے وہ مس شملا زیدی کا ہی ہے۔" یہ آخری بات جھوٹ تھی مگر یہ جھوٹ ناگزیر تھا۔ ڈی سلوا میری آواز پر یوں اچھلا تھا جیسے بے خبری میں کسی نے اس کے کان کے پاس فائر کر دیا ہو اور پھر اسی طرح بے حس و حرکت ہو گیا تھا جیسے وہ آدمی نہیں پتھر کا بے جان مجسمہ ہے۔ شملا کے گھر میں میری موجودگی کا تصور کرنا بھی اس کے لیے محال تھا۔ اسے بہت دیر تک یقین نہ آیا کہ میری آواز اور میرے الفاظ اس کے کانوں کا دھوکا نہیں ہیں۔ پھر اس نے شملا کو مسکراتے دیکھا۔ اس مسکراہٹ میں نفرت کا جذبہ بھرا تھا اور جتنی حقارت تھی اس نے ڈی سلوا کو اس تمام صورت حال کا نئے سرے سے جائزہ لینے پر مجبور کر دیا۔ وہ اس کے سوا کیا سمجھ سکتا تھا کہ شملا نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ میرے اور شملا نے [illegible] خود ڈی سلوا کی اصلیت کو بھانپ لینے کے بعد وہ اس کے دشمنوں سے مل گئی ہے مگر اب وہ نہ شملا سے کوئی شکایت کر سکتا تھا اور نہ اسے کسی قسم کا الزام دے سکتا تھا۔ پہل خود اس نے کی تھی اور تقدیر کی ایک غلط چال نے صورت حال کو یکسر اس کے خلاف کر دیا تھا۔ صیاد خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا اور میں دروازے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ پھر وہ ہوا جس کی مجھے ذرا بھی امید نہ تھی۔ ڈی سلوا نے انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک جست لگائی اور کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اگر مجھے ریوالور کے فائر کی آواز سے دوسروں کے متوجہ ہونے کا خدشہ نہ ہوتا تو میں بلا تامل اسے گولی مار دیتا۔ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر چند سیکنڈ کے فرق سے وہ بچ نکل گیا اور جاتے جاتے دروازے کو باہر سے بند کر گیا۔ میں اپنے ہی زور میں دروازے سے ٹکرایا۔ سنبھل کر اٹھنے اور کھڑکی کھول کر باہر کودنے میں مجھے مزید تین سیکنڈ لگے ہوں گے مگر اتنی دیر میں ڈی سلوا اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کر چکا تھا اور جب میں دوڑتا ہوا باہر نکلا تو اس کی کار کسی راکٹ کی طرح گیٹ کا رخ کر رہی تھی۔ ایک بار پھر میں نے ریوالور اٹھایا کہ کار کے پچھلے ٹائر کو برسٹ کر دوں مگر مجبوری کے خیال سے رک گیا۔ اگر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا تو میرے لیے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے۔ میرے لیے شملا کے گھر میں اپنی موجودگی کی وضاحت کرنا مشکل ہو جاتا اور ناجائز طور پر حاصل کردہ ریوالور سے ڈی سلوا پر گولی چلانے کی ضرورت کا جواز پیش کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہوتا۔

جب میں واپس کمرے میں آیا تو رابعہ نے شملا کو سنبھال لیا تھا جو اس جذباتی بحران سے گزر کے اپنی تمام ذہنی و جسمانی توانائی زائل کر چکی تھی اور اب اس پر ہسٹیریا کا زبردست دورہ پڑا تھا۔ اس کی مٹھیاں بند تھیں اور وہ آنکھیں موندے صوفے پر بیٹھی ہچکیاں لے رہی تھی اور بار بار ایک ہی بات دہرا رہی تھی۔ "میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ وہ مجھے کیا سمجھتا ہے!"

میں نے ریوالور کو جیب میں رکھ لیا۔ "کیسی عجیب بات ہے۔ شملا کے گھر میں اتنا ہنگامہ ہوا اور کوئی دیکھنے تک نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "شملا کی ماں نے بھی نہیں دیکھا؟"

"شملا نے کہا تھا کہ وہ بیمار ہے۔" رابعہ بولی۔ "میں دیکھتی ہوں۔"

"نہیں، تم یہاں شملا کے پاس ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں۔" میں نے اندر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

ایک کمرہ تو وہی تھا جس میں رابعہ اور میں چھپے تھے۔ ٹارچ جلا کر دیکھنے پر مجھے دو دروازے نظر آئے۔ بائیں طرف کا دروازہ باہر کھلا ہوا تھا جس سے رات کا اندھیرا ہر سو بکھرا دکھائی دیا۔ میں نے اسے بند کیا اور دوسرے دروازے سے ایک بیڈ روم میں داخل ہوا جو غالباً شملا کا بیڈ روم تھا۔ خوبصورت، پر تکلف اور حسن و آرائش کا مرقع۔ بالکل رابعہ کے کمرے کی طرح زنانہ استعمال کے سامان کی خوشبو سے بھرا ہوا۔ نسوانیت کے لطیف احساس سے معمور کمرے میں صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ وہیں سے ایک دروازہ غالباً باتھ روم کا تھا۔ دوسرے دروازے کے نیچے روشنی کی ایک لکیر چمک رہی تھی۔ میں نے اس دروازے کو کھولا اور ٹھٹھک کر رک گیا۔ یہ بھی ایک بیڈ روم تھا مگر اس میں ایک ضعیف عورت آنکھیں کھولے یوں پڑی تھی کہ پہلی ہی نظر میں اس کا وجود زندگی کی ہر علامت سے محروم لگتا تھا۔ وہ کم سے کم ستر سال کی تھی اور ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ اس کے بال بالکل سفید اور چاندی کے تار ہو گئے تھے اور عمر رفتہ کا ہر سال اس کی صورت پر ایک شکن چھوڑ گیا تھا۔ اس کا آدھا دھڑ مفلوج تھا چنانچہ وہ کسی سہارے کے بغیر اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے بیڈ سے ذرا فاصلے پر معذوروں والی وہیل چیئر موجود تھی۔ خوف اس کی کھلی آنکھوں میں ایک سوال بن گیا تھا۔

"تم... تم کون ہو؟" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میری شملا کہاں ہے؟"

"شملا بالکل خیریت سے ہے ماں جی!" میں نے گھٹنوں کے بل اس کے پاس جھک کر کہا۔ "میں شملا... کے پاس کام کرتا ہوں۔"

"کیا... عدنان آ گیا ہے؟" بڑھیا نے پوچھا۔ "ابھی... ابھی میں نے کچھ آوازیں سی تھیں۔"

"عدنان کون ہے ماں جی؟ ابھی تو ڈی سلوا آیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں۔" میں نے اس کی کانپتی آواز سنی تھی۔ وہ اطمینان کا سانس لے کر بولی۔ "میں سمجھی عدنان پھر دلی سے آ گیا ہے... خدا اسے ہدایت دے۔ میں اسے بددعا بھی تو نہیں دے سکتی۔ وہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔"

میں سکتے میں رہ گیا۔ شملا نے مجھ سے یہ جھوٹ بھی بولا تھا کہ گھر میں صرف اس کا بھائی ہے جو ہر شام سو جانے کا عادی ہے۔ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ گھر میں اس کے سوا صرف ایک معذور عورت ہے۔ وہ بھائی تھا یا نہیں تھا مگر وہ گھر کے اندر اس کی موجودگی کا نفسیاتی سہارا لینا چاہتی تھی۔ ایک معذور عورت اور اس کا بدچلن شرابی بیٹا۔ اگر وہ گھر میں موجود ہوتا تب بھی کسی کا کیا بگاڑ لیتا مگر اس نے مجھے یہ تاثر دیا تھا کہ اس کا محافظ بھائی گھر میں موجود ہے اور کسی بھی وقت اٹھ کے آ سکتا ہے۔ ہر غیرت مند بھائی کی طرح وہ بہن کی آبرو کا رکھوالا ہے۔ یہ تھا خوش شکل، خوش پوش اور خوش باش نظر آنے والی شملا زیدی کی خوبصورت زندگی کا پس منظر۔ خون کے رشتے ختم ہو جانے کے بعد اس نے جذبات کے رشتوں کو استوار رکھا تھا مگر یہ رشتے بھی سوت کے دھاگے تھے۔ ایک جھٹکے میں ٹوٹ جانے والے۔ ناقابل اعتماد اور جھوٹے مگر اس نے ان کی

کا بھرپور طریقے سے زندگی سے مفاہمت کرلی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے خوبصورت کلرنگ اور ریشمی پردہ ہٹا کے گندی گلی کا منظر دیکھ لیا ہے جہاں غلاظت، تعفن اور پست ترین سطح پر جینے والی مخلوق کی زندگی کی تمام بدصورتی موجود ہے۔

"ماں جی!" میں نے کہا۔ "کیا عدنان کو معلوم ہے کہ شہلا اس کی بہن نہیں ہے؟"

"کون کہتا ہے شہلا اس کی بہن نہیں ہے۔" میری بات نے جیسے اس بوڑھی عورت کے زخم دل پر انگارہ رکھ دیا۔ "وہ میری بیٹی ہے تو عدنان کی بہن ہی ہوئی نا۔ تمہارا کیا مطلب؟" میں سمجھ گیا تھا کہ زندگی کے اس راز کو شہلا نے ڈی سلوا کے سوا کسی پر افشا نہیں کیا تھا۔ وہ ڈی سلوا پر کتنا اعتماد کرتی تھی اور ڈی سلوا کے بعد یہ بات صرف مجھے اور رابعہ کو معلوم ہوگئی تھی۔

"تم... اس نے بتادیا ہے تم کو یہ... شہلا نے اچھا نہیں کیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو یہ بات معلوم ہو اگر ممکن ہوتا تو میں شہلا کو بھی پتہ نہ چلنے دیتی۔ جب اس کے والدین گھر میں آگ لگ جانے سے مرگئے تھے تو وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ عدنان چار سال کا تھا مگر شہلا کی عمر دس سال تھی۔ اسے سب یاد ہے حالانکہ تیرہ سال بیت چکے ہیں اس بات کو۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں اس عظیم عورت کی محبت اور مامتا کے جذبات کو سلام کیا۔ اس نے شہلا پر اپنی زندگی قربان کردی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا اور شاید اسی لیے عدنان کے ہاتھوں شہلا کی عزت محفوظ رہی تھی۔ سترہ سال کی عمر میں شراب کا عادی ہوجانے والا عدنان یقیناً صحبت بد میں تباہ ہوا تھا۔ اسے برے بھلے کی تمیز کہاں ہوگی۔ شاید وہ اس کوٹھی کو اور اس گھر کی ہر چیز کو باپ کی شفقت سمجھتا ہوگا اور بہن کی کمائی پر اینٹھتا ہوگا۔ قابل تعریف شہلا کا حوصلہ اور ظرف بھی تھا۔ اس نے ڈی سلوا کو صاف جواب دے کر بڑی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ماں جی!" میں نے کہا۔ "آپ کو چند دن کے لیے یہاں سے جانا ہوگا میرے ساتھ۔"

"نہیں۔" وہ چلائی۔ "میں شہلا کو، اپنی بیٹی کو چھوڑ کے کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"شہلا آپ کے ساتھ چلے گی۔ ہمارے ساتھ رہے گی ماں جی! یہاں کچھ بدقماش لوگ اس کی جان کے دشمن ہورہے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔"

دروازے میں رابعہ کے ساتھ شہلا نمودار ہوئی۔ رابعہ نے اتنی دیر میں اس کو خاصا سنبھال لیا تھا اور شاید اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوگئی تھی کہ ان حالات میں اس کا یہاں رہنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں اماں! ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔" شہلا نے کہا۔ مایوسی اور افسردگی اس کی صورت سے بھی عیاں تھی۔

"مگر کیوں؟ آخر ہم کہاں جائیں گے؟" شہلا کی ماں نے ایک ہاتھ کے سہارے بدن اٹھانا چاہا۔

اس وقت تک میں طے کرچکا تھا کہ شہلا کو اور اس کی ماں کو کہاں چھپایا جاسکتا ہے۔ رابعہ کی خالہ کا گھر اس کے لیے محفوظ ترین جگہ تھی۔

"میں نے شہلا سے کہا ہے کہ وہ ماسی کے گھر میں بالکل محفوظ رہے گی۔" رابعہ نے جیسے میرے خیالات کو پڑھ لیا۔

"میں نے بھی یہی سوچا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب دیر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ڈی سلوا واپس بھی آسکتا ہے۔"

"لیکن مجھے کچھ تو بتاؤ کہ یہ دشمنی کرنے والے کون ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟" بوڑھی عورت نے فریادی لہجے میں کہا۔ "اگر خطرہ کی کوئی بات ہے تو پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دیتے؟ ایسے گھر بار چھوڑ کے بھی کوئی جاسکتا ہے؟"

"یہ بہت لمبی بات ہے ماں جی!" میں نے کہا۔ "اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جو آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ ہم پر اعتماد کیجیے جیسے ہی حالات ٹھیک ہوئے ہم واپس آجائیں گے۔"

"اور عدنان؟ اس کا کیا ہوگا؟ وہ کہاں جائے گا؟" شہلا کی ماں نے کہا۔

یہ مسئلہ میرے ذہن میں بھی تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ ماں اپنے بیٹے کو خطرات میں تنہا چھوڑ کے جانے پر رضامند نہیں ہوگی۔ اس مسئلے کا صرف ایک ہی حل تھا۔ "میں یہاں عدنان کا انتظار کروں گا۔" میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "اور اسے بعد میں اپنے ساتھ لے آؤں گا۔ آپ رابعہ کے ساتھ جائیں۔"

"یہ تمہاری بیوی ہے؟" شہلا کی ماں نے کہا۔

رابعہ کا چہرہ سرخ ہوگیا لیکن اس سے پہلے کہ میں وضاحت یا تردید کرتا، شہلا نے کہا۔ "ہاں اماں! اور یہ بہت بڑی وکیل ہیں۔" بڑھیا نے ہماری طرف یوں دیکھا جیسے مروت کے تحت بولے جانے والے اس جھوٹ کی اہمیت ہم پر واضح کرنا چاہتی ہے۔ اس نے پرانے وقتوں کی اس بوڑھی عورت کی نظروں میں ہماری عزت کم نہیں ہونے دی تھی اور ہمیں زیادہ اعتبار کے قابل بنادیا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس گھر میں پہلی بار نظر آنے والے اجنبی مرد کے ساتھ ایک غیرشادی شدہ لڑکی آئی ہے تو

ہم دونوں کا کردار اس کے اخلاقی معیار کے مطابق مشکوک ہوجاتا۔

"ابھی نئی شادی ہوئی ہے کیا؟" شہلا کی ماں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "بہت شرماتی ہے۔"

"شہلا تم ایک سوٹ کیس میں ضرورت کا تھوڑا سامان لے لو۔" میں نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔ "اگر زیورات یا نقد رقم ہے تو یہاں مت چھوڑنا اور ایسے کاغذات بھی لے لینا جو اہم ہوں، ماں جی کی اسناد، چیک بک، ڈائری اور خطوط وغیرہ۔"

بیس منٹ بعد میں شہلا کی معذور ماں کو گود میں اٹھا کر شہلا کی پرانی کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا چکا تھا۔ شہلا نے گھر کی چابیاں میرے حوالے کیں اور انجن اسٹارٹ کیا۔

"سکندر! تم اس لڑکے عدنان کے لیے کوئی پیغام چھوڑ کے..." رابعہ نے کار میں بیٹھنے سے پہلے کہا۔ "مجھے تمہاری طرف سے پریشانی رہے گی۔ تم یہاں اکیلے ہو۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے ہنس کے کہا۔ "عدنان کے آتے ہی میں بھی روانہ ہوجاؤں گا۔"

"اور اس سے پہلے ڈی سلوا یا اس کے آدمی آگئے... تو؟"

"میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں رابعہ!" میں نے پیار سے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "خالی ہاتھ بھی میں ان سے نمٹ سکتا ہوں اور میرے پاس بھرا ہوا ریوالور بھی ہے۔"

"زیادہ شیخی مت مارو سکندر!" وہ بولی۔ "میں جانتی ہوں تم بڑے بہادر ہو لیکن تم پہلے ہی کم آفات میں نہیں ہو کہ تم کسی نئی مصیبت میں پڑو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"بزدل تو تم نے مجھے بھی بنا دیا ہے۔ پہلے میں صرف اپنے لیے جیتا تھا اور اکیلا آدمی مرنے سے نہیں ڈرتا۔" میں نے جذباتی ہوکے کہا۔ "لیکن اب میں تمہاری خاطر زندہ رہوں گا۔ تمہیں میری خاطر کسی نئی آزمائش کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔" میں نے اسے کار میں بٹھا کے دروازہ بند کردیا اور کار کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں نے گیٹ کو کھلا چھوڑ دیا اور اندر لوٹ آیا۔ ڈرائنگ روم کی لائٹس آف کرکے میں نے شہلا کے بیڈروم کی ہر لائٹ جلادی۔ ٹیلیویژن آن کرکے اس کی آواز اتنی اونچی کردی کہ باہر سنی جاسکے۔ نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دیتا تھا کہ ڈی سلوا پھر آئے گا۔ اس کے لیے خطرہ پہلے سے کہیں زیادہ ہوگیا تھا جس کا فوری تدارک ضروری تھا۔ میری موجودگی میں اسے پسپائی اختیار کرنی پڑی تھی تاہم اس کے لیے یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ میں جاتے وقت شہلا اور اس کی ماں کو بھی لے جاؤں گا۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ پھر آیا تو بہت زیادہ قوت کے ساتھ حملہ آور ہوگا اور مجھے [illegible] ہوسکے صرف جرأت سے ہی نہیں ہوشیاری سے بھی کام لینا ہوگا۔ میں باہر ایک تاریک گوشے میں بیٹھا بے چینی سے عدنان کی واپسی کا منتظر رہا۔ اگر وہ بے وقوف لڑکا آجاتا تو میں اس کے ساتھ بحفاظت نکل سکتا تھا پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ اگر میں عدنان کے ساتھ چلا گیا اور حملہ آور [illegible] میں آئے تو انہیں سخت مایوسی ہوگی اور مایوسی کے ردعمل کا نتیجہ انتقامی کارروائی کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ شہلا کے گھر کو بھی اسی طرح تباہ و برباد کردیں جیسے انہوں نے رابعہ کے گھر کو نیست و نابود کیا تھا۔ گھر میں ٹیلیفون ہوتا تو میں ضامن رضوی صاحب کو بتادیتا اور وہ کوئی نہ کوئی حفاظتی بندوبست کردیتے یا میں پولیس اسٹیشن فون کردیتا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا تو اسٹریٹ لائٹس کے اجالے میں مجھے ٹیلیفون کے تار کسی ہم رنگ سیاہ لکیر کی طرح دکھائی دیے جو ساتھ والے گھر سے ملے ہوئے تھے۔ وقت کم تھا اور سوچنے میں نہیں گنوایا جاسکتا تھا۔ درمیان کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے خود کو تھوڑا سا بلند کیا اور دوسری طرف جھانکا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا لیکن دو کنال کی اس کوٹھی کے ویران احاطے میں سوائے دو کاروں کے اور کچھ نہیں تھا۔ گھوم کر جانے میں زیادہ وقت صرف ہوتا چنانچہ میں دیوار پھلانگ کے کود گیا۔

اندر والے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی میری ملاقات سولہ سترہ سال کے ایک لڑکے سے ہوگئی جو چابیاں گھماتا باہر آرہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ساتھ والے گھر سے آیا ہوں اور میرا ٹیلیفون خراب ہے۔ نوجوان جلدی میں تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک فون اندر کوریڈور میں رکھا ہے اور میری طرف دیکھے بغیر نکل گیا۔ حسب توقع یہاں رہنے والے اپنے ہمسائے کو بھی نہیں پہچانتے تھے۔ نوجوان کو کہاں معلوم ہوگا کہ ساتھ والے گھر میں کتنے افراد رہتے ہیں اور فون ہے یا نہیں۔ اس نے یقین کرلیا کہ اتنے اعتماد سے اندر آجانے والا اور حلیے سے شریف اور معزز دکھائی دینے والا ہمسایہ ہی ہوسکتا ہے۔ ٹیلیفون کوریڈور میں دیوار پر نصب ایک نازک سے اسٹینڈ پر رکھا ہوا تھا۔ اندر کسی کمرے میں اسٹیریو بج رہا تھا اور دھمک بتاتی تھی کہ اسپیکر سو واٹ کے ضرور ہیں۔ کسی اور کمرے میں کوئی ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ کوریڈور میں آویزاں فانوس کی روشنی میں ایک لڑکی ایک دروازے سے نکل کر دوسرے دروازے میں غائب ہوگئی لیکن کوئی میری طرف متوجہ نہ ہوا۔ میں نے اطمینان سے پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا اور شہلا کے گھر کا نمبر دیا۔ میں نے کہا کہ میں شہلا کا ہمسایہ بول رہا ہوں اور میں نے ابھی ابھی اس گھر میں فائرنگ کی آوازیں سنی ہیں۔ وہاں ایک مفلوج عورت اپنی بیٹی

www.paksociety.com

کے ساتھ رہتی ہے۔ اگر پولیس چیک کرے تو اچھا ہے۔ مجھ سے بات کرنے والے پولیس انسپکٹر نے میرا نام پوچھا اور میں نے کہا کہ میں ایس ایس پی رضا حسن رضوی کا چھوٹا بھائی ہوں۔ میں نے ٹیلیفون نمبر بھی رضا حسن رضوی صاحب ہی کا دیا۔ اس کے بعد کس کی مجال تھی کہ تصدیق کرتا یا اس رپورٹ کو نظرانداز کرتا۔ گلبرگ میں رہنے والے یوں بھی عام لوگ نہیں ہوتے کہ ان کی شکایت پر ایکشن میں تاخیر ممکن ہوتی۔ میں ٹیلی فون کے ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر کسی کا شکریہ ادا کیے بغیر باہر نکلا اور دیوار پھاندنے کے بجائے گیٹ سے باہر آیا۔ شہلا کے گھر کے دروازے تک پہنچنے میں مجھے مشکل سے پانچ منٹ لگے ہوں گے۔ پھر سوچ کر میں دروازے پر ہی رک گیا۔ جب بھی کوئی کار نمودار ہوتی تھی تو میں دس منٹ سے پہنچنے کے لیے میں گیٹ پوسٹ کے پیچھے ہو جاتا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد ایک کار سیدھی اندر آئی اور پورچ میں رک گئی۔ یہ ایک ٹیکسی تھی جس میں چار افراد بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک ڈرائیور کی جگہ انجن اسٹارٹ کیے بیٹھا رہا اور تین نیچے اتر آئے۔ ان سب نے چہرہ چھپانے کے لیے منہ پر اسکارف لپیٹ رکھے تھے اور وہ سب سیاہ رنگ کی پتلونوں پر چست سیاہ بنیانیں پہنے ہوئے تھے۔

"میرا خیال ہے وہ اندر ہی ہے۔" ڈرائیور نے باہر سر نکال کے کہا۔ "اور جاگ رہی ہے۔ احتیاط سے کام لینا ورنہ وہ شور مچا دے گی۔ اس کے پاس ریوالور بھی ہے۔" اس کا تحکمانہ لہجہ بتاتا تھا کہ وہ ان بدمعاشوں کا لیڈر ہے۔

"فکر کی کوئی بات نہیں استاد!" ان تینوں میں سے ایک نے کہا۔

"ہم ابھی ان سب کو سمیٹ لاتے ہیں۔" دوسرے نے ہاں میں ہاں ملائی اور وہ تین مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔ ایک سامنے والے دروازے سے اندر چلا گیا۔ باقی دو نے دائیں بائیں جانب سے گھر کو حصار میں لینے کی کوشش کی۔ گھر کے دونوں طرف ساتھ والی کوٹھیوں کی دیوار اور چند فٹ کے فاصلے تھے چنانچہ دونوں طرف گلیاں سی بن گئی تھیں اور آخری حصے میں دونوں طرف بیڈ روم، کچن اور اسٹور کے دروازے کھلتے تھے۔ میں دبے پاؤں بائیں طرف چلنے لگا۔ ٹیکسی میں آنے والا ایک شخص مجھ سے دس قدم آگے تھا اور میرے چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اگر وہ ایک بار بھی پلٹ کر دیکھ لیتا تو خود کو بچانے کے لیے مجھے اس پر گولی چلانی پڑتی ورنہ یہ دس قدم کا فاصلہ طے کرنے سے پہلے ہی وہ مجھے شوٹ کر دیتا چنانچہ میں بہت محتاط تھا۔ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا لیکن تیز رفتاری کے باوجود اسے میرے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے ریوالور کے نیچے ایک شعلہ تھرتھرایا اور اس سکوت میں وہ آواز بادل کی گرج کی طرح لگی۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی رکے تھے۔ اس نے بجلی کی طرح پلٹ کر فائر کیا۔ میں اس کے لیے تیار تھا۔ جسم کے خودکار دفاعی نظام نے مجھے بروقت غوطہ مار کر گولی کے راستے سے ہٹا دیا اور اس کے ساتھ جوابی فائر پر مجبور کر دیا۔ وہ شخص گلا پھاڑ کے چلایا اور پلٹ کر پیچھے گرا۔ اسی وقت وہ کھڑکی کھلا جو کچھ دیر پہلے میں نے ہی کھولا تھا۔ سیدھا اندر داخل ہو جانے والے شخص نے چیخ کر کہا۔ "یہ کیا ہے؟" اور مجھے صرف اس کا سر دکھائی دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس دوسرے شخص کے ہاتھ میں بھی ریوالور ضرور ہوگا اور اسے ایک لمحے کی مہلت دینا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ میں نے پوری قوت سے جست لگائی اور اپنے حریف کو کچھ سمجھنے یا سنبھلنے کا موقع دیے بغیر باہر کھینچ لیا۔ میرے ہاتھ اس کے بالوں پر پڑے تھے۔ ایک جھٹکے میں وہ سامنے کی دیوار سے ٹکرایا۔ میں نے اس کی گردن پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ میں اس کی گردن توڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن عجلت میں ہاتھ سخت پڑ گیا یا اس کی گردن ایسے زاویے پر آ گئی کہ میں نے ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ افسوس کرنے کی فرصت نہ تھی کیونکہ ابھی دو دشمن باقی تھے۔ اس تماشے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ یکے بعد دیگرے ہونے والے دو فائروں کی آواز سے وہ بھی مقابلے کے لیے لڑ پڑے ہوں گے۔ میں کھلے دروازے کے اندر پہنچ گیا۔ کمرے میں بدستور اندھیرا تھا۔ میں پوری قوت کے ساتھ اس شخص سے ٹکرا گیا جو دوڑتا ہوا دروازے کی طرف آ رہا تھا اور غالباً یہ وہی شخص تھا جو دائیں طرف سے گھر میں گھسا تھا۔ ہم ایک ساتھ گرے۔ اس نے اندھیرے میں ایک کرسی اٹھا کے مجھ پہ پھینکی جو میرے شانے پر لگی اور ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پہ گر گیا۔ پھر میں نے اس شخص کو دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر اوپر اٹھایا اور گھما کر دیوار پہ دے مارا۔ شاید اس کا ریوالور تصادم کے وقت اس کی گرفت سے نکل گیا تھا ورنہ وہ کرسی پھینک کر مارنے کے بجائے مجھے گولی مار دیتا۔ اب وہ دیوار کے قریب الٹا پڑا تھا اور مجھے اس آخری آدمی کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں جو ان کا لیڈر تھا اور جسے میں نے ٹیکسی میں ڈرائیور کی جگہ بیٹھے دیکھا تھا۔ اگر میں لائٹ جلاتا تو وہ سیدھا اندر آ جاتا۔ میں نے اندھیرے ہی میں ہاتھوں اور پیروں کے بل چلتے ہوئے فرش پر ریوالور تلاش کیا اور کامیاب بھی رہا لیکن جو ریوالور میرے ہاتھ میں آیا وہ میرا نہیں تھا بلکہ اس دوسرے

شخص کا تھا۔ میں نے اسے بھی جیب میں ڈالا اور اپنا ریوالور ڈھونڈتا رہا۔ اس پر میرے فنگر پرنٹ تھے اور میں اسے یہاں چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ جو آدمی اپنے ساتھیوں کو پکارتا آگے بڑھ رہا تھا اور جواب نہ ملنے پر انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ پھر اس کا سایہ دروازے کے فریم میں نمودار ہوا اور میں جہاں تھا وہیں رک گیا۔ کمرے کے اسباب کے درمیان میرے وجود کا پتہ نہیں چلتا تھا لیکن خفیف سی حرکت بھی میری موجودگی کی خبر دے سکتی تھی اور وہ وہاں کھڑے کھڑے میرا نشانہ لے کر مجھے کتے کی موت مار سکتا تھا۔ وہ چند سیکنڈ تک بے حس و حرکت کھڑا اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی جدوجہد کرتا رہا۔ پھر شاید اسے یقین آ گیا کہ اس کے ساتھیوں میں سے کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ میں نے اسے پلٹ کر جاتے ہوئے دیکھا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے اپنا ریوالور مل گیا اور میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ اسی وقت میرے کانوں میں ٹیکسی کے انجن کے غرانے کی آواز آئی۔ وہ میری توقعات سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا۔ اپنے کسی ساتھی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کسی نادیدہ دشمن کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں یا گرفتار ہو چکے ہیں۔ اس نے مقابلے کا ارادہ ترک کر کے فرار ہو جانا بہتر سمجھا تھا۔ میں دوڑتا ہوا باہر آیا تو ٹیکسی دروازے سے نکل رہی تھی۔ میں نے فائر کیا۔ گولی ٹائر میں لگنے کے بجائے ٹیکسی کے پچھلے شیشے پر لگی۔ شیشہ ٹوٹ گیا لیکن ٹیکسی غائب ہو گئی۔ میں نے اس کا نمبر نوٹ کر لیا تھا مگر اس لیے کہ ٹیکسی میں سے کسی کے فنگر پرنٹ مل سکتے تھے۔ وہ نمبر میں جانتا تھا کہ ٹیکسی چوری کی ہوگی اور پولیس کو ایک دو روز بعد کہیں لاوارث کھڑی ہوئی مل جائے گی۔ میں ابھی ریوالور ہاتھ میں لیے کھڑا واپس اندر جانے اور گھر میں پڑے ہوئے تین افراد کی جامہ تلاشی لینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے پولیس کی ایک جیپ کو دروازے پر رکتے دیکھا۔ تین پولیس والے رائفلیں تانے اطمینان سے اترے اور دروازے سے اندر کی طرف آنے لگے۔ صرف اسی دیر کے لیے میں تذبذب کا شکار ہوا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں سامنے جا کر کہہ سکتا تھا کہ فون میں نے کیا تھا۔ میری رپورٹ درست ثابت ہو چکی تھی لیکن شہادت اور بیان کے چکروں میں پڑ جاتا اور مجھے رابعہ کی بات یاد تھی جو اس نے رخصت ہوتے وقت کی تھی کہ مجھ پہ پہلے ہی کم آفات نہیں ہیں چنانچہ میں نے تمام واقعات سے لاتعلق رہنا بہتر سمجھا اور اس سے پہلے کہ پولیس کی نگاہ مجھ پہ پڑتی پھر اسی کوٹھی میں کود گیا جہاں سے میں نے فون کیا تھا۔ دو کنال کے رقبے کی وجہ سے یہ کوٹھی شہلا کے گھر سے کافی دور تھی۔ درمیان میں باغ کا وسیع علاقہ حائل تھا۔ اس کے علاوہ کوٹھی کے رہنے والے اپنے اپنے کمروں میں ائیرکنڈیشنڈ اور ٹی وی لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے کانوں تک فائر کی آواز پہنچی بھی ہوگی تو انہوں نے طے کر لیا ہوگا کہ یہ کسی کار کے بیک فائر کی آواز ہے۔ یوں بھی اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ دینے کی فرصت کسے ہوتی ہے۔

میں اطمینان سے چلتا ہوا دوسری طرف گیٹ سے نکلا اور مخالف سمت میں چل دیا۔ تقریباً سو گز چلنے کے بعد مجھے وہ ٹیکسی سڑک کے ایک کنارے پر کھڑی ہوئی نظر آئی جس کا پچھلا شیشہ گولی سے ٹوٹ گیا تھا اور ٹوٹے ہوئے شیشے کا خلا شفاف جلد پر زخم کے بدنما داغ کی طرح لگتا تھا۔ ٹیکسی کو یہاں تک لانے والا اسے چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا تھا کیونکہ اپنی موجودہ حالت میں یہ ٹیکسی پولیس کو فوراً متوجہ کر لیتی۔ قریب سے دیکھنے پر مجھے فٹ بورڈ کے پاس خون کے قطرے نظر آئے۔ میں نے رومال نکالا اور اس سے ہینڈل کو تھام کر دروازہ کھولا۔ خون کے داغ سیٹ کی پشت پر بھی لگے تھے جس سے میں نے اندازہ کیا کہ میری گولی شیشے سے گزرنے کے بعد ڈرائیور کے شانے میں دائیں طرف لگی ہوگی اور اس کے لیے ڈرائیو تک کرنا بھی مشکل ہو گیا ہوگا۔ میں نے دروازہ پھر بند کیا اور روانہ ہو گیا۔

ایک ٹیکسی نے مجھے صدر بازار میں اتارا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ سڑک سے گلی میں داخل ہو کے میں نے ماسی کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ خود ماسی نے کھولا اور ایک طرف ہو گئی۔ دو کمروں کا یہ چھوٹا سا غریب خانہ، ان کوٹھیوں سے زمین اور آسمان کے فرق کا نمونہ پیش کرتا تھا جن کے رہنے والے اس وقت یہاں پناہ گیر تھے۔ رابعہ کی خادمہ ماسی کے لیے اپنی چھوٹی بی بی کا آنا اور خدمت کا موقع فراہم کرنا ایک سعادت سے کم نہ تھا اور اپنی حیثیت کے مطابق وہ میزبانی کے سارے آداب نبھانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ اس نے شہلا کی ماں کو ایک بستر پہ نئی چادر بچھا کر لٹا دیا تھا اور اب کھانے کے اہتمام میں لگی ہوئی تھی۔ بھوک ہم میں سے کسی کو بھی نہیں تھی۔ میرے نہ آنے سے رابعہ اور شہلا دونوں ہی پریشان تھیں مگر ان کے لیے عدنان کی ماں کو مطمئن رکھنا زیادہ مشکل مسئلہ بنا ہوا تھا۔ وہ بہت کچھ پوچھ رہی تھی جس کا جواب نہ رابعہ دے سکی تھی اور نہ شہلا۔ میں نے طے کیا کہ اس وقت تمام واقعات کو گول کر کے ایک جھوٹ سے سب کو مطمئن کرنا مصلحت کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگا۔

www.paksociety.com

"اتنی دیر کیوں کی تم نے؟" وہ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "عدنان کیوں نہیں ہے تمہارے ساتھ؟"

"یہ بیٹا فکر کی کوئی بات نہیں۔" میں نے مسکرا کے پرسکون لہجے میں کہا۔ "عدنان آیا تھا اور میں نے سب بتا دیا تھا کہ اماں کی ماں اور بہن ایک ضرورت کے تحت میرے گھر چلی گئی ہیں اور شاید چند روز باہر ہی رہیں گی لیکن اس نے میرے ساتھ آنے کے بجائے اپنے کسی دوست کے گھر جانا پسند کیا۔"

شہلا کی ماں کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے۔ "تم نے اچھا کیا کہ اسے علاوہ کچھ نہیں بتایا۔"

میں نے اس بوڑھی عورت کو تو مطمئن کر دیا تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ میرے جواب نے رابعہ اور شہلا کو شک میں ڈال دیا ہے۔ کچھ دیر بعد جب ہم کھانے کے رسمی تکلف سے فارغ ہو گئے تو شہلا نے سوٹ کیس میں سے دوائیں نکال کر ماں کو دیں۔ غالباً ان میں کوئی خواب آور دوا بھی تھی کہ بیس منٹ بعد وہ مفلوج عورت سو گئی۔ میں نے شہلا اور رابعہ کو دوسرے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ چونکہ ماسی وہیں بیٹھی چائے بنانے میں مصروف تھی پھر بھی میں نے انگریزی میں بات کی۔ اور ان دونوں کو وہ سب واقعات سنا دیے جو ان کی روانگی کے بعد پیش آئے تھے۔

"اب ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔" میں نے کہا۔ "شہلا بی بی تم کسی کے سامنے یہ ذکر نہیں کرو گی کہ میں اور رابعہ تمہارے گھر آئے تھے اور ہمارے درمیان کیا باتیں ہوئیں تھیں۔ تمہیں وہاں پولیس کے آنے اور اس سے ہونے والی گفتگو کا حوالہ دینے کی ضرورت بھی نہیں۔ تم یہاں خاموشی سے گمنامی میں رہو۔ پولیس خود یہ مفروضہ قائم کرے گی کہ تمہیں اغوا کر لیا گیا ہے کیونکہ ان کو پہلے سے فائرنگ کی رپورٹ مل گئی تھی۔ وہاں ایک آدمی تو یقیناً مر گیا۔ دوسرے کے بارے میں مجھے معلوم نہیں لیکن تیسرا صرف بے ہوش ہوا۔ پولیس اپنے طور پر تفتیش کر کے جو معلوم کرنا چاہے گی معلوم کرے گی اس سے اصل پریشانی ڈی سلوا کو ہو گی جس نے وہ آدمی بھیجے تھے اور دیکھنا یہ ہے کہ اب وہ کیا کرتا ہے... اور تم رابعہ بی بی!" میں نے رابعہ سے مخاطب ہو کے کہا۔ "تم آج رات یہیں رہو گی۔"

"لیکن اس سے رضوی صاحب کو شک نہیں ہو گا؟" رابعہ بولی۔

"شک کس بات کا؟ میں اور تم ایک ساتھ نکلے تھے۔ تم نے ایک نظر اپنے گھر کو دیکھا اور پھر کچھ دیر وہاں رک کر اسکی تعمیر نو کے مسائل پر بات کرتے رہے۔ پھر کھانا کھانے چلے گئے۔ کھانا ہم نے لارڈز میں کھایا۔ تم نے کھانے کے بعد خواہش ظاہر کی کہ ماسی سے ملنا ہے اور نو بجے میں تمہیں یہاں لے آیا جہاں ماسی نے اصرار کر کے تمہیں روک لیا اور میں فلم دیکھنے چلا گیا۔ معلوم ہے اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ رضوی صاحب یقیناً پریشان ہوں گے اور ہم اس وقت اکٹھے پہنچے تو خواہ کہانی کچھ بھی سنائیں وہ ہمارے آدھی رات تک باہر پھرنے کو سخت معیوب سمجھیں گے اور ناراض بھی ہوں گے۔ اس میں کوئی بڑی بات نہیں کہ تم رات کو ماسی کے گھر رہیں یا میں فلم کا آخری شو دیکھنے چلا گیا۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔"

"لیکن عدنان کا کیا بنے گا؟" شہلا نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ "وہ تو آتے ہی پولیس کے جال میں پھنس جائے گا۔"

"اگر وہ پہلے سے جائے واردات پر موجود ہوتا تو یقیناً مشکل میں پڑ جاتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ پولیس کی موجودگی میں آئے گا تو اس کی بے خبری ہی اس کی بے گناہی کا ثبوت بن جائے گی۔ اس کے علاوہ کہیں نہ کہیں اس کی موجودگی کے گواہ بھی ہوں گے۔ خواہ وہ گواہ کچھ بھی کر رہے ہوں۔ یہ تو بتا سکیں گے کہ عدنان کب سے کب تک ان کے ساتھ تھا۔"

"وہ... وہ بے راہ رو اور نو عمر ہی سہی لیکن احمق بھی ہے"

شہلا نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"مس شہلا! تم اس کو واقعی بھائیوں کی طرح چاہتی ہو۔ ان تمام خرابیوں کے باوجود جو اس کی ذات سے منسوب ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ نہیں جانتے اسے سکندر صاحب! وہ برا ہے تو دنیا کے لیے، میرے لیے وہ بالکل ویسا ہی بھائی ہے جیسے دنیا میں بہنوں کے بھائی ہوتے ہیں۔ وہ دل کا برا اچھا ہے لیکن یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ قدم بہت جلد بھٹک جاتے ہیں اور جو ایک بار غلط راستوں پر چل نکلیں وہ اس وقت تک صراط مستقیم کی طرف نہیں لوٹتے جب تک انہیں کوئی تلخ تجربہ نہ ہو جائے۔ اور... اور ان کے اعمال کی سزا اس دنیا ہی میں نہ ملے۔ میں اس دن سے ڈرتی ہوں...." وہ یکلخت چپ ہو گئی۔

"کس دن سے؟" میں نے کہا۔ "جب زندگی اسے کوئی سبق سکھائے گی؟ اور وہ شرافت کی راہ اختیار کرے گا؟"

"یہ سزا بہت سخت بھی تو ہو سکتی ہے۔" وہ مجھے نظر ملائے بغیر بولی۔

ماسی نے ہمارے درمیان چائے رکھ دی۔

"خدا سے نیکی کی توقع رکھو۔" میں نے شہلا سے کہا۔ "وہ جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ آج بھی ہم تمہاری طرف آنے کے بجائے الماس کی طرف جانے والے تھے۔ الماس پہلے ڈی سلوا کی سیکرٹری تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ اسے گواہ بنا کر لائیں تاکہ تم کو ہماری بات کا اعتبار آ جائے مگر عین وقت پر انہوں نے مجھے روک لیا اور کہا پہلے شہلا کی فکر کرنی چاہیے اور یہ خدا کی مصلحت نہیں تھی تو کیا تھا کہ ہم الماس کے دروازے تک پہنچ کے لوٹ آئے۔ یہ اندازہ تم خود بھی کر سکتی ہو کہ ہم نہ آتے تو کیا ہوتا۔"

"آپ دونوں نے مجھے تباہی کی دلدل سے نکال لیا۔ میں اس احسان کا بدلہ تمام عمر کیسے ادا کروں گی کہ ہر قسم کا خطرہ مول لے کر بھی آپ نے محض انسانی ہمدردی کی بنیاد پر مجھے ڈی سلوا کا اصل چہرہ دکھا دیا۔" شہلا نے جذباتی ہو کے کہا۔

"اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟" میں نے کہا۔ "تمہارے بارے میں نام سے مذہب کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم شہلا زیدی ہو۔ تم نے ڈی سلوا کے وعدوں پر کیسے اعتبار کر لیا۔ میرا مطلب ہے..."

"اس نے ایک وعدہ یہ بھی کیا تھا کہ وہ میری خاطر اپنا مذہب بدل لے گا۔" شہلا نے نظر جھکا کے کہا۔

"چلو اب بھول جاؤ ان سب باتوں اور وعدوں کو۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہی تجربات تو جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔"

جب میں اجازت لے کر رخصت ہوا تو ماسی اس مسئلے پر سخت پریشان اور شرمندہ تھی کہ وہ اپنے معزز مہمانوں کے لیے سونے کا کیا انتظام کرے۔ گھر میں صرف ایک ہی چارپائی تھی اور اتنی رات گئے پاس پڑوس کے کسی گھر سے چارپائی مانگنا مشکل تھا۔ رابعہ اور شہلا نے بڑی مشکل سے اسے قائل کیا کہ وہ ایک رات فرش پر بستر بچھا کے بھی سو سکتی ہیں اور اس میں تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ میں باہر نکلا تو سڑک پر دور تک سناٹا تھا۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ گھروں کے بیرونی دریچے کی بیرونی روشنی گل ہو گئی تھی۔ دنیا سکون کی گہری نیند میں تھی۔ سڑک پر صرف رات کے چوکیدار نظر آ رہے تھے اور میرا خیال تھا کہ اب گھر تک دس میل کا فاصلہ مجھے پیدل ہی طے کرنا ہو گا لیکن آرام باغ بازار کی طرف سے ایک رکشا کی آواز آئی۔ اتفاق سے رکشا خالی تھا اور میرے اشارے پر ڈرائیور نے رکنے کی زحمت بھی گوارا کر لی۔ تاہم مجھے منزل تک پہنچانے کا معاوضہ اس نے دس روپے طلب کیا اور میرے احتجاج پر کہ شکل سے دس میل جانے کا دوگنا کرایہ ہے تب بھی کم بنتا ہے۔ اس نے کسی فلسفی کی طرح ارشاد کیا کہ "وقت دولت ہے اور آدمی جو کچھ کرتا ہے اپنے آرام کی خاطر کرتا ہے۔ اگر مجھے پیسہ بچانا ہے تو میں اسی طرح چلتا ہوا دس منٹ کے بجائے پون گھنٹے میں پہنچ ہی جاؤں گا بشرطیکہ مجھے راستے میں پولیس نے آوارہ گرد سمجھ کے بند نہ کیا اور پاگل سمجھ کے نہ چھوڑا۔"

اس پاگل شخص کے دلائل میں بڑا وزن تھا مگر وہ خود ان دلائل سے زیادہ وزنی تھا چنانچہ میں رکشا میں بیٹھ گیا۔ رضوی صاحب کے گھر کے دروازے پر اتر کر میں نے کہا۔ "اس وقت میں نے تمہاری بات کا جواب اس لیے نہیں دیا تھا کہ میں مجبور تھا، معذور نہیں۔ میں پیدل چل سکتا ہوں مسلسل دس میل۔ مگر میں آج واقعی بہت تھکا ہوا تھا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم اپنے فلسفے کے مطابق وقت بچاؤ گے یا پیسہ؟ کیونکہ یہ دروازہ ایس پی ضامن رضوی کے گھر کا ہے۔" پھر میں نے باری باری دونوں جیبوں سے ریوالور نکالے۔ "میرے پاس دینے کے لیے یہ کرایہ بھی ہے چنانچہ یہاں تم خود بتاؤ۔"

رکشا ڈرائیور کی حالت غیر ہو گئی۔ اس کے حلق سے "بجو... بجو..." کے سوا کچھ نہ نکلا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر دس کا نوٹ رکھا اور اسے دفع ہو جانے کو کہا۔ "میں صرف اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں ورنہ جیسے تم لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو ایسے ہی میں تم کو وہ سبق دے سکتا تھا جو تمہیں عمر بھر یاد رہتا۔" وہ سلام کر کے بگولے کی طرح بھاگا اور میں اتنی خونریزی اور پریشانی کے واقعات سے بھرپور شام کے بعد اس چھوٹے سے لطیفے پر مسکراتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ رضوی صاحب واقعی پریشان تھے۔ میں نے ان کو مطمئن کیا اور اپنے کوارٹر کی طرف چلا گیا جہاں محسن میرے انتظار میں سگریٹ پھونک رہا تھا۔

"کہاں مر گیا تھا تو؟" وہ بولا۔ "اپنے ساتھ رابعہ کو کیوں لے گیا تھا؟"

"یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ جب میں گیا تھا تو جناب گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ اب مجھے اجازت ہو کہ باقی ماندہ گھوڑے گدھے بیچ کر سو جاؤں کیونکہ میں سخت تھکا ہوا ہوں۔ صبح بشرط زندگی پوری بات عرض کروں گا۔" میں نے بستر پر گرتے ہوئے کہا۔

"صبح تک میں پنڈی جا رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "نادر شاہی حکم جاری ہوا ہے کہ فوراً گھر آ جاؤ ورنہ ہم پولیس لے کر حاضر ہوتے ہیں۔"

میں اٹھ بیٹھا۔ "یہ اس چراغ الدین کی کارستانی ہے؟"

"ہاں۔ اس بدمعاش نے فون پر میری ماں سے بات کی اور بہت نمک مرچ لگا کے بتایا کہ کس طرح میں تمہارے ساتھ گیا اور اس کو قتل کی دھمکی دی۔ سارا الزام اس نے تم پر عائد کیا ہے کہ میں نے تمہارے بہکانے پر یہ حرکت کی۔ ڈیڈی تو اس سے کہتے کہ میاں میرا بیٹا عاقل و بالغ ہے کوئی بچہ نہیں کہ بہکانے

www.paksociety.com

سے بھاگ جانے، لیکن تم تو جانتے ہو۔ اس وقت دو چار لڑکیاں کی حمایت کرنے پر تلی ہوئی ہیں اور تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم دنیا کے سب سے کمینے آدمی ہو۔ انھوں نے یہاں انکل شفیق کو فون کیا اور مجھ سے تو بات نہیں ہوئی مگر رضوی صاحب سے انھوں نے سب کچھ کہہ دیا۔ یہ بھی کہ وہ لڑکی نا بعد کچھ اچھے کردار کی معلوم نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں رضوی صاحب نے اس کا کیسا جواب دیا۔ میرے بارے میں ممی نے کہا کہ اسے سکندر تباہ کر دے گا، کیا وہ اس کے ساتھ پھانسی چڑھنے کا ارادہ رکھتی ہیں، وہ اسے فوراً گھر بھیج دیا جائے۔"

"آ گئی سی۔" میں نے غور فرمانے کے بعد کہا۔ اب میری نیند پھر اڑ گئی تھی چنانچہ میں نے سگریٹ جلائی۔ "اور تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"بتا تو چکا ہوں کہ صبح گھر جا رہا ہوں۔" محسن بولا۔ کچھ دیر میرے اترے ہوئے مایوس چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر مسکرایا۔ "لیکن میں کل ہی واپس بھی آ جاؤں گا۔ مجھے دو تین باتیں ٹھیک سے کہنی ہیں۔ ایک یہ کہ فوزیہ کی شادی میرے جیتے جی چاند سے نہیں ہو سکتی۔ دوسری یہ کہ میں سکندر بخت کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کے بعد خواہ مجھے عاق کر دیا جائے، ناخلف اور نافرمان قرار دے کر یا گھر سے نکال دیا جائے، میں اپنے فیصلے پر قائم رہوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ممی چیخیں پکاریں گی، چلائیں گی، جلنے اور کڑھنے دیں گی اور شاید مر جانے کی دھمکی بھی دیں لیکن ڈیڈی زیادہ معقول رویہ اختیار کریں گے۔ وہ لڑکی جو بہت پسند اور اصول پرست آدمی ہیں۔ بے شک بیوی سے دبتے ہیں مگر اتنے بھی نہیں کہ مجھے عاق نامہ تھما دیں۔ وہ زبردستی نہیں کر پائیں گے۔ فوزیہ کے معاملے میں اور نہ تیرے معاملے میں۔ اس لیے مجھے امید ہے کل شام یا رات تک میں پھر حاضر ہو جاؤں گا ان شاء اللہ۔ پرسوں تو یقینی ہے۔"

اس کے بعد میرے لیے وہ سب واقعات بیان کرنا ضروری ہو گیا جو شہلا کی کوٹھی میں پیش آئے تھے۔ اس نے بے حد اطمینان کا اظہار کیا اور مجھے مشورہ دیا کہ شہلا کو چھپائے رکھنے کے لیے احتیاط سے کام لوں۔ خود ادھر نہ جاؤں تاکہ کوئی بے خبری میں میرا تعاقب کرتا ہوا اس ٹھکانے تک نہ پہنچ جائے اور ایک کے لیے ماسی کی خدمات سے استفادہ کروں۔ اس کا مشورہ معقول تھا اور احتیاط پسندی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ میں نے محتاط رہنے کا وعدہ کیا اور سو گیا۔ صبح میری آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ محسن جا چکا تھا اور میں کئی دن کی تھکن دور کر کے اب بالکل تازہ دم تھا۔

میں غسل کر رہا تھا کہ رابعہ آ پہنچی۔

"ہیلو۔" میں نے باتھ روم میں سے کہا۔ "گڈ مارننگ رابعہ! آپ بیڈ روم کو ڈرائنگ روم سمجھ کے تشریف رکھیں بلکہ بہتر ہے کچن میں جا کے چائے بنانے کا عملی تجربہ حاصل کریں۔"

وہ ہنسی۔ "مسٹر سکندر اعظم! شرط یہ ہے کہ وہ تجربہ آپ کو بھی پینی پڑے گی خندہ پیشانی سے۔"

"خندہ پیشانی سے تو ہم تھنے کا پانی بھی پی سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "بشرطیکہ آپ کے دست حنائی سے سگریٹ کی بجائے پیش کیا جائے۔"

میں باتھ روم سے نکلا تو رابعہ باورچی خانے سے برآمد ہوئی۔ وہ خود تو ماں کے گھر سے ناشتہ کر کے آئی تھی مگر میرا بھوک سے برا حال تھا۔ میں نے اسے رضوی صاحب کے گھر سے کھانے کی کوئی چیز لانے بھیج دیا اور خود وہ اخبار دیکھنے لگا جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی چونکہ اخبار والوں کو قبرستان پہنچنے کا موقع نہ ملا تھا اس لیے میرے والی لاش کے غائب ہونے کی خبر کہیں نہ تھی۔ صرف ایک اخبار کا رپورٹر گھومتا ہوا ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ جا پہنچا تھا اور اس نے گورکن کی موت کی خبر چھاپ دی تھی۔ گورکن کے لڑکے نے اسے بتایا تھا کہ اس کا باپ کس طرح قبر سے زندہ برآمد ہوا تھا اور کس طرح ہسپتال میں مر گیا تھا۔ جو اس نے ڈاکٹر سے انٹرویو لیا تھا اور قتل کی تفصیلات حاصل کر لی تھیں۔ مجھے امید تھی کہ اگلے شمارے میں وہ اس شخص کی تلاش سے متعلق دیگر حقائق کو بھی بے نقاب کرے گا۔ دوسری نمایاں اہم خبر شہلا کے گھر میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں تھی۔ جن میں سے دو افراد مارے گئے تھے۔ ایک کی گردن ٹوٹ گئی تھی اور دوسرے کے سر میں گولی لگی تھی مگر تیسرا کو زندہ مل گیا تھا لیکن وہ ہسپتال میں بے ہوش پڑا تھا اور پولیس اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی تک ... نے ڈی سلوا کی سیکرٹری مس شہلا زیدی کا نام نہیں لکھا تھا اور ایک حلیہ چھپنے والے گورکن کی جیتے قاتل نرس کی مس شہلا سے مشابہت کا کوئی حوالہ نہیں دیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ مجھے ڈی سلوا کا خیال آیا۔ نہ جانے یہ خبر پڑھ کے اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ وہ ان کرائے کے بدمعاشوں کی موت کے بعد زیادہ مشتعل ہوگا یا محتاط ہو جائے گا۔

رابعہ ایک ٹرے میں بہت سی چیزیں رکھ کے لائی اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس وقت میں نے صفحہ پلٹا اور ... نے ایک چھوٹی سی مگر اہم خبر پڑھ لی۔ کسی جگہ جوا کھیلتے ہوئے ایک شخص ہلاک اور ایک زخمی ہو گیا۔ جھگڑے میں چار ...

ٹوٹ گئے تھے۔ پولیس کو دو گرفتار ہونے والے جواریوں سے معلوم ہوا تھا کہ مرنے والا ایک بد قماش نوجوان تھا اور اس کا نام عدنان تھا ... میرے حلق میں اٹک گیا۔ عدنان ایسا نام نہیں تھا جو بہت عام ہو۔ میں نے وہ خبر رابعہ کو دکھائی۔

"اب کیا ہوگا؟" رابعہ نے پریشان ہو کے کہا۔ "اس کی ماں تو مر جائے گی۔"

"میرا خیال ہے ابھی اسے کچھ نہ بتایا جائے۔" میں نے چائے ختم کرتے ہوئے کہا۔ "شہلا کو بتا دیا جائے۔ وہ جیسا مناسب سمجھے کرے گی۔ اگر پولیس کو عدنان کے بارے میں تفصیلات مل گئیں تو وہ اس کے گھر پہنچیں گے اور یہی نتیجہ اخذ کریں گے کہ عدنان کے قاتلوں کا اس گھر میں ملنے جلنے والوں سے کوئی تعلق ضرور ہے۔"

اسی روز شام کے وقت میں اور رابعہ پھر ... روڈ پہنچے۔ الماس ایک ملازم ... مکان کے اوپر والے حصے میں کرائے پر رہتی تھی۔ رابعہ کو مالک مکان سے جھوٹ بولنا پڑا کہ وہ الماس کے بچی کی کلاس فیلو ہے۔ الماس کا شوہر گھر میں ہی تھا۔ الماس نے ہمیں بڑے اخلاق سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اس کی گود میں دو سال کا ایک مختصر بچہ بھی تھا۔ گھر کے اسباب سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زیادہ خوش حال نہیں۔ تاہم ایک قناعت پسند روایتی مشرقی بیوی کی طرح الماس اپنے گھر میں یقیناً خوش تھی۔

"دراصل مجھے آپ سے ایک کام تھا۔ ایک ضروری بات کرنی تھی جس کے لیے مجھے یہ جھوٹ بولنا پڑا۔ میں آپ سے کبھی نہیں ملی۔ میں رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ہوں۔" اس نے اپنا کارڈ آگے بڑھا دیا۔

الماس کی صورت سے پریشانی جھلکنے لگی۔ "دیکھیے، آپ پھر کبھی آ جایئے گا۔ دو چار دن بعد۔"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "جو بات مجھے کرنی تھی وہ آپ کے شوہر کے سامنے نہیں کی جا سکتی۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ وہ کہیں گئے ہوئے ہیں ورنہ مجھے پھر کسی وقت آپ سے علیحدگی میں بات کرنے کے لیے بہانہ اور موقع تلاش کرنا پڑتا۔"

الماس اب نروس ہو گئی تھی۔ "آپ... آپ لوگ کون ہیں؟ کیسے کیوں آئے ہیں؟"

"میں کل پھر آ سکتی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔ "کل تک آپ میرے بارے میں جو تحقیق و تفتیش کرنا چاہیں کر لیں۔ مثلاً یہ کہ کیا واقعی رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ہوں یا نہیں۔ یہ بات آپ کا اطمینان ہو جانے کے بعد بھی کی جا سکتی ہے مگر اتنا ضرور سمجھ لیجیے کہ آپ کے شوہر کے کانوں تک اس بات کی بھنک بھی پڑی تو خود آپ کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

"یہ تو آپ مجھے دھمکی دے رہی ہیں؟" الماس نے تیز ہو کر کہا۔ "اگر آپ کو ایسی ہی پرائیویٹ بات کرنی تھی تو کیا آپ اکیلی نہیں آ سکتی تھیں؟ اور پھر مجھ سے آپ کبھی ملی نہیں تو میرے بارے میں ایسی کون سی بات معلوم ہو گئی ہے آپ کو، یہ کس نے بتائی ہے یہ بات؟ اپنے شوہر کو ساتھ لے کر آنے کا کیا مقصد ہے؟" پرائیویٹ میں وہ جواب کا موقع دیے بغیر سوالات کرتی جا رہی تھی اور شاید یہ سمجھنے میں حق بجانب تھی کہ ہم کوئی نوسرباز ہیں جو اس کے شوہر کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گھر میں گھس کے کوئی غلط کام کرنا چاہتے ہیں۔

"الماس! یہ میری ... تو کسی گھر میں رات کے وقت اکیلے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔" رابعہ نے کہنا شروع کیا۔

"دیکھیے خاتون! میں ان کا شوہر نہیں ہوں۔" میں نے بر وقت مداخلت ضروری سمجھی ورنہ الماس چلا اٹھتی۔ "حقیقت یہ ہے کہ مجھے ڈی سلوا کے بارے میں بات کرنی تھی۔ آپ ایک زمانے میں اس کی سیکرٹری تھیں۔ بات کا تعلق اسی زمانے میں پیش آنے والے واقعات سے ہے۔ اگر میں اکیلا آتا تو آپ سے بات کیسے کرتا؟ آپ کے اطمینان کے لیے میں ایک عورت کو ساتھ لایا ہوں اور وہ عورت بھی عام عورت نہیں ہے، ایک بیرسٹر ہے جس کی شرافت اور نیک چلنی کی ضمانت جج صاحبان تک دے سکتے ہیں۔"

ڈی سلوا کا نام سنتے ہی الماس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا اور اب یوں لگتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ "تم... تم لوگ مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی مگر اب اس کی آواز بہت پست تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ہمارے آنے کا مقصد کیا ہے۔ وہ ساکت و صامت بیٹھی رہی اور سہمی سہمی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی گود میں کھیلنے والا بچہ دودھ کی بوتل منہ میں لیے لیٹ گیا تھا۔

"میرے ساتھ ڈی سلوا نے کوئی زیادتی نہیں کی۔" وہ اپنے جسم سے لرزتے ہوئے بولی۔ "اور اگر کی تھی تو میں تمھیں کیوں بتاؤں؟ میں کسی ڈی سلوا کو نہیں جانتی۔ میں کبھی اس کی سیکرٹری نہیں رہی۔ میں وہ سب باتیں بھلا چکی ہوں اور بھولے سے بھی ایسی کوئی بات زبان پر نہیں لانا چاہتی جس سے میرا گھر برباد ہو جائے۔ میرے شوہر کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے۔"

"یہ تو میں بھی نہیں چاہتا اور اسی لیے میں آج کے گھر آنے کو مناسب ترین سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "سوال ایک اور لڑکی کی زندگی کا ہے جو اب ڈی سلوا کی سیکرٹری ہے اور جس کی عصمت

www.paksociety.com

وعدوں کے جال میں گرفتار ہو کے بہت سی غلطیاں کر چکی ہے۔"

"تمہیں کیوں ہمدردی ہے اس لڑکی سے؟" الماس نے کہا۔ "تمہاری کیا لگتی ہے وہ؟"

"کچھ نہیں، مگر ایک انسانی جان بچانا بھی بڑا ثواب ہے۔" میں نے کہا۔

"تم اپنے ثواب اور عذاب سے غرض رکھو اور میرے ثواب عذاب میرے لیے چھوڑ دو۔ اس لڑکی نے جس اگر حماقت کی ہے تو کوئی تو اس کو سزا ملنی چاہیے۔ غلطی پر سزا تو ملتی ہی ہے پھر تم کیوں فکرمند ہو رہے ہو۔ جان کا ڈر تمہارے جگر میں کیوں ہے؟" الماس بولتی گئی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔ "میں اس وقت آؤں گا جب تمہارا شوہر بھی موجود ہوگا اور میں ڈی سلوا کو ساتھ لے کر آؤں گا تاکہ تمہیں بھی اس غلطی کی سزا مل جائے جس سے تم اب تک بچی ہوئی تھیں اور بچی رہ سکتی تھیں۔ میں دیکھوں گا کہ ڈی سلوا کے سامنے تم اس سے تعلق سے کیسے انکار کرو گی۔ مجھے یہاں آنے اور بات کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا کیونکہ اب یہ ایک قانونی معاملہ بن جانے کا ڈی سلوا کی موجودگی میں ڈی سلوا نے ایک قتل کر دیا ہے۔ اس نے یہ غلطی اور اتنی بڑی کی ہے اور میں ڈی سلوا کا دشمن ہوں کیونکہ ڈی سلوا میرے باپ کے قاتلوں میں شامل ہے۔ اس کو کیفر کردار تک پہنچانا میرا فرض ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرا فرض یہ بھی ہے کہ شہلا کی زندگی بچاؤں۔ شہلا اس لڑکی کا نام ہے جس کو ڈی سلوا نے آلۂ کار بنایا۔ اس کا یہ راز فاش ہو چکا ہے اس لیے ممکن ہے وہ شہلا کو ختم کر دے مگر میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ ڈی سلوا کے خلاف گواہی دینے کے لیے آ سکے اور زندہ رہے۔" میں نے رابعہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔

"ٹھہرو۔" الماس چلائی۔ "مجھے یہ تو بتاتے جاؤ کہ کیا مجھے بھی کسی عدالت میں گواہی کے لیے آنا پڑے گا؟"

"اگر تم اس وقت ہمیں ڈی سلوا کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دو گی جو تم جانتی ہو تو اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔" میں نے کہا۔ "مجھے ڈی سلوا کے خلاف ثبوت چاہیے۔ تم اپنا دامن بچا کے ثبوت فراہم کر سکتی ہو۔ تمہارے بعد اور بھی بہت سی لڑکیاں اس کی ہوس اور شیطانی فطرت کے جال میں پھنس کے نقصان اٹھا چکی ہیں اور میں ان سے بھی ملوں گا۔"

"خدا کے لیے مجھے بخش دو۔" وہ منت کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "اگر میرے شوہر کو معلوم ہو گیا تو؟"

"کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں میرے دعوے پر اعتبار کرنا ہی ہوگا الماس! یہاں سے مجھے شہلا کے پاس جانا ہے اور اسے بھی قائل کرنا ہے کہ وہ کتنی خطرناک سازش کا شکار ہوئی ہے۔ اسے احساس نہیں لیکن اس کی زندگی تک کو خطرہ لاحق ہے۔ مجھے اس کو بتانا پڑے گا کہ ڈی سلوا پہلے کتنی لڑکیوں کا مستقبل تباہ کر چکا ہے۔ میرے پاس وقت کم ہے۔"

الماس نے بچے کو دوسرے کمرے میں لے جا کر بستر پر لٹا دیا۔ میں نے اسے بچے پر کمبل پھیلا کے اس کے ماتھے پر ماں کی سی محبت کرتے دیکھا۔ اس نے وہ آنسو خشک کیے جو ارادے کے بغیر آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ اس نے خود کو … کی ذلیل ترین اور تند ترین لہر کے زور سے بچا لیا تھا اور اب اس کی زندگی کو لاحق خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ یہ اس کے لیے سخت ترین آزمائش تھی۔ وہ … سے بھی ڈرتی تھی اور خاموشی کے نتائج سے بھی۔ … میں لوٹ کر آئی تو ایک بار پھر مجھے اور رابعہ کو اپنی … اور اس کے مستقبل کو تحفظ کی ضمانت حاصل ہونے کا یقین … کی سخت جدوجہد کرنی پڑی۔

"دیکھو الماس!" رابعہ نے کہا۔ "تمہارے بعد وہ بہت … لڑکیوں کو ذلیل و خوار کر چکا ہے۔ وہ سب بزدل ہیں یا … اس سے انتقام نہیں لے سکیں مگر سکندر بخت کا معاملہ مختلف ہے۔ یہ انگلستان میں زیر تعلیم تھے جب ڈی سلوا نے … کے ساتھ مل کر ان کے والد کو بلیک میل کیا اور ان کا سب … چھین کر انہیں مرنے پر مجبور کر دیا۔ جب یہ پاکستان آئے … کو اصل حالات کا علم ہوا تو ان کو قتل کے ایک جھوٹے … میں پھانس لیا گیا اس لیے کہ ڈی سلوا اور اس کے ساتھی … اثر و رسوخ کے مالک اور بدمعاش تھے۔ ان کے مقدمات … پیروی میں کر رہی ہوں اور میرے ساتھ دوسرے وکیل … ہیں۔ عبدالودود منظر، ہم تینوں بچپن میں ایک ساتھ … اور ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے … لڑکیاں تمہارے چلے جانے کے بعد اس کی سیکرٹری … کیا انجام ہوا۔ ایک نے خودکشی کی اور دوسری … ہو گئی۔ تیسری کا بچہ ہمارے پاس موجود ہے اور ہم … بھی ملیں گے۔ شاید وہ بھی کچھ بتا سکے اور پھر ہم … جا کر اس کو خبردار کر سکیں۔ اسے بتا سکیں کہ وہ کسی خوش فہمی … ہے اور اپنی جان بچا کے نکل جائے ورنہ اس کا انجام … برا ہوگا۔ ڈی سلوا اس کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ … ہماری بات نہ مانے۔ عشق میں آدمی اندھا بہرا اور … ہے۔ اگر اس نے سمجھا کہ ہم ڈی سلوا کی دشمنی میں ایسی … رہے ہیں تو ہم اسے تمہارے پاس لے آئیں گے اور اس دوسری لڑکی سے بھی ملوا دیں گے۔ پھر وہ یقین کرنے پر مجبور ہوگی اور ہمیں ڈی سلوا کے بارے میں وہ سب باتیں بتا دے گی جو … سکندر بخت نے اس بدمعاش سے انتقام لینے کی قسم کھائی ہے۔ کیا تمہیں اس سے انتقام لینے کی خواہش نہیں؟ یقیناً ہوگی مگر تم مجبور ہو۔ تمہارا گھر آباد ہو چکا ہے اور تمہارے شوہر کو کچھ معلوم نہیں۔ ظاہر ہے تم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتیں مگر تم اتنا تو کر سکتی ہو کہ…"

"میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔" الماس نے قطعی لہجے میں کہا۔ "میں اس کو تباہ کر سکتی ہوں۔ اسی طرح جیسے اس نے مجھے دھوکا دیا اور خراب کیا۔ میں بے وقوف اور جذباتی تھی کہ اس کی باتوں میں آ گئی اور اس کے بچے کو جنم دیا جو قانون کی نظر میں جرم ہے۔ مذہب کے لیے گناہ اور معاشرے میں ناقابلِ معافی۔ میں نے بھی سوچا تھا کہ میں مر جاؤں یا اس شیطان کو مار دوں لیکن میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ پھر قدرت کو مجھ پر رحم آ گیا اور اس نے میری غلطیوں کو معاف کر کے مجھے جینے کا موقع فراہم کر دیا۔ وہ باتیں بہت پرانی ہو چکی ہیں لیکن میں کچھ بھی نہیں بھولی ہوں۔ زخم اگر مندمل ہو گئے ہیں تو کیا۔ ان کے داغ بہت گہرے ہیں…"

وہ اب مخالف جذبات کی رو میں بہنے لگی تھی اور اپنے تمام اندیشوں اور وسوسوں کو بھول کر ہمیں ہر بات بتانے کے لیے تیار تھی کیونکہ ہم اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ تقریباً پانچ سال پہلے اس کی ملاقات ڈی سلوا سے ہوئی تھی۔ اس کے والدین کا انتقال بچپن میں ہو چکا تھا چنانچہ اس کی پرورش حقیقی چچا نے کی تھی۔ چچا کو مرحوم بھائی کے احسانات کا بہت پاس تھا۔ بڑے بھائی نے … ان کو پالا تھا۔ انہوں نے الماس کو محبت اور شفقت … اس کی ضروریات کو اپنا پیٹ کاٹ کے پورا کیا اور اسے … تک تعلیم دلوائی۔ یہ سب چچی کو سخت گراں گزرتا تھا … چنانچہ شوہر کی عدم موجودگی میں وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتی تھی … کہتی تھی جو ماں باپ کو کھا کے ان کے گھر میں آ گھسی … میرے بچوں کا حق مارنے آ گئی ہے اور ایسے منہ پھاڑ کے … ہے جیسے اس کا باپ خزانہ چھوڑ گیا تھا … چچا کے مالی حالات کبھی زیادہ اچھے نہیں رہے تھے اور الماس … کچھ نہیں چھوڑا تھا … باتیں اس کے … گئی تھیں۔ ان باتوں کا اثر گھر کے بچوں پر بھی … بچپن کے ہونے کے باوجود اسے بے عزت کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ اسے منحوس، مصیبت اور بلا کہتے تھے۔ بات بات پر اسے احساس دلاتے تھے کہ یہ ہمارے باپ کا گھر ہے تمہارے باپ کا نہیں۔ الماس نے دو ایک مرتبہ ان کو اس بدتمیزی پر ہلکا سا تھپڑ رسید کر دیا تو انہوں نے کہرام مچا دیا اور چچا کے سامنے یہ کہا کہ الماس نے بچوں کو بلاوجہ انتہائی بے رحمی سے مارا ہے۔ چچا بہت کچھ سمجھنے کے باوجود بہت سی باتیں نہیں سمجھتے تھے۔ خدانخواستہ بیوی تو الماس کے خلاف جھوٹا الزام عائد کر سکتی ہے مگر بچے جھوٹ نہیں بول سکتے۔ ایسے متعدد مواقع آئے جب چچا نے بھی غصے میں اسے لعن طعن کی گو بعد میں انہوں نے پیار سے تلافی بھی کی مگر الماس کے دل میں تو یہ بات جڑ پکڑ گئی تھی کہ اسے اپنا گھر بنانا ہے۔ سارا دن پرائے گھر کی نفرت کا شکار بننے کے بعد شام کو گھر آنے والے چچا کی شفقت اس کے دکھ کا مداوا نہیں کر سکتی تھی۔

پانچ سال پہلے وہ ایک ایسے گھر میں رہتی تھی جو سڑک کے کنارے بازار میں تھا۔ وہ اکثر بالکونی میں آ کھڑی ہوتی تھی اور بازار کی چہل پہل دیکھتی رہتی تھی۔ بالکونی کے عین مقابل سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک بینک تھا۔ ایک روز وہ حسب عادت باہر دیکھ رہی تھی کہ بینک کے سامنے سیاہ رنگ کی لمبی سی کار آ کے رکی جس کی ایک چیز نے الماس کو متوجہ کیا۔ وہ کار کے شیشے تھے جن میں سے اندر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے سامنے تین افراد کار کے پچھلے دروازے کھول کر اترے اور جو تھا انجن اسٹارٹ کیے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ الماس یہ دیکھ کر اور حیران ہوئی کہ تینوں افراد نے ایک جیسے بریف کیس اٹھا رکھے تھے، ایک جیسے لباس پہن رکھے تھے اور ان کا حلیہ بھی تقریباً ایک جیسا تھا۔ انہوں نے ملیشیا کی قمیص شلواریں اور لمبے کرتے پہن رکھے تھے۔ سب کے سروں پر پگڑیاں تھیں اور وہ ایک ہی عمر کے صحت مند جوان مرد تھے جن کے بارعب چہروں پر گھنی سیاہ داڑھی تھی۔ ان کی صورتوں اور حلیوں کی مماثلت دیکھ کر یہ خیال آتا تھا کہ وہ تینوں بھائی ہیں۔ الماس کے سامنے وہ تینوں بینک میں داخل ہوئے اور دروازے پر کھڑے ہوئے گارڈ نے بھی ان کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ابھی مشکل سے دو منٹ گزرے ہوں گے کہ بینک میں سے گولیاں چلنے کی آواز آئی اور الماس کی دہشت زدہ نگاہوں نے گارڈ کو باہر گرتے دیکھا۔ وہ بندوق جس کو گارڈ سہارے کے لیے بطور لاٹھی استعمال کر رہا تھا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اندر گر گئی۔ بینک کے اندر ایک چیخ پکار مچی ہوئی تھی اور دروازے کے باہر وہ گارڈ تڑپ رہا تھا جس کے سینے میں کم از کم دو گولیاں لگی

www.paksociety.com

تھیں۔ اس کا خون نیچے ٹائل کے فرش پر بہہ رہا تھا اور چھینٹے بینک کی بیرونی دیوار پر بھی نظر آ رہے تھے۔ بازار میں بھی لوگوں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ وہ شخص جو کار میں بیٹھا رہا تھا، فوراً باہر نکل آیا اور بینک کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مشین گن تھی اور وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو خبردار کر رہا تھا کہ قریب کوئی نہ آئے۔ یہ سب کچھ اتنی عجلت میں ہوا اور اتنا غیر متوقع تھا کہ الماس خوف اور حیرت سے گم کھڑی رہ گئی۔ اسے خیال ہی نہ آیا کہ وہ دوڑ کر ساتھ والے گھر میں جائے اور پولیس کو فون کر کے بینک میں ڈاکا پڑنے کی اطلاع کرے۔ اس نے دیکھا کہ وہ آدمی جو مشین گن لیے باہر کھڑا تھا صورت شکل اور حلیے میں باقی تین افراد سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے سیاہ پتلون پر سفید دھاریوں والی سرخ جرسی پہن رکھی تھی۔ اور آنکھوں پر سیاہ شیشوں والا دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ شاید کار سے اترنا اس کے پروگرام میں شامل نہیں تھا ورنہ وہ بھی ٹھیک صورت حال ہنگامی نہ ہو جاتی۔ تین چار منٹ میں اندر جانے والے دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ سیاہ چشمے اور سرخ جرسی والا نوجوان پھر کار کی طرف لپکا اور اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ الماس کے باقی تینوں ساتھی ایک کے پیچھے ایک بھاگتے آ رہے تھے۔

الماس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی جو کسی سنسنی خیز فلم کی طرح تھا مگر حقیقی زندگی کا منظر تھا۔ اچانک دم توڑتے ہوئے گارڈ نے جسم کی ختم ہوتی ہوئی قوت مجتمع کر کے دونالی بندوق کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت تک ایک ڈاکو کار کا پچھلا دروازہ کھول کے بیٹھ چکا تھا۔ گارڈ نے دوسرے پر گولی چلائی اور وہ وہیں سڑک پر گر گیا۔ الماس نے نوٹ کیا کہ واپسی پر بریف کیس تینوں کے ہاتھ میں نہیں تھے لہٰذا اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ ان میں اسلحہ لے کر گئے تھے۔ غالباً وہ سب مشین گن جس کے ٹکڑے الگ کیے جا سکتے ہیں اور ان کو جوڑ کر پھر یہی مشین گن بنائی جا سکتی ہے۔ واپسی پر کار میں سب سے پہلے بیٹھنے والا بھی بریف کیس کے بجائے مشین گن لیے نکلا تھا اور اس کا دوسرا ساتھی بھی جو مارا جا چکا تھا۔ بریف کیس صرف ان کے تیسرے ساتھی کے ہاتھ میں تھا جو سب سے پیچھے تھا۔ خون میں لت پت گارڈ نے ایک بار پھر بندوق اٹھائی اور دوسری گولی چلائی مگر اس کے ہاتھوں کی قوت جواب دے رہی تھی اور شاید اس کی نظر بھی دھندلا چکی تھی کہ دونالی کو پوری طرح اٹھا سکا اور گولی بریف کیس والے شخص کی ٹانگ میں لگی۔ مال غنیمت یقیناً بریف کیس میں تھا۔ وہ ایک بار گرا اور پھر اٹھ کر بھاگا۔ کار میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور نے ہوا میں چلا کر اسے جلدی کرنے کو کہا اور گاڑی آہستہ آہستہ کھسکنے لگی۔ اس کا ایک پچھلا دروازہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ زخمی ٹانگ والے ساتھ بھاگنے والے شخص نے کار تک پہنچنے کی بھرپور کوشش کی مگر وہ کار کے پچھلے حصے سے ٹکرا کے گر گیا۔ تاہم اس نے بریف کیس پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ ڈاکوؤں میں سے ایک نے چیخ کر اسے گالی دی اور بریف کیس پھینکنے کے لیے کہا مگر رہ جانے والا جانتا تھا کہ اس نے بریف کیس پکڑا دیا تو ساتھی خود اسے گولی مار کر وہیں چھوڑ جائیں گے۔ اس نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا لیکن بریف کیس کو پیچھے رکھا۔ کار میں بیٹھے ہوئے شخص نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کار میں گھسیٹنے کی کوشش کی لیکن کار کی رفتار بڑھ چکی تھی۔ بریف کیس والا سڑک پر گر کر رہ گیا پھر اچانک ہوا کے زور سے کار کا دروازہ بند ہو گیا اور بازار کے سے پولیس کی ایک جیپ نمودار ہوئی۔ الماس کا خیال بھی یہی تھا کہ پولیس ڈاکے کی اطلاع پا کر آئی ہے مگر وہ کہیں چھاپہ مارنے جا رہے تھے۔ ڈاکو ان کو دیکھتے ہی ایسے بدحواس ہوئے کہ انہوں نے ایک شیشہ کھول کر مسلسل ہوائی فائر کیے۔ پولیس کی جیپ فوراً ایک گلی میں گھس گئی اور بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ تیزی سے بڑھی اور بریف کیس والا سڑک پر پڑا رہ گیا۔ ساتھیوں کو بے وفائی کرتے اپنی جان بچانے کی خاطر فرار ہوتے دیکھ کر پاگل ہو گیا اور اٹھ کر بے تحاشا ان کے پیچھے چلاتا ہوا دوڑا۔ "خدا کے لیے... مجھے چھوڑ کے مت جاؤ..." اسے وہ ذرا بھی دکھائی نہ دیا جو سامنے سے آ رہا تھا۔ وہ سڑک کے وسط اپنی زخمی ٹانگ کا لہو چھپاتا، دیوانہ وار چلاتا ہوا بھاگ رہا تھا ٹرک ڈرائیور نے اسے بچانے کی پوری کوشش کی مگر ٹرک کی رفتار بہت زیادہ تھی۔ پلک جھپکتے میں ٹرک اس کے اوپر سے گزر گیا۔ لوگ ہر طرف سے دوڑ پڑے اور لاش کے گرد ایک مجمع لگ گیا۔

الماس نے سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسے ایک چکر آیا اور وہ اندر کی طرف بھاگی۔ بستر پر گر کے وہ ذرا سی دیر کے لیے بے ہوش ہو گئی۔ دہشت سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا اور ٹھنڈا پسینہ اس کے جسم پر پانی کی طرح بہنے لگا تھا اور اس کے رونگٹے کانٹے سے بن گئے تھے۔ ہوش میں آتے ہی اس نے خود کو سنبھالا اور اٹھ کر پانی کا ایک گلاس پیا۔ اس کا چچا آفس میں تھا۔ بچے اسکول گئے ہوئے تھے اور چچی شاپنگ کے لیے چلی گئی تھی۔ بعد جب الماس کے ہوش ٹھکانے آئے تو اس نے سوچا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اور بالآخر اس فیصلے پر پہنچی کہ اس کے لیے خاموش رہنا ہی بہتر ہوگا ورنہ وہ مشکل میں پھنس جائے گی۔ اسے بیان کے لیے تھانے جانا پڑے گا اور نہ جانے کب تک اسے عدالت میں حاضری دینی پڑے گی۔ اس کے چچا اور چچی کو یہ ہرگز منظور نہ ہوگا کہ پولیس ان کے گھر کے چکر لگائے اور آئے دن عدالت کا حلیہ بھی یہ دروازے پر موجود ہو، سیاہ چشمے اور سرخ جرسی پوش والے ڈاکو کی صورت اس کے دل میں نقش ہو گئی تھی۔ باقی تین نے جانے بوجھے ایک جیسا حلیہ بنا کے آئے تھے تاکہ کسی کے بارے میں کوئی بھی چشم دید گواہ واضح بیان نہ دے سکے۔ دیکھنے والے بہت تھے چنانچہ الماس نے طے کیا کہ وہ اس کھکھیڑ میں نہیں پڑے گی بلکہ واپسی پر چچی نے پوچھا تو وہ کہہ دے گی کہ میں سو رہی تھی اور مجھے کچھ معلوم نہیں کہ باہر کیا ہو گیا۔

ٹھیک اسی وقت الماس کو یوں لگا جیسے کوئی دھم سے صحن میں کودا۔ صحن کا ایک دروازہ پچھلی طرف کی تنگ گلی میں کھلتا تھا۔ وہ کمرے سے نکلی اور نیچے اتری۔ نیچے کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ پچھلی منزل کے باورچی خانے کے سامنے سے گزر کے کمرے میں جا رہی تھی کہ اچانک کسی نے اس کو باورچی خانے میں گھسیٹ لیا۔ الماس کی چیخ اس کے حلق میں گھٹ کے رہ گئی۔ اس کی آنکھوں نے ایک اجنبی کو دیکھا جس کے دوسرے ہاتھ میں تیز دھار والا لمبا اور چمکیلا خنجر تھا۔ خنجر باورچی خانے کی روشنی میں چمک رہا تھا اور اس کی نوک الماس کے حلق سے چند سوت کے فاصلے پر تھی۔

"اگر آواز نکالی تو تمہیں ذبح کر دوں گا۔" وہ بولا اور اس نے الماس کو آزاد کر دیا۔ الماس سہم کر دیوار سے لگ گئی۔ "تمہارے سوا گھر میں کون کون ہے؟" اس شخص نے پوچھا۔ وہ تیس چالیس سال کا تندرست آدمی تھا۔ کلین شیو اور سفید شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا الماس نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"کوئی... کوئی نہیں۔" الماس نے حلق میں پھنس جانے والے الفاظ بڑی مشکل سے ادا کیے۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" وہ بولا۔ "دیکھو لڑکی! میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ بس تم اپنی زبان بند رکھو اور مجھے یہ بتا دو کہ میں کچھ دیر تک کہاں چھپا رہ سکتا ہوں؟"

"ایک... ایک گھنٹے بعد اسکول سے بچے آ جائیں گے" الماس نے کانپتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تک تمہیں کوئی خطرہ نہیں... لیکن تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں!" وہ درشتی سے بولا۔ "تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ میں کون ہوں۔ آج کے بعد بھولے سے بھی اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی لیکن میں کسی رات کو سوتے میں اس خنجر سے تمہاری یہ نازک اور خوبصورت گردن کاٹ جاؤں گا... ایسے۔" اس نے ہوا میں خنجر کو حرکت دی۔ "تمہارے بھائی بہن ماں باپ سب کے سر تن سے جدا کر جاؤں گا۔"

دہشت سے الماس کی حالت غیر ہو گئی۔ اجنبی نے اسے ڈھیل چھوڑا اور باہر نکل کر دروازے کی کنڈی لگا گیا۔ الماس سوچنے لگی کہ کیا وہ چلا گیا؟ مگر اس نے تو ایک گھنٹہ چھپے رہنے کی مہلت مانگی تھی۔ اگر وہ مجھے اسی طرح چھوڑ گیا تو میں چچی کو کیا بتاؤں گی کہ مجھے باورچی خانے میں کس نے بند کیا تھا۔ اسی وقت دروازہ کھل گیا اور الماس نے اجنبی کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھا۔ "تم واقعی سمجھدار لڑکی ہو۔" وہ بولا۔ "میں تمہیں آزما رہا تھا کہ موقع ملنے کے بعد تم خود تماشائی ہو رہی ہو یا نہیں۔ میرا خیال ہے مجھے ایک گھنٹہ ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ پچھلی گلیوں کی طرف سے نکل جانے میں خطرے کی بات نظر نہیں آتی۔"

وہ بولتا جا رہا تھا اور الماس کی نظر اس بریف کیس پر تھی جو اب اجنبی کے ہاتھ میں تھا۔ چند منٹ کے اندر یہ بریف کیس وہ باہر سے نہیں لا سکتا تھا۔ بریف کیس گھر میں ہی موجود تھا اور شاید اس نے خود اندر کودنے سے پہلے صحن میں پھینک دیا تھا۔ یہ وہی بریف کیس تھا جو ٹرک کے نیچے آ جانے والے ڈاکو کے پاس تھا۔ اس کی ساخت اور اس کا رنگ بالکل وہی تھا اس پر سڑک کی کھردری سطح پر گھسیٹے جانے سے خراشیں پڑ گئی تھیں اور براؤن رنگ کی شارک اسکن جیسی بیرونی سطح کئی جگہ سے چھٹ گئی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ صاف کر دینے کے باوجود اس پر اب بھی خون کے داغ تھے۔ جب وہ چلا گیا تو الماس بہت دیر تک مجسمہ بنی کھڑی رہی۔ اپنی انتہا کو پہنچ کر خوف ختم ہو گیا تھا اور یہ قدرت کی عطا کردہ حیوانی جبلت کا کرشمہ تھا جو ایسے ہی حالات میں زندہ رہنے کے لیے قوت اور حوصلہ فراہم کرتی ہے۔ جسم میں جمع شدہ ایڈرینالین خون میں شامل ہو کے بلی کو بھی شیر کے مقابلے پر آ جانے کی ہمت دیتی ہے۔ الماس کی سوچنے سمجھنے کی قوت اچانک بحال ہو گئی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ بریف کیس اجنبی کے پاس کیسے پہنچا۔ جب ڈاکو ٹرک کے نیچے آیا تو سب کی توجہ حادثے کی طرف تھی سوائے اس اجنبی کے جس کی نگاہ نے بریف کیس کو دور گرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بریف کیس میں کیا ہے چنانچہ وہ سب کی نظر بچا کر بریف کیس اٹھا کر بھاگ نکلا۔ سب سے پہلا گھر الماس کا تھا۔ جس کی دیواریں بھی نیچی تھیں۔ اسے ڈر ہوگا کہ لوگ اس کو بریف کیس سمیت بھاگتے دیکھ چکے ہوں گے اور ممکن ہے اس کے تعاقب میں بھی آتے ہوں۔ وہ اس گھر میں چھپ گیا اور جب یہ اندیشہ نہ رہا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے تو وہ بریف کیس لے کر اطمینان سے نکل گیا۔

www.paksociety.com

الماس کی آنکھوں نے ستم ظریف تقدیر کا وہ تماشا دیکھا تھا جو ایک درسِ عبرت تھا۔ اس دولت کی خاطر ڈاکا ڈالنے کا پروگرام بنانے والے اور جان دینے والے لوگ دوسرے تھے مگر یہ دولت ایک ایسے شخص کی جھولی میں آگری تھی جس نے حادثے کے وقت سے چند سیکنڈ قبل بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی دولت کا مالک بننے والا ہے۔

الماس اس بات کو بھول گئی اور اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ بعد میں یہ اس لیے بھی مشکل ہو گیا کہ اسے چچا اور چچی کی ناراضگی کا ڈر تھا جو اس بات پر یقیناً خفا ہوتے کہ اس نے اتنی بڑی بات جھوٹ بول کر کیوں چھپائی۔ ان دنوں بی۔ اے کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی اور نتیجے کا انتظار کر رہی تھی۔ چونکہ اسے پاس ہو جانے کا یقین تھا اس لیے چوری چھپے اس نے کئی جگہ ملازمت کی درخواستیں بھجوا رکھی تھیں۔ اس کی بڑی آرزو تھی کہ وہ اس گھر کے رسوا کن احسانات کا بار جلد از جلد اتار دے۔ وہ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کی آرزومند تھی کیونکہ اس میں ذلت برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ تقدیر نے اس کی مدد کی اور ابھی نتیجہ آیا بھی نہ تھا کہ اس کو میرو نیر اینڈ کمپنی کی طرف سے ملازمت کا پروانہ مل گیا۔ نجانے کیوں ڈی سلوا کو دیکھتے ہی اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ پہلے بھی اس کی صورت کہیں دیکھ چکی ہے۔ اسے ملازمت کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ اس کے شبہات کی تصدیق ہو گئی۔ ایک روز دفتر میں ایک شخص ڈی سلوا سے ملنے آیا جس کا استقبال ڈی سلوا نے بڑی گرمجوشی سے کیا۔ اس شخص کا نام چوہدری ملاور تھا۔

"چوہدری ملاور!" میں نے بے اختیار کہا اور اتنی اونچی آواز میں کہ الماس نے مجھے تشویش سے دیکھا۔ "کیا تم اسے پہچان سکتی ہو؟ میرا مطلب ہے کہ اس کا حلیہ بیان کر سکتی ہو؟"

الماس نے کسی دشواری کے بغیر مجھے چوہدری ملاور کے بارے میں تمام تفصیلات فراہم کر دیں اور میرے لیے شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی کہ چوہدری ملاور وہی ہے جو بعد میں میرو نیر اینڈ کمپنی کا تیسرا پارٹنر بنا۔ صاف ظاہر تھا کہ کاروبار میں وہ اس مالِ غنیمت کی وجہ سے شامل ہوا تھا جو لاٹری کے انعام کی طرح اسے غیر متوقع طور پر مل گیا تھا۔ الماس کے بیان کے مطابق بینک لوٹنے والے فرار ہو گئے تھے اور اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ گئے تھے جن سے پولیس کچھ معلوم نہیں کر سکی ہوگی۔ پولیس کے ریکارڈ سے ڈکیتی کی اس واردات کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔ اخبارات کی بہت سی فائلیں دیکھنے سے بھی بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ یہ کہ ڈاکو کتنی رقم لے گئے تھے اور ان کے باقی ساتھی پکڑے جا سکے تھے یا نہیں۔

لیکن اس سے یہ ثابت کرنا یقیناً بہت مشکل تھا کہ چوہدری ملاور کا سرمایہ اسی رقم پر مشتمل تھا جو بینک سے لوٹی گئی تھی۔ تم نے میر شرافت علی کو یا اپنے مرحوم والد کو اپنی دولت سے متعلق جھوٹی کہانی سنا کر مطمئن کر دیا ہوگا اور یہی کہا ہوگا کہ اس نے دولت اپنی محنت سے کمائی ہے یا باپ سے ورثے میں ملی ہے۔ تاہم بہت سی باتیں واقعاتی شہادت کا حصہ بن سکتی تھیں مثلاً یہ کہ اس زمانے میں جب ڈکیتی کی یہ واردات ہوئی تو چوہدری ملاور کہاں قیام پذیر تھا اور یہ کہ وہ کس کاروبار میں شریک ہوا تھا۔ الماس کو بعد میں چشم دید گواہ کے طور پر سامنے لایا جا سکتا تھا لیکن ابھی سے اس کا نام سامنے آنا نہ ہوتا اور الماس کی زندگی کے لیے نئے خطرات پیدا کر سکتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے اس سے کہا کہ وہ اس ملاقات کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ اپنے شوہر سے بھی نہیں۔

"ان سے میں کوئی بات کیسے کہہ سکتی ہوں۔" وہ شرم سے نظر جھکا کر بولی۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ آپ میرے یہاں آنے کا، بعد از تمہاری سے آشنائی کا حوالہ بھی نہ دیں۔" میں نے کہا۔ "یہ تو ظاہر ہے کہ آپ اپنے اور ڈی سلوا کے تعلقات کے بارے میں اپنے شوہر کو کچھ نہیں بتائیں گی مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کے حوالے سے بینک میں پڑنے والے ڈاکے کی بات نہ کریں۔ اسی طرح جیسے اس وقت آپ نے اپنے گھر میں تمام نہیں کی تھی۔ بعد میں کسی مرحلے پر آپ کی گواہی چوہدری ملاور کی شناخت کرنے میں بنیادی کردار ادا کرے گی۔"

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں کسی عدالت میں کوئی بیان نہیں دینے جاؤں گی۔" وہ فوراً ہو کے بولی۔

"میں نے یہ کب کہا ہے؟" میں نے فوراً اس کی تصحیح کر دی۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی پولیس افسر ڈکیتی کی واردات طے ہوئے جانے والے مشتبہ افراد کی تصویریں لے کر آ جائے جن میں چوہدری ملاور کی تصویر بھی ہو اور آپ اسے شناخت کر لیں۔ اس کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک بار آپ کو عدالت کے سامنے بھی ملزم کو شناخت کرنے کے لیے طلب کیا جا سکتا ہے تو وہ کوئی ایسی بات نہیں۔ اپنے شوہر سے بھی آپ کہہ سکتی ہیں کہ خوف کے باعث اس واردات کا ذکر آپ نے کبھی کسی کے سامنے نہیں کیا تھا۔ ویسے آپ چاہیں تو اپنے شوہر کو

واپسی کے بعد کسی بھی بہانے یہ واقعہ بتا سکتی ہیں۔ اس طرح ان کو عدم اعتماد کی شکایت بھی نہیں رہے گی اور اگر آپ کو گواہی کے لیے عدالت میں حاضر ہونا بھی پڑا تو ان کو صدمہ یا اعتراض نہیں ہوگا۔ اس گواہی میں ڈی سلوا کا نام کہیں نہیں آئے گا لیکن آپ اپنے شوہر کو کچھ بتائیں تو یہ ضرور سمجھا دیں کہ رازداری کتنی اہم ہے۔"

وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوئی تھی اور کچھ پشیمانی کے احساس کا شکار نظر آتی تھی کہ اس نے اتنی جلدی مجھ پر اعتبار کیوں کر لیا اور مجھے اپنی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع کیوں فراہم کر دیا۔ میری نیت بالکل صاف تھی اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس لڑکی کا مستقبل کسی طرح بھی اس کے ماضی کے آسیب کا شکار ہو۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کی گواہی کے بغیر بھی میں چوہدری دلاور کو قانون کے حوالے کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اسے بلاوجہ ان معاملات میں ملوث نہیں کروں گا لیکن مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ڈی سلوا سے کیوں ڈرتی ہے اور اس کے خلاف انتقامی جذبات کے اسباب کیا ہیں۔ کیا ایسی کوئی بات ہے جسے ڈی سلوا بلیک میلنگ کے لیے استعمال کر سکے؟ میرا یہ سوال ہی غلط تھا کیونکہ ایسی کوئی بات نہ ہوتی تو الماس کے لیے ڈرنے کی کوئی وجہ بھی نہ ہوتی مگر خود اپنی زبان سے جرم کا اعتراف کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

"دیکھو الماس! زندگی میں کون غلطی نہیں کرتا۔ جو غلطی نہ کرنے کا دعویٰ کرے وہ فرشتہ تو ہو سکتا ہے انسان نہیں۔ ہم ہر قدم پہ ہر روز غلطی کرتے ہیں اور ان تجربات کی روشنی میں مستقبل کی راہیں متعین کرتے ہیں۔ غلطیوں سے ہم سبق سیکھتے ہیں اور کامیاب وہ رہتے ہیں جو ایک ہی غلطی دوبارہ نہیں کرتے۔ اس کے باوجود معاف کر دینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور انسانوں میں شیطان بھی ہیں جو دوسروں کی کمزوری کو اپنی طاقت بنا لیتے ہیں۔ تم نے صرف یہ غلطی کی کہ ڈی سلوا کی باتوں پر اعتبار کیا۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ کوئی غلطی نہیں۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ ڈی سلوا فریبی اور دھوکے باز آدمی ہے۔ خود تم نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا تھا اس لیے تم سمجھتی تھیں کہ دنیا میں کوئی کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ یہ قصور ہمارے معاشرے کا ہے جہاں عورت کی چھوٹی سی غلطی تمام عمر کے لیے بہت بڑی سزا بن جاتی ہے۔ مرد حاکم ہے اور زبردست ہے۔ وہ چاہے تو سو بار بھی مجبور لڑکیوں کی عفت و عصمت کا داغ مگر خود اس کا دامن داغدار نہیں ہوتا۔ کنوارا کی شادی بھی ہو جاتی ہے اور اسے کوئی خوف

نہیں ہوتا کہ ان مجبور لڑکیوں میں سے کوئی اسے بلیک میل کر سکے گی۔ کیونکہ وہ آخری لڑکی جو اس کی بیوی بنتی ہے وہ بھی تو آخر مجبور ہی ہوتی ہے اور کسی کا ذکر کیا خود اپنے ماں باپ کے گھر کے دروازے اس پر بند ہو جاتے ہیں چنانچہ وہ کہیں نہیں جا سکتی۔ کسی سے انتقام نہیں لے سکتی اور شوہر کیسا بھی ہو صبر و شکر کے ساتھ اس کا ہر ظلم سہنے اور اسی کی پناہ میں رہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ تمہارا بھی یہی کیس ہے لیکن تم خوش قسمت ہو اور عقلمند ہو کر سنبھل گئیں مگر ان سب کا سوچو جن کی ایک غلطی کو کسی نے معاف نہیں کیا اور وہ اب تک اس کی سزا بھگت رہی ہیں۔ ان کے گھر آباد نہیں ہو سکے کیونکہ انہوں نے خاندانی شرافت کے دامن پر بدنامی کا داغ لگا دیا تھا۔ وہ خود یا ان کے خاندان والے، قانون کے محافظ اور انصاف کرنے والے سب مل کر بھی اس داغ کو مٹا نہیں سکتے۔ تم کہو گی کہ مجھے ان سے کیا، ان کی خاطر میں اپنا گھر کیوں برباد کروں۔ ٹھیک ہے تم کچھ مت کرو۔ جو کچھ کرنا ہے وہ میں خود کروں گا اور تم پر آنچ نہیں آئے گی۔ ڈی سلوا جیسے آدمی نے صرف گناہ ہی نہیں جرم بھی کیے ہوں گے۔ ایسے جرائم جن کا تعلق تمہاری ذات سے نہیں ہوگا۔ اگر تم مجھے کوئی بھی بات بتا سکو تو باقی سراغ میں لگا لوں گا اور انجام تم خود دیکھ لو گی۔ ابھی تو میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ میرے والد کے قاتلوں میں شامل ہے لیکن قانون کی عدالت میں یہ جرم اس پر ثابت نہ ہو سکا تب بھی میں تہیہ کر چکا ہوں کہ اپنے یقین کی بنیاد پر خود اپنے ضمیر کی عدالت میں ہر مجرم کو کھینچ لاؤں گا اور انصاف خود کروں گا۔"

میں نے الماس کو قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور

www.paksociety.com

اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اپنا تمام زورِ بیان صرف کر دیا تھا۔ نتیجے اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ الماس کے لیے تو وہ کہانی سنانی جس میں کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی۔ یہ آپ بیتی کسی بھی الماس کی ہو سکتی تھی۔ ڈی سلوا نے اسے دو درجن لڑکیوں میں سے صورت دیکھ کر منتخب کیا تھا۔ ابتدائی چند ہفتوں میں ڈی سلوا نے خود کو ایک سنجیدہ مزاج، شریف اور قابلِ اعتماد باس ثابت کرنے کے لیے احتیاط سے کام لیا تھا۔ الماس کے کام سے کام رکھا تھا، اس کی خامیوں کو نظر انداز کیا تھا اور دفتری امور میں اس کی رہنمائی کے لیے مشفقانہ رویہ اختیار کیا تھا جو بعد میں ہمدردانہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ دوستانہ۔ پھر بالکل نامعلوم طریقے سے یہ رویہ عاشقانہ ہوا اور ڈی سلوا نے الماس کو اپنی محبت کے جال میں گرفتار کر لیا۔ اس میں وہ سب خوبیاں تھیں جو ایک فلمی ہیرو میں ہوتی ہیں اور جب لڑکی کو زندگی میں کوئی مرد ایک مثالی شوہر نظر آنے لگے تو اپنی خوش بختی پر ناز کرتے ہوئے وہ مصلحت کے تمام تقاضوں کو بھول کر دنیا کی انگشت نمائی کی پروا نہیں کرتی اور اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہے۔ اپنا سب کچھ لٹا دینے کے بعد الماس کے پاس ندامتوں کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ آنکھ سے فلمی ہیرو نظر آنے والا عملی زندگی میں ولن ثابت ہوا تھا اور وہ جس نے زندگی کی آخری سانس تک ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا، الماس کو ناامیدی اور دل شکستگی کے صحرا میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ گیا تھا جہاں خوابوں کے سراب تھے۔ پاؤں کے نیچے ریگِ تپاں تھی اور تنہائی کی کڑی دھوپ تھی۔ اگر ایک فرشتۂ رحمت اس کا ہاتھ نہ تھام لیتا تو وہ اس صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے مر جاتی۔ الماس کا شوہر واقعی فرشتہ سیرت تھا۔ اس نے کبھی الماس کے ماضی کو نہیں کریدا تھا لیکن وہ بہرحال ایک مرد تھا جو شادی کے بعد عورت کو صرف اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور نیا کہہ کر اسے سیکنڈ ہینڈ مال دے دیا گیا ہے تو اس کی سزا بھی وہ اصل مجرم کو نہیں، بیوی کو ہی دیتا ہے۔ مرد کی فطرت کا یہ تضاد کتنا عجیب ہے کہ وہ پاکباز اور وفا شعار بیویوں کو چھوڑ کر طوائفوں کو گھر میں ڈال لیتے ہیں مگر بیوی کے بارے میں بدخواہوں کی زبان سے جھوٹ بھی سن لیں تو ان کی غیرت حمیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ الماس نے اعتراف کیا کہ ڈی سلوا سے جذباتی وابستگی کے زمانے کی چند تصویریں اور الماس کے خطوط اب بھی ڈی سلوا کے پاس ہیں۔ اس نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ تصویریں کس قسم کی ہیں مگر الماس کی صورت گواہی دیتی تھی کہ ان کا ذکر بھی اسے شرم سے پانی پانی کر رہا ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں یہ تصویریں اور خطوط واپس لینے کی پوری کوشش کروں گا مگر یہ کوشش اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب میرے ہاتھ میں بھی کوئی ترپ کا کارڈ ہو۔

بہت سوچ کر الماس نے مجھے ایک بات بتائی۔ اسے ملازمت کرتے ہوئے ایک سال ہونے والا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب الماس پوری طرح ڈی سلوا کے قبضے میں تھی۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ ایک مہینے بعد وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔ ڈی سلوا نے الماس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسلام قبول کرے گا اور جیسے ہی اس کے والدین یورپ کے دورے سے واپس آئیں گے وہ ان کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دے گا۔ اس کے ماں باپ روشن خیال اور فراخدل ہیں، اس لیے فکر کی بات نہیں۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ ڈی سلوا کے والدین کا کہیں وجود بھی نہیں۔ ڈی سلوا کا ماضی ایک تاریک خلا کی طرح تھا جس کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔

ایک روز شام کے وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اتفاق سے دروازہ خود الماس نے کھولا تو اسے اپنے سامنے ایک اجنبی نظر آیا۔ "مس الماس؟" وہ شخص آہستہ سے بولا۔ "یہ خط ڈی سلوا صاحب نے دیا ہے۔" خط لانے والا ایک عمر رسیدہ اور حلیے سے غریب نظر آنے والا شخص تھا۔ الماس نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس نے بڑی آسانی سے الماس کو پہچان لیا تھا۔ خط میں صرف دو سطریں لکھی ہوئی تھیں۔ ڈی سلوا نے ایک ہنگامی ضرورت کے باعث الماس کو طلب کیا تھا اور مکمل رازداری کی ہدایت کی تھی۔ الماس الجھن میں پڑ گئی۔ تحریر ڈی سلوا ہی کے ہاتھ کی تھی لیکن اسے کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ ہنگامی ضرورت کیا ہے، اسے کہاں جانا ہے اور کتنی دیر کے لیے جانا ہے۔ آدھے گھنٹے کی تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اس سے زیادہ دیر تک گھر سے باہر رہنا اس کے گھر والوں کے لیے باعثِ تشویش ہو سکتا تھا۔ وہ رات کو اکیلی باہر نہیں گئی تھی لیکن خط میں رازداری کی شرط تھی، چنانچہ وہ چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ نہیں لے جا سکتی تھی۔ اس بوڑھے نے بھی الماس کو کچھ بتانے سے انکار کر دیا کہ ڈی سلوا نے صرف خط دینے کی تاکید کی تھی۔ اس نے کہا کہ گاڑی گلی کے آخر میں سڑک پر کھڑی ہے۔ اگر وہ ڈی سلوا صاحب کی گاڑی کو پہچانتی ہے تو آ جائے، وہ آدھے گھنٹے تک انتظار کرے گا۔ اس کے بعد وہ رخصت ہو گیا اور الماس نے

صرف دو سطروں کے پیغام کو جلا کر راکھ کر دیا۔ خط کا مضمون اسے ازبر ہو چکا تھا اور وہ شدید کشمکش میں مبتلا تھی۔ عقل کے تقاضے دل کی آواز سے برسرِ پیکار تھے اور اسے جلد فیصلہ بھی کرنا تھا کہ وہ گھر والوں کو دھوکا دے کر ایک اجنبی کے ساتھ کیسے جائے؟ بالآخر جیت دل کی ہوئی۔ اس نے بڑی چالاکی سے ساتھ والے گھر جا کر اپنی ایک قابلِ اعتماد سہیلی کو فون کیا کہ وہ فوراً آ جائے۔ ایک منٹ کی تاخیر کیے بغیر کیونکہ بات ایسی ہے جو فون پر نہیں بتائی جا سکتی۔ یہ سہیلی الماس کی رازدار تھی اور پہلے بھی کئی بار ڈی سلوا اور الماس کی ملاقاتوں کا وسیلہ بن چکی تھی۔ اس کے علاوہ دونوں گھروں کے تعلقات بہت قریبی تھے اس لیے شک کی کوئی نوبت نہیں آئی تھی۔ ڈی سلوا نے اب آدھے گھنٹے کا وقت دیا تھا جو تیاری کے علاوہ مناسب بہانہ بنانے کے لیے بھی کم تھا۔ الماس بے چینی سے انتظار کرتی رہی۔ اس کی سہیلی دس منٹ بعد نمودار ہوئی۔ مزید دس منٹ الماس کے والدین کو یہ سمجھانے میں لگ گئے کہ وہ ایک تقریب میں شرکت کے لیے الماس کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئی ہے۔ اس کا ذکر وہ اس سے اس لیے نہیں کر سکی تھی کہ وہ خود بے حد مصروف تھی۔ مزید دس منٹ بعد جب وہ دونوں سڑک تک پہنچیں تو الماس کا خیال تھا کہ وہ شخص جا چکا ہوگا کیونکہ اس نے آدھے گھنٹے کا ٹائم دیا تھا اور الماس چالیس منٹ بعد پہنچی تھی لیکن ڈی سلوا کی گاڑی موجود تھی اور وہ شخص ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا۔ اتنی دیر میں الماس نے اپنی سہیلی کو تمام صورتِ حال سمجھا دی تھی تاکہ اسے واپسی میں دیر ہو جائے تو بات نہ بگڑے۔ ڈی سلوا سے ملاقات کے لیے جاتے ہوئے الماس کبھی خوف میں مبتلا نہیں ہوئی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس دفعہ یہ احساس غالب تھا کہ اس طرح گھر سے نکل کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی الماس کو معلوم ہو گیا کہ یہ گاڑی باہر سے دیکھنے میں بالکل ڈی سلوا کی گاڑی جیسی تھی مگر اندر سے بالکل مختلف۔ کار کے کسی دروازے میں شیشے اتارنے چڑھانے یا دروازہ کھولنے کے لیے ایک بھی ہینڈل نہیں تھا چنانچہ یہ دروازے صرف باہر سے کھولے جا سکتے تھے اور بند شیشوں سے الماس کے چلانے کی آواز بھی کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ خوف سے الماس بالکل مفلوج ہو چکی تھی اور گاڑی کو مختلف راستوں سے گزرتا دیکھ رہی تھی۔ اطمینان کی بات صرف یہ تھی کہ راستے اس کے ۔۔۔ اگر اسے ذرا بھی اندیشہ ہوتا کہ گاڑی غلط

جاسوسی ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ

انسان کی ترقی و تہذیب کے حیات افروز واقعات

صدیوں سے زندہ ایک پراسرار شخص کی آپ بیتی، ہُما جس کی دوست تھی، سمندر جس کے لیے آغوشِ مادر تھا، آگ اس کے بدن کو نمو دیتی تھی۔

****

وہ کہانی جس نے اپنے وقت میں مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیے

صدیوں کا بیٹا

پانچ حصوں میں مکمل

قیمت فی حصہ ۴۰ روپے • ڈاک خرچ فی حصہ ۱۲ روپے

www.paksociety.com

راستے پر جا رہی ہے تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرتی مثلاً وہ پیچھے سے ڈرائیور کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اسے گاڑی روکنے پر مجبور کرتی خواہ اس سے گاڑی کے بے قابو ہونے، الٹ جانے یا کسی سے ٹکرا جانے کا خطرہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ یا وہ کسی کھڑکی کا شیشہ توڑنے کی کوشش کرتی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ خالی ہاتھ کی ضرب سے اس شیشے کو توڑنا مشکل ہوتا ہے۔ ڈرائیور نے جو سامنے کے شیشے میں سے اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا صرف ایک بار کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

"تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ ڈی سلوا صاحب نے اپنی گاڑی بھیجی ہے؟" الماس بولی۔

"جھوٹ کہاں ہے بی بی؟ کیا تم کار کے ماڈل اور رنگ سے واقف نہیں ہو؟" وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔ "اور میں غلط آدمی تو نہیں ہوں؟"

"یہ مجھے کیا معلوم۔ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" الماس نے کہا۔

"ابھی تم نے دنیا میں بہت کچھ نہیں دیکھا۔" وہ بولا۔ "تمہاری عمر ہی کیا ہے۔"

"لیکن میں نے ڈی سلوا صاحب کی کار دیکھی ہے۔ اس کے اندر سارے سینڈل وغیرہ موجود تھے۔"

"ضرور ہوں گے۔ مگر ضرورت کے وقت یہ چیزیں ہٹائی بھی جا سکتی ہیں۔" وہ بولا۔ "آدھے گھنٹے میں پھر سب لگ جاتی ہیں اور چیزیں ہی کیا آدمی بھی بدلے جا سکتے ہیں اور ایسے غائب کیے جا سکتے ہیں کہ دنیا کو نظر نہ آئیں۔ سب ضرورت کی بات ہے۔"

الماس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن وہ ان باتوں سے مزید دہشت زدہ ہو گئی۔ "اچھا تم مجھے یہ بتا دو کہ جانا کہاں ہے؟ ڈی سلوا صاحب کے گھر؟ میں خود پہنچ جاؤں گی کسی ٹیکسی میں۔"

"کار کے ہوتے ہوئے ٹیکسی میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟" بڈھے نے خشک لہجے میں کہا۔

"ضرورت ہے یا نہیں؟" الماس نے چیخ کر کہا۔ "میں کار کا نمبر دیکھنا چاہتی ہوں۔ کہیں تم نے میرے ساتھ دھوکا تو نہیں کیا؟ آخر کیا ضرورت تھی مجھے ایسے قید کر کے لے جانے کی؟ اگر مجھے اطمینان ہو گیا کہ نمبر وہی ہے تو مجھے تمہارے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہیں۔" "دیکھو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو لڑکی میرے ساتھ کار تک آ گئی تھی اسے سب معلوم ہے اور وہ بہت ذہین لڑکی ہے... اس نے نمبر ضرور دیکھا ہوگا۔ اس کا باپ پولیس میں ہے۔" الماس اب خوف کے بخار میں مبتلا تھی اسے یقین آ چکا تھا کہ وہ کسی سازش کا شکار ہوئی ہے۔ وہ جھوٹ سچ بول کر اس بڈھے ڈرائیور کو دھوکا دینے کی بے سود کوشش میں مصروف تھی لیکن وہ بڈھا بھی متاثر نہیں ہوا تھا اور گاڑی روکنے کے لیے تیار نہ تھا۔

"تم بہرے ہو گئے ہو؟" الماس نے چیخ کر کہا۔ "میں کہتی ہوں گاڑی روکو۔ میں ڈی سلوا صاحب کے گھر فون کروں گی، تصدیق کروں گی۔"

"کیا تصدیق کرو گی؟ کیا وہ تحریر کسی اور کی تھی؟" بڈھے نے کہا۔

"کسی اور کی نہیں تھی تو تمہیں ڈر نہیں ہونا چاہیے۔" الماس نے لرزتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھو اس دکان میں فون ہے"

لیکن کار کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ کار کا رخ اب بھی سلوا کے بنگلے کی طرف تھا۔ الماس کو یہ شبہ بھی نہیں تھا کہ وہ خط ڈی سلوا کی اپنی ہینڈ رائٹنگ میں نہیں ہے مگر اسے یقین آ چکا تھا کہ خود ڈی سلوا بھی کسی سازش کا شکار ہوا۔ عین ممکن ہے کسی نے اس سے یہ تحریر زبردستی حاصل کی ہو۔ وہ یک لخت ڈرائیور پر حملہ آور ہوئی۔ گاڑی اب بازاروں سے گزر کے شہر کے مضافات میں داخل ہو چکی تھی۔ ڈرائیور اس حملے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے ایک دم بریک لگائے تو زبردست جھٹکے سے الماس آگے آ گری۔ اس کا ایک ہاتھ کار کے اسٹیئرنگ پر لگا جس سے گاڑی بے قابو ہو کر فٹ پاتھ پر چڑھ گئی لیکن اس نے بڑی مہارت سے اسے روک لیا اور ایک کوٹھی کی دیوار سے ٹکرانے سے بچا لیا۔ الماس کا سر فرنٹ بورڈ سے لگا تھا اور وہ آگے یوں گری کہ اس کا سر نیچے جھکا تھا۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ اس کے سر پر کسی بھاری چیز کی ضرب پڑی جس کے بعد اسے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔

جب اس کی آنکھ کھلی اور اس نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی تو یہ دیکھ کر اس کا سارا خوف مٹ گیا کہ وہ ڈی سلوا کے بنگلے میں اور اس کے بیڈ روم میں لیٹی ہوئی تھی۔ کوئی بھی چیز الماس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ اس کے سامانِ آرائش۔ قالین، پلو، پردے، بیڈ اور نائٹ لیمپ کا نرم اجالا، خواب آگیں فضا کا اندھیرا اور روشنی جال کا سحر انگیز طلسم... سب الماس کو پہچانتے تھے۔ کوئی چیز بدلی ہوئی نہ تھی۔ الماس کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا۔ خطرہ محض فریبِ خیال ثابت ہوا تھا اور اس کے

تمام اندیشے بے بنیاد تھے۔ وہ بڈھا ڈرائیور کوئی غلط ارادہ نہیں رکھتا تھا سب شکوک اسکے اپنے ذہن کی پیداوار تھے لیکن وہ گاڑی . . . . . !

وہ اٹھ بیٹھی۔ بے اختیار اس کی نگاہ وال کلاک پر چلی گئی۔ کچھ دیر وہ گھڑی کی سوئیوں کو بے یقینی کے ساتھ دیکھتی رہی۔ کیا یہ بھی نظر کا دھوکا ہے؟ گھڑی میں صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ چھ گھنٹے سے بھی زیادہ دیر تک بے ہوش رہی تھی۔ الماس کا دل خوف سے بیٹھنے لگا۔ یہ پوری رات اس نے گھر سے باہر گزار دی تھی۔ صبح ہونے سے پہلے اس کے لیے گھر پہنچنا ناممکن تھا۔ معلوم نہیں گھر والوں میں سے کوئی اس کی سہیلی کے پاس پہنچا یا نہیں اور پہنچا تو کیا وہ انہیں مطمئن کرنے میں کامیاب رہی؟ ڈی سلوا کہاں گیا؟ اس نے تو مجھے ایک ہنگامی ضرورت کے تحت بلایا تھا اس ضرورت کی وضاحت کیے بغیر وہ کہاں جا سکتا ہے۔ اس نے ڈی سلوا کو آواز دی لیکن اس مختصر سے بنگلے کی خاموشی میں کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے دوسرے کمرے میں جھانکا اور باتھ روم تک دیکھ ڈالے لیکن ڈی سلوا کہیں ہوتا تو ملتا۔ الماس پھر بیڈ روم میں لوٹ آئی۔ ایک بار پھر خوف کے مرغولے تھم تھم اس کے دل کو جکڑنے لگے۔ الماس نے سب دروازے اندر سے بند کیے اور شدید اعصابی کشیدگی کا شکار اور ان گنت نئے اندیشوں کی یلغار سے ہراساں بیٹھی رہی اور انتظار کرتی رہی کہ ڈی سلوا کسی کام سے باہر گیا ہو تو لوٹ آئے۔ رفتہ رفتہ پردوں کے پیچھے کھڑکی کے شیشوں پر صبح کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ اور الماس کا یہ شک یقین کی صورت اختیار کرنے لگا کہ ڈی سلوا کے ساتھ بھی کوئی حادثہ پیش آ چکا ہے ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ الماس کو بلوائے اور اسے گھر میں اکیلا چھوڑ کے غائب ہو جائے۔ تاہم اس کا ذہن واقعات سے حقائق کا اندازہ لگانے اور کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔

دن کی روشنی کے پھیلتے ہی وہ گھر کو کھلا چھوڑ کے فرار ہو گئی۔ اپنی راز دار سہیلی کے گھر پہنچ کے اس کی جان میں جان آئی۔ الماس کے گھر سے کوئی بھی کچھ پوچھنے نہیں آیا تھا۔ سہیلی کے گھر والے اتنی صبح الماس کو دیکھ کے بہت حیران ہوئے لیکن الماس نے ان کو مطمئن کر دیا اور اپنی سہیلی کے ساتھ واپس گھر پہنچی۔ ناشتہ انہوں نے ایک ساتھ کیا اور پھر الگ الگ اپنے کام پر روانہ ہو گئیں۔

ڈی سلوا آفس میں بھی نہیں تھا۔ الماس نے گیارہ بجے تک اس کا انتظار کیا پھر اس نے غلام علی کو بلایا جو آفس فرم میں اکاؤنٹنٹ تھا اور اس سے ڈی سلوا کے بارے میں پوچھا۔ غلام علی کے جواب پر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ ڈی سلوا تو دو دن پہلے فرم کے کسی کام سے لندن جا چکا ہے اور شاید ایک ہفتہ بعد واپس آئے گا۔ غلام علی خود بھی حیران ہوا کہ ڈی سلوا اپنی سیکریٹری کو کچھ بتا کر کیوں نہیں گیا۔ معاملات الماس کی سمجھ سے باہر تھے اور حالات کے اس معمے کا کوئی حل نہ تھا۔ خود ڈی سلوا ہی سے کسی وضاحت کی امید کی جا سکتی تھی۔ لیکن اس کیس میں الماس نے خود اپنے لیے ایک مشکل پیدا کر لی تھی۔ اس نے ڈی سلوا کی طرف سے موصول ہونے والے پیغام کو جلا دیا تھا۔ اب اس کے پاس اپنے یقین پر ہوا اس بات کا کوئی ثبوت نہیں رہا تھا کہ وہ تحریر ڈی سلوا ہی کے ہاتھ کی تھی۔ وہ کوئی تحریر شناسی کی ماہر نہیں تھی اور جلدی میں اس نے تحریر پر بہت زیادہ غور بھی نہیں کیا تھا جب کہ جعل سازی کے امکانات کو یکسر مسترد کرنا بھی مشکل تھا۔ جعل سازی والے تو سب کچھ بنا لیتے ہیں۔ تحریر کیا چیز ہے کرنسی نوٹ تک چھاپ لیتے ہیں۔ دوسری طرف اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا کہ الماس کو دھوکے سے ساتھ لے جانے والے، اسے بخیر و عافیت ڈی سلوا کے بیڈ روم میں چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔ شام کو الماس نے ٹرنک کال بک کرائی اور لندن میں ڈی سلوا سے بات کی۔ اس نے بے حد حیرت کا اظہار کیا کہ وہ عجلت میں الماس کو اپنی روانگی کے پروگرام کے بارے میں مطلع نہ کر سکا لیکن الماس نے اس سے اور کوئی بات نہیں کی۔ وہ صرف اس بات کا یقین کرنا چاہتی تھی کہ ڈی سلوا واقعی لندن میں ہے۔ اس کی واپسی پر الماس نے پہلی فرصت میں اس کو تمام واقعہ سنایا۔ وہ سخت حیران ہوا اور تشویش کا شکار بھی کیونکہ اس نے الماس کو بلوانے کے لیے کوئی تحریری پیغام نہیں بھیجا تھا۔

"بھلا مجھے ایسی کون سی ہنگامی ضرورت لاحق ہو سکتی تھی؟" ڈی سلوا نے کہا۔ "اور ہوتی تو کیا میں خود نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن میں تو یہاں تھا ہی نہیں۔"

"اور تمہارا گھر؟ وہ کیوں کھلا پڑا تھا؟" الماس نے بیوقوفوں کی طرح کہا۔

"کھلا پڑا تھا؟ گھر کو میں مقفل کر کے چابیاں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔" ڈی سلوا نے تردید کرتے ہوئے کہا۔ "واپسی پر بھی گھر اسی طرح مقفل ملا جیسا میں چھوڑ گیا تھا۔"

"کیا دروازوں کے ہر قفل کی دوسری چابی تمہارے پاس تھی؟" الماس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ایک کے ساتھ دوسری چابی اپنے پاس بے وقوف

www.paksociety.com

دیکھتے ہیں۔" ڈی سلوا بولا۔ "دوسرا سیٹ میری آفس ٹیبل کی دراز میں رہتا ہے۔" ثبوت کے طور پر اس نے چابیوں کا ایک گچھا اپنی جیب سے اور دوسرا میز کی سب سے نیچے والی دراز میں سے نکال کے دکھا دیا۔ اس نے الماس کو لانے والے کسی بڈھے ڈرائیور کے بارے میں بھی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا اور یہ بھی بتایا کہ جاتے وقت وہ اپنی گاڑی کو گیراج میں بند کر کے اور شٹر گرا کے مقفل کر گیا تھا چنانچہ وہ گاڑی دوسری ہو گی جسے رنگ، ماڈل اور ساخت کی یکسانیت کے باعث الماس پہچان نہ سکی۔ الماس اسے جھوٹا نہیں کہہ سکتی تھی۔ دنیا میں ڈی سلوا سے زیادہ قابل اعتماد کون ہو سکتا تھا مگر اس کے دل میں ایک خلش سی تھی جیسے کوئی کانٹا نکل جائے مگر نوک خار ٹوٹ کر رہ جائے اور نظر نہ آنے کے باوجود باعث آزار بنی رہے کیونکہ اس کی سہیلی نے واقعی کار کا نمبر نوٹ کیا تھا اور یہ نمبر ڈی سلوا کی کار کا تھا لیکن وہ مزید سوالات کرتی تو زیادہ بے وقوف بنتی۔ ڈی سلوا کہتا کہ تمہارا دماغ خراب ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ میری نمبر پلیٹ کوئی اپنی گاڑی پہ کیسے لگا سکتا ہے جبکہ میری گاڑی بدستور گیراج میں کھڑی رہی اور کسی نے قفل کو چھوا تک نہیں۔ الماس کیا کہتی کہ خرابی میرے دماغ کی نہیں بلکہ اتفاق سے نمبر ایک تیسرے شخص نے نوٹ کیا تھا۔ الماس کی سہیلی نے عادت کے مطابق احتیاط پسندی کا مظاہرہ کیا تھا اور مطمئن ہونے کے باوجود الماس کو ایک اجنبی کے ساتھ گاڑی میں رخصت کرتے وقت ایک نظر نمبر پلیٹ پہ بھی ڈال لی تھی۔ کوئی منطقی تجزیہ کرنا یا عقل کے دلائل سے کچھ ثابت کرنا ناممکن تھا۔ خود سے زیادہ الجھن اور پریشانی کا انجام تعلقات میں کشیدگی کا سبب بنتا۔ مجبوراً وہ خاموش ہو گئی۔

ایک ہفتہ بعد وہ صبح دفتر پہنچی تو ڈی سلوا نے اسے کمرے میں بلوا لیا اور اندر سے دروازہ بند کرنے کے بعد ٹیلی فون پہ اپنے ماتحت غلام علی سے کہا کہ وہ کسی سے نہیں ملے گا اور اگر ٹیلی فون پہ بھی اسے کوئی پوچھے تو کہہ دیا جائے کہ ڈی سلوا صاحب نہیں آئے۔ غلام علی کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ڈی سلوا جب بھی "ضروری کام" میں مصروف ہوتا تھا تو ایسی ہی ہدایات جاری کر دیتا تھا لیکن الماس کے لیے ڈی سلوا کی گھبراہٹ اور پریشانی ایک نیا تجربہ تھی۔ وہ سخت مضطرب اور بوکھلایا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ منہ دھوئے بغیر اور ناشتہ کیے بغیر آفس آ گیا ہے اور شاید رات بھر جاگتا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، بال پریشان تھے اور کپڑے بے ترتیب تھے۔ اس نے الماس کو حوصلہ رکھنے اور سکون سے پوری بات سننے کی تاکید کی حالانکہ خود اسے سکون اور حوصلے کی ضرورت تھی۔ وہ الماس کے سامنے بیٹھا آدھی آدھی سگریٹوں کو ایش ٹرے میں مسل کر بجھاتا رہا اور پھر نئی سگریٹ جلاتا رہا۔ اس کی ہر حرکت سے دلی اضطراب عیاں تھا اور یوں لگتا تھا کہ اسے بات کرنی مشکل ہو رہی ہے۔ بالآخر جو کچھ اس نے بتایا وہ ہیروشیما پر گرنے والے پہلے ایٹم بم کے دھماکے سے کم نہ تھا۔

اس نے بتایا کہ ایک ہفتہ پہلے الماس کو اغوا کر کے لانے والے اس کے پرانے کاروباری حریف تھے جنہوں نے اس کے ذاتی دشمنوں سے الحاق کر کے ایک سازش کی تھی۔ انہوں نے ڈی سلوا کی عدم موجودگی میں اس کے گھر کے دروازوں کی چابیاں بنوا لیں، گیراج سے اس کی کار بھی نکال لی اور اس کی تحریر بنا کر الماس کو ایک پیغام ارسال کر دیا۔ الماس کو لانے والا دیکھنے میں بڈھا لگتا ہے مگر وہ صحت میں جوانوں سے زیادہ پھرتیلا اور طاقتور ہے اور جوڈو کراٹے کے علاوہ خنجر کے استعمال میں بھی ماہر ہے۔ وہ لوگ ایک خاص مقصد کے تحت الماس کو لائے تھے۔ الماس چوٹ لگنے سے بے ہوش نہیں رہی تھی بلکہ اسے خواب آور دوا کے زیر اثر بے ہوش رکھا گیا تھا ورنہ چوٹ سے تو وہ کچھ دیر بعد ہوش میں آ جاتی۔ بے ہوشی کے اس وقفے میں انہوں نے الماس کی بہت سی تصویریں اتار لیں۔ یہ تصویریں ایسی ہیں کہ کوئی شریف آدمی ان کو ایک نظر دیکھنا تک گوارا نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے نہ جانے کب وہ اسی بیڈروم میں گھسے ہوئے ڈی سلوا کی تصویریں لے چکے تھے۔ چونکہ ڈی سلوا کے گھر میں اس کے سوا کوئی بھی نہیں ہوتا اور [illegible] کپڑے پہن کر سونے کی عادت نہیں ہے اس لیے خاص زاویے سے لی ہوئی یہ تصاویر بھی قابل اعتراض کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن اسی پہ بس نہیں۔ کیمرہ ٹرک اور فوٹو گرافی کے کمال سے ڈی سلوا اور الماس کی چند تصویروں کو یکجا کر کے کچھ ایسی تصویریں بھی بنائی گئی ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جو تصویریں الگ الگ ہیں ان میں بھی بیڈروم ایک ہی ہے اور کیمرے کی جعلسازی کوئی نہیں چنانچہ باقی تصویروں کو جعلی ثابت کرنا آسان کام نہیں ہے جو کسی ماہر فوٹو گرافر نے تیار کی ہیں۔ جعلی ثابت کرنے کے لیے بھی مقدمہ کرنا پڑتا ہے اور عدالت میں فیصلہ ہونے تک ساری دنیا نقل کو اصل مان چکی ہوتی ہے چنانچہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ خود اپنی رسوائی کا سامان کرنے کے مترادف ہو گا وغیرہ وغیرہ۔

جب الماس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے بے شمار سوالات کیے اور ان کے جواب میں ڈی سلوا نے بتایا کہ دشمن الماس

کے ذریعے سے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے ڈی سلوا سے رابطہ قائم کیا تھا کہ وہ [illegible] کام سے باہر جاتا ہے اگر اس دن وہ اپنے ساتھ ایک سوٹ کیس لے جائے تو اس کو یہاں دس لاکھ روپیہ نقد دیا جا سکتا ہے یا اس کے نام سے باہر ایک لاکھ ڈالر کا اکاؤنٹ کھولا جا سکتا ہے۔ اتنے بڑے معاوضے کی پیشکش پہ ڈی سلوا کو شک ہونا لازمی تھا اور تصدیق کرنے پہ معلوم ہو گیا کہ سوٹ کیس میں ایک کروڑ روپے کی ہیروئن ہے۔ ڈی سلوا نے ان کو پکڑوانے کی غرض سے حامی بھر لی لیکن دوسری طرف کسٹم والوں کو اس کی اطلاع دے دی۔ کسٹم والے سب ایماندار اور فرض شناس تو نہیں ہوتے۔ انہوں نے اس رپورٹ کی خبر متعلقہ افراد تک پہنچا دی جنہوں نے آخری وقت میں سوٹ کیس بدل دیا۔ ایئرپورٹ پہ دوسرا سوٹ کیس لانے والا پکڑا گیا مگر سوٹ کیس میں سے پھٹے پرانے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں نکلا اور وہ شخص بھی بے گناہ ثابت ہوا جو سوٹ کیس لایا تھا۔ وہ کسی کو چھوڑنے آیا تھا کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اسے سوٹ کیس دیا اور اشارے سے بتایا کہ وہ صاحب جلدی میں بھول گئے تھے۔ اس شخص نے کسی شک و شبہ کے بغیر سوٹ کیس ڈی سلوا کے حوالے کر دیا۔

"اب ان ہی لوگوں کا [illegible]" ڈی سلوا نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا۔ "ان کے ایک آدمی نے کل رات مجھے لفٹ مانگی اور اترتے وقت سیٹ پر ایک لفافہ چھوڑ گیا جسے میں نے گھر پہنچ کے دیکھا۔ یقین کرو مجھے ہارٹ اٹیک ہوتے ہوتے رہ گیا۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں ان تصویروں کو دیکھتا رہا جو اس لفافے میں سے برآمد ہوئی تھیں۔ میری ذہنی کیفیت اس وقت میں بیان نہیں کر سکتا۔ غصے اور صدمے نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ رات کے ایک بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور کسی بدمعاش نے کہا۔ "مسٹر ڈی سلوا تصویریں پسند آئیں؟" میں نے جواب میں اس کو سیکڑوں گالیاں دیں اور کہا کہ میں ایک ایک سے نمٹ لوں گا۔ مگر وہ بے حیا ہنسا اور کہنے لگا کہ ڈی سلوا صاحب، کچھ نہیں کر سکتے تم۔ تم نے ہمارے ساتھ دھوکا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اس کی سزا تھی۔ اب تم ہی کام کرو گے لیکن اس بار صاف انکار کرو گے تو اپنے ساتھ الماس کی زندگی بھی خراب کرو گے۔ بے حیائی کی زندگی گزار سکتے ہو کیونکہ تم کہیں بھی جا سکتے ہو لیکن الماس یا تو خودکشی کر سکتی ہے یا بالآخر کسی کوٹھے پر بیٹھ سکتی ہے۔ میرا دماغ الٹ گیا اور میں نے دیوانگی میں ٹیلی فون کا ریسیور کریڈل پہ دے مارنے کے علاوہ بھی بہت کچھ

کیا مگر صبح ہوتے ہوتے میری عقل ٹھکانے آ گئی اور میں نے اپنے اوچھے ہتھیاروں کے مقابلے میں شکست تسلیم کرنے کے بجائے فیصلہ کیا کہ انہیں ایسی عبرتناک سزا دوں جو ان کو تمام عمر یاد رہے۔"

الماس کے لیے اس فیصلے کی مخالفت کرنا بھی مشکل تھا اور حمایت بھی۔ اسے ہر صورت میں اپنا مستقبل تاریک نظر آتا تھا کیونکہ اس مقابلے میں جیت بھی ہار تھی۔ الماس نے مفاہمت یا مصالحت کی کوئی صورت سب سے بہتر سمجھی مگر ڈی سلوا نے اس کی بات کو مسترد کر دیا۔ مصالحت شریف لوگ کرتے ہیں یا مجبور لوگ اور اس مرحلے پہ مصالحت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ شب ملنے والی تصویریں تو اس نے جلا ڈالی تھیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ نیگیٹو دشمن کے پاس ہیں جن سے وہ جتنی نقلیں چاہے تیار کر سکتا ہے اور یہ مسئلہ یوں حل نہیں ہو گا۔ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے چنانچہ بدمعاشی کا جواب بھی بدمعاشی سے ہی دیا جا سکتا ہے۔ اس نے الماس کو بتایا کہ اس شخص کی ایک بیٹی ہے جو کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ باقی بات الماس خود ہی سمجھ گئی۔

"اب تم بھی یہی کرو گے؟" وہ دیوانوں کی طرح چلائی۔ "تم بھی اسے دھوکے سے اٹھا کر لاؤ گے؟ تم بھی اس کی تصویریں اتارو گے؟ کیا تم بھی انتقام کے جذبے میں شیطان بن گئے ہو؟ تمہارا ضمیر بھی مر گیا ہے کیا؟ ہوش کرو۔ اگر پاگل کتا تمہیں کاٹ لے گا تو کیا تم بھی پاگل کتے کو کاٹنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑو گے؟"

"تم نے ابھی میری پوری بات نہیں سنی۔" ڈی سلوا نے تحمل سے کہا۔ "تم پاگل ہو رہی ہو۔"

"ہاں میں پاگل ہو رہی ہوں۔" الماس چلائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "مجھے پاگل ہی ہو جانے دو۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے اور اب مجھے موت اور رسوائی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تم مجھے زہر دے کر قتل کر دو۔ میرے مرنے کے بعد اگر کوئی رسوائی بھی ہوئی تو کیا ہو گا۔ کوئی مجھ سے کیا چھین لے گا لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میرے جیتے جی میری وجہ سے ایک ایسی لڑکی کی زندگی خراب ہو جس کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں اور جو بالکل بے قصور ہے۔ ہر غیرت مند لڑکی اتنی رسوائی پر موت کو ترجیح دے گی۔ مگر میں اس کی موت کا الزام قبول کر کے کیسے زندہ رہوں گی؟ میرے لیے تو یہ دوسری سزا ہو گی کہ ایک جنازہ میری نادانی

www.paksociety.com

عزت و ناموس کا اچھالے اور دوسرا اس تیجر کا۔۔ نہیں ڈی سلوا! تم اسے بخش دو۔ مجھے مرجانے دو اور اسے جینے دو۔ ایک کی جگہ دو قتل مت کرو۔۔"

ڈی سلوا نے پانی کا گلاس الماس کے منہ پر پھینک دیا جس کا ہسٹریا ایک جنونی کیفیت اختیار کرنے لگا تھا۔ "تم صرف اپنی بات کیوں کرتی ہو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے بغیر میں کیسے زندہ رہ سکوں گا؟ دوسری صورت یہ ہے کہ میں ان سب کو چن چن کر قتل کر دوں جو تمہاری عزت سے کھیلنا چاہتے ہیں لیکن تیسری صورت پر تم نے غور نہیں کیا۔ اس صورت میں ہم سب زندہ رہ سکتے ہیں اور عزت و آبرو کے ساتھ۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں اس لڑکی کو اغوا کر کے اس کی بھی ویسی ہی تصویریں بنانا چاہتا ہوں۔ میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی تم نے نتائج اخذ کر لیے اور مجھے بے حس شیطان سب کچھ کہہ دیا بیوقوف لڑکی! اگر اس دنیا میں طاقت کا توازن بگڑ جائے تو کوئی قائم نہیں رہ سکتا۔ دشمن اسی وقت وار کرتا ہے جب اسے یقین ہو کہ دوسرا حریف اس کا کچھ نہیں کر سکتا۔ گولی چلانے والے کو معلوم ہو کہ دوسرے شخص کے ہاتھ میں بھی بندوق ہے تو اس کا ہاتھ رک جاتا ہے۔ مگر دوسرا فریق خالی ہاتھ ہونے کے باوجود یہ تاثر دے سکے کہ وہ بھی مسلح ہے تو بھی دشمن آسانی سے کامیاب نہیں ہوتا۔" پھر جیسے جیسے الماس کا ہسٹریا کم ہوتا گیا ڈی سلوا کی باتیں اس کی سمجھ میں آتی گئیں۔

"میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی بہانے اس لڑکی کو میرے پاس لے آؤ۔" ڈی سلوا نے اپنی اسکیم کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔ "ایک ہفتے کے اندر اندر تم اس سے دوستی بڑھا سکتی ہو اور اسے ایک ایسی جگہ لا سکتی ہو جہاں تمہارا کام ختم ہو جائے گا اور باقی کام میرا ہوگا۔ میں چند گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ ایک دن اس لڑکی کو قید میں رکھوں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس کو باندھ کر رکھوں گا یا اس پر کوئی ظلم کروں گا۔ وہ آرام سے ایک گھر میں رہے گی اور تم اس کے ساتھ رہو گی۔ تم دیکھو گی کہ میں اس لڑکی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کروں گا اور اس کی کوئی تصویر نہیں اتاروں گا۔ لیکن میں اس کے باپ سے فون پر یہی کہوں گا کہ جو جیسا کرتا ہے ویسا کاٹتا ہے۔ اس نے کسی کی بیٹی کی عزت کا سودا کرنا چاہا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ اس کی اپنی بھی ایک جوان بیٹی ہے۔ وہ اس وقت ہمارے اسٹوڈیو میں موجود ہے اور ہم زیادہ اچھی فوٹوگرافی کر رہے ہیں۔ اس نے تو سات تصویروں پر ہی اکتفا کی تھی لیکن ہم فلم بنا رہے ہیں جسے دیکھ کر اس کی

اور وہ گویا نقتن کی طبیعت باغ باغ ہو جائے گی۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ یہ فلم ریلیز نہ ہو تو وہ تمام نیگیٹو اور پرنٹ لے کر آ جائے اور اس بات کو ذہن میں رکھے کہ اسے ایسا کوئی خیال آ گیا ہے تو دوسرے کو بھی آئے گا۔ اگرچہ ہوگا کچھ بھی نہیں لیکن اس دھمکی کے بعد بڈھے کے لیے ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔"

غور کرنے پر الماس کو اس پورے منصوبے میں بدی کا کوئی پہلو دکھائی نہ دیا۔ صرف دھمکی دینے سے بگڑے ہوئے معاملات سلجھ سکتے ہوں تو کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ پہل تو اس بڈھے ہی کی تھی۔ اسے اتنی سزا ضرور ملنی چاہیے کہ آئندہ دوسروں کے دامن عزت پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اپنا دامن بچانے کی فکر کرے۔ ڈی سلوا نے اسے پوری طرح مطمئن کر دیا کہ وہ جارحانہ عزائم بالکل نہیں رکھتا اور جو کچھ وہ کر رہا ہے، صرف اپنا دفاع ہے۔ باقی تفصیلات سمجھ لینے کے بعد الماس نے اس کی مدد کی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اس نے بڈھے کی لڑکی سے دوستی کر لی۔ یہ لڑکی جس کا نام "گل رخ" تھا طبعاً بہت سیدھی سادی لڑکی تھی اور اس سے تعلقات بڑھانے میں الماس کو زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ ایک بار ڈی سلوا کی جوابی کارروائی میں شریک ہونے کے بعد خود الماس کے جذبات انتقامی ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ کون سا شریفانہ سلوک ہوا تھا کہ وہ رعایت کرے۔ اگر وہ خودکشی کر لیتی تو گل رخ کے باپ کا کیا نقصان ہوتا؟ اسے یہ سبق کون دیتا کہ جیسے کو تیسا ضرور ملتا ہے۔ اس نے ڈی سلوا پر اعتبار کر لیا تھا کہ اس تمام کارروائی کا مقصد اور کچھ نہیں۔ وہ ڈی سلوا کی ذہانت اور جرأت کی زیادہ قائل ہو گئی تھی جس نے صرف اس کی خاطر ہار نہیں مانی تھی۔ غلط کام نہیں کیا تھا اور گل رخ کے ساتھ بھی وہ کوئی زیادتی نہ کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ ایک رات اپنی بیٹی گھر سے غائب رہے گی تو اس خبیث بڈھے کا دماغ درست ہو جائے گا۔ غصے سے الماس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ پھر غصہ اتر جاتا تھا اور وہ خود اپنے تصور کی ہر تصویر دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتی تھی۔ خوف سے کانپنے لگتی تھی کہ بات پھیل گئی یا ڈی سلوا کی چال ناکام رہی تو کیا ہوگا۔ ایک ہفتے کے دوران میں الماس کو بہت سی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ گل رخ کی شادی اب تک اس لیے نہیں ہو سکی تھی کہ جو اس کا پیغام لے کر آتا اس کی کسی چھوٹی بہن کو پسند کر لیتا تھا لیکن اب اس کے سوا گھر میں کوئی نہیں رہا تھا اور خدا نے والدین کی عاجزی قبول کرتے ہوئے اس کے لیے بھی ایک رشتہ بھیج دیا تھا چنانچہ اس سال کے آخر تک وہ شادی کے بعد اسکول میں پڑھنا

چھوڑ دے گی۔ اس کا شوہر اعلیٰ سرکاری افسر ہے اور والدین کے پاس بھی خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ مگر الماس کو ان باتوں سے دلچسپی نہیں تھی اس لیے اس نے کبھی گل رخ کے ہونے والے شوہر کا نام نہیں پوچھا اور یہ نہیں پوچھا کہ اس کا باپ کیا کرتا ہے۔ اپنے بارے میں بھی اس نے گل رخ کو ہر بات غلط بتائی۔ اپنا نام بھی اپنے خاندان اور گھر کا پتہ بھی۔ ڈی سلوا نے کہا تھا کہ وہ اس کے گھر جائے نہ اسے اپنے گھر یا دفتر کا پتہ بتائے ورنہ بعد میں گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔ الماس اس کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی اور بہت محتاط تھی۔

بالآخر ایک روز وہ گل رخ کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئی۔ طے شدہ مقام پر ڈی سلوا کی کار موجود تھی جو گل رخ کے ساتھ قریب سے گزری تو اچانک دروازہ کھلا اور دو زبردست ہاتھوں نے تقریباً ایک ساتھ ان کو اندر گھسیٹ لیا۔ گاڑی کا انجن پہلے ہی چل رہا تھا۔ دروازہ بند ہوتے ہی گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ گل رخ کے حلق سے چیخ نکلنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک ہاتھ نے اس کے منہ پر کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال رکھ دیا۔ اندر گھسنے ہی الماس نے دیکھ لیا تھا کہ پچھلی سیٹ پر دو آدمی ہیں جو ایک جیسے تنومند ہیں اور دونوں نے چہرے پر جوکر کی وہ رنگین تصویر چڑھا رکھی ہے جس سے بچے کھیلتے ہیں۔ اس کے سوراخوں میں سے وہ سب کچھ دیکھ سکتے تھے مگر خود ان کی صورت مسخرے کی تصویر کے پیچھے نظر نہیں آتی تھی۔ الماس کا خیال تھا کہ یہ سب ڈرامہ ہے چنانچہ اغوا کرنے کے بعد بھی وہ خوفزدہ نہیں ہوئی تھی مگر دوسرے ہاتھ نے اس کو دبوچ کر اس کی ناک پر بھی رومال رکھ دیا تو ہوش کے آخری لمحے میں حقیقت اس پر یوں عیاں ہوئی کہ وہ خوف سے ہی بے ہوش ہو گئی۔ یہ وہی گاڑی تھی جس کے اندر کوئی ہینڈل نہ تھا اور گاڑی چلانے والا وہی بوڑھا تھا جو الماس کو لے گیا تھا۔

ہوش میں آنے پر اسے سخت متلی اور سر درد کا احساس ہوا۔ اس نے خود کو بالکل اجنبی جگہ دیکھا۔ یہ گودام جیسی عمارت کا ایک کمرہ تھا جس میں گل رخ اس کے قریب ہی سخت فرش پر پڑی تھی۔ جو لوگ وہاں موجود تھے ان میں وہ بڈھا شامل نہیں تھا۔ الماس نے ڈی سلوا کے بارے میں سوال کیا۔

"ڈی سلوا!" ایک نقاب پوش نے قہقہہ لگایا۔ "وہ کیا سمجھتی ہے۔ کیا پوری طرح ہوش نہیں آیا ابھی؟" اس کے اشارے پر دوسرے نے ٹھنڈے پانی کی بھری ہوئی بالٹی الماس پر

"تم... تم لوگ کون ہو؟" وہ ہانپتے اور سردی سے کانپتے ہوئے بولی۔ "ڈی سلوا تم کو قتل کر دے گا جب اسے معلوم ہوگا۔۔"

الماس کے منہ پر زبردست طمانچہ پڑا۔ "یہ نام پھر مت لینا۔" پہلے شخص نے کہا اور الماس کی طرف ایک لفافہ پھینک دیا۔ "یہ ہیں تمہاری تصویریں۔ باقی تصویریں ابھی یہاں تک آ جائیں گی۔"

"باقی تصویریں؟" الماس نے دہشت زدہ ہو کر چیخ ماری۔ "کیا تم نے اس کی بھی۔۔۔؟" اس نے فرش پر بیہوش پڑی گل رخ کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ ہم نے اس کی بھی کچھ تصویریں بنائی ہیں۔" دوسرا شخص بولا۔ "اس کا منگیتر کسٹم آفیسر ہے۔ ہمیں اس سے ایک کام لینا تھا۔ تم نے ہماری مدد کی۔ اب تم برابر کی شریک جرم ہو۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" الماس نے کھوکھلی آواز میں کہا مگر اس کو جواب دینے کے لیے خود ڈی سلوا اندر آ گیا۔ وہ بے اختیار ڈی سلوا کی طرف بھاگی۔ "ڈی سلوا! یہ سب کیا ہے؟"

"تمہاری عقل کا فتور۔ تمہاری تقدیر کا چکر۔ تمہاری شامت اعمال۔" ڈی سلوا نے لات سے دھکیل دیا۔ "میں نے تم سے سب جھوٹ بولا تھا۔ تم کو میرے ایجنٹ میرے ہی آدمی اغوا کر کے لے گئے تھے۔ تم کو اس معاملے میں کوئی خوش فہمی نہیں رہنی چاہیے کہ میں تمہیں ایک مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا مقصد تم سے نجات حاصل کرنا تھا۔ تم مجھ سے شادی کے معاملے میں سیریس ہوتی جا رہی تھیں۔ کسی دن کہہ سکتی تھیں کہ تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔"

"حرامی... کمینے...!" وہ اس پر حملہ آور ہوئی۔ "کیا یہ جھوٹ ہوگا؟ میں تجھے قتل کر دوں گی۔" مگر ڈی سلوا کے تھپڑ سے وہ پھر نیچے جا گری۔

"اگر کچھ ہوگا بھی تو وہ جھوٹ سمجھا جائے گا۔" ڈی سلوا نے حقارت سے کہا۔ "اس لیے کہ میں اسے جھوٹ کہوں گا اور دنیا میری بات تسلیم کرے گی۔ میں ایک معزز آدمی ہوں۔ تو کیا ہے؟ ہوٹلوں کی چھوکری... فاحشہ... یہ تصویریں تیرے ہی خلاف ثبوت فراہم کریں گی۔ پھر ان میں میری کوئی تصویر نہیں ہوگی۔ بیڈروم کا وہ سب سامان اور رنگ روغن بدلا جا چکا ہے جو تصویروں میں نظر آتا ہے اور یہ تصویریں بھی دوسرے لوگوں کے پاس ہوں گی۔ تیرے خلاف یہ لڑکی بھی گواہی دے گی کہ تو اسے ورغلا کے یہاں لائی تھی اور تو نے اپنا نام پتہ سب غلط بتایا تھا تو تو خودکشی بھی نہیں کر سکتی کیونکہ اس

ہے تیرے گھر والوں کی عزت پر آنے والا بدنامی کا داغ نہیں مٹے گا
تیرے بعد دنیا تیرے ماں باپ کے منہ پر تھوکے گی اور تیری بہنیں
ساری عمر کنواری بیٹھی رہ جائیں گی۔"

فرش پر پڑی ہوئی الماس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں یہ سب باتیں سنیں۔ تقدیر کی اس بے رحمی پر اور اپنی بے بسی پر روتے روتے اس کے آنسو بھی خشک ہو گئے اور ڈی سلوا کی دغا بازی پر خودکشی سے قتل تک کے تمام اقدامات کو ناقابل عمل سمجھنے کے بعد اس نے ڈی سلوا کے لیے کام کرنا منظور کر لیا۔ ڈی سلوا نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ اس نے کوئی حماقت اور حکم عدولی نہ کی تو اسے معاف کر دیا جائے گا اور اس کے خلاف تمام ثبوت ختم کر دیے جائیں گے۔ پھر ڈی سلوا نے اسے گل رخ کے منگیتر سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کہا جو کسٹم آفیسر تھا اور ڈی سلوا کو خاصا نقصان پہنچا چکا تھا۔ رشوت قبول نہیں کرتا تھا اور دو مرتبہ ڈی سلوا کے آدمیوں کو مار کے بھگا چکا تھا۔

الماس اس کے پاس ایک مخبر بن کے پہنچی۔ کسٹم آفیسر بہت ذہین آدمی تھا۔ اس نے سب سے پہلے الماس سے یہی پوچھا کہ بظاہر وہ ایک شریف لڑکی نظر آتی ہے۔ اس کا اسمگلروں سے کیا تعلق ہے؟ اور اسے ان کے بارے میں معلومات کیسے حاصل ہوئیں؟ الماس نے کہا کہ وہ اچھے گھر کی لڑکی ہے مگر اس کا بھائی صحبت بد میں پڑ کے خاندان کی عزت کو خاک میں ملانے پر تل گیا ہے۔ اس کے پاس مشکوک چال چلن اور صورت سے بدقماش نظر آنے والے افراد کا آنا جانا ہے۔ وہ ان کے ساتھ جاتا ہے تو کئی کئی دن لوٹ کر گھر نہیں آتا اور آتا ہے تو نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس لے کر آتا ہے۔ شروع میں والدین نے سختی سے پوچھا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے اور اتنا پیسہ کہاں سے لاتا ہے مگر اس نے کہا کہ آم کھانے سے غرض رکھو پیڑ مت گنو۔ اب والدین بھی حرام کی اس کمائی سے عیاشی کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن چند روز سے وہ دیکھ رہی ہے کہ ماڈ کیڑوں کی طرح کچھ لوگ مسلسل ان کے گھر کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ وہ بھائی کو نہیں گھر کی عزت کو بچانا چاہتی ہے۔ وہ چند افراد کو بھی شناخت کر سکتی ہے اور ان کے ٹھکانے سے بھی واقف ہے جو اس کے خیال میں وہ اڈا ہے جہاں سے سامان آتا جاتا ہے۔ کسٹم آفیسر پھر بھی مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے پوچھا کہ ایسی صورت میں پولیس سے رجوع کرنے کے بجائے وہ اس کے پاس کیسے آگئی؟ الماس کے پاس بہت معقول جواب تھا۔ وہ گل رخ کی سہیلی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ گل رخ نے کہا تھا کہ تھانے جاؤ گی تو خود بھی مشکل میں پڑ جاؤ گی۔ میرا منگیتر کسٹم آفیسر ہے۔ اسے اطمینان سے ساری بات بتا دو۔

گل رخ کا حوالہ آتے ہی کسٹم آفیسر کا رویہ بدل گیا۔ اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ الماس کی مدد کے ساتھ ساتھ وہ اپنی فرض شناسی اور مستعدی کے مزید ثبوت فراہم کر سکتا ہے۔ اس نے الماس کو حراست میں نہیں لیا۔ اپنے آدمی اس کے پیچھے نہیں لگائے اور رات کو اس سے ایک مقررہ جگہ پر ملنے کا وعدہ کر لیا۔ الماس جب واپس پہنچی تو گل رخ کا کمرہ بند تھا۔ ڈی سلوا نے اسے بتایا کہ وہ بخیر و عافیت اپنے گھر پہنچ چکی ہے اور اسے بھی اچھی طرح سمجھا دیا گیا ہے کہ عدم تعاون یا پولیس کے پاس جانے کا انجام کیا ہوگا۔ وہ کسٹم آفیسر اس سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کی بات نہیں ٹال سکتا۔ وہ اسے نوکری چھوڑنے پر مجبور کرے گی۔ اس نوکری میں ہر وقت جان کو خطرہ لاحق رہتا ہے کیونکہ واسطہ پڑتا ہے اسمگلروں سے جو انتہائی مجبور ہو جائیں تو ایک کی جگہ دس کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ گل رخ اسے کاروبار کے لیے سرمایہ فراہم کرے گی اور اس کسٹم آفیسر سے صاف کہہ دے گی کہ وہ نوکری اور شادی میں سے ایک کا انتخاب کرے۔ اگر وہ اس کو قائل کر کے اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گئی تو اس کی تمام تصویریں واپس کر دی جائیں گی لیکن وہ ناکام رہی تو یہ تصویریں اس کی شادی کے بعد استعمال کریں گے۔ ابھی تو خود گل رخ کو بھی معلوم نہیں کہ اس کی تصویریں اتاری گئی ہیں اور اسے کچھ معلوم ہونا بھی نہیں چاہیے۔

الماس خود کو چالاک سمجھتی اور اتنے تلخ تجربات سے گزر کے محتاط ہو جانے کے باوجود ڈی سلوا کے پھیلائے ہوئے دوسرے جال میں گرفتار ہو گئی۔ اسے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ جو شخص ایک بار اپنے کیے ہوئے تمام وعدے اتنی ڈھٹائی سے توڑ سکتا ہے وہ دوسری بار بھی ایسا کر سکتا ہے۔ اس کا ذہن ویسے بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا اور اس کی تمام تر خواہش یہ تھی کہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ جلد از جلد اس دلدل سے نکل جائے۔ اسے اپنی رسوا کن تصویریں اور ان کے نیگیٹو مل جائیں اور وہ خطرہ ٹل جائے جو اس کی خاندان کی اور چھوٹی بہنوں کی زندگی تباہ کر سکتا تھا۔ یہ فنا اور بقا کی جدوجہد کا مسئلہ تھا چنانچہ الماس نے خود غرض بن کے تمام اخلاقی قدروں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اب گل رخ پر کیا گزر رہی ہے۔ اس کسٹم آفیسر کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اس کے بارے میں خود کو مورد الزام سمجھنے کی شرمندگی بھی نہیں رہی تھی۔ ڈی سلوا کے آدمی الماس کو اور اس کسٹم آفیسر کو کسی نامعلوم جگہ لے گئے جہاں ایک بار پھر الماس کے ساتھ وہ ہوا جو پہلے بھی ہو چکا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس مرتبہ بیڈ روم بدل گیا تھا اور اس کا پارٹنر ایک کسٹم آفیسر تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد الماس نے دیکھا کہ وہ کسٹم آفیسر ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ ڈی سلوا نے سمجھا دیا تھا کہ وہ عقل سے کام لے اور ان کی مدد کرے تو اس میں دونوں کا فائدہ ہے ورنہ نقصان صرف کسٹم آفیسر کا ہوگا۔ اسے الماس کی پہلے والی تصویریں دکھا کر یقین دلا دیا گیا تھا کہ یہ عورت اسے پھانس کر لائی ہے۔ وہ ایک بدکردار طوائف ہے جس کے شریفانہ حلیے سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اس کی چند قابل اعتراض تصویریں اتاری گئی ہیں جن سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وہ عیاش اور بدقماش آدمی ہے۔

"ان تصویروں کا پرچار اور تمہاری باتوں پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔" کسٹم آفیسر بولا۔

ڈی سلوا ہنسا۔ "دنیا برائی پر بہت جلدی یقین کر لیتی ہے۔ تمہاری منگیتر گل رخ بھی ضرور یقین کرے گی۔ الماس نے اس کو اپنا نام پتہ سب غلط بتایا تھا۔ کیا کوئی شریف لڑکی بغیر وجہ کے ایسا کرتی ہے؟ جب وہ الماس کی سابقہ تصویریں دیکھے گی جو کسی اور مرد کے ساتھ کسی اور گھر میں لی گئی تھیں تو شبہ کی گنجائش کہاں باقی رہے گی۔ تم کیا بتاؤ گے کہ تم کہاں گئے تھے؟ یہ اگر تم کہو گے کہ مخبری کرنے یا چھاپہ مارنے کے لیے اسمگلروں کے اڈے کا سراغ لگانے گئے تھے تو پوچھنے والے پوچھیں گے کہ وہ اڈا کہاں تھا؟ کس کا تھا؟ اور وہاں تمہیں کیا ملا؟ جب یہ تصاویر تمہارے محکمے کو ارسال کی جائیں گی تو تمہارے چھاپہ مارنے کی کہانی سفید جھوٹ بن جائے گی۔ اتفاق سے یہ گھر بھی ایک پرانے کسٹم آفیسر کا ہے جو تمہارا دوست رہا تھا اور عیاش تھا۔ تمہارا اس کے گھر میں ملنا خود تمہارے خلاف ثبوت فراہم کرے گا کہ تم بھی مختلف نہیں تھے۔ جس کا یہ گھر ہے وہ متعدد مقدمات میں ماخوذ ہونے کے بعد روپوش ہو گیا ہے۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ کیا وہ تمہارا دوست تھا۔ دوست نہیں تھا تو تمہیں گھر کی چابیاں کیسے سونپ گیا تھا کہ تم وہاں ایک جھوٹی کہانی گھڑ کے عیاشی کے لیے جا پہنچے۔ پولیس تمہیں بھی تفتیش میں شامل کرے گی... لیکن تمہارے خلاف سب سے بڑا اور ناقابل تردید ثبوت تمہارا بینک اکاؤنٹ ہوگا۔ تمہاری ملازمت شروع ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا لیکن اس میں ایک لاکھ روپے سے زیادہ نقد رقم جمع ہے۔"

"جھوٹ ہے۔" کسٹم آفیسر نے کہا۔ "میرے اکاؤنٹ میں صرف دو ہزار روپے ہیں۔"

"پاتھا لیکن تو آدمی کیا؟" ڈی سلوا بولا۔ "کسی کے حساب میں سے رقم نکلوانا مشکل کام ہوتا ہے۔ رقم جمع کرانے کے لیے صرف اکاؤنٹ نمبر معلوم ہونا کافی ہوتا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں لیکن گزشتہ ماہ کی گیارہ، سترہ اور چوبیس تاریخ کو تم نے بالترتیب پچیس ہزار، چھتیس ہزار اور چالیس ہزار جمع کرائے۔ ان کا تم کیا حساب دو گے؟ یہ نتیجہ بھی نکالا جائے گا کہ تم نوکری میں نئے تھے اس لیے تم پہلے محتاط رہے اور کچھ فرض شناسی کا مظاہرہ بھی کرتے رہے لیکن بعد میں تجربہ کار ہو گئے تو اسی رنگ میں رنگے گئے جس میں دوسرے بھی رنگے ہوئے تھے۔ سب اوپر والے ہمارے ساتھ ہیں اور تم اگر ہمارے کاروبار کو نقصان پہنچا رہے ہو تو ان کی آمدنی میں بھی رکاوٹ ڈال رہے ہو۔ انہیں صرف بہانہ چاہیے کہ تمہیں بدعنوانی کے مقدمات میں الجھا کر الگ کر سکیں۔ ثبوت وہ خود بھی پیدا کر سکتے ہیں اور ہم بھی انہیں فراہم کر سکتے ہیں۔ ہم تمہیں مار بھی سکتے تھے لیکن ہم خود سے مرنے والے کو مارنے کے قائل نہیں ہیں۔ تمہارے حق میں بہتر ہے کہ ملازمت چھوڑ دو اور کاروبار کرو۔ جانا چاہو تو ملک سے باہر چلے جاؤ۔ ہم تمہاری مدد بھی کریں گے۔ بصورت دیگر نہ تمہاری ملازمت رہے گی نہ تم گل رخ سے شادی کر سکو گے اور نہ اس کو رسوائی سے بچا سکو گے۔ ابھی تم جوان ہو۔ اصول پرستی کے چکر میں مت پڑو۔ خود بھی جیو اور دوسروں کو بھی جینے دو کا فلسفہ سب سے اچھا ہے۔"

اس کے بعد کسٹم آفیسر کے لیے مخالفت کی گنجائش نہ تھی۔ اس نے فائدے کا سودا کیا اور وہیں سب کچھ طے ہو گیا۔ ڈی سلوا نے اسے مزید دو لاکھ فراہم کرنے اور گل رخ سمیت لندن میں سکونت اختیار کرنے کی گارنٹی دی اور کہا کہ تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو جانے کے بعد تصاویر نیگیٹو کے ساتھ واپس کر دی جائیں گی اور آئندہ ان کا کسی سے یا کسی کا ان سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ جب وہ کسٹم آفیسر چلا گیا ڈی سلوا نے الماس سے کہا کہ وہ اس کے کام سے بہت خوش ہے اور اس کی تمام تصویریں اور نیگیٹو اس کے حوالے کر دیے کہ وہ اپنے ہاتھ سے جلا دے۔ الماس نے تسلیم کیا کہ تصدیق کی خاطر اس نے تصویریں دیکھی ضرور تھیں لیکن یہ بات کہتے ہوئے احساس ذلت سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس کے ماتھے پر عرق ندامت کی نمی آگئی۔ اس کے بعد الماس کا ڈی سلوا سے کوئی رابطہ نہیں رہا اور تین برس بعد جب اس کی شادی ہوئی تو

www.paksociety.com

وہ اپنے بھیانک ماضی کی ہر یاد کو ذہن کے نہاں خانوں کی اتھاہ گہرائی میں دفن کر چکی تھی۔ اس کا دل اپنے پروردگار کے لیے شکر کے جذبات سے معمور تھا جس نے المالس کی توبہ قبول کر لی تھی اور اسے باعزت زندگی گزارنے کا موقع عطا کیا تھا۔ المالس نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ گل رخ اور اس کسٹم آفیسر کا بعد میں کیا ہوا، لیکن ڈی سلوا سے انتقام کی آرزو بھی نہیں مری تھی۔

میں اور رابعہ دم بخود بیٹھے تھے اور المالس نے خود ہی اپنی داستان ماضی کا حرف حرف دہرا دیا تھا۔ ہم نے ان زخموں کو چھیڑ دیا تھا جو بظاہر وقت کی چارہ گری سے مندمل ہو گئے تھے جب دل کے یہ ناسور پھر رسنے لگے تو ہر قطرۂ خوں نے اپنی داستان الم خود کہہ دی۔

"تمھیں اس کسٹم آفیسر کا نام معلوم ہے؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"نام؟" المالس نے کہا۔ "اب تو یاد نہیں۔"

"اچھا گل رخ کے گھر کا پتہ تو تمھیں معلوم ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہم وہاں سے پوچھ لیں گے۔"

المالس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں کبھی اس کے گھر نہیں گئی تھی۔ ڈی سلوا نے مجھے سختی سے منع کر رکھا تھا۔"

"سکندر!" رابعہ نے اچانک کہا۔ "اس اسکول سے تو گل رخ کا پتہ مل ہی سکتا ہے جہاں وہ پڑھاتی تھی۔"

"تم اسے یہاں لاؤ گے؟" المالس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"اول تو اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ تمہارے سامنے آ بھی جائے گی تو کچھ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ وہ تمہارے اصل نام سے واقف نہیں اور تم اسے پہچاننے سے صاف انکار کر سکتی ہو۔ اس کے علاوہ جتنی خوف زدہ تم ہو گی اتنی ہی وہ بھی ہو گی کہ کہیں تم نہ مل جاؤ۔ البتہ تمھیں ضرورت پڑنے پر یہ باتیں ایک ایسی لڑکی کو بتانی ہوں گی جو آج تک ڈی سلوا کے فریب کا شکار رہی تھی۔"

"خدا کے لیے مجھے ان معاملات سے الگ رکھو۔" المالس ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

"ہم پر اعتبار کرو المالس!" رابعہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "میری کوئی بہن نہیں لیکن یقین کرو تمہارا آنے والا مستقبل بھی مجھے اتنا ہی عزیز ہے جتنا اپنی سگی بہن کا ہوتا۔ ہم پر اعتماد نہیں تو خدا پر بھروسہ رکھو جس نے اب تک تمہاری حفاظت کی اور آئندہ بھی کرے گا۔"

ہم رات کا اندھیرا پھیلنے سے بہت پہلے آ گئے تھے اور جب رخصت ہوئے تو رات کے دس بجنے والے تھے۔ میں نے رابعہ کو خاقان رضوی کے گھر کے دروازے پر اتار دیا اور خود رخصت ہو گیا۔ میں نے رابعہ کو سمجھا دیا تھا کہ رضوی صاحب کی نظر میں ہماری پوزیشن خراب نہیں ہونی چاہیے۔ اگر وہ پوچھیں تو رابعہ کہہ دے کہ میں آفس چلی گئی تھی اور مجھے سکندر کا پتہ نہیں۔ میں آدھے گھنٹے بعد آؤں گا اور انھوں نے مجھ سے پوچھا تو اپنی وضاحت خود پیش کر دوں گا۔ رابعہ کی شکستہ حال سرخ ٹو سیٹر گاڑی کوٹھی کے احاطے میں کھڑی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ رضوی صاحب کے اثر و رسوخ کے باعث پولیس نے کار کو اصل مالک تک پہنچانے میں بڑی مستعدی کا ثبوت دیا تھا۔ میرے ہاتھوں اس کی جو درگت بنی تھی سو بنی تھی، باقی گاڑی کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ اور اس کی کوئی چیز بھی غائب نہیں ہوئی تھی۔ جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا تو اس کا رنگ و روغن بڑا چمکیلا تھا اور اس پر ایک خراش بھی نہ تھی۔ اب وہ چار ہزار خرچ کیے بغیر اس کو دوبارہ اپنی اصل حالت پر لانا مشکل تھا۔ جب رابعہ اندر چلی گئی تو میں اسی ٹیکسی میں صدر پہنچا۔ حسب معمول میں نے ٹیکسی کو سڑک پر چھوڑا اور ادھر ادھر اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس گلی میں داخل ہو گیا جس میں شہلا مقیم تھی۔ وہ عالم سخت اضطراب اور بے چینی کا شکار رہی تھی لیکن باہر جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ اس نے اخبار میں وہ سب واقعات پڑھ لیے تھے جو اس کے گلبرگ والے گھر میں پیش آئے تھے۔ صبح کے اخبارات کو زیادہ تفصیلات نہیں مل سکی تھیں مگر شام کے ایک اخبار نے ان لاشوں کی تصویریں بھی چھاپ دی تھیں جو پولیس کو گھر کے اندر اور باہر سے ملی تھیں۔ یہ سب بدمعاش اور ہسٹری شیٹر تھے چنانچہ پولیس نے یہ مفروضہ قائم کیا تھا کہ وہ ڈاکا ڈالنے آئے تھے اور غیر متوقع طور پر ان کو کسی ایسے شخص سے مقابلہ کرنا پڑ گیا جو ان سے زیادہ طاقتور ثابت ہوا۔ اس نے تینوں کو ٹھکانے لگا دیا مگر خود بھاگ گیا۔ یہ نامعلوم شخص کون تھا؟ اس کے بارے میں پولیس کی نظریات مختلف تھیں۔ ایک یہ کہ وہ چوکیدار تھا جسے گھر والے اپنی جانے وقت حفاظت کے خیال سے چھوڑ گئے تھے اور وہ پولیس کی کارروائی سے بچنے کے لیے روپوش ہو گیا۔ دوسرا نظریہ یہ تھا کہ واردات کے وقت گھر میں کوئی مہمان موجود تھا جس نے ڈاکوؤں کو ٹھکانے لگا دیا اور گھر والوں کو ساتھ لے گیا تاکہ وہ ان واقعات سے اپنی بے خبری اور لاتعلقی ثابت کر سکے۔ ابھی تک مکینوں کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔ آس پاس کے رہنے والوں نے صرف یہ بتایا ہے کہ گھر میں ایک مفلوج بڑھیا اپنی غیر شادی

شدہ لڑکی اور نوجوان اوباش لڑکے کے ساتھ رہتی تھی اور ان کا کسی سے ملنا جلنا نہیں تھا۔ پولیس کے لیے پریشانی کے اور بھی سبب تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ٹیلیفون پر رپورٹ دینے والے نے خود کو ایس ایس پی خاقان رضوی صاحب کا چھوٹا بھائی بتایا تھا اور کہا تھا کہ وہ پڑوس میں رہتا ہے لیکن تفتیش کرنے پر دونوں باتیں غلط ثابت ہوئیں۔ خاقان رضوی صاحب گلبرگ میں نہیں رہتے۔ انھوں نے پوچھنے پر بتایا کہ ان کا چھوٹا بھائی کوئی نہیں ہے چنانچہ یہی بات زیادہ قابل اعتبار لگتی ہے کہ فون بھی اسی نامعلوم شخص نے کیا ہوگا جس نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور انھیں مارنے کے بعد اپنی اور گھر والوں کی جان بچا کر صاف نکل گیا لیکن یہ نامعلوم شخص گھر میں رہنے والی مس شہلا زیدی کا تو عزیز بھائی نہیں ہو سکتا۔ پولیس کو رپورٹ دینے کے بجائے روپوش ہو جانے کا مطلب یہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ کوئی اس گھر میں اپنی اس وقت موجودگی کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

مجھے معلوم تھا کہ اگلے دن کے اخبارات مزید بال کی کھال نکالیں گے۔ یہ معلوم ہو جائے گا کہ مس شہلا زیدی کہاں کام کرتی تھی۔ جوا کھیلتے ہوئے قتل ہو جانے والے عدنان کی خبر کو شہلا کے گھر پہ حملے کی خبر سے مربوط کر دیا جائے گا اور تفتیش سے کچھ اور نتائج سامنے آئیں گے۔ اگر خاقان رضوی صاحب کو معلوم ہوا کہ میں نے شہلا کو کہاں چھپا رکھا ہے تو وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ جس نامعلوم نوجوان نے تین ڈاکوؤں کو مار دیا اور پھر خاقان رضوی صاحب کا نام لے کر پولیس کو فون کیا وہ میرے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ بھی سمجھ لیں گے کہ مارے جانے والے ڈاکا ڈالنے نہیں آئے تھے بلکہ ڈی سلوا کے آدمی تھے۔ اس کے بعد ان کے لیے سخت ترین آزمائش کا مرحلہ درپیش ہوگا۔ یعنی وہ فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے پولیس کو حقائق سے آگاہ کر دیں یا خاموش رہیں کیونکہ میرے اور رابعہ کے انکار کی صورت میں کچھ بھی ثابت نہیں ہو سکتا لیکن اب تک جو کچھ انھوں نے میرے لیے اور رابعہ کے لیے کیا تھا وہ سب خاک میں مل جاتا اور یہ نیکی برباد گناہ لازم والی بات ہوتی۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ مسلسل چشم پوشی سے کام لیں اور ایک کے بعد ایک میری ہر مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھ کے قبول کرتے جائیں۔ انھوں نے مجھے پناہ دی تھی۔ میرے ساتھ حسن سلوک کیا تھا۔ پھر رابعہ کو اپنے گھر میں بیٹی کی طرح جگہ دی تھی۔ اب شہلا اور اس کی مفلوج ماں کا بار ان پر ڈالنا ظلم ہوتا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اس مسئلے کو التوا میں رکھنا مناسب سمجھا کیونکہ فوری مسئلہ عدنان کا تھا جس کے بارے میں شہلا نے ابھی تک ایک اخبار کی چھوٹی سی خبر کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ یہ اخبار بھی اس نے ماسی کے ذریعے پاس پڑوس کے کسی گھر سے منگوائے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ عدنان کی لاش اس وقت سرکاری مردہ خانہ میں بہت سی لاوارث لاشوں کے درمیان پڑی ہوگی اور پولیس منتظر ہوگی کہ کوئی وارث آئے تو اسے تفتیش کے جال میں جکڑ لے۔ شہلا کا وہاں جانا بعید از قیاس تھا کیونکہ ہمیں تو ظاہر کرنا تھا کہ حملہ آور اس کو اغوا کر کے لے گئے تھے اور مناسب وقت تک اس کو چھپائے رکھنا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ عدنان کی لاش حاصل کر کے اس کی تدفین کی جائے ورنہ بہت سی لاوارث قرار دی جانے والی لاشوں کی طرح یہ لاش بھی میڈیکل کالج کے طلبہ کو فروخت کر دی جاتی جن کو تکمیل و تحصیل علم کے لیے وہ تجربات کرنے پڑتے ہیں جو زندہ انسانوں پر نہیں کیے جا سکتے مگر جن پر مردے کبھی معترض نہیں ہوتے۔ میں عدنان کا وارث نہیں تھا اور یہ بھی ناممکن تھا کہ میں عدنان کی ماں کو پہلے یہ جاں لیوا خبر سناؤں اور پھر اسے ساتھ لے کر ہسپتال جاؤں۔

شہلا کی ماں گولی کھا کے سو چکی تھی۔ میں نے شہلا سے انگریزی میں کہا کہ وہ ماسی کو بھی سو جانے دے اور اپنے آپ کو ایک بہت بڑی خبر سننے کے لیے تیار کر لے۔ مجھے بھوک بالکل نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے صرف ایک پیالی چائے پی اور ماسی سے کہا کہ وہ دوسرے کمرے میں شہلا کی ماں کے پاس سو جائے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ شہلا کی حالت غیر ہو رہی ہے اور وہ جلد از جلد وہ بڑی خبر سننا چاہتی ہے۔

"بات یہ ہے شہلا!" میں نے موقع پاتے ہی کہا۔ "کہ زندگی میں ہر آدمی کو ناقابل تصور صدمات جھیلنے پڑتے ہیں۔ ہر بار وہ سمجھتا ہے کہ یہ صدمہ برداشت سے باہر ہوگا لیکن وقت آنے پر نہ صرف یہ کہ وہ صدمہ جھیل کر زندہ رہتا ہے بلکہ کچھ عرصے بعد اس کے نقش تک مٹ جاتے ہیں۔ مثلاً والدین کے لیے اولاد کا صدمہ یا بہن کے لیے اکلوتے بھائی کی موت کا صدمہ..."

"صاف صاف کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ چلائی۔ "کیا میرا صبر و حوصلہ آزما رہے ہو؟"

"نہیں۔ صبر اور حوصلہ تو تم میں ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ میں نے کل دیکھا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس وقت بھی تم اسی حوصلے سے کام لو۔ اس کمرے کے باہر کسی کو پتہ نہ چلے

www.paksociety.com

کہ میں نے کیا کہا ہے۔"
"اگر عدنان کو کچھ ہوا ہے تو بتا دو۔" وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بولی۔ "بری صحبت کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ پہلے بھی میں عدنان کے بارے میں بری بری خبر سننے کے لیے تیار رہتی تھی اور اب بھی سن سکتی ہوں۔ کیا پولیس نے۔۔۔؟"
"نہیں شہلا! وہ اب پولیس کی گرفت میں نہیں آسکتا۔" میں نے کہا۔ "وہ جزا و سزا اور نیکی بدی کی اس دنیا سے بہت دور جا چکا ہے۔ اب تو تم صرف اس کی مغفرت کی دعا مانگ سکتی ہو۔"
میں نے اخبار شہلا کے اندر کے صفحات کی ایک چھوٹی سی خبر پر انگلی رکھ دی۔ شہلا نے خبر پڑھی کچھ دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے خبر کے بے رحم الفاظ کو گھورتی رہی، پھر اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑ گیا اور اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونا شروع کر دیا۔ میں نے اسے تسلی دی اور یاد دلایا کہ اپنی ماں سے اس خبر کو چھپانا اس کا فرض ہے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور آواز ماسی کے کانوں تک پہنچ گئی۔ ابھی تک میں نے انگریزی میں بات کی تھی چنانچہ ماسی پریشان تھی کہ میں نے شہلا سے کیا کہہ دیا ہے کہ اس کی حالت سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ مجبوراً مجھے اس کو بھی ساری بات سنانی پڑی۔
رفتہ رفتہ شہلا نارمل ہو گئی اور میں نے اسے سمجھا دیا کہ اس مسئلے کو کیسے حل کیا جا سکتا ہے۔ عدنان کی ماں سے حقیقت کو چھپائے رکھنے کے لیے ایک ایسی عورت کا تعاون درکار ہوگا جو وقتی طور پر ماں کا کردار نبھا سکے۔ اس کام کے لیے مناسب ترین عورت رابعہ کی خادمہ ماسی ہی ہو سکتی تھی۔ وہ صورت سے اور عادات و اطوار سے اتنی سیدھی سادی اور بے وقوف لگتی تھی کہ مجھے اس کی کامیابی مشکوک نظر آتی تھی۔ ماسی کے لیے حقیقی ماں کی طرح اکلوتے بیٹے کے اس طرح مارے جانے پر غم کا اظہار کرنا اور اپنی اداکاری سے کسی پر اصلیت ظاہر نہ ہونے دینا بہت مشکل کام تھا لیکن میں نے غور و خوض کے بعد اس کا بھی ایک آسان سا حل تلاش کر لیا۔ ماسی کو سمجھانے اور اطمینان دلانے میں مجھے خاصی دشواری کا سامنا ہوا مگر بالآخر وہ سمجھ گئی اور میں نصف شب کے بعد رخصت ہوا۔ رضوی صاحب سو چکے تھے۔ میں کوٹھی کے دروازے سے سیدھا گزر کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ سرونٹ کوارٹر میں بھی اندھیرا تھا۔ میں نے رضوی صاحب کے ڈرائیور کا شمسل کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا جس کی نظر میں ہماری حیثیت پہلے ہی بہت پراسرار تھی اور کسی حد تک خطرناک ہو گئی تھی۔ وہ مجبور تھا تو صرف اس لیے کہ رضوی صاحب ہمارا لحاظ کرتے تھے اور ہم پر بہت مہربان تھے ورنہ وہ کب کا ہمیں نکال باہر کر چکا ہوتا تاہم اس نے اب سلام دعا تک بھی ترک کر دی تھی جس کی ہمیں پروا نہیں تھی۔
اندھیرے میں جگنو سا چمکتا دکھائی دیا تو میں سمجھ گیا کہ محسن لوٹ آیا ہے اور اپنی یا میری پریشانی کے باعث جاگ رہا ہے اور انتظار کا وقت کاٹنے کے لیے بستر پر لیٹا سگریٹیں پھونک رہا ہے۔ اپنی بات کہنے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ میں اس کی سنوں۔ حسب توقع وہ گھر سے ایک زبردست جنگ لڑ کے آ گیا تھا اور اپنے پیچھے ایک شدید جذباتی بحران چھوڑ آیا تھا۔ والدین اس کی باغیانہ روش پر سخت رنجیدہ بھی اور برافروختہ تھے لیکن کوئی انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے اسے عاق بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک بیٹا ان کی ضرورت بھی تھا اور مجبوری بھی۔ لیکن اس تمام فساد کا ذمے دار میں ٹھہرا تھا جس نے پہلے بھی فوزیہ کی زندگی تباہ کی تھی اور اب بھی اس کے مقدر میں کوئی خوشی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے محسن کو بھڑکایا تھا۔ فوزیہ ایک نا سمجھ، ناتجربہ کار اور جذباتی لڑکی تھی۔ محسن اسے سمجھا سکتا تھا اور اسے حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ کر سکتا تھا مگر اس نے جو کچھ کیا، برعکس کیا۔ اس کی ماں کا خیال تھا کہ اب شیرازی صاحب کو میری سرپرستی سے فوراً ہاتھ کھینچ لینا چاہیے کیونکہ میں کمینہ اور احسان فراموش ثابت ہوا ہوں۔ شیرازی صاحب اس نظریے سے متفق یا قائل نہیں ہوئے اور انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ اس معاملے میں قطعی غیر جانبدار رہیں گے۔ جس کا جو دل چاہے کرے۔ وہ خود بھی کسی کے کہنے سے مجبور ہو کے کچھ نہیں کریں گے۔ یہ محسن کے نقطۂ نظر سے بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ شیرازی صاحب نے فوزیہ پر زبردستی اپنی مرضی مسلط کرنے سے انکار کر دیا تھا تو دوسری طرف مجھ سے وہ تعلق ختم کرنا بھی منظور نہیں تھا جس کی بنیاد میرے والد کی اور ان کی نصف صدی پرانی دوستی کے رشتوں پر تھی۔ مجموعی صورت حال سے محسن خوش اور مطمئن تھا۔ شیرازی صاحب نے پہلی بار بیوی کی بات ماننے سے انکار کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ بھی شوہر ہیں، بیوی کے غلام نہیں۔ چنانچہ اکیلی فوزیہ کی ماں اب اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ شوہر نے ان کا ساتھ دیا ہوتا تو محسن کو یقیناً شکست ہو جاتی اور فوزیہ کے مستقبل کا فیصلہ بھی ہو جاتا۔
میں نے اپنی بات کم سے کم الفاظ میں کہی کیونکہ رات بہت بیت چکی تھی اور میں اگلے دن تازہ دم رہنے کے لیے نیند کی کمی پوری کرنا چاہتا تھا۔ محسن نے میرے منصوبے سے

اتفاق کیا اور اپنے خدشات کا اظہار بھی کیا کہ پول کھل گئی تو ہمارے ساتھ ماسی بھی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گی مگر مصیبت کا مفہوم بھی ہمارے لیے بے معنی ہو گیا تھا۔ "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں" والا معاملہ تھا۔ صبح نو بجے پھر رابعہ نے مجھے بیدار کیا۔
"مانا کہ جناب گھوڑوں کا تمام اسٹاک بیچ کر سوتے تھے۔" وہ مسکرا کے بولی۔ "مگر اب جاگنے کا خیال نہیں ہے کیا؟"
"جاگ تو میں رہا تھا۔" میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ "لیکن منتظر تھا کہ تم آ کے جگاؤ۔ اگر ہر صبح اسی طرح تمہارے آفتاب حسن کی حدت سے طلوع ہو۔۔۔"
رابعہ کا چہرہ شفقی رنگ ہو گیا اور اس نے گھبرا کے محسن کی طرف دیکھا جو سر تک چادر تانے مردے کی طرح سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔ محسن سن لے گا۔۔۔"
"حکومت کرو۔ محسن سو رہا ہے۔" محسن نے ہلے جلے بغیر کہا اور رابعہ بے اختیار ہنس کے بھاگ گئی۔ محسن قہقہہ مار کے اٹھ بیٹھا۔ "یار! یہ سب لڑکیاں ایک جیسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟ پڑھی لکھی ہوں یا جاہل۔۔۔ چہ خوب۔۔۔ یہ باتیں سننا بھی چاہتی ہیں اور پھر کہتی ہیں کیسی باتیں کرتے ہو۔"
"اگر اس رومانٹک سین کو آپ کچھ دیر اور چلنے دیتے تو کیا جاتا؟" میں نے تکیہ اس کی طرف پھینکا۔ "اور کسی دن تجھے عشق ہوا نا کسی سے، اس دن میں پوچھوں گا کہ یہ باتیں کیسی لگتی ہیں؟"
"سچا عشق بھی زکام کی طرح اکثر ہوتا رہتا ہے۔" محسن نے ارشاد کیا۔ "علاج دونوں کا نہیں۔ خدا شفا دیتا ہے، بندہ نکاح فرما لیتا ہے۔"
صبح کا آغاز اچھا ہوا تھا۔ رضوی صاحب ڈیوٹی پر جا چکے تھے چنانچہ ہم نے کوٹھی میں ناشتہ کیا اور بہت سی چیزوں کے ساتھ بیگم رضوی کی جھاڑ بھی کھائی۔ ان کو ہماری شب و روز کی مصروفیت پر سخت تشویش لاحق تھی کہ ہم کہاں رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں اور کیوں کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ ان کا ہمارے معاملات سے بے خبر اور بے تعلق رہنا ہی بہتر تھا اس لیے ہم باتوں کو مذاق میں ٹال گئے۔ پھر میں نے مرتضیٰ پولیس مردہ خانے فون کیا اور عدنان کے بارے میں دریافت کیا۔ مجھ سے دس منٹ بعد دوبارہ فون کرنے کو کہا گیا۔ دس منٹ بعد فون اٹھانے والے نے بہت سے سوالات کیے کہ میں کون ہوں اور عدنان سے میرا کیا رشتہ ہے۔ بات کرنے والا ڈاکٹر تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں عدنان کا فیملی ڈاکٹر ہوں اور اس کی فالج زدہ ماں کا علاج کر رہا ہوں۔ مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے کہ عدنان کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس خبر سے اس کی ماں کی حالت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ جسمانی طور پر وہ پہلے ہی مفلوج تھی اب اس کا ذہن بھی مفلوج ہو گیا ہے۔"
"دیکھیے جناب! یہ پولیس کیس ہے۔" مجھ سے بات کرنے والے ڈاکٹر نے کہا۔ "مجھے ہمدردی ضرور ہے لیکن میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"
"میں چاہتا تھا کہ لاش کو اسپتال ہی میں غسل اور کفن وغیرہ دے دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "اور وہیں سے تدفین کے لیے قبرستان پہنچا دیا جائے۔ اگر لاش گھر لائی گئی تو ممکن ہے اس کو دیکھتے ہی عدنان کی ماں مر جائے۔"
"آئی ایم سوری۔ آپ نے دیر سے فون کیا۔" وہ بولا۔ "عدنان کی لاش کو وارث لے جا چکے ہیں۔"
"آپ کا مطلب ہے کہ لاش اس کی بہن کے حوالے کر دی گئی ہے؟" میں نے اپنی حیرت پر قابو پا کر کہا۔ "جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کا کوئی اور قانونی وارث نہیں ہے۔"
"مجھے تو یہ معلوم ہے کہ کل ایک صاحب آئے تھے اور یہی وقت تھا، چنانچہ میری ہی ڈیوٹی تھی۔ انہوں نے بھی یہ بات کہی تھی کہ عدنان کی ماں مفلوج ہے اس لیے خود نہیں آ سکتی اور بہن اس صدمے سے بے ہوش پڑی ہے اس لیے وہ بھی نہیں آ سکتی۔ پھر انہوں نے پولیس سے بات کی اور لاش لے گئے۔ غالباً وہ لڑکی کے چچا تھے۔" ڈاکٹر نے کہا۔
"چچا؟" میں نے کہا۔ "کیا نام بتایا تھا انہوں نے؟"
"نام تو غالباً چوہدری دلاور تھا۔" ڈاکٹر بولا۔ "ٹھہریے میں آپ کو دیکھ کر بتا دیتا ہوں۔"
ایک تو وہ کچھ معقول اور شریف آدمی تھا۔ پھر یہ کہ مجھے اپنا ہم پیشہ سمجھ کے اس نے تعاون کیا ورنہ وہ یہ کہہ کر بات ختم کر سکتا تھا کہ متعلقہ تھانے سے معلوم کیجیے۔ اس نئی صورت حال نے مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ چوہدری دلاور کے عزائم بالکل واضح تھے۔ وہ جانتا تھا کہ شہلا روپوش ہو گئی ہے۔ اسے یہ شک بھی ہوگا کہ شہلا کے گھر میں بدمعاشوں کا مقابلہ کرنے والا میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا اور یقین ہوگا کہ بھائی کی خبر پاتے ہی شہلا سامنے آنے پر مجبور ہوگی۔ وہ اسپتال پہنچے گی تاکہ پوسٹ مارٹم کے بعد بھائی کی لاش لے جا سکے۔ چوہدری دلاور اس سے پہلے ہی لاش لے گیا اور اپنا بندہ چھوڑ گیا کہ شہلا اسپتال سے سیدھی اس کے گھر جائے اور پولیس کے ہتھے چڑھ جائے۔ شہلا کا وجود اب ان کے لیے خطرناک ہو گیا

تھا۔ اس نے ڈی سلوا کو کھلم کھلا دھمکی دی تھی اور اس خطرے کا سدِ باب ضروری تھا۔ اس کے پاس دولت کی طاقت تھی اور اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا جس سے وہ پولیس کو خرید بھی سکتے تھے۔ شہلا ایک بار ان کے چنگل میں گرفتار ہو جاتی تو اس کے لیے رہائی اور نجات کے سارے دروازے بند ہو جاتے۔ میں نے فوراً محسن سے مشورہ کیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ کام مجھے ہی کرنا پڑے گا۔" محسن نے کہا۔ "تیرا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔ اگر تیرے خلاف ہی تفتیش کا چکر شروع ہو گیا تو نئی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔"

"خطرہ مجھے صرف ایک شخص سے ہے۔" میں نے کہا۔ "جب میں ساتھ والے گھر فون کرنے گیا تھا تو ایک نوجوان باہر نکل رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں شہلا کا پڑوسی ہوں۔ وہ مجھے پہچان سکتا ہے، لیکن تجھے نہیں پہچان سکتا۔"

"اس کے علاوہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ مار دھاڑ کرتے ہوئے نادانستگی میں تو نے کہیں اپنے فنگر پرنٹ وغیرہ چھوڑ دیے ہوں۔ ڈی سلوا نے تجھے وہاں دیکھا تھا مگر بعد میں اس نے پولیس کو اپنا نام بتائے بغیر ٹیلی فون کر دیا ہو۔ اس امید میں کہ پولیس شہلا سے یا اس کی ماں سے تیری موجودگی کا اعتراف کروا لے گی۔ پولیس اب بھی وہاں ہوگی مگر مجھے ان سے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ میرے فنگر پرنٹ لے کر بھی کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔"

"تجھے وہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "تو رابعہ کی گاڑی لے جا۔ جیسی بھی ہے، چلتی تو ہے۔ ماسی کو کمبل وغیرہ لپیٹ کر پچھلی سیٹ پر لٹا دینا اور چوہدری ولاور کے گھر پہنچ جانا۔ میرا خیال ہے وہ شہلا کی ماں کو نہیں پہچانتا ہوگا۔ ماسی کچھ نہیں بولے گی۔ وجہ صاف ظاہر ہے، صدمے کا اثر اس کے دماغ پر ہو گیا ہے اور اس کی زبان بھی گنگ ہو گئی ہے۔ تدفین کے انتظام کی ذمہ داری تو چوہدری ولاور قبول کر ہی چکا ہے۔ شہلا کے بارے میں اس کی امیدیں خاک میں مل جائیں گی۔ میں شہلا کے پاس جا کے اسے اس نئی صورت حال سے خبردار کرتا ہوں۔"

میں اور محسن ایک ساتھ ہی شہلا کے پاس پہنچے جہاں سے محسن تو کچھ دیر بعد ماسی کو لے کر روانہ ہو گیا مگر میں شہلا کی ماں سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بیٹے کے لیے بہت پریشان تھی۔ اور یہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ آخر کب تک وہ اپنے گھر واپس جا سکے گی۔ میں نے، رابعہ نے اور شہلا نے مل کر حالات کی جو وضاحت کی تھی وہ اس سے مطمئن نہیں ہو سکی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ عدنان کو ایک بحری جہاز پر بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے چنانچہ وہ اپنے پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات کے حصول کی کوشش میں لگا ہوا ہے اور اسی مصروفیت کے باعث آ نہیں سکا۔ جہاز کل روانہ ہوگا مگر عدنان جانے سے پہلے ملنے کے لیے ضرور آئے گا۔ عدنان کی ماں کی صورت پر میرے جھوٹ سے اطمینان اور مسرت کے جذبات جتنے نمایاں ہوتے جا رہے تھے میرا ذہنی کرب اتنا ہی بڑھ رہا تھا۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھی۔

"تم خود ملے تھے اس سے؟ خود اس نے تم سے کہا تھا کہ وہ ملنے کے لیے ضرور آئے گا؟ شاید خدا نے میری دعا سن لی ہے۔ وہ بڑی مصیبت سے بچ گیا۔ وہ نوکری کی تلاش میں تھا۔" پھر وہ مجھ سے مزید سوالات کرنے لگی۔ "اسے یہ نوکری تو پسند ہے نا؟ دور تو جانا ہی پڑتا ہے۔ اپنے فائدے کے لیے۔ اور وہ کون سا ہمیشہ کے لیے دور جا رہا ہے۔ کب تک آئے گا مجھ سے ملنے کے لیے؟"

میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا مگر میں جواب دیتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں چلنے لگا تو شہلا میرے ساتھ دروازے تک آئی۔

"یہ تم نے کیا نیا چکر چلا دیا ہے؟" وہ پریشانی سے بولی۔

"اس مسئلے کا یہی سب سے آسان حل تھا۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "آج یا کل، جس وقت بھی ماں سوئے تو اس کے جاگنے کے بعد کہہ دینا کہ عدنان آیا تھا اور بیٹھا رہا۔ مگر اس نے آپ کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"سکندر بھائی!" وہ میرے شانے پر سر رکھ کے رونے لگی۔ "یہ جھوٹ کب تک چلے گا؟ عدنان تو کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ ماں کب تک اس کا انتظار کرے گی؟"

یکلخت میں جذباتی ہو گیا۔ "تم نے مجھے بھائی کہا ہے نا شہلا! اس لیے کہ یہ رشتہ تمہارے لیے بہت مقدس تھا، تمہیں بہت عزیز تھا اور تم اس سہارے سے محروم ہو کے خود کو تنہا محسوس کرتی ہو۔ پاگل، مجھے دیکھو۔ میں تو شروع سے تنہا ہوں۔ میرے بھی بھائی بہن تھے اور میری بھی ویسی ہی ماں تھی جیسی سب کی ماں ہوتی ہے۔ ان سب رشتوں کو تقدیر کے بے رحم ہاتھوں نے ایک جھٹکے سے توڑ ڈالا۔ میرا باپ بہت باہمت تھا جس نے اس وطن کے لیے اتنی بڑی قربانی دی مگر حوصلہ نہیں ہارا۔ اس کے گھر کو اجاڑنے والے تو غیر تھے اور دشمن تھے مگر اس کو مارنے والے اپنے کہلاتے تھے۔ اب میں اکیلا ہوں مگر تم نے بہن کا رشتہ قائم کر کے میرے اس احساس کو ختم کر دیا ہے۔ اب ہم دونوں اکیلے نہیں کیونکہ میں سکندر نہیں بلکہ عدنان ہوں اور میرے ہوتے ہوئے

تمہیں فکر مند ہونے کی یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن میرے بھائی! مجھے بھی تو بتاؤ کہ ہم ماں کو کیسے دلاسہ دیں گے؟"

"وہ میں نے سوچ لیا ہے۔" میں نے شہلا کے آنسوؤں کو اس کے دوپٹے سے صاف کر دیا۔ "سمندر پار سے عدنان کے خطوط برابر آتے رہیں گے اور ان میں یہی ہوگا کہ وہ بالکل خیریت سے ہے اور خوش ہے۔ اور تم یہ خط پڑھ کے ماں کو سناتی رہو گی۔ کبھی کبھی وہ تمہارے لیے اور ماں کے لیے تحائف بھی بھیجے گا۔"

"یہ سب کیسے ہوگا بھیا؟" وہ نظریں جھکا کے بولی۔ "اب تو میری نوکری بھی نہیں رہی ہے۔"

"میری چھوٹی سی بہن!" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں سب کچھ کر لوں گا۔ بس مجھے تھوڑی سی مہلت چاہیے۔ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

باہر آ کے سڑک تک پیدل جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ سب کیسے ٹھیک ہوگا۔ شہلا اس گھر میں کیسے واپس جائے گی اور واپس نہیں جائے گی تو یہاں کب تک رہے گی؟ کیا بھائی کی حیثیت سے میں اپنی تمام ذمہ داریاں پوری کر سکوں گا؟ میں تو خود مسائل کے جال میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتا تھا اور میرے مسائل بہت بڑے تھے۔ انتہائی خطرناک تھے اور میرے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے۔ شکاری میری جان کے درپے تھے اور مجھے چن چن کر ہر شکاری کو شکار کرنا تھا یا خود شکار ہو جانا تھا۔ شکاری میرے لیے جال پھیلا رہے تھے اور میں خود کو بچاتا ہوا ہر شکاری کی تاک میں تھا۔ میری ایک غلطی، بلکہ ایک غلط قدم میری شکست کا سبب بن سکتے تھے لیکن یہ شکست صرف میری نہ ہوتی کیونکہ اس جنگ میں رابعہ بھی شریک تھی، محسن بھی شامل تھا، شہلا اور اس کی ماں بھی فریق بن گئی تھیں اور ایک لڑکی گل رخ بھی آ گئی تھی جسے میں نے دیکھا تک نہیں تھا اور جس کے بارے میں مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ وہ اپنے اسی چاہنے والے کسٹم افسر کے ساتھ شاد و آباد ہے یا اپنی غیرت کے ساتھ کسی بے نشان مدفن میں سو چکی ہے۔ مجھے سلامت شاہ، ڈوگر، غلام علی اور دوسرے بہت سے لوگ یاد آئے جو میری وجہ سے مارے گئے یا میرے ہاتھوں مارے گئے۔

ایک کیمسٹ کی دکان پر میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں اسکول کا نمبر تلاش کیا۔ ہیڈ مسٹریس اب بھی وہی تھی اور اسے گل رخ یاد تھی۔ "مجھے تو یاد آ ہی جاتی ہے۔ بہت پیاری بچی تھی۔" وہ بولی۔ "ملازمت چھوڑ دیں یا ٹرانسفر ہو جاتی ہیں اور کبھی لوٹ کر نہیں آتیں مگر گل رخ کی بات اور ہے۔ وہ اب بھی کینیڈا سے آتی ہے تو مجھ سے ضرور ملتی ہے۔"

"کینیڈا سے؟ کیا آج کل وہ کینیڈا میں ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں، شادی کے بعد وہ کینیڈا چلی گئی تھی۔ آپ کو نہیں معلوم؟"

"جی... در اصل میں خود کئی سال باہر رہا۔" میں نے کہا۔ "جس لڑکے سے اس کی شادی ہونے والی تھی، وہ کسٹم میں افسر تھا اور میرا دوست تھا۔"

"نعیم... تم نعیم کے دوست ہو؟" ہیڈ مسٹریس بولی۔ "اچھا اچھا۔ گل رخ کی شادی اسی سے ہوئی تھی مگر شادی سے پہلے نعیم نے کسٹم کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ شادی کے بعد وہ لندن چلے گئے تھے اور وہاں نعیم نے کوئی اسٹور وغیرہ کھول لیا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے سب بیچ دیا اور اچانک معلوم ہوا کہ وہ کینیڈا میں ہے۔ پتہ تو مجھے معلوم نہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اس کے گھر سے معلوم کر لوں گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔" ہیڈ مسٹریس نے خاصی دیر بعد کہا۔ "اس کا گھر بھی اب کہاں ہے! آئی ایم سوری کہ مجھے یہ سب بتانا پڑ رہا ہے۔ گل رخ کا باپ بہت نیک اور پرانی قسم کا خدا ترس انسان تھا۔ مولوی کہلاتا تھا۔ بیٹی کی شادی کے چند ماہ بعد بے چارے کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ ایک رات اس نے تیل چھڑک کر گھر میں آگ لگا دی۔ گل رخ کی ماں بھی اس حادثے میں جل کر مر گئی تھی۔ پڑوس کے ایک رہنے والے نے آگ لگنے سے پہلے گولیاں چلنے کی آوازیں سنی تھیں اور اسی نے یہ بیان پولیس کو بھی دیا تھا! غالباً پوسٹ مارٹم سے بھی یہ ثابت ہو گیا تھا کہ مولوی صاحب نے پہلے بیوی کو گولی ماری، پھر گھر کو آگ لگائی اور اپنے آپ کو بھی شوٹ کر لیا۔ اسی واردات کے بعد مجھے پتہ چلا تھا کہ نعیم اور گل رخ برطانیہ سے کینیڈا چلے گئے۔ میرا خیال ہے وہاں رہنے والے پاکستانی یا سفارت خانے والے ان کا پتہ چلانے میں تمہاری مدد کر سکیں گے۔"

"جی... وہ میں معلوم کر لوں گا۔ میں خود بھی کینیڈا جانے ہی والا تھا۔ تھینک یو۔" میں نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا اور فون کال کے پیسے دے کر دکان سے باہر آ گیا۔ واقعات کی کڑیاں آپس میں مل گئی تھیں اور میرا ذہن اندازوں کی بنیاد

پر کچھ نتائج اخذ کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ کسٹم آفیسر نعیم نے دباؤ کے تحت ملازمت سے دستبردار ہونا قبول کر لیا تھا اور گل رخ کے ساتھ لندن میں آباد ہو گیا تھا۔ شاید گل رخ کو معلوم بھی نہ ہو گا کہ جو لوگ اسے زبردستی گاڑی میں ڈال کر لے گئے تھے وہ کون تھے اور اسے کیوں لے گئے تھے صرف نعیم جانتا تھا کہ ان بدمعاشوں نے گل رخ کی تصویریں بھی اتاری تھیں۔ ان کی دھمکی کو نظر انداز کرنا واقعی مشکل تھا۔ وہ اس کی محبت چھین بھی سکتے تھے۔ ملازمت بھی اور شاید زندگی بھی۔ چنانچہ وہ گل رخ کو ساتھ لے کر بھاگ گیا۔ تاہم اسے معلوم ہو گا کہ بلیک میل کرنے والے اپنے وعدوں پر قائم نہیں رہتے اور کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ لندن پہنچ جانے کے بعد مناسب وقت کا انتظار کرتا رہا اور پھر خاموشی سے کینیڈا چلا گیا۔ ممکن ہے ڈی سلوا نے دوبارہ اس سے رابطہ قائم کیا ہو اور اس پر دباؤ ڈالا ہو کہ وہ ان کے لیے کام کرے ورنہ اس کی ازدواجی زندگی تباہ کر دی جائے گی اور اس دھمکی کے بعد نعیم نے روپوش ہو جانا بہتر سمجھا ہو گا۔ وہ لندن میں کسی کو بتا کر نہیں گیا ہو گا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ شاید اس نے مشہور کیا ہو گا کہ وہ واپس وطن جا رہے ہیں لیکن کینیڈا پہنچ گئے ہوں گے۔ سات سمندر پار دنیا میں صرف نام کی مدد سے کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ ڈی سلوا کے آدمی انہیں پاکستان میں ڈھونڈتے بیٹھے ہوں گے یا انہوں نے برطانیہ کے دوسرے شہروں میں تلاش کیا ہو گا اور انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔

ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے خیالات کا سلسلہ پھر جوڑا۔ نعیم اور گل رخ کے کیس میں سب سے افسوسناک پہلو گل رخ کے والدین کی ہلاکت کا تھا۔ کیا واقعی مولوی محبوب کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا؟ یہ معلوم کرنا مشکل نہیں تھا کہ دیوانگی کے آثار مولوی محبوب کی شخصیت میں پہلے سے نمایاں ہو چکے تھے یا وہ اچانک بالکل پاگل ہو گیا تھا۔ اگر وہ شروع سے خبطی یا جنونی قسم کا آدمی ہو گا تو یہ بات اس سے ملنے جلنے والے ضرور جانتے ہوں گے لیکن وہ متوازن ذہن کا مالک تھا تو دیوانگی کے اس دورے کا سبب کوئی ذہنی صدمہ ہی ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ڈی سلوا یا اس کے آدمی مولوی محبوب کے پاس پہنچے ہوں اور اس سے پوچھا ہو کہ تمہاری بیٹی اور داماد برطانیہ سے غائب ہو کر کہاں گئے ہیں؟ شاید مولوی محبوب کو بھی خبر نہ ہو گی کہ وہ روپوش ہو چکے ہیں۔ اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہو گا تو پتہ پوچھنے والوں نے سنگین نتائج کی دھمکی دی ہو گی اور اس سے بھی مقصد پورا نہ ہوا تو گل رخ کی یا نعیم کی تصویریں سامنے

سکھ دیکھی ہوں گی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے دیوانگی کا نام دے دیا گیا۔ مولوی محبوب جو اپنی دینداری اور نیکی کے لیے مشہور تھا بے حیائی اور بے غیرتی کے ان نمونوں کو دیکھ کر واقعی پاگل ہو سکتا تھا اور رسوائی کے تصور سے ڈر کے بیٹی اور بیوی کی زندگی کا خاتمہ اسی طرح کر سکتا تھا کہ گھر کی آگ میں جل مریں لیکن یہ بات ناقابل فہم تھی کہ اس طرح گھر کو آگ لگانے سے پہلے اس نے بیوی کو گولی کیوں ماری اور آگ لگانے کے بعد اپنے آپ کو شوٹ کیوں کیا؟ کیا اسے ڈر تھا کہ آگ میں جل کے راکھ ہونے سے پہلے ہی ان کو بچا لیا جائے گا اور وہ زندہ رہنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اہم سوال یہ ہے کہ مولوی کہلانے والے کسی انتہائی شریف آدمی کے پاس ریوالور کہاں سے آیا؟ اس ملک میں بغیر لائسنس کا ریوالور سیٹھ یا بدمعاش قسم کے لوگ رکھ سکتے ہیں اور لائسنس کے تحت صرف ضرورت مند۔ مولوی محبوب جیسا آدمی لائسنس لے سکتا تھا اور نہ بغیر لائسنس کا اسلحہ رکھ سکتا تھا۔ زیادہ امکان اسی بات کا نظر آتا تھا کہ تصویریں دیکھتے ہی مولوی محبوب کا دماغ الٹ گیا اور اس نے دھمکی دینے والوں کو جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی اور نتیجے میں خود مارا گیا۔ اس کی بیوی بھی شوہر کے قاتلوں کی گولی کا نشانہ بنی ہو گی۔ جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے گھر کو آگ لگا کے فرار ہو گئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ آگ سے جل جانے کے بعد لاشوں پر گولی کے زخم کیسے نظر آئیں گے۔ مگر فائرنگ کی آواز ایک پڑوسی نے سن لی۔ اس نے اپنے بیان میں بھی فائرنگ کا ذکر کیا تھا چنانچہ پولیس کے لیے پوسٹ مارٹم کرانا ضروری ہو گیا۔ شاید وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ اب بھی کہیں پرانے ریکارڈ سے نکل آئے یا پولیس کی رپورٹ اور ہمسائے کا بیان مل جائے۔ نعیم اور گل رخ کا پتہ بعد میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔ حمیدہ مسٹریس کو اتنا تو معلوم تھا کہ وہ کینیڈا میں ہیں اور کسی کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہو گا۔ حمیدہ مسٹریس کی باتوں سے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ گل رخ کینیڈا جانے کے بعد بھی پاکستان آئی تھی۔ اسے اپنے والدین کے المناک انجام کی خبر یقیناً ہو گی۔ غالباً نعیم نے اسے یہ بھی سمجھا دیا ہو گا کہ ڈی سلوا گینگ کے خوف سے اس نے ملازمت چھوڑی تھی جلا وطن ہونے پر مجبور ہو گیا تھا اور وہاں سے بھاگ کر کینیڈا میں آباد ہونے پر مجبور ہوا تھا۔ وہ اسی طرح آتے ہوں گے کہ کسی کو پتہ نہ چلے اور چند روز وطن میں گزار کے لوٹ گئے ہوں گے۔ ممکن ہے یہاں نعیم کے والدین یا بہن بھائی رہتے ہوں۔ میں نے ٹیکسی سے اترتے ہوئے سوچا اور اس کے ساتھ ہی

مجھے دوسرا خیال یہ بھی آیا کہ کہیں نعیم کے دورے کا مقصد ڈی سلوا کے خلاف انتقامی کارروائی کے مواقع تلاش کرنا تو نہیں تھا جو انتقام کی آگ میں تو وہ دونوں ایک ہی طرح جل رہے ہوں گے۔

میرفورڈ اینڈ کمپنی کے دفتر کی بالائی منزل پر قدم رکھتے ہوئے میں بہت پُراعتماد تھا۔ خالی ہاتھ ہونے کے باوجود کیونکہ اب میرے پاس حقائق تھے جن سے ڈی سلوا کے لیے مفر نہ تھا۔ اچانک میری نظر ٹیلی فون کے اس تار کو دیکھا جو زینے کی دیوار کے ساتھ ساتھ اوپر جا رہا تھا۔ ادھر اُدھر کسی کو نہ پا کے میں نے اپنا جیبی چاقو نکالا اور تار پر رگڑ دیا۔ سخت تار کے مقابلے میں یہ چاقو بہت چھوٹا تھا مگر تھوڑی سی قوت صرف کر کے میں تار کاٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ غور سے دیکھے بغیر تار کے کٹے ہوئے حصے کو تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ دونوں الگ ہو جانے والے ٹکڑے اسی طرح سیدھے اور آپس میں ملے ہوئے لگتے تھے۔ میں چاقو جیب میں رکھ ہی رہا تھا کہ بائیں طرف کا دروازہ کھلا اور ایک شخص نیچے جانے کے لیے اترا۔

"سکندر صاحب!" اس نے مجھے دیکھتے ہی حیرانی سے کہا اور مجھ سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "آپ یہاں کیسے؟" وہ پھر بولا کے سرگوشی میں بولا۔ "آپ کی تلاش میں تو پولیس یہاں آئی تھی۔"

"یہاں! کیا میں یہاں رہتا ہوں؟ یا یہاں کام کرتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔ ظاہر ہے اس کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ "خیر یہ بتاؤ کہ کس سلسلے میں آئی تھی پولیس؟"

"وہ... دراصل ڈی سلوا صاحب... ان کی ایک سیکرٹری ہوتی تھیں، مس شہلا زیدی۔" وہ سر کھجا کے بولا۔ "ان کے گھر پر کچھ ہنگامہ ہوا تھا۔ وہ خود بھی غائب ہیں اور ہمیں تو ڈی سلوا صاحب نے بتایا تھا کہ..."

"اچھا اچھا۔ ڈی سلوا صاحب نے بتایا تھا۔" میں نے کہا۔ "ان سے تو میں خود پوچھ لیتا ہوں۔ تم جاؤ۔"

وہ کیبن خالی پڑا تھا جہاں میں نے اس سے پہلے شہلا کو بیٹھے دیکھا تھا۔ فرض اور محبت کے تقاضوں سے مغلوب ایک بے وقوف لڑکی ڈی سلوا کی خاطر مجھ سے دشمنی پر آمادہ تھی جسے بہت نقصان اٹھانے کے بعد معلوم ہوا تھا کہ دشمن تو وہ تھا جس پر اس نے متاعِ دل و جاں نثار کر دی تھی۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا... میں نے ڈی سلوا کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بھی غالب کو یاد کیا اور ڈی سلوا کو فائل پر سے نظر اٹھا کر چونکتے ہوئے دیکھا۔ اس کا ہاتھ فوراً دراز کی طرف بڑھا اور رک گیا۔ اس نے میرے تیور دیکھ لیے تھے اور اندازہ کر لیا تھا کہ میں اسے جارحانہ کارروائی کی مہلت نہیں دوں گا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر ڈی سلوا۔" میں نے ہاتھ اٹھا کے صلح جویانہ انداز میں کہا۔ "میں صرف باتیں کرنے آیا ہوں اور باتیں ہی کروں گا۔ بشرطیکہ تمہیں بھی اس پر اعتراض نہ ہو۔"

"میں تم سے کسی قسم کی کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔" ڈی سلوا سپاٹ لہجے میں بولا۔

"ہاں۔ تم بھلا کیوں چاہو گے۔" میں نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مگر میں چاہتا ہوں کہ باتیں کروں اس لیے میں باتیں ضرور کروں گا اور اگر تم جواب نہیں دو گے تو تمہاری خاموشی کو اقرار سمجھ کے بولتا رہوں گا۔ دراصل بہ دستِ تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ مجھے وہ دوسرا کام بھی آتا ہے۔ لاتوں کے بھوت کو باتوں سے منوانا یا اس کے برعکس باتوں کے بھوت کو لاتوں سے قائل کرنا۔ مگر مجھے امید ہے کہ تم مجھے دوسرا طریقہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرو گے کیونکہ تم سمجھدار آدمی ہو۔ ضرورت سے بہت زیادہ سمجھدار۔" ڈی سلوا مجھے گھورتا رہا اور خاموشی سے میرے ہاتھوں کو میز کا سامان ہٹا کر ایک طرف کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی چیز حائل ہو۔ یہ صورت حفاظتی نوعیت کی تھی تاکہ ضرورت پڑنے پر میں ڈی سلوا کو فوراً قابو کر سکوں۔ "آج تمہارا یہ دفتر کچھ اجڑا اجڑا سا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہاری وہ جانِ بہار سیکرٹری نظر نہیں آ رہی ہے جس کے عکسِ جمال سے یہ انجمن روشن تھی۔ کیا نام تھا اس کا؟ شہلا زیدی۔ میں نے تو سنا ہے... دشمنوں کے کان بہرے... کہ وہ غائب ہو گئی ہے؟ جیسے گدھے کے سر سے محاورے کے مطابق سینگ۔ سینگ کے ساتھ گدھا کتنا خوبصورت لگتا ہوگا۔ اتنا ہی جتنا پہلے یہ دفتر لگتا تھا۔ خیر یہ بتاؤ تم نے اسے رکھا کہاں ہے؟ مجھے حیرانی ہے کہ تم جیسا آدمی اتنا قدامت پرست اور تنگ نظر شوہر ثابت ہوگا کہ شادی کے بعد بیوی کو ملازمت نہیں کرنے دے گا۔ تم تو اس کی خاطر مذہب تک بدل رہے تھے؟"

ڈی سلوا کا چہرہ سرخ پڑنے لگا تھا۔ "یہ بکواس شہلا نے بہت سے لوگوں کے سامنے کی تھی۔" وہ حقارت سے بولا۔ "لیکن میں نے اس سے شادی کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ مذہب بدلنے کا کیا سوال؟"

"ہاں مذہب بدلنے کا کیا سوال۔" میں نے اتفاق کیا۔ "مذہب کی بنیاد ہے انسانیت پر اور اس لیے تمہارا مذہب تم کہاں کر بدلو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ پولیس مجھے تلاش کرتی ہوئی یہاں آئی تھی؟"

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ شہلا کے گھر میں وہ تین آدمی کس طرح مارے گئے تھے۔"

"ہاں۔" میں نے قہقہہ مارا۔ "مگر یہ پولیس والے بے وقوف کچھ نہیں جانتے۔ خلاف یہ نہیں جانتے کہ میں ایس ایس پی رحمان رضوی کے گھر میں رہتا ہوں۔ وہ مجھے پوچھتے ہوئے یہاں آ گئے۔ ہے نا کمال کی بات۔ وہ ایک شخص تھا تمہارے جیسا افلاطون۔ اس کی سوئی گھر میں کھو گئی تھی مگر وہ باہر سڑک پر ڈھونڈ رہا تھا۔ کیونکہ گھر میں اندھیرا تھا۔ ویسے میں سوچتا ہوں اور تم میرے گھر میں اندھیرا ہے کہ میں نظر نہ آؤں۔ اندھیرا ان پولیس والوں کی کھوپڑی میں ہے۔ انہوں نے تم کو تو پریشان نہیں کیا؟ اس وقت تم نے بتائے تھے اور وہ بیچاری بھی تمہاری تھی؟"

"دیکھو میرے!" ڈی سلوا تیز لہجے میں بولا۔ "میں یہاں فارغ نہیں بیٹھا ہوں۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ اگر تم یہی فضول باتیں کر کے میرا وقت ضائع کرنے آئے ہو..."

"او آئی ایم سوری۔" میں نے پھر ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "میں بالکل بھول گیا تھا کہ تمہارا وقت قیمتی ہے حالانکہ یہ میرا وقت ہے اگر تم غور کرو۔ میں مالک ہوں اور تم ملازم۔ چنانچہ میں حکم دے سکتا ہوں کہ مسٹر مینیجر کام پہ لعنت بھیجو اور میری فضول بکواس کو غور سے سنو۔ مگر تم پھر وہی اعتراض اٹھاؤ گے کہ ابھی میں مالک نہیں بنا۔ اس لیے میں اصل بات پر آتا ہوں۔ مجھے تم سے ایک شخص کا پتہ معلوم کرنا تھا۔ وہ کچھ عرصہ پہلے کسٹم انسپکٹر تھا اور اس کا نام تھا نعیم۔"

بڑی تیزی سے ڈی سلوا نے اپنی صورت کے بدلتے رنگ پر قابو پایا۔ "تم غلط جگہ آ گئے ہو۔"

"کیسی لطیفے کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ میرے باپ کا دفتر ہے۔ پھر میرے لیے غلط جگہ کیسے ہو گئی؟"

"میرا مطلب تھا کہ تمہیں کسٹم آفس والوں سے رجوع کرنا چاہیے تھا۔"

میں نے دوبارہ سے نفی میں گردن ہلائی۔ "اوہو! نو مسٹر ڈی سلوا! کسٹم میں تو وہ بہت پہلے تھا۔ پھر اس نے نوکری چھوڑ دی تھی اور لندن چلا گیا تھا۔ اپنی بیوی گل رخ کے ساتھ۔ وہاں اس کا ایک اسٹور تھا۔"

"وہاٹ نان سینس۔" ڈی سلوا نے سنبھل جانے کے بعد پرسکون لہجے میں کہا۔ "اگر یہ سب کچھ تمہیں معلوم ہے تو مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ میں کسی نعیم کو نہیں جانتا۔ کسی گل رخ کو نہیں جانتا ہوں۔"

"وہاٹ نان سینس۔" میں نے بالکل ڈی سلوا کے لہجے میں دہرایا۔ "وہ مجھے لندن میں ملا تھا تو اس نے تمہارا ذکر کیا تھا۔"

"کیا ذکر کیا تھا؟" ڈی سلوا نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا لیکن وہ اپنے لہجے سے ظاہر ہونے والی تشویش کو نہ چھپا سکا۔

"ذکر یہی کہ تم سے اس کی دوستی تھی یا شناسائی تھی۔" میں نے گول مول جواب دیا۔ "میں نے بات کی تھی میرفورڈ اینڈ کمپنی کی اور اس نے تمہارا نام لیا۔ وہ کہتا تھا کہ تم گل رخ کی فیملی کو بھی جانتے ہو۔"

ڈی سلوا کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ "اس نے بکواس کی تھی۔"

"اچھا!" میں نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔ "تم مولوی محبوب کو نہیں جانتے جو وہ جو پاگل ہو کر گھر کو آگ لگانے کے بعد بیوی کے ساتھ جل مرا تھا؟ اور میں نے سنا ہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ..."

"شٹ اپ!" ڈی سلوا نے میز پر مکا مارا اور چیخ کر کہا "شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ ورنہ میں پولیس کو بلاتا ہوں۔"

"ضرور بلاؤ۔" میں نے ٹیلی فون اس کی طرف کھسکا دیا اور اپنے ظاہری سکون اور اطمینان میں فرق نہیں آنے دیا۔ "بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ تم دو جگہ سے پولیس کو طلب کرو۔ ایک تو انہیں جو مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئے تھے۔ دوسرے تھانے والوں کو بھی جن کے پاس مولوی محبوب اور اس کی بیوی کی پُراسرار موت کی رپورٹ ہے۔"

ڈی سلوا نے ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا کر دھڑ سے دے مارا۔ "تو یہ بات ہے؟"

"آہستہ مسٹر ڈی سلوا! ٹیلی فون ٹوٹ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ آفس کی ملکیت ہے تمہارے باپ کی نہیں..."

ابھی میرا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ ڈی سلوا نے ٹیلی فون اٹھا کر مجھ پر پھینکا۔ اس کا ہاتھ ریسیور پٹخنے کے بعد ٹیلی فون سے الگ ہوا ہی نہ تھا چنانچہ میں تیار تھا۔ میں نے ہاتھ مار کے ٹیلی فون کو ایک طرف گرا دیا۔ ٹیلی فون میرے پیچھے جا کر گرا اور شیشے کو توڑتا ہوا فرش پر گر کر ٹکڑے ہو گیا۔ ڈی سلوا نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر دراز کھینچی مگر میں نے لات مار کر اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ ہاتھ کو جھٹکا لگنے سے دراز باہر آ گری اور ریوالور جو کاغذات میں سب سے اوپر رکھا تھا اچھل کر ڈی سلوا کے پیروں کے پاس جا پڑا۔ ڈی سلوا کرسی سے ٹکرا کر سنبھل ہی رہا تھا کہ ریوالور کو اپنی دسترس میں دیکھ کر وہ

www.paksociety.com

تیزی سے جھکا۔ اس کا ہاتھ اور میرا پاؤں تقریباً ایک ساتھ ریوالور تک پہنچے۔ ڈی سلوا کا ہاتھ سیکنڈ کے دسویں حصے کے فرق سے پہلے پہنچا تھا۔ چنانچہ میرے جوتے کے نیچے آگیا اور میں نے اس پر اپنا پورا وزن ڈال دیا۔ میرے ہاتھوں نے اس کا دوسرا بازو جکڑ لیا۔ کرسی اور میز کے درمیان اس کی گردن اس طرح آگئی کہ ایک دوسرے پیر کا گھٹنا مارتا تو میز کے کنارے سے اس کی گردن ٹوٹ جاتی۔ چنانچہ میں نے اس کو جھٹکا دے کر اٹھایا اور کرسی میں فٹ کر دیا۔ ابھی تک ان آوازوں نے دفتر کے دوسرے حصے میں کام کرنے والوں کو متوجہ نہیں کیا تھا کیونکہ ہمارے درمیان دو کمروں کی پارٹیشن اور ایک ترتیب کی دو دیواریں حائل تھیں۔ اس کے علاوہ نیچے میڈان روڈ کی ٹریفک کا شور و غل تھا۔

"مسٹر ڈی سلوا! میں نے تمہیں خبردار کیا تھا۔" میں نے اسے حرکت کا موقع دیے بغیر کہا۔ "اور اب پھر خبردار کر رہا ہوں! میں بات کرنے آیا تھا۔ مجھے ہاتھ چلانے پر مجبور مت کرو۔ میں یہ بھی کر سکتا ہوں کہ ایک ہاتھ سے تمہارے ہوش رخصت کر دوں اور تمہارے کپڑے اتار کے تمہیں اس پنکھے سے الٹا لٹکا دوں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے ماتحت یہ تماشہ دیکھیں؟ تمہارے لیے یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہو گا کہ میں یہاں آیا تھا۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ تم مجھے اس دفتر سے نکلنے کی مہلت نہیں دو گے اور شور مچاؤ گے تو سارا عملہ اکٹھا کر لو گے۔ اس لیے میں جانے سے پہلے اپنی حفاظت کا بندوبست ضرور کروں گا۔ انتخاب میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ تم وہ طریقہ پسند کرو گے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا تھا؟ یا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میں تمہیں اس کرسی سے باندھ جاؤں اور تمہارا منہ بند کر جاؤں۔ تماشہ تو یہ بھی ہو گا مگر زیادہ برا نہیں۔ تم عقل مندی سے کام لو تو اس شخص کو خاموش بھی رکھ سکتے ہو جو تمہیں نجات دلانے آئے گا۔"

ظاہر ہے انتخاب اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ میں نے اسے باندھنے کے لیے ٹیلی فون کا تار استعمال کیا جو میز سے دیوار کے ساتھ ساتھ سیکرٹری کے کمرے میں سے گزرتا ہوا باہر کی طرف جا رہا تھا۔ ایک جھٹکے سے تار میرے ہاتھ میں آ گیا اور دوسرے جھٹکے میں دیوار کے آخری موڑ کے پاس سے ٹوٹ گیا۔ یہ تقریباً پانچ گز لمبا ٹکڑا تھا۔ میں نے ڈی سلوا کے دونوں ہاتھ کرسی کی پشت سے مضبوطی سے باندھے پھر اس کے دونوں پیروں کو ٹخنوں کے پاس سے موڑ کر کرسی کے گھومنے والے حصے کے پیچھے کیا اور باقی تار سے باندھ دیا۔ اس دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی ڈی سلوا کی طرف سے غافل نہیں رہا۔ خود بھی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ کر بھی سکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے مزاحمت کو خود ہی زیادہ دیر تک جاری رکھنے سے گریز کیا۔ میں نے اس کا منہ بند کرنے کے لیے اس کے منہ میں کاغذوں کی گڈی سی بنا کر دبا دی۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی ایسی چیز دستیاب نہ تھی۔ پھر میں نے اس کے منہ پر رومال باندھا۔ اس تمام کارروائی میں میرے پانچ منٹ ضرور صرف ہوئے ہوں گے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ عملے کا کوئی فرد مینیجر کے کمرے میں کوئی کام لے کر نہیں آیا۔

"گڈ بائی، ڈی سلوا!" میں نے اس کی جیب میں سے ... نکالتے ہوئے کہا۔ "ویسے گڈ لک۔ آج کی ملاقات سے تم نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ اب میں اتنا کمزور اور بے بس نہیں جتنا لندن سے ڈی پورٹ کیے جانے کے وقت تھا۔ اصل کمزوری اور بے بسی کا سبب میری لاعلمی تھی۔ آئندہ تک مجھے اور بہت سی ایسی باتیں معلوم ہو جائیں گی جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ مجھے کچھ اور ثبوت مل جائیں گے تو تم دیکھو گے کہ تمہارے لیے خطرات کا مفہوم ایک ہی ہو گا۔ پھر ایک وقت آئے گا جب تم کمبل کو چھوڑنا چاہو گے مگر کمبل تمہیں نہیں چھوڑے گا اور تمہارا کفن بن جائے گا۔ میری خوش فہمی نہیں ہے میرا ایمان ہے کہ جھوٹ کی رسی کو زیادہ دراز نہیں کرتا اور جیت بالآخر سچائی کی ہوتی ہے۔ قدرت کا یہ نظام انصاف نہ بدلا ہے اور نہ بدلے گا۔"

میں نے نیچے پڑے ہوئے ریوالور پر ڈی سلوا کا رومال ڈالا اور اسے نال کی طرف سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ پوری احتیاط سے میں نے ریوالور کو رومال سمیت ایک لفافے میں منتقل کیا۔ ڈی سلوا بے بسی سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے خوف اور پریشانی کے جذبات عیاں تھے مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں کمرے سے نکل کر اطمینان سے چلتا ہوا نیچے اتر گیا۔

ڈی سلوا جس کرسی سے بندھا ہوا تھا وہ بہت بھاری تھی لہٰذا وہ آزاد نہیں ہو سکتا تھا اور کرسی سمیت باہر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن یہ خطرہ اپنی جگہ موجود تھا کہ میرے اترتے ہی اس کا ماتحت اس کا نجات دہندہ بن کے آپہنچے۔ ڈی سلوا اسے حقیقت بتاتے یا کوئی کہانی سناتے بہرصورت اس کا میرا تعاقب میں آنا یقینی تھا کیونکہ میں اس کا ریوالور لے آیا تھا جس پر اس کے فنگر پرنٹ تھے۔ ادھر ادھر دیکھنے پر بھی کوئی سواری نظر نہ آئی۔ میں کیری ہوم ریسٹورنٹ میں سامنے سے اندر داخل ہو گیا جہاں لنچ کے وقفے کا رش تھا۔

کوئی جگہ خالی نہ تھی لیکن آخری حصے میں ایک میز پر صرف ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس سے اجازت لے کر میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ دروازے کی طرف میری پشت تھی چنانچہ کوئی بھی اندر آنے والا ایک نظر میں مجھے تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ تقریباً پونے گھنٹے بعد جب میں کھانے سے فارغ ہو چکا تھا اور ہاتھ دھونے کے لیے واش بیسن کی طرف جا رہا تھا تو میں نے ڈی سلوا کو چند فٹ کے فاصلے پر دوسری میز پر بیٹھے مصروف دیکھا اور صرف ایک بار ہماری نظریں چار ہوئیں۔ میرے ساتھ ہی وہ بھی اٹھا۔ میں نے ہاتھ دھونے کا ارادہ ترک کیا۔ بل کی ادائیگی کا مرحلہ ابھی باقی تھا اور میں انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں کاؤنٹر پر بل ادا کرنے جاتا تو منیجر اس ویٹر کو بلاتا جس نے مجھے سرو کیا تھا لیکن کاؤنٹر دروازے کے پاس تھا۔ وہاں ڈی سلوا مجھ سے پہلے پہنچ سکتا تھا۔ میں نے رخ کاؤنٹر کی طرف رکھا۔ چار قدم چلنے کے بعد جب میں نے دیکھا کہ ڈی سلوا زیادہ تیزی سے کاؤنٹر کا رخ کر رہا ہے تو میں اچانک پلٹا اور مخالف سمت میں چلنے لگا۔ اچانک میرے سامنے ویٹر آ گیا۔ میں نے جیب سے پچاس کا نوٹ نکالا اور اس ٹرے پر رکھ دیا جس میں وہ کسی اور کے لیے کھانا لے کر جا رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ بل پچیس روپے سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ باقی رقم میں نے ویٹر کو ٹپ کے طور پر بخش دی اور اسے ہکا بکا چھوڑ کے اس دروازے کی طرف گیا جو باورچی خانے میں کھلتا تھا۔ میرے آنکھ مارنے سے ویٹر سمجھ گیا تھا کہ میں نے اسے ٹپ نہیں رشوت دی ہے۔ ابھی تک کسی نے دوڑ نہیں لگائی تھی ورنہ بھگدڑ مچ جاتی۔ لیکن اس دروازے سے گزرتے ہی جس پر لکھا تھا "اندر آنا منع ہے" میں بھاگا۔ مجھے اپنے پیچھے بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ یقیناً ڈی سلوا میرے پیچھے دوڑا تھا۔ میں نے دو بیروں کو ڈاج کیا۔ ایک کو کھانے کی ٹرے اور برتنوں سمیت چت کیا اور کچن میں نمودار ہوا جہاں پتیلیوں اور دیگچیوں اور دوسرے برتنوں کی آوازوں کے علاوہ بیروں اور خانساماؤں کی چیخ و پکار کا ملا جلا شور تھا اور مختلف چولہوں پر پکتے ہوئے سب کھانوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ بہت کم لوگوں نے مجھے دیکھا مگر انہوں نے نظر انداز کر دیا۔ کچھ حیران بھی ہوئے مگر صرف ایک فرض شناس خانساماں کفگیر سائز چمچہ لے کر میری طرف لپکا۔ اس کو یقین تھا کہ میں بل ادا کیے بغیر فرار ہو رہا ہوں۔ اس نے مجھے کوئی گرز کی طرح گھما کر مارنا چاہا مگر میں جھکائی دے کر پچھلے دروازے سے نکل گیا۔ دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کر میں آ گیا۔ ایک رکشا والا سواری اتار کے پیچھے سے دیکھ رہا تھا کہ میں رکشا میں جا بیٹھا۔ حسب توقع اس نے بلا اجازت بیٹھنے کا برا منایا اور حسب معمول رشتے کرایہ کی بحث کی کوشش پر چل پڑا۔ ابھی میٹر میں کرایہ بدلا بھی نہیں تھا کہ میں نے روک لیا۔ گن کر ایک سو روپیہ میں پیچھے اس کے ہاتھ پہ رکھے جو واقعی اصل کرایہ سے دوگنے تھے مگر اس کی توقعات سے بہت کم تھے۔ وہ پانچ کے دس یا دس کے بیس لینے کی سوچ رہا تھا۔ اتنی ایمانداری سے اس کو دھوکا دے کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں اسے بڑبڑاتا چھوڑ کر سامنے سے گزرتی ہوئی بس میں بیٹھ گیا۔ رکشا ڈرائیور کے نکتۂ نظر سے میں نے پیسے بچائے لیکن درحقیقت میں نے سفر کا زیادہ محفوظ طریقہ اختیار کیا تھا۔

اب محسن کی واپسی تک مجھے کوئی کام نہ تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ شام سے پہلے لوٹ کر نہیں آئے گا۔ مجھے اس کی طرف سے تھوڑی سی تشویش بھی تھی کہ اسے اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی ہوتی۔ مگر میں انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ رابعہ کے ساتھ میں اس کے آفس گیا جہاں اس نے دو گھنٹے مصروف کیے۔ اس کے ماتحت جو نئے وکیل نوجوان تھے مگر ذہین تھے اور رابعہ کے ساتھ بہت مخلص تھے انہوں نے رابعہ کی عدم موجودگی میں بھی اپنا کام بڑی لگن اور محنت سے جاری رکھا تھا اور مقدمات کی پیروی میں کوئی خلل نہیں پڑا تھا۔ ان سب کو رابعہ سے دلی ہمدردی تھی کیونکہ وہ رابعہ کی دل سے عزت کرتے تھے۔ ان کی ٹیم اسپرٹ نے مجھے بہت متاثر کیا جس کی سربراہی رابعہ کرتی تھی۔ انہوں نے رابعہ کو یقین دلایا کہ وہ آفس کی طرف سے بے فکر رہے اور اپنے حالات کو سنبھالنے پر پوری توجہ دے۔ شام کے سائے پھیلنے لگے تھے جب میں اور رابعہ آفس سے نکلے۔ جیپ میں جا کے پیچھے بیٹھ گئے۔

"یہ تمہاری خوش قسمتی ہے۔" میں نے کہا۔ "کہ تمہارے ساتھ کام کرنے والے اتنے اچھے لوگ ہیں۔"

"ان حالات میں خوش قسمتی کا لفظ کتنا اجنبی لگتا ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر ایسے وقت میں میری پریکٹس کا بیڑہ غرق ہو جاتا تو آمدنی کے ذرائع بھی بند ہو جاتے۔ یہ لوگ واقعی اچھے ہیں اور ان کی ہمدردی بہت بڑا سہارا ہے۔ میری غیر حاضری میں ان لوگوں نے بیس ہزار روپے ادا کیے تھے جو انہوں نے میرے حوالے کر دیے۔"

"اس آمدنی میں سے تم ان لوگوں کی تنخواہ بھی ادا کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

www.paksociety.com

"نہیں۔ تنخواہ کا کوئی سوال ہی نہیں۔" رابعہ بولی۔ "پہلے میں نے ان کو معاوضے کی بنیاد پر ملازم رکھا تھا لیکن ان کے تعاون اور نیک نیتی کو دیکھتے ہوئے پارٹنر شپ پیش کی۔ آمدنی میں سے چالیس فیصد میرا اور باقی ساٹھ فیصد میں سے تینوں کا حصہ برابر ہے۔ اس میں سب کا فائدہ ہے۔ مجھے کبھی ماہانہ بیس ہزار سے کم نہیں ملے اور ان کو بھی دس دس ہزار ضرور ملے۔ الگ پریکٹس کر کے بھی یہ اتنا کما لیتے مگر بہت محنت کرنے کے بعد۔ ٹیم ورک میں کام آسان ہو جاتا ہے اور آمدنی بھی نسبتاً تیزی سے بڑھتی ہے۔" بات کرتے کرتے اچانک اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور براؤن پیپر کا ایک چپٹا سا لفافہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ "یہ رکھ لو۔ تمہیں ضرورت ہوگی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تم سے کس نے کہہ دیا کہ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے؟"

"سچ بتاؤں؟" وہ نظر جھکا کر بولی۔ "مجھ سے یہ بات میرے دل نے کہی ہے۔ کیا یہ غلط ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "دل کی بات غلط نہیں ہوتی لیکن میں اتنا سارا لے کر کیا کروں گا؟"

"جو تمہارا دل چاہے کرنا۔" وہ بولی۔ "میں تم سے حساب نہیں مانگوں گی۔"

"جانِ من!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "قرض تو قرض ہی ہوتا ہے۔"

"اگر تم نے قرض کا لفظ دوبارہ استعمال کیا تو میں ابھی واک آؤٹ کر جاؤں گی۔" وہ برہمی سے بولی۔

"اچھا بابا دھمکی مت دو۔" میں نے وہ پیکٹ اٹھا لیا۔ "لیکن ایک بات بتاؤں۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب تم اتنی فراخدل نہیں رہو گی اور میں نے ذرا بھی فضول خرچی کی تو بھوکے بھیڑیے کی طرح میرے پیچھے پڑ جاؤ گی۔"

وہ میرا مطلب فوراً سمجھ گئی کیونکہ اس کا رنگ غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں جیسا ہو گیا جن کا عکس افق کے کسی کنارے سے ایک شیشے میں جھلکنے لگا تھا۔

"تم سے ایک بات پوچھوں؟" میں نے کہا۔ "لیکن اندازہ کرنا تو ایک نازیبا حرکت ہے۔ تمہاری آمدنی معقول بھی ہے یہ بتاؤ کہ اب تک تم نے کتنا بچا لیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کیا تم اور کوئی گھر بنوا سکتی ہو؟ ہو سکے تو اس گھر کو اب چھوڑ جاؤ۔ ماضی کی یادیں پُرعذاب ہوں تو ان کو ذہن سے خارج کر دینا ہی اچھا ہے۔ وہ زمین بہت مہنگی ہے اس کو فروخت کر کے تم آدھی قیمت پر کسی ماڈرن علاقے میں اتنی ہی جگہ حاصل کر سکتی ہو۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن کسی ماڈرن علاقے میں بھی میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔"

"تم اپنے ساتھ ماسی کو رکھ سکتی ہو۔" میں نے مشورہ دیا۔ "جب تک میرے حالات درست نہیں ہوتے۔"

"شہلا بھی اسی طرح رہتی تھی۔" رابعہ بولی۔ "ماڈرن علاقے کے ماڈرن لوگ اسے نہیں بچا سکے۔ اس سے بہتر ہے کہ میں کسی پرانی آبادی میں کوئی پرانا مکان خرید لوں جہاں ہر طرف حقوقِ ہمسائیگی کو سمجھنے والے وضع دار لوگ رہتے ہوں۔ اس عمارت کے ایک حصے میں خود رہوں اور باقی حصے کرائے پر اٹھا دوں۔ کسی بھی شریف فیملی کے ساتھ میں زیادہ محفوظ رہوں گی۔ بہت ضروری ہوا تو میں ایک ڈرائیور رکھ لوں گی جو ڈیوٹی بھی دے اور چوکیداری بھی کرے۔ جو کمرے اس کو بھی دے اور رہنے کے لیے جگہ بھی۔ میں خود بھی زیادہ [illegible] تک صاحب نقوی صاحب کی مہمان بن کے رہنا نہیں [illegible]"

"جو کچھ تم نے سوچا ہے بہت مناسب ہے۔" [illegible] چٹکی بجا کر ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ "مسئلہ رہ جاتا ہے کار کا۔ وہ بھی وہاں زیادہ عرصے نہیں رہ سکتی اور مجھے ڈر ہے کبھی نہ کبھی دشمن اس کا سراغ لگا لیں گے۔"

"دشمن تو کبھی نہ کبھی سب کا سراغ لگا لیں گے۔ کار کا رُخ کا یا میرا؟" وہ مسکرا کر بولی۔ "تمہیں صرف اتنی فکر کیوں ہے کہ وہ کہاں رہے گی؟"

"تمہیں معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن آج تم نے یہ ذمہ داری بھی قبول کر لی ہے اور عمران کی جگہ لے لی۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم اتنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا سکو گے؟"

"میں اکیلا کہاں ہوں؟ میرے ساتھ میری جان بھی ہے، میرا دوست محسن ہے۔" میں نے کہا۔ "اور تم ہو جو میرا ایمان ہے۔ آؤ اب چلیں۔"

جب ہم کلب پہنچے تو اندھیرا ہونے لگا تھا اور کمروں میں روشنی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ محسن [illegible] میں کچھ فاصلے پر رُک گیا اور میں نے لفافے میں سے [illegible] نکالا جو رومال میں لپٹا ہوا تھا۔ "اسے احتیاط سے [illegible] میں رکھ لو۔ اس کے چیمبر میں دو گولیاں کم ہیں اور [illegible] کے اعتبار سے یہ ویسا ہی ریوالور ہے جیسا حمزہ اور [illegible] مگر اس پر ڈی سلوا کے فنگر پرنٹس ہیں۔ [illegible] گھر میں کسی جگہ پر ڈال دے گا جہاں سے اسے فوراً برآمد کیا جا سکے۔ اس رومال کے ایک کونے پر ڈی ایس کے حروف ڈی سلوا کے خلاف ایک اور شہادت فراہم کریں گے۔ رومال کو بھی گھر میں ہی ڈالا جا سکتا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے محسن نے یہاں شہلا کو لانے کی حماقت نہیں کی ہوگی اور اسی کو گھر چھوڑ کے شہلا کی اصل ماں کو یہاں لے آیا ہوگا۔ تم وکیل ہو اور ذہین ہو اس لیے پورے اعتماد کے ساتھ اندر جا سکتی ہو۔ اگر پولیس ابھی تک موجود ہوئی تو تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ تم کہہ سکتی ہو کہ میرا شہلا کے گھر آنا جانا تھا اور ان کے خاندان پر نازل ہونے والی مصیبت کی خبر پڑھ کے تم خیریت بھی معلوم کرنے آئی ہو اور قانونی امداد کی خاطر بھی۔ پولیس والوں کو اندر بلا کر ریوالور اور رومال دونوں دکھا دینا اور انہیں جتا دینا کہ وہ خاک تفتیش کرتے ہیں۔ یہ چیزیں انہوں نے کیوں نہیں دیکھیں؟ اور اب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ فنگر پرنٹ ضائع ہو جائیں۔"

"میں سمجھ گئی۔" رابعہ نے کہا۔ "اب تم یہاں انتظار کرو لیکن احتیاط کے ساتھ۔ [illegible] مشتبہ حالت میں کھڑا ہوا دیکھ کر ہمارے آنے سے پہلے ہی پکڑ کر نہ لے جائیں۔"

میں آہستہ سے ہنسا اور اسے دروازے کی طرف بڑھتا ہوا دیکھتا رہا۔ دور میں سے ایک گیٹ لائٹ جل رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک پولیس والے کو گیٹ سے باہر آتے اور رابعہ سے باتیں کرتے دیکھا پھر رابعہ اندر چلی گئی اور گیٹ بند ہو گیا۔ میں اس چھوٹی سی سڑک پر اکیلا ٹہلتا رہا اور ہر پانچ منٹ کے بعد گھڑی کے روشن ڈائل کو دیکھتا رہا۔ میں سڑک سے دور درختوں کے پیچھے تھا جہاں اندھیرا اور گہرا تھا۔ سڑک پر سے گزرنے والے اکا دکا راہگیروں نے اس طرف دیکھا بھی نہیں۔ جب بھی کوئی کار نمودار ہوتی تھی میں درخت کے تنے کی آڑ میں ہو جاتا تھا۔ ایک گاڑی اس کوٹھی سے بھی نکلی جہاں سے میں نے فون کیا تھا اور جب وہ میرے سامنے سے گزری تو میں نے کھڑکی میں سے ایک جھلک اس نوجوان کی دیکھی جس نے مجھے فون کرنے کی اجازت دی تھی۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتا تو میرے لیے مصیبت کا باعث بن جاتا۔ انتظار کا عذاب کتنا سخت ہوتا ہے، اس کا تجربہ مجھے کئی بار ہو چکا تھا لیکن سابقہ تجربات میں انتظار کے ساتھ اشتیاق ہوتا تھا، اضطراب ہوتا تھا یا تجسس ہوتا تھا لیکن خوف کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اندیشے نہیں ہوتے تھے اور خطرات کی یہ سنسنی خیزی نہیں ہوتی تھی جو ہر لمحہ بڑھ جاتی ہے۔ پھر ایک موٹر سائیکل آ کے رکی اور ایک پولیس انسپکٹر اندر چلا گیا۔

میں نے طے کیا کہ انسپکٹر کے آنے کے بعد بھی رابعہ اور محسن کو ضابطے کی کارروائی کے مطابق بیان دینے اور ریوالور اور رومال اس کے حوالے کرنے میں کم سے کم بیس منٹ ضرور لگیں گے۔ خدا کرے وہ اپنی ذہانت سے کام لیتے ہوئے انسپکٹر کو یقین دلا سکیں کہ دونوں چیزیں انہوں نے اتفاقیہ دریافت کی ہیں اور اسے یہ شک نہ ہو کہ ڈی سلوا کو ملوث کرنے کی نیت سے دونوں چیزوں کو وہاں لا کر ڈالا گیا ہے۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ میں نے ایک شخص کو دروازے کے سامنے رک کر چند سیکنڈ بعد پھر روانہ ہوتے دیکھا۔ بظاہر یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ یہ گھر گزشتہ چند دن میں غیر معمولی ہنگامہ آرائی کے باعث سب کی توجہ کا مرکز رہا تھا۔ پاس پڑوس میں رہنے والا کوئی بھی شخص دروازے پر کھڑی ہوئی موٹر سائیکل کو دیکھ کر تجسس میں مبتلا ہو سکتا تھا لیکن میں نے اس شخص کو پچاس قدم کے فاصلے سے واپس آتے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھر دروازے کے سامنے سے گزرا اور اس مرتبہ رکنے کے بجائے اس نے گیٹ کے اوپر سے جھانکنے کی کوشش کی۔ وہ گھر کے اندر کے حصے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اگر وہ سپاہی موجود ہوتا جس نے رابعہ کے لیے دروازہ کھولا تھا تو اس شخص کو اتنی مہلت نہ دیتا مگر معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے افسر اعلیٰ کو تفتیش میں مدد دینے کی خاطر اندر چلا گیا تھا۔ میں غور سے اس شخص کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اچانک وہ گیٹ پر چڑھا اور اندر اتر گیا۔

بریف کیس کو وہیں چھوڑ کر میں دروازے کی طرف بڑھا۔ میرے اور گیٹ کے درمیان چالیس قدم کا فاصلہ ضرور تھا مگر میں نے یہ فاصلہ آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں طے کیا۔ جب میں نے اوپر سے جھانکا تو وہ شخص کہیں نہ تھا۔ پھر میں نے اسے ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر دوسرے درخت کی اوٹ میں جاتے دیکھا۔ وہ خود کو چھپاتا ہوا گھر کے قریب ہونے لگا تھا۔ پلک جھپکتے میں خود میں بھی گیٹ پر سے اندر اتر گیا۔ میں گیٹ کے اس طرف تھا جدھر لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا سا تھا۔ لوہے کے گیٹ پر میرے چڑھنے اور اترنے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی۔ میں اندر اترتے ہی فرش پر لیٹ گیا تھا۔ اس شخص نے جو پلٹ کر گیٹ کی طرف دیکھا تو اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اب اس شخص کے سامنے لان کے کنارے پر بنی ہوئی مشکل سے دو فٹ اونچی جھاڑیوں کی مہندی کی دیوار تھی جس کے پیچھے میں پناہ گزین تھا اور جو گیٹ

www.paksociety.com

سے شروع ہو کے پورچ تک جاتی تھی۔ وہ درخت کے پیچھے سے نکلا اور ان جھاڑیوں کے دامن میں لیٹ گیا۔ اس کی نگاہ گھر کی طرف تھی چنانچہ میں آہستہ سے اٹھا اور کوئی آہٹ کیے بغیر پہلے درخت کے پیچھے پہنچ گیا۔ دوسرا درخت مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔ پورچ کی لائٹ لان پر پڑ رہی تھی مگر وہ شخص سرسبز و ہموار تراشی ہوئی جھاڑیوں کے سائے میں لیٹا ہوا اندھیرے کا ایک جزو لگ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر گیٹ کی طرف دیکھا اور مطمئن ہو گیا کہ اسے دیکھنے والا کوئی نہیں۔

میں دوسرے درخت کی آڑ تک اس کے بہت قریب جا پہنچا۔ اب مجھے اس کی صورت تو صاف نظر نہیں آ رہی تھی مگر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ جسمانی طور پر خاصا صحت مند اور دراز قد آدمی ہے۔ اس نے گہرے رنگ کی قمیص شلوار پہن رکھی تھی۔ لباس کے رنگ کا اندازہ بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا اس شخص کے پاس خنجر یا ریوالور کی موجودگی کا اندازہ کرنا مگر اتنا یقینی تھا کہ وہ کمزور حریف نہیں ہے اور شاید جسمانی طور پر مجھ سے بہتر قد و قامت اور زیادہ وزن کا مالک تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ خالی ہاتھوں سے مقابلہ کرنے کا اہل ہو۔ میں نے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا۔ میں بہت آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا اور بالکل صحیح فاصلے سے اس کے اوپر جا پڑا۔ اس کے حلق سے آواز بھی نہ نکل پائی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبایا تھا اور وہ خود میرے بدن کے نیچے حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ میرے دوسرے ہاتھ کے وار نے اس کو ہوش سے بیگانہ کر دیا اور وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے اس کو وہیں سیدھا لٹا کے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کی شلوار کے نیفے میں سے ایک کمانی دار خنجر برآمد ہوا۔ اس کی جیب میں دو سو بیس روپے تھے اور ایک کنگھی مگر ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے اس کی شناخت ہو سکتی۔

اب میں نے بھی وہیں لیٹ کر انتظار کرنا بہتر سمجھا۔ دس منٹ بعد انسپکٹر اندر سے باہر آیا۔

"معلوم نہیں آپ لوگ پولیس میں سب کو اتنا نااہل کیوں سمجھتے ہیں۔" اس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"اگر تم غیر معمولی طور پر ذہین ہو تو خود کو اس لہجے سے مستثنیٰ سمجھو۔" رابعہ نے کہا۔ "برا ماننے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ بھی تو بہت عقلمند اور تجربہ کار لوگ سمجھے جاتے ہوں گے جن کو اس واردات کی تفتیش پر مامور کیا گیا تھا... اور ان کا ریکارڈ یقیناً اچھا ہوگا مگر ثبوت تمہارے سامنے ہے کہ انہوں نے اپنی عقل اور اپنے تجربے سے کیا تیر مارا تھا؟"

انسپکٹر نے اس بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا اور ماتحت کو کوئی ہدایت دینے کی تاکید کرتا ہوا گیٹ سے نکل گیا۔ توقع چند منٹ کے بعد کانسٹیبل بھی اپنے افسر کو سیلوٹ کر کے رخصت کرنے کے لیے گیٹ سے باہر گیا۔ یہی وقت تھا جب ہم اپنے قیدی کو اندر لے جا سکتے تھے۔ رابعہ اور محسن پورچ میں کھڑے تھے۔ رابعہ کی سرخ ٹاکس کار گیٹ پر پورچ تک آ گئی تھی۔ میں نے جھکے سے سیٹی بجائی اور محسن کو اِدھر دیکھا۔

"اِدھر توجہ چشم!" میں نے اٹھ کے ہاتھ ہلایا اور اپنی طرف متوجہ کیا۔ "جلدی۔"

دو منٹ میں محسن کی مدد سے میں نے اس بھاری شخص کو اندر منتقل کر دیا۔ اس کا وزن دو سو پونڈ سے زیادہ ہی تھا۔ مجھے اس شخص کے ساتھ چھوڑ کے رابعہ اور محسن نکل گئے۔ میں نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ یہ ڈرائنگ روم تھا جس میں ایک ہی بیڈ شیٹ کیمپ روشن تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس انسپکٹر نے اپنی تمام کارروائی دوسرے کمرے میں پوری کی۔ یہ دوسرا کمرہ شہلا کی ماں کا بیڈ روم ہو سکتا تھا یا پھر شہلا کا کمرہ تھا کیونکہ گھر میں ملازم نہیں تھے۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ اس اجنبی کو باندھنے کے لیے پرانا طریقہ اختیار کروں یعنی ایک پردہ پھاڑوں۔ ابھی اس کے ہوش میں آنے کا فوری خطرہ نہیں تھا۔ کمرے کی آرائش کو خراب کرنا غیر ضروری تھا۔ لیکن اندر سے کوئی بھی رسی وغیرہ تلاش کی جا سکتی تھی۔ مجھے محسن کی آواز آئی۔ وہ کانسٹیبل کو ہدایات دے رہا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ چائے پینے نکل جائے یا سو جائے اور کوئی اندر آ گھسے۔ جواب میں کانسٹیبل نے کہا کہ اندر کیا لینے آئے گا۔ پھر چائے اور کھانے کا مسئلہ حل ہو جائے۔ وہ گیٹ پر بیٹھ کر گزارا کر سکتا ہے۔ اس کا مقصد صاف ظاہر تھا چنانچہ رابعہ نے کہا کہ کھانے کا انتظام تو مشکل ہے مگر اسے چائے کے ساتھ بسکٹ بھیجنے کے لیے کچھ بھیجا جا سکتا ہے۔ یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی کیونکہ اب کانسٹیبل کے اندر آنے کا امکان نہیں رہا تھا۔

میں نے اس شخص کو صوفے پر ڈال دیا تھا اور ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی صورت کبھی کہیں دیکھی ہے یا نہیں۔ محسن اور رابعہ ایک ساتھ آئے تو میں نے مختصراً بتایا کہ میں نے اس شخص کو کیسے گرفتار کیا تھا۔

"اس کی صورت دیکھ کر تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔" محسن نے کہا۔

"ظاہر ہے ہمیں اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"یہ ضروری تو نہیں کہ ہوش میں آنے کے بعد یہ تمہارے ہر سوال کا جواب شرافت سے دے دے۔" محسن بولا۔

"شرافت سے تو شریف آدمی ہی جواب دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور یہ شخص مجھے کسی زاویے سے شریف نہیں لگتا۔ ہمیں اس کو بات کرنے پر مجبور کرنے کے لیے غیر شریفانہ طریقے ہی اختیار کرنے ہوں گے۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس گھر میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ اندر ایک بیمار اور مفلوج عورت لیٹی ہوئی ہے اور باہر قانون کا محافظ کھڑا ہے۔ اگر اس نے چیخ پکار مچائی تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

"یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر اس کو یہاں سے جانا پڑا تو پھر وہی مسئلہ پیدا ہوگا۔ پہلے تو رابعہ کی کوٹھی تھی۔ اب وہ بھی نہیں ہے۔ عاصی کے گھر میں بھی کام نہیں ہو سکتا۔ وہ انتہائی گنجان آباد محلہ ہے۔ ہمارا اپنا کمرہ بڑی مناسب جگہ تھی بشرطیکہ ساتھ والے کمرے میں کانسٹیبل نہ ہوتا جس کے ساتھ ہمارے مخلصانہ مراسم کشیدہ ہیں۔"

"میرا آفس اس وقت خالی ہوگا۔" رابعہ نے پہلی بار دخل دیا۔ "بلکہ وہ عمارت ہی تقریباً خالی ہوگی کیونکہ اس میں زیادہ تر دفاتر ہیں۔ ہوں گے تو دو چوکیدار ہوں گے مگر وہ مجھے پہچانتے ہیں۔"

"یہ تجویز قابل عمل ہے۔" میں نے کہا۔ "اب ہم یہ سوچتے ہیں کہ اس شخص کو یہاں سے نکال کر وہاں کیسے لے جائیں۔ تم اتنی دیر میں باورچی خانہ تلاش کرو۔ دیکھو کہ بھاری اور سنتری بہادر کی خاطر مدارت کا کیا انتظام ہو سکتا ہے۔"

میری اپنی سرگزشت میں کوئی اہم بات نہیں تھی چنانچہ میں نے محسن سے پوچھا کہ اس کا مشن کیسا رہا اور ایک صوفے پر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"میرا مشن بے حد کامیاب رہا۔" اس نے دوسرے صوفے پر بیٹھ کر پاؤں میز پر پھیلا دیے۔ "چوہدری ولایت نے مجھے پہچانا تھا اور نہ شہلا کی ماں کو۔ اسے یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ شہلا ہمارے ساتھ نہیں ہے مگر چوہدری ولایت برداشت کر رہا ہے۔ ہماری آمد سے وہ پریشان ضرور ہوا ہوگا مگر اس نے اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

ہم نے بھی یہ ظاہر کیا کہ ہمیں تمام حالات کا علم نہیں۔ میں اسے ایک طرف لے گیا اور اس کو بتایا کہ رشتے میں میں شہلا کا ایک کزن ہوں اور میں اس کی ماں کو چند دن کے لیے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ تین دن بعد ہم راولپنڈی سے واپس آئے اور گھر پہنچے تو گیٹ پر کھڑے ہوئے کانسٹیبل نے ہمیں اندر جانے سے روک دیا اور صرف اتنا بتایا کہ کوٹھی میں قتل کی واردات ہوئی ہے۔ ہم پولیس اسٹیشن گئے اور وہاں سے ہسپتال۔ ہسپتال والوں نے بتایا کہ عدنان کی لاش اس کے گھر والے لے گئے ہیں۔ چنانچہ ہم ادھر آ گئے ہیں۔ چوہدری ولایت کو یقین تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ ڈی سلوا کی زبانی اس کو معلوم ہوا ہوگا کہ قتل کی رات گھر میں کون کون موجود تھا۔ ڈی سلوا نے بتایا ہوگا کہ شہلا اور اس کی ماں کے علاوہ گھر میں سکندر اور رابعہ بھی موجود تھے۔ میرا بیان غلط تھا مگر چوہدری ولایت اسے غلط کیسے کہتا۔ وہ خود بھی تو غلط بیانی کر کے عدنان کی لاش لے گیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ شہلا کہاں ہے اور میں نے انجان بن کر کہا کہ یہ تو مجھے آپ سے پوچھنا تھا۔ آپ بھی تو کسی رشتے سے شہلا کے چچا ہیں۔ چوہدری ولایت بہت عیار اور مکار شخص ہے۔ اس نے کہا کہ شہلا کے والد سے انتہائی قریبی و دوستانہ مراسم کے باعث شہلا بچپن میں اسے چچا کہتی تھی۔ اسی خیال سے وہ ہسپتال پہنچا تھا کہ شہلا کی خیریت معلوم کرے۔ مگر معلوم ہوا کہ شہلا کا کوئی پتہ نہیں چنانچہ وہ لاش اپنے گھر لے آیا۔ اس نے پولیس اسٹیشن سے بھی رابطہ قائم کیا تھا اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ گھر پر کوئی نہیں ہے اور وہ سمجھا تھا کہ شہلا اپنی نابینا ماں کو لے کر کہیں روپوش ہو گئی ہے۔ چوہدری ولایت یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ میں اس مفلوج عورت کو شہلا کی ماں اور خود کو اس کا کزن ثابت کروں۔ ماں کے بارے میں اسے یقین آ گیا تھا کہ حقیقی ماں ہے کیونکہ وہ بالکل نابینا و معذور عورت کی طرح پڑی رہی تھی۔ میں نے چوہدری ولایت کو سمجھایا کہ عدنان کے قتل کی خبر شہلا کی ماں کے ذہن پر بھی اثر انداز ہوئی ہے چنانچہ اب وہ زبان تک بھی نہیں ہلا سکتی۔ اس سے ولایت کو یقیناً تھوڑا سا اطمینان حاصل ہوا ہوگا کہ شہلا کی ماں اس کے دعوے کی نفی نہیں کر سکتی اور یہ نہیں کہہ سکتی کہ چوہدری ولایت کبھی شہلا کے باپ کا دوست نہیں رہا تھا۔ مجبوراً اس نے یہ جھوٹ تسلیم کیا کہ شہلا کی ماں تین دن بعد راولپنڈی سے لوٹی ہے اور میرے ساتھ شہلا کی گمشدگی پر تشویش میں شریک ہو رہا ہے۔ پولیس والے بھی تھے لیکن وہ شہلا کی ماں سے یعنی عاصی سے

www.paksociety.com

کیا پوچھتے جو بالکل بول نہیں سکتی تھی؟ اسے اندر پہنچا دیا گیا تھا جہاں وہ بڑی ہمت سے بستر پہ سیدھی لیٹی رہی اور چھت کو گھورتی رہی۔ یہ واقعی قابلِ تعریف بات ہے کہ ان حالات میں ماسی کا نروس بریک ڈاؤن نہیں ہوا حالانکہ وہ خاصی عمر کی عورت ہے اور اتنی زیادہ چالاک بھی نہیں لگتی لیکن اس کے اعصاب واقعی مضبوط ہیں۔ پولیس والوں نے مجھ سے کچھ سوالات ضرور کیے لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکے۔ میں نے اپنا نام غلط اور پتہ درست بتایا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ میرے والد راولپنڈی کے بہت بڑے اور مشہور ڈاکٹر ہیں۔ اس کے بعد چوہدری ولاور کو مقتول کے چچا کا رول ادا کرنا پڑا اور عدنان کی تدفین کا تمام انتظام اطمینان بخش طریقے پہ ہو گیا۔ چوہدری ولاور کے گھر میں صرف مرد رہ گئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیوی بچوں کو اس نے کہیں بھیج دیا تھا تاکہ وہ اس لڑکے کو دیکھ کر حیران پریشان نہ ہوں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ڈی سلوا وہاں دکھائی نہیں دیا حالانکہ یہ اسکیم اسی نے بنائی ہوگی جو فیل ہو گئی۔ ان کا مقصد شہلا کو پکڑنا تھا۔ شہلا تو ہاتھ آئی نہیں۔ اس کے بھائی کے کفن دفن کی ذمہ داری خواہ مخواہ چوہدری ولاور کو قبول کرنی پڑی۔ اس نے ٹیلی فون پہ ڈی سلوا کو گالیاں دی ہوں تو کچھ عجب نہیں۔"

"اگر اس نے بارہ بجے کے بعد فون کیا ہوگا تو لائن کٹنے پر اس کو مزید کوفت ہوئی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "اور اگر ٹیلیفون آ جاتا بھی تو میں ریسیو کرتا کیونکہ دو بجے تک میں وہاں موجود تھا لیکن میں نے اندر جانے سے پہلے لائن کاٹ دی تھی۔ پوری بات میں بعد میں بتاؤں گا، پہلے تو بتاؤ کہ بعد میں کیا ہوا؟"

"بعد میں کیا ہونا تھا۔" محسن بولا۔ "سب کچھ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوا۔ چوہدری ولاور نے پاس پڑوس کے لوگوں کو جمع کیا اور ایک گاڑی کا انتظام کیا جس میں میت کو میانی صاحب کے قبرستان لے جایا گیا۔ پیچھے صرف ایک نوکر رہ گیا تھا۔ جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا، ماسی نے کمبل ہٹایا اور فرار ہو گئی۔ معلوم نہیں چوہدری ولاور نے اسے واپسی پر غفلت کی کیا سزا دی ہوگی۔ میں بھی قبرستان تک ساتھ تھا اور نمازِ جنازہ میں بھی شریک تھا مگر جب میت کو لحد میں اتارا جا رہا تھا تو مجھے بڑا اچھا موقع مل گیا۔ چند قدم کے فاصلے پہ دوسری قبر کے لیے ایک اور جنازہ لایا گیا جس کے ساتھ سو ڈیڑھ سو آدمی تھے اور وہ ہمارے ساتھ مل گئے۔ میں اس بھیڑ میں گم ہو گیا اور باہر نکل آیا۔ ڈی سلوا قبرستان کے دروازے پہ اپنی گاڑی میں موجود تھا۔ وہ یقیناً چوہدری ولاور کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا لیکن اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ بعد میں دونوں کو شدت سے اپنے بیوقوف بننے کا احساس ہوا ہوگا۔"

اس دوران میں رابعہ چائے لے کر آ گئی تھی۔ گو کہ ہم آدھی ڈبل روٹی کھا چکے تھے اور کچھ انڈے۔ اس نے آملیٹ کر کے ڈبل روٹی اور چائے دروازے پہ کانسٹیبل کو پہنچا دی تھی جسے یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کوٹھی میں کیک، بسکٹ، نمکین یا پھل سب کچھ ہوگا۔ ایک کانسٹیبل اگر کلرک کی معمولی سی کوٹھی میں [illegible] زندگی کا کیسے تصور کر سکتا ہے۔ جتنی دیر میں کھانا ختم ہوا، رابعہ نے محسن سے وہ بات پھر سے پوچھی جو [illegible] تھا اور محسن کو سنانی پڑی۔ اس کی روداد ختم ہونے [illegible] میں نے اس اجنبی شخص کو باندھا، لپیٹا اور اچھی طرح [illegible] کر کے اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ سنتری دروازے [illegible] بیٹھا آدھی ڈبل روٹی مع آملیٹ کے ساتھ نگلنے [illegible] تھا۔ میں نے رابعہ کی گاڑی کا دروازہ کھولا اور [illegible] کو آگے اور پیچھے کی سیٹوں کے درمیان فرش پہ ڈال [illegible] پھر میں گیٹ کی طرف گیا۔

"کیوں بھئی! کھانا کھا لیا پیٹ بھر کے؟" میں نے [illegible] خوش دلی سے پوچھا۔

"کھانا کہاں تھا صاحب جی! ناشتہ تھا۔" وہ [illegible] سے بولا۔

"چلو گزارا تو ہو گیا۔" میں نے ترس کھاتے ہوئے [illegible] "ویسے بڑے افسوس کی بات ہے کہ پولیس والوں کو [illegible] سمجھا جاتا۔ ڈیوٹی پہ کھڑا کر دیتے ہیں اور کھانے پینے کا [illegible] پوچھتے۔" میرے ہمدردانہ لہجے اور ہمدردانہ رویے [illegible] متاثر ہوا اور اس کا ذہن شکوک کا شکار نہیں ہوا ورنہ وہ پوچھ سکتا تھا کہ جناب آپ کون ہیں اور کب تشریف لائے؟ میں کوٹھی کے اندر سے آیا تھا تو ظاہر ہے گھر کا ہی آدمی [illegible] بلاوجہ کیوں الزام اسی پہ آتا تھا کہ اس کی غفلت کے [illegible] کوئی تیسرا شخص اندر کیسے پہنچ گیا۔ اس نے فرض کر لیا [illegible] جب گاڑی اندر گئی تھی تو اس میں دو مرد تھے [illegible] تھیں۔ یا اس نے کچھ سوچنے کی زحمت ہی گوارا [illegible] ہوگی۔

دس منٹ بعد ہم نے گاڑی کو بیک کیا۔ جیسے رابعہ [illegible] رہی تھی اور گاڑی گیٹ کی طرف بڑھی۔ سنتری اپنی [illegible] رہا اور دروازہ کھولنے کے بجائے گاڑی کی طرف آیا۔

"صاحب کا آرڈر ہے کہ کوئی بھی آئے اسے روک لو۔" وہ بولا۔

"ہاں۔ ہمارے جانے کے بعد کوئی بھی آئے تو اسے یہیں روک لو۔" رابعہ نے کہا۔ "ہم سب دروازوں کو لاک کر کے جا رہے ہیں۔ کوئی زبردستی گھسنا چاہے تو اسے گولی مار دو۔ پیار اور ہے؟"

سنتری نے ادھر ادھر دیکھا اور جواب دینے سے گریز کیا کیونکہ اس کے پاس ریوالور کی جگہ وہی دقیانوسی بھاری بھرکم رائفل تھی جس کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ ضرورت پڑنے پہ فائر کرے گی یا نہیں اور کرے گی تو گولی آگے سے نکلے گی یا پیچھے سے۔ مزید یہ کہ وہ آنے جانے کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ آرڈر تھا آنے والوں کے لیے لیکن ہم تو جا رہے تھے چنانچہ اس نے دروازہ کھول دینا بہتر سمجھا۔ گھر والوں کو صاحب دیکھ چکا تھا اور اس نے جاتے وقت یہ نہیں کہا تھا کہ ان کو بھی گھر میں قید رکھا۔ پھر اس کی کیا ذمہ داری؟

گاڑی ابھی باہر نکلی ہی تھی کہ میں نے رابعہ کو رک جانے کے لیے کہا۔ پھر میں نیچے اتر کر درخت تک گیا اور اس کے پیچھے رکھا ہوا بریف کیس اٹھا لایا۔

شہلا کی ماں بدستور بےہوشی کی حالت میں تھی۔ شہلا نے اسے خواب آور گولیاں دے دی تھیں ورنہ وہ اس کارروائی میں دخل اندازی کرتی۔ عدنان نے بارے میں سوالات کرتی یا وہ گفتگو سن لیتی جو رابعہ، محسن اور پولیس انسپکٹر کے درمیان ہوئی تھی۔ شاید خود انسپکٹر اسے ہوش میں دیکھتا تو اس سے کچھ پوچھتا اور ہمارا جھوٹ کھل جاتا جو ہم نے عدنان کے بارے میں بولا تھا۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اتنے بڑے جھوٹ کے بعد وہ اتنے بڑے سچ کا صدمہ برداشت کر سکتی۔ محسن نے انسپکٹر سے بھی یہی کہا تھا جو چوہدری ولاور نے کہا تھا۔ شہلا کی ماں سوتے میں اپنے گھر تک جا پہنچی تھی اگر اس کی نیند ٹوٹی ہوگی تو اس نے سمجھا ہوگا کہ وہ خواب دیکھ رہی ہے اور پھر سو گئی ہوگی۔ ہم نے طے کیا کہ اسے واپس شہلا کے پاس پہنچا دیا جائے اور وہاں سے ہم رابعہ کے آفس جائیں۔ یہ بڑا ضروری تھا چنانچہ ڈرائیونگ میں نے سنبھال لی۔ رابعہ کی شکستہ حالت کو کسی دشمن کی کارکردگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کے اندر کو پانی کی ضرورت بھی نہ پڑی تھی اور فول میں کوئی کمی ہو رہی تھی کہ پٹرول ٹینک اب بھی آدھے سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ ہم نے شہلا سے کہا کہ کوئی بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہم واپسی میں سب کچھ بتائیں گے۔ فی الحال وہ مطمئن رہے کہ سب خیریت ہے اور کسی بات کی فکر نہ کرے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم رابعہ کے آفس پہنچے۔ رابعہ اوپر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد محسن کار سے اتر کے بلڈنگ کے دروازے تک پہنچا اور اس نے چوکیدار سے رابعہ کے آفس کا پتہ پوچھا۔ چوکیدار اسے اپنے ہمراہ لے گیا۔ موقع پاتے ہی میں نے چادر میں لپٹے ہوئے اس شخص کو کندھے پہ ڈالا اور خود بھی اندر داخل ہو گیا۔ حسبِ توقع عمارت کی اندرونی منزل اس وقت ویران تھی۔ میں زینے کے نیچے کی خالی جگہ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار نیچے اترا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ میں زینے کے نیچے سے نکلا اور کوئی آہٹ کیے بغیر اوپر چڑھ گیا۔ وہ سو پونڈ کے آدمی کا بوجھ تھا کہ اتنی احتیاط کے ساتھ چڑھنا آسان کام نہیں تھا۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ اوپر سے کوئی نہ آ جائے۔ رابعہ کا آفس گراؤنڈ فلور کے اوپر تھا اور مجھے اس فلور پہ ہر جگہ روشنی نظر آ رہی تھی۔ سب سے اوپر والی منزل پہ بھی کچھ لوگ دفتر کھولے بیٹھے تھے یا رہائش پذیر تھے۔ پانچ منٹ کے اس وقفے میں میری ملاقات کسی سے نہیں ہوئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور رابعہ کے آفس میں پہنچتے ہی دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ آفس کے دو حصے تھے۔ باہر کے حصے میں موکلوں کے لیے ویٹنگ روم بنایا گیا تھا۔ یہ حصہ کچھ چھوٹا تھا۔ اس میں قالین پہ دو صوفہ سیٹ تھے اور ایک سینٹر ٹیبل پر اخبار اور رسالے پڑے ہوئے تھے۔ اندر والے حصے کو پھر دو حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ رابعہ کا آفس ویٹنگ روم سے بڑا، لکڑی اور شیشے کی پارٹیشن سے بنا ہوا کمرہ تھا۔ پارٹیشن کے دوسری جانب والا حصہ ہال نما تھا جس میں تین وکیلوں کے کیبن ایک طرف تھے اور درمیان میں کلریکل عملے کی میزیں تھیں۔ ٹائپ رائٹر، فائل کیبنٹ اور الماریاں تھیں جو چاروں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ بنائی گئی تھیں۔ الماریوں کے شفاف شیشے والے خانوں کے پیچھے قانونی ضابطوں، حوالوں اور پی ایل ڈی جیسی ضخیم کتابیں [illegible] نظر آتی تھیں۔ میں نے اپنے بوجھ کو رابعہ کے آفس میں پہنچ کر [illegible] اور اسے صوفے پہ ڈال کے ایک گہری سانس لی۔

"مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ!" میں نے کہا۔ "ویسے تو آپ بھی ہر غیر قانونی کارروائی میں ہمارے ساتھ شامل رہی ہیں لیکن ایک تو آپ جانتی ہیں کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اپنے دفاع کے لیے کرتے ہیں اور ضابطوں کی کارروائی سے

www.paksociety.com

بچنے کے لیے کر رہے ہیں۔ ہمارا مقصد قانون شکنی نہیں ہے تاہم جو کچھ ہم نے کیا اسے غیر قانونی ہی کہا جائے گا۔"

"اہل مقید کی اس وقت کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟" رابعہ نے کہا۔ "صاف بات کیوں نہیں کرتے؟"

"صاف بات یہ ہے بی بی کہ ہمیں اس شخص سے کچھ پوچھنا ہے۔" میں نے کہا۔ "زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا اور ہمیں وہ طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جسے تھرڈ ڈگری کہا جاتا ہے۔ تم اپنی مرضی سے موجود رہنا چاہو تو تمہاری مرضی ورنہ تمہیں وہ مناظر دیکھنے پڑیں گے جنہیں دیکھ کر عام طور پر خواتین بے ہوش ہونا پسند کرتی ہیں۔"

رابعہ کا رنگ اڑ گیا۔ "کیا یہ ضروری ہے؟ ممکن ہے یہ شخص ویسے ہی کچھ بتا دے۔"

"حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ شخص محض آلۂ کار ہے۔ اگر اس کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اپنے مشن میں ناکام رہا ہے اور ہمارے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تب بھی اس کی جان بچنی مشکل ہے۔ اس کی حیثیت ہی کیا کہ یہ خود اپنی زبان سے اعتراف جرم کرے اور ان کے بارے میں کچھ بتائے جنہوں نے اس کو بھیجا ہے۔ یہ خود بھی جانتا ہے کہ افشائے راز کی قیمت اسے اپنی جان دے کر ادا کرنی پڑے گی۔ ہم اسے پولیس کے حوالے بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں ہم نے جمیلہ اور اس کی ماں کی زندگی بچانے کے لیے جو کوشش کی تھی وہ رائیگاں جاتی اور ہمارے لیے اپنی پوزیشن کی وضاحت مشکل ہو جاتی۔ تم جانتی ہو کہ قانون کے محافظ تمہاری حفاظت کرنے میں کس طرح ناکام رہے تھے۔ ہمارے مقابل وہ لوگ ہیں جو قانون اور پولیس کو کچھ نہیں سمجھتے۔ اگر ہم نے قانون سے مدد لی تو جمیلہ یا اس کی ماں کی زندگی کی ضمانت کوئی نہیں دے سکے گا۔ اگر کچھ کر سکتے ہیں تو ہم خود۔ تمہاری پوزیشن بہت عجیب ہے کیونکہ تم وکیل بھی ہو اور عورت بھی۔ ایک طرف تمہارے پیشے کے تقاضے ہیں تو دوسری طرف زندگی کے رشتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ضمیر پر کوئی بوجھ ہو یا تمہاری دوستی تمہارے لیے عذاب بن جائے۔"

"اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔" رابعہ بولی۔ "اب میں تمہارے ساتھ ہوں اور میرے ذہن میں کوئی کشمکش نہیں۔ شاید اس لیے کہ مجھے تمہاری نیت پر اعتبار ہے۔ عملی زندگی میں قانون کی بے بسی کا تماشہ میں نے تم سے زیادہ دیکھا ہے اور خود بھی تماشہ بن چکی ہوں۔ تم خود بھی تسلیم کرتے ہو کہ میں ایک عورت ہوں۔ کیا مجھے ایک عام عورت کی طرح دشمنوں سے انتقام لینے کا حق بھی حاصل نہیں؟ میں منطقی دلائل سے اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتی۔ اگر کبھی وہ لوگ میرے سامنے آ جائیں جنہوں نے میرا گھر تباہ کیا تو میں انہیں اپنے ہاتھ سے شوٹ کر دوں۔ میرے بیٹے اور شوہر کا میں انصاف حاصل کرنے کے لیے انہیں عدالت میں لے جاؤں اور پھر بے بسی سے دیکھتی رہوں کہ ثبوت اور شہادت نہ ہونے کے باعث وہ بری ہو جائیں۔ میں تمہیں کس طرح روکوں جبکہ میں جانتی ہوں کہ تمہارے جذبات کی شدت اور حدت کہیں زیادہ ہے اور تم مجھ سے زیادہ مظلوم ہو۔"

میں نے اور محسن نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اس شخص کی طرف جو ہوش میں آنے لگا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھوں اور پیروں کو آزاد کیا لیکن اس کے منہ میں ٹھونسا ہوا کپڑا نہیں نکالا۔ اس نے ابھی آنکھیں کھولیں اور اس کی نظروں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ میں بالکل اس کے سر پر سوار کھڑا تھا کہ اگر وہ کوئی بھی جارحانہ حرکت کرے تو اس کو روک دوں لیکن وہ سہما ہوا اور خوف زدہ تھا۔

"اگر تم مقابلہ کرنا چاہتے ہو تو بتا دو۔" میں نے اس سے کہا۔ "ایک تجربہ تو تمہیں ہو چکا ہے۔"

اس شخص نے نفی میں سر ہلایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے منہ کا کپڑا نکالنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کی آنکھیں سوال کر رہی تھیں کہ ہم اس کے ساتھ اب کیا سلوک کریں گے۔

"اگر تم خاموش رہنے کا وعدہ کرو تو تمہیں اجازت دی جا سکتی ہے کہ یہ کپڑا منہ سے نکال لو۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس بات کا خیال رکھنا اگر تم نے غلط حرکت کی کوشش کی تو میں گولی مار دوں گا۔ میرا ہاتھ کبھی غلط حرکت نہیں کرے گا اور تمہارے حلق سے ذرا بھی آواز نکلی تو وہ تمہاری آخری آواز ہوگی۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور آہستہ آہستہ اپنے منہ سے کپڑے کو یوں نکالنے لگا جیسے اسٹیج پر شعبدہ باز منہ سے رومال نکالتے ہیں۔ پھر اس نے اطمینان سے ایک گہرا سانس لیا۔

"تم لوگ کون ہو؟" وہ بولا۔ "پولیس کے آدمی ہو؟"

میں نے اور محسن نے صرف ایک لمحے کے لیے نظروں ہی نظروں میں تبادلہ خیالات کیا۔ کیا یہ مکاری ہے؟

اتنا ڈرا ہوا کیوں ہے اور کیا واقعی ہمیں نہیں پہچانتا ہے؟ اگر پولیس کا ڈر کیوں ہے؟

"ہم اپنے بارے میں بعد میں بتائیں گے۔" محسن نے کہا۔ "تم بتاؤ کہ اس گھر میں تمہیں کس نے بھیجا تھا؟"

"مجھے ... کسی نے ... کسی نے بھی نہیں۔" اس نے بمشکل تمام تھوک نگل کر حلق تر کیا۔ "میں خود گیا تھا۔"

"کیوں؟" میں نے کہا۔ "چوری کرنے یا ڈاکا ڈالنے؟ کون ہو آخر تم؟"

"میں ... میں ٹیڈی ہوں۔ یہ میرا نام نہیں ہے مگر میرا نام کوئی نہیں لیتا۔ استاد ٹیڈی کہتے ہیں سب۔" وہ بولا۔

"ہم نے بہت سے استاد دیکھے ہیں اور استادوں کے استاد دیکھے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم کس قسم کے استاد ہو؟"

"وہ ... وہ اپنا یار تھا ... جوڈی ...!" وہ بولا۔ "میں اس کی بہن سے ملنے گیا تھا۔"

"جوڈی کون؟" میں نے کہا۔ "وہاں کسی جوڈی کی بہن نہیں رہتی۔ جھوٹ بولو گے تو ..."

"قسم مولا کی۔" وہ بے اختیار چیخ پڑا۔ "ہم اسے جوڈی کہتے تھے۔ ہم لوگ ایسے ہی نام دیتے ہیں سب کو۔ اس کا نام مہتاب تھا۔ جب وہ آیا تھا تو خود کو مسٹر زیدی کہتا تھا۔ لوگ بہت ہنستے کہ مسٹر زیدی کیا ہوا بھلا، جوڈی چلے گا۔ میرا نام بھی علی رضا تھا۔ پہلے ٹیڈی ہوا۔ اب استاد ٹیڈی ہوں۔ جوڈی بھی دو چار سال میں استاد جوڈی ہو جاتا۔"

ان ناموں کے ساتھ ہی میرے ذہن میں استاد پیڈرو کا خیال آیا تھا۔ یہ اس دنیا کے باسی تھے جہاں اصل نام سے زیادہ ان کی عرفیت مشہور ہو جاتی ہے اور وہ اسی پر فخر کرتے ہیں۔ میں، رابعہ اور محسن اس کی باتوں پر یقین کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔ اس کا لہجہ ہی اس کی صداقت کا گواہ تھا۔ اسے اپنے یار کی موت کا صدمہ تھا۔

"تم مہتاب کے دوست تھے؟" میں نے کہا۔ "اس کی بہن کے پاس تعزیت کے لیے گئے تھے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "جوڈی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی ماں اپاہج ہے اور بہن نوکری کرتی ہے۔ میں ایک دن پہلے بھی گیا تھا لیکن وہاں کوئی واردات ہوئی تھی۔ ادھر ادھر رہنے والوں نے مجھے بتایا کہ بدمعاشوں نے حملہ کیا تھا اور اس کی بہن کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ میں نے ان کی تصویریں اخبار میں دیکھی تھیں۔ قسم مولا کی۔ وہ یوں نہ مرتے تو آج تک استاد ٹیڈی کے ہاتھوں مارے جا چکے ہوتے۔ میں دوبارہ گیا تھا اور دروازے پر موٹر سائیکل کھڑی دیکھی تو اندر چلا گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا ان کا کوئی اور ساتھی گھر میں گھسا ہے۔ روشنی دیکھ کر مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ جوڈی کی بہن واپس نہ آ گئی ہو۔"

"یہ شک تمہیں کیوں ہوا تھا کہ مہتاب کی بہن واپس آ گئی ہوگی۔ اغوا کرنے والے تو کسی پر رحم نہیں کھاتے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو ہے۔ مگر ... مگر میں نے سوچا ممکن ہے وہ گھر سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہو۔" وہ بولا۔ "حملہ کرنے والے تینوں ایسے لوگ نہیں تھے۔ میرا مطلب ہے اغوا قسم کی واردات میں انہوں نے کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔ اکیلی عورتوں کو اٹھا کر لے جانے کو بدمعاشی کون کہتا ہے۔ وہ بدمعاش تو تھے مگر بے غیرت نہیں تھے اور بزدل بھی نہیں تھے۔ میں جانتا ہوں۔"

"گویا بدمعاش بھی غیرت مند ہوتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "کیا وہ کسی گروہ کے آدمی تھے؟"

"کسی خاص گروہ کے نہیں تھے۔ کبھی ایک کے ساتھ ہو جاتے تھے کبھی دوسرے کے ساتھ۔ وہ تو سگے بھائی تھے۔" وہ بولا۔

"اچھا آج کل وہ کس کے ساتھ تھے؟" میں نے پوچھا۔ محسن اور رابعہ بیٹھے ہوئے تھے مگر میں اب بھی کھڑا تھا۔

"آج کل؟ میں نے کچھ سنا نہیں۔" وہ سوچ کر بولا۔ "لیکن میں معلوم کر لیتا۔"

"تم نے استاد پیڈرو کا نام سنا ہوگا؟" میں نے کہا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ صورت حال یکلخت بدل گئی تھی۔ وہ دشمن کے کیمپ کا نہیں ہمارا طرفدار ثابت ہوا تھا۔

"استاد پیڈرو کا نام تو سارا جہان جانتا ہے۔ قسم مولا علی کی، کیا بدمعاش شخص تھا۔"

"تھا کا کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔ "کیا بدمعاشی چھوڑ دی ہے اس نے؟" محسن بولا۔

"نہیں۔ وہ مارا گیا تھا۔" ٹیڈی نے ہماری کم علمی پر افسوس سے ہمیں دیکھا۔ "پولیس سے مقابلے میں۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔ "کب کی بات ہے؟"

"سال بھر سے اوپر کی۔" وہ بولا۔ "ادھر قصور سے آگے بارڈر کراس کر رہا تھا کہ دونوں طرف سے فائرنگ ہو گئی۔ معلوم نہیں کس کی گولی لگی تھی۔ اس کا ایک ساتھی پکڑا گیا تھا مگر اس نے حوالات میں خودکشی کر لی۔ دوسرا نکل گیا تھا۔"

"تم ان سب کو پہچان سکتے ہو؟" میں نے کچھ دیر بعد

www.paksociety.com

کیا؟ میرا مطلب ہے اگر تمہیں استاد پیڈرو کی تصویر دکھائی جائے یا اس ساتھی کی جو فرار ہوگیا تھا۔ کیا نام تھے ان کے۔ حلیہ سے کچھ ذہن میں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "صرف تو پیڈرو ہی تھا۔ باقی دو گمنام لوگ تھے۔ ابھی مشہور نہیں ہوسکے تھے، لیکن میں استاد پیڈرو کو پہچان سکتا ہوں۔ اس کا حلیہ بھی بتا سکتا ہوں۔" پھر اس نے یادداشت کی مدد سے جو حلیہ بتایا اسے میں نے بہت غور سے سنا۔ یہ استاد پیڈرو کا حلیہ نہیں تھا مگر ہوسکتا تھا۔ اگر وہ استاد پیڈرو جس کے بارے میں مشہور کردیا گیا تھا کہ وہ پولیس سے مقابلے میں مارا گیا، اپنی مونچھیں صاف کرلے، بال چھوٹے کرالے اور ان کا رنگ بدل لے، کانوں میں مُندریاں پہن لے تو جسامت، قد و قامت اور وزن کے مطابق وہی استاد پیڈرو بن سکتا تھا جس کا ہم سے واسطہ پڑ رہا تھا۔ ہم سب کے خیالات کی سمت ایک ہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ پولیس کے مقابلے تو فرضی بھی ہوتے ہیں۔ اگر اس صورت حال کو مختلف زاویے سے دیکھا جائے، مثلاً کیا یہ ممکن نہیں کہ استاد پیڈرو روپوش ہوگیا۔ پھر اس نے کسی وجہ سے سامنے آنا مناسب نہیں سمجھا لیکن در پردہ کام کرتا رہا۔ مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک بدمعاش کے بارے میں بدمعاشوں کو بھی خبر نہ ہو۔ اس کا وہ ساتھی جو بچ نکلا تھا کیا وہ چوہدری ولاور ہوسکتا ہے؟

"اچھا استاد ٹیڈی! ہم تمہیں بعد میں دو چار چہرے دکھائیں گے۔" محسن نے کہا۔ "ابھی تو تم یہ بتاؤ کہ عذران کیسے مارا گیا تھا؟"

"سیدھا کھیل رہا تھا۔ کسی کو شک ہوگیا کہ وہ پتے بانٹ کر رہا ہے۔" ٹیڈی بولا۔

"کسی کو؟ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ مارنے والا کون تھا؟" میں نے کہا۔ "تم خود کو استاد کہتے ہو اور عذران کے دوست بھی ہو؟"

"مجھے سب معلوم ہے۔" وہ طنز کے اس دوسرے وار پر مشتعل ہوکے بولا۔ "مگر وہ بدمعاش چھپا ہوا ہے۔ قسمو مولا علی کی، وہ پولیس سے بچ سکتا ہے۔ استاد ٹیڈی کے خنجر سے نہیں بچ سکتا۔"

"گویا تمہیں قاتل کے بارے میں تو معلوم ہوچکا ہے مگر تم کسی کو بتانا نہیں چاہتے۔ پولیس کو بھی نہیں؟" رابعہ بولی۔

"پولیس کیا کرے گی۔ اپنے یار کا بدلہ ہم خود لیں گے۔ انصاف ہم خود کریں گے جی۔" وہ بولا۔ "آپ کچھ لیں نا۔"

"تم یہ بات ہمارے سامنے کررہے ہو۔ اگر ہم تمہیں گرفتار کرلیں۔ بہ فرض کرو ہم پولیس والے ہوتے؟" میں نے کہا۔

"آپ لوگ پولیس والے نہیں ہیں۔" وہ بولا۔ "پولیس والے تو ہم سے اس طرح بات نہیں کرتے اور میں نے کیا جرم کیا ہے کہ آپ لوگ مجھے پولیس کے حوالے کرلیں گے۔ قسمو مولا علی کی، وہ میری زبان سے اس کا نام نہیں اگلوا سکتے جس سے میرے یار کے خون کا بدلہ لینا ہے۔ وہ خود بچے باز ہے سالا… کبھی بچے بازی نہیں کی تھی۔ یہ سب جانتے ہیں۔"

"تم عذران کی بہن کو پہچانتے ہو؟" میں نے کہا اور رابعہ کی طرف دیکھا۔

ٹیڈی دھوکا کھا گیا۔ "آپ… جو آپ اس کی باجی…" وہ حیرت سے منہ کھول کے بولا۔ اس کے بچپن… [illegible]

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں بھئی! میں تو ایک… وکیل ہوں۔"

ٹیڈی کا چہرہ بجھ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ "… اس گھر میں… آپ ڈی سلوا صاحب ہیں؟" اسے… کچھ یاد آگیا۔

"اچھا! تو تمہیں یہ بھی معلوم ہے؟" میں نے کہا۔ "… سلوا میں نہیں ہوں، مگر تمہیں یہ نام کس نے بتایا ہے؟"

"محمود… چوہدری نے کہا تھا… کہ اس کی بہن کی… ہونے والی ہے… اور یہ ڈی سلوا صاحب بہت… ہے اور بہت اچھا آدمی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ مسلمان… جائے گا۔ میں نے اسے بھی دیکھا نہیں ہے۔"

"اچھا استاد ٹیڈی! اب تم نے ہمیں مطمئن کردیا…" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "تمہیں ہم سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہم تمہارے خلاف کچھ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ہمارا خیال ہے کہ تم ہمارے کام آسکتے ہو۔"

"آپ لوگوں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا…" وہ مشتبہ لہجے میں بولا۔ "ان کے سوا" اس نے رابعہ کی طرف دیکھا۔

"ہم اپنے بارے میں تفصیل سے تو…" میں نے کہا۔ "ابھی صرف یہ سمجھ لو کہ میرا نام سکندر بخت ہے۔ یہ میرا دوست ہے۔ اس کا نام ہے محسن اور یہ رابعہ قانون کی وکیل ہیں۔ بہت بڑی اور اچھی… یہ… سہیلی ہیں۔ میں ان کے ساتھ وہاں گیا تھا اور… تھا کہ تم انہی بدمعاشوں کے ساتھی ہو۔ اس غلط فہمی کی… سے تمہارے ساتھ تھوڑی سی زیادتی ہوگئی۔ … کی تلافی کردیتے ہیں۔ ہم تمہیں ایک اچھی خبر… لیکن شرط یہ ہے کہ بات تمہارے سوا کسی کو معلوم نہیں ہونی چاہیے۔ تمہارے دوست کی بہن اغوا نہیں ہوئی ہے۔ اسے چھپا رکھا ہے۔ ہمیں بروقت معلوم ہوگیا تھا کہ کچھ… اس کے گھر پر حملہ کرنے والے ہیں۔ ہم اسے اور اس کی ماں… نکال لے گئے تھے۔"

"کون بدمعاش ہیں وہ؟ قسم مولا علی کی نام بتادیں مجھے…" … وہ بیٹا کر… بولا۔ درحقیقت وہ اتنا بڑا بدمعاش نہیں تھا جتنا بڑا خود کو ظاہر کرتا تھا لیکن وہ ہمارے لیے بہتر مخبر بن سکتا تھا اور ہمارا ایجنٹ بن کے دشمن کی صفوں میں شامل ہوسکتا تھا۔ اس کی بدمعاشی تو میں نے ایک وار میں ختم کردی تھی اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ خود کو منوا پانے کے وہ کتنا قد کا تھا۔ پہلے وہ ہمیں پولیس کا آدمی سمجھ کے خوفزدہ ہوگیا تھا اور اب کہہ رہا تھا کہ… اس میں اتنی جرأت بھی نہ رہی تھی کہ اپنی… ہاتھ جا کے وہ رومال ہی نکال لیتا جو ہم نے اس کے منہ میں ٹھونس رکھا تھا اور اس نے دھمکی سے ڈر کے فوراً… بھی کرلیا تھا کہ وہ کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا۔ جب اس نے… کیا خطرے کی کوئی بات نہیں تو اب بڑھ چڑھ کے بولنے لگا تھا۔ تاہم وہ اپنے دوست کی موت کے معاملے میں سخت جذباتی ہو رہا تھا۔ قاتل بھی کوئی چھوٹا موٹا بدمعاش ہی تھا کہ… نام ہوگیا تھا۔ شاید استاد ٹیڈی اس کو واقعی مار دیتا۔ لیکن ڈی سلوا اور چوہدری ولاور جیسے لوگوں سے مقابلہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے اعتراف کرلیا تھا کہ پیڈرو بہت بڑا بدمعاش تھا۔ وہ خود اپنے لمبے چوڑے جسم سے تو واقعی بڑا بدمعاش نظر آتا تھا مگر میں نے اس کی اصلیت جان لی تھی۔ اسے بڑ مارنے کی زیادہ عادت تھی۔

"ان کا نام ابھی مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔" میں نے کافی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "لیکن ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں اور تم اس کام میں یقیناً ہماری مدد کرسکتے ہو تاکہ تمہارے یار کی بڑی بہن… کی جان کو خطرہ لاحق نہ رہے۔ جب تک یہ خطرہ… ہم کسی کو یہ بھی نہیں بتاسکتے کہ وہ کہاں ہیں۔ لیکن ہم تمہیں… ملنے لے چلیں گے۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہوگی جناب!" وہ بولا۔

"استاد ٹیڈی!" محسن نے کہا۔ "کیا تم اپنے دوست کے جنازے میں شریک ہوئے تھے؟"

ٹیڈی نے سر ہلایا۔ "میں نے آپ کو وہاں دیکھا تھا۔ … سوچ رہا تھا کہ آپ کی صورت جانی پہچانی لگتی ہے۔"

"لیکن تم نے غور نہیں کیا تھا؟" محسن بولا۔ "وہاں سب ہی… لوگ تھے۔"

"دل کو تسلی کے لئے… نہیں گیا تھا۔" وہ بولا۔ "بالآخر… رہا تھا۔ جب میت گاڑی روانہ ہونے لگی تھی تو چپکے سے پیچھے بیٹھ گیا تھا لیکن میں نے قبرستان میں اپنے یار کی صورت آخری بار دیکھ لی تھی۔ اس کے بعد پھر غائب ہوگیا تھا۔"

"کیوں؟ کس کا ڈر تھا تمہیں؟" محسن نے پوچھا۔

"ڈر… ڈر تو کسی کا نہیں تھا… مگر وہاں پولیس تھی۔ وہ مجھے خواہ مخواہ پکڑ لیتے کہ مشکوک حالت میں وہاں پھر رہا تھا۔ ان کا یہی طریقہ ہے جو ہاتھ آجائے اسے پکڑ کر لے جاؤ۔ اصل مجرم تو بھاگ گئے۔ انہوں نے دس بیس چھوٹے موٹے آوارہ گرد پکڑے ہوں گے اور ان سے زبردستی معلوم کریں گے کہ قاتل کون تھا۔ اب یا تو کوئی بتادے گا ورنہ وہ دو دن انہیں حوالات میں رکھ کے چھوڑ دیں گے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "معلوم تو مجھے بھی ہے مگر یہ کون بتا سکتا ہے کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے وہ کوٹھی کس کی تھی جہاں سے عذران کا جنازہ اٹھایا گیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ اس کے چچا کا گھر تھا۔ چوہدری ولاور حسین کا۔" وہ بولا۔ اس نے چوہدری ولاور کا نام بڑی عزت سے لیا تھا جس کا مطلب… تھا… آوارہ گردوں کے حلقے میں یہ نام بہت بڑا سمجھا… ہے۔

"پہلے تو جانتے تھے؟ میرا مطلب ہے پہلے کبھی یہ نام سنا تھا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "سیٹھ ولاور کا نام تو سنا تھا، چوہدری ولاور حسین کا نہیں۔"

"اور اس سیٹھ ولاور کو تم نے کبھی دیکھا نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"اسے تو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ سیٹھ ولاور کا صرف نام چلتا ہے۔" وہ بولا۔

میرے شبہات کی تصدیق ہوتی جارہی تھی۔ چوہدری ولاور جیسے لوگوں کی کبھی ایک شخصیت نہیں ہوتی۔ ہر شخصیت کا چہرہ جدا ہوتا ہے۔ جہاں وہ رہتا تھا وہاں اس کی حیثیت ایک شریف اور معزز آدمی کی تھی۔ چوہدری ولاور حسین۔ لیکن یہی شخص دوسرے حلقے میں سیٹھ ولاور ہوسکتا تھا۔ ہوسکتا ہے کسی زمانے میں وہ صرف ولاور ہو۔ پھر استاد ولاور بن گیا ہو اور اب برسوں بعد وہ سیٹھ ولاور تھا۔ یا یہ تیرے تین نام۔ اس کے سیٹھ بن جانے کے اسباب بھی مجھے معلوم تھے۔ اب وہ سامنے نہیں آتا تھا مگر بقول استاد ٹیڈی اس کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ میں ایسے بہت سے سیٹھوں کو جانتا تھا جن کے نام روایت بن گئے تھے اور پبلک کے سامنے وہ اتنے بڑے بدمعاش تھے کہ ان کا یارانہ اعلیٰ پولیس افسروں سے اور سرکاری حکام سے تھا اور

www.paksociety.com

ان کو بدمعاشی کی مملکت میں بے تاج بادشاہ کی حیثیت حاصل تھی مگر ان کی سماجی حیثیت اتنی بلند تھی کہ کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

"میرا خیال ہے اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "استاد شیدی نے تو خود ہی سب کچھ بتا دیا ہے اور بہت سی کام کی باتیں بتا دی ہیں جو ہمارے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔"

محسن نے تائید میں سر ہلایا۔ "استاد! ہم سے رابطہ قائم کرنے کا ایک پتہ تو ہمیں دے دو۔"

رابعہ نے ہینڈ بیگ میں سے اپنا کارڈ نکالا اور آگے بڑھا دیا۔ "اس پر آفس کا فون نمبر بھی ہے اور گھر کا بھی۔ مگر گھر کا فون کٹ گیا ہے۔ یہاں تم شام کے وقت میرے نام پیغام دے سکتے ہو... اور ان کے نام بھی۔" اس نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

"لیکن تم سے رابطہ قائم کرنا ہو تو کیسے کیا جائے؟" میں نے سوال کیا۔

"میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔" وہ کارڈ کو جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ "میں خود ہی آ جاؤں گا۔"

"تم دیکھ سکتے ہو کہ تمہاری سب چیزیں جیب میں موجود ہیں۔" میں نے کہا۔ "سوائے ایک چیز کے۔" میں نے جیب میں سے کمانی دار خنجر نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ "اب تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔ یہاں سے آمد کا زیادہ وقت نہیں ہے۔"

شیدی کے چلے جانے کے بعد بھی ہم کچھ دیر بیٹھے رہے اور ان خیالات کا اظہار کرتے رہے جو ہمارے ذہن میں تھے، مگر شیدی کے سامنے یہ باتیں کرنا مناسب نہ تھا۔ ہم سب اس مسئلے پر ایک ہی نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ شیدی سے سب کے سامنے ملنا انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔ سب سے بہتر صورت یہی تھی کہ وہ ہمارا جاسوس بن کے کام کرے اور جو معلومات ہم خود حاصل نہ کر سکیں وہ شیدی کے ذریعے حاصل کریں۔ ممکن ہو تو اس کو ڈی سلوا یا چوہدری ولا داد کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ کر لیں مگر یہ کام خطرناک تھا۔ اگر ان دونوں کو شک بھی ہو جاتا کہ شیدی ہم سے ملا ہے تو شیدی کی جان سے جاتا۔ ابھی اس مرحلے کو اتنا آگے بڑھانا عقلمندی کی نہ ہوتی۔

رات کے دس بجنے والے تھے۔ ہم نے نیچے اتر کے کسی معقول ریسٹورنٹ میں رات کا کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے لائٹس آف کیں اور محسن نے [illegible] ساتھ زینے کی طرف بڑھے۔ اسی وقت نیچے سے چوکیدار کی آواز آئی۔ وہ کسی کو روک رہا تھا۔ جواب میں [illegible] کو گالی دی۔ چوکیدار پھر چلایا لیکن اس مرتبہ [illegible] تھی۔ یہ کسی مجروح آدمی کی چیخ تھی جس میں درد و کرب تھا اور [illegible] تھی۔ اس کے بعد جو آواز [illegible] دی وہ [illegible] کر دیا۔ [illegible]

"رابعہ! اس عمارت سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ [illegible]" میں نے رابعہ کو روک لیا۔

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "عمارت کے دوسرے [illegible] پر بھی ایک زینہ ہے۔ پچھلی طرف۔"

"تم محسن کے ساتھ جاؤ۔ جلدی کرو۔" میں نے [illegible] لوگ زینے پر بھاری قدم رکھتے اوپر آ رہے تھے۔

"اور تم... تم کیا کرو گے؟" رابعہ نے پریشان ہو کر [illegible]

"جاؤ۔" میں نے اسے دھکیل دیا اور محسن نے [illegible] گھسیٹ لیا۔ نیچے سے آنے والے اب بہت قریب پہنچ چکے تھے۔

معلوم نہیں تھا یہ کون لوگ ہیں۔ میں نے سوچا اور کیا [illegible] ہیں لیکن یہ بھی شکاری ہیں تو [illegible]

دھاوا بولنے سے پہلے انہوں نے فرار کے سب راستے بند [illegible] بھول گئے اور میرا خیال غلط نہیں تھا۔ محسن اور [illegible] آخری حصے تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ وہ دونوں حرف [illegible] ہوئے یعنی اس زینے کی جانب سے جو ہم نے آتے وقت [illegible] کیا تھا اور اس دوسرے یعنی زینے کی طرف سے بھی [illegible] رابعہ اور محسن نکل جانا چاہتے تھے۔ وہ کل [illegible] ایک جیسے قد و قامت کے اور شلوار قمیص پہنے ہوئے [illegible] کے چہروں پر ایک جیسی داڑھیاں تھیں اور [illegible] جو نقلی ہونے کے باوجود اصلی لگتی تھیں۔ ان سب [illegible] اپنے چہروں کو غیر نمایاں اور ناقابل شناخت بنانے کے لیے [illegible] گول ٹوپیاں بھی سر پہ کھلی تھیں جن سے پیشانی کا آدھا حصہ [illegible] گیا تھا۔ یہ ان کا بہت کامیاب حربہ تھا کہ وہ ایک جیسے [illegible] آتے تھے اور یہ کنفیوژن چھوڑ جاتے تھے کہ ان کی تعداد کیا [illegible] وقت بھی مدنی موقع واردات کے چوکیداروں نے دو ہی افراد [illegible] جاتے دیکھا ہو گا اور بشرطیکہ وہ بعد میں کوئی بیان [illegible] تو دو کا ذکر کریں گے اور کسی نے دیکھ لیا تو [illegible] آئیں گے مگر حلیہ بیان کیا جائے گا تو معلوم ہو گا کہ ایک [illegible] آدمی تھا۔

رابعہ اور محسن انہیں دیکھتے ہی ٹھٹھک گئے تھے اور غیر ارادی طور پر محسن نے رابعہ کو اپنے پیچھے کر لیا تھا لیکن مجھے انتہائی حیرت ہوئی جب آنے والوں نے ان کی طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ وہ چاروں میری طرف بڑھتے آ رہے تھے اور پیچھے تک وہ خالی ہاتھ تھے لیکن جب میرے اور ان کے درمیان چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تو باری باری ان سب نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈالا اور اپنے اپنے ریوالور نکال لیے۔ میں مقابلے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ اگر وہ خالی ہاتھ ہوتے یا خنجر اور لاٹھی لے کر بھی آتے تو میں ان چاروں سے نمٹ لیتا مگر چار گنوں سے آنے والی چار گولیوں سے مقابلہ ناممکن تھا۔ محسن اور رابعہ راستہ صاف دیکھ کر غائب ہو چکے تھے۔ شاید اس خیال سے کہ وہاں تماشائی بن کر کھڑے رہنے سے وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے لیکن اس عمارت سے باہر جا کے وہ یقیناً کچھ کر سکتے تھے۔ میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور ان کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ "کیا چاہتے ہو؟" میں نے ان سب کو براہ راست مخاطب کیا۔

"سکندر بابو؟" ان میں سے ایک نے چند قدم کے فاصلے پر رک کر کہا۔ "ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

"زندہ یا مردہ۔" بائیں طرف اتنے ہی فاصلے پر رک جانے والے دوسرے شخص نے کہا۔

"لیکن ہم تمہیں مردہ نہیں چاہتے۔" تیسرے نے دائیں طرف سے کہا۔

"کیونکہ حکم یہی ہے کہ تم کو زندہ لانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔" چوتھے نے پھر بائیں طرف سے بات کی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسٹیج کے اداکار ہیں اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ اسے کس وقت کیا ڈائیلاگ بولنا ہے۔

"کہہ دو۔" میں نے طنزیہ انداز سے دونوں ہاتھ باندھ کر سینے پر رکھے اور مسکرا کے کہا۔ "میں نے تم سب کی سن لی۔ اب مجھے صرف دو سوالوں کا جواب چاہیے۔ ایک یہ کہ حکم دینے والا کون ہے؟ اور دوسرا یہ کہ تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"ہم کسی سوال کا جواب دینے کے پابند نہیں ہیں۔" پہلے نے کہا۔

"اس لیے کہ جواب خود ہمیں معلوم نہیں۔" دوسرے نے کہا۔

"تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ فضول باتوں میں وقت ضائع کیے بغیر چلے چلو۔" تیسرا بولا اور میں نے چوتھے کی طرف دیکھا۔

"تاکہ ہم کو اس مداخلت کی حماقت کرنے والے کو گولی مارنے پر مجبور نہ ہوں۔" چوتھے نے کہا۔

"میں بھی کسی بے گناہ کا خون بہتے دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ تم پوری تیاری اور منظم ارادے کے ساتھ آئے ہو۔ میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

وہ مجھ سے تقریباً چھ فٹ دور ایک نیم دائرے کی شکل میں حصار قائم کیے کھڑے تھے۔ اگر اس وقت کوئی نیچے اترنے والا دور سے دیکھتا تو اسے کسی قسم کا شک نہ ہوتا اور یہی نظر آتا کہ چار افراد مجھ سے کسی کاروباری مسئلے پر بات کر رہے ہیں۔ وہ مجھے وکیل سمجھتا اور ان کو میرا موکل اور ہم پر دوسری نگاہ ڈالے بغیر گزر جاتا۔ ریوالور ان کے ہاتھوں میں تھے وہ پشت کی جانب سے نظر نہیں آ سکتے تھے۔ میرے ارادے کا اظہار ہوتے ہی انہوں نے مجھے راستہ دے دیا اور میرے پیچھے ہو گئے۔ زینے سے اترتے ہی میں نے چوکیدار کو تلاش کیا۔

"تم نے اس غریب چوکیدار کو مار ڈالا ہے؟" میں نے رک کر کہا۔

"نہیں۔" کسی نے مجھے دھکیل کر جواب دیا۔ "وہ صرف بے ہوش پڑا ہے۔ زینے کے نیچے۔"

باہر بہت سی گاڑیوں کے درمیان ان کی کار بھی موجود

خوابوں کی تعبیر ان کی حقیقت اور ان کی افادیت کے بارے میں ایک اہم کتاب

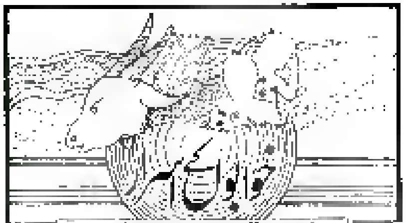

خواب کیا ہوتے ہیں؟
ان کی تعبیر کیا ہوتی ہے؟
خواب کیوں نظر آتے ہیں؟
خوابوں کے بارے میں مکمل معلومات

www.paksociety.com

تھی۔ جب انھوں نے مجھے اس گاڑی کی طرف چلنے کا اشارہ کیا تو میں نے اس کا نمبر پڑھنے کی کوشش کی لیکن نمبر پلیٹ کی لائٹ بجھی ہوئی تھی اور گاڑی اندھیرے میں کھڑی تھی۔ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تب بھی اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا بعد میں معلوم ہوتا کہ نمبر پلیٹ نقلی تھی یا گاڑی چوری کی تھی۔ گاڑی میں ڈرائیور کی جگہ ایک شخص اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ مجھے ڈرائیور والی سیٹ پر آگے بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ خود وہ میرے پیچھے سیٹ پر بیٹھ گئے۔ گاڑی کے ڈرائیور نے انجن پہلے سے اسٹارٹ کر رکھا تھا۔ دروازے بند ہوتے ہی گاڑی چل پڑی اور ہائیکورٹ کے چوک سے گھوم کر مال پر آ گئی۔ خلاف توقع مجھے یہ دیکھ کر تھوڑی سی خوشی ہوئی کہ اندر کی جانب شیشے اور دروازے کھولنے کے لیے ہینڈل موجود ہیں لیکن میں نے احمقانہ جرأت کے مظاہرے سے گریز کیا۔ یہ بات یقینی نظر آتی تھی کہ پیچھے بیٹھے ہوئے شکاری مجھے اپنے دام سے نکلتا دیکھیں گے تو بلا جھجک گولی مار دیں گے۔ اپنے اور ڈرائیور کے درمیان لگے ہوئے آئینے میں پیچھے آنے والی ٹریفک کے بجائے مجھے ان دونوں کے چہرے نظر آ رہے تھے جو بالکل ایک جیسے لگتے تھے! ابھی تک نہ انھوں نے ٹوپیاں اتاری تھیں اور نہ داڑھی مونچھیں۔ پھر بھی ان کی آنکھیں اور ان کے ناک کان دیکھ کر میں تصور کی مدد سے ایک ایسی خیالی تصویر بنا سکتا تھا جس میں ان کی صورت کے اصل نقوش داڑھی مونچھوں کے بغیر نظر آتے ہوں۔ گاڑی اب نئی انارکلی کے چوک سے گزر چکی تھی۔ میرے دائیں ہاتھ پر پنجاب یونیورسٹی کی خوبصورت عمارت تھی جس کے طرز تعمیر میں مشرقی روایات کا تمام حسن تھا۔ قدامت کی باوقار شان و شوکت تھی اور علم و عرفان کی ساری عظمت تھی۔ دوسری طرف عجائب خانہ جو گئی صدیوں کی تاریخ کے گم گشتہ اوراق کا خزینہ تھا اور پنجاب پبلک لائبریری تھی جس کی لاکھوں کتابیں انسان کی عقلی، علمی، آگہی اور تجربات کے بے کراں سمندر کی طرح موجود تھیں۔ مگر میں ان سب کے درمیان سے گزرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ دونوں دشمن کہاں گئے جو میرے ساتھ نہیں آئے تھے۔ جواب فوراً میرے ذہن میں آ گیا وہ دوسرے دروازے پر کھڑی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر پیچھے آ رہے ہوں گے۔ کیا اس کا مطلب یہ نکالا جا سکتا ہے کہ انھوں نے رابعہ اور محسن کو بھی بے بس کر کے دوسری گاڑی میں ڈال لیا ہوگا؟ میں نے سوچا اور جھک کر آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی کہ کیا ہمارے پیچھے بھی کوئی گاڑی ہے۔ پیچھے کوئی ایک گاڑی ہوتی تو اندازہ ہو سکتا تھا۔ ہمارے پیچھے تو گاڑیوں کی ایک قطار تھی اور دائیں سے

وقت صرف ان کی ہیڈ لائٹس نظر آتی تھیں۔ پیچھے بیٹھے شخص نے مجھے سیدھا بیٹھنے کا حکم دیا اور میں نے تعمیل کی۔ انھوں نے میری آنکھوں پر کوئی پٹی نہیں باندھی تھی اور مجھے بے خبر رکھنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میں چند عمارتوں کو دیکھتا جا رہا تھا جو میرے جانے پہچانے تھے۔ اس طرح سے میں اپنے محافظوں کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں پوری طرح ان سے تعاون کر رہا ہوں اور میری بے نیازی کا انداز یہ ظاہر کرتا تھا کہ میں خوف زدہ بھی نہیں ہوں۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میرے ذہن میں ایک اسکیم تھی جس کی کامیابی کا دار و مدار حالات پر تھا۔ میں ناکامی کے نتائج کا تصور اور خوف کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

اب گاڑی ان سڑکوں پر دوڑ رہی تھی جو غیر آباد تھیں۔ دونوں جانب اونچے اونچے گھنے درخت تھے اور سڑک کے کھیت تھے جن کے زیادہ تر حصے ویران تھے اور جو بجلی و روشنی کی کمی کے باعث ویرانے کی طرح لگ رہے تھے۔ سڑک سے دور نئی آبادی میں تعمیر ہونے والی چھوٹی بڑی عمارتیں تھیں۔ شروع کے حصے میں آبادی زیادہ تھی اور گھروں میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ پھر خالی پلاٹوں کی قطار لگی جن میں کہیں جنگل اور کہیں اکا دکا جھگیاں الگ الگ سے الگ نظر آتی تھیں۔ یہ حالات مجھے امید افزا لگے میری اسکیم کے لیے سازگار تھے۔ ایک موڑ پر رفتار دھیمی ہوئی۔ جھٹکے میں دائیں ہاتھ سے میں نے اسٹیئرنگ پکڑا اور بائیں ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور اگر بریک نہ لگاتا تو گاڑی الٹ جاتی۔ مگر فوراً بریک لگنے سے وہ فائر نہ ہو سکے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں افراد ایک دوسرے پر گرے اور میں نے کھلے دروازے سے چھلانگ لگا دی۔ مجھے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ گرتے ہی میں نے خود کو اٹھایا اور ایک درخت کے تنے کی پناہ لینے بھاگا۔ تنے کے پیچھے سے میں نے دیکھا گاڑی دوسرے کنارے کے درخت سے ٹکرا گئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے کار کو اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھا۔

میری اسکیم فیل ہو گئی تھی۔ کیونکہ میں اپنے پیچھے والی اس دوسری گاڑی کے وجود سے بے خبر تھا جو ہیڈ لائٹس آف کیے بغیر کسی لائٹ کا تعاقب کر رہی تھی۔ انھوں نے ذرا سی چالاکی سے مجھے دھوکا دیا تھا۔ اگر وہ روشن رکھتے تو کسی ویران سڑک پر پیچھے کی دور تک آنے والی روشنی دیکھ کر میں سمجھ جاتا کہ دوسری گاڑی

ساتھ ہی چل رہی ہے ان کو بھی اندیشہ ضرور تھا کہ میں راستے میں توڑ پھوڑ کروں گا اور اس خطرے سے نمٹنے کے لیے انھوں نے جو انتظام کیا تھا قابل تعریف تھا۔ ابھی میں پوری طرح درخت کے پیچھے چھپا بھی نہیں تھا کہ دوسری کار میں سے پیچھے رہ جانے والے دونوں افراد ایک ساتھ نکلے اور انھوں نے درخت کے دونوں طرف پوزیشن سنبھال لی۔

"تم بھاگ کے کہیں نہیں جا سکتے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "کوشش کرو گے تو مارے جاؤ گے۔"

"چلو اس دوسری گاڑی میں۔" دوسرے نے کہا جو گھوم کر میرے پیچھے آ چکا تھا۔ وہ دونوں مشتعل تھے اور ان کے ہاتھوں میں ریوالور فائر کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ ان کے پاس بہانہ بھی تھا چنانچہ وہ مجھے اس ویرانے میں قتل کر کے آسانی سے فرار ہو سکتے تھے۔ میں نے آہستہ آہستہ دونوں ہاتھ اٹھائے اور دوسری گاڑی کی طرف چلنے لگا اور اس وقت میں نے دیکھا کہ پہلی گاڑی کو بھی زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا کیونکہ تصادم کے وقت اس کی رفتار بہت کم ہو گئی تھی۔ ڈرائیور شدت سے اس لیے بچ گیا تھا کہ آخری وقت میں اس نے ٹکر کو ناگزیر سمجھتے ہوئے دفاعی انداز اختیار کر لیا تھا۔ پیچھے والوں کو کچھ بھی نہیں ہوا تھا اور اب وہ بھی باہر آ چکے تھے۔ چند منٹ بعد میں بالکل اسی طرح دوسری گاڑی میں بیٹھا تھا اور کسی نامعلوم منزل کی جانب رواں تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ پہلی کار اسٹارٹ ہو گئی ہے لیکن پیچھے آنے کے بجائے واپس شہر کی طرف جا رہی ہے۔ میرے محافظ بدل گئے تھے اور اب میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ جب وہ چاروں رابعہ کے دفتر کی عمارت کے باہر مجھ سے بات کر رہے تھے تو ہدایات کے مطابق سب نے اپنی آواز بھی بدل لی ہوئی تھی۔ اب ایک ہنگامی صورت حال پیدا ہوئی تو ان کو یہ بات یاد نہ رہی۔ ایک آواز کو میں نے فوراً پہچان لیا تھا۔ یہ ٹونی سلوا کی آواز تھی۔ جب انھوں نے مجھے کار میں بٹھانے کے لیے دروازہ کھولا تو اندر خود بخود ایک لائٹ جل گئی تھی اور میں نے معمولی سی روشنی میں ذرا سی دیر کے لیے ان کے چہرے دیکھے۔ بظاہر ان میں کوئی فرق نہ تھا مگر میں نے پھر اپنے تصور سے مدد لی اور ایک چہرے پر سے داڑھی مونچھوں کو الگ کر کے دیکھا۔ آواز کی شناخت کے بعد اس صورت کے اصلی نقوش کو پہچاننا مشکل ثابت نہ ہوا۔ میرے دونوں محافظوں میں سے ایک یقیناً ٹونی سلوا تھا۔ اس یقین کے بعد میں محتاط ہو گیا۔ ٹونی سلوا ایسا دشمن تھا جسے بے وقوف بنانے کی کوشش کا انجام میری موت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ گاڑی ایک ویران اور اندھیرے گھر کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ ٹونی سلوا اور اس کا ساتھی مجھ سے پہلے اترے اور انھوں نے مجھے بھی باہر آنے کا حکم دیا۔ ڈرائیور بدستور انجن اسٹارٹ کیے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

"پیچھے پلٹ کر دیکھے بغیر دروازہ کھولو۔" ٹونی سلوا نے کہا۔ وہ پھر آواز اور لہجہ بنا کے بول رہا تھا۔

"یہ کس کا گھر ہے مسٹر ٹونی سلوا؟" میں نے کہا۔ "تمہارے کسی باپ کا؟"

"شٹ اپ!" ٹونی سلوا نے مشتعل ہوئے بغیر کہا۔ "تم سے جو کچھ کہا جائے وہی کرو۔"

"لیکن اس کی چابی؟" میں نے کہا۔ "مجھے تو یہ دروازہ مقفل لگتا ہے۔"

"دروازہ کھلا ہوا ہے۔" ٹونی سلوا کے ساتھی نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا۔ میں نے سنبھل کر دروازے کا ہینڈل گھمایا اور اندر داخل ہو گیا۔ میرے پیچھے دروازہ دھڑ سے بند ہوا اور مجھے باہر سے قفل لگنے اور چابی گھمانے کی آواز سنائی دی۔ کمرے میں تین دروازے اور بھی تھے لیکن میں کوشش کیے بغیر اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے مقفل ہوں گے یا باہر سے بند ہوں گے۔ میرے کانوں میں گاڑی کے دروازے بند ہونے کی اور پھر روانہ ہونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر بعد یہ آواز بھی دم توڑ گئی اور میرے ارد گرد ایسی خاموشی کا احساس رہ گیا جس میں انگریزی محاورے کے مطابق پن کے گرنے کی آواز بھی سنی جا سکتی تھی۔ دشمن مجھے ایک کمرے میں قید کر کے جا چکے تھے۔

اب میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ کسی نئے مکان کا خالی کمرہ تھا جس کی دیواروں پر رنگ و روغن ہو گیا تھا لیکن سامان نام کی کوئی چیز ابھی تک نہیں رکھی گئی تھی۔ سوائے اس ٹرانسسٹر ریڈیو کے جو کمرے کے عین درمیان میں چٹائی کے فرش پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک چینی ٹارچ پڑی تھی جسے بہت پہلے روشن کر کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ چنانچہ سیل کمزور پڑ گئے تھے اور روشنی برائے نام رہ گئی تھی۔

"سکندر بخت!" ریڈیو اچانک بولا۔ "تمہیں یہاں لانے کا مقصد تم سے باتیں کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ ہماری گزشتہ ملاقات تین ہفتے پہلے ہوئی تھی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے تمہیں ایک ماہ کی مہلت دی تھی۔"

میں اس آواز کو سن کر چونکا ضرور تھا لیکن حیران نہیں ہوا۔ آواز اسی شخص کی تھی جس نے پہلی بار خود کو چوہدری دلاور کہہ کر متعارف کرایا تھا لیکن اس رات میں صرف چوہدری دلاور کا سایہ دیکھ سکا تھا اور اس کے سائے سے ہی باتیں کرتا رہا تھا۔

اب بھی میں اس کی آواز سن رہا تھا لیکن اسے دیکھنے سے قاصر تھا۔ وہ کہیں آس پاس ہی موجود تھا۔ شاید اسی گاڑی میں جو مجھے لے کر یہاں تک آئی تھی اور کسی پاکٹ سائز ٹرانسمیٹر کے ذریعہ بات کر رہا تھا۔ ریڈیو پہلے سے آن کر کے اور ٹرانسمیٹر کی فریکوئنسی پر ٹیون کر کے رکھ دیا گیا تھا چنانچہ ریڈیو اس کی آواز کو صاف ریسیو کر رہا تھا۔ اس کے لیے خطرے کی کوئی بات نہ تھی ٹرانسمیٹر سے نشر ہونے والی آواز کی لہروں کا دائرہ بھی اس گز ہوگا اور اس محدود دائرے میں اس وقت کون ریڈیو لگائے بیٹھا ہوگا اگر کوئی ہوتا بھی تو وہ اپنی پسند کے مطابق کسی اسٹیشن سے خبریں سن رہا ہوتا یا فرمائشی گانے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی عین اسی جگہ ریڈیو کی سوئی لے آئے اور یہ گفتگو سننے لگے۔

"کیا میری آواز تمہیں سنائی نہیں دی؟" چوہدری دلاور نے کہا۔ "تم حیران ہو رہے ہو یا کسی سوچ میں ہو؟"

"حیرانی کی میرے لیے کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "سوچ میں یہ رہا تھا کہ بات چیت کا یہ انتظام یکطرفہ تو نہیں ہے؟ میری آواز بھی تمہارے کانوں تک پہنچ سکتی ہے یا نہیں؟"

"یہ انتظام دوطرفہ ہے۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "میں تمہاری آواز سن رہا ہوں اپنے ریڈیو پر۔"

"تم نے مجھے ایک مہینہ دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے ہی دوسری ملاقات کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟"

"اس عرصے میں بہت سی باتیں ایسی ہوئی ہیں جن سے مجھے تمہارے عزائم کا اندازہ ہوتا جا رہا ہے۔" چوہدری دلاور بولا۔ "اور میرا خیال ہے کہ تم نے اس ایک ماہ کی مہلت کو سوچ بچار میں صرف نہیں کیا۔"

"تمہارے اندازے غلط بھی تو ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی مجھے بلا لیا۔ میں بھی تم سے بہت سی باتوں کی وضاحت چاہتا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ تم خود کو چوہدری دلاور کہتے ہو۔ ایک چوہدری دلاور کو میں بھی جانتا ہوں۔ اس کی شخصیت، اس کا لب و لہجہ اور اس کے انداز و اطوار سب مختلف ہیں۔ یا تو اسے اداکاری کا کمال سمجھا جا سکتا ہے یا تمہارا جھوٹ..."

"کیوں؟ کیا دنیا میں ایک نام کے دو فرد نہیں ہو سکتے؟" وہ بولا۔ "اور یہ سوال قطعی غیر اہم ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آئندہ ایک ہفتے میں تمہیں ایک فیصلہ کرنا ہے۔ یا تو تم حق وراثت کا کیس واپس لے کر قانونی طور پر اپنے والد کی جائیداد پر ملکیت کے دعوے سے دستبردار ہو جاؤ اور اس کے بدلے جو رقم پیش کروں معاوضہ لے کر واپس لندن چلے جاؤ۔ اگر رابعہ تمہارے ساتھ جانا چاہے تو جا سکتی ہے۔ ہمارا اس سے بعد میں کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہے گا اور تم بھی ایک نئی زندگی کا آغاز کرو گے جس کا تمہارے ماضی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ دوسری پیش کش کا انحصار تمہاری ہمت اور تمہاری مرضی پر ہے۔ تم لندن میں بیٹھ کر کام کر سکتے ہو اور خوشحالی سے زندگی گزار سکتے ہو۔ اس کے علاوہ کوئی تیسری صورت نہیں ہے۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میرے معاملات کی سزا دوسرے لوگوں کو کیوں دی جا رہی ہے؟" میں نے کہا۔

"جو کچھ کر رہے ہو تم خود کر رہے ہو۔" وہ بولا۔ "تمہیں ہمیشہ پہلے غور کرنے اور فیصلہ کرنے کی مہلت دی۔ غلط فیصلہ کرنے والے خود تم تھے۔ اگر تم ہمارے آدمی کو چھوڑ دیتے تو رابعہ کا گھر یوں تباہ نہ ہوتا۔ یہ بھی تمہاری حماقت تھی کہ تم نے اس آدمی کو رابعہ کے گھر میں رکھا اور پھر ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی۔ نقصان کس کا ہوا؟ ہمارا یا تمہارا...؟"

"یہ تو وقت بتائے گا کہ نقصان میں کون رہا۔" میں نے کہا۔

"وقت تو سب کچھ بتا چکا ہے۔" وہ ہنسا۔ "کیا تم ثابت کر سکتے کہ تمہارے والد کو قتل کیا گیا تھا؟ یا تمہیں معلوم ہے کہ اب ان کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں؟ کیا تمہاری مدد کرکے غلام علی کو کوئی فائدہ ہوا؟ ایک عورت بیوہ ہو گئی اور اس کے بچے یتیم ہو گئے۔ اس سے پہلے منشی نے ہم سے نمک حرامی کی تھی اور تمہیں معلوم ہے اس کا کیا انجام ہوا؟ یہی انجام شہلا کا بھی ہوگا۔ تم سمجھتے ہو کہ ہم اسے تلاش نہیں کر سکتے؟ یہ تمہاری بھول ہے۔ کبھی نہ کبھی اس کا سراغ بھی مل جائے گا۔ آخر تمہارا رشتہ کیا ہے اس سے کہ تم اس کی خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر لگائے ہو؟"

"چوہدری دلاور! تمہاری کسی دھمکی سے ڈر کے میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "رشتوں کی بات ہے تو رشتے تو دیواروں سے بھی استوار ہو جاتے ہیں۔ لوگ ایک درخت کو اتنی ہی محبت اور توجہ سے بڑا کرتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو۔ وہ اپنے کتوں سے بھی پیار کرتے ہیں۔ شہلا سے بھی میرا ایک جذباتی رشتہ ہے۔"

"پہلے نوری ہے، پھر رابعہ ہے اور اب شہلا ہے... تم کس کس کے جذباتی رشتوں کی حفاظت کرو گے؟" وہ طنز سے بولا۔ "ہوگا کچھ بھی نہیں۔ بس یہ سب تمہارے جذباتی رشتوں کی بھینٹ چڑھ جائیں گی اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ تمہاری ضد کی سزا محسن کو بھی مل سکتی ہے۔ اس کے گھر کے ہر فرد کو مل سکتی ہے۔ اس ادیب کو مل سکتی ہے جسے تم ڈھال بنائے بیٹھے ہو۔"

"تمہارا خیال بالکل غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر میں یہ سمجھوں گا کہ میری وجہ سے ان کو نقصان پہنچ سکتا ہے جن کا مجھ

سے کوئی جذباتی تعلق ہے تو میں اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔ اگر میں نے تمہاری دونوں شرطوں کو قبول نہ کیا تو میں اس کی اطلاع دینے کے لیے خود ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ یہ الگ بات ہے کہ خود تختۂ دار تک پہنچنے سے پہلے میں ان سب کو چن چن کر قتل کر دوں جن کو میں اپنی تمام مشکلات اور مصائب کا ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ الزام ایک میر شرافت علی کے قتل کا ہو یا تم جیسے دس بدمعاشوں کے قتل کا، کوئی مجھے دس بار پھانسی نہیں دے سکتا۔ تم نے مجھے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی ہے میری یہ بات بھی سمجھ لو کہ میں نے مرنے کا فیصلہ کر لیا تو زندہ رہ کے تم بھی پچھتاؤ گے۔ میں ایک ایک کے گھر کو اور کاروبار کو اسی طرح راکھ کا ڈھیر بنا سکتا ہوں جیسے تم نے رابعہ کے گھر کو بنایا تھا۔ میرے حق وراثت کو تم مجھے مار کر بھی نہیں چھین سکتے۔ میں نے اپنی درخواست میں یہ بھی لکھا ہے کہ عدالتی فیصلے سے قبل ہی خدانخواستہ مجھے کچھ ہو جائے تو رابعہ کو میرا وارث تصور کیا جائے۔ رابعہ نے ایک وصیت نامے کی رو سے کسی اور کو وارث بنا دیا ہے۔ یہ بڑا لمبا سلسلہ ہے۔ تم ایک کے بعد ایک کو مارتے جاؤ، کوئی نہ کوئی وصیت نامہ لیے وراثت کا حق حاصل کرنے کے لیے موجود رہے گا۔"

اس کی خاموشی سے اندازہ ہوتا تھا کہ میری دھمکی رائیگاں نہیں گئی۔

"ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا تو اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ "عقل سے کام لو، سکندر بخت اور سب کا فائدہ دیکھو۔"

"تمہارے اور میرے نقطۂ نظر میں فرق نہ ہوتا تو اختلاف کی گنجائش ہی کہاں تھی۔" میں نے کہا۔ "جسے تم فائدہ سمجھتے ہو میں بھی اسے فائدہ مان لیتا لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔"

"تمہاری یہ اعتقاد اصول پرستی بہت سی جانوں کا نذرانہ لے چکی ہے۔" وہ بولا۔ "اور آئندہ اس ضد پر کس کس زندگی کو قربان ہونا ہے یہ تم بھی نہیں جانتے۔ کیا حساب کے کسی پلڑے سے تم صرف ایک زندگی کی قیمت بتا سکتے ہو؟ اور اس کے بعد یہ کہہ سکتے ہو کہ تم اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد لے کر فائدے میں رہے؟ تم اپنے آپ کو قائل کر سکو گے کہ تمہارے اصول ان سب کی زندگی سے زیادہ اہم تھے جو ناحق مارے گئے؟"

"یہ بڑی لمبی بحث ہے چوہدری دلاور!" میں نے کہا۔ "انسانی تاریخ کے ایسے بہت سے باب ہیں جو لہو کی سرخی سے لکھے گئے اور یہ لہو ایسے ہی لوگوں کا تھا جو سمجھتے تھے کہ سچائی کا سودا نہیں ہو سکتا۔ اصول فروخت نہیں کیے جا سکتے اور ضمیر کی آواز دبائی نہیں جا سکتی۔ ایسے لوگ کبھی اکیلے نہیں رہے اور ان کا ساتھ دینے والے بھی مارے گئے لیکن خیر و شر اور نیکی بدی کی یہ جنگ ازل سے جاری ہے اور ابد تک چلتی رہے گی۔ تم جیسے لوگوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس دنیا کا وجود اور انسان کی زندگی کی بقا کا مسئلہ کبھی انسان کے اختیار میں نہیں رہا۔ تم آج کے دن کی فتح اور آج کا فائدہ شمار کرتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ کل سرخرو کون ہوں گے۔ اس لیے تم میرے نفع و نقصان کو اپنے پیمانے میں مت دیکھو۔ تم اپنی فکر کرو۔ میرے بارے میں یا میرا ساتھ دینے والوں کے انجام کے بارے میں مت سوچو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں آخری موقع فراہم کیا تھا۔" وہ بولا۔ "ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ ان سب سے بھی مشورہ کر لو جو تمہارے قریب ہیں لیکن غیر جذباتی ہو کے سوچ سکتے ہیں۔"

"اب مجھے یہ بھی بتا دو کہ میری رہائی کی کیا صورت ہے؟" میں نے کہا۔

"تم نے خود اپنے آپ کو قید کر رکھا ہے۔" وہ بولا۔ "چابی تمہاری دسترس میں ہے اور تمہارا راستہ روکنے والا کوئی نہیں ہے۔"

کمرے کی دیواریں بالکل سپاٹ اور ویران تھیں اور ان دیواروں میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں چابی چھپائی جا سکتی۔ میں نے پین ٹارچ کی برائے نام روشنی میں ہر گوشۂ دیوار کا جائزہ لیا اور صوفہ ایک طرف ہٹا کر بھی دیکھا لیکن چابی مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔

"تلاش کر چکے؟" اس کا شیطانی قہقہہ سنائی دیا۔ "تم ذہین آدمی ہو۔ تمہاری نظر بھی کمزور نہیں ہے اور میں نے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ چابی واقعی اسی کمرے میں ہے اور تم آسانی سے حاصل بھی کر سکتے ہو۔"

"اب صرف ایک جگہ رہ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "چابی اس ریڈیو کے نیچے یا اس کے اندر موجود ہو سکتی ہے یہ بیٹری ٹائپ بہت چھوٹی ہے۔ اس میں چابی آ ہی نہیں سکتی۔"

"میں ایک بار پھر تمہاری ذہانت کا اعتراف کرتا ہوں۔" اس کی آواز آئی۔ "ٹرانزسٹر کے پچھلے حصے میں سیل ڈالنے کے لیے ایک چھوٹا سا خانہ ہے جس میں چھ سیل پڑتے ہیں۔ تم یہ سیل نکال کر دیکھو گے تو تمہیں چابی مل جائے گی۔"

چابی اسی جگہ موجود تھی جہاں اس نے بتایا تھا لیکن سیل نکالنے کے لیے میں نے ٹرانزسٹر اٹھایا اور اس کے پیچھے وہ خانہ تلاش کیا جو ہموار سطح پر دکھائی بھی نہ دیتا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ ٹرانزسٹر کچھ زیادہ بھاری ہے۔ اس ساخت کے کسی بھی

www.paksociety.com

ٹرانزسٹر ریڈیو کا وزن اس سے آدھا بھی نہ ہوتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ اسی ٹرانزسٹر میں کوئی چھوٹا سا ٹرانسمیٹر بھی پوشیدہ تھا جس کے ذریعے میری آواز چوہدری دلاور تک پہنچ رہی تھی مگر میں سوچ میں پڑ گیا۔ میرے دشمن بے وقوف نہیں تھے۔ اگر ان کو صرف اس ٹرانزسٹر پہ بات کرنی ہوتی تو وہ اتنی مشکلوں سے مجھے یہاں تک اٹھا کے کیوں لاتے۔ اس سے کہیں آسان تو یہ ہوتا کہ وہ یہی ریڈیو ٹرانسمیٹر کسی طرح میرے کمرے میں رکھ آتے یا اس وقت رابعہ کی گاڑی میں چھوڑ دیتے جب ہم اوپر آفس میں بیٹھے تھے۔ انہیں چار مسلح افراد کو بھیجنے کی، ایک بچی پہ اسے کو گم کرنے کی اور دو گواہوں کی موجودگی میں مجھے زبردستی اغوا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ کیا ایسے بے ضمیر دشمن سے اصول پرستی کی توقع کی جا سکتی ہے کہ ایک ماہ کی مہلت دے کر وہ اس وعدے پر قائم رہے گا جو جب مجھ سے یہ وعدہ کیا گیا تھا تو بہت سی باتیں مجھے معلوم نہیں تھیں اور دشمنوں کا خیال تھا کہ اپنے مقصد میں بے آزار کر کے مجھے ہراساں کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انہوں نے ہر طرف سے خطرے کی دیوار کھڑی کر کے مجھے محصور کرنے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہے تھے۔ اب تو انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میرے عزائم خطرناک ہیں۔ میں نے ان کی پیشکش پہ غور کرنے کے بجائے تین ہفتے ان سے محاذ آرائی میں گنوا دیے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ میں ان کی پیشکش کو قبول کرنے کا اور اپنی شکست تسلیم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ ابھی ابھی میں نے ان پہ دوبارہ یہ واضح کر دیا تھا کہ مجھے اپنے نفع نقصان کی پروا نہیں۔

میرا دماغ کسی کمپیوٹر کی طرح کام کر رہا تھا اور خود بخود نتائج اخذ کرتا جا رہا تھا۔ نہیں، میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اس میں بھی کوئی چال ہے۔ اگر وہ مجھے اتنی آسانی سے نکل جانے کی اجازت دے رہے ہیں تو کیوں؟ اس لیے کہ میں باہر نکل کے ان کے لیے مزید مشکلات اور پریشانی کا سبب بنوں؟ میں نے ڈی ایس پی کو بتا دیا تھا کہ میری معلومات کا ذخیرہ کس حد تک خطرناک ہو چکا ہے۔ میرے پاس کتنے ثبوت ہیں اور کتنے گواہ ہیں۔ اس نے یہ بات فوراً آگے پہنچائی ہو گی اور انہیں یقین آ گیا ہو گا کہ میرے بارے میں ان کے سارے اندازے غلط ہو گئے ہیں۔ اب میں وہ سکندر نہیں رہا جو لندن میں ایک خوش باش اور بے فکرا طالب علم تھا۔ نوجوان اور خوش مزاج اور ہر قسم کی ذمہ داریوں کے بوجھ سے آزاد نوجوان جس کو وہ گھیر کر اپنی شکارگاہ میں لے آئے تھے۔ وہ اس خوش فہمی کے غرور میں مبتلا تھے کہ جیسے چار سال تک گھر کے حالات سے واسطہ ہی نہ رہا ہو وہ ان کا حریف کیسے بن سکتا ہے۔ ان کی پیشکش بہت بڑی تھی اور وہ بہت طاقتور لوگ تھے چنانچہ ان کو یقینی نظر آتا تھا کہ میں اپنی جان بچانے کی کوشش کروں گا اور ان کی فراخدلانہ پیشکش کے لالچ سے قائل نہ ہوا تو انجام کے خوف سے خود بھاگ جاؤں گا لیکن اب صورت حال اس کے برعکس تھی کیا اب وہ مجھے زندہ رہنے کی مہلت دیں گے؟ اس سوال کا جواب نفی میں آتا تھا۔ جتنا میں نے سوچا اتنا ہی خطرے کا احساس بڑھتا گیا۔ وہ چھٹی حس جو خطرے سے اسی طرح خبردار کرتی ہے جیسے جہاز کا راڈار بہت آگے کے موسم کی خرابی سے آگاہ کرتا ہے، مجھے ہوشیار کرنے لگی کہ میں دشمن کی آخری بات کا یقین نہ کروں۔ انہیں معلوم تھا کہ میں نے بہت کچھ جھوٹ بھی بولا ہے مثلاً یہ کہ حق وراثت کے کیس میں رابعہ کے وارث ہونے کا کوئی ذکر نہیں تھا اور رابعہ نے کوئی وصیت نامہ مرتب نہیں کیا تھا۔ جس کی رو سے ایک کے بعد ایک وارث پیدا ہوتا جائے۔ دشمنوں کے وسائل اتنے زیادہ تھے کہ وہ وراثت کے مقدمے کی پوری فائل دیکھ چکے ہوں گے۔ یہ شکاری کی دہشت نمایاں تھی جس کا پتا لگانے لگی ہے۔ ان کے جال میں مت پھنس جانا سکندر! یہ تم سے آخری بار پوچھنا چاہتے تھے کہ تم مقابلے سے دستبردار ہو کے ان کی شرائط کو قبول کر رہے ہو یا نہیں اور تم نے ابھی ابھی ان کو دو ٹوک الفاظ میں صاف جواب دے دیا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی شک کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ تمہیں اٹھا کے یہاں لانے کا مقصد کیا تھا!

میں نے کوٹھڑی کے پچھلے حصے کے سیل والے خانے کا معائنہ کیا۔ بظاہر اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن میرے ذہن میں کئی خیال آئے مثلاً کیا یہ ممکن ہے کہ سیل نکالتے ہی کوئی دھماکا ہو اور ٹرانزسٹر کے اندر پوشیدہ کوئی بارودی فیوز ہو کے پھٹ جائے یا میں قفل میں چابی گھماؤں تو کوئی کنکشن ٹوٹ جائے اور دروازے پہ رکھا ہوا بم پھٹ جائے۔ انگریزی میں اس قسم کے نظام کو "بوبی ٹریپ" کہا جاتا ہے مگر اردو میں اس کے لیے کوئی متبادل لفظ نہیں۔ لیکن یہ نظام کہیں بھی بہت آسانی سے نصب کیا جا سکتا ہے۔ میرے شبہات کو تقویت پہنچانے والی بات یہ بھی تھی کہ دشمن مجھے تنہا چھوڑ کے فرار ہو گئے تھے اور اب چوہدری دلاور کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی جس کا مطلب یہ بھی نکالا جا سکتا تھا کہ چوہدری دلاور جو قریب ہی کسی گاڑی میں ٹرانسمیٹر لیے بیٹھا تھا اب جا چکا تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ رہائی کے دوسرے امکانات کا جائزہ لیتا رہا مگر یہ امکانات صفر تھے۔ نہ کسی کو یہ معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں جو میری مدد کے لیے آ جاتا اور نہ میں خود باہر سے اپنا راستہ بنا سکتا تھا۔ کمرے کے تینوں دروازے اتنے مضبوط تھے کہ ان کا ٹوٹنا محال تھا اور مدد کے لیے میری فریاد و فغاں بھی کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اب میرے لیے زندگی کو داؤ پہ لگا کے قسمت آزمانے کے سوا کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔ میں نے ایک ایک سیل کو بڑی احتیاط کے ساتھ نکالنا شروع کیا۔ اوپر والے تین سیل جو ایک ہی قطار میں تھے باہر نکل آئے اور کوئی دھماکا نہیں ہوا۔ چابی اب بھی نظر نہ آئی تھی اور میرے لیے باقی تین سیل نکالنا بھی ناگزیر تھا جو نیچے والی قطار میں دوسرے رخ لگے ہوئے تھے۔ خطرہ کا سامنا کرتے ہوئے میں نے ان کو بھی الگ کر دیا کہ زندگی ہو گی تو دشمن کی کوئی چال مجھے تقدیر کی عطا کی ہوئی آخری سانس لینے سے پہلے نہ مار سکے گی لیکن کاتب تقدیر نے اتنی ہی فرصت عطا کی ہو گی تو اپنی تمام کوشش اور احتیاط سے بھی میں اس میں ایک پل کا اضافہ نہ کر سکوں گا۔ جب خانہ خالی ہو گیا تو مجھے ایک چابی نظر آئی جو اسپنج کی پتلی سی تہہ کے اوپر رکھی تھی۔ پین ٹارچ کی روشنی بڑی نامناسب تھی لیکن اس کو چابی پہ مرکوز کرنے سے مجھے وہ بات معلوم ہو گئی جس نے مجھے مرگ ناگہاں سے بچا لیا۔ چابی کے دونوں کناروں کو باریک تاروں سے باندھ رکھا تھا۔ ایک تار چابی کے گول سوراخ والے حصے پر لپٹا ہوا تھا اور اس کا دوسرا سرا خانے میں دائیں جانب پن جیسے سوراخ میں غائب ہو گیا تھا۔ دوسرا تار چابی کے اس حصے پر جوڑا گیا تھا جو وہ لاک کے اندر داخل ہوتا ہے اور اس تار کا دوسرا کنارہ خانے کے بائیں حصے میں نظر آنے والے چھوٹے سے سوراخ میں جا رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ٹرانزسٹر ریڈیو میں کوئی بم موجود ہے تو یہ چابی ہی اس کا فیوز ہے۔ اگر میں جلد بازی کا مظاہرہ کرتا اور ہدایات ملتے ہی احتیاط کے سارے تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سیل نکال کر چابی کو اٹھانے کی کوشش کرتا تو جھٹکے سے وہ باریک تار ٹوٹ جاتے جو سرسری نگاہ ڈالنے پہ دکھائی نہ دیتے تھے۔ پھر شاید ایک دھماکا ہوتا اور میرا وجود ہی باقی نہ رہتا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دشمنوں کے بہت سے مسائل کا خاتمہ ہو جاتا۔

میں نے اس رب کریم کا شکر ادا کیا جس نے مجھے زندہ رکھا اور زندہ رہنے کی جدوجہد کے لیے عقل سے کام لینے کی توفیق عطا کی۔ بڑی احتیاط سے میں نے تمام سیل سابقہ پوزیشن کے مطابق اسی خانے میں فٹ کر دیے اور ڈھکن کو برابر کر دیا۔ اس کامیابی نے میرے حوصلے دشمنوں کے عزائم سے کہیں زیادہ بلند کر دیا تھا۔ میرے لیے دام اجل بچھانے والے شکاری تدبیر کر چکے تھے کہ میرا کام تمام کر دیا جائے اور انہیں یقین بھی ہو گا کہ وہ میرا پتا کاٹ دیں گے۔ بعد میں وہ دوسرے مسائل پیدا ہونے سے پہلے نمٹا لیں گے اور دشمن میرے قتل کو واقعات کے پرانے سلسلے کا نتیجہ قرار دیں گے اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش بھی کریں گے کہ میرا برطانیہ سے اخراج، وزیر خان کی پُراسرار موت، مجھ پہ میر شرافت علی کے قتل کا الزام اور بالآخر میرا قتل ایک ہی سازش تھی اور یہ سازش کرنے والے وہ لوگ تھے جو ایمرڈ ہیومیڈی انجینئرنگ کمپلیکس کو بلاشرکت غیرے اپنی ملکیت میں لینا چاہتے تھے تاکہ وہ ایک جائز کاروبار کے نام پہ اپنی مجرمانہ سرگرمیاں جاری رکھ سکیں لیکن یہ سب کچھ ثابت کرنا جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ مشکل کام ثابت ہوتا۔ بالفرض محال وہ ہر جرم کا ثبوت فراہم کر دیتے اور ہر مجرم کو کیفر کردار تک پہنچا دیتے تب بھی یہ ان کی شکست ہی ہوتی کیونکہ اس سے نہ مجھے میری زندگی واپس مل سکتی تھی اور نہ وہ حق حاصل ہوتا تھا جس کے لیے ہماری سب جدوجہد تھی۔ اس وقت مجھے یہ خیال بھی آیا کہ جدوجہد کو جاری رہنا چاہیے خواہ میں خود رہوں یا نہ رہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ایک جھوٹ بولا تھا کہ میرے بعد حق وراثت خود بخود رابعہ کو منتقل ہو جائے گا اور رابعہ کی وصیت کے مطابق کسی تیسرے شخص کو اور یہ سلسلہ ختم نہیں ہو گا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ یہ انتظام مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ یہ ایک ایسا دفاعی نظام تھا جو دشمن کے عزائم کو خاک میں ملا سکتا تھا۔ اب تک وہ سمجھتے تھے کہ مجھے ہراساں کر کے لالچ دے کر یا اپنے راستے سے ہٹا کر وہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کر سکتے ہیں لیکن ان کو یقین آ جائے کہ وزیر خان مرحوم کے وارث کے بعد بھی وارث کبھی ختم نہیں ہوں گے اور ایک کے بعد ایک خود کو حقدار ثابت کرنے کے لیے آتے رہیں گے تو پورے کاروبار پر قابض ہونے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو گا۔ انہیں سوچنا پڑے گا کہ سکندر بخت کو قتل کرنے کا فائدہ کچھ نہ ہوا تو مشکلات میں اضافہ کرنے سے کیا حاصل؟ اس کے بعد رابعہ آ جائے گی۔ اگر انہوں نے رابعہ کو ٹھکانے لگایا تو محسن میدان میں اترے گا۔ محسن کے بعد شملا آ سکتی ہے اور دشمن یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میرے وارثوں اور خون ناحق کے دعویداروں کا سلسلہ کہاں تک دراز ہو گا۔ جب انہیں احساس ہو گا کہ ان کے مقابل ایک سکندر بخت کے بعد ان گنت سکندر بخت ہیں تو یہ ان کی شکست ہو گی اور یہی میرے لیے تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت ہو گی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو پہلا

www.paksociety.com

کام بھی کروں گا کہ اپنا وصیت نامہ منگوا کے رجسٹر کروا لوں گا۔ محسن یا رابعہ دونوں میں سے کسی ایک کو اپنے بعد اپنا وارث بنا جاؤں گا اور ان سے بھی کہوں گا کہ وہ میری پیروی کرتے ہوئے اپنے اپنے وصیت نامے کے مطابق کسی کو وارث بنا دیں۔ اول تو دشمن خود ہی جان جائیں گے کہ ہم نے اپنے دفاعی حصار کو ناقابلِ تسخیر بنا دیا ہے ورنہ ہم خود اس کی تشہیر کر کے یہ بات ان تک پہنچا دیں گے۔ انہیں سوچنا پڑے گا کہ سکندر بخت کو مارنا بے سود ہے۔

فوری مسئلہ یہ تھا کہ رہائی کی کیا صورت ہو۔ میں نے ٹرانزسٹر کو ایک طرف رکھ دیا لیکن آف نہیں کیا۔ اس کے ذریعے کل پھر سوئی بھی دی جا سکتی ہے۔ اگر میں اس کو چھیڑ دیتا تو دشمنوں سے دوبارہ مواصلاتی رابطہ قائم ہونے کے امکانات بالکل ختم ہو جاتے۔ ٹرانزسٹر کی صورت میں میرے پاس دشمن کا ایک ایسا خطرناک ہتھیار بھی آ گیا تھا جسے میں ضرورت پڑنے پر خود دشمن کے خلاف استعمال کر سکتا تھا۔ میں نے زور زور سے دروازہ پیٹا اور اس امید پر "کوئی ہے ۔۔ کوئی ہے" چلاتا رہا کہ شاید کوئی قریب ہو تو میری آواز سن لے یا خالی کوٹھی کا چوکیدار آ گیا ہو تو متوجہ ہو جائے لیکن میری پکار صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ کمرے میں ایک کیل تک نہ تھی جسے ٹھونک ٹھونک کر میں دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا یا دیوار کھرچ کے پلاسٹر ہٹانے کے بعد ایک اینٹ نکال سکتا۔ یہ کام مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔ ایک کیل سے دیوار میں شگاف کرنا تو صرف مستقل مزاجی اور وقت کی بات تھی۔ چوبیس گھنٹے کی محنت سے یہ کام ہو سکتا تھا۔ میں نے دوسری جنگِ عظیم میں قیدخانوں سے فرار ہونے والوں کی ناقابلِ یقین سچی کہانیاں پڑھی تھیں جو کھانے کے ایک چمچے، ٹین کے ایک ٹکڑے جیسی چیزوں یہاں تک کہ صرف ناخنوں کی مدد سے مہینوں کی محنت کے بعد سرنگ بنا کے نکل گئے تھے۔ میں نے اطمینان سے بیٹھ کر دیوار کا سہارا لیا۔ فرش پہ پاؤں پھیلائے اور سگریٹ جلا کے اپنے مسائل اور وسائل کا جائزہ لینے لگا۔ ٹارچ ختم ہونے کے قریب تھی اور میرے کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔ ماچس کی چند تیلیوں سے میں دروازے میں آگ نہیں لگا سکتا تھا۔ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے ٹھونک ٹھونک کے اسکرو کھولے جا سکیں۔ یہ امید رکھنا فضول تھا کہ محسن یا رابعہ مجھے تلاش کرتے ہوئے آ جائیں گے۔ زیادہ امید اس بات کی تھی کہ وہ خود بھی کسی نامعلوم مقام پہ قید ہوں گے۔

"سکندر اعظم!" ٹرانزسٹر ریڈیو کے اسپیکر نے اچانک کہا۔ "کیا اب بھی زندگی کی آس لگائے بیٹھے ہو؟ جہاں تم ہو وہاں کوئی نہیں آ سکتا۔ تم جواب کیوں نہیں دیتے؟"

میں جواب دیتے دیتے رک گیا۔ مجھے خیال آیا کہ دوبارہ رابطے کی کوشش کا مقصد اس بات کی تصدیق کرنا ہو سکتا ہے کہ میں زندہ ہوں یا ان کی پُرفریب سازش کا شکار ہو چکا ہوں۔ اگر میں بول پڑتا تو انہیں فوراً معلوم ہو جاتا کہ ان کی چال ناکام ہو گئی ہے اور میں ٹرانزسٹر ریڈیو میں پوشیدہ بم کے راز سے واقف ہو چکا ہوں یا میں نے ابھی تک ٹرانزسٹر کھول کے چابی نکالی ہی نہیں ہے۔

"کیا بات ہے سکندر بخت، بات کرنا نہیں چاہتے ہو؟"

"مُردے بات نہیں کرتے۔" دوسری آواز نے کہا۔ کسی نے گالی دی اور ایک قہقہہ سنائی دیا۔

"بکواس مت کرو۔ کیا معلوم وہ جان بوجھ کر خاموش بیٹھا ہو۔" یہ آواز ڈی سلوا کی تھی۔

"یہ ناممکن ہے استاد۔۔۔ اس نے تو اب تک چابی نکالی ہو گی دروازہ کھولنے کے لیے۔"

"فرض کرو اس نے۔۔۔" ڈی سلوا بولا۔

"فرض کیا کرنا استاد! چابی نظر آنے کے بعد یہ ممکن ہے کہ اس کا خیال کسی اور طرف گیا ہو۔" دوسرے نے اس کی بات کاٹ دی۔

"دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "دھماکے کی آواز نہیں آئی۔"

"ارے استاد! تم بھی کس چکر میں پڑ گئے خوامخواہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے چابی ذرا اٹھائی ہو اور اسے بعد میں خیال آیا ہو گا کہ چابی کے ساتھ تار بھی بندھے ہوئے ہیں تو اس خیال سے پہلے ہی تار ٹوٹ چکے ہوں گے۔ تار بہت باریک اور کمزور تھے۔ ایک معمولی سے جھٹکے میں ٹوٹ جانے والے۔ اسے مہلت ہی کہاں ملی ہو گی کہ چابی واپس رکھ دیتا۔"

"اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں لیکن میں فرض کرنے کا قائل نہیں۔ مجھے خود جا کے دیکھنا پڑے گا۔" ڈی سلوا اپنی بات پر اڑا رہا۔

"تمہاری مرضی ہے تو چلو۔"

آوازیں کم ہوتے ہوتے معدوم ہو گئیں۔ میری خاموشی نے ان کو اپنی کامیابی کا یقین تو دلا دیا تھا لیکن ان کا استاد یقین کرنے کے خلاف تھا۔ اب وہ دیکھنے آ رہے تھے کہ کیا خاموشی کا مطلب کامیابی ہے اور ان کا شکار دھماکے کے بعد نیست و نابود ہو چکا ہے یا اس میں کوئی خرابی واقع ہو گئی ہے۔

دیکھنا اب یہ تھا کہ وہ کتنے قریب آ کر تصدیق کرتے ہیں۔ آخر ٹرانزسٹر میں کتنا بڑا بم رکھا جا سکتا ہے؟ اس کے اندر خالی جگہ زیادہ نہیں ہوتی اور اس میں اتنا آتش گیر مادہ نہیں بھرا جا سکتا جو اس کمرے کی دیواریں ڈھا دے لیکن ایک آدمی کی جان لینا کوئی مشکل کام نہیں خصوصاً اس شخص کو جو ٹرانزسٹر ہاتھ میں لیے کھڑا ہو۔ پھر کیا وہ اندر آ کے دیکھیں گے یا نہیں۔۔۔ وہ دور سے ہی اندازہ کریں گے کہ دھماکا ہوا کہ نہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ دھماکے سے دیواریں نہ گریں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ دھماکا آس پاس رہنے والوں کو متوجہ نہ کرے۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ویران کوٹھی بدستور ویران پڑی ہے اور آس پاس لوگ جمع نہیں ہیں تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے اور یا تو میں عمداً خاموش رہا تھا یا میں نے مواصلاتی رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ سیل نکال کر سوئی آف کیے بغیر یہ تھا کہ صرف ٹرانزسٹر ریڈیو آف کر کے رابطہ ختم کیا جا سکتا تھا۔

یہ خیال بہت حوصلہ افزا تھا کہ دشمن دور ہی سے لوٹ جائیں گے۔ اگر وہ اندر آ گئے تو ان سے مقابلہ کر کے باہر نکلنے کا راستہ بنایا جا سکتا تھا۔ اس مقابلے میں میرا مارا جانا بھی ممکن تھا لیکن یہ موت زیادہ قابلِ قبول تھی۔ بصورت دیگر مجھے اسی کوٹھڑی کی ویرانی میں بھوک اور پیاس کا طویل عذاب جھیل کر مرنا تھا۔ ایک بار پھر میرا ذہن ٹرانزسٹر کی طرف گیا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس میں جو بم یا آتش گیر مادہ بھرا ہوا ہے اس کی ہلاکت کا دائرہ بھی محدود ہے تو اس سے وہ شخص یقیناً ہلاک ہو سکتا ہے جو اس کے بہت قریب ہو لیکن اگر وہ خود دور ہو تو پھر... اچانک میں نے آزادی کی روشنی کو یوں پھیلتے دیکھا جیسے صبح کاذب کے دھندلکے میں صبح صادق کا اجالا پھیلتا ہے۔ مایوسی کے گھپ اندھیرے میں ایک کرن روشن ہو گئی۔ ذہن کے بند دروازے کھلتے گئے اور ایک قابلِ عمل خیال نے میرے ذہن میں جگہ بنا لی۔

جو کچھ میں نے سوچا تھا وہ بھی پُرخطر تھا۔ جان جانے کے امکانات اس میں بھی تھے مگر یہ امکانات صفر سے بڑھ کر پچاس فیصد ہو گئے تھے۔ کچھ کیے بغیر مرنے سے کچھ کر کے مرنا بہتر تھا۔ پہلے میں نے اپنی قمیص اتاری لیکن کچھ سوچ کے اس کو پھاڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پتلون کے نیچے میں نے انڈرویئر پہن رکھا تھا جس کی لمبائی دو فٹ سے زیادہ تھی اور لاسٹک لگا ہوا تھا۔ میں نے پتلون کو ... اتار کے پھینکا اور اس کا الاسٹک نکال لیا۔ یہ ... الاسٹک کھینچنے سے ... لمبا ہو جاتا تھا۔ قمیص کو پھاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ... بڑی صفائی سے بنیان کو پھاڑا اور اس کی گولائی ... اچھی چوڑی کئی پٹیاں نکالیں۔ ان سب پٹیوں کو گرہ لگا کر آپس میں جوڑنے سے ایک اتنی لمبی پٹی بن گئی جو کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جا سکتی تھی۔

اب دوسرا مرحلہ درپیش تھا جو سب سے زیادہ خطرناک تھا لیکن کامیابی کی امید نے مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح چاق و چوبند اور مستعد کر دیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ٹرانزسٹر ریڈیو کا سیل والا خانہ کھولا اور سارے سیل نکال دیے۔ قفل کی وہ چابی میرے سامنے آ گئی جو زندگی کے راستے کھول سکتی تھی مگر مجسم موت تھی۔ بہت آہستہ آہستہ چابی کو ذرا بھی ہلائے بغیر میں نے اس کے نیچے سے اسفنج کی پتلی تہہ کو نوچ کر جدا کرنا شروع کیا۔ نرم ربڑ کے بستر پہ یہ چابی کسی لاش کی طرح لیٹی ہوئی تھی۔ ٹرانزسٹر ریڈیو بنانے والی کمپنی نے یہ نرم تہہ اس لیے بچھائی تھی کہ سیل سے پلاسٹک کی باڈی کو نقصان نہ پہنچے۔ میں ایک انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے تھوڑا تھوڑا فوم ربڑ نوچتا رہا۔ تقریباً دس منٹ تک میری جان سولی پہ لٹکی رہی۔ اگر غلطی سے بھی میری انگلی سے چابی کو جھٹکا لگ جاتا تو کوئی نہ کوئی تار ٹوٹ جاتا۔ بالآخر میں چابی کے درمیانی حصے کے نیچے سے فوم ربڑ صاف کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب چابی کے نیچے تین سوت کا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے انڈرویئر میں سے نکلنے والے گول الاسٹک کا ایک سرا اس خلا میں سے گزارا۔ خالی جگہ تقریباً اتنی ہی تھی جتنی الاسٹک کی گولائی۔ آہستہ آہستہ کھینچنے سے الاسٹک کا سرا دوسری جانب بڑھتا گیا۔ جب اس کی لمبائی چار انچ کے قریب ہو گئی تو میں نے سرے کو تھام کر باقی الاسٹک کے ساتھ وہ گرہ لگائی جو کھینچنے سے کھلنے کے بجائے اور سخت ہو جائے۔ جب کام مکمل ہو گیا تو میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور اس وقت مجھے اپنے ماتھے پہ پسینے کی نمی کا احساس ہوا۔ میرا آدھے سے بھی کم رہ جانے والا بنیان قریب ہی پڑا تھا۔ اس سے میں نے ہاتھ اور منہ صاف کیے اور آخری مرحلے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں نے ٹرانزسٹر کو ایک دروازے سے ملا کے رکھا اور الاسٹک کے لمبے حصے کے ساتھ وہ ڈوری بھی منسلک کر دی جو میں نے بنیان پھاڑ کے بنائی تھی۔ پوری احتیاط کے ساتھ میں اس ڈوری کو مخالف سمت میں آخری گوشے تک لے گیا۔ اب میرے اور اس بم کے درمیان تقریباً بارہ فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں نے الٹا لیٹ کر وہ پوزیشن اختیار کی جس سے میرا چہرہ، سر اور بازو محفوظ ہو گئے۔ میں اب کونے میں منہ دیے لیٹے کی حالت میں پڑا تھا۔ اللہ کا نام لے کر میں نے ڈوری کو کھینچنا شروع کیا۔ ڈوری میں بہت لچک تھی۔ بنیان کے ٹکڑے بھی الاسٹک کی طرح کھنچ رہے تھے۔ میں ڈوری کو ایک ایک انچ تک کھینچتا گیا۔ ہر بار میرا دل پہلے سے زور سے

www.paksociety.com

دھوکتا تھا اور میں چند سیکنڈ کے بعد ڈوری کو کھول کر کھینچ لیتا تھا
جب دھماکا ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے کانوں کے پردے
پھٹ گئے ہوں۔ خالی کمرے میں اس کی گونج زیادہ سنائی دی
تھی مگر اس کے ساتھ ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ سب خیریت ہے۔
نہ میں زخمی ہوا ہوں اور نہ مجھ پر کمرے کی دیواریں گری ہیں۔ میرا
اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ بم زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اتنا
چھوٹا بھی نہیں تھا۔ اگر ٹرانزسٹر میرے ہاتھ میں ہوتا تو میرا
حشر بھی وہی ہوتا جو اب دروازے کا ہوا تھا۔ اس کا نچلا حصہ
صاف اڑ گیا تھا۔ قبضے اور لاک کے نکل جانے سے دروازہ
صرف اوپر کے ایک قبضے پر ٹکا رہ گیا تھا اور ٹیڑھا ہو گیا تھا
آتش گیر مادے سے چوکھٹ کی خشک لکڑی نے بھی آگ
پکڑ لی تھی اور پٹ بھی جل رہا تھا۔ بم کے ٹکڑے قریب کی
دیوار پر خراش ڈالتے ہوئے گزرے تھے لیکن آخری کونے
تک پہنچتے پہنچتے ان کی قوت کچھ کم ہو گئی تھی اور جو ٹکڑے
وہاں تک پہنچے تھے وہ بھی بہت اوپر کے حصے میں لگے
تھے۔ ٹرانزسٹر یا اس ٹرانسمیٹر ریڈیو کا نام و نشان تک نہ
رہا تھا۔ میں نے آدھی بنیان کے ٹکڑے کو بھی جلتے دیکھا اور
دروازے کی طرف لپکا۔ چوکھٹ اب آگ کا ایک حلقہ تھی
اور میری راہ میں دروازے کا وہ پٹ بھی ایک رکاوٹ تھا
جس کی خشک لکڑی سے شعلے اٹھ رہے تھے لیکن میں نے دوڑتے
ہوئے جست لگائی اور اس آگ میں سے سرکس کے بازیگر کی
طرح صاف گزر گیا۔ باہر گرتے ہی میں پھر اٹھ کر بھاگا۔ دھماکے
نے آس پاس کھلبلی مچا دی تھی۔ مجھے تین طرف سے لوگ
دوڑتے ہوئے نظر آئے چنانچہ میں نے چوتھی طرف کا رخ
کیا۔ آگ کے پورے مکان میں پھیلنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا
کیونکہ دروازے کے آس پاس صرف دیواریں تھیں۔ دوسرے
دروازے اور کھڑکیاں شعلوں کی دسترس سے دور تھے مگر
اندھیری رات میں یہ آگ بھی کسی الاؤ کی طرح سب کو متوجہ
کر رہی تھی۔ میں ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ دیکھتے
ہی دیکھتے وہاں ایک مختصر سا ہجوم ہو گیا۔ ہجوم میں زیادہ
تعداد نوکروں کی تھی جو آس پاس کی کوٹھیوں میں کام کرتے
تھے۔ انہوں نے ذرا سی دیر میں دروازے کی آگ بجھا دی۔
نہ جانے کہاں سے ان کو پینٹ کے خالی ڈبے مل گئے تھے
اور یہ ڈبے انہوں نے اندر ہی کے نلکوں سے بھر لیے تھے۔
اب وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ دھماکا کیسا تھا اور
آگ کیسے لگی یہ سوال تو نہ آدمی سے تھا نہ آدم زاد۔
سڑک پر دو تین گاڑیاں رک گئی تھیں۔ اچانک
میں نے رابعہ کی سرخ خستہ حال فوکس ویگن کو بھی سڑک پر رکتے
دیکھا۔ میں درخت کی اوٹ سے نکلا اور ابھی وہ دونوں گاڑی
سے نکلے ہی تھے کہ میں ان کے پاس جا پہنچا۔ وہ دونوں مجھے
دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

"تم!" ان دونوں نے غیر ارادی طور پر ایک ساتھ کہا۔

"ہاں میں!" میں نے اگلی سیٹ اٹھا کر پیچھے کی سیٹ
پر جمپ لگاتے ہوئے کہا۔ "پہلے یہاں سے نکل چلو پھر باتیں
کریں گے۔"

وہ فوراً اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور محسن نے گاڑی چلا دی۔
پیچھے کھڑی ہوئی ایک سفید کار میں سے کوئی شخص چلا کر
اسے ... لیکن پھر کسی کا انتظار کیے بغیر وہ گاڑی لے کر ہمارے
پیچھے دوڑا۔ اس نے مجھے گاڑی میں سے چھلانگ کر آتے دیکھا
تھا۔ فوکس ویگن صرف ایک منٹ کے لیے رکی تھی اور مجھے
لے کر روانہ ہو گئی تھی چنانچہ وہ شخص یہ سمجھنے میں حق بجانب
تھا کہ میں ہی دھماکے اور آتش زنی کا ذمہ دار ہوں اور وہ
میرے ساتھی تھے جو عین وقت پر مجھے لے کر فرار ہو رہے تھے۔

"اس کی تو ایسی کی تیسی!" محسن نے کہا۔ "ہم سے دوڑ
لگانے کا!" اس نے گاڑی کی رفتار ایک دم بڑھا دی۔ ٹوٹی پھوٹی
نظر آنے کے باوجود فوکس ویگن اپنے انجن کی کارکردگی کے اعتبار سے
بہت بہتر تھی۔ رات کے وقت سڑکیں خالی ہونے کا فائدہ بھی
ہوا۔ دس منٹ میں محسن نے دائیں بائیں کئی موڑ کاٹے۔ اس
وقت تک ہمارے تعاقب میں آنے والا بہت پیچھے رہ گیا
تھا اور شاید مایوس ہو کر "مجرموں" کو پکڑنے کا ارادہ بھی ترک
کر چکا تھا۔ محسن نے سامنے کے آئینے میں دیکھ کر اپنا اطمینان کیا
اور رفتار کم کر دی۔

"شکر ہے تم زخمی نہیں ہوئے!" رابعہ نے پیچھے مڑ کر تشویش سے کہا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں!" میں نے بشاشت سے
کہا۔ "تم نے مجھے دوڑتے نہیں دیکھا تھا؟"

"لیکن تمہارے ہاتھوں پر خون کے داغ ہیں!" رابعہ
نے کہا۔ "اور تمہارے کپڑوں پر بھی!"

"وہ معمولی خراشیں ہیں، فکر کی کوئی بات نہیں!" میں نے
کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ اس غلط جگہ پر تم دونوں وہاں کیسے پہنچے؟"

"ہم تو بہت دیر سے ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے تھے!"
محسن بولا۔ "جب دھماکا ہوا تو ہم دوسری سڑک پر تھے۔" رابعہ
نے کہا کہ محسن یہ دھماکا کیسا تھا؟ اور میں نے اندازے سے گاڑی
ادھر موڑ لی۔ پھر ہمیں آگ لگی ہوئی نظر آ گئی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر تم اس علاقے میں کیسے پہنچے؟"

میں نے پوچھا۔

"ہم رابعہ کے آفس سے نیچے تو اتر آئے تھے!" محسن نے
کہا۔ "مگر نیچے ایک گاڑی کھڑی تھی اور اس میں ایک شخص بیٹھا ہوا
بیٹھا تھا۔ اس نے ہمیں روک لیا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ
تمہارے ساتھ کیا ہوا۔ پھر اس گاڑی میں دو آدمی آ بیٹھے اور
گاڑی روانہ ہو گئی۔ ہمیں بعد میں اپنی کار تک پہنچنے میں کچھ دیر
لگی لیکن میں نے گاڑی کے پیچھے لگا دی تھی۔ گاڑی کا نمبر تو میں نے
نوٹ نہیں کیا تھا لیکن دو نشانیاں دیکھ لی تھیں۔ ایک یہ کہ
سیدھے ہاتھ کی ٹیل لائٹ ٹوٹی ہوئی ہے اور دوسری یہ کہ اس
کا رنگ لال ہے۔ شہزاد کے پاس میں نے اس گاڑی کو پہچان
لیا وہاں پیچھا کرنا آسان تھا کیونکہ آس پاس بہت سی گاڑیاں
تھیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ گاڑی زیادہ رفتار سے نہیں جا
رہی تھی اور مسلسل ایک دوسری گاڑی کے پیچھے چل رہی تھی۔
میں نے دونوں گاڑیوں کے نمبر دیکھ لیے اور آگے جا کے تصدیق
ہو گئی کہ وہ دونوں گاڑیاں ساتھ ساتھ ہیں۔ جب خیرآباد علاقہ
آیا تو لال گاڑی نے اپنی ہیڈ لائٹس آف کر دیں اور ہمارے لیے
بھی کم فاصلے سے پیچھے لگے رہنا مشکل ہو گیا۔ ہم تقریباً ایک
فرلانگ دور رہے اور ہم نے بھی ہیڈ لائٹس بند رکھیں لیکن
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں کچھ شک ہو گیا تھا۔ وہ ہمیں
ڈاج دے کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم اس علاقے میں
تو پہنچ ہی گئے تھے۔ اچانک ایک گاڑی ہمارے سامنے
سے نمودار ہوئی اور سیدھی گزر گئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس ٹوٹی ہوئی
تھیں۔ اندھیرے میں ٹکر ہو جاتی چنانچہ میں نے لائٹس جلا
دیں۔ آخری وقت میں مجھے اندازہ ہوا کہ یہ تو وہی گاڑی ہے
جو لال گاڑی کے آگے آگے چل رہی تھی لیکن اب وہ واپس
جا رہی تھی اور اس کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ میرے کسی فیصلے پر
پہنچنے سے قبل ہی وہ غائب ہو گئی۔ اس کا کہیں ایکسیڈنٹ
ہو گیا تھا!"

"ہاں اس کا ذمہ دار میں ہوں!" میں نے کہا۔ "گاڑی
رکنے کی کوئی اور صورت نہیں رہ گئی تھی!"

"اس طرح گاڑی رکنے سے پہلے آپ نے غور فرمایا تھا
کہ آپ خود بھی ٹوٹ پھوٹ سکتے ہیں!" رابعہ نے کہا۔

"غور فرما لیا تھا!" میں نے کہا۔ "لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔
میرے لیے یہ خطرہ مول لینے کے سوا چارہ ہی کیا تھا اور خطرات
تو اب زندگی کا ایک ایسا جزو بن گئے ہیں کہ خوف کا کوئی مفہوم
نہیں رہا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ جس روز ہماری زندگی کے حالات
معمول پر آ گئے اور کوئی خطرہ باقی نہ رہا اس روز یہ زندگی بالکل
بے کیف اور سپاٹ ہو جائے گی۔ بالکل عام لوگوں کی زندگی کی
طرح کی!

"صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ عمر یونہی تمام ہوتی ہے!"

"تمہارے لیے عام آدمی کی زندگی بے مصرف اور غیر
دلچسپ ہے!" رابعہ نے کہا۔ "اس لیے کہ وہ معمولات کے
مطابق جیتے ہیں۔ ان کے جینے میں کوئی مسرت کی بات
نہیں ہے کیونکہ اس میں خطرات کی سنسنی خیزی نہیں ہے۔ یہ کیسا
عجیب فلسفۂ حیات ہے تمہارا۔ لوگ تو قدم قدم پر خوشیوں
کے خزانے تلاش کرتے ہیں کیونکہ خوشی تو صرف ایک احساس
کا نام ہے۔ تمہاری بات کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ خوش
قسمتی سے تم زندہ رہے تو بڑی بدبختی یہ ہوگی کہ تمہارا احساس
مر جائے گا!"

"یہ وکیلوں کی طرح الفاظ سے غلط مطلب اخذ کرنے
کا کمال دکھایا ہے تم نے!" میں نے کہا۔ "حالانکہ آپ بھی اچھی طرح
جانتی ہیں کہ میں آدمی ہوں مشین نہیں۔ چنانچہ میں جذبات سے
محروم نہیں۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سنسنی خیز مسرت کا وہ
احساس مجھے نہ ہو جو ہر کامیابی عطا کرتی ہے، وہ مسرت عطا
کرتی ہے جس میں روز فرقت کے بعد شب وصل کی راحت
کا یقین ہو۔ جو تخلیق کے غرور سے ملتی ہے۔ لفظ بانٹتے
رنگ سے اور خوشبو سے۔ یہاں تک کہ ایک ایٹم بم گرا
کے لاکھوں انسانوں کو مار دینے کے بعد فتح کے اعلان سے
ملتی ہے!"

"تم دونوں خبطی اور جھکی ہو!" محسن نے جھنجھلا کے کہا۔ "خدا
موقع محل اور سچویشن سے اتر گئے۔ ملاحظہ ہو کہ بات کیا ہو رہی
ہے سارے بابا یہ سوچ کر رسید بیاد جانے کی خبر گرفت!"

"تم نے تو مجھے حیران کر دیا یار!" میں نے ہنس کر کہا۔

"ہم لوگ غصے میں انگریزی بولتے ہیں تم فارسی بولتے ہو!"

"ابھی یہ انگریزی فارسی سب دھری رہ جائے گی!"
محسن نے اسی لہجے میں کہا۔ "جب رضوی صاحب یہ پوچھیں
گے کہ آخر سواری کہاں سے تشریف لا رہی ہے اور جناب کا
یہ حلیہ کیا ہو رہا ہے؟"

"ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ گھر پہنچتے ہی تم دونوں
فرار ہو جاؤ!" رابعہ نے کہا۔ "میں اتر کر اندر چلی جاؤں گی اور
میرا بیان صاف ہوگا کہ آفس سے آ رہی ہوں۔ تم دونوں
شریفانہ حلیہ بنا کے کچھ دیر بعد آ سکتے ہو۔ بہانے بنانے تو
تمہیں آتے ہی ہیں!"

"بجا ارشاد!" میں نے کہا۔ "لیکن فرض کرو رضوی صاحب

یہاں باہر ہی مل گئے۔ انتظار اور اضطراب میں ٹہلتے ہوئے تو گاڑی سے اترتے ہی وہ ہمیں دیکھ لیں گے اور پھر پیشی ہی ہوگی یعنی مجھ۔ کیا بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔ ہمارا جھوٹ نہیں چلے گا، اس لیے میں ترکیب نمبر دو عرض کرتا ہوں۔ یعنی محسن رابعہ کے پروگرام پہ عمل درآمد کا موقع نہ ملا تو پھر سب سے مناسب یہی ہوگا کہ حقیقت حال عرض کر دی جائے۔ اس میں آخر نقصان ہی کیا ہے؟"

"میں اتفاق کرتا ہوں۔" محسن بولا۔ "لیکن حقیقت حال میں سے استاد ٹیڈی کو خارج کر دیا جائے۔ باقی سب وہی ہو جو ہوا اور سب نے دیکھا۔ رضوی صاحب جانتے ہیں کہ ہمارے دشمن کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں، اب تک کیا کر چکے ہیں اور آئندہ کیا کر سکتے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے سکندر کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ ہم نے تعاقب کیا، باقی سکندر خود بتا دے گا۔"

رضوی صاحب باہر نہیں تھے ان کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ کوئی اور گاڑی ہوتی تو ہم خاموشی سے اتر کے ترکیب نمبر ایک پہ عمل کر لیتے مگر فوکس ویگن تو دور سے اپنی آمد کا اعلان کرتی ہے۔ ابھی ہم نے گاڑی روکی بھی نہیں تھی کہ وہ باہر نکل آئے۔

"آ گئے آپ لوگ؟" انہوں نے ہمیں مجرموں کی طرح خاموش کھڑا دیکھ کر کہا۔ "وقت کیا ہو رہا ہے؟"

ہم نے باری باری ایک دوسرے کی صورت دیکھی۔ سب کی صورت پہ بارہ بج رہے تھے مگر گھڑیوں میں ایک بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔

"ہم ایک مصیبت میں پھنس گئے تھے انکل!" رابعہ نے ہمت سے کام لے کر کہا۔

"یہ اندازہ تو سکندر کا حلیہ دیکھ کے بھی ہو جاتا ہے۔" وہ ناراضگی سے بولے۔ "مصیبت یہ ہے کہ تم لوگ مصیبت سے دامن بچا کے نکلنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ خود مصیبت میں گرفتار ہونے چلے جاتے ہو۔ آج کیا ہو گیا تھا؟ خیر بعد میں بتانا، پہلے اندر آؤ۔ کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے نا؟"

"بس آج خدا نے بچا لیا ورنہ" رابعہ نے اندر پہنچنے کے بعد کہا۔ "کچھ لوگ سکندر کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔"

"اچھا تم جاؤ اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔" رضوی صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔ "کھانا وغیرہ کھایا ہے یا نہیں؟"

"ابھی تک تو دھکے ہی کھائے ہیں۔" رابعہ نے دبے لہجے میں کہا۔ "اور اب آپ کی جھاڑ کھا رہے ہیں۔"

رضوی صاحب مسکرائے۔ "اچھا تم بھی جاؤ اور دیکھو کھانے پینے کا کیا انتظام ہو سکتا ہے۔ میں محسن سے بات کرتا ہوں۔"

تقریباً پندرہ منٹ بعد میں ہاتھ منہ دھو کر خراشوں کو ڈیٹول سے صاف کر کے اور کپڑے بدل کے واپس پہنچا تو محسن خاموش بیٹھا تھا اور رضوی صاحب ایک ہاتھ نائٹ گاؤن کی جیب میں ڈالے اور دوسرے ہاتھ میں پائپ لیے کھڑے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ رضوی صاحب نے اپنا سارا غصہ محسن پر اتار لیا ہے۔ پانچ منٹ بعد رابعہ ٹرے اٹھائے اندر آ گئی اور ہم بلا تکلف کھانے میں لگ گئے۔ رضوی صاحب نے آدھی کہانی محسن کی زبانی سن لی تھی۔ اپنے قید ہونے اور قید سے نکلنے کا احوال میں نے کھانے کے دوران میں بتا دیا۔ رضوی صاحب سنتے رہے اور کمرے میں ٹہلتے رہے۔ رابعہ کچن میں چائے کے لیے پانی رکھ آئی تھی۔ کھانے کے برتن سمیٹ کر وہ چائے بنانے کے لیے چلی گئی۔

"تم دوبارہ اس مکان تک پہنچ سکتے ہو؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"براہِ راست تو نہیں پہنچ سکتا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے کہ رات کا وقت تھا اور وہ نئی آبادی ہے سب سڑکیں ایک جیسی لگتی ہیں لیکن گھوم پھر کر دیکھا جائے تو ممکن ہے کہ میں کوٹھی کو دیکھ کر پہچان لوں۔ اس کے علاوہ آس پاس کے رہنے والوں سے بھی مدد مل سکتی ہے۔ دھماکا دور تک سنا گیا تھا اور بہت سے لوگوں نے دور سے ہی آگ بھی دیکھی ہوگی۔"

رضوی صاحب نے انداز میں سر ہلایا۔ "جہاں تک میرا خیال ہے دونوں کاریں چرائی گئی ہوں گی یا ان کی نمبر پلیٹ جعلی ہوگی۔ مکان کے اصل مالک سے کچھ پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا لیکن جلنے والے آلات پر... میرا مطلب ہے اس کمرے میں سے بم کے ٹکڑے مل سکتے ہیں اور ان سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ بم کس کا تھا۔ ہمارے ریکارڈ پر بہت سے ماہرین کے نام ہیں جو پیشہ ور مجرموں کی مدد کرتے ہیں مثلاً جعلی دستاویزات بنانے والے، خصوصاً پرانی تاریخوں کے اسٹامپ پیپر فروخت کرنے والے، عدالتوں کی مہریں اور دستخط بنانے کے ماہر، ہر قسم کی شناختی دستاویزات تیار کرنے والے، جھوٹے گواہ اور ضامن فراہم کرنے والے... لیکن یہ کچھ دہشت گردی کا کیس ہے۔ ہمارے ملک میں تو کوئی دہشت پسند تنظیم موجود نہیں مگر دوسرے ملکوں میں ہر نظریے کے یا حکومت کے حامی لوگوں کی تنظیمیں ہیں مثلاً بلیک ستمبر یا بلیک سنڈے۔ اور ان کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ ان کے پاس ایسے ذرائع ہیں کہ وہ ہر قسم کا اسلحہ اور ماہرین کی خدمات بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ قتل و خونریزی تو ہمارے ملک میں بھی ہوتی ہے لیکن اس کے بیشتر اسباب ذاتی ہوتے ہیں یعنی زر، زمین اور زن کے جھگڑے جن میں روایتی ہتھیار استعمال ہوتے ہیں۔ لاٹھی، خنجر یا بندوق اور ریوالور۔ مگر ٹرانسمیٹر یا ریڈیو کے اندر بم چھپانا تو خصوصی فنی مہارت کا کام ہے۔ ریڈیو کو دو طرفہ مواصلاتی رابطے کے قابل بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ کوئی بھی اچھا ریڈیو مکینک عام پرزوں کی مدد سے ریڈیو بھی اسمبل کر سکتا ہے اور ٹرانسمیٹر بھی لیکن ٹرانسمیٹر رکھنا ہمارے قوانین کے مطابق بہت سنگین جرم ہے۔ یہ بڑی آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نشریات کہاں سے جاری ہیں۔ ہمارے پاس آلات ہیں جو ریڈیائی لہروں کی اسی طرح نشاندہی کرتے ہیں جیسے قطب نما کی سوئی شمال کی نشاندہی کرتی ہے اس لیے یہاں کوئی شخص ٹرانسمیٹر بنانے یا رکھنے کی جرات نہیں کرتا۔ تاہم یہ آسان کام ہے۔ اس کے اندر بم چھپانا اور فیوز لگانا دوسری قسم کی مہارت ہے۔ یہ کام کوئی سابق فوجی ماہر انجام دے سکتا ہے لیکن کسی وطن کے محافظوں سے ایسی غیر قومی حرکت کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ سرحد پار کے ہمارے دشمنوں کے ایجنٹ آ گئے ہوں لیکن ابھی تک تخریب کاری کی کوئی واردات بھی نہیں ہوئی ہے۔"

"آپ ایک حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں انکل۔" میں نے کہا۔ "ڈی سلوا کا رابطہ باہر کی دنیا سے بھی ہے اور وہ خود بھی باہر آتا جاتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سامان وہ باہر سے لایا ہو۔"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔" رضوی صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ ان کے پاس زیادہ تباہ کن اسلحہ موجود ہے۔ تمہیں یقین ہے کہ تم نے ڈی سلوا کی آواز پہچان لی تھی؟"

"مجھے کوئی شبہ نہیں۔" میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ "دوسری گاڑی میں ڈی سلوا ہی تھا۔"

رابعہ چائے لے کر اندر آ گئی اور رضوی صاحب بھی بیٹھ گئے تھے۔ تفکرات کے آثار ان کی صورت سے عیاں تھے۔ چائے پیتے ہوئے بھی وہ کچھ سوچتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ محسن کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ اسے میں نے رضوی صاحب کی ناراضگی کا نتیجہ سمجھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم کو اس واقعے کی رپورٹ پولیس کو لکھا دینی چاہیے۔" رضوی صاحب نے کسی فیصلے پہ پہنچ کے کہا۔ "تمہیں یقین ہے تو صاف کہو کہ اغوا کرنے والا ڈی سلوا تھا۔ مکان تو ایک گھنٹے میں مل جائے گا اور وہاں گواہ بھی ہوں گے اگر بم کے ٹکڑے دستیاب ہو گئے تو ہماری لیبارٹری کے ماہرین بم کی ساخت کے بارے میں قطعی رپورٹ دے سکیں گے۔ اس کے بعد تفتیش کا رخ موڑا جا سکتا ہے اور ڈی سلوا سے پوچھا جا سکتا ہے کہ بیرون ملک وہ کہاں کہاں جا چکا ہے اور اس کا رابطہ کن افراد سے رہا ہے۔ بیروت بہت سی دہشت پسند سرگرمیوں کا مرکز ہے کیونکہ وہاں ہر جلا وطن کو پناہ مل جاتی ہے اور قوانین کچھ ایسے ہیں کہ جب تک فرانس کی یا عوام کی سلامتی کو خطرہ لاحق نہ ہو ہر شخص کو سب کچھ کرنے کی آزادی ہے۔ اگر تفتیش کے دوران ڈی سلوا خود ہی قبول کر لے کہ وہ باہر سے اس قسم کا ممنوعہ سامان لایا تھا اور یہ سامان برآمد ہو جائے تو اسے عمر قید تک ہو سکتی ہے۔ اگر تم رپورٹ لکھوانے کے لیے تیار ہو تو ابھی وقت چلے جاؤ۔ رپورٹ میں دیر سے نقصان ہو سکتا ہے۔ صبح پولیس اسے طلب کرے گی اور تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گی تاکہ تم جائے واردات کی نشاندہی کر سکو۔"

"رپورٹ لکھوانے سے تو میں نہیں ڈرتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک تو پولیس کا طریقہ تفتیش... اس میں بہت وقت ضائع ہوگا۔ ڈی سلوا اپنے پیسے اور اثر و رسوخ سے پورا فائدہ اٹھائے گا۔ تفتیش کرنے والے، اصل کی رپورٹ دینے والے اور گواہی دینے والے سب اسی معاشرے کے فرد ہیں جن کو رشوت کا مرض کینسر کی طرح جڑ پکڑ چکا ہے۔ معلوم نہیں کتنے سچ سے مکر جائیں گے اور اگر کوئی سچ بولنے والا ہر قسم کے دباؤ کے باوجود اڑا رہا تب بھی یہ مسئلہ فوراً حل نہیں ہوگا۔ کیس عدالت میں چلتا رہے گا اور فیصلہ معلوم نہیں کیا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری خاطر آپ پولیس میں بدنام ہوں اور خواہ مخواہ اختیارات کے ناجائز الزام سے بدنام ہوں۔ اب بھی دشمنوں کا خیال ہے کہ میں آپ کو ڈھال اور تلوار بنا کے استعمال کر رہا ہوں۔ سازشی ذہن رکھنے والے آپ کے افسران بالا کی رائے کو متاثر کر سکتے ہیں کہ آپ میری پشت پناہ بنے ہوئے ہیں حالانکہ مجھ پہ قتل کا الزام ہے۔"

"اس سے میرا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔" رضوی صاحب نے برہمی سے کہا۔ "میں عدالت کے معاملات میں تو دخل نہیں دے رہا ہوں۔ مقدمے کا جو فیصلہ ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ فرض کرو قتل کا الزام میرے بیٹے یا بھائی پہ ہوتا تو کیا میں اسے گھر سے نکال دیتا؟"

"آپ کو کوئی کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔" میں نے کہا

"لیکن مجھ سے آپ کا سہارا چھیننے کی خاطر یہ تو کر سکتا ہے کہ آپ کو اس شہر سے ٹرانسفر کرا دے اور آپ کے لیے پریشانی پیدا ہو جائے۔ یہاں آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کو رہنے کے لیے اچھی جگہ ملی ہوئی ہے اور آپ کے بچے ایک اچھے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ فرض کیجیے آپ کو اس نے پراگندہ بنا کے بھجوا دیا جائے آپ کیا کریں گے؟ بہ لیکہ جائیں گے تو ایک مستقل مسئلہ گھر سے عدم موجودگی کا اور آنے جانے کا۔۔۔ سب کو ساتھ لے جائیں تو مزید پریشانی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے معاملات سے بالکل بے تعلق رہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک میں اس گھر میں رہوں گا آپ کے لیے بے تعلق رہنا بہت مشکل ہوگا۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"فیصلہ میں نے کیا ہے۔" مجھ سے پہلے رابعہ نے جواب دیا۔ "سکینہ میرا مؤکل ہے اور اس سے میرا کیس خراب ہو سکتا ہے۔ اگر وکیل استغاثہ یہ نکتہ اٹھا دے کہ ملزم کو اعلیٰ پولیس آفیسروں کی حمایت حاصل ہے جو ناجائز دباؤ ڈالتے ہیں تو ضمانت تک منسوخ ہو سکتی ہے اور آپ کے لیے بھی مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ سکینہ کرائے پر مکان لے لے اور محسن کے ساتھ رہے۔"

"اس شہر میں لوگ مجرد اکیلے آدمی کو مکان نہیں دیتے۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"مکان خریدا بھی جا سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "زیادہ بڑا نہ سہی کوئی چھوٹا سا مکان خریدنے کے لیے زیادہ روپے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"چھوٹے سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کسی پرانی، غلیظ اور گنجان بستی میں دو کمرے؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "بلاشبہ وہاں بھی انسان رہتے ہیں اور میرا ذاتی خیال ہے کہ ان میں انسانیت بھی زیادہ ہوتی ہے لیکن کیا سکینہ اس ماحول کا بوجھ اٹھا سکے گی؟ خود تم اور محسن کس ماحول کے عادی ہو؟"

"ضرورت کا تقاضا تو یہی ہے کہ میں کسی ایسی ہی گمنام آبادی میں رہوں۔" میں نے کہا۔ "اور خود رابعہ بھی یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ اسباب وہی ہیں جو رابعہ نے بتائے۔"

"مجھے کچھ ایسے لگتا ہے کہ اتفاق رائے سے تم کوئی فیصلہ کر چکے ہو۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "رابعہ بھی جانا چاہتی ہے۔ تم بھی جانا چاہتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ دولت تمہارے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ مکان خریدنے کی سوچ سکو۔ لیکن رابعہ کے پاس یقیناً ہوگا۔ مگر تم دونوں نے شادی کر کے یا گھر آباد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو مجھے صاف بتا دو۔"

رابعہ نے فوراً چائے کے برتن سمیٹے اور کمرے سے نکل گئی اور میں نے دیکھا کہ رابعہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "چچا! آپ کو کیوں آیا یہ؟"

"ایک تو وہی پرانا محاورہ ہے کہ کچھ چیزیں چھپائی نہیں جا سکتیں۔" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر زیرِ لب مسکرا کے کہا۔ "پھر کچھ اپنی عمر کا تجربہ، کچھ ملازمت کی نوعیت اور کچھ حالات ایسے ہیں کہ مجھے دو اور دو چار نظر آتے ہیں۔۔۔ اور میرا خیال ہے کہ جلد ہی ہوتے ہیں۔ ایک طرف رابعہ کی ضروریات ہیں مثلاً ایک ذاتی مکان جو پہلے تھا اور اب نہیں ہے مگر وہ چاہے تو بنا سکتی ہے۔ احساسِ عدم تحفظ وغیرہ۔۔۔ دوسری طرف تمہاری ضروریات ہیں اور تمہارا مستقبل ہے۔ کمی تم کو بھی کسی چیز کی نہیں ہوگی۔ روپیہ پیسہ تعلیم سب ہے۔"

"بس بس انکل!" میں نے کہا۔ "میں آپ کی بات سمجھ گیا لیکن میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ ابھی شادی یا خانہ آبادی کے کسی پروگرام پر کسی نے غور نہیں کیا اس لیے کہ دوسرے مسائل زیادہ اہم ہیں۔ ان سے نمٹنے کے بعد کیا ہوگا، یہ میں خود بھی نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے میں باعزت طور پر بری ہو جاؤں لیکن سزا کے امکانات کو مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے تو میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ اپنے مقدمے کا فیصلہ ہونے سے پہلے کسی لڑکی کے مقدر کا فیصلہ کروں۔ خود پھانسی لگ جاؤں یا عمر قید پا کے جیل کی دیواروں کے پیچھے بند ہو جاؤں تو اسے بیوہ کر جاؤں یا دنیا میں رسوا، لاوارث اور تنہا چھوڑ جاؤں۔ فیصلے تک زیادہ وقت تو نہیں لگے گا۔ کون بدبخت ہوگی جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ ادھورا سہاگ قبول کرے گی اور مانگ کی افشاں بکھرنے سے پہلے بیوگی کے خیال کو گلے لگائے گی۔ کم از کم رابعہ کو میں ایسی سزا نہیں دے سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ بیوی بن کر وہ میرا مقدمہ لڑے اور ہار جائے تو میری وارث بن کے کسی منحوس صبح کو میری لاش لینے جیل کے دروازے پر انتظار کرے۔ مواقع اور بھی پیدا ہو سکتے ہیں لیکن آج نہیں۔"

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "تم دونوں بالغ ہو اور سمجھدار ہو۔ اپنے معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق طے کرنے کے مجاز بھی ہو کیونکہ تمہیں کسی سے اجازت نہیں لینی۔ تمہارے والدین، حقیقی چچا، ماموں وغیرہ کوئی نہیں جو اپنی بزرگی کی ٹانگ اڑا سکیں۔ اگر ہیں تو جیسے کے انکل۔ میں یا شیرازی صاحب۔ تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"آپ مجھے بے عزت کر رہے ہیں انکل!" میں نے آبدیدہ ہو کے کہا۔ "کیا میرے رویے سے آپ کو کبھی یہ احساس ہوا کہ میں سرکش اور نافرمان ہوں یا والد کے بعد اب آپ کو اپنا سرپرست نہیں سمجھتا؟ ایک آپ اور ایک انکل شیرازی میرے بزرگ، چچا یا ماموں جو کچھ ہیں آپ ہیں۔ اگر آپ مجھے حکم دیں گے کہ رابعہ سے شادی مت کرو تو۔۔۔"

"میں یہ حکم کیسے دوں؟" انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ "شاید وہ وقت گزر چکا ہے جب میں یہ حکم دے سکتا تھا اور تعمیل کی امید بھی رکھ سکتا تھا لیکن اب میں یہ حکم نہیں دوں گا۔ تم مجھے اختیار دیتے ہو، اس کے باوجود نہیں دوں گا۔" ان کے لہجے میں اچانک دکھ اور بے بسی کا کرب اتر آیا تھا۔ وہ اعصابی کشیدگی کا شکار ہو گئے تھے اور انہیں یہ بھی احساس نہیں تھا کہ پائپ جسے وہ مضبوطی سے پکڑے بیٹھے تھے بہت دیر پہلے بجھ چکا ہے۔ ان کا دوسرا ہاتھ سختی سے کرسی کے بازو پر جما ہوا تھا اور نظریں میری بجائے محسن کو دیکھ رہی تھیں۔ پھر میں نے محسن کو دیکھا۔ وہ پتھر کا بت بنا بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا اور وہ خلا میں دیکھ رہا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ کوئی بات ایسی ضرور ہوئی تھی جو ابھی تک مجھے معلوم نہیں تھی۔ شاید اس وقت جب میں اپنا حلیہ ٹھیک کرنے گیا ہوا تھا اور رابعہ کھانا لینے باورچی خانے میں گئی تھی۔

"انکل رضوی! آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟" میں نے کہا۔ "محسن۔۔۔ کیا بات ہے؟"

"محسن تمہاری بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔" رضوی صاحب نے پائپ کی راکھ کو ایش ٹرے میں ڈالا اور پائپ کو کھرچ کر صاف کرنے لگے۔ "تم ایک سوال کا جواب ایمانداری سے دو گے؟" انہوں نے پائپ میں تمباکو بھر کے انگوٹھے سے دبانا شروع کیا اور میز سے ماچس اٹھائی۔ "تم نے رابعہ سے شادی نہ کرنے کے جو اسباب بتائے ہیں کیا وہ درست ہیں؟"

"یہ اسباب تو میں نے کبھی آپ کے سامنے بیان نہیں کیے۔" میں نے کہا۔

"ہاں مگر آج میری شیرازی صاحب سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔" انہوں نے پائپ کے تمباکو پر جلتی ہوئی دیاسلائی رکھی اور ایک کش لیا۔ "انہوں نے اس موضوع پر بات کرنے کے لیے فون نہیں کیا تھا۔ وہ ایک اطلاع دینا چاہتے تھے کیونکہ وہ پریشان تھے۔ میں نے شیرازی صاحب کو زندگی میں پریشان ہوتے ہوئے پہلے بھی دیکھا تھا لیکن آج وہ ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے رو پڑے۔ سوچو جب کوئی پچاس سال کی عمر کا آدمی جو ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہو، رونے پر مجبور ہو جائے اور وہ آدمی دوست ہو، جیسے محسن تمہارا دوست ہے۔ بھائی سے زیادہ عزیز ہو۔۔۔ تو دل ٹوٹنے لگتا ہے۔ میں یہی خبر سنانے کے لیے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ فرزانہ نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ صرف کوشش۔ یہ کوشش کامیاب بھی ہو سکتی تھی مگر ناکام رہی۔ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ شیرازی صاحب اس کیس کو دبانے میں بھی کامیاب ہو گئے ہیں۔"

مجھے بالکل معلوم نہیں ہوا کہ محسن کب اٹھ کر چلا گیا۔ "انکل رضوی!" میں نے کہا۔ "آپ کے سوال کا جواب محسن بہتر طور پر دے سکتا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اصل مجرم تو میں ہوں اور مجھے بھی تقدیر نے مجرم بنا دیا ہے۔ زندگی حالات کے اس موڑ پر لے آئی ہے جہاں میں اپنے جرم کا اعتراف کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس جرم کی سب سے سخت سزا صرف میرے لیے ہے۔ میرے لیے ایک نہیں بلکہ دو جہنم ہیں۔ میں یہ فرض کرنے پر بھی مجبور ہوں کہ مجھے ایک جنت آباد کرنی ہے۔" میں نے ان کو وہیں بیٹھے چھوڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ میرے ذہن میں ایک آندھی چل رہی تھی اور مجھے محسن کی طرف سے تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ میں دوسرے کمرے میں گیا تو محسن دونوں ہاتھ تکیے پر سر کے نیچے رکھے لیٹا تھا اور چھت کو دیکھ رہا تھا۔

"میں نے فون کیا تھا۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "فرزانہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں محسن جس سے میں مطمئن ہو جاؤں کہ خطرہ ٹل گیا۔" میں نے بستر پر بیٹھ کے کہا۔ "اگر کوئی مرنا چاہے تو اسے مرنے سے کون روک سکتا ہے۔ ایک کوشش کی ناکامی سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی دوسری کوشش کامیاب ہو سکتی ہے۔"

"یار! یہ لڑکیاں بہت جلد ہمت ہار دیتی ہیں۔" محسن نے کہا۔ "فرزانہ نے ناز و نعم میں پرورش پائی۔ زندگی میں اسے وہ سب کچھ ملا جو اس نے چاہا۔ اس نے حالات کی سختی کبھی نہیں جھیلی۔ ناکامی کا صدمہ نہیں اٹھایا اور محرومی کے آزار سے ہمیشہ بچی رہی۔ لیکن ایسی لڑکیاں تو بہت ہیں۔ خوشحال گھرانوں کی بے فکر، غم سے نا آشنا اور زندگی کو صرف خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھنے والی۔ کیا وہ سب اتنی ہی بزدل ہوتی ہیں اور خودکشی کو مسائل کا حل سمجھتی ہیں؟"

"میں سمجھتا ہوں محسن، یہ سارا قصور میرا ہے۔۔۔"

"نہیں یار!" محسن اٹھ بیٹھا۔ "میں تو تمہیں بتانا چاہتا تھا

کہ فوزیہ جیسی لڑکی نے یہ انتہائی قدم کیوں اٹھایا۔ وہ میری بہن ہے اور میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تصور میں بھی نہیں وہ مجھ پر بہت بھروسہ کرتی ہے اور اسے یقین ہے کہ میں ان حالات میں اس کو سہارا دے سکتا ہوں۔ ممی اپنے آگے کسی کی نہیں چلنے دیتیں اور ڈیڈی خود کو مجبور دیکھتے ہیں تو کچھوے کی طرح اپنی ذات کے خول میں بند ہو جاتے ہیں۔ حیران کن بات ہے کچھ بھی ہو تا ہے آج جب میں نے ٹیلی فون کیا... ابھی کچھ دیر پہلے جب کوئی ڈیڑھ بجے گیا ہوا تھا تو میری بات ممی سے ہوئی۔ جب تو تم انہوں نے کہا فوزیہ مر رہی ہے تو مر جانے دو۔ تمہارا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں تم ہماری فکر کیوں کرتے ہو؟ اچھا ہوا کہ فون ڈیڈی نے لے لیا۔ میں نے کہا کہ مجھے فوزیہ سے بات کرنی ہے تو انہوں نے سی ایم ایچ کا نمبر دیا۔ اس وقت لائن فوراً مل جاتی ہے نا۔ دو منٹ بعد میں نے ہسپتال کا نمبر ملایا اور بتایا کہ میں فوزیہ کا بھائی ہوں اور لاہور سے بول رہا ہوں تو انہوں نے چیک کیا اور فوزیہ کے کمرے کی لائن دے دی۔ وہ جاگ رہی تھی اور میرا خیال تھا کہ میری آواز سنتے ہی رونے لگے گی بلکہ مجھے تو ڈر تھا کہ اس جذباتی بحران کی کیفیت میں کہیں اس پر ہسٹریا کا دورہ نہ پڑ جائے لیکن وہ بہت پرسکون تھی۔ اس نے مجھے صاف بتا دیا کہ بھائی جان مجھے سکندر سے کوئی گلہ نہیں۔ ان کی خوشی میری خوشی ہے۔ میرا ہرگز ان کو دکھ پہنچانے یا احساس جرم میں مبتلا رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں ان کے بغیر زندہ رہ سکتی تھی لیکن میں چراغ دین سے شادی کر کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر میں چاہا بھی تب بھی یہ ناممکن ہے۔ وہ مجھے زندہ نہیں رہنے دے گا۔ معلوم نہیں اس بات کا کیا مطلب تھا جو میں فوراً نہ سمجھ سکا۔ میں نے اس سے کہا کہ فوزیہ بس اتنی سی بات تھی۔ مجھ سے یہ وعدہ کر کہ دوبارہ ایسی کوئی حماقت نہیں ہوگی اور چراغ دین کی طرف سے بے فکر ہو جا۔ اگر وہ چراغ الدین بن کے آئے تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوگا۔ میرے جیتے جی تجھ پر کوئی جبر نہیں کر سکتا اور اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ پھر کوئی بے وقوفی نہیں کرے گی۔ اسے مجھ پر کتنا اعتماد ہے سکندر...!"

میں نے محسوس کیا کہ احساس جرم و پشیمانی، مایوسی اور بے چارگی اور رنج و الم کا ایک پہاڑ جتنا بوجھ گرم ہونے لگا ہے جس کے نیچے میری روح بھی کراہنے لگی تھی۔

"اس سے زیادہ وہ میری بات نہ ہو سکی" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "یہ اطمینان ہی کیا کم تھا کہ اس نے خود ٹیلی فون اٹھا کے مجھ سے بات کی اور مجھ سے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ زندہ رہے گی لیکن اس وقت سے میں سوچ رہا ہوں کہ فوزیہ کی بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے ماضی کو بھول کر بھی زندہ رہ سکتی ہے لیکن چراغ دین کے ساتھ نہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ چراغ دین کے بجائے کوئی اور ہوتا تو وہ زندگی سے سمجھوتہ کر لیتی؟ یعنی وہ کسی بھی معقول آدمی سے شادی کر کے گزارا کر سکتی ہے مگر چراغ دین اسے قطعی ناقابل قبول ہے۔ اس حد تک کہ وہ اس کے مقابلے میں موت کو ترجیح دے گی۔ سوال یہ ہے کہ کیوں؟ اسے تو چراغ دین کے بارے میں وہ سب باتیں معلوم نہیں جو مجھے یا تجھے معلوم ہیں۔ ایک عام لڑکی کے نقطہ نظر سے چراغ دین میں کیا خامی ہے۔ وہ بدکردار اور عیاش بھی نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ان خرابیوں کا شکار نہیں جو دولت سے خریدی جا سکتی ہیں۔ فوزیہ تو یہ بھی جانتی ہے کہ وہ مریم باجی سے کتنی محبت کرتا تھا اور خود مریم اپنی ازدواجی زندگی سے کتنی مطمئن اور خوش تھی پھر چراغ دین سے اتنی شدید نفرت کیوں؟"

"تیرے خیال میں فوزیہ کی چراغ دین سے اس نفرت کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے تمام حقائق کو فراموش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ نفرت نہیں ہے سکندر! خوف ہے" محسن نے کہا۔ "یہی بات تو میں تجھے سمجھانا چاہتا تھا۔ فوزیہ نے کہا تھا کہ وہ چراغ دین کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکے گی لیکن دوسرے جملے میں یہ بات زیادہ واضح ہو گئی۔ اس نے کہا کہ چراغ دین مجھے زندہ ہی نہیں رہنے دے گا۔ اس سے نفرت کا نہیں خوف کا اظہار ہوتا ہے۔ آخر اسے یہ ڈر کیوں ہے کہ چراغ دین اسے مار ڈالے گا؟ عورت کی فطرت میں بڑی لچک ہوتی ہے۔ وہ جس مرد کے ساتھ گزارا کرنا چاہے کر سکتی ہے۔ ہر ماحول سے مطابقت کر جاتی ہے اور خود اپنے حالات کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ بالکل پانی کی طرح کہ جس برتن میں ڈالو اسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ صلاحیت فوزیہ میں بھی ہے۔ اگر اس کے باوجود وہ چراغ دین کو فرشتۂ اجل کے روپ میں دیکھتی ہے اور ڈرتی ہے تو اس کی کوئی وجہ ضرور ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے کہا۔ "آخر ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے جو مجھے تو چراغ دین سے ایک پرانا حساب چکانا ہے۔ میری نفرت اور دشمنی کے جذبات کا ایک سبب ہے۔"

"یہی بات تو میرے لیے الجھن بنی ہوئی ہے" محسن نے لیٹتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں ایک بار پھر فوزیہ سے بات کروں اور اس سے وضاحت طلب کروں کہ یہ کیا چکر ہے"

میں فوزیہ سے وعدہ کر چکا ہوں جو مجھے ہر صورت پورا کرنا ہے مجھے فوزیہ کی زندگی کے لیے ہزار چراغ دین بھی قتل کرنے پڑیں تو میں کروں گا۔ اس کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ اس نے پہلے بھی میری بات ماننے سے انکار کر دیا تھا اور اس روز بھی میں نے سوچا تھا کہ یہ جھگڑا ختم کر دوں۔ تجھے معلوم ہے کہ میں اس کو قتل کرنے گیا تھا؟"

"مجھے معلوم ہے" میں نے کہا۔ "تو صبح صبح غائب ہو گیا تھا اور واپسی پر تو نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔"

"ہاں۔ اس وقت مجھے موقع نہیں مل سکا" محسن نے کہا "اور جھوٹ میں نے اس لیے بولا تھا کہ کہیں تو میرے ارادوں کی راہ میں حائل نہ ہو جائے۔"

اب صبح ہونے لگی تھی۔ رات کی سیاہی میں تھوڑا سا اجالا جھلکنے لگا تھا۔ میں کھلی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا اور پھر وہیں بیٹھ گیا۔ میری کمر کھڑکی کی چوکھٹ کے ایک کنارے سے لگی ہوئی تھی اور میرے پاؤں دوسرے کنارے کو چھو رہے تھے۔ سگریٹ کا آخری کش لے کر میں نے ٹکڑے کو فضا میں اچھال دیا اور یہ ٹکڑا دم دار ستارے کی طرح اندھیرے میں ایک روشن لکیر بناتے غائب ہو گیا۔ میری نظر صبح کے ستارے پر گئی اور مجھے فوزیہ کا خیال آیا۔ اگر وہ مر گئی ہوتی تو کیا صبح کا یہ ستارہ مجھے ایسے ہی روشن نظر آتا؟ اس کے بعد آسمان کتنا تاریک اور ویران ہوتا۔ لیکن وہ زندہ ہے۔ کیا وہ بھی جاگ رہی ہوگی؟ اور ہسپتال کے پرائیویٹ روم کی کھڑکی سے اسی طرح ستارۂ صبح کو دیکھ رہی ہوگی؟ مجھے ٹیگور کی بات یاد آئی۔ "میرا محبوب بہت دور ہے۔ پھر میں چاند کو کیوں نہ دیکھوں، کسی جگہ تو میری اور اس کی نظریں ملتی ہیں..." سونے کا اب کوئی امکان اور فائدہ نہ تھا۔ شاید محسن نے بھی یہ بات سمجھ لی تھی کیونکہ وہ بستر سے اٹھ کر چائے بنانے کے لیے کچن میں چلا گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک میدان کارزار تھا، جس میں ہر طرف سے خیالوں کے غنیم یلغار کر رہے تھے۔ میرے اپنے مسائل پیچھے ہٹ گئے تھے اور فوزیہ کی زندگی کا مسئلہ چراغ دین کی موت کے مقابل آ گیا تھا۔ انتہائی اہم اور ناگزیر ہو گیا تھا۔ وہ خلا پُر کرنا بن گیا تھا اور آقا غلام اور غلام نے اپنے پرانے آقا کو ذلت اور بے بسی کی موت عطا کی تھی۔ اسی چراغ دین نے برسوں پہلے مریم نام کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی جو محسن کی بڑی بہن تھی اور اچھا ہی تھا کہ محسن اس شادی میں شریک نہیں ہوا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ مریم کے ساتھ زبردستی ہوئی ہے۔ شاید وہ کسی اور کو چاہتی تھی لیکن بعد میں سب کچھ بھول بھال گئی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی کسی کو چاہے اور فراغت کی زندگی میسر ہو تو اس چاہت کو بھول جائے؟ کیا یہ ناممکن ہے کہ مریم بعد میں بھی اس سے محبت ہی کرتی رہی ہو جسے وہ چاہتی تھی اور اس کی حادثاتی موت حادثے کا نتیجہ نہ ہو؟ محسن نے ابھی اپنے ایک دوست کا عجیب واقعہ سنایا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا اس کے ذہن میں بھی کہیں شک کا کوئی زہریلا سانپ سر اٹھا رہا تھا کہ چراغ دین نے اپنی بیوی کو مروا دیا تھا؟ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مریم کے بچے اس کے نہیں ہیں؟ فوزیہ اور مریم میں فطرت کے اعتبار سے زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ مریم انتہائی ذہین اور چالاک لڑکی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ دولت اور عزت کے درمیان لٹکتے باہمی کا کوئی سمجھوتہ طے پا گیا ہو؟ چراغ دین نے مریم کو اس سے ملنے کی اجازت دے دی ہو؟ میں نے محسوس کیا کہ میں اسی طرح سوچتا رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میرے خیالات کی کوئی سمت نہیں تھی۔ میرے مفروضات بے بنیاد تھے اور میری سوچ کی راہ بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی۔ حقائق کی دنیا میں ان کی کوئی قیمت نہ تھی۔ چراغ دین پر جن کا الزام کسی عدالت انصاف میں ثابت نہیں ہوا تھا۔ پھر محسن کیا ثابت کرے گا؟ اسے تو قتل سزا بچ سکے گا۔ اس نے ذکر کیا تو یہ کام مجھے کرنا پڑے گا۔ مجھ پر ایک قتل کا الزام پہلے ہی ہے۔ دوسرے قتل کا الزام بھی کسی نہ کسی کو اٹھانا ہوگا کیونکہ قتل ثابت ہو جاتا ہے تو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا۔ انجام وہی رسوائی دکھ اور پشیمانی پہنچے گی۔ اور دونوں کے لیے بھی۔ چراغ دین مجرم تھا لیکن اس نے عقل سے کام لیا تھا چنانچہ وہ محفوظ رہا تھا۔ ہم جذبات سے کام لیں گے تو کوئی عقل مندی کریں گے۔ دشمن بہادر ہو تو بہادری سے مقابلہ کرنے میں مزہ ہے لیکن عیاری اور مکاری کے جواب میں بہادری کے جوہر دکھانا بے وقوفی ہے۔"

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں محسن!" میں نے چائے کا کپ لیتے ہوئے کہا۔ "میرا اور تیرا مسئلہ جذبات سے نہیں، عقل سے کام لے کر حل ہوگا۔ سانپ کو مرنا چاہیے اور لاٹھی کو نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ اس وقت تو بھی مشتعل ہے اور میں بھی انتقامی ردعمل کا شکار ہوں۔ یہ کام بالکل اسی طرح ہونا چاہیے جیسے چراغ دین نے کیا تھا۔ وہ آج تک کسی کی گرفت میں نہیں آیا۔ اس کا پتا ایسے صاف ہونا چاہیے کہ خود اسے بھی خبر نہ ہو اور ہم پر بھی کسی پر حرف نہ آئے۔"

"تیری بات جی کو لگتی ہے لیکن سوچ بچار میں وقت

www.paksociety.com

سے ہاتھ سے نکل جانے کا ڈر ہے۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔" میں نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کہا۔ "اس پر عمل درآمد میں وقت ضائع ہونے کا کوئی سوال نہیں بشرطیکہ ایک شخص ہماری مدد کرے اور وہ شخص ہے استاد ڈنڈی۔ مجھے امید ہے وہ آج شام کو رابعہ کے آفس آئے گا یا کہیں سے ٹیلی فون کرے گا۔ اپنے مقتول دوست کے معاملے میں وہ سخت جذباتی ہو رہا تھا اور اس کی بڑی بہن سے مل کر تعزیت کرنے کے علاوہ یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ وہ قاتل سے انتقام ضرور لے گا۔ اگر شہلا اس سے کہے تو وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائے گا۔"

"سب کچھ کیا؟" محسن نے کہا۔ "ان معاملات میں اسے کیوں لانا ہے؟"

"مجھے ذرا سوچنے دو۔" میں نے کہا۔ "شاید شام تک میں تفصیل سے بتا سکوں۔ آج مجھے بہت کام کرنے ہیں۔ ایک تو مجھے رابعہ کے ساتھ جا کے کوئی مناسب سا مکان بھی دیکھنا ہے وہ ایک مکان خریدنا چاہتی ہے جو اس کی اور ہماری ضروریات پوری کر سکے۔ اس کا گزشتہ ہفتہ ہوا مکان تو جلنے کا ڈھیر ہے لیکن وہ زمین بہت قیمتی ہے۔ کچھ نقد سرمایہ رابعہ کے پاس بھی ہے۔ ہم کسی پراپرٹی ڈیلر سے بات کریں گے جو یکمشت رقم نقد دے کر لے لے اور مکان کا قبضہ فوراً دلا دے۔ باقی رقم رابعہ کے گھر کی زمین کے فروخت ہوتے ہی ادا کر دی جائے گی۔ اس پلاٹ کو بکنے میں دیر نہیں لگے گی۔ چنانچہ مجھے پوری امید ہے کہ ہر پراپرٹی ڈیلر — یہ سودا بہت خوش ہو کے کرے گا۔ ڈبل کمیشن کا معاملہ ہے۔ پہلے مکان کی خریداری پھر پلاٹ کی فروخت پر اور سودا بھی اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والا ہے۔ جس میں دیر کا کوئی امکان نہیں۔"

"دوسرا کام؟" محسن بولا۔ "اس کے لیے آج وقت ملے گا؟"

"وقت کا مسئلہ واقعی ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "البتہ ہم کام تقسیم کر لیں تو مشکل حل ہو سکتی ہے۔ شہلا، رابعہ اپنے مکان کے انتخاب کا مسئلہ مجھ پر چھوڑ دے۔ اسے میری پسند یا اور قوت فیصلہ پر اعتبار ہے اس لیے وہ مان جائے گی۔ وہ خود چلی جائے شہلا کی طرف۔ شہلا کی ماں کو بھی بتا دے کہ وہ اب ہمارے ساتھ رہیں گی اور سامان کو بھی تیار کر لے۔ ہو سکتا ہے کل تک ادائیگی ہو جائے اور ہم سب نئے مکان میں منتقل ہو جائیں۔ ایک نیا خاندان وجود میں آ جائے۔ ماں بیٹے بہن بھائی کے سارے مقدس رشتوں کی بنیاد پڑ جائے جو خون کے رشتوں سے زیادہ استوار ثابت ہوں زیادہ پر خلوص ہوں اور زیادہ سچے ہوں۔ سچ پوچھو تو شہلا نے مجھے اپنا بھائی بنا لیا ہے۔"

"اب تک تو معلوم نہیں تھا مگر اب ہو گیا ہے۔" محسن بولا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ خواب میں ہو۔ "یار سکندر! رشتوں کی آبرو بھی کیا چیز ہے کیسی جنت ہو گا وہ گھر جس میں کوئی رشتوں کا بھرم رکھنے پر مجبور نہیں ہو گا اور جذبے سچے ہوں گے سو فیصد خالص اور بے غرض جہاں کوئی اپنے مفاد اور نسب کی بات نہیں کرے گا۔ الگ الگ راستوں سے ایک منزل پر جمع ہو جانے والوں کی کامیابی کتنی مکمل ہو گی۔ شاید بہت جلد آلام و مصائب کا یہ زمانہ بھی ختم ہو جائے گا اور … کا گھر تمہارا گھر کہلائے گا … "

"انشاء اللہ!" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "خواب سے واپس حقیقت کی دنیا میں آ جاؤ اور سنو دوسرا کام کیا ہے۔ مجھے الماس کے والدین کی موت اور ان کے گھر میں آتش زدگی کے بارے میں پولیس کی رپورٹ وغیرہ چاہیے اور اگر ممکن ہو تو اس کی نقل بھی حاصل کرنی ہے۔ متعلقہ تھانے کا عملہ اب تک بدل چکا ہو گا اس لیے کام دشوار نہیں۔ کسی محرر یا تھانیدار کو سو کے نوٹ دکھانا اور داخل دفتر ہو جانے والے کیس کی فائل تیرے حوالے کر دے گا۔ بعد میں کسی مرحلے پر اس کی ضرورت پڑی تو الزام کسی پر بھی نہیں آئے گا کہ فائل کس نے گم کی۔ جانے والوں نے یا آنے والوں نے۔"

"تو پھر بالکل!" محسن نے کہا۔ "یہ کام ہو جائے گا۔"

"اب ایک مسئلہ ایسا ہے جو صرف رابعہ حل کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کو شہلا سے ایک بات پوچھنی ہے جو میں نہیں پوچھ سکتا۔ جس رات میں اور رابعہ پہلی بار اس کے گھر گئے تھے تو ڈی ایس پی وہاں آئے۔ شہلا سے کچھ باتیں کی تھیں ان کی خلش ابھی تک میرے دل میں باقی ہے اور حالات کے زیادہ خراب ہونے سے پہلے کوئی نہ کوئی بندوبست ایسا ہونا چاہیے کہ شہلا مزید رسوائی سے بچ جائے۔"

"میں تیری بات سمجھ گیا۔" محسن نے کہا۔ "لیکن میں رابعہ سے کیا کہوں اور کیسے کہوں؟"

"زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "ویسے بھی وہ وکیل ہے اور اس مسئلے کا ایک قانونی پہلو بھی ہے۔ جو اس سے کہنا کہ تلخ کلامی کے دوران میں ڈی ایس پی نے شہلا پر کچھ الزامات عائد کیے تھے اور شہلا نے بھی کسی حد تک اعتراف جرم کیا تھا۔ اس بات میں کس حد تک صداقت ہے کہ خدانخواستہ وہ ماں بنی تو ڈی ایس پی کی باتوں میں آ کے گناہ ہو جانے کی سزا ہو گی۔ رابعہ نے ساری باتیں سنی تھیں۔ وہ خود اپنے طور پر معلوم کرے گی۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ کیا کیا جائے۔"

ساتھ والے کمرے میں سے کانسٹیبل حمایت میاں نمودار ہوا اور ہماری طرف دیکھے بغیر باتھ روم میں گھس گیا۔ دس منٹ تک ایسی آوازیں آتی رہیں جیسے کوئی ڈوب رہا ہو۔ کانسٹیبل غسل کرتے ہوئے یہ آوازیں حلق، ناک اور منہ سے نکال رہا تھا۔ جب وہ اپنی وردی پہن کر چلا گیا تو ہم نے تیاری شروع کی۔ میں نے شیو اور غسل سے فارغ ہو کے ناشتہ بنانے کا عمل شروع ہی کیا تھا کہ کانسٹیبل پھر نمودار ہوا۔

"صاحب نے یہ خط دیا ہے۔" اس نے ایک لفافہ آگے بڑھایا اور واپس جانے لگا۔

"میاں تھانیدار صاحب!" میں نے کہا۔ "ذرا توقف فرمائیے، شاید کوئی جواب طلب بات ہو۔" میں نے لفافہ کھولا۔ اسی وقت محسن بھی باتھ روم سے نکل آیا۔ "کون تھانیدار؟ یہ اچھے بھلے تھانیدار ہو گئے ہیں؟ پھر تو بہت بہت مبارک ہو۔" محسن نے زبردستی کانسٹیبل سے گلے ملتے ہوئے کہا۔ وہ تولیہ لے جانا بھول گیا تھا۔ کانسٹیبل کی ساری وردی بھیگ گئی۔

"آپ بڑے غلط لوگ ہیں۔" اس نے خود کو چھڑا کے کہا۔ "ہمیشہ غلط کام کرتے ہیں۔"

میں نے لفافے میں سے برآمد ہونے والے پرچے کو دیکھا اس پر ہال روڈ کی ایک دکان کا پتہ اور ایک شخص کا نام لکھا ہوا تھا۔

"اچھا ہم ایک صحیح کام کرتے ہیں۔" محسن نے مذاق جاری رکھا۔ "ہم صاحب سے کہہ کے تمہیں واقعی تھانیدار بنوا دیتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ صاحب ہمارا کتنا خیال کرتے ہیں۔"

کانسٹیبل نے بے یقینی سے محسن کو دیکھا۔ "میں تھانیدار بن سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے رقعہ جیب میں رکھ کے کہا۔ "ہماری خدمت کرو اور ہمیں خوش رکھو۔ ہم تمہاری سفارش کر دیں گے۔"

"جناب عالی! بندہ تو ویسے ہی آپ کا غلام ہے۔" کانسٹیبل نے عاجزی سے کہنا شروع کیا۔ "بس آپ حکم دیں۔" ترقی پا کے تھانیدار بن جانے کا خیال اس کے لیے معراج سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنے سابقہ رویے پر شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا اور ہمارے قدموں میں لوٹنے کے لیے تیار تھا۔

"حکم تو ابھی کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس خدمت کے لیے تیار رہو۔ سر خدمت کے لیے۔ اب جاؤ۔"

جب وہ چلا گیا تو ہم بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ اس شخص سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ میں نے محسن کو وہ نام اور پتہ بھی دکھایا جو رضوی صاحب نے لکھ بھیجا تھا۔ ہم دونوں کی رائے ایک ہی تھی۔ ہال روڈ کا یہ ریڈیو مکینک رضوی صاحب کی نظر میں تھا تو یقیناً ہمارے لیے بھی کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد رابعہ آ گئی اور اس بات پر بہت ناراض ہوئی کہ ہم یہاں بیٹھے ناشتہ کر رہے ہیں۔ اندر گھر میں بھی سب ناشتہ کر چکے ہیں لیکن ہمارے انتظار میں وہ بھوکی بیٹھی ہے۔ ہم نے کہا کہ خفگی کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ ہم دوبارہ اس کے ساتھ بھی ناشتہ کر لیں گے۔ رضوی صاحب جا چکے تھے۔ ان کی بیگم نے بتایا کہ وہ رات بھر سوئے نہیں اور جانے سے پہلے انہوں نے ٹیلی فون پر اسلام آباد میں شیرازی صاحب سے بات کی تھی اور پھر سی ایم ایچ کے کسی کرنل سے۔ فوزیہ آج گھر واپس چلی جائے گی۔ یہ اطلاع دینے کے بعد انہوں نے ہمیں اطمینان سے ناشتہ کرنے کے لیے کہا اور خود کسی کام کا عذر پیش کر کے چلی گئیں۔ رضوی صاحب کی بیگم بالکل ویسی ہی عورت تھیں جو کسی اعلیٰ پولیس افسر کی بیوی بن کے بھی خوش رہ سکتی ہو۔ اس کی تمام توجہ اور دلچسپی اپنے گھر، شوہر اور بچوں تک محدود تھی۔ گھر سے باہر کیا ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے، یہ اس نے کبھی اپنا دردِ سر نہیں سمجھا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اس کو ہمارے معاملات کی خبر ہی نہ ہو لیکن اس کے لیے ہم گھر کے فرد تھے یا مہمان تھے چنانچہ وہ میزبانی کے فرائض سے سروکار رکھتی تھیں۔ اس نے کبھی تجسس ظاہر نہیں کیا تھا اور ہماری پراسرار طرزِ زندگی اور معاملات کے متعلق کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ ہم پر کبھی بزرگی یا سرپرستی کا رعب ڈال کر ہمیں شرمندہ کرنے کی اور راہِ راست پر لانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس بے نیازی میں بے رخی کا دخل بالکل نہیں تھا۔ شائستگی اور اخلاق اس کے مزاج کا حصہ تھی اور اس کا مزاج تغیر سے ناآشنا تھا۔

ہم سنجیدگی سے دوبارہ ناشتہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھے لیکن رابعہ نے کہا تمہاری سزا یہی ہے کہ پورا ناشتہ ختم کرو خواہ بدہضمی ہو یا پیٹ پھٹے۔ بعد میں محسن نے دوسرے کمرے سے اپنے گھر فون کیا اور شیرازی صاحب سے بات کرتا رہا۔ اس

www.paksociety.com

وقفے میں، میں نے رابعہ سے مکان کی خریداری کے سلسلے پر بات کی۔ اس نے کہا کہ مرضی کا کیا سوال اسے میری پسند اور میرے فیصلے پر اعتماد ہے بس میں جیسا چاہوں کروں۔ پھر محسن آ گیا اور میں ٹیلیفون کرنے کے بہانے چلا گیا۔ لیکن میں نے کسی کو فون نہیں کیا۔ مجھ میں فوزیہ سے اس کی خیریت معلوم کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس کی ماں سے بات کرتا تو گالیاں اور کوسنے سنتا اور شیرازی صاحب سے کہتا تو کیا کہتا۔ میں دروازے سے لگ کر محسن اور رابعہ کی گفتگو سننے لگا۔

"بات یہ نہیں ہے رابعہ۔" محسن کہہ رہا تھا۔ "کہ سکندر تمہیں ساتھ رکھنا نہیں چاہتا۔ اسے فوزیہ کی حماقت یا رضوی صاحب کی بات سے دکھ ضرور ہوا ہے۔ لیکن تمہارے لیے اس کے جذبات میں فرق نہیں پڑا ہے۔"

"ایک بات کہوں محسن، برا مت ماننا۔" رابعہ نے کہا "تم جیسا بھائی اور تم جیسا دوست میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ہمارے حالات سے باخبر ہونے کے باوجود تم دونوں رشتوں کو نبھا رہے ہو۔ انگریز کہتے ہیں کہ دو کشتیوں کا مسافر ڈوب جاتا ہے۔ تمہیں احساس نہیں ہوتا کہ تم انصاف نہیں کر رہے ہو۔"

محسن کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "نہیں رابعہ! جبر کا احساس مجھے اس لیے نہیں ہوتا کہ میں زندگی کے تقاضوں کو جذباتی مسائل نہیں بناتا۔ آدمی کی پسند اور ناپسند کا معیار عمر کے جذبات کے ساتھ ساتھ بدلتا ہے کیونکہ اس کی شخصیت بدلتی ہے۔ سکندر بخت کو جتنے قریب سے میں نے دیکھا ہے کسی اور نے نہیں دیکھا ہے۔ اس کے باپ نے بھی نہیں جس نے سکندر کو ہمیشہ دور رکھا اور یہی دعویٰ میں اپنی بہن کے بارے میں کروں تو غلط نہیں ہوگا۔ ان دونوں کے بارے میں میرا یہ فیصلہ قطعی غیر جانبدارانہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کچھ دن تو خوش رہ سکتے تھے۔ تمام عمر خوش نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ دونوں کی فطرت کے تقاضے الگ ہیں جو بالآخر جذبات پر غالب آ جاتے۔ شاید وہ ذمہ داریوں کے بوجھ کو گھسیٹتے رہتے اور خوش دکھائی بھی دیتے... شاید وہ الگ ہو جاتے اور ایک دوسرے کی زندگی میں دکھ کے کانٹے بھر جاتے۔ اب جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ آج کا چھوٹا سا صدمہ ایک عمر کے روگ سے بہتر ہے۔"

دروازے کے پیچھے میں منجمد کھڑا تھا۔ محسن جھوٹ بول رہا تھا یا سچ؟ اگر وہ فریب دے رہا تھا تو کیسے؟ رابعہ کو یا اپنے آپ کو؟ یہ حقیقت تھی کہ محسن اپنے آپ پر جبر کر رہا تھا اور سب کو خوش رکھنے کے لیے خود قربان ہو رہا تھا۔

"اصل بات یہ ہے کہ تمہیں ایک اور کام کرنا ہے۔ تمہیں آج شہلا کے پاس جانا ہے۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اس کی ماں کو یہ بتا دو گی کہ اب وہ ہمارے ساتھ رہے گی۔ یہ معلوم نہیں کہ کہاں، لیکن آج کل میں کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ ان کا جو سامان پرانے گھر میں ہے وہ بعد میں نکال لیا جائے گا۔ شہلا مان گئی تو اس کی ماں کیسے نہ مانے گی۔ وہ اس کی حقیقی ماں تو ہے نہیں پھر تم بات کرو گی لیکن اس سے زیادہ اہم کام جو تمہیں کرنا ہے وہ یہ ہے... یعنی تمہیں شہلا سے اکیلے میں راز داری کے ساتھ بات کرنی ہے۔ اس کے اور ڈی سلوا کے تعلقات... کیا ہیں، اس کے بارے میں۔"

"وہ تو تم بھی جانتے ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "میں اس موضوع پر کیا بات کروں۔"

"نہیں، وہ باتیں میں نے نہیں سنیں جو تم نے سنی تھیں۔" محسن بولا۔ "اس رات سکندر بخت تمہارے ساتھ تھا۔ جب دونوں شہلا کے گھر گئے تھے۔ پھر وہاں ڈی سلوا آ گیا تھا اور کچھ گرما گرمی ہوئی تھی۔ ڈی سلوا نے شہلا نے ایک دوسرے کو مورد الزام قرار دیا تھا اور ایک دوسرے پر الزام لگائے تھے اور اب تمہیں شہلا سے یہ پوچھنا ہے کہ معاملات کس حد تک آگے بڑھ چکے تھے۔ اور ان میں کتنا سچ تھا یا... جھوٹ ہے۔"

"میں معلوم کروں گی۔" رابعہ نے کہا اور اسی وقت میں اندر آ گیا۔

رابعہ کو صدر بازار میں ماسی کے گھر ڈراپ کر کے اور شام پانچ چھ بجے تک لوٹ آنے کا وعدہ کر کے میں محسن کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اسے پولیس اسٹیشن کے قریب کہیں اترنا تھا۔ جب میں روانہ ہونے لگا تو محسن نے ادھر ادھر دیکھ کے جیب سے ریوالور نکالا اور مجھے تھما دیا۔

"اسے اپنے ساتھ رکھو، حالات زیادہ خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔" وہ بولا۔ "ویسے بھی میرا ناجائز اسلحے کے ساتھ پولیس اسٹیشن میں داخل ہونا ٹھیک نہیں۔" میں نے ریوالور کو احتیاط سے چھپایا اور وہاں صدر کی طرف چل پڑا۔ بیشتر دکانیں ابھی بند پڑی تھیں۔ میں نے گاڑی ایک جگہ روک دی اور رضوی صاحب کا دیا ہوا پتہ تلاش کرنے لگا۔ وہ دکان نسبتاً بہت چھوٹی تھی اور بڑے بڑے بورڈ والی الیکٹرانکس کی دکانوں کے درمیان کھڑی نہ دیتی تھی لیکن دوسرے پل میں میری نظر نے وہ چھوٹا سا سائن بورڈ دیکھ لیا جس پر لکھے ہوئے حروف صاف طور پر پڑھے بھی نہ جاتے تھے۔ دکان بند تھی لیکن دس منٹ بعد اچانک ایک خاصی منہگی کار دکان سے کچھ دور رکی جسے ماڈل کی ایک عورت چلا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ ہلا کر مرد کو خدا حافظ کہا اور گاڑی میں سیدھی نکل گئی۔ مرد نے سڑک پار کر کے دکان کا دروازہ کھولا۔ باہر لوہے کی گرل تھی جو شٹر کی طرح ایک طرف ہو گئی۔ ایک پٹ کا شیشے والا دروازہ سامنے آ گیا جس پر عام قسم کا ڈور لاک تھا۔ پانچ منٹ بعد میں اس کی دکان میں جا پہنچا۔

"امین صاحب!" میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "کیا حال ہے آپ کا؟ کاروبار کیسا چل رہا ہے؟"

امین ابھی جھاڑ پونچھ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ فرش پر اور الماریوں میں ناکارہ، نامکمل اور خراب ٹی وی اور ویڈیو وغیرہ کے ان کے فاضل پرزے اور مرمت میں کام آنے والے آلات بھرے پڑے تھے۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور ہاتھ ملا کے کچھ سوچتا رہا۔

"معاف کیجیے، میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔" وہ بالآخر حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

"ارے بھائی امین صاحب!" میں نے ہنس کر کہا۔ "آپ بھلا ہمیں کیوں پہچاننے لگے۔ ویسے بھی آپ اس شہر میں سب کو پہچاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ بیچنے والے بیچ ہی جاتے ہیں۔" میرے لہجے نے اس کو چوکنا کر دیا۔

"کوئی کام ہے آپ کو، ریڈیو ٹی وی ٹھیک کرانا ہے؟" وہ بولا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے کہا۔ "یہ کام تو سب کر لیتے ہیں۔ اس کے لیے ہم آپ کو تکلیف دیں گے؟"

"اور کیا کام ہے؟" وہ محتاط ہو کے بولا۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی رہیں۔

"امین صاحب! میں دس ہزار تک دینے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "تین دن میں کام ہو جانا چاہیے۔"

"میں سمجھا نہیں آپ کیا چاہتے ہیں؟" وہ سخت لہجے میں بولا۔ "دس ہزار کس کام کے؟"

"دیکھو مسٹر امین! یہ ڈرامہ نہیں چلے گا۔" میں نے کہا۔ "کام وہی ہے جو تم پہلے بھی کر چکے ہو۔"

"میں صرف ریڈیو اور ٹی وی ٹھیک کرتا ہوں۔" وہ اسی لہجے میں بولا۔

"تم کیا کرتے ہو اور کیا نہیں کرتے، یہ سب مجھے معلوم ہے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمہاری گاڑی کا رنگ کیا ہے اور نمبر کیا ہے۔ ڈیڑھ لاکھ کی یہ گاڑی تم نے کب خریدی اور کیسے خریدی۔ جن لوگوں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے، انہوں نے سب بتا دیا ہے۔"

"کس نے بھیجا ہے تمہیں؟" وہ اب نروس ہو رہا تھا۔ "تمہیں غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟"

"مجھے ڈی سلوا نے بھیجا ہے۔" میں نے اچانک سنجیدہ ہو کے کہا۔ "اسے یقین ہے کہ تم نے اس کے لیے ایک ٹرانزسٹر ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر کا یونٹ بنایا تھا اور اس میں ایک بم رکھا تھا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔

"میں فضول بکواس سننے نہیں آیا ہوں۔" میں نے جیب سے ریوالور نکال کر سامنے رکھ دیا۔ "اگر معاوضہ کم ہے تو منہ سے بکو کتنا چاہیے لیکن کام تین دن میں ہوگا ورنہ میں نے پیشہ ور بدمعاشوں کی طرح لہجے کو خطرناک بنا کے ریوالور کا رخ اس کے سینے کی طرف کر دیا۔ "بیٹھنے والے خود تم سے نمٹ لیں گے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "پرسوں شام کو آ جانا۔" اس نے اداکاری چھوڑ کے یکلخت کاروباری لہجہ اختیار کر لیا۔ اس کا یہ خوف دور ہو گیا تھا کہ یہ پولیس کا پھیلایا ہوا جال نہ ہو۔ ناجائز کاروبار کرنے والوں کے لیے اپنا اطمینان ضروری ہوتا ہے اور شاید ان کی بھی کوئی چھٹی حس ہوتی ہے جو بتا دیتی ہے کہ خطرہ موجود ہے یا نہیں۔

میں نے ریوالور جیب میں رکھا۔ جیب میں سے پانچ ہزار کے نوٹ یوں نکالے جیسے ان کی حیثیت ردی کاغذ سے زیادہ نہیں اور اس کے سامنے پھینک دیے۔ "یہ آدھی رقم ہے، باقی کام کرنے پر۔" میں نے کہا۔

اس نے نوٹوں پر ایک نگاہ ڈالی لیکن ان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ "کام ہو جائے گا لیکن یہ ڈی سلوا کون ہے؟" وہ بولا۔

"ڈی سلوا تمہارا باپ ہے اور کون؟" میں نے دروازے کا رخ کرتے ہوئے غرا کے کہا۔ میرے باہر نکلنے تک وہ اسی طرح بیٹھا تھا اور بعد میں بھی مجھے دیکھنے کے لیے باہر نہیں

www.paksociety.com

آیا۔ اسے یقین آ چکا تھا کہ میں کسی بہت بڑے بدمعاش کا نمائندہ ہوں۔ ڈی سلوا کے نام پر اس کی حیرانی جائز تھی۔ وہ سمجھا ہوگا کہ یہ بھی کوئی بڑا بدمعاش ہی ہے کیونکہ ڈی سلوا نے بھی کسی اور کو ہی بھیجا ہوگا۔ یہ بعید از قیاس بات تھی کہ ڈی سلوا نے خود آ کے اپنے آپ کو صحیح نام سے متعارف کرانے کا خطرہ مول لیا ہو۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا جو نشانے پر بیٹھا تھا۔ رضوی صاحب کو شہر بھر کی خبر تھی اور انہوں نے مجھے ایک نام پتہ فراہم کر دیا تھا۔ انہیں میری ذہانت پر اتنا اعتماد ضرور تھا کہ میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکوں گا۔ ڈی سلوا نے بھی ان کی خدمات حاصل کی تھیں یا نہیں اور اپنی مہارت کے ایک کام کا کیا معاوضہ دیا تھا، یہ معلوم کرنا مشکل تھا تاہم میرا اندازہ میرے کام آیا اور دس ہزار میں یہ سودا برا نہیں تھا۔ خود کو بہت زیادہ چالاک اور طاقتور سمجھنے والے دشمن کی خوش فہمی دور کرنا اپنی بقا کی ضمانت حاصل کرنے کے مترادف تھا۔ اگر وہ شکاری تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ مجھے آسانی سے شکار کر لیں گے تو میں ان پر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ شکاری میں بھی ہوں اور ان کو انہی کے ہتھیاروں سے شکار کر سکتا ہوں۔

اس کامیابی نے میرے حوصلے کو ہمالیہ پہاڑ سے بھی اونچا کر دیا تھا۔ یہ سب خدا کی مدد تھی کہ لندن سے ڈی پورٹ ہو کے دلہن لوٹنے والا، الاٹ اور لاعلم سکندر آج اتنے اعتماد کے ساتھ دشمنوں کے خلاف صف آرا تھا اور اپنی طاقت کے زعم میں مبتلا دشمن جو سمجھتے تھے کہ سکندر کو چوہے دان میں پھنسنے والے چوہے کی طرح شکار کیا جا سکتا ہے پریشانی اور خوف کا شکار ہونے لگے تھے۔ میں نے حالات کی سنگینی بھی سمجھی اور ہر قربانی دی تھی لیکن امید کا دامن بھی نہیں چھوڑا تھا۔

دوپہر کے بعد میں نے تین مکان دیکھے۔ ان میں سے صرف ایک فوری طور پر دستیاب تھا اور کسی حد تک ہماری ضرورت کو بھی پورا کرتا تھا لیکن میں نے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا۔ شام تک تلاش جاری رکھنے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے میں نعمت کدہ گیا۔ وہاں معمول کے مطابق تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی اور مجھے کچھ دیر کوئی سیٹ خالی ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص میرے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، سرخ و سفید چہرہ، قابل رشک صحت، سیاہ شیروانی اور کلف دار طرے والی پگڑی۔ ہاتھ میں عصا اور انداز میں رعونت۔ بالکل کسی ریاستی نواب یا والی ریاست یا بہت بڑے جاگیردار کی چلتی جاگتی تصویر۔ میں نے صرف ایک بار اسے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کی نظر میں پہچان … سی تھی میں۔

"معلوم ہوتا ہے سارا شہر اسی وقت … کھانے …
ہے۔" وہ میری طرف دیکھ کے مسکرایا۔

ولیمے کے نام پر مجھے بھی ہنسی آ گئی کیونکہ لوگ ندیدوں کی طرح کھا رہے تھے۔ "دراصل معقول … پر جگہ نہیں ملتا۔" میں نے کہا۔ "باقی جگہ نام بڑے … چھوٹے والی بات ہے۔"

اسی وقت ایک میز خالی ہوئی اور میں آگے … مجھے اس والی ریاست کا خیال آیا اور میں نے پلٹ … بھی آ جائیے۔ میرا خیال ہے وہ شریف آدمی ایک … کھانا تو کھا ہی سکتے ہیں۔" اس نے متشکر سر ہلایا اور … مقابل بیٹھ گیا۔ ہم نے اپنی اپنی پسند کے مطابق آرڈر … کھانا کھاتے ہوئے بھی کوئی بات نہیں کی۔ … وقت ہوئی جب اس نے دونوں بل اٹھا کر ویٹر کو … تھما دیا۔

"یہ آپ کی سراسر زیادتی ہے۔" میں نے احتجاج …

"اپنی بات واپس لیجئے۔" وہ دانتوں میں خلال … ہوتے بولا۔ "یہ زیادتی کیسے ہو گئی۔ … آدمی ہیں۔ دونوں نے ایک جگہ بیٹھ کے کھانا کھایا … کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ تم نے … کھائی اور اپنے ہاتھوں سے کھائی ہے۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ سارا بل آپ نے کیوں …" میں نے خفت سے کہا۔

"اور کیا آدھا بل دیتا۔ ایک طرف خود کو … آدمی کہتے ہو۔ دوسری طرف میں بائیس روپے کی … شمار کرتے ہو۔" وہ بولا۔ "میرا خیال ہے یہ بہت … ہے۔"

میں لاجواب ہو گیا۔ ہم ایک ساتھ باہر نکلے … نے کہا۔ "میں تو اب اجازت چاہوں گا کیونکہ مجھے شام … چھپانے کا کوئی ٹھکانا ڈھونڈنا ہے۔ اگر آپ کو …"

"میری گاڑی وہ کھڑی ہے۔" اس نے … اشارہ کیا اور میں اس کی چمکتی دمکتی شاندار … مزید شرمندہ ہوا۔ "تم کیا اپنے لیے کوئی مکان … رہے ہو؟" وہ بولا۔

بات بالکل غیر ارادی طور پر میری زبان سے نکل … میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ … مکان خریدنا چاہتا ہوں۔"

"ہوں تو!" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کتنی مالیت کا؟ … چاہیے یا … دراصل میں خود بھی ایک مکان بیچنا چاہتا ہوں۔ بہت دن سے خالی پڑا ہے۔"

"مجھے مکان چاہیے جس میں کم سے کم چار بیڈ روم ہوں۔ پانچ ہو جائیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "علاوہ ازیں لان وغیرہ۔ اگر دو منزلہ ہو تو اور بھی اچھا ہے۔ وہ یا کہ جس میں کم از کم ایک گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ ہو اور … کسی قدر دور ہو۔ فاصلے کی کوئی قید نہیں۔"

"واہ میاں واہ۔" وہ شخص اپنی بڑی بڑی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے بولا۔ "یہ تم اپنی پسند بتا رہے ہو یا میرے مکان کا نقشہ بیان کر رہے ہو؟"

"میرے ساتھ ایک مسئلہ اور بھی ہے۔" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس رقم کچھ کم ہے لیکن ایک پلاٹ ہے جو محل وقوع کے اعتبار سے کمرشل بن سکتا ہے۔ … سینما والی سڑک پر سینما سے چند قدم دور۔ مجھے امید ہے کہ اس کی بڑی اچھی قیمت ملے گی اور وہ کھڑے کھڑے بک جائے گا۔ باقی رقم پلاٹ کی فروخت کے بعد ادا کی جا سکتی ہے۔ میں ہر قسم کی شخصی ضمانت بھی فراہم کر سکتا ہوں۔"

"پھر مسئلہ کیا ہوا؟" اس نے چھڑی کو عادت کے مطابق گھما کر کہا۔ "تم میرے ساتھ چلو اور مکان دیکھ لو۔ اگر پسند آ جائے تو … مکان تمہارا۔ باقی … کی جلدی کوئی نہیں ہے۔"

مجھے یوں لگا جیسے قدرت میری مدد پر آمادہ ہے اور میری تلاش آج ہی ختم ہو جائے گی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس شخص کے ساتھ چلنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کروں، اس کی شاندار گاڑی کے مقابلے میں چھکڑا نظر آنے والی گاڑی لے کر میں کیسے چلوں یا اس کے ساتھ بیٹھ جاؤں کہ اس نے مجھے باقاعدہ ہاتھ سے کھینچ لیا۔

"اپنی گاڑی اسی جگہ رہنے دو۔" وہ بولا۔ "میرا شوفر تمہیں پھر یہاں چھوڑ جائے گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "میں رکشا ٹیکسی سے آ جاؤں گا۔" ابھی تک میں نے اس کے شوفر کو نہیں دیکھا تھا۔ ہم گاڑی کے قریب پہنچے تو وہ دروازہ کھولنے کے لیے اچانک نمودار ہوا اور میں اسے دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ سو فیصد اپنے آقا کی تصویر تھا۔ ان کے ناک نقشے، قد و قامت، حلیے اور لباس میں سر مو فرق نہ تھا۔ عام دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ وہ جڑواں بھائی ہیں اور ان میں اتنی محبت ہے یا ان کی پسند بھی اتنی ملتی ہے کہ دونوں ایک جیسا لباس پہنتے ہیں۔ میں اپنے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے تو میں کسی فرق سے مالک یا شوفر کو پہچان سکتا۔ وہ میری حیرت دیکھ کر مسکرایا۔ شوفر پچھلی سیٹ کا … دروازہ تھامے باادب کھڑا رہا۔

"بات دراصل یہ ہے میاں! …" … پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی میرے ساتھ بیٹھ کر … "ہم ریاستی لوگ ہیں۔ گاؤں کے رہنے والے … ہمارے آباؤ اجداد کو انگریزوں نے ریاست سے محروم کر دیا تھا۔ انہوں نے ایک قانون بنایا تھا کہ کسی راجہ مہاراجہ یا نواب کا وارث نہیں ہوگا تو اس کی موت کے بعد ریاست خود بخود برطانوی سلطنت کا حصہ بن جائے گی۔ یہ قانون الحاق تھا۔ اس کے نفاذ سے پہلے راجے مہاراجے اور والیان ریاست کسی کو گود لے لیتے تھے تو بعد میں وہ تخت و تاج کا مالک ہو جاتا تھا۔ انگریز نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ بعد میں کچھ اس قسم کے حالات پیدا ہوئے کہ وائسرائے ہند نے ہمارے دادا کو تقریباً اتنی ہی بڑی جاگیر بخش دی جتنی بڑی ریاست تھی اور دلی دربار میں ان کی پذیرائی ہوئی۔ یہ وفاداری کا انعام تھا یا غداری کا صلہ، جو چاہو سمجھ لو کیونکہ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ جو جاگیر ان کو ملی وہ بدقسمتی سے پہلے کسی ہندو راجہ کی ملکیت تھی۔ وہ خود بغاوت کے دوران مارا گیا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے جن کو توپ دم کر دیا گیا۔ تین بیٹوں کے سات لڑکے تھے جو اس زمانے میں رشتہ داروں کے ہاں چھپائے گئے تھے، ان کی جان بچ گئی۔ بیوہ ہو جانے والی تینوں عورتیں جان بچا کے نکل گئیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ کہاں گئیں۔ لیکن سنا ہے بعد میں رانی بھی مر گئی اور مرتے مرتے انتقام کی وصیت کر گئی۔ یہی اس کے سات پوتوں کی ماؤں نے کیا۔ ان تینوں نے مرتے وقت بیٹوں کو قسم دی کہ وہ اپنے باپ کے قاتلوں سے اور دشمنوں سے انتقام ضرور لیں۔ یہ ساتوں لڑکے جب بڑے ہوئے تو حالات بہت بدل چکے تھے۔ ان کے پاس پرانے وقتوں کی دستاویزات تھیں۔ وہ اپنا مقدمہ عدالت میں لے گئے اور میری جاگیر پر اپنا حق ملکیت ثابت کرنے کے لیے انہوں نے ہر بڑے وکیل کی خدمات حاصل کر لیں۔ یہ تقسیم سے پہلے کی باتیں ہیں۔ نوجوان لڑکے انگریز سے دشمنی کے جذبات

www.paksociety.com

کو بھول کر صرف جاگیر کے چکر میں تھے اور ان کا دشمن بن گیا تھا حالانکہ جو کچھ ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ ان کے پاس ابھی حقِ ملکیت کی کوئی بنیاد نہیں تھی مگر تم جانتے ہو وکیل آدمی کو کیسا چکر دیتے ہیں۔ انہوں نے بھاری فیس وصول کی اور یقین دلایا کہ ان کا حق ضرور ملے گا۔ اتنی فیس انہوں نے کیسے ادا کی اور زندگی کیسے گزاری جو اس کے بارے میں عام قیاس یہی تھا کہ راتی اور اس کی ماں کے پاس بے حساب سونا تھا اور زیورات تھے جو انہوں نے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے پہلے ہی کہیں گاڑ دیے تھے۔۔۔ قصہ مختصر، مقدمہ خارج ہو گیا۔ انہوں نے ہائیکورٹ میں اپیل کی اور ہار گئے۔ فیڈرل کورٹ میں ان کی اپیل زیرِ سماعت تھی کہ یہ جاگیر جو مغربی پنجاب میں تھی پاکستان میں شامل ہو گئی۔ انڈین سپریم کورٹ کے دائرہ سماعت سے باہر ہو گئی اور دوسرے ملک کے قانون کے تحفظ میں آ گئی۔ میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ حالات نہ بدلتے تب بھی وہ مقدمہ خارج ہو جاتا جو ایک فضول سے آئینی نکتے پر چل رہا تھا۔ لیکن ان ساتوں بھائیوں نے جو آپس میں کزن تھے اپنی شکست کو نوشتہ تقدیر سمجھ کے قبول نہیں کیا۔ انہوں نے کسی کے بچے پر قسم کھائی کہ جاگیر ان کے خاندان کی نہ رہی تو میرے خاندان کی بھی نہیں رہے گی۔ وہ سرحد پار کر کے پاکستان آ گئے۔ انہوں نے مسلمانوں جیسے نام رکھ لیے۔ دل سے وہ اب بھی ہندو مت کے عقائد پر قائم ہوں گے۔ میں اپنے خاندان کا ایک ہی وارث رہ گیا ہوں۔ مجھ سے بڑا بھائی آج کل آسٹریلیا میں ہے اور مجھے بالکل معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ زندہ ہے کہ مر گیا۔ سب سے چھوٹا بہت جوشیلا اور بانکا نوجوان تھا۔ اس نے فوج میں کمیشن لیا اور کشمیر میں جنگ بندی لائن پر شہید ہو گیا۔ اب میرے دو بچے ہیں جن کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں کہ وہ ایبٹ آباد میں زیرِ تعلیم ہیں۔ میرے وہ سات دشمن کئی بار مجھ پر قاتلانہ حملے کر چکے ہیں لیکن میں بھی اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہوں۔ میرے ملازم مجھ سے بہت خوش اور مطمئن ہیں اور صحیح معنی میں جاں نثار ہیں۔ کوئی اجنبی وہاں آسانی سے نہیں پہنچ سکتا۔ میں خود مسلح پھرتا ہوں اور اپنے ساتھ ایک باڈی گارڈ ضرور رکھتا ہوں۔" اس نے ہاتھ سے اپنے سامنے شوفر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ دشمنوں کو دھوکا دینے کا پرانا طریقہ ہے میں نے سنا ہے کہ ہٹلر بھی کسی ہم شکل کو ساتھ رکھتا تھا اور خدا جانے یہ سچ ہے کہ جھوٹ کہ کئی بار وہ ہٹلر کی جگہ ہلاکت کے سامنے

بھی بچ گیا اور کوئی اسے نہ پہچان سکا۔ لیکن یہ میرا شوفر نہ ماسٹر میں سے بھی کوئی ایسا ہی کرتا تھا۔" وہ ہنسا۔ "وہ اب میں کر رہا ہوں۔ اس سے زندگی اور موت کا تفریحی کھیل ہو جاتے ہیں۔ میرے اس ہم شکل جاں نثار پر [illegible] مرتبہ قاتلانہ حملے ہو چکے لیکن گاڑی بلٹ پروف ہے اس لیے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ تم سوچتے ہو گے تو بڑا کمینہ اور خود غرض ہے کہ اپنی زندگی پر میں نے کسی اور کی [illegible] پر لگا رکھی ہے لیکن برادر عزیز ہم اس دنیا میں بہت سے اپنی زندگی سے جوا کھیلتے ہیں۔ عجیب و غریب کارنامے سر انجام دیتے ہیں۔ کسی کو ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کا شوق ہے تو کسی کو نیاگرا فال میں کودنے کا۔ لیکن یہ لوگ ویسے ڈرتے ہیں۔۔۔ عام آدمی جب چوری کرتا ہے یا ڈاکہ یا اسمگلنگ وغیرہ کرتا ہے تو کیا وہ صرف [illegible] بھروسے پر جوا نہیں کھیلتا؟ وہ مارا بھی جا سکتا ہے یا تختہ قبول کرنے والے زندگی کے ہر مرحلے پر جوا [illegible]۔ میں نے اس شخص سے ایک معاہدہ کر رکھا ہے۔ اگر کبھی یہ [illegible] خاطر مارا گیا تو اس کے بیوی بچوں کی کفالت میرے ذمے ہو گی۔ کفالت کا مطلب دال روٹی نہیں [illegible] بچوں کے لیے اعلیٰ ترین تعلیم کا انتظام ہو گا خواہ وہ [illegible] پڑھیں۔ بیٹیوں کی ڈولی اسی شان سے اٹھے گی جیسے میری [illegible] اور مرضی کے مطابق جو رہائش کا بندوبست [illegible] اخراجات کے لیے میں دس ہزار روپے ماہانہ [illegible] ہوں۔ وہ ان کو حسبِ سابق ملتا رہے گا۔ کیا [illegible] کافی نہیں اور یہ سو فیصد اختیاری معاہدہ ہے [illegible] کو ذرا بھی دخل نہیں۔"

میں نے اس کی پوری کہانی بہت دلچسپی سے [illegible] سنی اور اس کی منطق پر غور کرتا رہا۔ وہ یقیناً [illegible] آدمی تھا۔ اس کی گفتگو کا انداز متاثر کرتا تھا [illegible] اس نے جو حوالے دیے تھے وہ مجھے مطمئن [illegible] لیکن جس بات نے مجھے ہوشیار کر دیا تھا وہ ایک [illegible] جو اس سے ملاقات میں مجھ پر ظاہر ہوئی۔ [illegible] ملاقات کے بعد کھانا کھاتے ہوئے وہ بالکل [illegible] تھا اور بعد میں بھی جو گفتگو ہوئی اس میں [illegible] اپنا نام نہیں لیا تھا۔ لیکن اس نے اپنی داستان [illegible] ہی مجھے نام لے کر مخاطب کیا تھا۔ میرے حالات نے مجھ کو بہت زیادہ حساس اور شکی مزاج بنا دیا تھا۔ غلطی کیسے ہو گئی [illegible] اس کے بعد یہ [illegible] مجھے پہلے سے جانتا تھا اور اس کا نعمت کدہ میں آ جانا اتفاق نہیں تھا جو اس نے مجھے میری پسند اور شرائط کے مطابق ایک مکان بھی پیش کر دیا۔ اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے؟

"تم کچھ سوچ میں پڑ گئے ہو؟" وہ بولا اور میں نے دیکھا کہ گاڑی شہر کے مضافات میں ایک مکان کے سامنے کھڑی ہے۔

"دراصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ نے مجھے سب کچھ بتا دیا لیکن ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔" میں نے گاڑی سے باہر آتے ہوئے کہا۔

"یہ خوب رہی۔" وہ ہنسا۔ "جو کام سب سے پہلے ہونا چاہیے تھا یعنی تعارف کا، وہ ابھی تک نہیں ہوا۔ [illegible] مجھے حقیقت ناموں سے یاد کرتے ہیں [illegible] آکسفورڈ کے زمانے کے دوست [illegible] کہتے تھے لیکن اصل میں میرا نام جمشید ہے۔" وہ پھر ہنسا۔ "یہ [illegible] نام رکھنے میں کیا مصلحت تھی یہ میں نے اپنے والد سے کبھی نہیں پوچھا۔ مجھ سے چھوٹا جو شہید ہو گیا وہ خورشید [illegible] تھا [illegible] آؤ مکان دیکھو۔ بھئی معاف کرنا میں نے پھر تمہارا [illegible] مسئلہ الجھا دیا۔" وہ چلتے چلتے رکا۔ "مجھے تم سے [illegible] نام بھی تو پوچھنا چاہیے۔"

"مجھے سکندر بخت کہتے ہیں جناب!" میں نے معذرت [illegible] کہا۔ "میرے ساتھ ایک بہن ہے ایک بھائی ہے ایک [illegible] ماں ہے۔ ایک خادم ہے اور۔۔۔"

"میں سمجھ گیا۔" وہ بے ساختہ ہنسا۔ "ان کے علاوہ [illegible] ایک بیوی ہے ایک بچہ ہے۔ سب ایک۔۔۔"

مکان میری توقعات سے کہیں زیادہ خوبصورت ثابت ہوا۔ [illegible] لیکن اس سے میرے شکوک پختہ ہو گئے۔ مکان نیا بنا ہوا تھا [illegible] اور اس کا رنگ و روغن بتاتا تھا کہ ابھی تک اس میں کسی نے رہائش اختیار نہیں کی۔ ایک کنال رقبے پر بنے ہوئے اس مکان میں چار کمرے تھے [illegible] اور میرے دونوں کمروں کے درمیان [illegible] اور جدید قسم کا باتھ روم تھا [illegible] اور ایک چھوٹا سا کچن گویا اوپر کا حصہ بھی ایک مکمل رہائشی یونٹ تھا۔ پچھلے حصے میں جو گیراج تھا اس میں دو گاڑیاں ساتھ ساتھ کھڑی کی جا سکتی تھیں اور ایک سرونٹ کوارٹر تھا جسے [illegible] بھی کہا جا سکتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ مکان [illegible] قیمت کا تھا اور جمشید نے جو قیمت مانگی وہ [illegible] اس کی اصل قیمت سے آدھی تھی۔

"جمشید صاحب!" میں نے کہا۔ "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر آپ کو اس مکان میں رہنا نہیں تھا تو آپ نے بنایا کیوں تھا۔ اس کے علاوہ اب جو قیمت آپ مانگ رہے ہیں وہ میرے اندازے کے مطابق بہت کم ہے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے میں اور آپ اجنبی تھے۔ ایک دوسرے کو نام اور صورت سے بھی نہیں جانتے تھے۔۔۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو میاں سکندر!" وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں اچانک جیسی تھکن اور اداسی اتر آئی ہے۔ "دنیا میں کوئی ایسا نہیں کرتا اور اگر کرے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ پاگل ہو گیا ہے۔ بات صرف سمجھنے کی ہے۔ جو آدمی کو اور اس کے حالات کو نہیں سمجھتے وہ کچھ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ مکان میں نے واقعی رہنے کے لیے بنوایا تھا لیکن تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ جس کی خاطر یہ سب کچھ کیا تھا اس نے ساتھ نہیں دیا۔ اب وہ ایک ایسے گھر میں رہتی ہے جو اس سرونٹ کوارٹر کے برابر بھی نہیں ہے۔ ایک تنگ و تاریک گلی میں۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔ "خدا اسے خوش رکھے۔ آدمی کو رہنا بھی وہیں چاہیے جہاں دل کی خوشی ملے۔ خوشی بڑا عجیب پودا ہے۔ کبھی اسے جھونپڑے کی آب و ہوا راس آتی ہے تو کبھی یہ محلوں کی دیواروں میں بھی سوکھ جاتا ہے۔"

"میں آپ کے نجی معاملات کے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔" میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "لیکن میرے دوسرے سوال کا جواب آپ نے نہیں دیا؟"

"اس کا میں کیا جواب دوں؟" وہ دونوں ہاتھ پھیلا کے بولا۔ "اس کی بھی ایک جذباتی وجہ ہے جو میں نہیں بتا سکتا، نہ تم یقین کرو گے اور نہ یہ سمجھو گے کہ میں پاگل ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ اس قیمت پر ایسا مکان تمہیں کہیں مل سکتا ہے جو ظاہر ہے کہ نہیں مل سکتا۔ اس سودے میں تمہارا فائدہ ہے۔ پھر سوال و جواب کی کیا ضرورت ہے۔ میری چیز ہے میں ایک روپے میں بیچ دوں یا کسی کو تحفے میں دے دوں۔ اخلاقی اور قانونی طور پر یہ کوئی جرم نہیں۔"

"بات یہ ہے جناب عالی کہ نواب صاحب کا چھوٹا بھائی جو شہید ہو گیا تھا۔" شوفر نے پہلی بار ہمت کر کے لب کھولے۔ "اس کی صورت بالکل آپ جیسی تھی۔ آپ تصویر دیکھیں گے تو کہیں گے کہ میری تصویر ہے۔"

"نہیں، نہیں یہ۔" جمشید جھلایا۔ "اس کی وجہ یہ نہیں ہے میرا مطلب ہے بے شک تم ہم شکل ہو۔۔۔ لیکن وہ تو شہید ہو چکا ہے کیا یہ بات میں نہیں سمجھتا۔ بس میں یہ مکان

www.paksociety.com

تمہیں اسی قیمت پر دینا چاہتا ہوں۔۔۔ تم لو گے یا نہیں؟"
اس کی آواز کانپ رہی تھی لیکن وہ مشتعل نہیں تھا صرف جذبات کی شدت سے مغلوب تھا اور اپنی اعصابی کش مکش کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو اس سودے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ جو نقد رقم ہے وہ کل آپ کو ادا کر دی جائے گی۔ باقی وعدے کے مطابق۔ قبضہ کل مل جائے گا؟"

"قبضہ؟" جمشید نے یہ لفظ دہرایا۔ "قبضہ لے لو ابھی لے لو۔۔۔ یہ لو۔" اس نے چابی مجھے تھمانے کی کوشش کی۔

"جی نہیں۔" میں نے پریشان ہو کے کہا۔ "مجھے کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔ میں آپ سے چابی کل لے لوں گا۔ یہ بتایئے کہ آپ کہاں ملیں گے؟"

"تمہاری مرضی۔" اس نے چابی واپس جیب میں رکھی۔ "اگر تم کل شام کو آؤ تو میں اسی جگہ ملوں گا۔ تم جتنی رقم لا رہے ہو اس کا بینک ڈرافٹ یا پے آرڈر بنوا لانا۔ باقی سیل ڈیڈ و دوسرے قانونی اور کاغذی مرحلے بعد میں طے ہو جائیں گے۔" وہ شوفر کی طرف پلٹا۔ "جاؤ سکندر صاحب کو چھوڑ آؤ۔ میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔" اس نے مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور میں اسے خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ میرا خیال تھا کہ شوفر میرے پیچھے آ رہا ہوگا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ غائب تھا مگر چند سیکنڈ بعد وہ بھی نمودار ہو گیا۔ اب میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ چند سیکنڈ کے اس وقفے میں کیا ہوا، جب میں ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ کیا خود جمشید نے اپنا عصا شوفر کو تھما دیا اور خود شوفر بن کے میرے پیچھے چل پڑا یا اس نے واقعی شوفر کو بھیج دیا۔ اگر میں ان پر نگاہ رکھتا تو یہ دھوکا نہ ہوتا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ عقل کی دلیل یہ تھی کہ جمشید نے شوفر کی جگہ لے لی ہو گی ورنہ آخر اسے سرے سے اتنی دور ایک بالکل خالی گھر میں ٹھہرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ وہ میرے ساتھ بھی جا سکتا تھا مگر اس کا ارادہ یہ ہوگا کہ میرا تعاقب کرے اور اگر میں اس کا تعاقب کروں تو دیکھ لے۔ کسی احمق کی عقل پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھے اپنی جائے رہائش سے بے خبر رکھنا چاہتا ہے اور اسی لیے سودا کرنے کے لیے اپنے آفس یا گھر کے بجائے اس نے شام کے وقت مجھے مکان پر پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ بینک ڈرافٹ

اور پے آرڈر کی بات میرے اطمینان کے لیے تھی … رقم لے جانے کی صورت میں لٹ جانے کا اندیشہ … لیکن اب میرا اگلا قدم شام کے وقت پہنچنا یقینی … اور ان کو یہ مہلت کوئی دام اجل بچھانے کے لیے … شوفر خاموشی سے گاڑی چلا رہا تھا اور … میں کھویا ہوا تھا لیکن میری نظریں راستے پر تھیں … یقین تھا کہ شوفر کی جگہ خود جمشید گاڑی چلا رہا ہے … خالی مکان کو مقفل کر کے کسی رکشا ٹیکسی تک … گا۔ جمشید ابھی تک اپنے ڈرامے میں کامیاب تھا … بالکل احساس نہ تھا کہ قبل از وقت میرا اس … غلطی نے اس کا راز فاش کر دیا تھا۔ میں … بجا نب تھا کہ جمشید بڑا شکاری ہے جو نیا جال … آیا ہے۔ میں پٹری والا ونی سلوا اور جمشید … کے علاوہ بھی کوئی ہے جو ابھی تک … سوچا مگر اس سوال کا جواب صرف وقت ہی … جال ابھی تک اور صحیح سمت میں تھی۔ دشمن … تھے کہ رابعہ کب تک پرائے گھر میں رہے گی … بیسہ ہے، وہ مکان تو خرید لے گی لیکن … یہ تو تقریباً طے تھا کہ میں اور محسن اس کے ساتھ … لیکن ہمارے معاشرے میں ایک جوان اور … شادی شدہ لڑکی دو جوان کنوارے مردوں کے ساتھ … سکتی ہے جن سے کوئی رشتہ بھی نہ ہو۔ انہوں نے … ہوگا کہ وہ مجھ سے شادی کرے رہے گی … تیر چلایا تھا کہ شاید میرا جواب غائب ہو جانے … اور اس کی ماں کو بھی ساتھ رکھیں گے۔ وہ جانتے تھے … کو کسی نے اغوا نہیں کیا ہے۔ بہر نے حالات سے … ہو سے اسے چھپا دیا ہے۔ ایک سستا مکان … جز الفصل بستے تھے کیونکہ وہ اور کسی طرح سے … نکالنے میں بھی ناکام رہے تھے اور میری ایک بات … میرے قتل کی کوشش کو بے فائدہ بنا دیا تھا۔ اب … نقطۂ نظر سے یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ میں اور … سب جا رہے تھے رابعہ، محسن اور شملا ایک مکان … جائیں تو اس مکان کے پیچھے بابعد بچانے کے … شادی کیا جائے۔

گاڑی ایک بار پھر ملت کردہ کے سامنے … نیچے اتر کے فوراً شوفر کا شکریہ ادا کیا جو میرے … مذہب گھر رہا تھا لیکن دروازہ بند کر کے بھی …

… کہ جگہ پر نہیں بیٹھا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر سگریٹ پیتے … ایک پان فروش کے کھوکھے کی طرف بڑھا جا رہا پہلے … صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے اپنی … کے لیے یا پیچھا کرنے کا موقع دینا چاہتا ہے۔ میرے … بہت کم وقت تھا۔ میں نے آہستہ سے … دروازہ کھولا۔ چابیاں سوچ میں کھو رہی تھیں … آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں چابی کھینچ کر میں نے دروازہ … وہاں ٹریفک کا اشارہ تھا کہ اشارے پر چند … دروازے کی آواز ڈرائیور کے کانوں تک نہیں … میں چند قدم چل کے یوں کھڑا ہو گیا جیسے … ٹیکسی کے لیے ٹریفک کے رکنے کا انتظار کر رہا ہوں … میں نے جمشید کو سگریٹ خرید کر واپس آتے ہوئے … دیکھا اور اس کی طرف دیکھ کے مسکرایا۔ پھر میں نے آدھی … اور میاں کی فٹ پاتھ جیسی جگہ پر رک گیا۔ … آنے اور جانے کے لیے دو حصوں میں بٹا ہوا تھی۔ … جمشید بظاہر اسی طرح نظر آیا۔ وہ اپنی جیبوں … ہاتھ ڈال کے ٹٹول رہا تھا اور شاید یاد کرنے کی کوشش … کر رہا تھا کہ اترتے وقت انجن بند کرنے کے بعد اس نے چابیاں … ساتھ ہی نکالی تھیں یا نہیں۔ مجھ پر شک ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ … پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور میرے لیے دروازہ خود … کھولا تھا۔ اس کے لیے یہ فرض کرنا مشکل ہو رہا تھا … چند سیکنڈ کے وقفے میں کوئی ہاتھ کی صفائی دکھا سکتا ہے۔ … میرے سامنے وہ بلا پان والے کے کھوکھے تک گیا اور … اپنی فاکس ویگن اسٹارٹ کی تو وہ گاڑی سے … گھر کے تک کے فاصلے کو غور سے دیکھتا رہا بار بار چلا ارادہ … پر ہاتھ مارتا اور پان والے کی دکان پر کھڑے ہوتے … مشکوک نظروں سے … کی نظر میں ڈالتا واپس آ رہا تھا۔ پان والے کی … رنگ آ گئے تھے۔ اسے یہ خیال بھی آیا … پہلے کھڑے تھے ان میں کوئی چابی اٹھا کے … اب خیال میں خود اس کا چابیاں نکال اور خدا … دکان پر کھڑے بیٹا بعید از قیاس نہ تھا۔ بعد … یہ بھی سوچا ہو گا کہ کہیں یہ میری حرکت نہ ہو مگر … وقت تک میں بہت دور جا چکا تھا۔

یہ صورت حال دلچسپ بھی تھی اور توجہ طلب بھی۔ محسن … اس صورت حال سے فائدہ بھی … آج کا دن بہت کامیاب گزرا … بے قرار تھا کہ محسن نے اور رابعہ

نے دل بھر کے کیا کیا؟ وعدے کے مطابق میں پانچ بجے رابعہ کے پاس جا پہنچا۔ وہ اور شملا باتوں میں مصروف تھیں اور نہ جانے کس بات پر ہنس رہی تھیں۔

"کیا بات ہے بھئی؟" میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی کہا۔ "ہم بھی تو سنیں کہ ہنسنے کی کون سی بات ہے؟"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں بھائی جان!" شملا نے کہا۔ "کیا ہنسنے پر بھی پابندی ہے؟" اس کی بات پر مجھے عدنان کا خیال آیا۔ اگر وہ شملا کا حقیقی بھائی ہوتا تو اس کی اماں کی موت کے بعد شملا اس طرح کبھی نہ ہنستی لیکن وہ ایک ملازم کا بیٹا تھا جسے شملا نے اپنی ضرورت کے لیے بھائی بنایا تھا۔ ضرورت ختم نہیں ہوئی تھی مگر شملا کو بن مانگے دوسرا بھائی مل گیا تھا چنانچہ اس نے عدنان کو فراموش کر دیا۔ وہ ایک خادم کا بیٹا تھا اور ذاتی کردار کے اعتبار سے شملا کا بھائی بننے کے قابل نہیں تھا لیکن اس شخص نے بھی بہن کے رشتے کا تقدس مجروح نہیں ہونے دیا تھا حالانکہ اسے نیکی بدی کی تمیز نہ رہی تھی۔ یہ خیال بڑا دل شکن تھا۔ رشتے جو ضرورت اور مصلحت کی بنیادوں پر استوار کیے جائیں کبھی حقیقی رشتوں کا نعم البدل نہیں ہوتے۔ ایسے رشتوں کی جڑیں دلی جذبات کی گہرائی میں نہیں ہوتیں چنانچہ وہ سوت کے کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ کیا میرے خلوص کا انجام بھی یہی ہوگا؟ شملا اسی طرح مجھے بھی بھلا دے گی اور میرے مرتے ہی بھائی کی خالی اسامی کو پھر کوئی پُر کر دے گا۔

"تم ایک دم اتنے سنجیدہ کیوں ہو گئے ہو؟" رابعہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔ "کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ ایسے ہی تم دونوں پر رشک کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "کتنے اطمینان سے گھر میں بیٹھی دانت نکال رہی ہو۔ ایک ہم ہیں کہ خوار پھر رہے ہیں۔ پتہ نہیں محسن کس حال میں ہے؟"

رابعہ مسکرائی۔ "وہ بالکل خیریت سے ہے۔ واپس آنے کے بعد گھنٹہ بھر اس معرکے کی روداد سناتا رہا جو اس نے تھانے میں سر کیا تھا۔ ابھی ابھی اپنے گھر فون کرنے گیا ہے۔ ہم اسی کی باتوں پر ہنس رہے تھے۔"

"ہنستے وقت آپ کو اس بڑھیا کا خیال نہیں آیا؟" میں نے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ خفت سے شملا کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"امی سوئی ہوئی ہیں اور وہ اونچا سنتی ہیں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"اس کے علاوہ ہمارا نارمل نظر آنا بھی ضروری ہے۔"

www.paksociety.com

رابعہ نے فوراً بات بنائی۔ "انھیں تو ایسے ہی یقین آ گیا کہ ان کا بیٹا باہر چلا گیا ہے۔ اگر وہ کسی کو روتا دھوتا دیکھ لیں گی تو ٹوٹ جائیں گی۔"

"آئی ایم سوری۔" میں نے کہا۔ "میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ چلو اب تم تیار ہو جاؤ۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گی۔" شہلا نے کہا۔ "میں ایسے حال میں نظر بند نہیں رہ سکتی۔"

"پاگل مت بنو۔" میں نے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ باہر تمہارے لیے کتنا خطرہ ہے۔"

محسن اندر آیا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ "میں ابھی ابھی دیکھ کے آیا ہوں۔ ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہے۔ زمین پر، آسمان پر، چھتوں پر اور سڑک پر جہاں بھی نظر جاتی ہے خطرے کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔"

"یار، یہ لڑکی ضد کر رہی ہے کہ میں بھی باہر چلوں گی۔" میں نے کہا۔ "تو سمجھا اسے۔"

"مجھے کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" شہلا بولی۔ "خطرہ ہے تو ہوا کرے۔ میں اس قید سے بھی تنگ آ گئی ہوں۔"

"یہ بات تو ہے۔" محسن نے کہا۔ "اگر مجھے اس طرح قید تنہائی میں رہنا پڑتا تو میں کہتا خطرے کی ایسی تیسی۔ پاگل ہو کے مرنے سے کیا فائدہ۔ موت برحق ہے اور اس کا ایک دن مقرر ہے۔ پھر ڈرنا کیسا؟"

"آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "چلو بھئی شہلا تم بھی تیار ہو جاؤ۔ تمہارے حق میں بھی ایک ووٹ ہے۔"

"اس کے علاوہ مس شہلا!" محسن نے ہاتھ سینے پر رکھا اور نہایت عاشقانہ انداز میں جھکا۔ "خطرہ میری لاش پر سے گزر کے آپ تک پہنچ سکتا ہے۔ کیسا ہے یہ ڈائیلاگ؟" اس نے تعریف طلب نظروں سے ہم سب کو دیکھا۔

شہلا کو ساتھ لے جانے کے لیے ہمیں غیر معمولی حفاظتی انتظامات کرنے پڑے۔ وہ سڑک پر ایک ماسی کے برقع میں لپٹی ہوئی مضحکہ خیز حالت میں تھی۔ پھر رابعہ بھی ایک چھتری، پرانی اور میلی چادر میں خود کو چھپائے جاہل بوڑھی عورتوں کی طرح باہر آئی اور شہلا کے ساتھ بیٹھ گئی۔ آخر میں، میں اور محسن نکلے اور میں نے واپس ہونے کے بجائے گاڑی کو اسی سڑک پر سیدھا جانے دیا۔ بازار ختم ہوتے ہی سڑک خالی رہ گئی۔ ہمارے پیچھے صرف ایک ٹیکسی تھی لیکن "زنگو اسٹیٹ" کے پاس سے اور مکتوب سینما سے کچھ پہلے ہم سیدھے ہاتھ مڑے تو ٹیکسی ایرپورٹ کی جانب چلی گئی۔ اب ہم فوری طور پر کسی خطرے سے دوچار نہیں تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ سامنے سے ڈی سلوا کی گاڑی نمودار ہوئی۔ اس کا گھر مکتوب سینما کے پاس ہی تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر [illegible] کیا سمجھتا۔ مگر وہ آفس سے آ رہا تھا اور بہت تیزی [illegible] اس کی نظریں سامنے تھیں اور وہ اکیلا تھا۔ اس کی [illegible] سیکنڈ میں ہمارے قریب سے گزر گئی لیکن فوراً ہی [illegible] میری نگاہ بار بار آئینے میں پیچھے آنے والی گاڑیوں [illegible] رہی۔ میں کوئی خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ [illegible] کی مدد ہمارے حق میں تھی اور اس مرحلے پر اس کا پورا فائدہ اٹھانا ضروری تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ [illegible] پل عبور کر کے گاڑی کو سیدھا لے جاؤں۔ یہ بعید [illegible] جا سکتا تھا کہ ہمیں رابعہ کے دفتر میں بیٹھ کر انتظار [illegible] یا کسی اور جگہ جا کے مال روڈ پر بہت سے اچھے ریستوران [illegible] تھے لیکن وہ جگہ خطرناک بھی تھی، وہاں کسی سے ٹکراؤ ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔ چنانچہ میں نے پل پر [illegible] گاڑی کو بائیں جانب پیچھے جانے والی چھوٹی سڑک [illegible] لیا۔ کینٹ اسٹیشن کے سامنے سے گزر کر [illegible] سڑک کی ریلوے کراسنگ عبور کی اور کلفٹن [illegible] جا پہنچا جہاں چار منزلہ بس کا آخری اسٹاپ تھا [illegible] وہ کام کرنے جہاں بھی ریلوے اسٹیشن بھی پہنچا [illegible] بھی ضائع کرتا ہوں تو اطمینان سے [illegible] میں جا بیٹھے بس خراماں خراماں چلتی [illegible] سیر کرانے کے بعد بالآخر ریلوے اسٹیشن پہنچا دے گی۔ چار منزلہ بس کی وجہ شہرت بالکل غلط ہے جو اس کے [illegible] پڑتا ہے۔ کوئی لمبے سفر کی بات کرے تو لوگ کہتے [illegible] بس میں بٹھا دو۔ جیسے کراچی میں لوگ کہتے ہیں [illegible]

گاڑی کو میں نے کلفٹن کے مرکزی علاقے [illegible] سینما کے قریب روکا۔ یہ مارکیٹ قصبے میں [illegible] انتہائی ماڈرن اور فیشن ایبل [illegible] سینٹر تھی۔ [illegible] اپنے نقاب گاڑی میں چھوڑے اور ہم ایک [illegible] ایئرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ کے فیملی روم میں جا بیٹھے۔ [illegible] لارڈز یا شیزان والا رش نہیں تھا۔ ہال کی بڑائی میں بہت کم لوگ دور دور بیٹھے تھے۔

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ مال روڈ کی طرف [illegible] نہیں۔" محسن نے بیٹھ کے کہا۔

"تو لیجئے آپ کو سچ مچ بیار عقل مند ثابت کر [illegible]" میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کے کہا۔

ڈمپو اور شہلا ہمارے سامنے ساتھ ساتھ بیٹھ گئیں۔

"حالانکہ عقل مند تم دونوں میں کوئی بھی نہیں۔" رابعہ نے [illegible]

[illegible] محسن نے فوراً فاتح کی۔ "عقل مند تو صرف آپ [illegible] بڑھ کر خاتون۔" اس نے شہلا کی طرف اشارہ کیا۔ [illegible] باقاعدہ آغاز کرنے سے پہلے آپ ایک کام کریں [illegible] کا ٹیلی فون ہو گا۔ آفس فون کر دو [illegible] رابعہ نے کہا۔ [illegible] آنے تو اسے یہاں بھیج دیا جائے۔ ہم تین گھنٹے تک [illegible] یہیں بیٹھیں گے۔" [illegible] والوں نے تنگ آ کے نکال دیا تو سامنے [illegible] ہوں گے۔" محسن بولا۔

"محسن کی مجال ہے کہ آدھی رات کو ریسٹورنٹ کے بند ہونے [illegible]" میں نے کہا۔ "ہم تو تب اٹھیں گے [illegible] بھی کیا تو سب باہر سا [illegible] ایک [illegible] گھنٹے بعد تو تناول فرمائیں گے۔ [illegible] گھنٹے تو یقیناً بیٹھیں گے۔"

رابعہ چند منٹ میں فون کر کے آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی بیرا [illegible] کھانے کا سامان رکھ کے چلا گیا۔ "پہلے یہ تو بتاؤ [illegible] کا آغاز کر رہا ہے۔" محسن نے کہا اور میں نے [illegible] ایک فائل برآمد کی جسے ڈسپلے کر کے اس نے پتلون کی بیلٹ [illegible] رکھی تھی۔ "یہ ہے ساری روداد۔ ایک شریف آدمی اور [illegible] کے گھر کی تباہی کی۔ الماس کے والدین کے گھر میں آگ لگی [illegible] مر گئے تھے۔ پولیس کا ابتدائی موقف [illegible] کا دماغ چل گیا تھا لیکن بعد میں ان کو اپنا خیال [illegible] ایک نہیں تین دن میں رہنے والے دو اہل [illegible] بیانات ہیں۔ دونوں پڑوسی زندہ ہیں اور وہیں رہتے ہیں اس کے علاوہ پوسٹ مارٹم رپورٹ ہے اور وہ ڈاکٹر پرائیویٹ [illegible] کرتا ہے جس نے یہ رپورٹ دی تھی۔ میں نے سب کا پتہ [illegible] اس قصبے کی کوئی گنجائش نہیں۔ پہلے الماس کے [illegible] کر قتل کیا گیا پھر قاتل گھر میں آگ لگا کے فرار ہو گئے۔ دونوں [illegible] صاف کہا ہے کہ فائرنگ کے بعد گھر میں آگ لگی تھی۔ [illegible] انھوں نے پٹرول کی بہت تیز بو محسوس کی تھی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ فائل تمہیں کیسے ملی؟"

محسن نے ایک ہاتھ کی پانچ انگلیاں پھیلا کے دکھائیں۔ "وہاں ایک بہت خبیث تھانیدار بیٹھا تھا۔ [illegible] علاقے میں سمجھا۔ میں نے ایک سنجیدہ کی بات کی تو [illegible] ہوا کہ یہ تھانہ ہے یا سبزی منڈی۔ آلو ٹماٹر کا سودا [illegible] دو ہزار کا مال ایک سو میں لینا چاہتے ہو؟ [illegible] کیا؟ ملاحظہ ہوا اس کا سوال۔ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ [illegible] مجھے اس کے باپ کی حلال کی کمائی تھی جس کے وہ دو ہزار سے کم لیتا تو اس کی حق تلفی ہو جاتی۔ پھر میں نے بھاؤ پانچ تک بڑھا دیا مگر یا تو اس کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ پانچ سو روپے اس کے لیے پانچ پیسے کی طرح بے وقعت ہیں یا وہ مجھے اتنا احمق اور مجبور سمجھ رہا تھا کہ میں دو ہزار چوری کر کے بھی پورے کروں گا۔ میں نے بھی منت سماجت کے بعد کہا کہ اچھا مجھ پھٹیچر والی کا کچھ زیور ہے، وہ بیچ کر لاتا ہوں۔ مگر میں اسے زری دیتا کہ بیٹا قاتل تو میں لے لوں گا۔ تو وہ قاتل غائب کر دیتا۔ میں باہر جا کے انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی کرسی پر کہیں دفع ہو گیا تو میں پھر اندر گیا۔ محرر مجھے دیکھ کر کھل اٹھا۔ اس نے جلدی جلدی ساری گفتگو سن لی تھی اور قاتل نکال کے دراز میں رکھ لی تھی۔ اس نے پانچ سو جیب میں ڈالے اور قاتل میرے ہاتھ میں دے کر کہا کہ بھاگ جاؤ۔ تھانیدار صاحب کو پتہ نہ چلے۔ سب ہی حرام کی کھاتے ہیں نا، اس لیے ایک دوسرے کو بھی کاٹ لیتے ہیں۔ اب تھانیدار بیٹھا ہے دو ہزار کی آس لگائے اور ڈھونڈتا پھرے قاتل۔"

"یہ ثبوت اور گواہ تو بعد میں کام آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "جب کیس سماعت کے لیے عدالت کے سامنے آئے گا۔ اس سے پہلے میں دو کام کرنا چاہتا ہوں۔ ایک کام میں استاد ونڈی ہماری مدد کرے گا۔ امید ہے اس سے چراغ دین کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا اور یہ کام اس طرح ہو گا کہ ہم دونوں بالکل محفوظ رہیں گے۔ استاد ونڈی کو آمادہ کرنے کے لیے ہمیں شہلا کی مدد درکار ہو گی۔"

"میری؟" شہلا نے کہا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ چراغ دین کون ہے اور اس کا مسئلہ کیا ہے۔ نہ میں کسی استاد ونڈی کو جانتی ہوں۔"

"وہ عدنان کا جگری یار تھا۔" میں نے کہا۔ "اور سخت جنگجو قسم کا آدمی ہے۔ وہ تمہیں عدنان کی چھوٹی بہن سمجھتا ہے اور تم سے مل کر تمہیں یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ وہ عدنان کے قاتلوں سے انتقام ضرور لے گا۔ تم اس سے صرف یہ کہنا کہ بھائی عدنان کا معاملہ انصاف پر یا خدا پر چھوڑ دو۔ اگر کچھ کرنا ہے تو میرا ایک کام کر دو۔ کام کیا ہے، یہ مسٹر بھائی بتائیں گے۔ وہ انکار نہیں کرے گا اور ہم اسے بعد میں سب کچھ سمجھا دیں گے۔"

"دوسرا کام کیا ہے؟" محسن نے کہا۔

"اس کے لیے دوسرا [illegible] آپ بیتی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کلیجہ تھام لو پہلے سنو [illegible] داستان میری۔"

"خواتین کی پہلی ہوتی ہے دوسرے کی دوستی۔" محسن نے لقمہ دیا اور شہلا ہنسی۔ میں نے دن بھر کی سرگزشت کہہ سنائی کی

www.paksociety.com

ملاقات سے شروع کیا اور خسرو جمشید کو چھپانے کے کل آنے کی واردات پر ختم کیا۔ میں بہت آہستہ لیکن روانی اور فصاحت کے ساتھ بول رہا تھا مگر میری بات میں چالیس منٹ گزر گئے۔ اس دوران میں صرف ایک وقفہ آیا جب محسن نے دوسری بار گرم چائے منگوائی۔

"حقیقتاً وہ سارا پروگرام یہ ہے کہ ابھی تم کو ویڈیو ٹرانسمیٹر میں ہم فٹ کر دیتے تو اس سے وہی سلوا کروا دو؟" رابعہ

"میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی سکندر!" رابعہ بولی۔

"تم وہ نہیں ہو جو میں مانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن شکل جیسے کہ وکیل ہونے کے باوجود عورت ہو۔ ابھی تک تم نے ہمیشہ وکیل صفائی کی حیثیت سے دلائل دیے ہیں۔ آج اگر تم کو جج بنا دیا جائے تو میرا خیال ہے کہ تم سفاک قاتلوں کو سزائے موت نہیں دے سکو گی۔"

"یہ غلط ہے۔" رابعہ نے احتجاج کیا۔ "وہ قانونی معاملہ ہے۔"

"اور وہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "جب وہ تمہیں اغوا کر کے لے گئے تھے۔ جب انھوں نے تمہاری ماں کا جنازہ اٹھنے سے پہلے ایک دھمکی دی تھی؟ اس وقت قانون تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ انھوں نے تمہارا آبائی گھر تم سے ہتھیا لیا۔ میرے باپ کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش تک چھپا لی۔ عدنان کو اور نہ جانے کتنے لوگوں کو مار دیا یا مروا دیا۔ قانون نے ان سے ضمانتیں لینے کے علاوہ کچھ کیا؟ وہ ایسا ہی بم تھا جو میری جان لے سکتا تھا لیکن خدا کو میری زندگی منظور تھی۔ میں نے چابی سے دروازہ نہیں کھولا ورنہ آج اس وقت یہاں میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے کے بجائے آپ سب لوگ میری قبر پر فاتحہ پڑھ رہے ہوتے۔ اور آئندہ کا کیا ہے؟ کیا میں، تم، شہلا اور دوسرے لوگ محفوظ ہو گئے ہیں؟ جمشید نے تو کھلی دھمکی دی ہے کہ خمیازہ سب کو بھگتنا پڑے گا۔ محسن کے گھر والوں کو، شہلا کی ماں کو اور رضوی صاحب کے بیوی بچوں کو۔ تم قانون سے مدد لے کے دیکھو۔ خود رضوی صاحب ایک نمبر کوشش کر کے دیکھ چکے ہیں۔"

"یہ... یہ سب تو ٹھیک ہے سکندر!" رابعہ نے بے بسی سے کہا۔ "لیکن کیا یہ غلط طریقہ نہیں ہے؟"

"ہے... میں کب کہتا ہوں کہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن صحیح طریقے صرف قانون کی کتابوں میں لکھے ہوتے ہیں۔ ان کو جاننے والے بھی نہیں پڑھتے اور ان کی پروا بھی نہیں کرتے۔ غلط اور صحیح کے معیار کبھی نہیں بدلتے لیکن عملی زندگی کے تقاضے بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ جینے کا حق کسی عدالت سے نہیں ملتا اور ظلم مقدر نہیں ہوتا۔ مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ دنیا طاقت ور کی ہے جس میں کمزور کی کوئی جگہ نہیں۔ دشمن کو جب تک یہ احساس نہ ہو کہ مقابل بھی اس کا ہم پلہ ہے وہ جارحیت سے باز نہیں آتا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا پڑتا ہے۔ وہ لوگ ایک طرف تو بد معاش ہیں، جرم، قانون، اخلاق اور معاشرے کی ساری قیود سے آزاد ہیں۔ شہر میں یوں پھرتے ہیں جیسے جنگل میں خون آشام درندے اور ہم قانون کی دفعات دیکھتے ہیں۔ تھانوں میں انصاف کی دہائی دیں یا حاکم سے فریاد کریں۔ لکھیں یا لیا جائے آدمی یا محمود صاحب سے درخواست کریں۔"

"ٹھیک ہے۔ تو نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کر دی۔" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ بتا کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ پہلے تو یہ ہے کہ ہم سب کو رہنے کی جگہ چاہیے۔"

"ہاں۔" میں نے ایک گہری سانس لی اور دیکھا وہ نظر جھکائے دانتوں سے اپنے ناخن کاٹ رہا تھا۔ "صبح میں نے تین مکان دیکھے تھے۔ ان میں سے ایک کے لیے بہت موزوں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ مایوسی نہ ہو۔"

"لیکن جانتے ہو جیسے ہم اس مکان میں رہ سکتے ہیں؟" محسن نے کہا۔

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "نیا مورچہ اسے ہمیں پیٹ دینا چاہیے۔ اس کی تو میرے ذہن میں آتی ہے مگر اس پر عمل پانچ ساڑھے پانچ لاکھ کا مکان ہمیں پیش کرتے ہیں۔ مقصد صاف ظاہر ہے۔ وہ سودا تو کر لیں گے اور ہمیں ظاہر بھی کے باعث ہم ان کی چال میں آ گئے ہیں۔ یقین ہو گا کہ ڈرامہ کامیاب جا رہا ہے۔"

"لیکن چابیاں نکال کے تو نے ان کو ہو گا۔" محسن بولا۔

"یہ شک تو میں آسانی سے دور کر سکتا ہوں۔ فرض کرو میں کل شام کو شہلا کے ساتھ وہاں خفیہ رقم ادا کرتی ہے وہ کہیں گی۔ کل صبح سے کی سیل ڈیڈ وغیرہ تیار ہو سکتی ہے۔ شہلا کو دیکھو"

یقین آ جائے گا کہ ہم پھنس گئے اور مکان کا قبضہ ملتے ہی جب خود کشی کے لیے پہنچ جائیں گے۔ وہ جلد از جلد کا کوئی دوائی مثل کر کے مکان بہانے سے نام کر دیں گے۔ وہ ڈھائی لاکھ ہی ان کو یہ سودا بہت سستا لگے گا کہ سالے چکر ختم۔ نہیں۔ نہ کسی سے مقابلے کا ڈر ہے اور نہ یہ بے نقاب ہونے کا۔ میر شرافت علی مارا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ اسے بھی ان لوگوں نے راستے سے ہٹا دیا۔ نو دو گیارہ ہو گئے۔ وزیر خان پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ حق ملکیت کا کوئی بھی دعویدار باقی نہ رہے۔ چودھری والا ورد جاتا ہے بہروہ اطمینان سے رکھ سکتے ہیں۔ ان کو گرفتاری کا فائدہ ہو گا۔ اس کے لیے دو لاکھ کا گھاٹا تو کچھ بھی نہیں اس سے زیادہ کی پیش کش وہ سمجھ کر ہی کیے تھے۔ یہ مکان وہ ہمیں مفت بھی دے دیتے لیکن وہ جانتے ہیں کہ ہم شک کریں گے۔ انھوں نے کیا زبردست جواز رکھا ہے۔ جمشید ایک بڑی ہستی ہے جسے پیسے کی پروا نہیں۔ اس کا ایک بیٹا جمشید ہو گیا اور میں سو فیصد اس کا قاتل ہوں۔ مجھے دیکھ کر وہ جذباتی ہو جاتا ہے۔ جذبات کا کوئی مول نہیں۔ خود اس نے کہا تھا کہ میری مرضی ہے میں یہ مکان کسی کو ایک دھیلے میں دے دوں۔ یہ اتنا معقول جواز ہے کہ اگر میں ان کی جگہ ہوتی تو میں بھی جذباتی ہو جاتا۔ مکان میں رہنے کا وقت طلاق ہو جاتی۔ جواب فرض کرو ہم وہ مکان لے لیں۔ ڈھائی لاکھ میں وہ مکان مل جانے کی صورت کر لی مگر اس کے بعد ہم غائب ہو جائیں۔ سامنے آئے بغیر ساڑھے پانچ لاکھ کے مکان کو ساڑھے چار لاکھ میں بیچ دیں تو دو لاکھ کا کوئی فائدہ نہیں ایک ہاتھ سے خریدے دوسرے ہاتھ سے بیچنے کی بات ہے اس میں کوئی دھوکا نہیں۔ سارا چکر دوبارہ سامنے نہ آنے کا ہے۔ ڈھائی کے بجائے ہم ساڑھے چار لاکھ کے مالک ہو سکتے ہیں۔"

رابعہ مسکرائی۔ "یہ تو کوئی مشکل مسئلہ نہیں۔" وہ بولی۔ "کل ڈیڑھ لاکھ کا بینک ڈرافٹ لے جاؤ۔ میں فروخت کے سیل ڈیڈ وغیرہ کا انتظام کر لوں گی۔ اس لیے یہ معاہدہ بھی ایسے ہی کرنا پڑے گا کہ میں پلاٹ کے فروخت ہوتے ہی ادا کر دوں گی۔ دوسرے الفاظ میں ہم جیر کر سکتے ہیں۔ خسرو جمشید ساتھ ہو گی۔ میں وہاں رضوی صاحب سے کہہ کے کوئی ایسا بند و بست کروا لوں گی کہ عمارت کے چاروں طرف سادہ کپڑوں میں پولیس موجود ہو جو بغیر شناخت کے کسی کو اندر نہ جانے دے۔ اس سے کل محسن کی مداخلت یا ہنگامہ آرائی کا خطرہ ٹل جائے گا۔ وہاں میں ان دستاویزات کے دو سیٹ بنوا کر تجویز پیش کروں گی کہ خسرو جمشید صاحب! اگر آپ مناسب سمجھیں تو بات اسی وقت ختم کر دیں۔ میں ڈیڑھ لاکھ نقد دے رہی ہوں اور پلاٹ آپ کے نام ٹرانسفر کر رہی ہوں۔ اس کے ایک لاکھ آپ کو ضرور ملیں گے۔ زیادہ بھی مل سکتے ہیں اور آپ اگر چاہیں تو وہاں دوسرا مکان بنا سکتے ہیں۔ بڑی اچھی جگہ ہے۔ اگر تمہارا یہ خیال درست ہے کہ وہ ہر قیمت پر مکان دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو میری تجویز بھی ان کے لیے قابل قبول ہو گی۔ پلاٹ اور ڈیڑھ لاکھ نقد کے بدلے مکان، پیپر، رجسٹری وغیرہ کے سارے مرحلے میں پرسوں ہی ختم کر دوں گی۔ اگر انھوں نے میری بات نہ مانی تو میں کہوں گی کہ جمشید صاحب آپ انتظار کیجیے میں تو مکان میں اس وقت تک نہیں آؤں گی جب تک کل رقم ادا نہ ہو جائے اور مکان واقعی میرا نہ ہو جائے۔ آگے جو بھی منظور۔ پلاٹ ایک ہفتے میں بکے یا ایک مہینے میں۔ جلدی ان کو ہے مجھ کو تاخیر قبول نہیں کرنا ہے۔ میری تجویز قبول کر لیں گے۔ پرسوں رجسٹری وغیرہ کے عدالتی معاملات ختم ہو گئے تو میں اپنی طرف سے کسی کو بھی مختار عام مقرر کر دوں گی۔ مختار عام میرے ساتھ کام کرنے والے وکیلوں میں سے بھی کوئی ہو سکتا ہے اور محسن بھی یا پھر رضوی صاحب۔ اس کے بعد ہمیں سامنے آنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جس کے پاس بھی جنرل پاور آف اٹارنی ہو گی وہ اگلے روز ہی مکان فروخت کر سکتا ہے۔ اس میں اطلاع عام کی رسمی سی کارروائی میں وقت لگتا ہے اور اخبار میں اشتہار وغیرہ دینا پڑتا ہے کہ کسی کو اعتراض ہو تو اتنے دن میں حاضر ہو کے بتائے لیکن یہ اشتہار کوئی نہیں پڑھتا۔ لوگ خرچ بچانے کے لیے کم سے کم اشاعت والے اخبار میں اشتہار دے کر کاغذی کارروائی پوری کرتے ہیں بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ عدالت میں کچھ لوگوں نے اخبار کے نام سے ڈیکلیریشن لے رکھے ہیں۔ ان میں کوئی خبر نہیں چھپتی اور نہ کوئی ان کا نام جانتا ہے۔ کورٹ نوٹس وغیرہ کے سوا ان میں کچھ نہیں ہوتا اور یہ محض ریکارڈ کے لیے فائل میں لگا دیے جاتے ہیں۔ ہم اسی سے کام چلائیں گے۔"

"ویری گڈ بی بی!" محسن نے کہا۔ "مکان ہم نے ڈھائی لاکھ میں لے لیا اور سامنے آئے بغیر ساڑھے چار لاکھ میں بیچ بھی دیا۔ اب اس خاکسار کے چند سوالات۔ پہلا یہ کہ کل شام کو سکندر اگر شہلا کو لے کر گیا تو اس بات کی کیا ضمانت ہو گی کہ یہ دونوں زندہ سلامت لوٹ کر آئیں گے اور ساتھ خسرو جمشید کو بھی لے

www.paksociety.com

آئیں گے۔ سوال تو یہ ہے کہ ہم غائب ہو کے کہاں جائیں گے؟ مکان کے فروخت اور بکنے میں کچھ وقت لگے گا اور پیسہ ہمارے پاس ہوگا نہیں کہ دوسرا مکان خرید لیں۔ جہاں ہم گمنامی اختیار کر سکیں"

"گمنامی میں تو ہم اب بھی رہتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "رہا سوال رضوی صاحب کے گھر سے منتقل ہونے کا تو میرا خیال ہے کہ ہمیں مکان فروخت کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ مکانوں کے مالک تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ کرایہ دار کو تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس کا ریکارڈ کہیں نہیں ہوتا اور کرایہ نامے میں نام کسی کا بھی لکھوایا جا سکتا ہے۔ اب تو ہمیں کرائے کے مکان میں رہ کر رہنا چاہیے لیکن دشمن بے وقوفی میں ہمیں نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو یہ منافع بخش سودا ضرور کرنا چاہیے تاکہ سارا نقصان پورا ہو جائے۔"

"سوال نمبر ایک کا جواب اب بھی باقی ہے۔" محسن نے کہا۔

"وہ حفاظتی انتظامات کا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "جو ہم خود بھی کر سکتے ہیں اور رضوی صاحب بھی۔ اگر انھیں معلوم ہو کہ مکان رابعہ خرید رہی ہے تو انھیں حیرت نہیں ہوگی اور رابعہ کہے کہ مجھے ڈر ہے کہ اس کا حشر بھی پہلے والے مکان جیسا ہوگا تو وہ اس قریبی مکان کی حفاظت کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ سابقہ ناکامی کی تلافی کے لیے۔"

میری نظر نے استاد شیڈی کو دروازے سے اندر آتے دیکھا۔ دروازے پر ہی ایک بیرے نے اس کو روکنے کی کوشش کی۔ غالباً اس کا حلیہ اس ماحول سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اور یہ ریسٹورنٹ والے "حقوق داخلہ محفوظ ہیں" کی آڑ میں بدمعاش نظر آنے والے ہر شخص کو فوراً ہی شامل ہونے سے روک سکتے تھے۔ صورت حال کو ناخوش گوار ہونے سے بچانے کے لیے میں تیزی سے آگے بڑھا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ سوائے شہلا کے ہم سب اسے پہچانتے تھے۔ وہ اعلیٰ سوسائٹی کے اس اجتماع میں سب سے الگ نظر آتا تھا اور اسی احساس اجنبیت کے باعث بہت نروس تھا۔ میں نے اسے شہلا کے بارے میں بتایا کہ یہ عدنان کی بڑی بہن ہیں تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ میں نے وقت کو غنیمت جانا اور کھانا منگوا لیا۔ میری یہ تدبیر کام کر گئی۔ کھانا ختم ہونے تک ہم لوگوں کی بے تکلف گفتگو اور چائے نے حوصلہ افزائی نے استاد شیڈی کی وہ جھجک ختم کر دی جو اس پر احساس جرم کی طرح سوار تھی۔ وہ زیادہ کھل کر باتیں کرنے لگا۔ اس نے عدنان کے بارے میں اپنی جذبات کا اظہار کیا جو ہمارے سامنے کر چکا تھا۔ یعنی یہ کہ وہ قاتلوں کا سراغ لگائے گا اور ان کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ عدنان اس کا جگری یار تھا چنانچہ وہ شہلا کو بھی بڑی بہن ہی سمجھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

"دیکھو بھیا!" شہلا نے اچانک کہا۔ "تقدیر کا لکھا مٹا نہیں سکتے اور ہر شخص کو اپنے اعمال کی سزا یا جزا یہاں بھی اور وہاں بھی۔ میں جانتی ہوں کہ عدنان کیسا آدمی تھا اور اس کا اٹھنا بیٹھنا کیسے لوگوں میں تھا تو یہ کہ اسی انجام سے ہمیشہ ڈرتی رہی۔ مجھے اس کی موت پر دکھ تھا لیکن اس پر حیرانی نہیں ہوئی تھی۔"

میں استاد شیڈی کی صورت کے بدلتے ہوئے تاثرات بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔" شہلا نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ایک خرابی کے بعد دوسری خرابی سے کیا حاصل ہوگا؟"

"آپ کہہ رہی ہیں کہ میں ان کو بخش دوں؟" استاد نے یوں کہا جیسے مجرم اس کے قبضے میں ہوں۔ "قسم مولا

"خواہ مخواہ قسمیں مت کھاؤ۔" شہلا نے کہا۔ "تم کو نظام انصاف پر بھروسہ نہیں ہے۔ خدا کے انصاف پر تو

"یہ کیا بات کہی جی آپ نے؟" شیڈی بولا۔ "میں کافر تو نہیں ہوں۔"

"تو میرے بھائی خدا پر بھروسہ رکھو۔" شہلا نے بات کاٹ دی۔ "جس کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔ وہ ہے اور صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ سزا اور جزا کا اختیار اسی کو ہے۔ وہی ہمارا انصاف کرے گا اور اس کی گرفت سے بچ کر کہاں جائیں گے تم قدرت کی خدائی میں دخل مت دو اور دیکھو ظالموں کا انجام کیسا عبرت ناک ہوتا ہے۔"

"آپ کی بات تو دل کو لگتی ہے جی۔" وہ بولا۔ "لیکن یہ کتنا ظلم ہے کہ ہم یاری کی بات کریں مگر یار کچھ نہ کریں۔ میں کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہتا ہوں"

"تم اس کی مغفرت کی دعا کرو اور نیکی سے

شہلا پہلی بار میں اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ وہ بہت آہستہ اور بڑی مہارت سے شیڈی کے ذہن کا رخ بدل رہی اور اس کے خیالات پر اپنی گرفت کو مضبوط کرتی جا رہی۔ رابعہ یا محسن اسے نیکی کی تلقین کرتے تو یہ تبلیغ کے نام والی بات ہوتی۔ شیڈی جیسے لوگ جو صراط مستقیم سے بھٹک گئے ہیں اور شیطان کے راستے پر چلنے لگے ہیں، وہ انسان ہی ہیں۔ لوگ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں کہ اب ان کو خدا انھیں نیکی کی توفیق دے تو دے۔ مگر کچھ لوگ کوشش جاری رکھتے ہیں۔ خواہ وہ بے سود ہو۔ ماں باپ کے بعد اور کبھی کبھی بڑا بھائی بھی انھیں سمجھانے کا فرض ادا کرتا ہے۔ شہلا نے اس وقت بڑی بہن کی ذمہ داری قبول کر لی

شیڈی کو تکتی رہی اور گناہ و ثواب پر لیکچر دینے کی بجائے بڑی بہن کا پورا مقام حاصل کر لیا۔ استاد شیڈی مجبور ہو گیا تھا۔ وہ شہلا کو جواب نہیں دے سکتا تھا۔ "جیسی کرنی ویسی بھرنی"۔۔۔ یہ دنیا کا قانون ہے۔"

"لیکن باجی!" اس نے جذباتی ہو کے کہا۔ "مجھے کچھ کرنے دیں قسم مولا کی۔ اگر میں آپ کے کام بھی نہ آ سکا تو لعنت میری یاری کے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ کچھ لوگ آپ کو بھی پریشان کر رہے ہیں"

"ہاں بھئی۔" شہلا متفکر ہو کے بولی۔ "معلوم نہیں کون کون سی دشمنی ہے۔ میں تو ان کے ڈر سے باہر بھی نہیں نکل سکتی اور اپنے گھر میں بھی نہیں رہ سکتی۔"

"آپ اپنے گھر میں رہیں جی۔" وہ سینہ تان کے بولا۔ "شیڈی آپ کی حفاظت کرے گا۔ شیڈی کی لاش پر سے گزرے بغیر کون مائی کا لال ہے جو بری نیت سے اندر قدم بھی رکھے۔ جہاں آپ جی چاہے جائیں۔ شیڈی کے ساتھ آپ کو کوئی ڈر نہیں۔ باجی مجھے بتائیں کہ وہ کون لوگ ہیں۔ قسم مولا کی ایک ایک کو ٹھنڈا نہ کر دوں تو" وہ پھر بڑ مارنے پر اتر آیا تھا اور اپنی بساط سے بڑھ کر بات کر رہا تھا۔

"ابھی تک صرف ایک آدمی کا پتہ چلا ہے۔" شہلا نے صحیح کر کہا۔ "کیوں سکندر بھائی؟"

"ہاں! ہاں!" میں نے چونک کر کہا۔ کیونکہ اس نے مجھ سے اچانک سوال کر دیا تھا۔ "وہ تو ٹھیک ہے شہلا لیکن ہمارے یقین سے تو بات نہیں بنتی نا۔ عدالت تو ثبوت اور گواہ مانگتی ہے اور وہ معزز آدمی کہلاتا ہے۔ کون مانے گا کہ عدنان کے قتل میں پس پردہ یہی شخص تھا اور وہ کسی نہ کسی بہانے عدنان کو مروانا چاہتا تھا۔ استاد شیڈی کو معلوم ہے کہ عدنان پر پتے بازی کا الزام جھوٹا تھا لیکن انھوں نے بہانہ بنا لیا۔"

"آپ مجھے بتائیں جی کون ہے وہ؟" بلا ارادہ اس نے ایک غلیظ گالی دی مگر اسے احساس نہیں ہوا۔

"میرا خیال ہے بہتر ہے تم شہلا کے ساتھ جاؤ۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا جس میں دس بج گئے تھے۔ "ہم بات کر کے آتے ہیں۔ آپ لوگوں کی موجودگی میں ہم کھل کے بات نہیں کر سکتے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہ مردانہ معاملات ہیں۔" محسن نے میری تائید کی۔ رابعہ نے اشارہ سمجھ لیا تھا۔ وہ اور شہلا ہمیں جلد پہنچنے کی تاکید کر کے چلی گئیں۔ ماحول بالکل ہی بدل گیا۔

"اب بات بتائیں استاد شیڈی!" میں نے پھر دہرایا کہا۔ "ہمیں بہت اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ عدنان کو قتل کرانے کے پیچھے کس شخص نے خرچ کیا تھا۔ ہماری نظر میں اصل مجرم وہی ہے اور ہم اسے سزا دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ تم اس کام میں ہماری مدد کرو گے؟"

"مدد کی آپ نے بھی کیا بات کی۔ قسم مولا کی جان بھی مانگو تو۔"

"نہیں۔ جان کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اسے قتل کرنا ہوتا تو ہم تم سے کہہ دیتے۔"

"اور تم اپنے خنجر سے اس کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیتے۔" محسن نے اضافہ کیا۔

"لیکن ہم تو اسے زیادہ سخت سزا دینا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب دیکھو کہ عدنان تو مر کے دنیا کے جھگڑوں سے ہی نکل گیا سزا کسے ملی؟ پیچھے رہ جانے والوں کو۔ اس شخص کو مارا گیا تو سزا ملے گی بے گناہ بیوی بچوں کو۔ ہم نے جو سوچا ہے جس میں وہ خود سزا کاٹے گا اور اس کا سب کچھ چھن جائے۔ اس کی دولت، اس کا غرور، طاقت کا نشہ اور اثر و رسوخ۔ اسے بہت لمبی قید ہو اور جب وہ باہر نکلے تو دنیا میں اس کا کوئی نہ ہو۔ وہ فقیروں سے بھی بدتر ہو۔"

میری بات کا بہت آہستہ آہستہ اثر ہوا۔ شیڈی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "یہ تو آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔ سزا اسی کو ملنی چاہیے۔"

"مجھے معلوم تھا تم بات سمجھ جاؤ گے۔" میں نے کہا۔ "اب میرے چند سوالات کا جواب دو۔ مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ تم کس حد تک مددگار ثابت ہو سکتے ہو۔ یہ بتاؤ کہ تمھاری جان پہچان کتنی ہے؟"

"قسم مولا کی استاد شیڈی ان سب کو جانتا ہے جن کو آپ نہیں جانتے۔"

"تم منشیات کا دھندا کرنے والوں سے واقف ہو؟"

"ایک تو وہ ہیں جو گلی گلی چرس بھرے سگریٹ اور پاکٹ تولی۔ ہیروئن یا اسپرٹ والی خراب بیچتے ہیں۔" شیڈی نے زور دے کر کہا۔

"ہاں۔ ایسے لوگوں کے علاوہ تم خریداروں سے بھی واقف ہو گے؟"

"خریدار تو بہت۔ وہ خود ہی آدمیوں پر پہنچ جاتے ہیں کسی نہ کسی کی معرفت۔" شیڈی نے کہا۔

"ان میں پولیس کے چھوڑے ہوئے آدمی بھی ہوں گے؟" محسن نے پوچھا۔

"بالکل ہیں جی مگر وہ اپنا بھتہ وصول کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔" شیڈی نے پھر کہا۔ "مخبری وہ اس وقت کرتے ہیں جب کوئی ان کے ساتھ بدمعاشی کرے یا ان کو حصہ کم دے

www.paksociety.com

یا آخری حد ہے؟"

"مگر یا تم منشیات فروخت کرنے والوں کو بھی پہچانتے ہو، خریداروں کو بھی اور مخبروں کو بھی؟" میں نے کہا۔ "ان میں سے کتنے تمہارے دوست ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ جو کام آ سکتے ہوں۔"

"کام کیا ہے؟" ٹیڈی نے پوچھا۔ محسن کی طرح ابھی تک وہ بھی میرے سوالوں سے پریشان تھا۔

"کام میں بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی جو کچھ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں وہ بتاؤ۔ یہ بتاؤ کہ یہ نشہ آور چیزیں آتی کہاں سے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ جو لوگ یہ چرس بھرے سگریٹ، پاکٹ ہیروئن اور مینڈریکس کی گولیاں بیچتے پھرتے ہیں، یہ لوگ مال کہاں سے لیتے ہیں؟"

"اس کے دو چار ٹھکانے ہیں۔" ٹیڈی سوچ کر بولا۔ "وہ بڑے خاص لوگ ہیں، وہ خود سامنے نہیں آتے۔"

"تم ایسے کسی خاص آدمی کے ٹھکانے سے واقف ہو؟" میں نے کہا۔ "فرض کرو میں تم سے کہوں کہ مجھے وہاں لے چلو۔"

"آپ کو ....!" وہ ہنسا۔ "آپ مذاق کرتے ہیں جی! میں آپ کو کیسے لے جا سکتا ہوں؟"

"اچھا چلو، مجھے نہ لے جاؤ۔ یہ بتاؤ کہ تم خود ان خاص لوگوں تک جا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔ "کوئی سودا کرنے کے لیے۔ مثلاً دس بیس ہزار کا مال اکٹھا خریدنے کے لیے۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں جی؟" ٹیڈی نے مجھے غور سے دیکھا لیکن میں بالکل سنجیدہ تھا۔ "میرا یہ دھندا نہیں اور آپ یہ مال لے کر کیا کریں گے؟"

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرے ہر سوال کا ایک مقصد ہے۔ تم صرف جواب دو، مجھ سے سوال مت کرو۔ میں ابھی اسی وقت بیس ہزار روپے کی چرس یا چرس کے سگریٹ یا ہیروئن خریدنا چاہتا ہوں۔ تم دلوا سکتے ہو؟ ہاں یا نہیں؟"

ٹیڈی نے بہت دیر بعد کہا۔ "میں سمجھا! میں خود مال نہیں لا سکتا۔ وہ ہر ایک کو مال نہیں دیتے۔ اسی کو دیتے ہیں جن کا دھندا ہو اور جن پر اعتبار ہو۔ میرا ایک یار ہے، وہ لا سکتا ہے مگر وہ پوچھے گا۔"

"تم کہہ سکتے ہو کہ میرا بھی یہی دھندا کرنے کا ارادہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اور میرا خیال ہے وہ تمہارا یار ہے تو اس کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"اس دھندے میں ادھار یا چیک نہیں چلتا۔" ٹیڈی نے کافی دیر بعد کہا۔

"میں نقد رقم دوں گا۔" میں نے کہا۔ "تم گن بھی سکتے ہو اور اپنے اس یار کو دکھا بھی سکتے ہو کہ نوٹ پرانے ہیں، نئے نہیں ہیں اور ان پر کوئی نشان نہیں ہے۔"

"فرض کریں جی میں نے مال لا دیا۔" ٹیڈی بولا۔ "تمہارا کام جو اس کے بعد ہوگا؟"

"یہ ہوئی نا بات۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم صرف باتیں ہی کر سکتے ہو۔" میں نے اس کے جذبات کو ہوا دی۔ "اگر تم ہمیں مال لا دو۔ وقت کی کوئی بات نہیں، رات کے بارہ بجیں، صبح کے دو بج جائیں، چار بجے صبح تک بھی مل جائے تو چلے گا۔ اس مال کو ہم ایک خاص جگہ پہنچا دیں گے۔ اس شخص کے گھر میں چھپا دیں گے جس نے عدنان کو قتل کرنے کے لیے بدمعاشوں کو پیسہ دیا تھا۔ یہ ہمارا کام ہے جس کی تم کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اس گھر کے نقشے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ سارا مال اگر دو تین گتے کے ڈبوں میں ہو تو بہت ہی اچھا ہو۔ ان ڈبوں میں ہم اوپر کچھ اور چیزیں مثلاً صابن، ٹوتھ پیسٹ وغیرہ اور اس شخص کے گھر میں جگہ جگہ رکھیں گے کہ خود اسے بھی معلوم نہ ہوگا مگر پولیس جب تلاشی لے گی تو ڈبے سامنے رکھے نظر نہیں آئیں گے۔ معلوم یہی ہوگا کہ انہیں چھپا کر رکھا گیا تھا۔"

"ابھی تک آپ نے مجھے اس شخص کا نام نہیں بتایا۔" ٹیڈی نے نرم لہجے میں کہا۔

"اس کا نام ہے چراغ دین۔" میں نے کہا۔ "اب دوسرا حصہ سنو۔ منشیات کا ایک چھوٹا سا پیکٹ الگ، جس کی مالیت پانچ سو روپے کے لگ بھگ ہونی چاہیے۔ چونکہ ہمیں معلوم نہیں اس لیے ہم خود پیکٹ بنا نہیں سکتے ہیں۔ اس پیکٹ کو ہم چراغ دین کے پاس رکھیں گے۔ کل صبح تم ایک گاہک اس کے گھر بھیجو گے۔ وہ پانچ سو روپے دے کر یہ پیکٹ خریدے گا۔ سو سو کے ان پانچ نوٹوں پر [illegible] والوں کے دستخط ہوں گے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو گاہک تم بھیجو گے وہ پولیس کا مخبر ہوگا۔ چراغ دین صبح دس بجے تک گھر پر ملتا ہے۔ یہ گاہک ساڑھے نو بجے پہنچ جائے گا۔ ایک اصل گاہک بھی وہاں پہنچے گا۔ اس کے پاس اپنا [illegible] لیکن یہ ضروری ہے کہ دونوں ساتھ پہنچیں تاکہ ایک گواہ بن سکیں۔ ٹھیک وقت پر پولیس یا اینٹی کرپشن والے کسی مجسٹریٹ کے ساتھ چھاپہ ماریں گے اور دستخط شدہ نوٹ چراغ دین کی جیب میں سے نکلیں گے۔ [illegible] ہونے کا کوئی امکان نہیں، وہ پانچ نوٹ [illegible] نکلے گا۔ یہ تو جرم کا ایک سو فیصد کا ثبوت۔"

"لیکن جناب اس میں وہ گاہک بھی تو پکڑا جائے گا جس نے سودا کیا ہوگا؟" ٹیڈی بولا۔

"جبھی وہ تو سرکاری آدمی ہوگا۔ فرضی گاہک بنا کے بھیجا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اسی لائن کا آدمی ہونا چاہیے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن مخبر بھی لالچ کے بغیر کام نہیں کرتے۔" ٹیڈی بولا۔ "ان کی آمدنی کا ذریعہ بند ہو جاتا ہے اور مخبر وہ اعتبار کے قابل نہیں رہتے۔ بڑا دھندا کرنے والے بھی ان کے دشمن ہو جاتے ہیں اور خود پولیس والے بھی۔ اگر سالے مخبر ایمان داری سے کام کرنے لگیں تو سب کا دھندا ختم نہ ہو جائے؟" وہ خاموش ہو کے کچھ سوچنے لگا۔ "البتہ ایک آدمی ہے میری نظر میں۔ ظاہر میں تو میرا دوست ہے مگر دوست وہ کسی کا بھی نہیں ہے۔ ایک بار تو اس نے مجھے مروا دیا تھا۔ مجھے یہی شبہ ہے کہ وہ اپنے یار کو قتل کرنے والوں کے بارے میں جانتا ہوگا۔ وہ ان کا خرچہ تھا۔"

"پھر تو یہ کوئی مسئلہ نہیں رہا۔" میں نے کہا۔ "ایسے شخص کو تو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ بس تم اسی کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلاؤ۔ کل صبح ہم تمہیں سو سو کے پانچ نوٹ دیں گے۔ دستخط شدہ نوٹ لے کر وہ چراغ دین کے گھر پہنچا اور اسے کہا کہ یہ بتا تھکا ہے۔ یہاں مال سستا ملتا ہے اس لیے منافع ہونے کی زیادہ امید ہے۔ تم چونکہ اس دھندے میں نہیں ہو اس لیے وہ صرف گاہک کو نہیں جس نے بتایا اور پوچھے تم کیوں نہیں رہے ہو؟ تم کہنا کہ بتانے والوں نے بتا دیا ہے اور لوگ ٹوٹ پڑے ہیں۔ مال اکٹھا ہے، اپنا بھی کچھ خیال ہے جو چار پیسے کمانے کا۔ پہلے ٹھکانے کی بات ہوتی تو وہ تم سے کہتا کہ میاں مجھے بیچ میں کیوں لاتے ہو؟ جاؤ فلاں جگہ فلاں سے لو۔ لیکن وہ مخبر ہے اور نئے ٹھکانے کا مطلب ہے اس کی آمدنی کا نیا ذریعہ۔ وہ تمہارے ساتھ ضرور جائے گا۔ نوٹ اس کو آخری وقت میں پکڑانا۔ یعنی گھر کے قریب پہنچ کر یا عین دروازے پر۔ دروازے پر ایک چوکیدار ہوتا ہے اس سے صرف یہ کہنا کہ صاحب کو بتا دے۔ وہ پیکٹ لینے والا آگیا ہے۔ وہ کچھ جانے گا اور باقی جو کچھ ہوگا سب کے سامنے ہوگا۔ وہ مخبر اور دوسرا خریدار ایک دوسرے کو یقیناً پہچان لیں گے اور بعد میں یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ وہ منشیات فروش ہیں۔ ایک گواہ تم بھی بن سکتے ہو۔ پھر چراغ دین اندر اور منشیات اسمگل کرنے کے الزام میں ساری جائیداد کی ضبطی۔ یہی ہم چاہتے ہیں اور یہی اس شخص کی سزا بھی ہونی چاہیے۔"

محسن کے اختلاف کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ استاد ٹیڈی کچھ شش و پنج کا شکار تھا لیکن وہ عدنان سے یاری کے بہت بڑے دعوے کر چکا تھا اور شملہ کو زبان دے چکا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے وہ ہمارے ساتھ اس ریسٹورنٹ سے نکلا۔ ہم نے ٹیکسی والے سے یہ معاملہ طے کیا کہ رات کو ہمیں شہر میں مختلف جگہ جانا ہے۔ اسے انتظار بھی کرنا پڑے گا اس لیے وہ میٹر کی بات نہ کرے، رات بھر کی اجرت طے کر لے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ٹیکسی والے نے منہ مانگی رقم مانگی اور ہم نے دو سو روپے ایڈوانس ادا کر دیے۔ ٹیکسی پہلے ایک جنرل اسٹور کے قریب رکی۔ وہاں سے میں نے چائے کے اور دودھ کے ڈبے خریدے اور دکان والے نے مجھے یہ سامان تین گتے کے ڈبوں میں پیک کر کے دیا۔ ایک ڈبا ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوبوں کا، دوسرا صابن کا اور تیسرا جلے ہوئے زخموں پر لگانے والے مرہم کا۔ یہ زیادہ جگہ گھیرنے والا سامان تھا، چنانچہ میرے دو سو روپے بھی خرچ نہیں ہو سکے تھے۔ ایک اور دکان پر ٹیکسی رکی اور میں نے خریداری کی — بارہ ٹیوبیں خریدیں جن کا کام گتے کے ڈبے کو بھرنا تھا۔ اسی طرح وہ دو درجن صابن اور زخم پر لگانے والے مرہم کی ٹیوبیں لے آئی۔ رات گئے اس دکان پر ایسا سامان پہلے کس نے خریدا ہوگا۔ دکان دار کچھ حیران تو تھا مگر آخری وقت میں آنے والی بکری سے خوش بھی تھا۔ پہلے والے تین ڈبوں کے سامان کو ہم نے ٹیکسی میں فرش پر اس طرح خالی کیا کہ ٹیکسی ڈرائیور کو پتا بھی نہ چلا۔ وہ دو سو روپے کما کے بہت خوش تھا اور دو سو کا سامان ہم نے ڈکی میں ڈال دیا تھا۔ اس کے لیے پریشانی پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

استاد ٹیڈی ہمیں بہت سی اندھیری گلیوں میں لے گیا۔ اس کو کئی جگہ مایوس بھی لوٹنا پڑا۔ ہماری ملاقات پراسرار قسم کے لوگوں سے ہوئی اور بالآخر اس وقت جب ہم استاد ٹیڈی کی طرف سے مایوسی کا شکار ہونے لگے تھے، ہماری جدوجہد بار آور ہوئی۔ ہم ٹیکسی میں آدھے گھنٹے سے اس کی واپسی کے منتظر تھے کہ وہ اچانک بہت جوش کے عالم میں نمودار ہوا اور تینوں خالی ڈبے لے گیا جس میں ہم نے پوری رقم رکھ دی تھی۔ ہم نے ڈرائیور سے کہا کہ ابھی آدھا گھنٹہ اور انتظار کرنا پڑے گا۔ اسے ہم صورت سے شریف آدمی لگتے تھے۔ وہ گاڑی کی چابیاں لے کر ایک ریسٹورنٹ میں چائے پینے بیٹھ گیا جس کے سامنے ٹیکسی کھڑی تھی۔ ٹیڈی صرف دس منٹ بعد آگیا۔ وہ مال لے آیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کے آنے سے پہلے ہم نے گتے کے تینوں ڈبوں کے اوپر ٹوتھ پیسٹ اور صابن وغیرہ رکھ دیے۔ پانچ سو کا پیکٹ بنا بنایا مل گیا تھا جو خوردہ فروشوں کے لیے تیار رکھا جاتا تھا۔ ہم ٹیکسی لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچے اور استاد ٹیڈی سے وہیں انتظار کرنے کے لیے کہا۔ چرس اور گتے کے ڈبے بغل میں دبا کر

چراغ دین کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوگئے۔

"دروازے پر عصمت خان ہوگا۔" میں نے محسن سے کہا۔

"لیکن اس وقت سویا ہوگا۔ اندر پہنچ کے ان چیزوں کو چھپانے کا مرحلہ زیادہ سخت ہے۔ اگر سب دروازے اور کھڑکیاں بند ہوئے تو کیا ہوگا؟"

"اندر کا نقشہ مجھے معلوم ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور کھڑکی بھی کھولی جا سکتی ہے۔ شاید کوئی شیشہ ٹوٹا ہوا مل جائے۔ لیکن زیادہ الجھن کی بات یہ ہے کہ تو نے چھوٹے سیٹھ کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ چراغ دین اسے کیوں لٹکے گا اور صبح کسی پانچ سو روپلے کر اسے کیوں دے گا؟"

"اس کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے۔" محسن آہستہ سے کہا۔ "تمہارے چچا تو چراغ دین کے ساتھ کل ہی سمجھا اور تیرا سب حساب بے باق ہو جائے گا۔ پھر میں دیکھتا ہوں شیر افضل صاحب اسے بیٹی کا رشتہ کیسے دیتے ہیں۔ وہ تو پہلے بھی چونکا کر اس نے فرقان کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔ اور قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ چنانچہ وہ خود کو بالکل محفوظ سمجھ کے بڑے سکون و اطمینان سے بیٹھا ہے کہ اب تو اس فرقان کا خود رونا گا اور اقصاب ہے۔ قصاب ہم مرد رہے حرام کی کمائی کا ایک ایک پیسہ نہ اگلوالیا تو سمجھ لو ہم نہیں۔"

"بتاؤ یہ سب کچھ ہو جائے گا مگر مجھے بھی تو بتاؤ کہ ہو گا کیسے؟"

"دیکھو، ابھی تو ہم یہ مال اس کے گھر میں چھپانے جا رہے ہیں۔ اگر کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو سارا منصوبہ چوپٹ ہو جائے گا اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ ہم نے اس کے خلاف سازش کی تھی۔ میں کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ اگر عصمت خان یا چراغ دین میں سے کوئی جاگ اٹھا تو اس سے پہلے کہ وہ ہنگامہ کرے یا ہمیں پہچانے، میں اس کو ناک آؤٹ کر دوں گا۔ مال کو چھپانے کا کام تیرا۔ ان دونوں پر نظر رکھنا میرا۔ اور جانے سے پہلے مین سوئچ آف کر دیں گے۔ خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہو تو وہ لائٹ نہ جلا سکیں۔ ہم اندھیرے میں ان کو مار کے نکل جائیں گے۔ ایک آدھ گھنٹے میں ان کو ہوش آ جائے گا تو ظاہر ہے وہ پہلے گھر کا جائزہ لیں گے۔ اگر کوئی چیز غائب نہ ملی تو پولیس کو رپورٹ کرنے کا سوال ہی نہیں۔ چراغ دین اپنے چوکیدار پہ تھوڑا سا بگڑے گا اور بات ختم۔"

"لوٹوں پہ دستخط کون کرے گا؟" محسن بولا۔ "اور دستخط کروانے کون جائے گا؟"

"دستخط کون کرے گا؟ یہ تو انسداد منشیات والے جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "دستخط کے لیے مجھے جانا پڑے گا اور میں اپنا حلیہ تھوڑا سا بدل کے جاؤں گا۔ جب پورا انتظام ہو جائے گا تو میں ان کے ساتھ چراغ دین کے گھر تک جاؤں گا۔ میرے ساتھ استاد مٹیڈی ہوگا اور چھاپہ مارنے والے تھوڑے سے وقفے کے بعد آئیں گے۔ میں اور استاد مٹیڈی کوشش کر کے خود نکل جاؤں گا۔ مٹیڈی بھی خود تو ... وہ اس شریف کو تنگ کرے گا۔ جب چھاپہ مارنے والے آئیں گے تو ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ملے گا۔ چھاپہ جاری رہے گا۔ وہاں جتنے ہوں گے سب پکڑے جائیں گے اور مال ضرور برآمد ہوگا۔"

دروازے پہ کیا کے میں نے اندر جھانکا۔ عصمت خان برآمدے میں چارپائی پہ سویا پڑا تھا۔ میں اور محسن باری باری اندر داخل ہو گئے اور گاڑی کی آڑ میں سیدھے کھڑے ہو گئے۔ اندر کے سب کمرے ... تھا اور باہر بھی کوئی لائٹ نہیں جل رہی تھی لیکن سڑک سے منعکس ہو کر پہنچنے والی معمولی سی روشنی میں کوٹھی کا ہر حصہ صاف نظر آتا تھا۔ تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے مگر غور سے دیکھنے پر پچھلے حصے کی طرف ایک کھڑکی کے پٹ کا سب سے اوپر والا شیشہ غائب نظر آیا۔ محسن کے اندازے کے مطابق یہ باورچی خانے کی کھڑکی تھی۔ چنانچہ باورچی خانے کا دروازہ باہر سے بند نہ ہوا تو گھر میں داخل ہونا آسان ہو جائے گا۔ میں نے منڈیر پہ قدم جمائے اور اوپر چڑھ کے شیشے میں ہاتھ ڈالا۔ چٹخنی آسانی سے کھل گئی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ آواز کے بغیر وا ہو گئے۔ ہم دونوں باری باری اندر اتر گئے۔

"اگر ہم کوئی چیز ٹارچ لے آتے تو کام آسان ہو جاتا۔" محسن نے کہا۔

"لائٹر جلاؤ اور اپنا ہاتھ سامنے رکھو۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "روشنی کا دائرہ محدود ہو جائے گا۔"

باورچی خانے کا دروازہ باہر سے بند نہیں تھا۔ ہم ایک مختصر سے کوریڈور میں طلوع ہوئے۔ باورچی خانے کے بالکل سامنے سٹور روم تھا۔ تین تھیلے چھپانے کے لیے جگہ کی کمی نہ تھی۔ چراغ دین کو ہفتوں کیا مہینوں معلوم نہ ہوتا کہ اتنے بڑے گھر کے سازوسامان میں راتوں رات تین ڈبوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ لیکن اس مال کا ایسی جگہ سے دستیاب ہونا ضروری تھا کہ تلاش کرنے پر آسانی سے مل جائے اور پولیس یہ یقین کرنے پر مجبور ہو کہ خود چراغ دین نے مال کو

چالاکی سے چھپایا تھا۔ اسٹور روم کا دروازہ بند کر کے محسن نے لائٹر جلایا اور ہم نے سارے فالتو سامان کا جائزہ لیا جو بے مصرف ہونے کی وجہ سے یہاں ڈال دیا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کاٹھ کباڑ میں کوئی ڈبا چھپانے سے یہ خیال ظاہر ہے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہوں گے۔ پولیس والے شک میں شاید اس کو تلاش کرے گی اور چراغ دین بھی اپنے دفاع میں یہ عذر پیش کر سکتے کہ کسی نے پھنسانے کی کوشش کی ہے تو پولیس کو ایسی جگہ چھپانا ضروری تھا جہاں چراغ دین کے سوا کسی اور کی رسائی نہ ہو۔ ایسی ایک جگہ وہ بیڈ روم ہو سکتی تھی جو اب مقفل ہو چکا تھا۔ جب تک مریم زندہ تھی چراغ دین بھی اسی بیڈ روم میں سوتا تھا۔ اس کی موت کے بعد چراغ دین نے مریم کے ذاتی استعمال کی چیزیں مقفل کر دی تھیں۔ ایک ٹرنک میں ریشمی لحاف گدے اور تکیے وغیرہ تھے۔ مریم کے تمام کپڑے اور جوتے وارڈروب میں بھرے ہوئے تھے اور یہ بات مجھے پہلے سے معلوم تھی۔ اپنی کاروباری مصروفیات کے باعث چراغ دین کی زندگی اس گھر میں صرف اپنے بیڈ روم اور باتھ روم تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ صبح کا گیا شام کو لوٹتا تھا لیکن اگر آتا تھا تو صرف لنچ کے لیے۔ مریم کے بیڈ روم کو کھولنے کی نہ اسے فرصت تھی اور نہ ضرورت رہی تھی۔ آپس میں مشورہ کرنے کے بعد میں اور محسن اس نتیجے پر پہنچے کہ مریم کا بیڈ روم موزوں ترین جگہ ہو سکتی ہے لیکن اس قفل کو کھولنا آسان نہیں تھا جو دروازے میں مہینوں سے پڑا ہوا تھا۔ شاید ہماری جگہ کوئی پیشہ ور نقب زن ہوتا تو اس کے لیے بھی یہ کام مشکل ہوتا۔ اس کے بعد اندر کے ٹرنک اور وارڈروب کے تالے کھولنے کا مرحلہ تھا اور بظاہر یہ کام ناممکن نظر آتا تھا۔

"یار محسن!" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ سب چابیاں ایک ہی جگہ ہوں گی۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "سوال یہ ہے کہ کہاں؟"

"یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "ممکن ہے اس نے چابیاں کسی میز کی دراز میں ڈال دی ہوں یا کہیں لٹکا دی ہوں۔ اس وقت ہم پورے گھر میں چابیاں تو تلاش نہیں کر سکتے۔"

"مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ چراغ دین جو چابیوں کا گچھا اٹھائے پھرتا ہے اس میں دس بارہ چابیاں ہیں۔"

"اس میں دکان کی چابیاں ہوں گی اور اگر گھر کی بھی ہوں گی تو اس وقت وہ گچھا اس کے کوٹ کی جیب میں، بیڈ سائیڈ ٹیبل پر یا تکیے کے نیچے کہیں بھی ہو سکتا ہے۔"

"دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔" محسن نے کہا۔ "چراغ دین تو سویا پڑا ہے۔"

"خراٹوں کی آواز تو مجھے بھی آ رہی ہے۔" میں نے اس تجویز کے قابل عمل ہونے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ بہت خطرناک کام ہوگا اگر وہ جاگ اٹھا تو اسے اندھیرے میں ناک آؤٹ کر دینے کے سوا فرار کی کوئی صورت نہ ہوگی۔"

"اگر ہم اپنے چہرے چھپالیں تو وہ ہمیں کیسے پہچان سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "بالفرض محال وہ اٹھ جاتے تو بیشک اس کو ناک آؤٹ کے پروگرام پہ عمل کرنا اور اس کی آواز نہ نکلنے دینا۔ صبح ہوش آنے پر وہ گھر کا جب جائزہ لے گا تو مطمئن ہو جائے گا کہ چور آئے تھے لیکن کچھ لے کر نہیں جا سکے۔ مریم باجی کا کمرہ بدستور مقفل ہوگا اور چراغ دین کو ہر چیز اپنی جگہ پر ملے گی تو وہ خدا کا شکر بجا لائے گا۔ عصمت خان کو جاگتے رہنے کے احکامات پہ سختی سے عمل کرنے کی تاکید کرے گا اور بہت کیا تو کل سے بھرا ہوا ریوالور تکیے کے نیچے رکھ کر سوئے گا کہ آج تو ہوش ہی گئے تھے کل کو جان نہ چلی جائے۔"

"بشرطیکہ کل رات بھی چراغ دین کو اسی بیڈ روم میں سونا نصیب ہوا۔" میں نے کہا۔ "اور اس کا قیام [illegible] خانے میں نہ ہوا تو..."

چراغ دین کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اور محسن نے تھوڑا سا جھانک کے دیکھا۔ چراغ دین نے کروٹ لی اور اٹھ بیٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اندھیرے کے باوجود اس نے میرا سایہ دیکھ لیا ہو۔ میں اور محسن ایک ساتھ پیچھے ہٹے اور دیوار سے چپک کر کھڑے ہو گئے۔ چند سیکنڈ بعد بیڈ روم سے ملحق باتھ روم کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ چراغ دین ذیابیطس کا مریض تھا چنانچہ اس کو رات کے دوران کئی بار اٹھنا پڑتا تھا۔ بجلی کی طرح ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا اور ایک نائٹ لیمپ کی مدھم سبز روشنی تھی۔ باتھ روم سے بیڈ تک چند قدم کا فاصلہ میں نے ایک سانس میں طے کیا۔ میری نظر نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی مختلف چیزوں کو الگ الگ دیکھا۔ اس پہ صرف تین چیزیں تھیں۔ سگریٹ کا ایک پیکٹ، ایک لائٹر اور ایک گلاس کا جگ۔ میں نے فوراً تکیہ اٹھایا۔ اس کے نیچے پرس تھا اور چابیوں کا گچھا تھا۔ چراغ دین کے باتھ روم سے باہر آنے تک میں یہ گچھا مٹھی میں دبا کے پلنگ کے نیچے غائب ہو چکا تھا۔ چراغ دین نے باتھ روم سے باہر آ کے نائٹ لیمپ آف کیا اور سو گیا۔ بیڈ کے نیچے میں نے اس

کے مزاحم ہونے کی اور کچھ دیر بعد خراٹے بجنے کی آواز سنی۔ دس منٹ بعد میں رینگتا ہوا بیڈ کے نیچے سے نکلا تو دروازے تک پہنچنا میرے لیے مشکل ثابت نہ ہوا کیونکہ اب کمرے کا نقشہ مکمل طور پر میرے ذہن میں تھا۔ میرے ہاتھ میں چابیاں دیکھ کر محسن نے مجھے اس طرح تھپکی دی جیسے کوئی استاد اپنے ہونہار شاگرد کو پہلے ڈاکے میں کامیابی کے بعد دیتا ہے لیکن کامیابی کے یقین کی منزل ابھی نہیں آئی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ درجن بھر چابیوں میں سے کوئی بھی چابی اس تالے کی نہ ہو جو مریم کے بیڈ روم کے دروازے میں لگا ہوا تھا۔ میں نے ساری چابیوں کو مضبوطی سے مٹھی میں دبا کے رکھا اور اندازے سے قفل میں پہلی چابی لگائی۔ تالے کی ساخت کے مطابق آٹھ میں سے صرف تین چابیاں آزمائی جا سکتی تھیں۔ تیسری چابی فٹ بیٹھی اور میں نے مسرت سے محسن کی طرف دیکھا۔ تالے کو اوپر سے تھام کے میں نے آہستہ سے چابی گھمائی اور کھٹکے والے تالے کو آواز کیے بغیر کنڈی کے ہک سے نکال لیا۔ تقدیر کچھ یاور تھی کہ کنڈی سخت نہیں تھی ورنہ ایسے بند ہونے والی کنڈی جام ہو جاتی تو ذرا سا ہلانے پر چلانے لگتی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ بند کر لیا۔ محسن نے تینوں ڈبے فرش پر رکھے اور جیب سے لائٹر نکال کے جلایا۔ قبر کی طرح تاریک کمرے میں ایک آسیب زدہ روشنی پھیل گئی تھی۔ میں اور محسن کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ میرے سامنے یادوں کا ایک قبرستان تھا جس میں وقت کا ہر گزرا ہوا لمحہ کسی لوح مزار کی طرح اداس نظر آتا تھا۔ ایسا ہی اجالا میں نے ایک گمنام قبر کے کھنڈر میں دیکھا تھا جس کے ایک گوشے میں منشی مرحوم عرف لوبانچو کا بے جان جسم فرش خاک پر بے گور و کفن پڑا تھا اور پکارتا تھا کہ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ اور میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو۔ کج وضعداری نے مجھے قارون بنا دیا ہے اور وفاداری نے مجرم! کمرے میں اس وقت کی بازگشت تھی جب یہ گھر مریم کے دم سے آباد تھا۔ وہ مریم جو بہت جلد مری کے پہاڑوں پر مسلط سیاہ رات میں ایک قبر کے نیچے صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی اور پھر جو اجنبی نہیں تھے اس کی خلوت گاہ میں چوروں کی طرح کھڑے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ہر سمت سے مریم کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ محسن کے خیالات مجھ سے مختلف نہ تھے جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں نمی کی چمک صاف نظر آئی لیکن اس نے ضبط کر کے قطرۂ اشک کو گرنے نہ دیا۔

"ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے سکندر۔" آدھ پونا ہو میرا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ٹرنک کا قفل کھولتے ہوئے پیار بھی مجھے اور محسن کو اپنا دل پتھر کرنا پڑا۔ ٹرنک میں سے ایک خوشبو کا جھونکا آیا جو ابھی تک زندہ تھی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے سامان ہٹایا اور مریم کے ذاتی استعمال کی چیزوں میں دوا لیے ڈبے رکھ دیے کہ مریم زندہ ہوتی تو ڈسنے کے لیے رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جاتی۔ اس وقت میرے ذہن میں چراغ دین سے انتقام کی آرزو بہت زیادہ غالب تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں اس کی قبر پر پھولوں کے بجائے غلاظت بکھیرنے کا گناہ کر رہا ہوں۔ پھر میں نے خود کو یاد دلایا کہ میرا مقصد کیا ہے اور چراغ دین کون ہے۔ چراغ دین مار آستین ہے جس نے اپنے پالنے والے کو ڈسا۔ ایسا سانپ کا پھن نہ کچلا گیا تو یہ نہ جانے کس کس کو ڈس لے گا اور شاید یہ اس کے نامہ اعمال میں لکھا جانے والا ایک اور جرم ہوگا جس کی سزا سے وہ خود کو بالکل محفوظ سمجھتا ہے۔ اس خیال نے مجھے بڑی تقویت دی اور باقی کام میں نے انتہائی مہارت سے کر کے دس پندرہ منٹ میں ختم کر لیے۔ میں نے ٹرنک میں پھر تالا لگایا اور اپنے رومال سے تالے کو اچھی طرح صاف کر دیا۔ کمرے کی ہر چیز پر گرد کی تہہ تھی اور اس پر فنگر پرنٹ نمایاں ہو سکتے تھے اسے صاف کرنے کا ایک اور فائدہ بھی ہوا۔ اب معمولی سی عقل رکھنے والا کوئی پولیس افسر یہ دیکھ سکتا تھا کہ اس گرد آلود کمرے میں تالا بالکل صاف ہے اور آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتا تھا کہ تالا اکثر کھولا اور بند کیا گیا ہے چنانچہ اس پر گرد نہیں ہے۔ تیسرا ڈبا وارڈ روب میں کپڑوں کے پیچھے چھپا کر میں نے کمرے کو باہر سے تالا لگایا اور اپنے رومال سے دروازے کے ہینڈل تک کو صاف کر دیا۔ اب آخری مرحلہ چابیوں کو واپس تکیے کے نیچے رکھنے کا تھا۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ نکل جائے اور ریلوے اسٹیشن کے سامنے کھڑی ہوئی ٹیکسی پر انتظار کرے۔ استاد ٹیڈی ہماری واپسی میں تاخیر سے پریشان ہو سکتا ہے۔ مجھے امید تھی کہ چراغ دین ایک بار پھر باتھ روم جانے کے لیے ضرور اٹھے گا اور اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے چابی پھر تکیے کے نیچے رکھ آنا مشکل نہ ہوگا۔

محسن کے جانے کے بعد میں چراغ دین کے بیڈ روم کے دروازے سے لگا کھڑا رہا اور انتظار کرتا رہا۔ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ صبح ہونے تک وہ نہ اٹھا تو میں کیا کروں گا یا صبح کے قریب اٹھ کے پھر نہ سویا تو یہاں سے کیسے نکلوں گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ہر صورت میں وہ اٹھتے ہی تکیے کے نیچے چابیوں کی موجودگی کی تصدیق نہیں کرے گا بلکہ پہلے باتھ روم ہی جائے گا۔ آدھے گھنٹے بعد ایک اور گڑبڑ ہو گئی۔ دور سے اذان کی آواز آئی اور میں نے جنت خان کو کلمہ پڑھ کے اٹھتے سنا۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے وہ اندر آ رہا ہے۔ میرے لیے اب چھپنے کی ایک ہی جگہ رہ گئی تھی۔ میں چراغ دین کے بیڈ کے نیچے گھس گیا۔ نیچے سے ہی میں نے جنت خان کو اندر آ کے دروازے میں سے دیکھا۔ وہ چند سیکنڈ کھڑا رہا اور پھر سیدھا نکل گیا۔ اسی وقت چراغ دین نے جمائی لی اور اٹھ کے باتھ روم میں گیا۔ میں نے چابی تکیے کے نیچے رکھی اور اس کے بیڈ روم سے نکل آیا۔ اب میں باورچی خانے کی کھڑکی کے راستے باہر نہیں جا سکتا تھا لیکن اب دروازہ کھل گیا تھا جدھر سے جنت خان گھر میں آیا تھا۔ ایک منٹ بعد میں باہر آ چکا تھا۔ پھاٹک کے اوپر سے کود کر سڑک پر آتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میری اسکیم کا پہلا مرحلہ کامیابی سے طے ہو گیا تھا لیکن ابھی بہت سے مرحلے باقی ہیں۔۔۔ میں نے خود کو یاد دلایا اور ریلوے اسٹیشن کی طرف چلنے لگا۔ محسن اور استاد ٹیڈی بہت بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ استاد ٹیڈی ٹیکسی کے بونٹ پر بیٹھا تھا اور محسن ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی محسن پیچھے والی سیٹ پر آ گیا اور استاد ٹیڈی نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر جگہ سنبھال لی۔

"اب کدھر جانا ہے بادشاہو؟" ٹیکسی ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔

"کیوں استاد؟" میں نے ٹیڈی سے مخاطب ہو کے کہا "وہ چراغ دین کے مدفون جنونی کہاں ملیں گے؟ جو نے کہا تھا کہ صبح ان کو پہنچا ہے۔" میں نے اس کو پلٹ کر دیکھا اور آنکھ ماری۔

"ایک تو داتا دربار کے پیچھے موہنی روڈ کی گلی میں ملے گا۔" ٹیڈی نے بات سمجھنے کے بعد سوچ کر کہا۔ "دوسرے کا پتہ کرنا پڑے گا۔"

"اچھا تو پہلے موہنی روڈ کی طرف چلو۔" میں نے کہا "ایک سے تو بات ہو جائے۔"

"یار سکندر اعظم!" محسن نے مجھ سے انگریزی میں کہا۔ "دستخطوں کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ میرا مطلب ہے ان پانچ کاغذات پر کس کے دستخط ہوں گے؟"

"یہ معاملہ ایسا ہے برادر عزیز!" میں نے انگریزی کے بجائے ٹوٹی پھوٹی فرنچ میں کہا۔ "کہ ہمیں اس موضوع پر بات نہیں کرنی چاہیے۔ وطن عزیز میں تعلیم کی صورت حال ایسی ہے کہ ان پڑھ نظر آنے والے گریجویٹ ثابت ہوتے ہیں۔"

"میری فرنچ میں اتنی ہی فصاحت و بلاغت ہے جتنی گوروں کی اردو میں تھی۔" محسن نے بھی فرنچ میں کہا۔

"دیکھیے نا! ہم دونوں کی زبان دانی میں انیس بیس کا فرق بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم ایک دوسرے کی گرامر اور تلفظ کی غلطیاں معاف کر سکتے ہیں کیونکہ مشکل وقت میں راز کی بات کہنے کے لیے آدھی ادھوری فرنچ سے بہتر کوئی زبان نہیں۔"

اپنے لندن کے چار سال کے قیام کی مدت میں ہم دونوں نے ایک ساتھ فرنچ پڑھی تھی۔ کچھ خود، کچھ بے قاعدہ کورس کر کے لیکن اس زبان میں گفتگو کرنے کی صلاحیت ہم نے اپنے ہم مکتب ساتھیوں اور دوست احباب کی مدد سے حاصل کی تھی۔ انگریزی کے لیے لاطینی اتنی اہم تھی جتنی پہلے اردو پر عبور حاصل کرنے والوں کے لیے عربی تھی لیکن وہ دور گزر چکے تھے۔ اب انگریز کوئی دوسری زبان جانتے تھے تو فرنچ۔ بالکل اسی طرح جیسے اپنے ملک میں فارسی کی آج بھی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

"دس سو کے پانچ نوٹوں پر کسی مجسٹریٹ کے دستخط حاصل کرنا آسان نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "انٹی کرپشن والوں کے پاس بھی جب تک باقاعدہ رپورٹ درج نہ کرائی جائے وہ چھاپہ نہیں مارتے اور یہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے والا کیس ہے۔ رپورٹ نہ میں لکھا سکتا ہوں نہ تو یہ کام کر سکتا ہے۔"

"تو پھر استاد، میری سمجھ میں ایک ہی صورت آتی ہے کہ ہم کسی پولیس انسپکٹر سے رابطہ قائم کریں اور اپنا زور بیان صرف کر کے یقین دلائیں کہ سیٹھ چراغ دین کوئی شریف آدمی نہیں ہے اور اس کے گھر میں واقعی خاصی مقدار میں منشیات کا ذخیرہ ہے۔"

"تمہارے زور بیان سے قائل ہو کے کون مشکل میں پڑنا پسند کرے گا؟" محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "پولیس بہت شریف آدمی کے گھر پر ایسے چھاپہ مارتے ڈرتی ہے کہ کوئی گھر محفوظ نہیں ہے۔ ان کو ڈر ہوتا ہے کہ کوٹھی والا ان پر بعد میں ہتک عزت اور ہراساں کرنے کے مقدمات دائر کر دے گا تو ان کی نوکری بھی جائے گی۔"

مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس نمبر ... کراچی

www.paksociety.com

"یہ کام مشکل ضرور ہے محسن، لیکن ناممکن نہیں ہے۔" میں نے
کہا۔ "نعیم بیان دہلا تو زیرِ نقشہ چلے گا۔ ہم کسی پولیس انسپکٹر کی
ذہانت پر بھی بھروسہ کر سکتے ہیں۔ وہ مجرموں کو پکڑنے کے
معاملے میں جتنے کند ذہن نظر آتے ہیں، کسی کو مجرم بنانے میں
اپنی ذہانت سے اتنا ہی کمال دکھاتے ہیں۔ آدمی کو پھانسنے
کے طریقے وہ خود ایجاد کر لیتے ہیں۔"
"ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔" محسن نے کہا۔
"چھاپہ مارنا تو قانونی مسئلہ ہے اور اس کے لیے جو طریقہ کار
ہے اس میں ہم مداخلت نہیں کر سکتے لیکن پولیس کسی کو سرِ راہ
منشیات فروخت کرتے پکڑ لے تو یہ ان کے دائرہ اختیار میں
ہے اور اس کے بعد خانہ تلاشی کے انتظامات وہ خود کر سکتے
ہیں۔ سرِ راہ کا مطلب ہے گھر سے باہر اور باہر کا مطلب
یہ نہیں کہ سڑک پر یا بازار میں۔ گھر کی حدود سے نکلنے کے
بعد کوئی واقعہ دروازے سے ایک فٹ دور بھی پیش آئے تو
یہ گھر سے باہر کی بات ہے۔"
"چشمِ بد دور!" میں نے محسن کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ "تم
نے ہمیشہ کی طرح ذہانت کا بے مثل مظاہرہ کیا ہے۔ خریدار اگر چراغ دین
کے گھر میں داخل نہ ہوا اور گیٹ سے باہر ہی کھڑا رہے
تو چراغ دین اسے وہ پیکٹ باہر آ کر دینے پر مجبور ہوگا۔ جیسے
ہی خریدار تم آ کر لے، انسپکٹر اسے گرفتار کر لے۔ اب سوال یہ
ہے کہ اس مقصد کے لیے کسی انسپکٹر کی خدمات حاصل کی جائیں۔
ہمارا تو کوئی دوست بھی نہیں۔"
"یہ کام تو متعلقہ تھانے کا کوئی انسپکٹر ہی کر سکتا ہے۔"
محسن نے کہا۔
میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو واپس ہونے کے لیے کہا۔ وہ
تھوڑا سا حیران ضرور ہوا لیکن پریشان نہیں ہوا۔ اسے رات
بھر کا معاوضہ توقع سے زیادہ مل گیا تھا اور ہماری فراخدلی نے
اس کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ہم غیر ملکی ہیں۔ میری ہدایات
کے مطابق گاڑی تھانے کی حدود سے کچھ فاصلے پر ٹھہری تھی۔
میں نے محسن کے بجائے یہ کام خود کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اتر کے
واپس گیا اور پچاس قدم چل کے موڑ کاٹتے ہی تھانے میں
داخل ہو گیا۔ تھانے کا سارا عملہ اب "تفتیش" میں مصروف
ہونے کے بعد اب آرام میں مصروف تھا۔ حوالات کی آہنی
سلاخوں کے پیچھے شب گزیدہ ملزمان ایک ہی جیسی حالت
میں پڑے تھے۔ ایس ایچ او کا کمرہ خالی تھا۔ دوسرے کمرے
میں دو افراد چارپائیوں پر سوئے پڑے تھے جو یقیناً عملے میں
شامل تھے مگر نیند میں اور معصوم یا ایک جیسی مونچھوں سے
ان کے عہدے کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ محرر کو میں نے اس کی
پہچان کے مطابق مرے لیٹے کی حالت میں تھا۔ میں نے کندھے سے ہلا کر
ہوشیار کیا اور پوچھا۔ "تھانے میں کوئی انسپکٹر کیوں نہیں ہے
اور ہے تو نظر کیوں نہیں آتا؟"
"کہاں ہے بھئی؟" محرر نے خلل در معقولات کے بعد
میرے سوال کو گستاخی سمجھتے ہوئے کہا۔ "میں کیا بتاؤں کہ کیوں
نہیں ہے۔ افسر لوگ ہیں، کسی کے باپ کے نوکر نہیں کہ اپنی
مرضی سے آتے جاتے ہیں۔"
"مرضی کے بچے!" میں نے محرر کو کرسی پر سے اٹھا کے
زمین پر کھڑا کر دیا۔ "معلوم ہے میں کون ہوں؟"
محرر اس سلوک کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ بوکھلا کر
رہ گیا اور فوراً سنبھل گیا۔ اس نے یہ بات تسلیم کر لی کہ تھانے
میں ایسی جرأت کا مظاہرہ کرنے والا اور اس لہجے میں گفتگو کرنے
والا یا تو کوئی مجسٹریٹ ہو سکتا ہے یا کوئی نیا پولیس افسر۔
"ایس آئی شیخ۔۔۔ سید الاسلام شیخ ڈیوٹی پر ہیں جناب
عالی!" محرر نے اٹینشن ہو کے کہا۔ "ابھی سرگشت لینے گئے ہیں۔"
"ایس آئی۔۔۔ ایس آئی شیخ!" میں نے تلخی سے زیرِ لب
مسکرا کے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ سگریٹ خریدنے گئے ہیں۔"
محرر کا رنگ اڑ گیا۔ "ہم تو ماتحت ہیں سر۔ افسر
کیا پولیس کہ حرام ہے۔ وہ خود بھی کسی سے لے کر پیتے ہیں یا
ہو تو آپ معلوم کر لیں۔"
جو بات مجھے معلوم کرنی تھی معلوم ہو گئی تھی۔ میں نے ہاتھ
اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ "میں ابھی کچھ دیر میں پھر آؤں
گا۔" میں نے محرر کو دیکھ کر کہا اور تھانے کی حدود سے باہر
آ گیا۔ محرر میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ مجھ سے میرے
بارے میں کوئی سوال کرتا۔ میں گیٹ سے کچھ فاصلے پر رک
کر انتظار کرنے لگا۔ اگر شیخ صاحب سے باہر ہی ملاقات
ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے، میں نے سوچا۔
ڈبل ایس آئی شیخ صاحب پندرہ منٹ بعد نمودار
ہوئے۔ وہ میرے سامنے سگریٹ کے تھانے میں داخل ہونے
کی نیت سے بڑھا ہی تھا کہ میں نے اسے نام سے پکارا۔ وہ
چونک کر رکا اور آہستہ آہستہ میری طرف آیا۔
"کون ہو تم؟" وہ اپنی بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔
"تم نے مجھے پہلے کہیں نہیں دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔
"نہ تھانے میں نہ عدالت میں نہ جیل میں۔ میں تمہارے پاس
ایک کام سے آیا ہوں لیکن اس میں میرا کوئی فائدہ نہیں۔
تمہیں کس حد تک فائدہ ہو سکتا ہے، اس کا انحصار تمہاری

ہمت اور صلاحیت پر ہے۔"
"میں نظامی مقتل کا آدمی ہوں۔" وہ بولا۔ "ایسے گھما
پھرا کر بات مت کرو۔"
"تمہارے علاقے میں ایک شخص منشیات کا کاروبار
کرتا ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "ابھی تک اس
کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔ میں اس شخص کو
پکڑوانے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ اگر تم اسے گرفتار کر کے
مال برآمد کرنے میں کامیاب رہے تو فائدہ تمہیں ضرور ہوگا۔
یہ کارنامہ تمہارے ریکارڈ پر آ جائے گا۔"
"ہاں۔" سب انسپکٹر نے کہا۔ "لیکن تم میرا فائدہ
کیوں چاہتے ہو؟ تمہاری کوئی دشمنی ہے اس شخص سے؟"
"ہاں۔ وہ ایک بار میری بیوی کو ورغلا کے لے گیا تھا
اور اس نے دوسری شادی کر لی۔ اب وہ دوسری کو بھی لے جانا
چاہتا ہے۔"
"تو یہ بات ہے۔" تھانیدار نے یوں سر ہلایا جیسے
پورا مسئلہ سمجھ لیا ہو۔ "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟"
"اگر تم اس کو گرفتار کرنا چاہو تو میں ہر ثبوت ایک
شرط پر فراہم کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں بالکل سامنے
نہیں آؤں گا۔ میں دو افراد کو اس کے پاس بھیجوں گا جو اس
سے مال خریدتے ہیں۔ تم اسے عین وقت پر پکڑ سکتے ہو۔"
"لیکن اس قسم کا چھاپہ مارنے کے لیے مجسٹریٹ کا
ساتھ ہونا ضروری ہے۔" سب انسپکٹر بولا۔
"تمہیں اس کے گھر پر چھاپہ نہیں مارنا ہے۔" میں نے
کہا۔ "اسے سڑک پر سے گرفتار کرنا ہے۔ ٹھیک نو بجے میں
ایک گاہک کو اس کے پاس بھیج سکتا ہوں جو پولیس کے لیے
مخبری بھی کرتا ہے۔ اسی وقت دوسرا گاہک بھی پہنچے گا جو
اکثر اس سے مال لیتا رہتا ہے۔ اگر تم مجھے سو کے پانچ
نوٹوں پر دستخط کر کے دے دو اور نو بجے سے پہلے اپنے آدمی
سادہ کپڑوں میں دروازے کے پاس کھڑے کر دو تو تم ان
تینوں کو پکڑ سکتے ہو۔ وہ شخص مال دینے کے لیے باہر نکلے گا۔
جیسے ہی وہ مال دے کر نوٹ جیب میں ڈالے تم اسے گھیر لو
اور اندر مت جانے دو۔ تم نے ایک مجرم کو علی الاعلان منشیات
فروخت کرتے دیکھا۔ اس کی اطلاع تمہیں کسی نے ٹیلیفون
پر دی تھی۔ دونوں خریدار تمہارے گواہ ہوں گے اور آسانی
سے اقبالِ جرم کر لیں گے۔ منشیات فروخت کرنے والوں
کے حلقے میں وہ دونوں مشہور ہیں۔ اس کے بعد تم گھر پر چھاپہ
مارنے اور خانہ تلاشی کے وارنٹ لینے کا انتظام خود کر
سکتے ہو۔ مجھے تو اس سے ایک بدلہ لینا ہے۔ تم سوچ لو کہ
بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔"
"نوٹ نکالو۔" سب انسپکٹر نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ
یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔
میں نے اس کو پانچ نوٹ پیش کیے۔ ایک لیمپ
پوسٹ کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے میری پاکٹ ڈائری
پر رکھے۔ اس نے اپنے قلم سے ہر نوٹ پر دستخط کیے اور
تاریخ ڈال کر میرے حوالے کر دیے۔ میں نے نوٹوں کو واپس
جیب میں رکھا۔ اس سے ہاتھ ملا کر تاکید کی کہ وہ نو بجے
چپ چاپ اپنی نفری کے ساتھ پہنچ جائے اور پوری طرح
چوکس رہے اور آخر میں اسے چراغ دین کا پتہ بتا کے رخصت
ہو گیا۔ پچیس منٹ بعد میں واپس پہنچا تو صبح کا اجالا پھیلنے
لگا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے محسن کو یہ خوشخبری سنائی کہ
دوسرا مرحلہ بھی سر ہو گیا۔ اگر استاد پیڈی کسی طرح دو آدمی
ٹھیک نو بجے چراغ دین کے دروازے پر پہنچا دے تو سمجھو
کھیل ختم۔ آج کے دن کا سورج چراغ دین کے لیے اس دنیا میں
یومِ حساب بن کر طلوع ہوگا۔ برسوں پہلے اس نمک حرام
نے جس تھالی میں کھایا تھا اسی میں چھید کیا تھا۔ وہ بہت
مطمئن تھا کہ اس نے بڑی صفائی سے ایک شخص کے اعتماد کو
دھوکا دیا۔ بڑی ذہانت سے قتل کیا اور بچ نکلا۔ اس نظامِ
انصاف میں اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوا اور اب
برسوں بعد اسے یہ بات یاد بھی نہ آتی ہوگی کہ دنیا میں اس نے
جتنی عزت اور دولت کمائی، اس کا جائز حق نہیں تھی اور
انتقامِ مظلوم کی دوسری نسل کو لینا تھا اگر پیر دو تو اندیشہ
تمام شد۔ ہماری سے اس نے جو کام لیا تھا اور بھی بچپا ہیں
نے بھی آنا چاہیے۔ مگر وہ بھی نہیں گیا تھا اور میرے پکڑے
جانے کا بھی کوئی امکان نہیں۔ اور جس طرح میں جانتا تھا کہ
چراغ دین مجرم ہے اسی طرح ایک دن وہ بھی جان لے گا
کہ باپ کا انتقام لینے والا صفدر خان کا بیٹا سکندر بخت ہی
تھا۔ اس خیال سے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے قرض کا
بار بہت ہلکا ہو گیا ہے۔ سوچا شاید میرے والد کے ذہن میں بھی
یہ تھا کہ اس نمک حرام کو ایسی سزا دی جائے جو اس کو قانون
نہ دے سکا۔ لیکن ان کو اتنی مہلت ہی نہ ملی۔
"سکندر بخت صاحب!" محسن نے کہا۔ "میں نے
آپ سے ایک سوال کیا تھا۔"
"کیا؟" میں نے چونک کر کہا۔ "معاف کیجیے گا میں کہیں
اور تھا۔"

"خریدار سے تو بات ابھی ہو جائے گی۔" محسن نے کہا۔ "ہم اب بھی اپنی لنگڑی لولی ترکیب چلا رہے تھے۔" ابھی تک وہ مال چراغ دین کو نہیں ملا ہے جو خریدار لیتے جاتے گا۔ میری مراد اس پانچ سو کے مال والے پیکٹ سے ہے۔"

میرے جواب دینے سے پہلے ٹیکسی موہنی روڈ پر رک گئی تھی۔ تنگ سی سڑک پر دونوں طرف دکانیں کھلنے لگی تھیں۔ خصوصاً دودھ دہی کی دکانوں پر بچے جمع تھے جو ہاتھوں میں ڈول، چھوٹی چھوٹی بالٹیاں، چینی کے پیالے اور مرتبے کے برتن لیے آخری کونڈا ختم ہونے سے پہلے دہی حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ان کے علاوہ صبح دم لسی پینے والے تھے جو الگ آوازیں لگا رہے تھے۔

"پہلوان جی، ذرا جلدی کرنا۔" مگر پہلوان جی جلسے شور و غل سے بے نیاز اطمینان سے کام کر رہے تھے۔ بعض جگہ کیبن کے شیشوں پر یہ جملہ لکھا تھا "یہاں نہانا سخت منع ہے" وہ دو تین افراد بڑی فراغت سے دہی مل مل کے غسل کرنے میں مصروف تھے۔ سڑک پر سے تانگے اور رکشے والے مسلسل آوازیں لگاتے ان لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے جن کو نہ آوازوں کی پروا تھی اور نہ بظاہر اپنی جان کی۔ مجھے یہ دیکھ کر ہمیشہ حیرانی ہوتی تھی کہ ایک بار بھی یا دسکی گاڑی چلانے والے یہ کوچوان کتنے ماہر ہیں کہ اسٹیئرنگ اور بریک نہ ہونے کے باوجود ہجوم میں سے راستہ نکال لیتے ہیں اور کوئی حادثہ نہیں ہوتا۔ پیرس کے ٹیکسی ڈرائیوروں کے بعد صرف یہی جان ہتھیلی پر رکھ کر گاڑی چلانے کا فن اگر جانتے تھے تو لاہور کے کوچوان۔ یہ اس شہر کا مزاج تھا جو دنیا کے ہر بڑے شہر کی طرح سب سے جدا تھا۔

استاد بیڈی ہمیں چھوڑ کر ایک گلی میں چلا گیا تھا اور ہم بڑے سسپنس میں مبتلا تھے۔ ہماری ساری اسکیم کا دارومدار بیڈی کے کامیاب لوٹنے پر تھا۔ خوش نصیب لگا کہ پولیس بھی بھیج دیتی ہے مگر میں چاہتا تھا کہ کام اچھی طرح ہو تاکہ بعد میں شک شبہے کی گنجائش ہی نہ رہے اور چراغ دین یہ نہ سمجھے کہ اس کے خلاف سازش کا جال پھیلایا گیا ہے۔ وہ مال دیکھ رہے اور قیمت وصول کرتے ہی پکڑا جائے گا۔ یہ ثابت ہو جائے گا کہ دونوں گاہک اس چکر میں پڑے ہیں اور بعض مال چراغ دین کے گھر سے برآمد ہو گا۔ ایک ایسی جگہ سے جس کا خود چراغ دین بھی تصور نہیں کر سکتا۔ وہ بڑے اطمینان سے خانہ تلاشی کے لیے تیار ہو جائے گا اور پولیس کو چابیاں بھی دے دے گا۔

"میرا پروگرام بالکل سیدھا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر یہاں سے دو گاہکوں کا بندوبست ہو گیا تو میں ساڑھے سات بجے چراغ دین کے پاس جاؤں گا اور پیکٹ اس کے حوالے کر دوں گا۔ محبت خان کی عدم موجودگی میں، میں اسے بتا دوں گا کہ شیروانی صاحب نے بھجوایا ہے۔ اس میں کچھ پتا نا در ہے جس کے بدلے ایک سنار نے زیور کے مطابق کچھ بنا کر دے گا۔ کیا بنا کر دے گا، یہ مجھے نہیں معلوم لیکن جو شخص آئے گا وہ اپنا نام بتائے گا اور ایک پرچی سونے کی بھی دے گا۔ یہ شیروانی صاحب کا کوئی حساب کتاب ہو گا جو وہ خود ہی جانتے ہیں..."

"اور اگر اس نے پوچھا کہ یہ پیکٹ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟" محسن نے میری بات کاٹ دی۔ "شیروانی صاحب نے محسن کو کیوں نہیں بھیجا؟"

"اس کا جواب بھی سیدھا سادا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں کہوں گا کہ یہ سب باتیں آپ شیروانی صاحب سے پوچھیے گا۔ محسن سے تو آج کل وہ ناراض ہیں اور شاید اسی لیے انہوں نے یہ کام محسن کو نہیں سونپا۔ صبح میرے پاس ایک شخص آیا تھا اور جو کچھ اس نے پیکٹ دینے کے بعد کہا وہ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ آپ باقی باتیں شیروانی صاحب سے ٹیلیفون پر پوچھ لیجیے گا۔ مجھے تو ایک مقدمے کے سلسلے میں آٹھ بجے سٹی کورٹ پہنچنا ہے۔ اب آپ غور فرمائیے محسن میاں کہ بعد میں کیا ہو گا۔ مسٹر چراغ الدین کا ذہن فوراً شادی کے انتظامات کی طرف جائے گا۔ وہ سمجھے گا کہ شیروانی صاحب زیور کے لیے کچھ جواہرات ہوں گے اور یہاں ان کا کوئی جاننے والا ہو گا۔ ورنہ جیولرز تو پنڈی میں بھی کم نہیں ہیں۔ وہ خوشی خوشی ڈبا رکھ لے گا۔ ہم ٹیکسی والے کی چھٹی کر لیں گے اور آٹھ بجے تک گویا ہم رات بھر سو کے اٹھے ہیں اور ہوٹل کے گواہ ہوں گے ہمارے پڑوس میں رہنے والے کانسٹیبل صاحب جن کو ہماری سفارش سے تھانیدار بننا ہے۔"

"اس کا تو باپ بھی کہے گا کہ ہم رات کو اپنے کمرے میں سوتے رہے ہیں۔" محسن نے آنکھ مار کے کہا۔

"اب آگے سنو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اگر ڈی ایس آئی شیخ نے چراغ دین کو پکڑ لیا تو جیسا کہ مارو روشن خیال استاد۔ میں اس بدمعاش سے اس وقت ملاقات کروں گا جب وہ جیل پہنچ جائے گا۔ اس سے پہلے نہیں۔ اس کا ثبوت یوں بھی ثابت ہو جائے گا کہ آج مجھے کسی مقدمے میں یہاں نہیں حاضر ہونا۔ وہ اپنے بیان میں کہے گا کہ سکندر نے یہ کہا تھا اور وہ کہا تھا۔ شیروانی صاحب تصدیق کر دیں گے اور نہ پولیس ملے گی۔ ہم آٹھ بجے اطمینان سے رضوی صاحب کے گھر میں ان کی فیملی کے ساتھ ناشتہ کریں گے۔ نو بجے تک گپ شپ لگائیں گے اور تھانے سے آنے والے کسی ٹیلیفون کا انتظار کریں گے۔ رضوی صاحب کی بیگم کو کوئی خواب سنائیں گے جو ہم نے گزشتہ رات دیکھا ہو اور اس عرصے میں ٹیلیفون آ گیا تو خود بات بھی کر لیں گے۔"

"لیکن فرض کرو وہ ڈی ایس پی اپنے وعدے پر قائم نہ رہا؟" محسن بولا۔ "اگر اس نے کہہ دیا کہ اطلاع دینے والا ایسی شخص تھا؟"

"وہ کہہ سکتا تھا لیکن جب اسے معلوم ہو گا کہ سکندر بخت تو ایس پی خان رضوی کے گھر کا کوئی فرد ہے تو وہ بہتر یہی سمجھے گا کہ مجھے نہ پہچانے اور کہہ دے کہ اطلاع دینے والا کوئی اور شخص تھا۔ ویسے اس کے وعدہ خلافی کرنے سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ ڈی ایس پی صاحب! نشہ آپ کی آنکھوں میں ہے یا آپ کے دماغ میں۔ اس کا علاج فرمائیے۔ اور اگر یہ بھی ناکام رہا جس کا امکان بہت کم ہے تو پھر کچھ اور سوچیں گے کیونکہ مال تو چراغ دین کے گھر میں ایسی جگہ رکھا ہے کہ خود اس کو بھی نظر نہیں آ سکتا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ چراغ دین کی گرفتاری کا منظر اپنی آنکھ سے دیکھتا لیکن مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم دور رہیں۔ کل تک اس کی رسوائی کی ساری داستان اخبار میں ہو گی۔"

استاد بیڈی اچانک گلی میں سے نمودار ہوا۔ اس کا دمکتا مسکراتا چہرہ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ اسے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی۔ یقین ممکن تھا کہ شدت جذبات میں وہ کوئی غلط بات کر دیتا جس سے ٹیکسی ڈرائیور کو شک ہو جاتا لیکن میں نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔ بیڈی خاموشی سے اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ہم نے فیصلہ کیا کہ اب ہمارا کام ختم ہو چکا ہے چنانچہ ہمیں ٹیکسی کو چھوڑ دینا چاہیے اور اپنا اپنا راستہ لینا چاہیے۔ ٹیکسی والا خود بھی یہ سمجھنے لگا تھا کہ بات پھر کا معاہدہ ختم ہو چکا ہے۔ ہم نے اسے لوہاری والے چوک پر رخصت کیا اور وہ واپس اُدھر گھوم کر ریلوے اسٹیشن جا پہنچا۔ صابن اور ٹوتھ پیسٹ وغیرہ ٹیکسی میں ہی رہ گئے تھے اس لیے یہ ہو سکتا ہے ... سے کوئی سواری راستے ہی میں مل جائے اور وہ اپنی ایمانداری ثابت کرنے کے لیے ہمارے پیچھے آتے لیکن جس راستے پر وہ گیا تھا یکطرفہ تھا اور اب وہ اگلے چوک سے گھوم کر جی ٹی ایس کے اڈے کے سامنے والی سڑک پر سے گزر کر اور ریلوے اسٹیشن کے پورے راؤنڈ اباؤٹ کا چکر لگائے بغیر واپس نہیں آ سکتا تھا۔ ہم اس سامان کو لے کر کیا کرتے اور کہاں لے جاتے؟ میں نے بیڈی سے کہا کہ وہ شام کو مجھے رابعہ کے آفس میں ملے اور ابھی خود بھی روپوش رہے کیونکہ دونوں خریدار جو چراغ دین کے پاس جائیں گے پولیس کے سامنے بیان میں یہ ضرور کہیں گے کہ ان کو بھیجنے والا استاد بیڈی نام کا شخص تھا۔ بیڈی نے سڑک پار کی اور ایک ویگن میں بیٹھ گیا۔ محسن مخالف سمت میں گڑھی شاہو کی طرف جانے والی بس پر سوار ہو گیا اور میں نے واپسی اختیار کی۔ چند قدم چلنے کے بعد میں جی ٹی ایس کے اڈے کے ایک دروازے سے داخل ہوا اور مختلف شہروں کو جانے والی بسوں اور مسافروں کے ہجوم میں سے گزرتا ہوا دوسرے دروازے سے نکل گیا۔ جہاں سے چراغ دین کی کوٹھی کا فاصلہ ایک فرلانگ بھی نہیں تھا۔ جو پیکٹ میرے پاس تھا وہ عام سائز کے بیس سگریٹوں کے پیکٹ سے کچھ بڑا تھا۔ گتے کے اس پیکٹ پر چاروں طرف سفید کاغذ اس طرح چپکایا گیا تھا کہ پیکٹ ہر طرف سے بند نظر آتا تھا۔ میں نے پیکٹ کو قمیص اور شلوار کے اندر ڈال کر شلوار کی بیلٹ سے دبا رکھا تھا۔ میں محبت خان سے ملاقات کی صورت میں بالکل خالی ہاتھ اندر جانا چاہتا تھا۔

محبت خان گیٹ پر یا گیٹ کے اندر موجود نہیں تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت وہ باورچی خانے میں خانساماں کے فرائض انجام دے رہا ہو گا اور ناشتہ بنا رہا ہو گا۔ گھنٹی بجانے کے بجائے میں سیدھا اندر چلا گیا اور دروازے پر دستک دی۔ چراغ دین نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور مجھے دیکھ کر حیران ہوا۔

"سکندر... تم؟" اس نے کسی قسم کی گرمجوشی کا مظاہرہ کیے بغیر کہا۔ "تم اس وقت یہاں کیسے؟"

"میں ایک ضروری کام سے آیا تھا۔" میں نے پیکٹ برآمد کرتے ہوئے کہا۔ "شیروانی صاحب نے اسلام آباد سے یہ سامان بھجوایا تھا آپ کے لیے۔"

"کیا ہے اس میں؟" اس نے کسی شک کے بغیر پیکٹ لے لیا۔ "کون لے کر آیا تھا؟"

"لے کر تو خود محسن آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور شیروانی

www.paksociety.com

صاحب نے اسے تاکید کی تھی کہ آپ کو پہنچا دے لیکن معلوم نہیں کیوں یہ کام اس نے میرے سپرد کر دیا حالانکہ میرے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔ مجھے ساڑھے آٹھ بجے ایک مقدمے کے سلسلے میں ڈسٹرکٹ کورٹ پہنچنا تھا۔" میں نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے عجلت ظاہر کی۔

چراغ دین معنی خیز طریقے سے مسکرایا۔ اس مسکراہٹ کے دو مطلب نکالے جا سکتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ محسن کے نہ آنے کی وجہ سمجھتا ہے اور دوسرا یہ کہ میرے مقدمات کے پس منظر سے واقف ہے۔

"اس میں کچھ پرانے زیورات ہیں۔" میں نے انجان بن کے کہا۔ "شیرازی صاحب ان سے نئے ڈیزائن کا کچھ زیور بنوانا چاہتے ہیں۔"

"کمال ہے۔ اس کے لیے انھیں راولپنڈی کا کوئی جوہری پسند نہیں آیا۔" چراغ دین ڈبے کو الٹ پلٹ کر بولا۔

"یہاں ان کا کوئی جاننے والا ہے۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "وہ آج ہی یہ پیکٹ آپ سے لے جائے گا۔"

"مگر میں اسے کس طرح پہچانوں گا؟ نام کیا ہے اس کا؟" چراغ دین نے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ شکوک کے بجائے اس پر خوش آئند تصورات کا غلبہ ہے۔ حسب توقع چراغ دین — سمجھ رہا تھا کہ شیرازی صاحب شادی کے لیے زیور خرید رہے ہیں۔

"اس کا نام محمود ہے اور اس نام کی وجہ تسمیہ بھی پانچ آنکھیں ہیں۔" میں نے ٹیڈی کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر کہا۔ "لیکن اصل بات یہ ہے کہ پہلے آپ کو اس سے پانچ سو لینے ہیں۔ اس کے بغیر یہ پیکٹ نہیں دینا ہے۔ یہ شیرازی صاحب کا کوئی پرانا حساب کتاب ہے جس کی رو سے اس شخص کے ذمے پانچ سو روپے نکلتے ہیں۔"

"میں وصول کر لوں گا۔" چراغ دین نے کہا۔ وہ ابھی تک مجھ سے دروازے ہی میں کھڑا بات کر رہا تھا۔ عمداً اس نے مجھ سے اندر بیٹھنے کے لیے کہا تھا اور نہ اخلاقاً ایک کپ چائے کے لیے پوچھا تھا۔ اپنی دانست میں وہ مجھے بے عزت کر رہا تھا لیکن اس بدبخت کو معلوم نہیں تھا کہ اس طرح وہ میری کتنی مدد کر رہا ہے اور خود اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہے۔ اگر وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھاتا اور میری خاطر تواضع کرتا تو اپنے حق میں اچھا کرتا۔ ثبوت خلاف ملتے کیونکہ بعد میں یہ گواہی دیتا کہ سکندر صاحب بنفس نفیس آ گئے تھے۔ اب اس بات کا کوئی گواہ نہیں ملا تو میں نے ایک بار پھر عدالت میں حاضری کا ذکر کیا اور معذرت چاہی کہ میں بیٹھ نہیں سکتا اور ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

پندرہ منٹ بعد ایک رکشا نے مجھے رضوی صاحب کی کوٹھی کے دروازے پر اتار دیا۔ میں تیر کی طرح سیدھا کوارٹر کے اس کمرے میں گیا جہاں محسن بستر پر بیٹھا تھا۔ ساتھ کے کمرے میں رہنے والا کانسٹیبل بھی وہیں موجود تھا۔

"آپ بھی آ گئے جناب عالی!" وہ مجھے دیکھ کر بولا۔

"آ گئے کا کیا مطلب ہے؟" محسن نے اسے ڈانٹا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم تھانیدار نہیں بننا چاہتے۔ کہا تھا تمہیں ابھی کہ ہم دونوں کل رات کو دس بجے سو گئے تھے۔ رات کو تم دو مرتبہ اٹھے۔ ایک مرتبہ پانی پینے اور دوسری مرتبہ حاجت کو گئے۔ دونوں مرتبہ تم نے ہمیں سوتا ہوا دیکھا اور اٹھنے کے بعد بھی ہم گھر میں ہی تھے۔ یہ جملے اسے اچھی طرح یاد کر لو اگر ایک لفظ بھی بھولے تو ہم رضوی صاحب سے تمہاری کوئی سفارش نہیں کریں گے۔"

"بالکل نہیں کریں گے۔" میں نے تائید کی اور جوتے اتارنے لگا جن پر آخری بار وہ جتنے پہلے تھی اور اب ان پر گرد اور کیچڑ اس طرح جمی ہوئی تھی کہ جوتوں کے اصل رنگ کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ محسن کے جاگنگ کرتے جوتوں کے مقابلے میں میرے جوتے کسی دیہاتی کے دس سال پرانے جوتے لگتے تھے۔ گھنٹہ پہلے خود محسن کے جوتوں کی بھی یہی حالت تھی۔

"اچھا اب تم جاؤ مگر اپنا سبق یاد رکھنا۔" کانسٹیبل کی مسکین صورت پر بے اختیار ہنسی آ رہی تھی۔

"ورنہ ہم ایسا سبق دیں گے کہ یاد رکھو گے تمام عمر۔"

"ہم تمہاری پوسٹنگ منڈی بہاؤالدین کرا دیں گے۔" محسن نے کہا۔

"جہاں اللہ کے سوا تمہارا یار کوئی نہیں ہو گا۔" میں نے اس کو مزید دہشت زدہ کیا۔

جب وہ چلا گیا تو ہم دل کھول کر ہنسے۔ تھانیدار بننے کے چکر میں کانسٹیبل عملی طور پر ہماری جوتیاں اٹھا رہا تھا حالانکہ ہم تھانیدار تو کیا اس کو سپاہی کا تبادلہ بھی نہیں کرا سکتے تھے۔ بیٹھتے بیٹھتے میں نے محسن کو چراغ دین والی گفتگو سنائی۔ ابھی ہم ہنس ہی رہے تھے کہ رابعہ آئی۔

"تم دونوں یہاں پڑے دانت نکال رہے ہو۔" اس نے کہا۔ "اور رضوی انکل تمہارے دانت توڑنے کے

کہہ رہے ہیں۔"

"اچھا؟ ہمارا خیال تھا کہ وہ پولیس افسر ہیں دندان ساز نہیں۔" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ ہمارے دانت بالکل ٹھیک ہیں۔ اچھی بھلی چیز کو توڑنے کی کیا ضرورت ہے؟" محسن نے کہا۔

"یہ سب کچھ ان سے ہی پوچھ لینا۔" رابعہ نے کہا۔ "انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ پانچ منٹ کے اندر دونوں کو ناشتے کے لیے حاضر کر دو۔ چار منٹ ہو چکے ہیں۔"

ہم دونوں ایک ساتھ اٹھ کر دوڑے اور رابعہ سے پہلے رضوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ہم دونوں نے منہ تک نہیں دھویا تھا۔ ہمارے بال بکھرے ہوئے تھے اور رات بھر جاگنے سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں لیکن معلوم یہی ہوتا تھا کہ ہم ابھی ابھی سو کر اٹھے ہیں اور ہماری آنکھوں میں نیند کا خمار ہے۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "ننگے پاؤں بھاگتے چلے آ رہے ہو؟"

"کیا کریں انکل!" میں نے کہا۔ "ہمیں حکم ملا تھا کہ پانچ منٹ میں حاضر ہو جائیں۔"

"اور چار منٹ گزر چکے تھے۔" محسن نے گردن ہلائی۔ "ہاتھ منہ دھونے یا جوتے پہننے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔"

"ہم تو ابھی سو کر بھی نہیں اٹھے تھے۔" میں نے کہا۔

"بلکہ شاید ابھی تک سو رہے ہیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔" محسن نے کہا۔ "ہم سوتے میں ہی ناشتہ کر لیں گے۔"

ہم نے رضوی صاحب کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ ہماری باتوں سے ان کی بیگم کو بڑی ہنسی آئی جو ابھی ناشتہ لگانے میں مصروف تھیں۔ پھر رابعہ آئی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ دونوں بہت بدمعاش ہیں۔" رضوی صاحب مسکرائے۔ "ہر وقت کوئی نہ کوئی ڈراما کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی یہ کوئی شرارت کر کے آئے ہیں۔" انھوں نے رابعہ سے مخاطب ہو کے سوال کیا۔

ایک سیکنڈ کے لیے مجھے یوں لگا کہ رضوی صاحب سب کچھ جانتے ہیں۔ انھیں معلوم ہو چکا ہے کہ ہم نے چراغ دین کے ساتھ کیا کارنامہ انجام دیا ہے لیکن یہ خیال میرے وہم کی پیداوار تھا۔ اسی وقت کانسٹیبل اندر آیا، سیلوٹ کر کے اس نے رضوی صاحب کو مطلع کیا کہ گاڑی تیار ہے جناب عالی!

"اب آپ اس سے پوچھ لیں۔" میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ "شرارت کا کیا سوال۔ ہم کل رات دس بجے سو گئے تھے اور ابھی اٹھے ہیں۔ مجال ہے جو رات کو خواب بھی دیکھا ہو۔ نیند سے فرصت ہی نہیں ملی۔"

"بالکل جناب عالی!" کانسٹیبل نے کہا اور ہماری تائید میں پورا بیان فرفر پڑھ دیا۔

"اچھا اچھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "تم جاؤ باہر ٹھہرو۔ میں ناشتہ کر کے آتا ہوں۔"

"انکل رضوی!" میں نے زور سے کہا۔ "آپ اسے تھانیدار بنا دیں نا۔"

"ہم نے تو اس سے کہیں زیادہ نالائق تھانیدار دیکھے ہیں۔" محسن نے فوراً کہا اور کانسٹیبل نے باہر جاتے جاتے رک کر ہمیں تشکر آمیز نظروں سے دیکھا لیکن اس نے رضوی صاحب کا جواب نہیں سنا۔

رضوی صاحب نے ہمیں بتایا کہ وہ صبح اسلام آباد فون کر چکے ہیں۔ فوزیہ بالکل خیریت سے ہے اور گھر پہنچ چکی ہے لیکن یہ اطلاع تمہید کے لیے تھی۔ اصل بات انھوں نے اس کے بعد کی۔

"مجھے رابعہ نے بتایا ہے کہ تم نے اس کے لیے کوئی مکان پسند کیا ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور آج اس کی ادائیگی کرنی ہے۔ یہ مکان کہاں ہے؟ مجھے ذرا تفصیل سے سمجھاؤ۔"

میں نے ان کو مکان کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کیں اور یہ بھی بتایا کہ وہاں ہمارے ساتھ کون کون رہے گا۔ میں نے شہلا کا نام بھی لیا مگر ان کو نہیں بتایا کہ وہ ڈی ایس او کی سیکرٹری رہ چکی ہے اور عدنان کی بہن ہے۔ میں نے کہا کہ وہ رابعہ کی کوئی پرانی جاننے والی ہے۔ اس کی مفلوج ماں بھی رابعہ کی ماں کو جانتی تھی اور ان کے حالات پہلے بہت اچھے تھے لیکن اب ان کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانا بھی نہیں ہے۔ اخبارات میں جرائم کی اور قتل و غارت گری کی خبریں بہت شائع ہوتی تھیں۔ ان کو شہلا کے نام سے کچھ یاد نہیں آیا۔

"چلو یہ انتظام کسی حد تک بہتر ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "ورنہ میں رابعہ کے یہاں سے جانے کو پسند نہیں کرتا۔ رابعہ کی خادمہ بھی ساتھ رہے گی اور وہ دوسری فیملی بھی تو کوئی ہرج نہیں۔ تم دونوں اوپر والے بیڈ روم میں رہو گے؟"

"خیال تو یہی ہے۔" میں نے کہا۔ "قدرے فرق ہے..."

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔" رضوی صاحب نے میری بات کاٹ دی۔ "رابعہ نے مجھ سے کہا ہے کہ میں چند روز

www.paksociety.com

کے لیے حفاظت کے خصوصی انتظامات کر دوں۔ میں اس مکان کے گرد و سادہ کپڑوں میں چار مسلح آدمی کھڑے کر رہا ہوں جو ایک ہفتے تک نگرانی کریں گے۔ ان کی ڈیوٹی بھی لگ چکی ہے لیکن یہ انتظام غیر سرکاری قسم کا ہوگا، یوں سمجھو کہ میں ذاتی طور پہ کر رہا ہوں۔"

"اور آفس کے لیے؟" رابعہ نے بیٹھے بیٹھے ہی کہا۔

"آفس کی بلڈنگ کے دو دروازے ہیں نا؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور دونوں پر چوکیدار بھی رہتے ہیں۔ ان سے کہو کہ ریوالور کے لائسنس کے لیے درخواست دے دیں۔ میں کل تک لائسنس دلوا دوں گا۔ بلڈنگ میں رہنے والے ان کو ریوالور فراہم کر سکتے ہیں۔ دونوں دروازوں پر آج ہی نوٹس لگوا دو کہ اندر جانے والوں کو شناخت کرانی ہوگی اور غیر متعلقہ افراد اندر جائیں گے تو دروازے پر اپنا نام پتہ لکھوا کر جائیں گے۔ میں وہاں بھی گارڈ رکھ دیتا لیکن مشکل یہ ہے کہ

اس عمارت میں وکیلوں کے دفتر ہیں۔ پولیس نے ان کو روکا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ چوکیدار جن لوگوں کو ذاتی طور پر پہچانتے ہوں ان کو جانے دیں۔ نیا آدمی ہو تو روک لیں۔ اس انتظام پہ کوئی قانونی اعتراض نہیں کر سکتا۔ اگر کرے تو رابعہ کہہ سکتی ہے کہ کچھ لوگ اسے ٹیلیفون پر دھمکیاں دے رہے تھے۔ یہ کہیں جانا ہے کہ رابعہ کے پرانے گھر میں کیا ہوا تھا اور سب کو رابعہ سے ہمدردی بھی ہے اس لیے وہ رابعہ سے تعاون کریں گے اور اگر ان کے موکلوں کو اوپر آنے سے پہلے اپنی شناخت کرانی پڑی تو کوئی وکیل اس کو اپنے کاروبار میں رخنہ اندازی نہیں سمجھے گا یا خود ہی موکل کو مطمئن کر دے گا۔ آفس کے اندر دو آدمی موجود ہوں گے جو ضرورت پڑنے پہ تمہاری حفاظت کرنے کے پوری طرح اہل ہوں گے۔ یہ تمہارے آفس کے اندر کا معاملہ ہے کہ تم انہیں جہاں چاہے کھڑا رکھو یا بٹھا دو۔ کلرکوں میں شامل کر دو یا چپراسی بنا دو۔ وہ پولیس کے تجربہ کار اور بہت اچھا ریکارڈ رکھنے والے لوگ ہیں اور اگر میں یہ کہوں کہ آدمی کو صورت سے تاڑ جاتے ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔" انہوں نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ "میں تو اب چلتا ہوں۔ پہلے ہی کچھ دیر ہو گئی ہے۔ تمہارا کیا پروگرام ہے آج کا؟"

"ابھی تو کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس بینک ڈرافٹ بنوانے جانا ہوگا۔"

رضوی صاحب کے جانے کے بعد بھی ہم بیٹھے گپ لگاتے رہے اور ان کی بیگم کو گزشتہ رات کے خواب سناتے رہے جن کا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ ہم رات بھر ایک کمرے میں سوتے رہے ہیں لیکن بیگم رضوی نے ہنستے ہوئے رابعہ سے کہا کہ بس اب شادی کر لو۔ یوں کب تک خوابوں پر گزارا کرو گے۔ پھر ہمیں تلقین کی کہ ہم سگریٹ پینا چھوڑ دیں اور کسی کام سے باہر چلی گئیں۔ ہم اپنا حلیہ درست کرنے اٹھنے والے ہی تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے محسن کی طرف دیکھا اور ریسیور اٹھا کے بھاری آواز میں کہا۔ "ہیلو۔"

"جناب ایس پی خان رضوی صاحب سے بات کرنی تھی۔ میں انسپکٹر شیخ بول رہا ہوں۔" جواب ملا۔

"بولو بولو۔" میں نے اسی بارعب لہجے میں کہا۔ "میں رضوی بات کر رہا ہوں۔"

"جناب ایس پی صاحب۔" انسپکٹر نے انتہائی مودب لہجے میں کہا۔ "آپ کے گھر میں کوئی سکندر بخت صاحب ہیں؟"

"ہاں میرا چھوٹا بھائی ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا کام ہے اس سے؟"

"کام تو جناب ایسا کوئی خاص نہیں ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "دراصل ہم نے ایک مجرم پکڑا ہے جو منشیات کا دھندا کرتا تھا۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ اس علاقے میں کوئی شخص یہ دھندا کر رہا ہے۔ ہم نے اطلاع دینے والے کو دستخط کیے گئے نوٹ دے دیے اور مجرم کو اس وقت پکڑ لیا جب وہ پانچ سو کا نوٹ لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ دس گرام کا پیکٹ بھی گرفتار ہو گیا ہے۔"

"کیا نام ہے مجرم کا؟" میں نے اسی لہجے میں کہا۔

"چراغ دین جناب۔" انسپکٹر بولا۔ "دو لیٹے تو اس نے دھوکا دینے کے لیے صدر میں جنرل اسٹور کھول رکھا ہے جو ہم نے ابھی دیکھا نہیں ہے۔ وہاں بھی دیکھنا ہے۔ مگر وہ کہتا ہے کہ اس کو پھنسایا گیا ہے۔ ہم ابھی خانہ تلاشی کے وارنٹ لے کر مجسٹریٹ کے ساتھ اس کے گھر میں سے بھی برآمد کر لیں گے۔ لیکن وہ بدمعاش آپ کے چھوٹے بھائی پر الزام لگا رہا ہے کہ انہوں نے آج صبح ساڑھے نو بجے یہ پیکٹ اسے دیا تھا۔"

"وہ بکواس کر رہا ہے۔" میں نے اسی انداز میں کہا۔ "سکندر رات کو گھر پہ تھا اور صبح تو اس نے میرے ساتھ ناشتہ کیا ہے بلکہ اس وقت بھی وہ باتھ روم میں موجود ہے۔"

"وہ بالکل بکواس کر رہا ہے جناب۔" انسپکٹر نے کہا۔ "یہ سب پکڑے جاتے ہیں تو ایسے ہی کہتے ہیں۔ ہم خود کر لیں گے تو سچ معلوم کر لیں گے لیکن آپ کسی وقت سکندر صاحب کو تھوڑی سی دیر کے لیے بھیج دیں۔ ان کا بیان تو لینا ہی پڑے گا۔"

"ہاں ہاں سکندر آجائے گا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"لیکن تم نے گھر پہ کیوں فون کیا ہے انسپکٹر؟"

"پہلے آفس کیا تھا سر۔ معلوم ہوا جناب ابھی گھر پر ہیں۔ غلطی ہو گئی۔" انسپکٹر نے کہا اور میں نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ریسیور رکھ دیا۔ محسن اور رابعہ سوال بنے بیٹھے تھے۔

"ہم پر بے شکاری نہیں ہیں بھائی محسن۔" میں نے اس سے ہاتھ ملا کر کہا۔ "یہ ہمارا پہلا شکار تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے جو جال پھیلایا تھا وہ ٹھیک تھا۔" محسن نے قہقہہ مار کے کہا اور رابعہ نے حیرانی سے ہم دونوں کو دیکھا۔ میں نے کہا کہ اپنے غریب خانے کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں ہم میں سے ایک شیو اور غسل کرے گا تو دوسرا تمہیں رات کی بات سنائے گا اور بات لمبی ہو گئی تو دوسرا تیاری کرے گا اور پہلا باقی بات بتا دے گا۔

محسن پہلے باتھ روم میں گھس گیا اور میں نے رابعہ کو اول تا آخر ایک پوری رات کی کارگزاری کا حال سنا دیا۔ "تو یہ ہوا کام ہے بی بی!" میں نے اضطراب کے عالم میں ٹہلتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے لیے بڑے اطمینان قلب کی بات ہے کہ میں نے ایک عیار شخص کو اس کی عیاری کی سزا عیاری سے دی۔ اس نے میرے سیدھے سادے اصول پرست، شریف اور اعتماد کرنے والے باپ کو دھوکا دیا تھا۔ امانت میں خیانت کی تھی اور یقین کر کے سمجھا تھا کہ وہ کبھی نہیں پکڑا جائے گا کیونکہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔ ثبوت واقعی نہیں تھا کیونکہ جب کوئی کسی پر اعتماد کرتا ہے تو دل سے کرتا ہے لیکن عدالت دل کی گواہی نہیں مانگتی، دستاویزی ثبوت مانگتی ہے۔ اس بدمعاش نے میرے باپ کو لوٹا، اس کی حلال کی کمائی ہڑپ کر ڈالی لیکن سزا سے محفوظ رہا۔ اسی غبن کے طفیل وہ عزت دار بن گیا اور بزنس مین ہو گیا۔ انتہا یہ ہے کہ اس نے میرے باپ کو گھر میں نوکر رکھا، اس کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کیا جو میرے باپ نے کبھی کسی کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ وہ تو ملازموں کو بھی اپنا دوست کہتا تھا۔ اس نمک حرام نے باپ کے احسانات کا بھی خیال نہیں کیا اور میرا باپ اس کے گھر کے سرونٹ کوارٹر میں ذلیل اور رسوا ہو کر مرا۔ اس حالت میں کہ اس کے پاس علاج کرانے کے لیے بھی پیسہ نہ تھا اور وہ سرکاری ہسپتال سے خیرات میں ملنے والی دوائیں لینے پہ مجبور تھا۔ بعد میں جو کچھ ہوا وہ ایک الگ کہانی ہے لیکن میرے باپ کی تباہی اور بربادی کی ابتدا اسی شخص نے کی تھی، میں نے اسی کو سب سے پہلے شکار کیا۔ میرے سینے میں نفرت اور انتقام کے جذبات کا جو آتش فشاں ابل رہا ہے رابعہ وہ ابھی سرد نہیں ہوا۔"

رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے بٹھایا۔ "تم جذبات کی شدت سے مغلوب ہو رہے ہو۔"

"ہاں — اس لیے کہ ان گنت ناکامیوں کے بعد میرے حصے میں آنے والی یہ پہلی کامیابی ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ مجھے قطعی احساس نہیں تھا کہ بات کرتے کرتے میں چلانے لگا ہوں اور میرا چہرہ گرم ہو کے سرخ پڑ گیا ہے۔

"یہ پہلی سزا ہے جو میں نے پہلے مجرم کو دی ہے۔ اس سے پہلے سزا صرف میرے باپ نے جھیلی لیکن مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ اس کا احساس بھی ایک سزا ہے لیکن اس کے بعد بھی میرے علاوہ کتنے لوگوں کو سزا مل چکی ہے۔ کیا جرم کیا تھا ان سب نے اور کیا اختیار تھا ان لوگوں کو سزا دینے کا؟"

دس بجے کے قریب ہم ایک ساتھ نکلے۔ میں نے محسن کو رابعہ کے ساتھ کر دیا کہ ایک بجے تک وہ خود بینک سے ڈیڑھ لاکھ روپے کا پے آرڈر بنوا لے یا بینک ڈرافٹ۔ پھر رابعہ کو لے جا کر صدر میں شملا کے پاس چھوڑ دے۔ وہاں اگر میں پہلے سے نہ ملوں تو پولیس اسٹیشن سے میری خیریت معلوم کر لے۔ رات بھر جاگنے کا اثر غسل کے بعد بھی محسوس ہو رہا تھا۔ میرا جسم کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ سر بھاری تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس کے علاوہ میں چراغ دین کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن میری سوچ کی کوئی سمت نہیں تھی۔ میں اپنی محنت کے نتائج جاننے کے لیے سخت بے چین تھا۔ تصور میرے سامنے وہ تصویریں پیش کر رہا تھا۔ ایک میں چراغ دین پولیس اسٹیشن میں نظر آتا تھا، دونوں ہاتھوں میں زنجیر پہنے ہوئے اپنی ذلت اور رسوائی کے خیال سے ہراساں اور میری سازش پہ برہم... غصے میں کھولتا ہوا مجھ سے بدلہ لینے کی

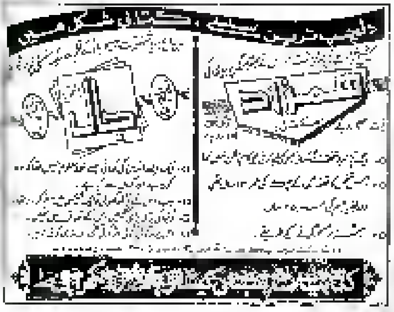

www.paksociety.com

آرزو اور جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرنے کی فکر میں مبتلا کھوسٹ نے کو معاملہ ختم کرنے کی کوشش میں مصروف اور اس عمر کو پھیلنے سے روکنے کی تدبیر سوچتا ہوا۔ ممکن ہے اسے یہ خیال بھی ہو کہ آج اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے کرنی کا پھل ہے اور اسے وہ وقت یاد آ رہا ہو جب اس نے وزیر خان کے ساتھ دغا کی تھی۔ آج تقدیر نے وہ دغا دے کر ثابت کر دیا ہے کہ خدا کی خدائی میں دیر ضرور ہو سکتی ہے مگر اندھیر نہیں ہے دوسرا منظر اس سے بالکل مختلف تھا کہ اب تک چراغ دین "باعزت" طور پر اپنے گھر واپس جا چکا ہوگا جیسے کہ بڑی طاقت ہے بچ نکلنے کا سفر کرے جا سکتے ہیں۔ اس نے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ہوتے ہی عزت بچانے کے لیے تھوڑی سی دولت قربان کر دی ہوگی۔ انگریزی محاورے کے مطابق تھانیدار میرا حصہ لے کر خاموشی سے لوٹ گیا ہوگا اور اسی طرح دوسرے چھاپہ مار رہ گئے گواہ یعنی وہ خریدار نوجوان بچ جانے کو غنیمت شمار کرتے ہوئے بھاگ لیے ہوں گے۔ اس وقت چراغ دین ٹیلیفون پر شیر علی صاحب کو بتا رہا ہوگا کہ سکندر بخت نے اس کے خلاف کیسی ناپاک سازش کی تھی جو خدا کی مہربانی سے ناکام رہی ورنہ وہ دنیا والوں میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا اور اب میں تھانے جاؤں گا تو وجوہات صحیح ہوگی کہ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود اس میں گرتا ہے اور تھانیدار کہے گا کہ آپ ہیں ایس پی رضوی صاحب کے چھوٹے بھائی اور آپ نے ایک شریف اور معزز آدمی پر ایسا گھناؤنا الزام عائد کرنے کی کوشش کی تھی ہم کیا اتنے بے وقوف ہیں کہ تم جیسے لونڈوں کی چالبازی کو نہ سمجھ سکیں ... اور پھر تفتیش کا ایک نیا سلسلہ...

تھانے میں داخل ہونے تک میری ذہنی کیفیت قدیم یونان کے اس غلام سے مختلف نہ تھی جسے بھوکے شیر سے لڑنے کے لیے ارینا میں دھکیلا جا رہا ہو اور جسے یہ علم ہو کہ وہ شیر کو مار کر آزاد ہو جائے گا اور عام معزز شہری بن سکے گا یا تماشا ختم ہونے تک اس کا لہو اور گوشت سرد ہو جائے گا اور باقی جسم بھوکے شیر کا پیٹ بھر چکا ہوگا۔ میں نے بہت خطرناک قدم اٹھایا تھا اور اپنی ناکامی کا خیال ہی میرے لیے سوہان روح تھا۔ میں رضوی صاحب سے کیا کہوں گا کہ میں نے ایسا کیوں کیا! شیر علی صاحب ان کی بیگم اور فوزیہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ وہ کہیں گے سکندر! ہم تمہیں اتنا گھٹیا آدمی نہیں سمجھتے تھے کہ رقابت میں تم اخلاقی پستی کی اس انتہا تک پہنچ جاؤ گے۔

تھانے میں پہنچ کر میں نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی وہ محترمہ موجود نہیں تھا جو گزشتہ رات ڈیوٹی پر تھا۔ انسپکٹر کے کمرے میں ڈبل ایس آئی شیخ کے علاوہ ایک اور بھی موجود تھا جو شیخ سے زیادہ عمر رسیدہ تجربہ کار نظر آتا تھا۔ اس کی نظر بچا کر شیخ نے مجھے آنکھ ماری اس کا مطلب سمجھ کر میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

"فرمائیے؟" شیخ نے بالکل اجنبی بن کے کہا۔ "کیا ہے آپ کو؟"

"یا کسی مصیبت اسے" انسپکٹر نے بڑی ناگواری سے آدم بیزار لہجے میں کہا۔ "جس کا دل چاہتا ہے بیل کی طرح منہ اٹھاتے اندر آ جاتا ہے... ہیں؟... اوئے یہ کوئی پان کی دکان ہے میاں؟ باہر کوئی نہیں بیٹھا ہے ان کو روکنے والا؟"

"انسپکٹر صاحب غور سے دیکھیے میں بیل نہیں ہوں" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ "میرا نام سکندر ہے اور مجھے ٹیلیفون کر کے بلوایا گیا تھا اور تھانے میں کوئی شریف آدمی نہیں آتا۔"

انسپکٹر کا چہرہ، پوڈر اور سب ایک دم بدل گئے۔

"اچھا اچھا" اس نے خاصی کوشش کے بعد اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "آپ اپنے ایس پی صاحب کے کیا ہیں...؟"

"برادر نسبتی" میں نے سکون سے کہا۔ اس امید پر کہ تھانیدار اتنی فارسی سمجھتا ہی نہیں ہوگا۔

"اوئے یار شیخ!" انسپکٹر نے دوبارہ کرسی میں بیٹھ کر کہا۔ "چنگی طرح دیکھ لے..."

"دیکھنا کیا ہے جی!" شیخ بولا۔ "وہ بدمعاش کہاں گیا ہے جو بندہ مجھے اطلاع دینے آیا تھا وہ خاصی عمر کا آدمی تھا کم سے کم پچاس سال کا۔ سر کے سارے بال سفید تھے جسم پر قمیص اور چارخانے کی لنگی باندھے تھا اور صورت سے ان پڑھ لگتا تھا... اور سکندر صاحب آپ کے سامنے ہیں فرق آپ خود دیکھ لیں۔"

"تو نے بھی کمال کیا یار شیخ!" انسپکٹر نے بڑی مایوسی سے کہا۔ "اوئے اس بندے کو جانے نہیں دینا تھا وہ جو خبر لایا تھا اپنا کوئی آدمی اس کے پیچھے لگا دینا تھا۔"

"اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے" شیخ نے کہا۔ "اطلاع غلط ہوتی تو اور بات تھی مگر دیکھیں نا جی مال ہمارے پاس ہے اور نوٹ بھی جن پر میرے دستخط ہیں۔ اور کیا چاہیے؟"

"چاہیے کیسے نہیں" انسپکٹر نے غصے سے کہا۔ "سوچے سمجھے بغیر کام کرتے ہو۔ کسی ایرے غیرے نے کہہ دیا اور تم نے اعتبار کر کے چھاپہ مار دیا۔ اوئے شیخ تیرا یہ قانونی معاملہ ہیں۔ اس میں سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا چاہیے اور پہلے اپنے افسروں سے بات کرنی چاہیے۔ آخر اتنی جلدی کیا تھی ایف آئی آر کاٹنے کی۔ اوئے میرا انتظار تو کیا ہوتا...؟"

"کیا میں نے مجرم کو گرفتار کر کے کوئی غیر قانونی کام کیا ہے؟" نوجوان سب انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "آپ آئے ہیں دس بجے۔ میں اگر نو بجے چھاپہ نہ مارتا تو یہ سب لوگ کیسے پکڑے جاتے؟ اب آپ کے پاس چالان پیش کرنے کے لیے ہر چیز ہے۔ مجرم اور گواہ۔ برآمد ہونے والا مال اور دستخط شدہ نوٹ۔ پھر تک ایف آئی آر کیسے رکتا تھا۔ اس میں واردات کا وقت بھی تو لکھنا تھا۔"

میں نے محسوس کیا کہ چراغ دین کی گرفتاری کے معاملے میں ان دونوں کے درمیان شدید قسم کا اختلاف رائے ہے یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ایس آئی شیخ مل گیا جو ایماندار اور فرض شناس تھا۔ شاید اس لیے کہ ابھی وہ ایک جذباتی جوشیلا نوجوان تھا جو ترقی کرنا چاہتا تھا اگر اس کی جگہ انسپکٹر ہوتا تو صورت حال وہی ہوتی جس کا میں نے تصور کیا تھا یعنی چراغ دین جیسے کر معاملے کو دبا دیتا اور الٹا مجھے پھنسانے نکل جاتا۔ انسپکٹر کو افسوس تھا کہ آمدنی کا اچھا خاصا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کا ماتحت شیخ اپنے افسر کی عادت اور فطرت سے بخوبی واقف تھا چنانچہ اس نے ایف آئی آر کاٹنے میں بالکل دیر نہیں لگائی۔ اس نے ایک اچھا کام یہ بھی کیا تھا کہ ایف آئی آر میں میرا نام کہیں نہیں لکھا تھا لیکن چراغ دین سے سودا کرنے والوں کو پکڑ کر بند کر دیا تھا اور چراغ دین کے ساتھ انہیں بھی مجرموں میں شامل کر دیا تھا۔ محبت خان اس ہنگامے میں مخواہ مخواہ ملوث ہو گیا تھا۔ وہ اپنے مالک کی حمایت میں بولا تھا اور شیخ نے اسے ایک گواہ بنا کے طلب کر لیا تھا۔ محبت خان نے اپنے بیان کو حقائق تک محدود رکھا تھا یعنی یہ کہ وہ صرف چوکیدار ہے جسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن وہ مالک کے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور اسے کچھ معلوم نہیں کہ چراغ دین سے جو لوگ ملنے آتے تھے وہ کیسے آدمی تھے۔ اس کے بیان نے میری پوزیشن بھی بہت بہتر کر دی تھی اگر وہ کہتا کہ صبح کے وقت وہ باورچی خانے میں ناشتہ بنا رہا تھا اور معلوم نہیں اس وقت سکندر صاحب آئے تھے یا نہیں تو صورت حال مختلف ہوتی مگر اس نے جلدی میں یہی کہا کہ میں نے تو صبح سکندر بخت صاحب کو آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا وہ آتے تو صاحب ان کو گھر میں خود بٹھاتے اور ان کی آواز بھی آ جاتی تو میں پہچان لیتا کہ اپنے سکندر صاحب آئے ہیں۔ یہ چراغ دین نے اپنی حماقت کی سزا پائی تھی۔ اس نے مجھے دروازے پر کھڑا کر رکھا تھا اور باہر سے ہی رخصت کر دیا تھا۔ اب وہ یقیناً پچھتا رہا ہوگا کہ مجھے بے عزت کر کے اسے فائدے کے بجائے الٹا یہ نقصان ہوا کہ وہ سب سے زیادہ قابل اعتماد گواہ سے محروم ہو گیا۔

میں نے چراغ دین کا پورا بیان پڑھا اور محبت خان کا بھی۔ چراغ دین نے صرف ایک عقلمندی کی تھی کہ فوزیہ کا نام نہیں لیا تھا لیکن مجھے اپنا دشمن قرار دیا تھا اور احسان فراموش کہا تھا کہ اس نے برے وقت میں میرے والد کو پناہ دی اور عزت و احترام سے ساتھ رکھا کیونکہ میں لندن میں تھا۔ اس نے اپنے بیان میں لکھا کہ میرے والد کی موت اور بیماری حقیقی حالات کا نتیجہ تھی لیکن میں نے اسے خطاوار ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی اور شاید میں چراغ دین پر بھی شک کرتا تھا کہ وہ بھی قتل کرنے والوں میں شامل ہے لیکن یہ ثابت نہیں ہو سکا تھا چنانچہ میں نے انتقام لینے کی نیت سے اس کے خلاف سازش کی ہے۔ چراغ دین نے آگے چل کر یہ بھی کہا تھا کہ کئی سال پہلے اس کو غبن کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن میرے والد وزیر خان مرحوم الزام کو عدالت میں ثابت کرنے سے قاصر رہے تھے چنانچہ چراغ دین باعزت طور پر بری ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ممکن ہے وزیر خان کے بیٹے کے ذہن میں یہ پرانی بات بھی ہو کیونکہ وہ نوجوان اور جذباتی آدمی ہے۔ اس نے اپنے طور پر فرض کر لیا ہوگا کہ عدالت سے انصاف نہیں ہوا تھا چنانچہ اب وہ مجھے سزا دینا چاہتا ہو۔ حسب توقع چراغ دین نے میر شرافت علی کے قتل کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ یہ بتایا تھا کہ میں ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ بہت سی باتیں وہ اپنے وکیل سے مشورہ کرنے کے بعد عدالت میں بتائے گا۔

"تو جناب سکندر صاحب!" انسپکٹر نے کہا۔ "کیا خیال ہے آپ کا اس بیان کے بارے میں؟"

"اس میں کچھ باتیں سچ ہیں" میں نے کہا۔ "مثلاً یہ کہ چراغ دین میرے والد کی فرم کا معمولی ملازم تھا۔ وہ غبن کر کے بھاگ گیا تھا۔ عدم ثبوت کی بنا پر اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوا تھا لیکن اس وجہ سے میں چراغ دین

کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ عدالت نے حقائق کی بنیاد پر جو فیصلہ دیا تھا وہ درست تھا۔ چنانچہ آج کئی سال بعد اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں عدالت کے فیصلے کو غلط کہوں اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر چراغ دین کو خود سزا دینے کے لیے سازش کروں۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ میرے والد نے زندگی کے آخری ایام چراغ دین کے ساتھ گزارے لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ چراغ دین نے ان کو پناہ دی تھی اور عزت و احترام کے ساتھ رکھا تھا۔ اس نے میرے والد کو نوکر رکھا تھا۔ ان کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کیا تھا اور انہیں سرونٹ کوارٹر کا ایک کمرہ رہنے کے لیے دیا تھا۔ میں نے ابھی تک یہ تسلیم نہیں کیا ہے کہ میرے والد کی موت کا سبب ان کی بیماری تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کو قتل کیا گیا تھا لیکن میں نے کبھی کسی کے سامنے چراغ دین پر قتل کا شبہ ظاہر نہیں کیا۔ میں چند سال تک برطانیہ میں زیر تعلیم رہا اور خصوصی حالات کے باعث اپنی تعلیم کا سلسلہ نامکمل چھوڑ کر واپس آنے پر مجبور ہوا۔ جب میں گیا تھا تو میرے والد کا شمار دولت مندوں میں ہوتا تھا۔ میں ان حالات کا پتہ چلانے کی پوری کوشش کر رہا ہوں جو میرے والد مرحوم کی تباہی کا اور موت کا سبب بنے۔ ایک دولت مند شخص کی سابقہ ملازم کے گھر میں ادنیٰ خادم کی حیثیت سے رہنے پر کیوں مجبور ہوا؟ یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ مجھے یہ بات ناقابل یقین لگتی ہے کہ وہ سرونٹ کوارٹر میں رہنے والا "ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپنی" کا پارٹنر بھی تھا جس کا اعداد و شمار کے مطابق لاکھوں روپے کا منافع بھی ہوا تھا لیکن اس بات کا چراغ دین کے کیس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ مجھ پر اسی کمپنی کے ایک پارٹنر میر شرافت علی کے قتل کا الزام ہے لیکن الزام جب تک ثابت نہ ہو جرم نہیں کہلاتا۔ میں ارتکاب جرم کرتے ہوئے نہیں پکڑا گیا تھا لیکن چراغ دین کی گرفتاری عین اس وقت ہوئی ہے جب وہ دو افراد کو منشیات فروخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ایک کو فروخت بھی کر چکا تھا۔ اس کا ثبوت سب انسپکٹر شیخ کے وہ دستخط شدہ نوٹ ہیں جو چراغ دین کی جیب میں سے نکلے تھے۔ یہ معلوم ہو جائے گا کہ جو لوگ چراغ دین سے منشیات خریدنے گئے تھے وہ اس دھندے میں ملوث ہیں یا نہیں۔ کیا انہوں نے بھی کہا ہے کہ میں نے انہیں چراغ دین کے پاس بھیجا تھا؟"

"وہ کسی استاد شیدی کا نام لیتے ہیں۔" انسپکٹر سے پہلے سب انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "کہ وہ صبح سویرے ان کے پاس آیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ مال ملنے کا ایک نیا ٹھکانا پیدا ہو گیا ہے جہاں سے مال اٹھانے میں زیادہ فائدہ ہے۔ استاد شیدی کوئی چھوٹا موٹا بدمعاش ہے۔ وہ خود بھی منشیات کی فروخت کا دھندا کرنا چاہتا تھا لیکن خود کچھ ڈرتا تھا چنانچہ وہ پانچ سو روپے دے گیا تھا کہ اس کے لیے بھی تھوڑا سا مال اٹھا لیا جائے۔ انہوں نے دیکھا ہی نہیں کہ نوٹ دستخط شدہ ہیں اور مال لینے پہنچ گئے تھے۔ ابھی انہوں نے قرآن کر کے مال لیا ہی تھا کہ سڑک پر آس پاس ٹہلنے والے سادہ کپڑوں کی پولیس والوں نے ان کو گھیر لیا تھا۔"

"استاد شیدی سے کچھ معلوم ہوا؟" میں نے اطمینان سے پوچھا۔

"وہ ابھی ہاتھ ہی کہاں آیا ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اس کا پتہ ٹھکانا کسی کو معلوم ہی نہیں۔ ہم نے حلیہ مشتہر کر دیا ہے۔"

"اصل بات تو یہ ہے کہ ہم نے ایک شخص کو سرراہ منشیات فروخت کرتے ہوئے پکڑا ہے۔" سب انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "مجھے اطلاع دینے والا استاد شیدی تھا یا کوئی اور، میں نہیں جانتا۔ اس نے خود کو پولیس کا مخبر کہا تھا اور میں نے اسے سو سو کے پانچ نوٹ، دستخط کر کے دے دیے تھے۔ نوٹ بھی میرے نہیں تھے اور مجھے یہ شبہ بھی نہیں تھا کہ اس سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھائے گا لیکن اس شخص کا حلیہ استاد شیدی کے حلیے سے بالکل نہیں ملتا۔" وہ میری طرف اشارہ کر کے بولا۔

"ہو سکتا ہے وہ چراغ دین کا کوئی دشمن ہو۔ پھر بھی" انسپکٹر نے کہا۔ "تمہیں چاہیے تھا کہ اس کو روک لیتے۔"

"کیا چراغ دین بھی استاد شیدی نام کے کسی شخص سے واقف ہے؟" میں نے اسی معصومیت سے سوال کیا۔ "اور وہ دونوں جو خریدار بن کر آئے تھے وہ کیا کہتے ہیں؟ کیا ان کی استاد شیدی سے کوئی دشمنی تھی؟"

"او نہیں بابا..." انسپکٹر نے میز پر ہاتھ مارا۔ "اور یہ تو کمال کی بات ہے۔ آخر چراغ دین صرف تمہارا نام کیوں لیتا ہے؟"

"یہ بات میں بھی اس سے پوچھنا چاہوں گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بات اور ہے جو آپ کے نقطہ نظر سے اہم ہو سکتی ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے چراغ دین کے خالو میاں سلامت شاہ کو نہایت بیدردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ آپ ہی کے تھانے کا کیس ہو گا۔"

"ہاں۔" انسپکٹر نے بادل ناخواستہ تسلیم کیا۔ "اس کی لاش کے ٹکڑے ایک بکس میں بھر دیے گئے تھے اور اس

بہت دن تک بند رہا تھا جب لاش کے سڑنے گلنے کی بو پھیلی تھی۔ تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

"سلامت شاہ کو میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ انتہائی نیک آدمی تھا اور اس نے زندگی کے آخری ایام میں میرے والد کی بہت مدد کی تھی۔ یہ بات آپ محبت خان سے پوچھ سکتے ہیں کہ سلامت شاہ کا دشمن کوئی نہیں تھا۔ ایسے آدمی کا دنیا میں کون دشمن ہو گا جو ولی صفت ہو۔ اس کا قتل انتہائی لرزہ خیز اور افسوسناک واقعہ تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ابھی تک قاتلوں کا سراغ نہیں ملا لیکن اب یہ سوچا جا سکتا ہے کہ خود چراغ دین نے اپنے خالو کو قتل کیا یا کرایا؟" میں شک کا بیج بونے میں کامیاب رہا تھا۔

"یہ نتیجہ آپ نے کیسے نکال لیا؟" انسپکٹر مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"انسپکٹر صاحب، محبت خان کو اس لیے کچھ نہیں معلوم وہ چوکیدار ہے، باہر گھر کا دربان ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "سلامت شاہ گھر کے اندر رہتا تھا۔ ممکن ہے اس نے کچھ سن لیا ہو یا دیکھ لیا ہو اور اس کا وجود چراغ دین کے لیے خطرناک بن گیا ہو۔"

"گھر کے اندر کچھ ہوا ہو گا تو ابھی ایک گھنٹے میں معلوم ہو جائے گا۔" سب انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "خانہ تلاشی کے وارنٹ لے کر ہم مجسٹریٹ کے ساتھ وہاں تک پہنچ جائیں گے۔ ہم نے دروازے پر گارڈ بٹھا دیے ہیں۔"

"آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ یہ دھندا کوئی گروہ چلاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "فرض کیجیے دوسرے لوگوں کو معلوم ہو گیا..."

"ہم نے ابھی تک کسی کو کچھ معلوم نہیں ہونے دیا۔" سب انسپکٹر نے کہا۔ "ان کو الگ الگ رکھا ہے اور سب سے الگ الگ پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ اگر ان کا کوئی ملاقاتی آیا تو اسے بھی ہم روک لیں گے۔ باقی رہا گروہ کا سوال تو کل یہ خبر اخبار میں آ جائے گی۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اس سے پہلے ہی چراغ دین گروہ کے باقی لوگوں کے نام بتا دے۔ کل تک ہم اسے تفتیش کے لیے روک سکتے ہیں اور اس کے بعد بھی عدالت سے ریمانڈ لے سکتے ہیں۔"

تفتیش کی بات سے مجھے عذاب کی وہ رات یاد آ گئی جب میر شرافت علی کے قتل کی تفتیش کے لیے مجھے تھانے لایا گیا تھا۔ تشدد کا ہر غیر انسانی طریقہ آزمایا گیا تھا جس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پولیس جن کا عام آدمی تجربے کے بغیر تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پولیس کے طریقہ تفتیش میں شامل ہیں۔ کیا چراغ دین آج رات تفتیش کی یہ سختی اور ذلت جھیل سکے گا؟ میں نے سوچا۔ اس خیال نے ایک وحشیانہ تسکین دی کہ مجھ پر ہر ظلم روا رکھنے والوں میں سے ایک آج خود ظلم سے آشنا ہو گا۔ ظاہر ہے ایک رات کا عذاب اس عذاب کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا جو میرے والد مرحوم نے برداشت کیا تھا اور میں نے جھیلا تھا لیکن یہ احساس ہی کیا کم تھا کہ بساط الٹ گئی ہے۔ کم سے کم ایک شخص جو کل تک اپنی ذہانت اور عیاری کے مقابلے میں انصاف کی قوت کو کچھ نہیں سمجھتا تھا، جو خود کو بہت بڑا شکاری سمجھتا تھا وہ آج خود گردش حالات کا شکار تھا اور اس کی خوش فہمیوں کے سارے جال ٹوٹ گئے تھے۔

"غالباً میں اپنی پوزیشن کی وضاحت کر چکا ہوں۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "چراغ دین کا الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ اس نے فرض کر لیا ہے کہ میں اس کا دشمن ہوں۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔ ہو تب بھی اس کا ہاتھ تو تنکا نکالنے کے لیے اٹھتا ہے۔ محبت خان کہہ چکا ہے کہ اس نے آج صبح مجھے آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پھر ایس پی عباس رضوی صاحب بتا چکے ہیں کہ کل رات سے صبح ٹیلیفون آنے تک میں گھر سے نکلا ہی نہیں۔ میں تو ابھی سو کے بھی نہیں اٹھا تھا کہ رضوی صاحب نے ناشتے پر بلا لیا۔ میں نے ان کی فیملی کے ساتھ ناشتہ کیا۔ گھر میں چند افراد بھی میری موجودگی کے گواہ ہیں مثلاً بیگم رضوی، ایک ایڈووکیٹ ہیں مس رابعہ قادری جو آج کل رضوی صاحب کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ اسلام آباد میں ایک ڈپٹی سیکرٹری ہیں مسٹر شیرازی ان کا ڈرائیور محسن بھی گھر میں ناشتے کے وقت موجود تھا۔ ایک ایس پی صاحب کا ڈرائیور کانسٹیبل ہے... اتنے گواہ ہوں تو کسی کے کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر بھی میں چراغ دین سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس نے میرا نام کیوں لیا... اور اگر آپ اجازت دیں تو میں یہی بات اس سے اکیلے میں پوچھ لوں؟"

"اگر ہمارے سامنے پوچھ لیں تو کوئی حرج ہے؟" انسپکٹر نے کچھ تذبذب کا مظاہرہ کیا۔ میرے حوالوں نے اس کو مرعوب کر لیا تھا۔

"آپ میری تلاشی لے لیں۔" میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "میرے پاس کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔ جیسا چاہو تو

www.paksociety.com

تک نہیں ہے اور نہ کوئی ٹیپ ریکارڈر قسم کی چیز جس سے اصل
پولیس کے سامنے ہر بات نہیں بتائی جا سکتی۔ آپ لوگ
اپنے طریقوں سے پوچھیں تو اور بات ہے۔ رضاکارانہ طور
پر اپنی خوشی سے کوئی بھی کچھ نہیں کہتا۔ میرے سامنے وہ
بے خوف ہو کے بات کر سکتا ہے۔"

انسپکٹر کے قائل ہو جانے کے بعد شیخ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ "دیکھیے سکندر صاحب! میں نے آپ کو کتنی صفائی سے بچا لیا۔" وہ بولا۔ "اگر یہ اطلاع غلط ثابت ہوتی تو اتنی ہی صفائی سے میں آپ کو گرفتار بھی کر لیتا۔"

"تمہارے ایس ایچ او صاحب کے رویے سے ایسا لگتا ہے کہ تمہارا یہ کارنامہ انہیں پسند نہیں آیا۔" میں نے چلتے ہوئے کہا۔

"سکندر صاحب! اس محکمے میں فرض شناسی اور ایمانداری کسی کو پسند نہیں آتی۔" وہ بولا۔ "کچھ تو ہم بدنام ہیں کچھ ہماری بدنامی کی تشہیر زیادہ ہوتی ہے اور عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ پولیس کے سارے محکمے میں کوئی حلال کی کھانے والا یا اصول پرست اور فرض شناس نہیں ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ایک مچھلی سارے جل کو گندہ کرتی ہے۔ یہاں سارا جل اتنا گندہ ہے کہ کوئی مچھلی اس میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر میں نے مجرموں کو صرف گرفتار کیا ہوتا اور رپورٹ نہ لکھی ہوتی اور معاملات کو ایس ایچ او صاحب کے آنے تک اٹھا رکھتا تو میرے کارنامے سے وہ بہت خوش ہوتے۔ وہ بڑی خوش اسلوبی سے معاملات کا سودا کر لیتے۔ میں نے پہلے بھی کئی بار معذرت کے ساتھ اپنا حصہ لینے سے انکار کر دیا تو کسی نے تعریف نہیں کی تھی بلکہ سب پریشان ہو گئے تھے کہ کھانے لگی یہ ایماندار کہاں سے آن ٹپکا۔ یہ تو نہ خود کھائے گا اور نہ ہمیں کھانے دے گا۔ اکیلا چنا بھاڑ تو نہیں پھوڑ سکتا۔ میں نے کسی کی اصلاح کا بیڑہ نہیں اٹھایا ہے کیونکہ یہ میرے فرائض میں شامل نہیں ہے اور اس سے سروکار نہیں کہ دوسرے کیا کرتے ہیں، لیکن میں نے خود اپنے ساتھ اصولوں پر کبھی سودا نہیں کیا اور اپنے آپ سے کوئی بے ایمانی نہیں کی۔ جسے رشوت نہ ملتی ہو وہ رشوت کے قانونی، مذہبی اور اخلاقی پہلو پر سب کو لیکچر دے سکتا ہے لیکن کیا آپ یقین کریں گے کہ آج صبح میں نے ایک لاکھ روپے کمانے کا نادر موقع جانتے بوجھتے گنوا دیا۔ ایس ایچ او صاحب کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ ہوتا اور ایک لاکھ میرے اکاؤنٹ تک جمع ہو جاتے۔ اس بات کا گواہ کون ہوتا کہ میں نے ایک مجرم کو چھوڑ دیا۔ میں یہ کہہ سکتا تھا کہ [illegible] تھی اور مجرم بھی شاید نہیں تھا۔"

ہم دونوں ایک برآمدے کے درمیان [illegible] کر رہے تھے۔ "آپ کا مطلب ہے شیخ صاحب نے آپ کو ایک لاکھ روپے کی رشوت [illegible] تھی؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "اور آپ نے انکار کر دیا؟"

"ہاں۔" شیخ بولا۔ "اسی بات کا ملال [illegible] کو ملال ہے۔ ان کی نگاہ میں مجھ سے بڑا بے [illegible] شیخ انہوں نے مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش [illegible] نوجوان جذباتی اور احمق ہوں۔ اصول اور فرض [illegible] آدمی کا پیٹ نہیں بھرتے، سارا کھیل پیسے [illegible] جس کے پاس دنیا میں پیسہ نہ ہو وہ آدمی [illegible] جاتا ہے... انہوں نے حساب لگا کے [illegible] ایک لاکھ میری کتنے برسوں کی تنخواہ کے برابر [illegible] بھی کہ میں اپنی موجودہ تنخواہ میں سے بچا [illegible] ریٹائرمنٹ کی عمر تک بھی ایک لاکھ جمع نہ [illegible] مجھے ایک گھنٹے کے اندر اندر مل سکتے تھے۔ [illegible] میں تو اس عظیم شخصیت کا حقیر سا [illegible] نے کہا تھا کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند اور [illegible] سورج رکھ دیا جائے تب بھی میں سچ بولنے سے [illegible] رہ سکتا۔ میں نے ایف آئی آر بھی کاٹ دی [illegible] چراغ دین کے خلاف ایک جرم کا اضافہ [illegible] نے مجھے ایک لاکھ روپے رشوت کے طور پر پیش [illegible] تھی۔"

میں حیرانی سے اس نوجوان پولیس افسر کو [illegible] نے واقعی سخت ترین آزمائش میں بھی [illegible] چھوڑا تھا۔ اس عمر تک کسی نوجوان کو بن مانگے [illegible] بغیر ایک لاکھ روپے مل جائیں تو وہ بہت [illegible] ایک لاکھ سے دس لاکھ اور دس لاکھ سے ایک [illegible] اور اپنے لیے مسرت اور سارے خوابوں کی تعبیر [illegible] مگر یہ نوجوان اسی زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے [illegible] پولیس کی آمدنی کی [illegible] بڑے بڑے اصول [illegible] گر جاتے ہیں مگر وہ رزق حلال پر [illegible] خواہ اس کے لیے زندگی کی ہر خوشی چھین لی [illegible] پوچھا اس سے معاملہ کیا؟" مجھے تم سے [illegible] ہے شیخ! اگر میرے حالات کی آزمائش [illegible] کہہ سکتا تھا کہ ہم دوست بن سکتے ہیں۔"

شیخ ہنسا۔ "تم الٹی بات کہہ رہے ہو۔ حالات کی آزمائش میں جو دوستی پروان چڑھتی ہے وہی دوستی ہوتی ہے۔ معلوم ہے کل رات میں نے تمہیں اتنی آسانی سے دستخط کیوں کر دیے تھے؟ اس لیے کہ تمہاری صورت دیکھ کر مجھے اعتبار آگیا تھا۔ مخبری کرنے والے ایسے بات نہیں کرتے۔ وہ سودا کرتے ہیں۔ جتنی بڑی اسامی ہوتا ہے اتنا ہی بڑا انعام طلب کرتے ہیں۔ تم نے تو وہ نوٹ بھی اپنی جیب سے نکالے تھے۔ اگر تمہاری جگہ کوئی پیشہ ور مخبر ہوتا اور میری جگہ ایس ایچ او صاحب ہوتے تو صورت حال بالکل مختلف ہوتی۔ لاکھ میں سے پچاس ہزار روپے ایس ایچ او صاحب لے جاتے، باقی دوسرے لوگوں میں ان کی حیثیت کے مطابق تقسیم ہوتے تو مخبر کو بھی دس ہزار روپے مل جاتے۔"

"میں سمجھا تھا کہ ترقی پانے کے خیال سے تم فوراً راضی ہو گئے ہو گے۔" میں نے کہا۔

"ترقی؟" وہ تلخی سے ہنسا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ ڈی آئی جی صاحب مجھے تعریفی سند اور پانچ سو روپے کی گراں قدر رقم بطور انعام عطا کر دیں اور اخبار میں ان کی تصویر بھی آئے لیکن اب میرا یہاں سے ٹرانسفر یقینی ہو گیا ہے۔ شاید مجھے پھر کبھی کسی تھانے میں پوسٹ نہ کیا جائے کہ میں خطرہ بن جاؤں، بلکہ دفتر میں بیٹھ کر کلرکی کروں اور شوق سے رزق حلال کماتا رہوں۔ [illegible] خراب ہو جائے اس سے مل لو۔" شیخ نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "سات بجے وارنٹ اور مجسٹریٹ صاحب آ گئے تو مشکل ہو جائے گی۔" اس نے آہنی سلاخوں والے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا جو برآمدے کے آخری حصے میں تھا اور سنتری کے ساتھ کھڑے ہوئے سپاہی سے کہا کہ مجھے اندر جانے دیا جائے۔

چراغ دین گھٹنوں میں سر دیے فرش پر بیٹھا تھا۔ دروازے کا قفل کھلنے کی آواز پر اس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ سنتری مجھے تفتیش کرنے والا سی آئی اے کا کوئی افسر سمجھ کے دروازے سے الگ ہٹ گیا تھا۔

چند سیکنڈ تک میں اور چراغ دین پلک جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ خلاف توقع مجھے دیکھ کر چراغ دین مشتعل نہیں ہوا تھا اور مجھ پر حملہ کرنے نہیں دوڑا تھا۔ اس کا انداز شکست خوردہ اور مایوس نظر آتا تھا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "تم نے یہ کھیل کیوں کیا سکندر؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے دیوار کا سہارا لے کر اطمینان سے سگریٹ سلگائی۔ "میرا تم نے کچھ نہیں بگاڑا تھا۔"

"تم خود فوزیہ سے شادی کرنے سے انکار کر چکے تھے۔" وہ بولا۔

"فوزیہ کا نام یہاں مت لو۔" میں نے بڑی بے رخی سے اس کے لات رسید کی۔ وہ اس حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا اور ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ بیٹھا نہ رہ سکا۔ "اس معاملے کا فوزیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" میں نے پھر سکون سے کھڑے ہو کر کہا۔

چراغ دین گرا اور فرش پر پڑا لمبے سانس لیتا رہا۔ دہشت سے اس کی آواز بند ہو گئی تھی اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں مجھے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے میں فرشتۂ اجل ہوں۔ چند سیکنڈ بعد وہ سہمے ہوئے کتے کی طرح ہاتھوں اور پیروں کے بل اٹھا اور دیوار سے کمر لگا کے بیٹھ گیا۔ "پھر... پھر تم نے مجھ سے یہ دشمنی کیوں کی؟" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیا میرے باپ نے تم سے کوئی دشمنی کی تھی؟" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "جو کچھ تم نے کیا اس کے بعد تو میں تمہیں قتل بھی کر سکتا تھا لیکن میں تمہیں موت سے زیادہ سخت سزا دینا چاہتا ہوں۔ خوش قسمتی ہمیشہ آدمی کا ساتھ نہیں دیتی بلکہ اکثر تو انسان اپنی بدبختی کو بھی اپنی خوش قسمتی فرض کر لیتا ہے، جیسا کہ تم نے کیا۔ جب خوش قسمتی نے میرے باپ کا ساتھ چھوڑا تو اس نے تم جیسے لوگوں پر اعتماد کیا اور اپنے نوکروں کا نوکر بننے پر مجبور ہوا۔ تمہاری بدبختی کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ جس شخص نے تمہیں گرفتار کیا اسے تمہاری دولت بھی نہیں خرید سکی۔ خدا نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ پیدا کیا ہے۔ یہ پولیس آفیسر لاکھوں میں ایک تھا جس نے تمہارے ایک لاکھ روپے پر تھوک دیا۔ تم اسے دس لاکھ یا دس کروڑ دے کر بھی نہیں بچ سکتے تھے کیونکہ تمہارے لیے سزا کا وقت آ گیا تھا۔ سزا تو تمہیں اسی وقت مل جانی چاہیے تھی جب تم نے ٹھگ سے سازش کی تھی اور میرے والد کی دولت کا غبن کیا تھا مگر اس وقت تم بچ گئے تھے۔ تم اس دولت میں دن رات اضافہ ہوتے دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ تمہیں خیال ہی نہیں آیا کہ اسی تناسب سے تمہاری سزا بھی بڑھ رہی ہے۔ غبن کے الزام میں شاید تمہیں سال چھ مہینے کی سزا ہوتی۔ اب تمہیں سات سال کی سزا بھی ہو سکتی ہے، عمر قید بھی اور پھانسی بھی۔"

"تم اپنے باپ کے قتل کا جرم بھی مجھ پر عائد کرو گے؟" چراغ دین طنز سے بولا۔

www.paksociety.com

"نہیں۔ ان کی موت کو اب قتل ثابت کرنا مشکل ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "لیکن سلامت شاہ کے قتل کا الزام تم پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ تمہارا ساتھ دینے والا اب کوئی نہیں رہا۔ شیر دل صاحب تمہارا نام بھی سننا گوارا نہیں کریں گے۔ میں اور محسن سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم اپنا پیسہ اور اثر و رسوخ سب کچھ استعمال کر کے تمہارے خلاف ثبوت اور شہادت بھی لا سکتے ہیں۔ دنیا میں یہ سب کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ میرے باپ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا، اس لیے کہ وہ اکیلا تھا... لیکن یہ ہو سکتا ہے چراغ دین کہ میں سلامت شاہ کے قتل کا الزام تم پر عائد کرنے کے بجائے کچھ نہ کروں اور تم تختۂ دار تک پہنچنے سے بچ جاؤ۔ اس کے لیے تم دو سوالوں کے جواب دو گے۔"

"کون سے دو سوال؟" چراغ دین نے نظر اٹھا کے پُرامید لہجے میں کہا۔

"پہلا سوال یہ ہے چراغ دین کہ آخر میرے ابا نے سارے شہر کو چھوڑ کر تمہارے گھر میں ملازمت کیوں کی تھی؟" میں نے کہا۔ "ایسی نوکری تو وزیر خان کو ہر گھر میں مل جاتی۔ پھر وہ تمہارے پاس کیوں آیا جبکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ تم وہی ذلیل آدمی ہو جس نے سب سے پہلے اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپا تھا۔ اس دشمن کو اس نے کیوں قبول کیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم... قسم خدا کی مجھے معلوم ہوتا تو تم کو ضرور بتا دیتا۔" چراغ دین مردہ آواز میں بولا۔ "وہ میرے پاس آیا تو تباہ ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا سارا کاروبار ختم ہو چکا ہے اور وہ کوڑی کوڑی کا محتاج ہے۔"

"کیا تمہیں کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے تم سے جھوٹ بولا تھا؟" میں نے کہا۔ "کاروبار بدستور چل رہا تھا بلکہ بہت پھیل گیا تھا۔ اس کے تین پارٹنر ہو گئے تھے جن میں سے ایک میر شرافت علی تھا۔"

"وہی میر شرافت علی... جس کے قتل کا تم پر الزام ہے؟" وہ بولا۔

"ہاں وہی میر شرافت علی۔" میں نے کہا۔ "وزیر خان بھی آخری وقت تک قانونی طور پر ایک مالک تھا اور حسابات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے منافع میں سے جو حصہ ملتا تھا اس کی رقم کئی لاکھ تھی۔"

"ہو سکتا ہے تم جو کہہ رہے ہو وہ ٹھیک ہو لیکن میں کیسے تصدیق کرتا؟ اور مجھے کیا ضرورت تھی تصدیق کرنے کی؟ اس نے جو کچھ کہا، میں نے سچ مان لیا۔ میں فرض کر سکتا تھا کہ لاکھوں کا مالک میرے پاس نوکر بن کر آئے گا؟"

"تم نے میرے پہلے سوال کا جواب نہیں دیا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے میں دوسرا سوال کرتا ہوں۔ کیا اس لیے مروایا تھا کہ تم اس کے بچوں کو اپنے سپوت سمجھتے تھے؟"

اس سوال کا رد عمل ایسا تھا جیسے کسی نے منہ میں چنگاری پھینک دی ہو۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو، بکواس کرتے ہو... ذلیل..." وہ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور ایک گندی گالی نکل رہی تھی۔ میں نے اس کو ایک مکا رسید کیا اور وہ دور جا گرا لیکن وہ بھیڑیے کی طرح جست لگا کر آیا۔ میں نے زیادہ قوت سے ... رسید کیا لیکن اس دوران میں شور سن کر سپاہی اور ... چراغ دین کے دوسری بار اٹھنے سے پہلے ... اور سنتری نے دروازے کو مقفل کر دیا۔

"یاد رکھنا چراغ دین کہ تم نے میرے ... کا جواب نہیں دیا ہے۔" میں نے سلاخوں کے ... اور چل پڑا۔ دوسری طرف سے مجھے ایس ایچ او ... سب انسپکٹر شیخ بھی اپنی طرف بڑھتے ہوئے ... وہ سب خاصے پریشان تھے۔

چراغ دین اب دروازے کے پیچھے کھڑا ... مجھے دھمکیاں دے رہا تھا اور گالیاں بک رہا ... "او کے بچے... کمینے... بدمعاش... میں ... لوں گا۔ تیرا باپ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا ... ہے... تو سمجھتا ہے چراغ دین کو جیل ہو جائے گی، پاگل کے بچے... تجھے کیا معلوم چراغ دین ... کیا ہے؟ میرے پاس الہ دین کا وہ چراغ ہے ... دنیا غلام ہے... میرے پاس پیسہ ہے پیسہ..."

"تمہیں تو اس شخص کو پاگل خانے میں ... تھا۔" میں نے ایس ایچ او سے کہا۔ "جیل خانہ ..."

"ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے ... جانتے ہیں۔" ایس ایچ او ادھر آیا۔ "اب یہاں ... دفع ہو جاؤ۔"

دروازے پر کھڑا ہوا سنتری اس صورت ... بدحواس ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے تفتیش کے ...

بچے کی غلطی کی تھی اور وہ کھڑا ہو گیا تھا اور اب اسے معلوم نہیں تھا کہ میں نے اس قیدی کے ساتھ کیا بات کی تھی جس سے وہ اتنا مشتعل ہے۔ اسے ایس ایچ او کے تیور بھی خطرناک اور بدلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے مگر سب انسپکٹر شیخ نے صورت حال کو فوراً سنبھال لیا تھا۔

"چراغ دین!" شیخ نے سخت لہجے میں کہا۔ "اگر تم نے یہ ہنگامہ اور دیوانگی کا مظاہرہ جاری رکھا تو میں تم کو زنجیروں سے باندھنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

"تم یہاں میرے ساتھ سب کچھ کر سکتے ہو۔" چراغ دین نے چلاّ کے کہا۔ "لیکن عدالت میں تم میرا منہ بند نہیں کر سکتے۔ یہ مت بھولو کہ تم ایک معمولی سب انسپکٹر ہو، حاکم نہیں ہو۔ میں بڑے سے بڑا وکیل کر سکتا ہوں..."

اس سے پہلے کہ بات بڑھ جاتی، میں نے وہاں سے کھسک جانا مناسب سمجھا۔ ایس ایچ او کسی چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح تھا۔ درمیان میں اگر ایس ایس پی صاحب رضوی کا حوالہ نہ ہوتا تو مجھے وہ اسی وقت بند کر دیتا کہ میں نے حوالات میں قیدی کے ساتھ مار پیٹ کی اور تھانے میں فساد کا موجب بنا۔ شیخ تو ماتحت تھا اور اس کی حمایت سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ تھانے سے نکل کے میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا۔ اگر محسن اور رابعہ کے گھر پہنچنے کا امکان ہوتا تو میں واپس چلا جاتا اور باقی دن ان کے ساتھ رہتا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک ڈرافٹ بنوانے کے لیے نکل چکے ہوں گے۔ قرب و جوار میں ایسا کوئی ریسٹورنٹ نہیں تھا جہاں میں سکون سے بیٹھ کے کچھ سوچ سکتا۔ میں ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ میں سوچ رہا تھا کہ چراغ دین میرے دوسرے سوال پر کیوں بھڑک اٹھا تھا۔ کیا میں نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی؟ کیا مریم کے بارے میں قیاس آرائی میں حقیقت کو دخل تھا؟ محسن نے مجھے ایک سچا واقعہ سنایا تھا۔ اس کے باوجود میرا ذہن یہ تسلیم نہیں کرتا تھا کہ اندوہناک زندگی گزارنے کے لیے مریم جیسی عورت اور چراغ دین جیسا مرد ایک دوسرے کو سمجھتے ہوئے اور باعزت طور پر کامیاب زندگی گزارنے کے لیے اتنا غیر اخلاقی سمجھوتا کرنے پر مجبور تھے۔ مجبوری اگر کوئی تھی بھی تو نہیں تھی۔ چراغ دین نے اپنی مرضی سے ... مریم سے شادی کی تھی اور بقول مریم نے مشرقی عورت کی روایت پر عمل کرتے ہوئے والدین کی خوشی پر اپنی محبت کو قربان کر دیا تھا۔ کیا یہ بھی فریب خیال تھا؟ مریم نے والدین کی خوشی کو بہانہ بنا کے دولت مند چراغ دین کو قبول کر لیا تھا اور اپنے مخلص پرستار کو چھوڑ دیا تھا؟ بلاشبہ مریم اپنی فطرت کے اعتبار سے بہت مختلف تھی لیکن میرے لیے یہ تصور کرنا محال تھا کہ اس نے جانتے بوجھتے ایک ایسے شخص کے ساتھ نباہ کیا جو ہرگز اس کا شوہر کہلانے کے قابل نہ تھا۔ وہ اتنی گری ہوئی عورت بہرحال نہیں تھی۔ اگر حصول دولت ہی اس کا مقصد ہوتا تو شادی کے بعد وہ کسی بھی وقت الگ ہو سکتی تھی۔ ایک لاکھ کا حق مہر تو اس کا قانونی حق تھا مگر وہ چراغ دین سے ذہنی اذیت کا ہرجانہ بھی وصول کر سکتی تھی کیونکہ عدالت میں جانے بغیر چراغ دین اس کو سب کچھ دے دیتا۔ مریم کو عدالت میں جانے سے بھی کون روک سکتا تھا۔ میں نے چشم تصور سے مریم کے بچوں کو دیکھا جو اپنی ماں کے ساتھ ہی ابدی نیند سو چکے تھے۔

دو نمبر بس میں سوار ہونے کے بعد مجھے اچانک احساس ہوا کہ میرے دائیں اور بائیں ہاتھ پر کھڑے ہوئے مسافر ایک طرح سے مجھے نرغے میں لیے ہوئے ہیں۔ اگرچہ بس میں اتنی بھیڑ نہیں تھی کہ کھڑے ہونے والے آپس میں چپکنے پر مجبور ہوں لیکن وہ دونوں مجھ سے چپکے کھڑے تھے اور ان میں سے ایک اس پوزیشن میں تھا کہ مجھے بس سے دھکا دے دے اور دوسرا خنجر گھونپ کر چلتی بس سے کود جائے۔ ڈبل ڈیکر بس کی رفتار بہت زیادہ نہیں ہوتی مگر اتنی بڑی چیز کو فوراً روکا بھی نہیں جا سکتا۔ وہ شخص ذرا بھی پھرتی دکھاتا تو کسی کے تعاقب میں آنے سے پہلے غائب ہو جاتا۔ ان دونوں کی صورتوں پہ احساس جرم کی تحریر تھی یا میرے احساس کا کرشمہ تھا کہ میں نے ان کی نیت کو بھانپ لیا تھا۔ جسمانی طور پر وہ کسی طرح بھی مجھ سے کم نہیں تھے اور اگر ان سے براہ راست مقابلے کی نوبت آ جاتی تو کسی کو خبر ہونے سے پہلے میرا کام تمام ہو جاتا۔ ان کے اس قدر قریب ہونے کا مطلب بھی بہت واضح تھا۔ وہ جانتے تھے آزادی سے ہاتھ پیر استعمال کرنے کا موقع ملا تو میں آسانی سے دونوں کو چت کر دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے میرے لیے ہلنے کی جگہ بھی نہیں چھوڑی تھی۔ چند سیکنڈ میں وہ دونوں طرف سے میرے سینے میں خنجر اتار کے فرار ہو سکتے تھے۔ خنجر کو مہارت سے استعمال کرنے والوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات تو خود مرنے والے کو بھی پتا نہیں چلتا کہ کسی نے کب اور کیسے پیٹ چاک کر دیا اور یہ خنجر کی دھار کے علاوہ ہاتھ کی صفائی کا کمال ہوتا ہے۔

www.paksociety.com

خطرے کا احساس ہو جانے کے بعد میرا یہ خودکشی
کے مترادف تھا۔ شملہ پہاڑی پر بس نے موڑ کاٹا تو میں ایکدم
پیچھے کی طرف ہٹا اور عقبی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے مسافروں کی
گود میں جا لیٹا۔ ان میں سے ایک سفید ریش بزرگوار تھے
جن کے ساتھ کھڑکی والی سیٹ پر ان کی بیٹی یا بیوی بیٹھی تھی
ابھی ان کے منہ سے "شور دا پتر" ہی نکلا تھا کہ میں اٹھ کھڑا
ہوا لیکن اٹھتے اٹھتے میں نے دونوں ٹانگیں مخالف سمتوں
میں اس طرح پھیلائیں کہ خنجر آزمائی کے مناسب موقعے کا
انتظار کرنے والوں کے قدم اکھڑ گئے۔ میرے دونوں بوٹ
ان کے ٹخنوں پر بڑے زور سے لگے تھے اور اس سے دوسرے
پیر کی نلیاں بھی ہل گئی تھیں۔ دو سیٹوں کے درمیان مڑ کے
بل گرے ادھر بزرگوار کی بیٹی یا بیوی نے بھی واویلا شروع کیا
اور مجھے "مشٹنڈا بے شرم" کہا۔ میں نے الزام ذرا تیوری کو
دیا جس نے اتنی رفتار سے موڑ کاٹا۔ کنڈیکٹر نے ڈرائیور کی حمایت
کرتے ہوئے میرے الزام کی پرزور الفاظ میں تردید کی اور یہ سب
کچھ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہو گیا۔ میرے دشمن میری
چال کو سمجھ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے مشتعل کرنے
کے لیے بہت گندی سی گالی دی مگر میں نے مسکرا کے کہا: "معاف کرنا
پہلوان جی۔۔" مجھے معلوم تھا کہ ایک بار جھگڑا شروع ہو گیا
تو دونوں طرف سے لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس تنگ
جگہ میں جو افراتفری پھیلے گی اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے
ان دونوں میں سے کوئی اپنا کام کر جائے گا۔ میں پورے یقین
کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خنجر باز ہیں۔ ان کے پاس
ریوالور بھی ہو سکتا تھا۔ بس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ کودنے کی
صورت میں میری گردن یا ٹانگ ٹوٹنے کے امکانات ففٹی
ففٹی تھے۔ مزید یہ کہ وہ دونوں اٹھ کے پچھلے دروازے کے قریب
راستہ روک کر کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے ایک قدم ان کی
طرف بڑھایا اور پھر اچانک اگلے زینے پر چڑھ گیا۔ اوپری منزل
پر جگہ زیادہ تھی۔ عام طور پر کنڈیکٹر اوپر کسی کو کھڑا ہونے کی
اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس وقت بھی تمام سیٹیں بھری ہوئی
تھیں اور میں مایوس ہو کے واپس نیچے آنے کے لیے پلٹا ہی
تھا کہ ایک وقت دو مسافر اٹھے میں فوراً ان کی سیٹ پر بیٹھنے
کے لیے لپکا۔ نیچے وہ دونوں اب بھی دروازے میں کھڑے
تھے لیکن زینے کے اوپر لگے ہوئے گول شیشے میں مجھے دکھائی دیتا
ہوا اور کچھ چمکتے تھے۔ اس شیشے میں کنڈیکٹر کو اوپری منزل کی
ہر سیٹ صاف نظر آتی تھی۔ میرے ساتھ والی سیٹ خالی
پڑی تھی جب میں نے سر گھما کے دیکھا تو ان میں سے ایک

اوپر آ چکا تھا اور میں اسے اپنے ساتھ بیٹھنے سے نہیں روک
سکتا تھا۔ میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی چنانچہ
پہلے کی نسبت زیادہ نازک پوزیشن میں تھا۔
"کیا چاہیے تمہیں؟" اس شخص کی طرح میں نے
اپنے ظاہری سکون اور اعتماد میں فرق نہیں آنے دیا
"بھاگنے کی کوشش سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا"
میری طرف جھک کے آہستہ سے بولا اور لیجے مسکرایا
اس نے مجھ سے کوئی بہت پر لطف بات کی ہو۔ میں
مسکرا کے اسے دیکھا۔ خاصی دیر کے لیے اس کا ہاتھ
لگ گیا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے ریوالور کو تھوڑا سا باہر
اور مجھے ایک جھلک دکھا کے واپس اندر کر دیا۔
کسی نے بھی اس چھوٹے سے آٹومیٹک ریوالور کی
اور سفاک چمک کو نہیں دیکھا تھا۔ سڑک کے کنارے
ہوئے درختوں کی آگے بڑھ آنے والی شاخیں کبھی کبھی
ٹکرا رہی تھیں اور کچھ پتے اڑتے ہوئے اندر آ گئے۔ مجھے یوں
جیسے کسی نے میرے گال پر چانٹا مار دیا ہے۔ میدان
کر ان اچانک جاگ اٹھی۔ بائیں طرف پنسل کی
جیسی سلاخ نہیں تھی جو بس کے ایک کنارے سے
کنارے تک ہر کھڑکی کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی
کی موجودگی میں کوئی اپنا سر کھڑکی سے باہر نہیں نکال
ہر کھڑکی تقریباً ڈھائی تین فٹ لمبی اور سوا فٹ
اونچی تھی۔ تین شیشے جو ایک بار ٹوٹ گئے تھے دوبارہ
لگ گئے تھے چنانچہ میرے بائیں ہاتھ پر شیشے اور سلاخ کی
موجودگی کے باعث باہر نکلنے کا راستہ پیدا ہو گیا تھا۔
چلتی ہوئی ڈبل ڈیکر بس کی دوسری منزل سے
لگانا اقدام خودکشی کا سبب بن سکتا تھا۔ مقابلے کی
جان لینا تو دشمنوں کی خواہش کی تکمیل کے مترادف تھا۔
"یہ تو ظاہر ہے کہ تم مجھے جانے نہیں دو گے"
بھی آہستہ سے کہا۔ "تمہارے پاس ریوالور ہے تو
ہو گا اور تمہیں چلانا بھی آتا ہو گا۔ خیر ایک بات
کام کا معاوضہ کون ادا کرے گا وہ جس نے بلوایا ہے"
نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا۔ میرا مقصد بھی
کی دیر کے لیے اس کا ذہن اپنی ساری توجہ مجھ پر
کیونکہ میری نظریں ان درختوں پر تھیں جن کی شاخیں
بلند دیواروں کی طرح میرے قریب سے گزرتی جا رہی
میرے قاتل ہمسفر کو جواب سوجھا بھی نہ تھا
سے ایک درخت کی شاخ کو قریب آتے دیکھا

میں نے شاخ کو گرفت میں لے لیا۔ میرے جسم کو ایک جھٹکا
لگا اور میں بس سے باہر نکل کر ہوا میں معلق رہ گیا۔ اگر مجھ سے
جھپٹنے کے ارادے میں چند سیکنڈ کی تاخیر ہو جاتی تو دست گیری کے
لیے کھڑکی تک پہنچنے والی شاخ گزر جاتی اور میں سڑک پر گر کے
مر جاتا۔ اگلے روز کے اخبارات میں حادثے کی خبر کے علاوہ
میری خودکشی کی خبر بھی شائع ہو جاتی۔
بس تیزی سے آگے نکل گئی تھی۔ میری ٹانگوں پر کھڑکی
سے ٹکرا کر چوٹ آئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ جھٹکا بہت شدید
ہو گا اور اگر میں نے شاخ پر گرفت قائم رکھی تب بھی لاش
کی طرح نیچے گر دوں گا۔ اندیشہ یہ بھی تھا کہ جھٹکے سے میرا بازو
اتر جائے یا میں پیچھے آنے والی کسی گاڑی کی لپیٹ میں آ جاؤں۔
اچھے سے اچھا فٹ پاتھ زمین پر چلنے والوں کو بچا سکتا ہے
آسمان سے ٹپکنے والوں کو کیسے بچا سکتا ہے۔ جب میں نے خود
کو صحیح سالم حالت میں پکے ہوئے پھل کی طرح ڈال سے
لٹکا ہوا دیکھا تو۔۔۔ خدا کا شکر ادا کیا جس نے میری زندگی منظور
کی۔ اس کیفیت میں بھی میرے کانوں نے اس فائر کی آواز
سن لی تھی جو میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے مجھے
بدحواسی کے عالم میں کر دیا تھا۔ بس میں پہلے ہی ہنگامہ
بپا تھا لیکن اس ہنگامے کی خبر نیچے پہنچنے میں کچھ وقت
لگا اور جب ڈرائیور نے بس روکی تو میرے اور بس کے درمیان
سو گز سے زیادہ کا فاصلہ حائل ہو چکا تھا۔ شاخ بہت لچکدار
تھی ورنہ ٹوٹ بھی سکتی تھی۔ میرے وزن کو شاخ نے تقریباً
دوہرا کر دیا تھا اور میرے پیر زمین سے پانچ چھ فٹ اوپر رہ
گئے تھے۔ ہاتھ چھوڑتے ہی میں پیراشوٹ سے اترنے والے
کی طرح زمین پر پہنچا۔ بس میں سے فوراً ڈرائیور اور کنڈیکٹر یقیناً
بہت سے تماشائی بھی میری طرف بھاگتے چلے
آ رہے تھے۔ ان میں وہ بدمعاش بھی شامل تھا جو پچھلے
دروازے پر کھڑا تھا۔ اوپر والے کے بارے میں فرض کیا جا
سکتا تھا کہ مسافروں نے اسے قابو کر لیا اور اب وہ پولیس
اسٹیشن پہنچا دیا جائے گا۔ میں بے تحاشا بھاگا اور ایک زیر
تعمیر عمارت میں داخل ہو کر مال روڈ پر نکلا۔ وہاں سے پھر میں
نے ٹریفک کی پروا کیے بغیر سڑک پار کی اور
باغ جناح کے لیڈیز پارک میں گھس گیا۔ وہاں اس وقت
بھی سات سال سے دس سال تک کی لڑکیاں کھیل رہی تھیں۔
دائیں طرف ہوا
عمارت میں داخل ہو گیا جو دوسری طرف سے لمبے
چوڑے برآمدوں اور مخروطی چھت والی

عمارت تھی۔ عام حالت میں کوئی شخص جو ممبر نہ ہو اندر
قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا لیکن اس وقت وہاں ملازموں کے
سوا کوئی نہیں تھا جو معمول کے مطابق جھاڑ پونچھ اور آرائش
کے کام میں مصروف تھے۔ میں نے پہلے اس عمارت کو اندر
سے نہیں دیکھا تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد کمرے اور ہال تھے
مجھے تین ویٹر ٹائپ لڑکوں کو ناک آؤٹ کرنا پڑا جو مختلف
کمروں میں ملے کیونکہ وہ شور مچانے پر آمادہ تھے۔ میں نے
ان کو صوفوں کے پیچھے قالین پر اس طرح لٹا دیا کہ کوئی اندر
آ جائے تو اسے کچھ دکھائی نہ دے۔ وہ تینوں آدھے گھنٹے یا
زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے بعد اپنے پیروں پر کھڑے ہو
جاتے مگر یہ میں جانتا تھا۔ مجھے باہر نکلنے کے راستے یا سمت
کا کوئی اندازہ نہیں رہا تھا۔ اتفاق سے جو تیسرے کمرے میں
کوئی نہیں تھا اور یہ کمرہ کارنر کا تھا۔ میں نے دروازے اندر
سے بند کیے اور کھڑکی کے پردے ہٹا کر باہر دیکھا تو دو مشتعل
مزاج لوگ میرا پیچھا کرتے ہوئے مال روڈ تک آ گئے
تھے لیکن اب حیران پریشان کھڑے ہوئے دائیں بائیں گزرتی
ٹریفک کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں وہ دوسرا بدمعاش بھی تھا
جو بس کے پائیدان پر میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔ غالباً دوسرے
لوگوں کی طرح اس کو بھی یقین آنے لگا تھا کہ میں کسی رکشا
یا ٹیکسی میں نکل گیا ہوں۔
دس منٹ بعد سب لوگ واپس جا چکے تھے۔ یہ سوچ
کر میں بہت محظوظ ہوا کہ جب بس دوبارہ روانہ ہوئی ہو گی تو
مسافروں کے درمیان اس سنسنی خیز واقعہ پر کیا کیا تبصرے نہ
ہوئے ہوں گے۔ جتنے منہ ہوں گے اتنی ہی باتیں۔ شاید کچھ
لوگوں نے یہ بھی کہا ہو کہ میں سرکس کا بازی گر تھا یا کوئی بہت
خطرناک قسم کا مجرم۔ میں یہ بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ فائر
کرنے والا اگر پکڑا نہیں گیا ہو گا تو اس ریوالور کی مدد سے لوگوں
کو دہشت زدہ کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہو گا اور
عین ممکن ہے کہ وہ فائر اس نے مجھ پر نہ کیا ہو لوگوں کو خوف زدہ
کرنے کے لیے کیا ہو۔ میرے حق میں بھی یہی بہتر تھا کہ وہ
فرار ہو جائے ورنہ پولیس والے مار مار کے اس سے پوچھ
لیں گے کہ وہ خود کون ہے اور جس پر اس نے گولی چلائی تھی
وہ کون تھا۔ اگر ڈپٹی سلوا یا چوہدری ملا مسعود نے ان کو بھیجا ہو گا
تو اسے میری تصویر دکھائی ہو گی یا بتایا ہو گا کہ میں کہاں ملوں
گا۔ ان کا ناکام لوٹ جانا خود ان کے حق میں بھی بہتر تھا۔
وہ ایک بار اور کوشش کرنے اور کامیاب ہونے کا دعویٰ
کر کے بچ سکتے تھے لیکن ان کا پولیس کے ہاتھوں میں پڑ

www.paksociety.com

جانا ڈی سسلوا اور چوہدری حلاوی کو بہت مہنگا پڑتا۔ یا تو وہ انہیں نقد معاوضہ ادا کر کے چھڑا لینے پر مجبور ہوتے یا [illegible] کی صورت میں ان کا خاتمہ کرتے۔

اب مجھے اس کمرے سے کھڑکی کے راستے باہر جانا تھا۔ جانے سے پہلے میں نے ایک گوشے میں رکھا ہوا فریج کھولا کیونکہ پیاس سے میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ پھر مجھے فریج کے اندر بہت اعلیٰ قسم کی فیرنی کے پیالے نظر آئے۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے پیالے جو ایک دوسرے کے اوپر اٹھا کر رکھ دیے گئے تھے۔ میں نے پیالوں کے تین جوڑے صاف کیے ان کو پھر اسی طرح رکھا اور باہر آ گیا۔ باہر زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی لیکن میری نگاہ ہر اجنبی صورت کو دیکھتی جا رہی تھی۔ میں مصنوعی آبشار کے پاس سے گزرا اور اوپن ایئر ریسٹورنٹ کے پاس سے گھوم کے سیدھا چلنے لگا۔ میرے بائیں ہاتھ پر مسجد اور سبزہ زار تھے اور اس سے ذرا آگے پہاڑی کے اوپر کہیں اوپن ایئر تھیٹر تھا جو درختوں کے حصار میں پیچھے سے دکھائی بھی نہ دیتا تھا یہ درخت سڑک کے دونوں کناروں پر کسی جنگل کی طرح اگے ہوئے تھے اور بہت پرانے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس باغ میں علم نباتات کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے وہ سب درخت لگائے گئے تھے جو یہاں کی آب و ہوا میں پرورش پا سکتے تھے۔ ہر درخت پر ایک چھوٹی سی تختی لگی ہوئی تھی جس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ یہ عام فہم زبان کے نام نہیں تھے بلکہ بوٹنی کے انتہائی مشکل لاطینی نام تھے۔ شام کو اس سڑک پر تفریح کے لیے آنے والوں کا ہجوم ہوتا تھا مگر اس وقت پورے باغ پر ایسی خاموشی اور ویرانی کا تسلط تھا کہ فضا بھی سوئی سوئی سی لگتی تھی۔ چڑیا گھر کے جنگلے میں تیرتی ہوئی بطخوں پر نظر ڈالتا ہوا میں اس گنبد نما مزار کے پاس سے گزرا جہاں ہر جمعرات کی شام قوالی ہوتی تھی اور مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا اہتمام کسی خاتون کی طرف سے ہوتا ہے۔ میں اپنے خیالات میں محو تھا اس کے باوجود میں نے اچانک اپنے پیچھے نمودار ہونے والی گاڑی کی آواز سنی۔ چڑیا گھر کے دروازے کے سامنے دو چار گاڑیاں اس وقت بھی کھڑی تھیں اور کچھ لوگ بیوی بچوں کے ساتھ ٹکٹ لے کر اندر جا رہے تھے۔ مجھے متوجہ کرنے والی انجن کی غیر معمولی آواز تھی کیونکہ مال روڈ کی طرف سے آنے یا جانے والے سڑک کے اس مختصر حصے میں تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کرتے جہاں ہر وقت بچے موجود رہتے ہیں۔

چنانچہ میں نے مڑ کے دیکھا کہ اتنی تیزی سے گاڑی چلا کر ---- کون سا ناٹک ہو رہا ہے اور بالکل آخری وقت پر مجھے کسی خونخوار جانور کی طرح چنگھاڑتے [illegible] اس کے ریڈی ایٹر کے سامنے کی جالی کسی خونخوار [illegible] کے جبڑوں کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور [illegible] میں اس کی سفاک آنکھوں کی چمک دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے خود بخود ایک زبردست چھلانگ لگا دی اور [illegible] گرا۔ گاڑی تقریباً میرے جسم کو چھوتی ہوئی گزری اور ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ میرے کانوں میں شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی اور اس کے ٹکڑے میرے آس پاس بکھرے۔ میں گرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور بے اختیار میری نظر اندر گئی۔ گاڑی کے اندر وہی دونوں موجود تھے جو میرے ساتھ تھے۔ ڈرائیونگ وہ شخص کر رہا تھا جو تعاقب میں دوڑا تھا۔ اتنی دیر میں اس نے گاڑی کو پیچھے کر لیا تھا۔ گاڑی درمیان میں سے دب گئی تھی ریڈی ایٹر کے ٹوٹنے سے سارا پانی بہہ گیا تھا۔ دونوں لائٹس کے چکنا چور ہو جانے کے بعد گاڑی کسی زخمی اندھے حیوان کی طرح لگتی تھی لیکن درخت سے ٹکرانے کے بعد بھی اس کا انجن بند نہیں ہوا تھا۔ میں جانتا تھا ریڈی ایٹر کے انجن کو ٹھنڈا رکھنے والے پانی کے بغیر یہ گاڑی صرف چند منٹ چل سکے گی۔ پھر اس کا انجن گرم ہو کے جل جائے گا۔ میں بے تحاشا بھاگا لیکن [illegible] کے بجائے میں نے اس طرف جانا بہتر سمجھا جہاں آلو چھولے، چنے چاٹ اور آئس کریم بیچنے والے تھے۔ سب سے کھڑے ان سب نے گاڑی کو درخت سے ٹکراتے دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ حادثہ ہے چنانچہ وہ مدد کے لیے بڑھے پھر انہوں نے گاڑی کو میرے پیچھے یوں آتے دیکھا جیسے کتا کسی خرگوش کے پیچھے دوڑتا ہے۔ وہ سب بھی اپنی جان بچانے بھاگے۔ مجھے یہ علم تھا کہ دونوں شکاریوں میں سے کم از کم ایک کے پاس یقیناً ریوالور ہے۔ میں نے گولگپے اور دہی بڑے کی دو ریڑھیوں کے درمیان راستہ بنایا اور گزرتے گزرتے تیسری ریڑھی کو دھکا دیا۔ میں نے اپنے پیچھے ایک ہنگامہ سنا۔ کار سے ٹکرا کر ریڑھیاں الٹ گئی تھیں اور سارا مال سڑک پر پھیل گیا تھا۔ ریڑھی کے مالک چلا رہے تھے اور ان کی آواز پر لوگ ہر طرف سے جمع ہونے لگے تھے۔ میں نے مڑ کر پلٹ کر دیکھا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ گاڑی جواب دے چکی تھی۔

تھی۔ وہ دونوں اب لوگوں کے نرغے میں آ چکے تھے مشتعل لوگوں نے ڈرائیور کو باہر گھسیٹ لیا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے اچانک ریوالور نکال لیا اور ایک ہوائی فائر کیا۔ لوگ واپس بھاگے۔ چڑیا گھر کے دروازے پر موجود بچوں نے چیخنا شروع کیا اور اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر ریوالور والا میری طرف دوڑا لیکن میں اس وقت تک ایک درخت کے پیچھے پناہ لے چکا تھا۔ دوسری گولی درخت کے تنے میں پیوست ہو گئی پھر کسی نے پیچھے سے پتھر مارا جو اس کے سر پر لگا اور وہ ذرا سی دیر کے لیے چکرا گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور ایک جست میں اس کے اوپر جا پڑا۔ میرے پاؤں کی ٹھوکر اس کے گھٹنے پر پڑی اور وہ ایک چیخ مار کے نیچے گر گیا۔ اس کے گھٹنے کی ہڈی یقیناً ٹوٹ چکی تھی اور وہ درد سے بلبلا رہا تھا۔ لوگوں نے اس کے ساتھی کو نہیں چھوڑا تھا۔ اب کچھ لوگ میری طرف آئے۔ میں نے جوڈو یا کراٹے کا مظاہرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ایک عام آدمی کی طرح اس شخص کو گلے مار کے زمین پر گرا لیا۔ ذرا سی دیر میں وہ بھی اسیر ہو گیا۔ اسیر کرنے والے وہی تھے جن کا مالی نقصان ہوا تھا۔ گولگپے اور دہی بڑے جو ان کو رات تک فروخت کرنے تھے ضائع ہو گئے تھے اور ان کی ریڑھیاں بھی ٹوٹ گئی تھیں۔ اگر ان کو نقصانات کی تلافی کا خیال نہ ہوتا تو شاید وہ مشتعل ہجوم ان دونوں کو مار ڈالتا جس میں متاثر ہونے والے افراد کے علاوہ دیگر ہم پیشہ اور کچھ جوشیلے تماشائی بھی شامل ہو گئے تھے۔ ایک بڈھے نے جو لنگی باندھے ہوئے تھا دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کیا کہ اب میں نئی ریڑھی کہاں سے لاؤں گا اور کاروبار کیسے شروع کروں گا۔ کسی اور نے تسلی دی کہ بابا! نقصان تو ان کا باپ بھی پورا کرے گا۔

کار کو میرے پیچھے آتے اور مجھے جان بچا کر دوڑتے سب نے ہی دیکھا تھا۔ اب وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کیا چکر ہے؟ میں نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے مجھے کار سے کچلنے کی کوشش کیوں کی تھی۔ میں تو ان کی صورت سے بھی آشنا نہیں ہوں۔"

"کوئی بات تو ضرور ہو گی۔" ایک نوجوان نے کہا جو لوگوں کے بیچ کھڑے ہوتے ریوالور کی حفاظت کر رہا تھا اور پولیس کے آنے سے پہلے کسی کو ریوالور اٹھانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ وہ کچھ قانونی ذہن کا مالک تھا۔

"یہ تو انہی سے تھانے جا کر پوچھا جائے گا۔" میں نے کہا۔ اسی وقت ایک پولیس مین نمودار ہوا جسے غالباً چیئرنگ کراس سے لایا گیا تھا۔ مختلف لوگوں نے اپنی اپنی آوازوں میں چلا کے اس سنسنی خیز واقعے پر اظہار خیال کیا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا پاؤں۔ میں اس وقت تھانے جا کر کسی نئی مشکل میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔

"یہ ضرور تمہارے کوئی دشمن ہوں گے۔" پولیس مین نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "ایسے ہی راہ چلتے لوگوں پر تو کوئی گاڑی نہیں چڑھاتا۔"

"قسم خدا کی حوالدار صاحب! میں تو ان کا نام بھی نہیں جانتا۔" میں نے سچ بولتے ہوئے کہا۔

"تھانے چلو سب معلوم ہو جائے گا۔" سپاہی نے دھمکی کے انداز میں سر ہلایا۔ "تمہارا اپنا نام کیا ہے؟"

"میں... میرا نام ہے جی..." میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے سوچتے ہوئے کہا۔ "منشی قلندر بخش حیران امرتسری۔ امرتسر کا رہنے والا ہوں اور حیران تخلص کرتا ہوں۔"

کسی کے کچھ اور کہنے سے پہلے مجمع کو چیرتا ہوا ایک معزز شخص آگے آیا۔ "میری گاڑی وہاں سے کس نے ہٹائی ہے؟" وہ رعب دار لہجے میں بولا۔ پھر اس نے حیرت زدہ لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے پیچھے سے گاڑی کا جائزہ لیا۔ "اوہ... مائی گاڈنس۔ اس کا تو بیڑہ غرق ہو گیا ہے۔ کس کی حرکت ہے یہ؟"

صورت حال لوگوں پر واضح ہو چکی تھی مگر وہ بتا رہا تھا کہ اس نے اپنی گاڑی چڑیا گھر کے دروازے پر کھڑی کی تھی اور اپنی فیملی کے ساتھ اندر چلا گیا تھا۔ باہر نکلنے پر اسے گاڑی نظر نہ آئی تو پوچھنے پر لوگوں نے مجمع کی طرف اشارہ کیا جو کار کو گھیرے کھڑا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ فرار ہونے کے لیے اس سے بہتر موقع نہ ملے گا۔ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے تھے۔ گاڑی والا اپنی تباہی کو رو رہا تھا تو ریڑھی والا اپنی بربادی کو اور لوگ میری طرف متوجہ نہیں رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا اور اس حلقے سے نکل گیا۔ سڑک پر ایک ٹیکسی والا ایسا بھی تھا جو اس سارے تماشے سے بے نیاز اسٹیئرنگ پر سر رکھے سو رہا تھا۔ میں نے جھنجھوڑ کر اس کا کندھا ہلایا اور کہا۔ "کرشن نگر۔" ذرا تیوری سے ادھ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور ایک خودکار عمل کے تحت انجن اسٹارٹ کر کے روانہ ہو گیا۔ طویل فاصلے کی سواری مل جانے کے بعد اس کے اعتراض کرنے یا تیوری چڑھی رکھنے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔ مال روڈ والے گیٹ پر پہنچ کے میں نے پیچھے دیکھا۔ مجمع ابھی تک میری عدم

www.paksociety.com

موجودگی سے بے خبر تھا۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور ٹیکسی کی سیٹ سے پشت لگا کے اپنا سر پیچھے رکھ لیا۔ ٹیکسی مال روڈ پر سے گزر رہی تھی اور ٹیکسی والا پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر جلائی اور اپنے منتشر خیالات کو منظم کیا۔ اس وقت اگر میں نے حاضر دماغی سے کام نہ لیا ہوتا تو وہ دونوں بدمعاش میرا کام تمام کر جاتے۔ جو اب گرفتار ہو چکے تھے۔ اب وہ جانیں اور پولیس جانے۔ سکندر بخت کچھ نہیں جانتا۔ اس نے تو آج باغ جناح میں قدم بھی نہیں رکھا۔ ان دونوں بدمعاشوں نے بھی حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے مقابلہ نہیں کیا تھا اور خاموشی اختیار کر لی تھی۔ تھانے پہنچ کر وہ پولیس کی پناہ میں آجائیں گے تو پبلک کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ شاید وہ سکندر بخت کا نام بھی نہیں لیں گے۔ ان کو اس مشن پر بھیجنے والے معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کر لیں گے۔ گاڑی والے کا نقصان پورا کر دیا جائے گا اور ضروری ہوا تو ریڑھی والوں کا بھی۔ پھر یقین کو عدالتی چکروں سے بچانے اور رپورٹ لکھے بغیر فیصلہ کرنے کا جو نذرانہ کوتوال صاحب لیں گے وہ ان کی مرضی اور خوشی کے مطابق ادا ہو جائے گا تو جھگڑا کہاں رہے گا۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر کرشن نگر کہہ دیا تھا لیکن ٹیکسی کرشن نگر پہنچی تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس وقت سے فائدہ اٹھاؤں۔ میں نے ٹیکسی شوری بلڈنگ کے پاس رکوائی۔

انعام کیمسٹ کی دکان تلاش کرنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ انعام تقریباً پچاس سال کا صحت مند اور شکل سے چالیس سال کا نظر آنے والا اسمارٹ آدمی تھا۔ اپنا اصل نام بتاتے بتاتے میں ایک اور خیال سے رک گیا۔ فوری طور پر مجھے دوسرا کوئی نام نہ سوجھا۔

"میں منشی قلندر بخش حیران امرتسری ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ کے بھائی غلام علی مرحوم میرے دوست تھے۔"

میرے مضحکہ خیز نام سے جو مسکراہٹ انعام کے چہرہ پہ نمودار ہوئی تھی وہ غلام علی کے ذکر پر کافور ہو گئی۔ "تشریف رکھیے حیران صاحب!" اس نے ہاتھ ملا کر مجھے کاؤنٹر کے پیچھے بلا لیا اور خود بھی میرے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"غلام علی اور میں پی ڈبلیو ڈی میں ایک ساتھ کام کرتے تھے۔" میں نے کہا۔ "اور ایک ساتھ ایک ہی جرم میں نکالے گئے تھے یعنی ایمانداری کے جرم میں۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے۔"

"بھائی صاحب مرحوم نے کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا تھا۔" وہ بولا۔

"دراصل ان کو تو ایک فرم میں بڑی اچھی ملازمت مل گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "میں نے بہت ٹھوکریں کھائیں۔ عرصے سے مشرقی پاکستان میں بھی رہا۔ مجھے کل ہی ان کی وفات کا علم ہوا۔ انھوں نے کئی بار آپ کا ذکر کیا تھا۔ بس اتفاق ہی کہ ملاقات ہوئی بھی ہے تو تعزیت کی خاطر۔"

اتنے مستند حوالوں کے بعد انعام کے لیے شک کی گنجائش نہ رہی۔ اپنے حالات تو مجھے خود غلام علی سنا چکے تھے۔ انعام نے دو لڑکوں کو کہا کہ لڑکے کو چائے وغیرہ لینے بھیجا جو ابھی زیر تربیت ملازم تھا۔ میں نے اپنی گفتگو میں میرز پرانڈ کمپنی کا ذکر بھی کیا۔ انعام نے کہا کہ وزیر خان مرحوم تو غلام علی کے لیے آدمی کیا ہم میں فرشتہ ثابت ہوئے تھے۔ ایسی باتوں کے دوران وہ مجھے مسلسل حیران صاحب کہہ کے مخاطب کرتا رہا اور جتنی باتیں غلام علی نے مجھے اپنے بارے میں بتائی تھیں ان کے ذکر سے میں نے ثابت کر دیا کہ ہم واقعی ایسے دوست تھے جن سے ایک دوسرے کی زندگی کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے عرض مدعا کی۔

"میرے حاضر ہونے کا ایک اور بھی مقصد تھا انعام صاحب۔" میں نے کہا۔ "مشرقی پاکستان سے آنے کے بعد میں مکان کے سلسلے میں بہت پریشان ہوں۔ کاروبار تو اللہ کے فضل سے اچھا چل رہا ہے۔"

"آپ کا کیا کاروبار ہے؟" انعام نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"میں کنسٹرکٹر ہوں۔" میں نے کہا۔ "جنرل آرڈر سپلائر۔ سرکاری محکموں کو ہر قسم کے سامان کی فراہمی کے ٹھیکے لیتا ہوں۔ تاہم ابھی اپنا ذاتی مکان خریدنے کی استطاعت نہیں۔ پہلے ایک مکان کا آدھا حصہ کرائے پہ لیا تھا۔ باقی آدھے حصے میں بڑے غلط قسم کے لوگ رہتے تھے۔ اب آپ کو کیا بتاؤں... بڑے غلط دھندے تھے ان کے۔ دوسرا مکان لیا ہے تو مالک مکان بڑا خود دماغ ملا ہے کہ آزادی سے سانس بھی نہیں لینے دیتا۔ خود نیچے رہتا ہے تو مجھ سے توقع رکھتا ہے کہ ہم چلتے وقت بھی فرش پر قدم نہ رکھیں کیونکہ اس سے دھمک پیدا ہوتی ہے۔ جس سے اس کی دوسری بیوی کو درد سر اور تیسری بیوی کو اختلاج ہونے لگتا ہے۔ بچوں کو کھیل نہیں ٹھوکنے دیتا۔ اب کپڑے ہوا میں معلق کر تو نہیں سکتا میں جادوگر نہ ہوتا۔"

انعام بے ساختہ ہنسا۔ "یہ تو بالکل بجا ہی ہو گا جھگڑا۔ جگہ اسی طرح چلتا ہے۔ اب ایک مکان تو ہے۔ وہ بھی نذرانہ ہے۔ لیکن نذرانہ ہے مطلب ہے اس کا کرایہ کچھ سوچ لیجئے۔ شاید میرے کہنے سے سات یا ساڑھے آٹھ سو روپے ہو جائے کیونکہ مالک مکان ایک بیوہ عورت ہے۔ بہت کیا میری پہچان ہے۔ وہاں آپ کو اس قسم کا کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا۔"

"مجھے اور کچھ نہیں چاہیے انعام صاحب۔" میں نے کہا۔ "اس وقت تو میں ہزار روپے کرایہ بھی دوں گا گویا قید خانے میں ہوں۔ یہ بتائیے کرایہ ایڈوانس کی رقم کتنی ہو گی؟"

"ایڈوانس کیا حیران صاحب!" انعام بولا۔ "آپ تو بھائی کے دوست ہیں اور کوئی ہوتا تو میں کرایہ نامہ وغیرہ بھی بھرواتا لیکن یہ بتائیے آپ اکیلے ہیں؟"

"خدا نہ کرے دنیا میں کوئی اکیلا ہو۔" میں نے کہا۔ "ایک مفلوج خالہ ہیں اور ان کی بیٹی ہے۔ ایک چچی ہیں اور چچا زاد بھائی بہن ہیں۔ یہی ہے اپنا کل خاندان۔"

"یعنی آپ کے اپنے والدین اور بھائی بہن یا بیوی بچے نہیں ہیں؟" انعام نے کہا۔

"شادی ابھی نہیں کی۔" میں نے کہا۔ "والدین اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بہن بھائی تھے ہی نہیں۔ ایک چچی اور خالہ بھی بیوہ ہیں چنانچہ ہم سب مل کے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے ہیں۔"

انعام نے سیلز مین کو دکان کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور خود میرے ساتھ چل پڑا۔ تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ پیدل طے کرنے کے بعد ہم ایک گلی میں مڑ گئے۔ انعام نے مجھے ایک منٹ انتظار کرنے کے لیے کہا اور خود ایک گھر میں گھس گیا۔ جب وہ باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں ایک چابی تھی۔ ہم نے کچھ اور فاصلہ طے کیا اور تقریباً اس جگہ جا پہنچے جہاں پہلے اور نمبر کا آخری اسٹاپ تھا۔ وہ مکان گلی کے آخر میں تھا۔ اس کے بعد کھیت شروع ہو جاتے تھے جن میں سبزیوں کی کاشت ہو رہی تھی۔ مکان میری توقع سے زیادہ بڑا نکلا۔ اس کی وسعت کو دیکھتے ہوئے آٹھ سو روپے کرایہ بہت کم کرایہ تھا لیکن اس کی وجہ شہر سے دوری تھی۔ یہی مکان کسی گلبرگ یا ماڈل ٹاؤن یا کسی نئی آبادی میں ہوتا تو ڈیڑھ ہزار سے کم کرایہ نہ ملتا لیکن ہمارے نقطہ نظر سے یہ مکان بہترین تھا۔ اس میں ہم سب کے لیے جگہ تھی۔ یہاں ہم گمنام رہ سکتے تھے اور ایک طرف کھلے کھیت جہاں صحت بخش ہوا کا انتظام کرتے تھے وہاں ہنگامی حالت میں فرار کے راستے بھی مہیا کرتے تھے۔ انعام کچھ تذبذب کا شکار تھا۔ ایک طرف مکان اس کی بیوہ بھابھی کا تھا جسے وہ زیادہ سے زیادہ کرایہ دلوانے کا آرزو مند تھا۔ دوسری طرف اس کے مرحوم بھائی کا دوست تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اتنے کرائے پہ میں آمادگی سے انکار کر دوں لیکن میں نے لیا۔ اسے ایک ماہ کا کرایہ ایڈوانس ادا کر دیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ ہم انتہائی دوستانہ اور خوشگوار ماحول میں واپس ہوئے تو مکان کی چابی میری جیب میں تھی اور میں بہت مطمئن تھا کہ ایک بہت بڑا مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا۔

شام چار بجے میں نے کرشن نگر سے رکشا لیا جس نے مجھے پونے پانچ بجے صدر پہنچا دیا۔ رابعہ اور محسن روانگی کے لیے تیار تھے۔ میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ شہلا اکیلی رہ جانے کے خیال سے کچھ افسردہ تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ صبر اور انتظار کی آزمائش کا زمانہ بہت جلد ختم ہو جائے گا اور یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ ایک دو روز میں ہم سب دوسرے بہت بڑے کشادہ اور آرام دہ مکان میں منتقل ہو جائیں گے۔ اس کے بعد کوشش کریں گے کہ گلبرگ کا سامان بھی نکال لائیں اور اسے کوئی حسب حیثیت بھی فراہم کر دیں۔ رابعہ کی گاڑی پچھلے والی گلی میں کھڑی تھی۔

"تمہاری یہ گاڑی بہت خطرناک ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک تو اس کا رنگ بہت نمایاں ہے پھر اس کا حلیہ۔"

"شاید آپ کو یاد نہیں رہا کہ حلیہ بگاڑنے کا کارنامہ آپ نے ہی سرانجام دیا تھا۔" رابعہ خفگی سے بولی۔ "اب اسے خطرناک کہتے ہو؟"

میں ہنسا۔ "برا ماننے کی تو کوئی بات نہیں بی بی! جو خطرناک ہے وہ خطرناک ہے اور جو محض ناک ہے وہ محض ناک ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ گاڑی کا رنگ اور حلیہ بدلا جائے یا گاڑی بدلی جائے کیونکہ ہر جگہ یہ گاڑی تمہاری پہچان بن جاتی ہے۔"

"یہ کیا فضول بات پر لڑنا شروع کر دیا ہے اس وقت۔" محسن نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ سارا دن کہاں جھک ماری۔ میں نے تھانے فون کیا تھا تو کسی نے کہا کہ چلے گئے۔"

"تھانے میں چراغ دین سے بڑی دلچسپ ملاقات ہوئی۔" میں نے کہا اور ان کو اول تا آخر ہر بات بتا دی جسے سن کر دونوں خاصے متفکر اور پریشان نظر آنے لگے۔

"اس کا مطلب ہے کہ اب وہ لوگ اصلی حلیوں پر آ گئے ہیں۔"

www.paksociety.com

محسن نے کہا۔ "اور یہ بھی فیصلہ کر چکے ہیں کہ سکندر بخت کو ختم کر دیا جائے۔ ان کی دی ہوئی مہلت بھی ختم ہو چکی ہے۔"

"ہاں اور انہیں یقین آ چکا ہے کہ میں ان کی شرائط قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" میں نے کہا۔

"پھر اس صورت میں تم کہیں بھی محفوظ نہیں ہو سکندر!" رابعہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "تم شہلا کی طرح گھر کی چھت کے نیچے نہیں بیٹھ سکتے اور سڑک پر ایک آدمی کی جان لینا ان جیسے لوگوں کے لیے کیا مشکل ہے۔"

"اسی لیے میں نے کہا تھا کہ میرے تحفظ کی ضمانت صرف ایک صورت میں ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "یعنی حسب تاموں کا ایک پورا سلسلہ مرتب کیا جائے اور اس کی اطلاع دشمنوں تک پہنچا دی جائے کہ خدانخواستہ مجھے کچھ ہوا تو محسن میرا وارث ہوگا۔ محسن کے بعد رابعہ... رابعہ کے بعد شہلا... صرف اسی ترکیب سے دشمن پر یہ واضح کیا جا سکتا ہے کہ وہ یہ جان کا ایک نہیں ان گنت وارث ہیں اور جو بدی والا دولت کے بوجھے کا ... پر بلاشرکت غیرے قبضہ کرنے کا جو منصوبہ بنایا ہے وہ ایک سکندر کے نہ ہونے سے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بلا مقصد کوئی قتل نہیں کرتا اور انہیں اپنے مقصد میں کامیابی کی امید نہیں رہے گی تو وہ مجھے راستے سے ہٹانے کا خیال بھی چھوڑ دیں گے۔ انہیں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔ وہ نئی شرائط پیش کریں گے یا مصالحت کا کوئی اور فارمولا تلاش کریں گے... جان بچانے کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میری ضمانت منسوخ ہو جائے اور میں جیل چلا جاؤں۔"

"جو لوگ ہسپتال کے اندر پہنچ سکتے ہیں اور قتل کر سکتے ہیں وہ جیل میں بھی تمہیں مروا سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"جیل کے اندر خصوصی انتظامات کیے جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس میں رضوی صاحب کے تعلقات کام آ سکتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ جہاں پھانسی پانے والے مجرموں کو رکھا جاتا ہے وہاں کوئی آسانی سے نہیں پہنچ سکتا۔"

"یہ کیسی باتیں کرتے ہو تم؟" رابعہ نے دہشت زدہ ہو کے کہا۔ شاید اسے خیال آ گیا تھا کہ مجھ پر بھی قتل کا الزام ہے اور قاتلوں کی آخری منزل کال کوٹھری ہوتی ہے جو عدم آباد کی سرحد پر واقع ہوتی ہے۔ خوف سے اس کی آواز کانپ رہی تھی اور اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔

جب میں نے تسلی دینے کے لیے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو اس کا ہاتھ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

"تم سے کس نے کہا ہے کہ وصیت نامہ ... ناقابل عمل ہے۔ مجھے دو چار دن کی مہلت ... صاحب مل کر سب کر لیں گے۔ رجسٹریشن کے بعد ... ناموں کی ایک ایک نقل ان لوگوں کو پہنچا دی جائے ..." محسن نے کہا۔

"اچھا اچھا... میں تمہیں خوف زدہ نہیں کر رہا تھا۔" میں نے رابعہ کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ "... تو زندہ لاشیں رہتی ہیں اور ظاہر ہے ایسی ... خوشی سے پناہ نہیں لیتا۔ وہ آخری صورت تھی ... پہلے ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" میں نے محسوس کیا کہ ... الفاظ کا خاطر خواہ اثر نہیں ہو رہا ہے چنانچہ ... بدل دیا۔ "یار محسن! میں نے تجھ سے کہا تھا کہ شہلا ... بات معلوم کرنی ہے۔"

"وہ سب ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "مجھے ... ہوتا تھا کہ میں نے اس کا موڈ بھی خراب کر دیا ... نے محض جیسی سلوا کو دھمکی دی تھی اس لیے کہ وہ ... بعد میں اس کا یہ ڈر بے بنیاد ثابت ہوا۔" اس ... وضاحت ممکن نہیں تھی۔

"شہلا سے ایک بات اور پوچھنی تھی۔" میں ...

"اس کا تعلق میرے شک سے ہے۔ ہسپتال میں ... گورکن کو زہر دینے والی تیسری نرس مجھے شہلا کی ..."

"اب اس کا کیا ذکر؟" رابعہ نے ...

میری طرف دیکھ کر کہا۔ "ڈی سلوا نے وہ کیس ..."

گاڑی اس عمارت کے سامنے جا رکی جس میں ... آفس تھا۔ دروازے پر پرانا چوکیدار موجود تھا لیکن ... سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ادھر ادھر دیکھنے پر مجھے ... ایسے نظر آئے جن کی صورت اور لباس دیکھ کر کہا جا ... تھا کہ وہ سادہ کپڑوں میں مسلح پولیس کے آدمی ہیں ... صاحب کی ہدایت پر وہاں پوسٹ کیے گئے ہیں ... وردی والا اے ایس آئی بھی موجود تھا۔ اس نے ... کر کہا کہ ہم اپنی شناخت کروائیں۔ لیکن چوکیدار نے ... کی اور اسے بتایا کہ میں مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ ... دفتر کو کسی نے بم سے اڑانے کی دھمکی دی تھی اور ... یہ حفاظتی انتظامات کیے گئے ہیں۔ اے ایس آئی ... نے ہمارے بارے میں پوچھا اور پھر اپنی خفت ... لیے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ آس پاس کوئی غلط آدمی ... بھی نہیں سکتا۔" رابعہ نے اس سے کہا کہ ابھی کچھ دیر ...

... ایک صاحب آ گئے تھے۔ سیاہ شیروانی، قراقلی ... سفید چوڑی دار اور سفید شلوار۔ بھاری بھرکم جسم اور گھنی مونچھوں والے ان کو اوپر آنے دیا جائے لیکن ان کی تلاشی لی جائے اس طرح کہ ان کو اپنی بے عزتی کا احساس نہ ہو۔

میں نے رابعہ کو آفس میں چھوڑا پھر بینک ڈرافٹ لے کر ... گاڑی میں آ بیٹھا۔ میں نے گزشتہ روز خسرو جمشید کو ... کے ساتھ جا کر دیکھی تھی۔ مجھے اس کی شاندار مرسڈیز دور سے ہی نظر آ گئی۔ قریب پہنچ کر میں نے گاڑی روک لی تو مجھے وہ شوفر کی جگہ بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس کا حلیہ بالکل وہی تھا۔ قریب پہنچ کر میں گاڑی سے اترا اور اس کی طرف بڑھا۔ "السلام علیکم" میں نے کھڑکی کے پاس پہنچ کر کہا۔ "یہ بتائیے کہ آپ کون ہیں؟ ... خود یا خسرو جمشید صاحب؟"

"وعلیکم السلام۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ "کیسے آئے ہیں آپ؟"

میں چکر میں پڑ گیا لیکن جال فوراً میرے ذہن میں آ گئی۔ ... "مگر تم تو شوفر ہو؟" میں نے ڈھٹائی سے کہا اور پچھلے دروازے کی طرف بڑھا جیسے مجھے خسرو جمشید کے اندر ہونے کا پورا یقین ہو۔

ابھی میں چند قدم دور ہی گیا تھا کہ وہ ہنسا۔ "برخوردار! ایسی نظر ہوتی تمہاری تو تم دنیا میں کہیں دھوکا نہ کھاتے۔" ... مونچھوں کو بل دے کر بولا۔

"خسرو صاحب!" میں نے شرمندہ ہو کے اس سے ہاتھ ملایا۔ "میں بینک ڈرافٹ لے آیا ہوں لیکن آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا کیونکہ مکان کی اصل خریدار ایک خاتون ہیں۔ مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ۔ آپ نے ان کا نام تو سنا ہوگا؟"

خسرو جمشید کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ "نام کچھ سنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کیا وہ آپ کے ساتھ آئی ہیں؟"

"جی نہیں۔ وہ اپنے آفس میں آپ کی منتظر ہیں۔" میں نے کہا۔ "میرے ساتھ ایک دوست آیا ہے۔ مس رابعہ سے آفس میں کاغذی کارروائی آسانی سے پوری ہو سکتی ہے اور آپ چاہیں تو میں اسی وقت بھی کر سکتا ہوں۔" میں نے اسے بینک ڈرافٹ پکڑا دیا۔ جتنی دیر میں اس نے بینک ڈرافٹ کو دیکھا میں نے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی ... رضوی صاحب کے حفاظتی انتظامات دیکھ سکوں لیکن مجھے آس پاس کوئی بھی نظر نہ آیا۔ ان کے آدمی اگر کہیں تھے تو چھپ کر نگرانی کر رہے تھے۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" خسرو جمشید نے بینک ڈرافٹ مجھے واپس کر دیا۔ "آپ میرے ساتھ چلیں گے یا اپنی گاڑی میں؟"

"آپ کے ساتھ تو آپ کا شوفر بھی ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میں اپنی ہی گاڑی میں زیادہ محفوظ رہوں گا۔ آپ تو اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں اور دشمن بھلاتے ہیں۔ میرا ابھی تک کوئی دشمن نہیں۔" میں نے بالکل غیر سنجیدگی کے ساتھ مذاق میں یہ بات کی تھی لیکن خسرو جمشید کا رد عمل بہت عجیب تھا۔ اس کے ماتھے پر ناگواری کے آثار شکن بن کے پھیل گئے تھے۔ یوں جیسے میں نے اس پر طنز کیا ہو۔

"میں اکیلا ہی چلوں گا۔" اس نے فیصلہ کرتے ہوئے انجن اسٹارٹ کیا۔ "آپ آگے چلیں۔"

"اور آپ کا شوفر؟" میں نے گھر کی طرف دیکھا۔ "کیا وہ یہاں اکیلا آپ کی واپسی کا انتظار کرتا رہے گا؟"

"نہیں۔ جب وہ دیکھے گا کہ میں جا چکا ہوں تو وہ بھی چلا جائے گا۔" خسرو نے کہا۔

"اگر آپ کہیں تو اندر جا کے اسے مطلع کر دوں؟" میں نے کہا۔ "ایسے بیچارہ کب تک..."

"میں نے کہا نا مسٹر سکندر بخت کہ وہ چلا جائے گا۔" خسرو جمشید نے سخت لہجے میں کہا۔ "اب آپ چلیے۔"

شک مجھے پہلے بھی تھا اب یقین آ گیا کہ کوٹھی کے اندر شوفر موجود ہی نہیں۔ باہر سے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند نظر آتے تھے اور خسرو جمشید کا اکیلے جانا اس کے سابقہ بیانات کی نفی کرتا تھا کہ زندگی اور موت کے امکانات کو نظر میں رکھنے کے لیے وہ اپنے ہی جیسے شوفر کو ساتھ رکھتا ہے۔ میں نے اسے بزدلی کا طعنہ نہیں دیا تھا اور یہ چیلنج نہیں دیا تھا کہ ہمت ہے تو اکیلے جا کر دکھاؤ۔ اس کے علاوہ شوفر واقعی موجود ہوتا تو خسرو جمشید اسے بے سبب چھوڑ کے کیوں جاتا۔

میں نے اپنے شبہ کا اظہار محسن پر کیا۔ "یہ شخص جو ہمارے پیچھے آ رہا ہے خسرو جمشید نہیں ہے بلکہ اس کا شوفر ہے۔"

"یہ شک جناب کو کیسے ہوا؟" محسن نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔

"شک کے بہت سے اسباب ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک تو یہی کہ ہمیشہ اپنے ہمزاد قسم کے شوفر کو ساتھ رکھنے کی احتیاط اگر ضرورت یا عادت ہوتی تو اس وقت وہ اکیلا نہ ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ مجھے شوفر کے انداز گفتگو میں اعتماد

www.paksociety.com

کی کمی محسوس ہوتی ہے کہ کل میری بات خسرو جمشید سے ہوئی تھی چنانچہ میں یہ فرق محسوس کر سکتا ہوں۔ غالباً یہ بھی مجھے قتل کرنے کی ایک سازش تھی۔ خسرو جمشید کا خیال ہوگا کہ سارے معاملات یہیں طے پا جائیں گے۔ اس نے کہا تھا کہ کاغذی اور قانونی کارروائی بعد میں مکمل ہوتی رہے گی۔ وہ تو مجھے کل بھی قبضہ دینے پر تیار تھا۔ آج اس نے شوفر کو بھیج دیا کہ وہ مجھ سے بینک ڈرافٹ لے اور چابی میرے حوالے کر کے لوٹ آئے۔ بینک ڈرافٹ کو کیش کرانا اس کے پروگرام میں شامل نہ تھا۔ بعد میں کیا ہوتا وہ یا تو میں اسی وقت چابی لگا کر دروازہ کھولتا اور اندر دیکھتا یا ہم سب ساتھ جاتے بہر صورت یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ چابی لگاتے ہی دھماکا ہوتا اور انجام بخیر۔ شوفر جا کر خسرو جمشید کو بتا دیتا کہ مشن کامیاب رہا۔ ابھی تک کسی نے مجھے خسرو جمشید کے ساتھ نہیں دیکھا اور اس سودے کا کوئی گواہ نہیں جو ہمارے درمیان طے پایا تھا۔ کون جانے وہ خسرو جمشید تھا یا کوئی اور۔ اور اس کوٹھی کا مالک بھی تھا یا نہیں۔ یہ سب تو ملکیت کے کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوتا۔ جائداد کی خرید و فروخت کہیں ایسے ہوتی ہے کہ میں نے نقد رقم ادا کی اور اس نے چابی مجھے دے کر کہا کہ جاؤ میاں آج سے تم مالک اس گھر کے۔ اعتماد حاصل کرنے کے لیے اس نے ایک جذباتی وجہ بتائی تھی اور کاغذی قانونی کارروائی کے لیے کہا تھا کہ بعد میں ہوتی رہے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کارروائی کی نوبت ہی نہ آتی۔“

”اگر اس گھر کی چابی واقعی ہلاکت خیز ہے تو کیا یہ بات معلوم نہیں کی جا سکتی؟“ محسن نے کہا۔

”رضوی صاحب ان ماہرین کو بھیج سکتے ہیں جو آتش گیر یا دھماکے سے پھٹنے والی چیزوں کو ناکارہ بنا دیں۔“ میں نے کہا۔

”ایک اور سوال یہ ہے کہ خسرو جمشید اس مکان کا مالک نہیں اور اس کی جگہ شوفر صرف چابی دینے آیا تھا تو اب وہ کاغذات پر دستخط کیوں اور کیسے کرے گا؟“ محسن نے کہا اور میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ مرسڈیز کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شوفر نہ تھا۔ ہم اپنی باتوں میں مصروف رہے اور خسرو جمشید کا ڈرائیور موقع پاتے ہی غائب ہو گیا۔ کیونکہ کسی وکیل کے آفس میں جا کر اپنے مالک کی جگہ قانونی دستاویزات پر دستخط کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے آئینے میں دیکھا تھا تو وہ گاڑی پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔“ محسن نے مایوسی سے کہا اور فوکس ویگن

کو سڑک کے ایک کنارے پر روک لیا۔ … انتظار کر لیتے ہیں۔“

”اس کا کوئی فائدہ نہیں۔“ میں نے نفی … سبب بڑا اہم تھا بلکہ فراڈ تھا۔ خسرو جمشید اور اس کا … ڈرائیور، دونوں پولیس کے اور اب دوبارہ کبھی … گئے۔ ان کا مقصد یہیں لالچ دے کر موت کے … جانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آج اس شوفر نے مجھ سے پوچھا کہ آپ رقم لے آئے ہیں، … جانے سے جھک دیا۔ اس کو ہدایات تھیں کہ بینک … خسرو جمشید کی طرف سے چابی مجھے پیش کرے اور … جائے۔ جاتے جاتے کہہ گیا کہ خسرو جمشید صاحب … آپ سے ملیں گے اور یہیں ملنے آئیں گے … میں نے اسے بتا دیا کہ جلدی میں نہیں ہوں۔ … بن گیا لیکن بینک ڈرافٹ لیتے ہوئے کہ … کو سودا طے کرنے کے لیے اور قانونی دستاویزات … کرنے کے لیے اسی وقت ایک … وہ غائب نہ ہوتا تو کیا کرتا جو اس وقت وہ … دے رہا ہوگا کہ مشن کیوں ناکام رہا۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آتا فانا اسکیم …“ محسن نے پانچ منٹ بعد ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ مجھے محسن کے خیال سے اختلاف نہیں تھا۔ … مشکل نظر آتا تھا کہ خسرو جمشید کوئی فوری قدم اٹھا …

سے ناکامی کے اسباب کا علم ہو سکے۔ میں نے اور محسن نے … کے آفس کے نیچے اپنی گاڑی روکی تو رات کے آٹھ بج … تھے لیکن خلاف معمول عمارت کے آس پاس کا … ہمیشہ اندھیرا نظر آتا تھا آج روشن تھا۔ گاڑیوں کی … لیکن مجھے سایہ دار درختوں کی قطار تھی اور … ٹریفک کا رش رہتا تھا اور روشنی کا انتظام بھی … اچھا تھا لیکن یہ روشنی درختوں کی وجہ سے اس … نہیں پہنچتی تھی جہاں اس عمارت کے سامنے بھی … تھی۔ آج اس عمارت کے اوپر دونوں طرف سرچ … نصب تھیں اور یہ حفاظتی انتظامات کی ایک … میں نے اوپر جا کر رابعہ کو اپنی ناکامی کا احوال سنایا … خدشات کا بھی ذکر کیا جو میرے ذہن میں پیدا ہوئے … کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرا خیال ہے … خبطی ہونے کی دلیل ہے۔ ایک بار پہلے بھی ایسا ہوا … جب ڈرائنیگ پر مجھ سے کہا گیا تھا کہ چابی میری …

… آسانی سے آزادی حاصل کر سکتا ہوں۔ مگر میں نے … سے نقل کھولنے کی کوشش کی ہوتی تو بات میرے … چابی سے ختم ہو جاتی اور یہ دوسری چابی پیش کرنے کی … ایک چابی باہر آنے کے لیے تھی تو دوسری … لیکن دونوں دروازے عدم کی دنیا میں … جانے کے لیے تھے۔“

”خدا کا شکر ہے کہ اس بار بھی وہ اپنے عزائم میں …“ رابعہ نے بینک ڈرافٹ کو اپنے ہینڈ بیگ میں … بھجوا اس مکان پر …

”لیکن یہ دیکھنا تو چاہیے کہ آخر اس کوٹھی کا مالک …“ میں نے کہا۔ ”شاید اس سے خسرو جمشید تک پہنچ سکیں … پتہ چل سکے اور یہ معلوم ہو سکے کہ کیا وہ بھی کوئی … ہے۔“

”وہ کوٹھی کس کی ہے۔ یہ تو کل ہی معلوم ہوگا۔“ محسن بولا۔ ”… کے اندیشوں کی تصدیق اسی وقت کی جا سکتی … رضوی صاحب نے کہا تھا کہ وہ اپنے آدمی وہاں … کے لیے پوسٹ کر دیں گے۔ وہ لوگ دروازے … کسی کھڑکی یا روشن دان سے اندر چلے جائیں تو دیکھ … کہ اس کی سلامتی کا انتظام ہے یا نہیں۔ باقی دروازے … مقفل دروازے کے پیچھے … پر چابی لگانے کے بعد پیچھے ہوں گے۔ وہ بم وغیرہ کو … ناکارہ بنا دیں گے۔“

”میں انکل سے بات کرتی ہوں۔“ رابعہ نے رضوی صاحب کے گھر کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔ میں نے … اپنے کیبن میں جا کر دوسرے فون کا ریسیور … اٹھا لیا۔ دونوں کا ایک ہی نمبر تھا چنانچہ میں رابعہ کی اور رضوی صاحب کی گفتگو سن سکتا تھا۔

”رابعہ! کیا بات ہے؟ کہاں سے بات کر رہی ہو؟“ … رضوی صاحب نے کہا۔

”اپنے آفس سے انکل!“ رابعہ نے خوشدلی سے کہا۔ ”… اس مکان کی بات کرنی تھی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ دونوں بدمعاش کہاں ہیں؟“ … رضوی صاحب نے کہا۔ وہ خاصے پریشان لگتے تھے۔

”آپ کا مطلب ہے محسن اور سکندر؟ وہ دونوں اس وقت بھی میرے ساتھ آفس میں موجود ہیں۔“ رابعہ ہنسی۔

”اچھا… لیکن سارا دن وہ کہاں تھے؟“ رضوی صاحب نے کہا۔

”دس گیارہ بجے تک ہم گھر پر ہی تھے۔“ رابعہ نے اسی سکون اور اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ ”محسن گھر سے نکلنے کے بعد بھی میرے ساتھ رہا۔ سکندر نے کہا تھا کہ اس کو پولیس اسٹیشن جانا ہے۔ چراغ دین نام کا کوئی شخص منشیات فروخت کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا…“

”کوئی شخص؟“ رضوی صاحب نے رابعہ کی بات کاٹ دی۔ ”ارے بھئی اس شخص کی شادی پہلے محسن کی بڑی بہن مریم سے ہوئی تھی اور اب اس کی چھوٹی بہن فوزیہ سے طے پائی تھی۔ تمہیں نہیں معلوم؟“

”مریم کے بارے میں تو معلوم تھا۔“ رابعہ نے معذرت سے کہا۔ ”فوزیہ کی نسبت کب طے ہوئی؟“

”نسبت طے نہیں ہوئی تھی۔ بس شادی ہونے والی تھی۔“ رضوی صاحب نے خفگی سے کہا۔ ”خدا نے بچا لیا۔ وہ تو منشیات کا بہت بڑا اسمگلر ہے۔ اس کے گھر سے لاکھوں کا مال برآمد ہوا ہے۔ میں ابھی شیرازی صاحب سے بات کرتا ہوں لیکن اس بدمعاش نے سکندر کا نام کیوں لیا؟“

”میں تو خود حیران تھی۔“ رابعہ نے کہا۔ ”کچھ ذاتی دشمنی یا رقابت کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے ورنہ آپ بھی جانتے ہیں کہ سکندر آج صبح تو گھر سے نکلا ہی نہیں تھا۔ میں نے اسے جگایا تھا تو وہ سوتے سوتے ہاتھ منہ دھوئے بغیر ناشتہ کرنے آ گیا تھا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ رضوی صاحب نے کہا۔ ”ایسی باتوں سے سکندر کا کیا نقصان ہو سکتا ہے لیکن تمہاری بات ٹھیک ہے۔ یہ پرانی رقابت اور رنجش کا چکر ہے لیکن اس کے باوجود عجیب چکر ہے۔ یہ بدمعاش چراغ دین اچھی طرح جانتا تھا کہ سکندر پہلے ہی انکار کر چکا ہے…“

”لیکن انکل!“ رابعہ نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”فوزیہ نے بھی خودکشی کی جو کوشش کی تھی، اس کا سبب غالباً یہی انکار تھا۔ اس سے چراغ دین نے تذلیل محسوس کی ہوگی اور اس کا غصہ سکندر کے خلاف…“

”ہاں۔ چھوڑو اس قصے کو۔“ رضوی صاحب نے عمداً اس موضوع پر مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ”کیا تم نے اس مکان کے سلسلے میں فون کیا تھا؟ کیا سودا ہو گیا؟“

”نہیں انکل!“ رابعہ نے کہا۔ ”سکندر اور محسن بینک ڈرافٹ لے کر گئے تھے لیکن پارٹی نہیں آئی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ دھوکے باز تھے۔ اس کے علاوہ ابھی کسی نامعلوم شخص کا فون آیا تھا۔ اس نے کہا کہ ایک دروازہ مقفل ہے۔ اس کی

www.paksociety.com

سکے پیچھے ایک بم رکھا ہے جو تالے میں چابی گھماتے ہی پھٹ جائے گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔ کیا آپ چیک کرا سکتے ہیں؟"

"لاحول ولا قوۃ — بھئی شہر میں مکانوں کی کمی ہے کیا؟" رضوی صاحب ناراض ہو کے بولے۔ "اور جہاں میں رہتا ہوں وہاں تمہیں کیا تکلیف ہے؟ کیا ضرورت ہے خطرہ مول لینے کی؟"

"انکل یہ مکان آدھی قیمت پر مل رہا ہے۔" رابعہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "اور میرا ارادہ وہاں رہنے کا نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا ارادہ ہے؟ پیسہ ڈبل کرنے کا؟"

"میں اسے ایک ہفتے کے اندر اندر فروخت کر دوں گی۔" رابعہ نے کہا۔ "اور خود سامنے آ کر سودا نہیں کروں گی اس لیے مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ آپ کو میرے فائدے کی خاطر بس ایک ہفتے تک ہی حفاظت کرنی ہے۔"

"اچھا بھئی — میں بھیجتا ہوں کسی کو۔ مگر تم اب گھر آ جاؤ اور ان دونوں کے ساتھ۔" انھوں نے فون بند کر دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کا موڈ خراب ہے لیکن وہ رابعہ کی وجہ سے مجبور ہو گئے ہیں۔ اس گفتگو میں جو میں نے چوری چھپے سنی میرے لیے خوشی کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ میرا رخ ذہنی [illegible] کا اسمگل ثابت ہو گیا اور دوسرا یہ کہ ابھی تک کسی کو اس معاملے میں میرے ملوث ہونے کا بالکل یقین نہیں۔ لاکھوں کے مال کا حوالہ دے کر رضوی صاحب نے کچھ مبالغے سے کام لیا تھا تو اس کا سبب یہ تھا کہ ابھی تک جو اطلاعات ان کو ملی تھیں وہ سنی سنائی تھیں اور سنانے والوں نے زیب داستان کے لیے ہزار [illegible] کی رقم کو بڑھا کے لاکھوں تک پہنچا دیا تھا۔ میں رابعہ کے آفس کی طرف جا رہا تھا کہ ویٹنگ روم کا دروازہ کھلا اور خسرو جمشید اندر آ گیا۔

"بھئی معاف کرنا۔ میاں سکندر بخت" وہ اپنی پاٹ دار آواز میں بولا۔ "میری گاڑی کا ایک ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا لیکن تم نے تو مڑ کے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔"

"پھر آپ یہاں کیسے آ پہنچے؟" میں نے اپنی حیرت پر قابو پا کے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ وہ چالیس منٹ بعد آیا تھا۔ ٹائر بدلنے میں دس پندرہ منٹ کی تاخیر تو ممکن تھی مگر چالیس منٹ میں یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شوفر نے آقا کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا ہو اور آقا خود کو سنبھال کے لے کر چلا ہو۔ ٹائر کے فلیٹ ہونے کی کہانی صرف درمیانی وقفے کو پورا کرنے کے لیے گھڑی گئی ہو۔

"ایک ٹیلیفون ... کرنا پڑا۔" خسرو جمشید نے کہا۔ میں نے اس ... خسرو جمشید کو اپنے ساتھ لے گیا۔ محسن نے یقیناً ... سن لی تھی اور رابعہ کو ہوشیار کر دیا تھا۔ چنانچہ ... نے حیران ہوئے بغیر بڑے تپاک سے خسرو ... کیا۔ "کہاں رہ گئے تھے آپ؟ ہم تو سمجھے ..." ... نے کہا۔

"بھئی ان کا ... میرا مطلب ہے ان کا ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا۔" میں نے محسن کو ... تعارف کے بعد مکان کی خرید و فروخت پر ... بات شروع ہوئی۔ "خریدار یہ ہیں ... اینڈ کیٹ نامی کورٹ۔"

"آپ کا مکان سکندر بخت صاحب ..." رابعہ نے کہا۔ "اور کاروباری جھوٹ بولنے ... ہے۔ سچ یہ ہے کہ آپ کا مکان انھیں بہت ... آ گیا ہے۔"

"لیکن خریدار آپ ہیں۔" جمشید نے کہا۔ "... تو پسند آنا چاہیے۔"

"مجھے ان کی پسند پر اعتماد ہے۔" رابعہ نے ... مختلف نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا اچھا۔" جمشید نے معنی خیز طریقے پر ... ہلا کے کہا۔ "میں سمجھ گیا ہوں۔"

رابعہ کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے سرخ پڑ گیا۔ ... جلدی سے ہینڈ بیگ کھولا اور بینک ڈرافٹ ... "یہ لو ڈیڑھ لاکھ تو نقد حاضر ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "باقی ... میں سکندر صاحب آپ کو بتا چکے ہیں کہ جیسے ہی ... فروخت ہوا۔ آپ کو ادا کر دی جائے گی ... خیال آیا کہ ایک متبادل صورت بھی ہے۔ جو ممکن ہے ... کے لیے قابل قبول ہو۔ فرض کیجیے میں وہ پلاٹ ... نام کر دوں، آپ فروخت کر دیں گے تو نقصان ... رہیں گے اور نہ آپ کو زیادہ انتظار کرنا پڑے گا۔ ... جلدی نہیں تو پچاس ہزار زیادہ بھی مل سکتے ہیں ... فروخت نہ کرنا چاہیں تو وہاں رہائش یا کاروبار ... ہو سکتی ہے کیونکہ وہ جگہ ہر اعتبار سے بہت اچھی ..."

"آپ کی تجویز بے حد معقول ہے۔" جمشید نے ... "یہ پلاٹ کس جگہ ہے اور کتنا بڑا ہے؟"

"اس کا رقبہ دس مرلے ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اور اگر آپ ڈرائیو کریں تو ذرا سا آگے جائیں تو سیدھے ہاتھ پر سڑک کے کنارے ... چھوٹا سا قطعہ ہے۔"

ان کی گفتگو کے درمیان میں بڑے غور سے خسرو جمشید کا جائزہ لیتا رہا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ میں نے جو مفروضہ قائم کیا تھا وہ سو فیصد حقیقت بن کر سامنے آ گیا ہے۔ پہلے مجھے ذاتی شوفر ملا تھا لیکن اب اصل خسرو جمشید میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ شوفر نے غائب ہو کے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا اور مالک فوراً روانہ ہو گیا تھا۔ درمیانی وقفے کو ٹائر فلیٹ ہو جانے کی کہانی سے بڑی ذہانت کے ساتھ پُر کیا گیا تھا۔ مگر اصل اور نقل کا فرق مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش ... کی تھی۔ ظاہری حلیے سے دوسروں کی نظر دھوکا کھا سکتی تھی۔ سامنے بیٹھ کر بات کرنے والا اس فریب کا شکار نہیں ہو سکتا تھا۔ کام اور تکلم کے انداز و اطوار کا فرق خود چغلی کھاتا تھا کہ خسرو جمشید کون ہے اور اس کا شوفر کون ہے؟

خسرو جمشید نے کسی تذبذب کے بغیر رابعہ کی تجویز سے اتفاق کیا۔ رابعہ نے کہا کہ اسے یہی امید تھی۔ چنانچہ اس نے جو دستاویزات تیار کی ہیں، وہ اسی تجویز کے مطابق ہیں۔ جمشید نے اعتماد کے اس مظاہرے پر رابعہ کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد اپنے بریف کیس میں سے مکان کی ملکیت کے کاغذات نکالے۔ رابعہ نے اور اس کے ماتحت وکیلوں نے ان کا بغور معائنہ کیا اور انھیں ہر لحاظ سے تسلی بخش پایا۔ میں اور محسن خاموش تماشائی بنے سیل ڈیڈ اور سیل ایگریمنٹ پر دستخطوں کی کارروائی کو دیکھتے رہے۔ رات کے گیارہ بجے یہ کارروائی پوری ہو گئی تو خسرو جمشید نے مکان کی چابیاں رابعہ کے حوالے کیں۔ ہمیں مبارک باد دی اور ہم سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ عدالتی کارروائی کے لیے اس نے صبح گیارہ بجے ڈسٹرکٹ کورٹ میں ملنے کا وعدہ کیا اور جاتے جاتے ... بھی کر گیا۔

ہم کچھ دیر حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ خسرو جمشید دغاباز تھا اور نہ یہ مال بوگس تھا۔ تمام دستاویزات کی رو سے خسرو جمشید بلاشرکت غیرے اس مکان کا مالک تھا جو اس نے آدھی قیمت پر ہمیں بیچ دیا تھا۔ اس کا رہائشی پتہ ماڈل ٹاؤن کا تھا اور اس کے کارڈ پر دو ٹیلی فون نمبر بھی لکھے ہوئے تھے۔

"ہمارے تو سب اندازے غلط ہو گئے۔" محسن نے بالآخر پہلی بات کہی۔

"غلط ہوئے نہیں — کر دیے گئے۔" میں نے کہا۔ "اور یہ کوئی فطرتاً کیا ہوا منصوبہ ہے۔ جال اپنی جگہ موجود ہے اور شکاری بھی قریب ہیں اور نظر سے غافل۔ انھوں نے پھر انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"مجھے اب بھی دال میں کالا ہی کالا نظر آ رہا ہے۔" محسن بولا۔ "اگر رات زیادہ نہ گزری ہوتی تو میں اسی وقت ماڈل ٹاؤن جا کے دیکھتا کہ یہ پتہ صحیح ہے یا غلط۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "مجھے یاد پڑتا ہے کہ قصر جمشید بہت عالی شان کوٹھی ہے۔ خصوصاً اس کا باغ سب کو متوجہ کرتا تھا جس میں ہر موسم میں پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ معلوم نہیں اب کیا حال ہے؟"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو رابعہ نے ریسیور اٹھایا۔ "جی، جی ہم آ رہے ہیں۔ بس ابھی چند منٹ میں اٹھنے ہی والے تھے۔ دراصل وہ پارٹی یہاں پہنچ گئی اور سودا بھی ہو گیا ...... جی ...؟" اس کی صورت پر حیرانی پھیل گئی۔ اس نے ہمیں ہاتھ سے اشارہ کیا اور ایک منٹ تک صرف سنتی رہی۔ آخر میں اس نے پھر کہا۔ "ہم زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔"

"بڑی دلچسپ خبر ہے حضرات۔" رابعہ نے مسکرا کر کہا۔ "رضوی صاحب نے بم ڈسپوزل والوں کو بھیجا تھا۔ وہاں ان کو پولیس کا ایک دستہ ملا جو سادہ کپڑوں میں تھا۔ ... تھے۔ جب انھوں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو پولیس والے حیران اور پریشان رہ گئے کہ اگر آپ بم ڈسپوزل والے ہیں تو وہ کون تھے جو ابھی کچھ دیر پہلے آئے تھے۔ انھیں تو اندر کچھ بھی نہیں ملا تھا۔"

"اور ظاہر ہے جب اصل لوگ گئے ہوں گے تو انھیں بھی کچھ نہیں ملا ہو گا۔" محسن نے کہا۔ "اگر پولیس والے شناختی کارڈ دیکھنے پر اصرار کرتے تو پہلے پہنچنے والے پکڑے جاتے لیکن یہاں مجرم کو پورا اعتماد ہے کہ پولیس والے ذہانت میں ان کے بالکل ... نہیں ہیں۔"

"یہ خوب لطیفہ ہے کہ مجرم تو مختلف طریقوں سے اور ... سے پورا استفادہ کرتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "لیکن وہی ... دیکھ کر پولیس کی کارکردگی کا معیار بہتر نہیں ہوتا۔ جرائم میں جدید ترین وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں لیکن سراغ رسانی کے لیے نہیں۔"

"میں یہ سوچ رہی ہوں کہ وہ لوگ پہلے کیسے پہنچ گئے؟" ... نے کہا۔ "کسی کا ٹیلی فون ٹیپ ہو رہا ہے؟ میرا یا انکل کا؟"

"رضوی صاحب کا ٹیلی فون ٹیپ ہونے کا پتہ ہم ایک بار لگا چکے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ہو سکتا ہے اسی طرح تمہارا ٹیلی فون بھی ٹیپ ہو رہا ہو۔"

"تو نے اچھا یاد دلایا محسن۔" میں نے کہا۔ "میں تو اس چیز ...

بالکل بھول ہی گیا تھا۔ خیر اب گھر چل کے بات کریں گے۔ زیادہ دیر ہوئی تو رضوی صاحب کی جھاڑ پڑے گی۔" مجھے ایک نیا خیال آیا تھا لیکن سوچے سمجھے بغیر اور محسن سے مشورہ کیے بغیر میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا اور یہ بات رابعہ کے سامنے بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رابعہ اپنے خیالات میں مگن تھی ورنہ وہ ضرور پوچھتی کہ میں کس چیز کا ذکر کر رہا ہوں۔

رضوی صاحب کا موڈ اچھا نہیں تھا اور اس کی متعدد وجوہات تھیں۔ ایک معاملہ چراغ دین کا تھا جس کی شادی فوزیہ سے ہونے والی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ فوزیہ کی وجہ سے میں اور محسن اس شادی کے خلاف ہیں۔ خصوصاً میری مخالفت ناقابل فہم تھی کیونکہ میں فوزیہ سے شادی کرنے سے بھی انکار کر چکا تھا۔ دوسرا مسئلہ رابعہ کا تھا۔ رابعہ کسان کو دل دے چکی تھی اور وہ رابعہ کو پسند بھی کرتے تھے لیکن ان کو رابعہ کا میرے ساتھ ہر وقت کا گھومنا پھرنا پسند نہیں تھا۔ وہ میرا ساتھ دینے کی پہلے ہی کافی سزا بھگت چکی تھی۔ مزید یہ کہ وہ ان کے گھر کو چھوڑ کے ہم سب کے ساتھ رہائش اختیار کرنے پر آمادہ تھی۔ جس کا مطلب تھا مزید مصیبت۔ اس کی حیثیت گھر کے ایک معزز فرد سے کم نہیں تھی اور رضوی صاحب کے ساتھ رہ کر وہ زیادہ محفوظ بھی تھی۔ خواہ اندیشہ دشمنوں کا ہو یا رسوائی کا۔ نئے مکان میں منتقل ہونے سے پہلے ہی خطرات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور تازہ ترین واقعہ جس پر وہ جھنجلاہٹ کا شکار تھے ان کی نگراں فوزیہ کی نااہلی تھی جس کے سبب پولیس کے بھیس میں ڈسپوزل والوں سے پہلے نامعلوم افراد اپنا کام کر گئے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ حالات دن بدن الجھتے جا رہے ہیں جس کے ذمہ دار بھی ہم تھے لیکن رضوی صاحب کو یہ معلوم نہ تھا کہ گھر سے باہر ہماری مصروفیات کیا ہیں اور ہم کیا چکر چلاتے رہتے ہیں۔

ان حالات سے وہ کب تک چشم پوشی کرتے اور برداشت سے کام لیتے۔ ہمارے گھر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے پہلا سوال یہ کیا کہ کیا ہم لوگ کھانا کھا کے آئے ہیں؟ اور رابعہ نے کہا کہ انکل ہم تو دفتر میں مسز جمشید کے ساتھ سر کھپا رہے تھے۔ کھانا کہاں سے کھاتے۔ وہ خاموش ہو گئے اور کھانے کی میز پر ہمارے ساتھ بیٹھے اپنا پائپ پیتے رہے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے لیکن ان کے ماتھے کی شکنوں کو اور پریشان چہرے کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ اعصابی کشیدگی کو کم کرنے اور غصے پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ تاکہ ہم سے پرسکون رہ کر بات کر سکیں۔ اندازہ ہم سب کو ہو گیا تھا کہ وہ بعد میں کوئی بات ضرور کریں گے اور بات کا تعلق انہی مسائل سے ہو گا جو ان کے لیے پریشانی کا سبب بنے ہوئے ہیں۔

"ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اسلام آباد فون کیا تھا۔" انھوں نے کھانے کے بعد کہا۔ اس وقت رابعہ برتن سمیٹ کر باورچی خانے کی طرف جا چکی تھی۔ "شیروانی صاحب کو چراغ دین کے بارے میں بتانا تھا۔"

"چراغ دین کے بارے میں آپ کی اطلاع ان کے لیے یقیناً ایٹم بم کا دھماکا ثابت ہوئی ہو گی۔" محسن نے کہا۔

"ہاں ۔۔۔ شیروانی صاحب نے تو حد کر دی کہ میری آواز تک پہچاننے سے انکار کر دیا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور معلوم ہے انھوں نے کیا کہا؟ انھوں نے کہا کہ مجھے بے وقوف بنانا چاہتے ہو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم آواز بدل کر بول رہے ہو۔ تم اگر محسن نہیں ہو تو سکندر ہو اور تمہارا مقصد مجھے چراغ دین سے بدظن کرنا ہے۔ خیر! میں نے انہیں سمجھایا کہ بھائی عقل سے کام لو۔ میں اپنے گھر سے بات کر رہا ہوں اور وہ تب جانے کہاں ہیں بات پر یقین نہیں آتا تو میں فون بند کر دیتا ہوں۔ تم میرے گھر کا نمبر ڈائل کر لو۔ پانچ منٹ بعد شیروانی کا فون آیا تو میں نے انہیں بتایا کہ چراغ دین واقعی منشیات کا اسمگلر تھا۔ وہ منشیات کا پیکٹ دے کر پانچ سو روپے لے چکا تھا کہ پولیس نے اسے دھر لیا اور اس کی جیب میں سے وہ رقم بھی برآمد کر لی جس پر ایک پولیس افسر نے دستخط کیے تھے۔ بعد میں خانہ تلاشی کے وقت مجسٹریٹ کی موجودگی میں اس کے گھر میں سے لاکھوں روپے کی ہیروئن اور چرس نکلی۔"

"لاکھوں روپے کی بات آپ نے کیسے کہہ دی؟" میں نے کہا۔ "کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟"

"یہ کیسا احمقانہ سوال ہے؟" رضوی صاحب نے ناگواری سے کہا۔ "ارے بھئی! میں ڈی آئی جی ہوں۔ مجھے رپورٹ مل جاتی ہے۔ یہ تو معاملہ ہی ایسا تھا کہ میرے پاس محکمہ انسداد منشیات کے ایک افسر کا فون آیا۔ اس وقت تک مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس نے تمہارے بارے میں پوچھا کہ سکندر نام کا کوئی شخص آپ کے ساتھ رہتا ہے؟ میں نے کہا کہ رہتا ہے۔ وہ بولا کہ آپ کو کچھ معلوم ہے کل رات سے آج صبح سات بجے تک وہ کہاں تھا۔ میں نے کہا۔ گھر پہ تھا اور کہاں تھا۔ کیونکہ سو کے اٹھا تو اس نے میرے ساتھ ہی ناشتہ کیا۔ نو بجے میں آفس کے لیے روانہ ہوا تو تب بھی وہ گھر کے دیگر افراد کے ساتھ ناشتہ کرنے میں مصروف تھا۔ لیکن یہ کیا چکر ہے ۔۔۔ اور تم سکندر کے بارے میں یہ تصدیق کس لیے کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ ابھی صرف تصدیق کرنی تھی۔ اس لیے آپ کو زحمت دی۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ معاملہ ایسا ہے کہ ہم فی الحال اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتے۔ اس کے باوجود میں پریشان رہا۔ گھر پہ فون کیا تو معلوم ہوا کہ تم جا چکے ہو۔ دوپہر کے بعد مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا کہ وہ چراغ دین نام کے ایک شخص کو پولیس نے منشیات فروخت کرتے ہوئے پکڑا ہے۔ میں نے متعلقہ تھانے میں فون کیا۔ چھاپہ مارنے والا ایک نوجوان افسر ہے۔ ایس آئی شیخ۔ ایس آئی اس کے نام کا حصہ ہے اور میں نے سنا تھا کہ وہ بہت جوشیلا ایماندار اور فرض شناس افسر ہے۔ چھاپہ مار کی دوسری ٹیم تھی۔ اس نے مجھے تفصیلات فراہم کیں کہ چراغ دین کے گھر میں سے تقریباً بیس لاکھ روپے کی ہیروئن برآمد ہوئی ہے اور اس سے آدھی مالیت کی چرس۔"

رابعہ بھی واپس آ چکی تھی اور ہم سب احمقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھے تھے۔ "آپ کا مطلب ہے تیس لاکھ کی منشیات اس نے اپنے گھر میں چھپا رکھی تھیں؟" میں نے حلق تک کر کہا۔ میرا یہ سوال محسن کے خیالات کی ترجمانی بھی کرتا تھا کہ ہم نے تو بیس ہزار داؤ پر لگائے تھے۔ پولیس نے تیس لاکھ کا مال کیسے برآمد کر لیا؟

"لیکن ۔۔۔ لیکن یہ سب کچھ ہوا کیسے؟" رابعہ نے کہا۔

"یہ سب اس لڑکے شیخ کا کمال ہے۔" رضوی صاحب نے پائپ کو پھر سے سلگایا۔ "چراغ دین نے اس کو ایک لاکھ روپے کی رشوت دے کر بچنے کی کوشش کی تھی مگر اس سے وہ اور بھڑک گیا۔ اینٹی کرپشن والوں نے شیخ کی رپورٹ پر ایک مقدمہ الگ قائم کر لیا ہے۔"

"اتنا مال اس نے گھر میں کہاں چھپا رکھا تھا؟" میں نے اپنی حیرانی پر قابو پا کے کہا۔

"شیخ نے بتایا ہے کہ کچھ مال تو دیواروں میں سے نکلا ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "کمروں کی ایک الماری کے پیچھے خفیہ خانہ تھا جس میں سے ایک آدمی اندر داخل ہو گیا۔ دو کمروں کی درمیانی دیوار کی موٹائی کا ایسے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اب یہ دیوار ہے ۔۔۔" انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "اس میں تمہیں ایک الماری نظر آ رہی ہے اور باقی دیوار صاف ہے۔ ادھر سے دوسرے کمرے میں جاؤ گے تو یہی نقشہ ملے گا۔ تم غور نہیں کرو گے کہ دیوار کی موٹائی اتنی ہی ہے جتنی عام طور پر رکھی جاتی ہے یا اس سے زیادہ ہے۔ چراغ دین نے درمیانی دیوار تقریباً ڈیڑھ فٹ چوڑی رکھی تھی جو بالکل اسی طرح نظر آ رہی تھی مگر وارڈروب کے ساتھ دیوار کا خالی حصہ محض ایک پردہ تھا۔ یوں سمجھو کہ دونوں طرف سیمنٹ کی مدد سے موٹی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی جو رنگ ہونے کے بعد کمرے کی باقی دیواروں جیسی نظر آتی تھی لیکن بیچ میں تقریباً سوا فٹ کا خلا رہ گیا تھا۔ وہ خانہ کپڑوں کے پیچھے نظر ہی نہیں آتا تھا۔ دیوار کے خلا میں زیادہ تر مال بھرا ہوا تھا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ تھوڑا سا مال جو مشکل سے پچیس ہزار کا ہو گا۔ چراغ دین کی پہلی بیوی کے بیڈروم میں سے بھی نکلا۔"

"مریم باجی کے بیڈروم میں سے ۔۔۔؟" محسن نے چونک کر کہا۔

"ہاں ۔۔۔ چراغ دین نے اس کے ذاتی استعمال کا سب سامان مقفل کر رکھا تھا اور وہ کمرہ بھی ہمیشہ بند رہتا تھا۔ ظاہر ہے یہ بھی دھوکا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ وہاں بھی وہ لاکھوں کا مال رکھتا ہو گا مگر اس وقت صرف یہی بیس پچیس ہزار کا رہ گیا تھا۔"

"یقین نہیں آتا انکل کہ چراغ دین اتنا بڑا مجرم تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا۔" محسن دیوار پر نظر جما کے بولا۔

"تمہاری طرح تمہارے والدین کو بھی بڑی مشکل سے یقین آیا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اطلاع دینے والا میں تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "ان کی بیگم نے تو رونا دھونا اور دشمنوں کو کوسنا شروع کر دیا تھا۔ جنہوں نے جھوٹا الزام لگا کے چراغ دین کو پھنسا دیا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ تفتیش کے بعد جھوٹ سچ سامنے آ جائے گا لیکن مجھے یہ کسی کی سازش نہیں لگتی۔ اس پر انھوں نے ایک عجیب بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ خدا غارت کرے سکندر کو اس نے فوزیہ کو کہیں کا نہ رکھا۔ شیروانی صاحب نے ان کو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنے دیا اور فون بند کر دیا۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں ہم سب ایک دوسرے سے نظر چرانے کی اور اپنے پریشان کن خیالات سے بچنے کی بے سود کوشش کرتے رہے۔ میری اور محسن کی سوچ ایک ہی تھی۔ ہم اس غیر متوقع کامیابی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بے شک ہم نے چراغ دین کو سزا دلوانے کے لیے سازش کی تھی مگر ہم سے پہلے قدرت اس کو سزا دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کے نامہ اعمال میں وہ سب جرائم بھی شامل تھے جو اس نے تدبیر پہ تکیہ کرتے ہوئے کیے اور تقدیر کو نظر انداز کیا۔ یہ بھول گیا کہ ہر شخص کے لیے زندگی میں خوش بختی کا، خوشیوں اور کامیابیوں کا ایک کوٹہ ہے۔ جو اعمال کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے تو کہیں کم۔ اور زیادہ خرچ کرنے سے یہ کوٹہ ختم ہو جاتا ہے تو مقدر میں صرف دکھ، محرومی اور ناکامی رہ جاتی ہے۔ اس نے میرے والد کی دولت میں سے غبن کیا تھا اور سزا نہ پا کے یہ سمجھا تھا کہ خوش قسمتی اس کے ساتھ ہے اس کے بعد بھی وہ اسی خوش قسمتی پر بھروسہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا گیا۔ ترقی کرتا رہا اور دولت مند بن گیا۔ یہاں تک

www.paksociety.com

کہ وہ دن طلوع ہوا جب اس کے پاس خوش قسمتی کے خزانے میں ایک تنکا بھی نہ رہا جو اسے ڈوبتے وقت سہارا دے سکتا اور ایک لمحہ وہ بدبختی کے دشمن اندھیرے میں تنہا محصور ہو گیا۔ قسمت کی بساط پر درست قدرت نے مجھے صرف ایک پیادے کی طرح آگے بڑھایا تھا اور شاطر چراغ دین کو مات ہو گئی۔ جو کچھ ہم نے کیا وہ بہانہ بن گیا ورنہ چراغ دین کے انجام کا فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ جاری جنگ کوئی اور بھی ایک چنگاری پھینک کر چراغ دین کی دنیا کو نیست و نابود کر سکتا تھا لیکن قدرت نے یہ موقع مجھے اور محسن کو اس لیے فراہم کیا کہ ہم ہی اصل مجرم گردانے گئے تھے اور چراغ دین کے معاملے میں انصاف کے طالب تھے ــ

رابعہ شاید فوزیہ کے بارے میں سوچ رہی تھی اور خود بھی احساسِ ندامت و پشیمانی کا شکار تھی۔ فوزیہ کی ماں نے جذباتی بحران کی کیفیت میں کہہ دیا تھا کہ میں نے فوزیہ کو کہیں کا نہیں رکھا۔ رابعہ کو یہ خیال ضرور آیا ہو گا کہ اس جرم میں وہ بھی برابر کی شریک ہے۔ اگر اس نے مجھ سے اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار نہ کیا ہوتا اور مجھ سے تعلقات کو کاروباری معاملات تک محدود رکھا ہوتا تو میرے اور فوزیہ کے درمیان فاصلے کی کوئی خلیج نہ ہوتی۔

"چراغ دین کی گرفتاری پر مجھے حیرانی نہیں ہوئی۔" رضوی صاحب نے بالآخر سکوت توڑا۔ "مجھے اس کے بیٹے کا زیادہ علم نہیں تھا ــ لیکن جس بات نے مجھے حیران کیا، اسے اتفاق پر مبنی نہیں سمجھا جا سکتا۔ سب سے پہلے تو خود چراغ دین نے سکندر کا نام لیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری معلومات کی حد تک اس نے جھوٹ بولا۔ پھر یہی بات مسز شیرانی نے کہی ــ اور چند منٹ پہلے شیرانی صاحب نے بھی اتنا ضرور کہا تھا کہ انہیں چراغ دین سے بدلہ لینے کے لیے جھوٹ بولا گیا ہے۔"

"اس کی وجہ بالکل صاف ظاہر ہے۔" میں نے بہت سے کام لے کر ہر شخص کے سامنے پیش کے زہر کا پیالہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ "میری منگنی بچپن ہی سے طے کر دی گئی تھی۔ اس کا احساس بھی نہ دلایا جاتا تو اچھا تھا لیکن ہمارے بزرگ مطمئن تھے کہ انہوں نے غلط فیصلہ نہیں کیا۔ انہیں ہم سے نافرمانی کی امید بھی نہیں تھی چنانچہ انہوں نے اس فیصلے کو پوشیدہ رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس کا نتیجہ ایک جذباتی تعلق کی صورت میں نکلا جو میرے اور فوزیہ کے درمیان شروع سے رہا۔ میں اس کو محبت نہیں کہوں گا۔ انس کہوں گا کچھ زیادہ انس۔ اتنا ہی جتنا مجھے اب محسن سے ہے یا اپنے والد سے تھا۔ اس وقت تک مجھے محبت کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میرے جذبات نے انس کو محبت سمجھ لیا تو اس میں کچھ قصور کم عمری کے خیالات کا تو کچھ حالات کا بھی ہے۔ سو اس کا مطلب یہ نہیں کہ فوزیہ مجھے پسند نہیں ہے۔ وہ ہر لحاظ سے بہت اچھی لڑکی ہے اور محبت کرنے کے قابل لیکن اس شخص کے لیے جسے فوزیہ سے محبت ہو جائے۔ یہ دقیانوسی فلسفہ آج بھی غلط نہیں سمجھا جاتا کہ محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جا سکتی۔ وہ شخص بہت خوش قسمت ہو گا جسے فوزیہ جیسی بیوی ملے گی لیکن میں خود کو دلاسا دینے کے قابل نہیں کر سکتا کہ میں کسی اور کو کیوں چاہتا ہوں۔ اور میں فوزیہ کو تمام عمر محبت کے فریب میں خوش رکھنے کی قسم بھی نہیں کھا سکتا۔ اس لیے میں نے سب کو پیچھے چھوڑ کے ناراض کر لیا ہے۔ حالانکہ میں نے صرف فوزیہ سے شادی کرنے سے انکار کیا ہے۔ میں اس کی خوشیوں کا دشمن سمجھا گیا ہوں۔ آج بھی اگر کوئی اسے زندگی کی کسی خوشی سے محروم کرنے کی کوشش کرے تو میں اسے معاف نہیں کروں گا۔"

"فوزیہ نے چراغ دین کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا تھا۔" رضوی صاحب نے پائپ کو خالی کر کے کہا۔ "آخر کیوں؟ اسے یہ ڈر کیوں تھا کہ چراغ دین کے ساتھ وہ خوش نہیں رہ سکے گی؟ خوف کا یہ احساس اس کے دل میں کس نے پیدا کیا؟ تم اور محسن اس معاملے میں چراغ دین کے دشمن تھے لیکن...." انہوں نے پائپ کی ڈنڈی کو میری طرف انگلی کی طرح اٹھا کے کہا۔ "تمہاری دشمنی کی جڑیں زیادہ گہری تھیں۔ اس دشمنی کا فوزیہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"کیا آپ یقین کرنا چاہتے ہیں کہ واقعی میں نے چراغ دین کے خلاف سازش کی ہے؟" میں نے کہا۔

"اوہ.... اگر تیس لاکھ کا معاملہ نہ ہوتا تو میں یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا کہ تم نے انتقامی کارروائی کی ہے۔" رضوی صاحب نے دوبارہ پائپ میں تمباکو بھرنا شروع کیا۔ "لیکن صرف مریم کے کمرے سے بیس پچیس ہزار کی چیزیں برآمد ہونے کا معاملہ ہوتا تو شاید میں بھی سمجھتا کہ تم نے سازش کی ہے۔ تمہارا ذہن سازشی ہے ــ یہ میں برے معنی میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تمہاری ذہانت ــ غالباً اس کو منفی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ تم ذہین ہو لیکن تمہاری ذہانت کسی تعمیری مقصد کے لیے استعمال نہیں ہو رہی ہے۔ تم اچھا دفاع بھی کر سکتے ہو اور ایک ایسی قانونی جنگ لڑ سکتے ہو جس میں مدعی بھی تم ہو اور منصف بھی۔ تم وکیل استغاثہ کی حیثیت سے اپنے آپ کو دلائل دیتے ہو، فیصلہ سناتے ہو اور اس پر عمل درآمد بھی کرتے ہو۔ گویا تم نے پولیس سے لے کر عدالت اور جیل کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"بالکل نہیں ــ آپ کی رائے میرے حالات کا بڑا صحیح تجزیہ کرتی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ سب کچھ مجھے اس لیے کرنا پڑتا ہے کہ آپ کی پولیس مجھے تحفظ فراہم نہیں کر سکتی۔ آپ کا نظامِ انصاف کبھی مجرموں پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ کسی قاتل کو تختۂ دار تک نہیں پہنچا سکتا۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں بھی اسی طرح ذلت و رسوائی اور بے بسی کی موت مر جاؤں جو میرے والد کا مقدر بنی تھی؟ آپ سب حالات سے باخبر ہونے کے باوجود مجھ سے توقع رکھتے ہیں...."

"میں تم سے کوئی توقع نہیں رکھتا۔" رضوی صاحب نے میری بات کاٹ دی۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم انتقام کے چکر میں نہ پڑو۔ معاف کر دینے میں بڑائی ہے اور فتح ہے۔"

"لیکن انکل صرف چاہنے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "میں کسے معاف اور کیسے معاف کروں؟ کیا کسی نے مجھے یہ موقع فراہم کیا ہے؟ یہ کہا ہے کہ سکندر رحیم ہوا ہے اسے بھول جاؤ؟ میں خود بھی عام آدمی کی طرح سکون سے جینا اور مرنا چاہتا ہوں مگر کوئی اس کی اجازت بھی تو دے ــ میری جدوجہد کا مقصد اور کیا ہے؟"

"مگر اس جدوجہد سے حاصل کیا ہو رہا ہے؟" رضوی صاحب نے برہمی سے کہا۔ "ہر روز ایک نئی پریشانی۔ ہر قدم پر اک نئی الجھن۔ مثلاً یہ بتاؤ کہ جس روز رابعہ کی امی کا جنازہ اٹھنے والا تھا، تم نے اسی گھر میں ایک شخص کو یرغمال کیوں بنا رکھا تھا؟ تم نے اسے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا تھا؟ تم پھر وہی عدم اعتماد کی بات کرو گے لیکن تم مجھ پر تو اعتماد کر سکتے تھے اور اگر یہ بھی ناممکن تھا تو صورتِ حالات کو دیکھتے ہوئے اس وقت خاموشی سے اسے چھوڑ سکتے تھے۔ تمہارے ہیرو بننے کی سزا کسے ملی؟ رابعہ کا گھر تباہ ہو گیا اور اب تم پھر وہی حماقت کر رہے ہو؟" وہ اچانک رابعہ سے مخاطب ہو گئے۔ "مس رابعہ فار یور کائنڈ [illegible]! اس وقت آپ کو ایک ایسا مکان خریدنے کا مشورہ کس عقل مند نے دیا ہے جس کے بارے میں آپ کو پہلے سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کا وہاں خیریت سے رہنا ناممکن ہے۔ آپ کے وہاں جانے سے قبل ہی اس مکان پر بم پھینکنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں آپ محفوظ تھیں۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ پھر اس حماقت کا مقصد تو صرف یہی ہوا نا کہ آپ سکندر کے دشمنوں کو بے وقوف بنانا چاہتی ہیں۔ آپ وہاں آئے بغیر اسے ڈھائی لاکھ کے منافع میں بیچ دیں تو کامیاب ہو جائیں گی لیکن کیا اس سے آپ دشمنوں کے عزائم خاک میں ملا دیں گی؟ وہ ڈھائی لاکھ کا گھاٹا کھا کے خاموش بیٹھ جائیں گے؟ آپ کی ذہانت اور سکندر کی جرأت سے شکست کھا جائیں گے؟ آپ سکندر کے ساتھ ایک ہی محاذ پر لڑ رہی ہیں۔ اس کے شانہ بشانہ قدم سے قدم ملا کے۔ فرق صرف یہی ہے کہ آپ قانونی طریقوں سے لڑ رہی ہیں اور سکندر کے طریقے غیر قانونی ہیں۔ آپ کو انجام کی فکر نہیں لیکن دوسری طرف آپ نے اور سکندر نے شادی کا فیصلہ بھی کر لیا ہے ــ شادی کے معاملے میں آپ مجھے قدامت پرست سمجھیں یا جاہل لیکن میں اس چیز کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ میرا مطلب ہے کہ آپ سب کی مشترکہ سرگرمیوں کو ــ میں آپ سب پر اعتماد کرتا ہوں اور اس اعتماد کی شکست سے ڈرتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ لوگ باہر کیا گل کھلاتے پھرتے ہیں لیکن اب میں نے حالات سے باخبر رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ مجھے ہر روز آپ لوگوں کی نقل و حرکت کی رپورٹ ملنی چاہیے اور اس کا انتظام بھی کر لیا ہے۔" وہ ہم سب کو خاموش اور ساکت و صامت چھوڑ کے باہر نکل گئے۔

"میرا خیال ہے کہ اس وقت ہمیں سکون سے سوچنا چاہیے۔" رابعہ نے فوراً ہی کہا۔ "صبح تک رضوی صاحب کا غصہ بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا اور ہم بھی ٹھنڈے دماغ سے سوچ سکیں گے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔"

رات بہت ہو چکی تھی اور ہم میں سے کوئی بھی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے اور محسن نے گزشتہ رات بھی جاگ کے گزاری تھی۔ وہ تو لیٹتے ہی سو گیا۔ کہتے ہیں کہ نیند خیالات سے فرار کا راستہ ہے۔ یہ راستہ نہ ملے تو آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ نیند کے خواب خیالات کا دباؤ کم کرتے ہیں اور سیفٹی والو کا کام کرتے ہیں۔ سیفٹی والو نہ ہو تو پریشر مضبوط سے مضبوط بوائلر کی دیواروں کو پھاڑ دیتا ہے۔ میں خود بھی نیند کی پناہ چاہتا تھا لیکن مجھے رات کی تاریکی میں ایک کام کرنا تھا جو دن کے اجالے میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دس منٹ تک میں نیند کی یلغار کو آنکھیں کھولے روکتا رہا۔ پھر میں خاموشی سے اٹھا اور سرونٹ کوارٹر کے عقبی حصے میں پہنچ کے ایک جگہ سے زمین کھودنے لگا۔

اپنے اندازے کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے بالکل صحیح جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ پندرہ منٹ بعد میں نے سلوفین میں لپٹا ہوا پیکٹ برآمد کیا اور اس میں سے وہ چھوٹا سا ریڈیو ٹرانسمیٹر نکال

www.paksociety.com

لیا جو رضوی صاحب کے ٹیلی فون ٹیپ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ ویسے واپس آنے کے بعد میں نے ہاتھ منہ دھو کر ریڈیو ٹرانسمیٹر کو سرہانے کی طرف بستر کے نیچے رکھا اور سو گیا۔ تھکن سے میری حالت اتنی غیر ہو رہی تھی کہ بستر پر گرتے ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں اور میں ایسی گہری نیند میں گم ہو گیا جسے بے ہوشی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ صبح نو بجے بھی میں اس وقت جاگا جب محسن نے میرے اوپر پانی سے بھری ہوئی بالٹی الٹ دی۔

"یہ کیا بدمعاشی ہے؟" میں نے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"اٹھیے حضور والا! سیلاب آگیا ہے۔" محسن نے کہا۔ پھر وہ اور رابعہ میری حالت دیکھ کر بے اختیار ہنسنے لگے۔

"سیلاب ہے کیسا سیلاب ہے سیلاب بکا؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کس کے گھر جانے کا سیلاب تمہارے لیے ہے اگر میں ڈوب جاتا تو کیا ہوتا؟"

"ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟" محسن بولا اور داد طلب نظروں سے رابعہ کو دیکھنے لگا۔

"بتا یہ کہ ___ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔" میں نے تولیہ اٹھا کے ہاتھ روک کر غسل کا رخ کیا اور ان دونوں کے ہنسنے کی پروا نہ کی۔ جب میں نہا دھو کے اور کپڑے بدل کے باہر آیا تو رابعہ میرے گیلے بستر کو کرسی کی دیوار پر دھوپ میں ڈال چکی تھی اور محسن ریڈیو ٹرانسمیٹر کا معائنہ کر رہا تھا۔

"خیال گیا اس میں بھی پانی ہے؟" میں نے کہا۔ "اب اس ڈبے کو پھینک دے۔"

"ڈبا بالکل ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن اس وقت گڑے مردے کو اکھاڑنے کا مقصد کیا ہے؟"

"مقصد بہت نیک ہے اور آج شام تک واضح ہو جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"رضوی صاحب پہلے ہی بہت خفا ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "وہ بتا چکے ہیں کہ آئندہ ہماری نقل و حرکت کی نگرانی ہوگی۔ خدا کے لیے کوئی نیا ہنگامہ مت کھڑا کرنا۔"

"زندگی ایک مسلسل ہنگامہ ہے۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "اسی لیے چچا مرحوم نے کہا تھا کہ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ جب ہم یہاں سے چلے جائیں گے تو رضوی صاحب کو احساس ہوگا کہ ہمارے دم سے یہاں کتنی رونق تھی۔ باقی رہی نگرانی کی بات تو اس سے کیا ڈرنا۔ ہم ایسے غائب ہوں گے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"

"پھر بھی رہیں گے تو اسی شہر میں" رابعہ بولی۔ "اور یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ ہم شملا کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر میں نہیں بیٹھ سکتے۔ مجھے اور تمہیں اپنے اپنے کاروبار کے سلسلے میں حاضر ہونا ہی پڑے گا۔ میں تو آفس کو بھی چھوڑ سکتی ہوں مگر تمہارے لیے تاریخ سماعت پر غیر حاضر ہونا ناممکن ہے۔ تمہاری ضمانت منسوخ ہو جائے گی۔"

"ہو سکتا ہے کل میں خود بھی اپنی ضمانت کے لیے ضمانت کی منسوخی کا طریقہ اختیار کروں۔" میں نے کہا۔ "ہوگا لیکن آج مجھے اور تمہیں بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ تمہیں کورٹ جا کر خسرو جمشید سے ملنا ہے اور مکان وغیرہ کے قانونی معاملات طے کرنے ہیں۔ محسن کو یہ دیکھنا ہے کہ شملا کے پرانے گھر سے سامان نکالنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ پھر اگر ممکن ہو تو محسن آج شام تک کسی وقت شملا کی ماں کے پاس جائے اور اسے عدنان کا خط پڑھ کر سنائے تاکہ اسے کچھ قرار آ جائے۔ خط کا لفافہ محسن چند منٹ میں لکھ دے گا۔ خط کے ساتھ ہی شملا کی طرف سے ماں کو پانچ سو روپے بھی پہنچا دیے جائیں تو وہ بہت خوش ہوگی۔"

"لیکن ہم اسے کب تک ان جھوٹی خوشیوں سے بہلاتے رہیں گے؟" رابعہ نے اداسی سے کہا۔

"جب تک یہ ہمارے اختیار میں ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی سے سچ کا زہر دے کر مارنے سے کیا فائدہ؟ جھوٹی اگر ہیں تو ہمارے نقطہ نظر سے، اس کے لیے بڑی سچی ہوں گی اور جب تک وہ جیے گی ان سچی خوشیوں کو محسوس کرتی رہے گی لیکن میرا خیال ہے وہ زیادہ دن نہیں جیے گی۔"

"تو نے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے" محسن نے کہا۔ "تو کس محاذ پر ہوگا؟"

"میں ابھی کچھ دیر بعد شملا کے پاس جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اور پھر تمہیں وہیں ملوں گا۔ اگر نہ ملوں تو میرا انتظار کرنا۔ بالفرض محال انکل رضوی نے کسی کو ہماری نگرانی پر مامور کیا ہوگا تو وہ کس کس کے پیچھے جائے گا؟ ہم تینوں مختلف اوقات میں روانہ ہوں گے۔ ہماری منزلیں اور راستے جدا ہوں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ رابعہ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر تجھے کوئی اپنے تعاقب میں نظر آئے جو صورت سے پولیس کا آدمی لگتا ہو تو تو بھی شک کر کے اپنی جان چھڑا لینا۔ میں خود بھی آ کر دیکھ لوں گا کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

بات ختم کرتے ہوئے ہم نے اخبارات دیکھے اور ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب چراغ دین کے متعلق رضوی صاحب کی فراہم کردہ معلومات سو فیصد درست ثابت ہوئیں۔ اس کے گھر میں سے واقعی لاکھوں کا مال برآمد ہوا تھا۔ محسن نے ایک سازش کر کے منشیات کا اسمگلر ثابت کرنا چاہا تھا لیکن یہ بات ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ چراغ دین واقعی اسمگلر ہے۔ قدرت پہلے ہی اسے سزا دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ہم تو محض ایک ذریعہ بن گئے تھے۔ پولیس کے ذرائع کے مطابق ملزم چراغ دین نے بہت سی باتوں کا اعتراف کر لیا تھا۔ مثلاً یہ کہ جب وہ پلاسٹک کے کھلونے بنا کر بیرون ملک بھیجتا تھا تو ان کھلونوں میں منشیات باہر بھیجتا تھا اور اس کا طریقہ کار بہت محفوظ تھا۔ وہ سیکڑوں میں سے ایک کھلونا اس مقصد کے لیے استعمال کرتا تھا اور چیکنگ کے دوران ایک کھلونے کے پکڑے جانے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے لیکن اس کا ایک کاروباری شریک دشمن ہو گیا تو چراغ دین نے بے فکری میں سنگدلی اور ایک انتہائی اسٹور کھول لیا۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تلاشی کے دوران چراغ دین کے گھر سے ہمیں کئی ایسے ملے تھے جو دیکھنے میں عام سے بارڈ بیٹ سے بھرے ہوئے نظر آتے تھے لیکن ان میں منشیات کی خاصی بڑی مقدار موجود تھی۔ خاصی بڑی مقدار میں منشیات پولیس نے یا پھر اخبار والوں نے زیب داستاں کے لیے گھڑی تھی ورنہ ہم بھی جانتے تھے کہ وہ مقدار کچھ اتنی نہیں۔ خصوصاً منشیات کی اسمگلنگ کرنے والوں کے نقطہ نظر سے۔ اخبار میں یہ بھی تھا کہ ابھی تفتیش جاری ہے اور پولیس کچھ ناموں کو صیغہ راز میں رکھ رہی ہے اور مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ بعض اخبارات میں صفحہ اول پر چراغ دین کی تصویر کے ساتھ مع وارد تھی۔

بہت عرصے بعد یہ پہلی خبر تھی جو میرے دل کے لیے تسکین کا سامان بنی۔ کل تک جو شملا کی تھا وہ آج شکار ہو چکا تھا اور اس پہلی کامیابی نے میرے عزم و حوصلے کو دو چند کر دیا تھا۔ ہم ابھی اس موضوع پر گفتگو کر ہی رہے تھے کہ اسلام آباد سے محسن کے والد کی ٹیلی فون کال موصول ہوئی۔ ٹیلی فون سے رابعہ نے ریسیور اٹھایا اور ہم نے اسے اشارے سے سمجھا دیا کہ شیروانی صاحب ہمارے بارے میں پوچھیں تو کہہ دے کہ ہم دونوں موجود نہیں ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ شیروانی صاحب نے کھل کے رابعہ سے بات کی۔ شیروانی صاحب بہت خوش تھے کہ چراغ دین کی گرفتاری سے اس کی شخصیت بروقت بے نقاب ہو گئی اور فوزیہ کی زندگی تباہ ہونے سے بچ گئی۔ فوزیہ نے اس خبر سے کوئی خاص تاثر قبول نہیں کیا تھا لیکن اس کی ماں کا صدمے سے برا حال تھا کہ خدانخواستہ یہ شادی ہو جاتی تو ان کی کتنی بدنامی ہوتی اور مریم کی ناگہانی موت کے بعد فوزیہ پر ان کی زبردستی کے باعث کوئی آفت ٹوٹ جاتی تو وہ جیتے جی مر جاتیں۔ یہ بات بھی باعث اطمینان تھی کہ ہمارے بارے میں محسن کے والدین کے خیالات میں بڑی خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔ انہوں نے تسلیم کر لیا تھا کہ میری اور محسن کی چراغ دین سے کوئی ذاتی عداوت نہیں تھی اور ہم فوزیہ سے اس کے رشتے کی مخالفت کر رہے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم کو اصل حالات کا علم تھا لیکن کسی مجبوری کی بنا پر ہم اصل حقائق بیان کرنے سے گریز کرتے تھے ___ مجموعی طور پر میری کوشش کا نتیجہ میری خواہشات کے مطابق رہا تھا۔ چراغ دین بالآخر قانون کی گرفت میں آگیا تھا اور جس منزلت وہ پہلے محفوظ رہا تھا وہ اب اس کا مقدر ہو چکی تھی۔ اس نے میرے والد کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھایا تھا اور اس کو بھی مجھ پر اعتماد کرنا بہت مہنگا پڑا تھا۔ چراغ دین نے میرے والد کو ذلت کا عذاب سہنے پر مجبور کیا تھا اور اب خود بھی عذاب میں مبتلا تھا۔ اس نے جتنا غبن کیا تھا اس میں حرام کی کمائی سے ہزار گنا اضافہ کر لیا تھا لیکن اب اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا اور اس طرح برسوں بعد انصاف کے تقاضے پورے ہو گئے تھے۔ چراغ دین کی دنیاوی عزت اور وقتی کامیابی سے حاصل ہونے والی دولت کا غرور خاک میں مل گئے تھے۔ فوزیہ کی زندگی بچ گئی تھی اور میرے ساتھ محسن کو بھی تمام تفکرات سے اور سب اندیشوں سے نجات مل گئی تھی جو فوزیہ کی ذات سے وابستہ تھے۔

رابعہ کے کورٹ چلے جانے کے بعد میں نے محسن کو اپنے عزائم سے آگاہ کیا۔

"تو نے ڈی سلوا کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" محسن بولا۔ "میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اس طرح کرنا ہے کہ اس سے قانون کی راہ میں حائل دشواریاں دور ہو جائیں اور انصاف ہو سکے۔ مجرموں کو سزا مل جائے جنہوں نے اپنے چالاک ذہن کی مدد سے اپنے جرم کا کوئی سراغ نہیں چھوڑا ہے۔ ہمیں اپنا حق حاصل کرنا ہے اور انصاف حاصل کرنا ہے اور ظالموں کو بتانا ہے کہ ہم بھی لڑنے کا حوصلہ رکھتے

www.paksociety.com

میں ہرگز مجرم نہیں بننا ہے۔"

"ابھی میرا الظفرۃ بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں بھی تم کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم بزدل نہیں ہیں۔ ہم نے ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں اور ہم طاقت میں بھی کم نہیں۔ چراغ دین کو جیل پہنچایا تھا ہم نے اسے جیل پہنچا دیا اور اسے جو سزا ملے گی آخری ہی ہوگی جس کا وہ مستحق تھا۔ قتل کرنا کیا مشکل ہے۔ میں ان سب کو ٹھکانے لگا سکتا ہوں جن کو مجرم سمجھتا ہوں لیکن اس طرح میں خود بھی مجرم کہلاؤں گا۔ میں قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لوں گا لیکن قانون کے ہاتھ اتنے مضبوط ضرور کردوں گا کہ ہر مجرم کی گردن تک پہنچ سکیں۔ اگر میں نے شروع ہی سے کمزوری کا مظاہرہ کیا ہوتا تو دشمن اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو جاتے اور ان کی مجرمانہ سرگرمیاں جاری رہتیں۔ آخر میں ضمیر فروش ہوتا تو اس وقت لندن میں عیش کر رہا ہوتا لیکن میں عہد کر چکا ہوں کہ مخالفوں سے ظلم کے ایک ایک لمحے کا حساب لوں گا اور اپنے حق سے دستبرداری کبھی قبول نہیں کروں گا خواہ اس کے لئے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔"

"لیکن تو نے جو انتظام کیا ہے اس میں ڈی سلوا کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔" محسن بولا۔

"اس نے بھی میرے بچنے کی کوئی صورت نہیں چھوڑی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن جس طرح میں بچ کر نکل آیا تھا اگر بچ سکا تو وہ بھی نکل آئے گا۔ مقصد تو اس کو یہ احساس دلانا ہے کہ ہم بھی اپنی طاقت اور وسائل کے اعتبار سے کم نہیں اور برابر کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس کا یہ غرور ختم ہو جانا چاہیے کہ وہ جب چاہے ہمیں حقیر کیڑے کی طرح مار سکتا ہے اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کھیل میں زندگی اور موت کے امکانات دونوں فریقوں کے لیے برابر ہیں۔ شکاری اگر وہ ہے تو ہم بھی ہیں اور کسی طرح بھی اس سے کم نہیں ہیں۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

"میں تجھے اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔" محسن نے کہا۔ "شہلا کے پرانے گھر سے سامان نکالنے کا مسئلہ اتنا اہم یا مشکل نہیں۔ ہم دونوں وہاں جا کے یہ کام کل بھی کر سکتے ہیں۔ زیادہ خطرناک کام وہ ہے جو تو اکیلے کرنا چاہتا ہے۔"

"جیسی تیری مرضی۔" میں نے کہا۔ "اصل کام تو شہلا کا ہے جو زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اگر وہ ہماری ہدایات کے مطابق ڈی سلوا سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی تو باقی کام میں سنبھال لوں گا۔"

"تو بہت سے خطرات کو نظر انداز کر جاتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "احتیاط اچھی چیز ہے۔ میں وہاں رہ کر نگرانی کر سکتا ہوں اور کوئی غیر متوقع بات ہو تو مدد کو پہنچ سکتا ہوں۔"

دوپہر کے قریب ہم شہلا کے پاس پہنچے۔ چند سطروں پر مشتمل ایک خط تحریر کیا تھا۔ ماں اگر اندھی نہ ہوتی تو یقیناً اس جعلسازی کو پکڑ لیتی۔ تحریر اس کے بیٹے کی نہیں ہے مگر اس نے بے اعتبار کیا اور اس خط کے مضمون کو کئی بار سنا۔ صورت پر مسرت اور اطمینان کے جذبات اور روشنی دیکھ کر محسن کے احساس جرم و پشیمانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ پانچ سو روپے اس طرح سے کہ ولایت سے اس کے بیٹے نے ماں کے نام کے پانچ سال ارسال کر دیے ہوں۔ یہ احساس دولت تھی۔ تقدیر کا یہ ستم بھی عنایت سے کم ... آنکھوں کی روشنی نہ رہی۔ اب وہ صرف ... سے دیکھ رہی تھی کہ بیٹا لندن میں خوشحال ہے۔ آنکھیں ہوتیں تو صرف وہ قبر دیکھتیں ... کی جگہ صرف اس کی ہڈیاں رہ گئی تھیں۔

دوسرے کمرے میں میں نے شہلا سے ... "تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں اپنے ساتھ آفس لے جاؤں گا۔"

وہ چونک پڑی۔ "کون سے آفس؟" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

اس کا خوف دور کرنے کے لیے میں ... "وہی آفس جہاں تم ڈی سلوا صاحب کی ... سیکرٹری تھیں۔"

شہلا کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ "اگر یہ مذاق ہے تو میں سمجھ نہیں سکی۔"

"یہ مذاق ہرگز نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم میرے ساتھ جاؤ گی۔ آفس کے دروازے تک میں تمہارے ساتھ رہوں گا لیکن اندر تم کو اکیلے ہی جانا ہوگا۔ تمہاری واپسی کا منتظر رہوں گا۔ دفتر میں تمہارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہاں دوسرے لوگ بھی موجود ہوں گے۔ چنانچہ ڈی سلوا تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر سکے گا۔ وہ تمہیں زبردستی اپنے ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا۔ اس نے کوشش کی تو میں اس کا راستہ روک لوں گا۔

میں بھی وہاں اکیلا نہیں رہوں گا، کچھ فاصلے پر محسن بھی موجود ہوگا۔"

"لیکن... لیکن یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" شہلا نے کہا۔ جواب بہت بنتی میری صورت کو دیکھ رہی تھی۔

"میں ڈی سلوا سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس سے کچھ باتیں کرنی ہیں لیکن وہ میرے بلانے پر نہیں آئے گا۔"

"پھر وہ میرے بلانے پر کیسے آ جائے گا؟" شہلا نے کہا۔ "وہ میری جان کا دشمن ہو رہا ہے اور اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"اسے یہ خیال ضرور ہوگا کہ ہم نے تمہیں چھپا رکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں۔ ابھی تک کسی نے تم کو ہمارے ساتھ آتے جاتے نہیں دیکھا ہے اور کسی کو یہ بھی علم نہیں کہ تم کہاں ہو۔ تو تمہیں اسے یقین دلانا ہوگا کہ تم محض پولیس کے ڈر سے روپوش تھیں اور اسی لیے لوٹ کر اپنے گھر نہیں گئیں کہ وہاں قتل ڈولن کی واردات ہو چکی تھی۔ پولیس کی تفتیش کے علاوہ تم ان لوگوں سے بھی خوفزدہ تھیں جن کے ساتھی مارے گئے تھے۔ تم ڈی سلوا کو یقین دلا سکتی ہو کہ بعد میں ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں رہا۔"

"وہ پوچھے گا تمہیں کہ اب میرے پاس کیوں آئی ہو؟"

"ضرور پوچھے گا۔" میں نے کہا۔ "اور اس کا جواب بہت آسان ہے۔ تم کہہ سکتی ہو کہ تمہیں پناہ کی ضرورت ہے اور ملازمت بھی چاہیے کیونکہ اس طرح چھپ کر کب تک زندگی گزاروں گی اور بیمار ماں کے علاج کے لیے پیسے کہاں سے لاؤں گی۔ تمہاری کامیابی کا دارومدار تمہاری اداکاری پر ہے۔ ڈی سلوا کو اعتبار آ جانا چاہیے کہ تم اس کے پاس واقعی مدد حاصل کرنے کے لیے آئی ہو۔"

"وہ سوال کر سکتا ہے کہ تمہارے حمایتی کہاں گئے؟" شہلا نے پریشان ہو کے کہا۔

"ہاں ڈی سلوا یہ بات پوچھ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اس کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ وہ حمایتی کسی کی کیا مدد کریں گے جو خود چھپتے پھرتے ہوں، مقدمات میں ملوث ہوں اور زیر ضمانت ہوں۔ بات یہ ہے شہلا کہ ہر قسم سوال کا جواب تمہیں طوطے کی طرح نہیں رٹایا جا سکتا۔ تم خود بھی ذہین ہو۔ تمہیں ڈی سلوا کا اعتماد حاصل کرنا ہے۔ یہ سمجھانا ہے کہ تمہارے دل میں کوئی رنجش نہیں اور تم ماضی کی ہر تلخی کو فراموش کر چکی ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ صرف ڈی سلوا ہی تمہیں بچا سکتا ہے کیونکہ طاقتور ہے، دولت مند ہے اور اثر و رسوخ کا مالک ہے۔"

ڈی سلوا کو زیر دام لانے کا ایک اور طریقہ بھی تھا جو کامیابی کا سو فیصد ضامن ہو سکتا تھا لیکن یہ بات ایسی تھی کہ میں اپنی زبان سے شہلا کے سامنے نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا۔ میں نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور اس کے ایک صفحے پر لکھا۔ "ڈی سلوا کو یہ تاثر بھی دینا کہ تم اس کے بچے کی ماں بننے والی ہو لیکن تمہارا ارادہ اس کو بلیک میل کرنے کا ہرگز نہیں ہے بلکہ تم یہ چاہتی ہو کہ ڈی سلوا تمہیں اس پریشانی سے نجات دلا دے۔"

شہلا غور سے مجھے دیکھتی رہی۔ شاید تذبذب کے آثار میری صورت سے بھی عیاں تھے۔ وہ حیران تھی کہ بات کرتے کرتے میں کیا نوٹ کرنے لگا ہوں۔

"ڈی سلوا کے آفس میں داخل ہونے سے پہلے یہ بھی پڑھ لینا۔" میں نے صفحے کو نوٹ بک سے پھاڑ کر الگ کیا اور کئی بار موڑ کے تعویذ کی طرح کر دیا۔ "ابھی اس کو اپنے بیگ میں ڈال لو۔ یہ تمہارا ترمپ کارڈ ہے۔ اگر تم نے عقل سے کام لیا تو ڈی سلوا تم سے ملنے ضرور آئے گا۔ جہاں بھی تم کہو گی۔ اس کے پیش نظر ایک مقصد تو یہ ہوگا کہ کسی طرح اپنی پریشانی ختم کرے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں آلۂ کار بنا کے ہمارے خلاف استعمال کرنے کی سوچے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم پر قطعی اعتبار نہ کرے۔ یہ سمجھے کہ تمہارا آنا ایک سازش ہے اور تم اسے بیوقوف بنا کے فائدہ اٹھانا چاہتی ہو۔ ایسی صورت میں وہ تمہیں بے وقوف بنا کے ہر طرح سے تمہاری مدد کا وعدہ کرے گا لیکن در حقیقت تمہارا جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہے گا۔ ہر صورت میں وہ تمہارے بلانے پر ضرور آئے گا۔ تم اسے آج شام یا رات کے وقت کسی بھی ایسی جگہ ملنے کے لیے کہہ سکتی ہو جہاں اس کے لیے خطرہ کی کوئی بات نہ ہو۔ مثلاً مال روڈ پر کسی جگہ بھی۔ باغ جناح میں یا میوزیم کے سامنے۔"

"مجھے اس کے سامنے جاتے ہوئے خوف آتا ہے سکندر بھائی!" شہلا نے کہا۔ "وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"کیا یہ بات میں نہیں جانتا؟" میں نے تھوڑی سی خفگی کا اظہار کیا۔ "اور تم کیا یہ سمجھتی ہو کہ میں جانتے بوجھتے

www.paksociety.com

تمہیں خطرات میں دھکیل رہا ہوں یا تمہیں اعتماد نہیں ہے کہ ضرورت پڑنے پر میں تمہاری حفاظت کر سکوں گا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" شہلا نظر جھکا کر بولی۔ "دنیا میں میرا کون ہے۔ حقیقی رشتوں کا میرے لیے کوئی مفہوم نہیں۔ خطرہ میرے لیے کیا ہے... اگر یہ تنہا، بے مصرف اور فکر بھری زندگی ختم ہوتی ہے تو ہو جائے۔ مجھے اس سے اتنا پیار نہیں ہے۔"

"پھر وہی بے وقوفی کی باتیں۔" میں نے اس کو بڑے بھائی کی طرح ڈانٹا۔ "حقیقی اور غیر حقیقی رشتے کیا ہوتے ہیں۔ رشتوں کا تعلق صرف جذبات سے ہے۔ تمہاری مراد خون کے رشتوں سے ہے تو دیکھو میرا بھی کسی سے کوئی رشتہ نہیں اس کے باوجود میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اپنے لیے، محسن کے لیے، تمہارے لیے اور رابعہ کے لیے اور دوسرے بہت سے لوگوں کے لیے۔ جن سے میری جذباتی وابستگی ہے۔ یہ رشتہ ایک زنجیر ہے جسے میں نہیں توڑ سکتا۔ پھر تم کیوں کہتی ہو کہ زندگی کا کوئی مصرف نہیں اور تمہارا کوئی نہیں ہے۔ جب میں تمہارا بھائی ہوں تو میرے تمام رشتے بھی تمہارے ہیں اور ہم سب کے لیے تمہاری زندگی بے حد اہم ہے۔ ہم تمہیں اس زندگی سے پیار کرنا بھی سکھا دیں گے۔"

شہلا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے لیکن وہ مسکرائی۔ "مجھے معاف کر دیجیے بھائی جان! میں بہت بے وقوف ہوں۔ میں نے زندگی میں دکھ ہی دکھ دیکھے ہیں۔ آہستہ آہستہ مجھے اپنے آپ پر اور دوسروں پر اعتماد کرنا آ جائے گا۔"

ہم تینوں گھر سے نکلے تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا لیکن بھوک ہم میں سے کسی کو بھی نہیں تھی۔ ٹیکسی کو ہم نے مال روڈ پر چھوڑ دیا۔ محسن نے بیڈن روڈ تک ہمارا ساتھ دیا اور میں نے چند قدم پیچھے رہ کر میری لینڈ کمپنی کے دروازے تک شہلا پر نظر رکھی۔ یہ بہت غیر دانشمندانہ فعل تھا۔ اگر ڈی سلوا یا اس کے آفس کا کوئی آدمی ہمیں آگے پیچھے دیکھ لیتا تو فوراً سمجھ جاتا کہ ہم ایک ساتھ آئے ہیں۔ شہلا نے آخری بار پلٹ کر مجھے دیکھا اور سیڑھیاں چڑھ گئی۔ میں سیدھا گزر گیا اور بیس قدم دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ بھرا ہوا ریوالور محسن کے پاس بھی تھا اور میرے پاس بھی اور ہم نے دونوں طرف سے ناکہ بندی کر رکھی تھی لیکن اس کے باوجود میرا ذہن وسوسوں اور اندیشوں کا شکار تھا۔ کبھی مجھے خیال آتا تھا کہ ڈی سلوا اپنے آفس میں شہلا کا کام تمام نہ کر دے۔ اگر کسی نے بھی شہلا کو آفس میں جاتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا تو گواہ کون ہوگا؟ پھر وہ رات کو کسی وقت اکیلا لاش کو ٹھکانے لگا دے گا۔ یہ خیال بالکل بے بنیاد تھا۔ اگر ہم چھٹی کے وقت تک انتظار کرنے کے بعد بھی ڈی سلوا اکیلا اترا ہے تو ہم اسے کہاں جانے دیتے۔ کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ دفتر میں چھپا دے یا لاش کو گم کر دے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ شہلا اگر ڈی سلوا کو قائل کرنے میں ناکام رہی تو صورت حال زیادہ سنگین ہو جائے گی۔ ڈی سلوا یقیناً شہلا کو ختم کرنے کی سوچے گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ کس کے ایما پر اسے چکر دینے آئی تھی۔ ممکن ہے وہ خود اس کا تعاقب کرے یا وعدہ کرنے کے باوجود شام کو خود لینے نہ آئے بلکہ اس کے آدمی شہلا کو اٹھا لے جائیں۔ یہ اندیشے بے بنیاد نہیں تھے چنانچہ یہ ضروری تھا کہ میں قبل از وقت حفاظتی اقدامات پر غور کر لوں۔ ڈی سلوا کو شہلا کے تعاقب سے روکنے کا طریقہ فوراً میری سمجھ میں آ گیا۔ اس کی گاڑی سڑک پر زینے سے تقریباً بیس گز دور کھڑی تھی۔ ادھر ادھر نگاہ ڈالتے ہوئے مجھے کتابوں اور کاپیوں کی چھوٹی سی دکان نظر آئی۔ وہاں سے میں نے ایک معمولی سی پرکار لی۔ میں اطمینان سے چلتا ہوا ڈی سلوا کی گاڑی تک پہنچا۔ دیوار اور گاڑی کے درمیان مشکل سے ایک فٹ کا فاصلہ تھا اور ایک صاحب ابھی ابھی ازار بند باندھتے اور خفت سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نکلے تھے۔ ان کی جگہ میں نے لی تو کسی نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر آگے اور پیچھے کے دونوں پہیوں کو پرکار کی نوک سے پنکچر کر دیا اور ایک منٹ بعد دور کھڑا ہو کے دونوں پہیوں کی ہوا نکل جانے کے بعد گاڑی کو دیوار کی طرف جھکتا ہوا دیکھتا رہا۔ ایک ٹائر فلیٹ ہو جائے تو دس منٹ میں اس کی جگہ دوسرا اسپیئر وہیل لگایا جا سکتا ہے لیکن ایک ہی وقت میں دو ٹائر بیکار ہو جائیں تو مسئلہ بن جاتا ہے اور گاڑی کو جیک پر چھوڑ کے پنکچر لگوانے لیے جانا پڑتا ہے۔ میں دل ہی دل میں اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا جب ڈی سلوا نیچے آ کر دیکھے گا کہ دو ٹائر فلیٹ ہیں اور ایک نہ شد دو شد والا مسئلہ ہے۔ شہلا کو اوپر گئے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا اور میری رسٹ واچ میں تین بج کر دس منٹ ہو رہے تھے جب وہ نیچے اتری اور مال روڈ کی طرف پیدل روانہ ہو گئی۔ آگے محسن موجود تھا چنانچہ میں وہیں کھڑا رہا۔ دو منٹ بعد ڈی سلوا تیزی سے نیچے آیا اور اس نے شہلا کی طرف دیکھا جو ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ پھر اس نے جیب سے گاڑی کی چابیاں نکالیں۔ ایک قدم آگے بڑھا اور رک گیا۔ اس کی نظر نے دونوں بیٹھے ہوئے ٹائروں کو دیکھ لیا تھا۔ اس کا چہرہ بگڑ گیا اور اس کے لبوں کی جنبش سے میں نے اندازہ کر لیا حسب عادت اس نے کوئی گالی بکی ہے۔ پھر اس نے ایک موٹر سائیکل کا ہینڈل پکڑ کر دیکھا جو شاید اس کے کسی ماتحت کی تھی اور واپس اوپر گیا۔ وہ دوسری بار نیچے اترا تو اس کے ہاتھ میں موٹر سائیکل کی چابیاں تھیں لیکن موٹر سائیکل کا لاک کھولنے اور اسے کک مار کے اسٹارٹ کرنے میں مزید تین منٹ صرف ہو گئے۔ میری طرح وہ بھی دیکھ رہا تھا کہ شہلا نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ اگر اس نے شہلا کی بات پر اعتبار نہیں کیا ہوگا تو اس کو یہ شک بھی ہوا ہوگا کہ شہلا نے ہی اوپر آنے سے پہلے ہوا نکال دی تھی۔ وہ موٹر سائیکل لے کر گیا اور پانچ منٹ بعد لوٹ آیا۔ ناکامی کی کوفت اس کی صورت سے عیاں تھی۔ وہ موٹر سائیکل کو پھر اسی جگہ چھوڑ کے آفس میں داخل ہو گیا تو میں نے وہاں رکنا فضول سمجھا۔ غصے اور پریشانی میں ڈی سلوا نے چابیاں بھی موٹر سائیکل ہی میں لگی چھوڑ دی تھیں۔ مفت کی تفریح کی خاطر میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور ہوا ہو گیا۔

محسن اور شہلا شیزان میں میرے منتظر تھے۔ شہلا کے روپوش ہونے کا سب سے آسان طریقہ یہی تھا کہ وہ چند قدم کے فاصلے پر واقع شیزان میں گھس جاتے۔ اگر وہ سڑک پر رک کر رکشا یا ٹیکسی کا انتظار کرتی تو ڈی سلوا اس کے پیچھے لگ جاتا۔ اس نے مال روڈ تک آ کے دیکھا ہوگا اور شہلا دور دور تک نظر نہ آئی ہوگی تو فرض کر لیا ہوگا کہ اتفاق سے شہلا کو فوراً کوئی سواری مل گئی اور وہ نکل گئی۔ شہلا نے مجھے بتایا کہ بظاہر مشن کامیاب رہا ہے۔ ڈی سلوا پہلے اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ پھر بہت لال پیلا ہوا تھا مگر شہلا نے میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اس کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ مجبور ہو کے مدد مانگنے آئی ہے اور اسے پناہ کے علاوہ ملازمت کی ضرورت بھی ہے جو صرف ڈی سلوا ہی فراہم کر سکتا ہے۔ اس کے بعد ڈی سلوا کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور اس نے شہلا کو تسلی دی تھی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن اس میں اگر کوئی دھوکا ہوا تو شہلا کا انجام برا ہوگا۔ اس نے شہلا کو ڈرایا بھی تھا کہ پولیس اس کو ہر جگہ تلاش کر رہی ہے۔ ایک کیس تو پرانے گھر کا ہے جہاں تین بدمعاش قتل ہوئے تھے اور پولیس یہ جاننا چاہتی ہے کہ شہلا کا ان سے کیا تعلق ہے۔ پولیس کو رمضان کے قتل کے سلسلے میں بھی اس کا بیان لینا تھا لیکن سب سے زیادہ سنگین مسئلہ اس تیسری نرس کا تھا جس کے بارے میں سب نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ شہلا تھی اور اسی نے بوڑھے گورکن کو اسپتال میں زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔ ڈی سلوا اس کیس کو دبا چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے گورکن کی موت کو زندہ دفن کیے جانے کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں زہر کا ذکر تک نہ تھا لیکن شہلا کو دہشت زدہ کرنے کے لیے اس نے جان بوجھ کے یہ بات چھپائی۔ ڈی سلوا نے شام کو اپنی مصروفیت کے باعث ملنے سے معذوری ظاہر کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ اگلے روز صبح آفس آ جائے۔ وہ پولیس کے معاملات بھی ختم کرا دے گا اور دوسرے معاملات بھی۔ دوسرے معاملات کا ذکر کرتے ہوئے شہلا کا رنگ لال ہو گیا تو میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ میری تحریری ہدایات کا حوالہ دے رہی ہے۔ اب اگلے روز صبح نو بجے شہلا کو ڈی سلوا سے صدر کے [illegible] پر ڈاکٹر فیاض کے کلینک کے سامنے ملنا تھا۔ شہلا نے غلطی سے اسے بتا دیا تھا کہ وہ صدر میں رہتی ہے اور ڈی سلوا نے کہا تھا کہ پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں گلوب سینما سے مال روڈ کی طرف جانے کے بجائے صدر کی طرف سے آ جاؤں گا اور اس کو گھر سے لے لوں گا۔ اس بہانے وہ شہلا کا گھر دیکھنا چاہتا تھا مگر شہلا نے کہا کہ وہ بہت اندر گلی میں رہتی ہے اس لیے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ وہ سڑک کے کنارے ڈی سلوا کا انتظار کرے گی۔

گفتگو کے دوران ہم نے دو مرتبہ چائے پی اور کھانے پینے کی چیزوں کا اسٹینڈ خالی کر دیا کیونکہ ہم نے دوپہر کو کچھ نہیں کھایا تھا اور اب شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ ریسٹورنٹ کے اندر روشنی برائے نام تھی اور ابھی شام کا رش بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اتفاق رائے سے ہم نے شہلا کو واپس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

"محسن تمہیں ٹیکسی میں بٹھا دے گا۔" میں نے کہا "فوری

طور پر تمہارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"آپ دونوں کا پروگرام کیا ہے؟" شہلا نے کہا۔ "میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟"

"مجھے اور محسن کو کچھ شاپنگ کرنی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور تم ہمارے ساتھ نہیں پھر سکتیں۔"

"ایسی کون سی مردانہ چیز خریدنی ہے آخر؟" شہلا بولی۔ "گھر پہ رابعہ باجی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"دیکھو بھئی! ہم تمہاری رابعہ باجی کو نہیں جانتے۔" محسن نے کہا۔ "ہم اپنی مرضی کے بادشاہ ہیں۔ جیسے سکندر اعظم۔"

"سچ کہا انکل صاحب آپ نے... معاف کیجیے گا۔ شیر دانی صاحب۔" میں نے تائید کی۔

"انتظار کرنا خواتین کا فرض ہے۔" محسن بولا۔ "دادی جان آج بھی انتظار کر رہی ہیں مگر دادا جان نے چالیس سال پہلے دریا میں غوطہ مارا تھا اور ابھی تک نہیں نکلے وہ بھی مرضی کے بادشاہ تھے۔"

"شادی کے بعد ہماری بیویاں ہاتھ باندھے ہمارا انتظار کیا کریں گی۔" میں نے کہا۔

"اور وہ ان جیسی ہوئیں تو ہم ہاتھ باندھے انتظار کریں گے۔ ہم حکم کے غلام بھی ہیں۔" محسن بولا۔

ہماری باتوں پر شہلا کو بے اختیار ہنسی آ گئی تھی اور سمجھ گئی تھی کہ ان باتوں کا کوئی مقصد نہیں اور ہم اسے ٹالنا چاہتے ہیں مگر محسن کی آخری بات پر اچانک اس کی ہنسی ختم ہو گئی۔ اس نے بڑی عجیب نظروں سے محسن کو دیکھا جو زیر لب مسکرا رہا تھا مگر شہلا کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ یک لخت مجھ پر انکشاف ہوا کہ محسن نے شہلا سے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو وہ کہنا چاہتا تھا اور شہلا نے اس کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ الفاظ بڑے بازی گر ہیں کبھی ایک پورا دفتر جذبوں کا تمناؤں کی چھوٹی سی گتھی نہیں سلجھا سکتا تو کبھی چند الفاظ ایک زندگی کا افسانہ کہہ دیتے ہیں۔ ان گنت خواہشات، لامحدود خوابوں اور بے حساب امیدوں سے تعمیر ہونے والے مستقبل کا عنوان بن جاتے ہیں اور جذبات کے سمندر کو سمیٹ لیتے ہیں۔

جب شہلا ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی تو میں نے کہا۔ "محسن! اب اس پروگرام کا سب سے خطرناک مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ایمن کی دکان ہے جس نے مجھے آج شام کا وقت دیا تھا لیکن احتیاط کا تقاضا ہے کہ میں وہاں نہ جاؤں۔ کیا خبر اس نے بعد میں پولیس کو اطلاع دے دی ہو اور وہ سادہ کپڑوں میں آس پاس ہی کہیں موجود ہوں۔ ایسی صورت میں وہ ہر آنے جانے والے پر نظر رکھیں گے اور شکل بڑے غور سے دیکھ رہے ہوں گے اور میں قرب و جوار میں نظر آیا تو پکڑا جاؤں گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے ایمن نے رابعہ کی سرخ فاکس ویگن دیکھ لی ہو جس کے ذریعے میں یہاں پہنچا تھا اور اب وہ سرخ رنگ کی ہر گاڑی کو دور سے دیکھتے ہی مستعد ہو جاتے ہوں۔"

"ایمن کے مراسم بدمعاشوں سے بھی ہوں گے۔" محسن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور ہم صورت سے شریف ہیں اس لیے بدمعاشوں کو نہیں پہچانتے۔"

"ابھی مسئلہ یہ ہے کہ ایمن مجھے پہچانتا ہے اور اس نے کوئی انتظام کیا ہوگا تو میرے لیے خطرہ ہے۔ اس لیے یہ کام تجھے کرنا ہوگا۔ ریوالور تیرے پاس ہے۔ تو موٹر سائیکل پہ سیدھا اس کے سامنے جا کے رکنا اور ادھر ادھر دیکھے بغیر اندر داخل ہو جانا۔ تجھ پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ مجھے امید ہے کہ اندر ایمن کے علاوہ کوئی نہیں ہوگا اور زیادہ خطرہ نہیں ہے لیکن ایک آدھ آدمی ہوا تب بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ تجھے دیکھ کر متوجہ نہیں ہوں گے بلکہ یہی سمجھیں گے کہ کوئی گاہک کسی کام سے آیا ہے۔ پھر تو اچانک ریوالور نکال لینا۔ پانچ ہزار روپے ان کے سامنے پھینک دینا اور ان سے کہنا کہ یہ ہے باقی رقم۔ پانچ ہزار تمہیں پہلے مل چکے ہیں۔ وہ چیز نکالو جو ڈی سلوا نے بنوائی تھی۔ ظاہر ہے وہ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے اور وہ چیز تیرے حوالے کر دیں گے۔ اس کے بعد وہاں سے نکلنا تیرا کام ہے۔ نکلنے سے پہلے ان کو تنبیہ کر دینا کہ حلق سے آواز بھی نکلی تو اچھا نہیں ہوگا۔ باہر ہمارے آدمی موجود ہیں جن کے پاس دستی بم بھی ہیں۔ مجھے امید ہے اس دھمکی کے بعد وہ گڑبڑ نہیں کرے گا۔ تو اس چیز کو لباس کے اندر چھپا کے باہر آنا اور موٹر سائیکل پہ روانہ ہو جانا۔ اگر کوئی نگرانی کر رہا ہوگا تو تیری طرف متوجہ نہیں ہوگا لیکن ان کے ہوشیار ہونے تک تیرا آہنی گھوڑا بہت دور جا چکا ہوگا۔ انگلستان میں ہم نے موٹر سائیکل چلانے کی جو مشق کی تھی وہ اب کام آنی چاہیے۔ موٹر سائیکل کا تعاقب بھی مشکل ہوتا ہے۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "جو تجھے کرنا ہے وہ میں کروں گا لیکن یہ جناب بار بار موٹر سائیکل کا حوالہ دیے جا رہے ہیں یہ کہاں سے آئے گی؟"

"انگلستان کے بچے!" میں نے محسن کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "میرے پاس سب کچھ ہے۔ آ میرے ساتھ۔"

موٹر سائیکل ان سیکڑوں اسکوٹروں اور موٹر سائیکلوں کے درمیان کھڑی تھی جو جیڈان روڈ کے شیزان والے کونے سے الفلاح بلڈنگ تک پارکنگ کے لیے مخصوص فٹ پاتھ پر ایک قطار میں موجود تھیں۔ اسی صف میں سائیکلیں بھی تھیں۔ چنانچہ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ پولیس نے اسے برآمد کر لیا ہوگا۔ اس کا بدنصیب مالک پہلے تو ڈی سلوا کے سامنے مرغا بنا ہوگا جس کی غفلت کے باعث موٹر سائیکل گئی۔ ڈی سلوا نے اسے غصے میں گالیاں دی ہوں گی کہ جاؤ پولیس میں رپورٹ لکھا دو یا ضبط سے کام لیا ہوگا اور کہا ہوگا کہ رپورٹ کر دو اگر مل گئی تو میں دوسری دلوا دوں گا۔ چنانچہ ابھی تو اصل مالک تھانے تک ہی پہنچا ہوگا۔ رپورٹ لکھنے کے بعد پولیس کچھ بھی نہیں کرے گی۔ ہر روز کئی گاڑیاں گم ہوتی ہیں۔ کچھ مل جاتی ہیں جو نہ ملیں ان کی فائلیں گم ہو جاتی ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا اور سارے شہر کی ... ان کے مالک قسمت کے میٹھے پھل کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

"اس موٹر سائیکل کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ آپ اسے بغیر لائسنس بھی دوڑا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک بار اس پلیٹ کی موٹر سائیکل کو آپ تھوڑا سمجھ سکتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ کسی نے اس کا نمبر نوٹ کر لیا تو الزام ہم پر نہیں آئے گا۔ اس کا مالک ڈی سلوا کا کوئی ماتحت ہے۔ اسے ہم کل فون پر بتا دیں گے کہ میاں رونا دھونا بند کرو اور فلاں جگہ سے اپنی موٹر سائیکل اٹھا لو۔ اگر کوئی چکر پڑا تو مالک کہہ سکے گا کہ موٹر سائیکل تو ڈی سلوا صاحب لے گئے تھے اور خدا معلوم واپس لائے تھے یا نہیں۔ ادھر ایمن بھی کہے گا کہ وہ ڈی سلوا کے آدمی تھے۔ چنانچہ ڈی سلوا پھنس جائے گا۔"

"اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔" محسن نے قہقہہ مارا۔ "لیکن یار سکندر! اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ایمن جو چیز میرے حوالے کرے گا اس میں کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ ہمارے دس ہزار ضائع ہو جائیں گے۔"

"تو اس کو سمجھا دینا کہ جن کا پیسہ ہے وہ آدمی کو ضائع کر سکتے ہیں۔ پیسہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ یہ تو جوا ہے۔ بازی جیتے تو اگلی چال چلیں گے۔ اب تو جا۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "تیرے یہاں کھڑے رہنے کا فائدہ کچھ نہیں۔ معلوم نہیں مجھے کس راستے سے فرار ہونا پڑے ویسے بھی تو میری مدد کرنے کے لیے وہاں نہیں آ سکتا۔ اس لیے خدا حافظ۔ میں ایک گھنٹے کے اندر اندر گھر پہنچ جاؤں گا... شہلا کے گھر۔"

"ورنہ اگر مرے جانے نہیں پہنچے گا تو کہاں جائے گا؟" میں نے کہا اور محسن کو موٹر سائیکل پر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

میں گھر پہنچا تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ رابعہ مجھ سے پہلے پہنچ چکی تھی اور شہلا سے ہماری مصروفیات کی رپورٹ بھی لے چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتی، میں نے اس سے پوچھ لیا کہ خسرو جمشید سے مکان کا سودا ہوا کہ نہیں؟

"سودا تو ہو گیا۔" رابعہ نے کہا۔ "لیکن خسرو جمشید خود نہیں پہنچا۔ اس کی جگہ ایک وکیل حاضر ہوا جس کے پاس مختار نامہ تھا۔ حقوق ملکیت حاصل ہو گئے ہیں لیکن ضابطے کی کارروائی کے مطابق منتقلی میں کچھ وقت لگے گا۔ اس کو بیچنے کا مرحلہ اس کے بعد آئے گا۔"

"اس کی ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ خسرو جمشید نے خود آنے سے کیوں گریز کیا؟"

"اس کے وکیل نے صرف یہ کہا کہ ناگزیر وجوہ کی بنا پر جمشید صاحب حاضر نہیں ہو سکے۔ بعد میں میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی ورنہ میں کچھ اور معلوم کرتی۔" رابعہ نے کہا۔

"خسرو جمشید بھی بہت پراسرار ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بارے میں معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ کون ہے اور اس کی کہانی میں حقیقت کو کتنا دخل ہے لیکن یہ سب کچھ بعد میں ہوتا رہے گا۔ ابھی محسن آ جائے تو اس کے بعد ہمیں پہلا کام یہ کرنا ہے کہ اپنا ٹھکانہ بدل لیں۔"

"اس وقت، اتنی جلدی یہ کام کیسے ہوگا؟" رابعہ نے کہا۔ "اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

"یہ احتیاط کا تقاضا ہے۔" میں نے کہا۔ "شہلا نے ڈی سلوا کے سامنے کہہ دیا تھا کہ وہ صدر میں رہتی ہے۔ اگر ڈی سلوا نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس کا ہم سے کوئی

مکتبہ ... پوسٹ بکس نمبر ... کراچی

www.paksociety.com

تعلق چھپا نہیں تو اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ شہلا کو یہاں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ لوگ اس کے نام یا اس کی صورت سے واقف نہیں لیکن تمہاری سرخ فاکس ویگن اکثر یہاں دکھائی دیتی ہے۔ وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہاں ایک خاتون وکیل رہتی ہیں جن کی چھوٹی سی لال رنگ کی گاڑی ہے۔ میرا خیال ہے بہت سے لوگ کہیں گے کہ انہوں نے گاڑی بھی دیکھی ہے اور گاڑی چلانے والی خاتون کو بھی دیکھا ہے۔ مردوں کے مقابلے میں کار چلانے والی عورت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ شاید کوئی یہ بھی بتا دے کہ تمہارا کس گھر میں آنا جانا ہے۔ آج تو وقت نہیں رہا لیکن کل ڈی سلوا تفتیش کر سکتا ہے۔"

"لیکن میرا یہاں آنا کوئی بات نہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "ماسی ہماری پرانی خادمہ ہے اور میں گزشتہ کئی سال سے یہاں آ رہی ہوں۔"

"اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ ابھی ماسی یہاں رہے اور تم پہلے کی طرح اس کے پاس آتی جاتی رہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن شہلا اور اس کی ماں کو راتوں رات یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ کل کسی کو یہاں ان کا سراغ بھی نہ ملے۔ مکان تمہارے پاس ہے اور ایسی جگہ پر ہے جہاں ڈی سلوا کے خیال کی رسائی بھی ممکن نہیں۔ تم اب گھر جاؤ تاکہ انکل رضوی کچھ مطمئن ہو جائیں۔ محسن کے آتے ہی میں شہلا اور اس کی ماں کو کرشن نگر پہنچا دوں گا۔ ہم ضرورت کا تھوڑا سا سامان لے جائیں گے۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ گلبرگ میں شہلا کے پرانے گھر سے سب سامان اٹھایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ آج کی رات شہلا کو اپنی ماں کے ساتھ اس گھر میں اکیلے بسر کرنی ہو گی۔ کل ہم سب رضوی صاحب سے اجازت لے کر وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"لیکن صبح نو بجے تو میں نے ڈی سلوا کو ٹائم دیا ہے کہ مجھے پک اپ کرے۔" شہلا نے کہا۔

"اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "ٹھیک صبح نو بجے وہاں پہنچا دیا جائے گا۔ ہم خود وہاں موجود ہوں گے۔"

"مجھے معلوم نہیں سکندر کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔" رابعہ بولی۔ "اور جو کچھ کر رہے ہو وہ صحیح ہے یا غلط۔ تم نے اس خطرناک کھیل میں شہلا کو بھی گھسیٹ لیا ہے۔"

"شہلا کو کل صبح نو بجے صرف چند منٹ کے لیے اپنی صورت دکھانے کے سوا کچھ نہیں کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈی سلوا کی گاڑی کے رکتے ہی شہلا کا کام ختم ہو جائے گا۔ باقی معاملات میں اور محسن سنبھال لیں گے۔ شہلا اس کے بعد سے گھر لوٹ جائے گی۔"

"اور تم کیا کرو گے؟" رابعہ نے کہا۔ "ڈی سلوا کو لے جاؤ گے اور قتل کر دو گے؟"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا ہے؟" میں نے ...

"میرا ارادہ صرف یہ ہے کہ ڈی سلوا سے کچھ باتیں ... مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔ وہ آسانی سے کچھ بتائے گا ... اس لیے مجھے جبر بھی کرنا پڑے گا ... سمجھانا پڑے گا کہ وہ عالم ... یا بزدل ... کے مسئلے میں تو اپنی حفاظت مقدم ہے اور اپنی جان کے لیے دشمن سے برابر کا مقابلہ کرنا کوئی جرم نہیں ... ارادہ ڈی سلوا کو قتل کرنے کا ہرگز نہیں ہے لیکن ... ہے کہ میں اسے جینے کی رعایت دوں ..."

"تم کچھ بھی کرو سکندر۔" رابعہ نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں یہ نہیں چاہتی کہ تم کسی نئی مصیبت میں پڑ جاؤ ... تو میری خواہش ہے کہ جیسے بھی ہو تم صاحب کے پاس ... سے نکل جاؤ تاکہ باقی زندگی عام انسانوں کی طرح ... سکون سے بسر کر سکیں۔"

جب وہ چلی گئی تو میں سوچتا رہا کہ میں ... چراغ جیسی وہ طلسماتی قوت کہاں سے لاؤں جو ... کی تکمیل کا سامان بن جائے اور یہ زندگی ... جائے جو رابعہ کے تصور میں ہے۔ اس نے کہا تھا ... انسانوں کی طرح سکھ چین کی زندگی بسر کر سکتے ہیں ... میرے لیے ہی نہیں اپنے لیے بھی سکھ چین مانگا تھا ... کسے کہتے ہیں، عام آدمی کیسا ہوتا ہے... یہ ... اور آسان سوال تھے اور یہی عجیب بات تھی کہ میرے ... ان کا جواب دینا ممکن نہ تھا۔

شہلا مجھے اپنے خیالات میں گم چھوڑ کے ... کمرے میں ماں کے پاس چلی گئی تھی۔ دروازے پر ... کھٹکے کی آواز آئی تو میں چونکا پھر محسن اندر آیا ... کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور بال پریشان تھے۔

"کیا ہوا محسن؟" میں نے ایک دم اٹھ کے کہا۔ "... سے جھگڑا وغیرہ ہو گیا تھا؟"

"جھگڑا تو ہوا تھا لیکن پریشانی کی کوئی بات ..." وہ مسکرایا اور دیوار سے ٹیک لگا کے فرش پر ... "یہ کپڑے تو موٹر سائیکل سلپ ہو جانے سے پھٹے ..."

"تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ہے؟" میں نے پریشانی سے اس کے ہاتھوں اور چہرے کی خراشیں دیکھ کر کہا۔

"نہیں فکر کی کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرایا۔ "میں وہ چیز لے آیا ہوں، دیکھو۔"

"اس چیز کی بات چھوڑو۔ جا کے پہلے منہ دھو کے زخم صاف کرو اور کپڑے بدلو۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد کوئی دوسری بات۔"

محسن نے وہ ریڈیو ٹرانزسٹر میرے سامنے رکھ دیا جو درحقیقت ٹرانزسٹر تھا اور ہنسا۔ "میرے کپڑے یہاں کہاں ہیں؟ اس حالت میں گھر گیا تو انکل رضوی کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ ابھی ایسے ہی ٹھیک ہے۔ بس میں ذرا ہاتھ منہ دھو لوں۔"

جتنی دیر میں شہلا نے چائے بنائی اور محسن نے اپنا حلیہ ٹھیک کیا، میں بازار سے اسپرٹ لے آیا۔ محسن کی پتلون گھٹنے کے پاس سے اور قمیص آستین پر سے پھٹ گئی تھی لیکن صاف ستھرا ہو جانے کے بعد اس کی حالت میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ اس سے میری تشویش خاصی کم ہو گئی۔ چائے پیتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ جب وہ دکان میں داخل ہوا تو امین اکیلا تھا اور حسب توقع وہ محسن کو دیکھ کر پریشان نہیں ہوا لیکن محسن نے اچانک ریوالور نکال لیا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ پانچ ہزار لے کر اس نے ریڈیو ٹرانزسٹر محسن کے حوالے کر دیا مگر اسے بتا دیا کہ اس چیز کو اپنے ساتھ لے کر وہ زندہ نہیں جا سکے گا۔ محسن سمجھ گیا کہ باہر اس کا راستہ روکنے والے موجود ہیں۔ وہ محسن کو پہچانتے نہیں تھے لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ محسن کے باہر نکلتے ہی امین چلا کر انہیں خبردار کر دے اور وہ ان کے نرغے میں پھنس جائے۔

"میرے لیے اس خبیث کو خاموش رکھنا ضروری ہو گیا تھا۔" محسن نے چائے ختم کی اور سگریٹ جلا کے کہا۔ "میری جگہ تم ہوتے تو ایک ہاتھ مار کے اس کو لٹا دیتے مگر میں ایسے کاموں کے عادی نہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں اسے باندھ کر ڈال دیتا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیتا۔ مجبوراً میں نے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا۔ بالکل ٹھیک پڑا اور وہ آواز نکالے بغیر نیچے گر گیا۔ پہلے تو میں ڈر گیا تھا کہ چوٹ خطرناک ہوئی تو وہ مر جائے گا لیکن وہ صرف بے ہوش ہوا تھا۔ میں دکان سے نکل رہا تھا کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے کے باہر ایک گرل ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ بند کر دوں حالانکہ مقفل کیے بغیر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ یہ غلطی ہو گئی۔ گرل بند کرتے دیکھ کر ایک شخص میری طرف لپکا جو سڑک کے دوسرے کنارے پر جیپ میں بیٹھا تھا۔ میں نے کک لگا کے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور قسمت اچھی تھی کہ ایک تو موٹر سائیکل فوراً اسٹارٹ ہو گئی دوسرے وہ شخص پہلے تو ٹریفک میں پھنس گیا تھا پھر اس نے مجھے جاتے دیکھا تو پاگلوں کی طرح ٹریفک کو نظر انداز کر کے بھاگا۔ اس کی ٹکر ایک رکشا سے ہو گئی مگر اتنی دیر میں وہ گاڑی غلط سمت سے موڑ کاٹ کے مال روڈ پر پہنچ گئی۔ میرا خیال ہے اس میں دو آدمی تھے۔ انہوں نے فائر بھی کیے لیکن میری رفتار زیادہ تھی اور میں دو مرتبہ بال بال بچا۔ پھر میں نے سیدھا چلنے کی بجائے موٹر سائیکل کو موڑ کے چلانا شروع کیا۔ وہاں خاصی افراتفری پھیل گئی تھی۔ کچھ لوگ تو فائرنگ پر چونکے تھے۔ کچھ یہ سوچ رہے تھے کہ میں کوئی شوقین مزاج اور احمق نوجوان ہوں جسے نہ اپنی جان کی پروا ہے اور نہ اپنی بانکی گری سے مضطرب ہونے والی ٹریفک کا خیال ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں یہ کرتب نہ دکھاتا تو کوئی گولی مجھے ضرور لگ جاتی کیونکہ وہ گاڑی میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ میں پرانی انارکلی کی طرف نکل گیا اور جو گلی سامنے آئی اس میں مڑتا گیا۔ گاڑی کے لیے تنگ گلیوں میں تیز رفتاری سے میرا پیچھا کرنا مشکل تھا۔ پندرہ منٹ بعد میں بالکل محفوظ تھا اور اسد بازار کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ اس وقت تک مجھے خراش بھی نہیں آئی تھی۔ پس اچانک ایک بھینس سامنے آ گئی۔ بھینس گلی میں سے نکلی، اس کے پیچھے مالک ڈنڈا سنبھالے شور مچاتا آیا۔ میں بھینس سے تو بچ گیا مگر بھینس والے کو بچاتے ہوئے سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے ایک نجومی کے بورڈ سے ٹکرا کے نجومی پر گرا۔ اسے بھی کافی چوٹیں آئیں۔ ظاہر ہے قصور یا تو بھینس کا تھا یا نجومی کا جو سڑک کے کنارے بیٹھا تھا۔ وہ بہت چیخا چلایا مگر میں نے کہا کہ سڑک تمہارے بیٹھنے کے لیے نہیں بنائی گئی ہے۔ ایسے ہی نجومی ہوتے تو آج کسی اور جگہ بیٹھ جاتے۔"

مجھے اور شہلا کو محسن کے ایڈونچر کا حال سن کر بے اختیار ہنسی آئی۔ شہلا کی آنکھوں میں تو ہنستے ہنستے آنسو آ گئے حالانکہ یہ ہنسنے کا نہیں شکر کرنے کا مقام تھا۔ ایک بھی گولی لگ جاتی تو محسن نہ جانے کہاں ہوتا۔ کسی اسپتال میں یا مردہ خانے میں۔ لیکن میری طرح محسن کا ذہن بھی حقیقت پسند تھا۔ خطرے کا وجود برحق مگر خطرہ ٹل جائے تو اسے یاد کر کے دہشت زدہ ہونے کا کیا فائدہ۔ ساری

www.paksociety.com

بات رٹیفیکی کی ہے۔ محسن کی طرح یہی بات تارسے لے کر ہنستے ہنستے سنانے کے بجائے لرزتے اور کانپتے ہوئے بھی سنائی جا سکتی تھی مگر اس سے صرف ہمارا حوصلہ کم ہوتا۔ مسائل کم نہ ہوتے۔ میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر کو آن کیا۔ بظاہر اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا لیکن اس کو ٹیسٹ کرنا مشکل تھا۔ دس ہزار لے کر امین نے ہمیں صرف ریڈیو ٹرانسمیٹر دیا تھا یا اس کے اندر ویسا ہی بم بھی فٹ کیا تھا جیسا ایک بار میرا تعاقب پاک کرنے کے لیے رکھا گیا تھا۔ یہ ابھی ہم نہیں دیکھ سکتے تھے چنانچہ میں نے اسے سکھر محسن کو نقل مکانی کے پروگرام سے آگاہ کیا۔ شہلا کو اور ماسی کو جلد از جلد ضروری سامان باندھنے کی تاکید کر کے میں اور محسن پھر موٹر سائیکل پر روانہ ہو گئے۔ اب موٹر سائیکل میں چلا رہا تھا اور محسن اس ریڈیو ٹرانسمیٹر کو بغل میں دبائے پیچھے بیٹھا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم اسی طرح لندن میں بے فکری سے گھومتے تھے آج مدت بعد ان گزرے ہوئے دنوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ ہم دونوں کا موڈ بہت اچھا تھا۔ ہمیں یہ احساس قطعاً پریشان نہیں کر رہا تھا کہ ہمارے پاس کیسی ہلاکت خیز چیز موجود ہے۔ جب تک اس کا خصوصی فیوز سلامت تھا یہ ریڈیو ٹرانسمیٹر بالکل بے ضرر تھا۔ ہمیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ ہمارے پاس چوری کی موٹر سائیکل بھی ہے۔ ہماری نیت چوری کی ہرگز نہیں تھی چنانچہ ہم مطمئن تھے۔ صبح مالک کو فون کریں گے تو اس ذہنی اذیت کی معافی بھی مانگ لیں گے جو ہماری وجہ سے اس کو اٹھانی پڑی۔ موٹر سائیکل کو ہم نے رضوی صاحب کے گھر سے دور ہی کھڑا کر دیا اور پیدل چلتے ہوئے اندر گئے۔ یہ دیکھ کر ہمیں مزید اطمینان حاصل ہوا کہ رضوی صاحب موجود نہیں لیکن وہ کچھ دیر بعد آ گئے۔ اتنی دیر میں ہم نہا دھو کے فارغ ہو گئے تھے اور رضوی صاحب کو ہم نے یہی تاثر دیا کہ آج ہم شریفانہ طریقے پر سر شام ہی لوٹ آئے ہیں۔ ان کا غصہ پہلے ہی اتر چکا تھا اور انہوں نے اخبار میں چھپا امین کی گرفتاری کی تفصیلات دیکھ کر یقین کر لیا تھا کہ ہمارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں گھر میں موجود پا کے انہوں نے مزید اطمینان کا اظہار کیا اور اگر ان کو کسی دعوت میں نہ جانا ہوتا تو وہ کھانے کے بعد بھی ہم سے باتیں کرتے رہتے۔

رضوی صاحب کے دعوت میں جانے سے ہمیں ایک طرح سے نقل و حرکت کی آزادی مل گئی۔ ہم نے ان سے وعدہ کیا کہ جب بھوک لگے گی ہم بلا تکلف کھانا مانگ لیں گے مگر ان کے رخصت ہوتے ہی میں اور محسن بھی روانہ ہو گئے۔ ہماری موٹر سائیکل وہیں کھڑی تھی جہاں ہم نے اس کو چھوڑا تھا۔ پندرہ منٹ بعد ہم شہلا کے گھر پہنچے تو ماسی کے ساتھ مل کر بیشتر سامان پیک کر چکی تھی۔ ہم نے ان کی مدد کی اور آدھے گھنٹے بعد سب سامان ایک ٹرک پہ لادا جا چکا تھا۔ شہلا کی ماں کو ٹرک میں آگے بٹھانے کے بجائے میں نے پیچھے کے کھلے حصے میں چارپائی ڈال کے لٹا دیا اور ماسی بھی اس کے ساتھ ہی سامان پر بیٹھ گئی تھی۔ ٹرک ڈرائیور سے میں نے رفتار کم رکھنے کی درخواست کی اور اسے دس روپے زیادہ دینے کا وعدہ بھی کیا لیکن وہ شریف آدمی تھا۔ اس نے کہا کہ بیمار کو آرام سے لے جانے کے پیسے وہ ایک پیسہ بھی نہیں لے گا۔ دس پندرہ منٹ کی دیر کوئی بات نہیں۔ محسن آگے ٹرک ڈرائیور کے ساتھ جا بیٹھا اور میں نے شہلا کو اپنے ساتھ موٹر سائیکل پہ بٹھا کر اس کا تعاقب کیا۔ میری ہدایات کے مطابق ماسی نے آس پاس کے لوگوں کو بتا دیا تھا کہ وہ ماڈل ٹاؤن میں کچھ دن کے لیے اپنی بہن کے گھر جا رہی ہے جو کرشن نگر سے بالکل مخالف سمت میں تھا۔ رات کے دس بجے یہ خاندان کو شہلا اور اس کی ماں کے ساتھ اپنے نئے گھر میں پہنچ چکے تھے۔ ماسی بہت حیران اور پریشان تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے مگر وفاداری اور دوسروں پہ اعتماد اس کی فطرت میں شامل تھا۔ اس نے خود کو حالات کے اور ہمارے سپرد کر دیا تھا اس یقین کے ساتھ کہ ہم اس کے حق میں جو کچھ کریں گے اچھا ہی کریں گے لیکن برا بھی ہوا تو وہ تقدیر کا لکھا سمجھ کے قبول کر لے گی۔ شہلا کی ماں کا وجود اور عدم وجود برابر تھا۔ وہ شہلا کا ساتھ دینے پہ مجبور تھی۔ شہلا اس نئے ماحول سے خوفزدہ تھی۔ ہم نے اسے تسلی دی کہ آج ہی رات کی بات ہے۔ وہ کھڑکیاں دروازے بند رکھے اور کسی اجنبی کے اندر داخل ہونے سے پہلے فرار ہو جائے۔ فرار کے لیے پچھلا دروازہ تھا جہاں اندھیرے میں پھیلے ہوئے کھیت تھے۔ چلتے چلتے میں نے شہلا کو یقین دلایا کہ یہ مکان بہت محفوظ جگہ پر ہے اور کسی دشمن کے یہاں پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کرشن نگر سے گھر تک کا فاصلہ کافی تھا اور شہلا کے پرانے گھر تک پہنچنے میں پون گھنٹہ لگ گیا۔ موٹر سائیکل دور چھوڑ کے میں اور محسن باتیں کرتے اجنبی بن کے گھر کے سامنے سے گزرے۔ مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور وہاں کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ ضابطے کی کارروائی کے مطابق تفتیش کے بعد

کے ہمسایوں والے بھی اس گھر کو بھول چکے تھے۔ تین مرتبہ سامنے سے گزر کر ہم نے اس بات کا اطمینان کر لیا کہ تھوڑی سی احتیاط سے کام لے کر ہمارے لیے سامان اٹھانا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ گھر کی چابیاں میرے پاس تھیں۔ ادھر ادھر دیکھ کر میں چار فٹ اونچی دیوار پھلانگ کے اندر کود گیا۔ محسن نے میری تقلید کی۔ چند منٹ بعد ہم گھر کے اندر تھے۔ احتیاطاً ہم نے بجلی کی کوئی لائٹ نہیں جلائی اور اندھیرے میں کھڑکیوں کے پردے پھیلا کے اس بات کا اطمینان کر لیا کہ باہر سے کوئی روشنی نظر نہ آئے۔ گھر میں اتنا سامان تھا کہ ایک پورا ٹرک بھر جاتا اور ٹرک بھرتے بھرتے رات گزر جاتی جبکہ ہمیں ایک ایک منٹ قیمتی محسوس ہو رہا تھا۔ ماسی کے مشورے سے ہم نے طے کیا تھا کہ بھاری سامان اور غیر ضروری فرنیچر اور قالین وغیرہ چھوڑ دیے جائیں۔ لیکن شہلا کے ذاتی استعمال کی سب چیزیں کپڑے اور سوٹ کیس اور تھوڑا بہت فرنیچر ساتھ جانا تھا۔ برتن سمیٹنا فضول تھا۔ کچھ برتن ماسی اپنے ساتھ لے آئی تھی اور باقی بازار سے بھی خریدے جا سکتے تھے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ آس پاس کی کوٹھیاں دور تھیں اور بظاہر ویران نظر آتی تھیں لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی روشنی دیکھے تو سمجھے کہ شہلا اور اس کی ماں واپس آ گئی ہیں۔ لوگ عام طور پہ یہاں ایک دوسرے سے بے تعلق رہنا پسند کرتے تھے مگر شہلا کا گھر غیر معمولی ہنگاموں کا مرکز رہا تھا چنانچہ کوئی بھی تجسس میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ تاہم تھوڑا بہت خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ میں نے محسن کو سامان اٹھا کے دروازے کے قریب لانے کے لیے کہا اور خود ٹرک لینے چلا گیا۔

اتنی رات گئے ٹرک آسانی سے نہیں مل سکتا تھا۔ میں ایک میل تک پیدل چلا گیا۔ جو ٹرک میرے قریب سے گزرتے تھے وہ سامان سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ بالآخر مجھے سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے ہوٹل کے قریب خالی ٹرک کھڑا نظر آیا۔ میں ڈرائیور کے جانے تک وہیں اس کا انتظار کرنے لگا کیونکہ میں دوسرے لوگوں کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ٹرک ڈرائیور میری بات پر بہت حیران ہوا۔ رات کو ٹرک ایک شہر سے دوسرے شہر کے درمیان چلتے ہیں مگر آدھی رات کو گھر کا سامان کوئی نہیں اٹھاتا۔ میری مجبوری کی بات سن کر اس نے جو معاوضہ طلب کیا وہ عام شرح سے چار گنا تھا لیکن میں نے بے چون و چرا قبول کر لیا اور ٹرک ڈرائیور کو جلد چلنے کے لیے کہا۔

ڈرائیور حد سے زیادہ باتونی اور بے پروا تھا۔ ایک میل دور نکل جانے کے بعد میں نے اس سے کہا کہ ٹرک کی چال میں فرق کیوں پڑ گیا ہے؟

"مجھے تو اپنے یار کی چال میں کوئی فرق نہیں لگتا۔" ڈرائیور نے بے فکری سے کہا۔

"فرق تو ہے۔" میں نے اصرار کیا۔ "کہیں پچھلے پہیے کی ہوا تو کم نہیں ہو گئی ہے؟"

"اپنے ٹرک میں ہوا، پانی، تیل، پٹرول سب فل رہتا ہے بابو!" وہ فخر سے بولا۔

میں نے کھڑکی میں سے سر نکالا اور پچھلے والے پہیے کو دیکھا۔ "عجیب ڈرائیور ہو تم۔" میں نے کہا۔ "پچھلے والے پہیے میں آدھی ہوا بھی نہیں رہی ہے اور تمہیں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ابھی پہیہ بالکل بیٹھ جائے گا تب مانو گے۔"

ڈرائیور کو اپنی مہارت پر اتنا یقین تھا کہ اس نے گھوم کر مجھے دیکھا، گیئر کو نیوٹرل کر کے دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ پلک جھپکتے میں اس کی جگہ میں نے سنبھالی۔ ڈرائیور گھوم کر پچھلے پہیے کی طرف گیا ہی تھا کہ میں نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور ٹرک کو گیئر میں ڈال دیا۔ ڈرائیور چلایا مگر اس کے لیے ٹرک کا تعاقب کرنا ناممکن تھا۔ دو فرلانگ دور جا کر میں نے راستہ بدلا اور ایک گھنٹے بعد مخالف سمت سے گھر تک جا پہنچا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ ٹرک ڈرائیور پولیس اسٹیشن گیا ہو گا تو اس نے مزنگ کی بات کی ہو گی اور پولیس گئی بھی ہو گی تو مزنگ کی طرف جو کسی طرح ہمارے راستے میں نہیں پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کے لیے ٹرک کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد ہم ٹرک کو کہیں بھی چھوڑ سکتے تھے۔ جب میں ٹرک کی لائٹ آف کر کے اس کو آہستہ آہستہ چلاتا ہوا اندر لے گیا تو محسن بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا اور ہم نے ضروری سامان ٹرک پر لادنا شروع کر دیا۔ معمولی آوازیں کسی کے کانوں تک نہیں جا سکتی تھیں مگر ہم محتاط تھے۔ سامان نکالنے اور چڑھانے کی کارروائی خاموشی سے سرانجام دیتے رہے۔ ایک گھنٹہ بعد ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ تھکن سے ہماری حالت غیر ہو رہی تھی مگر ابھی تک کسی نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ گھر کے اندر بڑی بڑی الماریاں، بیڈ، صندوق، ڈریسنگ ٹیبل اور فریج وغیرہ رہ گئے تھے جن کو اٹھانا مشکل تھا۔ باقی سب کچھ ہم نے سمیٹ لیا تھا۔

www.paksociety.com

ہم ٹرک لے کر روانہ ہوتے ہی تھے کہ ٹرک پر گیٹ کے سامنے ایک موٹر سائیکل آکے رکی۔ میں نے محسن کو خبردار کیا کیونکہ موٹر سائیکل سے اترنے والا کوئی انسپکٹر تھا یا سب انسپکٹر۔ شاید وہ گشت پر تھا اور اسے معلوم ہی تھا کہ یہ گھر کس کا ہے ٹرک کو روانہ ہوتے دیکھ کر اس کا شک میں مبتلا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ ابھی وہ گیٹ کے قریب ہی پہنچا تھا کہ میں نے رفتار ایک دم بڑھائی اور میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ میں اس کی موٹر سائیکل کو ناقابلِ استعمال بنا دوں۔ وہ خود تو عین وقت پر چھلانگ لگا کے ایک طرف ہو گیا لیکن اس کی موٹر سائیکل ٹرک کی ٹکر سے دور تک گھسٹتی ہوئی گئی۔ جواب میں اس نے فائر کیا لیکن گولی ٹرک کے ٹائر پر لگنے کے بجائے اس کی سائیڈ میں لگی۔ محسن نے پیچھے سے اس کے فائر کا جواب دیا اور بہت عقل مندی کا ثبوت دیا کیونکہ اس طرح انسپکٹر کو بھی ہمارے مسلح ہونے کا اندازہ ہو گیا۔ اگلا فائر کرنے سے پہلے اس نے کسی محفوظ جگہ کی پناہ لی ہوگی تیسری گولی تقریباً ایک منٹ بعد ہمارے پیچھے آئی مگر ٹرک کو چھوئے بغیر گزر گئی۔ ہم فوری طور پر اس کی زد سے باہر ہو گئے تھے اور وہ موٹر سائیکل لے کر ہمارا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔ گرین نگر پہنچنے سے پہلے ہم نے ایک اور حرکت کی۔ محسن نے کہیں سے ایک کوئلہ تلاش کیا اور ٹرک کی نمبر پلیٹ کو تھوڑا سا بدل دیا۔ یعنی ایک کو سات بنا دیا اور تین کو آٹھ۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اتنی رات کو سامان اتارنے والے ٹرک کا نمبر کوئی دیکھ لے تو بعد میں چوری ہونے والے ٹرک کے نمبر سے نہ ملے۔

دو چار لوگوں نے ہمیں سامان منتقل کرتے ہوئے دیکھا۔ شاید وہ حیران بھی ہوئے ہوں گے لیکن ہم سے کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے میں نے شہلا سے اجازت لی اور کہا کہ صبح آٹھ بجے وہ میرا انتظار کرے۔ نئی جگہ پر وہ کچھ نروس تھی چنانچہ ہم نے اسے ٹرک حاصل کرنے اور پولیس سے مڈبھیڑ ہو جانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ورنہ وہ پریشان ہوتی۔ واپسی پر مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے ٹرک کو میکلوڈ روڈ کی طرف سے جا کر بیڈن روڈ پر میوزیکل اینڈ کمپنی کے سامنے عین اس جگہ کھڑا کر دیا جہاں سے گل ملایی گاڑی کھڑی کرتا تھا۔ ہم نے رومال سے ہر اس جگہ کو صاف کر دیا جہاں ہماری انگلیوں کے نشان ملنے کے امکانات تھے۔ پھر ہم نے نمبر پلیٹ کو صاف کیا۔ سات کا ہندسہ پھر ایک نظر آنے لگا اور آٹھ کا ہندسہ پھر تین بن گیا۔ شہر کے اس علاقے میں رات کے ایک بجے بھی رونق ہوتی ہے جن سے زمانہ سینماؤں کے آخری شو ابھی ابھی ختم ہوئے تھے اور واپس گھروں کو جانے والے سگریٹ پان کی دکانوں پر موجود تھے چنانچہ ہم پر کسی کو شک نہیں ہوا ویران اور غیر آباد علاقے میں چوکیدار یا پولیس والے پوچھ گچھ ضرور کرتے۔ اس وقت وہ رکشا بھی [illegible] جو سواری نہ ملنے کے باعث خالی لوٹ رہا تھا [illegible] سے ایک نے صرف پانچ روپے زیادہ لے کر [illegible] پہنچا دیا جہاں ہماری موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ شہلا [illegible] آگئے تھا اس لیے ہم محفوظ تھے۔ صبح [illegible] پھر اپنے کوارٹر میں تھے اور موٹر سائیکل [illegible] سڑک سے ہٹ کے دو گھروں کی پشت کی دیوار کے [illegible] کھڑی تھی۔ اس طرح کسی کی بھی کوٹھی میں [illegible] پڑے تو وہ سمجھے کہ موٹر سائیکل ساتھ والے گھر کی ہے ہمارا پڑوسی کانسٹیبل بھی خوابِ غفلت کے مزے لے رہا تھا [illegible] اسے ہمارے آنے جانے کی کوئی خبر نہیں ہوئی۔ خود اس کے گھر کا اندھیرا اور سکوت مکینوں کے خوابیدہ ہونے کا ثبوت تھا۔ میں نے وہ ریڈیو ٹرانسمیٹر اٹھایا جسے ہم نے بنگلے سے نکالا تھا اور محسن نے دوسرا ریڈیو ٹرانسمیٹر اٹھا لیا۔ ہمارے خیال کے مطابق یہ بم تھا۔ اس کا پتہ [illegible] بعد ہی چل سکتا تھا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے [illegible] محسن کا خیال دونوں کو ایک ہی قبر میں [illegible] تھا لیکن یہ کام گھر کے اندر نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک [illegible] تھا کہ ہیلو ہیلو کی آواز ہمارے کانسٹیبل کی نیند [illegible] ہوگی۔ دوسرے ہمیں ٹیون کرنے کے بعد کچھ [illegible] کے فاصلے سے بات کرنی تھی اور یہ دیکھنا تھا کہ [illegible] آواز ایک جیسی سنائی دیتی ہے یا نہیں۔ یہ کام [illegible] کی کوٹھی کے اندر رہ کر مخالف سمت کے آخری [illegible] تھے بلکہ مواصلاتی رابطے کا فاصلہ بڑھانے کے لیے [illegible] جا سکتے تھے۔ ہم نکلنے ہی والے تھے کہ محسن [illegible] کو رابعہ اندر آگئی۔ پرانے قبضوں کے چرچرانے سے [illegible] پڑے اور کچھ دیر یوں کھڑے رہے جیسے چوری کرتے پکڑے گئے ہوں۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اس وقت یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

"کچھ نہیں۔ بس آپ دونوں کی خیریت [illegible] ہے۔" رابعہ نے بھی آہستہ سے کہا۔ "اس سے پہلے جاگ کے جا چکی ہوں۔ مجھے تم دونوں کی طرف سے سخت تشویش لاحق تھی۔"

"اچھا اب آپ کی تشویش رفع ہو گئی ہے؟" میں نے کہا۔ "آپ نے دیکھ لیا کہ ہم خیریت سے ہیں؟ اب آپ تشریف لے جائیے اور سو جائیے۔" محسن نے کہا۔ "انکل رضوی اٹھ گئے اور انہوں نے دیکھا کہ آپ موجود نہیں تو سکندر کا چالان ہو جائے گا۔"

"میں جاتی ہوں۔" رابعہ بولی۔ "مگر یہ بتاؤ تم لوگ اب تک کہاں تھے؟"

"دیکھو بی بی! یہ باتیں صبح بھی ہو سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم جاؤ سو جاؤ۔"

"جب تک تم بتاؤ گے نہیں مجھے نیند نہیں آئے گی اور میں جاؤں گی بھی نہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"اُف۔ یعنی ہم گئے تھے شہلا کا سامان نئے گھر میں پہنچانے۔" میں نے کہا۔

"یعنی اس کے پرانے گھر میں سے نکلنے کے لیے۔" رابعہ نے لقمہ دیا۔ "خیر... کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہوئی؟"

"ہوئی تو نہیں مگر ہو جائے گی۔ اب خدا کے لیے تم جاؤ۔" میں نے آہستہ سے اس کا رخ پلٹ دیا۔

"ایک آخری بات۔" رابعہ نے پھر پلٹ کر کہا۔ "اس وقت آپ دونوں کہاں جا رہے ہیں اور یہ بغل میں کیا ہے؟"

"بغل میں بچہ ہے جس کا ڈھنڈورا پیٹنے ہم شہر جا رہے ہیں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"یعنی حد ہو گئی... آپ تو رضوی صاحب سے بڑھ کے تھانیدار ہیں خاتون!" محسن بولا۔ "اب دیکھیے نا سیدھی سی بات ہے آپ کو نیند نہیں آ رہی تھی تو آپ ادھر کے چکر لگا رہی تھیں۔ کیا کہا جائے گا اسے ہم کیسے جانیں؟ بہر حال... ہمیں بھی بے خوابی کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے چنانچہ ہم باغ میں بیٹھ کر گانے سننا چاہتے ہیں۔ آپ کو اعتراض ہے؟"

"اس وقت تو مجھے بھی گانے پسند ہیں اور محسن کو بھی گانے۔" [illegible] "اس لیے ہم ایک ساتھ دو ٹرانزسٹر لے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کو اعتراض ہے؟"

"آپ بھی جائیں اور کوئی اچھا سا ساز بجا کر گانے [illegible] دیکھیں۔" محسن نے کہا۔

"تم دونوں بھی اور خبطی ہو۔" رابعہ نے واپس جاتے جاتے جاتے پر کہا۔ "جب کسی بات کا صحیح جواب دینا نہیں چاہتے تو فضول ہولنا شروع کر دیتے ہو۔"

اتنی دیر میں محسن نے دونوں سیٹ ٹیون کیے۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ صبح ہمیں کیا کرنا ہے۔ مختلف سمتوں سے ریڈیو ٹرانسمیٹر کی کارکردگی کو آزما لینے کے بعد ہم لوٹ آئے۔ یہاں سے سوگز کے درمیان دو طرفہ گفتگو کا ہر لفظ بالکل صاف سنائی دیتا تھا۔ ہم نے کھانا نہیں کھایا تھا مگر اس وقت بھوک پر تھکن غالب تھی اور چند گھنٹے کی نیند بے حد ضروری تھی۔ میں نے ساتھ بجے کا الارم لگایا اور کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کے سو گیا تاکہ ہمارا پڑوسی کانسٹیبل اٹھے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ ہم واقعی کمرے میں سوئے پڑے ہیں۔ نیند اتنی گہری تھی کہ الارم کلاک کی آواز نے صبح سات بجے ہم دونوں میں سے کسی کو بیدار نہیں کیا لیکن ہماری سفارش پر کانسٹیبل سے تھانیدار بن جانے کی امید رکھنے والے رضوی صاحب کے ڈرائیور نے ڈیوٹی پر جانے سے پہلے ساڑھے سات بجے ہمیں جگا دیا اور مطلع کیا کہ الارم تو آدھا گھنٹہ پہلے بج کے خاموش ہو چکا ہے۔ اس طرح کانسٹیبل موصوف نے ہماری نیند میں خلل اندازی کی گستاخی کرنے پر اپنی وضاحت پیش کی اور رخصت ہو گیا۔ میں نے بڑی عجلت میں تیاری کی اور ٹھیک وقت پر ناشتہ کرنے پہنچ گیا۔ رضوی صاحب روانگی کے لیے تیار تھے۔ ان کے پوچھنے پر میں نے بتا دیا کہ محسن بھی آنے ہی والا ہے۔ وہ ہمیں خدا حافظ کہہ کے چلے گئے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ انہیں ہماری شب بیداری اور رات بھر کی کارروائی کا علم نہیں۔ رضوی صاحب جیسے ذہین اور تجربہ کار پولیس آفسر کے بارے میں کسی خوش فہمی کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ ہماری طرف سے شکوک میں بھی مبتلا تھے چنانچہ یہ ناممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے طور پر ہماری نگرانی کرتے۔ ناشتے سے فراغت کے بعد میں نکلنے ہی والا تھا کہ رابعہ آنکھیں ملتی نمودار ہوئی۔

"جنابِ سکندرِ اعظم!" اس نے چند کاغذات میرے سامنے رکھ کے کہا۔ "اس وصیت نامے پر دستخط کر دیجیے۔"

"وصیت نامہ؟" میں نے چونک کر کہا۔ "کس کا وصیت نامہ ہے تمہارا؟"

"جی نہیں۔" میں نے مسکین صورت بنا کے کہا۔ "دیکھیے نا دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ کل کی فکر آج کی جائے۔"

"آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔" محسن نے اندر آ کے بیٹھتے ہوئے افسوس سے کہا۔ "سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں۔"

www.paksociety.com

میں نے اس بے موقع بات پر اسے گھور کر دیکھا اور جہاں جہاں رابعہ نے کہا وہاں اپنے دستخط کر دیے۔

"اس میں کیا انگریزی میں لکھی ہے؟" میں نے کہا "ذرا پڑھ کے تو سنا دو وکیل صاحبہ!"

"ہاں۔ اس بے چارے کو تو انگریزی آتی نہیں۔ چار برس ولایت میں بھاڑ جھونکا" محسن نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کی ہدایات کے مطابق اس میں آپ کے متعدد وارث مقرر کر دیے گئے ہیں" رابعہ نے کہا "بالکل اسی طرح جیسے تاج و تخت برطانیہ کے وارث ترتیب وار موجود رہتے ہیں۔ بالفرض محال آپ نہ رہے تو اس دنیاوی مال و متاع کا پہلا حقدار محسن ہوگا۔ دست اجل نے اس کو بھی نہ چھوڑا تو یہ بندی کام آئے گی اور اس کے بعد وراثت کی جنگ ساتوں بی بیاں لڑیں گی۔ میرے بعد شہلا اور شہلا کے بعد فوزیہ.... علیٰ ہذا القیاس.... یہاں تک کہ ساتویں نمبر پہ استاد شیدی کا نام آتا ہے جس کو ہم اپنی حد تک ایک مخلص اور قابل اعتماد ساتھی سمجھ سکتے ہیں۔"

"تم سب پاگل ہو گئے ہو کیا؟" بیگم رضوی نے کہا "آخر اتنا لمبا چکر کس لیے؟"

"وہ ماننے نہ تھی بیگم رضوی!" میں نے کہا "کیا بھروسہ ہے زندگانی کا۔ آدمی بلبلہ ہے پانی کا۔"

"اس پہ گواہوں کے دستخط اور تصدیق وغیرہ کا کام آج ہو جائے گا" رابعہ نے کہا "اصل اسے رجسٹریشن کے لیے داخل کر دیا جائے گا۔ اس کی ایک مصدقہ نقل ایک بینک لاکر میں رکھوا دی جائے گی اور اسے کھولنے کا حق اصل مالک کے بعد صرف اسے حاصل ہوگا جو چابی کے ساتھ عدالت کا جاری کردہ وراثت کا سرٹیفکیٹ لائے گا۔ ایک نقل میرے آفس میں بھی موجود رہے گی۔"

"یہ تم نے ایسا زبردست کام کیا ہے کہ مجھے اپنے گرد ایک ناقابل تسخیر حصار محسوس ہوتا ہے۔ تمہارے پاس اس کی کوئی فاضل نقل ہے؟"

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا اور چند منٹ بعد مجھے ایک سیکنڈ نقل تھما دی جو گلابی رنگ کے پیپر پہ تھی لیکن اس پر تصدیق کی مہر اور میرے دستخط نہیں تھے۔ میں نے اس کو تہہ کر کے جیب میں رکھا۔ محسن اتنی دیر میں ناشتہ ختم کر چکا تھا۔ رابعہ نے ابھی منہ بھی نہیں دھویا تھا چنانچہ ہم لوٹ آئے اور بیگم رضوی بھی یہی سمجھیں کہ ہم کوارٹر کی طرف گئے ہیں۔ پروگرام کے مطابق محسن کو [illegible] رہنا تھا اور میں پچھلی طرف سے نکل سکتا تھا [illegible] سائیکل رات بھر لاوارث کھڑی رہی [illegible] علم لوگوں کو صبح کا اجالا پھیلنے کے بعد اس وقت [illegible] جب کوئی باہر آیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ گھنٹہ دو [illegible] پہلے... چھ بجے میں گھنٹے بعد تو کوئی بھی پولیس [illegible] سکتا تھا کہ نہ جانے کون اس غریب کی ایک موٹر سائیکل چھوڑ گیا ہے مگر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں کسی کا [illegible] سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں کرشن نگر پہنچا [illegible] بجنے والے تھے۔ شہلا کو تیار دیکھ کر مجھے [illegible] عورتوں کی طرح وہ دو منٹ کم کے تیار ہو [illegible] صرف کرتی تو سارا پروگرام چوپٹ ہو جاتا [illegible] کچھ اپنے خوف کے باعث وہ رات بھر سو نہیں [illegible] نے اسے وارننگ دی کہ پیچھے بیٹھ کر غیر [illegible] کوشش نہ کرے کیونکہ میرا ارادہ موٹر سائیکل کو [illegible] کی طرح چلانے کا ہے۔ وہ کہیں پیچھے پڑی [illegible] اور مجھے معلوم بھی نہیں ہوگا۔"

پچیس منٹ کے ریکارڈ ٹائم میں [illegible] اس جگہ پہنچا دیا جہاں اس کو ڈی سلوا سے ملنا [illegible] نے موٹر سائیکل کو سڑک کے کنارے چھوڑا [illegible] شہلا سے چند قدم دور دو اڑھائی فٹ کے پاس [illegible] وہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی چنانچہ میں نے [illegible] اختیار کیا اور ایک اخبار خرید کے اپنے چہرے کے [illegible] لیا۔ میں یہ بھی کر سکتا تھا کہ اخبار میں ایک سوراخ [illegible] کر لوں اور اس میں سے سامنے کی پوری سڑک کو [illegible] کیونکہ ڈی سلوا کی گاڑی کو ادھر سے ہی آنا تھا [illegible] اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا [illegible] کی گاڑی میرے بہت قریب آ کے رکے گی [illegible] بھی شہلا سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کرے گا [illegible] اس مختصر سے وقفے میں ہی مجھے اپنا کام [illegible] اخبار کھولے خبریں پڑھتا رہا لیکن درحقیقت [illegible] آنکھیں الفاظ کو بھی نہیں دیکھ رہی تھیں [illegible] صرف آواز پہ لگے ہوئے تھے۔ نو بج کے [illegible] پہ ایک گاڑی نے بریک لگایا اور ایک [illegible] ڈی سلوا کی آواز سنی جس نے بڑی خوش دلی سے [illegible] گڈ مارننگ کہا تھا۔ گاڑی صدر کی طرف [illegible] اس لیے آگے والی سیٹ کا دوسرا دروازہ [illegible]

[illegible] کی طرف تھا اور ڈی سلوا بھی اب ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ شہلا نے گن کر چار قدم ہی اٹھائے تھے کہ میں پیچھے سے [illegible] دروازے تک جا پہنچا۔ اس سے پہلے کہ ڈی سلوا صورت حال کو سمجھتا یا سنبھلتا میں اس کے ساتھ بیٹھ کے دروازہ بند کر چکا تھا اور ریوالور میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ ریوالور گاڑی کے ڈیش بورڈ سے نیچے تھا چنانچہ باہر سے کوئی بھی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"واٹ از آل دس؟" ڈی سلوا نے کچھ دیر بعد اپنے حواس پر قابو پا کے کہا۔

"تم نے مجھے پہچانا نہیں مسٹر ڈی سلوا؟" میں نے بلاوجہ مسکرا کے کہا "میں تمہارا دوست سکندر بخت ہوں اور تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں تم کچھ اور کرنا چاہتے ہو" ڈی سلوا بولا "اگر ایسی کوئی بات نہیں کرنا۔ بات کرنی ہوتی تو تم مجھے ٹیلی فون کرتے یا دفتر آ جاتے لیکن اس غیر شریفانہ طریقے پر میرا راستہ نہ روکتے۔"

"اگر تم سمجھدار ہو تو دیر مت کرو" میں نے کہا "ابھی تک یہ سمجھ سکے ہیں کہ تم مجھے لفٹ دینے کے لیے رکے ہو۔ کسی کو شک ہونے سے پہلے گاڑی آگے بڑھا لو اور واپس چلو۔ انکار کرو گے تو..."

"تو تم مجھے گولی مار دو گے؟" وہ نفرت اور حقارت سے تلملا کے بولا "ٹھیک ہے مار دو گولی۔ میں دیکھوں گا کہ تم بچ کر کہاں جاتے ہو۔ ایک قتل کا الزام تم پہ پہلے لگا ہوا ہے۔"

"میں خالی ہاتھوں سے بھی کام لینا جانتا ہوں" میں نے کہا "اور مجھے ڈرائیونگ بھی آتی ہے" وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا اور اس کا مقصد صاف یہ معلوم ہوتا تھا کہ مجھے زیادہ سے زیادہ دیر تک وہاں الجھائے رکھے۔ ریوالور میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ میرا بایاں ہاتھ اتنی پھرتی سے حرکت میں آیا کہ ڈی سلوا کوشش کے باوجود نہ بچ سکا اور ضرب گردن کے سامنے والے حصے پہ پڑی جس نے اسے مفلوج کر دیا۔ میں فوراً باہر آیا اور سامنے سے گھوم کر ڈی سلوا کی طرف پہنچا۔ اخبار اڑ کے دور جا چکا تھا۔ موٹر سائیکل وہاں کھڑی تھی اور شہلا میری ہدایات پہ عمل کرتے ہوئے غائب ہو چکی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کے ڈی سلوا کو ساتھ والی سیٹ کی طرف دھکیلا اور خود اس کی جگہ بیٹھ گیا۔ گاڑی [illegible] کھڑی تھی۔ راؤنڈ اباؤٹ کا چکر کاٹ کے گزرنے والوں میں سے کوئی میری طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ گاڑی کا انجن چل رہا تھا لیکن نیوٹرل تھا۔ میں نے پورے اطمینان سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ ساتھ والی سیٹ پر ڈی سلوا سر پیچھے کیے نیم دراز تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ آنکھیں بند کیے آرام کر رہا ہو۔ سڑک کے پل پر محسن سوٹ کیس لیے کھڑا تھا۔ اس نے ڈی سلوا کو پیچھے والی سیٹ پہ ڈال دیا۔ کلب سے ہم بائیں طرف گھوم گئے اور سیدھے چلتے گئے۔ میری آنکھوں نے وہ مقام بھی دیکھا جہاں ایک شخص سڑک کے کنارے جان کچھ بتانے سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے دو الفاظ اب بھی مجھے یاد تھے۔ ان میں سے ایک سراج تھا لیکن دوسرے کا مطلب ہنوز غیر واضح تھا کہ اس نے کیا کہا تھا۔ راج سنا جد یا راجگڑھ۔ یہ جگہ اس وقت بھی غیر آباد تھی۔ اکا دکا گاڑیوں کے علاوہ کبھی کوئی سائیکل سوار گزر جاتا تھا۔ ڈی سلوا کے کراہنے کی آواز سے میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ ہوش میں آنے لگا ہے۔ گاڑی روک کے میں نے ڈکی کھولی مگر اس میں کوئی رسی یا تار کا ٹکڑا نہیں تھا جس سے ڈی سلوا کے ہاتھ پیر باندھے جا سکتے۔ سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں نے دروازے کی ربر لائننگ کو ایک جھٹکے سے کھینچ کر الگ کیا۔ اس کے دو ٹکڑے بہت کارآمد ثابت ہوئے اور میں نے ڈی سلوا کو نیچے سے اوپر تک اس طرح باندھا کہ شاید اس کے ہاتھ پیروں کی خون کی گردش بھی رک گئی ہوگی۔ اس کے منہ میں رومال ٹھونس کر ہم پھر چل پڑے۔ ربڑ لائننگ کے نکل جانے سے دروازے بند ہونے کے باوجود کھڑکھڑانے لگے تھے۔ ابھی ہمارے ذہن میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں ڈی سلوا کو اسیر رکھا جا سکتا لیکن ہم جانتے تھے کہ مضافات میں کہیں بھی کوئی نہ کوئی نامکمل خالی کوٹھی مل جائے گی۔ ماڈل ٹاؤن کے علاقے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک بار پھر اپنا گھر دیکھا جو اب میرا نہیں تھا۔ اس کی پرآسائش مسرت بخش اور اپنائیت کے احساس سے معمور فضا میں میرے لیے ایک سوگوار اجنبیت تھی۔ میں ایک سرد آہ بھر کے رہ گیا۔ اگلے موڑ پر میرے پیر نے خود بخود بریک پیڈل کو دبا دیا اور گاڑی کے پہیے جام ہو گئے۔ محسن نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"یہ قصر جمشید ہے" میں نے کہا "خسرو جمشید کا گھر۔ میں نے کہا تھا نا کہ جب میں چھوٹا سا تھا تو اس کے پاس سے گزرتا تھا اور جو چیز مجھے سب سے زیادہ پرکشش لگتی

www.paksociety.com

تھی وہ پھولوں کے رنگ تھے۔"

"لیکن اب تو یہاں دھول اڑ رہی ہے۔" محسن نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے یہاں کوئی رہتا بھی نہیں۔"

میں نے نیچے اتر کے دیکھا۔ زنگ آلود پھاٹک کے اونچے گیٹ پوسٹ پر لگی ہوئی بجلی کی لالٹین کی آب و تاب ختم ہو چکی تھی۔ سنگ مرمر کی تختی پر لکھے ہوئے قصر جمشید کے حروف بھی ماند پڑ گئے تھے اور وسیع و عریض لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں سے بنا ہوا گیٹ بند تھا۔ اس کے دونوں پٹ ایک ساتھ ملا کے موٹی سی زنجیر سے باندھ دیے گئے تھے اور زنجیر میں پرانے وقتوں کا بھاری تالا پڑا ہوا تھا۔ زنگ کا رنگ سب پر غالب تھا لیکن مجھے جس چیز نے متوجہ کیا وہ پھاٹک کے نیچے کی زمین تھی۔ اس پر دونوں جانب بارش سے بہہ کر آنے والی مٹی جمع ہو گئی تھی اور اس مٹی میں گھاس اُگ آئی تھی۔ پھاٹک کے دونوں پٹ اب زمین میں پیوست نظر آتے تھے اور صاف ظاہر تھا کہ برسوں سے کوئی بھی اس دروازے سے نہیں گزرا۔ دروازے کے ساتھ ساتھ تین فٹ اونچی دیوار کی فصیل تھی اور اس فصیل پر گیٹ کے ڈیزائن کی گرل نصب تھی۔ کسی دشواری کے بغیر میں اور محسن اندر اتر گئے اور گیٹ سے حویلی جیسے مکان تک جانے والے ویران راستے پر چلنے لگے۔ باغ کسمپرسی کے عالم میں تھا۔ لان کی جگہ خودرو گھاس لہرا رہی تھی اور پھولوں کی جگہ جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ دو منزلہ عمارت میں اوپر نیچے گرل لگی روشن دان والی کھڑکیاں تھیں جو سب بند تھیں اور ان کے شیشے جا بجا ٹوٹے ہوئے نظر آتے تھے۔

ہم دونوں کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا اور اس کا جواب قصر جمشید کی خاک/ویرانی تھی۔ خسرو جمشید نے ہم سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ یہاں رہائش پذیر ہوتا تو اس گھر کی یہ حالت نہ ہوتی۔ محض تجسس سے مجبور ہو کے ہم نے اس خاندانی [illegible] کے گرد ایک چکر لگایا۔ اس خاموشی میں جہاں ہمارے قدموں کی چاپ کے سوا کوئی صدا نہ تھی، ہمارے کان کسی انسانی آواز کے منتظر نہ تھے چنانچہ کسی نے ہمارے پیچھے نمودار ہو کر بات کی تو ہم دونوں اچھل پڑے۔

"کا بات ہے ہو سرکار؟" ایک بوڑھے نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ضرور ہوگی لیکن وہ صحت مند آدمی تھا جس کا گٹھا ہوا سیاہ بدن دھوپ میں چمک رہا تھا اور وہ صرف دھوتی میں ملبوس تھا۔

"ہم خسرو جمشید صاحب سے ملنے آئے تھے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"نواب صاحب سے؟" بوڑھا [illegible] "جی رہیں؟ ہمار سنگ مذاک کرت ہو بابو؟"

"مذاق کی اس میں کون سی بات ہے؟"

"کیا نواب صاحب یہاں نہیں رہتے؟"

"ہو رہت ہیں حجور!" اس نے [illegible] ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "مالک ہیں [illegible]"

میری اور محسن کی آنکھوں نے ایک [illegible] جہاں ایک مختصر سی شکستہ چار دیواری [illegible] مرمر سے ڈھکی ہوئی قبر نظر آ رہی تھی۔ چار [illegible] سے آٹھ فٹ اونچے ستونوں [illegible] ایک چھت قائم تھی۔ میرے ذہن میں خسرو [illegible] کے ہم شکل کا حلیہ تھا اور وہ سب باتیں [illegible] مجھ سے کی تھیں۔

"اگر یہ نواب خسرو جمشید کی قبر ہے" [illegible] ہوئے کہا۔ "تو اس محل کا موجودہ مالک [illegible] پرویز ہے؟"

بوڑھے نے آہستہ آہستہ آواز میں [illegible] "آپ تو نواب جمشید سے ملنے آئے تھے سرکار۔"

"وہ کچھ غلط فہمی ہو گئی۔" میں نے کہا۔ [illegible] غلط بتا دیا۔ خیر یہ خسرو پرویز صاحب کہاں [illegible]"

"چھوٹے نواب تو دس سال سے ولایت [illegible] ہیں۔" وہ اسی مشکوک لہجے میں بولا۔

"عجیب بات ہے۔ کیا گزشتہ [illegible] نہیں تھے؟ پاکستان میں؟"

بوڑھے نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کا شک [illegible] میں بدلنے لگا تھا۔ "چھوٹے نواب اودھر [illegible] معلوم نہ ہوتا ہے وہ اودھر بیاہ کر لیے ہیں [illegible] سال پہلے آئے تھے، پھر نہیں آئے۔"

"اور تم یہاں چوکیداری کرتے ہو؟" محسن [illegible] "مطلب ہے ہمارے ساتھ دھوکا ہوا۔ خیر [illegible] ضرورت نہیں۔ ہم واپس جا رہے ہیں۔" صرف [illegible] اور پوچھی تھی کہ مرحوم نواب خسرو جمشید [illegible] اس نے کم سے کم الفاظ میں خسرو جمشید کا [illegible] ہم نے دیکھا تھا۔ بوڑھا دربان حیرانی سے [illegible] ہم اس کے لیے بہت بڑا اسرار/معما بن [illegible] یہ معلوم نہیں تھا کہ خسرو جمشید کو مرے [illegible]

[illegible] ان کا بیٹا خسرو پرویز ولایت میں رہتا ہے۔ اس کے [illegible] جو حلیہ بیان کیا تھا وہ سو فیصد مرحوم نواب [illegible] کی تصویر تھا۔ دربان کو حیرانی تھی کہ ہم نے ان کو کہاں دیکھ [illegible] ہماری تو ابھی عمر بھی اتنی نہیں تھی جتنا عرصہ نواب [illegible] کے انتقال کو ہو چکا تھا۔ جب میں نے اس کو [illegible] ایک زمانے میں میرے والد کی کوٹھی بھی [illegible] قصر جمشید کو گلشن کی طرح آباد دیکھ چکا [illegible] نے ایک سرد آہ بھر کے تسلیم کیا کہ اس [illegible] چھوٹے نواب یہیں رہتے تھے اور وہ اپنے والد [illegible] تھے مگر وہ کسی میم کے چکر میں ایسے اسیر [illegible] کے بعد اس کے ساتھ چلے گئے کیونکہ وہ کالے [illegible] اس دنیا میں رہنے کو تیار نہیں تھی۔ انہوں نے [illegible] جاکے ہی شادی کی اور سنا ہے اب ان کا لڑکا [illegible] ہے۔ وہ میم ان کو چھوڑ چکی ہے۔

"کیا مرحوم نواب کی یا ان کے بیٹے کی کسی سے جانی دشمنی تھی؟" میں نے کہا۔

"دوست دشمن تو سب کے ہوت ہیں سرکار!" دربان بولا۔ "پر ہمارے بڑے نواب کا جانی دشمن کوئی [illegible]" نے نفی میں سر ہلایا۔ "ان کی جان کا دشمن کون کیسے ہوگا جو انسان کے روپ میں فرشتہ تھے۔"

اس بوڑھے سے کچھ اور کہنا سننا بیکار تھا۔ ہم نے اس سے [illegible] انداز میں معذرت چاہی اور باہر نکل آئے۔

"کسی نے ہمارے ساتھ بہت بڑا فراڈ کیا ہے۔" محسن نے گاڑی کے قریب رک کر کہا۔ "اس نے ہماری لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نواب خسرو جمشید کا بھیس اختیار کر کے ایک جھوٹی کہانی سنائی اور وہ جائیداد بھی فروخت [illegible] جو خسرو جمشید کی ہرگز نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ [illegible] کا سب کچھ ڈوب گیا۔" محسن نے کہا۔ "اور اس کا پلاٹ بھی ہاتھ سے گیا۔"

"نہیں۔ ہم مکان نقلی خسرو جمشید نے اونے پونے [illegible] وہ اس کی اپنی ملکیت ہے کیونکہ اس کے کاغذات [illegible]" میں نے کہا۔ "صرف کاغذات میں مالک [illegible] غلط تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ آج اگر [illegible] پلاٹ خرید کے مکان تعمیر کروں تو کسی کا بھی اپنا نام [illegible] لکھوا سکتا ہوں۔ لیز اور رجسٹری کرنے [illegible] کھیل ہونے لگا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ خسرو کی گئے خسرو جمشید ہیں اور کہاں کہاں بستے ہیں۔ پہلے کار ڈوب [illegible] آ گئی مگر پلاٹ کی منتقلی روکی جا سکتی ہے۔ معاہدے پر خسرو جمشید نے خود دستخط کیے تھے چنانچہ اس کا قانونی اعتراض نہیں اٹھا سکتا۔ خلاف ورزی پر قانونی کارروائی کے لیے خسرو جمشید کو خود سامنے آنا پڑے گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دھوکا دہی کی اس واردات کا مقصد کیا تھا؟" محسن نے کہا۔ "نقصان میں آخر کون رہا؟"

"تو صرف دو چار لاکھ کے نقصان کی بات کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے تو جوا کھیلا تھا۔ اگر وہ جیت جاتے تو انہیں کتنا فائدہ ہوتا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ضرورت مند ہونے کے باوجود ہم اس چکر میں پھنسنے کے لیے نہیں گئے ورنہ ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں سب کا قصہ پاک ہو جاتا۔ پلاٹ کی منتقلی روکنے سے قانونی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ سب سے بہتر یہی ہے کہ وہ بعد اس مکان کو فروخت کر کے دوگنی قیمت وصول کر لے۔ اپنی ناکامی کا احساس دشمنوں کو جب ہوگا جب ہماری بجائے وہاں کوئی اور رہائش اختیار کرے گا۔ اگر انہوں نے مکان کے نیچے کمرے میں بارود کی سرنگ بچھا رکھی ہوگی تو ان کا سارا انتظام بے مصرف ہوگا۔ وہ کسی غیر متعلق اور بے گناہ شخص سے اپنی ناکامی کا انتقام نہیں لیں گے۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم ماڈل ٹاؤن سے باہر نکل آئے۔

"ان کی اسکیم تھی بہت شاندار۔" محسن بولا۔ "پلاٹ بھی اچھا تھا اور اس کے دو مرکزی کردار اپنا رول بہت اچھی طرح نبھا گئے۔ لیکن وہ تھے کون؟"

"قیاس آرائی سے اس سوال کا جواب نہ پاؤ گے۔" میں نے کہا۔ "بہت مشکل ہے۔ جب حالات سے پردہ اٹھے گا تو یہ کردار بھی اپنے اصل چہروں کے ساتھ سامنے آ جائیں گے۔ ابھی ہم فرض کر سکتے ہیں کہ وہ بھی ٹھگ سے تھے۔"

"ڈبل سلوا، چوہدری والا اور [illegible] ملاوہ کے گروہ کا [illegible] ملک تعلق تو ثابت ہے۔" محسن نے کہا۔ "انہوں نے کوشش کی تھی کہ سابق کمشنر آغا [illegible] لندن میں ان کے لیے کام کرے مگر وہ شریف اور [illegible] آدمی تھا کہ [illegible] ہو گیا۔ ایک پیشکش وہ مجھ کو بھی کر چکے ہیں جسے تو نے مسترد کر دیا۔ کیا یہ بات خارج از امکان ہے کہ لندن میں رہنے والا نواب خسرو جمشید کا بیٹا ان کا آلۂ کار بننے پر رضامند ہو گیا ہو یا مجبور ہو گیا ہو۔۔۔ بہت سے نواب

www.paksociety.com

ولایت میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور نوابی ٹھاٹ برقرار رکھنے کے لیے غربت مند رہتے ہیں۔"

"تو نے کمال ہی کر دیا۔" میں نے کہا۔ "مجھے سخت حسد محسوس ہو رہا ہے کہ یہ بات مجھے کیوں نہیں سوجھی۔ یہ واقعی ہو سکتا ہے کہ ڈرامے کا مرکزی کردار خورشید پرویز ہو اور اسی نے خورشید کے بارے میں مفصل معلومات فراہم کرنے کے علاوہ یہ سلسلہ بھی اپنا لیا ہو۔ اس کے پاس یقیناً لندن کی شہریت ہوگی چنانچہ ہم پاکستانی سفارت خانے سے زیادہ معلومات حاصل نہیں کر سکتے لیکن برطانوی ہوم آفس شاید ان کا موجودہ پتہ بتا سکے ورنہ یہ تو معلوم ہو ہی سکتا ہے کہ خورشید پرویز نام کے کسی مسافر نے پی آئی اے یا پی اے او سی کے کسی طیارے سے سفر کیا ہے یا نہیں۔ اگر انہوں نے اصل نام سے سفر کیا ہوگا تو پاسپورٹ سے دوسری تفصیلات بھی حاصل ہو جائیں گی ورنہ کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ لندن سے کراچی تک تو براہ راست لائن آتی ہے۔"

آبادی اب خال خال رہ گئی تھی۔ میں اوگھن باتوں کے ساتھ یہ بھی دیکھتے جا رہے تھے کہ کون سی جگہ ہمارے مقصد کے لیے موزوں ہے۔ بہت سی کوٹھیوں میں زنگ آلود تالے پڑے ہوئے تھے مگر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان کا محافظ بھی کوئی نہیں ہے۔ بہت سی کوٹھیاں زیر تعمیر تھیں اور بہت سی نامکمل بھی رہ گئی تھیں مگر ان کے آس پاس آبادی تھی۔ بالآخر مجھے ایک دو منزلہ عمارت کا ڈھانچہ نظر آیا۔ آثار بتا رہے تھے کہ مدت سے اس میں ایک اینٹ کا اضافہ بھی نہیں ہوا۔ نیچے والی منزل تقریباً مکمل تھی مگر زنگ خوردہ آہنی دروازے اور بغیر شیشوں والی کھڑکیوں کے پٹ کھلے پڑے تھے۔ میں نے اندر گھوم پھر کے اور "کوئی ہے" کی صدا لگا کے اطمینان کر لیا کہ اندر واقعی کسی فقیر کا ڈیرا بھی نہیں۔ ہم گاڑی کو اندر لے گئے اور ڈی سلوا کو گھسیٹ کر ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ اب ہوش میں آ چکا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ کھول کے سیدھا بٹھا دیا اور اس کے منہ میں سے رومال نکال دیا۔ وہ کچھ دیر لمبے لمبے سانس لیتا رہا اور ہمیں خونخوار نظروں سے گھورتا رہا۔

"اگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے یہاں لائے ہو۔" اس نے عادتاً انگریزی میں کہا۔ "تو جلد از جلد اپنا کام ختم کرو۔"

میں نے اس کے ایک لات رسید کی اور وہ فرش پر گر گیا۔ "یہاں بھی حکم چلاتا ہے ہم پر جیسے کہ غلام ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا اب بھی یہ بات سمجھانی ضروری ہے کہ ہم مالک ہیں اور تم نوکر ہو؟"

"اس کے علاوہ ہم جلدی میں ہیں۔ کوئی کرائے کے قاتل نہیں مسٹر ڈی سلوا!" محسن نے بالوں سے پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔

"ہم تمہیں ماریں گے بھی تو آہستہ آہستہ۔" اس کے دوسری لات ماری اور وہ پھر گر گیا۔ "ابھی تم سے بہت کچھ پوچھنا ہے اور قبول کروانا ہے حالانکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس طرح کیے جانے والے اعتراف جرم کی قانونی حیثیت کیا ہوگی۔" محسن نے اسے پھر بٹھا دیا۔ "لیکن کوئی ثبوت ہو تو تمہاری باتوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔"

"پھر بھی ہم تمہاری زبان سے ان سب کی تصدیق چاہتے ہیں جو ہمیں معلوم ہو چکی ہیں۔" پھر اسے لات مار کر گرا دیا۔ "لیکن تم سمجھتے ہو کہ ہمیں سب معلوم ہے۔" میں نے لات مارتے وقت یہ خیال رکھا کہ سخت نہ پڑے ورنہ پہلی دفعہ میں ہی اس کے جبڑے ٹوٹ جاتے۔ دوسری بار اس کی پسلیاں ٹوٹ جاتیں اور تیسری لات سے وہ ہمیشہ کے لیے ساکت ہو سکتا تھا۔ ابھی وہ نیم بے ہوش تھا اور اس کی حالت غیر تھی۔ وہ کچھ دیر فرش پر پڑا ہانپتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ ہاتھوں کے بل پر خود ہی اٹھ بیٹھا۔

"ایک بار یہی سب کچھ میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ رابعہ کے ساتھ بھی۔" میں نے کہا۔ "تقدیر یاور تھی اور میں نے خداداد ذہانت سے بھی کام لیا۔ اس لیے بچ رہا۔ آج میں تمہیں اپنی قسمت آزمانے کا موقع دوں گا۔ تم خود کو بہت ذہین بھی سمجھتے ہو۔ ہم دیکھیں گے تم بھی زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوتے ہو یا نہیں۔ حالات بالکل وہی ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو۔ چیختے چلاتے تمہارا گلا بیٹھ جائے گا۔ تمہارے لیے کوئی نہیں آئے گا اور ہم بہت دور ہوں گے۔ بچ نکلے تب بھی ہم پر کوئی الزام ثابت نہیں ہو گا۔"

محسن اتنی دیر میں سوٹ کیس لے آیا تھا۔ میرے کندھے پر چڑھ کے اس نے بارہ فٹ اونچی چھت کے وسط میں لگے ہوئے لوہے کے ہک کو پکڑ لیا جو پنکھا لٹکانے کے لیے لگایا گیا تھا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ہینڈل میں بندھی ہوئی پتلی سی نائلون کی ڈوری کو ہک پر سے گزار کر وہ واپس نیچے اتر آیا۔ رسی کافی لمبی تھی۔ اس کے دوسرے سرے کو تھام کر اس نے ایک بار پھر مجھے سیڑھی کے طور پر استعمال کیا اور رسی کو روشن دان میں سے باہر پھینک دیا۔ ڈی سلوا اس تمام کارروائی کو وحشت زدہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ محسن نے مجھے بتایا کہ اس ڈوری کے ساتھ ساتھ ایک ساز بھی لپٹا ہوا ہے جو ایریل کا کام دے گا اور آواز کی لہروں کو تقریباً سو گز نصف قطر کے دائرے تک نشر کرنے اور ریسیو کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر اب کمرے کے فرش پر ہک کے بالکل نیچے رکھا ہوا تھا جسے روشن دان سے گزر کے باہر جانے والی رسی کو کھینچا جاتا تو وہ چھت سے جا لگتا۔ لیکن ابھی محسن کو اس کی نگرانی کرنا تھی جس میں میری موجودگی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی۔ وہ سوٹ کیس میں اپنے لیے سینڈوچ اور گھر سے چلتے ہوئے بھرا ہوا تھرماس بھی لے کر آیا تھا۔ چنانچہ اس نے مجھے اجازت دی کہ میں اطمینان سے اپنا کام کر آؤں۔

"ہو سکتا ہے مجھے دو تین گھنٹے لگ جائیں۔" میں نے روانگی سے پہلے کہا۔ "یا اس سے بھی زیادہ۔ میری طرف سے بے فکر رہنا لیکن اس کی طرف سے غافل مت ہونا۔" میں نے ڈی سلوا کی طرف اشارہ کیا اور اس کے ہاتھ پھر سے پیچھے کر کے باندھ دیے۔

"اگر اس نے گڑبڑ کی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔" محسن نے ریڈیو کا پچھلا حصہ کھولتے ہوئے کہا اور ڈی سلوا کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔

"مار دینا۔" میں نے بھی اسی بے نیازی سے کہا۔ "گولی کی آواز سننے والا کون ہے۔"

"لاش کہاں دفن کریں گے؟" محسن بولا۔ "کسی کھنڈر میں؟"

"ہاں۔ کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "یہاں ابھی فرش بھی کچا ہے اور دوسرے کمرے میں تو مٹی بھی ایک طرف پڑی ہے۔ قبر کھودنے کا سامان رہ گیا ہے۔"

"مگر اس کے لیے بیلچے وغیرہ تو لانے پڑیں گے۔"

محسن اپنے کام میں مصروف رہا۔ اتنے پرسکون لہجے اور انداز سے بے نیازی کے ساتھ گفتگو کرنے کا مقصد ڈی سلوا کو وحشت زدہ کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"وہ بعد کی بات ہے۔" میں نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ "لاش کا کیا ہے، کسی گٹر یا کنویں میں بھی ڈالی جا سکتی ہے۔"

"پاگل ہوا ہے۔" محسن بولا۔ "لاش بو دینے لگے گی تو پولیس والے گدھ کی طرح آ جائیں گے۔"

"پھر کیا ہوا۔" میں نے کہا۔ "بس کپڑے اتار لیں گے یا تیزاب سے زیادہ مرکاٹ کے کہیں ڈال دیں گے۔ پولیس کا باپ بھی شناخت نہیں کر سکتا۔"

"تم دونوں... مجھے ختم کر کے... تم بچ نہیں سکو گے۔" ڈی سلوا وحشت سے چلایا۔ "تمہیں بھی پھانسی ہو گی..."

میں ہنسا اور باہر نکل گیا۔ چابیاں ابھی تک ڈی سلوا کی گاڑی میں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے بیک کیا اور اسی راستے پر چل پڑا جس راستے سے ہم یہاں پہنچے تھے۔ میں نے ہر موڑ کی نشانی کو ذہن میں رکھا تاکہ واپسی آسان ہو اور میرے بھٹکنے کے امکانات نہ رہیں۔ گاڑی بہت شاندار تھی اور اتنے آرام سے چلتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا انجن ہی نہیں ہے۔ میں نے شیشے چڑھا کر اس کا ایئرکنڈیشنر آن کر دیا۔ مجھے اب شہر کے دوسرے کنارے تک جانا تھا۔ چالیس منٹ کے اس راستے کو طے کرتے ہوئے میں نے کار کے ڈیش بورڈ میں لگے ہوئے ریڈیو کو آن کیا اور کہیں سے موسیقی کا کوئی پروگرام سننے کی کوشش کی مگر لاہور سے پنجابی فلموں کے بے سرے یا اشتہاری پروگرام نشر ہو رہے تھے جبکہ جالندھر امرتسر سے عورتوں کے پروگرام میں بے مقصد اور نیم فلسفیانہ گفتگو چل رہی تھی اور جموں سری نگر سے دیہاتی بھائیوں کو مفید مشورے دیے جا رہے تھے۔ باقی اسٹیشن چلتی ہوئی کار کے شور میں صاف سنائی ہی نہ دیتے تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے میں نے راوی کا پل عبور کیا اور "ایم ٹی بیوڈی انجینئرنگ کمپلیکس" پہنچنے تک لاہور سے ایک غزل سننے میں کامیاب ہو گیا۔ میری توقع کے عین مطابق چوکیدار نے گاڑی کو دور سے دیکھا اور یہ غور کیے بغیر کہ اس میں کون بیٹھا ہے گیٹ پورا کھول دیا۔ گاڑی اندر سے گزر گئی اور کسی کو میری ایک جھلک بھی نظر نہ آئی۔ میں نے گاڑی کو آفس کے بالکل سامنے روکا تو کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ ڈی سلوا مالک نہیں تھا مگر اس کا رتبہ مالکوں سے کم بھی نہ تھا۔ کس کی مجال تھی کہ گاڑی کو وہاں پارک نہ ہونے دیتا۔ میں کار کے اندر بیٹھا مناسب موقعے کا

www.paksociety.com

انتظار کرتا رہا۔ پھر میں نے چوہدری دلاور کے سیکرٹری کو اس کے کمرے سے نکل کر ورکشاپ کی طرف جاتے دیکھا۔ اس نے ڈی سلوا کی گاڑی کو پہچان کر ادھر ادھر دیکھا۔ تھوڑا سا حیران ہوا مگر میرے قریب نہیں آیا۔ برآمدہ خالی پا کے میں دوسرے دروازے سے نکلا اور پلک جھپکتے میں اندر جا پہنچا۔

میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر دلاور کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ خوف سے منجمد بیٹھا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔ جب اسے یقین آ گیا کہ میرا ارادہ اس کو فوراً گولی مار کے فرار ہو جانے کا نہیں ہے تو اس نے سخت جدوجہد کے بعد خود کو سنبھال لیا۔

"یہ کیا ڈراما ہے اپنے سکندر صاحب؟" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "کوئی خطا ہو گئی ہے ہم سے جناب عالی جو ایسے گولہ بارود لے کر حملہ کیا ہے آپ نے تو جیسے خدا نخواستہ ہم آپ کے دشمن ہیں۔ جان چاہیے تو ویسے ہی حاضر ہے۔"

"تمہاری جان میرے کس کام کی ہے؟" میں نے کہا۔ "لیکن سیٹھ دلاور! ڈراما ابھی کہاں شروع ہوا ہے۔ یہ تو پہلا سین ہے۔ اصل ڈراما دیکھنے کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔" میں نے ریوالور سے اس کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس کا رنگ فق ہو گیا مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

"میں سمجھا نہیں جناب عالی!"

"اچھا تو میں تم کو آسان زبان میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایسے مناظر تم نے فلموں میں بھی دیکھے ہی ہوں گے۔ میں صرف دس تک گنوں گا۔ اتنی دیر میں تم کو دروازے تک پہنچنا ہے۔ قتل میرے پروگرام میں شامل نہیں ہے لیکن تم خودکشی کرنا چاہو تو تمہاری مرضی۔ کسی کو آواز دے کر دیکھو یا مقابلہ کرو۔ تمہارے قتل کا الزام ڈی سلوا پر آئے گا۔ کیسے اور کیوں؟ یہ تو جناب عالی! یہ بھی آپ باہر نکلتے ہی سمجھ جائیں گے۔ ایک... دو... تین... چار..." شاید میرے ارادے کی مضبوطی کا اندازہ اس نے میرے لہجے سے لگا لیا تھا کہ وہ فوراً کھڑا ہو گیا اور ابھی میں نے آٹھ ہی گنا تھا کہ دروازے تک جا پہنچا۔ خود میں بھی جوا کھیل رہا تھا اور ہر لمحہ مجھے کسی کے آ جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ حل میں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا اگر کوئی آ جاتا تو منظر بالکل بدل جاتا۔ ریوالور غائب ہو جاتا اور میرے ہاتھ میں میرے وصیت نامے کی نقل آ جاتی۔ سننے والا یہی سمجھتا کہ میں چوہدری دلاور کو یہ نقل دینے کی بات کر رہا ہوں اور چوہدری دلاور کے لیے ثابت کرنا ناممکن ہو جاتا کہ میں اس کو زبردستی اغوا کر کے لے جا رہا ہوں۔ میں [illegible] کے لیے... وہاں دیا سے فیکٹری کی [illegible] کو اٹھا کر لے جانا کوئی سمجھ میں آنے والی بات [illegible] منٹ کے وقفے میں کوئی بھی حائل نہیں ہوا [illegible] آخری مرحلہ برآمدہ تھا جہاں کوئی بھی [illegible] گڑبڑ ہو جاتی چنانچہ میں نے صرف ایک [illegible] مخالف سمت میں جاتے دیکھا تو خدا کا شکر [illegible] پہلے چوہدری دلاور کو اور پھر مجھے گاڑی کی [illegible] نہیں دیکھا۔

"گاڑی اسٹارٹ کرو۔" میں نے دلاور [illegible] حکم دیا اور اطمینان سے گیٹ کی طرف چلا۔ [illegible] کو ذہن میں رکھنا کہ گیٹ پر کسی کو شک [illegible] ورنہ میں خود بھی گاڑی چلانا جانتا ہوں۔ [illegible] بھی میں گاڑی نکال لے جاؤں گا لیکن دیکھنے [illegible] دیکھیں گے کہ تمہیں ڈی سلوا لے گیا ہے۔"

"آپ بڑے بھولے ہیں اپنے سکندر صاحب!" [illegible] نے کہا۔ "کسی نے کچھ بھی کہنے سے کیا فرق پڑے گا [illegible] اس وقت اپنے آفس میں بیٹھا ہوگا اور اس [illegible] بھول گئے۔"

"عجیب بات ہے دلاور!" میں نے کہا۔ [illegible] ڈی سلوا آفس پہنچا ہی نہیں حالانکہ وہ گھر سے آفس کے ہی لیے نکلا تھا۔ اگر وقت ہوتا تو میں آپ [illegible] کرتا اور آپ ٹیلی فون کر کے تصدیق کر لیتے [illegible] گاڑی چلایئے جناب عالی!"

چوہدری دلاور کو یقین آ گیا کہ میں جھوٹ [illegible] رہا ہوں اور اس کے خلاف سازش کا یہ جال [illegible] ہے۔ اس نے گاڑی کا رخ دروازے کی طرف موڑا [illegible] بالکل تیار تھا کہ وہ ذرا بھی غلط حرکت کرے تو [illegible] بجائے ریوالور کا دستہ مار کے کام چلاؤں۔ [illegible] گیٹ کھولا اور چوہدری دلاور کو گاڑی چلاتے [illegible] بھی کہا۔ سبز رنگ کے شیشوں میں سے اس نے [illegible] کی ہلکی سی جھلک بھی دیکھی ہو گی۔ میں دوسری [illegible] اور ایک سیکنڈ کے لیے میں نے اپنا چہرہ بھی [illegible] میں کر لیا تھا۔ گاڑی پھاٹک سے [illegible] دلاور سے کہا۔ "اس وقت تم نے عقل مندی سے [illegible] کرا کے بچوں کو یتیم ہونے سے بچا لیا۔"

[illegible] صاحب!" اس نے [illegible] "[illegible] عقل مند ہوتے [illegible] اس وقت تک سمجھ گئے ہوتے کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟"

"آہستہ آہستہ سب باتیں سمجھ میں آ جائیں گی۔" میں [illegible] معاملات کو سمجھنے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے [illegible] اتنا عرصہ ہو گیا ولایت سے آئے [illegible] بہت سی باتوں کو اور بہت سے انسانوں کو [illegible] کوشش کر رہا ہوں لیکن کامیابی ابھی تک نہیں [illegible] مثلاً میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ میرے خلاف عمل [illegible] وزیر خان کے قاتلوں کے بارے میں [illegible] معلوم ہے کہ وہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ بس میں [illegible] عدالت میں نہیں لے جا سکتا۔ میری سمجھ میں یہ بھی [illegible] شخص نے آپ کے ایک بزنس پارٹنر کی حیثیت [illegible] سال گزشتہ کا منافع ساڑھے تین لاکھ روپے وصول [illegible] ہسپتال سے ملنے والی مفت دوائی کے [illegible] وہ تمہارا پارٹنر تھا۔ اس نے تمہیں اس قابل [illegible] نہیں سمجھا..."

"تم بھی تو اس کی ایک ہی اولاد تھے۔" دلاور نے [illegible] بات کاٹ دی۔ "اس نے تمہیں قابل اعتماد کیوں نہیں سمجھا؟"

"قابل اعتماد؟" یہ لفظ ایک طمانچے کی طرح تھا جو [illegible] اس طمانچے کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن میں اس [illegible] جواب بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ عدم اعتماد [illegible] خوف تھا یا اندیشہ تھا جس نے نواب [illegible] خوف کس کا تھا اور اندیشہ کس سے تھا [illegible] سے خطرہ میری زندگی کو لاحق ہوتا [illegible] اور ایسے ان گنت سوالوں کا [illegible] اور میری ساری جدوجہد اس [illegible]

"[illegible] مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے سیٹھ دلاور! [illegible] وقت نہیں بھی بہت کچھ بتا دے گا۔ دیکھنا یہ [illegible] کا حوصلہ کس میں زیادہ ہے۔ اس [illegible] سے پہلے تمہیں بھی بہت سے ایسے تجربات [illegible] تمہارے گمان میں بھی نہیں ہیں۔ گاڑی کو ماڈل [illegible] ان راستوں سے تم اچھی طرح [illegible]

ماڈل ٹاؤن پہنچنے کے بعد میں نے دلاور کی راہنمائی کی۔ اتفاق سے دلاور نے بھی صورت حالات کو سمجھ لیا تھا۔ اس کا خوف زدہ ہونا ایک فطری امر تھا لیکن وہ بہت اچھا اداکار تھا۔ اس کے نمونے میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ ایک رات وہ بیان کر چکا تھا کہ [illegible] ہوا تھا۔ دوسری بار میں نے اس کی آواز فرشتہ اجل کی طرح ایک ویڈیو ٹرانسمیٹر سے سنی تھی لیکن کسی بھی موقع پر وہ میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ قصر جمشید کے سامنے پہنچ کر میں نے اسے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔

"یہ ویران حویلی ایک ایسے شخص کی ہے جو مجھ سے اپنی موت کے چالیس سال بعد ملا۔" میں نے کہا۔ "یہی نہیں۔ اس کے ساتھ اس کا ہمزاد بھی تھا۔"

"یہ قصے کہانیاں مجھے سنانے کا کیا مقصد ہے اپنے سکندر صاحب!" وہ بولا۔

"کچھ لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ ہر شخص کا ایک ہمزاد بھی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اسے تابع بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہمزاد کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بات واقعی قابل غور ہے کہ چالیس سال بعد اگر نواب خسرو جمشید کی روح کو دنیاوی معاملات میں دخل دینا ہی تھا تو اس نے اپنے ہمزاد کو بلاوجہ کیوں زحمت دی۔ کیا ہمزاد کی کوئی اپنی روح بھی ہوتی ہے؟"

میں نے قہقہہ مارا۔ "تم تو مجھے ایسے دیکھ رہے ہو جیسے میں فارسی بول رہا ہوں۔ حالانکہ جو بات ہے وہ تم سمجھ گئے ہو۔" وہ اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا چنانچہ میرے اچانک وار سے وہ خود کو بچانے کی کوشش بھی نہ کر سکا اور وہیں سیٹ پر لڑھک گیا۔ اس کی جگہ ڈرائیونگ سنبھال کے میں گاڑی کو پیچھے لے گیا جہاں محسن میرا منتظر تھا اور اپنے کام سے تقریباً فارغ ہو چکا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر بے ہوش دلاور کو دوسرے کمرے میں منتقل کیا اور بے دست و پا کر کے ڈال دیا۔

محسن نے کمال مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ اصل وڈیو ٹرانسمیٹر میں بھی فیوز کا نظام تقریباً ویسا ہی تھا جیسا پہلی بار مجھے ختم کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ نیچے والے خانے میں سیل اوپر تھے اور نیچے [illegible] کی جگہ بھی تقریباً دو انچ لمبا لوہے کا ٹکڑا تھا جس کے آخری کونے سے دونوں طرف بال جیسے باریک تار بندھے ہوئے تھے اور یہ تار ابھی باڈی کے اندر غائب ہو جاتے تھے۔ محسن نے بجلی کے بورڈ کی ڈوری کا ایک سرا بڑی احتیاط سے مضبوطی کے ساتھ لوہے کے ٹکڑے کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ صرف ایک جھٹکا دینے سے وہ ٹکڑا سیل کے ساتھ باہر آ گرتا اور دونوں تاروں کا سرکٹ ایک بار پھر

www.paksociety.com

"تاروں کے قریب ہی بم پھٹ جاتا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر کا پچھلا حصہ محسن نے کھول کر چھوڑ دیا تھا اور دو قطاروں میں لگے ہوئے آٹھ سیل صاف نظر آتے تھے۔ ڈور کا دوسرا سرا ان سیلوں ہی سے جڑا ہوا تھا لیکن محسن نے پرانی وضع کی ایک گھڑی اپنے سوٹ کیس میں سے برآمد کی۔ اس نے ڈور کو ٹائم پیس کے پیچھے نکلے ہوئے ہیں ایک چابی سے لپیٹ کر دکھایا۔

"اس وقت ڈیڑھ بجا ہے۔" محسن نے گول ٹیبل کلاک کا رخ میری طرف کیا۔ گھڑی چل رہی تھی اور خالی کمرے میں اس کی ٹک ٹک صاف سنائی دیتی تھی —— "اس میں الارم بجنے کے لیے اس دوسری چابی کو دائیں سے بائیں گھمانا پڑتا ہے۔" اس نے مجھ سے زیادہ ڈی سلوا کی معلومات کے لیے [illegible] "فرض کیجیے آپ دو بجے کا الارم سیٹ کر کے رخصت ہو جاتے ہیں اور ڈور کو اس چابی سے باندھ کر گھڑی کو اسٹینڈ کی سطح پر رکھ دیتے ہیں کہ ڈور کھنچی رہے تو ٹھیک دو بجے کیا ہوگا؟"

"الارم بجنے لگے گا اور چابی مخالف سمت میں گھومے گی یعنی بائیں سے دائیں۔" میں نے کہا۔

"رائٹ۔ اور جب چابی گھومے گی تو ڈور اس پر لپٹنے لگے گی۔ الارم کے اسپرنگ کی قوت خاصی ہوتی ہے اور ڈور کو ایک جھٹکے سے کھینچنے کی ضرورت ہے۔ ایک بار یا زیادہ سے زیادہ دو بار چابی کے گرد لپٹنے سے ڈور کا تناؤ بڑھ جائے گا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر چھت کے ساتھ مضبوطی سے بندھا ہوا ہے اور ڈور اسے نہیں کھینچ سکتی۔ ڈور ٹوٹ بھی نہیں سکتی لیکن لوہے کے ٹکڑے کو کھینچ سکتی ہے جسے میں ایک ساتھ فوراً پکڑ لیں گے اور اس کے ساتھ ہی لوہے کے ٹکڑے کا تاروں سے رابطہ ٹوٹ جائے گا۔ پھر دھماکا!" اس نے اپنے سینے پر انگلی سے صلیب کا نشان بنایا۔ "جاتے وقت ہم اس گھڑی کو روشن دان میں رکھ جائیں گے۔"

"جانے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ مسٹر ڈی سلوا اپنا وصیت نامہ پڑھ لیں۔" میں نے کہا۔ اور جیب سے اپنے وصیت نامے کی ایک نقل برآمد کی جو میں نے رابعہ سے حاصل کی تھی۔ یہ نقل میں نے ڈی سلوا کے سامنے رکھ دی جس کی حالت اس شخص سے مختلف نہ تھی جو دیکھ رہا ہو کہ اسے پھانسی دینے کے انتظامات مکمل کیے جا رہے ہیں۔

"یہ۔۔ یہ تو تمہارا وصیت نامہ ہے۔" وہ مردہ آواز میں بولا۔

"کمال ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "مسٹر ڈی سلوا وصیت نامہ ہمیشہ مرنے والے چھوڑتے ہیں۔ بفضل خدا میں صحیح سالم اور تندرست ہوں۔ نہ میری مرنے کی عمر ہے اور نہ میرا ارادہ خودکشی کا ہے۔ قدرت نے تمہاری عقل خبط کر دی ہے۔" ایک بار پھر ڈی سلوا کی عقل واقعی خبط ہو چکی تھی۔

وہ دوبارہ وصیت نامہ کو دیکھنے لگا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے نام تھے مگر ڈی سلوا کو [illegible] نے وہ نقل اٹھائی اور تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لی۔

"اب ہم چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ [illegible]

"یونہی آباد رہے گی دنیا۔ ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا۔"

"وقت بہت کم ہے۔ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔" محسن نے کہا۔ "تاکہ تم سکون سے مر سکو۔"

اس کے بعد محسن نے [illegible] روشن دان میں رکھا لیکن ڈی سلوا کو بتانے [illegible] بچنے سے پہلے [illegible] تھی۔ وہ گالیاں بکتا ہوا اور چیختا چلاتا دونوں [illegible] کرسی سمیت اچھلتا ہوا ہماری طرف آنے لگا اور جب وہ قریب پہنچا تو [illegible] ڈی سلوا کے منہ پر [illegible] کر گیا۔ محسن گھڑی رکھ کے پیچھے مڑ گیا۔

"وہ چیخ رہا ہے۔" [illegible] "ایک تو یہ کہ دور دور تک چیخ سننے والا کوئی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ تم [illegible] کھڑکیوں میں سلاخیں ہیں اور [illegible] باہر سے بند ہے۔ بالفرض محال تم آزاد ہو گئے تب بھی [illegible] نکل سکتے اور [illegible] چھت [illegible] اس کمرے کی سیاحت [illegible] کرنے میں ایک منٹ بھی نہیں ہے [illegible] گھڑی کو [illegible] ہاتھ [illegible] آدھ گھنٹے آگے بڑھا دیا ہے۔ یہ فیصلہ تم خود کر سکتے ہو کہ کتنی زندگی باقی ہے اور یہ وقت تمہیں کیسے گزارنا ہے۔"

[illegible] باہر نکلے محسن نے [illegible] ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر تھا جس میں کوئی [illegible] باہر آتے ہی محسن نے اس کو آن کیا اور ڈی سلوا کی آواز صاف سنی۔

"بہت سے کام لو مسٹر ڈی سلوا۔" میں نے [illegible] کہا۔ "تم تو بہت بہادر بنتے تھے۔ موت کو سامنے دیکھ کر [illegible] حالت خود ہی [illegible] باعث شرم [illegible] تمہیں تو کمرے میں چھت سے لٹکے ہوئے ریڈیو ٹرانسمیٹر [illegible] ڈی سلوا کے کانوں تک پہنچا دیا ہوگا۔"

"[illegible] ایک آخری اطلاع ہے۔" محسن نے کہا۔ [illegible] اس کے معتبر گواہ موجود ہیں۔ اس لیے [illegible] الزام ہم پر نہیں آئے گا۔"

"تم نے ایک بہت ہی غلط کام کیا تھا۔" میں نے کہا۔ [illegible] فیکٹری کے مالک کو [illegible] ہیں اور مجھے یقین ہے [illegible] رپورٹ بھی نہیں جا سکے گی۔ افسوس [illegible] تو اس حال میں کہ کوئی [illegible] ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کا مالک ابھی [illegible] بڑی جیب تنگی پیدا ہو جائے گی۔ وہ [illegible] معاملے کو طول نہیں دیتے [illegible] کر لیں گے کہ تم سیٹھ دلاور کو [illegible] تھے اور [illegible] اسے کہیں لے جا کر قتل کر دیا [illegible] کیس رد ہو جائے گا کیونکہ تمہیں کس نے مارا [illegible]"

"[illegible] ٹھیک۔" ڈی سلوا کی لرزتی ہوئی آواز آئی۔ "میں اپنے ہر جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔"

[illegible]

[illegible] میں نے ہنس کر کہا۔ "کیا فائدہ اس اعتراف کا [illegible] اس وقت تو تم صرف خدا سے معافی [illegible] دنیا کے قانون کو تم نے اپنے ہاتھ میں لے [illegible] اب یہ بھی دیکھو کہ قدرت کا نظام انصاف کیا ہے۔ [illegible] حق وراثت سے محروم کرنا چاہتے تھے تاکہ سیٹھ دلاور [illegible] کا مالک بن جائے لیکن اب صرف [illegible] کا اضافہ کیا ہوں۔"

"خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔" ڈی سلوا بلبلایا۔ "میں تمہیں سب کچھ دے دوں گا۔"

"مسٹر ڈی سلوا [illegible] تم ایک تنخواہ دار ملازم تھے۔" [illegible] تمہاری جو [illegible] زیادہ [illegible] کہ صرف تنخواہ تم لیتے [illegible] اب ہم جا رہے ہیں۔ [illegible] گھنٹہ ہے۔ [illegible] باقی۔"

[illegible] کے اشارے کی تو میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر کا تار [illegible] گاڑی [illegible] ڈی سلوا کے چیخنے چلانے منت سماجت کرنے [illegible] کی آوازیں صاف سنائی نہیں دیتی [illegible] منٹ میں اس پاس کی کچی پکی سڑکوں پر سو گز دور جا کے بھی دیکھا۔ مواصلاتی رابطہ بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا۔ ڈی سلوا نے یقیناً گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز سن لی تھی اور سمجھ لیا تھا کہ ہم پر کسی بات کا اثر نہیں ہوگا۔ اب وہ رو بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے اپنے خیال کے مطابق دس منٹ میں اس کا کام تمام ہونے والا تھا۔

"یار محسن!" میں نے تشویش سے کہا۔ "کہیں یہ ڈھائی بجے سے پہلے ہی نہ مر جائے۔"

"اگر مر جائے تو اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔" محسن بولا۔ "قتل کا کیس ہی نہیں بنے گا۔ یہ ریڈیو ٹرانسمیٹر پھر بھی کام آئے گا۔ کچھ دیر بعد لوٹ کر جائیں گے تو دیکھ لیں گے لیکن وہ جو دوسرے کمرے میں بڑا [illegible] ہے ...."

"وہ زیادہ سے زیادہ فرش پر لوٹ لگا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈی سلوا کے چیخنے چلانے کی آواز سن سکتا ہے مگر وہ اپنی مدد نہیں کر سکتا تو ڈی سلوا کی کیا مدد کرے گا۔ چلو کہیں کھانا کھا کے آتے ہیں۔"

"کیوں نہ ہم گھر جا کے کھانا کھائیں۔" میں نے تجویز پیش کی۔ "بیگم رضوی سیدھی سادی عورت ہیں۔ ان کو یقین دلایا جا سکتا ہے کہ ہم دو گھنٹے پہلے [illegible] تھے۔ کھانے کے بعد قیلولہ کریں گے اور [illegible] کے آ جانے کے بعد اطمینان سے [illegible] جانے کے بہانے نکلیں گے۔"

"اور یہ گاڑی [illegible] اس کی ضرورت ہے۔" محسن بولا۔

"اسے گھر سے دور باغ جناح میں پارک کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "دس منٹ کا راستہ پیدل طے کر لیں گے۔"

بیگم رضوی ہمیں دیکھ کر خاصی حیران ہوئیں۔ انھوں نے بہت آسانی سے یقین کر لیا کہ ہم سوئے پڑے تھے اس لیے ٹھیک کھانے کے وقت نہیں پہنچ سکے۔ خانساماں کو [illegible] میں طلب کر کے دو افراد کا کھانا حاضر کرنے کا حکم دیا گیا اور کھانا آنے تک ہم نے بیگم رضوی کو اپنی باتوں سے خوب ہنسایا۔ شوہر کی مستقل مصروفیت کی وجہ سے وہ زیادہ وقت گھر میں تنہا گزارتی تھیں اور انھیں کوئی بات کرنے والا بھی نہیں ملتا تھا۔ اس کے علاوہ رضوی صاحب سنجیدہ مزاج تھے۔ بیگم رضوی کو اس بات کا ملال تھا کہ ہم نے الگ مکان لے کر رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور اگر رابعہ بھی بیٹے کے ساتھ چلی گئی تو انھیں گھر سونا سونا لگے گا۔ پھر انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ رابعہ سے شادی کر لوں اور اسی گھر میں رہوں۔ میں نے [illegible] بڑی سنجیدگی سے کہا کہ اس وقت تو [illegible] ہے اور رابعہ بھی نہیں ہے۔ [illegible] ایک کے بعد ایک۔ میں نے [illegible] کہا۔ "خدا کے

www.paksociety.com

چاہا تو یہ گھر جلد ہی کیمپ بن جائے گا۔" میں نے ان کو ہنستا چھوڑا اور ہم دونوں اپنے کمرے میں آ کے پڑ گئے۔ آنکھ کھلی تو پانچ بجے تھے۔ ہم نے جلد از جلد تیار ہو کے انکل رضوی کی خدمت میں حاضری دی جو لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ شاید بیگم رضوی نے دوپہر کی باتیں سنائی تھیں کہ اچھے موڈ میں نظر آتے تھے۔ چائے پیتے ہوئے ہم نے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور ان کو اپنے پروگرام سے بھی آگاہ کر دیا۔ جب ساڑھے پانچ بجے ہمیں ان سے اجازت ملی تو ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ ساتھ نہیں ہو لیے یا بیگم رضوی نے اپنا ایک فلم کا پروگرام نہیں بنایا۔۔۔

بازار جانے تک پہنچتے پہنچتے ہمیں چھ بج گئے۔ ڈرائیونگ میں نے سنبھالی اور گاڑی کو مسٹر اسمتھ کی رفتار سے دوڑایا۔ دو جگہ ہم نے جلتے ہوئے سگنل توڑے اور ٹریفک سارجنٹ کو گاڑی کا نمبر نوٹ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ٹریفک اسکواڈ کے سگنل پر ایک سارجنٹ نے اپنی بھاری بھرکم موٹر سائیکل پر ہمارا تعاقب کا ارادہ کیا۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک ہمیں گاڑی چھوڑ کے بھاگنا پڑتا مگر اس کی موٹر سائیکل اسٹارٹ نہیں ہوئی اور ہم چند منٹ میں مال روڈ کے ختم ہوتے ہی ضلع کچہری کے پاس بائیں طرف گھوم گئے۔ ساڑھے چھ بج رہے تھے جب میں نے گاڑی کو پھر اسی کوٹھی کے اندر کھڑا کیا جہاں ہمارے دونوں اسیر موجود تھے۔ میں آتے ہی باری باری دونوں کمروں میں گیا۔ ڈی سلوا اسی طرح دست و پابستہ دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھا تھا اور برسوں کا بیمار لگتا تھا۔ چند گھنٹوں میں اس کی عمر میں کئی سال کا اضافہ ہو گیا تھا لیکن وہ زندہ تھا اس امید پر کہ موت کا وقت ٹل گیا ہے۔ میں نے دروازہ پھر بند کیا اور چودھری دلاور کو اٹھا لایا۔ محسن کار کی ڈکی کھولے کھڑا تھا۔ میں نے چودھری دلاور کو اسپیئر وہیل، جیک اور وہیل اسپینر کے ساتھ ہی لٹا دیا۔ دلاور کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اس کی خاموشی بھی التجا بن گئی تھی۔ بنڈل کی طرح بندھے پڑے رہنے کا اثر اس کی صورت سے عیاں تھا اور شاید سر کی چوٹ کا اثر بھی باقی تھا۔

"ہم نے تمہیں بہت مہلت دی تھی چودھری دلاور۔" میں نے ایک پیر پچھلے بمپر پر رکھ کے کہا۔ "یہ غور کرنے کے لیے کہ طاقت کا غرور کتنا بے معنی ہوتا ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے نا کہ آدمی بلبلا ہے پانی کا۔ وہ ان سب کے لیے کہا ہے جن کا ذکر 'آدمی نامہ' میں آیا ہے۔ ظالم اور مظلوم، محمود و ایاز، غریب و امیر، تم اور ہم سب پانی کے بلبلے ہیں۔ ابھی تمہیں اندازہ ہوا ہے۔ بہت جلد تمہیں اس کا یقین بھی آ جائے گا۔ تمہیں معلوم ہے یہ گاڑی ڈی سلوا کی ہے۔ مجھے تمہارے آفس میں آتے

کسی نے نہیں دیکھا تھا اور دیکھنے والوں کو یقین [illegible] ڈی سلوا اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ جب تمہاری لاش [illegible] میں سے برآمد ہو گی تو قتل کا الزام کس پر آئے گا [illegible] کا قاتل کوئی اور تھا مگر حالات نے مجھے ملزم [illegible] حالات ہی ڈی سلوا کو تختہ دار پر لے جائیں گے [illegible] کھیل ہے چودھری صاحب جو آپ اب تک کھیلتے [illegible] آپ قانون سے کھیلتے رہے۔ اب تقدیر آپ کے ساتھ کھیل [illegible] ہے۔ ڈی سلوا اور تم دونوں مل کر ہر جرم کرتے رہے [illegible] کی گرفت سے محفوظ رہے کیونکہ تم نے ہمیشہ [illegible] اپنے خلاف کوئی ثبوت یا شہادت نہیں چھوڑتے تھے [illegible] وقت بھی تم نے سوچا تھا کہ [illegible]؟"

میں نے اس کے منہ میں سے کپڑا نکال دیا۔ "تم دوسروں کی مجبوری کا اور ان کی بے بسی کا مذاق اڑاتے رہے [illegible] ہنستے ہیں۔ انگریز کہتے ہیں کہ ہنسنے والوں کو ہنسنے دو [illegible] آخری بار کون کس پر ہنستا ہے۔ اور کون کس [illegible]"

"سکندر صاحب!" چودھری دلاور نے بڑے [illegible] اس کی آواز کا سارا غرور اور اعتماد ختم ہو چکا تھا۔ "مجھے مار کے تمہیں کیا ملے گا؟"

"یہ تم پوچھ رہے ہو؟" میں نے ایک قہقہہ لگایا [illegible] وہی سب کا دیا ہوا ملے گا جو آپ چودھری صاحب [illegible] آپ بننا چاہتے تھے۔"

محسن نے دوبارہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے ڈکی بند کر دی اور ہم باہر نکل آئے۔ اس علاقے میں [illegible] کم ہی تھی اور رات کے وقت تاریکی دیکھ کر یہ اندازہ کرنا بھی آسان ہو جاتا تھا کہ کون سا مکان لاوارث پڑا ہے۔ سات ستر گز کے فاصلے پر میں نے ایک ویسا ہی گھر منتخب کیا جو خالی پلاٹوں کے درمیان اکیلا کھڑا تھا اور بالکل بے آباد تھا۔ انجن بند کر کے میں نے ہیڈ لائٹس آف کیں اور پیدل چل کے دروازے تک پہنچا۔ بار بار کال بیل بجانے کے باوجود [illegible] کھولنے کوئی نہیں آیا تو میں نے محسن کو اشارہ کیا اور [illegible] ٹرانسمیٹر لے کر گاڑی سے اتر آیا۔ ہم دونوں دیوار پھاند کر اندر پہنچے اور پچھلے حصے کے برآمدے میں بیٹھ گئے۔ محسن نے ایریل کے تار کو ایک درخت کی شاخ سے باندھ کے [illegible] آن کیا۔ ہمیں صرف ایک ایسی جگہ کی ضرورت تھی جو [illegible] کے فاصلے سے زیادہ دور نہ ہو اور جہاں ہمیں کوئی [illegible] کرتا نہ دیکھ سکے۔

"مسلسل آن رکھنے سے دوسرے ریڈیو ٹرانسمیٹر کے سیل

[illegible] بھول گئے؟" میں نے کہا۔

"[illegible] اتنی جلدی سیل ختم نہیں ہو سکتے۔" محسن بولا۔ "نہیں۔ [illegible] اس سے صرف یہ ہو گا کہ آواز جلدی [illegible] اور زیادہ دور تک نہیں جائے گی۔"

میں نے ٹرانسمیٹر والا بٹن دبایا اور چند سیکنڈ تک [illegible] کوشش کرتا رہا لیکن ڈی سلوا خاموش [illegible] پانچ گھنٹوں میں اس نے یہ حقیقت [illegible] مرضی کے بغیر اس کا یہاں سے زندہ [illegible] ہے۔ ڈھائی بجے اس نے سمجھ لیا ہو گا کہ [illegible] چند سیکنڈ میں الارم بجنے لگے گا [illegible] پر لٹکنے والے شخص کی طرح جان لیوا [illegible] گزرے ہوں گے۔ ہر لمحہ عذاب کی ایک گھڑی [illegible] مگر اس وقت کے گزر جانے کے بعد آہستہ آہستہ [illegible] بے یقینی کے ساتھ امید بھی بیدار ہونے لگی ہو گی۔ اس [illegible] کہ ہم لطف لے رہے تھے۔ ہمارا ارادہ اس کو قتل کرنے کا نہیں تھا۔ [illegible] دہشت زدہ کرنا چاہتے تھے اور یہ [illegible] کہ ان کا [illegible] ہم بھی استعمال کر سکتے ہیں اور [illegible] لیکن یہ خوف ہر وقت اس پر سوار رہا ہو گا کہ [illegible] الارم اچانک چلانے لگے گا۔ ڈھائی بجے کے بجائے [illegible] ہوا اور ہمارا مقصد اس کے لیے [illegible] سے زیادہ طویل دینا ہو۔

"ہیلو مسٹر ڈی سلوا!" میں نے کہا۔ "کیا یہ خوشی کی بات نہیں ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو؟"

محسن نے اتنی دیر میں ریڈیو ریسیور سے ایک پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر جوڑ دیا تھا تاکہ ڈی سلوا کی ہر بات ریکارڈ بھی ہو جائے۔

"اب تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" ڈی سلوا نے سرگوشی کی آواز میں کہا۔

"اصل بات یہ ہے مسٹر ڈی سلوا کہ ہم کچھ پوچھنا چاہتے [illegible] جواب دینے کے لیے تمہارے پاس صرف ایک گھنٹہ ہے [illegible] کوئی گنجائش نہیں کیونکہ [illegible] آٹھ بجے کا رکھا تھا [illegible] ٹھیک ٹھیک جواب دو گے تو ہم ٹھیک [illegible] تمہیں نکال لیں گے۔ ورنہ دس منٹ پہلے یہاں سے [illegible] جہاں سے ہم بات کر رہے ہیں یہ جگہ زیادہ دور [illegible] ہمارا رابطہ شارٹ رینج کے میڈیم ویو ٹرانسمیٹر کے ذریعہ [illegible] ہماری آواز کوئی اور نہیں سن سکتا۔"

"[illegible] کوشش کروں گا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں تمہیں بتا دوں۔" ڈی سلوا کی آواز آئی۔

میں نے محسن کو ٹیپ ریکارڈر آن کرنے کا اشارہ کیا اور اس کے مائیکرو فون پر اپنا رومال ڈال کے کہا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ میر شرافت علی کو کس نے قتل کیا تھا۔ اسے کس نے قتل کروایا تھا اور کیوں؟" اب میری آواز نشر بھی ہو رہی تھی اور ریکارڈ بھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ ڈی سلوا کے کانوں تک پہنچنے والی آواز میں کوئی فرق نہ تھا لیکن مائیکرو فون پر پڑے ہوئے رومال کے باعث ریکارڈ ہونے والی آواز بالکل بدل گئی تھی۔

"مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ قتل کرنے والا اسنائپر تھا۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "مجھے یہ نہیں معلوم کہ [illegible] حکم دینے والا کون تھا۔ چودھری دلاور اور میر شرافت علی ایک دوسرے کے ساتھی تھے اور انہوں نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ پہلے [illegible] کرا اور پھر انہیں ٹھکانے لگا دیا جائے تاکہ ان کا کاروبار چلتا رہے۔ میر شرافت علی نے تمہارے والد کو راستے سے ہٹانے کی اسکیم بنائی تھی۔ معلوم نہیں خود اسے راستے سے ہٹانے کی اسکیم بنانے والا کون تھا۔"

"تمہارے خیال میں چودھری دلاور کے علاوہ بھی کوئی شخص یہ کر سکتا تھا؟"

"ہاں۔ خود تمہارے والد میر شرافت علی کی جان کے دشمن تھے۔" ڈی سلوا بولا۔ "ان کے علاوہ دلاور کے دوست یا ساتھی تھے اور کاروباری حریف تھے۔ مجھے ان کے نام نہیں معلوم کیونکہ میں تو صرف دفتر میں رہتا تھا۔"

"تم میرے ابا کے ساتھ دوروں پر بھی جاتے رہتے تھے۔"

"ہاں۔ صرف رقم وصول کرنے کے لیے۔ مجھے معلوم نہیں رقم دینے والے کون لوگ ہوتے تھے۔" وہ بولا۔

"باہر بھی ان کا رابطہ جن لوگوں سے رہا ان میں خسرو پرویز نام کا کوئی شخص بھی تھا جو لندن میں رہتا ہے؟"

"خسرو پرویز مجھے لندن میں ملا ضرور تھا مگر اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔"

"کیا خسرو پرویز ان دنوں پاکستان آیا ہوا ہے؟"

"ہاں۔ اسے دلاور نے ایک خاص کام سے بلایا تھا۔"

"وہ خاص کام کیا تھا؟ ہم سب کا قتل؟"

"ہاں۔ اس کے ساتھ ایک دہشت پسند بھی آیا تھا۔" [illegible] پھر کہا۔ "اس نے خسرو پرویز کے کسی مکان کے نیچے بارودی سرنگیں بچھانے کا کام کیا تھا اور اس کا معاوضہ بھی لیا تھا۔ بعد میں یہ مکان رابعہ کو فروخت کے لیے پیش کر دیا گیا تھا۔"

"رابعہ کے پہلے مکان کو دھماکے سے تباہ کرنے والا بھی یہی شخص تھا؟ تم اس کا نام جانتے ہو؟"

"نہیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ رابعہ کا گھر اسی نے تباہ

www.paksociety.com

کیا تھا؟"

"دونوں کو پاکستان بلوانے والا کون تھا؟ سیٹھ دلاور؟"

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"تمہارے ایک پرانے اور ایمان دار آفیسر نعیم سے لندن میں کس نے رابطہ قائم کیا تھا؟"

"شمشیر مرزا نے۔" ڈی سلوا بولا۔ "لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا۔"

"جس کے بعد اس کی بیوی کے والدین کو قتل کیا گیا۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ وہ نعیم یا اس کی بیوی کا پتہ بتانے سے قاصر تھے اور ان کے گھر کو آگ لگا کے قتل کے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش بھی کی گئی۔ یہ کارنامہ تم نے سرانجام دیا تھا؟"

"نہیں۔ مجھے اس کا علم بعد میں ہوا۔"

"لیکن تم نے جرم کرنے والوں کا ساتھ تو دیا۔" میں نے کہا۔ "تم نے ایک نہیں دو لڑکیوں کو بلیک میل کر کے ان کی مدد کی۔ تمہارے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے ڈی سلوا اور وقت کم ہے اس لیے میں تم سے آخری تین سوال کروں گا اور اس کے بعد فیصلہ کروں گا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ نبیلہ کے والد کی لاش کہاں گئی؟"

"لاش کسی جگہ دفنا دی گئی ہے لیکن مجھے وہ جگہ نہیں معلوم۔ میرا کام صرف لاش حاصل کرنا تھا اور مجھے اس کا معاوضہ پچاس ہزار روپے دیا گیا تھا۔ رقم مجھے اپنے گھر کے نمبر بکس میں ملی تھی اور یہ کام کرانے والے نے مجھ سے ایک دن پہلے ٹیلی فون پر بات کی تھی۔"

"میرا دوسرا سوال۔ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کے نام پر چلنے والا ادارہ کس ناجائز اور غیر قانونی کاروبار کے لیے استعمال ہو رہا ہے اور اس میں والدہ کے علاوہ کون کون شامل ہیں؟"

"اس سوال کا جواب میں نہیں دوں گا۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "کیونکہ وہ لوگ بہت طاقت ور ہیں۔ میں آج نہ مارا گیا تو ان کے ہاتھوں کل مارا جاؤں گا۔ میں فقط ان کا آلہ کار ہوں۔ وہ مجھے نقد معاوضہ بھی ادا کرتے ہیں اور دباؤ ڈال کے مجھے بلیک میل بھی کرتے ہیں۔ میں نے ان کے جتنے کام کیے ہیں پیسے کے لالچ میں کیے ہیں۔ کبھی دوسروں کو معاوضہ ادا کر کے کرائے ہیں تو کبھی اپنی جان بچانے کے لیے دوسروں کو بلیک میل بھی کیا ہے۔"

"میرا آخری سوال۔ نبیلہ کے والد کو بلیک میل کر کے خاموش رہنے پر مجبور کرنے والا کون تھا؟" میں نے کہا۔ "اور ان کی کون سی مجبوری سے فائدہ اٹھا کے انہیں لوٹ رہا تھا؟"

"میر شرافت علی۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "اس کے اسباب کا علم صرف ایک شخص کو تھا جو میر شرافت علی کا ملازم تھا اور شیخ ملانا ... بھی مذاق میں لوگ اسے فوراً پہچان لیتے تھے۔ دو سال پہلے اس کا

وارث کوئی نہیں ہے۔"

میں نے محسن کو ٹیپ ریکارڈر آف کرنے کا اشارہ کیا۔ تیس منٹ کی ایک سائڈ تقریباً ختم ہونے والی تھی۔ مجھے میں بس منٹ رہ گئے تھے۔ میں نے فوراً ... ہم دونوں چیزیں اٹھا کے باہر آ گئے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈی سلوا مجرم ہے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن اس کا جرم یہی ہے کہ وہ لالچی ہے۔ اس کے باعث اس نے غلط کام کیے اور بلیک میل ہو کر دشمنوں کا آلہ کار بنا لیکن براہ راست اس کو ... نہیں تھی۔"

"اور جو کچھ اس نے بتایا ہے اس سے ہم کوئی غلطی نہیں کر رہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔ "اب یہ ریکارڈنگ اعجاز صاحب کے لیے کوئی انتظام کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ خود کچھ نہ کریں اور اگر کوئی ایسی ویسی بات معلوم ہو پہلے سے بتا دیں۔ ہم یہ ٹیپ بطور ضمانت اپنے پاس رکھیں گے۔"

جب گاڑی اس گھر کے پاس رکی جس کے ایک ... ڈی سلوا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا ... کو جانا ہی فیصلہ کیا ہوگا تو پولیس نے آٹھ بجے تھے ... ڈی سلوا کو اندر سے اٹھا کے گاڑی میں ... کو میں نے اندر سینچا دیا۔ پھر بیٹے کی طرح محسن نے ... پر جھک کے اندھیرے میں بھی روشن دان میں دکھائی ... کو بھی احتیاط سے اٹھایا اور الارم کی چابی پر بند ... الگ کر دی جب وہ نیچے اترا تو میں نے اطمینان کا ... کیونکہ آٹھ بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے ... گھڑی سے پابندی وقت کے اعلیٰ ترین ... دکھا غلط تھا۔ الارم پانچ منٹ پہلے ہی بج سکتا تھا ... ہو سکتا تھا کہ اندھیرے میں گھڑی محسن کے ہاتھ سے ... اور ایک جھٹکے سے نیچے آتی یا کسی بھی وجہ سے ... بگڑ جاتا ... ٹرانسمیٹر کے اندر چھپا ہوا بم بالکل ... ہوا تھا اور یہ یقینی بات تھی کہ بم پھٹتے تو ... آگ لگتی اور ہم وہیں زندہ دفن ہو جاتے۔

"میرا خیال ہے کہ ابھی آدھے ایک ... جاری رکھ سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ ہم نے گھڑی ... سے گھڑی اور ٹیپ ریکارڈر کی روشنی میں محسن نے ساڑھے آٹھ اور چھ ... کر دیا۔

"قطعون کے ثبوت ... آٹھ کے بعد ..."

میں نے کہا۔ "تم ... کوشش نہیں ہوگا۔ یہاں سے ہمیں ساڑھے آٹھ ...

www.paksociety.com

محسن نے ریڈیو ٹرانسمیٹر کی رسی اور ایریل بھی روشن دان میں سے کھینچ لیے تھے اور اب اگلا مرحلہ ریڈیو ٹرانسمیٹر کو نیچے اتارنے کا تھا جس کے لیے مجھے چوتھی مرتبہ محسن کو تھوڑی دیر کندھوں پر اٹھانا پڑا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر کو نیچے پہنچانے کے بعد میں نے درست کر کے دیکھا۔ ایک کمرے کے ساتھ باتھ روم تھا جس کا ابھی دروازہ نہیں لگا تھا۔ ولاور ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ہم اس کے ساتھ کیا تماشا کرنا چاہتے ہیں۔ اسے درست کرنے میں پہنچا کے میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر کو باتھ روم میں رکھا اور اس کے رسی جیسے ایریل کو روشن دان سے باہر لٹکا دیا۔ ولاور کے ہاتھ پیر اسی طرح رسی سے بندھے ہوئے تھے جب میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا تو اس نے ایک گہری سانس لی۔

"تم نے اتنی دیر سے مجھے جکڑ رکھا ہے میرے ہاتھ پاؤں ہمیشہ کے لیے مفلوج بھی ہو سکتے ہیں۔" وہ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔

"پھر کیا ہوا۔ کیا تم نے دنیا میں مفلوج انسانوں کو زندگی گزارتے ہوئے نہیں دیکھا؟" میں نے بے رخی سے کہا۔

"سڑکوں اور فٹ پاتھ پر ہر جگہ مفلوج اور اپاہج پڑے بھیک مانگتے رہتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"لیکن میں اس زندگی پر موت کو ترجیح دوں گا۔" ولاور نے مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ ہر لحاظ سے ڈی سلوا کے مقابلے میں زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔

"آل رائٹ تمھاری یہ مرضی ہے تو یہی سہی۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم خود اپنے ہاتھوں سے تمھیں قتل نہیں کر سکتے — ڈی سلوا تمھارا ماتحت ہے اور تمھیں باس بھی مانتا ہے۔ ہم اسے بھیج دیتے ہیں کہ تمھاری آخری خواہش پوری کر دے۔"

کمرے میں صرف میرے سگریٹ لائٹر کا بڑا نام جل رہا تھا اور اس کی روشنی بھی بے رنگ و روغن سیمنٹ کی سلیٹی رنگ کی دیواریں جذب کر رہی تھیں۔ ہم دونوں کے سائے پیچھے کی بوسیدہ دیوار پر پھیلے ہوئے تھے اور ایک گوشے میں بیٹھا ہوا ولاور خود بھی سایہ ہی لگ رہا تھا جب ہم دروازہ بند کر کے رخصت ہونے والے تھے تو اس نے ہمیں فحش ترین گالیاں دیں اور دھمکی دی کہ وہ ہم سے ایسا بدلہ لے گا کہ ہم کیا ہماری آنے والی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔ اس وقت تک ولاور کو معلوم نہیں تھا کہ اس سے چند منٹ کے فاصلے پر ہم نے باتھ روم میں جو ریڈیو رکھا ہے وہ اصل ٹرانسمیٹر ہے۔ باہر آ کے ہم نے گاڑی میں سے اپنا ریڈیو ٹرانسمیٹر اور ٹیپ ریکارڈر نکالا۔ دور جانے کے لیے وقت نہیں رہا تھا۔ ہم نے کوٹھی کے احاطے میں بیٹھ کر پھر

اپنا مواصلاتی رابطہ بحال کیا اور محسن نے کیسٹ کو چلا دیا۔

"چودھری ولاور! میں نے ٹرانسمیٹر کا بٹن دبا کے کہا۔ "تم جانتے تھے نا؟ تمھاری یہ زندگی تمھارے لیے بھی اس قابل نہیں کہ تم اس پر فخر کر سکو بلکہ تمھارے اعمال میں اب مزید گنجائش باقی نہیں رہی اور تمھارے جرائم کی فہرست کو دیکھتے ہوئے تمھیں سزائے موت دی جائے تو کچھ نہیں۔ تمھیں ڈولنے کا شوق ایک بار تم نے مجھ سے اور اس کے بعد ایک تماشے میں گفتگو کی تھی۔ دوسری مرتبہ بھی تم نے یہی طریقہ زیادہ مناسب سمجھا اپنا یا تھا چنانچہ آج جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ میں نے تم سے ہی سیکھا ہے۔ اس ریڈیو ٹرانسمیٹر کا فیوز ایک الارم کلاک سے ملا ہوا ہے جو ٹھیک ایک گھنٹے بعد تمھاری موت کا اعلان کرے گا۔ الارم کی آواز سننے کے بعد تمھیں صرف اتنی مہلت ملے گی کہ کلمہ پڑھ سکو لیکن ابھی تمھارے پاس چالیس منٹ باقی ہیں۔ اگر تم میرے چند سوالات کا صحیح جواب دو تو ہو سکتا ہے کہ میں تمھیں فیوز سے الگ کرنے کا موقع دوں۔ تمھاری قسمت کہ کوئی تمھیں یہاں سے نکالنے کے لیے آ جائے یا ممکن ہے کوئی تمھاری پکار پر متوجہ ہو جائے۔"

"اگر میں سوالوں کا جواب دے سکا تو دیکھوں گا کہ تم اپنے وعدے پر قائم رہتے ہو یا نہیں۔" وہ بولا۔

"سیٹھ ولاور! میں نے کہا اور محسن نے ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ بات بہت پرانی ہے۔ سالاجو کے ایک بینک پر کچھ ڈاکوؤں نے حملہ کیا لیکن ایک فرض شناس گارڈ نے اپنی جان دے کر اس کوشش کو ناکام بنا دیا اور فرار ہونے والے ڈاکو جلدی میں مال غنیمت سڑک پر پھینک گئے۔ ایک شخص نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور افراتفری میں نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس اٹھا کے ایک گھر میں گھس گیا جہاں اتفاق سے کوئی بھی نہیں تھا سوائے ایک لڑکی کے جو اس گھر میں تھی۔ اسے خوف زدہ کر کے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا گیا اور یوں وہ شخص جو ایک معمولی اور ننگ آدمی تھا جلد ہی علاوہ رہن کے ہیرو زیانیہ کمپنی میں حصہ دار بن گیا اور جو چند افراد کی اجارہ داری دنیا میں سیٹھ ولاور کے نام سے مشہور ہوا۔"

"اس بے سرو پا کہانی پر کوئی یقین نہیں کر سکتا۔" ولاور بولا۔

"اور آج یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ تم ہی وہ شخص تھے۔"

"تم نے پہلے سوال کا جواب غلط دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور جانتے بوجھتے حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔"

"میں نے انکار نہیں کیا ہے۔" ولاور زرد ہو کے بولا۔ "میں نے کہا ہے کہ میرے خلاف کوئی ثبوت یا شہادت نہیں۔"

جانتے بوجھتے میں نے یہ نہیں بتایا کہ ... ڈی سلوا کی ... زندہ بچ گئی تھی اور اگر اس نے ... دیکھ لیا

... یا بہن کے بدلے میں جھوٹ بولنے کا مقصد ... محفوظ ہے۔

"یہ بھی ٹھیک ہے سوال سنو ولاور!" میں نے اس کی وضاحت ... آنے سے پہلے میرو زیانیہ کمپنی ... اور ڈولنے کا شوق ... جدید پریس اور زندگی کی آلات باقی ... اور دنیا کی کاروبار تھا لیکن اب میرے سامنے ... جو تصویر ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک جائز ... کوئی غیر قانونی کاروبار چل رہا ہے یہ کاروبار کیا ہے؟"

"اس سوال کا جواب دینا میرے لیے ناممکن ہے۔" ولاور ... معلوم کر سکتے ہو تو کر لو۔"

"میں تمھیں آخری موقع فراہم کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"وزیر خان کی لاش اب کہاں ہے؟"

اس کا جواب دینا اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کے مترادف ہے۔" ولاور نے کہا۔ "طویل انتظار کے عذاب اور رسوائی کی موت کے مقابلے میں مجھے اسی وقت مرنا منظور ہے میرے ... کی فکر تم کیوں کرتے ہو ... میں اتنا مجبور ہو جاؤں گا کہ ان کی ... زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا میری بیوی بہت ... عورت ہے اور اولاد کی پرورش بالکل صحیح خطوط پر کر رہی ہے جب وہ بڑے ہوں گے تو سیٹھ ولاور نہیں بن سکیں گے۔"

"دنیا میں پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہے چودھری ولاور!" میں نے کہا۔ "ہر عورت کو ایک مرد کی محبت اور بچے کو باپ کی شفقت ... بازار میں نہیں ملتی۔ ان کا یہ احساس محرومی تمھاری دولت سے ختم نہیں ہو گا۔"

"یہ احساس محرومی تو تمھارا اقتدار بھی رہا ہے۔" وہ بولا۔ "اس کے باوجود ... اور اب تمھاری جدوجہد صرف دولت کے لیے ... تمھیں کچھ بھی نہیں ملے گا ... وراثت ... کی محبت اور نہ زندگی کی مہلت۔"

"ان دھمکیوں کا اب کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا۔ ... اب ... ایک قانونی وصیت ... تمھیں ... تھا اور ... معلوم ہو جانا کہ میری زندگی کا مقصد بالکل مختلف ہے ... ساتھی مجھے قتل کر دیں گے ... اس قتل سے ان کے عزائم بھی پورے نہیں ہوں گے ... ایک وصیت نامے کی رو سے اپنے وارث کو نامزد ... اور آپ کے بعد ... وارث کی جگہ لینے والوں ... ہے اور وہ سب ... بحث میں ... سب کر

معلوم ہے کہ میر خرافت علی نے وزیر خان کو بینک میں کیا ... کر تم نے اسے ... مروا دیا اور ... کھلانے والے ایک غریب ... کی جان لی۔ مجھے نواب خسرو جنگ کے بیٹے خسرو ... کی سازش کا علم بھی ہو چکا ہے جو لندن میں رہتا ہے اور تمھارے ساتھ ایک ایمان دار افسر انیس نعیم بھی ہے جسے بینک کی نوکری سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا۔"

"تمھیں یہ سب باتیں کس نمک حرام نے بتائی ہیں؟" ولاور نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"یہ معلوم کر کے کیا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "یہ دیکھو کتنے کم وقت میں گردش حالات تمھیں کہاں سے کہاں لے آئی ہے۔ تمھارا کوئی راز راز نہیں رہا ہے اور اب مقابلہ برابر کا ہے۔ اس وقت کا انتظار کرو جب تم جیسے شکاری مجھے گھیر کے پاکستان لائے تھے تاکہ مجھے پھر سے دلدل میں پھنس جانے والے چوہے کی طرح سکیں۔ تم نے مجھے فوراً بھی چاہا کہ میں کچھ جانے بغیر سے ... میدان چھوڑ جاؤں۔ آج تم چوہے کی طرح پھنسے ہو تمھارے بعد دوسروں کو بھی بہت جلد اندازہ ہو جائے گا کہ میں بھی ان سے کم شکاری نہیں ہوں۔"

"ہم اس وقت ... برابری کی بنیاد پر بات کر سکتے ہیں۔" ولاور نے کہا۔

"میں اور تم کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔" میں نے کہا۔ "بالکل اسی طرح جیسے قاتل اور مقتول برابر نہیں ہو سکتے۔ قانون کی نظر میں ... دنیا کی نظر میں ... بات کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔ جو کچھ تمھیں کرنا تھا تم کر چکے ہو۔ اب فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم میرے سوالات کا جواب دے دیتے تو شاید میں آج تمھاری جان بخشی کر دیتا۔ لیکن اب میں جا رہا ہوں۔ بقیہ چالیس منٹ میں اس مہلت کا استعمال تم جیسے چاہو کرو۔ چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ آخری وقت میں خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو تو اچھا ہے۔" میں نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ کیسٹ بھی ختم ہو چکا تھا۔ ہم نے بڑی عجلت میں اپنا سامان اٹھایا اور باہر نکل آئے۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ میں نے ڈی سلوا کو گاڑی کی ڈگی سے نکالا اور محسن نے جلدی جلدی ایک کپڑے سے ڈی سلوا کی گاڑی کے ان تمام حصوں کو صاف کر دیا جہاں ہماری انگلیوں کے نشانات ملنے کے امکانات ہو سکتے تھے۔ پھر محسن نے اپنا سامان بغل میں دبایا اور ... ہو گیا۔ میں نے بے ہوش ڈی سلوا کو ڈگی میں سے نکال کر ... ڈالا اور محسن کے پیچھے چل پڑا۔ اس علاقے میں ٹیکسی ملنا دشوار تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے پیچھے سے آنے والی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھیں

www.paksociety.com

اس سڑک کے درمیان میں تھے کہ ڈرائیور نے زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔ یہ ایک چھوٹا سا ٹرک تھا۔

"کیا بات ہے؟" ٹرک ڈرائیور نے مجبوراً ٹرک کے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"یہ ہمارا پڑوسی ہے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ بڑی مہربانی ہوگی اگر ہمیں آبادی تک لے چلو۔ جہاں ٹیکسی مل جائے۔"

ڈرائیور کی صورت کا تاثر فوراً بدل گیا اور اس نے ہمیں پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اور محسن نے ڈی سلوا کو ٹرک میں لادا اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ ٹرک اتنا پرانا تھا کہ اس کا پورا ڈھانچہ چلتے ہوئے فریاد کرتا تھا اور انجن جھٹکے لیتا تھا مگر اس وقت ٹرک کا پرانا ہونا ہمارے لیے مفید ثابت ہوا۔ ڈی سلوا کو اچانک ہوش آ گیا تھا۔ میں نے ایک غلطی یہ کی تھی کہ اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا تھا۔ وہ ایک بار کراہا اور دوسری بار چلایا لیکن اس کی آواز ٹرک ڈرائیور نے نہیں سنی۔ میں نے فوراً اس کی کنپٹی پر کان کے پیچھے ہلکا سا ہاتھ مارا اور اس کی آواز بند ہو گئی۔ ٹرک ضلع کچہری کے پاس رک گیا جہاں ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ہم نے ٹرک ڈرائیور کا شکریہ ادا کر کے ڈی سلوا کو ٹیکسی میں ڈال لیا۔ ٹیکسی والا پہلے تو گلوب سینما جانے کو تیار ہی نہ تھا مگر ہم نے کہا کہ بھائی صاحب کا شوق ہے کہ ایک بار گھر پہنچنا ہے۔ ہم زیادہ پیسے دے دیں گے تو ٹیکسی والا رضامند ہو گیا۔ اس وقت آٹھ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ سڑک خالی ہونے کا فائدہ یہ ہوا کہ ٹیکسی والے نے بیس منٹ بعد ہی گلوب سینما کے پاس ڈی سلوا کے گھر کے دروازے پر اتار دیا اور اصل کرایہ سے دس روپے زیادہ لے کر رخصت ہو گیا۔ ٹیکسی کے جاتے ہی ہم نے ڈی سلوا کو گیٹ کے اندر کیا اور دوبارہ گیٹ بند کیا۔ اب شریر بچوں کی طرح کال بیل کا بٹن دبا کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہمیں معلوم تھا کہ اب نوکر اپنے آقا کو گیٹ سے اٹھا کے بیڈ روم میں لے جائیں گے۔ گلوب سینما کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم ان لوگوں میں شامل ہو گئے جو فلم کا آخری شو دیکھ کر نکلے تھے۔ ایک شخص نے دو ٹکٹوں کے آدھے آدھے حصے پھینکے جو میں نے فوراً اٹھا لیے۔ گھر پہنچنے کے بعد بہت ہوشیاری سے میں نے فلم کا ذکر کیا اور دونوں کو ٹکٹ کے ٹکڑے بطور یادگاری دکھا دیے۔ آج کی رات ہمیں اپنے گھر میں گزارنی تھی چنانچہ میں اور محسن اپنا سامان اٹھانے کے لیے سرونٹ کوارٹر میں پہنچے تو وہاں ایک شخص ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا۔

"تمہاری صورت مجھے کچھ دیکھی ہوئی لگتی ہے۔" میں نے اس اجنبی کو غور سے دیکھ کر کہا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ خوف، گھبراہٹ اور پریشانی کا شکار ہے اور اسے بات کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے ہیں یا اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وضاحت کر سکے۔ وہ چالیس پینتالیس سال کا صحت مند آدمی تھا۔ حلیے سے غریب نظر آتا تھا۔ اس مختصر سے وقفے میں اپنی یادداشت کی مدد سے میں اس کی صورت سے آشنائی کے اسباب تلاش کر رہا تھا۔ میرے ساتھ محسن بھی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" وہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔ پھر اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "ایک بار آپ سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ آپ نے مجھے مارا تھا۔"

"معذرت۔ مارا ہوگا۔" مجھے تعارف کے اس انداز پر جھنجھلاہٹ آئی۔ "اب یہ بھی بتاؤ کہ ہم نے تمہیں کیوں مارا تھا، کہاں مارا تھا اور کب مارا تھا؟"

"ہم جیسے ہزاروں لوگوں کی پٹائی کر چکے ہیں۔" محسن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اور اتنی بار پیٹ چکے ہیں کہ کچھ یاد نہیں رہتا۔ خیر سب سے پہلے تو تم اپنا نام بتاؤ۔"

اس مظلوم صورت شخص کی پریشانی اور بدحواسی میں اضافہ ہو گیا۔ "نام... نام تو جناب عبداللہ تھا لیکن سب عبدل کہتے ہیں۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "شاید آپ بھول گئے۔ آپ نے مجھے میر شرافت علی کے گھر میں مارا تھا کیونکہ میں نے ان کی جان بچانے کے لیے کوشش کی تھی۔ میں ان کا نوکر تھا۔"

میری ساری خوش مزاجی کافور ہو گئی اور میں پلک جھپکائے بغیر اس شخص کو دیکھتا رہا جس نے شرافت علی کے دوسرے ملازم رشید کے ساتھ مل کر میرے خلاف گواہی دی تھی اور پولیس کے سامنے مجھے قاتل کی حیثیت سے شناخت کیا تھا۔ اس کی گواہی پر پولیس نے مجھے عین اس وقت گرفتار کیا تھا جب میں لاہور سے پنڈی جانے والی ریل کار میں بیٹھ چکا تھا اور ریل کار روانہ ہونے ہی والی تھی۔

"اب یہاں کیا لینے آئے ہو؟" میں نے سنجیدہ ہو کر سخت لہجے میں کہا۔ "اس روز تم شوفر کی وردی میں تھے اس لیے آج میں تمہیں فوراً نہ پہچان سکا۔ کیا کوئی کسر باقی رہ گئی تھی جو...؟"

"مجھے معاف کر دو جناب!" وہ خوف زدہ ہو کے بولا۔ "میری آپ سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"اس سے زیادہ دشمنی تم کیا کر سکتے تھے؟" میں نے بلاوجہ ہو کے کہا۔ "تم نے مجھ پر قتل کا جھوٹا الزام عائد کر دیا۔"

"نہیں جناب! میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ قتل آپ نے کیا ہے۔ آپ میرا بیان دیکھ کر تصدیق کر سکتے ہیں۔ جو کچھ میں نے کہا تھا وہی تھا جو میں نے دیکھا تھا۔ میں نے آپ کو شرافت علی کے کمرے میں جاتے اور بیڈ روم کا سامان بکھرتے دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ آپ شرافت علی کو مار رہے ہیں اور میں نے شور مچا کر وہاں پہنچا تھا تو آپ نے مجھے بھی لہولہان کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ میں نے کچھ نہیں کہا تھا اور یہ سب سچ تھا۔ میں شرافت علی کا ملازم تھا۔ ان کا نمک کھاتا تھا۔ مجھ پر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں ان کی مدد نہ کرتا یا جانتے بوجھتے سچ نہ بولتا۔ قسم ہے پروردگار کی! میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ نے قتل بھی کیا ہے یا میں نے آپ کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ بات رشید نے کہی تھی لیکن میں نے نہیں۔ میرے بیان کا ایک ایک لفظ پولیس کے ریکارڈ پر ہے اور آپ چاہیں تو تصدیق بھی کر سکتے ہیں۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ میں اور محسن بھی خاموش بیٹھے اس شخص کی صورت دیکھتے رہے۔ وہ صورت سے اتنا مسکین اور بے حد ستم رسیدہ نظر آتا تھا کہ اس پر غصہ اتارنا بے سود تھا۔ اس کی بات کو غلط یا جھوٹ قرار دینا بھی مشکل نظر آتا تھا لیکن سوچے سمجھے بغیر اس پر اعتبار کر لینا بھی مشکل تھا۔ اس کا آنا دشمن کی نئی چال بھی ہو سکتی تھی۔ ہمیں ہلاک کرنے کے لیے بال بال بچے تھے اور شکاری جان چکے تھے کہ ان کی طاقت ہمیں تسخیر نہیں کر سکتی۔ ان کی دولت ہمیں خرید نہیں سکتی اور موت کا خوف ہمارے جارحانہ عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ وہ تمام اخلاقی اور غیر اخلاقی، جائز اور ناجائز حربے آزما چکے تھے لیکن اب تک انہیں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی اور ہمارے بارے میں ان کے ابتدائی اندازے بالکل غلط ہو چکے تھے۔ اب یہ جنگ پورے عروج پر تھی۔ نقصان ہمارا ہوا تھا تو دشمن کا اس سے زیادہ ہوا تھا۔ مشکلات اگر ہمارے لیے پیدا ہوئی تھیں تو ہماری پیدا کردہ مشکلات نے دشمنوں کو بھی پریشان کر دیا تھا اور ہمیں آسان شکار سمجھنے والے یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ہم بھی ان کی ٹکر کے شکاری ہیں بلکہ ان سے بہتر شکاری ہیں۔ ہمارے وسائل بہت محدود تھے اور ان کے پاس سب کچھ تھا چنانچہ ہمارے لیے ان کے لشکر کا مقابلہ کرنا ایک قدرتی بات تھی۔ کیا دشمن اب ہمیں تنگ کرنے کے بہانے یا اپنی کمزوری کا اعتراف کر کے عیاری اور مکاری سے ہماری پیٹھ میں خنجر گھونپنا چاہتا ہے؟ میں نے سوچا۔

"میاں عبدل!" بالآخر میں نے اس سکوت کو ختم کیا۔ "اگر میں تمہاری بات مان لوں تب بھی میرے سوال کا جواب باقی رہتا ہے کہ تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"وہ... بات یہ ہے جی...!" عبدل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہنا شروع کیا۔ "کہ میری ماں نے آپ کو بلایا ہے۔"

میں نے اور محسن نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ محسن کے چونکنے سے مجھے یقین آیا کہ میرے کانوں نے غلط نہیں سنا۔

"تمہاری ماں نے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "تمہاری ماں کا مجھ سے کیا تعلق؟ وہ مجھے جانتی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم جناب!" عبدل نے کہا۔ "وہ مجھے کچھ نہیں بتاتی۔"

"کیا تم نے اسے کچھ بتایا تھا؟" میں نے کہا۔ "میرے بارے میں یا میر شرافت علی کے قتل کے بارے میں؟ کیا وہ اس کیس میں تمہارے اور میرے کردار کے بارے میں کچھ جانتی ہے؟"

"میں بڑی مشکل میں ہوں جناب!" عبدل بولا۔ "ادھر آپ میری بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ادھر میری ماں مجھے کچھ بتانے کو تیار نہیں۔ اس کی حالت ایسی ہے کہ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے مجبوراً آنا پڑا۔"

"حالت سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے نرمی سے کہا کیونکہ وہ اب رو پڑنے کے قریب تھا۔

"وہ بہت بوڑھی ہے جناب!" عبدل نے کہا۔ "اتنی بوڑھی کہ اسے اپنی عمر بھی یاد نہیں لیکن اسے اور بہت کچھ یاد ہے۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے کی باتیں بھی وہ بھولی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے وہ ستر اسی برس کی تو ضرور ہوگی۔ یوں سمجھ لیں کہ اس نے میر شرافت علی کو اپنی گود میں کھلایا تھا۔ اب اسے دکھائی نہیں دیتا۔ وہ بہت اونچا سنتی ہے اور سہارے کے بغیر بستر سے اٹھ کے ایک قدم نہیں چل سکتی۔ میں نے اسے میر شرافت علی کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے لیکن اس نے رشید سے پوچھا کہ شرافت کیوں نہیں آتا تو رشید نے بتا دیا۔ جب تک میر شرافت علی زندہ تھا وہ دن میں ایک بار اس کے کمرے میں خیریت معلوم کرنے ضرور جاتا تھا۔ تین دن بعد اس نے رشید سے پوچھا کہ شرافت کہاں ہے۔ کہیں دورے پر ولایت چلا گیا ہے کیا؟ اور رشید بے وقوف نے کہہ دیا کہ ماں جی وہ تو ایسے لمبے دورے پر گیا ہے کہ اب واپس نہیں آئے گا۔ بس اس کی مغفرت کی دعا کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ رشید نے قتل کی بات نہیں کی اور کہہ دیا کہ

www.paksociety.com

وہ بیمار ہوا تھا اسپتال جا کے مر گیا۔ میری ماں بہت روئی پیٹی اور بعد میں مجھ پر بھی بہت خفا ہوئی کہ میں نے اسے بے خبر کیوں رکھا۔ ایک روز اچانک اس نے کہا کہ عبدل! تجھے وزیر خان کا پتہ معلوم ہے؟ میں تو اچھل پڑا۔ میں نے کہا کون وزیر خان؟ اس نے کہا وہی جو شرافت کا دوست تھا وہ دونوں مل کر کاروبار کرتے تھے نا۔ اس وقت اگر میں اپنی ماں سے کہتا کہ وزیر خان بھی مر چکا ہے یا اسے دوسری باتیں بتا دیتا تو معلوم نہیں کیا ہوتا۔ شاید وہ اسی وقت مر جاتی۔ چنانچہ میں نے بات ٹال دی کہ مجھے نہیں معلوم لیکن وہ اس بات کو بھولی نہیں۔ جب بھی اسے یاد آتا تھا تو وہ پوچھتی تھی کہ وزیر خان کا پتہ معلوم کیا تو نے؟ اس کا ایک لڑکا بھی ہے کبیر خان جو ولایت میں پڑھتا ہے۔ اس کا اصرار بڑھتا گیا۔ اب کچھ روز سے وہ بیمار ہے کھانا پینا بالکل چھوٹ گیا ہے۔ وہ خود بھی کہتی ہے اور مجھے بھی ایسا نظر آتا ہے کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں کل اس نے کہا کہ عبدل تو مجھے... اندھی بوڑھی اور معذور عورت کو... اپنی ماں کو دھوکا دے رہا ہے؟ وزیر خان ایسا آدمی تو نہیں جس کا پتہ نہ ملے۔ میں تجھے مرتے وقت دودھ معاف نہیں کروں گی عبدل! مجھ پر وزیر خان کا ایک قرض ہے۔ تو چاہتا ہے کہ وہ قرض میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں اور قیامت کے روز وزیر خان کو منہ دکھا سکوں؟ اس کے بعد میں کیا کرتا۔ اگر میں آپ کے پاس نہ آتا تو پاگل ہو جاتا۔ آپ میرے ساتھ چلیں اور جیسے چاہیں اسے سمجھا دیں اور اس کی سن لیں۔"

میں اور محسن ہکا بکا بیٹھے تھے جیسے کہنے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ ایک بوڑھی عورت جس کے پاس زندگی کی آخری چند سانسوں کے سوا کچھ نہ رہا تھا، جو وزیر خان کو جانتی تھی، یہ بھی جانتی تھی کہ سکندر بخت کا اصل نام کبیر خان تھا، وہ مرنے سے پہلے کون سا قرض اتارنا چاہتی تھی؟ میرے والد نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن انہوں نے تو مجھے بہت سی باتوں سے بے خبر رکھا تھا۔ انہوں نے زندگی بھر مجھے انگلی پکڑ کے چلایا۔ میرے راستے کی سمت کا تعین کیا اور میری نظر صرف منزل پر رہی۔ میرے گرد و پیش کے حالات میری نگاہ سے اوجھل رہے۔ میں اس مسافر کی طرح چلا گیا جو رات کے گھپ اندھیرے میں صرف ستارے کی تلاش میں سرگرداں ہو مگر وہ ستارہ طلوع ہونے سے پہلے ہی غروب ہو گیا تھا اور اب میرے ہر طرف ایک گھپ اندھیرا تھا جس میں مجھے راستہ دکھانے والا کوئی نہ تھا۔ ہر قدم پر کوئی خوفناک حقیقت اندھے غار کی طرح منہ پھاڑے میری منتظر تھی۔ مرحوم کی طرح یہ عورت بھی وہ چراغ ثابت ہو سکتی تھی جو مجھے بے رحم حقائق کے اس تاریک جنگل سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھا سکے۔ اس سے پہلے کہ یہ چراغ بھی بجھ جائے یا بجھا دیا جائے مجھے اس بوڑھی عورت سے مل لینا چاہیے۔ محسن سے ملنے میں دیر کرنے کا انجام میرے ذہن میں تھا۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بات یاد رکھنا اگر اس میں دھوکا ہوا تو نقصان میں تم رہو گے۔"

"تیرے ساتھ میں بھی چلوں گا۔" محسن بولا۔ "لیکن اندر کا باہر رک کر تیرا انتظار کروں گا اور مجھے خطرے کا احساس ہوا تو میں انکل رضوی کو فون پر بتا دوں گا کہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے والا کون تھا اور کہاں لے گیا تھا۔"

"ہم انکل رضوی کو جانے سے پہلے بھی تو بتا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آج کل ان کو ہماری نقل و حرکت کے بارے میں تشویش لاحق رہتی ہے۔ بتا کر جانے سے ان کو بھی تسلی ہو جائے گی اور وہ ہماری حفاظت کے خیال سے بھی غافل نہیں رہیں گے۔"

ہم عبدل کو رضوی صاحب کے پاس لے گئے۔ انہوں نے پوری بات غور سے سنی اور عبدل سے خالص پولیس افسروں کے لہجے میں بہت سے سوالات بھی کیے۔ عبدل ان کے سامنے بھی بھیگی بلی بنا کھڑا رہا۔

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے مطمئن ہو کے کہا۔ "تم لوگ جاؤ۔ میں پولیس اسٹیشن فون کر دیتا ہوں۔ تمہارے پہنچنے تک میر شرافت علی کی کوٹھی کے آس پاس سادہ کپڑوں والے پولیس مین پہنچ چکے ہوں گے۔"

عبدل کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے رضوی صاحب کے سوالات کا جواب کسی گھبراہٹ کے بغیر دیا تھا اور وہ حفاظتی اقدامات سے بھی پریشان نہیں تھا جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اس نے کوئی غلط بات نہیں کی ہے۔ ہمارا ارادہ ٹیکسی میں جانے کا تھا لیکن رابعہ نے اصرار کیا کہ ہم اس کی لوکس لے کر جائیں۔ "ہر جگہ ٹیکسی کا ملنا یقینی نہیں ہوتا۔" وہ بولی۔

"تمہاری اس گاڑی میں بیٹھنے کے بعد زندگی پر یقین آدھا رہ جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مسافر منزل پر پہنچے گا یا آخری منزل پر۔"

"یاد کرو اس گاڑی نے کہاں کہاں اور کیسے آڑے وقت

میں ہمارا ساتھ دیا تھا۔" رابعہ برا مان کے بولی۔ "مگر تم مرد ذات کے اعتبار سے سب ایک جیسے ہوتے ہو۔ صورت پر جاتے ہو۔ وفاداری اور خدمت گزاری کی قدر نہیں کرتے، خواہ وہ بیوی ہو یا گاڑی۔" محسن نے خواہ مخواہ رابعہ کی تائید کی۔ "جا آ تو ظاہری حسن کو دوام نہیں اور گاڑی ہو یا بیوی وقت کے ہاتھوں یا حادثات کے باعث بگڑ جانا دونوں کا مقدر ہے۔"

"اب دیکھو نا محسن بھائی۔" رابعہ شکایت کرتے ہوئے بولی۔ "اس کا حلیہ بگاڑنے والے یہ خود ہیں۔ ویسے میں یہ گاڑی کسی سے کم نہیں ہے تھوڑا سا ڈینٹ پینٹ ہو گا تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

"تھوڑا سا جی بی بی! اس پر گاڑی کی قیمت سے زیادہ رقم خرچ ہو گا۔" میں نے کہا۔ "بس اب اسے ریٹائر کرو۔ بہت خدمت کر چکی تمہاری۔ اور دوسری نئی گاڑی لے لو کوئی نئی الٹرا خوبصورت سی۔"

"سنا تم نے۔" محسن شرارت سے بولا۔ "کل کو ایسی ہی بات یہ اپنی بیوی کے بارے میں بھی کہے گا۔ ابھی وقت ہے سوچ لینا۔"

رابعہ سمجھ گئی کہ محسن بالکل سنجیدہ نہیں ہے اور اس کی تائید کا مقصد شرارت کے سوا کچھ نہیں۔ وہ سخت برا مان کے اندر چلی گئی تو ہم گاڑی لے کر روانہ ہو گئے۔

"یار محسن!" میں نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا۔ "نیا ماڈل تو پرانا سوفٹ۔ یہ گاڑی واقعی خوب ہے۔"

"صحیح فرمایا آپ نے۔" محسن نے اسی غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اس کے علاوہ ہر چیز کی ایک جذباتی قیمت ہوتی ہے جس کا مارکیٹ ویلیو سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ خیال کے طور پر سمجھ لو اگر مجنوں اس فضول سے کتے کو بیچنا چاہتا تو کوئی کوڑیوں کے مول بھی نہ دیتا مگر مجنوں کے لیے اس کی جذباتی قیمت کیا تھی۔" میں زور زور سے ہنسا۔ "رابعہ نے سخت ناشتہ کیا ہو گا۔"

"مگر ابھی بہت سخت ماتم کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "رابعہ ٹھیک کہتی ہے۔ ہم اس کو نہیں چھوڑ سکتے اگر اس کا رزلٹ ٹھیک نہ ہوا اور ہمیں اس پر نئی مرسڈیز کی قیمت سے زیادہ مرمت کے اخراجات برداشت کرنے پڑیں تب بھی کوئی بات نہیں۔"

عبدل کے لیے ہماری گفتگو بالکل بے معنی تھی اور وہ پچھلی سیٹ پر کھویا ہوا چپ چاپ بیٹھا تھا۔ گاڑی جانے پیچیدہ راستوں سے گزرتی ہوئی ایسٹ روڈ پہنچی اور میر شرافت علی کی کوٹھی "برین بسیرا" کے سامنے ٹھہر گئی۔ پوری عمارت پر اندھیرے کی حکمرانی تھی۔ گیٹ بند تھا اور اس کے اوپر لگی ہوئی لائٹس بھی بجھی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے میرا ذہن گزرے ہوئے وقت کی یادوں میں کھو گیا۔ یہیں سے میرے تمام مصائب کا آغاز ہوا تھا۔ اگر میں نے اس روز محسن کی بات مان لی ہوتی تو شاید میں میر شرافت علی کو قتل کرنے کے جھوٹے الزام میں ملوث نہ ہوتا۔ جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر میں نے احتیاط کے تقاضوں کو بھی فراموش کر دیا تھا اور تب میں عقل سے کام لیتا تو میر شرافت علی کو کہیں زیادہ نقصان پہنچا سکتا تھا لیکن اپنے خلاف کسی کو چشم دید گواہ نہ بناتا۔ میں اور محسن اسے اٹھا کر لے جا سکتے تھے اور اس سے وہ بات بھی معلوم کر سکتے تھے جو میر شرافت علی نے آخری وقت تک نہیں بتائی تھی۔ شاید اس طرح ہم اسے قتل ہونے سے بھی بچا لیتے مگر اب اس پچھتاوے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے اس جگہ کو بھی دیکھا جہاں سے میں ٹیلی فون کے تار کاٹ کر اندر کودا تھا اور اس جگہ کو بھی جہاں پیدو خواب نظر آنے والی ٹیکسی میں سر ڈالے کھڑا تھا۔ اس نے میرے نکلتے ہی حالات سے فائدہ اٹھا کر میر شرافت علی کو قتل کر دیا تھا مگر اتفاقی شہادت نے مجھے ملزم بنا دیا تھا۔

"اس کوٹھی کے دوسرے ملازم کہاں گئے؟" میں نے عبدل سے پوچھا۔ "شیدے کے علاوہ ایک چوکیدار بھی تھا۔"

"چوکیدار تو دوسری جگہ چلا گیا ہے۔" عبدل بولا۔ "شیدے کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔ یہ سرونٹ کوارٹر شیدے سے ہمارے پاس تھا اس لیے ہم ابھی تک یہیں ہیں۔"

اس نے بڑے گیٹ کے بیچ میں سے دوسرا چھوٹا کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر جانے سے پہلے میں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی مگر مجھے پولیس جیسا کوئی شخص نظر نہ آیا۔ شاید رضوی صاحب نے بھی عبدل کو ڈرانے کے لیے صرف دھمکی دی تھی۔ میری طرح ان کو بھی عبدل کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ محسن گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ میں عبدل کے ساتھ کوٹھی کے عقبی حصے میں گیا۔

دوسری بار آنے میں نے گزرے ہوئے وقت کے ہر لمحے کو چشم تصور سے پھر زندہ دیکھا اور اس کی اذیت کو محسوس کیا۔ ویران اور تاریک کوٹھی کے اندر میر شرافت علی کا بیڈ روم تھا جہاں میں اچانک نمودار ہو گیا تھا۔ وہ منظر میرے ذہن میں نقش تھا جب میر شرافت علی نے حیرانی اور پریشانی

www.paksociety.com

سے مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھا۔ میرے ذہن میں ایک اور تصویر اُس ڈرائنگ روم کی تھی جس میں لاکھوں کی مالیت کے نوادرات تھے۔ میں نے ان سب کو تباہ کر دیا تھا اور۔۔۔ برخوردار علی ملبے کے ڈھیر میں میرے سامنے زاروقطار رو رہا تھا اور مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ کل کی بات ہو۔ تمام تفصیلات میری نظر کے سامنے تھیں اور عبدل کے پیچھے چلتے ہوئے میں وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو میری آنکھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

سرونٹ کوارٹر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ اس کی ظاہری حالت اور سازوسامان کی کیفیت ویسی ہی تھی جیسی کسی معمولی نوکر کے گھر کی ہونی چاہیے۔ ایک کمرہ تقریباً خالی تھا جبکہ دوسرے میں صرف ایک بستر بچھا ہوا تھا اور چالیس واٹ کا بلب روشن تھا۔ دوسرے کمرے میں اندھیرا تھا مگر عبدل نے لائٹ جلائی تو میلی دیواروں پہ پھیل جانے والی مدھم پیلی روشنی میں مجھے ایک چارپائی پہ عبدل کی ماں نظر آئی۔ اس نے ماں کی حالت بیان کرتے ہوئے مبالغے سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ پڑا تھا جس پہ خشک جھریوں بھری سیاہ کھال منڈھی تھی۔ کمرے میں ٹین کے بنے ہوئے دو پرانے ٹرنک بھی اوپر نیچے رکھے ہوئے تھے۔ لکڑی کے ایک پرانے بے ڈھنگے اسٹول پہ زیرِ استعمال دوائیں جمع تھیں۔ لائٹ جلتے ہی ہڈیوں کے ڈھانچے میں حرکت ہوئی۔

"عبدل آ گیا؟" بوڑھی عورت نے آہستہ سے کہا۔ "کہاں گیا تھا تو؟ میں کب سے تیرا انتظار کر رہی ہوں۔"

"ماں!" عبدل اس پہ جھک کر بولا۔ "میں وزیر خان کے لڑکے سکندر کو لایا ہوں۔"

بڑھیا نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ "کون سکندر؟ وزیر خان کے بیٹے کا نام تو کبیر خان تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔"

میں نے عبدل کو اشارہ کیا کہ وہ ہٹ جائے اور پھر سرہانے کی طرف بیٹھ گیا۔ "ہاں جی!" میں نے کہا۔ "کبیر خان میرا ہی نام تھا۔ پاکستان آنے کے بعد میں نے نام بدل لیا تھا۔"

"کیوں؟" وہ مشکوک لہجے میں بولی۔ "نام بھی کوئی پاؤں کی جوتی ہے کہ جب کوئی چاہے بدل لے؟"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تو ایک زمانے میں کبیر ہی تھا۔ اس میں بھی رہا ہوں جب میرے گھر کے سب افراد کو ہلاک کر دیا گیا تھا اور میں ہندوستان میں اکیلا رہ گیا تھا۔"

"میری بات سنے سے پہلے ہی قائل کیا؟ تیرا باپ وزیر خان کہاں ہے؟ وہ تیرے ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

"ابا جی بیمار تھے۔" میں نے پورے اعتماد سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "ان کو میں نے علاج کے لیے ولایت بھیج دیا ہے۔"

"کبیر خان!" وہ کچھ دیر بعد بولی۔ "تو نے اچھا کیا جو آ گیا۔ اگر تو بھی نہ آتا تو میرے لیے مرنا مشکل ہو جاتا۔ خدا انصاف کرے، عبدل کے باپ نے یہ قصہ تو کسی پہ ظاہر کرنے کا کام تو اس کا تھا مگر اس نے کہا تھا کہ عبدل کی ماں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ معلوم نہیں اس نے یہ بات کیوں کہی تھی۔ کیا یہ بات میں نہیں جانتی تھی جو معلوم ہے کہ تمہارا ساتھ رہا ہو۔ ایک بار اس نے حساب لگا کے مجھے بتایا تھا، اس لیے مجھے یاد ہے۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ ہمارے بیٹے اور بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کے ہو گئے۔ اب ان کے بچوں کے بھی بچے ہیں۔ یہ عبدل سب سے چھوٹا تھا۔ اس کے باپ نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی لیکن اپنی عمر کے آخری دنوں کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ عبدل کی ماں! ایک بات ایسی بھی ہے جو میں نے تجھے نہیں بتائی تھی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے اعتبار نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ میں اس راز کو راز رکھنے کا پابند تھا۔ ہر شخص قیامت کے دن اپنی نیکی بدی کا حساب خود دے گا۔ خدا دلوں کے بھید بھی جانتا ہے اور اس سے کچھ چھپانا ناممکن ہے مگر جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں یہ بات اب تجھے بتانے پہ مجبور ہوں کہ خدا نخواستہ مجھے کچھ ہو جائے تو یہ بات وزیر خان یا اس کے بیٹے کو بتا دینا۔" وہ بولتے بولتے تھک کر ہانپنے لگی تھی۔ عبدل نے اسے پانی میں گلوکوز ملا کر دیا اور کوئی گولی کھلانے کو دی۔ "اس نے کہا کہ اب میری زندگی کے دن گنتی کے رہ گئے ہیں کہ میں کسی سے کہہ دوں۔" وہ پانچ منٹ بعد پھر بولنے لگی۔ "اب تک میں ڈرتا تھا لیکن اب اس سے زیادہ برداشت کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ وہ مجھے ملے چاہیں تو مار دیں۔ میں نے کہا کہ وہ کون ہیں؟ وہ بولا کہ تو نہیں جانتی انہیں۔ بس تو دھیان سے میری بات سن لے۔ اس کے بعد بھی وزیر خان یا اس کے بیٹے کو حقیقت معلوم ہو جائے۔ افسوس یہ ہے کہ ابھی تک میں خود ان سے یہ بات نہیں کہہ سکا۔ مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا اور جب موقع ملا تو انہوں نے میری بات نہیں سنی یا پھر میرا اعتبار نہیں کیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وزیر خان کہیں چلا گیا ہے اور اس کا بیٹا ولایت میں ہے۔ میں نے دو مرتبہ ولایت میں اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر ملاقات نہیں ہو سکی۔"

"عبدل کے باپ سے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "اس نے مجھ سے دو بار بات کی تھی جو ولایت میں۔۔۔"

"ہاں۔ اس نے مجھے بھی بتایا تھا۔" بڑھیا بولی۔ "جب وہ ولایت سے واپس آیا تو بہت مایوس تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ عبدل کی ماں! ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ کوئی کسی پہ اعتبار ہی نہیں کرتا۔ میں نے کبیر خان سے دو مرتبہ ٹیلی فون پہ بات کی اور ایک بار اسے ملاقات کے لیے بلایا تاکہ اسے ساری بات بتا دوں۔۔۔ مگر وہ نہیں پہنچا۔ وزیر خان نے اسے ولایت بھیج کے بڑی غلطی کی ہے۔ معلوم نہیں وہ کن چکروں میں پڑا ہوا ہے کہ باپ کی خبر ہی نہیں لیتا۔ اللہ ایسی اولاد دینے سے تو اچھا ہے۔۔۔ وزیر خان کا بھرا گھر اجڑ گیا۔ یہ ایک لڑکا بچا تھا۔۔۔"

بڑھیا بولتی جا رہی تھی۔ میرے کان اس کی آواز سن رہے تھے اور ہر لفظ میرے سامنے واقعات کی ایک تصویر پیش کر رہا تھا۔ گزرے ہوئے وقت کی ہر بار ایک تصویر ان سے ابھرتی تھی اور مٹ جاتی تھی۔ پرانی آوازیں صدائے بازگشت کی طرح سنائی دیتی تھیں اور ختم ہو جاتی تھیں۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ فون پہ جس نے کہا اور اس کی آواز میرے کانوں نے اسی طرح سنی جیسے لندن میں ٹیلی فون پہ سنی تھی۔ ہاں، میں نے اس سے کہا تھا کہ سوری۔۔۔ مجھے اس وقت بہت بڑا معرکہ درپیش ہے اور اس نے کہا تھا، بیٹا تم مت ہو، میں تمہیں بہت سے خطرات سے خبردار کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن جاننے سے کیا ہوتا ہے اور تم میرے نزدیک نوشتۂ تقدیر کو کون بدل سکتا ہے۔ میں اس بڑھیا کو کیا بتاتا کہ ظفر آ... میں بھی چاہتا تھا مگر گھر کا نمبر غلط ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی سب کچھ غلط ہو گیا تھا۔

"معلوم نہیں وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔" بڑھیا اب بھی بول رہی تھی۔ "ایک دن میں نے پوچھا تو اس نے کہا، عبدل کی ماں! معلوم نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔ مجھے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہو گئی ہیں جو معلوم نہ ہوتیں تو اچھا تھا اور انہیں بھی شک ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کہ کس کی بات کر رہے ہو؟ تو اس نے ایک سرد آہ بھری اور بولا کہ چھوڑو۔۔۔ تمہارا کچھ نہ جاننا ہی اچھا ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے کہ میں وزیر خان کے لیے کچھ نہ کر سکا کیونکہ میں بزدل تھا اور مرنے سے ڈرتا تھا۔ اب میں نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو مجھے معلوم تھا۔ میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح وزیر خان یا اس کے بیٹے سے بات کروں۔ وزیر خان سے بات کرنے کا مجھے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ کبیر خان کو سب معلوم ہونا چاہیے۔ اور وہ کاہن مکھ کے نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا۔ میرا خیال ہے وہ ہی باتیں ہوں گی جو اس نے مجھے بتائی تھیں۔ کئی دن تک وہ پریشان پھرتا رہا۔ وہ بہت خوف زدہ تھا اور مجھے بھی کچھ نہ بتاتا تھا۔ پھر ایک روز وہ ایسا گیا کہ لوٹ کر نہیں آیا۔"

"منشی مرحوم آپ کے شوہر تھے؟" میں نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔

"مرحوم؟" وہ چونکی۔ "وہ مر چکا ہے نا؟ مجھے معلوم تھا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی جاتا تھا تو مجھے بتا کے جاتا تھا اور اگر بتانے کا موقع نہیں ملتا تھا تو کسی کے ہاتھ پیغام بھجوا دیتا تھا لیکن اس مرتبہ۔۔۔" وہ تھک گئی تھی۔ میری بات نے اس سے امید کی آخری کرن بھی چھین لی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ تمام عمر اس کا ساتھ نبھانے والا اب اس دنیا میں نہیں ہے مگر خود فریبی کا یہ طلسم اسے عزیز تھا جو آج ٹوٹ گیا تھا۔ زندہ رہنے کے لیے ہم سب جھوٹے سہاروں کو بھی عزیز رکھتے ہیں، صرف سچ کے زہر پہ کون جی سکتا ہے۔ اب اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ رو رہی ہے اور بے نور آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو چہرے کی جھریوں میں یوں بہے جا رہے تھے جیسے بارش کا پانی خشک مٹی نالوں سے بہتا ہے۔

"جب ایک مدت کا آدھا حصہ ایک دوسرے کے ساتھ بیت جاتا ہے۔" وہ کچھ دیر بعد بولی۔ "تو میاں بیوی ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے دل کی بات کو الفاظ کی مدد کے بغیر بھی سمجھتے ہیں۔ ان کا ذہن ایک ہو جاتا ہے اور وہ خیالات کی زبان میں بھی گفتگو کر لیتے ہیں۔ جب عبدل کے باپ نے کہا کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں تو میں نے مان لیا تھا کہ وہ سچ کہتا ہے۔ اس کو مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اور نہ جانے کیوں میرے اپنے دل میں بھی ہول اٹھ رہے تھے۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اور عبدل کا باپ کسی پہاڑ کی چوٹی پہ کھڑے ہیں اور وہ چوٹی بادلوں میں سے یوں ابھری ہوئی ہے جیسے سمندر میں چٹانیں نکلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ زمین بہت نیچے بادلوں میں چھپی ہوئی تھی اور وہ جگہ جہاں ہم کھڑے تھے مشکل سے چھ فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی تھی۔ بالکل کسی قبر کی طرح—

اور اچانک عبدل کے باپ نے کہا کہ اب تم واپس جاؤ کیونکہ مجھے آگے جانا ہے اور میرا ہاتھ چھوڑ کے اس نے ایک قدم بڑھایا۔ میں حیرانی سے اس کو خلا میں اترتا ہوا دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ بادلوں میں گم ہو گیا۔ میں نے عبدل کے باپ سے اپنے خواب کا تذکرہ نہیں کیا تھا اور کسی خواب کی تعبیر بتلانے والے کے پاس بھی نہیں گئی تھی لیکن خواب کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ چند دن بعد وہ چلا گیا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا لیکن ایک رات میں نے اسے پھر خواب میں دیکھا۔ وہ کوئی عجیب سی جگہ تھی بس ایک کمرہ تھا جس کی چھت گنبد جیسی تھی اس کی خستہ حال دیواروں میں دروازے بھی نہیں تھے۔ میں نے وہ جگہ پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں وہاں کیسے پہنچی۔ میں نے تو صرف یہ دیکھا کہ وہ چراغ جلائے ایک کونے میں لیٹا ہوا ہے اور کچھ پڑھ رہا ہے۔ میں نے کہا کہ کتنی دیر سے میں تمہیں تلاش کرتی پھر رہی ہوں اور تم یہاں چھپے ہوئے ہو۔ اس نے کہا کہ عبدل کی ماں! تجھے یہاں آنے کو کس نے کہا تھا پھر اس نے وہ کاغذات دیے کی لو پر رکھے اور ان کو جل کے راکھ ہوتے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ بولا کہ گھر جاؤ اور مجھے سونے دو کیونکہ میں بہت تھک گیا ہوں۔ اس نے چادر ڈالی اور لمبی تان کر سو گیا۔ میں چلنے لگی تو اس نے چادر سے منہ نکال کر کہا کہ عبدل کی ماں! تمہارے پاس میری ایک امانت ہے۔ اسے سنبھال کر رکھنا اور جس کا حق ہے اسے پہنچا دینا۔ پھر وہ منہ ڈھانپ کے سو گیا اور میں ایک ویران جنگل کی رات میں بھٹکتی پھری لیکن اسی دن مجھے یقین آ گیا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔"

میں چپ تھی۔ روح کا وجود اور ایسی ہی مافوق الفطرت باتوں کو عقل سلیم تسلیم کرے یا نہ کرے، میں نے اپنے کانوں سے جو کچھ سنا تھا ناقابل یقین بھی تھا اور ناقابل تردید بھی۔ جب وہ خواب میں اپنے شوہر سے آخری ملاقات کا ذکر کر رہی تھی تو میری نظروں کے سامنے ایک فلم چل رہی تھی۔ میں نے منشی مرحوم صرف تو ابچو کو عین اسی جگہ دیکھا تھا جہاں اس کی بیوی نے دیکھا تھا۔ باغبان پورے کی طرف جانے والی اور مقبرے کے ساتھ ساتھ چلنے والی سڑک پہ بائیں طرف وہ مقبرہ اب بھی موجود تھا جس کی شکستہ حالی درس عبرت تھی جس کے اوپر گنبد جیسی چھت تھی مگر اس کی چاروں دیواریں بیٹھیں اسی گمنام اور ویران مقبرے میں میری آنکھوں نے منشی کی لاش پڑی دیکھی تھی۔ اس ویرانے میں ایک دیا بھی روشن تھا لیکن وہ خط مجھے نہیں ملا تھا جس کو میرے ہاتھوں تک پہنچانے کی کوشش میں منشی کی جان چلی گئی تھی جو کچھ میں نے لکھا تھا وہ جلتے ہوئے جائے واردات پہ پہنچنے کے بعد دیکھا تھا وہ منشی کی بیوی نے خواب میں دیکھ لیا تھا۔ اس کے خواب اور حقیقت میں سرمو فرق نہیں تھا اور میں اس کی توجیہ کرنے سے قاصر تھا۔ سائنسی ترقی کے اس دور میں بھی جب انسان ایٹم کا دل چیر کر دیکھنے میں کامیاب ہے اور خلا کی تسخیر کر رہا ہے لاتعداد باتیں ایسی ہیں جن کا احاطہ عقل نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین آ چکا تھا کہ عبدل کی ماں نے اپنے شوہر کو اسی رات خواب میں دیکھا ہوگا جس رات وہ ہلاک ہوا۔

"آپ نے کچھ ایسی باتوں کا ذکر کیا تھا جو منشی مرحوم نے پہلے مجھے بتلانے کی کوشش کی تھی اور بعد میں آپ کو بتا دی تھیں۔" میں نے جانتے بوجھتے موضوع بدل دیا۔ "شاید وہ باتیں انہوں نے خط میں تحریر کی تھیں لیکن وہ خط مجھے نہیں مل سکا تھا۔ اس کی کوئی نقل آپ کے پاس بھی ہے؟ آپ نے ابھی گفتگو کے دوران میں کہا تھا کہ منشی مرحوم کا۔۔۔ [illegible] کے لکھتے تھے۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کیا ہے۔" وہ بولی۔ "عبدل کہاں ہے؟"

"عبدل؟" میں نے اس غیر متوقع سوال پہ حیران ہو کے کہا۔ "عبدل یہاں ہی موجود ہے۔"

"عبدل تو باہر چلا جا۔" بڑھیا نے بیٹے کو حکم دیا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہو اماں؟" عبدل نے برہمی سے کہا۔ "کیا تمہیں اپنے بیٹے پہ بھی اعتبار نہیں؟"

"اعتبار کی بات نہیں ہے بیٹا!" وہ عبدل کو سمجھاتے ہوئے بولی۔ "تیرے باپ نے یہی کہا تھا۔ میں اس کا حکم نہیں ٹال سکتی۔ اس نے کہا تھا کہ کبیر خان کو یہ امانت کسی کے سامنے نہیں لوٹانی ہے۔"

میں نے عبدل کی طرف دیکھا تو احساس ذلت سے یا غصے کی وجہ سے اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا اور وہ مجھے اس طرح گھور رہا تھا جیسے اس کی ماں کے عدم اعتماد والے رویے کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے التجا کی کہ وہ عقل سے کام لے کر صورت حال کو سمجھے اور تھوڑی دیر کے لیے وہاں سے چلا جائے۔ سخت اشتعال کے عالم میں اس نے دروازے کا رخ کیا تو مجھے افسوس بھی ہوا اور حیرانی بھی ہوئی کہ ابھی کچھ دیر پہلے رضوی صاحب کے گھر میں وہ عاجزی و انکساری اور مظلومیت کا پیکر بنا ہوا تھا لیکن اب وہ مجسم نفرت و حقارت کا دھواں دیتا

آتش فشاں تھا۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنا بڑا انقلاب اس کی شخصیت میں رونما ہوا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے نکل گیا تو اس کی ماں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر میں نے اسے ایک منٹ خاموش رہنے کے لیے کہا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ چند سیکنڈ تک میں دروازے سے کان لگائے کچھ سننے کی کوشش کرتا رہا پھر میں نے دروازہ ایک جھٹکے سے کھولا اور عبدل میرے قدموں میں آ گرا۔ میں نے اسے کالر سے پکڑ کے اٹھا لیا۔

"تمہیں شرم آنی چاہیے عبدل!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم اپنی ماں کو دھوکا دے رہے ہو۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تم صاف انکار کر دیتے۔"

"اس نے مجھے کمرے سے باہر جانے کا حکم دیا تھا۔" عبدل خود کو چھڑا کے بولا۔ "میں کمرے سے باہر کھڑا ہوں۔"

"ایسی باتوں سے تم اپنے آپ کو دھوکا دے سکتے ہو مجھے نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس دروازے سے اتنی دور چلے جاؤ کہ تمہارے کان کچھ نہ سن سکیں۔ اگر تم نے چھپ کے سننے کی کوشش کی تو میں خود تم کو دور چھوڑ آؤں گا۔ پھر تم ایک گھنٹے تک ادھر کا رخ نہیں کر سکو گے۔ یہ دروازہ کھلا رہے گا۔۔۔ جاؤ۔"

عبدل نے خون آشام نظروں سے مجھے گھورا اور پلٹ کر تیز تیز قدموں سے روانہ ہو گیا۔

"کبیر خان!۔۔۔ عبدل!" بڑھیا چلا رہی تھی۔ "کیا بات ہے تم دونوں چلے گئے ہو کیا؟" وہ اونچا سنتی تھی اس لیے میری اور عبدل کی گفتگو اس کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی اگر عبدل دروازے کے باہر کھڑا رہتا تو یقیناً ہماری سب باتیں سن لیتا کیونکہ مجھے ہر بات بڑھیا کے کان میں بلند آواز سے کہنی پڑتی تھی۔

"میں ذرا دروازے تک گیا تھا اماں جی!" میں نے کہا۔ "اب جو کہنا ہے کہہ دیجیے سننے والا کوئی نہیں ہے۔"

عبدل کی ماں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گلے میں پڑی ہوئی زنجیر کو گردن سے جدا کیا۔ زنجیر کے درمیان ایک لاکٹ تھا جو دیکھنے میں تعویذ نظر آتا تھا۔ اس نے تقریباً سوا انچ لمبی اور ایک انچ سے کم چوڑی ڈبیہ کو انگلیوں کی مدد سے ٹٹول کر کھولا اور میرے سامنے کر دیا۔ ڈبیہ کے ایک حصے میں منشی مرحوم کی جوانی کی تصویر تھی اور دوسرے حصے میں کوئی نقش تھا۔

"یہ تصویر پہچانی تو نے کبیر خان؟" وہ بولی۔ "میری تو آنکھیں بھی نہیں ہیں مگر میں اسے دیکھ سکتی ہوں اور یہ نقش میرے بزرگوں کی نشانی ہے۔ دیکھو اس پہ کیا لکھا ہے اور اس کے پیچھے کیا ہے؟"

"آپ کو تو معلوم ہوگا۔۔۔" میں نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد کاغذ کا وہ پرانا میلا سا ٹکڑا اٹھا لیا جس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ اس کے نیچے ایک چھوٹی سی چابی تھی۔ میں نے وہ چابی بھی اٹھالی اور چار مرتبہ تہ کیے ہوئے کاغذ کو احتیاط سے کھولا۔ کاغذ اتنا پرانا تھا کہ مجھے ہر تہ پر سے اس کے پھٹنے کا اندیشہ تھا۔ کاغذ پر صرف سات سو چھیاسی کے اعداد لکھے ہوئے تھے۔

"اس پہ تو صرف بسم اللہ کے اعداد لکھے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور یہ چھوٹی سی چابی ہے۔"

"ہاں۔" بڑھیا نے کہا۔ "ان مبارک اعداد سے سارے بند دروازے کھل جاتے ہیں اور ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔" اس نے مجھے ایک اور چابی تھمائی جو عام قسم کے قفل کی چابی تھی اور اس نے تکیے کے نیچے سے برآمد کی تھی۔ "اس کمرے میں دو ٹرنک رکھے ہیں۔ یہ نیچے والے ٹرنک کی چابی ہے۔ اس میں میری شادی کے تمام زیور اور بھاری جوڑے رکھے ہوئے ہیں۔ کئی سال سے اس کو کھولنے کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن جانے سے پہلے عبدل کے باپ نے کپڑوں کے نیچے ایک چھوٹا سا بکس رکھوا دیا تھا اور مجھے بتا دیا تھا۔ اس بکس میں دو تالے ہیں۔ ایک چابی سے کھلے گا اور دوسرا نمبروں کو گھمانے سے۔ تجھے سات سو چھیاسی کے عدد ملانے ہوں گے۔ صندوق میں سے بکس نکال کر دیکھ لے۔ تیری امانت محفوظ ہے یا نہیں؟"

اوپر کا صندوق کافی بڑا اور بھاری تھا اسے ہٹانے کے لیے مجھے خاصی قوت صرف کرنی پڑی۔ پھر میں نے نیچے والے ٹرنک کا تالا کھولا اور کچھ دیر ڈھکنا اٹھائے بیٹھا رہا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ وہی صندوق ہے جسے میرا باپ پاکستان آتے وقت اپنے ساتھ لایا تھا اور جس میں وہ اپنی زندگی کی سب خوبصورت یادیں سمیٹ کر رکھتا تھا۔ ایسے ہی گہنے اور کپڑے میری ماں کے بھی تھے جو سلامت شاہ کے کوارٹر سے غائب ہو گئے تھے اور ان کی جگہ ٹرنک میں سلامت شاہ کی لاش کے ٹکڑے بھر دیے گئے تھے۔ بڑھیا کی آواز سن کر میں چونکا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ مجھے بکس ملا ہے کہ نہیں۔ میں نے جلدی جلدی کافور سے مہکتے ہوئے پرانے ریشمی کپڑوں کے نیچے ہاتھ مارا۔ بکس در حقیقت ایک بریف کیس تھا جو بالکل نیا تھا اور

شاید منشی اسے غیر ملکی دوروں سے واپسی پر لایا تھا۔

بریف کیس میں ایک لفافے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا اور یہ بالکل ویسا ہی لفافہ تھا جیسا ایک بار پہلے بھی میرے ہاتھ آ چکا تھا لیکن اس لفافے کے حصول کی خاطر ہم نے ناقابلِ بیان سختیاں جھیلی تھیں اور بہت نقصان اٹھایا تھا۔ یہاں تک کہ منشی کو اس کی قیمت جان دے کر ادا کرنا پڑی تھی۔ ایک فوری خیال کے تحت میری نگاہ کھلے دروازے کی طرف گئی۔ باہر اندھیرے میں ایک سایہ سا جھلک دکھا کے اوجھل ہو گیا۔ میں نے لفافے کو بریف کیس میں سے نکال کر ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے رکھا اور بریف کیس مقفل کر کے ایک ہاتھ میں اٹھا لیا۔ ٹرنک کو میں نے مقفل نہیں کیا تھا لیکن ایک نظر میں دیکھنے والے کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ٹرنک غیر مقفل ہے۔ بریف کیس کی چابی جیب میں ڈال کر میں عبدل کی ماں کے پاس گیا اور ٹرنک کے تالے کی چابی اسے واپس کر دی۔

"اپنی امانت وصول کر لی؟" وہ بولی۔ "اب مجھ پر کوئی قرض تو نہیں رہا؟"

"نہیں ماں جی!" میں نے کہا۔ "میری چیز مجھے مل گئی ہے۔ میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟"

"شکریہ کس بات کا؟" وہ بولی۔ "یہ میرے لیے مجازی خدا کا حکم تھا۔ اگر اس نے کہا ہوتا کہ قدیر خان کے بیٹے کو زہر دے دینا تو مرنے سے پہلے میں یہ فرض بھی ادا کر دیتی۔"

"اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک سوال کروں؟" میں نے کہا۔ "منشی مرحوم خود کو فوما نچو کیوں کہتے تھے؟"

"یہ بڑی پرانی بات ہے بیٹا۔" وہ اداس ہو کے بولی۔ "اسے ڈاکٹر فوما نچو کے ناول بہت پسند تھے۔ ایک زمانے میں ان کے ترجمے شائع ہوتے تھے تو ہر جگہ بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ ڈاکٹر فوما نچو۔ فوما نچو کی واپسی... اور پتہ نہیں کیا کیا نام ہوتے تھے۔ عبدل کا باپ ان کے پیچھے ایسا دیوانہ تھا کہ یار دوست اس کو فوما نچو کہنے لگے تھے مگر اس نے کبھی کسی کی بات کا برا نہیں مانا۔"

اس کی بات سننے کے بعد منشی کا پُراسرار رویہ میری سمجھ میں آ گیا۔ اس نے خط لکھنے کے اور پہنچانے کے جتنے طریقے اختیار کیے تھے انہی ناولوں سے متاثر ہو کے کیے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ڈاکٹر فوما نچو کا کردار تخلیق کرنے والے انگریز مصنف کو بہت بڑا خراجِ عقیدت تھا۔ عبدل کی ماں سے اجازت لے کر میں بریف کیس اٹھائے باہر آیا اور کوٹھی سے باہر جانے والے راستے پر چلنے لگا۔ میں پوری طرح محتاط تھا مگر مجھے اپنے آس پاس کوئی بھی نظر نہ آیا۔ پھر ایک درخت کے پیچھے سے عبدل نے مجھ پر چھلانگ لگائی اور ہم دونوں ایک ساتھ نیچے گرے۔ بریف کیس میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا۔ میرے اٹھنے سے پہلے عبدل اس کی طرف لپکا۔ میں نے لیٹے لیٹے ایک ٹانگ بڑھائی اور عبدل پھر منہ کے بل گرا مگر اس نے بریف کیس نہیں چھوڑا۔ اگر میں چاہتا تو ایک لمحے میں اسے مقابلے کا مزہ چکھا دیتا لیکن میں نے جانتے بوجھتے بھی سستی اور اناڑی پن کا مظاہرہ کیا اور اسے اتنی مہلت دی کہ وہ اٹھ کر فرار ہو جائے لیکن وہ فرار نہیں ہوا۔ اس نے پستول بھی نکال لیا اور گولی داغ دی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ گولی چلانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اتنی جلدی بحال نہیں ہو سکتی تھی۔ جنگ ابھی جاری تھی اور اسے دشمن پر غلبہ پانے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ اس موقع کو کیسے ضائع کر سکتا تھا۔ اگر میں مقابلہ جاری رکھتا تو دوسری گولی یقیناً میرا کام تمام کر دیتی۔ پہلی گولی کا نشانہ تو اس لیے خطا ہو گیا تھا کہ عبدل نے بڑی عجلت میں فائر کیا تھا اور میں بھی متحرک تھا۔ اگر میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا تو وہ اطمینان سے نشانہ لے کر گولی چلاتا۔ چنانچہ میں نے ایک بہت بڑا خطرہ مول لیا اور چیخ مار کے گر گیا۔ اندھیرے میں عبدل کو خون تو نظر نہیں آیا لیکن مجھے تڑپتا ہوا دیکھ کر اسے یقین آ گیا کہ گولی اپنا کام کر گئی ہے۔ میرے لیے خطرہ یہ تھا کہ کہیں وہ دوسری گولی چلا کے میری موت کو یقینی بنانے کی کوشش نہ کرے لیکن وہ بریف کیس مل جانے کے بعد ایک سیکنڈ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ فائرنگ کی آواز سن کر سب سے پہلے محسن آ جائے گا جو صرف میری حفاظت کے لیے دروازے پہ کھڑی ہوئی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہ پلٹ کر بے تحاشا بھاگا۔ میں نے فرش پر لوٹتے ہوئے دیکھا کہ اس نے بریف کیس کو ہاتھ گھما کے چھت پر پھینک دیا ہے۔ میں اس شخص کی طرح دردناک آوازیں نکالتا رہا جو نزع کے کرب میں مبتلا ہو اور عبدل کو بندر کی طرح کھڑکی کے چھجے پر اور وہاں سے چھت پر چڑھتے دیکھتا رہا۔ دوسری طرف سے میں نے محسن کو دوڑ کر آتے ہوئے دیکھا اور کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے سکندر؟" محسن نے چلا کر کہا۔ "فائرنگ کس نے کی تھی؟"

"وہ تو بھاگ گیا۔" میں نے کہا اور ویران چھت کی طرف دیکھا۔ عبدل کا تعاقب کرنے میں کوئی عقلمندی نہیں تھی۔ وہ

خالی بریف کیس کے سوا کچھ بھی نہیں لے گیا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس عورت کے حال پر قہقہہ مار کے ہنسوں مگر میری چھٹی حس خبردار کر رہی تھی کہ خطرہ اب بھی باقی ہے۔ عبدل اپنا ادب بھی بھلا کے مجھے دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ بہ ظاہر میرا دشمن تھا یا دشمن کا آلہ کار تھا اور اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ شاید ابھی اس کے ساتھی گھر میں یا گھر کے آس پاس کہیں موجود ہوں۔ عبدل ماں کی ضد سے مجبور ہو گیا تھا۔ اور اس کی آخری خواہش پوری کرنے کے لیے مجھے بلا لایا تھا۔ اس نے یقیناً ماں سے معلوم کرنے کی کوشش کی ہو گی کہ وہ مجھ سے یا قدیر خان سے کیوں ملنا چاہتی ہے اور مرنے سے پہلے کون سا قرض اتارنے کے لیے اتنی فکرمند ہے مگر بڑھیا جسمانی طور پر مفلوج ہونے کے باوجود پوری طرح ہوش و حواس میں تھی اور شوہر کے حکم کو خدا کا حکم سمجھتے ہوئے آخری وقت تک راز کو راز رکھنے کے ارادے پر قائم تھی۔ اپنی قوتِ ارادی کا مظاہرہ اس نے کچھ دیر پہلے بیٹے کو کمرے سے نکال کر کیا تھا۔

اس کی بات نے عبدل کے تجسس کو پریشانی میں بدل دیا ہو گا اور اس نے یہ بات شیدے کو یا ان لوگوں کو بتائی ہو گی جو میرے نقطۂ نظر سے قدیر خان اور پھر خرافت علی کے قتل کے ذمہ دار تھے اور جنہوں نے مجھے قاتل بنانے کے لیے میرے قتل کا بیڑہ بھی اٹھا رکھا تھا۔ انہوں نے ہی عبدل کو یہ سکیم سمجھائی ہو گی کہ وہ خرافت کا لبادہ اوڑھ کے مجھے یہاں لے آئے اور پھر دیکھے کہ منشی کی بیوہ کیا چکر چلانا چاہتی ہے۔ منشی میرے دشمنوں کے نزدیک نمک حرام اور غدار تھا۔ چنانچہ شوہر کو مجازی خدا سمجھنے والی بیوی بھی ان کے لیے خطرہ پیدا کر سکتی تھی اور ان کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ وہ کیا جانتی ہے۔ اگر وہ اتنی ضعیف اور قریب المرگ نہ ہوتی تو شاید وہ تشدد کے مخصوص طریقے آزما کے اس سے ہر بات پوچھ لیتے مگر وہ جانتے تھے کہ بڑھیا کی صرف سانس اٹکی ہوئی ہے اور جسم و جاں کا رشتہ سوت کے کچے دھاگے کی طرح ہے جو ایک معمولی سے جھٹکے میں ٹوٹ جائے گا۔ وہ مر گئی تو انہیں کبھی معلوم نہ ہو گا کہ وہ کون سا راز اپنے ساتھ قبر میں لے گئی۔ عبدل نے یقیناً چھپ کر ساری باتیں سن لی تھیں اور وہ لفافہ چھین لینے کے لیے تیار کھڑا تھا لیکن یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ بہت جلد عبدل کو اپنے بے وقوف بنائے جانے کا پتہ چل جائے گا۔ شیدے کے سامنے یا اپنے کسی آقا کے حضور اس نے بڑے فخر سے بریف کیس پیش کیا ہو گا تو اس میں سے کچھ بھی نہیں نکلا ہو گا۔ اگر وہ کہیں قریب ہوتے تو فوراً واپس آ جائیں گے۔

"جب وہ بھاگ گیا ہے تو یہاں کھڑے رہ کر چھت کو گھورنے کا کیا مقصد؟" محسن نے میرا بازو ہلا کے کہا۔

میں چونک پڑا۔ "کچھ نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ واپس نہ آ جائیں۔ ہمیں نکل جانا چاہیے یا انتظار کرنا چاہیے؟"

پھر میں نے کم سے کم الفاظ میں اسے بتایا کہ جس لفافے کے لیے فوما نچو کی جان گئی تھی اور جو ہمارے ہاتھ میں آنے کے بعد بھی ضائع ہو گیا تھا، اس کی ایک نقل عبدل کی ماں کے پاس بھی موجود ہے اور اس کے پرانے کپڑوں کے نیچے چھپی ہوئی ہے لیکن عبدل خوش فہمی میں خالی بریف کیس لے کر فرار ہو گیا ہے۔

"ایسی صورت میں جلد بازی سے نقصان ہو سکتا ہے۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ان کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ عبدل کے علاوہ اس سازش میں کون کون شامل ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا اور ہم جونہی خرافت علی کی کوٹھی سے باہر آئے تو ہماری صورت سے چال سے اور انداز سے مایوسی اور شکست عیاں تھی۔ ہم گاڑی میں واپس ہو گئے۔ میں نے بیک ویو مرر میں اور محسن نے سر گھما کے کئی بار دیکھا لیکن ہمارے تعاقب میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ ہم الٹے سیدھے راستوں سے گزر کے لاہور ہوٹل کی طرف سے میکلوڈ روڈ پر پہنچے اور گاڑی کو چوک میں "کنگ سرکل" ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑا کر دیا۔ خرافت علی کی کوٹھی تک باقی راستہ ہم نے پیدل طے کیا۔ خرافت علی کی کوٹھی اسی طرح ویران اور تاریک پڑی تھی۔ اپنے اپنے ریوالور ہاتھ میں رکھتے ہوئے میں نے اور محسن نے دو مختلف مقامات سے دیوار کو عبور کیا۔ کوٹھی کے دونوں طرف تنگ سی گلی تھی جو ساتھ والی کوٹھیوں کی دیواریں کھڑی ہونے سے خود بخود بن گئی تھی۔ بائیں ہاتھ کی گلی سیدھی سرونٹ کوارٹر تک پہنچ کے ختم ہوتی تھی۔ دائیں جانب کی گلی کے آخری حصے میں گیراج تھا جس میں اب خرافت علی کی گاڑی مقفل دروازوں کے پیچھے کھڑی رہ گئی تھی۔ میں نے بائیں طرف چلنا شروع کیا اور محسن نے دائیں جانب سے گھوم کر آنے والا راستہ اختیار کیا۔ یہ حفاظتی پیش بندی تھی۔ خدانخواستہ ہم میں سے ایک دشمن کے نرغے میں آ جاتا تو دوسرا اس کی بے خبری میں کچھ مدد کر سکتا۔ رضوی صاحب نے یقیناً پولیس نہیں بھیجی تھی ورنہ وہ فائرنگ کی آواز سن کر ضرور پہنچ جاتے۔ انہوں نے صرف عبدل کو ڈرایا تھا اور ہمیں اب اپنی حفاظت خود کرنی تھی۔ آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد

مجھے صورتحال کا اندازہ ہو گیا۔ عبدل کی ماں کے کمرے میں روشنی تھی اور سرونٹ کوارٹر میں سے دو مردوں کی اونچی آواز میں بات کرنے سے پتہ چلتا تھا کہ دشمنوں کے بارے میں ہماری توقعات غلط نہیں تھیں۔ میں نے محسن کے آنے کا انتظار کیا ایک منٹ بعد وہ گیراج کی طرف سے نمودار ہوا تو میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں بے آواز قدموں سے اندھیرے کی پناہ میں چلتے ہوئے دروازے تک جا پہنچے اور باہر کی دیوار سے لگے کھڑے رہے۔

"اماں، دیکھ، اپنا نہیں تو میرا ہی خیال کر۔" عبدل کی آواز آئی۔ "تو نے سکندر بخت کو کیا دیا تھا؟"

"بدبخت، نامراد۔۔۔" بڑھیا چلائی۔ "تجھے بتا دیا ہے کہ ایک بار تیرا باپ ایک امانت چھوڑ گیا تھا، وہ میں نے اس کے حوالے کر دی۔"

"یہ بکواس کرتی ہے عبدل!" دوسرے مرد کی آواز نے سخت لہجے میں کہا۔ "اس نے سیدھی طرح نہ بتایا تو۔۔۔"

"نہیں رشیدے!" عبدل منت سماجت کرتے ہوئے بولا۔ "میں اماں کو سمجھا لوں گا۔ دیکھو اماں! وہ یہاں سے ایک بکس لے گیا تھا لیکن اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم نے اس کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے لیکن اس میں کچھ بھی نہیں نکلا۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں کہ اس بکس میں کیا تھا۔" بڑھیا بدستور اپنی بات پر اڑی رہی۔ "تجھے کیا بتاؤں۔"

"اچھا تیرے پاس وہ بکس کہاں سے آیا جو میں نے کبھی نہیں دیکھا؟"

"تو نے تو ابھی دنیا میں بہت کچھ نہیں دیکھا بیٹا! جو یہ اندھی آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔" بڑھیا بولی۔

"تو ہٹ جا عبدل!" رشیدے نے چیخ کر کہا۔ "میں ابھی دو منٹ میں سب معلوم کر لوں گا۔۔۔ اس کی زبان نہ کھلی تو۔۔۔"

"تو کیا ہو گا؟" عبدل نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تو ملے گا اسے جو اس بڑھیا کو جو بستر سے اٹھ نہیں سکتی ہے کیا ملے گا تجھے اس کو مار کے رشیدے! تیرے نامۂ اعمال میں ایک اور قتل شامل ہو جائے گا۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔" رشیدے نے غرا کے کہا۔ "یہ ویسے بھی مرنے والی ہے۔ میں اسے اجازت نہیں دے سکتا کہ مرتے مرتے ہم سب کو مروا دے۔"

"میں بھی تجھے اجازت نہیں دے سکتا رشیدے! میرے سامنے تو میری ماں پر ہاتھ اٹھائے۔" عبدل نے بے خوفی سے کہا۔

"میں تجھے صرف پانچ منٹ دوں گا۔" رشیدے نے خطرناک لہجہ بنا کے کہا۔ "اتنی دیر میں اس سے پوچھ لے کہ اس نے سکندر کو کیا بتایا ہے۔ اس کے بعد تو نے میرا راستہ روکا تو میرا ہاتھ تجھ پر اٹھنے لگے گا۔ مجھے شک ہے کہ تو نے بھی غفلت برتی اور سکندر پر نگاہ نہیں رکھی ورنہ وہ بریف کیس خالی نہ ہوتا۔"

"قسم خدا کی رشیدے! میرے سامنے اس نے بریف کیس میں سے کوئی چیز نکال کر کہیں نہیں چھپائی تھی۔" عبدل بولا۔ "وہ نکلا ہی تھا کہ میں نے اس سے بریف کیس چھین لیا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بریف کیس میں تھا، سکندر اسی کمرے میں چھپا گیا ہو گا۔" رشیدے نے کہا۔ "پھر ہم بعد میں تلاش کر لیں گے۔ اپنی ماں سے پوچھ کہ اس نے اچھے۔۔۔"

"رشیدے!" عبدل چیخا۔ "میرے سامنے میری ماں کو گالی مت دے ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔"

"رشیدے نے تو بہت مارا ہے خون پینے والوں کو۔" اس نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ "خالی ہاتھوں سے۔۔۔"

ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ عبدل نے اس پر حملہ کیا۔ ہم یہ جھانک کر دیکھ چکے تھے کہ رشیدا اپنے ڈیل ڈول کی وجہ سے ہی نہیں جسمانی اعتبار سے بھی عبدل پر بھاری پڑتا تھا۔ اس نے گولی چلانے کے بجائے گھٹنا اٹھا کے عبدل کے پیٹ میں مارا اور اپنے ہی زور میں آنے والا عبدل ضرب کی شدت برداشت نہ کر سکا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور پیچھے گرا اور پلنگ سے ٹکرا کر ماں کے اوپر جا پڑا۔

"عبدل!" بڑھیا نے چیخ کر کہا اور اپنے دونوں ہاتھ اس اندھیرے میں پھیلائے جو دن اور رات کے فرق کے بغیر اس کی دنیا میں چھایا رہتا تھا۔ "کیا ہوا ہے تجھے؟ بول!"

میں اور محسن دروازے کی دہلیز سے سر نکالے اندر کا پورا منظر دیکھ رہے تھے اور مداخلت کے لیے مناسب وقت کے انتظار میں تھے۔ رشیدا اچانک آگے بڑھا۔ اس وقت عبدل کی نظر نے ہمیں دیکھا اور ہم جو اس کے دشمن تھے، یکلخت اس کی نظر میں مدد کے لیے پہنچنے والے فرشتہ غیب بن گئے۔ وہ ہماری جان کا دشمن اور ہمارے خون کا پیاسا تھا مگر اس وقت وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاموش التجا تھی کہ مجھے اور میری ماں کو بچا لو۔ میں بہت کمینہ ہوں مگر مجھے معاف کر دو۔ مگر ندامت اور پشیمانی کے اظہار کا وقت گزر چکا تھا۔

کائنات عمل کی گھڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ لب کھولتا یا ہم اسے بچانے کی کوشش کرتے، رشیدا اس کے سر پہ پستول کی ضرب لگا چکا تھا۔ یہ ضرب ماں کے بوڑھے ہاتھوں پر بھی آئی تھی۔ عبدل کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ ماں کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں گر گیا۔ اس سے زیادہ بلند آواز چیخ عبدل کی ماں نے ماری۔

"مار ڈالا! میرے عبدل کو مار ڈالا!" وہ دیوانہ وار عبدل کا سر ٹٹولتے ہوئے بولی اور اس کے بوڑھے ہاتھ خون میں بھر گئے۔

"ابھی تو نہیں مارا ہے لیکن مار ڈالوں گا۔" رشیدا چیخ کر بولا اور اس نے ایک ہاتھ سے عبدل کو کھینچ کر ماں سے الگ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ سوکھے ہاتھ عبدل سے یوں چمٹ گئے تھے کہ عبدل اس کے وجود کا ہی ایک حصہ بن گیا تھا، بالکل اسی طرح جیسے وہ جنم لینے سے پہلے تھا۔ اسی لمحے میں رشیدے کی پشت ہماری طرف ہوئی اور میں نے اس پر چیتے کی طرح جست لگائی جو لہو کی پیاس لیے شکار کے نزدیک آ جانے کا منتظر بیٹھا ہو۔ اس غیر متوقع حملے نے رشیدے کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اگر میں چاہتا تو ایک ہاتھ مار کے اس کی گردن توڑ دیتا یا اسے بے ہوش کر کے ڈال دیتا لیکن مجھ پر وحشت سوار تھی۔ میں اسے مارتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ میرے مکے اس کے پیٹ اور منہ پر اتنی قوت سے پڑے کہ وہ کئی بار گرا۔ جب وہ گرتا تھا تو میرے پاؤں خود بخود اس کو ٹھوکریں مارتے تھے۔ اس میں مدافعت کی قوت ہی نہ رہی تھی کہ وہ تندرست و توانا تھا مگر میرے غیظ و غضب کی طوفانی آندھی کے آگے اس کا وجود حقیر تنکا بن گیا۔ میں نے آخری بار اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور اتنی طاقت سے دیوار پر دے مارا کہ اس مرد تنومند کو اوپر کی پرانی دلائیں بھی یاد آگئی ہوں گی۔

جب مجھے ہوش آیا تو منظر بالکل بدل چکا تھا۔ عبدل کی ماں بانہیں پھیلائے پڑی تھی اور اس کی کھلی آنکھیں چھت پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ روح نے بالآخر خاک ہو جانے والے جسم سے رہائی پا لی تھی۔ بڑھیا کے ہونٹوں پر مجھے ایک بڑا اطمینان کیفیت کا احساس ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی جو ان سب کا مذاق اڑاتی ہوئی محسوس ہوتی تھی جنہوں نے اپنی تمام طاقت صرف کر دی تھی کہ پنجرے سے اڑ جانے والی یہ چڑیا اپنے خدا کے حضور ان کی تفصیل نہ کرے مگر انہیں ناکامی ہوئی تھی۔ وہ جو اپنی دولت، اپنے اثر و رسوخ اور اپنی بدمعاشی کے غرور میں تھے اور خود کو پہاڑ سے زیادہ مضبوط اور ناقابل تسخیر سمجھتے تھے۔ اس معذور اور بے بس عورت کے عزم کو شکست نہیں دے سکے تھے۔ عبدل خون میں نہایا ہوا رشیدے کا ریوالور اٹھائے کھڑا تھا۔ اس نے محسن کو دروازے کے قریب روک رکھا تھا اور میرا ہاتھ پکڑنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا چنانچہ اس کے چہرے پر سے بہتا ہوا خون اس کے کپڑوں کو رنگین کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پہ بہہ رہا تھا اور فرش پر ٹپک رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کا خون اسی طرح ضائع ہوتا رہا تو وہ زیادہ دیر نہیں جیئے گا۔

"سکندر صاحب۔۔۔!" عبدل نے ریوالور سے اشارہ کیا۔ "اب یہاں سے چلے جاؤ۔"

میں نے دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے رشیدے کو دیکھا جو بڑی مشکل سے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا اور اس کے حلق سے خرخر کی آواز نکل رہی تھی۔ اس کا چہرہ بھی لہولہان ہو رہا تھا۔ "عبدل! ہم تمہیں اسپتال لے چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

عبدل نے انکار میں سر ہلایا اور ایک ہاتھ سے دیوار تھام لی۔ دیوار پر ایک خونی پنجے کا نقش بن گیا۔ "میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میرے مرنے سے پہلے مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہارے خلاف جھوٹی گواہی دی تھی۔۔۔"

"کس کے کہنے پر؟" میں نے کہا۔ "شرافت علی کا قاتل کون تھا؟"

"ان سب باتوں کا وقت نہیں ہے۔۔۔" اس نے آستین سے ہونٹوں تک آ جانے والا خون صاف کیا۔ "میری ماں تو مر ہی چکی ہے۔ میرے باپ نے بھی تمہارے لیے جان دی تھی۔ اب میرا وقت ہے۔۔۔ میں بہت ناخلف اولاد تھا لیکن میدان حشر میں سرخرو ہونے کا وقت ابھی ہے۔ تم جلد از جلد یہاں سے نکل جاؤ۔ پھر میں کوٹھی سے ٹیلیفون کر کے پولیس کو بلاؤں گا اور ان کے سامنے اعتراف جرم کروں گا۔ مرتے ہوئے شخص کے اعتراف کو سچ تسلیم کیا جاتا ہے نا۔۔۔ میں کہہ دوں گا کہ شرافت علی کو میں نے ہی مارا ہے اور رشیدے کو بھی۔۔۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"لیکن رشیدا تو ابھی زندہ ہے۔" میں نے کہا۔

جواب دینے کی بجائے عبدل نے ریوالور سے رشیدے کے سر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ "رشیدا زندہ تھا مگر اب نہیں ہے۔ اس بدمعاش نے میری ماں کو مارا۔ وہ مجھے بھی مارتا

www.paksociety.com

جاچکا تھا... اور اس لڑائی میں ہم دونوں مارے گئے...
پولیس کے سامنے میرا بیان یہی ہو گا...“ اس نے قہقہہ لگایا اور کہتے کہتے بچا۔ وہ پاگل ہو چکا تھا اور اس کی طاقت جواب دینے لگی تھی۔ ”تم دونوں جاؤ!“ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ رشیدا اب بالکل ساکت و صامت پڑا تھا۔

”اچھا عبدل! ہم جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن وہ چیز جو تمہاری ماں نے مجھے دی تھی، ابھی یہیں چھوڑ گیا تھا۔“ میں نے بیت کے ٹرنک کی طرف اشارہ کیا۔ ”بریف کیس میں ایک لفافہ تھا۔ تمہاری ماں کی امانت...“

عبدل نے سر ہلایا۔ ”لے جاؤ۔ وہ ضرور لے جاؤ، ورنہ میرے باپ کی... میری ماں کی... اور میری قربانی رائیگاں جائے گی... تمہاری امانت کی حفاظت کے لیے ہم سب نے جان دی۔ یہ بات یاد رکھنا۔“

میں نے بے یقینی کے ساتھ اوپر والا ٹرنک ہٹایا اور نیچے والے ٹرنک کے تالے کو ایک جھٹکے سے الگ کر دیا۔ لفافہ ہاتھ میں آنے تک مجھے یقین نہیں تھا کہ عبدل جو کچھ کہہ رہا ہے بقائمی ہوش و حواس کہہ رہا ہے اور وہ مجھ پر گولی نہیں چلائے گا۔ لفافہ نکال کے میں نے پھر اس کی طرف دیکھا اور اس نے ریوالور سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ جو کچھ میری اور محسن کی نظروں نے دیکھا تھا کسی بھیانک خواب کا حصہ لگتا تھا۔ ہم دونوں بوجھل قدموں سے چلتے رہے۔ ممرونٹ کو اندر سے باہر آنے کے بعد ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ جسم کی رہی سہی قوت سے کام لے کر عبدل دیوار کا سہارا لیتا کشتی کی طرف آ رہا تھا۔

”ہم اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“ میں نے محسن کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”دعائے مغفرت بھی نہیں۔ اس نے اپنی زندگی کے تمام گناہوں کا کفارہ خود ہی ادا کر دیا ہے۔“

مجھ پر مسلسل یہ خوف غالب تھا کہ کہیں کسی طرف سے کوئی نادیدہ دشمن ہم پر حملہ نہ کر دے۔ معلوم نہیں منشی مرحوم نے کاغذ کے چند صفحات میں کیا لکھ دیا تھا کہ اس تحریر کو میری دسترس سے دور رکھنے کے لیے دشمن سب کچھ کر چکے تھے اور ان کی آخری ناکام کوشش کا نتیجہ تین افراد کی موت کی صورت میں نکلا تھا لیکن ہم بھی اس وقت تک اپنی کامیابی کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے جب تک خط کا مضمون ہمارے ذہن میں منتقل نہ ہو جائے۔ گاڑی تک پہنچنے سے پہلے میں بہت محتاط تھا اور میری نظریں ہر اجنبی پہ تھیں کہ کہیں وہ ہمارے تعاقب میں تو نہیں ہے۔ میری شدید خواہش تھی کہ میں اس لفافے کو کھول کر دیکھوں جسے میں نے قمیص کے اندر چھپا لیا تھا مگر میں سڑک پر اس کو نکالتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ میں اور محسن دونوں اعصابی کشیدگی پر قابو پانے کا انتظار آنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے لیکن ہم دونوں کے ہاتھ ابھی تک لرز رہے تھے۔ میں نے محسن کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ جیسے ہی وہ کوئی خطرہ محسوس کرے ریوالور نکال لے۔ ہمارے پیچھے لگے دشمن کے فراہم کردہ اس موقع کو ضائع کرنا انتہائی بیوقوفی کی بات ہوگی۔ چنانچہ ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ اپنی جان بچانے کی بھی نکلنے کی کوشش کریں گے۔ ایک بار مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ساتھ کچھ دھوکا نہ ہوا ہو اور لفافے میں سادہ بے مقصد کاغذات کے سوا کچھ نہ نکلے۔

”محسن!“ میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنی گاڑی یہیں چھوڑ دینی چاہیے۔“

”ہمارے تعاقب میں تو کوئی بھی نہیں تھا پھر ڈرنے کی کیا بات ہے؟“ محسن بولا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے چاروں طرف نگاہ رکھی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں سو فیصد یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا اور اس وقت ہم ایک فیصد امکانات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے دشمنوں نے بھی عبدل اور رشید کی ناکامی کے امکانات کو نظر انداز نہ کیا ہو اور وہ ہماری گاڑی کے آس پاس موجود ہوں کہ ہم بخیر و عافیت یہ خط لے کر نکلنے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ پھر ہمارا راستہ روک سکیں۔“

”تیری بات دل کو لگتی ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”ایک تو اب کی اس گاڑی کا رنگ ایسا ہے کہ ہر جگہ پہچانی جاتی ہے، رنگ سے زیادہ اس کا حلیہ متوجہ کرتا ہے۔ ہم کوئی ٹیکسی پکڑ لیتے ہیں۔“

میکلوڈ روڈ پہ پہنچ کر ہم نے مخالف سمت میں [illegible] کی طرف چلنا شروع کیا۔ ٹیکسی والے سینما کے آخری شو کی سواریاں کو لوٹنے کے لیے بے تحاشا بھاگے چلے جا رہے تھے اور ان میں سے کوئی بھی کرشن نگر کی آخری حدود کے ویران علاقے تک جانے کے لیے آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ دلیل ان کی یہی تھی کہ واپسی میں سواری نہیں ملتی اور اس دلیل کی توڑ کا جواب [illegible] تھا جس کی ایک جھلک دکھا کے ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے تھے۔ محسن نے ٹیکسی والے سے صرف اتنا ہی کہا کہ بھائی کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ واپسی میں خالی آنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر تمہیں ٹیکسی چلانے میں کوئی فائدہ نہیں رہا ہے تو دوسرے دھندے بہت ہیں۔ یہ کوئی برا ماننے والی بات نہیں تھی مگر ٹیکسی ڈرائیور ضرورت سے زیادہ بدتمیز تھا۔

[illegible] ٹیکسی روک دی۔
[illegible] کا نوٹ ہے تو مت سمجھنا کہ تم نے مجھے خرید لیا ہے۔ [illegible] مجبور ہے تمہاری بکواس سن رہا ہوں۔ چلو [illegible]

[illegible] نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ ”چلو غلطی ہو گئی [illegible] میں نے محسن کا چہرہ [illegible] سنجیدگی سے کہا۔ ”غصہ [illegible] ٹیکسی چلاؤ۔“

[illegible] ڈرائیور نے کچھ باتیں اور کیں کہ وہ کسی کے باپ کا [illegible] اور بڑے بڑے جیسے خان اس کے سامنے کچھ نہیں [illegible] ٹیکسی لے کر روانہ ہو گیا۔ میں نے قمیص کے [illegible] لفافہ نکالا۔ لفافہ کھول کر کاغذات برآمد کیے اور [illegible] پھر بند کر کے چھپا لیا۔ کاغذات میں نے محسن [illegible] اور اس نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے انہیں [illegible] پتلون کی بیلٹ کے نیچے دبا کر رکھ لیے۔

”[illegible] راستے میں کسی جگہ اتار دو گا؟“ میں نے [illegible] کہا۔ ”ہم دونوں کا ایک ساتھ رہنا ٹھیک نہیں [illegible] کو ٹیلی فون کر دینا کہ وہ ہماری طرف سے پریشان [illegible] صبح کو حاضر ہوں گے۔ اس کے بعد تو کوئی [illegible] اور [illegible] میں شمشاد کے گھر میں تیرا انتظار کروں گا۔“

”اس طرح الگ الگ جانے کا فائدہ؟“ محسن نے کہا۔

”فائدہ ہو یا نہ ہو احتیاط ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسی احتیاط کی وجہ سے عبدل کو خالی بریف کیس ملا تھا۔ [illegible] کوئی پیچھے ہوا تو اسے پھر ناکامی ہو گی اور خیال رکھنا۔“ انگریزی بولتے بولتے میں نے فرانسیسی میں [illegible] ٹیکسی ڈرائیور کو اس کی بدتمیزی کی تھوڑی سی سزا [illegible]“

ڈرائیور نے سر گھما کے پیچھے دیکھا۔ ”انگریزی تو میں نے [illegible] تک پڑھی ہے مگر یہ کون سی زبان تھی؟“

”یہ فارسی زبان تھی۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جیسے [illegible] زبان ہوتی ہے نا...“

”ویسے دیکھنے میں ہم پاکستانی لگتے ہیں۔“ محسن نے کہا۔ ”[illegible] انگریز تھی اور باپ فرانسیسی تھا اور وہ [illegible] ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالک تھے۔ بڑا اچھا بزنس تھا [illegible] لٹ گیا۔“

”[illegible] اب یہاں خوار پھر رہے ہیں۔ شریف آدمی کی [illegible] کہا۔“ بس گاڑی ایک منٹ کے لیے موڑ پر [illegible] سواریاں کراتا ہے۔“ ڈرائیور کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ اس نے گھور کر ہمیں دیکھا اور ٹیکسی روک دی۔ محسن کے اترتے ہی میں نے اسے آگے چلنے کے لیے کہا۔ مگر ابھی ایک فرلانگ دور تھا کہ میں نے ٹیکسی رکوائی اور نیچے اتر آیا۔ ”بھائی صاحب!“ میں نے بڑے شریفانہ لہجے میں کہا۔ ”ذرا باہر تشریف لایئے۔ آپ سے کچھ گفت و شنید کرنی ہے۔“

”اس کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ بولا۔ ”کرایہ نکالو۔“

میں اطمینان سے ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔ ”بات یہ ہے حضور والا کہ یہ بندہ حقیر فقیر پر تقصیر کرایہ ادا کرنے کا اس وقت تک کوئی ارادہ نہیں رکھتا جب تک آپ اپنے گستاخانہ رویے پہ اظہار ندامت نہ فرمائیں۔ اردو سمجھ میں آ رہی ہے تا ماشاءاللہ میٹرک تو پڑھی ہو گی؟“

”اے کی بکواس اے؟“ ڈرائیور مشتعل ہو کے باہر نکلا۔

”کی فرمائی ہوئی اے؟“

”یہ خاکسار واضح کرنا چاہتا تھا کہ آغاز میں ہم مجبور تھے انجام آپ کی مجبوری ہے۔“ میں نے شستہ اردو میں کہا۔

”مجبوری دے پتر!“ ڈرائیور نے ہاتھ گھمایا اور میں نے اس کی کلائی پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ وہ [illegible] سڑک پہ بیٹھا ہوا تھا۔ پلک جھپکتے میں وہ پھر اٹھا اور ڈب سے خنجر نکال کے مجھ پہ حملہ آور ہوا۔ میں چند قدم کے فاصلے پہ اسی طرح

www.paksociety.com

ہاتھ باندھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بالکل آخری وقت میں میرے دونوں ہاتھ حرکت میں آ گئے۔ ایک ہاتھ کی ضرب سے اس کا خنجر اڑتا ہوا اندر چلا گیا اور دوسرے ہاتھ نے اس کو پھر پچھلے پاؤں سڑک پر لٹا دیا۔

"اب فرمائیے کہ آپ اس ناچیز کی درخواست پر غور کریں گے؟" میں پھر ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔ سڑک دور دور تک خالی تھی اور صرف چند منٹ کے ایکشن کا یہ ڈراما کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ "بہتر ہے کہ اب معافی مانگ لیجیے کیونکہ ابھی تک تو میں نے صرف ایک ہاتھ کی صفائی دکھائی ہے۔" میں نے اچانک ریوالور نکال لیا۔ "ابھی تم نے میرا نشانہ نہیں دیکھا۔"

وہ بے چارہ بڑی مشکل سے کھڑا ہوا تھا۔ ریوالور دیکھتے ہی اس کی حالت غیر ہو گئی۔ "اچھا میرے باپ!" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "میں معافی مانگتا ہوں۔ خدا کے لیے میری جان بخش دے۔ میں نے غلطی کی تھی۔"

میں نے بڑے شاہانہ وقار سے کھا تو سر ہلایا۔ ریوالور جیب میں رکھا اور پچاس کا نوٹ اس کو پکڑا دیا۔ "اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ آئندہ کبھی ملاقات کا شوق ہو تو ایس پی انکل رضوی کے گھر تشریف لے آئیے گا۔ میں وہیں ملوں گا۔ نام یاد رہے گا نا؟ حسن رضوی۔"

جس بدحواسی کے عالم میں وہ ٹیکسی لے کر فرار ہوا اس پر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ٹیکسی کے نظر سے اوجھل ہوتے ہی میں گلی میں غائب ہو گیا۔ اندازے سے کئی گلیوں میں مڑتا ہوا میں شہلا کے گھر کی سمت چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک گلی کا اختتام کھیتوں پر ہوا۔ پھر میں کھیت کی منڈیر کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور مکانوں کو غور سے دیکھتا گیا۔ سو قدم چلنے کے بعد میری نظروں نے مکان کو شناخت کر لیا۔ کئی بار دستک دینے پر اندر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور روشنی صحن تک پہنچی۔ دروازے کے قریب آ کے شہلا نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں شہلا!" میں نے نرمی سے کہا۔ "تمہارا بھائی سکندر۔"

دروازہ کھل گیا اور میرے سامنے شہلا کا حیرت زدہ چہرہ آ گیا۔ نیند کا خمار اب بھی اس کی آنکھوں میں باقی تھا۔ "آپ؟ اس وقت کیسے؟" وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ "خیریت تو ہے نا؟"

"پریشان کیوں ہوتی ہے پگلی!" میں نے ہنس کے کہا۔ "سب خیریت ہے اور وقت کی کیا بات ہے۔ کبھی ہمارا گھر ہے۔ ہم جب جی چاہیں آ جائیں یا آدھی رات [illegible]"

ظاہر تھا کہ میری بات یا میرے لہجے نے اسے [illegible] ہے۔ اندر جانے کے بعد جب وہ میری فرمائش [illegible] لگی تو میں نے لفافہ نکال کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ ہے وہ خونی لفافہ جس میں ایک خوفناک راز بند ہے۔" میں نے کہا۔ "بالکل اسی طرح جیسے کوئی بم ہوتا ہے۔"

"لیکن اس میں تو [illegible]" [illegible] لفافے میں جھانک کر کہا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے میں محسن خان شیروانی [illegible] والے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی [illegible] پاس ہے۔" پھر میں نے اسے سنجیدگی سے عبدل کے [illegible] لے کر مارے جانے تک کے واقعات سنا دیے۔ [illegible] دہشت زدہ ہوتی گئی۔ مجھے اس کی طرف سے [illegible] نے اسے پانی پلایا اور ایک اسٹول پر بٹھا دیا۔ [illegible] پانی اس نے چائے بنانے کے لیے [illegible] آدھا بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے اس میں اور پانی [illegible]

"سکندر بھائی!" شہلا نے کانپتی ہوئی آواز [illegible] "آپ کو عبدل کو ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"پہلی بات تو یہ ہے شہلا کہ ہم مجبور تھے۔" [illegible] کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سمجھاتے ہوئے کہا۔ [illegible] ہسپتال لے جاتے مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ [illegible] تھا اور اسے اپنے بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ [illegible] اس کے ہاتھ میں تھا اگر ہم اس کی بات نہ مانتے تو [illegible] وہ کیا کر گزرتا۔ شاید وہ سر میں گولی مار کے مر جاتا [illegible] جہاں بھی نظر آ رہا تھا کہ اسے ہسپتال لے جانے [illegible] نہیں ہو گا۔ الٹا ہم مزید مشکلات میں مبتلا ہو جاتے [illegible] یہ اخلاقی فرض پورا کرنے کی کوشش ہم نے [illegible] خود بھی پولیس کو طلب کرنا چاہتا تھا۔"

"آپ کے خیال میں پولیس کے آنے تک [illegible] رہے گا؟" شہلا نے کہا۔

"اسے زندہ رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ [illegible] وہ زندہ رہے۔ یہ تو انتہائی خود غرضی اور [illegible] لیکن حقیقت یہی ہے شہلا کہ اس کا بیان ہی [illegible] سے بچا سکتا ہے ورنہ مجھ پر میر شرافت علی کے قتل [illegible] الزام کو بھی ختم کر سکتا ہے۔ اگر اسے یہ موقع نہ ملا [illegible] زیادہ مشکلات کا شکار ہو جائیں گے کیونکہ عبدل [illegible]

[illegible] سے بڑے اور چشم دید گواہ تھے۔ ان [illegible] کا الزام میرے سوا کسی پر نہیں آ سکتا۔ میرے لیے انکار [illegible] ناممکن ہو گا کیونکہ میں تو خود انکل رضوی کو بتا کے آیا [illegible] کہاں جا رہا ہوں۔ قدرتی طور پر وہ یہی نتیجہ اخذ [illegible] کہ میری عبدل اور شہزاد سے لڑائی ہوئی جس کے نتیجے میں وہ دونوں مارے گئے اور عبدل کی حالت اس صدمے کی تاب [illegible] مجھ پر ایک کی جگہ تین افراد کے قتل کا الزام آ [illegible] اور میری ضمانت تو فوراً ہی منسوخ ہو جائے گی۔ اس لیے بہت ضروری ہے کہ عبدل پولیس کے سامنے اپنا پورا [illegible] دے۔"

محسن نے اس وقت دستک دی جب میں چائے تیار کر [illegible] تھا۔ وہ اندر آیا تو اس کی صورت دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے سوال [illegible] "عبدل اب کیسا ہے۔۔۔؟"

محسن نے انکار میں سر ہلایا اور باورچی خانے کے فرش پر بیٹھ کر اپنے سامنے خلا میں گھورنے لگا۔ اس کا چہرہ حزن و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔ بالآخر وہی ہوا تھا جس کا اندیشہ تھا۔ یعنی ہر حفاظتی تدبیر کے باوجود عبدل موت کے دھارے کو توڑنے میں ناکام رہا تھا اور ہم پھر ہار گئے تھے۔ شاید یہ آخری موقع تھا۔ میں نے افسوس اور بے بسی سے سوچا اب کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ وہ داستان کیا تھی جس کا ہر لفظ خون سے لکھا گیا تھا مگر یہ خون رائیگاں گیا۔ جب تقدیر ساتھ نہ دے تو تدبیر سے کیا ہو گا؟ [illegible] اطمینان کی بات یہ تھی کہ محسن کو کچھ نہیں ہوا تھا اور [illegible] مجھے اگر خوشی تھی تو صرف اسی بات کی۔

"چلو چھوڑو محسن! جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب اس پر سنجیدہ ہونے سے کیا حاصل؟" میں نے بہت دیر بعد حوصلہ افزا لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اس سے ہمارے عزم و استقلال میں فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ بشرطِ زندگی ہم اس راز کی حقیقت معلوم کر لیں گے کیونکہ زندگی کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر ہمیشہ مثبت رہا ہے۔ کچھ لوگ روتے ہیں کہ پیمانۂ حیات کتنا خالی ہے۔ ہم ہمیشہ شکر ادا کرتے ہیں کہ پیمانہ سلامت ہے۔"

محسن نے ایک زبردست قہقہہ مارا۔ "فلسفی کی اولاد!" اس نے ہنستے ہنستے بے حال ہو کے کہا۔ "بند کرو اپنی بکواس۔ میرے لیے اس سے زیادہ برداشت کرنا مشکل تھا۔"

"تو۔۔۔ مذاق کر رہا تھا؟" میں نے بے وقوفوں کی طرح [illegible] "یہ سب اداکاری تھی؟"

محسن کے ساتھ اب شہلا بھی ہنسنے لگی تھی۔ "تم تو کمال کے اداکار ہو۔ فلموں میں جاتے تو نامور ہیرو ہوتے۔" شہلا نے اسے چائے کی پیالی تھما دی۔

"کیا عرض کروں مس شہلا!" محسن نے انکساری سے کہا۔ "بس اپنے مقابلے کی کوئی ہیروئن نظر نہیں آتی تھی۔ اگر آپ ہوتیں تو ضرور کوشش کرتا۔"

"یہ سالا تو پیدائشی ایکٹر ہے۔" میں نے چائے کی پیالی لیتے ہوئے نوٹ کیا کہ شہلا کا رنگ گلابی ہو گیا تھا۔ "بلکہ اس کی زندگی مسلسل اداکاری ہے۔ میرا یہ تو کیا اس کا باپ بھی نہیں بن سکتا تھا۔ کالج کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی جب بھی اسٹیج پر آتا تھا اس کو مضحکہ خیز کردار ملتے تھے۔"

شہلا کے لیے یہ انکشاف تھا۔ "تو آپ اسٹیج پر ایکٹنگ کرتے تھے؟"

"ایسی ویسی؟" محسن نے فخر سے کہا۔ "تہلکہ مچا رکھا تھا میں نے۔ قیامت برپا کر رکھی تھی۔"

"یہ بھی بتا دو کہ تمہیں رول کیا ملتے تھے؟" میں نے جل کر کہا۔ "ایک سے ایک بیہودہ اور مضحکہ خیز۔ ایک مرتبہ یہ جوکر کی ماں بنا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے بوڑھے کنجوس یہودی کا

مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر جی ایم ستار کی شہرۂ آفاق تصنیف

ازدواجی نفسیات
مکتبہ نفسیات [illegible] کراچی

www.paksociety.com

پارٹ کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ ایک بار وہ زخمی ہو گیا تھا اور اسٹیج پر ملک ملک کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کو ویسے بھی نقلیں کرنے میں کمال حاصل تھا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ہمیں وقت پر پیسے نہیں پہنچے تھے اور کرسمس کا موقع تھا تو وہ لمبی سی سفید داڑھی اور میک اپ سے سانتا کلاز بن کے ہوسٹل کے رہنے والے باہر انگریز طالب علم کے دروازے پر جا بیٹھا تھا اور اس نے نہایت جذباتی انداز میں آواز بنا کے کہا تھا کہ غریب سانتا کلاز غریب بچوں کو تحفے دینے کی خاطر آپ سے تھوڑی سی قربانی چاہتا ہے اور انگریز قوم اس معاملے میں خاصی جذباتی ہے۔ لڑکوں کو والدین نے کرسمس کے لیے زیادہ جیب خرچ بھیجا تھا اور چھٹیاں بھی ہونے ہی والی تھیں۔ وہ ان سے تین سو پونڈ ٹھگ لایا اور انہیں کبھی شک نہیں ہوا۔“

ہنستے ہنستے سلطانہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور جھینپنے کے باوجود خود محسن بھی ہنس رہا تھا۔ ”تین سو پونڈ سے کتنا عیش کیا تھا ہم نے اور گوسٹل کو لوٹ کر خوشی کتنی ہوئی تھی ہمیں۔“ محسن نے قمیص میں ہاتھ ڈال کے کاغذات نکالتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے اب ہمیں سنجیدہ ہو جانا چاہیے مسٹر سکندر بخت! کیوں نہ خواتین کو باورچی خانے سے نکال دیا جائے۔ یہ رازداری کا معاملہ ہے۔“

”خواتین کو باورچی خانے سے نہیں نکالا جا سکتا۔“ سلطانہ نے اعلان کیا۔ ”اعتبار نہیں ہے تو حضرات باتھ روم استعمال کر سکتے ہیں مگر یہ خیال رہے کہ دیواروں کے بھی کان ہو سکتے ہیں۔“

”بات یہ ہے نیک بی بی کہ اس خط کا موضوع بے پاس شدہ نہیں ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”آخر اس میں کہیں پنجابی فلموں کی سچویشن یا پنجابی فلموں کے ڈائلاگ آ گئے تو بڑی غلط بات ہو گی مگر خیر... محسن خیال رکھے گا کہ ایسے حصوں کو حذف کر دے اور آپ کو سنانے کے بجائے مجھے پڑھوا دے۔“

محسن نے پڑھنا شروع کیا۔

”عزیزم کبیر خان!

بعد دعائے خیریت اور درازیٔ عمر کے واضح ہو کہ مجھے اب تک تم سے ملاقات نہ ہونے کا بہت رنج ہے۔ مجھے قوی امید تھی کہ لندن میں تم مجھ سے ملنے ضرور آؤ گے کیونکہ اس سے پہلے ٹیلی فون پر تمہیں بہت سی ایسی باتیں بتا چکا تھا جو تمہیں معلوم نہ تھیں اور تمہارا تشویش میں مبتلا ہو جانا ایک قدرتی امر تھا لیکن تم نہیں پہنچے اور میں بہت مایوس اور رنجیدہ واپس پاکستان لوٹا۔ مایوس اس لیے کہ میں نے بہت بڑا خطرہ مول لے کر تم سے رابطہ قائم کیا تھا اس لیے کہ وزیر خان کے بیٹے کی حیثیت سے [illegible] جو توقعات وابستہ کر لی تھیں تم ان پر پورے نہ اترے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے نہ آنے کا سبب کیا تھا۔ مجھے قابل اعتبار نہیں سمجھا تھا یا [illegible] وہ تمہارے نقطۂ نظر سے اتنا اہم نہیں تھا کہ تمہارے [illegible] تشویش ہوتا یا تمہاری راہ میں کوئی مجبوری حائل [illegible] نے تمہارا راستہ روک لیا تھا یا مجھ سے بدظن کر دیا [illegible] وجہ خواہ کچھ بھی ہو تم نہیں آئے [illegible] کی اپنی کوشش جاری رکھوں گا۔ حالات کو [illegible] یہ کوشش بھی خودکشی کے مترادف لگتی [illegible] پر بوجھ بڑھتا جا رہا ہے اور میں خود کو بھی صف [illegible] شامل سمجھنے لگا ہوں۔ اگر کوئی تمہاری نظر [illegible] نکال کے کسی کے پیٹ میں گھونپ دیتے [illegible] جا رہا ہو تو کیا تم اپنی آنکھیں بند کر سکتے ہو [illegible] خاموش رہ سکتے ہو کہ زید نے بکر کو مار دیا [illegible] تو دونوں سے تعلق نہیں اور میرے لیے صرف [illegible] ہے جو میں کسی تیسرے شخص پر اعتبار نہیں کر [illegible] نامہ بر جا کے نہیں بھیج سکتا۔ مجھے یہ بھی اندیشہ [illegible] کچھ لوگوں کو میری ذات پر شک ہو گیا ہے اور [illegible] حرکت کی نگرانی کر رہے ہیں۔ غالباً کسی ذریعے [illegible] معلوم ہو گیا ہے کہ میں نے تم سے رابطہ قائم [illegible] ہو سکتا ہے کہ ان کو پوری گفتگو کی رپورٹ مل [illegible] صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ تمہارے ہوٹل نہ آنے [illegible] خدا کو کوئی بہتری منظور تھی۔

اب جو کچھ میں جانتا ہوں اسے تحریر [illegible] میں تمہارے ہاتھوں تک پہنچانے کی کوشش کروں [illegible] خط کے تم تک پہنچنے سے پہلے ہی غائب ہو جانے [illegible] امکانات کو نظر انداز نہیں کروں گا۔ ایک زمانے [illegible] جاسوسی ناول پڑھنے کا جنون تھا اور میں نے انگریزی [illegible] کے وہ سب ترجمے چاٹ رکھے تھے جو [illegible] اور اس دور کے دوسرے لوگوں نے کیے تھے [illegible] سیکسٹن رومر کے ناول بہت پسند تھے۔ [illegible] جن کا مرکزی کردار ڈاکٹر فو مانچو کا تھا۔ فو مانچو [illegible] کے مطابق چند ہولناک ناول تھے اور میں فو مانچو [illegible] اتنا متاثر ہوا تھا کہ ہر جگہ اس کا تذکرہ کرتا تھا [illegible] جینئس ہے لیکن اس کی منفی ذہانت بھی حیرت [illegible]

[illegible] استعمال ہوتی تو وہ خطرناک ہو جاتا۔ [illegible] نے بہت کچھ سیکھا مگر خدا کا شکر ہے [illegible] استعمال نہیں کیا۔ اب میں ایک چھوٹا [illegible] کوشش کروں گا۔ میں نے نظر آنے والی [illegible] بہت سے طریقے نوٹ کر رکھے ہیں ان میں [illegible] میں تمہارے نام ایک خط ارسال [illegible] صفحات پر مشتمل ہو گا۔ اگر کسی کو شک ہوا تو [illegible] حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے گا اور شاید [illegible] ایک علیحدہ خط کے ذریعے میں تمہیں بتا [illegible] سادہ صفحات وصول ہونے کے بعد پریشان ہونے [illegible] ضرورت نہیں اور اگر خط کو پڑھنا مقصود ہو تو اس [illegible] خاص طریقہ ہے جس سے تحریر نمایاں ہو جائے گی [illegible] بات یہ ہے کہ خط کے مضمون میں صرف [illegible] ہے۔ میں نے جانتے بوجھتے اس خط کو غلط [illegible] سے پُر کرنے کا فیصلہ کیا ہے مگر اس میں ایک [illegible] حقیقت بھی شامل کر دی ہے تاکہ وہ شخص جھوٹ [illegible] اگر یہ خط دشمنوں کے ہاتھ پڑ گیا تو تمہیں [illegible] نقصان نہیں ہو گا مگر تمہارے دشمن دھوکا کھا جائیں [illegible] واقعات کا سچ غیرارادی طور پر انہیں [illegible] واقعات کی سچائی کا قائل کرے گا اور وہ اس سب کو [illegible] مطمئن ہو جائیں گے۔ اس کے بعد میرا اپنا انجام [illegible] مجھے اس کی فکر تو ہے لیکن میں اس سے خوف زدہ نہیں ہوں۔

میں تمہیں دوسرا خط بھی لکھوں گا جس میں تمام واقعات وضاحت سے ہوں گے اور یہ خط میں ایک جگہ سے لا کر لکھوا دوں گا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ لوگ ابھی ان کی دسترس [illegible] بہت طاقتور لوگ ہیں اور ان کے اثر و رسوخ [illegible] بہت وسیع ہے چنانچہ دوسری نقل میں اپنی بیوی کے [illegible] رکھوا دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ کسی کو مجھ [illegible] حفاظت کی توقع نہیں ہو سکتی اس لیے یہ نقل محفوظ [illegible] امکانات زیادہ روشن ہیں اور میں اپنی بیوی سے [illegible] کہتا ہوں کہ وہ مرتے دم تک اس امانت کی حفاظت کرے گی جو میں تمہارے لیے چھوڑ جاؤں گا۔

برخوردار کبیر خان! تمہارے والد اور میرے درمیان [illegible] نصف صدی پرانا کہا جا سکتا ہے ہم نے کم و بیش [illegible] ایک ہی مکتب سے حصول علم کا آغاز کیا تھا [illegible] تک ہم دن رات کے رفیق تھے۔ بعد میں روزگار نے ہمیں کئی بار جدا کیا اور تقدیر نے کئی بار ملایا۔ دوبارہ مل کر بھی ہمارا تعلق کسی نہ کسی صورت برقرار رہا اور ہم ایک دوسرے کے مونس و ہمدم، ہم مشرب و ہم راز رہے۔ وزیر خان مرحوم کی سب سے بڑی خوبی اس کی وضع داری تھی۔ اس کے اور میرے درمیان معاشی حالات کا فرق پڑ گیا تھا۔ لیکن وہ کہتا تھا کہ فو مانچو! مایا تو آنی جانی چھاؤں ہے۔ کاغذوں کے نوٹ پرانے ہوتے ہیں تو پھٹ جاتے ہیں۔ دوستی پرانی ہو کے پائیدار ہو جاتی ہے کیونکہ آدمی کاغذ کا نوٹ نہیں ہے... ہم اونچ نیچ کا خیال کیے بغیر ملتے تھے تو پرانے وقتوں کی باتیں بھی کرتے تھے اور آنے والے وقت کی بھی۔ وہ فیکٹری کا مالک تھا اور میں ایک معمولی منشی مگر وہ کہتا تھا کہ دنیا میں میرے لیے دو ہی رشتے تو رہ گئے ہیں۔ ایک خون کا رشتہ جو سکندر سے ہے اور دوسرا دوستی کا رشتہ جو تم سے ہے۔

لیکن کچھ عرصہ ہوا ہماری ملاقاتیں اچانک بند ہو گئیں۔ میں کسی کام سے چند دن کے لیے شہر سے باہر رہا اور واپس آنے کے بعد بھی ایک ہفتے تک وزیر خان سے ملنے نہ جا سکا۔ تین ہفتے بعد میں شام کے وقت میں اس کی ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پہنچا اور عادت کے مطابق سیدھا اندر چلا گیا سب سے پہلے میری نگاہ ایک خادمہ پر گئی جو چائے کی ٹرے اٹھائے کچن کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے چلا کے کہا۔ ”ارے میاں وزیر بادشاہ! کیا ٹھاٹ ہیں۔ یہ غلام اور کنیزاں خرید...“ مگر میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی خادمہ نے چیخ مار کر ٹرے گرا دی۔ ہنگامے پر بیگم صاحب نکلیں دوسری عورت نے ایک دروازہ کھول کے جھانکا اور فوراً بند کر دیا۔ پھر ایک ہٹا کٹا صاحب بہادر باہر آیا اور اس نے غنڈوں کی طرح غرا کے میری گردن پکڑ لی۔ میں نے بڑی مشکل سے گلو خلاصی کرائی اور اسے یہ سمجھایا کہ میں کوٹھی کے مالک کا لنگوٹیا یار ہوں اور وزیر خان کے مہمانوں کا میرے ساتھ ایسا برتاؤ زیب نہیں دیتا۔

”مہمان؟ کون مہمان؟“ وہ دھاڑ کر بولا۔ ”وزیر خان جب اس گھر کا مالک تھا تب تھا۔ اب مالک میں ہوں اور تم میرے لنگوٹیے یار نہیں ہو۔ اس لیے اپنی لنگوٹی سمیت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

”آپ کا مطلب ہے... یعنی کوٹھی آپ نے وزیر خان سے خرید لی ہے؟“ میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

”خریدی نہیں تو کیا اس نے مجھے تحفے میں دی ہے؟“

”اچھا آپ ناراض نہ ہوں۔“ میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ”مجھے صرف یہ بتا دیں کہ وہ کہاں گیا ہے؟“

www.paksociety.com

"وہ گیا ہے جہنم میں۔" وہ شخص چیخ کر بولا۔ "اب تم جاتے ہو یا تمہیں بھی جہنم رسید کروں؟"

ایسے بدتمیز آدمی سے بات کرنا فضول تھا۔ میں نے اندازہ یہ کیا تھا کہ وزیر خان نے گھر بیچ دیا ہے اور فیشن ایبل علاقے میں کوئی نئی خرید لی ہوگی تو یہ بات کل معلوم ہو جائے گی لیکن میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اگلے روز میر شرافت علی نے بھی ان تمام معاملات سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

"کمال ہے میر صاحب!" میں نے کہا۔ "وہ آپ کے پارٹنر ہیں اور آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے اتنا بڑا سودا کر لیا ہے۔"

"بھئی منشی جی!" میر شرافت علی نے کہا۔ "یہ سب اس کے ذاتی معاملات ہیں جن سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اپنی کوٹھی یا کار یا گھر کی کوئی بھی چیز خریدتا ہے یا بدلتا ہے تو مجھ سے مشورہ نہیں کرتا۔ بالکل اسی طرح جیسے میں اس سے نہیں پوچھتا۔"

"مگر میر صاحب! ان کا پتہ تو آپ کے پاس ہونا چاہیے نا۔"

"ہونا تو چاہیے۔" میر شرافت علی نے اتفاق کیا۔ "لیکن اس نے بتانا مناسب نہیں سمجھا تو میں کیا کروں۔"

"اگر آپ کو ان سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آ جائے تو؟"

"بھئی منشی یہ تو اس کو بھی سوچنا چاہیے۔" میر شرافت علی نے بےزاری سے کہا۔ "پھر یہ کہ اس کا فون ابھی کچھ دیر پہلے بھی آیا تھا لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔"

میں نے میر شرافت علی کے موڈ کو دیکھتے ہوئے اس موضوع پر زیادہ گفتگو نہیں کی لیکن یہ ضرور کہا کہ اب وزیر خان کا فون آئے تو آپ مجھے بتائیں یا اس کا پتہ لے لیں۔ دفتر میں کام کرنے والے دوسرے لوگوں کو بھی میری زبانی ہی پتہ چلا کہ وزیر خان نے اپنی رہائش تبدیل کر لی ہے۔ ان میں سے کچھ پرانے کارکن بھی تھے جن کو وزیر خان نے ہمیشہ قابل اعتماد دوست سمجھا تھا۔ یہ اطلاع ان کے لیے بھی حیرانی کا سبب بنی۔ اس کے بعد ایک ہفتہ تک میں مسلسل میر شرافت علی سے اور دوسرے لوگوں سے دریافت کرتا رہا لیکن وزیر خان نے ٹیلی فون پر بھی کسی سے بات نہیں کی تھی۔ ایک ہفتے بعد شرافت علی نے کہا کہ فون آیا تھا مگر میں تم کو بلانا بھول گیا۔ آٹھ دس دن اور گزر گئے تو شرافت علی نے کہا کہ وہ کچھ نہیں پوچھ سکا کیونکہ لائن اچانک کٹ گئی تھی۔ میری تشویش میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا اور میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ میر شرافت علی کو میری تشویش سے خوشی نہیں ہوتی پریشانی ہوتی ہے۔ ایک بزنس پارٹنر کو دوسرے بزنس پارٹنر سے بے تعلق ہو کے بھی نہیں رہنا چاہیے ... کے بعد تو انسان کو اپنے گھر کی دیواروں سے بھی ... میں نے ولایت میں ایک سکتے کی گمشدگی پر ... سوگوار اور آنسو بہاتے ہوئے دیکھا تھا جیسے ... ایک فرد تھا۔ اتنے طویل تعلق کے بعد میر شرافت ... جذباتی کاروباری رویہ میری عقل اور سمجھ سے ...

پھر اچانک ایک دن وزیر خان آفس ... کا وقت تھا چنانچہ اس کو صرف ... سیکرٹری نے آتے اور جاتے دیکھا۔ ان میں سے کسی ... خیال سے اس کا نیا پتہ دریافت نہیں کیا۔ لوگوں کو ... پوچھنے پر بڑی حیرانی ظاہر کی کہ مسٹر وزیر خان کا نیا ... گیا ہے۔ وزیر خان بہت سے اہم کاغذات ... چلا گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کو کہاں تلاش کروں۔ اگر وہ سرے سے غائب ہو جاتا تو جا کر اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا سکتا تھا۔ میر شرافت علی سے اس کی ٹیلی فون پر بات ہوتی ... کے علاوہ آفس کے تین افراد اسے زندہ سلامت ... دیکھ چکے تھے۔ اگلے دو ماہ میں میر شرافت علی کے کہنے کے مطابق اس نے کئی بار ٹیلی فون پہ گفتگو کی اور ڈی سوزا کے بیان کے مطابق وہ لنچ کے وقفے میں دوبار آیا اور پہلے کی طرح کاغذات پر دستخط کر کے چلا گیا۔ میں اس کو مجبور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ وزیر خان ... یا اس سے کسی اور وقت آنے کی اور مجھ سے ملنے ... کر لے۔ ایک مہینے تک میں نے لنچ کے وقفے ... دیا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ... شام کو ایسے وقت میں آیا جب میں نہیں تھا ... کھلتے ہی آ پہنچا۔ مجھے معلوم ہوتا رہا کہ وہ زیادہ ... اور ضروری کاغذات پر دستخط کر کے چلا جاتا ہے ... بارے میں کچھ نہیں بتاتا کہ وہ کہاں قیام پذیر ہے ... رہائش بدلنے کی کیا ضرورت تھی اور ... ترک تعلق کر کے گوشہ نشینی ... کیا ہے؟

وزیر خان کا رویہ میرے لیے پراسرار ... بھی تھا۔ وہ کوئی خلوت پسند یا آدم بیزار شخص ... تعلقات کو زندگی کے سہارے سمجھتا تھا۔ اس نے ...

آخر کیوں؟ میں نے دفتر میں کچھ لوگوں سے کہا ... اور اگلی مرتبہ وزیر خان آئے تو اس سے ... کی کوشش کریں۔ اگر وہ انکار کرے تو ... اس کا پیچھا کریں اور دیکھیں کہ وہ کہاں جاتا ہے ... میرے اس پروگرام پر عمل درآمد کے لیے تیار تھے ... مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ جب وزیر ... معلوم ہی نہ ہوا اور جب معلوم ہوا تو انہیں ... جانے کی اجازت ہی نہیں ملی۔ چپراسی نے کہا کہ اندر ... میٹنگ ہو رہی ہے اور حکم ہے کہ کسی کو مداخلت نہ کرنے ... میٹنگ کے ختم ہونے کا بھی کسی کو پتہ نہ چلا اور ... جانے کس وقت چلا گیا۔ میرے دل میں ہزار شکوک ... شکایتیں تھیں جن کو میں بے بنیاد قرار دے کر ذہن سے ... جھٹک دیتا تھا کیونکہ بظاہر ایسی کوئی بات نظر نہ آتی تھی جسے ... بنیاد بنا کے میں کوئی قانونی کارروائی کر سکتا۔ وزیر خان ... کسی قید میں نہیں تھا۔ اپنی مرضی سے آتا جاتا تھا اور اس کے ... فون کالیں وہ خود نہیں کرتا تھا یا اس سے جبراً نہیں کروائی جاتے ... اگر وہ ایک بار اپنے کاروباری معاملات اپنے پارٹنر کے سپرد ... کر کے آفس نہیں آتا یا آتا ہے تو کسی سے نہیں ملتا ... اپنا پتہ نہیں بتاتا تو اس میں کوئی بات غیر قانونی نہیں ... اگر وہ ایک کے بعد ایک کوٹھی یا گاڑی بدلتا ہے تو اس ... دوستی کے پرانے رشتے توڑ دیتا ہے تو یہ اس کا ... ذاتی فعل ہے لیکن اس کے باوجود میری چھٹی حس خبردار کرتی ... وزیر خان کی فطرت نہیں بدلی۔ اس کے حالات میں کوئی ... تبدیلی رونما ہوئی ہے جس نے اسے ... اور اس کو کوئی ایسی مجبوری لاحق ہے جو وہ ... نہیں کر سکتا ہے لیکن بہت سوچنے کے باوجود میں یہ ... سمجھنے سے قاصر تھا کہ وزیر خان کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ پھر ایک ... مرتبہ اسے میر شرافت علی کے ساتھ آفس ... سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا اور جذبات سے بےقابو ہو کر چلاتا ... ہوا بھاگا مگر مجھے میر شرافت علی نے روک کر سخت ... لہجے میں کہا۔ "منشی! معلوم ہوتا ہے تم سٹھیا گئے ہو اور اب ... ریٹائر ہو جانا چاہیے۔ آخر ڈسپلن بھی کوئی چیز ہے۔ ... اس طرح چپراسی بھی عام سے کر چیختا چلاتا مالکوں کے پیچھے ... اور ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ کرے گا تو کام کیسے ... چلے گا۔ ... کہ تم ایک معمولی منشی ہو۔" ان الفاظ نے ... مجھے پانی پانی کر دیا تھا اور میرے قدم روک لیے ... تھے لیکن اس کے باوجود میرا خیال تھا کہ وزیر خان مجھ سے بات کرے گا لیکن اس نے بے رخی سے میری طرف دیکھے بغیر کہا کہ میر صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ آفس میں حفظ مراتب کا خیال رکھنا چاہیے۔ پھر وہ آگے بڑھ گیا اور شرافت علی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اپنے ساتھیوں سے زیادہ میں اپنی نظر میں رسوا ہو گیا اور اس وقت تو غصے کی حالت میں میرا فیصلہ یہی تھا کہ وزیر خان کی ایسی تیسی۔ اس نے دوست سمجھنا چھوڑ دیا ہے تو مجھے اس کے لیے فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن بعد میں غصہ اتر گیا تو صرف دکھ کا احساس باقی رہ گیا اور میں نے سوچا کہ وزیر خان کا رویہ ایسا کیوں تھا؟ وہ ایسا آدمی تو نہیں تھا۔ اس عمر میں انسانی فطرت کہاں بدلتی ہے۔ مجھے کوئی ایسی وجہ بھی نظر نہیں آتی تھی کہ وزیر خان مجھ سے بدظن ہو گیا ہو۔ اسے کوئی بات بری لگی تھی تو وہ مجھ سے ضرور پوچھتا اور مجھے صفائی کا موقع دیے بغیر اتنے پرانے تعلقات کو یکلخت ختم نہ کرتا۔ وہ یقیناً مجبور ہے لیکن میری عقل اس سوال کا جواب دینے سے قاصر تھی کہ یہ مجبوری کیا ہو سکتی تھی؟

اس کے بعد میں نے کئی مرتبہ سنا کہ وہ آفس آیا اور چلا گیا۔ اس نے ضروری کاغذات پر دستخط بھی کیے مگر بات کسی سے نہیں کی۔ میر شرافت علی اور ڈی سوزا مجھے بری طرح جھاڑ چکے تھے کہ اپنے کام سے کام رکھو اور نہ چھٹی کرو۔ وزیر خان تمہیں یہ نہیں بتانا چاہتا کہ اب وہ کہاں رہتا ہے اور ہم اسے مجبور نہیں کر سکتے۔ تم چاہو تو تھانے جا کے رپورٹ لکھوا دو کہ میرا دوست وزیر خان مجھے اپنے گھر نہیں بلاتا اور مجھ سے ملنے بھی نہیں آتا۔ دیکھو پھر وہ تمہیں پاگل قرار دے کر بند کرتے ہیں یا وزیر خان کو بلاتے ہیں۔ انہوں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ آئندہ میں ان سے یا دفتر کے کسی فرد سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کروں ورنہ میرے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی وزیر خان کو سب سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں یقیناً وزیر خان کا پتہ معلوم ہے کیونکہ بارہا وہ اس کو اپنی گاڑی میں ساتھ لے جا چکے تھے مگر وہ اس کا پتہ کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔ آخر وہ کیوں نہیں چاہتے کہ وزیر خان کسی سے ملے؟ میں نے سوچا اس میں ان کے لیے خطرے کی کون سی بات ہے؟ کیا وہ وزیر خان کو غلط مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں؟ اور آزاد نظر آنے کے باوجود وزیر خان عملاً ان کی قید میں ہے؟ لیکن وزیر خان کو کیا ہوا ہے؟ وہ ان کے ہاتھوں کھلونا بنے پر کیوں مجبور ہے؟ وہ انکار کیوں نہیں کر سکتا؟ احتجاج کیوں

www.paksociety.com

نہیں کرتا۔ مدد کے لیے پولیس کے پاس کیوں نہیں جاتا اور لوگوں کو کوئی بات کیوں نہیں بتاتا؟ ان تمام سوالوں کا جواب تھا کہ وزیرخان مجبور تھا۔ میرا ذہن ایک دائرے میں گھوم کر پھر وہیں پہنچ جاتا تھا جہاں وزیرخان کی مجبوری۔ کوئی ناقابل فہم، ناقابل بیان اور ناقابل یقین مجبوری اپنے وجود کو تسلیم کرانے پر مصر تھی مگر اس کی نوعیت کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں راتوں کو جاگ کر سوچا کرتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہی کیفیت رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گا لیکن اسی زمانے میں دو اہم واقعات پیش آئے۔ پہلے تو میر وزیر اینڈ کمپنی کی شاہدرہ کے صنعتی علاقے میں منتقل تھی جہاں اس کا نام بدل کر ایم۔ ڈبلیو۔ ڈی کمپلیکس کر دیا گیا (یہ مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ اس کا سبب کاروبار میں تیسرے پارٹنر دلاور کی شمولیت تھی اور یہ میر، وزیر، دلاور کے ناموں کا مخفف تھا۔ ایک معمولی ملازم کی حیثیت سے میں نے مالکوں کے معاملے میں غیر ضروری تشویش کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کی نظر میں میرا وجود بھی کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا تھا اور اگر میں اپنا رویہ نہ بدلتا تو وہ مجھے کب کا نکال باہر کر چکے ہوتے۔ صرف وزیرخان کے متعلق حقیقت جاننے کے لیے میں نے دل پر جبر کر کے خوشامد اور چاپلوسی سے بھی کام لیا ورنہ میں نکال دیا جاتا تو وزیرخان کے بارے میں کوئی بات کیسے معلوم کرتا؟) میں یہ دیکھ رہا تھا کہ وزیرخان کے دستخط اہم کاغذات پر باقاعدگی سے ثبت ہو رہے تھے لیکن مدت سے اسے کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بیمار رہنے لگا ہے اور مسلسل تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد وہ نظر آیا تو دیکھنے والوں کو یقین کرنا پڑا کہ وہ بیمار ہے مگر اس سے میرے یہ اندیشے مٹ گئے کہ وہ مر چکا ہے۔

دوسرا اہم واقعہ تقریباً ایک ماہ بعد پیش آیا جب میں نے وزیرخان کو راہ چلتے دیکھ لیا۔ پہلے تو مجھے شبہ ہوا کہ وہ وزیرخان نہیں، اس کا کوئی ہم صورت ہے مگر قریب پہنچ کے میں سناٹے میں آ گیا۔ چالیس سال سے زیادہ عرصے تک میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا تھا اور میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ میں تو اس کی چال کو بھی دور سے پہچان سکتا تھا۔ پھر اس کے ماتھے پر دائیں جانب مندمل ہو جانے والے زخم کا نشان تھا جو ۱۹۶۵ء کی یادگار تھا۔ اس کی آنکھوں اور بالوں کا رنگ یہاں تک کہ اس کے کپڑے بھی وہی تھے جو میرے لیے اجنبی نہیں تھے لیکن یہ کپڑے انتہائی بوسیدہ تھے اور کثرت استعمال سے پھٹنے والے تھے۔ وہ انتہائی کمزور اور لاغر ہو چکا تھا اور ایک

لاٹھی کے سہارے آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ میں پھر شک میں مبتلا ہو گیا۔ وزیرخان ایک ... تھا اور شاندار گاڑی میں گھومتا تھا۔ وہ اس حال میں کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اس کے ... پیچھے چلتا گیا۔ میرا مقصد صرف یہ دیکھنا تھا کہ ... ہے۔ ایک بار اس کا ٹھکانہ معلوم ہو جائے تو تفصیل بات کی جا سکتی تھی اور پوچھا جا سکتا ... سب چکر کیا ہے۔ اچانک وہ ریلوے ... گیا۔ میں نے اسے ٹی بی کے مریضوں کی قطار ... ہوتے دیکھا جو ڈاکٹر کو دکھانے کے بعد جب ... لیے ایک کھڑکی کے سامنے لگی ہوئی قطار میں ... میں بھی قطار میں شامل ہو گیا۔ اس نے ... مگر میں نے اس کی پرچی دیکھ لی۔ اس پر وزیرخان ... جاتا تھا۔ پھر دوا دینے والے نے شیشی اور پرچی ... منٹ بعد کہا۔ "وزیرخان ... یہ تین گولیاں ... اور مکسچر صبح و شام۔ دس دن کی دوا ہے۔" اس ... ساتھ دس کیپسول اور ایک مکسچر کی شیشی وزیرخان ... گولیاں وزیرخان کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ ... قطار سے الگ ہو کر کوشش کر رہا تھا کہ اس ... کروں جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں اور ان ... کروں جو میرے کانوں نے سنے۔ میرا دل ... رہا تھا اور عقل مجھ سے فریاد کر رہی تھی کہ یہ سب ہے مگر عقل بضد تھی کہ سچ تو سچ ہی رہتا ہے۔

جب وزیرخان اسی طرح لاٹھی ٹیکتا ... دم لیتا اور کچھوے کی طرح رینگتا ہوا واپس روانہ ... اس کے پیچھے تھا۔ مناسب فاصلے سے میں نے ... کا تعاقب جاری رکھا۔ آدھے میل سے بھی کم فاصلہ آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت میں طے کیا اور ... کے دروازے میں داخل ہو گیا جس کے باہر ... کی بجائے "سی ٹی ڈی" کی تختی لگی ہوئی ... صدمہ میرے لیے پہلے سے بھی زیادہ ... تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ سی ٹی ڈی بن جانے ... اصلیت کیا ہے۔ نمک حرام اور بے ضمیر ... وزیرخان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کے ... غبن کیا تھا لیکن عدم ثبوت کی بنا پر عدالت ... کا فائدہ دے کر چھوڑ دیا تھا۔ وہ کمینہ اپنے ... سے دولت مند بنا اور یہ بات بہت سے پرانے ...

... آستین کے گھر میں جانا میری سمجھ میں ... وزیرخان کا آخری ... برداشت جواب دے گئی۔ میں نے چلا کر ... اور اسے چونک کر پلٹتے ہوئے بھی دیکھا ... وزیرخان! ... کے لیے اس کی حالت مجھے دیکھ کر غیر ہو گئی ... خود پر قابو پا لیا اور اچانک اس کی آنکھیں میرے ... اس کی صورت میرے لیے اجنبی ہو گئی ... اجنبی ہو گیا۔

... بھائی؟" اس نے جذبات سے عاری ... لہجے میں کہا۔

"تم ... وزیرخان ... تم؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"لیکن میں تو وزیرخان نہیں ہوں۔" وہ اسی کھوکھلے لہجے میں بولا۔

"تم وزیرخان نہیں ہو؟" میں نے اسی طرح چلاتے ... "اگر تم وزیرخان نہیں ہو تو میری آواز پر چونکے کیوں ... اس پرچی پر تمہارا نام وزیرخان کیوں لکھا ہوا ہے ... ابھی ... اسپتال سے دوا لے کر آ رہے ہو؟ ... آ گیا ہے وزیرخان کہ تم مجھے جھٹلا رہے ہو ... بے وقوف بنانا چاہتے ہو جو پچھلے ... سال سے تمہیں اور تمہاری اگلی پچھلی نسلوں کو جانتا ... کیا چکر چلا رکھا ہے تم نے؟ یہ جو بیٹھے ہیں تمہارے ... سوچ سوچ کے اور لوگوں سے پوچھ پوچھ کے میں ... حیران ہو گیا ہے اور اب تم ملے ہو تو کہتے ہو کہ ... وزیرخان نہیں ہوں۔ قسم خدا کی وزیرخان اگر تم ... یہاں کھینچ لاؤں گا میر شرافت علی کو، گاڑی منگوا ... دفتر کے پرانے لوگوں کو۔ میں اسلام آباد سے ... صاحب کو اور ولایت سے ... خان کو ..."

... اس کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا اور ... آنکھوں میں خوف کے گہرے سائے اتر آئے۔

"اچھا اچھا ... میں مانتا ہوں کہ میں وزیرخان ہوں۔" وہ ... کے بولا یوں جیسے اس کو ڈر ہو کہ کوئی یہ باتیں ... "خدا کے لیے آہستہ بولو۔ میں تمہیں سب بتا دوں گا۔" ... اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور کوٹھی کے پچھلے ... سرونٹ کوارٹر کے ایک کمرے میں ...

"تم یہاں رہتے ہو وزیرخان؟" میں نے کمرے کی ... مفلسی کی منہ بولتی تصویر دیکھ کر کہا۔ "اس ... ایک کمرے میں ہو اور اس شخص کی کوٹھی میں

جو کبھی تمہارا ملازم تھا؟ وہ نمک حرام جس نے تمہارے اعتماد کا یہ صلہ دیا تھا کہ تمہارے ہی مال پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ جس تھالی میں کھایا تھا اسی میں چھید کیا تھا؟ تم نے اپنی وہ ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی، وہ گاڑی اور تمام ساز و سامان بیچ دیا۔ آخر کیوں؟ اور اس کے باوجود آج تمہارے پاس رہنے کو جگہ نہیں۔ تمہاری حالت سے ظاہر ہے کہ تمہارے پاس اچھا کھانے پینے کو نہیں اور تم بیمار ہونے کے باوجود سرکاری اسپتال سے یہ بے کار دوائیں لا کے استعمال کرنے پر مجبور ہو۔ کیا تم میر وزیر اینڈ کمپنی کے مالک نہیں ہو ...؟" مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنی دیر تک بولتا رہا۔ اگر میں نہ بولتا تو رنج و غم اور صدمے کا آتش فشاں اندر ہی اندر میرے وجود کو بھسم کر دیتا مگر یہ لاوا صبر و ضبط کے سارے بند توڑ کر بہہ نکلا۔ وزیرخان سب کچھ ایک مجرمانہ خاموشی کے ساتھ سر جھکائے سنتا رہا۔ بالآخر میں خاموش ہو گیا۔

"منشی!" وزیرخان نے بہت دیر بعد پُرسکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تیری ہر شکایت بجا ہے۔ ہر الزام درست ہے اور ہر سوال جائز ہے لیکن میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کہنا تو چاہتا ہوں مگر نہیں کہہ سکتا۔ میں صرف اپنی مجبوری کا عذر ہی پیش کر سکتا ہوں اور یہ عذر تجھے قبول کرنا ہے کیونکہ یہ بے بنیاد نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا انتہائی مجبوری کے تحت کیا۔ میں پاگل نہیں ہوا تھا اور آج بھی خدا کے فضل سے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پہلے سے کم نہیں۔ میری قوتِ ارادی میں فرق نہیں آیا اور میری قوتِ فیصلہ برقرار ہے لیکن میں کیا کروں، میں مجبور ہوں۔"

میں پھر پھٹ پڑا۔ "تو بکواس کرتا ہے وزیرخان ... جھوٹ بولتا ہے۔ مجبوری کی رٹ لگا کے تو مجھے ٹالنا چاہتا ہے کیونکہ تیرے پاس مجھے مطمئن کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ مجبوری ہوتی ہے غریب آدمی کی، مجبوری ہوتی ہے لاوارث اور بے بس آدمی کی۔ مجبوری ہوتی ہے اس کی جس کے کندھوں پر کسی خاندان کی کفالت کا بوجھ ہو اور یہ بوجھ اٹھانے والا اس کے سوا کوئی نہ ہو۔ مجبوری ہوتی ہے اس کی جو اپنا دکھ کسی کو نہ بانٹ سکے اور جس کا مداوا کوئی نہ ہو۔ تجھے کس بات کی مجبوری ہے؟ تیری مجبوری کا سن کے کوئی ناواقف متاثر ہو جائے تو ہو جائے لیکن میرے سامنے مجبوری کی بات مت کر۔"

وزیرخان نے ایک سرد آہ بھر کے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "تو بھی ٹھیک کہتا ہے منشی! کیونکہ

www.paksociety.com

چالیس سال میں تُو نے کبھی مجھے مجبور نہیں دیکھا۔ تو دعویٰ کر سکتا ہے کہ وزیر خان کو جتنے قریب سے تُو نے دیکھا ہے کسی نے نہیں دیکھا اور تو مجھے مجبور بھی کہہ سکتا ہے۔ لیکن مجھے جھوٹا نہیں کہوں گا کیونکہ میں تیری نیت کے خلوص پر شک کر ہی نہیں سکتا۔ اگر تیرا دل چاہتا ہے تو میری بات مان اور جو تیرا جی چاہے کر لے۔ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا منشی! کہ میری مجبوریوں نے مجھے اس مقام تک پہنچا دیا لیکن میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"کیوں وزیر خان! کیوں؟" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کے کہا۔ "ایسی کون سی مجبوری ہے جس کا ذکر تو میرے سامنے بھی نہیں کر سکتا؟ کیا چالیس سال کی دوستی کے بعد بھی تیرے لیے میری ذات قابلِ اعتماد نہیں؟"

"کیسی باتیں کرتا ہے تو منشی!" وزیر خان نے تڑپ کر بھرے لہجے میں کہا۔ "مجھے بتا کہ کبھی میں نے تجھ سے کوئی بات چھپائی ہے؟ وہ سب باتیں جو تجھے معلوم ہیں جو میں نے اپنی بیوی کو نہیں بتائیں، جو سکندر کو معلوم نہیں اور دنیا میں تیرے سوا ان کا ذکر میں نے کسی سے نہیں کیا۔"

"پھر اب کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا میں بدل گیا ہوں؟ یا میرے بارے میں تیرے خیالات بدل گئے ہیں؟"

"ایسی کوئی بات نہیں منشی!" وزیر خان نے ایک انگلی سے آنکھوں میں آ جانے والے قطرۂ اشک کو جھٹک دیا۔ "میں اپنی مجبوری کا راز افشا ہونے سے ڈرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری زندگی میں کسی کو کچھ معلوم ہو۔ اس زندگی کے اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں، مجھے سکندر کی فکر ہے منشی! اس کی تو ابھی پوری زندگی پڑی ہے۔ خدا اسے اپنی امان میں رکھے۔ اپنا پورا گھر اس وطن کے لیے قربان کر دینے کے باوجود میں پاگل نہیں ہوا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس کی رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے صبر اختیار کیا تھا تاکہ میں سکندر کی پرورش کر سکوں۔ میرے خاندان کے گلشن میں طوفان کی تباہ کاری سے بچ جانے والا ایک ہی تو گلِ آرزو تھا جس سے میں نے مستقبل کی سب توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ اللہ کا بڑا احسان ہے جس نے مجھے اس کے لیے محنت، استطاعت اور زندگی کی فرصت دی۔ آج سکندر میری امیدوں کا جیتا جاگتا نقش ہے اور میرے خوابوں کی مجسم تعبیر ہے۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو کچھ بھی کیا کرتا۔ بے مقصد جینا بھی کوئی جینا ہوتا ہے لیکن میرا مقصد سکندر تھا۔ اب وہی میری مجبوری ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں کامیابی کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد سکندر کے مستقبل

کی خوشی، کامیابی اور خوشحالی کا دشمن ہو جاؤں؟ ... زندگی کو تحفظ کی ضمانت فراہم کرنے کے لیے ... کر رہا ہوں منشی! جسے میں اپنی مجبوری سمجھتا ہوں۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا وزیر خان!" ...

"تو نے جو کچھ کیا سکندر کے لیے کیا۔ لیکن اس ... فائدہ ہوگا؟ تو نے تو اس سے سب کچھ چھین لیا ... کا حق تھا۔ یہ کیسی مجبوری ہے کہ تو نے اپنا سب ... اور یہاں اس حال میں پڑا ہوا ہے۔ کیا سکندر کو ... معلوم ہے؟"

وزیر خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "اسے معلوم ... منشی! بھی ولایت میں پڑھ رہا ہے وہ اپنے کیرئیر ... مگر یہاں آ کے بھی وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا ... خطرات میں گھر جاتا ہے۔ تو اس حال میں بھی ... کہیں اس پر ولایت میں کوئی مصیبت نازل نہ ... دشمنوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں منشی!"

"کون دشمن؟ کیسے خطرات؟ یہ کس کی ..." تو جب میں نے پریشان ہو کے کہا۔ "تو نے کسی کا کیا بگاڑا ... جو کوئی تجھ سے دشمنی کرے گا یا سکندر کو نقصان ... گا؟ خدا کے لیے صاف بات کر کہ تیری اس حالت کا ... کون ہے؟ میں اپنی دوستی کی قسم کھا کے کہتا ہوں ... دشمن کوئی بھی ہو، کتنا ہی طاقتور ہو اور اس کے ... ہی لمبے کیوں نہ ہوں میں اس کو شکست دینا ... اپنی جان قربان کر دوں گا تو یہ تجھ پر کوئی احسان نہ ..."

"تو سمجھتا نہیں منشی!" وزیر خان نے ... بھی کر سکتا تھا، لیکن دشمن کوئی ایک نہیں ہے ... اور ہر طرف شکاری کی طرح گھات میں ہیں۔ میں ... سے مقابلے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ ... کے لیے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ کوئی باپ اپنے ... زندگی سنوارنے کے بعد اس کی راہ میں ... سکتا۔ تو آج کی ملاقات کو بھول جا۔ یہ سمجھ ... چالیس سال تک تیرا دوست رہا تھا، مر چکا ہے ... تو نے جسے دیکھا تھا وہ اس کا کوئی ہم شکل تھا ... سے اس بات کا تذکرہ کیا تو یہ دوستی نہیں دشمنی ... ساتھ بھی، سکندر سے بھی اور اپنے آپ سے بھی ... چلا جا اور دوبارہ کبھی مجھ سے ملنے مت آنا ... آ جانے میں اور تو رات کے اندھیرے میں ...

"نہیں وزیر خان! انجام کچھ بھی ہو ..."

... نہیں کروں گا البتہ یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ ... کو معلوم نہیں ہو گی۔ جینے والا میری یا ... سکتا ہے مگر دینا ممکن ہے ... بچوں کی جان تو لے سکتا ہے ... نچوڑ سکے؟" میں نے کہا۔

"... مجبور ہو گیا۔" اس نے مجھے بتایا کہ میں وزیر اینڈ ... کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ بے شک کاغذات ... اب بھی مالکوں میں میرا نام شامل ہے مگر کاروبار ... انتظامی امور اور عملی طور پر تمام معاملات ... تعلق نہیں رہا۔ سارے فیصلے میر شرافت علی ... ایک نابالغ چوہدری والا دھی پیدا ہو گیا ہے ... شخص جسے میں نے اپنے دستخطوں سے بطور منیجر ... تھا آج سوا بھی مالک بن بیٹھا ہے۔ وہ جہاں کہتے ... دستخط کر دیتا ہوں۔ اس سال تمام اخراجات وضع کرنے ... کا منافع ساڑھے تین لاکھ بنا تھا۔ انھوں نے ... کر کے منافع وصول پایا، اور میں نے دستخط ... مجھے اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں ملا۔

"... بھی چپکا رہ گیا؟" اور یہ ساڑھے تین لاکھ کہاں گئے ... حوالے کیے؟"

"اسی شخص نے جو میری موجودہ حالت کا ذمہ دار ہے" ... کہا۔ "اس نے یقیناً دوسروں کو بھی حصہ دیا ہوگا لیکن ... براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ میری تباہی ... شخص ہے جسے میں نے سب سے پہلے اپنے ... شریک کیا تھا۔ میں انکار کر ہی نہیں سکتا تھا ... پاکستان آیا تھا اور مجھ سے ملا تھا تو مجھے ... کہ مجھ پر کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ ... فطرت سے واقف ہوں لیکن سمجھتا تھا کہ میں ... میں چھوڑ آیا ہوں اور یہاں اس کے شر سے بالکل ... لیکن بہت جلد میری غلط فہمی رفع ہو گئی۔ اس ... سب کچھ چھین لیا۔ میرا بنا بنایا گھر، جما جمایا کاروبار ... اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ میرے جسم ... آخری قطرہ بھی نچوڑ لیتا لیکن وہ دنیا کی نظر میں ... اس لیے مجھے زندہ رکھا لیکن کیا یہ زندگی ... اب لاوارث ہو رہا تھا۔" میرے آنسو ... ملامت اور خیر خواہ کچھ نہیں جانتے۔ ... بدل گیا ہوں۔ مغرور ہو گیا ہوں یا خبطی ہو ... شان و شوکت چھوڑ کے گلبرگ میں کوٹھی بنالی ... نہیں جانتا کیونکہ میں اپنے برابر کے لوگوں

کے علاوہ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ وہ مجھے آتا جاتا دیکھتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ اب میں ان سے بات تک کرنے کا روادار نہیں ہوں۔ معلوم نہیں پیٹھ پیچھے لوگ کیسی کیسی باتیں بناتے ہوں گے لیکن میری کیسی بے بسی ہے کہ میں کسی کو کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔ اپنی صفائی تک پیش نہیں کر سکتا۔"

میں بہت دیر تک دم بخود بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ "وزیر خان! کیا تجھ میں شرافت علی کو قتل کر دینے کی ہمت نہیں تھی؟" میں نے برافروختہ ہو کے کہا۔ "اور اگر نہیں تھی تو تو نے مجھ سے کیوں نہیں کہا۔ کیا ملا تجھے اپنا سب کچھ گنوا کے؟ سکندر کا سب کچھ محفوظ ہو گیا؟ تیرے مصائب کا خاتمہ ہو گیا؟ یہ سلسلہ تو جاری رہے گا۔ وہ اسی طرح تیرا خون چوستا رہے گا اور تو یہاں بیٹھا کڑھتا رہے گا۔ کچھ نہیں کرے گا۔ دنیا میں ایسا کون سا مسئلہ ہے جو حل نہیں ہو سکتا؟ تیرا جوان بیٹا ہے۔ اس کے بازوؤں میں دم ہے اور اس کو تیری قربانیوں کا بھی احساس ہے جو تو نے اس کے بہترین مستقبل کے لیے دیں۔ وہ تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ سکندر تو ولایت میں بیٹھا ہے مگر یہاں میں ہوں..."

"تو کچھ نہیں کرے گا منشی!" وزیر خان نے میری بات کاٹ دی۔ "تو وعدہ کر چکا ہے کہ اس گفتگو کا کسی کو پتہ نہیں چلنے دے گا۔ میں نے اسی لیے تجھے یہ بات بتائی ہے۔ اگر تیری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو اچھا نہیں ہوگا۔ اس کی سزا صرف مجھے ملتی تو کوئی بات نہیں مگر سزا تجھ کو بھی ملے گی اور سب سے زیادہ نقصان سکندر کو ہوگا۔ میری تمام عمر کی محنت اور قربانی رائیگاں جائے گی۔ شرافت علی کو قتل کرنے سے خطرات کم نہیں ہوں گے بڑھ جائیں گے۔"

"اُف!" میں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ "میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا وزیر خان! میں پاگل ہو جاؤں گا اور پاگل پن میں کچھ بھی کر گزروں تو مجھے الزام مت دینا۔ خدا کے لیے مجھے یہ سمجھا دے کہ خطرہ کیا ہے اور کہاں ہے؟ جسے میر شرافت علی نے پیسے پیسے کا محتاج کر دیا ہے۔ تیرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ اب اس سے کیا ڈرنا؟ اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتا ہے؟ ذرا اپنی ذلت کو دیکھ۔ تو اپنے معمولی نوکر کا نوکر ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں تو گلبرگ کی کسی عالی شان کوٹھی میں رہتا ہے اور تو اس سرونٹ کوارٹر میں مر رہا ہے۔ تو ایک فیکٹری کا مالک ہے اور تیرا بیٹا ولایت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اسے بالکل معلوم نہیں ہے کہ میر شرافت علی نے تجھ پر کتنا ظلم ڈھایا ہے۔ کیوں ڈرتا ہے تو میر شرافت علی سے؟ تو اس کے خلاف کسی سے مدد کیوں نہیں

www.paksociety.com

جا سکتا۔ احتجاج اور فریاد کیوں نہیں کر سکتا؟ تو نے اپنا سب
کچھ لٹا دیا تو کیوں؟ تیری کس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اس
نے؟" میں غم و غصہ میں کانپ رہا تھا۔ چلا رہا تھا اور جنون میں
میز پر مکے مار رہا تھا۔ "ٹھیک ہے میں نے وعدہ کیا تھا اور
میں وعدے پر قائم بھی رہوں گا لیکن خدا کے لیے مجھے بتا تو سہی
کہ میر خرافت علی کس طرح مجھے بلیک میل کر رہا ہے؟ وہ اسے
ایسی کون سی بات معلوم ہے تیرے بارے میں؟"

جو کچھ اس کے بعد وزیر خان نے بتایا وہ بہت پرانی باتیں
ہیں لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھے افسوس ہوا کہ میں یہ بات
کیوں بھول رہا۔ اگر مجھے تقسیم ہند سے پہلے کا یہ واقعہ یاد آجاتا
تو شاید اس کلید سے میرے ذہن کے بند دروازے کھل جاتے
اور جو واقعات میرے تصور میں نہ آسکے تھے، آپس کی کڑیاں
مل جانے کے بعد خود بخود سمجھ میں آجاتے۔ میں یہ سرگزشت
وزیر خان کے الفاظ میں بیان کر دیتا ہوں۔

وزیر خان نے کہا "تجھے یاد ہو گا کہ تقسیم سے پندرہ
سولہ سال پہلے ہندوستان میں سول نافرمانی کی تحریک عروج
پر تھی اور یہ آگ پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ
ہر انگریزی چیز کو چھوڑ رہے تھے، خطابات واپس کر رہے تھے
اور انگریزی لباس کو نذر آتش کر رہے تھے۔ نفرت کی یہ آگ بھی
کبھی پرتشدد بھی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ مشتعل ہجوم میں گھر جانے
والے یا جوشیلے یا سرپھرے نوجوانوں کے ہتھے چڑھ جانے والے
انگریز اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ رد عمل کے طور پر
حاکموں کا عتاب نازل ہوتا تھا تو بے گناہ اور گنہگار سب
پکڑے جاتے تھے۔ جیل خانے بھر گئے تھے اور کالے پانی جانے
والوں کو بڑی دھوم دھام سے رخصت کیا جاتا تھا۔ میں بڑے
اچھے عہدے پر فائز تھا لیکن عوامی جذبات کی رو میں بہہ کر میں
نے استعفیٰ دے دیا۔ میں مسلم لیگ کا بڑا جوشیلا اور سرگرم کارکن
تھا۔ شاید تجھے یاد ہو میرے گھر پر بم اسی لیے پھینکا گیا تھا کہ
میں نے مسلم لیگ کا سبز پرچم اتارنے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ
مخلص ساتھیوں نے بھی مجھے مصلحت سے کام لینے سمجھانے
کی کوشش کی تھی اور بعد میں بلوائیوں نے میرے بھرے گھر
کے ایک ایک فرد سے یوں انتقام لیا تھا کہ میں اور سکندر بہ
اتفاق سے بچ گئے تھے۔ خیر اب اس بات کا کیا ذکر کرنا کہ یہ
میری عاقبت نااندیشی تھی یا وہ میرا عزم تھا جس کی خاطر میں
نے ہر قربانی دی۔ لیکن مسلم لیگ سے میری وابستگی کوئی ڈھکی چھپی
بات نہیں تھی۔ میں جلسوں کے انتظام میں پیش پیش رہتا تھا۔
استقبالیہ کمیٹی میں اور انتظام کرنے والوں میں آگے آگے ہوتا
تھا۔ جو کچھ بھی اندوختہ تھا وہ مسلم لیگ کو چندہ ...
میں پہلے اپنے حلقے کا سیکرٹری تھا۔ پھر ...
صوبائی مجلس عاملہ میں آ گیا۔ میری سیاسی ...
کی بھی نظر تھی۔ سول نافرمانی کے دور میں ...
ان رپورٹوں کی بنیاد پر برطرف کر دیا جاتا جو ...
بالا کو ارسال کی گئی تھیں۔ یہی شہرت میرے کام آئی ...
ریاست سلطان آباد کے ولی عہد کا سیکرٹری ...
میری تنخواہ چار گنا تھی۔ مجھے شاہانہ مراعات ...
ریاست کا تحفظ حاصل تھا۔ بہت سے والیان ریاست
کے سرپرست تھے اور نواب احمد جنگ بھی ان ...
مسلم لیگ کے ایک جلسے میں میرا جوش و خروش ...
خیالات سے متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے شاہی ...
اور کہا تھا کہ کبھی ضرورت پڑے تو میں بلا تکلف ...
میں حاضر ہو جاؤں۔ مستعفی ہونے کے بعد فکر معاش ...
ہوا تو میں نواب صاحب کے پاس پہنچا اور انہوں نے ...
لیا۔ نواب صاحب یہ بھی جانتے تھے کہ میں ...
جذباتی اور جوشیلا آدمی ہی نہیں بلکہ دیانت دار ...
بھی رکھتا ہوں اور نہ برطانوی حکومت مجھے ...
دے رہی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سے انگریز
حریت پسند مسلمانوں کو ہمیشہ سر پہ لٹکنے والی خطرے کی تلوار
اور ہندوؤں کے مقابلے میں ان کی وفاداری ہمیشہ مشکوک
رہی۔ میرا استعفیٰ دینا جدوجہد آزادی کی خاطر ...
گیا اور نواب صاحب نے میری قدر کرتے ہوئے مجھے
شہزادہ خورشید عالم کا سیکرٹری اور اتالیق مقرر ...
نواب صاحب اور ان کے فرزند ...
اور فطرت کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق تھا۔
صاحب شفیق اور بردبار، فراخ دل اور شریف النفس
مضبوط کردار کے آدمی تھے۔ ان کی خط و کتابت ...
رہنماؤں سے تھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ان کا ...
بند تھا جس پر وہ بے حد اعتماد کرتے تھے ...
شخص شروع سے اچھا نہیں لگا۔ اس کا نام ...
نے محسوس کیا کہ میرا سلطان آباد آنا بھی اس کو ناگوار ...
میری ذات پر نواب صاحب کی عنایات ...
ناخوش کیا تھا۔ میں نے اس کو ایک ...
اور نظر انداز کر دیا تھا۔ ہماری ذمہ داریاں ...
کی نوعیت میں فرق تھا اور ایک طرح سے ...
الگ ہی تھے چنانچہ ہمارے راستوں کا ایک ...

... ہمارے درمیان براہ راست تعلق نہ ہونے
... کسی مسئلے پر اختلاف رائے کا بھی سوال نہ تھا مگر اس
... کے درمیان پہلے ہی دن سے
... جنگ چھڑ گئی تھی۔ اسے جنگ کہنا
... کیونکہ ہم ایک دوسرے کے دشمن بھی
... بھی نہیں تھے چنانچہ دونوں ایک دوسرے
... دوست ... کرتے تھے۔ اس کشیدگی کو کسی نے کبھی
... کی بنیاد مذہبی عقائد کے اختلاف پر بھی
... سمجھتا تھا کہ کسی ہندو کا مسلم لیگ کے منشور اور
... نظریات سے اتفاق کرنا مشکل ضرور ہے مگر
... کیونکہ بہت سے مسلمان بھی کٹر کانگریسی تھے۔
نواب صاحب کے برعکس شہزادہ خورشید عالم کی
طبیعت بالکل مختلف تھی۔ علاوہ ازیں احباب میں وہ پرنس خرم
... حلقہ میں ایسے حضرات و خواتین کی اکثریت
... سے تعلق رکھتے تھے مگر میرے نقطۂ نظر سے
... طور طریقے معیوب اور غیر مشروط تھے ان کا
... دولت عیش و عشرت کی ہنگامہ آرائی میں صرف ہوتا
... ایک وجہ مصروفیت کا نہ ہونا بھی تھی۔ نوابوں
... کی اولاد فکر معاش سے اور ہر قسم کی
... ذمہ داریوں سے آزاد تھی۔ ان کے پاس خرچ کرنے کو
... بے حساب پیسہ تھا اور بہت فرصت تھی چنانچہ وہ ایک دوسرے
... پارٹیاں دیتے تھے کبھی سالگرہ کے جلسے کبھی تہوار کی
... سال نو کے آغاز پر یہاں تک کہ کرسمس پر بھی
... صاحب بھی بلائے جاتے تھے اور یہ صاحب
... ریذیڈنٹ بہادر کے دوست اور حاشیہ بردار
... تھے۔ انگریزوں نے اپنی حکمت عملی سے ہر ریاست
... ایک غیر مقرر کر رکھا تھا جو ریذیڈنٹ کہلاتا تھا۔
... ریاست اس کے مشورے اور اس کی تائید کے بغیر کوئی
... کرنے کے مجاز تھے اور وہ ایک طرح سے ریاست
... حاکم ہوتا تھا۔ یہ صورت حال کسی کے لیے بھی
... تھی جہاں حاکم یا ریذیڈنٹ میں سے کوئی ایک
... سمجھتا تھا کہ ایک نیام میں دو تلواریں کیسے رہ سکتی
... کام رک جاتے تھے۔ والی ریاست اور
ریذیڈنٹ کا جھگڑا وائسرائے کی کونسل تک پہنچتا تھا۔ حکومت
... اختیارات محدود تھے لیکن مصالحت کی
... صورت نہیں رہتی تو ریذیڈنٹ ہی بدلا جاتا تھا۔
... ریذیڈنٹ جانتے تھے کہ والیان ریاست کی پوزیشن
اب بھی مستحکم ہے اور حکومت انہیں سرکاری ملازم کی طرح نہ تبدیل
کر سکتی ہے اور نہ برطرف کر سکتی ہے۔ چنانچہ وہ "جیو اور جینے دو"
کی پالیسی اپنا لیتے تھے۔ اختیارات کو سوچ سمجھ کر استعمال کرتے
تھے کہ خرابی پیدا نہ ہو اور عموماً والیان ریاست کی برتری کو
تسلیم کرتے ہوئے ان کے دوست بنے رہتے تھے۔

سلطان آباد میں میرے وارد ہونے سے پہلے ایک
معقولیت پسند انگریز بارہ سال تک ریذیڈنٹ رہا اور نواب
صاحب اس کے اخلاق و کردار کی اکثر تعریف کرتے تھے۔ وہ ریٹائر
ہو کے انگلستان چلا گیا تو حکومت نے ایک سرپھرے متعصب
اور تنگ نظر نوجوان کو ریذیڈنٹ بنا دیا جو نواب صاحب کے
مقابلے میں واقعی لونڈا تھا مگر حاکمیت کے نشے میں چور تھا کیونکہ
اس کی شاہی خاندان سے بہت دور کی قرابت داری بھی تھی۔ وہ عام
ہندوستانی کو ڈیم فول کالا آدمی سمجھتا تھا اور کہتا تھا۔ نواب صاحب
نے اپنی فطری بردباری اور عالی ظرفی کے باعث بہت عرصہ
برداشت کیا اور بالآخر مجبور ہو کے وائسرائے سے کہا کہ یا تو اس
ریذیڈنٹ کو والیان ریاست کے ساتھ بیٹھنے کے آداب سکھا
دیے جائیں ورنہ ہم اسے چانٹوں سے جوتے لگوا کر ریاست کی
حدود سے باہر پھینکوا دیں گے۔ وائسرائے کے لیے یہ کوئی نیا
مسئلہ نہیں تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سابقہ ریذیڈنٹ
نے بارہ سال تک اپنے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام
دیے تھے اور اگر وہ ریٹائر نہ ہوتا تو سلطان آباد میں اختلاف
کی نوبت ہی نہ آتی۔ وائسرائے نے اوپر ہی اوپر ریذیڈنٹ کو
سمجھا دیا کہ شاہی خاندان سے تعلق کو بھول جاؤ کیونکہ جن سے
تمہارا تعلق ہے ان کا شجرۂ نسب بھی شاہوں کے خاندان سے
ملتا ہے۔ ریذیڈنٹ وقتی طور پر خون کے گھونٹ پی کر خاموش
ہو گیا مگر اس نے ذلت کا انتقام لینے کے لیے سیاسی چال چلی۔
"تقسیم کرو اور حکومت کرو" انگریز کی ہندوستان میں کامیابی کا
فارمولا تھا۔ ریذیڈنٹ نے ولی عہد سے دوستی گانٹھی۔ وہ دونوں
ہم عمر تھے، دو عورتوں کے ذریعے میل ملاقات بڑھی۔ وہ دونوں سیر و
تفریح اور شکار کے لیے ایک ساتھ جانے لگے اور عیش و نشاط
کی ایسی محفلیں سجانے لگے جہاں رازداری کا خصوصی انتظام
ہوتا تھا اور کسی غیر کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ ریذیڈنٹ
کے بنگلے پر لکھنؤ اور بمبئی سے ناچنے گانے والیاں بلائی جاتی
تھیں۔ رقص و موسیقی کی محفلوں میں شراب و شباب ساتھ ساتھ
چلتے تھے۔ ریذیڈنٹ کی سرکاری رہائش گاہ کو ریذیڈنسی کہا
جاتا تھا۔ یہ طوائفیں خاموشی سے وہیں بلوائی جاتی تھیں اور
وہاں سے رخصت ہو جاتی تھیں۔

www.paksociety.com

میری جان بڑے عذاب میں پھنس گئی تھی۔ کہنے کو میں پرنس کا اتالیق بھی تھا مگر اصل صورت حال یہ تھی کہ اُلٹا پرنس مجھے زندہ رہنے کے طور طریقے سکھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کا نظریۂ حیات صرف یہ تھا کہ ”بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست“۔ وہ کہتا تھا کہ ”میاں وزیر خان! یہ جوانی میں تم نے کیا روگ دے لیے ہیں۔ یہ آزادی اور مسلم لیگ، یہ سیاسی نظریات... میں یہ نہیں کہتا کہ آزادی نہیں ملنی چاہیے یا مسلم لیگ کا کوئی مقصد نہیں۔ آزادی بالکل ملنی چاہیے اور مسلمانوں کو مسلم لیگ کا ساتھ دینا چاہیے مگر تمہاری کوئی سیاست کی عمر ہے۔ ارے بھائی چالیس سال کے ہو جاؤ تو یہ دھندے بھی کر لینا۔ جوانی کے دھندے کچھ اور ہوتے ہیں...“ ظاہر ہے میں اتفاق نہیں کر سکتا تھا۔ صرف ایک بار میں نے کہا تھا کہ ”شہزادہ صاحب! آپ کو امورِ سلطنت اور سیاست سے اتنا بے تعلق نہیں رہنا چاہیے۔ کیونکہ نواب صاحب قبلہ کے بعد ان کی ذمہ داری آپ کو سنبھالنی ہے۔“ تو وہ ہنستے ہنستے بولا تھا کہ ”یار! تم تو بس نام کے وزیر ہو، عقل کے پیدل ہو۔ ذرا سوچو تم کب کی بات کر رہے ہو۔ نواب صاحب ماشاءاللہ جوانوں سے زیادہ صحت مند اور آبا و اجداد کی طرح لمبی عمر پائیں گے تو ابھی اتنا ہی اور جئیں گے۔ معلوم نہیں اس وقت تک ریاست رہتی ہے یا نہیں اور ہم خود رہتے ہیں یا نہیں۔ ہمیں حکومت کرنے کا بالکل شوق نہیں۔ ورنہ باپ کو قتل کر کے تخت پر بیٹھ جانا تو روایت رہی ہے۔ خدا والد ماجد کا سایہ تا ابد سلامت رکھے تاکہ اپنی زندگی بھی اسی بے فکری سے عیش کرتے گزر جائے۔“

پرنس کی عیاشی اور عیش پرستی کی رپورٹ نواب صاحب کو دینا مجھے بے مقصد لگتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ باپ کو اکلوتے بیٹے کے بارے میں یقیناً پہلے سے سب کچھ معلوم ہوگا۔ اگر وہ چشم پوشی کرتے ہیں تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ دونوں طرف سے بدگمانی مول لوں۔ نواب صاحب تو شاید ناگواری سے سب کچھ سن کے بھی خاموش رہیں مگر پرنس فوراً مجھے برخاست کروا دے گا۔ نواب صاحب مجھے اس پر زبردستی مسلط نہیں رکھیں گے بلکہ عین ممکن ہے کہ پرنس اسے انا کا مسئلہ بنا لے تو مجھے اصطبل میں گھوڑے مالش کرنے پر لگا دیا جائے یا ریاست سے نکال باہر کیا جائے ۔۔۔ انگریز کی نوکری میں چھوڑ چکا تھا اور اب ایک طرح سے حکومت کے مخالفین میں شامل تھا۔ ریاست میں رہ کر مجھے تحفظ بھی حاصل تھا اور ہر آسائش بھی میسر تھی لیکن اس سے زیادہ اہم بات میرے لیے نواب صاحب کی مسلم لیگ کی حمایت تھی۔ یہاں میں کھل کھول کر اور بے خوف خطر مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتا تھا۔ چنانچہ [...] پرنس کے ذاتی معاملات سے خود کو الگ رکھنا [...] نکلا کہ پرنس نے مجھے دوست و ہمراز بنا لیا۔ اس محل [...] کے آخری حصے میں تھی اسی حصے میں میرا قیام [...] کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ یہ حصہ باقی محل سے [...] تھا۔ آدھی رات کو عقبی دروازے سے چادروں میں [...] عورتیں اندر آتی تھیں اور صبح کا اجالا پھیلنے سے [...] اکرام لے کر رخصت ہو جاتی تھیں۔ ان میں [...] تخصیص نہیں تھی۔ بس وہ دولت کے جھنکار [...] والی لڑکیاں ہوتی تھیں۔ یہ رہ رہ روزی دیکھنے والا [...] تماشائی میں ہی نہیں تھا۔ محل کے اسی حصے میں [...] بھی تھی۔ اللہ میاں کی گائے جسے ایک بیگم [...] محل میں لا کر کھونٹے سے باندھ دیا گیا تھا۔ ایک [...] حیثیت سے اس کے دل پر جو گزرتی ہوگی اس کا اندازہ [...] کر سکتا تھا لیکن میری طرح وہ بھی مجبور تھی۔ [...] نواب زادوں کی جوانی کے بارے میں پہلے ہی کہا [...] جو کسی کے بس میں نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ پرنس کو [...] دیکھ کر میں نے دبے دبے لہجے میں کہا تھا کہ بیوی [...] ہوتے یہ سب کس حد تک جائز ہے تو پرنس نے [...] تھا ”اے عقل کے اندھے وزیر! یار کیا تو نے [...] گھر کی مرغی دال برابر“۔

اس کے بعد ہونے لگا کہ [...] اپنی جگہ چھوڑ کے نکل گیا اور رات بھر ریذیڈنسی [...] صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے لوٹ آیا۔ جہاں [...] ”ایک سے ایک لاجواب مال ملتا ہے“۔ میں بڑی کو [...] تھا کہ یہ خطرناک ذمہ داری قبول نہ کروں لیکن [...] کے سامنے میری ایک نہ چلتی تھی۔ ایک طرف مجھے [...] کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کسی رات [...] ادھر نہ آ نکلیں یا پرنس کو طلب نہ کر لیں تو [...] پریشانی لاحق رہتی تھی کہ پرنس کی بیوی کو یہ بات [...] تو وہ میرے خلاف طوفان کھڑا کر دے گی اور [...] بھی چین سے نہیں بیٹھے گی کیونکہ وہ خود بھی ایک [...] رئیس کی بیٹی تھی اور اس کے بھائی بڑے [...] میاں بیوی کے تعلقات روایت کے مطابق [...] انتہا کو پہنچ گئے تھے جہاں ازدواجی رشتے [...] بے معنی ہو کر رہ گئی تھی صرف خاندانی وقار [...] اور مذہب یا قانون کے تقاضے علیحدگی کی راہ میں [...]

[...] ان کے بیڈ روم الگ اور اتنے فاصلے پر تھے [...] کی آواز بھی دوسرے کمرے تک نہیں پہنچ سکتی [...] کے باوجود بیوی کو شوہر کے کمرے میں آنے سے [...] سکتا تھا اگر کسی رات وہ دیکھ لیتی کہ ان کے [...] ساتھیوں اور شوہر غائب ہے تو یہ بھی ہو سکتا تھا [...] کہ وہ مجھے قتل کرا دے یا کرا دے۔ اس محل کی [...] کے اندر اس پر کوئی الزام نہیں آ سکتا تھا لیکن مجھ [...] آتا تھا کہ اتالیق ہونے کے باوجود میں نے پرنس کو [...] کی اجازت دی۔ اس کے اخلاق و کردار کو [...] کے بجائے برائی کے راستوں پر چلنے میں اس کی مدد [...] اس طرح نواب صاحب کے اعتماد کو بھی مجروح کیا۔ [...] مجھے پریشان کرتا تھا اور میں یہ سوچنے لگا تھا کہ [...] سلطان آباد سے نکل جاؤں۔ مجھے احساس [...] عیش کی زندگی سے دست بردار ہونا پڑے گا اور [...] معمولی نوکری کرنی پڑے گی۔ جھوٹ بول کر نواب صاحب کو مطمئن کرنا ہوگا کہ میں ان کی عنایات کو ٹھکرانے [...] ہوں اور مسلم لیگ سے جذباتی وابستگی کا خمیازہ [...] بھگتنا پڑے گا مگر میں اس ذہنی عذاب سے تو بچ جاؤں [...] پہلے کہ میں اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی [...] میں اس دلدل میں اور گہرا اتر گیا۔ ایک روز میں ہوا [...] بیٹھا تھا۔

میرے احتجاج کے باوجود پرنس ریذیڈنسی جا چکا تھا [...] ایک آفت جاں، غارت گر ہوش، کافر ادا [...] فرنگ تازہ تازہ ولایت سے وارد ہوئی [...] اس کے عشق نے خانہ خراب نے قیامت [...] قیامت ڈھائی ہے۔ پرنس نے یہ بھی فرمایا تھا [...] کسی اور کے باغ کی زینت ہے لیکن دونوں [...] برابر لگی ہوئی ہے۔ میں نے پرنس کو ایک شادی شدہ [...] سے آگاہ کر دیا تھا کیونکہ وہ بتا یا میں [...] کی بیوی تھی بھی حاکموں کے طبقے میں شامل تھی۔ عشق [...] ہے کیونکہ اس کی خوشبو تو مشک کی طرح [...] خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس پر پرنس نے [...] سینے پر ہاتھ رکھا تھا اور ٹھنڈی سانس لے کے [...] ”حضرت ناصح! یہ عشق نہیں آساں بس اتنا [...] ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔“ [...] بیٹھا میں اپنی افتاد کے بارے میں [...] روشنی گل بھی نہ کی تھی کہ دروازہ کھلا اور

ایک عورت اندر آ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے دیکھتے ہی میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ کون ہو سکتی ہے۔ وہ نوجوان اور صحت مند عورت تھی جس کے حسن و شباب کی دلکشی اور رعنائی کا ذکر کرنے لگوں تو الفاظ کم پڑ جائیں گے۔ اس کے انداز و اطوار میں ایسی شاہانہ تمکنت تھی کہ میں دم بخود اور سحر زدہ بیٹھا رہ گیا۔ محل میں محرم اور نامحرم سے پردے کا اہتمام بہت سخت تھا چنانچہ میں نے اسے کبھی بار دیکھا تھا مگر میں سمجھ گیا کہ وہ پرنس کی بیوی کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔

”بندگی تسلیم بجا لاتی ہے وزیر صاحب!“ اس نے طنز کا تیر چلاتے ہوئے کہا اور معنی خیز طریقے پر ہنسی۔ ”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ بہت صدمہ ہوا ہے مجھے یہاں دیکھ کر؟“

”بیگم صاحبہ...!“ میں نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس وقت یہاں؟ آپ کو تو اپنی خوابگاہ میں ہونا چاہیے تھا۔“

”بجا ارشاد!“ وہ اسی طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”میں اپنی خوابگاہ ہی میں ہوں۔ آپ کو یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ شوہر کی خوابگاہ میں صرف شوہر کو یا اس کی بیوی کو ہونا چاہیے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہاں آپ کیا کر رہے ہیں اور شہزادہ صاحب کہاں ہیں؟“

میں سخت نروس ہو رہا تھا۔ شرمندگی سے میرا سارا وجود پانی بن گیا تھا۔ پرنس کی بیوی کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کی کاٹ تلوار کی دھار سے زیادہ تیز تھی۔ میں بیک وقت اس کے حسن و شباب کی کشش سے مغلوب اور سہما ہوا تھا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔

”تشریف رکھیے وزیر صاحب! پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے۔“ وہ بڑی نخوت کے ساتھ مسہری کے ایک کنارے پر اطمینان سے بیٹھ گئی۔ ”میں آپ کو شرمندہ کرنے نہیں آئی ہوں کہ جو کچھ آپ نے کیا وہ ایک اتالیق کا منصب نہیں تھا۔ مجھے اپنے شوہر کی مصروفیات کا اندازہ نہیں معلوم ہے کہ یہاں کون آتا ہے یا وہ خود کہاں جاتا ہے۔ وہ بیوی ہی کیا جسے شوہر کے پل پل کی خبر نہ ہو خواہ شوہر پل بھر کے لیے بھی اس کی خبر لینے نہ آتا ہو اور جو اس کی رگ رگ سے واقف نہ ہو۔ جو کہنے کو رگ جاں سے بھی قریب تر ہو مگر اتنی دور ہو جتنا آکاش سے پاتال... لیکن میری بدقسمتی کو میری خوش قسمتی مان لیا گیا ہے۔ ایک مزدور کی بیوی اپنے شوہر کا گریبان پکڑ کے پوچھ سکتی ہے کہ بول اتنی دیر سے گھر کیوں آیا لیکن ایک نواب کی بہو اور علی عہد بہادر کی منکوحہ جو محل

www.paksociety.com

میں رہتی ہے، خادموں اور کنیزوں پر حکم چلاتی ہے، دنیاوی مال و متاع کے خزانوں کی چابیاں رکھتی ہے اور بہت اونچی ناک رکھنے والے خاندان کی عزت کہلاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر سے کوئی سوال نہیں کرسکتی کہ میرے مزاج اعروسی کے پہلے چند ماہ کے بعد مجھے میرا حق کیوں نہیں ملا؟"

اب میں اپنی گھبراہٹ پر کسی حد تک قابو پا چکا تھا لیکن میرے لب بند تھے اور میری عقل دنگ تھی۔ مجھے پرنس کی بدنصیبی کا خیال نہیں تھا جو گھر کے کوہ نور کو ٹھکرا کے کوچہ بازار میں ٹھیکریاں چنتا پھر رہا تھا۔ میں دستِ قدرت کے تراشے ہوئے حسنِ بےمثال کے اس پیکر کو دیکھ رہا تھا جس کے لبوں سے نکلنے والا ہر لفظ ٹکسال ہی سے ڈھل کر نکلنے والے چمکتے دمکتے سکّے کی طرح تھا۔ اس کا اندازِ گفتگو، لہجے کی دلآویزی اور آواز کی نغمگی مجھ پر جادو کر رہی تھی۔ مجھے دیوانہ کر رہی تھی۔

"... میں تو آپ سے ایک صاف سیدھی بات کا جواب مانگنے آئی ہوں۔" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "میں آپ کو منصف بنا رہی ہوں کہ مذہب اور قانون کی رو سے کسی کو اس کے جرم کی سزا دینا جائز ہے یا نہیں؟ کیا خون کا بدلہ خون نہیں ہونا چاہیے؟"

میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔ "یہ تو دنیا میں ہوتا ہی ہے اور ہونا بھی چاہیے۔"

"بجا ارشاد۔" وہ مسکرائی۔ "آپ نے انصاف کیا اور اسی فیصلے کی روشنی میں فریادی کے دوسرے سوال کا جواب بھی دیا جائے کہ کیا بے وفائی کے بدلے بےوفائی غلط ہوگی؟ بولیے، جواب دیجیے۔"

"دیکھیے! میں کوئی مفتی، قاضی یا جج تو نہیں ہوں۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

"ہاں، لیکن آپ نے ایک عام آدمی کی طرح اپنی عقل سے کام لے کر فیصلہ کر دیا ہے۔" وہ پھر مسکرائی۔ "میں کب کہتی ہوں کہ یہ عدالتی فیصلہ ہے یا کوئی فتویٰ ہے۔ اب تم اس فیصلے سے انحراف ہی نہیں کرسکتے۔ تم اس پوزیشن میں ہی نہیں ہو کہ انحراف کرسکو۔" وہ آپ سے اچانک تم پر آگئی تھی اور اس کے لہجے میں بے تکلف شوخی کا انداز نمایاں ہونے لگا تھا۔ "تم اپنے ہونہار شاگرد کو بےوفائی کرنے سے نہیں روک سکے تو کیا مجھے روک سکتے ہو؟ ہمت ہے تو انکار کرکے دیکھو۔ میری آواز کے بلند ہوتے ہی کتنے جاں نثار دوڑتے چلے آئیں گے اور اتنی سی دیر میں نواب صاحب کو بھی خبر ہو جائے گی۔"

اس نے مجھے بلیک میل کیا کیونکہ وہ بلیک... پوزیشن میں تھی لیکن سب سے بڑی بات یہ... بلیک میل ہونا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ... نے اس کو امرت کا پیالہ سمجھ کر اٹھا لیا۔ میں... آگ ہے مگر میں نے انگاروں سے دامن بھر... پرنس کو پھر کبھی نہیں ٹوکا اور اس کا رازدار... عشق میں مبتلا تھا۔ وہ دن بدن شدت اختیار... وہ اکثر راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگا لیکن... عدم موجودگی کے ہر لمحے کو غنیمت شمار کیا اور... نایاب کی خوشی سمیٹ لی۔ اس کے جاتے ہی... اس کی خواب گاہ میں خوشبو، رنگ اور لطافت... بدن کے اتر آتی تھی اور صبح سے پہلے میں... لیے دروازے کھول دیتا تھا۔ وہ آتے ہی... کرتا تھا کہ سب خیریت ہے، میاں، خیر ہو ناں... دل ہی دل میں مسکرا کے کہتا تھا کہ شہزادے عالی جاہ... تو آقا ہو یار ہو۔ پرنس کے معاملات آگے بڑھ... بھی محل میں آنے لگی۔ اس کا شوہر کبھی کبھی... لیے دلّی چلا جاتا تھا اور وہ ہر رات لوگوں کے... بعد پرنس کی خواب گاہ تک ایک فرلانگ کا فاصلہ... طے کرلیتی تھی۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ... اس نے کبھی نہیں سوچا کہ اس راہ میں کتنی جان لیوا... خطرات ہیں اور کسی نے اس کو دیکھ لیا تو کیا ہوگا... اس کو چشم براہ ملتا تھا اور صبح سے پہلے پھر خواب... کے دروازے کھلتے تھے تو حویلی کے راز کسی پر افشا... کرتے تھے۔ پرنس کو مجھ پر پورا اعتماد تھا اور اس... گمان میں بھی نہ تھا کہ جو پیار اور اعتماد اپنا... گیا ہے، جب وہ فرنگن پرنس کی خواب گاہ میں... میرے بے فراغت بڑھ جاتی تھی۔ مجھے پرنس کے... لوٹ آنے کا خوف نہیں رہتا تھا اور میں زیادہ... ساتھ اپنی خواب گاہ میں رہتا تھا اور میرے... خواب گاہ کے دروازے بھی کھل جاتے تھے... پرنس کے قدموں نے کئی ماہ سے عبور نہیں کیا تھا۔

یہ انکشاف مجھ پر بہت بعد میں ہوا کہ... شادی شدہ فرنگن کے عشق میں دیوانہ ہو رہا... کی بیوی ہے۔ یہ بات معلوم ہوئی تو میرے... زمین نکل گئی۔ میں جانتا تھا کہ ریذیڈنٹ... کینہ پرور شخص ہے۔ ایک بار پہلے اس کی انا...

اس نے انتقام لینے کے لیے بیٹے کے ہاتھوں باپ کو قتل کرانے کی سازش کی تھی۔ اس نے پرنس سے راہ و رسم اسی لیے بڑھائی تھی کہ اسے نواب صاحب کے خلاف اکسائے، جھوٹی بے بنیاد باتیں بنا کے بدظن کرنے کی کوشش کرے۔ اپنے زرخرید حاشیہ برداروں کی مدد سے افواہوں کا زہر پھیلائے اور پرنس کو حاکم بننے کے جنون میں مبتلا کردے لیکن اس کی سازش ناکام رہی۔ اپنے والد کے بارے میں پرنس کے خیالات کو بدلنا ناممکن تھا۔ ریذیڈنٹ اسے الٹی پٹی پڑھاتا تھا اور وہ جس کے بارے میں کہتا تھا کہ سالا مجھ سے بیر کھانے والا سمجھتا ہے کہ میں کاٹھ کا الّو ہوں۔ "میں تمہارے والد سے بہتر ہونے کی باتیں کرتا ہے۔ ان انگریزوں نے ایسی ہی شیطانی سازشوں سے پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ سلطان آباد میں یہ چکر نہیں چلے گا۔ ہم تخت و تاج کو لات مار سکتے ہیں تو دوسری لات برطانیہ کے شاہی خاندان سے رشتہ ملانے والے کو بھی مار سکتے ہیں... اور یوں آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔ ریذیڈنٹ نے پرنس کو چکر میں ڈال دیا اور خود چکر میں پڑ گیا۔ میں حیران تھا کہ وہ کیسا شوہر ہے جس کو ابھی تک بیوی کے رویے کی تبدیلی سے صورتِ حالات کا کوئی اندازہ نہیں ہوا۔ آزادانہ میل جول ان کی سوسائٹی میں برا نہیں سمجھا جاتا لیکن پرنس جیسے شخص کا اپنی بیوی سے میل جول اسے حد سے زیادہ نہیں لگتا؟ کیا وہ اتنا بے وقوف ہے کہ جائز اور ناجائز تعلق کے فرق کو محسوس نہیں کرسکتا۔ ریذیڈنسی کے لوگ خوار کچھ نہیں دیکھتے اور اسے کچھ نہیں بتاتے؟ اس کے حلقۂ احباب میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ پرنس کے اور اس کی بیوی کے بڑھتے ہوئے تعلق کی طرف نہیں دلائی؟ کیا اس نے کبھی آئینے میں خود کو دیکھ کر موازنہ نہیں کیا کہ پرنس اس کے مقابلے میں کتنا وجیہ، شکیل اور پرکشش مرد ہے؟ اور اس کو بیوی کے رویے کا فرق بھی محسوس نہیں ہوتا؟

میں کچھ دنوں سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک نامعلوم خطرے کا سایہ افق کے آخری کنارے سے اٹھنے والے سیاہ دان کے بادل کی طرح پھیلتا جا رہا ہے۔ یہ خطرہ ہر طرف تھا اور ہر لمحہ قریب آ رہا تھا اور اس کا حصار تنگ سے تنگ تر ہونے لگا تھا۔ کئی بار میں نے اس کو اپنے مجرم ذہن کا احساس سمجھ کے جھٹک دینے کی کوشش کی مگر کوئی غیبی قوت یا میری چھٹی حس مجھے مسلسل خبردار کرتی رہی۔ اچانک ایک دن مجھے نواب صاحب نے تخلیے میں طلب فرمایا۔ ادھر ادھر کی بہت سی باتوں کے بعد انہوں نے کہا۔ "میاں وزیر خان! ہمیں تمہاری دیانت اور صلاحیت پر، تمہارے خلوص اور تمہاری وفاداری پر بہت اعتماد ہے۔"

"حضور کی قدر نوازی ہے۔" میں نے اندر ہی اندر شرم سے پانی پانی ہو کے کہا۔

"تمہارے خیالات اور نظریات بھی ہمیں پسند ہیں۔" انہوں نے ہاتھ پیچھے باندھ کر ٹہلتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "ہم بہت دنوں سے سوچ رہے تھے کہ ایک خاص کام تمہارے سپرد کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس معاملے میں تم رازداری کو شرطِ اوّل تصور کرو گے کیونکہ یہ ہماری عزت کا بھی سوال ہے۔ ہمیں امید ہے کہ تم یہ کام خوش اسلوبی سے کر لوگے۔ اگر تم چاہو تو گیان چند بھی تمہاری مدد کرسکتا ہے کیونکہ وہ قابلِ اعتماد ہے۔"

"آپ حکم کیجیے۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

"معاملہ ہے ریذیڈنٹ کا۔" نواب صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہم نے گیان چند سے بھی ذکر کیا تھا۔ لیکن دوبارہ غور کرنے پر تم ہمیں اس کام کے لیے زیادہ موزوں شخص نظر آئے۔ آج رات..."

نواب صاحب کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ گیان چند اندر آگیا اور اس نے اطلاع دی کہ ریذیڈنٹ صاحب بغرضِ ملاقات تشریف لائے ہیں۔ نواب صاحب نے مجھ سے کہا کہ پھر بات کریں گے اور خود مہمان کی پذیرائی کے لیے باہر چلے گئے۔ میں تمام دن سوچتا رہا کہ نواب صاحب کے کام کی نوعیت کیا ہوسکتی ہے اور وہ کون سا معاملہ ہوسکتا ہے جس کا تعلق ریذیڈنٹ سے ہو۔ نواب صاحب کا مزاج برہم ہوتا تو میں سمجھ لیتا کہ بالآخر ان کے کانوں تک بات پہنچ چکی ہے۔ لیکن وہ بالکل پرسکون تھے۔ میں سارا دن اپنے کمرے سے بھی نہیں نکلا کہ کہیں نواب صاحب دوبارہ بات کرنے کے لیے طلب نہ فرمائیں۔ رات کے کھانے کے بعد میں پرنس سے یہی بات کر رہا تھا کہ گیان چند آیا اور اس نے کہا کہ ریذیڈنٹ صاحب نے گاڑی بھیجی ہے اور تمہیں بلایا ہے۔

"تمہیں بلایا ہے یا وزیر خان کو؟" پرنس نے حیرانی سے کہا۔ "کون لینے آیا ہے؟"

"میر شرافت علی۔ ان کا شوفر۔" گیان چند نے کہا۔

"مگر ریذیڈنٹ صاحب کو وزیر خان سے کیا کام ہوسکتا ہے؟" پرنس نے کچھ پریشان ہو کے کہا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا حضور! لیکن نواب صاحب کا کوئی کام ہوسکتا ہے۔" گیان چند نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

www.paksociety.com

"کیوں وزیر خان؟" اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔

"اچھا اچھا۔ ہم ابھی یہی بات کر رہے تھے۔" پرنس نے مسکرا کے کہا۔ "ٹھیک ہے وزیر خان! نہ ابا حضور کا کام ٹالا جا سکتا ہے اور نہ ریذیڈنٹ بہادر کا حکم۔ تم جاؤ مگر واپسی میں مجھے ضرور بتانا کہ کیا گپ شپ رہی۔"

میں باہر آیا تو ریذیڈنسی کی سیاہ گاڑی کھڑی ہوئی تھی اور میر شرافت علی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ گیان چند نے پچھلا دروازہ کھولا اور خود بھی میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس وقت تک میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ گاڑی کی ڈکی میں ہمارے ساتھ ایک لاش بھی سفر کر رہی ہے!

جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں نے گیان چند سے پوچھا کہ ریذیڈنٹ صاحب کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا ہے۔ "میں پرنس کا سیکرٹری ہوں اور میرا ریاست کے انتظامی معاملات سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور یوں بے پروا بیٹھا رہا، جیسے میری بات اس نے سنی بھی نہیں ہے۔ دوسری بار میں نے شانہ ہلا کے اسے متوجہ کیا اور اپنا سوال دہرایا تو اس نے بڑی رکھائی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور جانتے بوجھتے مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ کشیدگی کے اسباب ہمارے درمیان پہلے سے موجود تھے چنانچہ میں نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے میر شرافت علی کو مخاطب کیا۔ "شرافت علی! کیا تمہیں بھی کچھ معلوم نہیں؟"

"بھائی وزیر خان!" شرافت علی نے نگاہ سامنے رکھی۔ "ایک شوفر کو کیا معلوم ہو سکتا ہے؟"

"شوفر کو راستے تو معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ "اندھیرے راستے پر تم جا رہے ہو وہ ریذیڈنسی کا راستہ نہیں ہے۔ آخر تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"گھبراتے کیوں ہو؟" گیان چند طنز سے بولا۔ "ہم تمہیں قتل کرنے نہیں جا رہے ہیں۔"

"یہ کیا فضول بکواس ہے؟" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "کیا مجھ سے جھوٹ بولا گیا تھا کہ مجھے ریذیڈنٹ نے طلب کیا ہے؟"

اس وقت تک گاڑی کی رفتار میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا تھا اور ہم آبادی کی حدود سے نکل چکے تھے۔ آگے گھنا جنگل تھا اور پھر ایک برساتی ندی تھی جس پر دو پل تھے۔ ایک لکڑی کا پرانا پل جسے صرف پیدل چلنے والے استعمال کرتے تھے اور دوسرا نیا بنا ہوا سیمنٹ کا پل جو گاڑیوں کی آمد و رفت کے لیے مخصوص تھا۔ ندی کے پار پھر جنگل شروع ہو جاتا تھا اور پانچ چھ میل تک سڑک اسی جنگل میں سے ہو کر گزرتی تھی۔ سڑک کے دائیں بائیں درخت اور جھاڑیاں صاف کر کے ایسے کچے راستے بنا دیے گئے تھے جن پر سے جیپ گزر سکتی تھی اور یہ کچے راستے جنگل میں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ جنگل در اصل ریاست کی شکارگاہ تھی اور یہ راستے شکاری رئیسوں اور صاحب بہادروں کے لیے خاص بنوائے گئے تھے۔ عام آدمی کا ان خطرناک راستوں پر گزر نہیں ہوتا تھا۔

گاڑی جب پل کو عبور کر گئی تو میں نے جھلا کر کہا۔ "کیا ریذیڈنٹ صاحب اس جنگل میں ملیں گے؟ میں کوئی شکاری نہیں ہوں۔ ان کے ہم مرتبہ شکاری تو پرنس خورشید ہو سکتے ہیں، ان کا سیکرٹری نہیں ہو سکتا۔ اگر تم لوگ کسی غلط ارادے سے مجھ کو اپنے ساتھ لائے ہو تو یہ بات ذہن میں رکھو کہ میری بات پرنس کے سامنے ہوئی تھی اور انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے کون لوگ لے گئے ہیں۔"

"اگر ریذیڈنٹ صاحب نے اپنی زبان سے کہہ دیا کہ تم کو صرف ریذیڈنسی لے جایا گیا تھا؟" گیان چند نے تمسخر آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بھی کہ وہ تمہارے ساتھ شطرنج کھیلتے رہے تھے تو تم کیا کر لو گے؟ کوئی مانے گا تمہاری بات کہ ہم تمہیں جنگل میں لے گئے تھے؟"

"مجھے معلوم ہے کہ تمہاری طرح ریذیڈنٹ بھی مکار آدمی ہے۔" میں نے حقارت سے کہا۔ "لیکن مجھ میں اس کو منہ پر جھوٹا کہنے کی ہمت ہے۔ وہ کیا کرے گا؟ کیا مجھے توپ دم کرے گا؟ پرنس کو معلوم ہے کہ میں کیسا آدمی ہوں۔ اعتبار وہ مجھ پر ہی کریں گے۔"

گاڑی اچانک سیدھے ہاتھ کے ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔ رات کے اندھیرے میں دونوں طرف کے گھنے درخت اور جھاڑیاں ایک سیاہ دیوار کی طرح نظر آتے تھے لیکن درمیان کا راستہ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی سے منور تھا۔ میں نے چیخ کر شرافت علی کو گاڑی روکنے کے لیے کہا لیکن اس نے رفتار میں اضافہ کر دیا۔ جھاڑیاں اور درختوں کی شاخیں جو راستے پر آگے تک نکل آئی تھیں، گاڑی کی بیرونی سطح سے رگڑ کھا رہی تھیں کیونکہ گاڑی جیپ کے مقابلے میں زیادہ چوڑی تھی۔ میں نے جان کی پروا نہ کرتے ہوئے باہر کودنے کا فیصلہ کیا اور دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ حفاظتی تدبیر کے طور پر اندر سے دروازہ کھولنے والا ہینڈل نکال لیا گیا ہے۔ میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔ ایک گالی دے کر میں نے پیچھے سے شرافت

علی کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔ گاڑی تھوڑا سا لہرائی اور شرافت علی کے بریک لگانے کے باوجود ایک جھاڑی میں گھس کے رک گئی۔

"یہ کیا دیوانگی ہے بھائی وزیر خان؟" شرافت علی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"دیوانگی کے بچے! میں تجھے اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک تو مجھے یہاں لانے کا مقصد نہیں بتائے گا۔" میں نے اس کی گردن پر اپنی گرفت سخت کر دی۔ "میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔ آخر تم لوگوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟"

"میں تمہیں سمجھا دیتا ہوں کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔" گیان چند نے کہا۔ "شرافت علی کو چھوڑ دو اور باہر آ جاؤ۔"

میں نے دیکھا کہ وہ ریوالور لیے باہر کھڑا تھا اور اس نے باہر سے میری طرف والا دروازہ بھی کھول دیا تھا چنانچہ اب میں براہ راست اس کے ریوالور کی زد میں تھا۔ میں نے شرافت علی کو چھوڑ دیا اور نیچے اتر آیا۔ گیان چند اس خیال سے چند قدم پیچھے ہٹ گیا کہ کہیں میں اس پر جست نہ لگا دوں۔

"ابھی تم نے کہا تھا کہ تم مجھے یہاں قتل کرنے کے لیے نہیں لائے ہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے گیان چند کہ میرا وجود تمہاری آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے کم ظرف اور کمینے دشمن ہو۔"

"تم اب بھی غلط سمجھ رہے ہو۔" گیان چند بولا۔ "میں بیوقوف نہیں ہوں کہ تمہیں قتل کر کے پھانسی چڑھ جاؤں۔ ہم یہاں ایک مشن پر آئے ہیں۔ میں اکیلا شرافت علی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے تمہیں بھی ساتھ لے لیا۔ میرے اور شرافت علی کے مقابلے میں تم زیادہ صحت مند ہو اور کام جسمانی مشقت کا ہے۔ ہمیں یہاں ایک لاش کو دفن کرنا ہے۔"

میں ہکا بکا کھڑا ہوا ان دونوں کی صورت دیکھ رہا تھا۔ "لاش کو؟ کس کی لاش کو؟"

"لاش تو لاش ہی ہوتی ہے، اس سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے کہ کس کی لاش ہے۔" شرافت علی نے کہا۔ "ہمارا کام تو اس کو دفن کرنا ہے۔"

"فرق کیسے نہیں پڑتا؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "لاش کسی کے باپ کی ہو، میرے بھائی دوست یا نواب صاحب کی ہو تو کیا میں تم کو زندہ دفن کر دوں گا۔ اور میری جگہ تم ہوتے شرافت علی تو تم بھی یہی کہتے اور یہی کرتے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں میاں وزیر خان!" شرافت علی نے تنک کر کہا۔ "تم بلاوجہ سیریس ہو رہے ہو۔ بات یہ ہے کہ ریذیڈنٹ صاحب سے کچھ نشے میں ایک قتل ہو گیا ہے۔ ہم میں سے کسی کا بھی مقتول کے ساتھ دور کا بھی رشتہ نہیں۔ چنانچہ ہمیں تو صرف ان کی عزت بچانے کی فکر کرنی چاہیے جن کا ہم نمک کھاتے ہیں۔ اس معاملے میں ہر شخص پر تو اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ ریذیڈنٹ صاحب نے یہ کام میرے سپرد کر دیا اور میرے لیے گیان چند کے بعد تم ہی بھروسے کے آدمی ہو کیونکہ تم پرنس کے سیکرٹری ہو اور جانتے ہو کہ ریذیڈنٹ صاحب سے ان کی کتنی پکی دوستی ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے کا کام ہے۔ ہم تینوں مل کر ایک قبر کھودیں گے جس کے لیے ہم سامان اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔ یہ سب کام ایک آدمی رات بھر میں نہیں کر سکتا کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی پیشہ ور گورکن نہیں ہے۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

مجھے اس ماحول میں یہ ہنسی بڑی بھیانک اور دہشت زدہ کرنے والی محسوس ہوئی لیکن شرافت علی پر کوئی اثر نہ تھا۔ "پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ لاش کس کی ہے؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "عورت کی ہے یا مرد کی؟ غصہ اور نفرت کرنا تمہارے صاحب کی فطرت میں شامل ہے۔ اس بدبخت کا نام کیا تھا؟"

"یہ سب باتیں جان کے کیا کرو گے بھائی وزیر خان؟" شرافت علی نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"یہ جانے بغیر میں تمہارے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کروں گا۔" میں نے اپنی ضد برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہے۔" شرافت علی نے کچھ سوچ کے کہا۔ "دنیا میں ایسا ہر روز ہوتا ہے اور ہر جگہ ہوتا ہے۔ ہمارے صاحب بہادر کچھ شوقین مزاج واقع ہوئے ہیں۔ شوقینی ایسے ہی صاحبوں اور رئیسوں کی شان ہے۔ میرے جیسے دال کھانے والے شوقین بننے کی کوشش کریں تو رسوا ہوتے ہیں۔ ایک بدبخت عورت نے صاحب کی مہربانیوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور بعد میں ان کی عزت سے کھیلنا چاہا۔ صاحب کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ اس کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ حاکم لوگ ہیں جن کی عزت رعایا کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہم ہوتی ہے۔ انہوں نے اس داغ رسوائی کو پھیلنے سے پہلے ہی مٹا دیا اور باقی کام ہم جیسے قابل اعتماد نمک خواروں کے سپرد کر دیا۔"

ریذیڈنٹ نے کسی عورت کو قتل کر دیا تھا۔ قانون کی نظر میں یہ جرم تھا اور قانونی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ معاملات انصاف میں حاکم و محکوم اور گورے یا کالے کے درمیان کوئی تفریق نہیں مگر یہ کتابی باتیں عملی زندگی کا حصہ نہیں تھیں۔ خصوصاً اس ریاست کی حدود میں جہاں حاکم اور

www.paksociety.com

محکوم کے درمیان زمین اور آسمان کی دوری تھی۔ حاکموں کا فرمایا ہوا مستند تھا اور قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ محکوم کے لیے کوئی قانون نہیں تھا اور اس کی کوئی آواز نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ شکیلی طبع اور کاروبار شوق میں پولیس اور ریذیڈنٹ ایک دوسرے کے رفیق و راز داں ہیں۔ چنانچہ میرے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ پولیس کو یہ بات یقیناً ناگوار گزرے گی کہ میں نے اس کے ہم مشرب و ہم پیالہ ریذیڈنٹ کی خواہش کا احترام کیوں نہیں کیا۔ اور جس عورت نے ریذیڈنٹ کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تھی اس کے قتل پر خاموشی سے پردہ ڈالنے والوں کے ساتھ تعاون کیوں نہیں کیا۔ اس راز سے آشنائی کے بعد خود میری ذات کا تحفظ بھی اخفائے راز سے وابستہ تھا۔ بصورت دیگر افشائے راز کے امکانات کو ختم کرنے کے لیے میرا خاتمہ ناگزیر ہو جاتا۔

ہم تینوں نے اپنے کپڑے اتارے اور صرف انڈر ویئر پہنے قبر کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ رات اندھیری تھی اور آسمان پر گہرے سیاہ بادل برسنے کو تیار کھڑے تھے۔ شرافت علی نے کام کا آغاز کیا لیکن دس منٹ بعد ہی اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کا بدن پسینے میں تر ہو گیا اور سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ اس کے الگ ہوتے ہی گیان چند نے بیلچہ سنبھالا اور پندرہ منٹ کام کر کے الگ ہو گیا۔ قبر ابھی آدھا فٹ گہری بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سر جھکا کے زمین کھودنی شروع ہی کی تھی کہ ایک کوندا سا لپکا اور میں نے سر اٹھا کے دیکھا تو شرافت علی اور گیان چند ساتھ ساتھ بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ شرافت علی نے کہا کہ بجلی چمک رہی ہے جلدی کرو۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ وہ بجلی کی چمک نہیں تھی۔ اس کے بعد گرج کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ میں پھر اپنے کام میں لگ گیا اور آدھے گھنٹے تک ادھر ادھر دیکھے بغیر مٹی کھودتا رہا۔ اس دوران میں بجلی دو مرتبہ چمکی اور ہر بار مجھے پہلے کی طرح یوں لگا جیسے خیرہ کن روشنی آسمان سے نہیں اتری ہے لیکن کچھ دیر بعد وقفے وقفے سے بجلی نے بادلوں میں رعنائی شروع کی اور گرج کی آواز بھی میرے کانوں تک پہنچی تو میرے ابتدائی شکوک خود بخود مٹ گئے۔ دو گھنٹے کی مسلسل اور جاں گسل کوشش کے بعد ہم چھ فٹ لمبی اور تین فٹ گہری قبر کھود کے فارغ ہوئے تو شرافت علی نے ڈکی کھولی اور مجھ سے لاش اٹھانے کو کہا۔ گیان چند ابھی ابھی کھدائی سے فارغ ہو کے بیٹھا تھا اور آرام کر رہا تھا۔ شرافت علی دبلا پتلا کمزور آدمی تھا چنانچہ میں نے عورت کی لاش کو ڈکی میں سے کھینچ کر نکالا

اور دونوں ہاتھوں میں اس طرح اٹھا لیا کہ میرا ایک بازو عورت کی کمر پر شانوں سے ذرا نیچے رہا تو دوسرا گھٹنوں کے نیچے۔ عورت کی ڈھلکی ہوئی گردن پیچھے جھول رہی تھی اور اس کے بال تیز ہوا میں اڑتے رہے۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کے مردہ جسم سے اٹھنے والی خوشبو جانی پہچانی لگی۔ میں اس بدبخت اور بدکردار عورت کا چہرہ دیکھنے سے عمداً گریز کر رہا تھا کیونکہ اس کی صورت کا تصور مجھے بعد میں پریشان نہ کرے۔ اضطراری طور پر گھبرا رہا تھا کہ ویسے بھی چہرے کے نقوش دکھائی نہ دیتے تھے۔ لاش کو قبر میں سیدھا لٹا رہا تھا کہ بجلی بالکل میرے سر پر چمکی اور میں سیدھا کھڑا ہو گیا اور میں نے قبر کے باہر کی سمت شرافت علی کو بیٹھے دیکھا۔ اسی وقت فلیش کی خیرہ کن روشنی میرے منہ پر پڑی اور میں ساری بات سمجھ گیا۔ میرے شکوک بے بنیاد نہیں تھے۔ پہلے بھی تین بار کیمرے کی فلیش لائٹ روشن تھی جس کی چکاچوند کو شرافت علی نے آسمانی بجلی کی چمک قرار دیا تھا حالانکہ بادلوں میں چمک اور گرج کا سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا تھا۔

میں نے شرافت علی کو ایک غلیظ گالی دی اور قبر سے باہر نکلنا چاہا۔ میں اتنا مشتعل تھا کہ شرافت علی میرے ہاتھ آ جاتا تو میں اس کو بھی کیمرے سمیت زمین میں گاڑ دیتا۔ شرافت علی نے پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک اور تصویر اتار لی اور میں ابھی باہر آیا بھی نہ تھا کہ گیان چند نے میرے سر پر ربڑ کی بنی ہوئی سخت گیند جیسی کوئی چیز گھما کے ماری۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میرا بھیجا ہل گیا اور میں ایک سیکنڈ میں بے ہوش ہو کر واپس قبر کے اندر لاش کے اوپر جا پڑا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اس جنگل کے بجائے ریذیڈنسی کی وسیع عمارت کے ایک کمرے میں صاف ستھرے بستر پر اپنے صاف ستھرے کپڑے پہنے لیٹا ہوا تھا۔ میرے ہاتھوں، چہرے یا سر پر مٹی کا ایک ذرہ تک نہ تھا۔ یہاں تک کہ میرے جوتے بھی پالش سے چمک رہے تھے۔ میرے سر پر چوٹ کا کوئی نشان نہیں تھا لیکن سر کے اندر درد کا ایک سمندر موجزن تھا۔ مجھ پر نقاہت طاری تھی اور آنکھیں کھول کر دیکھنے سے مجھے اپنے اطراف کمرے کی دیواریں گردش کرتی ہوئی ہوتی تھیں۔ پھر بھی میں نے دیکھ لیا کہ شرافت علی میرے قریب گرم دودھ کا گلاس لیے کھڑا ہے اور گیان چند مستعدی کے قریب ریوالور لیے بیٹھا ہے۔ تھوڑا سا دودھ حلق سے اتارنے کے بعد مجھے اپنی حالت میں افاقہ محسوس ہوا۔ ہوش و حواس کے ساتھ میری جسمانی توانائی بحال ہونے لگی اور میں اس قابل

ہو گیا کہ بیٹھ کر بات کر سکوں۔ "شرافت علی!" میں نے اپنا سر تھام کے کہا۔ "تم نے مجھے کیوں دھوکا دیا تھا؟"

"اس کے بغیر تم وہ سب کچھ کرنے پر تیار نہ ہوتے۔" شرافت علی نے خباثت سے ہنس کر کہا۔ وہ اب مجھ سے کچھ فاصلے پر کرسی پر جا بیٹھا تھا۔ "اور بھی یہ کام تم سے ہی لینا تھا۔"

"آخر وہ عورت کون تھی جس کو دفن کرنے کے لیے صرف میری خدمات حاصل کرنا ضروری ہو گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "یہ کام تو اس ریاست میں کوئی مزدور بھی کر سکتا تھا۔"

"اس کی وجہ تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گی وزیر خان!" گیان چند نے دور سے کہا۔

"وہ تصویریں تم نے مجھے بلیک میل کرنے کے لیے اتاری ہیں؟" میں نے کہا۔ "لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میں پولیس کا سپاہی یا ماتحت ہی نہیں قابل اعتماد دوست بھی ہوں۔ تم میرے خلاف جو ثبوت چاہو لے آؤ۔ پولیس صرف میری بات پر اعتبار کرے گی۔"

"قبل از وقت دعویٰ کرنا بے وقوفی کی دلیل ہے وزیر خان!" شرافت علی نے کہا۔ "تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ ابھی کسی کے سامنے کوئی بات نہ کرو۔ تم کچھ بھی ثابت نہیں کر سکو گے۔"

"مجھے کسی ثبوت یا گواہ کی ضرورت نہیں۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "میرا گواہ پولیس ہے۔"

"پولیس؟" شرافت علی نے قہقہہ مارا۔ "پولیس اور ریذیڈنٹ تو آج ہی صبح اکٹھے آگرہ گئے ہیں اور شاید دو دن بعد واپس آئیں گے۔ بے شک پولیس کو معلوم ہے کہ تم کو ریذیڈنٹ نے بلوایا تھا اور شرافت علی کو گاڑی دے کر بھیجا تھا۔ یہ بات تو ریذیڈنٹ صاحب نے بھی اب تک پولیس کے سامنے تسلیم کر لی ہو گی کہ تم گزشتہ شب دس منٹ کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے بتایا ہو گا کہ تمہیں ایک خط ذاتی طور پر پولیس کو پہنچانے کے لیے طلب کیا گیا تھا مگر بعد میں ریذیڈنٹ صاحب نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اس کے بعد خود پولیس سے بات کر لی۔ ان دونوں کا آگرہ میں کوئی خاص پروگرام تھا۔ تم جانتے ہو کہ ان دونوں کے خاص پروگرام کیا ہوتے ہیں۔" شرافت علی مجھے آنکھ مار کے بے شرمی سے ہنسا۔ "نواب صاحب کو تو بیٹے کی مصروفیات کی کوئی خبر نہیں اور انہیں بے خبر رکھنے کے متمنی تم بھی ہو۔ اس لیے نواب صاحب کے سامنے تم لب نہیں کھول سکتے۔ گزشتہ رات کے واقعات کا ذکر کرو گے تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارو گے۔ سوائے شرمندگی کے حاصل کچھ نہ ہو گا۔ گیان چند صبح ہونے سے پہلے ہی واپس پہنچ گیا تھا۔ نواب صاحب نے اس کو معمول کے مطابق محل میں

موجود پایا تھا لیکن تم غائب تھے۔ ممکن ہے پولیس کو واپس آنے کے بعد یہ بات یاد آ جائے اور وہ تم سے پوچھے کہ رات بھر بارش میں تم کہاں رہے تھے جب ریذیڈنٹ صاحب نے تو دس منٹ بعد ہی تمہیں واپس بھجوا دیا تھا اور میں بتاؤں گا کہ تمہیں محل کے دروازے پر چھوڑ گیا تھا تو تمہارے لیے اپنی صفائی میں کچھ کہنا زیادہ مشکل ہو جائے گا۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔۔۔ جھوٹ کہتے ہو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "میں تمہاری اس ناپاک سازش کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ پولیس کی واپسی سے پہلے ہی میں نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر سارے واقعات من و عن بیان کر دوں گا اور ان کو سیدھا اس مقام تک لے جاؤں گا جہاں تم نے ... قتل کیا ہے تو ریذیڈنٹ نے پولیس نے یا میں نے نہیں اور نواب صاحب اس لڑکے سے پہلے بھی شکست کھا چکے ہیں اور اب بھی اس کی ایسی تیسی کر سکتے ہیں۔"

وہ دونوں ایک ساتھ ہنسے جیسے یہ سب مجذوب کی بڑ ہے اور ان باتوں کا کوئی مطلب نہیں۔

"وزیر خان صاحب! آپ پہ کوئی پابندی نہیں۔۔۔" گیان چند نے طنز سے کہا۔ "اس وقت سہ پہر کے تین بجے ہیں۔ نواب صاحب قیلولہ فرما رہے ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہو کے کچھ عرض کرنے سے پہلے وہ جگہ دیکھ آؤ جہاں بقول تمہارے گزشتہ رات ایک عورت کو دفن کیا گیا تھا۔ اول تو تم شکارگاہ کے بھول بھلیوں جیسے کچے راستوں پر گھنٹوں بھٹکتے پھرو گے اور بالفرض محال اس راستے پر جا نکلے تب بھی اس جگہ کی نشاندہی کرنی ناممکن ہو گی۔ آدھی رات کے بعد سے صبح تک ہونے والی موسلا دھار بارش نے سارے نشانات مٹا دیے ہیں اور زمین برابر کر دی ہے جیسے میلوں تک پھیلی ہوئی زمین۔ تمہیں نواب صاحب کو اپنے ہمراہ لے جا کر بڑی خفت کا سامنا ہو گا۔ ہم خود بھی نہا دھو کر کپڑے بدل چکے ہیں۔ گاڑی ریذیڈنٹ صاحب لے گئے ہیں اور انہیں گاڑی بالکل دھلی دھلائی اور صاف ملی تھی۔ اتنا تو پولیس کو بھی یاد رہے گا کہ صبح گاڑی کے پہیوں پر کیچڑ کا داغ تک نہ تھا اگر غلاظت اور گھاس پھونس ہوتی تو وہ فوراً نوٹ کر لیتے اور ریذیڈنٹ صاحب بھی شرافت علی پر ناراض ضرور ہوتے۔ یہاں ریذیڈنسی میں ایسا کوئی نہیں جو کہہ سکے کہ گاڑی رات بھر باہر رہی ہے۔ اب تم اپنی حالت پر غور کرو۔ تمہیں کہیں مٹی نظر آتی ہے؟ تمہارے ناخن تک صاف ہیں اور جوتوں کی پالش تک خراب نہیں ہوئی۔ تین فٹ گہری قبر کھودنے والے کی حالت ایسی ہوتی

www.paksociety.com

ہے یہ نواب صاحب تم پر کیسے یقین کر لیں گے وزیر خان کہ تم جھوٹ نہیں بول رہے ہو؟"

میں چپ بیٹھے ہوئے مہرے کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ چکی تھی کہ شرافت علی اور گیان چند نے اپنے جرم کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا ہے۔ مجھے یقین آنے لگا تھا کہ اس نامعلوم عورت کے اصل قاتل وہی دونوں ہیں۔ ریذیڈنٹ کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہوگا اور تصویریں اتارنے کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ ملزم مجھے بنا دیا جائے۔ شرافت علی کبھی میرا دوست نہ تھا اور گیان چند سے میری پرانی دشمنی تھی۔ اب اس نے مجھے بلیک میل کرنے کا ایک وسیلہ پیدا کر لیا تھا اور یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ اپنے کون سے شیطانی عزائم کی تکمیل چاہتا ہے۔ اس کا مقصد مجھے ریاست سے فرار ہونے پر مجبور کرنا تھی۔

"اب میں تو چلتا ہوں۔" گیان چند نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "نواب صاحب جاگنے والے ہوں گے۔" اس نے دیوار جیب میں ڈال لیا۔ جسمانی طور پر وہ دونوں مجھ سے کمزور تھے اور انہیں ڈر تھا کہ ہوش میں آنے کے بعد میں مشتعل ہو کے ان پر حملہ نہ کردوں لیکن اب میری حالت کو دیکھتے ہوئے یہ خوف باقی نہیں رہا تھا۔ میں اس قابل بھی نہ تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکوں۔ کمرے کے ایک گوشے میں تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبا بہت موٹے ربر کا ہوز پائپ پڑا تھا جس کے ایک کنارے میں لکڑی کا گول سلنڈر جیسا ٹکڑا فٹ کر دیا گیا تھا۔ لکڑی کے ٹکڑے اور ہوز پائپ کا قطر برابر تھا لیکن ربر میں تھوڑی سی لچک کے باعث پھیلنے کی گنجائش تھی اور لکڑی کا وہ ٹکڑا ربر کے پائپ میں زبردستی ٹھونسا گیا تھا چنانچہ اس کا کنارہ تقریباً تین انچ تک باقی پائپ کے مقابلے میں پھولا ہوا نظر آتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ جسے میں نے کسی سخت چیز سمجھا تھا وہ اسی پائپ کا پھولا ہوا حصہ تھا اور پائپ گھما کر میرے سر میں مارنے سے بیرونی چوٹ نہیں آئی تھی مگر اندر سے میرے دماغ کی مشینری کا ہر پرزہ ہل گیا تھا۔

گیان چند کے جانے کے بعد شرافت علی نے اپنی حفاظت کے لیے ہوز پائپ اٹھا لیا اور ایک دو بار ہوا میں گھما کر مجھ پر واضح کیا کہ وقت ضرورت یہ ہتھیار دوبارہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

"شرافت علی!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "گیان چند سے میں نے کبھی بھلائی کی توقع نہیں رکھی۔ وہ ہندو ہے اور میں مسلمان ہوں لیکن ہمارے درمیان اختلاف کی وجہ یہ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ انتہائی چالاک کینہ اور سازشی ذہن کا مالک ہے جو کسی طرح نواب صاحب کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ نواب صاحب خود شریف، اصول پسند اور فراخدل ہیں۔ اس لیے وہ دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر میں گیان چند کے ظاہر و باطن کا فرق دیکھ رہا ہوں۔ وہ مجھ سے ڈرتا ہے اور میرا پتا کاٹ دینا چاہتا ہے لیکن تم سے میرا کوئی اختلاف نہیں اور اس رات سے پہلے ہمارا تعلق برائے نام تھا۔ آخر تم نے گیان چند کے ساتھ مل کر میرے خلاف سازش کیوں کی؟"

شرافت علی کچھ دیر ہوز پائپ لیے مجھ سے دور دور کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "نوکری کسی بھی ہو مجبوری ہوتی ہے وزیر خان! اور یہاں تو غلامی ہے۔ اب یہی دیکھو کہ ایک مسلمان ہونے کے باوجود میں نے ہندو کا ساتھ دیا اور تم سے دشمنی کی حالانکہ تم نے میرا کچھ نہیں بگاڑا تھا لیکن میں کیا کرتا؟ میں ریذیڈنٹ صاحب کا حکم کیسے ٹالتا۔ ریاست میں دوہرے اقتدار کا حکم چلتا ہے۔ ایک نواب صاحب کا اور دوسرا ریذیڈنٹ کا۔ حقیقت یہ ہے کہ گیان چند خود میرے پاس نواب صاحب کا پیغام لے کر آیا تھا۔ اس عورت کو نواب صاحب کی خواہش اور ان کے حکم کے مطابق قتل کیا گیا تھا۔"

"اس کا ... اس کا مطلب یہ ہے۔۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "کہ وہ کہانی جھوٹی تھی جو تم نے مجھے سنائی تھی؟"

"ہاں۔ گیان چند کے سامنے میں سچ نہیں بول سکتا تھا۔" شرافت علی نے کہا۔ "ویسے تو خود ریذیڈنٹ صاحب بھی اس عورت کی وجہ سے پریشان تھے لیکن وہ اسے قتل شاید نہیں کر سکتے تھے۔"

"میرا ذہن یہ بات تسلیم نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "نواب صاحب کا اس عورت سے کیا تعلق ہے؟ اور اگر وہ ریذیڈنٹ کے لیے مسئلہ بنی ہوئی تھی تو نواب صاحب نے اس کو کیوں قتل کرایا؟"

"میرا خیال تھا وزیر خان کہ تم سمجھ جاؤ گے کیونکہ تم ذہین آدمی ہو۔" شرافت علی نے مایوسی اور افسردگی سے سر ہلایا۔ "تم خود بھی بالواسطہ طور پر ملوث تھے۔"

"میں؟" میں نے بے اختیار چلا کے کہا۔ "کیا تمہارا دماغ خراب ہے۔ اب تم مجھے بھی اس معاملے میں گھسیٹ رہے ہو جس کی میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔"

"جھوٹ مت بولو وزیر خان!" شرافت علی نے دھیمی آواز میں کہا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ نواب صاحب کے لڑکے شہزادہ خورشید عالم کے اور ریذیڈنٹ کی بیوی کے درمیان ناجائز تعلقات ہیں؟ کیا تم اس راز سے واقف نہیں تھے کہ پرنس رات کو محل سے غائب ہو کے کہاں جاتا ہے؟ یہ نہیں تو یہ بھی علم ہوگا کہ ریذیڈنٹ کی بیوی نے کتنی راتیں پرنس کی خواب گاہ میں گزاری ہیں۔ جب ریذیڈنٹ سرکاری کام سے دہلی گیا ہوا تھا۔ تم پرنس کے اتالیق تھے اس کے اخلاق و کردار کے ذمہ دار تھے۔ پھر تم نے یہ بات کیوں چھپائی۔ نواب صاحب کو کیوں نہیں بتایا کہ ان کا فرزند آگ سے کھیل رہا ہے؟ عشق تو آدمی کو اندھا کر ہی دیتا ہے۔ وہ دونوں سمجھتے تھے کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں اور انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا لیکن تمہاری عقل پر کیسا پردہ پڑ گیا تھا؟ لالچ کا کیونکہ پرنس تمہیں انعام و اکرام سے نوازتا تھا؟"

خوف اور حیرت سے میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی نہ رہی تھی اور میں بے حس و حرکت بیٹھا رہ گیا تھا چنانچہ میں تردید بھی نہ کر سکا کہ پرنس نے مجھے اس کا کوئی معاوضہ نہیں دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ غلط ہو رہا ہے اور ایک نہ ایک دن اس عشق کے چرچے نواب صاحب کے کانوں تک پہنچیں گے اور جرم میں بھی گردانا جاؤں گا مگر زبان خلق پر آ جانے والی بات کیسے چھپی رہ سکتی ہے اور عشق کی آگ بھڑکتی ہے تو جلنے والوں کے سوا دھواں سب کو نظر آتا ہے۔ میں شرافت علی کو کیسے سمجھاتا کہ یہ غلطی مجھ سے مجبوری میں سرزد ہوئی تھی اور مجھے اندازہ نہ تھا کہ آگے مجبوریوں کا ایک سلسلہ ہے جس سے نکلنا میرے اختیار کی بات نہ رہے گی۔ میں نجات پانے کی جتنی کوشش کروں گا اتنا ہی اس میں اترتا چلا جاؤں گا۔

"شرافت علی! کیا یہ بات نواب صاحب کو معلوم ہے... کہ میں بھی...؟" میں نے بے ربط الفاظ میں اپنے دل کی بات زبان سے کہنے کی کوشش کی۔

"پرنس کے بارے میں نواب صاحب کو یقیناً بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا۔" شرافت علی نے کہا۔ "لیکن وہ ریذیڈنٹ سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ کسی اور کی بیوی ہوتی تو نواب صاحب اس کے وارثوں کو اٹھوا لیتے اور خاموشی سے سمجھا دیتے کہ میاں! اپنے گھر کی عزت سنبھالو اور اپنی اوقات مت بھولو۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھنے کی گستاخی کر رہی ہے پھر بھی اگر سمجھ نہ آتی تو زندہ دفن کروا دیتے۔ لیکن اس انگریز ریذیڈنٹ کے حاکم سے بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ خود نواب صاحب اس کو منہ نہ لگا سکے۔ اس کی بیوی کے متعلق کچھ کہتے ہوئے ڈرتے تھے کہ ریذیڈنٹ اسے الزام اور اپنی عزت پر حملہ سمجھے گا تو نواب صاحب کو بھی بے عزت کرنے کا بدلہ لے گا یہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ منع کرنے سے یا سمجھانے سے پرنس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اگر وہ عقل سے کام لے سکتا تو یہ حماقت ہی کیوں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے ان کو یہ خبر دینے والا گیان چند ہی ہوگا۔ اسے تم سے پرخاش تھی چنانچہ اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔ تم جانتے ہو نواب صاحب آنکھ بند کر کے گیان چند کی بات پر اعتبار کر لیتے ہیں۔ گیان چند نے ناقابل تردید ثبوت اور شہادت مل جانے کے بعد ہی نواب صاحب کو بتایا ہوگا کہ پرنس کیسے خطرناک کھیل میں مصروف ہے اور جسے آپ نے اتالیق مقرر کیا تھا وہ پرنس کا معاون و مددگار بن گیا ہے۔ ریذیڈنٹ کے ذہن میں ایسا کوئی خیال نہ تھا لیکن نواب صاحب کو خیال ضرور آیا ہوگا کہ ریذیڈنٹ جیسا کینہ پرور آدمی رقابت کے جذبات سے مغلوب ہو کر ان کے اکلوتے بیٹے کو مروا دے گا۔ عین ممکن ہے گیان چند نے نواب صاحب کو اپنی آنکھوں سے سب کچھ دکھا دیا ہو جس کے بعد شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہی ہو۔ نواب صاحب کے لیے یہ بھی ناممکن تھا کہ پرنس کو قید کر دیں اور اس عورت سے نہ ملنے دیں اور یہ بھی ناممکن تھا کہ ریذیڈنٹ کو

سسپنس ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ
جسے قارئین آج تک نہیں بھولے
طالوت
۴ حصوں میں مکمل
قیمت فی حصہ ۔/۴۰ روپے | ڈاک خرچ فی حصہ ۔/۱۰ روپے
□ پُراسرار کہانیوں کے شائقین کے لیے
□ طنز و مزاح پسند کرنے والوں کے لیے
□ جاسوسی کہانیوں کے پرستاروں کے لیے
ایک دلچسپ داستان جو آج تک آپ نے نہیں پڑھی ہوگی!
کتابی شکل میں تیار ہے
اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہ راست ہم سے منگوائیں
ڈاک خرچ معاف
کتابیات پبلیکیشنز پوسٹ بکس ۱۳۴ کراچی

اپنی بیوی میت ریاست سے نکلوادیں۔ چنانچہ انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا جو سب سے کم خطرناک تھا۔"

شرافت علی کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ میرے کانوں نے سزائے موت کے فیصلے کی طرح سنا جس کے خلاف اپیل کی گنجائش نہ ہو۔ گیان چند محل کے اندر ہی رہتا تھا اس نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہوگا یا کسی سے پوچھا ہوگا تو اس نے خود جاسوسی کی ہوگی تاکہ میرے خلاف جرم ثابت کر سکے۔ ایک بار شک ہو جانے کے بعد اس کے لیے چوری چھپے میری اور پرنس کی نقل و حرکت کی نگرانی کرنا مشکل نہ تھا۔ ہم مطمئن تھے کہ دیکھنے والا کوئی نہیں لیکن کسی تاریک گوشے، کسی بند دریچے یا کسی جھاڑی کی اوٹ سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے چشم دید گواہ بھی پیدا کر لیے ہوں گے یا خود نواب صاحب کو دکھا دیا ہوگا کہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ نواب صاحب نے مجھے طلب فرما کے پرسش کیوں نہیں کی۔ اگر ان کو تمام حالات کا علم ہو چکا تھا تو انہوں نے مجھے قصوروار کیوں نہیں سمجھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ ولی عہد بہادر کی رنگین مزاجی کے بارے میں پہلے سے جانتے تھے۔ کون باپ ہے جو بیٹے کی فطرت سے ناآشنا رہتا ہے۔ پرنس کے سابقہ کارنامے بھی ان سے پوشیدہ نہ رہے ہوں گے مگر وہ چشم پوشی پر مجبور تھے۔ ایک اس لیے کہ پرنس ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ شہزادہ تھا۔ مجھے بھی انہوں نے مجبور سمجھ کر معاف کر دیا ہوگا کہ میں بیکرٹری بھی تھا اور اتالیق بھی لیکن درحقیقت میں پرنس کا ملازم تھا اور اس کے حکم یا اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ مجھ سے پہلے کسی نے پرنس کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی ہوتی تو براہِ راست پرنس نے اسے برطرف کر دیا ہوگا۔ چنانچہ نواب صاحب نے مجھے مورد الزام اور شریکِ جرم ہونے کی سزا نہیں دی اور خود ہی معاملات کو درست کر دیا۔

"شرافت علی! تم نے بتایا نہیں کہ نواب صاحب کا انتخاب کردہ سب سے کم خطرناک طریقہ کیا تھا؟" میں نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔

"یار وزیر خان! کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو؟" شرافت علی نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں اس کی نگاہ میں دنیا کا سب سے بڑا احمق ہوں۔ "یہی انہوں نے وہی کیا جو حالات کا تقاضا تھا۔ انہوں نے گیان چند سے کہا کہ وہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔ جیسے بھی ہو اس معاملے کو ختم کرو اور گیان چند نے معاملہ ختم کر دیا۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔"

"کیا بک رہے ہو؟" میں نے وحشت زدہ ہو کے کہا۔ "کیا گیان چند نے ریذیڈنٹ کی بیوی کو قتل کر دیا ہے؟"

"تمہارے خیال میں وہ عورت کون تھی جسے پچھلی رات دفن کیا تھا؟" شرافت علی نے جھنجلا کر کہا اور اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کے میری طرف پھینکا۔ "یہ تصویریں ابھی دو گھنٹے پہلے دھل کر تیار ہوئی ہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

کانپتے ہاتھوں سے میں نے تصویریں نکالیں۔ پہلی تصویر پر نگاہ پڑتے ہی میرے ذہن میں ایک خوفناک دھماکا ہوا جس نے میرے ہوش و حواس مختل کر دیے۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں میں ریذیڈنٹ کی بیوی کی لاش اٹھائے کھڑا تھا۔ اور پس منظر میں وہ قبر تھی جو ایک ویران جنگل کے کسی گمنام مقام پر کھودی گئی تھی۔ پھر دوسری تصویر میرے سامنے آگئی۔ میں تین فٹ گہری قبر میں لاش کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ ایک اور بدکاری کا ہوا جس کے بعد میں ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔ تصویریں میرے ہاتھ سے گر گئیں اور میں نے عالم دیوانگی میں شرافت علی پر جست لگائی لیکن وہ تیار تھا اور اسی وقت کے انتظار میں ہونٹ بھینچے بیٹھا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے ہاتھ گھمایا اور مجھے یوں لگا جیسے من بھر کا پتھر شہابِ ثاقب کی طرح میرے سینے پر آ گرا ہو۔ پل بھر کے لیے میں بے دم ہو گیا مگر جنون کی کیفیت میری طاقت بن گئی اور میں پھر شرافت علی کی طرف لپکا ہوا تھی دیر میں چند قدم دور جا کھڑا ہوا تھا اور بڑی خباثت سے ہنس رہا تھا۔ دوسری مرتبہ وہ ہوا جب میری دائیں ٹانگ پر ٹھوکر سے ذرا اوپر لگا۔ میری دائیں ٹانگ بیکار ہو گئی اور میں نیچے گر رہا تھا کہ شرافت علی نے میری دوسری ٹانگ بیکار کر دیا۔ وہ مجھے جان سے نہیں مارنا چاہتا تھا ورنہ میرے سر کا نشانہ لیتا یا میری گردن توڑ دیتا لیکن اس نے مجھے اٹھنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ جب میں گر گیا تو اس نے میرے شانوں پر ضرب لگائی اور میرے ہاتھ بھی ناکارہ ہو گئے۔

"مسٹر وزیر خان! ریذیڈنٹ کی بیوی کو تم نے قتل کیا ہے، صرف تم نے۔" وہ میرے مفلوج جسم پر جھک کے بولا۔ "جناب نواب صاحب نے یہ کام گیان چند کے سپرد کیا تھا مگر قاتل تم ہو اور اس کا ثبوت یہ تصویریں ہیں۔ اس میں دھیان چند ہے اور نہ میں ہوں۔ گیان چند نے نواب صاحب کو خوشخبری دی ہے اس میں بھی تمہاری فرض شناسی اور جاں نثاری کو سراہا گیا ہے کہ گیان چند نے اس مصیبت سے نجات پانے کے

نے مشورہ کیا اور تم نے لکھے ہی سب کچھ کر لیا کیونکہ اتالیق کی حیثیت سے تم پرنس کی بہتری چاہتے تھے لیکن کچھ کہتے ہوئے ڈرتے تھے۔ نواب صاحب کا اشارہ پا کے تمہارا خوف دور ہو گیا اور اب نواب صاحب کو تم سے کوئی گلا نہیں۔ وہ خوش ہیں کہ تم نے اتنا بڑا مسئلہ ختم کر دیا۔ ... مگر وزیر خان! بیوقوف پرنس نے یہ تصویریں دیکھ لیں تو تمہارا انجام کیا ہوگا یہ بھی سمجھ لو کہ ریذیڈنٹ کی نگاہ میں ابھی تک اس کی بیوی نے جرم بے وفائی نہیں کیا تھا۔ وہ بے وقوف اور عقل کا اندھا اپنی بیوی کو روز اول کی طرح وفادار سمجھتا تھا۔ یہی تصویریں اس نے دیکھ لیں تو کیا وہ اپنی باوفا اور شوہر سے محبت کرنے والی بیوی کے قاتل کو معاف کر دے گا؟ تم بیک وقت پرنس اور ریذیڈنٹ کے قہر و غضب کا نشانہ بنو گے تو تمہیں کون پناہ دے گا؟ نواب صاحب؟ شاید وہ اس حد تک تمہاری مدد کر دیں کہ تمہیں بحفاظت ریاست کی حدود سے باہر پہنچا دیں کیونکہ یہاں رہ کر تم جیل میں تمہارے بادشاہ کا دکھ کرنا ہو انجام نہیں دے سکتے۔ لیکن ایک بات اور بھی ہے جس کا علم ابھی تک صرف گیان چند کو ہے یا مجھے ہے اور وہ ہے تمہارے اور پرنس کی بیوی کے مراسم کی بات... تم نے نواب صاحب کے خاندان کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اگر یہ بات نواب صاحب کے علم میں لائی گئی تو تمہارا ٹھکانہ کہاں ہوگا وزیر خان؟"

میری نظروں کے سامنے بار بار اندھیرا پھیل جاتا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرا وجود اس تاریکی میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ قصوروار میں نہیں تھا، پرنس تھا جس نے مشرقی ماحول کی پروردہ، عالی نسب اور حسن و جمال میں بے مثال بیوی کو چھوڑ کے ایک فرنگن کے عشق کا طوق گلے میں ڈال لیا تھا۔ اگرچہ وہ رعنائی و دلکشی اور معیارِ حسن کے اعتبار سے پرنس کی بیوی کا پاسنگ بھی نہ تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ دیارِ غیر سے آنے والی یہ عورت اس کی کیسے ہو سکتی ہے جبکہ وہ اپنے شوہر کی نہ ہوئی... اور یہ نہیں سوچا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے اور جس دن بیوی کی بے وفائی اور بدمستی کا دم بھرنے والے پرنس کی دغابازی کا علم ریذیڈنٹ کو ہوگا، اس کی غیرت کہاں جائے گی۔ انہیں یہ بھی پتا نہ ہوگا کیونکہ ریذیڈنٹ بہرحال ایک مرد تھا جو کتنا ہی بے غیرت کیوں نہ ہو، بیوی کے معاملے میں مکمل ملکیت اور احساسِ ملکیت اس کی فطرت کا جزو ہیں اور اس کی انا کو ٹھیس پہنچے تو جوشِ انتقام میں مہذب ترین معاشرے کا فرد بھی حیوان بن جاتا ہے... اور اس نے سوچا کہ وہ بیوی کی بھی عورت ہوتی ہے جسے شرافت

اور نجابت اور ظاہری حسن کے معیار سے پرکھنے کے بعد سنگین دیواروں کے حصار میں قید کر دیا جائے جہاں اس کے جذبات اور امنگوں کی فریاد سننے والا کوئی نہ ہو اور اس سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اپنی خواہشات کو ان دیواروں کی آبرو پر قربان کر دے گی۔ قصوروار اس عورت کی انا تھی جسے ایک کمتر عورت نے شکست دی تھی اور اس سے وہ مرد چھین لیا تھا جس کو اس نے سب کے سامنے اپنے سر کا تاج، اپنا سہاگ اور اپنا مجازی خدا تسلیم کیا تھا۔ اس کا انتقامی ردعمل فطری تھا۔ اس کے شوہر نے دوسری عورت کی خاطر اسے چھوڑ دیا تھا۔ اس نے دوسرے مرد کی خاطر شوہر کو چھوڑ دیا۔ اگر وہ بزدل اور کم ہمت عورت ہوتی تو شاہی محل کی خواب گاہ کی تنہائی میں دیواروں سے سر پھوڑ کے مر جاتی... لیکن اس نے وفائی کا بدلہ بے وفائی سے لیا اور انجام کی پروا نہیں کی۔ اپنی خواب گاہ کی قید تنہائی سے فرار ہوتے ہوئے اس کو خیال تو آیا ہوگا کہ پکڑے جانے کی صورت میں خاندان کے ناموس کو خاک میں ملانے کی سزا بھی موت ہوگی مگر وہ پہلے ہی زندہ درگور تھی۔ خودکشی کر کے یا گھٹ گھٹ کر جان دینے سے اس نے یہ بہتر سمجھا ہوگا کہ اس خاندان سے وہ سب خوشیاں چھین لے جو اس کا حق ہونے کے باوجود اسے نہیں ملی تھیں اور مرنے سے پہلے اپنی حویلیوں میں رہنے والے کھوکھلی عزت کے پاسبانوں کے منہ پر وہ سیاہی مل جائے جسے وہ دنیا سے چھپائیں تب بھی آئینے میں ان کو اپنا چہرہ سیاہ دکھائی دے۔ قصوروار وہ ریذیڈنٹ بھی تھا جس کی آنکھیں کچھ دیکھنے سے قاصر تھیں یا جو انتہائی بے غیرت تھا اور اپنی بیوی کو بھی طوائف سمجھتا تھا جسے حصولِ مقصد کی خاطر استعمال کیا جا سکے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ قصوروار صرف وہ دوسرے تھے، قصوروار میں بھی تھا۔ مجھے روزِ اول ہی نواب صاحب کو بتا دینا چاہیے تھا کہ میں شہزادے کا اتالیق تو کیا سیکرٹری بھی

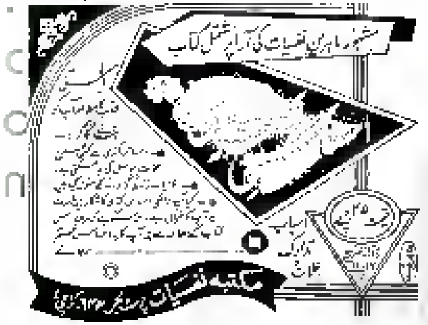

www.paksociety.com

نہیں بن سکتا لیکن مجھے اچھی تنخواہ اور پُرآسائش زندگی کی ہوس نے روک لیا۔ میں نتائج کی پروا کیے بغیر نواب صاحب کو بتا سکتا تھا کہ پرنس کی مصروفیات کیا رنگ لا سکتی ہیں مگر خوف نے میری زبان پکڑ لی۔ میں موقع ملتے ہی باعزت طور پر ریاست سے جا سکتا تھا مگر مجھے پرنس کی بیوی نے اسیر کر لیا۔ اور اب بھی صورتِ حال یہ تھی کہ ہر قصور کی سزا صرف میرا مقدر ہو چکی تھی سوائے میرے کوئی بھی قصوروار نہ رہا تھا اور میں ہر طرف سے محصور ہو گیا تھا۔ واپس آنے کے بعد ریذیڈنٹ اپنی بیوی کی پُراسرار گمشدگی پر ہنگامہ برپا کرے گا تو رپورٹ وائسرائے تک جائے گی۔ ایسی صورت میں صرف ایک تصویر مجھے تختۂ دار تک پہنچانے کے لیے کافی ہو گی۔ بشرطیکہ اس مقدمۂ قتل کی سماعت مکمل ہونے تک پرنس نے بھی مجھے زندہ چھوڑا۔ شدتِ جذبات میں اپنی محبوبہ دلنواز کے قاتل کو معاف کرنا اس کے بس میں نہ ہوگا۔ نواب صاحب بھی مجھے بچانا ضروری نہیں سمجھیں گے اور یہی کہیں گے کہ وزیر خان! اگر تم نے شروع میں ہی خبردار کر دیا ہوتا تو ہم اس فتنے کا سدِباب کر لیتے اور نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

مجھے معلوم نہیں کہ شرافت علی کب گیا۔ کتنی دیر تک بولتا رہا اور میں کب سے زمین پر پڑا ہوں۔ جب مجھے ہوش آیا اور میں اس قابل ہوا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کے چل سکوں تو میں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا جسے شرافت علی کھلا چھوڑ گیا تھا۔ درمیان میں پہنچ کر میرے قدم رک گئے۔ فرش پر وہ چار عدد تصویریں بکھری پڑی تھیں جو میرے جرم کا منہ بولتا ثبوت فراہم کرتی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر میری ذہنی کیفیت میں ایک غیر متوقع تبدیلی آئی۔ یکلخت اپنی مجبوری اور بے بسی کا احساس انتقام کی آرزو میں ڈھلنے لگا۔ گیان چند اور شرافت علی نے مل کر میرے خلاف ایک ایسی سازش کی تھی جو مجھے قتل کرا دینے کی کوشش کے مترادف تھی لیکن میں ان کی سازش کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ وہ اتنی آسانی سے مجھے شکار نہیں کر سکیں گے۔ اگر وہ مجھے بلیک میل کرنے کی سوچ رہے ہیں تو میں ان کے مطالبات کے سامنے سر جھکانے کے بجائے ان کو مار کے مرجانے کو ترجیح دوں گا۔ اس سے پہلے کہ مجھے میرے ناکردہ گناہوں کی سزا ملے میں ان دونوں کو اپنا جرم میرے سر تھوپنے کی سزا ضرور دوں گا۔ اس کے بعد کچھ بھی ہو۔ ان کے پاس نگیٹو ہے اور اس سے جتنے پرنٹ چاہیں بنوا سکتے ہیں۔ بعد میں کوئی کاپی پرنس یا ریذیڈنٹ کو بھیج سکتے تھے۔ تختۂ دار پر مجھے یہ اطمینان تو حاصل ہوگا کہ مجھ سے پہلے میرے قاتل مارے گئے۔ میں نے تصویروں کو جیب میں ڈالا اور باہر نکل کے دیکھا تو خود کو عقبی حصے میں پایا۔ ایک صحیح فیصلے پر پہنچ جانے کے بعد میں کچھ پُرسکون ہو گیا تھا۔ میں نے ریذیڈنسی کے دوسرے ملازموں سے پوچھا کہ شرافت علی کہاں ہے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ بھی چلا گیا ہے اور وہاں سے آگرہ جائے گا اور واپسی پر گاڑی ٹھیک کر کے لا سکے۔ ریذیڈنٹ صاحب بھی آگرہ گئے تھے۔ دوسرے ملازم مجھے پہچانتے تھے چنانچہ میری خواہش پر انہوں نے مجھے چائے اور کھانے پینے کی چیزیں لا کر دیں۔ آدھے گھنٹے تک میں ریذیڈنسی کے لان پر اکیلا بیٹھا رہا۔ میں بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا اور جلد سے جلد فیصلہ کرنا چاہتا تھا لیکن میرا ذہن اس طوفانی سمندر کی طرح تھا جس میں جگہ جگہ گرداب ہوں۔ بپھری چٹانیں ہوں اور مخالف ہوا ہو جس سے کشتیوں کا دم ٹوٹ جائے۔ جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو میری حالت بہتر تھی۔ گزشتہ شب سے اب تک کے واقعات کسی ڈراؤنے خواب کی طرح لگتے تھے مگر وہ چار تصویریں جو میری جیب میں تھیں مجھے مسلسل یقین دلا رہی تھیں کہ حقیقت سے کہیں مفر نہیں۔ محل میں پہنچنے کے بعد دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ گیان چند بھی نواب صاحب سے تین دن کی چھٹی لے کر چلا گیا ہے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ دونوں خوفزدہ ہو کے فرار ہو گئے ہیں۔ ان کو یقین ہو گا کہ ہوش و حواس بحال ہونے کے بعد میرا پہلا ردِعمل انتقامی ہو گا۔ خیر میں نے اپنے آپ سے کہا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ میرا فیصلہ قطعی اور اٹل ہے۔ اتفاق سے میرا سامنا نواب صاحب سے بھی ہو گیا اور انہوں نے اخلاقاً پوچھا کہ خیریت تو ہے؟ کئی دن سے نظر نہیں آئے اور کچھ بیمار سے لگتے ہو۔ میں نے طبیعت کی معمولی سی خرابی کا بہانہ کیا اور کہا کہ میں آج کچھ سویا ہوا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ پرنس کے ساتھ آگرہ ہو آتے تو طبیعت بحال ہو جاتی اور میں شکریہ ادا کر کے لیبارٹری میں گھس گیا۔ میرا جسم رات بھر جاگنے، محنت مشقت کرنے اور اس کے بعد شرافت علی کے تشدد کا نشانہ بننے کی وجہ سے ٹوٹ رہا تھا اور مجھے آرام کی سخت ضرورت تھی لیکن اس ذہنی کیفیت میں نیند کا آنا محال بلکہ ناممکن نظر آتا تھا۔ چنانچہ موقع پاتے ہی میں پرنس کی بیوی کے کمرے میں گھس گیا جو کمرے میں موجود نہیں تھی۔ تھوڑا سا تلاش کرنے پر مجھے ٹیبل کی ایک دراز میں سے سکون بخش گولیاں مل گئیں۔ خوراک کی مقدار کا اندازہ کیے بغیر میں نے آدھی شیشی

اور اپنے کمرے میں پہنچ کر پانی کے ساتھ نگل گیا۔ عین وقت پر مجھے ان تصویروں کا خیال آیا جو میری جیب میں تھیں اور میں نے انہیں تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ بیس منٹ تک میں بستر پہ پڑا چھت کو گھورتا رہا۔ سفید بے داغ چھت سینما کا اسکرین بن گئی اور اس پہ گزشتہ شب کے واقعات کی فلم چلنے لگی۔ پھر دوا کا اثر شروع ہوا اور میرا تصور بھٹکنے لگا۔ باری باری میں نے وہ سب مناظر دیکھے جو خوف نے کر الاشعور کی گہرائی میں نقش کر دیے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو پھانسی کے تختے پر دستِ جلاد کی ایک جنبش کا منتظر دیکھا جس کے بعد میرے جسم کو موت کے اندھے کنویں میں غائب ہو جانا تھا۔ پھر میں نے پرنس کو دیکھا جس کی آنکھوں سے مجنوں کی طرح وحشت ٹپک رہی تھی اور وہ چلا رہا تھا۔ "مارِ آستین! تو نے میری محبت کو ڈس لیا۔" اور اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ہنٹر تھا جو وہ میری لاش پہ برسا رہا تھا۔ میں نے ریذیڈنٹ کو دیکھا جو دیوار سے میرے سر کا نشانہ لیے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "یو ڈرٹی بلیک مین! وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی جس کو تم نے مردود کیا۔ وہ ہمارا وائلٹ تھا اور ہمارا دل۔" آخری منظر میں جو بہت تند لگا تھا میں نے نواب صاحب کو ہاتھ بڑھاتے اداس اور خوفزدہ اپنے جاہ و جلال اور وقار کے ساتھ دو لاشوں کے پاس بیٹھے دیکھا۔ ان میں سے ایک لاش میری تھی اور دوسری پرنس کی بیوی اور نواب صاحب کی بہو کی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "افسوس کہ ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ اب ان لاوارثوں کی لاش کے ٹکڑے شکارگاہ میں بکھیر دو تاکہ کل تک ہماری خاندانی عزت سے کھیلنے والوں کی ناپاک ہڈیاں بھی گدھ اور بھیڑیے کھا جائیں۔" جیسے جیسے سکون بخش گولیوں کا اثر بڑھتا گیا، تصورات کی پرچھائیاں زیادہ بے ربط ہونے لگیں اور پھر غائب ہو گئیں جو درحقیقت ہوش سے بیگانگی تھی۔ ہر چند کہ میری ذہنی انتشار کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ سکون دینے والی دواؤں کا اثر بھی عارضی ثابت ہوا اور رات کے کسی پہر میں بھیانک خوابوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ اتنی زیادہ مقدار کے باوجود لاشعور پر دواؤں کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ پھر نیم بیداری کے عالم میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پرنس کی بیوی مجھے جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ میرے گالوں پہ طمانچے مارے۔ یہاں تک کہ میں آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو گیا اور اس کا دھندلایا ہوا چہرہ مجھے صاف نظر آنے لگا۔

"وزیر خان، دیکھو میری طرف۔" اس نے مجھے پانی کے چھینٹے مارنے شروع کیے۔ "دیکھو میں کون ہوں۔ پہچانتے ہو نا مجھے؟"

میں نے سر کو آہستہ سے اقرار میں ہلایا۔ "تم... پرنسس ایمیتہ ہوئٹ۔" میں نے آنکھیں بند کر کے بڑبڑانا شروع کیا۔ "اور میں وزیر خان... مجھے سب یاد ہے... ہم اس دنیا میں ملے تھے جہاں تمہارا شوہر عیاش اور بے وفا شوہر تھا... اور وہ بدمعاش... گیان چند تھا... اور اس کا ساتھی شرافت علی تھا... ان دونوں نے... ہم دونوں کی جان لی تھی۔ وہ قاتل ہیں... مگر وہ زندہ ہیں اور ہم مر چکے ہیں..."

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو وزیر خان!" وہ میرے شانے کو ہلا کے بولی۔ "دیکھو، یہ وہی دنیا ہے اور ہم دونوں زندہ ہیں۔"

میں نے آنکھیں کھول کر اسے غور سے دیکھا۔ "ہم دونوں زندہ ہیں؟ کیوں زندہ ہیں؟"

"اچھا دیکھو اب سونا نہیں ہے۔ میں تمہارے لیے گرم چائے لائی ہوں۔" وہ بولی۔ "میں تمہیں سہارا دیتی ہوں، اٹھ کر بیٹھو۔ شاباش۔"

اس نے تھرماس میں سے بغیر دودھ اور چینی کی چائے کے دو گھونٹ زبردستی میرے حلق سے اتار دیے تو میں اپنی طرح ہوش میں آ گیا۔

"یہ کیا حماقت کی تھی تم نے؟" وہ مجھے تکیوں کے سہارے بٹھا کے بولی۔ "اگر وہ گولیاں زیادہ طاقت کی ہوتیں؟"

"تم کو کیسے معلوم ہوا کہ میں نے تمہاری گولیاں کھا لی ہیں؟" میں نے کہا۔ میرا سر اب بھی بھاری تھا لیکن تلخ چائے نے تریاق کا کام کیا تھا۔

"تم جلدی میں دراز کھلا چھوڑ آئے تھے۔" وہ بولی۔ "اور شیشی بھی اوپر رکھی تھی چنانچہ میں نے فوراً دیکھ لی ورنہ مجھے رات کے وقت معلوم ہوتا۔"

"اور اس وقت تک میں واقعی عالمِ ارواح میں ہوتا۔" میں نے ہاتھ بڑھا کے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا۔

"اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔" وہ بولی۔ "تم پوری شیشی کھا لیتے تو زیادہ سے زیادہ بے ہوش ہو جاتے لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ کل رات تم کہاں تھے اور واپس آ کے خودکشی کی یہ کوشش کرنے کا مقصد کیا تھا؟" اب تک اس کا رویہ ہمدردانہ اور حوصلہ افزا تھا مگر یکلخت وہ برہم ہو گئی۔

میں بہت دیر تک کشمکش میں مبتلا رہا۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ تمام واقعات بتا دینے سے مصلحت کے تقاضے تو نظر انداز نہیں ہوں گے۔ بیشک

ابھی تک اس نے بڑی سمجھداری کا ثبوت دیا تھا اور اپنے ہی میری حالت سنبھالنے میں کامیاب رہی تھی لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ حقائق سے آگاہی کے بعد اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟

"کیا بات ہے وزیر خان؟" وہ مجروح لہجے میں بولی۔ "کیا کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتے؟ کسی کا ڈر ہے تمہیں؟ یا مجھ پر اعتماد نہیں ہے تمہیں؟ تمہاری صورت سے لگتا ہے کہ تم برسوں کے بیمار ہو۔ تمہاری آنکھوں میں دہشت زدہ کر دینے والی ویرانی نظر آتی ہے تو تمہارے ماتھے پر احساسِ جرم و ندامت کی تحریر ہے۔ ایسا کیوں ہے وزیر خان؟ کیا یہ میری نظر کا دھوکا ہے؟ بولو۔ کچھ تو کہو۔" وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ "کیا دنیا میں کوئی میرا نہیں ہوگا۔ شوہر نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے میں نے تمہیں اپنایا تھا اور تم بھی مجھے اس بے درد دنیا کے حوالے کر کے جانا چاہتے ہو؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارے بعد خود اپنی نظروں میں گر کے جینا میرے لیے ناممکن ہوگا۔"

میں اسے روتا ہوا دیکھتا رہا۔ ہر قطرۂ اشک تیزاب کی طرح تھا جو میرے سینے پر فکر و غم کی بھاری چٹان کو کاٹ رہا تھا اور میرا بوجھ کم کر رہا تھا۔ ایک شاہی خاندان کی پروردہ، ایک والیِ ریاست کے اکلوتے بیٹے کی بیوی۔ دولت اور اختیارات کی مالک پرنس امینہ صرف ایک عورت رہ گئی تھی۔ ایک ایسی عورت جس کا دامن خوشیوں سے خالی تھا اور وہ جھولی پھیلائے مجھ سے پیار مانگ رہی تھی۔ اعتماد کی بھیک چاہتی تھی اور تحفظ کی طلب گار تھی۔ اس کے بدلے وہ مجھے بھی پیار، اعتماد اور تحفظ دے سکتی تھی چنانچہ میں نے اس کو سب کچھ بتلا دیا۔ پرنس کی عیاشی کی روداد سے کر اپنی ذات پر آنے والے ہر الزام تک اس سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ میں نے اعتراف کیا کہ میں نے اپنی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے پرنس کی زندگی سنوارنے کی بجائے اسے بگاڑ دی اور اس طرح نواب صاحب کے اعتماد کو بھی دھوکا دیا اور پھر پرنس کے اعتماد کو بھی۔۔۔ اور انجام کار نوبت یہاں تک آ گئی کہ اب مجھے جینے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ گیان چند اور شرافت علی جیسے شیطان مجھے ہر طرح سے بلیک میل کر سکتے ہیں اور ان کی بات نہ ماننے سے میری ہی نہیں امینہ کی عزت اور زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

اُس نے میری بات بڑی توجہ سے سنی لیکن پریشان بالکل نہیں ہوئی۔ "جہاں تک میرے سرتاج ولی عہد بہادر کا تعلق ہے۔" اس نے میری بات ختم ہونے کے بعد کہا۔ "اُن کے اخلاق و کردار کو تم نے نہیں بگاڑا۔ تم سے پہلے بھی کئی اتالیق اس جرم میں بڑی ذلت کے ساتھ رخصت کیے جا چکے ہیں کیونکہ انہوں نے سچ مچ اتالیق بن کے شہزادے کی اصلاح کرنا اپنا فرض سمجھنے کی غلطی کی تھی۔ یہاں شرافت کے معیار مختلف ہیں۔ جسے تم عیش پرستی کہتے ہو وہ نوابی شان ہے جو کچھ کل رات ہوا اس میں تمہاری نیت کو یا ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔ اب رہا سوال اس اونچے خاندان کی جھوٹی آبرو کے جرم کا تو تم سے پہلے میں نے اس کو خاک میں ملایا تھا۔ پہل تم نے نہیں کی تھی۔ اپنی زندگی کو خود میں نے داؤ پر لگایا تھا۔ تم نے میرے لیے کوئی خطرہ پیدا نہیں کیا۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میں مرنے سے نہیں ڈرتی لیکن جینا ضرور چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھ سے بھی کم حوصلہ ہو؟ کیا تم شرافت علی اور گیان چند جیسے لوگوں کو شکست نہیں دے سکتے؟"

میں حیرانی سے اس کی صورت کو دیکھتا رہا۔ "تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"میرا خیال ہے وزیر خان!" وہ تذبذب اور فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "کہ ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔"

"ہمیں؟ کہاں؟ میرا مطلب ہے کیا تم بھی؟"

"ہاں۔" وہ میری بے ربط بات کے جواب میں سکون سے بولی۔ "مجھے بھی تمہارے ساتھ ہی جانا ہوگا کیونکہ تم میرے بغیر کہیں بھی نہیں جا سکتے۔ اگر تم مجھے اکیلا چھوڑ کے جاؤ گے تو خود ہی واپس آنے پر مجبور ہو جاؤ گے مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوگی اور تمہیں مجھ سے ملنے کے لیے میری قبر پر آنا پڑے گا۔ میری مرگِ ناگہاں کی کہانی سب کی زبان پر ایک ہی ہوگی کہ کس طرح ایک رات اچانک میں علیل ہوئی اور اس سے پہلے کہ طبیب یا ڈاکٹر پہنچتے میں خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ کسی زبان سے تم رسوائی کی کوئی بات نہ سنو گے۔"

"لیکن۔۔۔ امینہ۔۔۔ اس طرح بھاگ کے ہم کہاں جا سکتے ہیں؟" میں نے فکر مند ہو کے پوچھا۔ امینہ کی بات نے مجھے سخت تشویش میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اس تشویش میں ایک سنسنی خیز مسرت کا احساس بھی شامل تھا۔ امینہ نے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جو میں نے تصور میں بھی نہ سوچی تھی۔

اب مجھے یوں لگتا تھا کہ یہ میرے دل کی آواز تھی اور چاہتا میں بھی یہی تھا مگر اس کا اعتراف یا اظہار کرنے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔

"کیا اتنی بڑی دنیا میں ہم کہیں نہیں جا سکتے؟" وہ بولی۔ "اور عشق کیا ہے تو انجام کی فکر کیسی؟ یہاں سے نہ جا کے ہم دشمنوں کو موقع فراہم کر رہے ہیں کہ وہ جس طرح چاہیں ہمیں ذلیل و خوار کریں اور ہر پل لٹکتی ہوئی خوف کی تلوار کے سائے میں مر مر کے جئیں۔ ہم نکل گئے تو اپنی بے بسی پر ماتم کے سوا وہ کیا کر سکیں گے؟ شکست انہیں ہوگی ہمیں نہیں۔ اور اس کے بعد اپنی شکست کو فتح میں بدلنے کے لیے وہ ہماری تلاش میں نکل پڑیں گے مگر سوچو وزیر خان کہ وہ ہمیں ڈھونڈنے نکلیں گے بھی تو کدھر جائیں گے؟ مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف؟ شمال میں یا جنوب میں؟ بالفرض محال وہ ہمیں پکڑ کر لانے میں کامیاب ہو گئے تب بھی کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ وہ ہمیں قتل کروا دیں گے لیکن یہ اطمینان پھر بھی ہمارا ہوگا کہ ہم نے جرمِ الفت کی سزا قبول کی مگر بلیک میل ہونا منظور نہیں کیا۔"

شہزادہ خورشید عالم کی بیوی پرنسس امینہ مجبور اور مظلوم ضرور تھی لیکن وہ انتہائی ذہین اور باہمت عورت بھی تھی۔ اس کی باتوں نے مجھے قائل بھی کیا اور شرمندہ بھی۔ اور اسی شرمندگی نے میرے اندر سوئے ہوئے مرد کو جگا دیا۔ اسی روز میں نے اپنا مختصر سا سامان سمیٹا۔ امینہ نے صرف وہ زیورات لیے جو اس کو باپ کے گھر سے جہیز میں ملے تھے اور ہم اسی رات وہی کپڑے پہن کر محل سے نکل کھڑے ہوئے جو ہمارے تن پر تھے۔ یہ کپڑے بھی معمولی اور میلے تھے اور ہمارا سرمایہ ایک پوٹلی میں بندھا ہوا تھا۔ اس پوٹلی کو میں نے کندھے پر رکھی ہوئی لاٹھی سے باندھ کر لٹکا لیا تھا۔ اگر کوئی ہمیں دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ ہم دیہاتی یا معمولی حیثیت کے غریب لوگ ہیں اور اس پوٹلی میں بھی کچھ کپڑے لتے اور سامان کے سوا کیا ہوگا۔ اس کے باوجود ہم نے چھپ کے سفر کیا اور سلطان آباد کی شاہراہ سے ہٹ کے فاصلہ رکھتے جنگل کے کنارے چلتے رہے۔ رات بھر کا یہ سفر انتہائی مشکل، خطرناک اور ہمارے حوصلے کی آزمائش تھا۔ ہم راستے سے بھٹک جاتے تھے۔ ہمارا دامن کانٹوں میں الجھ جاتا تھا جس سے ہمارے کپڑے بھی پھٹ گئے تھے۔ ہمارے ہاتھوں پر اور چہرے پر خراشیں پڑ جاتی تھیں۔ ناہموار اور پُر خار راستوں پر ہم نے کئی بار ٹھوکر کھائی مگر ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ اپنی تکلیف کو خاموشی سے برداشت کیا اور ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ سلطان آباد کا یہ گھنا جنگل ایک شکار گاہ ہے جس میں چیتے، ریچھ یا خرگوش ہرن جیسے معصوم جانوروں کے علاوہ بھوکے بھیڑیے بھی گھومتے ہیں۔ بھوک میں تو گیدڑ بھی بھیڑیے کی طرح خطرناک ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ اس جنگل میں سانپوں کی بہتات ہے مگر اس وقت ہمیں کسی کا خوف نہیں تھا اور ہم منزل کی لگن میں بڑھتے جا رہے تھے۔ ظلم و ستم، جبر و استحصال، عیش پرستی اور بے راہ روی اور مکر و فریب کی سازش کے جال سے نکل کر دنیا کے کسی گمنام گوشے میں ایک چھوٹا سا گھر بنانے کے لیے چلتے جا رہے تھے اور ایک بھیانک ماضی کی یادوں سے نجات کی خاطر خوبصورت مستقبل کے خوابوں کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس رات ہم نے کتنی مسافت طے کی مگر صبح کا اجالا افق پر نمودار ہوا تو ہم اس جہنم سے فرار کی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکے تھے۔ سورج نکلنے کے بعد میں نے دیکھا تو مجھے امینہ کے نازک ہاتھوں اور اس کے چہرے کی مخمل جیسی جلد پر ان گنت سرخ لکیریں نظر آئیں جو کانٹوں کی زبان میں لکھی ہوئی اقرارِ محبت کی انمول تحریر تھی۔ اس نے بڑی استقامت کے ساتھ یہ سفر طے کیا تھا اور ہر سختی صرف اس لیے جھیلی تھی کہ وہ خوشی مل جائے جو اسے محل میں رہ کر نہیں مل سکی تھی۔ اسے مجھ پر اعتماد تھا کہ میں اسے ہر خوشی دے سکتا ہوں جو خریدی نہیں جا سکتی لہٰذا اپنے آپ پر اعتماد تھا کہ وہ میرے ساتھ خوش رہ سکتی ہے۔

سلطان آباد کی آخری حد کے قریب ایک چھوٹا سا پہاڑی سلسلہ تھا مگر اس سے پہلے ایک ندی تھی جس کو صرف پل پر سے عبور کیا جا سکتا تھا اور یہ بہت خطرناک کام تھا۔ اگر نواب صاحب کو معلوم ہوا ہوگا کہ میں ان کی خاندانی عزت کا جنازہ نکال کے محل سے نکل گیا ہوں تو ان کے کارندے ہر طرف دوڑ پڑے ہوں گے اور ریاست سے باہر جانے والے تمام راستے بند کر دیے جائیں گے۔ شرافت علی اور گیان چند کو معلوم ہوگا کہ میں نے ان کے شیطانی عزائم کو خاک میں ملا دیا ہے تو وہ انتقامی کارروائی کرتے ہوئے نواب صاحب کو جھوٹ سچ سب بتا دیں گے۔ اس کے بعد اگر فوری طور پر نواب صاحب نے خودکشی نہ کی تو گیان چند معاملہ ختم ہونے کا ثبوت دے گا اور نواب صاحب کو سمجھا دے گا کہ وہ فکر نہ کریں۔ محل کی بات محل کی دیواروں سے باہر نہیں جائے گی۔ ان کی بہو پر کوئی حرف نہیں آئے گا اور اصل ملزم کو یعنی مجھے ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ نواب صاحب کی بہو کے بارے میں کون جان سکتا ہے کہ وہ محل میں موجود نہیں۔ پردہ دار عورت کا یہ پردہ سلامت رہے گا۔ میرے بارے میں مشہور کر دیا جائے گا کہ

میں بہت سا مال و زر سمیٹ کر فرار ہو گیا ہوں اور میرے جیسے کمینے، ظالم، احسان فراموش اور بے ضمیر آدمی کو قتل کر دینا کوئی جرم نہیں چنانچہ مجھے زندہ یا مردہ حالت میں نواب صاحب کے سامنے پیش کرے گا۔ اسے انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ رہا ہو بیگم کا مسئلہ تو بیٹے کے بعد ان کی علالت کا اور اچانک موت کا ڈرامہ بھی کیا جا سکتا ہے اور باعزت طور پر سب کے سامنے ایک لاش دفن بھی کی جا سکتی ہے لیکن چونکہ نواب صاحب کا یہی حکم ہوگا کہ وہ دونوں جہاں بھی نظر آئیں ان کو وہیں مار کے گاڑ دیا جائے۔ نواب صاحب کو پہلے ہی گیان چند پر بہت اعتماد ہے اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تو اس کی قدر و منزلت پہلے سے بہت زیادہ ہو جائے گی۔ اگر ابھی کچھ نہ ہوا تو پرنس اور ریذیڈنٹ کی واپسی پر ضرور ہوگا۔

میں نے امینہ کے ساتھ دریا کو کس طرح تیر کر پار کیا یہ ایسی کہانی ہے جو الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ آج مجھے یہ کارنامہ ناممکن نظر آتا ہے مگر اس وقت جذبۂ عشق نے مجھے ناممکن کو ممکن بنا دینے کا حوصلہ عطا کر دیا تھا۔ رات بھر کے سفر کی تھکن سے چور اور خستہ حال ہونے کے باوجود میں نے امینہ کے ساتھ دریا پار کر لیا اور ہم ایک چھوٹے سے پہاڑی غار میں پناہ گزیں ہو گئے جہاں سے پل کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ امینہ عورت تھی اور شہزادی تھی جس نے قالین اور سرسبز گھاس کے سوا کبھی سخت زمین پر پیدل سفر نہیں کیا تھا چنانچہ اس کی حالت زیادہ خراب تھی۔ اسے آرام سے لٹا کر اور تسلی دے کر میں نے پہاڑ کی سرحد کو عبور کیا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں سے مجھے کھانے پینے کی چیزیں مل گئیں اور ایک ایسا شخص بھی مل گیا جس نے پچاس روپے لے کر مجھے اپنا ایک پرانا جوڑا بھی دے دیا اور امینہ کے لیے اس کی چھوٹی بیوی کے کپڑوں میں سے بھی ایک جوڑا نکال لایا۔ ان کپڑوں کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ شاید وہ بھنگی نظر آنے والا دیہاتی اور اس کی بیوی خود بھی یہ کپڑے استعمال نہیں کرتے ہوں گے مگر اس نے میری مدد کر کے ثواب بھی کما لیا اور پیسے بھی۔ میں یہ چیزیں لے کر واپس غار میں پہنچا تو امینہ بے ہوش پڑی تھی۔ ادھر ادھر سے کچھ لکڑیاں جمع کر کے میں نے آگ جلائی اور دودھ گرم کیا۔ امینہ کے زخم صاف کیے اور مجبوراً خود ہی اس کے کپڑے بھی بدلے۔ پھر میں نے گرم دودھ بھی پیا اور زبردستی اس کے حلق سے بھی اتارا۔ ایک گھنٹے بعد وہ ہوش میں آئی۔ اس وقت تک میں بھی لباس تبدیل کر چکا تھا۔ ہم دونوں نے جو کچھ کھایا جا سکتا تھا کھایا اور بے سدھ ہو کے پڑ گئے۔ پہلے میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ شام ہو چکی ہے میری حالت بہت بہتر تھی۔ تھکن اور کمزوری کے اثرات زائل ہو چکے تھے اور میں اس قابل تھا کہ رات کو پھر سفر جاری رکھ سکوں امینہ بدستور فرش خاک پر گہری نیند میں تھی۔ اس کے اور اپنے کپڑوں کو اور فقیرانہ حلیے کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ پھر ایک دکھ کا احساس غالب آ گیا۔ یہ محلوں کی رہنے والی عورت کل تک مرمریں ریشم کے گل رنگ ملبوس پہنتی تھی۔ خوشبو اور لطافت کا پیکر تھی۔ شاہانہ خواب گاہ میں بادلوں سے زیادہ ملائم گدوں کی آغوش میں سوتی تھی مگر وہ اس وقت اتنے سکون سے کھردری ناہموار اور پتھریلی زمین پر سو رہی تھی کہ حیرت ہوتی تھی۔ بالکل الف لیلیٰ کی کہانیوں کی طرح لگتا تھا کہ گویا بادشاہ کی بیٹی پر فریفتہ ہو گیا اور شہزادی کو ایک جن کی قید سے نکال لایا اور پھر شہزادی نے گڈریے سے شادی کر لی۔ ایسی محبت میرے لیے بالکل نیا تجربہ تھی۔ میں نے محسوس کیا اس محبت پر غرور کی خوشی کے سوا میرے دل میں کوئی جذبہ نہیں ہے۔ نخوت کا نشہ بھی دبا رہا تھا۔ میں غار کے دہانے پر آ کھڑا ہوا اور دریا کے پار سلطان آباد کی طرف دیکھنے لگا۔ سورج میرے پیچھے پہاڑی چوٹیوں میں غروب ہو چکا تھا لیکن سامنے اب بھی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے سڑک پر ریاستی نشان والی گاڑی دیکھی گاڑی پل پر پہنچ کے رک گئی اور اس میں سے چار آدمی اترے ان میں سے دو مسلح محافظ تھے جن کی رائفلیں کندھے پر لٹکی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ شرافت علی اور گیان چند تھے جن کو میں نے صاف شناخت کر لیا۔ انہوں نے پل کے دونوں کناروں پر کھڑے ہوئے محافظوں سے بات کی جن کو ابھی تک میں نہ دیکھ سکا تھا۔ شرافت علی نے پل کے دونوں جانب ہاتھ سے اشارہ کیا اور شاید یہ پوچھا کہ کسی نے دریا کو پار تو نہیں کیا کیونکہ جواب میں سنتری نے گردن ہلا کر نفی کی تردید کی۔ پھر شرافت علی اس کے باوجود بہتے دریا کے پانی اور دریا کے پاٹ کو دیکھتا رہا ایک بار اس کی نگاہ پہاڑی سلسلے پر بھی گئی اور ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ بے شک میں گہرے سائے میں اور چٹان کے پیچھے تھا مگر اسی وقت امینہ اٹھ کے باہر آ جاتی یا شرافت علی دوسرے کنارے سے غار تک پہنچنے کا فیصلہ کر لیتا تو ہم پکڑے جاتے۔ میرا خیال ہے کہ دریا کی تیز رفتاری اور چوڑائی کو دیکھنے کے بعد وہ خود بھی قائل ہو گیا کہ ہم پل سے نہیں گزرے تو یہ بھی ناممکن ہے کہ اس مقام سے دریا کو عبور کر گئے ہوں۔ اس نے سوچا ہوگا کہ ہم ابھی تک جنگل میں ہی بھٹک رہے ہیں اور اگر ہم نے تیر کر دریا کو پار کیا ہوگا تو اب اتنے قریب سے نہیں گیا ہوگا۔ چنانچہ وہ جدھر سے آیا تھا ادھر ہی چلا گیا۔ میں نے دریا پار کرنے کی جس جرأت کا مظاہرہ کیا تھا اسی نے ہمیں بچا لیا اور مجھے محبت کی اس طاقت پر اعتبار آ گیا جس کی مدد سے فرہاد نے پہاڑ کاٹ کر قصر شیریں تک دودھ کی نہر نکال دی تھی۔

سورج غروب ہونے کے بعد جب رات نے اپنا دامن پھیلایا تو میں نے اور امینہ نے "ڈنر" کیا۔ جو کھانے پینے کی بچی کھچی چیزوں پر مشتمل تھا اور ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت ہنسے ہمیں شرافت علی اور گیان چند کے ناکام لوٹ جانے کی بات پہ بھی ہنسی آئی۔ اصل بات یہ تھی کہ ہم بہت خوش تھے اور اس وقت کوئی ہمیں گرفتار کرنے بھی آ جاتا یا ہمارے سامنے شیر آ کھڑا ہوتا تب بھی ہم اسی طرح ہنستے رہتے اور ہنستے ہنستے ہی مر بھی جاتے۔ اس رات ہمارا سفر زیادہ دشوار نہیں رہا۔ ہم اس بستی سے نہیں گزرے جہاں سے میں نے کھانے پینے کی چیزیں لی تھیں اور کپڑے خریدے تھے۔ کپڑے دینے والا ایسا لالچی آدمی تھا کہ مزید پچاس روپے ملتے تو وہ میرا مکمل حلیہ بیان کر دیتا اور یہ بھی بتا دیتا کہ میں پہاڑیوں کی طرف چلا گیا ہوں۔ آدھی رات کے بعد ہم دوسری بستی میں پہنچے اور ایک جھوٹی کہانی سنائی کہ ہم میاں بیوی اپنی بیل گاڑی میں آ رہے تھے کہ راستے میں بدمعاشوں نے ہماری بیل گاڑی چھین کر ہمیں پیدل کر دیا۔ جس ہندو کو یہ ہم نے دستک دی تھی وہ ایک مسلمان جولاہے کا گھر تھا۔ اس نے ہمیں اپنے جھونپڑے سے گھر میں پناہ دی اور سونے کی جگہ فراہم کی۔ اگلے روز ہم اس گاؤں سے روانہ ہو گئے۔ اس وقت تک سلطان آباد کے بارے میں بہت سی سنسنی خیز خبریں اور افواہیں پھیل چکی تھیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ نواب صاحب نے خودکشی کر لی۔ کچھ کہتے تھے کہ نواب صاحب نے انگریز حاکم کی بیوی کو اغوا کر لیا تھا اور انگریزوں نے دونوں کو گولی مار دی۔ یہ مشہور بھی تھا کہ بیٹے نے ریاست پر حکومت کی خاطر باپ کو قتل کر دیا اور موت کو خودکشی قرار دے دیا۔ جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں۔ حقیقت بہرحال یہ تھی کہ نواب صاحب اچانک ان پر قربان ہو گئے تھے۔ یا انہوں نے بدبخت بیٹے کے گناہوں کا کفارہ اپنی جان دے کر ادا کر دیا تھا۔ بعد میں پرنس اور ریذیڈنٹ کے درمیان ایک زبردست جنگ چھڑ گئی تھی جس کی بنیاد ذاتی رقابت اور دشمنی کے جذبات پر مبنی تھی، جس کے نتیجے میں ریذیڈنٹ کو تبدیل کر دیا گیا تھا۔ چونکہ وہ حاکموں کے طبقے کا آدمی تھا اور ذاتی اس کا تعلق شاہی خاندان سے تھا اس لیے وہ مسلسل ترقی کرتا رہا اور کسی صوبے کا لیفٹیننٹ گورنر بھی بن گیا مگر یہ بہت بعد کی بات ہے اس گڑبڑ میں شرافت علی اور گیان چند کو بھی جان بچا کے فرار ہونا پڑا۔ شرافت علی میرٹھ پہنچا اور گیان چند لاہور۔ میں امینہ کے ساتھ دس سال تک مختلف مقامات پر پھرتا رہا۔ تین سال ہم نے جنوبی ہندوستان میں گزارے اور پھر اس کے قریب سے وہاں سے آسام گئے اور دو سال بعد پنجاب کے شہر امرتسر آ گئے۔ میرا اپنا گھر میرٹھ میں ہی تھا جہاں میرے والدین میری طرف سے سخت پریشان تھے کہ آخر میں نے ایسا کیا جرم کیا ہے کہ چھپ چھپا کر بھی میرٹھ نہیں پہنچ سکتا لیکن جب تک شرافت علی میرٹھ میں تھا میرے وہاں جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اپنے گھر والوں کو کبھی اپنا پتہ دیا تھا اور نہ امینہ کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ ڈرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ خط غلط ہاتھوں میں پڑ جاتا تو میرے خلاف میرے ہی ہاتھ کی لکھی ہوئی اعتراف جرم کی تحریر بن جاتا یا خود میرے گھر والوں کی زبان سے ناواقفیت میں کوئی بات نکل جاتی تو میرا راز فاش ہو جاتا لیکن خوف کی دوسری وجہ زیادہ اہم ہے۔ دس سال میں ہمارے پانچ بچے ہو چکے تھے لیکن ہمارا نکاح نہیں ہوا تھا۔ مذہب اور قانون کی رو سے امینہ ایک شوہر کی موجودگی میں دوسرا شوہر نہیں کر سکتی تھی۔ بے شک ہم مجرم تھے اور گنہگار تھے لیکن ہم مجبور تھے اور دنیا کے بعد آخرت میں اپنے لیے ہر سزا قبول کر چکے تھے۔ میرے ساتھ محل کی زندگی کو لات مار کے خانہ بدوشی اختیار کرنے والی امینہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ ظاہر ہے یہ بچہ میرا نہیں شہزادہ خورشید عالم کا تھا جو ایک ریاست کا حاکم تھا اور بہت طاقتور شخص تھا۔ اس بچے کا نام میں نے کبیر جان اور اس کی ماں نے سکندر بخت رکھا تھا۔

حفظ ماتقدم کے طور پر امینہ نے اپنا نام بدل کے سلطانہ رکھ لیا تھا اور میں نے سلطان۔ مقصد صرف یہ تھا کہ خدانخواستہ کبھی پرنس سے نواب خورشید عالم بن جانے والے امینہ کے شوہر کو ہماری خبر مل جائے تو وہ حقوق زوجیت یا کبیر کے حقوق ولدیت کا دعویٰ نہ کر سکے۔ تقسیم کے بعد ریاستیں ختم ہو گئیں اور سابق حکمرانوں کا گزارا سرکاری وظائف پر ہوتا تھا لیکن اس سے پہلے بھی برطانوی حکومت کا قانون غالب تھا اور ریاست کی حدود سے باہر نواب خورشید عالم ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس کے باوجود ہم ڈرتے رہے اور کہیں بھی جم کر نہیں رہ سکے۔ ہر جگہ ہمیں یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ نواب کے کسی حواری نے یا ریاست کے کسی باشندے نے ہمیں دیکھ لیا تو خبر اس تک پہنچ جائے گی چنانچہ ہم اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے تھے اور حسب ضرورت نام بھی

میں ثواب و عذاب کے فلسفے کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں کہتا کہ ہم گنہگار نہ تھے اور یہ نہیں سمجھتا کہ ہمارا جرم قابلِ معافی ہے لیکن میں نے سزا و جزا کا فیصلہ داورِ محشر پر چھوڑ دیا تھا جو نیتوں کا حال جانتا ہے اور ظاہری اعمال کو نہیں دیکھتا۔ عفو و درگزر بہ ذات ہے اور بہت مہربان اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔ ہم نے ہمیشہ بڑے عجز کے ساتھ اس کے سامنے سر جھکایا اور اپنی غلطی پر صدقِ دل سے معافی مانگی۔ دنیا میں انسانوں پر بہت کچھ حرام کیا گیا ہے لیکن مخصوص حالات میں جہاں زندگی اور موت کا سوال ہو اور جان بچنے کی کوئی صورت نہ ہو وہاں حرام کو بھی حلال کر دیا گیا ہے [illegible]۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جان بچائی تھی اور ایک مطمئن اور پُرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ آخرت میں ہمارے لیے کوئی سزا تھی تو ہم اس کے لیے راضی بہ رضا تھے… اس مجرم کی طرح جس نے ایک جائز مقصد کی خاطر جنسی خوشی سزا لینے دار و رسن قبول کی ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ سلطانہ کی اور ہمارے تمام بچوں کی موت ہمارے گناہوں کی سزا تھی اور سکندر اس لیے بچ گیا کہ وہ اپنے باپ کی جائز اولاد تھا۔ منطقی اعتبار سے لوگوں کی بات غلط نہیں معلوم ہوتی مگر میرا دل یہ بات نہیں مانتا۔ قدرت کے نظامِ انصاف کو سمجھنے کا دعویٰ فانی انسان کیسے کر سکتا ہے۔ اس دورِ جنون خیز میں تو لاکھوں مارے گئے تھے۔ ان میں معصوم شیر خوار بچے بھی تھے جو گناہ کے مفہوم سے بھی نا آشنا تھے اور جن کی پاک دامنی کی قسم فرشتے بھی کھا سکتے تھے۔

قصہ مختصر… کئی سال تک دربدر پھرنے کے بعد ایک وقت ایسا آیا جب ہم نے محسوس کیا کہ وہ پُرخطر اور پُرآشوب زمانہ ختم ہو چکا ہے جو ہم نے جلاوطنی میں گزار دیا۔ شاید نواب خورشید عالم کو یاد بھی نہ ہو گا کہ پرنسس امینہ کو باعزت طور پر "دفن" کرتے وقت انہوں نے اپنے حلقۂ احباب اور اپنی رعایا کو اس کی المناک موت کی کیا کہانی سنائی ہو گی اور ان کا حرم حسبِ سابق اسی طرح آباد رہا ہو گا اور انتقام کے جذبات شراب و شباب کی مستی میں دم توڑ چکے ہوں گے۔ انگریز ریذیڈنٹ شاید وطن واپس لوٹ گیا ہو گا یا ہندوستان میں ہوا تو نہ جانے کہاں اور کس عہدے پر ہو گا۔ یہ ناممکن ہے کہ ابھی تک وہ اپنی بیوی کے مبینہ قاتل کی تلاش میں دیوانوں کی طرح سرگرداں ہو۔ وقت بہت بڑا جادوگر ہے اور گہرے سے گہرے زخم کو اپنی مسیحائی سے مندمل کر دیتا ہے۔ جذبات کی شدت کم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے اور ہر شے سے بڑا سانحہ ایک بھولی بسری یاد بن کے ماضی کے صحرا کی گرد میں دفن ہو جاتا ہے۔

گیان چند کا تو مجھے علم ہی نہ تھا لیکن شرافت علی کے بارے میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ میرٹھ میں ہے اور وہاں کوئی بزنس کر رہا ہے۔ میرا یہ بھی خیال تھا کہ شرافت علی بھی پرانی باتیں بھلا چکا ہو گا۔ شاید وہ اپنے کیے پر شرمسار بھی ہو اور اب مجھے کوئی بھی نقصان پہنچانا اس کے لیے ممکن ہی نہ ہو۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میری عدم موجودگی میں میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ آخری وقت تک وہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے مجھے یاد کرتے رہے اور ایک ایک سے التجا کرتے رہے کہ کسی طرح میرے فرید خان کو بلا لاؤ۔ اس سے کہو کہ آخری بار مجھے اپنی صورت تو دکھا جائے لیکن کوئی بھی ان کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ کسی کو معلوم ہی نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے قانون کی گرفت میں آنے کا ڈر نہیں تھا۔ بھیس بدل کے رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح چھپتے میرٹھ ہو آنا کوئی مشکل کام نہ تھا مگر میں اپنے گھر والوں کو اپنا چہرہ دکھاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے ڈرتا تھا کہ میں ایک غیر مرد کی شادی شدہ بیوی کو اس کے گھر سے نکال لایا ہوں اور میں نے اس سے نکاح بھی نہیں کیا ہے لیکن میں پانچ بچوں کا باپ ہوں۔ میں اپنے باپ کی اور ان کی فطرت کو سمجھتا تھا اور اپنی ماں کو بھی جانتا تھا۔ وہ حالات کا عذر کبھی قبول نہ کرتے اور مجھے کبھی معاف نہ کرتے۔ میری وجہ سے وہ اپنی نظروں سے گر جاتے اور یہ صدمہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا۔ میں اپنے بہنوں اور بھائیوں کو کیسے منہ دکھاتا اور خدانخواستہ شرافت علی پرانی تصویر لے کر بچے کے واقعات سامنے لے آتا تو میرے گھر کی عزت خاک میں مل جاتی۔

والد کے انتقال نے مجھے اپنا بن باس ختم کر کے گھر لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ مرنے سے پہلے وہ میری سب بہنوں کی رخصتی کر چکے تھے اور میرا واحد بھائی جو فوج میں تھا، برما کے محاذ سے لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ گھر میں صرف میری ماں رہ گئی تھی۔ گو میرے تمام خطوط لکھے گئے تھے لیکن سال چھ مہینے میں مجھ کو کسی نہ کسی ذریعے سے گھر کے حالات کا پتا چلتا رہتا تھا۔ جب میں گھر پہنچا تو میری ماں رو رو کے جیسے بے ہوش ہو گئی۔ اس نے مجھے اپنے بوڑھے ہاتھوں سے بہت مارا اور بہت کوسا کہ نامراد بے غیرت… اب بھی آنے کی کیا ضرورت تھی… اور کچھ دن کے بعد میری قبر پر آ جاتا۔ میں نے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور رو دھو کے اپنی مجبوریوں کی ایک جھوٹی کہانی سنائی۔ وہ ماں تھی، مجھے معاف کر کے گلے سے کیوں نہ لگاتی جب اچانک اسے ایک جوان بیٹا لوٹا دیا تھا۔

بیٹے کی طرح خدمت گزار ہو اور اس کے بچوں کے وجود سے مالامال کر رہا تھا۔ ہم اکیلی نہیں رہی تھی۔ بہت جلد وہ سب کچھ بھول گئی۔ سلطانہ نے یعنی امینہ نے گھر کو سنبھال لیا۔ میں نے باپ کے کاروبار کو۔ سلطانہ کے بارے میں اپنی ماں سے کوئی بات سچ نہیں بتائی اور صرف یہ کہا کہ خاندان کے پٹھانوں کی لڑکی ہے اور ماں باپ بہت عزت دار تھے لیکن ان کا انتقال ہو جانے کے بعد اب دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ ایسی باتوں کا مقصد ایک طرف تو ماں کو مطمئن کرنا تھا اور دوسری طرف بہو کی حیثیت سے سلطانہ کی قدر و منزلت میں اضافہ کرنا تھا۔ میری [illegible] آدمی کے کسی بیٹے سے بیاہی گئی تھی جو آخری [illegible] کے مطابق ڈیرہ دون کی ملٹری اکیڈمی میں انسٹرکٹر تھا۔ [illegible] شادی کر کے سنگاپور چلی گئی تھی۔ ایسے میں سلطانہ کا اور میرا گھر پہنچنا بہت مبارک ثابت ہوا اور اس گھر کی رونق اور خوشی لوٹ آئی۔ لیکن یہ خوشی بہت مختصر ثابت ہوئی۔ دو مہینے بعد جب میں کاروبار بھی سنبھال چکا تھا میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ تعزیت کے لیے آنے والوں میں شرافت علی بھی تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کسی [illegible] کا اظہار نہیں کیا۔ یوں جیسے وہ پہلے سے میری موجودگی سے باخبر تھا۔ اس نے بڑی شرافت سے بات کی اور [illegible] دلاسا دینے کا اخلاقی فرض پورا کر کے چلا گیا۔ اس کو سوئم اور چہلم پر بھی دیکھا۔ بعد میں اس نے مجھ سے میل ملاقات بڑھائی اور ایک پرانے تعلق کی بنیاد بنا لیا۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ شرافت علی کو سلطان آباد میں پیش آنے والے واقعات سے [illegible] دلچسپی نہیں رہی تو خود میں نے ایک دن اس سے پوچھا کہ میرے اور پرنسس امینہ کے فرار ہو جانے کے بعد [illegible] لوگوں کا ردِعمل کیا تھا؟

"سب سے زیادہ صدمہ نواب صاحب کو ہوا تھا۔" [illegible] سے یا پاگل ہو جانے کی سی حالت ہو گئی تھی [illegible] ناموس کا خون کر دیتے۔ [illegible] رسوا ہونے کی ہمت نہ تھی چنانچہ انہوں نے خودکشی [illegible]

"[illegible] تو مجھے بھی معلوم ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "پرنس کا [illegible] کیا تھا؟"

"[illegible] کسی بھی غیرت مند شوہر کا ہونا چاہیے تھا۔ [illegible] اس نے قسم کھائی تھی کہ تم جہاں بھی ملو گے اور جب بھی ملو گے وہ تمہیں زیادہ سے زیادہ بے آبرو کر کے اور زیادہ عذاب دے کر قتل کر دے گا۔"

"تمہارے خیال میں وہ ابھی تک اپنے اس عہد پر قائم ہو گا؟" میں نے کہا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" شرافت علی بولا۔ "پرنس عیاش اور شوقین مزاج آدمی تھا، اس نے بعد میں کوئی شادی نہیں کی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی راتیں بدستور آباد رہیں۔ در اصل پرنس میں بہت سی خوبیاں باپ کی طرح تھیں جیسا کہ وہ ذہین تھا۔ ریاست کے معاملات کو سابقہ روایت کے مطابق چلانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ مزاج کا ضدی اور اپنی انا کے معاملے میں انتہائی خودپرست تھا۔"

"کیا دوسری شادی نہ کرنا بھی اس کی قسم میں شامل تھا؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میں نے یہی سنا ہے۔" شرافت علی بولا۔ "جب تک پرنس اپنی قسم پوری نہیں کرے گا، شادی بھی نہیں کرے گا۔ اب وہ وضع دار اور سنجیدہ مزاج آدمی ہے۔ کوئی بے فکرا نوجوان نہیں ہے۔ نواب کا حرم کتنا ہی آباد کیوں نہ ہو، اس میں بیوی کی جگہ تو خالی رہتی ہے اور اس کا احساس بھی برقرار رہتا ہے۔"

"اپنی بیوی کی بے وفائی کے داغ کو اس نے دنیا سے کس طرح چھپایا تھا؟ اتنا اندازہ تو مجھے تھا کہ وہ اس خبر کو محل کی دیواروں سے باہر نہیں نکلنے دے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ نواب صاحب کی خودکشی کو ایک حادثہ قرار دے دیا گیا تھا۔" شرافت علی نے کہا۔ "اور کہا یہ گیا کہ وہ اپنی شکاری بندوق کا معائنہ کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بندوق خالی ہے لیکن اس میں ایک گولی تھی جو ٹریگر دبانے سے ہی چل گئی۔ اس کے گواہ محل کے ہی دو خادم تھے۔ ان میں سے ایک گیان چند تھا۔ جب پہلے گواہ کی لاش ایک رات تالاب میں تیرتی ہوئی پائی گئی تو گیان چند کو اپنی فکر لاحق ہوئی اور وہ صبح ہونے سے پہلے ہی فرار ہو گیا۔ پھر وہ ملازم پُراسرار طور پر غائب ہو گئے جو امینہ کی خدمت پر مامور تھے اور جن سے افشائے راز کا ڈر تھا۔ بے شک وہ پُرانے خدمت گار تھے اور محلوں کے راز کو راز رکھنا جانتے تھے مگر پرنس نے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر وہ غلطی سے بھی کہہ دیتے کہ بیگم صاحبہ تو خواب گاہ یا محل میں موجود ہی نہیں ہیں تو ڈرامہ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ بعد میں دوسرے ملازموں کو سختی سے تاکید کر دی گئی کہ وہ اس

www.paksociety.com

حقیقت میں قدم بھی نہ رکھیں جہاں پرنسس امینہ اور شہزادہ خورشید عالم کا قیام تھا کیونکہ نواب بیگم کی علالت کے باعث ڈاکٹروں نے سب ملنے جلنے والوں پر پابندی عائد کر دی تھی یہاں تک کہ خود نواب خورشید عالم بھی ان کے کمرے میں نہیں جا سکتے۔ محل میں بہت سے اجنبی چہرے نظر آتے جن کے بارے میں کہا گیا کہ دہلی اور کلکتہ سے آئے ہوئے بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر ہیں۔ تاہم صرف ایک ہفتہ بعد نواب بیگم کا انتقال ہو گیا اور ان کو خاموشی سے محل کے احاطے ہی میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔"

"اور وہ لاش کس کی تھی جو دفنائی گئی تھی؟" میں نے کہا۔

"صورت تو کسی نے بھی نہیں دیکھی ہوگی۔" شرافت علی بولا۔ "وہ پردہ دار بیوی تھی۔ مرنے کے بعد بھی شوہر کے سوا کوئی نامحرم اس کا چہرہ کیسے دیکھ سکتا تھا۔ کفن میں کسی عورت کی لاش تھی یا مرد کی۔ وہ لاش کہاں سے حاصل کی گئی تھی، یہ سب باتیں غیر اہم تھیں۔"

"کیوں؟ امینہ کے والدین اور اس کے بھائی بھی تو تھے۔" میں نے کہا۔

شرافت علی ہنسا۔ "ان کی مرضی شامل نہ ہوتی تو یہ ممکن ہو سکتا تھا؟ وہ بھی نواب کے خاندان کی طرح اونچی ناک والے تھے۔ انہوں نے نواب سے کہا ہوگا کہ ہمارے گھر سے جانے کے بعد وہ تمہارے گھر کی عزت تھی۔ باپ کے گھر سے بیٹی کی ڈولی اٹھتی ہے اور شوہر کے گھر سے صرف جنازہ اٹھتا ہے۔ اب تم جیسے چاہو اپنی عزت کا جنازہ اٹھاؤ۔ ہم دخل نہیں دیں گے۔ ان کی بیٹی کے فرار ہونے کی بات لوگوں کی زبان پر آ جاتی تو وہ بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے چنانچہ انہوں نے خاموشی کا ساتھ دیا۔"

میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ یہی بات مجھ سے امینہ نے بھی کہی تھی کہ تم واپس آ گئے بھی تو تمہیں صرف میری قبر ملے گی۔ قبر اب بھی موجود تھی مگر چند لوگوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس میں پرنسس امینہ کی ہڈیاں نہیں ہیں۔ امینہ اب سلطانہ تھی اور میرے ساتھ تھی اور میں خود بھی زندہ تھا۔ اگر اس رات میں اور امینہ محل سے نہ نکلتے تو آج میرا بے نشان مدفن بھی امینہ کے مزار سے بہت دور ہوتا۔

"اور وہ جو ریذیڈنٹ تھا... جان سائمن۔" میں نے کہا۔ "کیا گیان چند نے اور تم نے اسے بتا دیا تھا... تمہارے پاس تو ناقابلِ تردید ثبوت تھے۔"

"پہلی بات تو یہ ہے بھائی وزیر خان!" شرافت علی [illegible] سے نظر ملائے بغیر بولا۔ "کہ یہ ساری اسکیم گیان چند [illegible] تھی۔ تم مانو یا نہ مانو اور میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور [illegible] تھا۔ تمہارے چلے جانے کا گیان چند کو بہت سخت [illegible] لیکن بعد میں اس کو بھی جان کے لالے پڑ گئے [illegible] سے اور بڑی عجلت میں جان بچا کر بھاگا تھا لیکن [illegible] سے پہلے اس نے وہ تصویریں جان سائمن کو ارسال کر [illegible] ان کی بجائے ہفتے بھر بعد سائمن جب پرنس کے ہمراہ [illegible] سے لوٹا تو اس نے اپنی ڈاک دیکھی۔ ڈاک میں وہ تصویریں بھی شامل تھیں۔ غصے میں پاگل ہو کے وہ سائمن سیدھا پرنس کے پاس پہنچا مگر محل میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ [illegible] صاحب نے واپس آتے ہی بیٹے کو بتا دیا تھا کہ [illegible] کی عزت کا رکھوالا تھا اور اس پر تھوک کے ایک [illegible] کے ساتھ جا چکی ہے۔ وہ دوسروں کی عزت سے کھیلنے [illegible] مصروف تھا اور [illegible] محل سے غائب ہو گیا تھا [illegible] تھا کہ اس کی اپنی عزت بھی تماشا بن سکتی ہے لیکن [illegible] بیٹھے گئے اور نہ تماشائی۔ اس کے بعد انہوں نے بیٹے [illegible] کی وصیت کی ہو گی اور سمجھایا ہو گا کہ اس مسئلے کو [illegible] کیسے حل کرنا ہے۔ چنانچہ ریذیڈنٹ پہنچا تو اسے [illegible] "اتفاقیہ" گولی چل جانے سے نواب صاحب کی [illegible] ہو گئی ہے۔ سائمن غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ وہ پرنس [illegible] ایک طرف لے گیا اور تصویریں اس کے سامنے رکھ دیں [illegible] تک گیان چند بھی وہیں موجود تھا اور یہ باتیں مجھے [illegible] معلوم ہوئی ہیں۔ پرنس نے تصویروں کو [illegible] اور کہا "سوری ریذیڈنٹ صاحب میں آپ کی کوئی [illegible] کر سکتا کیونکہ یہ شخص وزیر خان جو آپ کی بیوی کا [illegible] محل سے فرار ہو گیا ہے اور وہ ایک حرام [illegible] کے بیش قیمت جواہرات اور میری بیوی کے زیورات [illegible] ہے۔ ریذیڈنٹ نے کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو [illegible] بچانا چاہتے ہو۔ وہ تمہارا خاص آدمی تھا۔ تم اس پر [illegible] اعتماد کرتے تھے اور اسے انتہائی ایماندار [illegible] نے کہا کہ میرے اندازے غلط تھے اور مجھ سے [illegible] میں دھوکا ہوا۔ وزیر خان بہت بدمعاش اور [illegible] ہالک تھا۔ کہتے ہیں کہ عالم پور والی [illegible] میں ریذیڈنٹ [illegible] پرنس کی بات نہیں مانی اور اس پر [illegible] وزیر خان کہاں ہے؟ پرنس نے آسانی سے [illegible] کی راہ تقل سے نشان دے کر کہا کہ میرا ساتھ [illegible]

تو اسی وقت گولی مار کے تمہاری لاش برطانوی حکومت کو حوالے کر سکتا ہوں کہ تمہارا یہ ریذیڈنٹ مجھے قتل کرنے کی نیت سے محل میں داخل ہوا تھا۔ تم جانتے ہو کہ یہاں اسلحہ لے کر کوئی نہیں آ سکتا۔ محل کے بہت سے ملازموں نے تمہیں اسلحہ سمیت اندر آتے دیکھا ہے۔ اگر نہ دیکھا ہوتا تب بھی کوئی زبان نہ کھولتا... کیونکہ وہ میرے ملازم ہیں اور میرے خلاف گواہی دینے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ ان کی زبان وہی بکے گی جو میں بولوں گا۔ اس سے بھی زیادہ آسان کام میرے لیے تم کو نواب صاحب کا قاتل ثابت کر دینا ہوگا۔ تم عین اسی وقت یہاں پہنچے ہو جب نواب صاحب اتفاقیہ گولی چل جانے سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ میں پولیس کے آنے تک تمہارے ہاتھ پیر باندھ کر تمہیں قید رکھ سکتا ہوں۔ پولیس کے سامنے سب یہ بیان دیں گے کہ نواب صاحب کو تم نے ہلاک کیا ہے اور یہاں محل کے سارے ملازم یک زبان ہو کر کہیں گے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں نواب صاحب پر گولی چلاتے ہوئے دیکھا ہے۔ تمہارے اور نواب صاحب کے تعلقات برے رہے ہیں جن کا علم وائسرائے کو بھی ہے چنانچہ اتفاقی شہادت اور چشم دید گواہوں کی موجودگی میں تمہارا قانون، [illegible] اور شاہی خاندان سے تمہارا تعلق سب مل کر [illegible] تم کو بچا نہیں سکیں گے لیکن میں تم کو بخش رہا ہوں [illegible] مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تم وزیر خان کے خلاف ایک رپورٹ درج کراؤ گے کہ اس نے تمہاری بیوی کو قتل کر دیا ہے اور تمہاری حکومت ایک ریذیڈنٹ کی بیوی کے قاتل کو گرفتار کرنے کے لیے اپنے تمام وسائل بروئے کار لانے پر مجبور ہو جائے گی۔ دوسری رپورٹ میں لکھواؤں گا کہ میرا سیکرٹری وزیر خان دس لاکھ [illegible] کے جواہرات چوری کر کے فرار ہو گیا ہے۔ [illegible] گرفتاری کے لیے میں اپنے خزانے سے ایک لاکھ روپے کا انعام دوں گا [illegible] پولیس لے گی۔"

"اور کیا انہوں نے واقعی ایسا کیا تھا؟" میں نے تعجب کے ساتھ کہا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟" شرافت علی نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ [illegible] اخبارات میں شائع ہوئی تھی تمہاری تصویر کے [illegible] پولیس کی جانب سے پبلک کے لیے ایک [illegible] تھا کہ تمہیں گرفتار کرنے یا پیش کرنے والے کو [illegible] ایک لاکھ روپے کا انعام ملے گا۔ [illegible] تمہاری تصویر بھی۔ تمام صوبوں کی پولیس کو بھی اس تصویر کی نقل فراہم کی گئی تھی۔ کمال کی بات ہے کہ تم نے نہیں دیکھی۔"

"یہ کمال کی نہیں تقدیر کے یاور ہونے کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "میں ایسے گمنام مقامات پر رہا جہاں عام طور پر اخبارات ہی نہیں پہنچتے تھے۔ خواص کا ایک طبقہ اخبارات پڑھتا تھا مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھی اور ان کا مجھ سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔"

"پھر بھی پولیس تو تمہیں شناخت کر سکتی تھی؟"

"پولیس کی مت پوچھو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ہر تھانے میں ایسے کتنے ہی روز آتے ہیں اور مفرور مجرموں کی تصویریں ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ سیکڑوں تصویریں پرانے ریکارڈ میں پڑی ہوں گی۔ ان سب کی صورت اور ان کے حلیے کسی کو کیا یاد رہ سکتے ہیں؟"

"تم ایک بہت اہم بات کو نظر انداز کر رہے ہو وزیر خان!" وہ بولا۔ "تم ایک لاکھ کی رقم کو نظر انداز کر رہے ہو۔ عام طور پر انعام کی رقم پانچ سو یا ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی۔ کسی حوالدار یا سپاہی کی لنترانی دیکھو... پوری ملازمت کے دوران میں وہ جتنی تنخواہ یا رشوت لے سکتا ہے یہ رقم اس سے کہیں زیادہ تھی اور ایک مشت مل رہی تھی اور جائز طور پر۔ تھوڑا تھوڑا بچانے کو کوئی تھانیدار بھی ایک لاکھ جمع نہیں کر سکتا۔ اتنے بڑے انعام کی امید میں نیچے سے اوپر تک سب اتنے مستعد ہو گئے ہوں گے کہ انہیں ہر شخص وزیر خان ہی نظر آتا ہو گا اور یہ بھی کیا معلوم کتنے شخص تمہاری صورت سے مشابہت رکھنے کے جرم میں خواہ مخواہ پکڑے گئے ہوں گے۔"

"ایسی صورت میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ مارنے والے ہاتھ سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہے۔" میں نے کہا۔ "میں سارے ہندوستان میں گھومتا پھرا اور نام بدلنے کے سوا کوئی احتیاط بھی نہیں کی۔ ممکن ہے [illegible] چہرہ بھی بدل گیا ہو مگر میں سمجھ رہا تھا کہ معاملات دب گئے۔"

"معاملات کیسے دب سکتے ہیں وزیر خان!" شرافت علی نے کہا۔ "وہ دونوں مقدمات درج کرانے والے میرے تمہارے جیسے معمولی لوگ تو نہیں تھے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد پولیس نے مایوس ہو کے تلاش ترک کر دی ہو گی۔ ان کے پاس نئے کیس آ گئے ہوں گے اور پرانے خود بخود سرد خانے میں چلے گئے ہوں گے لیکن تم جانتے ہو کہ قتل کا کیس کبھی ختم نہیں ہوتا اور پھر جب بھی پکڑا جائے چور ہی کہلاتا ہے۔ پہلے تم پر ایک ریذیڈنٹ کی بیوی کے قتل کا الزام تھا مگر جان سائمن اب ایک تصویر سے

www.paksociety.com

کا لیفٹیننٹ گورنر ہے اور نواب خورشید عالم کیسے بھول سکتے ہیں کہ تم نے ان کے خاندان کی عزت لوٹی اور ان کے والد کی موت کا سبب بنے۔ اگر آج بھی کوئی تمہارے بارے میں پولیس کو مخبری کر دے......"

"کیا تم مجھے پھر دھمکی دے رہے ہو شرافت علی؟" میں نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو وزیر خان!" شرافت علی بولا۔ "اگر مجھے یہی کرنا ہوتا تو میں اب تک انتظار کیوں کرتا۔ مجھے تو بہت پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ تم میرٹھ میں ہو لیکن دو وجوہ سے محتاط رہو۔ تمہارے رشتے دار، محلے دار اور جان پہچان والوں کو کئی برس پرانی بات یاد ہو گی۔ ان میں سے بیشتر تمہارے خیر خواہ ہیں اس لیے تم ابھی تک محفوظ ہو ورنہ ایسا کوئی نہیں ہوتا جس کا دشمن کوئی نہ ہو۔"

شرافت علی کے انکشافات نے میرا خون خشک کر دیا تھا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ خطرہ ہر طرف سے رات کے اندھیرے کی طرح میری طرف بڑھ رہا ہے اور اس اندھیرے کی آڑ میں قانون کے ہاتھ چپکے چپکے مجھے گرفت میں لینے کے لیے آگے آ رہے ہیں۔ فضا میں انگشت نمائی کرنے والے بدخواہوں کی سرگوشی سنائی دیتی تھی۔ ہتھکڑیوں کی زنجیر کھنکتی تھی اور تقدیر کی بے رحم ہنسی گونجتی تھی۔ اس رات میں نے امینہ کو بتایا کہ شرافت علی سے مجھے کیا معلوم ہوا ہے تو وہ بھی خوفزدہ ہو گئی۔ یوں لگتا تھا کہ ہندوستان کی زمین پر اب ہمارے لیے کوئی جائے پناہ نہیں رہی ہے۔ بعد کے واقعات تم جانتے ہو منشی! میں بیوی بچوں کے ساتھ میرٹھ سے نکل گیا تھا کیونکہ میرٹھ میں میرے جاننے والے بہت تھے اور دہلی چلا گیا تھا جہاں مجھے کسی شناسا کے ملنے کا ڈر نہیں تھا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے منشی کہ میرا پورا خاندان فسادات کی نذر ہو گیا تھا۔"

میں وزیر خان کے بچپن کا دوست تھا اور ان واقعات کے سوا جن کا تعلق ریاست سلطان آباد سے تھا اور جو مجھے وزیر خان کی زبانی پہلی بار معلوم ہوئے تھے میں اس کی زندگی کے حالات سے پوری طرح باخبر تھا۔ جس زمانے میں وزیر خان سلطان آباد سے نکل کر ہندوستان کے طول و عرض میں چھپتا پھر رہا تھا میں میرٹھ سے ساٹھ میل دور ایک گاؤں کے چھوٹے سے پرائمری اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھا اور انتہائی سکون اور قناعت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو بھی عام نہ تھے اور اس گاؤں تک اخبارات تو کیا ڈاک بھی مشکل سے پہنچتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے وزیر خان کے بارے میں شائع ہونے والی خبریں نہیں پڑھیں نہ اشتہارات دیکھے اور تصویر نہیں دیکھی ورنہ میں اسے میرٹھ پہنچتے ہی خبردار کر دیتا اور اسے فوراً نکل جانے کا مشورہ دیتا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وزیر خان کے والدین بھی ان حقائق سے بے خبر رہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کو عمداً بے خبر رکھا گیا۔ ورنہ بڑھاپے میں یہ غم ان کی جان لے لیتا۔ وہ خود اخبار نہیں پڑھتے تھے اور اگر ... اخبار میں کچھ دیکھا تھا وہ نیک دل لوگ تھے۔ انہوں نے جانتے بوجھتے ان کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ وزیر خان کا ایک بہنوئی انڈین آرمی میں میجر تھا اور اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ فرض شناسی کے چکر میں بیوی کی بھی پروا نہ کرے اور اس کے بھائی کو پکڑوا دے مگر شاید ان لوگوں کو اس خیال نے بھی کچھ نہ کرنے دیا کہ ... زیادہ ان کی حرکت کو ایک لاکھ کے لالچ سے تعبیر کیا جائے گا ... لوگ انگریز کے دشمن تھے۔ انہوں نے سمجھا ہو گا کہ وزیر خان نے ایک انگریز کی بیوی کو قتل کیا تو کوئی جرم نہیں کیا بلکہ ... کیا اور یہ قتل بھی اس نے بے سبب تو نہیں کیا ہو گا ... اس نے اپنی تذلیل کا انتقام لیا ہو۔ جو لوگ وزیر خان کے کردار سے واقف تھے وہ سمجھتے ہوں گے کہ ... کا نتیجہ ہے۔ وزیر خان ایسا آدمی نہیں ... اسی میں پیچیدہ کیسے پھر یہ سب واقعات ایک بڑی ریاست میں پیش آئے تھے اور وزیر خان پر الزامات عائد کرنے والے خود وہاں حاکم تھے۔ وزیر خان ایک معمولی ملازم تھا جسے وہ کسی بھی ذاتی رنجش کے باعث اپنے انتقام کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ غرض یہ سب باتیں تھیں جن کی وجہ سے وزیر خان میرٹھ میں بھی محفوظ رہا اور کسی نے اس کی موجودگی کا راز فاش نہیں کیا۔

لیکن یہ سب تقسیم سے پہلے کی باتیں تھیں جب ... سال ہو چکے تھے۔ وقت بدل گیا تھا جغرافیائی سرحدیں بدل گئی تھیں۔ ہندوستان میں سلطان آباد کی ریاست ... بھارت میں ضم ہو گئی تھی۔ انگریز اپنا بوریا بستر گول کر کے چلے گئے تھے۔ وزیر خان نے دوسرے ملک میں ایک ... زندگی کا آغاز اپنے حوصلے کی بنیاد پر کیا تھا۔ اس نے ... شروع کیا تھا تو اس کا سرمایہ فقط اس کا عزم تھا اور ... مستقل مزاجی تھی۔ نیک نیتی تھی اور دیانتداری بھی۔ چنانچہ ... کاروبار کو برکت دی۔

۱۹۵۶ء میں شرافت علی کاروبار میں پارٹنر ... پہلے سے وزیر خان کے ساتھ تھا اور وزیر خان ... کرتا تھا چنانچہ میرا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ... وزیر خان کو بلیک میل کر سکتا ہے۔ اس کے خلاف ... کے الزامات کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ وہ شخص جس کی بیوی کا مقدمہ کیا تھا برطانیہ میں تھا اور ... بھول چکا تھا۔ اس نے دوسری شادی کر لی تھی اور ... گزار رہا تھا۔ تم بھی اسے جانتے ہو کبیر خان! ... تم اس کی لڑکی کی ماڈرن ... کے دوست تھے اور یہ لڑکی اس کی دوسری بیوی کے بطن سے ہے۔ وہ بڑھا اب ... ہے مگر اسے یہ علم نہیں ہے کہ تم کس وزیر خان کے بیٹے ہو ... تم کو حیرانی ہوئی ہو گی کہ میں یہ سب کچھ کیسے جانتا ہوں ... میری عمر جاسوسی ناول پڑھتے گزری ہے۔ اسی کے باعث رشک مجھے منشی کی بجائے ... کہنے لگے ... کام کے سلسلے میں لندن آتا جاتا رہتا تھا اور تمہارے ... کے مطابق جاسوسی کر کے معلوم کرتا تھا کہ تم لندن ... کیا کرتے ہو اور کیسے رہتے ہو۔ واپسی پر میں وزیر خان کو رپورٹ دیتا تھا کہ سب خیریت ہے۔ صرف ایک بات ... سے نہیں بتائی تھی کہ تم جان سامسن کے ساتھ گھومتے ... ورنہ وہ تشویش میں مبتلا ہو جاتا۔

وزیر خان کی ساری روداد سن کے میں نے کہا۔ "وزیر خان! ... میرے سوال کا جواب اب بھی نہیں ملا ہے۔ شرافت علی ... کیسے بلیک میل کر رہا ہے؟ شرافت علی کو تم سے ... تو وہ تقسیم سے پہلے ہی اس زمانے میں تم کو پکڑوا ... جب تم میرٹھ میں تھے اور ایک لاکھ کا انعام حاصل کر لیتا۔"

"اس کی ہمت نہیں تھی منشی!" وزیر خان نے کہا۔ "میں ... کا پرانا ساکن ہوں اور میرے دوست بھی بہت ... جان نثار کر سکتے تھے۔ وہ شرافت علی کو زندہ نہ ..."

"پھر کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "تمہارے باقی دشمن تو ... گئے یا ادھر ادھر ہو گئے۔ مثلاً وہ ریذیڈنٹ جان ... کیا بگاڑ سکتا ہے؟ نواب خورشید عالم کی ... بھی ہندوستان میں رہ گئے۔ اب زندہ ... خوار ہوں گے۔ رہ گیا ان جنہ تو میرا ... فسادات میں مارا گیا ہو گا۔ اس کا گھر ... کے اندر تھا جہاں سب سے زیادہ سکھ اور ... گئے تھے۔ اگر وہ جان بچا کے فرار ہوا ہو گا تو بھارت ... ہو گا۔ بھارت کی پولیس کے قوانین پاکستان میں ... ایک لاکھ کے انعام والا اشتہار یہاں کچھ نہیں کر ... تم کو کس کا ڈر ہے؟ کیوں بلیک میل ہونے پر مجبور ہے تو؟"

"دیکھو منشی! میں نے تمہیں ہر بات بتا دی ہے۔" وزیر خان نے کہا۔ "یہ بھی مان لیا ہے کہ شرافت علی مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔ میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ اسباب وہی پرانے ہیں جن کا میں نے ذکر کیا۔ اب میں اپنے انجام سے نہیں ڈرتا۔ میری زندگی کے تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں لیکن سکندر کی پوری زندگی باقی ہے۔ اسے محفوظ رکھنے کے لیے میں نے سینے پر صبر کی سِل رکھ لی ہے۔ اس کو اپنی نگاہوں سے بھی دور رکھا۔ میں نے یہ قربانی اس کے مستقبل کے لیے دی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آخری وقت میں یہ جنگ ہار جاؤں۔ جو کچھ میرے پاس تھا وہ میں نے بھوکے بھیڑیوں کے سامنے ڈال دیا ہے سوائے اس چیز کے جس پر میرے بعد سکندر کا حق تھا۔ یہ کاروبار میرا ہے میری زندگی میں کوئی مجھے اس کی ملکیت سے محروم نہیں کر سکتا۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں اس سے بھی دستبردار ہو جاؤں لیکن میں سکندر کو اس کے حق سے کیسے محروم کر دوں۔ وہ میری جان تو لے سکتے ہیں مگر حق ملکیت سے دستبرداری کے کاغذات پر دستخط نہیں لے سکتے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا وزیر خان کہ کسی وکیل کی معرفت تو اپنا مقدمہ عدالت میں کیوں نہیں لے جا سکتا؟" میں نے کہا۔ "یا پولیس کو رپورٹ کیوں نہیں کر سکتا؟"

"اس کا کوئی فائدہ نہیں منشی! یہ سب بالکل بے کار ہے۔" وہ بولا۔ "میں کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتا اور ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"اور اگر بعد میں انہوں نے یہی کھیل سکندر کے ساتھ جاری رکھا؟"

"سکندر جوان آدمی ہے۔" وزیر خان نے کہا۔ "باہمت ہے اور ذہین ہے لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے ماضی کے دامن پر کوئی داغ نہیں ہے کوئی اسے بلیک میل نہیں کر سکتا۔ وہ اپنا دفاع خود کرے گا۔ اللہ اس کا حامی و ناصر ہو گا۔"

تو برخوردار کبیر خان! اس سے زیادہ میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ اس سے زیادہ مجھے وزیر خان نے کچھ نہیں بتایا۔ یہ بات میرے لیے آج بھی معما ہے کہ تیس سال قبل سلطان آباد کی ریاست میں پیش آنے والے واقعات کا ان واقعات سے کیا تعلق ہے جو وزیر خان کے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔ گو کہ میری عقل تو کوئی تعلق دریافت کرنے سے قاصر ہے۔ میں رازداری کا پابند تھا چنانچہ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ میں دوبارہ وزیر خان سے ملنے بھی نہیں گیا۔ میری اور اس کی آخری ملاقات اس کے مرنے کے بعد ہوئی تھی جب وہ جنازے

www.paksociety.com

کی کوٹھی کے برآمدے میں کفن پہنے ابدی نیند سو رہا تھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ کوٹھی اسی کی ہے لیکن کسی کو یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ تو اپنے نوکر کے نوکروں کے ساتھ سرونٹ کوارٹر کے ایک کمرے میں رہتا تھا لیکن میرا دل خون کے آنسو رو رہا اور جب میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کو لحد میں اتارا تو میں نے کہا کہ بھائی وزیر خان تم نے رفاقت کا عہد توڑ دیا۔ اب میں کسی عہد کا پابند نہیں رہا۔ جو کچھ تھا تمہارے دم کے ساتھ تھا۔ اب تم نہیں تو دوستی نہیں۔ اور جب دوستی نہیں تو کیسا وعدہ اور کہاں کے عہد و پیمان۔ میں نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ جو بات میں تم کو خود نہ بتا سکا وہ تحریر کی صورت میں چھوڑ جاؤں گا۔ خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ آگے کے معاملات میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ تم کو معلوم کرنا ہو گا کہ میر شرافت علی نے تمہارے باپ کی کوٹھی مجبوری سے خالی کرائی تھی کرا کے مار ڈالا۔ مجھے معلوم نہیں کیوں مجھے یہ شبہ ہو چلا ہے کہ وزیر خان کی موت کے اسباب طبعی نہیں تھے اسے ختم کیا گیا تھا۔ اس احساس کو تم میری جبلی حس کا کرشمہ بھی کہہ سکتے ہو اور میری جبلی حس یہ بھی کہتی ہے کہ میرا انجام وزیر خان کے انجام سے مختلف نہ ہو گا۔ اس کے دشمن پوری کوشش کریں گے کہ تم کو کچھ نہ بتا سکوں لیکن میں بھی نوابزادہ ہوں۔ میں ان کو ایسا چکر دوں گا کہ ایک نہ ایک دن یہ تحریر تمہارے ہاتھوں تک پہنچ جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ جب تم اسے پڑھو تو میرا وجود مشتِ خاک بن چکا ہو۔ اگر ایسا ہو تو میری مغفرت کی دعا کرنا۔ میری روح کی نجات کے لیے اتنا بھی بہت ہو گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی ہے۔ جان تو آنی جانی ہے۔ اس جان کی کوئی بات نہیں... فقط:

تمہارا چچا۔ دعاگو اور خیر خواہ

نوما بچو

خط ختم ہو گیا۔ ماضی کی ایک داستان ختم ہو گئی وہ داستان پہلے ختم ہو گئی تھی جس نے قید زماں و مکاں کو ختم کر دیا تھا۔ میں، شہلا اور محسن محض ایک وجود رہ گئے تھے صرف ایک احساس جو حال اور ماضی کے درمیان سرگرداں تھا۔ یہ کوئی سائنس فکشن نہیں تھا۔ ہمارے پاس کوئی نام نہیں نہیں تھی، ان سب کے لیے اس حقیقت سے انکار ناممکن تھا کہ اس رات کے دوران میں ہم نے بہت پیچھے جا کر ستائیس برسوں کا سفر طے کیا۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا۔ چند گھنٹوں کے مختصر وقفوں میں ستائیس سال کا وقت کیسے سمٹ گیا۔ مگر اس طویل سفر کے بعد میں کہاں تھا۔ اقرار وہ دنیا میری نہیں تھی۔ میں بھی وہ نہیں تھا جو اس سفر میں محسن کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ اس خلا نورد کی طرح ایک سیارے سے پرواز کر کے دوسرے سیارے پر جا اترے ایک اجنبی دنیا میں اکیلا تھا۔ ایسا خواب جس میں کبھی کبھی آنکھ کھل جاتی ہے مگر ذہن بدستور خواب کے سحر میں رہتا ہے۔

"سکندر! میری طرف دیکھو، میں محسن ہوں۔" محسن نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

"گستاخ!" میں نے گرج کر کہا اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "تو ہو گا محسن... لیکن ہم سکندر نہیں ہیں۔ ہم... ہم سکندر بیگ... ہم پرنس کبیر خان ہیں... ولی عہد ریاست... ہیں۔ ہماری ماں پرنسس امینہ تھیں اور ہمارے والد نواب خورشید عالم..." میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"بھائی جان... یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو... خدا کے لیے ہوش میں آ جائیے۔" شہلا نے روتے ہوئے کہا۔

"بد تمیز کنیز۔" میں نے اس کے ایک چانٹا رسید کیا۔ "نہیں کہ ہم اکلوتے تھے۔ تو ہمیں بھائی کہتی ہے... بد تمیز تیری کھال میں بھس بھروا دیں گے... ہم اس ریاست کے ہیں اور یہاں کوئی ہمارے حکم سے سرتابی کی ہمت نہیں کر سکتا۔ صرف ہم عالی نسب خاندان کے فرزند ہیں۔ کسی کی مجال نہیں ہمیں ایک معمولی آدمی کی اولاد کہہ سکے۔ ہم نواب خورشید عالم کی جائز اولاد ہیں، باقی سب... وہ سب جو وزیر خان کی اولاد تھے..." میرا خیال ہے کہ میں چلا رہا تھا... شرابی کی طرح بکار رہا تھا۔ شہلا مسلسل رو رہی تھی۔ محسن... تھا۔ بنس رہا تھا اور میں مسلسل بک رہا تھا کہ اچانک مجھے چکر آ گیا۔ مجھے گھومتے ہوئے آفاق پر خورشید عالم... اندھیرا خلا ہو گئی اور میرا وجود اس خلا میں گرتا چلا گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی کمرے میں... تھا۔ میرے ہاتھ پیر بالکل سن ہو چکے تھے اور میں... سے ایک انگلی تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ آنکھیں کھولیں تو مجھے مانوس چہروں کی پرچھائیاں تیرتی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے باری باری ہر چہرے کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ سوال خود بخود میرے ذہن میں آیا۔

"آخر یہ کون لوگ ہیں جو صورت سے میرے اپنے نظر آتے ہیں۔ یہ عورت جو میرے سینے سے ہاتھ کی طرح آنسو بہا رہی ہے کس کے لیے رو رہی ہے؟... ہاتھ میں تو ایک اور لڑکی کھڑی ہے۔ وہ کیوں رو رہی ہے؟"

میں نے آنکھیں کھول کر پھر دوسری طرف دیکھا جہاں دو مرد کھڑے تھے۔ ایک عمر رسیدہ اور ایک میرا ہم عمر۔ میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے گہری نیند آ رہی ہے لیکن میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں سوچنا چاہتا تھا مگر میرے دماغ میں خلا تھا جس کے ساتھ میرا ذہن بھی مفلوج ہو چکا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اٹھ کر بیٹھ جاؤں مگر یہ میرے اختیار کی بات نہ رہی تھی۔ بے ہوشی کے وقفے آتے رہے۔ جب میں نیم بیداری اور نیم بے ہوشی کے عالم میں بہت کچھ دیکھتا رہا۔ ان میں سے کچھ مناظر حقیقی تھے اور کچھ میرے تصور کی پیداوار تھے۔ میرے کانوں نے بہت سی آوازیں سنیں جو ایک گم گشتہ وقت کی صدائے بازگشت تھی۔ میں نے مارگریٹ کے باپ سر جان ہیملٹن کو دیکھا جو حوالات میں میرے سامنے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میری بیٹی ایک خیر پرنس کو چاہنے لگی تھی۔ میں نے اس کو باعزت طور پر قتل کرا دیا تھا... میں نے اپنے والد کو دیکھا۔ انہوں نے غصے سے مجھ سے کہا: "تم میرے بیٹے ہو سکندر! یہ کر تم... والی عورت میری بیوی تھی اور تمہیں میں نے پالا تھا۔" پھر ایک اجنبی نمودار ہوا جو حلیے میں خسرو ترشی کی طرح تھا۔ اس نے تنفر بار کے حقارت سے کہا: "یہ ایک حرام جو ساتھ لگا ہے۔ امینہ میری بیوی تھی اور تم میرے بیٹے ہو..." پھر گھپ اندھیرے سے نکل کے بہت سے چہرے روشنی میں آ گئے۔ ان کے بدن زخموں سے فگار تھے اور انہوں نے یک زبان ہو کے کہا: "ہمارا خون آ کر وہ لاشیں دیکھو۔ کیا تم ہمیں پہچانتے نہیں ہو؟ ہم تمہارے بھائی ہیں۔" اندھیرے ہال میں سینما کے پردے پر نظر آنے والے سلائڈ کی طرح بہت سے چہرے روشن ہوئے اور بجھ گئے ان کا ثبت دیا تھا کا منحوس چہرہ تھا۔ ان کے بیچ محسن کا چہرہ تھا۔ ایک عورت بڑے شاہانہ وقار کے ساتھ اپنے محل کی خواب گاہ میں دکھائی دی۔ پھر ایک عورت کو ایک چھوٹے سے گھر کے پچھلے پرانے کپڑے دیتے ہوئے دیکھا۔ "پرنسس امینہ!" اس نے میری طرف دیکھا: "میں تو تمہاری ماں ہوں سکندر!" اس کے علاوہ بھی میں نے بہت کچھ دیکھا جو غشی کے خلا میں بیان کردہ واقعات کی تصویر تھا۔ بالآخر میرے ذہن سے جذباتی صدمے کے اثرات زائل ہونے لگے اور اپنے عزیزوں کی مخلصانہ کوششوں اور ان کی دعاؤں کے سبب میں آہستہ آہستہ زندگی کی طرف بڑھتا گیا۔ میں نے والدہ اور شہلا کا چہرہ پہچان لیا۔ محسن کو اور انکل رضوی کو پہچان لیا اور ان کی باتیں سمجھنے لگا۔ میری جسمانی معذوری اور ذہنی تھکن کا سبب وہ سکون بخش اور خواب آور دوائیں تھیں جو مجھے وافر مقدار میں دی گئی تھیں۔ میں اسی کوٹھی نگر والے گھر میں تھا اور رفتہ رفتہ حقیقت کو خواب سے الگ کر کے دیکھنے لگا تھا۔ بالآخر ایک وقت ایسا آیا جب میں نے ہوش سے بیگانہ رکھنے والی دوائیں کھانے سے انکار کر دیا اور سیال غذا طلب کی۔ میں نے اپنی بات کا انتہائی مسرت خیز ردِعمل دیکھا۔ ان سب کے چہرے امید کی روشنی سے دمک اٹھے جو میری شفایابی کے لیے خلوصِ نیت کے ساتھ کوشاں تھے۔ چند منٹ بعد والدہ خود اور یخنی کی گرم گرم پیالی کا بہت بڑا مگ بھر لائیں۔ محسن نے مجھے سہارا دیا اور شہلا نے تھوڑی تھوڑی کر کے سب کا سب میرے حلق میں اتار دی۔ پھر آہستہ آہستہ دھند چھٹنے لگی اور میرا ذہن صاف ہوتا گیا۔ میری جسمانی توانائی بحال ہونے لگی اور آدھے گھنٹے بعد میں پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ میں نے باری باری سب کی طرف دیکھا اور شرمندہ ہو کے کہا: "میں بہت شرمندہ ہوں آپ سب سے۔"

"ابھی اپنے ذہن پر بار مت ڈالو۔" انکل رضوی نے شفقت سے مسکرا کے میری پیٹھ تھپکی۔ "شرمندہ ہونے کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔"

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں انکل رضوی!" میں نے کہا۔ "ذہنی صدمہ اتنا شدید تھا کہ میں برداشت نہ کر سکا۔"

"زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس صدمے کے اثرات عارضی ثابت ہوئے۔" محسن نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ "اور تم بہت جلد سنبھل گئے۔"

"کیا اس بات کا امکان بھی تھا کہ میرا دماغی توازن ہمیشہ کے لیے بگڑ جاتا؟"

"ہمیشہ کے لیے تو نہیں۔" محسن بولا۔ "لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ اس میں کچھ زیادہ وقت لگ جاتا۔"

"میری نیند یا بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا؟" میں نے پوچھا۔ "مجھے وقت کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔"

"آپ صرف چوبیس گھنٹے نڈھال رہے۔" محسن نے کہا۔ "اس وقت صبح کے نو بجے ہیں اور..."

"میرا خیال ہے کہ اس وقت تمہیں زیادہ بات نہیں کرنی چاہیے۔" رضوی صاحب نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا۔ "فکر کی تو کوئی بات نہیں رہی مگر سکندر کو ابھی آرام کی ضرورت ہے۔ میں اب ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔ شام کو آؤں گا۔ اس وقت

www.paksociety.com

تک تم لوگ سکندر کے آرام کا خیال رکھو گے اور اس کو سوپ اور گلوکوز دیتے رہو گے۔"

انکل رضوی کے جانے کے بعد رابعہ، محسن اور شہلا نے مل کر ان کی ہدایات پر عمل کرنے کی پوری کوشش کی اور تجربتی مجھے کمرے میں اکیلا چھوڑنے اور میرے پیٹ کو حلق تک طاقت دینے والی چیزوں سے بھر دینے کی متفقہ جدوجہد کی مگر میں نے اپنے آگے ان کی ایک نہ چلنے دی۔

"آخر یہ کیا تماشا ہے؟" میں نے رابعہ کے ہاتھ سے گرم دودھ کا پیالہ لے کر کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ چاہتے ہو کہ میرا پیٹ پھٹ جائے۔ میرا پیٹ ہے کوئی ڈرم؟ صبح سے کوئی ایک گیلن جوس چڑھایا جا چکا ہے، کوئی ایک گیلن چائے اور گلوکوز اور اب آپ دوسری بار ایک گیلن دودھ اٹھا لائی ہیں۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔"

"خاک ٹھیک ہو۔" رابعہ نے جل بھن کر کہا۔ "یہ دماغ کی خرابی نہیں ہے تو کیا ہے کہ پیالہ باہر پھینک دیا۔"

"اب اگر کوئی کسی قسم کا مائع میرے حلق میں ڈالنے کے لیے لایا تو میں اس کو بھی باہر پھینک دوں گا۔" میں نے کہا۔

اسی وقت شہلا اور محسن کمرے میں داخل ہوئے۔ شہلا کے ہاتھ میں سوپ کا پیالہ تھا اور محسن کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی جس میں دو ابلے ہوئے انڈے رکھے تھے۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے سہم کر کہا۔ "کیا یہ بھی...؟"

"جی ہاں یہ بھی۔" محسن نے جارحانہ انداز میں آستینیں چڑھائیں۔ "ہم سب مل کر زبردستی یہ تمہارے حلق سے اتاریں گے۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ ہمیں باری باری اٹھا کر باہر پھینک دو۔"

"دیکھیے شیرازی صاحب!" میں نے لجاجت سے کہا۔ "شرفا کا یہ شیوہ نہیں۔ میں ایک شرط پر آپ کی بات مان لیتا ہوں کہ بعد میں آپ یہاں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کریں گے۔ مجھے آپ سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔"

"مجھے منظور ہے۔" محسن بولا اور میں نے بھوک نہ ہونے کے باوجود کھانا پینا شروع کیا۔ رابعہ اور شہلا مسکراتی رہیں۔

"اس وقت تو آپ عقلوں کی بتیسی باہر آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے کیوں آنسو بہائے جا رہے تھے؟"

"وہ خوشی کے آنسو تھے۔" رابعہ نے بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بولتے ہوئے اعلان کیا۔

"اچھا یار محسن!" میں نے خالی گلاس شہلا کو واپس پکڑا کے کہا۔ "وہ خط کہاں ہے؟"

"خط انکل رضوی کے پاس ہے۔" محسن نے کہا۔ "ویسے بھی اس وقت خط کے موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔"

"دیکھو محسن! میرا ذہنی رد عمل فطری تھا۔ میں مانتا ہوں کہ کچھ دیر کے لیے میرا دماغ خراب ہو گیا تھا لیکن اب ہوش میں آنے کے بعد میں نارمل ہوں اور وہی پہلے والا سکندر بخت ہوں۔ بے شک اس خط نے بہت سے تلخ حقائق کا انکشاف کیا ہے جن کو تسلیم کیے بنا چارہ نہیں لیکن ان سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کسی نواب خورشید عالم کو نہیں جانتا۔ اگر کچھ بھی ہوا، شہاب الدین کے لیے میرے خیالات اور جذبات وہی ہیں جو یہ خط ملنے سے پہلے تھے۔ میں منیر خان کا بیٹا ہوں اور اب بھی اس عہد پر قائم ہوں کہ مجھے اس کے قتل کا انتقام لینا ہے۔ ان سب سے بڑا اس کی موت کے ذمہ دار تھے۔ شرافت علی تو مر چکا ہے لیکن آج میرے دشمنوں کی فہرست میں ایک نام کا اضافہ ہو گیا ہے یعنی گیان چند۔ شرافت علی اور گیان چند بھی بہت مکار اور عیار شکاری تھے جو ہمیں بھیر کر شکار گاہ تک لے گئے اور وہ ان کی سازش کا شکار ہو گیا۔ اس کی عمر شکاری کتوں کے تعاقب سے بچتے بچتے بھاگتے ہوئے گزر گئی۔ وہ ان سب کچھ فنا کے تعاقب میں... مگر یہ شکاری کتے یہاں بھی آ پہنچے اور انہوں نے بالآخر شکار کر لیا۔ اب بازی پلٹ چکی تھی اور شکاری میں ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں شرافت علی کے قتل کا انتقام نہ لے سکا لیکن اسے قتل نہ کر سکا۔ ایک جذباتی کمزوری کے تحت میں شرافت علی کو میرے ہاتھوں وہ سزا نہ ملی جس کا وہ مستحق تھا۔"

"اگر منشی یہ خط نہ لکھتا تو اچھا ہوتا۔" محسن باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا فائدہ ہوا؟ یعنی اس سے یہ تو ہم اب جان گئے کہ مرحوم چچا وزیر خان کی مجبوریاں کیا تھیں، یہ کیا تھا۔ مجھے کہ تجھے حالات کا علم ہو گیا تو تیری نظر میں جذباتی رشتوں کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تیرا ان سے خون کا رشتہ نہیں ہے، تو وزیر خان کو چھوڑ کر نواب خورشید عالم کے پاس چلا جائے گا۔"

"میں اپنے والد کی فطرت کو سمجھتا تھا۔" محسن! میں نے کہا۔ "انہیں مجھ پر پورا اعتماد ہو گا کہ میں انہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ رشتے جذبات کے ہوتے ہیں۔ خون کا رشتہ تو خون کے صرف گروپ ہوتے ہیں۔ یہ دیکھنا ہے تو کسی ہسپتال میں چلا جا۔ گورے کا خون کالے کو دیا جاتا ہے، بھنگی ہے تو پنڈت سے مل جاتا ہے یا فرشتے بانٹ کر ہم خون فروخت کرتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کس کا خون...

ہاں... پھر خون کا رشتہ کیا ہوا۔ جس شخص کی جان بچ جاتی ہے وہ تو اسے پہچانتا بھی نہیں جس نے اپنا خون اس کو دیا تھا۔ مجھے اس سے بھی کوئی غرض نہیں کہ میری ماں پرنسس امینہ تھی یا سلطانہ نام کی ایک عام عورت تھی۔ ماں تو صرف ماں ہی ہوتی ہے۔ میرے وہ بہن بھائی جنہوں نے اس رحم کے بیچ جوان کی، ایک ہی ماں سے پیدا ہوتے تھے اور ان کی بہن میرے لیے ایک مقدس امانت ہے۔ یہ جذبات کے بندھن ہیں، حالات کی گردش انہیں توڑ نہیں سکتی۔"

"مجھے تجھ پر فخر ہے سکندر بخت!" محسن نے کہا۔ "اگر تیرے بیانات بدل جاتے تو مجھے دکھ ہوتا۔"

"اگر آج میرے ماضی کے کسی راز پر پڑا ہوا پردہ اٹھ جائے" میں نے کہا۔ "اور تم میرے لیے غیر ہو جاؤ۔ تم سب جن کو میں اپنا خاندان سمجھتا ہوں تو دکھ مجھے بھی ہوگا۔ اگر آج رابعہ مجھ سے محبت کرتی ہے، تو میرا دوست ہے یا شہلا نے مجھے بھائی کہا ہے تو اس لیے کہ آج میں جیسا بھی ہوں اس حیثیت سے تمہارا ہوں۔ جس کا میرے ماضی سے تو کوئی تعلق نہیں۔ اگر میں نے کبھی کسی سازش کا شکار ہو کے نادانستگی میں کوئی قتل کیا ہوتا کیا تم مجھ سے رشتے توڑ لیتے؟"

"میرا خیال ہے سکندر! اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔" محسن نے کہا۔ "اپنی نگاہ مستقبل پر رکھو۔ پیچھے مڑ کے دیکھو گے تو تمہارے لیے آگے قدم بڑھانا مشکل ہو جائے گا۔"

"مجھے اپنے ماضی پر کوئی ندامت ہے اور نہ افسوس۔" میں نے بے رخی سے کہا۔ "اور میں اپنے آپ سے نہیں ڈرتا۔ جب بھی مجھے موقع ملا میں سلطان آباد ضرور جاؤں گا۔ میں گیان چند کا سراغ بھی لگاؤں گا۔ بے شک وہ بہت بڑا ملک ہے، پچاس ساٹھ کروڑ کی آبادی میں ایک آدمی کو ڈھونڈنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے لیکن ہو سکتا ہے مجھے سلطان آباد سے گیان چند کا کوئی اتا پتا مل جائے۔ سرحد کے پار بھی اچھے لوگ بستے ہیں اور شکار پور سے ایک پنڈت دیا ناتھ تھے جو شاید اب دنیا میں نہ ہوں۔ ان کا ایک بیٹا تھا موہن اور اس کی بہن تھی موہنی۔ ان سے بھی میرا بہت گہرا جذباتی رشتہ ہے۔ وہ میری سرپرستی... فی الحال مجھے یہاں کے مسائل سے نمٹنا ہے۔ ... آزاد نہیں ہوں کہ ابھی پرسوں سے جہاں چاہوں چلا جاؤں۔ یہ بتاؤ تو میرے سر پر کیا واقعہ پیش آیا ہے جس سے میں بے ہوش ہوا؟"

"شکریہ!" محسن ہنسا۔ "اس کے سوا تجھے قابو کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی، تو پاگل ہو رہا تھا۔"

اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور میں اٹھ بیٹھا۔ "محسن! میں تو یہ بات بالکل ہی بھول گیا تھا۔ یہ سوال جس نے ملاوہ کے لیے جال پھیلایا تھا... اور ڈی سلوا...؟"

"مانا کہ تو بہت بڑا شکاری ہے۔" محسن نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ بہت لمبی بات ہے۔"

"اچھا صرف اتنا بتا دے کہ ملاوہ مارا گیا یا نہیں؟" میں نے کہا۔ "اور ڈی سلوا پکڑا گیا یا نہیں؟"

"اس سوال کا جواب ہاں یا نہ میں دینا مشکل ہے۔" محسن بولا۔ "بہت سی باتیں ہیں جو اخبار والوں کو معلوم نہیں ہو سکیں۔ مثلاً یہ کہ جب ہم ڈی سلوا کو اس کے گھر کے دروازے پر ڈال کر بھاگ آئے تھے تو بعد میں کیا ہوا تھا... کال بیل کی آواز پر ایک نوکر دروازے تک آیا تھا اور اپنے آقا کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ ڈی سلوا بے ہوش تھا اور نوکر کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ صاحب کو کیا ہوا ہے۔ سابقہ تجربے کی بنا پر اتنا اندازہ تو اس کو ہو گیا تھا کہ صاحب نشے میں دھت نہیں ہے، لہٰذا اس نے ڈاکٹر کو طلب کر لیا تھا جس نے غور سے معائنہ کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ڈی سلوا کسی حادثے کا شکار نہیں ہوا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے مارا پیٹا گیا ہے۔ اس کے جسم پر چوٹوں کے نشانات بھی تھے اور رسی سے باندھے جانے کے بھی۔ ڈاکٹر کے خیال میں یہ ممکن تھا کہ کسی نے اسے لوٹنے کے لیے یا کسی بری نیت سے اغوا کیا ہو، چنانچہ یہ پولیس کیس ہے اور اس کی رپورٹ فوراً کر دینی چاہیے۔ بات اگر گھر تک محدود رہتی تو ڈی سلوا کے ہوش میں آنے تک نوکر کچھ بھی نہ کرتا اور اس نے کچھ کیا بھی نہیں تھا لیکن اس ڈاکٹر نے پہنچتے ہی تھانے فون کر دیا ——

وہ کچھ اصول پرست اور قانون کی سختی سے پابندی کرنے والا ڈاکٹر تھا۔ نتیجہ یہ کہ اُدھر ڈی سلوا ہوش میں آیا، اُدھر قانون کے رکھوالے آ گئے۔ اب ڈی سلوا ان کو بتاتا بھی تو کیسے بتاتا؟ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی گاڑی کہاں کھڑی ہے اور جو ہنستی ملاوہ کہاں ہے۔ پھر نے اپنا پورا پلان ان کو بتا دیا تھا کہ ہم اس کی گاڑی میں ملاوہ کو اغوا کر کے لے آئے ہیں اور اسے قتل کر دینا چاہتے ہیں لیکن ہماری پوزیشن محفوظ ہے چنانچہ ملاوہ کے قتل کا الزام اگر آیا بھی تو صرف اس کی ذات پر آئے گا۔ اب تک وہ ہمیں اچھی طرح سمجھ چکا ہے۔ اس نے یہ فرض نہیں کیا ہوگا کہ ہم محض بکواس کر رہے تھے۔ اس نے تسلیم کر لیا ہوگا کہ ہمیشہ کی طرح ہم نے

www.paksociety.com

چونکہ کہانی پر عمل بھی کیا ہوگا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم نے دلاور کو کہاں لے جاکر مارا اور کیسے مارا۔ وہ ویسی قیاس امکانات کو مسترد بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہم نے فون کیا ہو اور ہمارا مقصد دلاور سے کچھ معلومات حاصل کرنا اور اسے دہشت زدہ کرنا ہی ہو۔ ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے پولیس کو ٹال دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں جس کی رپورٹ درج کرائی جائے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ڈی سلوا نے پولیس کو نامعلوم افراد سے لڑائی جھگڑے کی کہانی سنادی ہوگی کہ وہ ڈی سلوا کو لوٹنا چاہتے تھے۔ قاضی کے گھر کے تو چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ اس کے نوکروں نے بھی معاملہ سنبھال لیا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ انھوں نے کہہ دیا ہوگا کہ صاحب کبھی زیادہ پی لیتا ہے تو آؤٹ ہو جاتا ہے اور ایسی حالت میں کیا بتا سکتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ یہ رپورٹ ایک ڈاکٹر کی تھی اس لیے پولیس کو جانا پڑا لیکن جانا انھیں مہنگا نہیں پڑا۔ معاملے کو بھول جانے کا مشورہ دے کر واپس چلے گئے تھے۔ غریب آدمی ہوتا تو تھانے لے جاتے اور کچھ "تفتیش" بھی کرتے۔"

"ڈی سلوا نے ہمارا نام نہیں لیا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "یہ نہیں کہا کہ ہم اس کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ اپنی گاڑی کے چوری ہو جانے کی رپورٹ تک نہیں لکھوائی تھی؟"

"اس وقت تو نہیں لکھوائی تھی۔" محسن نے کہا۔ "ایک تو اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ سوچ سمجھ کے کوئی فیصلہ کر سکتا۔ اس کو سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ پھر یہ کہ وہ انتظار کرنا چاہتا تھا اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ اس کی گاڑی کہاں ملتی ہے، دلاور کی لاش ملتی ہے یا وہ بھی اسی کی طرح اپنے گھر پہنچتا ہے۔ ڈی سلوا نے دیکھ لیا تھا کہ قتل کی دھمکی دینے اور مار کے گاڑ دینے کا مصمم ارادہ ظاہر کرنے کے باوجود ہم نے اس سے کچھ معلومات حاصل کیں، اسے دہشت زدہ کیا لیکن آخر میں اس کو قتل کرنے کے بجائے گھر چھوڑ گئے۔ اسے خیال ضرور آیا ہوگا کہ شاید دلاور کے ساتھ بھی ہم نے اس سے زیادہ کچھ نہ کیا ہو اور صبح ہونے تک دلاور سے رابطہ قائم ہو جائے تو آئندہ کی فکر کی جائے اور ہمارے خلاف کوئی مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ وہ ڈرتا بھی ہوگا کہ جو کچھ ہم اس سے پوچھ چکے ہیں وہ کسی بھی سے اس کی پوزیشن خراب کر سکتا ہے۔ اطمینان کا ایک پہلو صرف یہ تھا کہ ہم نے دلاور کو قتل نہیں کیا ہوگا تو اس سے بھی بہت کچھ معلوم کر لیا ہوگا۔ بعد میں وہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کے اپنی اپنی دکھ بھری کہانی سنا سکتے تھے اور اعتراف کر سکتے تھے کہ ہمارے جبر و تشدد اور ہماری بدمعاشی کا شکار ہو کے انھوں نے ہمارے سامنے کتنا سچ بولا اور کتنا جھوٹ۔ اور جو ہونا تھا سو ہو گیا لیکن اب سوچنا چاہیے کہ … ہوگا اور ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا۔"

"اور اگر بعد کے نتائج ڈی سلوا کے اندازوں کی … " میں نے کہا۔

"بعد میں یہی ہوا تھا۔" محسن بولا۔ "یعنی ڈی سلوا نے عقل مند بننے کی کوشش میں زبردست بیوقوفی کا ثبوت دیا۔ ہوا یہ کہ ٹھیک آٹھ بجے ریڈیو ٹرانسمیٹر میں رکھا ہوا بم پھٹ گیا اور اس زیر تعمیر عمارت کے باتھ روم کی چھت دھماکے سے گر گئی جس کے ساتھ والے کمرے میں دلاور قید تھا۔ کمرے کی ایک دیوار اور چھت کا تھوڑا سا حصہ بھی منہدم ہوئے لیکن دلاور ذرا دور تھا اس لیے معمولی زخمی ہوا۔ کمرے کی باقی دیواریں بھی ترخ گئی تھیں۔ میں نے خود بعد میں وہاں جاکے دیکھا تھا۔ اس وقت آپ یہاں استراحت فرما رہے تھے … سے شوق فرما رہے تھے۔ خیر، حسب توقع دھماکا ہوتے ہی ادھر ادھر کے لوگ جمع ہو گئے۔ انھوں نے دلاور کو آزاد کیا اور اتنی دیر میں پولیس بھی وہاں پہنچ گئی۔ جائے واردات پر چشم دید گواہوں نے تو یہی بتایا جو دیکھا تھا لیکن دلاور نے ہمارے خلاف اغوا کا اور ہم دونوں کے خلاف قتل کی سازش کا الزام عائد کر دیا۔ اب کنفیوژن سے بڑی عجیب و غریب اور مزاحیہ صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ دلاور کی بیوی نے کہیں اپنے شوہر کو فون کیا تھا تو اسے بتایا گیا تھا کہ دلاور صاحب کو ڈی سلوا صاحب اپنی گاڑی میں لے گئے ہیں۔ اسے حقیقت کا علم کہاں تھا۔ یہی بات اس نے پولیس کو بتا دی۔ پولیس نے … چوکیدار سے بیان لیا تو اس نے حلف اٹھا کے کہا کہ دلاور صاحب خود گاڑی چلا رہے تھے اور گاڑی ڈی سلوا صاحب کی تھی۔ گیٹ سے گزرتے ہوئے چوہدری صاحب نے اس کے سلام کا جواب بھی دیا تھا اور ان کے ساتھ والی سیٹ پر ڈی سلوا صاحب موجود تھے۔ چوکیدار بے چارہ … اس نے ڈی سلوا صاحب کو دیکھے بغیر گاڑی کو اندر جانے دیا تھا اور واپسی میں چوہدری صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ دلاور کی بیوی اور چوکیدار کے بیان دلاور کے بیان کی صاف نفی کرتے تھے۔ … کار خانے کے اندر آتے جاتے اور دلاور کو … اغوا کر کے لے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ دلاور کا …

… جانا اور بالکل نارمل طریقے سے چوکیدار کے سلام کا جواب دینا اس بات کا ثبوت فراہم کرتا تھا کہ وہ جہاں بھی گیا تھا، مرضی سے گیا تھا۔ چوکیدار کے بیان نے یہ بتا دیا کہ دلاور کا نارمل نظر آنا … کرنا بھی ایک امر تھا چنانچہ اس الزام کو ہی نہیں لیا اور وہ ابھی تک اپنے بیان پر قائم ہے کہ ہم دلاور کو … خود اس کی بیوی اور اس کے ایک ملازم نے جھوٹا کر دیا۔ دوسری طرف ڈی سلوا پھنس گیا۔ سب سے پہلے تو وہ آفس نہ جانے کی وجہ نہیں بتا سکا۔ چونکہ … الگ الگ بیانات لیے تھے اور ڈی سلوا نے … بریفنگ نہیں کی تھی اس لیے نوکروں نے اپنے بیان … صاحب معمول کے مطابق دفتر گئے تھے۔ اب … کیا جائے کہ سارا دن اس نے کہاں گزارا اور کیسے گزارا۔ … پولیس کے سامنے حقیقت بیان کر دیتا تو اس … خراب نہ ہوتی مگر اس نے جلد بازی سے گریز کیا اور … دلاور سے ملاقات تک التوا میں رکھنے کی … اب وہ کیسے ثابت کرتا کہ شملا اس سے ملی تھی اور … گاڑی سمیت ہائی جیک کر کے لے گیا تھا۔ وہ … گھر سے دور جاتے ہوئے اس کو ایک پرانا دوست … یا اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی مگر گاڑی اس کے … تھی۔ وہ کوئی وضاحت پیش نہیں کر سکا کہ اس کی … ایک نیم آباد علاقے میں کھڑی ہوئی کیوں پائی گئی؟ … کوٹھی کے سامنے والی سڑک پر … جہاں دلاور قید تھا۔ اگر کوئی اس کی گاڑی … گاڑی چوری ہو گئی تھی تو ڈی سلوا نے رپورٹ … نہیں لکھوائی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں کیس الگ … تھانوں کے ہیں بلکہ اس میں تو تین تھانے ملوث ہو گئے۔ … دلاور کے اغوا کا کیس … کے ایک تھانے … جہاں دھماکا ہوا تھا وہ ماڈل ٹاؤن تھانے کا علاقہ ہے … تیسرا تھانہ وہ ہے جس کی حدود میں ڈی سلوا کی کوٹھی … آتی ہے۔ پولیس والے رات کو ڈاکٹر کی رپورٹ پر … سے خوش ہو کے لوٹے تھے کہ … ہاتھ میں … لیکن اب انھوں نے بھی ڈی سلوا اور اس … کو غلط بیانی کا ملزم بنا دیا کیونکہ وہ ڈاکٹر اپنی … کہ اس نے تو رات … کو فون کر دیا تھا۔ … والوں نے کچھ نہیں کیا اور ڈی سلوا نے منہ بند کر کے … بھیج دیا تو یہ دونوں کی مجرمانہ غلطی ہے۔"

"آخر پولیس کسی نتیجے پر تو پہنچی ہوگی؟" میں نے کہا۔

"پولیس خود تو کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکتی تھی اور نہ پہنچنا چاہتی تھی۔" محسن نے کہا۔ "ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے معاملات ان کے ہاتھ میں رہیں۔ مقدمہ درج کرنے کی نوبت نہ آئے۔ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ملوث کر کے اپنی تفتیش کے عمل کو جاری رکھ سکیں اور پھر فریقین سے معاملات کو نمٹانے کا جتنا معاوضہ وصول کر سکیں کر لیں۔ انھیں اس سے کیا غرض کہ غلطی کس کی تھی، ظلم کس نے کیا تھا، کس پر کیا تھا۔ قانون کے تقاضے کیا ہیں۔ وہ تفتیش، سماعت اور سزا کے نام سے سب کو پریشان رکھنے میں ہی ان کی خوشحالی کا راز مضمر ہے۔ اگر انکل رضوی نے مداخلت نہ کی ہوتی تو تیرے خلاف بھی بہت سی دفعات کے تحت تفتیش شروع ہو جاتی لیکن ان کو یقین تھا کہ دلاور بکواس کرتا ہے۔ ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ سارا دن ہم کہاں رہے اور کیا کرتے رہے۔ خود بیگم رضوی کی گواہی ہمارے حق میں ہے اور ہمیں بے گناہ ثابت کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے شوہر کو بتا دیا تھا کہ ہم ناشتے کے بعد کوارٹر میں چلے گئے تھے اور دوپہر کے کھانے کے وقت بھی گھر میں موجود تھے۔ اصل میں وہ ہم دونوں سے بہت خوش ہیں بلکہ ہم کو نیک سمجھتی ہیں۔"

"کیونکہ ہم اپنی باتوں سے ان کا دل بہلاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور ان کو بہلاتے ہیں۔"

"بلاشبہ، دیگر ایک سیدھی سادی عورت کو بڑی نیک نیتی سے بے وقوف بناتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اللہ معاف کرے میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ بیگم رضوی ہماری خاطر جھوٹ بھی بول سکتی ہیں۔ وہ رضوی صاحب کی طرح سخت اصول پرست اور محبت پر فرض کو مقدم رکھنے والی چیز نہیں ہیں۔ انکل رضوی کا تو اصول یہ ہے کہ ادائے فرض میں وہ تعلقات کو حائل نہیں ہونے دیتے۔ میں نے ڈیڈی کو بتایا، تیرے مرحوم والد نے بھی کبھی ان سے کوئی ناجائز کام کرنے کو نہیں کہا لیکن ہمارے کیس میں انھیں صاف گڑبڑ نظر آتی ہے۔ معاملات اگر لندن تک محدود رہتے تو وہ ہمارے سوا کسی کو قصوروار نہ سمجھتے مگر یہاں انھوں نے اپنی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھا ہے۔ چچا … مرحوم کے حالات اور ان کی موت کے غیر معمولی اسباب، سلامت شاہ کا قتل، راہد کے گھر کی تباہی اور اب یہ خط جس کی خاطر قشمی مرحوم کے … خاندان نے اپنی جان قربان کر دی۔ ان سب باتوں نے شبہے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ ڈی سلوا اور دلاور ہی ہمارے اصل دشمن ہیں جن کا ساتھ دینے والے استاد … سے لے کر نواب خورشید تک بہت سے لوگ تھے۔ ان کی مجبوریاں دو ہیں۔ ایک تو میر شرافت علی کے قتل کا الزام جس میں حالات اور اتفاقات

کی شہادت مجھے مجرم ثابت کرتی ہے۔ دوسری مجبوری ہماری عزت ہے۔ انھیں ہم سے گلہ ہے کہ ہم ان بے چاروں پہ بھروسہ نہیں کرتے اور جائز و ناجائز طریقے پہ معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے کر مزید خرابی کے اسباب پیدا کرتے ہیں لیکن اس دن کے بارے میں ان کو پورا یقین ہے کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ اس سے پہلے کی رات کے واقعات کا ان کو کوئی علم نہیں۔ صبح انھوں نے ہمیں سو کر اٹھ کے ناشتے کے لیے آتے دیکھا تھا۔ جب وہ آفس گئے تھے تو ہم گھر پہ تھے جب رابعہ کورٹ گئی تھی تب بھی ہم ناشتے کی میز پہ ہی بیٹھے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت تک ہماری موجودگی کی گواہ بیگم رضوی ہو گئیں۔ شام کے وقت پھر انکل رضوی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ہم سو کر اٹھے ہیں اور کوارٹر سے برآمد ہوتے ہیں۔ چھ بجے تک ہم نے ان کے ساتھ چائے پی تھی اور گپ لگائی تھی اور پھر پیدل روانہ ہوئے تھے کہ فلم دیکھنے جا رہے ہیں۔ ہم ٹھیک وقت پہ واپس پہنچے تو ہمارے پاس دو ٹکٹوں کے پھاڑے ہوئے کوپن بھی تھے۔ رضوی صاحب بہت ذہین افسر ہیں صرف کوپن دیکھ کر وہ بھی تسلیم نہ کرتے کہ ہم واقعی فلم دیکھ رہے تھے لیکن شام چھ بجے تک ہماری گھر میں موجودگی شبہے سے بالاتر تھی پھر وہ کیسے مان لیتے کہ چوہدری دلاور اور ڈی سلوا سچ بول رہے ہیں۔ پولیس والے جب ہمارا بیان لینے پہنچے تو صرف میں موجود تھا اور میں نے بڑی معصومیت سے بتا دیا تھا کہ ہم تو گھر سے نکلے ہی نہیں تھے۔ یہ ساری کہانی جھوٹی ہے جو ڈی سلوا اور چوہدری دلاور نے آپس میں سازش کر کے ہمارے خلاف گھڑی ہے۔ اپنے یقین کی بنیاد پر انکل رضوی نے میری تائید کی۔ تفتیش کے لیے آنے والا ایک انسپکٹر تھا وہ بے چارہ کسی ایس ایس پی کے سامنے کیا بولتا۔ ایس ایس پی بھی وہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ باپ کو نہ بخشے۔ رضوی صاحب نے چوہدری دلاور اور ڈی سلوا پہ سخت ناراضگی ظاہر کی۔ انسپکٹر سے کہا کہ ان دونوں بدمعاشوں سے ذرا سختی کے ساتھ پوچھو کہ اتنا بڑا جھوٹ بولنے کے لیے انھوں نے یہ ڈرامہ کیوں کیا۔ کیا وہ دونوں سب کو احمق اور گدھا سمجھتے ہیں؟"

۔۔۔محسن نے قہقہہ مارا۔ "اور میری توقعات کے عین مطابق انکل رضوی نے انسپکٹر سے بڑا اچھا سوال کیا۔ انھوں نے کہا۔ "انسپکٹر! ذرا عقل سے کام لو کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک شخص گاڑی چرا کے اپنے دو جانی دشمنوں کو اغوا کرے۔ مارے پیٹے اور پھر ان میں سے ایک کو بحفاظت گھر پہنچا دے۔ دوسرے کو قتل کرنے کی ایسی احمقانہ کوشش کرے۔ ہم باتھ روم میں تھا اور دلاور دروازے پر کھڑے تھے۔ کیا ہم کو اور دلاور کو باتھ روم میں ایک ہی جگہ نہیں رکھا جا سکتا تھا؟ ... پر پیچھے اٹھ جاتے۔ اس کے ساتھ ڈی سلوا کو بھی ... دونوں کا قصہ ہی پاک ہو جاتا۔ بالفرض محال محسن اور سکندر نے ... حرکت کی ہوتی تو کیا ان پہ کوئی الزام آ سکتا تھا؟ ... واقعات کی اور مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ کی گواہی ... یہ دونوں سارا دن گھر میں ہی رہے، جو ایک حقیقت ہے اور ایسے گواہوں کی گواہی کو کوئی عدالت مسترد نہیں کر سکتی کم سے کم میرے بارے میں تو دنیا جانتی ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔"

"حالانکہ وہ اس وقت بھی جھوٹ بول رہے تھے" ... نے شرمندگی سے کہا۔

"ہاں ... اور اس یقین کامل کے ساتھ کہ میں سچ ..." محسن نے اعتراف کیا۔ "انھوں نے انسپکٹر کے سامنے ... کیا کہ ڈی سلوا کو چوہدری دلاور نے گھر کے دروازے پر ... حالت میں چھوڑا اور خود کچھ شبہ پیدا ہو۔ پھر وہ ڈی سلوا کی گاڑی چلا کے اس ویران کوٹھی تک لے گیا جہاں اس نے پوری احتیاط سے مجرم کو باتھ روم میں رکھا اور خود ... کمرے کے آخری گوشے میں کھڑا رہا۔ اسے معلوم ... کی طاقت کتنی ہے اور سکندر کی جسامت کتنی مضبوط ہے۔ شاید اس کے کسی آدمی نے اسے باندھ بھی دیا ... کی آواز پر گڑبڑ کا آ جانا یقینی تھا۔ انسپکٹر تو میرا بیان ... کی رسمی کارروائی بھی پوری کرنا چاہتا تھا لیکن انکل ... کہا کہ سکندر کو چوٹ آئی ہے اور بہت تیز بخار ہے۔ ... دو دن بعد پوچھ لینا۔ ظاہر ہے انسپکٹر اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔"

"انکل رضوی نے یہ جھوٹ کیوں بولا؟" ... میں کہا۔

"یہ جھوٹ نہیں تھا" محسن نے برا مان کے کہا۔ "... خط پڑھ چکے تھے اور تیری حالت بھی دیکھ چکے تھے۔"

تین افراد بیک وقت کمرے میں داخل ہوئے ... آگے ڈاکٹر تھا جسے میں نے عالم ہوش میں پہلی بار دیکھا ... اس کا چہرہ مجھے جانا پہچانا لگا۔ ویسے بھی ... دل کی دھڑکن شمار کرنے والا گلے کا ہار اس کے ... کا اشتہار تھا۔ اس کے پیچھے رابعہ اور شہلا تھیں اور ... ہوتا تھا کہ ان دونوں نے زبردستی ڈاکٹر کو آگے ... آداب دیا اور پھر اس کے پیچھے چلی آئی ہیں۔

"ملاحظہ فرمایئے ڈاکٹر صاحب" رابعہ نے ... شکایت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے آپ کا بیمار! ... فی تیمار دار۔ دونوں آپ کی ہدایات کی صریح خلاف ورزی کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر نے ہم دونوں کو ملامت آمیز نظروں سے دیکھا ... نہایت خطرناک مجرم کے ساتھ میرے قریب بیٹھ کر اپنا بیگ کھولنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ کوئی انجکشن ٹھونک کر پھر بے ہوش کرنا چاہتا ہے۔

"قبلہ ڈاکٹر صاحب!" میں کہنا شروع کیا۔ "آپ یقین کیجیے میں بالکل صحت مند ہوں اور مجھے علاج یا تیمارداری کی ... ضرورت نہیں ہے۔"

ڈاکٹر یوں سلو موشن میں سر نفی میں ہلا رہا جیسے میں کسی اور سے مخاطب ہوں۔ اور شہلا مسکرا رہی تھی۔ "البتہ یہ خواتین" ... نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "ان کو کچھ ... ذہنی امراض لاحق ... بالکل تو خیر نہیں ہیں مگر ..."

سلو موشن میں حرکت کرنے والے ڈاکٹر نے اچانک بجلی کی طرح لپک کر میرا بازو تھام کر انجکشن لگانے کی ناکام کوشش کی۔ بڑے وقت پہ میں نے جھکائی دی اور بیڈ کے دوسرے کنارے سے نیچے گرا۔

ڈاکٹر نے ایک سرد آہ بھری۔ سینے میں گھسپ جانے والے انجکشن کی سوئی نکالی اور اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ جو ایک طرح شکست ... کا اعلان تھا۔ "میں کچھ نہیں کر سکتا رابعہ بی بی!"

"کیا آپ کے پاس وہ گن نہیں ہے" رابعہ نے مایوسی سے کہا۔ "جس سے بے ہوش کرنے والے فائر کیے جاتے ہیں۔ میں نے ایک فلم میں دیکھا تھا کہ افریقہ میں گینڈے کس طرح بے ہوش کیے جاتے ہیں۔"

"یہ تقریباً ویسی ہی کوشش تھی" میں نے اٹھ کر فاتحانہ ... سے کہا۔ "لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔"

"اس کو کیسے بے ہوش کر سکتا ہوں؟" محسن نے دعویٰ کیا۔ "لیکن میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

ڈاکٹر بہت کم گو تھا یا شاید اس مقولے پہ عمل پیرا تھا ... جواب جاہلاں باشد خاموشی۔ وہ روانہ ہونے ہی والا تھا ... آداب ... کا خیال آیا اور وہ جاتے جاتے ... میں نے سنجیدگی سے معذرت کی اور ڈاکٹر ... کہ اب واقعی ٹھیک ہوں اور مجھے بہت ... بے ہوش پڑے رہنے سے زیادہ تھوڑی ...

"کیا ضروری ہے اور کیا ضروری نہیں" ڈاکٹر نے کسی فلسفی ... "اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔"

اسی وقت شہلا چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آئی تو میں حیران ہوا۔ یقیناً چائے پہلے سے تیار تھی ورنہ ایک منٹ میں کیسے آ جاتی۔ ڈاکٹر ایسا مظلوم صورت تھا کہ بے اختیار اسے چھیڑنے کو دل چاہتا تھا جب وہ چائے پی رہا تھا تو میں نے بڑے فخر سے اس کو بتایا کہ وقت کی کمی کی وجہ سے میں جوڈو اور کراٹے میں بلیک بیلٹ لیتے لیتے رہ گیا چنانچہ پہلے ... کے بعد وہ دوسری کوشش کرتا تو میری جگہ خود لیٹا ہوتا۔ انجکشن لگنے سے پہلے ہی میں اسے ناک آؤٹ کر دیتا۔ ڈاکٹر خاموش رہا اور رابعہ مجھے بدتمیزی کے اس مظاہرے پہ ...

"اچھا مسٹر بلیک بیلٹ!" ڈاکٹر نے چلتے چلتے کہا۔ "وقت ملے تو میری بات پہ بھی غور کرنا۔"

کمرے میں اپنے مختصر سے قیام کے دوران اس نے دو ہی جملے بولے اور قابل اعتبار صرف دوسرا ہی جملہ تھا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد رابعہ نے زور اور شہلا نے ہنسنا شروع کیا اور ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا تو ہنستے اور محسن نے دونوں کی طرح ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ کیا چکر ہے مسٹر شیروانی؟" میں نے بیڈ پر لیٹ کر کہا۔

"چکر تو ابھی آپ کو آئیں گے" شہلا نے کہا۔ "یہ کمرہ آپ کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے گا اور دنیا اندھیر ہو جائے گی۔"

"دراصل مجھے پہلے ہی اس بات کا اندیشہ تھا سکندر اعظم!" رابعہ بولی۔ "کہ تم مزاحمت کرو گے حالانکہ ابھی تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں نے باہر ہی ڈاکٹر سے بات کر لی تھی اور اس نے دوسرا طریقہ بھی بتا دیا تھا۔ چائے آپ کو کیسی لگی؟"

"یہ چائے تھی یا کافی؟" میں نے ڈاکٹر کی اور رابعہ کی بات پہ ایک ساتھ غور کیا اور فوراً اس نتیجے پہ پہنچ گیا کہ جو دوا مجھے انجکشن کے ذریعے نہیں دی جا سکی وہ مجھے چائے میں دے دی گئی ہے۔ اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے۔

"فراڈ" میں نے چلا کے کہا۔ "ایک بے بس اور لاچار بیمار مریض کے ساتھ فراڈ۔ پولیس ..."

خواب آور دوا کا اثر زائل ہوا تو میری آنکھ اس وقت کھلی جب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کمرے میں ایک لائٹ دیوار کی اور ایک ٹیبل لیمپ میرے سرہانے روشن تھی۔ کچھ دیر تو کمرے کی ہر چیز آؤٹ آف فوکس رہی لیکن دس منٹ بعد دھند چھٹ گئی اور میں نے ہر صورت کو اپنے مقابل صاف دیکھا۔ میرے بائیں ہاتھ پہ یعنی دروازے کی طرف تین کرسیاں پڑی تھیں۔ وہاں محسن اور رابعہ آمنے سامنے چپ بیٹھے تھے۔ تیسری خالی کرسی رضوی صاحب کی تھی جو ہاتھ باندھے کمرے میں ٹہل رہے تھے اور خاصے متفکر نظر

www.paksociety.com

آ گئے تھے۔

"گڈ مارننگ انکل رضوی!" میں نے ہاتھ کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آج مجھ پر بہت ظلم ہوا۔۔۔"

"مجھے معلوم ہے۔" انہوں نے درشتگی سے میری بات کاٹ دی اور ایک ہاتھ سے دوسری طرف اشارہ کیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دائیں طرف بھی دو کرسیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر جو پولیس انسپکٹر بیٹھا تھا اسے میں اچھی طرح جانتا تھا۔

"ہیلو، ایس آئی شیخ!" میں نے حیرت اور مسرت سے کہا اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "آپ یہاں کیسے آئے؟" اس وقت تک میرا خیال یہی تھا کہ چراغ دین جیسے منشیات کے اسمگلر کی گرفتاری میں مدد کرنے پر وہ میرا شکریہ ادا کرنے آیا ہوگا یا محض میری خیریت معلوم کرنے کے لیے۔

"میرا ٹرانسفر کر دیا گیا ہے مسٹر سکندر۔" ایس آئی سید اکرام شیخ نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا جو میرے لیے غیر متوقع بات نہیں تھی۔

"تم دونوں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہو؟" رضوی صاحب نے حیرانی سے کہا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ "خیر، یہ بڑی اچھی بات ہے سکندر!" وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولے۔ "سب انسپکٹر شیخ ایک بہت اصول پرست اور ایماندار انسپکٹر ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے انکل!" میں نے کہا۔ "اور اسی لیے اتنا بڑا کارنامہ انجام دینے پر ان کی ترقی نہیں ہوئی بلکہ تبدیلی ہو گئی۔"

"آپ نے پہلی ملاقات میں کہا تھا کہ ہم سازگار حالات میں ملے ہوتے تو اچھے دوست بن سکتے تھے۔" انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "افسوس یہ ہے کہ ہماری دوسری ملاقات بھی ایسے ہی حالات میں ہو رہی ہے۔"

"دراصل مسٹر شیخ ایک کیس کے سلسلے میں تم سے کچھ پوچھنے کے لیے آئے ہیں۔" رابعہ نے بروقت مداخلت کر کے مجھے خبردار کر دیا کہ میں سوچے سمجھے بغیر منہ سے کوئی بات نہ نکالوں۔

"ان کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟" میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔

"انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "پولیس کے ریکارڈ پر تمہارا پتہ یہی ہے جو میرا ہے۔ میں ان کو یہاں لے آیا ہوں اور مجھے یہاں رابعہ لائی تھی۔"

"ویسے آپ کو اپنا پتہ بدلنے سے پہلے عدالت کو مطلع کر دینا چاہیے تھا۔" انسپکٹر شیخ نے کہا۔

"جس روز میں گھر بدلوں گا گواہی کرا دوں گا۔" میں نے کہا۔ "یہ تو میری بہن کا گھر ہے۔"

"میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق آپ کی کوئی بہن نہیں ہے۔" انسپکٹر شیخ نے ایک خاصی ضخیم فائل دکھاتے ہوئے کہا۔ "آپ نذیر خان مرحوم کے ایک ہی وارث ہیں۔"

بے اختیار میں نے رابعہ، محسن اور رضوی صاحب کی طرف دیکھا۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ کیا ایک ہی سوال کا جواب انکار بھی ہو سکتا ہے اور اقرار بھی؟ آخر میں کس کا وارث ہوں؟ سلطان آباد کے سابق حکمران نواب خورشید کا یا اس نذیر خان کا جس نے پاکستان کی خاطر اپنے پورے خاندان کی زندگی داؤ پر لگا دی اور صرف مجھے بچا لیا تھا، اور جو لکھ پتی ہونے کے باوجود کسمپرسی کی موت مرا؟ ایسے سوالات میرے ذہن میں پہلے کبھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ رابعہ اور محسن کے علاوہ رضوی صاحب نے میرے خیالات کو میری صورت پر پڑھ لیا تھا اور مجھ سے نظر ملانے سے کترا رہے تھے۔

"مسٹر سکندر! میرا چراغ دین کے کیس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔" شیخ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کیس کی تفتیش کا چارج لینے سے پہلے مجھے آپ کے بارے میں، آپ کے والد کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہو گئی تھیں مگر ان کا ذکر نہیں کروں گا۔ اب جو کیس مجھے دیا گیا ہے اس کا تعلق تین افراد سے ہے۔ دو کے بارے میں میڈیکل رپورٹ اور اتفاقی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کو قتل کر دیا تھا۔ ایک کا نام عبدل تھا اور دوسرے کو رشید کہا جاتا تھا۔ یہ دونوں میر شرافت علی کے ملازم تھے۔۔۔"

"اور میر شرافت علی کا قاتل میں ہوں؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر تلخی سے کہا۔ "رائٹ؟"

"یہ فیصلہ تو صرف عدالت ہی کر سکتی ہے۔" انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ تم پر اس قتل کا الزام ہے۔"

شمالہ کے اندر آ جانے کے باعث وہ خاموش ہو گیا۔ شمالہ نے مجھے دوا دی اور چائے کی ٹرے درمیان میں رکھ کے باہر چلی گئی۔ "میں اس لڑکی کو بہن کہتا ہوں اور سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کا نام شمالہ ہے۔"

"ہلاک ہونے والی بوڑھی عورت عبدل کی ماں تھی۔" انسپکٹر شیخ نے میری بات کو اہمیت دیے بغیر فائل پر نگاہ ڈالی۔ "پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اس کی موت حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب ہوئی تھی۔"

"پولیس کو اس واردات کی اطلاع کس نے دی تھی؟" میں نے رابعہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے کر آگے بڑھایا۔

"مجھے بتایا گیا تھا۔" شیخ نے چائے کا کپ لیتے ہوئے رضوی صاحب کی طرف دیکھا۔ "کہ آپ بیمار ہیں یا کچھ ایسا وغیرہ تھا۔ چنانچہ میں شام کو ایس پی صاحب کے گھر پہنچا۔ ایس پی صاحب کے پاس جانے کا ایک مقصد یہ تھا کہ آپ کی خیریت معلوم کروں اور دوسرا مقصد آپ سے ان دونوں کے بارے میں پوچھنا تھا۔ یعنی عبدل اور رشید کے بارے میں کیونکہ وہ ان کے قتل کے چشم دید گواہ تھے اور استغاثہ کا سارا کیس ان کی گواہی پر منحصر تھا۔۔۔"

"تعجب کی بات ہے انسپکٹر شیخ!" میں نے کہا۔ "صفائی کا صرف ایک ہی گواہ تھا، سلامت شاہ۔"

"پلیز، آپ مجھے بات ختم کرنے دیں۔" انسپکٹر شیخ نے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "ایس پی صاحب نے بتایا کہ آپ کو ابھی تک دوہرے قتل کی اس واردات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اخبار آپ نے دیکھا نہیں اور بیماری کی وجہ سے آپ کو یہ بات نہیں بتائی۔" وہ ذرا رکا۔ سگریٹ جلا کے اس نے ایک کش لیا اور دوبارہ بولا۔ "یہ دو دن پہلے کی بات ہے یعنی منگل کی رات کو بارہ بجے یا آپ کہہ سکتے ہیں کہ بدھ کی صبح ایک بجے ایک شخص نے پولیس اسٹیشن فون کیا۔ اتفاق سے رات کی ڈیوٹی پر میں تھا۔ ریسیور میں نے ہی اٹھایا تو فون کرنے والے نے کہا کہ وہ کسی ذمہ دار افسر سے بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں سب انسپکٹر شیخ بول رہا ہوں اور تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔ اس نے کہا: "جناب انسپکٹر صاحب! سوالات بعد میں کیجیے گا، پہلے میرا بیان لکھ لیجیے یا ٹیپ کر لیجیے کیونکہ میں شدید زخمی ہوں اور میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے پہنچنے سے پہلے مر جاؤں اور میں بیان دیے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔" حسن اتفاق ہے کہ اس وقت تھانے میں ایک ٹیپ ریکارڈر موجود تھا۔ چند روز قبل ایک چور پکڑا گیا تھا اور اس کے قبضے سے جو مال برآمد ہوا تھا اس میں یہ ٹیپ ریکارڈر بھی شامل تھا اور تھانے میں رکھا تھا۔ فون کرنے والے کی آواز بتاتی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ میں نے ٹیپ ریکارڈر چیک کر کے آن کیا اور ٹیلی فون سے منسلک کر دیا۔ وہ گرینڈیگ جرمنی کا خاصا مہنگا ٹیپ ریکارڈر تھا، ماڈل ٹی سی ۲۰۰ جو میرے گھر میں بھی ہے۔ اس میں ٹیلی فون کی بات ریکارڈ کرنے کا خصوصی نظام ہے۔ آپ اسے ٹیلی فون سے منسلک کر دیں تو آپ کی عدم موجودگی میں آنے والے پیغامات ریکارڈ کر سکتا ہے اور آپ جب بھی واپس آئیں ٹیپ سے پیغامات سن سکتے ہیں۔ کیونکہ میں اس کے طریقہ استعمال سے واقف تھا اس لیے مجھے ٹیلی فون اور ٹیپ ریکارڈر کا کنکشن ملانے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا۔ عبدل کا وہ بیان جو اس نے مرنے سے پہلے دیا لفظ بہ لفظ اس کی اپنی آواز میں ریکارڈ ہو گیا۔ جب میں پولیس پارٹی کے ساتھ عبدل کے بتائے پتے یعنی۔۔۔ میر شرافت علی کی پرانی کوٹھی "ریگل ولا" پر پہنچا تو عبدل ایک بیڈروم میں ٹیلی فون کے قریب مرا پڑا تھا۔ بعد میں ٹیپ کی مدد سے میں نے اس بیان کو کاغذ پر اتار لیا۔ اگر تھوڑی سی مہلت ملتی تو میں تحریری بیان پر عبدل کے دستخط بھی حاصل کر لیتا۔"

"لیکن اب تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا۔ "آپ کے پاس ٹیپ ہو گا اور جہاں تک میری قانونی معلومات کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ وہ بیان سچ سمجھا جاتا ہے جو کوئی شخص مرنے سے پہلے دیتا ہے۔"

میری بات کا انسپکٹر شیخ نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اس نے سگریٹ کو فرش پر ڈال کے جوتے سے مسل دیا کیونکہ آس پاس کوئی ایش ٹرے نہیں تھی۔ "آپ کی بات غلط نہیں ہے۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "افسوس یہ ہے کہ وہ ٹیپ غائب ہو گیا تھا۔"

"غائب ہو گیا تھا؟" میں نے اس بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے کے بعد کہا۔ "لیکن یہ کوئی سوال نہیں تھا۔ شیخ صاحب! ٹیپ چوری ہو سکتا ہے، تباہ ہو سکتا ہے یا گم ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ریکارڈنگ کو عمداً صاف کر دیا جائے مگر ایک ابلے ہوئے پانی کے بلبلے کی طرح غائب نہیں ہو سکتا۔"

"آپ کا اعتراض بجا ہے۔" شیخ بولا۔ "مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ ٹیپ غائب کر دیا گیا ہے یا چوری کر لیا گیا ہے۔ ٹیلی فون پر عبدل کا بیان پورا ہوتے ہی میں نے محرر کو سمجھایا کہ ٹیپ کے الفاظ کو کاغذ پر کیسے اتارا جاتا ہے اور خود دو سپاہیوں کے ساتھ جائے واردات پر پہنچ گیا۔ یہاں تھانوں میں آمد و رفت کی کوئی سہولت تو ہوتی نہیں چنانچہ مجھے سڑک تک آ کے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا اور جب ہم ٹیکسی میں میر شرافت علی کی کوٹھی پہنچے تو آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ میں نے محرر کو ہدایت کی تھی کہ بیان کی نقل بن جائے تو فوراً کسی کے ہاتھ روانہ کر دے۔ مقصد یہی تھا کہ عبدل زندہ مل جائے تو بیان پر اس کے دستخط لے لوں یا اس کا انگوٹھا لگوا لوں لیکن عبدل تو میرے پہنچنے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ بیان کی نقل ایک گھنٹے بعد موصول ہوئی۔ اس کے بعد میں ضابطے کی کارروائی میں الجھ گیا۔ رشید کی لاش مجھے کمرے میں ملی اور عبدل کی ماں کی لاش بھی۔ میں نے آلۂ قتل وغیرہ اپنے قبضے میں لیے، فنگر پرنٹس لیے، آس پاس رہنے والوں کو بلایا اور بالآخر تقریباً صبح کے دس بجے لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کے بعد

www.paksociety.com

واپس پولیس اسٹیشن پہنچا۔ اگر یہ واردات نہ ہوتی تو میری ڈیوٹی آٹھ بجے ختم ہو جاتی۔ میری عدم موجودگی میں ڈیوٹی پر حشمت خان آ گیا تھا۔"

"حشمت خان تو؟" میں نے چونک کر کہا۔ "پھر تو یہ ہونا ہی تھا۔"

"نہیں، ٹیپ حشمت خان نے غائب نہیں کیا۔" شیخ نے کہا۔ "اس کی قسموں پر تو میں نے بھی اعتبار نہیں کیا تھا۔ اس نے میرے پوچھنے پر کسی ٹیپ کی موجودگی سے قطعی لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ وہ آٹھ کے بجائے ساڑھے نو بجے یعنی صرف آدھے گھنٹے پہلے آیا تھا اور اس آدھے گھنٹے میں روزنامچہ دیکھنے یا چائے پینے کے سوا اس نے کوئی کام نہیں کیا۔ وہ تو اپنی سیٹ پر سے اٹھا بھی نہیں۔ ٹیپ ریکارڈر وہیں موجود تھا جہاں میں نے اس کو رکھ کر تالا لگایا تھا لیکن اس میں کوئی کیسٹ نہیں تھا۔ میرے ہنگامہ کرنے پر محرر جاگ اٹھا جو رات کی ڈیوٹی پر تھا اور پیچھے والے کمرے میں سو رہا تھا۔ اس نے بروقت مداخلت کی ورنہ میری حشمت خان سے بھی جنگ چھڑ جاتی اور میں رپورٹ حکام بالا تک ضرور پہنچاتا۔ محرر نے رازداری کے وعدے پر ڈرتے ڈرتے مجھے بتایا کہ جب وہ ٹیپ کو کاپی کر رہا تھا تو ایس ایچ او صاحب نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور پوچھا تھا کہ یہ کیا تماشا ہے۔۔۔"

"ایس ایچ او کے ذرائع اب بھی [illegible] رہا ہے۔" میر محمد تو؟" میں نے پوچھا۔

"پولیس تھانے کے بارے میں تمہاری معلومات حسب معمول اپ ٹو ڈیٹ ہیں۔" انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "محرر نے بتایا کہ ٹیپ ایس ایچ او صاحب ہی نے نکال لیا تھا اور ظاہر ہے بیچارہ محرر انہیں روک نہیں سکتا تھا۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ میر محمد انتہائی کینہ اور کینہ پرور آدمی ہے۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ محرر نے ٹیپ کی چوری کا الزام اس پر عائد کر دیا ہے تو میرے ساتھ وہ محرر کی جان کا دشمن بھی ہو جائے گا۔ میں نے اسے اطمینان دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہو گی اور وہ مطمئن رہے۔ ابھی مجھے اس تھانے میں پہنچے ہوئے چند ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے اور تقریباً ہر شخص سے اختلاف اور تلخ کلامی کی نوبت آ چکی تھی۔ جب بھی ڈیوٹی پر ہوتا تھا تو سارے عملے کے لیے مسئلہ بن جاتا تھا خصوصاً نائٹ ڈیوٹی کے دوران۔ ایک تو انہیں ہر شخص کی پوری کنڈلی پتا تھی اور تعلق غیر جانبداری کے ساتھ۔ [illegible] حقائق کو مسخ کرنے یا ظالم کو مظلوم بنا دینے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی تھی۔ رات بے وقت اپنے عزیزوں کو گھر سے کھانا پہنچانے اور تشدد سے بچانے کے لیے بھاری معاوضے ادا کرتے ہیں۔ میری موجودگی میں یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ پہلی بار میر محمد سے میری اسی بات پر جھڑپ ہوئی۔ اس نے مجھ سے بڑے مغلظ لہجے میں کہا کہ مسٹر شیخ یہ کہ تم نے رات کو تفتیش میں رکاوٹ ڈالی۔ تھانے کے معمول کے مطابق کام نہیں کرنے دیا اور لوگوں کو بھی پریشان کیا۔ میں نے کہا کہ مسٹر قائم مقام ایس ایچ او صاحب! میں آپ کو معاف کر رہا ہوں۔ آئندہ یاد رکھیے گا کہ میرا نام شیخ ہے۔ باقی الزامات میرے سمجھنے نہیں ہیں۔ اگر کو مجھ سے شکایت ہے تو تحریری طور پر آپ کو دے کر اوپر بھیج سکتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں اپنی موجودگی میں کوئی غلط کام نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے پولیس کی نوکری ایک مشن سمجھ کے کی ہے اور یہ مشن ہے قانون کی مدد سے معاشرے کی اصلاح کا۔ ورنہ میرا باپ بزنس مین ہے اور مجھے پیٹ پالنے کے لیے اس تنخواہ کی بھی ضرورت نہیں۔ میر محمد بہت [illegible] اور کہنے لگا کہ شاباش! کبھی ایک چچا بھانجا [illegible] پتا ہے جو نوکری کی ضرورت نہیں ہے تو گھر جاؤ اور عیش کرو۔ دوسرے بھی عیش کر لیں۔ میں نے کہا کہ نوکری تو حکومت کی ہے یا کسی اور کے کہنے سے میں گھر جا کے نہیں بیٹھ سکتا اور آئندہ یہ بات مجھ سے کہنا بھی نہیں۔ خیر اس کے بعد میری اور میر محمد کی بات نہیں ہوئی۔ محرر سے حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد بڑی الجھن میں پڑ گیا۔ یا تو خود محرر گواہی دیتا کہ اس نے میر محمد کو ٹیپ لے جاتے دیکھا ہے لیکن یہ ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں تھی کہ میں میر محمد پر الزام عائد کر سکتا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ایک چال چلی۔ میں حشمت خان کو چونکا دے کر نکلا اور پیچھے سے گھوم کر پھر اسی کمرے میں آ گیا۔ محرر سے کہا کہ وہ باہر برآمدے میں چلا کے سو جائے۔ میں [illegible] جگہ لیٹا رہا کہ کوئی اندر آئے تو مجھے سوتا دیکھ کر لوٹ جائے۔ زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بیس منٹ بعد میر محمد آ گیا [illegible] نے فوراً اسے مطلع کیا کہ میں ٹیپ کے [illegible] تھا۔ حسب توقع میر محمد نے مجھے ایک سے ایک [illegible] کا اظہار کیا کہ اس نے میری ایسی تیسی کر کے [illegible] نہ نکلوایا تو اپنا نام بدل دے گا اور مجھے افسوس ہوا کہ ان کی گفتگو کو ریکارڈ کرنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ [illegible] عقبی دروازے سے نکل کر واقعہ اگر میرے پاس کوئی ٹیپ ریکارڈر بھی ہوتا تو صورت حال مختلف ہو جاتی۔ [illegible] ساتھ اس کی ہاں میں ہاں ملانے والا اور حشمت [illegible] جاتا۔ اس موضوع پر ان کی گفتگو ختم ہوئی تو میں ایک دم [illegible] آ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ذرا سی دیر کے لیے ان دونوں

کی حالت غیر ہو گئی تھی مگر وہ پرانے پاپی ہیں۔ انہوں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میر محمد نے کہا کہ میر صاحب! جو کچھ آپ نے زیادہ سے زیادہ سنا جتنی گالیاں آپ نے مجھے دیں ان سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا اور آپ دونوں مل کر میرا جو بگاڑنا چاہیں بگاڑ لیں مگر وہ ٹیپ مجھے اسی وقت مل جانا چاہیے۔ ان دونوں کی اداکاری واقعی کمال کی تھی۔ میر نے بڑی حیرانی سے حشمت خان کی طرف دیکھا اور کہا کہ یہ شیخ صاحب کیا فرما رہے ہیں؟ جو ہم نے انہیں گالیاں اور دھمکیاں دی ہیں؟ اور حشمت خان نے بھی اتنی ہی حیرانی سے نفی میں سر ہلایا اور کہا کہ ہم نے تو شیخ صاحب کی بات ہی نہیں کی۔ میں نے کہا کہ اچھا یہ سب چھوڑو اور وہ ٹیپ نکالو۔ میر نے قطعی لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ ٹیپ ریکارڈر میں کوئی ٹیپ تھا ہی نہیں۔ میری دھمکی پر اس نے روزنامچہ میرے سامنے رکھ دیا جس میں برآمد ہونے والے تمام سامان کی تفصیل لکھی ہوئی تھی جس میں ٹیپ ریکارڈر اور اس کا ماڈل نمبر وغیرہ سب درج تھے لیکن یہ واقعی نہیں تھا کہ ٹیپ ریکارڈر کے اندر کوئی کیسٹ بھی تھا۔ ظاہر ہے اس پر کسی نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ یا غور کیا تھا تو قابل ذکر نہیں سمجھا تھا۔ اب یہی نادانستگی میں ہونے والی غلطی یا فروگذاشت ایک انتہائی سنگین مسئلہ بن گئی تھی جس کی عدم موجودگی میں محرر کے ہاتھ کا لکھا ہوا بیان بے معنی تھا۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ محرر کے ہاتھ کی تحریر میں وہ بیان میرے پاس پہنچ گیا۔ اگر خود میں نے اسے کاپی کیا ہوتا تو میرے پاس کوئی گواہ بھی نہ ہوتا۔ محرر کی پوزیشن بڑی خراب ہے۔ وہ بیوی بچوں والا آدمی ہے اور میر محمد سے ڈرتا ہے کہ دشمن ہو گیا تو کسی الزام میں پھنسا کے نوکری سے بھی نکلوا دے گا اور جیل بھی بھجوا دے گا کیونکہ حشمت خان اینڈ کمپنی بھی میر محمد کے ساتھ ہے۔ میں نے محرر سے بات کی تھی کہ وہ کھوئے ایک شخص کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر یہ ثابت نہ ہو سکا کہ عدیل اور نجیب نے ایک دوسرے کو قتل کیا تھا تو الزام خود بخود اس شخص پر آ جائے گا جو پہلے ہی ایک قتل کے مقدمے میں ملوث ہے لیکن ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔ اس کی ضمانت فوراً منسوخ کروا دی جائے گی کہ اس نے اپنی آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں [illegible] کو جھٹکانے لگا دیا اور اس کے بعد یہ تین افراد کے قتل عمد کا کیس بنے گا جس میں سزائے موت یقینی ہو گی۔ تحریر تمہارے ہاتھ کی ہے اس لیے مجھے صرف تمہاری گواہی چاہیے کہ عدیل نے مرنے سے پہلے فون کیا تھا اور تم نے وہی لکھا تھا جو اس نے ٹیلی فون پر کہا تھا۔ محرر نے پھر اپنے بیوی بچوں کی بات کی تو میں نے کہا کہ رزق دینے والا تو خدا ہے۔ تمہیں اس پر اور اپنے آپ پر بالکل اعتماد نہیں۔ نعوذ باللہ میر محمد کاتب تقدیر تو نہیں ہے۔۔۔ لیکن میرے دلائل سے فائدہ کچھ نہیں ہوا۔ محرر نے صاف بتا دیا کہ وہ میرے حق میں گواہی نہیں دے گا۔ اسے ملازمت میں اپنی سزا قبول ہے لیکن وہ دنیا میں بیوی بچوں کو فاقہ کشی، مفلسی اور پریشانی کی سزا نہیں دے سکتا۔ وہ اکیلا ہوتا تو پھانسی بھی چڑھ جاتا مگر اس پر اپنے خاندان کے علاوہ بوڑھے اور بیمار والدین کی ذمہ داری بھی ہے۔ میں اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتا اور مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ میں نے عدیل کے اس بیان کا حوالہ دیا جو اس نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا تو وہ کہے گا کہ شیخ صاحب نے سر پر کھڑے ہو کے مجھ سے یہ تحریر لکھوائی تھی۔ وہ افسر ہیں اور میں انکار نہیں کر سکتا تھا اس لیے وہ جو کچھ کہتے گئے، میں لکھتا گیا۔"

کمرے میں موجود ہر شخص خاموش تھا۔ رابعہ سر جھکائے اپنے دوپٹے کو ایک انگلی پر لپیٹ رہی تھی اور کھول رہی تھی۔ یہ اضطراری حرکت اس کے جذباتی خلفشار کی آئینہ دار تھی۔ شیخ میری بجائے رابعہ کو زیادہ غور سے دیکھ رہا تھا اور عفوی صاحب نے پھر ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔

"کیا تمہاری اپنی گواہی بالکل معتبر نہیں سمجھی جائے گی؟" میں نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ اس آواز میں ویرانی کی آسیب زدہ بازگشت تھی چنانچہ مجھے خود بھی اپنی آواز سے خوف آیا۔

"سکندر! اس وقت میں پولیس افسر نہیں ہوں۔" شیخ نے میرا ہاتھ تھام کے کہا۔ "مجھے تم سے اور تمہارے حالات سے ہمدردی ہے لیکن قانون کے تقاضے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ بے شک میں تفتیش کے لیے ایس پی صاحب کے گھر گیا تھا لیکن مجھے معلوم ہوا کہ تم بیمار ہو تو میں بیان لینے کے لیے یہاں آ گیا اور میں نے تم کو وہ ساری باتیں تفصیل سے بتا دیں جو ابھی تک میرے سوا کوئی نہیں جانتا اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایس پی صاحب کے عہدے سے مرعوب نہیں مگر ان کے کردار سے متاثر ہوں اور یہی بات میرے لیے قابل عزت ہے۔ یہاں آنے کے بعد مس رابعہ تمہاری نے بھی مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ وہ تمہاری وکالت کر رہی ہیں اور کمرے میں موجود دیگر کوئی اور وکیل ہوتا تو شاید میں یہ درخواست مسترد کر دیتا۔ میں نے تو شمن کو بھی کمرے سے نہیں نکالا۔ بہت سی باتیں میں نے معلوم کر لی تھیں مگر جو کچھ میں نے دیکھا وہ بالکل مختلف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ سب ایک خون کا رشتہ نہ ہونے کے باوجود ایک خاندان کی طرح ہیں جس کی بنیاد بناوٹ سے پاک احساس خلوص اور اعتماد پر ہے۔ مثلاً وہ لڑکی جو ابھی [illegible]

آئی تھی۔ تم اسے جن کہتے ہو اور سمجھتے ہو۔ میں جب کام سے کہیں جاتا ہوں تو جانے کا ایک سبب بھی نہیں پتا لیکن یہاں میں نے انکار نہیں کیا۔ دراصل اس گھر کی فضا میں مجھے اعتماد نظر آتا ہے۔ اعتماد نہ ہوتا تو ایس پی صاحب مجھے یہاں لے کر ہی نہ آتے۔ میری اپنی زندگی کے تجربات بالکل مختلف ہیں اور خاصے ناخوشگوار۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت میں تم سے دوست بن کے بات کر رہا ہوں۔ بے شک میری گواہی تمہارے حق میں ہوگی اور سچ بات کہنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ تمہیں اس سے کوئی فائدہ ہونے کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ جس تھانے سے مجھے ٹرانسفر کیا گیا ہے وہاں بھی تمہارے نام کے ساتھ میرا نام لیا گیا تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ میں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے تمہیں ملزم قرار دینے سے قبل اپنی ملاقات کی اجازت دی تھی۔ میرے کارنامے کو تمہاری مخبری سے منسوب کیا گیا تھا۔ اب میں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو کے کہوں گا کہ عبدل اور شیدے کو سکندر بخت نے قتل نہیں کیا تھا۔ عبدل نے شیدے کو اس لیے مار دیا تھا کہ اس نے مروت کو ادھر ہی ایک بوڑھی عورت کو اکیلا پا کے ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی اور اس کا زیور وغیرہ لے جانے کے لیے زبردستی کر رہا تھا کہ عبدل آ گیا۔ اس نے مشتعل ہو کے شیدے پر گولی چلا دی اور شیدے نے مرتے مرتے عبدل کو گولی مار دی۔ یہ سب ایک تحریری بیان کی صورت میں پہلے سے موجود ہے لیکن یہ ثابت کیسے ہوگا کہ یہی وہ بیان ہے جو عبدل نے ٹیلی فون پر دیا تھا اور میں نے ٹیپ کیا تھا۔ اس ٹیپ کا تو وجود ہی ثابت نہیں ہوتا۔ اگر عبدل نے کسی دوسرے گھر سے فون کیا ہوتا تو ممکن ہے کوئی گواہ مل جاتا جو اس بیان کی تائید کرتا۔ اب تو یہ فرض کر لیا جائے گا اور کہا بھی جائے گا کہ میں تمہارے احسان کا بدلہ چکا رہا ہوں۔ تمہاری مخبری سے میں نے منشیات کے اسمگلروں کے ایک گروہ کی بیخ کنی کی تھی اور اب تمہارے لیے صفائی کا گواہ بن گیا ہوں۔ پھر میری پوزیشن پر غور کرو کہ میری ہی ڈیوٹی یہ تھی کہ میں نے ہی جائے واردات پر پہنچ کے ابتدائی تفتیش کی۔ ثبوت، شہادت، گواہوں کے بیانات وغیرہ حاصل کیے۔ یہ کیس پہلے سے میرے پاس تھا۔ اب میں ہی صفائی کا گواہ بن کے پیش ہوا تو اس کے دو نتیجے نکالے جائیں گے۔ ایک یہ کہ مجھے بہت بھاری رشوت ملی ہے۔ دوسرا یہ کہ مجھ پر رضوی صاحب کا دباؤ ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں سچ نہیں بولوں گا۔ ثبوت کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کسی کی ناراضی یا ناراضی کے خیال سے نہیں ڈرتا کیونکہ میرا اپنا ضمیر بالکل مطمئن ہے۔

کل وکیل سرکار کی طرف سے درخواست لگائی جائے گی کہ تمہاری ضمانت منسوخ کر دی جائے جو منظور ہو جائے گی اور کل ہی تمہارے وارنٹ جاری ہو جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اس مرتبہ تمہیں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل نہیں بھیجا جائے گا بلکہ پولیس تمہارا جسمانی ریمانڈ حاصل کرے گی۔ تمہارے دونوں وکیل بہت بڑے وکیل ہیں اور تمہارے ساتھ بہت مخلص ہیں لیکن مجھے شبہ ہے کہ ان کی قابلیت اور ان کا خلوص تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ ہو سکتا ہے کل مجھے ہی تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالنی پڑے اور اپنے ساتھ لے جانا پڑے۔ اس سے دل شکستہ مت ہونا۔ ان سب لوگوں کی طرح میں بھی تمہارے ساتھ ہوں کیونکہ مجھے بھی تمہاری بے گناہی کا پورا یقین ہے۔"

"تھینک یو۔ تھینک یو ویری مچ شیخ!" میں نے فرطِ جذبات سے گلوگیر آواز میں کہا۔ "وہ شخص خود کو اکیلا اور بے سہارا کیسے سمجھ سکتا ہے جس کے ساتھ خدا کے علاوہ آپ جیسے نیک دل اور مخلص دوست بھی ہوں۔"

قانونی کارروائی پوری کرنے کے لیے انسپکٹر شیخ نے میرا بیان لکھا۔ میں نے اپنے بیان میں وہی کہا جو مجھے کہنا چاہیے تھا یعنی یہ کہ جس رات شیدے اور عبدل کا قتل ہوا میں عبدل کے کہنے پر اس کے ساتھ ضرور گیا تھا۔ وہ خود مجھے بلانے کے لیے رضوی صاحب کے گھر آیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس کی بوڑھی اور بیمار ماں مجھ سے ملنا چاہتی ہے اور جاتے وقت یہ بات میں نے رضوی صاحب کو بھی بتا دی تھی۔

"مسٹر سکندر! اپنے بیان کو آپ ان واقعات تک محدود رکھیں جو میر شرافت علی کی کوٹھی میں پیش آئے۔" انسپکٹر شیخ نے مداخلت کی۔

"اصل میں یہ سب باتیں تو میں اپنے بیان میں بھی بتا چکا ہوں۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"سب سے پہلے یہ بتائیے کہ عبدل نے آپ سے جھوٹ بولا تھا تو آپ نے اس پر یقین کیسے کر لیا؟" شیخ نے کہا۔ "کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کا دوست یا ہمدرد نہیں، بلکہ دشمن ہے؟"

"اس نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔" میں نے کہا۔ "عبدل کی ماں نے مجھے واقعی بلایا تھا۔"

"کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عبدل کی ماں تمام حالات سے بے خبر تھی۔" شیخ بولا۔ "یعنی اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا بیٹا تمہارے خلاف قتل کے کیس میں ایک چشم دید گواہ ہے؟"

"ایک ایسی عورت کو دنیا میں پیش آنے والے واقعات کی خبر کیسے ہو سکتی ہے انسپکٹر جس کو عرصے اور بیماری نے بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہ چھوڑا ہو اور جو کچھ دیکھ بھی نہ سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "وہ اپنی تاریک دنیا میں بھی اتنی ہی اکیلی رہتی تھی جتنی اب قبر کے اندھیرے میں ہوگی۔ اس کی یادوں کے رشتے ماضی سے ملتے تھے اور صرف اس کے تصور میں استوار تھے۔ شاید اسے اتنا ہی معلوم تھا کہ پہلے وہ ہندوستان میں تھی اور اب پاکستان میں ہے لیکن اسے یہ کون بتاتا کہ زمین کے ساتھ ہی انسان بدل گئے ہیں۔ انسانوں کے چہرے ہی نہیں ان کے دل بدل گئے ہیں اور محبتوں کے رشتے عداوتوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میرے والد نذیر خان کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ یہی سمجھتی تھی کہ میر شرافت علی اور نذیر خان کی دوستی آج بھی قائم ہے۔"

"پھر ایسی کیا بات تھی کہ اس نے اچانک تمہیں طلب کر لیا اور تم سوچے سمجھے بغیر چلے گئے؟"

"یہ غلط ہے کہ میں سوچے سمجھے بغیر چلا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نے محسن کو بھی اپنے ساتھ رکھا تھا اور ہم دونوں نے سازش کے امکانات کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔ محسن کا باہر رک کر حالات پر نظر رکھنا اور میری واپسی تک انتظار کرنا بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں تھے۔ اس کے علاوہ رضوی صاحب نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ وہ ہمارے لیے مناسب حفاظتی انتظامات کر دیں گے۔"

"یہ دلیل بالکل بے وزن ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اور اگر آپ برا نہ مانیں تو میں عرض کروں کہ آپ میں سے کسی نے بھی عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ میں تمام واقعات کو دہرانا نہیں چاہتا لیکن اب تک جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ اپنے معاملات سے خود نمٹنے میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اگر وہاں چار آدمی پہلے سے موجود ہوتے اور وہ آپ کے ٹکڑے کر دیتے تو باہر انتظار کرنے والا محسن ان کا کیا بگاڑ لیتا اور ایس پی صاحب کوٹھی کے باہر تک بھی فورس کھڑی کر دیتے تو کیا تمہاری جان بچ جاتی؟ حفاظتی انتظامات اور احتیاط لینے کی بات مت کرو۔ بس یہ کہو کہ زندگی باقی تھی اور خدا نے تمہیں محفوظ رکھا۔ تمہاری جگہ وہ دونوں مارے گئے جو تمہاری جان کے دشمن تھے۔ انتقام ملازم کے ساتھ لوٹ آئے۔ فرض کرو تم جانے سے پہلے پولیس کو اطلاع دیتے اور مسلح پولیس کے ساتھ جاتے تو ظاہر ہے اس کے بعد وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔ پولیس کی موجودگی میں عبدل شیدا ایک دوسرے کو قتل نہ کرتے لیکن سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ خود پولیس تمہاری بے گناہی کی گواہ ہو جاتی۔"

ہم میں سے کوئی بھی شیخ کی دلیل کو مسترد نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ خود رضوی صاحب بھی خاموش تھے۔ "میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس وقت مجھے عبدل کی بات اور اس کے لہجے نے قائل کر لیا تھا کہ مجبور وہ خود ہے اور اگر اس کی ماں بضد نہ ہوتی تو وہ خود کبھی میرے سامنے آنے کی ہمت نہ کرتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اسے دیکھتے ہی میں مشتعل ہو جاتا اور نہ جانے کیا کر بیٹھتا۔"

"خیر یہ بتاؤ کہ عبدل کی ماں کو تم کیسے جانتے ہو؟"

"میں اسے بالکل نہیں جانتا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کا بیٹا ہے اور اس کے والدین زندہ ہیں یا نہیں لیکن وہ سب کچھ جانتی تھی۔ اس کا شوہر میرے والد کا پرانا دوست تھا چنانچہ اسے وہ باتیں بھی معلوم تھیں جو مجھے معلوم نہیں تھیں۔"

"اور اس نے تمہیں یہی باتیں بتانے کے لیے بلایا تھا؟" شیخ نے کہا۔

میں نے باری باری رابعہ، محسن اور رضوی صاحب کی طرف دیکھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ سب انسپکٹر شیخ کو اس خط کے بارے میں کچھ بتایا گیا ہے یا نہیں جس کی وجہ سے تین افراد بھی جائے واردات پر مر گئے تھے اور اس سے پہلے بھی بہت سے افراد اپنی جان دے چکے تھے۔ محسن اور رابعہ بالکل سامنے تھے اور ان پر شیخ کی نظر بھی تھی چنانچہ وہ مجھے کوئی اشارہ بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن رضوی صاحب ٹہلتے ہوئے ایسی جگہ پہنچ گئے تھے کہ شیخ کی پیٹھ ان کی طرف تھی مگر وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے اپنا سگار جلاتے ہوئے ایک انگلی سے مجھے واضح اشارہ کیا جس کا مطلب میں نے یہ نکالا کہ میں خط کی بات نہ کروں۔

"وہ مجھ سے میرے والد کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ بہت عرصے سے ان کی کوئی خیر خیریت نہیں ملی تھی اور اسے کوئی کچھ نہیں بتاتا تھا۔"

"غلط بیانی سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" شیخ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے تمہیں کوئی خط دیا تھا۔"

میرا اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ غالباً شیخ مجھ سے پہلے دوسروں کے بیانات قلمبند کر چکا تھا۔

"انسپکٹر!" رضوی صاحب نے بروقت مداخلت کی۔ "میرا ایک بیان سب کے بیانات کو غلط کر دے گا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ بوگس اور جعلی خط تھا جس کی کوئی اہمیت نہیں

www.paksociety.com

یہ خط کسی نے وزیر خان کے نام سے بھیجا تھا اور اس میں منشی مرحوم سے دو ہزار روپے بطور قرض مانگے گئے تھے حالانکہ اس خط کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے یہ خط وزیر خان کی موت کے ایک مہینے بعد لکھا گیا تھا۔ میں وزیر خان کی تحریر بھی پہچانتا ہوں اور ان کے دستخط بھی۔"

شیخ نے اس مداخلت کو پسند نہیں کیا۔ یہ بات ایک بچہ بھی سمجھ سکتا تھا کہ رضوی صاحب نے مجھے جواب دینے کا موقع نہیں دیا اور بالواسطہ طور پر مجھے سمجھا دیا کہ خط کے متعلق شیخ کو کیا بتایا گیا ہے۔ مگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شیخ یقیناً اسے بے عزت کر دیتا کہ سوال اس سے نہیں کیا تھا تو جواب اس نے کیوں دیا۔ شاید وہ اس حقیقت کو بھی فرض کے تقاضوں پر قربان کر دیتا کہ وہ خود ایک معمولی اے ایس آئی ہے جس کے مقابل ایس ایس پی ہے مگر دو باتوں کا لحاظ کر کے خاموش ہو گیا۔ ایک رضوی صاحب کی عمر کا اور ان کی شائستگی کا۔ دوسرا اس بات کا کہ وہ تھانے میں نہیں ہمارے گھر میں بیٹھا تھا اور ہم میزبانی کے آداب کا خیال رکھا تھا تو یہ خود بخود اس کا اخلاقی فرض ہو جاتا تھا کہ وہ مہمانی کے آداب فراموش نہ کرے۔

"میں نے تم سے کہا تھا محسن کہ وہ خط انہیں دکھا دو۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "بلکہ انہیں دے دو۔ یہ اپنے ریکارڈ میں شامل کر لیں۔"

"جی۔۔۔" محسن نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔ "دراصل وہ خط میں کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔" پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک خط نکالا۔ میں نے جان بوجھ کر کسی طرف نہیں دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ جو خط شیخ کے حوالے کیا گیا ہے وہ جعلسازی کا نمونہ ہے۔

"اس خط کے ساتھ کوئی لفافہ بھی ہو گا؟" شیخ نے خط کے مضمون پر نگاہ ڈالنے کے بعد زیر لب مسکرا کے کہا۔

"لوگ صرف خط سنبھال کے رکھتے ہیں اور لفافے پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"محض اس خط سے تو کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ خط لکھنے والا کون ہے اور اس نے یہ خط کہاں سے ڈالا ہے۔" شیخ بولا۔

"خط ایک لیٹر پیڈ پر لکھا گیا ہے اور اس پر لندن کا پتہ چھپا ہوا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اگرچہ اس سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ خط واقعی کسی نے لندن سے لکھا تھا کیونکہ پیڈ تو یہاں بھی چھپ جاتے ہیں مگر تفتیش کرنا پولیس کا کام ہے۔ ہو سکتا ہے اس پتے سے کوئی کام آمد بات معلوم ہو جائے۔"

میں نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ کو ضبط کیا۔ ایک زمانہ تھا کہ میں نے اور محسن نے خود کو برطانیہ میں کالوں کے حقوق کے تحفظ کا ٹھیکیدار بنا رکھا تھا۔ خصوصاً اپنے ہم وطن پاکستانی طلبہ کے حقوق کا۔ ہم نے تین چار کلب اور انجمن جیسے ادارے بنا رکھے تھے جن کے نام بہت متاثر کرتے تھے۔ درحقیقت ان کا وجود کہیں نہ تھا مگر جب بھی ہمارے نقطۂ نظر سے کسی پاکستانی کے ساتھ یا ہمارے ساتھ کوئی زیادتی ہوتی تھی تو ہم مختلف اخبارات کو مراسلے، اجتماعی قراردادیں اور پریس نوٹ وغیرہ بھیج دیتے تھے جو کسی نہ کسی اخبار یا ہفت روزے میں شائع ہو جاتے تھے کہ پاکستانی طلبہ کی فلاں انجمن کے ایک ہنگامی جلسے میں اس بات کی مذمت کی گئی وغیرہ وغیرہ۔ یہ ان میں سے ایک لیٹر ہیڈ تھا۔ اگر پاکستان کی پولیس دریافت کرتی تو خود لندن کی پولیس اس پتے پر پہنچنے میں ناکام رہتی اور اس تگ و دو سے کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔

"دراصل عبدل کی ماں کا خیال تھا کہ میں عبدل کا سرپرست ہوں۔" میں نے کہا۔ "بیٹے نے اس کو یہی بتا رکھا تھا۔ وہ مجھ سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وزیر خان کو لندن میں دو ہزار روپے کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے کیونکہ یہ بہت چھوٹی سی رقم تھی اور عبدل کی ماں نہیں جانتی تھی کہ باہر سے بیچے لے ہوں تو کیا کرنا چاہیے۔"

"میرے لیے اس بیان کی صداقت کو تسلیم کیے بنا چارہ نہیں۔" شیخ نے خط کو فائل میں رکھتے ہوئے کہا۔ "اب ایک انتہائی اہم سوال یہ ہے کہ آپ لوگ ٹھیک کتنی دیر ٹھہرے تھے؟"

"مشکل سے بیس منٹ۔" محسن نے فوراً کہا۔ "یہ بات آپ کو شملا بھی بتا چکی ہے کہ ہم ساڑھے دس بجے گھر لوٹ گئے تھے۔"

شیخ نے ناگواری سے محسن کی طرف دیکھا۔ "مجھے مسٹر سکندر کا بیان آپ لوگوں کی موجودگی میں نہیں لینا چاہیے تھا۔ اب تو آپ سب کا بیان ایک ہو گیا۔ سوال میں نے آپ سے تو نہیں کیا تھا مسٹر محسن۔"

"آئی ایم سوری۔" محسن نے بڑی معصومیت کے ساتھ کہا۔ "آپ نے پوچھا تھا آپ لوگ۔۔۔ میں سمجھا سوال ہم دونوں سے کیا گیا ہے۔"

"اس کے باوجود مجموعی صورت حال نہیں بدلتی۔" شیخ نے کہا۔ "آپ کے لیے ثابت کرنا مشکل ہو گا کہ آپ واقعی ساڑھے دس بجے لوٹ آئے تھے۔ اس کے گواہ صرف گھر والے ہیں۔ کیا باہر کا کوئی آدمی ہے جو کہہ سکے کہ اس نے آپ کو واردات سے پہلے کہیں دیکھا تھا؟"

"میں اس سوال کو تفتیش کا ایک لازمی جزو سمجھ کر جواب دینے کے لیے تیار تھا۔" "یار محسن!" میں نے اچانک کہا۔ "تو نے استاد

ٹیڈی کا ذکر نہیں کیا؟ وہ کس وقت ملا تھا؟"

"وہ۔۔۔ میرا خیال ہے کہ دس بجے کے بعد ہی ملا تھا نا؟" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں اس کا ذکر کرنے ہی والا تھا۔ وہ یقیناً شیخ صاحب کو بتا سکتا ہے کہ ہم کس وقت ملے تھے۔"

"جب ہم واپس آ رہے تھے انسپکٹر صاحب!" میں نے کہا۔ "تو وہاں استاد ٹیڈی مل گیا تھا۔ وہ اکیلا تانگے میں جا رہا تھا کہ اس کی نظر ہم پر پڑ گئی اور اس نے ہمیں بھی ساتھ بٹھا لیا۔ ہم نے اس کے ساتھ چائے بھی پی تھی۔"

شیخ حیرانی سے مجھے اور محسن کو دیکھتا رہا۔ "یہ استاد ٹیڈی کیا چیز ہے اور آپ جیسے شریفوں کا ایسے استادوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔۔۔ جرمنی وارو۔ نام سے تو مجھے وہ کسی اسکول کا استاد نہیں لگتا۔"

"بیچارہ شیخ صاحب۔" میں نے افسوس سے کہا۔ "اپنا بچپن کا دوست تھا۔ بس غلط راستے پر پڑ گیا۔ کوئی بدمعاش نہیں ہے لیکن ذرا تیز ہے اور کبھی کبھی ہاتھ کی صفائی دکھا دیتا ہے جیب وغیرہ اس لیے استاد ٹیڈی کہنے لگے ہیں۔"

"اور تمہارا یہ استاد کہاں ملے گا؟" شیخ نے بے بسی سے کہا۔ "اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ میں اس کا بیان علیحدگی میں لوں کیونکہ اس کی گواہی بہت اہم ہے۔"

"آج تو اس کا ملنا مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ راولپنڈی گیا ہوا ہے۔ بری امام شاہ کے مزار پر منت ماننے کی بات کر رہا تھا کل پرسوں تک آ جائے گا۔ مجھ سے اس نے یہی کہا تھا۔"

"تم اس کا پتہ تو بتا سکتے ہو؟" شیخ بولا۔ "لاہور میں وہ کہاں رہتا ہے؟"

"یہ بھی مجھے معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک تو اس کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ پھر یہ کہ ہم بھی بس رسم و راہ نبھاتے ہیں۔ ایسے ہی سر راہ ملاقات ہو جاتی ہے تو ہو جاتی ہے۔ اس کے گھر جانے کا اتفاق نہیں ہوتا۔"

"ویری گڈ مسٹر سکندر!" شیخ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اتفاق کی بڑی برکت ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ میں نے آج یہاں دیکھا۔ جھوٹ سچ کا پتہ چلانا عدالت کا کام ہے لیکن اتنا میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ سب لوگوں کے بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ بڑا اچھا میچ تھا۔"

"اے ایس آئی شیخ!" رابعہ نے پہلی بار لب کھولے۔ "بیان کے دوران میں نے کہیں دخل نہیں دیا اور میرے وکیل نے آپ کے کسی سوال کا جواب دینے سے انکار نہیں کیا لیکن اب میں پوچھنا چاہوں گی کہ آپ بیان لینے کے بعد بیان پر تبصرہ بھی فرما رہے ہیں جو آپ کی ذمہ داری نہیں۔ اس کے علاوہ آپ نام لیے بغیر سب کی دیانت داری پر شبے کا اظہار کر رہے ہیں جس کا آپ کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس سے آپ کی اپنی غیر جانب داری مشکوک ہو جاتی ہے۔ آپ کو کچھ اور پوچھنا ہے؟"

"نہیں میڈم۔" شیخ نے فائل سنبھال کے طنز سے کہا۔ "اگر میرے الفاظ سے غلط مفہوم نکلتا ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ میں اپنے الفاظ واپس بھی لے سکتا ہوں کہ وہ واقعی اگر غلط ہوں۔"

"سٹ ڈاؤن۔" رضوی صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "فرض شناسی بڑی اچھی چیز ہے اور میں اس کی قدر کرتا ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ تمہارے رویے میں اعتماد کی جھلک نہیں ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ جس وقت تم میرے گھر آئے تھے اور تم نے مجھ سے سکندر کے بارے میں دریافت کیا تھا تو میں تم کو یہاں لے آیا تھا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میرا اردلی تم کو باہر سے ہی رخصت کر دیتا یا میں کہہ دیتا کہ مجھے معلوم نہیں اور بات کرنی ہے تو کل دفتر میں آ جانا۔۔۔"

شیخ پھر بیٹھ گیا۔ "میں آپ کے رویے سے متاثر ہوا ہوں رضوی صاحب لیکن آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرض کے تقاضے بہرحال نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔"

"یہ غلطی تو تم سے پہلے ہی سرزد ہو چکی ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "کیا فرض کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ تم عبدل کا فون ملنے کے بعد ٹیپ کی حفاظت کا معقول انتظام پہلے کرتے؟ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تم ٹیپ کو مقفل کر جاتے یا اپنے ساتھ لے جاتے۔"

"لیکن سر! میں نے کوشش کی تھی کہ تحریری بیان پر دستخط بھی حاصل کر لوں۔"

"اور حاصل کیا ہوا؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ اب نہ تمہارے پاس وہ ٹیپ ہے اور نہ کوئی دستخط شدہ بیان ورنہ تمہارے پاس کم سے کم ایک چیز تو ہوتی جسے عدالت میں پیش کیا جا سکتا۔ اس پر ایک شخص کی زندگی اور موت کا انحصار تھا اور اس کے نہ ہونے سے کیا نقصانات ہوں گے، یہ اندازہ تم خود بھی کر سکتے ہو۔"

"لیکن سر! میں نے وہ ٹیپ ایک ذمہ دار شخص کے سپرد کیا تھا۔" شیخ کی پوزیشن خراب ہونے لگی تھی۔

"اور اس ایڈیٹ ذمہ دار شخص نے کیا کیا؟" رضوی صاحب اب واقعی غصے میں تھے۔ "تم نے کیا کیا؟ اس [illegible] بھیجو میرے پاس اور اس سے کہو کہ اپنے آپ کو معطل سمجھے۔ اسے بتا دو کہ اب وہ ایک ہی صورت میں بچ سکتا ہے۔ اگر وہ ٹیپ لے

اور جو کچھ ہوا ہے عدالت میں بیان کر دے۔ اس کی حفاظت کی ذمے داری میں لیتا ہوں۔ میں دیکھوں گا کہ نوکری اس کی جاتی ہے یا میری بھی۔ لیکن اس نے جانتے بوجھتے حقیقت کا اعتراف کرنے سے گریز کیا اور سکندر کی ضمانت منسوخ ہوئی تو اس کا حشر بہت بُرا ہوگا۔"

"یس سر!" شیخ نے کھڑے ہو کر سلوٹ کیا۔ "جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"

رضوی صاحب کا غصہ اس کے چلے جانے کے بعد بھی کم نہیں ہوا۔ "بہت فرض شناسی کی بات کرتا ہے۔ بے وقوف یہ نہیں دیکھتا کہ کوتاہی کتنی بڑی ہوئی ہے۔ جب ایک شخص ٹیلیفون پر خود بتا رہا ہے کہ میں مرنے والا ہوں تو اس کا بیان ضرور لکھو۔ مگر یہ بھی تو سوچو کہ دوسرے نتائج کیا نکل سکتے ہیں۔ آدمی کو ہر طرف دیکھنا چاہیے اور تمام امکانات کو مد نظر رکھنا چاہیے مگر تم نوجوان لوگ عقل کی بجائے جوش و جذبات سے کام لیتے ہو۔" وہ اچانک میری طرف مڑے۔ "یہ میر محمد ہی ہے نا جس نے تم پر تشدد کیا تھا۔ اس نے ٹیپ غائب کیا ہوگا تو میں اس کو بخشوں گا نہیں۔"

"جی۔" میں نے کہا۔ "بہت کینہ پرور اور کمینہ آدمی ہے اور میرے معاملے میں اس پر کسی کا دباؤ بھی ہے۔ کوئی اسے ہدایت دے رہا ہے۔"

"میں سمجھ لوں گا اس سے۔" رضوی صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب اسے فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ نوکری کرنا چاہتا ہے یا وہ ٹیپ واپس کرنا چاہتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے اس نے ٹیپ تباہ کر دیا ہو یا صاف کر دیا ہو۔" رابعہ نے کہا۔

"ایسی صورت میں وہ احتساب کے حق سے بھی محروم ہو جائے گا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اس کے خلاف شیخ بھی گواہی دے گا اور وہ محرر بھی۔ ان کے انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے ایک کپ چائے پلا دو بیٹی۔" وہ بولے۔

رابعہ ان کے لیے چائے لینے چلی گئی تو میں نے کہا۔ "انکل رضوی! میں نے اس دور دراز علاقے میں یہ ایک گمنام سا مکان شہلا کی حفاظت کے لیے لیا تھا مگر اب یہ بھی محفوظ نہیں رہا۔ یہ پتہ پولیس کے ریکارڈ پر آ جائے گا تو سب کو معلوم ہو جائے گا۔"

"تم لوگوں نے بھی مجھے کم پریشان نہیں کیا ہے۔" رضوی صاحب نے خفگی سے کہا۔ "کچھ تو تقدیر نے تمہارے خلاف چکر چلا رکھے ہیں اور کچھ تمہارے دشمنوں نے۔ لیکن خود تم بھی اپنی عقل مندی سے اپنی مشکلات میں اضافہ کرتے ہو۔ آخر کیا ضرورت تھی اس لاپروائی کی؟ کیا میرے پاس بنگلہ کم تھا؟ کیا تمہیں یہ احساس تھا کہ تم مجھ پر بار ہو یا وہاں محفوظ نہیں ہو؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں تھی انکل!" محسن نے وضاحت کی کوشش کی۔ "مگر..."

"اگر مگر کچھ نہیں۔" انھوں نے محسن کی بات کاٹ دی۔ "اپنا سامان آج ہی یہاں سے اٹھاؤ اور واپس چلو۔ وہ پورا سرونٹ کوارٹر شہلا اور اس کی ماں کے لیے کافی ہوگا۔ کانسٹیبل اپنا بندوبست کہیں اور کر لے گا۔ رابعہ حسب سابق رہے گی اور تم دونوں کو ایک کمرہ مل جائے گا۔ جہاں تم میری نگرانی میں رہو گے۔ تم دونوں نے اپنے آپ کو بہت آزاد اور خود مختار سمجھ لیا ہے اس لیے کہ ایک کا باپ مر گیا ہے اور دوسرے کا بہت دور ولایت میں بیٹھا ہے۔" ان کا موڈ بہت خراب تھا۔ ایک طرف ان کی سرپرستی کے رشتے سے یہ اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ جس حد تک بھی ہمارا خیال رکھ سکتے ہوں رکھیں۔ دوسری طرف قانون کے مقابلے میں وہ اپنی مجبوریاں بھی سمجھتے تھے اور اس خیال سے بہت پریشان تھے کہ خدا نخواستہ مجھ پر استغاثہ کے دونوں گواہوں کے قتل کا الزام آ گیا تو کیا ہوگا۔

وہ چائے پی کر رخصت ہو گئے تو میں نے اور محسن نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کے حکم سے سرتابی ممکن نہ تھی اور ویسے بھی یہ گھر اب محفوظ نہیں رہا تھا۔ رابعہ اور محسن نے بھی اتفاق کیا کہ ان حالات میں ہمارے لیے اور کوئی جائے پناہ نہیں ہے اور فی الحال ہمیں رضوی صاحب کی میزبانی کو مجبوری یا ضرورت سمجھتے ہوئے قبول کرنا پڑے گا۔ شہلا کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی۔ مردہ بدست زندہ۔ اسے ہمارا ہر فیصلہ قبول تھا۔ اسی روز شام تک منتقلی کا سارا کام مکمل ہو گیا۔ جس میں عملی طور پر میں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ محسن، رابعہ اور شہلا نے وہ سامان پھر باندھا جو ابھی پوری طرح کھلا بھی نہ تھا۔ پھر محسن ایک ٹرک اور چند مزدور لے کر آیا جنھوں نے ذرا سی دیر میں سب سامان لاد دیا اور سورج غروب ہونے سے پہلے رضوی صاحب کی کوٹھی میں اتار دیا۔ ہمارا ہمسایہ کانسٹیبل رات کو ڈیوٹی سے فارغ ہو کے واپس آیا تو یہ دیکھ کر سخت مایوس ہوا کہ عرب کے اونٹ کی طرح ہم نے اسے باہر نکال پھینکا ہے۔ اس نے تو ہمارے جوتے تک پالش کیے تھے کیونکہ ہم نے اسے تھانے دار بنوا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ ہمارے عزائم غاصبانہ اور بدنیتی پر مبنی نہیں ہیں بلکہ یہ سب رضوی صاحب کے حکم سے ہے۔ اس جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوا اور تڑپ کر رضوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا مگر رضوی صاحب نے اسے کہا کہ پریشان ہونے

کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی رہائش کے لیے ساتھ والی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں ایک کمرے کا انتظام ہو گیا ہے۔ مطمئن وہ پھر بھی نہیں ہوا مگر تعمیل کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر اور ہم سے سخت بدظن ہو کے رخصت ہوا۔ اس وقت تک شہلا نے لپیٹے ہوئے گھر میں سامان کو ٹھکانے سے رکھنے کا انتظام مکمل کر لیا تھا۔ جو کمرہ ہمیں دیا گیا تھا وہ گھر کے آخری حصے میں تھا اور بچوں کا بیڈ روم تھا۔ بیچ میں بچوں کو اس کمرے میں منتقل کیا جو پہلے مہمانوں کا کمرہ کہلاتا تھا۔ لیکن میری توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی کہ اس سارے انتظام کا مقصد یہ ہے کہ ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھی جا سکے ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بچوں کو ان کے کمرے میں رہنے دیا جاتا اور ہمیں مہمانوں والا کمرہ دے دیا جاتا۔ اب ہم شریفانہ راستہ اختیار کر کے باہر جاتے تو ناممکن تھا کہ رضوی صاحب یا ان کی بیگم کو معلوم نہ ہو۔ دوسرا طریقہ کھڑکی کو دروازے کے طور پر استعمال کرنے کا تھا لیکن اس میں یہ خطرہ بہرحال تھا کہ ہماری عدم موجودگی کا راز کسی بھی وقت افشا ہو جاتا۔ محسن نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ رضوی صاحب غالباً ان کے بھتیجے اور رابعہ کو زیادہ سے زیادہ فاصلے پر رکھنا چاہتے ہیں اور میں نے اس کو زبردست قلبی جواب دیا۔

رات کے کھانے پر رضوی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور ہماری سعادت مندی کی تعریف کی۔ ان سے زیادہ خوشی بیگم رضوی کو تھی کہ وہ اکیلی تھیں۔ رابعہ کے علاوہ اب شہلا بھی ان کی رفیق تنہائی ہو گئی ہے۔ شہلا خوفزدہ تھی کیونکہ وہ اس ماحول میں اجنبی تھی۔ شاید اسے یہ احساس بھی تھا کہ جو اختیار اسے پہلے اپنی زندگی پر تھا وہ اب ختم ہو گیا۔ اپنے گھر والے گھر سے نکلا اسے راس نہیں آیا تھا۔ اب کا کوئی ٹھکانا مستقل نہ رہا تھا۔ شہلا کی ماں اس سے زیادہ پریشان تھی جس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے اکلوتے بیٹے کے جانے کے بعد حالات میں یہ کیسا انقلاب آ گیا ہے اور اسے ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ اور دوسری جگہ سے تیسری جگہ تک لے جایا جا رہا ہے۔ وہ شہلا کی حقیقی ماں بھی نہیں تھی کہ اس پر حکم چلا سکتی یا اس سے وضاحت طلب کر سکتی۔ اس طرح وہ وجود عملی زندگی کی جدوجہد میں آگے بڑھنے والوں کے لیے ایک بار گراں تھا جسے اتار کر پھینکا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اپنی حالت کو سمجھتی تھی اور دوسروں کی مجبوری کو بھی۔

رات کو رخصت ہوتے ہی میں اور محسن اپنے کمرے میں سونے کے لیے پہنچے تو ہم میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہم نے چائے کی فرمائش کی اور اپنے اپنے بستر پر لیٹ کر سگریٹ کے دھوئیں کو چھت کی طرف اڑا کر فضا میں تحلیل ہوتا دیکھتے رہے۔

"آج کتنے دن ہو گئے میرا اپنے گھر سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔" محسن نے اچانک کہا۔ "معلوم نہیں نوزی کیسی ہے۔ سب سے زیادہ وہی مجھے یاد کرتی ہوگی۔"

"دیکھو محسن! اب بھی وقت ہے۔" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تو اپنے گھر لوٹ جا۔ والدین کے حقوق مجھ سے زیادہ ہیں۔"

"میں ان کے حقوق تسلیم کرتا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "اور وقت آئے گا تو میں اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کروں گا لیکن اس وقت میں کسی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ نہ تجھے، نہ رابعہ کو اور نہ شہلا کو۔ ہم سب ایک دوسرے کے ذمے دار ہیں اور جب رابعہ یا شہلا عورت ہونے کے باوجود پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تو میں کیسے بھاگ جاؤں؟"

"تیرے پاس وہ کیسٹ تو محفوظ ہے نا جس میں ہم نے ڈی ایس پی سلوا اور چودھری ولاور کی گفتگو ریکارڈ کی تھی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہی تو ہمارے پاس ایک موثر ہتھیار ہے۔" محسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کم سے کم ڈی ایس پی سلوا کے خلاف۔"

"ابھی تک ان میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ ہم نے ساری گفتگو ریکارڈ کر لی تھی۔" میں نے کہا۔

"ہاں، لیکن وہ بے وقوف نہیں ہیں۔" محسن نے اپنے بریف کیس میں سے کیسٹ نکالا۔ "انھوں نے اندازہ ضرور کر لیا ہوگا کہ جب ہم دو طرفہ مواصلاتی رابطہ قائم کر سکتے ہیں تو ان کی آواز بھی ریکارڈ کر سکتے ہیں کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے چودھری ولاور نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو بعد میں اس کے خلاف استعمال کی جا سکتی لیکن ڈی ایس پی سلوا نے پوری طرح اعتراف جرم کر لیا تھا۔"

"اب یہ ضروری ہے کہ اسے اپنی ہی آواز سنوائی جائے اور پھر اس کا رد عمل دیکھا جائے۔" محسن بولا۔

"رد عمل کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "وہ بزدل آدمی ہے یا تو ولاور کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہوگا... یا فرار پر۔"

"لیکن ولاور کا ساتھ چھوڑ کے وہ کہاں جائے گا؟" محسن بولا۔ "ہم یہ فرض نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے ساتھ مل کر ہمارے دشمنوں کے خلاف صف آرا ہو جائے گا۔ اس کے لیے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ غائب ہو جائے۔ وہ ولاور سے دشمنی مول نہیں لے سکتا اور ہم اس پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اسے یہ کیسٹ سنوائیں اور دھمکی دیں کہ اس کی ایک نقل ولاور کو ارسال کر دی جائے گی۔ اس کے بعد وہ کیا

www.paksociety.com

کرے گا؟ میرا خیال ہے وہ دلاور کی خدمت میں حاضر ہو کر رونے پیٹنے لگا کہ کس طرح ہم نے جبر اور تشدد سے اسے بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا۔ "دلاور کبھی اسے مجبوری کے عذر سے معاف نہیں کرے گا۔ اس کا اعترافِ جرم غداری کے مترادف سمجھا جائے گا جس کی سزا مجرموں کے ضابطۂ اخلاق کے مطابق صرف موت ہے۔ یہ بات خود ڈی سلوا بھی اچھی طرح جانتا ہوگا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ دلاور تھوڑی سی عقل مندی سے کام لے تو ڈی سلوا کا قصہ صاف کر سکتا ہے۔ حالات اور واقعات کی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈی سلوا ہی دلاور کو اپنی گاڑی میں لے گیا تھا اور اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر دلاور بھی یہی کرے تو ڈی سلوا کیسے بچے گا؟"

"تیرا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔" محسن نے مجھ سے کہا۔ "دلاور جانتا ہے کہ وہ مجھے ملزم ثابت نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے آسان یہ ہے کہ ملزم ڈی سلوا کو بنا دیا جائے مگر اس سے دلاور کو کیا فائدہ ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ ڈی سلوا کو دو چار سال قید کی سزا ہو جائے گی مگر اس سے یہ خطرہ ہے کہ ڈی سلوا دشمن ہو جائے تو ساری پول کھول دے اور دلاور کا بیڑا غرق بھی کر دے ۔۔۔ ایسی اور بھی بہت سی ایسی باتیں معلوم ہیں جو کسی کو بھی معلوم نہیں ہیں۔ وہ اب تک ہر کاروبار کے اور ہر جرم میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ ان دونوں کے لیے ہر حال میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے سوا چارہ نہیں۔ وہ ایک دوسرے کے دشمن بھی نہیں ہو سکتے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا یہ کیسٹ ہمارے کسی کام نہیں آ سکتا؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں کام کیوں نہیں آ سکتا؟" محسن نے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ خود اسی کیسٹ کی وجہ سے مصالحت یا کوئی سودا کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ وہ پہلے جیسی صورتِ حال نہیں ہے۔"

"وہ اپنی بدمعاشی کے بل پر ہم سے یہ کیسٹ حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یا ڈی سلوا ڈبل گیم کھیل سکتا ہے۔"

"ایک کیسٹ تو ایک نیگیٹو کی طرح ہوتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اس سے کئی نقلیں بنائی جا سکتی ہیں اور چوہدری دلاور کو یہ بتایا جا سکتا ہے کہ یہ کوشش بے سود ہے کیونکہ ہمارے پاس اس کی دس کاپیاں موجود ہیں جن سے ہم مزید ایک سو یا ایک ہزار کاپیاں بنا سکتے ہیں۔"

"اور بھی بنا لینی چاہئیں۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو ہمارے پاس صرف اصل ہے۔"

"اس میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ہمیں خارج کرنی ہیں۔" محسن نے کہا۔ "جن کا نہ ہونا ہی بہتر ہے مگر ضروری ہے کہ اسے ہم ایک بار سن کر دیکھیں اسی وقت۔"

"اس وقت تو مشکل ہے۔ ابھی رابعہ چائے لے کر آئے گی تو اس سے کہیں گے کہ ٹیپ ریکارڈر ڈھونڈ لائے۔" میں نے کہا۔ "خود ہم نے کوشش کی تو انکل رضوی فوراً شک میں مبتلا ہو جائیں گے اور یہ کیسٹ ان کے ہاتھ لگ گیا تو عجیب مسئلہ ہو جائے گا اس لیے بہتر ہے کہ تم اسے واپس رکھ دو۔"

اسی وقت رابعہ چائے لے کر اندر آئی۔ "تم نے تو مجھے بھی مشکل میں ڈال دیا تھا۔" وہ ٹرے میز پر رکھ کے بولی۔ "انکل پوچھ رہے تھے کہ اس وقت چائے پینے کی کیا تک ہے؟ تم لوگوں کو سو جانا چاہیے۔ میں نے سر درد کا بہانہ کیا۔"

"کس کے سر درد کا؟" محسن نے کہا۔ "اپنے یا کسی اور کے؟ اور سر درد کے اسباب کیا بتائے؟"

رابعہ نے آنکھیں نکال کے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے کیسٹ کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تک محسن کے ہاتھ میں تھا۔

"یہ یہ ایک کیسٹ ہے۔" محسن نے اسے مطلع کیا۔ "اور اس پر لکھا ہے پیار بھرے نغمے۔ اگر آپ دونوں سننا چاہیں تو ٹیپ ریکارڈر لے آئیں۔ میں یہاں سے دفع ہو جاتا ہوں۔"

"آپ ادھر سرونٹ کوارٹر کی طرف تشریف لے جائیے۔" رابعہ نے جواب دیا۔ "وہاں ایک خاتون ہیں مس شہلا۔ ان کے پاس ٹیپ ریکارڈر ہے۔ آپ دونوں شوق فرمائیے۔" وہ بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔

"آئیڈیا! مسٹر محسن شیروانی!" میں نے کہا۔ "یہ خیال تو پہلے آیا ہی نہیں تھا کہ ٹیپ ریکارڈر شہلا کے پاس بھی ہے۔"

"تمہارا دماغ! وہ سو چکی ہے۔" محسن نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ "تھک گئی ہوگی سارا دن کی مصروفیت میں۔"

"مجھے تو ڈر ہے کہیں وہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار نہ ہو جائے۔" رابعہ نے کہا۔ "اس کے اعصاب اتنے مضبوط نہیں ہیں۔ پہلے عدنان کی موت کا صدمہ تھا۔ پھر اسے پتہ چلا کہ عدنان زندہ ہے۔ ڈی سلوا کی وجہ سے اس کے گھر میں کشت و خون ہوا اور اب وہ کسی مفرور مجرم کی طرح روپوش رہنے پر مجبور ہے۔ جذباتی دباؤ کی ایک وجہ عدنان ہی ہے جو

نہ زندوں میں ہے اور نہ مُردوں میں۔ مصروفیت میں اعصابی دباؤ کم ہو جاتا ہے لیکن وہ گھر میں قید رہتی ہے۔ تم اتنے پریشان ہو کر نہیں اس کی پروا ہی نہیں۔" وہ محسن کو مخاطب ہو کے بولی۔ "ورنہ تم اس کا سہارا بن سکتے ہو۔"

"نہیں بی بی! میں سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن یہ قربانی قبول نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ سمجھ سکتی ہیں۔ میں اپنے والدین کا بھی ایک ہی بیٹا ہوں۔ اگر میرا ایک بھائی اور ہوتا تو بڑا اچھا تھا۔ میں بیک وقت ماں اور باپ کی امیدوں کا مرکز نہ ہوتا اور وقتی طور پر ان کو ناراض کرنا بھی منظور کر لیتا۔ میرے والد بہت معقولیت پسند ہیں لیکن فوزیہ ایک بے وقوف، انتہائی جذباتی اور کمزور لڑکی ہے۔ اس میں کسی جذباتی بحران کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی چنانچہ ایک مرتبہ وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کی بزدلانہ کوشش کر چکی ہے۔ حالانکہ اسے معلوم تھا اس کی ماں اب صرف تین مہینے کی مہمان ہے۔ تین ماہ قبل جب ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر ٹرمینل کینسر کی تشخیص کی تھی اور حتمی فیصلہ دیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ چھ مہینے زندہ رہیں گی تو ہم سب نے عہد کیا تھا کہ ان کی زندگی کے بقیہ ایام میں ان کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کریں گے مگر وہ اس عہد کو بھول گئی۔ وہ مر جاتی تو ممی کی زندگی اور مختصر ہو جاتی اور ڈیڈی اکیلے رہ جاتے۔ یہ بات شاید ممی کو بھی معلوم ہو گئی ہے کہ ڈیڈی بہت جلد اکیلے رہ جائیں گے۔ میرا خیال ہے ہر مریض کو اس کی چھٹی حس سب کچھ بتا دیتی ہے۔ شاید ڈاکٹروں کے طرزِ عمل میں یا ان کے ظاہری اطمینان میں کوئی بات ایسی ہوتی ہے جو ان کے جھوٹ کی پول کھول دیتی ہے یا ان کی خاموشی میں سچ سامنے آ جاتا ہے۔ اب وہ کوشش کر رہی ہیں کہ ایک بیٹے کے اندر سارے حوصلے آ جائیں۔ زندگی مہلت دیتی تو اتنی جلدی نہ کرتیں مگر وہ چاہتی ہیں کہ بعد میں کوئی ڈیڈی کا خیال رکھنے والا ہونا چاہیے۔ فوزیہ کو یاد آ کر خراب ہو جاتا ہے اور بے اطلاع تو نہیں ملی مگر میرا اندازہ ہے کہ اب وہ پھر فیصلہ بازی کا سہارا لیں گی۔ معلوم نہیں یہ چراغ دین بیچ میں کیوں آ گیا تھا۔ اس نے ممی کو گمراہ کیا۔ اپنی طرف سے انہوں نے بہتری کے لیے وہ سب خوشی خرید لی تھی جو چراغ دین کی دولت دے سکتی تھی۔ پر فیصلہ بازی کی خرافت، علمیت یا محبت نہیں دے سکتی تھی۔ ان کا نقطۂ نظر غلط تھا مگر اچھا ہوا حالات نے یہ بات انہیں سمجھا دی۔ ایاز نے یقیناً بڑا دکھ محسوس کیا ہوگا مگر وہ کم ظرف آدمی نہیں ہے۔ وہ زیادہ دیر ناراض نہیں رہے گا۔ وہ فوزیہ کو خوش رکھے گا۔"

"اور تم ۔۔۔ تمہارے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے؟" رابعہ نے کہا۔ اس پر یہ انکشاف پہلی بار ہوا تھا چنانچہ وہ تصویرِ حیرت بنی ہوئی تھی۔ "ممی نے تمہارے لیے کس کو شریکِ حیات منتخب کیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" محسن نے کہا۔ "پہلے کسی ڈپٹی سیکرٹری کی لڑکی تھی۔ چراغ دین اسکینڈل میں وہ بات ختم ہو گئی۔ خود لڑکی والوں نے انکار کر دیا اور مجھ پر بڑا احسان کیا۔ ممی کو بڑا سبق ملا ہوگا کہ بڑے گھر والوں کے اخلاقی معیار کتنے پست ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے اب وہ اپنی پسند کا معیار بدل دیں۔ کوئی گھر سلیقہ مند، خدمت گزار قسم کی بہو لائیں۔"

"شہلا اس معیار پر پوری اترتی ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"اسے کوئی ناپسند نہیں کر سکتا۔"

"ہاں۔ مگر ممی پہلے یہ ضرور دیکھیں گی کہ شہلا کے ماں باپ کون ہیں، یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔" محسن نے کہا۔

"یہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔" رابعہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میرے اور تمہارے نقطۂ نظر سے اس کا باپ بھنگی بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ زیادہ قابلِ احترام ہو جاتا ہے جس نے بیٹی کی تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی مگر تمہاری ممی کو مطمئن کرنے کے لیے اس کے شجرۂ نسب میں نظرِ ضرورت کے تحت ترمیم کی جا سکتی ہے جیسے وہ میری سگی بہن ہو سکتی ہے۔ میں انکل رضوی سے نہیں بیگم رضوی سے بات کر سکتی ہوں اور وہ انکل کو سمجھا سکتی ہیں۔ پھر انکل تمہارے ڈیڈی سے بات کر سکتے ہیں۔"

"لیکن تمہیں اتنا لمبا چکر چلانے کی اتنی اشد ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے بی بی؟" محسن نے کہا۔

"اس لیے کہ میں کھلی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھ رہی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔ "حقیقی زندگی کا ڈراما۔"

"بالکل اسی طرح جیسے ہم نے [illegible] دیکھی تھیں۔" میں نے کہا۔ "علاوہ ولایت کی بالغ کرنے والی فلموں کے۔"

"اور اب اپنے کانوں سے سب کچھ سن لینے کے بعد میں نہیں چاہتی کہ مزید خرابی کے اسباب پیدا ہوں۔" رابعہ نے مجھے گھور کر کہا۔ "ابھی وقت ہے اور بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

"ایک شعر عرض کیا ہے ۔۔

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو!
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو"

"ٹھیک ہے۔ مجھے صرف آپ کے اس ولی کی ضرورت

www.paksociety.com

تھی۔" رابعہ نے جاتے جاتے کہا۔

"یہ ایڈووکیسی یک طرفہ ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے اب تک کوئی شادی ایسی نہیں دیکھی جس میں قاضی کے علاوہ صرف دولہا ہو اور کسی کو ایک ہاتھ سے تالی بجاتے نہیں سنا۔"

"میں صرف دائیں ہاتھ سے آپ کے ایک چھانپڑ رسید کروں تو آواز بالکل تالی کی طرح آئے گی، شرطیہ۔" محسن نے کہا۔ "اگر مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ اجازت دیں۔"

"میری طرف سے اجازت ہے۔" رابعہ نے باہر سے کہا اور غائب ہو گئی۔

"کس بات کی اجازت ہے؟" محسن نے چلا کے کہا۔ "میں تو پوچھ رہا تھا کہ اجازت ہو تو نکاح شروع کروں؟"

بات مذاق میں ختم ہو گئی تھی لیکن وہ خلش ٹوٹ کر رہ جانے والی نوک خار کی طرح اپنے وجود کا مسلسل احساس دلا رہی تھی جس سے کوئی محفوظ نہ تھا۔ رابعہ جانتی تھی کہ لوزیہ کے جذباتی بحران کی استوار وہ خود بھی ہے۔ یہی احساس جرم مجھے بھی تھا اور محسن بھی سمجھتا ہوگا کہ نا بعد ہی یہ کوشش باعثی سے عطا کردہ زخموں پر مستقبل کی امیدوں کا پھاہا رکھنے کے مترادف ہے۔ سب سے بڑا دل محسن کا تھا جس نے ہمیں معاف کر دیا تھا اور دوستی کے رشتے کا آئینہ سلامت تھا۔ اس میں بال تک نہ آیا تھا۔ اس کے سامنے میں خود کو بہت چھوٹا محسوس کرتا تھا اور یہ خیال بھی مجھے اکثر آتا تھا کہ محسن کی جگہ میں ہوتا تو کیا کرتا۔ اس سوال کا جواب بھی اتنا ہی مشکل تھا۔ معلوم نہیں جو کچھ ہوا۔ ایسا تو کسی نے نہ سوچا تھا نہ چاہا تھا۔

"محسن!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "تم سب لوگوں نے، میرا مطلب ہے رابعہ نے، انکل رضوی نے اور تم نے، وہ خط پڑھنے کے بعد کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا کہ اسے مخفی رکھا جائے۔"

"ہاں۔" محسن نے کہا۔ "کسی کو اس کے بارے میں بتانے سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ یہ پیچیدگی مزید پیدا ہو سکتی تھی کہ تو وزیر خان کا وارث نہیں ہے اور اس کا اثر تیرے وراثت کے سرٹیفکیٹ کے مقدمے پر بھی پڑتا۔ بے شک تو خود کو وزیر خان کا بیٹا ہی سمجھتا ہے مگر یہ تیرے جذبات کا مسئلہ ہے جو قانونی مسئلے سے بالکل الگ ہے۔"

"غور طلب بات یہ ہے محسن کہ میرے والد نے اپنے دوست کو ایسی بہت سی باتیں بتا دیں۔۔۔ یہ۔۔۔ اگر وہ چاہتے تو نہ بتاتے۔ مثلاً وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم نے محل چھوڑنے سے پہلے نکاح کر لیا تھا۔ اس بات کا گواہ کون تھا۔ الدشتی بھی ثبوت نہ مانگتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر خان کو اپنے دوست پر کتنا اعتماد تھا۔ اس نے اپنی کوتاہیاں اور غلطیاں چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مگر پھر بھی اس نے وہ بات نہیں بتائی جو سب سے اہم تھی یعنی شرافت علی نے ان کو اس حد تک کیسے بلیک میل کر لیا؟" میں نے کہا۔

"اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اور ہم نے سب پر بحث کی تھی۔ ایک وجہ وہ تصاویر ہو سکتی تھیں جن کے نیگیٹو گیان چند کے پاس تھے۔ ممکن ہے وہ جاتے جاتے یہ نیگیٹو اپنے دوسرے رفیق کار کو بخش گیا ہو یا بیچ گیا ہو۔ مگر ان سے شرافت علی پاکستان میں کیا فائدہ اٹھا سکتا تھا؟"

"بہت سے ممالک کے درمیان ایک سمجھوتا ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جو مجرموں کے تبادلے کا سمجھوتا کہلاتا ہے کہ ایک ملک کا کوئی مجرم سرحد پار کر جائے تو دوسرے ملک کی پولیس اسے گرفتار کرنے کے لیے اپنا مجرم فرض کرے اور پکڑا جائے تو متعلقہ ملک کو واپس کر دے۔ وزیر خان کے خلاف دو مقدمات قائم تھے، ایک قتل کا، ایک ڈکیتی کا۔"

"ہاں۔ اور میر شرافت علی اس کو گرفتار کرا دیتا تو اسے ایک لاکھ کا وہ انعام بھی مل جاتا جو سابق برطانوی حکومت کے دور میں اس کی گرفتاری کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "مگر اس نے ایک لاکھ سے زیادہ کا فائدہ اٹھایا۔ ساڑھے تین لاکھ تو وزیر خان سے اس نے سالِ اوّل کا منافع لے لیا۔ اس کے علاوہ بھی کیا کچھ نہیں لیا۔ نہیں سکندر! یہ بات کچھ اور تھی۔ اس سے بھی زیادہ سنگین خطرہ تھا جسے وزیر خان ٹالتے رہے۔ شرافت علی کا اپنا منہ بند رکھنے کی قیمت ادا کرتے رہے اور خاموش رہے۔"

"تیرا مطلب ہے وہ میرے اور وزیر خان کے درمیان موجود رشتے کو توڑ دینے کی دھمکی دیتا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "میرے والد سے کہتا ہوگا کہ میں سکندر کو بتا دوں گا کہ تم کون ہو اور جو شخص میری پیدائش کا ذمہ دار ہے کون تھا؟"

"ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ اس دھمکی کا وزیر خان مرحوم پر بھی کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔" محسن نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں وقتی طور پر صدمہ ضرور ہوا تھا مگر بہت جلد تم سنبھل گئے تھے۔ وزیر خان مرحوم کے لیے اب تمہارے جذبات کے آئینے میں بال تک نہیں۔ تمہاری فطرت کو میں سمجھتا ہوں تو کیا وہ شخص نہیں سمجھتا ہوگا جس نے تمہیں بچپن سے جوانی تک پال پوس کے بڑا کیا۔ تمہارے لیے بیک وقت باپ

اور ماں بن کے جیا اور تمہارے لیے مر گیا۔ اسے تم پر اعتماد ہوگا کہ کوئی لاکھ گمان کرے اور وزیر خان کے خلاف کچھ بھی کہے، تمہارے جذبات کا رخ نہیں پلٹ سکتا۔ میر شرافت علی یا گیان چند کے لیے ان تصویروں کی مدد سے ان کو قاتل ثابت کرنا بہت آسان تھا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ تصدیق کرنا چاہو تو ریکارڈ دیکھو، تمہارا باپ تمہاری ماں کو بھگا کر لایا تھا اور انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ شادی والی بات کو ثابت کرنا آسان نہیں تھا۔ پرانے وقتوں میں نکاح تو دو گواہوں کی موجودگی میں ہو جاتے تھے، لکھت پڑھت ہوتی ہی نہیں تھی مگر وہ الزام بہرحال لگا سکتے تھے اور یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ سابق ہندوستان اور موجودہ بھارت کی پولیس سے پوچھ کر دیکھو۔ ان کے پاس اس لاکھ کے ہیرے جواہرات لے کر بھاگ جانے والے وزیر خان کے خلاف ایک ایف آئی آر بھی نکل آئے گی جو پرنس خورشید عالم عرف خرم نے لکھوائی تھی لیکن وہ جانتے تھے کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم کہہ دو گے کہ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ میرے لیے وزیر خان ہی باپ ہے اور اس حیثیت میں اس کی عزت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ انہوں نے یہ نہیں کیا۔ انہوں نے وزیر خان کو بھی دھمکی نہیں دی اور تم سے بھی رابطہ قائم نہیں کیا۔ ممکن ہے وہ وزیر خان سے بات کر کے منہ کی کھا چکے ہوں۔ انہوں نے کہہ دیا ہو۔ جاؤ، تمہارا جو دل چاہے کر لو۔ جسے جو چاہو بتاؤ۔ سکندر میرا بیٹا ہے اور میرا بیٹا ہی رہے گا۔ اس کے بعد۔۔۔"

"مجھے ایک بات بتا محسن!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تو جمع کا صیغہ کیوں استعمال کر رہا ہے۔ بات شرافت علی کی تھی مگر تو گیان چند کو بھی بیچ میں لا رہا ہے؟"

"گیان چند کے بارے میں آخری اطلاع یہی تھی کہ وہ جان بچا کے بھاگ گیا تھا۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "لیکن بھاگ کر وہ کہاں گیا تھا یہ کسی کو معلوم نہیں۔ انکل رضوی کا خیال ہے کہ وہ پنجاب کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ ہو سکتا ہے تقسیم کے بعد وہ ہجرت کر کے نہ گیا ہو۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے اپنی جائیداد کو اپنے مذہب سے زیادہ اہم سمجھا اور ملک بدلنے سے زیادہ آسان یہ سمجھا کہ وہ مذہب بدل لیں اور پھر وہیں رہیں جہاں رہتے تھے۔ ویسے بھی بہت سے ہندو پاکستان میں اسی طرح آباد ہیں جس طرح بھارت میں مسلمان۔ اور ان میں دولت مند بھی ہیں۔ مثلاً پنڈی میں ایک مشہور فوٹو گرافر ہندو ہے۔ ایک خاندان سا ہے جس کی دکان صدر میں ہے اور وہ کسی معمولی پوزیشن میں نہیں۔ وہ عام شہریوں کی طرح معزز زندگی گزار رہے ہیں اور ان کی حیثیت کا معیار ان کی دولت ہے جتنی

کا وہ دور گزر چکا ہے جب مذہب کے نام پر شیطانوں نے خون کی ہولی کھیلی تھی اور اب اس وقت کو یاد کر کے بھی انسانوں کے سر ندامت سے جھک جاتے ہیں۔ اور لندن میں بہت سے دولت مند سابق ہندو اور سیاسی ڈاکٹر، ایڈووکیٹ اور پروفیسر ہندو ہیں۔ کیا گیان چند ان میں شامل نہیں ہو سکتا؟ انکل رضوی سے مجھے بھی اتفاق ہے۔ شرافت علی جو بدری علاوہ دو دی سلو اور خسر ڈیہ کے علاوہ اسی گروہ میں گیان چند بھی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اب اس کا نام بھی بدل گیا ہو۔ چہرہ تو وقت کے ساتھ کچھ بدل ہی جاتا ہے۔۔۔"

"اس خط میں لکھا تھا کہ گیان چند نے وہ تصاویر سر جان سائمن کو ارسال کی تھیں جن میں وزیر خان کو ریذیڈنٹ کی بیوی کو قتل کرنے کے بعد دفن کرتے دکھایا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "جان سائمن کے پاس وہ تصویریں تو اب بھی ہوں گی۔"

"ضرور ہوں گی اور لندن میں ہمارے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا سبب وہ تصاویر ہو سکتی ہیں۔" محسن نے کہا۔ "یعنی جب تک سر جان سائمن کو یہ علم نہ تھا کہ تم کس کے بیٹے ہو، اس نے مارگریٹ کی تم سے محبت کو طوعاً و کرہاً برداشت کیا۔ دیسی لوگوں سے اس کی شدید نفرت کے اسباب بھی اس پس منظر میں صاف نظر آتے ہیں۔ فرض کرو کسی مرحلے پر تمہارے والد کے انکار کے بعد جان سائمن کو یہ بات بتا دی گئی کہ وزیر خان تمہارا باپ تھا، برطانیہ میں بیٹھ کے وہ وزیر خان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ اس نے تمہیں قتل کرانے کی کوشش کی محض اس لیے کہ وزیر خان کو بڑھاپے میں اتنا ہی شدید جذباتی صدمہ پہنچے جتنا اسے جوانی میں اٹھانا پڑا تھا مگر یہ بھی مفروضہ ہے۔ وزیر خان مرحوم نے سب کچھ تو انہیں دے دیا تھا۔"

"لیکن وہ کاروبار سے دستبردار ہونے پر آخری وقت تک رضامند نہیں ہوئے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ شاید اسی بات پر انہیں دھمکی دی گئی ہو کہ سکندر کے بارے میں سر جان سائمن کو بتا دیا جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "اور انہوں نے کہہ دیا ہو کہ اب جو چاہو کرو۔ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے اور کچھ نہیں۔ لیکن خود شرافت علی اینڈ کمپنی کے لیے بھی اس میں سو فیصد تحفظ کی ضمانت نہیں تھی۔ بالفرض محال وزیر خان کو برسوں پرانے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا تو کیا شرافت علی محفوظ رہتا اور وہ گیان چند جو تھا یا ہے۔۔۔ محفوظ رہتا؟ وزیر خان کے بیان کے بعد وہ بھی ملوث ہو جاتے۔"

"میرا خیال ہے کہ سیدہ ساجت سلطان آباد کہیں نہ کہیں ضرور ہوں گی۔" میں نے کہا۔ "اس کی خود مختاری بھارت میں ضم ہو جانے

سے مزید ختم ہوتی ہوگی مگر وہ جگہ سلطان آباد، وہاں کے لوگ جو سابق حکمرانوں کے دور میں زندہ تھے جو نواب کو ریذیڈنٹ کی پرنس کو ان سے منسوب داستانوں کو اور سلطان آباد کی تاریخ کو یقیناً جانتے ہوں گے۔ کسی کتاب میں اس تاریخ کا ذکر ملے نہ ملے، ایک سے دوسری نسل کو منتقل ہونے والی روایات زندہ رہتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں جلیانوالہ باغ کے خونیں واقعے کا تصور کر سکتا ہوں حالانکہ 1919ء میں میرا وجود تک نہ تھا اور میں کبھی جلیانوالہ نہیں گیا مگر میں نے پڑھنے کے علاوہ بہت سے لوگوں سے بہت کچھ سنا ہے۔ سلطان آباد کی موجودہ نسل کو بھی پرانے واقعات کا مزید علم ہوگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اصل حقائق میں بہت کچھ زیب داستان کے لیے بھی شامل ہو گیا ہوگا مگر حقائق کا حوالہ پھر بھی ملے گا۔"

"رابعہ کا خیال تھا کہ خسرو جمشید ہی دراصل پرنس خورشید عالم ہے، جو بعد میں نواب خورشید عالم ہو گیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ انکل رضوی نے غیر سرکاری طور پر ٹیلی فون کے ذریعے ہندوستان کے سفارت خانے سے درخواست کی تھی کہ سلطان آباد کے آخری نواب خورشید عالم کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں۔ ان کے کسی صحافی دوست نے یہ کام کیا تھا۔ جواب یہ ملا کہ نواب نے پانچ سال سرکاری وظیفہ لیا۔ پھر اپنی تمام جائداد منقولہ و غیر منقولہ کو فروخت کیا اور غائب لندن چلا گیا۔ شادی تو اس نے نہیں کی تھی چنانچہ سلطان آباد میں حکمران خاندان کا کوئی فرد نہیں۔ خسرو جمشید بھی لندن ہی سے آیا تھا لیکن میں نے کہا کہ یہ اس کے باپ کا نام تھا۔ خسرو جمشید مر چکا ہے اور اس کی قبر یہیں موجود ہے۔ وہ خسرو پرویز تھا جو ہمیں ملا تھا اور جس کے ساتھ ایک مشکل شوفر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ خسرو پرویز لندن میں مر گیا ہو اور سابق نواب خورشید عالم نے دولت مند کمپنی میں شامل ہونے کے لیے یہ نام اختیار کر لیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لاہور آنے کے باوجود اپنی کوٹھی میں نہیں گیا۔ اس کا ملازم زندہ ہے۔ وہ فوراً پہچان جاتا کہ خسرو پرویز کے بہروپ میں کوئی اور ہے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ چوکیدار عالی شرم کا بوڑھا ہمارے منہ سے خسرو جمشید کا اور پھر خسرو پرویز کا ذکر سن کے کتنا حیران ہوا تھا۔"

"نواب خورشید عالم نے اپنا نام کیوں بدلا؟ اور بدلنا ہی تھا تو یہ نام کیوں اختیار کیا؟" میں نے کہا۔

"وجہ جب تک مسٹر پرویز سے دوبارہ ملاقات نہ ہو یہ عقدہ وا نہیں ہو سکتا۔" محسن نے کہا۔

"اگر زندگی نے مہلت دی تو میں کبھی نہ کبھی سلطان آباد ضرور جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس سے پہلے یہاں بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ بہت سے لوگوں سے نمٹنا ہے۔" یکلخت مجھے محسوس ہوا کہ کھڑکی کے پاس سے ایک سایہ سا گزرا ہے۔

"یہ... یہ کون تھا؟" محسن نے چونک کر کہا۔ "کیا کوئی کھڑکی کے پاس کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا؟"

"دیکھا تو کچھ میں نے بھی تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ بھی میری نظر کا دھوکا ہے۔"

محسن نے کھڑکی کھول کے باہر جھانکا۔ "یہاں تو کوئی بھی نہیں۔" اس نے احتیاط سے دائیں بائیں نگاہ ڈال کے کہا اور پھر باہر اتر گیا۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ رضوی صاحب کی کوٹھی میں گیٹ لائٹ یا ہمارے کمرے کی لائٹ کے سوا کہیں روشنی نہ تھی۔ "ہوشیار... !" باہر سے چوکیدار صدا لگاتا گزرا۔ میں نے اٹھ کر باہر دیکھا تو مجھے اندھیرے میں گم ہوتے ہوئے محسن کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ کوٹھی کے گرد گھوم کر دوسری دیوار کے گوشے سے سرونٹ کوارٹر پر نگاہ ڈالنا چاہتا تھا جہاں اب شہلا مقیم تھی۔ میں چند قدم اس کے پیچھے گیا اور رک گیا۔ صرف اس خیال سے کہ خطرے کی کوئی بات ہی نہیں اور محسن بھی کوارٹر تک جا کے لوٹ آئے گا۔ میری نظروں کے سامنے اس نے سرونٹ کوارٹر کی بیرونی دیوار تک پہنچ کے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شہلا احتیاط پسند لڑکی تھی اور اپنی زندگی کے جس دور سے گزر رہی تھی اس میں احتیاط پسندی ایک ضرورت تھی۔ یہ بات مجھے قدرے غیر معمولی لگی کہ اس اجنبی گھر میں پہلی رات ہی اس نے سونے سے پہلے کھڑکیاں اور دروازے کھلے چھوڑ دیے۔ محسن کے اور میرے درمیان شاید بیس گز کا فاصلہ بھی نہیں ہوگا۔ اگر اس نے دستک دی ہوتی تو اس کی آواز ہی میرے کان ضرور سن لیتے۔ میں یہ بھی فرض نہیں کر سکتا تھا کہ محسن نے شہلا کو ملاقات کا وقت دے رکھا تھا اور وہ نصف شب کے بعد دروازہ کھولے چشم براہ تھی۔ ایسی بات ہوتی تو محسن مجھے ضرور بتا دیتا۔ انہیں ایک دوسرے سے ملنا ہوتا تو اس کے لیے اتنی رازداری کے اہتمام کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ ان کی راہ میں حائل ہونے والا کوئی نہیں تھا۔

پھر یہ شجر ممنوعہ قسم کی محبت اور چوری چھپے ملاقات کی

ابھی تک گھر میں مکمل اندھیرا تھا۔ اگر شہلا جاگ رہی ہوتی تو محسن کے آنے پر لائٹ ضرور جلا دیتی۔ میری نظریں اس منظر کا تصور کرنے سے قاصر تھیں کہ وہ دونوں اندھیرے کی پناہ میں سایوں کی طرح کھڑے فلمی محبت کے جذباتی مکالمے بول رہے

ہوں گے۔ آہستہ آہستہ میں آگے بڑھا اور سرونٹ کوارٹر کے کھلے دروازے تک جا پہنچا۔ "محسن!" میں نے مکمل خاموشی میں چند سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد کہا۔ محسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری بار میں نے اسے زیادہ اونچی آواز میں پکارا کہ اگر وہ اندر کے کسی کمرے میں ہوتا تب بھی میری آواز سن لیتا۔ پھر میں نے شہلا کو آواز دی مگر سکوتِ شب میں کمی نہ آئی اور یہ احساس بوجھل ہونے لگا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میں نے دروازے کے اندر قدم رکھا۔ سامنے کے دونوں کمروں کے دروازے کھلے نظر آ رہے تھے۔ اب شک کی گنجائش ختم ہونے لگی تھی۔ یہ تو ہو سکتا تھا کہ شہلا باہر والا دروازہ بند کرنا بھول گئی ہو مگر اندر کے دروازے کھلے چھوڑ کر سونا شہلا کے لیے مشکل تھا۔ وہ حالات سے بے حد خوف زدہ تھی اور یہ نئی جگہ تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ باقی گھر سے الگ ہے اور اس کے ساتھ صرف ایک بوڑھی عورت ہے جو کچھ نہیں کر سکتی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دروازے کھلے چھوڑ کر بے فکری سے سو جائے۔

میں چند قدم آگے بڑھا۔ میری نگاہ کمروں کے کھلے دروازوں سے گزر کر اندھیرے میں کسی غیر معمولی حرکت یا اجنبی اور نامانوس سائے کی جستجو میں تھی لیکن اندھیرا دیوار سے زیادہ ٹھوس تھا اور جامد تھا۔ خطرے کی بو دیتا ہوا۔ کسی نامعلوم خوف سے ڈرا ہوا، سہما ہوا۔ میں نے اگلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ مجھے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ میں نے پیچھے دیکھا اور لہو میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ فرش پر محسن چت لیٹا تھا۔ "محسن!" میں نے چلا کر کہا اور گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ کر اس کے چہرے کو تھپتھپایا۔ یہ حرکت قطعی غیر ارادی تھی لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے سر کے کسی زخم سے لہو تو نہیں بہہ رہا ہے۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ تھام کر نبض دیکھی۔ نبض کی رفتار مجھے نارمل لگی۔ ایک جست لگا کے میں نے باتھ روم کی لائٹ جلا دی جو قریب ترین تھی۔ دروازے سے روشنی کا ایک مستطیل کوارٹر کے صحن میں پھیل گیا اور میں نے محسن کو کسی لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑا دیکھا۔ ایک مگ میں پانی لے کر آدھے منٹ بعد پھر محسن کے قریب جا بیٹھا۔ میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور اس کے گالوں پر تھپکی دی۔ وہ آہستہ سے کراہا اور میں نے پانی کا مگ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ایک گھونٹ میں سے آدھا حلق سے اترا۔ باقی ہونٹوں کے کناروں سے بہہ گیا لیکن میری کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ وہ مکمل طور پر ہوش میں آ گیا۔ اس نے سر کو جھٹکا اور اٹھ بیٹھا۔ "مجھے..." وہ ہکلا رہا تھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اس نے سر جھکا کے اندر دیکھا۔ "شہلا... وہ... سکندر... کیا وہ لے گئے اسے؟" اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"کون؟" میں نے کہا۔ "کون لے گیا شہلا کو؟" میں نے کہا۔

"وہی... جنہوں نے میرے سر پہ کوئی چیز ماری تھی۔" محسن نے کہا۔ "جیسے ہی میں اندر داخل ہوا... میں نے دیکھا نہیں..."

اب تک میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا۔ میری ساری توجہ محسن پر مرکوز تھی۔ اس کی بات پر میں نے پلٹ کر دیکھا اور کمرے تک پہنچنے والے دھندلے اجالے میں مجھے یوں لگا جیسے کوئی کرسی پہ بیٹھا ہے۔ میں نے پوری طرح چوکس رہتے ہوئے آگے بڑھ کر کمرے کی بجلی جلائی۔ کمرے کا پورا منظر یکلخت میرے سامنے آ گیا اور میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ شہلا کرسی پہ بندھی بیٹھی تھی اور بے ہوش تھی۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ پیروں کو کرسی کے اگلے دو پایوں سے باندھا گیا تھا اور ہاتھوں کو ساتھ ملا کر ایک ہی رسی پیچھے سے اوپر کرسی کی پشت تک لپیٹ دی گئی تھی۔ اس طرح کہ ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ حرکت نہ کر سکے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ کو ضبط کیا۔ یہ رضوی صاحب کے گھر میں ان کی پہلی رات تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ شور اور ہنگامے سے رضوی صاحب کی نیند جاگ اٹھے تو انہیں احساس ہو کہ ہماری میزبانی قبول کر کے انہوں نے کوئی غلطی کی ہے۔ جانتے بوجھتے ہمارے خطرات کو اپنا دردِ سر بنا لیا ہے اور اپنی پُر تحفظ زندگی کا سکون قربان کر دیا ہے۔

سب سے پہلے میں نے شہلا کی ظاہری حالت دیکھی۔ وہ صرف بے ہوش تھی۔ اس کے جسم پر مزاحمت، مقابلے یا تشدد کے آثار ناپید تھے۔ جب میں نے اس کے جسم کے گرد لپٹی ہوئی رسی کھولنی شروع کی تو مجھے احساس ہوا کہ باندھنے والوں نے اسے باندھنے کے محض مذاق کیا ہے۔ ان کا مقصد ہرگز یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ شہلا کو بے بس کر دیا جائے۔ رسیاں اتنی ڈھیلی تھیں کہ اگر شہلا ہوش میں آ جاتی تو معمولی سی جدوجہد کر کے خود کو آزاد کر سکتی تھی۔ رسیوں کی گانٹھیں ایک اشارے میں کھل گئیں۔ شہلا کے ٹخنوں پر ہلکا سا نشان ضرور پڑ گیا تھا مگر خراش تک نہیں آئی تھی۔ اس رعایت اور تحمل کے مظاہرے کی غرض و غایت میری سمجھ میں نہ آئی۔ پھر میں نے ایک اور بات پر غور کیا۔ اسے بے بس کرنے والوں نے یہ بندوبست بھی نہیں کیا تھا کہ شہلا ہوش میں آنے کے بعد چلا نہ سکے۔ نہ اس کے منہ میں کوئی کپڑا ٹھونسا گیا تھا اور نہ ہونٹوں پر ٹیپ چپکایا گیا

تھا۔ باندھنے کا مقصد یہ لگتا تھا کہ وہ بے ہوشی کے عالم میں کرسی سے نہ گر پڑے اور جیسے ہی ہوش میں آئے مدد کے لیے پکارنے لگے۔

"یہ کیا چکر ہے محسن؟" میں نے محسن کو اندر آتے دیکھ کر کہا۔ "تو نے دیکھا تھا کسی کو؟"

"نہیں۔ میں تو دروازہ کھلا دیکھ کر حیران ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "اور وہ شاید دروازے سے لگا کھڑا تھا کہ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا اس نے کوئی سخت سی چیز میرے سر پہ دے ماری۔"

میں نے شہلا کو کرسی سے اٹھا کے بستر پہ لٹا دیا۔ "کوئی سلاخ یا ڈنڈا؟"

"نہیں۔ انھوں نے فوری ہتھیار استعمال کیا۔" محسن بولا۔ "ربڑ کے ہوز پائپ کے ایک سرے پہ لکڑی کا کوئی ٹکڑا چھپا دیا اور گٹ کی گھنڈی فٹ کر دی۔ مجھے تو یوں لگا تھا جیسے سر میں توپ کا گولہ آ لگا ہے مگر چوٹ کی کوئی علامت نہیں۔ بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے آواز نکالنے کی کیا پورا سانس لینے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ میں فوراً آؤٹ ہو گیا تھا۔ شہلا کو کیا ہوا ہے؟"

"ممکن ہے شہلا پہ بھی وہی ہتھیار آزمایا گیا ہو۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شہلا محض دہشت سے بے ہوش ہو گئی ہو۔ کلوروفارم وغیرہ کی بو تو ہے نہیں اور مجھے تشدد کے آثار بھی نہیں ملے۔ وہ خود ہی ہوش میں آ کے کچھ بتا سکے گی۔"

"وہ سایہ سا جو ہماری کھڑکی کے سامنے سے گزرا تھا۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "انھی لوگوں میں سے ایک ہو گا جو یہاں آئے تھے اور انھی میں سے ایک کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا تھا۔"

"ایک وجہ میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ وہ ہمیں متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ اگر کسی وجہ سے ہم اس سائے کو کھڑکی کے سامنے سے گزرتا نہ دیکھ پاتے تو کچھ دیر بعد شہلا کی چیخ و پکار ہمیں متوجہ کر لیتی۔ لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہمیں یوں متوجہ کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "اور وہ آخری آدمی جو تیرے آنے کے بعد گیا، پہلے کیوں نہیں چلا گیا تھا؟ اصل وجہ میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ وہ صرف مجھے متوجہ کرنا چاہتے تھے لیکن ان کو یہ خیال بھی تھا کہ کہیں ان کی ساری پلاننگ فیل نہ ہو جائے۔ کھڑکی کے سامنے سے گزرنے والے پہ صرف تیری نظر پڑے تو میری بجائے صرف تو آئے اور صورت حال کو مشکوک پا کے مجھے ادھر کھسکا دے۔ اتفاق سے یہاں پہلے تو آیا اور وہ تجھے ناک آؤٹ کر کے نکل گئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب کچھ دیر بعد میں بھی ضرور پہنچوں گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے؟"

"شہلا ہوش میں آ جائے تو شاید کچھ بتا سکے۔" محسن نے گھڑی دیکھی جس میں رات کا ایک بجا تھا۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ "محسن! دوسرے کمرے میں ... وہ شہلا کی ماں کا بیڈ تھا۔ تو یہاں ٹھہر، میں دیکھتا ہوں۔"

دوسرا کمرہ بالکل خالی تھا۔ دو دیواروں کے سنگم پہ لگا ہوا صاف ستھرا بستر دیکھ کے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ بوڑھی مفلوج عورت اس پہ موجود تھی جسے شہلا اپنی ماں سمجھتی تھی۔ اب اس کی جگہ سلوٹ آلود سفید چادر پہ ایک لفافہ رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس لفافے کو یوں اٹھایا جیسے اس میں موت کی اطلاع کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے بتایا جائے گا:

مسٹر سکندر بخت! جنگ ابھی جاری ہے۔ اس سے پہلے ایک محاذ پر تم اپنی حکمت عملی سے فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو گئے تھے جیسے کوئی چالاک جنرل دشمن کی توپوں کو آپس ہی میں لڑا دے۔ لیکن اب جنگ ایک نئے فیصلہ کن موڑ پر آ گئی ہے۔ صبح تمھیں اس عورت کی لاش مل جائے گی جس سے تمھارا براہ راست کوئی جذباتی تعلق نہیں۔ اب تمھیں اندازہ ہو جائے گا کہ ہم کتنے بڑے شکاری ہیں۔ تم مقابلہ جاری رکھنا چاہتے ہو تو اپنے مہرے شمار کر لو۔ ہو سکتا ہے اس کے بعد شہلا کی باری آ جائے۔ پھر فوزیہ کی یا ساجدہ کی، محسن کی اور بالآخر سب کچھ کھو کر تمھیں بھی فراغت مل جائے۔

میں نے لاحول پڑھ کے ذہن سے پریشان کرنے والے خیالات کو جھٹک دیا۔ کیا یہ میری ذہنی شکست خوردگی کے آثار ہیں۔ ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں۔ اور اب تو اپنے خیالوں سے ڈرنے لگا ہوں۔ مجھے پہلے اس لفافے کو کھول کر تو دیکھنا چاہیے۔ لفافہ بند نہیں تھا۔ میں نے اس کے اندر سے وہ کاغذ نکالا جو کسی کتاب یا رسالے میں سے پھاڑ لیا گیا تھا بلکہ نوچ لیا گیا تھا۔ مطبوعہ عبارت کو کہیں کہیں سے انڈر لائن کر دیا گیا تھا۔ یہ جرم و سزا کی کوئی کہانی تھی اور خط کشیدہ جملوں کو ملا کر پڑھنے سے پیغام بالکل واضح ہو جاتا تھا۔

خط کشیدہ الفاظ اور جملوں سے یہ عبارت بنی تھی:

"ہم کسی کو قتل کرنا نہیں چاہتے۔ تمھاری بیٹی کو ہم ایک خاص مقصد کی خاطر لے جا رہے ہیں۔ اگر تمھیں اس کی زندگی عزیز ہے تو ہماری بات مان لو۔ پولیس کو اطلاع دی تو ہم تمھاری بیٹی کی لاش پولیس ہیڈ کوارٹر کے دروازے پہ ڈال جائیں گے۔ باہر نکل کے دائیں طرف چلنا شروع کر دو۔ تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر تمھیں سلیٹی رنگ کی ایک کار کھڑی ہوئی نظر آئے گی۔ کار میں کوئی بھی نہیں ہو گا۔ مزید ہدایات تمھیں کار کے ڈیش بورڈ پہ رکھے ہوئے لفافے میں ملیں گی۔ ہم ایک گھنٹے تک تمھارا انتظار کریں گے۔ اس کے بعد تمھاری بیوی ..."

آخری جملہ اس لیے نامکمل رہ گیا تھا کہ وہ اس صفحے کی عبارت کا آخری جملہ تھا۔ باقی جملہ اس سے اگلے صفحے پہ مکمل ہوا ہو گا، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ مطلب ہر حال واضح ہو جاتا تھا۔ ایک بچہ بھی تھوڑی سی عقل سے کام لے کر خالی جگہ کو پُر کیجیے کا یہ سوال حل کر سکتا تھا۔ "اس کے بعد تمھاری بیوی کو قتل کر دیا جائے گا۔" وہ میری بیوی کو اغوا کر کے نہیں لے گئے تھے مگر "تمھاری بیٹی" کی جگہ "شہلا کی ماں" کے الفاظ رکھنے سے عبارت بالکل حسب حال ہو جاتی تھی۔ یوں گویا کسی اغوا کنندہ نے پیغام اپنے ہاتھ سے لکھا ہو۔

"یہ کیا لیے کھڑا ہے تو؟" محسن نے میرے پیچھے آ کے کہا اور میں نے وہ صفحہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بھی مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگائی۔

"یہ بہت چالاک لوگ ہیں۔" وہ صفحے کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔ "انھوں نے اپنا ہینڈ رائٹنگ تو کیا ٹائپ کے حروف کا پیغام بھی نہیں چھوڑا۔"

"حالانکہ ہماری پولیس۔ جتیم ہیڈ رسٹائپ رائٹر کے الفاظ کی ساخت اور صورت سے تاقیامت معلوم نہیں کر سکتی کہ یہ کس ٹائپ رائٹر کی تحریر ہے۔"

"اسکاٹ لینڈ یارڈ والے تو تیرے بھی چچا ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ تو اس صفحے کو بھی رکھ لیتے۔ پھر معلوم کر لیتے۔ یا کم از کم معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرتے ... کہ یہ کس کتاب یا رسالے کا صفحہ چھیانوے ستانوے ہے۔ اصل کتاب انھیں نہ ملتی تب بھی وہ دوسرے نسخے سے کہانی ضرور ڈھونڈ لیتے اور پھر پوری کہانی پڑھ کے اس کے پلاٹ پہ بھی غور کرتے کہ کیا اس سے کوئی سراغ ملتا ہے۔ لیکن یہاں تو یہ منوانا بھی مشکل کام ہے کہ یہ صفحہ واقعی بڑی بی کو اغوا کرنے والوں نے ہمارے لیے چھوڑا ہے اور یہ انکی بے مقصد نہیں ہیں اور کسی بچے نے نہیں لگائی ہیں۔ حرام خور قسم کے لوگوں کے لیے یہی بہانہ بہت ہے کہ اس میں تو لکھا ہے: ہم تمھاری بیوی کو ایک خاص مقصد کے لیے لے جا رہے ہیں۔ آپ دونوں میں سے تو کوئی شادی شدہ بھی نہیں چنانچہ یہ سب بے معنی بکواس ہے۔ یہ سمجھانا مشکل ہے کہ عبارت میں 'شہلا کی ماں' کے الفاظ وہ کہاں سے لاتے؟"

"سوال یہ ہے کہ اب کیا کرنا ہے؟" محسن نے کہا۔

"کرنا وہی ہے جو ہمیں کہا گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔ شہلا کی ماں کو واپس تو لانا ہی ہے۔"

"ایسے ہی ہ خالی ہاتھ؟" محسن نے کہا۔ "تو خود کیسے واپس آئے گا؟"

"میں ابھی سے کیسے بتا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مسلح ہو کر جانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میں پستول لے کر جاؤں گا تو وہ توپ لیے منتظر ملیں گے اور ایک کا مقابلہ کرنے کے لیے دو موجود ہوں گے۔"

"پہلے رضوی صاحب کو بتا دینا چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "انسپکٹر شیخ کو بھی یہ شکایت تھی کہ ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر نقصان اٹھاتے ہیں۔"

"میں یہ خطرہ مول لینے کے حق میں نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ لوگ یقیناً مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے قتل کرنا نہیں چاہتے تھے اور یہ بات بھی تو نہیں ہو گی۔ وہ کوئی بات منوانے کے لیے دباؤ بڑھانا چاہتے ہیں۔ مجھے بارڈر سے ان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ یہ ان کو پہلے بھی معلوم تھا اور ہم نے بھی اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ میری قسمت کہ میں دیکھتا ہوں کہ وہ مجھے کیا دھمکی دیتے ہیں۔ میں تو کوشش کروں گا کہ بڑی بی کو ساتھ لے کر جلد از جلد لوٹ آؤں۔ اگر صرف میرے وعدے سے کام چل سکتا تو میں سمجھتا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ میں جھوٹا وعدہ کر کے نکل آؤں گا لیکن معاملات اس حد تک آگے بڑھ چکے ہیں کہ کوئی کسی پہ اعتبار نہیں کر سکتا۔ انھوں نے کچھ اور سوچا ہو گا جس کا اندازہ میں نہیں کر سکتا۔ یہ تو ان سے مل کر ہی معلوم ہو گا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ اگر مذاکرات کامیاب رہے تو میں صبح ہونے سے پہلے لوٹ آؤں گا لیکن میں نہ آؤں تو جیسا تو مناسب سمجھے کرنا۔ اگر شہلا خود رضوی صاحب کو بتا دے کہ رات کو کیا ہوا تھا تو یہ زیادہ اچھا ہو گا۔ پھر تو کہہ دینا کہ میں سو کر اٹھا تو مجھے سکندر کے پلنگ پہ یہ صفحہ پڑا ہوا ملا اور کہہ دینا میرا خیال ہے وہ شہلا کی ماں کی جان بچانے کے لیے نکل گیا۔"

"وہ پوچھیں گے کہ اس نے تمھیں بھی نہیں بتایا؟" محسن نے سوچ کر کہا۔

"اس کا جواب آسان ہے۔" میں نے کہا۔ "تو کہہ سکتا ہے کہ شاید سکندر نے عمداً ایسا نہیں کیا۔ اس خیال سے کہ میں اسے اکیلا جانے نہیں دوں گا۔ بات یہ ہے محسن کہ اس کام میں میری چھٹی حس میری رہنمائی کر رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ

تاخیر ہوتی یا ہدایات پر عمل نہ کیا گیا تو اس بڑھیا کی جان ضرور جائے گی جس کا ہمارے مسائل سے دور کا بھی تعلق نہیں جسے کچھ معلوم ہی نہیں۔ ہم بھی اتنے ہی بے حس اور سنگدل ہو گئے تو خود کو قائل کرنے کے لیے ہمارے پاس دلائل کی کمی نہیں۔ اس بڑھیا سے شہلا کا قریبی تعلق تو ہے لیکن کوئی گہرا جذباتی رشتہ نہیں ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ عدنان کی موت کا اسے دکھ ضرور ہوا تھا مگر ایسا شدید صدمہ نہیں جیسا اسے سگے بھائی کی موت پر ہوتا۔ بڑھیا کی موت پر وہ پاگل نہیں ہو جائے گی۔ ہم اس دھمکی کو اس طرح بھی نظرانداز کر سکتے ہیں کہ وہ آدھی ادھوری بے مصرف اور بے سہارا زندگی ... ہی تو اچھا ہی ہوگا جو دوسروں کے اعصاب پر تسمہ پا کی طرح سوار ہے جس کے لیے اپنا وجود ایک مسلسل ذہنی و جسمانی اذیت کے سوا کچھ نہیں اور اس طرح مر جانے سے سال پر جوان بیٹے کی موت کا راز افشا نہیں ہوگا اور ہم اس کی نظر میں ذلیل نہیں ہوں گے کہ ہم نے جھوٹ بول کر اسے دھوکے میں رکھا۔ ماں کو لندن سے موصول ہونے والے بیٹے کے وجود خطوط سناتے ہے جبکہ اس کے بیٹے کا وجود محض ہڈیوں کا ایک مدفون پنجر کے سوا کچھ نہ تھا اور کیا معلوم جس روز بھی حقیقت کا انکشاف ہوتا وہ اسی روز صدمے سے مر جاتی" مگر یہ سب دلائل غیر انسانی ہیں۔ اگر وہ مفلوج ہونے کے علاوہ پاگل ہوتی یا اس کی زندگی کی چند سانسیں باقی ہوتیں تب بھی میں اس کی اور اپنی زندگی کو ایک ہی سطح پر اہمیت دیتا۔ تو شہلا کا خیال رکھنا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی زیادہ کار آمد بات بتا سکے اور اسے تسلی بھی دینا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر صبح تک معاملات طے ہو گئے تو چوہدری صاحب کو کچھ معلوم ہی نہیں ہوگا۔"

محسن کو خاموش اور اپنے خیالات سے نبرد آزما چھوڑ کے میں باہر نکل گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ میرے دلائل نے اسے قائل تو کر لیا ہے لیکن جذبات کی دیوار کو عبور کرنا اس کے لیے مشکل ثابت ہو رہا ہے۔ وہ مجھے ہنسی خوشی کیسے اجازت دیتا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں جن لوگوں سے ملنے جا رہا ہوں وہ کس قماش کے لوگ ہیں۔ ان سے کچھ بعید نہیں۔ ویسے بھی دنیا میں یہ کہاں ہوا ہے کہ جنگ اصولوں پر لڑی گئی ہو۔ وہ وقت اور اس وقت کا تصور بھی اب مضحکہ خیز لگتا تھا جب سورج غروب ہوتے ہی لشکر ہتھیار رکھ کے خیموں میں لوٹ آتے تھے اور اگلی صبح طبل جنگ بجنے تک لڑائی پھر شروع نہیں ہوتی تھی۔ پھر یہ لڑائیاں بھی کھلے میدانوں میں ہوتی تھیں مثلاً پانی پت کا میدان۔ جنگ تو ہوتی کرکٹ ہو گئی کہ لارڈز ٹرینٹ برج کے گراؤنڈ میں ہو سکتی ہے جہاں مقابلہ دو ٹیموں میں نہیں دو ملکوں میں ہوتا ہے۔ اصول و قواعد اور ضوابط کے مطابق پابندی کم ہوتی اور لیول پہ کھیل ختم۔ اب صبح لڑیں گے کشتوں کے پشتے لگا کر رکھ دیں گے۔ گویا جو کے چھکے مار مار کے چھکے چھڑا دیں گے۔ لیفٹ رائٹ شکست گویا انگلینڈ کی فتح۔

اپنے خیالات کی رو میں بہتا میں ابھی گیٹ سے نکل کے پچاس قدم ہی گیا تھا کہ پیچھے سے ایک کار کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں۔ میں نے صرف ایک بار پلٹ کر دیکھا اور پھر سامنے دور تک سڑک کو روشن کر دینے والی ہیڈ لائٹس کے اجالے میں کسی سلیٹی رنگ کی کار کی جستجو کرنے لگا مگر سڑک کے آخری کنارے تک مجھے صرف ایک گاڑی دکھائی دی جس کا رنگ سفید تھا۔ ممکن ہے اس صفحے کی عبارت میں سفید کی جگہ سلیٹی ہی چھپا ہوا ہو۔ جیسے "شہلا کی ماں" کی جگہ تمہاری بیوی تھا۔ مطلب تو یہ تھا کہ ایک کار ملے گی اور کار تقریباً اسی جگہ موجود تھی جہاں اسے ہونا چاہیے تھا لیکن ابھی میں چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ پیچھے سے آنے والی کار اس طرح میرے پاس آ کے رکی کہ مجھے زبردست رگڑ لگی اور میں ایک جھٹکے سے گھوم گیا۔ میری کہنی بھی کار کے دروازے کے ہینڈل سے ٹکرائی۔ میرے سنبھلنے سے پہلے دروازے کھلے اور ایک ساتھ دو افراد نے مجھے تقریباً اٹھا کے پچھلی سیٹ پر اچھال دیا جس پر پہلے سے ایک شخص ریوالور لیے بیٹھا تھا۔ مجھے اٹھانے والے دونوں افراد میں سے ایک تو خود ڈرائیور تھا اور دوسرا میں اس کے بالکل پیچھے بیٹھا ہوا گوریلا جو میرے اندر گرتے ہی پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ ایک منٹ سے کم وقت میں دروازے پھر بند ہوئے اور کار چل پڑی۔ میں اب پچھلی سیٹ پر دو گوریلوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا جو قد و قامت سے دیو زاد لگتے تھے۔ صورت سے جتنی مگر میں نے دیکھ لیا کہ انہوں نے چہروں پر کالک یا سیاہی وغیرہ مل رکھی ہے۔ گردن کے نیچے اور کان کے پیچھے ان کا اصلی گندمی رنگ نہ کہ وہ سفید نظر آتا تھا۔ آگے والی سیٹ پر ڈرائیور کے علاوہ بھی ایک شخص تھا جس نے پلٹ کر ایک بار بھی نہیں دیکھا اور زبان سے ایک لفظ نہیں بولا۔ وہ کچھ پستہ قد تھا۔ ہماری بیان کا اور اطوار سے معقول نظر آنے والا۔ اس نے مفصل ہدایات پہلے ہی دے دی تھیں چنانچہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی اور میں خاموشی سے برضا و رغبت اغوا ہو گیا تھا۔ گاڑی کے شیشوں پر اندر سیاہ پینٹ کر دیا گیا تھا۔

"اس گاڑی کا رنگ سلیٹی تو نہیں لیا ہے" میں نے

دیکھا جب گاڑی دائیں طرف گھومی تو اور یہ ... گاڑی ہے اوپل ریکارڈ، لیفٹ ہینڈ ڈرائیو، ... کے ماڈل ہے۔ بہت اچھی گاڑی ہے۔"

کسی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ ڈرائیور کے علاوہ دائیں بائیں کا ٹک مل کے بیٹھنے والے تینوں افراد ایک جیسے سیاہ لباس بھی پہن کے بیٹھے تھے اور قد و قامت میں بھی ایک دوسرے سے کم نہ تھے لیکن ایک بات میں نے نوٹ کر لی۔ ڈرائیور کے کانوں میں سونے کی بالیاں چمک رہی تھیں۔

"اس کے ونڈ اسکرین پہ یہ لکیر سی کیسی ہے؟" میں نے کہا۔ "شاید شیشے میں بال پڑ گیا ہے۔ مار دیا ہوگا کسی نے دو لاتیں اور ... ذرا سی ... ہزار کی۔ میرا خیال ہے میں دوبارہ اسے دیکھوں گا تو پہچان لوں گا۔"

"پھر کسی جنم میں اس جگہ سے گزرو گے تو سب پہچان لو گے۔ بشیر ظفر دوسرا جنم ملا اور تم اس میں آدمی ہی بنتے نہ ہوئے" ڈرائیور نے غرا کر کہا۔

میں ہنسا۔ "میرا اس زندگی پر اعتقاد ہے یا عاقبت کی ... پہ خدا کا شکر ہے اس نے مجھے انسان بنایا ہے ورنہ ... کتے کی طرح ہے۔ آقا کے اشارے پہ ہٹنے ... ایک ہڈی کے پیچھے لپکنے والے ... تمہاری دم کو کسی نے بارہ سال بعد نلکی سے نکال کے دیکھا ٹیڑھا ہی پایا۔ معلوم نہیں تیرہ سال بعد کیا ہوتا ویسے ... کے ہی ہو کاٹتے بھی ہو ... اور وہ کتے جو ... ہوتا ہے ..."

میرے دائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے شخص نے اپنی کہنی سے ... پسلیوں پر زبردست وار کیا۔ درد کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر میں نے نوٹ کر لیا کہ گاڑی جو ... رفتار سے جا رہی تھی آہستہ ہوئی اور بائیں جانب مڑ ... کی رفتار پھر زیادہ ہو گئی۔

"معاف کرنا ... تم نے میرے سچ کا برا مانا۔ سچ ہمیشہ کڑوا لگتا ہے" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ [illegible] دو مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک تو میں ان کو بتانا چاہتا تھا کہ میں بالکل خوفزدہ نہیں ہوں۔ دوسرے میں ان کو مشتعل کرنا چاہتا تھا کہ وہ راستے میں کچھ ذکر کرنے اور کچھ مفصل ہدایات کو بھول کر ذرا بھی غافل ہوں تو میں کچھ فائدہ اٹھاؤں۔ لیکن آگے بیٹھے ہوئے دوسرے شخص [illegible] کہا جس کے بعد وہ سب پھر محتاط ہو گئے۔

"تم تینوں ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے کیا؟" میں نے کہا۔ "رنگ روپ ناک نقشہ سب ایک سے۔ باکسی تصویریں جو کردار ادا کرتے ہو تینوں، اس وقت تو خیر مشکل ہے لیکن کبھی نہ کبھی میں تم تینوں کو ایک ساتھ دنگل لڑنے کی دعوت ضرور دوں گا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔ اپنے اپنے استاد پھر ساتھ لانا اماؤں سے دودھ بھی بخشوا لینا۔"

اس بار بائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص نے میرے سر پہ ریوالور کا بٹ مارا۔ مجھے صرف ذرا سی دیر کے لیے چکر آیا تھا مگر میں اپنے محسن کے کندھے پہ سر رکھ کے اچھا خاصا غافل ہو گیا۔ کار رک گئی کیونکہ میں نے ایک زبردست کراہ بھی بلند کی تھی۔

"او کے بیٹھے" آگے بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ "میں نے کیا سمجھایا تھا تجھے؟"

"ارے استاد، سالا ہوتا جا رہا تھا اور اپنی ماں کا نام کیسے لیا اس نے؟" مجھے ناک آؤٹ کرنے والے نے کہا۔ "میں کب تک یہ بک بک برداشت کرتا۔ ہم کو اس نے گالی کہا اور یہ سمجھا کہ ہم چوہے ہیں۔"

"اگر اسے راستے میں ہی ہوش نہ آیا تو منزل پہ پہنچنے کے بعد تمہاری قوت برداشت کا امتحان میں خود لوں گا" وہ بولا۔

"ارے استاد، معاف کر دو، بے وقوف ہے" ... نے لجاجت سے کہا۔ "پہلی بار ایسے مشن میں شامل ہوا ہے۔"

"تم نے مجھے یقین دلایا تھا کہ سب پرانے آدمی ہیں اور قابل اعتماد ہیں۔"

"ویسے تو بڑے بڑے کام کر چکا ہے مگر اس کام کی نوعیت ذرا اور ہے نا" منہ ہی منہ میں کہا۔

"تم اس کو نہیں جانتے۔ یہ ہر ایک کی ذات پہچان لے گا" استاد کا غصہ کچھ کم ہوا۔ "میں نے اسی لیے سمجھا دیا تھا کہ کوئی بھی بالکل نہ بولے۔ تمہارا کام صرف اس کو اٹھانا تھا مگر تم نے مجھے بھی بولنے پر مجبور کر دیا۔"

"ہم میں سے کوئی بھی اصل آواز میں بات نہیں کر رہا ہے استاد" اس شخص نے کہا جو اب تک خاموش تھا اور جس نے میری پسلیوں میں خاموشی سے کہنی ماری تھی۔

"ہر شخص کو اپنی طرح عقل سے پیدل مت سمجھو" استاد نے پھر بھی سے کہا۔ "تاڑنے والے سات پردوں میں بھی تاڑ لیتے ہیں اور یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے عقل کے اعتبار سے تم جیسے دس کو یہ کوڑیوں کے مول بیچ آئے۔ چلو اب گاڑی چلاؤ" دشمن کے منہ سے اپنی تعریف سن کے مجھے تھوڑی سی خوشی

ہوئی مگر اس وقت احساسِ مسرت پر دوسرے خیالات غالب تھے۔ میں واقعی کوشش کر رہا تھا کہ اصل آواز کو پہچان سکوں۔ منڈی والے کے بارے میں مجھے کوئی شک نہیں تھا۔ حیرت مجھے اس کی عقل پر تھی۔ میں نے اسے بہت عرصے بعد دیکھا تھا مگر منڈیوں کے باعث اسے فوراً شناخت کر لیا تھا۔ آخر وہ ان منڈیوں کو اتار کیوں نہیں دیتا جو ہر جگہ اس کے ٹریڈ مارک کی طرح نظر آ جاتی ہیں۔ اس نے روپوش رہنا قبول کیا اور اتنے عرصے بعد سامنے آیا بھی تو اپنی ظاہری صورت کو بدل کے لیکن منڈیاں اس نے پھر بھی نہیں اتاریں۔ اس حماقت کے دو ہی اسباب ہو سکتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ منڈیاں اسے بہت عزیز تھیں اور کوئی جذباتی وجہ ایسی تھی کہ ان سے جدا ہونا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ دوسرا یہ کہ کان کاٹے بغیر شاید وہ اتاری ہی نہیں جا سکتی تھیں مگر پہلی وجہ زیادہ قابلِ قبول تھی۔ شاید منڈیاں اس کی ماں نے کوئی منت مان کے پہنائی ہوں اور مرتے وقت اسے بتا دیا ہو کہ انہیں کبھی نہ اتارے ورنہ فلاں درویش بابا کے علمِ غیب کے مطابق وہ کسی سخت مشکل میں گرفتار ہو جائے گا یا اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ استاد کی آواز پہ مجھے لالو کی آواز کا شبہ ہوتا تھا۔ وہ بڑا اچھا اداکار اور صداکار تھا۔ اس نے اپنے کمالِ فن کے کئی نمونے پیش کیے تھے۔ مجھ سے پہلی ملاقات میں اس کا لب و لہجہ بالکل مختلف تھا۔ پھر یہ بن کر مجھ سے بات کرتے وقت اس کا اندازِ گفتگو کچھ اور تھا۔ ایک تہہ خانے میں مائیکروفون کے ذریعے بات کرتے ہوئے اور ہسپتال میں ڈاکٹروں کے سامنے گورکن کی ہلاکت کے معاملے پر اپنی بے گناہی ثابت کرتے ہوئے۔ ہر جگہ وہ ایک مختلف آدمی تھا۔ بے شک اس کی اصل آواز بھی میں نے سنی تھی لیکن اس وقت میں سو فیصد یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ لالو ہی ہے۔ صرف اس کے قد و قامت سے یہ اندازہ ممکن تھا ورنہ ابھی تک اس نے مجھے اپنا چہرہ ہی نہیں دکھایا تھا۔ میں بے ہوش تھا۔ ایک آنکھ کی درز کو تھوڑا سا کھولے پڑا تھا اور اگر وہ ایک بار بھی پلٹ کر دیکھتا تو اندھیرے کے باوجود میں اسے پہچان لیتا مگر اس نے پیچھے والوں کو بھی پیچھے دیکھے بغیر ہدایت جاری کی تھی۔ ایک وجہ آگے کی دونوں سیٹوں پر لگے ہوئے ہیڈ ریسٹ تھے جن کی وجہ سے سیٹوں کی پشت دونوں آگے بیٹھنے والوں کے سر سے بھی اونچی ہو گئی تھی۔

دوسرے موڑ کے بعد میں سمجھ گیا تھا کہ گاڑی اب پہاڑ پر چھاؤنی کی طرف جا رہی ہے اور میرا خیال تھا کہ اس سمت میں جہانگیر منزل ڈی سلوا کا گھر ہی ہوگا لیکن گاڑی نے ایک موڑ اور کاٹا۔ اگرچہ میں باہر کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں نے اندازے کو بنیاد بنا کے فرض کیا کہ اب ہم صدر بازار سے نکل کے بند سے گزر رہے ہیں۔ دس منٹ بعد کار بائیں جانب مڑنے لگی تو میں نے تصور میں وہ سڑک دیکھی جو دھوبی گھاٹ کے سامنے سے گزر کے گولڈن شاہ بو کی طرف جاتی ہے۔ یہ علامہ اقبال روڈ جو پہلے میورو روڈ کہلاتی تھی۔ کار کو مسلسل جھٹکے لگے تو مجھے اپنے اندازے کے درست ہونے کا یقین آ گیا۔ کار کے پہیوں نے صدر کی ریلوے کراسنگ پار کی تھی اور جھٹکے دونوں لائنوں پر گاڑی کے اچھلنے سے آئے تھے۔ لائن کے آس پاس کی ٹوٹی پھوٹی سڑک میں لائنوں کے ساتھ ساتھ نالیاں سی بنی ہوئی تھیں اور ریلوے لائن سڑک کی سطح کے برابر نہیں رہی تھی۔

ہم ایک بہت لمبا چکر کاٹ کے تقریباً اسی جگہ پہنچ رہے تھے جہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ مزید پانچ منٹ کے بعد میں نے نہر کے پل کے نیچے پانی کی روانی کا شور سنا۔ مجھے کوئی شبہ نہیں رہا۔ اگر وہ چاہتے تو روانہ ہوتے ہی دائیں طرف مڑنے کی بجائے بائیں طرف مڑ جاتے اور جہاں وہ آدھے گھنٹے میں پہنچے تھے وہاں تین منٹ میں پہنچ جاتے لیکن شاید وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح میں سمت اور فاصلے کا اندازہ نہ کر سکوں گا۔ اتنے لمبے راستے سے گھوم کر آنے اور اتنے موڑ کاٹنے کا مقصد مجھے کنفیوز کرنے کے سوا کچھ نہ تھا لیکن انہیں ابھی تک اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ نہر کا پل عبور کرتے ہی کار سیدھے ہاتھ پر گھوم گئی اور نہر کے ساتھ ساتھ خالی سڑک پر دوڑتی رہی۔ اب اگرچہ نہر کے پانی کے خاموشی سے بہنے کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی لیکن میں نہر کے پانی کی اور کنارے کی مٹی کی، سبزے کی اور نم آلود ہوا کی خوشبو سونگھ رہا تھا جو کار کے اگلے شیشوں کے کھل جانے سے اندر تک پہنچ رہی تھی۔ مجھے بے ہوش دیکھ کر انہوں نے آگے والی کھڑکیوں کے شیشے اتار دیے تھے تاکہ گھٹن کچھ کم ہو۔ ایک پل اور آیا اور اس کے بعد کار نے دائیں طرف کا رخ کر لیا جو میرے خیال کے مطابق باغ جناح والی سڑک تھی اور ہم اب شالیمار باغ کی طرف جا رہے تھے۔

بالآخر کار رک گئی اور میرے دونوں جانب بیٹھے ہوئے نوجوانوں نے مجھے باہر نکال کے اندر پہنچانے کا کام شروع کیا۔ ان کے یقین کے مطابق میں ابھی تک بے ہوش ہی تھا۔ اس لیے میرے سر پر پستول کا دستہ مارنے کی غلطی کرنے والا بھی متفکر ہوگا کہ کہیں میں مر نہ جاؤں۔ اب اسے قوت برداشت کا امتحان دینا پڑے گا۔ اگر شہلا کی ماں کا خیال نہ ہوتا تو میں اسی وقت اندازہ لگا سکتا تھا۔ منڈیوں والا شخص اندر سے اتر کے ہی دروازہ نکال لیا تھا تاکہ میری منتقلی کے آپریشن میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا سب کا لیڈر تھا۔ وہ اترتے ہی اندر چلا گیا تھا چنانچہ میں چاہتا تو اس شخص کا منحوس وار دیتا جو مجھے ڈاکٹر کی طرح اٹھا کے لے جا رہا تھا۔ دوسرے کے ایک لات رسید کرتا تو اس کی گردن ٹوٹ جاتی۔ وہ میری لات کی رسائی میں بھی تھا اور اس سے پہلے کہ منڈیوں والا سنبھلتا میں سواری کے لیے استعمال ہونے والے حیوانِ ناطق کو اس کے اوپر پھینک دیتا۔ گولی چلتی بھی تو اسی کے جسم میں پیوست ہوتی۔ تاہم یہ سب اور بھی بہت کچھ ہاتھ تک جا سکتا مگر اس کے بعد کیا ہوتا یہ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اندر سے گولیوں کی آواز سن کے جتنے مسلح افراد نکل آتے مجھے شکار کر لیتے اور بے شمار افراد کرتے اور شہلا کی ماں سمیت بھاگ جاتے یا اس کی لاش چھوڑ جاتے کہ مجھے بہادر بننے کی بے وقوفی کرنے پر عبرت آمیز سبق دیا جائے۔

عمارت کو میں نے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی کوٹھی تھی جو نواب کے ڈبل رول کرنے والے خسرو جمشید نے میری معرفت رابعہ نیازی کی تھی۔ مجبوراً... اور اس کے پیچھے گولڈ... نے بطور خاص اسی لیے بچایا تھا کہ مجھے اور رابعہ نیازی کو ایک ہی دفعہ میں ایک ساتھ اپنی طلب میں ختم کر دیا جائے۔ اب وصیت ناموں کے ایک سلسلے نے میری وفات سے فائدہ اٹھانے والے نواب کو عملاً صفر کر دیا تھا چنانچہ وہ مجھے زندہ رکھنے پر مجبور تھے اور زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ مجھ پر دباؤ ڈال کے مجھے اپنے مطالبات کے سامنے سپر ڈالنے پر مجبور کر لیں۔ کسی محاذ پر جنگ طول پکڑ جائے اور طاقت سے فیصلہ نہ ہو تو حکمتِ عملی بدل کے مختلف حربے آزمانے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ شہلا کی ماں کا اغوا اس جنگ میں ایک نئے موڑ کا آغاز تھا۔ مجھے دشمن کے کیمپ میں جا کر یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اب مجھے جنگ بندی قبول ہے یا نہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ مجھے کس قسم کے نتائج کی دھمکیاں دے سکتے ہیں لیکن شہلا کی ماں کی زندگی کا مسئلہ انتہائی اہم بنا ہوا تھا۔

مجھے ایک خالی کمرے کے فرش پر لٹا دیا گیا۔ فرش پر ٹاٹ بچھا ہوا تھا... سیاہ پتھروں کے موزیک کا ہوتا تھا مگر اس پر گرد تھی کہ اصل ڈیزائن کے نقوش نظر ہی نہ آتے تھے۔ ... محسوس ہوتا تھا جیسے یہ مکان ... ایک تیز فانوس عین وسط میں روشن تھا جس میں کئی ہی بولڈ لائٹس تھیں چنانچہ کمرہ ہر طرف سے روشن تھا لیکن سایہ کہیں نہ تھا۔ لائٹس کے علاوہ کمرے میں کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی سپاٹ دیواروں پر سے روغن کا رنگ نیلا تھا اور اس کا نارنجی مائل نمدہ۔ میں نے فرش پر استراحت فرمانے سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ کمرے میں میرا انتظار ہو رہا ہے۔ میری جان لینے والے کتنے افراد موجود ہیں۔ جو شخص کار میں استاد بنا ہوا تھا وہ بہادری علاوہ ہی تھا۔ ڈی سلوا اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ پھر وہ ڈبل رول کرنے والے دونوں بھائی تھے یعنی نواب خسرو جمشید اور اس کا شوفر۔ اس وقت بھی وہ ایک جیسے لباس اور حلیے میں تھے چنانچہ میں پورے یقین کے ساتھ محمود و ایاز میں تفریق نہیں کر سکتا تھا۔ پانچویں شخص کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تیس پینتیس سال کا جوان آدمی تھا جس کی ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ وہ قمیص پتلون پہنے ہوئے تھا اور صورت سے مہذب، تعلیم یافتہ اور معزز نظر آتا تھا۔ ان سب کے سامنے تین آدمی تو پہلے ہی سے بالکل بھوت نظر آتے تھے۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" پانچویں شخص نے مجھ پر نگاہ ڈال کے کہا۔ ساتھ والے کمرے میں سے غراہٹوں کی آواز آئی۔

"اس پاگل کے بچے نے یہ ثابت کیا تھا کہ یہ چوہا نہیں چیتا ہے۔" لالو نے حقارت سے اس شخص پر نظر ڈالی جو اب دوسری جانب دو سیاہ افراد کی صف میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ "حالانکہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ بس اسے سمجھا دیا تھا کہ بے ہوش ہی رہنا ہے۔"

"مجھ سے غلطی ہو گئی سراج صاحب!" پاگل کے بچے نے گڑگڑا کر کہا۔ "اس بار معافی دے دیں۔"

"یہ بھی دیکھو کہ بے ہوشی اصلی ہے یا نقلی؟" سراج نے معافی کے خواستگار کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ بظاہر اسے معاف کر دیا گیا تھا مگر اس کی بات نے یکلخت میرے ذہن میں ایک چیستاں کو کھول دیا تھا۔ ایک معما حل کر دیا تھا اور ایک پرانی یاد سے وابستہ نام کو حقیقی وجود عطا کر دیا تھا۔ وہ پھر اسی منظر میں تصور میں زندہ ہو گیا جب رابعہ کی ماں کی تدفین کے بعد ہم واپس لوٹ کر آ رہے تھے تو ایک جنگی قیدی جسے ہم بڑی مشکل سے نکال کر لانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اس کامیابی کی بہت بڑی قیمت ادا کی تھی قریب المرگ تھا۔ ہم اسے ایک نہر کے کنارے مرتا دیکھتے رہے تھے اور جب میں ہاتھوں کے پیالے میں نہر کا پانی بھر کے لایا تو وہ مر چکا تھا لیکن مرنے سے پہلے اس نے کچھ بے ربط الفاظ کہے تھے۔ ایک لفظ کا مطلب راج جو بھی ہو سکتا تھا۔ دوسرا لفظ کرامت تھا

www.paksociety.com

جس کے معنی ابھی تک واضح نہ تھے مگر یقیناً لفظ مراج تھا۔ اب شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی کہ اس نے سراب بھی نہیں کہا تھا اور سرج بھی نہیں۔ اس نے بتایا سراج نام کے اس شخص کے بارے میں کچھ بتانے کی کوشش کی تھی مگر فرشتۂ اجل نے اس کی روح پہلے قبض کر لی۔

میری ناک میں زبردست خارش ہوئی۔ یوں جیسے چیونٹیوں کی فوج میری ناک کو اپنا بل سمجھ کے اندر گھس آئی ہو۔ پھر مجھے ایک زبردست چھینک آئی اور مجھے اٹھ کر بیٹھنا پڑا۔ سراج اپنی چالاکی سے یہ معلوم کرنے میں کامیاب رہا تھا کہ میری بیہوشی محض اداکاری ہے۔ کسی نے میری ناک کو بطور ایش ٹرے استعمال کیا تھا اور جلتی سگریٹ سے گرم راکھ جھاڑ کے پھونک مار دی تھی۔

"السلام علیکم حضرات!" میں نے آلتی پالتی مار کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ سب کو ایک جگہ دیکھ کر... خوشی تو نہیں ہوئی۔ یہ ثابت ہو گیا کہ اکیلا صرف میں ہوں۔ بے شک میرا خدا میرے ساتھ ہے مگر آپ لوگوں کے ساتھ بیادی خدائی ہے۔"

"ونڈر فل!" سراج نام کا شخص بولا جو اب پیچھے ہاتھ باندھے اور پیروں کو تھوڑا سا پھیلائے کھڑا تھا۔ "میں نے سنا تھا کہ تم اور تمہارا وہ ساتھی، دونوں جوکر ہو۔ تمہیں معلوم ہے ہم نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟"

"نہیں۔ اور میں معلوم کرنا بھی نہیں چاہتا لیکن تم لوگ بتائے بغیر جانے نہیں دو گے۔" میں نے کہا۔ "اسے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس تو نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ٹیبل سرے سے نہیں۔ آپ لوگ تشریف رکھیں! ایسے کب تک کھڑے رہیں گے؟"

"تم اس بڑھیا کو زندہ واپس لے جانا چاہو گے یا اس کی لاش؟" سراج نے متانت سے کہا۔ اس کے رکھ رکھاؤ اور اس کے ساتھ دو سروں کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس شکاری ٹولے کی کمان وہی کرتا ہے۔ اب تک وہ پس منظر میں تھا مگر اب دو مرلیں کی مسلسل ناکامیوں کے بعد اس نے خود سامنے آکر مجھ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے سراج صاحب!" میں نے کہا۔ "چاہتا تو میں یہ ہوں کہ شملا کی ماں کو زندہ لے جاؤں اور آپ سب کی لاشیں۔ مگر کیا آپ اس کی اجازت دیں گے؟" ساتھ کے کمرے سے پھر کسی کے کراہنے جیسی آواز سنائی دی۔

"تمہاری حس مزاح بہت سخت جان ہے۔" وہ بولا۔ "میرا خیال ہے پہلے تم کو سنجیدگی سے گفتگو کے لیے آمادہ کیا جائے۔ مذاق بہت ہو چکا اور مذاق مذاق میں بہت وقت

بھی ضائع ہوا اور بہت سے آدمی بھی ضائع ہو گئے۔ میرا خیال ہے تمہیں کچھ ہماقوں سے ملوایا جائے جو تم سے ملاقات کے لیے بڑی دور سے آئے ہیں۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر اس کا اشارہ پاتے ہی وہ دونوں کالے بھجوت مجھ سے چمٹ گئے۔ جو ابھی تک میں مجھے دونوں طرف سے دبوچے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔ اس وقت نہ جانے کیوں مجھے شرارت سوجھی حالانکہ یہ مقابلے کی کوئی جگہ نہیں تھی اور مقابلے کا فائدہ بھی کوئی نہیں تھا لیکن یہ احساس غالب تھا کہ وہ مجھے نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے۔ میں نے بڑی پھرتی سے ان میں سے ایک کو لات رسید کی اور ابھی وہ فرش پر گرا نہ تھا کہ دوسرے کو گردن میں پیچھے سے ہاتھ ڈال کر آگے جھکا دیا۔ ساتھ بہت سے ریوالور نکل آئے اور خسرو جمشید یا اس کے کسی آدمی نے نشانے کو گولی بھی چلائی جو میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر کے دیوار میں پیوست ہو گئی۔

میں نے دونوں ہاتھ پہلے ہی اوپر اٹھا دیے تھے۔ "سوری" میں نے کہا۔ "میں تھوڑی سی پریکٹس کر رہا تھا اور ان دونوں کالے دیو کے بچوں کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اتنی بڑی باڈی سے کچھ نہیں ہوتا۔ جینو بھی کہ دھر چلنا ہے؟" میں نے ان دونوں سے سرپرستانہ انداز میں کہا جو اب کمر سہلاتے اٹھ رہے تھے اور اپنے خفت زدہ اور مشتعل سے تھے کہ پابندیاں نہ ہوتیں تو وہ متحد ہو کے مجھ پر پھر حملہ کرتے۔ "خبردار اب ہاتھ مت لگانا!" میں نے ان کو وارننگ دی۔ "ورنہ ہاتھ پیر توڑ دیے جائیں گے۔"

وہ دونوں مجھے خون آشام نظروں سے گھورتے ہوئے میرے ساتھ ہو لیے اور دائیں بائیں چلنے لگے لیکن ان میں سے کسی نے مجھ سے چھ انچ کے فاصلے پر آنے کی کوشش نہیں کی۔ چوہدری دلاور زیر لب مسکرا رہا تھا اور اپنی ایک مونچھ کو عادت کے مطابق مروڑنے میں مصروف تھا۔ ڈی ایس پی مجھ سے نظر نہیں ملا رہا تھا اور یوں کھڑا تھا جیسے اس تمام منظر سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ خسرو جمشید اور اس کے نقش خانی چہرے بھی سپاٹ تھے صرف سراج کے ماتھے پر نمودار ہونے والی ایک شکن یہ ظاہر کرتی تھی کہ اس نے میرے ایک تکنیکی مظاہرے کو پسند نہیں کیا لیکن مصلحت کا تقاضا تھا کہ مجھے شوٹ بھی نہیں کیا۔ وہ اس قسم کا آدمی تھا جو بات کرتے کرتے ریوالور نکال کے کسی کو بھی گولی مار سکتا تھا اور پھر پورے اطمینان سے بات وہیں سے شروع کر سکتا تھا جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا۔ یوں جیسے درمیان میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ آیا

یعنی انگریزی محاورے کے مطابق "آسمانی تحفہ سے مل دار"! کہنا غلط نہ ہوتا۔ اس میں وہ سب تھا جو تم ہرا دیا گیا ہوا سے شکاری شکاریوں کے اس غول میں دوسرے درجے پر تھا اور جنہوں نے اس منصب کا اہل ثابت کر دیا تھا۔ دوسرے کمرے میں قدم رکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چھت میرے سر پر آگری ہے یا زمین میرے قدموں کے نیچے سے غائب ہو گئی ہے اور میں اندھے خلا میں گرتا جا رہا ہوں۔ میرے سامنے دو کرسیوں پر فوزیہ اور انکل شیروانی بیٹھے تھے۔ ان کی آواز کو خاموش رکھنے کے لیے لبوں پر ٹیپ چپکا دیا گیا تھا۔ جو آوازیں مجھے کبوتر کی غٹرغوں سے مشابہ لگی تھیں وہ صرف ناک سے نکلنے والی آوازیں تھیں جن سے شیروانی صاحب مجھے متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت اچانک آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑنے اور نتائج کی پروا کیے بغیر ان شیطانوں کی رزم گاہ میں کود پڑنے کی بجائے میں نے کیسے خود پر قابو پا لیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور سر کو جھٹکا کر خود کو سنبھالا۔ اب صورت حال بالکل مختلف ہو گئی ہے جس میں کسی ذرا سی سنجیدہ غلطی دونوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ آگے بڑھ کر میں نے باری باری ان دونوں کے منہ پر سے ٹیپ ہٹایا اور وہ رسیاں کھول دیں جن سے وہ بندھے ہوئے تھے۔

"یہ شیطان آپ کو بھی اٹھا لائے انکل!" میں نے سخت ذہنی اذیت اور شرمندگی کے ساتھ کہا۔

شیروانی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہمیں کوئی اٹھا کے نہیں لایا سکندر!" انہوں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"پھر... پھر آپ لوگ یہاں کیسے پہنچے؟" میں نے فوزیہ کے زرد رنگ کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ شملا اس کی صورت پر احساس ذلت، نفرت، بے بسی اور شرمندگی اور غصے کے ساتھ میرے لیے ملامت کے جذبات عیاں تھے۔

"شامت اعمال ہمیں یہاں لے آئی بیٹے!" شیروانی صاحب نے تلخی سے کہا۔ "ہم اس چکر سے کب تک بچتے رہ سکتے تھے۔ میں نے تمہارا ضامن بننے کی غلطی بھی کی تھی۔"

"مگر... میں آپ سے کیا کہوں انکل!" میں نے مشکل سے کہا۔ "یہ کیوں کہیں کہ میں بے قصور ہوں۔ میرا یہی قصور کیا کم ہے کہ میں نور خان کا بیٹا ہوں جو آپ کا دوست تھا۔ سزا آپ کو اس کی بھی برداشت کرنی پڑ رہی ہے جو کسی بھی طرح مجھ سے کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ جو کچھ میرے ساتھ اب ہو رہا ہے اس کا علم اگر مجھے پہلے سے ہو جاتا تو میں ابا سے کہتا کہ مجھے کو چھوڑ دیجیے یا سارے رشتے توڑ لیجیے! مجھے

عاق کر کے مجھ سے بھی بے تعلق ہو جایئے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" شیروانی صاحب نے ہاتھ اٹھا کے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ "ہمیں تمہاری طرف سے ایک تار ملا تھا کہ محسن سخت بیمار ہے اور یہ بات ایسی تھی کہ میں... ہم نے محسن کی ماں کو نہیں بتائی۔ میں تو اکیلا ہی آ رہا تھا۔ بھائی کی وجہ سے فوزیہ بھی ساتھ آ گئی۔"

فوزیہ کی صورت کا تاثر میری بات کے بعد کچھ مختلف ہو گیا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے کلائیوں پر رسی سے پڑ جانے والے نشانات کو مٹانے میں مصروف تھی جو ایک اضطراری اور غیر ارادی حرکت تھی۔ تاہم وہ میری طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

"اسٹیشن پر ہمیں پولیس کی وردی میں ملبوس ایک شخص ملا۔" شیروانی صاحب نے قدرے توقف کر کے کہا۔ "اس نے کہا کہ رضوی صاحب نے ہمیں لے جانے کے لیے گاڑی بھیجی ہے۔ ہمیں شک کیسے ہو سکتا تھا۔"

"اب آمدہ کے بارے میں کیا کہوں۔ یہ کہ آپ تصدیق کیے بغیر یہاں نہ آیا کریں۔" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے آپ خود مختار ہیں گے۔ ابھی تو آپ کو یہ بتانا ہے کہ محسن بالکل خیریت سے رضوی صاحب کے گھر ہے اور اب ان لوگوں سے پوچھنا ہے کہ ان کے عزائم کیا ہیں؟"

"دیکھو سکندر! میں لمبی بات نہیں کرنا چاہتا۔" شیروانی صاحب نے کہا۔ "حالات کو ہم سب سمجھتے ہیں اور کوئی بھی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا مگر ہو سکے تو معاملات کو سمیٹنے کی کوشش کرو۔ ورنہ خدا نہ کرے ہمیں بھی بھروسہ ہے۔ جو ہمارا نوشتۂ تقدیر ہے سامنے آ جائے گا۔ اس سے مفر نہیں۔ نہ ہمیں نہ تمہیں اور نہ ان کو جو فرعون کی طرح خدا بنے قسمتوں کے فیصلے کرنے لگے ہیں۔" ان کو تسلی دے کر میں پلٹ کر اسی کمرے میں آیا جہاں وہ سب جمع تھے۔

"میں مطمئن ہوں سکندر! ملاقات ہوئی اپنے انکل سے جو تمہارے ضامن بھی تھے۔" خسرو جمشید فرعون نے کہا۔

"اور سسر بھی ہو سکتے تھے اللہ کی مہربانی سے۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "اگر تم ذرا وہ نہ ہوتے۔ کیا نام اچھے... کوتاہ اندیش۔"

"اپنی بکواس بند کرو اور مجھے بتاؤ ان لوگوں کو یہاں لانے کا کیا مقصد ہے؟" میں نے دھاڑ کر کہا اور اس کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں فوزیہ اور شیروانی صاحب بدستور کرسی پر بیٹھے تھے۔ "کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

www.paksociety.com

"جو ہم جانتے ہیں۔" سراج نامی شخص نے سگریٹ کا ایک کش لے کر سوچتے ہوئے کہا۔ "وہ تم جانتے ہو۔"
"میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ غیر متعلق لوگوں کو، مفلوج اور بیمار عورتوں کو، بوڑھوں کو اور کمزور لوگوں کو اس طرح اٹھا لانے میں کون سی بہادری ہے؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "کیا تم میں مردانہ وار مقابلے کا حوصلہ نہیں رہا؟"
"ہم نے کب کہا تھا کہ تم مقابلہ کرو۔" سراج بولا۔ "تمہیں سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے لیے ایک مہینے کی مہلت بھی دی تھی۔ تم نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔"
"سراج!" میں نے کہا۔ "تم اس جنگ کو پھیلا رہے ہو۔"
"جنگ کو ختم کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔ ہم نے ایک پیشکش کی تھی۔" سراج بولا۔ "تمہارے سامنے بہت سے راستے رکھے تھے مگر تم نے ان میں سے کسی کا انتخاب نہیں کیا۔"
"وقت اب بھی نہیں گزرا ہے سکندر صاحب!" چوہدری ولادت نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "غور فرماؤ۔"
"ہاں برخوردار! تمہیں غور کرنے کے لیے مزید مہلت دی جا سکتی ہے۔" شیخ خورشید نے کہا۔
"اور اگر تم سمجھتے ہو کہ ہماری پیشکش میں کوئی کمی تھی۔" سراج نے اپنے معاونین کی تائید میں سر ہلایا۔ "تو تم بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ آدمی کے رویے میں لچک ہونی چاہیے۔ ہم مل بیٹھ کر معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کر سکتے ہیں۔"
"خوش اسلوبی سے؟ اب؟" میں نے نفرت کے مارے زہر کو نگل کے کہا۔ "جب تم میرے باپ کو بے کسی کی موت مار چکے ہو، غنی کو اور سلامت شاہ کو اپنی درندگی کا نشانہ بنا چکے ہو، غلام علی کو قتل کر چکے ہو اور لندن کی ایک لاوارث سے لے کر یہاں کرائے پہ ملنے والے کتنے ہی بدمعاشوں کا خون بہا چکے ہو؟ آج تم رویے میں لچک کی بات کرتے ہو؟ رابعہ کے گھر کو بم سے اڑانے، شہلا کے گھر کو آگ لگانے، فیروز اور گل رخ کی زندگی تباہ کرنے کے بعد؟" میں نے آگے بڑھ کر سراج کے منہ پہ تھوک دیا۔ "میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں، تھو...!"
سراج کا تھپڑ میرے منہ پہ پوری قوت سے پڑا۔ "میں تمہاری بات سن رہا ہوں، یہی کافی ہے۔" اس نے اطمینان سے رومال نکال کے اپنا منہ صاف کیا۔ "ورنہ یہاں صرف لاشیں چھوڑ کر جانا میرے لیے ممکن ہے۔"
"پہلے بہت کچھ ممکن تھا سراج! تم نے شرافت علی کے قتل کا الزام میرے سر منڈھ دیا۔" میں نے تلخی سے مسکرا کے کہا۔ "اور جتنی آسانی سے تم نے وزیر خان کو شکار کیا تھا اتنی ہی آسانی سے مجھے شکار کرنا چاہا تھا لیکن بدقسمتی سے تمہیں ابھی سبق نہیں ملا کہ شکاری تم ہی نہیں، وہ بھی ہیں جو تمہاری دسترس سے آگے ہیں۔ تم اپنی ساری فرعونیت اور طاقت کے باوجود مجھ جیسے شخص کو نشانہ نہیں بنا سکے۔ جان لینا آسان ہے، دینا بہت مشکل ہے مگر اس بوڑھے اور کمزور شخص کو دیکھو جس نے اپنے آپ کو داؤ پہ لگا دیا، پھر اپنی بیوی کو۔ سوچو ذرا وہ اندھی بوڑھی محبت تمہارے مقابلے میں کیا تھی؟ اس کی زندگی کو بھی داؤ پہ لگا دیا اور انہوں نے تمہیں شکست دی۔ موت تو ایک دن سب کو آنی ہے مگر یہ دیکھو کیا تم اس بوڑھے کو میرے ہاتھوں تک پہنچنے سے روک سکے۔ تم نے سلامت شاہ کے ٹکڑے کر دیے مگر کیا اس سے حقائق پہ کوئی پردہ پڑا۔ تم نے ایک لڑکی کو زندہ گور کر دیا لیکن کیا یہ بات ثابت نہیں ہو گئی کہ وزیر خان کی لاش غائب کر دی گئی ہے۔" میں نے ایک نظر شیخ سلوا کی طرف دیکھا جس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ "اب سارا زمانہ جانتا ہے کہ وزیر خان کو قتل کیا گیا تھا۔ یہ بھی جلد معلوم ہو جائے گا کہ اسے بے دردی سے کیسے بلیک میل کیا گیا اور کیوں۔ آج میں اکیلا ہی نہیں جس کو تمہارے مذموم عزائم کا علم ہے۔ تم نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا۔ اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا کہ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہے؟"
"واہ! اپنے سکندر صاحب! یہ تو بچوں جیسی بات ہو گئی۔" ولادت نے کہا۔ "یہ کتابی باتیں کتابوں ہی میں اچھی لگتی ہیں۔ ایسا ہی ہوتا تو... خیر... بات مطلب کی کرو تاکہ یہ معاملہ ختم ہو سکتا ہے۔"
"یہ تو تمہیں طے کرنا ہے۔ میں نے تو تم سے اپنے حق کے سوا کچھ نہیں مانگا اور میرے حق میں انصاف کا حق بھی شامل ہے۔" میں نے کہا۔
"انصاف کا معیار، اس کے تقاضے اور حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔" سراج نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔
"ہاں، حالات کے پیش نظر میں یہ چاہتا ہوں کہ بلیک میلر کو قانون کے سپرد کروں جس نے میرے باپ کو لکھ پتی ہونے کے باوجود فقیروں کی طرح کر دیا۔" میں نے کہا۔ "میں اس کے قاتل کو تختہ دار پہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"
"بے شک وزیر خان کے معاملے میں کچھ زیادتی ہوئی... افسوسناک حد تک زیادتی ہوئی۔" سراج نے ایک ایک لفظ آہستہ آہستہ ادا کیا۔ بات کرتے وقت وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا اور اس کی آنکھیں خلا میں گھورتی تھیں۔ "اس کا ذمے دار شرافت علی تھا۔ اسے تم نے مار دیا۔ اب مصالحت کی بات ہو تو یہ الزام بھی تم پہ ختم ہو جائے گا۔"
"مصالحت کا کوئی سوال نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میرا کوئی مطالبہ ہے اور نہ میں تمہاری کسی پیشکش پر غور کرنے کے لیے مہلت چاہتا ہوں۔ جو قانونی طور پر میرا ہے وہ مجھے ضرور ملے گا۔ انصاف ضرور ہو گا خواہ عدالت کے باہر ہو۔ ظلم کرنے والے کو سزا ضرور ملے گی خواہ قانون نہ دے سکے۔ میرا ایمان دو باتوں پر متزلزل نہیں ہو سکتا۔ ایک یہ کہ موت وقت سے پہلے نہیں آ سکتی اور نوشتہ تقدیر کوئی نہیں بدل سکتا۔"
"تمہیں معلوم ہے اس ضد کا نقصان کسے ہو گا؟" سراج نے کہا۔
"ہاں۔ تم نے ایک بوڑھی عورت کو اٹھا کے ثابت کر دیا ہے کہ میری ضد پہ کون کون قربان ہو گا۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ تمہارے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ تم اسلام آباد سے بھی لوگوں کو اٹھوا سکتے ہو۔"
"اور اس کے باوجود تم سمجھتے ہو یہ دانشمندی ہے۔" سراج نے کہا۔ "تمہیں یہ منظور ہے کہ شہلا جیسی معصوم بچی اپنی ماں کی مسخ شدہ لاش دیکھے؟ اتنا عزیز ہے یہ کاروبار تمہیں جو اس کی خاطر تم دو معصوموں کی زندگی کو جہنم بنا سکتے ہو۔ تمہیں معلوم ہے فوزیہ کی ماں کی عمر کیا ہو چکی ہے۔ کیا تمہاری ضد کی وجہ سے اسے بھی کچھ ملے گی؟"
"تم اس سے زیادہ بھی بہت کچھ کر سکتے ہو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "تم فوزیہ کو تشدد کا نشانہ بنا سکتے ہو۔ اس کی آبرو سے کھیل سکتے ہو۔ اس کی ماں تو مرنے ہی والی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ باپ بھی صدمے سے مر جائے گا۔"
سراج نے افسوس سے سر ہلایا۔ "تم صرف جذباتی اور خود سر ہو۔ ان سب لوگوں کی زندگی کی قیمت تمہارے نزدیک اس جھگڑے کے کاروبار سے زیادہ نہیں۔"
"بات کاروبار کی نہیں۔ مگر میرا باپ بھی فقیری بھی جھیل گیا ہوتا تو مجھے فرق نہ پڑتا۔" میں نے کہا۔ "آج بھی میں اس کاروبار سے دستبرداری قبول کر سکتا ہوں لیکن اس سے پہلے مجرم پیش کیا جائے جو عدالت کے روبرو اعتراف کرے کہ اس نے کس طرح میرے باپ کو لوٹا، قتل کیا اور اس کی لاش کو غائب کیا۔ جو اس کے بعد ہونے والے ہر قتل کا الزام قبول کرے، تمام قاتلوں کی نشاندہی کرے۔ میں کارپوریشن کی ملکیت یا اپنے باپ سے ملنے کی دولت نہیں مانگتا۔ میں انصاف مانگتا ہوں۔ یہ انصاف میرا حق ہے۔ مجھے میرا حق مل جائے تو میں دنیا کی ساری دولت ٹھکرا دوں لیکن اس حق سے دستبرداری کسی قیمت پہ قبول نہیں کر سکتا۔ یہ کاروبار نہیں، اصولوں کا معاملہ ہے جس پہ سودا نہیں ہوتا۔ اصولوں کی خاطر مجھ سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے سختیاں جھیلی ہیں اور قربانیاں دی ہیں اور آئندہ بھی دیتے رہیں گے۔ ایسا نہ ہو تو یہ انسانی معاشرہ درندوں کا جنگل بن جائے۔"
"ویری گڈ۔ تم طوطے جیسی رٹی ہوئی باتیں بول رہے ہو مگر اس وقت تم اسٹیج پہ نہیں ہو۔" سراج نے کہا۔ "میں جلدی میں کوئی کام نہیں کرتا۔ فوزیہ کو اور شیرانی صاحب کو صحیح باعزت طور پر واپس پہنچا دیا جائے گا۔ بخیر و عافیت اور زندہ سلامت بھیج دیں گے۔ تمہیں ضرورت محسوس ہو گی تو بلا لیں گے۔ ابھی تو صبح تمہارے پاس صرف شہلا کی ماں کی لاش واپس کی جائے گی۔ اس کے بعد تمہاری قوت مزاحمت کا اندازہ کیا جائے گا۔ تم اڑے رہے تو ہم تمہیں کوئی چھوٹا سا تحفہ بھیجیں گے۔ مثلاً تمہاری منگیتر اور شریک حیات بننے والی فوزیہ کی ایک چھوٹی انگلی۔ اگر تم مان گئے تو زیادہ گھاٹے میں نہیں رہو گے۔ نو انگلیوں کے ساتھ بھی فوزیہ جیسی بیوی بری نہیں۔ اس سے اگلے مرحلے میں تمہیں اس کا ایک ہاتھ ارسال کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہاتھ کے بغیر وہ زندہ تو رہ سکے گی اور تمہاری محبت میں بھی شاید فرق نہ پڑے لیکن دونوں ہاتھوں سے محرومی کے بعد...!"
"کمینے!" میں نے سراج پہ حملہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ دونوں کالے بھجنگ مجھ سے چمٹ گئے۔ "اس کے بعد تو فوزیہ کے باقی ٹکڑے ارسال کرے گا مجھے۔ اور تیرا کیا خیال ہے میں صرف آنسو بہاتا رہوں گا۔ میں تم سب کو چن چن کے قتل کروں گا۔ چوہدری ولادت، بدمعاش، تیری بھی تو ایک نسل ہے۔ تم سب کی بھی کوئی نہ کوئی فوزیہ ضرور ہو گی۔ تمہارے بھی رشتے ہوں گے۔ ماں کے اور بہن کے اور بیٹی کے جن کی تقدیس میں انسانیت کی عظمت ہے لیکن تم نے مجھے انسان سے شیطان بنا دیا تو کیا میں ان رشتوں کا احترام کروں گا؟ ان سب کو معاف کر دوں گا؟ میں تمہارے بوڑھے اور بیمار والدین کو، تمہاری بیویوں کو اور ان کے بچوں کو، تمہارے بچوں کو، بھتیجوں کو اور بھانجوں کو اسی طرح اٹھاؤں گا۔ تم کس کس کے ساتھ رہو گے اور کہاں کہاں ان کی حفاظت کرو گے؟ ان کا حشر بھی مختلف نہیں ہو گا۔ یاد رکھو تم مجھے قتل کر دو تو میں قسم کھاتا ہوں کہ جو کچھ میرے ساتھ ہو گا اس سے بدتر تمہارے ساتھ ہو گا۔" چلاتے چلاتے میرا گلا بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح پرسکون اور بے حس کھڑے رہے جیسے میری آواز ان کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں رہی ہے۔
"تم مجھے شرافت علی کا قاتل سمجھتے ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ قاتل تم میں سے ایک ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

www.paksociety.com

"اب تم میرے والد کے ساتھ ہونے والے ظلم کا ذمے دار بھی اسے قرار دیتے ہو، صرف اس لیے کہ وہ تمہارے الزام کی تردید کے لیے نہیں آ سکتا۔ پھر مجھ سے کیوں توقع رکھتے ہو کہ میں اس کو سچ تسلیم کر لوں۔ میرا خیال ہے شرافت علی کا جرم بھی وہی ہوگا جو میرے والد کا تھا۔ اس نے تمہارے مذموم کاروبار میں حصہ نہ لیا ہوگا چنانچہ تم نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ تم نے اسے مار دیا اور مجھے اس کا قاتل بنا دیا تاکہ تم مجھے انتخاب کا حق دے سکو کہ اپنی زندگی یا حق وراثت میں سے ایک چیز سے محرومی قبول کروں۔ تم نے صفائی کے واحد گواہ کو بھی زندہ نہیں رہنے دیا مگر تم نے بچانے والے ہاتھ کا کرشمہ دیکھا ہے۔ تمہارے دونوں چشم دید گواہ بھی نہیں رہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو ختم کر دیا ہے۔"

"ان کے قتل کا الزام بھی تم پر ہی ہے مسٹر سکندر۔" سراج نے کہا۔ "اور حالات و واقعات کی شہادت پھر تمہارے خلاف ہے۔ تمہیں پھانسی ہو جائے گی۔"

"ہونے دو۔ اس سے تمہیں وہ کاروبار نہیں ملے گا۔ تمہارے مقاصد پورے نہیں ہوں گے اور وہ سب جو صفِ مجرماں میں شامل ہیں، اپنی سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔" میں نے کہا۔ "میں عاقبت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ انہیں یہیں اسی دنیا کے نظامِ انصاف کے مطابق سزا ملے گی۔ ایک سزا تو وہ اس وقت بھی کاٹ رہے ہیں۔ وہ خود اپنی نظر میں مجرم ہیں اور اس احساس سے نجات ان کے اختیار میں نہیں۔ تم جو چاہو کرو۔"

"دیکھو سکندر۔" سراج نے نسبتاً دوستانہ لہجے میں کہا۔ "میں بہادر اور ذہین دشمن کو بزدل اور بے وقوف دوست سے بہتر سمجھتا ہوں۔ میں اصول پرستی وغیرہ کو غلط نہیں کہتا مگر یہ دنیا کتابی نظریات پر نہیں چل رہی ہے۔ سب ایمانداری سے رزقِ حلال نہیں کما رہے ہیں۔ سچ نہیں بول رہے ہیں اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مذہب، اخلاق یا قانون کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر نہیں کر رہے ہیں۔ آنکھیں کھول کر دنیا کو دیکھو کہ اقدار کی وقعت زیادہ ہے یا دولت کی۔ نادار کی فائدے میں کون ہے اور نقصان میں کون؟ مثالی انسان صرف مثالی معاشرے میں اور مثالی دنیا میں زندہ رہ سکتا ہے جس کا تصور کتابوں میں تو ہے مگر عملاً یہ دنیا اس سے بہت دور ہے اور دور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ وقت کا دھارا ہے۔ یہ مت سوچو کہ اسے کس سمت میں بہنا چاہیے۔ یہ دیکھو کہ کس سمت میں بہہ رہا ہے اور اس حقیقت کو قبول کر لو۔ اس کا رخ بدلنے کی کوشش دیوانگی کہلاتی ہے۔ تم پر واضح کر دیا گیا تھا کہ میر اینڈ کمپنی کی گڈ ول سے ہم دیگر فوائد بھی حاصل کر رہے ہیں اور اسی لیے تمہارے سامنے دو متبادل راستے رکھے گئے تھے کہ شرافت سے مکمل علیحدگی یا ہم سب کے برابر کی شرکت کی بنیاد پر لندن میں ہماری نمائندگی۔ مگر تم حقِ ملکیت پر مصر ہو۔ تمہارے کہنے پر ہم سارا کاروبار ختم کر کے صرف 'ایم ڈبلیو ٹی کمپلیکس' کی مصنوعات فروخت کرنے پر قناعت نہیں کر سکتے۔" اس نے ایک منتظر دوسروں کی طرف دیکھا جو اس طرح کھڑے تھے جیسے وہ منتظر ہیں اور ان کا سپریم کمانڈر دشمن فوج کے کمانڈر سے فیصلہ کن مذاکرات کر رہا ہے۔ مزید نقصانات سے بچنے کے لیے سراج پھر کہنا شروع کیا۔ "اور مفاہمت کی خاطر... ہم نے یہ طے کیا ہے کہ تمہاری بات مان لی جائے یعنی تمہیں ایک مالک تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ جو سالانہ منافع اب تک تمہارا حق بنتا ہے وہ بھی تمہیں ادا کر دیا جائے۔ علاوہ دیگر چھوٹے موٹے نقصانات کے۔ مثلاً تمہارے والد مرحوم کی جائیداد کو بھی کاروبار، اس کے عوض بھی تلافی کے طور پر مناسب معاوضہ ادا کر دیا جائے۔"

"تھینک یو ویری مچ۔ آپ لوگ واقعی بہت فراخدل ہیں۔" میں نے طنزآمیز تلخی سے کہا۔ "لیکن میں یہ رشوت اور خیرات آپ کو بخشتا ہوں۔ آپ سب نے مل کر جتنا مال حرام کھایا، جتنی بے ایمانی کی، ناجائز ذرائع سے جتنی دولت کمائی وہ سب جو میرے والد کو ملا تھا اور نہیں ملا۔ وہ سب جو ان کے پاس تھا اور نہیں رہا۔ میں یہ سب کچھ چھوڑتا ہوں۔ باقی ہے آپ لوگوں کے جرائم اور نامۂ اعمال کے گناہ۔ ان سب کا حساب میں یومِ حساب پر چھوڑتا ہوں۔ میں اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ آدمی کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ میں اکیلا اس ساری دنیا کی خرابیوں کو ٹھیک نہیں کر سکتا اور محض میرے چاہنے سے دنیا ایک تصوراتی جنت نہیں بن سکتی۔ جرائم کا وجود ہر دور میں رہا ہے مگر یہ زمانہ تیز رفتاری کا ہے چنانچہ جرائم کی رفتار میں بھی اسی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔ مافیا جیسی اسمگلروں کی بین الاقوامی تنظیم کسی صدر کو قتل کرا سکتی ہے تو میں کیا ہوں۔ میں تو اپنے پڑوسی کے اعمال کو کیا خود اپنے اعمال کو درست رکھنے پر قادر نہیں۔ چنانچہ میں ایم ڈبلیو ٹی کمپلیکس اور اس کی آڑ میں ہونے والا ناجائز اور جائز ہر قسم کا کاروبار کلی طور پر تمہارے حوالے کرتا ہوں۔"

انہوں نے بڑی امید افزا نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر میں نے ایک ذرا سا وقفہ دیا تھا۔

"لیکن..." میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "آپ لوگوں کی یہ بات ماننے اور یہ مطالبہ منظور کر لینے کے بعد مجھے بھی یہ حق پہنچتا ہے حضرات کہ آپ لوگوں سے کچھ مانگ سکوں۔ اب

سب با اختیار، با اثر اور بادشاہ لوگ ہیں۔" میں خاموش ہو گیا۔

"لیں۔" سراج نے میری خاموشی سے اعصابی کشیدگی میں مبتلا ہو کے کہا۔ "کیا مطالبات ہیں تمہارے؟"

"میرا ایک مطالبہ تو یہ ہے کہ فوزیہ اور شیرازی صاحب کو اسی وقت رضوی صاحب کے گھر پہنچا دیا جائے۔" میں نے کہا۔

سراج نے ایک سیاہ فام کی طرف دیکھا اور اسے سر کی جنبش سے اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد ایک کار ان دونوں کو لے کر روانہ ہو گئی۔

"میرے باقی مطالبات بہت سیدھے سادے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اب جمع کا صیغہ استعمال کرنا بھی غلط ہے۔ میرا تو صرف ایک مطالبہ ہے۔ مجھے اپنا باپ وزیر خان چاہیے، زندہ سلامت، صحت مند اور خوشحال۔ بالکل اسی حالت میں جیسے میں نے اس کو لندن جاتے وقت دیکھا تھا۔" شاید اس اینٹی کلائمکس سے ان سب کے چہرے اتر گئے۔

سراج نے آدھی سے زیادہ سگریٹ کو زمین پر ڈال کے جوتے کی ایڑی سے رگڑ دیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا تھا۔ "میرا خیال تھا تم کوئی معقولیت کی بات کرو گے۔"

"یہ اپنے سکندر صاحب بڑے مسخرے ہیں بھئی۔" چوہدری دلاور نے تمسخرآمیز طنز سے کہا۔

"جلدی کوئی فیصلہ کرو۔" سراج نے دانت پیس کر کہا۔ "تم ایسے نہیں مانو گے۔"

"ہاں۔ جب تک میرا یہ ایک مطالبہ پورا نہیں ہوگا میں کسی کی کوئی بات نہیں مانوں گا۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تم نے مجھے بتا دیا ہے کہ اب تم کیا کرو گے۔ میرا پروگرام بھی سن لو۔ ابھی تک میں اکیلا تھا۔ میرا ایک دوست ضرور تھا لیکن مگر وہ اس جنگ میں ایک فریق نہیں تھا۔ تمہارے جرائم کی نوعیت واضح ہو جانے کے بعد میں نے بھی طے کر لیا ہے کہ اب ہم شریف آدمی نہیں رہیں گے۔ شرافت کی سند کو ہم پھاڑ کر زنبیل میں پھینک دیں گے۔ فی الحال طاقِ نسیاں پر رکھ دیں گے اور پھر تمہاری طرح بدمعاشی کے دعوے کے ساتھ ایک گروہ بنائیں گے۔ سب کھیل پیسے کا ہے یا طاقت کا ہے اور ہمارے پاس گزارے کے لیے دونوں چیزیں ہیں۔ ہم کرائے کے بدمعاش بھرتی کریں گے یا ان کی خدمات حاصل کریں گے۔ اب تک ہم نے تم سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ وہ سب ہمارے کام آئے گا۔ پھر ہم بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکیں گے۔ ہمارا راستہ تو ہماری شرافت میں روک تھی۔ ایک بار ہم نے اس کو طلاق دے دی تو تمہارے لیے کوئی کام مشکل نہیں رہے گا۔ ہم بھی جس کو اٹھانا چاہیں گے اٹھوا لیں گے۔ تم سب بھی تو بہن، ماں، باپ کے پیدا نہیں ہوئے ہو۔ تمہارے بھی خاندان ہیں اور دوست احباب ہیں اور ان سب کے بیوی بچے ہیں۔ میری دنیا میں کون ہے؟ سابقہ کا کون ہے؟ محسن کی بھی ایک ہی بہن ہے۔ ماں کو شاید ہی مت کہو۔ باپ کی زندگی بھی ابھی گزر رہی تھی اور اس نے بیٹی کو مار کے خودکشی کر لی تو محسن بھی اکیلا رہ جائے گا۔ اب تم بھی اپنے اردگرد نظر ڈالو۔ نفع نقصان کا حساب لگاؤ۔ شرافت، مروت، انسانیت کو بالائے طاق رکھنے کے بعد آپ نے ہمیں شیطان بننے پر مجبور کیا تو..." وہ سب بڑے انہماک سے چہروں پر مسخرانہ طنز والی مسکراہٹ سجائے، اپنی طاقت کے غرور میں بدمست، ایک جرم انداز بے نیازی کے ساتھ میرے جذباتی دعووں کو سن رہے تھے جو ان کے نزدیک فضول بکواس سے زیادہ نہ تھی۔ میری حکمتِ عملی حالات کے مطابق کارگر ہو رہی تھی۔ عین اسی وقت جب وہ میرا ادھورا جملہ مکمل ہونے کے انتظار میں تھے، میں نے ایک جست لگائی اور سراج کو یوں دبوچ لیا کہ ان میں سے کوئی حرکت بھی نہ کر سکا۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں سراج اس طرح میرے سامنے آ گیا کہ میرے بائیں ہاتھ نے اس کی گردن کو بازو کے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ میرا ہاتھ سامنے سے گھوم کر سراج کے دائیں شانے کو گرفت میں لے چکا تھا اور دائیں ہاتھ سے میں نے سراج کے سیدھے ہاتھ کو اس طرح موڑ لیا تھا کہ اگر وہ ذرا بھی حرکت کرتا یا خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتا تو اس کی گردن یا کلائی ضرور ٹوٹ جاتی۔ میں اب دیوار سے لگا ہوا تھا اور سراج میرے سامنے ڈھال بن گیا تھا۔ میری گرفت اتنی سخت تھی کہ سراج کا سانس رکنے لگا تھا۔ وہ تھوڑا سا تڑپا اور اس کی کلائی کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ کمرے میں موجود دیگر افراد اپنے اپنے ریوالور ہاتھ میں لیے بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ سراج بلبلایا۔

"تم میں سے جو سراج کو گولی مارنا چاہے، مار سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر کسی کو انتقام لینے کا موقع آج تک نہیں ملا تھا تو فائدہ اٹھا لے۔ ابھی سراج زندہ ہے۔ صرف ایک ہاتھ سے معذور ہوا ہے جس سے یہ گولی چلاتا تھا۔ ٹھیک ایک منٹ بعد میں کہنی کے پاس سے بھی ہاتھ توڑ دوں گا۔" پھر میں نے سراج کی ایک ٹانگ کو اپنی ایک ٹانگ میں پھنسا لیا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے مسٹر سراج نے ایک پروگرام کا خاکہ پیش کیا تھا کہ وہ کس طرح فوزیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ارسال کر سکتے ہیں۔ میں آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتا۔" میں نے سراج کے بازو کو بل دیا۔ کہنی کے پاس سے اس کا جوڑ چٹخ گیا۔

www.paksociety.com

اور اس نے ایک کراہ بھری۔

"یہ... اپنے سکندر صاحب! تم نے اسی وقت مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے شاید۔" چوہدری دلاور نے کہا۔

"مجھے کب مرنا ہے، اس کا فیصلہ تو وہ کر چکا ہے جس نے مجھے زندگی دی تھی۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ سراج کا آخری وقت آ گیا ہو۔ اور تقدیر کی ستم ظریفی دیکھو، اس کو مارنے والا بھی تم میں سے کوئی ایک ہو گا جو اس کے اطاعت گزار، جاں نثار بنا دیے گئے تھے۔ گولی اگر سراج کے جسم سے گزر کر میرا کام بھی تمام کر گئی تو مجھے افسوس نہیں ہو گا کیونکہ مجھے مارنے والے دشمن ہی بھول گئے۔ سراج نے کبھی سوچا تک نہ ہو گا کہ تم میں سے کوئی اس کا قاتل بنے گا ورنہ وہ بہت پہلے مقتول ہو جاتا۔"

"تمہیں معلوم ہے سراج صاحب کون ہیں؟" خسرو جمشید نمبر ون نے کہا۔

"ہاں۔ اچھے بھلے صحیح سالم آدمی تھے ابھی چند منٹ پہلے اور غاصب اسٹیج اڑ رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "اب ایک ہاتھ سے معذور اور زندگی سے مایوس بے بس آدمی ہیں۔ میں نے سراج کا ٹوٹا ہوا بازو چھوڑ دیا اور اس کی پتلون کی جیب میں سے ریوالور نکال لیا۔" میں چاہوں تو ان کے شیطانی دماغ کا سارا لاوا ایک سوراخ سے خارج بھی کر سکتا ہوں مگر میں انہی کی زبان میں تمہیں سمجھاؤں گا کہ ایک ہاتھ سے معذور ہو جانے کے باوجود ابھی نقصان زیادہ نہیں ہوا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ دو انگلیاں نہ ہونے کے باوجود نوزیہ بری بیوی نہیں... تو سراج بھی ہاتھ ٹوٹنے کے باوجود برا سرغنہ نہیں۔ دو چار ماہ میں ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جڑ سکتی ہیں۔ ہاتھ پھر ٹھیک ہو سکتا ہے۔ میں تمہیں مزید دو منٹ دوں گا۔ اس کے بعد سراج کا دوسرا بازو بھی پہلے بازو کی طرح ہو جائے گا۔ یہ خالی ہاتھوں سے بہت کچھ کرنے کا فن ہے۔ میں نے کوئی بلیک بیلٹ وغیرہ تو نہیں لی مگر کوشش کرتا تو لے سکتا تھا۔ چنانچہ میں نہایت فنکارانہ طریقے سے اس کی ٹانگ کو بل دوں گا۔ اس کے بعد صرف ایک ٹانگ پر کھڑا رہ سکے گا۔ تم جیسا کہ سراج نے کہا تھا کہ ایک ہاتھ نہ ہونے سے بھی نوزیہ کے ساتھ میری زندگی گزر سکتی ہے۔ ایسے ہی میں کہتا ہوں کہ ٹوٹے ہوئے ہاتھوں اور پیروں کی مرمت کے بعد سراج زندہ رہ سکتا ہے اور سال چھ ماہ میں ویسا ہی ہو سکتا ہے جیسا کچھ دیر پہلے تھا۔"

"سکندر اعظم کی اولاد!" خسرو جمشید نمبر ون نے کہا۔

"سراج ایک اعلیٰ پولیس افسر ہے۔"

"اوہ!" میں نے سخت تعجب کا اظہار کیا پھر تکلفت

میرے ذہن کے نہاں خانوں میں یاد کی ایک کرن روشن ہو گئی۔ اپنی گرفتاری کی پہلی رات میر محمد نے کسی اے ایس پی کا حوالہ دیا تھا۔ میں نے منشی والے کو نکالنے میں آگے جانے کو کہا تھا لیکن میر محمد نے صاف انکار کر دیا تھا۔ ایک بار اس نے کہا تھا "کیا تم ڈی ایس پی صاحب کو مروا دو گے کہ یہ اصل قاتل ہے؟" مگر بعد میں اس نے مجھے صاف بتا دیا تھا کہ اے ایس پی کا کیا حکم ہے۔ ملزم جب تک قتل کا اعتراف نہ کرے اور بیان نہ دے، پوچھ گچھ جاری رکھی جائے۔ پہلی بار شاید اس نے روانی میں صحیح عہدہ بتا دیا تھا۔ بعد میں اس کو غلطی کا احساس ہوا تو اس نے اسے اے ایس پی کہا۔

"سراج صاحب ڈی ایس پی ہیں نا؟" میں نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے مجھے معلوم نہیں تھا؟"

"ان کو کچھ ہوا... تو پولیس کا سارا محکمہ حرکت میں آ جائے گا۔" خسرو جمشید نمبر ون نے کہا۔ "اور وہ سب جو اب تک نہیں ہوا تھا۔"

"ہاں۔ مثلاً ایک جگہ خالی ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "اور کسی تھانیدار کو سفارش کی بنیاد پر ڈی ایس پی کے عہدے پر ترقی مل جائے گی یا کوئی اے ایس پی سنیارٹی پر ڈی ایس پی ہو جائے گا۔"

منشی والے کے ساتھ اب ایک کالا بھجنگ کھڑا رہ گیا تھا۔ دوسرا جو نوزیہ اور شیرانی صاحب کو لے کر گیا تھا ایک گھنٹے سے پہلے لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔ ان کی طرف سے میں بہت مطمئن تھا۔ وہ سراج کی اجازت یا حکم پر بھیجے گئے تھے اور انہیں لے جانے والے کی مجال نہ تھی کہ اپنے طور پر کوئی خرابی کرے۔ میرا خیال تھا کہ ڈرائیور انہیں کوٹھی سے کچھ پہلے اتار کر لوٹ آئے گا۔ کوٹھی میں پہنچتے ہی وہ دونوں چوہدری صاحب اور محسن کو ساری بات بتا دیں گے سوائے ایک بات کے۔ وہ اس جگہ کے متعلق کچھ نہ بتا سکیں گے جہاں دشمنوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ البتہ یہ امید کی جا سکتی تھی کہ زنانی گھر اور کولہن کے نقشے سے وہ صحیح نتیجہ اخذ کر لیں اور دس فیصد امکانات کی روشنی میں پولیس فورس لے کر یہاں آ جائیں مگر اس سب کارروائی میں دو گھنٹے صرف ہونے لازمی تھے۔ میں نے اچانک سراج کا دوسرا ہاتھ موڑا اور کہنی کے پاس سے توڑ دیا۔

سراج کے سرغنہ ہونے کے اسباب بھی واضح ہو چکے تھے۔ وہ پولیس میں ڈی ایس پی تھا اور اپنے اختیارات اور وسائل سے سب کو بچاتا تھا اور ہر قسم کی مدد فراہم کرتا تھا۔ شاید اسی کی معرفت بدمعاشوں کی خدمات حاصل ہوتی تھیں۔ پولیس

علاقے کے اور شہر کے سب بدمعاشوں کے پیچھے ٹھکانے ... بار جانتی ہے اور اخبارات اور رائے عامہ کے مطابق ... کے فرائض بھی پورے کرتی ہے۔ اگر کوئی اور ... ہوتا تو یقیناً اسے اور مجھے گولی مار دیتا اور خود گروہ ... سنبھال لیتا مگر ڈی ایس پی سراج کو قتل کرنا آسان ... نہ تھا اور اس کا نعم البدل ملنا بھی مشکل تھا۔ سب کو ایسے ... ساتھیوں کے گروہوں کے سرغنہ نہیں ہوتے بقول شاعر ... بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔ چنانچہ وہ ... سب بے بس اور متذبذب کھڑے رہے تھے۔

"اب صرف ایک منٹ باقی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد ڈی ایس پی صاحب کی ٹانگ بھی گئی۔ ہاتھ تو شاید ٹھیک ہو جاتے ہیں لیکن ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں بہت فرق بھی رہ جاتا ہے تو اچھا بھلا پولیس افسر لنگڑوں کی طرح چلتا ہے۔ تم سب لوگ اپنے اپنے ریوالور اس کونے میں پھینک سکتے ہو۔ میں ... کھڑا ہوں۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر چوہدری دلاور نے ... "ان کا نمبر دو" کی حیثیت سے ہتھیار ڈال دیے۔ پھر کسی نے کوئی پس و پیش نہیں ... اتار دیے۔ یکے بعد دیگرے چھ ریوالور اور پستول کے فرش پر گرنے کی آواز ... اور پھسلتے ہوئے دیوار تک آ گئے۔ میں نے ایک ... ہوئے بھی اپنی نظر ان سب پر سے نہیں ہٹائی۔ وہ بہت ... تھے اور ان کے پاس دوسرے ریوالور کی موجودگی ممکن ... تھی۔ اگر میرے ساتھ کوئی اور ہوتا تو میں تلاشی کا فرض اسے ... خود سراج کو یرغمال بنائے ریوالور لیے کھڑا رہتا مگر ... میرے ذہن میں صرف ایک ہی ترکیب آئی تھی۔ اگر میں ان ... دوسرے کمرے میں چلے جائیں اور پھر باہر سے کنڈی ... ہونے کی کوشش کرتا تو یہ ہو سکتا تھا کہ وہ دوسرے ... دروازے سے نکل آتے یا کھڑکی میں سے ... باتھ روم محفوظ جگہ ہو سکتی تھی مگر مجھے معلوم ... اس کوٹھی میں باتھ روم کہاں ہیں۔ ان کے ... چھوٹے ہیں یا اتنے بڑے کہ آدمی گزر جائے۔ اور ... باہر سے بند ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ میں نے ... سب ریوالور کونے میں ڈھیر کرا لیے۔ اس وقت ... سراج کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ وہ درد سے تڑپ رہا تھا ... کے شکنجے میں کسا ہوا سانس لینے کی کوشش میں ... ہانپ رہا تھا۔ تاہم آدمی سخت جان تھا کہ ابھی تک ... بے ہوش نہیں ہوا تھا اور ہڈیاں ٹوٹ جانے کے باوجود ... سہہ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے رحم کی بھیک بھی نہیں

مانگی تھی۔ میری منت سماجت بھی نہیں کی تھی اور مشتعل ہو کے اپنے ساتھیوں کو گالیاں بھی نہیں دی تھیں کہ وہ بزدلوں کی طرح خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں اور کٹھ پتلیوں کی طرح میرے اشاروں پر چل رہے ہیں۔ وہ اپنی اور ان کی مجبوریوں کو سمجھتا تھا۔

"اب کیا چاہتے ہو تم ہمارے سکندر صاحب؟" چوہدری دلاور نے پرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ہم باہر چلے جائیں، دفع ہو جائیں یہاں سے؟ تم ڈی ایس پی صاحب کی جان تو چھوڑ دو۔"

"دفع ہو جاؤ اور ہر طرف سے عمارت کو گھیر لو۔" میں نے قہقہہ لگایا۔ "چوہدری! جب تک یہ شکار میرے قبضے میں ہے تم مجھے شکار نہیں کر سکتے۔ میں جانتا ہوں تم بہت بڑے شکاری ہو لیکن یہی بات اب تک تم کو میرے متعلق معلوم ہو چکی ہوگی۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم میں سے کسی کے پاس اندر کی کسی جیب میں کوئی دوسرا ریوالور نہیں ہے؟"

"آخر یہ ضمانت کیسے فراہم کی جائے؟" خسرو جمشید نمبر ایک نے کہا۔

"ہم اپنی اپنی تلاشی دینے کے لیے تیار ہیں۔" اس کے ہمزاد نے کہا۔

"لیکن میں تو تلاشی لے نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔

"تو ہم تمہارے سامنے ایک دوسرے کی تلاشی لیتے ہیں۔" خسرو جمشید نمبر دو نے تجویز پیش کی۔

"اس جامہ تلاشی پر اعتماد کر کے میں اپنے بے وقوف ہونے کا ثبوت دینا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے اب میں حکم دیتا ہوں کہ آپ حضرات اسٹیج کی طرح اپنے اپنے کپڑے اتار کے اس ڈھیر پر پھینک دیں۔ ذرا احتیاط سے۔"

"تمہارا... تمہارا مطلب ہے ہم سب کپڑے... اتار دیں؟" چوہدری دلاور نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں۔ یہاں ایک حمام میں سب ننگے ہیں۔ یہ محاورہ اگر عملاً درست ہو جائے تو کیا ہرج ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ... یہ ناممکن ہے... اپنے سکندر صاحب! تم حد سے بڑھتے جا رہے ہو۔" چوہدری دلاور کا رنگ سرخ پڑ گیا۔

"کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں ہے، اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا اپنے چوہدری صاحب!" میں نے کہا۔ "میں دو منٹ کی مہلت دوں گا۔ اس کے بعد تمہارے جیدے کی ٹانگ گھٹنے کے پاس سے دو نیم ہو جائے گی۔"

یہ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ پانسہ اتنی جلدی پلٹ جائے گا اور ان کی اتنی بڑی فتح اتنی ذلیل آمیز شکست

www.paksociety.com

میں تبدیل ہو جائے گی۔ بے عزتی، ندامت، اشتعال اور بے بسی کے ملے جلے جذبات نے ان سب کو ایک دوسرے کی نظر میں اور خود اپنی نظر میں رسوا کر دیا تھا سوائے ڈی سلوا کے۔ سب ایک جیسے جذباتی ردعمل کا شکار تھے۔ صرف ڈی سلوا تھا جو خاموش رہا تھا اور جس نے خلاف معمول اپنا جارحانہ انداز برقرار نہیں رکھا تھا۔ اس کی وجہ صرف میں جانتا تھا۔ وہ خوفزدہ بیٹھے ہوئے مہرے کی طرح محسوس کر رہا تھا اور اگرچہ وہ شدت سے اس خوف کا اظہار نہیں ہونے دے رہا تھا لیکن یہ ناممکن تھا کہ وہ خوفزدہ نہ ہو۔ اس نے میرے سامنے بہت کچھ قبول دیا تھا۔ چنانچہ اسے یہ ڈر تھا کہ کہیں میں اس کے الفاظ دہرا کے اسے مروا نہ دوں۔ اگر اس کے ساتھیوں کو اس کی غداری کا علم ہو جاتا تو وہ اس کو یقیناً مار ڈالتے۔ ڈی سلوا نے پہلے میرے رویے کا مشاہدہ کیا تھا اور پھر شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ میں اس کا راز ابھی افشا نہیں کروں گا بلکہ بعد میں اسے بلیک میل کرنے کے لیے استعمال کروں گا۔

ہتھیار ڈالنے میں چوہدری ولاور نے پہل کی تھی۔ کپڑے اتارنے میں ڈی سلوا تھے۔

"ڈیم اٹ مین!" اس نے غصے میں پتلون کے اندر سے قمیص نکالی اور اتار کے گولہ سا بنا کر میری طرف پھینک دی۔ اس کے بعد ولاور کے لیے بھی تقلید کے سوا چارہ نہ رہا۔ سب سے زیادہ مضحکہ خیز وہ دونوں نظر آ رہے تھے جنہوں نے اپنے چہروں پر سیاہی ملی تھی۔ ان کے جسم کا رنگ ہاتھوں سے بھی زیادہ صاف تھا۔ چنانچہ کالے سر اور منہ کے ساتھ جسم کا صاف رنگ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے سنگ مرمر کے مجسمے کا سر کالی مٹی سے بنوا دیا ہو۔ میرا شبہ غلط نہیں تھا۔ جب چوہدری ولاور اور خورشید مہرواں نے اپنے کپڑے پھینکے تو فرش پر دھات کی کسی چیز کے گرنے سے آواز پیدا ہوئی جو سگریٹ لائٹر جیسی چھوٹی چیز کی آواز نہیں ہو سکتی تھی۔

"کار کی چابیاں کس کے پاس ہیں؟" میں نے کہا۔

"باہر اب صرف ایک کار رہ گئی۔ اس میں چابیاں لگی ہوئی ہیں۔" چوہدری ولاور نے جل کے کہا۔ "جاؤ، دفع ہو جاؤ کتے کے بچے....." اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے اپنی بے بسی کا بدلہ لینے کے لیے ایک سے ایک گندی گالی دی۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کے غصے کے آتش فشاں کو پھٹتے دیکھا تھا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ ریوالور اب صرف میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے مہاراج کو ان کی طرف دھکیلنے سے پہلے اس کے کپڑوں کو ٹٹول کر دیکھا۔ اس کے پاس دوسرا ریوالور نہیں تھا۔

"اب تم لوگ اتنے بے بس ہو کہ میں تمہیں باندھ کر پولیس اسٹیشن بھی لے جا سکتا ہوں۔ میں چاہوں تو پولیس کو بھی یہاں بلا سکتا ہوں لیکن میں جانتا ہوں ڈی ایس پی صاحب کی موجودگی میں پولیس کیا کارروائی کرے گی اور کس کے خلاف کرے گی۔ یہ اتفاق نہیں کہ ... رابطہ ہے۔ تم لوگوں نے بہت صحیح جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ اگر کوئی بات غلط ہو جاتی اور کشت و خون ہوتا تو اس کا ... رابعہ قادری ایڈووکیٹ کو کرنی پڑتی۔ مجھے اپنے خلاف ... کی ڈیلیں توڑنے کا کہیں ہوا ہے کا بھی کوئی شوق نہیں ... میں آپ سب کو اسی حال پہ چھوڑ کر اکیلا ہی جا رہا ہوں ... سے پہلے ایک آخری بات۔ میں یہاں آپ لوگوں سے ... کرنے یا آپ لوگوں کا یہ ... میں نہیں آیا تھا۔ بہت سی باتوں میں اصل بات تو رہ گئی۔ وہ بوڑھی اور مفلوج عورت کہاں ہے جسے اٹھا لانے کا کارنامہ سرانجام دینے کو آپ نے سمجھا تھا کہ بازی جیت لی۔ دل تو چاہتا ہے کہ کاش میرے پاس اس وقت ایک کیمرہ ہوتا اور میں یہ گروپ فوٹو اتار لیتا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آوے۔ میں لوگوں کو بشمول آپ کے اہل خانہ کے یہ تصویر دکھا کے کہہ سکتا کہ دیکھو یہ ہیں وہ شرفا... باہر ... پاس ایک آئینہ ہوتا جس میں تم سب اپنے آپ کو دیکھ سکتے۔" میں نے ایک قہقہہ مارا۔ "بالکل کسی سرکس کا گروپ ہے۔ وہ جوکر اور یہ پانچ بازیگر ... ایک مدو ..."

"اس بڑھیا کو بھی واپس کر دیا گیا ہے بدمعاش!" چوہدری ولاور نے کہا۔ "تمہاری ماں کے ساتھ۔"

میں نے ایک فائر کیا اور چوہدری ولاور یوں تڑپ کر گرا جیسے اسے سچ مچ گولی لگ گئی ہے۔ تڑپنے کے بارے میں اس کے الفاظ نے مجھے مشتعل کر دیا تھا مگر مجھ میں اتنی عقل سلامت تھی کہ اس کامیابی کو ایک قتل کر کے ناکامی میں نہ بدلوں۔

"اب زبان سنبھال کے بات کرنا۔" میں نے دھاڑ کر کہا۔ "زندگی تھی اس لیے پہلی بار میرا نشانہ خطا ہو گیا۔"

"وہ اسی کار میں تھی جو رضوی صاحب کے گھر گئی ہے۔" ڈی سلوا نے کہا۔

"آل رائٹ۔ باقی سب لوگ چلیں دوسرے کمرے میں۔" میں نے کہا۔ "مسٹر ڈی سلوا! تم اپنے کپڑے پہن لو ... گے۔ میں پیچھے بیٹھوں گا۔ تمہیں رضوی صاحب کے گھر کا تو معلوم ہوگا۔ راستے میں کسی جگہ سے میں فون کر لوں گا ... تصدیق ہو گئی کہ شہلا کی ماں بخیر و عافیت واپس پہنچ گئی ہے

تو تم بھی بخیر و عافیت گھر لوٹ جاؤ گے لیکن یہ جھوٹ ہوا تو تمہاری لاش بھی کسی کو نہ ملے گی۔ کم آن۔ سنا تم نے؟ ... باقی ... نے"

وہ سب نہایت مضحکہ خیز طریقے پر آگے پیچھے چلتے ایک دوسرے سے نظر چراتے شرم سے اور شرمندگی سے اور غصے سے بے حال مگر بے بس اس کمرے میں جانے لگے ... بیٹھے میں ... انتہائی شیر دلی سے اور ... بات ... تھی۔ ایک پاؤں کی ٹھوکر سے میں نے ڈی سلوا ... اس کی طرف پھینکے اور اسے دروازے میں رکھتے ہوئے کمرے کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ چوہدری ولاور اور خورشید ... کی طرف منہ کر کے کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ باقی لوگ ... سنبھال رہے تھے۔ غالباً وہ دیکھ چکے تھے کہ کمرے کے دوسرے دو دروازوں میں سے ایک اٹیچ باتھ کا تھا اور دوسرا باہر سے بند تھا۔ میں نے وہ دروازہ بھی بند کر دیا جس سے وہ کمرے میں گئے تھے۔ میرے کنڈی لگاتے ہی اندر سے چوہدری ولاور نے مجھے ایک مدت سے ... گالیاں دیں۔

"مسٹر ڈی سلوا!" میں نے کہا۔ "جب تم کپڑے پہن چکو تو ... کی طرف منہ کر کے ... ایک قمیص میں یہ سب اسلحہ باندھ لینا ... کام نہ آ سکا۔ شاید میرے کام آ جائے اور یاد رکھنا کہ ... کی خفیف سی کوشش بھی کی تو ... میں سوراخ کر دوں گا۔"

ڈی سلوا نے کوئی جواب نہیں دیا اور میرے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے آٹھ ریوالور اور ایک پوٹلی میں باندھ لیے ... آ گئے۔ "گاڑی اسٹارٹ کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ پوٹلی پچھلی سیٹ پر رکھ دینا اور خیال رکھنا کہ ... کوئی بہتر نہیں۔ غلط فہمی بھی تمہاری جان لے سکتی ہے۔"

"میں تمہارے خلاف نہیں ہوں۔" ڈی سلوا نے باہر ... آہستہ سے فرنچ میں کہا۔

"تمہیں فرنچ آتی ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"میں گوا کا رہنے والا ہوں اور یورپ میں کئی سال ... ہوں۔" وہ بولا۔ "جو بات میں کہنا چاہتا تھا وہ یہ کہ بڑھیا اس کار میں نہیں تھی جو تمہارے انکل کے گھر گئی ہے۔"

"پھر؟" میں چلتے چلتے رک گیا۔ "کیا وہ یہیں ہے؟" ... کمرے کی طرف دیکھا جہاں باقی شکاری بند تھے۔ وہ سب کھڑکی سے منہ لگائے باہر جھانک رہے تھے ... بات سنے بغیر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور کار اسٹارٹ کی۔ اسی وقت مجھے ایک خیال آیا۔ اگر وہ بڑھیا گھر میں ہوتی تو ڈی سلوا ضرور اشارہ کر دیتا۔ جواب میں ہاں یا نہ ہی کہہ دیتا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے کسی دوسری جگہ پہنچا دیا گیا ہے۔ مثلاً اس کار کی ڈکی میں جو اب مجھے لے کر روانہ ہونے والی تھی۔

"چیا؟" میں نے کہا۔ "اگر وہ یہاں نہیں ہے تو کہاں ہے؟"

"میں نے بتو نہیں ... وہ یہاں نہیں ہے ——" ڈی سلوا نے کہا۔ "لیکن پلیز مسٹر سکندر! اپنے رویے سے دوستانہ طرز عمل کا اظہار مت کیجیے۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر میرا رویہ بدلتے دیکھ کر نہ کہہ سکا۔

"آل رائٹ۔ یو آر اے فول.....!" میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے چلا کر انگریزی میں کہا۔

ڈی سلوا نے کسی وجہ کے بغیر نفی میں سر ہلایا۔ "میں ابھی تم کو بتا دیتا ہوں کہ وہ کہاں ہے لیکن ادھر ادھر دیکھنے کی بجائے تم میرے ایک مکا مارنا جس سے ظاہر ہو کہ میں بدستور عدم تعاون کا مظاہرہ کر رہا ہوں اور جو لوگ کھڑکی میں سے دیکھ رہے ہیں ان کو یہ شک نہ ہو کہ... کہ میں غدار ہوں....."

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں!" میں نے چیخ کر کہا اور نہایت جارحانہ عزائم کے ساتھ آگے بڑھا۔

"وہ ڈکی میں بند ہے۔" ڈی سلوا نے آہستہ سے کہا اور میں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس کے ایک مکا رسید کیا۔ اگر اس نے مجھے پہلے سے تیار نہ کیا ہوتا تو میں یقیناً ڈکی کھول کر دیکھتا اور اس کے ساتھیوں کو اندازہ ہو جاتا کہ ڈی سلوا نے غداری کی ہے۔ ڈی سلوا لڑکھڑایا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر سنبھل گیا۔ اندر سے آنے والی آوازوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اسیران قفس رہائی کے لیے کوشاں ہیں اور دیواروں سے سر ٹکرانے کی بجائے دروازہ توڑنے کی فکر میں ہیں۔

"کیا وہ زندہ ہے؟" میں نے ریوالور کا رخ اس کی جانب کیا۔

"اسے قتل کرنا پروگرام میں شامل نہیں تھا۔" ڈی سلوا نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ "وہ خود ہی مر گئی ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔"

اس کا خیال میرے لیے سخت باعث تشویش ہو گیا۔ شہلا کی ماں اتنی دیر تک ڈکی میں بند رہ کے مر نہیں گئی ہوگی تو مرنے والی ہوگی۔ اس کی جان ناتواں کے لیے اس فولادی پنجرے میں محبوس اور بے دست و پا رہ کے سانس کی نازک ڈوری کو ٹوٹنے نہ دینا بظاہر محال معلوم ہوتا تھا لیکن یہ دیکھنے کے لیے میرا اس گھر سے کچھ دور پہنچ جانا ضروری تھا، جہاں تماشے کی غلط فہمی کے مطابق ایک حمام میں سب بند تھے۔ دروازے کا ٹوٹ جانا

www.paksociety.com

یقینی تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ رہائی پاتے ہی وہ خاموشی سے راہِ فرار اختیار کر لیں گے۔ میری طرح وہ بھی جانتے تھے کہ جب تک یہاں ان کی موجودگی کا کوئی سراغ نہ ملے اور میں ان کو یہ موقع فراہم کرنا چاہتا تھا ورنہ میرے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ جاتے جاتے میں ان سب کو شوٹ کر دوں یا پولیس کو طلب کر لوں لیکن دونوں صورتوں میں میرے لیے اور ما بعد کے لیے ایسی قانونی مشکلات پیدا ہو جاتیں کہ میرا یہ انتہائی قدم خودکشی کے مترادف ہوتا۔ مسئلہ اگر صرف ان کو قتل کرنے کا ہوتا تو میں بہت پہلے ان سب کو مار دیتا لیکن مجھے پہلے ان سے یہ پوچھنا تھا کہ انہوں نے میرے باپ کو کیوں مارا اور کیسے مارا۔ بالکل اسی طرح جیسے مجھے مار دینے سے ان کے مقاصد کی تکمیل نہیں ہوتی تھی، اسی طرح میں بھی ان کو زندہ چھوڑ دینے پر مجبور تھا۔ ہم وہ شکاری تھے جو ایک دوسرے کے لیے جال پھیلائے بیٹھے تھے مگر ہمارا مقصد ایک دوسرے کی جان لینا نہیں تھا۔

پھر چلتے چلتے مجھے شرارت سوجھی۔ "مسٹر ڈی سلوا!" میں نے کہا۔ "اباؤٹ ٹرن۔ بالکل گھوم جاؤ۔"

"کیا تم مجھے بھی ان کے ساتھ بند کرو گے؟" اس نے پلٹ کر کہا۔

"نہیں، مجھے ایک ڈرائیور کی ضرورت تو ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں اپنی حفاظت کی خاطر ایک تماشا کرنا چاہتا ہوں۔ تم چابیاں اندر پھینکو اور ان سب شرفا کے کپڑے اٹھا لاؤ۔"

میری نگرانی میں ڈی سلوا نے کمرے میں گھس کر سب کپڑوں کی گٹھری سی بنالی۔ دروازہ اب بری طرح ہل رہا تھا اور گرنے ہی والا تھا۔ کپڑوں کے بنڈل کو بھی میں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھا اور ڈی سلوا کو حکم دیا کہ وہ کار نکال لے چلے۔ ڈی سلوا نے تعمیل کی۔ اسی وقت ایک دھماکے سے دروازہ ٹوٹ کر گرا اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کسی نے ایک پتھر پھینکا جو کار کے پچھلے حصے پر آ کے لگا۔ ان کی بے بسی کا تصور کر کے مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ تاریکیٔ شب کی پناہ میں ہونے کے باوجود ان سب کے لیے ہمارے پیچھے دوڑنا یا دوسروں کو مدد کے لیے پکارنا بعید از قیاس تھا۔ ان کے لیے تو صبح ہونے سے پہلے پہلے اس گھر سے نکل کر اپنے اپنے گھر پہنچنا بھی مشکل ہوگا۔ خود کو بہت بڑا شکاری سمجھنے والے پریشان تھے اور یہ سمجھتے کہ شکار تو ہاتھ سے گیا، جاتے جاتے ان کو ایک دوسرے کی نظر میں شرمندہ اور رسوا بھی کر گیا۔ شکار کرنے کو آئے تھے شکار ہو کے چلے۔ اب وہ کیا کریں گے؟ شاید کسی نوکر یا غلام کو آواز دیں کہ کسی بھی گھر میں جا کر کوئی چادر کوئی تولیہ یا پردہ ہی مانگ لائے اور پھر اس لباسِ فاخرہ کو زیب تن کر کے کہیں جائے اور کسی بہانے ان سب کے لیے ایسے کپڑے لے آئے جو [illegible] یاد آ گئی!

اس قابلِ عزت ہجوم کو دیکھنے والوں کو وہ [illegible] نظر آئیں گے۔ بقول شاعر تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس کوئی علاج کہ دنیا کی نظر شاعرانہ نہیں۔ جب تک ان کی ستر پوشی کا سامان فراہم نہیں ہو جائے گا وہ اس گھر سے تو نکل جائیں گے مگر کسی گمنام گوشے کے اندھیرے میں چھپ کر انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گے۔ گاڑی اب اس گھر سے کافی دور آ چکی تھی اور شہر کے ساتھ ساتھ چلنے والی سڑک پر رواں تھی۔

"مسٹر ڈی سلوا!" میں نے اچانک کہا۔ "یہ گاڑی کس کی ہے؟"

"کسی کی بھی نہیں۔" ڈی سلوا نے اطمینان سے کہا۔ "میرا مطلب ہے ان سب میں سے کسی کی نہیں۔"

"آل رائٹ۔ گاڑی کو یہیں روک دو۔" میں نے کہا۔ "میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس بوڑھی عورت کا کیا حال ہے اور یہ خیال رکھنا کہ میرا اعتماد حاصل کر کے تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ اگر تم نے مقابلے کی کوشش کی تو میں تمہیں ہلاک کرنے کے بعد بڑھیا اور کار لے کر بھاگ جاؤں گا۔ تمہارے ساتھی بھی یہ وضاحت کرنے سے گریز کریں گے کہ تمہاری لاش یہاں کیوں پڑی تھی اور..."

"یقین کرو مسٹر سکندر! میں ابھی مرنا بالکل نہیں چاہتا۔" ڈی سلوا نے کہا۔

اس کی یقین دہانی کے باوجود میں نے ایک قمیص میں لپٹے ہوئے آٹومیٹک ریوالور کا بے ہنگم بنڈل اٹھا لیا۔ "اگر تم نے گاڑی لے کر بھاگنے کی کوشش کی تب بھی مجھے اس کے دونوں ٹائر برسٹ کرنے کے لیے گولی چلانی پڑے گی۔"

"اور اگر تم محض دھمکیاں دینے میں وقت ضائع کرتے رہے تو وہ بڑھیا مر جائے گی۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "میری اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ڈکی کھولنے کے لیے تمہیں چابیوں کی ضرورت پڑے گی۔ پھر میں کار لے کر کیسے فرار ہو سکتا ہوں۔" اس نے اگنیشن سوئچ آف کیا اور چابیاں میری طرف اچھال دیں۔ میں نے چابیاں اٹھا کے اور پیچھے جا کے ڈکی کھولی۔ ابھی میں اس پر جھکا ہی تھا کہ گاڑی ایک دم اسٹارٹ ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا گاڑی ایک زبردست جست لگا کے آگے بڑھی۔ ڈی سلوا نے کلچ ایک دم چھوڑ کے ایکسیلیٹر کو پورا دبا دیا تھا اور بظاہر اس کا مقصد یہی معلوم ہوتا تھا کہ میں جھٹکے سے گر جاؤں تو سڑک پہ پڑا رہ جاؤں لیکن میں اندر لڑھکنے میں کامیاب ہو گیا۔ ڈکی کا ادھ کھلا ڈھکن جھٹکے سے پیچھے آیا۔ اگر میری ٹانگیں باہر لٹکی ہوئی نہ ہوتیں تو ڈکی خود بخود بند اور مقفل ہو جاتی اور میرے لیے اندر سے اس کو کھولنا ناممکن ہوتا۔ مزید یہ کہ اسپیئر وہیل اور جیک وغیرہ کے ساتھ جس مختصر سی جگہ میں شہلا کی ماں قید تھی اسی میں میں بھی پیک ہو جاتا اور ڈی سلوا دونوں قیدیوں کے ساتھ...

بہت آسانی سے کپڑے پیش کر کے اپنے آقاؤں کے سامنے سرخرو ہوتا۔ اپنی ذہانت، جرأت اور فرض شناسی کا لوہا منوا لیتا۔ اس عظیم الشان فتح کا سہرا بلاشبہ اسی کے سر بندھتا۔ مگر تقدیر نے ٹانگ اڑا دی اور میری ٹانگیں درمیان میں آ گئیں۔ چنانچہ ڈکی کا ڈھکنا میرے پیروں پر گرا جس سے ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہ بھی شک گزرا کہ شاید گھٹنوں سے نیچے میری ٹانگیں کٹ کر سڑک پہ ہی گر چکی ہیں۔ پھر درد کی شدت نے مجھے تڑپا دیا اور میں سمجھا کہ پنڈلی سے اوپر میری ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں لیکن چند منٹ بعد میں ٹانگیں ہلا کے ڈھکن کو اوپر اٹھانے میں کامیاب ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بفضلِ خدا میں صحیح سالم ہوں اور منہ ڈکی میں دیے ٹانگیں آسمان کی طرف اٹھائے نہایت مضحکہ خیز انداز میں سفر کر رہا ہوں۔ کار اس وقت تک واپس ہو کے شہر کے ساتھ ساتھ بل کھاتی سڑک پر دوڑ رہی تھی اور شالیمار باغ کی طرف رواں تھی۔

گاڑی کی رفتار اسی میل سے کم نہیں تھی۔ غیر ارادی طور پر میں نے چیخ کر ڈی سلوا کو ایک غلیظ گالی دی۔ پھر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میری آواز اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی اور اگر پہنچ بھی جاتی تو وہ کب فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے گاڑی روک دیتا۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے ریوالور نکال کر ڈی سلوا کو شوٹ کرنے کا ارادہ کیا لیکن ڈکی میں سے آگے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے کسی بھی شخص کا نشانہ لینا عملاً ناممکن تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں گولی سے پیٹرول ٹینک میں سوراخ کر دوں لیکن اس طرح پیٹرول کو آگ لگتی تو ٹینک دھماکے سے پھٹ جاتا اور ہم خود جو پیٹرول ٹینک کے اوپر براجمان تھے اس کے ساتھ ہی اڑ جاتے۔ میرے پاس آٹھ ریوالور تھے اور سب بھرے ہوئے تھے لیکن ڈکی سے سر نکال کے ایک ٹائر بھی برسٹ نہیں کر سکتا تھا۔ اس رفتار پر ٹائر برسٹ ہوتے ہی گاڑی الٹ جاتی۔ وقت بہت کم تھا اور فاصلہ ہر لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ڈی سلوا مجھے واپس وہیں لے جا رہا تھا جہاں میرے دشمن کسی زخم خوردہ درندے کی طرح میرے خون کے پیاسے اور میری بوٹیاں نوچ کھانے کے لیے تیار تھے۔

بڑی کوشش سے میں نے خود کو اٹھایا اور پیچھے سرک کر اپنے پیروں کو گاڑی کے پچھلے والے بمپر پہ جما دیا۔ جس کا انگریزی حرف ایل کی شکل میں آدھا کار کے اندر تھا اور آدھا باہر۔ میری پوری کوشش تھی کہ میرے جسم کا بوجھ اندر کی جانب ہی رہے تاکہ میں الٹ کر سڑک پر نہ جا گروں۔ اپنا ایک ہاتھ میں نے اوپر اٹھا رکھا تھا۔ ہر جھٹکے سے پیچھے آنے والا ڈکی کا فولادی اور بھاری ڈھکن میرے ہاتھ سے ٹکراتا تھا اور رک جاتا تھا۔ ہاتھ کی یہ روک نہ ہوتی تو ڈھکنا میری کمر پہ گرتا اور ریڑھ کی ہڈی کا ایک آدھ مہرہ ضرور توڑ دیتا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے ڈکی کو اندر سے تھام رکھا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب میرے دونوں پنجے بمپر اور کار کی باڈی کے درمیان پھنس گئے ہیں اور چند سیکنڈ کے لیے ہی سہی مگر میں ہاتھوں کی گرفت کے بغیر بھی اپنا توازن کسی سرکس کے بازیگر کی طرح قائم رکھ سکتا ہوں تو میں نے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ کو تھوڑا سا نیچے کیا۔ ڈکی کا ڈھکنا نیچے آیا تو میں نے جھپٹ کر اپنی انگلیاں نمبر پلیٹ پر جما دیں۔ ٹین کی نمبر پلیٹ تھوڑی سی خم ہوئی اور میری انگلیاں اس کے پیچھے پھنس گئیں۔ میں نے دوسرا ہاتھ بھی چھوڑ دیا جس سے میں نے ڈکی کے اندر کا کنارہ پکڑ رکھا تھا۔

ڈکی کا ڈھکنا ایک دھماکے سے بند ہوا اور میرا جسم توازن کے سبب کچھ یوں پیچھے گیا کہ میرے بمپر میں پھنسے ہوئے پیروں اور نمبر پلیٹ کو تھامنے والے ہاتھوں کے درمیان میرا جسم سات کے عدد کی طرح ہو گیا۔ یہ اطمینان بہت حوصلہ افزا تھا کہ میں جھٹکے سے سڑک پہ نہیں گرا ورنہ میری موت انتہائی پُرعذاب ہوتی۔ میرے پیر بمپر میں پھنسے رہتے اور میرا سر سڑک کی سنگین سطح پر ساٹھ ستر میل کی رفتار سے رگڑ کھاتے ہوئے چند سیکنڈ میں پاش پاش ہو جاتا اور میرا جسم ان غلاموں کے جسم کی طرح ادھڑ جاتا جن کو معتوب ہونے پر رتھ کے پیچھے باندھ کر رتھ دوڑانے کا فرمان جاری ہوتا تھا۔

اس جان لیوا مرحلے سے گزر جانے کے بعد میں نے نمبر پلیٹ چھوڑ کر ہاتھ آگے پھیلائے اور ڈکی پہ سر کے بل جا گرا۔ آہستہ آہستہ میں نے اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے دونوں پیروں کو بمپر سے نکالا۔ ڈی سلوا نے پلٹ کر دیکھا اور صورتِ حال کا فوراً اندازہ کر لیا۔ مجھے ڈکی پر سے گرانے کے لیے اس نے کار کی رفتار بڑھا دی اور انتہائی خطرناک طریقے سے لہرا کے چلانے لگا۔ کار ایک سیکنڈ میں سڑک کے ایک کنارے پہ ہوتی تھی اور دوسرے سیکنڈ میں دوسرے کنارے پہ۔ ڈکی کی پینٹ کی ہوئی سطح آئینے جیسی چکنی تھی کہ میں وائپر کی طرح پھسلتا ہوا کبھی ایک کنارے پہ جا پہنچتا تھا تو کبھی دوسرے کنارے پہ اور مجھے خود کو نیچے گرنے سے بچانے کے لیے جسم کی تمام قوت کو مخالف سمت میں صرف کرنا پڑتا تھا لیکن اب میں ونڈ اسکرین کے پیچھے تھا اور مجھے صرف ایک سیکنڈ کی مہلت درکار تھی کہ میں ریوالور کا بٹ مار کے شیشے کو چور چور کر دوں۔ اس کے پاس بس یہی مہلت تھی چنانچہ ڈی سلوا مجھے دھکا دینے اور گاڑی لے کر فرار ہونے

www.paksociety.com

میں کامیاب تو ہو گیا تھا مگر اب اسے اپنی کامیابی خاک میں ملتی نظر آ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ناکامی اسے کتنی مہنگی پڑے گی اور اسے اپنا انجام صاف نظر آنے لگا تھا۔ وہ شکست سے بچنے کے لیے دیوانہ وار کوشش کر رہا تھا اور اسے اپنی جان کی پروا بھی نہ تھی۔

موقع ملتے ہی میں نے بائیں ہاتھ سے ریوالور کا بھرپور وار کیا اور پیچھے والا شیشہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ ڈی سلوا نے دہشت زدہ ہو کے پیچھے دیکھا۔ شاید اسے یقین آ چکا تھا کہ اب کسی بھی لمحے ریوالور کی گولی اس کے سر کو پاش پاش کر دے گی۔ اس ایک لمحے میں جب خوف نے اس کی عقل کو مفلوج کر دیا تھا اور اسے موت کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا وہ بھول گیا کہ اس کے ہاتھ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑنے والی کار کے اسٹیئرنگ وہیل کو سنبھالے ہوئے ہیں اور یہ خطرناک کام مکمل یکسوئی اور توجہ کا طالب ہے۔ وہ اسٹیئرنگ کو دائیں بائیں گھما رہا تھا۔ مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس کی نگاہ سامنے نہ رہی لیکن ہاتھ کسی ارادے کے بغیر حرکت میں رہے۔ کار پھر قوس کی شکل میں لہرائی لیکن سڑک کے دوسرے کنارے تک پہنچنے کے بعد مخالف سمت میں گھومنے کی گنجائش نہ رہی اور ڈی سلوا نے یہ سب کچھ اس وقت دیکھا جب کچھ کرنا اس کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ چند سیکنڈ کے سوویں یا ہزارویں حصے میں میری نگاہ نے بھی دیکھ لیا کہ ایک تناور درخت کار کی رفتار سے بے نیاز اپنی جڑوں سے زمین کو تھامے پوری مستقل مزاجی کے ساتھ کھڑا ہے۔ اگر ڈی سلوا کی نظر سڑک پر ہوتی اور اس کی عقل نے ساتھ دیا ہوتا تو وہ اپنی مہارت اور کوشش سے تصادم ٹال دیتا۔ میری نظر نے بھی درخت کا صرف سایہ دیکھا پھر ایک زبردست دھماکا ہوا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ساری کائنات آتش فشاں ہو، آوازوں کا ایک مکروہ شور اٹھا جس میں موت کی ہذیانی ہنسی کا دبدبہ سب سے الگ تھا۔ پھر ایک مہیب سناٹا پھیل گیا۔ مہیب، پُرآسیب اور بیکراں۔

آنکھیں کھولتے ہی میں نے ماحول کا تصور کیا لیکن مجھے اپنے اردگرد ایک فولادی شکستہ پنجرہ سا دکھائی دیا۔ میں کار کی اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد میں سر اٹھا کے اپنے جسم کے دیگر اعضا کا جائزہ لینے کے قابل ہو گیا۔ مار نے والا ہاتھ ڈی سلوا کا تھا۔ بچانے والا ہاتھ ڈی سلوا کے خدا اور میرے خدا کا تھا۔ میں جھٹکے سے اندر گیا تو کار کی اگلی سیٹوں نے شاک ابزاربر کا کام کیا۔ آگے پیچھے چلنے والی سیٹوں کی پشت سے ٹکرا کے میں وہیں رک گیا اور پیچھے آ رہی ایک لمبی سیٹ پر گرا جس کے کشن بہت نرم تھے چنانچہ میرا کوئی عضو درمیان میں رہ گیا۔ مجھے چوٹیں تو آئی تھیں لیکن میرے ہاتھ پاؤں سلامت تھے اور معمولی خراشوں کے سوا میرے جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ دھماکے کے بعد اِدھر اُدھر کے بہت سے لوگ دوڑے آئیں گے۔ گاڑیوں کو اور گشت کرنے والے پولیس والوں کو ضرور متوجہ کیا ہوگا۔ ڈی سلوا مر چکا تھا۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اگلا حصہ چور چور ہو کے پچک گیا تھا اور ڈی سلوا کی خون آلود، مسخ شدہ اور بھیانک لاش نہایت مضحکہ خیز طریقے سے ڈھانچے میں پھنسی رہ گئی تھی۔ اسٹیئرنگ وہیل کسی بیڑی کی طرح اس کے اوپر آیا ہوا تھا اور اس کا سر گردن کے ٹوٹ جانے سے بائیں طرف کی کھڑکی سے باہر لٹک گیا تھا تو ایک ٹانگ مخالف سمت کی کھڑکی سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کا سر درخت سے ٹکرا کے ہی ٹوٹا ہوگا۔ اب اس کا وہ مغز جو ہر طرح کے شیطانی خیالات کی آماجگاہ رہا تھا، جس سے تمام مجرمانہ منصوبے جنم لیتے تھے اور جس میں اس کے منکر انسانیت ماضی کا ہر نقش محفوظ تھا، اس کے ناپاک خون کے ساتھ فرش خاک پر ٹپک رہا تھا۔ ایسی موت ایک درس عبرت تھی مگر ان کے لیے جو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتے ہوں ورنہ یہ عبرت ناک تماشا تو ہر جگہ ہوتا ہے اور مرنے والے اس سے بھی کہیں زیادہ عذاب ناک موت مرتے ہیں۔

میں نے خود کو گھسیٹ کر پیچھے کی شکستہ کھڑکی سے باہر نکالا۔ حادثے نے میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا اور بچ جانے کے باوجود میرا وجود وحشت سے سُن ہو رہا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ ڈی سلوا کی لاش پر دوسری نظر ڈال سکوں لیکن اس سے بھی زیادہ روح فرسا خیال شملا کی ماں کا تھا۔ جانے کہاں گری تھیں مگر دوسری جانب اگنیشن سوئچ میں چابیاں لٹکی رہ گئی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے چابیاں نکالیں۔ ایسا کرتے ہوئے میرا ہاتھ ڈی سلوا کے خون سے تر ہو گیا۔ مجھے گرم انسانی خون کی مہک محسوس ہوئی۔ جو میرے خون سے مختلف نہ تھا۔ فرق ہوتا ہے تو انسانوں میں، خون کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ مجھے ایک چکر سا آیا اور میرا جی متلانے لگا۔ وہیں سڑک پر گر کے میں نے قے کی اور اپنا سر تھامے لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ ابھی تک اس ویرانے میں کوئی نہیں پہنچا تھا لیکن کوئی راہ گیر، گشتی پولیس یا پیدل والوں میں سے کسی کا آنا ناممکن نہیں تھا۔ متلی ہو جانے کے بعد میری طبیعت بحال ہو گئی تھی لیکن کمزوری باقی تھی۔ جسم کی تمام قوت کو جمع کر کے میں اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے ڈی کی طرف بڑھا جہاں سے جانا تھا۔ میں پہلے سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ پھر کوشش کے باوجود میں چابی نہ گھما سکا۔ ایک نامعلوم طاقت نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ہمت کر کے اس لاوارث عورت کے مدفن کو دیکھو۔ اس کے مفلوج جسم کا اس زنداں میں کیا انجام ہوا۔ تم جانتے ہو کہ تصادم ہوتے ہی اس کا استخوانی ڈھانچہ فولادی دیواروں سے ٹکرا کے ٹوٹ پھوٹ گیا ہوگا۔ جسم سے روح کا رشتہ تو پہلے ہی زندگی کے نام پر ایک تہمت تھا۔ اب دیکھنے کو کیا ہے۔ جنگ عشق ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل، درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل۔ پھر میں نے سوچا شکوں سے۔ پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو اور اگلی رت کی فکر کرو، جب پھر اک بار اجڑنا ہے جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے۔

میں نے چابیاں واپس اگنیشن سوئچ میں لگا دیں اور پیچھے سے وہ پوٹلی اٹھا لی جس میں اب بھی سات ریوالور بند ہو سکتے تھے۔ آٹھویں ریوالور کو بھی اسی میں ٹھونس کر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اندھیرے میں کئی جگہ میں ٹھوکر کھا کے گرتے گرتے بچا۔ جسم میں طاقت نہیں تھی اور ضمیر میرے راستے میں کانٹے بچھا رہا تھا لیکن عقل مجھے گھسیٹ رہی تھی۔ خود غرضی اور کمینگی پر مبنی اپنی ذات کے تحفظ کی آرزو مجھے اس جگہ سے دور دھکیل رہی تھی جہاں ایک بوڑھی عورت کا ٹوٹا پھوٹا بے جان جسم بہت سے سوالوں کے جواب مانگ رہا تھا کہ میں نے ماتا کی دھرتی سے صرف اسی کو پروان نہیں چڑھایا تھا جس نے میری کوکھ سے جنم لیا تھا۔ شملا کو بھی وہ سب دیا تھا جو اس کی ماں دیتی۔ پھر میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا؟ عالم ارواح میں اس نے اپنے بیٹے سے کہا ہوگا۔ عدنان! کیا یہ وہی ولایت ہے جہاں سے تو نے مجھے چٹھی لکھی تھی اور پیسے بھیجے تھے؟ تو اول نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟ اگر اس وقت جب تو ایک جواری کے ہاتھوں قتل ہوا تھا، مجھے سچ بتا دیا جاتا تو میں یقیناً مر جاتی مگر کیا وہ موت زیادہ باعزت اور قابل احترام نہ ہوتی۔ اس موت سے بہتر نہ ہوتی؟ پھر اب میرا جنازہ کون اٹھائے گا؟ مجھے مٹی کون دے گا؟ میری قبر پر پھول چڑھانے کون آئے گا؟ میں اپنے خیالات کے پاگل کر دینے والے ہجوم سے بچ کر جا رہا تھا۔ بے شک میرا ایک قوی دشمن خود اپنی ہی وجہ سے مارا گیا تھا اور جسے وہ مارنا چاہتا تھا بچ گئے تھے۔ وہ صرف اس لیے زندہ رہا تھا کہ ابھی اس کی زندگی کے دن پورے نہیں ہوئے تھے مگر صرف میری وجہ سے شملا کی ماں بھی مر گئی تھی۔ میری خاطر جان دینے والوں میں ایک اور بے گناہ نام کا اضافہ ہو گیا تھا اور ان سب کی جان کا قرض بڑھتا جا رہا تھا۔ اس قرض کو چکانے کے لیے مجھے نہ جانے کتنی فرصت زندگی درکار تھی۔

کسی تھہرے ہوئے صیاد دیدہ کی طرح میں سایوں کی پناہ لیے بھاگتا رہا۔ میں جلد از جلد رضوی صاحب کی کوٹھی پہنچ کے دیکھنا چاہتا تھا کہ نوزیہ اور انکل شیروانی کو بحفاظت پہنچا دیا گیا ہے یا وہ بھی محض میرا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ایک ڈراما تھا۔ کہیں مجھے مطمئن کرنے کے لیے ان کو وہاں سے رخصت کر دیا گیا ہو اور کسی دوسرے زنداں میں قید کر دیا گیا ہو۔ صبح ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔ اگر نوزیہ اپنے والد کے ہمراہ رضوی صاحب کے پاس پہنچی ہوگی تو اب تک ایس ایس پی رضوی اپنی عقل اور ذہانت سے کام لے کر بہت کچھ پوچھ چکے ہوں گے اور سمجھ چکے ہوں گے۔ اپنی آتش تہہ و غضب کو انھوں نے بھڑکنے سے پہلے ہی فریز کر دیا ہوگا اور اب وہ اپنے تمام قانونی اختیارات سے کام لے کر مجھے بچانے کے ساتھ ساتھ مجرموں کو گرفت میں لینے کی فکر بھی کر رہے ہوں گے۔ اس طرح کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ بے شک یہ انتہائی اشتعال انگیز کارروائی تھی مگر رضوی صاحب کا سب سے نمایاں وصف اور شاید ان کی ہر کامیابی کا ضامن تھا ہنگامی حالات میں عقل پر جذبات کو حاوی نہ ہونے دینے کی قابل رشک صلاحیت تھی۔ میں جانتا تھا کہ ان کے کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے خود بھی گھر پہنچ جاؤں۔ کچھ باتیں تحسین پہلے ہی بتا چکا ہوگا یا اس نے اپنے والدین کے ساتھ پیش آنے والے واقعات سن کر بتا دی ہوں گی۔ چنانچہ رامیعہ اور شملا سے بھی کچھ پوشیدہ نہ رہا ہوگا۔ انکل شیروانی نے بھی ان واقعات کا تذکرہ کر دیا ہوگا جو ان کے ساتھ پیش آئے۔ اب مجھے یہ بتانا تھا کہ بعد میں کیا ہوا۔ میں اس ادھیڑبن میں تھا کہ کتنے فیصد حقائق کو حذف کروں۔ مثلاً میں رضوی صاحب کو اپنے ایڈونچر کے متعلق صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں لڑ بھڑ کے نکل آیا۔ یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں نے کس طرح ڈی سلوا کا مقابلہ کیا۔ ڈی سلوا کے حادثے میں مرنے اور شملا کی ماں کے بارے میں کچھ بتانے کا نتیجہ یہ نکلتا کہ میں ایک اور ضابطے کی کارروائی میں ملوث ہو جاتا۔ صورت حالات ایسی تھی کہ میرے لیے بہت سی الجھنوں کا اضافہ ہو جاتا۔ ابھی تازہ ترین الزام یہ تھا کہ میں نے چودھری ولاور کو اغوا کیا اور ڈی سلوا کی کار چرائی۔ پھر ڈی سلوا کو لے گیا اور ولاور کو ختم کر کے لڑکی کو اغوا کرنے کا پلان بنایا۔ اس کے فوراً بعد اگر میں یہ کہتا کہ میں نے تو صرف یہ کوشش کی تھی کہ ڈی سلوا مجھے اور شملا کی ماں واپس نہ لے جا سکے۔ حادثہ خود ڈی سلوا کی بدحواسی کا شاخسانہ تھا

تو یہ بات سخت مشکوک سمجھی جاتی۔ دوست اور دشمن اپنے اور پرائے سب یہ سوچنے میں حق بجانب ہوتے کہ لڑکی کے اغوا کی واردات نے مجھے پاگل کر دیا ہوگا۔ میں شہلا کی ماں کو بچانا چاہتا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ مجرم اس لڑکی کو اٹھا لائے ہیں جس سے میری بڑی جذباتی وابستگی تھی اور اس کے باپ کو پکڑ لائے ہیں تو غصے میں اپنی جان پر کھیل کر میں وہاں سے نکل آیا اور ڈرائیور کو قتل کر کے یا بے ہوش کر کے اس کی گاڑی کو درخت سے ٹکرا دیا کہ یہ حادثہ نظر آئے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے اور گیئر میں ڈال کے دروازے میں سے چھلانگ لگا دی جائے اور چھلانگ لگانے سے پہلے ایکسیلریٹر کو دبانے کے لیے پتھر بھی رکھ دیا جائے تو گاڑی کسی بے ہوش آدمی کو لے کر خود ہی بھاگتی تیز ہوتی جائے گی اور کہیں نہ کہیں کسی کھمبے، درخت یا دیوار سے ٹکرا جائے گی۔ بے ہوش آدمی کی موت اس تصادم کے بعد حادثے کا نتیجہ ہی سمجھی جائے گی۔

میرے خاموش رہنے سے پولیس کے لیے بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ فرض کر لیتے کہ ڈی ایس پی صاحب شہلا کی ماں کو اغوا کر کے لے جا رہا تھا تو بریک فیل ہو جانے کے باعث یا کسی اور وجہ سے کار بے قابو ہو گئی اور درخت سے ٹکرا گئی۔ ٹوٹی پھوٹی کار کے ملبے کو دیکھ کر تو اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ماہرین بھی نہیں بتا سکتے کہ بریک لائن کہاں سے ٹوٹی تھی۔ چشم بد دور ہماری بے حد ذہین اور مستعد پولیس ایسے کیس فوراً فائل کر دیتی ہے کہ یہ "حادثہ" کچھ نہ بتا سکے۔ چشم دید گواہ کوئی نہ ہو اور مشکوک ملزم بھی کوئی نہ ہو جس سے تفتیش کی جا سکے چنانچہ جو حقائق انہوں نے رپورٹ میں لکھے وہی فائنل۔ کیس داخل دفتر۔ بصورت دیگر ان کو مجھ سے بہت کچھ پوچھنا پڑتا۔ چوہدری جلال الدین کی کوٹھی جانا پڑتا، بیانات لینے پڑتے۔ میرے بتائے ہوئے راستوں پر جانا ہوتا، چھاپے مارنے پڑتے اور انکل شیر ولی، فوزیہ اور رضوی صاحب کے علاوہ شہلا کے محسن کہاں سے اور بچانے کیسے، لوگوں سے معلوم کرنا پڑتا کہ یہ سب کیسے ہوا اور کیوں ہوا؟ ضابطے کی کارروائی ٹالی نہیں جا سکتی تھی۔ پولیس والے پھنس جاتے۔ ایک طرف وہ بڑے بدمعاش تھے جو انہیں اخراجات کا وظیفہ دیتے ہیں کہ ان کے معاملات دبا دیے جائیں یا ان کے حریفوں کو دبایا جائے۔ دوسری طرف ایک ایس ایس پی اور ایک ڈپٹی سیکرٹری، آگے کنواں پیچھے خندق۔ میں جلد از جلد گھر پہنچ کے کسی چیز کو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کرنے کا آرزو مند تھا میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ گھر پہنچوں تو ایک ماتم خانہ میرا منتظر ہو اور ان میں وہ سب لوگ بھی ہوں جن کے نزدیک اس نے

کا اور مالک کا نام و نشان معلوم کیا جا سکے۔ دوسری طرف میں یہ کہ ہنر میں بھی فرق کرنا نہیں جانتا تھا۔ یہ ریوالور بہت بڑی نعمت بننے کا فیصلہ تھے۔ پاکستان میں ایک ریوالور حاصل کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ اگر درے سے دیسی ساخت کا ریوالور اسمگل کر کے لایا جائے تو اس میں بھی پکڑے جانے یا نکل آنے کے امکانات ففٹی ففٹی رہتے ہیں۔ بلاشبہ درے کے دیسی ریوالور بنانے والے فن کے تجربہ کار ماہرین ہوتے ہیں اور انگلش ریوالور سے کسی طرح کوالٹی میں کم نہیں ہوتے مگر انہیں لاہور تک پہنچانا بھی اتنا ہی دشوار اور پرخطر ہوتا ہے جتنا تیرنا سیکھے بغیر دریا پار کرنے کی کوشش کرنا۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ اب وقت کے تقاضوں نے اس کاروبار میں بھی ایمانداری کو غیر ضروری بنا دیا ہے جو لوگ دھندے کا ریوالور اسمگل کرتے ہیں وہی پولیس کو مخبری بھی کر دیتے ہیں پھر ڈبل منافع ہوتا ہے۔ ریوالور اسمگل کرنے کی کوشش کرنے والا پکڑا جاتا ہے تو حسب توفیق سو پیاز اور سو جوتے کھا کے یا سو سو کے نوٹ اور ریوالور دے کر جان چھڑاتا ہے۔ ریوالور واپس اسی کے پاس پہنچ جاتا ہے جس نے فراہم کیا تھا اور پولیس آدھی قیمت مال پہنچانے کے بدلے وصول کر لیتی ہے۔ وہی ریوالور پھر فروخت ہوتا ہے اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے یہ ریوالور اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ کسی غیر معمولی صورت میں ہم اپنی جان بچانے کے لیے کسی کو مار کے نکل آنے پر مجبور ہو جاتے تو آلۂ قتل وہیں چھوڑ آتے۔ تفتیش ہوتی تو پولیس اس کے مالک کا سراغ لگاتی، ہمارا نہیں۔ ہمارے حریف وہ بدنام مجرم تھے جو عیاری، مکاری، جھوٹ اور فریب، دغابازی اور بدمعاشی کے تمام حربے بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ اپنی طاقت میں خود کو فرعون کی طرح (نعوذ باللہ) خدا سے کم نہیں جانتے تھے اور اپنی دولت کی بالادستی کے غرور میں ساری خدائی کو قابل خرید سمجھتے تھے۔ ہم اب تک ان پر یہ بات واضح کر چکے تھے کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے اور اگر وہ سیر ہیں تو ہم بھی سوا سیر ہیں۔ اگر ہم نے ان کا غرور نہیں توڑا تھا تو اتنا تو کیا تھا کہ انہیں اپنے برابر کا شکاری ہونے کا یقین ضرور دلا دیا تھا۔ پہلے وہ خود کو ببر شیر سمجھتے تھے تو ہمیں چوہے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ ان پر نفسیاتی دباؤ برقرار رکھا جائے اور یہ احساس بھی ختم نہ ہو کہ ہم ان سے ذرا بھی خوف زدہ نہیں اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی صلاحیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے یہ ضروری نہیں تھا کہ ہم ریوالور سے کسی کی جان لیں۔ سب سے پہلے تو یہ ہمارے اپنے دفاع کا مؤثر ذریعہ تھے۔ پھر یہ کہ حالات سے

فائدہ اٹھانے میں مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ جیسے دشمن نے محض حالات کی شہادت سے مجھے قاتل بنا دیا تھا۔ ایسے ہی موقع ملنے پر میں بھی یہ کر سکتا تھا کہ ڈالر والا یا ——— سراج کے اپنے ریوالور کو کسی جگہ بطور ثبوت چھوڑ دوں اور پھر ایسے حالات پیدا کر دوں کہ قانون صرف انہیں گرفت میں لے۔ سر دست مسئلہ یہ تھا کہ میں یہ اسلحے کا ذخیرہ کہاں چھپاؤں جہاں سے وقت ضرورت اس کا حصول بھی آسان ہو۔

رضوی صاحب کے گھر کے پاس پہنچ کے یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ مجھے اس جگہ کا خیال آیا جہاں میں نے ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر دفن کیا تھا۔ یہ جگہ اس کوارٹر کے عقب میں تھی جہاں پہلے ہمارے ساتھ کے دوسرے کمرے میں ایک کانسٹیبل مقیم تھا۔ ہم نے اسے تھانیدار بنوانے کے چکر میں ڈال کے اپنے جوتے تک صاف کرائے تھے اور بالآخر گھر سے بیدخل کرا دیا تھا۔ اس کی جگہ شہلا کی ماں نے لی تھی مگر اس کا قیام کتنا مختصر تھا۔ ایک بار پھر چشم تصور سے میں نے اس کا بکھرا ہوا وجود دیکھا جس میں وہ انسانی ڈھانچے آخر شب اس انتظار میں بیٹھے کہ صبح ہو تو اجالا دنیا کو ان کے انجام کی خبر دے ابھی نہ سہی چند گھنٹوں میں شہلا کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ جنم دینے والی ماں کے بعد ماں کا درجہ دینے والی ماں سے بھی محروم ہو چکی ہے عدنان اور بالشخص قسم کا آدمی تھا جس سے شہلا کی جذباتی وابستگی سطحی رہی مگر جس عورت نے اسے پرورش کیا تھا اسے زندہ رکھنے کے لیے بھرپور جدوجہد کی تھی، عزم و حوصلہ دیا تھا اور زمانے کی کڑی دھوپ سے بچائے رکھنے کے لیے محبت اور شفقت کا ٹھنڈا سایہ دیا تھا اس کی یہ اچانک موت ایک ایسا جذباتی سانحہ ہوگی جس کی شدت اسے رلاتی رہے گی اور جس کی کسک برسوں باقی رہے گی۔ بے شک وقت ہی سب سے بڑا چارہ گر ہے جو ہر دکھ ہر زخم کا مداوا بن جاتا ہے مگر وقت تو گزرتے گزرتے ہی گزرتا ہے یہ آدمی کے اختیار میں نہیں کہ وہ احساس کو وقت کی رفتار سے آگے لے جائے اور مہ و سال لمحوں میں منتقل ہو جائیں۔

رضوی صاحب کے گھر کا ہر کمرہ روشن تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ اہل خانہ جاگ رہے ہیں اور اس ناگہانی افتاد سے پیدا ہونے والی صورت حال سے نمٹنے کے لیے عملی اقدامات زیر غور ہیں۔ اس ہنگامی اجلاس میں شہلا بھی یقیناً شریک ہوگی۔ میں نے ساتھ والی کوٹھی میں داخل ہونے کا سوچا اور سامنے دیواریں چوروں کی طرح پھلانگنے لگا۔ لیکن ہنوز لذت خواب سحر میں کھوئے ہوئے تھے مجھے ان کی خوش نصیبی پر رشک آیا جن کے لیے غم جہاں کے لیے تفکر روزگار حیات کی جدوجہد کے لیے وقف تھے مگر راتیں صرف آرام کے لیے تھی۔ نیند ان کی ہے خواب ان کے ہیں

راتیں ان کی ہیں جن کے خیالات پر خوف کی یلغار نہیں جن کی ہر رات ایک فصیل ہے جو انہیں افکارات سے تحفظ فراہم کرتی ہے دن بھر کی تھکن کے بعد آسودگی کے لیے فرصت فراہم کرتی ہے کہ وہ صبح اٹھیں تو زندگی کے ایک نئے پرامید اور پرمسرت دن کے آغاز کے لیے ان کے پاس توانائی اور ذہنی یکسوئی کا نیا ذخیرہ ہو۔

دیوار کے آخری گوشے تک پہنچ کے میں رضوی صاحب کے گھر میں سرونٹ کوارٹر کے پیچھے کود گیا۔ کوارٹر کے پیچھے اندھیرا تھا مگر دو کھڑکیوں کی بند کھڑکیوں کے شیشوں سے اندر کی روشنی باہر بھی پہنچ رہی تھی۔ اس اجالے میں میرے لیے وہ جگہ تلاش کرنا آسان ہو گیا جہاں میں ریوالور دفن کرنا چاہتا تھا۔ وہ زمین ابھی زیادہ سخت نہیں ہوئی تھی مگر صرف ہاتھوں کی مدد سے ایک فٹ گہرا گڑھا بنانا بہرحال آسان نہیں تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے کھڑکی کے ایک شیشے میں سے اندر جھانکا۔ میں براہ راست روشنی کی زد میں نہیں تھا چنانچہ میرا سایہ شیشے پر نہیں آ سکتا تھا۔ یہ شہلا کے کمرے کی کھڑکی تھی۔ اس کا پلنگ خالی تھا اور اوپر سو واٹ کا بلب روشن تھا۔ نہ جانے کیوں میں نے دوسرے کمرے کے اندر بھی دیکھا چند سیکنڈ تک میں اس پلنگ کو گھورتا رہا جو اب کسی خالی قبر کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اوپر جلنے والا چالیس واٹ کا بلب اپنی زرد اداس روشنی سے کمرے کی ویرانی کے تاثر کو گہرا کر رہا تھا اور اس کے ماحول کو آسیب زدہ بنا رہا تھا۔

میں گھوم کر سامنے والے حصے کی طرف گیا اور کچن کے دروازے سے گھر میں داخل ہو گیا۔ یہ وہی گھر تھا جہاں میں رہتا تھا مگر اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی مقبرے میں قدم رکھ رہا ہوں یا اس گھر میں تنہا کھڑا ہوں جہاں سے ابھی ابھی کوئی میت اٹھائی گئی ہے۔ اس گھر کی دیواریں تک میرے لیے اجنبی ہو گئی تھیں اور مجھے یوں گھور رہی تھیں جیسے زبان خاموشی سے پوچھ رہی ہوں کہ آ گئے ستمگر! بڑے دعوے اور طمطراق سے گئے تھے۔ پھر اب تمہارے ہاتھ خالی اور تمہارا چہرہ احساس شکست کی تصویر اور تمہارا دل ویران کیوں ہے؟

میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر باورچی خانے میں سے ایک چھری لے کر نکل آیا۔ زمین کے سینے میں یہ خنجر پوری قوت سے اتار کے میں نے ایک بہت بڑا گھاؤ پیدا کر دیا لیکن یہ گھاؤ بھی مجھ پر خندہ زن رہا۔ یہ دشمن کا سینہ نہیں مٹی ہے جو زندگی کو نمو بھی دیتی ہے اور اسے فنا بھی کر دیتی ہے۔ وہ گڑھا اور اس کے قریب لگے ہوئے مٹی کے ڈھیر کو دیکھ کر مجھے اپنے باپ کی خالی قبر یاد آئی۔ زمین بیک وقت کتنی مہربان اور کتنی بے رحم ہے۔ آدمی کو جیتے

www.paksociety.com

کے لیے کیا کچھ نہیں دیتی ہے۔ ندی بہتے دریاؤں اور گنگناتے چشموں کا ٹھنڈا میٹھا پانی، سونا چاندی، تیل جو مشینوں کو متحرک رکھتا ہے اور یہ سب کچھ دے دیتی ہے۔ آدمی کا گوشت پوست اور ہڈیاں سب نگل جاتی ہے کتنے دفینے ان میں جن کے نشان مدفنوں کی خبر نہیں دیتی اور ان کے بے گناہ لہو کا سراغ نہیں دیتی۔ زلزلوں سے اور سیلابوں سے بستیاں فنا کر دیتی ہے۔ سمندروں کو جگہ دیتی ہے۔ بنجر ان سنگلاخ صحراؤں میں اپنی محبتوں کے لیے گنجائش نکال لیتی ہے مگر روتے زمین پر پھولوں کے رنگ اور خوشبو کا جادو بھی جگاتی ہے۔

ریوالوروں کو بحفاظت قابل استعمال رکھنے کے لیے مجھے پولی تھین یا سیلوفین جیسی چیز کی تلاش تھی جو بھرا ہوا پڑا کوڑے کے ڈھیر میں سے جو شہلا نے جھاڑو دے کر ایک کونے میں کر دیا تھا مجھے ڈبل روٹی کے خالی پیکٹ ملے۔ میں نے ان کو جھاڑا اور ایک ایک تھیلی میں دو دو ریوالور اچھی طرح لپیٹ کر گڑھے میں اوپر تلے رکھ دیے زمین برابر کرنے میں مجھے پانچ منٹ بھی نہیں لگے۔ مٹی کو پیروں سے دبا کر میں نے اس کے اوپر خشک پتے اور گھاس پھونس بکھیرا اور اس جگہ کو بالکل ایسا ہی کر دیا جیسا اس پاس کا علاقہ تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ قانونی کارروائی ہونے پر رضوی صاحب سرونٹ کوارٹر کے پیچھے بھی تفتیش کے لیے ضرور آئیں گے۔ وہ میرے نقش قدم بھی دیکھیں گے اور وہ جگہ بھی جہاں سے میں کودا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ میں نے پاؤں کے آٹھ نمبر والے جوتے پہن رکھے تھے جو نیچے سے بالکل چکنے تھے۔ اگر سول پر کوئی پرنٹ ہوتا تو میں پکڑا جاتا اور رضوی صاحب مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دیتے لیکن اب جو نشانات بنے تھے ان سے کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ شہر میں ہزاروں افراد اسی ساخت کے ایسے ہی جوتے پہنے پھرتے تھے۔ اس کے علاوہ مجھے انکل شیروانی اور فوزیہ کے بیانات کا تحفظ بھی حاصل تھا جس کے مطابق میں ہنوز ان کی قید میں تھا۔ رضوی صاحب کا ذہن میری طرف جا ہی نہیں سکتا تھا۔

حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے براہ راست اندر جانے سے گریز کیا اور لوٹ کر اس راستے پر بھی نہیں گیا جس سے اندر آیا تھا میں نے مخالف سمت کا رخ کیا اور دوسری طرف والی کوٹھی کو جدا کرنے والی دیوار عبور کر گیا۔ اب اگر نقوش قدم دیکھے جاتے تب بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جاتا کہ ملزم ایک طرف سے آئے اور دوسری طرف سے نکل گئے۔ دوسری طرف قد آدم گھنی جھاڑیوں کی باڑھ تھی جو مین گیٹ تک چلی گئی تھی لیکن خشک ہو رہی تھی۔ اس میں سے گزرتے ہوئے میرے ہاتھوں پر اور چہرے پر خراشیں آئیں اور میرے کپڑے پھٹے لیکن میں نے پروا نہیں کی۔ یہ ظاہری حالت میرے بیان کی صداقت کا منہ بولتا ثبوت ہوگی۔ وہ قمیص جس میں ریوالور بند تھے اب بھی میرے پاس تھی۔ اسے میں نے سڑک پر آتے ہی پھینک دیا۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ دیر میں دن نکلنے سے پہلے ہی سڑک پر لوگوں کی آمدورفت شروع ہوگی تو پہلا خوش نصیب اس بیش قیمت قمیص کو فوراً اٹھا لے گا اور سب کی نظروں سے بچا کر بغل میں دبا کے فوراً رفوچکر ہو جائے گا۔

میں نے بڑی ڈرامائی "انٹری" دی۔ میں آہستہ سے دروازہ دھکیل کر بھی اندر جا سکتا تھا مگر میں نے باہر ہی سے چلانا شروع کیا۔ "انکل شیروانی! انکل رضوی! محسن...!" اور پھر اس سے پہلے کہ وہ سب باہر نکلتے، میں دھڑام سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ میرا تصادم رابعہ سے ہوا جو شاید سب سے پہلے بھاگی تھی۔ وہ نیچے گری اور رضوی صاحب نے اسے سنبھال لیا۔ میں بہت زور زور سے سانس لے رہا تھا جیسے سارا فاصلہ میں نے دوڑ کر طے کیا ہو۔

"آپ... آپ... اور فوزیہ..." میں نے ہانپتے ہوئے کہا اور دیوار تھام لی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ کمرے میں سب لوگ موجود ہیں۔ رابعہ اور فوزیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ان کے چہرے غم و اندوہ اور خوف سے نڈھال تھے۔ انکل شیروانی کی حالت بھی ایسی تھی جیسے ان پر لرزہ کا دورہ پڑا ہے۔ صرف محسن اور انکل رضوی پرسکون تھے مگر تفکرات کے آثار ان کی صورت پر بھی عیاں تھے۔

"خدا کا شکر ہے تم آگئے۔" انکل شیروانی نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "کیا تم کو وہ بدمعاش خود ہی چھوڑ گئے تھے؟"

"تم ٹھیک تو ہو نا سکندر؟" فوزیہ اور رابعہ نے ایک ساتھ کہا۔ دونوں کے الفاظ ایک سے تھے۔ الفاظ کے جذبے ایک سے تھے۔ لہجہ ایک تھا اور لہجے میں تشویش کے ساتھ اطمینان کا احساس ایک تھا۔ ان دونوں کو بیک وقت اپنے اپنے دل کی بے تابی کا اور اپنے جذبات پر اپنے اختیار کے نہ ہونے کا احساس ہوا مگر اس میں رقابت کی خلش نہیں صرف خلوص اور اپنائیت کا انداز تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے ان دونوں کو خجالت سے بچانے کے لیے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا اور کرسی پر گر گیا۔ "شہلا کہاں ہے؟"

"وہ دوسرے کمرے میں سو رہی ہے۔" انکل رضوی نے متانت سے کہا۔ "تمہاری آنٹی نے اس کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی ڈاکٹر کو طلب کر لیا تھا۔ اور اب وہ سو رہی ہے۔" انہوں نے رابعہ اور فوزیہ کو اشارہ کیا۔ "تم لوگ جاؤ، کچھ چائے وغیرہ لاؤ۔"

"میری امی کا کیا بنا سکندر بھائی؟" شہلا نے اچانک تڑپ کے بے حد خوفزدہ ہو کے کہا۔ "آپ ان کو لینے گئے تھے۔"

ایک لمحے کے لیے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ غالباً میری آواز نے شہلا کے لاشعور کو بھی جھنجوڑ دیا تھا اور اسے کوئی خواب آور دوا دی گئی تھی تو اس کا اثر زائل ہو گیا تھا مگر وہ اب بھی غنودگی سے یوں لڑکھڑا رہی تھی کہ لگتا تھا سو رہی ہے۔ اس کی آنکھیں اپنے سامنے دیوار پر مرکوز تھیں جہاں کھڑکی کے شیشوں سے صبح کی سفیدی جھلکنے لگی تھی۔

"وہ بالکل ٹھیک ہیں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "خدا کا شکر ہے میں وقت پر پہنچ گیا۔"

"آپ انہیں لے کر کیوں نہیں آئے؟" شہلا نے پلک جھپکائے بغیر سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں ان کو یہاں لاتا۔" میں نے اسی بے ساختگی سے کہا۔ "میں انہیں ہسپتال لے گیا تھا جہاں ڈاکٹروں نے انہیں داخل کر لیا ہے۔ ایک دو دن میں گھر لوٹ آئیں گی۔ شام کو..."

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں سکندر بھائی!" شہلا نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"یہ شک تمہیں کیسے ہوا بے وقوف؟" میں نے اس کے لہجے سے سنبھل کے کہا۔

"اس لیے کہ آپ نے رضوان کے بارے میں بھی اسی اعتماد کے ساتھ ان سے جھوٹ بولا تھا۔" شہلا نے کہا۔

"وہ... ان کی بات اور تھی۔" میں نے اس کی منطق سے بوکھلا کے کہا۔ "تم تو ماشاء اللہ سمجھدار ہو۔"

"اسی لیے تو پوچھ رہی ہوں کہ مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"رابعہ!" رضوی صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔ "فضول بحث کا وقت نہیں ہے۔ اسے اندر لے جاؤ اور دوا دے دو۔"

"کون سی دوا؟" شہلا نے رابعہ سے بازو چھڑا لیا۔ "جھوٹ کو سچ بنانے کی دوا؟ حقائق سے بے خبر رکھنے کے لیے آنکھیں بند کر دینے والی گولی؟ نہیں انکل! میں بھی آپ سب میں شامل ہوں۔ مجھے بھی یہ حق حاصل ہے کہ جو آپ سب جانتے ہیں وہ مجھے بھی معلوم ہو۔ مجھے سلا سلا کر آپ کب تک حقیقت کو چھپا سکتے ہیں؟"

"دیکھو شہلا! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" محسن اور رابعہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ ان کے بیچ میں سے نکل کے وسط میں آ گئی۔ "آپ سب لوگ خوفزدہ ہیں... میں وعدہ کرتی ہوں کہ بڑی سے بڑی خبر سن کے بھی چیخ نہیں ماروں گی بے ہوش ہو کے نہیں گروں گی، پاگل ہو کے کپڑے نہیں پھاڑوں گی اور بری سے بری خبر کیا ہو سکتی ہے یہی نا کہ جو انہیں اٹھا کے لے گئے تھے ان بے غیرتوں نے انہیں مار دیا۔ وہ پہلے بھی زندہ ہی کہاں تھیں کہ کوئی ان کو مار کے خونی کہلائے۔ یا مجھے صدمہ ہو کہ وہ کیوں مر گئیں۔ انہیں تو بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا۔"

"آل رائٹ۔ آل رائٹ۔" انکل رضوی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے شفقت سے تھپکی دی۔ "بیٹھ جاؤ۔ ابھی خود ہمیں بھی کچھ معلوم نہیں۔ سکندر نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔" انہوں نے شہلا کو ایک کرسی پر شیروانی صاحب کے ساتھ بٹھا دیا۔

"سکندر بھائی! کہہ دیجیے کہ آپ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا اور وہ مر چکی ہیں۔" شہلا نے اسی سکون سے کہا۔

اس کی طرف دیکھے بغیر میں نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور پھر... ذرا سی دیر کے لیے اس کمرے میں موجود تمام افراد صرف پتھر کے بت بنے رہ گئے جن کی ساکت نظریں مجھ پر مرکوز تھیں۔

"میں نے کہا تھا کہ چائے لاؤ۔" رضوی صاحب نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شہلا کو اور سکندر کو بلیک کافی دو۔ اسٹرانگ۔ تم اندر جا کے ہاتھ منہ دھو لو۔" وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولے۔ "اور کپڑے بدل لو۔ تم پانچ دس منٹ کی تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ ضروری ہے کہ تم سب بات کرنے اور سمجھنے کے قابل ہوں۔"

ٹھیک دس منٹ بعد میں بدلے ہوئے حلیے میں واپس پہنچا تو کمرے میں انکل شیروانی اور رضوی کے علاوہ شہلا بھی بالکل اپنی اپنی جگہ اسی طرح خاموش بیٹھے تھے۔ شہلا کا چہرہ بدستور سپاٹ تھا۔ شیروانی صاحب اضطراب میں پہلو بدل رہے تھے اور صرف رضوی صاحب تھے جو پرسکون نظر آتے تھے۔ وہ سگریٹ کے کش لے کر کچھ سوچنے میں محو تھے۔

"شیروانی صاحب سے مجھے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔" رضوی صاحب نے اچانک سگریٹ کو کھڑکی سے باہر اچھال کے کہا۔ "انہوں نے کسی کی صورت نہیں دیکھی سوائے اس کے جو پولیس کی وردی میں ملبوس ہو کے آیا تھا۔"

"میں نے تو اس کی صورت پر بھی غور نہیں کیا۔" شیروانی صاحب نے خفت سے کہا۔ "وردی میں سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ وہ دبلا پتلا اور درمیانے قد کا آدمی تھا۔"

"آپ نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "ملازم... ڈرائیور اور دوسرے لوگوں کو؟"

شیروانی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ... وہ طبیعت

ڈرائیور۔۔۔ وہ مجھے سیدھا اس کمرے میں لے گیا تھا۔ وہاں دو آدمی اور بھی تھے مگر انھوں نے منہ پر نقاب ڈال رکھے تھے۔ ڈرائیور نے ریوالور نکال لیا، ایک نے فوزیہ کو باندھ دیا، دوسرے نے مجھے۔"

"واپسی میں تو آپ نے غور کیا ہوگا۔۔۔" میں نے کہا۔

"کیا تم نے دیکھا نہیں تھا؟ انھوں نے ہماری آنکھوں پر ٹیپ چپکا دیے تھے۔" شیروانی صاحب نے کہا۔

"اوہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ آپ لوگ جب میرے سامنے سے گزرے تو۔۔۔ تو میں نے صرف پشت دیکھی تھی۔" میں نے کہا۔

"ایک نے کہا تھا کہ خاموشی سے نکل چلو۔ حلق سے آواز بھی نکالی تو۔۔۔ وہ مارا جائے گا۔" شیروانی صاحب نے کہا۔ "اس نے گالی دے کر تمہارا نام لیا تھا۔ دوسرے نے کہا خطرہ مول مت لو، ان کو ٹھنڈا کر کے چلو۔ غالباً اس کی مراد بے ہوش کرنے سے تھی لیکن میں نے کہا کہ میں وعدہ کرتا ہوں، خاموش رہوں گا اور فوزیہ بھی خاموش رہے گی لیکن تم بھی خدا کو حاضر ناظر جان کے وعدہ کرو کہ بعد میں ہم دونوں کو کچھ نہیں ہوگا۔"

"آپ بہت سادہ لوح ہیں انکل!" میں نے کہا۔ "وہ آپ کی بات پر ضرور ہنسے ہوں گے۔"

"ہاں۔ خبیث ہنسے تھے مگر اتنا ضرور ہوا کہ وہ ہمیں ایسے ہی نکال لائے، بغیر ایک آدھ کیے۔" شیروانی صاحب نے کہا۔

"آپ نے ان سے پوچھا نہیں کہ اب کہاں لے جا رہے ہو اور یہ اچانک ارادہ کیسے بدل گیا؟" میں نے کہا۔

"پوچھا تھا۔ ایک بدمعاش کہنے لگا، حجت مت کرو بڈھے۔" شیروانی صاحب نے کہا۔ "ہم کو باس کا حکم ہے کہ تمہیں ایس پی کے گھر چھوڑ آئیں۔ ہمارا ارادہ بدل گیا تو اوپر پہنچا دیں گے۔ اللہ میاں کے گھر۔"

"انکل۔ آپ تو پہلے بھی لاہور آچکے تھے۔" میں نے کہا۔ "جب ڈرائیور نے راستہ بدلا تو آپ نے نوٹ نہیں کیا؟"

"ہاں۔۔۔ پہلے تو وہ سیدھے راستے پر چلتا گیا۔ ریلوے اسٹیشن سے گڑھی شاہو کی طرف۔" شیروانی صاحب نے کہا۔ "پھر میں اور فوزیہ باتیں کرنے لگے۔ محسن کی طرف سے بھی تشویش تو تھی اور ہماری سے زیادہ مجھے اس بات کی فکر تھی کہ کہیں وہ کسی مشکل میں گرفتار نہ ہو۔ یہاں تمہارے حالات ہی ایسے ہیں۔ بس اسی میں چند منٹ گزر گئے۔ پھر جب میں نے دیکھا تو کار ایک خاصی ویران سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ شالیمار باغ والی سڑک تھی غالباً۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ کدھر جا رہے ہو تو اس نے ریوالور نکال لیا اور بولا خبردار حرکت مت کرو۔ گاڑی کے شیشے اندر سے نہیں کھولے جا سکتے تھے۔ یہ احساس بھی بہت بعد میں ہوا ہم کو کہ یہ ایئر کنڈیشنڈ گاڑی ہے اس لیے شیشے بند ہیں ویسے بھی کار کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ ہم چھلانگ لگاتے تو یہ خودکشی کے مترادف ہوتا۔"

"وہ۔۔۔ انکل اور فوزیہ کو اسی کوٹھی میں لے گئے تھے جو نواب خسرو جمشید نے رابعہ کو فروخت کی تھی۔" میں نے رضوی صاحب کو مطلع کیا۔ "اور وہاں ان کی پوری کمپنی موجود تھی۔ رابعہ اور فوزیہ جانتے تھے کہ انجان ہیں اور خاموشی سے بیٹھی تھیں۔"

"پوری کمپنی سے کچھ پتا نہیں چلتا۔ تم سب کو پہچانتے ہو؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"جی۔ ایک تو وہی تھا ان کا سرغنہ۔" میں نے کہا۔ "بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سرغنہ وہ بھی نہیں اور اس کا انکشاف بھی آج ہی ہوا ہے۔ اب تک میں سمجھتا تھا کہ سارے گروہ کی کمان چوہدری فلاں کے ہاتھ میں ہے۔ پھر چندری والا تھا جس نے میرے یقین کے مطابق میر شرافت علی کو قتل کیا تھا۔ وہ شخص تھا جو خود کو نواب خسرو جمشید کہتا ہے اور اس کا نقش ثانی شوفر۔ یہ پتا چلانا بہت مشکل ہے کہ ان میں فرق کہاں ہے ——— وہاں وزیر علی تھا جو بالکل خاموش تھا۔ دو افراد اور بھی تھے جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا۔ چندری والے اور ان دونوں افراد نے منہ پر سیاہی مل رکھی تھی اور ایک جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ میر شرافت علی کا قاتل تو مونچھوں کی وجہ سے پہچانا گیا۔ باقی دو میں سے ایک شاید وہ ڈرائیور ہوگا جو انکل شیروانی کو اسٹیشن سے لے کر آیا تھا۔ ان کی حیثیت حکم کے غلام کی سی تھی۔"

"گویا سات آدمی تھے۔" رضوی صاحب نے غور کر کے کہا۔ "اور سرغنہ تمہارے خیال میں کون تھا؟"

"سرغنہ۔۔۔" میں نے قدرے تامل کے ساتھ کہا۔ "آپ کو سن کر حیرانی بھی ہوگی اور افسوس بھی ہوگا۔ سرغنہ کوئی بدمعاش نہیں ایک پولیس افسر ہے۔"

رابعہ نے سب کو چائے کی پیالی تھمائی۔

"ڈی ایس پی؟" رضوی صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "کیا نام ہے اس کا اور تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ پولیس افسر ہے؟"

فوزیہ نے مجھے ایک مگ میں بلیک کافی بنا کے دی اور دوسرا مگ شمائلہ کو پلانے لگی۔

"اس کا نام سراج ہے۔" میں نے کہا۔ "سراج دین یا سراج الدین یہ میں نہیں جانتا۔ وہاں جو لوگ موجود تھے وہ اسے سراج ہی کہہ رہے تھے اور اس کے سامنے بہت باادب باملاحظہ ہوشیار نظر آتے تھے۔ تمام باتیں خود سراج نے کی تھیں اور وہی سب کو حکم دے رہا تھا۔ اس کے اطوار میں بھی ایک شاہانہ وقار سا تھا

اور تمکنت کا انداز تھا جو محض اداکاری ہو سکتا۔ انھوں نے مجھ پر یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ پولیس افسر ہے۔"

"سراج؟" رضوی صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کیا وہ وردی میں تھا؟"

"نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ سراج واقعی پولیس افسر ہوگا۔" میں نے کہا۔ "مجھے ایک بات یاد ہے۔ جس رات مجھے چند گھنٹے حوالات میں گزارنے پڑے تھے تو چندری والا وہاں آیا تھا اور ایس ایچ او میر محمد سے مل کر نکل گیا تھا لیکن میں نے اسے پہچان لیا تھا کیونکہ لندن سے واپسی پر وہی مجھے ٹیکسی میں چراغ دین کی کوٹھی تک لایا تھا۔ وہی قتل کی شب میر شرافت علی کی کوٹھی کے باہر مجھے دوبارہ ملا تھا مگر یہ بعد کی بات ہے۔ جب میں قتل کے الزام میں حوالات میں بند تھا تو مجھے اس کی ایک جھلک دکھائی دی تھی اور میں نے بہت چیخ پکار مچائی تھی کہ اسے پکڑو لیکن میر محمد نے پہلے تو صاف انکار کر دیا کہ یہاں سے کوئی چندری والا مل کر گیا ہے۔ معلوم نہیں وہ کیا پیغام لایا تھا اور کیا دیکھنے آیا تھا۔ میرے اصرار پر میر محمد نے مجھ پر تشدد کیا اور صاف کہا کہ اعتراف جرم تو مجھے کرنا ہی پڑے گا کیونکہ ڈی ایس پی صاحب یہ چاہتے ہیں۔ پہلے اس نے اسے ایس پی کہا تھا اور ہو سکتا ہے عمداً ڈی ایس پی کو ایس پی کہا ہو یا اس وقت سراج ڈی ایس پی ہی ہو اور اس کی ترقی بعد میں ہوئی ہو۔"

"یہ میں معلوم کر لوں گا۔" رضوی صاحب نے سر ہلا کے کہا اور خالی کپ میز پر رکھ دیا۔

"مقصد مجھے صرف یہ جتانا تھا کہ اس معاملے میں ایک اعلیٰ پولیس افسر کے احکامات کیا ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور میرے لیے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ بعد میں ایک اور انکشاف ہوا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جس دن رابعہ کی والدہ کا انتقال ہوا تھا اس رات ہمارے قبضے میں دشمن کا ایک آدمی تھا اور ہمارا خیال تھا کہ اس سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

"مجھے یاد ہے۔ تم نے اور محسن نے جو کارنامہ انجام دیا تھا۔" رضوی صاحب نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔ "اسی حماقت کے باعث رابعہ کا گھر بھی تباہ ہوا تھا اور جھڑپ میں غریب بیوہ کے علاوہ چوہدریوں کی کاریں بھی تباہ ہوئی تھیں۔ اخبارات نے ایک اسکینڈل کھڑا کر دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا نام نہیں آیا ورنہ تو تم نے مجھے بھی گھیر لیا تھا، بلاوجہ۔ میں نے بڑی مشکل سے نوکری بچائی تھی۔ بلکہ کیا ملا تھا تمہیں اس سے؟ وہ شکنجے میں آنے لگے تھے۔"

"میں اپنی حماقت کا اعتراف کرتا ہوں انکل!" میں نے نظر جھکا کر۔۔۔ "اور ان تمام نقصانات کی ذمہ داری بھی قبول کرتا ہوں جو میرے اور محسن کے غلط اقدام کا نتیجہ تھے لیکن ہمیں اس شخص سے ایک کام کی بات معلوم ہو گئی تھی۔"

"وہ تو۔۔۔ شاید کچھ بتائے بغیر ہی مر گیا تھا۔"

"نہیں انکل! ہم نے کچھ غلط بیانی بھی کی تھی آپ سے۔" میں نے خجالت سے کہا۔ "مرنے سے پہلے اس نے ایک نام لیا تھا۔ سراج۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر مجھے شبہ تھا کہ اس نے راج کہا ہے یا سراج کہا ہے۔ مگر تو یہ نہیں ہو سکتا تھا اور خراج بھی مشکل تھا۔ راج گڑھ یہاں کے ایک علاقے کا نام ہے۔ ہم نے اس سے پوچھا تھا کہ اسے مارنے والا کون ہے؟"

"اس نے ایک لفظ اور بھی بولا تھا، کرامت۔" محسن نے مجھے یاد دلانے کے لیے لب کھولے۔

"ہاں۔ اور بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ راج گڑھ میں ایک کرامت اسٹریٹ ہے۔" میں نے کہا۔ "جو ہسپتال پارک سے شروع ہوتی ہے۔ وہاں سے دوسری گلی سیدھی چوبرجی چوک پر جا نکلتی ہے۔"

"تو گویا تمہارے خیال میں یہ ڈی ایس پی سراج وہیں رہتا ہے؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "راج گڑھ کی کرامت اسٹریٹ میں ہو اس سے کچھ مدد مل سکتی ہے؟"

"جی۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ مرنے والا کیا بتانا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ کہ ڈی ایس پی سراج وہاں رہتا ہے یا وہاں ان کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اس گلی میں قریباً پچاس سے زائد مکان ہوں گے اور وہاں عام قسم کے شریف لوگ رہتے ہیں۔ یہ پرانی آبادی ہے جس میں غریب اور نچلے طبقے کے لوگ رہتے ہیں۔ ان جیسے بدمعاشوں کو جن کے پاس لاکھوں ہوں اور ناجائز ذرائع سے آمدنی کے وسیع ذرائع ہوں وہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ماڈل ٹاؤن، گلبرگ اور سمن آباد میں ان کے ہیڈ کوارٹر ہو سکتے ہیں۔"

رضوی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ لوگ گمنام علاقوں کو بھی اسی لیے منتخب کر لیتے ہیں کہ سیدھے سادے لوگ کچھ نہیں سمجھتے اور وہاں ان کی موجودگی کی طرف کسی کا خیال بھی نہیں جاتا۔ خیر یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں۔ کرامت اسٹریٹ کے دونوں کناروں پر سادہ کپڑوں میں پولیس کو پوسٹ کیا جا سکتا ہے اور ——— سراج کا سراغ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ اس کا اصل نام ہو۔ تم اس کو دوبارہ دیکھو تو پہچان لو گے؟"

"بالکل پہچان لوں گا۔" میں نے یقین کامل کے ساتھ کہا۔ "وہ تقریباً چھ فٹ قد کا آدمی ہے۔ وزن شاید ڈیڑھ سو پونڈ کے لگ بھگ ہوگا۔ چوڑا چکلا جسم متناسب اور مضبوط لگتا ہے۔ پیچھے کی طرف بال بناتا ہے۔ بالوں کا رنگ بالکل سیاہ نہیں بلکہ

www.paksociety.com

میں ہلکا سا بھورا رنگ جھلکتا ہے۔ آنکھیں بھی ہلکی سی سبز جھلک دیتی ہیں اور آپ اسے شاعری نہ سمجھیں تو کہوں کہ بالکل کسی گہری جھیل کی طرح ساکت نظر آتی ہیں۔ ہر وقت سوچ میں ڈوبی ہوئی۔ رک رک کر ایک ایک لفظ صاف ادا کرتا ہے۔ لہجہ مدھم رکھتا ہے اور عادتاً سر کے بالوں کو ہاتھ پھیر کر جمانے کی غیر ارادی حرکت میں مصروف رہتا ہے۔ چہرہ کچھ لمبوترا اور ناک قدرے ستواں۔۔۔"

"اتنا کافی ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "بعد میں نوٹ کرا دینا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں سے جانے کے بعد کیا ہوا؟"

"وہی جو ان کے پیغام میں تھا۔" میں نے کہا۔ "آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ انہوں نے کسی کہانی کا ایک صفحہ پیغام کا مفہوم واضح کرنے کے لیے کس طرح استعمال کیا تھا لیکن میں سو فیصد ان کے پلان کے مطابق نہیں چلا۔ مجھے باہر کوئی سلیٹی رنگ کی کار نہیں ملی۔ میں ابھی مشکل سے پچاس قدم گیا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک سفید کار نے میرے قریب آکے بریک لگائے اور اس کی کھڑکی سے گن نکل آئی۔ وہ مجھے کار میں ڈال کے لے گئے اور راستے میں ریوالور کا بٹ مار کے بے ہوش کر دیا۔ کار کے اندر شیشوں پر بھی سیاہ پینٹ تھا یا سیاہ کاغذ چپکا دیا گیا تھا مگر میں نے اس کوٹھی کو اندر سے دیکھا تو پہچان لیا۔"

"اور وہاں ان سے کیا بات ہوئی؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "تمہیں لے جانے کا مقصد کچھ تو ہوگا؟"

"انہوں نے پرانے مطالبے دہرائے۔ یعنی میں کاروبار سے اور حق وراثت سے دستبردار ہو جاؤں۔" میں نے کہا۔ "اپنی سابقہ پیش کش کا اعادہ کیا لیکن تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ۔ اب وہ مجھے ایک مالک کی حیثیت دینے پر تیار ہیں۔ میرے نقصانات کی تلافی پر بھی آمادہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ سب اس شرط پر کہ میں اب خاندان سے سروکار نہ رکھوں۔ کاروبار کی نوعیت سے بھی دخل نہ دوں اور ایک طرح سے 'سلیپنگ پارٹنر' رہوں۔ میں نے کہہ دیا کہ مجھے اپنا سب کچھ دینا منظور ہے۔ بدلے میں مجھے صرف میرا باپ دلا دیا جائے۔ اس کے بعد مذاکرات کی گنجائش ہی نہ تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔"

"اور انہوں نے پہلے شیروانی صاحب اور فوزیہ کو چھوڑ دیا پھر تمہیں گھر لوٹ جانے کی اجازت دے دی؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"جی نہیں۔ ایسے تو نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں تو فیصلہ کن حد تک گیا تھا اور قدرت کو مجھے بچانا منظور تھا۔ اچانک سراج میرے قابو میں آ گیا۔ وہ گولی مارتے تو اس کو لگتی۔ اس کے باوجود وہ اپنی شکست تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ مجبوراً مجھے ان پر انہی کے حربے آزمانے پڑے۔"

"کیا؟ تم نے سراج کو... مار دیا؟" شیروانی صاحب نے پریشان ہو کے کہا۔

"نہیں انکل! میں نے ان کو نوٹس دیا کہ آپ کو بخیر و عافیت گھر پہنچا دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "سراج کی ایک کلائی پہلے ہی ٹوٹ گئی تھی مزاحمت کرتے ہوئے۔ میں نے ان کو تھوڑی سی مہلت دی اور وہ انکل کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ دوسری کلائی ٹوٹنے کے بعد۔ اس کے بعد خود میرے نکلنے کا مسئلہ تھا۔ میں نے سراج کو ڈھال بنائے رکھا۔ اس کے ہاتھ تو بے کار ہو ہی چکے تھے۔ میں اس کی آڑ میں دروازے کی طرف بڑھا تو ان کا حوصلہ جواب دینے لگا۔ وہ مجھ پر حملہ کرنا چاہتے تھے مگر میں نے کہا کہ ہاتھوں کی ہڈیاں تو جڑ جائیں گی لیکن کوئی آگے بڑھا تو سراج صاحب کی ٹانگیں اور ضرورت ہوئی تو گردن بھی توڑ دوں گا ـــــ وہ بے بس ہو گئے اور میں سراج کو سامنے رکھ کے الٹا چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ پچاس قدم بعد میں نے اسے دھکا دیا اور بھاگ لیا۔"

"شہلا کی ماں کے بارے میں؟" رضوی صاحب نے کچھ دیر بعد کہا اور شہلا کی طرف دیکھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"ان کی گفتگو سے۔" میں نے اپنے جھوٹ کو پوری طرح نبھاتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ شخص تمہیں خوفزدہ کر رہے ہوں۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"ہاں ہو سکتا ہے لیکن مجھے امید کم ہے۔" میں نے متذبذب لہجے میں کہا۔

"تم نے اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا تھا؟ میرا مطلب ہے شہلا کی ماں کو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "دیکھا تو نہیں۔۔۔ میں دیکھ بھی کیسے سکتا تھا؟"

یہ بات سچ تھی مگر سچ کے دو مفہوم ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو میرے ذہن میں تھا۔ دوسرا وہ جو وہ سب لوگ سمجھتے۔ یعنی امید کی جا سکتی ہے کہ شاید وہ ایک بوڑھی اور اپاہج عورت کو بخش دیں۔ رضوی صاحب نے جملے کے آخری الفاظ بدل لیے "قتل نہ کریں" کی بجائے انہوں نے "بخش دیں" کہہ دیا۔

"نہیں انکل!" میں نے مناسب سمجھا کہ شہلا کو جھوٹی امید کے فریب میں نہ رکھوں۔ "وہ جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ابھی تمہیں براہ راست نقصان نہیں ہوا ہے۔ ہمارا اس عورت سے کوئی خونی یا قانونی رشتہ نہیں تھا جسے ہم نے زندگی کی طرح ... کے سپرد کر دیا۔ ہم اس کے بوجھ کو کہاں اٹھائے پھرتے لیکن آئندہ پھر اسے اٹھائیں گے جو تمہیں زیادہ عزیز ہوگا۔ پھر اس کو جو عزیزتر ہوگا اور سب کے بعد عزیزترین کو۔ کس کی قیمت تمہارے نزدیک کتنی ہے یہ ہم جانتے ہیں اور تم بھی جانتے ہو۔ دیکھتے ہیں تم میں دوسروں کی زندگی قربان کرنے کا حوصلہ کتنا ہے۔ نفع نقصان کا حساب تم خود لگا لینا۔" میں نے انہیں صاف بتا دیا انکل کہ میری اپنی جان کا کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے مار کے بھی تمہیں کچھ نہیں ملے گا سوائے کسی اور کی جان کی قیمت کو بھی برابر ادا کرنا پڑے گی۔ اگر میں اکیلا نہیں ہوں تو تم بھی اکیلے نہیں ہو اور رشتے اگر میرے لیے اہم ہیں تو تمہارے لیے بھی ہوں گے۔ تم ان کی قدر کو مجروح کرو گے تو یہ مت سمجھنا کہ میں بدلہ نہیں لوں گا اور معاملہ یوم حساب کے آنے تک ٹل جائے گا۔ یہ حساب یہیں بے باق ہوگا۔" مساوی طور پر میرا خیال ہے مشتعل ہونے کی وجہ سے میری آواز کچھ بلند ہو گئی تھی۔

"اچھا اچھا۔ اب یہ بات چھوڑو۔ میرا خیال ہے تمہیں آج آرام کی ضرورت ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"لیکن مجھے آج عدالت میں حاضر ہونا ہے۔" میں نے کہا۔ "شبیر اور عبدل کے قتل کے بعد وکیل سرکار میری ضمانت کی منسوخی کی درخواست کرے گا۔"

"آئی سی۔" رضوی صاحب نے متفکر ہو کے کہا اور شاید کی طرف دیکھا۔ "کیا ضمانت منسوخ ہو جائے گی؟"

"مجھے امکانات تو نظر نہیں آتے۔" ذرا بعد نے کہا۔ "میں نے محرر صاحب سے بھی بات کی تھی۔ سب انسپکٹر شیخ کا بیان اور محرر کی تحریر میں اس بیان کی نقل کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر محرر بھی انسپکٹر شیخ کے بیان کی تائید کر دے تو صرف یہ کہ ضمانت کی منسوخی کا جواز نہیں رہتا بلکہ بعد میں صفائی کے گواہوں کی عدم موجودگی میں سر شرافت علی کے قتل کا کیس بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔"

"محرر ضرور تائیدی بیان دے گا۔" رضوی صاحب نے پورے یقین سے کہا۔ "اسے میر محمد کا ڈر ہے تاہم میں اسے اپنے پاس بلوا لیتا ہوں۔ فی الحال عارضی طور پر۔ بعد میں اسے بند کوارٹر میں رکھ لوں گا یا جہاں وہ خود کو محفوظ سمجھے گا بھجوا دوں گا یا پھر میر محمد کو کسی دور افتادہ قصبے میں پوسٹ کرا دوں گا۔"

"لیکن انکل! خطرہ تو پھر بھی رہے گا۔" میں نے کہا۔ "میر محمد کی پشت پر سراج ہے۔"

"وہ کچھ نہیں کر سکتا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "میر محمد کو اس کی پشت پناہی مہنگی پڑے گی۔ میں میر محمد کو سمجھا دوں گا۔ ابھی تو میں آفس جا رہا ہوں۔ وہاں سے فون کر کے پوچھ لوں گا کہ عدالت میں پیشی کا وقت کیا ہے۔ ظاہر ہے اس وقت وہاں میر بھی ہوگا اور وہ محرر بھی۔ تم نگاہ رکھنا کہ کہیں آس پاس سادے کپڑوں میں دوسرے لوگ بھی ہیں یا نہیں اور اگر ـــــ سراج نظر آ جائے تو مجھے اشارہ کر دینا۔ ایک ٹیم کو میں وہاں بھیج رہا ہوں جہاں گزشتہ شب تمہیں لے جایا گیا تھا۔ وہ رابعہ کا اپنا مکان ہے مگر میں معاملے کو الجھانا نہیں چاہتا۔ میں یہ رپورٹ دلا دوں گا کہ کچھ دشمن مجرم میری ایک عزیز خاتون کو اغوا کر کے یہاں لائے تھے اور انہوں نے فون کر کے مجھے بتا بھی دیا تھا کہ ایک لاکھ دے کر وہ اسے رہا کر دیں گے ورنہ اسے قتل کر دیں گے۔ میرے پاس ایک لاکھ نہیں تھے چنانچہ میں بات کرنے گیا تھا مگر مجھے وہاں کوئی بھی نہیں ملا۔ شیروانی صاحب کا اور فوزیہ کا نام اس کیس میں بالکل نہیں آنا چاہیے اور میرا خیال ہے آپ دونوں کچھ دیر بعد واپس پنڈی چلے جائیں۔ میرا ڈرائیور میری کار میں آپ کو لے جائے گا۔ آپ محسن کی والدہ کو تسلی دیجیے گا کہ سب ٹھیک ہے۔ بہتر ہے وہ بھی یہاں آ جائیں اور ہاں محسن! تم نے شیخ کے سامنے کسی استاد حمیدی کا ذکر کیا تھا؟"

"میں اسے لے کر عدالت پہنچ جاؤں گا۔" محسن نے کہا۔ "وہ صفائی کا سب سے اہم گواہ بنے گا۔ بس وہ مل جائے۔"

"یہ صورت حال اب میرے لیے بھی باعث تشویش ہو گئی ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور خطرناک بھی۔ مجرموں کا حوصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ابھی تک میں نے پوری کوشش کی ہے کہ غیر جانبدار رہوں اور انصاف کے عمل میں دخل اندازی نہ کروں لیکن مجرم اسی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وہ ہر غیر قانونی کام کرنے کے باوجود قانون کی گرفت میں نہیں آتے اور ہر چالاکی سے بے گناہی ثابت کر دیتے ہیں۔ میں اس لاقانونیت کو کب تک خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا رہوں گا۔ اگر آج انہوں نے تمہیں اور فوزیہ کو اٹھوا لیا ہے ــــــ تو کل کو وہ میرے گھر سے کسی کو بھی اٹھا کے لے جا سکتے ہیں۔ میرے بچوں کو۔ شہلا یا رابعہ کو۔ اور پھر گواہ لا سکتے ہیں کہ وہ تو پکنک پر گئی تھیں۔ کل صبح کراچی میں یا پشاور میں کسی کی شادی یا موت میں گئے ہوئے تھے۔ اس جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرنا ناممکن ہوگا لیکن میں یہ نوبت نہیں آنے دوں گا۔ یہ لوگ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں اپنے قانونی اختیارات سے تجاوز کر کے ان کے دماغ درست کرنے کا انتظام کروں۔ بس میری اصول پرست فطرت آڑے آتی ہے۔ خیر آئندہ کی فکر ابھی سے کیا کرنی۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے شیروانی صاحب سے ہاتھ ملایا۔ "پھر ملیں گے۔" انہوں نے شیروانی صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "خدا نے

چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن احتیاط لازم ہے۔ اگر ہو سکے تو اپنی رہائش بدل دو۔ کچھ عرصے کے لیے چھٹی لے کر یہاں آ جاؤ۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم نے سروس میں بہت کم چھٹی کی ہے۔ بہت چھٹی جمع ہوگی تمہارے حساب میں؟"

"چھٹی تو ہے۔" شیروانی صاحب نے کہا "لیکن رضوی! جو تم کہتے ہو وہ ناقابل عمل ہے۔ گھر بدلنے سے حالات تو نہیں بدلیں گے۔ پتا چلانے والے ہر جگہ پہنچ سکتے ہیں۔ پھر چھٹی لے کر میں یہاں کیسے آ جاؤں؟ وہ بیٹے میں مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔"

رضوی صاحب کا ہاتھ ان کے کندھے پر ہی رک گیا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے جہاں ایک نئے دن کی دھوپ پھیل چکی تھی۔ محسن کی ماں کو ڈاکٹروں نے جینے کی جتنی مہلت دی تھی اس میں ایک اور دن کم ہو گیا تھا۔ خاموشی کا وقفہ اتنا بوجھل ہو گیا کہ میرا سانس رکنے لگا۔ میرے لیے فوزیہ سے نظر ملانا ناممکن ہو گیا۔ قصوروار اگر میرے حالات تھے تو میں بھی تھا۔ وقت نے مجھے ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں مجھے ہی قوت فیصلہ کو بروئے کار لاتے ہوئے رابعہ اور فوزیہ میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ فوزیہ سے میری دلی وابستگی ماضی کے حالات کا تقاضا تھی جبکہ رابعہ سے نہیں ملا تھا اس کے لیے میرے جذبات بھی وہی تھے جو فوزیہ کے دل میں میرے لیے تھے لیکن رابعہ بہت مظلوم تھی۔ تنہا تھی اور میرے لیے تباہ ہو گئی تھی پھر عقل کے تقاضے ان جذبات پر غالب آ گئے تھے اور میں نے فوزیہ کے خیال کو دل سے نکال دیا تھا۔ یا کم از کم اس کی ناکام کوشش ضرور کی تھی۔ فوزیہ اب تک دل کے نہاں خانے میں ماضی کی ہر یاد کے ساتھ جلوہ فگن تھی مگر مستقبل کے خوابوں تک اس کی جگہ رابعہ نے لے لی تھی۔ اس مسئلے پر میں نے بہت سوچا تھا لیکن یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اس کے حق میں اور اس کے خلاف دلائل کبھی ختم نہیں ہو سکتے تھے اور یہ حقیقت اپنا وجود خود تسلیم کرا لیتی تھی کہ رابعہ کا پلڑا بھاری ہے۔ اپنے تجربے کے مطابق فوزیہ کی اور میری محبت خلوص نیت پر مبنی ہونے کے باوجود ماحول کی پروردہ تھی۔ ہم بچپن سے قریب تھے اور عام خیال یہی تھا کہ باقاعدہ منسوب نہ ہونے پر بھی ہم بالآخر ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔ رابعہ کا عشق عقلی اور عقلی بنیادوں پر استوار تھا۔ بے شک اس کی جذباتی جڑیں بھی بچپن کے وقت کی گہرائی تک اتری ہوئی تھیں۔ جب ہم ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے لیکن دوبارہ رابعہ سے ملاقات کے وقت اس دور کی کوئی یاد میرے ذہن میں نہ تھی۔ پھر دیکھتے دیکھتے حالات نے میرے خیالات کو بدل دیا اور رابعہ میرے لیے ناگزیر ہو گئی۔ مجھ پر اس کا قرض بڑھتا گیا اور میں ہر طرف سے محصور ہو گیا۔ ایک خیال ہمدردی و ترحم کا سا تھا کیونکہ رابعہ ایک بار شادی کے بعد رخصتی سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی تھی اور المیہ یہ تھا کہ اس کا نام نہاد شوہر بھی زندہ تھا پھر رابعہ نے میری جو بے پایاں ہمدردی اور میرے جذبات کا احساس کیا۔ احسان مندی کا خیال بھی شامل ہو گیا۔ بالخصوص اس کی موت اور اس کے گھر کی تباہی کے بعد احساس جرم نے مجھے رابعہ کا سہارا بننے پر مجبور کر دیا اور جب میں نے دیکھا کہ میری وجہ سے ہونے والے نقصانات کے باوجود رابعہ کے جذبات، اس کے خلوص اور اس کے عزم و رفاقت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے تو بلاشبہ میں اس کی محبت کی عظمت کا قائل ہو گیا۔ اس کے مقابلے میں فوزیہ ایک عام لڑکی رہ گئی۔ ظاہری حسن کی کشش میں رابعہ بھی کم نہ تھی مگر فوزیہ وہ سب کچھ نہیں کر سکتی تھی جو رابعہ نے میرے لیے کیا۔ آہستہ آہستہ میرا یہ یقین پختہ اور ناقابل شکست ہو گیا کہ زندگی کے پُر خطر، حوصلہ آزما اور دشوار سفر میں صرف رابعہ ہی میرا ساتھ دے سکتی ہے۔ فوزیہ کو صدمہ یقیناً ہوگا اور اس نے جذباتی بحران کے ایک لمحے میں اپنی جان سے کھیلنے کی کوشش بھی کی تھی مگر وہ بحران گزر چکا تھا اور اب میں دیکھ رہا تھا کہ فوزیہ کا ردعمل منفی ہونے لگا ہے۔ وہ مجھے ایک کمینہ، خود غرض، مغرب کی تعلیم سے بگڑا ہوا، دولت کے حصول کی خاطر رابعہ سے رشتہ جوڑ لینے والا طوطا چشم قسم کا جھوٹا عاشق سمجھنے لگی تھی جو میرے لیے دکھ کی نہیں بڑے اطمینان کی بات تھی۔ اب وہ ماں کی آخری خواہش کو پورا کرنے کے لیے پروفیسر ایاز کو قبول کر لے گی تو اسے مجھ سے بے وفائی کا خیال ضمیر کی خلش بن کے پریشان نہیں کرے گا اور وہ ایاز کے ساتھ خوش بھی رہ سکے گی جو بہرحال ایک شریف آدمی تھا۔

ٹیڑھا مسئلہ محسن کا تھا۔ اگر اپنی زندگی کے باقی ماندہ دو ماہ کے عرصے میں خالہ نے یہ چاہا کہ بیٹی کو رخصت کرنے سے پہلے ہو کر گھر میں نے آئے تو کیا محسن اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے میرا ساتھ چھوڑ کے چلا جائے گا؟ معلوم نہیں میں کب تک اپنے خیالات میں ڈوبا رہتا مگر محسن نے شانہ پکڑ کے مجھے ہلا دیا۔ "سات بجے ہیں گیانی مہاراج!" وہ بولا۔ "تو کیا آپ کو عدالت پہنچنا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں رہا تھا۔ "باقی لوگ کہاں گئے؟"

"انکل رضوی گئے اپنے آفس۔ شہلا کو فوزیہ اپنے ساتھ لے جا رہی ہے۔"

"کہاں؟ اسلام آباد؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ اور ڈیڈی نے کہا ہے کہ اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ فی الحال شہلا کو اس ماحول سے نکل جانا چاہیے۔ وہ اکیلی بھی نہیں رہ سکتی اور رضوی صاحب کے بیٹے ہم عمر ہی بہت ہیں۔" محسن ہنسا۔ "وہ لوگ مائنڈ کرتے ہیں۔"

"محسن! ابھی سب کے سامنے جو کچھ میں نے کہا سب جھوٹ تھا۔" میں نے کہا۔ "تفصیل میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی یہ سن لو کہ ڈی سلوا مارا جا چکا ہے۔"

"کیسے؟" محسن نے کچھ بے یقینی سے کہا۔ "جب اسے یقین ہو گیا کہ میں ایسیڈ میں ہوں۔ تم نے ... "

"نہیں۔ کار کے حادثے میں۔" میں نے کہا۔ "وہ مجھے لے کر واپس جا رہا تھا کہ میں نے اسے قابو کرنے کی کوشش کی اور کار بے قابو ہو کے درخت سے ٹکرا گئی۔ رفتار بہت زیادہ تھی وہ وہیں مر گیا۔ اسی کار کی ڈکی میں شہلا کی ماں تھی جب سے دشمن اس کو اغوا کر کے لے گئے تھے وہ اسی میں بند تھی مگر مجھے معلوم نہیں تھا۔ اوّل تو وہ پہلے ہی مر چکی ہو گی اور اگر زندہ ہوتی تو حادثے کے بعد اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"کیا تو نے ڈکی کھول کے نہیں دیکھا تھا؟" محسن نے کہا۔

"نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی ... اور ... مجھ میں ہمت بھی نہیں تھی۔" میں نے اعتراف کیا۔

"تجھے معلوم کیسے ہوا کہ شہلا کی ماں ڈکی میں بند ہے؟" محسن بولا۔

"مجھے ڈی سلوا نے بتایا تھا لیکن اس وقت موقع نہیں تھا۔ موقع ملنے سے پہلے ہی حادثہ پیش آ گیا۔" میں نے کہا۔

"اور یہ حادثہ کہاں ہوا؟" محسن نے کہا۔

"منڈوالی سڑک پر۔ تقریباً موڑ کے پاس۔" میں نے کہا۔ "اس شکستہ مرقد کے سامنے جہاں سے زمانو کی لاش ملی تھی۔"

"یہ بات تو چھپی نہیں رہ سکتی۔" محسن نے سوچ کر کہا۔ "ابھی کچھ دیر بعد انکل رضوی کو بھی خبر مل ہی جائے گی۔ پولیس تو اب تک پہنچ چکی ہوگی۔ انکل رضوی۔ رپورٹ کریں گے کہ ان کی ایک خاتون عزیزہ کو گزشتہ شب اغوا کر لیا گیا تھا تو نام، حلیہ اور عمر وغیرہ بھی لکھوائیں گے اور معاملہ چونکہ ایس ایس پی کا ہے اس لیے اطلاع دی جائے گی کہ مطلوبہ حلیے کی خاتون فلاں جگہ کار کی ڈکی میں سے ملی ہیں۔ پھر ڈی سلوا کی شناخت بھی ہو ہی جائے گی۔"

"اس سے میرا بیان غلط نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "بس یہ ثابت ہوگا کہ اغوا کرنے والا ڈی سلوا تھا۔ حادثہ کیسے پیش آیا وہ پولیس اپنی تفتیش سے جو نتیجہ چاہے اخذ کرے۔ میں بتا ہی چکا ہوں کہ میں کس طرح نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس میں کوئی بات غلط نہیں لیکن اس کے باوجود میں نے ڈی سلوا کو گن پوائنٹ پر گاڑی پیچھے چلانے کو کہا تھا۔ اس نے شہلا کی ماں کے بارے میں بتا کے مجھے اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ میں اس کی چال میں آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اب بہت خوفزدہ ہے لیکن میں ڈکی کھولنے اترا تو اس نے گاڑی چلا دی اور واپس جانے لگا۔ میں بونٹ پر چڑھ گیا اور ونڈ اسکرین توڑ کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی میں حادثہ ہو گیا۔ میں خواہ مخواہ کے قانونی چکروں سے بھی بچنا چاہتا تھا۔ اب ڈی سلوا کی موت کے کیس میں میرا نام ہی نہیں آئے گا۔ شہلا کو میں نے اتنا تو بتا دیا ہے کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔ وہ اس خبر کے صدمے کو برداشت کر لیتے کے بعد لاش دیکھ کر بھی پاگل نہیں ہوگی اور ظاہر ہے پوسٹ مارٹم کے بعد لاش یہیں آئے گی۔"

"پھر تو یہ اور بھی اچھا ہے کہ شہلا اسی وقت فوزیہ اور ڈیڈی کے ساتھ نکل جائے۔" محسن بولا۔ "ہم بعد میں اسے اطلاع دے دیں گے کہ لاش مل گئی تھی اور ہم نے تدفین کر دی ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھے گی۔"

"محسن!" میں نے کہا۔ "فوزیہ کے بارے میں تیری خالہ نے کیا طے کیا ہے؟"

"اس کی شادی آئندہ ماہ پروفیسر ایاز سے ہو رہی ہے۔" محسن نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ اچھا آدمی ہے۔ فوزیہ خوش رہے گی۔"

"مجھے کوئی دکھ نہیں۔ کوئی گلا نہیں مجھے۔ مگر میں نے ..." میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔

"نہیں سکندر! یہ حالات کا قصور ہے تیرا نہیں۔" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "فرض کرو تمہاری زندگی میں وہ بہتری آتی جیسی کبھی سوچا تھا۔"

یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے۔

وہی بات ہوتی تو کیا فائدہ ہوتا۔ کون جانے انجام کیا ہوتا اور اس سے ہماری دوستی بھی متاثر ہوتی۔ اچھا ہوا ابھی بات صاف ہو گئی۔ خدا جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ تیری جگہ جو ایاز چن لیتا تو بڑی خرابی ہوتی۔ مجھے اس ذلیل کو قتل کرنا

پڑتا اور فوزیہ کی زندگی بھی تباہ ہو جاتی۔"

"انکل شیروانی نے ابھی دو ماہ کی بات کی تھی۔" میں نے بڑی مشکل سے الفاظ کو مربوط کیا۔ "فرض کرو اسی عرصے میں تیری ممی نے تجھے بھی بلا لیا اور پہلے بیاہ لانے کا سوچا۔"

"تو میں مخالفت نہیں کروں گا۔" محسن نے کہا۔ "رشتہ تو تقریباً طے ہی ہے۔ نکاح کی رسمی کارروائی باقی ہے۔ اس کے لیے میں نے ممی سے بات کر لی تھی کہ اچھا ہو یا برا، میں آپ کے انتخاب کو قبول کرتا ہوں لیکن نکاح بالکل سادگی سے ہوگا۔ رسمیں وغیرہ بالکل نہیں ہوں گی۔ دھوم دھام قطعی نہیں۔ میں صرف دو دن کے لیے جاؤں گا۔ ایک دن نکاح کا، دوسرا ولیمے کا۔ تیسرے دن لوٹ آؤں گا۔"

"اور تیری ممی... وہ اجازت دیں گی کہ تو نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر بھاگ جائے؟"

"وہ جیسی میں نے انہیں چلا دیا ہے۔ ڈیڈی سے کہہ دیا ہے کہ وہ بھی اس بات کو سمجھ لیں۔ میں دوست کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا اور اس کی ماں کو بھی ناخوش نہیں کر سکتا جس کی زندگی چراغِ سحری ہے۔" محسن بولا۔ "چنانچہ میں جھوٹ بولوں گا کہ میں نے لاہور میں کام شروع کیا ہے اور اس مرحلے پر دو دن بھی میرے مستقبل کو تباہ کر سکتے ہیں۔ مجھے کنسٹرکشن کا ایک کنٹریکٹ ملا ہے جسے فوراً سائن کرنا ضروری ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں ساتھ ساتھ کسی مناسب جگہ پر مکان بھی تلاش کرتا رہوں اور بعد میں بیوی کو بلوا لوں۔ اس عرصے میں بیوی جہاں چاہے رہے۔ اس کے دو گھر ہیں۔ اپنے ماں باپ کا اور میرے ماں باپ کا۔"

"فوزیہ کی رخصتی کے لیے تجھے پھر جانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"اس کے لیے ڈیڈی کچھ ایسا انتظام کر رہے ہیں کہ دونوں کام ایک ساتھ ہو جائیں۔ ایک برات آئے، ایک جائے۔" محسن بولا۔ "تیرے ڈیڈی ابھی تک مجھ سے بدظن نہیں ہوتے۔ میں نے پہلے تو فوزیہ کو قبول نہیں کیا...."

"اگر تیرے انکار سے ممی ناخوش ہو گئیں تو ڈیڈی بھی تجھے معاف نہ کرتے۔" وہ بولا۔ "لیکن ممی اس شادی کے شروع سے خلاف تھیں۔ تیرے انکار کے بعد ڈیڈی کو موقع مل گیا کہ انہیں اپنی خوشی کو نہ دیں۔"

"انھوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ سکندر کے ساتھ رہ کر مصیبت میں گرفتار ہونے اور دنگل کا خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نہیں۔ یہ بات وہ کبھی نہیں کہہ سکتے۔" محسن نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ "وہ خود بہت وضعدار اور اصول پرست آدمی ہیں۔ انھوں نے چچا اور یرجان مرحوم سے جس طرح دوستی

نبھائی وہ اس کی مثال ہے۔ وہ مجھے دوستی نبھانے سے کیسے روک سکتے ہیں؟ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اگر ان حالات میں میں تیرا ساتھ نہ دیتا تو ان کو افسوس ہوتا۔ اب تو وہ مطمئن ہوں گے کہ بیٹا ان سے کم نہیں رہا۔"

"تم لوگ ناشتہ بھی کرو گے یا ایک دوسرے کا سر کھاتے رہو گے؟" رابعہ نے اندر آ کے ہمیں ٹوکا تھا۔

"آپ کے سر عزیز کی قسم! آپ نے ٹوکا نہ ہوتا تو سر کیا، ہم ایک دوسرے کو سالم نگل جاتے۔" محسن نے کہا۔

"لیکن محسن خان شیروانی! ہم آدم خور تو نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "حلوا خور ہیں۔"

"قبلہ آپ لا مذہب ہو گئے۔ غالباً آپ حلوا خور کہنا چاہتے تھے۔ عزیزہ! کیا ناشتے میں حلوا پوری ملے گا؟" محسن نے مفروضہ داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

"میں تو جا رہی ہوں کورٹ۔" رابعہ نے نرمی سے کہا۔ "میں گیارہ بجے کا ٹائم لگواؤں گی۔ نہیں پہنچو گے تو زیر حراست کر دو گے۔"

"اور لنچ؟" میں نے پوچھا۔ "حوالات میں آج کل مینو کیا ہوتا ہے، چائنیز یا انگلش؟" مگر میری بات پوری ہونے تک وہ دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا اور حیران ہوئے کہ ان حالات میں بھی ہم ہنسنا نہیں بھولے۔ اور خطرات، حادثات اور سخت حالات کے باوجود ہنسی کے فکر و غم کی گرد کو جھاڑ سکتے ہیں۔

"اب بادل... میں نصیحت کہتے کہتے رک گیا۔" "ٹیڈی کو پکڑو۔"

"کہاں سے پکڑیں؟ وہ تو شیخ کو سالا تھا۔" محسن نے کہا۔ "مجھے کیا معلوم وہ کہاں ہوگا۔"

"اس کے ٹھکانے دیکھو اور اگر وہ مل جائے تو اس کو ساری صورت حال سمجھا کے لے آؤ۔" میں نے کہا۔

"وہ... دے گا وہی بیان، جو میں نے اس سے منسوب کر دیا تھا؟" محسن نے مشتبہ لہجے میں سوال کیا۔

"ٹیڈی دل کا خیر ہے اور بہت اچھا قابلِ اعتماد اور مخلص دوست بن سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "المیہ یہی ہے کہ زندگی نے اس سے دشمنی کی اور وہ راستے سے بھٹک گیا۔ وحشی جانور کو بھی پیار سے اپنی مرضی کا تابع بنایا جا سکتا ہے۔ ٹیڈی بچپن سے محرومی کا شکار ہے۔ اسے کسی نے اپنایا نہیں ہے۔ ہم نے اسے عزت دی اور اس کی نیکی کو سراہا۔ وہ شعلہ کو بہن سمجھتا ہے اور ہمیں دوست۔ حالانکہ ہمارے معاشرے کے معیار پر اس کی

اور ہم میں بہت فرق ہے۔ کہ طرف لوگوں کے لیے وہ اچھوت رہا ہے۔ معزز، تعلیم یافتہ اور شریف لوگوں میں جگہ مل جائے تو وہ بھی سدھر سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس جنگ میں وہ ہمارا اتنا ہی اچھا مددگار ثابت ہو سکتا ہے جتنا نوباپخو تھا۔ یاد رہے۔"

ہم دوسرے کمرے میں ناشتے کے لیے گئے تو اسلام آباد جانے والے تیار تھے۔ فوزیہ نے شہلا کے چند جوڑے اپنے سوٹ کیس میں رکھ لیے تھے۔ ان دونوں کی جسمانی ساخت ایک جیسی تھی چنانچہ شہلا اسلام آباد میں فوزیہ کے جوتے، کپڑے بھی استعمال کر سکتی تھی۔ باقی تمام چیزوں کے لیے اس نے شہلا سے کہہ دیا تھا کہ گھر میں سب کچھ ہے اور نہیں ہوگا تو آ جائے گا۔ شہلا اس قبل استعمال سے زیادہ مطمئن نظر نہیں آ رہی تھی مگر دونوں بزرگوں یعنی رضوی اور شیروانی صاحبان کے سامنے وہ کچھ نہ بول سکی۔ پھر رابعہ نے اور بیگم رضوی نے بھی اسے سمجھا دیا کہ بیٹی یہ محسن کا گھر بھی غیر کا گھر نہیں ہے۔ شاید وہ خود بھی وقتی طور پر اس ماحول سے چھٹکارا چاہتی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا آئندہ چند دن یہاں کیا ہوگا۔ اس نے ایک ماہ کے لیے جانا قبول کیا تھا۔ فوزیہ نے تو اسے نہیں بتایا تھا لیکن رابعہ نے بتا دیا تھا کہ ایک ماہ کے اندر اندر فوزیہ کی رخصتی ہے اور اس کی ماں بیمار ہے چنانچہ وہ شادی کے کام میں مدد کر سکتی ہے۔ بے چاری لڑکی کے ساتھ دہرا المیہ تھا۔ ایک تو فوزیہ کی شادی کی بات ایسے وقت میں کی گئی جب خود اس کی اپنی ماں کی موت کو ایک دن بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ لاکھ حقیقی ماں نہ سہی شہلا کا غم تو کم نہ تھا۔ پھر اسے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ فوزیہ کے ساتھ ہی محسن کی شادی بھی طے ہو چکی ہے۔ وہ محسن کو چاہنے لگی تھی اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ سے کم میں اور رابعہ اس کے جذبات کو بہت پہلے سمجھ چکے تھے اور میرا اندازہ یہ بھی تھا کہ محسن مجبور نہ ہوتا تو شادی کے لیے کبھی تیار نہ ہوتا۔ ناشتے کے دوران میں نے اس تمام صورت حال پر غور کیا اور مجھے یہ بات مناسب لگی کہ ایک ماہ بعد وہ لوٹ آئے، اس وقت تک یہاں تجہیز و تکفین کے اور قانونی کارروائی کے سارے مرحلے پورے ہو چکے ہوں گے۔ پولیس خواہ مخواہ شہلا کا بیان نہیں لے گی اور ڈی سلو سے اس کے تعلقات کو زیر بحث نہیں لائے گی۔ رضوی صاحب کہہ دیں گے کہ وہ تو بیٹی ہی ہے، شہلا نے بھی میرے بیان پر یقین کر لیا تھا کہ اس کی ماں کو مجرموں نے لاری سے پھینک دیا ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے اب تجہیز و تکفین سے متعلق مشکلات ہی زیر بحث تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ پسند نہ کرتا کہ وہ ماں کی مسخ شدہ لاش دیکھے۔ شہلا بہت رونے دھونے کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی تھی۔

لیکن اس کا ایک ماہ بعد لوٹ آنا بھی اتنا ہی ضروری تھا جتنا اس وقت یہاں سے چلے جانا۔ ایک ماہ بعد اگر پروگرام کے مطابق محسن کی شادی ہو گئی تو یہ شہلا کے لیے ایک اور جذباتی سانحہ ہوگا۔ پھر فوزیہ رخصت ہو چکی ہوگی چنانچہ اسے تسلی دینے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ فوزیہ کی ماں کے لیے وہ زندگی کا آخری مہینہ ہوگا اور ان کی حالت اس وقت تک یقیناً خاصی خراب ہو جائے گی۔ محسن کی بیوی اگر تیسرے دن والدین کے گھر جا بھی تو تیمارداری کے لیے صرف شہلا رہ جائے گی۔ محسن نے تو مجھے صاف بتا دیا تھا کہ وہ شادی کے لیے گیا بھی تو دو دن کے لیے جائے گا اور لوٹ آئے گا۔ پھر شہلا کے لیے وہاں بھی ایک المناک موت کا نظارہ کرتے رہنا دکھ درد سے چھپائے رکھنے کا دہرا عذاب ہوگا چنانچہ بہتر یہی ہوگا کہ وہ اس وقت سے پہلے ہی واپس آ جائے اور یہاں ہم سب مل کر اس کو پھر زندگی کی جدوجہد میں کسی نہ کسی کے ساتھ شریک ہونے پر مجبور کر دیں۔

عین اس وقت جب باقی لوگ گاڑی میں بیٹھ چکے تھے میں نے شہلا کو ایک منٹ کے لیے ایک طرف بلایا۔ "تمہیں معلوم ہے شہلا کہ محسن کی ماں بیمار ہے؟" میں نے کہا۔

"جی بھائی جان، رابعہ باجی نے مجھے بتایا تھا کہ فوزیہ کی شادی بھی آئندہ ماہ تک متوقع ہے۔" وہ بولی۔

"اور یہ شادی ہنگامی حالات میں اسی لیے کی جا رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ مسز شیروانی کی زندگی غیر متوقع ہے۔"

وہ میری بات پر کچھ حیران ہوئی۔ "کیا بیماری لاحق ہے انہیں سکندر بھائی؟"

"انہیں سرطان ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بات ڈاکٹروں نے بہت پہلے بتا دی تھی کہ انہیں زیادہ سے زیادہ چھ ماہ جینا ہے۔ اب انکل شیروانی نے کہا ہے کہ ان کی زندگی کے دو ماہ بھی نہیں ہیں جب تک کوئی معجزہ ہی انہیں بچا سکتا ہے۔"

"کیا یہ بات فوزیہ کو... اور محسن کو معلوم ہے؟" وہ سہم کر بولی۔

"ہاں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے سوائے خود محسن کی ماں کے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے انہیں بھی معلوم ہو چکا ہے۔ حقیقت کبھی چھپی نہیں رہتی۔ سب ایک مرے کے جھوٹ کا بھرم رکھتے ہیں اور یہ بھرم تم کو بھی رکھنا ہے۔" میں نے الفاظ کی تلاش کے لیے سخت جدوجہد کی لیکن اچانک میرے ذہن میں خلا رہ گیا۔

"چلو بھئی۔ یہ کیا کانفرنس شروع کر دی ہے۔" باہر سے شیروانی صاحب کی آواز آئی۔

www.paksociety.com

"ایک منٹ انکل!" میں نے چلا کر کہا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ وقت کم ہے۔ تلخ حقیقت کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ "بات یہ ہے شہلا کہ محسن، فوزیہ اور ان کے والد مل کر کوشش کر رہے ہیں کہ۔۔۔ کہ ایک شخص زندگی کے آخری ایام میں جو مانگے اسے دے دیا جاتا ہے۔ اس کی خوشی کو مقدم رکھا جاتا ہے اور اسے دنیا سے یوں رخصت کیا جاتا ہے کہ اسے اپنوں سے کوئی گلہ نہ ہو۔ جو ماں صاحبہ نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر قربانی دینے کا عزم کر رکھا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ محسن کی شادی بھی اپنی زندگی میں ہی کرنا چاہتی ہیں۔ اس میں محسن کی پسند کا کوئی سوال نہیں۔ وہ مجبور ہے۔"

اس انکشافِ حقیقت کے ایک لمحے میں شہلا کے جذبات کا جو عکس اس کی صورت پر نمودار ہوا اسے الفاظ میں بیان کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ اس نے ایک بار نظر جھکائی اور پھر سر اٹھا کر مجھے دیکھا تو مجھے وہ بالکل اجنبی لگی۔

"یہ آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے کیا آپ کو شک ہے کہ میں اس آزمائش میں پوری نہیں اتروں گی؟" وہ بولی۔

"نہیں!" میں نے کہا۔ "میں صرف یہ چاہتا تھا کہ۔۔۔ کہ جہاں تم جا رہی ہو۔ وہاں کے بارے میں حالات کا کوئی پہلو تم سے پوشیدہ نہ رہے۔ ویسے مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔"

"اس اعتماد کا بہت بہت شکریہ بھائی جان!" شہلا نے طنز آمیز تلخی سے کہا۔ "شاید میں اس کی مستحق نہیں تھی مگر پھر بھی میں کوشش کروں گی کہ کسی کو مجھ سے شکایت نہ ہو۔ خدا حافظ!"

اس کی بات کا ہر لفظ میرے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گیا۔ وہ پلٹی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ محسن پہلے ہی استاد میڈی کا کھوج لگانے جا چکا تھا۔ میں وہیں کھڑا سوچتا رہا کہ کیا وہ اس وقت موجود ہوتا تو شہلا کو جانے دیتا! غالباً محسن نے اس سے پوچھا ہی نہیں تھا اور انکل رضوی اور انکل شیروانی نے یہ فیصلہ خود ہی کر لیا تھا۔ انھیں اندازہ کہاں تھا کہ شہلا اور محسن کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے جذبات کی نوعیت کیا ہے۔ رابعہ کو موقع نہیں ملا تھا اور شاید اس کا خیال یہ بھی ہو کہ جب باقی لوگ جانتے ہیں تو محسن بھی جانتا ہوگا لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ ہم سب نے نادانستگی میں شہلا پر ایک اور ظلم کیا ہے۔ اگر وہ یہیں رہتی اور محسن کی شادی کی تاریخ بھی طے ہو جاتی تو محسن اپنے طور پر اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کر دیتا اور اس سے معافی مانگ لیتا لیکن محسن کو خبر بھی نہیں ہو سکی تھی۔ اب فوزیہ کو رخصت کرتے وقت ایک امتحان میرے لیے درپیش ہوگا۔ دوسرے امتحان سے شہلا اس وقت گزرے گی جب محسن کی بارات سجے گی۔ میں اس جذباتی بحران کا سامنا کر لوں گا کیونکہ فوزیہ اس وقت تک میرے خیال کو بھی دل سے نکال دے گی اور غیر شعوری طور پر مجھ سے نفرت کا شکار ہوگی لیکن محسن دیکھے گا کہ ماں کی خوشی کے لیے اس نے اپنے جذبات کے ساتھ شہلا کے ارمانوں کو بھی پامال کر دیا ہے اور شہلا اسی گھر کی چھت کے نیچے موجود ہے جہاں اس کے لیے شبِ عروسی کی مسرت کا اہتمام ہو رہا ہے اور جسے سینے پر صبر کی سِل رکھے انگاروں کے بستر پر تنہا لیٹنا ہے۔

باہر سے کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پھر یہ آواز دور ہونے لگی اور چند سیکنڈ میں فضا کے سکوت کا ایک حصہ بن کے کھو گئی۔ انکل شیروانی نے مجھے بدتمیز سمجھا ہوگا کہ خدا حافظ کہنے کے لیے دروازے سے باہر بھی نہیں آیا۔ فوزیہ نے مجھے مجرم سمجھا ہوگا جس میں اتنی ہمت ہی نہ تھی کہ اپنا چہرہ دکھا سکے۔ شہلا نے مجھے وہ بھائی سمجھا ہوگا جس نے سہارا دے کر اسے بے سہارا کر دیا۔ بیگم رضوی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونکا۔

"یہ کیا رونی شکل بنائے کھڑے ہو؟" انھوں نے کہا۔ "کوئی تم سے ملنے آیا بیٹھا ہے۔"

"مجھ سے! اس وقت کون ملنے آ گیا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"وہ جسے تم ڈبل ایس آئی شیخ کہتے ہو۔" بیگم رضوی نے کہا۔ "ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے وہ تمھیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔"

میں نے سر ہلایا اور آہستہ آہستہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ خلافِ معمول شیخ کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

"ملزم حاضر ہے شیخ صاحب!" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "جس طرح چاہیں۔۔۔"

"آئی ایم سوری سکندر!" اس نے مصافحہ کرنے کے بعد پھر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "غالباً آج سماعت نہ ہو سکے گی۔ شیدے اور عبدل کے کیس کا چالان ہی پولیس نے مکمل نہیں کیا ہے۔ پھر بھی حاضری تو ضروری ہے۔"

"اور جب تک چالان پیش نہیں کیا جائے گا اس وقت تک کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "میری ضمانت برقرار رہے گی یا منسوخ سمجھی جائے گی؟"

"بغیر سماعت کے ضمانت کیسے منسوخ کی جا سکتی ہے؟" وہ بولا۔ "پہلے چالان پیش ہوگا۔ اس میں کہا جائے گا کہ قتل کے سلسلے میں تم پر شک ہے چنانچہ تفتیش کے لیے تمھاری ضمانت پر رہائی کے احکامات واپس لیے جائیں اور تمھیں پولیس کے حوالے کیا جائے۔ شیدے اور عبدل کے قتل کا مقدمہ دوسری عدالت میں سماعت کے لیے جائے گا۔ تمھاری ضمانت منظور کرنے والی عدالت دوسری ہے۔ وہاں چالان کی نقل ہی نہیں پہنچے گی تو سماعت کیسے ہوگی؟"

"پھر پریشانی کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا ملزم کو حاضر کرنے کے لیے ہتھکڑی لگانے کا مسئلہ ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب تم ضمانت پر ہو تو حاضر ہونا تمھاری اپنی ذمے داری ہے۔ میرا کام عدالت کے سمن تم تک پہنچانا تھا۔" اس نے فائل میں سے ایک کاغذ نکالا۔ "یہ اپنے پاس رکھ لو اور اس پر بیان دستخط کر دو۔ تاریخ آج کی مت ڈالنا اس دن کی ڈالنا جب میں تم سے ملنے کے لیے کرشن نگر آیا تھا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے دستخط کرتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ یہ سمن مجھے اسی روز دیے گئے تھے۔" شیخ نے مطمئن ہو کے فائل پر نگاہ ڈالی۔ "لیکن میں باتوں میں بھول گیا۔ خیر اب چلو۔" اس نے گھڑی پر نگاہ ڈال کے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس تو اس وقت کوئی سواری نہیں۔" میں نے کہا۔ "کار ابھی ابھی پنڈی گئی ہے۔ سرکاری جیپ میں رضوی صاحب آفس گئے ہیں اور اپنی فاکس ویگن میں رابعہ کورٹ جا چکی ہے۔ سڑک پر جہاں تک ٹیکسی ملے پیدل ہی جانا ہوگا۔"

گھر کی طرف آنے کے بجائے ہم دونوں مخالف سمت میں چلنے لگے۔ اگلے چوک پر رکشا یا ٹیکسی عموماً مل جاتے تھے۔

"سکندر!" شیخ نے اچانک کہا۔ "فرض کی ادائیگی خود ایک امتحان ہوتی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اب تک میں نے جانتے بوجھتے کبھی کوتاہی نہیں کی لیکن فرض شناسی کا یہ امتحان اب ایک سزا بننے لگا ہے۔"

"جو کچھ کہنا ہے صاف الفاظ میں کھل کر کہو۔ کسی نے دھمکی دی ہے تمھیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مختلف اوقات میں اور مختلف طریقوں سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔" وہ بولا۔ "سب سے پہلے تو اس دن جب میں کرشن نگر میں تمھاری بہن شہلا کے مکان سے نکلا تو کچھ لوگ میرے انتظار میں تھے۔ باہر نکلتے ہی مجھے ٹیکسی نظر آ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ بات کرتے میں روانہ ہو گیا۔ انھوں نے ایک جیپ میں تعاقب کیا لیکن میری خوش قسمتی یا ان کی بدقسمتی ایک ٹائر فلیٹ ہو گیا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ میرے پیچھے بھی کوئی ہے۔ اگر یہ معمولی سا حادثہ نہ پیش آتا تو وہ لوگ وہیں معاملہ طے کر لیتے۔"

"کس بات کا معاملہ؟" میں نے کہا۔

"وہ ٹیپ تو میرے پاس نہیں ہے جس پر میں نے عبدل کے مرنے سے پہلے اس کا ٹیلی فون پر موصول ہونے والا پیغام ریکارڈ کیا تھا مگر محرر نے اپنے ہاتھ سے جو نقل بنائی تھی وہ میرے پاس تھی۔ اگر وہ نقل بھی نہ ہو تو خود محرر بھی صاف انکار کر سکتا ہے کہ کیسا ٹیپ اور کیسا تحریری بیان۔ میں نے تو اپنے ہاتھ سے کچھ بھی نہیں لکھا۔ غالباً ان لوگوں نے میری اطلاع پر محرر سے رابطہ قائم کیا تھا۔ محرر بیچارے نے کہا ہوگا کہ میں اب کیا کروں۔ تحریر میرے ہاتھ کی ہے لیکن دوسروں کے ہاتھ چڑھ چکی ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ میں یہ کر سکتا ہوں کہ شیخ صاحب پر بددیانتی اور وہ بیان لکھوانے کا غلط الزام عائد کر دوں مگر یہ بہت کمزور موقف ہوگا۔ سکندر کے وکیل بہت بڑے ہیں اور اس کے ساتھ ایک ایس ایس پی بھی ہے جو میری ایسی تیسی کر سکتا ہے۔ اگر وہ تحریر محرر کے پاس ہوتی یا تھانے میں ہوتی تو وہ یقیناً ہر قیمت پر اسے حاصل کر لیتے۔"

"کیا اب وہ منہ مانگی قیمت دینے کی پوزیشن میں نہیں رہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ وہ تحریر کسی کی دسترس میں نہیں رہی۔" شیخ مسکرایا۔ "پہلی ناکامی کے بعد کسی نے میرے گھر فون کیا تھا اور مجھ سے صاف بات کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں کوئی بیان ہی نہ دوں اور اگر دوں تو اس میں عبدل کے ٹیلی فون کا کوئی ذکر نہ کروں۔ میں نے پوچھا کہ جناب کون ہیں؟ یہ مطالبہ کیوں فرما رہے ہیں اور اس کیس میں اتنی دلچسپی لینے کی وجہ کیا ہے؟ مجھے جواب ملا کہ شیخ صاحب! آپ واقعی بھولے ہیں۔ بھائی آدمی کو آم کھانے چاہئیں یا پیڑ شمار کرنے میں وقت ضائع کرنا چاہیے۔ عقل سے کام لو۔ ہماری بات ماننے میں فائدہ ہے تو فائدہ اٹھاؤ۔ ہم کسی کو مرڈر کرنے کا مطالبہ تو نہیں کر رہے ہیں۔ خاموش رہنا بھی کوئی مشکل کام ہے اور اگر محض خاموش رہنے کے ایک لاکھ مل جائیں تو کیا حرج ہے؟"

میں نے کہا۔ "لاکھ کے بعد ہوتا ہے کروڑ۔ اس کے بعد ارب اور کھرب۔ نگران سے پہلے ہوتا ہے اصول۔ اس کے معنی جانتے ہو؟ میرا دستور ہے کہ میرے اصول قابلِ فروخت و خرید نہیں چنانچہ اعداد و شمار کے چکر میں مت پڑو۔ اپنی دولت بچاؤ اور جیسا کہ تم نے ابھی کہا تھا۔ مجھ بھولے کی بات ماننے میں فائدہ ہے تو فائدہ ضرور اٹھاؤ۔" پھر میں نے فون بند کر دیا لیکن اس شخص نے پھر فون کیا اور رقم بڑھا کے پانچ لاکھ تک کر دی۔ اس وقت

مجھ سے ایک غلطی ہوگئی۔ میں نے کمرہ بک کرایا جب میں ٹیلی فون
ایکسچینج سے شکایت کر رہا ہوں اور تم نے فون کیا تو مجھے معلوم
ہو جائے گا کہ تم کہاں سے بات کر رہے ہو اور ہو سکتا ہے وہاں
آبزرویشن پر سب ریکارڈ ہو جائے۔ تیسری بار کسی عورت نے میرے
والد سے بات کی اور ان سے کہا کہ آپ کا عاقبت۔ نہ نامش بیٹا
پانچ لاکھ کی رقم کو نہیں لات مار رہا ہے اور اچھا نہیں
کر رہا ہے۔ آپ کے نزدیک اس کی زندگی کی قیمت کیا ہوگی؟
میرے والد پریشان تو ہوئے مگر انھوں نے کہا۔ بی بی! آپ کیا
معموں میں بات کر رہی ہو، میں کچھ نہیں سمجھا۔ کیا تمہارا کوئی بیٹا
ہے؟ تو مجھے بھی بتا دو کہ اس کی زندگی کی مالیت تم نے
سکۂ رائج الوقت میں کتنی رکھی ہے؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی
کا کوئی مول ہی نہیں اور یہ خدا کی امانت ہے۔ اس عورت نے
کہا کہ تفصیلات اپنے بیٹے سے معلوم کر لیجیے اور فون بند کر دیا۔ غالباً
وہ خوفزدہ ہوگئی کہ کہیں ایکسچینج میں نے ٹیلی فون کو آبزرویشن پر
نہ رکھوا دیا ہو۔ میرے والد نے مجھے بلایا اور ساری بات بتائی۔ میں
نے کہا کہ آپ کا جواب بہت مناسب تھا۔ وہ مجھ سے میرے
ایمان کا سودا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بتاتے کہتے میں ہچکچاہٹ میرے
والد نے کہا کہ یہ بات ہے تو جان کی فکر مت کرو۔ اس کا لینے
والا بھی اس کے سوا کوئی نہیں جو زندگی دیتا ہے اور اسے
وقت مقررہ سے اس کی حفاظت بھی خود ہی کرنا ہے۔ لیکن...
"لیکن... شیخ تم نے تو واقعی ثابت کر دیا کہ تم بچے نہیں
انسپکٹر نہیں ہو۔ ...ہے ہوا" میں نے کہا۔ "اس دھمکی کے باوجود
فائل کو لیوں... لیے پھر رہے ہو بقول چچا غالب کے
کہ پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے"
"جناب! میں اتنا احمق نہیں ہوں جتنا نظر آتا ہوں
...پوچھے گا تو میں چھپاؤں گا کچھ نہیں۔ فائل ان کے حوالے
کر دوں گا۔"
"یہ مزید عقلمندی کی دلیل ہوگی" میں نے کہا۔ "پہلے
پانچ لاکھ چھوڑ دیے پھر فائل تحفے میں دے دی۔"
"یہ تحفہ پا کے وہ خوش نہیں ہوں گے" شیخ نے ہنس
کر کہا اور فائل کھول کر مجھے دکھائی۔
میں بھونچکا رہ گیا۔ فائل میں وہ کاغذ ضرور موجود تھا جس
پر میں نے ابھی کچھ دیر پہلے دستخط کیے تھے لیکن باقی فائل کی
ضخامت بے مصرف صفحات پر مبنی تھی۔ درمیان میں ردی اخبار
تہہ کر کے لگا دیے گئے تھے۔
"اصل فائل کہاں گئی؟" میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا۔
"اب بتاؤ جو لوگ عقلمند ہوتے ہیں یا پٹھان؟" شیخ نے
ایک ٹیکسی کو روکتے ہوئے کہا۔
"میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں" میں نے کہا۔ "تم یہ
نقلی فائل لیے پھر رہے ہو خطرہ تو پھر بھی ہے۔ جو اس نقلی
فائل کو اصل سمجھ کے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے وہ تمہیں کوئی
رعایت نہیں دیں گے اور جب انھیں اپنے بے وقوف بننے کا
اور اپنی ناکامی کا احساس ہوگا تو وہ مزید مشتعل ہو جائیں گے۔" میں بھی
ٹیکسی کی پچھلی والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔
"رات کو میں نے اس صورت حال پر ہر پہلو سے غور کر
لیا تھا" شیخ نے کہا۔ "مجھے تو رات کو بھی اندیشہ تھا کہ کہیں اس
فائل کے لیے صبح ہونے سے پہلے ہی خریدار نہ آ جائیں چنانچہ پہلا
کام تو میں نے یہ کیا کہ فائل اپنے ساتھ والے گھر میں رکھوا دی۔
ایک لفافے میں بند کر کے اور لفافے کو بریف کیس میں مقفل
کر کے۔ پھر ساری رات میں نے یہ فائل تیار کی۔ اس کے علاوہ
میں نے تھانے سے دو مسلح سپاہی بلوائے جو آگے پیچھے پہرہ دیتے
رہے۔ خود میں بھی جاگتا رہا اور میرا ریوالور تکیے کے نیچے موجود رہا
ممکن ہے کہ کوئی آیا ہو اور یہ حفاظتی انتظامات دیکھ کر لوٹ
گیا ہو۔"
"اگر تم سادہ کپڑوں میں لوگوں کو چھپا دیتے تو شاید کوئی
تمہارے ہاتھ لگ جاتا" میں نے کہا۔
"یہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا" شیخ نے کہا۔ "لیکن میں نے
دوسرے امکانات پر غور کیا۔ مثلاً یہ کہ وہ بھی مسلح ہو کے آتے اور
خود کو محصور دیکھتے تو ایک خونریز جنگ کے بعد یا تو مر جاتے
یا کسی کو مار دیتے۔ میں خون خرابا نہیں چاہتا تھا اور یہ بھی واضح
کر دینا چاہتا تھا کہ ایک پولیس افسر اپنی حفاظت کر سکتا ہے۔ وہ
کھلی جنگ نہیں لڑ سکتے۔ صبح میں نے والد سے کہا کہ جب میں نکل
جاؤں تو آدھے گھنٹے بعد آپ پڑوس کے گھر جائیں۔ وہاں سے
بریف کیس لیں اور ان سے کہیں کہ اپنی گاڑی میں آپ کو کورٹ
پہنچا دیں۔ ان سے ہمارے پرانے مراسم ہیں اور ایک زمانے میں یہ
پڑوسی میرے والد کا شاگرد رہا تھا۔ وہ انکار کر ہی نہیں سکتا۔ کورٹ
جانے کے بعد وہ بریف کیس رابعہ قادری ایڈووکیٹ کے حوالے کر دیں
اور لوٹ آئیں۔ بار روم سے مس رابعہ قادری کا پتا چل جائے گا۔ وہ
نہ ملیں تو عبدالودود منظر نام کے ایڈووکیٹ سے مل لیں اور انھیں
ساری بات بتا دیں۔ پھر میں پہنچ جاؤں گا اور اگر نہ بھی پہنچا تو
فائل بہرحال عدالت کی تحویل میں پہنچ جائے گی۔ ایک مرتبہ
ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج اس محترمہ کے لکھے ہوئے بیان کو پڑھ
لے اور میرا بیان سن لے۔ میں گزشتہ شب ٹیلی فون پر ہونے والی
گفتگو کا ذکر بھی کروں گا اور میرے والد بھی بیان حلفی داخل کریں گے

ہے اس کے بعد کوئی خطرہ نہیں۔"
"لیکن شیخ — وہ عزیز..."
ابھی میرا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک زبردست دھماکا
ہوا۔ ڈرائیور نے سخت کوشش کر کے ٹیکسی کو بے قابو ہونے
سے بچا لیا مگر اسے ایک دیوار کے ساتھ ٹکرانے سے
نہیں بچا سکا۔ میں اور شیخ تصادم کے بعد ایک دوسرے پر
گرے مگر فوراً سنبھل گئے۔ میرے کانوں میں ہیڈلائٹس اور
سامنے کے ونڈ اسکرین کا شیشہ ٹوٹ کر بکھرنے کی آواز آئی اور
شیشے کے ذرے اڑ کر اندر آئے۔ مجھے ذرا سی دیر کے لیے ٹیکسی
ڈرائیور کا لہولہان چہرہ دکھائی دیا پھر میں نے وہ جیپ دیکھی
جس نے سائڈ روڈ سے آ کے ٹیکسی کو ٹکر ماری تھی۔ یہ پرانی جیپ
بہت ہی کم مضبوط تھی لیکن اس کے سامنے جیپ کے اوپر لوہے
کی سلاخوں سے بنی ہوئی جالی لگا دی گئی تھی۔ بظاہر اس کا مقصد
ہیڈلائٹس یا جیپ کے سامنے والے حصے کی حفاظت کے
انتظام کے سوا کچھ نہ تھا مگر میں نے دیکھا کہ لوہے کی
سلاخیں سامنے کی طرف موڑ دی گئی ہیں اور ان کا اگلا حصہ نوکیلا
ہے۔ جیپ کی چوڑائی کے رخ پر ایک ایک فٹ لمبے بھالے سے
نکلے ہوئے تھے کہ جیپ دیوار سے ٹکرائی تو دیوار میں پیوست
ہو جائے۔ انھوں نے ڈرائیور کی سائڈ سے ٹکر ماری تھی —
ان کا نشانہ پیچھے والا دروازہ ہوگا لیکن ذرا سے فرق
کے باعث سلاخیں ڈرائیور کی سائڈ والے حصے میں انجن کے
[illegible] میں اور ایک [illegible] میں گھس گئیں۔ [illegible] ہوتے ہی
[illegible] سے تھوڑا سا جھٹکا لگا اور ڈرائیور کی سائڈ کا دروازہ
[illegible] گیا تھا۔ اس میں سلاخوں سے سوراخ بھی ہوتے تھے
ڈرائیور بال بال بچ گیا تھا۔ خود میں نے جب اس طرف سے
دروازہ کھول کے باہر نکلنے کی کوشش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ پچھلے
دروازے کو بھی ایک سلاخ نے سیل کر دیا ہے۔ میں اور شیخ تقریباً
ساتھ دوسری طرف سے باہر نکلے۔ میرا خیال تھا کہ شیخ نے
ریوالور نکال لیا ہوگا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ جیپ میں
سوار دو افراد نے ہمارا راستہ اس طرح روک لیا کہ ہم
[illegible] دیوار سے لگ گئے۔ وہ دونوں قد و قامت میں ہم سے
بڑے تھے مگر اصل خطرے کی بات یہ تھی کہ ایک چند قدم پیچھے
[illegible] اس نے ایک ہاتھ میں ریوالور پکڑ رکھا تھا جس کا رخ
ہماری طرف تھا۔ دونوں نے منہ پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔
"انسپکٹر صاحب! یہ فائل" آگے رہنے والے نے ہاتھ
بڑھایا مگر وہ اب بھی ہم سے کافی دور تھا۔
"لیکن... تم نے پانچ لاکھ... کل میری بات ہوئی
تھی" شیخ نے ہکلا کر کہا۔
اس شخص نے قہقہہ مارا اور پھر شیخ کو ایک گالی دی۔
"وہ کل کی بات تھی۔ کل کے ساتھ گئی۔"
"یہ... یہ تو بڑی زیادتی ہے" شیخ نے مظلوم بن کے
فریاد کی۔ یہ سب اداکاری تھی۔ "چلو ایک لاکھ ہی دے دو۔"
"کچھ نہیں چاہیے۔ فائل پھینک ادھر" اس نے مزید
غلاظت کا اضافہ کیا۔
شیخ نے فائل اس کی طرف پھینک دی جسے اس نے بڑی
پھرتی سے اٹھا لیا۔ اس کا دوسرا ساتھی ایک لمحے کے لیے بھی غافل
نہیں ہوا۔ میں ذرا بھی مستعدی دکھاتا تو وہ یقیناً گولی چلا دیتا۔ اس
کی نیت کا اندازہ اس کی آنکھوں سے ہو رہا تھا۔ شاید اسے اچھی
طرح بریف کر دیا گیا تھا کہ انسپکٹر کے پاس تو خیر ریوالور ہوگا ہی
مگر اس کے ساتھ جو شخص خالی ہاتھ ہوگا وہ زیادہ خطرناک ہے
اسے موقع دیا تو وہ پلک جھپکتے میں گردن توڑ دے گا۔ میں
نے اور شیخ نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنے
حریفوں کو کامیابی پر مسرور ہونے کا موقع دیا۔
اچانک ایک کار نمودار ہوئی۔ جہاں ہم مجبور بنے کھڑے
تھے وہاں سے بچ کے گزرنے والا کوئی نہ تھا چنانچہ اس کار
کو دیکھ کر مجھے تھوڑی سی خوشی ہوئی مگر یہ خوشی پل بھر کی بھی
نہ تھی۔ کار پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ نمبر نوٹ
کر کے ایک گواہ تو پیدا کر لوں گا جو بعد میں چشم دید واقعات
بیان کر سکے گا۔ کار سیدھی ہمارے سامنے آ رکی۔ فائل والا
ایک ایک قدم پیچھے ہٹا اور کار کے ڈرائیور نے اس کے لیے
پچھلا دروازہ کھول دیا۔ اس نے کار میں بیٹھتے ہی ریوالور کھڑکی
سے باہر نکالا اور اپنے دوسرے ساتھی کو واپسی کا حکم دیا۔ دوسرا
شخص دوسری طرف سے کار میں جا بیٹھا۔ کار ایک جھٹکے سے روانہ
ہوئی اور حیرت انگیز رفتار سے سیدھی اس سڑک پر دوڑنے لگی
جس پر ہم پیدل چل کے آئے تھے۔ اس کے بعد شیخ نے بڑی
تیزی سے ریوالور نکالا اور کار کے ٹائروں کا نشانہ لے کر فائر
کیا مگر اس کی گولی کے نکلنے سے چند سیکنڈ قبل فرار ہونے والے
مجرموں نے کھڑکی میں سے کوئی چیز باہر پھینکی جو چھوٹا سا بم لگ کے
دھماکے سے پھٹی اور دھوئیں کا ایک گہرا سیاہ بادل اٹھا جس نے
کار کو ہماری نظروں سے چھپا لیا۔ اس کثیف دھوئیں کے پار
دیکھنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کسی ایک فٹ موٹی دیوار کے پار دیکھنا۔
شیخ کا نشانہ خطا ہو گیا۔ وہ بے اختیار پیچھے دوڑا مگر میں نے
اسے روک لیا۔
"پاگل ہوئے ہو۔ وہ بہت دور جا چکے ہیں" میں نے

www.paksociety.com

کہا۔ ”ہم ان کا پیچھا نہیں کر سکتے۔ جتنی دیر میں ہمیں کوئی سواری ملے گی، وہ میلوں دور جا چکے ہوں گے۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے نکل چلو۔ لوگ جمع ہو رہے ہیں۔“

”مگر مجھے اس حملے کی رپورٹ دینی ہے۔“ شیخ نے برہمی سے کہا۔ ”انھوں نے جان بوجھ کے ٹکر ماری تھی۔“

”مجھے بھی معلوم ہے لیکن اس کا ثبوت؟“ میں نے کہا۔ ”کیوں خود کو بلاوجہ اس حادثے میں ملوث کرتے ہو۔ عقل سے کام لے کر جان تو بچالی تھی اور فائل بھی، اب مصیبت میں کیوں۔۔۔“

”تمھارا مطلب ہے میں اس ٹیکسی ڈرائیور کو یہیں چھوڑ کے چلا جاؤں، اسی حالت میں؟“

”ڈرائیور کو صرف خراشیں آئی ہیں اور وہ بھی منہ پر شیشہ ٹوٹنے سے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ کچھ دیر بعد ہوش میں آ جائے گا۔“

”اور ہوش میں آتے ہی وہ بیان دے گا کہ مجھے ایک سب انسپکٹر نے روکا تھا۔“ شیخ بولا اور ریوالور جیب میں رکھ لیا۔

”کس سب انسپکٹر نے؟ وہ تمھارا نام تو نہیں جانتا۔“ میں نے کہا۔ ”وردی میں سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ ہم اپنے اپنے گھروں سے بہت دور ہیں۔ وہ میرا حلیہ بھی لکھوائے گا۔ تو کیا پتا چلے گا؟“ میں نے اسے اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔

”مگر اس کی ٹیکسی کا بہت نقصان ہوا ہے۔“ شیخ نے کہا۔ ”اس کا ذمے دار میں ہوں۔“

”زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار میں ٹیکسی ڈینٹ پینٹ ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”یہ رقم ہم اسے بعد میں بھجوا دیں گے۔ جیپ جس نے ٹکر ماری تھی، یہیں پھنسی ہوئی ہے اور اس پر نمبر پلیٹ بھی ہے۔ اس علاقے کے تھانے کو تفتیش کرنے دو۔ یا تو وہ جیپ والے کا سراغ لگا لیں گے، ورنہ کیس فائل کر دیں گے۔ ہو سکتا ہے جیپ چوری کی ہو یا کسی کی بھی نہ ہو۔ فرضی نام پتے پر رجسٹرڈ ہو۔ ابھی یہاں کوئی چشم دید گواہ نہیں۔ لوگ جو کچھ جمع ہو رہے ہیں مگر وہ ادھر بھی آ جائیں گے پیچھے ہم پھنس جائیں گے اور وقت پر عدالت میں حاضر نہیں ہو سکیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میری ضمانت خود بخود منسوخ ہو جائے گی۔ عدالت میں پہنچ کے تم اپنا مفصل بیان لکھواتے ہو لیکن دیکھو، حادثے کا ذکر کرکے مشکل میں پڑنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اطمینان سے عدالت میں وہ فائل پیش کر دو اور یہ ظاہر کرو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ پھر دیکھنا اس ناکامی سے مجرم کتنے پیچ و تاب کھاتے ہیں لیکن پھر وہ کچھ نہیں کر سکیں گے۔ تیر ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔“

شیخ آہستہ آہستہ میری باتوں سے قائل ہونے لگا۔ ہم اب جائے حادثہ سے اگلا موڑ کاٹ کر مال پر آ گئے تھے۔ وہاں ہمیں ایک رکشا ملا اور ہم اس ملعون حادثے [illegible] کے بعد پھر ضلع کچہری کی جانب روانہ ہو گئے۔

یہ عجیب ہنگامہ خیز دن تھا۔ ایک رات کے ختم ہونے سے پہلے دو افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان میں ایک بوڑھی اور مفلوج عورت تھی جو کسی جرم کے مفہوم سے بھی آشنا نہ تھی۔ شاید وہ سمجھتی ہوگی کہ جھوٹ بولنا جرم ہے، امانت میں خیانت جرم ہے، کسی کا دل دکھانا جرم ہے۔ یہ باتیں پرانے لوگ کہتے تھے اور پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی تھیں اور آج بھی غلط نہ تھیں مگر منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ، بردہ فروشی اور بطور پیشہ قتل کرنے یا کرانے اور اس نوعیت کے سنگین جرائم کے مقابلے میں یہ باتیں کس قدر عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ شاہد کی ماں کو سمجھایا جاتا تب بھی وہ نہ سمجھتی کہ ڈی سلوا اور چوہدری دلاور کیا کرتے ہیں اور کیوں کرتے ہیں اور اس نے مرنے سے پہلے بہت سوچا ہوگا کہ مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے اور یہ سزا دینے والے کون ہیں مگر کوئی جواب اس کی عقل میں آنے سے پہلے موت کا بلاوا آ گیا ہوگا۔ خود ڈی سلوا نے اس کے برعکس سوچا بھی نہ ہوگا کہ اگلا لمحہ اس کے اختیار سے باہر موت کو [illegible] کرنے کے بعد آئے گا۔ وہ اپنی قوت اور ذہنی و جسمانی صلاحیت پر نازاں کامل اعتماد کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پر کامیابی کی طرف ایک اور قدم اٹھا چکا تھا اور اب اس وقت جبکہ میں، شیخ اور ہم جیسے دنیا کے تمام انسان بدستور کاروبارِ حیات میں مصروف تھے کیونکہ وہ زندہ تھے اور یہ دنیا اسی طرح وقت کے [illegible] مطابق سورج کے گرد گھوم رہی تھی، ڈی سلوا کا بے حس وجود ڈی کمپوز ہونے لگا تھا۔ زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب۔ موت کیا ہے انھی اجزا کا پریشاں ہونا۔ معلوم نہیں کہاں لکھا تھا کہ آدمی کے جسم میں ستر فیصد پانی ہے جو بخارات بن کے فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ باقی جسم کے کیمیائی اجزا کیلشیم، فاسفورس، فولاد وغیرہ کی قیمت ساڑھے چھ ڈالر بنتی ہے۔ گویا ڈی سلوا بھی ساڑھے چھ ڈالر کے نوٹ کی طرح پھٹا ہوا [illegible] اور قانون کے نگہبان صرف یہ جاننے کی فکر میں ہوں گے کہ نوٹ آخر پھٹا کیسے؟

”کیا سوچ رہے ہو؟“ شیخ نے میرا شانہ ہلا کے کہا۔ ”تم نے کچھ پوچھا تھا؟“

میں بری طرح چونکا۔ ”اوہ۔ معاف کرنا میرا ذہن [illegible] پیش آنے والے واقعات میں الجھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس وقت تمھارے پاس اصل فائل ہوتی تو تم کیا کرتے؟“

”ظاہر ہے میں اس کی حفاظت کرتا، جب تک ممکن ہوتا۔“ شیخ بولا۔

”یہ تمھاری دانشمندی یا دور اندیشی کے علاوہ تائیدِ ایزدی بھی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر وہ اسی وقت فائل کھول کے دیکھ لیتے تب بھی شاید صورت حال مختلف نہ ہوتی مگر اب تو معاملہ نازک ہو گیا ہے۔ مارے وہی جائیں گے جو ہمیں مارنے آئے تھے۔ بڑے فخر سے اپنے کامیاب مشن کی رپورٹ دیں گے اور سند کے طور پر فائل پیش کر دیں گے۔ اس کا جو انعام انھیں ملے گا وہ ظاہر ہے۔“

”یہ ہو سکتا ہے کہ وہ دوبارہ کوشش کریں، عدالت پہنچنے سے پہلے۔“ شیخ نے کہا۔

”نہیں۔ وہاں وہ بے بسی سے تماشا دیکھ سکتے ہیں، کچھ نہیں کر سکتے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تو ناممکن ہے کہ اس کا فوری ردعمل ظاہر کرنے کے لیے وہ تمھیں خدانخواستہ تمھارے والد کو اغوا اور [illegible] سے کسی کو شوٹ کر دیں۔ البتہ مجھے اب اس عزیز کی طرف سے تشویش لاحق ہو گئی ہے۔“

”تشویش کیسی؟ عدالت میں اسے کچھ تو کہنا ہی پڑے گا۔ جھوٹ یا سچ۔“ شیخ نے کہا۔

”ہاں۔ بشرطیکہ وہ عدالت پہنچا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے تو چوہدری صاحب نے بھی کہا تھا کہ عزیز بیان ضرور دے گا اور اسے [illegible] کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ [illegible] اسے اپنے پاس بلوا لیں گے یا میرا خانہ خراب کر دیں گے [illegible] زبانی دعوے ہیں جو غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عزیز غائب ہو جائے۔“

”غائب ہو کے وہ کہاں جائے گا؟“ شیخ نے کہا۔ ”اور کتنے دن غائب رہے گا؟“

”یار شیخ، پھر وہی کم عقلی کی باتیں۔“ میں نے کہا۔ ”ارے بھائی اس دنیا میں سب تو ایسے آئیڈیلسٹ نہیں ہیں اور ان کے [illegible] ایسے کہاں ہوتے ہیں جو زندگی کو اصولوں کی بنا میں [illegible] یہ بھی تسلیم کر لیں کہ ایمان کے لیے جان دینا کوئی گھاٹے کا سودا نہیں [illegible] عزیز گھاٹے کا سودا کیوں کرے گا۔ اس سے تو صحیح [illegible] ہے کہ وہ پانچ لاکھ ٹھکرا دے گا اور اپنی زبان بند رکھے گا۔ وہ پانچ لاکھ لے کر بیوی بچوں سمیت پاکستان سے [illegible] ہو جائے گا اور اس کی مدد کرنے والے بھی بہت [illegible] اسے کوئی دشواری پیش نہیں آنے دیں گے۔ بچانے والوں نے اسے یہ بھی سمجھا دیا ہوگا کہ وہ صرف مدد کے علاوہ بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں اور پانچ لاکھ دے سکتے ہیں تو جان بھی لے سکتے ہیں، ملک سے باہر پہنچا سکتے ہیں جہاں کوئی اس سے سوال کرنے والا نہ ہو لیکن وہ نہ مانے تو اسے عدم آباد بھی پہنچانا مشکل نہیں۔ عزیز غریب اور کم ہمت آدمی ہے۔ پہلے بھی کہہ چکا تھا کہ اسے بیرسٹر سے ڈر لگتا ہے۔ ڈی سلوا اور چوہدری دلاور جیسے لوگوں کا مقابلہ کرنے کی وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”اگر اس نے میرے بیان کی تائید نہ کی تو میری گواہی قابلِ اعتبار نہیں رہے گی۔“ شیخ نے مایوسی سے کہا۔ ”الزام پھر مجھ پر ہی آئے گا کہ میں نے تمھاری ناجائز مدد کی اور ایک ماتحت سے زبردستی وہ تحریر لکھوائی۔ مگر تم نے کسی اور کا ذکر بھی تو کیا تھا؟“

”استاد ٹیڈی کا۔“ میں نے کہا۔ ”محسن اسے تلاش کرنے نکلا ہے۔ مل گیا تو سیدھا عدالت میں حاضر کر دے گا۔“

”مجھے اب بھی یہ خیال پریشان کر رہا ہے کہ مجھے اس ٹیکسی ڈرائیور کو اس حال میں چھوڑ کے نہیں آنا چاہیے تھا۔“ وہ بولا۔

”خدا کا شکر ادا کرو شیخ کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا اور مالی نقصان بھی برائے نام ہوا۔“ میں نے کہا۔ ”تم قتل نہیں ہوئے اور ایک فائل کو بچانے کے لیے بیرسٹر یا تمھارے ہاتھوں کوئی مارا نہیں گیا۔ حملہ آوروں کو بھی صرف فائل کے حصول کا حکم تھا اور خونریزی سے اجتناب کی تاکید تھی۔ جہاں اس وقت وہ ٹیکسی کھڑی ہے وہاں لاشیں پڑی ہوتیں۔ تم مارنے والوں میں ہوتے تو تمھارا شمار قاتلوں میں ہوتا اور تم معطل ہو جاتے۔ جو تمھارے بدخواہوں کی خواہش کے عین مطابق ہوتا۔ یہ بھی خدا کی مرضی تھی کہ حادثے میں کسی کو گزند نہ پہنچے ورنہ لوہے کی وہ سلاخیں جو [illegible] تمھارے یا اس ٹیکسی ڈرائیور کے جسم کے پار بھی ہو سکتی تھیں۔“

”تمھیں یقین ہے کہ وہ صرف بے ہوش تھا؟ فرض کرو اس کے سر کی چوٹ مہلک ثابت ہوئی؟“

”چوٹ اس کے سر میں نہیں آئی تھی اور نہ کوئی گہرا زخم تھا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ صدمے کے عارضی اثرات سے بے ہوش تھا اور اب تک یقیناً ہوش میں آ گیا ہوگا۔ لوگ جائے حادثہ پر پہنچ چکے ہوں گے۔ اسے اسپتال پہنچا دیا جائے گا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ مجرموں نے فرار ہوتے وقت دستی بم نہیں پھینکا۔ صرف دھواں پھیلانے والا گولا چھوڑ دیا اور اس اسموک اسکرین کی پناہ میں فرار ہو گئے۔ اسی اسموک اسکرین یا دھوئیں کی دیوار نے ہمیں بھی نکل آنے کا موقع فراہم کیا اور کسی نے ہمیں دیکھا نہیں۔“

”لوگوں کی بے حسی پر مجھے حیرانی ہوتی ہے۔“ شیخ بولا۔ ”حادثے کے بعد اس وقت جب ملزم ہمیں ہینڈز اپ کرائے کھڑے تھے

www.paksociety.com

اس جگہ سے تین افراد گزرے تھے۔ تم نے نہیں دیکھا مگر میں نے دیکھا تھا۔ ایک موٹر سائیکل والا ایک سائیکل سوار اور ایک پیدل۔ مگر وہ سب ایسے نظر چرا کے بھاگے جیسے خود مجرم ہوں۔"

"ہر شریف آدمی گواہی کے چکر میں پڑنے سے گریز کرتا ہے شیخ۔" میں نے کہا۔ "بھلا جو شخص گھر سے نوکری پر جانے یا دکان کھولنے یا محنت مزدوری کرنے نکلا ہو، وہ خواہ مخواہ اس قسم کے معاملات میں پڑ کے مشکل میں گرفتار کیوں ہو۔ بعد میں کیس تو نہ جانے کب تک چلے گا۔ اسے تفتیش میں خوار ہونے کے بعد ہر تاریخ سماعت پر حاضری کے لیے دفتر سے چھٹی کرنی پڑے گی۔ دکان بند رکھنی ہوگی یا ایک دن کی روزی قربان کرنی پڑے گی۔ چشم دید گواہ تو مصیبت میں پڑ جاتے ہیں۔"

رکشا ضلع کچہری کے احاطے میں رکا تو میں نے کرایہ ادا کیا۔ رکشا والے نے خاصی حیرانی سے اور کچھ پریشانی کے بعد کرایہ قبول کیا۔ اس کے لیے بھی یہ ایک نیا تجربہ ہوگا کہ کوئی پولیس افسر وردی میں ہونے کے باوجود مفت میں رکشا کی سواری نہ کرے۔

"اب آخری بار سچ بولو شیخ!" میں نے کہا۔ "ہمارے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ تمہاری صورت میں یارو سچ رہے ہیں پولیس افسر بن جاؤ جو قتل کے ایک ملزم کو لے کر عدالت پہنچا ہے۔ ہمارے چلے سے کچھ پتا نہیں چلتا پھر ہمیں کسی کو کچھ بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بھی نہیں کہ ہم گھر سے رکشا میں بیٹھے اور یہاں آگئے کوئی بھلا ہم سے کیوں پوچھے گا کہ آپ لوگ کس طرح پہنچے؟"

"اتنا بڑا جھوٹ میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں بولا تھا مکندر!" وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"زندگی میں ابھی تم نے بہت کچھ نہیں کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میری طرح تجربات کی بھٹی سے نکلو گے تو زمانے کے گرم و سرد کو سمجھ لو گے اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹ اور سچ محض حالات کے پیمانے ہیں اور یہ دوسروں کا نقطۂ نظر ہے جو سچ اور جھوٹ کے درمیان فرق پیدا کرتا ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تم جانتے ہو کہ عبدل نے تمہیں فون کیا تھا اور یہ بتا دیا تھا کہ پسج کیا ہے۔ مگر اتنا بڑا سچ دوسروں کے نقطۂ نظر سے جھوٹ ثابت ہو رہا ہے۔ سچ یہ بھی ہے کہ میر شرافت علی کو میں نے قتل نہیں کیا تھا مگر اسے جھوٹ ثابت کرنے والے زیادہ مستعد ہیں۔ سچ تو یہ بھی ہے کہ میرے باپ کو بلیک میل کرنے والوں نے عزت اور بے بسی کی بدترین موت عطا کی مگر سچ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نے سالِ رواں میں ساڑھے تین لاکھ کا منافع وصول کیا تھا اور اپنے دشمنوں سے۔ مگر اب اس کی اولاد ہی نہیں جو اس جھوٹ کی تردید کر سکے۔ ہم اس ٹیکسی والے کی مدد سامنے آئے بغیر بھی کر سکتے

ہیں۔ سامنے آنے اور سچ بولنے سے اس کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا تمہارا انجام وہی ہوگا جو فرض شناس اور ایمان دار کے کاموں کا بھی اچھا نہیں ہوا۔"

شیخ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی حالت سے پہلے اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے دلائل سے اس کے ضمیر کی پھانس کا کانٹا نہیں نکلا اور اس وقت تک وہ اضطراب کے شکار سے پریشانی کے احساس میں مبتلا رہے گا جب تک اسے معلوم نہیں ہو جائے گا کہ ٹیکسی والا خیریت سے ہے۔ بار روم میں پہنچ کے میں نے مس رابعہ قاری سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ وکیلوں کو بلانے کی خدمت پہ مامور آدم بیزار شخص نے اشتہار کام قسم کے ایک نعرے میں پکارا۔ "مس رابعہ قاری... مس رابعہ قاری!" اور پھر مجھ سے کہا کہ ہم انتظار کریں۔ وہ آ رہی ہیں۔ بار روم میں عام آدمی کا داخلہ ممنوع تھا چنانچہ اس کے سامنے موکلوں کا اور ملاقاتیوں کا ایک اجتماع تھا۔ وہ ایک وکیل کو پکار کے فارغ ہوتا تھا تو دوسرے لوگ اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے کہ فلاں وکیل صاحب کے بارے میں معلوم کرو، عدالت میں ہیں یا بار روم میں بیٹھے ہیں۔ اس کی آدم بیزاری درست تھی۔ کم سے کم دس افراد اس کے سامنے کھڑے مختلف ناموں کی گردان کر رہے تھے۔

پانچ منٹ بعد رابعہ نمودار ہوئی۔ "بہت دیر کردی آپ لوگوں نے آنے میں۔" وہ بولی۔ "عدالت میں بڑی مشکل سے گیارہ بجے کا وقت لگوایا ہے۔"

"مگر ابھی تو دس بھی نہیں بجے۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"تمہیں یہاں نو بجے موجود ہونا چاہیے تھا۔" وہ برہمی سے بولی۔ "اگر دلاور اینڈ کمپنی کی کوشش سے پہلا نام تمہارا ہی پکارا جاتا اور کاز لسٹ میں سر فہرست ہوتا تو تم کیا کرلیتے۔ تمہاری ضمانت منسوخ ہو جاتی۔"

"آئی ایم سوری۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تمہیں کس نے ذکول بریف کیس پہنچایا ہے؟"

"ہاں۔ ایک بزرگوار تشریف لائے تھے۔" رابعہ نے کہا۔ "میں نے تو دیکھا بھی نہیں۔ یہاں ریسپشن میں بریف کیس دے گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ میرا بیٹا آ کے لے لے گا۔ کیا ہے اس میں؟ اور وہ کون صاحب تھے؟"

"وہ انسپکٹر شیخ کے والد تھے۔" میں نے کہا۔ "تم نے بریف کیس کھول کے دیکھا ہوتا تو تمہیں معلوم ہو جاتا کہ اس میں کیس فائل ہے جس میں عزیز کے ہاتھ کا لکھا ہوا عبدل کا بیان بھی لگا ہوا ہے۔"

"میں کیوں کھول کر دیکھتی۔" رابعہ نے کہا۔ "جیسا کہ مجھے بھی بتا دیا گیا تھا کہ... کہ لینے کوئی اور آئے گا۔ آخر کیس فائل کی

ضرورت پہنچانے کی ضرورت کیا تھی؟"

"اگر شیخ صاحب نے عقلمندی سے کام نہ لیا ہوتا تو وہ تحریر اب تک دشمنوں کے ہاتھ میں پہنچ چکی ہوتی۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے اس کا سودا کرنے کی کوشش بھی کی تھی اور انسپکٹر صاحب کو خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دی تھی۔"

"اچھا تم ابھی عدالت میں پہنچو اور باہر ٹھہرو۔" رابعہ نے کہا۔ "مظہر صاحب بھی وہیں ملیں گے۔ میں آتی ہوں۔ وہ بریف کیس بار روم ہی میں پڑا ہے۔ میں وہ بریف کیس تو اٹھا نہیں سکتی۔ میں فائل نکال کے اپنے بریف کیس میں رکھ لوں گی۔"

"رابعہ وہ فائل عدالت کی تحویل میں دینی ہے۔ پوری فائل بلکہ وہ بیان جو عزیز نے لکھا تھا اس کی اصل عدالت کے ریکارڈ میں ہے کی تو محفوظ ہوگی۔"

"وہ عزیز بھی آیا ہے کہ نہیں؟" رابعہ نے کہا۔ "اس کی تائید یا تردید بغیر وہ تحریر... اتنی اہم نہیں رہتی۔"

"کیوں اہم نہیں رہتی؟" میں نے کہا۔ "اگر وہ آیا تو اس کو اب بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اس نے یہ بیان خود چپ سے کاغذ پر لکھا تھا جو بعد میں غائب ہو گیا تھا۔ نہ آیا تو ہم اس کے نمونے اور تھانے سے اس کی تحریر کے نمونے حاصل کرلیں گے جس سے ثابت ہو جائے گا کہ لکھنے والا وہی تھا اور میرا خیال ہے کہ دوسرا طریقہ ہی اختیار کرنا پڑے گا۔ عزیز کے آنے کا ذرا بھی امکان نظر نہیں آتا۔"

"اور تمہیں وہ استاد میڈی۔ وہ تو آئے گا؟" رابعہ نے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "محسن اسے تلاش کرنے کے لیے پہلے نکل گیا تھا۔"

"مس رابعہ!" شیخ نے کہا۔ "ایک مشکل پیش ہے۔ ضمانت کی منسوخی کی درخواست پر سماعت نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے میڈی کو نہ لایا تو مقدمہ پیشی پر آ جائے گا۔ اس کے لیے کافی وقت ملے گا اور اصل مسئلہ ہے اور عبدل کے قتل کا چالان ہی ابھی تک پیش نہیں کیا گیا ہے۔"

جب وہ رابعہ سے بات کر رہا تھا تو میری نگاہیں چاروں طرف کسی شناسا چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے سرگرداں تھیں۔ کیونکہ ہجوم میں مجھے جانے پہچانے دشمنوں کی صورت کہیں دکھائی نہیں دی۔ ہر طرف وہ لوگ تھے جو کسی مقدمے کی تاریخ سماعت پر اپنے ساتھ آئے تھے گواہ تھے، ملزم تھے، کچھ صرف جھگڑا بلکہ ہتھکڑیاں پہنے پاؤں میں بیڑیوں کے ساتھ ان کو گھیرے رکھنے والے سپاہی تھے جو زنجیر کا دوسرا سرا اپنی وردی کی بیلٹ سے باندھے اور ملزم کو چائے اور ناشتے یا سگریٹ وغیرہ پہنچ

کی رعایت دینے کا نذرانہ ان کے عزیزوں دوستوں سے وصول کر رہے تھے۔ وکیل اور ان کے منشی اور ایجنٹ تھے اور اس گہما گہمی کو دیکھ کر اندازہ یہ ہوتا تھا کہ قانون کے محافظ کتنی مستعدی سے انصاف فراہم کرنے کے عمل میں کوشاں ہیں جبکہ درحقیقت کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وکیلوں کی معرفت ریڈر سے پیشی دینے یا نہ دینے کا فیصلہ اس معاوضے کی بنیاد پر کر رہے تھے جو ان کو سب کی نظر بچا کے مگر سب کے سامنے دیا جا رہا تھا۔ گواہوں کو سبق پڑھایا جا رہا تھا کہ ان کو کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے یا اظہارِ حقائق سے باز رہنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ فیس کا آدھا حصہ پیشگی وصول کر لینے والے اپنے موکلوں کو یقین دلانے میں مصروف تھے کہ پہلی پیشی میں فیصلہ ان کے حق میں ہو جائے گا۔ دور دراز مقامات مضافات اور دیہات سے آئے ہوئے پورے پورے خاندان کسی ایک اسیر کی خاطر خوار و زبوں تھے اور برآمدوں میں اور خشک بے وجود گھاس کے تختوں پر ڈیرے ڈالے بیٹھے تھے اور ملزم سے زیادہ مظلوم لگتے تھے۔ یہ کہاں روزِ مکافات ہے خدائے دادگیر!

جس عدالت میں مجھے پیش ہونا تھا وہاں کا نقشہ بھی مختلف نہ تھا اور فلموں میں دکھائے جانے والے مناظر سے قطعی مختلف تھا۔ سیلن زدہ دیواروں اور اونچی چھتوں والے کمرے نیم تاریک تھے جن میں پرانی خستہ حال بنچوں اور کرسیوں پر لوگ زندگی سے بیزار بیٹھے تھے۔ انگریزوں کے وقت کا لٹکایا ہوا پنکھا جیسے تھک چکا تھا کہ اب بادل ناخواستہ گھومنے پر مجبور تھا۔ کمرے کی الماریاں اور اس میں ٹھونسی ہوئی فائلوں کو دیکھ کر کسی سرکاری دفتر کا گمان ہوتا تھا۔ ریڈر کے گرد موکلوں اور وکیلوں کا اژدحام تھا اور ایک سیدھی سادی میز جس پر ہوتے کے اسٹینڈ والا چھوٹا سا جھنڈا موجود تھا تقریباً خالی پڑی تھی۔ اس کے پیچھے والی کرسی بھی خالی تھی جس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کرسی پہ رونق افروز ہونے والا منصف ابھی اپنے چیمبر میں ہے۔ عدالت اور چیمبر کے درمیانی دروازے پر ایک اتنا ہی میلا اور پرانا کپڑا بطور پردے کے استعمال ہو رہا تھا جتنا میز پر پھیلا ہوا میز پوش۔

میرا خیال تھا کہ وہاں میر محمد پہلے سے موجود ہوگا مگر اس کی جگہ میری ملاقات حشمت خان اور حوالدار بجلی سے ہوئی۔ حوالدار کے اضطراب و اشتیاق سے ظاہر ہوتا تھا کہ بقول شاعر۔

تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

اسے ایک اشارہ چاہیے پھر وہ مثلِ برقِ تپاں مجھ پر گرتا اور ملزم زیر دفعہ ضابطہ فوجداری ۳۰۲ ہونے کے باوجود اکڑ فوں دکھانے کا مزہ چکھا دیتا۔ میں نہ صرف یہ کہ گستاخانہ طور پر مسکرا رہا تھا بلکہ میں نے اس کے اعلیٰ افسر کو نظر انداز

www.paksociety.com

کر کے گزر جانے کی جسارت بھی کی تھی۔ حشمت خان نے خود مجھے روک لیا۔ "آ گئے ہو شہزادے! واپسی والا اپنے شیخ صاحب بھی ساتھ ہیں۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے کیا مگر میں نے اطمینان کے ساتھ جیب سے سگریٹ نکالی اور لائٹر سے جلائی۔ حشمت خان نے خفیف ہو کے ہاتھ کھینچ لیا اور حوالدار کی نظر میں تحقیر کی بجلی سی لہرائی۔ وہ اپنی خودی کو بلند رکھنے کی جدوجہد میں افسران بالا کو بھی نہیں بھولا تھا۔

"خیر سے اپنے سکندر صاحب کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔" وہ حوالدار سے مخاطب ہو کے بولا۔

"ایک بار آجائیں ہماری مہمانی کے لیے، ہم ساری ناراضگی دور کر دیں گے ان شاء اللہ۔" حوالدار نے خون کے گھونٹ پی کر کہا۔ پھر دلی تسکین کے لیے اس نے غیر معمولی پھرتی سے ایک قیدی کے منہ پر چانٹا مارا۔ "سگریٹ پیتا ہے عدالت میں' کھوتے دا..." ملزم مذکور بھونچکا رہ گیا کیونکہ اس نے یہ رعایت ایسے ہی حاصل نہیں کی تھی۔

"تم کہاں شتر بے مہار کی طرح پھر رہے ہو؟" میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا۔ "تمہارا وہ ایس ایچ او پھر کیوں نہیں آیا؟ الو کے پٹھے!" میں نے غور سے سگریٹ کو دیکھا۔

"کیا؟" حوالدار یوں اچھلا جیسے اس کو چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ "گالی... گالی دیتا ہے! ملزم؟"

"ہاں" میں نے اطمینان سے کہا۔ "میں سگریٹ بنانے والوں کو کہہ رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے بھوسہ بھر دیا ہے۔"

"وہ جی..." حشمت خان مجھے شکل باندھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "بڑے افسوس کی بات ہے..." اس نے کہنا شروع کیا۔

"ہاں۔ بھوسہ اس لیے تو نہیں ہوتا کہ سگریٹ میں بھرا جائے۔ آخر کچھ تو فرق ہونا چاہیے سگریٹ میں اور پولیس والوں کی کھوپڑی میں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔ شیخ بے نیازی سے دوسری طرف دیکھتا رہا۔

حوالدار بجلی پھر تڑپا۔ "پچھلی بار تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس بار پتا لگ گیا کہ بھوسہ کیسے بھرا جاتا ہے کہاں ہیں؟"

"ابھی ایس ایس پی صاحب آنے والے ہیں۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "انہیں بھی سمجھا دینا۔"

حوالدار بجلی کے غبارے میں سے ساری ہوا نکل گئی۔ حشمت خان نے اسے ملامت اور غصے سے دیکھا۔ "اوئے کھوتے! الو ہے اپنی ٹانگ مت اڑایا کر بیچ میں۔" حشمت خان نے حوالدار بجلی کی خودی کو انتہائی بلندی سے انتہائی پستی میں پہنچا کے کہا۔ "میں بات کر رہا تھا میر کی۔ بات یہ ہے اپنے سکندر صاحب کہ تا تو میر محمد ہی کو تھا۔ پکا ایس ایچ او تو خیر ابھی وہ نہیں بنا لیکن اسی طرح کام کر رہا ہے مگر مجھے اس کا پیغام ملا۔ ایک سگریٹ تو نکالیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اپنے پیسے سے کھاؤ پیو، حشمت خان! سگریٹ خرید کر پیو۔ تم میرے دوست تو نہیں ہو۔"

حشمت خان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بادل ناخواستہ اس نے جیب سے ایک اٹھنی نکالی اور حوالدار بجلی کو دی۔ "جا لے آ کیفے ٹیریا کا ایک سگریٹ کیپٹن لا۔" حوالدار بجلی نے افسوس ناک نظروں سے اٹھنی کو دیکھا جو اس کے نقطۂ نظر سے ہزاروں کا نقصان تھا۔

"کیا پیغام ملا تھا میر محمد کا؟" میرے بجائے شیخ نے سوال کیا۔

انسپکٹر حشمت خان نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ "اسے تو اچھا تھا رخصت کی درخواست بھیج دیتا لیکن اس نے لکھا ہے کہ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں، تم بھی شرافت علی کے قتل کے کیس سے نمٹ لینا۔"

"حشمت خان!" انسپکٹر شیخ نے کاغذ کے اس پرزے پر نظر کر کے کہا جو کسی کاپی سے پھاڑا گیا تھا۔ "یہ میر محمد کا ہینڈ رائٹنگ تو نہیں ہے۔ وہ خاصا بدخط ہے۔ مجھے یہ دستخط بھی اس کے نہیں لگتے۔"

"او جی یہ تو ہم نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ آپ بھی کیا کہہ رہے ہو؟" حشمت خان نے ناگواری سے کہا۔

"پھر یہ بات سمجھ لینے کے بعد تم نے کچھ کیا؟" شیخ نے پوچھا۔

"آپ تو ہم سے ایسے پوچھ رہے ہو جی... جیسے کہ آپ ہی ہمارے افسر ہو۔ او جی ہم نے کیا کوئی توپ چلانی تھی؟" وہ خفگی سے بولا۔ "ہم نے اس کا انتظار کیا۔ پھر اس کے گھر جا کے دیکھا۔ وہیں تو رہتا ہے وہ۔ تھانے کے پیچھے لیکن اس کی گھر والی نے کہا۔ خیر اب عورت ذات کو کیا کہیں۔ اس نے تو بہت کچھ کہا تھا۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ میر محمد اس وقت ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔ گھر میں نہیں بیٹھا رہتا۔ حضر ماری کے لیے وقت نہیں تھا بعد میں دیکھیں گے کیا چکر ہے۔ اگر سرکاری کام ہوتا تو وہ ہمیں بتا کے جاتا۔ پرائیویٹ کام ہوتا تو گھر والی کو معلوم ہوتا۔"

اسی وقت کسی نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔

"ارے بھائی سکندر اعظم ۔ واہ واہ۔ کمال کر دیا۔"

"منظر!" میں نے پلٹ کر اس سے مصافحہ کیا۔ "کیا حال ہے میاں؟ کچھ اور بھول گیا ہے تو... کیا لکھتا ہے؟"

"دکھاتے ہیں اپنا اور دوسروں کا مر... بس غم نہیں کھاتے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "تو بھی بڑا آدم خور شیر ہو گیا ہے... اور بیٹھے اور کھا گیا؟ کیا جا سب سالوں کو... [illegible] تیرے پیچھے لے کر پھریں گے۔ وہ کیا کہتے ہیں... کہاں ہے ہیرو کو..." اس نے کہا اور پھر زور سے ہنسا۔ حوالدار ہاتھ آنے میں لیفٹیننٹ کے بیس سگریٹوں کا پیکٹ لے آیا تھا۔ خود بلحاظ شخصیت بہت کم محسوس کیا۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکالے اسے اور شیخ کو پیش کی۔ حشمت خان نے مناسب یہی سمجھا کہ مزید بے عزتی برداشت کرنے کے بجائے وہ کھسک لے۔

"یار وہ تیرا جو کیس تھا عشق و وراثت والا؟" منظر نے سگریٹ جلا کے کہا۔ "وہ تو ذرا وقت لے گا۔ کورٹ خالی ہے اور جب تک کسی کی پوسٹنگ نہیں ہوتی..."

"اس کیس کی بات چھوڑو۔ مجھے رابعہ نے کچھ بتایا ہے اس کیس کے بارے میں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔" منظر نے کہا۔ "رابعہ خود ہی لیک کرے گی ضمانت منسوخ نہیں ہوگی۔ وہ کیا کہتے ہیں جیسی روح ویسے فرشتے۔ تو تیرے لیے بھی رابعہ سے بہتر وکیل کون ہو سکتا ہے؟" وہ حسن تیز طریقے پر مجھے آنکھ مار کے مسکرایا۔ "ویسے میں عدالت میں موجود رہوں گا۔"

"منظر! اگر وہ محترمہ حاضر نہ ہوا جس کی امید بہت کم ہے؟"

"ارے بھائی کوئی مار محترمہ کو بھی؟" وہ ہنسا۔ "جب کسر رہ جائے سب کچھ ہو جائے گا تو رونا کیسا۔ ہم پر اعتماد نہیں ہے کیا؟ [illegible] تو تیری جگہ پھانسی پر چڑھ جائیں۔ سولی پر تو چڑھے ہوتے [illegible] جب سے شادی کی ہے اور غضب خدا کا۔ وہ بھی شور وار [illegible] ہے مجھے۔ اچھا یار! میری ڈیوٹی ہے ایک کیس میں۔ [illegible]"

"خوب آدمی ہے تمہارا یہ وکیل بھی۔" شیخ نے مسکرا کے کہا۔

"وکیل تو بعد میں بنا ہے پہلے تو اپنا یار تھا۔ بچپن میں رابعہ [illegible] اس کے ساتھ ہی پڑھتے تھے۔" میں نے کہا۔ [illegible] "شیخ!" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "وہ محترمہ نہیں پہنچا۔"

"غنیمت ہے کہ آج سماعت کا امکان نہیں۔ لیکن اسے [illegible]" شیخ نے کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ ادھر ادھر نظر رکھنا۔"

"سارا ہر طرف دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ابھی تک کوئی مشکوک نہیں آیا ہے۔ وہ لوگ دور دور سے دیکھ رہے ہوں تو [illegible] بات ہے۔ قریب آتے ہوئے ڈرتے ہوں۔"

"تمہارا دوست محسن بھی نہیں آیا۔" شیخ نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تمہارا استاد ٹیڈی..."

"استاد ٹیڈی حاضر ہے جناب عالی!" ٹیڈی نے اچانک [illegible] سے نمودار ہو کے کہا۔ "قسم مولا علی کی۔ یاروں کو ٹیڈی کی ضرورت پڑے اور ٹیڈی نہ آئے یہ کبھی ہو سکتا ہے؟"

"تو تم استاد ٹیڈی ہو؟" انسپکٹر شیخ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔ "استاد کس نے بنا دیا ہے تمہیں؟ کیا بچوں کو پڑھاتے ہو کسی اسکول وغیرہ میں؟" اس نے جانتے بوجھتے انجان بن کے سوال کیا۔

"استاد زمانے نے بنا دیا ہے تھانیدار صاحب!" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "زمانہ جسے چاہے کچھ بھی بنا دے۔ جسے چاہے بادشاہ کر دے اور جسے چاہے فقیر۔ قسم مولا علی کی ہم تو پڑھے ہوتے تو کسی کو پڑھانے کا کام کرتے۔ استاد کا درجہ تو باپ کے برابر ہوتا ہے۔ ہم تو اس نام کو بھی بدنام کرتے ہیں۔"

"محسن کہاں ہے ٹیڈی؟" میں نے ادھر ادھر نگاہ ڈال کے کہا۔

"وہ رک گیا تھا ٹیکسی کے پیسے دینے کے لیے۔ آتا ہوگا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں سکندر صاحب!" اس نے مضبوط لہجے اور اعتماد سے کہا اور شیخ کی نظر بچا کے مجھے آنکھ ماری۔ "ہم بھی کہیں لگے ہوئے ہیں۔ پہلے کوئی ہماری گردن اتارے۔"

"اور سچ کیا ہے؟ کیا اس رات سکندر صاحب اور محسن صاحب تمہارے ساتھ تھے جس رات شیدے اور عبدل کے قتل کی ڈبل واردات ہوئی؟" شیخ نے کہا۔

"ہاں جی! اس میں کوئی شک ہے۔ سارا زمانہ جانتا ہے یہ بات تو۔" وہ بولا۔ "ہم ادھر ہی سینما کے پاس تیل مالش کرا رہے تھے کہ چلو ان [illegible] والا آ گیا۔ بولا گھر چل رہے ہو۔ میں..."

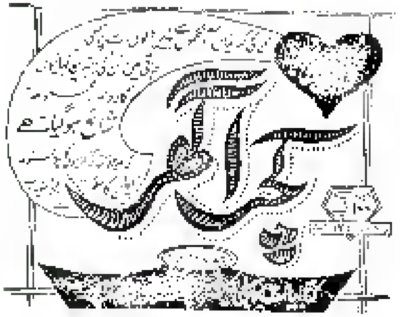

مکتبہ [illegible] پوسٹ بکس نمبر ۹۱۳ کراچی

www.paksociety.com

"گھوڑی کھول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آج ابھی سے بوسواری نہیں مل رہی ہے کیا؟" "یہ اپنا یار پہلوان بھی الو ہے۔ رات کو جاگتا ہے۔ اسٹیشن سے سواریاں اٹھاتا ہے۔ اس کے بعد صبح ہونے سے پہلے اکھاڑے میں پہنچ جاتا ہے۔ دن میں سوتا ہے اور شام کو پھر اکھاڑے میں۔ ویسے پٹھے ہیں اس کے قسم مولا علی کی۔ ایک سے ایک بانکا گھبرو جوان ہے۔ پر یہ پہلوان تانگے والا سب کا باپ ہے۔۔۔"

"تم پٹری سے اتر رہے ہو۔" شیخ نے اسے ٹوکا۔ "یہ بتاؤ کہ سکندر صاحب کس وقت ملے تھے تمہیں؟"

"وہی تو بتا رہا ہوں تھانیدار صاحب!" ٹیڈی نے عاجزی سے کہا۔ "پہلوان کہنے لگا کہ یار ماں بیمار ہے، جلدی گھر پہنچنا ہے اس کو دوائی دینی ہے۔ ورنہ سواریاں تو رب کی مہربانی سے اتنی کہ رات ٹھک جاتی ہے ڈھوتے ڈھوتے۔ خیر جی ہم نے کہا چلو چلتے ہیں۔ اس وقت بجے ہوں گے یہی کوئی دس۔ اتفاق سے میں نے سکندر صاحب کو اور محسن صاحب کو دیکھ لیا اور ان کو بھی ادھر ہی جانا تھا۔ ہم پہلے تو سب بیٹھ گئے تانگے میں۔ پھر راستے میں ہم نے کہا سکندر صاحب! آؤ آپ کو چائے پلائیں۔ بڑے دن بعد ملے ہو۔ ______ اپنے اڈے سے پرے ایسی ملائی والی چائے ملتی ہے تھانیدار صاحب کہ آپ کو کہیں پورے لاہور میں نہیں ملے گی۔ ہم وہاں بارہ بجے تک بیٹھے رہے۔ اس ہوٹل کا مالک ہے شیرو۔ اس نے بھی دیکھا تھا اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ سب آ سکتے ہیں گواہی دینے۔"

میں سمجھ گیا کہ محسن نے اسے تمام صورت حال سمجھا دی ہے اور باقی سب کچھ استاد ٹیڈی کے حسن انتظام کی دلیل ہے اگر اس نے کسی پہلوان تانگے والے اور کسی ہوٹل کے مالک شیرو کا حوالہ دیا ہے تو اسے یقین ہوگا کہ ضرورت پڑنے پر یہ دونوں گواہ اس کے بیان کی صداقت ثابت کرنے کے لیے ضرور آ جائیں گے۔ بے شک یہ گواہی جھوٹی ہوگی مگر جس نظام ____ کی بنیاد ہی شہادت پر ہو اور جس میں سچ کو جھوٹ ثابت کرنے والے پیشہ ور گواہ عدالتوں کے احاطوں کا طواف کرتے ہوں، پیشہ ور ضامن بے وجود یا جعلی کاغذات سے صاحب جائداد بن کے حاضر ہوتے ہوں، دنیا و عقبیٰ کے خوف کا خیال دل میں لائے بغیر حلف اٹھاتے ہوں۔ وہاں اور کیا ہو سکتا ہے۔ غلط کام میں بھی کر رہا تھا اور دل کو یہ تسلی بھی دے سکتا تھا کہ میں تو صرف ایک سچ کو سچ ثابت کرنے کے لیے جھوٹے گواہ لانے پر مجبور ہوں مگر یہ جواز صرف بقا کی جدوجہد کے معیار پر درست تسلیم کیا جا سکتا تھا جس کا اخلاق کے معیار سے رشتہ نہ ہو۔ ورنہ کسی معاشرے، مذہب یا قانون کا کوئی اصول میرے فعل کو قبولیت کی سند نہیں دے سکتا تھا۔ یہی میرا اور میرے دور کا المیہ تھا کہ اصولی اور عملی زندگی کے راستے الگ اور متضاد سمتوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور سقراط کی طرح زہر کا پیالہ اٹھانے والا عقل و ہوش سے بیگانہ قرار دیا جاتا تھا۔ میں یہ پیالہ کیسے اٹھاتا جو اس وقت کا تقاضا تھا۔

ٹھیک گیارہ بجے میں پانچ منٹ بعد نمودار ہوئی۔ ٹھیک [illegible] بجے میرا نام پکارا گیا اور اندر جاتے ہوئے میں نے رضوی صاحب کو گاڑی سے اترتے اور منظر کو آتے ہوئے ہجوم میں راستہ بناتے دیکھا۔ عدالتی کارروائی میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوا۔ وکیل استغاثہ کی طرف سے میری ضمانت منسوخ کرنے کی استدعا کی گئی۔ پبلک پراسیکیوٹر نوجوان لڑکا سا تھا جو بار بار رابعہ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے اندازہ کیا کہ رابعہ پہلے ہی اس سے بات کر چکی ہے پھر سب انسپکٹر شیخ نے اپنا بیان قلم بند کرایا۔ اس نے بہت اختصار سے کام لیا اور اپنے بیان کو بنیادی حقائق تک محدود رکھا جس میں جیدل کے قتل، تحریر کے لکھے ہوئے بیان، ٹیپ کے غائب ہونے اور ٹیلی فون پر ملنے والی دھمکی سب کا ذکر آ گیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ یہ حقائق عدالت کے ریکارڈ پر رکھنا چاہتا ہے اور اس کیس سے دستبردار ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی رابعہ نے استدعا کی کہ تحریر کے لکھے ہوئے جیدل کے اس بیان کو بھی عدالت اپنے ریکارڈ پر رکھے جو اس نے مرتے وقت دیا تھا کیونکہ نامعلوم افراد کی طرف سے دھمکیاں موصول ہونے کے بعد یہ اندیشہ ہے کہ ٹیپ کی طرح یہ تحریر بھی غائب ہو جائے گی پھر اس نے وکیل استغاثہ کی درخواست مسترد کرنے کے لیے اپنے دلائل پیش کیے اور مخالف کے ایک گواہ استاد ٹیڈی کا بیان ہوا۔ حسب توقع فیصلہ یہی ہوا کہ موجودہ حالات میں ضمانت کی منسوخی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جیدل اور رشید کے قتل کی تفتیش ہنوز نامکمل ہے اور ظاہری شہادت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ واردات سے سکندر بخت کا کوئی تعلق ہے۔ عدالت نے صفائی کے دوسرے گواہ یعنی [illegible] کی غیر حاضری کو نوٹ کیا اور میر محمد کے خلاف تفتیش کے لیے بھی احکامات جاری کیے جو سب انسپکٹر شیخ کے بیان کے مطابق ٹیپ غائب کرنے کا ذمہ دار تھا اور یہ بھی حکم دیا کہ اگلی پیشی پر وہ خود حاضر ہو کے ان الزامات کا جواب دے۔ تاہم کیس کی تفتیش سے سب انسپکٹر شیخ کی دستبرداری کے عذر کو عدالت نے ناکافی وجوہات کی بنا پر قبول نہیں کیا اور اسے پولیس کے اعلیٰ حکام کا مسئلہ قرار دیا۔ سب انسپکٹر شیخ چاہے تو اپنی درخواست افسران بالا کو بھیج سکتا ہے۔ تحریر کے لکھے ہوئے بیان کو عدالت نے اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کی ایک مصدقہ نقل

پولیس کو فراہم کرنے کی تاکید کی۔

اس تمام کارروائی کے دوران میں اپنے آگے پیچھے دیکھتا رہا۔ منظر میرے سامنے پہلی قطار میں موجود تھا اور رابعہ نے کئی بار اس سے مشورہ بھی کیا۔ پیچھے کی بنچوں پر غیر متعلقہ افراد بھی موجود تھے لیکن ان میں سے کسی کا چہرہ جانا پہچانا نہیں تھا۔ بس دوسری قطار میں استاد ٹیڈی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ بعد میں سب انسپکٹر شیخ بھی ان کے ساتھ جا بیٹھا اور میں نے محسن کو اس سے ہاتھ ملاتے دیکھا جو ایک طرح سے اس کی حق گوئی و بے باکی اور آئین جواں مردی کو خراج تحسین تھا۔ رضوی صاحب کی موجودگی کو میں نے خصوصاً نوٹ کیا۔ شاید وہ عمداً باہر رہے تھے۔ [illegible] کی حیثیت سے وہ غیر معروف شخصیت نہیں تھے۔ باوجود ان کا سماعت کے دوران حاضر رہنا سب کی نظر میں آتا۔ آئندہ تاریخ سماعت ایک ماہ بعد مقرر ہوئی اور ہم باہر نکلے تو بارہ بج رہا تھا۔ عدالت کی کارروائی میں بھی وقفہ آ گیا تھا۔ سب کے اٹھتے ہی منظر نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"بس، جا اور قتل کر، قتل عام کر یار لے۔ بس فکر مت کر [illegible]۔ لے جب رابعہ جیسی وکیل ہوگی تو کوئی تیرا کیا بگاڑے گا۔ تو خود ہی بگڑ جائے تو اور بات ہے۔" وہ بے حد خوش تھا۔ مجھ سے بات کرتے کرتے وہ شیخ کی طرف متوجہ ہوا۔ "بھئی کیا نام ہے تمہارا۔ سب انسپکٹر شیخ۔ تم نے تو ثابت کر دیا کہ آج کل بھی سچ بولنا ممکن ہے۔ بہت ہمت کی بات ہے بھائی۔"

"میرا خیال ہے ضمانت منسوخ نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب شیخ کا بیان ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ میری خوش قسمتی تھی کہ کیس شیخ کے پاس تھا۔ ورنہ ان کی خاموشی مجھے مزید دو افراد کے قتل کے الزام میں ملوث کر سکتی تھی۔ ان کی جرأت اظہار، اصول پرستی اور ایمان داری نے مجھے تختہ دار تک پہنچنے سے بچا لیا ہے۔ میری زندگی ان کا قرض ہو گئی ہے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ لوگ۔" سب انسپکٹر شیخ نے [illegible] "میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔"

"یہی تو کمال ہے آپ کا۔ ورنہ فرض کا احساس کہاں رہ گیا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "آپ پہلے ہی فرض شناسی کا نقصان اٹھا چکے ہیں اور مجھے تو ڈر ہے آج آپ نے اپنی مشکلات میں اضافہ کیا ہے۔ اپنی نوکری ہی نہیں زندگی کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے اور جب یہ بات مد نظر رکھی جائے کہ آپ نے یہ [illegible] تو واقعی یقین نہیں آتا۔"

"مس رابعہ! اصول پرستی میں کبھی کسی نے دنیاوی مادی فوائد حاصل نہیں کیے۔ اگر میں پانچ لاکھ لے کر خاموش ہو جاتا یا دھمکی سے ڈر جاتا تو اپنا ایمان ہی نہیں ایک بے گناہ شخص کی زندگی بھی بیچتا۔ جو میرے نقطہ نظر سے قتل ہوتا۔ میں فرشتہ نہیں ہوں۔ آپ سب بھی جانتے ہو مجھے کسی کو قتل نہیں کر سکتے۔"

"قسم مولا علی کی تھانیدار بادشاہ!" استاد ٹیڈی نے آگے بڑھ کر شیخ کے ہاتھ تھام لیے۔ "تم چاہے نہ مانو ہم تو سمجھتے ہیں کہ جو تم نے کیا وہ کسی ہم جیسے گنہگار انسان کے لیے ناممکن تھا۔ تم واقعی فرشتہ ہو۔ کبھی ضرورت پڑے تو کہنا کہ جان چاہیے۔ قسم مولا علی کی ٹیڈی سر کے بل آئے گا۔"

"اچھا اچھا۔ اب چلیں آپ سب لوگ۔ بہت ہو چکی قصیدہ خوانی۔" شیخ نے کہا۔ "میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب یہ کیس کسی اور کے سپرد کر دوں۔"

"عجلت میں یہ غلطی مت کرو شیخ!" میں نے کہا۔ "یہ تو ہو گا کہ کیس تمہارے ہاتھ سے نکلے تو حشمت خان جیسے شخص کے سپرد ہو جائے اور تم آخر ڈرتے کیوں ہو؟ سچ بولنے والے تو رشتوں کے ٹوٹ جانے کی پروا نہیں کرتے اور تم جیسا شخص تو دوست رہ کے بھی جانبدار نہیں ہو سکتا۔ اگر حقائق مجھے مجرم ثابت کریں گے تو تم کسی کا لحاظ نہیں کرو گے مگر اس میں میرے لیے یہ اطمینان تو ہو گا کہ میرے ساتھ انصاف ہوا۔ میر محمد اور حشمت خان تو ایسے لوگ ہیں کہ جس کی گردن میں فٹ آ جائے اسی کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالتے پھرتے ہیں۔ مجھے ان کے حوالے کیوں کرتے ہو؟" مجھے قطعی احساس نہیں تھا کہ حشمت خان اور حوالدار جبلی کان لگائے ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہے تھے۔ ان کی حیثیت پٹے ہوئے مہرے سے بدتر تھی۔ خصوصاً حوالدار جبلی کا تو سارا کرنٹ ختم ہو گیا تھا۔

رضوی صاحب عدالت کے باہر مجھے اس وقت ملے جب شیخ، استاد ٹیڈی اور دوسرے سب لوگ جا چکے تھے۔ میرے ساتھ صرف رابعہ اور محسن رہ گئے تھے۔

"تم لوگ میرے ساتھ چلو۔" انھوں نے کہا اور میں نے اندازہ کیا کہ ان کا موڈ کچھ آف ہے۔

"لیکن انکل۔ میری گاڑی [illegible]"

"وہ میرا شوفر لے آئے گا۔" انھوں نے [illegible] "تم بھی چلو [illegible] تم بھی محسن۔ مجھے کچھ کہنا ہے تم سب سے۔"

ان کی جیپ ڈسٹرکٹ کورٹ کے احاطے سے نکل کر مال روڈ پر دوڑنے لگی۔

"آپ کچھ کہنا چاہتے تھے۔" رابعہ نے ہمت کر کے کہا۔

www.paksociety.com

"ہاں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم لوگ مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ مجھے بے وقوف کیوں بناتے ہو؟ کیا تمہیں اعتماد نہیں ہے مجھ پر؟" وہ یکلخت پھٹ پڑے۔ "کیا سمجھتے ہو تم مجھے؟"

محسن اور میں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے آپ سے بہت جھوٹ بولے ہیں، لیکن یہ غلط ہے کہ ہمیں آپ پر اعتماد نہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"یہ بالکل جھوٹ ہے۔ تم کو معلوم تھا کہ شہلا کی ماں مر چکی ہے۔ تم جانتے تھے کہ ڈی سلوا مر چکا ہے۔"

"آپ سے کس نے کہا ہے کہ ہمیں یہ بات معلوم تھی؟" میں نے جرأت سے کام لے کر کہا۔ "اگر محسن یا رابعہ کو یہ بات معلوم تھی تو انھوں نے مجھے نہیں بتائی۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا؟" محسن نے احتجاج کیا۔ "میں صبح سے ڈیڈی کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔"

"پھر تو میں ہی رہ گئی۔ میں نے ہی کسی عدالت میں یا بار روم میں سنی ہو گی یہ بات۔" رابعہ نے تلخی سے کہا۔

"دیکھو، یہ سب کچھ تم لوگوں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق کیا ہے۔" رضوی صاحب نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "تم لوگوں نے جانتے بوجھتے شہلا کو اسلام آباد بھجوا دیا، تاکہ وہ اپنی ماں کی مسخ شدہ لاش نہ دیکھے اور ہر قسم کی تحقیق و تفتیش سے بچ جائے۔"

"شہلا۔ وہ ڈیڈی کے ساتھ چلی گئی ہے؟" محسن نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "دراصل اسے انکل شیروانی نے اور فوزیہ نے مجبور کیا تھا۔ میں نے نہیں۔ یقین نہیں تو گھر جا کے فون پر ان سے بات کر لینا۔ وہ بھی اب گھر پہنچنے ہی والے ہوں گے لیکن پہلے مجھے یہ بتایئے انکل کہ آپ نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ ہمیں وہ سب کچھ معلوم تھا جو آپ کو معلوم ہو گیا ہے۔"

"میرے پاس کوئی ثبوت نہیں مگر میں جانتا ہوں کل رات تم نے مجھے اپنے فرار کی جو کہانی سنائی تھی۔ وہ سو فی صد سچ نہیں تھی۔"

"تو آپ بتا دیجیے کہ کون سا سچ کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "اور میرے سچ میں جھوٹ کی آمیزش کا تناسب آپ نے کیا نکالا ہے اور کیسے نکالا ہے؟"

"دیکھو برخوردار! تمہارے معاملے میں میرے دو کردار ہیں۔ میری شخصیت کے دو حصے ہو گئے ہیں اور ان کو برابر رکھنا میرے لیے دن بدن مشکل ہوتا جا رہا ہے۔" رضوی صاحب نے [illegible] میں کہا۔ "ایک طرف میں ایس ایس پی ہوں۔ دوسری طرف تم مجھے انکل کہتے ہو۔ میں نے کبھی اپنے فرائض سے پہلو تہی نہیں کی۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ظلم تمہارے ساتھ ہوا ہے۔ کاش میں تمہاری طرح یہ نہیں کر سکتا کہ ظلم کرنے والوں سے خود نمٹوں۔ نظام انصاف میں لاکھ خرابیاں سہی پھر بھی اس سے بہتر نظام اور کیا ہو گا۔ عملی صورت کو مت دیکھو جسے ہم نے مسخ کر رکھا ہے۔ اصولی طور پر یہ ایک صدی سے زیادہ کے عرصے میں مکمل ہوا ہے اور تکمیل کا یہ عمل ابھی جاری ہے مگر اس نظام نے زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کر رکھا ہے۔ ہم اس کو بہتر بنانے کے لیے یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی زندگی میں خود اس کو عملی طور پر قبول کریں اور اس کے پابند ہوں۔ اس وقت بھی جب کوئی پولیس مین نہ دیکھ رہا ہو۔ اگر اس میں خرابیاں پیدا کرنے والے ہم خود ہیں تو اس نظام کو مورد الزام نہ ٹھہرائیں [illegible] کریں۔ اگر ہر شخص قانون کو بے بس اور بے اثر ہو کے خود اپنا نظام انصاف وضع کرنے لگے، خود مدعی ہو اور خود ہی منصف بھی تو یہ قانون جنگل کا قانون ہو گا۔ کسی بھی دنیا کے مہذب معاشرے میں اجتماعی قدروں کو فوقیت [illegible] ہے۔ یہ نہ ہو تو پھر جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔"

"ہمارے اردگرد یہی ہو رہا ہے انکل۔ اور اس کے ذمے دار ہم نہیں آپ ہیں۔ میرا مطلب ہے وہ جو ہمارے پیش رو تھے۔ جنھوں نے ہمارے لیے یہ ماحول پیدا کیا جس میں ہم نے پرورش پائی۔" میں نے کہا۔ "ہم نے تو ابھی عملی زندگی میں قدم بھی نہیں رکھا۔ ان سب خرابیوں کے ذمے دار ہم کیسے ہو گئے؟ ہر دور میں نئی نسل کو مورد الزام قرار دیا جاتا ہے کہ وہ اخلاقی قدروں کو پامال کر رہی ہے۔ معاشرتی خرابیوں کا سارا بوجھ ان پر ڈال دیا جاتا ہے جو نوجوان کہلاتے ہیں۔ کیا وہ لوگ بالکل بے قصور ہوتے ہیں جو ان نوجوانوں کی پرورش کرتے ہیں؟ ان کے اخلاق و کردار کے نگران کہلاتے ہیں اور جن کے نقش قدم پر نوجوان چلتے ہیں؟ نہ جانے کب سے لوگ کہتے آ رہے ہیں کہ یہ کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا، ویسا نہیں ہوتا تھا اور ہم تو گویا فرشتے تھے۔ قرب قیامت کی نشانیاں کس دور میں نظر نہیں آئیں۔ ان کو جو بوڑھے ہو چلے تھے۔ کوئی ان سے سوال نہیں کرتا کہ جناب کیا ان نوجوانوں کے سن بلوغت کو پہنچتے ہی راتوں رات دنیا اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو گئی۔ پہلے ہر شخص نیک تھا، پرہیزگار اور سیدھا سادہ، معصوم و مہذب، باحیا اور قانون کا احترام کرنے والا تھا۔ پھر اس [illegible] بھی کیوں نہ جی [illegible] شہلا میں اور محسن تو پہلے اسکول میں [illegible] پھر لندن چلے گئے۔ یہاں جو کچھ ہوا اس میں نوجوان نسل کا [illegible] تھا؟ [illegible] شرافت علی چوہدری، ڈلاور، چراغ دین، پیڈرو، [illegible] آپ کے اور انکل شیروانی کے دور کے لوگ ہیں۔ یہاں [illegible] کی باگ دوڑ جن کے ہاتھ میں تھی۔ انھیں تو واپس پھر [illegible] میں ہی ملی جیسی نظر آتی ہے۔ وہ نہیں جو بولی جا چکی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اتفاق کرتا ہوں مگر تمہارا کام بھی یہ تو [illegible] کہ ان خرابیوں میں اضافہ کرو۔ ظلم ہوتا دیکھو تو ظالم بن جاؤ، [illegible] کو چوری کرتے ڈاکا ڈالتے دیکھو تو ڈاکو بن جاؤ۔" رضوی صاحب [illegible] نرم پڑتے ہوئے کہا۔ رابعہ نے بے حد عجیب نظروں سے [illegible] دیکھا۔ ان نظروں میں فخر و مسرت کے جذبات بھی تھے [illegible] ستائش کے بھی۔ "تم کو ان خرابیوں کے خلاف جہاد کرنا [illegible] ہے۔ مگر ان خرابیوں کا شکار ہو جانا چاہیے۔ آخر یہ کام کون [illegible] گا؟ خیر۔ میں جانتا ہوں یہ فلسفیانہ بحث کبھی ختم ہونے [illegible] نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کیا تمہیں واقعی ڈی سلوا کی موت کا علم [illegible] تھا؟"

ذرا سی دیر کے لیے میں مخمصے میں پڑ گیا لیکن میری قوت [illegible] نے بروقت مجھے خبردار کر دیا۔ اب سچ بولنے سے کچھ حاصل [illegible] ہوگا [illegible] خرابی کے۔ اور جھوٹ جس سے کسی کو نقصان نہ [illegible] مجبوری میں بولا جاتا ہے اور سچ کے مقابلے میں کم [illegible] ہو، بہرحال بہتر ہے۔

"مجھے اب تک یقین نہیں کہ میرا ایک اتنا بڑا دشمن نہیں [illegible]" [illegible] نے کہا۔ "آپ کو کس نے بتایا؟"

"[illegible] نے ایک رپورٹ درج کرائی تھی، جیسا کہ میں نے [illegible]" رضوی صاحب نے کہا۔ "دس بجے کے قریب مجھے [illegible] تھے میں تباہ ہو جانے والی ایک گاڑی [illegible] میں سے ایک بوڑھی عورت کی لاش ملی ہے۔ مجھے شناخت [illegible] پڑا۔ میں جائے واردات پر پہنچا تو [illegible] آخری موڑ پر وہ سڑک جو نہر کے ساتھ [illegible] جاتی ہے اور وہ جو پہنچ گئے ہیں [illegible] تو پہچان ہی لیا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس [illegible] ڈی سلوا بھی ہلاک ہو گیا ہے۔"

"[illegible] ڈی سلوا ہی شہلا کی ماں کو اغوا کر کے لے گیا تھا [illegible] کا شکار ہو گیا۔"

"[illegible] یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔" رضوی صاحب [illegible] کوئی وجہ نہیں۔ ڈی سلوا شراب کے نشے میں تھا اور گاڑی درخت سے ٹکرائی ہے۔ کسی گاڑی سے نہیں۔ پھر گاڑی کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حادثے کے وقت اس کی رفتار کم سے کم پچاس میل فی گھنٹہ ضرور تھی۔"

"ہو سکتا ہے اس نے سامنے سے آنے والی کسی گاڑی سے تصادم کو بچانے کی کوشش کی ہو۔" میں نے کہا۔ "اور گاڑی بے قابو ہو گئی ہو۔"

"یہ صرف فرض کیا جا سکتا ہے۔" رضوی صاحب نے عدم اتفاق کی کوئی صورت نہ پا کے کہا۔ "یہ بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بریک فیل ہو گئے تھے مگر حقائق کچھ اور ہیں۔ تم نے اسے کس وقت دیکھا تھا؟"

"تقریباً رات کے ایک بجے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے ڈیڑھ کا وقت ہو۔"

"تم صبح کے ساڑھے پانچ بجے واپس پہنچے تھے اور بظاہر تم نے یہ فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کیا تھا۔ تمہاری حالت سے یہی ظاہر ہوتا تھا اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ یہ فاصلہ تم نے کتنی دیر میں طے کیا تھا؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"میرا خیال ہے ایک گھنٹہ تو لگا ہو گا مجھے۔" میں نے کہا۔

محسن نے میرا ہاتھ دبا کے مجھے محتاط ہونے کی تاکید کی۔

"شیروانی صاحب اور ان کی بیٹی تین بجے صبح پہنچے تھے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور وہ گاڑی میں لائے گئے تھے جس نے انھیں عین میری کوٹھی کے دروازے پر اتارا تھا۔ گاڑی پر کوئی نمبر پلیٹ تھی تو وہ دیکھ نہیں سکے۔ لائٹ آف تھی اور وہ گھبرائے ہوئے بھی تھے مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ آدھے گھنٹے سے کم میں۔ تقریباً بیس منٹ میں پہنچے ہوں گے گویا پونے تین بجے کے قریب وہاں سے روانہ ہوئے ہوں گے۔ اس حساب میں کوئی غلطی ہے تو بتاؤ کہ جو فاصلہ ایک شخص پیدل چل کے ایک گھنٹے میں طے کرے۔ وہ کار زیادہ سے زیادہ ایک چوتھائی وقت میں طے ہو جائے گا۔ تم نے کسی سے لفٹ نہیں لی تھی۔ کوئی رکشا یا ٹیکسی تمہیں نہیں ملی تھی اور ظاہر ہے اتنی رات گئے تم نے پانچ میل کی دوڑ نہیں لگائی تھی۔ اتنے طویل راستے پر گشتی پولیس یا چوکیدار تمہیں بھاگتا دیکھتے تو ضرور تمہارے پیچھے لگ جاتے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تمہیں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگا ہو گا۔ اوسطاً آدمی تین میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا ہے۔ تیز تیز چلے تب بھی چار میل سے زیادہ کی رفتار نہیں ہو سکتی اور یہ رفتار بھی ایک دو میل تک برقرار رہ سکتی ہے۔ بعد میں گھٹ جاتی ہے۔ خیر یہ بتاؤ کہ جب تم نے سراج کو ٹالو کے فون سے اور شیروانی کو بھیجا تو کیا

www.paksociety.com

ڈی سلوا وہاں موجود تھا؟"
"جی۔ اس وقت وہ وہیں تھا۔" میں نے غور کر کے کہا۔
"اور تمہارے پہنچنے کے کتنی دیر بعد ان کو روانگی ہوئی تھی؟"
"ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد۔" میں نے کہا۔ "آپ کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں اس سے؟"
"اور تم ان کے روانہ ہونے کے بعد کتنی دیر وہاں رہے تھے؟" رضوی صاحب نے میرے سوال کو در خور اعتنا نہیں سمجھا۔
"میں... میں تقریباً ان کے ساتھ ہی۔ چند منٹ کے فرق سے۔" میں نے کہا لیکن مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا تھا۔
"میرا بھی یہی خیال تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "جب تم نے ایک بار سراج کو قابو کر لیا تھا۔ تو ظاہر ہے اسے ایک گھنٹے تک پکڑے نہیں کھڑے رہے ہوگے۔ تم نے پہلے شیروانی اور نوزیہ کو چھڑایا اور اس کے بعد ڈی ایس پی سراج کو ڈھال بنا کے باہر آ گئے۔ رائٹ۔ فرض کرو دس منٹ بعد۔ گویا تم تین بجے وہاں سے روانہ ہوئے اور تمہارے کہنے کے مطابق ایک گھنٹے میں گھر پہنچ گئے۔ لیکن اس طرح تمہیں چار بجے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ تو ڈیڑھ گھنٹا تم کہاں رہے؟"
رضوی صاحب نے مجھے ٹریپ کر لیا تھا۔ وقت کے الٹ پھیر میں ڈیڑھ گھنٹے کا فرق نکل آیا تھا۔ "میں نے اندازوں کی بنیاد پر بات کی ہے۔ آپ صحیح وقت کو مدنظر رکھ کے حساب لگا رہے ہیں۔" میں نے کہا مگر صاف ظاہر تھا کہ میرا لہجہ اعتماد سے خالی ہے۔
"اچھا یہ بھی مانا۔ یہ بتاؤ جب تم روانہ ہوئے تب بھی ڈی سلوا وہیں موجود تھا؟ ظاہر ہے ہوگا۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صبح کے تقریباً پانچ چھ بجے وہ شہلا کی ماں کو ادھر سے لے کر مخالف سمت میں کہاں جا رہا تھا؟" رضوی صاحب نے کہا۔
"کیا موت کے وقت کا تعین ہو گیا ہے؟" میں نے کہا۔
"ابتدائی اندازے کے مطابق اسے مرے ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "صبح چھ بجے ایک شخص نے کہیں سے فون کر کے حادثے کی اطلاع دی۔ اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ پولیس ساڑھے چھ بجے پہنچی اور ایک انسپکٹر نے مجھے بتایا ہے کہ خون کا رنگ اور مہک باقی تھے۔ خون کچھ جم گیا تھا لیکن کچھ اس وقت بھی رس رہا تھا۔ چنانچہ اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ حادثے کے کچھ دیر بعد ہی کسی نے گاڑی دیکھ لی۔ سڑک کے دوسری طرف بنگلے ہیں۔ وہیں سے کسی نے فون کر دیا۔ گویا وقت وہی پانچ اور چھ بجے کے درمیان کا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے حتمی طور پر یہ بات معلوم ہو جائے گی۔ مگر جو بات میں نہیں سمجھ سکا وہ کچھ اور ہے۔ میرے ایما پر ایک پولیس پارٹی وہاں گئی تھی جہاں تمہیں لے جایا گیا تھا۔ انھوں نے بڑا تفصیلی معائنہ کیا لیکن کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ انھیں غیر آباد کمروں میں اور آس پاس کوئی سراغ نہیں ملا جس سے ثابت ہوتا کہ رات کو وہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ یہاں کے نشانات کیا، گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات تک نہیں تھے۔ کھڑکیاں اور دروازے سب بند تھے۔ سوائے ایک کھڑکی کے۔"
"ظاہر ہے وہ اس میں سے نکل گئے اور جاتے جاتے اپنی موجودگی کی تمام علامات مٹا گئے۔" میں نے کہا۔
"ہاں۔ لیکن ڈی سلوا کی گاڑی کو یہ حادثہ وہاں سے آتے ہوئے پیش نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہاں جا رہا تھا۔ وہ گلوب سینما کے پاس رہتا ہے۔ اگر اسے یہ خیال تھا کہ شہلا کی ماں کو اپنے گھر لے جائے تب بھی یہ سمت بالکل الٹی ہے۔ کار کا رخ دوسری جانب ہونا چاہیے تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "مگر اسے شہلا کی ماں کو کہیں اور لے جانا تھا تب بھی یہ غلط ہے۔ اس صورت میں حادثہ داروغہ والا کی جانب کہیں ہوتا یا مخالف سمت میں یا غیبہ چورہے کی طرف۔"
"اب آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ بھی صاف بتا دیجیے۔ منطقی اعتبار سے آپ نے مجھے قائل کر لیا۔"
"میرا خیال یہ ہے میاں سکندر اعظم کہ تم نے ڈی سلوا کو مجبور کیا کہ وہ تمہیں ڈراپ کرے۔" رضوی صاحب نے ایک بار پلٹ کے مجھے دیکھا اور پھر گاڑی موڑ لی۔ "اس وقت تمہارے ذہن میں یہ خیال نہیں تھا کہ پانچ میل کی دوڑ لگائی جائے۔ جب باہر ایک گاڑی موجود ہو تو کوئی یہ خطرہ کیسے مول لے سکتا ہے۔ ایک صورت یہ تھی کہ تم گاڑی کے ٹائر فلیٹ کر دو۔ مگر اس کے لیے تمہیں گولی چلانی پڑتی۔ دوسری بہتر صورت تھی کہ تم اسی گاڑی کو استعمال کرو۔ اتنی رات گئے تم رکشا یا ٹیکسی ملنے کی امید نہیں کر سکتے تھے۔ گھر سے پانچ میل دور تھے اور تمہیں جلد از جلد گھر پہنچنے کی فکر تھی۔ سراج جو تمہارے خیال کے مطابق گروہ کا سرغنہ ہے تمہاری گرفت میں تھا۔ تم اس کے دونوں ہاتھ توڑ چکے تھے۔ کیا اس کے بعد تم نے سراج کا ریوالور نہیں نکال لیا ہوگا؟ ہاں اسی صورت میں ممکن ہے جب میں فرض کر لوں کہ سراج غیر مسلح تھا مگر کسی خطرناک گروہ کا سرغنہ اپنے پاس ریوالور نہ رکھے۔ اور وہ بھی ایک پولیس افسر جسے باقاعدہ ریوالور ملتا ہے اور ناجائز اسلحہ برآمد کرنے کے مواقع ملتے ہیں تو اس میں سے خورد برد کے مواقع بھی ملتے ہیں۔ تم نے ریوالور کی مدد سے ڈی سلوا کو گاڑی چلانے پر مجبور کیا اور اسے تمہیں چھوڑ کے واپس جانا تھا۔ جب یہ حادثہ پیش آیا۔ تمہیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ڈکی میں شہلا کی ماں ہے۔ جیسے ہی وہ تمہیں شہر کے پل کے آس پاس کہیں چھوڑ کے واپس ہوا تم گاڑی سے چمٹ گئے۔ تمہارے پاس سراج کا ریوالور تھا۔ اس سے تم نے پیچھے کا ونڈ اسکرین توڑا۔ میرا خیال ہے جب ڈی سلوا نے گاڑی کو بیک کیا ہوگا تو پچھلا ٹائر سامنے کے تم لوٹنے پر چڑھ گئے ہوگے۔ پہلے تم نے کوشش کی ہوگی کہ وہ ریوالور سے ڈر کے رک جائے مگر وہ بزدل اور خوفزدہ ہو کے بھاگا اور اس کوشش میں گاڑی بے قابو ہوئی۔ یہ فاصلہ چند منٹ کا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ڈی سلوا مخالف سمت میں کیوں جا رہا تھا۔ شہلا کی ماں کیسے ماری گئی اور تم کو گھر پہنچتے پہنچتے ساڑھے پانچ کیسے بج گئے۔ اب یہ بتاؤ کہ سراج کا ریوالور کہاں ہے؟"
"وہ... وہ میں نے نہر میں پھینک دیا تھا۔" میں نے اس وقت کہا جب گاڑی گھر کے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ رضوی صاحب نے اپنی ذہانت سے تقریباً صحیح صورتحال کا اندازہ کر لیا تھا اور میرے لیے اعتراف جرم کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میرے ساتھ محسن اور رابعہ بھی شرمسار بیٹھے تھے۔ رابعہ کچھ خائف تھی کیونکہ ابھی تک ہم نے اسے بھی شریک راز نہیں کیا تھا۔
"دیکھو میرے ساتھ جھوٹ مت بولنا۔" رضوی صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔ "اس ریوالور کی مدد سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ تمھیں پتہ ہے، وہ سرکاری ریوالور ہو۔ اس کے سیریل نمبر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کس کو دیا گیا تھا۔"
"کیا اس کا نام سراج نہیں ہے؟" میں نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔
"نہیں۔ میں نے معلوم کر لیا ہے۔ یہاں سراج نام کا کوئی ڈی ایس پی یا ایس پی نہیں ہے۔ کسی تھانے کا انچارج تک سراج نہیں ہے۔ پرسنل برانچ نے مجھے بتایا ہے کہ ایک سب انسپکٹر سراج تھانے میں ہے اور دوسرا اسی ضلع کے علاقے میں۔ جن کے نام میں سراج آتا ہے۔ ان میں سے ایک کا تبادلہ پنجور ہو گیا ہوا ہے اور دوسرا ریٹائر ہونے والا ہے۔ یعنی کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اس جگہ کی نشاندہی کر سکتے ہو جہاں تم نے ریوالور پھینکا تھا؟"
میں نے فقط اقرار میں سر ہلایا۔ پھر بیگم رضوی نمودار ہوئیں اور ہم خاموشی سے اندر چلے گئے۔
"کیا بات ہے۔ صورتیں کیوں اتری ہوئی ہیں؟" انھوں نے پوچھا۔ "ضمانت منسوخ ہو گئی کیا؟"

"ضمانت منسوخ ہو جاتی تو یہ حضرت یہاں نظر آتے؟" رضوی صاحب نے طنز سے کہا۔ محسن بہت حد تک حقائق سے باخبر تھا مگر مجھے موقع ہی نہیں ملا تھا کہ رابعہ کو کچھ بتا سکوں۔ موقع اس وقت بھی نہیں تھا۔ کھانا تقریباً تیار تھا۔ ابھی ہم کھانا کھا ہی رہے تھے کہ میو ہسپتال سے ٹیلی فون موصول ہوا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد شہلا کی ماں کی لاش لے کر ایک ایمبولینس روانہ ہو چکی تھی۔
شام تک اس غریب لاوارث عورت کی تدفین بڑی سادگی اور خاموشی سے ہو گئی۔ جنازے میں مشکل سے بیس افراد شریک ہوئے جو میانی صاحب کے قبرستان سے ایک گھنٹے میں لوٹ آئے۔ میں نے اور محسن نے لوٹتے ہوئے رابعہ کی ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ پہلے رابعہ کی ماں، پھر شہلا کی ماں اور اب ہوگی محسن کی ماں کی باری۔ فرشتۂ اجل نے صرف میرے باپ کا انتخاب کیا تھا۔ باقی سب کی ماؤں کا۔ یہ فضول و بے سروپا خیال میرے ذہنی انتشار کا آئینہ دار تھا۔ شام کا اندھیرا ایک سوگوار رات کے اندھیرے میں ڈھل گیا۔ پورے گھر پر ایک ماتمی سکوت کا غلبہ تھا۔ کسی نے رات کے کھانے پر ہمیں نہیں بلایا۔ شاید کسی نے کھانا کھایا ہی نہیں۔ رضوی صاحب اپنے کمرے سے نہیں نکلے اور رابعہ اپنے کمرے میں بند رہی۔ میں اور محسن سرگوشیوں میں دبے دبے لہجے میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ گزشتہ شب میری اپنے دشمنوں سے کیا باتیں ہوئی تھیں اور ڈی سلوا کی موت تک پیش آنے والے تمام واقعات کا مفصل ذکر کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ استاد ٹیڈی کو تلاش کرنے اور اسے صورتحال سے آگاہ کر کے بیان کے لیے تیار کرنے میں کتنی محنت ہوئی۔ "لیکن یہ محنت اکارت نہیں گئی۔" محسن نے کہا۔ "اس نے تو کمال کر دیا۔"
"شیدے اور عیدل کے قتل کا الزام تو اب ہم پر آتا نہیں۔" میں نے کہا۔ "شکاری کوئی اور چال سوچیں۔"
"میرا خیال ہے سر دست تو ان کی پیش کش قبول کر لے۔" محسن نے اچانک کہا۔
"کیا؟ یعنی ان کے ناجائز کاروبار میں ان کے ساتھ شریک ہو جاؤں؟" میں نے بھڑک کر کہا۔
"نہیں۔ سیاست سے کام لے سکندر۔ وہ تجھے پارٹنر کی حیثیت دینے پر تیار ہو گئے ہیں۔ پہلے اپنی پوزیشن کو مستحکم کر لے۔ اس کے بعد دیکھ وہ کیا کرتے ہیں۔" محسن نے کہا۔
"انھوں نے میرے سامنے کچھ شرائط رکھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "جو میں قبول نہیں کر سکتا۔ مثلاً ان کا مدعا ہے کہ وزیر خان

www.paksociety.com

والے معاملے کو دبا دیا۔ وہ میرے نقصانات کی تلافی کے لیے تیار ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ میں اس کی موت کو بھول جاؤں۔ یہ بات بھول جاؤں کہ انھیں کس طرح محصور کر کے بے بس کر کے اور مفلس کر کے مار دیا گیا۔ میں سلامت شاہ، تو ماچو، غلام علی اور دیگر سب بے گناہوں کے خون کی قیمت وصول کر لوں اور خاموش ہو جاؤں۔"

"میں یہ نہیں کہتا کہ تو ان کی شرائط پر صلح کر لے۔" محسن نے کہا۔ "اگر وہ تیرے حقِ وراثت کو تسلیم کر لیتے ہیں تو یہ ایک محاذ پر تیری فتح ہے۔ جنگی حکمت عملی یہ ہونی چاہیے کہ پہلے مورچے کو مضبوط کر لیا جائے اور پھر پیش قدمی کی جائے۔ تو یہ طے ہے کہ سودا کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا۔ آج اگر وہ سب کچھ تیرے حوالے کر دیں تب بھی نہیں۔ کوئی مجرم کسی عدالت میں ایک پھول سے جرم کی قیمت ادا کر کے نہیں بچ سکتا۔ ان کے جرائم تو بہت سنگین ہیں۔ ان کو معاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ فوزیہ کو اٹھا لائے، میرے باپ کو اٹھا لائے۔ انھوں نے شملا کی ماں کو مار دیا۔ جنگ کا دائرہ تو اب بہت پھیل گیا ہے۔"

"بالکل یہی میں نے ان سے کہا تھا۔" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مگر یار سکندر! یہ تو نے شملا کو وہاں جانے سے روکا کیوں نہیں؟" وہ بولا۔ "وہ تیرے کہنے سے رک جاتی۔"

"میں کیسے روکتا۔ سب لوگ ایک طرف تھے۔ بیگم رضوی، انکل، رابعہ اور فوزیہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن... میں نے اسے وہ سب بتا دیا تھا جو اسے نہیں معلوم تھا۔"

"ممی کی بیماری کے متعلق؟" وہ بولا۔ "یا فوزیہ کی شادی کے بارے میں؟"

"یہ تو اسے بتا دیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "مگر... یہ کہ فوزیہ کے علاوہ تیری بھی شادی ہو سکتی ہے۔ میرا ابھی خیال یہی ہے کہ اسے وہاں موجود نہیں ہونا چاہیے۔ تیری شادی کے موقعے پر اور اس کے بعد لیکن اب اس کی ایک ہی صورت ہے کہ پہلے فوزیہ کی شادی ہو، اس کے بعد شملا لوٹ آئے اور..."

محسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر ہم اپنے اپنے خیالات میں کھوئے خاموش بیٹھے چھت کو گھورتے رہے پھر باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے غور سے سنا۔ آہٹ باہر کی طرف ہوتی تھی۔ "محسن!" میں نے سرگوشی میں کہا مگر وہ سو چکا تھا۔ میں دم سادھے پڑا رہا۔ کمرے کی کھڑکی میں ایک سایہ سا نمودار ہوا۔

میں نے کھڑکی کھول کے جھانکا۔ باہر کوئی نہ تھا۔ گیٹ پر صرف ایک مسلح سپاہی بے حد مستعد کھڑا تھا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں پولیس کی روایتی گوروں کے عہدِ رفتہ کی نشانی، دونالی نہیں بلکہ ایک فائر کرنے والی تھری ناٹ تھری کی وہ رائفل نہیں تھی جس سے دوسری گولی چلانی مقصود ہو تو اس کے میگزین سے برآمد کرنی پڑتی ہے اور اس کے لیے ایک لیور کو خاصی زور آزمائی سے کھینچ کر پیچھے کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس رائفل کے بغیر میرے ذہن میں مسلح پولیس کی تصویر مکمل نہیں ہوتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے سہرے کے بغیر دولھا کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

بلکہ یہ سپاہی جدید طرز کی چھوٹی سی آٹومیٹک مشین گن لیے کھڑا تھا جو اسٹین گن سے مشابہ تھی اور نئی نئی تھی۔ میں نے جدید آلاتِ حرب کو مار دھاڑ سے بھرپور انگریزی فلموں میں استعمال ہوتے دیکھا تھا یا سنا تھا کہ وطنِ عزیز میں بھی ڈکیتی کی وارداتوں کے لیے ان کا استعمال کامیابی سے ہوتا رہا ہے مگر ذاتی طور پر ان کی اقسام کے فرق کو آتشیں دوست محسوس کرنا میرے لیے مشکل تھا۔

گیٹ کے اوپر پیچھے دو سرچ لائٹس بھی نظر آئیں۔ ہر ایک کا رخ مخالف سمت میں تھا اور ایک سے بیرونی لان کا وہ حصہ روشن تھا جو سڑک کے ساتھ ساتھ تھا تو دوسری سے دائیں طرف سرونٹ کوارٹر تک کوٹھی کا تمام علاقہ روشن تھا۔ ہر چند کوارٹر مقفل اور تاریک تھا مگر اس کے باہر سایہ بھی حرکت کرتا تو مستعد محافظ کی نظر اسے دیکھ لیتی۔ اسی طرح پچھلی طرف سے کوئی احاطے کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا تھا۔ یہ تازہ ترین حفاظتی انتظامات جو رضوی صاحب نے صرف ہماری وجہ سے کیے تھے ان کی دور اندیشی، فہم و فراست اور حسنِ تدبیر کا عملی ثبوت تھے۔

میں نے اپنے آپ کو قدرے محفوظ محسوس کیا۔ دشمنوں سے کچھ بعید نہ تھا کہ ڈی سلوا کی موت کے بعد وہ راست اقدام کا منصوبہ بنا لیتے۔ محسن یا رابعہ کو اغوا کر لے جاتے یا اس گھر کا بھی وہی حشر کرتے جو رابعہ کے گھر کا ہوا تھا۔ بے شک دن میں ہم پر شبہ ان کے انتقام کا نشانہ بن سکتے تھے مگر اب کسی کو بھی غیر محفوظ نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ ہمارے قتل سے ان کو کوئی فائدہ ہوتا تو وہ بہت پہلے ہی ٹھکانے لگا چکے ہوتے۔ کسی نامعلوم سمت سے آنے والی کے صحیح نشانے پر لگنے والی گولی ان کے مسائل کا حل ہوتی تو وہ خود سارا جھگڑا ختم کر دیتے یا کسی پیشہ ور قاتل کی خدمات حاصل کر لیتے۔

لیکن ان کے عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے ہم نے جارحیت کا جواب جارحیت سے دیا تھا اور اپنے دفاع کو بھی اتنا مضبوط بنا لیا تھا کہ وہ آسانی سے کامیاب ہونے کے جو خواب دیکھ رہے تھے ان کی تعبیر الٹی ہوتی جا رہی تھی۔ ان ہم سے اپنی تمام تر شرائط منوانے کی صرف ایک مؤثر صورت یہی تھی کہ وہ ہم میں سے کسی ایک کو یرغمال بنا لیں اور اس کی جان کے بدلے ہم سے سودا کریں۔ ہمارے رفقائے کار میں صرف ایک فرد ایسا تھا جو ہمارا ایک دوسرے سے جذباتی وابستگی تھی۔

وہ جانتے تھے کہ مجھے شملا، رابعہ یا محسن کو ایک دوسرے سے کتنی محبت ہے۔ انکل رضوی اور ان کی فیملی کے ساتھ شیروانی صاحب کے خاندان سے بھی ہمارے رشتوں کی بنیاد کتنی مستحکم ہے۔ یہ عزتیں اور خلوص پر مبنی ان رشتوں کو صرف اسی طرح شکست ہو سکتی ہے کہ ہمارے درمیان کسی کے لیے بھی آزمائش کی کوئی صورت پیدا کر دی جائے۔ وہ اگر رضوی صاحب کے گھر کے ایک بچے کو بھی اٹھا لے جاتے تو میں مجبوراً اپنی ہار قبول کر لیتا اور شرائط پر ہتھیار ڈال دیتا۔ جو بات وہ نہیں جانتے تھے یہ تھی کہ ایسا وقت آیا تو اعترافِ شکست میرے لیے زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ رضوی صاحب جیسے کٹر اصول پرست شخص کے لیے یہ صرف ایک بچے کے اغوا کا کیس تھا۔ ان کے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ وہ بچہ ان کا ہے یا کسی اور کا۔ وہ مجھے بھی اجازت نہ دیں گے کہ مجرموں کے ایسے مطالبے کے سامنے سر جھکا دوں خواہ اس کا انجام کچھ بھی ہو۔ انھیں اپنے لختِ جگر کی لاش ملے، وہ کامل یکسوئی کے ساتھ مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی قانونی کارروائی کو جاری رکھیں گے۔ یہی صورت حال شملا کے ساتھ ہوتی۔ رابعہ، محسن اور شملا مجھ سے ایک بھی اپنی محبت یا اپنی جان کی قسم دے کر منع کر دیتے تاکہ دشمنوں کی بات نہ مانوں ورنہ وہ مجھے کبھی معاف نہ کر سکیں گے۔

ان حالات میں ہم میں سے کوئی بھی آسانی سے اغوا نہ ہو سکتا تھا۔ نہ میں اور محسن، نہ رابعہ یا رضوی صاحب۔ ہم مقابلہ کرتے اور مرتے یا مار دیتے۔ میری موت اب منظور نہ تھی۔ ایک افسر کو قتل کرنے کی ان میں ہمت کہاں کا سارا محکمہ اپنے تمام وسائل کے ساتھ ان کی بیخ کنی پر تل جاتا اور یہ دشمنی انھیں بہت مہنگی پڑتی۔ یہی صورت رابعہ کی تھی۔ اس کے اغوا یا قتل ہوتے ہی ساری وکیل برادری اٹھ کھڑی ہوتی اور ڈسٹرکٹ سے لے کر ہائی کورٹ تک ہر بار ایسوسی ایشن اور سب قومی اخبارات پولیس کے پیچھے پڑ جاتے تو مجرموں کے لیے جائے پناہ نہ رہتی۔ پولیس کی نظر کسی مجرم پر نہیں ہوتی۔ دل را دلی می شناسد۔ وہ جانتے ہیں کہ علاقے میں کتنے گرہ کٹ اور جیب تراش ہیں، کتنے چور اور کتنے ڈاکو ہیں، اسمگلنگ کے اڈے کہاں ہیں اور منشیات کے کہاں۔ لیکن وہ کچھ دو اور کچھ لو۔ جیو اور جینے دو کے فلسفے پر عمل پیرا رہتے ہوئے عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں۔ جب یہ نوبت آ جاتی ہے کہ انھیں اپنی جان کے یا نوکری کے لالے پڑ جائیں تو وہ جائز طریقے اختیار کریں یا ناجائز مگر مجرم تک رسائی ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کامیابی میں عموماً سب سے بڑا ہاتھ ان مخبروں کا ہوتا ہے جو بظاہر مجرموں کے آلۂ کار ہوتے ہیں اور خود بھی غیر قانونی طریقے سے روزی نہیں کماتے۔ سابقہ سزا یافتہ مجرم، بھتہ وصول کر کے آگے پہنچانے والے، ہتھیارے وار اور بعض اوقات بالکل بے ضرر کاروبار میں مصروف عام آدمی۔ ان سب کا جال شہر کے گلی کوچوں میں پھیلا رہتا ہے اور بوقتِ ضرورت خفیہ طور پر معلومات کی فراہمی کا سب سے مؤثر ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

صرف محسن ایسا شخص تھا جسے دشمن اغوا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو ناکامی کی صورت میں قتل بھی کر دیتے اور یہ ایک عام آدمی کا قتل کہلاتا جو زیادہ اہم نہیں سمجھا جاتا اور زیادہ مسائل پیدا نہ کرتا۔ مگر اس سے زیادہ آسان شملا یا فوزیہ کو اٹھانا تھا اور فوزیہ کے ساتھ تو شیروانی صاحب کو اسلام آباد سے لاہور پہنچا کے انھوں نے ثابت کر دیا تھا کہ ان کے ہاتھ کتنے لمبے تھے۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی لیکن نیند کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں کھلی کھڑکی میں کھڑا سگریٹ پیتا رہا اور ایک غیر یقینی مستقبل کے خدشات، امکانات اور تصورات میں گم رہا۔ شیروانی صاحب، پرانی وضع کے شریف اور عمر رسیدہ افسر۔ وہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تو کسی اور کو کیسے بچائیں گے۔ پہلے ایک فوزیہ ہی تھی، اب شملا بھی ہے۔ یک نہ شد دو شد۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ خیال یہ تھا کہ ان بے ضمیر انسانوں نے انتقام کی آرزو میں اندھا ہو کے اور ذلت کی انتہائی پستی میں گرتے ہوئے اس عورت کو حصولِ مقصد کا ذریعہ بنا لیا

www.paksociety.com

جس کی زندگی چراغِ سحری ہے تو کیا ہوگا؟ بہت جلد محسن کی ماں کو دنیا سے رخصت سفر باندھنا تھا اور اس کے پاس فرصتِ عمر بہت کم تھی۔ شاید وہ خود بھی جانتی تھی کہ زندگی کے باقی ماندہ گنے چنے دنوں میں اس کو کیا کچھ کرنا ہے۔ عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن۔ کٹ تو بہت کچھ تھا مگر اسے لیا آرزو کر کے ہلاک شدہ۔ کبھی ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں۔ ان گنت خواہشوں اور بے حساب تمناؤں کے لیے کوئی گنجائش نہیں، اس نے تھوڑی سی خوشیوں کا انتخاب کر لیا ہے۔ جیسے پیاسے نے سمندر سے شبنم کے چند قطرے مانگ لیے ہوں اور ہم سب نے تہیہ کر رکھا تھا کہ ان خوشیوں کی تکمیل کا سامان ضرور کریں گے۔ اسے دنیا سے یہ مراد، دلِ شکستہ اور اس احساس کے ساتھ رخصت نہیں ہوں گے کہ اس نے جن پودوں کو جنم دیا اور اپنے لہو سے پروان چڑھایا، ان کا ثمر ناامیدی ہے، احساسِ محرومی ہے اور تنہائی ہے۔ ازلی و ابدی۔ ان میں پھول نہیں کھلے، کانٹے نکلے اور ہلاک۔ عدم میں اس کے ساتھ کسی کا پیار تک نہیں۔

اور ہمیں مجبوریوں کے جال میں پھنسا لینے والے فنکارانہ سوال کریں گے کہ میاں سکندرِ اعظم! کیا اب بھی تم کو اپنی فتوحات عزیز تر ہیں؟ فوزیہ اور اس کے باپ کی ملتجی سوالیہ نگاہیں مجھ سے ان خوشیوں کی بھیک مانگنے پر مجبور ہوں گی جو وہ اپنی ماں اور اپنی شریکِ زندگی کے دامن میں ڈالنے کا عہد کر چکے تھے اور اس عہد کو ایک مقدس فرض کی طرح پورا کرنا چاہتے تھے مگر سب سے کڑی آزمائش محسن کے لیے ہوگی۔ وہ میرا ساتھ دے گا تو اس جنت سے محروم رہ جائے گا جو ماں کے قدموں کے نیچے ملتی ہے پھر اس کے لیے یہ زندگی جہنم کے عذاب سے کم نہ ہوگی جس میں ہر سانس، ضمیر کا ایک تازیانہ ہوگی کہ بدبخت تو نے اپنی ہی ماں کی آخری چند سانسوں کو سکون اور طمانیت کی جگہ دکھ اور آزار دیے اور اس سے چند دن اور جینے کا حق بھی چھین لیا۔ اگر اس نے ماں کی خاطر میری رفاقت کو قربان کیا، تب بھی یہ زندگی اس کے لیے ایک مستقل سزا ہوگی اور صرف وزیر خان ہی نہیں ملامت نما فرما چکو اور دہ جانے کتنے بے گناہوں کے لہو کا خیال اُسے ستاتا رہے گا جو لوم حشر اس سے انصاف کا طلبگار ہوگا۔ یہ احساس ہی اسے پاگل کر دے گا کہ اس نے اپنے مظلوم دوست کو آزمائش کی گھڑی میں تنہا چھوڑ دیا اور وہ منزلِ دار و رسن تک گیا تو ایک صدمہ اسے جس جرم بے گناہی کی

سزا پانے کا تھا تو دوسرا دوستی کے نام کو رسوا کرنے والے محسن کی بے وفائی کا۔

خود میں اس پوزیشن میں ہوتا تو کیا کرتا؟ اس ماں کا ساتھ دیتا جسے بہرحال مرجانا ہے اور خواہ دنیا کی ساری خوشیاں اس کے سامنے ڈھیر کر دی جائیں، اس کی زندگی کا خلا پھر بھی رہے گا ان کا ندامتیں لیے بیٹھنے والا نہیں ہے۔ سب سے بڑا دکھ تو یہی ہے کہ آدمی خود کو اس لمحے کے مقابل بے بس پا کر زندہ انسانوں کی خوبصورت دنیا سے تہی دست جانے پر مجبور ہو اور پھر یہ بھی جانتا ہو کہ اپنے پرائے، جان سے پیارے اور جان کے دشمن سب بہت جلد اسے بھول کر کاروبارِ حیات کی مصروفیت میں کھو جائیں گے۔ سوئم، چہلم، ایک آدھ برسی۔ پھر یاد کا کوئی بے کسک لمحہ، اس کے بعد کچھ بھی نہیں۔ اطمینان کی بات صرف یہ ہوتی ہے کہ جسم کے ساتھ ہی احساس بھی مرجاتا ہے اور جسم بھی مٹی ہوجاتا ہے ورنہ قبر میں لیٹے ہوئے آدمی کو یہ دکھ کتنا تڑپاتا کہ اسے اتنی جلد فراموش کر دینے والی یہ کمینی دنیا، زندگی کے حسن سے بدستور راحت لے رہی ہے اور خوشی کے خزانے سے اپنا حصہ وصول کرنے کی خودغرضانہ جدوجہد جاری ہے۔

کیا یہ سوال حساب کے قاعدے سے حل کیا جا سکتا ہے؟ ایک عورت (فرض کر و ماں) جس کو صرف چند دن اور جینا ہو، بیٹے کی طرف سے مایوسی کا دکھ اٹھا کے مرجانے تو بہتر ہے؟ یا ایک دوست جس کو ابھی نہیں مرنا ہے اس عورت کی وقتی خوشی کی خاطر جینے کے حق سے محروم ہو جائے۔ کس کو دکھ دینا چاہیے؟ فائدہ کس کے دکھ میں ہے اور نقصان کس کے دکھ کا زیادہ ہے؟ نہیں۔ یہ نفع نقصان کا سوال ہی نہیں۔

معلوم نہیں میں کب تک اس کشمکش میں بے حس بیٹھا کروٹ بدلتا رہتا برقرار رکھے بیٹھا رہتا اور ایسے ہی خیالات کی بھول بھلیاں میں بھٹکتا رہتا لیکن میری نظر نے سایۂ دیوار سے ایک اور سایہ جدا ہوتے دیکھا۔ یہ رابعہ تھی جو نجانے کب سے رات کے اس خاموش پہر میں دیوار سے ٹیک لگائے تنہا کھڑی تھی۔ میری طرف اس کی پشت تھی ورنہ شاید وہ دیکھ لیتی کہ میں بھی اس کی طرح خیالات کے گرداب میں اکیلا ڈوب رہا ہوں، ڈوب کر ابھرنے کی کوشش میں امید کے ایک تنکے کا سہارا چاہتا ہوں اور روشنی کی ایک کرن کا متلاشی ہوں۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ مجھے اس پر رشک آیا۔ شاید اس کے ذہن میں کوئی کشمکش نہیں، کوئی خلفشار نہیں۔ وہ فیصلہ کر چکا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس فیصلے سے پوری طرح مطمئن بھی ہے۔

رابعہ اب دائیں جانب کے مختصر سے باغیچے میں لان پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ نیم شب کی چاندنی میں وہ بالکل کسی مرمریں مجسمے کی طرح نظر آتی تھی جس کے پیکر کے خدوخال کو اس مہارت سے تراشنے میں فنکار کے ہاتھوں کو خود قدرت نے اپنے کمالِ حسن آفرینی کا ذریعہ بنایا ہو۔ میں دبے پاؤں اس کے پیچھے پہنچا اور حلق سے مینڈک کی طرح آواز نکالی۔

وہ اچھل کر دور جا کھڑی ہوئی۔ پھر اس نے مجھے دیکھا۔ میں جھک کر تسلیم بجا لایا اور پھر وہی آواز نکالی۔

"آدھی رات کو مینڈک کی طرح ٹرانے سے کیا ہوتا ہے؟" وہ ہنس کر بولی۔

"مینڈک ہو تو گلا صاف ہوجاتا ہے۔" میں نے کھنکار کر کہا۔ "اگر مینڈکی ہو تو زکام ہوجاتا ہے۔"

اسی وقت رابعہ کو چھینک آئی۔ دروازے پر مستعد کھڑے ہوئے سنتری نے چونک کر ہمیں دیکھا۔ اس نے یقیناً یہ سمجھا ہوگا کہ اس کوٹھی میں رہنے والے بھی رات کو شراب پی کر آؤٹ ہو جاتے ہیں اور کوٹھی والوں کے متعلق اس کے عقائد کو تقویت حاصل ہوئی ہوگی کہ سب بلاتخصیص اخلاقی طور پر دیوالیہ ہوتے ہیں۔ ہم دونوں بے ساختہ ہنسے۔

"میں نے نوٹ کیا ہے کہ تم ایک گھنٹہ چوالیس منٹ بیالیس سیکنڈ تک سامنے کو دیکھتی رہیں۔ پانچ منٹ چھ سیکنڈ تک چاندنی پر غور فرماتی رہیں۔ اور اب تین منٹ چار سیکنڈ سے میرے فرموداتِ عالیہ سے مستفید ہو رہی ہو۔ آخر کیوں؟ میرا مطلب ہے، نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟ مجھے اور تمہیں۔" میں نے کرسی پر بیٹھ کر کہا۔ "کیا یہ الزام غلط ہے؟"

"نہیں۔" رابعہ دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ "مگر تم مدعی ہو یا مدعا علیہ؟ جواب تو تمہیں بھی دینا ہے۔"

"کرۂ ارض پر رات بھر جاگنے والوں کی تین اقسام مشہور ہیں۔" میں نے کہا۔ "اخبار چھاپنے والے، عاشقانِ مہجور اور اُلو۔"

رابعہ پھر ہنسی۔ "تم نے جس زبان میں فریاد کی تھی وہ کچھ اور تھی۔"

"اس کے بارے میں ایک شعر عرض کرتا ہوں۔

جب مینڈک ٹراتے ہیں اُلو جاگتا رہتا ہے
کتے بھونکتے رہتے ہیں، قافلہ جاگتا رہتا ہے۔"

"قافلہ چلتا رہتا ہے؟ کم سے کم محاورے کو تو بخش دو۔" رابعہ نے کہا۔

"نہیں۔ جب کتے بھونکیں گے تو قافلے والے خود سر پٹ دوڑیں گے۔ محاورہ درست کر لیں۔ یہ ذاتی تجربے کی بات ہے۔"

رابعہ کو پھر ہنسی آئی اور مجھے بہت اچھا لگا۔ خدشات اور تفکرات کے بیابان سے نکل کر میں یکلخت اپنے خوابوں کے دل نشین جزیرے میں جا اترا تھا جہاں رنگ اور خوشبو کی فراوانی تھی، حسن و رعنائی کے آبشار تھے اور گنگناتے چشموں کے گیت تھے۔

"ابھی خاصی باتیں کرتے کرتے سکتہ کیوں طاری ہو گیا؟" رابعہ نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کے کہا۔

میں چونکا۔ "باتیں؟ ہاں، میں باتیں ہی تو کرنا چاہتا تھا لیکن کب سے سوچتے سوچتے تھک گیا تھا۔"

"صرف سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا سکندر!" وہ بولی۔

"صرف سوچتے رہنے سے آدمی پاگل تو ہوجاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور شاید تم نظر نہ آئیں تو یہ بھی ہوجاتا۔ تم نے دیکھا کہ آثار پیدا ہو چلے تھے۔ میں نے بے تکی سی دو باتیں کی ہیں، اور اور کیا تھا؟ میرے دماغ کے پریشر ککر میں اندیشوں کی اسٹیم کا پریشر بڑھ گیا تھا۔ پریشر والو کھلنے سے کیسا شور پیدا ہوتا ہے مگر اس سے بوائلر نہیں پھٹتا۔ کچھ دیر سے پہلے میں بالکل اکیلا تھا اور بہت ڈرا ہوا تھا۔ تم نے مجھے بچا لیا۔ اب مجھ سے باتیں کرو۔ وہ باتیں جن کا تعلق سکندر وقت کے مقدمات سے، اس کے مسائل اور اس کی مشکلات سے نہ ہو۔ تھانے، کچہری اور قانون کی وضاحت سے نہ ہو۔ لاقانونیت سے نہ ہو۔ مستقبل کے کسی خوف، کسی تاریک پہلو اور کسی پریشانی سے نہ ہو۔ اچھی بات کرو۔ میری بات کرو۔ ان خوابوں کی بات کرو جو میرے بھی ہیں اور تمہارے بھی۔ اس محبت کی بات کرو جس نے مجھے تسخیر کیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے رات کے اندھیرے کو صبح کا اجالا تسخیر کرتا ہے۔ ہر صبح پہلے کاذب لگتی ہے۔ دھوکا۔ فریبِ نگاہ۔ مگر یہی صبح صادق کا اجالا بن جاتی ہے تو سحر کے یقین کو کون جھٹلا سکتا ہے۔" بولتے بولتے میں نے رابعہ کی طرف دیکھا اور خاموش ہوگیا۔ وہ بت بنی بیٹھی تھی اور اس نے نظر جھکا لی تھیں اس کے عارضوں پر رنگِ گلاب کی سرخی جھلکنے لگی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور سر کو کرسی کی پشت سے لگا دیا۔ سکون اور طمانیت کا ایک انجانی احساس

بخش احساس میرے وجود میں نشہ بن کے اترنے لگا۔ میں نے آرزو کی کہ کاش وقت کی گردش یہیں رک جائے۔ اس رات کا کا دوسرا کنارہ نہ ہو۔

"سکندر!" رابعہ کی آواز بیکراں وقت کے کسی ساحل سے آئی۔ "میں تمھارے اس سوال کا جواب دوں گی جو تم نے سب سے پہلے کیا تھا۔ کہ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟ تم نے تو وجہ بتا دی۔ وجہ میرے لیے بھی وہی تھی۔ میں بھی مستقبل کے اندیشوں میں گرفتار تھی۔ تنہا تھی اور ڈر رہی تھی لیکن میں عورت بھی ہوں، صرف وکیل ہی نہیں۔ میں بھی سوچ رہی تھی اور تم نہ آتے تو شاید سوچتے سوچتے میں بھی پاگل ہو جاتی۔ مگر میں صرف اپنے اور تمھارے بارے میں سوچ رہی تھی، کسی مقدمے اور کسی قانونی حوالے کے بارے میں نہیں۔ وہ دل کی دنیا ہے جس میں ہم سب ایک ساتھ ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ تم اور میں۔ محسن اور شہلا۔ انکل رضوی اور شیرازی اور فوزیہ اور اس کی ماں۔ ہم سب ایک ساتھ پار اتر جائیں گے۔ سلامتی کے کسی ساحل پر۔ یا اسی منجدھار میں ڈوب جائیں گے۔ مگر میں یہ نہیں چاہتی۔ مجھے جینے کے لیے صرف ایک زندگی ملی ہے۔ اگر میں صرف اپنے لیے جینا چاہوں تو کیا یہ جرم ہے؟ خود غرضی ہے؟ اور خود غرضی ہے تو کیا بقا کی جدوجہد میں اپنے سوا سب کو نظر انداز کر دینا قانونِ فطرت ہے؟ ایک حیوانی جبلت ہے؟ میں اپنی ایک زندگی کو ایک دنیا کی بقا کے مسائل پر قربان کیوں کروں؟ کیا دیا ہے آخر اب تک اس دنیا نے مجھے کہ میں اس کی خاطر کچھ کروں اور آئندہ کیا دے گی؟ دکھ، بدنامی اور مصائب کے سوا۔ میں اپنی دنیا کو لے کر الگ کیوں نہ ہو جاؤں؟ خوشی پر میرا حق بھی تو ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے آنکھیں کھول کر اور سیدھا بیٹھ کے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ میں کیا چاہتی ہوں۔" وہ بولی۔ "کیونکہ وہی تم بھی چاہتے ہو۔ اپنے آپ سے تو جھوٹ مت بولو سکندر!"

"حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے رابعہ!" میں نے کہا۔ "صرف آرزو کرنے سے ہی بات نہیں بنتی۔"

"ہونہہ" وہ سر جھٹک کر بولی۔ اس کے بال چہرے پر آ گئے۔ اس نے نزاکت سے انھیں پھر شانوں پر پھیلا دیا۔ "آرزو کیا ہے؟ فقط اپنے ارادوں کی کمزوری۔ ورنہ جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔"

"راہ تو ہے لیکن منزل کہاں ہے؟ ابھی تو نشانِ منزل کا بھی پتا نہیں ہے۔"

"مجھے ٹالنے کی کوشش مت کرو۔ میری اور تمھاری منزل ایک ہے تو ڈر کیسا؟" وہ بولی۔ "میرا ہاتھ تھام لو۔ میں تمھیں سیدھا راستہ دکھاتی ہوں۔ ورنہ جن راستوں سے ہم منزل تک پہنچنے کو سرگرداں ہیں، وہ اتنے پُرپیچ ہیں کہ ہم تمام عمر بھٹکتے رہیں گے اور منزل ہمیشہ سراب کی طرح دور ہوتی جائے گی۔ ان سب جھگڑوں، بکھیڑوں کو یہیں چھوڑ دو۔ سارے رشتوں کو اور سب بندھنوں کو توڑ دو۔ چلو اپنی دنیا میں چلیں۔"

"تم زنانہ ناولوں کے ڈائیلاگ بول رہی ہو۔ اس دنیا سے الگ کون سی دنیا ہے؟ سوائے عالمِ ارواح کے۔"

"نہیں۔ میرے سامنے ایک عملی صورت ہے۔" وہ بڑا مانے بغیر بولی۔ "ذرا تصور کرو دنیا کا وہ دوسرا کنارہ کہاں ہے۔ دنیا کی زمین اور اب آبادی کہاں کہاں پھیلی ہوئی ہے۔ قطبِ شمالی سے قطبِ جنوبی تک۔ ہانگ کانگ سے لاس اینجلز تک۔ پانچ براعظم ہیں۔ سوا سو ملک ہیں۔ سیکڑوں شہر، لاکھوں قصبے۔ اتنی وسیع زمین پر انسانوں کے اس سمندر میں ایک مرد اور ایک عورت کے لیے پناہ کی کوئی جگہ نہیں؟ کسی دور افتادہ، خیال اور امکان کی دسترس سے دور ایک چھوٹا سا گھر بھی نہیں جو کسی گمنام اور نادیدہ و ناشنیدہ گاؤں میں ہو؟"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تم کہہ رہی ہو کہ ہم دونوں بھاگ جائیں؟"

"بے شک اخباروں اور کتابوں کی دنیا میں اور ہمارے گھروں میں یہ لفظ مختلف معانی رکھتے ہیں۔ لیکن کیا اس کے باوجود لوگ پناہ کے لیے بھاگتے نہیں رہتے۔ ہمت ہوتی ہے تو کبھی بچے، کبھی ماں اور کبھی باپ اس گھر سے بھاگ جاتے ہیں جہاں خوشی نہ ہو۔ بزدل ہوں تو ذمے داریوں سے بچ کر بھاگ جاتے ہیں۔ ہم سب دن سے بھاگ کر رات کی آغوش میں اور حقائق سے بھاگ کر خوابوں کی دنیا میں پناہ لیتے ہیں۔ یہ سب جو مار دھاڑ، عشق و محبت اور ہنسی مذاق سے بھرپور فلمیں دیکھتے ہیں وہ بھی تو گھٹن سے بچنے کے لیے عملی زندگی سے بھاگ جاتے ہیں اور اسکرین کی دنیا میں انھیں خوشی مل جاتی ہے۔ جنھیں کہیں خوشی نہ ملے وہ نشہ یا خودکشی نہ کر سکیں تو عقل و ہوش کی دنیا سے بھاگ جاتے ہیں۔ پاگل خانے کی دنیا میں بھی انھیں خوشی مل جاتی ہے۔"

"تمھارا... مطلب ہے میں اور تم اس ملک سے نکل جائیں؟" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

"ہاں۔ ذرا سوچو کتنے مجرم ہیں جو اس طرح اپنے ملک سے نکل گئے اور انھوں نے اپنے وسائل سے دوسرے ملکوں کی شہریت حاصل کر لی۔" رابعہ نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو رابعہ!" میں نے کہا۔ "تم قانون کو سمجھتی ہو۔ اتنا تجربہ مجھے بھی ہے کہ غلط نام سے پاسپورٹ کیسے اور کہاں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بھیس بدل کے یا فرضی نام اختیار کر کے مشرق مغرب یا شمال جنوب کی طرف نکل جانے کے کتنے راستے ہیں۔ خشکی کے راستے، سمندر کے راستے اور ہوائی سفر کے راستے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جتنا پیسہ اب تمھارے پاس ہے اسے زرِ مبادلہ کی صورت میں باہر منتقل کرنا ہو تو کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہ رقم یقیناً اتنی ہے کہ جس سے ہم۔ بقول تمھارے ہانگ کانگ سے لاس اینجلز تک کہیں بھی سکونت اختیار کر سکتے ہیں اور خود کفالت کے لیے آمدنی کے مزید ذرائع بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے ارادوں میں کھوٹ نہیں۔ ہم کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوں گے اور جان بچانا کوئی جرم نہیں۔ ہم باقاعدہ شادی کر کے عام لوگوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔ خواہ ہم دوسرے نام سے کیوں نہ ہوں۔ جیسے فلمی دنیا میں ممتاز بیگم کی جگہ مدھو بالا اور یوسف خان کی جگہ دلیپ کمار نے لی۔ ویسے ہی ہم مسٹر اینڈ مسز ایکس وائی زیڈ ہو جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہم کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں، کس کے لیے کر رہے ہیں۔ یہ جانتا ہوں کہ... قانون کی دسترس سے دور ہو جانے کے بعد ہم سب آفات، تمام مصائب اور سارے مسائل و تفکرات سے محفوظ ہو جائیں گے اور میرے مقدمات کی فائلیں بالآخر داخل دفتر ہو جائیں گی۔ ان کو دیمک چاٹ جائے گی خواہ ریکارڈ پر مفرور مجرم کا لیبل لگا رہے۔"

دم لینے کے لیے اور اپنے کلائمکس کی تیاری کے لیے میں نے توقف دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کے سلگائی۔ رابعہ جانتی تھی کہ میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی اور اس میں فیصلہ کن موڑ باقی ہے۔

"ان تمام حقائق کو سمجھتے ہوئے بھی" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں تم سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اس لیے نہیں کہ میں ڈرتا ہوں۔ نہیں۔ بقول فلمی شاعر۔ پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ میں ہیرو بننے کے خبط میں بھی مبتلا نہیں اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ [illegible] ایک کو ٹھکانے لگا دوں گا اور دشمنوں کی ایسی تیسی۔ ہم یہیں رہ کے شادی کر لیں گے اور جیسا کہ عموماً فلموں میں ہوتا ہے۔ ولن کا خانہ خراب ہو گا اور آخری منظر میں ہیرو ہیروئن کی خانہ آبادی ہو گی۔ اصل بات یہ ہے رابعہ کہ مجھ پر اپنی جان کا نہیں دوسروں کی جان کا قرض ہے۔ سب سے پہلے وزیر خان کا دردناک انجام مجھ سے تقاضا کرتا ہے کہ میں اس کی روح کے لیے سکون کا سامان فراہم کروں۔ جذباتی رشتے [illegible] باپ تھا۔ اس نے جس نیک نیتی اور فراخ دلی سے میری پرورش پر اپنی زندگی قربان کی اس کا صلہ میں اس طرح نہیں دے سکتا کہ صرف اپنی خوشی کو مقدم سمجھتے ہوئے بھاگ جاؤں۔ ہم کسی دور افتادہ اور گمنام قصبے کے چھوٹے سے گھر میں ـــــ... قانون اور اپنے دشمنوں کے حساب سے تو محفوظ رہ سکتے ہیں لیکن خوش نہیں رہ سکتے رابعہ! ضمیر کی ایک خلش ہم دونوں کے لیے ساری عمر کا آزار بن جائے گی کہ ہم نے ان سب کے لیے کچھ نہیں کیا جنھوں نے ہماری خاطر جان تک دے دی۔ مظلوم تم بھی ہو۔ شہلا بھی ہے۔ یاسمین نام کی ایک لڑکی بھی ہے۔ پیر گل رخ ہے اور ایک ایماندار کسٹم آفیسر نعیم ہے جو روپوش رہنے پر مجبور ہے۔ میں بزدلی اور کم ہمتی کا طعنہ برداشت کر لوں گا۔ اپنی خود غرضی کو جواز فراہم کر دوں گا۔ لیکن کیا میں اس بات پر خود کو معاف کر سکوں گا کہ میرے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے سے جیت ان کی ہوئی جو ظالم تھے۔ اپنی طاقت کے زعم میں۔ نعوذ باللہ۔ خود کو خدا سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ مر سکندر بخت اگر مفرور مجرم ہو جائے تو دنیا میں صرف وہی چند بے ضمیر مجرم رہ جائیں گے جو ڈی سلوا ہوں گے اور چوہدری دلاور ہوں گے۔ وزیر خان اور سلامت شاہ اور فومانچو اسی طرح بے بسی کی موت مرتے رہیں گے۔ نہیں رابعہ! اس احساس کے ساتھ زندہ رہنے میں میرے لیے خوشی کا تصور بھی ناممکن ہے۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ دور کہیں سے مؤذن کی صدا بلند ہوئی۔ گواہی دیتا ہوں میں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں۔ کوئی حاکم نہیں۔ وہ سب سے بڑا ہے۔ ہر ڈی سلوا، ہر چوہدری دلاور، ہر خسرو جمشید، ہر ظالم اور فرعون، ہر شیطان اور ہر شرکاری سے بہت بڑا ہے۔ بہت زیادہ طاقتور ہے۔ وہ دیکھنے والا ہے اور اس کا ہاتھ مارنے والے کے ہاتھ سے زبردست ہے۔ اس کی عدالت کا قانون اندھا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ دنیا نیکی کے مفہوم اور سچ کے وجود کو کہاں سمجھتی اور خود آدمی نے اپنی ہی دنیا کو کب کا تباہ کر دیا ہوتا۔

مجھے رابعہ کے اٹھ کر جانے کا علم نہیں ہوا۔ چشمِ تصور میں وہ پیکرِ حسن و خوبی میرے مقابل تھا اور میں آنکھیں بند کیے اس چھوٹے سے گھر میں گھوم رہا تھا جو سیکڑوں بلکہ ہزاروں میل دور دامنِ کوہ کے ایک چھوٹے سے پُرفضا قصبے کے آخری کنارے پر تھا۔ سرخ اینٹوں کے اس مکان کی کھڑکیاں اور دروازے سفید تھے اور اس کی مخروطی چھت پر ایک چمنی کے ساتھ ٹی وی کا انٹینا لگا ہوا تھا۔ اندر آتش دان میں شعلے بھڑک رہے تھے جن کا عکس فائر اسکرین کو... روشن

کر رہا تھا۔ بند کھڑکیوں کے شفاف شیشوں سے برفباری کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔ چھت پر ڈھیر ہو جانے والی برف پھسل پھسل کر نیچے گرنے لگی تھی۔ ٹی وی پر کوئی تصویر نہیں نظر آ رہی تھی لیکن ہم خود تصویر بنے ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنی محبت کے عکس کو روشن دیکھ کر خوش تھے۔ میں اس سے نظر نہ ملا سکا اور آنکھیں بند کر لیں۔

جب میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ جا چکی تھی۔ اس کی کرسی خالی پڑی تھی۔ وہ خود شاید اندر اپنے کمرے میں بستر پر پڑی اپنے خواب آرزو کی شکست پر آنسو بہا رہی تھی۔ آخر کیا ہو جاتا ہے اچھی بھلی بالغ اور سنجیدہ عورتوں کو۔ محبت کرتی ہیں تو سب ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔ وہی رومان پرور خیالات کی غیر عملی دنیا میں رہنے والی نادان لڑکی جو صرف جذبات کی زبان سمجھتی ہے اور عقل سے سب رشتے توڑ دیتی ہے۔ میرا گھر میری جنت۔ شوہر میرے سر کا تاج اور میرے بچے، میرے گلشن کے پھول۔ کیا گاؤں کی ألھڑ دوشیزہ۔ کیا اسکول گرل اور کیا وکیل۔ ان سب کی تمنائیں خوشیاں اور خواب اتنے عام اور مشترک کیوں ہوتے ہیں۔ فلم میں ہیروئن بھی مطالبہ کرتی ہے کہ میں چلیو دنیا سے اس نکلتے جتنے بندہ نہ جس ذی ذات ہو لیے۔ اور رابعہ بھی یہی چاہتی تھی کہ ہم دونوں رہیں ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو۔ بات تو ایک ہی ہے۔ کوئی سمجھا نہ کر پایا۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ تو ٹپ ٹپ آنسو شکوہ۔ ہسٹریا۔

میں اٹھا اور تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ رابعہ کی بات نے میرے خیالات کے دھارے کا رخ بدل دیا تھا۔ میں اب اپنی زندگی کو لاحق خطرات اور اپنے مقدمات کے بارے میں نہیں رابعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کیسے تفکرات کا بار گراں غائب ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ صرف ایک خیال رہ گیا تھا۔ وہ مجھے اتنا چاہتی ہے۔ دیوانگی کی حد تک۔ میری خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہے۔ اپنا نام اپنا معزز پیشہ۔ اپنا گھر اور وطن۔ اتنا بھروسہ ہے اسے مجھ پر۔ اور اس خیال میں میرے لیے جو سکون بخش راحت اور مسرت تھی کہ جب میں کھڑکی کے راستے پھر کمرے میں داخل ہوا تو مسکرا رہا تھا۔

محسن آلتی پالتی مارے سادھو کی طرح بستر پر بیٹھا تھا اور اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

”وعلیکم السلام“ میں نے خفت کو چھپانے کے لیے خوش دلی سے کہا۔ ”کیا وقت ہوا ہے؟“

”یہ وقت ہے شگفتہ گل کھلانے کا“ اس نے میری طرف دیکھے بغیر روبوٹ کی طرح کہا۔ ”مگر ایش ٹرے میں ایک ٹوٹا ہوا نہ چھوڑنا بڑی کمینگی ہے۔ ایک سگریٹ لے تو مزید گستاخی کر لوں آپ کی شان میں۔“

”ضرور ضرور“ میں نے سگریٹ کا پیکٹ اس کی گود میں ڈال کے کہا۔

اس نے سگریٹ جلا کے ایک کش لیا اور ڈانٹ کر بولا ”یہ کیا ہو رہا تھا باغ میں؟“

”باغ میں؟ کون سے باغ میں؟“ میں نے معصومیت سے کہا۔ ”کیا ہو رہا تھا؟ کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ کسی بھی باغ میں۔“

”میری پڑنانی ایسے ہی بال بکھرائے راتوں کو باغ میں گھومتی تھیں“ محسن نے کہا۔ ”ان پر ایک جن فریفتہ ہو گیا تھا۔ خاصا وی آئی پی قسم کا۔“

”وہ تمہاری پڑنانی نہیں تھیں“ میں نے کہا۔ ”رابعہ تھی۔“

”کدھر ہی ہو گی میرے ساتھ نکل چلو“ محسن بولا۔

میں اچھل پڑا ”تو۔۔۔ تو سن رہا تھا!“

”نہیں“ محسن ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ ”مگر یہ مخلوق ایک ہی زبان بولتی ہے۔ ہم نے یہ بال ایسے ہی دھوپ میں کالے کر کے سیاہ کیے ہیں فور بشم۔ دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ اس لیے سب جانتے ہیں۔“

محسن نے مذاق کیا تھا اور اندھیرے میں تیر چلایا تھا مگر غلط نہیں کہا تھا۔ ”کہاں ہے یار!“ میں نے کہا۔ ”رابعہ اتنی عقل و ذہانت اعلیٰ تعلیم اور تجربے کے باوجود بہت کمزور عورت ہے۔“ پھر میں نے اسے بتایا کہ رابعہ کیا چاہتی تھی۔

”یار تم دونوں ہنمونولو چلے جاؤ۔ وہاں میری ایک بہن فرینڈ ہے“ محسن نے کہا۔ میں رابعہ سے اتفاق کرتا ہوں۔“

”پہلے تو شملا کے ساتھ منگو چلا جا۔ وہاں میری ایک بہن فرینڈ رہتی ہے“ میں نے جل بھن کر کہا۔

”خیال تو اچھا ہے“ محسن نے کہا۔ ”بس ایسا کرتے ہیں کہ ان دونوں کو بھی ٹرایپ کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ فالتو پیسہ بھیجنے پہ خرچ کرتی ہیں۔ تو خالی ہاتھ منگو چلا جا۔ میں جاتا ہوں ہنولولو۔ اپنی اپنی بہن فرینڈز سے۔۔۔“

”بہن فرینڈ۔۔۔؟“ رضوی صاحب نے اچانک اندر آ کے کہا۔ ”ارے بھئی ابھی تک یہ بچوں والی باتیں!“ وہ حسب عادت صبح دم لان پر ٹہلنے کے لیے نکلے تھے مگر ہمارے کمرے میں روشنی دیکھ کر ادھر آ گئے۔ محسن نے بڑی عجلت میں سگریٹ

چھپایا اور جلتی ہوئی سگریٹ کو پلنگ کے نیچے پھینک دیا۔ اسے اتنا وقت ہی نہیں ملا تھا کہ سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھا سکتا۔

”السلام علیکم انکل!“ ہم دونوں نے ایک ساتھ اٹھتے ہوئے بوکھلا کے کہا۔

رضوی صاحب مسکرائے ”بھئی آج تم دونوں کی سحر خیزی۔ خدا خیر کرے۔ کوئی نیا گل کھلانے کا خیال ہے؟“

”نہیں انکل!“ میں نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔ ”یہ تو ایک اچھی عادت ہے۔ انگریز کہتے ہیں نا۔۔۔“

”بالکل بالکل“ رضوی صاحب نے بیڈ کے نیچے سے دھوئیں کی بل کھاتی لکیر کو دیکھ کر کہا۔ ”مگر یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے۔ انگریز یہ بھی کہتے ہیں کہ جہاں دھواں ہو گا وہاں آگ ضرور ہو گی“ انھوں نے نیچے جھک کر سگریٹ اٹھائی اور محسن کو پیش کی ”شوق فرمائیے۔“

محسن نے جھینپ کر سگریٹ لی اور ایش ٹرے میں بجھا دی۔ ”وہ۔۔۔ میں۔۔۔ میرا خیال ہے۔ میں غسل کر لوں“ وہ جلدی سے اٹھا۔ باتھ روم تک پہنچتے پہنچتے ایک اسٹول سے ٹھوکر کھا کے منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ پھر دروازہ کھولے بغیر باتھ روم میں داخل ہونے کی کوشش میں دروازے سے ٹکرایا اور سر سہلاتا ہوا انت نکالتا روپوش ہو گیا۔

”گدھا“ رضوی صاحب نے شفقت سے مسکرا کے کہا اور نائٹ گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈالے خالی بیڈ کے کنارے پہ ٹک گئے۔

”جی“ میں نے کہا۔ سوائے اس کے میں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

”جی کیا؟ تم خود کیا ہو؟“ انھوں نے فرمایا۔ ”الو۔ آخر تم لوگوں کو نیند کیوں نہیں آتی سارے بھی جوانی میں تو آدمی گھوڑے گدھے سب بیچ کر سوتا ہے۔ ہم بھی سوتے تھے۔ کیا باتیں کرنے کے لیے دن کم ہے کہ رات کو بھی قربان کیا جائے۔ وکیل اور موکل کس مسئلے پہ تاریخی سرگوشیوں میں مصروف تھے؟“

اب میرے بوکھلانے کی باری تھی ”وہ۔۔۔ بس یہی۔۔۔۔ دراصل مسائل اتنے ہیں۔ پریشانیوں کے باعث۔“

”خدا نے رات آرام کے لیے بنائی ہے۔ پریشان ہونے کے لیے نہیں اور کیا محض پریشان ہونے سے مسائل حل ہو جاتے ہیں“ انھوں نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔ ”خرابی یہی ہے کہ آرام نہ کرنے سے جسم پر اعصاب پر اور ذہن پر برا اثر پڑتا ہے۔ رات کو سکون سے سونے کے بعد جو شخص تازہ دم ہو کے اٹھتا ہے وہ اپنے مسائل کو بہتر طور پر حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خیر! میں کوئی لیکچر دینے نہیں آیا تھا۔ تم

عاقل و بالغ ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود مختار ہو۔“

”آپ شرمندہ کر رہے ہیں انکل!“ میں نے سر جھکا کے کہا۔

”ہاں۔ مگر کسی توقع پر نہیں“ انھوں نے کہا۔ ”اچھا ہوا تمہارا مشیر اعلیٰ چلا گیا۔ ورنہ مجھے تم کو خاص طور پر اپنے ساتھ لے جانا پڑتا۔ مجھے تم سے ہی بات کرنی تھی۔ اٹھو چلو میرے ساتھ۔“

میں نے بلا چون و چرا تعمیل کی اور ان کے ساتھ لان پر آ گیا۔

”رات کو شیروانی کا فون آیا تھا“ انھوں نے ٹہلتے ٹہلتے کہا۔

”خیریت تو ہے نا وہاں انکل؟“ میں نے ان کے لہجے کی تشویش کو محسوس کر لیا۔

”نہیں۔ بظاہر خیریت نہیں ہے“ رضوی صاحب نے کہا۔ ”شیروانی نے تو مجھے تسلی دینے کے لیے الفاظ کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ پریشان تھا۔ مسز شیروانی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔ وہ سی ایم ایچ میں داخل ہیں۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ یہ کولیپس۔ اردو میں اس کا متبادل کیا ہے؟ خیر تو یہ سمجھ لو کہ غیر معمولی اعصابی کشیدگی اور ذہنی دباؤ کا۔ اور یہ پریشانیوں کا۔ جبکہ انھیں تاکید تھی کہ وہ خوش رہیں۔ یہ ڈاکٹر لوگ آخر دنیا کو اپنی نظر سے کیوں دیکھتے ہیں کہ ایسا ہونا چاہیے۔ جیسے روٹی میسر نہیں اسے کہتے ہیں کچھ نہیں۔ انیمیا ہے۔ خوب پھل انڈے گوشت کھاؤ۔ وہی کہ روٹی نہیں ملتی تو کیک کھاؤ۔ اور وہ جو پانچ سو کمانے کے لیے صبح سے شام تک لوہا پتھر کوٹتا ہے اور ٹی بی میں مبتلا ہو جاتا ہے اسے کہتے ہیں آرام کرو اور تفکرات سے دور رہو۔ وہ غریب آرام کرے گا تو کنبہ فاقے کرے گا۔ اس کو تو مرنا ہی ہے۔ یہ لاعلاج روگ ہیں۔ تکلف برطرف کہہ کے وہ خفگی میں اصل بات تو بھول گئے تھے لیکن میں نے ان کو ٹوکا نہیں۔ انھوں نے ایک گہری سانس لی ”میرا خیال ہے کہ میرا بلڈ پریشر کچھ ہائی ہونے لگا ہے۔ اس عمر میں احتیاط کرتے رہنا چاہیے۔ میں بات کر رہا تھا مسز شیروانی کی۔“

”کیا خدا نخواستہ۔ معاملہ سیریس ہے؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

”نہیں۔ اب تو ہوش میں ہیں۔ مگر ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ انھوں نے۔ انھوں نے کیا۔ یہ تو قدرت کا بہت پہلے سے تحریر کردہ فیصلہ ہے جسے ڈاکٹر صحیح طرح پڑھ سکے بہرحال جتنی مہلت ان کے اندازے کے مطابق باقی تھی۔ وہ اب آدھی بھی نہیں رہی اور کوشش تو سب نے کی تھی لیکن یہ بات مسز شیروانی سے چھپی نہیں رہ سکی۔ ہوتی ہے کوئی غیبی قوت۔ یا چھٹی حس۔ جو پُرخطر حالات میں قبل از وقت

خبردار کر دیتی ہے۔ انھوں نے سب کو جتا دیا ہے کہ ان کا آخری وقت آ گیا ہے اور ڈاکٹروں کی رائے یا دوسروں کے دلائل سے سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کی کوشش بے سود ہو گی۔ چنانچہ انھوں نے کل دوائیں وغیرہ سب پھینک دیں اور واپس گھر جانے پر اصرار کیا۔ اس سے مزید تشویشناک صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ علاج جاری رہتا تو کچھ وقت اور گزر جاتا۔ مگر دوا تو کھانے سے...“ انھوں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”آج شیروانی اسے گھر لے جائے گا۔“ میں نے بھی کہا۔ ”اب کیا فائدہ زبردستی کرنے کا۔“ وہ خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر ہم ختم سے لان پر ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ میں جانتا تھا وہ کچھ اور کہنے کی سوچ رہے ہیں اور شاید مناسب الفاظ کی جستجو میں ہیں۔ تذبذب ان کی صورت سے عیاں تھا۔

”پھر تو محسن کو فوراً گھر چلا جانا چاہیے۔“ میں نے اس خاموشی سے گھبرا کے کہا۔

”ہاں، اسے تو جانا ہی ہے۔“ وہ بے خیالی میں سر ہلا کے بولے۔ ”بس وہ ابھی ناشتا وغیرہ کر لے اور روانہ ہو جائے۔ ڈر مجھے یہ ہے کہ وہ انکار نہ کر دے۔“

”وہ اتنا بے حس اور سنگدل یا نافرمان تو نہیں ہے انکل!“ میں نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے وہ اپنی ماں کے لیے دل میں کیا جذبات رکھتا ہے اور اس کی خاطر ہر قربانی دے سکتا ہے۔“

”ہاں۔ سوائے شاید ایک تمہاری دوستی کے۔“ انھوں نے اتفاق کیا۔ ”لیکن یہ قربانی کسی نے کبھی نہیں مانگی ہے۔ ہوتا یہ ہے سمجھ لو کہ بعض اوقات آزمائش کے مرحلے توقعات سے زیادہ سخت ثابت ہوتے ہیں۔ وہ شخص جس کا دل موم کا بنا ہوا ہو کسی کو مرتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ مرنے والی اگر اپنی ماں ہو اور اس کی موت دوسروں کے لیے بھی اتنی پرعذاب ہو، تو وہ ڈر جاتا ہے۔ نزع کے قرب سے تدفین تک کے مراحل۔ سب امتحان صبر آزما... رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد یادوں کو ذہن سے خارج کر دینا آسان نہیں ہوتا۔ زیادہ آسان یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سطر کا تعزیتی تار پڑھ لے کہ ماں مر گئی۔ ٹیلیفون پر اطلاع ملنے کے بعد بھی اس وقت پہنچے جب دیکھنے یا کرنے کو کچھ نہ رہے۔ وہ باپ کو تسلی دے۔ ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھے اور لوٹ آئے۔“

”محسن ایسا کبھی نہیں کرے گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس کی ایک بہن بھی ہے۔ جو اس سے چھوٹی ہے۔“

”اسی کا تو مسئلہ ہے۔“ رضوی صاحب نے کہا۔ ”وہ دو دن کے اندر اندر وہ اس کا نکاح اور رخصتی سب کر دینا چاہتی ہیں۔ آج یا کل میں... کوئی پروفیسر ہے...“

”ایاز!“ میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ ”یہ بات تو پہلے سے طے تھی؟“

”تم... تمہیں کوئی صدمہ نہیں ہوا؟“ انھوں نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔ ”کیوں؟“

”ایاز بہت اچھا آدمی ہے۔“ میں نے نظر چرا کے کہا۔ ”فوزیہ اس کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن رہے گی۔“

”اور تم... میرا خیال تھا کہ تم بھی اسے چاہتے تھے۔ اس سے منسوب تھے۔ باقاعدہ نہ سہی۔“

”وقت کے ساتھ آدمی کے خیالات۔ اس کی پسند ناپسند بہت کچھ بدل جاتا ہے انکل! ہم سب ایک مسلسل تغیر کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ بقول شاعر۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔“ میں نے کسی یقین کے بغیر اپنا دفاع کیا۔

”جذبات کی اس تبدیلی کا ذمے دار کون ہے؟ تم یا فوزیہ؟“

”میں انکل!“ میں نے ہمت سے کام لے کر کہا۔ ”خود میں نے اسے ٹرن ڈاؤن کیا۔ کسی مجبوری کے بغیر۔ ولایت میں رہ کے میرے جذبات وہ نہیں رہے تھے۔ یہ بات میں نے محسن سے بھی کہہ دی تھی اور فوزیہ سے بھی۔ میں جھوٹ کیسے بولتا ان سے۔“

رضوی صاحب نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ ”ستاروں میں یہ بھی تھا۔ اچھا کیا جو تم نے تصدیق کر دی۔ میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں رہا۔“ انھوں نے گھڑی دیکھی۔ ”ناشتا کرنا چاہیے۔“

”ایک بات اور بتا دوں انکل!“ میں نے کہا۔ ”محسن کی ماں نے اس کی نسبت بھی کسی جمیل صاحب کی لڑکی سے طے کر دی تھی جسے محسن نے دیکھا تک نہیں۔ اس کا نام تک نہیں جانتا وہ۔ مگر وہ ماں کی خوشی کے لیے اس رشتے کو قبول کر چکا تھا حالانکہ وہ شہلا کو پسند کرتا ہے اور محسن ایسا آدمی ہے کہ جبر کے تحت ہونے والی شادی پر بھی تمام عمر خوش رہنے کی اداکاری کرتا رہتا مگر کسی پر ذرا بھی ظاہر نہ ہونے دیتا۔“

”خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔“ انھوں نے میرے ساتھ اندر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ بہت غلط لوگ ثابت ہوئے۔ بات کر کے مکر گئے۔ کسی لڑکے کا پیام آیا تھا جو امریکہ میں ہے۔ انھوں نے راتوں رات نکاح پڑھوا کے لڑکی کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔“

میں چکرا کے رہ گیا۔ ”اس کا علم آپ کو کیسے ہوا... میرا مطلب ہے محسن...“

”مجھے شیروانی نے رات کو بتایا۔ لیکن اس نے یہ بات اپنی بیوی کو نہیں بتائی ہے۔ اس سے کہا ہے کہ لڑکی یرقان میں مبتلا ہے اور اسپتال میں داخل ہے۔ ورنہ وہ تو مصر تھی کہ دونوں کام ایک ساتھ ہو جائیں۔ اسے حقیقت معلوم ہو جاتی تو شاید جانے کیا ہوتا۔ اب لڑکی کو ایک ہفتہ تک اسپتال میں رکھا جا سکتا ہے۔“ رضوی صاحب نے کہا۔

”ایک ہفتہ؟ کیا اس کا مطلب ہے کہ محسن کی ماں... اس سے زیادہ...“

”ہاں برخوردار! اس کا بالکل یہی مطلب ہے۔“ رضوی صاحب نے کہا۔ ”جاؤ ذرا اطمینان سے محسن کو سب سمجھا دو اور پھر جلدی سے ناشتے کے لیے آ جاؤ۔ غسل تو تم بھی کر چکے ہو گے۔“

محسن اور بیگم رضوی صوفے پر بیٹھے بڑی متانت سے گفتگو میں مصروف تھے جو بہت غیر معمولی بات تھی۔ بیگم رضوی کے سامنے ہم دونوں سنجیدگی سے بات کر ہی نہیں سکتے تھے اور ان کو میری، محسن یا رابعہ کی باتوں پر یا لایعنیوں پر ہنسی آتی تھی تو ہمیں بڑی اپنائیت محسوس ہوتی تھی۔ اس بے تکلفی کا مظاہرہ رضوی صاحب کی موجودگی میں ناممکن تھا۔ جن کو غصہ کبھی نہیں آتا تھا مگر ان کا رعب اور دبدبہ پورے گھر پر قائم تھا۔ رابعہ ان کے سامنے اتنی ہی متانت کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے مجھ سے نگاہیں نہیں ملائیں مگر مجھے اس کے دھلے دھلائے شگفتہ چہرے پر برگشتگی یا شرمندگی کے آثار بالکل محسوس نہیں ہوئے۔

”محسن!“ میں نے موقع پا کے کہا۔ ”وہ ذرا ایک منٹ۔“

”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ محسن نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ”آنٹی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

بے اختیار میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ یوں جیسے میرے سر پر رکھا ہوا پہاڑ کے برابر بوجھ بخارات بن کے فضا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ ”تھینک یو آنٹی! آپ نے میری مدد کر کے میری مشکل آسان کر دی۔“ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”اب کیا پروگرام ہے؟“

”محسن ابھی پنڈی جا رہا ہے۔“ بیگم رضوی نے مجھے مطلع کیا۔ ”ریل کار تو نکل گئی ہے، ویگن ہر وقت مل سکتی ہے۔“

جانے کے بعد میں ناشتے کی میز پر پہنچا تو ماحول مجموعی طور پر سوگوار تھا جو ایک قدرتی بات تھی۔ ”آپ محسن کے ساتھ چلی جائیں۔“ رضوی صاحب نے کہا۔ ”اور گاڑی لے جائیں۔“

”بچوں کا کیا ہو گا؟“ بیگم رضوی نے بالکل گھریلو بیویوں کی طرح کہا۔ ”انھیں بھی لے جانا ہے؟“

”نہیں۔ میرے خیال میں ان کا وہاں جانا مناسب نہیں۔ میں کچھ کر لوں گا۔ ساتھ والوں کے گھر میں انھیں کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔“ رضوی صاحب نے کہا۔ ”ہم لوگ شام یا رات تک آ جائیں گے۔“

”آخر آپ سب لوگ ہمارے ساتھ کیوں نہیں جا سکتے؟“ بیگم رضوی نے کہا۔

”میرا تو کوئی مسئلہ نہیں۔“ رضوی صاحب نے کہا۔ ”فون کر سکتا ہوں اور بتا سکتا ہوں کہ دو چار دن کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ سب جانتے ہیں میں بلاوجہ چھٹی نہیں کرتا۔ کوئی مجھ سے سبب بھی نہیں پوچھے گا۔“

”میرے کیس میں میرے ساتھی پیش ہو سکتے ہیں یا تاریخ لے سکتے ہیں۔“ رابعہ نے کہا۔ اس کا لہجہ بالکل نارمل تھا۔

”مشکل ہے سکندر کے لیے۔“ رضوی صاحب نے کہا۔

”یہ عدالت کی اجازت کے بغیر شہر سے نہیں جا سکتا۔ تمہاری اگلی پیشی کب ہے؟“ انھوں نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔

”ابھی کافی دن ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اجازت ملنے میں کتنا وقت لگ جاتا ہے؟“

”اجازت عدالت کی صوابدید پر ہے۔“ رابعہ نے کہا۔ ”آج ہی مل سکتی ہے۔ انکار بھی ہو سکتا ہے اور اس کے امکانات زیادہ ہیں۔“

”کیوں؟ جب میرے ضامن موجود ہیں...“ میں نے کہا۔

”عدالت کے اختیارات کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے خلاف اپیل کی جا سکتی ہے۔“ رابعہ نے کہا۔ ”وہ جج اس معاملے میں بہت سخت ہے جس کے پاس تمہارا کیس ہے۔ وہ تم سے دس سوالات کرے گا اور فیصلہ دے گا کہ اجازت دینے کا کوئی جواز نہیں کیونکہ ملزم کا اس خاندان سے براہ راست کوئی رشتہ نہیں۔ اپنے ماں باپ اور بھائی بہن ہوں تو انکار کا جواز نہیں رہتا۔ دراصل زیر ضمانت ملزم جو اس نوعیت کے مقدمات میں ماخوذ ہوں، گھومنے پھرنے کے لیے ایسے ہی بہانے کرتے ہیں۔ فلاں دوست یا کسی کزن کی فیملی میں کچھ ہو رہا ہے۔ جھوٹ سچ کا پتا چلنا مشکل ہوتا ہے۔“

”تم چھوڑو اس سارے چکر کو۔“ بیگم رضوی نے کہا۔ ”ابھی نہ پیشی ہے نہ کوئی سمن آنے کو ہے۔“

”یہ... خلاف قانون ہے بیگم!“ رضوی صاحب نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”ہاں ہاں۔ ہے۔ مگر تم سڑک پر سے گزرتے ہو تو کتنی جگہ تمہاری نظر خلاف قانون کام ہوتا دیکھتی ہے مگر تم نظر انداز کر کے گزر جاتے ہو۔ گاڑیاں غلط جگہ کھڑی ہوتی ہیں۔ خود

تمھیں لوگ غلط سائڈ سے اوورٹیک کر جاتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر جا بجا سے کہ ریڑھیاں لگانے والے ٹھیلے تک سب بزنس کرتے ہیں۔ پابندی کے باوجود لوگ کار واشنگ کے نلکوں پر نہاتے ہیں۔ تب کے پل پر پہنچتے تک سڑک سے گزرتے ہیں اور اس ریلوے پھاٹک کو بند ہونے کے باوجود سائیکل اٹھا کے کراس کرتے ہیں۔ اور شب برات پر کیا تمھارے بچے آتش بازی نہیں کرتے؟ پھر اس بات کو کیوں نظر انداز نہیں کر سکتے تم جو بالکل جائز ہے۔" بیگم جعفری کو میں نے کبھی اتنی دیر تک مسلسل بولتے نہیں دیکھا تھا اور نہ اس طرح جعفری صاحب کے سامنے اختلاف رائے کرتے سنا تھا۔

"ارے کیا بات ہے رابعہ!" خلاف توقع جعفری صاحب نے مسکرا کے کہا "تم ہی وکیل نہیں ہو اس گھر میں۔"

"ویسے کسی کو معلوم تو نہیں ہو سکتا انکل!" رابعہ نے کہا "یہ لوگ فرنیچر بیٹھنے تک مسیج وصول نہیں کر سکتے۔ گھر میں موجود ہونے کے باوجود سا ایسا کوئی انتظام کر لیں کہ کوئی آئے تو کہہ دیا جائے محسن صاحب ڈاکٹر کے پاس گئے ہوئے ہیں۔" صرف ایک جھنجھلاہٹ کی بات ہی نو سے بلکہ اسے احساس ہوا کہ یہ آخری جملہ جو غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکل گیا تھا کتنا غلط تھا۔

"اگر یہ انتہائی ضروری ہے کہ اس وقت ہم سب وہاں موجود ہوں،" بیگم جعفری نے فوراً خلا کو پُر کر دیا "تو تمام عزیزوں نے سے بعد میں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اسا پی کی رخصتی میں ہم شریک نہ ہوئے تو کون ہوگا۔"

محسن اچانک اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اس کی حالت کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ وہ برداشت کر رہا تھا مگر اس کا دل رو رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ جعفری نے رابعہ کو پیچھے آتے دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔" جعفری صاحب نے بھی ناشتا ادھورا چھوڑ کے کہا "ہم سب جائیں گے۔ ابھی ایک گھنٹے میں ان شاء اللہ!"

محسن اپنے کمرے میں کھڑا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ پلٹا اور مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے۔ یہ زندگی میں دوسرا موقع تھا جب میں نے اس کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر خود کو بے بس محسوس کیا۔ محسن باہمت اور اپنے دکھ کو چھپا کر چلنے والا آدمی تھا جس کی نگاہ ہمیشہ زندگی کے روشن پہلو پر رہتی تھی۔ پہلا جذباتی صدمہ مریم کی موت تھی۔ اس حادثے ... کے بعد وہ سارا دن روتا رہا تھا اور پھر بیٹھے رہا تھا۔ کھویا کھویا سا اور گرد و پیش سے بے خبر۔

اس کی نظریں ادھر ادھر کچھ تلاش کرتی رہتی تھیں اور وہ بجلی ذہنی طور پر غیر حاضر ہو جاتا تھا۔ کبھی بات کرتے کرتے چپ ہو جاتا تھا۔ محفل یاراں میں شمارہ جاتا تھا۔ فلم یا تھیٹر کے دوران میں احساس ہوتا تھا کہ اس کی توجہ سامنے کے منظر سے ہٹ گئی ہے اور وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ میں نے جب کبھی اسے ٹوکا اس نے اعتراف کیا کہ یار نہ جانے کیا بات ہے۔ باجی کی موت کو میں حقیقت سمجھ کے تسلیم کر چکا ہوں۔ اب ایسا لگتا ہے کہ میرا کچھ کھو گیا ہے۔ کوئی ایسی چیز جو مجھے بہت عزیز تھی۔ میں سوچتا ہوں وہ کیا چیز تھی؟ جیب ٹٹولتا ہوں، کیا کوئی نوٹ گم ہو گیا ہے؟ پرس گر گیا ہے؟ سڑک پر چلتے چلتے خیال آتا ہے کہ کچھ تھا جو اب نہیں ہے۔ کیا تھا؟ درخت، بچے، عمارات، دکانیں، کوئی سائن بورڈ، ہزار بار کے دیکھے بھالے منظروں سے کیا غائب ہو گیا ہے؟ میں غور کرتا ہوں اور سب کچھ وہی ہوتا ہے۔ تیرے ساتھ یا دوستوں سے باتیں کرتے کرتے بلکہ اپنے بچپن کی کوئی بات یاد آ جاتی ہے خلاف یہ کہ بعض اوقات کسی قصور کے بغیر پٹائی ہو جاتی تھی تو وہی مجھے تسلی دیتی تھی اور پیار کرتی تھی کہ کبھی تو بے قصور ہوتا ہے نا تھا، دسویں بار بے قصور پٹ گئے تو کیا ہوا۔ اس کے بعد ظلم تو کچھ نہیں۔ جب تم دنیا میں قدم رکھو گے تو دیکھو گے کہ دنیا میں کتنا ظلم ہو رہا ہے۔ بے گناہ مارے جا رہے ہیں۔ تمھیں یہاں کی فیصد انصاف بھی مل جائے گا تو سمجھنا بہت خوش قسمت ہو۔ دس فیصد مقدمات میں تو ہر جگہ غلط فیصلہ ہو سکتا ہے۔ یا پہلا وجہ خیال آ جاتا ہے کہ وہ بہن کا حلوا کتنا اچھا بناتی تھی۔" یہ محسن کے لاشعور کا قصور تھا جو پرانی یادوں کے البم سے بھولی بسری تصویریں نکال کے موقع بے موقع اس کے سامنے پیش کر دیتا تھا۔ میں نے اس کی بہت دلجوئی کی۔ وہ بالکل اس بچے کی طرح ہو گیا تھا جس کے ہاتھوں میں غبارے کی ڈور رہ گئی ہو مگر ہوا میں اڑتا ہوا غبارہ دھماکا ہوتے ہی غائب ہو چکا ہو۔

اس عجیب و غریب داستان کے بقیہ واقعات

آئندہ صفحات پر ملاحظہ فرمائیے

www.paksociety.com

پسندیدہ ناول و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں
[illegible]
[illegible]

معاشرے کے ان بد نصیب مجرموں کی روداد جو گوشت پوست کے بنے ہوئے
انسانی جذبوں میں گندھے ہوئے تھے۔ ایک کٹھن مرحلے سے گزرتے ہوئے
کمال جس کے روز و شب موت کی انتظار میں

اب وہ پھر میرے کندھے پر سر رکھ کے رو رہا تھا لیکن صدمے کی کیفیت مختلف تھی۔ یہ احساس زیادہ باعث آزار تھا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ دوا اور دعا سب بے کار ہیں۔ میں نے اسے رونے دیا۔ تاکہ اس کے دل کا غبار نکل جائے اور وہ گھر پہنچے تو سب کے سامنے نہ روئے۔ وہاں اس کی ذمے داریاں سب سے زیادہ تھیں۔ ایک جوان بیٹے کو اور بہن کے بڑے بھائی کو دوسروں کے آنسو پونچھنے تھے اور انھیں حوصلہ دینا تھا کہ وہ خاندان کی عمارت کے اس ستون کو گرنے سے تو نہیں بچا سکے مگر باقی ستونوں پر اس کو قائم رکھنے کی جدوجہد انھیں ضرور کرنی چاہیے۔

رابعہ میرے پیچھے کھڑی تھی اور بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہی تھی۔ "محسن بھائی! ہمت سے کام لیجیے۔ ایسے رونے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔" اور خود بھی روئے جا رہی تھی لیکن اسے احساس نہ تھا۔ کچھ دیر بعد محسن پرسکون ہو گیا تو میرے کہنے پر وہ سامان پیک کرنے چلی گئی۔

"محسن!" میں نے کہا۔ "اب اس کے واپس آنے تک تمھیں رونا نہیں ہے۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "یار یہ سب مجھے معلوم تھا۔ پھر بھی ہونا یہ ہے۔ مگر اس کے باوجود۔ تو جانتا ہے نا، جب سزائے موت ہو جائے وہ آخری اپیل کے مسترد ہونے تک پُرامید رہتا ہے۔ اس وقت تک کسی معجزے کا انتظار کرتا ہے جب تک اسے تختہ دار پر لے جانے والے نہ آ جائیں۔"

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے وہاں کیا ہوگا۔ کوئی بات غیر متوقع نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تیرے مقابلے میں فوزیہ بہت کمزور ہے کیونکہ وہ عورت ہے اور شہریار صاحب عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں ذہنی سفر کے بغیر سفر زندگی بے مقصد لگتا ہے اور پھر سب کے ساتھ تجھے وہ صدمہ بھی اٹھانا ہے جس میں تیری مدد کوئی بھی نہیں کر سکتا ہے۔ میں بھی صرف الفاظ کا سہارا دے سکتا ہوں۔ اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمدردی کے مصنوعی الفاظ کی کمی کسی کے پاس نہیں ہوگی مگر اس درد کا درمان صرف وقت کے پاس ہے اور یہ سفاک مسیحا میرے قبضے میں نہیں ہے۔"

"ہاں۔ ہم سب زندہ رہیں گے۔" محسن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ایک بات اور ہے محسن!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "وقت بہت کم ہے اس لیے میں صرف تجھے سمجھا سکتا ہوں۔ میں تم سب کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ میں آ جاؤں گا۔ تین چار دن بعد۔"

"فوزیہ کی رخصتی کے بعد؟" محسن نے اسی لہجے میں کہا۔

"فوزیہ سے ڈرتا ہے تو ؟"

"ہاں ۔" میں نے بمشکل تمام کہا۔ "صاف بات یہ ہے کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اس کا سامنا کرسکوں اور وہ بھی ایسے وقت میں ۔ یہاں سب منتظر ہوں گے کہ ساتھ چلو۔"

"تو کیا بہانہ کرے گا ؟" محسن نے کہا۔ "رضوی صاحب اور رابعہ نہیں مانیں گے۔"

"بہانہ پہلے سے موجود ہے ۔ میں اجازت لے کر آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اجازت مجھے منظر صاحب بھی دلوا سکتے ہیں ۔"

"جیسی تیری مرضی ۔" محسن نے کہا۔ "مگر تو یہاں اکیلا ہو گا ..."

"میری فکر نہ کر ۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا ۔" میں نے کہا۔

دوسروں پر اپنے ارادے کا اعلان میں نے اس وقت کیا جب ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں ۔ سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا اور خواتین گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں ۔ ان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر محسن تھا ۔ رضوی صاحب میری بات پر حیران ہوئے ۔

"او بیگم ! اس کو کہتے ہیں تدبی چست گواہ سست ۔" انھوں نے کہا۔ "صاحبزادے فرما رہے ہیں بعد میں آؤں گا ۔ تمھاری وکالت نے مجھے تو مجبور کر دیا تھا ۔"

"یہ تمھیں اچانک کیا ہو گیا ہے سکندر !" بیگم رضوی نے برہمی سے کہا ۔ "کیا ارادہ ہے تمھارا ؟"

"میرا کوئی غلط ارادہ نہیں ہے ۔" میں نے کہا۔ "در اصل میں نہیں چاہتا کہ خلاف قانون کام کروں اور کل کو خدانخواستہ میری وجہ سے رضوی صاحب پر حرف آئے ۔ انھوں نے یہ مجبوری آپ کی بات مان لی تھی ۔ میں کل پرسوں تک اجازت لے کر پہنچ جاؤں گا ۔"

"مگر رابعہ تو تمھارے ساتھ جا رہی ہے ۔"

"میرے دو وکیل ہیں اور دو میرا بھی نہیں کا دوست ہے ۔ عبدالودود منتظر یہ کام وہ کرے گا ۔" میں نے کہا۔

رابعہ میری صورت سے میرے دلی جذبات کا اندازہ کرنے کی بے سود کوشش کر رہی تھی اور کچھ متفکر تھی ۔ محسن کی طرح اسے بھی میرے اکیلے رہ جانے کا خیال آیا ہو گا اور شاید یہ بھی کہ تم سے مہارت ہو جاؤں ۔ اکیلا تھا میری جنگ عظیم نہ چھیڑ دوں یا دشمنوں کے نرغے میں نہ آ جاؤں ۔ جرگوں کی سلوائی کی موت کے بعد بہت زیادہ مشتعل ہوں گے ۔ ایسے ہی جیسے بہت بڑے اور بہت طاقتور غنیم کی فوج کا کوئی جنرل گر پڑتے اور مصور حریف سے

ہاتھوں ہلاک ہو جائے ۔ مجھے آ ... ان شکار سمجھنے والا ایک زور آور عیار اور سفاک شکاری خود اپنی موت مارا گیا تھا ۔ اپنی موت کا تعین وارہ خود تھا ۔ اگر وہ مجھے شرافت سے گھر چھوڑ دیتا تو میں بھی اسے لوٹ جانے دیتا ۔ دفاع دینے کی کوشش خود اس نے کی تھی اور میں نے صرف اپنے دفاع کی جنگ لڑی تھی ۔ وہ میرے ہاتھوں نہیں گاڑی کے بے قابو ہو کر حادثے کا شکار ہو جانے کے باعث ہلاک ہوا تھا مگر شکار گاہ کے دوسرے شکاری یہ بات نہیں جانتے تھے ۔ انھیں یقین ہو گا کہ یہ حادثہ نہیں قتل تھا جو میں نے کیا ۔

"چار سے جانے کے بعد اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہ ہو جانا ۔" رابعہ نے کہا ۔ بالکل بیکے جانے والی بیویوں کی طرح ۔

"بالفاظ دیگر ۔ دو دن شرافت سے رہنا ۔" رضوی صاحب نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا ۔ "رستم خانی کے زعم میں ہر جگہ لنگوٹ کس ہی نہ کر بیٹھنا ۔ ابل مجھے مار ۔"

جب گاڑی چلی گئی تو مجھے ایک ایسے سناٹے کا احساس ہوا جو میرے چاروں سو، زمین سے آسمان تک محیط تھا ۔ شہر جیسے شہر خموشاں بن گیا تھا جس میں خود اپنی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی ۔ گھر کے در و دیوار خاموش تھے ، اداس تھے اور میری طرح تنہائی کے احساس کا شکار تھے ۔ میں خالی گھر کے خالی کمروں میں پھرتا رہا ۔ ابھی صبح ہوئی تھی ۔ دوپہر بہت دور تھی ۔ اس کے بعد شام کی منزل تھی اور رات نہ جانے کتنی صدیوں کی مسافت پر تھی ۔ صبح کرنا شام کا لانا مرحلہ ہو گا ۔ میں کچھ دیر اپنے کمرے میں لیٹا چھت کو گھورتا رہا مگر چھت پر یادوں کی پرچھائیوں کی فلم چل رہی تھی اور سکوت میں آوازوں کی بازگشت تھی ۔ رابعہ کی صورت کا خیال تھا اور اس کی باتیں تھیں — شب گزشتہ کا ہر نقش ہنوز تازہ تھا ۔ چاندنی میں وہ کیسے وہیں کا مجسمہ بنی کھڑی تھی ۔ بے داغ سفید لباس میں اس کے ملکوتی حسن پر چاندنی کے کھلنے کا منظر کتنا سحر آفریں تھا ۔ اس کی زلف مشکبار کے ہالے میں اس کا چہرہ کتنا روشن تھا ۔ دیکھے اب ایسی جگہ چل کے جہاں کوئی نہ ہو ۔ کاش ! کاش خواہشوں کے مقابل آدمی اتنا بے اختیار نہ ہوتا ۔ اس کا نقش مٹتا تھا تو فوزیہ اپنی تمام حشر سامانی کے ساتھ آ جاتی تھی ۔ وقت کے پر اسرار پیرہن لے کر ۔ کیا یہ تم نے نہیں کہا تھا ؟ یہ وعدہ تم نے نہیں کیا تھا ؟ میری آنکھوں کو یہ خواب تم نے نہیں دیا تھا ؟ کیا ملا تمھیں آخر فریب آرزو کا درد دے کر ؟ اب تم شکستہ شیشۂ دل کی

صدا بھی نہیں سنتے ۔ پھر وہ عام لڑکیوں کی طرح رونا شروع کر دیتی تھی ۔ قصور میرا تھا کہ میں نے تمھیں غلط نہیں سمجھا ۔ تم وہ تھے جو نظر آتے تھے ۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ولایت جا کے میرے سکندر نہ رہو گے ۔ میری محبت کتنی بے ثبات تھی ۔ کتنی آسانی سے دوسری عورت نے اس پر قبضہ کر لیا ۔ اگر تم ولایت سے کوئی میم لے آتے تو میں صبر کر لیتی کہ تمھارے قدم بھی آزادی ملتے ہی بھٹک گئے ۔ یہ ڈر تو مجھے تھا ۔ مگر میں نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ تم واپس آ کے ...

میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا ۔ ابھی تک نو ہی بجے تھے ۔ آخر میں کہاں جاؤں ؟ دیواروں سے باتیں کروں یا اپنے آپ سے ۔ بچے اسکول گئے ہوئے تھے اور ان کو واپس آنے کے بعد بھی ساتھ والے گھر جانا تھا جہاں ان سب کا سامان پہنچا دیا گیا تھا وہاں ان کے ہم عمر دوست اور کلاس فیلو بھی تھے چنانچہ وہ بہت خوش تھے کہ ایک ہفتے تک دن رات ان کا ساتھ رہے گا ۔ دروازے پر ڈیوٹی بدل جانے کے بعد دوسرا سنتری آ گیا تھا ۔

سینما ابھی بند تھے اور اس وقت سونا بھی بہت مشکل تھا ۔ وقت سے نمٹنے کا ایک طریقہ یہی تھا کہ میں باہر نکل جاؤں ۔ سڑکوں اور بازاروں میں بے مقصد پھروں ۔ جہاں کسی دشمن سے مڈبھیڑ کا امکان نہ ہو ۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہونے تک شاید چلا جاؤں ۔ باغ جناح میں جا بیٹھوں ۔ میوزیم ۔ انار کلی ۔ جہانگیر کا مقبرہ ۔ مگر اکیلا آدمی ایسی جگہ کتنا بھٹکا ہوا لگتا ہے ۔ اس بچے کی طرح جو گھر سے تو اسکول گیا ہو مگر اسکول سے بھاگ آیا ہو ۔ دنیا کی رونق کسی ساتھی کے بغیر کچھ نہیں ۔

میں لباس بدل کے موزے چڑھانے کے بعد جوتوں کے بند باندھ رہا تھا کہ اندر رضوی صاحب کے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی ۔ میں ایک جوتا پہنے ایک ہاتھ میں اٹھائے لنگڑاتا ہوا گیا اور ریسیور اٹھا لیا ۔

"ہیلو ۔" میں نے آواز کو تھوڑا سا بھاری کرنے کے لیے ماؤتھ پیس پر رومال ڈال لیا ۔ "ایس ایس پی رضوی صاحب کی ریذیڈنس ۔"

"رضوی صاحب کو بلاؤ ۔" کسی نے بھاری آواز میں مجھے حکم دیا ۔

"وہ تو نہیں ہیں ۔" میں نے کہا ۔ "عموماً اس وقت گھر پر نہیں ہوتے ۔ آپ کو آفس فون کرنا چاہیے تھا ۔"

"بدتمیز ! تم کون ہو مجھے سمجھانے والے ۔ کیا وہ چلے گئے ہیں ؟" بات کرنے والا گرم ہو کے انگریزی میں بولا ۔

"ہاں ۔ مگر تم مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو ؟" میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا ۔ "اس گھر میں بدتمیز لوگ رہتے ہیں اور نہ کسی بدتمیز سے تعلق رکھتے ہیں ۔ یہاں فون کرنے والے تم پہلے بدتمیز آدمی ہو ۔ افسوس یہ ہے کہ میں تمھیں فون پر تمیز نہیں سکھا سکتا ۔"

مگر اس نے ریسیور رکھ دیا ۔ آخر یہ کون الو کا پٹھا تھا ۔ اپنے محکمانہ لہجے سے تو وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ بہ لحاظ عہدہ وہ رضوی صاحب سے برتر ہے یا ان کے برابر ضرور ہے مگر ان کے عہدے کے لوگ اس طرح بات نہیں کرتے ۔ ہیڈ کوارٹر کے علاوہ کوئی ان سے سینئر کہاں ہو سکتا ہے اور ہیڈ کوارٹر کے افسران کو معلوم ہو گا کہ خاص رضوی صاحب رخصت پر ہیں اور چند دن نہیں آئیں گے ۔ مزید یہ کہ دس بجے گھر پر رضوی صاحب کو وہی فون کر سکتا ہے جسے معلوم ہو کہ وہ دفتر میں نہیں ہیں ۔ اس کا یہ پوچھنا کہ کیا وہ چلے گئے ہیں ؟ کیا وہ جانتا تھا کہ انھیں جانا تھا ۔ شاید رضوی صاحب نے بتا دیا ہو گا کہ ان کے آفس نہ آنے کی وجہ کیا ہے لیکن بات تو انھوں نے اپنے کسی افسر اعلیٰ سے ہی کی ہو گی ۔ جو انھیں چھٹی دینے کا مجاز ہو گا ۔ رضوی صاحب جیسے شریف آدمی کے گھر فون کرنے والا اگر خود وہی افسر اعلیٰ ہوتا تو ایسے لہجے میں بات نہ کرتا ۔ ماتحت ہوتا تو اس کا لہجہ زیادہ مودبانہ ہوتا مگر اتنی جلدی ماتحت کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ رضوی صاحب رخصت پر ہیں اور انھیں اسلام آباد جانا تھا ۔ وہ کیوں پوچھے گا کہ رضوی صاحب چلے گئے ہیں یا نہیں ۔ خیر ۔ وہ جو بھی تھا بھاڑ میں جائے ۔

میں اسی طرح ایک جوتے کو انگلی کے ہک پر لٹکائے کھڑا تھا اور واپس ہونے ہی والا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی ۔ میں کچھ دیر متذبذب کھڑا رہا پھر یہ سوچ کر ریسیور اٹھا لیا کہ فون مسز رضوی کا یا ان کے کسی جاننے والے کا بھی تو

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

گمراہ

آٹھ حصے ، مکمل ، قیمت فی حصہ ۲۵ روپے

ایک ایسے نوجوان کی داستان جو حالات کے ہجوم میں پھنس کر جرم کی دنیا میں گرفتار ہو گیا

جبار توقیر کا منفرد انداز بیان

کتابیات پبلی کیشنز ، پوسٹ بکس ۲۳ کراچی

ہو سکتا ہے۔
"ہیلو۔" میں نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے آواز سے بھی شناخت کرے۔
"ارے بھئی کون بول رہا ہے؟" کسی نے بڑے شائستہ شگفتہ لہجے میں کہا۔ آواز پھر مردانہ تھی اور نہ جانے کیا بات تھی کہ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ پیغام میرے ذہن کی... لیبارٹری میں پہنچ چکا تھا جہاں آواز کا تجزیہ ہو رہا تھا۔ چند سیکنڈ میں رپورٹ موصول ہو گئی۔ آواز وہی ہے۔ لہجہ بدلا ہوا ہے۔
"میں... میں جی حکم کا غلام۔ میرا مطلب ہے حکم دین۔" میں نے جاہلوں کی طرح کہا۔
"اچھا بھئی حکم دین! ایس پی صاحب ایک سیف کی چابیاں لے کر نہیں گئے۔ اس میں بہت اہم کاغذات ہیں جن کی ضرورت پڑ سکتی ہے بعد میں۔" فون کرنے والے نے کہا۔ "ان سے کہو رؤف بول رہا ہے۔ میں ان کا پی اے ہوں۔"
میں چکر میں پڑ گیا۔ کیا میرے دماغ کے کمپیوٹر کی رپورٹ غلط تھی۔
"وہ... وہ تو چلے گئے جی۔ پنڈی۔" میں نے کہا۔
"اکیلے؟" وہ بولا۔
میرا ماتھا پھر ٹھنکا۔ "اکیلے کیوں جی! سب گئے ہیں۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ رضوی صاحب کے پی اے کو یہ تجسس کیوں کہ وہ اکیلے گئے ہیں یا سب کے ساتھ۔ اور کیا رضوی صاحب اتنے غیر ذمہ دار ہیں کہ ایک ایسے سیف کی چابیاں ساتھ لے گئے جس میں اہم دستاویزات تھیں۔
جوتے کو نیچے رکھ کر میں نے ڈائریکٹری اٹھائی اور ہیڈ کوارٹر کے نمبر دیکھنے لگا۔ رضوی صاحب کا نمبر اسی لائن میں دیا گیا تھا۔ گھر کے فون نمبر کے علاوہ ان میں آفس کے دو نمبر دیے ہوئے تھے۔ ایک ڈائریکٹ لائن تھی۔ دوسری ایکسچینج کی ایکس ٹینشن۔ میں نے ڈائریکٹ نمبر ملایا۔
"رؤف۔" کسی نے تیسری گھنٹی پر ریسیور اٹھا کے کہا۔ گو نام درست تھا مگر میں فوراً سمجھ گیا کہ پہلا رؤف نقلی تھا۔
"رؤف صاحب!" میں نے کہا۔ "میں رضوی صاحب کے گھر سے سکندر بول رہا تھا۔ کیا آپ نے ابھی فون کیا تھا؟"
"میں نے!" وہ حیران ہو کے بولا۔ "میں فون کیوں کروں گا۔ مجھے معلوم ہے وہ چھٹی لے کر اسلام آباد گئے ہیں۔"
"ابھی کسی نے آپ کا نام لے کر کہا تھا کہ رضوی صاحب دفتر کی چابیاں اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔" میں نے اسے گواہ بنانے کی خاطر یہ اطلاع دینا مناسب سمجھا۔ "کسی الماری کی چابیاں۔"
"چابیاں سب میرے پاس رہتی ہیں۔" رؤف نے کہا۔ "کسی نے شرارت کی ہو گی۔"
"ہاں، مگر رؤف صاحب یہ شرارت بھی وہی کر سکتا تھا جسے علم ہو کہ رضوی صاحب رخصت پر ہیں۔" میں نے کہا۔ "پریشانی کی تو کوئی بات نہیں۔ آپ کو میں صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ خدانخواستہ ایسی ویسی کوئی بات ہو تو..."
"ایسی ویسی کیا بات ہو سکتی ہے سکندر صاحب؟" وہ میری بات کاٹ کے بولا۔
"کچھ نہیں۔ بس سمجھ لیجیے احتیاطاً آپ کے نوٹس میں یہ بات ہونی چاہیے۔ کوئی گواہ تو ہو گا۔"
"میں سمجھا نہیں سکندر صاحب؟" وہ بولا۔ "گواہی سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کہاں درپیش ہو گی مجھے گواہی اور کیوں؟ دیکھیے نا میں تو آپ کو نہیں جانتا۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ واقعی رضوی صاحب کے گھر سے بول رہے ہیں یا کسی پبلک کال آفس سے...."
"میں ریسیور رکھ دیتا ہوں۔ آپ ان کے گھر کا نمبر ملا کے دیکھ لیں۔"
"چلیے میں مانتا ہوں۔ مگر دیکھیے نا۔ فون میری موجودگی میں تو نہیں آیا۔ آپ کہہ رہے ہیں وہ جھوٹ بھی ہو سکتا ہے اور سچ بھی۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا ہوں کہ سکندر نام کے کسی شخص نے.... دس بج کے چالیس منٹ پر مجھے فون کر کے کیا بتایا تھا۔"
وہ سخت جھکی اور قانونی آدمی تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا رضوی صاحب جیسے افسر کا پی اے تھا۔
"رؤف صاحب! میرے ہاتھ میں ایک جوتا ہے۔" میں نے کہا۔
"جوتا ہے؟" وہ چڑچڑا ہو کے بولا۔ "کیا مطلب ہے اس واہیات بات کا؟"
"میں نے صرف یہ کہا ہے کہ میرے ہاتھ میں ایک جوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "دوسرا میرے پیر میں ہے۔ جو میں نے ساڑھے دس بجے پہنا تھا۔ ٹھیک پونے گیارہ بجے میں دوسرا جوتا بھی پہن لوں گا۔ آپ کو اس لیے اطلاع..."
اس نے فون بند کر دیا تو میں ہنسا اور جوتے کو پھر انگلی پر اٹھا لیا۔ اس وقت مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ پالش تو میں نے دونوں جوتوں پر کر لی تھی لیکن برش اور کپڑا صرف ایک ہی پر مارا تھا اور اسے پہن لیا تھا۔ دوسرے کی باری

آنے سے قبل ہی فون آ گیا تھا۔ میں اسے شکار کی ہوئی مچھلی کی طرح لٹکائے اسی طرح لنگڑاتا ہوا اپنے بیڈروم کی طرف واپس ہوا۔
جوتے کو کچھ دیر گزرنے کے بعد میں نے اسے مقابل رکھ کے بیٹھ کے دیکھنے کی عبث کوشش کی کہ اس میں آئینے جیسی چمک پیدا ہوئی ہے یا نہیں۔ مگر وہ بدبخت جوتا جسے محض چمکا لیا جائے اور میں والی پالش نصیب نہ ہو میری توقعات پر کیسے پورا اتر سکتا تھا۔ اس کا رونا جیسا کہ بے رونق چہرہ کسی بیوہ کے چہرے کی طرح تھا جس پر میک اپ بھی ضائع ہو جائے۔
ابھی جوتا میرے ہاتھ میں ہی تھا کہ مجھے باہر ایک آہٹ سنائی دی۔ میں جوتا ہاتھ میں لیے باہر نکلا۔ کوریڈور خالی پڑا تھا لیکن میرا شک برقرار تھا۔ میں نے قدموں کی واضح آہٹ سنی تھی۔
میں ایک پاؤں میں جوتا پہنے دوسرے کمرے میں گیا۔ میری ایک ٹانگ تقریباً دو انچ لمبی ہو گئی تھی چنانچہ میری چال مضحکہ خیز ہو گئی تھی لیکن میری حالت پر ہنسنے یا رونے والا کون تھا۔ یکے بعد دیگرے میں نے سب کمرے دیکھے۔ کہیں کوئی بات بھی خلاف معمول نہیں تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ میں نے ایک نہیں کم سے کم دو افراد کے قدموں کی دبی دبی چاپ سنی تھی۔ دو کمروں کے ساتھ اٹیچ باتھ روم تھے۔ میں نے ان میں بھی جھانکا۔ پھر اسٹور اور کچن کو ملاحظہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تنہائی میرے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی ہے اور یہ حد سے بڑھی ہوئی حساسیت ہے جس کی وجہ سے ابھی تو میرے کان بجنے لگے ہیں پھر میری آنکھیں بھی بے وجود چیزوں کو دیکھنے لگیں گی۔ کسی بھی گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان کے اعصاب لوہے کے بنے ہوئے نہیں ہوتے اور دماغ بھی بالآخر قوت برداشت کی مسلسل آزمائش سے تھک جاتا ہے۔
اسی وقت میری نگاہ باہر گئی۔ سنتری جسے بہت سخت احکامات تھے کہ دروازے سے نہ ہلے اور کوئی زبردستی اندر داخل ہونے کی کوشش کرے یا دروازے کے علاوہ کسی دوسرے راستے سے اندر آنا چاہے تو بلا تامل گولی مار دے، غائب تھا۔ "سنتری!" میں نے کھڑکی سے سر نکال کے آواز دی۔ "گل رقو!"
اگر وہ دروازے کے آس پاس ہوتا تو جواب ضرور دیتا یا فوراً سامنے آ جاتا۔ میرے شکوک میں اضافہ ہو گیا۔ گارڈ کی اتنی ہمت نہ تھی کہ رضوی صاحب کے جاتے ہی خود بھی چھٹی کر لے۔ سگریٹ پینے نکل جائے یا لمبی تان کے سو جائے۔ جاتے جاتے بھی رضوی صاحب نے اس کو لیکچر دیا تھا اور ایک معنوی کی تمثیل کی کہانی بلا کر فرائض میں کوتاہی کا مرتکب ہو۔ رضوی صاحب کی سخت گیری مشہور تھی۔
میں پلٹا ہی تھا کہ ایک شخص اندر آ گیا۔ کوئی سوال کیے بغیر میں نے وہ جوتا ہاتھ گھما کر اس کی طرف پھینکا جو میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ وہ راکٹ کی طرح گیا اور اس کی ناک پر لگا۔ وہ اتنے فوری ردعمل اور اس نوعیت کے ہتھیار کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ بری طرح بلبلایا اور میں نے اس کی ناک سے خون کا فوارہ ابلتے دیکھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کے ایک طرف ہوا ہی تھا کہ اس کے پیچھے آنے والے تین افراد نے کمان سنبھال لی۔ اعلان جنگ سے پہلے ہی جنگ شروع ہو گئی تھی۔ بظاہر وہ بھی میری طرح خالی ہاتھ تھے لیکن یہ ناممکن تھا کہ وہ مسلح ہو کے نہ آئے ہوں۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان چاروں نے بالکل ایک جیسے کپڑے پہن رکھے تھے اور کسی میک اپ آرٹسٹ نے ان کی صورتوں کو بھی مشابہ کر دیا تھا۔ سب نے گول قراقلی ٹوپیاں، گھیر دار ملیشیا کی شلواریں اور قمیصیں پہننے کے علاوہ ایک ہی رنگ، سائز اور تراش کی داڑھی مونچھیں بھی لگا لی تھیں۔ فرق صرف قد و قامت میں رہ گیا تھا۔ دو تو ہم وزن تھے اور قد میں بھی برابر تھے۔ تیسرا نسبتاً دبلا اور چھوٹا تھا۔ چوتھا جسے جوتا لگا تھا سب سے دراز قد تھا۔
صاف ظاہر تھا کہ ان کے ارادے نیک نہیں مگر مجھے یہ گمان رہتا تھا کہ میں اپنی عقل اور اپنے ہاتھوں سے زیادہ کام لے سکوں۔ "بس چار ہی ہو؟ خیریت؟" میں نے ان کے پیچھے دیکھ کر کہا۔
"کیوں پٹنے آئے ہو؟ اور باری باری پٹو گے یا ایک ساتھ؟"
"ہم ایک ٹیپ لینے آئے ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "شرافت سے لا دو گے تو ہم جیسے آئے ہیں ویسے ہی چلے جائیں گے۔"
"واپس کیسے چلے جاؤ گے؟" میں نے کہا۔ "خاطر تواضع کے بغیر۔"
جس شخص کی ناک جوتے کی راہ میں حائل ہو گئی تھی وہ غسل خانے سے برآمد ہوا۔ "دیکھتے کیا ہو؟" وہ عجیب مضحکہ خیز آواز میں فریاد کرتے ہوئے چلایا۔ "ہڈیاں توڑ دو اس کی۔ دو دانت توڑ دیے ہیں اس نے میرے۔" اس نے ہاتھ ہٹا کے اپنی صداقت کا ثبوت پیش کیا۔ اور یہ کے لب کے نیچے دانتوں کی قطار میں واقعی خلا پیدا ہو گیا تھا۔
"باس نے کیا کہا تھا۔ مار پیٹ نہیں کرنی ہے۔" چوتھے نے کہا۔ "یہ تمہارے باپ کا نہیں ایک پولیس افسر کا گھر ہے۔"
"باس تو پاگل ہے۔" وہ بولا۔ "میں اپنی منگیتر کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"
"یہ تمہاری تشویش نہیں منگیتر کی ہے۔ دیکھو کے پیچھے۔" ... نے کہا۔

www.paksociety.com

"فضول بکواس مت کرو۔ وہ ٹیپ کہاں ہے؟" دراز قد نے کہا۔ اس کے پاس ایک بیگ تھا جو اس نے اندر آتے ہی نیچے رکھ دیا تھا۔

"ٹیپ؟" میں نے سر کھجاتے سوچتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے الماری میں ہوگا۔" کمرے میں ایک ہی الماری تھی۔

"چھوٹے! الماری دیکھو۔" دراز قد نے کہا اور ریوالور نکال لیا۔

"الماری میں تالا ہے۔" چھوٹے نے اسٹیل کی الماری کا ہینڈل گھمانے کی ناکام جدوجہد کی۔

"چابیاں منگوا لیتے ہیں۔ رضوی صاحب کو فون کر کے۔" میں نے کہا۔ "مگر اس کی لائن تو کاٹ دی ہوگی تم نے۔"

"چھوٹے! اعقل نہیں مگر ریوالور تو ہے میرے پاس۔" دراز قد نے کہا۔

"ریوالور تو ہے۔" چھوٹے نے اتر ٹیس طور کا ریوالور نکال کے کہا۔ "مگر اس سے تالا کیسے کھلے گا؟" وہ واقعی احمق تھا۔

"تالا اُڑا دے گولی مار کے ورنہ میں تجھے گولی مار دوں گا۔" دراز قد کا حوصلہ جواب دے گیا۔

ایک دھماکا ہوا۔ گولی نے فولادی دروازے کے پرخچے اڑا دیے اور شاید اس میں سے صاف گزر کر دیوار سے ٹکرائی کیونکہ بند الماری میں بھی گونج پیدا ہوئی تھی۔ چھوٹے نے الماری میں سے ہر چیز نکال کے باہر پھینکنا شروع کی۔ الماری خالی ہو گئی تو اس نے خفیہ دراز کو کھینچا۔ سارے کاغذات فرش پر بکھر گئے۔

"اس میں کوئی ٹیپ نہیں ہے۔" چھوٹے نے اعلان کیا اور بیگ میں سے کوئی چیز نکالی۔

"تم سب اندھے ہو گئے ہو کیا؟" اس نے کہا۔ "یہ سامنے کیا پڑا ہے؟ اپنا اپنا قد دیکھ لو۔" میں نے اپنی ٹیپ کی طرف اشارہ کیا۔

"ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ تم جوکر ہو۔" دراز قد نے دانت پیس کر کہا۔ "یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔ یہ بات سمجھ لو کہ ہمارے پاس وقت کی کمی نہیں۔ ایک ہفتے تک تم ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے اور یہاں تمہاری مدد کے لیے کوئی نہیں آ سکتا۔"

"غلط فہمی خود تم نے پیدا کی۔" میں نے کہا۔ "پہلے ہی بتا دیتے کہ اسکاچ ٹیپ چاہیے۔"

"اسکاچ ٹیپ کی اولاد!" دراز قد نے چیخ کر کہا۔ "ہمیں وہ ٹیپ چاہیے...!"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔ "تمہیں پلاسٹک ٹیپ چاہیے۔ انسولیشن کے لیے۔ الیکٹریشن ہو تم لوگ؟"

دراز قد نے جست لگائی۔ میں یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی قوت برداشت جواب دے جائے اور وہ اتنا مشتعل ہو جائے کہ حملہ کر دے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اس کی صلاحیت کو کم سمجھا تھا۔ وہ اناڑی نہیں تھا۔ اس نے مجھے دونوں پیر اٹھا کے فلائنگ کک مارنی چاہی تھی۔ اگر یہ پیر میرے سینے پر لگتے تو میں الٹ کر گرتا لیکن جوڈو کی مشق میرے کام آئی۔ میری تربیت بلیک بیلٹ کی حد تک تقریباً مکمل ہو چکی تھی جب میں کوئی سند لیے بغیر برطانیہ سے ڈی پورٹ کیا گیا تھا۔ شاید جنگ کی سند تو جوڈو کی۔ مگر اس کاغذی سند کے بغیر بھی میرا علم اور تجربہ میرے ساتھ تھا۔ میں نے فوراً بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کو بڑی پھرتی سے اوپر اٹھایا اور حملہ آور کو اپنی ہی قوت میں سر کے اوپر سے گزار دیا۔ وہ تیرتا ہوا گیا اور کھڑکی کے شیشے توڑتا ہوا باہر جا گرا۔ میری توجہ باقی دو کی طرف ہو گئی کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ بروقت میں نے دیکھ لیا کہ ایک جوتا مار کے میں نے جس شخص کا ازدواجی مستقبل تباہ کر دیا تھا وہ فائر کرنے کے لیے ریوالور اٹھا رہا تھا۔ میں نے غوطہ مارا اور گولی اس شخص کے سر پر لگی جو باہر گرنے کے بعد پھر اٹھ کے اندر آنے کی کوشش میں کھڑکی کو عبور کر چکا تھا۔ اس کا چہرہ ٹوٹے ہوئے شیشے لگنے سے پہلے ہی لہولہان ہو رہا تھا۔ گولی لگتے ہی اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور کھڑکی سے اندر لڑھک گیا۔ اس کا خون ایک دھارے کی شکل میں دیوار پر پڑا۔ اگر میں خود کو نہ بچاتا تو خون کے چھینٹے مجھ پر بھی گرتے۔ میں ابھی اٹھا بھی نہ تھا کہ چھوٹے نے بڑی مہارت سے کوئی چیز میری طرف پھینکی۔ یہ نائلون کا جال تھا۔ جو میرا شور کی طرح کھل کے میرے اوپر گرا۔ میں نے اس سے نکلنے کی بے سود کوشش کی۔ جال میرے گرد لپٹتا گیا۔ چھوٹے نے ایک ڈوری کھینچی اور مجھے بے بس کر دیا۔

فنکاری سے مجھے اس جال میں اسیر کر کے وہ بے خوف ہو گئے تھے۔ میرے لیے اس جال کو توڑنا ناممکن تھا۔ اس کی ہر ڈوری پتلی ہونے کے باوجود اتنی مضبوط تھی کہ میں آزاد ہوتا تب بھی اپنے زور بازو سے اس کے دو ٹکڑے نہیں کر سکتا تھا۔ اب تو یہ پوزیشن تھی کہ میں ہاتھ سے زور لگاتا تھا تو جال کھنچ جاتا تھا لیکن میری کمر دہری ہونے لگتی تھی۔ پیروں سے زور لگاتا تھا تب بھی یہی ہوتا تھا۔ جال ہر سمت میں گنجائش کے مطابق پھیل جاتا تھا لیکن دوسری طرف سے میرے جسم میں گڑنے لگتا تھا۔ یہ اینٹ پتھر کی دیواروں سے زیادہ مضبوط حصار تھا جسے سر ٹکرا کے بھی نہیں توڑا جا سکتا تھا۔ مزید یہ کہ میں اس محدود سے دائرے میں پابند سلاسل نہ ہونے کے باوجود حرکت تو کر سکتا تھا مگر نہ بیٹھ سکتا تھا نہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ میرا چیخنا چلانا یا کسی کو مدد کے لیے پکارنا سب بے کار تھا۔ میری آواز دوسری کسی کوٹھی کے اندر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ویسے بھی اس وقت کوٹھیوں میں

پچیس تک در تھے۔ نوکر یا گھر میں رہ جانے والی خواتین یا باورچی خانے یا گھر کے کسی کمرے میں امور خانہ داری کو نمٹانے میں مصروف ہوں گی وہ کسی آواز پر متوجہ بھی ہوتے تو کام چھوڑ کر نہ آتے۔ سڑک پر سے بہت کم لوگ پیدل گزرتے تھے۔ زیادہ تعداد ان گاڑیوں کی ہوتی تھی جو گردو پیش شاہراہ اور اسٹیشن کا لمبا راستہ چھوڑ کے اندر شہر سے بچنے کے لیے اس طرف سے مال روڈ تک پہنچنا پسند کرتے تھے یا ادھر سے واپس آتے تھے۔ ان میں رکشا اور ٹیکسی بھی شامل تھے۔ ایسے گزرنے والے ادھر ادھر کی آواز پر غور ہی نہیں کرتے تھے۔

میں یہ بات بھی سمجھ چکا تھا کہ اندر آنے سے پہلے انھوں نے سنتری کو بھی قابو کر لیا ہوگا اور اگر قتل کر کے نہیں ڈالا ہوگا تو اسے بھی میری طرح گٹھری بنا کے کسی جگہ رکھ دیا ہوگا۔ یہ کام مشکل ضرور تھا ناممکن نہیں تھا۔ سڑک پر کھڑا ہوا مسلح سنتری بہت خطرناک تھا۔ ایک تو یہ کہ ذرا سا شبہ ہوتے ہی وہ ایک باؤنڈ میں ان سب کو لٹا دیتا۔ مزید یہ کہ وہ آنے جانے والوں کی نظر میں تھا اور اسے زیر کرنے کے لیے بس کرنے میں یہ اندیشہ یقینی تھا کہ کوئی دیکھ لے گا تو رک جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے ساری کارروائی مناسب وقفے میں بڑی پھرتی سے کی ہوگی۔ سنتری کے سر پر ڈنڈا مار کے اسے لٹا دیا ہوگا یا اچانک پیچھے سے دبوچ کر اس کی ناک پر کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال رکھ دیا ہوگا اور پھر اسے فوراً دروازے سے ہٹا کے اندر لے آئے ہوں گے۔

"چھوٹے!" دراز قد نے کہا۔ "یہ سب چیزیں جو تو نے الماری میں سے ایسے نکال پھینکی ہیں، واپس اسی طرح رکھ۔ جو چیز جہاں تھی وہیں۔ اور رومال سے فنگر پرنٹ وغیرہ مٹا۔"

چھوٹے نے پریشانی سے فرش پر بکھرے ہوئے متفرق نوعیت کے سامان کو دیکھا۔ "مجھے تو یاد نہیں کون سی چیز کہاں تھی۔"

"تو پھر ایسے پھینکی کیوں تھیں؟" دراز قد غرایا۔ "کیا کہا تھا باس نے۔ کوئی چیز ادھر سے ادھر نہ ہو۔ بالکل پتا نہ چلے کہ گھر میں داخل ہو کے کسی نے خانہ تلاشی لی ہے۔" اس نے دوسرے کی طرف دیکھا۔ "تو الماری کے تالے کی طرف دیکھ لے اور بازار جا کے بالکل ایسا ہی تالا لے آ۔ بلکہ اسے کھول کے لے جا اپنے ساتھ۔"

جسے مخاطب کیا گیا تھا وہ بیگ اٹھا کے الماری کی طرف بڑھا وہ بڑے منظم طریقے پر تمام سامان ضرورت سے لیس ہو کر آئے تھے۔ ان کو مفصل ہدایات دے دی گئی تھیں کہ انھیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے چنانچہ مجھے حیرانی ہوئی کہ وہ تالے کھولنے کے لیے چابیاں اور کسی ماہر فن کو نہیں لائے جو گولی سے اڑائے بغیر تالے کھول دیتا۔ شاید یہ انتظام عجلت میں کیا گیا تھا اور اس کی وجہ بھی صاف ظاہر تھی۔ رضوی صاحب نے اسلام آباد جانے کا فیصلہ بھی گزشتہ شب کی ٹیلی فون کال موصول ہونے کے بعد کیا تھا۔ سب کے جانے کی بات تو ابھی چند گھنٹے پہلے ہوئی تھی۔

اور سب جانتے دشمنوں کو فوراً معلوم ہو گیا تھا۔ اس انکشاف نے مجھے سن کر دیا۔ ایک بار پہلے بھی ہم ٹیلی فون سے منسلک ٹرانسمیٹر دریافت کر چکے تھے۔ مگر اس کے بعد دشمنوں نے موقع ملتے ہی شاید دوبارہ بندوبست کر لیا تھا۔ انھوں نے گھر کے اندر کسی جگہ کوئی مائیکروفون نصب کر دیا تھا۔ چھت اور دیواروں کے سیکڑوں گوشے تھے اور سامان سے بھری ہوئی کوٹھی میں ایک تنکے سے مائیکروفون کو چھپانا کوئی مشکل کام نہ تھا مگر اس کو تلاش کرنا یقیناً بہت مشکل کام تھا۔ امریکہ اور یورپ میں یہ ننھے منے خفیہ مائیکروفون "بگ" کہلاتے ہیں اور وہاں اتنا چھوٹا ٹرانسمیٹر حکومت کی اجازت سے کوئی بھی لگا سکتا ہے جس کی نشریات عام سنی جا سکیں مگر جاسوسی اور سراغرسانی کرنے والے اداروں یا پولیس کے سوا خفیہ مائیکروفون رکھنا وہاں بھی جرم ہے تاہم یہ ممنوعہ چیز بھی وہاں اتنی ہی آسانی سے مل جاتی ہے جتنی آسانی سے ممنوعہ ادویات یا منشیات۔ شوکیس میں رکھ کے اسے نہیں بیچا جا سکتا مگر دنیا کے ہر ملک میں انڈر گراؤنڈ مارکیٹ ہوتی ہے جہاں سب کچھ دستیاب ہوتا ہے۔ لانے والے وہاں سے یہ چیزیں... پاکستان بھی لے آتے ہیں جو عموماً جرائم پیشہ افراد ہی کے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ لوگوں کی پرائیویٹ زندگی کے یا کاروباری معاملات کے راز جاننے کا سب سے مؤثر ذریعہ "بگ" ہے۔

رضوی صاحب کے گھر میں ایک یا ایک سے زیادہ "بگ" موجود تھے۔ جو اس گھر کی چار دیواری میں ہونے والی سب گفتگو دوسروں تک پہنچا دیتے تھے۔ بگ ویسے تو کھٹمل کو کہتے ہیں مگر یہ نظر نہ آنے والے کھٹمل سے بہت زیادہ خطرناک تھے۔ ان کے ذریعے باہر پہنچنے والی ہر بات ایک محدود دائرے میں سنی جا سکتی تھی یا اور آگے نشر کی جا سکتی تھی۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ آس پاس ہی کہیں دشمنوں نے اپنا ریسیونگ اسٹیشن بھی قائم کر رکھا تھا۔ سو دو سو گز کے اندر اندر وہ کسی کوٹھی میں مقیم ہیں جو انھوں نے خرید لی ہے یا کرائے پر حاصل کی ہے۔ اس امکان کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی ہمسائے سے مل گئے ہوں۔ اسے نقد رقم کا لالچ دیا ہو یا اس سے جھوٹ بولا ہو کہ وہ انٹیلی جنس کے آدمی ہیں اور ایک دشمن ملک کے جاسوسوں نے قریب ہی اپنا خفیہ ٹھکانا بنا رکھا ہے جن کی نقل و حرکت

www.paksociety.com

کی نگرانی اور ان کے ارسال کردہ پیغامات کی وہ آخر سیپشن "
کے لیے بجد مطلوب ہے۔ محب وطن شہری ویسے ہی تعاون کرتے
ہوئے ایک کمرہ دینے میں عار نہیں محسوس کرے گا۔ اگر کوئی نہ
مانے تو اسے دھمکی دی جاسکتی ہے کہ حکومت قانونی طور پر زبردستی
بھی یہ کمرہ لے سکتی ہے، جو غلط نہیں۔ اور اسے افشائے راز یا
اس مسئلے پر اٹھائے جانے کے سنگین نتائج اور سخت سزا سے
خوفزدہ کر کے خاموش رہنے پر مجبور بھی کیا جاسکتا ہے۔ جس کا ہم
میں چوہدری ولادر جیسے ایکشن ڈائریکٹر ہوں وہ سب کر سکتی
ہے۔ رضوی صاحب کے سرونٹ کوارٹر کی طرح انھیں کوئی سے
غیر آباد سرونٹ کوارٹر یا گیراج بھی مل سکتا ہے جہاں وہ خاموشی
سے کسی تک حرام لالچی نوکر کی مدد سے ڈیرہ جمائے بیٹھے ہوں
اور صاحب خانہ کو علم ہی نہ ہو۔

یہ صورت حال بالکل نئی تھی اور بہت خطرناک۔ میرے
لیے پہلا مسئلہ رہائی پانے کا تھا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ کسی کا
پروگرام مجھے قتل یا اغوا کرنے کا نہیں تھا۔ اس سلسلے میں انھیں
واضح ہدایات تھیں۔ وہ ایک پولیس افسر کے گھر میں واردات
کرنے کے نتائج کی سنگینی سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ اپنی
تشریف آوری کا کوئی ثبوت تک چھوڑ کے جانا نہیں چاہتے تھے۔

ان میں سے ایک اسٹیل کی الماری کے نقصان رسیدہ تالے
کو کھولنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ باقی سب تجربے
اطمینان سے تلاشی لینے میں مصروف تھے اور بہت احتیاط کے
ساتھ۔ انھیں جلدی نہیں تھی اور کسی کا ڈر نہیں تھا۔ جھوٹا بھی کسی
نہ کسی طرح تمام سامان واپس الماری میں اسی طرح رکھ چکا تھا
کہ بے ترتیب نظر نہ آئے۔ جوتے کا فیتہ نہ کھلنے والا بار بار...
غسل خانے میں جاتا تھا اور کلیاں کر کے لوٹتا تھا اور ہر بار مجھے
نئی گالیاں دیتا تھا۔

"تمھاری بدقسمتی! اب تیسی رہ گئی ہے۔" میں نے فرش
پر پڑے پڑے کہا۔ "اگر تم منہ بند رکھو تو کچھ پتا نہیں چلتا۔ اس لیے
اب تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ جتنی گالیاں دینی ہیں وہ دل ہی دل
میں دو۔"

"بکتے ہو!" وہ میرا جوتا اٹھا کے میری طرف لپکا۔ "تیرا منہ
بھی اسی طرح بند کرتا ہوں میں۔"

میں نے اپنا سر گھما کے منہ فرش کی طرف نہ کر لیا ہوتا تو
وہ اپنے عزائم میں یقیناً کامیاب ہو جاتا۔ اب ایک دلچسپ کھیل
شروع ہوا۔ وہ جوتا لے کر دائیں طرف آتا تھا تو میں اپنا منہ دوسری
طرف کر لیتا تھا۔ وہ دوسری طرف آتا تھا تو میں منہ پھیر لیتا تھا۔
اس نے میرا سر تھام کے اور گردن گھما کے منہ کو اوپر لانے کی کوشش
بھی کی مگر ناکام رہا۔ مجھے اس پر حملہ کرنے کے دو مواقع ملے۔
ایک بار میں نے جال کے اندر سے ہی ہاتھ لمبا کر کے اس
کے سر پر مکا مارا مگر چوٹ سخت نہیں پڑی۔ دوسری بار میں
نے اپنا سر اس کی پسلیوں میں مارا اور وہ پیچھے لڑھک گیا۔ تیسری
بار وہ لڑکھڑا کے پیچھے گرا تو میں اس کے اوپر آ گیا۔ جال میں پھنسا
ہوا ہونے کے باوجود اب میں اپنے ہاتھوں سے یا جسم کے زور
سے اس کی گردن بھی توڑ سکتا تھا لیکن گردن میری دسترس سے
دور تھی۔ میں اس کے پیٹ پر تھا چنانچہ میں نے ہاتھوں کو پسلیوں
پر رکھ کے دبایا تو وہ تڑپا۔ اس کی دو پسلیوں کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز
کے ساتھ گونجی۔ اس نے ذبح ہونے والے بکرے کی طرح
آواز نکالی۔

اس کے ساتھی پہلے اس پر ہنس رہے تھے۔ بعد میں دراز قد
نے اسے گالی دے کر کہا تھا کہ چھوڑ اسے اور اپنا کام کر۔ اب
وہ کام چھوڑ کر لپکے۔

"تو بھی کیا یاد کرے گا۔" میں نے اسے گالی دے کر
کہا۔ "اچھا بھلا ثابت اور مکمل آیا تھا۔ دو دانت، ہنسلی اور دو
پسلیاں..." میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے میرے سر پر کوئی چیز
پڑی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میری آنکھوں نے دن میں تارے دیکھ
لیے۔ پھر تارے غائب ہو گئے اور دن کی جگہ رات رہ گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو وہ جاچکے تھے۔ مجھے دست و
پابستہ چھوڑ کے۔ جھوٹا کسی مچھیرے کی اولاد لگتا تھا۔ جس نے
اتنی مہارت سے جال پھینکا تھا کہ مجھے بچنے کی مہلت ہی نہیں ملی
تھی اور ڈوری کھینچتے ہی جال میرے گرد یوں لپٹ گیا تھا کہ میں
کچھ نہ کر سکا تھا۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ میں کچھ نہ کروں۔ نہ گولی
چلانی پڑے اور نہ خنجر۔ مجھے خراش تک نہ آنے اور میں ان کے
کام میں مداخلت نہ کر سکوں۔ یہ کام آسانی سے ہونے والا نہیں
تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میں مزاحمت کروں گا اور اگرچہ وہ چار
ہیں مگر پھر بھی نقصانات کا تناسب برابر رہے گا۔ وہ ایک کو پکڑیں
گے تو دو کے جزوی یا کلی نقصان کے بعد۔ اور وہ اپنے ساتھ
اسٹریچر یا ایمبولینس وغیرہ نہیں لائے تھے۔ اس کے باوجود میں
نے ایک کا حلیہ اور مستقبل خراب کر ہی دیا تھا۔ وہ اسے اٹھا
کر لے گئے ہوں گے اور اب یہ اوپر والوں کی اور اوپر والے
کی مرضی کہ اس بدبخت کا شکستہ اعضا کی مرمت کے بعد زندگی
سے اور مستقبل سے پرانا رشتہ استوار رہے یا اس کی دنیا میں ضرورت
اور قدر و قیمت ختم ہوگئی ہو تو اسے دریا برد کر دیا جائے۔ کرائے
پر ایسی مہمات سر کرنے والوں کو زندگی اور موت کا جوا تو کھیلنا ہی
پڑتا ہے اور جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ "قابل خرچ"

ہوتے ہیں۔ یعنی اٹھ گئے تو اٹھ گئے۔ ہزاروں اٹھ جاتے ہیں۔
کاغذ کے روپے بھی ایسے روپے سے ملنے والے بھی۔ ان کی
جگہ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ احمق ہو وہ کون کرتا ہے کہ ٹوٹ
پھوٹ جانے والوں کے علاج معالجے پر مزید خرچ کرے۔ گاڑی
ہو تو ڈینٹنگ پینٹنگ پر اخراجات سے فائدہ بھی ہے۔ ناکارہ
انسان کو صفر کر دینا چاہیے۔ ان کا معاوضہ بچتا ہے۔ دوا دارو کا
خرچ بچتا ہے اور یہ خطرہ نہیں رہتا کہ وہ کچھ بک نہ دیں۔

مجھ سیٹ کرنے کی ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ دنگل ہوتا اور یہ
کمرہ اپنی ہمت کے میدان کا نقشہ پیش کرتا لیکن اب تو صرف یہ ثابت
ہوتا تھا کہ میں نے بہ رضا و رغبت خود کو اس جال میں داخل فرمایا اور
شوقیہ ڈوری کھینچ کر استراحت کا یہ نیا طریقہ اختیار کیا۔ انھیں
گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ میں تقریباً سوا گھنٹے بے ہوش
رہا تھا۔ کیا اس وقفے میں ان کی کوشش بار آور ہوئی تھی؟

ٹیپ سے ان کی مراد یقیناً وہ کیسٹ تھا جو ہم نے
خاصی زبردستی کے بعد ریکارڈ کیا تھا اور جس میں ڈی سلوا
آنجہانی کا اعتراف جرم بھی تھا۔ اور چوہدری ولادر کی آواز بھی
تھی۔ ڈی سلوا کے مرنے کے بعد اس کیسٹ سے خطرہ صرف
ولادر کے لیے باقی رہ گیا تھا۔ وہ جاننا چاہتا ہوگا کہ آخر اس میں
کتنا مواد ہے جسے قانونی طور پر ہم اس کے خلاف استعمال کر سکتے
ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ ایک کیسٹ سے ہم جیسے چالاک
لوگ کئی کاپیاں بنوا سکتے ہیں، اس کے لیے ایک نقل حاصل کرنا
ضروری تھا تاکہ وہ بچاؤ کی فکر کر سکے اور جوابی اقدامات سوچ سکے۔

کیسٹ محسن کے بریف کیس میں تھا جو وہ کراچی میں ہی
چھوڑ گیا تھا چنانچہ شبہے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ ان کا مشن کامیاب
رہا۔ اتنا انھیں افسوس ہوا ہوگا کہ مجھ سے پوچھنے کے بجائے وہ اپنی
کارروائی کا آغاز جال پھینکنے سے ہی کرتے تو اپنی پسلیاں اور دانت
تڑوائے بغیر کامران لوٹ جاتے۔ کیسٹ تو سامنے ہی رکھا تھا۔

اب چوہدری دھمکی تو ولادر کو بعد میں دی جائے گی کہ کیسٹ
کی اور بھی نقلیں ہیں۔ اس سے پہلے تو اس جال کے جنجال سے رہائی
کی کوئی صورت ہونی چاہیے۔ آخر میں کب تک یوں مال غنیمت کی طرح
گٹھری بنا پڑا رہوں گا۔ سر کا درد سب سے زیادہ شدید تھا مگر جسم
کے دیگر اعضا بھی ایک ہی پوز میں پڑے رہنے سے اکڑ گئے تھے۔
میں نے متعدد امکانات پر غور کیا۔ ان واقعات کو یاد کیا جب ان
لوگوں سے زیادہ مشکل حالات میں قید سے نکل گئے۔ میں نے
دانتوں سے جال کاٹنے کا سوچا اور پھر دیا ایک حلقہ تو اس پر دانت
جمانے لگے لیکن کچھ دیر بعد میرے دانت درد کرنے لگے۔ رسی پر
اثر کیا ہوتا الٹا دانت ہی کچھ گھس گئے۔ پھر میں نے جال کو کسی
نوکیلی چیز پر رگڑ کے کاٹنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔ قریب
ترین دروازے یا کھڑکی کا کنارہ بھی میری پہنچ سے باہر تھا۔
میز اور بیڈ بھی دور تھے۔ قریب صرف ایک کرسی تھی اور اس کے
پائے لکڑی کے تھے۔ مگر دھار خاصی امید افزا نظر آئی تھی۔ میں نے
جال کو اس پر رگڑنا شروع کیا۔ کرسی الٹ گئی اور مجھ سے
دور ہو گئی۔

مسلسل ناکامیوں کے بعد مجھے دوسری نوعیت کے واقعات
کا خیال آنے لگا۔ ان کا جو کسی غیر آباد مکان میں ایسے ہی قید ہوتے
رہے تھے۔ اس امید میں کہ کوئی تو ادھر ضرور آئے گا۔ ان کی
نجات کے لیے صرف فرشتۂ اجل آیا تھا۔ اس وقت جب بھوک پیاس
سے پہلے ہی وہ ہوش کھو چکے تھے۔ کیا میں ایک ہفتے تک کچھ کھائے
پیے بغیر اس طرح لیٹا رہ سکتا ہوں؟ ہر آدمی کی قوت برداشت
جدا ہوتی ہے لیکن عموماً میرے جیسا صحت مند آدمی کتنے دن
بھوکا رہ سکتا ہے۔ اور مرتا ہے تو بھوک سے یا پیاس سے؟
مجھے تو دونوں ہی بھوکے پیاسے رہنے کا تجربہ نہ تھا۔ آدمی کو یہ
مشق بھی ہونی چاہیے۔ اسلام آباد میں میرے نہ پہنچنے سے کیا ہوگا؟
تین چار دن بعد ہی تشویش کا آغاز ہوگا۔ شاید رضوی صاحب
یا ان میں سے کوئی فون کرے۔ فون کی گھنٹی بجتی رہے گی۔ نہیں۔
مجھے اچانک خیال آیا۔ اگر انھوں نے اندر آنے سے پہلے فون
کے تار کاٹ دیے ہوں گے تو گھنٹی بھی کہاں بجے گی۔ پھر رضوی
صاحب کیا کریں گے؟ وہ ایکسچینج سے معلوم کر لیں گے کہ لائن ڈیڈ
کیوں ہے؟ شاید ٹیلی فون والے ایک پولیس افسر کے فون کی خرابی کو
اہمیت دیتے ہوئے فوراً دوڑیں۔ مگر وہ باہر سے ہی لائن جوڑ کے
چلے جائیں گے۔ شاید وہ اپنے آفس میں اپنی اسے کو فون کریں۔
یا کسی پولیس اسٹیشن کو۔ کہ جا کر دیکھو معاملہ کیا ہے۔ ممکن ہے وہ ایسے
اپنے آفس کے ساتھیوں سے کہے کہ میری خیریت دریافت کر لیں۔
بے شک میں بچہ نہیں ہوں مگر میری خیریت کو ہمیشہ سخت خطرہ
لاحق رہتا ہے۔ پانچویں دن کسی کے آنے یا نہ آنے کے امکانات
ففٹی ففٹی ہیں۔ پانچ دن کیا کم ہوتے ہیں۔ ابھی تو پانچ گھنٹے بھی
نہیں گزرے اور بھی چلاؤ لگتا ہے۔

خدا جانے کیا چیز تھی جو مسلسل میری پسلیوں میں چبھ رہی
تھی۔ میں نے پہلو بدل کے اس کو ہٹانے کی کوشش کی اور میرے
ہاتھ میں لائٹر آ گیا۔ صدمے سے میرا برا حال ہو گیا۔ وہ لائٹر ایک
میڈل تھا کہ جو کارِ عرض پر میرا امتحان میں کیا جا سکتا ہے جیسا احمق
درجہ اول ہوں۔ عقل ہونے کے باوجود بروقت اس کا استعمال
نہ کر سکتے ہوں اور خود کو عاقل خان سمجھتے ہوں۔ سلائٹر شاید اسی
دنگل کے دوران میں جیب سے باہر گر گیا تھا جس میں میرے

www.paksociety.com

حریف کی دو ٹیلیاں ٹوٹی تھیں۔

میں نے لائٹر کو روشن کیا اور چند سیکنڈ اس کے شعلے سے شعلے کو تصویروں میں جذب کیے۔ پھر میں نے شعلے کو جال کے پھندے سے چھوا۔ نائلون چشم کی طرح جل گیا۔ ایک حلقہ پھیل کر دو حلقوں کے برابر ہو گیا پھر اس کی وسعت چار کے برابر ہو گئی۔ چند منٹ بعد جال فرش پر پڑا تھا اور میں کچرا ہوا کھڑا تھا۔

آہستہ آہستہ میری کمر سیدھی ہونے لگی۔ میں نے کرسی کو سیدھا کیا اور اس پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب میرے ہاتھوں پیروں میں دوران خون بحال ہو گیا اور میری جسمانی صلاحیت کا گراف کچھ اوپر اٹھا تو میں ہمت کر کے کرسی پر سے اٹھا اور شرابی کی طرح ڈولتا کچن کی طرف گیا۔ وہاں میں نے چائے اور کافی میں سے کافی کا انتخاب کیا۔ کافی کے لیے مجھے صرف الیکٹرک کیٹل کا پلگ لگا کے پانی ابالنا پڑا۔ اس میں کریم کے ساتھ میں نے چینی کے بجائے شکر کو استعمال کیا اور وہیں دیوار کے سہارے بیٹھ کر پورا مگ ختم کیا۔ تھوڑی سی ورزش کے بعد میں بالکل ویسا ہی ہو گیا جیسا جال میں پھنسنے سے قبل تھا۔

اندر جا کے میں نے سب سے پہلے تو محسن کا بریف کیس دیکھا۔ حسب توقع کیسٹ اس میں نہیں تھا۔ اس میں کوئی ایسی بات تو نہ تھی جس سے ہم دلاور کو سب کے بل آنے کے اعتراف شکست پر مجبور کر سکتے مگر کیسٹ ایک ٹرمپ کارڈ تھا جس سے ہم دلاور کو خوف میں ضرور مبتلا رکھ سکتے تھے۔ اب تک وہ کیسٹ سن چکا ہو گا اور شاید اس پر طبلہ خان ہارمونیم والے اور سارنگی خان تانپورے والے قوالی اور ما ماؤں کی آوازیں کوئی قوالی بھی ریکارڈ کر چکا ہو گا۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں رضوی صاحب کے مطالعے کے کمرے میں گیا اور سب سے نیچے والی دراز کھینچ کر دیکھی۔ اس میں سے وہ فائل بھی غائب تھی جو بیگم مرحوم غلام علی خان نے لا کر دی تھی۔ انہوں نے یہ ہرگز نہیں سمجھا تھا کہ وہ اپنے محسن اور مربی وزیر خان کے احسانات کا بدلہ چکا رہا ہے اور یہ فائل ان احسانات کی قیمت ہے۔ مگر اس فائل کے ساتھ ہی اسے جان بھی دینی پڑی تھی۔ چنانچہ وہ قرض تو ادا ہو گیا تھا جو وزیر خان پر واجب الادا تھا اور اب الٹا میں اس کا مقروض تھا۔

اس فائل کے جانے کا مجھے سخت صدمہ ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے غلام علی کی قربانی رائیگاں گئی۔ اس نے جس نیک مقصد کی خاطر جان تک قربان کر دی تھی وہ خاک میں مل گیا۔ صرف اس لیے کہ ہم نے اصل کی ایک ہی فوٹو اسٹیٹ کاپی بنوائی تھی جو میں نے ایک گلدان میں تا آخری خاطر کی سلوا کر اور دلال

کر دی تھی۔ ایک بار اس سے چھین لی تھی اور پھر اس کی سیکرٹری کے سامنے پھینک دی تھی کہ یہ اپنے باس کو دے دو۔ ہم اصل کی دس سو یا ہزار جتنی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں چاہیں بنوا سکتے ہیں اس وقت ڈی سلوا کی سیکرٹری شہلا تھی۔ ہم نے اصل کو محفوظ سمجھتے ہوئے اس کی مزید کاپیاں بنوانے کی ضرورت کو اہم نہیں سمجھا تھا اور اس تساہل کا نتیجہ یہ تھا کہ اب ہمارے پاس کچھ نہیں رہا تھا لیکن دلاور کو معلوم ہو گیا تھا کہ سابقہ واقعات کے بارے میں ہماری معلومات کس حد تک اپ ٹو ڈیٹ ہیں۔

فوری طور پر اس سے یاسمین کو اور اس کی ازدواجی زندگی کے مستقبل کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ مگر کیا دلاور کو معلوم ہو گا کہ وہ لڑکی اب کہاں ہے جس نے اسے ایک ناکام بینک ڈکیتی کا مال غنیمت سمیت فرار ہوتے دیکھا تھا اور جو اسے اب بھی شناخت کر سکتی ہے کیونکہ وہ اسی کے گھر میں چھپا رہا تھا خطرہ ٹلنے تک۔ اب وہ پھر خود کو خطرے میں محسوس کرے گا۔ اگر اسے علم ہوا کہ وہ لڑکی نسبتاً دو ڈھیر رہتی ہے تو وہ ہمیشہ کے لیے اس خطرے کو ختم کر دے گا جو یاسمین کے وجود سے وابستہ ہے۔ مگر یہ کام تو وہ پہلے بھی کر سکتا تھا اور یقیناً کر چکا ہوتا۔ نہیں۔ اسے نہیں معلوم کہ یاسمین کہاں ہے تاہم میرے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ میں یاسمین کو خبردار کر دوں۔

لیکن اس سے بھی پہلے میرے لیے ضروری تھا کہ میں غیر قانونی طور پر رضوی صاحب کے گھر میں داخل ہونے، خانہ تلاشی لینے والے اور سامان پیک کرنے والے مجرموں کے خلاف قانونی کارروائی کروں اور یہ معلوم کروں کہ دروازے پر پہرہ دینے والے گارڈ کا کیا حشر ہوا؟ اس کی ایک سیدھی صورت یہ تھی کہ میں دالعیم کی گاڑی لے کر جاؤں اور پولیس اسٹیشن پر واردات کی رپورٹ لکھوا دوں۔ ان کے رپورٹ لکھنے میں لیت و لعل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

لیکن اس میں اندیشہ یہ تھا کہ خبر فوراً حکام بالا تک پہنچ جائے گی۔ قواعد کے تحت رخصت پر جانے سے پہلے وہ پتا ضرور چھوڑ کر گئے ہوں گے۔ جہاں ان سے ہنگامی ضرورت میں رابطہ قائم کیا جا سکے۔ ان کے کسی ساتھی یا پی اے سے کچھ بعید نہیں کہ وہ ریسیور اٹھائے اور شیروانی صاحب کے گھر کا نمبر گھما کے ساری کہانی سنا دے۔ خصوصاً وہ پی اے جسے میں نے کچھ ہی دیر قبل فون کیا تھا۔ وہ تو یہ بھی بتا دے گا کہ آپ کے گھر سے یاسمین سے سکندر نام کے کسی شخص نے فون پر ایسی باتیں کی تھیں جن کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ رضوی صاحب کے لیے نئی پریشانی پیدا ہو جائے گی کہ منع کرنے کے باوجود میں نے کوئی نیا گل کھلایا ہے۔

وہ جس مقصد کی خاطر سارے کام چھوڑ کر گئے ہیں وہ فوت نہیں ہو گا تب بھی اس عمر سے ان کا پروگرام ضرور متاثر ہو گا۔ وہ یہاں آ کے صورت حال کا جائزہ لینے پر اور ہر سب ٹھیک ہے کی اطلاع پا کے فوراً واپس جائیں گے تو ان کو سخت کوفت ہو گی اور ان کی برہمی کا نشانہ صرف میری ذات ہو گی۔

میں نے محسوس کیا کہ میری قوت فیصلہ میرا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ میں عبدالودود منظر سے مشورہ کر لیتا مگر وہ تو جانے کس کورٹ میں تھا چنانچہ اس سے رابطہ محال تھا۔ پھر مجھے اکرام شیخ کا خیال آیا۔ کیوں نہ میں اسے بلا لوں اور اسے تمام واقعات بتا دوں۔ پھر جیسا مشورہ وہ دے وہی کر لوں۔

ایک مرتبہ پھر میں نے ڈائریکٹری دیکھی اور تھانوں کی طویل فہرست میں سے اس کا نمبر تلاش کیا۔ ڈائریکٹری میں ابھی تک سابق ایس ایچ او کا نام درج تھا۔ جس کے بارے میں حشمت خان نے ارشاد کیا تھا کہ اسے ایک معمولی سی بات پر لائن حاضر کروا دیا تھا۔ معمولی بات یہ تھی کہ اس نے تفتیش کے دوران میں ایک آدمی پر اتنا تشدد کیا تھا کہ وہ مر گیا تھا۔ مگر پولیس کے نقطہ نظر سے یہ واقعی معمولی بات تھی اور اس کی یہ سزا بہت بڑی تھی کہ اسے لائن حاضر کر دیا گیا۔ اور بس۔ تشدد سے موت واقع ہونے کے واقعات تو عام تھے لیکن ملک کی تاریخ میں ایسا واقعہ ایک بھی نہیں تھا جب کسی تھانیدار پر قتل عمد کا کیس بھی بنا ہو۔

ریسیور حشمت خان نے اٹھایا۔ "ہاں بولو" اور دے لگا اس۔۔۔ کے بچے" اس نے درمیان میں ایک گالی دے کر کہا مگر یہ بات اس نے مجھ سے نہیں مخاطبین درناظرین سے کہی تھی اور ان کے بارے میں کہی تھی جو زیر تفتیش تھے۔ "ہاں جی" اس نے یوں کہا جیسے مجھ سے دخل در معقولات کر کے اس کھیل کا مزہ کرکرا کر دیا ہے جس میں وہ پوری دلچسپی کے ساتھ مصروف تھا۔

"مجھے سید اکرام شیخ صاحب سے بات کرنی تھی۔" میں نے اپنا نام بتانے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

"تو کر لینا شام کو۔ جب وہ ڈیوٹی پر آئیں۔ اور سے میرا سے چوری سے گا" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ یہ آخری جملہ میرے لیے نہیں تھا بلکہ کسی ایسے شخص کے لیے تھا جو اعتراف جرم پر آمادہ نہ تھا۔

میں نے پھر نمبر ملایا۔ "حشمت خان!" میں نے آواز بدل کے سخت اور افسرانہ لہجے میں کہا۔ پس منظر میں مجھے "چھترباز" اور "اللہ فریاد" اور فغاں کا ملا جلا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔

"یس۔۔۔ یس سر!" حشمت خان نے محتاط ہو کے کہا اور شاید اشارہ کیا کہ "انٹرول" شور یکلخت تھم گیا۔

"جھنگ میں رؤف بول۔ ہیڈ کوارٹر سے" میں نے تحقیق الہی کا اس کی نقل اتاری۔ "ایس ایس پی کا پی اے۔ کون کون حاضر ہے؟"

"سب ہیں جناب! حکم فرمائیں میرے لیے۔ ہم بھی خادم ہیں۔"

"میر محمد کو بلاؤ۔" میں نے کہا۔ مجھے معلوم تھا وہ اکثر موجود نہیں ہوتا۔ "اور وہ نہیں تو اس کے لڑکے شیخ کو۔"

"میر صاحب تو۔۔۔ جائے واردات پر گئے ہیں نقص امن کی رپورٹ ملی تھی۔ اکرام شیخ کی ڈیوٹی نہیں ہے۔ کوئی ضروری بات ہے تو اس کے گھر فون کر لیں۔" حشمت خان نے شرافت سے کہا۔

"اس کے گھر میں فون ہے؟" میں نے کسی قدر حیرانی سے کہا۔ "اے ایس آئی کے گھر میں؟"

"جی رؤف صاحب! سب پیسے کے کھیل ہیں۔" حشمت خان نے گول مول بات کی اور یہ نہیں کہا کہ وہ کھاتے پیتے گھر کا لڑکا ہے "جمعہ جمعہ ابھی آٹھ دن بھی نہیں ہوئے نوکری کو۔ آپ نمبر لکھ لیں۔"

"بھئی حشمت خان! میں نے نمبر نوٹ کر کے کہا۔ "تھانے کے خلاف بڑی لمبی رپورٹ آئی ہے۔ اوپر والے بہت خفا ہیں کہ کیا چکر ہے۔ پہلے والی رپورٹیں کہاں ہیں؟"

"پہلے والی پ۔" حشمت خان کی مری مری آواز آئی۔ "کس۔۔۔ نے کی تھی؟" وہ کو فقرہ دیتے دیتے رک گیا۔

www.paksociety.com

"یہ تو اب تفتیش ہوگی تو معلوم ہوگا۔ تم فوراً تھانے جا کر رپورٹ دو" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ اتنی بات حشمت خان کی نیندیں اڑانے کے لیے کافی تھی۔ اب وہ تفتیش وغیرہ چھوڑ کے اپنے خلاف ہونے والی تفتیش کے چکر میں پڑ جائے گا۔ اگر اس نے رضوی سے پھر بات کی تو وہ اس سے زیادہ پریشان ہوگا کہ یہ آخر کون میرے نام کے الٹ پھیر کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اس کنفیوژن کا تصور کر کے میں بے اختیار ہنسا جو بعد میں پیدا ہوگا۔ حشمت خان پر حقیقت واضح ہوگی تو وہ [illegible] کی طرح اچھلے گا۔

میں نے اکرام شیخ کے گھر فون کیا جو کسی خاتون نے اٹھایا۔ دو منٹ بعد اکرام شیخ کی آواز سنائی دی۔

"یار شیخ!" میں نے کہا "میں بدبخت سکندر بخت بول رہا ہوں۔ تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں؟ دوپہر کے کھانے کا انتظار" وہ بولا "خیریت ہے؟"

"خیریت! میں تو اس لفظ کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہوتا جا رہا ہوں" میں نے کہا "تم ایسا کرو۔ یہاں آجاؤ۔ خان رضوی صاحب کے گھر۔ مجھے تم سے ایک انتہائی اہم بات کرنی ہے جو میں کسی اور سے نہیں کر سکتا۔ کھانا ہم دونوں باہر کھائیں گے۔"

"کیوں بھئی گھر میں دال پکی ہے کیا؟" وہ بولا۔

"گھر میں میرے سوا کوئی نہیں۔ سب اسلام آباد گئے ہوئے ہیں" میں نے کہا "میں آجاتا لیکن مسئلہ یہی ہے کہ یہاں عجیب اور ہنگامی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ تم سے مشورہ کیے بغیر میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا۔"

"اچھا" وہ کچھ توقف کے بعد بولا "میں بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ زندہ تو ملو گے نا؟"

"آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں" میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا "سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں" اور فون رکھ دیا۔

اس میں بیس منٹ تک میں کمرے میں ٹہلتا رہا اور ہر ایک منٹ بعد گھڑی کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر سنتری کہاں گیا؟ یہ سوال [illegible] دیکھ کر میرے ذہن میں آیا۔ گزشتہ شب کی بات تھی۔ ان احمقوں نے اسے بے حد مستعد کھڑا دیکھا تھا اور صبح اسے جان بوجھ کے لیے گیٹ میں رکی تھی تو اس نے رضوی صاحب وزیر بند سلیوٹ جھاڑا تھا۔ دوسرا سگریٹ ختم ہونے والا تھا کہ اکرام شیخ اسکوٹر پر اندر داخل ہوا۔

میں باہر نکلا تو وہ اسکوٹر بند کر کے اسٹینڈ پر کھڑا کر رہا تھا۔ "کدھر ہے ہنگامی صورت حال؟" اس نے کہا۔

"ہر طرف۔ اندر۔ باہر" میں نے کہا "ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ پیدائش پر ہنگامہ۔ موت پر ہنگامہ۔"

اندر لے جا کر میں نے اسے ساری بات تفصیل سے سنائی لیکن کیسٹ کا ذکر عمداً نہیں کیا۔ ورنہ مجھے یہ بھی بتانا پڑتا کہ میں نے ڈی سلوا اور رولا ور کی گفتگو کس طرح ریکارڈ کی تھی۔ میں نے صرف اس فائل کا ذکر کیا جو غلام علی نے فراہم کی تھی اور اسی جرم کی پاداش میں مارا گیا تھا۔

"فائل تو بعد میں مل جائے گی۔ پہلا مسئلہ گارڈ کا ہے" وہ متفکر ہو کے بولا "وہ کہاں گیا ہے؟"

"مجھے تو شک ہے کہ وہ مارا گیا۔ ان لوگوں نے پہلے بھی پہرے داروں کو ٹھکانے لگایا ہے" میں نے کہا۔

اکرام شیخ نے نفی میں سر ہلایا "وہ پولیس کا آدمی تھا۔ تجربہ کار اور اس کے پاس گن تھی۔"

ہم دونوں نے گیٹ کا معائنہ کیا۔ وہاں جدوجہد، مزاحمت یا کشمکش کے آثار مفقود تھے۔ پھر میرے ساتھ شیخ نے ایک ایک کمرے میں، باتھ روم میں یہاں تک کہ ہر بیڈ کے نیچے اور پردوں، الماریوں کے پیچھے دیکھا۔ میں نے اسے وہ میز دکھائی جس کے نیچے والی دراز میں سے فائل چوری ہوئی تھی۔ باقی کاغذات کو چھیڑا تک نہیں گیا تھا۔ گھر کے اندر دیکھ لینے کے بعد ہم نے عقبی حصے کا رخ کیا۔ باغ اور گیراج دیکھے۔ آخری حصہ وہ کوارٹر تھا جس میں پہلے صرف ایک کانسٹیبل رہتا تھا۔ پھر ہم رہتے تھے اور آخر میں [illegible] اپنی ماں کے ساتھ کچھ دن گزارتے تھے۔ اب یہ کوارٹر ویران پڑا تھا۔ میں نے اس کے دروازے کو دھکیلا اور ہم تقریباً ایک ساتھ اندر داخل ہو کے ایک ساتھ ٹھٹک گئے۔ صحن کی دیوار کے ساتھ کوئی شخص بندھا پڑا تھا۔ اسے بڑی مضبوطی سے باندھ کے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ بظاہر وہ شخص مردہ نظر آتا تھا لیکن وہ صرف بے ہوش تھا۔

چہرہ دیکھتے ہی میں نے اسے شناخت کر لیا۔ یہ وہی پولیس گارڈ تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اسے غور سے دیکھا۔ "شیخ! یہ تو پولیس گارڈ ہے" میں نے کہا "جسے دروازے پر تعینات کیا گیا تھا اور ابھی صبح تک ڈیوٹی پر تھا۔"

شیخ بھی گھٹنوں کے بل میرے قریب ٹک گیا۔ اس نے گارڈ کا ہاتھ تھام کے اس کی نبض دیکھی۔ "غنیمت ہے کہ اسے قتل نہیں کیا گیا۔ نبض کچھ سست ہے" شیخ نے کہا اور گارڈ کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔

"جسم بھی کچھ ٹھنڈا ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نہ جانے کب سے یہ اسی طرح کھلے آسمان کے نیچے زمین پر پڑا ہے۔ یہ خود ہی بتا سکتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا" شیخ نے کہا "پہلے تو اسے اٹھا کے اندر لے چلتے ہیں۔"

"پہلے اس کی یہ رسیاں کاٹ دیں" میں نے باورچی خانے کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔ جہاں میرے خیال کے مطابق ایک چھری ہونی چاہیے تھی۔ چھری مجھے تھوڑی سی تلاش کے بعد مل گئی۔ ایک منٹ بعد میں وہ رسیاں کاٹ چکا تھا جو گارڈ کے جسم پر اتنی سختی سے باندھی گئی تھیں کہ گوشت میں گڑ گئی تھیں اور سیاہی مائل نیلی لکیریں گارڈ کے سارے جسم پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ان لکیروں کے علاوہ اس کے جسم پر تشدد کے نشان نہیں تھے۔

میں اور شیخ اسے اٹھا کے سرونٹ کوارٹر سے بیڈ روم تک لائے اور ایک بستر پر لٹا دیا۔

"میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں" میں نے فون کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

جتنی دیر میں شیخ نے اس کے جسم پر کمبل ڈالا، میں نے ڈاکٹر کو فون کیا اور اسے بتایا کہ میں رضوی صاحب کے گھر سے بول رہا ہوں اور وہ فوراً پہنچ جائیں۔ ڈاکٹر ان کی فیملی کے ہر فرد کو جانتا تھا۔ چنانچہ اس نے مجھ سے معلوم کرنا چاہا کہ کون بیمار ہے اور بیماری کیا ہے۔ مجبوراً مجھے ٹیلی فون پر ہی بتانا پڑا کہ بات کیا ہے۔

"تم نے پولیس کو رپورٹ کی؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"میرا ایک دوست ہے۔ پولیس انسپکٹر" میں نے کہا "وہ اس وقت یہاں موجود ہے۔"

"تمہیں اس گارڈ کو اسپتال لے جانا چاہیے" ڈاکٹر نے کہا "پولیس سرجن سے بات کرو اور ایمبولینس منگواؤ۔"

"اس کی کنڈیشن سیریس نہیں ہے" میں نے کہا "کسی اور کا گھر ہوتا تو میں بھی یہی کرتا جو آپ کہہ رہے ہیں لیکن رضوی صاحب ہوتے تو معاملات کو خود سنبھال لیتے۔ جیسا مناسب سمجھتے کرتے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ شاید وہ بھی تشہیر پسند نہ کرتے۔ تفتیش تو ہوگی ہی بعد میں۔ پہلے تو آپ اتنا دیکھ لیں کہ اسپتال لے جائے بغیر کام چل سکتا ہے یا نہیں۔"

"اچھا" ڈاکٹر نے بادل ناخواستہ مجھ سے اتفاق کیا "میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔"

اس کے آنے تک مجھے اور شیخ کو کچھ نہیں کرنا تھا۔ میں نے اسے چائے کی پیش کش کی۔

"چائے!" وہ سر پہ ہاتھ مار کے بولا "لنچ کے وقت چائے۔ گھر میں مچھلی تلی جا رہی تھی۔ تم نے کہا لنچ باہر کریں گے اور اب چائے۔ ذرا ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔"

"لنچ بھی ہوگا۔ ذرا دیر ہوگی۔ ایسا اندھیر نہیں ہوگا کہ تمہیں محض ایک پیالی چائے پر ٹرخا دیا جائے" میں نے کہا۔

"لاؤ لاؤ۔ کچھ بھی لاؤ" شیخ نے کہا "بھوک کو قتل تو کرنا ہی ہے۔"

"شاید سنتری صاحب کو بھی چائے دینے سے ہوش آجائے"

میں نے مزید دلائل دیے "ڈاکٹر صاحب کی خاطر بھی ہو جائے گی۔"

ڈاکٹر کے پہنچنے سے قبل ہی میں نے اور شیخ نے خاصی کوشش سے ایک ایک چمچہ کر کے آدھا کپ گرم چائے گارڈ کے حلق سے اتار دی اور اس کے مفید نتائج بھی برآمد ہوئے۔ وہ پوری طرح ہوش میں تو نہیں آیا مگر اس کے جسم کا درجہ حرارت نارمل ہو گیا اور نبض کی رفتار بھی بہتر ہو گئی۔ وہ ایک بار آہستہ سے کراہا بھی جو ہوش آجانے کی پہلی امید افزا علامت تھی۔ ہم نے چائے کے ساتھ صبح کی بچی ہوئی ڈبل روٹی کا ایک ایک سلائس کھایا جو بھوکے اور خالی پیٹ کے لیے مجبوری کا مداوا کے مترادف تھا۔

"میں نے اپنا استعفیٰ اوپر ارسال کر دیا ہے" شیخ نے کہا۔

"معاف کیجیے گا شیخ صاحب! یہ کوئی عقلمندی نہیں کی آپ نے" میں نے کہا "اتنی جلدی میدان چھوڑ کے بھاگ گئے۔"

"سکندر! مانا کہ تم بڑے مرد میدان ہو" وہ بولا "مگر کیا ملا تمھیں مقابلہ کر کے؟ اس کے علاوہ تم میں اور مجھ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ تمہارا جتنا نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ تم انتقام کے جذبات سے مغلوب تھے اور تنہا تھے۔ میرے ساتھ جوان بہن ہے۔ ماں ہے۔ سوتیلی ہے تو کیا۔ اور میرا باپ ہے۔ میں ان سب کو اپنی جرأت و مردانگی کی انا پر قربان نہیں کر سکتا۔ کیا قصور ہے آخر ان کا۔ انھوں نے مجھے پڑھا لکھا کے جوان کیا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا۔ مجھے محبت دی اور میری خواہش کا احترام کرتے ہوئے بڑی نیک نیتی سے ایک غلطی بھی کی۔ یعنی مجھے اجازت دی کہ میں پولیس کی نوکری کر لوں۔ وہ چاہتے تو مجھ سے کہتے کہ قانون پڑھو اور اپنی پریکٹس جماؤ جیسا کہ میرے خاندان میں بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔ مالی طور پر پریکٹس چلنے تک وہ میری کفالت بھی کر سکتے تھے اور ضرور کرتے لیکن میں نے کہا کہ میں ملک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ طنز سے ہنسا "بالکل اسی طرح جیسے ڈاکٹر کہتے ہیں۔ لوگ بہت مظلوم ہیں کیونکہ انھیں انصاف نہیں ملتا اور انھیں پولیس سے بہت شکایات ہیں کہ وہ ظالم کی طرف دار ہے اور خود بھی ظالم ہے۔ میں اس تاثر کو ختم کروں گا۔ بے شک اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا مگر کسی کو صحیح سمت میں قدم اٹھانا ہی ہوگا۔ یہ نظام ان خرابیوں کے ساتھ ہمیشہ نہیں چل سکتا۔ میں تمام نقصانات اور خطرات سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھی تیار تھا۔

www.paksociety.com

کیوں کہ دریا میں رہ کے مگرمچھوں سے بیر رکھنے کے نتائج کبھی خوشگوار نہیں ہوتے۔ اور تم اسے فلمی ڈائیلاگ نہ سمجھو تو لوگوں کو میں فرض کی ادائیگی کے لیے جان دینے سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ جب فرض ہی چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں سے مقابلے کا ہو تو جان کی سلامتی کا یقین کیسے ہوتا ہے۔ یہ 'وائٹ کالر جاب' نہیں ہے۔ میز پر بیٹھ کے کلرکی کرنے یا افسری کے کمرے میں بیٹھنے والے کو بھلا کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ پولیس والے اگر رشوت لیتے ہیں یا بھتے وصول کرتے ہیں یا جرائم کی سرپرستی کرتے ہیں تو مارے بھی جاتے ہیں۔ کبھی اسمگلروں کے ہاتھوں۔ کبھی قانون شکن عناصر کی فائرنگ سے اور کبھی مشتعل ہجوم کے حملے سے لیکن ملازمت کے اس مختصر سے دور نے میری خوش فہمی دور کر دی ہے۔ میری جنگ قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں سے نہیں ہوئی۔ میں ایک بدعنوان سازشی نظام کی جیرہ دستی کا شکار ہو گیا جنھوں نے مجھے صرف اس لیے مجرم قرار دیا کہ میں کتابی اور اصولی باتیں کرتا تھا اور ان پر عمل بھی کرنا چاہتا تھا۔ جب معاشرہ ہی کرپٹ ہو تو وہ افراد جو اس معاشرے کا حصہ ہوں کیسے ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ انھیں آپ کہیں بھی بٹھا دیں۔ لہریں گننے والی بات سنی ہے نا تم نے؟ کسی بادشاہ نے ایک راشی اور بدعنوان شخص کو شکایات موصول ہونے کے بعد کبھی ایک محکمے میں کبھی دوسرے میں لگایا مگر وہ ہر جگہ لوگوں کو پریشان کر کے ناجائز آمدنی کے ذرائع پیدا کر لیتا تھا۔ تنگ آ کے بادشاہ وقت نے اس کو دریا کے کنارے بٹھا دیا کہ یہاں بیٹھو اور لہریں گنو۔ صبح سے شام تک اور کوئی کام نہیں اور تمھیں بس اسی کام کی تنخواہ ملے گی۔ چند دن میں اس نے وہاں بھی آمدنی کی ایک صورت نکال لی۔ اس نے ماہی گیروں کو اور دریا سے کشتی پر سامان لے جانے والوں کو روک دیا اور کہا کہ تم سرکاری کام میں مداخلت کرتے ہو۔ مجھے یہاں لہریں گننے پر لگایا گیا ہے۔ تمھاری کشتیوں کے آنے جانے سے لہروں کا سارا حساب غلط ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد اجازت لیے بغیر کوئی نہیں گزر سکتا تھا اور اجازت بلا معاوضہ نہیں ملتی تھی۔"

میں اس کی سنجیدہ گفتگو کے باوجود ہنسنے لگا۔ "یہ تو ٹھیک ہے۔ یہاں نیک نام صرف وہی ہیں جن کو موقع نہیں ملتا ورنہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ اس حمام میں ننگا وہ ہے جس نے کپڑے پہن رکھے ہوں۔ جو مچھلی گندی نہیں ہے وہ جل میں رہنے کے قابل نہیں۔"

"اور الزام کوئی کیسے لگ گیا؟" شیخ نے کہا۔ "آپ ایک ادارے کی بدعنوانی کی روک تھام کے لیے اس کے اوپر دوسرا ادارہ بنا دیں۔ وہ بھی ہوں گے تو ہم لوگ ہی نا۔ خیر یہ سب مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ مجھے کیا مشکلات درپیش ہوں گی۔ مگر میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ میری اصول پرستی اور فرض شناسی کی سزا میرے علاوہ میرے گھر والوں کو بھی مل سکتی ہے۔ ان کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے اور انھیں بھی خطرناک نتائج کی دھمکی دی جا سکتی ہے۔ تمھارے بارے میں مفصل معلومات حاصل ہو جانے کے بعد مجھے انجام صاف نظر آنے لگا۔ میرے لیے شبہے کی کوئی گنجائش نہ رہی کہ میرے جرائم کی سزا سے دوسرے بھی نہیں بچ سکیں گے۔ میرا خیال ہے وہ مجرم بہتر ہیں جو کسی پولیس افسر کو گولی مار دیتے ہیں لیکن اس کے بعد کچھ نہیں کرتے۔ اس کی فیملی کو ختم نہیں کرتے۔ بیوی، بچوں، ماں باپ یا بھائی بہن پر ظلم نہیں کرتے۔ جن مجرموں سے میرا واسطہ پڑ رہا ہے وہ اتنے بے ضمیر ہیں کہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ پھر مجھے کیا ضرورت ہے دوسروں کی زندگی سے دشمنی کرنے کی۔ کل کو خدانخواستہ میری بہن غائب ہو جائے۔ وہ ہر روز پیدل کالج جاتی ہے۔ میرے باپ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جائے جس سے میری سوتیلی ماں بیوہ ہو جائے۔ وہ میری ماں کی سب سے چھوٹی بہن بھی ہے اور اس رشتے سے میری خالہ ہے۔ وہ روایتی قسم کی سوتیلی ماں نہیں ہے۔ میں اور میری بہن اس پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔ وہ ہمیں اپنا سب کچھ سمجھتی ہے۔ مجھے کیا حق حاصل ہے کہ اپنی ضد پر پڑے بستے بستے گھر کو اجاڑ دوں۔ اپنی وجہ سے نہیں میں ان سب کی وجہ سے شکست تسلیم کر لینا بہتر سمجھتا ہوں جن سے میرا خونی اور جذباتی رشتہ ہے۔ فکر معاش مجھے کبھی نہیں ہوئی۔ میں بزنس بھی کر سکتا ہوں۔"

"اور اس نظام کا کیا ہوگا جس کی اصلاح کا عزم لے کر تم پولیس میں بھرتی ہوئے تھے؟"

"اس کو خدا ہی ٹھیک کرے تو کرے۔ میں اپنی ہار مانتا ہوں بھائی۔" شیخ نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"گویا یہاں کوئی بھی پہل نہیں کرے گا۔ کوئی سقراط نہیں آئے گا جو زہر کا یہ پیالہ اٹھائے؟" میں نے کہا۔ "مجھے ایک بات بتاؤ۔ آخر رضوی صاحب نے اسی دلدل میں رہ کے خود کو کیسے غلاظت سے پاک رکھا۔ ان کے دامن پر داغ بھی نہیں آیا اور انھوں نے ترقی بھی کی۔ عزت بھی پائی اور نیک نامی بھی کمائی۔ آج بھی میری وجہ سے انھوں نے اپنی فیملی کے تحفظ کو غیر یقینی بنا رکھا ہے۔ وہ مجھے، محسن اور رابعہ کو گھر میں رکھے ہوئے ہیں اور ان کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ رابعہ کا گھر کس طرح تباہ ہوا تھا اور میرا ساتھ دینے والوں کا کیا حشر ہوا۔ تم اگر پولیس میں رہتے تو ہمارا تحفظ کر سکتے تھے۔"

"مجھے معلوم نہیں رضوی صاحب نے ناممکن کو کیسے ممکن کر دکھایا۔ شاید وہ اس دور میں بھرتی ہوئے تھے جب آزمائش اتنی سخت نہیں ہوتی تھی۔ اصول پرستی اور فرض شناسی سے کم لوگ خوف زدہ ہوتے تھے؟ مگر اوپر کچھ لوگ ضرور ہوں گے جو ان کی حفاظت کرتے رہے۔ اوپر والا مضبوط کردار کا مالک ہو اور غلطی پر سختی سے باز پرس کر سکتا ہو اور سخت سزا دے سکتا ہو تو نیچے والوں کی ہمت نہیں پڑتی کہ کوئی غلط کام کریں۔ وہ اب اس پوزیشن میں ہیں کہ کوئی انھیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

"کچھ لوگوں کے نقطۂ نظر سے وہ نقصان میں ہیں۔" وہ "اسی شہر کے کسی علاقے کے ایس پی ہوتے تو کتنے تھانوں کے مالک ہوتے؟ ایک معمولی تھانے کا چارج لینے والے کتنی سخت کوشش کرتے ہیں۔ سفارش لاتے ہیں اور بعض جگہ تو اس کی قیمت مقرر ہے۔ فلاں تھانے میں پوسٹنگ اتنا معاوضہ۔ رضوی صاحب کسی قصبے کے ایس پی ہوتے تو اپنے علاقے کے بے تاج بادشاہ ہوتے اور اس رعایا سے جو خراج وصول کرنا چاہتے کر لیتے اور ہیڈ کوارٹر میں پوسٹنگ تو گویا سزا ہوتی ہے ان کے نزدیک۔ رضوی صاحب تمھارے بارے میں سب جانتے ہیں اور ان کی رائے بہت اچھی ہے۔ میرا خیال ہے وہ تمھیں بھی اپنے سایۂ عاطفت میں اپنی ہیڈ کوارٹر میں بلانے کی سوچ رہے ہیں۔ لعنت بھیجو تھانے پر۔ تم حشمت خان اور میر محمد جیسے لوگوں کو ٹھیک نہیں کر سکتے جو کتے کی دم ہیں۔ بلکہ کاٹنے والے کتے ہیں۔ رضوی صاحب کے ساتھ رہو۔"

شیخ خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔ بظاہر وہ مجھ سے متفق نظر آتا تھا۔

"لیکن اب تو میں استعفیٰ بھیج چکا۔" اس نے کہا۔

"استعفیٰ واپس بھی لیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور نامنظور بھی کیا جا سکتا ہے۔"

اسی وقت کوئی گاڑی باہر آ کے رکی اور ڈاکٹر نے ہارن بجا کے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ میں اسے لینے باہر گیا تو وہ کار سے اتر رہا تھا۔ اس نے اپنا بیگ مجھے یوں تھما دیا جیسے گھر کے کسی ملازم کو تھماتا ہو۔

"تم ہو سکندر اعظم؟" اس نے کہا۔ "کیا لگتے ہو رضوی صاحب کے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "سکندر اعظم بھی ان کا کچھ نہیں لگتا تھا جو تئیس سو سال پہلے فوت ہوا تھا۔ میں سکندر بخت ہوں۔"

ڈاکٹر نے میرے مذاق پر برا سا منہ بنایا اور سیدھا چلا گیا۔ میں دروازہ کھول کے بیڈ روم میں داخل ہوا تو وہ خاصا

سب رنگ ڈائجسٹ میں قسط وار شائع ہونے والا سلسلہ

مکمل دو حصوں میں

تاریک براعظم کے پراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حیرت انگیز داستان جہاں کالے جادو اور عقل کے مقابلے برپا ہوتے تھے — وحشی قبائل اور ان کے وحشیانہ رسم و رواج کی ایک ناقابل یقین سرگزشت — انتہائی دور گمنام جزیرے کی کہانی — جہاں تہذیب کا کوئی دخل نہیں تھا — شگون کی خاطر معصوم اور بے خبر کنواریوں کو بھینٹ چڑھایا جاتا تھا — عجیب اعتقادات اور خوفناک دیوتاؤں کے مجسموں کو تازہ خون سے غسل دیا جاتا تھا — نوخیز حسیناؤں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی

افتابلا

وحشی قبیلوں کی ایک سرکش حسینہ جس کا حسن لازوال تھا جس کے حصول کے لیے موت کا بازار ہمیشہ گرم رہتا تھا — خون کی ہولی کھیلی جاتی تھی۔ ایک سیاح کی زندگی کے لرزہ خیز واقعات جسے سمندر کی سرکش موجوں نے اٹھا کر افتابلا کے وحشیوں کے قدموں میں ڈال دیا تھا —

کتابی شکل میں پہلی بار منظر عام پر آ گئی ہے

قیمت فی حصہ ۲۰/- روپے علاوہ محصول ڈاک

پتہ ذیل پر رجوع کریں

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس نمبر ۲۳ ○ کراچی ۱

www.paksociety.com

آگے نکل چکا تھا اور میرے آواز دینے پر واپس آیا تو مزید حیرت زدہ ہوا۔ اس نے گارڈ کا معائنہ یوں کیا جیسے پوسٹ مارٹم شروع کرنے والا ہو۔

"کچھ نہیں۔" اس نے چند منٹ میں فیصلہ کر دیا۔ "شاک اور سر کی چوٹ۔ میں انجکشن دیتا ہوں۔ اگر ہوش منٹ کے ایک گھنٹے کے اندر اندر۔ یا ہوش آنے کے بعد متلی اور سستی وغیرہ ہو تو سیدھا ہسپتال لے جانا۔ ورنہ علاج کی ضرورت نہیں۔ آرام اور خوراک۔" اس نے ایک انجکشن بھرا اور گارڈ کی کلائی سے ذرا اوپر ابھری ہوئی رگ میں لگا دیا۔

"مسٹر پولیس انسپکٹر!" اس نے روانگی سے قبل کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ اس کیس میں کہیں میرا نام آئے۔"

"میرا خیال ہے اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" شیخ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ مریض خود ہی ہوش میں آ گیا تھا۔ اور خدانخواستہ کنڈیشن سیریس ہو جائے۔ جس کا مجھے کوئی امکان نظر نہیں آتا تو آپ یہ نہیں کہیں گے کہ کسی پرائیویٹ ڈاکٹر نے انجکشن وغیرہ دیا تھا۔"

"آئی ایم سوری۔ اس صورت میں جھوٹ بولنا مشکل ہو گا میرے لیے۔" شیخ نے کہا۔

ڈاکٹر نے نظر جما کے شیخ کو دیکھا۔ "میرے لیے مشکل نہیں ہو گا انسپکٹر! میں صاف انکار کر دوں گا۔ اور ثابت بھی کر دوں گا کہ میں سچا ہوں۔" وہ بیگ اٹھا کے احتجاجی انداز میں واک آؤٹ کر گیا۔

"اس شخص کی رضوی صاحب سے کیسے نبھ رہی ہے؟" شیخ نے حیرانی سے کہا۔

"شاید اس لیے کہ ڈاکٹر اچھا ہے۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر کے جانے کے آدھے گھنٹے بعد سنتری کو ہوش آ گیا۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھا اور احمقوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گیٹ پر ڈیوٹی دیتے دیتے وہ بیڈ روم میں کیسے آ لیٹا۔ ہم نے اسے تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں اور ٹیکہ بھی لگا دیا۔ "وہ... جناب... بات تو سن لیں۔" اس نے حیرانی سے اپنے کپڑوں کو دیکھا۔

"تمہاری بات بھی سنیں گے۔ لیکن ابھی نہیں۔" شیخ نے کہا۔ "جب تمہاری طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

"قسم خدا کی جناب! میرا کوئی... قصور نہیں۔" سنتری نے اس کے باوجود اپنا دفاع جاری رکھا۔

"ہاں ہاں۔ ہم جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ابھی تم آرام کرو۔ یہ انسپکٹر صاحب اسی لیے آئے ہیں کہ تمہارا بیان لیں۔"

ہم نے اسے ایک گلاس گرم دودھ کا گلوکوز ملا کے دیا اور ہدایت کی کہ ہم ایک گھنٹے کے لیے اسے چھوڑ کے جا سکتے ہیں۔ یہ بات ہم نے اسے نہیں بتائی ورنہ وہ اتنا خوفزدہ تھا کہ شاید اٹھ کے بھاگ جاتا۔ ہم نے کہا کہ دو گھنٹے بعد ہم پھر آئیں گے۔ ہم دوسرے کمرے میں آرام کرتے ہیں۔ ممکن ہو تو وہ بھی سو جائے۔

شیخ نے باہر آ کے اسکوٹر اسٹارٹ نہیں کیا۔ وہ سڑک تک اسکوٹر کو ایسے ہی چلا کے لایا اور گیٹ سے کچھ فاصلے پر روک کے اسٹارٹنگ کک لگائی۔ اس وقت تین بجنے والے تھے اور جتنی دیر میں ہم پٹھان ہوٹل سے کھانا کھا کے لوٹے شام ہونے لگی تھی۔

"کیس کی رپورٹ تو لکھوانی پڑے گی۔" شیخ نے کہا۔ "پہلے ذرا اس کی سن لیں۔ رضوی صاحب کو اطلاع دینی چاہیے یا نہیں۔ یہ فیصلہ بعد میں کریں گے۔"

سنتری پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا اور آنکھیں کھولے ہونقوں کی طرح چھت کو گھور رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔

"آپ تو خیر سکندر صاحب ہیں۔" وہ بولا۔ "لیکن یہ انسپکٹر صاحب کون ہیں۔ کس نے بلایا ہے انھیں؟"

"میں نے بلایا ہے۔" میں اس کے لہجے پر حیران ہو کے بولا۔ "یہ سب انسپکٹر اکرام شیخ ہیں۔"

"سوالات مجھے کرنے ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

"دین محمد۔ مگر میں کانسٹیبل نہیں ہوں۔" اس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"پھر کیا ہو؟ ناٹک؟" شیخ نے فل اسکیپ کاغذ پر قلم سے کچھ لکھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی سب انسپکٹر ہوں۔" وہ بولا۔ "میں اپنی اسناد کا اور میڈلوں کا کیا ذکر کروں۔ یوں سمجھ لیں کہ دہشت گردی کا کیس ہو تو عموماً مجھے خصوصی تفتیش کی ٹیم میں ضرور شامل کیا جاتا ہے۔"

انسپکٹر شیخ نے اور میں نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "گویا تمہیں خاص طور پر رضوی صاحب کے گھر کی حفاظت کے لیے منتخب کیا گیا تھا؟" شیخ نے کاغذ پر اس کا نام اور عہدہ لکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اور مجھے بہت افسوس ہے کہ میں ناکام رہا۔ ایس پی صاحب کے گھر میں تو خیریت ہے نا؟" وہ تشویش سے بولا۔

"ہاں۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ اسلام آباد گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جاتے وقت انھوں نے تم سے بات بھی کی تھی۔"

"مجھ سے؟" وہ حیران ہو کے بولا۔ "میں نے تو انھیں جاتے

ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ کب گئے تھے وہ؟"

"آج صبح ساڑھے نو بجے۔" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "وہ خود گاڑی چلا رہے تھے اور اس وقت تم اپنی مشین گن لیے گیٹ پہ کھڑے تھے۔ میرے سامنے انھوں نے گیٹ پہ کار روکی تھی۔"

دین محمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کوئی اور ہو گا سکندر صاحب!"

"کل۔ یعنی گزشتہ رات تقریباً ایک بجے سے ساڑھے چار بجے تک بھی میں نے تم کو ہی گیٹ پر اٹن شن دیکھا تھا۔" میں نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے کہا۔ "اس لیے میں نے تمہیں شناخت کر لیا۔ میرے علاوہ رابعہ بی بی نے دیکھا تھا تمہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا تھا ہمیں۔ ہم باغ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ چاندنی کا اجالا بہت کافی تھا۔ اور تم تو گیٹ لائٹ..."

"آپ الٹی گنگا بہا رہے ہیں۔" دین محمد نے ناگواری سے کہا۔ "میری بھی تو سن لیں۔ گزشتہ رات بھی میں ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ آپ نے کسی اور کو دیکھا ہو گا۔ اتنی دور سے وردی میں سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ میرے ہی قد و قامت کا کوئی آدمی ہو۔ یا اس کی صورت مجھ سے ملتی ہو۔ صورت تو میک اپ سے بنائی بھی جا سکتی ہے۔ میں تو پرسوں شام کو اندھیرا ہونے کے بعد ڈیوٹی پہ پہنچا تھا۔ دن میں دوسرا شخص آ گیا۔ رات کو دس بجے پھر میں نے چارج لیا تھا۔ اس وقت تک صاحب بھی گھر نہیں لوٹے تھے۔ اس گیٹ پوسٹ کے پیچھے یا ساتھ والی کوٹھی کی دیوار کے ادھر کوئی چھپا کھڑا تھا جس نے اچانک مجھے قابو کر لیا۔ میری نظر سڑک پہ جمی تھی اور... ہر طرف تھی۔ لیکن پڑوسیوں کی طرف سے میں مطمئن تھا۔ مجھے معلوم ہے وہاں کون رہتا ہے۔ وہ بہت چالاک لوگ تھے۔ واقعی پیشہ ور لوگ۔ انھوں نے مجھے پیچھے سے دبوچا اور میری ناک پہ رومال رکھ دیا۔ کلوروفارم میں بھیگا ہوا۔ وہ دو تھے اور جس نے مجھے قابو کیا وہ خاصا طاقتور تھا۔ اس نے رومال رکھتے ہی مجھے پیچھے جھاڑیوں میں گھسیٹ لیا تھا۔ جبکہ دوسرے نے میرے سر پر کوئی چیز دے ماری تھی۔ کوئی خاصی سخت چیز۔ میرا خیال ہے رومال یا کسی کپڑے سے ہاکی یا کرکٹ کی گیند لپیٹ کر وار کیا گیا تھا۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ کلوروفارم سے نہیں۔ اس ضرب سے۔ میں نے سانس روک لیا تھا اور تین منٹ تک روک سکتا تھا۔ مجھے اگر مہلت ملتی تو میں ان دونوں سے نمٹ لیتا۔ شاید انھوں نے اندازہ کر لیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے سر پہ وار کیا۔ میں نے ان کی صورتیں تو نہیں دیکھیں مگر آوازیں سنی تھیں۔ ایک نے دوسرے سے چلا کے کہا تھا "دیکھتا کیا ہے۔ مار۔" اس کے بعد کیا ہوا مجھے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے جاتے ہی ان میں سے کسی نے میری وردی پہن لی ہو گی اور پہرے دار بن کے کھڑا ہو گیا ہو گا۔ آپ نے بھی اسے ہی دیکھا اور ایس پی صاحب نے بھی۔ میں حیران ہوں کہ آپ کی نظر تو دھوکا کھا سکتی ہے۔ ایس پی صاحب کو دھوکا کیسے ہو گیا؟"

"میرا خیال ہے انھوں نے اس شخص کو نہیں دیکھا ہو گا جو دن کی ڈیوٹی پر مامور تھا۔ اگر انھیں تمہاری جگہ کوئی اور نظر آیا ہو گا تو وہ سمجھے ہوں گے کہ دن میں یہی شخص ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "وہ کس وقت آتا ہے؟"

"دس بجے۔" دین محمد نے کہا۔ "بارہ بارہ گھنٹے سے ڈیوٹی بدلتی ہے۔"

"پھر سوال یہ ہے دین محمد کہ آج صبح دس بجے وہ کیوں نہیں آیا؟" شیخ نے کہا۔ "رضوی صاحب آدھے گھنٹے پہلے چلے گئے تھے اس لیے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انھوں نے نقلی محافظ کو اصلی سمجھا۔ گزشتہ روز بھی وہ دس بجے آیا ہو گا۔ اور دس بجے رضوی صاحب آفس میں ہوتے ہیں۔ ڈیوٹی باہر ہی باہر بدل جاتی تھی۔ اس لیے بیگم صاحبہ نے بھی نہیں دیکھا۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"خواجہ اکبر۔ وہ بھی سب انسپکٹر ہے۔ سی آئی اے کا۔" دین محمد نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کل رات دس بجے سے تم وہاں بے ہوش اور بندھے پڑے تھے؟"

"کہاں بندھا پڑا تھا۔ نشانات تو مجھے بھی نظر آ رہے ہیں اپنے جسم پر۔" وہ بولا۔

"یہ بھی ایک سرونٹ کوارٹر ہے۔ اس کے صحن میں۔" میں نے کہا۔ "آج دو بجے تک سولہ گھنٹے ہو گئے۔ اور کلوروفارم سے کوئی بھی سولہ گھنٹے بے ہوش نہیں رہ سکتا۔ انھوں نے تمہیں خواب آور دوا بھی دی ہو گی۔"

"اس کا اثر بھی آٹھ گھنٹے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن تمہاری بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں پڑے ہو۔" شیخ نے میری بات پر تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ "تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا تک نہیں۔ چنانچہ یا تو ہم فرض کر سکتے ہیں کہ سولہ گھنٹے کی بے ہوشی سر کی چوٹ کا نتیجہ تھی۔ جو بہت طویل وقفہ ہے اور چوٹ اتنی سیریس ہوتی تو ڈاکٹر کو اندازہ ہو جاتا۔ اس کا کوئی نشان نہ ہوتا تب بھی ڈاکٹر اسے معمولی قرار نہ دیتا۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اپنا کام ختم ہونے تک تمہیں ہوش میں نہیں آنے دیا گیا۔ وقفے وقفے سے تمہیں انجکشن وغیرہ دیے گئے۔"

دین محمد نے ڈھیلے ڈھالے نائٹ سوٹ کی آستین کو شانے تک اٹھا کے دیکھا۔ شانے سے ذرا نیچے تین ننھے ننھے نشان نظر آ رہے تھے۔ اس نے بازو کو دوسرے ہاتھ سے تھوڑا سا دبا کے اقرار میں سر ہلایا۔

www.paksociety.com

"ممکن ہے اسی شخص نے یہ کام بھی کیا ہو جو پہریداری کے بہانے گھر کی نگرانی پر مامور تھا۔ مار دیا۔ بیٹھا ڈرین یا ڈرائنگ روم کا پیڈی ڈورز دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ چیزیں عام دستیاب ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہارا قابلِ فخر ریکارڈ خراب ہو گیا دین محمد! تم پر چارج تو لگے گا۔ ایک غفلت برتنے کا، دوسرا وہ اسلحہ گم کرنے کا جو تمہیں خصوصی اجازت کے تحت دیا گیا ہو گا۔ تم معطل بھی ہو جاؤ گے لیکن میرا خیال ہے بحال بھی ہو جاؤ گے۔"

"کیسی عجیب اور خطرناک بات ہے شیخ کہ رضوی صاحب تک مطمئن تھے۔" میں نے کہا۔ "اور وہ بدمعاش پاسبان تھیلی دشمنِ جان تھا۔ آج مجھے خیال آیا تھا کہ سنتری اس طرح ڈیوٹی چھوڑ کے جانے کی حماقت اور جرات نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ گھر کی بات دشمنوں تک اتنی جلدی کیسے پہنچ گئی۔ کل رات ہی محسن کے والد کا فون آیا تھا اور انھوں نے صبح مجھ سے بات کی۔ اس سے پہلے اسلام آباد جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اور اس پروگرام کی فوراً دشمنوں کو خبر مل گئی۔ میں سوچ رہا تھا کیسے؟ کیا انھوں نے گھر کے اندر کوئی خفیہ مائیکروفون چھپا رکھا ہے اور کہیں آس پاس ہی بیٹھے سب گفتگو سن رہے ہیں۔ اب بات سمجھ میں آتی ہے۔ یا تو وہ بدمعاش جو گیٹ پر محافظ بنا کھڑا تھا کسی کھڑکی دروازے سے کان لگا کے ساری باتیں سن سکتا تھا مگر اس میں پکڑے جانے کا بہت خطرہ تھا۔ رضوی صاحب یا گھر کا کوئی فرد اچانک باہر آ جاتا تو اسے دیکھ لیتا۔ چنانچہ اصل بات یہ ہے کہ کوئی چھوٹا سا ٹرانسمیٹر یا مائیکروفون گھر کے اندر تھا اور ریسیور اس کی جیب میں۔ ظاہر ہے اس کی رینج بہت کم ہوتی ہے۔ انھیں آس پاس کوئی جگہ نہ ملی..."

"نہیں سکندر! بات جگہ کی نہیں۔" شیخ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "وہ کچھ اور بتانا چاہتے تھے۔ یہ کہ تم لاکھ ایس پی کی کوٹھی میں قلعہ بند ہو کے بیٹھ جاؤ اور دروازوں پر محافظ بٹھا دو۔ ہماری پہنچ سے باہر نہیں۔ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ غور کرو کہ ان کے ہاتھ یہ مشین گن تھی۔ وہ کیا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ گھر کو اڑا دیتے یا سب کو لے جاتے۔ مگر وہ صرف ایک فائل لے گئے اور کچھ کیے بغیر بہت کچھ کہہ گئے کہ ہم بلاوجہ کشت و خون نہیں کرتے اور تمہیں ایک موقع فراہم کرتے ہیں کہ ہماری طاقت کا اندازہ کرتے ہوئے مقابلے کا خیال چھوڑ دو۔"

شیخ کے مشورے پر میں نے رضوی صاحب کو اطلاع دیے بغیر رپورٹ درج کرانے کا فیصلہ کیا۔ کچھ دیر بعد اس کی ڈیوٹی شروع ہونے والی تھی۔ وہ رخصت ہو گیا تو میں نے طے کیا کہ رپورٹ بھی آٹھ بجے کے بعد لکھواؤں جب حشمت خان کی جگہ خود اکرام شیخ آ جاتے۔ اس کے جانے کے بعد میں دین محمد سے باتیں کرتا رہا۔ وہ پرانا سپاہی تھا۔ وہ مجھے اپنی بہادری کے پرانے کارنامے سناتا رہا جن پر اسے تعریفی اسناد ملی تھیں اور میڈل ملے تھے۔

ساری بات یہ ہے کہ موت نہ وقت مقررہ سے پہلے آ سکتی ہے نہ اس کے بعد۔ جب یہ وقت آتا ہے تو وہ عورت جو مفلوج ہو اور گھر کے اندر بستر پر لیٹی ہو اور بالکل نہ جانتی ہو کہ دنیا میں کوئی اس کا دشمن بھی ہے جو تصور بھی نہ کر سکتی ہو کہ اس کی موت طبعی نہیں ہو گی اور قتل کو ایسا فعل سمجھتی ہو جو انسان نہیں کر سکتے۔ خود قتل ہو جاتی ہے۔ ورنہ دین محمد جیسے لوگ خطرناک ترین مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچاتے ہیں۔ آٹومیٹک اسلحے کی جنگ میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور جان ہتھیلی پہ لیے پھرتے ہیں۔ میڈل اور اسناد پانے کے لیے زندہ رہتے ہیں اور انھیں خراش تک نہیں آتی۔

رات کو میں اسے رابعہ کی گاڑی میں بٹھا کے اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے گیا۔ حشمت خان چارج دے چکا تھا اور شیخ کو اپنا فلسفۂ حیات اور ملازمت کے زریں اصول سمجھا کے شیخ کا وقت ضائع کرنے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ چونکنے کا اصل سبب میرے ساتھ دین محمد کا آنا تھا۔ دین محمد پولیس سے سی آئی اے میں گیا تھا اور پرانا افسر تھا چنانچہ حشمت خان بھی اس کو پہچانتا تھا۔ پہلا نظریہ اس نے یہی قائم کیا ہو گا کہ میرے جیسے خطرناک مجرم کا کیس اب سی آئی اے نے لے لیا ہے مگر رپورٹ کی بات کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ دین محمد اب سیری قمیص اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔

"آپ میری مانیں تو گھوڑے شاہ کے مزار پر کوئی منت مان لیں۔" اس نے درمیان ہی میں موقع پا کے کہا۔ "آپ کے سارے گھر پر کسی کا نحوس سایہ ہے۔" اس نے بڑے معنی خیز طریقے سے میری طرف دیکھا۔

"سارے گھر کا کیا مطلب؟" دین محمد نے ناگواری سے کہا۔ "میرے ساتھ اس سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔"

"وہ تو ہے جی۔ مگر ذرا غور کریں نا۔ ایک ہی وقت میں آپ اور آپ کے بھائی دونوں..." اس نے عمداً جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"پوری بات کیوں نہیں کرتے؟" دین محمد نے کہا۔ "کیا ہوا ہے میر محمد کو؟"

چونکنے کی باری اب میری تھی۔ "میر محمد بھائی ہے تمہارا؟ سگا؟"

"اور کیا سوتیلا۔ آپ بھی کمال بات کرتے ہیں سکندر صاحب اب دیکھیں نا۔ کل سے اس کا بھی پتا نہیں۔" حشمت خان بولا۔

"کیا پتا نہیں؟" دین محمد نے برہمی سے کہا۔ "اس کا گھر تو یہیں ہے۔"

"میں بتاتا ہوں آپ کو۔" حشمت خان نے ...

ساتھ غائب ہو جاتا تھا لیکن ان کا ایک پیغام ملا مجھے کہ وہ نہیں جا سکتے اور یہ کام میں کروں۔ کورٹ تو میں چلا گیا۔ لیکن میں نے اپنے شک کا بہرحال اظہار کر دیا تھا کیونکہ غیر حاضری میر محمد کی نہیں تھی۔ اس کی بیوی بھی بہت پریشان ہے۔ ایسے بتائے بغیر وہ پہلے کبھی کہیں نہیں گیا۔"

دین محمد اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں بھابی سے پوچھتا ہوں۔"

میں اور شیخ اس کے پیچھے گئے لیکن حشمت خان وہیں بیٹھا رہا۔ میر محمد کا گھر تھانے سے ملحق احاطے میں تھا جہاں عملے کی رہائش کے لیے فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ دو بلاک ماتحت عملے کے لیے تھے اور یہ چھوٹے کوارٹر تھے۔ میر محمد تین کمروں والے فلیٹ میں تھا اور اس کا فلیٹ تیسری منزل پر تھا۔ دین محمد نے دستک دی اور دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہو گیا۔ پھر ہم نے اس کے چلّانے کی آواز سنی اور اجازت لیے بغیر اندر گھس گئے۔

اندر دین محمد دیوانہ وار ایک سے دوسرے کمرے میں جا رہا تھا۔ دونوں کمروں کی حالت ناقابلِ بیان حد تک ابتر تھی۔ گھر کا سارا سامان کباڑی کی دکان کی طرح بکھرا پڑا تھا۔ سارے صندوقوں کو الٹ کر خالی کر دیا گیا تھا۔ اب خالی صندوق الگ پڑے تھے اور ان کا سامان فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ یہی کیفیت الماریوں کی تھی۔ ان میں سے ہر چیز نکال کے باہر ڈال دی گئی تھی۔ تلاشی لینے والوں کے لیے ممکن ہوتا تو وہ دیواروں کو بھی ادھیڑ دیتے کیونکہ انھوں نے کوئی چیز سلامت نہیں چھوڑی تھی۔ انھوں نے تکیے، لحاف بستر سب پھاڑ دیے تھے۔ ایک صوفہ سیٹ کا کور خنجر جیسی کسی چیز سے یوں پھاڑا گیا تھا کہ صرف اندر کے اسپرنگ رہ گئے تھے انھوں نے درمیان میں بھری ہوئی جوٹ تک نکال پھینکی تھی۔

"میر محمد کی بیوی کہاں ہے؟" شیخ نے ہر طرف پھیلی ہوئی تباہی اور بربادی کا مکمل جائزہ لینے کے بعد کہا۔

"مجھے... مجھے کیا معلوم۔ میں ابھی تھانے سے سامنے ہی تو آیا ہوں۔" دین محمد نے کہا۔ "دیکھا نہیں تھا کیا؟"

"تمہاری دستک پر دروازہ کس نے کھولا تھا؟" شیخ نے میری طرف دیکھا۔

"کسی نے بھی نہیں۔ جب میں نے دستک دی تھی تو دروازہ تھوڑا سا پیچھے ہو گیا تھا۔" دین محمد نے کہا۔ "دروازہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔"

"شاید سامنے کے فلیٹ والے پڑوسی کو کچھ معلوم ہو۔" شیخ نے کہا۔ باہر جھانکنے پر مجھے سامنے کا دروازہ مقفل نظر آیا۔ نیچے دیکھنے والوں کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہر منزل پر دو فلیٹ تھے جن کے دروازے زینے میں آمنے سامنے کھلتے تھے چنانچہ میر محمد کی بیوی کا میل ملاپ زیادہ تر تیسری منزل کے دوسرے مکینوں کے ساتھ تھا مگر اس میں رہنے والا اے ایس آئی تبدیل ہو کے ملتان چلا گیا تھا اور تب سے وہ فلیٹ خالی پڑا تھا۔ تیسری منزل پر میر محمد اکیلا تھا۔ دین محمد اور اکرام شیخ نے مجھے فلیٹ ہی میں چھوڑا اور اوپر چلے گئے۔ اوپر کسی دوسرے تھانے کے دو انسپکٹر رہتے تھے۔ وہ اپنے اپنے گھر میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ ان کے کانوں نے بھی کوئی غیر معمولی آواز نہیں سنی تھی۔ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میر محمد غائب ہے۔

دس منٹ بعد وہ دونوں لوٹ آئے۔ "ابھی کل میری اس سے بات ہوئی تھی۔" دین محمد نے کہا۔

"کل بات ہوئی تھی تمہاری؟" شیخ نے چونک کر کہا۔ "کس وقت؟"

"صبح دس ساڑھے دس بجے۔ صحیح وقت تو میں نے نوٹ نہیں کیا تھا۔ میں ڈیوٹی کے بعد تھانے گیا تھا۔" دین محمد بولا۔

"اور تمہارا بھائی وہاں موجود تھا؟" شیخ نے کہا۔ "کیا بات ہوئی تھی اس سے؟"

"اس نے فون کیا تھا۔" دین محمد نے کہا۔

"کہاں سے؟ اس کے گھر میں تو فون ہے نہیں اور تھانے پہ وہ آیا نہیں تھا۔" شیخ نے کہا۔

"یہ میں نے اس سے نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں سے بول رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ تھانے سے ہی بات کر رہا ہو گا۔" دین محمد بولا۔

"اور تم نے اپنے تھانے پہنچ کر فون ریسیو کیا تھا؟" شیخ نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے ڈیوٹی کے بعد گھر جانے سے پہلے ایس پی صاحب کو رپورٹ دینی پڑتی ہے۔ ابھی میں نے رپورٹ نہیں دی تھی۔ صاحب کے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ اتنی دیر میں ایک انسپکٹر نے آواز دے کر مجھے بلایا اور کہا میر محمد کا فون ہے۔"

"گویا میر محمد کو معلوم تھا کہ تم اس وقت ڈیوٹی ختم کر کے تھانے پہنچ گئے ہو گے۔" شیخ نے کہا۔

"یہ نتیجہ آپ نکال رہے ہیں۔" دین محمد نے کہا۔ "میر محمد کو تو میں نے اپنی ڈیوٹی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہمیں جب بھی بات کرنی ہوتی تھی ہم اپنے تھانے سے فون کر لیتے تھے۔ اس میں کوئی غیر معمولی یا نئی بات نہیں تھی۔"

"اچھا کل کوئی خاص بات کی تھی اس نے؟" شیخ نے کہا۔

"دیکھیں جی۔ ویسے تو وہ بھائی تھا میرا۔ مجھ سے چھوٹا تھا۔" دین محمد نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "لیکن اس کی اور میری طبیعت میں بہت فرق تھا۔ اسے پیسے کی ہوس تھی۔ پیسے کی خاطر وہ بہت سے غلط کام بھی کرتا تھا۔ غلط کام تو سب ہی کرتے ہیں مگر چالاکی

www.paksociety.com

بچا سکے۔ زمانہ بڑا خراب آگیا ہے۔ ایک بردہ فروش کے وارث بھی ہائی کورٹ جا پہنچتے ہیں، وکیل کر لیتے ہیں اور پولیس کو عدالت میں گھسیٹ لیتے ہیں۔ پیسہ آگیا ہے سب کے ہاتھ میں اور وکیل صاحب کو صرف پیسہ چاہیے۔ ایک بار اس نے کسی ٹرک ڈرائیور کے ہاتھ مار دیا تھا۔ جی ٹی روڈ پر ساری ٹریفک رک گئی۔ ٹرک والوں کے ساتھ بس والے شامل ہو گئے اور انھوں نے سڑک بند کر دی۔ ایس ڈی ایم اور کمشنر صاحب کو معاملہ رفع دفع کرانا پڑا۔ میں اس کو بہت سمجھاتا رہا کہ دیکھو حد سے نہ بڑھو۔ تیرا ریکارڈ اچھا نہیں ہے۔ آئے دن شکایات موصول ہوتی ہیں۔ مگر اسے پروا نہیں تھی۔ اس نے اتنا پیسہ جمع کر لیا تھا کہ وہ کسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ بیوی کے نام سے گلبرگ کی ایک دو منزلہ کوٹھی دو سال پہلے خریدی تھی، ایک کمال کی کوٹھی ہے۔ اس کے دونوں بیٹے کراچی پڑھ رہے تھے۔ دوسری ابھی بیٹے کے نام سے لی تھی۔ خاصی زرخیز زمین بھی تھی — ساہیوال کی طرف۔ کینوں مالٹے کے ایک باغ سے ہی پچاس ہزار سالانہ ملتے تھے۔ لیکن اس میں قناعت نہیں تھی۔ بیوی بھی روتی تھی اور مجھ سے کہتی تھی بھائیا جی! آپ ہی سمجھائیں انھیں۔ میری تو ایک نہیں سنتے۔ اتنا لالچ ٹھیک نہیں۔ کوئی اونچی نیچی بات ہو گئی تو نوکری بھی جائے گی اور عزت بھی۔ کیا فائدہ ان کوٹھیوں کا اور اس پیسے کا جس کا مالک جیل میں پڑا ہو۔ ہمیں اتنا ہی بہت ہے۔ وہ الٹا مجھ پر گرم ہوتا تھا کہ بس عورت ہے۔ جو کچھ میں کرتا ہوں ان کے بھلے کے لیے، بچوں کے بھلے کے لیے کرتا ہوں۔ جس روز ایسی ویسی بات کا خطرہ ہوگا میں استعفیٰ منہ پر مار دوں گا۔ کیا میں اس معمولی سی پنشن کی رقم کے لیے نوکری کر رہا ہوں جس سے میرا بیٹے کا سگریٹ خرچ بھی پورا نہیں ہوتا۔ میں جب چاہوں اپنا بزنس شروع کر سکتا ہوں اور جتنی تنخواہ اب سرکار کے خزانے سے لے رہا ہوں اس سے زیادہ تنخواہ پہ سینکڑوں ملازم رکھ سکتا ہوں۔"

"یہ تو میں سمجھ گیا۔" شیخ نے بڑی احتیاط سے اس کو ٹوکا۔ "کل کیا بات ہوئی تھی؟"

"کل..." دین محمد نے کہا۔ "وہ کچھ تذبذب کا شکار تھا۔ ایک بات ایسی تھی، قابلِ ذکر... اس نے کہا تھا بھائیا جی! بس اب نوکری سے چھٹی اچھی۔ میں نے کہا، کیا مطلب؟ استعفیٰ دے دیا ہے کیا؟ اس نے کہا، بس دے دوں گا آج کل میں۔ بہت کر لی سب کی غلامی۔ میں پہلے تو یہی سمجھا کہ جس بات سے میں ڈرتا تھا وہی نہ ہوئی ہو۔ میں نے کہا، کوئی ایسی ویسی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔ وہ ہنسنے لگا۔ بولا، بھائیا جی! آپ تو ہمیشہ ڈرتے ہی رہے۔ بات کیا ہونی ہے۔ بس جی بھر گیا ہے سیانا نا۔ میں نے کہا۔ پھر بھی کوئی بات تو ایسی ہوئی کہ آج تم نے اچانک فیصلہ کر لیا۔ وہ بولا، ہاں ایک بڑا سودا کیا ہے۔ لاکھوں کا۔ بڑی پارٹی ہے۔ پانچ لاکھ دینے تھے مگر میں نے دس پر مجبور کر دیا۔ میرے بہت پوچھنے پر بھی اس نے سودے کی نوعیت نہیں بتائی اور پارٹی کا نام نہیں لیا۔ ایک بات میں اس سے کہنا چاہتا تھا مگر نہیں کہہ سکا کہ دس لاکھ دینے والے معمولی لوگ نہیں ہوتے۔ ان سے بہت محتاط رہنا چاہیے۔ وہ تو لاکھوں کا بندوبست بھی کر سکتے ہیں۔ ایک لاکھ دے کر کسی کو تمہارا پتہ صاف کرنے کے لیے بھیج سکتے ہیں۔ اس شہر میں ایسے بہت ہیں جو ایک لاکھ کی خاطر اپنے بھائی کے قتل سے گریز نہ کریں۔" وہ ذرا دم لینے کے لیے رکا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے اندیشے غلط نہیں تھے۔"

"یہ معاملہ تفتیش طلب ہے۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن پہلے یہ معلوم کرنا ہے کہ بیوی بچے کہاں ہیں۔ میرا مطلب ہے کہیں وہ تمہارے گھر تو نہیں گئے ہوئے ہیں؟"

دین محمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کی بیوی کی میری بیوی سے کبھی نہیں بنی، حالانکہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔"

"اس اختلاف کی وجہ؟" شیخ نے کہا۔

"عورت ذات کی فطرت۔" دین محمد نے تلخی سے کہا۔ "سگی بہنیں دو گھروں میں جا کے ایک دوسرے کی حریف بن جاتی ہیں تو خون کے رشتے کو فراموش کر دیتی ہیں۔ یہ دیکھنے لگتی ہیں کہ دوسری بہن کے گھر میں کیا ہے اور میرے گھر میں کیا نہیں ہے۔ حسد کرنے لگتی ہیں۔ سارا قصور میری بیوی کا ہے۔ وہ ہر وقت... کر کے اپنے بہنوئی کے گھر کو دیکھو اور اپنے گھر کو دیکھو۔ میری تو قسمت پھوٹ گئی تھی آپ سے شادی کر کے۔ وہ چھوٹی بہن ہے اور اس کے گھر میں ہر چیز ہے، یہاں دھول اڑ رہی ہے۔ وہ عیش کر رہی ہے اور میں اپنے نصیب کو رو رہی ہوں۔ حالانکہ میر محمد کی بیوی اپنے شوہر کی کمائی سے خوش نہیں تھی۔ وہ میرے سامنے رویا کرتی تھی کہ مجھے یہ حرام کی کمائی اور ایسی بھلائی نہیں چاہیے۔ معاملہ بالکل الٹا تھا۔ جسے سب میسر تھا وہ کہتی تھی مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ معلوم نہیں وہ میری بیوی ہوتی تو کیا کہتی۔ شاید وہی جواب میری بیوی کہتی ہے۔ عورت کو دولت راس آتی ہے نہ بے دولتی۔ بس اسی بات پہ ان کی ایسی ان بن تھی کہ ایک دوسرے سے بات تک کرنے کی روادار نہ تھیں۔"

"ممکن ہے وہ میکے گئی ہو۔" شیخ نے کہا۔

دین محمد نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ "دونوں کا میکہ ایک تھا، اب نہیں ہے۔ ماں باپ مر گئے۔ بھائیوں نے مکان بیچ کر پیسہ بانٹ لیا۔ ایک دوبئی چلا گیا۔ دوسرا کراچی گیا تھا۔ معلوم نہیں اب کہاں ہے۔"

"تمہیں ان سے ملنے جلنے والوں کے متعلق کچھ معلوم ہے؟" شیخ نے کہا۔

"شیخ صاحب! اس وقت رات کے دس بج رہے ہیں۔" دین محمد نے اپنی کلائی کی طرف دیکھا لیکن اسے بے ہوش کرنے والے اس کی گھڑی بھی اتار کر لے گئے تھے۔ "جس عورت کا شوہر دو دن سے غائب ہو وہ کہاں جائے گی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ؟"

"شاید وہ یہی معلوم کرنے نکلی ہو۔ اسے معلوم ہوگا کہ میر محمد کہاں جاتا ہے۔ کس کس سے ملتا ہے۔" شیخ نے کہا۔

"یہ معلوم کرنے کے لیے اسے خود دھکے کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تھانے میں لکھوا سکتی تھی کہ فلاں فلاں جگہ پر جا کے دیکھو۔" دین محمد نے کہا۔ "وہ خود گھر پر انتظار کرتی۔"

"اگر وہ کچھ دیر میں آجاتی ہے تو ٹھیک ہے۔" شیخ نے کہا۔ "ورنہ... ہمیں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ میر محمد کی بیوی بھی غائب ہے اور وہ خیریت سے نہیں ہے۔ تو لاکھ دینے والوں نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا ہے۔ شاید انتخاب انھوں نے میر محمد پر چھوڑ دیا ہوگا کہ بیوی بچوں کی زندگی اور دس لاکھ میں سے جو قبول ہے رکھ لو۔"

دین محمد نے افسردگی سے سر ہلایا۔ "سوچ تو میں بھی یہی رہا تھا مگر مجھ میں ہمت نہیں تھی یہ بات کہنے کی۔"

"حقائق کا سامنا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے دین محمد!" شیخ نے کہا۔ "خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔ تمھیں بالکل اندازہ نہیں کہ یہ سب کس نے کیوں کیا ہوگا؟ کس چیز کی تلاش تھی انھیں؟"

میں بہت دیر سے خاموش تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ میر محمد کس پارٹی کو پانچ لاکھ کے بجائے دس لاکھ دینے پر مجبور کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا؟ وہ کیا چیز تھی جس کے بدلے کوئی اتنی بڑی رقم دینے کے لیے تیار تھا۔ میری سمجھ میں ایک ہی جواب آتا تھا۔ میر محمد نے چوہدری ولاور اینڈ کمپنی سے ٹیپ ریکارڈر کے ایک اسپول کا سودا کرنے کی کوشش کی ہوگی جو اس نے ٹیپ ریکارڈر میں سے نکال لیا تھا اور غائب کر دیا تھا۔ اس پر عبدل کا وہ اعترافِ جرم اس کی اپنی آواز میں ریکارڈ ہوا تھا جو اس نے مرنے سے قبل کیا تھا۔ شیخ نے فون کو ٹیپ ریکارڈر سے جوڑ کر عبدل کی آواز کو محفوظ کر لیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ جب عبدل کا فون آیا تھا تو تھانے میں ایک ٹیپ ریکارڈر موجود تھا۔ گرنڈگ کا ماڈل ٹی کے۔ TK جو ٹیلی فون کے پیغامات خود بخود ریکارڈ کر سکتا ہے۔ لیکن جب وہ عبدل کے قتل کی ابتدائی تفتیش کر کے لوٹا تھا تو یہ ٹیپ موجود نہیں تھا جس کے پیغام کو ایک محرر نے کاغذ پر نقل کیا تھا۔ اب وہ محرر بھی نہیں تھا۔ لیکن محرر نے بتایا تھا کہ ٹیپ کو میر محمد نے حشمت خان کی موجودگی میں نکالا تھا۔ محرر اور ٹیپ کی عدم موجودگی میں عبدل اور رشید کے قتل کا الزام مجھ پر آتا تھا۔ میر محمد پہلے سے چوہدری ولاور اینڈ کمپنی سے ملا ہوا تھا۔ اس نے مجھے گرفتار کرنے کے بعد کہا تھا کہ صاحب چاہتے ہیں تم میر شرافت علی کے قتل کا اعتراف کر لو۔ میں نے اصل قاتل یعنی منصوری والے استاد پیڈرو کو تھانے میں اس کے پاس آتے دیکھا تھا مگر وہ صاف مکر گیا تھا۔ اب تو یہ بھی ثابت ہو گیا تھا کہ وہ جعلی اے ایس پی سراج تھا جو کوئی جعل ساز تھا۔

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں تصور کر سکتا تھا کہ میر محمد نے اس ٹیپ اسپول کا سودا کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ اس نے چوہدری ولاور یا ان کے کسی ساتھی سے کہا ہوگا کہ میرے پاس وہ چیز ہے جو تمہارے دشمن کو سیدھا تختہ دار تک پہنچا سکتی ہے اور تمہارے سارے مسائل حل کر سکتی ہے۔ بولو کتنے میں سودا کرتے ہو۔ اور جب انھوں نے پانچ لاکھ سے زیادہ دینے سے انکار کیا ہوگا تو میر نے کہا ہوگا کہ اچھا میں یہ ٹیپ شیخ کے حوالے کر دیتا ہوں یا سکندر کو دے دیتا ہوں۔ اس کے بعد وہ دس لاکھ دینے پر بھی رضامند ہو گئے ہوں گے۔

اور اس کے بعد وہی ہوا ہوگا جو ولاور جیسے لوگ تمام آسانی سے ہی کر سکتے ہیں۔ انھوں نے طے کر لیا ہوگا سب سے پہلے وہ اسپول ٹیپ ان کے حوالے کرے گا اُدھر دوسری طرف وہ بیوی بچوں کو اٹھوایا جائے گا اور میر محمد کے سامنے دونوں چیزیں رکھ دی جائیں گی کہ یہ رہے دس لاکھ نقد اور یہ رہی تمھاری فیملی۔ ایک چیز لے جاؤ۔ دس لاکھ کی رقم کم تو نہیں ہوتی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ سودا اگر طے ہو گیا تھا تو خانہ تلاشی کی نوبت کیوں آئی۔

اس سوال کے کئی جواب ممکن تھے۔ مثلاً میر محمد نے وعدہ کیا کہ وہ اسپول ٹیپ لے کر وقتِ مقررہ پر فلاں جگہ پہنچ جائے گا۔ میر محمد بھی کم ہوشیار نہیں تھا۔ اس نے احتیاط کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی ویران جگہ پر ٹیپ اس کے حوالے نہیں کیا ہوگا۔ شاید اس نے کسی ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا ہوگا اور وہ وقت سے پہلے بھی پہنچ گیا ہوگا۔ اس نے قبل از وقت پہنچ کے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اس کو رقم دینے اور ٹیپ لینے کون آتا ہے۔ وہ پولیس کی وردی میں گیا ہوگا اور اس نے ٹیپ کہیں رکھوا دیا ہوگا۔ مثلاً ریسٹورنٹ کے منیجر کے پاس یا اپنے کسی آدمی کے پاس جو قریب ہی مستعد بیٹھا ہوگا۔ سودا کرنے والوں کی نیت میں فتور کا احساس ہو یا وہ میر محمد کو ٹیپ سمیت لے جانے کے موڈ میں آئیں تو وہ بات کیے بغیر نکل جائے یا وہ لوگ ٹیپ چھین کر رقم ادا کیے بغیر جانا چاہیں تو نہ جا سکیں۔ میر محمد کا ساتھی ان کا راستہ روک لے۔ پھر وردی میں ملبوس ایک پولیس انسپکٹر ان سب کو ہینڈز اپ کرا کے لے جاتا اور تھانے میں بند کر دیتا۔ شاید ایسی ہی کوئی وجہ تھی جس کے باعث سودا نہ ہو سکا مگر وہ لوگ میر محمد کو ٹیپ سمیت لے جانے

www.paksociety.com

بھی کامیاب ہو گئے۔ میر محمد کی احتیاطی پیش بندی ناکام رہی تو ایسی صورت میں میر محمد کے بجائے اس کی لاش ملنے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔

یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سودا کرنے والوں نے رقم ادا کر دی ہو مگر میر محمد کے دل میں بے ایمانی آ گئی ہو اور اس نے جو ٹیپ دس لاکھ میں طے کر دیا ہو وہ اصل نہ ہو یا اس نے آدھی رقم پیشگی مانگی ہو اور اسے باقی آدھی نہ ملی ہو تو اس نے ٹیپ دینے سے انکار کر دیا ہو۔ تلاشی لینے پر اس کے پاس سے کچھ برآمد نہ ہوا ہو تو پانچ لاکھ ادا کر دینے والوں نے اسے اپنے پاس رکھا ہو اور اپنے آدمی اس کے گھر سے اسپول ٹیپ لانے کے لیے بھیجے ہوں۔ ٹیپ تو انھیں نہیں ملا مگر وہ جاتے جاتے اس کے بیوی بچوں کو لے گئے تاکہ ان پر تشدد کا شکنجہ کس کے میر سے ٹیپ حاصل کر سکیں۔ یا پھر سودا تو اسی طرح ہوا ہو جیسے ہونا چاہیے تھا مگر ادائیگی کرنے والوں نے اس بات کی ضمانت طلب کی ہو کہ اس ٹیپ کا دوسرا ٹیپ نہیں ریکارڈ کیا گیا ہے۔ میر محمد جیسے نے نقد رقم لینے سے گریز کیا ہو گا۔ اس نے محفوظ راستہ اختیار کیا ہو گا۔ مثلاً اس نے مختلف ناموں سے بیرر چیک لیے ہوں گے۔ بیوی کے نام سے پے آرڈر۔ یا اس نے کہا ہو گا کہ فلاں کوٹھی خریدنے کے کاغذات میری بیوی کے نام کرا دو۔ خود براہ راست کچھ نہ لینے کے بہت سے طریقے ہیں۔ دس لاکھ دینے والوں کے لیے یہ رقم واپس لینا آسان نہیں تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ میر محمد کو قتل کر سکتے تھے اور اس کا خیال ہو گا کہ ٹیپ حاصل کر لینے کے بعد وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ شاید اس نے دھمکی دے دی کہ مجھے یا میری فیملی کو نقصان پہنچانے کا خیال دل میں مت لانا۔ میرے پاس اس کی ایک نقل محفوظ ہے جو میری سب سے بڑی ضمانت ہے۔

چنانچہ ولا اینڈ کمپنی نے میر محمد کو روک لیا کہ تمہاری ضمانت کی ایسی تیسی، ہم دیکھتے ہیں وہ دوسرا ٹیپ کہاں ہے۔ گھر ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں وہ اصل ٹیپ کی نقل تلاش کر سکتے تھے اور میر کے گھر میں پھیلی ہوئی تباہی اس کا ثبوت تھی کہ وہ کسی اور مقصد سے نہیں آئے تھے۔ جواب طلب سوال صرف یہ تھا کہ کیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور انھوں نے ٹیپ حاصل کر کے میر محمد کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا؟ اگر وہ کامیاب نہیں ہوئے تھے تو یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس وقت وہ میر محمد سے پوچھ رہے ہوں گے کہ دوسرا ٹیپ کہاں ہے؟ اور اس سے صحیح جواب حاصل کرنے کے لیے اس کے بیوی بچوں پر تشدد کا مؤثر حربہ استعمال کر رہے ہوں گے یا کر چکے ہوں گے۔

دس لاکھ اتنی آسانی سے بہرحال حاصل نہیں ہوتے اور اس دھندے میں اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی کو داؤ پر لگا کے جوا کھیلنا ہی پڑتا ہے۔ جوئے میں جیت کا تناسب زیادہ رہتا ہے یا ہار کا، یہی آدمی کی بدبختی یا خوش قسمتی کہلاتی ہے۔ بقول ولن محمد کے۔ نو لاکھ بچانے کے لیے ایک لاکھ میں کرائے کے قاتل حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔

اب اس سوال کا جواب وقت ہی دے سکتا ہے کہ میر محمد کا اور اس کے بیوی بچوں کا انجام کیا ہوا ہے؟ چاہ کن را چاہ در پیش۔ میر محمد نے میرے لیے گڑھا کھودا تھا۔ کیا اس گڑھے میں وہ خود دفن ہو گا؟ اپنے بیوی بچوں اور اپنے اس مستقبل سمیت جسے وہ ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت کے عوض میں اچھی قسمت خرید لیں سمجھتا تھا۔ اس کی گلبرگ کی دو منزلہ کوٹھی۔ وہ کوٹھی جو اس نے حال ہی میں خریدی تھی۔ اس کی زرعی زمین، لاکھوں کا بینک بیلنس۔ کسی بھی وقت استعفیٰ دے کر بزنس کرنے کا پروگرام۔ ان سب کا کیا ہو گا۔ اسکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ میر محمد کے گناہوں کی سزا اس کے خاندان کو بھی ملے گی؟ اس کے بینک بیلنس میں دس لاکھ کا اضافہ ہو جائے گا اور وہ بیوی بچوں کے ساتھ خیر و عافیت لوٹ آئے گا یا۔۔۔

ایک کانسٹیبل کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "آپ کا فون ہے صاحب!" اس نے اکرام شیخ کو مخاطب کر کے کہا۔ "کوئی صرف آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے بہت اہم خبر ہے۔ کسی اخبار کا نمائندہ ہے۔"

"تم نے بتایا نہیں کہ میں اس وقت کسی اخباری نمائندے کے ساتھ سر نہیں کھپا سکتا۔" شیخ نے خفگی سے کہا۔ "خیر، دیکھو اس فلیٹ کو لاک کر دو۔ کسی چیز کو چھونا نہیں ہے اور یہاں سے جانا بھی نہیں ہے۔"

"یس سر!" کانسٹیبل نے مردہ آواز میں کہا۔ وہ پیغام دینے آیا تھا اور بیگار میں پکڑا گیا تھا۔

"میر صاحب کی فیملی کے علاوہ کوئی اندر نہیں جائے گا۔" شیخ نے کہا۔ "اور اگر وہ آ جائیں تو ان سے بھی کہنا ہے کہ پہلے مجھ سے ملیں۔ کوئی اور آئے تو روک لو اور مجھے اطلاع کرو۔ زبردستی کرے تو گولی مار دو۔"

"گولی؟" کانسٹیبل نے بمشکل تمام کہا۔ "خالی ہاتھ سے۔۔۔"

شیخ نے اپنا خالی ریوالور اسے دے دیا۔ "یہ لو۔ مگر اس کا استعمال صرف ایک صورت میں کرنا ہے۔ جب کوئی تم پر حملہ کرے اور تم مقابلہ نہ کر سکو۔"

پریشان حال کانسٹیبل کو وہیں چھوڑ کے ہم واپس تھانے کی عمارت میں پہنچے۔ حشمت خان کی کرسی خالی دیکھ کر ایک خیال بجلی کی

طرح میرے ذہن میں آیا۔ حشمت خان بھی تو جانتا ہے کہ میر نے اسپول نکالا تھا۔ شیخ نے چھپ کر ان کی باتیں سنی تھیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ میر محمد کے ساتھ برابر کا شریک جرم ہے اور اس کا دست راست ہے۔ اسے یقیناً علم ہو گا کہ میر محمد کس سے سودا کر رہا ہے۔ اس سودے میں حشمت خان کا حصہ بھی تو ہو گا لیکن وہ جا چکا تھا۔

اخباری نمائندہ بہت مستقل مزاج تھا کہ دس منٹ تک دوسری طرف ہولڈ کیے کھڑا رہا۔

"ہیلو! میں شیخ اکرام بول رہا ہوں۔ ایس آئی اکرام شیخ۔" شیخ نے ریسیور اٹھاتے ہی کہا۔ "ہاں ہاں بھائی میں ہی ڈیوٹی پر ہوں۔ ٹھیک ہے آپ کسی ذمے دار افسر سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کوئی کیا کرتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ سارے بھائی ایس ایچ او کوئی نہیں ہے یہاں۔ اس وقت سب کچھ میں ہی ہوں یہاں۔ جی مست قلندر؟ اچھا آپ کالم لکھتے ہیں اس نام سے؟ کون سے اخبار میں؟ جی نہیں۔ بدقسمتی ہے میری کہ اب تک آپ کا یہ کالم تو کیا اخبار تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ فرمائیے کیسے یاد کیا اس وقت۔ اطلاع دینی تھی تو دیجیے۔" شیخ کچھ دیر سنتا رہا اور دیکھتے دیکھتے اس کی صورت کا نقشہ بدل گیا۔ اس کے ماتھے کی ہر شکن گہری ہو گئی اور تشویش کے آثار زیادہ نمایاں ہو گئے۔

"جی ہاں میں بہت غور سے سن رہا ہوں، آپ بولتے جائیے۔" اس نے درمیان میں صرف ایک بار کہا۔ مست قلندر صاحب بہت مفصل گفتگو کے عادی معلوم ہوتے تھے اور کسی سہ کالمی خبروں کا پورا متن سنانے پر آمادہ تھے۔ شیخ نے صبر و تحمل کے ساتھ غیر ضروری بکواس بھی سنی اور پھر کہا۔ "قلندر صاحب! معاف کیجیے گا مست قلندر صاحب! آپ وہیں موجود رہیے۔ میں خود حاضر ہوتا ہوں۔ جی بس دس پندرہ منٹ میں۔" اور ریسیور رکھ دیا۔

"ولی محمد!" شیخ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ایک واردات ہو گئی ہے۔ تم یہاں اپنی رپورٹ لکھواؤ۔ وہ سب کچھ جو تمہارے ساتھ ہوا۔ جو تم نے دیکھا۔ یا ایسا کرو۔ دونوں کیس الگ کر لو۔ پہلے صاحب کے گھر کی رپورٹ درج کرو۔ پھر دوسری رپورٹ بھائی کی حیثیت سے لکھواؤ۔ میر محمد اور اس کی فیملی اور گھر کے متعلق۔ محرر کہاں ہے؟"

"محرر تو آج ابھی نہیں آیا سر!" ایک نائک نے کہا۔

"کیا مصیبت ہے۔ تھانہ ہے کہ چنڈو خانہ۔ ایس ایچ او غائب۔ محرر غائب۔ آج سارا دن رپورٹیں کس نے لکھیں؟"

"کسی نے بھی نہیں سر!" نائک نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "حشمت خان صاحب نے کہا جو رپورٹ لکھوانے آئے اسے بھگا دو۔ دو افراد چوری کی رپورٹ درج کرانے آئے تھے۔ ان میں سے ایک ضدی تھا۔ حشمت خان نے کہا محرر ہے نہیں تو رپورٹ تمہارا باپ درج کرے گا۔ کل آنا۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی اخبار کے رپورٹر کا بھائی تھا۔ جاتے جاتے دھمکی دے گیا کہ کل کا اخبار دیکھ لینا۔"

"اچھا بابا۔ وہ حشمت خان کا درد سر ہے۔ تم بیٹھو جا کر محرر کی جگہ۔" شیخ نے کہا۔ "اور دیکھو۔ میر محمد کے گھر کے دروازے پر ایک کانسٹیبل کھڑا ہے۔ اسے کوئی رائفل پہنچا دو اور اس سے میرا ریوالور لے آؤ۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سکندر صاحب! بہتر ہو گا آج کی رات آپ کسی ہوٹل میں گزار لیں۔ فوری طور پر میں وہاں کسی گارڈ کو پوسٹ کرنے کا انتظام نہیں کر سکتا۔ کل پتا معلوم کروں گا اس دوسرے گارڈ خواجہ اکبر کا کیا ہوا۔ وہ ڈیوٹی پر کیوں نہیں پہنچا۔"

باہر آ کے میں کچھ دیر سوچتا رہا کہ موجودہ حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ شیخ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے کسی ہوٹل میں قیام کرنا چاہیے یا گھر ہی میں رہنا چاہیے۔ گھر کے اندر بھی مناسب حفاظتی انتظامات کے ساتھ ایک رات تو گزار ہی سکتا ہوں۔ فائدہ یہ ہو گا کہ میں اسلام آباد فون کر کے سب کی خیریت دریافت کر سکوں گا۔

"یار سکندر!" شیخ نے اچانک میرے پاس آ کے کہا۔ اس کا سانس کچھ پھولا ہوا تھا۔ "میرا اسکوٹر اسٹارٹ نہیں ہو رہا ہے۔ میں نے پلگ بھی صاف کر کے دیکھ لیا۔ معلوم نہیں کیا بات ہے۔ تم کو کوئی ضروری کام نہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔"

"مجھے فرصت ہی فرصت ہے۔" میں نے کہا۔ "بیٹھو۔" میں نے گاڑی کا دوسرا دروازہ کھول دیا۔

"اسے چلتا دیکھ کر مجھے بہت حیرانی ہوتی ہے۔" اس نے بیٹھنے کے بعد کہا۔ "اور اب مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ راستے میں ہی اس کی باڈی تو الگ ہو کے بکھر جائے گی تم اسٹیئرنگ تھامے اور میں اس سیٹ پر چار پہیوں کے دوڑتے ہوئے چیسس پر دھرے رہ جائیں گے۔"

"اس شاندار گاڑی کی اس حالت کا ذمے دار میں ہوں۔" میں نے اسے بڑے فخر سے مطلع کیا۔

"دیکھنے میں یہ اب بھی ناکس دلہن کی طرح لگتی ہے۔" شیخ نے کہا۔ "بس معلوم ہوتا ہے بحر ظلمات میں دوڑتی رہی ہے۔"

"یہ اب بھی ناکس دلہن کی طرح دوڑتی ہے اور بحر ظلمات کیا ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ یا بحر الکاہل دونوں پر سے گزر سکتی ہے۔"

جب گاڑی نے زبردست گرج کے ساتھ دوڑنا شروع کیا تو شیخ نے اپنے الفاظ واپس لے لیے۔ گاڑی کی دل آزاری کے خیال سے۔

"فون کس مست قلندر کا تھا؟" میں نے کہا۔ "واردات

www.paksociety.com

کیا چکر ہے؟"

"میں دین محمد کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔" شیخ نے کہا۔ "ایک روزنامے میں کالم لکھتا ہے۔ کالم کا عنوان ہے 'دیوار' چنانچہ مجھے مست قلندر بہت موزوں ہے۔ آج شام ایک بچہ دفتر آیا۔ تقریباً سات سال کا۔ اس کے ساتھ دوسرا بچہ تھا جو دو سال چھوٹا تھا۔ انھوں نے اندر آکے ایڈیٹر کو پوچھا۔ دونوں بہت ڈرے ہوئے تھے۔ اس وقت تک اخبار کا عملہ نہیں آیا تھا۔ مست قلندر صاحب اپنا کالم لکھتے لکھتے پان لینے باہر نکلے تھے کہ وہ بچے مل گئے۔ انھیں بچوں کا آنا کچھ عجیب سا لگا۔ پہلا خیال انھیں یہ آیا کہ بچے گھر سے بھاگے ہیں یا اغوا کرنے والے لوگوں سے بچ کے۔ انھیں شرکا دوں کا خیال بھی آیا لیکن بچوں کی ظاہری حالت ویسی نہیں تھی جیسی تھر کار کیمپ سے بھاگنے والوں کی ہوتی ہے۔ انھوں نے کمر پکڑ کر کیا بات ہے بیٹا! میں ایڈیٹر ہوں۔ بڑے بچے نے کہا۔ ہمیں امی نے کہا تھا کہ سیدھے اخبار کے دفتر جانا اور ایڈیٹر کے سوا کسی سے بات نہ کرنا۔ قلندر صاحب مزید حیران ہوئے۔ انھوں نے پوچھا کہ تمھاری امی کون ہیں اور انھوں نے کیوں بھیجا ہے تمھیں یہاں۔ وہ بچوں کو اپنے کمرے میں لے گئے اور انھیں خاصی تسلی دی کہ ڈرنے کی بالکل کوئی بات نہیں۔ یہاں کوئی نہیں آسکتا۔ تم پوری بات بتاؤ۔ اس پر بڑے بچے نے کہا کہ ان کے والد پولیس میں ہیں اور ان کا نام میر محمد ہے۔"

میں اچھے چونکا کر گاڑی دائیں سے بائیں لہرائی۔ "میر محمد کے بچے؟ اخبار کے دفتر میں ہیں؟"

"ہاں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے والد کا کل سے کوئی پتا نہیں۔" شیخ نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ہماری امی بہت پریشان تھیں۔ آج شام کو کسی نے ہمارے دروازے پر دستک دی۔ ہماری امی نے دروازہ کھولا تو انھیں دو اجنبی نظر آئے۔ انھوں نے اندر آتے ہی ہماری امی کو دھکا دیا اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ پھر انھوں نے گھر کی ہر چیز توڑ پھوڑ ڈالی اور ہماری امی کو مارا۔ وہ بےہوش ہو کے گر گئیں اور وہ اپنا کام کرتے رہے۔ لیکن درمیان میں امی کو ہوش آگیا۔ انھوں نے بڑے لڑکے کو اشارے سے بلایا اور سرگوشی میں کہا کہ پیچھے جاؤ۔ سب سے پیچھے والے فلیٹ میں۔ ان سے کہنا کہ ابا جان نے جو چیز رکھوائی تھی وہ دے دیں۔ وہ موقع ملنے کے انتظار میں رہے۔ ماں نے انھیں یہ بھی سمجھا دیا کہ وہ چیز لے کر اوپر نہ آئیں۔ سیدھے اخبار کے دفتر جائیں۔ گھر کی تلاشی لینے والے یہ سمجھتے رہے کہ عورت بےہوش پڑی ہے اور دونوں بچے اس سے لگے ہوئے بیٹھے ہیں۔ پانچ اور سات سال کے بچوں کو انھوں نے قطعی بے ضرر سمجھتے ہوئے اہمیت نہیں دی۔ جب وہ اندر کے کمرے میں سرسری تلاشی لے رہے تھے تو ماں ہمت کر کے اٹھی۔ خاموشی سے دبے پاؤں دروازے تک گئی اور اس نے دونوں بچوں کو باہر نکال دیا۔ پھر وہ واپس آکے اپنی جگہ لیٹ گئی۔ یہاں سے دائیں طرف..."

"اور وہ بچے، وہ چیز لے کر مست قلندر کے پاس پہنچ گئے؟" میں نے کہا اور گاڑی موڑ دی۔

"ہاں۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ دفتر کہاں ہے... اور کتنی دور ہے۔" شیخ نے کہا۔ "تھوڑی دور آکے انھوں نے ایک شخص سے پوچھا۔ وہ شخص گاڑی سے اتر کے سگریٹ پینے کے بعد پھر گاڑی میں بیٹھنے والا تھا۔ بچوں نے اس سے پوچھا کہ اخبار... کا دفتر کہاں ہے؟ وہ شخص بھی حیران ہوا اور اس نے بھی پوچھا کہ تمھیں وہاں کیا کام ہے؟ بڑے بچے نے صاف کہہ دیا کہ ہماری امی نے کہا ہے کہ ایڈیٹر کے پاس چلے جاؤ۔ غالباً بچوں نے اسے بھی ساری بات بتا دی۔ وہ بچوں کو دفتر کے دروازے پر چھوڑ کے نکل گیا۔ وہ کسی چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا... بائیں طرف۔"

"اور وہ چیز کیا تھی جو بچے لے کر گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"وہ ایک سیل بند پیکٹ تھا۔ مست قلندر صاحب نے اس کو کھولا تو اس میں سے ایک اسپول ٹائپ ٹیپ نکلا۔" شیخ نے کہا۔

"تو معاملہ کیا رہ گیا؟ وہ اسپول! لو میر محمد نے..."

"ہاں۔ اس نے مجھ کو دیا تھا اور شاید یہ ہدایات بھی دی تھیں جو اس نے بچوں کو دیں۔ بچوں نے کمال ہمت کا ثبوت دیا۔ مست قلندر صاحب نے ٹیپ کو سننے کے لیے کہیں سے ٹیپ ریکارڈر منگوایا۔" شیخ نے کہا۔ "اس وقت تک اخبار کا عملہ بھی آچکا تھا مگر مست قلندر صاحب نے ایڈیٹر کے سوا کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ انھوں نے ٹیپ سنا۔ وہ پوری بات تو نہیں سمجھے لیکن ایڈیٹر نے مختلف تھانوں میں فون کیے۔ یہاں... بس یہاں روک لو۔"

میں نے کار روکی اور شیخ کے ساتھ اتر گیا۔ "یہ جگہ تو یہی بتائی تھی۔" وہ زیرِ لب بولا۔ پھر وہ نیچے اتر گیا۔ میں اس کے ساتھ رہا۔ اچانک شیخ کی ٹارچ کی روشنی ایک گڑھے میں گئی۔

گڑھا

زمین کھودنے سے بنا تھا اور زمین کی مٹی کسی نے اپنے گھر کی بنیادیں اونچی رکھنے میں استعمال کرلی تھی۔ گڑھا بالکل گول نہیں تھا، بیضوی تھا لیکن کنارے گولائی میں تھے اور اس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی چھ سات فٹ اور لمبائی دس بارہ فٹ کے درمیان تھی۔ کناروں کے مقابلے میں درمیان کا حصہ زیادہ گہرا تھا لیکن یہ گہرائی کہیں بھی ... نہیں تھی۔ اردگرد جھاڑیاں تھیں جو بے مصرف زمین پر کسی محنت کے بغیر صرف سورج سے روشنی اور بارش سے پانی لے کر

سے نو پا کے آئی تھیں۔ بالکل ان بچوں کی طرح جن کو کسی عورت کی ممتا اور کسی مرد سے باپ کی شفقت کسی کی محبت اور توجہ نہیں ملتی لیکن ان کا وجود گلیوں کی خاک چھان کے اور روٹی کے ٹکڑے چن کر غربت اور محرومی کے سائے میں کسی مقصدِ حیات کے بغیر پلتا اور بڑھتا ہے۔ حالانکہ دنیا کو ان کی اور انھیں دنیا کی پروا نہیں ہوتی۔

"یہاں کیا ہے؟" میں نے شیخ کے متفکر چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی کے دائرے کو اس گڑھے میں ہر طرف لے جا کر دیکھ چکا تھا اور بظاہر اس کی تلاش لاحاصل رہی تھی۔

"جگہ تو یہی ہے یار!" اس نے میرے سوال کا جواب یوں دیا جیسے وہ مجھ سے زیادہ خود سے مخاطب ہے۔

"کیا تھا یہاں؟" میں نے کہا۔

"پام کا ایک درخت۔" وہ بولا۔ "وہ درخت بھی ہے اور قریب میں اور کوئی ایسی گہری جگہ بھی نہیں ہے۔" اس نے ٹارچ کی روشنی سے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ "یہ مذاق بھی نہیں ہوسکتا۔ اطلاع دینے والا جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔"

"تم اپنے آپ سے ہم کلام ہو اور تمھاری عقل دنگ ہے۔" میں نے کہا۔

"عقل تو میری بھی دنگ ہے۔" شیخ نے کہا۔ "تمھارے آنے سے پہلے کسی نے فون کیا تھا۔ اس نے اپنا نام پتا کچھ نہیں بتایا تھا۔ صرف یہ کہا تھا کہ وہ موٹر سائیکل پر اس راستے سے گزر رہا تھا کہ ایک گاڑی مخالف سمت سے آکے یہاں رکی۔ اس میں سے دو آدمی ایک بوری اٹھائے اترے اور بوری کو گھسیٹتے ہوئے سڑک سے نیچے اتر گئے۔ موٹر سائیکل والے نے ہیڈ لائٹ کی روشنی میں یہ منظر صاف دیکھا تھا لیکن روشنی سڑک پر تھی۔ اس لیے وہ ان لوگوں کے چہرے نہیں دیکھ سکا تھا۔ اسے وہاں کچھ کالا نظر آیا۔ وہ لیکن اس جگہ تو نہیں رکا مگر گزرتے گزرتے اس نے دیکھ لیا کہ گاڑی سے اترنے والوں نے بوری کو گڑھے میں ڈال دیا ہے۔ موٹر سائیکل والا تقریباً پچاس گز دور جا کے کھڑا ہوگیا۔ انجن بند کرکے اور لائٹس آف کرکے اس نے اپنی موٹر سائیکل کے اسپارک پلگ کو نکالا اور اسے صاف کرنے کے بہانے پیچھے دیکھنے لگا۔ وہ دونوں جو بوری پھینکنے گئے تھے، کار کے پچھلے دروازے کو کھول کر بیٹھ گئے جس سے اس نے اندازہ کیا کہ کم سے کم ایک شخص آگے ڈرائیونگ سیٹ پر اسٹیئرنگ سنبھالے بھی بیٹھا تھا۔"

"یہ بات اس نے کار کے قریب سے گزرتے وقت نوٹ نہیں کی تھی؟" میں نے کہا۔

"میں نے اس سے بالکل یہی سوال کیا تھا۔" شیخ نے کہا۔ "اور اس نے بہت معقول جواب دیا۔ اس نے کہا کہ وہ بائیں جانب متوجہ تھا۔ کار دائیں جانب تھی۔ سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کار قابلِ غور نہیں ہوتی۔ مگر رات کے اندھیرے میں دو افراد بوری میں کچھ بھر کے پھینکنے جا رہے ہوں تو یہ غیر معمولی بات لگتی ہے۔ بوری کا وزن کافی تھا کیونکہ اسے گھسیٹنے میں انھیں خاصا زور صرف کرنا پڑ رہا تھا۔ اس ویران اور غیر آباد علاقے میں کوئی کیا پھینکنے آئے گا۔ اس خیال نے موٹر سائیکل والے کو شبے میں مبتلا کردیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ بہت زیادہ جاسوسی ناول پڑھنے اور جرائم پر مبنی فلمیں دیکھنے کی وجہ سے اس کا ذہن فوراً اس امکان کی طرف گیا تھا کہ بوری میں لاش ہوسکتی ہے جسے قاتل جائے واردات سے بہت دور پھینکنے لائے ہوں گے۔ وہ خود بھی اس جگہ سے بہت دور رہتے ہوں گے اور ان کا بزنس یا ان کا ہیڈ کوارٹر بھی اتنی دور ہوگا کہ اس لاش کو دریافت کے بعد بھی کوئی ان سے منسوب نہ کرسکے۔ اس نے بتایا کہ گاڑی کی لائٹس آف تھیں مگر انجن آن تھا۔ تاہم پچاس گز کے فاصلے سے وہ کار کا رنگ بھی نہیں دیکھ سکا جو سیاہ، گہرا نیلا یا گہرا سرخ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ نمبر نوٹ کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ لائٹ آن ہوتی تب بھی پچاس گز کے فاصلے سے نہ وہ حروف پڑھ سکتا تھا اور نہ اعداد۔ گاڑیوں کی ظاہری صورت سے یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کوئی جاپانی گاڑی ٹویوٹا، مزدا یا ڈاٹسن تھی یا فورڈ یا اوپل۔ چنانچہ یہ کیسے بتاتا کہ ماڈل کس سال کا تھا۔ جب گاڑی چلی گئی تو وہ موٹر سائیکل وہیں چھوڑ کے پیدل واپس گیا تاکہ وہ گاڑی آگے جا کے لوٹ آئے تو وہ فوراً کسی جھاڑی کے پیچھے چھپ سکے۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ گڑھے کے قریب جا کے اس نے اپنا سگریٹ لائٹر جلایا اور اس کی پراسرار نیم روشنی میں بوری کو دیکھ لیا۔ اس نے پورے یقین کے ساتھ بتایا کہ بوری پر خون کے داغ تھے۔ اوپر سے یہ داغ صاف نظر نہیں آتے تھے۔ چنانچہ ادھر ادھر دیکھ کے اللہ کا نام لے کر وہ ... نیچے اتر گیا۔ بوری کو چھو کر دیکھنے سے ہی وہ سمجھ گیا کہ اس کے شکوک غلط نہیں تھے۔ اس میں واقعی کوئی آدمی تھا۔ زندہ یا مردہ۔ اس نے پہلے بھاگنے کی سوچی پھر اسے خیال آیا کہ کہیں وہ شخص زندہ ہی نہ ہو جو بوری میں بند ہے۔ خوف پر انسانی ہمدردی کا جذبہ غالب آگیا اور اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر بوری کا منہ کھولا اور خاصی محنت سے اس شخص کا چہرہ دیکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ شناخت کرنا تو اس کے لیے ناممکن تھا مگر اس نے نکلی آنکھیں اور مسخ شدہ صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ مر چکا ہے۔ وہ بے تحاشا بھاگا اور اپنی موٹر سائیکل لے کر چلا ہوگیا۔ فون اس نے پی سی او سے کیا تھا۔"

"جی پی او سے تمہیں کیوں؟" میں نے کہا۔ "کیا وہ تمہیں جانتا تھا؟"

"کمال ہے۔ تم تو مجھ سے وہی سوالات کر رہے ہو جو میں نے اس سے کیے تھے۔" شیخ نے کہا۔ "اس نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم اس علاقے کا تھانہ کون سا ہے جہاں وہ لاش پڑی ہے۔ تھانے والوں کی حدود عجیب ہوتی ہیں اور اس علاقے میں رہنے والوں کو بھی بعض اوقات خود تھانے والے نہیں جانتے کہ ان کی تھانیداری کی سرحد کہاں سے کہاں تک ہے۔ اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری دیکھی۔ ایک نمبر ملایا۔ وہ ملا نہیں دوسرا ملایا تو کسی نے ریسیور ہی نہیں اٹھایا۔ تیسری جگہ میں نے اٹھا لیا۔ وہ خود تھانے میں قدم رکھنے سے بہتر سمجھتا تھا کہ آدم خور شیر کے پنجرے میں داخل ہو جائے جہاں موت سے فوراً اور باعزت طور پر تشدد کا عذاب جھیلے بغیر ملاقات ہو سکتی ہے۔ کیا افسوسناک تاثر قائم ہو گیا ہے پبلک کے ذہن میں اور کسی کو پروا بھی نہیں۔ خیر اتفاق یہ کہ وہ جگہ ہمارے تھانے کی حدود میں تھی۔ میں نے حشمت خان سے کہا کہ وہ موٹر سائیکل پر گزرتے گزرتے دیکھ لے اور یہ کسی کی شرارت نہ ہو تو اپنے گھر جا کے فون کر دے۔ مگر اسے کیا کہا جائے؟ بے حسی یا حرام خوری؟ اس نے کہا کہ شیخ صاحب! اتنی تنخواہ میں تو بس اتنی ہی نوکری ہو سکتی ہے۔ اپنی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو چکا ہے۔"

"حرام خور نے" میں نے کہا۔ "تنخواہ اور ڈیوٹی کے نام کی بات کرتا ہے۔ اس آمدنی کی بات نہیں کرتا جو اسی ڈیوٹی کے نام میں رشوت سے ہوتی ہے۔ کچھ ملنے کی امید ہوتی نا تو سر کے بل جاتا۔ خواہ مخواہ بیٹھا رہا تھانے میں۔"

"یہ تو آف دی ریکارڈ ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اس کے انکار کے بعد میں کیا کرتا۔ ادھر میر محمد نہیں ہے سابق ایس ایچ او صاحب معطل بیٹھے ہیں۔ افسر دو ہی رہ گئے ہیں۔ میں اور حشمت خان۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ خود جاؤں یا کسی کانسٹیبل کو بھیجوں۔ تھانے میں ایک ڈیوٹی آفیسر بھی تو ہونا چاہیے۔ اتنے میں تم آ گئے پھر وہ میر محمد کا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تم تو گواہ ہو ابھی اس سے فراغت بھی نہیں ہوئی تھی کہ مست قلندر صاحب کا فون آ گیا۔ اب یہاں دیکھ لو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اخبار کے آفس جاتے جاتے ایک نظر ڈال لوں۔"

"چلو اب یہاں کچھ نہیں تو وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل؟" میں نے کہا۔

"نہیں سکندر! میرے دل یا میری چھٹی حس کا تقاضا ہے کہ میں نیچے اتر کے دیکھوں۔ اس آدمی کا لہجہ اس کے سچ کا گواہ تھا۔ جو شرارت میں فون کرتے ہیں اتنی سنجیدگی سے بات نہیں کرتے۔ اتنی تفصیلات نہیں بتاتے اور اتنا منطقی تجزیہ نہیں کرتے۔"

"چلو تو نیچے بھی دیکھ لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پہنچ گئے [illegible] ہوں گے تو نظر بھی آ جائیں گے۔"

میں اور اکرام شیخ ایک ہی ٹارچ کی محدود روشنی کے دائرے میں ساتھ ساتھ اس بیضوی گڑھے کے کنارے سے اترنے لگے۔ نشیب کی جانب ناہموار زمین کی مٹی میں کنکر بھی تھے۔ چنانچہ ایک بار میں پھسلتے پھسلتے بچا۔ پانچ منٹ میں ہم راستہ طے کر کے نیچے پہنچ گئے۔ اب ہمیں سڑک پر سے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں زمین کا رنگ صاف نظر آ رہا تھا۔ ہم نے گہرائی کے محیط میں کنارے کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔

پھر شیخ اور میں ایک ساتھ رک گئے۔ مٹی کے خاکی رنگ میں سرخی کا ایک دھبا الگ نظر آ رہا تھا۔ اس دھبے سے اوپر کی طرف دیکھنے پر ہمیں وہ نشانات بھی نظر آئے جو کسی بوری کو گھسیٹنے سے ہی بن سکتے تھے۔

"رپورٹ بالکل درست تھی۔" شیخ نے کہا۔ "مگر وہ بوری والی لاش کہاں گئی؟"

"کہیں وہ لوگ بعد میں اسے اٹھا کے تو نہیں لے گئے؟" میں نے کہا۔ "انھیں خیال آیا ہو کہ... کہ وہ لاش کو دفنا دیتے تو بہتر تھا۔ کہیں کسی کو سراغ ہی نہ ملے تو اچھا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ انھوں نے موٹر سائیکل والے کو رک کر جائزہ لیتے دیکھ لیا ہو جس کا موٹر سائیکل والے کو اندازہ نہ ہو سکا ہو۔" شیخ نے کہا۔ "وہ اسے دیکھتے رہے اور جب وہ چلا گیا تو وہ لوٹ کر آئے اور لاش لے گئے۔" میں نے شیخ سے اتفاق کیا۔ اس ناکامی پر وہ خاصا مایوس نظر آتا تھا۔ ہم دونوں نے اس لکیر کے ساتھ ساتھ اوپر چڑھنا شروع کیا جو بوری کے گھسیٹے جانے کا ثبوت فراہم کر رہی تھی۔

شیخ اپنی ٹارچ سے اردگرد کی بنجر زمین اور خود رو نباتات پر بھی روشنی ڈالتا جا رہا تھا۔ بام کا واحد درخت اب ہمارے دائیں ہاتھ پہ رہ گیا تھا۔ اچانک شیخ رک گیا۔

"یہ کیا ہے سکندر؟" اس نے روشنی کو ایک جگہ مرتکز کر دیا تھا۔ دس قدم دور سے بھی وہ جگہ تازہ کھدی ہوئی نظر آتی تھی۔ جواب دینے کے بجائے میں شیخ کے ساتھ ہو لیا۔

"غالباً تمھارا خیال درست تھا۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے موٹر سائیکل والے کی حرکات و سکنات پر نظر رکھی تھی۔ وہ لوٹ کر آئے ہوں گے مگر موٹر سائیکل والا انھیں نہیں دیکھ سکا۔ گڑھے کے اندر اتر جانے کے بعد سڑک تو نظر نہیں آتی۔ وہ پیدل لاش سا بچا

کے آئے ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے موٹر سائیکل والے کو اس وقت دیکھا ہو جب وہ گڑھے سے نکل کر بھاگا تھا۔ اب یا تو وہ موٹر سائیکل کا پیچھا کرتے جو ذرا مشکل کام ہے۔ موٹر سائیکل گلی کوچوں میں بھی غائب ہو جاتی ہے پھر یہ کہ کسی کی آنکھوں سے نکلتے ہو تو انگلیاں تیز بھی کیوں کی جاتیں۔ ایک قتل کرنے سے زیادہ آسان یہ تھا کہ لاش کو اس جگہ سے ہٹا دیا جائے۔"

"یہ تو صاف ظاہر ہے کہ یہاں زمین کھود کے برابر کی گئی ہے۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن اب میرے لیے خالی ہاتھوں زمین کھودنا تو ممکن نہیں۔ ویسے بھی عجلت غیر ضروری ہے۔ اس جگہ کا علم کسے ہے؟ میں بعد میں دوسرے لوگوں کو بھیج سکتا ہوں کہ لاش ہے تو نکال لیں۔ ہم مست قلندر صاحب کی طرف چلتے ہیں۔"

مست قلندر صاحب دیکھنے کی چیز تھے۔ اتنا مزہ شاید ان کے کالم میں نہیں نظر آتا ہوگا جتنا ان کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے سائز سے بہت بڑی شیروانی اور سائز سے بہت چھوٹا شلوار پہن رکھی تھی جسے شرعی کہا جا سکتا تھا۔ شلوار کا رنگ نیلا تھا اور شیروانی کبھی کریم کلر کی ہوگی۔ مسلسل استعمال اور سالانہ ڈرائی کلیننگ کے باعث اس کا رنگ کچھ سرمئی سا ہو گیا تھا۔ یہ طے کرنا مشکل تھا کہ شیروانی کے نیچے قمیص ہے یا نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے سر پہ پیالے کی طرح رکھی ہوئی ٹوپی کے نیچے بالوں کی موجودگی کا پتا چلانا مشکل تھا۔ حالانکہ کپڑے کی ٹوپی اس ہیر ٹانک میں تر تھی جو انھوں نے وافر مقدار میں چپڑا تھا۔ ان کی تیکھی آواز ان کی جانِ ناتواں سے بہت میچ کرتی تھی۔

"ارے میاں اللہ! شیخ صاحب! کمال کر دیا لیکن کہ..." انھوں نے کسی تعارف کے بغیر ہمیں پہچان لیا۔

"اکرام شیخ۔" شیخ نے ریکارڈ کی درستی کے لیے کہا۔

"احسان کیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ چھوڑو القاب و اکرام بس شیخ۔" انھوں نے ایک چڑمڑ جیسے رومال میں اپنی ناک کی برآمدات کو بڑی پھرتی سے منتقل کیا۔ "ہم تو بس سوکھ گئے انتظار میں۔ طول شب فراق کیا چیز ہے۔ اب تو کالم چلا گیا۔ مگر کل... کل کا موضوع ہے پولیس کی تاخیر پسندی اور بہر شیخ جی بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔"

"ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔" میں نے عرض کی۔

"واہ سبحان اللہ۔ گویا تم آپ آتے تھے مگر کوئی عنان گیر بھی تھا۔ کون تھا وہ؟" انھوں نے پھڑک کر کہا۔ "یا تھی؟"

"وہ میں بعد میں عرض کروں گا۔ پہلے عرض مدعا۔ وہ بچے اور ٹیپ کہاں ہیں؟" شیخ نے کہا۔

"ٹیپ کے بچے... میرا مطلب ہے ٹیپ اور بچے دونوں بلکہ تینوں خیریت سے ہیں۔ الحمدللہ۔" مست قلندر صاحب نے فرمایا۔ "مگر میاں شیخ جی! یہ اسٹوری کیا ہے؟" انھوں نے رازدارانہ طور پر آگے جھک کر سرگوشی میں کہا۔

"اسٹوری آپ کی۔" شیخ نے مسکرا کے کہا۔ "پہلے یہ بتائیے ٹیپ اور بچے کہاں محفوظ ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ ممکن ہے آپ کے نقطہ نظر سے وہ محفوظ ہوں لیکن درحقیقت ایسا نہ ہو۔"

"شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی شکر ہے زندگی تباہ نہ کی۔" انھوں نے کہا۔ "ورنہ میاں ہم بھی ہو جاتے کالوری گویا فلاطون ایک آپ ہی نہیں۔ ہمارا نقطہ نظر تو یعنی کہ ایسا ہی ہے جیسا ہمارا کالم۔ اور کالم آپ نے کبھی پڑھا نہیں ہمارا۔ حضرت شیخ! بچے ہیں اس عاجز کے یتیم خانے میں۔" وہ ہنسے۔ "کیا سمجھے؟ میاں ہم یتیم تو ہمارا گھر بھلا کیا ہوا۔ اور وہاں تو ایک اژدھام ہے۔ بچہ اپنے سے چھ فٹ تک کے بچے حاضر اسٹاک سے دستیاب ہیں۔ وہ بھی انھی میں گھل مل گئے ہوں گے۔ کوئی کیسے ڈھونڈے گا انھیں؟ اپنا رنج نہ بیاہے کر۔ اب رہا ٹیپ۔ تو وہ یہاں ہے۔" انھوں نے عقیدت سے سر جھکا کے ٹوپی اتاری اور اس کی تیل سے چکنی سطح کے نیچے بال نہ ہونے کا راز افشا کر دیا۔ "مگر یہ بھی نہیں حضرت! اصل ٹیپ تو گیا لائبریری کا ہیں۔ گویا پرانی خبروں کی قبروں میں۔ نقل حاضر ہے۔" انھوں نے کھٹ سے الماری کھولی اور ٹیپ ہمارے سامنے رکھ دیا۔

"آپ نے تو کمال کر دیا۔" شیخ نے کچھ دیر بعد توقف سے میں کہا۔ "میں معافی چاہتا ہوں اعتماد نہ کرنے پر یہ نقل میں اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ باقی معاملات کو جوں کا توں رکھیے فی الحال۔ ابھی یہ عقدہ پوری طرح وا نہیں ہوا ہے۔ اس لیے میں اسٹوری آپ کو اس وقت دوں گا جب واقعات کی سب کڑیاں آپس میں مل جائیں گی۔ اجازت ہو تو چند سوالات کر لوں؟"

"اجازت؟ میاں تھانیدار بادشاہ! کیوں شرمندہ کرتے ہو اپنے نام کو۔ تم اور اجازت؟ انکار کر کے ہمیں تھانے نہیں جانا ہے۔" مست قلندر صاحب نے ٹوپی کو پھر سر پہ چپکا کے کہا۔

"آپ نے ان بچوں سے پوچھا کہ انھیں ماں نے خاص طور سے آپ کے اخبار کے دفتر کا پتا کیوں دیا تھا؟" شیخ نے ان کے طنز کو پی کر کہا۔ "کون تھا جس پہ ان کی ماں کو اتنا اعتماد تھا۔ میرا مطلب ہے مقصد صرف کسی اخبار کے دفتر بھیجنا ہوتا تو..."

"ہاں ہاں کیسے کیسے کہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے۔" قلندر صاحب نے چہک کر کہا۔ "کون پوچھتا ہے اس اخبار کو جو سب سے وقتی ہے۔ امروز ہے اور مشرق ہے اور بڑے بڑے کثیر الاشاعت متعدد

www.paksociety.com

اخبارات میں۔ تو تصور اس کی یہی وجہ تھی۔ اس رسالے کے مدیر اُس وقت بھی مجنوں تھے جبکہ مجنوں نام الف کنٹ تھا دلوا رو دبستان پہ دونوں کا المیہ ایک ہی ہے۔ فیل فروخت لیتے تھا ایک کو سوا یک پہنچا دیا، دوسرے کو سعادتے وقت میں مجھے کوئی نہیں منشا۔ وہ روغ برگردن راوی۔ بچوں کی ماں سے وہی منسوب تھے۔ عقد ہو گیا تھانیدار سے۔ اب یہ تو ظالم سماج کی وہ خباثت ہے جس پر اتنے ناول لکھے گئے اور اتنی فلمیں بنیں مگر کتنے کی قدم کیسی سیدھی ہوتی ہے ہمارے مدیر صاحب تب سے بیٹھے ہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے حالانکہ یہ قصہ ہے تب کا جب آتش جوان تھا۔ تھانیدار کی رقابت مہنگی پڑی۔ ہر روز ایک نئی دفعہ ضابطہ فوجداری کی نکال لیتا تھا اور ان کو بند کر دیتا تھا۔ آخری بار جب نکلے تو پہلے تھانیدارنی ہو چکی تھی نمبر سے۔"

"سمجھ گیا۔" شیخ میری طرف دیکھ کے بے ساختہ ہنسا۔ "پھر بچوں کو وہ کیوں نہیں لے گئے؟"

"ارے میاں! جس نے شادی ہی نہیں کی بچے کیسے پالتا؟" مست قلندر صاحب نے کہا۔ "اور بیٹے کے بچے پالتا تو بیٹے کو کیسے تلاش کرتا۔ وہ بھی تو کرتا ہے۔ بھوکے کمائیاں جہاں سیر وہاں سوا سیر۔ یہ بار امانت بھی اٹھا لیتے ہیں۔ اپنے ریوڑ میں شامل کر لیا کہ گویا سمندر میں لوٹا بھر پانی۔"

ٹیپ لے کر اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے ہم ہنستے ہوئے رخصت ہوئے۔

"آدمی ہے کہ اچھا خاصا فٹ کا بیسٹ کالم۔" میں نے کہا۔

"شکل بھی کارٹون ہے لیکن عقل سے پیدل نہیں ہے۔ بہت سے تھانیداروں سے زیادہ معاملہ فہم اور دور اندیش ہے۔ تم گویا ماننا میں حشمت خان جیسے بیانوں سے موازنہ کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس نے واقعی بہت تسلی بخش انتظام کیا ہے، بہت سوچ سمجھ کر۔ حالانکہ پوری بات اسے معلوم نہیں تھی۔"

"میرے سر سے تو ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔" شیخ نے کہا۔ "یوں لگتا ہے کہ قدرت نے بازی میرے حق میں پلٹ دی ہے۔ ایک طرف خیریت اور عدل کے قتل کا الزام نہیں رہا۔ دوسری طرف مقتولہ کے دونوں بچے چشم دید گواہ نہیں رہے۔"

"اس وقت میرے سامنے زیادہ اہم اور فوری توجہ طلب مسائل دو ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "ایک یہ کہ میر محمد کہاں گیا۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ گھر میں گھس کر تلاشی لینے اور مارپیٹ کرنے والے اسی ٹیپ کی تلاش میں تھے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ میر محمد کی بیوی کہاں گئی۔ عورت ذات کس حد تک ناقص العقل ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ یوں کر لو کہ میر کی بیوی نے بچوں کو باہر نکال دیا۔ اور ساتھ ہی دروازہ کھولا تھا تو خود بھی نکل جاتی اور دروازے کو باہر سے بند کر دیتی۔ واپس جاکے وہیں لیٹنے کی کیا تک تھی؟"

"میری سمجھ میں ایک وجہ آتی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ مجرموں کو فرار ہونے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ فلیٹ کا دوسرا دروازہ بھی تھا لیکن اس کی باہر والی کنڈی غائب تھی۔ حملہ آوروں نے پانچ اور سات سال کے دونوں بچوں سے تعرض نہیں کیا تھا اور ایک طرح سے ان کی موجودگی کو نظرانداز کر دیا تھا۔ انہیں غیر موجود پاکے بھی وہ پریشان نہیں ہوئے ہوں گے لیکن وہ خود نکل جاتی اور ایک منٹ بعد انہیں معلوم ہو جاتا تو وہ پیچھے دوڑتے اور شاید وہ اس قابل نہیں تھی کہ ایک منٹ میں دوڑ کر ان کی دسترس سے دور ہو جاتی۔ اس نے خود کو ڈھال بنا کے بچوں کو پناہ فراہم کی۔ ممکن ہے بعد میں انہوں نے پوچھا بھی ہو کہ بچے کہاں گئے اور اس نے کوئی بہانہ کر کے انہیں چند منٹ تک روکے رکھا ہو۔ مثلاً یہ کہہ دیا ہو کہ وہ باتھ روم میں ہیں۔ ادھر بچوں کی مدد قدرت نے کی۔ وہ ٹیپ لے کر نکلے تو ایک کار والے نے انہیں بٹھا لیا اور اخبار کے دفتر تک چھوڑ گیا۔"

"آدمی میر محمد بھی چالاک تھا لیکن اس کی بیوی بھی بہت سمجھدار ثابت ہوئی۔ شاید اسی لیے میر نے اس پر بھروسہ کرتے ہوئے بتا دیا ہوگا کہ ٹیپ والوں کے پاس ٹیپ کی ایک نقل موجود ہے۔ جب تک کوئی تم سے زبردستی کر کے نہ پوچھے اس کے بارے میں کسی سے بات تک نہ کرنا۔ وہ میری زندگی کی ضمانت ہے۔ اس کی بیوی نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ٹیپ کی تلاش میں آنے والے جب اپنے مقصد میں ناکام ہوں گے تو کیا کریں گے۔ وہ تشدد پر اتر آئیں گے اور ہو سکتا ہے وہ ان کے ظلم کی تاب نہ لاتے ہوئے سچ بولنے پر مجبور ہو جاتی۔ میر محمد جیسے پولیس افسر کی بیوی جانتی ہوگی کہ تشدد کے حربے کیا ہوتے ہیں اور کتنے کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ وہ بتا دیتی کہ ٹیپ بچے والوں کے پاس ہے۔ امانت رکھنے والوں کی شامت آ جاتی اور وہ ٹیپ ہاتھ سے [illegible] کے شوہر کی زندگی کی ضمانت تھا۔ بعد میں اس نے خود بتا دیا کہ ٹیپ تو بچے لے گئے پولیس اسٹیشن۔ یا محض یہ کہہ دیا کہ ٹیپ بچے والوں کے پاس ہے۔ اگر وہ بچے والوں کے پاس گئے ہوں گے تو انہیں معلوم ہوا ہوگا کہ پانچ سات سال کے دو بچے جن کو وہ بے ضرر سمجھے تھے ٹیپ لے کر غائب ہو گئے ہیں۔ وہ ادھر ادھر دوڑے ہوں گے کہ اتنے چھوٹے بچے زیادہ دور نہیں جا سکتے لیکن بچے کار میں نکل گئے تھے۔ اب یا تو میر کی بیوی بھی اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے نکل گئی۔ مگر وہ نکلتی تو اس کے لیے پناہ کی قریب ترین اور سب سے محفوظ جگہ پولیس اسٹیشن تھا۔ وہ وہاں نہیں پہنچی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اپنی ناکامی اور ایک عورت کی چالاکی پر سخت مشتعل ہوتے

اور وحشت اشتعال میں یا تو انہوں نے میر کی بیوی کو وہیں مار دیا اور لاش لے گئے یا اسے اپنے باس کے سامنے پیش کر دیا کہ یہ ہے ہمارے خالی ہاتھ لوٹنے کی اصل وجہ۔ چنانچہ لاش کو دریا برد یا کہیں دفن نہیں کیا گیا تو اس وقت وہ میر محمد کے سامنے جسمانی تشدد کے وہ سب انسانیت سوز مظالم جھیل رہی ہوگی جو میر محمد کے معمولات میں شامل تھے۔ اس معاملے میں یعنی ایذا رسانی کے طریقے ایجاد کرنے میں وہ شیطانی جینیئس تھا لیکن اپنا کیا اپنے ہی سامنے آتا ہے۔ تم خود تصور کر سکتے ہو کہ میر محمد کی بے بسی کا عذاب کتنا شدید ہوگا۔"

"کیا یہ امکان نہیں ہے کہ وہ حقیقت کے اظہار پر مجبور ہو جائے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن جس بدمعاشی کا مظاہرہ انہوں نے ایک گھر میں کیا وہ کسی اخبار کے دفتر میں یا پولیس اسٹیشن پر ناممکن ہے۔" شیخ نے کہا۔ "تھانے میں طوطی کی آواز چاہے کوئی نہ سنے مست قلندر کے اخبار کی بہرحال سنی جاتی ہے اور اس عورت سے تو مجھے امید ہے کہ اس نے کسی بڑے اخبار کا نام ہی لیا ہوگا۔ اب وہ ایڈیٹر کو فون کر کے دھمکی دینا تو درکنار اس سے ٹیپ کے متعلق پوچھ بھی نہیں سکتے۔ تم نے ایک کالم لکھنے والے کی مقبولیت دیکھی ہے تو ایڈیٹر کے متعلق خود ہی سوچ لو۔ کسی نے اس سے پوچھنے کی حماقت کی ہوتی تو اس نے وہ چکر چلایا ہوگا کہ بدمعاشوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ہوں گے۔ مثلاً اس نے کہا ہوگا کہ بچوں کی فکر چھوڑو اپنی فکر کرو۔ ٹیپ کی نقل تو گئی اوپر ڈی آئی جی تک۔ تمہارا نام نہیں تو کیا، حلیہ وغیرہ سب آ رہا ہے صبح کے اخبار میں۔ اب خیریت مطلوب ہے تو میر محمد اور اس کی بیوی کو اخبار کی آخری کاپی پریس جانے سے پہلے چھوڑ دو۔ ورنہ وہ چشم دید گواہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ کئی تصویریں پولیس کے ریکارڈ پر ہیں وہ ان کو دکھائی جائیں گی اور مجرم پہچان لیے جائیں گے۔"

میں نے اس کے باوجود مایوسی کا اظہار کیا۔ "میر محمد یا اس کی بیوی کا زندہ ملنا مجھے محال نظر آتا ہے۔ اگر اغوا کرنے والوں کو امید ہوتی کہ ان کی فراہم کردہ معلومات کے بغیر ٹیپ حاصل کرنا ناممکن ہے تو وہ ان کو زندہ رکھتے لیکن جھنجلاہٹ اور بے بسی میں وہ یہی کر سکتے ہیں کہ بچوں کو یتیم کر دیں۔ ان کے ماں باپ دونوں کو مار ڈالیں۔ وہ کسی لیڈر کی دھمکی سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ پکڑے جانے کا خوف کچھ نہیں۔ سب سے زیادہ ملال انہیں ٹیپ کے ہاتھ سے نکل جانے کا ہوگا۔"

"مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ حشمت خان اس ٹیپ کو غائب کرنے کی سازش میں شریک تھا۔" میں نے کہا۔ "یا اس جرم کا گواہ ضرور تھا۔ کیا اس نے میر محمد سے کوئی قیمت وصول نہیں کی ہوگی؟"

"ممکن ہے کی ہو اور میر محمد نے کہا ہو کہ ذرا صبر کرو۔ میں بہت بڑا سودا کر رہا ہوں۔ اس میں سے تمہیں حق ضرور ملے گا مگر مجھ سے کوئی توقع مت رکھنا جیسے تم نے انکار کیا تھا ویسے ہی میں بھی انکار کر سکتا ہوں۔"

"کیا حشمت خان نے نہیں پوچھا ہوگا کہ سودا کس سے ہو رہا ہے اور کتنی رقم کا؟"

"پوچھا ہوگا تو وہ بھی کیوں بتاتے۔ اسے تو اب اپنی فکر پڑ جائے گی اور اس کے لیے سلامتی اسی میں ہے کہ وہ اپنے سابقہ موقف پر قائم رہے۔" شیخ نے کہا۔

"تم نے اس عزم کے ساتھ آنے کو اہمیت نہیں دی۔ کیا اس کے ساتھ بھی وہ نہیں ہو سکتا جو میر محمد کے ساتھ ہوا۔ اسے اپنے ہاتھ کی تحریر شناخت کرنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ دشمن جانتے ہیں کہ رضوی صاحب ہمارے حامی ہیں۔ وہ عزم سے ڈرا دھمکا کے یہ بیان بھی دلوا سکتے تھے کہ بیان اس نے ٹیپ سے نقل کیا تھا اور ٹیپ میر محمد نے نکال لیا تھا۔"

"یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے۔ میں صبح اس کے بارے میں بھی معلوم کروں گا۔ میری تحقیق دور وا اسی کیس تک محدود رہے گی جس کا تعلق تم سے بھی اتنا ہی ہے جتنا میر محمد سے۔ لیکن میر محمد کا کیس میں نہیں لوں گا۔ اس کا بھائی جو چاہے کرے۔ لیکن حشمت خان کو مجھے یا سی آئی اے کو ٹرانسفر کرا لے۔" شیخ نے کہا۔ "یا خصوصی ٹیم بنا دی جائے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ ایک پوسٹ پہلے سے خالی تھی۔ دوسری ایس ایچ او کی معطلی سے خالی ہوئی۔ تیسری میر محمد کی گمشدگی سے اور توقع ہے کہ چوتھی میرے استعفے سے ہوگی۔ اس طرح تھانہ نہیں چل سکتا۔"

گاڑی پھر پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ "استعفیٰ ان حالات میں ویسے بھی منظور نہیں ہوگا اور رضوی صاحب سے کہوں گا کہ منظور نہ ہونے دیں۔ بعد میں چاہو تو حیدرآباد چلے جانا۔"

تھانے میں ذہین محمد بے چینی سے ہماری واپسی کے انتظار میں تھا۔ اکرام شیخ نے اسے مختصراً بتایا کہ اس کے بھائی اور بیوی کے ساتھ کیا ہوا یا ہو سکتا ہے۔

"یہ ٹیپ ساری خرابی کی وجہ ہے۔" شیخ نے کہا۔ "میر محمد نے اس کو غائب نہ کیا ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔ یا وہ اتنا بڑا سودا کرنے کا خطرہ مول نہ لیتا۔ بے شک وہ بہت ہوشیار تھا اور کبھی پکڑا نہیں گیا تھا لیکن اونٹ کبھی تو پہاڑ کے نیچے سے گزرتا ہی ہے۔ تب ہی اسے معلوم ہوتا ہے۔"

"یہ مجھے معلوم ہے جو ہونا تھا ہو چکا لیکن اب تم کیا کر رہے ہو؟" ذہین محمد نے بے رخی سے کہا۔

www.paksociety.com

"میں تو بس تفتیش کر رہا ہوں۔" شیخ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے مجھے۔"

"تم نے یہ سب کچھ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟" دین محمد نے جھنجلا کر کہا۔

"میں اب بھی تمھیں کچھ بتانے کا پابند نہیں ہوں۔" شیخ نے اسی لہجے میں کہا۔ "نہ میں تمھارا ماتحت ہوں۔"

"لیکن تم میر محمد کے ماتحت ہو۔" دین محمد چیخ کے بولا۔

"آہستہ بات کرو۔" شیخ نے میز پر ہاتھ مارا۔ "اگر میں اس کا ماتحت ہوں تو مجھ سے صرف وہ پرسش کا اختیار رکھتا ہے، تم نہیں۔ دوسری زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس لیے میں تمھارا بھائی بھی مجھ سے کچھ نہیں پوچھ سکتا۔ میں اپنا استعفیٰ اوپر بھیج چکا ہوں۔ میں تفتیش سے انکار بھی کر دوں تو کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آئی جی بھی نہیں۔"

دین محمد کا غصہ سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"مجھے ایک ہی کام نہیں ہے دین محمد! مجھے تمھارے بھائی اور بھاوج کے علاوہ اپنے عزیز اور تمھارے دوسرے ساتھی خواجہ اکبر کی گمشدگی کا بھی پتا چلانا ہے۔" شیخ نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "مجھے تم سے ہمدردی ضرور ہے اور اسی لیے میں تمھیں ایک مشورہ دیتا ہوں۔ مجھے ایس پی صاحب سے معلوم ہوا ہے کہ میر محمد کا کیس سی آئی اے کو دے دیا جائے۔ یا اس کی تفتیش کے لیے خصوصی ٹیم تشکیل دی جائے کیونکہ معاملہ بہرحال ایک ایس ایچ او کی گمشدگی یا اغوا کا ہے۔ شاید میں اکیلا زیادہ دوڑ دھوپ نہ کر سکوں۔ حشمت خان پہ بھروسہ ہے تو الگ بات ہے۔ ورنہ میرا مشورہ مانو۔ تم اپنا اثر و رسوخ استعمال کر سکتے ہو۔ کیونکہ میں تمھارے ہی ساتھی ہوں گے اور ہمدردی تو سب کو ہی ہو گی۔ ابھی تو بجے ہیں رات کے گیارہ؟ مجھے ایک اور کیس کے لیے جانا ہے اور ابھی تک میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ تم بیٹھے ہوئے تنگ مت کرو۔"

"اس کے بچے تو میرے پاس ہونے چاہئیں۔" دین محمد بولا۔

"مہربانی فرماؤ انھیں وہیں رہنے دو۔ وہاں وہ زیادہ محفوظ ہیں اور اپنی حفاظت کی سوچو کیونکہ تم میر محمد کے بھائی ہو۔" شیخ نے کہا۔ "مجرموں کا اگلا نشانہ تمھارا گھر بھی ہو سکتا ہے۔"

اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور جانے کے لیے اٹھا۔ "تو پھر میں چلتا ہوں۔"

"تم نے اس حملے کی رپورٹ لکھوا دی ہے جو تم پر ہوا تھا؟" اکرام شیخ نے کہا۔

دین محمد نے اقرار میں سر ہلایا تو شیخ نے تصدیق کی کہ دونوں کیس الگ الگ درج کر لیے گئے ہیں۔

"دیکھو دین محمد! ان حالات میں تم کو گھر جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "میں تمھیں گرفتار کرنے پر مجبور ہوں۔ تم نے وہ مشین گن کھو دی ہے جو تمھیں حکومت کی طرف سے ڈیوٹی کے لیے دی گئی تھی۔"

دین محمد رک گیا۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔ "مگر کیا وہ میرا قصور تھا؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ یہ تمھارا بیان ہے اور میں فیصلے کا مجاز نہیں۔" شیخ نے کہا۔ "صبح تمھیں متعلقہ حکام کے حوالے کر دیا جائے گا۔ وہ تمھیں معطل رکھیں یا تمھارے بیان سے مطمئن ہو کر تمھیں بحال کر دیں، یہ ان کا کام ہے۔"

"نہیں! تم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔" دین محمد برافروختہ ہو کے بولا۔

"جو کچھ میں نے یا سکندر صاحب نے دیکھا تھا وہ ہم بتا دیں گے۔" شیخ نے کہا۔ "تم ہمارا نام بطور گواہ کے درج کرا سکتے ہو۔ ہم نے تم کو سرونٹ کوارٹر میں بے ہوش اور بندھا ہوا پایا تھا لیکن اس سے قبل کیا ہوا تھا، یہ صرف تم جانتے ہو۔ ہم اس کے چشم دید گواہ نہیں ہیں۔ بحال دیے جانے پر میں تم کو معاف کرتا ہوں کیونکہ وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" اس نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ "دین محمد صاحب کو لاک اپ میں لے جاؤ۔ لاٹ صاحب کا فون آئے تب بھی میری اجازت کے بغیر ان کو چھوڑنا نہیں ہے۔"

"میں تم سے سمجھ لوں گا شیخ!" دین محمد نے سخت احساس تذلیل کے ساتھ زہریلے لہجے میں کہا۔

"میں اس دھمکی کو بھی نظرانداز کرتا ہوں کیونکہ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ لیکن میں کسی طرح بھی قانون کے تقاضوں کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔" شیخ نے کہا۔

دین محمد آہستہ آہستہ لاک اپ کی طرف بڑھا اور اس کے کھلے دروازے سے زیر تفتیش مجرموں کے درمیان جا کھڑا ہوا۔ میں اس کی ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ اس کے پاس جرأت و ہمت اور فرض شناسی کے مظاہرے پر ملنے والی اسناد تھیں اور میڈلز تھے۔ اس کا شمار اچھے پولیس افسروں میں ہوتا تھا اور اپنے فرض میں کوتاہی کا مرتکب وہ اب بھی نہیں ہوا تھا لیکن اس وقت وہ عام مجرموں کے ساتھ ایک تھانے کے لاک اپ میں بند تھا۔

"کانسٹیبل!" شیخ نے کہا۔ "لاک اپ کی چابی مجھے دے دو اور تم دو سپاہیوں کے ساتھ چلو۔ اپنے ساتھ زمین کھودنے کا سامان بھی لے لو۔ ہمیں ایک لاش برآمد کرنی ہے۔"

کانسٹیبل کی حالت غیر ہو گئی۔ "اس وقت... میرا مطلب ہے سرکار سواری کا کیا ہو گا؟"

www.paksociety.com

"یہ سکندر صاحب ہماری مدد کر رہے ہیں۔ ان کے پاس گاڑی ہے۔" شیخ نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

تین افراد کو ہم نے وہاں پہنچایا، جہاں زمین تازہ کھدی ہوئی لگتی تھی۔ میری حالت بھوک سے غیر ہو رہی تھی۔ چنانچہ راہ میں کسی سینما کے آخری شو سے لوٹنے والی ریڑھی کو دیکھ کر میں نے گاڑی روکی اور اس سے چند کباب کا تمام بچا ہوا اسٹاک خرید لیا۔ اس کے پاس دس بند اور بیس کباب باقی رہ گئے تھے جو شاید وہ اگلے دن کے مال میں شامل کرتا۔ پورے پیسے ملنے پر اس کا چہرہ دمک اٹھا ورنہ وہ سمجھ رہا تھا کہ بچا ہوا مال بے کار ہی گیا۔ گاڑی میں میرے سوا چاروں افراد پولیس کی وردی میں تھے اور ان میں ایک انسپکٹر بھی تھا۔ بادل ناخواستہ ہمارے ساتھ بیگار پر جانے والے تینوں کانسٹیبل یقیناً ڈنر تناول فرما چکے تھے مگر انھوں نے ہماری دعوت کو مسترد نہیں کیا اور ہمارے ساتھ برابر کے شریک رہے۔ یہ روکھی سوکھی حلق سے اتارنے کے بعد ہم نے کولڈ ڈرنک پیے اور تھانے سے روانہ ہونے کے نصف گھنٹے بعد وہاں پہنچے جہاں ہمارے اندازے کے مطابق ایک لاش دفن تھی۔

ایک کانسٹیبل نے جو زیادہ بے باک تھا، یہ خیال ظاہر کیا کہ یہی کارروائی صبح ہونے کے بعد کی جاتی تو کیا تھا اور اس بات پر شیخ سے جھاڑ کھائی۔ ہم انھیں کھدائی میں مصروف چھوڑ کے چند قدم دور جا کھڑے ہوئے اور سگریٹ پینے لگے۔ ہم سڑک سے تقریباً پچاس گز دور نشیبی علاقے میں تھے۔ اب چاند بھی نکل آیا تھا لیکن گورکنی پر مامور کانسٹیبل ایک پیٹرومیکس لیمپ بھی لائے تھے اور اسے روشن کرنے میں بھی کامیاب ہو چکے تھے۔ آدھے گھنٹے میں سڑک پر سے دو گاڑیاں گزریں اور دو موٹر سائیکلیں۔ ان سب نے رک کر اندھیرے اور ویرانے میں ہونے والی کارروائی کو بغور دیکھا اور اس امر کا یقین کرنے کے بعد کہ یہ جن بھوت نہیں، پولیس والے ہیں، دو فوچکر ہو گئے۔ ان کے لیے دونوں ہی برابر تھے کہ چمٹ جائیں تو جان نہ چھوڑیں۔ خدا دونوں سے امان میں رکھے۔

تقریباً پون گھنٹے تک آپس میں باتیں کرنے یا ہمیں گالیاں دینے کے بعد بالآخر ایک کانسٹیبل نے چلا کر ہمیں پکارا اور ہم بڑی توقعات کے ساتھ لپکے۔ وہ تین فٹ قطر کے محدود علاقے میں دو فٹ کی گہرائی تک کھدائی کر چکے تھے اور ایک بوری کی دریافت پر مطمئن تھے کہ ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔

بوری کا منہ اوپر کی طرف نہیں تھا لیکن بوری خالی بھی نہیں تھی۔ اردگرد کی ساری جگہ کھودے بغیر یہ بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا کہ نیچے سے بوری کا منہ بند ہو گا یا نہیں۔ قتل قبول کرنے والے نے تو واضح اعتراف کیا تھا کہ اس نے بوری کو کھول کر دیکھا تھا اور پھر خوف زدہ ہو کے بھاگ لیا تھا۔ ایسی صورت میں بوری کو اوپر کے دونوں کناروں سے کھینچنے کا عمل کر کے کھینچا جاتا تو تمام بوجھ ہو کر لاش گڑھے میں رہ جاتی اور خالی بوری کھینچنے والے پیچھے جا گرتے۔

اکرام نے ٹارچ کی لائٹ ڈال کے دیکھا۔ بوری کے اوپر بھی خون کا رنگ شامل تھا۔ قانون کے رکھوالے عام طور پر اس قسم کی محنت کے عادی نہ تھے جس سے جیب میں کچھ نہ جائے اور تکلیف کے سوا کچھ حاصل نہ ہو۔ [illegible] کھلاتی ہے۔ وہ بوری کے اردگرد مٹی [illegible] نکالنے پر آمادہ نہ لگتے تھے۔ شیخ نے اپنے [illegible] کا اظہار کیا تو انھوں نے متبادل تجویز پیش کی۔ وہ بوری کے کناروں کو اس طرح کھینچ کر نکالیں گے کہ اندر سے لاش کے جسم کا کوئی حصہ بھی گرفت میں آ جائے۔ شیخ نے بادل ناخواستہ ان سے اتفاق کیا۔ وہ جانتا تھا کہ زبردستی اب نہیں چلے گی۔ تینوں ماتحت جلسے پیٹ جائیں گے۔ ایک کہے گا میری کمر میں جھٹکا آگیا ہے۔ دوسرا چکر آنے کے بعد بے ہوش بھی ہو سکتا تھا۔ تیسرا صاف کہتا کہ اب میں اکیلا کیا کروں۔

ان تینوں نے مل کر زور لگایا اور معلوم نہیں کس نے لاش کی ٹانگ کھینچی اور کس نے ہاتھ پکڑ کے گھسیٹا لیکن بالآخر وہ مٹی میں دبی ہوئی بوری کو نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ بوری کا منہ دوسری طرف سے [illegible] دیا گیا تھا جس سے یہ نظریہ درست ثابت ہوتا تھا کہ اصل قاتل کسی خوف یا مصلحت کی بنا پر دوبارہ آئے تھے۔

"کھولو اسے۔" شیخ نے کچھ دیر ٹارچ کی لائٹ کو بوری پر جمانے کے بعد کہا۔ یہ اندازہ تو بوری کی بے ڈھب حالت سے بھی ہوتا تھا کہ اس میں لاش ہی ہے، ریت یا بھوسہ نہیں بھرا ہوا ہے۔

اس پر لپٹی ہوئی رسی کسی دشواری کے بغیر کھل گئی لیکن جو چیز اس میں سے برآمد ہوئی اس نے ہمیں بھی دہشت زدہ کر دیا۔ دو کانسٹیبل اللہ توبہ کرتے بھاگے اور چند قدم کے فاصلے پر جا کھڑے ہوئے۔ بوری کا کفن اتارنے والا بھی خود کو روک نہ سکا اور پیچھے ہٹ کر ہمارے قریب آگیا۔

اب ہمارے درمیان ایک بے گور و کفن جو تھیں [illegible] لاش پڑی تھی۔ خاک و خون میں لتھڑی ہوئی اور [illegible] کے مطابق منہ کے بل لیکن مکمل طور پر منہ کے بغیر۔ گردن سے اوپر لاش کا سر غائب تھا۔ سر کو تن سے جدا کرنے کا کام کسی نے بڑی مہارت اور صفائی کے ساتھ کیا تھا۔ [illegible] قصائیوں کا بڑا چھرا استعمال کیا ہو گا یا کلہاڑا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" میں نے [illegible] خاموشی کے اس وقفے کو ختم کیا۔

"ہاں۔ سچ پوچھو تو مجھے بھی مایوسی ہوئی ہے۔" [illegible]

"تمھیں امید تھی کہ اس میں سے میر محمد یا اس کی بیوی کی لاش نکلے گی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن میں قبل از وقت یہ بات نہیں کہنا چاہتا تھا۔" شیخ نے کہا۔ "قتل تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور کبھی کبھار ایسی وارداتیں بھی نظر آتی ہیں لیکن جس طرح مجھے اطلاع دی گئی تھی پھر جیسے میر محمد کے گھر کی تباہی دیکھی اور اس کے فرنٹ پوسٹ صاحب نے میر محمد کے بچوں کی بات کی۔ اس سے میرے ذہن نے واقعات کو منسلک کر لیا اور میرا یہ شک بھی یقین میں بدلنے لگا کہ یہ پھینکی جانے والی لاش دونوں بدقسمت میاں بیوی میں سے کسی ایک کی ہوگی۔ یہ نہ ہوتا تو میں آدھی رات تک اپنے ساتھ دوسروں کو بھی خوار نہ کرتا۔ لاش صبح نکال لی جاتی اور اسپتال بھیج دی جاتی۔"

"سچ پوچھو تو میرا بھی یہی خیال تھا۔" میں نے کہا۔ "میں اس لیے خاموش رہا کہ جو ہو گا سامنے آجائے گا۔ تم بڑی دلچسپی کے ساتھ اس کام میں لگے ہوئے تھے۔"

"اب یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جسمانی ساخت کے اعتبار سے یہ لاش میر محمد کی بھی ہو سکتی ہے مگر تصدیق صرف فنگر پرنٹ سے ہی ممکن ہے۔" شیخ نے کہا۔

"فنگر پرنٹ کہاں سے لیں گے سر!" ایک کانسٹیبل نے اطلاع دی۔ "جب فنگر ہی نہیں ہوں گی۔"

"کیا مطلب؟" اکرام شیخ نے چونک کر کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ لاش کے سر کی طرح اس کے ہاتھ بھی غائب ہیں کلائی کے پاس سے۔" کانسٹیبل نے کہا۔

"یہ بہت غیر معمولی بات ہے۔ سر بریدہ لاش تو بعض اوقات مل جاتی ہے لیکن وہ کسی عام آدمی کی لاش ہوتی ہے جس کی فنگر پرنٹس کا ریکارڈ کہیں بھی نہیں ہوتا۔" شیخ نے کہا۔ "بس کوئی قاتل جنونی کیفیت میں یہ حرکت کر بیٹھتا ہے یا پھر وہ اتنا سیانا ہوتا ہے کہ شناخت کو دشوار بنا دیتا ہے۔ لیکن ہاتھ کاٹنے کا تو اور کوئی سبب ہی نہیں۔ قاتل یہ جانتے ہوں گے کہ مقتول کی شناخت فنگر پرنٹ سے ممکن ہو جائے گی۔ فنگر پرنٹ یا تو سرکاری شناختی رجسٹروں سے مل جاتے ہیں یا پھر ملازمت پیشہ افراد کے۔ ان کی سروس بک کے آغاز میں۔ اب میں پھر شک میں پڑ گیا ہوں۔"

"یعنی یہ کہ لاش میر محمد کی ہو سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن فوری طور پر میں کچھ ثابت نہیں کر سکتا۔ عملی زندگی میں شناخت کی دوسری علامات وہ نشان ہوتے ہیں جو کسی زخم وغیرہ کے باعث یا چوٹ لگنے سے پڑ جاتے ہیں۔ عموماً یہ نشانات بھی جسم کے کھلے حصوں پر ملتے ہیں۔ منہ پر یا ہاتھوں پر اور نمایاں شناختی علامات کبھی صورت دیکھ کر لکھ دی جاتی ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "جسم کے باقی حصوں پر کوئی تل یا پیدائشی نشان یا جلنے کا داغ ہو تو... تو اس کی ماں کے بعد صرف اس کی بیوی بتا سکتی ہے۔ فی الحال وہ دونوں بھی موجود نہیں۔ ایک مر چکی ہے، ایک غائب ہے۔ اس لیے ہم چلتے ہیں۔ ایمبولینس بھیج دیتے ہیں جو لاش کو اسپتال لے جائے گی۔"

میں اور اکرام شیخ تھکے ہارے سڑک کی طرف روانہ ہوئے۔ مجھے بھی اپنی توقعات کے غلط ثابت ہو جانے کا ملال تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس شخص کو مردہ دیکھنا چاہتا تھا جو شکاریوں کا آلۂ کار تھا اور جس نے قتل جیسے سنگین ترین جرم کا اعتراف کرنے کے بعد ایک رات مجھ پر تشدد کے وہ جاں سوز اور ننگ انسانیت حربے آزمائے تھے جن کے تصور سے آج بھی مجھے جھرجھری آ جاتی تھی۔ میں صرف ایک بے نام تجسس کا شکار تھا اور میرے خیال کے راستے بھی ایک ہی سمت میں اشارہ کرتے تھے اور میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میری سوچ کی سمت غلط ہے یا نہیں۔ اس شخص نے ایک تیر سے دو شکار کرنے چاہے تھے۔ اس نے ٹیپ غائب کر کے مجھے تختۂ دار تک پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی اور اس کے ساتھ ہی اپنے کارنامے پر منہ مانگا انعام حاصل کرنا چاہا تھا مگر تیر قضا نے اسے پہلے شکار کر لیا۔ خدا ہی جانے وہ سالم ٹیپ پھر شیخ کی تحویل میں تھا اور میر محمد لاپتہ تھا۔ ایک بہت بڑا سودا کرتے کرتے اپنا سب کچھ کھو بیٹھا تھا۔

اگر وہ مجھے دوبارہ زندہ مل جائے تو میں اس سے ضرور پوچھوں کہ کیا قدرت کے فیصلوں کو بدلنا اس کے اختیار میں تھا؟ کیا یہ درست نہیں ہے کہ ظلم کی کھیتی کبھی پھلتی نہیں؟

"کیا سوچ رہے ہو؟" شیخ نے کہا۔ "واپس نہیں چلنا کیا؟"

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور شیخ میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ "اب کیا پروگرام ہے؟" میں نے کہا۔

"مجھے تھانے میں ڈراپ کر دو۔ اس کے بعد تم جاؤ۔ رات کے دو بجنے والے ہیں اور میری ڈیوٹی تو صبح تک ہے۔" شیخ نے کہا۔ "تم جا کے آرام کرو۔"

"مجھے بھی اسلام آباد فون کرنا ہے۔ اس وقت لائن فوراً مل جائے گی۔" میں نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"فون تو مجھے بھی کرنا ہے۔" شیخ بولا۔ "وہ حضرت بھی فارغ ہونے ہی والے ہوں گے۔ مجنون پیر..."

مجھے جواب دینے کا موقع نہ ملا۔ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "گاڑی یہاں سے سیدھی لے چلو۔" تھپکی دینے والے نے بھاری بھرکم لہجے میں مجھے حکم دیا۔

www.paksociety.com

ایک لمحے کے لیے میں اور اکرام شیخ اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھے رہ گئے۔ ہم دونوں کے ذہن نے فوراً اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ حکم دینے والا حکم پر عمل کرانے کی پوزیشن میں بھی ہے اور کسی فوری ردِعمل کے تحت ہم نے جرأت کا مظاہرہ کیا ہوتا تو یقیناً نقصان میں رہتے۔ آہستہ آہستہ ہم دونوں نے مڑ کر تھوڑا سا پیچھے گھمایا اور ایک وقت اس ریوالور کو دیکھا جس کی زد میں ہم دونوں تھے۔ اسے گولی چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سر کے پچھلے حصے پر بٹ مار کے بھی ہمیں ناک آؤٹ کر سکتا تھا۔ اس کا پہلا نشانہ شیخ ہی ہوتا کیونکہ میرے ہاتھ میں اسٹیئرنگ تھا۔

میں نے گاڑی کو سڑک پر چھوڑتے وقت لاک کر دیا تھا مگر کاروں کے ڈور لاک کسی بھی ماسٹر کی یا چابی سے کھل جاتے ہیں۔ وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پیچھے آ بیٹھا تھا اور ہم نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ ہم اپنے خیالات میں محو تھے اور آگے کی سیٹوں پر بیٹھنے کے بعد پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ بیٹھا ہوا ہوتا تو شاید میں اس کی پرچھائیں بیک ویو مرر میں دیکھ لیتا مگر وہ لیٹا ہوا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ سیاہ رنگ کی سیٹوں پر کسی فلاح کرنے کے لیے اس نے کالے کپڑے بھی پہن لیے ہوں یا اوپر کالی چادر اوڑھ رکھی ہو۔

"کیا چاہیے تمھیں؟" شیخ نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"تم جو بھی ہو مسٹر ایکس والی ٹیپ دے دو۔"

"مجھے وہ چیز چاہیے جو میر محمد انھیں نہ دے سکا۔" وہ بولا۔ میں نے اس کی آواز پر غور کیا جو کچھ دبی ہوئی لگتی تھی۔

"تمھیں کیوں یقین ہے کہ وہ چیز تم کو ہم سے مل سکتی ہے؟" شیخ نے کہا۔

"میر محمد نے بتا دیا تھا کہ وہ چیز تمھارے پاس ہے۔" وہ بولا۔ "اور وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔"

"تم اس کے لیے ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کر رہے ہو؟ کیا تم اسے مار چکے ہو مسٹر ایکس؟"

"مجبوری تھی۔ وہ لالچ میں حد سے بڑھ گیا تھا۔ آدمی جس شاخ پر بیٹھا ہو اسے ہی کاٹنے لگے تو کیا ہوگا؟"

"تم نے اس کی بات پر یقین کر کے عقلمند ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔" شیخ نے کہا۔ "کیا تمھیں معلوم نہیں کہ وہ ٹیپ جو تم مانگ رہے ہو میر محمد نے لے لیا تھا۔ اس کا گواہ حشمت خان بھی ہے اور اسی بات پر میر کے اور میرے درمیان شدید اختلافات تھے۔ میں نے عدالت کے کٹہرے میں اپنے بیان میں بھی یہی کہا تھا۔"

"اس وقت تک یہ بات سچ تھی۔" وہ پیچھے سے بولا۔ "لگتا ہے بعد میں اس کے ضمیر نے ملامت کی تو اس نے ٹیپ مجھے دے دیا؟" شیخ نے طنزیہ کہا۔ "یا وہ تم سے منہ مانگا انعام وصول کرنے میں ناکام رہا تو دشمنی پر اتر آیا؟"

"اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ہم سے دشمنی کر سکتا اور ہم اسے منہ مانگا انعام دینے کا وعدہ بھی کر چکے تھے۔"

"صرف وعدہ؟ یا تم نے اسے کچھ دیا بھی تھا؟" شیخ نے کہا۔

"اس نے دس لاکھ مانگے تھے اور پانچ لاکھ اسے دے دیے گئے تھے۔" وہ بولا۔ "لیکن کل تم دونوں سکندر اور محسن آدھی رات کے وقت اس کے گھر میں جا گھسے۔ تم نے اس کے بچوں کو ریوالور کی زد پر رکھ کے اس سے ٹیپ طلب کیا اور دھمکی دی کہ ٹیپ نہ دیا گیا تو تم اس کے دونوں بچوں کو لے جاؤ گے۔ کوئی بھی تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا کیونکہ ایک بڑا پولیس افسر اور عائدہ کیٹ رالجہ جیسے لوگ گواہی دیں گے کہ اغوا کی واردات کے وقت تم ان کے سامنے گھر میں بیٹھے لوڈو کھیل رہے تھے۔"

"مسٹر ایکس... یہ سب کچھ تم سے میر محمد نے کہا تھا؟" شیخ نے کہا۔

"ہاں۔ وہ خود کبھی تمھاری دھمکی میں نہ آتا۔ اس نے اپنی بے وقوف اور بزدل بیوی کو سمجھایا بھی کہ نہ ہم گولی چلا سکتے ہیں، اس کی آواز پر اوپر نیچے رہنے والے آ جائیں گے اور شاید تھانے والے بھی۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ ہم دو بچوں کو اٹھا کے نیچے تک جائیں اور پھر بھاگ کر تھانے کی حدود سے بھی نکل جائیں لیکن وہ عورت تھی، اپنے بچوں کو دہشت زدہ نہ دیکھ سکی اور خود ان سے زیادہ دہشت زدہ ہو گئی۔ اس نے میر محمد کے منع کرنے کے باوجود ٹیپ تمھیں لا دیا۔ میر محمد نے صرف ایک بے وقوفی کی تھی۔ اس نے ٹیپ کو گھر میں رکھا تھا اور وہ بھی اپنے بیڈ کے نیچے اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ وہ منہ مانگا انعام وصول کیے بغیر ٹیپ ہمارے حوالے کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ وہ ٹیپ کو اگلے ہی دن پہنچا دیتا۔"

"ویری گڈ۔ کہانی اچھی سنائی تھی میر محمد نے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟" میں نے پہلی بار گفتگو میں دخل دیا۔ "کیا ہم نے اسے چھوڑ دیا اور اطمینان سے نیچے اتر گئے۔ یا جاتے جاتے ہم میاں بیوی کو ناک آؤٹ کر گئے کہ وہ شور نہ مچا سکیں اور کھڑکی سے کسی کو آواز نہ دے سکیں؟"

"نہیں، تم ایک بچے کو بطور ضمانت اپنے ساتھ لے گئے تھے۔" وہ بولا۔ "کہ اسے تھانے کے گیٹ پر ڈراپ کر دیا جائے گا۔ بچہ دس منٹ بعد واپس آیا اور اس نے دونوں دروازوں کی کنڈی باہر سے کھولی۔"

میں اور شیخ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ "کیا بچے نے یہ بھی کہا تھا کہ گاڑی لال رنگ کی تھی یا وہ فاکس ویگن کو

پہچانتا ہے۔ ایک ہوشیار پولیس افسر کا بیٹا ہے نا۔ اس نے تو نمبر بھی نوٹ کر لیا ہوگا۔"

"گاڑی یہاں روک دو۔" وہ بولا۔ میں نے تعمیل کی اور گاڑی کو اس ویران سڑک پر کھڑا کر دیا جہاں سے اس وقت کسی کے گزرنے کا امکان نہ تھا۔ "ہمیں یہیں انتظار کرنا ہے کچھ دیر۔"

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟" میں نے کہا۔

"بچے نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ میر محمد تمھیں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ تمھاری گاڑی تھانے کے گیٹ سے نکل رہی ہے۔ وہ گاڑی کو بھی پہچان گیا۔" اجنبی نے کہا۔

"مسٹر ایکس! پھر تم یہ ٹیپ لینے کے لیے میرے گھر کیوں نہیں آئے۔ حالانکہ میں اکیلا تھا اور تمھارا ایک آدمی رضوی صاحب کی کوٹھی کے گیٹ پر سنتری بنا کھڑا تھا۔" میں نے کہا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو سکندر! کہ ہم نے ایک نہیں چار آدمی بھیجے تھے اور انھیں اچھی طرح سمجھا بھی دیا تھا کہ انھیں ایک ٹیپ لانا ہے۔ ہم انھیں یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ ٹیپ کیسا ہے یا اس میں کون سی خطرناک بات ہے۔ اتنا ان کو یقیناً معلوم تھا کہ وہ ٹیپ ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور اس کا حاصل کرنا ہمارے لیے بے حد ضروری ہے۔ ان کو دس دس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا گیا تھا اور یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ اپنا کام اطمینان سے کریں، وہاں کوئی نہیں آئے گا لیکن تم سے ہوشیار رہیں۔ لیکن وہ ناتجربہ کار لوگ تھے اور اس بات سے بہت زیادہ پریشان تھے کہ انھیں ایک بہت بڑے پولیس افسر کے گھر میں گھس کر سارا کام کرنا ہے جس نے سخت حفاظتی انتظامات بھی کر رکھے ہیں۔ سنتری کو ہم نے خود ہی ہٹا دیا تھا مگر اندر کی انھیں کچھ خبر نہ تھی کہ وہاں کوئی خفیہ الارم نہ ہو یا کوئی کیمرہ وغیرہ پوشیدہ نہ ہو۔ یہ بات ہم نے ان پر بھی واضح کر دی تھی کہ چند روپوں کے ایک کیسٹ کو لانے کے لیے ہم چار افراد کو دس دس ہزار بے وجہ نہیں دے رہے ہیں۔ یہ کام آسان بہرحال نہیں ہے۔ انھیں گھر کی تلاشی لینی ہوگی اور پوری احتیاط کے ساتھ۔ وہ کیسٹ کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ کیسٹ ہمارے ہی کمرے میں ہوگا۔ ورنہ رالجہ کے کمرے میں۔ رضوی صاحب کا کمرہ اور گھر کے دوسرے حصے بعد میں دیکھے جائیں لیکن خانہ تلاشی کا ثبوت کہیں نہ چھوڑا جائے۔ انھیں اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ مار پیٹ اور توڑ پھوڑ سے گریز کریں اور ریوالور دکھا کے تمھیں بے بس کر دیں۔ مگر وہ جو بڑا دبنگ بنتا تھا اور ان کا سرغنہ بن کے گیا تھا انھیں کنٹرول نہ کر سکا۔ ایک تو تمھاری اشتعال انگیزی کے باعث بے قابو ہو گیا اور دوسرے نے تمھیں ٹھڈے مار کے بے ہوش کر دیا۔"

"اگر میں نے وہ دوسرا جوتا بھی پہن لیا ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔" میں نے کہا۔ "اگر کا لفظ تاریخ میں بھی بڑی گڑبڑ کا باعث رہا ہے۔ اگر نور جہاں نے وہ دوسرا کبوتر بھی نہ چھوڑا ہوتا جو جہانگیر نے اسے تھمایا تھا۔ اگر ایک سقے نے اپنی مشک سے شہنشاہ ہمایوں کی جان نہ بچائی ہوتی۔ وہ جوتا بھی میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میں اس کو فوراً نہ کھینچ مارتا اس کے سامنے کے دو دانت نہ ٹوٹتے۔ وہ مذاق نہ بنتا۔ اسے دانت ٹوٹنے کا غم نہ ہوتا اور وہ مشتعل ہو کے حملہ کرنے کی حماقت نہ کرتا تو اس کی پسلیاں ٹوٹنے کی نوبت نہ آتی۔ غالباً اس کے بعد وہ بدحواس ہو گئے۔"

"ہاں۔ پھر تو فوراً دوڑ کر باہر آ گیا کہ میرا کام ختم ہو گیا۔" وہ بولا۔ "باقی لوگوں نے بڑی عجلت میں تلاشی لی۔ ان میں سے ایک احمق نے اپنے باس کے حکم پر الماری کے تالے کو فائر کر کے کھول لیا تھا۔ جو انھیں بعد میں بازار سے لا کے لگانا پڑا تھا۔"

"مسٹر ایکس! کیا اس ٹیم میں شامل کرنے کے لیے کوئی ایسا آدمی نہیں ملا تھا جو تالے کھولنے کا ماہر ہوتا؟" میں نے کہا۔

"وہ پانچواں آدمی پہنچا ہی نہیں جس کا وہ ٹیک تھا۔ اسے پولیس بہت سے لوگوں کے ساتھ چوری کے ایک کیس میں تفتیش کے لیے اٹھا کر لے گئی تھی۔" وہ بولا۔ "باقی لوگوں نے واپس آ کے ناکامی کی رپورٹ دینا مناسب نہ سمجھا۔ انھیں یہ ڈر بھی تھا کہ ان کے دس دس ہزار مارے جائیں گے۔ وہ ایک کے بعد دوسری غلطی کرتے چلے گئے۔ انھوں نے ایک بریف کیس میں سے ایک ٹیپ بھی نکال لیا۔ وہ اسے ہی اصل سمجھے۔"

"کیوں؟ کیا انھوں نے اسے سن کر دیکھا تھا مسٹر ایکس؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ انھوں نے گھر کے ہی ایک کیسٹ پلیئر پر اسے سنا تھا۔" وہ بولا۔

"اس کا مطلب ہے وہ آوازیں پہچان گئے تھے۔ وہ ان لوگوں کو پہلے سے جانتے تھے جن کی آوازیں اس ٹیپ میں تھیں۔ وہ ناتجربہ کار تو تھے مگر اتنے احمق نہیں تھے۔" میں نے کہا۔ "وہ چودھری دلاور کی اور ڈی سلوا کی باتیں سن کے اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ یہی وہ خطرناک ٹیپ ہے۔ پھر یہ کہ وہ ایک فائل بھی لے گئے۔"

"فائل؟ کون سی فائل؟ وہ کوئی فائل وغیرہ لینے نہیں گئے تھے۔" وہ بولا۔ اس کے لہجے نے مجھے چکرا دیا۔ "وہ فائل پھر کہاں گئی؟"

"تم انھیں بتا دیتے کہ ٹیپ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "ایک یہ نئے کیسٹ والا ٹیپ اور دوسرے پرانا اسپول۔"

"یہ غلط فہمی تو اس اُلو کے پٹھے میر محمد نے پیدا کی تھی جو آخر

www.paksociety.com

تک صرف ٹیپ ٹیپ کہتا رہا۔"

"اسے اب گالی کیوں دیتے ہو جو مر چکا۔ اس نے تو تمہیں بھولنے کی غلط باتوں سے بے وقوف بنایا۔" میں نے کہا۔ "تم کو ٹیپ چاہیے تو یہ لو۔" میں نے گاڑی کا خانہ کھولا اور اسپول کو گتے کے ڈبے سمیت پیچھے بڑھا دیا۔ "لیکن کچھ باتیں میری بھی سن لو۔ معلوم نہیں ہم یہاں کس کا انتظار کر رہے ہیں اور کیوں۔ اور یہ انتظار کب تک جاری رہے گا۔ میری باتیں تمہاری سمجھ میں آ جائیں تو انھیں بھی بتا دینا جو سمجھتے ہیں کہ میری جان اس ٹیپ میں ہے۔ یہ پرانے الف لیلوی قصوں جیسی بات ہے کہ سمندر بیچ ایک جزیرہ ہے۔ جزیرے میں سات کوس پر ایک باغ ہے۔ باغ میں سونے کا ایک پنجرہ ہے اور اس پنجرے میں جو طوطا ہے اس میں کالے دیو کی جان ہے۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اس ٹیپ کو حاصل کرنے کی جدوجہد بھی فضول تھی۔ ایک جھوٹ تو میر محمد نے تم سے یہ بولا کہ ٹیپ ہم لے گئے تھے۔ ثبوت اگر دیکھنا ہو تو میر محمد کا فلیٹ جا کے دیکھو۔ اس کے دو دروازے زینے میں کھلتے ہیں مگر دونوں باہر سے بند نہیں ہو سکتے۔ ایک کی کنڈی ہی نہیں ہے باہر۔ اگر میر محمد کو ناک آؤٹ کیے بغیر فرار ہوتے تو صرف ایک دروازہ بند کر سکتے تھے۔ وہ دوسرے دروازے سے ہمارے پیچھے دوڑ کر آ سکتا تھا۔"

وہ خاموش رہا اور میں نے اندازہ لگایا کہ میری بات کا تھوڑا بہت اثر ضرور ہوا ہے۔

"دوسری بات زیادہ اہم ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے یہ ٹیپ اپنے خلاف ہونے والی محکمہ جاتی کارروائی سے بچنے کے لیے خود اکرام شیخ کو دیا تھا۔ اس بیان کے بعد جو اکرام شیخ نے عدالت میں دیا تھا۔ اس کے خلاف تفتیش ناگزیر تھی۔ خاص طور پر محرر کے اس بیان کی وجہ سے جو اس نے ٹیپ سے نقل کیا تھا۔ بے شک اب وہ تحریر بھی غائب ہے اور بیان پر عبداللہ کے دستخط بھی نہیں ہیں لیکن اس بات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ وہ تحریر محرر کی ہی ہے۔ اس کی تحریر کا نمونہ تو تھانے کے روزنامچے میں بھی ہے جب کہ بیان عدالت کے ریکارڈ پر ہے۔ عدالت قدرتی طور پر یہ سوال کرے گی کہ محرر کو بلاوجہ کسی مقتول سے ایک اعتراف جرم منسوب کر کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ شیخ کو بلاوجہ میر محمد پر ٹیپ کی چوری کا الزام عائد کرنے میں کیا فائدہ تھا؟"

"تم غلط کہتے ہو۔" وہ بولا۔ "میر محمد کو ٹیپ کے پانچ لاکھ مل چکے تھے۔ پانچ لاکھ اور ملنے تھے۔ اسے اندازہ تھا کہ بد عہدی اور غداری کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

"خمیازہ!" میں نے طنز سے ہنس کر کہا۔ "وہ بہت چالاک تھا

مسٹر ایکس! اس نے اکرام شیخ سے کہا تھا کہ وہ نادم ہے اور اس نے ایک درخواست کی تھی۔ شیخ کو دے کر کوئی شخص یہ ٹیپ تھانے میں چھوڑ گیا تھا۔ اگلی پیشی پر شیخ یہ بتا دے کہ گمشدہ ٹیپ مل گیا ہے۔ اس سے پہلے وہ اصل ٹیپ تمہارے حوالے کر کے تم سے باقی پانچ لاکھ وصول کر لیتا اور بعد میں معصوم بن جاتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ شیخ پہلے ہی ایک نقل بنا چکا ہے۔ اس کے گھر میں بھی ویسا ہی ٹیپ ریکارڈر ہے۔ یقین نہیں تو اس کے گھر جا کے دیکھ لو۔ ویسے بھی وہ نوکری پر لات مار کے ملک سے فرار ہونے کی سوچ رہا تھا۔"

"بکواس بند کرو۔ اب تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ ٹیپ دو ہیں!"

"افسوس کہ تم نے میر محمد کو مارنے میں بہت جلدی کی۔" میں نے کہا۔ "وہ زندہ ہوتا تو تم اس سے پوچھ سکتے تھے کہ اصل ٹیپ کس کمپنی کا بنایا ہوا تھا اور وہ تمہیں بتاتا کہ جو ٹیپ اس نے نکالا تھا 'بی اے ایس ایف' کا تھا۔ وہ ٹیپ ریکارڈر بھی جرمنی کا بنا ہوا تھا۔ اسپول ٹیپ بھی جرمن تھا۔ اب اس ٹیپ پر غور کرو مسٹر ایکس! یہ جاپانی ہے۔ اکائی آف جاپان۔ فرق صاف ظاہر ہے لیکن تمہارے پاس تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔"

"اور وہ اصل کیا نام لیا تھا تم نے بی اے ایس...؟"

میری بات نے اسے چکرا دیا تھا۔

"بی اے ایس ایف۔" میں نے اس کی جہالت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اس کی بیوی کے پاس لے جاؤ گے۔ تو وہ دونوں کے ڈبے دیکھ کر فرق بتا دے گی۔"

"اس کو تو ہم نے میر محمد کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا ساری خرابی کی ذمے دار وہ تھی۔ اس نے ہماری آنکھوں میں دھول جھونکی تھی۔" وہ مشتعل ہو کے بولا۔

"اور میر محمد، وہ کچھ نہیں بولا تھا اس ظلم کے باوجود؟"

"ہم نے اسے ایک ہی دفعہ میں نہیں مار دیا تھا۔" وہ بولا۔ "ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے ختم کیا تھا۔ میر محمد کے سامنے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا کہ میر پاگل ہو گیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اپنی بیوی کو گالیاں دیتا رہا اور اسے کہتا رہا کہ ٹیپ کے متعلق بتا دے مگر اس نے شوہر کی بھی نہیں مانی اور بڑے عذاب کے ساتھ مرنا منظور کر لیا۔ کسی کو بھی امید نہیں تھی کہ ایک عورت ایسی قوت کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔"

عورت؟ میں نے سوچا۔ وہ عورت نہیں ماں تھی۔ اس کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنی جان بچا لیتی اور اپنی ممتا کا خون کر دیتی۔ اپنے بچوں کو ان خونی درندوں کے حوالے کر دیتی۔ ماں کے مقدس رشتے کی آبرو گنوا دیتی۔

"جلد بازی کا نتیجہ ہمیشہ برا ہوتا ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا

"اب تمہیں کون بتائے گا کہ اصل ٹیپ کہاں ہے؟ تم تو میر محمد کو بھی قتل کر چکے ہو مسٹر ایکس!"

"اس نے دیوانگی میں ہم پر حملہ کیا تھا۔" وہ بولا۔

"اور تم میں سے کس نے اسے گولی مار دی؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ ہم نے اسے ذبح کر دیا۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"گویا وہ لاش میر محمد کی ہے جس کا نہ سر ہے نہ ہاتھ ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور جو ابھی قبر سے نکلی ہے۔"

"وہ قبر نہیں تھی، چوہے دان تھا جس میں تم دونوں پھنس گئے ہو۔" وہ بولا۔

"مجھے فون کرنے والے تم ہی تھے نا؟" شیخ نے اچانک کہا۔ "آواز بدلی ہوئی تھی لیکن تمہارا لہجہ وہی ہے۔"

وہ ہنسا۔ "کیسی تھی وہ کہانی جو ہم نے سنائی تھی۔ جب میں اور میرے ساتھی بوری پھینکنے گئے تھے تو وہاں سے کوئی آلو کا پٹھا موٹر سائیکل والا نہیں گزر رہا تھا۔ ہمیں معلوم تھا تم تجسس اور فرض شناسی کے چکر میں وہاں ضرور آؤ گے۔"

"تم اس ڈرامے کے ہدایت کار نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "ایک معمولی اداکار ہو۔ خود کو یہ کریڈٹ مت دو کہ..."

"یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میں نہ آتا۔" شیخ نے کہا۔ "ایک حماقت تم نے بھی کی تھی یعنی پہلے لاش کو گڑھے میں پھینک دیا تھا اور پھر اس کو کچھ دور لے جا کر دفن کیا تھا۔"

"یہ صرف اس لیے تھا کہ تم نہ آؤ تو کم سے کم میر محمد کی گمشدگی کا راز فاش نہ ہو۔" وہ بولا۔ "بعد میں کسی نے کہا تھا کہ ایک پولیس افسر کی لاش سے بہت ہلچل پیدا ہو گی۔ اسے ناقابل شناخت بنا دو۔ تم نہ آئے تو کوئی بات نہیں اور آ گئے تو کھود کر کیا نکالو گے۔ محض ایک جسم، نامکمل اور بے جان، جو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے گا۔ تمہاری ذہانت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات یقینی تھی کہ تم نشانات سے اصل مدفن تک پہنچ جاؤ گے۔"

"ہم یہاں کب تک مذاکرات کرتے رہیں گے؟" میں نے کہا۔ "جبکہ منشور کا اعلامیہ جاری ہونے کے امکانات بھی ہیں اور ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم سب کا انجام کیا ہو گا۔"

"تمہیں میرے انجام کی فکر کیوں ہے؟" وہ چڑ کر بولا۔

"اس لیے کہ تم بھی محض ایک مہرے ہو، پیدل، گھوڑے یا فیل بھی نہیں۔ تمہارا پٹنا بھی یقینی ہے۔"

"تم بولے بغیر نہیں رہ سکتے۔" وہ بولا۔ "یا تم مجھے بھی مشتعل کرنے کا حربہ آزما کے شکار کرنا چاہتے ہو؟"

"میں ایک سگریٹ تو پی سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "تمہاری اجازت ہے؟"

"اس بہانے اپنی پھرتی اور چالاکی مت دکھانا۔ مجھے حکم ہے کہ تم سے کوئی سروکار نہ رکھوں بلکہ پوری کوشش کروں کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔" وہ بولا۔ "وہ لوگ صرف شیخ صاحب کو لینے آئیں گے۔"

"بیٹھے بیٹھے تو میرا سارا جسم اکڑ گیا ہے۔" میں نے ہاتھ اٹھا کے انگڑائی لی اور ہاتھ نیچے لاتے ہوئے تھوڑا سا بیک ویو مرر کو گھما دیا۔ بیک ویو مرر گھوم کر پیچھے والی سیٹ کا منظر پیش کرنے لگا۔ پھر میں نے سگریٹ جلائی۔

میرا دل اچھل کر میرے سینے سے ٹکرایا اور میرا سانس رک گیا۔ پیچھے کی سیٹ پر میر محمد بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی کھلی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ لائٹر کی مدھم روشنی میں بھی اس کی صورت کے نقوش بالکل واضح تھے۔ اس صورت کو شناخت کرنے میں میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ یہ وہی میر محمد تھا جس نے بہت کوشش کی تھی کہ پھانسی کا پھندا میرے گلے میں فٹ ہو جائے۔

فرق صرف اتنا تھا کہ میری نظر کے سامنے صرف میر محمد کا چہرہ تھا۔ باقی دھڑ نہیں تھا۔ باقی دھڑ بہت پیچھے اس وقت بھی فرش خاک پر داستان عبرت بنا پڑا تھا۔ یہ صرف سر تھا گردن سے اوپر کا وہ حصہ جو لاش کے تن سے جدا کر دیا گیا تھا۔

آہستہ آہستہ میں نے اپنے رکے ہوئے سانس کو خارج کیا اور پھونک مار کے لائٹر کو آف کر دیا حالانکہ میرا اس پر سے انگوٹھا ہٹا لینا ہی اس کے شعلے کو دبا دینے کے لیے کافی تھا۔ میں نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور دھواں خارج کرتے ہوئے ایک بار پھر بیک ویو مرر میں دیکھا۔

شیخ نے یقیناً میری حالت میں رونما ہونے والے تغیر کو نوٹ کر لیا تھا۔

"تم نے مجھے سگریٹ نہیں دی۔" وہ بولا۔ "سگریٹ پینے کے ادب آداب سب بھول گئے؟"

ناول سیریز
مسٹر چکرم

www.paksociety.com

"سوری۔" میں نے چونک کر کہا۔ "پہلے ان سے تو اجازت لے لو۔ ہمارے جیلر صاحب سے۔"

"مسٹر ایکس! کیا میں بھی سگریٹ لے سکتا ہوں؟" شیخ نے کہا۔

"لے لو۔ اور ہو سکے تو ایک مجھے بھی دے دو۔" اس نے بڑی شان استغنا سے کہا۔

میں نے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کے شیخ کی طرف بڑھائی اور اپنے لائٹر سے جلائی۔ امید کی ایک کرن پل بھر کے لیے روشن ہوئی۔ میں نے سگریٹ اور لائٹر دونوں ۔۔۔ مڑ کر دیکھے بغیر پیچھے بڑھا دیے۔

حسب توقع اس نے ایک ہاتھ سے ریوالور تھامے رکھا اور سگریٹ کا پیکٹ لینے کے لیے دوسرا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "معلوم نہیں یار شیخ! اسلام آباد کی صورت حال کیا ہے۔" میں نے ایک بے مقصد بات کی اور بظاہر غیر ارادی طور پر میرا وہ ہاتھ پیچھے ہو گیا جو سگریٹ اور لائٹر اپنے شانے کے پیچھے پکڑانے کے لیے آگے بڑھا ہوا تھا۔ یہ ایک بے مقصد سی بات تھی جس کا ہماری موجودہ صورت حال سے ذرا بھی تعلق نہیں تھا۔ مسٹر ایکس نے ہاتھ اور آگے بڑھا کے دونوں چیزیں لے لیں۔

مشکل یہ تھی کہ وہ عین اکرام شیخ کے پیچھے تھا چنانچہ مجھے بیک ویو مرر میں نظر نہیں آتا تھا۔ بالکل دوسرے کنارے پر میرے پیچھے میر محمد کا سر سیٹ پر لڑھکا ہوا تھا۔ کہیں نگاہ اٹھا کے دیکھتا تھا تو اس کی آنکھیں مجھے گھورنے لگتی تھیں۔ بیک ویو مرر کا زاویہ جس میں پیچھے کی سڑک اور ٹریفک نظر آتی تھی میرا ہاتھ لگنے سے ایسے زاویے پر آ گیا تھا جسے درست کرنا اب مشکل تھا۔ چاہتا میں یہی تھا کہ اس آئینے میں اپنے دشمن کا چہرہ دیکھوں مگر میرا ہاتھ ایسے لگا کہ آئینہ دوسری سمت میں گھوم گیا۔

اس نے دائیں ہاتھ میں ریوالور پر گرفت مضبوط رکھی۔ پیکٹ کو گود میں رکھ کے اس نے بائیں ہاتھ کی مدد سے ایک سگریٹ نکال کے لبوں میں دبائی اور پھر بائیں ہاتھ سے ہی لائٹر کو دبا کے روشن کیا۔

"یہ لوگ تمہیں کہاں لے جائیں گے شیخ؟" میں نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔ "ٹیپ تو مل گیا ہے ان کو۔" بظاہر میں پیچھے کی طرف بالکل متوجہ نہ تھا لیکن درحقیقت میری تمام توجہ پیچھے تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر مجھے واپس دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا چکا ہے۔ میں نے بات شیخ سے جاری رکھی اور ہاتھ کو تھوڑا سا پیچھے کیا۔ اس نے اپنا ہاتھ تھوڑا سا اور آگے بڑھایا تاکہ دونوں چیزیں میرے ہاتھ تک پہنچ جائیں۔ اچانک میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ تقریباً میرے کندھے کے پاس ہے۔

وہ لمحہ بہت مختصر تھا جب میں ہاتھ پکڑ کے ایک جھٹکے میں اسے آگے لا سکتا تھا اور اسی وقت دونوں ہاتھوں کی قوت سے ریوالور اٹھا کر پیروں کو سمیٹتے ہوئے اس خالی جگہ سے گزر سکتا تھا جو سیٹ اور فاکس ویگن کی چھت کے درمیان تھی۔ وہ جھٹکے سے آگے آتا اور اس کا سر اپنے مقابل سیٹ کی پشت سے ٹکراتا اور وہ اسے جھٹکا جاتا کہ میں اس کے اوپر جا گرتا۔

لیکن یہ بات مفروضی تھی کہ اس کے ریوالور سے ایک گولی بھی نہ نکلے گی۔ جب اس کا توازن بگڑے گا تو ریوالور کا رخ جانے کدھر ہو گا۔ کس حد تک یہ حملہ ہوتے ہی اس کا ذہنی ردعمل کسی خودکار مشین کی طرح ہو گا۔ اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ کی گرفت میں محسوس کرتے ہی وہ فائر کرے گا اور اس لمحے کے ایک مختصر ترین حصے میں جب میں اچانک اس پر حملہ کروں گا وہ آگے آ رہا ہو گا اور میں اس کو زیر کرنے کے لیے پیچھے کی طرف چھلانگ لگا دوں گا مگر ابھی اتنا ہی وقت گزرا ہو گا کہ میں اوپر اٹھ جاؤں۔ وہ فائر کر چکا ہو گا۔ اس وقت ریوالور سے نکلنے والی گولی کہاں جائے گی؟

میرا اندازہ یہ تھا کہ ریوالور کا رخ اس وقت اکرام شیخ کے سر کی طرف ہے۔ دشمن کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ میں جو بڑے پرسکون طریقے پر حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے تسلیم کر چکا ہوں کہ دشمن زبردست ہے اور مقابلہ بے سود ہے، یکلخت اپنی بے ضرر گفتگو کو منقطع کر کے اور جملہ ادھورا چھوڑ کے اس پر حملہ کرنے والا ہوں۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ جب فائر ہو گا تو ریوالور کا منہ اوپر کے بجائے کچھ نیچے ہو جائے گا لیکن ریوالور اکرام شیخ کے بالکل پیچھے بہت قریب تھا۔ تھوڑا نیچا ہونے کے باوجود ریوالور کی گولی اس کو کہیں بھی لگ سکتی تھی گردن میں، اس سے نیچے ریڑھ کی ہڈی میں، شانے سے کچھ نیچے بائیں طرف سے دل میں۔ بہرصورت یہ گولی مہلک ثابت ہوتی۔ میری بہادری کا انعام یہ ہوتا کہ میں نے اکرام شیخ کو مروا دیا۔ بالواسطہ نہ سہی بلاواسطہ طور پر میں اس کے قتل کا ذمے دار ہوتا۔

ہاں اگر ریوالور اتنا جھک جاتا کہ گولی سیٹ کے نیچے فرش پر لگے یا سو فیصد امکانات کی صورت میں ہاتھ کے اوپر اٹھنے سے چھت پھاڑ کے نکل جاتی تو میں اس دشمن کو مغلوب کر سکتا ہوں جسے اپنی طاقت پر نہیں اس چھوٹے سے آتشیں اور ہلاکت خیز کھلونے پر بھروسہ تھا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اس سے زیادہ اعتماد مجھے اپنے خالی ہاتھوں کی قوت پر ہے لیکن میں مجبور ہوں، اس لیے کہ خطرہ میری جان کو نہیں، میرے دوست اکرام شیخ کی زندگی کو تھا۔

چنانچہ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ وقت کم ہے اور مجھے کوئی

موقع نہیں ملے گا، میں نے اس فیصلہ کن لمحے کو مایوس لوٹا دیا اور سگریٹ لائٹر لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ میں نے بزدلی اور کم ہمتی کے احساس سے مفاہمت کر لی لیکن ایک اچھے دوست اور اچھے آدمی کے بے گناہ خون کے چھینٹوں سے اپنا دامن بچا لیا۔

"تم ٹاپ۔ مین تو نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن استاد پینڈو کی طرح اوپر والوں کے معتمد خاص ضرور ہو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ مجھے چھوڑنے اور شیخ کو ساتھ لے جانے میں کیا مصلحت ہے؟"

"میں جواب دینے کا پابند تو نہیں۔" مجھ سے معتمد خاص کا خطاب پا کے اس کی خودی کچھ بلند ہو گئی تھی۔ "لیکن بتا دینے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتا۔ سب انسپکٹر شیخ کو ہم بطور ضمانت لے جائیں گے۔ صرف تصدیق کے لیے کہ تم نے ہمیں خالی ٹیپ تو نہیں تھما دیا ہے۔ یہاں تو کوئی صورت نہیں اس کو سننے کی۔ اس کے لیے وہ ہماری بیئر کم ٹیپ ریکارڈر چاہیے۔ اگر ٹیپ ٹھیک ہوا تو شیخ صاحب کو چھوڑ دیا جائے گا لیکن یہ پہلے کی بات تھی جب ہمارا خیال تھا کہ ٹیپ ایک ہی ہے۔ تم نے دوسرے ٹیپ کی موجودگی کا ذکر کر کے حالات کو غیر یقینی بنا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے اب مسٹر شیخ کو اس وقت تک رکھا جائے جب تک دوسرا ٹیپ بھی نہ مل جائے جو اصل ہے۔"

"مگر وہ دوسرا ٹیپ ہمارے پاس تو نہیں ہے جو اصل ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو۔ کیا یہ جھوٹ نہیں ہو سکتا؟" وہ بولا۔

"ہو سکتا ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اصل ٹیپ سے صرف ایک ہی کاپی نہ بنائی گئی ہو۔ دو یا دس کاپیاں بنا لی گئی ہوں اب تک ایک کاپی ہمارے پاس تھی تمہیں کیا معلوم ہم نے اس کاپی سے کتنی کاپیاں اور بنا لی ہیں۔ جس ثبوت کو تم مٹانا چاہتے تھے وہ صرف ایک کاپی لے جانے سے تو ختم نہیں ہو گا۔"

"اب کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔" وہ لاجواب ہو کے بولا۔ "اس کا فیصلہ وہی کریں گے جو ٹاپ مین ہیں۔"

پھر ایک ایسی بات ہوئی جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ فاکس ویگن دو دروازوں والی کار ہے اور یہ دونوں دروازے آگے ہوتے ہیں۔ ان کو کھولنے والے ہینڈل بھی آگے ہی ہوتے ہیں مگر اکرام شیخ اگر نکلنا چاہتا تو اسے بائیں ہاتھ سے پیچھے کا ہینڈل کو اوپر کرنا پڑتا اور پھر اس کے دروازے کو شانے سے یا ہاتھ سے دھکا دینا پڑتا۔ اس کے بعد بھی باہر نکلنا اقدام خودکشی کے مترادف ہوتا۔ وہ سیٹ پر سے لڑھک جاتا تب بھی کھلے دروازے کے فٹ بورڈ کے قریب زمین پر گرتا اور اتنی دیر میں دشمن اس کو یقیناً شوٹ کر دیتا۔

یہ گولی اکرام شیخ کے کہیں بھی لگ سکتی تھی۔ باہر نکلنے سے پہلے یا زمین پر گرنے کے بعد۔ دشمن جو پوری طرح تیار بیٹھا تھا اطمینان سے اس کا نشانہ لے سکتا تھا چنانچہ میرا خیال تھا کہ اکرام شیخ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا مگر جس طرح میرا ذہن مسلسل مصروف عمل تھا شیخ بھی خالی نہیں بیٹھا تھا۔ اس نے میری صورت کے تاثرات سے میرے لہجے کی مایوسی سے یا اپنی چھٹی حس سے جس کو ہم ٹیلی پیتھی بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ہم ایک جیسی صورت حال سے دوچار تھے اور ہمارے ذہن اس لیے ہم آہنگ تھے کہ ہم ایک ہی مسئلے پر ساری توانائی صرف کر رہے تھے۔ یہ اندازہ کر لیا کہ میں نے کچھ سوچا تھا اور ناقابل عمل سمجھ کے اس پر عمل نہیں کیا۔

پھر اس نے طے کیا کہ اب میری باری ہے۔ سکندر کم ہمت نہیں ہے اور اس نے خطرہ مول نہیں لیا۔ تو شاید میری وجہ سے کیونکہ ریوالور کی زد پر میں ہوں۔" اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد شیخ نے عملی قدم اٹھایا۔

میں نے تو صرف ہلکا سا کھٹکا سنا تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں یا اس سے بھی کم حصے میں میں نے سمجھ لیا کہ شیخ اپنی جان پر کھیلنے کا فیصلہ کر چکا ہے اور دروازہ کھول کے باہر گرنے والا ہے۔ یہ کھٹکا اس سوئچ کے کھٹکے کی طرح تھا جس سے کوئی برقی نظام فعال ہو جائے۔ کوئی مشینی کارخانہ چل پڑے یا دو تاروں کے ملنے سے ڈائنامائٹ کا دھماکا ہو جائے۔ بیک وقت میں نے نتائج کی پروا کیے بغیر پیچھے چھلانگ لگائی۔ شیخ کو باہر گرتے دیکھا اور فائر کی آواز سنی۔

ریوالور کا رخ باہر کی طرف تھا اور دشمن کی تمام توجہ اس شخص کی طرف تھی جسے وہ گرفتار کر کے ساتھ لے جانے پر مامور تھا۔ چنانچہ میرے لیے کوئی خطرہ نہ تھا۔ دوسرے لمحے میں اس کے اوپر تھا اور وہ میرے نیچے۔

میں نے اس کا سر ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ آگے اور پیچھے والی سیٹ کے درمیان گھسیٹ دیا۔ وہ دوہرا ہو گیا۔ کیونکہ اس کے پیر پہلے ہی فرش پر تھے۔ میں مشتعل نہیں تھا اس لیے میں نے پوری احتیاط کے ساتھ اور متوازن قوت کے ساتھ اس کے کان کے پیچھے وار کیا۔ اس کا تمام شور و غوغا ختم ہو گیا اور وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کے ایک جھٹکے سے اٹھایا اور اسے کھینچ کر سیٹ پر ڈال دیا پھر میں نے اگلی سیٹ کو دھکیلا اور جگہ پیدا ہوتے ہی باہر نکل گیا۔

"شیخ!" میں نے زور سے پکارا اور ادھر ادھر دیکھا۔ وہ گاڑی کے پیچھے سے نکلا۔ اسے زندہ سلامت پا کے مجھے خوشی ہوئی۔

www.paksociety.com

"تم نے بڑی حماقت کی تھی۔ مر جاتے تو یہ بہادری نہیں، خودکشی کہلاتی۔" میں نے کہا۔

"ارے یار! مرنا تو ایک ہی بار ہے۔" وہ بولا۔

"اور ٹیپو سلطان کا قول ہے کہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر شیخ جی! وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کر رہا تھا۔ اس کی لڑائی بدمعاشوں سے نہیں تھی اور وہ میسور کا حکمران تھا، پولیس کا سب انسپکٹر نہیں تھا۔ یہ بتا کہیں چوٹ تو نہیں آئی ہے؟"

"چوٹ تو نہیں آئی۔" وہ بولا۔ "ایک زخم آیا ہے گولی سے۔" پھر وہ ایک قدم آگے بڑھا تو میں نے اسے لنگڑاتے دیکھا۔ گولی اس کی بائیں ٹانگ میں لگی تھی۔

"کہاں لگی ہے گولی؟" میں نے اسے سہارا دے کر کہا۔ "تو چل سکتا ہے نا یا میں اٹھا لوں۔"

"میں چل سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "گولی پنڈلی میں لگی ہے، بس ہڈی نہیں ٹوٹی۔"

"اس کار کو یہیں چھوڑ کے ذرا دور سے دیکھتے ہیں کہ ادھر کون آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک منٹ ٹھہر جا۔ پہلے میں ذرا اپنی حفاظت کا انتظام بھی کر لوں۔ تیرے پاس تو ایک ریوالور ہے نا؟ اس سے مجھے کور کر۔"

میں اسے چھوڑ کے واپس فاکس ویگن میں گھسا اور اس شخص کو دیکھا جو پچھلی سیٹ پر ترچھا پڑا تھا۔ اس طرح کہ اس کے اور میر محمد کے سر کے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک سیاہ نقاب سی تھی جو اتار کر دیکھنے پر عام کپڑے کا سیاہ تھیلا ثابت ہوا۔ اس میں سامنے سے دیکھنے کے لیے دو سوراخ بنا دیے گئے تھے۔

میں نے اگلی سیٹ پر دیکھا مگر شیخ کی ٹارچ سیٹ پر نہیں تھی۔ فاکس ویگن کے ڈیش بورڈ پر کچھ رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ ٹارچ اس نے اپنی گود میں ہی رکھی ہوگی اور جب اس نے باہر چھلانگ لگائی تھی تو شاید نیچے جا گری ہوگی۔ میں نے جھک کے دیکھا۔ ٹارچ دونوں اگلی سیٹوں کے درمیان پڑی تھی۔

ٹارچ کی روشنی میں اس کا چہرہ سیدھا کر کے دیکھتے ہی میں چونکا سا گیا۔ یہ پیڈرو تھا۔ اس کے کانوں میں بندیاں بدستور موجود تھیں اور ویسے بھی اس سے میرا اتنا سابقہ پڑ چکا تھا کہ اب اسے میں دور سے بھی شناخت کر سکتا تھا۔

اس نے کالے رنگ کی ٹائٹ فٹ پینٹ اور ویسی ہی رنگ کی جسم سے چپکی ہوئی جرسی پہن رکھی تھی۔ چنانچہ وہ غور سے دیکھے بغیر اندھیرے میں کیسے نظر آتا۔ حیرت کا ایک لمحہ گزر گیا تو اس کی جگہ مسرت نے لے لی۔

"بیٹے جی شیخ!" میں نے بے اختیار ایک نعرہ بلند کیا۔ "اب دیکھو ہم نے تو ایک شکاری کو گرفتار کر لیا ہے۔"

"کون شکاری؟" شیخ نے قریب آ کے کہا۔

"واہ بیٹا!" میں نے شیخ کی بات کا جواب دینے کے بجائے بے ہوش استاد پیڈرو کو مخاطب کیا۔ "کہاں جا کے قابو آیا ہے۔ اب تو تیرا باپ بھی بتائے گا کہ شرافت علی کو میں نے قتل کیا تھا یا تو نے؟"

شیخ نے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔ "پاگل ہو گیا ہے کیا؟" اس کی آواز میں وحشت تھی اور اس وحشت کی وجہ بھی ظاہر تھی۔ اس نے میر محمد کا کٹا ہوا سر دیکھ لیا تھا۔ "کس سے باتیں کر رہا ہے؟"

"سوری یار!" میں نے کہا۔ "یہ استاد پیڈرو ہے جو بہت سے مصائب کے علاوہ میر شرافت علی کا اصل قاتل ہے۔ اس کا سر میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ بیک ویو مرر میں۔ لیکن یہ خاموش رہا۔"

"اس سر کو یہاں رکھنے کا مقصد؟" شیخ نے سوچ کر کہا۔

"غالباً دشمن یہ چاہتے تھے کہ وہ مجھے ٹیپ کیسٹ لے جانے دیں۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے جانے دیں۔ ظاہر ہے اس کے بعد پیچھے نہ دیکھتا اور تیرے اغوا کی رپورٹ لے کر سیدھا تھانے جاتا تو یہ سر میرے ساتھ تھانے پہنچتا۔ میری اور اس کی دشمنی پہلے سے چل رہی ہے اور میں نے برملا اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ تھانے میں پہنچنے کے بعد یہ دریافت ہوتا کہ میں ایس ایچ او صاحب کا سر بمع خود اتنی دیدہ دلیری کے ساتھ لیے پھر رہا ہوں تو مجھ سے پوچھا جاتا کہ سکندر اعظم ایاز ایس ایچ او صاحب کہاں ہیں؟ اور میں آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے بتا دیتا کہ اس سر کا باقی حصہ فلاں جگہ برآمد ہونے والے جسم سے جوڑ کر دیکھو تو وہ کہتے کہ آنکھوں میں دھول جھونکتے ہو۔ وہ بے سر کی لاش تو مسٹر ایکس یا ایمانداد ولد خیرا خان کی ہے۔ میر محمد کی لاش کہاں ہے؟"

"ایسے مفروضات نہیں چلتے۔ پوسٹ مارٹم سے معلوم ہو جاتا کہ سر اسی لاش کا ہے۔" شیخ نے کہا۔

"یار تم غیر عملی باتیں کرتے ہو۔" میں نے جھلا کر کہا۔ "جب قبر سے لاش غائب ہو سکتی ہے، اسپتال میں ڈاکٹروں، نرسوں، پولیس اور چوکیدار کی موجودگی میں ایک زندہ مدعی کو بیچ جانے والے کو زہر دیا جا سکتا ہے تو کیا اسپتال میں پڑی ہوئی درجنوں لاشوں میں سے ایک غائب نہیں کی جا سکتی یا اس کی جگہ دوسری لاش نہیں رکھی جا سکتی۔ تم نے مردہ خانے تو دیکھے ہوں گے اور وہاں کی حالت زار اور بدانتظامی بھی دیکھی ہوگی۔ جمعدار تک ...

کے اس ٹرانزٹ کیمپ کا سب کچھ ہوتا ہے۔ آئی اے آئی۔ وہ بھی اپنی دھونس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے یہ دھاندلی اس کے لیے ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ہر جگہ دشمن کا راج ہے۔ دشمن سماج کے لیے تو مردہ تو مردہ ہے۔ ادھر سے ادھر رکھنے یا اس کا ٹیپ بدلنے سے جیب میں سو سو کے دس بیس نوٹ آ جاتے ہیں تو کسی کا نقصان نہیں۔ الف کے وارثوں نے جیم کے مردے کو دفنا دیا اور جیم کے وارثوں نے الف کے مردے کو تو کون سا غضب ہو گیا۔ دفن تو دونوں ہو گئے اور قیامت آئے گی تو اٹھیں گے بھی ساتھ ساتھ۔ تم خود کو تو اس سر اور اس جسم کے اسپتال پہنچنے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ ملنے تک بڑے مرحلے ہیں اور گھپلا کہیں بھی کیا جا سکتا ہے جس سے حسب منشا رپورٹ حاصل ہو جائے۔ میں کیا بتاتا کہ سر سے پہلے میر محمد کیا ہوا؟ پھر ایک اور بھی غور طلب بات ہے۔ لاش کے بارے میں ابتدائی رپورٹ غلط تھی۔ جھوٹ بول کر ہمیں ایک جگہ بلایا گیا تھا اور شک ہونے کے باوجود ہم نے قبل از وقت کسی سے بات نہیں کی تھی۔ ایک دوسرے سے بھی نہیں لیکن پتا چلانے ہم دونوں ہی آئے تھے۔ کیا یہ نہ کہا جاتا کہ ہم دونوں پہلے میر محمد کو کاٹ گئے پھر لاش برآمد کرنے کے لیے پولیس کی نفری کے ساتھ پہنچے۔ بالکل انجان بن کے۔ میں یہ کیسے ثابت کرتا کہ اکرام شیخ کو واقعی گن پوائنٹ پر اغوا کیا گیا ہے۔ جب تو یہاں ہو کے واپس پہنچتا تو یہی ثابت ہوتا کہ اغوا بھی ڈراما تھا۔ اکرام شیخ اپنی مرضی سے غائب ہوا اور پھر مناسب وقت پر لوٹ آیا۔ یعنی اس وقت جب میں رپورٹ لکھوا چکا تھا۔ میر محمد کے سر کو ہم نے کہیں اور پھینکنے یا گاڑنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن بدحواسی یا شامت اعمال کے باعث بھول گئے۔"

"یہ تو بڑی خطرناک سازش تھی جس سے ہم بال بال بچ گئے۔" شیخ نے قائل ہو کے کہا۔

"بس تیری ٹانگ میں گولی کا ایک زخم آیا۔ مجھ پہ ایک اور قتل کا الزام نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "اور ہمارے ہاتھ وہ شخص لگ گیا جس کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت تھی۔"

"پھر اب کیا سوچا ہے؟" شیخ نے کہا۔ "میری ٹانگ میں تکلیف ہو رہی ہے۔ رومال تو باندھ لیا تھا میں نے پیچھے جا کر۔"

"یہاں سے کچھ دور مورچہ قائم کرتے ہیں۔" میں نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔ "اور دیکھتے ہیں کون آتا ہے۔"

میں اسے کچھ دور لے گیا اور ہم ایک جھاڑی کے پیچھے اس طرح بیٹھ گئے کہ ہماری گاڑی صاف نظر آتی رہے۔ ایک دروازہ مقفل تھا اور اگر ہوش میں آنے کے بعد جس کا کوئی امکان نہ تھا، پیڈرو دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو اس کے ریوالور کی ایک گولی اس کا راستہ روکنے کے لیے کافی ہوتی۔

"ہمیں یہاں ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "آخر وہ لوگ آئے کیوں نہیں؟"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "بے شک ہماری واپسی کا کوئی وقت متعین نہیں تھا لیکن پیڈرو کے ساتھی کچھ دور رہ کر انتظار کر رہے تھے۔ مثلاً اسی جگہ اور نگران کا خیال واقعی میں اس وقت پہنچنے کا تھا جب پیڈرو ہمیں لے کر یہاں پہنچ جائے تب بھی ایک گھنٹے کا فرق؟ چہ معنی دارد۔ کیا وہ پندرہ منٹ پہلے یا پانچ دس منٹ بعد نہیں آ سکتے تھے؟"

"ورنہ اس ایک گھنٹے میں چکر لگا کے تو دیکھ سکتے تھے کہ پیڈرو اپنے آمیروں کو لے آیا ہے یا نہیں۔ ہمیں کیا معلوم وہ کس قسم کی گاڑی میں آئیں گے۔ وہ احتیاطاً ظاہر یہ کر سکتے تھے کہ ایک مرتبہ سیدھے گزر جاتے اور مطمئن ہو جانے کے بعد لوٹ آتے۔" شیخ نے کہا۔

"ادھر تو کوئی گاڑی ہی نہیں آئی۔"

"کچھ دیر میں صبح ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا ہو؟" شیخ بولا۔ "یا ان کی گاڑی خراب ہو گئی ہو؟"

www.paksociety.com

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اب کچھ اور سوچ رہا ہوں شیخ!"

میں نے کہا۔ "جب کوئی بڑی مقصود ہو جائے اور اس کے دفاع کی کوئی صورت نہ رہے تو اسے دشمنوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ گھوڑا بیمار یا لنگڑا ہو جائے تو اسے گولی مار دیتے ہیں اور جس گھر کی مخدوش حالت سے دوسروں کو خطرہ لاحق ہو اسے گرا دیا جاتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" اکرام شیخ نے کراہ کے کہا۔ "آپ سیدھی صاف بات کریں تو میری ناقص عقل میں آئے گی۔"

"شیخ جی!" میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "شروع سے اب تک استاد پیڈرو نمایاں رہا ہے۔ ہر جگہ اس کا نام آیا ہے اور وہ کئی بار نظر آ چکا ہے۔ میرے اور رمی کے علاوہ بھی اسے بہت سے لوگ پہچانتے ہیں۔ اس کی پوزیشن ایک ایسی قابل اعتماد لڑکی کی سی ہے جو کارکردگی کے اعتبار سے بہترین ہو، سیکڑوں بار سمندر میں سفر کر چکی ہو اور مالکوں کو لاکھوں کروڑوں کا فائدہ پہنچا چکی ہو۔ ابھی مزید کئی سال چل سکتی ہو اور مالکوں کو اتنا ہی فائدہ اور پہنچا سکتی ہو مگر پولیس کی نظر میں آ گئی ہو۔ کیا یہ لانچ اپنی جان کے صدقے میں پولیس کے سپرد کر دینا عقلمندی نہیں۔ اسے آخری سفر پر یوں روانہ کیا جائے کہ معلوم ہو یہ بھی ایک کاروباری پھیرا ہے اور پولیس کو موقع دیا جائے کہ وہ تعاقب کر کے اسے پکڑ لے۔"

"تمہارا مطلب ہے اب وہ خود پیڈرو کو پولیس کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں؟" شیخ نے کہا۔

"غالباً۔ لیکن بیچارے استاد پیڈرو کو یہ بات نہیں معلوم۔ وہ اس یقین کے ساتھ آیا تھا کہ یہ بھی حسب سابق ایک ایسی اہم خدمت تھی جس کے لائق کوئی اور نہ تھا۔ ذرا سوچو کر دن کا اجالا پھیل جانے کے بعد وہ ہمیں کیسے قابو میں رکھتا۔ اسے حکم تھا کہ مجھے گودی تک پہنچے۔ تمہیں بحفاظت لایا جائے اور وہ بھی بطور ضمانت صرف تصدیق کے لیے۔ دن چڑھنے سے پہلے وہ کیسے بھاگ کر ہم اسے بھاگنے دیتے؟ ایک صورت یہی رہ جاتی تھی کہ وہ ہم دونوں کو مار کے نکل جائے۔ ورنہ روشنی ہوتے ہی لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی۔ سامنے والی کوٹھیوں میں سے کوئی پوچھنے آ جاتا کہ میاں یہاں کیوں گاڑی روکے بیٹھے ہو یا کوئی راہ گیر ایسا جھانک کر سر دیکھ لیتا تو اس کا سر نہ پھر جاتا۔ ابھی تک پیڈرو کو شک نہیں ہوا تھا کہ اسے پھنسا دیا گیا ہے۔ اگر وہ اپنے ساتھیوں کے نہ آنے سے پریشان تھا تو اس کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ اگر اسی طرح بیٹھے بیٹھے آدھا گھنٹہ بھی اور گزر جاتا تو وہ کچھ نہ کچھ فکر کرتا۔"

"پھر یہاں انتظار کرنے سے کیا حاصل؟" شیخ نے کہا۔ "تھانے چلتے ہیں؟"

"کیا تیری ٹانگ میں بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ گولی سے تو صرف خراش آئی ہے۔ کچھ گہرا ہے مگر اب تو خون بھی رسنا بند ہو گیا ہے۔"

"تو پھر کچھ دیر یہاں انتظار کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔" میں نے کہا۔ "شاید تیری ہی بات ٹھیک ہو کسی حادثے یا گاڑی میں خرابی کے باعث وہ ابھی تک نہ پہنچ سکے ہوں۔"

"تیری بات میں بہت سے نکات کی وضاحت نہیں ہوئی۔" شیخ نے کہا۔ "کیا ان کے پاس پیڈرو سے نجات پانے کے اور رستے نہیں تھے؟ وہ چاہتے تو کسی دشواری کے بغیر مستقل کرا دیتے۔"

"یعنی سامنے کھڑا کر کے گولی مار دیتے؟" میں نے کہا۔ "کیا کسی کو اس کے قتل پر مامور کر دیتے۔ بے شک یہ ہو سکتا تھا لیکن اس طرح ان کے دیگر ساتھی احساس عدم تحفظ میں مبتلا ہو جاتے۔ ان کے پاس دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن کی خدمات کسی وقتی ضرورت کے تحت اور معاوضے پر حاصل کر لی جاتی ہیں۔ عموماً پیڈرو جیسے لوگ ہی مطلب کے آدمی ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ کام ہو جائے تو انہیں معاوضہ دے دیا جاتا ہے اور تعلق ختم۔ کام کے دوران میں وہ مارے جائیں تو ان کا مقدر۔ پکڑے جائیں تو خطرے کی بات نہیں۔ وہ کچھ بتا ہی نہیں سکتے سوائے اس کے کہ ان کو اتنے معاوضے پر یہ کام کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ کس نے کہا تھا؟ ایک آدمی تھا اس کا حلیہ بھی غلط ہوتا ہے۔ چنانچہ خود ان کے سوا کوئی سزا نہیں پاتا۔ دوسری قسم پیڈرو جیسے لوگوں کی ہے۔ لیڈران در جہ دوم، خصوصی معتمد۔ یہ مستقل ساتھی ہوتے ہیں جو طویل رفاقت اور آزمائش کے بعد اس مرتبے تک پہنچتے ہیں اور اگر تقدیر یاوری کرے یعنی جرائم کی مملکت کے بے تاج بادشاہ سلامت نہ رہیں۔ حادثے میں جہنم رسید ہو جائیں یا شامت اعمال کے باعث پولیس سے مقابلے میں مارے جائیں تو قیادت انہی کے پاس آ جاتی ہے لیکن ایسے وفاداروں کو قتل کیا جائے اور یہ خبر پھیل جائے تو دوسرے سمجھتے ہیں کہ کسی دن انہیں بھی وفاداری اور جانثاری کا صلہ یہی ملے گا۔ ان میں خوف اور بددلی پھیل جاتی ہے تو گروہ میں دلچسپی نہیں رہتی۔ بغاوت کا اندیشہ رہتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خصوصی معتمد کسی حریف گروہ میں شامل ہو جائیں تو ان کے اپنے گروہ کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے۔ یہ طریقہ باعزت اور بے خطر ہے۔ پیڈرو کو سب کے سامنے ایک مشن پر روانہ کیا گیا تھا۔ افسوس کہ وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا اور لوٹ کر نہیں آیا۔ ممکن ہے کہ اس وقت بھی کچھ لوگ مخالف سمت میں یا یہاں سے بہت دور کسی سڑک پر منتظر ہوں کہ استاد پیڈرو فتح کے جھنڈے لہراتا سرخ فاکس ویگن میں دو قیدیوں کے ساتھ نمودار ہو گا۔ یہ جگہ ان کے وہم و گمان میں

بھی نہ ہو گی۔ وہ کب تک انتظار کریں گے؟ شاید اب تک وہ واپس جا کے پیڈرو کے نہ آنے کی رپورٹ بھی دے چکے ہوں گے۔"

شیخ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "تمہاری باتوں سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چار سال تک تم انگلستان میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے نہیں گئے تھے، اسکاٹ لینڈ یارڈ میں زیر تربیت تھے۔ کتنا اچھا ہوا اگر تم جیسے لوگ پولیس میں ہوں۔"

میں بے اختیار ہنسا۔ "تیری یہ خواہش ایسی ہی ہے جیسے کوئی چاہے کہ سورج رات کو نکلا کرے اور چاند دن میں۔ فرق تو کوئی نہیں پڑے گا۔ خرد کا نام جنون رکھ دیا جنوں کا خرد۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ تو شیخ صاحب! پولیس کے بجائے میں صف مجرمان میں شامل ہوں۔ اور ہوتے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی۔ یہ ہو سکتا ہے لیکن ہو گا نہیں کہ میرے جیسے لوگ پولیس میں ہوں۔ جہاں سے تم جیسے بھی فارغ کیے جا رہے ہیں۔"

"کیا پیڈرو کو خود کشی کے اس مشن پر ارسال کرنے والوں کو یہ اندیشہ نہیں کہ پیڈرو سب کچھ جانتا ہے اور پولیس باقاعدہ جرم کرانا جانتی ہے۔ ان کے سارے راز افشا ہو جائیں گے۔"

"نہیں۔ جب یہ لوگ پولیس کے ہاتھ لگتے ہیں تو یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اعتراف جرم کیا تو قانون سزائے موت دے گا اور اگر کوئی انکشاف کیا تو سزائے موت دوسری طرف سے ملے گی لیکن وہ بامروت ہے۔ تڑپتے رہے اور کسی کے بارے میں کچھ نہ بتایا تو انہیں قانونی وغیرہ قانونی طور پر تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ وکیل اور مقدمے کے اخراجات، زرضمانت سب کا بندوبست ہو جائے گا اور خدانخواستہ سزا ہو گئی تب بھی جیل کے اندر انہیں ہر سہولت حاصل رہے گی۔ وہ رہائی پا کے نکلیں گے تو اپنی جانثاری کے باعث پہلے سے زیادہ اہم ہو جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔" شیخ نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "اب کوئی نہیں آئے گا۔ تیرا خیال درست ثابت ہو رہا ہے۔"

میں نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے تین بج چکے تھے۔ ایک گھنٹے میں صبح کے آثار نمودار ہونے لگیں گے۔ میں نے اقرار میں سر ہلایا اور کھڑا ہو گیا۔

"میں تیرے ساتھ تھانے تک نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "تیرا بیان یہی ہو گا کہ میں تجھے جائے واردات تک پہنچانے کے بعد گھر چلا گیا تھا۔ تیرا اور میرا ایک ساتھ تھانے پہنچنا شکوک پیدا کرے گا۔ میں تجھے اور تیرے قیدی کو کسی ایسی جگہ پہنچا دوں گا جہاں سے تجھے ٹیکسی مل جائے۔ ٹیپ بھی میں لے جاؤں گا۔"

"اور اس کا کیا ہو گا؟" اکرام شیخ نے ہاتھ سے میر محمد کے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے بھی میں ہی لے جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "سب سے اچھا تو یہ ہوتا کہ ہم اس کو جائے واردات کے آس پاس ہی ڈال سکتے لیکن ابھی وہاں تیری نوچ کھسوٹ ہے اور شاید تاج کا سارا دن کوئی وہاں رہے۔"

"میں ان کو ہٹا لوں گا۔" شیخ نے کہا۔ "لاش کے اسپتال پہنچنے کے بعد۔"

"پھر بھی وہاں ایسی کوئی کارروائی خطرے سے خالی نہیں۔" میں نے کہا۔ "رات تک میں کچھ کر لوں گا۔ مجھے دو کام کرنے ہیں۔ ایک تو میر محمد کے سر لاش کی حفاظت کے لیے خصوصی انتظامات کہ غائب یا تبدیل نہ ہونے پائے۔ اس سے زیادہ خطرناک کام استاد پیڈرو کو بچانا ہے۔ اگر یہ ہوش میں ہوا تو اس کو حوالات میں بھی قتل کرا دیا جائے گا خواہ اس کے لیے قاتلوں کو دستی بم ہی کیوں نہ پھینکنا پڑے۔ یہ ہوش میں نہ آیا تو اسے پولیس کی تحویل میں اسپتال لے جانا پڑے گا اور اسپتال میں قاتلوں کا کام زیادہ آسان ہو جائے گا۔ اچھا اب تو آگے پیچھے نظر رکھ۔ میں میر محمد کے سر کو سیٹ پر سے اٹھا کے ڈگی میں رکھتا ہوں۔"

"ایسے ہی۔۔۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "تیری سیٹ پر تو خون کے داغ ہوں گے ہی۔ ڈگی میں بھی پڑ جائیں گے۔"

"میرے پاس ایک پرانا تولیہ ہے۔" میں نے کہا۔ "جسے میں گاڑی یا ونڈ اسکرین پر سے گرد جھاڑنے کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے سر کو اسی میں لپیٹ لوں۔"

تولیہ سیٹ کے نیچے تھا۔ میں نے اسے پچھلی سیٹ پر پھیلایا اور میر محمد کے سر کو بالوں سے پکڑ کے اوپر اٹھایا۔ ذرا سی دیر کے لیے میرا ہاتھ کانپا۔ پھر میں نے سر کو تولیے پر رکھ دیا اور تولیے کے چاروں کونے الٹ کر اس کی گٹھری سی بنالی۔ اکرام شیخ نے اندر سے تار کھینچا اور میں نے ڈگی کو اٹھا کے سر کو اسپیئر وہیل کے بیچ کی خالی جگہ میں رکھ دیا۔ اسپیئر وہیل کو بالکل سامنے کے کھانچے میں کھڑا ہونا چاہیے تھا لیکن جب سے ایکسیڈنٹ میں اگلا حصہ پچکا تھا وہ اس جگہ میں فٹ نہیں ہوتا تھا اور فٹ ہوتا تھا تو بونٹ بند نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اسے ڈگی میں جیک وغیرہ کے ساتھ ہی رکھ دیا گیا تھا۔ درمیان میں سر کے لڑھکنے پھرنے کا امکان نہیں تھا۔

بونٹ بند کر کے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اکرام شیخ نے دروازہ بند کیا اور میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے ایک کام یہ کیا کہ جو کالا نقاب پیڈرو کے سر پر تھا، وہ پیچھے کی نمبر پلیٹ پر چڑھا دیا۔ احتیاط بہر حال ضروری تھی۔

"کیا تو نے کوئی بہت زوردار ہاتھ مار دیا تھا؟" شیخ نے

www.paksociety.com

کہا: "یہ ہوش میں کیوں نہیں آرہا ہے؟"

"ہاتھ تو میں نے بہت ناپ تول کے مارا تھا۔" میں نے کہا: "اب ہر شخص کی قوتِ برداشت الگ ہوتی ہے۔ ویسے تشویش کی بات نہیں۔ صبح ہونے سے پہلے اسے یقیناً ہوش آجائے گا۔ اسے باندھ کے رکھنا اور ہوسکے تو چھپا کے بھی۔"

"وہ میں کرلوں گا۔" شیخ نے کہا: "اس سے اگلے چوک پر ٹھہر جانا۔ وہاں سے اسٹیشن جانے والے رکشا اور ٹیکسی گزرتے رہتے ہیں۔ اب تو صبح ہونے والی ہے۔"

"ٹیکسی والے کو شک نہیں ہوگا؟" میں نے کہا اور گاڑی روک لی۔ اسی وقت ایک ٹیکسی نمودار ہوئی۔ شیخ فوراً اتر کے اس کے سامنے آگیا۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ صبح دم بیگار میں پکڑے جانے کے خوف سے بھاگ جاتا۔

"دیکھو بھائی!" شیخ نے شرافت سے کہا: "ذرا تھانے تک چلنا ہے۔ ایک آدمی سڑک پر بےہوش پڑا تھا۔ یہ کار والے شریف آدمی تھے۔ یہاں تک تو لے آئے ہیں مگر یہ خود جلدی میں ہیں۔ ان کو مخالف سمت میں جانا ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور ایک بار رکنے کے بعد انکار کی پوزیشن میں کہاں تھا مگر اکرام شیخ کے شریفانہ اور قطعی "غیر تھانیدارانہ" لہجے نے اسے شک میں ڈال دیا کہ کہیں پولیس کی وردی میں ڈاکو نہ ہوں۔ وہ تذبذب کے عالم میں بیٹھا رہا۔

"ایسے بے وقوفوں کی طرح منہ کیا دیکھ رہے ہو؟" اکرام شیخ نے ایک دم لہجہ بدل لیا: "کوئی فارسی تو نہیں بول رہا ہوں میں۔" اس نے گرج کر کہا: "نیچے اترو اور اس آدمی کو اٹھاؤ۔"

"جی... جی صاحب...!" ٹیکسی والے کے سارے شکوک دور ہوگئے۔ اس نے بےہوش کو ٹیکسی کے اندر لٹانے میں میری مدد کی اور کچھ حیران بھی ہوا۔ ایک شخص پولیس کی وردی میں، دوسرا شریفانہ لباس میں، تیسرا چوروں جیسے کالے کپڑے پہنے۔ لیکن وہ بولا نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ تھانے جاکے جب شیخ اسے کرایہ ادا کرے گا تو وہ مزید حیران ہوگا کہ جسے وہ برا شگون سمجھا تھا، وہ مبارک ترین فال ثابت ہوا۔ ایک "اصلی تے وڈا" تھانیدار اسے پکڑ کر تھانے لے گیا اور بوہنی ایسی ہوئی جو اس کی توقعات کے عین برعکس تھی۔ اس تھانیدار نے غلط میٹر کے مطابق پیسے دیے۔ ایسا پہلے کبھی ہوا ہے؟

ٹیکسی کے نظروں سے اوجھل ہوجانے کے بعد میں نے گاڑی اسٹارٹ کرکے بیک کی اور گھر کی طرف چل پڑا۔ میں نے کراؤن سینما سے آگے گرومندر شاہراہ کا موڑ کاٹ کے دائیں طرف ایک فرلانگ کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ انجن نے پہلا جھٹکا لیا۔ چند قدم بعد دوسرا اور آخری جھٹکا لے کر بند ہوگئی۔

میں نے فیول میٹر کی طرف نگاہ ڈالی۔ اس کی سوئی نہ جانے کب سے بتا رہی تھی کہ ٹینک خالی ہوچکا ہے مگر میں ذہنی طور پر دوسرے مسائل میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ میں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔ پیٹرول پمپ مجھے سامنے مشکل سے دو فرلانگ کے فاصلے پر نظر آرہا تھا لیکن میرے پاس کوئی خالی ڈبا نہیں تھا اور ہوتا بھی تو پیٹرول پمپ سے ڈبے میں پیٹرول منع تھا۔ اس قانون کی مضحکہ خیزی نے مجھے ہمیشہ حیران کیا تھا۔ ویسے ایک بوند پیٹرول نہیں ملے گا، آپ خود جائیں تو ٹینک فل کرائیں۔ پھر گھر جاکر پائپ سے سب نکال کے ڈبے بھرلیں اور اگلے پیٹرول پمپ سے پھر ٹینک بھروالیں۔ جب تک خود آپ کا دل نہ بھرے، آپ ہر پیٹرول پمپ پر جاکے اپنا یہ شغل جاری رکھیں۔ قانون اپنی جگہ ہے چنانچہ پمپ والے پیٹرول دیں تو ان کی سزا یہ کہ لائسنس منسوخ۔ قید یا جرمانہ یا دونوں۔ اور جو اس طرح پیٹرول لینے آتا ہے وہ فیملی کے ساتھ ہو یا خود کو ہر حوالے سے شریف آدمی ثابت کرے، تب بھی مجرم ہے جو آتش زنی کی واردات پر کمربستہ ہے۔

سڑک خالی پڑی تھی۔ فاکس ویگن کو اکیلے دھکا لگا کے لے جانا بہت مشکل کام تھا۔ دس گز بعد میرا سانس پھول گیا۔ دو ریڑھی والے مدد کرنے کے بجائے آپس میں ریس لگاتے گزر گئے۔ ایک "جوگنگ" کرنے والے نوجوان نے اس خستہ حال فاکس ویگن کو دھکا لگانے کو کسرِ شان سمجھا۔ دھکا لگانا ہو تو آدمی کم سے کم مرسیڈیز کو تو دھکا لگائے۔

پھر ایک فقیر گلے میں کشکول ڈالے نمودار ہوا۔ وہ بھی روز کی طرح فکرِ معاش میں نکلا تھا اور ڈیوٹی پر جارہا تھا۔ "دھکا دے دے" کہتا ہے بچہ!" وہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولا: "تم جیسوں نے ہمیں دھکے دیے ہیں ہمیشہ۔"

"وہ وقت اور مقدر کی بات ہے بابا! جن کے مقدر میں دھکے کھانا لکھا ہے وہ دھکے ہی کھائے گا۔" میں نے اس کے فلسفیانہ نکتے کا جواب فلسفے سے دیا: "میں ایک روپیہ دوں گا۔"

"ایک روپیہ!" وہ کھی کھی کرکے ہنسا: "ایک روپیہ تو فقیر صرف دعا دیتا ہے، دھکا نہیں دیتا۔ پانچ دے گا؟"

مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ وہ موقعے سے فائدہ ضرور اٹھائے گا۔ اگر وہ ایک روپے میں مان جاتا تو میں حیران ہوتا اور پیٹرول پمپ پہنچنے کے بعد اسے پانچ ہی دیتا۔ گاڑی نے آگے کھسکنا شروع کیا۔

"یا علی مدد!" فقیر نے نعرہ لگایا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ پیٹرول پمپ پر بہت مشکل ہوگی۔ پیٹرول ڈلوانے کے لیے مجھے آگے سے ڈگی کھولنی پڑے گی جس میں پیٹرول ٹینک کا منہ ہے۔ اگر تولیے میں لپٹا ہوا سر کوئی کونہ ہٹ جانے سے نمایاں ہوگیا۔ یا کہیں خون کا داغ نظر آگیا تو کیا ہوگا۔ پیٹرول بھرنے والا تو فوراً تولیہ لپٹا دیکھ کے چیخ مارے گا اور بےہوش ہوجائے گا۔ ورنہ پولیس پولیس چلانے لگے گا۔ اس کے لیے مجھے بہت محتاط رہنا ہوگا۔ میں نے طے کیا۔ ڈگی کا ڈھکن اٹھتے ہی میں باہر جاکے کھڑا ہوجاؤں گا اور خود پیٹرول ٹینک کی کیپ کھولوں گا۔ پائپ سے پیٹرول ڈالنے والے کو پیسے دینے والے کو اپنی طرف متوجہ رکھوں گا اور تولیے کو ہرگز ہاتھ نہیں لگنے دوں گا۔

فقیر اور میں فاکس ویگن کو دھکا دیتے پیٹرول پمپ پہنچے تو اس منظر سے وہاں موجود عملہ محظوظ ہوا۔ فقیر نے پانچ کا نوٹ کھیسے میں ڈالا اور کوئی دعا نہیں دی۔ پانچ روپے اس نے محنت سے کمائے تھے، خیرات نہیں لیے تھے اور شاید وہ پشیمان بھی تھا کہ خواہ مخواہ زورِ بازو سے کمائی کے چکر میں اس نے توانائی ضائع کی۔ اسے محنت کی عادت نہیں تھی۔ چنانچہ اس کا سانس مجھ سے بھی زیادہ پھولا ہوا تھا۔ خود اندر سے تار کھینچ کر ڈگی کھولنے کے بجائے میں نے اس لڑکے سے جو پمپ کی نال کو مشین گن کی طرح تھامے کھڑا تھا، یہ کہا کہ وہ تار کھینچے اور اس کے بعد ایک سکون سا محسوس کیا۔

"معاف کرنا یار! مجھ میں مزید زور لگانے کا دم نہیں ہے۔" میں نے ضرورت سے زیادہ ہانپتے ہوئے کہا۔ وہ اس بات پر حیران تو ہوا مگر اس نے ہوز پائپ کو واپس لٹکایا اور میری مدد کی۔ میں نے ڈگی کو اٹھایا اور بےہوش ہوتے ہوتے بچا۔ سر کے اوپر سے تولیے کے چاروں کونے پھسل چکے تھے اور اب کٹا ہوا سر ڈگی میں وہ سر ایسے بچھے ہوئے تولیے پر یوں رکھا ہوا تھا جیسے نمائش کے لیے رکھا گیا ہو۔

میں نے خدا کا ہزار شکر ادا کیا کہ دوسرا شخص یعنی کیشیئر جس نے گلے میں چمڑے کا تھیلا لٹکا رکھا تھا، ابھی دور تھا۔ پیٹرول بھرنے والے لڑکے نے بھی سامنے سے ہوکر جانے کے بجائے پیچھے کی طرف سے پمپ تک کا فاصلہ طے کیا اور مجھے اتنا وقت مل گیا کہ میں تولیے کو پھر اس کھوپڑی پر ڈھک سکوں۔ چار گیلن ہوتے ہوتے ہی میں نے خود پیٹرول ٹینک کی کیپ بند کی اور لڑکے نے ہوز پائپ کو واپس پمپ کی سائڈ میں لٹکا دیا۔

اور اس وقت اپنی طرف سے ہر احتیاط برتنے کے باوجود مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ نوٹ میرے ہاتھ میں تھا اور میری توجہ کیشیئر کی طرف نہیں رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں ڈگی بند کرتا، وہ میرے پیچھے سے نکل کر سامنے آگیا: "یہ ٹائر کو یہاں نہیں رکھنا چاہیے صاحب!" اس نے میرے منع کرنے سے پہلے ٹائر اٹھانے کے لیے کھینچا۔

"کیا کر رہے ہو تم؟" میں چلایا: "رہنے دو اسے یہیں۔"

"اس کے نیچے تار ہوتے ہیں صاحب! شارٹ ہوگئے..." جملہ نامکمل رہ گیا کیونکہ ٹائر کے کھینچنے سے درمیان میں رکھے ہوئے سر کے اوپر پڑا ہوا تولیہ ہٹ گیا اور مردے کا کٹا ہوا سر کیشیئر کو گھورنے لگا۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے دہشت سے منجمد ہوگیا۔ پہلے اس نے یقیناً سمجھا ہوگا کہ یہ فریبِ نظر ہے یا میرا دماغ چل گیا ہے۔ کسی شریف آدمی کی ڈگی میں لاش کا تصور کسی کے قیاس میں آنے والی بات بھی نہیں۔

یکلخت مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے نوٹ اس کی طرف پھینکا مگر اس وقت تک وہ ایک فلک شگاف چیخ مار چکا تھا: "خون... قاتل... اوئے پکڑو..." اس نے پوری قوت سے چلانا شروع کیا۔ میں نے ایک کمرے کے شیشے والے آفس میں سے دو افراد کو دوڑ کر آتے دیکھا۔ کیشیئر کے جنون کی حالت دیکھ کر وہ سمجھے ہوں گے کہ میں کوئی ڈاکو ہوں جو گن پوائنٹ پر اس کے کیش کا تھیلا چھین کر بھاگنا چاہتا ہوں۔

میں نے کیشیئر کے ایک مکا رسید کیا کیونکہ وہ مجھے پکڑ چکا تھا اور مجھے کار میں نہیں بیٹھنے دے رہا تھا۔ وہ پیچھے گرا تو وہ لڑکا سامنے آگیا جس نے پیٹرول ڈالا تھا۔ میں نے ایک لات اس کے رسید کی اور وہ چلا کے بیٹھ گیا۔ کیشیئر کو پکے فرش پر گرنے سے چکر آگئے تھے۔ چنانچہ وہ اٹھ کر تو بیٹھ گیا تھا مگر پھر مقابلے کے لیے کھڑا نہیں ہوا تھا۔ وہ ہذیانی کیفیت میں چلا رہا تھا: "قاتل، خون۔ اوئے میری توبہ مولا۔ ڈگی میں سر ہے کٹا..." میں نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ آفس میں سے نمودار ہونے والے آپہنچے۔

صورتِ حال یکلخت سنگین ہوگئی تھی۔ کوئی گاڑی کسی بھی وقت پیٹرول لینے آجاتی تو میرے لیے فرار بھی مشکل ہوجاتا۔ سامنے سے آنے والے ہٹے کٹے نوجوان تھے اور غالباً گارڈ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ میں نے سمجھ لیا کہ ان دونوں سے مقابلہ آسان نہیں ہوگا۔ میں نے فوراً پوزیشن لے لی۔ اب میرے لیے جوڈو میں اپنی مہارت کا استعمال کیے بغیر نکلنا مشکل تھا۔

وہ دونوں ایک ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئے اور میں نے غوطہ مار کے دونوں کو بازوؤں پر لے لیا۔ پھر میں نے بیک سمرسالٹ یعنی الٹی قلابازی کھائی اور وہ میرے ساتھ ہی فرش پر یوں گرے۔ جیسے کوئی ڈھول پٹخا مارنے سے کمر کے بل گرتا ہے۔ وہ ایسی پیشہ ورانہ مہارت کے مظاہرے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ وہ چت ہی پڑے تھے کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کروٹ لے کر اٹھنے لگے تو میں نے بوٹ سے ان کی ٹھوڑی کے نیچے ٹک رسید کی۔ وہ دونوں الٹ کر گرے اور میں کھلے دروازے کی طرف بڑھا۔

www.paksociety.com

گاڑی کا انجن بند تھا اور اگلے حصے کے ٹینک سے پیچھے انجن کے کاربوریٹر تک پیٹرول اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا تھا جب تک میں ایکسیلریٹر کو خوب پمپ نہ کر دوں۔ اس کے بعد بھی اگر انجن اسٹارٹ نہ ہوتا تو کوئی عجیب بات نہ ہوتی۔ بعض اوقات خشک کاربوریٹر میں تھوڑا سا پیٹرول انجن کا بونٹ اٹھا کے اور ایئر کلینر ہٹا کے بھی ڈالنا پڑتا ہے۔ اس میں بھی مقدار کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ پیٹرول کم ہو تو آخری قطرہ تک استعمال کر لینے والے انجن کا بھلا نہیں ہوتا اور زیادہ ہو کے کاربوریٹر میں جمع ہو جائے تو گاڑی اوور ہو جاتی ہے پھر اسے دھکا دے کر ہی اسٹارٹ کرنا بہتر ہوتا ہے۔ ورنہ سیلف مارنے سے کاربوریٹر میں کچھ اور پیٹرول آ جاتا ہے اور بار بار سیلف مارنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیٹری بیٹھ جاتی ہے اور گاڑی کھڑی رہتی ہے۔

اندر بیٹھتے ہی میں نے زور زور سے ایکسیلریٹر پمپ کیا اور کھڑکی سے باہر دیکھا تو نائٹ آؤٹ ہونے والے کھڑے ہو چکے تھے کیشیئر ان پر واضح کر چکا تھا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔ عام حالات میں شاید وہ کیشیئر کی بات پر یقین نہ کرتے اور اسے نظر و دماغ کا فتور قرار دیتے لیکن اس معرکہ آرائی کے بعد یقین نہ کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ اب چلّا چلّا کے راہ چلتے مسافر کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر سارا علاقہ ابھی سوئی پڑی تھی۔ ایک شخص نے دوسری منزل کے مکان کی کھڑکی سے سر نکال کے کہا "اوئے کیا رولا ہے بھئی؟"

میں نے انجن کو اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھمائی۔ انجن غرایا اور خاموش ہو گیا۔ میں نے پھر پمپنگ کی۔ اسی وقت ایک رکشا اندر کی طرف مڑا۔ پیٹرول پمپ والے اس کی طرف دوڑے۔ میں نے دوبارہ چابی گھمائی اور انجن یک لخت اسٹارٹ ہو گیا۔ اس مختصر مدت میں رکشا والے کو بھی صورت حال کی سنگینی کا خلاصہ چار افراد نے بیک وقت اپنی بے ربط گفتگو میں سنا دیا تھا۔ "گاڑی کا نمبر!" رکشا والا چلایا۔

میں نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کے دو ہوائی فائر کیے اور کار لے کر بھاگا۔ فاکس ویگن کی رفتار کا مقابلہ رکشا کیا کرتا۔ میرا مقصد تو اسے خوف زدہ کر کے تعاقب سے روکنا تھا۔ اندھیرا اب بھی تھا مگر میں نے نہ ہیڈلائٹس جلائیں نہ عقبی لائٹس جلائیں۔ اس وقت مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ میری ایک چھوٹی سی احتیاط نے مجھے بڑی مشکل میں پڑنے سے بچا لیا ہے۔ اگر پیچھے والی نمبر پلیٹ پر کالا کپڑا نہ چڑھا ہوتا تو پیٹرول پمپ کی مرکری لائٹ میں وہ کار کا نمبر صاف نوٹ کر لیتے۔

لائٹس میں نے ایک فرلانگ دور آنے کے بعد جلائیں جب مجھے یقین آ گیا کہ میرے تعاقب میں کوئی نہیں ہے۔

صحیح سمت سے گریز کی خاطر میں نے گاڑی کو دائیں ہاتھ موڑنے کے بجائے بائیں طرف موڑ لیا۔ پھر مجھے پولیس کی فوری کارروائی کا خیال آیا جو شاید ابھی تک ایمبولینس کے انتظار میں اپنے افسر کی بے سر لاش پر پہرہ دے رہی ہو۔ وہ گاڑی کو پہچان جائیں گے۔ عام فاکس ویگن کا رنگ سرخ ہوتا تو وہ سمجھتے کہ یہ کوئی اور ہی دوسری گاڑی ہے لیکن سامنے سے میں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا کہ اب اسے ایک بار دیکھنے والا دوبارہ دیکھتے ہی شناخت کر سکتا تھا۔ پھر یہ کیا عجیب صورت حال ہوتی کہ ایس ایچ او کا دھڑ تو اسی جگہ پڑا نظر آیا اور سر کوئی اٹھا کے وہیں سے لے کر گزر جاتا۔ اگر ایمانداری بقول شاعر حق گوئی و بیباکی آئین جواں مرداں سے کام لیتے ہوئے رک کر یہ سر پیش کر کے ایس ایچ او صاحب کو قتل کر لیا جاتا تو کوئی جرم نہ کرنے کے باوجود مجرم بن جاتا اور یہ راست گوئی خود اپنے لیے زندانِ دوام کا سامان فراہم کرنے کے مترادف ہوتی۔

میں نے کار کو بیک کیا اور پل پر سے سیدھا گزر گیا۔ صبح کے آثار اب آسمان کی سیاہی میں ہلکی سی سفیدی بن کے جھلکنے لگے تھے۔ اخبار فروش اور دودھ والے سائیکلوں پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ "تیسری دنیا کے غریبوں کو جگا دو۔" پھر انھیں دودھ اور پانی کا پانی دو۔ کارپوریشن کا پانی اور بھینس کا دودھ یکساں قیمت میں ایک ساتھ۔ اور انھیں اخبار دو کہ انھیں جرم کی تازہ ترین صورت حال سے لے کر آنے والا کا جہاں سب معلوم ہو جائے اور رات خوابوں کی دنیا میں بسر کرنے والے عملی زندگی کے تلخ اور سنگین حقائق کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

کار کی طرح میرے خیالات کی سمت بھی کوئی نہ تھی۔ کار کو میں نے غیر ارادی طور پر دائیں طرف موڑ لیا اور اتفاق سے وہ سڑک سے گزرا۔ میاں میر صاحب کا قبرستان میرے ہاتھ پر رہ گیا اور ایک ورکشاپ کی چار دیواری شروع ہو گئی پھر فورٹریس اسٹیڈیم آ گیا جہاں ہر سال میلہ اسپاں و مویشیاں کا ہنگامہ بپا ہوتا ہے۔ اس وقت وہاں حدِ نظر تک ویرانی تھی۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا تو مجھے اپنے پیچھے بھی سڑک دور دور تک خالی نظر آئی۔ آگے مال روڈ تھا اور نمبر پلیٹ پر سیاہ کپڑا چڑھا کے وہاں سے گزرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ مال پر ٹریفک ہو گا اور پیچھے سے آنے والی کوئی بھی گاڑی پولیس یا ملٹری کی ہوئی تو فوراً نوٹ کر لے گی۔

میں نے گاڑی کو ایک طرف روکا اور اتر کے پیچھے گیا۔ پیچھے کا سیاہ نقاب میں نے زبردستی نمبر پلیٹ

دبا دیا تھا کیونکہ کنارے سے نٹ بولٹ سے کسے ہوئے تھے۔ تاہم اس سے نمبر کا آدھا حصہ تو چھپ گیا تھا۔ ایک طرف صرف ایل پڑھا جاتا تھا تو دوسرے کنارے پر صرف چھ کا ہندسہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اتارا اور دور ہی پھینک دیا۔

مال روڈ پر پہنچ کے میں نے اطمینان سے گاڑی چلاتے ہوئے اپنے خطرات اور خدشات کا جائزہ لیا۔ بے شک ہوائی فائرنگ سے خوف زدہ ہو جانے والوں نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا کیونکہ ان میں سے کسی کو بھی ایک نئے دن کا آغاز اپنی وفات سے کرنا منظور نہ تھا لیکن سوال یہ تھا کہ کیا انھوں نے بعد میں اس ناقابلِ حد تک خوفناک، دہشت ناک، افسوسناک اور سنسنی خیز واقعے کی رپورٹ پولیس کو دی ہو گی یا نہیں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ رپورٹ میں وہ کیا لکھوائیں گے؟ سب سے ضروری کام تو یہ تھا کہ وہ کار کا نمبر نوٹ کرتے۔ تالنے کی مانند پولیس انھیں اس نااہلی پر دھر لے گی اور بنا سبب نذرانہ لے کر چھوڑے گی کہ خبردار آئندہ بلاوجہ پولیس کو تنگ کرنے مت آنا۔ نہ یہ معلوم کر خبر کیا تھا۔ ملزم کا نام کیا تھا۔ ولدیت بتا۔ کچھ معلوم نہیں۔ چلے آئے رپورٹ لکھوانے۔ لال رنگ کی فاکس ویگن تھی۔ آدمی تھا تقریباً چھ فٹ کا، رنگ سانولا، بال کالے، سفید قمیص، سیاہی مائل پتلون۔ ایسے تو سب ہی ہوتے ہیں اور لال رنگ کی کیا ایک ہی گاڑی ہے شہر میں؟

لیکن سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ سب بھی عام لوگ تھے۔ عام آدمی کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ تھانے کچہری کے چکر میں نہیں پڑتا۔ قانون کی مدد کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتا۔ یہ سمجھتا ہے کہ قانون اس کے گلے پڑ جائے گا۔ اس کا وقت، ذہنی سکون، پیسہ، کاروبار سب متاثر ہوں گے اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ تفتیش کتنے مہینے یا کتنے سال چلے گی۔ پھر مقدمے کے سلسلے میں کتنے مہینے یا کتنے سال وہ بطور گواہ حاضر ہوتے رہیں گے اور انجام کیا کسے خبر جس کی گردن میں پھندا فٹ ہو وہی لٹک جائے۔ چنانچہ پیٹرول پمپ پر رہ جانے والوں نے بعد میں پہلے تو اپنے نقصانات کا جائزہ لیا ہو گا۔ سب کو معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ سب کی ہڈیاں پسلیاں سلامت تھیں۔ پیسے میں زیادہ ہی دس کا یا نقد پچاس کا پورا نوٹ پھینک دیا تھا۔ اتفاقِ رائے سے انھوں نے طے کیا ہو گا کہ اس معاملے میں لب کشائی کی ضرورت نہیں۔ انھیں جان کا صدقہ دینا چاہیے کہ ایک خطرناک قاتل کی کوئی گولی ان میں سے کسی کے سینے میں نہیں لگی۔ اس لاقانونیت کا تدارک کون کر سکتا ہے۔ زمانہ ہی ایسا ہے۔ کس دیدہ دلیری کے ساتھ قاتل اپنے مقتولوں کے سر کٹوا کے لیے پھرتے ہیں جیسے بکس بھروا کے ڈرائنگ روم میں سجانے کا ارادہ ہے۔ اسی طرح جیسے شکاری ہرن، بارہ سنگھے، شیر کے سر کو شیلڈ بنا کے لگاتے ہیں۔

جب میں گھر پہنچا تو سورج نکل آیا تھا۔ دروازے کے باہر ایک شخص ملٹری ماڈل کی پرانی موٹر سائیکل پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے اسے ہارن دیا۔ "گاڑی کے بریک ٹھیک نہیں ہیں۔" میں نے نیچے اتر کے گیٹ کھولتے ہوئے کہا۔ "غنیمت ہے کہ تمہارے اسپِ تازی پر سے نہیں گزری۔"

"بس پرے ہٹ۔" وہ موٹر سائیکل کو ہٹا کے کھڑا کرنے کے بعد بولا۔ "کیا کہا ہے تم نے مجھے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا اور گاڑی کو اندر لے گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آیا۔ اس کی بغل میں ایک فائل تھی۔

"تم — تم اندر بھی آ گئے؟" میں نے کہا۔ "بلا اجازت؟"

"یہ ۔۔۔ یہ ۔۔۔ ضامن رضوی صاحب کی کوٹھی ہے؟" اس نے کچھ مؤدب ہو کے کہا۔

"تمھیں کیا نظر آتی ہے؟ کوٹھی یا جھگی؟ اور اس سوال کا مقصد؟" میں نے کہا۔

"میں تفتیش کے لیے آیا ہوں۔" وہ فائل نکالتے ہوئے بولا۔ "بیان لینا ہے۔"

"معاف کرو بابا! میں اس وقت کچھ نہیں دے سکتا۔ پھر کبھی آنا۔" میں نے یوں کہا جیسے وہ فقیر ہے اور بھیک مانگ رہا ہے۔

"میں بیان لیے بغیر نہیں جا سکتا۔" اس نے اپنی خودی کو سہارا دے کر بلند کیا۔ "میں سی آئی اے میں ہوں۔"

"پی آئی اے میں ہو تو جاؤ جہاز اڑاؤ۔" میں نے کہا۔ "ہوا بازی کی جگہ بیان بازی کا اختیار کس نے دیا ہے تمھیں؟"

اس نے جز بز ہو کے اپنا کارڈ نکالا۔ "میں نے سی آئی اے کہا تھا۔ ہمارے دو انسپکٹر یہاں ڈیوٹی پر مامور تھے۔ دین محمد اور خواجہ اکبر۔"

"ان میں سے پچاس فیصد کو میں دریافت کر چکا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تم کو دین محمد سے ملنا ہو تو تھانے چلے جاؤ۔ وہ حوالات میں بند ہے۔"

"آپ سیریس ہو کے بات نہیں کر سکتے؟" اس کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی تھی۔

"کیا مطلب؟" میں نے کہا۔ "میں سیریس نہیں ہوں! مذاق کر رہا ہوں؟ جوکر ہوں؟ اچھا اندر آؤ۔"

وہ میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ "یہ فون رکھا ہے؟ نمبر ملانا آتا ہے نا؟ تو یہ نمبر ملاؤ۔ ایک انسپکٹر اکرام شیخ جواب دے گا۔ اس سے کہنا کہ دین محمد سے بات کرا دے۔ میں اتنی دیر میں

www.paksociety.com

تنہا کھاتا ہوں۔"

جب میں تنہا کے آیا تو تفتیش کے لیے آنے والا یوں بیٹھا تھا جیسے زیر تفتیش ہو۔

"بات یہ ہے مسٹر صاحب!" اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "خواجہ اکبر پہلے ہی مل چکا تھا۔ دین محمد کا پتا نہیں چل رہا تھا۔"

"خواجہ اکبر کی سرگزشت سناؤ۔" میں نے کہا۔ "وہ کہاں تھا اور کیوں تھا؟"

"اس کے ساتھ بڑی عجیب بات ہوئی۔" وہ بولا۔ "وہ صبح گھر سے نکلا تھا ڈیوٹی پر پہنچنے کے لیے۔ وہ بس سے آرہا تھا۔ راستے میں اسے ایک مسافر نے سگریٹ پیش کی۔"

"سگریٹ؟" میں نے کہا۔ "بس میں تو سگریٹ پینا جرم ہے مگر تم لوگوں کو مفت ملے تو زہر بھی پی لو۔ خیر۔"

"اس نے سگریٹ ختم کی تو اسے چکر سے آنے لگے۔ تھوڑی دیر میں وہ بے ہوش ہوگیا۔" وہ میری مداخلت کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "لوگوں نے اسے سگریٹ پیش کرنے والے سے باتیں کرتے دیکھا تھا چنانچہ وہ انھیں ساتھی سمجھے اور سگریٹ پلانے والے نے کہا کہ اس کا دوست دل کا مریض ہے۔ بس فوراً روک دی گئی اور وہ خواجہ اکبر کو لے کر اتر گیا اور ٹیکسی میں ڈال کر لے گیا۔" وہ خاموش ہوگیا اور کچھ سوچنے لگا۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟ کوئی دردناک واقعہ پیش آیا یا خوفناک؟" میں نے اس کے تذبذب کو دیکھ کر کہا۔

"میں وہی بتا دیتا ہوں جو خواجہ اکبر نے کہا تھا۔ اسے ہوش آیا تو وہ کسی کوٹھی میں لیٹا تھا۔ کوٹھی بہت شاندار تھی۔ خواجہ اکبر بیڈروم میں تھا اور جس بیڈ پر جوتوں سمیت لیٹا تھا۔ وہ بھی بہت بیش قیمت تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا کہ یہ حقیقت ہے یا خواب۔ آہستہ آہستہ اسے گزرے ہوئے واقعات یاد آنے لگے۔ وہ سمجھ گیا کہ ساری خرابی اس سگریٹ کی تھی جو اسے ایک اجنبی نے پیش کی تھی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ شریف آدمی نظر آتا تھا اور کچھ شریف آدمی با اخلاق بھی ہوتے ہیں جو کسی ہمسفر کو ایک سگریٹ پیش کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ خواجہ اکبر کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا اور وہ لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ کہیں اس نے غلط تو نہیں سمجھا۔ ممکن ہے اس کی طبیعت بگڑ گئی ہو۔ وہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض بھی ہے۔ اس نے سوچا کہیں مجھے دل کا دورہ تو نہیں پڑا تھا اور یہ اسی شریف آدمی کا گھر تو نہیں ہے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سگریٹ پلا کے بے ہوش کرنے والا اسے ایک بنی سجائی کوٹھی میں لے آئے آرام سے لاکر لٹا دے۔ ایک اجنبی دوسرے بے ہوش اجنبی کو اٹھا کے کیسے اجنبیوں کی خوابگاہ میں کیسے پہنچا سکتا ہے۔ وہ سوچ رہا اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے علاوہ اٹھنے کی اور کسی کو پکارنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ایک عورت اندر آگئی۔ خواجہ اکبر کو دیکھتے ہی اس نے ایک چیخ ماری اور پٹ سے گر کے بے ہوش ہوگئی۔ خواجہ کو وضاحت کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ پھر بیٹھا تھا کہ دو ہٹے کٹے نوکر اور دو مشٹنڈے نوجوان اندر آگئے جو اس عورت کے بیٹے تھے۔ انھوں نے خواجہ اکبر کو پکڑ لیا۔ نوکروں نے صرف خواجہ اکبر کو پکڑے رکھا، نوجوانوں نے . . ."

"نوجوانوں نے تفتیش شروع کی۔" میں نے قہقہہ مار کے کہا "تمھارے اپنے طریقوں کے مطابق۔"

"وہ دونوں کالج کے باکسر تھے۔ انھوں نے خواجہ اکبر کی ایک نہیں مانی اور یہی پوچھتے رہے کہ وہ اندر کیسے آیا اور اس نے ان کی ممی کو کیوں مارا؟" وہ بولا۔ "خواجہ اکبر کی جیب میں کچھ نہیں تھا نہ پیسہ نہ شناختی کارڈ۔ انھوں نے اسے اپنے باتھ روم میں بند کر دیا اور تھانے میں رپورٹ لکھوا دی کہ کوئی بدمعاش چوری کی نیت سے ان کے گھر میں آگھسا تھا۔ خواجہ اکبر چلتا آدمی ہے مگر جو اے ایس آئی آیا وہ نیا تھا۔ اس نے دفعہ چار سو گیارہ ضابطہ فوجداری کے تحت ایف آئی آر کاٹ دی۔ یعنی مجرمانہ عزائم سے کر ناجائز طور پر کسی کے گھر میں داخل ہونا۔ جو ناقابل ضمانت جرم ہو جاتا ہے۔ ضمانت صرف عدالت منظور کر سکتی ہے۔ اصل بات تو اس کے حوالات میں بند ہو جانے کے بعد معلوم ہوئی۔ مگر ایف آئی آر تو کٹ چکی تھی۔ اب وہ معطل ہے اور حوالات میں بیٹھا ہے۔ باعزت طور پر بری ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا۔"

میری ہنسی اس کو مشتعل بھی کر رہی تھی اور شرمندہ بھی لیکن وہ ضبط پر مجبور تھا کیونکہ یہ کسی غریب لاوارث کا نہیں ایک پولیس والے کا گھر تھا۔ دشمنوں کی پلاننگ بہت اچھی تھی۔ انھیں وقتی طور پر دونوں محافظوں کو ہٹانا مقصود تھا۔ ایک پر انھیں تھوڑی سی زبردستی کرنی پڑی۔ دوسرے کو انھوں نے بڑی آسانی سے روک لیا۔ دونوں کی فرض شناسی نے انھیں حوالات پہنچا دیا۔ زمانہ بڑا قدر ناشناس ہے۔

"واہ بھئی واہ۔" میں نے ہنسی روک کر کہا۔ "ساتھ ہی یوں کہو پہلے دونوں سی آئی اے میں تھے، اب دونوں حوالات میں ہیں۔"

اچانک باہر سے ایک کتے نے بھونکنا شروع کیا۔ میں نے دو منٹ تک برداشت سے کام لیا۔ اس امید میں کہ شاید وہ خود ہی چلا جائے گا لیکن دو منٹ بعد وہ ایک سے دو ہوگئے۔

"کیا رضوی صاحب نے کتے بھی پال رکھے ہیں؟"

"سنتے ہو؟" میں نے کچھ سوچ کر مسکراتے لہجے میں کہا۔ "ہاں۔ بہت۔" لیکن وہ کچھ نہیں سمجھا اور میں اس کے ساتھ باہر آیا۔ میری ساری شوخی ہیکلوٹ کافور ہوگئی۔ دونوں کتے کار کی ڈکی پر حملہ کرنے کے موڈ میں تھے اور اس کی طرف تھوتھنی اٹھا کے مسلسل بھونک رہے تھے۔ انھیں ڈکی میں سے خارج ہونے والے خون اور گوشت کی اس بو نے متوجہ کر لیا تھا جو انسانی ناک محسوس نہیں کر سکتی تھی۔

"کیا ہے اس کار میں؟" تفتیش کے لیے آنے والے نے کہا۔

"بہت کچھ ہے۔" میں نے بدستور غیر سنجیدہ رہنے کی کوشش کی۔ "وہ انجن ہے، باڈی ہے، چار پہیے ہیں۔"

"ڈکی میں کیا ہے؟" وہ میری بات کاٹ کے بولا۔

"پیٹرول ٹینک، اسپیئر وہیل، جیک۔" میں نے کہا۔ "بجلی کے تار اور بہت کچھ۔"

"کتے ایسی چیزوں پر نہیں بھونکتے۔"

"ان کتوں کو کسی چیز سے الرجی معلوم ہوتی ہے مثلاً پیٹرول کی بو سے۔ یا سرخ رنگ سے۔" میں نے کہا۔ "اور ان کا ایک علاج تو یہ ہے کہ انھیں نفسیاتی کلینک بھیج دیا جائے لیکن دوسرا علاج فوری سستا اور موثر ہے۔" میں نے ایک پتھر اٹھایا اور تاک کر ایک کتے کے رسید کیا۔ مجھے اس وقت تک علم نہ تھا کہ میرا نشانہ کتنا صحیح ہے۔ پتھر ایک کتے کے سر پر لگا۔ وہ چلاتا ہوا بھاگا۔ اس کے پارٹنر نے دوسرے پتھر کا انتظار نہیں کیا اور وہ دونوں بیک وقت فرار ہوگئے۔ "کتے کہیں کے۔" میں نے ہاتھ جھاڑے اور اس اجنبی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آؤ اب چائے پی کر جانا۔"

اس نے برا سا منہ بنایا کیونکہ جملے کا ابتدائی آدھا حصہ اس سے نہیں کہا گیا تھا مگر اس پر بھی منطبق ہوتا تھا۔ وہ میرے اس رویے کے بعد میری مہمان نوازی کو قبول کرنے کے موڈ میں نہ تھا لیکن میں نے اسے بے تکلفی سے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ میں نے اس کے سامنے اخبار رکھا اور ناشتا بنانے چلا گیا۔ ناشتا بناتے بناتے مجھے ایک اور خیال آیا۔

واپسی پر میں چائے کے علاوہ ٹرے میں اتنا سامان بھر لایا کہ وہ آدھے گھنٹے تک کھانے میں مصروف رہے۔ فریج میں سالم ڈبل روٹی تھی۔ میں نے چار انڈے ابال لیے تھے، چار کا آملیٹ بنایا تھا۔ مکھن اور جام اس کے علاوہ تھے اور غالباً وہ ناشتا کر کے نہیں آیا تھا۔ وہ سب ذلت بھول کے پورے انہماک کے ساتھ کھانے میں مصروف ہوگیا۔ دو منٹ بعد میں نے کہا۔ "معاف کرنا یار، ابھی آتا ہوں باتھ روم ہو کے۔ تم جاری رکھو۔"

"تکلف کی بالکل ضرورت نہیں۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ اور اس نے فقط سر ہلایا۔

باہر آکے میں نے ڈکی کو کسی آواز کے بغیر کھولا اور پیر محمد کے سر کو تولیے سمیت اٹھا لیا۔ وہ ہیبت ناک [illegible] کے اندر گٹھڑی تھی۔ اس کے گرد سے دونوں طرف مڑتے اور نیلے کینوس کے بیگ رکھ رہے تھے اور انھیں بیلٹ جیسے تسموں کو بکل سے گزار کے بند کیا گیا تھا۔ ایک میں کچھ کاغذات تھے۔ دوسرے میں سے مختلف اشیا برآمد ہوئیں۔ بسکٹ کا ایک ڈبا۔ بچوں کے جانسن پاؤڈر کا ایک ڈبا۔ ڈرائی فروٹ کے دو لفافے۔ ایک میں آدھا سیر کے قریب کاجو بادام تھے، دوسرے میں اخروٹ کی گریں۔ یہ سب مال غنیمت تھا۔ وہ نذرانہ جو صاحب اختیار لوگ راہ چلتے بھی وصول کر لیتے ہیں۔ سوائے شاید بے بی جانسن پاؤڈر کے جو میں نے واپس رکھ دیا۔ باقی اسباب کی جگہ میں نے پیر محمد سابق سب انسپکٹر اینڈ آنریری ایس ایچ او کے سر کو منتقل کیا۔ اس طرح کہ میں نے اپنے ہاتھ سے سر کو چھوا تک نہیں۔ تولیے کا ایک کونا پکڑ کے کھینچ لیا۔ دوبارہ بکل سے بیگ کو بند کرنے اور سامان کو اندر لے جانے میں میرے دو منٹ بھی صرف نہیں ہوئے۔ پانچ منٹ بعد میں پھر ناشتے کی میز پر تھا۔ جہاں اب میرے کھانے کے لیے بہت کم بچا تھا مگر میں نے ابھی

پکاری لاشیں

جہنم کی بلائیں

مسٹر چکرم

تیسرا روپ

www.paksociety.com

پیدا کرنا تھا کہ جو میرے مقدر میں تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے اسے سگریٹ پیش کی اور اس سے معذرت کی کوشش۔ اپنی عادت سے مجبور ہوں اور بعض اوقات مذاق میں حد سے بڑھ جاتا ہوں۔ میرا مقصد اس کی بے عزتی ہرگز نہیں تھا۔

جب وہ رخصت ہوا تو بہت خوش تھا اور اس نے رازدارانہ طور پر مجھے یہ بھی بتایا کہ خواجہ اکبر کو زیر دفعہ چار سو اکیاون ضابطہ فوجداری سزا ہو جائے تو اس کی ترقی یقینی ہے اور سزا اس لیے یقینی ہے کہ مدعی بہت اونچے لوگ ہیں۔ کیا رضوی صاحب بھی سزا دلوانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟ کیوں نہیں کر سکتے؟ میں نے اسے یقین دلایا۔ میں بات کروں گا انکل سے اور انکل بات کریں گے کمشنر سے اور سمجھ لو کہ خواجہ اکبر گیا اندر۔ خوشی میں اس نے موٹر سائیکل سے متعلق کسی بیگ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ دوبارہ آپس میں ملاپ اور کک مارنے کے عمل میں مصروف ہو گیا۔ اس کا سانس اکھڑنے ہی والا تھا جب موٹر سائیکل کا انجن اسٹارٹ ہونے پر مجبور ہو گیا۔ ہانپتے ہوئے اس نے آخری بار مجھ سے مصافحہ کیا اور دندناتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اکرام شیخ سے بات کی اور اسے پٹرول پمپ کی جعلی جنگ کے اسباب، واقعات اور نتائج سے مطلع کیا۔ "ذرا معلوم کرنا اپنے طور پر کہ متعلقہ تھانے میں کسی نے رپورٹ لکھوانے کی حماقت تو نہیں کی ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ تو میں کر لوں گا۔" شیخ نے کہا۔ "تم خدا کے لیے اس کار کو لے کر مت نکلنا۔"

"اسے میں ابھی ڈینٹ پینٹ کے لیے دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "نیا رنگ ہونے کے بعد تو نئی لگے گی۔"

"اس پر... میرا مطلب ہے سیٹ پر۔ ویسے تو تم عقل مند ہو۔"

"در حقیقت... وہ میں دھو دھلا کے صاف کر دوں گا۔" میں نے کہا۔ پھر لائن کٹ گئی۔ شاید کوئی آ گیا تھا۔ میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اسلام آباد سے خاص رضوی صاحب بات کر رہے تھے۔

"گڈ مارننگ انکل!" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "خیریت تو ہے وہاں؟"

"ابھی تک تو خیریت ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "تم رات کو کہاں تھے۔ دو مرتبہ فون کیا تھا میں نے؟"

"اچھا؟" میں نے بے حد حیرت کا اظہار کیا۔ "میں تو کہیں گیا ہی نہیں۔ ذرا جلدی سو گیا تھا۔"

"جھوٹ مت بولو۔ میں نے ایک آدمی کو بھیجا تھا چیک کرنے کے لیے۔ نو بجے کے قریب۔"

"وہ... اس وقت تو میں کھانے کے لیے نکلا تھا۔ دس بجے تک لوٹ آیا تھا۔" میں نے سنبھل کر کہا۔

"اچھا اچھا۔ وہ تم نے اجازت کے لیے درخواست دی۔ کب آ رہے ہو یہاں؟" انھوں نے مطمئن ہو کے کہا۔

"بس انشاء اللہ آج نہیں تو کل۔" میں نے کہا۔ "مسز رضوی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ان کی حالت اچانک سنبھل گئی ہے لیکن ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ حالت اسی طرح اچانک بگڑ بھی سکتی ہے۔ دوا یا غذا کی نہیں یہ ان کی اپنی قوت ارادی ہے جو انھیں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ یا یوں سمجھ لو کہ قدرت کا مقرر کیا ہوا وقت ابھی نہیں آیا۔ ابھی تو وہ پوری طرح ہوش میں ہیں اور لیٹے لیٹے سب انتظامات اپنی نگرانی میں کرا رہی ہیں۔" انھوں نے کہا۔

"کیسے انتظامات؟" میں نے بے خیالی میں کہا۔

"فوزیہ کی رخصتی کے۔ آج سہ پہر کے بعد نکاح ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔

اچانک میرے اردگرد ایک مہیب سناٹا مسلط ہو گیا۔ جیسے شہر خموشاں کی زمین شق ہو گئی اور گزرے ہوئے وقت کی یادوں کے قبرستان سے ان گنت ڈھانچے نکل آئے۔ وہ اپنے استخوانی ہاتھ اٹھا اٹھا کے میری طرف اشارہ کر رہے تھے۔ "تم نے... فوزیہ اپنے گھر جا رہی ہے۔ دلہن بن کے رخصت ہو رہی ہے۔ تمہاری محبت کو تمہارے وعدوں کو اور تمہارے خوابوں کو اس نے نفرت کا زہر دے کر قتل کر دیا ہے۔ پیار کا امرت دینے کے بعد یہ زہر بھی تم نے ہی فوزیہ کو دیا تھا۔ تم ان سب امیدوں کے قاتل ہو جو آسیب بن کے مرتے دم تک اس کا پیچھا کریں گی۔ کوئی اپنے ماضی سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے۔ یادوں کے گلاب اگر خار دار کیکٹس بن جائیں تو اس آزار سے نجات کوئی مستقبل نہیں دے سکتا۔ خواہ اس میں ہر خوشی ہو، ہر آسائش ہو اور ہر آرزو کی تکمیل کا سامان ہو۔"

مجھے بالکل اندازہ نہیں کہ رضوی صاحب نے کب بات ختم کی اور کیا کہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑا تھا اور بالکل اکیلا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ آخری بار فوزیہ سے معافی مانگ سکتا۔

باہر آ کے میں نے کار کی پچھلی سیٹ نکالی اور اسے اٹھا کے دھونے کے لیے اندر لے گیا۔ صابن سے اچھی طرح رگڑ کر دھونے اور خشک کرنے کے بعد میں نے اسے پھر فٹ کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ لہو کے داغ دھونے سے کہیں ختم نہیں ہوتے اور اگر

سائنٹیفک ٹیسٹ لیے جائیں تو ہزار بار دھونے کے بعد بھی ان کا سراغ مل جاتا ہے مگر مجھے ایسے کسی ٹیسٹ کا اندیشہ نہ تھا۔ ڈکی میں اب کوئی داغ نہ تھا کیونکہ کٹے ہوئے سر سے بہنے والا خون جم کر بالکل خشک ہو چکا تھا اور میں نے اسے ڈکی میں رکھا تھا تو تولیے میں لپیٹ کر۔ اس کے باوجود مجھے یہ خیال ضرور تھا کہ کہیں وہ موٹر سائیکل والا پھر نہ آ دھمکے۔

یہ عین ممکن تھا کہ وہ سارا دن مصروف رہے اور شام کو گھر پہنچنے سے پہلے بیگ نہ کھولے اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے ابھی معلوم ہو جائے۔ وہ کہیں موٹر سائیکل کھڑی کرے تو کوئی کتا اس کے بیگ کو دیکھ کر بھونکنے لگے۔ یہاں تو میں نے اسے ٹال دیا تھا لیکن اپنی موٹر سائیکل کی تلاشی وہ فوراً لے گا۔ اس کا ذہن فاکس ویگن کی طرف بھی جا سکتا ہے اور اگر اس نے میرے کار کا سر برآمد کر لیا تو وہ یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ کتے بلاوجہ نہیں بھونک رہے تھے۔ اس میں شبے کی بات ہی نہ ہو گی کہ وہ سر میں نے اس کے تھیلے میں ڈالا لیکن اس کے پاس ثبوت کوئی نہ ہو گا۔

اگر ایک بڑے پولیس افسر کا گھر نہ ہوتا اور یہ گاڑی راحیلہ فاروقی ایڈووکیٹ کی نہ ہوتی تو وہ مجھے سی آئی اے کے تھانے میں الٹا لٹکا کے ثبوت بھی حاصل کر لیتے اور مجھ سے اعتراف جرم بھی کرا لیتا۔ مگر وہ میرا ایڈریس دیکھ چکا تھا۔ میں اس کے قابو میں آنے والا شخص نہیں تھا۔ میں نے اپنی بلا اس کے سر منڈھ دی تھی۔ وہ عقلمندی سے کام لے گا تو ہنگامہ کیے بغیر اس سر کو کسی اور کے حوالے کر دے گا یا کہیں پھینک دے گا۔ دوسرے کاغذات کے علاوہ میں ٹیپ کو بھی گھر میں رکھ چکا تھا تاہم میرے لیے یہ ضروری تھا کہ میں فوراً گھر سے نکل جاؤں۔ اگر وہ لوٹ کر آئے بھی تو میرا اس سے سامنا نہ ہو۔ حفظ ماتقدم کے طور پر یہ بندوبست بھی ضروری تھا کہ وہ مجھے پھنسانا چاہے تو میں اس کو پہچاننے سے بھی انکار کر دوں۔ یہ ثابت کر دوں کہ میں گھر سے باہر تھا۔ چنانچہ اس سے ملاقات کا کیا سوال۔ اس کام میں دو افراد میری مدد کر سکتے تھے۔ ایک استاد ٹیڈی اور دوسرا عبدالودود عرف استاد ٹیڈی کا پتا ٹھکانا مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ میں نے منظر سے ہٹ کر اپنے دفاعی انتظامات مستحکم کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ناشتے کے آثار مٹائے۔ سارے دروازے مقفل کیے۔ پھر میں فاکس ویگن لے کر نکلا۔ کونے والے گھر کے سامنے ایک اور فاکس ویگن کھڑی تھی جسے میں ہمیشہ وہاں کھڑا دیکھتا تھا۔ اس کے چلنے کی نوبت بہت کم آتی تھی۔ اس پہ گرد، دھنک، پتے اور پرندوں کی غلاظت جمی رہتی تھی۔ کوئی صاف نہیں کرتا تھا۔ آج بھی اس کی حالت مالکوں کی عدم توجہی کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ شاید اسے چلانے والا یہاں تھا ہی نہیں یا گھر والوں کے پاس کوئی دوسری بڑی گاڑی آ گئی تھی۔ چنانچہ پرانی گاڑی کسمپرسی کا شکار تھی۔

میں نے اپنی گاڑی کو اس کے پاس لے جا کر روکا۔ چند منٹ ادھر ادھر دیکھا پھر میں نے اپنی چابی سے دوسری فاکس ویگن کا دروازہ کھولا۔ اس کی گرد آلود سیٹ کو اٹھا کر اپنی گاڑی تک لا کے میں نے اپنی گاڑی کی سیٹ ہٹا لی۔ اس کی جگہ دوسری سیٹ فٹ کی اور اپنی سیٹ دوسری فاکس ویگن میں لگا کے دروازہ پھر مقفل کر دیا۔ چند گزرنے والوں نے مجھے ایک نظر دیکھا اور کسی قسم کا شک کیے بغیر گزر گئے۔ دونوں گاڑیوں کی سیٹ اوریجنل تھی یعنی کالے رنگ کی دانے دار ریگزین سے بنی ہوئی۔ دوسری فاکس ویگن کے مالک کو تبدیلی کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ حیران ہو گا کہ پچھلی والی سیٹ اتنی صاف کیسے ہو گئی۔ اسی حیرت کا اظہار اس ڈینٹر پینٹر نے بھی کیا جسے میں نے فاکس ویگن سفید رنگ کرنے کے لیے دی۔ پچھلی سیٹ کی گرد دیکھ کر اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ میں نے کافی دن بعد گاڑی کو چلایا ہے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "ایسی بگڑی ہوئی شکل والی فاکس ویگن کو لے کر شہر میں پھرنا کوئی آسان کام ہے۔ لوگ کم اور دوست زیادہ ملتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اب آپ فکر نہ کریں۔ ایک دم شاندار اسٹائل ہو کے نکلے گی۔ نئی بھی کیا مقابلہ کرے گی اس کا۔" وہ بولا۔

"اور یہ کام کتنے دن میں مکمل ہو جائے گا؟" میں نے کہا۔

"دس دن تو لگیں گے صاحب!" وہ بولا۔ "رنگ اسکریپ کرنا پڑے گا۔ پھر نیا استر۔ اس سے پہلے چار پانچ دن ڈینٹنگ کا۔ ڈیکو پینٹ ہو گا اصل جناب۔ بہت رب کرنا پڑتا ہے اسے۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر گاڑی لینے میں نہیں آؤں گا۔ وہ بیگم صاحبہ آئیں گی جن کی گاڑی ہے۔ بہت بڑی وکیل ہیں مس راحیلہ فاروقی۔" میں نے اسے بتایا۔ تاکہ پولیس تفتیش کرتی ہوئی آئے اور لال گاڑی دیکھ کر سوال کرے تو وہ کہہ دے کہ گاڑی ایک خاتون وکیل کی ہے۔ میں نے اسے پانچ سو روپے بطور ایڈوانس دیے اور پیدل روانہ ہو گیا۔

شہر اجڑا اجڑا سا تھا۔ فضا بے رنگ تھی اور ہوا خاموش، اور پورا آسمان کی ویرانی میں بہت بلندی پر اڑنے والے پرندے ایک بیگانگی کے انداز میں محو پرواز تھے۔ نیچے زمین پر حشرات سے نکلے ہوئے انسان زندگی کا بوجھ ڈھو رہے تھے۔ بقا کی جدوجہد میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خاطر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لیے تیار تھے۔ حصول دولت کی اس سعی رائیگاں کو ہی کامیابی

www.paksociety.com

سمجھ رہے تھے جس کی ابتدا عدم وجود پر تھی اور انتہا بھی عدم وجود پر۔ ایک صفر کے اضافے سے ایک کا ہندسہ کیا بنتا ہے۔ دس، سو، ہزار، لاکھ، کروڑ، پہلے صفر سے آخری صفر تک کے سفر میں آدمی کو کیا ملتا ہے۔ ثواب و عذاب، نیکی بدی، خوشی غم، ان سب کی قیمت کیا ہوتی ہے؟

میں بے حد متذبذب ہو رہا تھا اور اس کے اسباب واضح تھے میرے پاس کوئی بھی نہیں تھا جس کے کندھے پر سر رکھ کے میں رو سکتا۔ نہ محسن، نہ رابعہ اور نہ شہلا۔ خون کے سب رشتے مر کے ادھر ادھر انسانوں کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ چنانچہ میں نے نئے رشتے استوار کر لیے تھے اور انھی کو سب کچھ بنا کے زندگی کا سفر طے کر رہا تھا۔ اب میں کہاں جاؤں، کدھر جاؤں؟

پھوٹے دو سو میل دور اسلام آباد میں فوزیہ دلہن بن رہی تھی۔ کیا بیٹیاں ایسے رخصت ہوتی ہیں ماں باپ کے گھر سے۔ نہ جشنِ طرب، نہ ہنگامۂ مسرت، نہ ڈھولک کی تھاپ اور چوڑیوں کی جھنکار پر گائے جانے والے وداعی کے گیت، نہ سکھیوں سہیلیوں کی شوخی سے کھنکتے قہقہے۔ فرشتۂ اجل دروازے پر دستک دیے جا رہا ہے۔ جلدی کرو جلدی، کیونکہ وقت کم ہے۔ دیر کس بات کی ہے مولانا صاحب! بسم اللہ کیجیے۔ مسٹر شیروانی دیئر از نو ٹائم۔ ہاں شکریہ میں کیا کروں۔ مسماۃ فوزیہ حامد بنت احمد رضا خاں شیروانی۔ تم کو کسی ایاز احمد ولد غیاث احمد سے اپنا عقد بعوض حق مہر شرعی قبول ہے۔ ویری سوری شیروانی صاحب! ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ خاتمہ اچانک ہو سکتا ہے۔ جا فوزی بی! اپنے گھر سدھار۔ سدا سکھی رہو۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔ سب کے چہرے سوگوار ہیں مجھے لگتا ہے ابھی کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں۔ سب آنسوؤں کو پی رہے ہیں۔ زبردستی مسکرا رہے ہیں۔ وہ خوشی کہاں ہے جو رخصتی کے وقت اشکوں سے بھی یوں چھلکتی ہے جیسے دامنِ سحاب سے شفق کی سرخی۔ شبِ تار میں ستاروں کی ضیا۔ آمدِ فصلِ گل کی نامہ بر ہوا سے خوشبو۔

سکندر بخت، ابد بخت، تیرے مقدر کی خوشی کیا ہوئی کاتبِ تقدیر تجھ پہ اتنا نامہرباں کیوں ہوا کہ مسرتوں کے لازوال لا محدود خزانے تیرے اپنے نہ رہے۔ تو صحرا کے اس پیاسے مسافر کی طرح حیران و سرگرداں ہے جس کی چھاگل کا آخری قطرۂ آب بھی ریت نے پی لیا ہو۔ یہاں جو کچھ ہے اپنے اپنے وقت کا پیمانہ بھر بالقسط ادا کر رہا ہے۔ آدمی خود اپنے گرد زنداں کی دیواریں اٹھاتا ہے اپنے جہنم کی آگ خود روشن کرتا ہے۔ اپنی جنت کی خود تعمیر کرتا ہے۔ اپنی خوشیوں کو خود قتل کرتا ہے اور اپنے دکھوں کو خود سینچتا ہے۔ وقت گزر جائے گا تو احساس مر جائے گا۔ سو جائے گا۔ فوزیہ اپنے گھر میں اپنے شوہر اور بچوں کے درمیان ہنستے ہنستے ایک پل کے لیے خاموش ہو جائے گی اور دوسرے پل میں تمھاری یاد کو بھی اسی طرح جھٹکے مار کے دل سے نکال دے گی جیسے کوئی گھر میں گھس آنے والے فقیر کو نکالتا ہے اور خود تم — تم کیا کرو گے جب حسن و دوار کی منزل سے گزر کے کوئے یار تک پہنچے تو وقت کے ہر زخم کا نشان بھی کھو چکا ہو گے۔ محبت، مائی فٹ۔ آئی واز این ایڈیٹ اینڈ سو واٹ۔ معلوم ہے جس روز اس کی شادی ہوئی میں کیا محسوس کر رہا تھا آئی واز میڈ — ہاہا... جوانی میں تو ایک عشق ازلی ہے سٹ۔ قہقہے۔ شادی کی ساتویں یا آٹھویں سالگرہ میں شریک ہونے والے معزز مہمان بھنے ہوئے مرغ، لیمب روسٹ، فروٹ کسٹرڈ کھا رہے ہیں۔ یہ سب فوزیہ زالیہ ہوٹل میں مصروف ہیں۔

ایک ہاتھ میری کمر پر پڑا۔ "لو بلڈی فرورڈ" پھر گھن گرج کے ساتھ ایک قہقہہ۔

میں نے سیدھا ہو کر منظر کی طرف دیکھا جو بار روم کے کاؤنٹر پر کھڑا تھا۔ میں بار روم کیسے پہنچا آخر؟ پیدل۔

"ایسے ایسے کیا الوؤں کی طرح دیدے گھما رہا ہے۔" اس نے میرے شانے کو ہلایا۔

"میں... میں تجھے ہی دیکھ رہا تھا۔" میں نے خود کو سنبھال کے بمشکل تمام کہا۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ بالکل غیر شعوری طور پر میں پیدل چلتا ہوا ڈسٹرکٹ کورٹ تک آ پہنچا ہوں۔

"تو بھائی کب تک دیکھے گا؟ نظر نہیں آ رہا ہوں میں کیا؟" وہ پھر گلا پھاڑ کے ہنسا۔ "کوئی خوردبین سے دیکھنے کی چیز ہوں میں؟ ایسے گھورے گا ایک جھانپڑ اور دوں گا۔ یہ کیا رونی شکل بنا رکھی ہے۔ پھر کسی کو قتل کر آیا ہے تو بتا۔ ہم ہیں تو چالان کا کیا ڈر۔ خود پہنچا دیں گے تجھے۔"

"یار وہ... فوزیہ کی ماں ذہن پہ بیٹھی ہے۔" میں نے کہا۔ "سب چلے گئے ہیں۔ میں اس لیے نہیں جا سکا کہ اجازت لی ہی نہیں تھی۔ عمداً میں نے یہ نہیں کہا کہ آج فوزیہ کی شادی بھی ہے۔"

"تجھے جانا ہے؟" وہ بولا۔ "تو جا۔ یہاں کیوں آیا ہے۔ باغ کا اڈا ہے یہ؟"

"یار بات کچھ اور ہے۔" میں نے کہا۔ "اکیلے میں کر لے۔ پانچ منٹ میری بات سن لے۔"

اس نے سر ہلایا اور مجھے کینٹین میں لے گیا۔ میں نے میر محمد کی لاش ملنے سے لے کر اس کے سر کی بازیابی تک کی روداد حرف بحرف سنا دی۔ وہ چپ بیٹھا سنتا رہا۔

"اب تو میری طرف سے اجازت کی درخواست لگا دے۔" میں نے کہا۔ "خدا نخواستہ کوئی چکر پڑ گیا تو میں یہ کہہ سکوں کہ میں جا کے ساتھ تھا۔ رضوی صاحب کا فون آیا تھا ساڑھے آٹھ بجے۔ پونے نو بجے میں نے تجھے فون کیا اور تو مجھے اپنے ساتھ ہی لے گیا۔"

"ابے تیرے چکر میں مجھے لگوا دے گا پھانسی۔" وہ میز پر ہاتھ مار کے بولا۔ "جان دے رہے ہیں کوئی پرائی ہوئی ہے۔ گھر پہ جو رہ لیے دسوال بہت تحفظ دیا ہے۔ خیر یہ بتا وہ تفتیش کرنے والا کس وقت آیا تھا؟"

"وہ تو سات بجے ہی وہاں موجود تھا۔" میں نے کہا۔

"تو پونے نو بجے سے پہلے کا کیا بنے گا؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "کیسے ثابت ہو گا کہ تو سو رہا تھا اور تجھ سے ملنے کوئی آیا ہی نہیں تھا؟"

"میرا خیال ہے استاد کہ ٹیڈی گواہ بن جائے گا۔ میں کہوں گا کہ میں اکیلا تھا اسے بلا لیا۔"

"ابے چھوڑ۔ میں کہہ دوں گا تو نے جھوٹ بولا تھا کہ رات کو میرے گھر میں سویا تھا ڈر کے مارے ہمت نہیں پڑ رہی تھی گھر جانے کی۔" منظر نے کہا۔ "بس اسی وقت گیا تھا صبح آٹھ بجے کے قریب ناشتہ کر کے۔ میرے گھر سے وہاں تک آدھا گھنٹہ تو لگتا ہی ہے اور رضوی صاحب میری مانیں گے تیری نہیں۔ کیا سمجھا؟" اس نے پھر میرے شانے پہ ہاتھ مارا اور زور سے ہنسا۔

"ٹھیک ہے منظر!" میں نے کہا۔ "میں بہت پریشان تھا۔ تجھے بھی جھوٹ بولنا پڑ رہا ہے میری وجہ سے۔"

"جھوٹ؟" وہ پھر ہنسا۔ "یار جھوٹ تو ہم یہاں اتنا بولتے ہیں کہ کبھی سچ منہ سے نکل جائے تو حیرانی ہوتی ہے۔ خیال آتا ہے کہ دماغ غیر حاضر تھا۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ دروغ کا عیب گزر رہا ہے روز ہو جاتا۔ اب تو احساس بھی نہیں ہوتا کہ جھوٹ بول رہے اور جب پیسے کی خاطر بولتے ہیں تو کیا یار کی خاطر نہیں بول سکتے؟"

"پھر تو بیوی سے بھی جھوٹ ہی بولتا ہو گا۔" میں نے کہا۔

وہ یوں ہنسا کہ کینٹین میں بہت سے لوگ متوجہ ہو گئے۔

"تب شادی کرے گا تو معلوم ہو گا کہ جھوٹ بولے بنا زندگی کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔ کیا کہتے ہیں وہ۔ کہ میاں بیوی زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ تو پہیا جھوٹ اس کی گریس ہے۔ گریس نہ ہو تو فرکشن پیدا ہوتی ہے۔ ازدواجی زندگی کا بوجھ ڈھونا مشکل ہو جاتا ہے۔ پہیے چوں چوں کرنے لگتے ہیں۔ دیکھ لے بیوی گھر سے کتنی خوش ہے۔ سچ بولتا تو کب کی میکے جا بیٹھی ہوتی۔ طلاق لے چکی ہوتی۔ کامیاب شوہر وہ ہے جو کامیابی سے جھوٹ بول سکے۔ آیا کچھ عقل شریف میں؟ چل اٹھ۔"

منظر نے بڑی صفائی سے کندھے کو ایک اور ہولے سے ہلایا اور ہم دونوں کینٹین سے نکل آئے۔ میں اس سے رخصت ہوا تو دوپہر ہونے والی تھی۔ میرے سر سے ایک پریشانی کا بوجھ اتر گیا تھا۔ رضوی صاحب نے جاتے جاتے بھی مجھے تاکید کی تھی کہ میں خرافات سے دور رہوں اور کوئی نیا گل نہ کھلاؤں۔ لیکن اب اس کا کیا علاج؟ کہ میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ میں نے تو اکرام شیخ کی مدد کی تھی۔ یہ شرافت اور اخلاق، دوستی یا قانون سب کا تقاضا تھا۔ اگر اس کا اسکوٹر خراب نہ ہوتا تو مجھے اس کے ساتھ نہ جانا پڑتا اور وہ سب کچھ نہ ہوتا جو بعد میں ہوا۔

لیکن یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ میر محمد کی لاش کا سر میری گاڑی میں صرف اس لیے رکھا گیا تھا کہ میں لاش برآمد کرانے کے لیے اکرام شیخ کو اپنی گاڑی میں لے گیا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ ٹیکسی میں چلا جاتا۔ پھر کیا دشمن اس سر کو ٹیکسی میں رکھتے؟ نہیں۔ وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ میر محمد کا سر میری گاڑی میں رکھا جائے گا۔ اگر میں اکرام شیخ کے ساتھ نہ جاتا اور گھر آ کے سو جاتا تو صبح یہ سر مجھے اسی طرح فاکس ویگن کی پچھلی سیٹ پر موجود ملتا۔ شاید میں پیچھے نگاہ ڈالے بغیر گاڑی لے کر روانہ ہو جاتا اور دن کے اجالے میں کہیں گاڑی پارک کر کے چلا جاتا تو واپسی پر گاڑی کے گرد مجمع ہوتا یا پھر جب سو کر اٹھنے سے پہلے ہی پولیس آ دھمکتی اور مجھے آنکھیں کھلنے سے پہلے گرفتار کر کے لے جاتی۔

لیکن۔ پولیس تو واقعی صبح ہی آ پہنچی تھی۔ سات بجے سے پہلے کسی کا تفتیش کے لیے آنا۔ چہ معنی دارد۔ یہ انتظام تو پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ جب اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر کوئی سر نظر نہ آیا تو اسے مایوسی ہوئی اور اس نے خواجہ اکبر کی بازیابی اور دین محمد کی گمشدگی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اسے اپنے آنے کی کوئی وجہ تو بتانی ہی تھی۔ لاش کا سر مل جاتا تو وہ کہتا کہ ہمیں مخبروں کے ذریعے یہ اطلاع ملی تھی۔ اور اطلاع غلط بھی نہیں تھی۔ اسے پہلے سے معلوم ہو گا کہ خواجہ اکبر کے ساتھ کیا ہوا۔ جب میں اسے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر غسل کرنے گیا تھا تو اس نے کہیں فون نہیں کیا ہو گا اور دین محمد کے بارے میں اکرام شیخ سے بات نہیں کی ہو گی۔ اس نے باہر کے فاکس ویگن میں جھانکا ہو گا لیکن گاڑی کے دونوں دروازے مقفل تھے اور شیشوں سے ناک لگا کر اندر دیکھنے سے اس کو خالی سیٹ تو نظر آ گئی ہو گی مگر سیاہ سیٹ پر خون کے دھبوں سے سرخ داغ دکھائی نہیں دیے ہوں گے۔ وہ سمجھا ہو گا کہ کسی وجہ سے وہ لوگ اپنی اسکیم پر عمل درآمد میں کامیاب نہیں ہوئے جنھوں نے اسے نہار منہ رضوی صاحب کے گھر پہنچنے کی تاکید کی تھی اور اس بات کا معاوضہ ادا کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں غسل کے بعد لوٹ

www.paksociety.com

کر آیا تھا تو اس کی صورت پر بارہ بجے ہوئے تھے۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ بظاہر میں نے اپنی حفاظت کا پورا بندوبست کر دیا ہے اور اپنے گلے پڑنے والی بلا سے نجات حاصل کر لی ہے مگر خطرہ اب بھی باقی ہے۔ وہ شخص اپنی ناکامی کی رپورٹ دے گا اور بتائے گا کہ سکندر بخت نے تو مجھے مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ معلوم نہیں کیسے اور کب اس نے میر جمعہ کا سر میری موٹر سائیکل کے بیگ میں ٹھونس دیا۔ اس کی خدمات حاصل کرنے والے کہیں گے پاگل کے بچے! سر تو ہم نے رات کو ہی گاڑی میں رکھ دیا تھا۔ اس گاڑی کو فوراً قبضے میں لے لو۔ اس کی پچھلی سیٹ پر خون کے داغ ضرور ہوں گے۔

اور اس وقت پریشانی کے باوجود مجھے تھوڑی سی خوشی بھی ہوئی کہ میں نے سیٹھ جمال کے دشمنوں کے عزائم کو ناکام بنا دیا ہے۔ اب شوق سے لے جائیں گاڑی کو اپنی لیبارٹری میں اور ہر طرح سے ٹیسٹ کر لیں۔ اکرام شیخ کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اسے گھر پر فون کیا اور اس نے مجھے بتایا کہ متعلقہ تھانے میں کسی پیٹرول پمپ پر کام کرنے والوں نے کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی ہے۔ اس نے مجھے دعوت دی کہ میں دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ کھاؤں لیکن میں نے کہا کہ میں ذرا مصروف ہوں اور بے کار بھی ہوں۔

"یہ تو بڑی خراب بات ہے" وہ بولا "انگریزی میں کہتے ہیں نا کہ بیکار آدمی کا ذہن شیطان کی ورکشاپ ہوتا ہے۔ مجھے بھی معلوم تو ہو آپ کی مصروفیات کیا ہیں؟ آخر وہ آپ کا مصروف رہنا ہی آپ کے حق میں اچھا ہے۔"

میں ہنسا "نہیں، میں کوشش کروں گا کہ مصروفیت سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو۔"

"یہ تمہارے اختیار کی بات نہیں ہے سکندر اعظم!" وہ بولا۔

"اچھا بھائی، میں گھر جاتا ہوں اور سو جاتا ہوں۔ خواب تک نہیں دیکھوں گا۔" میں نے کہا۔

"یہاں آنے میں کیا اعتراض ہے تمہیں؟ کھانا کہیں تو کھاؤ گے یا بھوکے ہی سو جاؤ گے۔" شیخ نے کہا "چلو اس بہانے میرے گھر والوں سے مل لو اور میرا گھر بھی دیکھ لو۔"

میں مجبور ہو گیا۔ رکشا لے کر میں آدھے گھنٹے بعد گلبرگ پہنچا۔ گھر کا نمبر مجھے معلوم تھا لیکن گھر تلاش کرنے میں میرا مزید آدھا گھنٹہ صرف ہو گیا۔ میں نے ان لوگوں کو کوسا جو شہر بساتے ہیں تو اپنی اپنی عقل کے مطابق گھروں پر نمبر لگانے کا طریقہ خود وضع کرتے ہیں۔ ہر کہ آمد عمارت نو ساخت۔ جو آیا اس نے سابقہ سسٹم کو خوبیاں خامیاں دیکھے بغیر آؤٹ آف ڈیٹ قرار دے کر متروک کر دیا اور اپنی افلاطونیت کا مظاہرہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ ہر علاقے میں نمبروں کا نظام ایک معمّا بن گیا۔ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ میں نے پہلے سنا تھا اور پھر دیکھا تھا کہ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں کسی ایک علاقے کا سسٹم جدا نہیں ہے۔ پورے شہر کی نمبرنگ کا ایک سائنٹیفک طریقہ ہے جو اتنا آسان ہے کہ آپ ٹیکسی والے کو نمبر بتا دیں اور وہ آپ کو گھر کے دروازے پر اتار دے گا۔

جب بالآخر ایک گھنٹے بعد میں نے کال بیل بجائی تو شیخ نے دروازہ کھولا "خدا کا شکر ہے کہ آپ بخیر و عافیت پہنچ گئے۔ میں تو متفکر ہو چلا تھا۔"

"فکر کی کون سی بات تھی؟" میں نے کہا "ذرا گھر تلاش کرنے میں دیر لگی۔"

"ارے بھائی! آپ کے لیے ہی تو کہا تھا کسی نے کہ یہ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے؟" وہ بولا "خیر۔ اب اندر آؤ۔"

اکرام شیخ کے والد ساٹھ سال سے زیادہ عمر کے مگر صحت مند آدمی تھے۔ شیخ نے میرا تعارف کرایا تو وہ ہاتھ ملانے کے بعد بہت دیر تک میرا ہاتھ بڑی شفقت اور محبت سے تھامے کھڑے رہے۔ "تو تم ہو سکندر بخت!" انھوں نے کہا "مجھے اکرام نے تمہارے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم بہت باہمت اور باکردار آدمی ہو۔ خدا نے چاہا تو کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔ آزمائش کا وقت تو سب پر آتا ہے۔ حوصلہ مت ہارنا۔"

"میں آپ کی حوصلہ افزائی اور آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں۔" میں نے کہا۔ پھر وہ ظہر کی نماز کے لیے مسجد چلے گئے اور شیخ مجھے اندر لے گیا۔ ڈرائنگ روم میں ایک لڑکی صوفے پر بیٹھی کتاب پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی۔ کتاب نیچے گر گئی تھی لیکن اسے خبر نہ تھی۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کی ایسی لڑکی تھی جس کا حسن نقش چغتائی تھا اور ایک نظر میں دیکھنے والوں کی نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں پلکوں کی چلمن کے سائے میں بھی بہت بھلی لگتی تھیں اور اس کے گول چہرے پر بہت بڑی نظر آتی تھیں۔ اس کے بکھرے سیاہ بالوں پر روشنی پڑنے سے چہرے کے گرد ایک سنہرا ہالا سا دکھائی دیتا تھا اور وہ کسی مصور کے تصور کی خیالی صورت کا حسین ترین مگر جیتا جاگتا عکس تھی۔ اپنی معصومیت کے تاثر سے یہ حسن ملکوتی لگتا تھا۔

شیخ نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور صوفے کے پیچھے جا کے قالین کے دھاگے سے بتی سی بنائی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کے یہ بتی اس کی ناک میں گھمائی اور صوفے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

وہ ہڑبڑا کے اور ایک چھینک مار کے اٹھی۔ اپنے مقابل مجھے پا کے اس نے فوراً دوپٹہ سنبھالا اور کچھ حیران ہوئی "آپ کون ہیں جی؟" وہ بگڑ کے بولی "اور یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

"آپ کی کتاب!" میں نے نیچے سے کتاب اٹھا کے گردن جھکائی اور اسے پیش کی "میں سکندر اعظم ہوں۔"

"کیا؟" وہ کتاب چھین کر بولی "میں بتاتی ہوں تمہیں۔" اس نے کتاب پھینک کر آستین چڑھائی اور جوڈو کی بالکل صحیح پوزیشن لے کر کھڑی ہو گئی۔ وہ یقیناً اس فن کی تربیت حاصل کر رہی تھی اور میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی قدرتی صلاحیت اور تربیت کا معیار کیا ہے لیکن شیخ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ وہ قہقہہ مار کے صوفے کے پیچھے سے برآمد ہوا۔

"دیکھا تم نے؟ کیسے کیسے نمونے ہیں یہاں؟ یہ میری چھوٹی بہن ہے نازلی۔ اسے ہم نازو کہتے ہیں۔ سوتے میں میں اسے نازی کہتا ہوں کیونکہ یہ ہٹلر سے کم خطرناک نہیں۔" شیخ نے ہنستے ہوئے کہا۔

نازلی کا رنگ خفت سے لال ہو گیا "تو یہ تمہاری حرکت تھی شیخ آف چلی!" وہ چلائی۔ اس نے صوفے کا کشن اٹھا کے شیخ کی طرف پھینکا۔ شیخ نے غوطہ مارا اور صاف بچ گیا۔

"ارے ارے" وہ بولا "مہمانوں کے سامنے بھی خانہ جنگی۔ کیا کہیں گے میرے دوست کہ گھر ہے یا پانی پت کا میدان۔"

"اور ابھی میں مار دیتی ان کے ایک ہاتھ۔ پھر؟" وہ میری طرف متوجہ ہوئے بغیر بولی۔

"تو تم پھر چودہ طبق روشن ہو جاتے نادان لڑکی! یہ جوڈو میں بلیک بیلٹ ہیں۔" شیخ نے کہا "میرے دوست سکندر بخت۔"

نازلی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں اس کے حسن فتنہ خیز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ "آپ واقعی بلیک بیلٹ ہیں۔ مجھ سے اکرام نے آپ کا ذکر کیا تھا۔ جوڈو کہاں سے سیکھا ہے آپ نے؟"

"اکرام ایسے ہی کہتا رہتا ہے۔" میں نے مسکرا کے کہا "مجھے جوڈو وغیرہ نہیں آتا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ بلیک بیلٹ تو اس وقت بھی باندھ رکھی ہے اس نے نازی!" اکرام شیخ نے کہا "تو کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ ایک ہاتھ مار دیتا نا تیرے۔ تو یہاں سے ڈولی میں نہیں اسٹریچر پر جاتی۔ سسرال نہیں اسپتال۔"

"بھیا! میں مار دوں گی۔" نازلی چلائی اور میں بھی بھائی بہن کی اس دلچسپ لڑائی میں اپنے سارے فکر و غم بھول گیا۔

کوئی پینتیس چھتیس سال کی ایک عورت اندر آئی "کیا شور ہے یہ۔ پھر لڑ رہے ہو بچوں کی طرح؟" اس نے مجھے دیکھا اور ٹھٹک کر رک گئی۔

"یہ میرے دوست ہیں سکندر بخت عرف سکندر اعظم ثانی۔" اکرام شیخ نے میرا تعارف کرایا۔ "ان کی فتوحات اور معرکہ آرائی کا ذکر تو آپ سنتی ہی رہتی ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ شیخ نے تعارف کو ادھورا کیوں چھوڑ دیا۔ وہ اس کے باپ کی دوسری بیوی تھی جسے وہ ماں نہیں کہتا تھا۔ یہ بات وہ پہلے میرے سامنے تسلیم کر چکا تھا لیکن اس وقت وہ ایک اجنبی کے سامنے اپنی سوتیلی ماں کو اپنی ماں بھی نہیں کہنا چاہتا تھا اور یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ "یہ ہیں میری آنٹی۔"

"آپ نے بہت دیر کی سکندر صاحب! ہم سب نے آپ کے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا۔" وہ بے حد اخلاق اور شائستگی سے بولی "اب آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ نماز پڑھ کے آ جائیں۔ آپ بیٹھیں! میں کھانا نکالتی ہوں۔" وہ لوٹ گئی اور میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آپ کہیں جوڈو سیکھ رہی ہیں؟" میں نے نازلی سے مخاطب ہو کے کہا۔

"جی۔ چھ مہینے ہو گئے ہیں۔" نازلی نے بڑے فخر سے کہا۔

"یہ بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے کہا "ہمارے ملک کی لڑکیوں نے خود کو چھوئی موئی بنا رکھا تھا۔ حالانکہ زمانہ ایسا ہے کہ سب کو اپنا دفاع اور اپنی حفاظت کرنے کا ہنر آنا چاہیے۔ افراد کی طاقت ہی قوم کی طاقت ہے۔"

نازلی نے بھائی کی طرف دیکھا "یہ ہمارے بھیا کبھی آپ سے اتفاق نہیں کریں گے۔ یہ تو کہتے ہیں بس ایک ریوالور کافی ہوتا ہے۔ ہاتھ پیر چلانے کا فن سیکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"یہ تو ہے۔" اکرام شیخ نے کہا "ہاتھ میں ریوالور ہو تو بلیک بیلٹ کا باپ قریب نہیں پھٹک سکتا۔"

"ہر شخص ہر وقت اور ہر جگہ تو ریوالور لے کر نہیں پھر سکتا۔" میں نے کہا "خصوصاً لڑکیاں۔"

"یہی میں کہتی ہوں ان سے۔" نازلی کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا "سچ بتائیں آپ بلیک بیلٹ ہیں؟"

اس نے اتنی معصومیت سے سوال کیا تھا کہ میں جھوٹ نہ بول سکا "جی بلیک بیلٹ وغیرہ تو نہیں۔ مگر لندن میں ایک اسکول تھا جوڈو اور کراٹے کا۔ وہاں میں نے مسلسل تربیت حاصل کی تھی اور تربیت دینے والے جاپان کے سند یافتہ بلیک بیلٹ تھے۔ ان کی رائے تھی کہ مجھ میں ایک خداداد صلاحیت ہے اور بلیک بیلٹ مل جاتی مجھے اگر لندن سے یک لخت آؤٹ نہ کیا جاتا۔"

www.paksociety.com

نائلہ نے حیرت اور مسرت سے ایک آہ بھری۔ "اللہ اکرم" کی خالص زنانہ آواز نکالی: "پھر تو آپ مجھے بھی کوچ کر سکتے ہیں۔"

"سوری۔" میں نے کہا: "ان دنوں مجھے ایک بے حد کٹھن اہم آپریشن درپیش ہے۔" شیخ نے سر ہلا کے میری تائید کی۔

"آپریشن؟" وہ چونک گئی۔ "تو آپ ڈاکٹر بھی ہیں۔ سرجن؟"

وہ آپریشن کا مطلب سرجیکل آپریشن سمجھی تھی تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ عام گفتگو میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے سوال سے مجھے اندازہ ہوا کہ اکرم شیخ نے اسے میرے معمولات اور قانونی مسائل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔

"سرجن۔" میں نے کہا: "بس یوں سمجھ لو۔ کچھ لوگ ہیں جن کے دماغ درست کرنے ہیں۔ کام بہت مشکل ہے۔"

"دماغ کا آپریشن بہت خطرناک ہوتا ہے۔" اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ وہ مجھ سے سخت متاثر اور مرعوب ہو چکی تھی۔

"تم بھی بیک وقت جوڈو اور شاعری سے شوق کرتی ہو؟" میں نے اس کی پھینکی ہوئی کتاب اٹھائی۔

"بھئی کا مطلب یہ کہ سکندر اعظم بھی گھوڑے گدھے کو ایک لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔" اکرم شیخ نے کہا۔

"کون سے اسکول میں پڑھتی ہو تم؟" میں نے کتاب کے صفحے پلٹتے ہوئے بے خیالی میں کہا۔

"اسکول میں؟" اس کا موڈ ایک دم آف ہو گیا۔ "کیا میں آپ کو ننھی سی بچی نظر آتی ہوں۔ بی اے فرسٹ ائیر میں ہوں جناب!"

اکرام شیخ کی ہنسی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ "بات فرسٹ ائیر کی نہیں۔ عقل کے اعتبار سے تم اسکول کی بچی کے برابر بھی نہیں ہو۔ میرا دوسرا بات ہے کہ اٹھارہ سال کی بالغ لڑکی ہو۔ مگر بالغ اور عاقل میں بڑا فرق ہے۔"

وہ احتجاجاً واک آؤٹ کر گئی۔ دوبارہ اس سے کھانے کی میز پر ملاقات ہوئی لیکن اس کا منہ پھولا رہا اور شیخ کی چھیڑ چھاڑ کے باوجود وہ خاموش رہی۔ مجھے وہ گھر اور وہ سب لوگ بہت اچھے لگے جہاں رہنے والے تمام تکلفات سے آزاد تھے اور اقدار کے باہمی رشتے میں اس طرح منسلک تھے کہ سب مل کر اس گھر کی تکمیل کرتے تھے جیسے الگ الگ کڑیوں کے ملنے سے ایک زنجیر بنتی ہے۔

کھانے کے بعد میں نے اجازت چاہی تو شیخ نے کہا کہ وہ مجھے اپنے اسکوٹر پر چھوڑ دے گا جس کا اصل مقصد [illegible] خیالات کرنا تھا۔ ہم [illegible] دیر تک باتیں کرتے گئے۔ وہاں پہنچ کے مجھے معلوم ہوا کہ رضوی صاحب اس مکان کو چھوڑ کے جا چکے ہیں۔ اس کی پڑوسن [illegible] نے اتنا تو بتا دیا کہ وہ ملک سے باہر ہے مگر پتہ نہیں بتایا کہ وہ کس ملک میں ہے۔ مجھے اطمینان کے لیے یہی بات کافی تھی کہ فی الحال وہ کسی کی دسترس میں نہیں اور اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہے۔ چوہدری دلاور نے وہ کیسٹ سن لیا ہوگا تب بھی وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

شام ہونے والی تھی جب اکرام شیخ نے مجھے رضوی صاحب کے گھر کے اندر اتارا۔ میں کھلا گیٹ دیکھ کر سوچ ہی رہا تھا کہ یہ بے احتیاطی میں نے جاتے وقت کی تھی یا بعد میں کوئی آیا تھا کہ مجھے حشمت خان نظر آیا۔ اس کے ساتھ دو سپاہی اور بھی تھے۔ وہ مجھے میر محمد کے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آئے تھے۔

شیخ کو میرے ساتھ دیکھ کے حشمت خان کو مایوسی ہوئی۔ اس کے ساتھ آنے والے دونوں ماتحت بڑے اطمینان سے لان پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور وہ خود بحیثیت افسر کے ایک کرسی پر متمکن تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" میں نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا۔ "کس کی اجازت سے اندر آئے ہو؟"

"پولیس کو تفتیش کے لیے بھی کسی سے اجازت لینی چاہیے اپنے سکندر صاحب؟" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"میں نے تفتیش کے بارے میں نہیں تمہارے بلا اجازت اندر آنے کے متعلق پوچھا تھا۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "تفتیش اپنے تھانے میں جیسے چاہے کرو یہ ایک بڑے پولیس آفیسر کا گھر ہے۔"

"تو ہم کون سے گھر کے اندر گھس گئے ہیں جو آپ گرم ہو رہے ہو۔" حشمت خان نے ماتحتوں کی موجودگی میں اپنی سبکی محسوس کی جو درحقیقت اس کی عزت نفس کا دفاع کرنے سے قاصر تھے۔

"تمہیں باہر انتظار کرنا چاہیے تھا حشمت خان!" ایس آئی شیخ نے متانت سے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے گھر پر کوئی نہیں؟"

"لیکن گیٹ کھلا پڑا تھا۔" حشمت خان نے احتجاج کیا۔ "ہم نے یہاں سے کیا اٹھا لیا ہے؟"

"اگر اندر والے دروازے کھلے پڑے ہوتے تو تم کیا کرتے؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "رضوی صاحب کے بیڈ روم میں استراحت فرماتے؟ مجھے اجازت دو گے تم کہ تمہارے گھر کا دروازہ کھلا دیکھوں تو اندر جا بیٹھوں؟ تم صریحاً مداخلت بے جا کے مرتکب ہوئے ہو حشمت خان اور رضوی صاحب موجود ہوتے تو اس وضاحت کے باوجود تم معطل کر دیے جاتے۔ یہ کوئی تمہارے تھانے کی زمین نہیں، رضوی صاحب کی ذاتی ملکیت ہے اس لیے فوراً اٹھ جاؤ۔" میں نے اسے نہایت تحقیر آمیز انداز میں ایک انگلی سے اشارہ کیا۔ حشمت خان کی تو بات

ہی الگ ہے اگر اس کی جگہ کوئی اجنبی یا شریف آدمی ہوتا تو میں اتنی معمولی سی بات پر یہ ہنگامہ کھڑا نہ کرتا مگر حشمت خان جیسے لوگ میرے نقطہ نظر سے ہر تذلیل کے مستحق تھے جو کسی شریف آدمی کو ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ایسے ہی لوگ پولیس کے ماتھے پر بدنما داغ ہیں۔ یہ اگر ایس آئی شیخ جیسا کوئی ایماندار و ذمے دار افسر ہوتا تو میں اسے معاف کر دیتا اور میرا رویہ اس کے ساتھ ایسا نہ ہوتا۔

"تم تو معلوم ہے۔" احساس ذلت سے حشمت خان کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ "میرے آنے کا مقصد......"

"تمہارے آنے کا مقصد اگر مجھے پھانسی دینا بھی ہے تو میں بعد میں معلوم کر لوں گا۔" میں نے چٹکی بجا کر اس کی بات درمیان سے اچکتے ہوئے کہا۔ "گیٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔ دروازے سے باہر جاؤ۔ کال بیل بجاؤ اور میرے آنے کا انتظار کرو۔ اگر دو منٹ میں تم باہر نظر نہ آئے تو میں تمہارے خلاف مجرمانہ مداخلت کا کیس درج کرانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ سب انسپکٹر شیخ تمہارے جرم کے گواہ ہیں۔"

حشمت خان آہستہ آہستہ اٹھا اور اس نے گھٹنے پر رکھی ہوئی ٹوپی سر پر جمائی۔ "باہر نکلو۔" اس نے ایک خوفناک کالی دی اور فرائے دونوں ماتحت سپاہیوں کو مخاطب کیا۔ "اتنا سن کے بھی بیٹھے ہوئے ہو بے غیرتو!"

دونوں سپاہی بڑی پھرتی سے اٹھے اور پلٹ کر دیکھے بغیر گیٹ سے نکل گئے پھر حشمت خان نے اپنی خودی کو بلند رکھنے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے ایک قدم بڑھایا۔ میں نے زیر لب مسکرا کے شیخ کی طرف دیکھا اور اسے آہستہ سے آنکھ ماری۔ وہ تمام معاملے سے قطعی لاتعلق اسکوٹر اسٹارٹ کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا سکندر!" حشمت خان رک کر بولا۔ "تم پچھتاؤ گے۔"

"آؤٹ۔" میں نے ہاتھ اٹھا کے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "میں نے آج تک کچھ بھی اچھا نہیں کیا لیکن پچھتانا مجھے نہیں آتا۔ اچھا تم نے بھی میرے ساتھ نہیں کیا مگر وہ سب جو تم نے اب تک اپنے حق میں کیا زیادہ برا تھا۔ اس کا اندازہ تمہیں میر محمد کے انجام سے ہو جانا چاہیے۔"

حشمت خان تڑپ کے پلٹا اور شاید جواب میں گالی دینے کی خواہش سہتا ہوا گیٹ کے باہر نکل گیا۔ میں نے گیٹ بند کر دیا۔

"یہ کس چکر میں آیا ہے؟" شیخ نے موقع پاتے ہی کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟ میں ٹھہروں کہ جاؤں؟"

"میرا خیال ہے تم کچھ دیر رک جاؤ۔" میں نے کہا۔ "پہلے میں اس کی بات سن لوں۔ تمہاری موجودگی میں وہ ذرا محتاط رہے گا۔"

حشمت خان نے باہر سے کال بیل بجائی۔ اس کی آواز گھر کے اندر سے آئی۔ میں نے شیخ کو اشارہ کیا اور ہم دونوں مقفل دروازے کو کھول کر اندر چلے گئے۔ دوبارہ گھنٹی بجی تو میں شیخ کے ساتھ باہر آیا۔ میرے ہاتھ میں ایک قفل تھا جو میں نے گیٹ کو بند کرنے کے بعد اندر کی طرف لگا دیا۔ "ہاں بھئی حشمت خان! اب بولو کیا بات ہے؟" میں نے چابی جیب میں ڈال کے کہا۔ "دراصل رضوی صاحب کہہ گئے تھے کہ میری عدم موجودگی میں گھر کا پوری طرح خیال رکھنا۔"

"میں انسپکٹر میر محمد کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"گویا مشتبہ افراد میں میرا نام شامل کر لیا ہے تم نے۔" میں نے کہا۔ "تم جیسے فرض شناس افسروں نے محکمے کا نام واقعی بہت روشن کیا ہے۔ میر شرافت علی کے قتل سے لے کر اب تک کتنے افراد کے قتل میں ملوث کر چکے ہو تم مجھے؟ ناکامی کی پروا مت کرو اور آئندہ بھی کوشش جاری رکھو۔ لاہور میں کیا مشرق کام میں بھی کوئی واردات ہو جائے تو میرا نام لکھوا دو۔"

"بات کو خواہ مخواہ مت الجھاؤ اپنے سکندر صاحب۔" حشمت خان بولا۔ "میں باقاعدہ رپورٹ لی ہے اور میں صرف پوچھ گچھ کے لیے آیا ہوں۔ تم سے زبانی باتیں کر لوں گا اور چلا جاؤں گا۔ میں نے تمہارا نام ایف آئی آر میں نہیں لکھا ہے لیکن تم نے یہی وطیرہ رکھا تو میں تمہاری گرفتاری کے وارنٹ بھی لے آؤں گا۔"

مجھے اس کیس میں ملوث کرنے کے بعد میرے خلاف کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن میری پریشانیوں میں تھوڑا سا اضافہ ضرور ہو جاتا۔ میر محمد کا تعلق براہ راست ان سب مقدمات سے تھا جو میرے خلاف زیر سماعت تھے۔ میری طرف سے اس پر متعدد ایسے الزامات بھی عائد کیے جا چکے تھے جن سے میری اور اس کی عداوت کے اسباب عدالت کے ریکارڈ پر آ گئے تھے مثلاً میں نے پہلی رات تھانے میں تشدد کی اور دلالی کا ذمہ دار اسے ٹھہرایا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس نے جاتے جاتے وہ ٹیپ غائب کر دیا جسے سن کر مجسٹریٹ نے عبدل کا آخری بیان تحریر کیا تھا۔ ٹیپ کی موجودگی سے ثابت ہوتا تھا کہ میر شرافت علی کے قتل کے کیس کے دونوں چشم دید گواہ یعنی عبدل اور شبیہ کو قتل کرنے والا اے ایس آئی [illegible] تھا۔ اگر میر محمد کے کیس میں بھی میرا نام آ جاتا تو مجھے ایک اور ضمانت حاصل کرنا پڑتی۔ قتل کی کسی ایف آئی آر میں نام آ جانے تو مقدمے کا فیصلہ ہونے تک خارج ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن

www.paksociety.com

ہوتا ہے۔

"آل رائٹ۔" میں نے کہا۔ "تم چلو، میں شیخ کے ساتھ پولیس اسٹیشن آتا ہوں۔ جو پوچھنا ہے، وہیں پوچھ لینا۔ میں اپنے وکیل کو بھی مطلع کر دوں اور ان سے مشورہ بھی لے لوں۔"

"صرف پوچھنے کی بات ہوتی تو ہم اتنی نفری لے کر آپ کے در دولت پر کیوں حاضر ہوتے۔" وہ طنزیہ اور تمسخر آمیز لہجے میں بولا۔ "ہمیں اندر کچھ دیکھنا ہے۔ میں وارنٹ لے کر تو نہیں آیا مگر۔۔۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ میرا گھر ہوتا تو میں ضرور اجازت دیتا مگر صاحب خانہ کی عدم موجودگی میں یہ ناممکن ہے۔"

"اور یہ جو تمہارا یار شیخ اندر بیٹھا ہے۔ وہ بھی تو تھانیدار ہے سکندر صاحب!" حشمت خان نے احساس ذلت کے ساتھ کہا۔

"وہ کسی قسم کی تفتیش کے سلسلے میں نہیں آیا ہے حشمت خان!" میں نے کہا۔ "اس وقت وہ عام شہری آدمی ہے تھانیدار نہیں۔ جب جعفری صاحب آجائیں تو خانہ تلاشی کے وارنٹ سمیت حاضر ہو جانا۔ ابھی تو وہ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔"

"میں نے خانہ تلاشی کی تو بات نہیں کی۔" حشمت خان بولا۔ "مجھے صرف وہ گاڑی دیکھنا تھی جو تمہاری۔۔۔ وکیل مس رابعہ قادری کی ہے۔"

"وہ گاڑی دیکھ کے کیا کرو گے؟" میں نے حیرانی کا اظہار کیا۔ "کئی بار تو دیکھ چکے ہو۔ اس کے علاوہ دیکھنے کا ہی شوق ہے تو اس جیسی کوئی بھی فاکس ویگن دیکھ لو۔ لاہور میں سیکڑوں پھر رہی ہیں۔ خریدنے کا خیال ہے کیا؟ تمہارا یہ دھواں دھار پھٹیچر۔۔۔" میں نے اس کی موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کیا۔

"سکندر صاحب! بہت ہو چکی۔" حشمت خان کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آج صبح سورج نکلنے سے بہت پہلے تم وہ گاڑی لے کر یہاں سے نکلے تھے اور اس گاڑی میں کوئی قتل ہوا تھا۔ تم نے ایک پیٹرول پمپ پر ادائیگی کی تھی اور فرار ہو گئے تھے کیونکہ پیٹرول پمپ کے ملازم نے گاڑی میں لاش کا سر دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے نمبر بھی نوٹ کر لیا تھا اور یہ نمبر مس رابعہ کی گاڑی کا ہے۔"

پیٹرول پمپ کے واقعات غلط نہیں تھے مگر نمبر دیکھنے والی بات جھوٹ تھی۔ جب میں فرار ہوا تھا تو پیچھے والی نمبر پلیٹ پر سیاہ کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ یہ نمبر پولیس والے پہلے سے جانتے تھے۔ اگر پیٹرول پمپ والوں نے کسی لمبے چکر سے بچنے کے لیے پولیس اسٹیشن فون کیا ہو گا کہ اس حلیے اور رنگ کی ایک گاڑی جسے ایک جوان چلا رہا تھا، پیٹرول لینے رکی تھی اور اس میں کسی شخص کا سر رکھا تھا تو میر محمد کے سر کو ایک خاص مقصد کے تحت اس کی پچھلی سیٹ پر رکھنے والوں نے خود پیٹرول پمپ والوں کو سمجھا دیا ہو گا کہ انہیں کیا بیان دینا ہے۔ گاڑی کا نمبر بتانے کے علاوہ ان کو یہ بھی کہنا ہو گا کہ سر کو پچھلی سیٹ پر رکھا تھا اور گاڑی کو شناخت کرنے والے یہ گواہ ایسے تھے کہ جن کی بات کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کے بیان میں اگر حقیقت کا عنصر پچیس فیصد ہوتا تو باقی پچیس فیصد پولیس کے دباؤ سے شامل ہو جاتا کہ مجموعی طور پر اس سچ پر جھوٹ کا شائبہ بھی نہ ہو۔

"اگر میں قفل نہ کھولوں حشمت خان!" میں نے سوچ کر کہا۔ "تو تم زبردستی اندر آنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ جعفری کی واپسی تک تمہیں یہاں گارڈ بٹھانی پڑے گی کہ کہیں گاڑی فرار نہ ہو جائے۔ چونکہ مجھے فرار ہونا ہے، اس کے لیے مجھ کو جعفری سے اجازت مل چکی ہے۔ اس لیے میں تم کو بہ رضا و رغبت اندر تشریف لانے کی دعوت دیتا ہوں۔" میں نے قفل کھولتے ہوئے کہا۔ "تم اگر چاہو تو میرے ساتھ گھر کے ہر کمرے میں، ہر چیز کو کھول کے بھی دیکھ سکتے ہو کہ گاڑی کہیں بھی چھپائی نہیں گئی ہے۔"

حشمت خان نے باضابطہ طور پر اندر قدم رنجہ فرمایا۔ "یہ نہیں ہے تو وہ گاڑی کہاں ہے سکندر صاحب؟"

"یہاں سے کوئی لے گیا ہو گا وہ سویلین دوست۔" میں نے دانت نکال کے کہا۔ "اب تم پوچھو گے کیوں؟ تو تھانیدار صاحب! ملک کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو مالک کو اپنی گاڑی لے کر پاکستان کی جغرافیائی حدود میں کسی بھی سمت میں جانے سے روک سکے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو سکندر صاحب!" حشمت خان نے بے یقینی سے کہا۔ "لیکن اس طرح تم بچ نہیں سکتے۔"

"یہ دھمکی اب تک اتنے لوگ دے چکے ہیں کہ اب مجھے ہنسی تک نہیں آتی۔" میں نے کہا۔ "میں قانون سے تعاون کو فرض سمجھنے والا شہری ہوں اور اگرچہ تم میری نظر میں لاقانونیت کے علمبردار ہو، مگر میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ اپنا اطمینان کر لو۔"

شیخ ڈرائنگ روم میں صوفے پر نیم دراز تھا اور تماشا ملاحظہ کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ سیدھا بیٹھ گیا۔

"یہ بڑے افسوس کی بات ہے شیخ صاحب!" حشمت خان نے اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی موجودگی میں ہماری اتنی بے عزتی خراب ہو جاتی ہے۔ آخر آپ بھی پولیس افسر ہیں۔ آپ ایک ملزم کے ساتھ پھر رہے ہیں۔"

"میں استعفیٰ دے چکا ہوں حشمت خان!" شیخ نے بے نیازی سے کہا۔ "تمہیں میرے ذاتی قول و فعل کی فکر نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہی تو بڑی مشکل ہے۔" حشمت خان نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ملزموں کو پولیس افسروں کی پشت پناہی مل جاتی ہے۔ ہم کیا کریں؟"

"تم اپنا کام کرو حشمت خان!" میں نے کہا۔ "تمہارے سامنے ٹیلی فون رکھا ہے۔ میں تم کو اسلام آباد میں ایک ڈپٹی سیکرٹری کی کوٹھی کا نمبر دیتا ہوں۔ خود بات کر لو جس سے چاہو۔ جعفری صاحب بھی وہیں ہیں، رابعہ بھی اور دونوں گھروں کے افراد بھی۔ سب لوگ اپنی اپنی گاڑی میں ایک ساتھ ہی گئے تھے۔"

حشمت خان کا ہاتھ بڑھا اور رک گیا۔ میرے اعتماد نے اس کے ارادے کو متزلزل کر دیا تھا۔ ویسے بھی کسی ڈپٹی سیکرٹری، کسی سیکرٹری خاتون یا ایک ایس ایس پی سے بات کرنا اس کے لیے آسان نہ تھا۔

"تمہارا۔۔۔ مطلب ہے۔۔۔ وہ سب جھوٹ ہے۔ پیٹرول پمپ کے وہ معمولی ملازم دشمن تو نہیں ہیں تمہارے۔"

"تم جسے چاہو میرے خلاف صف دشمناں میں کھڑا کر دو حشمت خان!" میں نے تلخی سے کہا۔ "مشکل یہ ہے کہ تم جھوٹ بھی وہ بولتے ہو جس کے پیر نہیں ہوتے۔ جھوٹ بولنے کے لیے بھی تمہارے پاس عقل کہاں۔"

"سکندر صاحب!" حشمت خان نے کہا۔ "ہم ان پڑھ لوگ ضرور ہیں، تم جیسے سیانے لوگ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ صرف علم سے تجربے کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ آج ہی صبح ایک انسپکٹر تفتیش کے لیے آیا تھا تو اس نے وہی گاڑی یہاں دیکھی تھی۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم اسی وقت کہیں سے آئے تھے اور تمہاری گاڑی کو دیکھ کر کتے بھونکنے لگے تھے؟ بلاوجہ ہر گاڑی پر تو نہیں بھونکتے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "مثلاً تمہاری اس موٹر سائیکل جیسی چیز پر ضرور بھونکتے ہوں گے مگر جہاں تک کسی انسپکٹر صاحب بہادر کا سوال ہے تو عرض یہ ہے کہ گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں مجھے صرف دو انسپکٹر ملے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ انسپکٹر کا بیان غلط نہیں تھا۔" حشمت خان بولا۔

"کس کا بیان؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "ایک انسپکٹر تو تمہارے سامنے بیٹھا ہے اور دوسرے تم ہو۔ تم دونوں نے کوئی بیان دیا ہے؟"

"میں اس کی بات کر رہا ہوں جو آج صبح تم سے ملا تھا۔" حشمت خان کا موڈ خراب ہو گیا۔

"آج صبح کوئی الو کا پٹھا مجھ سے ملنے یہاں نہیں آیا۔" میں نے بھی سخت لہجے میں کہا۔ "اور آیا ہو گا تو بھونک مار کے لوٹ گیا ہو گا۔ یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ گزشتہ رات بھی میں ایک دوست کے گھر تھا۔ وہ میرا دوست بھی ہے اور میرا وکیل بھی۔ تم چاہو تو تصدیق کر سکتے ہو کہ میں رات کو عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کے گھر سویا تھا یا نہیں۔ وہ خود تو اس وقت ہو گا نہیں لیکن یہ بات تو اس کی بیوی بھی بتا دے گی کہ صبح میں کس وقت گھر سے نکلا تھا۔ اس کے بعد میں شیخ کے گھر چلا گیا تھا۔ شیخ تمہارے سامنے بیٹھا ہے لیکن تم اس کے گھر فون کر لو۔ وہاں اس کے والد اور گھر کے دیگر افراد ہیں۔ وہ تمہارے ہر سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کل شام سے اب تک میں کہاں تھا۔ یہ بھی پوچھ لینا کہ میں گاڑی لے کر گیا تھا یا پیدل۔ اس کے بعد پیٹرول پمپ والوں کو تھانے بلا کے سچ پوچھنا۔ شاید اس وقت وہ نشے میں نہ ہوں۔"

حشمت خان کی مایوسی اور بے بسی قابل دید تھی۔ میرے اعتماد کے علاوہ میرے جوابوں نے اس کی تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ وہ سارا منصوبہ جو مجھے میر محمد کے سر بریدہ کے ساتھ گرفتار کرنے کا تھا، فلاپ ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ میں اس جال سے صاف بچ گیا تھا اور اس نے اپنے سازشی منصوبے کی بنیاد جھوٹ پر رکھی تھی تو میں نے زیادہ بڑے جھوٹ سے اس کو ناکام بنا دیا تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ میرے گواہ زیادہ معتبر اور ناقابل تردید تھے۔ ان کی گواہی کو مسترد کرنا ناممکن تھا۔ حشمت خان دوسروں کا مہرہ تھا۔ وہ بہت بڑے شاطر تھے لیکن حشمت خان بہت چھوٹا پولیس افسر تھا۔ اگر اس میں ہمت ہوتی تو وہ اسلام آباد فون ضرور کر لیتا اور پھر میرے جھوٹ کا پردہ چاک ہو جاتا لیکن میرا اعتماد میرے کام آیا اور اسے تسلیم کرنا پڑا کہ جھوٹ ہونے کے باوجود سچ وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں اور وہ گاڑی واقعی رابعہ اپنے ساتھ اسلام آباد لے جا چکی ہے۔ اسے یقین ہو گا کہ رابعہ صبح انسپکٹر سے میری ملاقات کے بعد گاڑی لے کر نکلی تو چار پانچ گھنٹے میں اسلام آباد پہنچ گئی ہو گی لیکن اس سے پوچھا گیا تو وہ بھی یہی کہے گی کہ وہ اپنی گاڑی میں گزشتہ روز اسلام آباد پہنچی تھی۔ اسی طرح شیخ یا عبدالودود منظر کے گھر فون کرنا اسے بے سود نظر آتا تھا۔ وہاں کون تھا جس سے حشمت خان کو مختلف بیان کی توقع ہوتی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ہم سب نے مل کے طے کر لیا ہے کہ کس نے کیا کہنا ہے۔ چنانچہ ہمارے بیانات میں سر مو فرق نہ ہو گا۔ درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن حشمت خان کے مایوس ذہن کا ردعمل حالات

www.paksociety.com

کی جو صفحۂ شکن تصویر پیش کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے ابھی تک فون نہیں کیا۔ اس طرح یہ خطرہ ٹل گیا کہ وہ لاہور میں ہی رابعہ کی گاڑی کو تلاش کرتا ہوا اس گیراج تک جا پہنچے گا جہاں میں نے گاڑی کو ڈینٹ پینٹ ہونے کے لیے دیا تھا۔ بے شک میں اس کی سیٹ بدل چکا تھا لیکن آگے ڈگی میں خون کے ذرات کی موجودگی بہت کچھ ثابت کر سکتی تھی۔ ہفتہ بھر کے بعد تو نئی چمکتی دمکتی گاڑی کو میں خود پھر اسی پیٹرول پمپ پر لے جاتا تو کسی کو شک بھی نہ ہوتا۔ نئے رنگ و روغن کے بعد کسی لہو کا سراغ ملنا ناممکن تھا۔

"میر محمد کے کیس کی کیا پوزیشن ہے حشمت خان؟" شیخ نے اخبار رکھ کے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"کاش تو جناب کو مل ہی گئی تھی۔" وہ طنز آمیز تعظیم سے بولا۔ "مسز کوئی تھانے میں ڈال گیا۔"

"کوئی کا کیا مطلب؟" شیخ نے کہا۔ "اور کہاں ڈال گیا؟"

"ایس ایچ او صاحب کے کمرے میں۔"

"صاحب کی صحبت میں آپ بھی مسخرے ہوتے جا رہے ہیں۔" حشمت خان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ "ہم نے دیکھا ہی نہ تھا، کسی کو اسے چلانے دیتے، بس عمارت کے پچھلے حصے میں پڑا ہوا ملا تھا، کھلے گٹر میں۔"

"پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اس انسپکٹر کے لیے اپنی جان چھڑانے کا اور کوئی آسان طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی اس پر انکشاف ہوا ہوگا کہ اپنے بیگ میں مال غنیمت کے ساتھ وہ ایک پولیس والے کی بسری بھی لیے پھر رہا ہے، وہ ساری بات سمجھ گیا ہوگا۔ ممکن ہے وہ لوٹ کر بھی آیا ہو مگر اس وقت تک میں گاڑی سمیت غائب ہو چکا تھا۔ کسی جھمیلے میں پڑنے کے بجائے اس نے سوچ سمجھ کر سر کو سپرد گٹر کیا اور اس طرح نہ صرف یہ کہ اپنا مسئلہ حل کیا بلکہ پولیس کی مشکل بھی آسان کر دی۔ اب ان کے پاس سالم میر محمد جلا ہوا نقشہ کے ساتھ موجود تھا۔ جسے مقتول ثابت کیا جا سکتا تھا اور اسے مرا نام لینے کی ضرورت تھی نہ کسی اور کی۔ شیخ مجھ سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

"میرا مشورہ تو ان حالات میں یہ ہے حشمت خان! کہ ہم لوگ سب کچھ بھول جائیں۔" میں نے کہا۔ "مثلاً وہ پیٹرول پمپ والے بھول جائیں کہ نشے کی کیفیت میں انہوں نے کیا دیکھا تھا۔ تم ان کی رپورٹ کو بھول جاؤ۔ میں بھول جاتا ہوں کہ تم یہاں آئے تھے اور تمہارے اور ہمارے درمیان غلط فہمی کی بنیاد پر کوئی بات ہوئی تھی۔ پُرسکون زندگی گزارنے کا ایک نسخہ یہ بھی ہے کہ آدمی بے بنیاد خیالات کے انتشار سے بچے اور جو بات ثابت نہ ہوتی ہو، وہ بے بنیاد خیال سے زیادہ فضول ہوتی ہے۔ تم قانون کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہو، وہ اسی سچائی کو تسلیم کرتا ہے جو ثابت بھی کی جا سکے۔"

معلوم نہیں حشمت خان کس موڈ میں تھا کہ جواب دینے کے بجائے وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اپنی کون سی نماز دشمنی چل رہی ہے سکندر صاحب! ہم تو کیسوں کے ساتھ جانے والے لوگ ہیں۔"

"اور تم محض لالچ کے باعث چکی کے دو پاٹوں کے بیچ آ گئے ہو۔" میں نے کہا۔ "چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے، دو پاٹ کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوئے۔ ذرا حساب کرو کہ اس چلتی چکی میں کتنے پس گئے۔ کیا میر محمد کے سر کو گٹر میں سے نکالتے وقت تمہیں بالکل خیال نہیں آیا تھا حشمت خان کہ یہ سر تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں... میں... میں ایسا کیوں سوچوں؟" حشمت خان کا رنگ اڑ گیا۔ "ویسے تو اس نوکری میں بدنامی اور خطرات لکھا ہی گیا ہے۔ سر کو ہتھیلی پر رکھ کے پھرنا ہی پڑتا ہے۔"

"بیٹھ جاؤ حشمت خان!" میں نے کہا۔ "تم تفتیش کر چکے، اب تم میرے مہمان ہو۔ ہماری گفتگو آف دی ریکارڈ ہوگی۔ تم نے تسلیم کیا ہے کہ ذاتی طور پر تمہیں مجھ سے کوئی عداوت نہیں تو پھر یہ کیا تھا حشمت خان جس نے تمہیں مجبور کر دیا کہ تم اس ٹیپ کو غائب کرنے میں میر محمد کا ساتھ دو۔ تم اچھی طرح جانتے تھے کہ میری بے گناہی کا وہی ایک ثبوت ہے اور اگر وہ ضائع ہو گیا تو شاید استغاثہ کے سب سے اہم گواہوں کو قتل کرنے کا الزام براہِ راست مجھ پر آ جائے گا۔ کرنے والے تو بہت دنوں سے کوشش کر رہے ہیں کہ مجھے دھکیل کر تختۂ دار تک لے جائیں۔ اس کوشش میں ان کا اپنا کیا انجام ہوا، یہ تم اب بھی نہیں سمجھے۔ تم ہتھیلی پر سر رکھ کے نہیں، ہتھیلی پھیلائے پھر رہے ہو اور تمہاری ہتھیلی میں سوراخ ہے۔ اس کو شاید دولت نہیں بھر سکتی، یہ ایک دن قبر کی مٹی ضرور بھر دے گی۔"

"ایسی آف دی ریکارڈ باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔" وہ خفا ہو کے بولا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ اب تمہارے پاس وقت کم ہے۔" میں نے کہا۔ "تم نے دیکھا کہ ڈی سلوا نہیں رہا۔ اسے کتنا غرور تھا اپنی طاقت کا اور میر محمد نہیں رہا۔ اس نے بھی ساری خدائی کا بوجھ قوت تسخیر میں سمجھا تھا۔ ان سے پہلے بہت سے نمرود اور فرعون گزرے جو اتنی سی بات نہ سمجھ پائے کہ ماننے والے سے بچانے والا زبردست ہے۔ تم نے میری زندگی کی قیمت کیا وصول کی تھی؟ بلکہ اس سوال کو یوں سمجھو کہ لگانے والوں نے میری زندگی کی جتنی قیمت لگائی تھی، اس میں سے تمہارا حصہ کیا تھا؟"

"یہ کیا فضول بکواس ہے۔" حشمت خان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہونے لگا تھا۔

"میں تم پر ایک الزام لگا رہا ہوں اور اس کے باوجود مجھے تمہاری بزدلی کا یہ انداز بھی کھلا لگتا ہے۔ تم خوفزدہ ہو حشمت خان!" میں نے کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو؟ مجھے کچھ معلوم نہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے صحیح رقم کا اندازہ نہیں مگر میں جانتا ہوں کہ میر محمد نے وہ ٹیپ میری جان کے دشمنوں کو فروخت کرنا چاہا تھا۔ اور وہ کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہا تھا کہ اسے خاصی رقم پیشگی مل گئی تھی مگر یہ ناممکن تھا کہ وہ اکیلا ساری رقم ہضم کر جاتا۔ اس کے شریک راز اور برابر کے شریک جرم تم بھی تھے۔ اس نے تمہارا حصہ ضرور ادا کیا ہوگا۔ خود تم حصہ لیے بغیر ٹلنے والے کہاں تھے مگر انعام کے بعد انجام کے لیے بھی تیار رہو۔ اپنی بیوی کو بھی وہ سب تفصیل سے بتا دینا جو میر محمد کی بیوی کے ساتھ ہوا۔ وہ بھی ذہنی طور پر تیار رہے اور اتنی ہی ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کرے جتنا میر محمد کی بیوی نے مرتے دم تک کیا۔"

"تمہارا... تمہارا دماغ خراب ہے۔ یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟" حشمت خان ہکلایا۔

"بہت سی باتیں تمہیں آج معلوم نہیں لیکن کیا تمہاری عقل سے کوئی فرق پڑتا ہے؟" میں نے کہا۔ "جو ہونا ہے وہ ضرور ہوگا۔ میں تو اچھا کر رہا ہوں کہ تم کو قبل از وقت خبردار کر رہا ہوں۔ میر محمد کی بیوی بہت سمجھدار تھی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے بچوں کی جان تو بچا لی۔ اگر تمہاری بیوی کچھ نہیں کر سکتی تو تم کوئی انتظام کر لو۔"

حشمت خان نے ٹوپی اٹھائی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ دہشت زدہ ہو گیا تھا۔

"اور کل صبح کے اخبارات ضرور دیکھ لینا۔" میں نے چلا کر کہا۔ "کسی میں تم کو میر محمد کے دونوں بچوں کی تصویروں کے علاوہ اور بہت سی دلچسپ خبریں ملیں گی۔" میں نے ایک قہقہہ مارا اور اس کے پیچھے پیچھے باہر تک آیا۔ حشمت خان کے دونوں ماتحت پہلے ہی جا چکے تھے۔ اب وہ اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر رہا تھا۔

"اب تو بہت پیسہ ہوگا تمہارے پاس۔ نئی کار نہ سہی، موٹر سائیکل نئی لے لو حشمت خان!" میں نے گیٹ بند کرتے ہوئے کہا۔ "لینے والے تو اتنے سود خور ہیں کہ ایک ہاتھ سے پیسہ دیتے ہیں تو دوسرے سے جان لے لیتے ہیں۔ میر محمد کا مزار تک نہیں بنا، میں نے اس پیسے سے جو بیچارے نے جان کی بازی لگا کر کمایا تھا۔"

حشمت خان نے ادھر ادھر دیکھ کے مجھے ایک فحش گالی دی اور بلبلاتے ہوئے کک مار کر اسٹارٹ۔

"میں ہنس دیا۔ تم جتنی گالیاں چاہے دو، میں مشتعل ہو کے ایک باوردی پولیس افسر پر حملہ نہیں کروں گا۔ افسوس حشمت خان! کہ دنیا میں تمہارا کوئی دوست نہیں ہے جو دوستی میں تمہاری خاطر جان دے سکے۔ پیسہ جسے تو نے دوست رکھا، جیتے جان لیتا ہے اور کسی سے وفا نہیں کرتا۔" اسی وقت موٹر سائیکل ایک پٹاخہ چھوڑنے کے بعد اسٹارٹ ہو گئی۔ "اچھا حشمت! خدا کرے صبح تک تمہارے بیوی بچے وغیرہ اور یتیم نہ ہوں۔ میری شکریہ کہنا میں رضوی صاحب سے کچھ نہیں کہوں گا۔" حشمت خان کا حوصلہ اتنا پست ہو گیا تھا کہ وہ بڑی عجلت میں فرار ہو گیا۔ خطرے کا احساس اسے یقیناً ہو گیا تھا جو اسکیم میر محمد کے قتل میں مجھے ملوث کرنے کے لیے اسے سمجھائی گئی تھی، وہ ناکام ہو گئی تھی اور اسے ڈر تھا کہ جو بیڑا اٹھائے اس کی ذات ٹھہرے گی۔ میر محمد کے انجام کے بعد میری باتوں نے اس کے ہوش گم کر دیے تھے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔ تاہم ڈی سلوا کے مارے جانے کے بعد میری اپنی ذات کے لیے خطرات بڑھ گئے تھے۔ ڈی سلوا اس گروہ کا ایک شکاری تھا جو وزیر خان کے بعد

www.paksociety.com

مجھے شکار کرنے کے لیے متحد ہوئے تھے۔ استاد پیڈرو اور میرے جیسے لوگ تو ان کا آلۂ کار تھے جو کارآمد رہیں تو قیمت رکھتے ہیں اور بے مصرف ہو جائیں تو ختم کر دیے جاتے ہیں۔ ان کی جگہ کبھی خالی نہیں رہتی۔ دنیا کے ہر بازار میں قاتل بھی مل جاتے ہیں جو صرف معاوضے کی بات کرتے ہیں، یہ نہیں پوچھتے کہ کس کی جان لینی ہے اور کیوں لینی ہے اور یہ نہیں سوچتے کہ یہ بازی جان کی بازی ہے اور بازی ہار جیت کے ساتھ ہار بھی ہو سکتی ہے۔ ڈی سلوا کی موت پر ایک فوری انتقامی ردعمل یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شکاری مزید صبر و ضبط سے کام نہ لے سکیں۔ اب تک وہ مجھے زندہ گرفتار کرنے کے لیے حصار کو تنگ کرتے جا رہے تھے اور انہیں امید تھی کہ بالآخر وہ مجھے زیرِ دام لانے میں کامیاب ہو جائیں گے جس کے لیے وہ بہت بڑی قیمت ادا کر چکے تھے لیکن کامیابی کی منزل ان سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ تازہ ترین شکست استاد پیڈرو کی گرفتاری تھی جسے وہ ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے اسے بچا کے ہم نے ان کے لیے بہت سے تشویش کے اسباب پیدا کر دیے تھے۔ استاد پیڈرو بہت کچھ جانتا تھا اور اب دشمن نے ہمیں کمزور سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ انہیں ڈر ہو گا کہ ہم اپنے مخصوص طریقے آزما کے استاد پیڈرو کی قوتِ مزاحمت کو شکست دے سکتے ہیں اور اسے بولنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ مجھے یہ بات تقریباً یقینی لگتی تھی کہ افشائے راز سے قبل ہی وہ استاد پیڈرو کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا انتظام کر دیں گے خواہ اس کے لیے پیڈرو کو حوالات میں ہی قتل کرانا پڑے یا اسے بزور باہر نکال کے لے جانا پڑے۔ مجھے شیخ پر اعتماد تھا کہ وہ پیڈرو کی حفاظت کے انتظامات میں کوتاہی کا مرتکب نہیں ہو سکتا چنانچہ میں نے بعد میں اس سے پوچھا ہی نہ تھا کہ قیدی کس حال میں ہے۔ رضوی صاحب نے اپنے گھر میں میری حفاظت کے لیے جو انتظامات کیے تھے وہ درہم برہم ہو گئے تھے اور اب ان کی واپسی تک یہاں میرا صرف اللہ نگہبان تھا۔ تاہم احتیاط کرنا مجھ پر لازم تھا اور مجھے آج کی رات اکیلے سونے میں خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ میں سارا دن گھر سے غیر حاضر رہا تھا اور اس وقفے میں کسی کا اندر چھپ کے بیٹھ جانا مشکل نہ تھا جو رات کو اندر سے دروازہ کھول دے تو مجھے سوتے میں اٹھا لیا جائے۔ استاد پیڈرو کے حصول کا ایک آسان طریقہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میری رہائی کو اس کی رہائی سے مشروط کر دیا جائے۔ یعنی ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ تم پیڈرو کو چھوڑ دو ہم سکندر کو واپس کر دیتے ہیں۔ چوہدری وقار ایسے سودے کرنے میں کسی سے کم نہ تھا۔

نہ جانے کیوں یہ خیال میرے ذہن میں واضح ہو گیا کہ آج رات ایسا ہی ہو گا اور مجھے اغوا کر لیا جائے گا۔ پہلے میں نے پورا مکان ساتھ رکھ کے گھر کا ہر کمرہ اور ہر کمرے کا ہر گوشہ دیکھا۔ اندر کوئی نہیں تھا لیکن میری تسلی نہ ہوئی۔ اس قسم کی خانہ تلاشی بے سود تھی۔ کسی بھی شخص کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ میں ایک کمرے سے جاؤں تو وہ دوسرے میں کھسک جائے اور میں دوسرے میں پہنچوں تو وہ پھر پہلے میں آ جائے۔ میں نے عقل کے دلائل سے خود کو قائل کرنا چاہا کہ یہ خیال میرے لاشعور میں پنہاں خوف کی پیداوار ہے جو اس لیے غالب آ رہا ہے کہ اچانک مجھے اپنے اکیلے رہ جانے کا احساس ہو گیا ہے۔ محسن، رابعہ، شعلہ اور انکل رضوی سمیت اس گھر کے مکین میرے لیے ایک نفسیاتی سہارا تھے جن کی موجودگی میں تنہائی کے خوف سے کبھی واسطہ نہ پڑتا تھا۔

میں نے سب کھڑکیاں اندر سے بند کر کے دروازے مقفل کیے اور گھر سے باہر آ گیا۔ رات اپنا دامن پھیلا چکی تھی اور دہشت سے ویرانی شہر بنگلوں کا تاثر کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ میں کچھ دیر لان میں کھڑا رہا۔ اس جگہ جہاں ایک رات میں اور رابعہ ایک درخت کے قریب بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ یہ قربتیں اور فاصلے سب احساس کے کرشمے تھے۔ اس رات وہ میرے کتنی قریب تھی۔ ظاہر کی آنکھ سے دیکھنے والے کو کیسے نظر آتا۔ اب وہ مجھ سے دور تو اس کا تصور ایک حقیقت بن کے رگِ جاں سے قریب تر آ گیا اور میں اسے بالکل ویسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے اسلام آباد میں مرے دیکھ رہا تھا یا شعلہ اور دوسرے لوگ دیکھ رہے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس وقت مجھے سب کے چہرے دکھائی دیے مضمحل اور ملول۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ میں شریک تھے۔ ان کا ایک دوسرے کے غم میں رفاقت کا جذبہ تو تھا۔ وہ ایک ساتھ رو سکتے تھے اور ایک دوسرے کے آنسو پونچھ سکتے تھے۔ صرف میں گم تھا۔ شام کے ساتھ ہی تنہائیت اسی طرح میرے رگ و پے میں اترنے لگتی تھی جب بھی میں اکیلا رہ جاتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ میں نے لورینہ کو یاد کیا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے بہت دور ہے جہاں میرے خیال کی رسائی بھی نہیں۔ وہ میرے خیالات کی دنیا سے بھی اتنی دور چلی گئی ہے کہ اس کا تصور تک دھندلا گیا ہے۔ اس خواب کے نقش کی طرح جسے رواں دواں زندگی کے ہنگامے میں یاد رکھنا بھی محال ہو۔

شاید جینے والوں کو ایسے ہی سہاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ مرنے والوں کے ساتھ مر نہیں جاتے۔ راستوں پر ساتھ چھوڑنے والوں کی جگہ نئے ہم سفر بنا لیتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ خود غرضی؟ وقت کی چارہ گری یا حقیقت پسندی کی انتہا؟ وہ انتہا جہاں جذبات کی وابستگی بھی عقل کے پیمانے پر حماقت نظر آتی ہے۔ وقت بڑا

www.paksociety.com

بے دلچسپ ہوا۔ وقت جو آنے والا ہے، وجود کا محتاج ہے۔ جو کچھ ہے بس اک پل ہے جو گزر رہا ہے۔ آج رابعہ کے بغیر میں ادھورا ہوں۔ مجھے دن کے ساتھ رات کے بغیر وقت کا کوئی تصور نہیں۔ کل اگر رابعہ کا ساتھ بھی نہ رہا تو کیا سفر ایسے ہی جاری رہے گا؟ میری ذات کی تکمیل کوئی اور کرے گا؟ "نہیں۔" میں نے گھبرا کے سوچا۔ رابعہ کہاں جا سکتی ہے جس کے بغیر میں کہاں رہ سکتا ہوں۔ جس نے اپنا سب کچھ دے دیا ہے اور مجھ سے سب کچھ لے لیا ہے اور زندگی کو اس سانچے میں ڈھال دیا ہے جو اس کے لیے اور میرے لیے ایک ہی ہے۔ فوزیہ ایک خواب تھی۔ رابعہ وہ حقیقت جس سے مفر نہیں۔

میں نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا اور سوچا کہ اگر میں اسی وقت روانہ ہو جاؤں تو رات کو کسی وقت پنڈی پہنچ سکتا ہوں۔ یہاں تو میں نے بلاوجہ وقت ضائع کیا۔ مجھے عدالت سے اجازت ملتے ہی روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ رات بھی کسی دوست کے گھر میں یا ہوٹل میں گزارنے سے کیا حاصل؟ فوزیہ کی شادی میں شرکت نہ کرنے کا ایک جذباتی عذر بھی تھا اور ایک قانونی عذر بھی لیکن محسن کی ماں کی زندگی کے آخری لمحات میں سب کے ساتھ مجھے بھی موجود ہونا چاہیے۔ بے شک محسن کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی مگر خدانخواستہ میں نے اجازت ہونے کے باوجود مسز شیروانی کی آخری رسوم میں شرکت نہ کی تو یہ بہت معیوب بات ہوگی۔

آدھی رات کے بعد اسلام آباد پہنچنے میں میرے لیے بھی پریشانی تھی اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی۔ صبح پہنچنا بہتر تھا یا صبح روانہ ہونا؟ میں نے اندر جا کے اپنا بریف کیس خالی کیا اور اس میں کپڑوں کے دو جوڑے ڈال لیے۔ میری جیب میں دو ڈھائی سو روپے تھے جو عام حالات میں میری ضرورت کے لیے کم نہ تھے لیکن اسلام آباد میں جہاں میرا کوئی بنک اکاؤنٹ نہیں تھا اور میرے قیام کی مدت غیر یقینی تھی، اب مجھے پیسے کی ضرورت پڑ جاتی تو رابعہ یا محسن سے مانگتے جھجکتا۔ بے شک وہ بھی اپنا ہی گھر تھا اور انکل رضوی یا انکل شیروانی میری ہر ضرورت پوری کر سکتے تھے مگر میں نے بہتر یہ سمجھا کہ خالی ہاتھ نہ جاؤں۔ اس وقت بنک بند تھے لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ میں کسی کو ایک ہزار کا چیک دے دوں جو وہ صبح کیش کرا لے اور مجھے اس وقت اپنے پاس سے ایک ہزار دے دے۔ شاید شیخ اس کا انتظام کر دے۔ اس کے سوا لاہور میں اپنا کوئی جاننے والا تھا تو استاد وٹیڈی مگر اس کا سراغ لگانا آسان کام نہ تھا۔ شیخ دن بھر میرے ساتھ رہا تھا چنانچہ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ رات کو ڈیوٹی پر ہوگا اور کچھ دیر قبل آنے والا حشمت خان اسے چارج دے کر جا چکا ہوگا۔

میرا اندازہ درست تھا۔ جب میں پولیس اسٹیشن پہنچا تو شیخ کو ڈیوٹی پر آئے آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا۔

"یہ کوئی پرابلم نہیں۔" اس نے مجھ سے چیک لے کر کہا۔ "جیب میں تو تھوڑی سی رقم ہے مگر میں گھر سے منگوا لیتا ہوں۔" اس نے اپنے گھر فون کیا۔ "نازو بی بی!" پھر وہ بولا۔ "ہاں، ہم تو بالکل خیریت سے ہیں لیکن تمہارے یہ گرد والے مہمان سکندر اعظم بلیک بیلٹ مصیبت زدہ بیٹھے ہیں۔ ان کا حال قابلِ رحم ہے۔ بڑی دکھ بھری کہانی ہے ان کی۔ مختصر یہ کہ ہزار کا چیک لیے پھر رہے ہیں اور نقد مانگتے ہیں۔ دیکھو بی بی! ہم پولیس والے کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔ یہ چیک ضرور بوگس ہوگا... مرضی... تم کر لو بات۔" اس نے ریسیور مجھے تھما دیا۔

"یہ کیا مصیبت ہے یارو۔" میں نے بادل ناخواستہ ریسیور سنبھالا۔ حوالات کی طرف سے کسی کا قہقہہ سنائی دیا۔

"استاد جی!" نازی کی شوخ آواز آئی۔ "ہزار روپے مل سکتے ہیں اسی وقت لیکن چند شرائط ہیں۔"

"وہ بھی فرمائیے۔" میں نے کہا۔ "لیکن فوراً آہستہ بولیے یا پھر ٹیلی فون رکھ کے بات کیجیے۔ آواز آ جائے گی۔"

وہ ہنسی۔ "ایک شرط تو یہ ہے کہ معاملہ ادھار کا ہے۔ ہزار کا سود لگے گا۔ دوسری یہ کہ آپ نے مجھے اسکول کی بچی کہا۔ اس کا جرمانہ دینا پڑے گا اور جرمانہ یہ ہے کہ آپ کو مجھے ساتھ... میں قبول کرنا ہوگا۔"

"پہلی شرط منظور ہے۔" میں نے کہا۔ "باقی نامنظور۔ تو سود بھی حرام ہے لیکن گناہ تمہارے سر۔"

"چلیے سود اور جرمانہ ایک کر لیتے ہیں۔" وہ بولی۔ "آ جائیے اور... چشم ما روشن دل ما شاد۔ باقی رہا شکر گزاری کرنے کا معاملہ تو جناب میرا بھیا تھانیدار ہے۔ اسے سب کرنا آتا ہے۔" اس نے ہنس کے ریسیور رکھ دیا۔

"یہ تیری بہن بھی کیا چیز ہے یار!" میں نے کان سہلا کے کہا۔ "کان کھا گئی میرے۔ فوراً مجھے اسکوٹر کی چابی دے۔"

"کیوں؟" شیخ نے مسکرا کے چابی میری طرف اچھالی۔ "دیا کوئی جرمانہ تم پر بھی۔ بس ایسے ہی مجھ سے بھی جرمانے وصول کرتی ہے اور رقم اینٹھتی رہتی ہے۔ اس کے پاس ہمیشہ نقد موجود رہتی ہے۔ ادھار دیتی ہے تو اس کی شرح سود ہے دس فیصد گھنٹہ تک۔ ایک بار رات کو سو روپے لے کر صبح دو سو دینے پڑے۔"

"مجھے حکم ہے کہ آ کے لے جائیے۔" میں نے کہا۔ "میں آتا ہوں۔"

"جا! تو ویسے بھی پڑتا تمہیں۔" شیخ نے کہا۔ "گھر پر کوئی نوکر تو ہے نہیں اور یہاں سے میرا جانا مشکل تھا۔"

★

نازی کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ آج ہی دن میں اسے دیکھ کر میں نے یہ سمجھا تھا کہ وہ اسکول کی بچی ہے تو کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ اپنی عمر سے بہت کم اور صورت سے بہت زیادہ معصوم لگتی تھی لیکن اس وقت وہ بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے اہتمام سے ساڑھی باندھی تھی جس کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ اس کے بال شانوں پر پریشان تھے اور اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا۔

"تم جا رہی ہو کہیں؟" میں نے اس کے حیا آلودہ رخسار پر پھیلی مسکراہٹ کا اجالا دیکھ کر کہا۔

"میں... جی نہیں... میرا مطلب ہے جی ہاں۔" اس نے کچھ سوچ کے اپنے جواب کو بدل دیا۔ "یہ لیجیے۔" اس نے بند مٹھی میرے سامنے کھول دی۔ گلابی ہاتھ پر سو سو کے دس نوٹوں کا رول سا بنا ہوا رکھا تھا اور اس کے ہاتھ کی نمی سے بھیگا بھیگا لگتا تھا۔ میں نے نوٹ جیب میں رکھے اور چیک آگے بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے چیک کو غور سے پڑھا اور پھر اطمینان سے اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے کہا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سی بے کلی محسوس ہونے لگی تھی۔

"کچھ نہیں، بس اعتبار ہے آپ پر۔ واپس آ کے لوٹا دیجیے گا۔" وہ اٹھلا کے بولی۔ "میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

"اچھا چائے؟" میں نے کہا۔ "میرا تو بالکل موڈ نہیں ہے اس وقت چائے پینے کا۔ بس میں چلتا ہوں اب۔"

"میں کون ہوتی ہوں؟" وہ مجھے دھمکی دیتے ہوئے بولی۔ "وہ تھانیدار کے باپ ہیں۔ کھانے پر روک لیں گے۔"

میں مجبور ہو کے بیٹھ گیا۔ کسی کمرے سے ٹی وی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید شیخ صاحب خبریں سن رہے تھے۔

نازی کا رویہ اچانک میرے لیے پراسرار اور کسی حد تک پریشان کن ہو گیا تھا۔ وہ نابالغ بچی واقعی نہیں تھی چنانچہ اس کی باتوں کا اور اس کے عشوہ و غمزہ و ادا کا مطلب سمجھنا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ وہ نادان لڑکی مجھ میں دلچسپی لے رہی تھی جو میرے لیے بہت خطرناک بات تھی۔ میرے لیے ناممکن تھا کہ اس کی دلچسپی کا جواب دلچسپی سے دوں۔ اس کی دل شکنی بھی بہت مشکل کام تھا ورنہ انکار یا اقرار، نتائج بہرصورت میری اور شیخ کی بے غرض دوستی پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔ میں نے تہیہ کیا کہ آئندہ کبھی ادھر نہیں آؤں گا اور آیا بھی تو رابعہ کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ ذرا بھی عقل ہوئی تو نازی خود سمجھ لے گی کہ میرے اور رابعہ کے درمیان جذبات کا رشتہ کتنا مضبوط ہے۔ نہیں تو خود کسی طرح یہ بات نازی کے کان میں ڈال دوں گا کہ میرا اور رابعہ کا ارادہ تمام عمر کی رفاقت کا ہے اور حالات کے سازگار ہوتے ہی ہم ایک ہو جائیں گے۔ میں نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ تو ایسے بھاگ رہے ہیں۔" نازی نے اپنا کپ رکھ کے کہا۔ "جیسے گاڑی نکلی جا رہی ہو۔"

"بجا ارشاد۔ گاڑی واقعی نکل جائے گی۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "مجھے اسی وقت پنڈی جانا ہے۔"

"سکندر جی! اس وقت کوئی ٹرین پنڈی نہیں جاتی۔" اس نے گھڑی دیکھ کے اعلان کیا۔ "اب آپ چلے گئے تو رستے میں میری ایک سہیلی کے گھر ڈراپ کر دیں گے۔ پلیز! بس ذرا آپ کو زحمت ہوگی۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ اگر میں نہیں آتا تو تم کیسے جاتیں؟" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ میں اسے دوسرا مصرعہ پڑھنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ شاید وہ پڑھتی بھی نہیں مگر کسی طرح مفہوم کا اظہار کر دیتی۔ میں نے خود کو احمق اور ناسمجھ ظاہر کرنا بہتر جانا جو اشارہ پا کے بھی بات نہ سمجھے۔

"پھر میں ٹیکسی پر چلی جاتی۔ اب پیسے کیوں ضائع کروں؟" وہ بولی۔ "اور آپ کیوں اکڑ رہے ہیں جناب؟ میرے بھیا کا اسکوٹر ہے۔ تھوڑی سی ڈرائیونگ بھی کرنا پڑے گی نا۔ ہم اس کا معاوضہ ادا کر دیں گے۔" وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی اور میرے لیے انکار کی گنجائش نہ رہی۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے یہ تمام تیاری میرے استقبال کے لیے کی تھی مگر میرے پہنچنے پر فوراً ایک جواز تلاش کر لیا اور میرے ساتھ جانے کا ایک بہانہ بھی۔ وہ کسی بھی سہیلی کے گھر کوئی پروگرام بنائے بغیر صرف ملاقات کے لیے جا سکتی تھی۔ اگرچہ میں اسکوٹر چلاتے وقت بہت محتاط تھا اور سڑک بھی ہموار تھی پھر بھی میں سخت مشکل میں تھا۔

بالآخر اس نے ایک کوٹھی کے گیٹ پر مجھے رکنے کو کہا۔ "آپ مانگیں گے کیا اجرت؟"

"جی نہیں۔" میں نے جل کر کہا۔ "صرف اجازت مانگوں گا۔ بہتر ہو واپس لے جانے کی بیگار میں پکڑا جاؤں۔" میں نے اس کے اترتے ہی اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ہنسی اور ہاتھ لہرا کے اندر غائب ہو گئی۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا کہ خیریت رہی اور کوئی ناخوشگوار صورتِ حال پیدا ہونے کی نوبت نہیں

www.paksociety.com

آئی، نہ میرے لیے اور نہ نازلی کے لیے۔ بیس منٹ بعد میں نے اسکوٹر کو پھر تھانے میں روکا تو رات کے ساڑھے نو بجنے والے تھے تھانے میں ایک وکیل نہ بیٹھا ہوتا تو شاید شیخ مجھ سے پوچھتا کہ اتنی دیر کیوں لگی مگر وہ دونوں بحث میں مصروف تھے۔ میں نے خاموشی سے چابی شیخ کی طرف کھسکائی اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کیوں وکیل نے مجھے غور سے دیکھا۔

"میں نے کہا نا وکیل صاحب کہ ملزم خیریت سے ہے۔" شیخ نے چابی جیب میں ڈال کے کہا۔

"ملزم! پھر وہی ملزم۔" وکیل نے کہا۔ "میں یہی تو پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس پر الزام کیا ہے؟"

"حقیقت تو یہ ہے وکیل صاحب کہ وہ ایک بہت پرانے مقدمۂ قتل کے سلسلے میں مطلوب تھا۔" شیخ نے کہا۔

"کیا اس کا نام ایف۔ آئی۔ آر میں ہے؟" وکیل نے اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں۔ مگر اس کو مشتبہ افراد میں سرفہرست سمجھا جا سکتا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اب یہ نہ پوچھیے گا کہ کیوں؟ یہ شبے کی بات ہے اور ہم تفتیش کے نتائج سے مطمئن نہیں۔ کسی کو قبل از وقت کچھ بتانے سے نقصان ہو سکتا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ بے قصور ہوگا تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔"

"کب؟ اور کس حالت میں؟" وکیل نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ساری رات اس پر تشدد کر کے جب وہ اٹھ کر کھڑا نہیں ہو سکے گا اور مرنے کے قریب ہو جائے گا تو تم اسے سڑک پر ڈال دو گے۔"

"تم کسی ثبوت کے بغیر مجھ پر ایک سنگین الزام عائد کر رہے ہو۔" شیخ نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا۔

"تو کر دو مجھے بھی بند۔ تم بادشاہ ہو تھانیدار صاحب۔" وکیل نے ترش ہو کے کہا۔ "میری زندگی اسی پیشے میں گزری ہے مجھے مت بتاؤ کہ تم لوگ کیا کرتے ہو اور کیا نہیں کرتے۔"

"میں نے زندگی میں کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا وکیل صاحب!"

"مجھے ابھی تک کوئی تھانیدار ایسا نہیں ملا جو یہ دعویٰ نہ کرتا ہو۔" وکیل نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ "جو ثابت نہ کرتا ہو کہ وہ صرف اپنی تنخواہ میں گزارا کرتا ہے اور رشوت لیتے ہیں تو دوسرے وہ خود تو فرشتہ ہے۔"

"میں تم پر کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتا۔" شیخ نے بے رخی سے کہا۔ "نہ میرا کوئی دعویٰ ہے۔"

"دعویٰ تم کس منہ سے کرو گے۔" وکیل نے میز پر مکا مارا۔ "کسی قانونی اختیار کے بغیر تم ایک شریف آدمی کے گھر میں گھس گئے۔ دن دہاڑے اسے گھر کے اندر سے اٹھا لائے۔ اس کے گھر کا سامان توڑ پھوڑ دیا گیا ہے تمہارے نزدیک قانونی تحفظ... تمہارے سوباؤں نے ایک عورت کو مارا، بچوں کو نہیں بخشا..."

"کون الو کا پٹھا کہتا ہے یہ؟" شیخ نے چیخ کر زیادہ زور سے میز پر مکا مارا۔ "نام بتاؤ مجھے اس کا؟"

"تم مجھ سے اس کا نام پوچھتے ہو؟" وکیل نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ "کمال! تم نے اپنے آپ کو دی سے تھانیدار!"

"میں...... میں نے یہ سب کچھ کیا تھا؟" شیخ الجھ...

"اور کس نے کیا تھا؟ کیسے گرفتار کیا تھا تم نے... سے پکڑا تھا؟" وکیل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

"ایک منٹ!" میں نے مداخلت کو ناگزیر سمجھتے ہوئے...

"میرا خیال ہے کوئی غلط فہمی......"

"شٹ اپ! غلط فہمی کے معنی معلوم ہیں تمہیں؟"... چراغ پا ہوتے ہوئے بولا۔ "کون ہو تم؟ ٹھہرو! پولیس کے بھیجے؟"

پلک جھپکتے ہی صورت حال بدل گئی۔ شیخ اپنی... کے بیچ میں حائل ہو گیا۔ اس نے فوراً اندازہ کر لیا تھا کہ... انگیزی کی فضا کس حد تک خطرناک ہو گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ شیخ نہ روکتا تو میں اس تذلیل کے بعد... سمیت تھانے سے باہر پھینک دیتا اور اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتا۔

"وکیل صاحب! یہ میرے دوست ہیں۔ انگلینڈ سے... کی اعلیٰ تعلیم لے کر لوٹے ہیں اور خود بھی ایک مصنف..." تھوڑے سے مبالغے کو ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔ "ان کا... کوئی تعلق نہیں۔ آپ بھی پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ تھانے... مت بنائیے۔ اطمینان سے بیٹھ کے بات کیجیے۔ یہ بتائیے کہ... متعلق جو کچھ آپ نے کہا وہ آپ سے کس نے کہا تھا؟"

"خود اس شخص کی بیوی نے، اس کے بچوں نے... نے۔" وکیل نے کہا۔

"یقین کیجیے یہ سب جھوٹ ہے۔" شیخ نے کہا۔ "... ابھی ابھی شروع ہوئی ہے۔"

"لیکن اسے آپ نے کل رات گھر سے اٹھایا تھا۔" وکیل...

"اور جن لوگوں نے مجھے دیکھا تھا، وہ مجھے پہچان..." شیخ نے کہا۔ "غالباً پہچان لیں گے۔ انہیں میری تصویر... گئی ہوگی۔ استعفیٰ تو میں دے چکا ہوں۔ یہ مجھے... کرانے کی کوشش ہے۔"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔" وکیل نے کہا۔ "جھوٹ... فیصلہ عدالت کرے گی۔ اس شخص کے دوستوں نے... مجھے وکیل کیا ہے اور میں ان کے بیانات کو

ہوں۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن وہ شخص کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔" شیخ نے کہا۔ "آج دن میں بھی کچھ ملاقاتی آئے تھے......"

"انہیں بھی لوٹا دیا گیا تھا۔" وکیل نے کہا۔ "لیکن میں... نہیں، اس کا وکیل ہوں۔ مجھے وکالت نامے پر اس کے دستخط لینے ہیں۔"

"لیکن اس نے آپ سے ملنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا تھا۔" شیخ نے کہا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" وکیل نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ وہ جسمانی طور پر اس قابل نہیں کہ تم اسے میرے سامنے لا سکو۔ تشدد کے باعث اس کی حالت غیر ہے یا وہ مر چکا ہے۔"

"یہ الزام ہم نے اس کی حفاظت کے پیش نظر بھی کیا تھا کہ کسی کو اس سے ملنے دیں۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن اب نہیں سمجھتا... کے لیے مجھے اس کو زبردستی بلوانا پڑے گا۔" اس نے میز پر... گھنٹی پر ہاتھ مارا۔

ایک سنتری نے کمرے میں آ کے سلیوٹ جھاڑا اور اٹین شن... کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو ایک حوالاتی ہے آخری کمرے میں۔" ایس۔ آئی شیخ نے کہا۔ "اس کو یہاں بلا لاؤ۔ کہنا میں بلا رہا ہوں۔"

آخری کمرے کے نام پر مجھے ایک جھرجھری سی آئی۔ یہ وہ... تفتیش تھا جہاں پہلی رات میں نے بھی تفتیش کے نام پر... ہونے والے انسانیت سوز ظلم کی اذیت برداشت کی تھی۔ چند... خاموشی میں گزرے تھے۔ وکیل کے جارحانہ رویے کے باعث... کشیدگی کی ایک ایسی فضا قائم ہو گئی تھی جس میں کسی کے لیے کسی سے نظر ملانا دشوار تھا۔ وکیل اپنی جیبوں میں کچھ تلاش کرتا... شیخ نے میز کی پیچھے والی دراز میں کچھ تلاش کیا اور اس میں سے سگریٹ لائٹر نکالا۔ اخلاقاً مجھے دوسروں کو بھی سگریٹ پیش کرنے کی عادت تھی مگر شیخ سگریٹ نوشی ترک کر چکا تھا اور بڑی سختی سے اپنے عہد پر قائم تھا۔ وکیل کے ساتھ اس کی بدتمیزی کے بعد... کی گنجائش ختم ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے لیے ایک سگریٹ نکالا اور پیکٹ کو خالی پا کے میز کے نیچے رکھی ہوئی ٹوکری میں ڈال دیا۔ جب میں نے سر اٹھایا تو ایک کانسٹیبل استاد پیڈرو کو اپنے... چکا تھا۔ پیڈرو کی نظر مجھ سے ملی تو وہ چونکا مگر پھر... کے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ مجھے اس کی مسکین صورت... رویے کی انکساری پر حیرت ہوئی۔ وہ بدمعاش ہو سکتا تھا... تھانوں میں ایسی سعادت مندی کا... عدالت کی اکثر قوں میں کمی نہیں آتی۔ لیکن

اس کے انداز و اطوار میں بدمعاشی کی جھلک تک نہ تھی۔ کسی جولانی نے نعرہ لگایا "حق اللہ۔"

"بیٹھ جاؤ بھئی۔" شیخ نے کہا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"زرداد جناب!" اس نے سوچے بغیر کہا۔ "ہمارا قصور تو بتا دیں تھانیدار صاحب! کل سے بند کر رکھا ہے ہمیں۔"

"تم استاد پیڈرو کے نام سے زیادہ مشہور ہو؟" شیخ نے کہا۔ "کرتے کیا ہو؟"

"ریڑھی لگاتا ہوں ریجنٹ سینما پر جناب! سردی میں مونگ پھلی، گرمی میں قلفی۔ استاد پیڈرو تو مجھے کوئی نہیں کہتا۔ میں نے تو آپ سے کہا تھا کہ مجھے کسی اور کے دھوکے میں پکڑ لیا گیا ہے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا اور ہچکی سی لی۔ میں نے اس سے کچھ پوچھنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔

کچھ دیر میں اور شیخ اسے گھورتے رہے۔ وہ بری اداکاری نہیں کر رہا تھا۔ "تم میر شرافت علی کے نام سے واقف ہو؟"

"جی ہاں، میرا ماموں بھی ہے اور سسر بھی۔" وہ بولا۔ "میرے ساتھ مل کر ریڑھی بھی لگاتا ہے۔"

"اب ان کو یہ بھی بتا دو زرداد کہ تمہیں کیسے گرفتار کیا گیا اور کہاں سے۔" وکیل نے کہا۔

استاد پیڈرو کی باتوں نے مجھے اور شیخ کو چکرا دیا تھا۔ وہ بہت بڑا بدمعاش تھا اور اس میں ہمارے لیے شک کی ایک فیصد گنجائش بھی نہ تھی مگر اس وقت وہ ایک مظلوم اور غریب آدمی بنا ہوا تھا جو محنت مزدوری کر کے اپنے اور بیوی بچوں کے لیے حلال کی روزی کمانے کے سوا کچھ نہیں کرتا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ استاد پیڈرو دہری زندگی بسر کرتا ہو۔ اپنے محلے میں وہ واقعی زرداد ہو اور اس بات کے گواہ بھی ہوں کہ وہ شرافت کی زندگی گزارتا ہے مگر باہر اس دنیا میں جہاں چوہدری دلاور اور ڈی سلوا جیسے لوگ اس کے باس تھے، وہ استاد پیڈرو تھا۔ بہت سے بدمعاش اپنے بیوی بچوں کی نگاہ میں ویسے ہی شوہر اور باپ رہنا پسند کرتے ہیں جیسے عام لوگ۔ اپنی مجرمانہ زندگی کا سایہ تک اپنے گھر پر نہیں پڑنے دیتے۔ وہ اس دنیا کے نشیب و فراز دیکھ لیتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ تقدیر نے انہیں جس غلط راہ پر ڈال دیا تھا اس پر ان کی اولاد کبھی دولت کو نصب العین بنا کے نہ چلے۔ وہ شریف کہلائیں اور ان کی زندگی دنیا میں قانون کی سزا کے خوف سے بھی آزاد ہو اور عاقبت کی سزا کے ڈر سے بھی۔ شاید پیڈرو بھی ایسا ہی آدمی تھا۔ اس نے بچوں کو ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت کا سکھ آرام اور زندگی کے تمام لوازمات ضرور فراہم کیے ہوں گے مگر اس کے ساتھ ہی ان کی نظر میں اپنی

www.paksociety.com

عزت اور وقار بحال رکھنے کے لیے جھوٹ کا سہارا بھی لیا ہوگا اور انھیں یقین ہوگا کہ ان کے باپ کا کوئی کام دبا ہے۔ اتنا ہی جائز جتنے سب کے ہوتے ہیں۔

وکیل کے سوال پر اس نے اجازت طلب نظروں سے شیخ کی طرف دیکھا، ڈرتے ڈرتے۔

"ان کی فکر مت کرو" وکیل نے کہا: "میری موجودگی میں یہ تم کو سچ بولنے سے نہیں روک سکتے۔ میں تمھارا وکیل ہوں۔ تمھاری بیوی نے مجھے بھیجا ہے۔ میری فیس بھی ادا کر دی ہے۔ اس نے کیا تم نے ملاقات سے انکار کر دیا تھا؟"

"یہ جھوٹ ہے" استاد پیڈرو کے رویے میں نمایاں تبدیلی آئی۔ اس کا خوف دور ہو گیا۔ اس نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ کس طرح آدھی رات کے بعد پولیس والے دیوار پھاند کے اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ اس کی بیوی نے شور مچایا تو ایک سپاہی نے اسے مارا اور باورچی خانے میں بند کر دیا۔ اس شور سے بچے جاگ اٹھے تھے اور سہم کر چلانے لگے تھے۔ ایک اور پولیس مین نے ان کو بھی گھسیٹ کر ماں کے ساتھ بند کر دیا۔ وہ لوگ سارے گھر میں کچھ تلاش کرتے پھرے اور پھر اسے مارتے دھکیلتے باہر لے آئے اور ایک جیپ میں ڈال کے تھانے پہنچا دیا۔

شیخ کے لیے اور میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہم اپنے ملزم کی گرفتاری کے اصل واقعات اور اسباب بیان نہیں کر سکتے تھے۔ جن حالات میں وہ ہمارے ہاتھ آیا تھا ان پر ہم نے مختلف انداز میں سوچا تھا۔ میر محمد اپنی ہوس کا شکار ہوا۔ اس نے تمام عمر ناجائز ذرائع سے پیسہ کمایا تھا اور اپنی تھانیداری کے بل پر اس کا شکار وہ ہوئے جو کمزور تھے۔ اپنی شہ زوری کے اسی زعم میں اس نے بڑی اسامی دیکھ کر بڑا ہاتھ مارنا چاہا لیکن جن پر اس نے ہاتھ ڈالا تھا وہ بہت بڑے شکاری تھے۔ شاید وہ میر محمد کو منہ مانگا انعام بھی دے دیتے لیکن میر محمد نے ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کی اور وہ ٹیپ گنوا دیا جس کا ضائع ہونا مجھے دہرے قتل کے الزام میں ملوث رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ اس کی وجہ سے چوہدری ولاور کی وہ کوشش ناکامی کے انجام سے دوچار ہوئی جو مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے کی گئی تھی۔ اگر میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں ناکام رہتا تو استغاثہ کے لیے مجھے میر شرافت علی کا قاتل ثابت کرنا کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ میر شرافت علی کے گھر میں گھس کے مجھے مار پیٹ اور توڑ پھوڑ میں مصروف دیکھنے والے بھی دو افراد تھے جو اس وقت میر شرافت علی کے گھر میں موجود تھے اور جنہوں نے چشم دید گواہ کی حیثیت سے مجھے شناخت بھی کر لیا تھا۔ ان کے سفاکانہ قتل کا ذمے دار میرے سوا کون ٹھہر

عبدل اور رشید معمولی گھریلو ملازم تھے اور ان کی کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی سوائے میرے۔ میں ان کے خلاف استغاثہ کی بنیاد بن جاتا اور جانتا تھا کہ جب عدالتی کارروائی کا آغاز ہوگا تو میں وہ آخری منزل جو در حقیقت تک پہنچا ہیں گے چنانچہ میں نے اس وقت آنے سے پہلے ہی ان کا پتّہ بھی صاف کر دیا جس طرح حالات گواہی نے مجھے میر شرافت علی کا قاتل بنا دیا تھا اسی طرح ان کی گواہی سے یہ الزام بھی مجھ پر آ جاتا کہ پہلے قتل کی سزا کے لیے میں نے دو قتل اور کر دیے۔ جب سوال اپنی زندگی کا کسی اور کی زندگی کی پروا کون کرتا ہے اور پھانسی تو ایک ہی ہوتی ہے خواہ ایک قتل کا جرم ثابت ہو خواہ تین کے قتل کا۔ ایک بات یقینی تھی۔ اگر میر شرافت علی کے کیس میں میرے موت سے بچنے کے امکانات مشکوک تھے اور عمر قید ہو جانے کے فائدے میں بری ہو جانے کے امکانات بھی مفقود تھے تو استغاثہ کے سب سے اہم گواہوں کو قتل کرنے کے بعد میرا سزائے موت سے بچنا ناممکن تھا۔ پہلے قتل کو حادثے کا نتیجہ دیا جا سکتا تھا۔ راجہ اور عبدالودود منظر کی کوشش سے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں نے عمداً اسے قتل نہیں کیا تھا بلکہ اپنا دفاع کیا تھا مگر عبدل اور رشید کا معاملہ قطعی مختلف تھا اور یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوتی کہ میں نے ان کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک خاص مقصد کی خاطر قتل کیا۔ موت حادثاتی اشتعال انگیزی کا نتیجہ ہو یا اپنے دفاع کا حق استعمال کرتے واقع ہو جائے تو قانون کی نظر میں اتنا سنگین جرم نہیں رہتا قتل عمد۔ بلکہ بعض اوقات یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ انسان بے بس ہے اور جذبات اس کی عقل پر حاوی آ جاتے ہیں وہ وحشت و دیوانگی میں جان دے بھی سکتا ہے اور لے بھی سکتا ہے مگر دیوانے کو اس کے قول و فعل کا ذمے دار ٹھہرا کر سزا نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ پھر کے قابل ترین وکیل مل کے مجھے میر شرافت علی کے قتل الزام سے تو بری کرا سکتے تھے مگر عبدل اور رشید کے قتل بچانے میں ناکام رہتے۔ میرا دشمن، میرا ماضی تھا۔ لندن کے دوران میں مجھ پر ایک طوائف کے قتل کا الزام آیا تھا ثابت نہیں ہوا تھا۔ انگریز دشمنی کے باعث مجھ پر [illegible] رکھنے اور دو افراد کی موت کا سبب بننے کا الزام آیا تھا [illegible] بچ گیا تھا لیکن بالآخر انہی مشکوک حالات کے باعث [illegible] سے پھر کالج اور پھر برطانیہ سے اخراج عمل میں آیا تھا [illegible] میں میرے والد وزیر خان کا اثر استعمال ہوا تھا وہ خود [illegible] کرتے تھے کہ میں نے بلیک میلنگ اور [illegible]

میر شرافت علی کا خون کیا یا اسے اتنا مارا کہ وہ مر گیا۔ استغاثہ کا کیس مختلف تھا کہ میں نے اسے خنجر کے وار سے ہلاک کیا۔ لیکن عبدل اور رشید کے کیس میں میرا تحفظ دل و دماغ کے ساتھ ارتکاب جرم ثابت ہوتا تھا مگر عبدل نے مرتے مرتے اپنے بیان کو یوں اتارا کہ مجھے بے گناہ قرار دے گیا اور قانون کی نظر میں وہ بیان اس لیے سچ تھا کہ ایک شخص نے اس وقت دیا جب اسے اپنی زندگی کے ختم ہونے کا اعتبار تھا اور ہوش و حواس میں آ گیا تھا۔ میر محمد کے لالچ سے زیادہ اس کی غیر دانشمندانہ دشمنی کے باعث عبدل کا وہ آخری بیان ریکارڈ پر آ گیا جس کے بارے میں شکاری مطمئن تھے کہ اب اس کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ اس بیان کو ایک محرر نے لکھا تھا مگر اس پر عبدل کے دستخط نہیں تھے صرف تحریر محرر کے ہاتھ کی تھی جسے عدالت کے ریکارڈ پر رکھنے سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوتا تھا کیونکہ میر محمد کے دباؤ میں یا چوہدری ولاور اینڈ کمپنی کی طرف سے دھمکی یا فرائض لاعلم پیشی کے بعد وہ کہہ سکتا تھا کہ ٹیپ کا کوئی وجود نہیں اور اس نے اپنے ہاتھ سے وہی لکھ دیا تھا جو پولیس [illegible] آئی جی صاحب لے لیا تھا مگر اب ٹیپ نہ ہمارے پاس تھا اور نہ ہمارے دشمنوں کے پاس بلکہ ایک طرح سے پبلک پراپرٹی ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مرنے سے پہلے میر محمد کی بیوی نے تشدد کرنے والوں کو دکھ ضرور دیا ہوگی کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اور وہ ٹیپ اخبار والوں تک پہنچ چکا ہے۔ شاید اس با ہمت اور چالاک عورت نے یہ بھی کہا ہو کہ اب بیان ہی اخبار میں نہیں آئے گا بلکہ ان کی تصویریں اور ان کا بیان کردہ مجرموں کا حلیہ بھی شائع ہو جائے گا اور کچھ بعید نہیں کہ اس نے جان بچانے کی خاطر پھر ناقابل یقین اور ناقابل یقین جھوٹ کا سہارا لیا ہو۔ یہ بھی کہہ دیا ہو کہ ان کے مجرموں کی تصویریں بھی لے کر گئے تھے۔ ایک رشوت خور پولیس والے کے گھر کے پاس عام قسم کا پاکٹ سائز یا بے بی کیمرہ ہونا بعید از قیاس بات نہیں لیکن اس کے بیان نے شکاریوں کو احساس دلا دیا کہ وہ جال کاٹ دیا گیا ہے جو انھوں نے مجھے شکار کرنے کے لیے پھیلایا تھا اور اسے کاٹنے میں میر محمد کا ہاتھ بھی ہے اور اس کی بیوی کا بھی۔ میر محمد نے ان کو بلیک میل کرنے کا جرم کیا تھا جو ان کے نقطہ نظر سے اتنا سنگین جرم نہیں تھا۔ پیسہ ان کے لیے غیر اہم تھا۔ زیادہ سنگین جرم یہ تھا کہ میر محمد نے اس ٹیپ کو اصل بنانے کے کیس پر [illegible] اور اس کی بیوی نے ناکامی کے باوجود اسے آخری کیل ٹھوک دی جب وہ ٹیپ اخبار والوں تک پہنچا دیا۔ ان دونوں کے لیے کم از کم سزائے موت کی ہی ہو سکتی تھی جو انھیں [illegible] عذاب کے ساتھ دی گئی اور دوسروں کے

خوف!

ایک ایسا مسئلہ جس سے ہر شخص دوچار ہے

خوف سے آدمی پریشان ہوتا ہے۔

خوف سے آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔

خوف سے زندگی ناکام ہو جاتی ہے۔

خوف سے ازدواجی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

خوف سے آدمی خودکشی کر لیتا ہے۔

خوف دیمک کی طرح زندگی کو چاٹتا رہتا ہے۔

شرم بھی خوف ہی کا ایک پہلو ہے اور اتنا ہی خطرناک

اردو کے جانے پہچانے منفرد نفسیاتی ادیب اسلام حسین کے قلم سے

خوف و شرم

اور اس کا سدِ باب

کا مطالعہ کیجیے

اور ان کمزوریوں سے نجات حاصل کر کے

کامیاب اور خوش و خرم زندگی گزاریے

قیمت: ۳۰ روپے

مکتبۂ نفسیات، پوسٹ بکس ۹۴۳ کراچی

www.paksociety.com

لیے وریس عبرت بنا کے رکھ دی گئی مگر اس کے باوجود تلافی نہ ہوئی تو انھوں نے نئی چال چلی اور میر محمد کی لاش سے وہ کام لیا جو میر محمد سے نہ لے سکے تھے۔ عبدل اور شیدے کے قتل کا الزام ڈیسی ہی میر محمد کے قتل کا سہی۔ اسباب تو دونوں کے ایک ہی بنتے تھے اور سزا بھی ایک تھی لیکن اس چال کی ناکامی غیر متوقع تھی۔ نہ صرف یہ کہ میں اپنی چالاکی اور تقدیر کی یاوری کے باعث صاف بچ گیا تھا بلکہ الٹا ہم ایک شکاری کو شکار کر لائے تھے۔

میں اور شیخ دونوں ہی قانونی معاملات کی الجھن کو جانتے تھے چنانچہ شیخ نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے قانونی کارروائی نہیں کی تھی اور اگر کی تھی تو صرف اس حد تک کہ اس شکاری کو حراست میں لے لیا تھا۔ اس وقت ہم دونوں کے ذہن میں وہ سب غیر قانونی حربے تھے جو دشمن ہمارے خلاف استعمال کر رہا تھا یا کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ایک قانون شکن دشمن کو ذہن میں رکھا اور یہ سوچا کہ اب وہ اپنے ساتھی کی رہائی کے لیے یا اس کی زبان کھلنے سے پہلے ہمیشہ کے لیے بند کرنے کی خاطر کیا قدم اٹھائیں گے۔ ہم نے تمام امکانات پر غور کر لیا تھا سوائے قانونی امکانات کے۔ یہ خیال مجھے بھی نہیں آیا تھا کہ استاد پیڈرو کی رہائی کے لیے ایک وکیل آ دھمکے گا جو قانون کے حوالے سے الزامات کی نوعیت اور شیخ کے اختیارات کو چیلنج کر دے گا۔ ابھی تو شیخ نے تفتیش کا آغاز بھی نہیں کیا تھا اور پیڈرو سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔

اب اچانک صورت حال مزید پیچیدہ ہو گئی تھی جسے ہم بہت بڑے مجرموں کا سب سے اہم آدمی سمجھ کے اٹھا لائے تھے وہ خود کو ایک غریب مونگ پھلی بیچنے والا ثابت کر رہا تھا اور الٹا الزام عائد کر رہا تھا کہ اسے کسی جرم کے بغیر گھر کے اندر گھس کر اٹھایا گیا ہے۔

"آپ کی زبان کو تالا کیوں لگ گیا تھانیدار صاحب؟" وکیل نے طنز سے کہا۔ "کس سوچ میں پڑ گئے آپ؟"

"میں یہ سوچ رہا تھا وکیل صاحب کہ سچ صرف ایک ہو سکتا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "یہ ناممکن ہے کہ جھوٹ بیک وقت جھوٹ بھی ہو اور سچ بھی۔ کیا آپ اتفاق کرتے ہیں میری بات سے؟"

"یہ ایک منطقی اور فلسفیانہ نکتہ ہے جس سے ہر معقول آدمی اتفاق کرے گا۔"

"پھر آپ مجھے بتائیے کہ یہ شخص اتنے بڑے جھوٹ کو سچ کیسے ثابت کرے گا؟" شیخ نے کہا۔

"یہ کام میرا ہے۔ ثبوت میں عدالت کے سامنے پیش کروں گا۔" وکیل نے کہا۔ "اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ معاملے کو ختم کریں گے ابھی اور اسی وقت....."

"ختم کرنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟" شیخ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اس شخص پر کوئی الزام نہیں۔ آپ سے میرے سا... پولیس زیادتی بھی کر لیتی ہے۔ خصوصاً ایسے غریبوں کے ساتھ جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر مقدمے بازی میں وقت ضائع ہو جانے ... نے مصالحت کے موڈ میں کہا۔

"یہ غریب شخص کہاں رہتا ہے؟" شیخ نے کہا۔ "بقول آپ جہاں سے میں نے اس کو بزور بازو اٹھایا؟"

"منزنگ میں، جہاں پھلی بیچنے والوں کی دکانیں ہیں، ان کے پیچھے ایک گلی میں۔" وکیل نے کہا۔

"اور آپ کو یقین ہے کہ وہاں چشم دید گواہ موجود ہیں جو مجھے بھی پہچان لیں گے؟ اس کے بیوی، بچے، محلے دار؟"

"جی ہاں، اور ان سب کی گواہی سے آپ خود مجرم بنیں گے۔" وکیل نے کہا۔

"آل رائٹ وکیل صاحب!" شیخ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "مقابلہ اگر جھوٹے گواہوں کو عدالت میں پیش کرنے کا ہے تو یہ چیلنج قبول کرتا ہوں۔ آپ کے علم میں یقیناً ہو گا کہ پولیس کے وسائل اور اختیارات کا ناجائز استعمال مشکل نہیں۔ کو... کبھی نہیں کیا مگر آپ نہیں مانیں گے اس لیے یہ ... بجائے میں وہی کروں گا جو آپ چاہتے ہیں یعنی انگریزی کے ... کے مطابق میں آپ کے سکوں سے آپ کو ادائیگی کروں گا۔ ... وقت بہت قیمتی ہے لیکن آپ کچھ دیر یہیں انتظار فرمائیے۔" ... ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔

وکیل کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس کے ... رخصت ہو گیا۔ "میں سمجھا نہیں یہ بات؟"

"آپ ابھی سمجھ جائیں گے۔ صرف دس منٹ میں۔" ... دوسرے کمرے میں غائب ہو گیا۔ میں اسی انداز بے نیازی ... ساتھ بیٹھا رہا۔ استاد پیڈرو کے لبوں پر ایک تحقیر آمیز مسکرا... تھی۔ وکیل بظاہر بے تعلق بیٹھا تھا مگر ایک بار مجھے ... کے خاموش کر دینے کے بعد وہ بھی خود کو فاتح تصور کر ... تاہم اس کی صورت پر اب الجھن کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ شیخ کو دبانے میں کامیاب ہو گیا ہے ... رویے کی تبدیلی اور اس کی آخری بات کے واضح نہ ہونے ... کا یقین برقرار نہ رہا تھا۔ خود میں اندازہ کرنے سے قاصر تھا ... کرنا چاہتا ہے۔ دس منٹ کے بجائے پندرہ منٹ گزر گئے ... شیخ لوٹ کر نہ آیا۔ اس دوران میں وکیل نے ... کو ڈرایا بھی اور اپنی متانت قائم رکھتے ہوئے غریب مونگ پھلی والے کو تسلی بھی دی کہ وہ فکر نہ کرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کی گفتگو کے انداز میں اجنبیت بھی تھی جیسے کہ وہ پہلی بار اپنے موکل سے مل رہا ہو اور اپنائیت بھی تھی کیونکہ اب بہرحال ان کے درمیان ایک رشتہ قائم ہو چکا تھا اگرچہ وہ نوعیت کے اعتبار سے کاروباری تھا۔

حقیقت کیا ہے؟ یہ ہم سب جانتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میری نظر اور عقل نے دھوکا نہیں کھایا۔ استاد پیڈرو جانتا تھا کہ وکیل کو بھیجنے والے کون ہیں۔ وکیل جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ کامیابی کی صورت میں اس کا معاوضہ کتنا ہو گا۔ وہ یقیناً مجھے بھی جانتا ہو گا۔ استاد پیڈرو جیسے خطرناک مجرم کو سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کے غریب مونگ پھلی والا ثابت کرنے کے انتظامات کر لیے گئے تھے اور بڑی ٹھوس بنیادوں پر۔ کون کہتا ہے اس بیسویں صدی میں کہ جھوٹ کی کشتی سدا چلتی نہیں، اور ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں — یہ بھی کاغذی ناؤ تھی جسے ایسے ہی وکیل اور ایسے ہی مجرموں کے مفاد و اشتراک باہمی کی قوت چلا رہی تھی اور وہ انصاف جس کا بول بالا ہوتا ہے اس ناؤ کے سامنے ڈوب رہا تھا۔

"سوری وکیل صاحب!" شیخ نے اچانک اندر آ کے کہا۔ "آپ کو کچھ انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔" وہ اپنے ساتھ روزنامچہ لے کر آیا تھا۔ اسی وقت ایک سپاہی چائے لے کر اندر آیا۔ "آپ کو کم از کم یہ شکایت تو نہ ہو کہ تھانے میں کوئی اخلاق سے بات نہیں کرتا اور حسن سلوک سے پیش نہیں آتا۔"

وکیل نے بادل ناخواستہ چائے کا کپ لے لیا۔ "آپ تشریف کہاں لے گئے تھے؟"

"میں دراصل روزنامچہ لینے گیا تھا۔" شیخ نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "محرر غائب ہے چنانچہ آج کل سب کام ایسے ہی چل رہا ہے۔ بعض اوقات تو رپورٹ بھی خود لکھنی پڑتی ہے، اپنے ہاتھ سے۔" اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور میری طرف دیکھا۔ چائے کا ایک کپ میرے سامنے بھی رکھ دیا گیا تھا۔ صرف استاد پیڈرو کو نظرانداز کیا گیا تھا۔

"چائے نہیں تو ایک سگریٹ ہی مل جائے تھانیدار صاحب۔" استاد پیڈرو نے مسکینی سے کہا۔

"اچھا۔" شیخ نے کہا اور ایک سپاہی کو طلب کیا کہ ملزم کی ہتھکڑی کو ایک ہاتھ تک محدود کر دیا جائے۔

استاد پیڈرو نے میز پر رکھے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر وکیل زیادہ مستعد ثابت ہوا۔ اس نے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ آگے بڑھائی اور میز پر سے ماچس اٹھا کے سلگانے میں اپنے موکل کی مدد کی جس کے لیے یہ سب کام ایک ہاتھ سے ممکن تو تھے لیکن آسان نہ تھے۔

"وکیل صاحب!" ایس آئی شیخ نے روزنامچے پر نظر رکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ریکارڈ میں ملزم کا نام استاد پیڈرو ہے۔ کوئی ذرا غلطی سے پکڑا گیا ہو گا تو چھوڑ بھی دیا گیا ہو گا۔ روزنامچے کے اندراجات کے مطابق تو ملزم کو آج سہ پہر گرفتار کیا گیا....."

"یہ جھوٹ ہے۔" وکیل یکلخت پھٹ پڑا۔ "کون الو کا پٹھا کہتا ہے؟"

"پلیز شٹ اپ۔" شیخ نے میز پر زور سے ہاتھ مارا۔ "اگر آپ نے مجھے پھر گالی دی تو نتائج کے خود ذمے دار ہوں گے۔ آپ وکیل ہیں، اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ تھانے میں کیا، سڑک پر بھی آپ کسی کو گالی دے کر اشتعال انگیزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میں آپ کو وہ بتا رہا ہوں جو روزنامچے میں لکھا ہوا ہے۔ اپنے دلائل عدالت میں دیجیے گا۔ کل صبح ہم ملزم کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کریں گے اور چودہ دن کے لیے اس کا جسمانی ریمانڈ حاصل کر لیں گے۔ جب تک تفتیش مکمل نہ ہو، چالان پیش کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔" اس نے پھر روزنامچے کو دیکھا۔ "اس میں لکھا ہے کہ ملزم مشتبہ حالت میں تھانے کے قریب گھومتا ہوا پایا گیا۔ ایک سنتری کے روکنے پر اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اسے پکڑ لیا گیا۔ اس کے قبضے سے چرس بھرے سگریٹوں کا ایک پیکٹ اور ایک غیر لائسنسی کا ریوالور دستیاب ہوا۔"

"یہ اندراج تم نے ابھی اندر جا کے کیا ہے۔" وکیل مشتعل ہو کے بولا۔ "چرس بھرے سگریٹ اور ایسے ریوالور تو تم لوگ اپنے پاس رکھتے ہو کہ....."

"میں نے کہا ہے کہ اسے عدالت مت سمجھیے۔" شیخ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "آپ اور آپ کا موکل دونوں پہلے درجے کے جھوٹے آدمی ہیں اور اس کا ثبوت یہ اندراج ہے جو چھ گھنٹے پہلے کا ہے۔ اس پر چار بج کر دس منٹ کا وقت لکھا ہوا ہے۔ میری ڈیوٹی آٹھ بجے شروع ہوئی ہے۔ اس وقت حشمت خان ڈیوٹی پر تھا مگر اندراج اس کے ہاتھ کا نہیں، آپ دیکھ سکتے ہیں۔ یہ میرے ہاتھ کی تحریر بھی نہیں۔ اس لیے یہ مت کہیے کہ میں ابھی اندر اسی کام سے گیا تھا۔"

وکیل نے روزنامچہ لے لیا۔ "میں جانتا ہوں تھانیدار صاحب! تم نے ابھی ابھی اپنے کسی ماتحت سے یہ سب کچھ لکھوایا ہے۔ اس سے پہلے چوری کی رپورٹ چار بجے لکھی گئی تھی۔ تم نے اگلا اندراج دس منٹ کا وقفہ دے کر دکھا دیا ہے۔"

"اب تم اپنے وہ سب گواہ عدالت میں لے کر آنا جنھوں

www.paksociety.com

نے دیکھا تھا کہ میں نے پولیس کی نوکری کے ساتھ اسی شریف مرنگ جیلی بیچنے والے کو اس کے گھر میں گھس کے گرفتار کیا۔ اس کے بیوی بچوں کو مارا اور توڑ پھوڑ کی۔ میں تو خیر استعفا دے ہی چکا ہوں۔ مگر حشمت خان کو طلب کر کے جرح کرنا کیونکہ یہ اندراج اس کی ڈیوٹی کے نام میں ہوا ہے۔ اس کی جواب دہی میرا کام نہیں۔ ہاں! تمہارے الزام کے جواب میں اپنا دفاع میں خود کروں گا یا میرا کوئی وکیل ہوگا۔" اس نے بدمزہ ہو کر کے گھنٹی بجائی۔ "ملزم کو ہتھکڑی لگاؤ اور لے جاؤ۔" اس نے ایک سپاہی کے اندر آتے ہی کہا۔

وکیل کے ماتھے پر پھر شکن گہری ہوگئی۔ "اس کا مطلب ہے... خیر۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کے استاد پیڈرو کو دوسری سگریٹ دی۔ "میں سمجھ لوں گا تم سے شیخ جی!" وہ پیڈرو کی سگریٹ جلانے کے بعد پیکٹ اور ماچس جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

"شٹ اپ! اینڈ گیٹ آؤٹ۔" شیخ نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ میری قوت برداشت جواب دے جائے۔"

وکیل نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور اجنبی چال اک آؤٹ کر گیا۔ سپاہی نے استاد پیڈرو کے دونوں ہاتھوں کو ہتھکڑی میں جکڑ دیا اور اسے اپنے ہمراہ لے گیا۔ دست بستہ ہونے کے باوجود پیڈرو نے سگریٹ تو نہیں چھوڑی۔ اس کے لبوں پر وہی زیر لب فاتحانہ مسکراہٹ تھی جو صاف ہمارا مذاق اڑاتی محسوس ہوتی تھی مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" شیخ نے وکیل کے جاتے ہی گہری سانس لے کر کہا۔ "یہ تو میرے گلے پڑ گیا تھا۔"

"مگر تم نے اچھا سلوک کیا اس کے ساتھ۔" میں نے کہا۔

"یار اب کیا کریں، مجبور ہو جاتے ہیں پولیس کے ہتھکنڈے استعمال کرنے پر۔ شرافت اور اصول پرستی سے کام لیتا تو ہاتھ سے جاتے بھی یہ الزام سر آ جاتا۔" وہ افسوس سے سر ہلا کے بولا۔ "اور میاں سکندر اعظم! مجھے قطعی شبہ نہ تھا کہ مجرم نکل جاتا، مجھے مجرم بنا کے۔"

"اندراج کس نے کیا؟" میں نے کہا۔ "حشمت خان اس کے پیچھے پڑ جائے گا۔"

"اسی سپاہی نے جو پیڈرو کو لے گیا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اس کی اور حشمت خان کی پرانی دشمنی چل رہی ہے پہلے سے لگتی ہے۔ شاید کسی بے ایمانی کے سودے میں بے ایمانی پر۔"

"یہ چکر تمہاری سمجھ میں آیا؟" میں نے کہا۔ "استاد پیڈرو کا ڈبل رول۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ پیڈرو سے ملتی جلتی شکل کا کوئی آدمی ہو؟ قسمت کے مطابق جڑواں بھائی ہو یا سب اپ سے..."

اس سے پہلے کہ میری بات پوری ہوتی حوالات کی طرف سے ہنگامے کی آواز آئی۔ بیک وقت تین چار افراد ایک دوسرے سے چلا چلا کر کچھ کہہ رہے تھے۔ پھر کسی نے کہا۔ "اٹھو کمبختو! بلاؤ انچارج صاحب کو..."

"ارے پانی پلا اس کو کھڑے دے پتر! انچارج صاحب! انچارج صاحب!" دوسرے نے پکارنا شروع کیا اور بیک وقت میں اور شیخ اندر کی طرف لپکے۔ استاد پیڈرو حوالات کے فرش پر لیٹا ہوا تھا اور ایک سپاہی زبردستی اس کے حلق سے پانی اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ حوالات کے دوسرے مکین نظارہ کرنے سے بیک وقت خوف، نفرت اور دلچسپی کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" شیخ نے پیڈرو کے پاس بیٹھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا اور نبض پر انگلی رکھ دی۔

"پتا نہیں سر! ابھی سگریٹ پی رہا تھا پھر کھانسنے لگا۔ جیسے دمے کا دورہ پڑتا ہے۔ پھر لیٹ گیا۔" پانی پلانے والے سپاہی نے اپنی کوشش ترک کر دی تھی کیونکہ پیڈرو مر چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں ٹھہر گئی تھیں۔

"فون کرو... ڈاکٹر کو بلاؤ فوراً۔" شیخ نے چلا کر کہا۔ "ایمبولینس منگواؤ۔ غالباً دل کا دورہ ہے۔"

"اس کا اب کوئی فائدہ نہیں شیخ!" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "مردے زندہ نہیں ہو سکتے۔"

شیخ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دونوں سپاہیوں کو پیچھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کے اس نے کہا۔ "تم بتاؤ! تم اس کو لے کر آئے تھے۔ کسی نے کچھ دیا تھا اسے؟" اس نے حوالات میں بند دوسرے لوگوں کے حوالے سے کہا۔

"نہیں سر!" سپاہی نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ "ابھی تو میں اس کو چھوڑ کر حوالات سے نکلا بھی نہیں تھا۔ بس اُدھر لے جا کے بٹھایا تھا۔ کھانا اس نے کھایا تھا؟ ان میں سے تو کوئی قریب نہیں آیا ملزم کے سر..." اس نے حوالات کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "بس وہی سگریٹ کے سوٹے لگا رہا تھا۔"

"سگریٹ؟ کہاں ہے وہ سگریٹ؟" شیخ نے چلا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "یہاں لاؤ تلاش کر کے۔"

پانچ منٹ کے اندر اندر وہ سگریٹ کا نصف سے زیادہ بجھا ہوا ٹکڑا شیخ کے سامنے رکھ دیا گیا۔

"اس ٹکڑے کو کسی کاغذ پر اٹھا لو۔" اس

"سکندر! تم نے دیکھا تھا نا؟ اس وکیل نے یہ سگریٹ دی تھی اسے؟"

"ہاں، لیکن میری گواہی سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔" میں نے تردد سے کہا۔ "اس کے علاوہ کیا وکیل نے اپنا نام بتایا تھا؟"

"ہاں۔ اس نے کہا تھا میں خادم حسین آفریدی بار ایٹ لا ہوں۔" شیخ نے مایوسی سے کہا۔ "اگر یہ اس کا نام نہ ہوا تو؟"

"مایوس ہونے کی ضرورت نہیں!" میں نے کہا۔ "ممکن ہے سگریٹ میں کچھ نہ ہو۔ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا ہو۔"

شیخ نے افسردگی سے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ جعل ساز ہاتھ دکھا گیا سکندر! مجھے اس کو یہ رعایت نہیں دینا چاہیے تھی کہ حوالاتی کو سگریٹ پیش کرے۔ وہ پیکٹ بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ جاؤ لاش کو حوالات سے ہٹا دو۔" اس نے دونوں سپاہیوں سے کہا۔

"میں اور تم جو سگریٹ پیتے ہیں..." میں نے کہا۔ "وہ کیپسٹن ہے۔ مگر وکیل نے اسے "کے ٹو" دی تھی۔"

"یہ بھی کیپسٹن ہے سکندر بخت!" شیخ نے کہا۔ "جو کے ٹو کی ڈبیا میں اس لیے رکھا گیا تھا۔ اس وقت کے لیے جب ملزم کو خیر اس کے ساتھ لے جانے کی کوئی صورت نہ رہے۔ آؤ ذرا لاش کو دیکھیں۔"

لاش اب ایک کمرے میں چارپائی پر رکھ دی گئی تھی۔

"جب اس نے سگریٹ ماچس جیب میں رکھے تھے تو میں حیران ہوا تھا۔ تم جانتے ہو کہ عموماً وکیل اتنے کم قیمت سگریٹ نہیں پیتے اور خود اس نے تو سگریٹ پی ہی نہیں۔" میں نے اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ ڈبیا اس نے میز پر کب رکھی تھی؟" شیخ نے چارپائی پر پڑے ہوئے پیڈرو کو دیکھا۔

"میں نے اسے کچھ رکھتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ڈبیا... پہلے سے میز پر رکھی تھی۔ میں سمجھا ہوں گی کسی کی۔" میں نے کہا۔ "کسی سپاہی کی۔"

"اب کچھ نہیں ہو سکتا دوست! مرنے والا مر گیا بلکہ مار دیا گیا۔" شیخ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب تو صرف پوسٹ مارٹم ہوگا۔ اس کی رپورٹ میں کچھ بھی لکھا جائے یہ کہ سگریٹ میں سائنائیڈ تھا یا ملزم کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ کل کے اخبارات کی سرخی یہی ہوگی کہ زیر تفتیش ملزم کی حوالات میں پراسرار ہلاکت۔"

"شیخ! یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے اس کی توجہ مرنے والے کے چہرے کی طرف مبذول کرائی۔

جب پیڈرو بیہوش ہوا تھا تو اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے والوں نے اس کے منہ پر پانی ڈالا تھا۔ جو پانی انہوں نے پلانے کی کوشش کی تھی وہ بھی منہ پر بہہ گیا تھا اور جہاں جہاں پانی جذب ہوا تھا وہاں سے اس کی کھال اترنے لگی تھی۔ لیکن کھال تو اتنی جلدی تیزاب سے بھی نہیں اترتی۔ شیخ نے اسے انگلی سے چھو کر دیکھا۔

"یہ... یہ تو کچھ پلاسٹر جیسی چیز ہے۔" اس نے فوراً انگلی ہٹالی۔ میں نے جھک کر غور سے دیکھا تو مجھے بالوں کے بھی مصنوعی ہونے کا شبہ ہوا۔ "یہ کوئی اور ہے سکندر!" شیخ دروازہ بند کر کے بولا۔

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ لیکن تم کچھ مت کرو۔ ایمبولینس کو آنے دو۔" میں نے کہا اور اسے ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔ شیخ نے دو سپاہیوں کو لاش کے پاس کھڑا کر دیا تھا۔ ایک درویش صفت قیدی نے نعرہ لگایا۔ "حق اللہ۔"

"یہ تو بہت برا ہوا سکندر!" شیخ نے اپنے آفس میں پہنچ کے کرسی پر گرتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ نوکری مجھے لے بیٹھے گی۔ اسی لیے میں اپنی جان چھڑا رہا تھا مگر اب تو جو مقدر میں لکھا ہے وہ ضرور ہوگا۔"

"گھبرانے کی کیا بات ہے یار!" میں نے کہا۔ "یہ سب

سب رنگ ڈائجسٹ میں چھپنے والی سلسلے وار کہانی

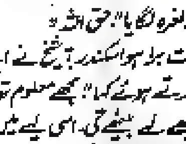

انکا
اقابلا
غلام روحیں
۲۵/-
۱۵/-

www.paksociety.com

میری وجہ سے ہوا ہے مگر رابعہ کو دیکھ اور شہلا کو دیکھ۔ انھوں نے میرا ساتھ دینے کی کتنی سخت سزا پائی ہے۔ تو نے خود تو اسے قتل نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ تجھ پر الزام آئے گا فرائض کی بجا آوری میں غفلت برتنے کا۔ تو نے ملزم کو وکیل سے ملوایا اور اسے سگریٹ پلانے کی اجازت دی اور۔۔ ظاہر ہے وہ جعلی وکیل تھا۔ تو نے تصدیق نہیں کی۔ مگر اس جرم کی سزا زیادہ نہیں ہو سکتی۔ وہی معطلی یا لائن حاضری۔ انکل رضوی اور کچھ نہیں ہونے دیں گے۔"

"بات صرف اتنی ہی نہیں ہوگی سکندر۔" شیخ نے کہا۔ "میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ اگر یہ پیڈرو نہیں تھا تو پھر یہ زردار ہی ہوگا۔ جو گرمی میں قلفی اور سردی میں مونگ پھلی بیچتا تھا۔ اس کی خدمات مستعار لی گئی ہوں گی۔ بھاری معاوضہ ادا کر کے اور تحفظ کی پوری یقین دہانی کے ساتھ۔ غریب اور سادہ لوح آدمی تھا۔ لالچ میں مارا گیا۔ اب میں فرض کر سکتا ہوں کہ یہ ڈراما کیا گیا تھا۔ اس مونگ پھلی والے سے بات کرنے اور اسے نقد معاوضہ ادا کرنے کے بعد رات کو کچھ لوگ پولیس کی وردی میں اس کے گھر پہنچے۔ انھوں نے وہی کیا جو زردار نے بتایا تھا اور ظاہر ہے کہ سب نے دیکھا تھا۔ ان میں کوئی تھانیدار بھی ہوگا میرے جیسے قد و قامت کا اور میری عمر کا۔ وردی پہن کے یوں بھی سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ رات کے وقت دیکھی ہوئی صورت کس کے ذہن میں رہے گی لیکن دیکھنے والوں کے سامنے میرا نام لیا گیا ہوگا۔ اس جعلی سب انسپکٹر کو اکرام شیخ کہہ کے بلایا گیا ہوگا یا شاید اس کے بیوی بچوں کو پہلے سے کوئی جھوٹی کہانی سنا دی گئی ہوگی کہ اکرام شیخ نام کا ایک سب انسپکٹر اس کے غریب شوہر کا دشمن ہو رہا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ بھتہ زیادہ مانگتا تھا یا ریڑھی نہیں لگنے دیتا۔ اور ڈر ہے کہ وہ دشمنی میں زردار کو بند کر دے گا کوئی بھی جھوٹا الزام لگا کے۔ مرنے والا تو بتا نہیں سکتا کہ اس نے میک اپ کیوں کیا تھا۔ اس کے بیوی بچے کیا بتائیں گے۔ شاید یہی کہ مجھ سے بچنے کے لیے اس نے یہ سوانگ بھرا ہوگا مگر وہ مجھے یقیناً پہچان لیں گے اور میرا نام بھی بتا دیں گے۔ میں نے جھوٹا الزام اس پر واقعی عائد کر دیا ہے۔ کون مانے گا کہ وہ غریب آدمی چرس کے سگریٹ اور بغیر لائسنس کا ریوالور لے کر مشتبہ حالت میں تھانے کے پاس گھوم رہا تھا۔"

"میرا موجود ہونا بھی اچھا ہی رہا۔ کم سے کم ایک گواہ تو تھا جس نے سب کچھ دیکھا۔" میں نے کہا۔ "مثلاً اس وکیل کو۔"

"مجھے خوش فہمی میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔" شیخ نے روزنامچے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "بہر حال۔ تم اپنا بیان لکھ کے دے دو۔ وجہ کیا بتاؤ گے کہ یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"میں حشمت خان سے ملنے آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے علم نہیں تھا کہ ڈیوٹی پر کون ملے گا اور مجھے یہ دیکھنا تھا کہ کیا واقعی انسپکٹر میر محمد کے قتل کے سلسلے میں کسی قسم کی رپورٹ میں میرا نام بھی آیا ہے۔ آیا ہے تو کیوں اور کس نے لیا ہے۔ آخر حشمت خان تفتیش کے لیے میرے پاس کیسے پہنچا؟ اتنا جواز کافی ہے۔"

"محلے کی کل بھی ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ اگر میر محمد ہوتا تو اس وقت میں یہاں موجود نہ ہوتا۔" شیخ بولا۔ "اب ایک تو ایس ایچ او کوئی نہیں، دوسرے محرر غائب۔ کسی کو لاش کے ساتھ بھی اسپتال بھیجنا ہے۔ یہاں حشمت خان کو شوق ہے دن بھر میں زیادہ سے زیادہ بندے لاک اپ کر دینے کا۔ لڑائی جھگڑا ہوا تو دونوں پارٹیاں اندر۔ چوری ڈکیتی کا کیس ہو تو جسے چاہو مشتبہ قرار دے کر بلوا لو۔ آوارہ گردی میں دھر لو۔ رپورٹ کسی کی نہیں لکھنا۔ بس سودا کھرا کیا اور مال جیب میں تو ملزم باہر، ورنہ حوالات میں۔ اب یہ دیکھو! اس وقت بھی دس آدمی بند ہیں۔ ان میں سے صرف دو کے خلاف پرچہ کاٹا گیا ہے۔ باقی آٹھ سے کچھ نہیں ملا تو میرے لیے چھوڑ گیا۔ روز رات کو آ کے ایک ایک سے سر کھپاتا ہوں اور جو واقعی بلاوجہ بند ہوتے ہیں انھیں چھوڑتا ہوں۔ آج تو ان بے چاروں کی بھی نہیں سنی۔"

باہر سے ایمبولینس کا سائرن سنائی دیا تو شیخ باہر نکلا۔ اس نے لاش اٹھوا کے میو اسپتال روانہ کی۔ ایک کانسٹیبل کو ہدایت دے کے ساتھ کیا اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد لوٹا تو میں اپنا تفصیلی بیان لکھ چکا تھا جو میں نے دستخط کرنے سے پہلے اسے پڑھ کے سنایا اور پھر دستخط کر کے اس کے حوالے کر دیا۔ رات کے گیارہ بجے وہ چوری کی ایک رپورٹ روزنامچے میں لکھ کے فارغ ہوا تو وہ سپاہی اندر آ گیا جو پیڈرو یعنی زردار کی لاش کے ساتھ گیا تھا۔

"ہمارا کیا بنے گا سر؟" اس نے فریاد کے انداز میں کہا۔ "حشمت خان کو کیا جواب دوں گا میں؟"

"جو مقدر میں ہے اسے کوئی نہیں ٹال سکتا جوان!" شیخ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "خود مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بے چارہ ایک سازش کا شکار ہوا ہے۔ جہاں تک حشمت خان کا سوال ہے تو اس سے ڈرنے کی تمھیں کیا ضرورت ہے۔ وہ سارا دن پولیس کارروائی کے سوا کرتا کیا ہے۔ تم اگر اڑ جاؤ کہ تم نے اس کے کہنے پر اندراج کیا تھا تو وہ مصلحت ہی بہتر سمجھے گا ... ہوئی کہ اس کیس میں وہ بالکل ملوث نہ ہو چنانچہ وہ ہرگز پسند نہیں کرے گا کہ تم اس کے خلاف کوئی بیان دو۔ وہ تمھاری آئندہ کیریئر کا تو تمھارا یا اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ جہاں تک معاملے کی کارروائی کا تعلق ہے تم دونوں جھوٹا ہو خود کو بچانے کے ... حشمت خان چرس اور ریوالور وغیرہ کا انتظام بھی کر ہی لے گا۔ اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ نہ ہو تو وہ حاصل کر لیتا ہے۔ سارا الزام مجھ پر آئے گا۔ اس لیے حشمت خان اپنی پوزیشن محفوظ رکھے گا اور تمھیں خود بخود تحفظ حاصل ہو جائے گا۔ اس نے ایک مشتبہ شخص کو پکڑا تھا اور بس۔ جو کچھ برآمد ہوا وہ محفوظ ہے۔ قیدی مر گیا تو اس کا کیا تعلق حشمت خان سے۔ وہ ڈیوٹی پر تھا ہی نہیں۔ وہ میرا بھی دشمن ہے اور تمھارا بھی لیکن اس وقت صورتِ حالات ایسی ہو گئی ہے کہ وہ ایک دشمن کا ساتھ دے کر دوسرے کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ چنانچہ تم مطمئن رہو وہ تمھارا ساتھ دے گا۔ جھوٹ یا سچ سے مرنے والے کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ نقصان ہو سکتا ہے۔ اس کی قضا آئی تھی کہ وہ یہاں پہنچا۔ قضا خود آدمی کو اس جگہ پہنچا دیتی ہے جہاں فرشتۂ اجل اس کا منتظر ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس کے خلاف بلاوجہ ایک اندراج کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں اسے چھوڑ دیتا تو وہ بچ جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس کی جان بچانے کی خاطر ہی اسے حوالات میں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس دھوکے باز وکیل نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں کوئی جواز پیدا کروں۔ وہ وکیل تھا ہی نہیں، قاتل تھا۔"

"جی!" سپاہی کی صورت پر بارہ بج گئے۔ اپنے افسر کی بات اس کی ناقص عقل میں نہیں آئی تھی۔

"تم کو یہ سب سمجھنے کی ضرورت نہیں۔" شیخ نے کہا۔ "یہ لمبا چکر ہے بس اتنا سمجھ لو کہ وہ شخص حوالات میں نہ مرتا تو باہر لے جا کر مار دیا جاتا۔ جب اس کی صورت نہ رہی تو اسے یہیں ختم کر دیا گیا۔ حوالات میں کتنے لوگ بلاوجہ بند ہیں۔ روزنامچہ دیکھو اور جن کے خلاف کوئی الزام نہیں انھیں یہاں لے آؤ۔"

دس منٹ بعد آٹھ افراد دست بستہ قائم مقام ایس ایچ او صاحب کے کمرے میں حاضر کیے گئے اور سر جھکا کے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان سب کو غور سے دیکھا۔ ان میں ایک تو حلیے سے ہی فقیر لگتا تھا۔ داڑھی اور سر کے جھاڑ جھنکار بالوں اور سرخ انگارہ آنکھوں سے تار تار لباس سے اور ننگے ... بھنگ پی ہوئی ملنگوں کی سی حالت سے۔ چھ اوباش اور لوفر قسم کے نوجوان ... یہ لفنگے کی رنگین شرٹیں پہن کے اور لمبے بال رکھ کے ہیرو بن جانے والے جو پڑھتے تھے نہ کوئی کام کرتے تھے مگر جوانی کے زعم میں اینٹھتے پھرتے تھے کہ ہم چوں دیگرے نیست۔ ان کی عمر تو لیکن مفلسی کی تحریر بتاتی تھی کہ وہ احساسِ محرومی کا شکار ہونے اور غریب گھر میں پیدا ہونے کو اپنا جرم سمجھنے لگے۔ وہ چاہتے تو محنت کر کے اپنی تقدیر بدل سکتے تھے مگر انھوں نے منفی اور انتقامی رد عمل اختیار کیا۔ اور غلط راہ پر چل پڑے۔ بد اچھا بدنام بُرا والا وارث اسی سے بھی بُرا۔ اب کہیں کچھ ہوا انھیں پکڑ کر جوتا کاری کے لیے بلا لیا جاتا تھا۔ آٹھواں نسبتاً عمر رسیدہ تھا اور اپنی صورت سے شریف اور مظلوم آدمی لگتا تھا۔ غالباً ان سب کو یہ سمجھا کر لایا گیا تھا کہ ایس ایچ او صاحب بہادر کے سامنے ان کو شور و غل نہیں کرنا ہے، رونا دھونا نہیں ہے اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے بک بک نہیں کرنی ہے چنانچہ وہ سب حکمِ حاکم کے انتظار میں تھے۔

درویش نے نعرہ مارا "حق اللہ" اور شیخ کے اشارے پر اسے سوال و جواب کیے بغیر سب سے پہلے رہائی مل گئی۔

"تم کیا کرتے ہو میاں؟" شیخ نے پولیس والوں کے لہجے میں عمر رسیدہ شخص سے پوچھا۔

"مزدور ہوں سائیں باپ!" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "لوگوں کے مکان کرائے پر اٹھواتا ہوں۔ کوئی غلط کام نہیں کرتا۔ اپنی محنت کا معاوضہ کمیشن لیتا ہوں۔ تھانیدار حشمت خان کو ایک کرائے دار لا کر دیا تھا۔ حشمت خان نے اپنی تھانیداری سے اس کا جینا عذاب کر دیا۔ ورنہ وہ شریف آدمی تھا۔ تنگ آ گیا تو اس نے اپنے سالے سے کہا۔ وہ سی آئی اے کا کوئی ڈی ایس پی ہے۔ اس نے حشمت خان کو اُدھر جانے سے بھی روک دیا۔ حشمت خان سال میں دو بار کرایہ بڑھوا چکا تھا۔ پھر اس نے مکان خالی کرانے کا نوٹس دے دیا۔ کرائے دار نے عدالت میں کیس کر دیا اور حشمت خان نے مجھے پکڑ لیا۔ مجھ سے کہتا ہے اسے نکالو نہیں تو دو سو روپے مہانہ دو۔ کرایہ بڑھ گیا ہے اور تمھارا آدمی پرانا کرایہ دیتا ہے۔ سائیں باپ! معاملہ عدالت کا ہے۔ ہم کیا کریں اور کرائے دار کو میں نے زبردستی تو نہیں رکھوایا تھا۔ بعد میں میری کیا ذمے داری؟"

"اچھا اچھا۔" شیخ نے کہا۔ "تم جاؤ۔ آئندہ کسی تھانیدار کو کرائے دار مت لا کر دینا۔"

"یہ بھی مشکل ہے سائیں باپ! جب دھندا یہی ہے تو تھانیدار کو کیسے انکار کر سکتے ہیں۔ آپ کی مہربانی۔" وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ پھر شیخ نے نوجوانوں کی طرف دیکھا۔

"ان دو کو تو میں پہچانتا ہوں۔" شیخ نے کہا۔ "بیٹے میں

www.paksociety.com

ایک بار ہمارے مہمان ضرور بن سکتے ہیں۔" اس نے قطار کے اوّل و آخر میں کھڑے ہوئے دو جوانوں سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے وہ کیا کرتے ہیں۔ تم سب بھی انھی کے چیلے ہو؟"

سب سر جھکائے کھڑے رہے اور شیخ کا لیکچر سنتے رہے۔

"تم لوگ لاتوں کے بھوت ہو گئے ہو۔" شیخ نے کہا۔ "باتیں بیکار ہیں۔ اس لیے میں پھر تم کو چھوڑ رہا ہوں مگر یہ آخری موقع ہے۔ ہو سکتا ہے میرے بعد آنے والا تھانیدار تمھارا دماغ درست کر دے۔"

چونکہ ان کی صحبت خراب تھی اور وہ چوروں، بدمعاشوں، جیب کتروں اور دس نمبریوں کے مرید تھے۔ اس لیے بعض اوقات جوتا کاری کے مفید نتائج نکلتے تھے اور ان کے ذریعے کسی نہ کسی واردات کا سراغ بھی مل جاتا تھا۔ ورنہ وہ رات حوالات میں گزارتے تھے اور صبح کوئی غریب باپ یا بھائی کہیں سے سو پچاس کا بندوبست کر لاتا تھا اور انھیں جوتے مارتا ہوا لے جاتا تھا۔ مگر وہ جس راستے پر گامزن تھے اس کی منزل حوالات کے بعد جیل یا تختہ دار بھی ہو سکتی تھی۔ واپسی نصیب کی نہیں، ان کے اپنے اختیار کی بات تھی۔ کسی سزا کے خوف سے یا کسی کی نصیحت سے وہ راہِ راست پر نہیں آ سکتے تھے۔ یہ صرف قوتِ ارادی کو بروئے کار لانے کا مسئلہ تھا۔ لیکن غلط ماحول میں وہ دن بدن خراب ہو رہے تھے۔ بیشتر صورتوں میں وہ چھوٹے موٹے گروہ بنا لیتے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف پولیس کے مخبر بن کے بھی کام کرتے تھے۔ کچھ ان سے بڑے بدمعاش اور کچھ پولیس والے دونوں مل کے انھیں صراطِ مستقیم سے دور لے جا رہے تھے۔

کیونکہ دونوں کے مفادات انھی سے وابستہ تھے اور یہ کم عمر نوجوان نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ کس کے لیے کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں؟ یہ شاید قومی ہی نہیں بین الاقوامی مسئلہ تھا۔ سنِ بلوغت تک پہنچنے والوں کو منشیات کا عادی بنانا، جرائم کی ترغیب دینا، دولت کی خاطر قانون اور معاشرے کے خلاف بغاوت پر اکسانا اور بدمعاشی کا مطلب بہادری سمجھانا آسان ہے کیونکہ بالغ اور بالغ نظر ہونے کی عمر میں بڑا فرق ہے۔ جو نوجوان بالغ ہوتے ہی اعلانِ خود مختاری کر دیتے ہیں، انھیں زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے بعد پتا چلتا ہے کہ قصور وار کون تھا۔ ان کا مقدر، زمانہ یا وہ خود؟

"ابھی جو کچھ ہوا، تم سب نے دیکھا تھا؟" شیخ نے کہا اور میں چونکا۔ ان سب نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ کیا اس میں میرا قصور تھا؟" شیخ نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کیا میں نے اس پر تشدد کیا تھا؟ تم میں سے کسی کے ساتھ کبھی کوئی زیادتی کی ہے میں نے؟ کبھی کسی بے قصور کو پکڑا ہے؟"

"نہیں جناب عالی! آپ ہی تو ایک ایسے ہیں، بچا لیتے ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "رات کو کسی اور کی ڈیوٹی ہوتی تو ہماری شامت آ جاتی تھی۔ اپنے پیروں پہ چل کے گھر جانا مشکل ہوتا تھا۔"

"آئندہ میں تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔" شیخ نے کہا۔ "ایک بات تو یہ کہ میں نے استعفا دے دیا ہے لیکن اس کے قبول ہونے سے پہلے ہی میں معطل ہو جاؤں گا اور ممکن ہے مجھ پر یہ الزام عائد کرنے کی کوشش بھی کی جائے کہ میں نے مرنے والے پر اتنا تشدد کیا کہ وہ مر گیا۔ تھانوں میں یہ ہوتا رہتا ہے اور سنسنی خیز خبریں چھاپنے والے اخبارات اس کی پبلسٹی کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ضرورت پڑنے پر میری طرف سے صفائی کے گواہ کے طور پر پیش ہو سکو گے؟ کبھی مجھے بچانے کے لیے عدالت میں آ کے سچ بول سکو گے؟ وہی بتا سکو گے جو تم نے دیکھا تھا؟"

قطار کے اوّل و آخر میں کھڑے ہوئے دونوں تجربہ کار نوجوانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ مشورہ کیا۔ پھر دوسروں کو متذبذب دیکھ کر وہ آگے بڑھے۔

"ہم آئیں گے جناب عالی!" ایک نے سینے پہ ہاتھ رکھ کے کہا۔ "کوئی مائی کا لال ہمیں سچ بولنے سے نہیں روک سکتا۔" باقی چار نے بھی ان کی دیکھا دیکھی کہا کہ وہ گواہی دینے حاضر ہو جائیں گے لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ مجبوراً اور صرف اپنی جان چھڑانے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔

"سالے سقراط کی اولاد۔" شیخ نے ان سب کے رخصت ہوتے ہی کہا۔ "تم دیکھنا، یہی دونوں صاف مکر جائیں گے اور ضرورت پڑنے پر ان کا پتا بھی نہیں چلے گا کہ ہیں کہاں۔ باقی چار میں سے دو شاید آ جائیں۔"

رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ میں نے شیخ سے اجازت لی۔ "مجھے اسلام آباد جانا ہے۔"

"واپسی کب ہوگی؟" شیخ نے پوچھا۔ "ممکن ہے پہلے مجھے تمھاری ضرورت پڑ جائے۔"

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔ "مسز شیروانی کی کنڈیشن بہت سیریس تھی اور ڈاکٹر نا امید ہو چکے تھے۔ خدا کرے ان کی حالت سنبھل جائے اور میں دو تین دن میں ہی واپس آ جاؤں۔ بصورتِ دیگر شاید ٹھہرنا پڑ جائے۔"

"میں بھی اسپتال چلتا ہوں۔ دیکھوں گا کہ میک اپ کے بغیر وہ کیا تھا۔" شیخ نے کہا۔ "پھر موقع ملا تو اس کے گھر جاؤں گا صرف تصدیق کے لیے کہ وہ وہی ہے؟"

گھر سے اٹھایا گیا تھا۔"

"اور اگر یہ سچ ہوا۔" میں نے کہا۔ "تو یہ خبر بھی تم ہی سنا دو گے کہ زردار کی گھر والی بیوہ ہو گئی ہے اور اس کے بچے یتیم ہو گئے ہیں۔ اتنی ہمت ہے تم میں؟"

"بے شک یہ کام بہت مشکل ہے۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن یہ بہت ضروری ہے کہ میں اپنی بے گناہی کسی عدالت میں ثابت کرنے سے پہلے اس عورت اور اس کے بچوں کے سامنے ثابت کر دوں۔ انھیں یہ بتا دوں کہ وہ کس چکر میں مارا گیا اور اس کے قاتل کیا چاہتے تھے؟ یہ وضاحت کر دوں کہ خود میں بھی سازش کا شکار ہوا ہوں اور قصور وار نہ ہونے کے باوجود مجھے مجرم بنا دیا گیا ہے۔ مجھے محکمہ جاتی کارروائی اور قانونی مسائل کی فکر نہیں۔ اگر وہ عورت میری بات سمجھ لے، مجھے معاف کر دے اور میری بے گناہی تسلیم کر لے تو میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں رہے گا۔ یہ بہت اطمینان کی بات ہوگی میرے لیے۔"

"اچھا۔" میں نے کچھ سوچ کے کہا۔ "پھر میں بھی چلتا ہوں تمھارے ساتھ۔ صبح چلا جاؤں گا اسلام آباد۔ میرا خیال ہے کہ اس تمام معاملے کو میں بہتر طور پہ سمجھا سکتا ہوں۔ مگر میں تھانے سے باہر ملوں گا۔"

ماتحت عملے کا انچارج ایک نائک کو مقرر کر کے اور دیگر لوگوں کو ضروری ہدایات دے کر وہ گشت پہ روانہ ہو گیا۔ میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔ تھانے سے کچھ فاصلے پہ اپنا بریف کیس اٹھائے کھڑا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ چنانچہ اس نے تھانے سے نکلتے ہی مجھے دیکھ لیا اور اسکوٹر میرے قریب لا کر روکا۔ سینما کے آخری شو ختم ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایبٹ روڈ سے آگے سڑکیں کچھ دیر کے لیے آباد ہو گئی تھیں۔ نسبت روڈ پر بھی ایک دو حلوائی دکانیں کھولے بیٹھے تھے۔ دکانوں کے سامنے لکڑی کی بنچوں پر لوگ بڑے بڑے پیالوں میں گرما گرم ملائی والا دودھ پی رہے تھے یا پیڑے والی کاڑھی اور ٹھنڈی لسی۔ اس کے آگے میو اسپتال کے دروازے پہ پہنچ رہی تھی۔ مجھے معاملات یاد آئے جب رابعہ کی ماں نے ایمرجنسی وارڈ میں زندگی کی آخری چند سانسوں کے ختم ہونے سے پہلے بیٹی کو دیکھنا چاہا تھا اور میں نے ایک اجنبی لڑکی کو جھوٹ بولنے پہ مجبور کر کے اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ اس گناہِ بے لذت کی کسک پھر تازہ ہو گئی۔ نہ جانے اب وہ لڑکی کہاں ہوگی جس کا نام تک مجھے معلوم نہیں۔ اسے بھی تمام عمر ملال رہے گا کہ اس نے ایک مرتی ہوئی عورت کو دھوکا دینا کیوں منظور کر لیا تھا جس کے حواس تک جواب دے چکے تھے جو نہ دیکھ سکتی تھی اور سن سکتی تھی اور نہ محسوس کر سکتی تھی۔

شیخ نے اسکوٹر مردہ خانے کے قریب روکا تو میں چونکا۔

"کون سی دنیا میں تھے جناب!" شیخ نے کہا۔ "پریشان میں بھی ہوں لیکن تم سے کم۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" میں نے خفت سے کہا اور ادھر ادھر دیکھا۔

"ہونا کیا تھا! اکیلا اپنے آپ سے باتیں کرتا آیا ہوں — تم نے کچھ سنا؟" شیخ نے اسکوٹر کو لاک کیا۔

"سچ تو یہ ہے کہ میں نے نہیں سنا۔" میں نے اعتراف کیا۔ "لیکن اس کی وجہ پریشانی نہیں، میں اپنے خیالات میں گم تھا۔"

"کس کے خیالات میں؟" شیخ نے صرف میرا موڈ اپ رکھنے کے لیے مذاق کیا۔ "نام لوں اس کا؟"

"کمال ہے کہ تم نے صحیح اندازہ کیا!" میں نے کہا۔ "نسبت اسی کے نام سے ہے۔ میں رابعہ کی ماں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

لاش کو مردہ خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کوئی ایمرجنسی نہیں ہوتی۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ تو صبح ہی طے ہوگا کہ پوسٹ مارٹم کس وقت کیا جائے گا اور کون ڈاکٹر کرے گا۔ چونکہ شیخ اپنی وردی میں تھا اس لیے مردہ خانے کے قائم مقام نگراں نے (جو بلحاظ عہدہ جمعدار تھا) ہمیں اندر جانے سے نہیں روکا مگر وہ ہمارے ساتھ رہا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے بڑھ کے دوستانہ لہجے میں اس سے نام پوچھا۔ یہ پوچھا کہ اسے کتنی تنخواہ ملتی ہے اور کیا اس مشکل کام کا کوئی خصوصی معاوضہ ملتا ہے؟ ظاہر ہے خصوصی معاوضہ کچھ نہ تھا۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا کہ بچے کتنے ہیں؟ چار بچے، ایک بیوی، ماں باپ، ایک بہن۔ نو افراد کا اس آمدنی میں کیسے گزارا ہوتا ہے! میں نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکال کے اسے دیا۔ بظاہر یہ ہمدردی کا انداز صرف مدد کرنے کے لیے تھا مگر وہ جانتا تھا کہ دولت مند بھی بلا وجہ ضرورت مندوں میں سو سو کے نوٹ نہیں بانٹتے پھرتے۔ اس تمام عرصے میں شیخ لاش کا بغور معائنہ کرتا رہا تھا۔

"تمھیں یقین ہے کہ یہی وہ لاش ہے جو تھانے سے لائی گئی تھی؟" میں نے کہا۔

جمعدار نے اقرار میں سر ہلایا۔ "آپ کے کوئی عزیز یا جاننے والے تھے کیا؟" سو کا نوٹ جیب میں رکھ لینے کے بعد وہ میری جوابی مدد کے لیے ذہنی طور پہ تیار تھا۔ وہاں آنے والے اس کو خصوصی خدمات کا خصوصی نذرانہ دیتے تھے اور وہ سب کے نذرانے ان کے کام کی نوعیت کے اعتبار سے قبول کرتا تھا۔

www.paksociety.com

"یہ ایک چور ہی تھا۔" میں نے کہا۔ "بے چارہ ضرورت سے مجبور ہو کے چوری کر بیٹھا۔ ہم اسے بچانے کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

"بات کچھ پلے نہیں پڑی جی۔ پولیس ایک چور کی مدد کیوں کرنا چاہتی ہے؟" وہ بے رُخی سے بولا۔ شیخ اب معائنے سے فارغ ہو چکا تھا اور ہماری گفتگو سے اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ میرے ذہن میں کیا ہے؟

"بات بہت آسان ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بے چارہ بھیس بدل کے ایک جگہ چوری کرنے پہنچا اور پکڑا گیا۔ گھر والے جاگ اٹھے تھے۔ یہ بھاگا اور کوئی راستہ نہ پا کے چھت پر سے گلی میں کود گیا۔ گھر والوں کی چیخ پکار پر گشتی پولیس آ گئی اور گلی میں بھی لوگ نکل آئے مگر یہ غریب بھاگنے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔ کسی اندرونی چوٹ سے جاں بلب تھا۔" وہ بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ پولیس اس کو تھانے لائی تو یہ مر چکا تھا۔ اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس نے فاقوں سے مجبور ہو کے پہلی بار یہ حرکت کی تھی۔ سرکس میں سوانگ بھرنے والوں کی اب آمدنی کہاں رہی ہے۔ لوگ فلم دیکھتے ہیں یا ٹی وی۔ اکیلا آدمی تو فاقے بھی برداشت کر لیتا ہے لیکن جس کے بیوی بچے ہوں؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "انھی کی خاطر تو آدمی سب کچھ کر گزرتا ہے۔"

"یہ تو ہے جی۔" جمعدار مذکور نے اتفاق میں سر ہلایا۔

"جن لوگوں نے اسے گرفتار کیا تھا، وہ اس کو پہچانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن گرفتاری کے وقت یہ میک اپ میں تھا۔ اب یہ بے چارہ خود تو مر گیا، تفتیش سے کیا فائدہ۔ اس کے گھر والے ہی پریشان ہوں گے نا۔ لیکن اس کا میک اپ اتار دیا جائے تو اس کو وہ لوگ بھی نہیں پہچان سکیں گے جنھوں نے اس کو دیکھ لیا تھا۔ میرا مطلب ہے اس گھر کے لوگ جہاں یہ چوری کرنے گیا تھا اور گشتی پولیس۔ پھر اس لاش کو گھر والے لے جائیں گے اور یہ کسی چور کی لاش نہیں، اس غریب آدمی کی لاش ہو گی جو غالباً کسی حادثے کا شکار ہوا تھا۔"

"لیکن جو لوگ لاش لائے تھے...." وہ متفکر ہو کے بولا۔

"وہ اسے تلاش کریں گے۔"

"انھیں یہ لاش چاہیے۔ جیسی یہ اب ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر میک اپ اتار دیا جائے تو وہ اس کو کیسے شناخت کر سکتے ہیں۔ صبح سے پہلے کوئی کارروائی نہیں ہو گی اور تمھاری ڈیوٹی صبح ختم ہو جائے گی۔ بعد میں کیا ہوتا ہے، یہ تمھاری ذمے داری نہیں۔"

"صرف.... سو روپے کی خاطر اتنا بڑا خطرہ....؟" اس نے متذبذب لہجے میں کہا اور لاش کو غور سے دیکھنے لگا۔

میں نے شیخ کو آنکھ ماری اور جیب سے مزید چار نوٹ نکال لیے۔ "لو بھئی اب تو کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے۔ پولیس نے ابھی تک کوئی رپورٹ درج نہیں کی ہے۔"

جمعدار نے پانچ سو کی رقم پر غور کیا اور مردہ خانے کے نظام اور طریق کار پر غور کیا۔ ان خطرات پر غور کیا جو اس کی ذات کو لاحق ہو سکتے تھے۔ ان امکانات پر غور کیا جو تحفظ کی ضمانت فراہم کرتے تھے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی کو آدمی کی مدد کرنا چاہیے۔ مرنے والے کی نیکی بدی اس کے ساتھ گئی۔ دس منٹ میں اس نے میک اپ دھو ڈالا اور وِگ اتار کے ہمیں تھما دی۔ میں اور شیخ دم بخود دیکھتے رہے۔ ذرا سی دیر میں جہاں استاد پیڈرو کی لاش پڑی تھی، وہاں اسی قد و قامت کے دوسرے آدمی کی لاش رہ گئی تھی جس کی شکل ذرا بھی پیڈرو سے نہیں ملتی تھی۔ اس کا رنگ پیڈرو کے مقابلے میں بہت صاف تھا۔ مونچھیں ہٹ جانے کے بعد اس کے ہونٹوں کی بناوٹ نمایاں ہو گئیں۔ پیڈرو کے جیسے بالوں کی جگہ استرے سے گھٹا ہوا صاف سر رہ گیا۔ معلوم نہیں صرف وِگ لگانے کے لیے اس نے سر صاف کرا لیا تھا یا وہ اسی ہیئر اسٹائل کو پسند کرتا تھا۔ لباس کا مسئلہ اب بھی باقی تھا۔ دو نوٹوں نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ جمعدار نے زیرو لاک کے کپڑے اتارے اور اس کی لاش کو اسپتال کی ہی ایک چادر میں لپیٹ دیا۔ وہ مردہ خانے میں کام کرتے کرتے اتنا نڈر اور بے حس ہو چکا تھا کہ نہ اسے مُردوں سے خوف محسوس ہوتا تھا اور نہ ان کے ساتھ کسی زیادتی پر افسوس۔ میں نے سنا تھا کہ مردہ خانوں میں لائی جانے والی لاشوں کے ہاتھوں سے گھڑیاں اور انگوٹھیاں تک اتار لی جاتی ہیں۔

"لیں جی ہمارا خیال رکھنا۔" وہ شیخ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "ہم غریب آدمی ہیں تھانیدار صاحب!"

"فکر مت کرو۔" میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ بہت سے لوگوں کو پریشانی سے بچایا ہے۔"

"... مثلاً ہم کو۔" شیخ نے باہر آ کے کہا۔ "تمھاری کچھ کچھ میری سمجھ میں آ گئی تھی۔"

"شیخ صاحب!" میں نے کہا۔ "میں جو اب تک بچا ہوا ہوں تو اس لیے نہیں کہ مجھے دنیا کے نظام قانون کا تحفظ ملتا رہا۔ قانون کی نظر میں تو میں مجرم ہوں لیکن بہت سے جرائم مجھ پر اس لیے ثابت نہیں ہوئے کہ میں نے بے گناہ ثبوت مٹا دیے اور اپنے خلاف جھوٹ کی شہادت کو ختم کر دیا۔ تم کہہ سکتے ہو مجھے تائید ایزدی اس لیے حاصل ہے کہ میں چپ ہوں یا سمجھو کہ میں نے ذہانت سے کام لیا۔ جو کچھ میں نے اپنے دفاع کے لیے کیا، اسے جرم نہیں سمجھا جا سکتا۔ میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور جنھوں نے میرے لیے گڑھا کھودا، میں نے ان کو گڑھے میں پہلے دھکیل دیا۔ فنا اور بقا کی جنگ میں یہی ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ دنیا اسی پر عمل پیرا ہے کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے اور ہم بہرحال اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ اب تم بات کو اچھی طرح سمجھو۔ حوالات میں کوئی زیرو لاک وغیرہ نہیں تھا۔ کسی روزنامچے میں اس کا ذکر نہیں۔ تم سے ملنے کے لیے کوئی خادم حسین آفندی بار ایٹ لا نہیں آیا تھا۔ نہ استاد پیڈرو اس کے سامنے لایا گیا تھا۔ نہ تم نے اس کو سگریٹ پیش کرنے کی اجازت دی تھی۔ چونکہ اس نام کا کوئی وکیل ہے ہی نہیں۔"

"تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو؟" شیخ نے کہا۔

"میری چھٹی حس کبھی غلط نہیں کہتی۔" میں نے کہا۔ "چاہو تو صبح بار کونسل سے تصدیق کر لینا۔ جیتھر قیدی رہا ہو کے گئے اور جو دور ہو گئے ہیں انھیں وہی معلوم ہے جو ان کے سامنے ہوا یعنی استاد پیڈرو حوالات میں بیٹھے بیٹھے مر گیا۔ کسی نے اس پر تشدد نہیں کیا اور کوئی زہریلی چیز نہیں دی۔ غالباً اس کا ہارٹ فیل ہوا۔ یہی سب نے سنا بھی تھا۔ پھر تم نے لاش اسپتال بھیج دی ایک کانسٹیبل کے ہمراہ۔ تمھاری ذمے داری ختم۔ اس وکیل میں ہمت ہے تو دوبارہ آ کے دکھائے۔"

"نہ جانے کیوں میں احساس جرم کا شکار ہوں۔" شیخ نے کہا۔ "جو کچھ میں نے کیا، فیئر پلے نہیں تھا۔"

"یار شیخ! جذبات سے نہیں، عقل سے سوچو۔ کہاں کا فیئر پلے، کیسا فیئر پلے؟" میں نے کہا۔ "فیئر پلے کے چکر میں تم نے اپنی نوکری کو اپنے لیے سزا بنا لیا اور کیا ملا اس سے؟ کیا حشمت خان اور میر محمد جیسے لوگوں نے تمھاری تقلید شروع کر دی؟ یا تمھیں جھک مار کے اس دلدل سے نکلنا پڑا۔ احساس جرم پھر کیسا؟ کیا اس شخص نے جو کچھ کیا تھا، وہ جائز تھا؟ جن لوگوں کے لیے وہ ایک غلط کام کرنے پر تیار ہوا، وہ اچھے لوگ تھے؟ تمھیں یا مجھے تو وہ جانتا تک نہ تھا مگر پیسے لے کر اس نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی اور تمھیں باعزت طور پہ مستعفی ہونے سے قبل ہی بدنام کر کے معطل کرانے کی سازش میں آلۂ کار بنا۔ پھر یہ بتاؤ کہ کیا اسے تم نے مارا؟ اس کا قاتل تو وہ دھوکے باز بدمعاش تھا جو وکیل بن کے پہنچا تھا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ ابھی تک تم نے اس واردات کے متعلق روزنامچے میں کوئی اندراج نہیں کیا ہے۔ ورنہ تم کیا کرتے جب معلوم ہوتا کہ خادم حسین آفندی بار ایٹ لا کا وجود ہی نہیں؟ قاتل کو کیسے گرفتار کرتے؟ جو آیا تو صرف ایک کام سے تھا کہ کچھ لے دے کر معاملہ ختم کرا دے اور زیرو لاک مطمئن تھا کہ حسب وعدہ اسے بحفاظت نکال کر لے جانے والے اپنا ایفائے عہد کرنے آ گئے ہیں۔ اگر زیرو لاک اس کے ساتھ چلا جاتا تو کیا ہوتا؟ شاید پولیس والوں کو اس کی لاش بھی نہ ملتی۔ مگر تم نے دشمنوں کے عزائم کو ناکام بنانا چاہا تو وہ جاتے جاتے ایک تیر سے دو شکار کر گیا۔ اس نے زیرو لاک کو بھی ٹھکانے لگایا اور تمھیں بھی سزا دلوانے کا انتظام کر دیا۔ اس کے باوجود تم بات کرتے ہو فیئر پلے کی؟ زندگی کے بارے میں میرا ایک نظریہ ہے جو نہ اخلاقیات کے خلاف ہے نہ ہمارے مذہبی عقائد کے۔ جان لینے کی کوشش کرنے والے کے ساتھ رعایت کیسی؟ ہمارا مذہب یہ نہیں سکھاتا کہ کوئی تمھارے گال پر ایک تھپڑ مارے تو تم دوسرا گال آگے کر دو۔ نہیں۔ ہم آنکھ کے بدلے آنکھ اور جان کے بدلے جان لینے کے مجاز ہیں۔ فرق صرف طریقۂ کار کا ہے تو یہ طریقۂ کار بھی انگریز کے بنائے ہوئے قانون کی وجہ سے مشکلات پیدا کرتا ہے۔ یہ پورا معاشرہ جھوٹ کے پاؤں پر چل رہا ہے۔ تم سچ کا سہارا لے کر دو قدم نہیں چل سکتے۔"

"پھر بھی مجھے خیال آتا ہے کہ مجھے سب سچ لکھ دینا چاہیے تھا اور پھر نتائج کا معاملہ خدا پر چھوڑ دینا چاہیے تھا۔"

"خدا نے یہ تو نہیں کہا ہے کہ جب ضرورت پڑے تو کچھ مت سوچو۔ عقل کو بالائے طاق رکھ دو اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاؤ۔" میں نے بھنا کے کہا۔ "کہ جو خدا کو منظور ہو گا، وہی ہو گا۔ حالات تمھارے سامنے ہیں اور تم سب کچھ جانتے ہو۔ تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ خود تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا، کسی کے خلاف زیادتی نہیں کی، قانون کا احترام کرتے رہے اور فرض کو مقدم جانا۔ کبھی رشوت نہیں لی اور اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کیا۔ آج جو کچھ ہوا، وہ میرے اور تمھارے خلاف ایک مذموم سازش تھی۔ ہم نے عقل سے کام لیا اور بچ گئے۔ خدا جانتا ہے کہ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ ایک بوجھ تمھارے ضمیر پر یہ ہے کہ مرنے والے کی بیوی کی نظر میں اس کے شوہر کو لے جانے والا ایس آئی اکرام شیخ تھا اور جب اسے علم ہو گا کہ وہ مر گیا ہے تو شاید وہ اکرام شیخ کو ہی قاتل سمجھتی رہے گی۔ اس کے لیے تم اپنی پوزیشن کلیئر کرنا چاہتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں یہ تم اچھا کر رہے ہو اور اسی لیے میں تمھارا ساتھ دے رہا ہوں۔"

"اچھا یار!" شیخ نے ایک گہری سانس لی۔ "تم کہتے ہو تو

www.paksociety.com

"ٹھیک ہے؟" اس نے کِک مار کے اسکوٹر کو اسٹارٹ کیا۔ "لیکن اب یہ نوکری اپنے بس کی نہیں۔ میں نے اس پر لعنت بھیج دی ہے اور بس اب خیریت کے ساتھ استعفیٰ منظور ہو جائے۔"

"پھر بڑی حماقت کی بات ہے۔" میں نے پیچھے بیٹھ کے کہا۔ "تم استعفیٰ واپس لو گے اور نہیں لوگے تو شرطیہ منظور نہیں ہوگا۔ تھانہ اگر گندی جگہ ہے تو اسے چھوڑ دو۔ ہیڈ کوارٹر میں رہو۔ وہاں صاف ستھرا کام ہے۔"

"بس، میں یہ نوکری کرنا ہی نہیں چاہتا۔" شیخ نے بگڑ کے کہا۔ "میں محتاج نہیں ہوں۔ میرے پاس سب کچھ ہے۔"

"یہ سب کچھ تو اس وقت بھی تھا جب تم نے پولیس کا محکمہ جوائن کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ جذبہ اتنا کمزور تھا؟ قانون کے ذریعے خدمتِ خلق کرنے کا؟ وہ محض جذباتی فیصلہ تھا جس نے تمہیں بزنس کرنے، مقابلے کا امتحان دینے یا گھر بیٹھ کر کھانے کے بجائے پولیس کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا؟"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں نے یہاں آ کے دیکھ لیا، کسی کو میرے جذبے کی ضرورت نہیں۔"

"غلط۔ بے شک تمہیں ماحول غلط ملا مگر یہ مت کہو کہ تمہارے جذبے کی قدر کرنے والا کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک تو میں ہوں اور میں اکیلا ہی نہیں۔ وہ سب ہیں جو میرے ساتھ ہیں اور تمہیں جانتے ہیں۔ تمہارے گھر والے بھی ان میں شامل ہیں۔ انکل رضوی جیسے بھی پولیس میں ہیں۔ ان کی جگہ کون لے گا اگر تم جیسے ہمت ہار کے نکل جائیں گے؟ تمہارا تجربہ ابھی بہت کم ہے۔ آہستہ آہستہ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اپنے مشن میں تم اکیلے نہیں۔ تمہارے محکمے میں بھی تمہارے ساتھ بہت ہیں۔ کیا کہا ہے وہ شاعر نے کہ تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب۔ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے۔ تو مسٹر عقاب! ایک دن تمہیں آئی جی وغیرہ بننا ہے اور اس پورے محکمے سے ہر حشمت خان کو خارج کرنا ہے۔ خود خارج ہو گئے تو یہاں راج کریں گے حشمت خان۔ نقصان ہوگا ملک و قوم کا اور پبلک کا کہ سب گل گئے، اگشن گئے، کنڈر کر لیے رہ گئے۔"

شیخ ہنس پڑا۔ "کہاں انجینئرنگ کے پیشے میں گھس گیا تو۔ وکیل ہوتا تو سب کا باجا بجا دیتا۔ تیری دلیل کے آگے کسی کی منطق نہ چلتی۔"

"اور مرزا شرندی کو ملتی نہ ملزم کو ملتی۔ وکیل صاحب دونوں طرف سے پیٹتے۔" میں نے کہا۔

"اس وقت رات کے تین بجے ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "مگر جا کے کسی کا دروازہ بجانا اور اس آدمی اندر داؤ کا گھر ہو تو کرنا بہت غلط بات ہوگی۔ کسی کو سوتے سے اٹھا کے بُری خبر سنائی جائے تو شاک بہت زیادہ ہوتا ہے۔"

"میں بھی سوچ رہا تھا کہ وہاں صبح ہونے سے پہلے نہیں جانا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "ایسا کرتے ہیں کہ تو جا پہنچ تھانے۔ گشت کے لیے نکلا تھا نا۔ اس لیے رات بھر غائب رہنا اچھا نہیں۔ وہاں تو معمول کے مطابق ڈیوٹی پوری کر۔ کسی قسم کی پریشانی کے بغیر۔ حوالات میں ایک قیدی مر گیا تو لاش تو نے اسپتال کی ایمبولینس میں بھیج دی جو روزنامچے کے اندراجات کے مطابق استاد پیڈی کی لاش تھی اور اسے شناخت کرنے والے بہت ہیں۔ بظاہر اسے دل کا دورہ پڑا تھا لیکن پوسٹ مارٹم ہوگا تو حقیقت سامنے آ جائے گی۔ اب استاد پیڈی کی لاش ہی نہ ملی تو پوسٹ مارٹم رپورٹ کیسی؟ اور لاش کہاں گئی، یہ تیری ذمے داری نہیں۔ اس سپاہی سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں جو ایمبولینس میں لاش کے ساتھ گیا تھا۔ وہ حلفیہ بیان دے گا کہ لاش اس نے اسپتال والوں کے حوالے کی تھی اور اس کا جو حلیہ بیان کرے گا، وہ بھی اس کے یقین کے مطابق غلط نہیں ہوگا۔ میں جاتا ہوں اپنے گھر۔ صبح جب تو ڈیوٹی ختم کر کے گھر پہنچے گا تو میں بھی آ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ناشتا ہمارے ساتھ کرنا۔" شیخ نے کہا۔ "اس کے بعد ہم نمبردار کے گھر چلیں گے۔"

"میرا ارادہ تھا کہ آٹھ بجے اسلام آباد چلا جاؤں۔" میں نے کہا۔ "دو ڈھائی سو روپے کم نہیں تھے مگر میں ایک ہزار احتیاطاً ساتھ لے جانے کے چکر میں پڑ گیا اور اب مجھے کل دوپہر پہلے روانگی مشکل نظر آتی ہے۔ میں تیرے پاس نہ آتا تو اس وقت پنڈی میں ہوتا۔ اچھی سزا ملی ہے احتیاط پسندی کی۔"

"قدرت کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔" شیخ نے کہا۔ "یہ احتیاط پسندی میرے تو کام آئی۔ میں اکیلا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میرا دماغ کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ تو نے میرا حوصلہ بحال رکھا۔" اسکوٹر کا رخ اب میرے گھر کی طرف تھا۔

"محسن کے ساتھ میری ذہنی کیفیت بھی یہی ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک اکیلا اور دو گیارہ۔ اور مجھے تو لگتا ہے کہ اب ہم ایک سو گیارہ ہو گئے ہیں۔ یہ سب خدا کی مہربانی ہے کہ جتنے دشمنوں کے حوصلے بلند ہوتے جا رہے ہیں اور ان کے عزائم پہلے سے زیادہ خطرناک ہونے لگے ہیں، اتنے ہی میرے دوست اور مددگار بڑھتے جا رہے ہیں۔ جب میں لندن سے آیا تھا تو میرے ساتھ صرف محسن تھا۔ یہاں پہنچا تو بالکل اکیلا تھا۔ ایک

باپ تھا، وہ بھی نہیں ملا مگر اس دن کے بعد سے آج تک کیا ہوا؟ شکاری جال پر جال پھیلاتے گئے اور میں بچ کر نکلتا گیا۔ یہاں تک کہ مجھ میں اتنا حوصلہ اور اعتماد آ گیا کہ میں خود شکاری بن گیا اور میں گزرے ہوئے وقت کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی کامیابیوں پر فخر یا غرور محسوس ہوتا ہے لیکن میں توبہ کرتا ہوں۔ یہ سب تائیدِ ایزدی ہے کہ آج دشمن مجھ سے اتنے ہی خوف زدہ ہیں جتنا کل میں ان سے تھا۔ آج میرے ساتھ صرف محسن ہی نہیں، رابعہ ہے اور شہلا ہے اور منظر ہے۔ تو ہے اور تیرے گھر والے ہیں۔ استاد پیڈی ہے۔ یہ سب لوگ اجنبی تھے جب میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ ان میں سے کسی کو نہ جانتا تھا۔ رابعہ اور منظر بچپن کے ساتھی ضرور ہیں لیکن ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں یہ بھی علم نہ تھا کہ کون زندہ ہے اور کون مر گیا ہے۔ میں انکل رضوی اور شیروانی صاحب سے ضرور واقف تھا مگر اس کے بعد مجھے کتنے سہارے ملے؟ کتنے قابلِ اعتماد اور کتنے حوصلہ دینے والے اور بے غرض، کتنے مخلص دوست ملے؟ کتنے سچ بولنے والے ملے اور کتنے بدخواہ کیفرِ کردار کو پہنچے؟ کتنے دشمن کم ہوئے؟ ہم ہے کہ یقین افراد کا نام میں پورے وثوق کے ساتھ لے سکتا ہوں کہ میرا وجود ان کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور وہ اس کانٹے کو نکال پھینکنا چاہتے تھے مگر کسی کے چاہنے سے کچھ ہوتا تو سب کے دشمن مر گئے ہوتے اور دنیا روزِ اول کی طرح غیر آباد ہوتی۔ یا اس میں صرف جانور ہوتے کیونکہ آدمی کا دشمن تو صرف آدمی ہی رہا ہے۔ چراغ دین، ڈی سلوا اور میر محمد نے کیا چاہا تھا اور خود ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

اسکوٹر نہر کے پل سے گزرا تو میں نے موقع پاتے ہی نمبردار کے کپڑے اور اس کی وگ کا بنڈل پانی میں پھینک دیا۔ نمبردار کے گھر پہنچنے کی اطلاع کسی گھر کے وال کلاک نے بہت دور سے دی۔ اور شیخ نے اسکوٹر روک کر مجھے گھر کے دروازے پر اتار دیا۔ میں اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ اس کی سرخ ٹیل لائٹ نظر آتی رہی۔ پھر میں نے گیٹ کو اندر ہاتھ ڈال کے کھولنا چاہا مگر اس کے پٹ خود بخود پیچھے ہو گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں گیٹ کو اندر سے مقفل کر کے اور پھر باہر کود گیا تھا لیکن اب وہ تالا ہی غائب تھا۔ بے اختیار میں پیچھے ہٹا اور دیوار کے سائے میں چلتا ہوا گیٹ سے دور ہو گیا۔ میں نے احتیاطاً وہ بھرا ہوا ریوالور بھی نکال لیا تھا جو میں نے جاتے ہوئے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔

آخری کونے پر جہاں ساتھ والی کوٹھی کا گیٹ تھا، میں نے دیوار کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ بظاہر اندر کسی قسم کی گڑبڑ نظر نہیں آتی تھی۔ سب کھڑکیاں اور دروازے بند تھے اور کمروں میں مکمل اندھیرا غالب تھا۔

"سکندر صاحب!" کسی نے دبی دبی سرگوشی میں مجھے پکارا اور میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کے دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر وہ درختوں کے پیچھے سے نکلا اور دیوار کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی سرسبز باڑھ کے پیچھے رہ کر سرکتا ہوا آگے بڑھا۔ دیوار اور باڑھ کے درمیان جگہ نہ ہونے کے برابر تھی چنانچہ اس کی پشت یقیناً دیوار سے چھل گئی ہوگی اور سامنے کٹی ہوئی شاخوں کے نوکیلے کناروں سے اس کے جسم پر خراشیں آئی ہوں گی۔ اس کی حرکت سے خاصی سرسراہٹ بھی پیدا ہو رہی تھی چنانچہ وہ بہت آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں دیوار پھلانگ کر اندر اتر گیا کیونکہ میں نے استاد پیڈی کو پہچان لیا تھا۔ میں دو دیواروں کے سنگم پر کونے میں دبکا کھڑا رہا اور استاد پیڈی کے پُراسرار رویے کے اسباب پر غور کرتا رہا۔ اس نے ضرور کوئی ایسی بات نوٹ کی تھی کہ وہ چھپا کھڑا تھا اور نگرانی کے علاوہ اس کا مقصد مجھے کسی خطرے سے بروقت خبردار کرنا تھا۔

"کیا بات ہے استاد؟" میں نے پیڈی کے قریب آتے ہی آہستہ سے پوچھا۔

"آپ نے اچھا کیا صاحب، اندر نہیں گئے۔" وہ منہ پر انگلی رکھ کے بولا۔ "میں نے اسی لیے تالا کھول لیا تھا۔"

"تالا تم نے کھولا تھا؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "کیسے؟"

"قسم مولا کی سکندر صاحب! ایسے ہی تو ہم استاد نہیں ہو گئے۔" وہ بولا۔ "بس آپ کی دعا ہے جب تک ضرورت نہ پڑے ہاتھ کی صفائی نہیں دکھاتے۔ یہ تو سیدھا سادا تالا تھا علی گڑھ والا۔ کبھی کوئی تجوری کھولنی ہو تو بتانا۔"

"تم نے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا اس وقت۔" میں نے کہا۔ "میں واقعی تالے کو غائب پا کے کھٹک گیا تھا۔"

"میں دروازے کے پاس انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھے صاف دیکھ لیتے۔" پیڈی نے کہا۔ اس کی نظر بے اختیار گھر کی طرف گئی۔

"وہ کون؟" میں نے کہا۔ "اندر کوئی ہے کیا؟"

پیڈی نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے کم سے کم تین آدمی ہیں۔" پیڈی بولا۔ "ایک ایک کر کے آئے تھے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ پیچھے ایک کھڑکی کا شیشہ غائب ہے۔ اندھیرے میں پتا نہیں چلتا۔ اندر سے پردے بھی برابر ہیں لیکن وہاں

www.paksociety.com

ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ تینوں اسی راستے سے اندر گئے ہوں گے۔"

"تم نے کسی کو پہچانا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی! وہ بہت دور تھے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "اس اندھیرے میں تو آپ نے آواز سن کے ہی مجھے پہچانا ہوگا۔"

"مجھے ڈر تھا اسی بات کا۔" میں نے کہا۔ "اور میں گھر سے تو نکل گیا تھا کہ آج رات یہاں نہیں رہوں گا۔ اسلام آباد چلا جاؤں گا لیکن واپس آنا پڑ گیا۔ اب کیا ہم صبح تک اسی جگہ چھپے کھڑے رہیں گے؟"

"اگر کچھ کرنا ہے اپنے سکندر صاحب! تو یہی وقت ہے۔" ٹیڈی مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔ "اندھیرے میں ہم بھی اندر جا سکتے ہیں اور ان کو دبوچ سکتے ہیں۔ ورنہ ان کا کیا ہے، وہ صبح ہونے کے بعد بھی اندر بیٹھے رہیں۔"

"ہاں۔ اندر ان کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے تسلیم کیا۔ "وہ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ سوائے میرے فی الحال کسی کے گھر آنے کا کوئی امکان نہیں اور میں کب تک نہیں آؤں گا، وہ انتظار کر سکتے ہیں۔ اندر ان کی ضرورت کا ہر سامان ہے۔ کھانے پینے کا اور آرام کرنے کا۔ جلدی کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"لیکن ہم تو صبح کی روشنی پھیلتے ہی صاف نظر آ جائیں گے۔" ٹیڈی نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "کیوں آئے ہیں یہ لوگ جی؟"

"استاد بھولے!" میں نے کہا۔ "چور ہوتے تو مایوس ہو کر لوٹ چکے ہوتے۔ اب تک جو بیٹھے ہیں، صرف سکندر بخت کے منتظر ہیں۔"

"پھر بتائیں آپ! اندر جا کے کچومر بنا دوں ان کا؟ قسم مولا کی... گاجر مولی ہیں سمجھو۔" اس نے ڈب سے خنجر نکال لیا۔

"بس بس، اتنا غصہ ٹھیک نہیں۔ چالاک دشمن کا مقابلہ طاقت سے نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری صحبت میں رہ کے ابھی تک تم نے اتنا بھی نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔ "یہ خنجر رکھ لو۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ لوگ تمھیں نہیں پہچانتے ہوں گے۔ لیکن میرا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے استاد!"

"آپ بولیں جی، کرنا کیا ہے؟" ٹیڈی کے جذبۂ شجاعت میں خنجر رکھ لینے کے باوجود کمی نہیں آئی تھی۔

"تم یہ کرو کہ اطمینان سے ہوشیار! خبردار! کی صدا لگاتے اندر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یوں جیسے تم اس علاقے کے چوکیدار ہو۔ اندر وہ یقیناً پریشان اور حیران ہوں گے کہ چوکیدار اندر کیوں آیا۔ لیکن سمجھیں گے کہ ایس پی کا گھر ہے تو دھیان دیتے وقت چوکیدار کو بطور خاص گھر کا خیال رکھنے کا کہہ گئے ہوں گے۔ چوکیدار اب دوسرے گھروں کا خیال رکھے نہ رکھے، اس گھر کی طرف سے غافل نہیں ہوگا۔ تم سامنے سے شروع کرو۔ ہر دروازے کو ٹھوک بجا کے اور ہلا جلا کے دیکھو۔ جیسے جیسے تم اس کھڑکی کی طرف بڑھو گے ان کی تشویش میں اضافہ ہوگا۔ وہ اندر سے کنڈی لگائیں گے اور انتظار کریں گے کہ تم جلد سے جلد دفع ہو جاؤ اور تم بالکل یہی کرنا یعنی اگلی کھڑکی کو اسی طرح دیکھ کے اسی طرح صدا دیتے نکل جانا۔ اس وقت تک میں کھڑکی کے عین نیچے پہنچ جاؤں گا۔ مجھے امید ہے کہ تمھارے جاتے ہی کوئی کھڑکی پھر کھولے گا اور اپنے اطمینان کے لیے سر نکال کر دیکھے گا۔ اس کے بعد میں سنبھال لوں گا۔"

"میں بھی چکر لگا کے پھر پیچھے پہنچ جاؤں گا۔" ٹیڈی نے میری اسکیم سے اتفاق کیا۔ "قسم مولا کی دونوں مل کر ان کا بھرتہ بنا دیں گے۔ ان کی تو..." اس نے کہا اور دیوار پر سے باہر کود گیا۔

صورت حال کی سنگینی کے باوجود مجھے ہنسی آ گئی۔ استاد ٹیڈی کے لیے شاید یہ عملی آزمائش کا پہلا موقع ہوگا۔ اب تک تو اس نے مولا کی قسمیں کھانے اور ساری دنیا کا بھرتہ بنا دینے کے زبانی عزائم کا اظہار کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔

چند منٹ بعد میں نے استاد ٹیڈی کی دبنگ آواز سنی جو اونچا بولنے کی وجہ سے پتلی اور کسی حد تک مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔ وہ بڑے شریش صدا لگا رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ جاگتے [illegible] رہو اور خبردار رہو کے بول گا رہا ہے۔ اصل چوکیدار کی آواز میں جو کرختگی اور کرارا پن ہوتا ہے اور جو ہر رات صدا لگانے کی مشق سے آتا ہے، وہ ٹیڈی کی آواز میں مفقود تھا لیکن اس فرق کو صرف میں ہی محسوس کر رہا تھا۔ دوبارہ اپنی مخصوص آواز میں اس نے کھنکارا اور کوٹھی کے اندر داخل ہوا۔ اس نے پورے اطمینان کے ساتھ سامنے کے دروازے ہلا کے بلکہ جھنجھوڑ کر دیکھے۔ جب وہ پیچھے کی طرف بڑھا تو میں جھاڑیوں سے تیر کی طرح نکلا۔ مجھے یقین تھا کہ اب جو لوگ اندر ہوں گے، غیر شعوری طور پر اسی کھڑکی کی طرف لپکے ہوں گے جس میں سے وہ اندر گئے تھے چنانچہ وہ مجھے نہیں دیکھ سکیں گے۔ ٹیڈی دائیں طرف سے گھوم کر گیا تھا، میں بائیں طرف سے گیا۔ موڑ کاٹتے ہی میں اتنا نیچے جھک گیا کہ مجھے چاروں ہاتھوں پیروں پر آہٹ کیے بغیر کسی جانور کی طرح دوڑنا پڑا۔ میں نے ٹیڈی کو سامنے سے آتے دیکھا اور اس سے چند سیکنڈ قبل ٹوٹے ہوئے شیشے والی کھڑکی کے نیچے پہنچ گیا۔ میرے کانوں نے واضح طور پر اندر سے چٹخنی

کے چڑھائے جانے کی ہلکی سی آواز سنی۔ میں دیوار سے چپکا ہوا سانس روکے چوکھٹ کے عین نیچے اس چیتے کی طرح بیٹھا رہا جو شکار پر جست لگانے کے لیے تیار ہو۔ ٹیڈی نے اس کھڑکی کو بھی تھوڑا سا ہلایا اور اگلی کھڑکی پر چلا گیا۔ اس کے بعد ایک دروازہ تھا، پھر آخری کھڑکی اور تقریباً موڑ کے پاس اسٹور کا دروازہ۔ ٹیڈی نے صدا لگائی اور گھوم گیا۔ اب میں بالکل تیار تھا کیونکہ ٹیڈی دوسری طرف کے کھڑکی دروازے چیک کر رہا تھا، جدھر سے میں آیا تھا اور اب کسی بھی لمحے کوئی کھڑکی کھول کے جھانک سکتا تھا۔

اچانک میرے کانوں نے چٹخنی کھولے جانے کی ہلکی سی آواز سنی۔ میں چوکنا ہو گیا تھا۔ سر اٹھا کے دیکھنے پر مجھے ایک سایہ سا دکھائی دیا جو کھڑکی کے چوکھٹے سے باہر نکلا ہوا تھا۔ "چلا گیا؟" کسی نے سرگوشی میں کہا۔

میں بجلی کی طرح اٹھا اور میرے ہاتھوں نے حلقہ بنا کے باہر جھانکنے والے کی گردن کو شکنجے کی طرح کس لیا۔ پھر میں نے آگے کی طرف جھٹکا دیا اور وہ کھڑکی سے سیدھا باہر آ رہا۔ یہ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ اپنے دفاع میں کچھ نہ کر سکا۔ اس کے حلق سے 'اوق' کی آواز نکلی۔ میں نے دھوبی پٹخے کے انداز میں اس کو کندھے پر سے گزار کے زمین پر الٹا مارا لیکن وہ بلا کا پھرتیلا آدمی تھا کہ گرتے ہی اس نے قلابازی کھائی اور پلک جھپکتے میں اٹھ کر میرے مقابل آ گیا۔ مجھے معلوم تھا وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس نے چوکیدار کے چلے جانے کے بعد کسی سے بات کی تھی اور خود ٹیڈی کا اندازہ بھی یہی تھا کہ اندر دو یا تین آدمی موجود ہیں۔ چنانچہ میں دوسروں کی طرف سے بھی غافل نہ تھا۔ میں نے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر اپنے حریف کو سامنے آنے کی دعوت دی۔ میرا مقصد تو کھڑکی سے دور ہونا تھا تاکہ پیچھے سے کوئی مجھے دبوچ نہ لے۔ اس نے اپنے بھاری بھرکم وجود پر انحصار کرتے ہوئے خود کو مجھ پر پھینک دیا اور حماقت اناڑی پن کا ثبوت دیا۔ میں اچھل کر ایک طرف ہو گیا اور وہ اپنے ہی زور میں منہ کے بل گرا۔ اگر وہ مجھ سے ٹکرا جاتا تو یقیناً دیوار سے تصادم میں میرا جسم پتے کی طرح چپٹا ہو جاتا۔ خود اسے امید ہوگی کہ میں ہوائی حملے کے لیے تیار نہ ہوں گا کیونکہ وہ کسی دبا کے چھوڑ دیے جانے والے اسپرنگ کی طرح میری طرف آیا تھا۔ دوسری بار منہ کے بل گرنے سے اس کی ہڈی پسلی ایک ہو جانا چاہیے تھی مگر وہ اتنی ہی مستعدی سے پھر اٹھ کھڑا ہوا اور اٹھتے اٹھتے اس نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔

ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے گھٹنے کے اوپر کی گول اور نرم ہڈی ہی ٹوٹ گئی ہے۔ درد کی لہر سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں جگنو سے جھلملانے لگے اور میرے وجود کی عمارت کو سہارا دینے والا ایک ستون جلنے لگا۔ میں نے دوسری لات گھما کے اس کے پیٹ پر ماری۔ وہ ضرب کی شدت سے بے اختیار دوہرا ہوا اور میں نے اسی پیر کو اٹھا کے گھٹنا مارا جو اس کی ٹھوڑی کے نیچے لگا۔ وہ پیچھے الٹ گیا۔ اسی وقت میں نے ٹیڈی کو دوڑ کر آتے دیکھا۔ وہ یوں چھرا لہراتا ہوا آ رہا تھا جیسے اس کے ہاتھ میں شمشیر بے نیام ہے اور وہ کسی لشکر کی کمان کر رہا ہے جو غنیم کو تہ تیغ کرنے کے لیے جوش سے نعرے لگاتا گھوڑے دوڑاتا میدان کارزار کی جانب بڑھ رہا ہو۔

"قسم مولا کی۔ آج کوئی سالا بچ کر نہیں جا سکتا۔" اس نے قریب آ کے بانگ دہل کہا لیکن دشمن کے اس مورچے یا کمین گاہ کو بھول گیا جس کے سامنے ابھی تک میری طرف ایک حریف سے دست بدست جنگ چل رہی تھی۔ کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کے کسی نے اس کے سر پر پشت سے کوئی چیز ماری۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پیتل کی ایک منقش تھالی تھی جو دیوار پر ڈیکوریشن پیس کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ استاد ٹیڈی کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور تھالی کی جھنجھناہٹ کی گونج کے ساتھ ہی وہ جھٹکے سے پیچھے گرا اور بالکل ساکت ہو گیا۔ مجھے بے ساختہ میاں خوجی اور ان کی وہ شہرہ آفاق قرولی یاد آ گئی جو وقت ضرورت اسی طرح ان کے بلند بانگ دعوؤں کو باطل کر دیتی تھی۔ استاد ٹیڈی کا خنجر بھی کام نہ آیا تھا اور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے دور جا پڑا تھا۔ میں فوراً اس کی طرف جھپٹا۔

اسی وقت کھڑکی سے آنے والی سرچ لائٹ جیسی تیز اندھا کر دینے والی روشنی میرے منہ پر پڑی۔

"بس!" کسی نے بھاری بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے ہاتھ میں ریوالور ہے۔ ہاتھ اوپر اٹھا کے کھڑے ہو جاؤ۔ بالکل سیدھے۔"

میں نے تعمیل کی اور خنجر کا خیال چھوڑ کے اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ وہ شخص جو میرے مقابلے پر اترا تھا، بلکہ جسے خود میں نے مقابلے پر گھسیٹ لیا تھا، اب احمقوں کی طرح آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور اپنا سر سہلا رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ میرے لیے اجنبی تھا اور کسی سانڈ کی طرح مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنے مقابلے کے بعد چت ہو جاتا لیکن وہ سخت جان بھی تھا اور کچھ لڑنے بھڑنے کا ماہر بھی۔

کھڑکی میں سے دوسرا شخص آہستہ آہستہ باہر آیا۔ اس نے ٹارچ ایک ہاتھ کی گرفت میں رکھی اور ریوالور کو دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے ایک ٹانگ نیچے لٹکائی: "کون ہو تم ٹارزن کی اولاد؟" وہ بولا۔

پھر ایک غیر متوقع اور کسی حد تک مضحکہ خیز بات ہوئی۔ استاد ٹیڈی تڑپ کر اٹھا اور اس نے اندر سے اترنے والے کی ٹانگ پکڑ کے پوری قوت سے گھسیٹ لیا۔ وہ بڑے عجیب طریقے سے باہر گرا۔ خود بخود اس کے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ گئی اور چند فٹ دور جا گری۔ اس کی روشنی دیوار پر ایک دائرے کی شکل میں پڑنے لگی۔

"قسم مولا کی... میں نے کہا تھا نا کہ کوئی..." استاد ٹیڈی کی آواز آئی۔

ابھی مجھے استاد ٹیڈی کی حاضر دماغی، پھرتی اور اداکاری پر حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ حریف اول نے ایک دم پیچھے سے آ کے اس کے سر پر وہی ٹارچ دے ماری جو اس کے قریب گری تھی۔ استاد ٹیڈی نے جملہ نامکمل چھوڑ کے حلق سے پھر وہی "اوق" کی آواز نکالی اور اس بار پکا غفیل ہو گیا۔ حریف ثانی جس کو اس نے کھڑکی سے برآمد کیا تھا، مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں اس سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے ریوالور کا دستہ میرے سر پر مارنا چاہا تو میں نے اس کے ہاتھ کو کلائی پر جھٹکا دیا۔ ریوالور تو اس کے ہاتھ سے نکل گیا مگر اس نے بڑی پھرتی سے میرے کان کے قریب ہاتھ کی ہتھیلی سے وار کیا۔ جس طرح اسے امید نہ تھی کہ میں جوڈو کراٹے کے فن سے واقف ہوں، اسی طرح میں بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ لڑائی مار کٹائی کے مروجہ دیسی طریقوں سے کام لے گا لیکن وہ بھی اس معاملے میں مجھ سے کم نہ تھا۔ اچانک وہ پورا منظر میری نظروں کے سامنے گردش کرنے لگا، دھندلا ہوا اور پھر غائب ہو گیا۔ میرا خیال ہے نیچے گرنے سے پہلے ہی میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

ہوش آنے کے بعد میں نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی تو ماحول کچھ جانا پہچانا محسوس ہوا اور رفتہ رفتہ دھند چھٹنے لگی اور میں نے انکل رضوی کے بیڈ روم کو پہچان لیا۔ میں اپنے ہی گھر میں رضوی صاحب کے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ گردن گھما کے دیکھنے پر مجھے اپنے ساتھ ہی استاد ٹیڈی لیٹا ہوا نظر آیا۔ میرے ہاتھ پیر آزاد تھے۔ یہ جان کے مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ پھر میں نے ان دونوں کو دیکھا جو ہاتھ میں ریوالور لیے اطمینان سے کرسی پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔

"تم... تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کون ہو تم لوگ؟"

"یہی سوال ہمیں تم سے کرنا ہے۔" حریف اول نے کسی قسم کی پریشانی کے بغیر کہا۔ "اور جواب تم پہلے دو گے۔"

"میں سکندر بخت ہوں۔" میں نے حیرانی سے کہا۔ "اسی گھر میں رہتا ہوں۔ کیا تمھیں معلوم نہیں؟"

"نہیں، ہمیں معلوم نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "اور یہ کارٹون؟" اس نے استاد ٹیڈی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ میرا دوست ہے۔ مجھ سے ملنے آیا تھا۔" میں نے لاپروا لہجے میں کہا۔

"تو یہ چوکیدار بننے کی ایکٹنگ کیوں کر رہا تھا؟" وہ بولا۔ "کیا تمھارے دوست اسی طرح آتے ہیں ملاقات کرنے اور ایسے ہی جوکر ہیں سب؟" اس کے انداز میں بڑا اہانت آمیز تمسخر تھا۔

"تم سب پوچھنے والے تم کون ہوتے ہو؟" میں نے متانت سے کہا۔ "اور تم یہاں کیا کر رہے تھے؟ کیا تمھیں معلوم ہے کہ یہ گھر کس کا ہے؟" ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مسکرائے اور ریوالور جیب میں رکھ لیے۔

"ہاں، اور ہمیں انھوں نے ہی بھیجا تھا۔" دوسرے نے پہلی بار لب کھولے۔ "جناب رضوی صاحب نے۔"

میں نے احمقوں کی طرح ان دونوں کو دیکھا۔ "رضوی صاحب نے؟ وہ کیوں؟"

اس نے جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکالا اور میری طرف پھینک دیا۔ میں نے تصویر کو اس کی صورت سے ملایا اور کارڈ پر غور کرنے کے بعد انکشاف ہوا کہ وہ خفیہ پولیس کا ایک انسپکٹر ہے۔

"اگر میں مان لوں کہ شناختی کارڈ جعلی نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انکل رضوی نے تم کو یہاں چوروں کی طرح چھپ کر بیٹھنے کے لیے کیوں بھیجا تھا اور کیا انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ سکندر بخت کی مرمت کرنی ہے؟"

"وہ آپ نے خود ہمیں دعوت دی تھی۔" وہ بولا۔ "اور ہم آپ کو پہچانتے نہیں تھے۔ رضوی صاحب آج دن بھر آپ کو فون کرتے رہے مگر آپ نہیں ملے۔ رات گیارہ بجے انھوں نے ہم سے رابطہ قائم کیا۔ وہ آپ کی طرف سے متفکر تھے۔ انھوں نے کہا کہ خاموشی سے جاؤ اور دیکھو سکندر بخت گھر میں ہے یا نہیں۔ یہاں آنے کے بعد ہم نے آپ کو سارے گھر میں تلاش کر کے دیکھ لیا اور رضوی صاحب کو فون پر بتا دیا کہ گھر پر تو سب خیریت ہے۔ دراصل انھوں نے کہا تھا کہ گھر میں کوئی غیر معمولی بات محسوس ہو تو..."

"ان کا مطلب ہو گا کہ میری لاش پڑی ملے یا توڑ پھوڑ، مار پیٹ یا خون خرابے کے آثار ملیں۔" میں نے کہا۔

"جی۔ ان کا مطلب ہم نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔" وہ بولا۔ "ہم جانے ہی والے تھے کہ ہمیں ایک شخص باہر پچھواڑے احاطے میں داخل ہو کے چھپتا نظر آیا۔ پھر ہمیں رکنا پڑا۔ ہم نے سوچا ممکن ہے اس کے دوسرے ساتھی بھی آئیں۔ اس کی نقل و حرکت پر تو ہمیں نگاہ رکھنی ہی تھی۔ ہم اندر کمرے میں اندھیرے میں بیٹھے تھے اور شیشے میں سے جھانک رہے تھے۔ باہر نسبتاً زیادہ روشنی تھی۔ وہ شخص جھاڑیوں کے پیچھے چھپا رہا۔ پھر اس کا ایک ساتھی دروازے تک آ کے لوٹ گیا۔ دوبارہ ہم نے اسے دیوار کے کونے سے اندر کودتے دیکھا۔ وہ شخص جھاڑیوں کے پیچھے سرکتا ہوا اس کے پاس گیا اور کچھ دیر وہ دونوں نہ جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔"

"وہ شخص،" میں نے اسی متانت سے استاد ٹیڈی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ ہے۔ اور دیوار پھاند کے کودنے والا میں خود تھا۔"

استاد ٹیڈی کی مونچھیں تھرتھرانے لگی تھیں اور حلق سے کچھ کراہنے کی آواز بھی بلند ہو رہی تھی۔

"یہ سب غلط فہمی کے باعث ہوا۔" میں نے کہا۔ "ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ اندر کوئی ہے۔ ہم باہر چھپ کر انتظار کرتے رہے۔ پھر میں نے ہی استاد ٹیڈی... میرا مطلب ہے اپنے اس دوست کو چوکیدار بنا کے بھیجا تھا۔"

"رضوی صاحب نے کہا تھا کہ آپ ڈرامے کرتے رہتے ہیں۔" دوسرا بولا۔ "مگر یہ تو کوئی ڈراما نہیں تھا کہ آپ نے اٹھا کے مجھے باہر پھینک دیا۔ خواہ مخواہ میں یا آپ لنگڑے لولے ہو جاتے پھر، یا ایس آئی صاحب گولی مار دیتے تو۔" ایس آئی نے اپنے ماتحت کو گھورا۔ "میرا خیال تھا کہ تم مقابلہ کر سکتے تھے۔ آخر جان صرف حرام کھانے کے لیے بنائی ہے؟"

"اچھا اب آپ لوگ بیٹھیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "خوشی کی بات یہ ہے کہ کسی کا نقصان نہیں ہوا۔ میں چائے بنا کے لاتا ہوں۔ میرا یار ہوش میں آنے لگا ہے۔ اسے بھی سمجھا دینا کہ سب خیریت ہے۔" لیکن وہ دونوں میرے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ چائے پئیں، ہم چلتے ہیں۔" پہلے نے جماہی لے کر کہا۔ "خواہ مخواہ رات بھر کی بیگار میں پڑ گئے تھے۔ اب گھر جا کے سوتے ہیں۔ آپ رضوی صاحب سے بات کر لیں۔"

"لیکن... یہ سب نہ کہیں... تو بڑی مہربانی۔" حوالدار نے سر پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ "جو کچھ ہوا غلط فہمی کے باعث ہوا۔"

میں ہنسا۔ "فکر مت کرو۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ان سے تو ہم بڑی بڑی باتیں سیکھتے ہیں۔"

جب میں چائے بنا کے لوٹا تو استاد ٹیڈی کے ہوش و حواس میں سے ہوش بحال ہو چکے تھے۔ میں نے اسے چائے پلانے کے بعد ساری رام کہانی سنائی تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی، خصوصاً اس منظر کا ذکر کرتے وقت جب ٹیڈی سر پر ٹارچ بجتے ہی ایک گراؤنڈ میوزک کے ساتھ لیٹ گیا تھا۔ "اداکاری خوب کی تھی تم نے استاد۔" میں نے کہا۔

"کیا خنجر دیا تھا کمبختوں کو۔" وہ نخوت سے بولا۔ "اچھا ہوا دشمن نہیں تھے ورنہ کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔"

میں اس کی حوصلہ شکنی نہیں چاہتا تھا لیکن چائے پیتے پیتے مجھے وہ منظر یاد آیا جب وہ خنجر کو تیغ آبدار کی طرح لہراتا آ رہا تھا۔ تو مجھے پھر ہنسی آ گئی۔ "غلط فہمی نے بھی کیا تماشا دکھا دیا۔" میں نے اسے مزید نخوت سے بچانے کے لیے کہا۔ میں نے اسے اس رات کے دوران میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا تھا اور ابھی تک اسی تذبذب کا شکار تھا کہ جو بات ابھی تک میرے اور شیخ کے سوا کسی کو معلوم نہیں، کیا اسے ٹیڈی کو بتانے سے مجھے کوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔ مجھے اسلام آباد جا کے یہ سب کچھ رابعہ کو اور محسن کو تو بتانا ہی تھا۔ استاد ٹیڈی کام کا آدمی تھا۔ اس نے ایک ہنگامی صورت حال میں میری مدد کی تھی اور ایسے گواہ فراہم کر دیے تھے جو ثابت کر سکتے تھے کہ عبدل اور شیبے کے قتل کی واردات کے وقت میں ان کے ساتھ تھا۔ یہ ضرورت مجھے پھر پیش آ سکتی تھی۔ گزشتہ رات کا بندوبست تو عبدالودود منتظر نے کر دیا تھا، اس کا بھی احسان بہت تھا۔ آج کی رات میں کہاں رہا اور کیا کرتا رہا؟ اس کے گواہ بھی ہونے چاہئیں۔ ظاہر ہے سچ بولنے کی گنجائش نہ میرے لیے رہی تھی نہ شیخ کے لیے۔ جھوٹ کا مقابلہ جھوٹ سے ہی کیا جا سکتا تھا۔ کون جانے کل میرے لیے یہ ثبوت فراہم کرنا مسئلہ بن جاتا کہ میں رات بھر کہاں تھا اور کس وقت کیا کر رہا تھا۔ خود انکل رضوی مجھ سے پوچھ سکتے تھے کہ برخوردار! گھر سے کہاں غائب تھے؟

"کیا سوچ رہے ہو استاد سکندر اعظم؟" ٹیڈی نے کہا۔

"میں؟... ہاں... میں سوچ رہا تھا کہ انکل نے بار بار مجھے فون کیوں کیا تھا۔" میں نے اصل بات چھپاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اسلام آباد فون کر کے معلوم کر لینا چاہیے۔ خدا کرے وہاں خیریت ہو۔"

"میرا بھی سلام دینا شملہ باجی کو۔" وہ بولا۔ "اور محسن بھائی کو۔"

میں ٹیلی فون کرنے کی غرض سے ہی دوسرے کمرے میں گیا تھا لیکن ریسیور اٹھانے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ لائن تو ڈیڈ ہے۔ میں نے پورے محکمے پر لعنت بھیجی اور ٹیلی فون کے پروگرام کو صبح پر ملتوی کر کے لوٹ آیا۔ یہ ناممکن تھا کہ اس وقت جب میٹھی نیند سونے والے کسی خواب کے کلائمکس کا غلطی انجام دیکھ رہے ہوں گے، میں انھیں جگا کے کہوں کہ جناب مجھے ٹیلی فون کی خرابی کی شکایت درج کرانے کے لیے آپ کے گھر سے فون کرنا ہے۔ وہ زبان سے تو کچھ نہ کہتے لیکن دل ہی دل میں گالیاں دیتے کہ میاں پانچ دس منٹ بعد آ جاتے تو کیا تھا۔

میں منہ لٹکائے واپس آیا تو ٹیڈی نے پوچھا "خیریت تو ہے اپنے سکندر صاحب؟"

"ہاں۔ بس فون مرا پڑا ہے" میں نے کہا "اب صبح ہونے والی ہے بلکہ ہو گئی ہے۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ یہ جو کچھ ابھی ہوا اس کی تو کوئی اہمیت نہیں۔ اس سے پہلے بہت کچھ ہو چکا تھا بڑی گڑبڑ والی بات ہے"

"پھر... کوئی... کسی قاتل کو مقتول بنا دیا ہے کیا؟" ٹیڈی نے سوچتے ہوئے کہا "یار! تم نے بھی خواہ مخواہ اپنی جان کو روگ لگا رکھے ہیں۔ میری مانو تو اپنی اس وکیل صاحبہ کو لو اور لوٹ جاؤ ولایت"

"یہ آرزو ہی بڑی چیز ہے مگر ہمدم" میں نے آہ بھر کے کسی فلسفی کی طرح کہا "خواہشات کوئی تانگوں میں جتے ہوئے گھوڑے نہیں کہ لگام ہاتھ میں ہو تو اپنی مرضی سے جس تعبیر کی راہ پر چاہو موڑ لو اور ہم کو ولایت نہیں مل جاتے تو اچھا ہے۔ وہاں سے تو ہم آئے نہیں نکالے گئے تھے۔ میں جو بات کہنا چاہتا ہوں اسے دھیان سے سنو! ہو سکتا ہے مجھے پھر تمہاری مدد کی ضرورت پڑ جائے"

جتنی دیر تک میں نے اسے تھانے میں پیش آنے والے واقعات کے انجام سے آگاہ کیا وہ یوں ہکا بکا بیٹھا رہا جیسے کسی زمانے میں داستانِ امیر حمزہ یا طلسم ہوشربا جیسی کہانیاں قسط وار سننے والے عمرو عیار کے کارناموں پر دم بخود بیٹھے رہتے ہوں گے۔ حقیقت سے ٹیڈی کو روشناس کرا دینے کا فیصلہ کر لینے کے بعد میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا۔

"قسم مولا کی" وہ میری بات ختم ہونے کے بعد بولا "ایسے خوفناک سنسنی خیز واقعات تو اپن نے کسی انگریزی فلم میں بھی نہیں دیکھے۔ کون تھا وہ جو پیڈرو کے میک اپ میں تھا!!"

"جیسا کہ اس نے خود بتایا 'زردادو'" میں نے کہا "لیکن اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا نام کیا تھا اور وہ کیا کرتا تھا۔ مرتنگ چلی بیچتا تھا یا قلفی۔ وہ تو اب ایک لاوارث لاش ہے جس پر صرف ایک حوالہ نمبر پڑا ہوا ہے۔ تم اگر رکھ ہو تو ایک کام کرو۔ بلکہ دو کام کرو"

"آپ دس کام کہیں اپنے سکندر صاحب! قسم مولا کی آپ نے ٹیڈی کو یار کہہ دیا تو اب ہم یاری کا حق ادا کر کے نہ دکھائیں تو لعنت ہم پر" وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے بولا۔

"پہلا کام تو یہ ہے کہ تم استاد پیڈرو کا پتا لگاؤ۔ وہ کہاں ملتا ہے اور واردات کی شب کہاں تھا؟ یقینی بات یہ ہے کہ جب کسی اور کو پیڈرو بنا کے بھیجا گیا تھا تو یہ انتظام بھی کیا ہو گا کہ اصل پیڈرو رات بھر کسی اور جگہ موجود رہے جہاں درجن بھر افراد اس کی ہمہ وقت موجودگی کے گواہ ہوں۔ دوسرا کام تم پہلے بھی کر چکے ہو۔ دو چار ایسے قابلِ اعتبار گواہ پیدا کر لو جو کہہ سکیں کہ رات بھر میں ان کے ساتھ تھا"

"لو جی۔ کیا سو ٹکے کی بات کی ہے آپ نے!" وہ ہاتھ ہلا کے بولا "آج اپنے یار جیجو پہلوان تانگے والے کے گھر میں کچھ رونق میلہ تھا اس کی بیٹی کی شادی ہے کل۔ اس نے کچھ فنکشن وغیرہ کا انتظام کیا تھا اور سب یار دوستوں کو بلایا تھا بس تم بھی وہیں تھے۔ رات بھر کا پروگرام تھا۔ صبح تک تم شریک رہے۔ خود جیجو بتا دے گا"

"واہ واہ استاد! تم واقعی یاروں کے یار ہو اور استادوں کے استاد" میں نے کہا۔

ٹیڈی کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ وہ ایک چھوٹا سا بدمعاش تھا لیکن اس کا دل بہت بڑا تھا۔ وہ ہر وقت ہر شخص کی مدد کے لیے تیار رہتا تھا اور ہر کسی کے دکھ میں شریک ہو جانا اس کا شعار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا حلقۂ احباب وسیع تھا اور وہ سب جن کے لیے اس نے کبھی کچھ کیا تھا ضرورت پڑنے پر ٹیڈی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ اس کو احساس تھا تو یہ کہ معاشرے میں اس کی عزت نہیں اور شرفا اس سے یوں پرہیز کرتے ہیں جیسے کسی کوڑھی سے لیکن ہم نے اسے وہ مقام دیا جس کا وہ آرزومند تھا۔ اب وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ' دولت مند اور معزز افراد کا دوست ہی نہیں جذبات کے رشتوں سے ہمارے مختصر سے خاندان کا ایک فرد بن چکا تھا اور بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ وہ سکندر بخت کا دوست ہے جو ایک فیکٹری کا مالک ہے اور چار سال ولایت میں رہ چکا ہے اور محسن کا دوست ہے جو اسلام آباد کے ایک ڈپٹی سیکرٹری کا لڑکا ہے۔ رابعہ قادری جیسی ایڈووکیٹ کے گھر میں اس کا آنا جانا اسی طرح ہے جیسے

بچپن کا جنونوں کے گھروں میں اور وہ قاضی قمری صاحب کی کوٹھی میں بھی جاتا رہتا ہے۔ یہ سب ایسی باتیں تھیں کہ ٹیڈی کے حلقۂ احباب میں بیشتر لوگ اسے زبردست گپ قرار دیتے ہوں گے تو یقین کرنے پر سخت مرعوب ہوتے ہوں گے کیونکہ خود ان کے خاندان اور حلقۂ شناسائی میں بھی اونچی ٹائپ کے لوگ تھے۔ وہ سب پستی کے مکین کہلاتے تھے اور جن کا ذکر ٹیڈی کرتا ہو گا وہ اونچے لوگ تھے جن کا دماغ عرش معلیٰ پر رہتا ہے۔ اعلیٰ سوسائٹی کا ٹیکا بہرحال ٹیڈی کے مستقبل کی راہیں بدل سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی موجودہ صحبت سے دور ہوتا جائے اور جتنا ہم سے قریب ہوا اس کی زندگی کے نظریات میں رونما ہونے والے انقلاب کی بنیاد یہی استوار ہو جائیں ہے ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد یہ بات اگر پہلے درست تھی تو اب یہ ہو سکتا تھا کہ "جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد" والی بات صحیح ہو جائے۔

میں نے سات بجے کے قریب غسل کیا اور جب ٹیڈی کی ایک کوٹھی کے خوبصورت باتھ روم میں نہانے کا لطف اٹھاتے ہوئے زور زور سے گا رہا تھا "میں تو چھوٹی موٹی ہے" تو میں ناشتہ تیار کر رہا تھا اور استاد ٹیڈی کی شجاعت کے کارنامے یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب میں نے دروازوں کو مقفل کیا اور ہم دونوں ایک ساتھ نکل کے مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ میں نے گزشتہ دن ہی عہد کیا تھا کہ پھر کبھی آیا تو رابعہ کے ساتھ آؤں گا لیکن ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ میں پھر شیخ کے گھر میں تھا۔ مجھے امید تھی کہ شیخ آ چکا ہو گا لیکن اسے کچھ دیر ہو گئی تھی میرا استقبال اس آفت کی پرکالہ نازلی نے کیا۔

"ارے آپ؟" وہ مجھے دیکھ کر دنگ رہ گئی "آپ تو اسلام آباد گئے تھے؟ پھر یہ کیا؟ آپ کی تصویر مجھے ٹی وی پر نظر آ رہی ہے یا تصور میں۔ یا آپ کی روح کو میری آنکھیں مجسم دیکھ رہی ہیں سکندر جی!"

"ارے بابا! ذرا سلام تو کر لو" میں نے زچ ہو کے کہا۔ "اب آپ مجھے اندر جانے دیں"

"اوہ۔ سوری۔ السلام علیکم!" وہ پیچھے ہٹ کے بولی۔ "صبح صبح کوا بول رہا تھا منڈیر پہ۔ میں نے بہت غور کیا کہ کون آنے والا ہے۔ ہے نا کمال کہ آپ آ گئے۔ ویسے آپ کو ہزار روپے کی ضرورت تھی تو اتنا لمبا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ جھوٹ بولنا بری بات ہے۔ اب مجھے ہی دیکھیے میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی"

"مگر بولتی بہت ہو۔ محاورے کے مطابق آپ کو کوے نوش فرمانے سے تو رغبت نہیں ہے؟" میں نے کہا "اور آج ناشتے میں آپ نے اس بدبخت کوے کو تو نہیں کھا لیا جس نے آپ کے گھر کی منڈیر پر آ کے بولنے کی حماقت کی تھی؟"

وہ ہنسی "وہ دراصل کوا نہیں تھا الو تھا۔ آ گیا صبح صبح۔ اب آنے والے کو کوئی کیسے روکے؟"

"خدا کے واسطے اندر جا کے شیخ سے کہو کہ شامت کا مارا سکندر آیا ہے" میں نے کہا۔

"شیخ صاحب کے تشریف لاتے ہی یہ بات میں ان سے کہہ دوں گی" وہ بولی "فی الحال آپ تشریف رکھیں"

"اچھا اپنے ڈیڈی سے یا امی سے کہہ دو" میں نے کہا۔

"ان سے تو ابھی ملاقات ہو جائے گی سکندر جی!" وہ چٹکی بجا کے بولی "میں ناشتا لگانے ہی والی تھی میز پر"

"میں ناشتا کر کے آیا ہوں" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "مجھے معاف کر دو۔ میرا پیٹ بھرا ہوا ہے"

"معاف کرنا کیسا جی۔ میں جا کے بتا دیتی ہوں امی کو کہ سکندر صاحب آئے ہیں بغیر ناشتا کیے" وہ ہنسی "بھئی صبح صبح کوئی بھوکا آ جائے دروازے پر تو اسے پیٹ بھر کھلانے کا بڑا ثواب ہے۔ ظاہر ہے تم اتنے بدخواہ بھی نہیں ہو ہمارے کہ ہمیں ثواب سے محروم رکھو اور اتنے بد اخلاق بھی نہیں کہ امی ڈیڈی کے ڈانٹنے پر بھی کچھ نہ کھاؤ۔ زیادہ سے زیادہ بدہضمی ہی ہو گی نا۔ باہر جا کے چورن کھا لینا" وہ باہر جاتے جاتے پھر ہنسی۔ یا میرے خدا! اس کی شادی کسی بہرے سے ہو جائے تو اچھا ہے۔ ورنہ وہ پاگل ہو جائے گا۔

ناشتے کی میز پر اس کا جبر جاری رہا۔ اس نے دو بار بے خبری میں حملہ کیا اور میری پلیٹ کو ایک بار دلیے سے اور دوسری بار حلوے سے بھر دیا پھر اس نے یہی زبردستی چائے کے معاملے میں کی۔ چنانچہ میں ناشتے کے بعد اٹھا تو میرے لیے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ مجھے بدہضمی کیا ہیضہ ہو جانے کا یقین آنے لگا تھا۔ نازلی کے والدین کو پتا نہیں تھا کہ صرف آدھے گھنٹے کے وقفے سے میں نے یہ دوسرا اور ڈبل ناشتا کیا تھا۔ وہ بڑے شفقت آمیز اصرار کے ساتھ مجھے اور کھلانے پر مجبور کرتے رہے اور نازلی کی شرارت کو آدابِ میزبانی سمجھ کے نظر انداز کرتے رہے۔ صرف نازلی تھی جو مجھ پہ یہ ظلم کر کے بہت خوش تھی۔

شیخ ساڑھے آٹھ بجے آیا اور اس نے اخلاقاً معذرت کی۔ "ہم پولیس والوں کی تو نوکری ہی ایسی ہے یار! نہ آنے کا وقت نہ جانے کا"

www.paksociety.com

"کوئی بات نہیں بھائی جان! انھوں نے ناشتا کر لیا ہے۔ گھر سے ایسے ہی آ گئے تھے۔" نازلی نے کہا۔

"گڈ!" شیخ نے چٹکی بجا کے کہا۔ "بس اب مجھے آدھا گھنٹا اور دے دو۔ میں آیا نہا کے اور ناشتا کر کے۔"

نازلی کی ماں اندر جا چکی تھی اور اس کے ابا اخبار لے کر باہر جا بیٹھے تھے چنانچہ آدھے گھنٹے کے لیے میں پھر نازلی کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ "مس نازلی!" میں نے متانت سے کہا۔ "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ بھی تشریف لے جائیں اور اندر جا کے کوئی نیک کام کریں۔ مثلاً کتابوں میں دل لگائیں۔"

"استاد جی!" وہ آہ سرد بھر کے بولی۔ "اس وقت میرا پڑھنے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔ آپ ایسا کریں کہ میرا ٹیسٹ لے لیں۔"

"ٹیسٹ لے لوں؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "کس چیز کا؟"

"یہی کہ مجھے جوڈو اور کراٹے کتنا آتا ہے۔ آجائیے سامنے۔" وہ اٹھی اور دوپٹے کو سر پر سے اتار کے کمر کے گرد لپیٹ لیا اور آستین کو اوپر چڑھا کے اس نے مجھے چیلنج کیا لیکن میں چیلنج قبول کرنے کے بجائے یہ سوچ رہا تھا کہ بے تکلفی اور معصومیت کے اس مظاہرے کو ظاہر کی آنکھ سے دیکھنے والا کیا عرف نوجوانی کا الھڑپن سمجھے گا؟ پہلے تو میں نے سوچا کہ اس لڑکی کو آزمانے کے بہانے ایسا سبق دوں کہ وہ ساری شوخی بھول جائے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ ایک کم عمر اور کم عقل لڑکی ہی تو ہے، میرا اس کا کیا مقابلہ؟ چنانچہ میں اسی اطمینان کے ساتھ بیٹھا رہا۔ تیار ہونے کے بجائے میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

"تم واقعی اسکول کی بچی ہو۔" میں نے سگریٹ جلا کے ایک کش لیتے ہوئے کہا۔ "غلطی سے کالج میں پہنچ گئی ہو۔"

"کیا مطلب؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کے بولی۔ "عقل نہیں ہے مجھ میں یا... چھوٹی ہوں میں؟"

"ماشاءاللہ! بہت جلد سمجھ لیا بات کو۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی پتہ ہے کہ تمھارا عقل نام کی کسی چیز سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹا بڑا ہوتا ہے آدمی ذہنی طور پر۔ اب تم دیکھنے میں تو واقعی بڑی لگتی ہو۔ مگر ہو نہیں۔"

میرا حربہ کارگر رہا۔ نازلی کا موڈ آف ہو گیا اور منہ سوج گیا۔ اس نے دوپٹے کو کمر سے کھول کر شانے پر ڈالا اور آستین نیچی کر کے سخت برہمی کے عالم میں دروازے کی طرف بڑھی۔ عین دروازے میں اس کا تصادم شیخ سے ہوا۔

"الٰہی خیر! یہ تو مرغی دُم دبا کے کہاں فرار ہو رہی ہے؟" شیخ نے کہا اور پھر غور سے اس کی روہانسی صورت کو دیکھا۔ "بے تجھے؟ پھر تو نے کاٹا ہے کیا؟ منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں یار!" میں نے کہا۔ "مجھ سے فرمائش ہو رہی تھی جوڈو کراٹے سکھا دیں۔" میں نے کہا۔ "عقل کے ناخن لو۔ شریف لڑکیاں ہانڈی چولھا کرتی ہیں۔ جھاڑو برتن کرتی ہیں، مار دھاڑ نہیں کرتی پھرتیں اور ابھی تو گڑیاں کھیلنے کی عمر ہے تمھاری۔ بس اسی کا غصہ ہے کہ میں نے سچ کیوں کہا۔"

نازلی میری بات سن کے ذرا سی دیر کو ٹھٹکی تھی مگر بات سننے کے بعد اس کا پارہ اور چڑھ گیا اور وہ پٹختی ہوئی نکل گئی۔

شیخ نے ایک زبردست قہقہہ مارا اور میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ تاکہ آواز نازلی تک پہنچ جائے اور وہ سمجھے کہ ہم اس پر ہنس رہے ہیں۔ ممکن ہے وہ جذباتی لڑکی اپنے کمرے میں بیٹھ کر اب رو رہی تھی — میں نے سوچا کہ جذباتی حماقت کی انتہا کا شکار ہونے والی لڑکی تو خودکشی بھی کر سکتی ہے۔ اگر اس نے بھی اسی قسم کا کوئی قدم اٹھا لیا تو اس جرم کا داغ جیسے ضمیر پر رہ جائے گا۔ میں کسی کو بتا بھی نہ سکوں گا کہ ایسا کیوں ہوا؟

"بیٹھے ہیں پھر تصورِ جاناں کیے ہوئے۔" شیخ نے طنزاً کہا۔ "مگر جناب ابھی فرصت کے وہ رات دن کہاں پاؤ گے کہ اب وہ لذتِ خواب سحر گئی۔"

میں چونک کر ہنسا۔ "پولیس اور غالب۔ کیا ستم ہے! کیا زمانہ آ گیا ہے۔"

باہر نکل کے میں نے اسے گزشتہ رات پیش آنے والے واقعات سنائے جو کسی لطیفے سے کم نہ تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ ایک اسکوٹر کی آواز پھر ٹریفک کا شور۔ مجھے اس کے کان میں چلا کے بات کرنا پڑ رہی تھی لیکن میری نظر ادھر ادھر بھی تھی کہ خدانخواستہ کوئی ہمارے تعاقب میں تو نہیں ہے۔

"یہ خوب ہوا۔" شیخ نے کہا۔ "مارا بھی اور مار بھی کھائی دھیرو کوئی نہیں۔ کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا دو روپے۔"

"اب یہ تو مشکل تھا کہ ہم آمنے سامنے ہو کے تعظیم بجا لاتے اور اپنا اپنا تعارف کراتے کہ فدوی کو سکندر بخت کہتے ہیں اور وہ کورنش بجا لاتے کہ ناچیز کارکنانِ خفیہ پولیس بعد آداب اور شب بخیر! مقصود صرف حضور کی خیریت دریافت کرنا تھا۔"

"لیکن یار! رضوی صاحب نے بار بار فون کیا تھا تو ان سے بھی پوچھ لینا تھا کہ بات کیا ہے۔ خدانخواستہ..."

"میں نے پہلا کام یہی کیا تھا مگر اپنے گھر کا ٹیلی فون فوت ہو چکا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب ذرا اپنے کام سے فارغ ہو لیں تو پی سی او سے بات کریں گے۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی یار! آخر نائلہ نے مجھے فون کیوں نہیں کیا۔ ایک بار تو کر لیتی۔"

"حالانکہ جناب نے اس کی یاد میں ہجر و فراق کے یہ دن تڑپ تڑپ کر گزارنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔" شیخ ہنسا۔ "صبح کرنا شام کا لانا تھا جوئے شیر کا۔ رات اختر شماری کرتے گزرتی تھی اور دن اسے ٹیلی فون کرتے۔"

"میں اسے کس طرح فون کر سکتا تھا یار! وہاں تو لوگ ہیں اور پھر وہاں کے حالات۔" میں نے خفت سے کہا۔

"تو اس کے لیے یہ پرابلم نہیں تھی کیا؟" شیخ نے کہا۔ "سب کچھ نظر انداز کر کے تمھیں حالِ دلِ زار بتاتی رہتی۔"

"اسے تو معلوم تھا نا یار کہ یہاں میں اکیلا ہوں۔" میں نے کہا۔ "فرض کرو وہاں انکل رضوی یا شیروانی صاحب میں سے کوئی ریسیور اٹھا لیتا تو میں بیمار پرسی کے بجائے کہتا کہ ذرا میری منسوبہ کو بلا دیجیے۔"

"یار! وہ بڑی پریکٹیکل لڑکی ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اس کے علاوہ وہ سمجھ رہی ہو گی کہ تم پہنچنے والے ہو۔ آج نہیں کل عدالتی اجازت ملتے ہی آ جاؤ گے۔ عدالت کی اجازت ملے چوبیس گھنٹے ہونے کو ہیں اور جناب کہاں جا رہے ہیں آپ! اعتراف کیجیے۔"

"میں تو مارا گیا شیخ صاحب! دونوں طرف سے۔" میں نے کہا۔ "ادھر محسن کو گلہ ہو گا تو دوسری طرف رابعہ کو بھی کہ میں اپنے ایڈونچرز سے باز نہیں آیا۔ حالانکہ خدا گواہ ہے، میں جانے کی نیت کر کے ہی تیرے پاس آیا تھا اور نازلی سے ایک ہزار نقد بھی اسی مقصد کے لیے مانگے تھے۔ مگر آگے جو کچھ ہوا اس میں میرا کیا قصور؟ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اگر وہ لڑکی مجھے زبردستی جانے نہ دیتی اور پھر خواہ مخواہ ایک سہیلی کے گھر چھوڑ کر آنے پر مجبور نہ کرتی تو میں بہت پہلے تھانے پہنچ جاتا۔ اس کیل کے آنے سے پہلے میں بادامی باغ کے اڈے پہنچ جاتا اور اس مصیبت سے بچ جاتا۔ لیکن بات وہی ہے کہ نصیب کا لکھا آگے آتا ہے اور خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں۔ میری موجودگی کے باعث ہی شیخ بچ گیا تھا۔"

"تو نے اس کانسٹیبل کو بریف کر دیا ہے نا کہ اسے حشمت خان سے کیا کہنا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ بہت نروس تھا لیکن میں نے کہا کہ جوان جب اوکھلی میں دیا سر تو موسلی کا کیا ڈر۔" شیخ نے کہا۔ "اب ڈٹے رہو لیکن بیان پر۔ حشمت خان کو شاید یاد ہی نہ آئے کہ اس نے کب کس کو گولی دینے کے احکامات صادر فرمائے تھے اور ان کا کیا جرم تھا۔ پیر بونز..."

"یہ ذرا مختلف بات ہے شیخ!" میں نے کہا۔ "اگر وہ کانسٹیبل کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کا نام لیتا تو حشمت خان شاید غصے میں پڑ جاتا لیکن استاد پیڈرو کا نام ایسا نہیں کہ وہ اچھل نہ پڑے۔ وہ استاد پیڈرو کی صورت ہی نہیں پہچانتا۔ اس کے معاونین میں سے ایک ہے۔ دوسرا میر محمد تھا جو اب نہیں ہے۔ تیسرا کوئی نقلی ڈی ایس پی سراج ہے۔"

"خیر اب وہ کانسٹیبل تو اپنے بیان سے ایک انچ نہیں ہٹے گا۔ ویسے بھی وہ گل محمد ہے۔ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔" شیخ نے کہا۔ "اسے اپنی جان بھی تو بچانی ہے۔ وہ اڑ جائے گا کہ اس نے حشمت خان کے کہنے پر روزنامچے میں اندراج کیا تھا۔ بعد میں وہ کیسے مرا؟ اس کے گواہ بہت ہیں۔ وہ ثابت کر دے گا کہ لاش تو اس نے خود اسپتال پہنچایا تھا اور اس کے گواہ ہوں گے ایمبولینس لے کر آنے والے۔ بعد میں لاش کہاں گئی؟ اس کی فکر حشمت خان کو بھی نہیں ہو گی۔ وہ سمجھے گا کہ لاش کو وہی لوگ لے گئے جو کبھی سامنے آ کے کام نہیں کرتے اور جو کچھ کرتے ہیں اس کا سراغ نہیں چھوڑتے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے شیخ جی کہ حشمت خان کو اصلیت کا علم ہو۔ وہ جانتا ہو کہ پکڑا جانے والا استاد پیڈرو کے ساتھ سب کوئی اور ہے۔ اگر یہ بات ہو گی تو وہ سمجھے گا کہ بلا ٹلی اور تمھارے گلے پڑ گئی۔ اب تم وضاحت کرتے پھرو کہ زندہ داد کون تھا؟ کیسے پکڑا گیا تھا اور کیسے مر گیا؟ وہ تو خوش ہو گا کہ ہم نے دونوں کا خود ایسا انتظام کر دیا کہ ایک تیر سے دو شکار ہو گئے۔ زندہ داد کو تو مرنا ہی تھا۔ اس نے اسے ہی شیخ کو بھی مروا دیا۔ میرا ساتھ دینے کی وجہ سے تم بھی اس کے دشمنوں میں شامل ہو گئے ہو۔"

"ارے یار! کرے کوئی ہم سے دشمنی۔ ایک جان ہی تو ہے جس کے جانے کا ڈر رہتا ہے۔ اس کے بعد کیا لے گا؟ یہ زندگی اور موت کا معاملہ خدا نے دنیا بناتے وقت کسی حشمت خان کے اختیار میں نہیں رکھا تھا۔" شیخ بولا۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ "یار شیخ! تو نے اخبار دیکھا؟"

"اخبار تو دیکھا مگر وہ نہیں۔" شیخ نے کہا۔ "وہ تو اس اخبار کی ایسی خبر ہو گی جو دھماکا کرے گی اور سب کو ہلا دے گی۔ ایسی کہاں ہو اسٹوری ہم بھی دیکھ لیتے ہیں۔" اس نے اسکوٹر

www.paksociety.com

کو ایک بک اسٹال کے سامنے ذرا سی دیر کے لیے روکا اور میں نے بطور خاص "صدائے وقت" طلب کیا اور اخبار فروش نے حسب توقع "نوائے وقت" نکالا۔ میں نے دوبارہ زیادہ واضح الفاظ میں "صدائے وقت" کہا۔ تو وہ خاصا حیران ہوا۔

"بابو جی! ایک بات پوچھوں؟ آج صبح سے آپ تیسرے آدمی ہیں جس نے یہ اخبار مانگا ہے۔" وہ بولا "بکتا نہیں اس لیے ہم تو رکھتے نہیں۔ مگر آگے آپ کو مل جائے گا۔ مزنگ چوک پہ۔"

ہم آگے روانہ ہو گئے۔ مزنگ چوک کی ایک دکان سے بالآخر "صدائے وقت" دستیاب ہوا۔ میں نے بڑے اشتیاق سے پہلا صفحہ کھولا۔ اس پر ملکی و غیر ملکی اور اندرون اضلاع کی سب اہم خبریں تھیں مگر وہ خبر نہیں تھی جس کی ہمیں تلاش تھی۔ میں نے وہ صفحہ دیکھا جس پر شہر کی خبریں تھیں۔ ہر اخبار کا ایک صفحہ مقامی نوعیت کی خبروں اور اعلانات وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس پر بھی ایسی کوئی سنسنی خیز ہیڈ لائن نہیں تھی۔ جس میں کسی ایسے ایڈیٹر کے گھر میں ہونے والی واردات کا ذکر ملتا۔ بقول شیخ کے اس میں کوئی "ایکس کلیوسو اسٹوری" نہیں تھی جس کے ساتھ ان بچوں کی تصویر بھی ہوتی جنھوں نے اخبار کو یہ خبر فراہم کی۔

"یہ کیا چکر ہے شیخ؟" میں نے اخبار الٹ پلٹ کر اس کے حوالے کیا۔

"میں خود سمجھنے سے قاصر ہوں۔" شیخ نے کہا۔ "یہ خبر تو تہلکہ مچا دیتی۔ پولیس کی ایسی تیسی ہو جاتی۔"

"اس کی وجہ صرف ایک ہو سکتی ہے دوست۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "کہیں سے فون کرو گے تو معلوم ہو جائے گا۔"

"فون کسے کرو گے؟ مست قلندر صاحب کو؟" شیخ نے کہا۔ "یا مدیر مجنوں کو؟ اس وقت دونوں نہیں ملیں گے۔"

"یار، اخبار کا مدیر تھا۔ اس کے گھر پر فون ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"کس اخبار کا؟ جسے کوئی پڑھتا ہی نہ تھا۔" شیخ نے تلخی سے کہا۔ "خیر کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

ایک جنرل اسٹور والا پہلے تو سوچ میں پڑ گیا تھا لیکن اس کے کوئی سوال کرنے سے قبل ہی شیخ نے اپنا کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ "ایک سرکاری کام سے اخبار کے دفتر فون کرنا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن ہم مفت نہیں کریں گے کال کے چارجز دیں گے۔"

"کیسی بات کرتے ہیں آپ، سرا قانون کی مدد مہذب شہری کا فرض ہے۔" اس نے رٹا رٹایا جملہ ... نے ڈائریکٹری دیکھی اور "صدائے وقت" کا نمبر تلاش کیا۔ خوش قسمتی کہ وہاں ایڈیٹر تو نہیں تھا لیکن ایک چپڑاسی نے اٹھا لیا اور یہ حوصلہ شکن اطلاع دی کہ مست قلندر صاحب میں تو فون ہے ہی نہیں۔ ایڈیٹر صاحب کے گھر کا نمبر اسے یاد نہیں۔ آپ پھر بتائے گا اور وہ دس ... گا۔ ریسیور رکھنے کے بعد میں کچھ دیر سوچتا رہا ... عقل پر افسوس ہوا۔ اخبار کے آخری صفحے پر سب سے ... پرنٹ لائن میں ایڈیٹر کا اصل نام موجود تھا۔ ... یہ نام ڈائریکٹری میں مل گیا۔ اس کے ساتھ ہی ... نوٹ کر لیا۔ دس منٹ تک ہم مسلسل وہ نمبر ملاتے رہے ... بجتی رہی لیکن ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔

"یہ رات کو جاگنے والی مخلوق ہے شیخ۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "گھوڑے گدھے سب بیچ کر سو رہے ہوں گے۔"

"کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو۔" شیخ نے سوچتے ہوئے کہا۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ مجنوں صاحب کے ساتھ کچھ ہو سکتا تھا کیونکہ بچے انھی کے پاس تھے اور وہ ٹیپ ... اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ میر گدو کی بیوی ... تاب نہ لا کے بچے بولنے پہ مجبور ہو گئی ہو۔ مست قلندر ... تو بچوں کو لے ہی مل گئے تھے لیکن انھوں نے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا تھا کہ بچوں کو ٹیپ سمیت آگے ارسال کر دیا ... ٹیپ کی ایک نقل جو کہ اپنے ریکارڈ روم میں رکھوا دی ... اینڈ کمپنی کو بھی معلوم ہوا ہوگا تو صرف یہی کہ بچے ٹیپ سمیت ایڈیٹر صاحب "صدائے وقت" کے پاس جا پہنچے۔ وہ ... گے کہ ان کے طشت از بام ہونے سے قبل ہی کوئی بندوبست ... ہیں۔ خبر کی اشاعت کے بعد انھیں نہ مجنوں صاحب ... کوئی فائدہ ہوتا نہ ان کی لیلیٰ کی نشانیوں کو قلم ... کے۔ جو خبر چھپ جاتی وہ زمانے کو معلوم ہو جاتی۔ اخبار ... ہو تو کیا، ایڈیٹر تو ایڈیٹر ہی ہوتا ہے۔ ایک معمولی رپورٹر ... کوئی زیادتی ہو تو سارا قومی پریس آسمان پر اٹھا لیتا ہے۔ ناممکن تھا کہ وہ اخبار کے دفتر پر حملہ کریں اور ایڈیٹر کو اغوا ... اتنا تو وہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ اخبار کا ایڈیٹر احمق نہیں ... اس نے سب سے پہلے اپنی اور بچوں کی حفاظت کے لیے بندوبست کیا ہوگا اور اس ٹیپ کی نہ جانے کتنی نقلیں ... تقسیم کر دی ہوں گی۔ میں اور شیخ یہ بات جانتے تھے کہ ...

... مست قلندر صاحب کا نام نہیں جانتی تھی اور نہ اسے ... کی بیوی ... کہ بچے اس کے پاس جا پہنچے ہوں گے۔ وہ کسی کو ایک ... علم تھا کہ بچے ... بتا سکتی ہے جس سے وہ خود بے خبر ہے۔ چنانچہ ایسی بات مجھے ... مست قلندر صاحب کی ذات محفوظ تھی اور اس طرح وہ ٹیپ بھی محفوظ تھا جو انھوں نے پرانے ریکارڈ میں دفن کر دیا تھا۔ لیکن ایڈیٹر کی ذات اپنے گھر میں بہرحال محفوظ نہ تھی۔ مست قلندر صاحب نے بتا دیا تھا کہ میاں مجنوں ابھی تک تنہا رہتے ہیں۔ ان کو بچوں اور ٹیپ سمیت اغوا کیا جا سکتا ہے۔

"یار شیخ!" میں نے کہا۔ "مجھے مجنوں صاحب کی طرف سے فکر لاحق ہو گئی ہے۔ پہلے ان کو نہ دیکھ لیں۔"

"رہتے تو وہ بھی ادھر ہی ہیں۔" شیخ نے پھر اسکوٹر اسٹارٹ کیا۔ "دیر تو ہو ہی گئی ہے۔"

"ابھی دیر نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔ "اسپتال میں نعشوں کے پوسٹ مارٹم کی کارروائی معمول کے مطابق ہوگی۔ کتنی لاشیں ہیں اور کتنے ڈاکٹر فارغ ہیں۔ پھر یہ کہ کون سا کیس فوری توجہ کا طالب ہے اور کس لاش کے پوسٹ مارٹم کو آخر تک التوا میں رکھا جا سکتا ہے۔ جلدی یا تو پولیس کرتی ہے یا لواحقین کرتے ہیں۔ زرداد کے لیے کون واویلا کر رہا ہے۔"

شیخ نے تائید میں سر ہلایا اور ہم ایڈیٹر "صدائے وقت" کی اقامت گاہ تلاش کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن ایڈیٹر کوئی ایسی شخصیت نہیں ہوتا جو ہر نشست میں جھلکتی دمکتی مرسیڈیز میں گزرتا جو تو زمانہ دیکھتا اور سلام کرتا ہو۔ وہ دانشور قسم کا اپنے خیالوں میں اور اپنے حال میں مست رہنے والا اپنے حلیے کی پروا نہ کرنے والا اور غریب نظر آنے والا شخص ایسا نہ تھا کہ اسے سب پہچانتے چنانچہ ہم آدھے گھنٹے بعد وہاں پہنچے جہاں ہم دس منٹ میں آ پہنچ سکتے تھے۔

دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ ہمیں بند دروازے کے سامنے احمقوں کی طرح کھڑا دیکھ کر ایک پڑوسی نے اوپر والی منزل کی کھڑکی سے سر نکالا۔ "کس سے ملنا ہے جی؟ ایڈیٹر صاحب سے؟" وہ غیر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "صدائے وقت کے مدیر اعلیٰ سے جناب۔"

"او بس جی۔ زبان کو اتنی تکلیف کیوں دیتے ہیں۔ وہ چلے گئے۔" اس نے دھوتی کو بڑی مہارت سے کھول کر باندھا۔

"کہاں چلے گئے؟" میں نے اور شیخ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"کن توری آدمی تھے۔ دنیا کا میلہ دیکھنے نکل گئے۔"

وہ مسکرایا۔ "اور دنیا بہت بڑی ہے۔ میرے کرائے دار تھے۔"

"تمہیں تو کچھ ضرور بتا کے جانا چاہیے تھا۔ بعد میں کوئی ملاقاتی آئے یا ڈاک آئے تو..."

"او جی یہ سب ہم نے بھی کہا تھا۔" وہ آگے لٹک کر بولا۔ "مگر وہ تو بس ہوا کے گھوڑے پہ سوار تھے۔ آدھا سامان بھی چھوڑ گئے۔ نوٹس نہیں دیا تھا اس لیے کرایہ دے گئے اور چلے گئے۔ کہنے لگے کہ جو بھی پوچھنے آئے اسے بتا دینا کہ گئے اور کچھ نہیں بتا کے گئے۔ ملک عدم گئے کہ جہنم میں گئے۔ یہ انھی کے الفاظ ہیں۔"

"ان کے ساتھ دو بچے بھی تھے؟" میں نے کہا۔

وہ چونکا۔ "ہاں... لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "وہ بھلے مانس تھے اس لیے میں نے رکھا ہوا تھا۔ ورنہ چھڑے چھانٹ کو کون رکھتا ہے۔ کل نہ جانے کہاں سے دو بچے آ گئے تھے۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے انسان کے بچے ہیں اور کس کے بچے ہیں۔ موڈی بندہ تھا جی! ایک دم موڈی۔ آپ دفتر سے معلوم کریں۔"

دفتر جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ مجنوں صاحب نے صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہی کیا فیصلہ کیا ہوگا۔ ایک طرف ملازمت تھی اور ان کا کیریئر تھا تو دوسری طرف وہ امانت تھی جس کی حفاظت ان کو جان سے کرنی تھی کیونکہ یہ امانت اس عورت نے ان کے سپرد کی تھی جس کی محبت ان کی زندگی کا سب سے عزیز سرمایہ تھی۔ برسوں حفاظت کرنے کے بعد وہ اس سرمائے کو ضائع کیسے کر دیتے۔

انھوں نے اخبار کے دفتر اپنا استعفیٰ ارسال کیا ہوگا اور خود اپنا بار امانت اٹھا کے نکل گئے ہوں گے۔ ملک خدا تنگ نیست، پائے گدا لنگ نیست۔ اور وہ جو کہا ہے نا شاعر نے کہ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ تو غلط نہیں کہا۔

مزنگ کی گلیوں میں زرداد کا گھر تلاش کرنا کہیں زیادہ مشکل مرحلہ ثابت ہوا۔ ہم نے مختلف دکانداروں سے پوچھا۔ ریڑھی والوں سے پوچھا۔ بالآخر ایک پان والے نے کاغذ پہ نقشہ بنا کے ہمیں منزل مراد کا پتا سمجھایا۔ دس منٹ بعد ہم نے ٹاٹ کے پردے والے ایک دروازے پہ دستک دی۔ تقریباً تیس سال کی ایک عورت نے دروازے کی اوٹ سے ہمیں دیکھا۔ میں نے اس کی ایک جھلک صاف دیکھ لی تھی۔ وہ اگر غریب اور پتلے حال میں نہ ہوتی تو یقیناً قبول صورت کہلاتی مگر زندگی کے دکھوں نے اس کو قبل از وقت ضعیفی کی سند عطا کر دی تھی۔

www.paksociety.com

چند لمحے اس کی سوالیہ نگاہیں مجھ پر اور شیخ پر مرکوز رہیں۔ وہ یادداشت کے دریچوں سے جھانک کر جیسے ہمارے چہروں میں شناسائی کے آثار تلاش کر رہی تھی اور میرے لیے یہ بڑے اطمینان کی بات تھی کہ اس نے شیخ کو دیکھتے ہی ہنگامہ برپا نہیں کیا۔ اگر شیخ نے واقعی اس کے شوہر کو گھر سے اٹھایا ہوتا تو اب تک وہ شیخ کا گریبان تھام چکی ہوتی اور چلا چلا کر اس سے سوال کر رہی ہوتی کہ میرا شوہر زندہ ہے یا مر گیا؟ اب تم دوبارہ اس گھر کے دروازے تک آ پہنچے ہو تو اب کیا لے جاؤ گے؟ مجھے یا اس آبرو کو جو ہر شریف عورت کے لیے متاعِ عاقبت ہوتی ہے اور بدکار کے لیے متاعِ حیات۔ لیکن اس کی آنکھوں سے حیرت ایک سوال بن کے جھانک رہی تھی۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو بھائی صاحب؟" اس نے بیک وقت ہم دونوں کو مخاطب کیا۔

"یہاں زرداد نام کا ایک شخص رہتا ہے؟" میں نے کہنا شروع کیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے بعد کیا کہوں۔

"کیا کام ہے تمہیں اس سے؟" عورت کی صورت اور لہجہ دونوں بدل گئے۔ "کون ہو تم لوگ؟"

"ہم اس کے دوست ہیں بہن!" شیخ نے کہا۔ "ہمیں اس کے بارے میں ایک تشویش ناک اطلاع ملی تھی کہ اسے پولیس اٹھا کر لے گئی ہے، کسی قصور کے بغیر۔"

"اور ہم آپ کی مدد کے خیال سے آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ ہم پر اعتماد کرتے ہوئے اجازت دیں گی کہ ہم اندر بیٹھ کے چند باتیں کر لیں، یا اس دروازے سے اندر آ کے گلی میں کھڑے رہ کر کچھ معیوب لگتا ہے۔"

وہ کچھ متذبذب کھڑی ہماری شریفانہ صورتوں پر اور جائے شائستہ لہجے پر غور کرتی رہی اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ ہم دھوکے باز ہوتے تب بھی بہن کہنے کے بعد اس کی عزت پر تو ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔ باقی اس گھر میں کیا ہے جس کے لٹ جانے کا ڈر ہو۔ یا پھر اسے واقعی ہم پر اعتبار آ گیا کہ اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور دروازہ کھلا چھوڑ کے پیچھے ہٹ گئی۔ تین چار مرلے پر بنے ہوئے اس گھر میں دو کمرے تھے۔ دونوں کمروں کے سامنے برآمدہ پھیلا ہوا تھا۔ پھر وہ صحن تھا جس میں ہم دونوں کھڑے تھے۔ دائیں ہاتھ پر غسل خانہ اور بائیں جانب زینہ تھا جو اوپر کھلی چھت کی طرف جا رہا تھا۔ چھت پر بیت الخلا کے علاوہ دستور یا ضرورت کی کوئی چیز نہیں ہو گی۔ ہم دونوں صحن میں ہی ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"پولیس نے آپ کے شوہر کو کس جرم میں گرفتار کیا تھا بہن؟" شیخ نے کہا۔

"وہ کسی کو بتاتے کب ہیں؟" وہ تلخی سے بولی۔ "اور گرفتاری اس کے لیے کون سی انوکھی بات تھی۔ وہ چار دن سے حوالات میں بند ہو کے نکلتا اور پھر آ جاتا کہ بے غیرتوں کی طرح دانت نکالتا ہوا۔"

"وہ اکثر گرفتار ہوتا رہتا ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "پہلے تو ایسا نہیں تھا وہ؟"

"پہلے کب؟ جب اس نے مجھے اس گھر میں زندہ درگور کیا تھا؟" وہ دیوار کا سہارا لے کر خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔ "میں نہیں جانتی کہ اس وقت وہ کیا تھا۔ اب تو وہ غلطی سے بھی کوئی نیک کام [illegible]"

"مگر میں نے سنا تھا کہ وہ [illegible] کھیلی اور [illegible] بیچتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔"

"خود اس نے کہی ہوں گی یہ سب باتیں آپ سے؟" وہ [illegible] "میرا باپ لگتا ہے۔ اس نے بہت چاہا کہ میری دنیا میں [illegible] زرداد کو بھی جگہ مل جائے مگر محنت کر کے کمانا بہت سخت کام ہے [illegible] مجھے رات کے ساڑھے گیارہ بارہ بجے تک ایک ہی جگہ [illegible] بیٹھے گھٹنے کے بس کی بات نہیں تھی۔ اب میرا باپ ہے، آدمی [illegible] لوٹتا ہے تو روٹی کھاتا ہے۔ صبح سو کے اٹھتا ہے تو [illegible] تیار کرتا ہے۔ وہ تو ان لٹے [illegible] اور وہ منہ سے قلفی کھاتے تھے یا رنگ برنگے [illegible] پڑتے تھے۔"

"اور تمہارا باپ کچھ نہیں کہتا تھا اسے؟" میں نے [illegible] "آخر کیسے چلتا تھا؟"

"پیٹ تو کتا بھی بھر ہی لیتا ہے۔" وہ بولی۔ "اس نے تو کبھی نہیں [illegible] کہ میری ضروریات کیسے پوری ہوتی ہیں۔ بازار سے ایک [illegible] خرید لاؤ [illegible] کہاں سے آ گئے [illegible] معلوم ہے [illegible] کہاں سے جائے گا۔ ایک میں ہی تو رہ گئی ہوں [illegible] مجھے بچا سکتا تو کچھ نہیں سکتا۔ شادی کے بعد رخصت ہو کے [illegible] کے گھر نہیں گئی تھی، وہ اس گھر میں رہنے لگا تھا۔ اس نے تو مجھے سبز باغ دکھائے کہ گھر بیچ کر جیسے [illegible] دن رات [illegible] کر کے لاکھ کے دس لاکھ بنائے گا۔ دکان سے فیکٹری [illegible] لیکن اسے توفیق نہیں ہونے والی تھی۔"

"زرداد کچھ تو کرتا ہی ہو گا۔ میرا مطلب ہے آخر پولیس اسے آئے دن کیوں پکڑ لیتی ہے؟" شیخ نے کچھ دیر بعد کہا۔

"پہلے سینما پر ٹکٹوں کو بلیک کرتا تھا۔ دو چار مرتبہ پکڑا گیا تو [illegible] چھوڑ دیا۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "پھر فلمی تصویریں بیچنے لگا۔ [illegible] کے نسخے جو دکھانے نہیں جاتے تھے۔ کسی فوٹوگرافر سے یارانہ تھا، اس کے ساتھ مل کر یہ تصویروں کا دھندا کرتا تھا۔" اس کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے [illegible] ہو گیا۔ "جوئے اور سٹے کا دھندا کرنے لگا تو پولیس والوں سے معاملہ [illegible] علاقے میں کوئی بھی ایسی واردات ہو جائے جس میں تفتیش کیے بنا [illegible] تو وہ سب ان گرامی قدروں کو بلا کے تھانے میں رونق میلہ لگاتے تھے۔"

[…] وہ سب کی گرد جھاڑ کے واپس کر دیتے تھے۔ [illegible] پولیس کے لیے [illegible] مشغلہ [illegible] تھا اور مخبری بھی کرتا تھا۔ [illegible] احساسِ ملامت کا ناتا بھی [illegible] ٹوٹ گیا۔ شاید شیخ نے بھی [illegible] اس کی کتابی سے کوئی شریف محنت [illegible] آدمی نہیں مانا گیا۔ جب وہ [illegible] کی موت پر جا پہنچی تھی۔ اس کی خود ساختہ دلیل [illegible] کہا تھا سب جھوٹ تھا۔

"آپ ان پولیس والوں کو جانتی ہیں بہن؟" شیخ نے کہا۔ "اور آپ [illegible] ہو جائیں گی۔" وہ [illegible] مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ دونوں زرداد کے دوست ہیں۔ آپ لوگ تو شریف آدمی ہیں۔"

"ہم جب بہت چھوٹے تھے تو دوست تھے۔" میں نے کہا۔ "اب کی ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ جب وہ ملتا تھا تو اپنے متعلق کچھ بھی نہیں بتاتا تھا، بس یہی کہتا تھا کہ محنت مزدوری سے گزارا ہو رہا ہے۔ عزت سے روزی کی روٹی مل رہی ہے۔"

"عزت سے!" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "سوچا تو میں نے بھی [illegible] اور لاوارث ہے تو کیا، بس عزت سے محنت مزدوری کر کے [illegible] کرو خدا کا شکر ادا کروں گی۔ سونے چاندی کے محلوں کے خواب میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔"

"میں نے یہ پوچھا تھا بہن کہ اسے لے جانے والے کون تھے؟" شیخ نے زمی سے اپنا سوال دہرایا۔

"وہی جو آتے رہتے تھے۔ کبھی بھتے کی رقم وصول کرنے تو کبھی ساتھ لے جانے کے لیے۔" وہ بولی۔

"آپ پہچانتی ہیں ان سب کو؟" شیخ نے کہا۔ "اگر وہ سادہ کپڑوں میں ہوں تو انہیں عدالت میں شناخت کر سکتی ہیں؟ میری مراد ان سے ہے جو اب زرداد کو لے گئے ہیں؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی، کس عدالت میں لے جانا ہے مجھے؟" وہ کچھ پریشان نظر آنے لگی۔

"بات یہ ہے بہن!" شیخ نے ایک طویل سانس لے کر کہنا شروع کیا۔ "میں خود بھی ایک پولیس افسر ہوں۔ آپ میرا شناختی کارڈ دیکھ کر اطمینان کر لیں۔" اس نے جیب سے شناختی کارڈ نکال کر آگے بڑھایا۔ معلوم نہیں وہ عورت کچھ پڑھی لکھی تھی یا نہیں مگر اس نے کارڈ پر لگی ہوئی تصویر غور سے دیکھی اور مطمئن ہو کے کارڈ واپس کر دیا۔

"میرا آپ کے شوہر کے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ میرا نام سید اکرام شیخ ہے۔ میں نے کسی مجبوری یا لالچ کی وجہ سے یہ نوکری نہیں کی تھی۔ خدا کے فضل سے ہمارے گھر میں سب کچھ تھا۔ میں خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں اور میرے والد صاحب نے [illegible] تربیت دی تھی وہ پولیس کی نوکری کے لیے نہیں تھی انہوں [illegible] نے مجھے اصول پرست دیانت دار اور فرض شناس بنا دیا تھا۔ یہ احساس مجھے بعد میں ہوا کہ یہ خوبیاں نہیں، میری خامیاں ہیں۔ شاید میں کسی کو کسی کی ملازمت کرتا تو دوسروں کے لیے اور اپنے لیے مشکلات پیدا کرتا۔ پولیس میں بھی دوست میں نے ایک بنایا تو دشمن دس پیدا کر لیے۔ ان دشمنوں نے میرے خلاف ہر سازش کی اور مجھے بدنام کرنے کی خاطر مجھ پر جھوٹے الزامات عائد کیے۔ اب تو خیر میں استعفیٰ دے چکا ہوں لیکن میرے دشمنوں نے آخری کوشش یہ کی تھی کہ مجھ پر زرداد کو گھر کے اندر گھس کر گرفتار کرنے کا الزام لگا دیا تھا۔ زرداد اُن کا آلۂ کار بنا اور جیسا بیان پولیس نے دلوانا چاہا اس نے ریٹ کے دیا۔ بیان میں یہ بھی ہے کہ میں نے کسی قانونی اختیار کے بغیر گھر میں داخل ہو کے زرداد کو پکڑنے کے علاوہ خدا نخواستہ تمہیں بھی مارا اور تمہارے ساتھ بدتمیزی کی۔ میں قرآن پر ہاتھ رکھ کے کہہ سکتا ہوں بہن کہ میں نے تو تھانے میں کسی مجرم تک پر ہاتھ نہیں اٹھایا میں تم جیسی مظلوم اور بے گناہ عورت پر ہاتھ کیسے اٹھا سکتا ہوں۔ میری نظر میں یہ ناقابلِ معافی گناہ ہے اور جرم ہے۔ اگر میں ایسا کروں گا تو خود اپنی نظروں میں گر جاؤں گا۔ میرے والد کو شدید ذہنی صدمہ ہو گا اور میری بیوی جو کالج میں پڑھتی ہے اور مجھے فرشتہ سیرت سمجھتی ہے اسے بہت دکھ ہو گا۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں ہم سب ایک دوسرے کے نگاہیں چراتے رہے۔

"مجھ سے تم کیا چاہتے ہو بھائی؟" زرداد کی بیوی نے بالآخر سر اٹھا کے کہا۔

"کچھ نہیں۔ صرف اتنا کہ کبھی ضرورت پڑے تو کہہ دینا کہ جو الزام مجھ پر لگایا گیا ہے، غلط ہے۔" شیخ نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ میں نے زرداد کو گرفتار کیا تھا نہ میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی تھی۔ میں نے تو آج پہلی بار اس گھر میں قدم رکھا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" زرداد کی بیوی نے کہا۔ "اور سچ بولنے میں کیا ہے۔"

"بعض اوقات حالات آدمی کو اتنا بے بس کر دیتے ہیں بہن کہ وہ سچ نہیں بول سکتا۔" شیخ نے کہا۔ "فرض کرو زرداد ہی کا معاملہ ہو۔ پولیس تمہیں مجبور کرے کہ اپنے شوہر کے بیان کی تائید کرو ورنہ......"

"ورنہ کیا؟ وہ اس پر تشدد کریں گے جو تشدد جھیلنے کا تو زرداد عادی ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔ "اسے جھوٹے کیس میں پھنسا کے جیل بھجوا دیں گے تو جیل تو اسے کئی بار ہو جاتی مگر نہیں ہوتی۔ اس نے جرم کیا اور پولیس کی پشت پناہی کے باعث بچ گیا۔ میں سمجھو لوں گی کہ آج سے پہلے بچتا ہوا اب سزا ملی ہے۔"

اس عورت کی ثابت قدمی نے اور مظلومیت نے مجھے حیران کر دیا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس کا ذہن انفرادیت کے رد عمل کا شکار تو نہیں۔ وہ شعوری طور پر اپنے شوہر سے اس کے مظالم کا انتقام تو نہیں لینا چاہتی؟

"آزمائش کا وقت آتا ہے تو زبانی دعوے ریت کی دیوار ثابت

www.paksociety.com

گئے ہیں؟" پرشینہ نے کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے بلکہ خود تمہاری ذات براہِ راست کسی وحشیانہ بربریت کا نشانہ بن جائے۔ تم عورت ہو اسی لیے میں تم سے یہ توقع نہیں رکھتا کہ تم ہر ظلم برداشت کر لو گی۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ خدانخواستہ اب کوئی غیر متوقع طور پر اس گھر میں قدم رکھے تو مجھے بتانا۔ میں تم کو اپنے گھر اور آفس کا پتا نوٹ کرا جاؤں گا۔ فون میرے گھر میں بھی ہے اور دفتر میں بھی۔ تم کسی طرح مجھے اطلاع کر دینا اور ان کو بتا دینا کہ [illegible] میرا جاننا ہے۔ پھر میں سب سے نمٹ لوں گا۔"

"میرے چچا ایس ایس پی ہیں۔" میں نے کہا۔ "پولیس کے بہت بڑے افسر۔ وہ سب کو تمہارے سامنے کھڑا کر دیں گے۔ تم بتانا کہ وہ کون تھے جو اکثر زرداد کے پاس آتے تھے اور جو اسے لے گئے تھے۔ اس کے بعد تم بالکل محفوظ رہو گی۔"

"مجھے انتقام کی پروا نہیں بھائی!" وہ سر جھکا کے بولی۔ "بس زرداد کی جان ان لوگوں سے چھوٹ جائے جنہوں نے اسے اپنے شیطانی جال میں پھنسا رکھا ہے اور وہ راہِ راست پر آ جائے۔"

میں نے اور پرشینہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ راہِ راست پر کیا آئے گا جو کسی کو قتل کرنے کے لیے دوسروں کے ہاتھوں استعمال ہو چکا ہو۔ زرداد کی بیوی سے یہ تو ثابت ہو گیا تھا کہ اس خود ساختہ وکیل نے اپنے جھوٹ سے ہمیں خوفزدہ کر کے یہ چاہا تھا کہ کسی طرح ہم مصالحت پر مجبور ہو جائیں اور ان کے لیے استاد بیٹھ کر راستہ صاف کر کے چھوڑ دیں۔ زرداد، پولیس کا خاص آدمی تھا چنانچہ حشمت خان یا میرے کے قاتلوں نے اس کو معقول معاوضے کے وعدے پر ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ اگر وہ جعلی وکیل اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو زرداد کا کچھ نہ بگڑتا۔ اسے معاوضہ ادا کر دیا جاتا اور وہ حسبِ سابق پولیس کے لیے کام کرتا رہتا مگر اس وکیل کا واسطہ پرشینہ جیسے خود دماغ افسر سے پڑ گیا۔ مجبوراً اسے زرداد کا قصہ ہی پاک کرنا پڑا۔ زرداد جیسے پولیس کو ہر وقت دستیاب رہتے ہیں اور کسی کام بھی آ جائیں تو ان کو جہان سے پاک کرنے کی بات ہوتی ہے۔ بظاہر زرداد کی بیوی بھی اس کے ساتھ انتہائی مجبوری میں زندگی گزار رہی تھی اور اس نے خود کو "زندہ درگور" بھی کہا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا تھا کہ وہ زرداد سے چھٹکارا چاہتی تھی اور اس کی موت کو بھی ذریعۂ نجات سمجھ کے قبول کر سکتی تھی۔ اس کے لیے وہ جیسا بھی تھا شوہر تھا، سرتاج، مجازی خدا، سہاگ کا سیندور اور مانگ کی افشاں۔ اس رشتے کے ان گنت نام تھے۔ اس کے بغیر وہ بیوی نہیں، بیوہ ہو جاتی تھی اور بیوگی کا تصور کوئی عورت نہیں مانگتی۔ خواہ وہ کسی چور، ڈاکو، شرابی، جواری یا قاتل کی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اب تک وہ بات کہنے کی جرأت ہم دونوں میں سے کسی نے نہیں کی تھی جو سب سے اہم اور اولین حقیقت تھی۔

"اگر تمہارا اس کے ساتھ نباہ کرنا اتنا ہی مشکل ہے تو اس سے علیحدگی اختیار کر لو۔" پرشینہ نے کہا۔

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ "اگر یہ میرے اختیار میں ہوتا، تو میں ضرور کر لیتی۔" اس نے رک رک کے کہا۔ "لیکن میرا باپ کہتا ہے کہ بیاہتا عورت کی ڈولی جائے جہاں سے اس کا جنازہ ہی نکلنا چاہیے۔ نہیں تو آگ میں تو اب بھی جلتی پھرتی لاش ہی ہوں۔ اسے زندگی کہو گی؟ میرا جنازہ تو کب کا اٹھ چکا۔ میرے ارمانوں کا، میری امیدوں کا۔ اس محبت کا جو میں اپنے شوہر کو دینے گئی تھی اور اس کی طلب کر رہی تھی۔ سب کا جنازہ اٹھ چکا۔ وہ خود زرداد جیسا ہے، یہ اپنی زندگی تو گزار لیں۔ اس کی بیوی نے یعنی میری ماں نے کبھی نہیں مر جانے یا اس کو مار دینے والا مر جائے۔"

"اور تم چاہتی ہو، تمہیں آتا ہے یہ خیال کہ وہ مر جائے؟" [illegible]

"جب زندگی کا عذاب اتنا سخت ہو گا تو اور کیا چاہے گا؟" وہ بولی۔ "طلاق تو وہ مجھے دیتا نہیں۔ کہتا ہے [illegible] لیکن یہ طعنہ برداشت نہیں کر سکتی کہ [illegible] لوٹ آئی ہے؟"

"اچھا بہن!" پرشینہ نے جرأت کر کے کہا۔ "شاید خدا کو یہی منظور ہو...... کہ تمہیں نجات بھی ملے تو دکھ اٹھا کے۔"

"ہم یہاں آئے تھے" میں نے کہنا شروع کیا۔ "تو ہمارا ایک مقصد اور بھی تھا۔ وہ جیسا بھی تھا، تمہارا شوہر تھا اور تمہارے بچے کا باپ تھا......"

"اور جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، وہ یقیناً بہت برا ہوا......" پرشینہ نے بات آگے بڑھائی۔ "تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی...... میرا مطلب اس ظلم کے ذمہ دار ثابت ہوں گے...... قانون سب کے لیے ایک ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ چلائی۔ "خدا کے لیے صاف کہو، کیا وہ مر گیا ہے؟"

"ہاں بہن! ہم تمہیں یہ بری خبر سناتے ہوئے ڈرتے تھے۔" میں نے کہا۔ "اب تم حوصلے سے اور صبر سے کام لو......"

"اور ہمیں یہ بتاؤ کہ اس کو اپنے ساتھ لے جانے والے کون تھے!" پرشینہ نے کہا۔

زرداد کی بیوی نے سینے پر ایک دو ہتڑ مارا۔ "مار ڈالا گئے؟ میرے زرداد کو" اس نے چیخ کر کہا۔ "ہائے ربا...... قتل کر دیا انہوں نے...... مجھے بھی مار ڈالو اب تو!" اس نے چلا چلا کر بین کرنا شروع کر دیا۔ عورت کتنی عجیب ہے، ایک لمحہ پہلے طلاق یا موت، ہر صورت میں زرداد سے نجات قبول کرنے پر آمادہ تھی۔

"...... اے لوگو! ...... اے خدا غارت کرے انہیں...... نے مجھے بیوہ کر دیا...... خدا ان سب کے گھر برباد کرے جنہوں نے بچوں کے سر سے باپ کا سایہ چھینا۔" وہ سر پر ہاتھ مار مار کے زرداد کی دہائی دے رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں آس پاس کے گھروں سے بہت سی عورتیں اندر آ گئیں۔

www.paksociety.com

دروازے پر اکٹھا ہو گئے تھے۔ میں اور شیخ اس صورت حال کے لیے قطعی تیار نہ تھے۔ [illegible] شیخ کو سامنے آتا دیکھ کر [illegible] کے ساتھ باہر آ کے اس نے لوگوں پر ایک نظر ڈالی۔

"میں سب انسپکٹر شیخ جمیل ہوں۔" اس نے اپنا کارڈ دکھا کے کہا۔ "میں زرداد کے فوت ہونے کی اطلاع لے کر آیا تھا۔ میرا تعلق اس علاقے کے تھانے سے نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اسے پولیس والے لے گئے تھے۔ آپ میں سے کون میری مدد کر سکتا ہے؟"

شیخ کی بات کا جواب خاموشی تھی جو دیکھنے اور سننے والوں کے دلی جذبات اور احساسات کی عکاسی کر رہی تھی۔ شیخ بھی پولیس میں تھا اور وہ بھی پولیس والے تھے جو زرداد کو قتل کرنے کے لیے گھر سے اٹھا کر لے گئے تھے چنانچہ شیخ کے اعتراف کا ردعمل غیر متوقع نہیں تھا۔ مگر لوگ اسی طرح پولیس کو تمام دشمن سمجھتے ہیں۔ بدعنوان و بدکردار افراد کا ایسا ٹولہ سمجھتے ہیں جو قانون کی مدد سے تحفظ فراہم کرنے کی ذمہ داری پوری نہیں کرتا۔ قانون کی آڑ میں تمام کارروائی کرتے اور ان کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنتے ہیں ان کا خدا کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔

"کیا بات ہے؟" شیخ نے سخت لہجے میں کہا۔ "آپ سب کی زبانوں کو تالے کیوں لگ گئے؟ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس واقعے کے چشم دید گواہ محلے والے ہیں۔ کسی نے تو دیکھا ہوگا کہ زرداد کو لے جانے والے کون تھے؟"

"لیے ہوئے مست ہو تھانیدار بادشاہ؟" ایک پہلوان قسم کے شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔ "تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ سب جانتے ہوئے بھی ہم سے ہی پوچھ رہے ہو؟"

"اگر ہم میں سے جو بولے اسے گواہی میں پکڑ کے لے جاؤ۔" لمبے لمبے بالوں والے ایک نوجوان نے چلا کر کہا۔ "اور تھانے لے جا کر اس کا بھی وہی حشر کرو جو زرداد کا کیا۔ پھر تمہاری مرضی کے مطابق بیان دے دے؟"

"یا سادہ کاغذ پر دستخط کر دے۔" ایک مولوی ٹائپ شخص نے غصے سے کہا۔ "جس پر تم جو چاہو لکھ لو۔"

"اسے یہ سب ایک جیسے ہی ہیں۔ جرم خود کیا ہے، پھنسانا ہمیں چاہتے ہیں۔" کسی نے پیچھے سے چیخ کر کہا۔ مجمع اب پہلے سے کہیں زیادہ ہو گیا تھا اور ایک بات سے ان کی زبانیں کھل گئی تھیں۔ اپنی افرادی طاقت کا احساس ان کے مشتعل جذبات کو ہوا دے رہا تھا۔

"آپ لوگ غلط سمجھ رہے ہیں۔" شیخ نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "زرداد تو مر گیا۔ اب اس کیس میں ان لوگوں کی گرفتاری ضروری ہے جو زرداد کو کسی جرم اور کسی وارنٹ کے بغیر لے گئے تھے۔ آخر ان کی شناخت کیسے ہوگی؟"

"اسے تھانیدار بادشاہ! زیادہ الو مت بناؤ ہمیں۔" پہلوان نے ایک قدم آگے بڑھ کے کہا۔ "تم کو سب معلوم ہوگا کہ کس نے زرداد کے ساتھ کیا ظلم کیا اور اس کے قاتل کون ہیں۔ ہم جیسے خراب آدمی ہیں، خفا ہو جائے تو ہم بھی بھول جاتے ہیں کہ ہمارا باپ کون تھا؟"

"مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تم کیسے آدمی ہو۔" شیخ نے متانت سے کہا۔ "اصل مسئلہ کچھ اور ہے۔ اگر تم میں سے کسی نے نہ بتایا کہ اس نے مجرموں کو دیکھا تھا تو مجھے مجبوراً زرداد کی بیوہ کو تھانے لے جانا پڑے گا۔ وہ جانتی ہے سب کو۔"

"تم اس کی بیوہ کو تھانے لے جاؤ گے؟" نوجوان نے تیزی سے کہا۔ "ایک عورت کو؟"

"اور عورت بھی وہ جو عدت کا زمانہ پورا کیے بغیر گھر سے نہ نکل سکتی۔" مولوی نے کہا اور گویا اجتماعی فیصلہ سنا دیا۔

"اسے قسم ہے اپنے پیدا کرنے والے کی تھانیدار بادشاہ!" پہلوان نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ "باہر ہو رہے ہو تم [illegible] نظر اٹھا کے بھی دیکھا تو ہم اپنی اور تمہاری جان ایک کر دیں گے۔"

"تم نے جا کر تو دیکھو اس بیوہ عورت کو ....." پیچھے سے کسی نے [illegible] شکل کرنے کے بعد ایک بڑی سی گالی دی۔ اس کے ساتھ ہی ہجوم نے پولیس کی ہجو شروع کر دی۔ "بھڑکا سالا تھانیداری کی اولاد۔ ہم پر رعب جماتا ہے۔ اڑن [illegible] کرتا ہے ..... ہم سے سالا۔" "پہلوان سب سے آگے [illegible] پکڑو۔ مارو سالوں کو۔ میں تنگ آ گیا ہوں۔" لوگ چلانے لگے۔ میری آواز ان کے شور میں دب گئی۔ پھر پہلوان نے شیخ کا گریبان پکڑ لیا۔ شیخ نے اس کا ہاتھ جھٹکنے کے لیے پیچھے دھکیل دیا مگر [illegible] لوگ گھیرے آگے بڑھ آئے تھے۔ فرداً فرداً وہ سب کمزور حریف تھے مگر ایک مشتعل ہجوم بڑی تباہ کن قوت بن جاتا ہے۔ کئی ہاتھ اوپر اٹھے۔ میں اور شیخ پیچھے سے پیچھے ہٹتے گئے۔ پیچھے صحن کا کھلا میدان تھا۔ آٹھ دس افراد ہم پر حملہ آور ہوئے۔ اس سے پہلے کہ شیخ اپنا ریوالور نکال لیتا میں نے اپنے لیے پوزیشن سنبھال لی تھی۔ میری لات [illegible] کی طرح پہلوان کی [illegible] پر پڑی اور وہ [illegible] کے لیٹ گیا اور درد سے کراہنے لگا لیکن اس سے [illegible] اضافہ ہو گیا۔ میں نے دوسرے شخص کو [illegible] ہاتھ تھام کے جھٹکا دیا اور الٹے ہاتھ پیچھے اچھال دیا۔ میرا گھٹنا ایک اور کی ٹانگوں میں لگا۔ میرے ہاتھ پیر بجلی کی طرح چل رہے تھے لیکن میں مشتعل [illegible] اور مجھے ہر لحظہ یہ خیال تھا کہ کسی کو کاری ضرب نہ آ جائے۔ ایک منٹ میں اتنے ڈھیر ہو گئے جو سوالی بن کے آئے تھے۔ آخری آدمی کو میں نے درمیان سے اٹھایا، گھمایا اور باقی مجمع کی طرف اچھال دیا۔ چند اس پر گرے اور [illegible] دو کو چادر [illegible] کا مظاہرہ کرنے والے پلٹ کر بھاگے۔ اسی وقت شیخ نے ریوالور نکال لیا۔ "ٹھہر جاؤ۔" اس نے گرج کر کہا۔ "ورنہ میں گولی مار دوں گا!" اس نے ایک ہوائی فائر کیا۔

فرار ہونے والے اپنی اپنی جگہ منجمد ہو گئے۔ میں نے ایک جست لگا کر ان کے درمیان سے گزر کے گلی میں آ گیا۔

"سب اندر۔" میں نے انہیں ریوڑ کی طرح ہانکتے ہوئے کہا۔ لمبے بالوں والے نوجوان نے مجھے چکمہ دے کر نکلنے کی کوشش کی مگر میں نے ٹانگ آگے بڑھائی اور وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے اسے پیچھے سے کپڑے سے اٹھایا اور اندر کی جانب دھکیل دیا۔ سب لوگوں کے گھر میں داخل ہو جانے کے بعد میں نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ وہ سب ایک گوشے میں سہمے ہوئے، خوف زدہ اور اسیر ہو جانے والے ریوڑ کی طرح کھڑے تھے۔ سب کے چہروں پر [illegible] ان میں سے چند ایک کی صورت دیکھ کر رحم آتا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب ہم انہیں [illegible] لگا کے شوٹ کر دیں گے، مار مار کر ادھ موا کر دیں گے۔ تھانے تو لے ہی جائیں گے۔ جیسے اور شیخ کے کپڑے بھی اس ہاتھا پائی میں [illegible] پھٹ گئے تھے اور ہم [illegible] حریف سمجھنے کے باوجود قابل رحم لگتے تھے۔

"تم سب کا جرم بہت سنگین ہے۔" شیخ نے رعب دار لہجے میں [illegible] سب کی طرف رخ کر کے کہا۔ "تم نے ان پولیس افسروں پر حملہ کیا جو [illegible] ان کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ [illegible] انکار کیا اور [illegible] حائل ہو جانے پر مجھے مجبور کیا۔ ان سب جرائم پر متعدد قانونی دفعات لاگو ہوتی ہیں اور تم سب کو سزا تین سال سے سات سال تک کی قید با مشقت ہو سکتی ہے۔" اس نے اپنی بات کا تاثر دیکھنے کے لیے ایک ذرا سا وقفہ دیا۔

"معاف کر دیں ہمیں۔" کسی نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ "آپ کو اللہ رسول کا واسطہ تھانیدار صاحب! غلطی ہو گئی ہم سے۔"

[illegible] اب بھی جرأت [illegible] باقی تھی اور ان کی آنکھیں چیلنج [illegible] محسوس ہوتی تھیں کہ ہمت ہے تو اپنی تھانیداری اور اپنا ریوالور چھوڑ کے سامنے آؤ۔ لیکن مجموعی طور پر [illegible] حالت غیر تھی۔ انہیں اپنے جذبات کی رو میں بہہ جانے کا افسوس تھا۔ [illegible] زندگی کا ایک اور عملی سبق تھا کہ پرائے پھڈے میں پڑنے کا [illegible] کس طرح خوار ہونا ہے۔

لیکن شیخ نے ریوالور جیب میں رکھ کر شرمندگی کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سب کو کچھ نہیں کہوں گا۔ معاف کرنے کا لفظ مجھے زیب نہیں دیتا۔ آپ سب میری ہی طرح جذبات سے مغلوب ہو جانے والے انسان ہیں۔ آپ لوگوں کو پولیس کے مظالم کی شکایت ہے اور اپنے ایک محلے دار کی موت کا افسوس ہے جو شریف آدمی تو نہیں تھا لیکن [illegible] موت کا مستحق ہر گز نہیں تھا۔ میں کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گا لیکن آپ سب کو میری مدد کرنا ہوگی۔ اپنا نام بتا کے جائیں تاکہ مجھے اندازہ ہو [illegible] جنہوں نے سب کچھ دیکھا تھا [illegible] اور میرے ساتھ اس علاقے کے پولیس اسٹیشن تک چلیں۔ آپ [illegible] جانتے ہیں کہ میں بھی زرداد کی بیوی کو تھانے لے جا کر تماشا بنانا نہیں چاہتا۔ [illegible] کوئی بات نہیں، آپ لوگوں پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ بس ان لوگوں کی نشاندہی کر دیں جو تھانے سے آتے جاتے تھے اور زرداد کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ میرا مقصد صرف یہی ہے کہ مجرموں کو سزا ملے۔ یہ کوئی [illegible] یا ہمدردی نہیں ہے جس کا مظاہرہ [illegible] ہوا تھا کہ اسے قانونی طور پر پوچھیے۔ گواہ بنیے [illegible] بے خوف ہو کے۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ لوگوں کی صورتوں کے تاثرات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ شیخ کی بات کا ردعمل انتہائی خوشگوار ہو رہا تھا۔ انھوں نے کسی تھانیدار کے لبوں سے اس لہجے میں ایسی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں چنانچہ وہ حیران تھے۔ [illegible] پشیمان تھے اور نفرت کی جگہ ان کی صورتوں پر [illegible] پھیلنے لگا تھا جیسے تاریکی کے بعد صبح صادق کی روشنی پھیلتی ہے۔

مولوی ٹائپ شخص نے سب سے پہلے خود کو پیش کیا۔ وہ زرداد کا ایک محلہ دار تھا۔ پھر پہلوان نے سر ہلایا جو اب تک کمر پر ہاتھ رکھے [illegible] سے کراہ رہا تھا۔ [illegible] دونوں [illegible] بھی نہیں تھا۔ [illegible] خاک میں [illegible] وہ زرداد کا [illegible] تھا۔

"دو گواہ کافی ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "باقی لوگ جا سکتے ہیں۔ بہتر ہو گا کچھ لوگ ہسپتال جا کے زرداد کی میت لائیں اور تجہیز و تکفین کا بندوبست کریں۔"

اسی وقت مجھے بھی زرداد کی بیوی کا خیال آیا۔ [illegible] کے علاوہ وہ فائر کی آواز سے دہشت زدہ ہو کے وہ [illegible] گھس گئی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے دروازہ کھلوایا۔ اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو خشک ہو چکے تھے۔

"آپ ہمت سے کام لیں بہن!" میں نے کہا۔ "محلے والے آپ کے ساتھ ہیں اور ہم تھانے جا رہے ہیں تاکہ وہ مجرموں کی نشاندہی کر سکیں۔ آپ کے بچے کہاں ہیں؟"

"وہ [illegible] نانا اور نانی کے ساتھ گئے ہیں۔" وہ بولی۔ "میں خود تو بھوک بھی برداشت کر لیتی تھی۔ محلے والے دیتے تھے تو صبر شکر کے ساتھ یہ خیرات بھی قبول کر لیتی تھی اور [illegible] بیٹیاں [illegible] تو یہ علم بھی ہوتی تھی لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ بچوں کی نظر میں یہ گھر یتیم خانہ ہو۔ جہاں ان کو خیرات سے پیٹ بھرنا پڑتا ہو۔ مجھے ان کے سامنے ذلیل ہونا قبول نہیں تھا۔ وہاں وہ سکون سے رہتے ہیں۔ وہ گھر ایسا تو ہے کہ انھیں محبت اور شفقت بھی مل رہی ہے اور ان کی پرورش بھی عزت کے ساتھ ہو رہی ہے۔ یہاں رہتے تو وہ گھر سے متنفر ہو جاتے۔ ماں باپ سے نفرت کرنے لگتے اور گھر کی قید سے نکل جاتے تو غلط صحبت میں پڑ کے وہی بنتے جو ان کا باپ تھا۔"

"ہاں۔" میں نے سوچا۔ "ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور ایسا ہی ہوتا ہے [illegible] ہم جو بچوں کی فلاح و بہبود کے شاندار منصوبے بناتے ہیں، ان کے لیے رفاہی ادارے قائم کرتے ہیں، سیمینار منعقد کرتے ہیں [illegible] مفروضہ تھا کہ

www.paksociety.com

پڑھے جاتے ہیں۔ بچوں کا عالمی دن مناتے ہیں۔ وہ معاشرہ جو آج کے بچوں کو آنے والے کل کا معمار کہتا ہے، وہ تربیت اور بچوں کی نفسیات کے ماہرین، یہ سب مل کے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔

پولیس اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا لیکن میں اور شیخ اسکوٹر پر تھے چنانچہ دونوں کو رکشہ لینا پڑا۔ جب ہم تھانے پہنچے تو پولیس اسٹیشن میں خاصا دلچسپ تماشا ہوا۔ پہلی نظر میں تھانے کے عملے نے ہمیں مجرم اور [illegible] سے آنے والوں کو مدعی سمجھا۔ پھر انھیں یہ تفصیل [illegible] الگ الگ آئے تھے اور ظاہری حالت سے ایک جیسے معزز معلوم ہوتے تھے۔ شیخ کے اعلان نے ان کو دم بخود کر دیا۔ انھوں نے پچھلے برسوں میں پیٹ کر آنے والے کسی پولیس افسر کو اتنے سکون سے ایسے شریفانہ لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ایس ایچ او صاحب بہادر گشت پر تشریف لے گئے تھے لیکن ایک سب انسپکٹر ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے شیخ کو اور مجھے بڑی عزت سے کمرے میں بٹھایا اور بادل نخواستہ چائے بھی منگوائی۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے قطعی لاعلمی ظاہر کی۔

"میری ڈیوٹی کے دوران ایسی کوئی واردات ہوئی نہیں شیخ صاحب!" وہ [illegible] لہجے میں بولا۔ "آپ کہتے ہیں تو روزنامچہ دیکھ لیتے ہیں۔"

"روزنامچے میں اس قسم کا کوئی اندراج نہیں ہوگا۔" شیخ نے کہا۔ "اس لیے خواہ مخواہ تکلیف مت کرو۔"

"اچھا جی، پھر آپ ہی فرمائیں کہ میں کیا کروں؟" انسپکٹر نے کہا۔ "تھانے میں تو ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے۔ میں سارے عملے کو اس وقت تو تھانے پر لا کے حاضر نہیں کر سکتا۔"

"مجھ سے ایسے بات مت کرو جیسے میں نے کبھی تھانہ نہیں دیکھا۔" شیخ نے تند لہجے میں کہا۔ "تمھاری طرح میں بھی ایک پولیس اسٹیشن میں ہوں اور جب ڈیوٹی ہوتی ہے تو وہی کرتا ہوں جو تم کر رہے ہو۔ اس وقت جو لوگ تھانے میں تھے انھیں بلاؤ۔"

"تم مجھے ایسے حکم دے رہے ہو جیسے تم ہی میرے افسر اعلیٰ ہو۔ ایس ایچ او۔" انسپکٹر بولا۔ "اگر میں انکار کر دوں تو تم کیا کرو گے شیخ صاحب؟"

"اس کے بعد کچھ مجھے ہی کرنا پڑے گا۔" میں نے شیخ کو جواب دینے سے پہلے کہا۔ "ایس ایس پی [illegible] رضوی صاحب یہاں آئیں گے [illegible] پریشان کی [illegible] ہوگی جس میں تھانے کی ساری نفری [illegible] ڈیوٹی پر ہوں گے وہ بھی اور جو نہیں ہوں گے وہ بھی حاضر ہوں گے۔ میں ان کے گھر پر رہتا ہوں اور ان کا چھوٹا بھائی ہوں۔ تم ابھی تو میں ٹال سکتے ہو کیونکہ رضوی صاحب [illegible] لیکن وہ چار دن میں تھانے میں ہوں گے اور [illegible] کرنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ تم جانتے ہی ہو گے کہ رضوی صاحب کس قسم کے افسر ہیں۔"

انسپکٹر کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ "تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "لاؤ ٹیلی فون مجھے دو۔ [illegible] کرانی تھی۔ [illegible] میں بتا دیتا ہوں کہ مسئلہ کیا ہے [illegible] سے بات کریں گے۔ [illegible] باہر [illegible] یا شیخ کے ساتھ [illegible] لیکن اس کے بعد تمھاری پوزیشن زیادہ خراب ہو جائے گی انسپکٹر! [illegible] براہ راست تمھیں فون کریں گے یا ایس ایچ او سے وضاحت طلب کریں گے۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ ہم اس کیس میں اصل مجرموں کی [illegible] گرفتاری [illegible] نہیں کریں گے۔"

انسپکٹر کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کے اپنے علاقے کے دو [illegible] کی خاموشی [illegible] لیکن بات [illegible] عدم تعاون کا نتیجہ مزید خرابی کا باعث ہوگا۔ [illegible] گفتگو پر [illegible] ایک بار [illegible] سے بھاگنا۔

"تھانے کے اندر کون کون ہے اس وقت؟" انسپکٹر نے کہا۔ "سب کو بلاؤ۔"

شیخ نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس میں بہت وقت لگے گا۔ [illegible] جس میں سب کی تصویریں اور نام پتے ہوں گے۔"

[illegible] ایک انسپکٹر تھا [illegible]

خواب سب دیکھتے ہیں۔
لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں؟ یہ خواب کیا ہوتے ہیں؟ خوابوں کی تشریحات کیسے کی جا سکتی ہیں؟ ان کی تعبیر کیا ہے؟ خواب آدمی کی زندگی میں کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ ان کی رہنمائی سے مستقبل کی تعمیر بدلی جا سکتی ہے؟ کیا وہ ہماری الجھنوں کے عکاس ہوتے ہیں یا وہ ہماری الجھنوں کا حل بھی پیش کرتے ہیں؟
خوابوں کے بارے میں ماہرین کی کیا رائے ہے؟
خوابوں کے بارے میں مذاہب عالم کیا کہتے ہیں؟ یہ اور ایسے لاتعداد سوالوں کے مکمل جواب کے لیے —— پڑھیے!

خوابوں کے اسرار

قیمت 15 روپے
[illegible]

ایس۔ ایم۔ صدیقی کے قلم سے
اردو میں پہلی بار —— ایک بھرپور اور منفرد کتاب
مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس ۱۲۳ کراچی

[illegible] زیادہ تھا تو وہ مزید عقل و ذہانت میں اس سے ایک [illegible] وقت بہت مایوس ہوئے جب انھوں نے کسی کو [illegible] کے دعا باب ہو سکتے تھے۔ ایک [illegible] جاتے تھے۔ انھیں بعد میں اسی علاقے میں رہنا [illegible] سے بیوی بچوں کے لیے کسی [illegible] حقیقت اخبار والوں کا تعلق اس [illegible] زیادہ قریب تھا اس لیے ہو سکتا تھا [illegible] وارد ہو گیا پولیس کی وردی میں پولیس تھانے میں [illegible] کے وقت حاضر ہونے کی ہدایت دے کر رخصت کر دینے کے [illegible] سے معذرت کی اور انسپکٹر شمد کو دینے میں [illegible]

"[illegible] عجیب معاملہ ہو گیا۔" شیخ نے تھانے سے نکل کے اسکوٹر کی [illegible] ہم نے جھک ماری۔ زندہ کے دعا کا ڈرامہ کرنے [illegible]

"[illegible] بیٹے۔" [illegible]

"مجھے ایک دو دن سے اندازہ [illegible]" شیخ نے اسکوٹر چلاتے ہوئے کہا۔ "کبھی [illegible] زندہ دفن کی پراسرار موت کا معاملہ۔ تو ہمارا اس سے کیا [illegible] ایک شخص زندہ تھا جس کی لاش ہم نے موت کے [illegible] اس لاش کا کیا ہوا؟ یا سچ [illegible] سے تعلق کوئی پوچھے گا نہیں تو انھیں وضاحت کی [illegible] زندہ کا معاملہ وہ سرکاری تھانے کا ہے جہاں سے ہم [illegible] کس طرح گھر سے اٹھایا گیا تھا۔ اٹھانے والے کون [illegible] اسپتال کیسے پہنچی۔ اس کی تفتیش ہماری ذمہ داری ہے لیکن [illegible] نہیں پڑیں گے چنانچہ زندہ کی دفن اس طرح ہو جائے [illegible] گھر پر طبعی موت مرا۔ نہ اسپتال والوں کے لیے پریشانی، نہ [illegible] زندہ جیسے لوگوں کی موت بھی ویسی ہی ہوتی ہے جیسی ان کی [illegible]

"[illegible] حقیقت ہے کہ زندہ کی بیوی کے پاس اپنا مکان ہے جس میں [illegible] اب اس کا کوئی ہے جو اس کی آمدنی سے گھر کا خرچ چلا جاتا ہے۔ [illegible] اپنے بچے کو کھانے کے قابل نہ ہو جائیں یہ سہارا کافی ہے۔"

"[illegible] کی فطرت بھی [illegible]" شیخ نے [illegible] جاتے ہیں کہ ان کی موت [illegible] سب بھول گئی۔"

"[illegible] سے جو کچھ ہے یہاں [illegible] ہی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے [illegible] نہیں ہوتا۔ میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "اب [illegible] کے باعث وہ مرنے والے کو جلد بھول جاتی ہیں [illegible] کی کوشش کرنی [illegible]"

"چھوڑو اس بکواس کو میاں!" شیخ نے کہا۔ "معلوم نہیں کتنی دیر ہوگی۔ اپنے وقت اور اپنی توانائی کو اپنے مسائل کے لیے بچا کے رکھو۔ دکھ مجھے بھی ہوا لیکن میرا جی ملول ہو جاتا ہے کہ وہ خبیث صرف ہاتھ نکل جاتے ہیں تو ان کی کھال میں بھس بھر دو۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ ظلم اور ناانصافی ہر طرف ہے اور ہر جگہ ہے۔ زندہ کے انصاف کو خدا پر چھوڑو۔ ایسے زندہ تو لاتعداد ہیں جن کے لیے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ بتا تجھے کہاں چھوڑ دوں؟"

"مجھے سیدھے گھر کے دروازے پر اتار دو۔ میرا مطلب ہے واپس کر دو۔" میں نے کہا۔ "ایک بار پھر ایاز کا تحفہ زیب تن فرما کر قصد اسلام آباد کا کرتا ہوں۔"

"اس سے زیادہ کٹھن مرحلہ مجھے درپیش ہے۔" شیخ نے کہا۔ "مجھے زندہ اس کے بیوی بچوں کو دیکھ کے بہت محظوظ ہوگی تو آپ میاں سخت پریشان ہوں گے اور انھیں تسلی دینے کے لیے مجھے کوئی کہانی گھڑنی پڑے گی۔ پھر وہ ڈانٹ پلائیں گی۔ سخت خان کو جا رہا ہے۔"

جب وہ رخصت ہوا تو شیخ نے نیک نیتی سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "انشاء اللہ بہت جلد پھر ملاقات ہو گی۔"

"شاید میرے اسلام آباد میں سب خیریت ہو اور میں جلد لوٹ آؤں۔"

میں نے کہا اور گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ غسل سے فارغ ہو کے میں نے لباس بدلا تو دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ پہلے اسلام آباد فون کر لوں تاکہ پھر بے فکر ہو جاؤں۔ کھانا بھی کھانے کے بعد وہاں لیں یا ڈگی پکو سکتا تھا۔ مجھے بات نہ بنے پر بڑا دکھ ہوا۔ میں نے نصیر اللہ صاحب کے گھر کا نمبر ملایا۔ خلاف توقع لائن دس منٹ میں مل گئی۔ ریسیور شمسہ نے اٹھایا۔ "ہیلو!" اس نے کہا۔

"ہیلو کیا جی؟" میں نے کہا۔ "السلام علیکم۔ یہ بتائیے آپ کہاں ہیں؟ ہم اسی حساب سے بات کریں۔"

"سکندر بھائی! میں شمسہ بول رہی ہوں۔" شمسہ ہنسی۔ "آپ کی آواز تو پہچان لی میں نے۔ خیریت سے ہیں نا آپ؟"

"آداب بجا لاتا ہوں آپا!" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تمھارا اور دیگر اہل خانہ کا کیا حال ہے۔ بچی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"بچی کی طبیعت بہتر ہے۔" وہ بولی۔ "فوزیہ کی بھی منگنی ہو گئی۔ آپ اس کے بعد بھی نہیں آئے۔ وہ لوگ بہت خفا ہیں۔"

"میں آج ہی آ رہا ہوں شام تک۔" میں نے کہا۔ "تصدق کے گلے سے نکلا۔ میری بات کو انھوں نے راستہ کاٹ دیا۔ یا ممکن ہے ہم نہ بات ہوئی کہ لوٹ کے [illegible] آئے۔ تم ذرا پولیس والے ان کو بلاؤ۔ مجھے انھیں کچھ بتانا ہے۔"

"بتاتی ہوں۔ آپ ہولڈ کریں۔" وہ بولی۔ "یہ بھی کہ دوں کہ سکندر بھائی آپ کو کچھ بتانا چاہتے ہیں۔"

تقریباً ایک منٹ بعد رضوی صاحب کی آواز آئی۔ "سکندر! فرصت مل گئی تمھیں؟"

"مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت خفا ہیں۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "لیکن یقین کیجیے..."

www.paksociety.com

"کس بات پر یقین کروں؟" رضوی صاحب نے بے بسی سے کہا: "شہلا نے بتا دیا ہے کہ تم گھر چھوڑ کر ان کو دینا چاہتے ہو؟"

اف! میں نے سر پکڑ لیا۔ بچپن بتا دیا جائے، آفت آ گئی تھی۔ [illegible] مجھ سے بھی۔

"قسم خدا کی انکل! حالات ہی ایسے ہو گئے تھے جس کی وجہ سے شہلا نے شرارت کی ہے۔" میں نے کہا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں راز آ لوں اور وہ بھی نہ ہو۔"

"آنے کی بات چھوڑو۔ تم تھے کہاں؟" انکل نے کہا: "پہلے رات کو [illegible] کیا، رات میں تین بار؟"

"اکیلے گھر میں وحشت ہوتی تھی انکل!" میں نے کہا: "عبدالودود مظفر کے گھر چلا گیا تھا۔ عدالت میں درخواست دی تھی۔ [illegible] اجازت۔ اگلے دن ملی میں نے سوچا تھا کہ رات کو روانہ ہو کے صبح اسلام آباد پہنچ جاؤں گا لیکن گھر گیا تو بیگم کی طبیعت خراب ہو گئی۔"

"تمہارے ساتھ گڑبڑ کے سوا ہی کیا ہے؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"یقین کیجیے انکل! اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ آپ [illegible] چاہتے ہیں؟" میں نے مسکینی سے کہا۔

"یہ جو آپ نے سچ فرمایا، قصور وار ہمیشہ دوسرے ہوتے ہیں۔"

"دیکھیے انکل! گھر میں جو گھس گئے تھے میں کیا کرتا؟" میں نے کہا۔ "وہ تو اتفاق ہے کہ میں نے عین وقت پر انھیں اندھا دھند دیکھ لیا اور وہ کچھ نہ کر سکے۔ بس جان سلامت لے گئے، یہی غنیمت ہے۔ ورنہ انشاء اللہ جب تک زندہ رہیں گے، یاد رکھیں گے۔"

"تم نے مار پیٹ کی ان سے؟" رضوی صاحب نے سخت تشویش میں مبتلا ہو کے کہا۔

"اور کیا میں مار کھاتا ان چوروں سے انکل؟" میں نے معصومیت سے کہا: "چار سال جوڈو کراٹے سیکھا کس لیے تھا آخر۔ بہت عرصے بعد موقع ملا تھا۔ ایک کی تو آدھی پسلیاں ضرور ٹوٹ گئی ہوں گی۔ دوسرے کی ناک کی ہڈی [illegible] ہو گئی۔ ایک شاید تمام عمر ایسے چلے گا جیسے ایک پاؤں فٹ پاتھ پر ہو تو دوسرا سڑک پر۔ وہ [illegible] ہمیشہ ایک آنکھ سے دیکھے گا، خاص [illegible] کرانی پڑے گی دونوں کو عمر بھر [illegible] مشکل ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ انھیں تو ان دونوں کو میں نے بھیجا تھا [illegible] معلوم کرنے کے لیے۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"اوہ..... آئی ایم سوری انکل... او دیکھیے... آپ نے بھی تو نہیں بتایا۔ اور وہ بھی بتا بیٹھے ہے اور پھر بھاگ گئے۔" میں نے کہا: "اب آپ واپس آ گئے تو میں ان سے معذرت کر لوں گا ہسپتال جا کے۔ میں رات تک پہنچ رہا ہوں۔"

"تم [illegible] مہربانی آ گئے۔" رضوی صاحب نے طنز سے کہا: "خیر اب بھی آ جاؤ گے تو مسز شیرازی کی عیادت کا اخلاقی فرض تو پورا کر لو گے۔ [illegible] سب بات ہوئی محسن سے۔ سیدھی اور اس کے بے تعلقی کا یہ انداز۔"

"محسن میری مجبوریوں کو سمجھتا ہے انکل! اور [illegible]" [illegible] نے کہا: "ذرا اسے بلا لیں آپ؟"

محسن سے میری گفتگو سرسری اور مختصر ہوئی۔ اصل [illegible] رابعہ کو بلوانے کا تھا۔ وہ چند منٹ میں رابعہ آ گئی۔ "جی؟" وہ بولی۔ "ہیں جناب آج کل؟"

"عرض کیا ہے — ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی [illegible] نہیں آتی۔" میں نے بزبانِ غالب ارشاد کیا۔

"کل رات غائب کہاں تھے؟" وہ بولی: "میں نے [illegible] رات کو کیا جناب کا پتا نہیں، کیا کر رہے تھے؟"

"دن میں رضوی [illegible] پڑھا رہا تھا۔" میں نے کہا: "[illegible] چلا گیا۔ شرفاء کا [illegible] پہلے ہی تھا۔"

"میں شرفاء کی نہیں تمہاری بات کر رہی تھی۔" وہ بولی۔ "[illegible] تھا مجھے تمہاری مصروفیات میں [illegible] نہیں۔ مجھے سخت [illegible] تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ آپ اسلام آباد کیسے گئی ہیں؟ میں نے کہا [illegible] بولا کون سی گاڑی سے؟" میں نے کہا۔ "ان فضول سوالات کا مطلب [illegible]"

"حیرت [illegible] گاڑی میں گئی ہیں یا طیارے [illegible] فضول کیا اس نے ورنہ تمہارا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ اگر اسے معلوم [illegible] کس وقت لاہور سے روانہ ہوئی تھی تو وہ وقت پوچھتا یا [illegible] فلائنگ [illegible] اسے یہ تو علم تھا کہ رضوی صاحب اسلام آباد میں ہیں [illegible] میں ان کے ساتھ اسی کی گاڑی میں گئی ہوں گی۔ اس کے [illegible] کر کے اس نے مجھے تذبذب میں مبتلا کر دیا۔ میں نے کہا تھا کیا خیال ہے میں اپنی گاڑی میں گئی ہوں تو کیا میں نے کوئی جرم کیا ہے۔ [illegible] ایسی جیب سے کیا فائدہ۔ پھر وہ بھی آپ اپنی فورس [illegible] میں تشریف لے گئے [illegible] آپ کا احسان ہو گا [illegible] کا لفظ استعمال کر کے اس نے مجھے [illegible] ایسی بات نہیں تھی جس کے لیے اسلام آباد اور [illegible] دیکھ سکتا تھا یا تم سے پوچھ سکتا تھا کہ گاڑی کہاں ہے یا نہیں [illegible] ہی گیا ہو گا اور گاڑی کے متعلق تم نے یہی کہا ہو گا کہ رابعہ لے گئی ہے [illegible] کر دیا تھا کیا؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے کہا: "پہلے یہ بتاؤ کہ کیا جواب دیا تھا؟"

"میں نے کہہ دیا تھا کہ سکندر صاحب کا بیان بالکل ٹھیک ہے۔ اپنی گاڑی ساتھ لائی ہوں۔" وہ بولی۔

میں نے قہقہہ مارا۔ "بیچارہ [illegible] سے اقرار کرنے [illegible] تھا۔ اسے سخت صدمہ ہوا ہو گا۔"

"[illegible] لگتا ٹھیک ہے وکیل صاحب! آپ بھی پہنچی ہوئی چیز ہیں۔ ہم کو بتا جاتے ہیں سمجھتے ہیں۔" رابعہ ہنسی۔

"[illegible] کہانی طویل ہے۔ بقلم خود حاضر ہو کے سناؤں گا۔" میں نے [illegible] ایک [illegible] اخلاق بولی بولی۔ میں نے ایک [illegible] بتا بعوث یہ تھا کہ کل رات کی [illegible] بعد ان کا کام سے [illegible] آنسو بہتے ہیں۔" [illegible] انکل کے نیلی فون کال آئے گا تو سب معلوم ہو جائے گا۔" وہ ہنسی [illegible] بات پکی سمجھو۔"

"میں کیا ہی دو مردوں کو کیا تک پہنچ سکے۔" میں نے [illegible] سانس لے کر کہا [illegible]

میرا اور حسن کی دال۔ وہ ہنسی اور فون بند ہو گیا۔ اس کے بعد میں [illegible] وہ سب کچھ دیکھا جو بار بار [illegible] دیکھ چکا تھا۔ رات کے بجے میں ساڑھے سات بجے راولپنڈی پہنچا۔ اسلام آباد پہنچتے پہنچتے مجھے نو بج گئے۔ جب میں مسز شیرازی کی خدمت میں حاضر ہوا اور [illegible] حالات دیکھ کر مجھے اقبال کا یہ مصرعہ یاد آیا۔ وہ [illegible] بالکل [illegible] تھیں حالانکہ جب میں نے ان کو گزشتہ بار دیکھا تھا تو عمر ان کے باوجود [illegible] حسن [illegible] آتی تھیں۔ ان کا رنگ سب میں نے جوانی میں بھی دیکھا تھا [illegible] ان کا نقش [illegible] تھی بعد وہاں جو نقش [illegible] تھی [illegible] حسین [illegible] تعمیرات [illegible] کو کھا گیا [illegible] ہو گئی ہوئی کھال اور رنگ [illegible] کے سوا کچھ نہ تھا۔ [illegible] ہاتھ میں نے لیا۔

"میں تو کچھ نہیں، تم خفا ہو مجھ سے؟" انھوں نے آہستہ سے مسکرا کے کہا۔

"[illegible] آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں [illegible] منتظر کرنے کے لیے؟" میں نے کہا۔ "[illegible] اور محسن میں کوئی فرق ہے؟" میں نے تو آپ کو ہمیشہ ماں کے روپ میں دیکھا ہے [illegible] ایسے کرتی ہیں! ... میں نے آپ کو بہت دکھ پہنچایا ہے اور آپ [illegible] معافی مجھے مانگنی ہے آپ سے۔"

"مجھے [illegible] شکایت نہیں بیٹا!" انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ "خدا تمہیں [illegible] رکھے۔"

"مجھے [illegible] کی بیماری کی خبر [illegible] ہے کی بھی؟" میں نے کہا۔

"[illegible] پہلے تم بتاؤ [illegible] کہاں ہو؟" شیرازی صاحب نے [illegible] کہا [illegible] وہ دیکھ رہے تھے [illegible] تم [illegible] غالب رہا تو سب [illegible] سے بیگم نے [illegible] سلامت [illegible] افسردہ [illegible] اس کا ایک ہاتھ محسن کے کندھے پر تھا [illegible] تھا۔ انکل [illegible] تک ان دونوں کو دیکھ رہے تھے [illegible] محسن کا معاملہ بھی ٹھیک ہے اور [illegible]

[illegible] بالکل [illegible] زبان [illegible] بغیر ایسے محسن سے مفاہمت کا معاملہ کر لیا ہے اور یہ [illegible] دنیاداری کی نظامی [illegible] سے کہیں زیادہ پُرتقدس ہے اور صرف ان جذبوں کا امین ہے جو انسانی معصوم رشتے اور پاکیزہ ہوتے ہیں جیسا جو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ نسبت طے ہو چکی ہے اور انھیں آئینہ کے سامنے نہیں آنا چاہیے اور شہلا کو ان لوگوں کی موجودگی میں اپنے شکریہ کے لیے پر ہاتھ رکھ کے برتری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ منظر اتنا دلکش اور دلنواز تھا کہ میں کوئی عظیم مصور ہوتا تو اس خوبصورت لمحے کو ہمیشہ کے لیے تصویر میں اتار لیتا اور حسن و عشق کی یہ تصویر بھی مونا لیزا کی مسکراہٹ کی طرح لافانی ہو جاتی۔ دیکھنے والے اس کے سامنے کھڑے ہو کر سوچتے کہ ان کے دل محبت کے جذبات کی عظمت، پاکیزگی اور سچائی کے احساس سے معمور ہو جاتے۔ جب میں اٹھا تو منظر بدل گیا، لیکن اس تصویر کا نقش میرے تصور میں باقی رہا اور لازوال ہو گیا۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے رضوی صاحب کے سامنے اعتراف کیا کہ میں نے جو واقعات ان کو سنائے تھے وہ ان میں زیب داستان کے لیے کچھ بڑھا بھی دیا تھا غلط فہمی کے باعث مصوری کی حد تک [illegible] تھی لیکن جھوٹ بالکل نہیں ہوتی اور ان کے [illegible] بفضل خدا لٹنے کا [illegible] صحیح سلامت ہی ہیں۔

جب انکل حضرات ہم لوگوں کی نامعقولیت پر تبصرے کے بعد تشریف لے گئے تو میں نے محسن اور رابعہ کو ان کی عدم موجودگی میں پیش آنے والے واقعات تفصیل سے سنائے۔ شہلا چاہتی ہے جیسے محفل سے غیر حاضر رہیں، اس کا احتمال ہو گا کہ آگے چل کے بعد ہم سب اس کا ہی ذکر کریں گے۔ محسن نے مجھ سے آنکھ ماری کیا اثر ہو گا اس کا؟ "ساتھ شامل ہے کہ شہلا کو پریشان کرنے پر آئے تو اس سے بعید نہیں۔ شہلا سے کہا سادہ لوح لڑکی تھی۔ بہت زیادہ ذہین اور حاضر جواب اور مذاق میں تیز طرار کہ اپنی زبان سے برابر کا مقابلہ کر سکے۔ محسن نے بالآخر اعتراف کیا کہ جو کچھ ہوا اس کی مرضی سے تو نہیں ہوا لیکن اس کی خواہش کے عین مطابق ہوا۔

"شہلا نے اپنی خدمت گزاری اور سعادت مندی اور شرافت سے بالآخر آئی کا دل جیت لیا ہے۔" رابعہ نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ "فوزیہ نے تو بہت پہلے ہی شہلا کو پسند کر لیا تھا۔ قسمت ہے جو سب سے پہلے ان کی ماں سے بات کرائی گئی تھی اب کسی جاننے کی ضرورت نہیں۔ خدا نے گھر بیٹھے وہ سب بھیج دیا ہے آپ کے لیے کہ اس جیسی دوسری چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔"

"رات کو بتایا ہے لے کر ڈھونڈنے سے۔" میں نے کہا: "دن میں عینک لگا کے تلاش کرنے سے بھی نہیں ملے گی۔"

رابعہ نے اس بے محل، بے حس انداز پر مجھے گھور کے دیکھا۔ "کیا دوسرے میں یہ فوزیہ سے تمیز خلاف ضابطہ قرار دی جاتی ہے؟"

"لیکن وہ دوسری تو تم خود شہلا تھی۔" میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا: "جو ہم نے ابھی بیٹیاں برداشت کی تھی کیوں محسن؟"

رابعہ کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے لال پڑ گیا۔ وہ بھول گئی کہ میں نے پہلے خبر دے رکھی ہے کہ کیوں دیکھے پہلے ملی تھی۔

"یہ تو ہے۔" محسن مسکرایا۔ "مگر فوزیہ کی بات خود ان کے دل کی بات تھی

لیکن انھوں نے کہا کہ وہ شہلا کی مرضی بھی جاننا چاہتی ہیں۔ اگر اس کے والدین ہوتے تو ان کی مرضی معلوم کی جاتی اور وہ زبردستی بھی کرتے تو یہ ان کا حق تھا لیکن وہ بے ماں باپ کی بچی یہاں ایک طرح سے ہماری پناہ میں ہے۔ خود ہم نے اپنی طرف سے قوی امکان ظاہر کیا تھا کہ شہلا انکار نہیں کرے گی مگر بعد میں انھی نے شہلا سے دریافت کیا۔ شہلا نے سر جھکا کے کہہ دیا کہ آپ ہی میرا اپنا تو اس دنیا میں کوئی نہیں، جو کچھ ہیں آپ ہیں۔ میں بالکل راضی ہوں۔ رابعہ باجی ہیں اور سکندر بھائی ہیں۔ یہی میرا خاندان ہے اور یہ جو بھی فیصلہ کریں گے تو میں قبول کر لوں گی۔ اس نے بابا سے کہا ان بزرگوں کا ایک خصوصی اجلاس طلب کیا گیا جو بیاہ شادی کمیٹی کا اجلاس تھا۔

"محبت کی رکنیت کا اعزاز مجھے بھی بخشا گیا۔" رابعہ نے کہا۔ "یہ تو مجھے میاں محسن خان شیرانی کی حیثیت سرپرست کے اگر میں یہ رشتہ قبول نہ کرتی تو انجام آپ کا دیکھا ہوا تھا جو کچھ ہوا... لیکن میں نے کہا کہ اگر یہ لڑکا ہے تو کچھ برا نہیں، مگر یہ جلنے کا راز راست ہے، جیسا کہ بات بچی ہوتی ہے۔ سب میں ایک بڑا لطیفہ پیش آیا۔ انکل شیرانی نے اعلان کیا کہ سب سے پہلے سیٹھ کا کہنا ہے کہ اگر سکندر مان جاتا تو اچھا تھا اس کی رائے بھی معلوم کر لیجیے۔ انکل رضوی نے مجھے ڈانٹا کہ اس حساس معقول کی کیا مجال کہ جو ہمارے فیصلے سے اختلاف کرے لیکن محسن سے بہرحال پوچھ لینا چاہیے۔ اس پر انکل شیرانی نے بھی مجھے ڈانٹ کر کہا اس نامعقول کی کیا مجال جو ہمارے فیصلے سے اختلاف کرے۔ ہر طرف سے خصوصیت میں یہی سب جو تیر کی طرح تھی۔ مجھے بلا وجہ ڈانٹا جا سکتا تھا۔ وہ ہم سب کے ساتھ تھی۔ دراصل اسے معلوم ہے کیا تھی؟" اس نے ہماری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "دونوں انکل ابھی فرق جاننے تھے کہ محسن اور شہلا کیا چاہتے ہیں اور سو یہ بات ہے کہ یہاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔"

"اور اب ایک اور اجلاس ہوگا شادی کی کمیٹی کا۔" محسن نے کہا۔ "جس میں دوسرا اجلاس بھی ہوگا لیکن اس کا سب سے جو تیر کی طرح ہوگا یہ کہ اسد......"

"فی الحال کوئی اجلاس درپیش نہیں ہے، یا پہلے مسز شیرانی کا اسد، ایک پیالی کی درخواست۔" رابعہ نے اٹھتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی۔

"عقلمندوں نے کہا ہے کہ عورت کی نا کو اس کی ہاں سمجھنا چاہیے۔" محسن نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

"بالکل ٹھیک کہا ہے عقلمندوں نے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"لیکن افسوس کہ شہلا نے ہاں کر دیا۔ مجبوری ہے بے چارے کی۔"

"جب تیار وقت آئے گا کیسی ہاں۔۔۔ ہم" محسن نے تکیے سے مجھ پر حملہ کیا۔

"تو دیکھیں گے کہ دلہن والا کتنی ہے یا نا۔"

"خان صاحب!" میں نے اپنے تکیے سے جوابی کارروائی کی۔ "اس نے انکار کیا تو میں دلہن کو قاضی سمیت لے کر اغوا کر کے لے جاؤں گا جیسے پرتھوی راج نے سوئمبر سے سنجوگتا کو اٹھا لیا تھا۔"

☸

شہلا کو رہیا چھوڑنے کے بعد سب اگلے دن لاہور سے واپس ہوئے۔ مسز شیرانی کی طبیعت کچھ افسردہ ضرور تھی لیکن یہ وقتی کیفیت تھی۔ یہ خیال کہ ان کے

ذہن میں بھی آیا ہوگا کہ شاید ان سب لوگوں سے دور جا رہی ہے بالکل فطری تھا۔ اس خیال کا اظہار بھی کسی نے نہیں کیا [illegible] طور پر یہی اسی خوف کا شکار تھے کہ مسز شیرانی کو زندگی [illegible] ثابت نہ ہو۔ ڈاکٹر ان کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے جس کا یہی نکالا جا سکتا تھا کہ ان کی زندگی کے گنے چنے دن باقی رہ گئے ہیں۔ رضوی صاحب نے پولیس سے غیر حاضر نہیں رہ سکتے تھے اور ان کے مقدمات کی پیروی غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ زیر سماعت تھا اور مجھے عدالت سے صرف تین دن کے لیے [illegible] ملی تھی۔ محسن کے رکنے کے متعدد اسباب تھے۔ پہلی وجہ اس کا یہ ملا تھا کہ "بابا" یعنی اپنی ماں کو وہ کو اپنے سامنے سے ہٹا دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔ ایک ادھیڑ عمر کے دیکھ بھال کا۔ کیونکہ بے خبر [illegible] سب سے بڑی وجہ بھی یہی تھی۔ دوسری وجہ شہلا تھی جس کی ان موجودگی [illegible] گھر میں دیکھا اخلاقی، جذباتی اور معاشرتی مسائل پیدا کر سکتا تھا [illegible] جن حالات میں وہ اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

سیٹھ مجید کے قتل اور اس الزام میں مجھے ملوث کرنے کی سازش نے محسن کے علاوہ رابعہ کو بھی متفکر اور خوفزدہ کر دیا تھا۔ ان کی [illegible] تھی لیکن خوف کا اظہار انھوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ زرتاج [illegible] اور افسوسناک تھا جیرانی کی بات یہ تھی کہ مجھے اتنی جلد جمعہ کے بعد مجھے گرفتار کیا تھا وہ کوئی اور تھا اور افسوسناک اس کی موت [illegible] تائید سے ہماری قوت میں اضافہ ہوا تھا اور سب کی متفقہ رائے [illegible] کہا تھا اور صحیح استعمال کرنے پر آمادہ کیا جائے تاکہ وہ شیخ کا [illegible] دیں اور اسے حفاظت سے ہٹا کے اپنے ساتھ سید آغا تک میں بھیجیں۔ رضوی صاحب کے ہاتھ وہ مطمئن نہیں ہوئی تھی کہ سب نے زرتاج کی موت کے بعد اپنی جان بچانے کی دینی، اخلاقی اور قانونی طور پر جائز اور واضح منصوبہ [illegible] کا خیال تھا کہ شیخ کو تمام واقعات کی ان دنوں رپورٹ لکھنی چاہیے تھی۔

"اگر وہ رپورٹ میں ایک جعلساز کی دلیل پیش کرے گا اور یہ [illegible] ایک زیر تفتیش ملزم کو قتل کرنے کا ذکر کر دیتا تو شیخ پر کیا الزام آتا؟ زیادہ سے زیادہ تنبیہ کی جاتی۔" اس نے کہا۔ "مگر اس پر گھٹنا ٹیکنے کے بعد والا اعتماد پیدا نہیں ہوتا جو اس نے ایک آپ سے اس کا طلب [illegible] تھا، شیخ کی پوزیشن اور صاف ہو جاتی۔ وہ لاش کو پوسٹ مارٹم کے [illegible] وقت بھی یہ بات واضح کر سکتا تھا۔"

"تم ایک بات بھول رہی ہو۔" میں نے کہا۔ "اس وقت خیال تھا کہ مقتول زرتاج کو غیبت یعنی طور پر گیسٹ اٹھانے کا [illegible] لوگوں کو مار ڈالنے کا اور مجلے میں بند کرنے کا الزام [illegible] یہ سفید جھوٹ تھا جو اس نے خود ساختہ کہانی بنانے کو نکال کے [illegible] بولا تھا۔ شیخ پریشان ہو گیا تھا کیونکہ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ جھوٹ [illegible] سمجھتا تو وہ سنگین الزامات میں ملوث ہو جاتا۔ [illegible]

زرتاج کی لاش سے اپنی لاتعلقی کا ثبوت فراہم کر چکے تھے اور ظاہر ہے اس کے سیاق و سباق میں کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ میری بات نے رابعہ کو خاموش کر دیا تھا لیکن قائل نہیں کیا تھا۔

معاملات عجیب صورت اختیار کرتے جا رہے تھے اور اس کا خیال تھا کہ اس قسم کے حالات جتنے زیادہ ہوں گے اتنے ہی خطرات زیادہ ہوں گے، اور یہ امکانات بڑھتے جائیں گے کہ نادانستگی میں ہم سے کوئی حماقت سرزد ہو جائے۔ جنگ میں خود کو دشمن سے زیادہ چالاک اور طاقتور سمجھنے والا اکثر مارا جاتا ہے، خواہ وہ ذہن میں حقیقت پسندی کیوں نہ ہو۔ میں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا تھا۔ اب ضرورت اس کی تھی کہ قتل کے مقدمے کی سماعت فوراً شروع ہو جانی چاہیے۔ اصل قاتل کا سراغ ملنے نہ ملے استغاثہ کے دونوں بنیادی گواہ رشید اور عبدل مارے جا چکے تھے اور ان میں سے ایک یعنی عبدل نے مرتے وقت جو بیان دیا تھا اس میں مجھے قتل کے الزام سے بری الذمہ قرار دیا گیا تھا۔ اس بیان کا ایک ٹیپ سب انسپکٹر زمان صاحب نے زرتاج کے فلیٹ سے برآمد کیا اور ریکارڈ میں رکھوا دیا تھا تو دوسرا اخبار کے مدیر لطیف اپنے ساتھ لے کر غائب ہو گئے تھے مگر مجھے یقین تھا کہ وقت پڑنے پر اصل مدیر بالائی ذہن کی طرح اچانک نمودار ہو جائے گا اور عدالت کے سامنے اصل ٹیپ پیش کر کے سب کو حیران کر دے گا۔ عدالت کی نائب کی تحریر کے ہاتھ کا لکھا ہوا بیان موجود ہے۔ جب ٹیپ ہوگا اور اکرم شیخ گواہی ہوگی تو کیس میرے خلاف کیا ہوگا؟

سفر کے آغاز میں تو موسم بہت خوشگوار تھا لیکن ہم سب خاموش تھے اور اپنے اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے تھے۔ باہر اونچے نیچے پہاڑی سلسلے تھے اور زرد مٹی کے ٹیلے جن پر کیکر اور جھاڑیاں بھی اُگی تھیں۔ ہوا چلتے ہوئے کہیں کہیں گہری کھائی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ جیسے ٹرپ وہاں لڑکا بیٹا تجربہ ملاقہ گوجرخان سے آگے جہلم تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ جنگل کا بہاؤ ہی سڑکوں کے اوپر سے گزر کر اور ہم نے سیکڑوں فٹ نیچے ترائی کو دیکھ کر یہ جنگل کے سرے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے پھر بری ہوئی سڑک کا راستہ جدا ہو گیا اور کار ہماری راستوں پر تھی۔ کافی دیر ہماری نالوں کے پل عبور کرتی وہ بارہ میل سے آگے قتل کی بستی کے بعد جہلم کا علاقہ کی ہریالی شروع ہوئی سرسبز و شاداب کی شادابی اور لہلہاتے کھیتوں کی جگہ جنگل کا استقبال کیا۔ تقریباً نصف راستہ طے کرنے کے بعد رضوی صاحب نے گاڑی روکی اور ہم نے ایک روڈ سائیڈ ریسٹورنٹ میں چائے پی۔ لاہور اب اتنی ہی دور تھا۔

دوبارہ سفر شروع ہوا تو رضوی صاحب پیچھے چلے گئے اور ڈرائیونگ محسن کو دے دی۔ تقریباً دس منٹ تک وہ پائپ کے کش لیتے رہے اور باہر دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے اچانک کہا۔ "مجھے معلوم ہوا تھا کہ سیٹھ مجید کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس کی لاش کا نصف حصہ یعنی دھڑ آرام شیخ نے دریا کے کنارے سرکنڈوں میں چھپا دیا تھا۔ تم کو شیخ نے کچھ بتایا تو ہو گا، قتل کے محرکات کیا ہو سکتے ہیں؟"

"اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس نے جعلسازی کے بیان کا ٹیپ غائب کیا تھا۔ بعد میں اس نے ٹیپ کے بدلے بہت بڑی رقم مانگی۔ اور اس نے زرتاج کی غلطی سے کہ ٹیپ کی نقل بنالی۔" میں نے اُن کو مختصر آ وہ تمام واقعات سنائے جو انکل کی غیر حاضری میں پیش آئے تھے۔ میں کس طرح عیسی نے دن مجید کے ساتھ جا کے اس کے بھائی کے گھر کا نقشہ دیکھا تھا اور کیسے مجھے منت خان رضا صاحب کی زبانی دیگر تفصیلات کا علم ہوا تھا۔ لیکن اب سیٹھ مجید کے بچے، اصل ٹیپ اور روزنامہ "صداقت" کے مدیر کہاں ہیں؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔" وہ بڑے دھیان سے سنتے رہے اور پائپ کے کش لیتے رہے۔

"گویا اس قتل کا براہِ راست تمھارے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے کوئی تعلق ضرور ہے؟" انھوں نے کہا۔ "کون ہو سکتے ہیں وہ لوگ جن پر قتل کا شبہہ کیا جا سکتا ہے؟"

"آپ اُن لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہیں انکل!" میں نے کہا۔ "یہ لوگ مجھے بے ضرورت کا قاتل ثابت کرنا چاہتے تھے۔ سیٹھ مجید کی بے وقوفی نے ان کے عزائم کو ناکامی کے اندیشے میں مبتلا کر دیا۔"

"اور ان لوگوں نے صرف سیٹھ مجید اور اس کی بیوی کے قتل کو کافی سمجھا؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "تمھیں اس الزام میں ملوث کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی، حالانکہ وہ بہت چالاک قسم کے لوگ ہیں۔ آسانی سے کر سکتے تھے کہ سیٹھ مجید کو مار کے اس کی لاش تمھارے قریب کہیں یعنی میرے گھر میں ڈال جاتے یا تمھارے کچھ چیزیں وہاں ڈال دیتے جہاں لاش ملی تھی۔"

رضوی صاحب کے ذہن ایک تجربہ کار پولیس افسر کی طرح صحیح خطوط پر سوچ رہا تھا لیکن میں نے ان سے کہا تھا کہ دشمنوں نے تو بڑی زبردست چال چلی تھی میرے ساتھ اور مجھے سیٹھ مجید کے قتل کے جرم میں گرفتار کرانے کا پورا بندوبست بھی کر رکھا تھا، مگر خدا نے مجھے بچا لیا اور ان کی چال ناکام ہو گئی۔

"دیکھو نا! سیٹھ مجید تمھارا دشمن تھا۔" انھوں نے مجھے خاموش دیکھ کے کہا۔ "یہ بات عدالت کے ریکارڈ پر بھی ہے۔ اگرچہ دشمنی کے اسباب معلوم نہیں لیکن تم نے اور شیخ نے اس پر ٹیپ غائب کرنے کا الزام لگایا تھا۔ اس نے تم پر تشدد بھی کیا تھا اور تم سے اعتراف جرم بھی کرا لیا۔ محسن کو شک تھا کہ تم اس جرم میں ملوث کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے۔"

"انھوں نے کوشش تو کی تھی انکل!" میں نے کہا۔ "عصمت خان کے گھر دن صبح سیٹھ آ پہنچا تھا، یہ پوچھنے کہ گزشتہ شب میں کہاں تھا۔"

"اور یہ اتفاق ہے کہ اس رات تم عبدالغفور منظر ایڈووکیٹ کے گھر سوئے تھے۔" رضوی صاحب نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ کہا جائے گا کہ ایڈووکیٹ صاحب اس بات کے گواہ ہیں تو زیادہ صحیح ہوگا۔ ان کا بیان نہ ہوتا تو پولیس تمھیں یقیناً گرفتار کر کے لے جاتی اور قتل کی ایف آئی آر میں تمھارا نام ضرور آتا۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے سیٹھ مجید کو قتل کیا، لیکن عبدالغفور منظر نے جھوٹا بیان دے کر مجھے بچا لیا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔" انھوں نے کچھ سوچ کے کہا۔ "قتل تو تم نہیں کر سکتے لیکن

تمہارے دوست بھی تم سے کم نہیں۔ تمہیں ہر الزام سے بچا لیتے ہیں۔"

"اگر مجھ جیسے انسان کو بچانے کی خاطر وہ جھوٹ بولتے بھی ہیں تو کیا غلط کرتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "جس دنیا میں آپ رہتے ہیں انکل! اس میں کتنے ہی جھوٹ لوگ بولتے ہیں۔ آپ کا تجربہ میری عمر سے زیادہ ہے۔"

"میں ساری دنیا کی بات نہیں کر رہا تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "تم مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟ یا تمہیں اندیشہ ہے کہ اب جھوٹ اور سچ کے فرق کو سمجھنے کی صلاحیت مجھ میں معدوم ہو چلی اور حقائق کا تجزیہ نہیں کر سکتا ہوں جب کہ مجھے بھی یہ عزم ہے کہ تم کو ان لوگوں کے حوالے کر دوں گا جو تمہاری جان کے دشمن ہیں اور ہر قیمت پر تمہیں ختم کر دینا چاہتے ہیں تاکہ ان کے مذموم عزائم کی تکمیل ہو سکے۔"

"میں سمجھتا ہوں، اب تک مجھے سب سے زیادہ تحفظ خدا کے بعد آپ نے ہی فراہم کیا ہے۔ رابعہ کو بھی نہیں، رابعہ کو بھی اور شہلا کو بھی آپ نے نہ صرف میری وجہ سے اپنے گھر میں جگہ دی، اپنے خاندان کا ایک فرد بنا کے رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"اور اس کے باوجود تم مجھے ہی وہ بات نہیں بتاتے ہو جو تم شاید رابعہ کو اور شہلا کو بتا چکے ہو؟"

میں مجبور ہو گیا۔ میں نے اُن کو میر جعفر کی لاش کے ملنے سے اس کار ملنے تک کی تمام روداد سنا دی۔ یہ بھی بتا دیا کہ میں نے کس طرح اپنی جان چھڑانے کے لیے وہ سر انسپکشن کے لیے آنے والے انسپکٹر کے بیگ میں ڈال دیا تھا اور اس نے سر کرکٹ گراؤنڈ کے اس مصیبت سے جان کا حاصل کیا۔ گاڑی کو میں نے ڈینٹ پینٹ کے لیے دے رکھا تھا چنانچہ حشمت خان کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اپنے بیان میں، میں نے استاد بیدو کی گرفتاری کا اور اس کے زندہ ثابت ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں نے گھر پہنچنے کے بعد گاڑی میں سر پڑا دیکھا تھا اور فوراً سمجھ گیا تھا کہ اس حرکت کا مقصد کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد میں نے وہی کیا جو میری عقل میں آیا۔

رضوی صاحب نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا لیکن اُن کا موڈ بتاتا تھا کہ وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اُن کی زندگی میں آزمائش کا ایسا دور کبھی نہیں آیا تھا۔ اگر وہ فرض کو مقدم سمجھتے تو اسی وقت مجھے پولیس کے حوالے کر دیتے لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ مجھ پر صریحاً ظلم ہو گا۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو ہر طرح سے مجھے اپنی سازش کے جال میں گرفتار کرنے پر تلے بیٹھے تھے اور اپنی طاقت اور اپنے وسائل کے بل پر ایسے حالات پیدا کر رہے تھے اور جھوٹی شہادتیں جمع کر رہے تھے تاکہ مجھے تختۂ دار تک پہنچا سکیں۔ یہی نہیں وہ بالواسطہ بھی میری زندگی پر قاتلانہ وار آزما چکے تھے۔ اگر رضوی صاحب یہ سب کچھ جانتے کے بعد صرف قانون کو دیکھتے تو انہی کی مدد کرتے جو صفِ دشمناں میں شامل تھے اور خود کو اتنا بڑا شکاری سمجھتے تھے کہ نظامِ انصاف تک کو شکار کرنے کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ انہوں نے بچپن سے مجھے دیکھا تھا۔ وہ میری فطرت کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے

اور اب میرے باپ کی جگہ تھے۔ انہیں وزیر خان کے حالات کا بھی علم ہو چکا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ اب وہ مجھے بھی ان سفاک درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے جو وزیر خان کے قاتل تھے۔ اگر میں ان کی نظر میں مجرم ہوتا تو شاید وہ کسی جذباتی رشتے کا لحاظ نہ کرتے لیکن ان کو یقین تھا کہ غلط طریقے سے ہی سہی میں جو کچھ کر رہا ہوں اپنے دفاع میں کر رہا ہوں۔

رضوی صاحب کی بیگم اگر ایک پولیس افسر کی رفاقت کی عادی نہ ہوتیں تو ہماری باتوں سے یقیناً دہشت زدہ ہو جاتیں لیکن ان کے تو تجربے میں ایسے واقعات کم نہیں تھے۔ رابعہ کچھ پریشان ہو گئی کہ کہیں میرے منہ سے کوئی غلط بات نہ نکل جائے اور میں اس ذہنی کشمکش سے دوچار تھا کہ کہیں میری مسلسل خاموشی کے باعث رضوی صاحب کا عقل کا فیصلہ میری توقعات کے برعکس نہ ہو جائے کیونکہ حقیقت کو ان کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تو میں مجرم تھا اور میرا یہ اقدام قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینے کے مترادف تھا۔ ہم گوجرانوالہ کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور وہ سڑک ابھی تک اتنی کشادہ نہیں تھی جتنی نقشے پر دکھائی گئی تھی۔ میں نے ایک ٹرک کو اوورٹیک کرنے کی کوشش کی جو تقریباً سڑک کے وسط میں تھا اور اس پر بھاری سامان لدا ہوا تھا۔ بالکل میں نے رفتار بڑھائی اور دوسری جانب سے نکلنے کی کوشش کی لیکن اسی وقت سامنے سے دوسرا ٹرک نمودار ہوا جو انتہائی تیز رفتاری سے ہماری طرف آ رہا تھا۔ حالانکہ اوورٹیک کرنے سے پہلے میں نے اطمینان کر لیا تھا کہ سڑک خالی ہے اور تین گاڑیاں آگے نکل کر سامنے سے ہو جاؤں۔ اس غیر متوقع صورت حال نے مجھے نروس کیا لیکن ڈرائیونگ کرتے ہوئے یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہوتی۔ پریشانی میں اس وقت ہوا جب میں نے بریک لگانے کی کوشش کی اور بریک نہیں تھے۔ بریک پیڈل گاڑی کے فرش سے جا لگا لیکن اس کی رفتار کم نہیں ہوئی۔ بریک فیل نہ ہوتے تو میں بہ آسانی رفتار کو کنٹرول کر کے دوبارہ ٹرک کے پیچھے ہو جاتا لیکن اب یہ ممکن نہیں رہی تھی۔

اس خطرناک صورت حال میں بھی میرے اوسان خطا نہیں ہوئے۔ میں نے چلا کر کہا۔ "انکل! بریک فیل ہو گئے ہیں۔" اور اسی وقت ساتھ ہی میں نے انجن کو ٹاپ گیئر سے دوسرے گیئر میں ڈالا۔ گاڑی نے ایک زبردست جھٹکا لیا اور اس کا انجن احتجاج کرتے ہوئے غرایا۔ رفتار میں نمایاں کمی آئی اور دوسرا والا ٹرک تھوڑا سا آگے ہو گیا اس کے باوجود پہلے ٹرک کی لائن میں آنا مشکل تھا۔ لمبے لمبے سریے انتہائی خطرناک طریقے سے ٹرک کی باڈی سے بہت پیچھے تک نکلے ہوئے تھے اور میں گاڑی کو ذرا سا بھی موڑتا تو سریے ونڈ اسکرین کو توڑتے، گاڑی کی باڈی میں سوراخ کرتے اور گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی زخمی کرتے۔ دوسری طرف سامنے سے آنے والا ٹرک بہت نزدیک آ گیا تھا لیکن ابھی تک اس کا ڈرائیور یہ اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ ہماری گاڑی کے بریک فیل ہو گئے ہیں۔ اس نے تو مجھے کوئی سر پھرا اور جوشیلا نوجوان سمجھا ہو گا جو کسی طرح

کی جان کی پروا کیے بغیر یوں گاڑی چلاتے ہیں جیسے وہ زمین پر نہیں ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ اس نے مجھے نئے ہی وقعت تصور کیا ہو گا وہ منہ کا مسئلہ کر رہا تھا، سامنے آنا خودکشی کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ اس نے ارادتاً ونڈو سے سر نکال کے بجلی کی سی پھرتی سے راستہ دینے کو کہا۔ بالکل آخری لمحے میں میں نے اسٹیئرنگ کو بائیں جانب کاٹ دیا اور گاڑی تقریباً نوے ڈگری کے زاویے پر گھوم گئی۔ پکی سڑک سے اتر کے نیچے کچی میں جا رہے تھے میری ساری توجہ اور جدوجہد گاڑی کا توازن برقرار رکھنے پر صرف ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے ایک چیخ کی سی رگڑ کی آواز سنی جو گاڑی کے پچھلے حصے سے آئی تھی۔ بعد میں نیچے اتر کے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ موت ہمارے کتنے قریب سے گزری تھی۔ گاڑی کا پچھلا حصہ ٹرک سے مس ہو کر نکل گیا تھا۔ فوری طور پر میں نے گاڑی کا انجن بند کیا اور بالکل آخری لمحے میں گاڑی کو ایک گڑھے میں گر کر الٹنے سے بچانے کی دیوانہ وار کوشش میں ہینڈ بریک لگا دیا۔ گاڑی کے اگلے حصے کے کنارے کا کچھ نقصان ہوا لیکن گاڑی الٹی نہیں۔ وہ ایک کھمبے سے ٹکرا گئی۔ اس وقت تک گاڑی کی رفتار اتنی کم ہو چکی تھی کہ تصادم نے صرف گاڑی کے سامنے والے حصے کو تباہ کیا۔ بمپر اور بونٹ بالکل درمیان سے اندر گھس گئے لیکن ونڈ اسکرین اور ہیڈ لائٹس کو

کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ دوسرے لوگوں کو خبردار کرنے کے بعد جو وقت میں نے اپنی اور اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی بچانے میں صرف کیا تھا وہ مشکل سے آدھا منٹ ہو گا۔ اس آدھے منٹ میں کس نے مجھ سے کیا کہا اور میں نے کیا جواب دیا، کس کس نے دہشت زدہ ہو کے چیخ ماری اور کون کس پر گرا، یہ سب نہ میں نے دیکھا نہ سنا۔ آدھے منٹ کی اس جدوجہد کی کامیابی کے بعد گاڑی آخری جھٹکے کے ساتھ رکی اور اس کا انجن بند ہو گیا تو میں نے نڈھال ہو کے اپنا سر اسٹیئرنگ پر رکھ دیا۔ ذہنی اور جسمانی طور پر میں اتنا تھک گیا تھا جیسے میں نے مسلسل چوبیس گھنٹے گاڑی چلائی ہو۔

کچھ دیر بعد مجھے ہوش آیا تو میں نے انکل رضوی کی آواز سنی۔ وہ میرے شانے پر تھپکی دے رہے تھے۔ "بیٹے سکندر! ہوش میں آؤ۔ شاباش! تم نے سب کو بچا لیا ہے سکندر! تم نے تو کمال کر دیا ہے بیٹے!"

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو مجھے بہت سے چہرے دکھائی دیے۔ ان میں رابعہ کا چہرہ تھا جو خوف سے سفید پڑ گیا تھا لیکن وہ مسکرا رہی تھی میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اسے مجھ پر کتنا فخر ہے۔ میں نے شہلا کو دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ میں اعتماد کا غرور تھا۔ بچوں کو خطرے کی سنگینی کا کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا اور وہ صرف جھٹکے لگنے سے خوف زدہ ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ خوف زدہ بیگم رضوی تھیں۔ جواب نے تجھے کو دو دل

انکا
اقبال
غلام روحیں
ڈاک خرچ: ــــــ روپے فی حصہ
دو حصے مکمل ۱۲۰ روپے فی حصہ
دو حصے مکمل ۱۲۰ روپے فی حصہ
قیمت: ۱۵ روپے ڈاک خرچ روپے

www.urdusociety.com

ہاتھوں سے اپنے قریب کے کھڑی تھیں۔ سڑک پر کچھ گاڑیاں رک گئی تھیں اور بہت سے لوگ مدد کے لیے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ وہ سڑک جس نے گاڑی کے پچھلے حصے کو چھوا تھا انجینئر کے سینے سے بالکل لگ گیا تھا۔

"کسی کے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" میں نے محسن سے کہا اور دروازہ کھول کے باہر نکلا۔

"خدا کا شکر ہے کہ سب خیریت سے ہیں۔" [illegible] تیرا کمال ہے سکندر اور نہ مجھے تو تصادم سے بچنے [illegible]

بعد میں سب نے فوراً [illegible] میری حاضر [illegible] فیصلے اور قوت ارادی کا اعتراف کیا اور خود میں نے گاڑی [illegible] دیکھا تو مجھے یقین نہ آیا کہ [illegible] سے ایک سیکنڈ کے ہزارویں [illegible] نہیں ہو جاتی تو ٹرک اپنی پوری قوت کے ساتھ گاڑی کے دونوں [illegible] سے ٹکراتا اور اسے یوں کھینچتا ہوا لے جاتا جیسے کوئی کھلونا [illegible] اپنے خون میں [illegible] کر لے جاتا ہے [illegible] تصادم کے بعد ہم میں سے کسی کا زندہ بچ جانا معجزہ ہی ہو سکتا تھا [illegible] الٹ جاتی یا کھڈ میں گر جاتی تب بھی ہمارے شدید زخمی [illegible] امکانات تھے لیکن پیچھے سے ٹکرانے سے صرف یہ نقصان ہوا تھا کہ [illegible] ٹوٹ گئی تھی۔ انجن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا مگر اب [illegible] ریڈی ایٹر کے سڑک تک [illegible] ممکن تھا۔ پانی نہ ہونے کی وجہ سے انجن گرم ہو جاتا۔

مدد کے لیے آنے والوں نے یہ کیا کہ گاڑی کی ڈگی میں سے سارا سامان نکالا اور ایک شخص [illegible] اور محسن کے سوا سب لوگوں کو اپنی گاڑی میں لاہور لے جانے پر تیار ہو گیا۔ جاتے جاتے بھی رضوی صاحب نے مجھے شاباش دی اور کہا کہ ہمیں نقصان کی بالکل فکر نہ کرو۔ خدا نے تو سب کی زندگی بچا لی ورنہ وہ خود گاڑی چلا رہے ہوتے تو [illegible] نہیں بچ سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے دو ہزار روپے بھی دیے کہ میں اور محسن کسی طرح بھی گاڑی کو ورکشاپ لے جائیں یا لاہور لے آئیں۔ ہم نے انہیں تسلی دے کر رخصت کیا اور کہا کہ وہ ہماری طرف سے مطمئن رہیں [illegible] ہم شام سے پہلے گاڑی سمیت گھر پہنچ جائیں گے۔

گاڑی کو نشیب سے سڑک تک پہنچانا بہت مشکل مرحلہ تھا لیکن مدد کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ چند [illegible] افراد نے جن میں زیادہ تر [illegible] قسم کے لوگ تھے ایک ساتھ [illegible] گاڑی کا رخ [illegible] سڑک تک لانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ فاصلہ [illegible] ہو گا لیکن سڑک تک آتے آتے ہم بری طرح ہانپنے لگے تھا۔ سب کے کپڑے پسینے میں تر تھے اور ہاتھ بھی [illegible] ہو گئے تھے۔ میں نے اور محسن نے مدد کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اب ہم باقی کام خود کر لیں گے۔ جو لوگ گاڑیاں روک کر آئے تھے وہ رخصت ہو گئے۔ صرف ایک پولیس کی گاڑی رکی رہی [illegible] کانسٹیبل [illegible] تجسس کی وجہ سے [illegible] رضوی صاحب نے [illegible] کہ وہ ہماری مدد کے بغیر نہ جائے۔ کانسٹیبل [illegible]

کہاں تھی کہ کسی اعلیٰ افسر کے حکم سے سرتابی کرتا۔ اس نے کسی ٹرک کو روک کے ایک بہت مضبوط رسی حاصل کی اور پھر خود ہی ہماری گاڑی کو اپنی گاڑی کے پیچھے باندھا۔ محسن نے ڈرائیونگ کی جگہ سنبھالی اور میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کانسٹیبل نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی گاڑی اسٹارٹ کی۔ ہماری گاڑی کا انجن بند تھا۔ [illegible] آگے بڑھی اور دونوں گاڑیاں تقریباً [illegible] آگے پیچھے [illegible] صرف ایک بار کانسٹیبل نے رفتار میں تھوڑا سا اضافہ کیا تھا [illegible] رفتار کم رکھے ورنہ اس نے بریک لگائی تو ہم [illegible] سوا کچھ نہ کر سکیں گے کہ پیچھے سے اس کی گاڑی [illegible] ٹکرا جائیں۔

میرے اعصاب پر ابھی تک حادثے کے اثرات باقی تھے اور اس منظر [illegible] تصور بھی [illegible] ثابت ہو رہا تھا جب زندگی اور موت کے درمیان وقت کا ایک سیکنڈ [illegible] رہ گئی تھی۔ موت کو میں نے اتنے قریب سے کبھی نہیں دیکھا تھا اور محسن کی طرح اب مجھے بھی یقین نہیں آتا تھا کہ صرف میری کوشش سے ایک نہیں کئی خاندان تباہ ہونے سے بچ گئے تھے۔ ایک خاندان تو رضوی صاحب کا تھا، دوسرا محسن کا خاندان تھا۔ اس کی [illegible] اور [illegible] بہت جلد ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہونے والی تھی۔ محسن [illegible] بوڑھے والدین اس صدمے سے مر جاتے۔ پھر اس خاندان کے بطن سے جنم لینے والا دوسرا خاندان وہ تھا جس کی بنیاد شہلا اور محسن تھے۔ یہ خاندان [illegible] آنے سے قبل ہی مٹ جاتا۔ چوتھا خاندان وہ تھا جو میرا [illegible] خاندان کہلاتا۔ ابھی تو میں نے صرف خیالوں ہی میں اس کا نقش مکمل کیا تھا [illegible] اس کا خاکہ بنایا تھا اور صرف خوابوں ہی میں اس کو آباد کیا تھا [illegible] روشن ہونے والے [illegible] کے چراغ [illegible] آرزو کو ویران کر دیتا ہے [illegible] محبت [illegible] کھنڈر کر کے گزر جاتا ہے۔

محسن نے میری طرف سگریٹ بڑھائی تو مجھے احساس ہوا کہ میرا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" محسن نے کہا۔ "بس [illegible] حوصلہ تھا [illegible] میں نے [illegible] کر کے دوسری جانیں [illegible] اور ایک محسن کو [illegible]"

"بات تو مجھے کچھ نہیں ہے محسن۔" میں نے کہا۔ "نتائج کا تصور [illegible] ہے۔ کیا ہوتا اگر گاڑی [illegible] اپنی جدوجہد کا آغاز کب کیا تھا اور کہاں سے کیا تھا اور کتنے مصائب برداشت کیے۔ کہیں کہیں آزمائش سے گزرے اور کتنے بڑے دشمنوں کا مقابلہ کرتے [illegible] مسائل ختم نہیں ہوئے [illegible] دشمن کو شکست [illegible] تقدیر کی ایک [illegible] سے وہ جیت جاتے اور ہم نے جتنی جدوجہد کی تھی [illegible] رائیگاں جاتی؟"

"یہ جدوجہد بہت عظیم تھی جو تم نے [illegible] سات افراد کی زندگی بچانے کے لیے کی۔" محسن نے کہا۔ "اور [illegible] بہت پہلے ہی شکست ہو جاتی۔ [illegible]

[illegible] کی کوشش نے موت کو شکست دے دی۔"

[illegible] کوشش سے کیا ہو سکتا تھا محسن اگر [illegible] تقدیر کے مطابق [illegible] اس وقت [illegible] موت کے خلاف [illegible] ڈاکٹر [illegible] کوشش کر سکتے [illegible] ان کے پاس جتنا علم تھا تجربہ تھا اور صلاحیت تھی [illegible] انہوں نے اپنی بے بسی کا اعتراف [illegible] نہیں ٹال سکتے۔"

"یہ بڑی عجیب بات ہے۔" محسن بولا۔ "ڈاکٹروں نے [illegible] جواب دے دیا [illegible] ہسپتال [illegible] ایسے معاملات [illegible] کوئی [illegible] لوگ تھے کسی نے کہا فلاں [illegible] ہے [illegible] ڈاکٹروں [illegible] ہدایات کے مطابق عمل کر کے [illegible] زندگی [illegible] کوشش [illegible] مگر کامیابی [illegible] تجربات [illegible] بیٹی کی [illegible] روحانی [illegible] عمل [illegible] میں نے انہیں [illegible] ڈاکٹروں سے رجوع کیا یا اسپتال گئے [illegible] ایک [illegible] جن کے ہاتھ میں خدا نے شفا دی ہے [illegible] علم سے [illegible] ڈاکٹر [illegible] علاج [illegible] کیس میں [illegible] ڈاکٹر [illegible] بہت سے واقعات سنا کر [illegible] کوشش کرنے [illegible]

[illegible] ڈاکٹر تو جواب دے چکے ہیں [illegible] ڈاکٹر [illegible] اور انہوں نے [illegible] یقین اور اعتماد کے ساتھ [illegible] شفا [illegible] انسان کی عقل سے [illegible] اس وقت تک [illegible] عجیب [illegible] اس [illegible] کوئی [illegible] حالت [illegible] میں نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ اس کی حالت پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے اور [illegible] بہتر ہو رہی ہے۔ بے شک یہ معجزوں کا

زمانہ نہیں ہے لیکن کیا ہر جگہ، ہر دور میں ایسے واقعات رونما نہیں ہوتے جن کو صرف معجزہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر، حکیم، وید [illegible] جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے والے [illegible] اور [illegible] ان سب کے ایسے واقعات منسوب ہیں جب مریض کی زندگی کی امید کسی کو نہیں تھی لیکن وہ دست شفا کے باعث موت کی سرحد تک جا کے لوٹ آئے اور [illegible] عمر کو پہنچ کے مرے۔"

"یہ بات صرف ہمارے ہندوستان پاکستان کی حد تک ہی درست نہیں۔" میں نے کہا۔ "جب ہم برطانیہ میں تھے تو کیسے عجیب و غریب [illegible] میں نظر آتے تھے۔ فلاں ماہر روحانیات، [illegible] سے علاج کرنے والے [illegible] کے ذریعے جسمانی عذاب سے نجات دلانے والے، ان کے معتقد بھی ہوتے تھے اور ایسے لوگ خود پبلک کے سامنے آتے تھے جو ان لوگوں کے ہاتھوں کسی علاج [illegible] علاج [illegible] سے شفایاب ہوئے تو [illegible] وضاحت کرنے سے قاصر رہتے تھے کہ ایسا کیوں ہوا؟"

"پھر پچھلے دنوں ایک بڑی عجیب بات اور بھی ہوئی۔" محسن بولا۔ "امی نے خواب میں ایک آواز سنی۔ وہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی تھیں۔ یہ خواب انہوں نے مجھ سے بھی بیان کیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے آواز آ رہی تھی جس کی بازگشت پربت سے آ رہی تھی۔ جا تجھے تیری بیٹی کے لیے زندگی دی گئی

ایم اے راحت کے دو سنسنی خیز ناول
عمران، ناصر آفریدی اور سپر فیصل ڈاکٹر
دو تیکھے ہنگامے
طنز و مزاح سے بھرپور
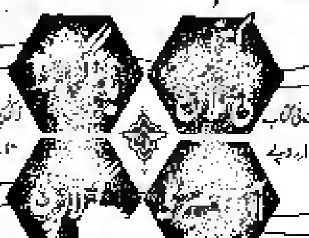
قیمت فی کتاب ۵ اروپے
قیمت فی کتاب [illegible] روپے
چاروں کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف
کتابیات پبلی کیشنز، پوسٹ بکس ۲۳ کراچی

دی اور اس کی زندگی بچی دی۔ الفاظ بالکل یہی تھے۔ کیا مطلب ہے ان کا؟"

"ہمارے ہاں کسی خواب کی تعبیر بتانے والے سے پوچھیں گے تو وہ اپنی تعلیمات کے عین مطابق یہ بتائے گا کہ یہ نئی زندگی کی بشارت ہے۔" میں نے کہا۔ "یا اسی قسم کی امید افزا باتیں کرے گا۔ نفسیات تو کہتی ہے خواب انسان کی نا آسودہ خواہشات کی تکمیل کا سامان فراہم کرتے ہیں اور انہی کا عکس ہوتے ہیں۔ چنانچہ تمہاری امی کے لاشعور میں زندہ رہنے کی جو خواہش موجود ہے، وہی خواب بن گئی۔ اب کون سچ کہتا ہے اور کون غلط، اس کا فیصلہ میں کیسے کر سکتا ہوں؟"

"فیصلہ میں بھی نہیں کر سکتا کہ خواب سچے ہوتے ہیں یا نہیں۔" محسن نے کہا۔ "لیکن امی پر اس خواب کا بڑا خوشگوار نفسیاتی اثر پڑا ہے۔ پہلے وہ مایوسی کی باتیں کرتی تھیں۔ اب کہتی ہیں میں زندہ رہوں گی۔ خدا نے مجھے زندگی کی مہلت دی ہے۔ تم سب دیکھ لینا میری بیٹی نے مجھے زندگی دی ہے۔"

"یعنی مریم باجی نے؟" میں نے کہا۔ "خواب میں انہوں نے خود کو بیمار دیکھا تھا اور مریم باجی کا انتقال جس حادثے میں ہوا تھا وہ بھی ان کے ذہن میں آیا تھا۔ یہ سب کچھ ان کے لاشعور میں......"

"نہیں۔ ان کی مراد شبنم سے ہے۔" محسن بولا۔ "پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا لیکن انہوں نے میری توجہ الفاظ کی طرف دلائی۔ تم بیٹی کے لیے زندگی دو۔ بیٹی بھی دی اور زندگی بھی دی۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ "یہ تو کمال ہو گیا۔ شبنم نے اس حد تک متاثر کیا ہے انہیں۔ ان حالات میں اگر شبنم ہی وہ نفسیاتی قوت بن جائے جو انہیں موت کے منہ سے کھینچ لائے تو کچھ عجب نہیں۔"

"معلوم نہیں کیا بات ہے سکندر! میں امی کی حالت میں موجودہ افاقے کو کسی طریقۂ علاج کی کامیابی سے منسوب نہیں کر سکتا۔" محسن نے کہا۔ "یہ ممکن ہے کہ جو تبدیلی آئی ہو وہ امی کا اعتقاد ہو، مگر تمہاری طرح میں بھی اسے اعتقاد کا کرشمہ سمجھنے پر مجبور ہوں۔ شبنم اور مہرالنساء کے لیے ان کے یقین سے دوگنا یقین تھا۔ ہم سب ان کے یقین کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی۔ یقین کی قوت سے بہت معجزے رونما ہوتے ہیں اور اسی لیے میں تمہارے ساتھ چلا آیا۔" میں نے کہا۔ "اب تو آپ ٹھیک ہو گئی ہیں۔ میں یہاں رہ کے کیا کروں گا۔ آپ کی خدمت کے لیے خدا نے آپ کو کتنی بیٹیاں دے دی ہیں۔ وہاں سکندر کے ساتھ کوئی نہیں۔" امید میں ان کے اعتقاد یا اپنے اعتماد کا اظہار تھا جو اس مرحلے پر بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اگر یہ سب میری خواہشات کا فریب ہو اور ڈاکٹروں کا فیصلہ ہی صحیح ثابت ہو تو میری بیٹی میں ان کے پاس رہ کر کیا کر لیتا۔ جب ضرورت پیش آئی پھر چلا جاؤں گا اور ان کی حسب منشا شرکت کر کے لوٹ آؤں گا۔ وہ بہرحال میری بات کا ان پر عمل بہت مثبت ہو گا اور شاید اسی وقت ہو گیا تھا جب انہوں نے کہا تھا "اچھا بیٹا اب ٹھیک ہوں، میری فکر مت کر، سکندر کا خیال رکھ۔"

بھائی اشرف پیر تک بہت زیادہ پیچیدگی پیدا ہو چکا تھا۔ ہم بالکل باتیں کرتے رہے کہ اس کوشش کر رہے تھے، پیچھے سے آنے والے تو قریب آ کے پاس سے گزر جاتے مگر...

کا سبب جان لیتے تھے اور اوور ٹیک کرنے سے پہلے احتیاط سے کام لیتے۔ لاہور کی طرف سے آنے والی بسوں اور ویگنوں سے تھا جو اس سڑک پر ایک دوسرے کے ساتھ ریس لگاتے تھے اور بعض اوقات آپس میں ٹکرا جاتے یا ٹریفک کے دوسرے کنارے تک پہنچ جاتے تھے۔ آمنے سامنے سے آنے والوں کو نہیں پہچانتا تھا، چنانچہ حادثات بھی ہو جاتے تھے۔

کالا شاہ کاکو سے آگے یہ خطرہ اور بڑھ گیا تو میں نے شوکت سے کہا۔ "شاہدرہ پہنچنے تک گاڑی کو سب سے پہلے نظر آنے والے گیراج پر روک دو۔" پانچ منٹ کے بعد ہی ہم نے سڑک سے ہٹ کر ایک جگہ سائن بورڈ دیکھا جو سڑک کے کنارے وہیں درخت کے نیچے ایک شخص ریڈیو اور ایک کی چارپائی میں بیٹھا کسی رائفل کا بلکہ قلم تھامے تھا۔ سامنے دو گاڑیاں کھڑی تھیں اور ورکشاپ کے سامنے بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ورکشاپ ایک بڑا اور سایہ دار جگہ کے علاوہ وہ کاریگر بھی نظر آ رہے تھے۔

میں نے اس سے کار کا نمبر اور پتا دے کر اسے کار مرمت کرنے کی غرض سے مطلب سمجھاتے ہوئے اپنی کار وہاں آہستہ آہستہ روک دی۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور گیراج کے مالک کو کار دکھائی۔ ایک لڑکے نے بتایا کہ استاد کہاں ہیں۔ پرویز اشرف کی کار درخت کے نیچے چار پائی پر سیدھا تھا جس کے کاندھوں پر کئی لوگوں کی طرح اس کے مطابق شفقت کا جواب تھا۔ "منیر بابو جی!" انہوں نے ہمیں پاس سے نکلتی ہوئی سیٹ کی طرف کام دکھا کر کہا۔ پھر انہوں نے آواز دے کر کہا۔ "ابے کیوں رے! ذرا دیکھ باؤ جی کی گاڑی میں کیا گڑبڑ ہے۔ تو بھی جا ساتھ اس کے پہلوان!"

جسے پہلوان قرار دیا گیا تھا وہ تیرہ چودہ برس کا لڑکا تھا جس کے سر پر لمبے لمبے بال رکھے ہوئے تھے اور آنکھوں میں سرمے کے ساتھ ساتھ ڈالا ہوا تھا۔ شاید یہ لقب اسے کبڈی کے شوق کی وجہ سے ملا ہو گا۔ پہلوان کے برعکس استاد ایک زندگی کا نمونہ تھا۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کا دبلا پتلا نوجوان تھا جس کی سانولی پیشانی پر بالوں کے کچھ لچھے بکھرے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا ہے گاڑی کو جناب عالی!" پرویز اشرف نے گاڑی کو دیکھ کر سوال کیا۔ ہم نے اپنی روداد کہی، کہانی حیرت انگیز ہی لگتی ہو گی، اور ہم سے کافی تفصیل بیان کی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ حادثے کی تفتیش کر کے ہماری امداد فراہم کرے۔

"چلو جی اب سب استاد کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے متاثر ہو کے کہا۔ "لیکن فیروز والا میں جا کر گزر جائیں گے آپ کے۔ جالی کھول کے دیکھیں پتہ لگ جائے گا، کیا خرابی ہے۔ یا مرمت سے کام چل جائے گا۔ ماشاء اللہ ماسٹر صاحب بہت جلدی چیک کر لیں گے۔ بیک سیٹ کو نیچے کرنا پڑے گا۔ جالیاں ڈھیلی ہیں ایک منٹ کا کام ہے۔"

"آپ یہ بتائیں گاڑی کا خرچہ کتنا ہو گا؟" میں نے کہا۔ "ہم آپ کو پیسے بھی دے جاتے ہیں اور کس وقت آ جائیں؟"

"دیکھو جی، اگر تو جالی تبدیل کرنی پڑی تو خرچہ ہو گا زیادہ۔ ورنہ آپ دو گھنٹے کے بعد آ جائیں۔" استاد نے کہا۔

آپ ۔۔۔ ہمیں ناشتہ کرا دیں۔" مجھے امید نہیں کہ مرمت کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "گاڑی گرم ہونے لگی تو مصیبت بنی ہے گی۔"

"جی ہاں، جیسی آپ کی مرضی۔" استاد نے کہا۔ "مگر آپ یا پانچ سو روپے تک یہ ... تین ... آپ آجائیں۔ خریدے وقت جو ہیں اور بھی کیا کام ہو رہا ہے ..."

"بڑے صاحب نے کیا کیا ہو گا؟" اس نے گاڑی کا بونٹ کھول کے ان کے ایک طرف ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ "وہ ہم بعد میں آ کے لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "پہلے گاڑی کا خیال رکھنا۔" اور سو کے پانچ نوٹ استاد جی کی نذر کیے۔ استاد جی نے دیکھا ہی نہیں اور ان کی جیب میں گئے ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ تو میری جیب میں موجود ہیں۔ ایک بار پھر انہوں نے ونڈ شیلڈ کا سارا کام اپنی نگرانی میں کرانے کے لیے ہماری بات مان لی، کیونکہ اس میں خصوصی رعایت دی جائے گی لیکن ہم جانتے تھے کہ یہ رعایت بھی محمود رضوی صاحب اپنی جیب سے ادا کریں گے۔ جب ہم کار میں تھے اور وہیں سے چلا پڑے کار کی ... دونوں جاب کے کھانے کا انتظام بھی تیار کیا تھا۔

تب مجھے ہم نے شاہدرہ چلے اپنی کار کی ٹھیک کرائی کی۔ ناشتہ کرنے کا وقت گزر چکا تھا چنانچہ ہم نے تنور کی روٹیاں کھانے کی ٹھنڈی تھیں اور انہیں احتول سے میں نے ٹھنڈی کھانے کا اتفاق کیا جو سخت طلب کا کام تھا۔ بڑا کھایا "قیمہ" چند ہڈیوں پر مشتمل تھا جن پر گوشت کے ذرات محسن نے دریافت کیے۔ دیگر اشیاء میں سب سے اہم چیز مرغ کا شوربہ تھا جو افراط میں ڈالی گئی تھیں۔ جس کو پیاز کھانے کے بعد آنکھوں سے بہنے لگے اور دو صوبائی شہر کا نوالہ سے خارج ہونے لگا۔ میں نے آنا تحمل ظاہر کیا کہ کوئی کو اس سے رہا سمجھا اور ادھر سے پانی ڈالا گیا۔

"شاید اس کا نام ہو۔" محسن بھائی، "میں نے گلو گیر لہجے میں آنکھیں پونچھ کر کہا۔ "اگ سی لگی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی ہے۔"

"یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے۔" محسن نے ارشاد کیا اور باقی جگہ خالی کر دیا۔ "اب اگر مجھے اجازت ہو تو میں جاؤں۔ کوئی بات سے سونا نصیب نہیں ہوا۔ پہلے رخصتی کا ہنگامہ رہا تھا اور سلام کرنے والا میں آ گیا۔ پھر تیمارداری اور دوڑ کا جذبہ باقی رہا تھا۔"

"مجھے افسوس ہے یار کہ میں پہلے نہیں آ سکا۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "میں آ ہی نہیں پا رہا تھا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "اب تم لوگ آ گئے تو کوئی فکر نہیں۔ تم کسی کے لیے جہانگیر کے مقبرے چلا جایا کرو۔ جو سامنے دوسرا مقبرہ سا نظر آ رہا ہے نا، وہ ہے تغیر۔ اس میں قلم تک والی دیکھ اور عشق عشق کر۔ کیا غضب ڈھایا ہے مسرت نذیر نے بھی جا کر چلا کے گلوکاری کی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے۔" اور ان مفید مشوروں کے بعد وہ ایک رکشا روک کے روانہ ہو گیا۔

میرا ارادہ قلم کیے والی دیکھ کے مسرت نذیر پر فریفتہ ہونے کا ہرگز نہیں تھا چنانچہ میں نے بڑی نیک نیتی سے مقبرہ جہانگیر کا رخ کیا تھا مگر۔ اندر کا ایسا ہی کہ بقول شاعر سے جو راہ ادھر کو جاتی ہے

متصل سے گزر کے جاتی ہے۔ میں "ایم ایز ولیم دی انٹیلیجنگ کمپلیکس" کے سامنے سے گزرا تو میری نیت بدل گئی اور میں نے سوچا کہ اتنے عرصے بعد چودھری دلاور سے ملاقات کر لینے میں کیا کوئی حرج نہیں۔ مقصد تو صرف وقت گزارنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ مجھے دیکھ کر دلاور کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ میں اطمینان سے اس کیبن تک گیا جو ریسپشن سے زیادہ چیک پوسٹ تھا۔ حسب توقع اندر وہی نوجوان شاید کسی مصنف کے تازہ ترین جاسوسی ناول میں غرق تھا۔ اگر وہ غور کرتا تو مجھے پہچان جاتا لیکن اس کے تصور میں منظر وہی رہا جہاں ہیرو نے دخل انداز کی تھی۔

"کیا کام ہے جی؟" اس نے کتاب رکھ کے کہا۔ "نام بتا دو اپنا؟"

"نام ہے سائیں علی مراد اور بھائی دلاور سے ملنا ہے۔" میں نے کہا۔ "وڈے چودھری صاحب نے بلایا تھا۔"

اس نے ایک پرچی پر "علی مراد" اور وقت ملاقات کے بعد چودھری دلاور لکھا اور مجھے پکڑا دی۔ "واپسی میں دستخط کرا کے لانا۔" اس نے دوبارہ ناول اٹھا کے اسی صفحے سے مطالعہ شروع کیا۔ میں نے پرچی گیٹ پر موجود چوکیدار کو دکھائی۔ وہ میری صورت سے آشنائی اور نام سے ناآشنائی کے باعث تھوڑے سے تذبذب کا شکار ہوا پھر اس نے طے کیا کہ پرچی ہے تو اسے کیا ضرورت ہے پریشان ہونے کی۔ اس نے مجھے اندر کر دیا۔ گیٹ پھر بند ہو گیا۔

میں نے پرچی کو گولی بنا کے اچھال دیا اور چودھری دلاور کے کمرے کی طرف بڑھا۔ ابھی ایک مرحلہ اور باقی تھا۔ پہلے دروازے سے کمرے میں قدم رکھتے ہی دلاور کے لبوں سے مذ بھیڑ ہوئی۔ اس نے مجھے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ میرا آنا مصیبت کے آنے سے کم نہیں تھا اور شاید دلاور اسے اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ میں کتنی خطرناک چیز ہوں اور کتنی گڑبڑ پھیلانے کا سبب بن چکا ہوں۔ چنانچہ وہ میری طرف لپکا۔ "سکندر صاحب! کیا بات ہے؟"

"کہاں کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "اور اگر کوئی بات ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ تمہیں بتائی جائے؟"

"چودھری صاحب کا حکم ہے... میرا مطلب ہے وہ خفا ہوں گے مجھ پر۔" وہ نروس ہو گیا۔ "میری نوکری کا تو خیال کیجیے۔"

"تمہاری نوکری برقرار رہے گی۔" میں نے کہا۔ "بلکہ ہم ترقی بھی دیں گے لیکن تم راہ میں حائل ہوئے تو ہم ایک جہانگیر ہی لگائیں گے اور نہیں تو آگے سے یوں بات کرنے کا مزہ اس وقت آئے گا جب تم تعلق نہیں رکھو گے۔ سو تم نہ ہوں فرمائیں گے۔"

مجھے اس کی مجبوری اور بے بسی پر ترس آیا۔ وہ ہاتھیوں کی جنگ میں پس جانے والے حشرات الارض سے زیادہ مظلوم تھا اور کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا سوائے اپنے۔ وہ مجھے نہ روک سکتا تو اپنی

www.paksociety.com

نوکری سے ہاتھ دھوتا اور روکتا تو اپنے ماتحتوں سے۔ میں اسے ہکا بکا اور پریشان حال چھوڑ کے دلاور کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ چوہدری دلاور گھومنے والی کرسی کی پشت کا سہارا لیے پیر اپنی میز پر پھیلا کے فارغ بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا بھی نہیں چونکا اور اسی پوزیشن میں بالکل بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کی اداکاری کی صلاحیت کا میں پہلے سے معترف تھا لیکن یہ اداکاری کا کمال نہیں تھا۔ اس نے یقیناً میری آواز سن لی تھی اور یہ طے کر چکا تھا کہ میری آمد پہ حیرت، خوف یا پریشانی کا اظہار اس کو زیب نہیں دیتا۔

"کون؟ ہاں اپنے سکندر صاحب۔" میرے "السلام علیکم" کے جواب میں اس نے بڑے سکون کے ساتھ مسکرا کے کہا اور پاؤں میز پر سے ہٹا کے آہستہ آہستہ اٹھا۔ "ابھی کمال ہو گیا۔ بڑی عمر ہے آپ کی۔ ابھی آپ کے متعلق ہی سوچ رہا تھا میں۔" مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کے بولا۔

"انگریز کہتے ہیں کہ ادھر شیطان کو یاد کرو، ادھر وہ حاضر۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔

"یہی تو فرق ہے جی ان میں اور ہم میں۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تشریف رکھیں۔ ہم سادہ دل لوگوں کے دل میں کبھی برائی کا خیال نہیں آتا۔ ہم کہتے ہیں کہ عمر لمبی ہو۔ وہ کہتے ہیں شیطان آگیا۔ اسی سادگی سے فائدہ اٹھا کے تو وہ ہم پہ اتنا عرصہ حکومت کر گئے۔ آپ نے تو بہت کچھ سیکھا ہوگا ان سے۔"

"انسان نے تو شیطان سے بھی سبق سیکھا تھا۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اور انگریز تو رخصت ہوئے مگر حکومت اب آپ جیسے سادہ دل لوگوں کی ہے۔ ہمیں بھی جو کچھ سیکھنا ہے آپ ہی سے سیکھنا ہے۔ اور کچھ سکھانا ہے تو وہ بھی آپ ہی کو۔"

چوہدری دلاور کا چہرہ میری ذو معنی بات کے باوجود سپاٹ رہا۔ "بڑے عرصے بعد ملاقات ہوئی آپ سے۔" وہ بولا۔

"آپ تو جانتے ہیں میں کتنا مصروف تھا اپنے چوہدری صاحب!" میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگائی۔ "تعزیت تک کے لیے حاضر نہ ہو سکا۔" میں نے لائٹر کو جیب میں رکھنے سے پہلے پھونک مار کے اس کے شعلے کو بجھایا۔

"کیسی تعزیت؟" دلاور نے کہا۔ ذرا سی دیر کے لیے اس کی صورت پر حیرانی کے آثار نمودار ہوئے۔ میرا آخری جملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ اپنے فطری رد عمل کو نہ چھپا سکا۔ پھر اسے یاد آگیا کہ میں کس کا حوالہ دے رہا ہوں۔ "اچھا... وہ......"

"جی۔ میں نے سنا تھا آپ کے گھر کی کسی خاتون کا انتقال ہو گیا تھا۔" میں نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ شہلا کی والدہ سے آپ کی قرابت داری تھی۔ وہ لڑکی تھی نا شہلا۔ اپنے ڈی ایس او صاحب کی سیکرٹری؟"

"مجھے معلوم ہوا ہے۔" دلاور نے گھونسا مارنے والی ... سے میز پہ پڑا اور مقتول لڑکی کی لاش پیچھے پھینک دی۔

"پھر بڑا افسوس ہوا ڈی ایس او صاحب کا۔ میں نے ... جا رکھی تھی؟ سنا ہے بڑا خوفناک۔ جلد علیحدہ ... بھی سنا ہے کہ......"

"جو بھی آپ نے سنا ہے ٹھیک ہی سنا ہوگا۔" ... وہ میری بات کاٹ کے بولا۔ "اور ابھی بہت کچھ سننے کو ... آپ بھی یہ بتائیں کیا لیں گے؟ پیپسی کہ ولائتی؟ میرا مطلب ہے ... کر ٹھنڈا؟"

"چائے۔" میں نے کہا۔ "اس میں زہر ہوتا ہے تھوڑا ... کیفین۔ وہ بھی دے دیں اپنے ہاتھ سے۔"

دلاور ہنسا۔ "آپ مذاق خوب کرتے ہیں۔" وہ بولا۔ "... پر زہر کیا اثر کرے گا؟ اور ہم کوئی دشمن ہیں آپ کے جو خدانخواستہ زہر دیں گے آپ کو۔ اور وہ بھی اپنے ہاتھوں سے۔" اس نے ... کا بٹن دبا کے چپراسی سے چائے کے لیے کہا۔

"ڈی ایس او کی جگہ کسی نئے منیجر کا تقرر کیا ہے آپ نے؟" ... نے کہا۔ "یا ایسے ہی کام چل رہا ہے؟"

"کام ایسے بھی کیسے چل سکتا ہے۔ نیا بندہ رکھا ہے ... ایک۔" وہ بولا۔ "لیکن ابھی عارضی ہے۔ اب یہ خدا جانے ... اپنے سکندر صاحب کے بیچ میں ہی فیصلے کر رہا ہوں۔ آپ سے مشورہ بغیر۔ مالک تو آپ بھی ہیں برابر کے۔ قانونی حیثیت کو تسلیم کرنا ہم آج کر رہے ہیں۔"

دلاور کا رویہ اور خیالات کی یہ تبدیلی کسی نئی حکمت ... تیار کی تھی۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا تھا کہ دلاور جیسے شخص ... کی سوچ کا یہ مثبت پہلو اس کی شخصیت میں رونما ہونے والے ... کا نتیجہ ہے۔ وہ مصالحت پر آمادہ ہے یا اس نے حقیقت کو تسلیم ... ہے۔ شکاری نئی چال چلا ہے مجھے یا نیا جال بچھا رہے تھے؟ عقل تقاضا کر رہی تھی کہ میں محتاط ہو جاؤں۔ ڈی ایس او ... جانے کا کہہ رکھا تھا اور دلاور سے نظر ملا کے پھیر ... گیا۔

"کیا پرانے لوگوں میں سے کوئی اس قابل نہیں تھا کہ اسے ... بنایا جائے۔ ان کو کام کا تجربہ تھا۔" میں نے کہا۔

"ایک ہی آدمی تھا کام کا جناب۔" وہ افسوس سے ... بولا۔ "مارا گیا بے چارا حادثے میں۔ کیا نام تھا اس کا..... ہاں ... اکاؤنٹنٹ تھا اور آپ کے والد مرحوم کا خاص آدمی تھا۔"

"اور یہ نیا منیجر ہے یہ کس کے والد کا خاص آدمی ہے؟" ... نے کہا۔ "تجربہ اور تعلیم کیا ہے اس کی؟"

دلاور کی قابلیت شک و شبہ سے بالاتر تھی کہ اسے اپنے اعصاب پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ وہ گالی کھا کے بھی مسکرا سکتا تھا اور مسکراتے ہوئے گالی دے سکتا تھا۔ اس کے دلی جذبات کا عکس اس کی صورت پہ حسب منشا نمودار ہوتا تھا۔ اور اندر ہی اندر آتش غضب سے کھولنے کے باوجود وہ اظہار مسرت پر قادر تھا اور نفرت کے زہر کو دبا کے محبت کرنا جانتا تھا۔

"ڈی ایس او قابل آدمی تھا۔" اس نے اعتراف کیا۔ "اللہ اسے غریق رحمت..... میری مراد اس نئے منیجر سے ہے۔ اس کے برابر تو نہیں ہے لیکن ہو جائے گا۔" اس نے ایک کپ چائے بنا کر میرے سامنے رکھی۔

"آپ کے زیر سایہ تربیت پا کے تو وہ ڈی ایس او سے آگے نکل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے چوہدری صاحب کہ آپ کی جوہر شناس نظروں نے اس ہیرے کو کہاں سے اٹھا لیا۔ راہ چلتے کسی آدمی کا تقرر تو نہیں کیا ہوگا آپ نے۔ ماشاء اللہ..... اور کیا یہ..... گریجویٹ تو ہے؟ یہ صاحب کون ہیں؟ پہلے کیا کرتے تھے اور کہاں تھے؟"

"میں اتنے بہت سارے سوالات کا جواب کیا دوں سکندر صاحب!" دلاور نے کہا اور انٹرکام کا بٹن دبا دیا۔ "ذرا احمد نواز سے کہو کہ سب کام چھوڑ کے آجائے اور یہ لڑکا جو ریسپشن پہ بیٹھا ہے اسے کہو کہ ادھر خبر لے کر آئے۔"

"یس سر!" پی اے نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ابھی حاضر ہو جاتا ہے حضور یہیں۔" دلاور نے کہا۔ "آپ جانتے نہیں۔ جو پوچھنا ہے اس سے آپ خود ہی دریافت فرما لیں۔"

"گویا آپ کو کچھ معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "یا آپ کا خیال ہے کہ میں یقین نہیں کروں گا بے خبر۔ آنے دیں اسے۔"

"بات دراصل یہ ہے جناب عالی!" دلاور نے کسی طنز کے بغیر کہا۔ "کہ یہ جو میرا پی اے ہے نا، اسی نے کہیں فون وغیرہ کیا تھا۔ دفتر روزگار والوں کو۔ اور ان کو سمجھا دیا تھا کہ ہمیں کیسا بندہ چاہیے۔ پہلے جانے کہاں تھا اور کیا کرتا رہا ہے۔ انہوں نے غلط آدمی تو نہیں بھیجا ہوگا۔ لیکن یہ ہے ایک قابل بندہ ڈگریاں لے کر جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہے۔ اس منڈی میں دیسی ولایتی سب مال مل جاتا ہے۔"

ریسپشن کے ڈیسک میں بیٹھ کے جاسوسی ناولوں کا کورس کرنے والا نوجوان رجسٹر لے کر نمودار ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی پیشانی پر ناگواری اور حیرت کے آثار شکن بن کے نمودار ہوئے۔ دوسرے لمحے مجھے پہچانتے ہی اس کا چہرہ ... روشن ہو گیا اور اس پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ ملازمت کی ... اس کی جاسوسی دھری رہ گئی اور اتنا پڑھ کے بھی اس نے جھک ماری کہ غلط آدمی کو شناخت نہ کر سکا۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے رجسٹر دلاور کے سامنے رکھ دیا۔

دلاور نے دور ہی سے اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ "یہ سائیں علی مراد کون آیا ہے مجھ سے ملنے۔ بلاؤ اسے۔"

"وہ..... یہ..... انہوں نے یہی کہا تھا۔" نوجوان نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اسے شاید میرا نام یاد نہیں آیا۔"

دلاور نے اسے غور سے دیکھا۔ "ادھر میاں! یہ بتا کہ نشہ کون سا کرتا ہے تو جو مالکوں کو نہیں پہچانتا ہے آج؟ کل باپ کو بھی نہیں پہچانے گا۔ کوئی اور ہوگا وہ۔ جا اسے دیکھ اور لے آ میرے پاس۔ کوئی ملنگ فقیر اندر فیکٹری میں گھس گیا اور تو کیا کرتا رہا؟ یہ جاسوسی ناول پڑھتا رہ گیا ہے۔" اس نے رجسٹر بند کر کے واپس اچھالا۔ "اس چوکیدار کے ساتھ مل کے سائیں علی مراد کو لے آ۔ شاباش ورنہ پھر تم دونوں کی خیر نہیں۔ دیکھیں نا اپنے سکندر صاحب! نہ جانے کون (.....) سائیں بھاگ کے اندر آگیا اور یہ (.....) دیکھتے رہے۔ وہ پاگل کا بچہ نقصان پہنچا دے مشینری کو یا آگ لگا دے فیکٹری میں۔" اس نے تینوں افراد کے لیے ایک ہی اسم صفت استعمال کیا اور اسے بڑی مہارت سے جملے کے درمیان یوں فٹ کیا کہ میں دنگ رہ گیا۔ اتنی بڑی گالی اس نوجوان مرد نے محض اس لیے چپ چاپ کھا لی کہ اسے اور اس کی آمدنی پہ انحصار کرنے والوں کو روٹی بھی کھانی تھی، تن بھی ڈھانپنا تھا اور زندہ رہنے کے اس سہارے

www.paksociety.com

کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے بڑی عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان نظروں میں فریاد بھی تھی، احتجاج بھی تھا، ملامت بھی تھی اور بے بسی کا اقرار بھی تھا کہ ملاحظہ فرمائیے سکندر صاحب! کسی کی جان گئی اور آپ کی ہنسی ٹھہری۔ ہم غریبوں سے آپ کا یہ کیسا جان لیوا مذاق تھا کہ ہم بے آسرا بھی ہوئے اور بے روزگار بھی۔ اور آپ اب بھی اقرار نہیں کر رہے ہیں کہ سائیں علی مراد آپ ہی آئے تھے۔

"چوہدری صاحب! قسم خدا کی اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو مجھے معاف کر دیں۔" وہ اچانک دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ "سکندر صاحب ڈیڈی تھے۔ اب مجھے ان کا نام یاد آ گیا ہے۔ انہوں نے اپنا نام سائیں علی مراد بھاٹی گیٹ والا ہی بتایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ نے بلایا ہے۔ میں ان کو پہچان نہیں سکا تھا۔ میری ماں کی آنکھوں کا آپریشن ہونا ہے۔ اس کے لیے میں تین ہزار روپے جمع کر رہا ہوں۔ آپ نوکری سے نکال دیں گے تو......"

"تو کیا ہوگا؟" میں نے گرج کر کہا۔ "تجھ جیسے لوگ یہاں زندگی گزار رہے ہیں سب یہیں پر ملازم ہیں جو مجھے یہاں سے نکال دیا گیا، کیا وہ فاقے کرتا مر گیا؟ شرم آنی چاہیے تمہیں۔ جوان آدمی ہو، ہاتھ پیر سلامت ہیں، مسلمان ہو۔ اس کے باوجود رزق کو لینے کے لیے انسان کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہو۔ یہاں سے نکال دیے گئے تو اور کچھ نہیں کر سکو گے۔ ماں کی آنکھوں کی روشنی عزیز ہے تو اس کے لیے ... نہیں لگا سکتے، گنڈیریاں نہیں بیچ سکتے، اسٹیشن پر قلی نہیں بن سکتے۔ محنت کرنے میں شرم آتی ہے۔ ... جاسوسی ناول پڑھنے کے لیے فرصت نہیں ملتی اس لیے تم آسانی کے عادی ہو گئے ہو۔ ہاتھ پیر چلائے بغیر ملتی ہے اس لیے گالیاں بھی قبول ہیں...."

نوجوان کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ احمقوں کی طرح مجھے دیکھنے لگا اور رونا بھول گیا۔

"جاؤ۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "آج معاف کیا مگر آئندہ یاد رکھنا۔ لیکن یہ چوہدری صاحب کی مہربانی سمجھو کہ برابر کے مالک کی حیثیت سے انہوں نے مجھے بھی فیصلے کرنے کا اختیار دیا ہے۔ میں دوبارہ بھی تمہارا تقرر کر سکتا ہوں مگر ابھی تو کسی صورت بھی نہیں کیا ہے۔ تم کو مذاق کے طور پر لیتے ہیں کہ محنت اور بے غیرت لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ سمجھا؟"

جب وہ چلا گیا تو میں نے ولاور کو دیکھا۔ وہ یقیناً اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا ہوگا مگر ظاہری طور پر بالکل پرسکون بیٹھا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

"بس ایسے ہی دل لگی کی سوجھ گئی مجھے اپنے چوہدری صاحب!" میں نے بھی اس کی طرف مسکرا کے دیکھا۔ میں نے کہا "ذرا آپ کو حیران کر دیں۔ سب چلیے خواہ مخواہ پریشان ہونے، میرے مذاق سے آپ کو

اطلاع ملتی تو آپ بھی حیران ہوتے کہ یہ کون سائیں آ گیا۔"

"کمال کرتے ہیں آپ" وہ بولا۔ "آپ جس بھیس میں آئیں اور کسی بھی حلیے میں آئیں کیا ہم آپ کو نہیں پہچانیں گے؟ کیا آپ سے وضاحت بھی کر دی۔ آئندہ مالکوں میں اور ملنے کے لیے آنے والوں میں فرق کا خیال تو رکھیں گے ... چاہیں ہی۔ یہی بات بری لگی تھی مجھے کہ شاید یہ سوچتے ... نہ جانے کون اندر گھس گیا۔ صورت دیکھتے ہی بند ... اسی لیے ان کو کھڑا کیا ہے وہاں۔ اب آپ نے معاف کر دیا ہے تو ہم کیا کہیں۔ ویسے بھی میں ذرا دم خم دیکھ رہا تھا ... کہ سائیں جی آپ ہی ہیں۔"

"مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے چوہدری صاحب کہ آپ آدمی کو پہچان جاتے ہیں" میں نے کہا۔ "اور حالات کو بہت جلد ... ہے۔ کاروبار میں آپ جیسے پارٹنر کا ہونا میری خوش قسمتی ہے۔ ... خدا بخش بڑا آدمی تھا۔ جزاء خیر ... قانونی الجھنوں میں پڑتا تھا ... کام کرتا تھا۔ اب یہ کتنی معقول بات ہے جو آپ نے ابھی کی ... تو مجھے کل مالک تسلیم کرے گا۔ آپ آج کر رہے ہیں۔ بے شک ... کے مالک ہیں لیکن تجربہ آپ کا زیادہ ہے۔ جو کام آپ نے ... کر سکتے ہیں وہ میں نہیں کر سکتا۔ اس لیے آئندہ بھی آپ کی ... بڑے بھائی جیسی ہوگی۔ آپ کی رہنمائی کے بغیر شاید میں اس کام کو چلا ہی نہیں سکتا تھا جو آپ چلا رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم ہی نہیں۔"

چوہدری ولاور نے محسوس کر لیا ہوگا کہ میری ہر بات کا مطلب ہے جو ... جس کاروبار کا میں حوالہ دے رہا ہوں وہ ... انجینئرنگ کمپلیکس نہیں، ... چلنے والا کاروبار ہے۔ وہ کاروبار جس کی بنیاد وزیر خان مرحوم نے رکھی تھی۔ ولاور نے میری ملکیت تسلیم کر کے کوئی چال چلی تھی۔ تو اس کو بڑے بھائی کی جگہ قرار دے کر میں نے بھی ظاہر کر دیا تھا کہ میٹھی چھری سے حلال کرنا مجھے بھی آتا ہے اور حقیقت اب بھی وہی ہے کہ ہم پارٹنر نہیں، ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ دو شطرنج کے کھلاڑی ہیں جو اس زندگی کی بازی کو اپنی چال سے ایک دوسرے کی شکست کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔ اس کاروبار میں مجھے برابر کا شریک کر رہا ہے کہ صرف ... کی کسی مجبوری کے باعث اور میں اسے قابل اعتماد سمجھ رہا ہوں ... اس لیے کہ مجھے سچائی کا پتا چلا ہے۔ اس ایک سچائی کے پردے میں بہت سے ... ہیں۔

"غلط فہمی سے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں" ولاور نے ایک ایک لفظ کو سوچ کر ادا کیا۔ "لیکن ہر غلط فہمی کبھی ... ہے۔ پہلے سکندر صاحب! اس ساری بات وقت کی ہے۔ شاید وہ ..."

... اس کے پہلے ہی مداخلت کی اور یہ اطلاع دی کہ گردیزی صاحب آ گئے ہیں۔ ولاور نے مسکرا کے میری طرف دیکھا۔ "کیا خیال ہے، بلالیں ان کو بھی؟"

"اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے" میں نے کہا۔ "آپ نے اسے ... سے یہاں تک دوڑایا ہے تو کیا صرف باہر بٹھانے کے لیے؟"

ایک منٹ بعد احمد نواز گردیزی نے اندر قدم رکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ چوہدری ولاور کا یہ ڈراما بھی کتنا کامیاب رہا ہے۔ اس سے قبل کی صورت حال کو انتہائی پراسرار اور ڈرامائی انداز میں پیش کر کے ... صلاحیت تسلیم کرا چکا تھا اور اس فن میں طاق تھا۔ وہ ذہن کو ... دینے کے لیے ایسے ہی تیار کرتا تھا جیسے قصائی ذبح کرنے سے پہلے بکرے کو چھری نہیں دکھاتا بلکہ پانی پلا کے اس کا دم کرتا ہے۔ احمد نواز گردیزی ... پر پڑتے ہی حیرت اور صدمے سے مفلوج ہو گیا اور اس طرح ... جس طرح میرے آنے پر ولاور ... فرق صرف یہ تھا کہ ... اداکاری کی تھی اور میرا رد عمل بالکل فطری تھا۔ کیونکہ ... گردیزی کے روپ میں میرے سامنے استاد بیڈرو مسکرا رہا تھا۔ اس کا ظاہری حلیہ بدلا ہوا تھا۔ وہ بہترین سوٹ میں تھا اور اس کے ہاتھ میں ... بریف کیس تھا۔ اس کے ... بال بڑے سلیقے سے جمے ہوئے تھے اور کانوں میں پیتل کی وہ مندریاں بھی نہیں تھیں جو ... کی شناخت کی سب سے بڑی اور نمایاں نشانی بن جاتی تھیں۔ لیکن دونوں کانوں میں وہ سوراخ صاف نظر آ رہے تھے جو برسوں مندریاں پہننے سے ہو گئے تھے۔ اس کا باقی ناک نقشہ اور رنگ روپ وہی تھا۔ ... ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی کہ اپنی نئی شخصیت کے ساتھ اپنا چہرہ بھی بدلے۔ چنانچہ میری نظروں نے استاد بیڈرو کا روپ دیکھ لیا ... سب سے پہلے وہ مجھے ایک ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں ملا تھا ... سے پاکستان پہنچنے کے بعد ایک ہی ... میں اس سے میری دوبارہ ملاقات کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں تھی۔ دوسری بار وہ تعاقب کرتا ہوا میرے ساتھ ساتھ سیر شرافت علی کی کوٹھی تک گیا تھا اور ... کے الزام میں ... سر تھوپنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس کے بعد وہ جب ... استاد بیڈرو ... لیکن اس کی شخصیت کا دوسرا عارضی ... روپ میں دیکھا تھا — جو اب منظر سے ہی ... دنیا کی نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔ احمد نواز گردیزی اس کا تیسرا روپ تھا ... محسوس کر لیا تھا کہ استاد بیڈرو کا اصل روپ اب ... ختم ہو جانا ہی بہتر ہے ... اپنے آقا ولاور کی خوشنودی کے لیے اپنی جان کی بازی ... کبھی دریغ نہیں کیا تھا چنانچہ وہ اس انعام کا مستحق تھا کہ اس کا درجہ بڑھا دیا جائے۔ ذہنی مسکراہٹ کے خلاف اس سے بہتر طور پر

کون پڑا رکھ سکتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی صلاحیت یہی تھی کہ وہ جان نثار تھا، جانباز تھا اور وفادار تھا اور ولاور کے لیے بڑی سزا کے بعد بھی راستہ بننے کا اہل تھا۔

"خیریت تو ہے اپنے سکندر صاحب؟" چوہدری ولاور نے خوش دلی سے کہا۔ "آپ کی طبیعت کچھ خراب لگتی ہے مجھے۔"

"نہیں ... وہ دراصل میں کچھ اور سوچنے لگا تھا" میں نے چونک کر کہا اور مسکرایا۔

"آپ تو بالکل ہی جامد ہو گئے تھے" چوہدری ولاور نے کہا۔ "یہ ہمارے نئے جنرل منیجر ہیں جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔"

احمد نواز گردیزی نے شاید پہلے بھی مجھ سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔ وہ اب دوسری کرسی پر ضرورت سے زیادہ سنجیدہ بیٹھا تھا۔ ولاور نے میرا نام بتانے کے بعد یہ بھی کہا کہ "گردیزی صاحب! میں نے آپ سے ذکر کیا تھا کہ اس کاروبار کے دوسرے مالک سکندر بخت صاحب بھی ہیں اور آج یہ اتفاق سے آ گئے تو میں نے سوچا کہ آپ کا تعارف کرا دوں۔"

گردیزی نے ایک بار پھر رسمی آداب و اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی اور اپنا ہاتھ تھوڑا سا آگے بڑھایا لیکن میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے لائٹر بڑی صفائی سے چھوڑ دیا اور لائٹر اٹھانے کے لیے جھکا۔ گردیزی کو دوبارہ شرمندگی اٹھانی پڑی کیونکہ میں نے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا۔

"گردیزی صاحب!" میں نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ "آپ کی صورت کچھ جانی پہچانی لگتی ہے۔ کیا ہماری ملاقات پہلے کبھی ہوئی ہے؟"

"مجھے تو یاد نہیں پڑتا" گردیزی نے کہا اور میں نے اس کی آواز بھی پہچان لی۔

"لیکن مجھے کچھ یاد آ رہا ہے" میں نے سوچتے ہوئے کہا اور اپنی بات کا رد عمل دیکھنے کے لیے تھوڑا سا وقفہ دیا۔ گردیزی بن جانے کے باوجود بیڈرو وہی شخص تھا جو ایک معمولی بدمعاش تھا اور جرائم کی دنیا میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے بعد استاد کے منصب پر فائز ہو گیا تھا لیکن وہ ولاور کی طرح منجھا ہوا اداکار نہیں تھا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا اور اس نے ولاور کی طرف امداد طلب نظروں سے دیکھا۔ میری نظر دونوں پر تھی اس لیے میں نے ولاور کی وہ نگاہ بھی دیکھ لی جس میں بیڈرو کے لیے واضح پیغام تھا کہ ہمت سے کام لو ورنہ یہ سمجھ جائے گا کہ تمہیں جنرل منیجر کے عہدے سے ہٹا کر پھر استاد بیڈرو بنا دیا جائے۔

"آپ کو یاد ہے تو بتا دیجیے کہ ہم کب اور کہاں ملے تھے" گردیزی نے خود کو سنبھال کے کہا۔

"میں نے یہ نہیں کہا مسٹر گردیزی!" میں نے معنی خیز مسکراہٹ

www.paksociety.com

کے ساتھ جواب دیا۔ "مجھے کچھ یاد آ رہا تھا۔ دراصل اس شہر میں بالکل آپ جیسی شکل و صورت کا ایک بدمعاش تھا۔"

"بعض اوقات شریفوں کی اور بدمعاشوں کی صورتوں کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔" دلاور نے کہا۔

"میں یہی بھی عرض کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ بدمعاش استاد پیڈرو کہلاتا تھا۔ پہلے تو ایسے ہی غنڈہ گردی کرتا تھا اور صرف پیڈرو تھا۔ بعد میں اپنا گروہ بنا کے استاد ہو گیا۔ پھر کسی اسمگلر کا ساتھی رہا اور بالآخر پولیس سے مقابلے میں مارا گیا۔ یہ کافی پرانی بات ہے جو آج مسٹر گردیزی کو دیکھ کر یاد آ گئی۔ میرا مطلب ہے ان کی صورت دیکھ کر۔" یہ براہِ راست کوئی الزام نہیں تھا لیکن میں نے واضح کر دیا تھا کہ میں گردیزی کی اصلیت کو اتنی ہی اچھی طرح سمجھ گیا ہوں جتنی اچھی طرح پیڈرو کی اصلیت کو جانتا تھا اور میری معلومات کس حد تک درست ہیں۔

دلاور مشتعل بیٹھا رہا۔ وہ یہی جاننا چاہتا تھا کہ یہ تماشا پہلی بار خود اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس کے بعد اگلا قدم اٹھائے۔ اگر میں اچانک پیڈرو اینڈ کمپنی کے آفس جا پہنچتا اور گردیزی کی جگہ پیڈرو کو دیکھتا تو دلاور کو ہم دونوں کے ردِ عمل کا پتا نہ چلتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں وہاں سے گردیزی کو جوتے مار کے نکال دیتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ پیڈرو گردیزی کا کردار نبھانے میں ناکامی ہوتی تو وہ مشتعل ہو کے اپنی فطرت اور مزاج کے مطابق مجھ پر خنجر یا پستول نکال لیتا۔ یہاں اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ دونوں کردار اس کے سامنے تھے اور اس کے کنٹرول میں تھے۔ میری پوزیشن کو اس نے پیڈرو سے بہتر رکھا تھا کیونکہ اسے مجھ پر زیادہ اعتماد تھا کہ میں جذبات سے بے قابو ہو کے کوئی ہنگامہ کرنے سے گریز کروں۔ بالفرض محال میں یہ حماقت کرتا تو وہ گردیزی کو رخصت کر دیتا اور کسی خواری کے بغیر میرے جذبات کو اپنی باتوں سے ٹھنڈا کر دیتا۔ غلطی اگر پیڈرو کرتا تو دلاور اسے کوئی رعایت نہ دیتا۔ وہ مجھ سے کہتا کہ سکندر صاحب اگر یہ شخص آپ کے خیال میں جنرل منیجر بننے کے قابل نہیں تو اس کی چھٹی کر دیتے ہیں اور بعد میں پیڈرو پر واضح کر دیتا کہ وہ خود کو جنرل منیجر احمد نواز گردیزی کی اہلیت کے معیار کا مستحق ثابت نہیں کر سکا چنانچہ اسے اپنی سابقہ پوزیشن پر واپس لوٹ کے استاد پیڈرو ہی بننا ہوگا۔ میرے اچانک آ جانے سے اسی کا موقع مل گیا کہ وہ پیڈرو کو آزما سکے اور یہ دیکھ سکے کہ وہ گردیزی کے کردار میں کہاں تک کامیاب رہتا ہے۔ یہ بات تو یقیناً پیڈرو بھی سمجھتا ہوگا کہ ایک نہ ایک دن اس کا اور میرا سامنا ہوگا لیکن وہ اس غیر متوقع آزمائش کے لیے تیار نہ تھا۔

"مجھے چوہدری صاحب نے بتایا ہے کہ جو کام آپ کے سپرد کیا گیا ہے اس میں تو آپ کو خاصا تجربہ ہے اور آپ اس کام کی نوعیت کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں جو چوہدری صاحب کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے میں آپ سے کوئی سوال نہیں کروں گا کہ آپ کی کوالیفکیشن کیا ہے۔

آپ پہلے کہاں تھے اور اس فیلڈ میں آپ کے تجربے کا ... ہوگا۔ ظاہر ہے چوہدری صاحب نے آپ کا تقرر کیا ہے تو ... کیا ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے۔"

"تو پھر چلئے گردیزی صاحب!" دلاور نے مسکرا کے ... صاحب نے آپ کی نوکری پکی کر دی۔"

"اگر میں ان کو مطمئن کر سکا تو مجھے بڑی خوشی ہوگی ..." اچانک انگریزی میں کہا۔ اس کے لہجے کی روانی سے مجھے ... یقیناً تعلیم یافتہ تھا اور یہ میرے لیے بہت افسوسناک انکشاف ... نہیں وہ کیا حالات تھے جنھوں نے اعلیٰ تعلیم کے باوجود ایک ... کو غلط راستوں پر ڈال دیا جہاں اس نے اپنی ذہانت اور علم ... استعمال کیا۔ دنیا ایسے افراد سے بھری پڑی ہے جو حالات کو ... اپنی منفی سوچ کے انداز کا جواز فراہم کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ... دنیا سے اپنی محرومیوں کا انتقام لے رہے ہیں یا نفرت کا ... کا شکار ہیں جو انھیں ساری دنیا نے دی۔ سب کی ایک ہی ... مجرم بنانے والی یہ دنیا ہے ورنہ ماں کے پیٹ سے کوئی مجرم ... نہیں ہوتا۔ کوئی بھی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ سارا قصور انسان کی فطرت ... اس کی سرشت میں شامل بدی کے عنصر کا ہے۔ برائی بہت جلد ... آسانی سے مغلوب کر لیتی ہے تو یہ انسان کے اپنے کردار ... اور قوتِ ارادی کے فقدان کے سبب ہوتا ہے۔ پیڈرو کے ... کوئی ایسی ہی کہانی ہوگی جو اب مجھ سے ڈھکی چھپی نہیں رہی۔

"مسٹر گردیزی! آفس کا کام تو آپ نے یقیناً ابھی ... لیا ہوگا؟" میں نے کہا اور بات انگریزی میں کی۔

"میرے تقرر کو ابھی صرف تین دن ہوئے ہیں مسٹر سکندر!" گردیزی نے اسی روانی سے انگریزی کا جواب انگریزی میں ... "پھر بھی میں نے دفتر کے نظام کو کافی حد تک سمجھ لیا ہے ... چکا ہوں اور کمپنی کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں ... ہے کہ پہلے حالات کیا تھے اور اب کیا ہیں؟"

"گویا آپ ابھی فائلوں کی گنجلک دنیا میں گم ہو رہے ..." نے کہا۔ "فیکٹری دیکھی آپ نے؟ یہاں کیا بنتا ہے، کیسے بنتا ہے ... جاتا ہے اور کیسا جاتا ہے؟ یہ پروڈکشن کی سائیڈ کبھی دیکھنا ..."

"یس سر!" گردیزی نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "... دیکھ چکا ہوں۔"

اس کے غلط جواب نے صورتحال کو یک لخت بدل دیا ... کھڑا ہوا۔ "ویری گڈ مسٹر گردیزی!" میں نے کہا۔ "میں نے ابھی ... کبھی نہیں دیکھا۔ دراصل برطانیہ سے آنے کے بعد میں بہت سے ... مسائل میں الجھ گیا تھا۔ ممکن ہے چوہدری صاحب نے ان کا ذکر ... نہیں کیا تو تفصیل سے بعد میں بتاؤں گا۔ لیکن ان ہی مسائل ...

سے مجھے فیکٹری کو دیکھنے کی فرصت نہیں ملی۔ اس وقت آپ بھی موجود ہیں تو چلیے میرے ساتھ۔"

"لیکن اب تو کوئی وقت نہیں رہا چلنے سکندر صاحب!" دلاور نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا اور اپنے ظاہری اطمینان میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔

"چھٹی کا وقت ہو گیا ہے۔" گردیزی نے اس کی تائید کی۔ "اس معاملے کو کل پر اٹھا رکھیے سر!"

"آج کا کام کبھی کل پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔" میں نے متانت سے کہا۔ "کل کا کوئی اعتبار نہیں اور جیسے بھی کاروباری دنیا میں یہی اصول کامیابی کی ضمانت ہے ورنہ دوسرے آگے نکل جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں ایک گھنٹے سے زیادہ تو نہیں لگے گا۔ ابھی پانچ بجے میں بیس پچیس منٹ باقی ہیں۔ پانچ بجے میں آپ مزدوروں کو جانے دیجیے۔ پروڈکشن کے ڈیپارٹمنٹ کو ایک گھنٹے کے لیے روک لیں اور انھیں کل ایک دن کے اوور ٹائم کی ادائیگی کر دیں۔ کل کتنے سیکشن ہیں جن کا تعلق ہماری پروڈکشن لائن سے ہے؟"

"سیکشن تو سات ہیں۔" دلاور نے بے خیالی میں کہا۔ وہ گردیزی کو غلط جواب دینے کی پریشانی سے بچا رہا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ میری بات نے اس کے لیے کوئی الجھن کھڑی کر دی تھی۔ پریشانی کے آثار گردیزی کے چہرے سے بھی عیاں تھے اور وہ دلاور کی طرف سوالیہ مگر پُرامید نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"سوچنے کی اور دیر کرنے کی کیا ضرورت ہے مسٹر گردیزی؟" میں نے کہا۔ "کیا آپ نے میرے احکامات نہیں سنے؟ دو منٹ میں چھٹی ہو جائے گی تو سب لوگ نکل جائیں گے۔ جائیے اور چوکیدار کو بتا دیجیے۔"

میرے سخت لہجے نے گردیزی کو کمرے سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ دلاور ابھی تک گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور بظاہر اس مشکل سے نکلنے کی کوئی صورت اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"آپ ساتھ چلیں گے چوہدری صاحب؟" میں نے بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یا گھر جائیں گے؟"

"میرا خیال ہے میں کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔" دلاور نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی بخیریت واپسی تک آفس میں انتظار کروں گا۔ لیکن سکندر صاحب!" وہ یقیناً کسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا اور اب میں اس کے لہجے میں محسوس ہونے والی دھمکی کو اپنا وہم سمجھ کے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور یہ دھمکی جس نے مجھے کسی خطرے کے وجود سے خبردار کر دیا تھی۔ جب اس نے کہا تھا کہ میں آپ کی واپسی تک انتظار کروں گا تو بخیریت کا لفظ بہت سوچ سمجھ کے اور مجھے یہ سمجھانے کے لیے دیا تھا کہ ممکن ہے میری واپسی نہ ہو یا ہو تو خیریت کے ساتھ نہ ہو۔ لیکن اب قدم آگے بڑھانے کے بعد پیچھے نہیں ہٹایا جا سکتا تھا۔ یہ بات تو میرے ذہن

میں بہت پہلے سے تھی کہ ایک نہ ایک دن مجھے فیکٹری کو اندر سے دیکھنا ہے کیونکہ گھپلا اگر کہیں ہو سکتا تھا تو صرف فیکٹری میں۔ آفس میں اس کی گنجائش نہیں تھی لیکن میرا اس وقت کا فیصلہ فوری تھا اور میں نے بہت عجلت سے کام لیتے ہوئے کر لیا تھا۔ اس فیصلے کی محرک یہ خواہش بھی تھی کہ میں احمد نواز گردیزی کی شخصیت میں چھپے ہوئے پیڈرو کو بے نقاب کر دوں۔ اس کی رویہ دلیری میرے لیے ایک کھلا چیلنج بن گئی تھی اور دلاور نے مجھے یہ چیلنج دینے کے بعد مجھ پر خندہ زن تھا کہ سکندر بیگ تم بھی تو بہت بڑا شکاری ہونے کا دعویٰ رکھتے ہو اور تمھیں اپنی عقل و ذہانت پر بھی بہت ناز ہے تو اب دیکھنا یہ ہے کہ اس فراڈ کو فاش کرنے کے لیے تم کیا کر سکتے ہو۔ میں نے استاد پیڈرو کو احمد نواز گردیزی بنا دیا ہے تم میں ہمت ہے تو اسے پھر استاد پیڈرو بنا کے دکھاؤ اور میں نے غیر شعوری طور پر اس چیلنج کو قبول کر لیا تھا کہ یہ سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ جب پیڈرو نے گردیزی بن کے مجھ سے انگریزی میں بات کی تھی تو ذہنی طور پر مجھے تسلیم کرنا پڑا تھا کہ یہ ایک کامیاب چال تھی اور ایک طرح سے انھیں مجھ پر نفسیاتی برتری حاصل ہو گئی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بدمعاش کہلانے والا پیڈرو میری ہی فیکٹری میں جنرل منیجر کے عہدے پر بیٹھ جانے لگا اور اپنی تعلیم و استعداد کی صلاحیت اور تجربے کو بتا کر وہ خود کو اس منصب کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس بات نے مجھے مشتعل کر دیا تھا کیونکہ یہ کھلی دھاندلی تھی۔

سوا پانچ بجے تک فیکٹری کے کارکن اور مزدور گیٹ سے جا چکے تھے۔ چوکیدار نے بڑے گیٹ میں فٹ ہونے والا چھوٹا دروازہ کھولا تھا جس میں سے ایک وقت میں ایک ہی آدمی کے گزرنے کی گنجائش تھی۔ دروازے کے باہر چوکیدار ان کے کپڑوں کو ٹٹول کر جامہ تلاشی کی رسمی کارروائی پوری کرتا تھا۔ ان کے بیگ اور ٹفن کیریئر کھول کے دیکھتا تھا۔ وہ سب اسی طریقۂ کار کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ جو سلوک میرے نقطۂ نظر سے ذلت آمیز تھا وہ ان کے لیے معمول کی بات تھی۔ صرف فیکٹری یا کارخانے میں چوری سے ہونے والے نقصانات کو روکنے کا یہی دستور تھا۔ مزدور پیچھے سے اور کیمپ جس کو موقع مل جاتا وہ کوئی نہ کوئی چیز چھپا کے نکالنے کی کوشش کرتا تھا خواہ وہ ایک پنسل ہو، کسی مشین کا کوئی پرزہ، کوئی اوزار یا مشین پر چڑھی ہوئی کوئی ایسی چیز جسے بازار میں فروخت کر کے چار پیسے ہاتھ میں آ جائیں۔ مزدوروں کی قطار میری اور گردیزی کی موجودگی کے خیال سے محتاط تھی یا مرعوب تھی چنانچہ وہ مردہ دلی کی طرح چپ چاپ خوشی میں ہنستے کھیلتے اور باتیں کرتے ہوئے نہیں جا رہے تھے بلکہ گم سم سے دکھائی دیتے تھے۔ اپنا کام میں تو یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مجھے جانتے تھے یا نہیں لیکن گردیزی کا نام، عہدہ اور چہرہ ان کے لیے اجنبی نہیں تھا کیونکہ شیخ ...

مینیجر صاحب کہہ کے سلام کرتے تھے۔ کیا ان لوگوں نے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا؟ میں نے سوچا پھر یہ سوچ کر کہ اس کی ظاہری حالت کے انقلاب پر حیران کیوں نہیں ہوا۔ کیا انہوں نے ذہنی طور پر یہ تسلیم کر لیا ہے کہ جو شخص پہلے چوہدری صاحب کا خاص آدمی تھا اس نے اب ڈی سلوا صاحب کی جگہ سنبھال لی ہے تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔

گیٹ بند ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ اندر میرے اور گروبیزی کے علاوہ صرف چھ آدمی رہ گئے تھے۔ یہ چھ آدمی ایک جیسے دراز قد اور صحت مند تھے۔ مجھے وہ دیکھنے سے ذرا بھی فیکٹری قسم کے لوگ نہیں لگے۔ نہ ان کے ہاتھ مشینوں پر کام کرنے سے گندے ہوئے تھے اور نہ ان کے لباس پر داغ نظر آیا تھا۔ ان میں سے چار نے ڈینم کی پرانی پتلونیں اور چست قسم کے آدھے بازوؤں والی بنیانیں پہن رکھی تھیں تاکہ وہ اپنے بازوؤں کی قوت کی بھرپور نمائش کر سکیں۔ باقی دو کا لباس بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ جو چیز مشترک تھی وہ ان کے جارحانہ تیور اور خطرناک انداز تھے۔ وہ سب کسی رجمنٹ کی طرح ایک قطار میں ہاتھ سینوں پر باندھے پیر پھیلائے کھڑے تھے اور مجھے گھور رہے تھے۔ یہ خود کو بدمعاش ظاہر کرنے کا گھٹیا فلمی انداز تھا۔ اگر وہ فورس میں ہوتے تو صرف ایک گھنٹہ پریڈ کے جانے پر افسروں کی موجودگی میں یہ اشتعال انگیز رویہ اختیار کرنے کے بعد اس بات پر تو یقیناً شکر گزار ہوتے کہ انہیں مشقت کی بیگار میں نہیں پکڑ لیا گیا بلکہ ایک گھنٹے کا الٹی میٹم ایک پورے دن کے معاوضے کے برابر دیا جا رہا ہے لیکن وہ پیدل دستے جیسے لوگ تھے۔ پھر اگر جنرل منیجر کا عہدہ سنبھال سکتا تھا تو وہ بھی ایک سیکشن کو یقیناً کنٹرول کر سکتے تھے۔ وہ مشینوں پر محنت کرنے کی صلاحیت کی بنا پر فورس میں نہیں لیے گئے تھے بلکہ مزدوروں پر مسلط کر دیے گئے تھے۔ ان کے انتخاب میں بھی اس بات کو پیش نظر رکھا گیا ہو گا کہ مشینوں سے زیادہ وہ گڑبڑ کرنے والوں کو کنٹرول کرنے کے قابل ہیں یا نہیں۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرا فیصلہ غلط تھا۔ میں کام میں اس طرح بھی کر سکتا تھا کہ میرے لیے اپنی حفاظت کا کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ میں محسن کے ساتھ کسی بھی وقت ایسے وقت میں آ سکتا تھا جب کام جاری ہوتا۔ صوفی صاحب کی مدد سے باڈی گارڈ ساتھ لے کر آ سکتا تھا لیکن اس وقت میں اکیلا تھا خالی ہاتھ تھا اور محصور تھا۔

باہر ابھی شام کے سائے پھیلنے شروع ہوئے تھے مگر اندر اندھیرا دن کے اجالے پر غالب آنے لگا تھا۔ فیکٹری کے گیٹ سے سڑک اتنی دور تھی اور سڑک پر ٹریفک کا شور اتنا زیادہ تھا کہ یہاں کوئی مجھ پر گولی بھی چلاتا تو فائر کی آواز پر کوئی متوجہ نہ ہوتا۔ مزید یہ کہ وہ سب لوگ جو میری مدد کر سکتے تھے اس بات سے بے خبر تھے کہ مجھے موت کی طرف لے جانے والے اعمال کے باعث میں کہاں آ کے مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ محسن نے تو مجھے سیدھا سادہ مشورہ یہ دیا تھا کہ وقت گزارنے کے لیے میں فلم دیکھوں یا جہانگیر کے مقبرے پہ چلا جاؤں۔ اگر انہیں شک بھی ہو جاتا کہ میں اس کے جاتے ہی چوہدری والا معاملہ نمٹانے پہنچ جاؤں گا تو شاید وہ مجھے چھوڑ کر ہی نہ جاتا۔ اب میں واپس نہ پہنچا تو وہ لوگ موٹر ورکشاپ جا چکے ہیں وہاں نہیں ملوں گا تو اسے اطلاع کی اور اگر تلاش بھی کر لیتے تو ان مقامات پر جہاں میری موجودگی کا کوئی سراغ مل سکے۔ فیکٹری کی طرف کوئی نہیں آئے گا جہاں ہم کھڑے تھے۔ بند ہو چکے تھے اور باہر اندھیرا اور تاریک۔ چوکیدار کے سوا انہیں کوئی نہ ملے گا اور چوکیدار کیا جانے گا کہ اندر کیا ہوا۔ شاید وہ کچھ جانے گا بھی نہیں۔

لیکن اب اپنے خوف کو ظاہر کر کے دشمن کا حوصلہ بڑھانا حماقت کے مترادف تھا چنانچہ میں نے اپنے اعتماد کے اظہار میں کمی نہیں ہونے دی۔

"مسٹر گروبیزی! آپ نے سخت لہجے میں کہا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ فورمین سات ہیں اور یہ بات مسٹر ڈی سلوا نے بھی آپ کی موجودگی میں کہی تھی۔ پھر یہاں چھ شکلیں کیوں دکھائی دے رہی ہیں؟"

"ساتواں آدمی اگر نہیں ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟" گروبیزی نے کہا۔

"اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارا کنٹرول موثر نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لوگ تمہارے حکم کی پروا نہیں کرتے اور یہ بات مجھے بالکل پسند نہیں آئی۔ مسٹر گروبیزی! تم پوری فیکٹری کو اس آفس کو کیسے کنٹرول کرو گے۔ اس ساتویں آدمی کو نوٹس کرو اور کل ٹھیک بارہ بجے اسے اپنے آفس طلب کر کے اس کا حساب کر دو۔ اگر اسے کچھ کہنا ہو گا تو مجھ سے کہہ دے گا۔" پھر میں نے اپنا بریف کیس اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ چوکیدار کے پاس رکھوا دو بلکہ اسے یہاں بلاؤ۔ میں خود بات کر لوں گا۔"

گروبیزی نے برا سا منہ بنایا لیکن چوکیدار کو بلانے چلا گیا۔ چوکیدار کو شاید معلوم ہو چکا تھا کہ آج میں نہ بچا تو وہ نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا۔ اس نے اندر آ کے مجھے سلام کیا اور با ادب کھڑا ہو گیا۔ "کیا حکم ہے صاحب؟"

"دیکھو چوکیدار!" میں نے کہا۔ "ابھی میرے ایک دوست آنے والے ہیں۔ یہ سن کر کہ دروازہ بند دیکھ کر وہ لوٹ جائیں۔ یہ بریف کیس ان کو دینا ہے اور یاد رکھنا کہ ان کا نام محسن ہو گا۔" میں نے بریف کیس اسے تھما دیا۔

"میں یاد رکھوں گا جناب!" چوکیدار نے مجھ سے بریف کیس لے لیا اور چلا گیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں انہیں یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میرے یہاں آنے کی خبر محسن کو بھی ہے اور وہ یہاں ضرور آئے گا۔ میں اب خالی ہاتھ بھی تھا اور پوری طرح تنہا بھی تھا۔ ضرورت پڑی تو خالی ہاتھ لڑنے کی جتنی تربیت میں نے حاصل کی تھی وہ اپنی جان بچانے کے لیے صرف کروں گا۔ عملی زندگی میں اس کے مظاہرے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی لیکن آج صورت حال

مختلف تھی کیونکہ میرے مقابل سات آدمی تھے جو کسی طرح بھی مجھ سے کم نہ تھے۔ کم از کم ان کی ظاہری صحت مجھ سے بہتر تھی۔ اندیشہ یہ بات بھی تھی کہ وہ مسلح نہ ہوں ورنہ جن کے ہاتھ میں ریوالور ہو وہی غالب رہتا ہے اور اس کے سامنے جوڈو کراٹے میں بلیک بیلٹ لینے والے پہلوان بھی تب بھی اس کے قریب آنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

"مسٹر گروبیزی! میں کسی جلوس کی قیادت نہیں کرنا چاہتا۔" میں نے کہا۔ "پہلے صرف ایک سیکشن کا فورمین آئے گا جب وہ فارغ ہو جائے گا تو دوسرے کو بھیج دے گا۔ کیا تم نے ان سب کو بتا دیا ہے کہ میں کون ہوں؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ لوگ آپ کو پہلے سے جانتے ہیں۔" گروبیزی نے کہا۔ "وہ جواب طلب لیں گے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ میں نے تمہارا خیال نہیں پوچھا تھا۔" میں نے طنز کے انداز میں کہا۔ "ایک سوال پوچھا تھا جس کا جواب ہاں یا نہ تھا۔ دوسری بات یہ کہ میں ڈسپلن کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ باہر تم مجھ سے برابر کے دوستوں کی طرح مل سکتے ہو لیکن یہاں میں باس ہوں۔ اس لیے بات کرتے وقت یا جواب دیتے ہوئے سر کہنا مت بھولو۔ یہ بات تم سب لوگ بھی نوٹ کر لو۔" میں نے ان چھ افراد سے مخاطب ہو کے کہا جو میری باتوں سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے اور ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے کے علاوہ زیر لب مسکرا رہے تھے۔ میرے اشارے پر پہلا آدمی آگے آیا۔ اس کے چیونگ گم چبانے کا انداز خالص ویسٹرن فلموں کا تھا۔

"تمہارا کون سا سیکشن ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اس سیکشن میں کب سے ہو اور نام کیا ہے تمہارا؟"

"میرا نام مظفر ہے ...... سر!" اس نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا اور آخری لفظ یوں ادا کیا جیسے وہ اس لہجے سے میری عزت کرنے کے بجائے میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ "میں فونڈری میں ہوں۔ چھ مہینے سے۔"

"اور چھ مہینے پہلے کہاں تھے؟" میں نے کہا۔ "کسی اور سیکشن میں؟"

"یہ آپ چوہدری صاحب سے پوچھ سکتے ہیں۔" وہ بولا۔ "وہ بتائیں گے آپ کو۔"

"شٹ اپ۔ جو بات تم سے پوچھی گئی ہے اس کا جواب تم دو گے۔" میں نے گرج کر کہا۔ "کوئی چوہدری نہیں دے گا۔ سمجھے!"

"دیکھو سکندر صاحب! ہم سے چوہدری صاحب نے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی۔" وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ "اور ہم بہت سیدھا آدمی ہیں۔ اپنے سے سیدھا بولو۔ ہاں۔"

"چوہدری صاحب اگر تمہاری بدتمیزی برداشت کرتے رہے ہیں یا انہوں نے تم کو ڈھیل دے رکھی تھی تو میرے لیے یہ بالکل مختلف قسم کا معاملہ ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "برطرف تو میں تمہیں کر دوں گا لیکن کسی سے گستاخانہ لہجے میں بات کی تو اس بدتمیزی کی سزا تمہیں خود دوں گا۔ مجھے بدمعاشوں کا برتاؤ میں فوراً پہچان جاتا ہوں لیکن کسی کو خوش فہمی ہو تو میں دور کر سکتا ہوں۔ اب بتاؤ کہ چھ مہینے پہلے تم کیا کرتے تھے؟ یہ بدتمیزی مت کرو میرے سامنے۔"

"چھ مہینے پہلے میں روڈ انسپکٹر تھا۔ گھاس کھودتا تھا۔" اس نے زمین پر تھوک کر کہا اور اس کے ساتھی بہت محظوظ ہوئے۔ ان میں سے دو نے ہنسنے کی کوشش بھی کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ دیکھ سکتے میں نے بڑی پھرتی سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے پیٹ میں گھونسا مارا۔ وہ بلبلا کے دہرا ہوا تو میرے دونوں ہاتھ حرکت میں آ گئے۔ میں نے ایک ہتھیلی سے اس کے بازو پر ضرب لگائی۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز اس کی چیخ سے پہلے آئی۔ دوسرا ہاتھ آنکھ جھپکنے میں کان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ مشکل سے پانچ سیکنڈ میں وہ زمین پر تڑپ کے بے حس و حرکت ہو گیا۔ گروبیزی سمیت باقی چھ افراد اس غیر متوقع صورت حال کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ دفعتاً ان پر سناٹا چھا گیا اور سب کی نظریں زمین پر پڑے ہوئے شخص پر مرکوز ہو گئیں لیکن وہ خوفزدہ نہیں ہوئے۔ ان کا غصہ بھڑک اٹھا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" گروبیزی برہم ہو کے بولا۔ "یہ تو اچھی طرح بھی بچے گا تم پر؟"

میں نے گروبیزی کے کوٹ کا کالر تھام لیا۔ "یہ آخری موقع ہے مسٹر گروبیزی! دوبارہ اس لہجے میں بات کی تو اس کے ساتھ تمہیں بھی ہاسپٹل کرنا پڑے گا۔ زبان اور دماغ کو قابو میں رکھو۔ تم کو جگہ پر

مفرور

کھوا دو مسٹر سکندر کو۔ پولیس نے آج تک کسی سمگلر کو اس جرم میں گرفتار نہیں کیا کہ اس نے ایک خطرناک ارادہ رکھنے والے مزدور کو سزا دی۔ پولیس میری مٹھی میں ہے۔ مجھے تم میں نے اسے چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”تم کو معلوم نہیں تو جا کے اپنے چوہدری سے پوچھو کہ میری کیا حیثیت ہے اور کتنی پہنچ ہے۔“

پنڈرو کا چہرہ احساس ذلت سے سرخ پڑ گیا۔ ”کیا یہ نہیں پتا ہے گا... مسٹر؟“ وہ بولا۔

”تم ایک آدمی کو ساتھ لو۔ دوسرے سیکشن کے فورمین کو“ میں نے کہا۔ ”باقی چار میں سے ایک چوہدری صاحب کے پاس جائے اور فون کر کے ایمبولینس منگوا لے۔ ویسے آدھے گھنٹے بعد یہ ہوش میں آ جائے گا... تو خود بھی اپنے پیروں سے چل کے جا سکے گا۔ ہڈی صرف ایک بازو کی ٹوٹی ہے۔ دوسرا میں نے سر کھا کے چھوڑ دیا۔“

دوسرا فورمین نہایت محتاط انداز میں آگے آیا۔ ”چلو مسٹر! ہمارا پکنک کا کام ہے۔“

گردیزی میرے دائیں ہاتھ پر رہا اور فورمین تھوڑے سے فاصلے سے بائیں جانب لیکن میں نے عمداً ان کو ایک قدم آگے رکھا تاکہ وہ میری نظر میں رہیں اور مجھ پر بے خبری میں حملہ نہ کر سکیں۔ جب بریک ہال میں ہم داخل ہوئے وہ سب سے بڑا تھا اور اس کی تو اسے ٹھیک تھا۔ یہاں مشینری کا مال آخری مرحلے میں مکمل ہونے کے بعد پہنچتا تھا اور پیک ہونے کے بعد سیدھا گیٹ سے نکل جاتا تھا۔ میں نے فورمین کو روک دیا کہ وہ ساری لائٹس جلا دے کیونکہ اندر اندھیرا تھا۔ بیرک کے سب سے اوپر والے حصے میں روشندانوں کی قطار تھی جو اس وقت روشنی کی مدھم سی جھلک دے رہی تھی۔ اندر مجھے مختلف سائز کے کریٹ نظر آئے۔ کچھ لکڑی چھوٹے بڑے ڈبوں کے کریٹ ہوتے ہیں تو کچھ اتنے بڑے کہ معلوم ہوتا تھا ان میں ٹریکٹر کا ماڈل ہو گا۔ ہم اندازہ نہیں بتا سکتے تھے چنانچہ میں نے فورمین سے پوچھا کہ اس میں کیا ہے اور اس نے خاصے مرعوب لہجے میں بتایا کہ اس میں فصل کاٹنے والے آلات ہیں جو ٹریکٹر کے ساتھ جوڑے جاتے ہیں۔ حالات اب بہت حد تک قابو میں آ گئے تھے اور میں نے اپنے ایک ہونے کے علاوہ لینے والا ”قربد معاش“ ہونے کا جو مظاہرہ کیا تھا وہ کامیاب رہا تھا۔ بیرک سے گزرتے ہوئے ہم نے لکڑی کے تختوں کے ڈھیر دیکھے جن سے کریٹ بنائے جا رہے تھے۔ کچھ لمبوترے کچھ چوکور کچھ اونچائی کے رخ چپٹے اور کچھ ہر طرف سے برابر نظر آنے والے کریٹ مکمل پڑے تھے۔ دوسری طرف وہ سامان رکھا تھا جو شاید اگلے دن پیک ہونا تھا۔ یہ سب زرعی آلات تھے۔ ویسٹ جرمنی کے تھریشر پلانٹ، دوا چھڑکنے، فصل کاٹنے اور بونے والے آلات کے پرزے یا مکمل آلات ان سب پر ”ایم کے ڈبلیو“ کی مہر تھی۔

میرا دورہ کامیاب رہا تھا اور فورمین نے تمام سوالات کے جواب شرافت سے دیے تھے چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ اس دورے کو ختم کر دوں۔ اتنی تفصیل سے پوری فیکٹری کو دیکھنے کے لیے کم از کم آدھے دن کی مہلت درکار تھی۔ یوں گھنٹے میں صرف ایک سیکشن ختم ہوا تھا۔ اگر میں چاہتا تو انہیں روک کے رکھتا اور رات تک معائنہ جاری رکھتا لیکن یہ خطرہ مول لینے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ بات زیادہ ہو جاتی تو میرا نکلنا دشوار ہو جاتا۔ مجھے مغرب کے بعد گاڑی بھی لینی تھی اور مسٹر گل نے کام کے لیے جو تین گھنٹے کی مہلت مانگی تھی وہ ختم ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے مسٹر گردیزی!“ میں نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا۔ ”باقی میں پھر کبھی دیکھوں گا۔“ میں نے ان لوگوں کا ایک گھنٹہ ضائع کیا تھا۔ ”انہیں اب جانے دو۔“ لیکن اسی وقت میں نے نوٹ کیا کہ فورمین جو مجھ سے آگے آگے اپنے سیکشن کے کام کی وضاحت کرتا چل رہا تھا دروازے میں رک گیا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھ یوں پھیلا دیے تھے کہ عین وسط میں کھڑا رہ کے وہ راستے کو بلاک کر رہا تھا۔ دروازہ اس سے زیادہ چوڑا تھا لیکن وہ دونوں طرف ہاتھ پھیلا کے اور دائیں بائیں جھک کے کسی کو بھی پکڑ سکتا تھا۔ میں نے گردیزی کو دیکھا۔ وہ میرے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا اور اس نے پستول کے ساتھ اپنا کارڈ بھی اتار کے نیچے پھینک دیا تھا۔

”تو یہ بات ہے!“ میں نے ایک قدم پیچھے ہو کے کہا۔ ”تمہارا خیال ہے کہ میں اب نکل نہیں سکتا؟“

”ضرور نکلے گا تم سکندر صاحب!“ فورمین بولا۔ ”لیکن ایسے نہیں تمہارا جنازہ نکلے گا۔“

گردیزی نے پنڈرو سے مجھے آگے دھکا دیا۔ میں سیدھا گیا۔ یوں جیسے دھکے سے میرے پیر اکھڑ گئے ہیں لیکن رکنے کے بجائے میں نے دروازے میں کھڑے ہوئے فورمین سے ٹکرا کے باہر نکلنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ فورمین میری نیت کو بھانپ گیا اور اس نے بڑی بھرپور لات گھمائی جو میرے منہ پر پڑتی تو میرے جبڑے ٹوٹ جاتے یا میری گردن فریکچر ہو جاتی مگر میں نے جب لٹک کے اس کی ٹانگ کو پکڑ لیا اور ایک جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ فورمین ایک ٹانگ پر آیا اور اس کے ہاتھ نے دروازے کو گرفت میں لے کر توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی مگر اسے ناکامی ہوئی اور وہ تھوڑا سا گھسٹنے کے بعد کھوکھے پر گرا۔ پیچھے سے گردیزی مجھ پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ میں نے فورمین کو اس کی ٹانگ سے پکڑ کے زمین سے تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور خود گھوم گیا۔ فورمین بھی یوں گھوم گیا جیسے سرکس کے ساتھ گھڑی کی سوئی گھومتی ہے یا بچے کا جھولا گھومتا ہے تو جھولے کے ڈنڈے گھوم گیا۔ اس کا سر گردیزی کی ٹانگ سے ٹکرایا۔ گردیزی لڑکھڑا کے گرا۔

میں نے توازن کو چھوڑ دیا۔ وہ گرتے ہوئے گردیزی کے ساتھ منہ کے بل جا گرا۔ ان کو اٹھنے کا موقع دیے بغیر میں نے گردیزی کے پیٹ کو ٹھوکر ماری اور وہ اٹھ کر دہرا ہو گیا۔ فورمین رکوع کی حالت میں تھا کہ میں نے اس کو کمر سے پکڑ کے اوپر اٹھا کر یوں پھینکا کہ وہ ایک کریٹ سے جا ٹکرایا جو اونچائی کی نسبت اس کی چوڑائی زیادہ تھی مگر کریٹ گردیزی کے سر پر لگا۔ اس نے کراہ کر سر پر ہاتھ رکھا اور ایک کریٹ اٹھا کے میری طرف پھینکا۔ میں نے بچایا لیکن اس کا ایک کونا میرے شانے سے رگڑ کھا گیا اور میری قمیص پھٹ گئی۔ کریٹ فرش پر بڑی آواز کے ساتھ گرا۔ اسی کے ساتھ دونوں طرف کے دروازوں سے دو دو افراد اندر داخل ہوئے۔ میں نے انہیں تختوں کے ڈھیر سے لکڑی کے تختے اٹھاتے دیکھا۔ اپنے قریب ہی مجھے ٹوٹنے والے کریٹ کے تختے نظر آئے۔ میں نے ایک تختہ اٹھایا جس کی چوڑائی ... تھی اور جیسے ہی گردیزی میری طرف آیا میں نے اس کے سر پر مارا لیکن وہ بچ گیا اور چوٹ اس کے شانے پر آئی۔ اس کی اور فورمین کی حالت کسی حد تک غیر تھی مگر چار افراد کی کمک نے ان کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔ میں ہر طرف سے محصور ہونے لگا تھا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ کسی کے ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا لیکن ان سب نے اپنی اپنی پسند کے مطابق لمبے تختے اٹھا لیے جو میرے ہاتھ کے تختے کی لمبائی سے دگنے تھے۔ اب وہ آہستہ آہستہ حلقہ بنائے میری طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ گالیاں بکتے، زمین پر سانڈ کی طرح پیر مارتے، نفرت اور عداوت سے تھوکتے۔ میرے ہلاک ہونے کے خواہاں گیدڑ بھبکیاں اور دھمکیاں دیتے۔

میں نے اب دفاعی انداز اختیار کر لیا تھا اور اپنی نشست بدلی کہ وہ سب میرے سامنے رہیں۔ بالکل سامنے آ کے ان میں سے ایک اچھلا اور علم بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے تختہ اٹھا کے میرے سر پر مارنا چاہا۔ میں نے سر کو بچانے یا جوابی وار کرنے کے بجائے اس تختے کا وار ہتھیلی پر روکا اور گرفت مضبوط کر کے جھٹکا دیا۔ وہ اپنے ہی زور میں آگے گرا اور میں نے دوسرے ہاتھ سے تختہ اس کے سر پر مارا۔ وہ چلایا اور وہیں گر گیا مگر اس کے بعد وہ سب ایک ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ دو کے وار کو میں نے تختے پر روکا اور ایک کے وار سے بچ گیا مگر ایک کا وار میرے شانے پر لگا۔ مجھے یہ مقابلہ بے سود نظر آ رہا تھا کیونکہ اپنی دو آنکھوں سے میں ان سب پر نظر رکھ سکتا تھا اور بیک وقت چھ افراد کے وار سے نہیں بچ سکتا تھا مگر یہ بھی ناممکن تھا کہ میں مقابلے بغیر شکست قبول کر لوں۔ خود کو گرنے سے پہلے میں دو کو کلائی آدمیوں کو الٹ چکا تھا۔ یہ مقابلہ دراصل جلد ہی بالآخر ختم ہو گیا۔ مجھے شانے والا وار ٹھیک میرے سر کے پچھلے حصے پر لگا۔ یکلخت ساری روشنیاں بجھ گئیں اور مجھے اندھیرے میں جگنو سے اڑتے دکھائی دیے۔ آخری احساس یہ تھا کہ ان میں سے کسی نے گالی دے کر میرے پیٹ پر ٹھوکر رسید کی ہے۔ آخری آواز دلاور کی تھی لیکن الفاظ کا مفہوم سمجھنے سے پہلے میرے ہوش و حواس ساتھ چھوڑ گئے۔

جب مجھے ہوش آیا تو میری ناک میں لکڑی کے رندہ کیے ہوئے تختوں کی مخصوص بو آئی۔ یہ بو بہت واضح تھی۔ پھر مجھے حرکت کا احساس ہوا۔ زمین میرے نیچے مسلسل اوپر نیچے ہو رہی تھی اور ٹرک کا شور اس حرکت کے ساتھ تھا۔ میرے ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے اور دونوں پیر ایک ساتھ باندھنے کے لیے بھی وہی رسی استعمال کی گئی تھی۔ اس کے باوجود میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور کچھ دیر میں کچھ جان سکا کہ آخر میرا سر نیچے کیوں ہے اور پیر اوپر کیوں اٹھے ہوئے ہیں۔ پھر جیسے جیسے ہوش و حواس بحال ہوتے گئے میں اس صورت حال کا بہتر طور پر جائزہ لینے کے قابل ہو گیا۔ میں لکڑی کے کسی کریٹ میں تھا اور کریٹ کو ایک طرف سے اوپر اٹھا کے زمین پر گھسیٹا جا رہا تھا مگر باہر اجالا ہوتا تو مجھے تختوں کی جھریوں سے ضرور دکھائی دیتا لیکن اندر اور باہر ایک جیسی سیاہی ظاہر کرتی تھی کہ وقت رات کا ہے۔ میں اس تابوت نما بکس میں ادھر سے ادھر ہو رہا تھا اور میرا سر بار بار نیچے کے تختے پر گھس رہا تھا۔ کریٹ میرے سائز کے مطابق نہیں بنایا گیا تھا بلکہ ان ہی میں سے منتخب کیا گیا تھا جو میں نے ورکشاپ میں تیار دیکھے تھے۔ اس کی لمبائی چوڑائی اور اونچائی میں اتنی گنجائش تھی کہ میں ہر طرف ایک فٹ تک حرکت کر سکتا تھا۔ چونکہ کریٹ مشینری کے لیے بنائے گئے تھے اس لیے تختے موٹے استعمال ہوئے تھے مگر ان کے درمیان کہیں سوت برابر کی جھری رہ گئی تھی تو اسے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ کوئی چیز اس میں سے کھسک کے یا بہہ کے باہر آنے والی ہوتی تو شاید اسے بند بھی کیا جاتا مگر اس میں سے تو ایک فٹ بولٹ بھی گرنے کا امکان نہیں تھا۔ تاہم یہی جھریاں میری زندگی کی ضامن تھیں کیونکہ ان میں سے تازہ ہوا کی فراہمی جاری تھی۔

”کریٹ کے اوپر کچھ نہیں لکھا؟ پاگل کے بچو!“ میں نے دلاور کی آواز سنی۔ ”راستے میں تمہارا کوئی باپ مل گیا تو کیا بتاؤ گے کہ کس کا مال ہے اور کہاں جا رہا ہے؟“

”کیپٹن کا ٹرک ہے چوہدری صاحب!“ پنڈرو یعنی گردیزی کی آواز آئی۔

”تو مجھ سے زیادہ عقلمند ہے؟“ چوہدری دلاور نے برہمی سے کہا۔ ”خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر پشاور کے کسی دیہات

www.paksociety.com

یا قبضے کا نام لکھ دو۔ کسی قریبی دارے کے نام سے سٹیشنری کے کاغذات بنانے کے ساتھ رکھ دو۔"

کریٹ اب ساکت تھا چنانچہ میں سیدھا لیٹا ہوا خود کو خاصا پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ ورنہ زمین سے رگڑ کھانے کا شور میری کھوپڑی میں بادلوں کی گرج کی طرح گونج رہا تھا اور میرا معدہ الٹ پلٹ ہونے لگتا تھا۔ میرے منہ پر انہوں نے ٹیپ لگا دیا تھا چنانچہ میں کسی کو مدد کے لیے نہیں پکار سکتا تھا۔ اگر میں کوشش کرتا تو میرے حلق سے کبوتر کی طرح غٹرغوں کے سوا کچھ نہ نکلتا۔ میں کریٹ کی سائڈ پر لاتیں مار سکتا تھا اور ہاتھوں سے بھی پیچھے کی طرف زور لگا سکتا تھا لیکن ابھی اس کارروائی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس کے لیے مناسب ترین موقع کا انتظار کرنا بہتر تھا۔ حالانکہ یہ امید بھی خود فریبی کے سوا کچھ نہ تھی کہ میں [illegible] کا زور لگا کے آدھا [illegible] سے زیادہ [illegible] کی کیلیں نکال دوں گا۔ یا [illegible] پر دھم دھم لاتیں مار کے کسی کو متوجہ کر سکوں گا یا ایسی ہی اوالیس کا سگنل دے سکوں گا۔

ان ہی بد معاشوں میں سے کسی نے کریٹ پر کالے رنگ اور برش سے کچھ لکھنا شروع کیا۔ ایک جھری میں سے بلب کی روشنی سنہرے تار کی طرح [illegible] میں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ ابھی ان کو یہی تاثر دینا بہتر تھا کہ مجھے ہوش ہی نہیں۔ شاید اسی طرح میں ان کی گفتگو کا کوئی لفظ سن کے اندازہ کر سکوں کہ وہ مجھے پیک کر کے کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔ مقصد اگر مجھے مارنے کا ہوتا تو اس کے لیے یہ تکلف غیر ضروری تھا اور تدفین کی خاطر تابوت بھی غیر ضروری تھا۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی قسم کا خطرہ مول لیے بغیر مجھے کہیں شفٹ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی ہاتھ پیر باندھ کے گٹھری کی طرح ٹرک میں لے جانا مشکل کام نہیں تھا لیکن وہ محتاط تھے اور مجھے کوئی موقع فراہم نہیں کرنا چاہتے تھے کہ میں رسیاں کھول کے چلتے ٹرک سے کود جاؤں یا ہوش میں آ کے بندھا ہوا بھی پنجرے کے کبوتر کی طرح قلابازیاں کھانے لگوں۔ کریٹ کے اندر سے میں نہ کسی کو نظر آ سکتا تھا اور نہ آزاد ہو جانے کی صورت میں (جس کا امکان ایک فیصد بھی نہیں تھا) کوئی خطرناک کارروائی کر سکتا تھا۔

"گاڑی میں دوسرا مال بھی جائے گا؟" گردیزی نے سوال کیا۔ معلوم نہیں دوسرے مال سے اس کی مراد کیا تھی؟

"نہیں۔ فی الحال اسی کو ٹھکانے لگانا ہے۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "اور دیکھو راستے میں کوئی روکے تو لے دے کے جان چھڑا لینا۔ قریب کوئی آنے ہی نہ پائے۔ کوئی پیچھے لگ جائے تو اسے جھکانے کی کوشش کرنا۔ ٹرک سے زیادہ کھلی سڑک پر کوئی نہیں بھاگ سکتا اور تیز رفتاری میں حادثہ ہو جاتا ہے۔ میں ہر غلطی معاف کر دوں گا لیکن حادثے میں کوئی نقصان ہوا تو زندہ گاڑ دوں گا۔" اس کی آواز اور اس کا لہجہ دونوں بدلے ہوئے تھے۔

"چوہدری صاحب! دونوں پرانے ٹرانسپورٹر [illegible] اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔" گردیزی بولا۔

"صبح تک سب کو واپس آنا ہے۔ سب [illegible] کے مطابق۔" دلاور نے کہا۔

ان کی گفتگو سے میں نے یہ نتائج اخذ کیے کہ [illegible] کا مطلب ٹھکانے لگانا نہیں تھا۔ مجھے وہ کسی محفوظ [illegible] رہے تھے جو ان کا اڈہ تھا یا کوئی ایسی جگہ تھی [illegible] مزید یہ کہ وہ جگہ سو سوا سو میل کے اندر تھی۔ ایک ٹرک [illegible] بھی دور جا کے واپس آ سکتا تھا۔ صبح تک انہیں [illegible] پانچ گھنٹے کا ایک طرف سفر زیادہ سے زیادہ دو سو میل [illegible] ٹرک کی اوسط رفتار چالیس میل فی گھنٹہ سمجھ لی جائے [illegible] رفتار رات کے وقت کافی ہے۔ پھر بڑے شہروں سے گزر [illegible] رفتار کو بیس پچیس میل رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ [illegible] تیس میل فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں طے کیے جا سکتے۔ [illegible] وزیرآباد، گجرات اور لالہ موسیٰ کے شہر تو یقیناً تھے لیکن [illegible] پھر جہلم کا شہر بھی آ سکتے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سو میل کے [illegible] تھا۔ ایک سو ساٹھ میل۔ اور میرے حساب کے مطابق وہ [illegible] آگے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ شاید جہلم اور [illegible] کی پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں کہیں وہ جگہ تھی جہاں مجھے قید [illegible] تھا۔ قید میں رکھنے کا مقصد کیا ہو گا یہ میں نے ابھی نہیں سوچا [illegible] دشمنوں کو صرف مہمان نوازی کا شرف دینے کے لیے قید نہیں کیا [illegible] سے کچھ اعتراف کرانے، کچھ پوچھنے یا کسی کام پر مجبور کرنے کا [illegible] ہے اور دیگر علوم و فنون کی طرح ایذا رسانی اور تشدد کے طریقے [illegible] بنیادوں پر اتنے موثر ہو گئے ہیں کہ ان کا تصور کرنے سے بھی [illegible] ہوتی ہے۔

دس منٹ بعد جو دس گھنٹوں کے برابر طویل تھے [illegible] ٹرک کی آواز سنی۔ میرے کان [illegible] پر ٹیوننگ کرتے رہے [illegible] کی گاڑی کی آواز سے آشنا تھے اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں [illegible] لوگ اس فرق کو محسوس کر سکتے ہیں۔ میرے خیال کے [illegible] کا چھوٹا ٹرک تھا۔ آوازیں جو کچھ دیر کے لیے معدوم [illegible] وہ لوگ راستے میں کھانے کے لیے کھانا [illegible] گئے تھے۔ دوبارہ سنائی دیں اور چار ہاتھوں نے مجھے [illegible] اٹھا کے ٹرک پر رکھا اور دھکا لگا کے آگے کر دیا۔ ٹرک [illegible] دروازہ بند ہوا جو دراصل دو فٹ اونچی روک تھا اور ٹرک کی تین دیواروں کے برابر تھا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ [illegible] دلاور نے [illegible]

[illegible] غائب ہو جانے کا شکر ادا کیا۔ "وہ تو پکا چور آ گیا ہے۔" اس نے جملے [illegible] کا اضافہ کیا۔ "سب اندر جاؤ اور [illegible] لائنس [illegible] جتنی [illegible] ہوتی ہے۔"

"کیا یہ خطرہ ہے چوہدری صاحب کہ وہ اندر آ جائے گا؟" [illegible]

"[illegible] یہاں کیوں آئے گا؟ اس کے باپ کا گھر ہے یا بیوی کا میکہ ہے [illegible] بریف کیس لے گا اور چلا جائے گا۔"

"اس نے چوکیدار سے کچھ پوچھا تو......" گردیزی نے کہا۔ "وہ [illegible]"

[illegible] لیکن اس کی بات سننے سے پہلے ہی میرا دل [illegible] سے دھڑکا تھا جتنی قوت سے گردیزی کے اس [illegible] میرے کانوں نے غلط نہیں سنا تھا۔ محسن پہنچ [illegible] مجھے کوئی امید نہیں تھی۔ میں نے ان کو طلب کیا تھا اور [illegible] صرف ان کو یہ احساس دلانا تھا کہ میرے یہاں آنے کی خبر دوسرا [illegible]

"یہ خون لاتیں مار کے ڈھول بجا رہا ہے۔" گردیزی نے کہا۔ "یہ [illegible] ایسے......"

"اس کا ڈھول بعد میں بجائیں گے۔" دلاور نے کہا۔ "جا کے [illegible] کیا بک بک کر رہا ہے۔"

"آپ نے تو کہہ ہی دیا تھا چوکیدار کو۔ وہ کہہ دے گا کہ سکندر صاحب آئے تھے اور یہ دے کر چلے گئے۔"

"وہاں تو غلطی ہو گئی ہے ہم سے۔" دلاور نے کہا۔ "اب اتنا تو ثابت ہو ہی جائے گا کہ وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ اس کا باپ ایسا ہی نہیں ہے [illegible] جائے گا جو یہ ثابت کرے کہ سکندر دروازے تک ہی آیا تھا یا اندر بھی گیا تھا۔"

میرا دل چاہا کہ میں قہقہہ مار کے ہنسوں۔ یہ بات اب یقینی تھی [illegible] راجا اور رضوی صاحب کی ساری تفتیش کا مرکز چوکیدار ہو گا [illegible] سوال فطری طور پر ان کے ذہن میں پیدا ہو گا کہ سکندر کو یہاں بریف کیس چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ اسے گاڑی سے گھر پہنچنا تھا۔ مجھے وقت کا اندازہ نہیں تھا لیکن محسن کا آنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ تقریباً [illegible] گھنٹے گزر چکے ہیں۔ انہوں نے رات ہونے تک میرا انتظار کیا ہو گا اور پھر محسن نے طے کیا ہو گا کہ وہ خود جا کے معلوم کرے۔ مجھے [illegible] گھنٹے کا تو گزر رہے تھے۔ پانچ گھنٹے بعد بھی میرے نہ پہنچنے سے تشویش پیدا ہونا یقینی تھا۔ چھ گھنٹے بعد بھی اگر محسن جاتا تو [illegible] کیا ہو گا تو [illegible] اسے بتایا ہو گا کہ جناب عالی! گاڑی [illegible] تیار کھڑی ہے پر وہ صاحب پہلے ہی نہیں آئے۔ اور ان کا [illegible] کہ اس کے ذہن میں وہ بھی مقامات پہلے [illegible] مقبرہ جہانگیر اور قلعہ جیسے [illegible] لیکن رات کو مقبرہ جہانگیر بند ہو جاتا ہے اور قلعہ کا آخری شو جاری ہو گا یا ختم ہونے والا ہو گا چنانچہ دونوں جگہ میری موجودگی خارج از امکان تھی۔ پھر وہی ہوا ہو گا جو میرے ساتھ ہوا یعنی ان کی نظر سے "ایم سیلاتو کی ایجنسی گڈ گیلکسی" کا بورڈ دیکھا ہو گا۔ [illegible] فطرت سے بخوبی واقف تھا اور خود اس کی سوچ کا انداز طویل رفاقت کے بعد میرے ذہن سے ہم آہنگ ہو چکا تھا اور ہمارے خیالات کی یہ مطابقت بعض اوقات ٹیلی پیتھی کی طرح ہو جاتی تھی۔ اس نے سوچا ہو گا کہ اگر سکندر [illegible] کی جولانی طبع اور مہم جو فطرت نے مجبور کیا ہو گا تو کچھ بعید نہیں کہ وہ [illegible] کو کیک چلاتا دیکھنے کے بجائے چوہدری دلاور سے [illegible] مار کھانے چل پڑے ہوں گے اور اب وہ دروازے تک آ پہنچا تھا۔ میری ایک فضول سی حرکت بہت بامعنی ہو گئی تھی اور دشمنوں کی ذرا سی غلطی بہت بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہونے والی تھی۔ اگر وہ بریف کیس غائب کر دیتے اور چوکیدار کو سمجھا دیتے کہ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تو کچھ نہ ہوتا لیکن خود ان کو ایک فیصد شبہ نہ تھا کہ محسن واقعی آ جائے گا۔ انہیں یہ سب میری اداکاری کا معجزہ محسوس ہوا ہو گا۔

"تم کہتے ہو بہت گھٹیا قسم کے۔" دلاور نے آہستہ سے کہا۔ "تم نے اسی وقت مجھے بتا دیا ہوتا تو میں بریف کیس منگوا لیتا لیکن تم نے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائے۔"

"میری جگہ آپ ہوتے چوہدری صاحب تو اس مکار کی باتیں سن کے یہی سمجھتے کہ سب کچھ اس پہ ہے۔" گردیزی بولا۔

"اچھا اب تم لوگ جاؤ۔" دلاور نے کہا۔ "چوکیدار سے میں نمٹ لوں گا۔ مجھے معلوم ہے وہ صبح پھر آئیں گے۔ ہو سکتا ہے رات کو ہی آ جائیں۔ اس سے پہلے مجھے چوکیدار بدلنا ہے۔ چوکیدار کو بھی ڈال لو گاڑی میں۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ یہ لوگ اب چوکیدار کو ختم کرنے پر آمادہ تھے۔ جب وہ چوکیدار ہی نہیں ہو گا تو کوئی اس کی زبان سے کیا اگلوائے گا اور نیا آدمی ہو گا تو لاکھ پوچھنے پر بھی وہ بات کیسے بتائے گا جس کا علم اس کے فرشتوں کو بھی نہیں۔ رضوی صاحب کی ساری قوتیں اندر آ کے کوئی کارنامہ [illegible] نہ انہیں سکندر ملے گا نہ وہ چوکیدار۔ چوہدری دلاور یا گردیزی [illegible] جانے والے چوکیدار کی پوزیشن بالکل محفوظ ہو گی۔ وہ صاف انکار کر دیں گے کہ سکندر بخت کو انہوں نے دیکھا تک نہیں۔ وہ معمول کے مطابق چھٹی کر کے گھر چلے گئے تھے۔ ان کے وہ [illegible] بھی یہی بیان دیں گے تو ثابت کیا ہو گا۔ اس کے باوجود مجھے خوشی تھی کہ کچھ تو ہوا۔ میرا سراغ اس فیکٹری کے گیٹ تک تو ملا۔ آگے رضوی صاحب کی ذہانت، ان کے وسائل اور ان کی مخصوص ٹیم پر ہے کہ کیا کرتے ہیں۔ یہ میرا مقدر۔

◆

"چوہدری صاحب! میری غلطی جناب!" چوکیدار کے [illegible] کی

www.paksociety.com

آواز آئی۔ پھر کسی نے اس کے سر پر کوئی چیز ماری کہ اس نے حلق سے ذبح کیے جاتے بکرے جیسی آواز نکالی اور خاموش ہوگیا۔ میرے قریب ہی دھماکا ہوا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ چوکیدار کو باندھ کے اوپر سے اچھال دیا گیا ہے۔ خدا کرے کہ وہ زندہ ہو۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ راستے میں اسے ہوش آجائے۔ میرے اور اس کے درمیان ایک تختے کی دیوار ہے۔ وہ میری بات سن سکے گا لیکن یہ آواز آگے بیٹھے ٹرک چلانے والوں تک نہیں پہنچے گی۔ میری پہلی کوشش کی ناکامی نے مجھے تھوڑا سا دل شکستہ کر دیا تھا لیکن مایوس نہیں کیا تھا۔ محرم گیٹ سے باہر تھا چنانچہ وہ آواز اس کے کانوں تک کیسے پہنچ سکتی تھی جو میری لاتوں کے کریٹ پر لگنے سے پیدا ہوئی تھی۔ اگر یہ دھم دھم وہ سن بھی لیتا تو اس سے یہ نتیجہ کیسے اخذ کرتا کہ یہ شہزادہ سکندر بخت کا ایس او ایس ہے جو اس وقت لکڑی کے ایک ڈبے میں پیک کیے جا چکے ہیں اور اندر ہی اندر مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے ہیں۔ لیکن اندر سے کسی تک باہر پہنچ سکے چوکیدار سے مشورہ کر سکتا تھا اور حالات کے مطابق اس کو مشورہ دے سکتا تھا یا اس کی رہنمائی کر سکتا تھا۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ۔ زندہ رہنے کی جدوجہد میں یہ اشتراک باہمی کارآمد ثابت ہوگا یا نہیں، یہ کہنا قبل از وقت تھا۔

ٹرک کا دروازہ بند ہوا اور ٹرک جھٹکے سے آگے بڑھا۔ فیکٹری کے گیٹ سے سڑک تک آنے میں دو منٹ بھی نہیں لگے ہوں گے۔ اس وقت میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ میں نے اس تمام ٹریفک کا تصور کیا جو ہمارے آگے پیچھے رواں تھی۔ بسیں اور ٹرک، ویگن اور کاریں۔ ان کا شور مجھ تک پہنچ رہا تھا لیکن مجھے ذرا بھی امید نہیں تھی کہ میں نے کریٹ کے اندر لاتیں مار کے ڈھول بجایا تو یہ آواز کسی کے کانوں تک پہنچے گی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اگر ٹرک کا کسی سے ایکسیڈنٹ ہو جائے۔ دھکے تیز بھی ہو شاید اس کے بریک فیل ہو جائیں۔ یا سامنے سے کوئی غلط اوورٹیک کرتے ہوئے اس سے ٹکرا جائے تو اس بات کا خاصا امکان ہے کہ جھٹکے سے کریٹ نیچے جا گرے یا ٹوٹ جائے۔ لیکن ایسی صورت میں ففٹی ففٹی چانس میری گردن ٹوٹنے کے یا میرا سر پھٹنے کے بھی تھے۔ معمولی زخمی ہونا تو یقینی تھا۔ یہ کس قدر ناقابل یقین بات ہوگی۔ میں نے سوچا۔ اگر دیکھنے والوں کو بتایا جائے کہ یہ جو ٹرک ابھی ابھی "ایم ڈبلیو ٹی انجینئرنگ کمپنیز" سے نکلا ہے اور جس پر صرف ایک کریٹ رکھا ہے اس میں خود فیکٹری کے مالک تشریف فرما ہیں۔ بے شک عام حالات میں فیکٹریوں کے مالک اس طرح سفر نہیں کرتے مگر یہ مخصوص حالات ہیں جن کا تعلق شامت اعمال سے ہے۔

سڑک پر پہنچنے کے بعد ٹرک کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ علاوہ ازیں جیسے ترقی کرنے والوں کی طرح میں نے صندوق کو اندر سے "ہیومیٹنگ" شروع کی۔

کے انداز میں بجایا۔ مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ میرا گمراہ ہے۔ اس مشینی سیفٹی کے قاتل ناخدا ترس نمبر ... وہ سب کچھ مصائب میں غرق ہونے والے بیاسا ... کے شور کے سوا کچھ دوا آیا جواب کچھ کم ہوگیا تھا۔

ہم شاہدرے سے دور آ چکے تھے میں نے اس لیے سوچنا شروع کیا کہ جا سا پاؤ گھنٹے میں کیا کچھ کیا جائے ... سے کچھ حاصل ہوا؟ ہم سب سے اچھا تو یہ ہوتا کہ کوئی میرے منہ پر سے ٹیپ اتار دیتا۔ پھر میں لاؤڈ اسپیکر ذکس کو ضرور متوجہ کر لیتا مگر دست غیب کے کریٹ کھولنے الف لیلوی تھا۔ بالکل ایسا ہی جیسے کسی پری کا ... کا خیال ہوا تھا کہ ایک جنبش سے کریٹ کی دیواریں ... میری ناک میں عجیب سی ناگوار بو بھی آرہی ...

ہم کالا شاہ کاکو سے گزر رہے تھے جہاں کیمیکلز تیار ... جلانے والا بہت بڑا کارخانہ ہے اور اس کی کیمیائی دھوئیں کو معطر رکھتا ہے۔ یہ تو وہی جگہ ہے گویا ... آیا؟ اس وقت جب موت یقینی نظر آرہی تھی خدا نے ... تھی کہ میں نے گاڑی کو ایک خوفناک مقام سے بال بال ... اس کے بعد جب وفات پانے کے امکانات تقریباً ... مجھے بھٹکا کے کہاں لے گیا۔ اب پھر اسی راستے پر ... میری منزل سلامتی کی منزل نہ تھی۔ اگلے اور پچھلے ... تھا چنانچہ ڈرائیور اور اس کے کلینر یہ تو دیکھ سکتے تھے کہ ... جگہ موجود ہے لیکن کسی قسم کی آواز نہیں سن سکتے تھے۔ ... جونا تو یقیناً بے ہوش پڑے ہوئے چوکیدار کو بھگت ... والے کی طرح اس وقت تک یہ عمل جاری رکھتا جب تک اس کے کانوں کے راستے اس کے لاشعور میں ... کو بیدار کر دیتی لیکن میں قوت گویائی سے ہی محروم تھا۔

میں انہیں بے سروپا خیالات میں غرق تھا کہ میں نے کراہنے کی آواز سنی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ اگر چوکیدار ہوش میں آجائے تو یقیناً چیخ و پکار مچا سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ ... سے گزرتے ہوئے۔ اسی وقت میں نے ایک بھاری گاڑی کی آواز سنی۔ پھر موٹر سائیکل نے ٹرک کو اوورٹیک کیا ... خالص پولیس والے ... لہجے میں کہا "گاڑی روکو" ... حکم عدولی کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ٹرک کی رفتار کم ... ایک سائیڈ پر رک گیا۔

"کیا لے جا رہے ہو؟" ٹرک کو روکنے والے نے کہا۔ آواز بہت قریب محسوس ہوئی۔

موہوم سی امید میں میرا دل زور سے دھڑکا۔

ایک بار میں نے دونوں لاتوں کو سمیٹ کر پھیلایا اور جسم کی ساری توانائی صرف کر کے اس صندوق کی دیوار پر مارا جو میرا تابوت بنا ہوا تھا۔ اندر ایک گونج سی پیدا ہوئی اور یہ آواز یقیناً اس کو بھی سنائی دیتی جس نے ٹرک روکا تھا مگر میری بدقسمتی کہ عین اسی وقت کوئی ٹرک کا دروازہ زور سے بند کر کے نیچے اترا۔

"سلام کریں عالی جاہ!" میں نے ایک آواز سنی۔ یہ انہی میں سے ایک تھا جو میرو وزیرا اینڈ کمپنی میں نوکر کہلاتے تھے۔

"کیا لے جا رہے ہو ٹرک میں؟" عالی جاہ نے خوشامدانہ لہجے سے متاثر ہوئے بغیر اکڑ کے کہا۔

"وہی جو روز لے جاتے ہیں سرکار! کمپنی کا مال ہے تھانیدار جی۔"

"کون سی کمپنی کا؟ کیا مال ہے اس صندوق میں؟" تھانیدار بولا۔

"کمپنی کا نام تو ٹرک پر لکھا ہوا ہے سرکار! اپنے چوہدری دلاور صاحب کی فیکٹری ہے۔"

میں نے پھر صندوق کی دیوار پر لات ماری۔ "یہ کیسی آواز ہے؟" تھانیدار نے کہا۔

"وہ پیچھے والا ٹپ ذرا ڈھیلا ہے عالی جاہ! آپ ذرا ادھر آئیں، سڑک سے ہٹ کر بات کریں۔"

"اوئے.... ہاتھ چھوڑ... بات کر اسی جگہ۔" تھانیدار گرم ہوگیا۔ "بکس میں کیا ہے؟"

"بکس میں پرزے ہیں جی! ٹریکٹر کے ساتھ جوڑنے والے۔" آواز اب قدرے دور سے آئی مگر میں نے بکس کے اندر لاتیں مارنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ "اپنے چوہدری صاحب کی فیکٹری میں ہی بنتے ہیں۔"

باہر سے ٹرک اور بسیں گزرتے جا رہے تھے چنانچہ جتنی آواز میرے کان اس ڈبے میں سن رہے تھے اتنی باہر تھانیدار تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اس کے باوجود تھانیدار کے ذہن میں جنم لینے والا شک برقرار رہا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مجھے اغوا کرنے والے کا لہجہ اعتماد سے خالی تھا۔ شاید وہ گھبرا گیا تھا کہ خوف اس کی آواز سے جھلک رہا تھا۔

"کھولو اسے بچے!" تھانیدار نے اسے ایک اور گالی دے کر کہا۔ "تھانے لے کر چل ٹرک کو۔"

"تھانے کی بات کیوں کرتے ہیں جناب عالی!" ڈرائیور نے لجاجت سے کہا۔ "بات تو یہاں بھی ہو سکتی ہے۔"

"بات کر انسانوں کی طرح۔ یہ کیا ڈھکا چھپی ہے بکس میں؟" تھانیدار نے کہا اور اپنی کوشش کی کامیابی نے میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ میں نے صندوق کے اندر مرغ بسمل کی طرح تڑپنا شروع کیا اور میری لاتیں لکڑی کی بنی ہوئی تین دیواروں پر پڑنے لگیں۔

"ٹریکٹر کے پرزے اندر ہی اندر اچھلنے لگے ہیں! تیرے چوہدری صاحب کی...." تھانیدار نے بڑی سے والد کو بھی گالی سے نوازا۔ "میں کھائی تک پہنچ کے سڑک پر ڈال دوں گا؟"

"عالی جاہ! اس بار معاف کر دیں۔" ڈرائیور بولا۔ "میں نے جھوٹ بولا تھا۔ بکس میں ہرن ہے۔ چوہدری صاحب نے چھانگا مانگا سے پکڑا تھا۔ بڑا سخت جرم ہے جی! لیکن ہم تو بے قصور ہیں۔ بڑے آدمیوں کے شوق ہیں۔ ہمیں حکم ملا تھا کہ اسے ایک دوست کے گھر پہنچانا ہے۔ وہ صوبہ سرحد کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ سرکار سے کھلا نہیں لے جا سکتے تھے اس لیے ایک بکس میں ڈال کے لے جا رہے ہیں۔" اس کی آواز رفتہ رفتہ قریب آرہی تھی جس سے میں نے اندازہ کیا کہ تھانیدار ایک ایک قدم پیچھے کی طرف بڑھتا آرہا ہے۔ ڈرائیور نے بڑی چالاکی سے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ لیکن ایک امید ابھی زندہ تھی۔ اگر پولیس والے نے پیچھے آ کے جھانکا تو اسے بے ہوش پڑا ہوا چوکیدار ضرور نظر آجائے گا۔ اس کے بعد وہ ڈرائیور کو ہرگز نہیں بخشے گا۔

"وہ دیکھیں عالی جاہ.... چوہدری صاحب نے کہا تھا کہ کوئی پوچھے تو اسے بھی بتایا جائے۔ اور یہ نذرانہ ہے چوہدری صاحب کی طرف سے۔" ڈرائیور نے تھانیدار کو روکنے کی کوشش میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ "پورے دو ہزار ہیں۔ آپ فرما دیں کم ہے تو..."

"یہ ہرن کا بچہ اچھل کود رہا ہے؟" تھانیدار کی آواز بہت قریب سے آئی۔ "چلا کیوں نہیں رہا ہے؟"

"چلائے گا کیسے سرکار! منہ باندھ دیا ہے اس کا۔" ڈرائیور بولا۔ "اب جانے دیں اس معاملے کو۔ خواہ مخواہ بات بڑھے گی۔ آپ اسے ضبط کر لیں گے۔ پھر مجھے پکڑ کے لے جائیں گے مگر چوہدری صاحب بڑے رسوخ والے آدمی ہیں۔ ان کو جیل تو ہو ہی نہیں سکتی۔ جرمانہ ہی ہوگا عدالت سے۔ جرمانہ آپ لے لیں۔ اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں عالی جاہ! میری بھی ضمانت ہو جائے گی۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ ہمارا کوئی جرم نہیں۔ چلیں آپ دو کے چار کر لیں۔ ویسے اپنے چوہدری صاحب نے مجھے پانچ تک اختیار دیا ہے۔ لیکن ہرن تو ضرور جائے گا جی۔ ہو سکتا ہے چوہدری صاحب اپنے ہی آ کے جائیں۔ پھر آپ کو افسوس ہوگا اپنے نقصان کا۔ ایسے ہی ضد میں پانچ ہزار بھی جائیں گے ہاتھ سے۔ ہرن کا کیا ہے؟"

"اوئے ہرن کے بچے!" تھانیدار نے یکلخت مشتعل ہو کے کہا۔ پھر چلانے کی طرح آواز آئی جس سے میں نے اندازہ کیا کہ تھپڑ

www.paksociety.com

تھا سا جیرا ہوا تھا اور ڈرائیور کے منہ پر پڑا ہے۔ "یہ ہیرا ہی ہے کہ بند؟ بول تیری ایسی تیسی۔"

"بتاتا ہوں، بتاتا ہوں مائی باپ!" ڈرائیور کی گھٹی گھٹی آواز آئی۔

یوں لگتا تھا کہ تھانیدار نے گالی دیتے ہی اس کی گردن بھی دبوچ لی ہے۔ "قتلے میری سن لی تھی۔ پولیس انسپکٹر نے بیہوش پڑے ہوئے چوکیدار کو دیکھ لیا تھا۔ ہیرے والا انگوٹھا شاید پانچ ہزار میں چل جاتا۔ لیکن اب معاملہ لمبا ہو گیا تھا۔" ڈرائیور بولتے بولتے کوشش میں حلق سے خرخر کی آوازیں نکال رہا تھا۔ "میرا گلا تو چھوڑیں۔" وہ ہانپتے ہوئے کھانسنے لگا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ گالیاں دینے والے تھانیدار کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ آخری آواز جو میرے کانوں نے سنی کراہنے کی تھی۔ شاید اس سے پہلے کوئی چیز گری تھی یا ٹکرائی تھی۔

"باڈی تھی سی آدمی مجھو انسپکٹر۔" ایک اور کرخت، جیتی ہوئی آواز آئی۔ "ہمیں لے تو پانچ ہزار۔"

"بڑے وقت پر کام کر دیا تو نے۔" پہلا شخص بولا۔ "میں تو گھبرا گیا تھا۔"

"چل اب نکل۔ گاڑی سٹارٹ کر۔" دوسرے نے کہا۔ "ٹریفک بہت ہے۔"

"اور اس کو کیا ہے گا۔ یہیں سڑک پر ہی پڑا رہے گا۔"

"یار تو جلدی کر۔ میں اس کو ڈالتا ہوں کنارے پر۔" دوسرا ہانپتا ہوا بولا۔ "او تے ٹھیر ذرا۔ ادھر بیٹھ جا۔ بیٹھ میرے ساتھ۔ کوئی گاڑی نہ پیچھے۔ لاش اس پہ پڑ آ گئے ورنہ پھنس جائیں گے۔ اس کو بالکل کور کر لے۔ بس پیچھے دیکھ۔ معلوم ہو کہ ہم ٹرک میں کوئی خرابی دیکھ رہے ہیں۔ ایسے گھبراہٹ جایا کر......"

"اس کی موٹر سائیکل بھی تو کھڑی ہے۔"

"وہ آگے ہے۔ اصل ٹرک کی سائیڈ میں ہے۔ پیچھے سے نظر نہیں آتی۔" دوسرا بولا۔

"مگر یار اس نے نمبر تو نوٹ کر ہی لیا ہو گا۔" ڈرائیور نے کہا۔

"او تے دماغ کو ٹھکانے رکھ۔ نمبر کون سا اصلی ہے۔" دوسرے نے جھلا کر کہا۔ "چل اب اٹھ۔ فٹافٹ نکل جاتے ہیں۔"

ٹرک ایک بار پھر روانہ ہو گیا اور اس اندھیرے میں جو دولت کا ایک حصہ تھا اور میرے ساتھ لکڑی کے اس باکس میں محصور تھا، پولیس کا گہرا اندھیرا بھی شامل ہو گیا۔ اتنا اندازہ تو مجھے تھا کہ ٹرک میں آگے کم و بیش دو افراد ہوں گے۔ اب میں تصور کر سکتا تھا کہ شامت اعمال کے باعث راستہ روکنے والے انسپکٹر کے ساتھ کیا ہوا۔ جب وہ ایک سے بات کر رہا تھا تو دوسرا ٹرک میں بیٹھا رہا اور موقع ملتے ہی دوسری جانب اتر گیا جہاں اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انسپکٹر تو بہت ایماندار اور فرض شناس تھا یا بہت لالچی کہ پانچ ہزار کی رقم بھی

دلنی کرنے کی فکر میں تھا۔ ڈرائیور کا دوسرا ساتھی ٹرک کی آڑ میں چھپا کھڑا رہا۔ انسپکٹر پانچ ہزار لے کر چلا جاتا تو وہ بھی خاموش لوٹ کر اپنی جگہ آ بیٹھتا۔ مگر اس نے معاملات کو طول پکڑتے دیکھا تو بے خبری میں اچانک پیچھے سے آ کے انسپکٹر کے سر پر یا سر پر سے وار کیا اور بات ختم کر دی۔ اب معلوم نہیں وہ زندہ تھا یا صرف بیہوش لیکن اس کا جسم سڑک سے ہٹ کر کسی جھاڑی کے پیچھے پڑا تھا جہاں اسے سڑک پر سے گزرنے والا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی موٹر سائیکل کو یقیناً ہر گاڑی کے ڈرائیور نے دیکھا ہو گا اور پہچان لیا ہو گا مگر جانتے بوجھتے کون رکتا ہے کہ پولیس کی خیریت معلوم کرنے رکے۔ سب یہی فرض کرتے رہیں گے کہ سارجنٹ آگے پیچھے کہیں ہو گا۔ صبح کی روشنی پھیلنے تک اس کو کوئی اٹھا لے خدا کرے۔ اگر وہ خود بھی ہوش میں آ کے اٹھ کھڑا ہوا تب بھی چوہدری صاحب کا کیا بگاڑ لے گا۔ وہ رپورٹ کرے گا کہ فلاں کے فلاں ٹرک نے جس کا نمبر یہ تھا اور جسے اس نے روکا تھا اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اور چوہدری دلاور کہے گا "کیسی باتیں کرتے ہیں انسپکٹر صاحب! اس نمبر کا ٹرک ہماری فیکٹری میں ہے اور نہ کوئی ڈرائیور۔ جی جی! یہ جو بندہ ہے جسے آپ نے شناخت کیا تو یہ ڈرائیور نہیں ہے جناب عالی! واہ، آپ بھی مذاق کر رہے ہیں ہم سے۔ لیجئے تھانیدار صاحب! ہیرے کہاں، اور ہوں بھی تو ہم کو مرنے جینے کی فرصت نہیں۔ پکڑنے لگے ہیرے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہ جرم ہے دوست؟ واہ جی واہ! ہم نے تو ابھی تک پنجاب سے آگے دیکھا ہی نہیں۔ یہ صوبہ سرحد ہے کدھر جناب انسپکٹر صاحب۔" بیچارا انسپکٹر بھی بہتر سمجھے گا کہ چوہدری صاحب ازراہ عنایت جو کچھ بھی دیں اسے لے کر شکریہ ادا کرے اور رخصت ہو جائے۔ لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں۔

وقت کے ساتھ فاصلے کا احساس بھی باقی نہ رہا۔ مسلسل جھٹکوں سے میری اپنی حالت غیر ہونے لگی۔ اگر مجھے کنکریٹ مکسر میں ڈال کے گھمایا جاتا تب بھی میری حالت یہی ہوتی۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ ہل گیا تھا اور اسی طرح درد کر رہا تھا جیسے پولیس کی حوالات میں پہلی رات سرکار کی میزبانی کے بعد درد میرے رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا۔ اس قید سے نجات کی بظاہر کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اور منزل تک پہنچنے سے پہلے اغوا کنندگان کے عزائم کا اندازہ لگانا بھی محال تھا۔ تاہم وقتی مایوسی اور ناامیدی کا وقفہ گزر گیا تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب تائید غیبی کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ سوائے سوچنے کے میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ ایک امید کی کرن

چوکیدار کا وجود تھا۔ خدا کرے اسے ہوش آ جائے اور وہ اس قابل ہو جائے کہ راہ گیروں کو متوجہ کر سکے جتنی کسی شہر یا قصبے سے گزرتے ہوئے چیخ دیکھا جا سکے۔ ہاتھوں اور پیروں کے کھل جانے کی امید ایسی ہی تھی جیسے میرے گرد مضبوطی سے جڑے ہوئے تختوں کی دیوار کے ٹوٹ جانے کی توقع رکھنا۔ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ کسی طرح وہ ٹیپ اکھڑ جائے جس نے میری قوت گویائی سلب کر رکھی تھی۔ میں نے ہونٹوں کو جبڑوں کو اور دو ہاتھوں کو حرکت دے کر اس ٹیپ سے نجات حاصل کرنے کی واجبی سی کوشش کی جس کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ ایسا خیال است و محال است و جنوں۔ ٹیپ تو میرے ہونٹوں کے گرد گرفت کے ہر ریشے سے یوں چپکا ہوا تھا کہ اس قسم کی کوشش اپنی ہی اذیت میں اضافہ لگتی تھی۔

پیچھے سے کسی گاڑی نے میوزیکل ہارن دینا شروع کیا۔ پیں پاں پی پاں۔ پیں پاں پیں پاں پیں پاں۔ یہ غالباً لاہور سے راولپنڈی جانے والی ویگن تھی جو ذرا سی دیر میں آگے نکل گئی۔ ڈرائیور محض تفریحاً یا اپنی انفرادیت کے مظاہرے کی خاطر ہارن بجا رہا تھا ورنہ اس وقت ٹریفک بہت کم تھی۔ شہر کے رش میں راستہ مانگنے کے لیے بجنے والی دھنیں کسی کے کانوں پر جوں کی طرح رینگتی ہیں بلکہ صرف ویگن والوں کی تفریح تھیں جو ایک شہر سے دوسرے شہر آیا جایا کرتی تھیں۔ ہارن کی آواز دور ہو کر مدھم ہو گئی پھر دوسرے ٹریفک کے شور میں گم ہو گئی۔ میں اس ہارن کے شور کو بھول چکا تھا کہ اچانک میرے کانوں نے وہی آواز سنی۔ ٹرک کی رفتار میں اضافہ نہیں ہوا تھا چنانچہ اس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ ویگن رک گئی تھی یا اس کی رفتار اتنی کم ہو گئی تھی کہ ٹرک نے پھر اسے جا لیا۔ دوسری صورت قدرے غیر منطقی لگتی تھی کیونکہ ویگن والے تیز رفتاری کے باعث خاصے بدنام ہیں چنانچہ یہ بات زیادہ قرین قیاس لگتی تھی کہ ویگن رکی ہے۔ پیں پاں پیں پاں۔ میوزیکل ہارن کی آواز پھر سنائی دی اور اسی وقت ہم نے اسے کراس کیا۔ ذرا سی دیر کے لیے ویگن کے کنڈیکٹر کی صدا آئی۔ "بھائی چکوال، چکوال" اس کا مطلب تھا کہ سوہاوہ کے قریب بائیں جانب ایک سڑک چکوال جاتی ہے۔ سنگ میل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام آباد کتنی دور ہے۔ مخالف سمت میں لاہور کتنی دور اور بائیں ہاتھ چکوال کا سفر کتنا ہے۔ ایسا ہی دوسرا موڑ بہت آگے راولپنڈی کے قریب آتا ہے لیکن میرے اندازے کے مطابق ابھی ہم نے اتنا فاصلہ طے نہیں کیا تھا۔

ٹرک بائیں طرف گھوم گیا۔ ویگن کا میوزیکل ہارن دور سے سنائی دیا۔ پھر قریب آنے لگا۔ اب شبے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ ٹرک چکوال والی سڑک پر جا رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں ویگن پھر آگے نکل گئی۔ ٹرک نے ایک اور موڑ کاٹا اور راستہ مزید ناہموار ہو گیا۔ یہ جہلم کے

گرد و نواح کا وہی ناہموار ٹیلوں اور کھائیوں والا علاقہ تھا جہاں سے میں صبح کار میں گزرا تھا۔ کار تو اب محسن لے جا چکا ہو گا اور میرے غائب ہو جانے سے سب تشویش اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی ہو گی کہ میرا بریف کیس "ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" کے چوکیدار کے پاس کیسے پہنچا اور میں فیکٹری میں نہیں گیا تو کہاں گیا۔ رضوی صاحب سخت برہم ہوں گے "یہ سکندر بادشاہ جب آتا ہے کوئی نیا گل کھلاتا ہے۔ اسے تو ہر وقت نظر کے سامنے رکھنا چاہیے۔ بس غلطی ہو گئی کہ گاڑی کو مرمت کرا کے لانے کی ذمہ داری سونپ دی۔" اور رابعہ سخت فکر مند ہو گی۔ عین ممکن ہے کسی کمرے میں بیٹھی رو رہی ہو۔ میں نے چشم تصور سے رابعہ کو بیٹھے روتے دیکھا اور اس منظر نے مجھے خاصا سامان تسکین قلب فراہم کیا۔ محسن کیا کرے گا۔ اب تو رضوی صاحب ہی طے کریں گے کہ اپنی پولیس فورس کے ساتھ فیکٹری پر چڑھائی کر دیں اور چوکیدار سے چوہدری دلاور تک سب کو چھان پھٹک کے میرا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔ مگر جب کچھ معلوم نہیں ہو گا تو پتا لگے گا کیا خاک۔ چوہدری دلاور کچھ بتانے والا آدمی نہیں ہے۔ وہ تو ایسا ایکٹر ہے کہ ایف بی آئی اور اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کے سامنے قتل کر دے اور پھر انہیں اپنی بے گناہی کا یقین دلا دے۔

ٹرک ایک جھٹکے کے بعد رک گیا۔ آگے والے دونوں دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ میں منتظر رہا کہ سفر ختم ہونے کے بعد آزمائش کا اگلا مرحلہ کیا ہو گا۔ بجلی کی طرح مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شاید اب وہ میرا قصہ پاک کر کے مجھے اس مقام پر دفن کر جائیں گے جہاں تک کسی کے خیال کی رسائی بھی نہیں ہو گی۔ لیکن میں نے یہ بھی سوچا کہ میرے قتل سے دشمنوں کو کچھ حاصل ہوتا تو وہ مجھے آج سے بہت پہلے ٹھکانے لگا چکے ہوتے۔ وہ اس کی جرات نہیں کر سکتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اکیلا ہونے کے باوجود میں اکیلا نہیں۔ میرے ذمہ دار قاسم رضوی، رابعہ قاری اینڈ کمپنی۔ محسن۔ اے ایس آئی شیخ اور استاد شیدی کے علاوہ میرے اتنے مخلص دوست اور طرف دار ہیں کہ انہیں ہر قطرۂ خون کا حساب دینا پڑے گا اور یہ سب ان لوگوں کو انجام تک پہنچائے بغیر دم نہیں لیں گے جن کے دامن پر میرے لہو کا ایک بھی داغ نظر آیا۔ مجھے اتنی دور لانے کا مقصد کچھ اور بھی ہو سکتا تھا جو مجھ پر واضح نہیں تھا۔ تشدد کے ذریعے کوئی تحریر حاصل کرنے یا کسی بات کا اعتراف کرنے کا مسئلہ ہوتا تو لاہور میں بھی حل ہو جاتا۔

لیکن ان کے رکنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ تھک گئے تھے۔ ان میں سے ایک کو رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی تھی اور دوسرا سردرد کی شکایت کر رہا تھا۔ اب وہ دونوں قریب ہی سے چائے پی رہے تھے۔ کچھ کھا رہے تھے اور نہ جانے کیوں خاموش تھے۔ پھر وہ ٹرک کے پچھلے حصے کے

www.paksociety.com

قریب میٹھو کے گھر تک پہنچ گئے۔ اسی وقت چوکیدار بڑبڑایا۔

"چوہدری... چوہ... دری... صاحب... معاف... معاف کر دیں مجھے... آپ کو... پاک پنج تن کا... واسطہ... مجھے... مت ماریں... میرے... بیوی بچے..."

وہ ہوش میں آنے لگا تھا۔ شعور اور لاشعور کے درمیان اس کا احساس جاگ رہا تھا اور اسے یاد دلا رہا تھا کہ چوہدری صاحب اس کے قتل کا حکم صادر فرما چکے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ وہ شخص جو اپنا گھر بنا لیتا ہے، کسی بھی عورت سے وابستہ ہو جاتا ہے اور باپ بن جاتا ہے اسے اپنی ذات کے مفادات کا تحفظ عزیز نہیں رہتا۔ وہ خود کو اور اپنی زندگی سے محبت کو بھول جاتا ہے اور اس کی تمام توجہ، محبت و شفقت، جذبات اور خیالات کی دنیا وہی گھر بن جاتا ہے۔ وہ خود کو اور اپنی زندگی کو اسی گھر میں بانٹ دیتا ہے اور اپنے لیے کچھ بھی نہیں رکھتا، کچھ بھی نہیں مانگتا۔ مرنے سے نہیں ڈرتا لیکن اس خیال سے ڈرتا ہے کہ وہ مر گیا تو اس کے گھر کا کیا بنے گا اور اس کے بیوی بچوں کو وہ سب کون دے گا جو اس کے دم سے انہیں میسر تھا اور اس میں بھی حیرت کا پہلو یہ تھا کہ کبھی کوئی یہ نہیں سوچتا تھا کہ انہیں روٹی کپڑا کون فراہم کرے گا اور ان کے مادی وسائل کا کیا بنے گا۔ خدا کے رازق ہونے پر سب کا اعتقاد کامل رہتا تھا اور سب یہ سمجھتے تھے کہ پلنے کو دنیا میں کتنے کے بچے بھی پل جاتے ہیں جن کا کوئی خاندان نہیں ہوتا۔ جذباتی رشتے نہیں ہوتے اور والدین جیسا پرورش کرنے والا نہیں ہوتا۔ اصل کمی محبت کی رہ جاتی ہے اور تربیت کی رہ جاتی ہے اور یہ کمی صرف باپ پوری کر سکتا ہے۔ میرا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ بیوی اور بچے نہیں تھے لیکن میں نے دنیا میں ہر جگہ خاندان اور گھر سے آدمی کے تعلق کو اسی انداز میں دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا۔

"گامے! ہمیں کام ختم کر کے واپس بھی جانا ہے۔" میں نے ڈرائیور کی آواز کو بہت قریب سے سُنا۔

"دیکھ طافے! اس چوکیدار کو چھوڑ دے۔" دوسرے شخص نے مذبذب لہجے میں کہا جسے گامے کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔

"کیا؟ دماغ چل گیا ہے تیرا۔" طافے نے کہا۔ "اس وقت ٹرک پر کوئی نہیں۔ اسے یہیں ڈال کے گاڑی اوپر سے گزار دیتے ہیں۔ اسے لمبائی کے رخ لٹا دے۔ پچھلے والے ڈبل پہیے اوپر سے ایک بار گزر گئے تو قیمہ ہو جائے گا۔ صورت بھی کون پہچانے گا؟"

"طافے! میری بات مان لے۔ یہ بہت غریب اور... بے قصور آدمی ہے۔ بیوی بچے ہیں اس کے۔"

طافے نے اسے گالی دی۔ "وہ تو تیرے بھی ہیں۔ چوہدری صاحب تجھے زندہ چھوڑیں گے؟"

"انہیں معلوم بھی نہیں ہو گا۔ میں اس کو صبح ملتان کا کرایہ [illegible]" گامے نے لجاجت سے کہا۔

"تو سفارش کیوں کر رہا ہے اس کی؟" طافے نے پوچھا۔ "تیرا ماما لگتا ہے یہ؟"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے طافے! یہ میرا ماما ہے۔" گامے [illegible] "سگا تو نہیں لیکن اس نے میری ماں کو ہمیشہ بہن کہا تھا اور اسے گاؤں سے بلا کے نوکری دلائی تھی۔"

"نہیں گامے۔" طافے نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ مجھے اپنی زندگی پیاری ہے۔ [illegible] مجھے چوہدری صاحب نے کہا تھا۔"

"طافے! کل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چوہدری صاحب ہمارا انعام تجھے اٹھا دیں۔" گامے نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ چوہدری کے کتنے تابعدار اسی لیے مارے گئے کہ انہوں نے حکم کی [illegible] وہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتا اور اپنے کسی رازدار کو زندہ نہیں رہنے دیتا کہ بعد میں اس کے لیے خطرہ بنے۔"

"کل کی کل دیکھی جائے گی۔" طافے نے کہا لیکن اب اس کے لہجے میں خوف شامل ہو گیا تھا اور اس کا اعتماد کھوکھلا لگتا تھا۔ "اس کے علاوہ جھوٹ تو نہیں ہی بولا جائے گا اور پکڑے جائے [illegible] پوچھے گا کہ ہم نے اسے مار دیا۔ بات تو ایک ہی ہے۔ پھر جرم کرنے کا فائدہ؟ ہو سکتا ہے چوہدری کو ان پر بھروسہ [illegible] بات تو کرتا ہے۔ ہمیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن کبھی پتا ہو گیا کہ ہم نے جھوٹ بولا تھا اور چوکیدار کو زندہ چھوڑ دیا تھا تو معاف نہیں کرے گا۔"

"اسے نہیں معلوم ہو گا طافے!" گامے نے کہا۔ "یہ تو آگے ایک گمنام سے گاؤں میں رہتا ہے۔ ضلع کیمل پور میں۔ چوہدری کا پااس کے کارندے کا قرض ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ میں اسے سب بتا دوں گا... کہ روپوش ہو جائے۔"

"بے وقوفی کی بات نہ کر۔" طافے نے مشتعل ہو کے کہا۔ "تو یہ سوچ چوہدری ہر اخبار دیکھے گا اور اس کو کسی بھی اخبار میں [illegible] نکال جانے والی سڑک پر کوئی نامعلوم شخص کسی بس کے نیچے کچلا گیا تو کیا وہ ہم سے نہیں پوچھے گا؟ کیا جواب دے گا اسے؟"

"ہم... ہم یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ سڑک پر خطرہ تھا۔ اخبار والے نہیں آئے۔" گامے نے کہا۔ "چنانچہ ہم نے اسے ایک [illegible] پھینک دیا۔ خالی ہاتھوں سے قبر کھود کے۔" طافے نے کہا۔ "اتنا بے وقوف سمجھتا ہے تو اس کو؟ وہ مجھے گردن کے لیے آئے گا کہ باپ اپنے ماں کی گردن توڑا تھا۔ میں وہ تیری قبر [illegible]"

"کچھ بھی ہو طافے!" گامے نے عقیدت سے بھی کہا۔ "[illegible]"

www.paksociety.com

بھرتے وقت ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ قتل نہیں ہونے دوں گا۔"

"تیرے فیصلے کی ایسی تیسی۔ میں خود کرلوں گا سب کچھ اور دیکھتا ہوں تو مجھے کیسے روک سکتا ہے؟" طافے نے کہا۔ میں دم بخود لیٹا یہ سب سن رہا تھا اور دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ ان کا اختلاف رائے تصادم کا باعث بن جائے۔ ان میں سے ایک مارا جائے گا مگر دوسرا بھی شدید زخمی ہو سکتا ہے۔ اس حد تک کہ وہ ٹرک چلانے کے قابل نہ رہے اور اب جھگڑا واقعی بڑھ گیا تھا۔ غالباً طافے نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور گامے نے اس کا راستہ روکا۔ میں گپ اندھیرے میں آوازیں سن کر صرف تصور سے کام لے سکتا تھا۔

طافے نے چلا کے ایک گالی بکی۔ "چھوڑ دے مجھے۔"

"میرا خیال تھا تو ایسے ہی سمجھ جائے گا۔" گامے نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "جا کے اپنے ماما کو قتل کر۔" اس نے گالی دے کر کہا۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" طافے نے بھی ہانپتے ہوئے دوسری گالی دی۔ "تو ہے کیا؟" آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی ٹرک کی دیوار سے ٹکرا کے کراہا۔ یہ آواز گامے کی تھی۔ پھر کچھ دیر کی خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ شاید گامے کی قوت مزاحمت دم توڑ گئی تھی یا جواب دے گئی تھی۔

"اوئے گامیا! طافے اچانک چلایا۔ وہ تو ہے ہی نہیں۔ بھاگ گیا وہ تیری ماں کا خصم۔"

"بھاگ گیا!" گامے نے کمزور آواز میں کہا۔ "اب کیا کرے گا تیرا سوہدری؟"

"ابھی تو یہاں تھا وہ۔" طافے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اتنی جلدی کہاں جا سکتا ہے وہ۔ میں اسے پکڑ لوں گا۔ اس کی حالت ایسی نہیں کہ وہ دور گیا ہو۔" پھر ایک جسم کے زمین پر گرنے کی آواز آئی۔ "چھوڑ میری ٹانگ کمینے!" طافے نے چیخ کر کہا جو شاید گامے کی وجہ سے منہ کے بل گرا تھا۔ گامے نے اس کے بھاگنے سے پہلے ہی اپنی ٹانگ اڑا دی تھی یا پھر ہاتھ بڑھا کے اس طرح طافے کی ٹانگ پکڑ لی تھی کہ وہ چت ہو گیا تھا۔ کچھ دیر تک میں صرف گالیاں، دھکیلیں اور خالی ہاتھوں پیٹ کرنے کی آوازیں سنتا رہا۔ پھر ان آوازوں میں تھکن کے اور شکست کے آثار نمودار ہونے لگے۔ غالباً دونوں حریف ہم پلہ تھے اور کسی کو موقع نہیں ملا تھا کہ خنجر یا چاقو استعمال کر کے حریف کا کام تمام کر سکے۔ چنانچہ دونوں ادھ موئے ہو رہے تھے۔ یہ صورت حالات میرے حق میں خوش آئند تھی اور قدرتی طور پر میری جذباتی ہمدردی گامے کے ساتھ تھی۔ وقت کا احساس بے معنی ہو چکا تھا۔ اب صرف انجام کا انتظار رہ گیا تھا لیکن آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں یا مدھم پڑ رہی تھیں۔ وہ دونوں اس طرح کراہ رہے تھے جیسے نزع کے کرب میں مبتلا ہوں۔

میری امیدیں نئے سرے سے بیدار ہو گئی تھیں۔ میں یقیناً اس حق بجانب تھا کہ بچ جانے والا بھی اس ٹرک کو [illegible] ساتھ ایسے اندھیرے میں اور ایسے راستوں پر تیز چلا سکے گا؟ کوشش کی تب بھی ٹرک الٹ جائے گا یا کسی گہرائی میں گر جائے گا یا کسی [illegible] سے ٹکرا جائے گا۔ ایسی صورت میں بکس کے ٹوٹ کے کھل جانے کے امکانات خاصے روشن تھے لیکن زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ میں بھی مر جاتا اور چند گھنٹے بعد دن کا اجالا نمودار ہو سکتا تھا پر ٹریفک بحال ہو تو گزرنے والے مدد کے لیے آ جاتے یا پولیس کو بلا لیتے۔ یا اس سے پہلے ہی گامے کا ماما کسی کو بلا لاتے۔ یہ یقینی نظر آنے لگی تھی لیکن نجات کے بعد بہت سے مسائل کا سامنا بھی یقینی تھا۔ مجھے اس ڈبے سے نکالنے والے کا پہلا سوال یہی ہوگا کہ میں کون ہوں؟ طافے نے تو مجھے [illegible] قرار دیا تھا اور وہ میں انسان ہونے کے باوجود آپ نے صیاد دیدہ تھا لیکن [illegible] ٹرک میں منتقلی اور قریب ہی دو افراد کے مردہ یا نیم مردہ پائے جانے کے اسباب خاصے وضاحت طلب ہوں گے۔ [illegible] میرا کوئی نقصان نہیں تھا۔ صفائی کے کٹھن مرحلے میں رابعہ اور مس شہلا پر مشتمل تھری بوٹل کے سامنے درپیش ہوں گے۔ [illegible] ہوں گے اشکل ایمرجنسی [illegible]۔

اچانک میں نے صندوق کی ایک دیوار پر کھٹ کھٹ [illegible]

خاموشی اتنی گہری تھی اور میں اپنے خیالات میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ پریشانی میں اچھل پڑا۔ میرے چونکنے کی اصل وجہ یہ بھی کہ اس دستک کا انداز مختلف تھا۔ اس میں سوال تھا کہ بتاؤ کیا تم خیریت سے ہو؟ تم جو بھی ہو میری مدد کے مستحق ہو۔ تم محفوظ ہو؟ [illegible] کی پرواہ [illegible] اگر تم اسی فیکٹری کے مالک ہو جس کا ادنیٰ سا ملازم ہوں تو کیا؟ اس مقام پر اور اس لمحے ہم ایک ہی جنگ میں برابر کے شریک ہیں۔ جو صرف یہ جانتے ہیں کہ خود بھی زندہ رہیں اور دوسروں کو بھی زندہ رہنے دیں۔ [illegible]

"دیکھو میاں! گھبراؤ نہیں۔ رب نے چاہا تو سب خیر ٹھیک ہو جائے گا۔" چوکیدار کی [illegible] آواز آئی۔ "اگر میں [illegible] دے سکتا تو ضرور دیتا کہ یہ فیصلہ تو میرے تمہارے رب نے پہلے ہی کر لیا تھا کہ ابھی ہمیں جینا ہے۔"

"جواب دے میاں! کچھ منہ سے بول!" چوکیدار [illegible] تختے سے منہ لگا کر سرگوشی کی۔ [illegible] گمشدہ مسافر کو تلاش کرنے والا [illegible] کا پیغام نشر کر رہا تھا۔ "ہیلو! ہیلو!" [illegible] نہیں سکتے۔ ہماری آواز سن رہے ہو تو جواب دو۔ [illegible] جان مسافر کے ساتھ ہی اس کا ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی بے کار ہو چکا [illegible]

[illegible] بیکراں وسعت میں ایک تنکے کا سہارا لے کر جینے کی امید [illegible] ڈوبنے والے کو جان بچانے والی کشتی تلاش کرتی پھر رہی تھی کاش [illegible] کے لیے ممکن ہوتا کہ وہ چلا کے انہیں متوجہ کر سکے جو اسے تلاش کرنے آئے تھے۔ سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے۔

"او بھائی! کوئی اندر ہے؟ کوئی بندہ ہے۔ جیوندا ہے؟" چوکیدار بولا۔ میں نے سر کو دیوار پر شدت سے ٹکرا کے اثبات میں جواب دیا۔ ہاں میں اندر ہوں۔ میں انسان ہوں اور ابھی زندہ ہوں۔

"اچھا اچھا۔ فکر نہ کر۔" چوکیدار نے کہا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وقت کا ایک ایک لمحہ اپنے وجود کا شعور دے رہا تھا۔ چوکیدار اب ٹرک سے اترا ہے۔ اب اس نے آگے والا دروازہ کھولا ہے۔ اب شاید وہ اندر لگی ہوئی چابیاں نکال لایا ہے۔ اب اس کے ہاتھ [illegible] چابیاں لگا رہے ہیں۔ تالا بھی کھل گیا ہے۔ اس میں [illegible] پیچ اور اسکرو ڈرائیور مل گئے۔ چوکیدار کے ہاتھ اوزاروں کو ٹٹول رہے تھے۔ اوزاروں کی آواز کتنی خوش گوار ہے۔ بالکل رابعہ کی ہنسی۔ روحت رابعہ! تیرے میرے بیچ صرف یہی رات حائل ہے۔ رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ سوچتی تو صرف ذہن [illegible] ہے۔ چوکیدار نے کوئی بڑا اسکرو ڈرائیور کونے کی درز میں پھنسا کے زور لگایا اور درز پھیلی تو لوہے کی ہر کیل [illegible] تختوں کو ایک دوسرے سے پیوست کر رکھا تھا۔ چوکیدار نے اسکرو ڈرائیور کو نیچے لا کے پھر زور لگایا اور ایک تختہ [illegible] کے ساتھ ٹرک میں گرا۔ چوکیدار اب ہانپ رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں نے [illegible] چوڑے شگاف میں سے مجھے وحشت و مایوسی [illegible] دیکھ لیا تھا کہ [illegible] تختہ بھی زیادہ کیلوں سے جڑا ہوا تھا۔ باقی تختوں میں صرف اوپر نیچے کیلیں ٹھونکی گئی تھیں۔ اس نے اوپر سے دوسرے تختے کو الگ کیا اور پھر ہاتھوں سے کھینچ کر نچلے حصے سے جدا کر دیا۔ خلا اب ایک فٹ کا ہو گیا تھا۔ لیکن خستہ حال چوکیدار کی جسمانی طاقت اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ میں کینچوے کی طرح نیچے کھسکا۔ جسم کو سمیٹ کر ورزش کے ساتھ پوری قوت سے پھیلایا اور میرے پاؤں ایک فٹ کے شگاف سے باہر نکل گئے۔

چوکیدار کے ہاتھ میرے پاؤں سے مس ہوئے۔ اس نے [illegible] کی سختی کا اندازہ کیا اور نہ جانے کیا سوچ کے پیچھے ہٹ گیا۔ ناتوانی کے سبب وہ ٹرک سے اترنے کے بجائے گر کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ایک فٹ کے اس روشن دان [illegible] سایہ دیکھا جس کے پس منظر میں تاروں بھرا آسمان تھا اور پھر کچھ پیچھے سرکا۔ چند منٹ بعد چوکیدار پھر نمودار ہوا [illegible] کوشش سے اس نے اپنے ہاتھ کو اوپر گھسیٹا اور گھٹنوں کے بل [illegible] اس نے تیلی جلائی تو مجھے تھکن کی جگہ اس کے چہرے پر زرد دکھائی دیا۔ جیسے وہ انسان نہیں فرشتہ ہے جو خدا کے حکم سے صرف میری زندگی بچانے کے لیے اترا ہو۔ اس نے کانپتے ہاتھوں کی پناہ میں دیا سلائی کے ننھے سے شعلے کو روشن رکھا اور آہستہ آہستہ رسی کے نیچے لے آیا۔ ایک تیلی بجھ گئی تو اس نے دوسری جلائی اور رسی کا ایک بل ایک ہی جگہ سے جلنے لگا۔ میں نے پیروں کو پھیلا کے زور لگایا اور ایک بند ٹوٹ گیا۔ باقی بل ڈھیلے پڑ گئے۔ چوکیدار نے ان کو میری پنڈلیوں سے جدا کیا۔ مردہ ہو جانے والی رگوں میں خون پھیلا تو درد کی ٹیس اٹھی۔ چوکیدار اس تمام کارروائی کے دوران مجھے مسلسل تسلی دیتا رہا تھا اور میرا حوصلہ بڑھاتا رہا تھا۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اور دیہاتی لہجے میں۔ لیکن میں الفاظ کے مفہوم پر غور ہی کہاں کر رہا تھا۔ میں تو دل ہی دل میں اس ہستی مطلق کے انتظام اور اس کی قدرت کاملہ کے سامنے آدمی کی بے بسی پر غور کر رہا تھا۔ اس نے ایک لفظ "کن" کہا اور وہ ہو گیا۔ فتح مندی کا غرور رکھنے والے مٹ گئے اور شکست خوردہ فاتح کہلائے جو خاک نشین تھے مسند نشین ہوئے۔ جو تاجدار تھے فقیر ہوئے۔ ایک بے بس و نادار بے ہوش و ناتواں چوکیدار کو قتل کرنے والے اس انجام سے دوچار ہوئے جو ان کے تصور میں بھی نہ تھا۔

میں نے جسم کی توانائی کو مجتمع کر کے خود کو کھینچا اور نیچے کھینچتا یہاں تک کہ میرا دھڑ اس ایک فٹ چوڑے شگاف تک پہنچ گیا۔ اگر میرے ہاتھ بندھے ہوئے نہ ہوتے تو میں پہلو کے بل سمٹ کے نکلنے کی کوشش ضرور کرتا لیکن ہاتھ کمر کی طرف تھے۔ چوکیدار نے تیلی جلا کے دیکھا اور سمجھ گیا کہ میرے رک جانے کی وجہ کیا ہے۔ اس نے وہی اسکرو ڈرائیور اٹھایا اور اوپر سے تیسرے تختے کی درز میں پھنسا کے زور لگایا۔ ہر کیل کسی چٹان میں پیوست پودے کی جڑ کی طرح نکل آئی اور تختہ نیچے کی طرف جھکا تو چوکیدار نے اسے کھینچ لیا۔ نیچے کی کیلیں تختے کے وزن ہی سے ٹرک کے اندر ہو گئیں۔ میں اٹھ بیٹھا اور کھڑے ہونے کی کوشش میں دھڑام سے گرا۔ میرے پیر ابھی جسم کا وزن اٹھا کے توازن برقرار رکھنے کے قابل نہیں ہوئے تھے۔ چوکیدار نے میرے منہ پر سے ٹیپ اتار دیا۔

"نا۔ نا۔ ہولے ہولے پتر۔" چوکیدار نے مجھے سہارا دیا اور مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ مجھ سے زیادہ تو خود چوکیدار کو سہارے کی ضرورت تھی۔ جسمانی طور پر وہ مجھ سے کم اور عمر میں بہت زیادہ تھا۔ میرے تو صرف ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے لیکن وہ سر کی چوٹ کے اثر سے گھنٹوں بے ہوش پڑا رہا تھا اور پھر بھی یہ اسی کی ہمت تھی کہ اپنے ساتھ اس نے مجھے بھی بچا لیا ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اکیلا ہی بھاگ جاتا۔ اب اس نے آہستہ آہستہ میرے ہاتھ سے لپٹی ہوئی رسی کھولی جو ہتھکڑی سے زیادہ مضبوط تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو سیدھا کیا تو میرے شانوں کا ہر جوڑ اور بازوؤں کا ہر [illegible]

www.paksociety.com

چھپا ہوا درد جاگ گیا۔ جسم درد سے چور کلائیوں سے آگے انگلیوں اور انگلیوں کی پوروں تک پھیلتا چلا گیا۔ میں لکڑی کے اسی صندوق کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ میری جسمانی توانائی بڑی سرعت سے بحال ہونے لگی تھی۔ دوران خون کے معمول پر آجانے کے بعد ہاتھوں اور پیروں کا درد ناقابل برداشت نہیں رہا تھا۔ چوکیدار میرے سامنے بیٹھا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ادھیڑ عمر چھریرے اور کمزور شخص نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں تھا۔

"بابا!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "آج تم نے میری زندگی بچالی۔"

"ناچیز! ایسا کچھ واقعہ ہے۔" وہ انگلی اوپر اٹھا کے بولا۔ "اس کا حکم نہ ہو تو بندہ کیا کرسکتا ہے۔"

"میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں۔ اس حالت میں بھی تم نے حوصلہ نہیں ہارا اور میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔" میں نے ہاتھوں پیروں کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ "تمہارا یہ احسان بھی مجھ پر ایک قرض رہے گا۔ جب چاہو وصول کرلینا۔ تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟"

کی جاناں میں کون بلیا۔ میں کون ہوں سے ہم تقصو۔ اگر میری اصل دیکھی جائے تو میں ایک پرنس ہوں۔ میری رگوں میں ایک نواب خاندان کا خون دوڑ رہا ہے اور میں ایک شہزادہ ہوں۔ پدرم سلطان بود۔ باپ ان کے پرورش کرنے والا شخص وزیر خان تھا۔ بے شک زندگی خدا کی دی ہوئی تھی مگر اس کی حفاظت وزیر خان نے کی۔ اور وہ سب بھی اپنا اپنا قرض مجھ پر چھوڑ گئے۔ یوم حشر میں کس کس کا قرض چکاؤں گا۔ سلامت شاہ کا؟ اس نابینا بوڑھی عورت کا جس نے میری امانت میرے حوالے کرنے سے پہلے فرشتہ اجل کا مقابلہ کیا؟ فقیرانہ بھیس بنا کے تماشائے اہل کرم دیکھنے والے فو بابو کا؟ اس بوڑھے گورکن کا جو زندہ درگور ہوا پیا رہتا جا رہا ہے۔ ابھی ابھی میں نے مقروض ہونے کی ایک اور دستاویز چوکیدار کے حوالے کردی ہے۔ رابعہ اور اس کی ماں۔ محسن اور اس کی ماں۔ یہ سب مجھ پر احسانات کرتے جا رہے ہیں یا کرکے گزرتے جا رہے ہیں۔ مجھے بھی اتنی توفیق دے خداوند! کہ میں سر اٹھا کے چل سکوں۔

"دیکھو بابا!" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ سگریٹ لائٹر اور پیکٹ میری جیب میں موجود تھے۔ "میں بھی اس فیکٹری کا ایک مالک ہوں جس میں تم چوکیدار ہو۔ چوہدری دلاور کی طرح۔ میں وزیر خان کا بیٹا ہوں۔"

"آپ... آپ وزیر خان مرحوم کے..." شدت جذبات سے اس کی آواز بند ہوگئی۔

"ہاں۔ میرا نام سکندر بخت ہے۔" میں نے سگریٹ جلا کے ایک طویل کش لیا۔ "چوہدری دلاور مجھے اپنے راستے سے ہٹا کر فیکٹری کا مالک بننا چاہتا ہے۔ آج اس نے مجھے دھوکے سے بلایا تھا اور شاید یہ لوگ مجھے ٹھکانے لگانے کے لیے جا رہے تھے!"

نے تفصیلات اور الجھنوں کا حوالہ دیے بغیر اسے سیدھے سادے الفاظ میں وہ بات بتائی جو اس کا ذہن آسانی سے قبول کرلے۔ "یہ وہ تمہیں بھی قتل کردیتے کیونکہ تم نے مجھے فیکٹری میں آتے دیکھا مگر تم کہاں غائب ہوگئے تھے اچانک؟"

"وہ... میں... معلوم نہیں جی کیسے میں نیچے اترا اور ڈرائیور پیچھے گھس گیا۔ انھوں نے مجھے کیوں مارا تھا جی؟"

"چوہدری دلاور اور اس کے چمچوں کو ڈر تھا کہ تم پولیس کو بتا دو گے۔" میں نے کہا۔ "جب میں غائب ہوجاؤں گا تو پولیس تحقیق کرے گی۔ فیکٹری بھی جائے گی۔ میں نے ایک بریف کیس تمہارے حوالے کیا تھا۔ کچھ یاد ہے؟"

"ہاں!" اس نے سر پہ ہاتھ رکھ کے ذہن پر زور دیا۔ "اور اسے کوئی لے گیا تھا۔ کیا نام تھا اس کا... احسان؟"

"نہیں۔ وہ محسن خان تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نے ہی بتایا تھا کہ وہ آئے گا۔ لیکن چوہدری دلاور ڈرتا تھا کہ تم یہ سب کچھ بتا دو گے۔ اس نے مجھے صندوق میں ڈالا اور تمہیں مار کے ... میں ڈال دیا۔ طالب اور گلاب نام کے دو شخص ابھی یہاں تھے۔ یہ چکوال جانے والی سڑک ہے۔ جنگل سے آگے..."

"گلاب کون جناب؟" چوکیدار نے مضطرب ہوکے میری بات کاٹ دی۔ "غلام محمد؟"

"ہاں۔ وہ جو تمہاری تبدیلی ... کا تھا۔" میں نے ... چوکیدار اب حفظ مراتب کے خیال سے محتاط اور مؤدب ہوگیا تھا۔

"وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ گلاب مجھے قتل نہیں کرسکتا جناب!" وہ بڑے دکھ اور یقین کے ساتھ بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے کہا۔ "اسی نے طالب سے کہا کہ تمہیں چھوڑ دے۔ اس بات پر ان میں جھگڑا ہوا۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا جناب! آپ تو کچھ نہیں دیکھ..." اس کا لہجہ بے یقینی کا آئینہ دار تھا۔

"ہاں لیکن میں سب سن رہا تھا۔ اور اندازہ کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے ایک دوسرے کو بہت مارا۔ اور میرا خیال ہے وہ کہیں قریب ہی بے ہوش پڑے ہوں گے۔ ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ اب میں بھی چل پھر سکتا ہوں۔"

وہ مجھ سے پہلے نیچے اتر گیا۔ "گلاب!" اس نے ایک سمت منہ کرکے آواز دی اور پھر دوسری طرف منہ کرکے پکارا۔ "شیر غلام محمد!" لیکن ان دونوں کو پہلے...

پر لہولہان اور بے سدھ پڑے تھے۔ ان کے ہاتھ اب یوں بھینچے ہوئے تھے جیسے وہ ایک دوسرے کا گلا گھونٹ دینا چاہتے ہوں۔ میں نے لائٹر کے ننھے سے شعلے کی روشنی میں ان کی کھلی آنکھوں کو دیکھا اور ان کے زخموں کا معائنہ کیا۔ بظاہر ان کی موت زیادہ خون بہہ جانے سے واقع ہوئی تھی لیکن یہ بھی ہوسکتا تھا کہ پہلے ایک نے دوسرے کو مار دیا ہو اور پھر کسی اندرونی چوٹ کے باعث خود بھی مرگیا ہو۔ لائٹر کی روشنی دیکھ کے چوکیدار میری طرف آیا۔

"گلاب!..." نصف شب کے سکوت میں اس کی چیخ نے جنگل کی ویران فضا کو جھنجھوڑ دیا۔ "او نے ظالما۔ میکوں مار دیتا سی۔ اوئے اپنے مالک نوں قتل کردیتا سی۔ تیری ماں توں کی دساں گا میں کہ تیرا پتر میرے لئی مرگیا؟" وہ دھاڑیں مار مار کے رو رہا تھا اور اس جہالت کے لیے بین کر رہا تھا جس کو ایک نہ ایک دن اسی انجام سے دوچار ہونا تھا۔ ہابیل کی طرح اس نے بھی انسانیت کے دشمنوں کا آلہ کار بن کر تمام عمر پامال کیا تھا مگر مرتے مرتے ایک لمحے کی جذباتی طاقت نے اسے جان دینے پر مجبور کردیا تھا۔ اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے لیے جس کے خون کا اس کے خون سے براہ راست کوئی رشتہ نہ تھا۔ میں نے چوکیدار کو ہاتھ پکڑ کے اٹھایا۔

"گلاب کے لیے اب تم کچھ نہیں کرسکتے۔" میں نے کہا۔ "سوائے مغفرت کی دعا کے۔ مگر جو کچھ وہ تمہارے لیے کرنا چاہتا تھا وہ مت بھولو۔ وہ تمہیں بچانا چاہتا تھا۔ مرتے دم تک اس نے یہی خواہش کی تھی۔"

میں اسے کھینچ کر ٹرک تک لے آیا۔ آگے ڈیش بورڈ کے نیچے پینے کے پانی سے بھرا ہوا پلاسٹک کا چھوٹا کین رکھا ہوا تھا۔ میں نے چند گھونٹ اس کو پلائے اور پھر بوتل اپنے منہ سے لگالی۔ آدھی کے قریب بوتل خالی کرکے مجھے احساس ہوا کہ میں کتنا پیاسا تھا لیکن ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہوکے چھوٹی چھوٹی ضرورت کی طرف کس کا دھیان جاتا ہے۔

"اس ٹرک کو ایک خاص وقت پہ کسی جگہ پہنچنا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور صبح ہونے سے پہلے لاہور لوٹ جانا تھا۔ جب دیر ہوگی تو چیتا شکاری اسے ڈھونڈتے ہوئے آئیں گے۔ میرا مطلب ہے چوہدری دلاور کے آدمی۔ اور ہم یہیں بیٹھے ملے تو وہ اپنا کام کر جائیں گے۔ گلاب کی یہ آرزو مرکے بھی پوری نہیں ہوگی کہ تم زندہ رہو۔ اس لیے اب جتنی جلدی ممکن ہو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ تم میرے ساتھ بیٹھو۔ ٹرک میں چلاؤں گا۔ چلو۔" میں نے اس کا بازو تھام کے کہا۔

"لیکن گلاب! کیا وہ یہیں پڑا رہے گا؟" اس نے اپنا بازو چھڑالیا۔ "وہ میری خاطر مرگیا اور..."

"گلاب کو پولیس پہنچا دے گی۔" میں نے کہا۔ "کل پرسوں تک اس کی لاش گاؤں پہنچ جائے گی۔ ہم اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ راستے میں کسی نے دیکھ لیا تو بہت سی قانونی مشکلات پیدا ہوجائیں گی۔ تمہارے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔"

"میں اسے چھوڑ کے نہیں جاؤں گا مالک!" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "آپ جائیں۔"

مجبوراً میں نے گلاب کی لاش کو اٹھا کے ٹرک کے پچھلے حصے میں اسی صندوق کے اندر رکھا جس میں کچھ دیر پہلے میں قید تھا۔ لاش کو چھپانے کے لیے مجھے باکس کا رخ بدلنا پڑا تاکہ کھلا حصہ دوسری طرف ہوجائے۔ خطرہ اس کے باوجود تھا کہ راہ میں کوئی چیک نہ کرلے لیکن فوری طور پر اس سے زیادہ پریشان کن مسائل دو تھے۔ ایک یہ کہ کہیں واپسی کے سفر میں خالی سڑک پہ شکاری نہ مل جائیں۔ وہ ٹرک کو فوراً شناخت کرلیں گے اور ان کا مقابلہ آسان نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ مسلح ہوں گے۔ دوسرا مسئلہ چوکیدار اور گلاب کا تھا۔ چوکیدار کو میں باآسانی بس یا ویگن میں بٹھا کے روانہ کرسکتا تھا اور سمجھا سکتا تھا کہ جب تک خطرہ ٹل نہ جائے وہ روپوش رہے لیکن لاش کو تلہ گنگ کے پہاڑی علاقے میں کسی دورافتادہ گاؤں تک پہنچانا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ گلاب کی طبعی موت ہوئی ہوتی تو میں اس کے تابوت کو لے کے ٹرک کا کرایہ ادا کرکے بھیج سکتا تھا۔ وہ رقم بھی میری جیب میں محفوظ تھی جو رضوی صاحب نے گاڑی کی مرمت کے اخراجات کے لیے دی تھی لیکن گلاب ایک خون آلود لاش تھا جسے کسی ایمبولینس یا ٹرک کے ذریعے اس وقت تک ارسال نہیں کیا جاسکتا تھا جب تک کہ پولیس کی ابتدائی تفتیش کے مرحلے طے نہ ہوجائیں اور پوسٹ مارٹم نہ ہوجائے۔ اس چکر میں چوکیدار کے لیے بہت خواری تھی اور روپوشی ناممکن تھی چنانچہ دوسری صورت یہی رہ جاتی تھی کہ میں خود لاش کو اس کے گاؤں تک پہنچاؤں اور کسی قسم کی قانونی کارروائی کے بغیر تدفین کرادوں۔ چوہدری دلاور کو معلوم ہی نہ ہوگا کہ طالب کیسے مارا گیا اور گلاب کہاں مرگیا۔ لیکن یہ بڑا لمبا اور خطرناک کام تھا۔ ٹرک پہ "ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" لکھا ہوا تھا۔ یہ ٹرک جہاں سے بھی گزرتا پہچانا جاتا۔ خصوصاً چھوٹے قصبوں اور دیہات میں۔ اور اگر ایک طرف کا سفر چھ سات گھنٹے کا ہو تب بھی تدفین کے بعد لاہور پہنچنے کے لیے مجھے دو دن درکار تھے۔ ایک عام ڈرائیور کے مقابلے میں میری پوزیشن قدرے بہتر تھی۔ میں کسی بھی پولیس افسر سے زیادہ اعتماد کے ساتھ بات کرسکتا تھا۔ ان میں اتنا دم خم نہیں ہوتا کہ کسی فیکٹری کے مالک سے آنکھیں ملا سکیں جو فر فر انگریزی بولتا ہو اور دوسرا سہارا ساٹھ ستر ہزار کی وہ رقم تھی جو میری جیب میں محفوظ رہ گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ میرے دشمنوں کو میرے پیسے کی ضرورت

ہی نہیں تھی۔

میں نے لاش کے بارے میں ساری صورتِ حال چوکیدار کو سمجھا دی۔ "اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ میں خود تمہیں گاؤں چھوڑ آؤں۔ گاؤں میں کوئی تھانیدار ہے؟"

"نہیں سرکار! تھانہ تو لنگ کا ہی لگتا ہے۔" وہ بولا۔ "وہ گشت پر آتے رہتے ہیں۔"

"حرام کھانے اور پھر اسہال کرنے کے لیے؟" میں نے کہا۔ "خیر۔ تم کو بیان دینا ہے کہ گاما کوٹھے سے گر گیا تھا۔ مار پیٹ، چوہدری دلاور یا طلائی کا ذکر نہیں کرنا ہے۔ سمجھے؟ ورنہ پھنس جاؤ گے لمبے چکر میں۔ گاما کی ماں کو سمجھانا تمہارا کام ہے۔ گاؤں والوں کو صرف یہ معلوم ہوگا کہ گاما رات کو چھٹی لے کر گھر آیا تھا اور تھوڑی دیر بعد یہ حادثہ پیش آ گیا۔ پھر فوراً تدفین کرا دینا۔ لاش کو صاف ستھرا کر کے۔"

"جو آپ کا حکم سرکار!" اور میں نے ٹرک کو اسٹارٹ کیا۔

اپنے اندازے پر بھروسہ کرتے ہوئے میں بہت جلد اس سڑک پر آ گیا جو سوہاوہ کے قریب جی ٹی روڈ سے جا ملتی تھی۔

"مقصد صرف یہ ہے کہ بات جتنی جلدی ختم ہو جائے اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ چوہدری دلاور تک پہنچ جائے گی۔"

وہ سادہ لوح اور سیدھا سادا آدمی تھا جس کا ذہن شکوک و شبہات اور اندیشوں کے جنگل سے دور رہتا تھا۔ ورنہ وہ پوچھ سکتا تھا کہ آخر چوہدری دلاور سے یہ بات کیسے چھپی رہ سکتی ہے۔ کیا گاؤں کے لوگ اس ٹرک کو اور اس ڈرائیور کو نہیں پہچان لیں گے جو خود کو فیکٹری کا مالک کہتا تھا۔ کیا فیکٹریوں کے مالک خود اپنے ملازموں کی میت ان کے آبائی گھروں تک پہنچاتے ہیں۔ میں خود نہیں چاہتا تھا کہ اس ٹرک میں بیٹھ کر خود اپنا اشتہار دیتا ہوا اتنی دور تک جاؤں لیکن اس مسئلے کو کسی اور طریقے سے حل کرنے کی ابھی تک میرے ذہن میں کوئی صورت نہیں آئی تھی۔ چنانچہ میں نے اس پر سوچ بچار ملتوی کر دی۔

"تم وزیر خان کو جانتے تھے چوکیدار؟" میں نے اچانک کہا۔

"آتے جاتے دیکھا تھا جناب۔" چوکیدار بولا۔ "سلام کا جواب بڑی خوش اخلاقی سے دیتے تھے۔ گھر بار کا حال بھی پوچھ لیتے تھے۔"

"وہ باقاعدگی سے فیکٹری میں آتے تھے؟ ہر ہفتے؟" میں نے کہا۔

"پہلے تو ہر روز ہی آتے تھے۔ پھر کبھی کبھار آنے لگے۔ میں نے سنا تھا وہ بیمار ہیں۔ آخری بار آئے تھے تو وہ بہت کمزور تھے۔" وہ بولا۔ "میر صاحب کے ساتھ آئے تھے۔"

"اور میر صاحب کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا۔ غالباً اسے علم نہیں تھا کہ مجھ پر میر صاحب کے قتل کا الزام ہے۔

"وہ بھی اچھے آدمی تھے۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔" چوکیدار بولا۔ "مجھے انہوں نے ہی ملازم رکھا تھا۔"

"کب؟" میں نے کہا۔ "تم سے پہلے تو صرف گاما یہاں کام کرتا تھا؟"

"ہاں جی۔ اسی نے مجھے نوکری دلائی تھی۔" وہ بولا۔ "پہلے میں نیاز صاحب کا چپڑاسی تھا۔ پھر یہاں چوکیدار ہو گیا۔ میرا مطلب ہے فیکٹری میں۔ کسی نے اسے رات کے وقت مار دیا تھا۔"

"مار دیا؟" میں نے چونک کر کہا۔ "کیسے؟ اور کتنی پرانی بات ہے یہ؟"

"سال ہو گیا جناب! یا ہونے والا ہے جناب۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "اس کی لاش فیکٹری گیٹ سے سو گز دور جی ٹی روڈ پر ملی تھی۔ کوئی اسے کچل کے فرار ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ روڈ پر کیا لینے گیا تھا۔"

میں اسے کیا بتاتا کہ روڈ تک وہ خود نہیں گیا تھا لے جایا گیا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج وہ خود چل کر روڈ تک لایا گیا تھا۔ جیسے اس کی بچی کھچی ہوئی مسخ شدہ لاش ملتی اگر گاما دخل در معقولات نہ کرتا۔ ایک حادثہ جی ٹی روڈ پر پیش آ چکا تھا چنانچہ انہی حالات میں ویسا ہی دوسرا حادثہ شکوک کو جنم دیتا۔ یہ اہتمام اسی لیے تھا کہ اس بار کوئی چوکیدار کی لاش کو شناخت تک نہ کر سکے اور یہ ذکر تک نہ ہو کہ "ایم ڈبلیو ٹی فیبرکس کمپنیز" کا دوسرا چوکیدار بالکل اسی طرح مارا گیا جیسے پہلا مارا گیا تھا۔ آئے کوئی تیسرا بھی آ جاتا جو دونوں اموات کو اتفاق پر محمول کرتا تو حقیقتاً تیسرا خود شکار نہ ہوتا لیکن پولیس اتفاقات کو اتنی آسانی سے تسلیم نہیں کرتی۔ ہر چوکیدار محرم رازِ درونِ میخانہ ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھتا رہتا ہے کہ کون آ رہا ہے اور کیا جا رہا ہے اور تجسس کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن وہ فرض شناسی کو ضروری سمجھتے ہوئے روک ٹوک کرنے لگے یا پوچھ تاچھ کرے کہ کوئی ناجائز چیز ناجائز طریقے پر نہ نکلنے دے تو حادثے کا شکار ہو جاتا ہے اور شکاری ہمیشہ ہی پردے میں جو کبھی سامنے نہیں آتے۔

"چوکیدار!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ سوہاوہ موڑ اب زیادہ دور نہیں رہا تھا۔ مجھے جی ٹی روڈ پر ٹریفک لائٹس نظر آنے لگی تھیں۔ "تم کو سال بھر تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ فیکٹری میں زرعی مشینری اور آلات بنتے ہیں۔ کیا اس عرصے میں تم نے کوئی غیر معمولی بات دیکھی؟ مثلاً یہ کہ اندر کوئی غلط کام ہو رہا ہے۔ یا فیکٹری میں غلط قسم کے لوگ آنے لگے ہیں؟"

"نہیں مالک! ہمارا کام دروازے کے باہر تھا۔ اندر کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔" وہ بولا۔ "بابو جی چٹ بنا دیتا تھا اسے اندر جانے کی اجازت تھی۔ اندر سے کوئی گاڑی نکلتی تھی تو پاس کے بغیر [illegible]

تھی جی اور یہاں پر خود چوہدری صاحب دستخط کرتے تھے۔"

"یہ بابو کا نام کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ جو باہر کیبن میں بیٹھا ہر وقت جاسوسی ناول پڑھتا رہتا ہے۔ اسے ملازم ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟" ذہن میں یہ خیال آیا کہ شاید وہ کلرک اس چوکیدار کے مقابلے میں زیادہ معلومات رکھتا ہو۔

"وہ بھی نیا آدمی ہے جناب!" چوکیدار بولا۔ "پہلے میں آیا تھا۔ دو چار دن بعد وہ آ گیا۔"

"اور اس سے پہلے وہاں کون تھا؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ "وہ بھی حادثے میں مر گیا تھا۔ یا قتل ہو گیا تھا؟"

چوکیدار نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں جی۔ پہلا بابو پہلے حاضر کرتا تھا جو اب الطاف فیروز کہلاتا ہے۔"

جی ٹی روڈ سے فرلانگ بھر پہلے میں نے ٹرک کو روک لیا۔ باہر نکل کے میں نے ٹرک پر لکھی ہوئی عبارت پر غور کیا۔ ٹرک کا رنگ دونوں جانب سے نیلا تھا اور اس پر فیکٹری کا نام سفید رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا۔ بہت غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ پہلے سے سفید حروف ابھرے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ میں نے سب سے بڑا پیچ کس اٹھایا اور بڑی احتیاط کے ساتھ پہلے لفظ کو کھرچنے لگا۔ پرانے سفید رنگ کی تہہ پلاں کی اکھڑ تو گئیں اور ٹرک پر "وزیر اینڈ کمپنی" باقی رہ گیا لیکن یہ نام بھی میرے "وزیر اینڈ کمپنی" سے خاصا مشابہ تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا اس میں مزید کیا رد و بدل کروں۔ پھر مجھے ایک طریقہ سوجھ گیا۔ اب سفید زمین کے انگریزی میں لکھے ہوئے لفظ کا پہلا حرف W جو بڑی خوبصورتی سے بنا ہوا تھا اگر بائیں طرف سے W کی صرف ایک لکیر رہ جاتی۔ ڈبلیو اپنی شکل بدل کے این ہو گیا اور جو پہلے وزیر اینڈ کمپنی تھا وہ نذیر اینڈ کمپنی ہو گیا۔ سفید حروف کے نیچے سے ٹرک کا اصلی نیلا رنگ نکل آیا تھا چنانچہ ایک نظر میں دیکھنے والے کو یہ تبدیلی محسوس نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسرا مسئلہ نمبر کا تھا اور فوری طور پر حل نہیں ہو سکتا تھا۔ نمبر پلیٹ پر سفید رنگ سے لکھے ہوئے تھے۔ اس کو میں نے سر دست اسی طرح رہنے دینا بہتر سمجھا۔ آگے گوجر خان سے کہیں کالا یا سفید رنگ ملنے کی امید تھی۔ لیکن میں نمبروں کو پینٹ سے بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے تو صرف کالی روشنائی ہی کافی تھی اور تھوڑا سا سفید کاغذ اور گوند۔ ایک کے ہندسے پر سفید کاغذ کی پٹی چپکا کے میں اسے سات بنا سکتا تھا اس طرح کہ جب تک کوئی قریب آ کے نہ دیکھے سفید پینٹ اور سفید کاغذ کا فرق محسوس نہ کر سکے۔ کالی روشنائی میں سفید پینٹ کے ہندسے کا ایک بازو انگریزی حرف آئی رہ جاتا۔ آٹھ کے ہندسے کے دائیں جانب تھوڑی سی سیاہی ملنے سے چھ کا ہندسہ بن سکتا تھا اور اس کے بعد نمبر پلیٹ بالکل مختلف ہو جاتی۔ یہ کام کرتے ہوئے نمبر پلیٹ کو دھندلا دینا کافی تھا۔ کاغذ اور روشنائی بعد کو صاف ہو جاتے اور اصل نمبر پھر نمودار ہو جاتے۔

ابھی صبح ہونے میں کچھ دیر تھی۔ باکس اور اس میں رکھی ہوئی لاش کا مسئلہ میں نے یوں حل کیا کہ لاش کو باہر رکھ کر چوکیدار کی مدد سے خالی بکس اور اکھڑے ہوئے تختے سب نیچے لڑھکا دیے۔ پتھریلی زمین کے نشیب و فراز میں لڑھکتے وہ لا محدود سو فٹ کی گہری کھائی تک پہنچتے پہنچتے پاش پاش ہو چکا تھا۔ لاش اب کھلے ٹرک میں رکھی تھی۔ ٹرک کی تینوں دیواریں تقریباً دو دو فٹ بلند تھیں چنانچہ بالکل آخری حصے میں رکھی ہوئی لاش کو کوئی اس وقت تک نہیں دیکھ سکتا تھا جب تک کہ قریب آ کے اندر نہ جھانکے۔ یہ صورتِ حال اطمینان بخش تو نہیں تھی لیکن میں نے اس کا بھی کوئی بہتر طریقہ اختیار کرنے کا .... مسئلہ حالات پر چھوڑ دیا اور ٹرک لے کر روانہ ہو گیا۔ سوہاوہ کے قصبے کا بازار صبح کے دھندلکے میں ویران پڑا تھا۔ آبادی سے نکلتے ہی کھیت آ گئے۔ پھر ایک جگہ میں نے سڑک کے بہت قریب ایک کچا گھر دیکھا۔ باہر کھلی ہوا میں دو چار چارپائیاں پڑی تھیں۔ دو دو پر بستر بچھے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی کوئی اٹھ کے کسی کنویں یا نہر پہ نہانے گیا ہوگا یا کسی مسجد میں نماز پڑھنے۔ میں نے ٹرک روکا اور بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بستر سمیٹ کر بغل میں دبایا اور دوسرے میں بان کی چارپائی اٹھا کے دوڑا۔ جب میں چارپائی کو ٹرک میں ڈال چکا تھا تو اندر سے نکلنے والے ایک بچے نے چلانا شروع کیا۔ میں نے بستر بھی ٹرک میں پھینکا اور ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کر ٹرک اسٹارٹ کر دیا۔

ایک میل آگے جا کے میں نے چوکیدار کو مدد کے لیے طلب کیا۔ ہم نے چارپائی پر بستر بچھا کے لاش کو اس کے اوپر لٹا دیا اور چادر اس طرح پھیلا دی کہ صرف چہرہ نظر آئے۔

"اب راستے میں اگر کوئی پوچھے تو کہنا میرا لڑکا ہے۔ علاج کے لیے پنڈی لے جا رہا ہوں۔" میں نے چوکیدار کو سمجھایا۔

"لیکن جناب! زندہ مردہ کا فرق تو نظر آ جاتا ہے۔" چوکیدار نے کہا جو میری اس کارروائی سے پریشان بھی تھا اور خوفزدہ بھی۔

"فرق تمہیں نظر آ رہا ہے کیونکہ تم حقیقت جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ بے ہوش یا بے جان آدمی ایک جیسے لگتے ہیں جب تک کوئی نظر جما کے نہ دیکھے کہ سانس بھی چل رہی ہے یا نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ کسی نے پوچھا تو تمہارے جواب سے یقیناً مطمئن ہو جائے گا۔ شک کی بات ہی نہیں ہوگی تو کوئی اتنے غور سے نہیں دیکھے گا۔"

مردہ بدستور زندہ۔ خود چوکیدار بھی میرے رحم و کرم پر تھا اور مطمئن اس لیے تھا کہ میں یہ سب کچھ اس کی بھلائی کے لیے کر رہا تھا۔

"اب تک تو میں تمہیں چوکیدار کہتا آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

"فلک شیر جناب۔" وہ بولا۔ "ویسے سب لوگ شیرو کہتے تھے۔"

"اچھا تو فلک شیر!" میں نے کہا۔ "کچھ باتیں ایسی ہیں جو تمہیں ابھی سے سمجھ لینی چاہئیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ چوہدری دلاور نے تمہیں قتل کرا کے دفن کرانے کا پورا بندوبست کر لیا تھا اور شاید تیرا بھی۔ جب انہیں معلوم ہو گا کہ تم بچ کر نکل گئے ہو یا انہیں شبہ ہو گا کہ گامے کی موت اس مشن سے پہلے واقع ہو گئی تھی تو وہ پریشان بھی ہوں گے اور برہم بھی۔ وہ کوشش کریں گے کہ تمہارا اور گامے کا پتا چلائیں اور پھر تم کو قتل کرا دیں۔ یہ بتاؤ تم لاہور میں کہاں رہتے تھے؟"

"میں گامے کے ساتھ تھا جناب!" چوکیدار بولا۔ "محلہ بی بی پاکدامن میں ایک کمرہ تھا۔"

"آفس میں تمہارا یا گامے کا پتا لکھا ہوا تھا؟ گاؤں یا گھر کا؟" میں نے کہا۔

"ہو گا جی۔" چوکیدار نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں۔"

"گاؤں سے تمہارے خطوط تو آتے ہوں گے؟" میں نے متفکر ہو کے کہا۔

"گامے کی ماں منشی سے چٹھیاں لکھواتی رہتی تھی۔ میری بیوی خود لکھتی تھی۔ وہ چار جماعت پڑھی ہوئی ہے۔"

"اور یہ سب خط تم پھاڑ دیتے تھے یا محفوظ رکھتے تھے؟" میں نے کہا۔

"گامے کی ماں کے سارے خط میں نے بکسے میں ڈال چھوڑے تھے جناب! گاما بھی ماں کے خطوں کو سنبھال کے رکھتا تھا۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "پھر تو وہ بہت جلد تمہارے گاؤں پہنچ جائیں گے۔ یہ بتاؤ تم گاؤں چھوڑ کے جا سکتے ہو۔ گامے کی ماں کو بھیج دو۔ اسے وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ اس کے آگے پیچھے کوئی ہے؟"

"گامے کے دو چھوٹے بھائی ہیں۔ دونوں کی عمریں کم ہیں۔ دونوں ابھی بچے ہیں۔ سب ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔" وہ بولا۔

"بس تو تم اپنی فیملی کو لے کر نکل جاؤ۔ کوئی ایسی جگہ ہے جہاں تم کچھ عرصہ چھپ کے رہ سکو اور کسی کو معلوم نہ ہو؟" میں نے کہا۔

"کراچی میں بھائی ہے میرا۔" وہ بولا۔ "کسی افسر کے پاس ڈرائیور ہے۔"

"بس اسی کے پاس چلے جاؤ۔ وہاں پہنچ کے مجھے ایک خط ڈال دینا۔" میں نے کہا۔

"لیکن جناب! کراچی پہنچنے کے لیے گاڑی کا کرایہ۔ اور وہاں پہنچ کے بھائی پر بوجھ بننا۔"

"تم اس کی بالکل بھی فکر مت کرو۔" میں نے ٹرک چلاتے چلاتے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سارے نوٹ اسے تھما دیے۔

"یہ ساڑھے تین ہزار کے قریب ہیں۔ دو ہزار تم رکھ لو۔ کراچی پہنچنے کے لیے کافی ہوں گے۔ باقی مجھے دے دو۔ مجھے بھی واپس پہنچنا ہے۔ چلو ڈھائی ہزار رکھ لو۔ ہزار مجھے بہت ہوں گے۔ جب تک تم کراچی میں رہو گے تمہیں ہر ماہ ایک ہزار روپے ملتے رہیں گے۔ وہاں روزگار بھی آسانی سے مل جاتا ہے۔ تمہارا بھائی مدد کرے گا تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا اور تم اس پر بوجھ نہیں بنو گے۔ پھر جب حالات میرے قابو میں آ گئے میں تم کو بلا لوں گا۔ اس وقت تو میں کوئی انعام دینے کا وعدہ بھی نہیں کر سکتا لیکن جب میں اس قابل ہو جاؤں گا تو تمہیں انعام ضرور دوں گا۔"

"کس بات کا انعام سرکار؟" چوکیدار ہکا بکا بیٹھا تھا۔

"تم نے آج میری زندگی بچا کے مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ تو میں چکا نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔ "تمہاری ہمت اور خوبی کا انعام ضرور دوں گا لیکن اس دن جب حالات سازگار ہوں گے تمہاری توقعات سے بڑھ کر۔"

"آپ... آپ کی اپنی زندگی بھی خطرے میں ہے سرکار!" فلک شیر نے کہا۔ "آپ کہاں جائیں گے؟"

"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "تمہارے بدنصیب بھانجے کی آخری رسوم میں شرکت کے بعد واپس لاہور جاؤں گا۔ لیکن پھر بھی مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہو گی۔ تم گاؤں میں میرا نام نذیر صاحب بتاؤ گے کیونکہ ٹرک پر 'نذیر اینڈ کمپنی' درج ہے تاکہ جب کوئی میرو وزیر اینڈ کمپنی یا سکندر بخت کو تلاش کرتا ہوا پہنچے تو کسی سے کچھ نہ معلوم ہو کہ میں اسی ٹرک میں تمہارے ساتھ گاؤں گیا تھا۔ تم کو گاؤں میں دو چار دن سے زیادہ نہیں رہنا ہے۔ بہتر ہو گا کہ تم گامے کا سوئم ہوتے ہی روپوش ہو جاؤ۔ اپنی بیوی کو بھی یہ بتانا کہ ہم لاہور جا رہے ہیں اور اب وہیں رہیں گے جہاں میں کام کرتا ہوں مگر اسے تاکید کر دینا کہ کسی سے کچھ نہ کہے۔ عورتیں بات کو چھپا نہیں سکتیں۔ اگر وہ کسی کو بتانے کی غلطی کرے گی تو بھی لاہور کا بتائے گی۔ پھر تم کراچی کا ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھ جانا۔ جب کراچی پہنچ جاؤ تو اپنے بھائی سے کسی بات کا ذکر مت کرنا۔ بس یہی کہہ دینا کہ تلاش روزگار میں آیا ہوں۔"

"اور اگر اس نے پوچھا کہ ہزار روپیہ مہینہ کون بھیج رہا ہے مجھے؟"

"اسے بتا دینا کہ ایک دوست ہے۔ ملازمت اور الگ گھر ملنے تک مدد کرے گا۔ جب تم الگ رہنے لگو گے تو بھائی کو کیا معلوم ہو گا۔" میں نے کہا۔

میں نے دیکھا کہ وہ تذبذب کا شکار ہے۔ اسے بہت سے خدشے گھر چھوڑنے کے پیچھے اور نقل مکانی یا جلا وطنی قبول کرنے پر آمادہ کیا جا رہا تھا۔ وہ گاؤں کا باسی تھا جس کے رشتے زمین سے اتنے ہی گہرے ہوتے ہیں جتنے پرانے ہوں۔ برگد کے درخت کی طرح۔ مگر وحشت کی دیواروں کی طرح نہیں جن کی بنیادیں ایک دو فٹ مٹی کے بعد ختم ہو جائیں۔ شہروں میں رہنے والے گھروں سے ملتے نہیں جوڑتے خواہ ان کا اپنا ہو یا پرایا اور خوب سے خوب تر کی جانب لپکتے رہتے ہیں محلے بدلتے رہتے ہیں۔ گاؤں میں جس زمین پر دادا پڑدادا ہل چلاتے آئے اسی پر تیسری چوتھی نسل نے بالکل اسی طرح ہل چلایا۔ وہی کچے گھروندے وہی خاندانی محبتیں اور عداوتوں کے سلسلے۔ نہ جانے لاہور وہ کیسے آیا تھا۔ پھر لاہور میں جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا اس کے بعد ایک اور بڑے زیادہ وحشت اور زیادہ بے حس شہر جا کے کیا ہو گا جہاں انسانوں کا جنگل آباد ہو اور آدمی بھی درخت ہوں جو پھیلتے پھولتے ہیں مگر دوسروں سے اپنا فاصلہ برقرار رکھتے ہیں اور جذبات سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ خطرے کی وجہ سے تو خود کے بارے میں سوچنے پر مجبور کی تھی اور جب سوال اپنوں کی زندگی کا ہو تو [illegible] نہیں کرنی چاہیے ورنہ بعد میں کف افسوس ملنے سے کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ چوہدری دلاور بہت خطرناک آدمی ہے اور اس کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ بہت جلد پھر اس کی گردن تک پہنچ جائیں گے اور عین ممکن ہے اس مرتبہ وہ اکیلا نہ مارا جائے۔ انتقام کے عتاب کی زد میں اس کا پورا خاندان آ جائے۔ بالآخر وہ قائل ہو گیا۔

جب ہم گوجرانوالہ سے گزرے تو صبح کے سات بجے تھے۔ بچے اور بچیاں پڑھنے کے لیے اسکول جا رہے تھے اور بازار آباد ہونے لگے تھے۔ [illegible] آسانی سے ہر جگہ مل جانے والی چیزیں تھیں اور مجھے صرف ایک روپے میں پہلی ہی دکان سے مل گئیں۔ اتفاق سے میری نظر [illegible] دکان میں رکھے ہوئے تھرمس پر پڑ گئی۔ میں نے وہ بھی خرید لیا اور ایک دکان نما ریسٹورنٹ سے کھولتی ہوئی چائے بھروالی۔ بسکٹوں کا ایک پیکٹ اور اسپرین لے کر میں واپس آیا تو چوکیدار [illegible] کے سامنے کھڑا تھا۔ "سچ سچ بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟" اے ایس آئی نے کہا۔

"چلو!" میں نے سامان آگے رکھ کے بے تعلقی سے اسے مخاطب کیا اور انگریزی پر آ گیا۔ "جھوٹ سچ مجھ سے پوچھو۔ میرے ملازم کو بلاوجہ ہراساں مت کرو۔" مجھ سے ذرا سی چوک یہ ہو گئی تھی کہ میں نے ٹرک کو سڑک کے کنارے واقع تھانے کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔

اے ایس آئی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ "تم کون ہو مالک صاحب؟"

"میرا نام مالک نہیں نذیر بیگ ہے۔ میں اس فیکٹری کا مالک ہوں جس کا نام ٹرک پر لکھا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب بولو؟"

"یہ ڈرائیور پہلے تو کہہ رہا تھا کہ اپنے بیٹے کو علاج کے لیے لے جا رہا ہے۔" اے ایس آئی بولا۔ "پھر میں نے پوچھا کہ بیماری کیا ہے تو کہنے لگا کہ بیٹھے سے گر گیا ہے۔" اور مجھے بسکٹ کا پیکٹ کھولتے دیکھتا رہا۔

"اس میں جھوٹ کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کے سر میں کوئی اندرونی چوٹ معلوم ہوتی ہے۔"

"اس کے چہرے پر خون نظر آ رہا ہے۔" اے ایس آئی نے کہا۔

"تم کوٹھے سے گر کے دیکھو خون نکلتا ہے یا صرف ہڈیاں ٹوٹتی ہیں۔" میں نے اسے مشتعل کرنے کے لیے کہا۔

"مجھے شک ہے کہ اصل معاملہ کچھ اور ہے۔" وہ گرم ہو کے بولا۔ "یہ دیکھنا پڑے گا کہ زخمی اس کا بیٹا ہے یا نہیں۔ اس نے خودکشی کی کوشش تو نہیں کی تھی اور یہ مار پیٹ میں تو زخمی نہیں ہوا۔"

وہ زبردستی کیس بنانے پر آمادہ تھا اور میں اس کا مطلب بھی سمجھتا تھا۔ "یہ ٹرک تمہارے تھانے کے علاقے میں کھڑا ہے اس لیے؟" میں نے کہا۔ "ہم تو جہلم کی طرف سے آ رہے ہیں۔" میں نے تھرماس میں سے چائے کا ایک مگ بھرا۔

"میں یہ سب نہیں جانتا۔" وہ بولا۔ "تفتیش ہو گی تو سب معلوم ہو جائے گا۔" مخصوص پولیس کا لہجہ اور زبان۔

"اور تفتیش ہی تفتیش میں یہ مر گیا تو ذمے دار کون ہو گا؟" میں نے ہاتھ سے گامے کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"تم نے حادثے کی رپورٹ درج نہیں کرائی ہے۔" وہ بولا۔ "اور میں اپنی آنکھوں کے سامنے سب کچھ دیکھ لینے کے بعد تم کو قانونی کارروائی کے بغیر کیسے جانے دوں؟"

میں نے چائے کا ایک مگ چوکیدار کو دیا۔ "تم اندر جا کے بیٹھو۔" میں نے کہا۔ "یہ بسکٹ بھی لیتے جاؤ۔" پھر میں نے دوسرا مگ اپنے لیے بھرا اور ایک بسکٹ کھانے لگا۔ "پھر ایسا کرتے ہیں..." میں نے کھاتے کھاتے بدتمیزی سے کہا۔ میرے انداز بے نیازی کے بعد وہ اس بداخلاقی پر مزید برہم تھا کہ ہم نے اسے چائے کے لیے پوچھا تک نہیں۔ "ایسا کرتے ہیں کہ اندر چلتے ہیں۔" میں نے تھانے کی طرف اشارہ کیا اور تیسرا بسکٹ نکالا۔ "معاف کرنا ناشتے کا وقت تھا۔ تم تو ڈیوٹی کے آتے ہو گے۔ ہم ذرا تازہ دم ہو لیں پھر لاہور فون کر لیتے ہیں۔ فون تو ہو گا تھانے میں؟"

"فون کسے کرنا ہے؟" اے ایس آئی مزید گرم ہوا۔ "مجھ سے سیدھی طرح بات کرو۔"

میں نے چائے کا خالی مگ تھرماس پر رکھا۔ رومال سے منہ صاف کیا اور جیب سے سگریٹ نکال کے لائٹر سے جلائی۔ "لاہور فون کرو۔" میں نے ایک طویل کش لے کر بے نیازی سے کہا اور اسے حسن رضوی صاحب کے گھر کا نمبر بتایا۔ "یہ نمبر ہے لاہور کے ایس ایس پی کی کوٹھی کا۔ ابھی وہ آفس نہیں گئے ہوں گے۔" میں نے

www.paksociety.com

گھڑی پر نظر ڈالی۔ "غالباً ناشتا کر رہے ہوں گے۔ فون ان کے گھر میں سے کوئی اٹھائے گا۔ محسن یا رابعہ قادری ایڈووکیٹ۔ یا خود ان کی بیگم۔ ان سے سب معلوم ہو جائے گا۔"

"کون مسٹر ایس پی؟" اے ایس آئی نے کہا۔ "خان محمد رضوی صاحب؟"

"ویری گڈ۔ تم تو جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "لاہور میں رہے ہو کیا؟"

"تمہارا ان سے کیا تعلق ہے؟" وہ بولا لیکن اب اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

"وہ انکل ہیں میرے۔" میں نے کہا۔ "انہی کے گھر میں رہتا ہوں۔ چلو۔" میں نے تھانے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"آپ پہلے ہی بتا دیتے نا جی۔" اے ایس آئی نے ناگواری سے کہا۔ "جائیں آپ۔"

"بھئی مجھے بات کرنی ہے اپنے گھر۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "انہیں اطلاع دینی ہے کہ ابھی تک سب خیریت ہے۔ اور آگے تو شاید پنڈی ہی میں کوئی موقع ملے۔ لیکن اس وقت تک وہ ڈیوٹی پر جا چکے ہوں گے۔ دفتر کا نمبر ذرا مشکل سے ملتا ہے۔ یا تم سمجھتے ہو کہ تھانے کا فون ایک ایس پی سے گفتگو کے لیے استعمال نہیں ہو سکتا؟"

"میں نے کب کہا ہے جی! آپ تو ایسے ہی بات بڑھا رہے ہیں۔ دس بار فون کریں۔" وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس کی ساری اکڑ فوں ختم ہو گئی تھی۔ اس کی صبح کا آغاز بہت غلط طریقے پر ہوا تھا۔ قانونی تفتیش اور کارروائی کا تو کوئی سوال ہی نہیں رہا تھا۔ الٹی اسے یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ میں اس کی شکایت نہ کر دوں۔ ایک تو میں دولت مند اور فیکٹری کا مالک۔ پھر ایس ایس پی کا بھانجا۔ لیکن میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ سب سے پہلے تو مجھے اپنی خیریت کی اطلاع دینی چاہیے۔ میں تار بھی دے سکتا تھا مگر فون پر براہ راست بات ہو سکتی تھی اور اس کے لیے تھانے کا فون سب سے بہتر ذریعہ تھا۔ بڑا اچھا ہو اگر فون محسن یا رابعہ میں سے کوئی اٹھائے، میں نے سوچا۔

اندر وہی نحوست تو وہ بڑا آسیب اور نیم روشن سی سہمی سہمی فضا تھی جو ہر تھانے کا طرۂ امتیاز ہے۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کے فون کو اپنی طرف کھینچا اور سگریٹ لبوں میں دبا کے نمبر ملانے لگا۔ میں اوور ایکٹنگ کر رہا تھا چنانچہ غریب اے ایس آئی احساس کمتری میں مبتلا ہو رہا تھا۔ ایسے ہی مواقع پر اس کی بادشاہت کا غرور خاک میں مل جاتا تھا۔ گھنٹی تین بار بجی۔ پھر محسن نے ریسیور اٹھا کے کہا۔ "ہیلو۔"

"ارے بھائی شیر دلانی صاحب! آداب عرض ہے قبلہ۔" میں نے اپنی قدرتی آواز میں کہا۔

"سکندر! الو کے پٹھے۔ خبیث۔" محسن نے میری آواز پہچانتے ہی بے اختیار دل کا غبار نکالنا شروع کیا۔ "کہاں کہاں ہے اب؟ مر گیا ہے کہ زندہ ہے؟"

"یار میں یہاں گوجر خان کے تھانے سے بول رہا ہوں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"پہنچ گیا پھر تھانے۔ قسم خدا کی جو اب تم یہاں سے گئے..." محسن نے برہمی سے کہا۔ "حد ہوتی ہے کسی بات کی!"

"میں بالکل خیریت سے ہوں محسن۔" میں نے کہا۔ "انکل کو بھی اطلاع دینی تھی۔ مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ کا کیا حال ہے؟"

"انتقال ہو گیا ان کا۔" محسن نے جھنجھلا کے کہا۔ "آپ کی یاد میں رو رو کے جان دے دی۔"

"اور انکل رضوی؟" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے ابھی نہیں گئے ہوں گے۔ ناشتا کر رہے ہوں گے۔"

"وہ بندوق لے کر آ رہے ہیں۔ ابھی فون پر گولی مار دیں گے۔" محسن بہت ناراض تھا۔

"آپ بات کرنا چاہیں ایس ایس پی صاحب سے تو۔" میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کے نزدیک ہی موجود اے ایس آئی سے کہا۔ "ناشتے کی میز پر ہیں۔ اخبار بھی اسی وقت پڑھتے ہیں اگر کوئی ڈسٹرب کرے تو۔۔۔"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں، انہیں تکلیف مت دیں۔ سلام کہہ دیں۔" اس نے سینے پر انگلی سے اپنے نام کے بیج کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا بھائی محسن! میں کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں پہنچ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "انکل کو بتا دینا۔ ابھی تو میں یہاں بس دو چار منٹ ہی ہوں۔"

"کہاں؟" محسن چلایا۔ "اب کدھر کا ارادہ ہے؟ اچھا خدا کے واسطے گھر آ جا۔ لے بات کرا انکل اور رابعہ سے۔"

"اچھا خان صاحب! خدا حافظ۔" میں نے فوراً ریسیور رکھ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ میں نے محسن کو بتا دیا تھا کہ میں تھانہ گوجر خان سے بول رہا ہوں۔ ابھی ذرا سی دیر میں وہ ان کا نمبر معلوم کر لیں گے اور پھر یہ کہہ دیں گے کہ اس شخص کو بند کر دو حوالات میں۔ اور جب تک خود لینے نہ آ جاؤں اسے مت چھوڑنا۔ یا حکم صادر کر دیں کہ اسے پولیس کے پہرے اور نگرانی میں لاہور روانہ کر دو۔ فوراً منٹ میں میرا فرار ہو جانا ضروری تھا۔ اے ایس آئی بادل نخواستہ مجھے رخصت کرنے تھانے کے گیٹ تک آیا۔

"معاف کیجیں۔ وہ جو کچھ بات ہوئی۔ غلط فہمی کے باعث۔" اس نے بمشکل تمام کہا۔

"او وہ۔ فارگیٹ اِٹ۔" میں نے کہا۔ "میں پولیس کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اصل میں ماتحت عملہ یہی۔ جب آپ جانتے ہیں کہ بچھو ڈنک مارتا ہے تو اس کی فطرت کو بدلنے کی کوشش کرنا یا اس کے کاٹنے پر بچھو کو برا بھلا کہنا دونوں ایک جیسی فضول باتیں ہیں۔ او کے۔ خدا حافظ۔"

بجائے اس کے منہ پر جو تمانچہ رسید کرنے کے میں نے تپاک سے مصافحہ کیا اور ٹرک کی جانب چل پڑا۔ اے ایس آئی کی دلی کیفیت کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ اس وقت کا بدلہ آج وہ ان سے لے گا جو شامت اعمال کے باعث گرفتار لائے جائیں گے۔ خوشی مجھے اس بات کی تھی کہ وہ ڈر کے مارے میں ٹرک نوٹ نہیں کر سکا اور شاید ٹرک کا نمبر بھی۔

فلک شیر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ میں نے شاید بریک فاسٹ اور لنچ کال میں تقریباً ایک گھنٹہ گزار دیا تھا۔ دھوپ چڑھ گئی تھی چنانچہ وہ لاش کی طرف سے متفکر تھا جو کھلی جگہ پر رکھی تھی۔ ابھی تک سائے میں تھا لیکن آگے کا سفر کم سے کم چھ گھنٹے کا تھا۔ دوپہر کے دو بجے تک دھوپ میں رہنا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ راولپنڈی سے ہم کوئی ترپال وغیرہ لے کر اوپر پھیلا دیں گے۔ حالات خراب نہیں ہوئے۔ گاؤں پہنچنے کے بعد بھی تدفین کے لیے دو چار گھنٹے لگ جائیں گے۔ موسم اتنا گرم نہیں تھا کہ بارہ گھنٹے میں خرابی کے آثار پیدا ہو جائیں۔

راولپنڈی کا فاصلہ میں نے ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا اور راستے میں صرف ایک جگہ پٹرول ٹینک فل کرانے کے لیے رکا۔ اگر میں سوان کیمپ اور ٹوپی پارک کی طرف سے پنڈی میں داخل ہو کے مال روڈ پر ہو جاتا تو شہر کی ٹریفک سے بچ کے بالکل سیدھا گزر جاتا اور کوہ نور ٹیکسٹائل مل کے بعد صرف ترنول چیک پوسٹ ہی تھی جہاں کوئی ٹرک میں جھانک کر دیکھتا لیکن اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم کہہ سکتے تھے کہ زخمی مریض کو لیڈی ریڈنگ ہاسپٹل پشاور لے جا رہے ہیں کیونکہ وہاں اس کا اچھا نیورو سرجن ہے۔ عام حالات میں پنڈی کے جنرل ہسپتال یا سی ایم ایچ جیسے اسپتالوں کو چھوڑ کے پشاور جانے کی بات کوئی نہیں کرتا لیکن کسی کا قریبی عزیز مثلاً خود ڈاکٹر ہو تو یہ بات فطری نظر آتی ہے۔ غیروں کے مقابلے اپنے زیادہ توجہ دے سکتے ہیں اور دور ہی سہی تب بھی ان پر اعتماد تو زیادہ ہی رہتا ہے۔

ترپال خریدنے کے لیے مجھے ہاتھی چوک جانا پڑتا۔ اس بات کا خطرہ تھا کہ ٹرک میں مجھے ہمدرد بستر پر ایک مجروح شخص کو لیٹا دیکھ کے لوگ جمع ہو جائیں یا کسی کی نظر قیامت کی ہو تو وہ تاڑ جائے۔ احتیاطاً میں نے کینٹ ہاسپٹل کی طرف سے گزرنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی زیادہ رش نہیں تھا۔ ترپال والے سے پہلے مجھے پلاسٹک شیٹ والے کی دکان نظر آ گئی اور میں نے وہیں سے ٹرک کو موڑ لیا۔ بیچنے والے پلاسٹک کی شیٹ کے رنگ برنگے تھان کپڑوں کی طرح لپیٹے ہوئے رکھے تھے۔ میں نے سادہ سے براؤن رنگ کی شیٹ خریدی اور ٹرک کی تینوں دیواروں پر پھیلا کے لاش پر ایک عارضی سائبان قائم کر دیا۔ شیٹ کے کناروں کو میں نے ٹرک کی سائڈ میں بنے ہوئے لوہے کی ہر ہک میں پرو دیا تاکہ ٹرک چلنے سے شیٹ کو ہوا نہ اڑا لے۔ اس کے باوجود جب میں فیروز پور کی طرف سے مال روڈ پر پہنچا اور دائیں طرف گھوم کے پشاور جانے والی سڑک پر ٹرک نے اسپیڈ پکڑی تو پلاسٹک شیٹ ہوا بھرنے سے پیراشوٹ کی طرح پھول گئی اور بالآخر پھٹ گئی۔ اس کا ایک کونا پھڑپھڑانے لگا۔ پھر دوسری ہک کا سوراخ ایک چاک بن گیا اور ابھی ہم ریڈیو پاکستان کے سامنے سے گزر رہے ہی تھے کہ شیٹ اڑ گئی۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" میں نے فلک شیر سے کہا۔ "ٹرک پر چھت تو نہیں ہے لیکن دھوپ کا اثر ہوا سے زائل ہوتا رہے گا۔"

فلک شیر کچھ نہیں بولا مگر اس کی صورت بتاتی تھی کہ اس صورت حال پر وہ آزردہ ہے۔

"اب چار پانچ گھنٹے کا سفر ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کہو تو میں لاش کو چارپائی کے نیچے رکھ دوں۔ یہی ایک صورت ہو سکتی ہے اسے سائے میں رکھنے کی؟"

فلک شیر نے اقرار میں سر ہلایا اور میں نے ٹرک کو ایک طرف کھڑا کیا۔ نیچے اترا اور پیچھے جا کے اکیلے ہی لاش کو چارپائی سے اتار کے ٹرک کے فرش پر رکھا اور چادر اس پر ڈال دی۔ لیکن بستر چارپائی پر ہی رہنے دیا۔ اب مردہ کو کوئی بیہوش قرار دینے اور علاج کی غرض سے پشاور لے جانے والی کہانی نہیں چل سکتی تھی۔ بیمار اور مجروح شخص کو آرام سے بستر پر لٹا کے لے جایا جاتا ہے نہ کہ سخت فرش پر جہاں جھٹکے لگنے سے صحت مند آدمی کی حالت بھی خراب ہو جائے۔ میں نے فلک شیر کو سمجھایا کہ اب ہم سے راہ میں کوئی سوال کرے گا تو ہمارا جواب مختلف ہو گا۔ ہم بتائیں گے کہ مریض کو علاج کے لیے پنڈی لے گئے تھے اور اس کا آپریشن ہونا تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ چنانچہ اب تجہیز و تکفین کے لیے واپس لے جا رہے ہیں اور اسے چارپائی کے نیچے رکھنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ دھوپ سے محفوظ رکھا جائے۔ لاش کے سر اور چہرے کے زخموں سے رسنے والا لہو جم کے سیاہ اور خشک ہو چکا تھا چنانچہ اس چادر پر کوئی داغ نمودار نہیں ہوا تھا جو میں نے لاش پر ڈالی تھی اور میرا خیال تھا کہ ہم نے احتیاط سے بات کی تو کوئی شک نہیں کرے گا۔

لیکن ترنول چیک پوسٹ پر تین افراد اچانک ٹرک کے سامنے آ گئے اور ٹرک روکنے والے لمبے بانس سے ڈنڈے کے پیچھے صف بستہ ہو گئے۔ ان کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ عموماً وہ ہر گاڑی پر سرسری نگاہ ڈال کے چنگی محصول لیتے تھے اور گاڑی کو گزر جانے دیتے تھے۔

www.paksociety.com

وہ ہر گاڑی کی تلاشی تفصیل سے لیتے تو دونوں جانب گاڑیوں کی قطاریں لگ جاتیں اور ٹریفک جام ہو جاتا۔ اس وقت وہ شکوک کی بنا پر کی پوزیشن میں تھے اور یہ ناممکن تھا کہ میں بیریئر کو توڑ کر آگے فرار ہو جاتا۔ صاف ظاہر تھا کہ رضوی صاحب کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔ گوجر خان کے تھانے میں سے ایس آئی نے انہیں ٹرک کا نمبر اور میرا حلیہ سب بتا دیا ہو گا۔ شکلاً بندوبست انہوں نے یہی کیا ہو گا کہ مجھے راولپنڈی میں داخل ہوتے وقت یا شہر سے نکلتے وقت روک لینے کی ہدایات جاری کر دی ہوں گی۔ انہیں راولپنڈی کے ایس ایس پی یا اسی عہدے کے کسی افسر کا تعاون حاصل ہو گا یا انہوں نے شیروانی صاحب کو بتا دیا ہو گا جو خود بھی اسلام آباد میں تھا سے بااثر افسر تھے۔ جیسے ہی میں نے ٹرک روکا ایک انسپکٹر قسم کا شخص میری طرف آیا۔ باقی دو پچھلے حصے کی طرف بڑھے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پرسکون رہتے ہوئے اطمینان سے کہا لیکن فلک شیر کا چہرہ فق ہو گیا۔

"کچھ نہیں۔ آپ نیچے تشریف لے آئیں۔" انسپکٹر نے طنزاً میٹھی شائستگی سے کہا۔ "آپ کا نام سکندر بخت ہے نا؟"

"ہاں۔ لیکن اس طرح میرا راستہ روکنے کا مقصد؟" میں نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا۔ "مجھے پشاور جانا ہے۔"

"ہم صرف احکامات کی تعمیل کر رہے ہیں۔" وہ بولا۔ "کہ آپ کو یہیں روک لیا جائے۔"

"کس لیے۔ اور کس نے دیا ہے یہ حکم؟" میں نے بحث کر کے اسے قائل کرنے کی بے سود کوشش کی۔

"ہمارے اعلیٰ افسران کا۔ اگر ہم سے کوتاہی کی تو معطل ہو جائیں گے۔ اس لیے آپ ضد نہ کریں۔" وہ بولا۔

"پیچھے بھوسے کے نیچے لاش ہے سر جی!" ایک ماتحت نے جا کے رپورٹ پیش کی اور اس سنسنی خیز دریافت پر اپنے افسر کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ افسر نے چونک کر مجھے غور سے دیکھا۔ اب تک وہ سمجھ رہا ہو گا کہ میں کوئی خطرناک قسم کا پُراسرار مجرم ہوں جیسا غیر ملکی جاسوس۔ چنانچہ افسرانِ بالا نے صرف مجھے روکنے کا حکم دیا ہے۔ گرفتار کرنے کا نہیں اور شاید وہ خود آ کے مجھے تفتیش کے لیے اپنے ہمراہ لے جانا چاہتے ہوں گے مگر اب اچانک میری حیثیت ایک عام مجرم کی سی ہو گئی جو قتل کر کے لاش سمیت فرار ہو رہا تھا۔ میں نے نیچے اتر کے دروازے کو زور سے مارا۔ فلک شیر پہلے ہی اتر گیا تھا۔ ایک شخص فوراً میری جگہ چڑھ گیا اور اس نے ٹرک کو بیچ میں سے ہٹا کے سڑک سے دور ایک کنارے پر کھڑا کر دیا۔ وقتی طور پہ رُک جانے والی ٹریفک پھر چل پڑی۔ انسپکٹر مجھے ایک مختصر سے کمرے میں لے گیا جہاں صرف ایک میز تھی اور ایک کرسی۔ میں فوراً اس کرسی پر بیٹھ گیا۔ عام حالات میں یہ بڑی گستاخی ہوتی مگر اس وقت انسپکٹر خوف کے مارے اپنی گرفتاری پر خاموش ہو گیا۔ اس نے پیچھے سے دوسری کرسی منگوائی لیکن فلک شیر کو کھڑا رکھا۔

"یہ لاش میری فیکٹری کے ایک فورمین غلام محمد کی ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا اور جیب سے سگریٹ نکال کے جلائی۔ "میں ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپنیز کا مالک ہوں۔ ہم اسے تدفین کے لیے لے جا رہے ہیں۔"

"اچھا جی؟" انسپکٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ پھر [illegible] اس نے ٹرک پر نگاہ ڈالی جس پر تدبیر اینڈ کمپنی کا نام لکھا ہوا تھا۔ لہجہ اور سوال دونوں مشتعل کرنے والے تھے لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔ "تم یہ کرو کہ اس افسر سے میری بات کراؤ جس کے حکم پر مجھے یہاں روکا گیا ہے۔ اور ہاں۔ یہاں چائے تو ملتی ہے۔ چائے کا انتظام کرو۔ پیسے میں دوں گا۔" میں نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر میز پر رکھے ہوئے فون کے قریب ڈال دیا۔ [illegible] مجبوراً اُٹھا۔ میرے تحکمانہ انداز نے اسے قائل کر لیا تھا کہ "صاحب ہے" اور میں معمولی آدمی نہیں ہوں۔ اس کے اٹھتے ہی میں نے فلک شیر کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انسپکٹر نے غصے سے پلٹ کر دیکھا پھر کسی سے کہا کہ وہ ٹھیک [illegible] جائے اور ایک کرسی لائے۔ ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کے عباس رضوی صاحب کے آفس کا نمبر ملانا شروع ہی کیا تھا کہ اس نے لائن کاٹ دی۔

"میں ایس ایس پی عباس رضوی صاحب کو فون کر رہا تھا۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

"یہاں کوئی عباس رضوی نہیں ہے۔" انسپکٹر [illegible] جیسے اس نے میرا جھوٹ پکڑ لیا ہے۔

"میں لاہور کا نمبر ملا رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہاں عباس رضوی ایس ایس پی ہیں۔ جن کے حکم پر مجھے روکا گیا ہے۔"

"ہم کسی عباس رضوی کو نہیں جانتے۔" وہ بولا۔ "یہ اسلام آباد کے ایک ایس پی کا حکم تھا۔ وہ آنے ہی والے ہیں۔"

کرسی پہلے آئی چائے اس کے بعد۔ دودھ پتی اور چینی [illegible] اس مکسچر کو اجزائے ترکیبی کی بنا پر چائے ہی کہا جا سکتا تھا۔ [illegible] اس میں چائے والی کوئی بات نہ تھی۔ سوائے درجہ حرارت کے کہ بہت زیادہ تھا۔ تھکن دور کرنے میں یہ گرم مشروب بے حد مفید ثابت ہوا۔ "شریعت کے مطابق میت کو دفن کرنے میں عجلت [illegible] فرض ہے۔" میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ انسپکٹر میری دینی معلومات پر تبصرہ کرتا، جیپ باہر آ کر رکی اور اس میں سے انکل شیروانی ایک [illegible] کے ساتھ برآمد ہوئے۔ انسپکٹر اچھل کے کھڑا ہو گیا۔ ایڑیاں کٹ سے بجا کے سیلیوٹ جھاڑا۔ انکل شیروانی نے پہنچتے ہی مجھے گلے لگایا اور پھر جواب طلبی شروع کر دی۔ "یعنی حد ہوتی ہے نامعقولیت کی۔ کسی کا خیال نہیں کہ سب کتنے پریشان ہیں۔ جب تک جا کے ایسے غائب ہو گئے جیسے ... جیسے ...."

"جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔" میں نے سر جھکا کے کہا۔ "میں واقعی گدھا ہوں لیکن آپ میری بات تو سن لیں۔"

"خاک سن لوں تمہاری بات۔" انکل شیروانی نے کہا۔ "وہاں سب کا جینا حرام کر رکھا ہے تم نے۔ رضوی کے فون پہ فون آ رہے ہیں کہ اسے کوئی سوال کیے بغیر ہتھکڑی لگا کے واپس بھیج دو۔ رابعہ اور محسن الگ پریشان ہیں۔ یہاں میری اور شمسہ کی نیند حرام۔ آخر تم کہاں غائب ہو گئے تھے اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے دیکھا کہ ڈی ایس پی زیرِ لب مسکرا رہا ہے لیکن انکل شیروانی کو دیکھ کر خوف سے گیا۔

"مسئلہ کوئی ایسا سنگین نہیں انکل!" میں نے کہا۔ "یہ [illegible] جان بچاتے ہوئے مارا گیا۔ مجھے اتنا تو کرنا چاہیے کہ اس کی آخری رسوم میں شریک ہوں۔" میری آواز اتنی کم تھی کہ دوسرے لوگ صاف نہیں سن سکتے تھے۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" انکل شیروانی بولے۔ "لیکن یہ نوبت آئی کیسے؟ یعنی تم اچھے بھلے سمجھدار آدمی تھے اپنی عقل اور حاضر دماغی سے تم نے سب کی جان بچائی اور پھر سب کی جان کے دشمن ہو گئے۔ کس حکیم نے لکھا تھا نسخہ کہ اکیلے وہاں جاؤ۔ بلا وجہ؟"

"میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس وقت میری پوزیشن کا خیال کیجیے۔ فورمین کی لاش کے ساتھ اس کا ماما ہے جو فیکٹری کا چوکیدار تھا اس کی جان بھی خدا نے بچائی۔ ورنہ یہ بھی میرے ساتھ ہی مارا جاتا۔ بس میں انہیں گاؤں تک چھوڑ آؤں۔ میرا وعدہ کہ دو پہر تک آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ آپ ذرا انکل رضوی کو سمجھا دیں۔ وہ آپ کی بات مان لیں گے۔"

"اچھا بھئی۔ لیکن دیکھو۔ میں کوئی انتظام کر دیتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کچھ لوگ چلے جائیں۔" انکل شیروانی نے مجبور ہو کے کہا۔ "صرف تمہاری حفاظت کے لیے۔ تمہارے لیے کام آ جائے گی۔"

میں یقیناً انکار کر دیتا لیکن اسی وقت پل بھر کے لیے میری نگاہ باہر گئی اور میں نے ایک نیلے رنگ کی کار کو گزرتے دیکھا۔ پھر شعوری طور پر مجھے [illegible] یاد آیا جس کے پاس ایسی ہی گاڑی تھی۔ [illegible] سابق استاد پیڈرو اور موجودہ احمد نواز کو دیکھا۔ وہ بڑی تیزی سے واپس جا رہا تھا اور اس کی نظر سڑک کے کنارے سے دور کھڑے ہوئے ٹرک پر گئی ہی نہیں جس پر "تدبیر اینڈ کمپنی" لکھا ہوا تھا۔ [illegible] کے باوجود اپنی فیکٹری کے ٹرک کو پہچان جاتا۔ یہ بھی بہت اچھا ہوا کہ ہم کمرے کے اندر تھے ورنہ سخت گڑبڑ ہو جاتی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کہاں سے واپس آیا ہے۔ مجھے اور چوکیدار کو لے جانے والا ٹرک مقررہ وقت پر ان کے ٹھکانے پر نہیں پہنچا ہو گا تو وہ تشویش میں مبتلا ہوتے ہوں گے اور تلاش کرنے پر انہیں طاہرہ کی لاش کے علاوہ لکڑی کا وہ شکستہ تابوت بھی نظر آ گیا ہو گا جس میں مجھے پیک کیا گیا تھا۔ شاید انہیں پہلے سے معلوم ہو گا کہ فیکٹری کا چوکیدار گامے کا رشتہ دار ہے اور وہ اسی نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ چوکیدار نے "غداری" کی یعنی مجھ سے وفاداری کی اور اپنے بھانجے سمیت فرار ہو گیا۔ گرو جی کے پاس [illegible] کا رجسٹر [illegible] اور اسے پہلے سے معلوم ہو گا کہ گامے کا اور چوکیدار کا تعلق کس گاؤں سے ہے۔ وہ بلا تاخیر روانہ ہو گیا۔ غالباً اس وقت جب ہم گوجر خان تھانے میں رُکے ہوئے تھے وہ وہیں کراس کر گیا۔ گامے اور چوکیدار کے گھر پہنچا اور یہ معلوم کر کے فوراً واپس آ گیا کہ وہ دونوں گاؤں نہیں پہنچے۔ اب وہ چوہدری دلاور کو رپورٹ دے گا کہ دونوں نمک حرام اسی وجہ سے گھر کی طرف نہیں گئے اور [illegible] میں حفاظت [illegible] نہیں ہے۔ وہ پیڈرو سے کہے گا۔ "گرو جی! تم گدھے کی اولاد ہو اور گدھے ہی رہو گے۔ تمہارے پاس کار تھی۔ تم گولی کی طرح گئے اور تصدیق کر کے لوٹ آئے۔ ان کے پاس کیا ہوائی جہاز تھا کہ تم سے پہلے پہنچ جاتے۔ وہ چھپتے چھپاتے بسوں میں سفر کر کے جائیں گے تو کل پرسوں تک پہنچیں گے۔" اور اس کے بعد پیڈرو کو اسی مشن پر واپس بھیج دیا جائے گا۔ اور دوسرے پھیرے میں پیڈرو کو چوکیدار مل جائے گا تو اس کے ساتھ اس کے بیوی بچے بھی اٹھا لیے جائیں گے اور انجام پہلے سے بھی برا ہو گا۔

"ٹھیک ہے انکل!" میں نے کہا۔ "مگر آپ کے آدمی سادہ کپڑوں میں ہوں تو اچھا ہے۔ دیہاتی ان کے پیچھے میت کے ساتھ بیٹھ جائیں۔ تدفین میں شریک رہیں اور ہمارے ساتھ ہی واپس آ جائیں لیکن میں اسی ٹرک کو لے جاؤں گا۔ کار رہنے دیں۔"

باوردی حضرات کو بے وردی کرنے اور حفاظتی انتظامات کی نوعیت سمجھانے میں ایک گھنٹہ گزر گیا۔ لیکن ہم دوبارہ روانہ ہوئے تو حالات بہت بہتر تھے۔ پیچھے میت کو دوبارہ چارپائی پر رکھ دیا گیا تھا اور پولیس نے اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے برف کی دو سلوں کا بھی انتظام کر لیا تھا جو چارپائی کے نیچے رکھ دی گئی تھیں۔ ٹرک دیکھنے میں پرانا لگتا تھا کیونکہ لوڈنگ میں استعمال ہوتا تھا لیکن اس کا انجن جاندار تھا۔ میں نے کیمبل پور تک اسے ساٹھ میل کی رفتار سے دوڑایا۔ پھر میں نے فلک شیر کی ہدایات پر عمل کیا کیونکہ آگے کا راستہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ کیمبل پور سے گزرتے ہوئے مردان کا [illegible] سا نکل گیا۔ زندگی خود کسی برساتی نالے کی طرح تھی اور اس کے پانی کی گہرائی

www.paksociety.com

برائے نام تھی۔ پانی کے شفاف دھارے کئی حصوں میں بٹ گئے تھے اور خشک جزیرے جیسے کئی ٹکڑے الگ الگ نظر آنے لگے تھے۔ ندی کی پوری تہ پر گول چکنے پتھروں کا فرش بچھا ہوا تھا اور اس پر جو پل قائم تھا وہ خاصا بلند تھا۔ شاید باڑھ کے موسم میں ندی کی سطح اتنی ہی بلند ہو جاتی ہوگی اور اس کا پاٹ بھی پل کی لمبائی کے برابر ہو جاتا ہوگا۔ ابھی تو مجھے خاصے نشیب میں فٹ پاتھ یا کسی بھولی بسری سڑک کے برابر ہموار سطح نظر آ رہی تھی جس پر دونوں جانب کوئی حفاظتی جنگلا نہیں تھا اور اس پر سے ایک وقت میں ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں ٹرک کے چاروں پہیوں کو سیدھا اور پل کے کناروں پر رکھنے میں کامیاب ہو گیا تب بھی اس کی باڈی پل کے دونوں طرف نکلی رہے گی۔ جو لنگ جانے والی بس کے مسافروں کا اس پل پر سے گزرتے ہوئے کیا حال ہوتا ہوگا جب وہ دیکھتے ہوں گے کہ بس پل پر ہوا پر سے گزر رہی ہے اور نیچے تو شاید پل پر ہی ہیں مگر وہ خود ندی کے اوپر معلق ہیں۔ نشیب کے فوراً بعد فراز تھا اور سڑک تیس درجے کے زاویے پر ایک دم اٹھتی تھی۔ کہیں کہیں یہ زاویہ پینتالیس درجے تک ہو جاتا تھا۔ چنانچہ پل کراس کرتے ہی مجھے ٹرک کو سیکنڈ گیئر میں رکھنا پڑا اور اس کا انجن زور زور لگاتا شور مچاتا اور چڑھنے لگا۔ چڑھائی کے علاوہ پہاڑی موڑ بھی جو اتنے خطرناک تھے کہ دوسری طرف سے آنے والی ٹریفک بالکل نظر نہیں آتی تھی چنانچہ ایک بس جو کیمبلپور جا رہی تھی، ڈرائیور کی وجہ سے لڑھکتی ہوئی زد میں سے گزر گئی تو مجھے حیرت ہوئی کہ دونوں گاڑیوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیوں نہیں کیا۔ لیکن بس ڈرائیور تجربہ کار اور ان راستوں پر غیر متوقع ملاقاتوں کا عادی تھا کہ ایک ملی میٹر کے فاصلے سے گاڑی نکال لے گیا۔ آگے کا راستہ اور بھی خطرناک ثابت ہوا اور مسافت کم ہونے کے باوجود مجھے بے حد محتاط رہنا پڑا اور رفتار کو قابو میں رکھنا پڑا۔

دو بجے بالآخر ہم اپنی منزل پر پہنچے۔ اس کے بعد ایک ہاتھی کمرا تھا جس کی ذہنی اذیت سے بچنے کے لیے میں گاؤں کے بازار چلا گیا جہاں گنتی کی چند دکانوں میں سے ایک چائے خانہ بھی تھا اور پروپرائٹر چائے خانہ نے اسے میرے جیسے وی آئی پی کے قدم رنجہ فرمانے پر خصوصی چائے کا انتظام کیا اور گلاس بھر کے اوپر تک میر ملائی کی موٹی تہ کے ساتھ چائے پیش کی اس کی شکل دیکھتے سے قاصر تھی کہ میں احتجاج کروں ———— کیونکہ میرے بے وردی ملازم سائے کی طرح میرے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ صبح بھی نظر آتے تھے اور مجھ سے آپ جناب کے بغیر بات نہیں کرتے تھے۔ ان تینوں کو بھی تقریباً ویسی ہی اسپیشل چائے پیش کی گئی لیکن وہ مجھ سے دور بیٹھے بسکٹوں کے باقاعدہ حصے کو بلند پیچ چبا رہا۔ ویسی حالات دیکھتے ہوئے غنیمت بھی بہت غنیمت ثابت ہوئی۔

شام کو قبرستان سے لوٹنے کے بعد میں نے فلک شیر سے کہا۔

"اگر تمہیں جانا پڑے تو تیاری کے لیے اور سامان وغیرہ باندھنے کے لیے کتنا وقت درکار ہوگا؟"

"تیاری کیسی مالک؟" وہ بولا۔ "اور غریب کا سامان ہی کتنا۔ بوریا بستر چند کپڑے اور برتن۔"

"اس کا مطلب ہے تم اگر چاہو تو آج میرے ساتھ واپس جا سکتے ہو بیوی بچوں سمیت۔" میں نے کہا۔

"آج؟" وہ چلتے چلتے رک گیا۔ "سوئم سے بھی پہلے؟"

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور میری کوئی ذاتی غرض وابستہ نہ ہوتی تو میں تمہارے ساتھ یہاں تک آتا ہی نہیں۔ تم کو دیر تک تو ان چوکی سے پولیس کی ایمبولینس میں یا اپنے ٹرک میں بھجوا دیتا اور خود واپس چلا جاتا۔ لیکن میرے یہاں آنے کا ایک مقصد ہے اور وہ مقصد ہے تمہیں اور تمہارے بیوی بچوں کو دلاور کے ظلم و ستم سے بچانا۔ تمہیں معلوم ہے اس کا ایک آدمی گامے کو پہنچانے ہوا گاؤں آ کے جا چکا ہے؟"

"آپ نے بھی سن لی ہے یہ بات جناب؟" وہ پھر میرے ساتھ چلنے لگا۔

"ہاں۔ آج یہاں سے کوئی نہیں ملا لیکن وہ معاف کرنے والا اور بھول جانے والا آدمی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ تمہارا وجود اس کے لیے خطرے کی علامت ہے۔ وہ پھر کسی کو بھیجے گا کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں۔ گامے نے تمہیں بچایا اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ تمہیں اس سے کتنی محبت تھی۔ کوئی ان کی خاطر تو جان بھی دیتا ہے جن سے نفرت کرتا ہو۔ لیکن کیا لیے بیوی بچوں سے تمہیں محبت نہیں ہے۔ تم یہ منظور کر سکتے ہو کہ تمہارے حصے کی سزا انہیں بھی ملے اور دلاور کے آدمی انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح کاٹ کے ڈال دیں۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ اپنی بساط کے مطابق تمہیں اس ظلم سے محفوظ رکھنے کی کوشش کروں۔ تاکہ تم زندہ رہو اور مجھے موقع ملے کہ میں تمہارے احسان کے بدلے تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔"

"پھر بھی، آج اچانک چلا جاؤں؟" وہ بڑبڑایا۔ "گامے کی ماں سے کیا کہوں؟"

"کچھ نہیں۔ کسی سے کچھ نہیں کہنا۔" میں نے کہا۔ "رات کو سامان سمیٹو اور میرے ساتھ ٹرک میں نکل چلو۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے ہم جاؤ گے۔ میں پنڈی سے تم کو کراچی کی ٹرین میں بٹھا دوں گا۔"

گاؤں میں رات مغرب کے فوراً بعد آ گئی۔ تعزیت کے لیے آنے والے عشاء کی نماز سے پہلے ہی اٹھ گئے تھے۔ عشاء کے بعد چوپال میں کوئی نہ رہا۔ کچھ گھروں میں جلنے والے تیل کے چراغ بجھ گئے اور ابھی نو ہی بجے تھے کہ چوکیدار نے ہوشیار خبردار کی صدا لگائی۔

پورا تھا کہ پھر بہت خاموشی پھیل گئی۔ اتنی گہری اور بوجھل کہ میں نے بھی محسوس نہ کی تھی۔ آوارہ کتے تک سو گئے تھے کہ کسی کے بھونکنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ جنگلوں اور کھیتوں میں گیدڑ تک نہیں چلا رہے تھے۔

میں نے فلک شیر سے کہا کہ یہی مناسب وقت ہے۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ فلک شیر کی بیوی کا اتنی کم مہلت میں اور "آدھی رات" کو چھوڑ کر ہزار کوس کے سفر پر نکلنے کے لیے آمادہ نہ ہوگی۔ مرد حقائق کو بہت کم وقت میں قبول کر لیتے ہیں۔ اور حالات کو سمجھتے ہوئے مصلحت کا راستہ اختیار کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ عورت کی ذات جذبات کا پیکر۔ جہاں رہے جس کے ساتھ رہے، وفا کے رشتوں کو اتنا استوار کرتی ہے کہ آسانی سے توڑ بھی نہیں سکتی۔ لیکن فلک شیر کی بیوی مختلف عورت ثابت ہوئی۔ فلک شیر کے کہنے پر میں نے خود اس سے بات کی تو اس نے میری بات بڑے سکون سے سنی اور فلک شیر کو دیکھتی رہی۔ نہ جانے کیوں فلک شیر نے اس سے نگاہ نہیں ملائی۔

"میں ضرور جاؤں گی ویر۔" اس نے بالآخر کہا۔ "اگر میں یہاں رہوں گی تو وہ ڈائن ہم سب کو کھا جائے گی۔"

"خواہ مخواہ بات کو مت بڑھا نیک بخت۔" فلک شیر نے آہستہ سے کہا اور باہر نکل گیا۔

"میں نے اپنی زندگی جل جل کے گزار دی۔ کیا نہیں کیا میں نے اس گھر کے لیے۔ مگر مجھے خوشی کبھی نہیں ملی۔ اس نے مجھے خوش رہنے ہی نہیں دیا۔" وہ نفرت کے زہر سے بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میرا بس چلتا تو میں اس کا گلا گھونٹ دیتی۔ اتنی دور چلی جاتی کہ اس کا منحوس خیال تک میرا پیچھا نہ کرتا۔"

"تم کس کی بات کر رہی ہو بہن؟" میں نے نرمی سے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

"اسی شمشاد گامے کی ماں کو رو رہی ہوں ویر۔" وہ بولی۔ "جو میری بچپن کی منگنی توڑ کے اس سے بیاہ رچانا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم ہے اس نے مولوی سے کتنے تعویذ لیے میرے خلاف، کتنے عمل کرائے۔"

"ایسی باتوں سے کچھ نہیں ہوتا بہن! ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔" میں نے محبت کی کہانی کے اس پیرائے کو سمجھتے ہوئے کہا جو ہر آدمی کا المیہ ہے۔ جسے وہ چاہتا ہے اسے فرق اور جانچتے رہتا ہے۔ محبت کرنے والے دو۔ حاصل محبت ایک خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور انجام یہی خانہ خرابی۔ خوشی کے پیچھے بھاگتے ہیں تو پتہ چلتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ خوشی تو ایک سراب تھی۔

"اپنا کیا اپنے آگے آتا ہے ویر جی۔" وہ بولی۔ "گھر والا چھوڑ گیا، تب تک لوگوں کی سنتا اور بے غیرت بن کے جیتا۔ سیانی ان دونوں کو بھی نہ آئی۔"

"لیکن گامے کے دو بھائی ہیں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "فلک شیر نے بتایا ہے مجھے۔"

"ہاں۔ اس نے دوسرا خصم جو کر لیا تھا۔" وہ بولی۔ "دونوں اسی کی اولاد ہیں۔ ایک دس سال کا، دوسرا بارہ سال کا۔"

"اور یہ گاما۔ غلام محمد۔ یہ پہلے شوہر سے تھا؟" میں نے زنانہ تجسس کا مظاہرہ کیا۔

وہ ہنسی۔ طنز آمیز، تلخ، تمسخر اڑانے والی بے بس ہنسی جو اپنی مجبوری کا نوحہ تھی۔ "ہاں کہا تو یہی جاتا ہے۔"

"میرا خیال ہے تم بلاوجہ حسد اور شک میں مبتلا ہو بہن۔" میں نے بے یقینی کے باوجود کہا۔ "وہ فلک شیر کی منہ بولی بہن ہے۔"

"پہلے سب یہی سمجھتے تھے۔ اب سب سمجھتے ہیں۔ اور پھر شوہر کو بیوی سے زیادہ کون جانتا ہے؟" وہ بولی۔

"چلو پھر تو تمہارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔" میں نے بات کو مختصر کیا۔ "فرض کرو فلک شیر جھوٹ بول رہا ہے۔ کراچی میں تو کوئی بات نہیں ہوگی۔ تم تیار ہو نا؟"

"میرا یہاں کون ہے۔ ہوتا تو میں اتنے دکھ سہتی؟" وہ بولی۔ "ان بچوں کو کسی کے سپرد کر دیتی اور زہر کھا لیتی۔ میرا فلک شیر مجھے مل جائے تو میں کہیں بھی جانے کے لیے تیار ہوں۔"

رات کے گیارہ بجے اس خاندان کا مختصر سامان پیک ہو چکا تھا۔ فلک شیر کے دونوں بچے حیران تھے کہ آدھی رات کو تمام سامان لے کر جانے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ فلک شیر چپ تھا اور اس چپ کے ہزار مفہوم تھے۔ یا نکالے جا سکتے تھے۔ یہ اس گھر سے یا اس زمین سے رشتہ ٹوٹنے کا دکھ بھی ہو سکتا تھا جس کے ہر ذرے سے اس کی عمر رفتہ کا دامن بندھا ہوا تھا۔ اگر فلک شیر کی بیوی نے غلط نہیں کہا تھا تو یہ ایک نقش ماضی کو حرف غلط کی طرح مٹا دینے کا افسوس بھی ہو سکتا تھا۔ خواب تھا جو ہم نے دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ یہ گامے کی موت کا غم بھی ہو سکتا تھا جسے اس نے اپنا بیٹا کہا تھا مگر جو اس کی بیوی کے خیال میں فلک شیر کا بیٹا تھا۔ اپنے عقیدے کے مطابق وہ اس کی مغفرت کے لیے بھی کچھ نہ کر سکا تھا۔ زندگی کی کہانیاں کہاں کہاں بکھری ہوئی ہیں اور ہر داستان حیات کا عنوان جدا ہے۔ اسی نفرت اور محبت اور رقابت کی بنیاد پر کھڑی ہوئی مثلث کے لاتعداد زاویے تھے۔

رات ایک بجے میں نے انہیں پنڈی کے اسٹیشن پر اتارا اور ان کے لیے بڑے جتن کر کے پشاور سے آنے والی خیبر میل میں جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ رات ڈھائی بجے خیبر میل کے روانہ ہو جانے کے بعد میں نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ میرے

www.paksociety.com

سر پہ لفافہ مت اور ماندیشوں کا ایک گروہ گراں تھا جو اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد باقی نہ رہا۔

میری حفاظت پہ مامور تینوں افراد کی حالت غیر تھی۔ مجھے روک کر وہ بیگار میں پکڑے گئے تھے۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ انہیں کچھ بھی نہیں کرنا تھا اور یہی ان کے لیے بہت بڑی سزا تھی یہ بھی کوئی ڈیوٹی ہوئی کہ بس ایک آدمی کے ساتھ رہو۔ وہ جہنم میں بھی جائے تو ساتھ جاؤ۔ متحرک پھرتے رہنا بھی ان کے نقطۂ نظر سے اس کو درجہ بہتر تھا کہ وہ خود بھی مصروف رہتے اور دوسروں کو بھی مصروف رکھتے۔ آدمی بھی انہیں میرے جیسا ملا تھا جس سے تعلقات کی ابتدائی کشیدگی ختم ہو چکی تھی اور جو لیڈروں رکھتا تھا جیسے ڈی آئی جی ہو چنانچہ وہ آپس میں بھی بے تکلف ہو کے گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ مجھ سے بے تکلف ہونے کا کیا سوال۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ ان کو دخل در معقولات سے باز رکھنے کے لیے یہ رویہ ضروری ہے۔ اب مجھے ان پہ ترس آیا۔ میں نے اتفاقاً ان سے کھانے پینے تک کو نہیں پوچھا تھا۔

"آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ" میں نے کہا "میری وجہ سے آپ سب کو بہت زحمت اٹھانا پڑی۔ اب آپ لوگ جائیں۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے نوٹ نکالے اور ان سب کو سو سو کے نوٹ پکڑا دیے۔ "افسوس یہ ہے کہ اس وقت میرے پاس یہی ہیں ورنہ میں آپ لوگوں کو اس مستعدی اور فرض شناسی کا زیادہ انعام دیتا۔"

انہوں نے رسماً انکار کیا اور پھر مجھ سے مصافحہ کر کے رفوچکر ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے مجھے بہت گالیاں دی ہوں گی کہ سالا فیکٹری کا مالک۔ سو روپے دے کر انعام کہتا ہے۔ دس گھنٹے کی بیگار اور سو روپے۔ لاحول ولا قوۃ۔ ایک بندے کو ذرا آوارہ گردی میں تو اس کی جیب سے نکل آتے ہیں۔ چار بندے ڈک دو والی ویگن ہزار روپے نذرانہ دے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے انکار نہیں کیا تھا۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔

صبح دم ساڑھے تین بجے جب مرغوں کے الارم کلاک بجنے لگے تھے میں نے ٹرک سمیت انکل شیروانی کی کوٹھی میں داخل ہو کے مسلسل ہارن بجانا شروع کیا اور انجن کو ریس دیتا رہا۔ پھر خود باہر نکلا اور چلانے لگا "ارے بھئی کوئی ہے، ہم ڈاکو ہیں۔ لوٹنے آئے ہیں۔ کسی کو کچھ حرکت ہونا چاہیے؟"

انکل شیروانی سخت بدحواسی میں نائٹ گاؤن پہنتے اور ریوالور کے انداز سے کا ایک کنارا ٹخنوں تک لہراتے نکلے "یعنی کہ یہ کیا ہنگامۂ محشر ہے۔ میاں تم آئے ہو کہ قیامت آئی ہے؟" انہوں نے ڈانٹتے ہوئے فرمایا "چلو اندر چلو۔"

پھر شہلا نکلی اور گلے لگ کے رونے لگی۔ میں نے اس کے سر پہ دست شفقت پھیرا۔ "ڈاکوؤں کے نام سے ڈر گئی تھیں؟" میں نے دانت نکال کے خفت سے کہا اور پھر شہلا کو تسلی دی۔ "ارے بھئی ہم مذاق کر رہے تھے۔ ہم شریف آدمی ہیں اور ہم پر کسٹم آفیسر یا پولیس آفیسر کا گمان تو ہے جیسے کوئی لوٹتے تھے۔" شیروانی صاحب کے پیچھے چلتے تھے۔

"یہ آپ کیا کرتے ہیں بھائی جان؟" وہ شکایتی لہجے میں بولی "سب کو پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہاں تو آپ کی خیریت کی اطلاع ملنے سے پہلے سب کا سکون چین حرام ہو گیا تھا۔"

"وہاں کہاں؟ آپ کے سسرال میں۔ نہیں میکے میں…"

"لاحول ولا قوۃ۔ سب گڑبڑ ہو گیا ہے۔ جو میکہ تھا اصولاً وہ سسرال ہو گیا ہے اور سسرال کو برباد کیا ہے تم نے میکہ۔ رخصتی کس کی ہوئی، کدھر کو کدھر سے ہوئی؟"

حسب توقع شہلا بھاگ گئی۔ میں چچی کے کمرے میں داخل ہو کر کورنش بجا لایا۔ انہوں نے بہت حیرت کا اظہار کیا "ارے لوٹ کل ہی تو گیا تھا۔ آج الٹے سویرے واپس! بات کیا ہے؟" انہیں غالباً میری پُراسرار گمشدگی اور بازیابی کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔

"وہ چچی۔ میں ذرا نکلا تھا گھومنے کے بعد چہل قدمی کے لیے" میں نے کہا "سوچا آپ کی خیریت بھی پوچھ لوں۔"

"کن رستوں سے ہو یا میں۔ لاہور سے اسلام آباد آ گئے چہل قدمی کرتے ہوئے۔" شیروانی صاحب مسکرائے "چلو تم نہا دھو کے انسان بنو۔ میں شہلا سے کہتا ہوں کچھ چائے کافی وغیرہ کا انتظام… یا ناشتا ہو گا؟ ایں تو وقت جانے سے پہلے سات بجے کیا ہو گا۔"

"ابھی تو کافی ہی کافی ہے" میں نے کہا "ناشتا کریں گے ذرا اطمینان سے۔ آپ کے ساتھ ہی۔"

کافی میں نے شہلا کے کمرے میں پی۔ "تم نے اپنے میاں کے بارے میں نہیں پوچھا۔ افسوس!"

"دیکھیں بھائی جان! ایسی باتیں مت کریں۔ ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔" شہلا نے منہ پھلا کے کہا۔

"منگنی کا یہ انداز اب مقبول نہیں رہا" میں نے کہا "ارے بھئی ذرا کبھی بھولے سے پوچھ لو محسن کا کیا حال ہے۔ دل کی بات لبوں تک نہ آنے دینا کون سی عقلمندی ہے اور خیریت معلوم کر لینے میں آخر یا شرعاً کون سی معیوب بات ہے؟"

"آپ اپنی بات کریں" وہ بولی "اس بار کہاں کہاں… کیا معرکہ سر کیا ہے جو دنیا میں ایسی کھلبلی مچی ہوئی تھی جیسے سکندر اعظم نے ڈھائی ہزار سال بعد پھر حملہ کر دیا ہے۔" سکندر بخت کے نام سے میرے ساتھ وہ بھی ہنسی۔ میں نے اسے مختصراً بتایا کہ شیر کی کچھار میں

داخل ہونے کی حماقت کرنا کہ مجھ پر کیا بیتی تھی اور اس حرکت کے ناخوشگوار نتائج پر روشنی ڈالی۔ چند نصائح کا اشارہ کر کے میں شیروانی صاحب کے ساتھ ناشتہ کیا اور انہیں خدا حافظ کہہ کے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ دوپہر ایک بجے میں شاہدرہ پہنچا۔ پروگرام کے مطابق میں نے ٹرک کو امرو ویو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کی طرف موڑا اور اس کے بیچ میں دروازے کے سامنے روک دیا۔ یہ دوپہر کے کھانے کا وقفہ تھا چنانچہ جاسوسی ناول پڑھنے والا نوجوان غیر حاضر تھا لیکن چوکیدار نے غل مچا دیا۔ "او خانہ خراب… یہ کیا ہے۔ کدھر گھسا کیا ہے اس کو۔ ہٹاؤ اسے اور سائڈ میں کھڑا کرو۔"

"محترم خان جگر!" میں نے چابیاں بڑھا کے کہا "اندر اولاد ملک یار اور چوہدری ولایت صاحب اپنے مرقد میں تشریف فرما ہوں گے۔ یہ چابیاں ان کی خدمت میں پہنچا کر دو۔ انہیں بتا دینا کہ عالم ارواح سے فرزند غلام محمد اور الطاف نے ارسال کی ہیں۔"

میری قادری کو چوکیدار کچھ سمجھا اور کچھ نہیں سمجھا لیکن میں چابیاں دیتے ہی واپس چل پڑا تھا اس لیے وہ حیرت سے سر ہلاتا اندر چلا گیا۔ اس کے چوہدری ولایت کے ہمراہ واپس آنے تک میں دو فرلانگ تک جا چکا تھا اور ایک رکشا میں بیٹھ گیا تھا۔ "الٹے پاؤں باغبانپورہ" میں نے رکشے والے سے کہا۔ وہ چکا بکا رہ گیا۔ "معاف کرنا… بسم اللہ شریف" میں نے کہا اور رکشا چل پڑا۔ "اصل معرکہ تو اب درپیش ہو گا۔ جناب شہزادہ سکندر بخت صاحب" میں نے اپنے آپ سے کہا "جب محسن زبان درازی کے ساتھ دست درازی پہ اتر آئے گا اور کسی رابعہ قادری نے ٹھنڈے کا رتنا خیال جنگ اختیار کر لیا گا۔ آخر میں رضوی صاحب کا آتش فشاں ابکے خیر۔ جب اگلی شادی پھر تو دو عملی کا کیا قصہ۔ بس ایک کان سے سنو اور دوسرے کان سے اڑا دو۔ رہ گئی روٹھی ہوئی محبوبہ تو اس کو منانے کے کئی جگراہ ایک کارگر نسخے ہمیں آتے ہیں۔ ایڈووکیٹ ہے تو کیا۔ ہر عورت جو محبت کرتی ہے مجبور ہوتی ہے اور اسی مجبوری کو سرمایہ عشق بھی… صرف رو سکتی ہے، لڑ نہیں سکتی اور یہ روٹھنا منانا تو پیار کا وہ سیمنٹ ہے جس سے عشق کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔"

محسن خان نے سب سے پہلے میرا دیدار کیا اور استقبال کے لیے آگے بڑھے "آئیے آئیے مہاراج۔ پدھاریے" اس نے سلیپر… میں لاؤنج کی طرف بڑھا لیکن دروازے پہ پہنچا گیا… اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بیوی… دشمنان کا کیا ہو گیا ہے آپ کو شیروانی صاحب؟" … "بھلا چھوڑ کے گیا تھا آپ کو میں! کب سے بے

جنون کی کیفیت؟ اور یہ لفظ بردار آپ جیسے شرفا کو زیب نہیں دیتی۔" بیگم رضوی ہنگامہ سن کے باہر آئیں اور انہوں نے ہم دونوں کو ڈانٹا "کیا ہو رہا ہے یہ۔ اندر تو چلو۔"

"نہیں آنٹی! یہ جانے کسی اور سفر پہ۔ سند باد جہازی کا خیر" محسن نے کہا لیکن بیگم رضوی مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔ فوری طور پہ میں نے باتھ روم کا رخ کیا اور نہانے دھونے کے بعد کپڑے بدل کے نکلا تو میز پہ کھانا لگا ہوا تھا۔

"واضح ہو کہ گزشتہ چوبیس گھنٹے میں باقاعدہ طعام قسم کی کوئی چیز مجھے نصیب نہیں ہوئی" میں نے کہا۔

"افسوس یہ ہے کہ راہِ حق میں آپ کو شہادت نصیب نہیں ہوئی" محسن نے میز پہ طبلہ بجاتے ہوئے کہا۔

"باقی لوگ کہاں ہیں؟" میں نے کہا "شہلا ایس ایس پی صاحب اور خاتون ایڈووکیٹ؟"

"اقل الذکر آپ کی خبر لینے دفتر سے روانہ ہو چکے ہیں" محسن نے کہا "باردوم میں بھوک ہڑتال ہے۔"

"اچھا!" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "میں باردوم ختم ہو کے آتا ہوں۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا کارِ ثواب ہے۔" اور محسن کے چیخنے اور بیگم رضوی صاحب کے مسکرانے کی پروا کیے بغیر میں باہر نکل گیا۔ رابعہ کا کمرہ بند تھا۔ میں نے ایک بار دستک دی اور کوئی جواب دیئے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ وہ بیڈ پہ پیر لٹکائے سیدھی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے بتا دیتے تھے کہ وہ سوئی نہیں اور روتی رہی ہے۔ "آہم" میں نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔ "بقول شاعر … خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں۔"

وہ اٹھ کے دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے اس کا راستہ روک لیا "بہت ناراض ہو؟"

"مجھے کیا ضرورت ہے ناراض ہونے کی؟" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "اور تم کون ہوتے ہو یہ سوال پوچھنے والے؟"

میں قہقہہ مار کے ہنسا "ایسی ہی صورت حال میں کسی نے فرمایا تھا کہ ان کو آتا ہے پیار پہ غصہ، ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے۔"

"یہ تھرڈ کلاس شعر اور آؤٹ آف ڈیٹ طریقے ہیں" وہ کھولتی ہوئی بولی "زندگی فلم لیلیٰ مجنوں نہیں ہے۔"

"اچھا تو سیدھی طرح بتاؤ کہ منہ کیوں سوجا ہوا ہے اور کھانے کی میز پہ موجود نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟" میں نے کہا "جو کچھ میں نے کیا اس کی وضاحت تو ہوتی رہے گی۔ جواب کے لیے میں پانچ سیکنڈ دیتا ہوں۔ اس کے بعد میں تمہیں اٹھا کے لے جاؤں گا۔ کسی کی پروا کیے بغیر اور کرسی پہ لے جا کر رکھ دوں گا۔ ہو گئے پانچ سیکنڈ" میں ایک دم اس کی طرف بڑھا۔

www.paksociety.com

"ارے رے... کیا کرتے ہو۔" اس کی پریشانی قابلِ دید تھی۔
"مت گھبرائیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ چلتی ہوں پاپا۔"
چند منٹ بعد میں رابعہ کے ساتھ مسکراتا ہوا کھانے کے کمرے میں پہنچا لیکن انکل رضوی پر نگاہ پڑتے ہی میری مسکراہٹ منجمد ہو گئی اور میں ساری شوخی بھول گیا۔ "دیکھیے انکل! مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت خفا ہیں۔ لیکن پہلے آپ مجھے کھانا کھانے دیں۔ پھر اپنے کمرے میں لے جا کر میری گوشمالی کریں یا سخت الفاظ سے نوازیں۔ مجھے منظور ہے۔ یقین میں بھوک سے ویسے ہی فوت ہونے والا ہوں۔ اس پر آپ نے مجمع عام میں پارٹی منانے کا فرمان فرمایا تو۔"
انکل رضوی مسکرائے۔ "بہت ڈھیٹ اور نامعقول ہو۔ چلو بیٹھو اور کھانا کھاؤ۔" میرا خیال ہے میرے آنے سے پہلے ہی بیگم رضوی نے انہیں کسی شفیق ماں کی طرح سمجھا دیا تھا کہ خیر سے گھر لوٹ کے آنے والے بدھو پہ ایک دم چوٹ لگے مت بول پڑنا۔ پہلے اس کی تسلی لینا۔ ورنہ میرے مسخرے پن پر وہ اور بھڑک اٹھتے۔
"کچھ نہیں انکل۔" محسن نے مایوسی سے کہا۔ "یہی وقت تھا اس کا دماغ درست کرنے کا۔ اب کو پولیس کے بجائے کسی انسدادِ بے رحمی حیوانات میں ہونا چاہیے تھا۔"
کھانے کے بعد بند کمرے میں ایک اجلاس ہوا۔ انکل رضوی، رابعہ اور محسن کی طرف سے مجھ پر ایک ہی الزام تھا کہ سیدھی طرح گاڑی لے کر گھر آنے کے بجائے مجھے خالی ہاتھ ممنوعہ علاقے میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں نے اپنی غلطی تسلیم کی اور اس کے بعد پیش آنے والے تمام واقعات بلا کم و کاست سنا دیے۔ میرا بیان کوئی ایک گھنٹہ جاری رہا۔ محسن صوفے پر نیم دراز رہا اور انکل رضوی ہاتھ پیچھے باندھے کمرے میں ٹہلتے رہے۔
"میں تو گھر آتے ہی سو گیا تھا اور شام کو اٹھا۔" محسن نے کہا۔
"جب رات ہو گئی تو مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ ملک نے کام وقت پر پورا نہیں کیا ہوگا لیکن دیر کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں رکشا لے کر گیراج گیا تو گاڑی تیار تھی۔ مالک نے کہا کہ کام تو عصر کے وقت ہی ختم ہو گیا تھا لیکن کوئی لینے ہی نہیں آیا۔ میری جیب میں اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ مرمت کے اخراجات ادا کر کے گاڑی لے آتا۔ میں نے کہا اچھا، میں دیکھ کے آتا ہوں۔ مقبرہ جہانگیر جانے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ میں نے سینما کا رخ کیا جہاں مسرت نذیر کی تھکا دینے والی فلم چل رہی ہے۔ آپ نے دیکھی ہے انکل؟"
"کیا؟" رضوی صاحب نے چونک کر کہا۔ "لاحول ولا قوۃ..."
میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی۔
"خیر، اب کرنا خدا کا یہ ہوا کہ راہ میں میری نظر 'ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس' کے بورڈ پر چلی گئی۔ اسے آپ چھپی جس کمپنی یا ٹیلی ویژن یا کچھ اور۔ سڑک میں رک گیا اور مجھے خیال آیا کہ میں یہاں سے گزرتا اور سکندر بچت ہوتا تو میرے قدم آگے بڑھتے؟ جواب نفی میں آیا کیونکہ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ میں نے سوچا پوچھ لینے میں کیا حرج ہے۔ جب چوکیدار نے مجھے بریف کیس دیا تو میں گھبرا گیا۔ صرف بریف کیس؟ وہ آدمی کہاں ہے جس کا بریف کیس تھا؟ چوکیدار نے جانتے ہوئے بتایا باعث کہا کہ اندر کوئی نہیں۔ فیکٹری بند ہو چکی ہے۔ اس نے کہا کہ اندر جانے کا کوئی سوال نہیں۔ میری تمام جرح بے کار، اس کے پاس ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا۔ مجھے نہیں معلوم۔ وہاں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں بریف کیس لے کر مین روڈ پر آ گیا اور ایک گھنٹے تک کھڑا رہا۔ ٹرک میرے سامنے نکلا تو میں نے فوراً رکشا ٹیکسی تلاش کیے۔ اگر اس وقت میری جیب میں اتنی رقم ہوتی کہ میں کار چھڑا سکتا تو تعاقب کرنا کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ رکشا مجھے ملا وہ دس منٹ بعد ملا اور جب چلا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی رفتار سائیکل کے برابر بھی نہیں۔ پانچ چھ میل کے بعد اس کے پلگ میں کچرا آ گیا اور اس نے سیٹ اٹھا کے پلگ نکالا۔ میں اس پر لعنت بھیجی اور دوسرے رکشے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر پنڈی جانے والی ایک ویگن آ گئی اور میں اسی میں بیٹھ گیا۔ افسوس کہ مجھے پتا تھا کہ میں نے ٹرک کا نمبر نہیں دیکھا۔ ایک تو موڑ پر اندھیرا تھا، دوسرے نمبر پلیٹ کو روشن رکھنے والی لائٹ بھی بجھی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود مجھے امید تھی کہ راستے میں کہیں نہ کہیں میں ٹرک کو دیکھ لوں گا کیونکہ ویگن کی رفتار ٹرک سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن پہلے تو ایک جگہ ڈیزل بھروانے کے لیے رک گئی۔ قسمت کی خرابی دیکھو کہ پٹرول پمپ پر پہنچتے تک بجلی گئی۔ ادھر ویگن والا غائب۔ پھر انہوں نے ہاتھ سے ہینڈل گھما کے ڈیزل بھرا۔ پندرہ منٹ کا انتظار میرے لیے دوبھر تھا اور میں یہ حساب لگا رہا تھا کہ اتنی دیر میں ٹرک کہاں پہنچ چکا ہوگا۔ خدا خدا کر کے ویگن پھر چلی۔ ابھی پچیس میل دور ہی گئی ہوگی کہ اس کا ٹائر فلیٹ ہو گیا۔ اور گوجرانوالہ شہر کی روشنیاں سامنے نظر آ رہی تھیں۔ عام حالات میں پہیہ بدلنا دس پندرہ منٹ کا کام ہوتا ہے لیکن ان کے پاس جیک نہیں تھا۔ میں فوراً گرم ہوا کہ گاڑی یہیں پر چھوڑ دیتے ہو تو لیکن چوری ہو گیا تھا۔ ابھی کسی سے لیتے ہیں، پھر وہ سڑک پر آنے والی ویگن کو ہاتھ دیتے رہے۔ آدھے گھنٹے بعد ایک ڈرائیور نے اس کی مدد کی لیکن اس وقت تک میں بالکل مایوس ہو چکا تھا اور مجھے یہ خیال بھی تھا کہ سکندر لوٹ گیا ہی تھا۔ میں پہنچا تو انکل رضوی کو میں نے گھر کو ... لوٹ آیا اور میں نے انکل کو ساری بات بتا دی۔"
خاموش ہو گیا۔
"میں نے اسی وقت چوہدری دلاور کے گھر فون کیا تھا۔" انکل رضوی نے کہا۔ "لیکن حسبِ توقع اس نے یہی کہا کہ سکندر صاحب سے ملے عرصہ ہو گیا۔ میں نے کہا پھر تمہارے چوکیدار کے پاس سکندر کا بریف کیس کیسے پہنچا؟ کہنے لگا جنابِ عالی یہ آپ اسی سے جا کے پوچھیں۔ میری دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کہنے لگا اپنے ایس پی صاحب! ہم قصور وار ہوں تو بے شک پھانسی لگوا دیجیے۔ آپ حاکم ہیں، مگر ایسے تو نہ کریں۔ سکندر کہیں چلا گیا ہے تو کیا شہر میں کسی کو بھی پکڑ کے اس سے زبردستی اعترافِ جرم کرا لیں گے کہ وہی سکندر کا قاتل ہے۔ پھر پوچھا کیا اس سے۔ میں اور محسن فیکٹری پہنچے لیکن وہاں وہ چوکیدار ہی نہیں تھا جس نے محسن کو تمہارا بریف کیس دیا تھا۔ اسے میں نے شاید پولیس اسٹیشن بھجوا دیا تھا جس کا مجھے افسوس ہے۔ اس نے کہا کہ وہ تو ابھی ابھی ڈیوٹی پہ آیا ہے۔ اس سے پہلے چوکیدار کون تھا یہ اسے بالکل معلوم نہیں۔ صبح میں نے سرچ وارنٹ حاصل کیے اور فیکٹری کے اندر کونا کونا چھان مارا لیکن تم وہاں ہوتے تو ملتے۔"
"تلاشی کے دوران میں آپ کو وہاں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس کا تعلق کاروبار سے نہ ہو؟" میں نے کہا۔ "کوئی غلط قسم کی مشتبہ بات نوٹ نہیں کی آپ نے؟"
رضوی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہاں وہی ہو رہا تھا جو ہونا چاہیے۔"
"دلاور دور اندیش آدمی ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے یقین ہو گا کہ چھاپا ضرور پڑے گا۔ اس نے راتوں رات سب صاف کر دیا۔"
"کیا صاف کر دیا؟" انکل رضوی نے بے خیالی میں کہا۔
"دیکھیے انکل! وہاں کوئی نہ کوئی غیر قانونی کاروبار ضرور ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ وہ مجھے کاروبار سے الگ رکھنے کے لیے اتنے جتن نہ کرتے۔ اگر میں پارٹنر بن جاتا تو وہ فقیر نہیں ہو جاتے۔ دلاور کا منافع آدھا رہ جاتا۔ یہ آدھا بھی کم تو نہیں ہوتا۔ پھر یہ سب کچھ کیوں کیا اس نے؟ جو منافع میں نقد ان کے لاکھوں روپے لانے کی پیشکش، یکمشت رقم کی ادائیگی کی پیشکش تاکہ میں اس کاروبار سے دستبردار ہو جاؤں اور مجھے کسی نہ کسی طرح تختۂ دار تک پہنچانے کی سازش۔ دلاور ہم نے اتنا کم ایسا کر لیا ہے کہ میرے قتل سے بھی الا کا فائدہ نہیں ہوتا۔ ایک کے بعد دوسرا وارث آ جائے گا۔ دلاور زیادہ سے زیادہ منافع دینے کو تیار ہے لیکن پارٹنر بنانے کو تیار نہیں، کاروبار میں دخل اندازی کا حق دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں کاروبار سے دور رہوں۔ آخر کیوں؟ وہ جانتا ہو گا۔ اور وہ میرے سامنے اعتراف بھی کر چکا ہے کہ یہ جائز کاروبار دوسرے ناجائز کاروبار کا پردہ ہے۔ یہ دوسرا کاروبار کیا ہے؟"
"مجھے اس سلسلے میں کوئی خصوصی تفتیشی ٹیم تشکیل دینی پڑے گی۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "ان کی سرگرمیاں عرصے سے جاری ہیں۔ معلوم ہوتا ہے قانون کوئی چیز ہی نہیں۔ جسے چاہا اٹھا لیا، جسے چاہا مروا دیا اور ان کا حوصلہ اس لیے بڑھتا جا رہا ہے کہ وہ ابھی تک گرفت میں نہیں آئے۔ مگر ان کے زمانے کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ ایک دن اور سہی۔ اس سے اگلا دن ان کے زوال کا ہو گا۔"
میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رضوی صاحب مستقل مزاجی اور دھن کے پکے تو مشہور ہی تھے۔ اس وقت وہ برہم بھی تھے اور یہ بڑی اچھی بات تھی۔ "آپ کی یہ خصوصی ٹیم کیا کرے گی انکل؟" میں نے ایک فضول سا سوال کیا۔
"ابھی سے کیا بتا دوں تحقیق کیا کرے گی؟" انکل رضوی نے چڑ کے کہا۔ "ہر ٹیم اپنے طریقۂ تفتیش کو حالات کے مطابق طے کرتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ عام کارکن کی حیثیت سے فیکٹری میں بھرتی ہو جائیں۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہر سیکشن کے فورمین کو میں دیکھ چکا ہوں۔ وہ دلاور کے اپنے آدمی ہیں۔ ڈی سلوا کی جگہ وہ سپیڈ کو اٹھوا کر گڈی رکھ کے لایا ہے۔ کچھ تجربہ کار ہے۔ باقی راہنمائی دلاور کرے گا اور اسے چلائے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ فورمین اپنے اپنے سیکشن کے آدمی خود رکھتے ہوں گے۔ اگر والد مرحوم زندہ ہوتے یا میر شرافت علی ہی ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ پرانے وفادار کارکن کتنے ہیں اور نئے آدمی کتنے۔ میں تو کسی کو بھی نہیں پہچانتا۔ وہ مجھے جانتے ہیں۔ دلاور اینڈ کمپنی نے ایک ایک کر کے سب پرانے آدمی نکال باہر کیے ہوں گے اور جیسے جیسے مجرموں کے آدمی ملتے گئے ہوں گے، ان کی جگہ بھرتی کیے گئے ہوں گے۔ بے شک ہر راہ چلتے کو ایک مخصوص مہارت کا مشینی کام نہیں سونپا جا سکتا لیکن ان مشینوں کو چلانے کے لیے کوئی ڈگری یا کورس نہیں کرنا پڑتا۔ جسے بھی خراد کا کام آتا ہو وہ ان مشینوں پر کام کر سکتا ہے اور خراد کی مشین کا استعمال مہینے میں آ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تربیت یافتہ افراد بھی لالچ میں ضمیر فروش بن سکتے ہیں۔"
"ابھی تو میرا خیال ہے کہ تمہارے ساتھ ایک بار دلاور سے ملاقات کروں۔" رضوی صاحب نے کہا۔
"دوسرا کام آپ یہ کریں کہ شاہدرہ سے آگے جی ٹی روڈ پر بائیں جانب کے علاقے پر نظر رکھیں۔ اُدھر کوئی ایسی جگہ ضرور ہے جہاں ان لوگوں کے ناجائز کاروبار کا اڈا ہے۔"
"وہ سارا علاقہ سیکڑوں مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔"

www.paksociety.com

رضوی صاحب نے کہا۔ "اس میں نہ جانے کتنے گاؤں ہوں گے۔ پہاڑ، ٹیلے اور کھائیوں کا کوئی شمار نہیں۔"

"میں دائرہ کار کو کسی حد تک کم کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ تو ظاہر ہے کہ طلائے اور گلٹے کو ابھی کچھ اور آگے جانا تھا۔ جہاں وہ مر گئے تھے وہاں تک میں پہنچ جاؤں گا۔ تلاش کا سلسلہ اس سے آگے شروع کیا جائے۔ میرا ایک خیال یہ بھی ہے کہ اُن کی منزل زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ جی ٹی روڈ پر اُن کو موقع نہیں ملا کہ گھمنے کو چھپا سکیں۔ اسے زندہ سلامت منزل تک پہنچانا احکامات کی خلاف ورزی کے مترادف ہوتا۔ شاید ان سے پہلے والا خود پہنچ چکا ہوتا یا اس کے معاونین منتظر ہوتے۔ مثلاً وہ نقلی ڈی ایس پی سراج۔ وہ نقلی نواب خسرو جمشید۔ یا پیڈرو۔ اس مقام سے آگے جہاں وہ تھے اور گلٹے نے ایک نہ دوسرے کو مار ڈالا، پہلے ہی کہیں کوئی خفیہ جگہ ہوگی۔"

"ایسے لوگ خطرے کا احساس ہوتے ہی ٹھکانہ بدل لیتے ہیں۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "وہیں فتح جنگ کے پاس انتہائی خطرناک قسم کا دشوار گزار جنگل بھی ہے۔ خیر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ ناشتا کر کے تم میرے ساتھ چلو، تم دونوں!"

نو بجنے میں پندرہ منٹ پر ہم رضوی صاحب کی جیپ میں "ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس" پہنچے۔ وہ ایس ایس پی کی وردی میں تھے چنانچہ دربان کی جرات نہ ہوئی کہ اُن کا راستہ روکے یا تشریف لانے کا مقصد پوچھے۔ جاسوسی ناول پڑھنے والا نوجوان کھڑا ہوا اور دم بخود کھڑا رہا۔ جیپ اندر داخل ہوئی اور دائیں طرف گھوم کر دلاور کے آفس کے سامنے رک گئی۔ دلاور کے پی اے نے بڑی پھرتی دکھائی اور فوراً انٹرکام اٹھا کے دلاور سے کچھ کہا۔ اس نے یقیناً ایس ایس پی کے دوبارہ اور میرے ہمراہ آنے کی اطلاع دے دی تھی لیکن دلاور نے حسب سابق بڑے سکون اور اعتماد کا مظاہرہ کیا۔ جب ہم نے دروازہ کھولا تو وہ غور سے کسی فائل کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور مسکرا کر آہستہ آہستہ اٹھا۔

"واہ بھئی واہ! صبح صبح بڑی بڑی ہستیاں آ رہی ہیں آج تو۔ بڑا مبارک دن ہے۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کا لہجہ اور چہرہ ایسے تھے کہ نہ اُن سے کسی قسم کی مسرت کا احساس ہوتا تھا نہ حیرت کا۔ وہ ہمیں دیکھ کے پریشان ہوا تھا نہ برہم۔ یہی ایس ایس پی ایک دن پہلے سرچ وارنٹ کے ساتھ آئی پولیس فورس لے کر اس کی فیکٹری پر چڑھائی کر چکا تھا۔ گزشتہ رات اس کا ایک مشن ناکامی کا شکار ہو چکا تھا اور اس کے دو کارندے اس ناکامی کی نذر ہو گئے تھے مگر اس کی صورت سے نہ تو افسوس کا اظہار ہوتا تھا نہ پشیمانی کا، نہ جھنجلاہٹ کا، نہ انتقامی جذبات کا۔ میں اور وہ تو ایک دوسرے کے واقف تھے۔ محسن میرا دوست، راست تھا اور رضا حسن رضوی صاحب اس کے خلاف ہی تھے۔ اس کے باوجود وہ اٹھنے لگا کہ علانیہ ہم دشمن کے آگے ٹہلے ہیں اور آج بھی ہمارا آنا کوئی غیر معمولی نہیں ہے۔ رضوی صاحب کی وجہ سے ہم نے بھی اپنی متانت رکھی اور خاموشی سے مصافحہ کر کے بیٹھ گئے۔

"کل حکم اے غلام واسطے؟" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر انکسار کے ساتھ کہا۔ "لیکن پہلے بتائیں کہ ٹھنڈا پیئیں گے یا گرم؟" اور جواب کا انتظار کیے بغیر انٹرکام اٹھالیا۔

"کچھ نہیں۔" رضوی صاحب نے تندی سے سخت لہجے میں کہا۔ "ابھی ناشتا کر کے گھر سے نکلے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا جی۔ وہ تو بڑی دیر ہو گئی۔" وہ مسکرایا۔ "ایک پیالے کی جگہ تو ہر وقت رہتی ہے۔"

"مسٹر دلاور، یہ بات کل بھی ہوئی تھی کہ ڈیوٹی پر میں خاطر تواضع قبول نہیں کرتا۔" رضوی صاحب کا لہجہ اور سخت ہو گیا۔

"اچھا جناب، ہاں!" وہ ہتھیار ڈالنے کے انداز میں بولا۔ "سکندر صاحب تو ڈیوٹی پر نہیں ہیں اور ان کے یہ دوست آج بار آئے ہیں۔"

"دوسری بار۔" محسن نے یاد دلایا۔ "میں کل شام بھی آیا تھا لیکن باہر سے ہی لوٹ گیا تھا۔"

"باہر سے کیوں جی؟" دلاور نے افسوس اور حیرت کا اظہار کیا۔ "اندر آنے میں کیا تھا؟ کوئی ناراضگی تھی ہم سے؟"

"مجھے اندر آنے ہی نہیں دیا گیا تھا۔" محسن بولا۔ "بڑے نے مجھے ایک بریف کیس تھما کے واپس کر دیا تھا۔"

"کون سا بریف کیس؟ اور کون بڑے؟ چوکیدار تھا وہ؟" دلاور بولا۔ "میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔"

"تمہیں سب معلوم ہے۔" رضوی صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔ "لیکن تم اداکاری اچھی کر لیتے ہو۔ کل رات تمہاری فیکٹری کے ساتھ کیا ہوا تھا، وہ چھ فورمین کہاں ہیں جنہوں نے [illegible] اور ایک صندوق میں بند کر دیا تھا؟"

دلاور تصویر حیرت بن گیا۔ "رات کو کس وقت؟ صاحب فیکٹری تو پانچ بجے بند ہو گئی تھی۔"

"بکواس بند کرو۔" رضوی صاحب نے [illegible] "اُن سب کو حاضر کرو۔ سب کو شناخت کے لیے حاضر کرو۔"

"جو حکم عالی جاہ! لیکن بات آہستہ [illegible]"

اس نے مرعوب ہوئے بغیر پھر انٹرکام اٹھا لیا۔ "او میاں! یہ جتنے بھی فورمین ہیں نا، سب کو میرے پاس بھیج دو۔ فوراً۔"

"تمہارا ایک فورمین غلام محمد بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "تنگ کے نام سے مشہور ہے۔"

"ہوگا۔ در اصل مجھے فیکٹری کے سب ورکرز کے نام ایسے یاد نہیں رہتے۔ صورت سے سب کو پہچانتا ہوں۔" وہ بولا۔

"اچھا تو الطاف عرف طلائے نام کے ایک شخص کو بھی بلوا لو۔" میں نے کہا۔

"ابھی لو جی۔ ارے دیکھو میاں! کوئی الطاف ہے یہاں، طلائے؟ اسے بھی حاضر کرو۔" وہ انٹرکام میں بولا۔

چند منٹ بعد پہلا شخص اندر آیا۔ اس کی صورت میرے لیے اجنبی تھی۔ اس کے بعد پانچ افراد اور آئے اور ایک لائن میں کھڑے ہو گئے۔ ان سب کی صورتوں پر ایک جیسا سوالیہ نشان تھا اور ایس ایس پی کو دیکھ کر وہ مزید نروس ہو گئے تھے۔

"کل مجھے بتایا گیا تھا کہ فورمین سات ہیں۔" میں نے کہا۔ "ساتواں آج کسی حکم عدولی کرتے ہوئے چھپ گیا تھا؟"

"ارے بھئی! کل اپنے سکندر صاحب سے کیا بات ہوئی تھی؟" دلاور نے ان چھ افراد سے مخاطب ہو کر کہا۔ ان میں ایک کی صورت مجھے پہلے نظر آئی تھی۔ مجھے ٹھوک بجا کے بریک کرنے کے لیے جو چھ افراد لائے گئے تھے وہ اور تھے۔ میں کسی کو اب پہچانتا تو اعتراض کرتا۔ چنانچہ چھ آدمی فورمین بنا کے میرے سامنے پیش کر دیے گئے تھے۔ ایک بات غور طلب تھی۔ وہ سب کاموں کی نوعیت کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات ضرور رکھتے تھے اور اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ مختلف شعبوں کے ملازم تھے یا انہیں باہر سے لایا گیا تھا۔ تب بھی وہ تربیت یافتہ تھے۔ کسی کا اصل کام فیکٹری سے باہر تھا مگر وہ اندر کے معاملات میں بھی کورے نہیں تھے۔

"یہ سب لوگ مختلف ہیں۔" میں نے کہا۔ "آخر یہ فورمین ہیں تو کہاں ہیں جن کو فورمین بنا کے لائن اپ کیا گیا تھا۔ ساتواں کہاں ہے؟"

دلاور نے سر کھجایا۔ "آپ کی بات کچھ اپنے پلے نہیں پڑ رہی۔ سکندر صاحب تو سیدھی ہی بات کرتے ہیں اپنے سکندر صاحب! کل یہ۔"

"انسپکٹر غلام محمد عرف گاما بھی ہے؟" میں نے کہا۔ "نظر نہیں آ رہا۔"

ایک لاغر اور سلنس جیسا شخص آگے بڑھا۔ "غلام محمد میرا نام ہے۔" اس نے کہا۔ جسم کے مقابلے میں اس کی آواز حیرت انگیز طور پر بھاری تھی۔

رضوی صاحب قہر آلود نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے اور اُن کے ماتھے کی ہر شکن ظاہر کر رہی تھی کہ وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔ ایک ایک کر کے چھ فورمین نے اپنا تعارف کرایا۔ شناختی کارڈ دکھایا، یہ بتایا کہ وہ کب سے ملازم ہے اور کیا کرتا ہے۔ وہ سب سچ بول رہے تھے۔ چنانچہ شبہے کی اب کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ گزشتہ شام چھ افراد کی خصوصی ٹیم برآمد کی گئی تھی اور وہ سب دلاور کے گینگ کے غیر قانونی کاروبار کو چلانے والے لوگ تھے جن کا فیکٹری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ چوکیدار گیا آدمی تھا لیکن وہ باہر کھڑا تھا۔ اگر میں اس سے پوچھتا تو وہ یقیناً بتا دیتا کہ ان میں سے فورمین کوئی نہیں۔ لیکن مجھے شک ہی نہیں تھا کہ دلاور اتنے کم وقت میں بھی اتنی کامیابی سے اس قسم کا چکر چلا سکتا ہے۔ شاید چوکیدار کا قصہ پاک کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ بوقت ضرورت وہ گواہ نہ بن سکے۔

انکل رضوی کے سوالات کے جواب میں ان لوگوں نے بتایا کہ وہ پندرہ سے بیس سال کا تجربہ رکھتے ہیں اور انہیں خود مرحوم وزیر خان نے ملازم رکھا تھا۔ وزیر خان کے متعلق اُن کی معلومات وہی تھیں جو عام طور سے مشہور تھیں کہ وہ بیمار رہنے لگے تھے اور بہت کم آتے تھے۔ آخری دنوں میں انہوں نے عملاً کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور سارے معاملات میر شرافت علی پر چھوڑ دیے تھے۔ چوہدری دلاور بھی میر صاحب کے ساتھ مل کر کاروبار چلاتے رہے۔ وزیر خان کے انتقال تک۔

میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ طلائے یعنی الطاف کو نہیں بلوایا گیا۔

"ابھی بلا لیتے ہیں جی۔ کسی کام میں لگا ہوا ہوگا۔" دلاور نے انٹرکام اٹھایا۔ "او یار اس طلائے کو بھیجو، گردن سے پکڑ لاؤ۔"

طلائے کی صورت میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ الیکٹریشن ہے اور فیکٹری میں بجلی کی ہر خرابی دور کرنا اسی کا کام ہے۔ مجھے ذہن پر زور دینے کے باوجود یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس شخص سے پہلے کب اور کہاں ملاقات ہوئی ہے۔ لیکن اس نے اپنے الیکٹریشن ہونے کا ذکر کیا تو یکلخت وہ پورا منظر میری نظروں میں گھوم گیا۔ جب مجھے کسی غلام بیگ کی خالی کوٹھی میں لے جایا گیا تھا۔ میرے سامنے چہرہ گن سرچ لائٹس لگا دی گئی تھیں تاکہ میں عملاً اندھا ہو جاؤں۔ پھر دلاور نے ایک روشن پردے کے پیچھے سے مجھ سے گفتگو کی تھی۔ وہاں سرچ لائٹس لانے والا، صحیح جگہ پر نصب کرنے والا اور جلانے بجھانے والا یہی شخص تھا۔ مجھے اس کے لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ کا شبہ بھی ہوا۔

www.paksociety.com

"میں داد دیتا ہوں تمہاری چالاکی اور عیاری کی۔" میں نے سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد کہا۔ "تم نے بڑی صفائی سے میری آنکھوں میں دھول جھونکی۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں اپنے سکندر صاحب!" وہ بڑا مانے بغیر بولا۔ "ہم اور آپ بھی تو پارٹنر ہیں بزنس میں۔"

"چھوڑو یہ باتیں۔" رضوی صاحب نے اچانک کہا۔ "وہ چوکیدار کہاں ہے جس نے محسن کو بریف کیس دیا تھا۔"

"چوکیدار تین ہیں اپنے ایس پی صاحب۔" دلاور نے کرسی کی پشت کا سہارا لے کر بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ "اور ان کی ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے۔ اب دیکھیں نا، کوئی بھی رات بارہ بجے سے صبح آٹھ بجے تک ہر روز ڈیوٹی دینا نہیں چاہتا۔ رات بھر جاگنے سے باہر رہنا پڑتا ہے۔ اس لیے ہم نے ایک انتظام کر رکھا ہے۔ باری باری شفٹ بدلتی رہتی ہے۔"

"کل پانچ بجے کون ڈیوٹی پر تھا؟" میرے ضبط کا پیمانہ چھلکنے والا تھا اور انکل رضوی نہ ہوتے تو شاید میں دلاور کی گردن پر ڈنک جھنجوڑ کر سچ اگلوا لیتا۔ دلاور حیرت انگیز طور پر سرد مزاج تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اسی طرح وہ اپنے حریف کو اعصابی شکست دے سکتا ہے۔ نہ وہ خود مشتعل ہوتا تھا اور نہ ایسا موقع آنے دیتا تھا کہ کوئی اور مشتعل ہو۔

"یہ ڈیوٹی کا چارٹ دیکھنا پڑے گا۔" وہ بولا۔ "ایک تو گیا ہوگا چار بجے چھٹی کر کے۔ جو کل چار بجے سے بارہ بجے رات تک ڈیوٹی پر تھا سو آج رات بارہ بجے سے کل صبح کے آٹھ بجے تک ملے گا۔"

"تمہارے پاس شناخت کے پتے تو ہوں گے جہاں ضرورت میں تم ان سے رابطہ قائم کر سکو؟"

"ہاں۔ ایک رجسٹر تو ہے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "لیکن میرا خیال ہے اپنے سکندر صاحب کہ جب کوئی گھر بدلتا ہے تو ہمیں نہیں بتاتا۔ حالانکہ اس کا فرض ہے کہ نئے پتے سے مطلع کرے۔ بہت کم لوگوں کے پتے اپ ٹو ڈیٹ ہوں گے۔ پھر بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

اس نے پھر اپنے پی اے سے بات کی اور اسے مطلوبہ رجسٹر لانے کے لیے کہا۔ اس میں چوکیدار ملک شیر کا وہی پتا تھا جو اس نے مجھے بتایا تھا۔ محمد علی پارک والا ایک کمرے کا مکان۔ اچانک مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ ملک شیر نے کہا تھا کہ وہ اپنے بھانجے غلام محمد کے ساتھ رہتا ہے جو فیکٹری میں فورمین ہے۔ لیکن فورمین غلام محمد بالکل مختلف آدمی تھا۔ چوکیدار مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ نیت اور اعمال کی خبر صرف خدا کو ہے۔ اس نے کھلے کراچی منزل کی بہن کا بیٹا کہا تھا جب کہ اس کی بیوی کے بیان کے مطابق وہ ملک شیر کا بیٹا تھا۔ اس جھوٹ سے قطع نظر چوکیدار کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ فیکٹری میں فورمین ہے۔ شاید وہ گل مالک فیکٹری میں وہ چوہدری دلاور کا کارندہ تھا اور اس نے خود ہی جھوٹ بولا تھا کہ وہ فورمین ہے۔ اب وہ مر چکا تھا اور بیوی بچوں کے ساتھ خیبر میل میں کراچی کی جانب رواں۔ محمد علی پارک جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہاں ہمارے کسی سوال کا جواب دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ مجھے آ کے ہم مزید بے وقوف بنے۔

خود رضوی صاحب کنفیوژن میں مبتلا تھے اور آج کی جرح رائیگاں گئی تھی۔ "اچھا مسٹر دلاور!" انہوں نے بعد کہا۔ "تمہارے ریکارڈ پر ہر قسم کی گاڑیوں کی فہرست ہے؟"

"بالکل ہے جناب عالی! اس میں سب کچھ ہے۔ کب خریدی گئی تھی۔ کتنے میل چل چکی ہے۔ کتنی بار..." وہ بولا۔ "ہر گاڑی کی لاگ بک الگ ہے۔ اس میں درج کیا جاتا ہے کہ گاڑی کہاں گئی تھی۔ کتنے میل چلی۔ اس سے پٹرول کے خرچ کا صحیح اندازہ رہتا ہے ورنہ یہ ڈرائیور تو لوٹ کھائیں۔" کوئی سوال کیے بغیر کہ یہ تفتیش کس سلسلے میں کی جا رہی ہے اس نے حکم دیا کہ ہر گاڑی کی لاگ بک لائی جائے۔

ٹرک کا نمبر مجھے یاد تھا چنانچہ ایک لاگ بک میں نے دیکھی۔

"یہ گاڑی کل کہاں گئی تھی؟"

"آپ بھی خوب مذاق کرتے ہیں اپنے سکندر صاحب!"

"دراصل سارا قصور دلاور کا ہے۔" وہ رضوی صاحب سے مخاطب ہو کر بولا۔ "طبیعت میں تھوڑی سی شوخی ہے۔ اس گاڑی کو خود سکندر صاحب کل کہیں لے گئے تھے۔ اب ہم سے پوچھ رہے ہیں۔ صاحب! ہم خود تو کبھی آپ سے شکایت نہ کرتے۔ لیکن بتانا پڑے گا۔ مجھے تو چوکیدار سے معلوم ہوا۔ یہ آج صبح گیٹ کے سامنے چھوڑ گئے اور چابیاں بھجوا کے چلے گئے۔ میں نے جا کے دیکھا تو بات کچھ سمجھ نہیں آئی۔ انہوں نے 'میرا' کو 'فرینڈلی کمپنی' بنا دیا تھا۔ چیف کو خبر کے۔ انہوں نے نمبر پلیٹ میں بھی دکھائی تھی۔ معلوم نہیں کیا تھا۔ اب الٹا مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہیں صاحب کہ گاڑی کو آپ کل کہاں لے گئے تھے؟"

"کیا میرے پاس گاڑی کی چابیاں تھیں۔ اصل چابیاں؟" میں نے بے بسی سے کہا۔

"اصل نقل کا تو ہمیں پتا نہیں جی۔ لیکن آپ تو جانتے ہیں گاڑی کو اسٹارٹ کرنا ناممکن نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "ایک ...

ہوتا ہے۔ جب چوکیدار نے مجھے وہ چابیاں لا کے دیں اور حلیہ بتایا تو میں سمجھ گیا کہ اپنے سکندر صاحب آپ ہی ہوں گے۔"

میں نے بمشکل خود کو ضبط کیا۔ مجرم دلاور تھا یا خانے اور گاڑی کی چوری کا الزام آسانی سے میری ذات پر آ رہا تھا۔ صرف اس لیے کہ جذباتی ہو کے میں نے ایک غلطی کی تھی اور چوکیدار کو ایک گواہ بنا لیا تھا۔

"میرے آنے کا مقصد بھی یہی تھا چوہدری صاحب!" رضوی صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ نوجوان ذرا جذباتی قسم کے ہیں، شرارتیں کرتے رہتے ہیں لیکن کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ چند باتیں وضاحت طلب تھیں جن کی آج وضاحت ہو گئی۔"

"آپ ہمارے یہاں تشریف لائے جی۔" دلاور نے مصافحہ کرنے کے بعد اپنا ہاتھ سینے پر رکھا۔ "ہم کو اپنا حضور کی خاطر ... وہ ... کا حساب ٹھیک ہو رہا ہے۔ کوئی گستاخی ہو تو معافی۔ خدمت کا موقع تو دیا ہی نہیں۔" وہ دروازے تک ہمارے ساتھ آیا۔ "بے شک آپ فرض منصبی ... سارا زمانہ جانتا ہے۔ مگر چائے کی ایک پیالی تو ... مہمان کے لیے اتنا تو سب ہی کرتے ہیں۔ پھر آپ کی مرضی۔"

اس نے محض اپنے اعتماد اور پرسکون لہجے سے بات بگڑنے نہیں دی تھی اور یہ ایسی صلاحیت تھی جس کا اعتراف مجھے بھی کرنا پڑا۔ ایسی برداشت کا مظاہرہ میرے لیے ناممکن تھا۔ دلاور کی جگہ میں ہوتا تو کسی ایس پی کو گھر میں قدم نہ رکھنے دیتا۔

واپسی پر انکل رضوی صاحب ذہنی طور پر غیر حاضر تھے اور کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ میری ذہنی کیفیت بھی مختلف تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ دلاور کے پاس آ کے میں نے خود کو بے وقوف ثابت کیا ہے۔ اور دلاور نے ایک بار پھر باور کرا دیا ہے کہ اس کا حصار کتنا مضبوط ہے۔

"تم نے یہ نوٹ کیا ہے کہ تم جذباتی ہو کے جارحانہ انداز اختیار کر لیتے ہو۔" رضوی صاحب نے اچانک کہا۔ "تمہارے مقابلے میں دلاور دوستانہ کھیل کھیلتا ہے۔ پہلی غلطی تم نے یہ کی تھی کہ اکیلے فیکٹری میں جا گھسے تھے۔ اس کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ تم نے اپنے نامکمل اختیارات کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ اختیارات قانونی طور پر تمہیں حاصل نہیں تھے اور اس کے لیے بہت غلط وقت کا انتخاب کیا۔ تم کسی اور وقت جاتے تو کچھ نہ ہوتا۔"

"کیا آپ کا مطلب یہ ہے ..." انکل رضوی نے محسن کی طرف دیکھ کے کہا۔

وقت کوئی غلط کام ہو سکتا تھا۔ ثبوت تو کوئی نہیں لیکن فرض کر لو کہ منشیات کی ایک کھیپ برآمد کے لیے تیار تھی ایسے وقت میں تمہیں اجازت نہیں دی جا سکتی تھی کہ تم معائنے کے بہانے تلاشی لو۔ اور حقیقت جان جاؤ چنانچہ تمہیں وہ تم فیکٹری میں دھر لیے گئے۔ انہوں نے تمہیں راستے سے ہٹا دیا اور اپنا کام کر لیا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ خانہ تلاشی میں کچھ بھی نہیں ملا۔ چھاپے بہت سوچ سمجھ کے مارے جاتے ہیں۔ طویل عرصے تک نگرانی کے بعد، مخبروں سے تمام معلومات حاصل کر لینے کے بعد اور فرار کے تمام راستے بند کر دینے کے بعد۔ تمہارا چھاپہ بے وقت تھا۔ اگر تم آج جاتے تو دلاور خود تمہیں دعوت دیتا اور تمہیں اجازت دیتا کہ جس طرح چاہو اپنا اطمینان کر لو۔ جو چاہو دیکھ لو۔ وہ ایک چال آگے کی سوچتا ہے۔ اس کو معلوم تھا کہ تمہاری تلاش کا آغاز کہیں سے ہوگا۔ وہ اگر چاہتا تو تمہیں کوئی اور تمہارا بھی انجام۔ لیکن اس نے تمہارے لیے جال پھیلایا تھا۔ تم آئے اور جھک مار کے چلے گئے۔ دلاور کا کیا نقصان ہوا؟ اس کی پوزیشن اور کلیئر ہو گئی کہ ایس پی صاحب نے دشمنوں کی رپورٹ پر چھاپہ مارا لیکن ملا کچھ نہیں۔ آئندہ چھاپہ مارنے کی اجازت لینا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ دوسری حماقت تم نے آج صبح کی۔ اگر تم اس ٹرک کو سڑک کے کنارے کسی جگہ بھی چھوڑ دیتے تو کیا حرج تھا۔ ٹرک بالآخر فیکٹری پہنچ جاتا۔ لیکن تم نے دلاور پر یہ جتلانے کی کوشش کی کہ تم کتنے بہادر اور عقلمند ہو۔ عقلمندی کے اس زعم میں تم بھول گئے کہ یہ نیا چوکیدار تمہارے خلاف ایک چشم دید گواہ ہو گیا ہے۔ دلاور جیسے دشمن کا مقابلہ ٹھنڈے دماغ سے اور عقل سے نہیں کرو گے تو منہ کی کھاؤ گے۔ مجھے تو اب کوئی امید نظر نہیں آتی کہ ہمیں کسی خفیہ ٹھکانے کا سراغ مل سکے۔"

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے خصوصی ٹیم تشکیل دینے کا پروگرام ختم کر دیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اب مجھے سوچنا پڑے گا۔" انکل نے کہا۔ "دلاور سے میں پہلی بار ملا ہوں اور مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ تم دونوں کے مقابلے میں بہت بھاری پڑتا ہے۔ تم اس کے سامنے طفل مکتب ہو۔"

"کیا آپ کے خیال میں یہ لوگ منشیات اسمگل کر رہے ہیں؟" محسن شفقت سے بولا۔

"نہیں۔ ابھی تک تو ایسی کوئی شہادت نہیں ملی۔" انکل رضوی نے کہا۔ "یہ کوئی اور چکر ہے۔ اچھا اب تم لوگوں کا پروگرام کیا ہے؟ مجھے تو پہلے ہی دفتر سے دیر ہو گئی ہے۔"

"آپ ہمیں کہیں بھی اتار دیں۔" میں نے کہا۔ "ہم گھر چلے جائیں گے۔ مجھے تو سونا ہے۔"

انکل رضوی نے جیپ روک لی۔ "میرا مشورہ مانو تو ...

www.paksociety.com

سمجھے بغیر کوئی قدم مت اٹھانا۔ سوچ لو تو مشورہ کر لو مجھ سے رابطہ ہے۔ ورنہ کسی دن ایسے پھنسو گے کہ ہم بھی تمہارے لیے کچھ نہ کر سکیں گے۔" صاف ظاہر تھا کہ ان کا موڈ آف تھا۔

"آیا کچھ عقل شریف میں؟" محسن نے جیب کے جاتے ہی طنز سے کہا۔

"ہر کام عقل پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "کچھ جذباتی فیصلے ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ جب عقل ساتھ نہیں دیتی یا اتنی مہلت ہی نہیں ملتی کہ مشورے سے لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ مثلاً اب میں سوچ رہا ہوں کہ "میروزیا اینڈ کمپنی" کے آفس کا ایک چکر لگا کے سابق استاد پیڈرو کو بحیثیت احمد نواز گردیزی جنرل منیجر کام کرتے دیکھوں کیا خیال ہے آپ کا؟"

"اگر آپ نے آج اسے نہ دیکھا تو کیا آپ کا ہاضمہ خراب ہو جائے گا؟" محسن نے جھنجھلا کر کہا۔ "گھر چل سیدھی طرح۔"

"شیروانی!" میں نے کہا۔ "دلاور نے تیری ہمت شکستہ کر کے بزدل بنا دیا ہے۔ اس وقت چوہدری دلاور بہت خوش ہو گا کہ اس نے ایس ایس پی صاحب کو دوسری شکست فاش دی۔ حالانکہ میرا خیال ہے اب اس کی خیر نہیں۔ رضوی صاحب نے اس کو مع ثبوت گھیرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔"

"گویا رضوی صاحب بھی شکاری ہو گئے ہیں؟" محسن نے کہا۔ "ہماری طرح۔"

"یہی سمجھ لے۔ دلاور نے فون پر پیڈرو یعنی احمد نواز گردیزی کو ہسپتال کے چار سے آنے اور جانے کا احوال سنایا ہو گا اور گردیزی کو اس وقت بالکل توقع نہیں ہو گی کہ ہم اہل ایمان ہیں سے ادھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے ادھر نکلے۔ وہ احمق ہے۔ فردوس ہو جائے گا۔ اسی آفس میں ڈی سلوا کی اور میری چپقلش بلکہ جنگ ہو چکی ہے۔ ڈی سلوا دباؤ میں آ گیا تھا۔ اپنے استاد پیڈرو کی شان دیکھتے ہیں۔ کہ احمق کی چال کیسے چل رہا ہے۔"

"ایڈونچر کوئی نہیں ہو گا۔" محسن نے کہا۔ "میں بالکل موڈ میں نہیں ہوں۔" ہم ایک رکشا میں بیٹھ کر گئے۔

"جہاں تک موڈ کا تعلق ہے خان صاحب۔" میں نے کہا۔ "تو دل اس وقت میرا بھی چاہتا ہے۔ کیا چاہتا ہے؟ یہ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ مگر رابعہ کورٹ میں ہو گی اور ضابطہ فوجداری و دیوانی کے چکر میں سب بھول گئی ہو گی۔ ضابطہ عشق کی دفعہ ایک سو نو۔"

"ایک سو نو آوارہ گردی ہوتی ہے۔" محسن نے مجھے مطلع کیا۔

"یہ ظالم سماج عشق کو آج بھی آوارہ گردی ہی سمجھتا ہے حالانکہ آوارہ گردی عشق کے نصاب میں شامل ہے۔" میں نے کہا۔ "مثلاً خانہ مجنوں صحرا گرد بے دروازہ تھا۔ وہ جنگلوں میں بھٹکتے پھرتے تھے۔ چنانچہ میرے تصور میں اور کچھ نہ تھا۔ رومانی ناولوں کا سا منظر ہے کہ ہم دونوں کی رات۔ لب جو تبادلہ اور ... کو سہارا۔ نمبر و محسن اور مرد عزیز۔ وہ جان بہار۔ لیکن حاضر اسٹاک میں کیا دستیاب ہے؟ وزیر ... تار کول کی پکی سڑک۔ جو تبالہ چشتی ... میرو زیر ضمانت زیر و فرو ...

—— اور میرو ... چنانچہ اب تصور سے ہی گزارا کرنا ہے جیسے اسلام آباد میں آپ کی منکوحہ زوجہ کر رہی ہیں۔"

"یار تو نے کچھ پوچھا تھا اس سے؟" محسن نے نہایت ... سے دانت نکال کے پوچھا۔ "یاد کر رہی تھی مجھے؟"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "میں اس دلکش دل آزار اور ... موضوع سے گریز چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس بدبخت کے ماں باپ بزرگوں نے کیا یعنی زبردستی سے کام لے کر اس کا مستقبل تباہ کر دیا۔ بس کچھ وہ مجبور تھی اس لیے استحصال کا شکار ہوئی۔ مگر اب ایک انتقامی رد عمل کا شکار ہے اور درد زیر گردان راوی زیر ستم جوان ... خود کے ساتھ فرار پر کمربستہ ہے۔ میں نے اپنی گناہگار آنکھوں سے اس کے کمرے میں وحید مراد اور ندیم کی تصویر دیکھی ہیں۔ علاوہ از انیل رضوی، چند شیر مان کی تصاویر کے ساتھ۔"

"اگر تو نے کہا اس چند کی آدمی رکشا سے کود جاؤں گا لیکن چھینک دوں گا۔" محسن نے جھلا کے کہا۔

"رکشا ڈرائیور کو چھینک دینے میں زیادہ فائدہ ہے۔" میں نے کہا لیکن اسی وقت رکشا رک گیا۔

میں اور محسن سیڑھیاں چڑھ کے اوپر پہنچے۔ خلاف توقع کسی نے ہمارا راستہ نہیں روکا۔ چوکیدار اور پکھڑا تھا جہاں بائیں کا دروازہ اسٹاف روم میں کھلتا تھا اور بائیں طرف جنرل منیجر ...

"کس سے ملنا ہے آپ کو صاحب؟" نئے چوکیدار نے ... وہ پرانے چوکیدار سے زیادہ مہذب تھا۔

"ملنا تو سب سے ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم اجازت دو گے۔ حاکم ہو۔"

"ہماری کیا مجال صاحب!" وہ سمجھا ہم اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ "میرا مطلب ہے آپ کو جس سے کام ہے تو ادھر جائیں۔"

"ہمیں ڈی سلوا صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے ... بے نیازی سے کہا۔

"وہ... وہ تو ان کا انتقال ہو چکا ہے صاحب!" ... ہماری کم علمی پر کہا۔

"اچھا!" میں نے کہا۔ "ہم استاد پیڈرو سے مل لیں گے۔"

"کون استاد پیڈرو جناب؟" اس نے حیران ہو کے کہا ...

ہم اس کو جواب دیے بغیر جنرل منیجر کے کمرے میں داخل ... نقشہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ پہلے وہ ہی مختصر کر آیا میں ... یہ جگہ نہ جانے کیوں ابھی تک خالی تھی۔ میں ... کرو جھیلا اور اندر داخل ہوا۔ میرے قدم!

جو شخص جنرل منیجر کی جگہ بیٹھا تھا وہ استاد پیڈرو نہیں تھا۔ وہ تیس پینتیس سال کا اسمارٹ سا آدمی تھا۔ کھلتے ہوئے رنگ اور اکہرے جسم والا جس کے صاف شیو کیے ہوئے چہرے پر ہلکی ہلکی اور نفاست سے تراشی ہوئی مونچھیں تھیں۔ اس کے گھنے سیاہ بال درمیان سے دو حصے کر کے بنائے گئے تھے اور اس نے آنکھوں پر قیمتی سنہرے فریم والی عینک لگا رکھی تھی۔ وہ سوٹ میں تھا اس کا کوٹ اس نے ہینگر سے لٹکا دیا تھا اور اب بے داغ سفید قمیص، سلیٹی رنگ کی پتلون اور سیاہ و سفید دھاریوں والی ٹائی میں ملبوس تھا۔ چہرے کے نقوش کی ملائمت سے وہ تعلیم یافتہ اور مہذب لگتا تھا۔

"یس پلیز!" وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھا۔ "تشریف لائیے۔" اس نے مجھے اور محسن کو مقابل کی نشست پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

"وہ... دراصل ہمیں مسٹر احمد نواز گردیزی سے ملنا تھا۔" میں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا اور گفتگو انگریزی میں کی۔

"احمد نواز گردیزی میں ہوں۔" اس نے بڑی شائستگی سے انگریزی میں جواب دیا۔ "فرمائیے؟"

اگر وہ کہتا کہ میں الہ دین کے چراغ کا جن ہوں تب بھی میں اور محسن اتنا نہ چونکتے۔ ہم نے پہلے ایک دوسرے کی طرف اور پھر غور سے اس دوسرے احمد نواز گردیزی کی طرف دیکھا جسے ہمارے رویے نے تھوڑا سا حیران کر دیا تھا۔

"آپ کو یقین ہے... کہ آپ ہی احمد نواز گردیزی ہیں؟" محسن نے نہایت احمقانہ سوال کیا۔ "نئے جنرل منیجر؟"

وہ مسکرایا۔ "مجھے تو یقین ہے لیکن آپ لوگوں کو یقین نہیں آیا ہے۔ کیوں؟"

"کیونکہ ایک احمد نواز گردیزی سے ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔" محسن نے کہا اور خود کو مزید حماقت سے بچایا۔

"اس جگہ؟ میرا مطلب ہے کسی نے خود کو آپ کو دھوکا دیا تھا؟" وہ بولا۔

"جی۔ لیکن اسے ہم سے یہاں نہیں ملوایا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہماری ملاقات باہر ہوئی تھی اور اس کے بارے میں یہی بتایا گیا تھا کہ وہ سابق جنرل منیجر مسٹر ڈی سلوا کی جگہ آیا ہے۔"

وہ کرسی کی پشت کا سہارا لے کر ہمیں غور سے دیکھنے لگا۔ "کون تھا وہ؟ کوئی ہی تھا؟ اور کیا مقصد تھا اس کا؟"

"ایک تو یہ بات بہت لمبی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اس کے علاوہ، میں یہ سمجھتا ہوں یہ ہمارے باہمی مفاد میں بھی نہیں کہ ملنے والے کا نام اور مقصد ظاہر کیا جائے ایسے تو ایک دن آپ کو معلوم ہو ہی جائے گا۔"

"آل رائٹ!" وہ کسی تردد کے بغیر بولا۔ "یہ تو بتا ہی سکتے ہیں آپ کہ وہ شخص خود کون تھا؟"

"استاد پیڈرو نام کے کسی شخص کو جانتے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔

"استاد پیڈرو؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "بڑا عجیب سا نام ہے۔ میں نے پہلے کبھی نہیں سنا۔"

"شیخ مختار اور بیگم پارس کی ایک فلم تھی" محسن نے کہا۔ "اس کا یہی نام تھا۔ پاکستان میں بھی ریلیز ہوئی تھی۔ نام ضرور سنا ہو گا آپ نے؟"

"آپ لوگ خود کون ہیں؟" وہ مشکوک لہجے میں بولا۔ "ابھی تک آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا ہے اور یہاں آنے کا کوئی مقصد بھی بیان نہیں کیا ہے۔"

"میرا نام سکندر ہے۔ سکندر اعظم نہیں، سکندر بخت۔" میں نے کہا۔ "ان دنوں بخت خراب ہیں لیکن سکندر ابھی تک ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ میرا دوست ہے مسٹر شیروانی عرف محسن حسن خان۔ ہمارے آنے کا مقصد صرف آپ سے ملاقات کرنا تھا۔"

"لیکن ابھی تو آپ حضرات کو جانتا تک نہیں۔" حیرت زدہ گردیزی نے کہا۔ "ویسے فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آپ ہمارے لیے چائے یا کافی منگوا سکتے ہیں؟" میں نے جیب سے سگریٹ نکالی اور ایک اسے پیش کی۔ "جو بھی ٹھنڈی نہ ہو جائے؟"

"تھینکس!" اس نے سگریٹ کی پیشکش کو مسترد کرتے ہوئے رکھائی سے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے آپ غلط جگہ آ گئے ہیں۔ ریسٹورنٹ نیچے ہے۔ یہ آفس ہے میروزیا اینڈ کمپنی کا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے اطمینان سے سگریٹ جلا کے لائٹر اور پیکٹ محسن کو پکڑا دیے۔ "اس کے بانی اور ایک سابق مالک وزیر خان میرے والد تھے۔ ان کی وفات کے وقت میں انگلینڈ میں انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ اب میں ان کا واحد وارث ہوں۔ میں نے حق وراثت کے لیے کیس فائل کر رکھا ہے چنانچہ آپ مجھے نصف فرم کا مالک سمجھ سکتے ہیں۔ میر شرافت علی کے بعد میں اور دلاور ہی رہ گئے ہیں۔"

اب اس کے حیران ہونے کی باری تھی۔ "آئی سی!" اس نے ابتدائی صدمے سے سنبھلنے کے بعد خوشگوار لہجے میں کہا اور دوبارہ مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "آپ نے بہت دیر میں بتایا۔ بہرحال، آپ سے مل کے خوشی ہوئی۔"

"میرے بچپن کے دوست اور کلاس فیلو مسٹر محسن کے والد وزارت خارجہ میں ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔" میں نے ہاتھ ملا کے کہا۔

اس نے فوراً محسن سے بھی مصافحہ کیا اور تقریباً وہی الفاظ کہے جو مجھ سے کہے تھے۔ پھر اس نے کافی کا آرڈر دے دیا۔

www.paksociety.com

"مسٹر ڈی سلوا کے پاس ایک سیکریٹری تھی۔" میں نے کہا۔ "آپ نے ابھی تک کسی کا تقرر نہیں کیا؟"

"پرابلم یہ ہے مسٹر سکندر!" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "کہ تقرر کریں گے مسٹر چوہدری۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ کام آپ خود بھی کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور بہتر ہوگا کہ آپ کرلیں۔ میں دلاور سے بات کرلوں گا۔"

"ٹھیک ہے مسٹر سکندر!" وہ شکر گزار لہجے میں بولا۔ "میں یہی چاہتا تھا۔ یعنی۔ کام میرا ہے۔ مجھے کیسے کرنا ہے اور کیسے لینا ہے۔ یہ میری پرابلم ہے۔ اب مسٹر چوہدری مالک ہیں اور مجھے اس میں بھی شبہ نہیں کہ مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہیں لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ میری اور ان کی پسند ناپسند میں مطابقت ہو۔ جیسے وہ سیکریٹری منتخب کرکے بھیجتے۔ اگر وہ میرے مزاج اور طریقہ کار کو نہ سمجھ پائی تو اس سے کارکردگی یقیناً متاثر ہوگی۔"

"اسی لیے میں نے آپ کو اختیار دیا ہے کہ اپنی سیکریٹری کا انتخاب خود کریں۔" میں نے کہا۔ "اخبار میں اشتہار دے دیں۔ جو انٹرویو کے لیے آئیں ان میں سے دیکھ لیں۔ اور تنخواہ بھی خود ہی صلاحیت اور تجربے کی بنا پر طے کرلیں۔"

گردیزی کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا۔ ایک چپراسی کافی کی ٹرے اندر رکھ گیا تھا۔ وہ ہمارے لیے کافی بنانے لگا۔ مجھے یہ شخص پسند آیا تھا۔ اگرچہ مجھے اس کے بارے میں مفصل معلومات حاصل نہیں تھیں لیکن مجھے کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ جنرل منیجر کے عہدے کے لیے ہر لحاظ سے موزوں ہے۔ ڈرامہ میرے ساتھ چوہدری دلاور نے کیا تھا۔ اس نے چند بدمعاش جو اس کے ناجائز کاروبار کو چلاتے تھے "میرو ذریا ٹریڈ کمپنی" کا فورمین بنا کے پیش کردیے تھے اور پھر مجھے ان کے حوالے کردیا تھا کہ مجھے صراط مستقیم دکھائیں۔ جس کے لیے مجھے رضوی صاحب کی موجودگی میں سخت خفت اٹھانی پڑی تھی جب اصل فورمین شناخت کے لیے صف بستہ کیے گئے تھے۔ دوسرا چکر دلاور نے مجھے جنرل منیجر کے لیے دیا تھا۔ اس نے اصل کاروبار کے لیے جس آدمی کا تقرر کیا تھا مگر میرے سامنے استاد پیڈرو کو احمد نواز گردیزی بنا کے کھڑا کردیا تھا۔ صرف میرا رد عمل دیکھنے کے لیے اور لطف لینے کے لیے۔ مجھ پر واضح کرنے کے لیے کہ وہ مجھے احمق سمجھتا ہے اور بے وقوف بنا سکتا ہے۔ بعد میں کسی مرحلے پر یہ انکشاف کرکے کہ یہ فراڈ ہے اور ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے تو وہ بڑے اطمینان سے اصل احمد نواز گردیزی کو سامنے لے آتا اور کہتا۔ "آپ بھی کمال کی باتیں کرتے ہیں پیارے سکندر صاحب! مذاق کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ پوچھ لیں ان سے جو سب بتا چکے ہیں۔ کیا ان کا نام بھی استاد پیڈرو تھا یا ہے؟"

اور میں مزید بے وقوف بنتا۔

"آپ نے اپنے متعلق نہیں بتایا؟" میں نے کافی سپ کرکے پوچھا۔ "پہلے آپ کہاں تھے؟"

"میں بٹالہ انجینئرنگ میں تھا۔" گردیزی نے کہا۔ "میں نے لانچ۔ کی منظوری ... سے ... کی تھی۔ بیکو میں سیل مانیٹر تھا۔ مسٹر چوہدری نے بہت اچھی آفر دی تو میں ادھر آگیا۔"

"آپ کو یقیناً کام سمجھنے اور چلانے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئے گی۔" میں نے کہا۔ "لیکن کچھ مسائل ایسے ہوں گے جن سے خود کو الگ تھلگ رکھ کے آپ کامیاب رہیں گے۔"

"مثلاً؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "وہ کیا مسائل ہوں گے مسٹر سکندر؟"

"میں آپ کو تاریکی میں رکھنا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "میرے اور دلاور کے درمیان کچھ ذاتی اختلافات ہیں۔ قانونی طور پر ہم دونوں برابر کے مالک ضرور ہیں۔ بظاہر تپاک سے ملتے ہیں اور کسی پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ لیکن یہ ایسی باتیں ہیں جو سب جانتے ہیں اور آپ کو بھی معلوم ہونی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ مجھ پر میر شرافت علی کے قتل کا الزام ہے۔ الزام بے بنیاد ہے اور اس کا مقصد مجھے کاروبار سے الگ کرنا ہے۔ میری بے گناہی یا سزا کا فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی۔ دلاور پورے کاروبار کا مالک بننا چاہتا تھا مگر ابھی تک اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ چنانچہ تفصیلات میں جائے بغیر میں کہوں کہ وہ میرا دشمن ہے تو یہ غلط نہیں ہوگا۔"

احمد نواز گردیزی کے لیے یہ انکشافات ناقابل یقین تھے جنہیں وہ سمجھ چکا بیٹھا تھا۔ "شاید اسی لیے آپ نے مجھے اختیار دیا ہے کہ اپنی سیکریٹری کا تقرر خود کرلوں۔" وہ پریشان ہوکے بولا۔ "مسٹر چوہدری ان احکامات کو منسوخ کردیں گے۔"

"اوہ نو۔" میں نے کہا اور ٹیلی فون کا ریسیور اٹھالیا۔ "میں نے بتایا نا کہ ہمارے ظاہری تعلقات اچھے ہیں۔" میں نے چوہدری دلاور کا نمبر ڈائل کرنا شروع کیا۔ "اس فون کی ایکسٹینشن سیکریٹری کے کمرے میں ہے۔ آپ ہماری گفتگو سن لیں۔"

گردیزی اٹھ کے دوسرے کمرے میں گیا۔ "چوہدری صاحب!" میں نے کہا۔ "السلام علیکم۔ سکندر بول رہا ہوں۔"

"وعلیکم السلام پیارے سکندر صاحب۔" چوہدری نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "خیریت ہے! آج؟"

"ہاں۔ میں یہاں آفس میں گردیزی صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔" میں نے کہا۔ "ان کے پاس کوئی سیکریٹری نہیں ابھی تک۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ اخبار میں اشتہار دے کر کوئی بھی خود طے کرلیں۔ جو بھی مناسب ہو۔"

"بہت اچھا کیا جی آپ نے۔" چوہدری دلاور نے بالکل نارمل رہتے ہوئے کہا۔ "میرا اور دماغ نہیں رہا۔ ویسے بھی وقت نہیں ملتا۔ کچھ یاد بھی نہیں رہتا۔"

"بس یہی بتانا تھا آپ کو۔ خدا حافظ!" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ بتانا تو مجھے یہ تھا کہ میں اصل گردیزی سے مل چکا ہوں اور کسی بات پر حیران نہیں ہوں۔ گردیزی جب واپس آیا تو زیادہ مطمئن تھا۔

"میں بھی یہی چاہوں گا۔" گردیزی اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اور آپ کی بڑی عنایت ہوگی کہ اپنے ذاتی اور قانونی مسائل سے مجھے بالکل الگ رکھیں۔ میں آپ دونوں کو ایک جیسا مالک تسلیم کرتا ہوں۔ کسی نے مجھے پارٹی بنایا تو میرے لیے کام کرنا مشکل ہوجائے گا۔ وہ ڈراما پڑھا ہے آپ نے۔ 'دی سرونٹ آف ٹو ماسٹرز'؟ کمال احمد رضوی نے یہاں آرٹس کونسل میں 'صاحب، بی بی اور غلام' کے نام سے اسٹیج کیا تھا۔ تو وہ پوزیشن ہوگی میری۔" وہ مسکرایا۔

"نہیں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "آپ تو ماسٹر آف ٹو سرونٹس ہوں گے۔"

"آف دی ریکارڈ مسٹر۔" وہ بولا۔ "آپ مجھے قاتل ٹائپ نہیں لگے۔ ذرا اپنا ہاتھ دکھائیے۔"

"آپ پامسٹری کے حساب سے فیصلہ کریں گے؟" میں نے کہا۔ "عدالتی نظام میں اس کی اہمیت نہیں ہے۔"

"ہہ ہہ۔ لیکن میرا اپنے علم پر سے یقین ختم نہیں ہوسکتا۔ میں کوئی پروفیشنل نہیں ہوں۔" وہ بولا۔ "یہ میرا شوق ہے۔ میں نے بہت سی ایسی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے جو ان خود ساختہ اور اشتہاروں سے بڑھ کر جانے والے پامسٹوں نے دیکھی تک نہیں ہوں گی۔ دوسری زبانوں میں ایسی کتب کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔" اس نے میرے ہاتھ کو دیکھنا جاری رکھا۔ "میرا ایک دوست روسی نژاد تھا۔ اس کا باپ انقلاب روس کے بعد ملک سے فرار ہوا تھا اور افغانستان کے راستے ہندوستان آگیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ زار روس کا شاہی نجومی تھا۔ بہت ٹھاٹھ سے رہتا تھا اور اس کے گھر کے برتن بھی سونے چاندی کے تھے لیکن اس کو بھاگنا پڑا تو نقدی زیور اور ہیرے جواہرات چھوڑ کے اس نے اپنے ساتھ وہی نایاب اور نادر کتابیں رکھیں جن کو وہ اپنی متاع حیات سمجھتا تھا۔ مرتے وقت وہ یہ علم اور کتب خانہ بیٹے کو دے گیا۔ ظاہر ہے اب دنیا میں نہ زار ہیں نہ شہنشاہ۔ پامسٹ فٹ پاتھ پر بیٹھتے ہیں۔ میرے اس دوست کی پرورش پاکستان میں ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے اس علاقے میں جو اب پاکستان میں شامل ہے۔ اس نے بیشتر کتابوں کا مجھے ترجمہ کرایا تھا کیونکہ یہ خبط مجھے بھی تھا۔ ان کتابوں کے ٹائپ کیے ہوئے مسودے میرے پاس پڑے ہیں۔ کوئی ناشر انہیں چھاپنے کے لیے تیار نہیں۔ خدا نے جب بھی توفیق دی میں انہیں اپنے خرچ پر چھپواؤں گا۔"

"تم اکیلے؟" میں نے کہا۔ "تمہارا وہ دوست اس منصوبے کے اخراجات میں حصہ نہیں دے گا؟ نام تو اسی کا ہوگا۔"

"نام۔" وہ تلخی سے مسکرایا اور میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "وہ کئی سال پہلے ایک حادثے میں مرچکا ہے۔ مجھے معلوم ہونے تک اس کی تدفین ایک لاوارث کی حیثیت سے ہوچکی تھی۔"

"آئی ایم سوری۔" میں نے اخلاقاً کہا۔ "کس نتیجے پر پہنچے آپ؟ اعتقاد نہیں ہے میرا۔ لیکن تجسس سمجھ لیں اسے۔"

"میرا نتیجہ یقین ہے کہ آپ پر قتل کا الزام بے بنیاد ہے۔" وہ بولا۔ "آپ قتل کر ہی نہیں سکتے۔"

"بغیر ارادے یا اپنے دفاع میں بھی نہیں؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔ "فرض کیجیے کوئی میری جان لینے کی کوشش میں مارا جاتا ہے؟"

"وہ قتل نہیں ہے مسٹر سکندر بلکہ جو کسی ارادے یا نیت کے بغیر سرزد ہوجائے۔" گردیزی نے کہا۔ "میں قانون کی بات نہیں کرتا۔ ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔ اگر روزے کی نیت کے بعد آپ بھول چوک میں کچھ کھالیں تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ بات ارادۂ قتل کی ہے جس میں فطری رجحانات کو دخل ہوتا ہے۔ گویا قتل عمد وہ آپ نہیں کرسکتے۔"

"ابھی میں اس فیصلے پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "حالات خود اس کی گواہی دیں گے۔ آہستہ آہستہ بہت سی باتیں آپ کو معلوم ہوجائیں گی۔ کچھ جھوٹ اور کچھ سچ۔ آپ اپنی عقل کے مطابق تجزیہ ضرور کریں۔ لیکن میں ایک بات کی قدر کروں گا۔ اگر آپ خود کو تمام معاملات سے الگ رکھیں اور صرف اس کام سے کام رکھیں جس کے لیے آپ کی خدمات مستعار لی گئی ہیں۔ تو بالآخر اس غیر جانبداری سے آپ کو فائدہ ہوگا۔ ابھی میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ کوئی وعدہ کرسکوں لیکن آپ کو اس غیر جانبدارانہ فرض شناسی کی کوشش میں مشکلات کا سامنا ہوا تو میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہوگی۔ صرف جذباتی نہیں، عملی۔ اب میں چلتا ہوں۔ کوئی پرابلم ہو تو مجھے ایس ایس پی رضوی صاحب کے تھرو فون کر لیجیے۔ میں نہ ملوں تو مسٹر محسن یا رابعہ قاری ایڈووکیٹ کو پیغام دے دیجیے۔"

وہ مجھے رخصت کرنے کے لیے اٹھا تھا اور اس کی صورت پر بڑی پروقار، شائستہ اور زندہ مسکراہٹ تھی اور اس کا ہاتھ الوداعی مصافحے کے لیے آگے بڑھا ہوا تھا لیکن وہ مسکراہٹ بجھ گئی۔ اس چراغ کی طرح جس نے محفل کو روشن رکھا ہو مگر ... اس نوزائیدہ بچے کی طرح جس نے ابھی مسکرانا سیکھا ہو۔ اس کی نظروں میں ایک ویرانی اتر گئی۔ اداس اور تنہا لمحوں کی طرح نوحہ خواں۔ اس کا وجود بیک وقت

میں اس پتھر کی طرح پڑا رہ گیا جسے دریا نے رُخ بدل کے پیاسا چھوڑ دیا ہو اور اس کا ذہن حال کی فصیل عبور کر کے ماضی کے ویرانوں میں بھٹکنے لگا جہاں ہر یادوں کے مدفن پر ایک کتبہ تھا لیکن اس کی تحریر مٹ گئی تھی۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ بے جان ہو کے گر گیا اور وہ لڑکھڑا کے بیٹھ گیا۔ اس کی حالت میں یہ تغیر اتنا نمایاں تھا کہ میں نے تشویش سے محسن کی طرف دیکھا۔ وہ خود اس انقلاب پر حیران تھا۔

"کیا بات ہے مسٹر گردیزی؟" میں نے کہا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ ہاں۔" وہ کھوکھلے لہجے میں بولا۔ "وہ بس۔ ایسے ہی کبھی کبھی مجھے کچھ ہو جاتا ہے۔"

"آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے۔" میں نے پھر بیٹھ کے کہا اور کہنیاں میز پر ٹکا کے آگے جھکا۔ "کیا آپ رابعہ کو جانتے تھے؟" میں نے نوٹ کر لیا تھا کہ یہ تبدیلی جس نے اس دلکش شخصیت کا سارا طلسم پامال کر دیا تھا کس کے نام پر آئی تھی۔

"میں؟" وہ زبردستی مسکرایا۔ "کیوں۔ جانتا تو آدمی بہت سے لوگوں کو ہے۔ اب وہ اتنی مشہور وکیل تھیں۔"

بات کچھ اور بھی تھی جو وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ دلاور کی طرح اچھا اداکار ہوتا تو اپنے دلی جذبات کا اظہار اپنی صورت سے نہ ہونے دیتا اور مجھے کچھ معلوم نہ ہوتا لیکن اس کا چہرہ اس کے دل کا آئینہ تھا جس میں ہر جذبے کا عکس اپنے اصل روپ میں اتر آتا تھا۔ اس نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا اور بہت کچھ بتا دیا تھا جو میں جاننا چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ مجھے نہ معلوم ہو تو اچھا ہے۔ محسن نے میری ذہنی کیفیت کو بھانپ لیا تھا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر نیچے اتر آیا۔

"اس گردیزی کو کیا ہو گیا تھا رابعہ کا نام سن کے؟" میں نے سڑک پر آتے ہی کہا۔

"اسے تو ہو گیا تھا مالیخولیا۔" محسن نے کہا۔ "تجھے کیا ہو گیا تھا؟"

"رابعہ نے تو مجھ سے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔" میں نے کہا۔

"چنانچہ یہ خیال آنا لازمی تھا کہ گردیزی کا رابعہ سے کیا تعلق تھا۔ ظاہر ہے اس کی نوعیت جذباتی تھی۔"

"کیا تھا اور کیا نہیں تھا۔ یہ سب جان کے کیا کرے گا تو؟" محسن نے کہا۔ "اپنے مستقبل کی بنیاد اس حسد پر رکھے گا جس کا اب کوئی جواز نہیں۔ فرض کر رابعہ کبھی اس کو چاہتی تھی۔ یہی پھانس چبھ گئی ہے نا تیرے دل میں؟ اب تو اس پھانس کو دیمک کی طرح پالے گا۔ اس کی غلط فہمی کے زہر میں مبتلا رہے گا۔ تیرا دماغ خراب ہے۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مت مار۔ آج وہ تجھے چاہتی ہے۔ صرف تیرے لیے زندہ ہے۔ کیا اس میں کوئی شبہ ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ میں کیا کروں؟"

"یہ سب بکواس ہے۔" محسن نے کہا۔ "آدمی جسے چاہتا ہے دل سے نہیں دماغ سے چاہتا ہے۔ اسے سمجھتا ہے، پرکھتا ہے اپنی خواہشات کے پیمانے سے۔ زندگی کے تقاضوں کے حوالے سے۔ مستقبل کی توقعات کے ترازو میں تول کر۔ اور رابعہ کو تو نے اسی طرح دیکھ لیا ہے کہ زندگی کے سفر میں اس سے بہتر ساتھی شاید پھر نہ ملے۔ یہ عقل کا فیصلہ تھا اس لیے میں نے بھی قبول کیا۔"

میں مجرم بنا خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ مجھے معلوم تھا اب وہ کیا کہے گا۔

"فوزیہ میری بہن تھی ———" مگر وہ بیزار

مگر میں محسن نے بات جاری رکھی۔ "میں حقیقت پسند نہ ہوتا تو تجھے قتل کر دیتا کہ تو نے اس کی زندگی میں کانٹے بوئے۔ ورنہ تیرا ساتھ تو نہ بھی دیتا اور کوئی برا نہ کہتا۔ سب میرے حق میں ہوتے کہ تو نے دوست بن کے دغا کی اور رشتوں کی آبرو گنوا دی۔ لیکن میں جانتا ہوں فوزیہ کی وابستگی بھی بس ایسی ہی تھی جیسی کہ اس عمر میں ہو جاتی ہے لیکن اب وہ تجھے بھول چکی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ نیاز کے ساتھ وہ بہت خوش رہے گی۔ تجھے یاد بھی کرے گی تو زندگی کے کسی تلخ تجربے کی طرح جسے فراموش کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ رابعہ کی بات مختلف ہے۔ تم دونوں اب سنجیدہ مزاج اور پختہ عمر ہو۔ تم دونوں اب ایک دوسرے پر شک کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس حسد وغیرہ کی اب تمہاری زندگی میں کوئی گنجائش نہیں۔ اگر زندگی کے کسی دور میں رابعہ نے گردیزی کو پسند بھی کیا ہو گا تو اسے بالکل ایسے ہی بھول بھی جائے گی جیسے فوزیہ تجھے بھول جائے گی۔ اس کے علاوہ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ گردیزی کے جذبات یکطرفہ ہوں۔ صرف وہ رابعہ کو چاہتا ہو۔ رابعہ کو علم ہی نہ ہو یا پروا ہی نہ ہو؟"

"شاید تو ٹھیک ہی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"اور بڑا اور۔ رابعہ کی فراخدلی بھی تو دیکھ۔" محسن نے کہا۔ "وہ تیرے اور فوزیہ کے جذباتی تعلقات کے بارے میں جانتی ہے مگر اس کے باوجود کیا وہ شک یا حسد میں مبتلا ہوئی؟ اپنے رویے یا اشارے کنائے سے اس نے کبھی حوالہ دیا کہ اسے تیری ذات پر اعتماد نہیں۔ شاید اس نے کبھی سوچا تک نہیں کہ جیسے تو فوزیہ کے لیے بدل گیا ایسے ہی پھر کسی کے لیے بدل جائے گا۔ اس کا یقین کامل ہے۔ اتنا کہ مجھے تعجب بھی ہوتا ہے اور تجھ

پر شک بھی آتا ہے۔"

"یقیناً تو میرا اچھا دوست ہے۔" میں نے شفقت سے کہا۔ "میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ یہ بات کیا ہوئی۔ تو نے اچھا کیا کہ میرے دماغ کو بھٹکنے سے پہلے ہی پھر راہ راست پر ڈال دیا۔"

"اس کے باوجود تو رابعہ سے پوچھے گا کہ احمد نواز گردیزی کون ہے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں۔" میں نے تسلیم کیا۔ "لیکن اس طرح نہیں جیسے پہلے پوچھا۔ ممکن ہے وہ خود ہی بتا دے۔"

"وہ بتا دے گی۔" محسن نے کہا۔ "وہ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی کہ تجھ سے کچھ چھپائے۔"

"مجھے اب خیال آ رہا ہے کہ احمد نواز گردیزی وہی نہ ہو؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"وہی کون؟" محسن نے چلتے چلتے حیرانی سے کہا۔ ہم دونوں پیدل ہی گھر کے قریب پہنچ چکے تھے۔

"اس کا پہلا شوہر۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ معلوم نہیں رابعہ نے بتایا تھا یا نہیں۔"

"رابعہ کی شادی پہلے بھی ہو چکی ہے؟" محسن نے دم بخود ہو کے کہا۔

"ہاں۔ صرف شادی۔" محسن نے کہا۔ "اور یہ شادی قانونی طور پر کافی عرصہ برقرار رہی۔ لیکن رخصتی کی نوبت نہیں آئی۔"

"کیوں؟" محسن نے کہا۔ "کسی کے ساتھ زبردستی ہوئی تھی؟"

"کسی کے ساتھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اپنی اپنی جگہ دونوں ٹھیک تھے۔ خواب کسی کو بھی نظر آ سکتے ہیں لیکن یہ شاید بعد میں پتا چلا کہ رشتہ سے انکار کر دینا چاہیے تھا مگر جیسا کہ خود رابعہ کے حصے میں آئی۔ ویسے وہ ظاہر کوئی دکھاوا کر پہلے اس کی رخصتی التوا میں پڑی رہی۔ بظاہر کسی وجہ کے بغیر پھر طلاق ہو گئی۔ کوئی خرابی تو ہو گی تاکہ بتایا جاتا۔ وہ بتا کر پچھتاتے اور نہ کرتے۔ نہیں گئے اور شریف لوگ تھے اس لیے خاموشی سے فریقین کی رضامندی اور طلاق دے کر الگ ہو گئے۔ رابعہ نے مجھے کبھی بتایا تھا یہ سب کچھ۔ کس دن مجھے یاد نہیں۔ سے معلوم ہوا تھا۔"

"لیکن سے بتایا ہو؟" محسن نے کہا۔ "مجھے یاد نہیں پڑتا۔ رابعہ کو جانتا ہے کہ وہ ... پر خاموش حاضر تھا اور کچھ سوچ رہا تھا ورنہ ایسی بات تو میں کیسے بھول جاتا۔ بڑی مظلوم لڑکی ہے رابعہ بھی۔ اگر بات یہی ہے تو میں اس کی وسعت قلب اور ... کا پہلے سے زیادہ معترف ہو گیا ہوں۔"

"اس نے زندگی سے بہت سمجھوتے کیے ہیں۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ حسرتوں، محرومیوں اور ناکامیوں کے سوا زندگی نے اسے کیا دیا ہے۔ لیکن سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بڑا کمال ہے کہ اس نے اپنی شخصیت کے حصار میں دراڑیں نہیں پڑنے دیں اور کسی منفی ردعمل کا شکار نہیں ہوئی۔"

"اگر احمد نواز گردیزی وہی شخص ہوا تو کیا ہو گا؟" محسن نے کہا۔

"کیا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "کچھ نہیں ہو گا۔ وہ رابعہ کا احسان مند تھا اور اس نے بعد میں بھی اپنا رویہ دوستانہ رکھا۔ ایک بار میرے لیے رابعہ کو اس کے پاس جانا پڑا تھا تو اس نے رابعہ کی مدد کی تھی۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی ناکامی کے باوجود بعد میں تجھ سے وہ ذہنی رقابت محسوس کرنے لگا ہو؟" محسن بولا۔ "رابعہ نے تو خود کو بچا لیا مگر ممکن ہے اس کی اپنی شخصیت منفی ردعمل سے مسخ ہو گئی ہو۔"

"میری رقابت سے اسے کیا فائدہ اور مجھے کیا نقصان ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ جذبات کا مسئلہ ہے۔" محسن نے کہا۔ "ایک معصوم بچہ بھی معذوری کے باعث کسی کھلونے سے نہ کھیل سکتا ہو تو اسے توڑ دیتا ہے اور اس طرح دوسروں کو بھی اس مسرت سے محروم کر دیتا ہے جس سے وہ خود محروم ہے۔"

"نہ جانے کیوں میرا ذہن اس دلیل کو قبول نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "اس نے رابعہ کو نقصان نہیں پہنچایا تو میرے خلاف کیا

www.paksociety.com

کرے گا؟ اور کیوں کرے گا؟ جو بات میری سمجھ میں نہیں آئی وہ کچھ اور ہے۔ رابعہ نے تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ سی ایس پی افسر ہو گیا تھا اور خاصے بڑے عہدے پر فائز تھا۔ احمد نواز گردیزی کہتا ہے کہ وہ بینکوں میں تھا۔"

"فرض کرو یہ بات غلط ثابت ہوتی؟" محسن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اس سے میری وہ بات زیادہ قابلِ غور ہو جائے گی کہ محض رابعہ کی وجہ سے وہ تیرے خلاف حسد میں مبتلا ہو جائے۔ رابعہ ایسی لڑکی ہے کہ جو اسے قریب سے دیکھتا ہے، اس کے ظاہر اور باطن کے حسن کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اگر یہ شادی چل جاتی تو گردیزی خود کو انتہائی خوش قسمت سمجھتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب کیا وہ اس شخص کے لیے مخالفانہ جذبات کا شکار نہیں ہو گا جو اتنا خوش قسمت ہے کہ رابعہ اسے مل گئی ہے۔ حالات نے جو انعام اسے دیا تھا وہ تقدیر نے کسی اور کو بخش دیا ہے۔"

"نظریاتی طور پر میں تیری بات کو تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن عملاً ایسا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے شبہ ہے کہ عملی صورت حال کچھ اور ہے۔" محسن نے کہا۔ "ممکن ہے احمد نواز گردیزی نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی ہو۔ اسے کسی ادارے میں بہتر معاوضے ملے ہوں۔ سرکاری نوکری ذہنی و جسمانی طور پر انسان کی طاقت پرواز کو محدود کر دیتی ہے اور اس کی صلاحیت کے لیے کوئی چیلنج نہیں بنتی۔ سال کے سال ایک انکریمنٹ ملتی ہے اور ترقی بھی قواعد و ضوابط کے مطابق ہوتا ہے اس وقت تک نہیں ملتی جب تک کہ افسرانِ بالا کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل نہ ہو۔ گردیزی جیسے مرد زندگی کے ایک محاذ پر شکست کی تلافی یوں کرتے ہیں کہ باقی زندگی میں ہر جگہ فتح حاصل کرتے ہیں۔ ان کے نامۂ اعمال میں ناکامی کا لفظ صرف ایک بار آئے تو کامیابی کے ذکر سے ان کی داستانِ حیات دوسروں کے لیے قابلِ رشک بن جائے۔ یوں سمجھ لے کہ جسمانی توانائی کی سمت بدل جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ گردیزی کو یہاں لایا گیا ہے۔"

میں چونکا۔ محسن کا سارا فلسفہ اچانک میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ "تیرا مطلب ہے وہ بھی شکاری ہے؟"

"بے شک نہیں تو ہو جائے گا۔ اس میں صلاحیت ہے اور وہ تمام صفات ہیں جن سے دوسرے شکاری فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اسے تھوڑی سی تربیت اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس کی سوچ کا انداز پہلے سے تیرے خلاف ہے۔ اب تک اس میں تخریبی عنصر شامل نہیں تھا لیکن ایک چیز کی کمی دوسری چیز سے پوری کی جا سکتی ہے۔ دولت کی طاقت سے اس کے جذبات کا رخ اسی طرح موڑا جا سکتا ہے جیسے دریا پر بند باندھ کے اس کا رخ موڑ دیا جاتا ہے اور اس کے پانی سے زمین سیراب کی جاتی ہے۔ تو خود سوچ کہ جہاں ڈی سلوا جیسا شخص کام چل سکتا ہے؟ اگر چلے گا تو صرف دو ہی صورتوں میں، یا تو کاروبار بدل جائے اور دلاور سالق دھندے چھوڑ کر جائز کام کرنے لگے۔ وہی پرانا کام جس کی بنیاد دوبارہ رکھی تھی۔ یہ ناممکن ہے۔ دوسری صورت پھر یہی رہ جاتی ہے کہ گردیزی دوسرا ڈی سلوا بن جائے یا بنا دیا جائے۔ بہت زیادہ قرینِ قیاس ہے۔"

"یار محسن خان شیروانی۔" میں نے کہا۔ "معاف کرنا، میں ایک بار پھر اعتراف کرتا ہوں کہ آپ دنیا کے سب سے احمق آدمی نہیں ہیں۔ جیسا کہ میرا عقیدہ تھا۔ یہ بات میرے ذہن میں نہیں آ سکتی تھی۔"

"عقل ہوتی تو آپ کے سر پر بال ہوتے، عزیزم!" محسن نے شفقت سے فرمایا۔ "یقیناً آپ نے اسے ناپسند کیا ہو گا۔ کوئی بھی شخص جو اس کے پس منظر سے آگاہ ہو براہِ راست اس کا حریف نہ ہے یقیناً اس سے متاثر ہو گا۔ مگر اس نے وہی مورچہ فتح کیا ہے جس پر اسے ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔ بہ جیتے پر سجا ہوا رابعہ کی محبت کا میڈل اس کے منہ پر طمانچہ ہے۔ دلاور اینڈ کمپنی نے یہ مہرہ بہت سوچ سمجھ کے اٹھایا ہے۔ انہیں اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہو گی لیکن ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔"

"اگر تصدیق کرنے پر معلوم ہو گیا کہ احمد نواز گردیزی انجینئرنگ میں نہیں تھا تو واقعی پیشے کی کوئی قسم نہیں ہے۔ گردیزی نوآموز شکاری ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن بعد میں سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہو گا کیونکہ اس کا بہت بڑا اثاثہ اور صلاحیت ہے علاوہ اس کی فطرت کے۔" میں نے سوچا۔ کسی رکاوٹ کے بغیر بہتا ہے تو اس کے کنارے آباد رہتے ہیں۔ ان سے کھیتوں کی زرخیزی قائم رہتی ہے اور زندگی پروان چڑھتی ہے لیکن گردیزی وہ دریا ہے جس کی راہ میں ایک رکاوٹ ڈالی ہے۔ بے شک اس سے حاصل ہونے والی قوت کو تعمیری مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس سے روشن ہوتے ہیں، مشینوں کے پرزے متحرک ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ڈھانپنے کو کپڑا ملتا ہے اور زندگی کو آسائش بنانے کے ہزار اسباب فراہم کرتی ہیں مگر یہی توانائی غلط مقاصد کے لیے اسیر ہو جائے تو میرو شیما اور ناگاساکی کھنڈر بن جاتے ہیں۔ دنیا کو جنت بنانے والوں کے عزائم جوہری اسلحہ خانوں سے بہت پیچھے نظر آتے ہیں۔

گھر میں ہم ٹھیک کھانے کے وقت پہنچے۔ بیگم رضوی، ان کے دونوں بچے اور رابعہ سب میز پر جمع تھے۔

"انکل سلطنت۔" رضوی صاحب کے چھوٹے بچے نے کہا۔ "ممی نے کہا تھا اب آپ کی خیر نہیں ہے۔"

"کیونکہ ڈیڈی مولا بخش کو لینے گئے ہیں۔" دوسرے نے شرارت سے کہا۔ ان کی ماں نے گھور کر انہیں دیکھا۔

"انکل یہ مولا بخش کون ہے؟" چھوٹے نے ماں کی تنبیہ نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"مولا بخش؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہمارا ایک بچپن کا دوست ہے۔ ہماری طرح سیدھا سادہ۔"

"سیدھے تو خیر ہم اب بھی ہیں۔ بالکل جلیبی کی طرح۔" محسن نے کہا۔ "بس کبھی کبھی مولا بخش کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

"کل آنٹی رابعہ بھی کہہ رہی تھیں کہ آپ کو چوہڑ کے چھیتے میں ہاتھ ڈالنے کا شوق ہے۔" پہلے نے مجھے مطلع کیا۔ "یہ آپ کی ہابی ہے انکل؟" وہ یقیناً سوچ رہا تھا کہ میں بہت دلیر آدمی ہوں۔ "شہد تو بازار میں بھی مل جاتا ہے۔"

"بھابی؟" محسن نے دخل در معقولات کیا۔ "ہماری بھابی؟ آپ جانتے ہیں ہماری بھابی کے متعلق۔ شہد کیا چیز ہے...؟"

"ارے بھئی کھانا کھاؤ۔" بیگم رضوی نے بچوں کو ٹوکا۔ "یہ کیا بچوں کے سامنے بابا اور بھابی کو ملا رہے ہو۔"

"دراصل آنٹی! بچوں کی تعلیم و تربیت بھی تو ضروری ہے۔" محسن بولا۔ "نفسیات کے جدید نظریات کے مطابق پہلے ملتا ہے صرف بابا۔ وہی آگے چل کر بھابی بن جاتی ہے..... اور جب بھابی وجود میں آتی ہے تو بن جاتی ہے ایک لابی۔ حزبِ اقتدار کی۔ جو پیدا کرتی ہے فراوانی...۔" اس سے پہلے کہ محسن اسی قافیے میں اپنی آزاد نظم کو آگے بڑھاتا، رضوی صاحب نازل ہو گئے۔

"آپ کچھ فرما رہے تھے۔" رابعہ نے کہا۔ "اپنے خیالات سے انکل کو بھی مستفیض فرمایئے۔"

"ممکن؟" محسن نے بے حد حیرانی سے کہا۔ "میں تو ایک لفظ نہیں بولا۔ بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ آپ کے کان بجنے لگے ہیں خالہ جان۔" بیگم رضوی کی ہنسی نے یہ راز افشا کر دیا کہ ہم کچھ بول رہے تھے لیکن انہیں دیکھ کر خاموش ہو گئے ہیں۔

"آج آپ لوگ کے اکرام شیخ کو بلوایا تھا میں نے۔" انکل نے بچوں کے کھانے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ان کے پاس بلڈ پریشر کے بہت کم وقت ہوتا تھا۔ وہ مشکل سے آدھا گھنٹہ بھر اس کا انحصار بھی فرصت ملنے پر تھا۔

"آپ اس کے استعفے کو نامنظور کر دیں انکل۔" میں نے کہا۔ "اور اسے اپنے سابقہ فاطمنت میں لے لیں۔ میرا مطلب ہے پولیس ہیڈ آفس میں ہی بٹھا لیں۔"

"ارے بھئی! اس میں کسی کے ساتھ کوئی زبردستی کیسے کر سکتا ہے؟" انہوں نے کہا۔ "اب وہ نوکری نہیں کرنا چاہتا تو میں کیا کروں۔ میں نے اسے انٹرویو کے لیے وقت دیا اور پوچھا کہ بات کیا ہے۔ خیر بات تو مجھے معلوم تھی۔ میں اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا لیکن اس نے کچھ بتایا نہیں۔ یہی کہتا رہا کہ میرے نجی حالات کا یہی تقاضا ہے۔ فی الحال میں نے فیصلہ ملتوی کر دیا ہے کہ اسٹاف کی پوزیشن بہتر ہونے پر غور کیا جائے گا۔ وہ کچھ ضرورت سے زیادہ برہم ہے۔ کہنے لگا آپ کی مرضی سر! میں تو نوکری چھوڑ چکا اور کرنے سے وہ اب آؤٹ کر گیا۔ کوئی اور ہوتا میری جگہ تو ان ڈسپلن سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جوانی کی شوریدہ سری ہے۔ تم سمجھا دو اسے۔"

"اب میں سمجھا لوں گا اسے انکل۔" میں نے پورے یقین سے کہا۔ "اس کا تو باپ بھی نوکری کرے گا۔"

"وہ تو نوکری کر کے ریٹائر ہو چکا۔ وہ دوبارہ نہیں کر سکتا۔" انکل رضوی نے ہنس کے کہا۔

"ڈیڈی! وہ مولا بخش کہاں ہے؟" ان کے چھوٹے بچے نے موقع پاتے ہی کہا۔

"ارے بیٹا۔ جانے دے۔" میں نے کہا۔ "ہم پہلے ہی مارے ہوتے ہیں زمانے کے، شامتِ اعمال کے، تقدیر کے اور نہ جانے کس کس کی نظر کے۔" میں نے نظر بچا کے رابعہ کی طرف دیکھا اور راہ کھڑا ہوا۔ رابعہ کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے متغیر ہوا۔

"کل فون آیا تھا اس کی بہن کا۔" بیگم رضوی نے اچانک کہا۔ "کیا نام ہے اس کا۔ نازو۔ کہہ رہی تھی تم کو اس کا کوئی ادھار چکانا تھا۔ میں نے بہت پوچھا کہ کیا ادھار ہے لیکن وہ ہنسنے لگی۔ میں نے بتایا کہ وہ تو لاپتا ہے تو پریشان ہو گئی۔ باتیں کرتے کرتے رونے لگی۔ کہنے لگی داتا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کے منت مانگوں گی۔ عجیب باؤلی لڑکی ہے۔"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا اور میرا دل بیٹھ گیا۔ اس نے صرف ایک نظر میری طرف دیکھا اور میں سمجھ گیا کہ جو پھانس میرے دل میں احمد نواز گردیزی کے دیے سے جلاوطنی گئی تھی وہی اب رابعہ کے دل میں خلش بن گئی ہے۔

"میں نے پنڈی جانے سے پہلے شیخ کو ایک ہزار روپے کا چیک ہے کرلیٹن دینے کے لیے کہا تھا۔" میں نے سب کے سامنے وضاحت کرنا بہتر سمجھا۔ "اس کے پاس نقد نہیں تھے۔

www.paksociety.com

مجھے اس کے گھر جانا پڑا۔ نازو اس کی چھوٹی بہن ہے۔ بالکل یہودی۔ اپنے بھائی کو بھی ایک دن کے لیے سو روپے دیتی ہے تو دوسرے دن ایک سو دس روپے وصول کرتی ہے۔ سو روپے روزانہ کے حساب سے تیرہ سو روپے دینے پڑیں گے اسے۔ بچپن بہت سے اس کی عادت ہیں۔"

"کیا کرنا تھا تمہیں ایک ہزار کا؟" رابعہ کے دل کی بات بیگم رضوی نے کہی۔ "تم پنڈی جا رہے تھے کہ حج کرنے؟"

"بس ایسے ہی۔ میں نے احتیاطاً یہ مناسب سمجھا۔ کہ کچھ پیسے جیب میں ہوں۔" میں نے محسوس کیا کہ اس وضاحت نے کسی کو بھی مطمئن نہیں کیا ہے۔ "اچانک کوئی ضرورت پڑ جائے تو۔"

"اچانک کوئی اشد ضرورت پڑ جاتی تو ہم سب تھے وہاں۔" رضوی صاحب نے اٹھتے ہوئے نیپکن سے ہاتھ صاف کیا اور خدا حافظ کہہ کر نکل گئے۔ جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو ان کی جیپ کے باہر نکلنے کی آواز آئی۔ چند منٹ بعد محسن اندر آیا تو میں بستر پہ نیم دراز سگریٹ کا دھواں پھیلا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا رابعہ جیسی عورت بھی بے بنیاد شک اور حسد میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ یہی سوال میں نے محسن سے کیا۔

"عورت تو عورت ہی ہوتی ہے۔" محسن نے فلسفیانہ انداز میں انکشاف کیا۔ "اور ہمارے سابق شمسؔ فرماتے تھے کہ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ تو یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟"

"آگ تو ہے مگر دونوں طرف برابر نہیں لگی ہوئی ہے اور میں نے لگائی بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا اور اسے نازو کے بارے میں سب کچھ بتا دیا جو اب تک محسن کو معلوم نہیں تھا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کروں کیا؟"

"نکاح۔" مسٹر محسن نے آنکھیں بند کر کے غور فرمانے کے بعد کہا۔ "ویسے تو آپ چار کر سکتے ہیں مگر میں صرف رابعہ کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے اس کی بدگمانی یا غلط فہمی وغیرہ نوٹ کی تھی۔ اب تک اگر وہ دل شکستہ ہو کے خودکشی کر لیتی ہو تو کچھ عجب نہیں۔"

"تم نے دیکھا ہو گا فلموں میں کیا ہوتا ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جہاں اس قسم کی سچویشن آتی ہے ہیرو کہیں سے آ نکلتا ہے۔ اور پھر جناب یا تو ہاتھ مار کے زہر کی شیشی گرا دیتا ہے یا چٹان سے دریا میں کودنے والی ہیروئن کو ہوا میں اچک لیتا ہے۔ چنانچہ میں جاتا ہوں عین وقت پہ نمودار ہونے کے لیے۔" میں پھرتی سے اٹھا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔

رابعہ اپنے کمرے میں سیدھی لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ . . . . نو بجا تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" وہ مجھے کھڑکی کے راستے اندر [illegible] دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ "دروازہ بھی تو کھلا تھا۔"

"کود اتری محفل میں کوئی دھم سے نہ ہو گا۔" [illegible] میں جا کے شعر پڑھا۔ "وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہو گا۔"

"چشم بد دور۔ ذوق اچھا ہے آپ کا۔" وہ بولی۔ [illegible] "آپ کی پسند کے معیار بدلتے رہتے ہیں؟"

"ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں بی بی کہ تم کس حوالے سے بات کر رہی ہو لیکن میں تم سے نکاح کرنے آیا ہوں۔ محسن کے حکم پہ۔"

"تمہارے دماغ پہ اثر ہے۔ کوئی چوٹ وغیرہ لگ گئی تھی کیا؟" رابعہ مسکرائی۔

"چوٹ لگی ہے دل پہ۔" میں نے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ "یہ ہے ڈائیلاگ؟ جہاں تک نکاح والی بات ہے تو میں سیریس ہوں۔ اس کے دو اسباب ہیں۔ بلکہ تین۔ ایک تو یہ کہ میں محسن کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ کہ نکاح ضروری ہے اور تیسرا یہ کہ تم کو بطور منکوحہ اپنے ساتھ لے جا کر اس [illegible] نازو پہ واضح کر سکتا ہوں کہ میں شادی شدہ آدمی ہوں لہٰذا وہ مجھ پہ ڈورے نہ ڈالے اور ڈالتے ہی ہیں تو پہلے تم سے ڈوئل لڑے۔"

"وہ تو میں ہار جاؤں گی۔" رابعہ ہنسی۔ "میں نے سنا ہے جوڈو جانتی ہے اور تمہاری شاگردی پہ فخر ہے۔"

"اچھا۔ اور اس کے باوجود تم روٹھی ہوئی نہیں ہو؟ یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تو تمہیں منانے آیا تھا لیکن مسٹر محسن خان شیروانی پہلے ہی فرما چکے تھے کہ تمہیں [illegible] کامل یقین ہے۔"

"کامل یقین کیا ہوتا ہے۔" وہ بولی۔ "اور کوئی کسی کے بارے میں یہ بات یقین کامل کے ساتھ کیسے کہہ سکتا ہے؟"

"یہ تو ہے۔" میں نے سر کھجا کے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ جب [illegible] تمہارے بھیڑوں کے پیچھے میں ہاتھ ڈال کے گرفتار ہو گیا تھا تو تمہارے دل کی کیا حالت تھی؟ میرا مطلب ہے خدانخواستہ [illegible] واپس نہ آتا؟"

"تم مجھ سے کہلوانا چاہتے ہو کہ تم مر جاتے تو میں بھی مر جاتی؟" وہ چڑ کے بولی۔ "یہ خیال مجھے آیا ہی نہیں تھا۔"

"تو یہی کمی ہے وہ۔ کامل یقین۔" میں نے کہا۔ "[illegible] دوں؟ جب میں اپنے تابوت شریف میں دست و پا بستہ اور بے زبان پڑا استراحت کر رہا تھا۔ تو مجھے خیال آیا تھا۔ اس وقت بالکل خوفزدہ نہیں تھا۔ اور جب تمہارا تصور کیا تو تم کو بالکل ایسا دیکھا جیسے اب دیکھ رہا ہوں۔ اور کیا محسوس کیا۔ میں [illegible]

www.paksociety.com

کرسکتی۔ تمہارے وجود سے ایک ذہنی کیفیت وابستہ ہے بالکل اسی طرح جیسے پریگننٹ کا ایک علامتی ظہور ہوتا ہے۔ پری مونیشن جیسی پیدائش کہتے ہیں اسے۔ تو میں اسی طرح میں نے تم کو محسوس کیا تھا۔"

"اب تمہیں سچ بتاؤں میں؟" رابعہ یکلخت بے حد سنجیدہ ہو گئی۔ "اس رات میری آنکھ کھلی تو میں بہت ڈری ہوئی تھی۔ حالانکہ میں نے کوئی ڈراؤنا خواب نہیں دیکھا تھا۔ سوتے وقت میرے ذہن میں کوئی ایسا ویسا خیال نہیں تھا۔ تمہارا ٹیلی فون تو بہت بعد میں آیا۔ لیکن مجھے ایسا لگا جیسے تم نے کچھ کہا۔ اور میں اندھیرے میں بیٹھی غور کرتی رہی۔ تمہارے الفاظ مجھے یاد تھے۔ میں بالکل خیریت سے ہوں اور تم لوگوں کو بس یوں اطلاع دینا مقصود تھی۔ اور تم نے میری خیریت پوچھی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ناقابل یقین بات یہ تھی کہ تم نے کہا تھا کہ میں گوجر خان سے بول رہا ہوں۔ سوچو ذرا مجھے گوجر خان کا خیال کیسے آگیا؟ ان گنت شہر قصبے ہیں جن کے نام میرے ذہن میں موجود ہیں۔ پھر یہی نام کہاں سے سن لیا تھا میں نے۔ میں نے کسی کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی ورنہ سب میرا مذاق اڑاتے۔ مجھ پر ہنستے کہ تم دل ہی دل میں بھوگئی ہو بی بی۔ اور محسن۔ وہ تو نہ جانے کیا کچھ کہتا۔ مگر اس نے مجھے تمہارے فون کے متعلق بتایا تو میں۔۔۔" وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ "ایسا ممکن کیا کہہ سکتے ہو سکندر؟"

"اب نہیں کروں گا۔" میں نے بے خیالی میں کہا جب رابعہ بات کر رہی تھی تو میں اس وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا جب مجھے رابعہ کے خیال نے سامان تسکین قلب فراہم کیا تھا کیونکہ چشم تصور سے میں نے اسے پلنگ پر روتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ٹرک کہاں تھا؟ سوہاوہ سے جہلم کی طرف جا رہا تھا۔ گیارہ رات کے بارہ ایک بجے کا وقت تھا۔

"جب رات کو تمہاری آنکھ کھلی تھی تو تم نے وقت دیکھا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ بارہ بج کے چالیس منٹ ہوئے تھے۔" وہ بولی۔ "میں بارہ بجے کے قریب سوئی تھی۔ کیوں؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی ایسی ہی بات ہے کہ کوئی سمجھ لا آسمنے کا پلا حسن۔ ٹھیک اسی وقت میں نے تم کو دیکھا تھا روتے ہوئے۔ حالانکہ میں تمہارا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔"

رابعہ کے عارض پر محبت کے گلاب کھلے اور اس کی آنکھوں سے اترنے والے شبنم کے دو موتی دو پلکوں پر جھلملانے لگے۔ پھر وہ ہنس پڑی۔ "پھر وہی ہنسی پڑا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں ہم لوگ۔" رابعہ نے کہا۔

"سچی باتیں۔" میں نے کہا۔ اسی وقت آدم و حوا کی جنت میں شیطان بن کے محسن خان وارد ہوئے۔

"اس سے زیادہ سو باتیں میں برداشت نہیں کر سکتا۔" اس نے فلم ڈائریکٹر کی طرح کہا۔ "آپ لوگ رومانٹک کہنے والے تھے۔ میں کوئی ریکارڈ لگا دیتا ہوں۔ آپ اس پر ریہرسل کر لیں گانا چلے گا۔ میں ترا چاند تو مری چاندنی۔"

"ہم شہزادہ سکندر بخت۔ اگر اپنی ریاست میں ہوتے تو ہم نے خیال ہوا ہیں منگوا لیا۔ تو تمہیں اس مداخلت پر آپ کی کھال میں بھس بھروا دیتے جو آپ کے مرغزیں میں بھرا ہوا تحبیب پھپھکے باتیں سنتا ہے ولد شیروانی عرف اچکن۔"

محسن نے خوف مارے کے خود کو بچایا۔ "دیکھئے دیکھیے خان یہ میں تو ٹیلی ویژن پہ اپنی نوید پرستی کم کر رہا تھا۔۔۔۔ آپ بلاوجہ ناراض ہو رہے ہیں۔ آپ دونوں کی گفتگو سے میرا تجسس بڑھا۔"

"اچھا اچھا۔" میں نے کہا۔ "پھر کوئی بات نہیں۔ آگے دیکھیے اور بذریعہ ٹیلی ویژن شملہ سے کہیے۔۔۔ کہیے کہ۔۔۔ بولیے حور میں مشکور خدا کی قدرت۔ اور دیکھیے جواب کیا آتا ہے؟"

"گویا جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ بیان کر دوں؟" محسن بیٹھے ہوئے بولا۔ "کہنے میں یہ آیا تھا کہ انکل جاتے جاتے کچھ فرما گئے ہیں۔ پولیس چالان پیش کر چکی ہے اور کل سماعت باقاعدہ شروع ہو گی۔ اس لیے آج باہر جانا بند۔"

"رابعہ نے مجھے بتا دیا تھا۔" میں نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا۔ پھر بات سنجیدگی سے ہونے لگی۔ اور رابعہ نے بتایا کہ عدالتی طریقہ کار کے مطابق کل کوئی خاص بات نہیں ہوگی۔ چالان کی ایک نقل فراہم کر دی جائے گی اور الزامات کی تردید ہوگی۔

"حبس دوام والے کیس میں کہاں تک پیش رفت ہوئی؟" میں نے کہا۔

"منظر صاحب ملے تھے۔ ایسے ہی بار روم میں سامنا ہوا تھا۔" وہ بولی۔ "کہہ رہے تھے کسی نے اعتراض داخل کیا ہے۔ وہ خود ہی جواب دیں گے آئندہ تاریخ سماعت پر۔"

"تم نے پوچھا نہیں کیسے اعتراض ہے اور کیا اعتراض ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ وہ جلدی میں تھے۔" رابعہ بولی۔ "ظاہر ہے اعتراض کرنے والے وہی تمہارے مہربان ہوں گے یا محض تاخیر کرانے والے ہوتے ہیں۔ حسد کے مارے ہوئے لوگ۔ مقدمہ کچھ نہیں ہوتا انہیں اور اعتراض بھی بے بنیاد ہوتے ہیں چنانچہ ہوتا بھی کچھ نہیں۔ حق تو حقدار کو مل ہی جاتا ہے۔ دو چار مہینے کی دیر معمولی بات ہے۔ یہ بتاؤ تم نے گاڑی تو دے دی رنگ روغن کے لیے۔ واپس کب ملے گی؟ اور رنگ کیا کہا تھا؟"

"میں نے سفید رنگ کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کہ سب سے عام رنگ ہے۔ گاڑی ٹوٹے گی ہفتہ بھر بعد۔"

"مجھے اس کا سرخی فیروزی رنگ ہی اچھا لگتا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"سب لڑکیوں کو سرخ رنگ اچھا لگتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ رنگ حنا اور سہاگ کے جوڑے کا رنگ ہی نہیں لہو کا رنگ بھی ہے۔ خون کسی کا نہیں ہونا چاہیے۔ نہ دل کا نہ ارمانوں کا اور نہ اپنا۔ اس لیے سفید رنگ جو امن کی علامت ہے۔۔۔"

"تم پیر خان سیریس ہو گئے ہو۔" وہ اٹھ کے باہر نکل گئی۔ "اب جو کچھ کہنا ہے وہ ایک دوسرے سے کہو۔"

صبح میں اور محسن بھی رابعہ کے ساتھ ہی کورٹ گئے اور بغوی صاحب کی گاڑی میں ٹھیک نو بجے کورٹ پہنچے تو مجرم بن نظر آنے والا سب سے پہلا چہرہ حشمت خان اور حوالدار بجلی کا تھا۔ حشمت خان کے تیور پہلے جتنے جارحانہ نہیں رہے تھے اور وہ کچھ تائب سا نظر آتا تھا لیکن حوالدار بجلی کا کرنٹ کم نہیں ہوا تھا۔ "مسکن بخت ولد وزیر خان۔ زیر ضمانت۔ ملزم زیر دفعہ تین صفر دو۔ ت۔ حاضر ہے جناب عالی۔" اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنے اعتزاز علی کو رپورٹ دی۔ اور مجھے یوں دیکھا جیسے جلاد گردن دار پر لٹکے ہوئے شخص کو دیکھتا ہے۔

"اوئے دیکھ لیا ہے میں نے تجھ سے پہلے۔" اعتزاز علی نے اپنی فرض شناسی کے مظاہرے کا جواب نہایت حوصلہ شکن لہجے میں دیا۔

"کوئی رشتے داری لے آئے ہو تا حوالدار صاحب جی۔" محسن نے کہا۔ "پھانسی تو بھولا ہی ہوتی ہے۔" اس نے بے تکلفی سے حوالدار بجلی کے کندھے پہ ہاتھ مارا جو صرف وردی ہی وردی تھا۔ حوالدار نے محسن کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"یار تم کو بھی ایسے ہی تنگ وردی ہوتی ہتھکڑی میں۔" محسن اسے چھیڑنے پر مصر تھا۔ "وردی کی ہیبت۔ اگلے دن آملا اور سواد کر دیا۔ بھوجان شان بنا تو اپنے حشمت خان کی طرح۔ کیا عالی شان توند ہے۔ کوئی دیکھے تو سمجھے تربوز چھپا کے جا رہا ہے۔"

"آپ جی۔۔۔ بس آپ خیال کریں۔ اپنا اور ہمارا بھی۔۔۔ منہ مت کھلوائیں۔" غصے سے حوالدار بجلی کا برا حال ہو گیا۔

پھر استاد ڈنگی نمودار ہوا۔ "تم مولا کی سے۔" اس نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ "یہ حوالدار کسی دن اندر ہی اندر غائب ہو جائے گا۔ وردی جھاڑیں گے تو خالی۔" یہ جلتی پہ تیل چھڑکنے کے مترادف تھا۔ حوالدار فوراً وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کی تو جیسے برداشت جواب دے رہی تھی اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ کمینوں کے منہ نہیں لگنا چاہیے۔ روز اول کی طرح اس نے تڑپ کر محسن کے ہاتھ نہ سنبھالا۔ اتنے عرصے میں جو کچھ وہ ہمارے متعلق سن رہا تھا اس سے حوالدار کو اتنا اندازہ تو بخوبی ہو گیا تھا کہ ہم سے عام مجرموں کی طرح پیش آنا اور اپنے فرائض کی بجا آوری میں اختیارات سے تجاوز کرنا خود اس کی ذات کے مفاد میں نہیں۔

سماعت کا آغاز معمول کے مطابق ویسے ہی ماحول میں ہوا جو میں نے اپنے ملک کی عدالتوں میں بارہا دیکھا تھا۔ یہ ماحول انگریزی عدالتوں اور پاکستانی فلموں میں پیش کیے جانے والے ماحول سے یکسر مختلف تھا۔ ایک فرق یہ بھی تھا کہ اس بار میں گواہ تھا نہ تماشائی۔ بلکہ ملزموں کے کٹہرے میں تھا۔ جہاں سے میں پوری عدالت کے منظر کو دیکھ سکتا تھا۔ وکیل استغاثہ اور پبلک پراسیکیوٹر کے ساتھ ہی دو بینچ اور کرسیاں رابعہ قاری اور عبدالودود منظر کے لیے تھیں جہاں سے منظر دوبارہ یہ بتانے آچکا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں اور جہاں میں ہوں وہاں کوئی مجرم ہو تو شرم کی بات ہے ورنہ یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔ مجھ سے پہلے بھی تو بے گناہ محض جرم بے گناہی میں اسی منزل دار و رسن سے سرفراز کر رہے ہیں اور بعد میں بھی کرتے رہیں گے۔ کیونکہ حق و باطل کی یہ جنگ ازلی و ابدی ہے۔ سماعت کی کارروائی دیکھنے کے لیے آنے والوں میں بہت سے چہرے اجنبی بھی تھے۔ اس کیس نے اخبارات میں بڑی شہرت پائی تھی کیونکہ اس میں نچلے طبقے کے یا پیشہ ور قلم کے کردار نہیں تھے۔ یہ ایک صنعت کار کے بیٹے کے ہاتھوں اپنے بزنس پارٹنر کے

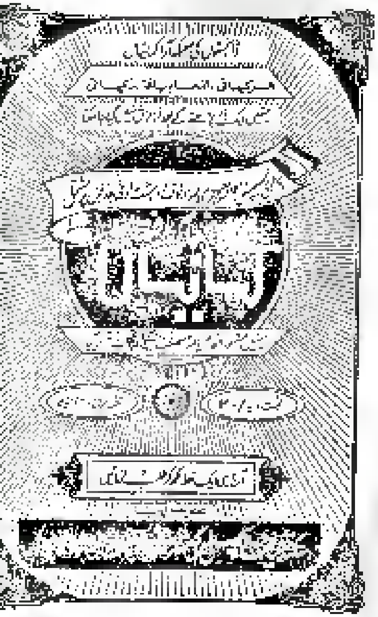

www.paksociety.com

قتل کا کیس تھا۔ جنید قاتل برطانیہ سے آیا تھا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ مقامی ایس ایس پی کا عزیز مشہور تھا۔ رضوی صاحب اسی لیے عدالت سے غیر حاضر تھے۔ اب تک زبان خلق پر میرا اور رابعہ کا نام بھی آگیا تھا اور ان ناموں سے وابستہ افسانے بھی مخصوص حلقوں میں گردش کر رہے تھے۔ پبلک کے لیے دلچسپی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ میں صرف بے گناہ ہونے کا دعوے نہیں رکھتا تھا، یہ الزام بھی عائد کر چکا تھا کہ خود مقتول شرافت علی نے میرے والد کو بلیک میل کیا تھا اور بالواسطہ طور پر ان کے قتل کا ذمہ دار تھا۔ بعد کے واقعات بھی وقتاً فوقتاً اخبارات کی زینت بنتے تھے چنانچہ میں نے اندازہ کیا کہ حاضرین میں مقامی اخباروں کے سب ہی نمائندے ہوں گے جنھوں نے اول سے آخر تک تمام واقعات کو اور خبروں کو شامل کر لیا تھا۔ چنانچہ ان کے نقطۂ نظر سے یہ انتہائی سنسنی خیز مقدمہ تھا۔

حاضرین کی پہلی صف میں کچھ دوست بھی تھے۔ محسن کے ساتھ استاد ڈیڈی بیٹھا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ بالکل آخری وقت میں مسز رضوی اندر آئیں اور ان کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ وہ رضوی صاحب کی پبلک لائف سے دور رہتی تھیں چنانچہ کسی نے ان کو ایس ایس پی کی بیگم کی حیثیت سے شناخت نہیں کیا۔ میں نے واحد لڑکا گرو جیزی کو بھی دیکھا جس نے بڑے حوصلہ افزا انداز میں مسکرا کے مجھے دیکھا اور دو انگلیوں سے "وی فار وکٹری" کا مشہور نشان بنایا۔ میری نگاہیں دوستوں اور نا آشنا چہروں کے درمیان شکاری کی تلاش کر رہی تھیں جن کے پھیلائے ہوئے دام نے مجھے بڑی کامیابی سے اسیر کر لیا تھا۔ اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے کے برعکس اُڑنے نہ پائے تھے زمین پہ گرفتار ہم ہو چکے۔ پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے۔ لیکن مجھے کوئی شناسا صورت نظر نہ آئی۔ اگر ان کا کوئی "رپورٹر" سب کے درمیان بیٹھا تھا تو میری نگاہ اسے شناخت نہ کر پائی۔ مختصر سا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

اچانک دوسری صف میں سے ایک شخص اٹھا۔ وہ تقریباً چالیس سال کا دبلا پتلا اور اوسط قد و قامت کا آدمی تھا جس کی شخصیت کا سب سے نمایاں حصہ اس کے لمبے لمبے بال تھے۔ بے ترتیب اور اس کے شانوں سے ذرا اوپر تک آنے والے سیاہ بالوں میں سفیدی کا عنصر قبل از وقت غالب محسوس ہوتا تھا۔ اس کی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی اور لباس کے معاملے میں بھی وہ خاصی بے توجہی کا شکار تھا۔ جو کرتا پاجامہ وہ پہن کے سویا تھا، اسی میں عدالت آ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اس وقت بھی خواب آلود تھیں۔

"جناب والا!" اس نے پلاسٹک کے سیاہ فریم اور موٹے شیشوں والی عینک کو ناک کے بانسے پہ جھکا کے کہا۔ "میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھے کچھ عرض کرنا تھا۔"

جج نے چشمہ ہٹا کے اسے غور سے دیکھا۔ "آپ کا اس کیس سے کوئی تعلق ہے؟"

"جی۔ بہت اہم تعلق ہے۔" وہ بولا۔ "میں صفائی کا گواہ ہوں۔"

"تو آپ انتظار کیجیے۔ جب گواہی کا مرحلہ آئے گا آپ کو طلب کر لیا جائے گا۔" جج نے کہا۔

"میرا نام صفائی کے گواہوں میں نہیں ہے جناب!" وہ بولا۔

"تو شامل کر لیا جائے گا۔" جج نے پھر چشمہ لگا لیا۔ "بیٹھ جائیں آپ۔"

"میں اس عدالت کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ گزارش کرنے پر مجبور ہوں کہ میرا بیان پہلے ہو جانا چاہیے۔" اس نے کہا۔

"سماعت ایک طریقۂ کار کے مطابق ہوتی ہے مسٹر!" جج نے سختی سے کہا۔

"مجھے اس کا علم ہے یور آنر۔ لیکن مخصوص حالات کے پیش نظر میں گزارش کروں گا کہ اس طریقۂ کار سے تھوڑا سا انحراف کرتے ہوئے میرا بیان ریکارڈ کر لیا جائے۔" اس شخص نے گھورنے والی نظروں کی پروا کیے بغیر کہا۔ اس کا لہجہ پُرسکون، پُراعتماد اور منجھا ہوا تھا۔ میں اور محسن، رابعہ اور منظر سب کی نگاہیں اس پہ مرکوز ہو گئی تھیں جو ہمارا نامعلوم طرف دار تھا۔

"کیوں؟" جج نے پھر چشمہ اتار کے رکھ دیا۔ "کیا ہیں وہ مخصوص حالات؟ مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ صرف تمہارے بیان کے لیے عدالتی طریقۂ کار بدل دیا جائے۔"

"یور آنر میں روزنامہ صدائے وقت کا مدیر اعلیٰ ہوں۔ احمد شہریار۔" اس نے اپنی باٹ دار آواز میں کہا۔ "جو بیان میں دینا چاہتا ہوں وہ میرے نقطۂ نظر سے اس پورے مقدمے کا سب سے اہم بیان ہوگا اور میں عرض کروں کہ اس کا تعلق زندگی اور موت سے ہے تو اس میں کچھ مبالغہ نہیں۔ مزید یہ کہ میرا بیان اور میری پیش کردہ دستاویزی شہادت سے میر شرافت علی کے قتل کے مقدمے کا رخ ہی نہیں بدلے گا، اس سے قتل کے دوسرے کیس کے حالات بھی منظر عام پر آئیں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" جج نے جھنجلا کے کہا۔ "سوال صرف یہ ہے کہ تم اسی وقت مداخلت پہ کیوں مصر ہو؟"

"یہ مداخلت نہیں ہے جناب والا! ضرورت ہے۔" احمد نے کہا۔ "اس لیے کہ مجھے اپنی زندگی کے آنے والے

بھی یقین نہیں، یہ بات میں عام عقیدے یا محاورے کے مطابق نہیں کہہ رہا ہوں۔ اگر یہ معزز عدالت مجھے ضمانت فراہم کر سکے کہ اس کمرے سے باہر نکلنے کے بعد مجھے قتل کر کے میری آواز ہمیشہ کے لیے خاموش نہیں کر دی جائے گی اور مجھے یقین دلا دیا جائے کہ دوسرے وقت آنے پہ جب میری گواہی مطلوب ہوگی تو یہ عدالت مجھے زندہ سلامت پیش کر سکے گی تو میں بیٹھ جاتا ہوں۔"

جب تک عدالت میں اس کی آواز آتی رہی مکمل سکوت رہا جس میں قدیم چھت کے پنکھے کی سرسراہٹ بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ اس کے خاموش ہوتے ہی آوازوں کا مجموعہ سا اٹھا۔ جج نے روایت کے مطابق لکڑی کا ہتھوڑا میز پہ مار کے "آرڈر آرڈر" کہا۔ "مسٹر جمیل احمد! آپ کو کیوں یقین ہے کہ بیان دینے سے پہلے ہی آپ کو قتل کر دیا جائے گا؟" جج نے سوال کیا۔

"اس لیے یور آنر کہ مجھے اس انجام سے خبردار کر دیا گیا ہے۔" جمیل احمد نے کہا۔ "اور میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ صرف دھمکی نہیں دیتے، اس پہ عمل کر کے بھی دکھاتے ہیں۔"

"کون لوگ؟" جج نے کہا جو اب اخبار کے اس ایڈیٹر کی بات سننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ "آپ نے پولیس کو رپورٹ کی تھی؟"

"میں ان کو نام سے نہیں جانتا جناب والا۔ کسی کو صورت سے بھی نہیں پہچانتا۔" جمیل نے کہا۔ "وہ میرے ذاتی دشمن بھی نہیں ہیں لیکن وہ یہ نہیں چاہتے کہ میں اپنی شہادت اس عدالت کے روبرو پیش کروں۔ ان کے خلاف میں رپورٹ کیسے لکھوا سکتا ہوں جناب والا جن کے متعلق میری معلومات صفر ہیں۔ مجھے ان کا نام پتا صورت کچھ معلوم نہیں۔ کیا پولیس رپورٹ درج کر لیتی؟ اور بالفرض محال مجھے ایک اخبار کا ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے رپورٹ لکھوانے میں کامیابی ہو جاتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ میں اس وقت حاضر ہو سکتا؟ محض ایک رپورٹ نے کبھی کسی کی جان بچائی ہے جناب والا؟"

"آل رائٹ۔" جج نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے وہ لوگ آپ کو جانتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ آپ کے پاس کوئی ایسی شہادت ہے جس سے۔ بقول آپ کے۔ مقدمے کا رخ پلٹ جائے گا۔ تو انھوں نے اب تک آپ کو مہلت کیوں دی؟"

"اس لیے جناب والا کہ میں روپوش تھا۔" جمیل احمد نے کہا۔ "میں نے ان کے عزائم کا اندازہ حالات سے کر لیا تھا اس لیے غائب ہو گیا۔ اگر انھیں میرا پتا معلوم ہو جاتا تو وہ مجھے اس عدالت تک ہرگز نہ پہنچنے دیتے۔ میں جانتا تھا کہ میرے لیے اس ملک سے بھاگ جانا آسان ہے اور جس دن میں اپنی گواہی کے لیے عدالت جاؤں گا تو شاید زندہ لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ مگر آج میں میرے لیے اطمینان کا ایک پہلو تھا۔ فرار ہو جانے کی صورت میں یہ بوجھ تمام عمر میرے ضمیر پہ رہتا کہ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے حقائق سے چشم پوشی کی اور وہ بنیادی شہادت فراہم نہیں کی جس سے ایک شخص کی زندگی بچ سکتی تھی۔ میری مراد مسٹر عاصم سکندر بخت سے ہے جسے میں نے آج پہلی بار دیکھا ہے۔ یہ میرے یقین کے مطابق قتل ہوتا۔ موت کا ایک دن معین ہے۔ بے شک کسی کے چاہنے سے کوئی مر سکتا ہے نہ جی سکتا ہے لیکن ضمیر پہ کوئی بوجھ لے کر جینے سے مر جانا بہتر ہے۔ میرے بیان کے بعد اگر وہ لوگ مجھے قتل بھی کر دیں گے تو مجھے اپنے مرنے کا کوئی افسوس نہیں ہوگا۔"

"مسٹر جمیل! مختصر بات کیجیے۔" جج نے کہا۔ "کیونکہ عدالت کا وقت قیمتی ہے۔"

"وقت کبھی انسانی زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتا جناب والا!" وہ بولا۔ "کیا یہ عدالت، وقت کو انصاف کے تقاضوں سے زیادہ اہمیت دے گی؟ طریقۂ کار کو ملحوظ رکھنے کے لیے ایک بے گناہ کو سزائے موت دینا پسند کرے گی؟ ہرگز نہیں۔"

"سوال صرف یہ ہے کہ آپ کو گواہی سے روکنے والے کون ہیں۔ نہ آپ انھیں جانتے ہیں نہ وہ آپ کے بارے میں جانتے تھے کہ آپ کہاں روپوش ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے آپ کو قتل کی دھمکی دی تو کیسے؟" جج نے کہا۔ "انھیں کیسے علم ہوا کہ آپ کے پاس کوئی بے حد اہم دستاویزی شہادت ہے۔ اور اگر مقدمے کا رخ پلٹ جاتا تو ان کا کیا نقصان تھا؟"

"میں معذرت خواہ ہوں یور آنر کہ تمام سوالات کے جواب نہیں دے سکتا۔" اس نے جیب میں سے اخبار کا ایک صفحہ نکالا جسے اس نے تہ کر کے چھپا رکھا تھا۔ "باقی تمام سوالات کا جواب شاید آپ کو سماعت کے دوران میں مل جائے گا۔ میں صرف ایک سوال کا جواب پیش کرتا ہوں تاکہ عدالت کو قائل کر سکوں۔ یہ ایک اشتہار ہے جو ہر سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوتا رہا۔ کسی نے اس کی عبارت یا مفہوم پہ غور نہیں کیا۔ ملاحظہ فرمائیے تازہ ترین اشتہار۔ بنام جمیل احمد صدیقی ولد کفیل احمد صدیقی۔ المعروف بہ پیارے میاں۔ ہمارے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ تم اہم دستاویزات لے کر روپوش ہو گئے ہو جن میں ایک ٹیپ بھی شامل ہے۔ تمھیں خبردار کیا جاتا ہے کہ کوئی غلط قدم اٹھانے کے نتائج انتہائی سنگین ہوں گے جن کے ذمے دار تم خود ہو گے۔"

کچھ دیر عدالت میں مچھلی بازار کا سماں رہا۔ کسی نے جج کے ہتھوڑے اور "آرڈر۔ آرڈر" پکارنے کی پروا نہیں کی۔ اخبار کا وہ صفحہ رابعہ سے ہوتا ہوا منظر کے ہاتھوں میں اور پھر جج تک

www.paksociety.com

پہنچی۔ جمیل احمد اب بیٹھ گیا تھا اور اسے قطعی پروا نہیں تھی کہ اس مجمع عام میں جو اس کے چاروں طرف موجود ہے کوئی بھی شخص اسے اس وقت بھی قتل کر سکتا تھا مگر عدالت کے کمرے میں قتل کے امکانات عملاً معدوم ہوتے ہیں اور احساس چار دیواری میں تحفظ کا احساس غالب رہتا ہے۔ مجھے اس شخص کی جرأت، ہمت نے بے باکی اور بے خوفی نے اور ضمیر کی آواز سنوانے کے اٹل فیصلے پر قائم رہنے کی مستقل مزاجی نے حیران کر دیا تھا۔ یہ تو وہ خود ہی بتا چکا تھا کہ پہلے مرنے جینے کی فکر سے اپنے فرض سے سبکدوشی بہتر جانتا تھا کہ اس کے بعد نہیں ہوگی اور جس طرح اس نے عدالتی کارروائی روک کر اپنے بیان اور دلائل دیے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سب سے پہلے اپنی کہنے آیا ہے تو اپنی کہہ کر ہی جائے گا۔ عدالت کے لیے وہ صفائی کا ایک اہم گواہ تھا لیکن میرے لیے وہ فرشتۂ غیب جس کی آمد کا مجھے انتظار تھا اور میرا نادیدہ محسن تھا جس نے میری زندگی بچانے کو اپنا مشن بنا لیا تھا اور بیش بہا گرانمایہ جان تھا تو اسے پروا نہ تھی۔ جس درجے کو کوئی قاتل مل گیا وہ شان سلامت رہتی ہے۔ یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی تو کوئی بات نہیں۔

عدالت کا اجلاس آدھے گھنٹے کے لیے ملتوی ہو گیا تھا۔

جج نے رابعہ اور منظر کے ساتھ ہی استغاثہ کے وکیلوں کو بھی چیمبر میں مشورے کے لیے طلب کیا تھا اور محسن نے جمیل صدیقی کو آگے اپنے اور استغاثہ کی کے درمیان بلا لیا تھا۔ محسن کے ساتھ مجھے اکرام شیخ نظر آیا جو شاید جمیل صدیقی کی بحث کے دوران پہنچا تھا۔ پھر میں نے نائلہ کو دیکھا اور نہ جانے کیوں مجھے دکھ ہوا کہ بیٹا والی لڑکی گرد و پیش سے بے نیاز آنکھیں بند کیے جذباتی وابستگی کے اس راستے پر آگے بڑھتی جا رہی ہے جس پر بیٹا اس کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ اس فریب آرزو کا انجام دل شکستگی تھا جو خواہشوں کے سراب کی جستجو میں سرگرداں اس لڑکی کے لیے منزل نقطۂ بے مراد واپسی کا تنہا اور پُر آزار سفر تھی لیکن یہ بات وہ نہیں سمجھتی تھی اور سمجھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی کہ میں اس کو یہیں روک کر کہہ سکتا کہ لوٹ جاؤ۔ مگر کیا میرے کہنے سے وہ اپنی امیدوں کی شکست قبول کر لیتی اور خالی دامن و تہی دست لوٹ جاتی؟ اپنے خوابوں سے دستبردار ہو جاتی اور اپنے ارمانوں کو اس نوزائیدہ بچے کی طرح دفن کر دیتی جس کا وجود سند رسوائی ہو۔ دل کو بہلا کے تھپک کے سلا دیتی کہ نہیں کوئی نہیں۔ راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا۔

میں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ یہ احساس مجھے جج کے دوبارہ آنے پر ہوا لیکن نائلہ و میری نظر کے اشارے کا غلط مطلب نکال چکی تھی۔ اب میں اسے کیا بتاتا اور کیسے بتاتا کہ میں تو اسے دیکھ ہی نہیں رہا تھا اور تصور صرف آنکھوں کا سپنا تھا جو کی جانب دیکھتی رہیں جب کہ میرے خیالات منتشر اور سوچ پریشان تھے۔ رابعہ نے مجھے دیکھ کے سر ہلایا اور منظر نے مسکرا کے باقاعدہ آنکھ ماری۔

"مسٹر جمیل احمد صدیقی!" جج نے کہا اور صدیقی صاحب کھڑے ہو گئے۔ "اگرچہ آپ شواہد و دلائل سے عدالت کے سامنے نظر حالات کا جواز پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں اور یہ ثابت نہیں کر سکے کہ محض اپنے بیان کی پاداش میں آپ کو نامعلوم افراد کے ہاتھوں مارے جانے کا خطرہ ہے لیکن وکیل صفائی نے نہایت تفصیل سے وضاحت کی چنانچہ یہ عدالت آپ کو اپنا بیان ریکارڈ کرانے کی خصوصی اجازت دیتی ہے۔"

"جناب والا!" وکیل استغاثہ نے اعتراض اٹھاتے ہوئے کہا۔ "بلکہ عدالتی طریقہ کار سے انحراف کا کوئی جواز نہیں ہے جیسا کہ آپ نے خود فرمایا۔ تو اس مرحلے پر یہ شہادت انصاف کے تقاضوں کے خلاف اور ملزم کو خصوصی رعایت دینے کے مترادف ہے۔"

"گواہ ایک معتبر اور معزز شخص ہے۔" جج نے کہا۔ "اس نے یہ درخواست بقائمی ہوش و حواس کی ہے۔ چنانچہ عدالت یہ کہنے پر مجبور ہے کہ اس کے خدشات بے بنیاد نہیں۔ اگر مناسب تحفظ فراہم نہ ہونے کے باعث ایک ایسی شہادت پیش ہونے سے رہ گئی جس پر ایک انسان کی زندگی یا موت کے فیصلے کا انحصار ہے تو یہ نقصان ناقابل تلافی ہوگا۔ صدیقی صاحب، آپ گواہوں کے کٹہرے میں آ سکتے ہیں۔"

جمیل احمد صدیقی نے مروجہ حلف اٹھایا اور بیان جاری کیا۔ "حضور والا! جو کچھ میں عرض کروں گا اس کا پہلے ہی تحریری صورت میں اس عدالت کے ریکارڈ پر ہے۔ میری مراد اے ایس آئی اکرام شیخ کے ایک بیان سے ہے جس کے ساتھ تھانے کے محرر کے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک اقبالی اعتراف نامہ شامل ہے۔ یہ استغاثہ کے ایک چشم دید گواہ عبدل کا وہ بیان ہے جو اس نے مرنے سے پہلے ٹیلی فون کر کے لکھوایا تھا کیونکہ مرحوم عبدل کے پاس خود تھانے حاضر ہو کے بیان دینے کے لیے وقت نہیں تھا اور اس کی جسمانی قوت جواب دے چکی تھی۔ وہ شیدے نام کے ایک شخص کو قتل کر چکا تھا جو استغاثہ کا دوسرا عینی گواہ تھا لیکن اس جھگڑے میں وہ خود بھی مہلک طور پر شدید زخمی ہوا تھا۔"

"مجھے اس پر اعتراض ہے جناب والا!" وکیل استغاثہ

نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "معزز گواہ کو ان واقعات کا علم کیسے ہوا؟"

جمیل صدیقی مسکرایا۔ "اول تو یہ سماعت پہلے بھی کھلی عدالت میں ہو چکی ہے چنانچہ کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ اس کے علاوہ میں ایک اخبار کا مدیر ہوں جس کو گرد و پیش کے واقعات کی خبر عام آدمی سے زیادہ ہوتی ہے۔ تیسری بات یہ کہ اے ایس آئی اکرام شیخ خود عدالت میں موجود ہیں۔ اگر میں غلط بیانی کروں تو انہیں تصدیق کے لیے طلب کیا جا سکتا ہے۔"

"میں آپ کا اعتراض مسترد کرنے پر مجبور ہوں۔" جج نے کہا۔ "بیان جاری رکھیے صدیقی صاحب!"

"شکریہ جناب والا!" جمیل نے کہا۔ "اے ایس آئی اکرام شیخ نے بتایا تھا کہ ٹیلی فون پر موصول ہونے والے عبدل کے بیان کو صرف محرر نے ہی نہیں لکھا تھا خود انہوں نے تھانے میں موجود ایک ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ کر لیا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر مال مسروقہ تھا۔ بعد میں ٹیپ ریکارڈر میں لگا ہوا اسپول پُراسرار طور پر غائب ہو گیا۔ اور ایک مقتول انسپکٹر میر محمد نے مشیر نامے کی رُو سے ثابت کیا کہ اس ٹیپ ریکارڈر میں کوئی اسپول نہیں تھا۔ شاید عدالت کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ کچھ عرصے بعد وہ محرر بھی چل بسا جس نے اپنے ہاتھ سے عبدل کا بیان ٹیپ سے کاغذ پر اتارا تھا۔ محرر کی گمشدگی کے متعلق پندرہ دن بعد تھانے میں ایک رپورٹ کرائی گئی جو محرر کی بیوی نے درج کرائی تھی۔ اس خبر کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے جناب والا کہ متعلقہ تھانے والوں نے محرر کی بیوی کی رپورٹ درج کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے تو ہم کیا کریں۔ اس عورت نے میرے اخبار کے ایک رپورٹر کی مدد سے ڈی آئی جی صاحب کو درخواست دی اور انہی کے حکم پر رپورٹ لکھی گئی مگر محرر کا ابھی تک کوئی پتا نہیں۔ ان حالات کا محض ذکر کر کے میں یہ دکھا سکتا ہوں کہ اس کی تحریر کی صداقت کو چیلنج کیا جائے گا۔ نہ وہ خود موجود ہے کہ اے ایس آئی اکرام شیخ کے بیان کی تائید کر سکے اور مقتول ایس ایچ او ٹیپ کی عدم موجودگی کا دستاویزی ثبوت پہلے ہی پیش کر چکا ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس ٹیپ ریکارڈر میں ٹیپ موجود تھا لیکن مشیر نامہ تیار کرتے وقت صرف اہم تفصیلات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ مثلاً مال مسروقہ کے کوائف کے طور پر ٹیپ ریکارڈر لکھا گیا اور میکر یعنی بنانے والی کمپنی کا نام، میرے خیال میں گرنڈگ تھا۔ اس ٹیپ ریکارڈر کا ماڈل نمبر لکھا جانا چاہیے تھا ورنہ گرنڈگ کمپنی کے بہت سے نئے پرانے ماڈل مستعمل ہیں۔ البتہ TK-747 ایسا ماڈل ہے جو ٹیلی فون سے منسلک ہو جائے تو موصول ہونے والے پیغامات ریکارڈ کر سکتا ہے۔ ایسی ہی ایک ضروری تفصیل یہ تھی کہ ٹیپ ریکارڈر میں لگے ہوئے اسپول کا ذکر کیا جاتا۔ بلکہ اس کا سائز بھی درج کیا جاتا۔ یہ حذف کیا گیا یا محض بے پروائی کے باعث۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا لیکن مقتول ایس ایچ او نے عدالت کے روبرو جیسا سنتے ہیں جھوٹ بولا۔ حقائق کو چھپایا اور بنیادی شہادت کو ختم کرنے کی کوشش کے جرم کا ارتکاب کیا۔"

"اعتراض یور آنر!" وکیل استغاثہ نے کہا۔ "ایک مقتول ایس ایچ او پر اس نوعیت کے سنگین الزامات عائد کرنا اخلاقاً اور قانوناً غلط ہے کیونکہ وہ ان کی تردید کے لیے پیش نہیں ہو سکتا۔"

"اس کی ضرورت نہیں یور آنر!" جمیل احمد صدیقی نے کہا۔ پھر اس نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کے گتے کا ایک ڈبا برآمد کیا جو ساڑھے آٹھ انچ مربع اور موٹائی میں نصف انچ کے قریب تھا۔ "یہ بی اے ایس ایف کا وہ اسپول ہے جناب والا جو ٹیپ ریکارڈر میں فٹ تھا۔ یہ چھ انچ سائز کا اسپول ہے۔ گتے کا ڈبا اس کے ساتھ نہیں تھا۔ یہ میں نے ٹیپ کی حفاظت کی خاطر خود فراہم کیا تھا۔ اس پر عبدل کا پورا بیان اس کی اپنی آواز میں موجود ہے جو اس نے مرنے سے پہلے دیا تھا چنانچہ قانوناً اس کی صداقت مسلّم ہے۔"

عدالت میں پھر ایک شور بپا ہوا۔ جج کے ریڈر نے ڈبا لے کر بڑی احتیاط سے جج کے سامنے رکھ دیا۔ میرے جسم کا رُواں رُواں مسرت سے سرشار ہو گیا اور میرا سر اس شخص کے لیے تعظیم سے جھک گیا جس نے عملاً ثابت کر دیا تھا کہ حق گوئی و بے باکی آئین جواں مرداں۔ جس نے بتا دیا تھا کہ دنیا اب بھی ان لوگوں سے خالی نہیں جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں اور دوسروں کے لیے مر بھی جاتے ہیں۔ جج نے کئی بار میز پر ہتھوڑا بجایا۔ اس سنسنی خیز اور ڈرامائی انکشاف نے عدالت میں دھماکا کر دیا تھا اور واقعی مقدمے کا رُخ بدل دیا تھا۔

"مسٹر جمیل احمد صدیقی!" جج نے خاموشی ہو جانے کے بعد کہا۔ "قانون کی مدد کے لیے آپ نے جس مستقل مزاجی اور دور اندیشی کا ثبوت دیا، عدالت اس کی قدر کرتی ہے۔"

"ابھی اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے جناب عالی کہ یہی وہ ٹیپ ہے۔" وکیل استغاثہ نے احتجاج کیا۔

"مجھے اس اعتراض کے اٹھائے جانے کی توقع تھی یور آنر!" جمیل احمد صدیقی نے کہا۔ "چنانچہ میں نے اپنے فراہم کردہ ثبوت کو حتمی اور ناقابل تردید بنانے کا بھی پورا بندوبست کر لیا تھا۔ اے ایس آئی اکرام شیخ میری اور اس معزز عدالت کی مدد کے لیے ویسا ہی ایک ٹیپ ریکارڈر لے کر آئے ہیں۔ میں استدعا کروں گا

www.paksociety.com

کہ مقتول عبدل کا یہ آخری بیان مدعی اور مدعا علیہان کے سامنے سنوا دیا جائے۔ اور اسے بطور عدالت کی تحویل میں اور اس کے ریکارڈ پر لے لیا جائے۔"

"مجھے یہ ٹیپ ریکارڈر پیش کرنے کی اجازت ہے یور آنر؟" اے ایس آئی اکرام شیخ نے کھڑے ہو کر کہا۔

"بیان زیادہ طویل نہیں ہے۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "اور اس کی ابتدائی باتیں واضح ہو جانے کے بعد عدالت پندرہ بیس منٹ کے مختصر وقت کا زیاں قرار نہیں دے گی۔"

جتنی دیر میں اکرام شیخ نے ٹیپ ریکارڈر کو جج کے سامنے میز پر رکھا اور اس کا پلگ لگایا، عدالت میں ایک ہلچل مچی رہی۔ ہر شخص آگے آ کے ٹیپ کا ہر لفظ سننے کے لیے بے تاب تھا۔ خصوصاً اخباری نمائندے۔ وہ اب پنسل اور پیڈ لیے اس بیان کا ایک ایک لفظ لکھنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ پنگے میرے قریب نہیں تھا مگر یہ بات یقیناً اکرام شیخ کے ذہن میں بھی تھی چنانچہ وہ خاص طور پر لیڈ لے کر آیا تھا جس سے ٹیپ ریکارڈر کو آخر بیچ گز دور سوئچ میں لگا دیا گیا۔ جج نے اس دوران میں کئی بار میز کو ہتھوڑے سے بجایا اور آرڈر آرڈر پکارا لیکن خاموشی اسی وقت ہوئی جب اکرام شیخ نے ٹیپ ریکارڈر میں ٹیپ فٹ کیا اور ٹیپ ریکارڈر کی ایک سرخ آنکھ جیسی روشنی "جوشیلا منتظر" پکارنے لگی۔ میں نے اشارے سے رابعہ کو اپنی طرف بلایا۔

"محسن سے کہو ذرا انکل رضوی کو فون کرے۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "ٹیپ ہم سن رہے ہیں۔ وہ انکل کو بتا دے کہ یہاں کیا صورت حال درپیش ہے۔ وہ جمیل احمد صدیقی کو بحفاظت عدالت سے باہر لے جانے اور گھر تک پہنچانے کا ایسا انتظام کر سکتے ہیں کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ پندرہ بیس منٹ ٹیپ چلے گا۔ ممکن ہے جمیل احمد صدیقی کا بیان بعد میں بھی چلے۔"

"یور آنر!" اکرام شیخ نے ٹیپ کو ایک جگہ روک کر جج کو مخاطب کیا۔ "عبدل کا تیلی فون موصول ہونے کے بعد میں ابتدائی گفتگو کا کچھ حصہ ریکارڈ نہیں کر سکا تھا کیونکہ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ہونے کے بعد میں نے فوراً اس ٹیپ ریکارڈر سے فائدہ اٹھایا جو برآمد شدہ... مالِ مسروقہ میں شامل تھا اور عبدل سے درخواست کی کہ وہ ساری بات پھر کہے چنانچہ اس نے دوبارہ بات شروع کی۔"

میں نے رابعہ کو محسن کے پاس جا کے آہستہ سے کچھ کہتے اور محسن کو دبے پاؤں باہر جاتے دیکھا۔ اسی وقت ٹیپ ریکارڈر سے ایک آواز ابھری جو بے وجود ہو چکی تھی مگر برقی مقناطیسی ارتعاشات کی صورت میں زندہ تھی۔

"جناب تھانیدار صاحب! میں عبدل بول رہا ہوں... میرا نام عبداللہ... باپ کا نام منشی ہدایت علی... شرافت علی مرحوم کا پرانا ملازم ہوں... مجھ سے پہلے میرا باپ منشی اس خاندان کا نمک خوار تھا... اور دوست احباب کے حلقے میں وہ نجومی کہلاتا تھا۔ شرافت علی کو قتل کر دیا گیا تھا اور اس کا الزام وزیر خان کے بیٹے سکندر بخت پر ہے۔ اس کے خلاف میں نے بھی گواہی دی تھی اور شیدے نے بھی۔ شیدا دراصل... رشید ہے۔ اسے ملازم ہوئے دو سال بھی نہیں ہوئے تھے اور وہ شرافت علی کا ڈرائیور تھا۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ... سکندر بخت نے... ہاتھے شرافت علی کو مارا... اور اس کے سر پر ہی سامان توڑ پھوڑ کر تباہ کیا کیونکہ... وہ بہت غصے میں تھا اور شرافت علی پر چلا رہا تھا کہ اس نے وزیر خان کو... بلیک میل کیا... اور قتل کرا دیا... میں نے شرافت علی کو سکندر کے سامنے... گھٹنوں کے بل بیٹھ کے رحم کی بھیک مانگتے بھی دیکھا تھا... لیکن خدا گواہ ہے... میں نے سکندر کو قتل کرتے نہیں دیکھا تھا... یہ بات صرف شیدے نے اپنے بیان میں کہی تھی... آج بھی اپنی ماں کے مجبور کرنے پر میں سکندر بخت کو بلانے گیا تھا... معلوم نہیں کیوں میری ماں اس سے ملنا چاہتی تھی... میں یہ جانتا ہوں کہ وزیر خان کی اور میرے باپ منشی کی دوستی تھی... پاکستان بننے سے پہلے سے... سکندر میرے ساتھ اکیلا نہیں آیا... اس نے اپنے دوست کو بھی ساتھ لیا... اور آنے سے پہلے اس نے رضوی صاحب کو بھی بتا دیا تھا۔ انہوں نے بھی مجھ سے کچھ سوالات کیے تھے... اور سکندر سے بھی کہا تھا کہ جاؤ... تمہاری حفاظت کا انتظام میں کر دوں گا۔ میری ماں نے سکندر کے آنے کے بعد مجھ سے کہا کہ میں باہر چلا جاؤں... وہ سکندر سے کوئی راز کی بات کہنا چاہتی تھی۔ لیکن مجھے جب معلوم ہوا کہ اس نے چپکے سے سکندر کو کچھ دے دیا، کیونکہ سکندر جب آیا تھا تو خالی ہاتھ تھا لیکن وہ جانے لگا تو اس کے پاس ایک بریف کیس تھا... یہ بات میں نے شیدے کو بتائی... ہم... نے مل کر سکندر کو روکنے کی اور اس سے بریف کیس

چھیننے کی کوشش کی... مگر وہ نکل گیا... کیونکہ اس کا دوست سا تھی فائر کی آواز پر آ گیا تھا... شیدا مجھے گالیاں دینے لگا... کہ تیری بے وقوفی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ تجھے کیا ضرورت تھی وہاں سے نکلنے کی... اور نکلا ہی تھا تو چھپ کر دیکھتا... اس نے میری ایک نہیں سنی... کہ میں نے پہلی کوشش کی تھی... پھر وہ میری ماں سے پوچھنے لگا... کہ اس نے سکندر بخت کو کیا دیا ہے... میری ماں اندھی تھی۔ تھانیدار صاحب... اور بہت بوڑھی تھی... مگر اس نے شیدے کو کچھ بتانے سے انکار کر دیا... شیدا گرم ہو گیا اور اس نے میری ماں کو گالی دی... میں نے اسے منع کیا تو وہ اور بھڑک گیا... وہ میری ماں کو میرے سامنے مارنا چاہتا تھا... اور پھر وہ سمجھ گیا اس سے... معلوم کرنا چاہتا تھا کہ... سکندر کیا... کیا لے گیا ہے... یہ میں کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ میں بہت بڑا ہوں... بڑا گنہگار ہوں... میری ساری عمر برے کاموں میں گزری ہے... لیکن اچھا ہو یا برا... ماں تو ہر بیٹے کے لیے ایک ہی جیسی ہوتی ہے تھانیدار صاحب... میں نے شیدے کا مقابلہ کیا... لیکن اس سے پہلے وہ مجھے گولی مار چکا تھا... مجھے معلوم ہے اب میں بھی مر جاؤں گا... میری ماں اس لڑائی سے پہلے ہی مر گئی تھی... اور میرا باپ بہت پہلے قتل کر دیا گیا تھا۔ اب میں اپنے ماں باپ کو اور شرمندہ نہیں کروں گا... میں بہت نا خلف تھا... ان کو بہت دکھ دیے میں نے... لیکن مرنے سے پہلے وہی کروں گا... جو وہ کرنا چاہتے تھے... میں سکندر پر کسی اور قتل کا الزام نہیں لگنے دوں گا... آپ جلدی آئیں۔ گئے مجھے کوئی سواری نہیں ملے گی... لیکن وہ مجھے لہولہان دیکھ کر بھاگ جائے گا... میں تھانے نہیں آ سکتا۔ میں شرافت علی کی کوٹھی کے اندر فون سے...

ٹیپ یکلخت خاموش ہو گیا۔ مکمل سکوت میں صرف اس کے اسپیکر کی ہلکی سی سرسراہٹ باقی رہ گئی تھی۔ عبدل کے ساتھ ہی عبدل کا بیان ختم ہو گیا تھا لیکن ایک سچائی ناقابل شکست بنیادوں پر استوار ہو چکی تھی۔ اکرام شیخ نے ہاتھ بڑھا کے ٹیپ کو آف کر دیا۔ پھر وائنڈ کیا اور نکال کے جج کے سامنے رکھ دیا۔ مہر بلب اور ساکت و صامت بیٹھے لوگوں کی صورت قابلِ دید تھی۔ وہ خوف، حیرت، تجسس، تحیر اور واقعات کے اس نئے موڑ کی سنسنی خیزی سے سانس روکے بیٹھے تھے۔ ٹیپ ختم ہوا تو آہستہ آہستہ انہیں کمرۂ عدالت میں اپنی موجودگی کا احساس ہوا۔ سرگوشی میں کی جانے والی باتوں کا شور رفتہ رفتہ بلند ہونے لگا۔ رابعہ اور عبدالودود منظر نے مسرت سے میری طرف دیکھا اور منظر نے عادتاً مجھے آنکھ ماری۔ اکرام شیخ اب تار نکال کے لپیٹ رہا تھا۔ اس کی بہن کا چہرہ یوں کھل اٹھا تھا جیسے مقدمہ کی سماعت ختم ہو چکی ہے اور عدالت نے مجھے باعزت طور پر بری کر دیا ہے۔

"مسٹر صدیقی! آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟" جج نے ایک بار پھر شور ہنگامے پر قابو پا کے کہا۔

"یس سر!" جمیل احمد نے کرسی سے اٹھ کے کہا۔ "جو لسٹ وہیں فراہم کر دی گئی تھی۔" ابھی تو میں نے ان معاملات سے متعلق کچھ کہا ہی نہیں جن کا تعلق مجھ سے ہے۔ میں سکندر بخت کو نہیں جانتا۔ کسی عبدل سے واقف نہیں اور میں نے صرف شرافت علی کا نام سنا تھا اور بعد میں اسے دیکھا تھا۔ قتل ہر روز ہوتے ہیں اور ان کے اسباب زر، زمین اور زن سے بڑھ کر کہیں زیادہ ہو گئے ہیں۔ میں ان کی خبریں چھاپتا تھا اور بھول جاتا تھا۔ اس کیس میں بھی میری کوئی ذاتی دلچسپی نہیں تھی اور سکندر بخت قاتل ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ عدالت ہی کرے گی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بہت سے مجرم کسی نہ کسی طرح قانون کی گرفت میں آنے سے رہ جاتے ہیں لیکن میرا یہ عقیدہ ہے کہ وہ سزا سے نہیں بچتے۔ اس دنیا کی ہر عدالت مطلقہ سے بڑی عدالت اوپر ہے جس کے سامنے "حقائق" واقعات اور شہادت کسی کو مسخ نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو اس دنیا کی عدالت سے سزا نہ پا کے سمجھتے ہیں کہ وہ بچ گئے وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ کیونکہ اس عدالت کی دی ہوئی سزا انہیں زیادہ سخت ہوتی ہے اور اس کے خلاف اپیل کوئی نہیں۔" اس نے اوپر انگلی اٹھا کے کہا۔ "کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود آج میں اس کیس میں بطور گواہ پیش ہونے پر مجبور ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا یہ عمل خود میری زندگی کے لیے پُرخطر ہے۔ یہ ٹیپ میرے پاس دو بچے لے کر آئے تھے۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ دونوں بچے مجھے تلاش کرتے ہوئے میرے اخبار کے دفتر پہنچے تھے۔ میں آفس میں موجود نہیں تھا چنانچہ ان کی ملاقات ایک مزاحیہ کالم نگار سے ہوئی جس کا نام مست قلندر تو نہیں ہے مگر وہ اسی قلمی نام سے فکاہیہ کالم لکھتا تھا۔ آپ نے پچھلے سال کے اخبارات میں ملاحظہ کیا ہو گا کہ کس طرح دن دہاڑے کچھ لوگوں نے 'صدائے وقت' کے دفتر پر حملہ کیا۔ بظاہر وہ طلبہ کا ایک گروہ

www.paksociety.com

تھے جو کسی خبر کے خلاف احتجاج کرنے آتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے جناب والا کہ انہوں نے مست قلندر سے ہی ٹیپ مانگا تھا۔ وہ دبلا پتلا کمزور سا آدمی جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتا تھا تو ایوان اقتدار میں بیٹھنے والوں کے قول و فعل کی پوسٹ مارٹم رپورٹ لکھ مارتا تھا اور اس کے قلم کی کاٹ سے اقتدار شاہی کے بڑے بڑے مُہرے پٹ جاتے تھے لیکن ان غنڈوں پر ہاتھ اٹھانا اس کے بس کی بات نہیں تھی جو لاقانونیت کو اپنا قانون سمجھتے تھے۔ انہوں نے مست قلندر سے پوچھا کہ ٹیپ کہاں ہے اور وہ دونوں بچے کہاں ہیں لیکن اس نے جبر کی طاقت کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا "تم مجھے صرف قتل کر سکتے ہو۔ قتل تو لوگ ہر روز ہوتے ہیں۔" یہی اس نے مجھ سے کہا تھا جناب والا۔ اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ سب لوگ ایک ہی طرح نہیں مرتے۔ کوئی بھی نہیں جان سکتا کہ وہ کب، کہاں اور کس طرح دنیا سے جائے گا۔ اب اگر سرنوشت تقدیر یہی ہے تو اس سے لڑنا میرے اختیار کی بات نہیں۔ ہاں مجھے اپنے قول و فعل پر پورا اختیار ہے اور اس کا حق تم مجھ سے اس وقت تک نہیں چھین سکتے جب تک اجل کا نامہ بر آ کے دستک نہ دے۔ مست قلندر تیری زندگی کا یہ فلسفہ ہے تو پورا ہوا۔ میں تم کو نہیں بتاؤں گا کہ اس ٹیپ کی اصل کہاں ہے اور نقل کہاں ہے۔ مرتے دم تک وہ اپنی بات پر قائم رہا اور وہ لوگ بہت مایوس ہوئے جو قتل کو دھمکی سمجھتے تھے۔ اس نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تم لوگ مجھے قتل کر سکتے ہو۔ خبر آپ نے پڑھ ہی لی ہوگی۔ آپ تعزیتی بیانات، احتجاجی بیانات، مذمتی قراردادیں۔ مجرموں کو قرار واقعی سزا دینے کے مطالبے سب پڑھ چکے ہوں گے۔ یہ رسم دنیا ہے جسے نبھانے والوں نے پسِ مرگ خوب نبھایا۔ عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن۔ یہ الگ بات ہے دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔ جذباتی ہو کے عدالتی بیان میں شاعری کہنے آیا۔ کہنا مجھے یہ تھا جناب والا کہ جو خبر کہیں شائع نہیں ہوئی اور کسی نے نہیں پڑھی وہ کچھ اور تھی۔ مست قلندر مر گیا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ اسے مارنے والے ٹیپ کی نقل تلاش کر کے لے جانے میں بھی کامیاب ہو گئے مگر وہ اصل کو اس عدالت تک پہنچانے کے مشن کو ناکام بنانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ مست قلندر کو امید نہیں تھی کہ اس بیسویں صدی کے مہذب معاشرے میں بھی قانون کو اتنا بے بس سمجھنے والے ہیں جو ایک ٹیپ کی خاطر ایک زندگی لے سکتے ہیں ورنہ وہ دو نقلیں بنوا لیتا اور دونوں ان کے حوالے کر دیتا۔ ممکن ہے وہ لوگ اسے بخش جاتے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اسے پہلے ہی مرنا تھا سو وہ مر گیا۔ لیکن مارنے والوں کو پھر بھی شکست ہوئی اور میں نے وہ ٹیپ عدالت کے سپرد کر دیا ہے لیکن ان حالات میں کیا میرے خدشات کو بے بنیاد اور بے جا کہا جا سکتا ہے؟ کیا اس صورت میں یہ ٹیپ کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے بعد میں نے خود اپنے لیے سزائے موت قبول نہیں کر لی ہے۔ میں اس ہستی کی خاک پا بھی نہیں جس نے ہر آزمائش ہر مصیبت کو سجدۂ شکر کے ساتھ قبول کیا۔ میں تو سقراط ہونے کا دعویٰ بھی کروں تو خدا مجھے اس عزم پر رسوا کرے۔ یہ ٹیپ میرے پاس ایک امانت تھا اور کیوں تھا؟ اس کہانی کا زیرِ سماعت مقدمہ سے کوئی تعلق نہیں چنانچہ میں اس کو حذف کرتا ہوں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اس بار امانت سے سبکدوش ہوا۔"

"مسٹر صدیقی!" جج نے نرمی سے کہا۔ "یہ ٹیپ آپ کے پاس کیسے پہنچا اور وہ بچے کون تھے جن کا آپ نے ذکر کیا ہے؟"

"جناب والا! مست قلندر مرحوم نے بڑی عجلت میں یہ ٹیپ کی ایک نقل بنا کے اوریجنل ریکارڈ میں رکھوا دی تھی۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "اور ان بچوں کو اصل سمیت میرے حوالے کر دیا تھا۔ وہ بچے مقتول انسپکٹر امیر محمد کے تھے۔ آپ کے علم میں یقیناً ہوگا کہ اسے قتل کرنے والے ابھی تک گرفتار نہیں ہوئے ہیں۔ انہی لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ امیر محمد کی بیوی کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔"

"سوال یہ ہے صدیقی صاحب کہ وہ بچے آپ کے پاس ہی کیوں پہنچے؟" جج نے کہا۔ "وہ پولیس اسٹیشن کی حدود میں رہتے تھے اور ان کے لیے وہیں پناہ لینا زیادہ آسان تھا۔"

"یہ ان کی ماں نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ تھانے نہ جائیں۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "شاید اس لیے کہ تھانے کو وہ ان کی جگہ سے دور نہیں سمجھتی تھی جو اس کے گھر میں داخل ہو کے اس کے اور توڑ پھوڑ کے جرم کے مرتکب ہوتے تھے۔ وہ بچے بہت چھوٹے ہیں جناب والا! یہ خود ان باتوں کو نہیں سمجھتے کہ لوگ قتل کیوں کرتے ہیں اور جب باپ گھر میں نہ ہو تو ماں کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیوں کرتے ہیں۔ انہوں نے مست قلندر مرحوم کو بھی بتایا تھا اور مجھے بھی کہ ان کے ابو کہیں گئے ہوئے تھے اور گھر میں صرف ان کی ماں تھی۔ ایک دبلی پتلی کمزور عورت۔"

"کیا آپ نے اسے دیکھا تھا؟" جج نے کہا۔ "آپ کی کوئی عزیزہ تھی وہ؟"

"عزیزہ؟" جمیل صدیقی نے یہ لفظ یوں دہرایا جیسے اس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ "جی ہاں۔ وہ عزیزہ تھی۔۔۔ بے حد

عزیزہ تھی جسے اور میں نے اسے دیکھا تھا۔ یہ قصہ ہے جب کا میں ابھی جوان تھا۔ آئی ایم سوری۔ مجھے بات مختصر کرنی چاہیے اور ٹو دی پوائنٹ۔ ان بچوں نے مجھے بتایا کہ وہ اسکول سے واپس آ کے کھانا کھا رہے تھے جب دروازے پر دستک ہوئی اور ان کی امی نے یہی کہا کہ شاید امیر محمد لوٹ آیا ہے۔ میں امیر محمد کے کردار پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ اس کے فرائض کی نوعیت البتہ ایسی تھی کہ وہ بعض اوقات دن رات گھر سے باہر رہتا تھا۔ اگر مسلسل غیر حاضر رہتا ہو تو یہ بھی ممکن ہے۔ دروازہ کھلتے ہی دو افراد اندر آ گئے جن کے متعلق بچوں نے بتایا کہ وہ بہت طاقتور تھے اور ان کی ماں کے مقابلے میں بہت بڑے تھے۔ بچوں کے اپنے الفاظ ہیں۔ "وہ پہلوانوں جیسے تھے اور امی ان کے سامنے بہت چھوٹی لگتی تھیں۔" اسی لیے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اب بھی دبلی پتلی اور نازک اندام تھی۔ بڑا بچہ خاصا سمجھدار ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اندر آتے ہی ان لوگوں نے بڑے بڑے چاقو نکال لیے تھے اور کہا تھا کہ چیخنے چلانے یا حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کی تو سب کو ذبح کر دیا جائے گا۔ بچے ڈر گئے کیونکہ ان کی ماں بھی ڈر گئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے بچوں کی ماں سے ٹیپ کے متعلق پوچھا۔ اور اس کے بعد اس پر تشدد کے وہ سب انسانیت سوز حربے آزمائے جن کا ذکر بھی میرے لیے باعثِ آزار ہے۔ یہ عدالت خود اندازہ کر سکتی ہے کہ کسی گھر میں ایک تنہا عورت کے ساتھ دو وحشی اور درندہ صفت افراد کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ تاہم بچے اسی دھمکی سے خوفزدہ تھے جو آنے والوں نے گھر میں قدم رکھتے ہی دی تھی۔ انہوں نے اس ڈر سے کوئی آواز نہیں نکالی کہ وہ لوگ انہیں اور ان کی ماں کو ذبح کر دیں گے اور کونے میں دبکے پڑے رہے۔ آپ ان بچوں کی ذہنی کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتے حضور والا۔ ان کے معصوم ذہن کو خوف نے کس حد تک مسخ کر دیا ہے۔ وہ رات کو روتے ہیں، نیند میں چلنے لگتے ہیں۔ اور ایسی باتیں کرنے لگتے ہیں جو ان کی عمر کے دوسرے بچے نہیں کرتے۔ وقت بڑا مسیحا ہے۔ میں انہیں جھوٹ کی گولیاں دے دے کر وقت گزار رہا ہوں اور کوشش کر رہا ہوں کہ وہ نارمل رہیں لیکن اس کے باوجود وہ بڑے ہو کر انسان نہ رہیں۔ آدمیت کا احترام نہ کریں اور عورت کے رتبے اور مقام کی عزت نہ کریں تو یہ ان کا قصور نہیں ہوگا۔ بقول شاعر۔ دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں۔ جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں۔ ہم سب یہی کرتے ہیں۔ پیار پاتے ہیں تو پیار لٹاتے ہیں۔ نفرت پاتے ہیں تو نفرت لوٹاتے ہیں۔"

"آپ بیان کو واقعات تک محدود رکھنے کی کوشش کیجیے صدیقی صاحب کیونکہ وقت کم رہ گیا ہے۔" جج نے گھڑی دیکھ کے کہا۔

"وقت واقعی کم رہ گیا ہے۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ اپنی بات کر رہا ہو۔ "بچوں نے بتایا کہ انہوں نے ماں کو بہت مارا لیکن ماں نے ٹیپ کا پتا نہیں بتایا۔ ٹیپ سب سے نیچے فلیٹ میں رہنے والوں کے پاس رکھا ہوا تھا۔ یہ بچوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ کیوں؟ مگر جب ان کی ماں نے موقع پاتے ہی انہیں گھر سے نکال دیا اور کہا کہ وہ نیچے والے گھر سے ٹیپ لے کر بھاگ جائیں تو وہ ٹیپ لے آئے۔ ماں نے ان سے کہا تھا کہ خبردار تھانے مت جانا۔ ایک نام یاد رکھنا۔ صدائے وقت۔ یہ اخبار ہے۔ اس کے دفتر پہنچ جانا۔ کسی بھی رکشا یا ٹیکسی میں بیٹھ کے۔ وہاں جمیل صاحب ہوں گے جو اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ انہیں سب بتا دینا۔ ٹیپ ان کے حوالے کر دینا اور پھر جیسا وہ کہیں کرنا۔ وہ بھول گئی تھی کہ میں دن کو گھر پہ ہوتا ہوں۔ اخبار رات کو چھپتا ہے چنانچہ میں شام کے بعد آفس پہنچتا ہوں۔ بڑا بچہ میرا نام بھول گیا لیکن اسے ایڈیٹر کا لفظ یاد رہا۔ قسمت ان کی یاوری کو رکشا ٹیکسی تلاش کرنے سے پہلے ان کو ایک پرائیویٹ کار کا ڈرائیور مل گیا جس نے انہیں صدائے وقت کے آفس پہنچا دیا۔ اس کے بعد کے واقعات آپ جانتے ہیں۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ان بچوں کو کسی مرحلے پر عدالت میں پیش کر سکیں؟"

"میں قانون کا پابند اور عدالت کا احترام کرنے والا آدمی ہوں جناب والا۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "لیکن میں استدعا کروں گا کہ ان بچوں کی زندگی کی خاطر مجھے اس حکم کی تعمیل کا پابند نہ کیا جائے۔ بچے بالکل محفوظ ہیں اور میں ان کو محفوظ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے عدالت کے احکامات کی تعمیل نہ کرنے کے جرم کی سزا قبول ہو گی۔۔۔"

"یہ کوئی حکم نہیں ہے صدیقی صاحب!" جج نے کہا۔ "کیا آپ یہ بتائیں گے کہ اس ٹیپ کو اتنی تاخیر سے عدالت تک پہنچانے کے اسباب کیا تھے؟ یہ بھی تو ممکن تھا کہ آپ ٹیپ کسی قابل اعتماد شخص کے ہاتھوں بھجوا دیتے اور خود سامنے آنے کا خطرہ مول نہ لیتے۔ ٹیپ کو آپ ڈاک سے بھی بھیج سکتے تھے۔ میرے گھر بھی پہنچا سکتے تھے۔ پتا معلوم کرنا آپ کے لیے مشکل نہیں تھا۔ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے آپ کے وسائل کم نہ تھے۔"

"یور لارڈ شپ و یور آنر۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "لیکن ٹیپ ملنے کے بعد میں نے بہت سے کام کیے۔ پہلے بچوں کو محفوظ مقام پر منتقل کیا۔ ٹیپ کی مزید دو نقول بنوائیں۔ اس

www.paksociety.com

کے ساتھ ہی میں میر محمد کی بیوی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ مجھے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی اور اب میں بھی ان سب کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں جو سمجھتے ہیں کہ میر محمد کے ساتھ ہی اس کی بیوی کو بھی اغوا کے بعد قتل کر دیا گیا ہوگا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میر محمد کی لاش کے ٹکڑے مل گئے ہیں۔ ان بچوں کی ماں کو کسی مدفن بے نشاں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ میں نے ٹیپ سننے کے بعد گزشتہ اخبارات میں شائع ہونے والی میر شرافت علی کے قتل کی سب خبروں کو یکجا کیا۔ پھر سکندر بخت یعنی مبینہ قاتل کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کیں۔ اس کے لیے مجھے برطانیہ میں اپنے چند ہم پیشہ افراد سے بھی رابطہ قائم کرنا پڑا۔ انھوں نے مجھے وہاں کے اخبارات کے تراشے ارسال کیے۔ میں نے واقعات کی کڑیوں کو جوڑا تو مجھے اور بھی بہت سی خبریں ملیں جن کا تعلق اسی ایک کیس سے تھا۔ یہ سب خبریں مختلف اوقات میں الگ الگ شائع ہوئی تھیں۔ اور ان سب پر غور کرنے کے بعد میں نے متعدد نتائج اخذ کیے۔ چونکہ مقدمہ زیر سماعت پر اپنی رائے دینا قانوناً جرم ہے اور یہ عدالت سماعت کے دوران میں واقعات، حالات اور شہادتوں سے از خود نتائج اخذ کرنے کی اہل ہے اس لیے میں یہ فائل عدالت کو پیش کر سکتا ہوں۔ صرف عدالت کی مدد کے لیے۔“ اس نے پیچھے کی طرف دیکھا اور لوگوں میں سے ایک شخص اچانک اٹھا جیسے وہ اسی وقت اور اشارے کا منتظر تھا۔ وہ صفوں کے بیچ سے گزرتے آیا اور اس نے ایک پتلی سی فائل جج کی میز پر رکھ دی۔ اسی وقت میں نے دائیں اور بائیں دروازوں سے سادہ کپڑے والوں کو اندر آتے دیکھا۔ محسن ان کے پیچھے تھا۔ وہ لوگ دروازوں کے قریب ہی دیوار سے یوں ٹیک لگا کے کھڑے ہو گئے جیسے بیٹھنے کی جگہ نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً کھڑے ہیں لیکن میں نے ان کو صورت شکل سے ہی نہیں، طور طریقے سے، مستعدی کے انداز سے اور تیوروں سے پہچان لیا۔ ظاہر ہے رضوی صاحب نے محسن کے ایس او ایس پر فوری کارروائی کی تھی۔ جمیل صدیقی کو بحفاظت اپنے نرغے میں لے کر نکال لے جانے والے آ پہنچے تھے اور اب جمیل صدیقی سے زیادہ مجھے اس بات کی فکر تھی کہ کہیں وہ اپنے مقصد میں ناکام نہ رہیں۔

”مجھے اور کچھ نہیں عرض کرنا ہے جناب والا۔“ صدیقی نے کہا۔

”مسٹر صدیقی!“ جج نے کہا۔ ”آج کی کارروائی کا تمام وقت آپ کے بیان میں صرف ہوا اور عدالت نے آپ کے مخصوص حالات کے پیش نظر مروجہ طریقہ کار سے انحراف کی رعایت بھی دی۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ مقدمے میں قانون کے تقاضے نظرانداز نہیں کیے جا سکتے۔ اس بیان کے بعد استغاثہ کو جرح کا حق ملنا چاہیے۔ آپ کا بیان فی الحال ریکارڈ پر رہنا چاہیے لیکن آئندہ پیشی پر جرح کا مرحلہ آئے گا تو آپ کے نام سمن جاری کر دیے جائیں گے بمعرفت روزنامہ صدائے وقت۔“

”بشرط زندگی میں عدالت کے احکامات کی ضرور تعمیل کروں گا جناب والا۔“ جمیل صدیقی نے کہا۔ اور جانے پر آمادہ ہوا۔

”آپ اب بھی محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے تو عدالت آپ کو پولیس کی معیت میں بھیج سکتی ہے لیکن آپ کو تحفظ کے لیے خود پولیس سے رجوع کرنا ہوگا۔“ جج نے کہا۔ ”وہ بھی آپ سے یہ سوال کریں گے کہ آپ کو کس سے خطرہ لاحق ہے۔“

”میں عدالت کا شکر گزار ہوں۔“ جمیل صدیقی نے کہا۔ ”لیکن میں ان انتظامات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اگر ایک مسلح پہرے دار سائے کی طرح ہر وقت میرے ساتھ رہے تب بھی اس گولی کو نہیں روکا جا سکتا جو کسی بھی نامعلوم سمت سے آ کے سارے انتظامات کو غیر مؤثر کر سکتی ہے۔ اگر ایک پوری رجمنٹ بھی میری حفاظت پر مامور ہو تو کیا یہ امکان نہیں کہ اسی رجمنٹ کا ایک سپاہی دشمنوں کے عزائم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی قیمت وصول کر لے۔“ اس نے تعظیم کے لیے سر جھکایا اور باہر نکل آیا۔

بڑی تیزی سے میں نے صفوں کے درمیان سے گزر کر جمیل صدیقی کے گرد حصار سا قائم کرتے دیکھا۔ جج اپنے چیمبر میں جا چکا تھا اور باقی لوگ بھی منتشر ہو رہے تھے۔ بظاہر کوئی بھی صورت سے قاتل نہیں لگتا تھا۔ لیکن جمیل احمد صدیقی کسی فوبیا کا شکار نہیں تھا۔ اس کا خوف بے سبب نہیں تھا۔ مست قلندر پر قاتلانہ حملے کی اطلاع نے مجھے سخت مضطرب کیا تھا۔ رابعہ اور محسن بھی اس خبر پر چونکے تھے۔ ظاہر ہے یہ افسوسناک واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب ہم اسلام آباد گئے ہوئے تھے اور وہاں ہم نے لاہور کے اخبار نہیں دیکھے تھے۔ مقامی اخبارات میں یہ خبر اگر گئی تو اندر کے کسی صفحے پر اور اتنی غیر نمایاں کہ ہم میں سے کسی نے نوٹ نہیں کی۔ محسن اور رابعہ کو ان دنوں میں ویسے بھی تفصیل سے اخبار دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ اور میں اپنے چکروں میں تھا۔ اس کے علاوہ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ خبر میں مست قلندر کا نام نمایاں نہیں ہوگا۔ جمیل صدیقی کے بیان کو ذہن میں رکھتے ہوئے جو ہیڈ لائن بنتی تھی وہ یہی ہو سکتی تھی کہ اخبار کے دفتر پر مشتعل طلبا کا حملہ۔ ایک کارکن زخموں کی تاب نہ لا کر جاں بحق۔ اس سے ہمارے ذہن میں مست قلندر کا خیال کیسے آ سکتا تھا۔

لیکن اس مست قلندر کی مرگ ناگہاں کے بعد جمیل صدیقی کی زندگی واقعی خطرے میں نظر آتی تھی۔

”یہ کیا ہے! کون ہیں آپ لوگ؟“ جمیل صدیقی نے بالخصوص اپنے گرد کچھ اجنبی چہرے دیکھ کر کہا۔

”فکر کی بات نہیں جمیل صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”یہ سب دوست ہیں، دشمن نہیں۔“

”اچھے دوست ہیں! میں تو کسی کو پہچانتا تک نہیں سکندر صاحب!“ وہ بولا۔

”یہ آپ کے محافظ ہیں۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”مجھے امید ہے کہ کسی کو آپ کے قریب نہیں آنے دیں گے۔“

”میں نے کسی قسم کے حفاظتی انتظامات کی درخواست کسی سے نہیں کی تھی۔“ وہ ناگواری سے بولا۔

”یہ جسارت میں نے کی صدیقی صاحب کہ آپ کی اجازت کے بغیر خاموشی سے یہ بندوبست کر لیا۔“ میں نے کہا۔ ”جیسے میری طرف سے صفائی کے گواہ کی حیثیت سے پیش ہونے کا خطرہ آپ نے اپنی مرضی سے مول لیا تھا۔ آگے بڑھتے رہیے۔“

”لیکن یہ لوگ مجھے کہاں لے جائیں گے؟“ جمیل صدیقی نے بے بسی سے کہا۔

”جہاں آپ کہیں گے۔“ محسن بولا۔ ”یہ لوگ اپنے کام کے ماہر ہیں۔ ان کے درمیان چلتے جائیے۔ باہر ایک بلٹ پروف کار کھڑی ہے۔ اگر کوئی اس کار کا پیچھا کرے گا تو پکڑا جائے گا۔ کیونکہ اس کے پیچھے بھی ایک کار ہوگی۔ اس کار کا تعاقب بہت مشکل ہے۔ یہ چکر دے کر آپ کو صاف نکال لے جائیں گے اور جب ان کو یقین ہوگا کہ اب آپ کے پیچھے کوئی نہیں تو یہ آپ کو گھر پہنچا دیں گے۔ اور کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ وہ گھر کہاں ہے۔ آپ ان پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ تاوقتیکہ آپ پر کوئی دستی بم نہ پھینکے، یہ آپ پر ہونے والے فائر کو بھی آپ کے جسم تک نہیں پہنچنے دیں گے۔“

”میں یقیناً بہت متاثر ہوا ہوں سکندر صاحب!“ جمیل صدیقی نے کہا۔ ”لیکن میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے یہ سب کیوں کیا؟“

”یہ تو ایسا سوال ہے کہ مجھے جواب دیتے ہوئے بھی ندامت کا احساس ہوتا ہے۔ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ سب کچھ آپ نے کیا۔ اس ٹیپ کو عدالت میں سنوانے تک کے مرحلے تک اور میرا تو آپ سے کوئی رشتہ تک نہ تھا۔ سوائے انسانیت کے رشتے کے۔ جو کچھ آپ نے میرے لیے کیا اس کے مقابلے تک یہ معمولی سی کوشش کیا ہے۔ مجھے اتنا حق تو دیجیے کہ آپ نے میری زندگی بچانے کے مقصد کو جہاد سمجھا تو میں بھی آپ کی زندگی کی قدر کر سکوں۔“

”جو کچھ میں نے کیا وہ میرا فرض تھا۔ اور فرض سے میں نے کبھی پہلو تہی نہیں کی۔“ وہ بولا۔

”بات تو احساس کی ہے صدیقی صاحب کہ آپ نفسا نفسی کی اس دنیا میں فرض کسے سمجھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”صرف اپنے لیے جینے اور مرنے کو، اپنے مفادات کے تحفظ کو اور اپنے مسائل کو، اپنے رشتوں کو اور اپنی محدود دنیا میں اپنی خوشی کی خاطر جدوجہد کرنے کو؟“

”اپنے مفادات کو دیکھتا اور صرف اپنے لیے جیتا برخوردار تو میں اس غیر معروف، ہمیشہ زیر عتاب رہنے والے اور مالی مشکلات کے شکار ’صدائے وقت‘ کا مدیر نہ ہوتا۔“ اس نے تلخی سے کہا۔ ”میں بڑے اور نامور، زیادہ فروخت ہونے والے اور سرکاری اشتہارات کے بل پر چلنے والے اخباروں کے مالکوں اور مدیروں کو جانتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی صلاحیت کیا ہے۔ وہ کتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول لیتے ہیں۔ خوشامد کر لیتے ہیں۔ ناجائز کو جائز اور دن کو رات کہہ سکتے ہیں اور اصول یا سچائی ان کے نزدیک محض تجارتی چالیں ہیں چنانچہ وہ خوش حال ہیں۔ مست قلندر میرا دستِ راست تھا اور میرے لیے حوصلہ افزا بات یہی تھی کہ دنیا میں میرے جیسے سر پھرے اور بھی ہیں۔ میری پوری ٹیم میری جانشین ہو سکتی ہے۔“

”آپ جیسے لوگ روشنی کا مینار ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اب کوئی ان سے رہنمائی حاصل کرے یا نہ کرے۔ آپ نے ان دونوں بچوں کی ذمہ داری قبول کی جن سے آپ کا ایک جذباتی تعلق تھا۔ بہت پیارا!“

”یہ بات تم کیسے جانتے ہو؟“ وہ چونکا اور چلتے چلتے رک گیا۔

”جیسے آپ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ نے کسی غرض کے بغیر میرے کیس میں دلچسپی لی۔ خبریں چھاپیں۔ ٹیپ کی حفاظت کی اور اسے عدالت کے سامنے پیش کرنے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر چلے آئے۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ آپ ان دونوں بچوں کے ساتھ مدینے شفٹ ہو جاتے۔ اس کی پروا کیے بغیر کہ سکندر کے ساتھ کیا ہوا اور کیوں ہوا۔ اور بعد میں کیا ہوگا۔ آپ پر کوئی اخلاقی ذمہ داری تک عائد نہیں ہوتی تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں آپ مجبور ہو گئے تھے۔ کسی منطقی استدلال کے بعد آپ قائل ہو گئے تھے کہ آپ نے میری مدد نہ کی تو تمام عمر اپنے آپ سے شرمندہ رہیں گے۔“

یہ مختصر سا جلوس سیاہ رنگ کی بلٹ پروف کار تک پہنچ گیا تھا۔ معلوم نہیں رضوی صاحب نے اتنے کم وقت میں

www.paksociety.com

اتنا قابلِ اعتماد انتظام کیسے کر دیا تھا۔ سکیورٹی کے پانچ افراد ہمارے دائیں بائیں اور آگے پیچھے بظاہر ہم سے لاتعلق چل رہے تھے لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ ان کی نگاہ ہر طرف ہے اور سب پر ہے۔ اگر وہ کسی کو ذرا بھی مشتبہ حرکت کرتے دیکھتے تو فوراً وہ ریوالور نکال لیتے جو ان کی قمیص کے نیچے شلوار کے نیفوں میں نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے اس قسم کے لوگوں کی پھرتی کا عملی مظاہرہ بھی دیکھا تھا۔ نظریاتی اختلاف میں جنون کی حد تک پہنچ جانے والے ایک شخص نے میرے سامنے ایک مشتعل مہمان کو گولی کا نشانہ بنانے کے لیے ریوالور نکالا ہی تھا کہ سیکیورٹی والوں نے مہمان کو گرا دیا اور خود اس کے اوپر نیچے دائیں بائیں لیٹ گئے۔ اس حالت میں مشین گن یا دستی بم سے بھی نقصان پہنچتا تو صرف انہی کی ذات کو۔ پھر پلک جھپکنے میں انہوں نے نوجوان کو نشانہ بنا لیا تھا لیکن اسے مارا نہیں تھا۔ اس کا نشانہ خطا کر دیا تھا اور اسے زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے تاکہ اس سے مزید پوچھ گچھ کی جا سکے اور یہ پتا چلایا جا سکے کہ جو کچھ اس نے کیا، وہ اس کا انفرادی فعل تھا یا کسی منظم سازش کا نتیجہ۔ کیا ہمارے یہ محافظ بھی ایسی ہی کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے؟ میں نے سوچا۔ جمیل صدیقی کے دائیں ہاتھ پر میں تھا۔ بائیں ہاتھ پر محسن اور پیچھے استاد ٹیڈی۔

"صدیقی صاحب؟" میں نے کہا۔ "ان حالات میں آپ کا روپوش اور گمنام رہنا ہی بہتر ہے۔ اور آپ کو یقیناً ہم سب کا پورا تعاون حاصل رہے گا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ بعد میں کسی وقت میں آپ سے مل سکوں۔ آپ مجھے ایس پی صاحب جعفری کے گھر فون کر سکتے ہیں اور یہ پیغام دے سکتے ہیں کہ میں کہاں اور کس وقت حاضر ہو جاؤں۔"

ایک محافظ نے دروازہ کھولا۔ جمیل صدیقی کو شاید زندگی میں پہلی بار یہ "وی آئی پی ٹریٹمنٹ" ملا تھا ورنہ وہ سر پھرا آزاد اور بے باک تو نہ چھپنے سے ڈرتا تھا نہ مرنے سے چنانچہ اپنی ذات اور خدا پر اعتماد کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔ وہی کرتا تھا جس پر اس کو ضمیر سے تائید ملے اور وہی لکھتا تھا جو اس کے نقطۂ نظر سے سچ ہو اور یہی وجوہات تھیں کہ "صدائے وقت" ایک غیر معروف، گمنام اخبار رہا اور تجارتی کامیابی کی اس منزل تک نہ پہنچ سکا جہاں دولت عزت اور شہرت مفت میں عطا کر دی جاتی ہے۔ خلعتِ فاخرہ کی طرح۔

"میں بتا دوں گا۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "لیکن اس کی وجہ؟"

"میں صرف دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کہ مجھے وضاحت بتائے کہ آپ نے جو ریسرچ کی تھی اس کے نتائج کس حد تک درست ہیں۔ میری حقیقت کو مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ مجھے یقین ہے کہ جس رائے کے اظہار سے آپ نے عدالت میں اجتناب کیا، صائب ہو گی اور جو نتائج آپ نے اخذ کیے وہ میرے یقین کے مطابق ہوں گے۔"

جمیل صدیقی مسکرایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ جو شخص دروازہ تھامے کھڑا تھا اس کے ساتھ والی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر بیٹھا۔ باقی تین افراد پہلے ہی پچھلی نشست پر پوزیشن سنبھال کر دروازے بند کر چکے تھے۔ گاڑی روانہ ہوئی تو ہم وہیں کھڑے رہے۔ مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ اور بھی بہت سے لوگ منتظر ہیں۔ ان کے اخباری نمائندے بھی تو تھے جنہوں نے جمیل صدیقی کی متعدد تصاویر اتاری تھیں۔ ہماری ساری توجہ دوسری طرف تھی لیکن فوری طور پر کوئی گاڑی تعاقب میں روانہ نہیں ہوئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"قسم مولا کی۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "یہ ہوتی نا بات۔ آج سمجھ میں آئی بات۔"

"آج تک تم کیا سمجھتے تھے؟" میں نے کہا۔ "یہی کہ خنجر چلا کے کسی نہتے شخص کو دہشت زدہ کر دینا یا اسٹین گن سے کسی جگہ سے لاکھوں لوٹ کر فرار ہو جانا ہی بہادری ہے؟"

"اب چلو۔ بیگم رضوی گاڑی میں ہماری منتظر ہیں۔" محسن نے کہا۔ "میرا خیال ہے ما بعد بھی پہنچ گئی ہوں گی۔"

"پھر مجھے اجازت دیں۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "شملہ باجی کو میرا سلام دیں۔ آج کی بات سن کے وہ بھی خوش ہوں گی۔"

"ہاں۔ شملہ کو ہم فون پہ اطلاع دیں گے۔" میں نے کہا۔ "لیکن استاد، تم کو ایک کام کرنا ہے۔ اس کے لیے وقت کی کوئی میعاد نہیں۔ ذرا یہ معلوم کرو کہ استاد پیڈرو کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ خصوصاً گزشتہ ایک ہفتے میں وہ کیا کر رہا تھا معلوم کر سکتے ہو؟"

"کوشش ضرور کروں گا جی۔ معلوم کیسے نہیں ہوگا۔" وہ جاتے جاتے بولا۔ میں اور محسن پلٹ کر مخالف سمت میں چلنے لگے۔ اچانک بھگدڑ سی مچ گئی۔ ایک شخص بے تحاشا بھاگا چلا آ رہا تھا۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ اسی شخص نے عدالت میں اخبار والے تراشوں پر مشتمل فائل پیش کی تھی۔ اس کے کپڑے کچھ پھٹے ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے وہ بڑے مقابلے کے بعد دشمنوں کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہوا ہے۔ دشمن اس کے پیچھے تھے۔ میں نے بیک وقت دو افراد کو اس کے پیچھے لپکتے دیکھا۔

"پکڑو۔ پکڑو۔" وہ دونوں چلا رہے تھے۔ "جیب کاٹ کے بھاگا ہے۔"

یہ سب جھوٹ تھا اور اس شخص کو پکڑنے کا بہانہ تھا سمجھنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ خود محسن اندازہ کر چکا تھا کہ بات کیا ہے۔ میں نے سامنے سے ایک کا راستہ یوں روکا کہ بظاہر اتفاقیہ نظر آئے۔ دوسرے کی ٹکر محسن سے ہوئی۔ دونوں چاروں شانے منہ کے بل گرے۔ معذرت کرنے کی بجائے میں نے اٹھ کے اس شخص کی گردن دبوچ لی جو مجھ سے ٹکرایا تھا۔

"اندھا ہے کیا؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "سانڈ کی طرح ٹکریں مارتا پھرتا ہے؟"

"ارے... رستے بھائی! میں تو اس کے پیچھے تھا۔" اس نے بمشکل تمام کہا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کی بدقسمتی کہ اشارہ ایک لڑکی کی طرف ہوا جو اس ہنگامے پہ رک گئی تھی اور کچھ سہمی ہوئی لگتی تھی۔

"اچھا۔ چوری اور سینہ زوری۔" میں نے اس کے ایک جانٹا رسید کیا۔ "شرم سے [illegible] لڑکیوں کا پیچھا کرتا ہے؟"

"ابے وہ میرا بٹوا نکال کے لے گیا۔" وہ چیخ کر بولا۔ "میں ایسا جیب کترے کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔"

"جیب کترا؟" میں نے حیرانی اور حقارت سے ادھر ادھر دیکھا۔ "پہلے بتانا تھا نا۔ ہم خود اسے پکڑ لیتے۔"

محسن حسن خان نے بھی کچھ ایسا ہی ڈراما کیا تھا اور ان سے بھی فریقِ ثانی کے مذاکرات خاصے غیر دوستانہ فضا میں ہو رہے تھے لیکن ان میں ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آئی تھی۔

"تم نے جانتے بوجھتے میرے ٹکر ماری ہے۔" محسن کہہ رہا تھا۔

"تم بکواس کرتے ہو۔ وہ شخص میری جیب کاٹ کے بھاگا تھا۔ میں اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔" دوسرا چیخ کر بولا۔

"ایک آدمی بیک وقت دو کی جیب کاٹ کر کیسے بھاگ گیا؟" میں نے چلا کے کہا۔ ہمارا ایک مقصد ان دونوں کی پیش قدمی روکنا تھا۔ اس ہنگامے پر ہمارے گرد مجمع لگ گیا تھا اور وہ شخص بحفاظت نکل گیا تھا جو حقائق پر مبنی فائل پیش کرنے کا مجرم تھا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے جمیل صدیقی کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن صدیقی صاحب جاتے وقت اسے غیر محفوظ چھوڑ گئے تھے۔ شاید ان کو یاد نہیں رہا تھا ورنہ وہ کسی مددگار و معاون کو بھولنے والے آدمی نہیں تھے۔ عدالت کے احاطے میں پولیس ناکافی نہیں ہوتی۔ ہمیں دیکھتے ہی حوالدار سے کمتر عہدے کے چند عزیز نمودار ہوئے۔ پھر حوالدار بجلی نمودار ہوا اور جھگڑے میں شدت کا دیکھ کر اس کے لبوں پہ ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی جو زبانِ حال سے اعلان کر رہی تھی کہ ہم جیسے "شرپسندوں" سے نمٹنے کے لیے اس کے قانونی اختیارات کافی ہیں اور وہ اس سنہرے موقعے سے پورا فائدہ اٹھائے گا۔ لیکن اس کی بدقسمتی کہ ابھی اس نے امن و امان کی صورتِ حال سنبھالنے کے لیے ابتدائی تفتیش کا آغاز بھی نہیں کیا تھا کہ اے ایس آئی اکرام شیخ نمودار ہو گیا۔ حوالدار بجلی کی امیدوں کے شگوفے بن کھلے مرجھا گئے۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" شیخ نے قطعی انجان بن کے کہا۔ "یہ کوئی مجمع لگانے کی جگہ ہے؟"

"اس نے مجھ پہ جیب کترا ہونے کا الزام لگایا ہے۔" محسن نے اپنے فریق کے خلاف اشتعال انگیزی کا مظاہرہ کیا۔

"جھوٹ۔ جیب کترا وہ تھا جو بھاگ گیا۔" دوسرا فریاد کناں لہجے میں بولا۔ "تم نے مجھے اس کے پیچھے جانے سے روکا۔"

"گویا میں بھی اس کا ساتھی اور شریکِ کار تھا۔" محسن نے اس بار اپنے حریف کا گریبان تھام لیا۔

"چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔ میں تم دونوں کو بند کر دوں گا۔" شیخ نے گرج کر کہا کیونکہ اس نے مجھے آنکھ مارتے دیکھ لیا تھا۔

"اس نے جانتے بوجھتے مجھے ٹکر ماری۔" میں نے اپنا کیس پیش کیا۔ "اس کا ساتھی میرا پرس لے کر بھاگ گیا۔"

"یہاں سے کوئی نہیں بھاگا۔" محسن نے چلا کر کہا۔ "کس نے دیکھا ہے کسی کو فرار ہوتے؟"

یہ سوال بڑا اہم عمل تھا۔ جنہوں نے ایک شخص کو بھاگتے دیکھا تھا وہ یا تو جا چکے تھے یا اب بھی موجود تھے تو انہوں نے لب کشائی سے گریز کیا۔ بلاوجہ کے جھگڑے میں کون اپنا کام چھوڑ کے تھانے جائے۔ باقی جمع ہونے والے بعد میں پہنچے تھے اور انہوں نے واقعی کسی کو بھی جائے واردات سے فرار ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ کچھ لوگ خاصے محظوظ ہو رہے تھے کیونکہ یہ طے کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ جیب کس کی کٹی، کس نے کاٹی؟ کون فرار ہوا اور کس نے کس کا راستہ روکا؟

"حوالدار!" شیخ نے حوالدار بجلی کو مخاطب کیا۔ "ان سب کو تھانے لے چلو۔ دیکھو کوئی کھسکنے نہ پائے۔"

"لیکن سر، آپ مجھ سے تو پوچھیں۔ میں جائے واردات پر موجود تھا۔ یہ دونوں..." اس نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

"یہاں کچہری مت لگاؤ۔" شیخ نے پھر گرج کر کہا۔ "جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔ جاؤ۔"

"یہ حوالدار بجتا ہے سر جی۔" کسی نے پیچھے سے کہا۔ "یہ تو آپ کے بھی بعد میں آیا تھا۔" میں نے استاد ٹیڈی کی آواز پہچان لی تھی۔ اس کی حمایت پر بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی لیکن حوالدار بجلی چلا

www.paksociety.com

ٹیڈی بھی شاید مجھے دیکھ کر لوٹ آیا تھا۔

"کون... کون کمینہ کہتا ہے—" اس نے چیخ کر کہا۔ "سامنے آئے میرے۔"

"حوالدار۔" شیخ نے غرا کے کہا۔ "تم ٹریفک پولیس کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ میرے حکم کو نظر انداز کر رہے ہو۔"

حوالدار بجلی کو خون کے گھونٹ پی کے رہ جانا پڑا۔ میں نے موقع پا کے استاد ٹیڈی سے کہا "رابعہ اور بیگم رضوی کو جا کے کہہ دو۔ ہم ذرا دیر سے گھر آئیں گے۔ شیخ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ بس اس سے زیادہ کچھ مت کہنا۔"

ٹیڈی بڑبڑاتا ہوا آگے آ گیا تھا میری بات سنتے ہی سرپٹ کے غائب ہو گیا۔ غیظ و غضب سے کھولتے ہوئے حوالدار بجلی نے ٹیکسی پکڑنے میں بڑی پھرتی دکھائی۔ بیگار میں ہاتھ آنے والی ٹیکسی کا ڈرائیور انکار کرتا تو یقیناً اس کے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔ شیخ نے بھی مناسب سمجھا کہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل جائے ورنہ یہاں اس سے بڑے افسر کا یا کسی مجسٹریٹ وغیرہ کا نمودار ہو جانا بھی عین ممکن تھا۔ متحارب گروپ کے ارکان چار تھے لیکن شیخ پانچویں سواری بن کے فٹ ہو گیا۔ ڈرائیور کہتا رہا کہ یہ خلاف قانون ہے۔ تھانیدار کی وردی میں شیخ آگے بیٹھا جا رہا تھا۔ پیچھے ہم چار افراد تھے لیکن ہم نے بھی بڑی چالاکی سے یہ کیا تھا کہ ایک پچھلے دروازے سے محسن پہلے اندر گھس کے بیٹھ گیا تھا۔ دوسری طرف سے میں نے ان دونوں کو پہلے بیٹھنے پر مجبور کیا تا کہ خود دوسرے دروازے کی طرف سے پہرے داری کے فرائض انجام دے سکوں۔ نشست کے اس انتظام پر بھی ایک مختصر سا تلخ و ترش اختلافی مکالمہ ہوا لیکن وہ محض چھیڑ خانی تھا۔ شیخ نے ان کو ایک ڈانٹ لگائی تو وہ مجبور ہو گئے۔ ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے وہ خاصے بے ضرر اور مظلوم نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن گرفتاری کے غیر متوقع انجام نے انہیں متفکر کر دیا تھا اور ان کے چہروں پر وہ خباثت لوٹ آئی تھی جو ان کی اصل فطرت کی عکاس تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ مسلح ہوں گے لیکن ضلع کچہری میں اسلحے کی نمائش مشکل تھی۔ اس کے بعد ہماری مداخلت نے انہیں بے بس کر دیا۔ خصوصاً میں مستعد تھا کہ کسی کا ہاتھ جیب یا نیفے کی طرف بڑھے تو اسے روک دوں خواہ اس کے لیے مجھے ہاتھ کو وار کر کے سُن کرنا پڑے یا کلائی توڑنی پڑے۔ آخری خرابی حوالدار بجلی اور انسپکٹر شیخ کا نمودار ہونا تھا اور یہ سب اتنی جلدی میں ہو گیا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکے تھے۔ عدالت میں یقیناً وہ بھی ہوں گے جنہوں نے طے کیا ہوگا کہ کسی نے ٹیپ کی کاپی پیش کی تو اسے باہر نکلتے ہی ٹھکانے لگا دیں گے لیکن ان کے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تو انہوں نے پینترا بدلا اور ہم کو حکم دیا کہ سکندر کے دوسرے حمایتی کو پکڑ لاؤ [illegible] کو خاک شدہ۔ وہ خود دیکھتے رہ گئے۔ حوالدار بجلی کو ذلت آخری صدمہ یہ اٹھانا پڑا کہ شیخ نے اسے زبردستی ٹیکسی میں بیٹھنے ہونے سے روک دیا اور پیچھے رکشا میں آنے کو کہا۔

"پانچ تو پہلے ہی پھنس گئے ہیں۔ پھر تم کو پیچھے آ کے گھسا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" شیخ نے کہا۔

"ویسے تو سر جی پانچ بھی نہیں بیٹھ سکتے ٹیکسی میں۔" حوالدار نے جل بھن کے مگر آہستہ سے کہا۔

"یہ تو ہے۔" شیخ نے یوں کہا جیسے ابھی تک اسے احساس نہیں تھا کہ پانچویں سواری قانون کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ "اچھا تم ان میں سے ایک کے ساتھ رکشا میں آ جاؤ۔" وہ بولا۔ اس نے مجھے اترنے کا اشارہ کیا۔ میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ شیخ نے ریوالور نکال لیا۔ "اگر راستے میں کسی نے دروازے کی طرف ہاتھ بھی بڑھایا تو میں گولی مار دوں گا۔" اور بیک ویو کو اس دروازے پر ایڈجسٹ کر لیا جس سے میں اترا تھا۔ "تم ذرا پیچھے دیکھ کے گاڑی چلاؤ۔ اور مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھو۔" اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

حوالدار بجلی اور میں ان مسافروں کی طرح کھڑے رہ گئے جن کو ایک دوسرے کی شکایت پر بے ٹکٹ ہونے کے جرم میں کسی ویران پلیٹ فارم پر اتار دیا گیا ہو اور ٹرین جا چکی ہو۔

"حوالدار صاحب!" میں نے کہا۔ "رکشا روکو۔ ایس پی صاحب حکم دے گئے ہیں۔"

"وہ اے ایس آئی تھا۔" حوالدار نے میری جہالت پر ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "رکشا کا کرایہ اس کا باپ دے گا۔ حکم دے گئے ہیں!"

"میرا خیال ہے تم سوال کرو گے تو بڑے شیخ صاحب انکار نہیں کریں گے۔" میں نے جیب سے سگریٹ نکال کے جلائی۔ "ان کا اصول ہے کہ کسی فقیر کو خالی ہاتھ مت لوٹاؤ۔ بڑے سخی اور نیک دل آدمی ہیں۔"

"تمہاری جیب میں بھی تو پیسے ہوں گے۔" حوالدار نے اس بے عزتی کو بھی دل پہ جبر کر کے برداشت کیا۔ "ایک سگریٹ تو دے دو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ رشوت ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ میرا اصول یہ ہے کہ نہ کسی سے مانگ کے پیتا ہوں نہ پلاتا ہوں۔"

"رکشا کا کرایہ تو دے سکتے ہو۔ تم خود بیٹھو گے اس میں۔"

حوالدار بجلی نے خونخوار لہجے میں کہا۔

"دے تو سکتا ہوں مگر دوں گا نہیں۔" میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا۔ "اس کے بھی دو اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ سوال میری عزت کا ہے۔ تم ساتھ بیٹھو گے تو لوگ سمجھیں گے کہ پولیس نے گرفتار کیا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ میرا ارادہ پیدل جانے کا ہے۔ پیدل چلنے سے صحت ٹھیک رہتی ہے اور مجھے تمہاری صحت تو ویسے ہی قابل افسوس لگتی ہے۔ موسم بھی سہانا ہے۔ پیدل چلو گے تو بھوک کھل جائے گی۔"

سہ پہر کا سورج اپنی تمازت برسا رہا تھا جس سے سڑک کا تارکول نرم پگھلنے لگا تھا اور خود میرا بھوک سے حال پتلا تھا لیکن میں نے پیدل چلنا شروع کیا۔ سخت طیش کے عالم میں حوالدار بجلی نے ایک رکشا والے کو روکا اور تقاضے پیچھے کر لیا۔ رکشا والے نے میٹر پہ بند کرتے ہوئے کپڑے کی طرف اشارہ کیا۔ "میری شفٹ ختم ہو رہی ہے حوالدار صاحب۔"

حوالدار بجلی نے اپنی مخصوص مہارت کا استعمال کیا اور بجلی کی طرح رکشا والے کی گدی پر ایک ہاتھ رسید کیا۔ "شفٹ کی اولاد۔ سرکاری ڈیوٹی سے انکار کرتا ہے۔"

رکشا والا ضرب کی شدت سے زیادہ اس قدر منحنی قسم کے حوالدار کی پھرتی پہ بھونچکا سا رہ گیا۔ انکار وہ کیا کرتا۔

"تمہارا میٹر ٹھیک ہے نا۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "حوالدار صاحب کرایہ ہمیشہ پورا دیتے ہیں۔"

"کرایہ کیا سرکار۔ دوسری شفٹ والے کو رکشا وقت پر ملا تو کل مالک مجھے رکشا دے گا ہی نہیں۔" رکشا والے نے زاری کی۔

میں نے حوالدار بجلی کو بے تکلفی سے ہاتھ تھام کے گھسیٹ لیا۔ "اچھا تو پھر تم جاؤ۔ ہم دوسرا رکشا لے کر چلے جاتے ہیں۔"

"آپ جیسے لوگ..." حوالدار بجلی نے بمشکل خود کو غلط تلفظ بولنے سے روکا۔ "ہماری بھی بے عزتی خراب کراتے ہیں۔" رکشا کا ڈرائیور رفو چکر ہو گیا تھا اور میں دوسرے رکشا کے لیے پھر حوالدار پر تکیہ کیے کھڑا تھا۔

"بے عزتی خراب اسی وقت ہوتی ہے۔" میں نے سگریٹ [illegible] کر اطمینان سے کہا۔ "جب آدمی کی عزت ہو۔ اچھا ہوا تم اسے زبردستی نہیں کی ورنہ دنیا و آخرت میں رسوا ہوتے۔ ایسے [illegible] کو مارنے کا تجربہ [illegible] تب [illegible] تھے۔ وہ تھانے جا [illegible] بیچ [illegible] خواہ مخواہ [illegible] بن جاتا۔ تم [illegible] اسے روزی سے محروم رکھنے کی کوشش کی۔ خدانخواستہ اس کے گھر میں فاقہ ہوتا۔"

"بہت پڑھنے سے بندے کا دماغ چل جاتا ہے۔ تمہاری طرح۔" اس نے دوسرا رکشا روکتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔

❋

شیخ نے دونوں ملزموں کو حوالات میں "لاک" دیا تھا۔ ان کے قبضے سے ناجائز اسلحہ برآمد ہوا تھا۔ چنانچہ وہ سب معاملہ ختم ہو گیا تھا جو ہمارے ٹانگ اڑانے کا نتیجہ تھا۔ اور ان کی ایک ہی [illegible] تھی۔ میں نے رابعہ کو فون کیا اور بتایا کہ ہم ساتھ کیوں نہیں آ سکے۔ "ذرا ان دونوں کی خبر لے لیں پھر آتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہاری نازو کا فون آ چکا ہے دو بار۔" رابعہ نے شوخی اور شرارت سے کہا لیکن مجھے یہ بات بُری لگی۔

"تم کبھی کبھی بالکل عام اور جاہل عورتوں کی طرح باتیں کرنے لگتی ہو۔ یہ تمہاری کٹ کٹ کا کیا مقصد ہے؟" میں نے جھنجھلا کے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ محسن نے اور شیخ نے بڑی دلچسپی سے میری صورت دیکھی۔

"کیا بات ہے؟" شیخ نے کہا۔ "دونوں طرف سے جھڑک برابر لگی ہوئی؟"

"ہاں۔ ہاں یار۔ حکم تھا کہ کھانا گھر آ کے کھاؤ۔" میں نے بات بنائی۔ "یہاں کہیں سے کچھ منگوا لے یار۔ حوالدار کو پیسے دیجئے۔"

حوالدار نے اس بات کا برا نہیں مانا۔ شیخ نے اسے سو کا نوٹ دیا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ ایک پیسہ خرچ کیے بغیر چاروں افراد کے لیے طعام کا مناسب بندوبست کرے گا۔

"مشکل ہے سر جی۔ صرف چکن ملے گا۔ یا چکن بریانی۔"

"چکن ملے یا چکن۔" شیخ نے کہا۔ "واپس آ کے مجھے بتانا کہاں سے لائے ہو۔ کھانا خراب ہوا تو میں اسے بھی ڈک دوں گا۔"

حوالدار کا چہرہ اتر گیا۔ یہ پیسے دے کر کھانا منگوانے والا صاحب کسی کو نہیں ڈک سکتا تھا۔ اس کی بات کا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ خبردار مال مفت مت لانا ورنہ میں معلوم کر لوں گا۔ وہ سخت دل شکستہ روانہ ہوا۔ شیخ نے ہم دونوں کو اشارہ کیا اور ایک سپاہی کو حکم دیا کہ نئے مہمانوں کو خاطر تواضع کے لیے لایا جائے۔ شیخ کے ہمراہ میں نے پھر اس کمرے میں قدم رکھا جہاں ایک رات نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ دیسی اور ولایتی تفتیش کے طریقوں میں کیا فرق ہے اور میں نے اتنی زیادہ رسوائی تشدد کی سختی اور ناقابل بیان مظالم کی ذلت جھیلی تھی کہ اندر داخل ہوتے ہی اس رات کا تصور میرے لیے حقیقی عذاب بن گیا۔ اس اذیت خانے میں [illegible] اس کی پُر آسیب وحشت زدہ کر دینے والی فضا۔ وہی دیواریں جن کے [illegible] داغ [illegible] کے

www.paksociety.com

لہو کا گمان ہوتا تھا۔ وہی غلیظ بدبودار فرش اور وہی سامان عقوبت۔ مجھے اس ماحول سے وحشت ہونے لگی۔

میری حالت کے تغیر کو محسن نے محسوس کیا اور سمجھ لیا۔ "یار شیخ کسی دوسرے کمرے میں بات نہیں ہوسکتی؟" میں نے کہا۔

"ہوسکتی ہے۔ لیکن میں اس جگہ کے نفسیاتی دباؤ کا استعمال کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "میں خود مختار ہوتا تو اس کمرے کو سارا کا دیتا لیکن یہاں جو کچھ ہے اور جیسا ہے ویسا ہی رہے گا۔ ایک رات کے تجربے کو اپنا پکچر میں بت بننے دے۔ زندگی میں اس سے زیادہ کٹھن مرحلے آتے ہیں۔ حادثے کا شکار ہونے والوں کی حالت کیا ہوتی ہے۔ وہ ٹوٹے پھوٹے شکستہ اور خون آلودہ مردہ اور نیم جاں جسم اور بکھر جانے والے انسانی اعضا سمیٹتے ہیں اور بعض اوقات خود تمام عمر معذوری کی زندگی گزارتے ہیں لیکن کیا اس بھیانک تجربے کے بعد وہ بسوں اور ٹرینوں سے ڈرنے لگتے ہیں، ان میں سفر کرنا چھوڑ دیتے ہیں؟ یہاں ایسے بھی ہیں جو روز ہی دیکھتے ہیں۔"

میں شرمندہ ہوکے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک سپاہی ان دونوں کو دھکے دیتا ہوا اندر لایا۔

"ہاں بھئی۔" شیخ نے ٹھیٹھ تھانیداروں والے لہجے میں کہا۔ "کیا ارادے ہیں پھر اب؟ کچھ خاطر مدارت کریں تمہاری؟"

"ان میں سے ایک نے واویلا شروع کیا۔ "لیکن ہمارا جرم تھانیدار جی! یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

"اوئے انصاف دے پتر!" شیخ نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "ناجائز اسلحہ لے کر پھرتا ہے قبضے میں۔ یہ شریف آدمی مداخلت نہ کرتے تو تم نے اس بندے کو وہیں کاٹ دینا تھا۔ اب جرم پوچھتا ہے؟"

ناجائز اسلحے کی تفصیل اب مجھ پر اور محسن پر واضح ہوئی۔ ان کے پاس سے صرف خنجر برآمد ہوئے تھے۔ میں نے خنجر دیکھے نہیں تھے لیکن یہ جانتا تھا کہ پولیس معمولی چاقو کو بھی اسلحہ ایکٹ کے تحت خنجر قرار دینے کے اختیارات رکھتی تھی جو ہر گھر کے باورچی خانے سے برآمد ہوسکتا ہے اور سڑک پر تلاشی لی جائے تو شریف آدمی کی جیب میں مل سکتا ہے۔

"تو بالاتوں کے بھوت!" شیخ نے دوسرے کے لات رسید کی۔ "کس نے بھیجا تھا تمہیں؟ بول نہیں تو تیری چمڑی اتارتا ہوں۔"

دوسرا ڈیل ڈول میں بڑا ہونے کے باوجود بہت کم ہمت تھا۔ وہ بلبلا کے گرا اور شیخ کی ٹانگوں کو پکڑ کے رونے لگا۔

"مجھے نہیں معلوم سرکار۔" وہ بولا۔ "ہم جیب کترے ضرور ہیں۔" اس نے ہاتھ جوڑ کے گڑگڑانا شروع کیا۔

"جیب کترے؟" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ کہا اپنی اپنی جیب دیکھی۔ ہم دونوں کے پرس غائب تھے۔ بیک وقت ان دونوں نے اپنی جیب سے پرس نکالے اور میز پر رکھ دیے۔ میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمارے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ وہ جیب کترے کے پیچھے دوڑنے کا دعوے کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے جو جیب تراش قرار دیا تھا اور جنہیں خود اس فن کے پرستار ... حالات کی سنگینی کے پیش نظر ہم نے سنجیدگی سے اپنے پرس اٹھائے۔

"دیکھ لیجیے جناب۔ ایک پیسہ کم ہو تو ہم کو سو جوتے سو پیاز منظور۔" پہلا بولا۔

"تم نے میرا سوال سنا نہیں تھا شاید۔" شیخ نے کہا۔ "تو خراب معلوم ہوتے ہیں تمہارے۔ ابھی گرم تیل ڈالتے ہیں صاف سننے لگ گے۔ اوئے حوالدار، ذرا لانا گرم مسالہ۔"

ان دونوں کی حالت غیر ہوگئی۔ انہوں نے اس چھتے دوسروں کی زبانی اس تشدد کا آنکھوں دیکھا حال ضرور سنا ہوگا کبھی پکڑے جانے کی صورت میں اس کا عملی تجربہ بھی کیا ہوگا تھانے میں گرم مسالہ کس طرح لگایا جاتا ہے۔ انہوں نے رونا پیٹنا شروع کیا۔ پھر موٹے نے کہا۔ "میں بتاتا ہوں سرکار آپ تھانہ مزنگ کے ملک صاحب سے ہمارے بارے میں پوچھ لیں۔ ہم صرف جیب کاٹتے ہیں۔ ضلع کچہری میں رش ہوتا ہے اور پیسہ دونوں کی جیب میں ملتا ہے۔"

"دونوں کون؟" محسن نے حیرانی سے کہا۔ بات میری بھی عقل میں بھی نہیں آئی تھی۔

"وہی جی۔ رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے۔" موٹے نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا اور ہم نے ایسا ... جیسے یہ بات تو ہمیں پہلے سے معلوم تھی۔ "اپنا علاقہ اب ... کی سفارش سے ہی ہوگیا ہے۔ پہلے انارکلی میں تھے ... رنگ چوک تک تھا۔ ہماری جگہ دو ... آ گئے تھے۔"

"انہیں کیوں تبدیل کردیا گیا اس علاقے سے؟" شیخ نے کہا۔ "ڈنڈی مارتے تھے؟"

"ہاں سرکار۔ نیت بے ایمان ہوگئی تھی ان کی۔ حصہ پورا نہیں پہنچاتے تھے۔" موٹے نے اعتراف کیا۔ میں اور محسن دم بخود بیٹھے رہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ایک علاقے کے تھانے سے دوسرے علاقے کے تھانے میں پوسٹنگ کی بات ہو رہی ہے لیکن شیخ نے ہمیں بعد میں سمجھایا کہ تھانوں کی طرح جیب کتروں کے دائرۂ اختیار کی بھی حدود متعین ہیں۔ ایک علاقے کا جیب کترا دوسرے علاقے میں واردات نہیں کرسکتا۔

ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی سمجھی جاتی ہے جس پر علاقے کے گروہ کا سردار دوسرے علاقے کے سرغنہ سے شکایت کرتا ہے اور عموماً معاملہ افہام و تفہیم سے طے پا جاتا ہے یعنی وہ مال متعلقہ علاقے والوں کے حوالے کردیا جاتا ہے جو علاقہ غیر سے لایا گیا ہو۔

"ملک صاحب بڑے سخت آدمی ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے۔" موٹے نے کہا اور شیخ نے سر ہلایا حالانکہ مجھے یقین ہے کہ اسے خاک علم نہیں ہوگا۔ "اب سرکار مندی کا زمانہ ... ہونے کا زور ہو، ان کا حصہ ... جاتا ہے ... ہم بھی خوش۔ آج بھی ہم روزی کی طرح شکار کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ وہاں رونق تھے پھرتے ہوتے ہیں تاکہ کسی ... کسی کو پہچانتا نہیں اور رش بھی اتنا ہوتا ہے کہ بندے کو بندے کی خبر نہیں ہوتی۔ دھکم پیل بہت زیادہ ہوتی ہے اور لوگ بولائے ہوئے پھرتے ہیں۔ گوالمنڈی کی طرح۔ کوئی وکیل ڈھونڈ رہا ہے تو کوئی اہلکار کو۔ سب کے اپنے اپنے کیس لگے ہوئے ہوتے ہیں اور سب اتنے پریشان ہوتے ہیں کہ دس بندے بھی ٹکرا جائیں تو وہ پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ بس اسی لیے ہمارا دھندا خوب چلتا ہے۔" اس کی باتیں اتنی عجیب تھیں کہ میں نے اور محسن نے اس کا باقاعدہ انٹرویو شروع کیا۔

"پھر بھی جیب کی طرف سے تو سب ہوشیار رہتے ہیں؟" محسن نے کہا۔ "تھانہ کچہری ہو یا بازار۔"

"وہ جی بھولے بادشاہ ہو۔ آپ نہیں سمجھتے ان باتوں کو۔ ... جیسے پاکٹ سے تو لوگ بسوں میں بھی ہوشیار رہتے ہیں مگر ہم پھر بھی اپنا کام دکھا جاتے ہیں۔ دراصل ہماری کامیابی ... جیب پہ ہاتھ مارنے سے پہلے بندے کو ٹٹول اور پرکھ لیتے ہیں آپ۔ ان کے قدم اکھاڑ دو۔ جو لوگ گھر سے مال لے کر چلتے ہیں نا جی وہ تو خود اس کی خبر دیتے ہیں۔ ان کا ہاتھ بار بار اسی جیب کی طرف جاتا ہے جس میں مال ہو۔ ہم بھی تاڑتے ... پھر پیچھے ہی موقع ملتا ہے، مال غائب۔ اب موقع بھی ... جاتا ہے۔ بس کو اچانک جھٹکا لگا، ڈرائیور نے ماردی بریک تو بیٹھے کھڑے ہوئے سب خود کو گرنے سے بچانے ... میں سنبھلتے ہیں یا کسی پر چڑھ جاتے ہیں۔ ... بس یہی ہوتا ہے موقع۔ اس ... سیکنڈ کے لیے آدمی کی توجہ مال سے ہٹ جاتی ہے۔ وہ خود کو سنبھالتا ہے یا معذرت کرتا ہے ورنہ ڈرائیور کو گالی دیتا ہے۔ اسی ایک سیکنڈ میں ہم ہاتھ کی صفائی دکھا جاتے ہیں، بندے کو معلوم بھی نہیں ہوتا۔ کچہری میں موقع خود پیدا ہوجاتا ہے۔ جس سے چاہو اور پیچھے آتے جاتے ٹکرا جاؤ۔ کوئی برا نہیں مانتا اور اسے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کب لٹ گیا۔ کس نے ٹکر ماری تھی جیب صاف کرنے کی نیت سے۔ ٹکر تو بھیڑ بھاڑ میں ہوتی رہتی ہے۔ کئی جگہ خود کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ کبھی گرنے سے کبھی کسی اور سے ٹکرانے سے۔ سب سوری کرکے گزر جاتے ہیں۔"

پیٹ بھرنے یا کسی کے قدم اکھاڑ کے لوٹ لینے کے اس بے ضرر ایک نفسیاتی مسئلے کی افادیت نے مجھے حیران کر دیا۔ کسی جیب کترے کی زبانی اس کے فن کے اسرار و رموز سے آشنائی کا یہ پہلا موقع تھا۔

"تو تم وہاں شکار کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ پھر کیا ہوا؟" شیخ نے متانت سے کہا۔

"پہلے تناول فرما لیجیے سر جی؟" حوالدار بجلی نے کمرے میں قدم رنجہ فرما کے اعلان کیا۔ "صرف چکن بریانی ہے۔"

"اچھا تم تناول فرماؤ۔" شیخ نے کہا۔ "ہم آتے ہیں۔ ہاں بھئی!" وہ پھر ان زیر تفتیش سے مخاطب ہوگیا۔

"ہمیں ایک آدمی نے بلایا اور کہا کہ ایک چھوٹا سا کام ہے۔ دونوں کو ہزار ہزار دوں گا۔" موٹے نے کہا۔ "اسی نے ہمیں طریقہ بھی سمجھایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ بس اس آدمی

www.paksociety.com

کر بیچ کے لے آؤ۔ میں اپنی گاڑی کے پاس کھڑا ہوں۔ تھانے لے جانے کے لیے اس کو اندر ڈال دو اور خود بھی بیٹھ جاؤ۔ جہاں کہو گے اتار دوں گا۔ باقی کام میرا۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا۔ دو ہزار کم نہیں تھے اور کام زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ کا تھا۔ ہم نے کہا رقم ایڈوانس دے دیں۔ انہوں نے دے دی۔"

"بے وقوف۔ اگر بعد میں وہ اس شخص کو قتل کر کے سڑک پر پھینک دیتے تو تم کیا کرتے؟" شیخ نے کہا۔ "کتنے لوگ گواہی دیتے کہ انہیں پکڑ کر لانے والے تم تھے۔ وہ سارے اسٹامپ وینڈر اور منشی اور ٹائپ کرنے والے۔ کیا بتاتے تم ان کے بارے میں؟ قتل کا کیس ایسا تو نہیں ہوتا کہ تمہارے ملک صاحب کی سفارش سے ختم ہو جاتا؟"

ان دونوں کا رنگ اڑ گیا۔ دو ہزار پیشگی مل جانے کے بعد وہ نتائج کی سنگینی کے بارے میں سوچنا تک بھول گئے تھے۔ اسی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ محض جیب کترے ہیں۔ کوئی خطرناک مجرم نہیں۔

"اس شخص کی گاڑی دیکھی تھی تم نے؟" شیخ نے کہا۔ "اس کا رنگ۔ ماڈل۔ نمبر؟"

ان دونوں نے سر جھکا کے اپنی کوتاہ اندیشی اور بے وقوفی کا اعتراف کیا۔

"اچھا پھر دیکھو گے اس شخص کو تو پہچان لو گے؟" شیخ نے کہا۔ "خدا کا شکر کرو کہ آج قتل کے الزام میں پھنسنے جانے سے بچ گئے۔ اگر وہ شخص تمہارے ہاتھ آ جاتا تو اب تک اس کی لاش مردہ خانے پہنچ چکی ہوتی۔ صورت یاد ہے نا اس کی؟"

ان دونوں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "پھر دیکھیں گے تو ضرور پہچان لیں گے عالی جاہ! آپ چاہیں تو وہ دو ہزار بھی رکھ لیں۔"

"بکواس مت!" شیخ نے گرج کے کہا۔ "افسوس یہ ہے کہ تم واردات کا ارتکاب کرتے پکڑے نہیں گئے۔ نام بتاؤ اپنے، اچھا رہنے دو۔ میں ملک صاحب سے پوچھ لوں گا سب کچھ۔ انہیں تو پتا بھی معلوم ہوگا۔"

"نام تو میرا بھولا ہے جی" چھوٹے نے کہا۔ "اور یہ چھوٹو ہے۔ ملک صاحب پتا نہیں بتائیں گے۔"

"اچھا" شیخ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "پھر ابھی تم یہیں رہو جب تک تمہارا صحیح ٹھکانہ معلوم نہ ہو جائے۔ حوالدار۔ لے جاؤ انہیں۔" اس نے بلند آواز میں کہا اور ہمارے ساتھ باہر آ گیا۔ حوالدار کی جگہ وہی کانسٹیبل پھر نمودار ہوا اور انہیں ہنکا کے لے گیا۔

حوالدار آفس میں ماحضر تناول فرمانے کی کارروائی میں بڑے انہماک سے مصروف تھا۔ ہمیں دیکھ کے اس نے ... زور دار ڈکار لی اور پانی کا گلاس اٹھا لیا۔ ہم سب نے بچے ہوئے چکن بریانی سے لنچ شروع کیا۔

"کیا انکشافات ہوتے ہیں اس ناچیز پر کہ عقل دنگ رہ جائے" میں نے کہا۔ "یعنی دھندا جیب کاٹنے کا اور ذکر بدبختی کے ... کا اور ایمانداری پر قائم رہنے کا۔"

"میرے علم میں تو اتنا اضافہ ہوا ہے کہ سوچتا ہوں یہی پیشہ اختیار کر لوں" محسن نے کہا۔ "چند دن کو ٹریننگ ... ۔"

"اس پیشے کے اور دلچسپ اور مضحکہ خیز پہلو ... نے کہا۔ "مثلاً یہی علاقوں کی تقسیم کا مسئلہ۔ اس میں بعض اوقات ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک جیب تراش نے کسی موٹی اسامی کو تاڑا اور اس کے پیچھے لگ گیا۔ اب ... اسے بدقسمتی سے موقع ہی نہیں ملا اور علاقہ دوسرا شروع ہو گیا کسی دوسرے جیب تراش کا۔ تو وہ آگے نہیں جائے گا۔ ... کا سودا کرے گا۔ اپنے کسی ہم پیشہ کو بتا دے گا کہ اسامی موٹی ہے ... مال ملنے کی امید ہے۔ اتنے میں سودا منظور ہے تو مال ... میں بتا رہا ہوں۔ اب بالکل یہ لاٹری والا کھیل ہے۔ معمولی سے ... پھر موٹی مرغی دوسرے کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ لیکن ... پھر جرم بہ قول ... نے خوش رہا۔ کہ مال تو میرا تھا مگر قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اب آگے دوسرا اپنی قسمت آزماتا ہے۔ خدا ... وہ بھی ناکام رہے اور تیسرے علاقے کی حدود میں داخل ہو جائے تو وہ رقم لے کے واپس مل جاتی ہے جو اس نے وار ... تھی۔ بعض اوقات ایک ہی اسامی چار چار پانچ پانچ ہاتھوں میں جاتی ہے اور اسے خبر نہیں ہوتی کہ کرنے والے کس مزے سے اس کا خرید و فروخت کر رہے ہیں۔"

مجھے اور محسن کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "پھر تو کسی جیب کترے کے گروہ میں تو نہیں رہا؟" میں نے کہا۔

"اگر وہ میں تو نہیں رہا لیکن اتفاق ہے کہ میں نے ... بہت قریب سے لیا ہے" شیخ ہنسا۔ "ایک زمانہ تھا ... میں رہتے تھے۔ وہیں ایک جیب کتروں کا ... تھا جہاں ... سرغنہ رہتا تھا۔ محلے میں اس کی بڑی عزت تھی اور وہ ... صاحب کہلاتا تھا لیکن عموماً لوگ یہ بات جانتے تھے کہ ... ہے۔ بس کچھ محلے داری کی وجہ سے۔ کچھ دشمنی کے ڈر سے ... شہادت نہ ہونے کے باعث اور پولیس کے چکر سے ... بچنے کے لیے کوئی اس کی رپورٹ نہیں کرتا تھا۔ ایک ... گلبرگ سے چار نمبر بس میں بیٹھا اور داتا ... اسٹیشن پہنچا۔ ... ہیں۔ تمہیں معلوم ہے وہ بس آدھا لاہور گھوم

ہے۔ اسٹیشن تک پہنچ کر معلوم ہوا کہ پرس غائب تھا کیونکہ ٹکٹ میں نے اتر نے کے بعد آلو بخارے خریدے تھے۔ جیب میں دوبارہ رام گلی کی بس میں چڑھا اور کنڈکٹر نے ٹکٹ کے پیسے مانگے تو پرس غائب۔ میں سخت پریشان اور شرمندہ ہوا۔ کچھ لوگ ٹکٹ نہ دینے کے لیے جیب کٹ جانے کا بہانہ استعمال کرتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے کنڈکٹر کو ایک میرا آلو بخارے پیش کیے کہ قبول فرمائیے اور ہم کو ایک ٹکٹ عنایت کر دیجیے۔ معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوا؟ کنڈکٹر نے دانت نکالتے ہوئے لفافہ لے لیا اور بظاہر لیا جیسے میرا جانتے والا ہے۔ "اس تکلف کی کیا ضرورت ہے جناب!" وہ بولا اور ٹکٹ دیے بغیر آگے نکل گیا۔"

ہنستے ہنستے میرا اور محسن کا برا حال ہو گیا۔ "قائمے میں رہا تو ورنہ وہ اتار دیتا بے عزت کر کے تو مارچ کرنا پڑتا۔"

"ابھی اور سنو۔" وہ بولا۔ "شام کو میں شاہ جی کے گھر گیا۔ میں نے کہا شاہ صاحب بڑے افسوس کی بات ہے اب محلے داری کا اتنا بھی لحاظ نہیں رہا۔ آپ ہی کے علاقے میں کسی نے ہاتھ صاف کر دیا۔ شاہ جی نے مجھے تسلی دی اور تفصیلات پوچھیں۔ مشورہ کر لیا آپ کو یقین ہے جیب اسٹیشن آنے سے پہلے نہیں کاٹی گئی۔ میں نے آلو بخارے والا واقعہ عرض کیا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ پرس اس وقت نہیں نکلا تھا۔ وہ قائل ہو گئے۔ "اسٹیشن سے پہلے ہمارا علاقہ نہیں ہے باؤ جی۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن اب آپ فکر نہ کریں۔ رات کو عشاء کے بعد آ جائیں۔ پرس مل جائے گا۔" مجھے ذرا بھی یقین نہیں تھا مگر رات آٹھ بجے گیا تو انہوں نے وہ پرس میرے سامنے رکھے اور کہا اپنی چیز اٹھا لیں اور رقم گن کے تسلی کر لیں۔ میں نے ہنس کر سمجھا دیا ہے۔ دیکھیں نا جی کی ... کے تھے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ پرس میں ایک روپیہ تک کم نہیں تھا۔"

کھانے کے بعد شیخ نے مزنگ تھانے کا نمبر ملایا۔ "شیخ ... انسپکٹر ... بول رہا ہوں۔ ہاں۔ وہ اپنے ملک صاحب ... بول رہے ہیں۔ اچھا اچھا۔ ملک صاحب ہی بول رہے ہیں۔ السلام علیکم۔ ... خیریت ہی تھی۔ وہ دو آج مشرق چوکی کے احاطے ... پکڑے گئے تھے۔ ایک خود کو بھولا بتاتا ہے۔ معاف ... بھولا کہتا ہے۔ دوسرا چھوٹو۔ کہتے ہیں ملک صاحب ... تھانے والے جانتے ہیں ... میں نے کہا اچھا ابھی ... معلوم کر لوں گا۔ کیا پتا ہے ان کا؟ پھر بھی کوئی ٹھکانہ ہوگا ... ضرورت پڑنے پر انہیں بلایا جا سکے۔ نہیں ابھی ... آپ کی ذمہ داری پر۔ لیکن بعد میں ان کو

بلانا پڑا تو۔۔۔ جی۔ آپ سے کہہ دوں۔ بہت بہتر۔ السلام علیکم۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ "دونوں ملک صاحب کے آدمی ہیں۔ جیب تراشی کے علاوہ مخبری بھی کرتے ہیں۔ ان کو روکے رکھنے سے کیا حاصل۔ وہ تو نکل گئے جنہوں نے دو ہزار میں انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ پیچھے جائیں اپنے دو ہزار واپس وصول کریں۔ نقد یا ناکامی کی سزا دے کر۔ حوالدار!"

حوالدار بکل زیادہ کھا لینے کے بعد کسی کرے میں قیلولہ فرما رہے تھے۔ وہ جماہیاں لیتا افیم کھانے والوں کی طرح سلو موشن میں چلتا ہوا نمودار ہوا۔ "حکم عالی جاہ!"

"ان دونوں کی چھٹی کر دو۔ واپس آ کے" شیخ نے کہا۔ "اور تم کو بھی سونا ہی ہے تو گھر جاؤ۔ چار بجنے والے ہیں حشمت خان کو چارج دے کر میں بھی چلا جاؤں گا۔" حوالدار نے سر ہلایا اور ملزمان کو تفتیش یا جرمانے کے بغیر رہا کر دینے کی مصلحت پر غور کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ کام کی کوئی بات ہمیں بھی معلوم نہیں ہوئی تھی چنانچہ ہم نے اجازت چاہی۔ چلتے چلتے مجھے نازلی کا قرض یاد آیا۔

"یار شیخ! دو ہزار جو میں نے نازو کے لیے تھے ابھی تک ادا نہیں ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔

شیخ ہنسا۔ "کوئی بات نہیں۔ سو روپیہ روز کے حساب سے سود ادا کر دینا۔ اس کا تو یہی حساب ہے؟"

"اچھا!" میں نے کہا۔ "آج رات ہم آئیں گے اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے۔" شیخ نے مصیبت سود کے بارے گراں کو ہی سمجھا ہوگا لیکن میرے نقطۂ نظر سے خود نازو ایک مصیبت بننے لگی تھی۔

"دنیا کیسے کیسے لوگوں سے بھری پڑی ہے" محسن نے باہر آ کے کہا۔ "مثلاً یہ بھولا اور چھوٹو۔ اور ان کے برعکس مست قلندر رحیم اور شکیل صدیقی۔ جو آج تو مرحوم نہیں ہو سکے مگر۔"

"مگر دیر کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ اپنا کام کر کے نکل گیا۔ اب وہ کسی کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ گاڑی دے گیا لیکن جرح کے لیے حاضر نہیں ہوگا۔ زمانہ ہم کو ڈھونڈے گا نہ جانے ہم کہاں ہوں گے۔"

"میرا خیال ہے اس کیس میں اب جان نہیں رہی۔" محسن نے کہا۔ "یہ دشمنوں کی سب سے بڑی شکست ہے۔ باقی رہ جاتا ہے مار پیٹ اور توڑ پھوڑ کا مقدمہ تو وہ کوئی سنگین معاملہ نہیں۔ اس کے ذمے دار کسی حد تک ہمارے اشتعال انگیز حالات تھے۔"

www.paksociety.com

"بظاہر تو مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن عقلمندوں نے کہا ہے کہ دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ دشمن اگر دلاور جیسے ہوں تو خود کو کسی خطرے سے محفوظ سمجھنا بے وقوفی ہے۔ انہوں نے میر شرافت علی کے قتل کا الزام مجھ پر عائد کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہے تو کیا؟ اس سے پہلے ہی وہ مجھے میر محمد کے قتل میں ملوث کرنے کا انتظام کر چکے تھے۔ مجھ پر جبل اور رشیدے کے قتل کا الزام تو یقیناً آ جاتا لیکن مارنے والے ہاتھ سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہے۔ جبل نے مرتے مرتے مجھے بچا لیا۔ میری کوشش کا کیا دخل تھا اس میں کہ وہ ٹیپ آج بحفاظت عدالت تک پہنچ گیا۔ کرنے والوں نے تو اس شہادت کو ضائع کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا تھا۔ اس کی خاطر میر محمد، اس کی بیوی اور مست قلندر کی افراد تو اپنی جان سے گئے۔ زیادہ سے زیادہ میں میر محمد کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس انجام کا مستحق تھا لیکن اس کی بیوی اور اس کے بچے یا مست قلندر کا خاندان؟ انہیں کس بات کی سزا ملی؟"

"اس عشق کی حقیقت کو بھی کسی نے نہ سمجھا۔" محسن بولا۔ "ملک خیر نظر آنے کے باوجود جمیلہ صدیقی کتنا عظیم ہے۔ کوئی تصور کر سکتا ہے اس کے عشق کا۔ یہ کیا تھا؟ صرف ایک عورت کے حصول کی خواہش اور اس میں ناکامی کا ردِعمل۔ وہ جذبہ تو اسی شدت کے ساتھ زندہ رہا۔ وہ عورت کسی اور کی ہو گئی اور شاید بھول بھی گئی کہ جمیل نام کے کسی شخص نے اسے چاہا تھا لیکن کمال دیکھو کہ جب وقت آیا تو اسے ساری دنیا میں جمیل سے زیادہ اعتماد کے قابل کوئی نظر نہ آیا اور اس نے کتنی عقیدت سے یہ بارِ امانت اٹھا لیا۔ کوئی رقابت نہیں، کوئی حسد نہیں، کوئی شکایت نہیں۔ یہ خیال نہیں کہ بچے کس کے ہیں۔ تمام عمر ایک نام سے نسبت رہی دل کو۔"

"کتنی حسرت سے کہا تھا اس نے کہ ہاں وہ عزیز تھی مجھے۔ بے حد عزیز تھی۔" میں نے کہا۔ "سب نے یہی سمجھا کہ وہ اپنے اور اس عورت کے رشتے کو تسلیم کر رہا ہے۔ وہ رشتہ کیا تھا؟ یہ صرف ہم جانتے ہیں۔ جب اس نے آتش کے جوان ہونے کا ذکر کیا تھا تو کچھ دیر کے لیے اس کا ذہن بھٹک گیا تھا۔ لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس نے فرض کر لیا ہے کہ اغوا کرنے والوں نے اس عورت کو قتل کر کے کہیں گاڑ دیا لیکن یہ بات اس نے کتنے غیر جذباتی انداز میں کہی۔ وجہ یہی کہ اس عورت سے وقتی رشتہ نہ پہلے تھا۔ نہ اب ہے۔ وہ اس کے خیال سے اور اس کے تصور سے پرستش کے جذبات وابستہ کیے زندہ ہے چنانچہ اس کے ذہن میں وہی پرانی فرعونی تیل نازک اقدام اٹھا جب تھی اس کے لہجے میں اس وقت آ گئی تھی جب وہ ایک عورت پر ہونے والے مظالم اور بچوں کے ذہن پر ان کے اثرات کا ذکر کر رہا تھا مگر یہ تلخی بھی غیر ذاتی تھی۔ میرا مطلب ہے اگر وہ کسی اجنبی عورت اور اس کے بچوں کا ذکر کرتا تب بھی اس کا لہجہ ایسا ہی تلخ ہو جاتا۔ ایک طرف یہ دیوانگی۔ دوسری طرف زندگی کا یہ شعور کہ اس نے ٹیپ سن کر تمام معلومات حاصل کیں اور انہیں عدالت تک پہنچا دیا۔ کیا آدمی تھا۔"

ہمارے گھر پہنچنے تک شام ہو گئی تھی۔ رضوی صاحب لان پر بیٹھے تھے لیکن اکیلے نہیں تھے۔ وہ دین محمد سے کسی بات پر بحث کر رہے تھے جو میر محمد کا بھائی تھا۔ ہم قریب جا کے بیٹھے تو ہم نے محسوس کیا کہ رضوی صاحب کا موڈ خراب تھا۔

"مجھے افسوس ہے سر۔ تھانے والوں نے میر محمد کے قتل اور اس کی بیوی کے اغوا کے کیس میں دلچسپی نہیں لی۔ ابھی تک کسی کو اس سلسلے میں تفتیش کے لیے گرفتار تک نہیں کیا گیا۔" وہ بولا۔

"تمہیں اگر کسی پر شک ہے تو بتاؤ۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور تم کیا چاہتے ہو؟ کیس سی آئی اے یا کرائم برانچ والوں کے سپرد کر دیا جائے؟ اس کے لیے تمہیں ڈی آئی جی کرائمز کے پاس جانا چاہیے۔"

"وہ کہتے ہیں پولیس خود ہی کوئی کیس ٹرانسفر کر سکتی ہے۔" دین محمد نے تلخی سے کہا۔ "حالانکہ یہ دو واقعات بالکل واضح ہیں اور ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں۔ مثلاً آپ کے اسلام آباد جانے سے پہلے مجھے بے ہوش کر کے اور باندھ کے پیچھے آپ کے سرونٹ کوارٹر میں ڈال دیا گیا۔ اُدھر میرا بھائی غائب ہوا اور تھانے کی حدود میں سے اس کی بیوی کو اٹھا لیا گیا۔"

"تمہارے پاس اگر کوئی ثبوت ہے کہ تمہیں ناک آؤٹ کرنے والے اور تمہارے بھائی کے گھر میں واردات کرنے والے وہی لوگ تھے تو بتاتے کیوں نہیں؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "میرا خیال ہے کسی کو تمہارے خاندان سے دشمنی تھی۔ پولیس اسی خاندانی تنازعہ اور انتقام کی لائن پر تفتیش کر رہی ہے۔"

"یہ تو سراسر غلط ہے۔ ہمارا کوئی دشمن نہیں تھا۔ ہمارا کوئی تنازعہ نہیں تھا۔ نہ زمین جائیداد کا۔ نہ رشتے ناتے کا۔" دین محمد نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے سر کہ دونوں جگہ واردات کے منظر میں اتفاق کی کوئی وجہ نہیں۔ مجھے یہاں کس کے لیے حفاظت پر مامور کیا گیا تھا؟ اور میر محمد کس کے خلاف قتل کے الزام کی تفتیش کر رہا تھا؟"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ وہ نام لیے بغیر اشارہ دے رہا تھا لیکن میں عمداً خاموش رہا۔

"تم سکندر بخت کو تفتیش میں شامل کرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "البتہ یہ بات منطقی طور پر عجیب سی لگے گی کہ میں سکندر بخت کی زندگی کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی وجوہات تھیں۔ پہلے کے واقعات۔ اور وہ یہاں اکیلا رہ گیا تھا اس لیے میں نے عارضی طور پر تمہیں تعینات کر دیا۔ اب تم کہو گے کہ اسی نے تمہیں مار باندھ کے ڈال دیا حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اگر وہ تمہیں نجات نہ دلاتا تو ہماری واپسی تک تم وہیں پڑے رہتے اور خدا معلوم اس وقت تک کیا ہو جاتا۔ تم کسی کو مدد کے لیے بھی متوجہ نہ کر سکتے۔ پھر مجھے اس کا سبب بتاؤ۔ یعنی فرض کرو سکندر نے ایسا کیا تو کیوں کیا؟"

"یہ تو تفتیش کرنے والے معلوم کر سکتے ہیں سر۔" دین محمد بولا۔ "لیکن آپ مزید اتفاقات پر غور کریں۔ میر محمد کے گھر میں پیش آنے والے واقعات اور اس کی بیوی بچوں کے اغوا کا پتا کس نے چلایا؟ اے ایس آئی شیخ نے۔"

"یہ غلط ہے۔" رضوی صاحب کے نفی میں سر ہلانے سے قبل بخت نے کہا۔ "پہلے تم گئے تھے۔ تم نے دروازہ کھلا پایا تھا اور سب سے پہلے تم نے خود ہی اندر کی تباہی کا نظارہ دیکھا تھا۔ یہاں اور شیخ بعد میں پہنچے۔"

"لیکن اس وقت میں ساتھ نہیں تھا جب تم نے اور شیخ نے میر محمد کی آدھی لاش دریافت کی تھی۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "جو کہنا ہے صاف کہو۔"

"صاف کیا کہوں سر! سب کچھ تو آپ کے سامنے ہے۔" وہ بولا۔ "اسی شخص کی وجہ سے سب کچھ ہوا۔ اسی کی حفاظت کرتے ہوئے مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اسی کے کیس کی تفتیش کرتے ہوئے میرا بھائی مارا گیا۔ یہ اس وقت بھی موجود تھا جب میر محمد کے گھر تباہی کا پتا چلا اور اس وقت بھی جب اس کی ادھوری لاش نکالی گئی۔ یہ اس کا دوست ہے اے ایس آئی شیخ۔ پھر اس کے سر کے بارے میں کچھ پتا چلا کہ ایک گاڑی میں تھا۔ وہ گاڑی بھی چلا رہا تھا۔ ٹریفک والوں نے اس کا نمبر تک دیکھ لیا تھا لیکن وہ گاڑی مس رابعہ قادری کی ثابت ہوئی جو اسی کی وکیل ہیں۔ انہوں نے کہہ دیا کہ وہ گاڑی تو اسلام آباد گئی ہے۔ اس سے کسی نے سوال تک نہیں کیا۔"

"دیکھو دین محمد! یہ سب کچھ لکھ کے تم ڈی آئی جی صاحب کو درخواست دے دو۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہارے ذہن میں شبہات کی نوعیت کیا ہے۔ تمہارے خیال میں سکندر بخت نے پہلے تمہیں ناک آؤٹ کیا۔ پھر میر محمد کو قتل کر کے کہیں گاڑ دیا لیکن اس کا سر اپنے ساتھ لے آیا۔ پھر سکندر بخت نے میر محمد کی بیوی اور بچوں کو اغوا کیا اور مارا پیٹا۔ اور رابعہ نے اس کی مدد کی۔ اے ایس آئی شیخ نے اس کی مدد کی۔ پولیس اس لیے تفتیش سے گریز کر رہی ہے کہ سکندر سے میرا کوئی تعلق ہے۔" وہ اب غصے میں تھے۔ "تم کو جذبات نے پاگل کر دیا ہے دین محمد۔ اس لیے میں تم کو قصوروار نہیں سمجھتا۔ تمہاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو چکی ہے۔ تم آزاد ہو۔ ایک ایک درخواست سب کے خلاف دے دو اور دیکھو نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ تمہیں دماغ کے معائنے کے لیے بھیج دیا جائے گا۔"

"آپ چاہیں گے تو ایسا ہی ہو گا سر۔" دین محمد اٹھتے ہوئے بولا۔ "لیکن مجھے نوکری کی پروا نہیں۔"

"شٹ اپ۔ بیٹھو ادھر اور میری پوری بات سنو۔" رضوی صاحب نے گرج کے کہا۔ "یہ دنیا جانتی ہے کہ میر محمد کس قماش کا آدمی تھا اور اے ایس آئی شیخ کیسا آدمی ہے۔ اس میں میری گواہی شامل نہیں ہو گی۔ مجھ سے سن لو کہ میر محمد کیوں مارا گیا۔ اگر تم آج عدالت میں ہوتے تو ایک ایسے شخص کی زبان سے ساری کہانی سن لیتے جس کا نام بھی شاید تم نے نہیں سنا ہو گا۔ میر محمد نے اپنی تباہی کا سامان خود کیا تھا۔ اس نے ایک ٹیپ غائب کر دیا تھا تاکہ دو افراد کے قتل کا جرم ثابت ہو جائے۔ لیکن خود اس کی بیوی نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ میر محمد کا جھوٹ ثابت ہو چکا ہے۔ اس نے کس کے کہنے پر ایسا کیا تھا۔ اور کیا تھا تو ٹیپ اپنے پاس کیوں رکھا۔ یہی وہ جرم تھا جس کی وجہ سے وہ مارا گیا۔ اس کی بیوی کو شوہر کے جرم کی سزا ملی۔ انجام ایک ہوا لیکن اسباب مختلف تھے۔ میر محمد اپنے لالچ کے باعث قتل ہوا۔ اور اس کی بیوی نے جو کچھ کیا وہ اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی ہی کے لکھا گیا۔ ان دونوں کے بچے محفوظ ہیں۔ کل کا اخبار پڑھ کے دیکھنا۔"

دین محمد کا جوش و خروش کچھ کم ہو گیا۔ "میرا مطلب یہ نہیں تھا سر۔"

"مجھے مطلب مت سمجھاؤ۔ میں نے تم سے زیادہ نوکری کی ہے اور اس سے زیادہ پیچیدہ نوعیت کے مقدمات دیکھے ہیں۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "تم کو شکایت ہے کہ رابعہ قادری ایڈووکیٹ نے جھوٹ بولا۔ تمہارے لیے سب دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ تھانے جاؤ۔ براہِ راست ایس ڈی ایم کو

www.paksociety.com

شکایت لکھوا دو یا ڈی آئی جی کو۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اے ایس آئی اکرام شیخ نے تو استعفیٰ دے دیا ہے مگر ابھی تک منظور نہیں ہوا ہے۔ اس کے خلاف دوسری درخواست لگا دو کہ جب تم نے اپنے بھائی کے گھر کی حالت دیکھی تو وہ کیوں موجود تھا؟ ایک گمنام اطلاع پر اس نے نصف شب کو کارروائی کیوں کی اور تمہارے بھائی کی لاش برآمد کیوں کی۔ گمنام شکایات پر کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ اچھا تھا اگر وہ لاش پر لات رکھے تھانے میں بیٹھا رہتا۔ اب رہ گیا سکندر۔ اس کے خلاف الگ تحقیقات شروع کرا دو کہ اس نے تمہیں کیوں آزاد کیا۔ یہ ثابت کرنا چاہو تو کر دینا کہ اسی نے تمہیں باندھا تھا۔ یہ نکتہ بھی اٹھانا کہ اے ایس آئی اکرام شیخ کے ساتھ یہ کیوں موجود تھا؟ یہ سب اپنی اپنی جوابدہی کریں گے۔ میرے خلاف بھی ایک درخواست دے دو کہ میں مجرموں کی پشت پناہی کر رہا ہوں۔ مجھے پروا نہ ہوگی۔ میرا ماضی بے داغ ہے اور ضمیر مطمئن ہے۔ اگر الزام تمہارے بیٹے پر ہوتا تو کیا تم اسے نکال سکتے تھے گھر سے؟ پھر یہ توقع مجھ سے کیوں رکھتے ہو کہ میں سکندر کو اس گھر میں رہنے بھی نہ دوں حالانکہ وہ میرے بچپن کے دوست کا بیٹا ہے اور اس کی حیثیت پہلے بھی اس گھر میں ایک فرد کی تھی جب اس پر قتل کا کوئی الزام نہیں تھا۔ اور دین محمد! اسے جب پھانسی ہو گئی تو اس کی لاش لینے والا وارث میرے سوا کوئی نہیں ہوگا۔ سمجھے؟"

دین محمد کا چہرہ فق ہو گیا۔ رضوی صاحب خوش گفتار، اور ۔ ۔ خوش اخلاق آدمی تھے اور لہجے کی ملائمت پر یوں برہم نہیں ہوتے تھے۔ شاید اسی رویے نے دین محمد کو اس جسارت پر اکسایا تھا کہ ان کے سامنے آ کے اول فول بکنا شروع کر دے۔ اب رضوی صاحب نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا تھا۔ جو بات اس کی ناقص عقل میں اس لیے نہیں آ رہی تھی کہ اس کی راہ میں جذبات حائل تھے وہ اس کی سمجھ میں آ گئی تھی اور اس پر چند لمحے میں روشن ہو گئے تھے۔

خادم جو چائے اندر سے لا کے درمیان میں رکھ گیا تھا وہ پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ انکل رضوی نے محسن سے کہا کہ وہ دوسری چائے منگوا لے۔ محسن کے اندر جاتے ہی دین محمد نے اجازت چاہی۔

"بیٹھو ابھی، چائے پی کر جانا۔" رضوی صاحب نے حکم دیا۔ وہ اب سگار کا کش لگا رہے تھے اور نسبتاً پرسکون تھے۔ "تم پولیس میں ہو دین محمد؟" انہوں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "یہ جانتے ہو کیا اس شہر میں ہونے والے اغوا، قتل اور دیگر تمام جرائم کا سراغ لگانے کا ذمے دار میں ہوں؟ ابھی تم سے پہلے اس عزیز کی بیوی آئی تھی۔ اس نے رو رو کے میرے پاؤں پکڑنے کی کوشش کی جیسے میرے سوا اس کے گمشدہ شوہر کو کوئی نہیں لا سکتا۔ ڈی آئی جی کو وہ پہلے ہی درخواست دے چکی ہے اور اس پر احکامات بھی صادر ہو چکے ہیں۔ میرے پاس کیا الٰہ دین کے چراغ کا جن ہے جسے میں حکم دوں اور وہ پلک جھپکنے میں مسئلہ حل کر دے۔ یہ سب تھانے۔ سی آئی اے۔ ایف آئی اے۔ ایس پی، ڈی ایس پی اور صوبوں کے ڈی آئی جی اور آئی جی آخر کس لیے بیٹھے ہیں۔ کیا تم اسی طرح ڈی آئی جی کے گھر جا سکتے تھے اور ان سے اتنی ہی دیر تک اس لہجے میں بات کر سکتے تھے؟ لیکن میں سمجھتا ہوں تم ہمدردی کے مستحق ہو۔ سکندر بخت کا سارا کیس معلوم ہے تم کو۔ تمہیں معلوم ہے اس کے ساتھ کیا کچھ ہوا؟ کیا اس کے لیے میں نے کوئی خصوصی کوشش کی؟ پولیس کے سارے محکمے کو لائن اپ کر دیا؟ کوئی خصوصی ٹیم تشکیل دی ان کے معاملات کی تفتیش کے لیے؟ کیا تم سے پہلے اس کا حق نہیں تھا۔ مجھے اپنے اختیارات سے تجاوز کرنا ہوتا تو اپنی افسری سے ناجائز مدد کر لی ہوتی تو ان کی مدد کرتا۔ جا کے پکڑ ٹھیک کر لیتا۔ مجھے اس نظام انصاف پر اعتماد ہے۔ ایک عدالت کے اوپر دوسری ہے۔ پھر ہائی کورٹ ہے۔ سپریم کورٹ ہے۔ وہاں جو لوگ بیٹھے ہیں اپنی عقل و فراست اور تجربے سے اس مقام تک پہنچے ہیں اور خدا نے انہیں جھوٹ سچ میں تمیز کرنے کی اہلیت صلاحیت سے نوازا ہے۔ کسی سے غلط فیصلہ ہوتا ہے تو اس لیے کہ اس کے سامنے حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ گواہ جھوٹ بولتے ہیں۔ لیکن کسی نہ کسی مرحلے پر اس کی تلافی ہو جاتی ہے اور فیصلہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے اور عین انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ میں ایک انتظامی افسر ہوں۔ آئندہ تم پاس آنے کے بجائے انصاف کرنے والوں سے رجوع کرو۔ شکایت کسی کے خلاف بھی ہو مجھ سے پاس مت آنا۔"

چائے پیتے ہوئے میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم نے میر محمد کے بارے میں انکل کو پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس انکشاف کے بعد کہ اس کا سرغنہ کس دشمن سے دستیاب ہوا تھا وہ ہمیں کبھی نہ بخشتے۔ میں اور محسن نہایت سعادت مندی سے خاموش بیٹھے رہے۔ ہمارا کیس رضوی صاحب خود دیکھ رہے تھے چنانچہ ہمارا دین محمد سے لڑنا حالات کو ہمارے خلاف کر دیتا۔ تھوڑی سی بہت جھاڑ پڑنے کی امید اب بھی تھی۔ ان کا موڈ بے حد خراب تھا۔ دین محمد سے انہوں نے جو کچھ کہا وہ مدلل اور ناقابل تردید تھا چنانچہ وہ اپنا سا منہ لے کر ۔۔۔ تو ہماری شامت آتی۔

"دیکھا تم دونوں نے۔ زندگی میں کبھی کسی ماتحت کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ میرے سامنے تو کیا میرے گھر آ کے اس قسم کی باتیں کر سکے۔" انہوں نے خفگی سے کہا۔ "اور تم لوگ ہو کہ ہم پولیس والوں سے نفرت۔ ابھی تک نہیں سمجھے ہو کہ دنیا کس طرح چل رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے دونوں مل کے اس پورے نظام کی اصلاح کیے بغیر دم نہیں لو گے۔" وہ اندر جانے لگے کچھ سوچ کے لیکن اندر سے رابعہ نے نمودار ہو کے انہیں طلب کیا۔

"آنٹی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آپ دیکھ لیں ڈاکٹر کو بلانا ہے کہ ہسپتال لے جائیں۔" رابعہ نے کہا۔

رضوی صاحب سب کچھ بھول گئے۔ اپنا غصہ بھلانے کی کوشش میں ادھ بجھا ہوا سگار چھوڑ کے وہ اندر لپکے۔

"کیا ہوا ہے بیگم رضوی کو؟" میں نے حیران اور پریشان ہو کے کہا۔

"تمہارا سر!" رابعہ نے برتن اٹھاتے اٹھاتے کہا۔ "وہ سب تو ہونا ہی تھا۔ پھر یہ چنگیز خان آ گئے چائے کے بہانے اور ہاتھ جوڑنے لگے کہ آنٹی ہم تو مارے گئے۔ کسی طرح انکل کو اندر بلا لیں۔"

"بڑے شرم کی بات ہے خان صاحب۔" میں نے شرمندہ ہو کے محسن کو ڈانٹا۔ "کیا تھا اگر ہم جھاڑ کی ایک ڈوز لے جاتے۔"

"ان کی طبیعت واقعی خراب تھی۔" محسن ڈھٹائی سے بولا۔ "میں نے کہا آپ لیٹ جائیں اور انکل کو بلا لیں۔ ہماری جان بخشی بھی ہو جائے گی۔ رحمدل خاتون نے اس گناہ گار کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا۔"

"لیکن اب اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ یہاں بے فکر بیٹھے دانت نکالتے رہو۔" رابعہ نے کہا۔ "اٹھو، اندر جا کے دیکھو۔"

میں اور محسن فوراً اٹھے اور اندر دوڑے۔ ضرورت سے زیادہ وفاداری اور مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم نے ڈاکٹر کو بلانے پر اصرار کیا لیکن بیگم رضوی نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بات ٹال دی۔ "رابعہ نے ایسے ہی پریشان کیا سب کو۔ بس ذرا سر میں درد تھا اس لیے اسپرین کھا کے لیٹ گئی تھی۔ اب ٹھیک ہے۔"

رضوی صاحب وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور سگار سلگاتے ہوئے "اچھا ہو گیا آج۔" انہوں نے عدالتی کارروائی کا حوالہ دیا۔

"آپ نے کمال کر دیا انکل۔" میں نے کہا۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ جمیل صدیقی زندہ سلامت واپس جا سکے۔"

"جمیل صدیقی؟ وہ کون ہے؟" انہوں نے بے خیالی میں کہا۔ "اچھا وہی۔ مدیر صدائے وقت۔ وہ بس اتنی جلدی میں کرنا پڑا سب انتظام کہ میں خود مطمئن نہیں تھا۔ بات سمجھنے میں ذرا دیر لگی۔ مگر خیر۔ تم لوگ جاؤ۔ نہانا دھونا ہو گا۔"

میں نے اور محسن نے اتنی آسانی سے گلو خلاصی پر خدا کا شکر ادا کیا اور باہر آ گئے۔ محسن کو نہا کے غسل کرنا تھا اور مجھے اس کا ارادہ اسلام آباد ٹیلی فون کرنے کا تھا۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کے رابعہ کے کمرے کا رخ کیا۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ "کون ہے؟" اس نے میری کھٹکھٹاہٹ دستک پہچان لینے کے باوجود کہا۔

"شرفا!" میں نے کہا۔ "سوری۔ یہ تو جمع کا صیغہ ہے۔ واحد متکلم حقیر فقیر پر تقصیر۔ طالب خیرات حسن۔"

"معاف کرو فقیر صاحب۔" اس نے دروازہ کھول کے جھانکا۔ "بیٹھے بٹھائے بھیک مانگتے شرم نہیں آتی؟"

میں زبردستی اندر داخل ہو گیا۔ "پہلے آتی تھی اب نہیں آتی۔" میں نے کہا۔ وہ آئینے کے سامنے بال سنوار رہی تھی۔ اس کے گہرے سیاہ بالوں کو یوں کھلا ہوا میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نظارہ حسن نے مجھے پل بھر کے لیے مبہوت کر دیا۔

رابعہ نے آئینے میں مجھے دیکھا اور اس کا رنگ گلابی ہو گیا لیکن اس نے پلٹے بغیر کہا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

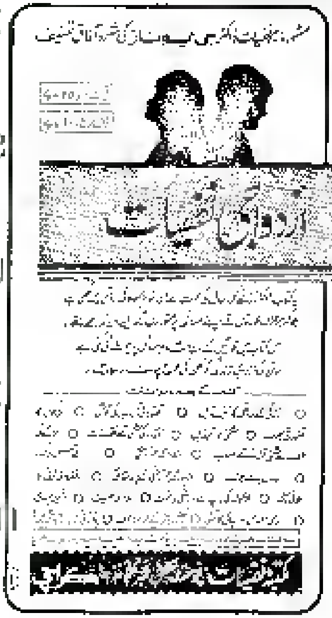

www.paksociety.com

"جو کچھ سوچ رہا تھا وہ تو نہیں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "تم کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی ہو؟"

"مجھے کہاں جانا ہے؟" وہ بولی۔

"جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے ساتھ۔ اور میں تم کو لے کر ہی جاؤں گا۔"

اس نے گھوم کر مجھے دیکھا۔ "نصیب دشمناں دماغ پہ کچھ اثر معلوم ہوتا ہے۔" وہ بولی اور مسکرائی۔

"مسئلہ بہت سنگین ہے رابعہ۔" میں نے گھٹنے سمیٹ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اور نہیں ہوا تو ہو جائے گا۔ لیکن یہ مسئلہ فی الحال قانونی نہیں ہے۔ اخلاقی اور معاشرتی ہے۔ اس کو حل کرنے میں تمہاری مدد، بلکہ رضامندی درکار ہے۔"

"میں نے تمہارے سارے مسائل حل کرنے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔ جب دیکھو مسئلہ۔ کبھی کوئی اور بات بھی کر لیا کرو۔"

"قسم خدا کی اگر میں نے وہ باتیں شروع کر دیں نا تو تم ایک منٹ نہیں ٹھہرو گی یہاں۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "دیواروں سے سر پھوڑتا رہ جاؤں گا میں۔ تم کو واقعی میرے ساتھ چلنا ہے۔ مجھے، تم کو اور محسن کو۔"

"لیکن کہاں؟" وہ مجھے سنجیدہ دیکھ کے بولی۔ "انکل ناراض ہوں گے۔ گاڑی بھی نہیں ہے۔"

"انکل بالکل ناراض نہیں ہوں گے اور ہم محسن کی گاڑی میں جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اکرام شیخ کے گھر۔"

"اس کے گھر میں کوئی تقریب ہے؟" وہ بولی۔ "تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔"

"نہیں۔ اس نے مدعو کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "خود ہی نے کہا تھا کہ ہم آئیں گے۔ مقصد صرف ملاقات نہیں ہے۔ میں تم کو نازلی سے ملوانا چاہتا ہوں۔ شیخ کی بہن سے۔"

رابعہ ہنسی۔ "جتنی ضد ہے تو تم جا کے ملو اس سے۔ مجھے ساتھ کیوں گھسیٹتے ہو۔ کیا اب میں [illegible]؟"

"میں ابھی یہ سارا میک اپ خراب کر دوں گا۔ منہ پر بھبھوت مل دوں گا۔" میں نے ایش ٹرے کو الٹ کر ہتھیلی پر خالی کی۔ "اور بال بنا دوں گا بیا کا گھونسلا۔" میں جارحانہ طریقے پر آگے بڑھا۔ "بات سنو گی سنجیدگی سے یا نہیں؟"

"ارے رے ــــ پاگل ہو گئے ہو۔" وہ گھوم کر بیڈ کے کنارے پر جا کھڑی ہوئی۔ "اچھا کہو کیا بات ہے؟"

میں پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "شیخ کی یہ بہن نازلی عرف نازو میرے لیے وبال جان بن رہی ہے۔ بہت کم سن ہے نادان ہے اور سادہ۔ اسے کچھ بھی معلوم نہیں میرے بارے میں۔"

"کیا معلوم نہیں؟ تمہارا کچا چٹھا تو اخبار میں چھپا ہے۔ اور وہ سب اسے [illegible] آئی شیخ کی بہن۔"

"پھر وہی۔" میں نے اسے دھمکی کے انداز میں کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ میں اب محبت نہیں کر سکتا۔ کسی اور سے کچھ نہیں کر سکتا۔"

"آئی سی۔" رابعہ سنجیدہ ہو کے بولی۔ "اور وہ تم پر مر رہی ہے کسی سے محبت کرنے پہ؟ کون ہے وہ؟"

"وہ مجھ پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئی ہے۔ تمہارا [illegible]" میں نے چلا کے کہا۔ "اسے نہیں معلوم کہ میں تم پر مرتا ہوں۔"

رابعہ کا رنگ فق ہو گیا۔ "خدا کے لیے آہستہ بولو۔ یہ کیا بچپن ہے۔"

"کسے نہیں معلوم کہ کون کس پہ مرتا ہے۔" محسن فاتحانہ بلا اجازت اندر قدم رنجہ فرما کے کہا۔

"یار محسن! وہ جو شیخ ہے نا۔ اس کی بہن نازو نے بڑا سخت پریشان کر رکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی مجھے اسرار قریشی سے ملنے جانا ہے۔ میں نے شیخ سے کہہ دیا تھا کہ ہم آئیں گے۔ اب وہاں ایک ڈرامہ کرنا ہے۔ تم کسی طرح نازو کے سامنے انکشاف کر دینا کہ ..... کہ رابعہ میری منگیتر ہے ..... کہ بہت جلد ہماری شادی ہونے والی ہے۔ کوئی [illegible] تمہیں ایسا مل جائے گا جب نازو ہو گی یا اس کے والدین ہوں گے۔ شیخ بھی ہو تو کوئی ہرج نہیں۔"

رابعہ کا چہرہ حیا سے گلنار ہو گیا۔ "سکندر! ایسا [illegible] انکل کو معلوم ہو جائے گا۔"

"ہو جانے دو۔ وہ بعد کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ میرے لیے اس لڑکی سے جان چھڑانے کی اور کوئی صورت نہیں رہی۔ اسے ایک ہی مرتبہ یہ کڑوی گولی نگلنے پر مجبور کر دیا جائے۔ امید ہے اس کو بھی [illegible] بات کو بڑھنے سے پہلے ہی ختم کر دینا بہتر ہے۔ ورنہ [illegible] شیخ اپنا دوست ہے۔ اس لڑکی نے یہ جذباتی [illegible] جاری رکھی تو اسے ضرور معلوم ہو جائے گا اور اس کو [illegible] ٹھیس پہنچے گی۔"

"ٹھیس تو اس کے دل کو بھی پہنچے گی۔" محسن نے [illegible] کہا۔ "اور میں نے سنا ہے ٹھکرائی ہوئی عورت زخم خوردہ ناگن سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔"

"آپ نے اب تک جو کچھ سنا ہے وہ مجھے [illegible]" میں نے کہا۔ "رابعہ! تو اب تم جا کے انکل سے گاڑی کی بات کرو۔"

نو بجے کے قریب جب ہم شیخ کے گھر پہنچے تو دعوت کا اہتمام دیکھ کر حیران رہ گئے۔ میں نے تو سرسری طور پہ کہا تھا کہ ہم آئیں گے لیکن وہاں سب یوں چشم براہ تھے جیسے ہمیں خصوصی طور پر مدعو کیا گیا ہے۔ رابعہ نے دلچسپی سے نازلی کو دیکھا جو سادگی کے باوجود بڑے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ رابعہ کی موجودگی پر کسی جذباتی تاثر کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن نازو کا شگفتہ سا کھلا ہوا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے بجھ گیا۔ "آپ سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

"یہ رابعہ قادری ہیں۔ مشہور رائیڈ وریکٹ۔" محسن نے کہا۔ "ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں۔"

"ہمارے ساتھ کا کیا مطلب؟" نازو مسکرائی۔ "آپ کے ساتھ۔ یا آپ کے ساتھ؟" اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

محسن نے مسکرا کے کہا۔ "جیسے میرے ساتھ رہتا ہے وہ تو اسلام آباد میں بیٹھی ہے۔" اس نے بڑی خوبی سے اور بڑے واضح الفاظ میں سب کچھ کہہ دیا تھا۔ اکرام شیخ کے والدین معذرت کر کے جا چکے تھے کہ آپ لوگ گپ شپ کریں۔ نوجوانوں کی محفل میں ہم بوڑھوں کا کیا کام۔ اور شیخ کسی کو فون کر رہا تھا چنانچہ محسن نے موقع سے فائدہ اٹھا لیا۔

کھانے کے دوران میں اور واپسی تک نازلی بجھی بجھی سی رہی۔ اس کی ساری شگفتگی اور شوخی کافور ہو چکی تھی۔ شیخ نے اسے محسوس کیا اور نازو کو چھیڑا مگر اس کے منہ کو چپ لگ گئی۔ انکل کی خرابی صحت کا بہانہ کر کے ہم جلد ہی لوٹ آئے۔ روانہ ہوتے ہی مجھے یوں لگا جیسے کوئی اور کار بھی ہمارے تعاقب میں روانہ ہوئی ہے۔ تصدیق کے لیے میں نے اپنی گاڑی کو غلط سمت میں ویران سڑکوں پر موڑا اور رفتار کم زیادہ کر کے دوڑایا لیکن وہ دوسری گاڑی بدستور پیچھے رہی۔

شک محسن کو بھی ہو گیا تھا اور اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کئی بار پلٹ کے دیکھا مگر رابعہ کے خیال سے خاموش رہا جو نہ جانے کس خیال میں گم تھی۔ شاید اسے نازلی کے دل پہ پہنچنے والے صدمے کا خیال تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ آج وہ خود نازلی کی جگہ ہوتی تو اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی۔ مجھ پر اس کا اعتماد برقرار تھا مگر ایک نادان لڑکی کو شکست دے کر اس جیت کے نتائج پر خود فخر کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔ وہ اتنی کم ظرف نہ تھی ــــ تعاقب کرنے والی گاڑی سو گز کا فاصلہ برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شبہے کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی اور ہم سب سامنے دور ہی [illegible] تھے۔ [illegible] کے شہر کی خالی سڑکوں پر پولیس کا فلمی سین پیش کر دوں اور سامنے جل دے کر نکل جاؤں۔ اس میں کامیابی یا ناکامی یا کسی حادثے کے امکانات مساوی تھے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں رک کے پیچھے آنے والوں کو سامنے آنے کا موقع دوں اور اگر ان کے عزائم غلط ہوں تو محسن کے ساتھ ان سے دو دو ہاتھ کر لوں۔ لیکن اس میں بھی خطرہ یہ تھا کہ ہمارے مقابل چار چار ہاتھ ہوئے یا آٹھ آٹھ تو مقابلہ برابر کا نہیں رہے گا اور پھر رابعہ کا کیا ہو گا؟

"سکندر!" میرے خیالات کا تسلسل محسن نے توڑ دیا۔ "یہ کون ہیں جو ہمیں گھر تک چھوڑنے پر کمربستہ ہیں۔ رضوی صاحب کے بندے یا ہمارے پرانے دوستوں کے نامہ بر؟"

رابعہ نے چونک کے پیچھے دیکھا۔ اسی وقت پیچھے والی کار ایک دم آگے آئی اور میں نے اندازہ کیا کہ اس طاقتور مرسیڈیز کو تیز رفتاری میں شکست دینا محال ہے۔ "یہ تو اب ان سے پوچھنا ہی پڑے گا۔" میں نے ہیڈ لائٹس آف کرتے ہوئے کہا۔ "رابعہ! کوئی ایسی ویسی بات ہو تو تم مت رکنا۔" میں نے چلا کر کہا اور رفتار کم کر کے اچانک بریک لگائے۔ "گاڑی لے کر نکل جانا۔"

میری آواز تصادم کے چھناکے سے دھماکے میں دب گئی۔ مرسیڈیز نے جان بوجھ کے پیچھے سے ٹکر ماری تھی اور مقصد صرف یہی ہو سکتا تھا کہ اب ہم دونوں نیچے اتر کے اپنی اپنی گاڑی کو دیکھیں۔ نقصان

www.paksociety.com

کا جائزہ لیتا اور ایک دوسرے کو موردِ الزام قرار دیتا۔ سڑک پر ہنگامہ تماشا ہوتا ہی رہتا ہے اور فضولی کسی کی ہمدردی میں ٹانگ اڑانے کی بجائے ہر شخص ایک طرف ہو کر اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ قانون کی مدد سے تلافی کا کوئی نہیں سوچتا لیکن یہاں ٹکر مارنے والے کچھ اور چاہتے تھے۔ اگر مقصد ہمیں ہلاک کرنا ہوتا تو وہ پیچھے سے فائرنگ کرتے یا دستی بم پھینک کر فرار ہو جاتے لیکن شکاری اب دفاعی کھیل پر اتر آئے تھے کیونکہ وہ یقین کر چکے تھے کہ ہم میں سے کسی کی موت سے ان کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا ورنہ یہ کام تو بہت آسان تھا اور بہت پہلے بھی کیا جا سکتا تھا۔ ان کے عزائم کی تکمیل ہمارے زندہ گرفتار ہونے سے ممکن تھی۔

ٹکر کے وقت گاڑی سڑک کے انتہائی بائیں جانب تھی۔ چنانچہ میرا دائیں طرف سڑک پر اترنا ہی ممکن تھا۔ محسن نے زیادہ عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا اور وہ بھی اُدھر کا دروازہ کھول کر ہی نکلا جدھر سے میں نکلا تھا۔ اگر وہ دوسری طرف اترتا تو زیادہ محفوظ رہتا اور چھپ کے زیادہ مؤثر کارروائی کر سکتا تھا۔ میں نے انجن بند نہیں کیا تھا۔ اترتے اترتے میں نے رابعہ کو سیٹ پر گھسیٹ لیا اور چلا کر اپنی بات دہرائی۔

"جاؤ۔ نکل جاؤ۔" ہمارے پیچھے آنے والی مرسیڈیز کے ڈرائیور نے بھی انجن بند نہیں کیا تھا۔ تصادم سے ہماری گاڑی کچھ آگے ہو گئی تھی۔ مرسیڈیز ذرا سے پیچھے ہوئی۔ ابھی ہمارے قدم زمین پر پڑے ہی تھے کہ وہ راستہ کاٹ کے اس طرح آگے آئی جیسے ڈرائیور کا ارادہ ہمیں کچل دینے کا ہو۔ میں نے اور محسن نے ایک ساتھ جست لگائی لیکن مرسیڈیز کا اگلا دروازہ ہماری گاڑی کے کھلے دروازوں سے ٹکرایا۔ دونوں دروازے ٹوٹ کے سڑک پر گرے اور ایک خوفناک آواز کے ساتھ سڑک کی سخت کھردری سطح پر دور تک گھسٹتے ہوئے گئے۔ میں اور محسن اپنی اپنی جان بچانے تک کامیاب رہے تھے لیکن رابعہ کی خوفزدہ نظروں نے اندھیرے میں کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے فرض کر لیا کہ ہم بھی گاڑی کے نیچے کچلے گئے۔ "سکندر!" اس نے دہشت زدہ ہو کے چیخ ماری۔

"رابعہ! گاڑی نکال کے لے جاؤ۔" میں نے اسے چلا کے زندہ سلامت ہونے کا ثبوت فراہم کیا ورنہ شاید وہ نتائج کی پروا کیے بغیر سڑک پر آ جاتی۔ میرے اندیشے یہ تھے کہ حملہ آور کسی کو قتل کرنا نہیں چاہتے۔ مجھ پر دباؤ ڈال کے اپنے مطالبات کے سامنے سر جھکانے کے لیے مجبور کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ اب یہی رہ گیا تھا کہ وہ کسی اور کی جان یا آبرو کے بدلے میں مجھ سے سب کچھ لے لیں۔ وہ جانتے تھے کہ رابعہ اور محسن کے لیے میں سب کچھ دے سکتا ہوں۔ دنیاوی مال و متاع بھی اور اپنی جان بھی۔ لیکن انہیں تو صرف ایک تحریر مطلوب تھی کہ میں سکندر بخت ولد وزیر خان برضا و رغبت میر وزیر اسٹیٹ کی ملکیت کے دعوے سے دستبرداری قبول کرتا ہوں۔ اعترافِ شکست کی اس دستاویز پر دستخط کے بعد مجھے کچھ نہیں کرنا تھا … کرنے کو کچھ باقی بھی نہیں رہتا لیکن میرے لیے مرنے والوں کا … رائیگاں جاتا تھا۔ ابھی تک میں نے کئی بار سوچا تھا مگر کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وقت آیا اور مجھے ایک طرف … یا ان کی طرح کسی اور کی زندگی اور مقابل میں سب سے … والوں کی آرزوئے انتقام میں سے کسی کا انتخاب کرنا پڑا تو … کسے چھوڑوں گا۔ اس وقت میرے ساتھ رابعہ بھی تھی اور … بھی تھا لیکن شکاری بھی انتخاب کرتے تو رابعہ کو ہی لے جاتے۔ وہ قانون کی عدالت میں ہمارا دفاع کر رہی تھی لیکن لاقانونیت کی قوت کے مقابل وہ ہمارے دفاعی حصار کا سب سے کمزور حصہ تھی۔ کیونکہ وہ بہرحال ایک عورت تھی۔ کمزور لیکن میری ساری طاقت تھی۔

گاڑی جو سائڈ سے آگے نکل گئی تھی تو بڑا سا گھوم کر ہماری کار کے سامنے رُک گئی تھی۔ یوں کہ اس کی طوالت نے سڑک کی چوڑائی میں گزرنے کا راستہ بند کر دیا تھا۔ میرے اندیشے بجا ثابت ہو رہے تھے۔ وہ رابعہ کو لے جانے آئے تھے اور … ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی اترتا اور رابعہ کو گھسیٹ کر لے جاتا میں نے ایک جست لگائی اور دروازے پہ جا پڑا۔ ڈرائیور نے دروازہ کھول کے ایک پاؤں زمین پر رکھا ہی تھا کہ میں نے دروازہ اپنے جسم کی قوت سے بند کر دیا۔ وہ بیچ میں دب کے کراہا۔

"محسن!" میں نے چیخ کر کہا۔ "یہ گاڑی جانے نہ پائے۔" محسن میرے ساتھ ہی آگے آیا تھا اور اس نے بھی حملہ آوروں کے دوسرے ساتھی کو دوسری طرف سے اترتے دیکھ لیا تھا۔ وہ دونوں گاڑیوں اور سڑک کے ساتھ بنی ہوئی دیوار کے درمیان تین طرف سے محصور تھا۔ اس نے اپنی گاڑی کی ڈگی پھلانگ کے مجھ پر کودنے کی کوشش کی لیکن محسن نے اسے دھکا دیا تو پلٹ کر گرا اور دیوار سے ٹکرایا۔

"رابعہ! گاڑی پیچھے کرو اور ریورس میں لے جاؤ۔" یہ محسن کی آواز تھی۔ میری ساری قوت اس شخص کو اندر رکھنے پر صرف ہو رہی تھی جو آدھے کھلے دروازے سے باہر آنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ ہماری گاڑی ایک دم پیچھے ہوئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ رابعہ ان کے ہاتھ نہیں آئی۔ اب ہمارے لیے امداد بھی حاصل کر سکتی تھی اور رضوی صاحب کو

بھی بتا سکتی تھی کہ ہم کہاں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی کوٹھی میں چلی جائے گی اور وہاں کے رہنے والوں کو بلائے گی اور وہیں سے انکل رضوی کو بھی فون کر دے گی۔ لیکن گاڑی کو ریورس میں دور تک لے جانے کے بجائے وہ صرف دس گز پیچھے لے گئی اور پھر آگے لے کر آئی۔ اس وقت تک وہ دوسرا شخص اٹھ کھڑا ہوا تھا جسے محسن نے پیچھے گرا دیا تھا۔ وہ حملے کی نیت سے آگے بڑھا ہی تھا کہ اس نے کار کو تیزی سے آتے دیکھا۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے پھر پیچھے جست لگائی اور سیدھا دیوار سے لگا۔ رابعہ نے خاصی رفتار سے گاڑی آگے لا کے ٹکر ماری۔ غالباً اس نے وہ بات سن لی تھی جو میں نے محسن سے کہی تھی۔ ایک اور دھماکا ہوا اور میں جھٹکے سے دور جا گرا۔ مجھے شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ پھر شیشے کے کنکر جیسے ٹکڑے اوپر گرے۔ ہیڈلائٹس کا اجالا غائب ہو گیا اور میں سمجھ گیا کہ ٹکر سے ہماری گاڑی کا کیا حال ہوا ہو گا۔ اس کی ہیڈلائٹس کا ہی نہیں ونڈ اسکرین کا بھی چورا ہو گیا ہو تو عجب نہیں۔ لیکن مرسیڈیز کا بھی تھوڑا بہت نقصان ضرور ہوا ہو گا۔ جب میں اٹھا تو میں نے دیکھا کہ دھکا لگنے سے مرسیڈیز آگے بڑھ کر دیوار میں گھس گئی تھی۔ دیوار منہدم ہونے سے مرسیڈیز کے شیشے بھی چکنا چور ہو گئے تھے اور ملبہ اس کے اوپر پڑا تھا۔ بونٹ پر اور ونڈ اسکرین کے کھلے شگاف سے سیٹوں پر اور اگلے پہیوں کے آس پاس۔ چنانچہ گاڑی اب پھنس گئی تھی اور اس کے نکل جانے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ جو کام محسن نہیں کر سکتا تھا وہ رابعہ نے ہمت اور حاضر دماغی سے کر دیا تھا۔

میں نے دوسرے حملہ آور کو رابعہ کی طرف لپکتے دیکھا۔ ہماری گاڑی کے دونوں دروازے کسمپرسی کے عالم میں ٹوٹے ہوئے سڑک پر پڑے تھے۔ چنانچہ اس کے لیے گاڑی میں داخل ہونا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ شاید وہ رابعہ سمیت ہماری گاڑی لے جانا چاہتا تھا۔ رابعہ نے اسے روکنے کے لیے لات ماری جو اس کے پیٹ پر لگی۔ پھر محسن نے اس کو پیچھے سے کھینچ لیا۔ "رابعہ!" محسن چلایا۔ "بے وقوفی مت کرو۔ گاڑی لے کر بھاگ جاؤ۔"

میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر نہ اٹھ سکا۔ میرے جسم کا دایاں حصہ سُن ہو کے ناکارہ ہو چکا تھا۔ جب رابعہ نے … مرسیڈیز کے دروازے پر جسم کا سارا بوجھ ڈال کے جکڑا ہوا تھا۔ جھٹکے سے دروازہ کھلا اور … زبردست … مجھے کسی جناتی ہاتھ کی طرح دور پھینک دیا تو سڑک … اور پتھروں پر گرنے سے مجھے … کے پاس درد اٹھنے پر شدید چوٹ آئی تھی۔ انتہائی بے بسی سے میں نے محسن کو اپنے حریف کے ہاتھوں ناک آؤٹ ہوتے دیکھا۔ وہ سڑک پر گر کے پھر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گاڑیوں کے ٹکرانے کی اور ٹوٹنے کی دہشت بکھرنے کی اور دیوار کے منہدم ہونے کی آوازوں کے شور نے رات کے سکوت کو درہم برہم کر دیا تھا۔ اس گھر کے مکین جاگ اٹھے تھے جس کی دیوار زد میں آئی تھی۔ گیٹ لائٹس روشن ہو گئی تھیں اور اندر سے کچھ لوگ چلاتے دوڑتے آ رہے تھے۔ پھر مجھے اور بھی لوگ نظر آئے جو چوکیدار تھے یا آس پاس کے رہنے والے۔ ان سب کا خیال یہی ہو گا کہ دو گاڑیوں کا خوفناک ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ خالی سڑک پہ دو گاڑیوں کے یوں ٹکرانے کا مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ اوور ٹیک کرتے ہوئے کسی وجہ سے ایک گاڑی بے قابو ہوئی۔ وجہ اگلے پہیے کا نکل جانا یا ٹائر برسٹ ہو جانا بھی ہو سکتی تھی۔ اور ڈرائیور کی مدہوشی بھی۔ لیکن اب شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ ہم پر غالب آ جانے والے حملہ آوروں کی گرفتاری یقینی تھی۔

پھر اس شخص کو اچانک میں نے اپنے سر پر دیکھا جو مرسیڈیز کا ڈرائیور تھا۔ اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔ "خبردار!" وہ چلایا۔ "کوئی آگے نہ آئے۔" اس نے قریب آنے والوں کی طرف دو ہوائی فائر کیے۔ چار پانچ جیالے ایک دم رُک گئے اور پلٹ کر بھاگے۔ جیسے وہ صرف تماشا دیکھنے کے لیے آئے تھے وہ حاضر نہیں تھا۔ بھاگنے والوں میں سے ایک خوف اور گھبراہٹ میں منہ کے بل گرا اور ساکت ہو گیا۔ اسے گولی ہرگز نہیں لگی تھی۔ وہ کمزور دل تھا یا دل کا مریض تھا۔ دوسرے لمحے ہوائی فائر کرنے والے نے ریوالور کا بٹ میرے سر پر دے مارا۔ سارا منظر ایک لمحے کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سیکنڈ کے ایک حصے کے لیے مجھے پھر ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں محسن کو گھسیٹ رہے تھے اور رابعہ اپنی بے مصرف نازک قوت کے ساتھ محسن سے لپٹی ہوئی تھی اور مدد کے لیے چیخ رہی تھی۔ اس کے بعد آخری آواز فائر کی تھی یا گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی۔ گھپ اندھیرے میں بصارت کے ساتھ میری سماعت بھی ختم ہو گئی اور میرا وجود بے حسی کے اندھے کنویں میں ڈوب گیا۔

مجھے ہوش آیا تو حالات بدلے ہوئے تھے۔ فطری طور پر سب سے پہلے مجھے یہ خیال آیا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رفتہ رفتہ بحال ہوئی۔ پھر منظر جو میرے پیشِ نگاہ تھا لیکن فوکس آؤٹ تھا، واضح ہونے لگا۔ میں ایک عام سے کمرے میں تھا اور انہی کپڑوں میں بیڈ پہ لیٹا ہوا تھا جو گزشتہ شب زور آزمائی کے وقت میرے جسم پر تھے۔ رات

www.paksociety.com

بیٹھ چکی تھی کیونکہ دو جانب دبیز و عریض کھڑکیاں تھیں جن پر سے پردے ہٹا دیے گئے تھے اور باہر کے روز روشن کا اجالا اندر بھی پھیل رہا تھا۔ کمرہ خاصے تکلف سے آراستہ تھا۔ چاروں دیواروں پر ایک آبنوسی ہاتھ نے دودھیا شیشے والی لائٹ تھام رکھی تھی۔ چھت کا پنکھا خاموشی سے گھوم رہا تھا اور بالکل وسط میں تھا۔ نیچے منقش قالین پر ایک صوفہ سیٹ اور درمیان میں سینٹر ٹیبل سیٹ رکھا تھا۔ گلاس ٹاپ اور سنہری المونیم کی پٹی کے حاشیے والا۔ ایک کونے میں پیڈسٹل لیمپ استادہ تھا اور دیوار پر لینڈ اسکیپ کا ایک منظر تھا جس میں سورج کو طلوع یا غروب ہوتے دکھایا گیا تھا۔ پینٹنگ کوئی چار فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی تھی لیکن فریم سے کم قیمت تھی۔

سب سے آخر میں سر گھما کے میں نے استاد پیڈرو کو دیکھا۔ وہ میز کی دوسری جانب کرسی پر اطمینان سے بیٹھا مسکرا رہا تھا اور مجھے گرد و پیش کا جائزہ لیتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک نمایاں تبدیلی کو میں نے فوراً نوٹ کر لیا۔ اس کے دونوں کانوں سے سونے کی مندریاں غائب ہو گئی تھیں جو اب تک اس کی شناخت بن چکی تھیں۔ اس نے اپنا ہیئر اسٹائل بھی بدل لیا تھا۔ بھورے گھنگھریالے اور سخت بالوں کی جگہ اس کے سر پر سیدھے سیاہ اور چمکیلے بال تھے جن کو اس نے درمیان سے دو حصے کر کے سنوار رکھا تھا۔ ایک جیسی شلوار قمیص کے بجائے وہ باریک سرخ دھاریوں والی سفید قمیص اور براؤن پتلون میں ملبوس تھا۔ لیکن اس ظاہری انقلاب سے اس کی صورت کی خباثت میں کمی نہیں آئی تھی اور اس کی آنکھوں سے جھانکنے والی درندوں جیسی سفاکی و بے رحمی ختم نہیں ہوئی تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو سکندر اعظم؟“ وہ بولا۔ ”کیا پہچانا نہیں؟“

”میں ولی ہونے کا دعوے تو نہیں رکھتا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن پھر بھی شیطان کو ہر روپ میں پہچان سکتا ہوں۔“

”اس نئی شخصیت کے لیے مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔“ وہ مسکرایا۔ ”تمہاری کوشش سے استاد پیڈرو کی لاش جو ہسپتال کے مردہ خانے پہنچی اور وہاں سے غائب ہو گئی۔ تمہارا دوست ایس آئی شیخ اور تھانے کا عملہ گواہ ہے کہ اس کی موت حوالات میں واقع ہوئی تھی اور ضابطے کی کارروائی کے مطابق اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی تھی۔ اب تو حشمت خان بھی یہی کہتا ہے اور وہ کانسٹیبل بھی جو لاش کے ساتھ گیا تھا۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ استاد پیڈرو مر گیا۔ وہ اتنا بدنام ہو گیا تھا اور اتنے لوگوں کی نظر میں آ گیا تھا کہ اس کا مرنا ضروری تھا۔“ پھر اسے کچھ اور یاد آیا۔ ”اب کیا خیال ہے تمہارا؟ میں کون ہوں؟ احمد نواز گردیزی؟“ وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ اب تم دنیا کے لیے کون ہو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم نے محسن اور رابعہ کے ساتھ کیا کیا۔ کیا وہ بھی میرے ساتھ ہی پکڑے گئے تھے؟“

”محسن تو نہیں پکڑا گیا۔“ وہ افسوس سے سر ہلا کے بولا۔ ”پولیس سے مزاحمت کی اس نے حالانکہ وہ بھی ہمارے ساتھ آ جاتا تو اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ دیکھ لو تم کتنے آرام سے ہو۔“

”وہ دونوں کہاں ہیں؟“ میں نے چیخ کر کہا اور اٹھنے کی کوشش کی لیکن خود ہی بستر پر گر گیا۔ ایک پٹی میری کہنی سے کلائی تک لپٹی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میں اپنا بازو سیدھا رکھنے پر مجبور تھا۔ دوسری پٹی گھٹنے کے اوپر سے نیچے تک پلستر کی شکل میں موجود تھی چنانچہ میں دائیں ٹانگ ہلانے سے قاصر تھا۔

”تمہیں شاید علم نہیں۔“ استاد پیڈرو نے جیب سے سگریٹ نکال کے اطمینان سے جلائی۔ ”تمہارے گھٹنے سے نیچے ٹانگ کی ہڈی میں بال آ گیا ہے۔ اگر تم نے مزید ہنگامہ آرائی کی تو بال بڑھ کے دراڑ بن جائے گا۔ ابھی تو ڈاکٹر کا خیال ہے کہ پندرہ بیس دن میں تم لنگڑا کے چل سکو گے اور مہینے دو مہینے میں بالکل سیدھے۔ لیکن ہڈی ٹوٹ گئی تو......“

”مجھے اپنی میڈیکل رپورٹ نہیں چاہیے۔“ میں نے اپنا غصہ کو بے سود سمجھتے ہوئے کہا۔ ”میرے سوال کا جواب دو۔“

”محسن کے بارے میں مجھے افسوس ہے۔“ وہ کش لے کر دھواں چھت کی طرف چھوڑتے ہوئے بولا۔ ”لیکن تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اسے قتل کیا۔ اسے مار پیٹ میں سر کی چوٹ آئی تھی۔ وہ دو دن ہسپتال میں بے ہوش پڑا رہا۔“

”جھوٹ...... بکواس کرتے ہو تم!“ میں نے کانپتے ہوئے کہا۔ ”محسن نہیں مر سکتا......“

”ہم سب مر سکتے ہیں سکندر اعظم!“ وہ تلخی سے بولا۔ ”وہ سکندر اعظم بھی مر گیا جس نے دنیا کو فتح کرنا چاہا تھا۔ ایک مچھر کے ڈنک نے اس کا خاتمہ کر دیا تھا۔ کیا اور لوگوں کو مرتے تم نے نہیں دیکھا؟ تو پھر محسن کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ مر نہیں سکتا بڑی عجیب سی بات ہے۔“

”تم مجھے وحشت زدہ کرنا چاہتے ہو۔ غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔“ میں نے یقین کی گرتی ہوئی دیوار کو استوار رکھنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ ”ایسی ہی بات تم رابعہ کے بارے میں کہو گے۔“

”نہیں۔“ پیڈرو نے نفی میں سر ہلایا۔ ”رابعہ کے بارے میں کوئی بیان نہیں دوں گا میں۔ اس لیے کہ مجھے خود بھی پتا نہیں وہ کہاں ہے۔ ممکن ہے کسی اور کو معلوم ہو۔“

”کیا وہ رضوی صاحب کے گھر میں نہیں ہے؟“ میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ سوال کیا۔

”نہیں۔ وہاں تو یقیناً نہیں ہے۔“ پیڈرو بولا۔ ”اس لیے کہ تم نے اخبارات میں خود مشہور خاتون ایڈووکیٹ اور ان کے دوست کی پُراسرار گمشدگی کی سنسنی خیز خبر پڑھی تھی۔ اخبار والے ایسی خبروں سے بہت فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک اخبار نے تو پہلے ہی یہ شوشہ چھوڑ دیا تھا کہ یہ ایڈووکیٹ اور سکندر بخت پہلے سے دوست ہیں لیکن سکندر بخت پر قتل کا الزام ہے چنانچہ ان کی عزیزہ خاتون ایڈووکیٹ گمشدہ ہیں۔ دونوں ایس پی خان صاحب عزیزی کے گھر میں مقیم تھے چنانچہ گمشدگی کو فرار بھی سمجھا جا سکتا ہے۔“

میں اس سے زیادہ نہ سن سکا۔ لیکن میں بے بس تھا۔ ورنہ میں ایک ہی گھونٹ کے اس کی زبان بند کر سکتا تھا اور میرے قریب کوئی ایسی چیز بھی نہ تھی جو میں اس پر کھینچ مارتا۔ میں نے اس پر تھوکا اور اسے ایک سے ایک گالی دی — تکیہ دور جا گرا اور پیڈرو اسی اطمینان کے ساتھ بیٹھا مسکراتا رہا۔ بالآخر میں بے دم ہو گیا۔

”افسوس مجھے اس بات کا ہے کہ تمہارے اور رابعہ کے اسکینڈل میں خان رضوی صاحب جیسے بااصول اور ایماندار افسر کو بھی استعفیٰ دینا پڑا۔“ پیڈرو نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”وہ کسی کو مشتبہ لوگوں کے ساتھ پناہ دینے کے قابل نہیں رہے تھے۔ آدمی عزت دار اور باغیرت تھے ورنہ رشوت کو ٹھوکر نہ دیتے۔ ان پر ایک مجرم کی اعانت اور سرپرستی کا الزام آ گیا تو کیا۔ یہ الزام تو پولیس پر بہت پرانا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ وہ مجرموں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ ایک اور اخبار والا آزادی دور کی کوڑی لایا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ خاتون ایڈووکیٹ کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے شادی نہیں کی تھی جو سراسر غلط ہے۔ ان کی پہلی شادی ایک سی ایس پی افسر سے ہوئی تھی جس نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر ان کو رخصتی سے قبل طلاق دے دی۔ یہ بھی خیال ہے کہ خاتون ایڈووکیٹ کی دلچسپی کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک سابق صنعت کار کا ولایت پلٹ بیٹا ہے جس کے قتل کی سماعت کا مقدمہ زیر سماعت ہے اور فیصلہ ملزم کے حق میں ہو جانے کی صورت میں ایڈووکیٹ کو اس سے بہتر دوسرا رشتہ نہیں مل سکتا تھا جو اپنی آزادی خیال کے باعث خاصی مشہور ہیں۔ شکایت اور دشمنی میں خاتون ایڈووکیٹ کا گھر تباہ ہو گیا تھا۔ اب ملزم سکندر بخت کی وجہ سے ان کی پریکٹس بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔“

”مگر ان سب کی ایسی تیسی کر دوں گا۔“ میں نے عالم اشتعال میں اٹھنے کی کوشش کی اور بے بسی کی شدت سے بستر پر ہاتھ مار کے کہا۔ ”سب پر ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دوں گا۔ ان سب کو بہت مہنگا پڑے گا......“

”اچھا؟“ پیڈرو ہنسا۔ ”یہ سچ بولنا مہنگا پڑے گا؟ اس میں کوئی بات غلط ثابت کر سکو گے تم؟ پوری زندگی۔ ابھی تو تم اپنے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔“

یکلخت مجھے مایوسی کی ایک قیامت خیز لہر نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پیڈرو کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس داستان کا ہر لفظ گزرتے ہوئے وقت کی تفسیر تھا۔ رابعہ کے اور میرے بارے میں ہر بات سچ تھی۔ فرق صرف سچ کے مفہوم کا تھا۔ سنسنی خیز صحافت کی زبان میں یہ مشتبہ مراسم تھے اور پُراسرار گمشدگی بھی یا فرار تھا جب کہ میرے نزدیک یہ محبت تھی۔ وہ محبت جس کا تعلق صرف خوبصورت جذبوں سے تھا اور خوبصورت مستقبل کے خوابوں سے تھا اور یہ جذبے اور یہ خواب ہر آلودگی سے پاک تھے۔ ان میں صرف وفا کے سدا بہار پھولوں کی مہک تھی اور زندگی کی آبرو مند روایات کو تابندہ رکھنے کے لیے سارے رنگ تھے۔ یہ محبت اتنی معصوم تھی جتنا برگ گل پر اترنے والے قطرۂ شبنم کی مسکان۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب رابعہ نے کہا تھا کہ چلو سکندر ہم ان سارے جھمیلوں کی دنیا سے نکل جاتے ہیں لیکن میں نے کہا تھا کہ رابعہ! ہم کو اپنا گھر اس دنیا میں آباد کرنا ہے۔ اس طرح کہ وہ گویا ایسی بہشت ارضی ہو جسے دیکھ کر محبت کرنے والے رشک کریں۔ اور دنیا والے عقیدت سے سر جھکا دیں۔ پُراسرار گمشدگی اور فرار کا کیا سوال۔ یہ کیچڑ تو ہمارے منہ پر صرف اس لیے ملا گیا تھا کہ ہماری محبت کو ہوس کا شیطانی جذبہ بنا دیا جائے اور بدنامی کی یہ داستان پھیلا کر ہمیں مستقبل پر اعتماد کے رشتوں سے محروم کر دیا جائے۔ نیا جال لائے پرانے شکاری۔ انہوں نے مجھے کہیں اور پھینک دیا۔ رابعہ کو کہیں اور...... ہماری نجی زندگی کے معاملات کو اسکینڈل بنا کے پیش کر دیا کیونکہ اس کے منفی اثرات بہت دور رس تھے۔ اس کی لپیٹ میں خان رضوی صاحب کی نوکری آ گئی جو نوکری سے زیادہ ان کے لیے آبرو کا سودا تھی۔ یہ خبر شملا تک پہنچے گی۔ بالآخر وہ بھی یقین کرنے پر مجبور ہوں گی کہ زبان خلق غلط نہیں کہہ سکتی۔ پھر ڈاکٹر تک پہنچے گی جس کی نظر میں میرا جرم پہلے ہی ناقابل معافی تھا۔ وہ بھی یقین کر لے گی کہ سکندر بخت ہوس پرست تھا۔ اس کی ہوس نے انگلستان میں قتل کروائے۔ یہاں آ کے دولت کی ہوس نے اسے قاتل بنا دیا۔ انکل شیروانی کیا کہیں گے۔ اور اگر رابعہ کو بھی معلوم ہوا تو اس کے دل پر کیا بیتے گی؟ پھر مجھے وہ متعدد مواقع یاد آئے جب زندگی کی آزمائش کے لمحات بہت سخت تھے اور رابعہ نے کہا تھا ہمت نہ ہارنا سکندر۔ یہ جان تو آنی جانی ہے اس جہان کی کوئی بات نہیں۔ محسن مر گیا۔ پھر کیا ہوا؟ کیا آدمی ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ کے بغیر زندہ نہیں رہتے؟ انکل بھی تو اتنے ہی نہیں ہیں تو کیا ہوا؟ خدا کے اس سہارے پر تمہارا

www.paksociety.com

اعتماد کیوں متزلزل ہو رہا ہے جس نے مجھے اب تک حوصلہ دیا۔ سہارا دیا اور قوت دی کیونکہ تم حق پر تھے۔ آہستہ آہستہ میرے خیالات کی بازگشت رابعہ کی آواز بن گئی۔ بازی ابھی تمام نہیں ہوئی سکندر۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ تمہارا حوصلہ ختم کرنا، تم سے امید کا سہارا چھین لینا اور تمہیں اعتماد سے محروم کر دینا بھی دشمن شکاری کی ایک چال ہو۔ اور میں نے آنکھیں کھول کر پیڈرو کو دیکھا۔

'کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اس بات کا؟' میں نے کہا۔ 'محسن مر گیا۔ رابعہ لاپتا ہو گئی اور رضوی صاحب مستعفی ہو گئے ہیں؟ تم مجھے وہ اخبارات لا کے دکھا سکتے ہو جن میں یہ سب کچھ شائع ہوا ہے؟'

"کیوں نہیں۔" پیڈرو بولا۔ "اخبارات گزشتہ ہفتے کے ہیں' گزشتہ صدی کے تو نہیں۔ فوراً تو پیش نہیں کر سکتا لیکن لا دوں گا۔ کہیں نہ کہیں سے مل جائیں گے۔"

"یہ...... یہ گزشتہ ہفتے کی بات ہے؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "ایک ہفتے سے بے ہوش رہا ہوں؟"

"مجبوراً رکھا ہم نے؟" وہ بولا۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا اور میری نظر نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ دیوار پہ لگی ہوئی گھڑی وقت کے ساتھ ہی تاریخ بتا رہی تھی۔ جو واقعات مجھے یاد تھے ایک ہفتہ پرانے ہو چکے تھے۔

"کیا مجبوری لاحق تھی تمہیں؟" میں نے طنز آمیز تلخ لہجے میں کہا۔

"ایک مجبوری تو تم خود تھے۔ درد کی شدت سے چلاتے تھے تو ہمارا سونا بھی حرام کرتے تھے۔" وہ بولا۔ "پھر حکم یہی تھا کہ جب تک معاملات درست نہ ہو جائیں تمہیں اسی تخیل رکھا جائے۔ اب ہرگز مت پوچھنا مجھ سے کہ کون سے معاملات؟"

میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ کیا معاملات درست ہونے کا مطلب یہ تھا کہ رابعہ کو کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جائے جہاں وہ سب کی دسترس سے اور میرے وہم و گمان کی رسائی سے بھی دور ہو۔ اور اس کے بعد مجھ سے میرا حال پوچھا جائے کہ سکندر اعظم صاحب! کیسے سودا کرتے ہیں؟ ہماری ایک مٹھی میں رابعہ کی جان داؤ پر ہے، دوسری مٹھی میں تمہارا کاروبار۔ بتاؤ کیا چاہیے۔ ہماری شرائط پر رابعہ کی رہائی یا وہ سب جو ابھی تک نہیں ہوا لیکن ہو سکتا ہے۔ اس وقت پیڈرو نے تمہیں صرف ٹریلر دکھایا ہے۔ اصل فلم اس سے کہیں زیادہ صبر آزما، لرزہ خیز اور عذاب ناک ہے۔ اور اگر وہ سب کچھ ہو چکا تھا جو پیڈرو نے مجھے بتایا تھا تو اب کیا ہو گا۔ انہی رشتوں کی تقدیس تو میرے پاؤں کی زنجیر تھی۔ اکیلے آدمی کا جینا کیا اور مرنا کیا۔ ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام۔ ایک مرگ ناگہانی اور ہے۔ تو موت سے کون

کا فرد رہتا ہے جو ایک ہی بار آتی ہے۔ آدمی دوسروں کے لیے جینا چاہتا ہے۔ کبھی اپنے بیوی بچوں کے لیے۔ کبھی والدین کی زندگی کے لیے۔ ان کے لیے جو اس کی ذات کو پیار و شفقت اور پھر اس کے پیار سے سہارا پاتے ہیں۔ دوستوں کے لیے اور محبت سے اپنا سمجھنے والوں کے لیے۔ دشمنوں کے لیے کون جیتا ہے۔ وہ مارتا ہے یا مر جاتا ہے اور کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی کی زندگی میں خلا نہیں آتا اور کوئی آنکھ نم نہیں ہوتی۔

میں فضول سوچ رہا تھا اور میرے خیالات بھٹکنے لگے تھے۔ میرا ذہن اس حقیقت سے گریز پا تھا کہ میں جینے کے سارے سہاروں سے محروم ہو چکا ہوں۔ ماں کی ممتا اور بہن بھائیوں سے خون کا رشتہ ہوش سنبھالنے سے قبل ہی ٹوٹ گیا تھا لیکن وقت اپنی یاد کا ناسور چھوڑ گیا تھا۔ وزیر خان کی موت کا زخم ابھی تازہ تھا۔ اور اس کی بے لوث زندگی کا انجام مجھے خون رلاتا تھا۔ میں ایک مشن لے کر آگے بڑھ رہا تھا اور یہ مشن تھا انہیں سزا دینے کا اور دنیا کے سامنے بے نقاب کرنے کا جو وزیر خان کے ہی نہیں اور بھی بہت سے بے گناہوں کے قاتل تھے۔ ان میں سلامت شاہ تھا جس کی بہن کی عزت نوچ لی گئی تھی۔ اس کی نابینا اور مظلوم بیوی تھی۔ رابعہ کی ماں تھی اور ایک بوڑھا گورکن تھا جسے اسپتال میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی موجودگی میں قتل کر دیا گیا تھا۔ مرنے والوں میں مسلا کی ماں تھی۔ غلام علی اکاؤنٹنٹ تھا جس نے تمام عمر ایماندار رہنے کی سزا پائی تھی اور نیکی کا ایک فرض ادا کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔ بچے والے ذکی سلوا سے لے کر زردار جیسے غریب آدمی تک لوگ تھے جن کی حقیقت بساط حیات پہ پیادے یا پیدل بادشاہ کی تھی۔ ان کی جگہ نئے مہرے آ گئے تھے۔ اور بازی تمام ہونے تک نہ جانے کتنے ہوں گے جو میر محمد اور اس کی بیوی کی طرح مٹ جائیں گے۔ کبھی ادھر سے مارے جائیں گے تو کبھی ادھر سے کیونکہ دونوں طرف کے شکاری اپنی اپنی کامیابی کے لیے ہر قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔

لیکن اب محسن بھی مر چکا تھا اور رابعہ میرے کیے کی سزا پا رہی تھی۔ جو اس نے پہلے کئی بار پائی تھی لیکن میری خاطر اس نے جھیلا تھا اور میرا انسانیت سوز ظلم برداشت کیا تھا۔ اب انکل رضوی کی ساری زندگی کی اصول پرستی، فرض شناسی اور ایمانداری میری وجہ سے خاک میں مل گئی تھی۔ یہی ان کی متاع عزیز تھی جو مجھ سے تعلق رکھنے کی پاداش میں بدنامی کی نذر ہو گئی۔ یہ مکافات تو خدا کے ہاں ہے دار و گیر۔ یہی سب تو میرا اسباب تھا۔ اگر میں اکیلا رہ گیا ہوں تو جیت کے میں کیا کروں گا۔ میری جیت پہ خوش ہونے والا کون ہو گا؟ کامیابی مجھے کیا دے گی

www.paksociety.com

میرا کیا ہے گی۔ بہتر ہے میں اس کھیل کو ختم کر دوں اور اپنی شکست مان لوں۔ سارے معاملات یومِ حشر پہ اٹھا رکھوں جب انصاف بہرحال ہوگا۔ وہاں میزانِ عدل کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری آنکھیں اشک فشاں ہیں۔ لاشعور کا خوف اب شعور پر غالب آ رہا تھا اور میری آنکھیں محسن کو دیکھ رہی تھیں۔ یادوں کا سلسلہ بڑا دراز تھا لیکن اب عمرِ گزشتہ اجڑے ہوؤں کا ایک قبرستان تھی جس میں ہر تاریخ ایک کتبہ بن گئی تھی۔ گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں۔ محسن اور میں کہاں کہاں پہ نقش چھوڑ آئے ہیں۔ اس راستے پہ جو گھر سے اسکول تک پھیلا ہوا تھا اور جس پہ ہم بستے گلوں میں لٹکائے برسوں آتے جاتے رہے۔ اس وقت کی رہ گزر پر جو سات سمندر پار ولایت کے عہدِ طالب علمی تک پھیلی ہوئی ہے۔ شب و روز کے واقعات۔ بہر واردات قلب و نظر۔ زندگی کی فتوحات کے کامراں لمحے۔ ناکامیوں کی دل شکستگی کے صدمے۔ وہ سب کچھ رزقِ خاک ہوا؟ محسن بھی مٹی کا ایک ڈھیر رہ گیا ہے جس پر پھول خشک ہو چکے ہیں اور اس کا جیتا جاگتا، جسے کبھی ہر دم ناقابلِ شکست نظر آنے والا وجود ڈھانچہ بن رہا ہے۔ مٹی میں مل رہا ہے اور حشرات الارض کا رزق ہو گیا ہے۔ صرف میں زندہ ہوں۔ اپنی آرزو کے انتقام پر سب کو قربان کر دینے والا خود غرض انسان۔

"تم رو رہے ہو؟" پیڈرو کی آواز نے مجھے پھر متوجہ کیا۔ اس کے انداز میں طنز کے ساتھ حقارت تھی۔

"تم مجھ پر ہنس سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن انگریز ایک بات کہتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ آخری بار کون کس پر ہنستا ہے اور کون کس کو روتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے۔ میں تم سے کسی قسم کی رعایت کا طلب گار نہیں۔"

"تم کو اس سے زیادہ رعایت دی بھی نہیں جا سکتی تھی۔" پیڈرو بولا۔

"تم مجھے اتنا تو بتا سکتے ہو کہ میں کہاں ہوں؟" میں نے کہا۔

"تم اسی زمین پر ہو۔ انسانوں کی دنیا میں۔" وہ بولا۔ "کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ تم عالمِ ارواح تک نہیں پہنچے۔ یہ اچھا خاصا آرام دہ مکان ہے۔ تمہاری ضرورت کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر تمہیں صبح شام دیکھنے آتا ہے۔ سگریٹ، چائے یا کافی کی خواہش ہے تو بتا دو۔ میں منگوا دیتا ہوں۔"

"یہ مکان کس کا ہے اور مجھے کب تک یہاں رہنا ہوگا؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اس کا انحصار حالات پر ہے۔" پیڈرو نے کہا۔ "ابھی تو تم خود بھی اس قابل نہیں ہو کہ کہیں جا سکو چنانچہ صرف میں تمہاری نگرانی کر رہا ہوں۔ یہ جان کے کیا کرو گے کہ مکان لاہور میں ہے یا شیخوپورہ میں۔ اور کس گلی محلے میں ہے۔ پاکستان کی حکومت پر فرض کر لو یہ مکان میرے باپ کا ہے اور ایسی جگہ ہے جہاں تمہارے کسی حمایتی کے پہنچنے کی کوئی صورت نہیں۔ زیادہ یہ ہے کہ یہاں تم بالکل بے بس ہو۔ کھلی کھڑکی سے بھی تمہاری چیخنے کی آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ جو ہوا تم اس کا پچھتاوا کرتے رہو۔ میرے علاوہ یہاں ایک ملازم ہے جو گونگا ہے۔ بہرا نہیں۔ پہلے وہ ٹھیک تھا مگر اس سے ایک غلطی ہوئی۔ اس نے ایک راز کی بات سن لی اور غلط موقع پر سے بک دی۔ آدمی وفادار تھا چنانچہ باس نے نرمی سے کام لیتے ہوئے اسے معاف کر دیا۔ بس وہ چیز نہیں چھوڑی جس کا اس نے غلط استعمال کیا تھا۔ بچہ بھی چاقو اٹھاتا ہے تو اس سے چھین لیا جاتا ہے کہ وہ اس کا استعمال نہیں جانتا۔ اور اس کے غلط استعمال سے دوسروں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ جو ڈاکٹر تمہارا علاج کر رہا ہے ہمارا اپنا آدمی ہے۔ پچاس ہزار روپے ماہانہ کا ملازم ہے۔ ہمارے احکامات کی تعمیل کرتا ہے۔ جو دوا یا انجکشن دینا ہو دے دیتا ہے جس سے منع کیا جائے گا وہ نہیں دیتا۔ قاعدے یا قانون کی فکر نہیں کرتا۔"

ڈاکٹر اسی وقت کمرے میں داخل ہوا۔ نہ جانے اس نے اپنی گاڑی کہاں کھڑی کی تھی؟ باہر مکمل سکوت تھا۔ وہ گاڑی لاتا تو میں آواز صاف سنتا۔ ایسے ڈاکٹر جو صرف ایک مجرمانہ گروہ سے ہر ماہ پچاس ہزار روپے وصول کر لیتے ہوں اور ناجائز ذرائع اختیار کر کے بھی پچاس ہزار تو یقیناً کما لیتے ہوں ایک لاکھ ماہانہ کی آمدنی والا ڈاکٹر جوتیاں نہیں چٹخاتا پھرتا۔ اس کے پاس ایک دو بہترین شاندار گاڑیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر وہ گاڑی کو دور چھوڑ کے آیا تھا کہ کوئی اسے یہاں آتا نہ دیکھے۔ اس سے یہ بات مزید ثابت ہوتی تھی کہ سڑک اسی طرف بہت دور نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ چالیس سال سے زائد عمر کا آدمی تھا جس کی صورت کو اس کے اعمال نے مسخ کر دیا تھا۔ زر کی خاطر نہ جانے اس نے کتنے انسانوں کے جسم سے اعضا نکالے اور کتنے جسموں سے روح کھینچ لی تھی۔ وہ اس مقدس پیشے کے نام پر کلنک کا ٹیکا تھا۔ اگر اس کے مذموم کاروبار کا علم پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کو ہو جاتا تو اس کا پریکٹس کا لائسنس منسوخ ہو جاتا اور شاید اس کی ڈگری بھی۔ اسے عام مجرموں کی طرح عدالت میں پیش کیا جاتا اور عام قاتلوں کی طرح پھانسی پر لٹکایا جاتا۔

"میں کب تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا؟" میں نے اس کے معائنے کے بعد کہا۔

"جب ہم چاہیں گے۔" وہ بولا۔ "ابھی تو دائیں ٹانگ ٹھیک نہیں۔ اس کے بعد بائیں ٹانگ خراب ہو سکتی ہے۔"

"بائیں ٹانگ کو تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ اس کی بات کیوں کرتے ہو؟" میں نے خوفزدگی سے کہا۔

"کچھ ہوا تو نہیں مگر ہو سکتا ہے۔ ایک تم نے خود توڑ دی تھی یا دوسری ہم نہیں توڑ سکتے؟ ایسے۔" اس نے اپنا ہاتھ میری بائیں ٹانگ پر ہتھوڑے کے انداز میں مارا۔

"تم واقعی ڈاکٹر نہیں جلاد ہو۔" میں نے کہا۔ "اگر تم نے میری ٹانگ توڑی تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔"

"اچھا؟" وہ میرے مذاق سے محظوظ ہو کے ہنسا۔ "تم سے پہلے میرا واسطہ بڑے نامی اور رستم قسم کے بدمعاشوں سے پڑا ہے جو تم سے زیادہ منہ پھٹ تھے اور میرا سر مانگتے تھے۔ بعد میں ایک گولی کھا کے مر گئے۔ ایک چھوٹے سے انجکشن نے ان کو چت کر دیا۔ ہمیشہ کے لیے۔"

"اور ایسے کتنے نامی اور رستم چت کر چکے ہو تم پہلوان؟" میں نے طنز سے کہا۔

"اس کا حساب نہیں رکھا میں نے۔" وہ جھک کر بیگ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "ورنہ ضرور بتاتا۔"

ذرا سی دیر کے لیے اس کا شیطانی سر میرے بہت قریب آگیا تھا۔ میں چاہتا تو اس کی گردن دبوچ لیتا۔ اور اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ ابھی ابھی اس نے میرے روبرو اعتراف کیا تھا کہ وہ بے حساب قتل کر چکا ہے اور یہ اعتراف اس نے انتہائی بے تکلفی سے اور کسی دباؤ کے بغیر کیا تھا کیونکہ وہ کسی عدالت میں نہیں تھا۔ کسی ایسے شخص کے سامنے بیان نہیں دے رہا تھا جو بعد میں اس کے خلاف گواہی دے سکے اور یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ انتہائی محفوظ ہے۔ لیکن وہ قاتل تھا اور اسے قتل کرنے کے بدلے موت سے کم کوئی سزا نہیں ہو سکتی تھی۔ چشم زدن میں میرا ہاتھ اٹھ گیا اور اس کی گردن پر پڑا۔ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی اور ڈاکٹر بے جان ہو کے زمین پر گر گیا۔

چند سیکنڈ تک پیڈرو بے یقینی کے عالم میں مجمد بیٹھا رہا۔ خوف اور حیرت نے اسے مفلوج کر دیا تھا اور اس کی آنکھیں ڈاکٹر کے ساکت جسم پر ٹھہر گئی تھیں۔ پھر وہ ایسے اچھلا جیسے کرسی میں یکایک برقی رو دوڑنے کا کرنٹ آگیا ہو۔

"کمینے!" وہ چیخ کر بولا۔ "یہ تم نے کیا کر دیا....؟"

"وہی جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔" میں نے سکون سے کہا۔ "ایک قاتل کو سزائے موت دے کر انصاف کے تقاضے پورے کر دیے۔ یہ سزا تو اسے بہت پہلے ہو جانی چاہیے تھی۔"

پیڈرو نے زمین پر پڑے ہوئے ڈاکٹر کی لاش کو بازوؤں میں اٹھایا تو اس کی کھوپڑی گردن سے معلق ہو کے جھولنے لگی۔ جب پیڈرو نے اسے صوفے پر لٹایا تب بھی اس کا سر مضحکہ خیز طور پر جھول رہا تھا۔

"تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ یہ انصاف تمہیں کتنا مہنگا پڑا ہے۔" پیڈرو ہانپتے ہوئے غرایا۔ اس کا چہرا غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا اور آنکھیں انگارے بن گئی تھیں۔ اگر اسے واضح احکامات نہ ہوتے کہ مجھے گزند نہ پہنچے تو وہ یقیناً مجھے قتل کر دیتا۔

"میرا ضمیر مطمئن ہے کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔" میں نے کہا۔ "ویسے تو ڈاکٹر کہلانے والے اس پیشہ ور قاتل کو دنیا کی کسی عدالت میں مجرم کی حیثیت سے پیش کرنا ناممکن تھا۔ عدالت ثبوت اور شہادت مانگتی ہے۔"

"اور تم نے کسی ثبوت اور شہادت کے بغیر اسے قتل کر دیا، منصف کی اولاد؟" پیڈرو چلایا۔

"مجھے ثبوت و شہادت کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "تم اس کے متعلق پہلے ہی سب کچھ بتا چکے تھے۔ خود اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ جتنے قتل وہ کر چکا ہے اس کا حساب بھی یاد نہیں۔"

"ایسے تو کوئی جج اپنے باپ کے قاتل کو بھی نہیں مار سکتا جو اس نے قتل ہوتے دیکھا ہو۔"

"جج اپنے عہدے اور منصب و مراتب، شرائطِ ملازمت اور قانونی پابندیوں کے باعث مجبور ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں مجبور نہیں تھا۔ اگر میں اس شخص کو زندہ چھوڑ دیتا تو یہ جرم ہوتا۔ یہ نہ جانے اور کس کس کی جان لیتا۔"

پیڈرو نے مجھے ایک گندی گالی دی۔ ڈاکٹر کی موت نے اسے مشتعل ضرور کیا تھا لیکن اتنا پاگل نہیں کیا تھا کہ اب وہ میرے قریب آنے کا خطرہ مول لیتا۔ اس نے کرسی اٹھا کے میری ٹانگ پر ماری۔ میں اچھلا اور درد کی ٹیسوں سے تڑپ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ٹانگ کی وہ ہڈی جس میں بال تھا، ٹوٹ کے الگ ہو گئی ہے لیکن کرسی کی ٹانگ گھٹنے کے اوپر لگی تھی۔ "اب کرو انصاف!" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان مجھے پھر گالی دی اور کرسی کو سر سے اونچا اٹھا کے پھر وہیں مارا۔ ضبط کرنے کے باوجود میری چیخ نکل گئی اور میری آنکھوں میں درد کی شدت سے آنسو آ گئے۔ میرا سارا جسم کانپنے لگا۔ "سیکھے رہا تھا انصاف کرو گے؟" پیڈرو چیخا اور اس نے تیسری بار کرسی اٹھائی۔ اگر اس کی وحشت بڑھ جاتی تو وہ براہِ راست میری ٹانگ کے مضروب حصے پر وار کر دیتا یا شاید کرسی میرے سر پر دے مارتا۔ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں بھی میرے

www.paksociety.com

ذہن نے سوچنا بند نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کو حیرت کی بار کرسی اٹھاتے دیکھا اور اس وقت اچانک مجھ میں اتنی طاقت آگئی کہ میں اُلٹے ہاتھ کے بل پہ اوپر اٹھا اور میں نے کرسی کو بائیں ٹانگ ماری۔ یہ ضرب کی شدت تھی یا تصادم کی قوت کہ کرسی ٹوٹ گئی اور پیڈرو جو اس جوابی کارروائی کے لیے تیار نہ تھا جھٹکے سے پیچھے جا گرا۔ وہ کچھ دیر اسی جگہ پڑا رہا جہاں پہلے ڈاکٹر پڑا تھا۔ اس کی دیوانگی کا دورہ ختم ہو گیا تھا۔ "تم سے میں بعد میں سمجھوں گا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا اور ایک دروازے سے ساتھ والے کمرے میں چلا گیا جہاں ٹیلی فون تھا۔ میں اسے کسی سے باتیں کرتے سنتا رہا۔ وہ اس علاقے کی رپورٹ اپنے الفاظ میں دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کیا تو مجھے ریسیور کو کریڈل پر رکھنے کی آواز سنائی نہیں دی اور تب مجھے خیال آیا کہ میں نے نمبر ڈائل کرنے کی آواز بھی کہاں سنی تھی۔ وہ یقیناً ریڈیو ٹرانسمیٹر پر بات کر رہا تھا۔ کس سے اور کہاں؟ اس کا اندازہ مجھے نہ ہو سکا۔

وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا جو بظاہر انسان ہی تھا کیونکہ اس کے دو ہاتھ پیر تھے۔ ناک کان اور آنکھیں بالکل انسانی تھیں، لیکن دیگر بہت سی صفات میں وہ آدمی نہیں تھا۔ مثلاً قد و قامت، جسامت اور وزن میں وہ گوریلا تھا۔ آدمی اگر حیوانِ ناطق ہے تو وہ صرف حیوان تھا۔ کیونکہ پیڈرو کے بیان کے مطابق وہ زبان جس کا اس نے غلط استعمال کیا تھا کاٹ دی گئی تھی۔ اب وہ بولنے کی کوشش میں حلق سے بے معنی اور عجیب و غریب آوازیں نکالتا تھا۔ اور اپنا مفہوم اشاروں کی مدد سے واضح کرتا تھا۔ معلوم نہیں اس کے کانوں میں کیا سرجری کی گئی ہو گی کہ وہ سماعت سے بھی محروم ہو گیا۔ ان جیسے سفاک لوگوں سے کچھ بعید نہیں کہ اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہو۔ وہ ساڑھے چھ فٹ سے زیادہ قد کا آدمی تھا اور اس کی گردن کسی سانڈ سے زیادہ مضبوط تھی۔ اس کے ہاتھوں کی گولائی شانوں سے نیچے اتنی زیادہ تھی کہ ان کا موازنہ میں اپنی ٹانگوں سے کر سکتا تھا لیکن وہ صرف گوشت کا انبار نہیں تھا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں اور جسم کے پٹھے چڑھے ہوئے تھے۔ اور اس کے ورزشی بدن کی غیر معمولی قوت کے مظہر تھے۔ مجھے اسے دیکھ کر الف لیلوی کہانیوں کے جن اور دیو یاد آئے اور وہ فلمیں یاد آئیں جن میں ہرکولیس، ٹارزن اور سیمسن کے کردار تھے۔ جب پیڈرو نے اسے مخاطب کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام سیمسن ہی ہے۔ پیڈرو نے اسے اشاروں کی زبان میں سمجھایا کہ میں نے کیسے ہاتھ مار کے ڈاکٹر کی گردن توڑ دی ہے اور وہ میری طرف بڑھا۔ میری روح فنا ہونے لگی۔ وہ دیو زاد مجھے کسی کھلونے کی طرح اٹھا کے اُچھال سکتا تھا اور دیوار پہ مار کے میرے جسم کے چیتھڑے بکھیر سکتا تھا۔ دفاع کی واحد صورت یہی رہ گئی تھی کہ میں معذوری کے باوجود میں جوڈو کراٹے کے فن کی ساری مہارت کو استعمال میں لاؤں اور جیسے بھی ہو اس گوریلے کے بازو توڑ دوں یا اس بگڑے ہوئے جانور کو اندھا ہی کر دوں۔ پیڈرو چند سیکنڈ میرے رد عمل سے محظوظ ہوتا رہا۔ پھر اس نے اپنے حکم کے غلام کو روک دیا۔

"سیمسن!" اس نے ہاتھ کے اشارے سے صوفے کی طرف اشارہ کیا جس پر ڈاکٹر کی لاش کا فل سیٹ سوٹ کے ساتھ پڑی تھی۔ "وہ ... پہلے یہ" اس نے ہاتھوں کی مدد سے واضح کیا کہ اس دیو زاد کو کیا کرنا ہے۔ اس نے سیمسن کو سمجھا دیا تھا کہ ڈاکٹر کو لے جا کر گاڑ دے۔

"اچھا کیا جو تم نے اس گوریلے کو روک دیا۔" میں نے پُرسکون ہوتے ہوئے کہا۔ "ورنہ خود تمہیں ایک کے بجائے دو لاشیں دفن کرنا پڑتیں۔ ڈاکٹر کو تو اٹھایا جا سکتا تھا۔ اس حیوان کو یہ لے جاتے تم، کرین کی مدد سے؟ اس کی قبر کے لیے گڑھا بھی موت سے کتنا گہرا کھودنا چاہیے؟"

سیمسن اپنے آقا کا اشارہ پا کے لوٹ گیا تھا لیکن میری بات سے پیڈرو کو پھر طیش آ گیا۔

"سیمسن!" اس نے چیخ کر کہا حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ سیمسن نے آواز کے بجائے کندھے کی تھپکی محسوس کر کے پلٹ کر پیڈرو کو دیکھنے لگا۔ نہ جانے پیڈرو نے اسے کیا اشارہ کیا کہ وہ حیوانی آوازیں نکالتا اپنے بازو پھیلا کے میری طرف لپکا۔ مجھے سنبھلنے کے لیے بہت کم وقت ملا۔ پھر بھی میں نے کسی بچھو کی طرح اپنے حواس کو قابو میں رکھا۔ محض ڈیل ڈول اور جسمانی طاقت میرے لیے کچھ نہیں تھی۔ میری کمزوری صرف یہی تھی کہ میں ایک ہاتھ اور ایک پیر کی مدد سے محروم تھا اور میری پھرتی کی صلاحیت ماؤف ہو گئی تھی۔ اگر میں صحیح پوزیشن لے سکتا اور آزادانہ نقل و حرکت کر سکتا تو مجھے اس پہاڑ کو زمیں بوس کرنے میں سات سیکنڈ سے زیادہ نہ لگتے اور وہ ایک بار میرے ہاتھ سے گر کر فرش پر کمر کے بل گرتا تو پھر نہ اٹھتا۔ اس کی کمر اور گردن دونوں ٹوٹ جاتے۔ لیکن اب بھی تقدیر یاوری کر رہی تھی اور سیمسن نے سوچے سمجھے بغیر اپنے لحیم شحیم وجود سمیت مجھ پر گرنے کی حماقت کی۔ میں نے اسے بڑی پھرتی سے ہاتھوں پر لیا اور ریلا توڑ دیا کہ وہ مقابل کی دیوار تک اپنے ہی زور میں گیا اور اس سے ٹکرایا کہ مجھے دیوار کے گرنے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ میرا بایاں ہاتھ زیادہ کام آیا تھا لیکن زور دائیں ہاتھ پر بھی پڑا تھا اور جھٹکا میرے دائیں پیر پر بھی آیا تھا۔ اگر وہ پھر حملہ کرتا تو شاید

میں اسے نہ روک پاتا لیکن پیڈرو نے اسے گر کر اٹھتے ہی رُک جانے کا اشارہ کیا۔ شاید پیڈرو نے محسوس کر لیا تھا کہ اس جنگ میں یہ جب بھی کام آ گیا تو وہ تماشا رہ جائے گا۔ سیمسن رُک گیا۔

"بس؟" میں نے تمسخرانہ انداز میں چیلنج کیا لیکن میں جانتا تھا کہ اب پیڈرو مشتعل نہیں ہو گا۔ "ختم ہو گیا اس گینڈے کی طاقت آزمائی کا غرور؟ اس حال میں بھی میرے لیے تمہارا سیمسن مچھر سے زیادہ نہیں۔"

پیڈرو نے اس اشتعال انگیزی کو نظرانداز کر دیا اور سیمسن کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ جسم کی مناسبت سے سیمسن کا سر بہت چھوٹا تھا۔ بالکل شاہ دولہ کے چوہوں کی طرح۔

سیمسن بالکل شاہ دولہ کا چوہا تھا۔ اس کا ذہن عام آدمی جیسا ہوتا تو آج اس کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ نہ جانے وہ کب سے ان مجرموں کے ساتھ تھا۔ نادانستگی میں سرزد ہو جانے والی ایک غلطی پر اس کی زبان کاٹ دی گئی تھی اور کان بہرے کر دیے گئے تھے اور یہ ایسی سزا تھی جس کا بیسویں صدی کے مہذب معاشرے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سیمسن اس کے باوجود وہیں تھا، زندہ نہیں ہوا تھا۔ اور ذہنی طور پر بدستور ان کا غلام تھا۔ ان کے اشاروں پر چلتا تھا۔ کیونکہ اس کا اپنا کوئی ارادہ، کوئی مرضی، کوئی فلسفہ نہیں تھی۔ قوتِ فیصلہ نہیں تھی اور اچھے برے میں تفریق کا شعور نہیں تھا۔ وہ آدمی سے زیادہ روبوٹ تھا، مشینی آدمی۔ ایک اشارہ اسے متحرک و فعال کر دیتا تھا، دوسرا اشارہ اسے سوئچ کی طرح آف کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کے ذاتی جذبات بالکل نہیں تھے کہ وہ حیران ہوتا، خوش ہوتا، مشتعل ہوتا، سوال کرتا کہ اسے یہ کام کرنے کے لیے کیوں کہا جا رہا ہے اور وہ کام کرنے سے کیوں روکا گیا ہے۔ اس کا کام عمل کرنا تھا، سوچنا نہیں۔ وہ سوچ سکتا تو ضرور یہ سوچتا کہ اس میں اور پیڈرو میں کیا فرق ہے؟ نہ وہ ڈاکٹر کی لاش دیکھ کے خوفزدہ ہوا تھا اور نہ میرے ہاتھوں پٹنے کی ذلت سے مشتعل۔ اس نے پہلے بھی پیڈرو کا حکم غلاموں کی طرح مانا تھا اور بعد میں بھی۔

جتنی دیر میں پیڈرو نے ڈاکٹر کی جیب سے ہر کاغذ کا پرزہ نکالا، اس کی گھڑی اور ہیرے ...... والی سونے کی انگوٹھی اتاری، اتنی دیر میں سیمسن کئی بار اندر گیا اور باہر آیا۔ پیڈرو جیسے ڈاکٹر کی شناخت کی ہر علامت مٹانے کے لیے کر رہا تھا۔ وہ شخص جو کچھ دیر پہلے پیڈرو کے گروہ کے لیے اتنا کارآمد تھا کہ وہ اسے کئی ہزار روپے ماہوار ادا کرتا کروڑوں کمانے کا سودا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اب صرف بے مصرف ہو گیا تھا۔ صرف ایک لاش رہ گیا تھا جس سے نجات حاصل کرنا ضروری تھا۔ فوری مسئلہ میرا نہیں

اس لاش کو تمام احتیاطی تدابیر کے ساتھ ٹھکانے لگانے کا تھا اور اس کے انتظامات مرحلہ وار ہو رہے تھے۔ نہ جانے کہاں سے سیمسن پلاسٹک کی ایک تھیلی لایا اور پیڈرو نے سر ہلا کے اطمینان سے سر ہلایا۔ ڈاکٹر کے جسم پر سے اب کپڑے تک اتار لیے گئے تھے۔ پیڈرو نے جیب سے ایک تیز دھار خنجر نکالا۔ بٹن دباتے ہی اس کا پھل باہر آ گیا۔ "اس سے میں تمہاری کھال اتاروں گا۔" وہ خنجر کو میری طرف لہرا کے بولا۔ لیکن یہ محض ایک جملہ معترضہ تھا۔ خنجر سے اس نے ڈاکٹر کے دونوں ہاتھوں کی دس انگلیوں کو اس طرح کچوکے لگا کے زخمی کیا جیسے قصائی گوشت کا قیمہ کرتے ہیں۔ یہ فنگر پرنٹ مٹانے کا آپریشن تھا۔

پھر پیڈرو نے خنجر کو واپس جیب میں رکھا اور سیمسن کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ سیمسن نے ڈاکٹر کو ٹوٹی ہوئی گردن سے چوزے کی طرح پکڑ کے اٹھایا اور پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال دیا۔ ڈاکٹر کو مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی چنانچہ اس کی لاش اکڑی نہیں تھی۔ وہ تھیلی میں یوں سما گیا کہ انگریزی حرف "یو" بن گیا۔ اس کی ٹانگیں سر کی طرف تھیں اور سر دونوں پیروں میں پھنس گیا تھا۔ پلاسٹک کی موٹی تھیلی چھ فٹ لمبی تھی چنانچہ آدھی تھیلی میں ڈاکٹر کا جسم دوہرا لپیٹ دیا گیا۔ میں حیران تھا کہ اس قسم کی تھیلی عام استعمال میں تو آتی نہیں۔ یہ ماجرا سائنس کہیں سے کیسے لے آیا۔ پھر جواب میری سمجھ میں آ گیا۔ یہ پلاسٹک کے کفن غالباً لاشوں کے لیے ہی تھے۔ ان میں بند کر کے لاش کو دفن کرنے اور غرق کرنے کے بعد یہ خطرہ بالکل نہیں رہتا تھا کہ تعفن کسی کو متوجہ کر سکتا ہے۔ لیکن میری آنکھوں نے ابھی بہت کچھ دیکھنا تھا۔

پیڈرو کے حکم پر سیمسن نے ڈاکٹر کی پلاسٹک کے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کو ایک بوری میں ڈال دیا اور بوری کا منہ اس جگہ سے باندھ دیا جہاں تک اس کا وجود سمایا۔ اوپر کا فالتو حصہ سیمسن کے ہاتھوں میں رہ گیا۔ اچانک اس نے بوری کو اٹھا کے گھمایا اور یوں زمین پہ دے مارا جیسے دھوبی کپڑے دھوتے ہیں۔ پیڈرو نے پھر اشارہ کیا اور سیمسن نے وہی عمل دہرایا۔ بے رحمی کا یہ مظاہرہ دیکھنا میری برداشت سے باہر ہو گیا۔

"پیڈرو... کچھ تو خدا کا خوف کرو!" میں چلایا۔ "وہ مر گیا۔ اب اسے کیوں مارتے ہو؟"

"مجھے خدا ترسی کا سبق دے رہے ہو؟" پیڈرو نے طنز سے کہا۔ "اسے مارنے والے خود تم ہو۔"

"میں نے اسے صرف وہ سزا دی تھی جس کا وہ مستحق تھا۔ جو اسے دنیا کا ہر نظامِ انصاف دیتا مگر سزا کے لیے موت دینے والے بھی کم سے کم عذاب دے کر مارتے ہیں۔ پھانسی کی جگہ

www.paksociety.com

الیکٹرک چیئر اور گیس چیمبر....."

"بند کرو اپنا یہ فضول لیکچر۔" پیڈرو بیزار ہوکے بولا۔ اس کے اشارے پر سیمسن نے پوری کو گھما کے پٹخنا شروع کیا۔ میں نے اس اذیت ناک منظر سے بچنے کے لیے آنکھیں بند کرکے منہ پھیر لیا مگر دھم دھم کی صدا میرے دماغ پہ ہتھوڑے کی طرح پڑتی رہی۔ سیمسن کے طاقتور بازو مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ ڈاکٹر کی ہڈیاں غالباً پہلی دفعہ ہی ٹوٹ گئی ہوں گی۔ اب اس کی لاش کا بھرتا ہو رہا تھا اور سالم آدمی کو قیمے جیسے گوشت کے ڈھیر میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔ اس ظالمانہ کارروائی کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ خوشی جو ڈاکٹر کے شیطانی وجود سے دنیا کو پاک کرکے ملی تھی ایک عذاب احساس ندامت میں ڈھل گئی تھی۔ ڈاکٹر کے ساتھ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا تھا کہ میں نے اس پر پہلا ہاتھ اٹھایا تھا اور اب مجھے اس کی سزا ملنی تھی جسے میں نے انصاف کا تقاضا سمجھا تھا۔ جو حشر مرنے کے بعد ڈاکٹر کا ہوا تھا وہ دنیا میں کسی کا نہیں ہوا ہوگا۔ پرانے وقتوں میں مطلق العنان حکمران ہاتھیوں کو باندھ کر ہاتھی کے پیروں میں ڈلانے کی سزا دیتے تھے۔ انسان اب بھی ٹرینوں سے کٹ جاتے تھے۔ دیوہیکل بسوں کے نیچے پس جاتے تھے اور بڑی بڑی مشینوں کی لپیٹ میں آکے ختم ہو جاتے تھے۔ لیکن یہ حادثات کہلاتے تھے۔ ایسے متعدد افسوسناک واقعات میں نے سنے تھے یا پڑھے تھے۔ لیکن سننے اور دیکھے ہوئے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اب میری طبیعت متلی ہو رہی تھی۔ میرے پیٹ میں مروڑ سا اٹھ رہا تھا اور میرا دل الٹنے کو چاہتا تھا۔ لیکن مجھے مسلسل ابکائیاں آ رہی تھیں۔ مجھے یہ احساس بالکل نہ تھا کہ میرا جسم ٹھنڈے پسینے میں ڈوبا ہوا ہے۔

باہر ایک گاڑی آکے رکی۔ میں نے دو افراد کے باتیں کرنے کی آوازیں سنیں۔ پھر کار کے چاروں دروازے بند ہوئے اور میں سوچتا رہا کہ یہ آواز کس کی ہے؟ حالانکہ میرا سابقہ اس آواز سے اتنی بار پڑ چکا تھا کہ اب مجھے ایک جملہ سن کے اسے شناخت کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن میرا ذہن اس وقت بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔

"اچھا! تو اپنے سکندر صاحب یہاں بھی ہاتھ کی صفائی دکھا گئے۔" اسی آواز نے کہا۔ اور میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو مجھے اپنے قریب چوہدری دلاور نظر آیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور وہ ٹانگوں کو تھوڑا سا پھیلا کے متانت کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ میں نواب خسرو جمشید تھا۔

"کیا بتاؤں چوہدری صاحب!" پیڈرو نے سہمے ہوئے معذرت آمیز لہجے میں کہا تو سیمسن کے کٹنے سے ایک دم ہاتھ روک دیا۔ "ڈاکٹر کی اتنی جان کہاں تھی۔"

"جان تو ہمارے سکندر صاحب کی ہے۔ بڑے سخت جان ہیں یہ۔" دلاور نے تلخی سے کہا۔ "لیکن یہاں ان کی حالت کچھ غیر ہو رہی ہے۔ فرش تو تنگ ہے، ہوائیاں چہرے پہ اڑ رہی ہیں؟"

"بالکل عالم نزع کی سی کیفیت ہے۔" خسرو جمشید مسکرایا۔ مجھے بہت عرصے بعد پھر نظر آیا تھا۔

"اوہو ہو... ان کے تو پسینے چھوٹ گئے ہیں۔" دلاور نے ہمیشہ کی طرح اپنی اداکاری جاری رکھی۔ "ارے بھئی جوان آدمی ہو، بہادر ہو، ابھی تو ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے، ابھی سے ہمت ہار گئے؟"

میں اسے کیا جواب دے سکتا تھا۔ اگر وہ میرے قریب ہوتا تو میں اس کے منہ پہ ضرور تھوک دیتا۔

"ڈاکٹر اچھا آدمی تھا۔" خسرو جمشید نے افسوس سے سر ہلایا۔ "وفادار تھا۔"

"ہاں۔ لالچی تو تھا مگر وفادار تھا۔ اب کسی اور کی وفاداری خریدنی ہوگی۔" دلاور نے کہا۔ "ہے کوئی بندہ ایسا نظر میں جو ... کے قابل ہو؟ مگر خیر یہ سب بعد میں ہوگا۔ پہلے ہم ڈاکٹر کی رسوم تو ادا کر لیں۔ پیڈرو! پیکنگ بہت اچھی ہونی چاہیے۔ تحفہ خاص ہے۔"

پیڈرو نے ٹین کا وہ خاص ڈبہ بنایا جو گھروں میں ایک من آٹا رکھنے کے کام آتا ہے۔ "یہ کیسا رہے گا؟"

"چلے گا۔" چوہدری دلاور نے کچھ دیر بعد سر ہلایا۔ پیڈرو نے جلدی جلدی ... سمیٹا۔ ڈاکٹر کی لاش ایک گٹھڑی کی شکل میں ... گئی تھی۔ بوری اسی طرح بند تھی لیکن اس میں سے خون کا ایک قطرہ تک باہر نہیں ٹپکا تھا۔ ٹاٹ کی موٹی بوری کے اندر ... کی ڈولی تر لگانے کے نتائج خاطر خواہ برآمد ہوئے تھے۔ پیڈرو نے بوری کو اٹھایا اور ڈبے میں ڈال دیا۔ مرحوم کے پاس بہت تھا۔ کوٹھیاں اور کاریں۔ سامان عیش و عشرت، دولت کی ... غرور۔ چوہدری دلاور جیسے مجرموں کی پشت پناہی کا احساس ... پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ہی اس نے کتنے اعتماد سے دھمکی دی تھی کہ وہ ایک ننھی سی گولی یا انجکشن سے مجھے چت کر سکتا ہے کیونکہ ... پہلے مجھ سے زیادہ طاقتور اور ... لوگوں کو مار چکا ہے۔ ... ان کی ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتے تھے۔ تقدیر کا یہ کیسا عجب ... جو ڈاکٹر نے کیا تھا وہ چند منٹ بعد ہو گیا۔

"اس کو کیسے بھیجنا ہے چوہدری صاحب؟" پیڈرو نے کنستر کو بند کرتے ہوئے کہا۔ "دوستی یا..."

"دوستی کا کیا سوال؟" چوہدری دلاور نے یوں کہا جیسے ... غلطی پر تنبیہ کر رہا ہو۔ "لاہور بک ٹرین میں بک کروا دو گے تو ... تمام ہو جائے گا۔"

پیڈرو کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے بدلا تھا جس سے میں نے اندازہ کیا تھا کہ غلطی سے وہ سچ بول گیا تھا۔ جہاں پہ ... پہنچا دیا تھا وہ جگہ لاہور سے زیادہ دور نہیں تھی۔ شاید ... اور یہ ممکن تھا کہ ڈاکٹر کو خود پہنچا دے۔ چوہدری دلاور نے ٹرین سے بکنگ کا ذکر کرکے معاملے کو سنبھالنا چاہا لیکن میں سمجھ گیا۔

"اور دیکھو، وہ سامان کہاں ہے جو گفٹ کے ساتھ جانا تھا؟" دلاور بولا۔

پیڈرو دوسرے کمرے میں گیا اور دونوں ہاتھوں میں ... چیزیں لیے لوٹا۔ ان میں میری کلائی کی گھڑی تھی۔ میرا پرس تھا، ... تھا۔ پرس میں نقد رقم بھی تھی جسے دلاور نے سرسری انداز میں دیکھا اور واپس رکھ دیا۔ پھر اس نے انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس نکالا جو میں نے لندن سے حاصل کیا تھا۔ اسے کھول کر میری تصویر دیکھنے کے بعد دلاور مسکرایا۔

"تصویر زیادہ پرانی تو نہیں لگتی اپنے سکندر صاحب۔ وارث پہچان لیں گے آپ کو؟"

"کون وارث؟" میں نے کسی انجانے خوف سے لرز کے کہا۔ "کیا مطلب ہے اس بات کا؟"

دلاور اور خسرو جمشید اس صوفے پر بیٹھ گئے جس پہ کچھ دیر پہلے ڈاکٹر کی لاش پڑی تھی۔ "آدمی تو تم ضرورت سے زیادہ سیانے ہو۔ وارث کا مطلب نہیں سمجھے؟" دلاور نے اطمینان سے پیر پھیلا کے کہا اور ... "پیڈرو کو بھی سمجھا دیں۔ وارث صرف ماں باپ یا بہن بھائی تو نہیں ہوتے۔ یار بیلی ہیں، چاچے مامے ہیں، چاہنے والے ... وکیل صاحب ہیں۔ نہیں نہیں، فکر مت کرو۔ ان کو ... یہ تحفہ۔ تم زندہ ہوتا تو...."

"کون زندہ ہے؟" میں دیوانہ وار چلایا۔ "تم سب ... ہو؟"

"ابھی تو سب زندہ ہیں۔" دلاور عجیب انداز میں ہنسا۔ "... مسئلہ یہ ہے کہ ... سمجھتا ہے۔" اس نے ... کی طرف اشارہ کیا۔ "... وکیل صاحب تو اب رہے نہیں ... شروع کر دیتے۔ پھر انہیں تکلیف دینے کا کیا فائدہ؟ ... سامان بھی تحفے کے ساتھ ہی جائے گا۔ بس اتنا بتا دو کہ ... ایک وہ تمہاری بہن ہے، شمسہ۔ دوسری وہ ... فرزانہ، جس کا باپ ہے... کون زیادہ خوش ہوگا یہ تحفہ وصول کرکے؟"

"خدا کے لیے دلاور۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "اپنے اور میرے معاملات میں ان لوگوں کو مت لاؤ۔ پہلے ہی کیا کم سزا مل چکی ہے انہیں۔ قصوروار اگر ہوں تو میں۔ مجھے جو سزا چاہو دو۔"

دلاور ہنسا۔ "اپنے اور میرے معاملات کے بیچ خدا کو مت لاؤ۔ خدا نے یہ دنیا بنانے کے بعد آدمی کو عقل و شعور اسی لیے دیا تھا کہ وہ اس کے انتظامی مسائل خود سنبھالے۔ قصوروار تو ایک ہی آدمی ہوتا ہے۔ وہ کسی خاندان کا سربراہ ہو، ادارے کا یا ملک کا۔ اگر وہ غلط فیصلہ کرتا ہے تو نقصان سب کو ہوتا ہے۔ بیوی بچوں کو، اس ادارے سے وابستہ افراد کو یا اس ملک میں رہنے والوں کو۔ جواری، شرابی اور بدکردار افراد کے گھروں میں کیا ہوتا ہے؟ کیا ان کے بیٹے وطن کا نام روشن کرتے ہیں؟ بیٹیوں کو عزت دار رشتے مل جاتے ہیں؟"

"پیڈرو کے بارے میں مجھے معلوم نہیں، لیکن تمہارا تو گھر بھی ہے اور بیوی بچے بھی ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں عزت دار آدمی ہوں اپنے سکندر صاحب!" دلاور طنز سے مسکرایا۔ "ایک تمہارے نہ ماننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میرے تعلقات کسی طرح بھی تمہارے انکل ایس ایس پی صاحب سے کم نہیں۔ میرے مقابلے میں تم کیا ہو؟ اپنی نظروں میں بڑے ہیرو۔ اصولوں کی جنگ میں جان کی بازی لگا دینے والے، حق پرست اور باضمیر۔ لیکن دنیا تم کو پھر بھی فرشتہ نہیں مانتی! قاتل سمجھتی ہے۔ تمہارے خلاف دستاویزات پر مشتمل ایک پوری فائل انگلستان میں محفوظ ہے۔ یہاں تمہارا نام اتنی بار اخبارات کی زینت بن چکا ہے، اتنے تھانوں میں اور مقدمات میں درج ہے کہ سب کو اکٹھا کیا جائے تو یہاں بھی دوسری فائل بن سکتی ہے۔ زیادہ بڑی۔ مارپیٹ، توڑ پھوڑ، آتش زنی، اغوا، قتل۔ کیا کچھ منسوب نہیں ہے تم سے۔ تم لاکھ کہو کہ یہ سب غلط ہے، تمہاری ماننے کا کون؟ اس کے برعکس میرے خلاف کیا ہے؟ وہ ایک بار تم نے مجھے ملوث کرنے کے لیے میرا نام لیا مگر اس سے کیا فرق پڑا؟ میرا نام آیا کہیں؟ میری عزت کم ہوئی یا کسی نے انگشت نمائی کی مجھ پر؟"

"دلاور!" میں نے کہا۔ "چور کے اسی طرح سو دن ہوتے ہیں اور کوتوال کا ایک دن۔"

"سب پرانے محاورے ہیں پرانی باتیں، اب تو کوتوال بھی چوہدریوں کا ہے۔" دلاور بولا۔ "اور سو دن تو بہت ہیں۔ ابھی تم کو ہماری دنیا میں آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ غلطی ہم سے ہوئی کہ تمہاری جوانی پر ترس کھایا اور تمہیں زندہ سلامت آنے دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ تم ... ماحول اور مادہ پرست معاشرے

www.paksociety.com

میں پرسکون رہ کے لوٹے ہو۔ اس کے بعد تم اپنے دماغ سے سوچتے ہوگے، دل سے نہیں۔ تم دو اور دو پانچ بھی مان لوگے۔ ہم نے تو دو جمع دو دو ہی تک کے تھے اور ہماری آفر انتہائی فراخدلانہ تھی۔ تم عیش سے عمر بسر کر سکتے تھے اور اس سارے عذاب سے بچ سکتے تھے جس میں تم خود بھی مبتلا ہوئے اور دوسروں کو بھی مبتلا کیا۔ تمہارا باپ اتنا ضدی نہیں تھا۔ اس نے ہماری ہر بات خوشی سے مان لی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ تم بھی اسی کی طرح ہوگے۔ ورنہ کسے ضرورت تھی کہ ہم تم کو رعایت دیتے رہیں۔ تمہاری ضد سے ہمارا کتنا نقصان ہوا، مالی بھی اور جانی بھی۔ دو چار مرتبہ تم حسنِ اتفاق یا لقمہ بیگ کی یاوری سے بچ گئے تو تمہارا حوصلہ بڑھ گیا۔" وہ اپنے لب و لہجے اور اندازِ گفتگو سے قطعی بدلا ہوا دلاور تھا۔

اتنی سنجیدگی کے ساتھ اور ایسے رواں لہجے میں اس نے پہلے کبھی بات نہیں کی تھی۔ اس کی اداکارانہ صلاحیت کا میں شروع سے معترف تھا۔ یہ انکشاف بھی میرے لیے باعثِ حیرت ثابت ہوا کہ اس کا ہر جملے میں "اپنے سکندر صاحب" کہنا، ادھورے جملے بولنا، اردو میں پنجابی کے الفاظ شامل کرنا اور ان پڑھوں کی طرح گفتگو کرنا بھی اداکاری تھی۔ اصل چوہدری دلاور کی زبان بالکل مختلف تھی۔ وہ انتہائی عیار اور سازشی ذہن، سرد مزاج، جہاندیدہ اور تعلیم یافتہ شخص تھا۔ دو ٹوک اور ٹو دی پوائنٹ بات کرنے والا۔ پُراعتماد اور اپنی حاکمیت میں خود مختار۔

"اس وقت تم سب کچھ کہہ سکتے ہو دلاور۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ میرے لیے قابلِ قبول ہو۔ اور آج اگر یہ سچ ہے تو کل بھی سچ ہوگا" میں نے کہا۔ "میں نے صرف اپنا حق مانگا تھا اور انصاف مانگا تھا۔"

دلاور ہنسا۔ "بیٹے تم غلط وقت پر پیدا ہوگئے۔ پھر غلط جگہ آ گئے۔ اپنی کتابوں کی دنیا میں ہی رہتے تو اچھا تھا۔ پڑھ لکھ کے کیا فائدہ ہوا تمہیں؟ آنکھیں تو تمہاری چندھیا گئیں مگر تم دنیا کو دیکھتے اپنی آنکھ سے بھی اور دوسروں کی آنکھ سے بھی۔ تمہیں معلوم ہو جاتا کہ اس پورے کرۂ ارض پر حق و انصاف کے الفاظ صرف تقریروں میں استعمال ہوتے ہیں جن کے مسودے بڑی محنت سے تیار کیے جاتے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں میں نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی فلموں یا قصے کہانیوں میں بھی جو دل بہلانے کے ذریعے ہیں۔ ورنہ میرا خیال ہے کہ ان الفاظ کو اب دنیا کی ہر زبان کی ڈکشنری سے بھی خارج کر دینا چاہیے۔ حق کیسے مل رہا ہے اور انصاف کہاں ہو رہا ہے؟ اسرائیل سے کشمیر تک؟ گوروں اور کالوں کی معاشی جنگ میں؟ پسماندہ کہلانے والے اور ترقی یافتہ ممالک میں؟ امیر اور غریب میں؟ اپنی معاشرتی قدروں کو دیکھو جن کے دُہرے معیار ہیں۔ اخلاقی حالت پر نظر ڈالو۔"

"یہ فلسفہ مت پڑھاؤ مجھے دلاور! کیونکہ میرا ذہن اسے قبول نہیں کرتا۔ جو فرق میری فطرت میں ہے، وہ رہے گا۔ ازل سے جب انسان کی سرشت میں نیکی یا بدی کا عنصر اسی لیے شامل رہا کہ سب انسان ایک جیسے نہیں تھے۔ کچھ تو زہر کا پیالہ پیتے تھے تو کچھ اسے جھوٹے لبوں سے لگا لیتے تھے۔ شیطان اور یزید ہے مگر جو کچھ پہنایا جاتا ہے۔ خواہ کسی بھی بہروپ میں آئے یزید بن کر، دلاور بن کر یا میر محمد بن کر۔ اور انکل رضوی صاحب یا انسپکٹر شیخ، رابعہ جیسی عورت اور مجھ جیسے کم عقل اور کم کام بھی اسے دیکھ لیتے ہیں۔"

"یہ بکواس بند کرو اور بتاؤ کہ ہم یہ باکس کس کس کے نام ارسال کریں؟" دلاور نے برہمی سے کہا۔

"میرا خیال ہے اسے تم خود اپنے بیوی بچوں کے لیے لے جاؤ۔ بیوی تمہاری شرافت کی اور بچے تمہاری رحم دلی کے قائل ہو جائیں گے دلاور۔" میں نے کہا۔ "تمہاری عزت پہلے سے زیادہ کرنے لگیں گے۔ پوری داستانِ شجاعت سنا دینا انہیں۔"

"تم مجھے مشتعل کرنا چاہتے ہو نا؟" چوہدری دلاور مسکرایا۔ "تاکہ تمہارے منہ پر تھپڑ رسید کرنے کی غلطی کروں اور تم کو دوسرا بدلہ میری گردن پر کرنے کا موقع مل جائے۔ افسوس یہ ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے نہیں سمجھا حالانکہ تم ذہین بھی ہو۔ حماقت کی حد تک جرأت مند ہونے کے علاوہ۔ اپنا کام کرو پیڈرو! تم کیوں رک گئے تھے؟"

پیڈرو نے خفیف ہو کے سر ہلایا اور ٹین کے اس ڈبے کو بند کر کے چاروں طرف سے گوند سے موٹا سفید کاغذ چپکانے لگا۔ مقفل کرنے سے پہلے اس نے باکس کو کھولا اور میری ملکیت اور میرے ذاتی استعمال کی وہ سب چیزیں ڈال دیں جو میری شناخت کا ذریعہ ثابت ہو سکتی تھیں۔ یہ دلاور کے شیطانی ذہن کی زیادہ قریبی ذہانت کا کمال تھا کہ اس نے مجھے نفسیاتی طور پر دہشت زدہ کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا۔ ڈاکٹر تو مر ہی چکا تھا اور دلاور کے لیے اس میں ذاتی صدمے کی کوئی بات نہیں تھی۔ جب ناجائز مقاصد کے لیے زرِ کثیر صرف کر کے کسی کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں تو اکثر غیر تحریری معاہدے کے تحت یہ بھی واضح کر دیا جاتا ہے کہ زیادہ معاوضہ درحقیقت اُن خطرات کا ہے جو ہر کام میں جن کا کوئی تو کچھ نہیں۔ زندگی اور موت کے مابین پل صراط کا سفر کرنا ہوگا اور ہر گام پہ ایک مرحلہ طلبگارِ جاں درپیش ہوگا۔ لیکن اگر صحیح وہ اندیشۂ سود و زیاں سے بے نیاز بچاس ہزار وصول کرتا رہا۔ اب موت اچانک آگئی تو اصل مع سود ادا ہو گیا۔ یہی کام اتنے ہی معاوضے پہ کوئی اور کرے گا اور پھر کرتا رہے گا۔

اس سہولت میں سب سے اہم کردار ہے۔ افراد یا پیسہ نہیں۔ جیالوجسٹ ڈاکٹر جو پرشاد رنجیت پچاس ہزار روپے سکہ رائج الوقت پہ ملازم مقرر ہوا تھا، اپنی غلطی سے مرا یا کسی اور کی غلطی سے۔ وہ دلاور بیٹھے بیٹھے کی بیلنس شیٹ میں کھپ گیا۔ اس کی آخری رسوم مذہبی حق مذہب کے مطابق ہوتی ہیں اور اس کی مغفرت کے لیے دعا مانگنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ اس کے نامۂ اعمال پر مہر ثبت ہونے کی فہرست پہلے لگ چکی تھی۔ بے جان جسم سے دلاور نے تھوڑا سا فائدہ اور اٹھایا۔ لاش کو اس نے کاٹنے اور جلانے یا دبانے کے بجائے میرے لیے سامانِ عقوبت بنا دیا۔ اب یہ لاش جسے مل جائے گی، انکل رضوی اور شیروانی، فوزیہ اور شملہ، انسپکٹر شیخ یا استاد جی، سب جان لیں گے کہ یہ تحفہ کس نے بھیجا ہے اور نتیجتاً دیکھ کر مان لیں گے کہ گوشت پوست کا یہ ڈھیر کس کا ہے۔ شناخت میں گو اب بھی یہ ان کا دوسرا ہوگا کہ لاش کو دفن کریں یا پوسٹ مارٹم کے لیے رکھیں، اور یہ شناخت تو ناممکن ہوگی کہ مرنے والا کون تھا۔

میری روح اس منظر کے تصور سے کانپ گئی تھی جب پلاسٹک کے کفن میں سے نکلنے والے متعفن گوشت اور ہڈیوں کے جوڑ سے برآمد ہونے والی اشیا کی مدد سے سکندر بخت سمجھا جائے گا۔ ابھی تو سب ہی میری گمشدگی سے پریشان تھے۔ ایسے میں میرے پرس، قلم اور گھڑی کے ساتھ موصول ہونے والے باکس کو کھولنے والے کے لیے ذہنی صدمہ کتنا شدید ہوگا۔ شیخ اور انکل رضوی تو پولیس کی نوکری کے باعث ایسے نظاروں کے عادی اعصاب پر قابو رکھ سکتے ہیں اور عقل سے کام لے کر یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اسباب تو سکندر بخت کا ہے لیکن کیا اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ بے جان جسم بھی سکندر کا ہے؟ انکل شیروانی محل سرونٹ، شریکِ حیات سے جدا ہونے کا منظر دیکھنے والے، یہ منظر دیکھ سکیں گے؟ ان کو ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے اور ان کا ذہن بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ فوزیہ پر ہسٹریا کا دورہ پڑ سکتا ہے اور اس کا ذہن بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ شملہ کا کچھ پتا نہیں۔ اس نے اتنے غم جھیلے ہیں اور اتنے دکھ اٹھائے ہیں کہ شاید اس کی تاب نہ لا سکے۔ پاگل ہو جائے یا خودکشی کر لے۔ صرف رابعہ کے بارے میں یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس کو بھی دامِ فریب سمجھے۔ اس کا دل مانے نہ کہ یہ سکندر ہے اور دماغ تسلیم کرے کہ سکندر کا یہ انجام ہو سکتا ہے۔ مگر ہے تو وہ بھی عورت۔ باشعور اور پیشے کے اعتبار سے وکیل، مگر ہر طرح سے صرف محبت کرنے والی عورت۔ بااہمیت منطق، دلائل اور عقل۔ اندر سے صرف جذبات کی نازکی، عشق کی حلاوت، خوابوں کی آسودگی۔

"دلاور!" میں نے کہا۔ "تم میرے ساتھ جو سلوک چاہو کرو، مجھے اتنا تو بتا دو کہ رابعہ کہاں ہے؟"

"رابعہ کہاں ہے؟" چوہدری دلاور نے زیرِ لب دہرایا جیسے یہ سیدھی سادی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ "یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ ایسی جلدی کیا ہے۔ آدمی کے لیے یہ دنیا ہے یا وہ دنیا۔ کہیں نہ کہیں وہ بھی ہوگی۔"

پیڈرو اتنی دیر میں فارغ ہو گیا تھا اور اب کہیں سے لال رنگ کا موٹا مارکر لا کے باکس پہ کچھ لکھ رہا تھا لیکن جس سائڈ پر وہ لکھ رہا تھا وہ میرے سامنے نہیں تھی۔

"اب اسے بھیج دو وہیں جہاں میں نے کہا تھا۔" دلاور نے کہا۔ اسی وقت یسین سے ایک غلطی ہو گئی۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے ہاتھ کو تھوڑا سا ہلا دیا۔ زمین کھودنے کے انداز میں۔ کیونکہ پیڈرو نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ اس باکس کو دفن کرنا ہے۔

میرے جسم کا رُواں رُواں ناقابلِ بیان اطمینان کی لذت سے سرشار ہو گیا تھا۔ دلاور نے نہیں دیکھا تھا کہ ایک گینڈے جتنا جسم اور چیونٹی جتنی عقل رکھنے والے غلام نے اس کے سارے ڈرامے کا پلاٹ کلائمکس سے پہلے ہی مجھے بتا دیا ہے۔ اس کی یہ حرکت ایسی ہی تھی جیسے مداری کی ڈگڈگی بجے زیادہ اس کے الفاظ پہ بندر خود بخود کھڑا ہو جائے۔ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے یا قلابازی کھا کے کوئی کرتب دکھا دے۔ یسین بھی ایک بہت بڑا بندر تھا جس کی ڈگڈگی دلاور کے ہاتھ میں تھی۔ محض عقلِ سلیم سے محرومی کے باعث وہ قدرت کی عطا کردہ سماعت اور نطق کی انسانی صفات سے محروم ہوا تھا۔ شاید اس نے کوئی ایسی بات بلا ارادہ کسی لڑکی اور انجام کا تصور کیے بغیر کہہ دی تھی جس سے دلاور اینڈ کمپنی کو نقصان ہوا۔ معمولی نقصان ہوتا تو اسے جسمانی سزا دی جاتی، کوڑے مار مار کے اس کی کھال ادھیڑ دی جاتی یا اس کے جسم کو گرم سلاخوں سے داغا جاتا مگر نقصان زیادہ ہوا تھا چنانچہ سزا بھی اسی مناسبت سے ملی تھی۔ اس وقت یسین سے بھی بے وقوفی سرزد ہوئی تھی مگر اس کا ذمے دار پیڈرو بھی تھا جس نے میرے سامنے یسین کو اشارے میں سمجھایا تھا کہ ڈاکٹر کا کیا کرنا ہے۔ اس کے ہاتھ ہلتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ خوفناک تحفہ کسی کو بھی نہیں جائے گا۔ اگر اس وقت میں اپنی خوشی کا اظہار کر دیتا یا بتا دیتا کہ پیڈرو اور یسین کی مشترکہ حماقت کے باعث حقیقت مجھ پر عیاں ہو گئی ہے تو ان دونوں کو کڑی سزا ملتی اور مجھے بھی ملتی ۔۔۔ دلاور کو اس خیال سے تسکین تھی کہ وہ مجھے دہشت زدہ کرنے میں کامیاب رہا اور اب یہ احساس میرے لیے سوہانِ روح رہے گا کہ میرے یوں مرنے کی خبر پاکر لواحقین پر کیا بیتے گی۔

"شکریہ!" یسین نے وہ ڈبا اٹھایا تو میں چلایا۔ "دلاور!"

www.paksociety.com

رحم کرو مجھ پہ۔ یہ تو بتا دو کہ میری لاش کسے بھیج رہے ہو؟"
"میں نے تو تم کو انتخاب کا حق دیا تھا۔" دلاور نے ہاتھ اٹھا کے یسین کو روکا۔ "جواب بتاؤ۔"
"معلوم نہیں تم کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو۔ اگر فوزیہ مر گئی یا شملا پاگل ہو گئی تو تمہیں کیا ملے گا؟ کوئی عورت یہ بھیانک منظر کیسے دیکھ سکتی ہے؟" میں نے منت کرنے کے انداز میں کہا۔
"تم پھر فضول باتوں میں الجھ گئے۔" دلاور بولا۔ "جلدی سے نام بتا دو۔ ورنہ...."
"بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔ "فوزیہ، رابعہ اور شملا کو چھوڑ دو۔ وہ کمزور جذباتی عورتیں ہیں۔ فوزیہ کی شادی ہو چکی ہے اور وہ مجھے اچھا آدمی نہیں سمجھتی لیکن اس کی ازدواجی زندگی بہت خوشی گزر رہی ہے۔ مظلوم رابعہ بھی ہے مگر شملا سب سے بزدل ہے اور سب سے زیادہ دکھ اٹھا چکی ہے۔ وہ پاگل ہو کے اپنی جان دے دے گی۔ تم اسے بخش دو۔ انکل رضوی اور انسپکٹر شیخ...."
"بس بس۔ وقت نہیں ہے میرے پاس اتنا۔" دلاور بولا۔ "پیڈرو۔ یہ تحفہ شملا کو بھجوا دو۔"
یسین اور پیڈرو کے ساتھ جمشید بھی نکل گیا۔ مجھے امید تھی کہ دلاور کا مقصد مجھے زیادہ سے زیادہ اذیت دینا ہے چنانچہ وہ میری بات کیوں ماننے لگا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ بالفرض محال یہ تحفہ بھیجا ہی جاتا تو اس سے کس کو زیادہ سے زیادہ صدمہ ہوتا۔ میں نے واضح کر دیا تھا کہ شملا سب سے زیادہ اثر لے گی۔ اس نے حسب توقع شملا ہی کو باکس بھجوانے کی ہدایت کر دی اور یہ اس کی ایذا پسند فطرت کے عین مطابق تھا۔ وہ مجھے بے وقوف بنا رہا تھا اور میں اسے یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میں بے وقوف بن گیا۔ میں نے اس پر اعتبار کر لیا اور اب شدید اندرونی کرب میں مبتلا ہوں جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں جانتا تھا کہ رات کو کسی ویرانے میں ڈاکٹر کی لاش ڈال دی جائے گی۔ دلاور کوئی کام بلاوجہ نہیں کرتا تھا۔ میری لاش میرے وارثوں کو بھجوانے سے اسے کیا فائدہ ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ میری موت کا یقین کر لیتے۔ اس کے لیے وہ سب ضروری تو نہیں تھا جو میرے سامنے ہوا۔ وہ تو صرف مجھے سزا دے رہا تھا ورنہ میرے مرنے کا یقین دلانے کے اور بھی آسان طریقے تھے۔
"دلاور!" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "اس درندگی کے مظاہرے سے تم کو حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ میرے سارے وارث تو نہیں مر جائیں گے۔ تم نے مجھے اور رابعہ کو قتل کر دیا اور شملا نے خودکشی کر لی تب بھی آدھی درجن باقی بچ جائیں گے کیونکہ محسن کو تم پہلے ہی مار چکے ہو۔ وہ تین ہماری جگہ مزید چار افراد کو نامزد کر دیں گے اور کاروبار اس زندگی میں کبھی صرف تمہاری ملکیت نہیں بنے گا۔ وارثوں کی اس قطار میں انکل رضوی اور انسپکٹر شیخ بھی ہیں۔ جس دن وہ تمہارے پارٹنر ہو گئے...."
"اپنے سکندر صاحب، آپ بہت بہت ہو۔" دلاور نے میری بات کاٹ دی اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "کس نے کہا ہے آپ سے کہ ہم رابعہ یا خدانخواستہ آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ محسن تو اپنی بہادری کی وجہ سے مارا گیا ہے۔"
"تو پھر کیا مقصد ہے مجھے یوں اغوا کرانے کا؟" میں نے کہا۔
"کچھ نہیں۔ بس دل چاہتا تھا کہ آپ کچھ دن ہمارے مہمان رہیں۔ اصل میں تو آپ اپنے گھر میں ہیں۔" وہ مسکرایا۔
"کیا ثبوت ہے اس بات کا؟" میں نے دھڑکتے دل پر قابو پا کے کہا۔
"ثبوت تو میں ابھی فراہم کر دیتا۔ ٹیلی فون پہ بات کروا دیتا تمہاری۔" وہ بولا۔ "لیکن اس میں تھوڑا سا خطرہ ہے۔ تمہارے انکل کی لائن پر یقیناً آبزرویشن ہوگی۔ تمہاری گفتگو ٹیپ ہونے میں تو ہمارا کچھ نہیں جاتا لیکن یہ ضرور معلوم ہو جائے گا کہ کہاں سے کال کی گئی۔ تم کوئی اور نمبر بتا دو۔"
"نمبر تو رابعہ کے آفس کا بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "شیخ کے گھر کا ہے۔"
"ہوں۔" وہ سوچ کے بولا۔ "اچھا میں بندوبست کرتا ہوں کہ تم بات کر لو۔ پہلے میں تصدیق کر لوں کہ جو نمبر تم دو گے وہ بھی آبزرویشن پہ تو نہیں ہیں۔ اگر نہ ہوئے تو میں رابعہ کے لیے پیغام دے دوں گا کہ کل کسی وقت وہاں آ جائے اور تم سے بات کر لے۔ شرط یہی ہے کہ لائن آبزرویشن پہ نہ ہو۔ اگر کل تک یہ انتظام کر لیا گیا تو مجھے پتا چل جائے گا اور پھر بات نہیں ہو سکے گی۔ نمبر بتاؤ۔"
میں نے اسے نمبر دیے اور وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ پہلے کی طرح پھر نمبر ڈائل کرنے کی آواز نہیں آئی۔ "ہیلو۔ دیکھو پتا کرو کہ انسپکٹر رضوی سابق ایس پی کی لائن ٹیپ ہو رہی ہے یا نہیں۔ یہی بات دو اور نمبروں کے لیے معلوم کرنی ہے۔ نمبر لکھو۔ ہاں.... اور دیکھو مجھے ابھی بتاؤ آدھے گھنٹے میں۔"
میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ایک طرف دلاور ایک نامعلوم لاش بھجوا کے میری موت کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف فون پہ براہ راست رابعہ سے بات کرا کے میرے زندہ

ہونے کا ثبوت فراہم کرنا چاہتا تھا۔ پہلی بات تو ذرا اعتراض کی تھی کہ دلاور ماہر تھا مگر یہ دوسری بات؟ یہ بھی ڈراما ہوگی؟
"مجھے کب تک یہاں رہنا ہوگا؟ ٹانگ ٹھیک ہونے تک؟" میں نے واپسی پر اس سے پوچھا۔
"اب اتنی بھی کیا جلدی ہے اپنے سکندر صاحب۔ آپ اپنے گھر میں آرام سے رہو۔ کھانے کی کوئی تکلیف ہو تو بتاؤ۔ ڈاکٹر کل دوسرا آ جائے گا۔ چاہو تو اسے بھی مار دینا۔ وہ تحفہ فوزیہ کو پہنچ جائے گا۔ زمانہ بڑا عجیب ہے۔ عجیب کیا ہے پیسے کا ہے۔ تم جتنے چاہو بنا لو۔ بازار میں جو چیز آج کل بہت لوگ بیچتے رہتے ہیں وہ ضمیر ہی ہے۔ اس کے پیسے اچھے مل جاتے ہیں نا۔ وطن دشمن اور غدار۔ پیشہ ور مجرم۔ ہر غیر قانونی اور ناجائز کام کرنے والے کر نہیں۔ علاج تمہیں کرانا ہے مجھے نہیں۔ ایسے بنے جاتے جاؤ گے تو اپنا ہی ڈھیر النقصان کرو گے۔ ہم لاش آگے بھیجتے رہیں گے اور تم یہاں پڑے رہو گے اسی طرح۔"
"پھر بھی مجھے کب تک قید رکھو گے؟" میں نے کہا۔
"یہی کوئی سات سال تک۔" دلاور بے نیازی سے بولا۔ "زیادہ دن لگے تو آٹھ نو سال۔"
میرا دل ڈوبنے لگا۔ "آٹھ نو سال۔ تمام عمر کیوں نہیں اور اس سے کیا حاصل؟" میں نے کہا۔ "تم مجھے مار کیوں نہیں دیتے۔ سات آٹھ یا نو سال تک تم مجھے کیوں زندہ رکھو گے؟"
"ہر بات میں کوئی مصلحت ہوتی ہے اپنے سکندر صاحب۔" وہ بولا۔ "اب فرض کرو ہم تمہیں مار دیں تو ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ ہم نے تو پکا بندوبست کر رکھا ہے۔ لائن لگا رکھی ہے کہ الف مر جائے تو ب اور ب مر جائے تو ج۔ تمہاری جگہ وارث ہوگا اور پھر فوزیہ ایڈ کمپنی کا وارث بن جائے گا۔ خود وہ لوگ ایسے ہیں کہ بچا کام ہوتے ہیں۔ تم سے کم نہیں۔ ظاہر ہے ان سب کو نہیں مارا جا سکتا۔ تم پہنچے ہوئے دوسرا محسن تھا۔ اور بھی راستے نہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ پوچھیں گے ضرور کہ چوہدری صاحب یہ قصہ کیا ہے۔ جو بھی میر ایڈ کمپنی میں آپ کا پارٹنر بنتا ہے قتل ہو جاتا ہے! اب آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ حق وراثت کا سرٹیفکیٹ آپ کے نام سے جاری ہو گیا ہے۔ عدالت نے احکامات تو صادر کر دیے لیکن آپ خود کیسے جاؤ گے عدالت میں یہ سرٹیفکیٹ لینے کے لیے۔ عدالت انتظار کرے گی۔ دوسری عدالت جس میں کیس قتل کا مقدمہ زیر سماعت ہے انتظار نہیں کرے گی اور آپ کی غیر حاضری پر ضمانت منسوخ کر دے گی۔ آپ کے وارث کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ بھی انتظار کریں گے۔ تلاش کریں گے۔ ساری دنیا کی خاک چھان ڈالیں گے۔ اگر لاش مل جاتی اور شناخت ہو جاتی تو قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ حق وراثت دوسرے شخص کو منتقل ہو جاتا ہے لیکن پہلا آدمی ملے ہی نہیں تو اسے کیسے مردہ ثابت کیا جا سکتا ہے؟ اس کے لیے سات سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی عدالت کو درخواست دی جا سکتی ہے کہ اب فلاں گم شدہ شخص کی بازیابی کا کوئی امکان نہیں چنانچہ اسے مردہ قرار دے دیا جائے اور فلاں کو اس کا وارث تسلیم کر لیا جائے۔ جس بیوی کا شوہر گم ہو جائے وہ سات سال تک دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ جنگ کے بعد اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سپاہی لاپتا ہو جاتے ہیں اور کسی ذریعے سے ان کی موت کی تصدیق نہیں ہوتی اور یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ دشمن کے قیدی بن گئے۔ قید میں مر گئے یا قید سے فرار ہو گئے۔ چنانچہ ان کی بیویوں کو سات سال تک شوہر کی واپسی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ تمہاری واپسی کا انتظار بھی سات سال تو ہوگا اور اس عرصے میں چار چھ ماہ تک میں بھی سخت تشویش میں مبتلا رہوں گا کہ میرا اتنا لائق فائق قانونی پارٹنر کدھر گیا۔ پھر کوئی اور تمہاری جگہ لینے آئے گا اور عدالتی کارروائی ہوگی۔ اسی لیے میں نے کہا کم سے کم سات سال۔ آٹھ یا نو اس لیے کہے کہ عدالت کو سال دو سال لگ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں رابعہ اتنا عرصہ تمہارا انتظار کرے گی یا نہیں مگر ہمارے لیے آٹھ نو سال کی مہلت بہت ہے۔ ظاہر ہے عملی طور پر میں ہی سارے کاروبار کو چلاؤں گا۔ کاروبار میں نفع بھی ہوتا ہے نقصان بھی۔ آگے کچھ یوں ہوگا کہ کاروبار سال بھر بعد گھاٹے میں جانے لگے گا۔ کبھی آگ لگ جائے گی۔ کبھی ہڑتال توڑ پھوڑ کر دیں گے۔ قرضہ بڑھ جائے گا۔ کوئی عمارت بیٹھ جائے گی۔ ان آفات کا انجام یہ ہوگا کہ کمپنی دیوالیہ ہو جائے گی۔ چار پانچ سال میں اس کا ملبہ اور جگہ رہ جائیں گے۔ وقت آنے پر اس کا قبضہ تمہارے وارثوں کو دے دیا جائے گا۔ شاید میں اس وقت دلوں پہلے ہی کاروبار سے دستبرداری کا اعلان کر کے نکل جاؤں گا۔ میرے ساتھیوں میں سے کوئی بھی نہیں ملے گا کیونکہ ہم کاروبار کو منتقل کر چکے ہوں گے۔ کسی اور شہر یا کسی اور ملک میں۔ ہاں پولیس تمہیں تلاش کرے گی۔ امیر شرافت علی کے قتل کے کیس میں گرفتار کرنے کے لیے۔"
میں خاموش لیٹا سنتا رہا۔ چوہدری دلاور کا یہ منصوبہ بھی بہت مکمل تھا۔
"اور تمہیں یقین ہے کہ تم آٹھ نو سال تک خود بھی زندہ رہو گے؟" میں نے کہا۔ "میں بھی زندہ رہوں گا اور اسی طرح تمہاری قید میں جیسے اس وقت ہوں!"
"معاف کرنا۔ میں بشرط زندگی کہنا بھول گیا تھا۔" دلاور نے طنز سے کہا۔ "کل کیا ہوگا اس کا دعویٰ سو فیصد یقین کے ساتھ کس نے کیا ہے؟ وہ کیا کہتے ہیں۔ سامان سو برس کا پل کی خبر

نہیں۔ تو پھر میرا ارادہ ہے یا منصوبہ ہے اور منصوبے تو حکومت بھی بناتی ہے۔ ایک پانچ سالہ منصوبہ، پھر دوسرا، پھر تیسرا، کرم پر کریں گے اور وہ کریں گے اور ہر سال بجٹ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ آئندہ ایک سال میں کیا ہوگا۔ آدمی گھر بنانے کی فکر میں رہتا ہے۔ اس کے لیے دن رات محنت کرتا ہے اور پس انداز کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی بنیاد رکھنے سے پہلے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ موت پر سو فیصد یقین رکھنے کے باوجود اور ہر سانس کو آخری سانس شمار کرنے کے باوجود ہر شخص زندگی کے کاروبار میں لگا ہے اور اس کی نظر آنے والے وقت پر ہے۔“

”تمہارا دعویٰ ہے کہ تم سوچے سمجھے بغیر کوئی کام نہیں کرتے اور بے مقصد نہیں کرتے۔“ میں نے کہا۔ ”پھر یہ کیا ہے۔ ایک طرف تم میری لاش ارسال کر رہے ہو کہ لواحقین کو میری موت کا یقین آ جائے۔ دوسری طرف رابعہ سے بات کرا رہے ہو؟“

اس سے پہلے کہ وہ میری بات کا جواب دیتا، دوسرے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دلاور اٹھ کے دوسرے کمرے میں گیا۔

”ہاں۔“ میں نے اس کی آواز سنی۔ ”تم نے اچھی طرح معلوم کر لیا ہے نا؟ کیسے؟ کون ہے ڈیوٹی پر ٹیلیفون ایکسچینج میں؟ اچھا.... اچھا ٹھیک ہے۔“ بات ختم ہو گئی اور وہ ٹیلی فون اٹھائے نمودار ہوا۔ یہ عام ٹیلی فون نہیں تھا۔ اس میں چوڑائی کے رُخ ایک حصے میں صفر سے نو تک بٹن تھے جن کو ڈائل گھمانے کی بجائے صرف انگلیوں سے دبانا کافی تھا مگر چند بٹن اس کے علاوہ تھے۔ دوسرے حصے میں گیریں سی یہ ظاہر کرتی تھیں کہ پیچھے اسپیکر ہوگا۔ ٹیلی فون کے ساتھ ساتھ دو تین لائنوں کا انتظام بھی تھا جیسے ایک گھر یا آفس میں تین ٹیلی فون لگے ہوں، آپس میں گفتگو کے لیے یا کال کو ایک فون سے دوسرے فون پر منتقل کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہ کوئی انوکھی ایجاد نہیں تھی۔ بازار میں اس قسم کے سیٹ عام ملتے تھے۔

”تو بھی۔ سابق ایس ایس پی صاحب سنتے ہیں گھر اور رابعہ کے گھر کی لائن پر تو آبزرویشن لگا رکھی ہے۔ تمہارے شیخ صاحب کا فون البتہ محفوظ ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”اب میں نمبر ملاتا ہوں۔ تمام گفتگو میں بیٹھ کے سنوں گا۔ تم کیسے پیغام دو گے؟“

”اگر شیخ ڈیوٹی پر ہوا تو اس کے والد ہوں گے یا نازو ہوگی، اس کی بہن۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ پیغام میں تم صرف اتنا کہو گے کہ رابعہ کو فون کر کے بلا لیا جائے۔ اسے بتا دیا جائے کہ سکندر بات کرے گا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں اور یہ بات بھی صرف رابعہ کو بتائی جائے گی۔ وہ کسی کو بتائے بغیر آئے گی۔ اگر کسی اور کو معلوم ہوا تو بات نہیں ہو سکے گی۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”تم نمبر ملاؤ۔“ اور پیغام بھی خود ہی دے دیا۔

دلاور نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہو سکتا ہے ایک اجنبی کی آواز پہ اعتبار کوئی نہ کرے۔“ وہ نمبر ملاتے ہوئے بولا۔ میں نے کوشش کی کہ اس نے اس انداز سے گود میں رکھا کہ میں نمبروں پہ اس کی ایک انگلی کو حرکت کرتے نہ دیکھ سکوں۔ ڈائل ہوتا تو اس کے گھومنے کی آواز سے مجھے ایک بات ضرور معلوم ہو جاتی کہ نمبر لوکل ہے یا اس نے ٹرنک نمبر ڈائل کیا ہے۔ پانچ بار نمبر ملانے کا مطلب ہوتا کہ بات لاہور ہی میں ہو رہی ہے مگر سات بار ڈائل گھومتا تو اس بات کا ثبوت ہوتا کہ ڈائریکٹ ڈائلنگ سے لاہور یا کراچی ملایا گیا ہے اور میں پنڈی میں ہوں یا پھر کراچی میں۔

”ہیلو! کون بول رہا ہے؟“ دلاور نے کہا اور میرا دل اچھل کے دھڑکا۔ اس خیال سے کہ میں دشمن کی قید سے اپنے گھر اپنی خیریت کی اطلاع دوں گا۔ جنگی اسیر اپنے زنداں سے ریڈیو کے ذریعے اپنے گھر والوں کو پیغام ارسال کرتے تھے اور وہ سب جن کے باپ بیٹے یا بھائی محاذ سے لوٹ کر نہیں آئے تھے اور لاپتا ہو گئے تھے دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ریڈیو کے گرد جمگھٹ لگائے سانس روکے گوش بر آواز رہتے تھے۔ ان کے چہروں کی کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جو بیک وقت امید اور ناامیدی، خوف اور عزم و اندوہ میں مبتلا، اپنی دعاؤں کی قبولیت پہ اعتبار کے باوجود عدم اعتماد کا شکار، آس کا دامن تھامے بیٹھے رہتے تھے۔ جب اچانک، بالکل لاٹری میں نکل آنے والے انعام کی طرح کوئی نام آ جاتا تھا۔ ”میں سپاہی فلاں ولد فلاں۔ فلاں علاقے کا رہنے والا اپنے گھر والوں کو سلام کہتا ہوں۔ میں دشمن کی قید میں ہوں۔ بالکل خیریت سے ہوں، میرے لیے دعا کریں۔“ اور اس وقت، اچانک کوئی فرط مسرت سے چلانے لگتا تھا۔ رونے لگتا تھا، ہنسنے لگتا تھا اور سجدے میں گر جاتا تھا۔ منّا کہنے کے دن ابا! وہ زندہ ہے۔ یہ اشکر ہے مولا۔ اور دوسرے جن کے حصے میں یہ خوشی کا لمحہ نہیں آیا تھا، بڑے رشک سے اپنے دکھ کے اوپر انہیں مبارکباد دیتے تھے۔ زندہ ہے تو کسی دن لوٹ بھی آئے گا۔ دشمن کی قید میں ہے تو کیا۔ کسی نامعلوم محاذ پہ بے گور و کفن تو نہیں پڑا ہے۔ اس پہ کوئی ٹینک تو نہیں گزرا۔ اور جب وہ آنے والا ہے گھر آ گیا تو قید زنداں کی مشکلات سے بھی گزر جائے گا۔ یہ تصور کا بہت پرانا نقش تھا جو ہنوز میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ ان جذبات کی تمام شدت کے ساتھ جو میں نے انتظار کرنے والوں کی صورت پر دیکھے تھے۔ پل بھر میں وہی تصویر بدلتے ہوئے وقت اور حالات کے ساتھ زندہ ہو گئی۔

”ہیلو، کون؟ جی ہاں جی آپ۔ کس سے کام ہے آپ کو؟“ پوچھنے والی آواز آئی۔

اسپیکر سے نازو کی آواز آئی۔

”نازو بی بی! سکندر صاحب بات کریں گے آپ سے۔“ دلاور نے سکون سے کہا اور ریسیور مجھے تھما دیا۔

”نازو! میں نے بمشکل تمام کہا۔ ”میں سکندر بات کر رہا ہوں۔“

”سکندر!“ نازو کی بے یقینی چیخ سنائی دی۔ ”کہاں ہو تم۔ اللہ۔ تمہیں پریشان ہیں سب۔“

”سنو نازو! چیخ پکار مت مچاؤ۔“ میں نے کہا۔

”شور کیسے نہ مچاؤں۔ یہاں سب کی حالت خراب ہے۔“ نازو اب رونے لگی تھی۔ ”یہ کیا کرتے ہو تم؟“

”نازو! میری بات سن لو پہلے۔ میں مجبور ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ مجھے اتنی اجازت ملی ہے کہ رابعہ سے بات کر لوں لیکن رابعہ کے گھر اور دفتر دونوں جگہ فون کرنا مشکل تھا۔“ یہاں میں نے کہا۔ ”انکل نے لائن پر آبزرویشن رکھوا دی ہے اس لیے تم کو.... تمہارے گھر فون کرنا پڑا۔ اب تم ایسا کرو کہ اسی وقت رابعہ کے پاس جاؤ۔ رکشا ٹیکسی کر کے یا کسی بھی طرح اور یہ رونا دھونا بھی بند کرو۔“

”میں بھائی جان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ وہ ڈیوٹی پہ نہیں ہیں۔“ وہ بدستور سسکیاں لیتی رہی۔

”ٹھیک ہے۔ خون مت کرنا اُسے.... سنا تم نے۔ اور شیخ سے۔“

”میں بلا لیتی ہوں ان کو بھی....“

”نہیں نہیں.... ایسا غضب مت کرنا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”کسی کو کچھ نہیں بتانا ہے۔ صرف رابعہ سے کہنی ہے یہ بات کہ میں بات کرنا چاہتا ہوں، تمہارے گھر میں۔ اسے ساتھ لے آنا لیکن دھیان رکھو کہ معلوم ہو کہ تم نے رابعہ سے کیا کہا ہے اور نہ کسی اور کو۔ رابعہ سے کہنا چپ چاپ تمہارے ساتھ آ جائے۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر۔ ورنہ مجھے ساتھ بات کرنے کی اجازت نہیں ملے گی....“

”کیا تم کسی کی قید میں ہو؟“ نازو نے روتے ہوئے کہا۔

”بس ایسی ہی بات ہے۔ اگر تمہارے بھیا یا انکل کو معلوم ہوا تو وہ پولیس والوں کی طرح اس نمبر سے بھی کال ٹریس کرنے کے چکر میں پڑ جائیں گے اور یہ لوگ.... جنہوں نے مجھے بات کرنے کی اجازت دی ہے.... ان کے تعلقات اور وسائل بہت وسیع ہیں۔ ان کو معلوم ہو جائے گا۔ اس لیے یہ بات میرے اور تمہارے درمیان رہنی چاہیے۔ میری قسم کھاؤ کہ ایسا ہی ہوگا۔“

”اپنی قسم دیتے ہو مجھے؟“ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ ”کہاں ہو تم سکندر؟“

”بس نازو.... میں پھر فون کروں گا.... ایک گھنٹے بعد“ میں نے کہا۔

”سکندر!“ وہ چلائی۔ ”ابھی بند مت کرنا۔ خدا کے لیے....

ایک بات مجھے بھی کہنے دو.... جو میں ابھی تک نہیں کہہ سکی تھی.... ایسا نہ ہو.... خدانخواستہ.... کہ میں.... پھر کوئی اجازت نہ دے.... یا مہلت نہ ملے۔ مجھے یاد نہیں۔“

میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہے گی لیکن میں مجبور تھا اور کوشش کے باوجود ریسیور نہ رکھ سکا۔ ”جلدی بولو نازو۔“

”بات.... بات بہت چھوٹی سی ہے.... اور بہت بڑی ہے.... میں تم سے محبت کرتی ہوں سکندر.... اس کے باوجود کہ تم رابعہ کو چاہتے تھے اور کبھی میرے نہیں ہو سکتے.... یہ میرے اختیار کی بات نہیں رہی کہ تمہیں بتا رہی ہوں....“

میں نے ریسیور رکھ دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن نازو میرے تصور میں اسی طرح ریسیور تھامے کھڑی رہی۔ اس کی آواز اب بھی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ ”سکندر.... سکندر تم سن رہے ہو نا۔ ہیلو.... ہیلو....!“

”زندگی میں اتنے چاہنے والے مجھے نہیں ملے۔“ دلاور مسکرایا۔ ”میں کیا کہوں تمہیں، خوش نصیب یا بدنصیب؟“

”خود تم نے کسے چاہا دلاور؟“ میں نے کہا۔ ”کس کی آرزو کی؟ صرف مال و زر کی۔ تمہارے دل میں چاہت کی گنجائش ہی کہاں تھی؟ تمہارا دل تو سونے کا ایک ڈلا تھا۔ صرف وہ باتیں تھا تمہارے پاس۔ اس سے تم نے جو چاہا پا لیا۔ اب شکوہ کیسا۔ کچھ لوگوں کے نقطۂ نظر سے تم انتہائی خوش نصیب ہو۔“

”مجھے اس بات کا افسوس ہوتا ہے کہ اپنی خوش نصیبی کو تم نے اپنی انا پر قربان کر دیا۔“ وہ بولا۔ ”یہ انا کا مسئلہ آخر کیا تھا۔ احمقانہ جذباتیت، سوالوں کی شوریدہ سری، عاقبت نااندیشی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر تم دس بیس لاکھ روپے لے کر واپس چلے جاتے۔ فوزیہ، رابعہ اور نازو جیسی لڑکیاں ہی کیا ہمارے دنیا کی رنگینی ہی اس عمر میں تمہارے لیے تھی۔ عقل کی آنکھ سے دیکھتے تو دنیا تمہیں بیس لاکھ روپے میں بڑی خوبصورت نظر آتی۔ لیکن تم اُلٹے چکر میں پڑ گئے۔ گڑے مُردے اکھاڑنے کے، انتقام کے اور معاوضے کے مطابق، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے چکر میں۔ اب تک کیا ملا ہے تمہیں اور میرا کیا گیا ہے۔ کبھی نفع نقصان کی بیلنس شیٹ دیکھو۔ گھاٹے میں کون جا رہا ہے؟ تکلیف کون اٹھا رہا ہے؟“

”مشکل یہ ہے کہ تم آج کی بات کر رہے ہو اور میں کل کو دیکھتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کون سے کل کو؟ وہ جو گزر گیا، یا وہ جو آنے کا ہی نہیں؟“ دلاور نے پُرتمسخر لہجے میں کہا۔

”دونوں کو۔ جو کل ہو گیا اسے جھٹلانا میرے بس کی بات نہیں اور آنے والے دن پر میرا اعتقاد کبھی متزلزل نہیں ہو سکتا خواہ

www.paksociety.com

حالات اس سے بھی زیادہ سخت ہو جائیں۔" میں نے کہا۔
"تم نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا۔" دلاور نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "ٹیلی فون آنے سے پہلے۔ کہ تمہاری وفات کا ثبوت فراہم کرنے کے بعد تمہاری گفتگو کرانے میں کون سی عقلمندی ہے؟ تو اپنے سکندر صاحب۔ وہ تحفہ پہنچے گا دو چار دن بعد۔ بات کر گئے تم ابھی۔ نکالنے والے تو یہی نتیجہ نکالیں گے کہ تم لحد میں مارے گئے کسی غلطی کے باعث۔ بعض اوقات ہماری بھی تو غلطی ہو جاتی ہے اور اس میں کسی کو شک نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے پیشے کا بہت شوق ہے۔ پھر کچھ دن یہی سسپنس چلے گا کہ تم زندہ ہو یا نہیں اور ہو تو کہاں ہو؟ اخبارات سے ہمیں معلوم ہوتا رہے گا کہ تمہارے انکل کیا تو پ چلا رہے ہیں اور تمہارے چاہنے والے کہاں کہاں کی خاک چھان رہے ہیں۔"
"گویا تمہیں یقین ہے کہ اس لاش کا تحفہ وصول کرنے کے باوجود بھی ان کو میری موت کا اعتبار آ سکے گا؟"
دلاور ہنسا۔ "ارے وہ ایس ایس پی بہت ہوشیار ہے اور اس کے ساتھ ہے ایک تو تمہارا سب کچھ۔ وکیل، مجوزہ منیجر۔ وہ بھی کم چالاک نہیں۔ تیسرے رشتے دار ہیں۔ وہ چھان بین کر کے پتا چلا لیں گے کہ لاش کسی اور کی ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کچھ عرصے بعد ہم پھر ٹیلیفون سے تمہاری آواز سنوا دیں گے انہیں۔"
"کتنے عرصے بعد؟" میں نے محسوس کیا کہ میرے لہجے میں مایوسی کا عنصر غالب آنے لگا ہے۔
"بھئی ابھی تو بات کی ہے تم سے۔" دلاور بولا۔ "اب چار چھ مہینے کی مکمل خاموشی ضروری ہے۔ جب دیکھیں گے کہ وہ کچھ مایوس ہونے لگے ہیں تو انہیں امید کا دوسرا انجکشن دے دیں گے۔"
"لیکن تم نے تو ابھی طلب کیا ہے رابعہ کو ایک گھنٹے میں۔"
دلاور قہقہہ مار کے ہنسا۔ "تم بھی بڑے یار شاہ ہو۔ رابعہ آتی ہے تو آنے دو۔ وہ بیٹھی رہے گی۔ انتظار کرتی رہے گی، شام تک یا رات تک۔ اصل مقصد تو حاصل ہو گیا۔ نازو نے تمہاری آواز پہچان لی۔ تم سے بات کر لی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ تم قیدی ہو اور مجبور ہو۔ اتنا کافی ہے۔ اب وہ سو روز کے اور قسمیں کھا کے لوگوں کو یقین دلاتی رہے گی کہ غلط فہمی کا کوئی سوال نہیں۔ آواز سکندر کی تھی لیکن اور کسی سوال کا جواب نہ دے سکے گی۔ کرنے والے تو اس سے ہزاروں سوال کریں گے۔ تحریری بیان لیں گے۔ ایک ایک لفظ جو تم نے کہا یا اس نے کہا لکھ کر دینے کو کہیں گے۔ سوائے اس آخری بات کے وہ سب لکھ دے گی اور بتا دے گی مگر اس کے بعد فل اسٹاپ۔

اچھا اب میں چلتا ہوں۔"
صرف ٹیلی فون تھا جو میں اس پر پھینک کر مار سکتا تھا۔ وہ اشٹر کر دو ہی قدم گیا تھا کہ میں نے گالیاں دیتے ہوئے ٹیلیفون اس کے سر کا نشانہ لے کر پھینکا۔ مگر ٹیلی فون کے ساتھ تار تھا چنانچہ دلاور بال بال بچ گیا۔ ٹیلی فون اس کے جسم سے چھوا نہ دور ہو گیا اور تار کی لمبائی ختم ہو جانے کے بعد جھٹکے سے نیچے گر کر ٹوٹ گیا۔
"ایسے کوئی نہ کوئی تمہاری خبر گیری کے لیے یہاں ہر وقت موجود رہے گا۔" دلاور نے ٹیلی فون کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اور تمہاری ہر ضرورت پوری ہوتی رہے گی۔ پھر بھی کسی چیز کی کمی ہو، مجھ سے کوئی بات کرنی ہو تو بتا دینا۔ جیسے ہی مجھے فرصت ملی، آ جاؤں گا۔" اس نے دروازہ بند کیا اور باہر نکل گیا۔
کمرے کے اندر اپنی اسیری اور تنہائی کا احساس پوری شدت کے ساتھ مجھ پر مسلط ہونے لگا۔ میرے پیروں میں کوئی زنجیر نہیں تھی اور میرے ہاتھ بھی آزاد تھے لیکن میں اٹھ کر کھڑکی تک بھی نہیں جا سکتا تھا۔ جسمانی طور پر نقل و حرکت کے قابل ہونے تک اس قید سے نجات کی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ زنداں کی دیواروں سے نکلنے اور فرار ہونے کے لیے جسمانی قوت بغیر صحت کے نہیں حاصل ہو سکتی تھی چنانچہ ابھی تو میرے لیے سوائے لیٹے رہنے کے کوئی کام نہ تھا۔ کسی سے بات کیے بغیر اور بالکل بے کار لیٹ کر چوبیس گھنٹے کا پورا دن کیسے کٹے گا۔ صبح کرنا شام کا لانا جوئے شیر کا۔ صبح کا دروازہ ہی جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل کام ہوں گے۔ اس پہ وہ ذہنی عذاب جو تصور دے گا جو ہر تصویر پیش کرے گا۔ سب کی صورت پر رنج و الم کی ہر کیفیت کا عکس دکھائے گا جو دن رات کے ہر لمحے میں پریشان ہوں گے۔ یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق رہیں گے اور ایک موہوم امید پر جئیں گے۔ اچھا ہوا اگر ایک ہی بار وہ مان لیتے کہ سکندر دنیا سے خالی ہاتھ گیا لیکن وہ میری آواز سن چکے ہیں۔ انہیں میری زندگی کا یقین آ چکا ہو گا۔ رابعہ نے پہلے ہی بتا دیا ہو گا کہ مجھے کن حالات میں اور کس طرح اغوا کیا گیا تھا۔ اب نازو بتا دے گی کہ میں نے اسے کیوں فون کیا تھا؟ مجھے اکیلا پا کے عجیب خیالوں کے عفریت ہر سمت سے نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں زہریلے خنجر اور بھالے تھے جن سے وہ دل کو چھیدتے تھے۔ ان کی زبان خاردار تھی جو روح کو زخم دیتی تھی۔ ان کی آنکھیں زہر کے پیالے تھے جو نزع کے کرب میں مبتلا تھے۔ محسن سے میں کہہ رہا تھا؟ بالآخر؟ اب سے وہ اس جنگ میں میرے ساتھ تھا۔ ہر فتح اور ہر شکست میں شریک تھا۔ میرے لیے اتنا ناگزیر ہو چکا تھا جتنا روح کے لیے ایک جسم کا وجود۔ اب پتا نہیں

اور کیا اس کو کفن میں لپیٹ کر کندھوں پہ اٹھا لیا گیا اور قبر میں رکھ کے اس پر مٹی ڈھیر کر دی گئی۔ نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ ہا ہا ہا۔ دلاور کی ہنسی ایک بازگشت کی سی گونجی۔ ہم سب مر سکتے ہیں سکندر اعظم، یا اور لوگوں کو مرتے نہیں دیکھا تم نے؟ محسن کیا لافانی تھا؟ تھا تو انسان ہی نا۔ انسان فانی ہے۔
یہ سب جھوٹ بھی ہو سکتا تھا کیونکہ چودھری دلاور بہت بڑا ڈرامے باز تھا۔ ایکٹر، ڈائریکٹر اور سسپنس خیز پلاٹ بنانے والا۔ ابھی ابھی دو بار اس نے اپنے جھوٹ کے سچ ہونے کا یقین دلایا تھا۔ اس نے مجھے واقعی دہشت زدہ کر دیا تھا کہ ڈاکٹری لاش کو میری لاش بنا کے شملا کے نام ارسال کر دیا گیا ہے اور یہ سب کچھ ایک انتہائی اذیت دہ اور ہولناک تجربہ تھا۔ پھر اس نے شک کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی کہ کچھ دیر میں میری بات رابعہ سے ہو گی اور بڑی چالاکی کے خواب آئندہ کو ختم کر دیا۔ عین اس وقت جب تصور رابعہ کو روبرو دیکھ رہا تھا اور اس سے ہم کلام تھا۔ اس نے بہت چالاکی سے اپنا مقصد پورا کر لیا تھا لیکن اس کی باتوں میں آ کے میں نے ایک موقع گنوا دیا تھا۔ میں نے نازو سے وہ سب نہیں کہا تھا جو میں رابعہ سے کہنا چاہتا تھا۔ مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ میں اس سے کیا کہوں گا اور کیا کہہ سکوں گا لیکن میں نے سوچ رکھا تھا کہ واضح الفاظ میں نہ سہی اشاروں میں کچھ نہ کچھ بتانے کی کوشش ضرور کروں گا۔ نازو کی نسبت رابعہ زیادہ ذہین اور سمجھدار تھی۔ وہ سمجھ لیتی لیکن اب وہ شفیق کے گھر میں ٹیلی فون کے پاس گم سم بیٹھی ہو گی۔ ایک ایک لمحہ کاٹنا ایک صدی کا انتظار ہو گا۔ لیکن ٹیلی فون چپ رہے گا۔ اس کی گھنٹی اگر بجے گی تو محض دھوکا دینے کے لیے۔ جھوٹی امیدوں کا مذاق اڑانے کے لیے۔
یقین اور بے یقینی کے درمیان لٹکے رہنا جانکنی کی تکلیف سے کم نہ تھا۔ کاش کوئی مجھے صرف اتنا بتا سکتا کہ محسن زندہ ہے اور رضوی صاحب کو میری وجہ سے مستقل نہیں ہونا پڑا۔ دلاور کے جھوٹ کا پردہ محسن کی ایک غیر شعوری حرکت نے چاک کر دیا تھا۔ پچھلے ایک جھوٹ کو دلاور چھپانے میں ناکام رہا تھا۔ پہلے اس نے مجھے رابعہ کے بارے میں یہ کہا تھا کہ وہ رضوی صاحب کے گھر گئی تو یقینا نہیں ہے مگر دلاور نے کسی تذبذب کے بغیر بتا دیا تھا کہ وہ اپنے گھر میں ہے۔ چنانچہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ سب جھوٹ ہو جو میرے سامنے سچ بنا کے پیش کیا گیا تھا۔ وہ صرف مجھے اعتراف کرانے کے لیے ہوں۔ اعتراف؟ اس واردات کے محرکات کیا تھے؟ دلاور مجھے اچھی طرح سمجھا گیا تھا۔ کسی اور سے ان کو غرض نہ تھی۔ جبکہ ان کو زندہ چھپانا غیر ضروری تھا۔
زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ اس رات حملے کے بعد وہ مجھے بیہوشی کے عالم میں اٹھا لائے۔ محسن اور رابعہ کسی وجہ سے ان کا تعاقب نہیں کر سکے۔ حملہ آوروں کی گاڑی تو پھنس گئی تھی۔ ممکن ہے وہ مجھے اسی گاڑی میں ڈال کے فرار ہوئے ہوں جس میں رابعہ تھی۔ میری نگاہ پھر دیوار پر گئی۔ وقت اور تاریخ نظر کا دھوکا نہیں تھے لیکن یہ عقل کو فریب دینے کا ایک طریقہ ہو سکتا تھا۔ گھڑی کی سوئیوں کو اگر گھما کر چوبیس گھنٹے آگے کر دیا جائے تو تاریخ خود بخود ایک دن آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسے سات دن آگے بھی کیا جا سکتا ہے۔ مجھے باور کرانے کے لیے کہ گزشتہ شب کا واقعہ درحقیقت ایک ہفتہ پہلے پیش آیا تھا۔
چودھری نے یہ بھی کہا تھا کہ تمام واقعات اخباروں میں آ چکے ہیں۔ اگر یہ جھوٹ تھا تو انتہائی احمقانہ جھوٹ تھا جو پکڑا جا سکتا تھا لیکن دلاور کبھی نہ بولتا۔ میں ثبوت کے لیے اخبار مانگ سکتا تھا۔ ایک بار تو اس نے بڑی خوبصورتی سے مجھے ٹال دیا تھا لیکن وہ کب تک ٹالے گا؟ اور ٹالے گا تو اس کے جھوٹ کی قلعی کھل جائے گی۔ پھر میں نے اس امکان پر غور کیا کہ کیا وہ تاریخ بدل کے یا مٹا کے مجھے کوئی اخبار دکھا سکتا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اخبار کے ہر صفحے پر یہی نہیں ہر خبر کے ساتھ تاریخ ہوتی ہے جو زیادہ سے زیادہ دو دن پہلے کی ہو سکتی ہے۔ وہ خبر کیوں چھپا سکتا ہے جو کسی دن پہلے کی ہو۔ بیشتر خبروں پر گزشتہ دن کی تاریخ ہو گی۔ چودھری دلاور کے وسائل بہت زیادہ تھے۔ وہ ایک اخبار چھاپ کے مجھے پیش کر سکتا تھا جس میں مجھے ہر خبر مل جائے اور تاریخ بھی لیکن یہ کسی کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کرنے کے مقابلے میں انتہائی دشوار کام تھا۔ اخبار کا ایک صفحہ ترتیب دینا بھی عقل اور ذہانت کا، تجربے اور مہارت کا اور خالص تکنیکی نوعیت کا کام ہے۔ اہمیت کے اعتبار سے ہر صفحے پر خبر کا انتخاب۔ سرخی کی تشکیل۔ متن کا مضمون۔ کتابت اور طباعت۔ سب زندگی کا ثبوت بنانے سے مختلف کام تھے۔ ہر اخبار میں سیکڑوں خبریں ہوتی ہیں۔ پہلے صفحے پر بین الاقوامی۔ اندر ایک صفحہ شہر کی مقامی خبروں کا۔ پھر ڈسٹرکٹ کی خبریں جو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے نمائندے ایک سے ایک غیر معروف مقام سے ارسال کرتے ہیں۔ پریس ریلیز اور بیانات۔ فیچر اور تصاویر۔ نہیں یہ کام چودھری دلاور اپنا تمام پیسہ اور اثر و رسوخ استعمال کر کے بھی نہیں کر سکتا۔
سیدھا طریقہ یہ تھا کہ میں چودھری سے گزشتہ ایک ہفتے کے اخبارات طلب کروں اور اس سے مطالبہ کروں کہ اس کی جان کے لیے عذاب بنا دوں یہاں تک کہ وہ ٹالتے ٹالتے تنگ آ جائے اور صاف انکار کر دے۔ اس کا انکار دراصل اقرار ہو گا کہ اس نے صرف جھوٹ

www.paksociety.com

بولا تھا لیکن پیڈرو ہے کہاں؟ میں نے کان لگا کے آواز سننے کی کوشش کی مگر اس گھر میں تو جیسے کوئی تھا ہی نہیں۔ ہر سمت ایک گہرا سکوت تھا۔ بوجھل اور بے کراں۔ باہر سے بھی کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ نہ کسی گاڑی کے گزرنے کی، نہ کسی کے باتیں کرنے کی۔ میں گوش بر آواز رہا تھا۔ کہیں کوئی بچہ روئے، کوئی قہقہہ مار کے ہنسے، کسی کے ہاتھ سے کوئی برتن گرے، کوئی دروازہ کھلے یا بند ہو۔ زندگی اپنے وجود کا کوئی تو ثبوت دے۔ لیکن آس پاس صرف سناٹا تھا جس میں کسی پرندے کی صدا تک نہ تھی۔ یہ کیسا ویرانہ ہے۔ میں نے سوچا۔ ورنہ چڑیاں کہاں نہیں ہوتیں۔ کوّے کہاں نہیں ہوتے۔ آبادیوں کے باہر تو طوطے اور مینا، کوئل اور پپیہا کی آواز بھی سنائی دے جاتی ہے۔

میں نے اپنی موجودہ حالت پر غور کیا۔ پیڈرو نے میری بائیں ٹانگ کو کسی ہتھوڑے سے بالکل ناکارہ بنا دیا تھا اور اب یہ ٹانگ بُری طرح درد کر رہی تھی۔ تکلیف دائیں ہاتھ کی بھی تھی جو چاہتا تھا میرے جسم کا دایاں نصف حصہ کارآمد نہیں رہا تھا لیکن اس وقت میں ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ کو کام میں لا سکتا تھا۔ میری نگاہ فرش پر پڑی۔ ڈاکٹر کا بیگ وہیں دھرا ہوا تھا جہاں سے اس کو اٹھاتے اٹھاتے وہ خود جہان سے اٹھ گیا تھا۔ ڈاکٹر کو اس مرگِ ناگہاں پر حیران ہونے کا وقت تک نہ ملا۔ جب وہ پچاس ہزار روپے اپنی فیس کا حق تک ادا کر کے یہاں آیا تھا تو اس نے اپنی شاندار گاڑی کسی پوشیدہ مقام پر روکی ہوگی اور تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کرتے وقت بھی اس کے ذہن میں جلد از جلد واپسی کا خیال ہوگا۔ آج شام سے رات تک کی مصروفیات کا خیال ہوگا لیکن یہ خیال ہرگز نہیں ہوگا کہ اگلے آدھے گھنٹے میں اس کی لاش کا قیمہ کر کے اسے ڈبے میں پیک کر دیا جائے گا اور وہ خود جہاں سے حرفِ مکرر کی طرح مٹ جائے گا، غائب ہو جائے گا۔ کیا کوئی اس کی واپسی کا انتظار نہیں کرے گا؟ میں نے سوچا اور جب وہ لوٹ کر نہیں جائے گا تو کوئی پریشان نہیں ہوگا؟ کوئی اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں کرائے گا؟ امید کی ایک کرن روشن ہوئی اور بجھ گئی۔ رپورٹ لکھوانے سے کیا ہوگا؟ کسے معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر کہاں سے وہ کہاں گیا؟ اس نے کسی کو نہیں بتایا ہوگا کہ وہ مجرموں کے ایک گروہ میں شامل ہے اور مسیحا ان کے قاتل ہو گیا ہے۔ نشتر چلاتی چھوڑ کے اس نے تیشہ چلا دا اٹھا لیا ہے۔ اس نے اپنے مذموم کاروبار کا سراغ کہیں نہیں چھوڑا ہوگا پھر کوئی اس کا سراغ یہاں تک کیسے لگائے گا؟

میں نے بائیں جانب جھک کر جسم کو تھوڑا سا گھسیٹا اور آگے جھکا۔ بیگ میری دسترس میں تھا۔ میں نے اسے جھٹکا کے اندر جھانکا۔ اس میں وہ سب کچھ تھا جو ایک عام ڈاکٹر کے میڈیکل بیگ میں ہوتا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ کوئی جو لوگ زہر بھی معقول، گولی یا انجکشن کی صورت میں۔ چند مہلک زہر میں نے بھی دیکھے تھے۔ مثلاً سنکھیا اور نیلا تھوتھا۔ کچھ کا میں نے ذکر سنا تھا یا پڑھا تھا لیکن میں ان کو شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بعض مخصوص حالات میں جو دوا کسی کو شفا دیتی ہے وہی ایک صحت مند آدمی کو دی جائے تو وہ مر جاتا ہے۔ کچھ دواؤں کی مقررہ مقدار فائدہ مند ہوتی ہے، زیادہ مقدار ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے لیکن میں کوئی ڈاکٹر نہیں تھا کہ مجھے یہ سب معلوم ہوتا۔ اس کے علاوہ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ میں بیگ سے ہر شیشی، ہر پیکٹ اور انجکشن کو نکال کے اس کا معائنہ کرتا۔ پیڈرو کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔ پورے بیگ کو چھپانا ممکن نہ تھا لیکن اس کا سامان نکالا جا سکتا تھا۔ سب سامان نکال لینا شک پیدا کرتا۔ میں نے جلدی جلدی بیگ میں ہاتھ مارا۔ ایک پیکٹ میں پانچ سی سی کا انجکشن بھرا ہوا تھا۔ مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر صرف ضرورت کے وقت سرنج بھرتے ہیں اور یہ بھی تشخیص کرنے کے بعد۔ میں نے اس پیکٹ کو فوراً تکیے کے نیچے چھپا دیا۔

ایک نظر دروازے پر اور کان آہٹ پر لگائے ہوئے میں نے بڑی عجلت میں شیشیوں کو دیکھا۔ بیشتر پر کمپنی کا لیبل تھا اور دوا کا نام صاف لکھا ہوا تھا۔ صرف تین شیشیاں ایسی تھیں جن پر سے لیبل اتار دیا گیا تھا۔ شیشیوں کا رنگ گہرا بھورا تھا۔ ایک میں گولیاں تھیں اور دو میں پاؤڈر تھا۔ یہ کس رنگ کا تھا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ میں نے تینوں شیشیاں تکیے کے نیچے رکھیں اور بیگ کو واپس وہیں رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا۔ بے بسی کا احساس کچھ کم ہوا۔ خنجر، پستول نہ سہی میرے پاس کچھ تو آیا جسے میں اپنا اسلحہ سمجھوں۔ شاید تقدیر ساتھ دے تو میں اسی سے [illegible] گرفتار کر سکوں۔

پھر میری نظر نے ٹوٹی ہوئی کرسی کو دیکھا جو سامنے پڑی ہوئی تھی۔ اس کا ایک پایہ ٹوٹ کر الگ ہو گیا تھا۔ یہ خیال ایک دم میرے ذہن میں آ گیا۔ بات صرف جسمانی ہمت کی تھی اگر میں کسی طرح اٹھ کے دروازے تک جا سکوں تو یہ ہو سکتا ہے کہ دیوار سے لگ کے کھڑا ہو جاؤں اور اس مضبوط ڈنڈے کو میں تھامے تیار کھڑا رہوں۔ دروازہ کھلتے ہی جو بھی اندر آئے اس کے سر پر پوری قوت سے وار کروں اور اسے ناک آؤٹ کر دوں لیکن اندر تین آدمی آ سکتے تھے جو شاید اس وقت ڈاکٹر کی تدفین میں شریک تھے۔ پیڈرو، نواب خسرو جمشید کہلانے والا بہروپیہ اور سیمن۔ آگے جیتا پیڈرو ہوگا یا خسرو جمشید۔ ایک ناک آؤٹ ہو جائے گا لیکن دوسرا مجھے ناک آؤٹ کر دے گا بلکہ زخمی حال میں اسے ہی کھینچ لیا تو سیمن رہ جائے گا۔ اس نے مجھے پکڑ لیا تو میری ہڈیاں چور چور کر دے گا لیکن اس کے ڈیل ڈول سے نمٹا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اسے قریب آنے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔

ابھی میں نے سخت جدوجہد کے بعد نیچے قدم رکھا ہی تھا کہ جانے کہاں ایک گھنٹی بجنے لگی لیکن کال بیل نہیں تھی۔ میں نے ایک پیر پر توازن قائم رکھتے ہوئے بیڈ کے کنارے کو تھاما اور جھک کر آگے بڑھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور سفید وردی میں ایک نرس اندر آ گئی۔

"یس سر؟" اس نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"تم کہاں سے آ گئیں؟" میں نے خفت سے سر جھکایا۔ "کیا میں نے تمہیں طلب کیا تھا؟"

"اس گھنٹی کا مطلب ہے کہ آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔" وہ اتنے ہی جذبات سے عاری لہجے میں بولی۔

نرس اٹھائیس برس کی ہو سکتی تھی اور اڑتیس کی بھی۔ عورت کی عمر میں لباس کی تبدیلی سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ تھا کہ اچھی خاصی جوان لڑکیاں اسکول یونیفارم میں بچی نظر آتی ہیں۔ انہی کو اسکول کے فنکشن میں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے جب وہ اپنے بہترین لباس میں سج دھج کے آتی ہیں۔ ساڑھی میں عمر زیادہ لگتی ہے تو شلوار قمیص میں کم ہو جاتی ہے اور پیشہ ورانہ قسم کے یونیفارم میں گویا منجمد ہو جاتی ہے۔

"جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے۔" میں نے کوئی جواب نہ پا کے کہا۔ "میں نے کوئی گھنٹی نہیں بجائی۔"

اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور مجھے پلک جھپکائے بغیر گھورتی رہی۔ گھنٹی ابھی تک بند نہیں ہوئی تھی۔

"اوہ آئی سی۔" میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں نے ہاتھ رکھ دیا ہوگا۔" گھنٹی اچانک بند ہو گئی۔

"آپ بیساکھی لے کر جا سکتے ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔" وہ بولی۔

"عجیب بات ہے! ابھی تم نے کہا تھا مدد کرنے آئی ہو۔ اب مشورہ دے رہی ہو کہ بیساکھی لے کر چلے جاؤ۔ میں اپنی مدد آپ کروں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کون سی بات ہے؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ گھنٹی پھر بجنے لگی اور اچانک یہ انتظام میری سمجھ میں آ گیا۔ "وہ یہ سارا آٹومیٹک نظام ہے۔" میں پھر بیٹھ گیا تھا اور گھنٹی بند ہو کے دوبارہ بجنے لگی۔ اس کا سلسلہ میرے بیڈ سے ملا ہوا تھا۔ بیڈ پر بوجھ پڑتا تھا تو کسی تار سے منسلک کوئی سوئچ بھی آن ہو جاتا تھا ---- وزن کم ہوتے ہی سوئچ آف ہو جاتا تھا۔ بالفاظ دیگر گھنٹی ایک الارم تھی کہ قیدی نے بستر سے نیچے قدم رکھا ہے۔ نرس خوبصورت نہیں تھی تو بدصورت بھی نہیں تھی۔

"اگر بیساکھی لے کر میں باتھ روم کی طرف نہ جاؤں، بلکہ دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کروں تو کیا تم میرا راستہ روک سکو گی؟" میں نے کہا۔

"یس سر، میرے پاس دو قسم کے پستول ہیں۔" وہ بولی۔ "ایک سے میں آپ کی ٹانگ پر گولی مار دوں گی۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" میں نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ دوسری قسم کا پستول کیا ہے؟ پستول تو صرف گولی چلانے کے لیے ہوتے ہیں۔ بے شک بے ہوشی والے پستول بھی استعمال کرتے ہیں لیکن تم بچی تو نہیں ہو؟"

"ضرورت کے وقت آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دوسرا پستول کس کام آتا ہے۔" وہ بولی۔ "اب آپ باتھ روم ہو آئیں۔ آپ کے ڈنر کا اور دوا کا وقت ہو رہا ہے۔ مجھے آپ کو انجکشن بھی دینا ہے۔"

"اب کس کی ہمت ہے کہ میرے قریب آ کے مجھے انجکشن لگا سکے۔" میں نے لیٹتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر نے یہ غلطی کی تھی اور اسے زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔"

نرس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور باہر نکل گئی۔ جب وہ دوبارہ کھانے کی ٹرے لیے نمودار ہوئی تو میں سیدھا لیٹا چھت کو گھور رہا تھا اور اس حوصلہ شکن صورتحال پر غور کر رہا تھا۔

"لے جاؤ یہ کھانا۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔" میں نے دیوار کی طرف رخ کر کے کہا۔ نرس نے ٹرے کو دروازے کے قریب رکھ دیا۔

"پھر آپ کو سو جانا چاہیے سر۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔" نرس نے مخصوص پیشہ ورانہ لہجے میں کہا۔

"میں سونا بھی نہیں چاہتا۔" میں نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔ "جب نیند آئے گی سو جاؤں گا۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے فرض کیا کہ اب وہ کھانے کی ٹرے اٹھائے گی اور چلی جائے گی۔ میں نے اس سے کوئی بھی غلط بات نہیں کہی تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ اس ذہنی پریشانی کی حالت میں میری نیند بھوک کا کوئی سوال نہ تھا۔ اچانک میری پشت پر شانے کے قریب چبھن سی اٹھی اور مجھے یوں لگا جیسے کوئی نوکدار شے میرے جسم میں پیوست ہو گئی ہے۔ میرا خیال غلط نہیں تھا۔ میں نے کراہ کے ہاتھ سے دیکھا تو شانے میں تقریباً چھ انچ لمبا ایک تنکا سا تیر گڑا ہوا تھا اور وہ نرس ہاتھ میں پستول جیسی کوئی چیز لیے کھڑی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس پستول کی نال زیادہ لمبی تھی۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے مشتعل لہجے میں کہا اور تیر کو کھینچ کر

www.paksociety.com

نکلا جو ربڑ کا بنا ہوا تھا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں مسٹر۔" وہ پستول کو اپنی یونیفارم میں ڈالتے کے بولی: "آپ کو انجکشن لگا دیا گیا ہے۔ چند منٹ بعد آپ سکون سے سو جائیں گے۔"

اس سے پہلے کہ میں اس خبیث نرس سے کچھ کہتا وہ ٹرے اُٹھا کے اور دروازہ بند کر کے نکل گئی۔ اس نے کہا تھا کہ ضرورت پڑنے پر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ دوسری قسم کا ریوالور کیا ہے اور اب اس کا استعمال خود پر میں نے اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے افریقی جنگلوں میں بنائی جانے والی فلموں میں شکاریوں کو ایسے کارتوس استعمال کرتے دیکھا تھا۔ جو وحشی درندوں کو بے ہوش کر کے زندہ پکڑنے کے کام آتے تھے۔ شکاری چھپ کر نشانہ لیتے تھے اور ببر شیر، چیتے یہاں تک کہ گینڈے ہاتھی بھی کارتوس کے جسم میں پیوست ہوتے ہی منٹوں ذرا دور بھاگتے تھے اور بے حس ہو جاتے تھے۔

میرے شکاری بھی جانتے تھے کہ میرے قریب جا کے مجھے انجکشن لگانا آسان نہیں۔ ڈاکٹر کی موت کے بعد وہ اور خوفزدہ ہو گئے تھے۔ ان کے لیے میں بھی کسی وحشی درندے سے کم خطرناک نہیں تھا جسے وہ زیر دام لانے میں تو کامیاب ہو گئے تھے مگر اب اسے اسیر رکھنا بھی ایک چیلنج تھا۔ یا تو وہ مجھے زنجیروں سے باندھ کر رکھتے۔ اپنی موجودہ حالت میں انہوں نے یہ ضروری نہیں سمجھا تھا مگر تقریباً بے دست و پا ہونے کے باوجود میں نے ان کا ایک آدمی مار ڈالا تھا اور ان کے سیمسن کے حملے کا منہ توڑ جواب دیا تھا۔ اب کوئی میرے قریب آنے کا رسک کیسے لیتا۔ اگر وہ میری گرفت میں آ جاتا تو زندہ بچ کے نہ نکلتا۔ چنانچہ انہوں نے جو طریقہ اختیار کیا ٹھیک تھا۔

مجھے معلوم تھا اب اس "پستولی انجکشن" کے زیر اثر میں بہت جلد ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاؤں گا۔ شاید پھر ہوش آنے پر یہی ہو گا کہ میں خود کو دست و پا بستہ پاؤں گا۔ آہستہ آہستہ کمرہ میری نظر کے سامنے ہلنے لگا۔ پھر گھومنے لگا اور دھندلا پڑ گیا۔ نرس نے جاتے جاتے بلب جلا دیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ بجلی بجھ سا رہا ہے۔ پھر سب کچھ غائب ہو گیا۔

▲

جب پھر میری آنکھ کھلی تو کمرے میں سورج کی روشنی تھی۔ میری نگاہ بے اختیار اس دیوار پر گئی جہاں گھڑی تھی لیکن گھڑی ہٹا لی گئی تھی۔ اب میں یہ اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ بے ہوشی کی اس نیند کا وقفہ کتنا طویل تھا اور میں اگلی صبح جاگا ہوں یا پھر مجھے کئی دن عالم بے ہوشی میں بیگانہ رکھا گیا ہے۔ دیو زاد سیمسن میرے سامنے دوسری طرف زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے کیمیائی اسلحے کی تصدیق کو تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔

اس حیوان نما انسان کی جگہ پہ جو مرد ہوتا تو میری حرکت پہ شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتا اور وہ یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ میں تکیے کے نیچے سے کیا نکال رہا ہوں لیکن سیمسن کا آئی کیو یا ذہانت کا معیار بہت پست تھا۔ وہ جنگل کے اندر کسی جھاڑیوں میں مصروف رہا اور ڈرنے کا چہرہ بنا رہا۔ میرا کیمیائی اسلحے کا ذخیرہ ابھی موجود تھا۔ ابھی تک میں نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ ان کے خلاف یہ اسلحہ موثر طور پر کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے استعمال کا مناسب موقع کب ملے گا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میری چوری پکڑی جائے اور میں خوش فہمی کے اس سہارے سے بھی محروم ہو جاؤں کہ اس ذخیرے سے تمام دشمنوں کو ٹھکانے لگا کر میں فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس کے علاوہ ابھی میں یقین کامل کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جو گولیاں اور سفوف میرے قبضے میں ہیں یا جو دوا انجکشن کی سرنج میں بھری ہوئی ہے وہ زہر قاتل ہی ہیں۔ گولیاں اور سفوف کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔ ہر قسم کی اسپرین یا کوئی بھی بات ہو سکتی ہے۔ صرف انجکشن کے بارے میں زیادہ پُرامید تھا۔ عام طور پر ڈاکٹر دوا کو وقت ضرورت سے پہلے سرنج میں نہیں بھرتے کیونکہ وہ خود نہیں جانتے کہ اگلا مریض کس قسم کا ہوگا اور اسے کون سا انجکشن دینا ہوگا لیکن یہ سرنج پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق تیار تھی کہ ضرورت پڑنے پر فوراً استعمال کی جا سکے۔ جب حالات جنگی ہوں اور اتنا وقت بھی نہ ہو کہ وائل کو ننھی سی آری سے کاٹا جائے اور ٹوٹے کر توڑ کر دوا سوئی کے ذریعے سرنج میں بھری جائے۔

دشمن چالاک تھے۔ جسمانی طور پر مجھ سے قوی اور ہوشمند تھے چنانچہ انہیں زہر دینا ہرگز آسان نہ تھا۔ نہ وہ میرے ہاتھ سے لے کر کھاتے پیتے تھے نہ پانی۔ بلکہ میں جو بھی کھانا پینا تھا وہ لا کر دیتے تھے اور وہ میرے قریب تک نہیں آتے تھے۔ پھر بھی نا امیدی کے صحرا میں خیال کا سراب خوبصورت تھا کہ شاید کبھی اتفاق ایسا ہو کہ میں زہر جانے کی پیالی میں گھول سکوں اور ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر پیالیاں بدل سکوں۔ عقل کہتی کہ ایں خیال است و محال است و جنوں۔

بیڈ کے پاس رکھا ہوا ڈاکٹر کا بیگ ہٹا لیا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ کسی کو بیگ میں سے کسی چیز کے نکالے جانے کی خبر نہیں ہوئی

کام آ سکتے باز آ گئے لیکن مجھے اپنے کیمیائی اسلحہ خانے کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنا تھا۔ تکیے کے نیچے اس کی موجودگی کا راز کسی بھی وقت افشا ہو سکتا تھا۔ خلاف توقع شیٹ بدلتے وقت سیمسن کی دن کروٹ بدل کے میں نے بڑی احتیاط سے انجکشن والے بیگ کو قمیص اور پتلون کے نیچے اپنے پیٹ سے لگا کے دبا لیا۔ ان شیشیوں کو چھپانا البتہ مسئلہ تھا۔ کمبل کے نیچے ہی میں نے انہیں اپنی پتلون کی دو جیبوں میں منتقل کرنا چاہا لیکن تنگ پتلون کی جیب میں ایسی گنجائش نہ تھی۔ میرے اٹھتے ہی جیب میں شیشی کی موجودگی خود اپنا راز فاش کر دیتی۔

میں نے بستر ہی کو بہتر سمجھا کہ تینوں شیشیاں تکیے کے نیچے چھوڑ دوں اور اس طرح دشمن کو موقع دوں کہ وہ میرے پوشیدہ وسائل کا سراغ لگا کے مطمئن ہو جائے۔ یہ سمجھے کہ اس نے اپنی ہوشیاری سے میری چالاکی کا پتہ لگا لیا ہے اور اس کامیابی کے بعد مزید جستجو کی ضرورت ہی محسوس نہ کرے۔ گولیاں زیادہ جگہ نہیں گھیرتیں اور شیشی تقریباً بھری ہوئی تھی۔ ان میں سے چند گولیاں نکالی جا سکتی تھیں اور جیب میں بھی چھپائی جا سکتی تھیں۔

ابھی میں اٹھ کے بیٹھا ہی تھا کہ سیمسن کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ یکلخت جارحانہ اور خطرناک ہو گئے۔ وہ مجھے اس خونی آدم خور درندے کی طرح نظر آیا جو اپنے شکار پر جست لگانے ہی والا ہو۔ اس کی آنکھوں کی حیوانی چمک میں وہی سفاکی تھی جس میں اس کی بیماری بستی تھی۔ میں دوستانہ انداز میں اس کو دیکھ کے مسکرایا اور ہاتھ کے اشارے سے واضح کیا کہ مجھے صرف باتھ روم تک جانا ہے۔

میری ٹانگ میں درد بہت کم تھا اور دائیں ہاتھ کی تکلیف میں بھی افاقہ محسوس ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ بے حس کرنے والی دوا کا اثر تھا یا پھر مجھے علاج سے فائدہ ہو رہا تھا۔ تاہم معذوری کا تقاضا تھا کہ میں اتنے کا بہانہ چلنے دوں۔ جانے کے ارادے سے ہمت کر کے میں نے بستر سے نیچے قدم رکھا اور بیساکھی اٹھائی۔ اندر سے کھڑکی بجنے کی آواز کے ساتھ ہی وہ نرس اندر آ گئی جس کے بارے میں اب مجھے کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی۔ وہ بلاتذبذب میری دوسری ٹانگ پر گولی چلا سکتی تھی اور سیمسن سے مجھے مکمل معذوری قبول نہ تھی۔

"کیا مسٹر؟" اس نے سوالیہ لہجے میں کہا اور ریوالور نکال لیا۔ یہ اصلی ریوالور تھا۔ ۳۰۔ کا تقریباً نیا کولٹ آٹومیٹک۔ اس کی بیلکوں جیسی والی نال کا رخ میری طرف تھا اور نشانہ میری ٹانگ تھی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے بے ضرر مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ذرا باتھ روم تک جانا تھا مجھے۔" اور بیساکھی کا سہارا لے کر آگے بڑھا۔ میری صورت سے سخت تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ جبکہ تکلیف معمولی تھی۔

نرس نے سر ہلا کے مجھے اجازت دی۔ "میں اتنی دیر میں آپ کا بیڈ ٹھیک کر دیتی ہوں۔" جس اطمینان کے ساتھ اس نے میری بات مان لی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرا باتھ روم جانا خطرے کی کوئی بات نہیں اور اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ باتھ روم سے فرار کے راستے مسدود تھے۔ اس میں صرف ایک واش بیسن اور ایک

بدنام ترین مجرم چارلس سوبھراج کے جرائم کی مکمل تفصیل

قیمت ۲۰ روپے

چارلس سوبھراج کی سرگزشت

میں ملاحظہ فرمائیں

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہ راست ہم سے حاصل کریں

کتابیات پبلی کیشنز ◎ پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

www.paksociety.com

ڈبلیو سی تھا۔ باقی دیواریں بالکل سپاٹ اور بے رنگ و روغن تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمرے کے ساتھ باتھ روم کا اضافہ حال ہی میں کیا گیا ہے۔ تقریباً آٹھ فٹ کی بلندی پر دو طرف روشندان تھے لیکن میں واش بیسن پر چڑھ کے وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ واش بیسن تیسری طرف تھا۔ بالفرض محال میں روشندان تک رسائی حاصل کر لیتا تب بھی مجھے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اس میں لوہے کی مضبوط گرل نصب تھی جسے ویلڈنگ ٹارچ سے ہی کاٹا جا سکتا تھا۔

میں بائیں ہاتھ سے منہ دھونے کی کوشش کر رہا تھا کہ باہر سے پیڈرو کے اونچا بولنے اور جواب میں نرس کے کچھ کہنے کا شور سنائی دیا۔ میں نے دروازے کے سوراخ سے آنکھ لگائی تو مجھے پیڈرو کی پشت نظر آئی۔ نرس اس کے سامنے تھی چنانچہ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"کہاں سے آئیں یہ سب چیزیں اس کے پاس؟" پیڈرو ہاتھ بڑھا کے بولا۔ "کیا ہے یہ سب؟"

"مجھے... مجھے نہیں معلوم۔" نرس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

پیڈرو کا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا اور اس کے بائیں رخسار پر آواز کے ساتھ پڑا۔ "تجھے نہیں معلوم اور کسے معلوم ہوگا؟ دروازے پر تو بیٹھی تھی۔ سو گئی تھی کیا؟"

"قسم خدا کی سر۔ وہ جب بھی بستر سے اترا میں نے اندر آنے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں کی۔"

"پھر یقیناً کوئی اندر آ کے اسے یہ دے گیا ہوگا۔" پیڈرو نے غذا کے ہاتھ سامنے کیا جس پر تینوں شیشیاں رکھی تھیں۔

"دروازہ میں باہر سے مقفل رکھتی تھی سر۔" نرس نے کہا۔ آنسو اس کے گالوں پر بہتے رہے۔

"پھر تو یہی راستہ رہ جاتا ہے۔" پیڈرو نے سر اٹھا کے کھڑکی کو دیکھا۔ نرس کے آنسوؤں نے یا لہجے نے پیڈرو کو اس کی سچائی کا قائل کر دیا تھا۔ اس کے لہجے کی درشتی ختم ہو گئی تھی اور اس نے سوال نہیں کیا تھا۔ ایک خیال ظاہر کیا تھا۔

"سیمسن!" اس نے کچھ دیر بعد کہا اور آگے بڑھ کے اشاروں کی زبان میں اس پر واضح کیا کہ ان تینوں شیشیوں میں کیا ہے جو میرے تکیے کے نیچے سے ملی تھیں۔ "یہ زہر ہے۔ بہت خطرناک قسم کا۔" پیڈرو نے زبان سے بھی بات کرنا جاری رکھا کیونکہ وہ خود گونگا نہیں تھا۔ بیشتر لوگ گونگے بہروں سے اشاروں میں بات کرتے ہوئے بھی خاموش نہیں رہ سکتے۔ پیڈرو میری نظروں کے سامنے نہیں تھا چنانچہ میں اس کا ردعمل نہ دیکھ سکا۔

"کہاں سے آیا یہ زہر؟ اُلّو کے پٹھے؟" پیڈرو نے چلا کر کہا۔ "بات سمجھتا ہی نہیں۔"

"اس کھڑکی کے راستے سے آیا تھا کوئی؟" پیڈرو نے انگلی سے ہوا کے ہاتھ چلائے۔ یوں جیسے کوئی رسی کے ذریعے مقام کے اوپر چڑھتا ہے۔ خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ غالباً سیمسن نے یقیناً تکلم کے ساتھ نفی میں سر ہلایا یا اس امکان کو مسترد کر دیا ہوگا۔

"جھوٹ۔" پیڈرو نے دہاڑ کر کہا۔ "تم دونوں میں سے ایک جھوٹ بک رہا ہے۔ کسی نہ کسی نے غفلت برتی ہے۔ یہ کتنا بھیانک غلطی کی ہے تو میں خود دونوں سے سوال کروں گا۔ ہزار طریقے ہیں میرے پاس سچ اگلوانے کے۔"

"سر یہ ضروری تو نہیں کہ اس میں زہر ہی ہو۔" نرس نے خوف زدہ ہو کے کہا۔

"اور کیا فرض کر لوں میں؟" پیڈرو نے چیخ کر کہا۔ "یہ دوا ہو تو دیتی ہے۔ یہ کون سی دوا ہے؟"

ان حالات میں میرے لیے انجکشن کو اپنے پاس رکھنا خطرناک تھا۔ میں نے باتھ روم میں ادھر اُدھر دیکھا لیکن مجھے روشندان کے سوا کوئی جگہ نظر نہ آئی جہاں اس پیکٹ کو چھپایا جا سکتا تھا۔ روشندان تک میرا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا مگر یہ ہو سکتا تھا کہ پیکٹ کو آہستہ سے اوپر اچھال دوں اور پیکٹ اس چھ انچ چوڑی جگہ میں لینڈ کر جائے جو دیوار کی موٹائی کے برابر تھی اور جسے روشندان کی گہرائی بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ تاہم یہ کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی۔ اگر پیڈرو باتھ روم کی تلاشی لیتا تو قدرتی طور پر سب سے پہلے روشندان کے طاقچے پر ہاتھ ڈالتا۔ وقت کم تھا۔ میں نے باتھ روم میں دس منٹ گزار لیے تھے۔ پانچ منٹ بعد کسی کو بھی غیر ضروری تاخیر کا احساس ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی تالے کے سوراخ سے دیکھنے لگتا تو میرے لیے اپنی کارروائی کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا۔ وہ عین وقت پر مجھے جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے پکڑ لیتے۔

روشندان کے علاوہ مجھے ایک ہی جگہ نسبتاً محفوظ نظر آئی۔ ڈبلیو سی کے اوپر لگا ہوا فلش ٹینک۔ میں نے اس کی ٹونٹی کو بند کیا جس سے ٹینک میں پانی جاتا تھا اور فلش چلا دیا۔ ٹینک خالی ہو گیا لیکن دوبارہ نہیں بھرا۔ پھر میں نے پیکٹ کو بڑی احتیاط سے نکالا اور فلش ٹینک کا ڈھکنا ہٹا کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ ٹینک کی سطح نم تھی مگر اس نمی سے گتے کی ڈبیا کے گل جانے کا کوئی احتمال نہ تھا۔ کوئی آواز کیے بغیر میں نے ڈھکنا واپس فٹ کیا اور اگرچہ مجھے سو فیصد اطمینان حاصل نہ تھا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہوں لیکن نصف اطمینان کا یہ احساس بھی بہت غنیمت تھا۔ ابھی میں ٹونٹی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی نے دھڑ سے دروازے پر لات ماری۔

"کیا ہو رہا ہے اندر؟" پیڈرو نے مجھے گالی دے کر کہا۔ "یہ باتھ روم ہے یا آرام کرنے کی جگہ؟"

قدرتی طور پر اس خیال نے مجھے مایوس کر دیا کہ شاید میرا مشن ناکام ہو گیا ہے۔ لات مارنے سے پہلے پیڈرو نے جھانکا ہوگا تو سب دیکھ لیا ہوگا۔ میں نے کنڈی کھولی اور باہر آ گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے قمیص کے دامن سے منہ صاف کر کے کہا۔ "اتنی جلدی کس بات کی ہے؟ تمہیں فکر تھی کہ میں لات مار کے دیوار سے راستہ نہ بنا لوں۔ میری لات تو ویسے ہی ٹوٹی ہوئی ہے اور میں سیمسن بھی نہیں ہوں۔"

"تمہیں فضول بھونکنے کی بہت عادت ہے۔" پیڈرو نے کہا جو میری بیساکھی اور میرے ہاتھ کی پہنچ سے خاصے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ؟" میں نے اس کی ہتھیلی کو غور سے دیکھا۔ "مجھے تو تین شیشیاں نظر آ رہی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ ان میں زہر ہے۔ تمہارے پاس کیسے آئیں یہ شیشیاں؟" پیڈرو دھاڑا۔

"میرے پاس؟" میں نے حیرانی سے کہا اور بیڈ کی طرف بڑھا۔ "شیشیاں تمہارے پاس ہیں پیڈرو۔"

"لیکن مجھے تمہارے تکیے کے نیچے سے ملی ہیں۔" وہ چیخ کر بولا۔

"میں نے کبھی تکیے کے نیچے جھانک کر نہیں دیکھا۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ورنہ اب تک یہ زہر تم سب کو دے چکا ہوتا۔ ایسا تم خود کہو تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ کون سا زہر ہے؟"

مجھے جواب دینے کے بجائے پیڈرو غصے میں پھنکارتا ہوا پلٹا اور دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ میں نے باہر سے دروازے کے قفل میں چابی گھمانے کی آواز سنی۔ "اب ہم تینوں قیدی ہیں۔ ایک ہی کشتی کے ڈوبنے والے مسافر۔" میں نے نرس اور سیمسن کی طرف دیکھ کے کہا۔ سیمسن نے بات سنی نہ سمجھی چنانچہ وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

"تم خود تو مرو گے ہی، ہم سب کو بھی ساتھ مرواؤ گے۔" نرس نے مجھے شعلہ بار نظروں سے گھورا۔

"سب مرنے والوں کی یہی کوشش ہوتی ہے۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا۔ "کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔"

"اور اس سے پہلے میں تمہیں گولی مار دوں تو؟" نرس کو میرے الفاظ نے مزید مشتعل کیا۔

"تم کیا چیز ہو؟ مجھے پیڈرو تک گولی نہیں مار سکتا۔" میں نے پلنگ پر لیٹ کے اور ٹانگ پھیلا کے کہا۔ "کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ! ہاتھ میں ریوالور آ جانے کا مطلب یہ نہیں کہ تم اسے چلانے کا اختیار بھی رکھتی ہو۔ تم نے صرف نرس کا یہ لباس پہن لیا ہے ورنہ تم پیسے کے عوض بک جانے والی ایک بدکردار اور بے ضمیر عورت ہو۔ تم بے گناہوں کے خون پر پلنے والی جونک ہو۔"

"بکواس مت کرو۔" نرس نے چیخ کر کہا اور لپک کے تکیے میں سے ریوالور نکال لیا۔ اس کا اشتعال قوت برداشت سے بڑھ گیا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس کے ہسٹریائی لہجے سے ہوا اور ایک فطری ردعمل کے طور پر میں پلٹ کر بیڈ کے دوسرے کنارے سے نیچے گر گیا۔ گولی جو میرے سینے یا پیٹ اور کمر میں کسی جگہ پیوست ہو سکتی تھی خالی بستر پر لگی اور سفید چادر پر ایک سوراخ چھوڑ کے فرش سے ٹکرائی۔ سوراخ کے جلے ہوئے کنارے سے دھواں اٹھا اور کمرے میں بارود کی بو پھیل گئی۔ کمرہ بند ہونے کے باوجود دھماکا پیڈرو نے بھی سنا جو شاید واپس آ رہا تھا۔ اس نے باہر سے قفل کھولا اور بگولے کی طرح اندر آیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" وہ نرس کی طرف دیکھ کر چلایا جو اب مجرم بنی کھڑی تھی۔ مغلوب کر کے عقل و ہوش سے بیگانہ کر دینے والا قاتل لمحہ گزر گیا تھا جس کے بعد ندامت اور خوف کا لمحہ تھا جو پوچھتا تھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور کیا تم کو عقل نہیں تھی کہ ہر ضابطے، حکم یا قانون کو توڑنے کی سزا ہے۔ شاید ہر قتل کے بعد یہ لمحہ ضرور آتا ہے۔ عمل کے بعد ردعمل اور مکافات عمل۔

"کہاں ہے وہ؟" پیڈرو نے میرے نام کی جگہ ایک غلیظ گالی استعمال کی۔ "سیمسن!"

صورت حالات کو محفوظ پا کے میں فرش سے اٹھا۔ "خدا کا شکر ہے کہ میں ابھی تک اسی قید حیات میں ہوں اور تمہاری جیل میں بھی۔ ورنہ اس عورت نے تو مجھے دونوں سے آزاد کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ حکم عدولی کی سزا کیا ہے تمہارے ضابطۂ فوجداری میں؟" میں نے چادر کے زخم کو ہاتھ سے جھاڑا۔ "یہ نقصان الگ ہوا۔"

"گولی کیوں چلائی تھی؟" پیڈرو نے پھر نرس پر گرجنا شروع کیا۔ "دماغ چل گیا تھا...؟"

"اس نے... اس نے مجھے گالیاں دی تھیں۔" نرس نے اس انتہائی اقدام کا ایک فضول سا جواز پیش کیا۔ خوف اور ہسٹریائی کیفیت میں اس کا ذہن کوئی بہتر وجہ سوچنے سے قاصر تھا۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔

پیڈرو نے اسے نصف درجن ایسی گالیاں دیں کہ مجھے شرم آ گئی۔ "اور جواب میں گالیاں دینے کے بجائے تو نے گولی چلا دی؟ اس لیے کہ تو بہت عزت دار اور غیرت مند ہے؟" اس نے مزید مغلظات بکنے کے بعد اچانک اپنا ہاتھ سامنے کیا۔ تب پہلی بار میں نے اس

www.paksociety.com

بات پر غور کیا کہ اب تک وہ دونوں ہاتھ پیچھے باندھے اور دونوں پاؤں پھیلائے مضبوطی سے زمین پر قدم جمائے اور بالکل دلہن کا پوز بنائے کیوں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ہنٹر تھا جس کا ایک سرا نسبتاً موٹا اور خنجر کے دستے کی طرح تھا۔ سانپ کی طرح لہرانے والا چابک جیسا حصہ چمڑے کی پتلی پتلی لیکن مضبوط ڈوریوں سے ایسے بنایا گیا تھا جیسے چوٹی گوندھتی ہیں۔ اس نے جبر و استبداد و حاکمیت اور قوت کے پیکر کا روپ دھار کے ہنٹر کو ایک بار ہوا میں شائیں سے لہرایا اور اس فوراً ہی ماحول سے خوف کی فضا کو گھمبیر کر دیا۔ نرس کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا اور وہ کانپنے لگی۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے بے ربط الفاظ میں ایک بار پھر پیڈرو کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس سے اپنے فرض میں کوتاہی بالکل نہیں ہوئی۔ وہ کرسچین تھی چنانچہ اس نے انگلی کے اشارے سے سینے پر صلیب بنانے کی غیر ارادی حرکت کی اور حضرت یسوع مسیح کی قسم کھا کے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھے گی اور گولی چلانے سے گریز کرے گی۔ مگر ہونٹوں پر ایک انتقامی اور شیطانی قسم کی سفاک مسکراہٹ سجائے پیڈرو قدم بقدم اس کی طرف بڑھتا گیا۔ وہ پیچھے ہٹتی گئی اور میں سانس روکے دیکھتا رہا کہ کیا واقعی اس جرم کی پاداش میں جرائم پیشہ ایک عورت کی کھال اُدھیڑ دے گا۔

نرس دیوار سے جا لگی۔ دیوار نہ ہوتی تب بھی اس کے لیے فرار ناممکن تھا۔ اچانک پیڈرو نے سیمسن کو اشارہ کیا جو نرس کے بہت قریب تھا اور اس نے نرس کو یوں پکڑ لیا جیسے شکاری اپنے پنجوں میں چڑیا کو دبوچ لے۔ پیڈرو کا ہاتھ گھوما اور نرس نے ایک دلخراش چیخ ماری۔ ضرب کی اذیت میں نے محسوس کی۔ مجھے یوں لگا جیسے ہنٹر کے شعلے کی آتشیں زبان میرے جسم پر سلگتی ہوئی لکیریں کھینچتی گئی ہے۔

"ٹھہرو، سوریا!" میں نے پیڈرو کو مخاطب کرتے ہوئے ہاتھ اٹھایا۔ "اس عورت کا کوئی قصور نہیں۔"

"تم کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔" پیڈرو سر گھما کے بولا لیکن اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔

"دراصل میں نے ڈاکٹر کے بیگ سے چوری کیا تھا۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اپنی غلطی کی سزا اس عورت کو کیوں دیتے ہو۔ کیا تمہیں خوش فہمی ہے کہ تم سزا سے بالاتر ہو۔ سزا تو ایک دن تمہارے آقا اور ان کے آقا چوہدری دلاور کو بھی ملے گی مگر وہ دن ابھی نہیں آیا۔ دلاور شاہ ابھی آئے۔ اگر وہ آیا تو میں اس کو بتا دوں گا کہ تم اس اعتماد کے مستحق نہیں ہو جو تمہیں حاصل ہے کیونکہ تم احمق ہو۔ احمق وہ ڈاکٹر بھی تھا جس نے میرے قریب آنے کی غلطی کی تھی مگر کیا یہ

تمہارا کام نہیں تھا کہ ڈاکٹر کی حفاظت کرتے۔ تم جانتے تھے کہ ڈاکٹر اپنا دفاع نہیں کر سکتا اور تمہاری کوتاہی کا انجام یہ ہوا کہ ڈاکٹر اپنی جان سے گیا۔ دلاور نے ابھی تک یہ نہیں سوچا ہے کہ تمہارا سکیورٹی کا انتظام ناقص تھا۔ تم ریوالور اٹھائے کھڑے رہتے تو میں ڈاکٹر پر ہاتھ کیسے اٹھاتا۔ دوسری غلطی تم نے بعد میں کی جب تم ڈاکٹر کی لاش کی تلاشی لینے کی کاوش سے زیادہ بے حرمت کرانے میں مصروف تھے اور اپنے نامۂ اعمال میں وہ گناہ بھی لکھوا رہے تھے جو شاید ابلیس کے لیے بھی باعث شرم ہوتا۔ تو ڈاکٹر کا بیگ میری دسترس میں تھا۔ تم کو معلوم تھا کہ اس میں کس قسم کے زہر بھی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں اب کیا کسی آتشیں اسلحے سے کم خطرناک تھا؟ اس کی جگہ ریوالور ہوتا تو تم فوراً اٹھا لیتے۔ یہ کس کی غلطی تھی؟" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے سب گولیاں نکال لیں۔ "یہ دیکھو۔"

پیڈرو کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے متغیر ہوا۔ "تم بکتے ہو۔"

"اچھا اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ خالی ہیں تو کھا لو۔" میں نے ہتھیلی پھیلا کے کہا۔ لیکن پیڈرو نے آگے بڑھ کر مجھ سے وہ گولیاں چھیننے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے سیمسن کو اشارہ کیا۔

"اس کی تلاشی لینی ہے سیمسن!" وہ ریوالور نکال کے بولا اور اسے سمجھایا کہ وہ مجھے قابو میں رکھے۔ سیمسن نے میرے پیچھے آکے اپنے دونوں ہاتھ میری بغلوں میں دیے اور گردن کو آگے جھکا کے انگلیاں یوں کس لیں کہ میں بے بس ہو گیا۔ میں نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی ورنہ میں ایک جھٹکے سے سیمسن کے شانوں کو بے کار کر دیتا، کلائی کے جوڑ الگ کر دیتا یا قریب آنے سے پہلے اس کو لپیٹ کر جتا دیتا کہ پیڈرو کے لیے گولی چلانا ناممکن ہو جاتا مگر میں اپنے سچ کا ثبوت فراہم کرنا چاہتا تھا۔ وہ عورت میرے نقطۂ نظر سے مجرم تھی اور اگر ممکن ہوتا تو میں خود اسے قانون کے حوالے کر دیتا۔ سخت ترین سزا کے لیے۔ اگر یہی لوگ اسے مار دیتے جن کے ہاتھوں کا وہ کھلونا تھی تو مجھے اس کی موت کا قطعی افسوس نہ ہوتا لیکن میرے سامنے اس پر جو بہیمانہ ظلم ہو رہا تھا وہ ایک ناکردہ گناہ کا خمیازہ تھا۔ یہ بات صرف میں جانتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ انصاف کے تقاضوں کے برعکس ہے۔ ہر مجرم کو اپنے جرائم کی سزا ملنی ہے جو اس پر ثابت ہوں۔

نرس ڈرتے ڈرتے میرے ہاتھ پر سے گولیاں اٹھانے بڑھی۔ اس کے لیے آگے کنواں پیچھے خندق والا مسئلہ تھا۔ ایک طرف پیڈرو ریوالور اور ہنٹر لیے کھڑا تھا تو دوسری طرف میں تھا جس کے متعلق وہ جانتی تھی کہ خالی ہاتھ اور بے بس نظر آنے کے باوجود خطرناک ہوں۔ ایک طرف یہ اندیشہ ہے کہ میرا ہاتھ اس کی نازک سی گردن دبوچ

بھی شاخ گل کی طرح نہ توڑ دے تو دوسری جانب یہ ڈر کہ اس کشمکش میں چلنے والی گولی اسی کو نشانہ نہ بنا لے مگر وہ مجبور تھی۔

"ڈرو نہیں۔" میں نے سرنگوں ہونے کے باوجود مسکرا کے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" نرس نے گولیاں چن لیں اور پیڈرو کی طرف بڑھی لیکن اس نے مکمل تلاشی کا حکم دیا۔ نرس نے ہر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میرا یقین ہے کہ اس کے بعد اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہو گئی تھی۔ جامہ تلاشی کے بعد میرے پلنگ کو اچھی طرح جھاڑ کر یہاں تک کہ تکیے کے اندر سے بھی پوشیدہ چیز برآمد کرنے کی کوشش کی گئی اور میں نے دشمنوں کے اطمینان کی خاطر اس کارروائی کی تکمیل میں عدم تعاون کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔

میرا یہ اعتراف شکست اپنی اس کامیابی کو صیغہ راز رکھنے کے مترادف تھا جو میں نے ایک آلۂ قتل کو فلش ٹینک میں چھپا کے حاصل کی تھی اور یہ آلۂ قتل ایک معمولی سی سرنج تھا جس کے متعلق میں یہ سمجھ رہا تھا کہ اس میں کون سا ہلاکت خیز محلول ہے۔ جب سیمسن نے مجھے رہا کیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

مگر خلاف توقع پیڈرو نے نرس کو میرا خیال رکھنے کا حکم دیا اور خود باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ میری کامیابی مشکوک ہو گئی۔ میری نگاہ نے دہلاتے ہوئے پیڈرو کا تعاقب کیا جو باتھ روم سے نشانی دیکھ رہا تھا۔ اگر پیڈرو فلش ٹینک کا ڈھکنا اٹھا کے دیکھتا تو فوراً معلوم ہو جاتا مگر اس کا دھیان اُدھر گیا ہی نہیں۔ فلش ٹونٹی کو ہاتھ سے گھما کر دیکھے بغیر اسے معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ ٹونٹی کھلی ہوئی ہے یا بند ہے۔ اس نے فرض کر لیا ہو گا کہ ٹونٹی کھلی ہوئی ہے چنانچہ فلش ٹینک پانی سے بھرا ہوا ہے اور اس میں کوئی چیز نہیں ڈالی جا سکتی۔ اس نے روشندان کے اوپر ضرور دیکھا ہو گا کیونکہ ایڈجسٹمنٹ کے بعد وہ ہاتھ سے گرد جھاڑتا نمودار ہوا۔ اس نے نرس کے ہاتھ سے گولیاں لے کر انہیں غور سے دیکھا۔ محتاط انداز میں سونگھا اور جیب میں ڈال لیا۔

"تمہیں معلوم ہے یہ کیا تھا؟" میں نے سخت کرب اور تکلیف کے احساس کو ظاہر کرنے کے لیے کراہ کر کہا۔ "نام تو اس کا بہت مشکل ہے۔ ٹرائی نائٹرو ڈائی آرسینک کلورائڈ پوٹاشیم سائنائڈ۔" میں نے سائنس اور کیمیائی مرکبات کے ناموں کو ملا جلا کر پیڈرو کو صرف دو الفاظ سمجھ میں آسکے۔ آرسینک یعنی سنکھیا اور سائنائڈ۔ اور اگر قاتل ہو جاتے تو اسے اندازہ ہو کر دو قاتل زہر مل کے کس حد تک جان لیوا ہو سکتے ہیں۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ کیا ہے؟" مجھے گھورنے کے بعد بولا۔ "شیشی پر ایک لیبل تھا جو میں نے پھاڑ کے ہٹا دیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "تمہیں یا اس زہر کے خواص کا علم ہے۔ سائنائڈ تو انتہائی مہلک ہے تاکہ آدمی نے پھانکا اور ختم ہوا۔ یہ سائنائڈ کا باپ ہے۔ چھونے سے جسم میں سرایت کر جاتا ہے۔ اب ہم تینوں نے بارہ گولیوں کو کم سے کم بارہ سیکنڈ تک تو ہتھیلی پر رکھا ہے۔ اس کی خاصی مقدار ہمارے خون میں شامل ہو چکی ہے۔ اس کی علامات آہستہ آہستہ ظاہر ہوں گی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہمارا اعصابی سسٹم متاثر ہو گا۔ سارا جسم کانپنے لگے گا۔ رعشے کے مریض کی طرح اور اس کے بعد کسی چیز پر ہمارا اختیار نہیں رہے گا۔ تم ہم اپنی مرضی سے ہاتھ ہلا سکیں گے نہ پیر۔ نظام اخراج اور اعصابی نظام پر ہمارا کنٹرول نہیں رہے گا۔ تم نے کبھی رعشے کے مریض کو مرتے دیکھا ہے کبھی؟"

"بکواس مت کرو۔ تم کہاں کے ڈاکٹر ہو؟ یہ سب کیسے جانتے ہو؟" پیڈرو نے اپنا اعتماد بحال رکھتے ہوئے کہا مگر نرس نے بار بار ہتھیلی کو دیکھا اور اپنی یونیفارم سے رگڑ کے صاف کیا۔

"میں نے جرائم پر مبنی کئی ناولوں میں پڑھا تھا۔" میں نے کہا۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اس کا پتا نہیں چلتا؟"

"نہیں!" نرس نے ایک چیخ ماری اور باتھ روم کی طرف دوڑی۔ "نہیں... میں مرنا نہیں چاہتی!" اس کے اعصاب پہلے ہی جواب دے چکے تھے۔ یہ دہشت زدہ کرنے والا جھوٹ اس کو بڑا بھیانک سچ نظر آیا۔ اس نے واویلا مچانا شروع کیا "میں ابھی نہیں مروں گی۔ ہولی فادر! مجھے موت سے بچا! میں بہت گنہگار ہوں۔ مجھے شیطان سے بچا!" واش بیسن میں بہنے والے پانی کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زہر آلود ہاتھ کو رگڑ رگڑ کے دھو رہی ہے۔

"بے کار ہے۔" میں نے باتھ روم کی طرف دیکھ کر ہمدردی سے کہا۔ "جو نقصان ہونا تھا ہو چکا۔ اب سوائے بہادری سے موت کا انتظار کرنے کے اور ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"جھوٹ بولتے ہو تم!" پیڈرو چلایا۔ نرس کے ترددِ کی ایک ڈائن نے اسے بھی پریشان کر دیا تھا۔

"ایک نرس تم سے زیادہ معلومات رکھتی ہے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ وہ ڈاکٹروں کے ساتھ رہتی ہے۔ اسپتالوں میں ہر قسم کے کیس آتے ہیں اور یہ بات مجھے معلوم ہے تو اس کو کیسے معلوم نہ ہو گی۔" نرس اب بھی پاگلوں کی طرح چلا رہی تھی۔

"میری ماں مر جائے گی۔ میرے بچے... تم سب کو مار ڈالے گا۔ ڈرٹی ڈاگ! اس نے مجھ پر چڑھ کیا تھا؟" وہ باہر آکے پیڈرو پر حملہ آور ہوئی۔ پیڈرو نے ایک ہاتھ پر روکا اور پوری

www.paksociety.com

قوت سے اٹھا کے دیوار پر دے مارا۔ وہ کسی لاش کی طرح لڑھکتی اور فرش پر گر کے بے حس و حرکت ہو گئی۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ پیڈرو کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ نرس کا ہاتھ تھام کے اس نے نبض دیکھی اور اطمینان کا سانس لے کر سیمسن کی طرف دیکھا۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے سیمسن کو میری طرف سے غافل نہ ہونے کی ہدایت دی اور یہ سمجھایا کہ نرس زندہ ہے۔ "ڈاکٹر کو بلاتا ہوں ابھی۔" اس نے مجھے سنانے کے لیے کہا اور جھک کر نرس کو اٹھا لیا۔ اسے کندھے پر ڈال کے پیڈرو نے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا اور پھر باہر سے مقفل کیا۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ایک بات جو میں نے قطعی غیر سنجیدگی سے کوئی مقصد سامنے رکھے بغیر کہی تھی اس کے حیرت انگیز نتائج ظاہر ہو رہے تھے۔ میں اس مختصر وقفے سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا تھا جس میں میرا محافظ و نگران صرف ایک گوریلا رہ گیا تھا۔ جو عقل و فہم میں کسی بچے سے بھی کم تھا حالانکہ اس کا وجود مجھ پر بھاری پڑتا تھا۔ اس کے خلاف صرف عقل استعمال کی جا سکتی تھی۔ وہ اپنے مالکوں کے اشارے پر چلتا تھا۔ حیوان کیا ہے۔ اسے پیڈرو اپنے تابع بھی کر سکتا ہے تو میں کیوں نہیں کر سکتا۔ وہ صرف عمل کرتا ہے۔ نتائج اور انجام کے بارے میں سوچنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔

"سیمسن!" میں نے ہاتھ اٹھا کے چٹکی بجائی۔ وہ حرکت پر میری طرف متوجہ ہوا۔

"تم نے دیکھا؟" میں نے ہاتھ کے اشارے سے پھر سمجھایا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے ابھی نرس کو مارا ہے۔ وہ مر گئی ہے۔" مرے ہوئے آدمی کی اداکاری میں نے یوں کی کہ آنکھیں ساکت کر کے گردن ڈھلکا کے اور ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کے اپنا سانس روک لیا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے سیمسن کی آنکھوں میں خوف و ہراس نظر آیا۔

"ابھی وہ واپس آئے گا۔" میں نے دروازے کے دوبارہ کھلنے اور پیڈرو کے اندر آنے کا تاثر دیا۔ "اس کے ہاتھ میں وہی ہو گا۔" میں نے ہوا میں ہاتھ لہرا کے خنجر کا مفہوم واضح کیا۔ "اور اب تمہاری باری ہے۔" میں نے انگلی سے اس کے سینے کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ تم کو اتنا مارے گا۔ اتنا مارے گا۔"

سیمسن میری بات سمجھ رہا تھا اور بڑے انہماک کے ساتھ سمجھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ میں اگلے منظر کا بیان کروں جو اس کی آنکھیں ابھی ابھی دیکھ چکی تھیں۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ نرس تو بڑی چلبلی عورت تھی جس کی لاش کو پیڈرو اٹھا کے لے گیا۔ جلد وہ اس کی لاش کو پیڈرو دیکھنے سے جانے گا۔ وہ کچھ کنفیوز بھی ہو رہا تھا۔ اشاروں کی زبان میں پیڈرو نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ نرس زندہ ہے۔ میں نے اس کے برعکس بات کہی تھی اور وہ پریشان تھا کہ کس پر یقین کرے اور کس پر نہ کرے۔ اس نے دیکھا تھا کہ پیڈرو نے نرس کے ایک انجکشن لگایا تھا پھر وہ پاگلوں کی طرح غسل خانے میں گئی تھی اور نکلی تھی تو پیڈرو پر پلٹی تھی۔ اس کے بعد سیمسن نے سنا کچھ نہیں تھا۔ واقعات کی ایک فلم دیکھی تھی۔ اس کا انجام کیا تھا؟ جو بڑے ڈاکٹر کا ہوا تھا؟ اور اس سے پہلے نہ جانے کتنے لوگوں کا ہو چکا تھا۔ سیمسن نے دیکھا تھا کہ وہ کس طرح مارے گئے تھے۔ اسے اپنی سزا بھی یاد تھی۔ کیا اب اس کا بھی وہی حشر ہوگا۔ مالک اس پر سخت ناراض تھا۔ اس کی ناراضگی بڑی چیز ہے۔

میں نے اسے ساکت و صامت کھڑا دیکھ کر ایک جست لگائی۔

میرا بایاں پیر پہلے زمین پر پڑا۔ دوسرا پاؤں زمین پر رکھتے ہی درد کی ٹیس اٹھی۔ میں لڑکھڑایا تو جسم کے بوجھ کو پنجوں پر سنبھال کے میں نے ایک اور چھلانگ لگائی۔ مجروح پیر پر میرا وزن چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں رہا اور میں نے کمرے کا آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کر لیا۔ صرف ایک بار سر گھما کے میں نے تیسری کوشش کی۔ سیمسن کو ہوش آ گیا تھا اور وہ میرے تعاقب میں آ رہا تھا لیکن وہ بیڈ کے دوسرے کنارے پر تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میں ہار گیا ہوں۔ میں نے جسم کی باقی ماندہ قوت کو مجتمع کیا۔ جان ہتھیلی پہ رکھ کے بھاگی لگائی ہے تو باقی نہیں ہے۔ میں نے خود کو یاد دلایا۔ ورنہ یہ درندہ مجھے دبوچ لے گا اور میری ہڈیاں سلامت نہیں چھوڑے گا۔ باتھ روم کا کھلا دروازہ میرے سامنے آ گیا تھا۔ صرف ایک اور کوشش۔ ایک اور ایسی ہی بھرپور جدوجہد۔ میں نے ہانپتے ہانپتے ایک گہرا سانس لیا۔ اور پھر دائیں پیر کا سہارا لے کر آخری چھلانگ لگائی۔ میں دروازے سے اندر جا کر گرا۔ سیمسن مجھے چند قدم دور نظر آیا۔ ایک بپھرا ہوا حیوان۔ میں نے لات مار کے دروازہ بند کیا اور اسی لمحے پر اٹھ کے اندر سے لاک کر دیا۔ سیمسن کسی بیل کی طرح دروازے سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں۔

مہلت بہت کم تھی۔ میں نے اس حیوان کو اسی طرح مشتعل کر دیا تھا جس طرح ایک بل فائٹر کپڑا لہرا کے خونخوار سانڈ کو مقابلے کے لیے اکساتا ہے لیکن بل فائٹر اپنی پھرتی اور ذہانت سے کام لیتا ہے اور بالآخر سانڈ کی گردن توڑ دیتا ہے۔ وقت ضائع کیے بغیر میں اٹھا اور پھسل کے گرا۔ سیمسن نے دروازے پر زیادہ قوت سے ٹکر ماری اور دھماکا غسل خانے سے کمرے میں گونجا۔ مجھے یوں لگا جیسے دروازے کے ساتھ باتھ روم کی دیواریں تک ہل گئی ہوں۔

شاید اس ضرب سے دروازے کے قبضے نکل جائیں گے یا چٹخنی ٹوٹ کے گر جائے گی۔ کسی جانور کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں پر خود کو گھسیٹتا ہوا میں اس فلش ٹینک تک پہنچا جس میں میرا پوشیدہ ہتھیار موجود تھا۔

سیمسن نے تیسری بار ٹکر ماری اور دروازہ لڑکھڑایا۔ اگر پیڈرو دھماکے سن کے آ پہنچا تو میرا مشن ناکامی کے عبرتناک انجام میں بدل جائے گا۔ وہ سیمسن کو روک دے گا اور ریوالور سے فائر کر کے ڈور کی کل اڑا دے گا۔ میں نے فلش کا ڈھکنا اٹھا کے نیچے پھینکا۔ چینی کا ڈھکنا ایک آواز کے ساتھ سیمنٹ کے فرش پر گرا اور بکھر گیا۔ میرے ہاتھوں نے پلک جھپکتے ہی اندر سے ڈبیا نکال لی۔ سرنج کو اپنے ہاتھ میں تھام کے میں تیزی سے پلٹا۔ اس کی قاتل سوئی کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ آخری مرحلہ اسے انتہائی احتیاط کے ساتھ صحیح وقت پر اور موثر طور پر استعمال کرنے کا تھا۔ سیکنڈ کے ایک حصے کے فرق سے دروازے کا پٹ اندر کی جانب گرا اور سیمسن اپنی ہی جسامت کے باعث اپنے ہی زور میں اندر آیا۔ میری بائیں ٹانگ آگے بڑھی اور سیمسن منہ کے بل گرا۔ اس کے حلق سے "آہ" جیسی آواز نکلی اور اس کے دونوں سرے جیسے بازو اوپر اٹھ گئے۔ پھر وہ دروازے کے پٹ پر گرا۔ میں گھات میں بیٹھے ہوئے شکاری کی طرح لپکا اور اگلے لمحے انجکشن کی سوئی پشت کی جانب سیمسن کی کمر سے ذرا نیچے گوشت میں اتر گئی۔ وہ چبھن کو اس نے محسوس بھی نہ کر سکا کہ گرنے سے اس کے سر پر چوٹ آئی تھی جس نے وقتی طور پر اسے چکرا دیا تھا۔

سرنج کی دوا اس انسان نما حیوان کے جسم میں اتر گئی جس کی زندگی خود اس کے لیے بے مصرف تھی۔ اس کا مصرف دوسروں کے لیے یہی تھا کہ ایک حیوانی قوت سے کمزور انسانوں کو زیر کیا جائے اور ضرورت محسوس ہو تو انہیں ڈاکٹر کی طرح توڑ پھوڑ کے ختم کرنے تک استعمال کیا جائے۔ اس کا مرنا جینا اپنی مرضی پر منحصر نہیں تھا اور جو لوگ اس کی زندگی پر اختیار رکھتے تھے اسے ایک ہلاکت خیز قوت کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ وہ انسان نہیں، انسانوں کی زندگی ختم کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ پستول اور بندوق، ٹینک اور بم کی طرح جو خود خطرناک نہیں ہوتے۔ ان کو استعمال کرنے والے اور استعمال کرنے والوں کے عزائم خطرناک ہوتے ہیں۔ سیمسن اگر زندہ رہتا تو لاعلاج کتنے انسانوں کو مار دیتا۔ اس خونی درندے کو ختم کر دینا کسی آدم خور شیر کو مار دینے کے مترادف تھا۔

میرا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ اگر انجکشن میں زہر نہ ہوا صرف بی کمپلیکس ہوا لیکن بی کمپلیکس کی مخصوص بو ہوتی ہے۔ میں نے انجکشن کی سرنج کو سونگھا اور فلش میں پھینک دیا۔ اس کا شیشہ چھن سے ٹوٹ کے فلش کے پانی میں گر گیا۔ دیو ہیکل سیمسن نے اٹھنا چاہا تھا لیکن ناکام رہا تھا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی آوازیں بھیانک خرخراہٹ میں بدل گئیں۔ اسی وقت پیڈرو اندر آیا۔ میں نے دروازے کا قفل کھلنے کی آواز سنی نہیں تھی لیکن اس نے باتھ روم کے اندر کا منظر فوراً دیکھ لیا تھا۔

"سیمسن!" وہ چلایا اور ریوالور نکال کے دوڑا۔ "کیا ہوا ہے سیمسن کو؟" وہ جانتا تھا کہ سیمسن کے کان نہیں ہیں چنانچہ اسے پکارنے کے باوجود سوال پیڈرو نے مجھ سے ہی کیا تھا۔ سیمسن کا جسم بڑے عجیب اور بھیانک کرب میں مبتلا تھا۔ وہ پلٹ رہا تھا اور اینٹھ رہا تھا۔ پیڈرو اس کے پاس پہنچ کے جھکا۔ اسی وقت سیمسن کے جسم نے آخری جھٹکا لیا اور ساکت ہو گیا۔ اس کی کھلی آنکھیں باتھ روم کی چھت پر مرتکز ہو گئیں۔ اگر میرے پاس کچھ ہوتا تو میں ایک لمحے کی اس مہلت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا جب حیرت، خوف اور غصے نے پیڈرو کو مفلوج کر دیا تھا لیکن میرے پاس صرف فلش ٹینک کے ڈھکنے کے ٹکڑے تھے۔ بے اختیار میں نے ایک بڑا ٹکڑا اٹھایا اور پیڈرو پر جا پڑا جس نے ریوالور کا دستہ میرے سر پر مارنے کے لیے جست لگائی تھی۔ موٹے پورسلین کے ٹکڑے نے تیشے کا کام کیا۔ ہم بیک وقت ٹکرائے تھے۔ خطرہ محسوس کرتے ہی پیڈرو نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔ دھماکا دو بار ہوا مگر گولی نہ جانے کدھر گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا کے گرے۔ پھر میرے ہاتھ سے نکلا ہوا وہ ٹکڑا پیڈرو کے ابرو پر لگا جس کے کنارے آری کی طرح تیز تھے۔ اس نے سر جھٹکا اور سنبھلنا چاہا لیکن میں نے بڑی پھرتی سے دوسرا وار کیا۔ پیڈرو ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ میں نے تیسری مرتبہ اپنا ہتھیار استعمال کرنا چاہا لیکن اس کی بیرونی سطح بہت چکنی تھی۔ چینی کی سطح میری انگلیوں میں سے پھسل گئی کیونکہ میرے ہاتھوں میں پسینے کی نمی بھی آ گئی تھی اور میری ہمت بھی جواب دے چکی تھی۔ میں کسی بدمست شرابی کی طرح جھومنے لگا۔ ایک دھندلے سائے کی طرح میں نے پیڈرو کو سلو موشن میں اٹھتے اور ہاتھ اٹھاتے دیکھا۔ پھر ضرب میرے سر پہ لگی اور میں اندھیرے کنوئیں میں گر گیا۔ بالکل پرسکون ہو گیا۔

زندہ رہنے کی تمنا لاشعور میں موجود تھی اور اسی نے بے ہوشی کے وقفے میں احساس کو بیدار کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ یہ تمنا ایک آواز بن کے مجھے جگاتی رہی کہ آخری جدوجہد کے بعد ہمت نہ ہارو۔ اٹھو وقت سے فائدہ اٹھالو اور نکل جاؤ۔ آزادی کی منزل کے راستے تک پہنچ جانے کے بعد واپسی کا کوئی سوال نہیں۔ پل بھر کے لیے گھپ اندھیرے میں روشنی کا ایک ہیولا نور بن کے ابھرا اور اس نے اپنے ہاتھ پھیلائے۔ "اٹھو سکندر! اب نہ اٹھے تو پھر کبھی یہ موقع نہ ملے گا۔ یہ لوگ تمہیں ایک ضرورت کے

www.paksociety.com

تحت زندہ رکھے ہوئے ہیں مگر یہ ضرورت کوئی مجبوری نہیں ہے۔ یہ تمہیں قتل بھی کر سکتے ہیں مگر تم کو زندہ رہنا ہے۔ اپنے لیے، میرے لیے۔

میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ باتھ روم کے فرش پر تین افراد پڑے ہوئے تھے۔ ایک میسن تھا جسے صور اسرافیل پھونکے جانے سے قبل نہیں اٹھنا تھا۔ دوسرا پیڈرو تھا جس کے سر پر میرے ہاتھ کی کوئی ضرب کارگر ثابت ہوئی تھی اور مجھے ڈسنے کے بعد وہ خود بھی لیٹ گیا تھا۔ تیسرا میں تھا جو میسن کی لاش کے اوپر گرا تھا۔ میرا سر اس کے پیٹ پر تھا چنانچہ آنکھیں کھولتے ہی میری نظریں اس کی بے نور نظروں سے ملیں اور میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ میرے ہاتھ اور ٹانگ کے مقابلے میں سر کی چوٹ زیادہ درد کر رہی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری گردن پر میرا سر نہیں کوئی چٹان ہے جس کا بوجھ اٹھانا میرے بس کی بات نہیں۔

دیوار کو ہاتھ سے تھام کر میں آہستہ آہستہ اٹھا۔ واش بیسن کے پاس رک کر میں نے ایک ہاتھ سے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو میری حالت کچھ سنبھلی۔ میں نے دروازے سے خلا کا رخ کیا۔ پھر مجھے پیڈرو کے ریوالور کا خیال آیا اور میں واپس ہوا۔ وہ کسی بھی وقت ہوش میں آ سکتا تھا اور میرا کام تمام کر سکتا تھا۔ میں نے میسن کو مار دیا تھا اور دشمن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ وہ ایک کی جگہ دوسرا ضمیر فروش ڈاکٹر تو لا سکتے تھے مگر دنیا کے بازار میں میسن اتنی آسانی سے دستیاب نہیں ہے۔ میں نے پیڈرو پر بھی واضح کر دیا تھا کہ میری نگرانی میں اس سے کیا کوتاہی سرزد ہوئی اور اسے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ میں دلاور کو اس کی حماقت سے آگاہ کر دوں گا۔

پھر میں نے اس کو دھوکا دے کر ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ اب ہوش میں آتے ہی وہ انتقام لینے کے لیے، سزا دینے کے لیے یا اپنی ذات کے تحفظ کی خاطر مجھے کوئی سوال کیے بغیر گولی مار دے تو عجب نہیں۔ دلاور کے سامنے وہ اس اقدام کو ناگزیر قرار دینے کے لیے وسیع جواز پیش کر سکتا ہے اور اسے مطمئن کر سکتا ہے کہ وہ مجھے قتل نہ کرتا تو میسن کے بعد خود مارا جاتا اور پھر نرس ماری جاتی۔ ان کے زنداں کا راز فاش ہو جاتا اور دلاور تا تو سیدھا پولیس کے جال میں گرفتار ہو جاتا۔ مجھے قتل نہ کرنے کے احکامات بہت واضح تھے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ مجھے سب کو قتل کرنے کا لائسنس مل گیا ہے۔ اپنے دفاع کے لیے قتل کرنے کا حق تو قانون بھی دیتا ہے۔

مجھے یاد آیا کہ دو گولیاں تو پیڈرو نے بھی چلائی تھیں۔ میں نے اس کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کے دیکھا لیکن مجھے صرف ایک چابی ملی جو دروازے سے زیادہ کسی ہتھکڑی کی لگتی تھی۔ میں نے اسے جیب میں ڈال لیا۔

پھر میں نے دوبارہ ادھر ادھر دیکھا مگر ریوالور نہ جانے کہاں تھا۔ پیڈرو کے ہاتھ سے گرتا تو اسی باتھ روم کے فرش پر کہیں ہوتا۔ اگر گرتے گرتے بھی اس نے ریوالور کہیں نہیں چھوڑا تھا تو اس کے نیچے ہی ہوگا۔ میں نے اس کے دائیں ہاتھ کو کھینچا جو اس کے اوندھے ہونے سے جسم کے نیچے آ گیا تھا۔ پیڈرو کراہا اور میں نے دیکھا ریوالور نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے اٹھایا ہی تھا کہ پیڈرو نے آنکھیں کھولیں اور اٹھنے کی کوشش کی۔

"خبردار!" میں نے اس سے دور ہو کے کہا۔ "میں گولی مار دوں گا۔" لیکن ہوش میں آتے ہی پیڈرو نے صورت حال کا اندازہ کر لیا۔ میری دھمکی کی پروا کیے بغیر اس نے پلٹ کر ایک ہاتھ بڑھایا اور میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں نے پیر کو جھٹکا لیکن یہ میرا صحت مند پیر نہیں تھا۔ پیڈرو نے اپنی گرفت اور سخت کر دی۔ ناقابل برداشت درد نے مجھے اپنی بے بسی کا احساس دلایا اور مجھے گرنے سے بچنے کے لیے دیوار کا سہارا لینا پڑا۔ اتنی اذیت برداشت کرنے اور اتنا لڑنے کے بعد اس جنگ کے آخری مرحلے میں جان کی بازی لگا دینے کے بعد ناکامی کا تصور ہی سوہان روح تھا۔ اب میں شکست کسی قیمت پر قبول نہیں کر سکتا تھا۔

"پیڈرو! چھوڑ دو مجھے کتے!" میں نے ہانپتے ہوئے کہا اور تکلیف کے باوجود اپنا پیر چھڑا کے دروازے کی طرف بڑھنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ کمزوری مجھ پر پھر غالب آنے لگی لیکن دوبارہ بے ہوشی کا مطلب تھا موت۔ میں نے ریوالور تان لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ ریوالور میں گولی ہوتی تو پیڈرو کی کھوپڑی کے پار ہو کے نکل جاتی مگر سلنڈر خالی ہو چکا تھا۔ ریوالور میں سے "کلک" کی آواز آئی۔ میں نے پھر کوشش کی اور آخری وقت میں جھک کر ریوالور کا دستہ پیڈرو کے ہاتھ پر مارا۔ پیڈرو کراہا اور میری ٹانگ آزاد ہو گئی۔ میں باہر بھاگا اور گرا۔ میری ٹانگ نے میرا ساتھ نہیں دیا تھا۔ پیڈرو اٹھ کے کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھا اور دوسری نظر سے اس بیساکھی کو جو میرے بیڈ کے ساتھ کھڑی تھی اور مجھ سے دور نہیں تھی۔ بیساکھی ہاتھ میں آتے ہی میں ایک ٹانگ پر اٹھا اور تیزی سے گھوما۔ پیڈرو کسی زخم خوردہ درندے کی طرح مجھے دبوچنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے بیساکھی گھمائی اور اس کے نچلے حصے کو پیڈرو کے سر پر پڑتے دیکھا۔ بیساکھی کا نچلا حصہ ڈنڈے کی طرح گول تھا اور اس پر لوہے کا خول تھا۔ پیڈرو نے اپنا سر پیچھے ہٹا کے بچنا چاہا تھا لیکن اس کا اندازہ غلط ہو گیا۔ بیساکھی اس کے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اگر وہ پوری طرح ہوش میں ہوتا تو اس معمولی ضرب کو جھیل جاتا۔ بیساکھی لگتے ہی وہ نیچے گرا۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا لیکن چکرا گیا تھا۔

میں دروازے کی طرف لپکا جو پیڈرو نے اندر آتے وقت کھلا چھوڑ دیا تھا۔ چابی باہر ہی لگی رہ گئی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر چابی گھما دی اور نکال کے جیب میں ڈالی۔ پھر میں نے اپنے زنداں کو باہر سے دیکھا۔ میں ایک زینے کے مقابل کھڑا تھا۔ وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جس سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا۔ جہاں میں قید تھا اور جہاں اب میسن کی لاش کے علاوہ پیڈرو پڑا رہ گیا تھا کسی مکان میں سب سے اوپر والی منزل پر بنا ہوا ایک کمرہ تھا۔ کھڑکی سے نظر آنے والے درختوں کی بلندی کے اور پرندوں کو محو پرواز دیکھ کر میں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میں سطح زمین سے خاصا اوپر ہوں۔ تیسری یا چوتھی منزل پر۔ اب میں نے نیچے کو دیکھا تو مجھے ایک اور جاں گسل مرحلے سے گزرنا مشکل دکھائی دیا۔ پورا زینہ صرف ایک ڈھانچہ تھا جس میں بغیر پلاستر کی سیڑھیاں تھیں اور کوئی ریلنگ نہیں تھی۔ دونوں طرف آڑے ترچھے زنگ خوردہ سریے نکلے ہوئے تھے۔ اگر دیوار اٹھائی جاتی تو یہ سریے اندر آ جاتے لیکن دیوار بننے کے بجائے باتھ روم کی طرح زینہ بھی تکمیل کے آخری مراحل میں رک گیا تھا۔ ایک طرف گھر کی نچلی منزل کا پورا نقشہ تھا لیکن دوسری طرف صرف خلا تھا۔ خالی میدان جس میں اینٹ پتھر کے ڈھیر تھے اور خودرو جھاڑیوں کے درمیان ایک ببول اگا ہوا تھا۔ قریب ترین مکان بھی چار پانچ سو گز دور تھا اور بیشتر مکان ایک دوسرے سے الگ زمینوں یا باغ میں بنے ہوئے تھے۔

میرا اندازہ درست تھا۔ میں دو منزلہ مکان کی چھت پر بنے ہوئے کمرے میں بند تھا گویا تیسری منزل پر تھا۔ سب سے اوپر کا یہ کمرہ نامکمل تھا جسے کسی طرح پورا کر سکے تھے تاہم یہ رہائش کے قابل تھا اور نچلی منزل کے مکان غیر آباد تھے یا ترک کر دیے گئے تھے۔ غور سے دیکھنے کے باوجود میں گرد و نواح سے اندازہ نہ کر سکا کہ میں کہاں ہوں۔

بیساکھی بغل میں دبا کے میں نے پوری احتیاط کے ساتھ پہلے زینے سے دوسرے زینے پر قدم رکھا۔ اپنا توازن برقرار رکھنا انتہائی ضروری تھا ورنہ میں دائیں جانب بیس فٹ نیچے پتھروں پر گرتا اور بائیں جانب اس سے نصف فاصلہ طے کر کے صحن میں سیمنٹ کے پختہ فرش پر۔ دو زینے اتر کے مجھے احساس ہوا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔ بیٹھ کے جسم کا سارا بوجھ ایک ٹانگ پر ڈالنا تھا جو ٹھیک تھی۔ پھر کسی چیز کا سہارا لیے بغیر بیساکھی اگلے زینے پر رکھتا تھا اور صحیح ٹانگ کے سہارے آگے جھک کر نیچے آتا تھا۔ دونوں صورتوں میں جسم کی ساری قوت صرف ہوتی تھی۔ آسان تھا کہ ٹانگ بیساکھی کے نچلے گول حصے پر توازن رکھنے کی مجھے عادت نہیں تھی۔ تیسرا زینہ اترنے سے پہلے مجھے چکر سا آیا اور زینہ میری نظروں کے سامنے ہلنے لگا۔ میں فوراً بیٹھ گیا۔

بیٹھ کے اترنا نسبتاً آسان تھا اور اس میں گرنے کے امکانات معدوم تھے۔ نیچے پہنچنے سے پہلے مجھے کئی بار پیڈرو کا خیال آیا۔ وہ کھلی کھڑکی کے راستے نیچے اتر سکتا تھا مگر آسانی سے نہیں۔ جسمانی طور پر وہ پوری طرح چاق و چوبند ہوتا تو روایتی انداز میں چادر پھاڑ کے پٹیاں بناتا اور پٹیوں کو گرہ دے کر رسی بنا لیتا۔ پھر وہ اسی رسی کے سہارے سرکتا ہوا کھڑکی کا ایک سرا انگوٹھے میں پھنساتا نیچے اتر جاتا لیکن ابھی تو اس کا ذہن بھی اس حد تک معاون نہیں ہوگا اور بالفرض محال اس نے رسی بنا بھی لی تو اس کی جسمانی صلاحیت آڑے آئے گی۔ اسے سوچنا پڑے گا کہ اس کوشش میں وہ اپنا وزن نہ سنبھال سکا تو نیچے گر کر کیسے اٹھے گا۔ بہر صورت وہ دس پندرہ منٹ سے پہلے کمرے سے باہر نہیں آ سکتا تھا۔

نیچے والی منزل کا ہر کمرہ بند اور مقفل تھا۔ گرد و غبار کی تہ بتاتی تھی کہ مدت سے یہاں کوئی بھی نہیں آیا۔ دلاور اینڈ کمپنی ہمیشہ ایسے ہی گھروں کا انتخاب کرتی تھی جن سے اس کا دور کا بھی تعلق ثابت نہ ہو۔ ہر آبادی میں ایسے گھر مل ہی جاتے ہیں جن کے مالک دوسرے شہر یا دوسرے ملک میں ہوں، غریب ہوں اور گھر لاوارث رہ گئے ہوں یا آسیب زدہ مشہور ہو گئے ہوں اور کوئی ان میں رہنے کے لیے نہ آتا ہو۔ دلاور اور اس کے حواری تو ایسے گھر تلاش کر کے نظروں میں رکھتے ہوں گے جو ان کے کام آئیں لیکن ان کا سراغ نہ دیں۔ ماضی میں ایسا کئی بار ہو چکا تھا۔

سب سے نیچے والی منزل تک پہنچنا کوئی مسئلہ نہ تھا کیونکہ زینے کے ایک طرف دیوار تھی تو دوسری جانب لکڑی کی ریلنگ۔ لیکن ابھی میں نے آخری زینے پر قدم رکھا ہی تھا کہ مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ چھپنے کے لیے نہ جگہ تھی اور نہ وقت تھا۔ چند سیکنڈ بعد نرس نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بری طرح چونکی اور اس کا ہاتھ خود بخود ریوالور نکالنے کے لیے بڑھا مگر میں خالی ریوالور کا رخ پہلے ہی اس کی طرف کر چکا تھا۔

"بالکل سیدھی کھڑی رہو۔" میں نے سپاٹ لہجے میں حکم دیا۔ "ورنہ جس طرح میں دو گولیوں سے میسن اور پیڈرو کو ٹھنڈا کر آیا ہوں اسی طرح تیسری گولی سے..." میں نے نشانہ لینے کے انداز میں ریوالور اوپر اٹھایا۔

"پلیز... پلیز مجھے مت مارو..." وہ کانپنے لگی۔ "تم جیسا کہتے ہو میں ویسا ہی کروں گی..."

"اچھا تو پہلے اپنے دونوں ریوالور نکالو۔ احتیاط سے آہستہ آہستہ اور نیچے میرے پیروں کی طرف پھینک دو۔" میں نے کہا۔ "یہ مت

www.paksociety.com

بھول گیا کہ مجھے صرف ٹریگر دبانا ہے۔ ذرا سی غلط حرکت کا شبہ بھی ہوا مجھے تو میں سوچوں گا نہیں۔"

نرس نے اقرار میں سر ہلایا اور ایک جیب سے ریوالور نکال کر میری طرف سرکا دیا۔ میں نے جھک کر اُسے اٹھایا اور جیب میں رکھ لیا۔ "اب دوسرا۔ جس سے تم نے مجھے گینڈا سمجھ کر بے ہوشی کا انجکشن دیا تھا۔" میں نے کہا اور اسی وقت مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ میں نے اپنا خالی ریوالور رکھ کے جیب سے نرس کا دیا ہوا ریوالور نکال لیا۔ اس کا ردعمل انتہائی غیر متوقع تھا۔ نرس نے بڑی پھرتی سے دوسرا ریوالور نکالا اور پیچھے ہٹ کر سیدھا نشانہ لیتے ہی فائر کر دیا۔ میں اُسے گولی مار سکتا تھا لیکن میری خواہش یہ تھی کہ اس چڑیل کو زندہ گرفتار کروں اور اس سے وہ سب پوچھ لوں جو مجھے معلوم نہیں تھا۔ چنانچہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے کے بجائے میں نے پیچھے گر کے خود کو اس زہر بجھے تیر کا ہدف بننے سے بچا لیا جو میرے جسم میں کہیں بھی پیوست ہو جاتا تو تین منٹ کے اندر اندر مجھے لٹا دیتا۔

میں نے نرس کو ایک گالی دی جو بلا ارادہ میری زبان پر آ گئی تھی اور محض اُسے خوف زدہ کرنے کے لیے ریوالور اٹھا کے ٹریگر دبا دیا۔ میں مطمئن تھا کہ گولی اُسے چھوئے بغیر اس کے سر کے اوپر سے گزر جائے گی لیکن ایک بار پھر ٹریگر دبنے کی آواز نہ آئی۔

نرس قہقہہ مار کے ہنسی۔ "اب تم جہاں بیٹھے ہو وہیں بیٹھے رہو۔" اس نے مجھے حکم دیا۔ نہ جانے کیوں اُس کی ہنسی کی طرح مجھے یہ حکم بھی ایک کھوکھلی دھمکی لگا۔ مجھے اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہوا۔ غالباً پینڈورو نے اس کے ریوالور کی گولیاں نکال لی تھیں اور نرس یہ بات جانتی تھی۔ اس سے پینڈورو کا خالی ریوالور بہرحال بہتر تھا جس نے نرس کو دہشت زدہ کر کے میرا حکم ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ وہ پھر مجھے نشانہ بنائے کھڑی تھی۔ ایک سیکنڈ مجھ پر صدیوں کے انتظار کا کرب بن گیا۔

"انتظار کس بات کا ہے؟" میں نے اس سیکنڈ کے بوجھ تلے دب کر کہا۔ لیکن وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ پھر حقیقت کو میں نے اس کی آنکھوں میں پڑھ لیا۔ فشار خالی ہو جانے کے بعد وہ بھی خالی ہاتھ رہ گئی تھی۔ یہ ریوالور بے مصرف ہو گیا تھا۔ شاید دوسری بار چلانے کے لیے اُسے پھر لوڈ کرنا پڑتا تھا۔ نرس کی ہنسی ایک بے جان مسکراہٹ میں ڈھل کے غائب ہو گئی۔ میں آہستہ آہستہ اٹھا اور بیساکھی لے کر کھڑا ہو گیا۔

"اب ہم دونوں کے ہاتھوں میں بے مصرف کھلونے ہیں۔" میں نے ہنسی نہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "عملاً ہم دونوں خالی ہاتھ ہیں۔ میری ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ پوری طرح کارآمد نہیں لیکن میرے پاس یہ اضافی ہتھیار ہے۔" میں نے بیساکھی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے علاوہ۔ جیسے مرا ہاتھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے ویسے ہی آدھا مرد پوری عورت کے مقابلے میں بھاری پڑتا ہے۔ تم آزمانا چاہو گی؟"

"اگر تم نے... میری طرف قدم بڑھایا۔" وہ چلائی اور اس نے خالی ریوالور مجھ پر کھینچ مارا۔ ریوالور ایک فٹ دور سے گزر کر نیچے کی دیوار پر لگا۔ "میں شور مچا دوں گی۔" وہ نروس ہو کے بولی۔

"ضرور مچاؤ شور۔" میں نے کہا۔ "اپنا یہ شوق بھی پورا کر لو۔ پتا نہیں پھر موقع ملے گا یا نہیں۔ یہ تم کو یقیناً معلوم ہو گا۔ شور مچانے کی ضرورت مجھے ہوتی تو میں تمھارے مقابلے میں لاؤڈ اسپیکر کی طرح چلا سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس سے صرف میری آواز خراب ہو جائے گی۔ سنے گا کون میری۔ تمھاری آواز بھی کہاں تک جائے گی۔ سننے والے تو مر گئے۔" موت کی خبر نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔

"پھر... مجھ سے کیا... کیا چاہتے ہو تم...؟" وہ ایک قدم پیچھے ہو کے بولی۔ "میرا کوئی قصور نہیں... میں مجبور تھی۔"

"ہم سب کے پاس مجبوری ایک ڈھال کا کام دیتی ہے۔" میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ "اس کی آڑ میں ہم اپنی ہر غلطی کو چھپا کے سے لڑتے ہیں۔ چھ کینٹ مانگنے میں مجبور تھا۔ طوائف خود کو مجبور کہتی ہے۔ اسمگلر کہتا ہے مجبور ہے۔ یہاں آخر کون سی مجبوری ہوتی ہے... پیٹ کی۔ پیٹ بھر روٹی تو شرافت اور عزت سے بھی مل جاتی ہے۔ مجبوری ہوتی ہے عیش کی زندگی۔ اس دولت کی جس سے تن آسانی اور عیاشی کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔" جیسے جیسے میں آگے بڑھتا گیا، وہ پیچھے ہٹتی گئی یہاں تک کہ وہ ایک دیوار سے جا لگی۔ اب اس کے لیے مزید مراجعت ممکن نہ رہی۔ میرے اور اس کے درمیان صرف ایک فٹ کا فاصلہ رہ گیا۔

"میرے پاس وقت کم ہے اس لیے میں تمھاری مجبوری کی کہانی سننے نہیں بیٹھ سکتا۔" میں نے کہا۔ "مجھے اسلحہ چاہیے۔ ریوالور کی دونوں قسم کی گولیاں جو تم استعمال کرتی رہی ہو۔"

"میرے پاس کچھ نہیں ہے اب۔" وہ بولی۔ "تمھاری وجہ سے انھوں نے سب کچھ چھین لیا۔"

"میری وجہ سے۔ خوب۔ گویا وہ میری غلطی تھی جس کی وجہ سے تم نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔" میں نے طنز سے کہا۔

"تم کو یقین نہیں تو میری تلاشی لے کر دیکھ لو۔" وہ بولی۔ "ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس نے ریوالور سے گولیاں نکال لی تھیں۔ بے ہوش کرنے والی گولی میرے پاس ایک ہی رہ گئی تھی۔"

"افسوس یہ ہے کہ میں تم جیسی عورت پر یقین نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "تمھیں علم تھا کہ ریوالور خالی ہے؟"

"ہاں... ابھی ہوش میں آنے کے بعد میں نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔" وہ بولی۔ "اس نے مجھے قابو کر کے ریوالور چھین لیا اور گولیاں باہر پھینک دیں۔"

"پھینک کیوں دیں؟" میں نے کہا۔ "جیب میں کیوں نہیں ڈالیں؟ وہ دوبارہ انھیں استعمال کر سکتا تھا۔"

نرس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کا ریوالور دوسری ساخت کا تھا۔ گولیاں باہر پڑی ہوں گی۔ تم ڈھونڈ سکتے ہو۔"

میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ یہ طے کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے یا جھوٹ۔ اس کا چہرہ اور آواز دونوں ہر قسم کے جذبات سے عاری تھے۔ "تم نے اُسے قتل کرنے کی کوشش کی اور اس نے صرف ریوالور خالی کرنا مناسب سمجھا؟" میں نے کہا۔ "تمھیں کچھ نہیں کہا؟"

"اس نے... مارا تھا مجھے..." اس نے اپنا رخسار سامنے کیا جس پر چار انگلیوں کے نشانات بہت واضح تھے۔ "میں گر گئی۔ وہ سمجھا میں پھر بے ہوش ہو گئی ہوں۔ اسی وقت اوپر سے ایک دھماکا سنائی دیا۔ پھر دوسرا... وہ مجھے چھوڑ کے اوپر بھاگا۔ اُسے دوسرا ریوالور لینے کا خیال نہیں آیا جلدی میں۔"

"اس دوسرے بے ہوش کرنے والے ریوالور کی گولی وہ کہاں سے لاتا تھا؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو وہ اپنی جیب سے نکال کے دیتا تھا۔" وہ بولی۔ "اور میرا خیال ہے اس کے پاس ایک ہی بچی تھی۔"

میں نے غور کیا تو مجھے سب سے نچلی منزل کے سارے کمرے کھلے نظر آئے۔ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا اور شاید پانچ مرلے پر بنا ہوا تھا۔ ہر منزل کا نقشہ ایک ہی تھا۔ دائیں طرف ایک کمرہ، سامنے دو کمرے۔ دونوں کمروں کے سامنے برآمدہ اور بائیں جانب ایک قطار میں تینوں خانے یعنی باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ۔ برآمدے میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ غالباً اس پر نرس سوتی ہو گی۔ سیمین کے لیے فرش خاک اور بستر ریشم و کمخواب ہوا تھے۔ وہ دونوں باری باری سامنے کے کمرے سے باہر آتے اور میری نگرانی کرتے ہوں گے۔ کھلا باورچی خانہ اس بات کا ثبوت تھا کہ نرس کے لیے وہاں کھانے پکانے کی سہولت فراہم کر دی گئی تھی۔ چنانچہ وہ باورچن بھی تھی۔ اپنے علاوہ سیمین کو بھی کھانا کھلاتی تھی اور مجھے بھی۔ سیٹھ بالا جیسے معزز مہمانوں کے لیے جانے کا کوئی راستہ بھی بنا ہو گا۔ ممکن ہے کہ اسلحہ بھی کسی خانے میں پوشیدہ ہو، میں نے سوچا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" نرس نے کہا۔ "باورچی خانے میں تمھارے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"تم تو خیالات تک پڑھ لیتی ہو۔" میں نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ "ایسے اعتبار نہیں کر سکتا میں تم پر۔ اپنا منہ دیوار کی طرف کر لو۔ میں تلاشی لوں گا۔ حرکت بالکل نہ کرنا بلکہ سانس بھی احتیاط سے لینا۔ تم نے میرے خالی ہاتھوں کا کمال دیکھا ہے۔"

"تم وقت ضائع کر کے خطرہ مول لے رہے ہو۔" وہ پلٹ کر بولی۔ "پینڈورو ہوش میں آ جائے گا۔"

اس کا احساس مجھے بھی تھا لیکن فرار ہونے سے پہلے میں اس امر کو یقینی بنا لینا چاہتا تھا کہ یہ شکاری عورت زیر دام آ جانے والے شکار کو حلقۂ دام توڑ کے فرار ہوتا دیکھے گی تو گولی نہیں چلائے گی۔ پینڈورو کا کسی بھی وقت ہوش میں آ جانا ممکن تھا اور اس کے لیے بند کمرے سے نکل آنا مشکل ضرور تھا، ناممکن نہیں تھا۔

"کیا سچ مچ تم نے پینڈورو کو مار دیا ہے؟" وہ میری صورت پر تذبذب کے آثار دیکھ کر بولی۔

"ہاں۔ اس میں شک کی کون سی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "تم لاش دیکھنا چاہتی ہو تو چلو۔ تمھیں بہت صدمہ ہے کیا؟"

"نہیں۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "میرا کون سا سہاگ اجڑ گیا ہے۔ میں بھی تو وہی کرنے والی تھی جو تم نے کیا۔ یہ جو ولایو کی بات کر رہا تھا۔ یہ اس کے آنے کا وقت ہے۔ وہ آ گیا تو بھاگنا مشکل ہو جائے گا۔"

"بھاگنا؟" میں نے جملے کے حصے پر حیران ہو کے کہا۔ "اگر تم بھی میرے ساتھ ہی نکلنے کا سوچ رہی ہو تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ میں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں۔ میں تم کو کہیں باتھ روم میں بند کر جاؤں گا۔"

"پلیز۔ ولایو مجھے مار ڈالے گا... مجھے یہاں مت چھوڑو۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "میں تمھاری مدد کروں گی۔"

"کیسی اور کیوں؟" میں نے کہا۔ "مجھ سے کیا ہمدردی ہو گئی ہے اچانک تم کو؟" میں نے کہا۔

"اس بحث سے کیا فائدہ۔" وہ بولی۔ "نکلنا مجھے بھی ہے یہاں سے اور تم کو بھی۔ ساتھ لے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے تو جاؤ مگر مجھے بند کر کے مت جاؤ۔ مجھے بھی زندہ رہنے دو۔ میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم میرے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں کرو گی؟" میں نے کہا۔ "یہ کوئی نئی چال تو نہیں ہے؟"

"تم کو اعتبار تو ہے نہیں مجھ پر۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ پھر

www.paksociety.com

ضمانت کیا کیسے دو گی!" وہ بولی۔ "جو پوچھنا ہے یہاں سے نکل کر پوچھ لینا۔ یقین کرنا چاہو تو کرنا ورنہ مجھے جہاں چاہو چھوڑ دینا۔ میرے تمہارے راستے الگ ہو جائیں گے۔"

"اچھا۔" میں نے کہا۔ "تم آگے چلو۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کہاں ہوں۔ یہ کون سی جگہ ہے اور کون سا شہر ہے۔" اس کے ساتھ ہی میں اسے راستہ دینے کے لیے پیچھے ہو گیا۔

"تمہیں نہیں معلوم کہ تم راولپنڈی میں ہو!" وہ حیرانی سے بولی۔ "یہ فتح جھنڈ کا علاقہ ہے۔ ذرا آگے دھمیال ہے۔ جہاں پہلے ایک چھوٹا سا ائیر فیلڈ تھا۔ سڑک ایک میل دور ہوگی۔ ہم کھیتوں سے گزر کے ایک کسی عبور کریں گے۔"

"کسی کیا؟" میں نے کہا۔

"ایک نالہ ہے۔" وہ بولی۔ "سارا سال تھوڑا بہت پانی ہوتا ہے۔ تم چل سکو گے نا؟"

"ہاں۔ چلنا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"اسی طرح؟ ننگے پاؤں؟" وہ بولی۔ "میں اوپر سے جوتے لا دیتی ہوں تمہارے۔۔۔"

"نہیں۔" میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "اس رعایت سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کی مت سوچو۔ میری فکر مت کرو اور باہر چلو۔" میں نے اسے مخالف سمت میں دھکیل دیا۔ اگر یہ بدمعاش مر گیا ہوتا تو شاید میں اسے اوپر جانے دیتا لیکن اب میں افشائے راز سے ڈرتا تھا۔ نرس کی صورت پر دکھ کا ایک سایہ آ کے گزر گیا۔

باہر کھلا آسمان تھا اور اس کی نیلگوں وسعت میں پرندے آزادی سے پرواز کر رہے تھے۔ کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی جیسی منڈیر پر چلتے ہوئے میں نے بھی انہی پرندوں کی طرح محسوس کیا جو پنجرہ کھلا پا کے اڑ جاتے ہیں۔ گندم کی فصل پک چکی تھی اور فضا میں خوشۂ گندم کی دلنواز مہک تھی۔ ہوا گرد و غبار اور دھوئیں سے پاک تھی اور اس میں سانس لینا ایک انتہائی فرحت بخش تجربہ تھا۔ پرندوں کی چہکار کے علاوہ کبھی کبھی فصل اٹھانے والے محنت کشوں کی صدا بھی سنائی دے جاتی تھی۔ "آ آ ۔۔۔۔ ہو ہو ۔۔۔" اور اس کے ساتھ ہی خوشہ چینی کرنے والی چڑیوں کا ایک غول پھر سے اڑ جاتا تھا۔ اپنی محنت کے ثمر کو بچانے کے لیے کاشت کاروں نے ڈنڈے جوڑ کر عجیب و غریب نمونے کھڑے کر دیے تھے۔ پھٹے پرانے کوٹ پتلون پہنے اور ٹوپی یا ہیٹ لگائے یہ ڈراؤنے ڈھانچے دور سے آدمی کی طرح نظر آتے تھے چنانچہ کم عقل پرندے انہیں محافظ سمجھتے ہوئے قرب و جوار میں دانہ چگنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ قریب سے دیکھنے پر یہ کارٹون جدید مجسمہ سازی میں کسی تجریدی تجربے کا شاہکار لگتے تھے۔ احتیاطاً میں نے منڈیر چھوڑ کے کھیتوں کے کنارے چلنا شروع کیا۔ زمین نرم تھی اور اس میں کنکر نہیں تھے۔ زیادہ چبھنے پر دوب یا پھوس [illegible] گھاس تھی چنانچہ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ "تم ان راستوں سے واقف ہو۔" میں نے رک کر پیچھے سے کہا۔

"نہیں۔ لیکن میں آتی جاتی رہی ہوں۔" وہ آگے پیچھے چلتے بولی۔

"آج دن کون سا ہے۔ اور تاریخ کیا ہے؟" میں نے اچانک پوچھا۔

"دن ہے جمعرات اور تاریخ ہے ستائیس۔" وہ بولی۔ یہ ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میرے حساب سے وقت تقریباً ایک ہفتہ پیچھے ہو گیا تھا۔ مجھے شک تو شروع سے تھا کہ میری بے ہوشی میں وقت کا حساب گڑبڑ کر دیا گیا ہے اور گھڑی، کیلنڈر یا اخبار کی عدم موجودگی میں صرف اندھیرے اجالے سے وقت کی رفتار کا اندازہ کرنا محال تھا۔ ولاور اور پیڈرو نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ میرے اغوا کی واردات کو دو ہفتے بیت چکے ہیں۔ محسن کو مرے ہوئے تو دو دن ہو گئے تھے۔ میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ ایک ہفتہ۔ اب تک تو جانے گئے محسن کا جسم فقط ہڈیوں کا پنجر رہ گیا ہوگا۔ ایک ہفتہ کم ہو گیا تو کیا ہوا۔ رابعہ کا کیا حال ہوگا؟ میرے تصور نے ایک تصویر کھینچی کہ وہ بالکل گم صم اور تنہا بیٹھی تھی۔ اس کے کپڑے میلے اور شکن آلود تھے۔ بال پریشان تھے اور آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے تھے۔ یکدم کر اس نے کھانا پینا سونا سب چھوڑ رکھا تھا۔ ایک ہفتے بعد وہ ایک سال کی بیمار لگتی تھی۔ پھر میں نے فوزیہ کو دیکھا جس نے آخری بار میری آواز سنی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور شیخ اسے تسلی دے رہا تھا کہ رونے کی کیا بات ہے سکندر ضرور لوٹ کر آئے گا۔ کیا شیخ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ماں کے آنسو کیا کہانی سنا رہے ہیں! تیسری تصویر شہلا کی تھی جو میرے تصور کی گرفت میں ہی نہ آئی۔ وہ سب سے کم رو مظلوم اور بے سہارا لڑکی تھی۔ اس نے اپنے وجود کی بنجر ہو جانے والی زمین میں سخت جدوجہد کے بعد محبت کے پھول کھلائے تھے۔ محسن کی محبت جیسے بھائی کی محبت۔ ان رشتوں کی محبت جو اجنبی ہو کے بھی اپنے ہو گئے تھے۔ موت کی آندھی نے وہ گلشن اجاڑ دیا۔ ایک زندگی اپنا دوسری بار مرگئے کے بعد اس نے جینا قبول کیا ہوگا؟ جواب حوصلہ دل شکن تھا۔ وہ کم ہمت لڑکی مر گئی ہوگی۔

لیکن ابھی ابھی وقت ایک ہفتہ پیچھے لوٹ گیا تھا۔ ایک حقیقت جسے میرے ذہن نے قبول کر لیا تھا، فریب خیال بن گئی۔ [illegible]

یاد کے جنگل میں گم ہو گئی تھی، دھوکا ثابت ہوئی۔ امید کا ایک ستارہ مایوسی کے افق پر یوں روشن ہوا کہ اس کی تابندگی نے میری عقل کو خیرہ کر دیا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ سب جھوٹ ہو۔ اول تا آخر۔ اغوا ورنہ مجھے کیا گیا تھا اور باقی خبریں محض میرے ذہن کو مایوسی شکست ذلت اور بے بسی کے احساس سے دوچار کرنے کا ذریعہ ہوں؟ مقصد میرا حوصلہ پست کرنا ہو تاکہ میں احساس جرم و ندامت میں مبتلا ہو کے جینے کی جدوجہد ہی چھوڑ دوں۔ میرے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ بالآخر میں اپنے عزیز ترین دوست محسن کی موت کا سبب بنا۔ اپنے محسن انکل رستمی کے بیٹے کی تباہی کا سبب بنا اور رابعہ کے مستقبل کی بربادی کا سبب بنا۔

میں اپنے خیالات میں گم چلا جا رہا تھا۔ اچانک میرے کانوں نے کچھ آوازیں سنیں۔ یہ ان آوازوں سے بالکل الگ تھیں جو کسان پرندوں کو اڑانے کے لیے نکال رہے تھے۔ کچھ لوگ تیز آواز میں باتیں کر رہے تھے یا ایک دوسرے پر چلا رہے تھے اور یہ آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ بجلی کی طرح میرے ذہن میں تعاقب کرنے والوں کا خیال آیا۔ میں نے نرس کا ہاتھ پکڑا اور سیدھا چلنے کے بجائے کھیتوں کے اندر گھستا چلا گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے میرے ساتھ آئی۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی اتر آئی۔ ابھی اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے بیساکھی چھوڑ کے اس کا منہ دبا لیا اور کھڑی فصلوں کے درمیان گر گیا۔

"خبردار جو آواز نکالی۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "گلا گھونٹ دوں گا۔"

نرس نے وحشت زدہ سہمی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور مزاحمت بالکل نہیں کی۔ میں سانس روکے پڑا رہا اور ہلکی سی نم آلود مٹی کا سبزہ اور گندم کی خوشبو سونگھتا رہا۔ میرا صرف ایک ہاتھ پہلی طرح کارآمد تھا اور اس سے میں نے نرس کو قابو کر رکھا تھا۔ اگر وہ ذرا بھی حرکت کرتی تو میں ایک ٹانگ سے بھی کام لے سکتا تھا۔ آوازیں اب واضح ہونے لگی تھیں۔

"وہ دور کہیں جا ہی نہیں سکتے۔" یہ آواز پیڈرو کی تھی۔ "میں نے بیساکھی کے نشان زمین پر دیکھے تھے۔"

"تم اس سے بہت آگے نکل آئے ہو۔" ولاور نے کہا۔ "اور فصلوں کے اندر تو زمین سخت ہے۔ میں نے ان دونوں کو منڈیر پر کھڑا دیکھا۔ اور نشان اب کیوں نظر نہیں آ رہے ہیں؟"

"قسمت ذات میں دفنا نہیں۔" پیڈرو نے دانت پیس کر کہا۔ "اگر ہاتھ آ جائے تو اس کے ٹکڑے کر کے یہیں ڈال دیں۔ گدھ اور گیدڑ کھا جائیں۔ کیا نہیں دیا میں نے اسے۔" وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

"اگر وہ زندہ ہے تو یہیں سڑک پر تمہارے ساتھ کروں گا۔" ولاور نے سکون سے کہا۔ "تمہیں بھی سب کچھ دیا ہے میں نے۔ تمہاری اوقات سے زیادہ۔" ایک بل میں سے نکلنے والے چیونٹوں نے میری ٹانگ پر چلنا شروع کیا۔ میں نے پیر کو جھٹکا۔

"چوہدری صاحب۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ۔۔۔ وہ اس۔۔۔ کے ساتھ مل گئی ہوگی۔" پیڈرو نے میرے نام کی جگہ گالی استعمال کی۔

"کیوں؟ کیا وہ پہلے بڑی شوہر پرست اور باوفا تھی؟" ولاور نے طنز سے کہا۔ "سکندر کبھی کم پرکشش نہیں ہے پیڈرو۔"

"جہاں آ کے بیساکھی کے نشانات ختم ہوئے تھے، وہاں سے دائیں اور بائیں جانب کھیتوں میں تلاش جاری ہے۔" پیڈرو نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "وہ زیادہ دور نہیں نکل سکتے ہیں۔ شکاری کتے ان کے پیچھے ہیں۔"

"سڑک زیادہ دور نہیں ہے پیڈرو۔" ولاور نے کہا۔ "اور ہوا کا رخ مخالف ہے۔ کتے ان کی بو نہیں پا سکتے۔"

یہ لرزہ خیز انکشاف تھا کہ وہ تربیت یافتہ شکاری کتے لے کر ہمارے تعاقب میں نکلے تھے۔ ہوا کی موافقت ایک تائید ایزدی تھی ورنہ اب تک آدم بو کو راڈار کی طرح محسوس کر لینے والے خون آشام کتے ہمارے جسم کی دھجیاں بکھیر چکے ہوتے اور اپنے دانتوں سے ہمارا گوشت ادھیڑتے ہوئے [illegible]۔ وہ پاس پہنچ چکے تھے جو انسان کے بھیس میں زیادہ بے رحم درندے تھے۔

وہ دونوں کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ "ایک کسان نے انہیں اسی طرف سے گزرتے دیکھا تھا ابھی کچھ دیر پہلے۔" پیڈرو نے کہا۔ "اس نے جو حلیہ بتایا تھا وہی تھا۔" چیونٹے میری ٹانگ پر کاٹنے لگے تھے مگر میں انہیں ضبط کر رہا تھا۔

"اگر تم سڑک پر پہنچ کے پوچھو گے تو بہت سے لوگ بتا دیں گے کہ انہوں نے بھی ایک نرس اور ایک بیساکھی کے سہارے چلنے والے لنگڑے آدمی کو دیکھا تھا۔" ولاور نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تلاش کرو گے تو کوئی ٹیکسی والا بھی بتا دے گا کہ وہ کہاں سے بیٹھے تھے اور کہاں گئے تھے۔ ان کی جوڑی بہت نمایاں تھی۔ نرس کی سفید یونیفارم اور اس کے ساتھ ایک جوان اور ہینڈسم آدمی جو معذور تھا۔ مگر یہ معلومات ان کا حال نہیں ہیں پیڈرو! مجھے ان کا سراغ نہیں، وہ دونوں چاہئیں۔"

"وہ ان ہی کھیتوں میں چھپے ہوئے ہوں گے چوہدری صاحب۔" پیڈرو نے لاجواب ہو کے کہا۔ "مل جائیں گے۔"

www.paksociety.com

"اچھا زرد دیکھو... وہ چیل ادھر... وہ چیل اُدھر" اللہ دتے نے زرین سے اس کے عقب پہ ایک تھپڑ رسید کیا، بالکل نادرشاہ کے لہجے میں بات کرنے کے لیے جھوٹی نے اپنی چھڑی سے اشارہ کیا تھا کہ چندر وہ بھی رہ گیا۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پہ گال پہ گیا۔ جلا جلا گال آنکھیں بتاتی تھی، ضرب کتنی شدید ہوگی۔ جبھی تو اب میری پنڈلی پر دو پڑتے ہوئے بہت اُوپر تک چلے گئے تھے۔ ایک جھٹکے نے زرین کو کاٹا تو وہ تڑپی لیکن چلا نہ سکی۔ اسی وقت وہ اور پلٹا اور واپس چلنے لگا۔

چندر کی بہت ذلت ہوئی تھی مگر وہ سہنے کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ ذلیل کا یہ تماشا سر بازار نہیں ہوا اور کسی نے اس کے منہ پر پڑنے والے تھپڑ کو نہیں دیکھا۔

جیلوں کے دو پانچوں کی سرنگ میں داخل ہو جانے تک جو تنگ…

میرا گوشت زخمی ہو چکا تھا اور بار بار ناقابل برداشت جلن ہو رہی تھی۔ زرین کا حال بھی کم خراب نہ تھا۔ جیونٹیاں بھی کاٹ رہی تھیں۔ وہ بار بار نیچیں چلاتی تھی اور میں مجبور تھا کہ اسے حرکت بھی نہ کرنے دوں۔ ورنہ ہم دونوں کے درمیان ہاتھی اور میرا ہاتھ دشمنوں کو متوجہ کر لیتی جو ہم سے بمشکل تمام دس گز کے فاصلے پر موجود تھے۔

ان کے جاتے ہی میں نے زرین کو چھوڑ دیا اور اٹھ کر زمین پر زور زور سے پیر پٹخنے لگا۔ جیونٹیوں کو جھاڑ… جیونٹیوں سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ زرین نے بھی ہاتھ… ایک ایک جیونٹی کو… ختم کیا۔ پھر آہستہ آہستہ ہم دونوں کھیتوں سے نکل آئے۔

"تم نے مجھ سے چندر کے متعلق جھوٹ کیوں بولا تھا؟" وہ کپڑے جھاڑتے ہوئے بولی۔

"کیا اسے زندہ پا کے تمہیں افسوس ہوا ہے؟" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ اگر تمہیں موقع ملا تھا تو تم نے اسے قتل کیوں نہیں کر دیا؟" وہ بولی۔ "بھیسن کا وہ تھا نہیں؟"

"بھیسن؟ اس کو پہلے ہی مار چکا تھا۔" میں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ "مگر خود میری حالت ابتر تھی۔ چندر کے ہوش میں آنے سے پہلے بن میں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مجھے اس کا وار بھی خالی ملا تھا۔"

"میں زرین بھی تھی۔ اب میں آزاد ہوں۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "میری… مجبوری حائل نہیں۔"

"مجبوری کا حوالہ تم نے پہلے بھی دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کیا تھی وہ مجبوری؟"

"مجبوری یہ تھی کہ وہ میرا شوہر ہے۔" وہ چلائی۔ "لیکن مجھے اس سے نفرت ہے۔ تم میں اگر جرأت نہیں تھی تو مجھے بتا دیتے۔ میں اسے قتل کرا دیتی۔"

اس انکشاف نے مجھے ایک لمحے کے لیے ساکت کر دیا۔ "تم… بیوی ہو اس کی؟ پھر یہ چیڑ کون ہے جس نے کہا تھا کہ تمہاری… ہو گی۔ پھر چندر تم کو مار ڈالے گا!"

"چیڑ… وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ بہت چاہتا ہے مجھ کو۔ میری خاطر اس نے اپنی زندگی برباد کر لی۔ وہ کمبخت… اور رنج جیل کے رہنے لگی۔" چند دو سال پہلے اس نے مجھے… کی انگوٹھی پہنائی تھی جو اب تک اس کے پاس ہے۔"

"پھر شادی کیوں نہیں کی تم دونوں نے؟" میں نے اس کے پاس بیٹھ کے نرمی سے کہا۔

"اس لیے کہ ہمارا خاندان مقروض تھا۔ میرے بابا نے سب کچھ گروی رکھ دیا تھا۔ مجھے یاد ہے… گھر جس میں ہم رہتے تھے۔ وہ گھر میری ماں کا تھا اور میری ماں زرین بھی ایسی زرین تھی جیسی میں ہوں۔ خدا نے بس… قسمت واپس نہیں تھی۔" وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگی۔

"پھر چندر نے کہا کہ وہ تمہارے سارے قرض ادا کر دے گا اور تمہارا گھر بھی تمہیں واپس مل جائے گا؟" میں نے کہا۔ "بشرطیکہ اس سے شادی کر لو؟"

اس نے روتے ہوئے سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ "کیا سب کچھ اس نے بتا دیا ہے تمہیں؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "دنیا میں ایسا ہوتا آیا ہے اور چندر… محبت کرنا ہر ایک کا کام ہے۔"

"محبت؟" اس نے آنسو پونچھ کے نفرت سے کہا۔ "اس لفظ کا مطلب تک نہیں جانتا وہ۔ اس کے خون میں صرف نفرت ہے۔ اس کا خون زہریلا ہے۔ اس نے پہلے میری ماں کو جیل بھیجا پھر مجھے۔"

"تمہاری ماں کا قصور کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"کوئی قصور نہیں تھا اس کا۔ تمام زندگی جہنم کا عذاب سہنے کے بعد اس نے ایک شیطان سے نجات حاصل کر لی تو کیا برا کیا؟" وہ بولی۔ "کب تک سہتی وہ یہ ظلم۔ برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔"

"اور اسی حد سے گزر کے تمہاری ماں نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا؟"

www.paksociety.com

"ہاں اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ شراب نے اس کا جگر چھلنی کردیا تھا۔ میری ماں نے تو اس کے ساتھ نیکی کی اور اُسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مرنے سے بچا لیا۔ صرف ایک انجکشن سے اس کے اور اپنے تمام دکھوں کا خاتمہ کردیا۔" وہ بولی۔

"تمھاری ماں اُس کا علاج بھی کرا سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

"کس لیے؟ تاکہ وہ پھر اسی راستے پر چلنے لگے۔ جس پر وہ کئی مرتبہ موت کی دہلیز تک گیا لیکن میری ماں نے اُسے اسپتال لے جاکر رکھا جہاں ڈاکٹر اس کے بھروسے تھے۔ اس کی مشکلات کو دیکھتے تھے۔ اس کا اچھے سے اچھا علاج ہوا۔ اُسے بہترین دوائیں ملیں اور وہ ہمیشہ پہلے سے زیادہ صحت مند ہوکے لوٹا میری ماں کے ٹکڑوں پر پلنے اس کی ہڈیاں توڑنے اور پرانے دوستوں کے ساتھ پرانی عادتیں اختیار کرنے کے لیے۔ ذلت و رسوائی کی اس زندگی میں کوئی سیدھا موڑ نہیں تھا جس پر وہ اُمید کا سہارا لے کر چل سکتی۔ نجات اسی میں تھی کہ وہ اپنا خاتمہ کرلے یا اُسے مار دے جو اس کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والی سزا بن گیا تھا۔ اگر میں نہ ہوتی تو وہ خود مر جاتی لیکن مجھے ایک ایسے باپ کے سپرد کرکے وہ کیسے قبر میں جا لیٹتی جو اتنا بے غیرت تھا کہ شراب کی ایک بوتل کے لیے مجھے بھی بیچ ڈالتا۔"

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی جو نرس نے باندھ رکھی تھی اور سوچا کہ مجھے کم سے کم ایک گھنٹہ یہیں گزارنا چاہیے تاکہ سڑک تک پیچھا کرنے والے مایوس ہوکر لوٹ جائیں۔ یہ وقت نرس سے مفید معلومات حاصل کرکے گزارا جاسکتا تھا۔

"یہ بات پیڈرو کو کیسے معلوم ہوگئی؟" میں نے واقعات سے نتائج اخذ کرتے ہوئے کہا۔

"اسی اسپتال کی ایک اور نرس سے۔" وہ بولی۔ "اس کا پیڈرو سے ملنا جلنا تھا۔ وہ میری ماں کی نجی زندگی کے مسائل سے بھی واقف تھی۔ سب ہی جانتے تھے کہ مسز شیبا کتنی مظلوم ہے لیکن پولیس کو میرے باپ کی اچانک موت نے شکوک میں مبتلا کردیا تھا۔ وہ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے گئے۔ وہاں ڈاکٹروں نے رپورٹ دے دی کہ موت کا سبب کثرت شراب نوشی ہے۔ پولیس کچھ نہ کرسکی۔ پیڈرو کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں نے میری ماں کی مدد کی ہے اور عمداً غلط رپورٹ دی ہے تو اُسے موقع مل گیا۔ حالاں کہ جس نرس نے یہ واقعہ سنایا تھا وہ میری ماں کی بدخواہ ہرگز نہیں تھی۔ بس وہ پیڈرو کی اصل فطرت سے ناواقف تھی۔ تین دن بعد وہ ایک حادثے میں مرگئی۔"

"اچھا! کیا حادثہ پیش آگیا اُسے؟" میں نے سب کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔

"وہ رات کی ڈیوٹی ختم کرکے جارہی تھی کہ ایک ویران سڑک پر کوئی گاڑی اُسے کچلتی ہوئی نکل گئی۔" وہ بولی۔ "ایک ہفتے بعد پیڈرو نے میری ماں سے بات کی۔ میں ساتھ والے کمرے میں میٹرک کے امتحان کی تیاری کررہی تھی۔ ہم اسپتال کے اندر ہی دو کمروں کے چھوٹے کوارٹر میں رہتے تھے۔ چنانچہ میں نے ہر بات صاف سنی۔ پیڈرو نے میری ماں کو بتایا کہ شیبا کے اثرات کا پانچ سال بعد بھی لاش کے ناخن اور بال دیکھ کے پتا چلایا جاسکتا ہے۔ ایک ہفتہ پہلے کی لاش دوبارہ نکال کے پھر پوسٹ مارٹم کرانا تو کوئی مشکل ہی نہیں۔ میری ماں کی منت سماجت رونا دھونا سب رائیگاں گیا۔ اس نے پیڈرو کو یہ بھی بتایا کہ روبی کی منگنی ہوچکی ہے لیکن اس نے کہا منگنی کوئی شادی تو نہیں۔ توڑی بھی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد کوئی کتنی بات سمجھتا یہ جرم ہے۔ بڑی مشکل سے وہ اس بات پر رضامند ہوا کہ جب تک میں میٹرک نہ کرلوں وہ شادی نہیں کرے گا۔ اس عرصے میں مجھ کو بھی مناسب الفاظ میں سمجھا دیا جائے گا کہ یہ شادی اب نہیں رک سکتی۔ وہ چلا گیا تو میں نے بڑا کہرام مچایا۔ جان دینے کی دھمکی دی۔ ماں نے کہا کہ تم کیوں مرتی ہو جوانی میں۔ زہر میں کھالیتی ہوں۔ پھر ہم دونوں کو سمجھایا۔ ہماری عزت پر اس نے اپنی محبت کو قربان کرنا منظور کرلیا اور منگنی کی انگوٹھی واپس لے گیا۔ میں نے میٹرک کرلیا اور ماں نے مجھے بھی نرسنگ اسکول بھیج دیا۔ پیٹر ایک مشن اسکول میں ٹیچر تھا۔ اس نے اپنا اسکول چھوڑ دیا اور سیالکوٹ چلا گیا۔ جہاں اس کا باپ پادری تھا۔ پیڈرو نے متفق ہوکے مجھے مزید مہلت دے دی کہ میں نرس بن جاؤں۔"

"روبی۔ یہ تمھارا نام ہے اور تمھاری ماں کا نام شیبا تھا۔ پیٹر بھی عیسائی ہوگا۔ پیڈرو کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"اس کے باپ دادا مسلمان تھے۔ دادا سیالکوٹ کے قریب ڈسکہ میں تھا جہاں مشنریوں نے تبلیغ سے اور مالی امداد سے مفلوک الحال افراد کو عیسائی بنانے میں خاصی کامیابی حاصل کی تھی۔" وہ بولی۔ "اس کا باپ سیالکوٹ میں خاکروب تھا اور ماں بھی خاکروب ہی تھی۔ اس کا باپ مجرموں کو جلاد کی حیثیت سے جیل میں پھانسی دیا کرتا تھا۔ پیڈرو کا اصل نام عنایت مسیح تھا۔"

"پیڈرو میں ماں باپ کی مشترکہ صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔" میں نے کہا۔ "کیا تم میں اور تمھاری ماں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ خود زہر کھانے کا سوچنے کے بجائے پیڈرو کو وہی زہر دے کر مار ڈالتیں؟"

"یہ پیڈرو نہیں عنایت مسیح تھا جس نے مجھ سے شادی کی تھی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اور شادی سے پہلے وہ بالکل مختلف انسان تھا۔ یہی شرافت کا لبادہ اوڑھ کے تو اس نے مجھے دھوکا

دیا تھا۔ اس نے اپنے سب وعدے پورے کیے۔ پہلا از خود ہوگیا۔ ہم پھر اسی مکان میں چلے گئے جو میری ماں کا تھا۔ پیڈرو نے زیادہ قیمت ادا کرکے واپس لے لیا پھر میری ماں کے نام کردیا۔ اس گھر میں رہنے کے بعد ہماری زندگی کا بالکل نیا دور شروع ہوا۔ پیڈرو نے اس میں آرام و آسائش کے تمام اسباب فراہم کیے۔ یہ سب کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے ساتھ میری زندگی بہت ٹھیک ہی گزر رہی۔ میری ماں خوش تھی کہ جو کچھ ہوا اچھا ہوا... خود میں اداس اور کم سخن... پیڈرو کو چاہنے لگی اور پیٹر کو بھول گئی۔ اس نے مجھے اندھا کردیا تھا۔ عیش و آرام کسے اچھا نہیں لگتا اور مجھے وہ زندگی مل گئی تھی جس کے میں خواب تو دیکھتی تھی لیکن ان کی تعبیر پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔ مگر میرے خواب سچ ہوگئے تھے۔ پیڈرو میں بظاہر کوئی خرابی نہیں تھی۔ اس نے میٹرک سیالکوٹ سے کیا تھا اور اُسے خاکروب کا بیٹا ہونے کے باوجود بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ کرسچین مشنری اس کی ہر طرح مدد کرتے تھے۔ اس کی فیس معاف تھی۔ کتابیں مفت مل جاتی تھیں۔ اس کو ہوسٹل میں رہنے کا خرچ نہیں دینا پڑتا تھا اور ماہانہ خرچ کے لیے وظیفہ الگ ملتا تھا۔ اس نے کبھی یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ وہ کبھی ہفتہ بھر کبھی پندرہ دن اور بعض اوقات ایک ایک مہینے کے لیے باہر چلا جاتا تھا اور لوٹ کر آتا تھا تو میرے لیے نئے تحائف لاتا تھا اور میری ماں کو اتنا پیسہ دیتا تھا کہ اس نے زندگی بھر کی ملازمت میں نہ دیکھا تھا۔ شادی کے بعد میں ملازمت چھوڑ دینا چاہتی تھی لیکن اس نے مجھے منع کردیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ اکثر شوہر تو یہی چاہتے ہیں کہ بیوی صرف گھر کی ہوکے رہے اور ملازمت کو معیوب سمجھتے ہیں۔ یہاں الٹا معاملہ تھا۔ میں چاہتی تھی کہ صرف گھر بار سنبھالوں کیوں کہ مجھے ملازمت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ شوہر کی آمدنی اتنی تھی کہ میں خود ملازم رکھ سکتی تھی مگر پیڈرو نے کہا وقت گزارنے کے لیے مشغلہ اچھا ہے۔ وہ اکثر باہر رہتا ہے۔ میں گھر کے اندر بیٹھ کے کیا کروں گی۔ میں کہتی کہ جب بچے ہوں گے تو میں کہاں رہوں گی اور مجھے فرصت کب ملے گی۔ سال بھر بعد میں اسپتال ہی میں نرس بنی گود بھری۔ وہ بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گیا۔ بہت روئی دھوئی لیکن اُسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر خاموش ہوگئی۔ دوسری اور تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا تو میں نے اس ڈاکٹر سے بات کی جو مجھے دیکھ رہی تھی اور اس نے رازداری کا وعدہ لے کر مجھے بتایا کہ میرے شوہر کو میرا ماں بننا منظور نہیں تھا کیوں کہ بچوں کو وہ مصیبت سمجھتا ہے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ بچے خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔ انسان کے لیے فرشتہ ہوتا ہے۔ وہ بھی ہوتا ہے کہا تمھاری زندگی کی بقا کا ضامن ہوتا ہے۔ وہ کتنا میاں بیوی کے دو دلوں کو ملاتا ہے۔ غم و غصے نے مجھے پاگل کردیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر بھی ہی نہیں، کوئی تجربہ کار مڈوائف تھی۔ میں نے اس پر حملہ کردیا اور اس کا منہ نوچ لیا۔ اُسے گالیاں دیں۔ چڑیل، ڈائن اور قاتل کہا۔ اس کے کپڑے پھاڑ دیے۔ وہ ایسی بھاگی کہ پھر نظر نہ آئی۔ میری ماں تو اس کے گھر بھی گئی تھی لیکن اس کا کوئی پتا نہ چلا۔"

"زمین کے اوپر پتا چل بھی نہیں سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"پیڈرو نے مجھے بہت مارا اور پھر دھمکی دی کہ اگر میں نے اپنی زبان بند نہ رکھی تو یہ میری ماں کے حق میں برا ہوگا۔" اس نے ایسی بات بھی کہی کہ میرے باپ کو مرے ہوئے ابھی پانچ سال نہیں ہوئے جن کے حادثات کے بعد میں موت نہیں ہوتی زمین رنگتی تھی۔ اس روگ نے میری ماں کو بستر سے لگا دیا اور علاج کے باوجود اس کی حالت بگڑتی گئی تھی۔ میں نے کئی ڈاکٹر بدلے اور ان سب نے کئی نسخے بدلے لیکن ہر دوا بے اثر ہوگئی تھی۔ ایک رات میں نے پیڈرو کو اصل دواؤں کی جگہ دوسری دوائیں رکھتے دیکھا۔ میں نے دیکھا تو شیشیاں بھی وہی تھیں اور ان کے لیبل بھی وہی تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس ردوبدل کا مقصد دوا کی جگہ زہر دینے کے سوا کچھ نہیں۔ میں نے ہنگامہ کیا تو پیڈرو نے مجھے بیلٹ سے مارا اور کہا کہ مجرم تم ہی ہو۔ وہ تو باہر رہتا ہے، ماں کے لیے ڈاکٹر لانا اور دوا دینا سب میں خود کرتی ہوں۔ مجھ سے پہلے وہ اپنے شک کا اظہار ڈاکٹروں سے کرچکا تھا۔ یہ سوال تو بعد میں پیدا ہوتا کہ کیا بیٹی جلاد جو ماں کو زہر دے سکتی ہے۔ پہلے تو پولیس مجھے گرفتار کرلیتی اور ڈاکٹر بھی شوہر کے ساتھ میرے خلاف گواہی دیتے۔ شوہر نے تو پہلے ہی بیوی پر شبہ ظاہر کردیا تھا۔ میں کیا کرتی؟ ماں کو صدمے سے بچانا بھی ضروری تھا۔ اس کے بعد میں نے دوائیں مقفل رکھنا اور خود ہر بار ماں کو دوا دینا شروع کیا مگر اس وقت تک زہر نے ماں کو موت کے کنارے تک پہنچا دیا تھا۔ اس کے جسم میں اتنا زہر جمع ہوگیا تھا کہ دوائیں کچھ نہیں کرسکتی تھیں۔ انھی دنوں میں اچانک پیٹر مجھے مل گیا۔ وہ خود خاصا بدل گیا تھا لیکن مجھے دیکھ کر تو وہ حیران رہ گیا۔ میں نے اُسے ساری بات بتادی اور اس سے مدد مانگی۔ اس نے خاموشی سے پیڈرو کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور دو ہفتے بعد مجھے بتادیا کہ جسے میں گھر کے اندر عنایت مسیح سمجھتی ہوں وہ باہر کی دنیا میں استاد پیڈرو ہے اور اس کا بزنس کیا ہے۔ جو کچھ اس نے کہا وہ میرے لیے ناقابل یقین تھا۔ میں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ میرا شوہر جرائم پیشہ افراد کے گروہ میں شامل ہے اور اس کی تمام آمدنی غیر قانونی ہے۔ ہر بیوی کی نظر میں شوہر فرشتہ ہوتا ہے لیکن میرا شوہر شیطان تھا۔

www.paksociety.com

میں اس کے ساتھ کب تک نباہ کرتی۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ اب وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا کیوں کہ حقیقت مجھے معلوم ہو گئی ہے۔

"حقیقت۔" وہ زہرخند کے ساتھ بولا۔ "حقیقت کیا ہوتی ہے؟ اور اگر تمہیں معلوم ہو گئی ہے تو اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم میری بیوی ہو۔"

"نہیں ہوں میں تمہاری بیوی۔" میں نے چلّا کے کہا۔ "میں عنایت مسیح کی بیوی تھی کسی استاد پیڈرو کی نہیں۔"

وہ چونکا۔ "کس نے بکھرا ہے تمہارے دماغ میں یہ زہر۔ کس نے بتایا ہے یہ نام تمہیں؟"

"پیٹر نے۔ اور اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا ہے کہ تم کوئی شریف آدمی نہیں ہو۔" میں اسی طرح چلّاتی رہی۔ "تمہارے بزنس کا بھی پتا چلا لیا ہے اس نے۔ تم مجرموں کے ساتھی ہو۔ سٹے باز اور جواری ہو۔ تم غنڈہ ٹیکس وصول کرتے ہو۔ شراب اور چرس اور ہیروئن کا بزنس کرتے ہو۔ اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ مجھے طلاق چاہیے۔"

اُس نے میرے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ "اپنے اس عاشق سے کہنا کہ میرے جیتے جی وہ تمہیں نہیں لے جا سکتا اور میرے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکتا۔"

"تم مجھے قتل کر سکتے ہو لیکن اپنی بیوی بنا کے نہیں رکھ سکتے۔" میں نے چیختے ہوئے کہا۔ "میں تم سے عدالت کے ذریعے علیحدگی حاصل کر لوں گی۔"

"عدالت میں جانے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ ابھی تمہارے باپ کو مرے ہوئے پانچ سال نہیں ہوئے۔" وہ بولا۔ "پولیس کیس تھا جسے تمہاری ماں کے جاننے والے ڈاکٹروں نے حل کر دیا تھا۔ لیکن پولیس کے پاس تفتیش کا ریکارڈ موجود ہے۔ دوسری پوسٹ مارٹم رپورٹ سارا بھانڈا پھوڑ دے گی۔ کیوں اپنے باپ کی روح کو خراب کرتی ہو اور اپنی ماں کو جیل بھیجنے کے کام کرتی ہو۔ اُسے سزائے موت نہ ہوئی تب بھی عمر قید ضرور ہو گی۔ اس کو اپنے گھر میں ہی مرنے دو۔"

"میں اب اس دھمکی میں نہیں آؤں گی۔" میں نے عزم مصمم کے ساتھ کہا۔ "میری ماں یوں بھی مرنے والی ہے۔ پولیس سے پہلے وہ خودکشی کر لے گی۔ لیکن تم کیسے بچو گے؟ میں بیان دوں گی عدالت میں کہ تم نے اپنے تین بچوں کو قتل کیا۔ میری ماں کو زہر دیتے رہے۔ تم عنایت مسیح نہیں استاد پیڈرو ہو۔ میں نے پیٹر سے کہہ دیا ہے کہ وکیل سے بات کرے۔"

اس نے مجھے ایک کمرے میں باندھ کے ڈال دیا۔ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور دروازہ باہر سے مقفل کر کے چلا گیا۔

تین دن تک میں اسی کمرے میں بھوکی پیاسی پڑی رہی لیکن ہمت تھی کہ مری نہیں۔ چوتھے دن میرا شوہر پھر آیا۔ اس نے مجھے کچھ کھانے پینے کو دیا اور بولا۔ "اب کیا خیال ہے؟ دماغ درست ہوا کچھ یا نہیں؟"

"میں یہیں مر جاؤں گی۔" میں نے بمشکل تمام کہا۔ "لیکن تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی۔ پیٹر تمہیں چھوڑے گا نہیں۔ اب تک وہ وکیل سے بات کر چکا ہو گا اور میرا سراغ نہ ملا تو وہ پولیس کے ساتھ آ جائے گا۔"

"اس کا مطلب ہے مجھے پہلے اس کتے کا بندوبست کرنا چاہیے۔" وہ بولا اور مجھے پھر سے بس چھوڑ کے چلا گیا۔ وہ ہمارے گھر کا ہی ایک اسٹور روم تھا جسے صاف کرنے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا تھا۔ تقریباً آٹھ فٹ لمبا چوڑا اور صرف چھ فٹ اونچا یہ کمرہ کچن کے پیچھے تھا۔ اسے گھر کا ٹوٹا پھوٹا اور غیر ضروری سامان پھینکنے کے لیے ہی کھولا جاتا تھا چنانچہ اس میں دن کے وقت بھی اندھیرا رہتا تھا اور چوہے ادھر سے اُدھر بھاگتے رہتے تھے۔ وہ اوپر کچن سے کھانے کی چیزیں لاتے تھے اور غلاظت پھیلاتے تھے۔ یہ سب چوہے بہت بڑے تھے۔ بلی کے بچے سے کچھ ہی چھوٹے۔ وہ بہت بھیانک آوازیں نکالتے تھے اور میرے قریب آ کے بڑے خطرناک طریقے سے مجھے گھورتے رہتے تھے۔ میں دہشت سے کانپتی رہتی تھی اور میرا جسم ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ اس خیال سے کہ میں مر گئی تو یہ آدم خور میرا گوشت نوچ کر کھانے لگیں گے اور دو دن میں صرف ہڈیوں کا پنجر چھوڑ دیں گے۔ کئی بار میں تھکن اور اذیت کے باوجود سو گئی یا بے ہوش ہو گئی تو یہ چوہے میرے اوپر چڑھ آئے۔ ایک بار میں نے سوتے ہوئے درد کی شدید ٹیس سے تڑپ کر آنکھ کھولی تو میرے پاؤں کے ایک انگوٹھے سے خون بہہ رہا تھا اور کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا چوہا ڈھیٹ بنا بیٹھا تھا۔ اس نے میرے انگوٹھے پر سے نوچا ہوا گوشت نگل لیا تھا اور اب تازہ گوشت کا دوسرا ٹکڑا اُڑانے کی فکر میں تھا۔ میں نے اسے ٹانگیں ہلا کے بھگایا تو وہ دوسری طرف آ گیا۔ میرے چہرے سے ایک فٹ کے فاصلے پر۔ میں خوف سے چیخ بھی نہیں سکتی تھی اور چوہا شاید اندازہ کر چکا تھا کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ دوسرے چوہوں سے زیادہ سیانا اور تجربہ کار تھا۔ اس کی مکروہ شکل کو اتنا قریب پا کے مجھے یوں لگا جیسے اب وہ میری آنکھیں نکال لے گا۔ اس کے بعد میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکوں گی۔ وہ اپنے قبیلے کے دوسرے چوہوں کو بلا کے کہے گا کہ بے خوف ہو کر دعوت اڑاؤ۔ اب تک آدمی نہیں چوہے دان میں پھنسا کرتے تھے!

ہے۔ آج آدمی ہمارے درمیان پھنس گیا ہے اور آتا ہی ہے۔ بس ہے۔ اس وقت مجھ میں غیر معمولی طاقت آ گئی اور میں نے فرش پر گھوم کے لاتیں چلائیں تو ایک ٹوٹی ہوئی کرسی جو بے کار پڑی تھی اور وہ بھاگ گیا۔ میرے ہاتھ پیر ایک ہی ہتھکڑی سے جکڑے ہوئے تھے۔ ہتھکڑی کا دوسرا سرا ایک بہت بڑی کیل کے ساتھ دیوار میں ٹھونک دیا گیا تھا چنانچہ میں بیٹھ تو سکتی تھی لیکن کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر بھی میں کتنی دیر بیٹھی رہتی۔ میری کمر اور ٹانگیں جب درد کرنے لگتے تھے اور جسمانی ہمت جواب دے جاتی تھی تو میں خود ہی فرش پر گر پڑتی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا یہ عذاب کب تک چلے گا۔ لیکن میں تہیہ کر چکی تھی کہ ان حالات میں پیڈرو کے ساتھ زندگی گزارنے کے بجائے مر جانا بہتر ہے۔ لگتا ہے دو تین دن میں میری حالت اور بگڑ گئی۔ مجھے خیالی شکلیں نظر آنے لگیں۔ خیالات کے نقش آسیب بن کر سامنے آنے لگے اور میرا ذہنی توازن بگڑنے لگا۔ مجھے وہ نظر آتا تھا جو نہیں تھا اور جو سامنے تھا وہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ شاید وہ چوہے۔ اب وہ بے باکی سے میرے اردگرد رہتے اور میرے بدن پر سے گزرتے تھے اور جس چوہے نے مجھے کاٹا تھا اسے انسانی گوشت کے مزے نے آدم خور بنا دیا تھا۔ وہ کئی جگہ سے میرا گوشت نوچ کے چکھ چکا تھا اور میرے جسم پر جگہ جگہ زخم تھے جن سے بہنے والا خون جم گیا تھا۔ اس وقت میری سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ میں مر جاؤں۔ جلد از جلد یہ عذاب ختم ہو جائے۔ لیکن پیڈرو پھر آ گیا۔ اس بار وہ اکیلا نہیں تھا۔ وہ میری ماں کو بھی لے آیا تھا۔ اس نے کھانے پینے کا اور مرہم پٹی کا سامان، دوائیں، پانی کی ایک بالٹی اور صاف کپڑے رکھ دیے اور مجھے آزاد کر دیا۔ میری ماں کی حالت بھی اچھی نہیں تھی لیکن مجھے دیکھ کر وہ پاگل ہو گئی۔ اس نے مجھے بہت پیار کیا اور گلے لگا کر زار و قطار رونے لگی۔ میں رو بھی نہ سکی۔

"دیکھ لو تم بھی۔" پیڈرو کچھ دیر یہ جذباتی اور بے رحمی سے تماشا دیکھنے کے بعد بولا۔ "اپنی بیٹی کو سمجھا لو۔ یہ عورت ذات ہے اور بھگت چکی ہے۔ ورنہ چیونٹی کی طرح مسل دوں گا۔ بڑے بڑے کانپتے ہیں میرے نام سے۔ یہ کیا مقابلہ کرے گی۔"

"میں سمجھا لوں گی بیٹا۔" میری ماں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہو گا۔"

"میں کل آؤں گا۔" وہ بولا۔ "آخری بار اس کا دماغ درست ہو گیا تو ٹھیک ورنہ مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا۔"

جب وہ چلا گیا تو ماں نے میرے غلیظ جسم کو ٹھنڈے پانی سے صاف کیا۔ میرا لباس بدلا اور مجھے کھانا کھلایا۔ بھوک کی مار بڑی سفاک ہوتی ہے۔ تم نے سنا ہو گا کہ بنگال میں قحط پڑا تھا تو عورتوں نے مٹھی بھر چاول کے لیے اولاد تک کو بیچ دیا تھا —— مجھے کھانا دیکھ کر میری ماں پھر پاگل ہو گئی۔ مار مار کے رونے لگی۔ میں بالکل کسی جانور کی طرح کھانا نگل رہی تھی اور میری وہ ذہنی حالت کسی ذہنی مریض سے کم خراب نہ تھی۔ کھانے کے بعد مجھے ماں نے دوا دی اور جب میں سو گئی تو میرے زخموں کو آنسوؤں سے دھو دھو کر ان پر مرہم لگاتی رہی۔ میں بارہ گھنٹے بعد سو کر اٹھی تو صرف جسمانی کمزوری رہ گئی تھی۔ ذہنی طور پر میری حالت میں حیرت انگیز افاقہ ہوا تھا اور میں صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھنے اور سمجھانے کے قابل ہو گئی تھی۔ میں نے ماں کو وہ سب کچھ بتا دیا جو مجھے پیٹر سے معلوم ہوا تھا اور وہ بھی جو مجھے پہلے سے معلوم ہو چکا تھا۔ میں نے ماں کو اس فیصلے سے بھی مطلع کر دیا کہ اب کچھ بھی ہو جائے میں پیڈرو کے ساتھ نہیں رہوں گی اور ماں نے بڑی مستقل مزاجی، صبر اور حوصلے کے ساتھ اس فیصلے کی تائید کی۔

اگلے دن پیڈرو آیا تو ہم نے اُسے بتا دیا کہ نہ ہمیں ذلت و رسوائی کا خوف ہے اور نہ موت کا۔

"تم دونوں کی عقل خراب ہو گئی ہے۔" وہ بولا۔ "میں تم سے کچھ مانگ تو نہیں رہا ہوں۔ اس سے پہلے بھی میں نے تمہیں بہت کچھ دیا ہے اور آئندہ بھی دیتا رہوں گا۔ تمہیں خاموش بیٹھنے کے سوا کیا کرنا ہے۔ عیش سے جیو۔"

"میری ممتا کا خون کر کے اور میرے اندر کی عورت کو مار کے کہتے ہو عیش سے جیو۔" میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ "اپنی اولاد کو قتل کیا ہے تم نے۔ غنڈے — بدمعاش — بلیک میلر۔"

"میری بیٹی سچ کہہ رہی ہے۔" میری ماں نے کہا۔

"زہر دے دے یا خود پھانسی پر لٹکا دے۔ ہمیں کسی پولیس کی دھمکی سے نہیں ڈرا سکتا اب۔ جا کر اسے رپورٹ لکھوا دے۔ میں لکھ کر دیتی ہوں کہ میں نے اپنے شرابی اور بدکردار شوہر کو زہر دے کر مارا تھا۔"

پیڈرو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے میری ماں کو ہتھکڑی لگا کے بٹھا دیا اور مجھے چمڑے کے ہنٹر سے اتنا مارا کہ کپڑے ہی نہیں میری کھال تک پھٹ گئی۔ چیخ چیخ کر میری ماں پاگل ہو گئی اور دیوار سے سر ٹکرانے لگی۔ مجھے ہوش آیا تو نقشہ بدلا ہوا تھا۔ میں اپنے بیڈ روم میں صاف ستھرے کپڑے پہنے لیٹی تھی اور پیڈرو کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

"میری ماں کہاں ہے؟" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم نہیں۔" پیڈرو مسکرایا۔ "بوڑھی اور بیچاری ہے۔" وہ

www.paksociety.com

طلاق میں ابھی مر جائے گی۔ تم نے تو دیکھے ہیں وہ چوہے جو اس کا گوشت کھا گئے۔ میں نے ان کو بڑی محنت سے پالا ہے۔ وہ عام چوہے نہیں ہیں۔ آدمی کا گوشت انھیں بہت مرغوب ہے۔"

میں چیختی چلاتی باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ پیڈرو نے میرا راستہ روکنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ لیکن کچن سے نیچے جانے والے زینے کا دروازہ مقفل تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگا کے سنا۔ چوہوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں مگر اس کے ساتھ ایک اور آواز بھی تھی جیسے کوئی نزع کے کرب میں کراہ رہا ہو۔ یہ میری ماں کی آواز تھی۔ میں نے دروازے پر ٹکریں ماریں اور ماں کو آوازیں دیں۔ میری آنکھیں ایک بھیانک منظر دیکھ رہی تھیں کہ وہ بے ہوش پڑی ہے اور چوہے اس کے جسم پر چڑھے ہوئے اپنے نکیلے دانتوں سے ہڈیوں پر سے بوٹی بوٹی کھال اتارتے جا رہے ہیں۔ میں نے دروازہ توڑنے کے لیے اس پر ہر چیز ماری جو میرے ہاتھ میں آئی مگر وہ اتنی آسانی سے ٹوٹنے والا دروازہ نہیں تھا۔

میں چیختی چلاتی باہر جانے کے لیے کچن کی کھڑکی سے کود گئی۔ پیڈرو کے مکان کے چاروں طرف کھلی جگہ ہے۔ پیچھے ایک سرونٹ کوارٹر ہے، گیراج ہے اور خوب صورت ویلی ہے۔ دائیں اور بائیں طرف درخت ہیں اور پھولوں کے پودے ہیں اور سامنے لان ہے۔ بدقسمتی سے اس کوٹھی کے ساتھ والا پلاٹ خالی پڑا ہے اور بائیں طرف ایک انجینئر رہتا ہے جس کی بیوی مر چکی ہے اور وہ بہرا ہے۔ اس کے باوجود مجھے امید تھی کہ شاید کسی کو مدد کے لیے بلا لاؤں گی لیکن میرے باہر آتے ہی ایک سیٹی سی سنائی دی اور دائیں طرف سے خوں خوار شکل والے کتے جھپٹتے ہوئے پہنچے۔ میں دوڑ کر واپس کھڑکی کے راستے کچن میں پہنچ گئی۔ پیڈرو قہقہہ لگا کے ہنسا تو میں سمجھ گئی کہ سیٹی اسی نے بجائی تھی۔ میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ میں زار و قطار روتی ہوئی اس کے قدموں میں گر گئی۔ "چھوڑ دو اسے، بند کر دو مجھے اس کی جگہ۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔" وہ بولا۔ "تمھاری اگر یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔" اس نے جیب سے چابی نکال کے دروازہ کھولا اور میں دیوانہ وار نیچے بھاگی۔ میری ماں ہوش میں تھی لیکن چوہے اس کے آس پاس مردار خور گدھ کی طرح آس لگائے بیٹھے تھے۔

"اس کی کوئی بات مت ماننا بیٹی۔" میری ماں نے کہا۔ "مجھے یہ سزا منظور ہے۔" اس نے ہاتھ سے سینے پر صلیب بنائی۔

"نہیں ماں۔" میں نے روتے روتے کہا۔ "میں تمھیں اس طرح نہیں مرنے دوں گی۔" پیڈرو نے چابی میری طرف بڑھائی اور خباثت سے مسکرایا۔ میں نے ماں کی ہتھکڑی کھول دی اور خود اس کی جگہ بیٹھ گئی۔

"اب تم مجھے یہاں چھوڑ کے جا سکتے ہو۔ دوبارہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ میری ماں بہت چیخی چلائی۔ اس نے پیڈرو کے علاوہ مجھے بھی گالیاں دیں کہ میں نے اس کی بات نہیں مانی لیکن پیڈرو اسے کھینچ کے لے گیا۔

"ماں بیٹی دونوں کو شوق ہے مرنے کا۔" وہ بولا۔ "تو اذیت سے مرو۔ ایک دوسرے کی موت کا نظارہ کر کے مرو۔" دروازہ بند ہو گیا۔ میری ماں کی چیخیں بہت دیر تک سنائی دیتی رہیں۔ میں نے دل پر پتھر رکھ لیا کہ مقدر یہی تھا۔ میرے بعد صدمے اور بیماری سے ماں بھی مر جائے گی لیکن اس کی موت میری طرح پُرعذاب تو نہیں ہوگی۔ پیڈرو اسے گھر سے باہر نہیں جانے دے گا لیکن گھر کے اندر رہ کر بھی وہ زیادہ آسانی سے اطمینان اور کسی تکلیف کے بغیر مرنے کی کوئی صورت نکال لے گی۔ یہ جرم میرا تھا۔ میں نے پیڈرو سے شادی کی۔ مجھے اسی وقت پیٹر کے ساتھ چلی جانا چاہیے تھا۔ جب وہ میری ماں کو بلیک میل کر رہا تھا لیکن ماں نے غریب پیٹر کی محبت کو چھوڑ کر دولت کو ترجیح دی تھی۔ میں اپنے ساتھ ماں کو بھی لے جا سکتی تھی اور ہم کہیں بھی گمنامی کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اس نے ہماری کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ باپ نے ہمیں بے گھر کر دیا تھا اور ہم سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ پیڈرو نے ہمیں پھر اسی گھر میں آباد کیا اور وہ سکھ دیا جو کبھی میری ماں کا خواب ہوگا۔ پھر میری حسرت بن گیا تھا۔ اس کا رویہ شریفانہ تھا اور میری رضامندی کے بعد اس نے کوئی بھی ناجائز مطالبہ نہیں کیا تھا۔ یہی سچ ہے کہ پیڈرو بھی مجھ سے محبت کرتا تھا اور صرف مجھ سے شادی کرنے کے لیے اس نے بلیک میلنگ کا سہارا لیا تھا کیونکہ وہ کسی قیمت پر مجھے کھونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کسی بھی لڑکی کے لیے یہ بڑا کٹھن مرحلہ بن جاتا ہے کہ وہ ماں کی عزت آبرو اور اپنی خوشی میں سے کس کا انتخاب کرے۔ مجبوری میں یہ سودا بہرحال برا نہ تھا۔ پیٹر سے مجھے صرف محبت ملتی۔ پیڈرو سے محبت کے ساتھ دولت بھی مل گئی۔ خود میری ماں کے لیے اپنے باپ کے گھر میں واپس جانا ایک ایسی تمنا تھی جس کے پورا ہونے کی کوئی امید نہ تھی لیکن زندگی کے دن بہت تھوڑے رہ گئے تھے۔ پیڈرو نے مکان دگنی قیمت پر خرید کے ناممکن کو ممکن کر دیا۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس نے میری ماں سے اس کی دُگنی قیمت کیسے وصول کی۔ میری ماں چپکے چپکے اسپتال سے خطرناک قسم کی دوائیں لا کر دیتی رہی۔ پیڈرو نے کبھی نہیں بتایا کہ وہ ان کا استعمال کہاں کرتا ہے۔

بدقسمتی سے پیٹر اسی دن ایک وکیل کے ساتھ آ پہنچا۔ پیڈرو نے اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر وکیل اڑ گیا کہ میں اپنی موکلہ سے ملے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ مجھے وکالت نامے پر اس کے دستخط چاہئیں کیونکہ وہ طلاق چاہتی ہے اور اگر وہ قتل ہو گئی تو مجھے پولیس کے پاس جانا پڑے گا کہ تم نے اُسے غائب کر دیا ہے یا قتل کر دیا ہے اور پولیس خود آ کے برآمد نہ کر سکی تو عدالت تمھیں اس کا پابند کر سکے گی کہ اپنی بیوی کو حاضر کرو یا اس کے بارے میں بتاؤ کہ وہ کہاں ہے۔ پیڈرو مجبور ہو گیا اور انھیں اندر لے آیا۔ میری ماں نے وکیل کو سب کچھ بتا دیا اور پیڈرو نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے مجھے بھی وکیل کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے میری بھی سنی اور میں نے ساری تفصیل اسے اپنے ساتھ ہونے والے مظالم کی بابت بتا دی۔ جب تک میں بول رہی تھی وہ بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ بیٹھا رہا۔ وکیل سخت برافروختہ تھا کہ یہ انتہائی انسانیت سوز اور سنگین جرائم ہیں جن پر سخت سزا ہو سکتی ہے۔

"ٹھیک ہے وکیل صاحب۔" پیڈرو بولا۔ "میں اپنی ہر غلطی کا اعتراف کرتا ہوں۔ آپ جیسا بھی سمجھتے ہوں لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ بلاوجہ پریشانی رسوائی اور اس کی ماں کے لیے بھی پیدا ہوگی۔ تھانے کچہری تک بات جائے گی تو اخبارات میں بھی آ سکتی ہے۔ کیوں نہ گھر کا معاملہ گھر میں ہی طے کر لیا جائے۔ ابھی آپ کی موجودگی میں ہم طلاق کا مسئلہ حل کیے لیتے ہیں۔"

"اور جو ذہنی اور جسمانی اذیت آپ نے روبی کو اور اس کی ماں کو دی۔" وکیل بولا۔ "اس کی تلافی کیسے ہوگی؟"

"وہ تو میں پہلے ہی بہت کچھ کر چکا ہوں۔" وہ بولا۔ "لیکن اب بھی میں ہرجانہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جتنی رقم چاہیے بتا دیں۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تم اپنا دیا بھی واپس لے سکتے ہو۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "بس مجھے اور میری ماں کو جانے دو۔"

"یہ جذباتی ہو رہی ہے وکیل صاحب۔" پیڈرو نے کہا۔ "آپ ذرا میرے ساتھ آئیے باہر۔ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہوگا۔" یہ اس کی چال تھی۔ وہ وکیل کو باہر لے گیا اور نہ جانے اس سے کیا بات کی یا وکیل کو کتنی بڑی رشوت دی کہ اس نے اپنا منہ بند رکھنا منظور کر لیا۔ واپس آ کے اس نے کہا کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے ہیں اور آئندہ کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہماری سابقہ تکالیف کا ازالہ ہو جائے گا اور پیڈرو سے قانونی طور پر علیحدگی بھی ہو جائے گی۔ جب وہ رخصت ہو گیا تو پیٹر نے کہا۔ "میں روبی کو اور اس کی ماں کو ساتھ لے جاؤں گا۔ یہاں میں انھیں محفوظ نہیں سمجھتا۔"

پیڈرو ہنسا۔ "تم خود جاؤ گے تو انھیں لے جاؤ گے بھی۔"

"کیا مطلب؟" پیٹر نے کھڑے ہو کر کہا۔ جسمانی قد و قامت میں وہ پیڈرو سے کم نہیں تھا۔

"مطلب یہ کہ آنا ہمیشہ اپنی مرضی سے ہوتا ہے۔" پیڈرو نے کہا۔ "جانا دوسرے کی مرضی سے۔ یہ تمھیں اس گھر میں قدم رکھنے سے پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا۔" خطرے کی بو میں نے اس کے لہجے سے سونگھ لی تھی لیکن میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" پیٹر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "تم میرا راستہ روک سکتے ہو؟"

"ہاں۔ میں بھی روک سکتا ہوں۔" پیڈرو نے اس کو نظروں سے ناپ کر کہا۔ "لیکن جو کام ملازم کر سکتے ہوں وہ میں خود نہیں کرتا۔"

"میرا وکیل جانتا ہے کہ میں یہاں ہوں۔" پیٹر نے دھمکی دینے کے انداز میں کہا۔

"لیکن وہ عقل مند آدمی تھا۔ سودا کر کے فائدے میں رہا اور خاموشی سے چلا گیا۔" پیڈرو بولا۔ "اب تم اس سے بات کر کے دیکھو وہ تمھیں پہچانے گا بھی نہیں۔ یہ ماننا تو دور کی بات ہے کہ وہ تمھارے ساتھ یہاں آیا تھا۔"

"اگر اس ضمیر فروش کو تم نے اپنے جرائم کی کمائی سے خرید لیا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" پیٹر نے بڑی سختی سے کہا۔ "میں دوسرا وکیل تلاش کر لوں گا۔ ہر وکیل ایسا نہیں ہوتا۔ تم کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ پیڈرو اطمینان سے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا رہا اور مسکراتا رہا۔ پھر اس نے کھڑکی سے منہ نکال کے سیٹی بجائی۔ باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ دو منٹ بعد پیٹر دروازے سے ٹکرایا اور اندر آ گرا۔ دو جرمن نسل کے شیپرڈ کتے اس کے اوپر چڑھے اور بھونکے۔ اس نے اپنا بریف کیس گھمایا اور ایک کتے کو لات ماری لیکن وہ بہت طاقت ور اور انتہائی خوں آشام کتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پیٹر کے جسم کو چیر پھاڑ کے کھا جائیں گے۔ میری ماں خوف سے بے ہوش ہو گئی اور میں نے ایک چیخ ماری۔ پیٹر بڑی بے جگری سے لڑ رہا تھا لیکن صاف ظاہر تھا کہ ایک شریف آدمی دو وحشی کتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

"عنایت۔ خدا کے لیے بس کرو۔" میں نے دوڑ کے پیڈرو کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں، پھر کبھی تم سے طلاق کی بات نہیں کروں گی۔ جیسا تم کہو گے ویسا ہی کروں گی۔"

"اچھا۔" پیڈرو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "یہ بات بعد میں بھول مت جانا۔" اس نے دوبارہ سیٹی بجائی اور دونوں کتے ایک دم خاموش ہو کے پیچھے ہٹ گئے اور اس کے پاس آ کے دم ہلانے لگے۔

"شاباش۔" اس نے دونوں کے سر پر تھپکی دی۔ "اب جاؤ۔" کتے

www.paksociety.com

چھلانگیں مارتے دروازے سے نکل گئے۔ پیٹر بڑی مشکل سے کھڑا ہوا۔ میں نے اسے سہارا دیا اور صوفے پر بٹھا دیا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ چہرے اور بازوؤں پر گہری خراشیں آئی تھیں جن سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک کتے نے اس کی ٹانگ کو دانتوں میں دبا لیا تھا اور ٹخنے کے اوپر جہاں اس نے دانت گاڑے تھے زخم کے نشانات زیادہ گہرے تھے۔ میں دوڑ کر اندر گئی اور اس کے لیے ایک گلاس پانی لے کر آئی۔ پانی پی کر اس کے اوسان کچھ بحال ہوئے۔

"میرے وکیل کیسے ہیں ہیرو؟" پیڈرو بولا۔ "تمہارے وکیل سے تو زیادہ ہی وفادار ثابت ہوئے؟"

"تم... تم رک نہیں سکتے شیطان کی اولاد!" پیٹر نے غصے میں کانپتے ہوئے کہا۔ "ایک نہ ایک دن تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ تمہارے یہ بھائی بند تمہارے کام نہیں آئیں گے۔" اس کا اشارہ کتوں کی طرف تھا۔

پیڈرو نے اس کے پیٹ پر لات ماری۔ کھڑے کھڑے اس نے اتنی تیزی سے لات گھمائی کہ پیٹر خود کو بچانے کے لیے حرکت بھی نہ کر سکا۔ پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے اڑ کر دور گیا اور وہ خود صوفے سے فرش پر گر گیا۔ پیڈرو نے پے در پے اس کو ٹھوکریں ماریں۔ اس کی پسلیوں میں، سر پر اور کمر پر۔ میں نے مداخلت کی کوشش کی تو اس نے ایک ہاتھ سے مجھے دھکا دیا اور میں دیوار سے اس طرح ٹکرائی کہ مجھے چکر آ گئے۔ ادھ کھلی آنکھوں سے میں نے دیکھا کہ پیڈرو وحشیوں کی طرح بے دردی کے ساتھ پیٹر کو بالوں سے پکڑ کے گھسیٹتا ہوا لے جا رہا ہے۔ وہ ضربات کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ اٹھنے کی کوشش میں دو بار گرنے کے بعد میں اس کے پیچھے بھاگی۔ اس وقت تک پیڈرو کچن سے گزر کے پیٹر کو تہ خانے میں لے جا چکا تھا۔ زینے کے قریب مجھے پھر چکر آیا اور سنبھلنے کی تمام جدوجہد رائیگاں گئی۔ میں اوپر سے نیچے تک لڑھکتی چلی گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے پیٹر کو اسی آہنی زنجیر سے بندھا ہوا دیکھا جس سے مجھے اور میری ماں کو اسیر رکھا گیا تھا۔ وہ زمین پر بے سدھ پڑا تھا اور وہی آدم خور چوہے اس کے اوپر کود رہے تھے۔ میں ایک چیخ مار کے اٹھی اور پیٹر کو پکارتی ہوئی بھاگی۔ خود میرے جسم پر گرنے سے شدید چوٹیں آئی تھیں۔ لیکن مجھے اس وقت اپنی تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ قریب جا کر دیکھنے پر مجھے وہ لمبے لمبے ابھرے ہوئے نیل دکھائی دیے جو پیٹر کے سارے جسم پر پھیلے ہوئے تھے۔ پیڈرو نے اسے جوتے کے ٹھڈے سے اتنا مارا تھا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گیا تھا۔ سوائے رونے کے میں اس کے لیے کیا کر سکتی تھی؟ ایک گھنٹے بعد پیڈرو پھر نمودار ہوا۔ ہنٹر اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ کچھ کہے بغیر وہ مجھ پر پل پڑا۔ میں چیختی چلاتی اس کے ہنٹر کی ضرب

سے بچنے کے لیے ادھر سے ادھر بھاگتی رہی مگر اس تہ خانے میں بھاگنے کی جگہ ہی کہاں تھی۔ ہنٹر مجھ پر مسلسل برستے رہے۔ ہر بار مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے انگارے سے میرے جسم پر ایک لکیر کھینچ دی ہے۔ بالآخر میں بے ہوش ہو کے گر پڑی۔

دوسری بار ہوش آنے پر میں نے خود کو لیٹے ہوئے پایا۔ اسی بیڈ پر میری ماں سکون سے سوتی پڑی تھی۔ میرا سارا جسم زخموں سے بھرا تھا اور میں ہاتھ لگانے سے ابھرے ہوئے نیل کو محسوس کر سکتی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ درد کا احساس یکسر مفقود تھا۔ پیڈرو نے یقیناً مجھے کوئی انتہائی موثر اور درد کے احساس کو ختم کر دینے والی دوا دی تھی۔ میرے کپڑے بدلے ہوئے تھے اور پیڈرو ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ آنسو خود بخود میری زبان بن گئے۔

"اس سے پہلے کہ تم پیٹر کے متعلق سوال کرو۔" وہ بولا۔ "میں خود ہی بتا رہا ہوں۔"

اس نے عمداً بات ادھوری چھوڑ دی اور میں نے دہشت سے چیخ کر کہا۔ "مار دیا اسے تم نے... کتے... بے رحم خون پینے والے... میں تیرا خون پی جاؤں گی۔" میں نے دیوانگی کی کیفیت میں اس پر حملہ کیا۔ اس نے سگریٹ پھینک کر میرے اٹھتے ہوئے ہاتھ کو کلائی سے پکڑ لیا اور بازو گھما کے میری کمر سے لگا دیا۔ میں بے بس ہو گئی۔ اگر ذرا بھی زور لگاتی تو بازو ٹوٹ جاتا۔

"وہ زندہ ہے۔" پیڈرو میرے کان میں بولا۔ "اور زندہ رہے گا لیکن اس کا انحصار تمہارے رویے پر ہے۔" اس نے مجھے آگے دھکیلا اور تہ خانے میں لے گیا۔ وہاں پیٹر صاف ستھرے کپڑے پہنے پٹی کے بجائے گدے پر لیٹا ہوا تھا۔ ہتھکڑی کا ایک ہاتھ بندھا تھا۔ اس کے قریب ہی کھانے کے برتن اور پانی کا گلاس موجود تھے لیکن اس نے کسی چیز کو چھوا تک نہیں تھا۔ لکڑی کی ایک ڈنڈی اس کے پاس رکھی تھی۔ جسے دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر وہ قریب آنے والے چوہوں کو بھگا سکتا تھا۔ وہ بے حد کمزور اور لاغر نظر آتا تھا۔ اس کا گندمی رنگ زرد ہو رہا تھا اور بڑھی ہوئی شیو کے باعث وہ قطعی جدا جدا نظر آتا تھا لیکن سب سے حیرت انگیز تبدیلی اس کے بالوں میں ہوئی تھی جو پہلے گھنے سیاہ تھے مگر اب بالکل سفید ہو چکے تھے۔ لگتا تھا جیسے میں پیٹر کو تیس چالیس سال کی نیند سے جاگنے کے بعد دیکھ رہی ہوں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مار کھانے کے بعد میں دو دن تک سوتی رہی اور اب درد کے احساس کا نہ ہونا بھی اسی کا نتیجہ تھا۔ صرف ان دو دنوں میں پیٹر کے بال سفید ہو چکے تھے۔

"پیٹر!" میں چلائی۔ "یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" اور اس کی طرف لپکی۔ مگر پیڈرو نے بال پکڑ کے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔

"یہ مت بھولو کہ تم میری بیوی ہو۔" پیڈرو بولا۔ "اور کوئی شوہر اتنا بے غیرت نہیں ہوتا کہ اپنی آنکھوں کے سامنے بیوی کو کسی غیر کے لیے مضطرب دیکھے۔"

"میری فکر مت کرو ڈیبی۔" پیٹر نے کہا۔ "اپنی جان بچاؤ۔ میں تو مر چکا ہوں۔"

"میں بھی زندہ نہیں رہ سکتی تمہارے بغیر۔" میں نے خون کے آنسو روتے ہوئے کہا۔ میں نرس تھی اور اسپتال میں ڈاکٹروں سے میں نے کئی بار سنا تھا کہ ذہنی صدمہ انتہائی شدید ہو تو بال راتوں رات سفید ہو جاتے ہیں اور ایسے کیس میڈیکل ہسٹری میں عام ہیں۔

"ہیرو اور ہیروئن کے ڈائیلاگ مجھے ایسے ہی لوگوں کو پسند آتے ہیں۔" پیڈرو ہنسا۔ "لیکن ایسی باتیں فلموں کی حد تک تو اچھی لگتی ہیں۔ عملی زندگی میں جھوٹ ثابت ہوتی ہیں۔ زندگی سے سب کو پیار ہوتا ہے۔ چار دن کھانے کو نہ ملے تو عشق محبت سب باتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مسٹر پیٹر کتوں سے مقابلہ ہی نہ کرتے خود کو ان کے آگے ڈال دیتے اور تم میرے پاؤں پکڑ کر وعدہ نہ کرتیں کہ جیسا میں چاہوں گا ویسا ہی کرو گی۔"

"تم کیا چاہتے ہو آخر؟" میں نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

"ادھر چلو۔ میں یہاں اس لیے لایا تھا تمہیں کہ تم پیٹر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔" پیڈرو نے کہا۔ "قید تنہائی کے سوا اس کو کوئی تکلیف نہیں۔ زندہ رہنے کے لیے کھانا بھی مل جاتا ہے اور ڈاکٹر ہیرو روز دیکھنے آتا ہے۔ اگر تمہارا رویہ درست رہا تو پیٹر کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ ورنہ یہ اسی تہ خانے میں سسک سسک کر اور تڑپ تڑپ کر بھوکا پیاسا مر جائے گا اور اس کی لاش کا گوشت بھی چوہے کھا جائیں گے تو ہڈیاں رہ جائیں گی۔ اس کے وجود کا سراغ تک نہیں ملے گا۔ یہ بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ پولیس سے یا کسی اور سے مدد حاصل کرنا بے سود ہوگا۔ سرچ وارنٹ کے بغیر پولیس یہاں قدم نہیں رکھ سکتی اور سرچ وارنٹ جاری ہونے سے بہت پہلے مجھے خود پولیس کے ذریعے اس کی اطلاع مل جائے گی۔ میں پیٹر کو ایسی جگہ شفٹ کر دوں گا جہاں تمہارے تصور کی رسائی بھی نہ ہوگی۔" اس نے کچھ پیپرز میری جانب رکھ دیے۔ "اپنا اور پیٹر کا مستقبل تمہارے ہاتھ میں ہے ڈیبی۔ اسی دنیا میں تم دونوں مل بھی سکتے ہو۔"

"میری خاطر اس کمینے سے کوئی سودا مت کرنا ڈیبی!" پیٹر چلایا۔ "کوئی فیصلہ ضمیر کے خلاف ہو۔"

پیڈرو نے رک کر سگریٹ اور ماچس اس کی طرف اچھال دی۔ "سلگاؤ، ٹینشن نہیں ہیرو۔"

"کھانا پینا مت چھوڑنا پیٹر۔ تمہیں میری قسم۔" میں نے جاتے جاتے کہا۔ "میں سب ٹھیک کر لوں گی۔"

"یہ تم نے کیا کیا؟" پیٹر نے کہا۔ "اپنی قسم کیوں دی مجھے۔ یہ ظلم کیوں کیا مجھ پر؟"

اوپر آنے کے بعد پیڈرو نے مجھے بتایا کہ یہ مکان واپس لینے سے پہلے اس نے ایک سودا میری ماں سے بھی کیا تھا اور اپنے مکان کے معاملے میں وہ اتنی جذباتی ہو گئی تھی کہ اس نے پیڈرو کی بات مان لی۔ وہ اسپتال کے اسٹور سے اور وارڈوں سے ہر قسم کے خطرناک انجکشن اور زہریلی دوائیں پیڈرو کو فراہم کرتی رہی۔ شرط کے مطابق اس نے کبھی پیڈرو سے سوال نہیں کیا کہ وہ ان کا کیا کرتا ہے۔ پیڈرو نے بتایا تھا کہ اس کا ایک سائنس دان دوست ہے جسے اپنی تحقیقات اور ریسرچ کے لیے ان دواؤں کی ضرورت پڑتی ہے لیکن یہ دوائیں بازار میں دستیاب نہیں۔ اب میری ماں نے نوکری چھوڑ دی تھی۔ تھا کہ یہی کام میں کروں۔ اسی لیے پیڈرو نے مجھ سے شادی کی تھی۔ مجھے نرس بننے کا موقع فراہم کیا تھا اور شادی کے بعد نوکری جاری رکھنے پر مجبور کیا تھا۔ میری ماں سکون کی نیند میں تھی۔ مجھے اس پر ترس بھی آیا اور غصہ بھی۔ جذباتی تعلق انسان کو کتنا مجبور اور بے بس کر دیتا ہے۔ اینٹ پتھر کے اس مکان کے لیے جو اس کے باپ کی نشانی تھا، میری ماں نے اپنے ضمیر کی آواز کو دبا دیا۔ ایک انتقامی خواہش سے مغلوب ہو کے اس نے اپنے شوہر کو مار دیا تھا۔ یہ دوسری انتقامی کارروائی ایک لاشعوری خواہش کا نتیجہ تھی۔ وہ مرنے والے کی روح کو بھی عذاب دینا چاہتی تھی کہ جس گھر کو اس نے شراب اور جوئے کی نذر کر دیا تھا وہ اسے واپس مل گیا ہے۔ اس کے لیے میری ماں نے بہت بھاری قیمت ادا کی۔ اس نے بہت گھاٹے کا سودا کیا تھا۔ یہ بات اس نے مجھ سے کبھی چھپائی لیکن اسے اپنے ضمیر کی خلش اس کا آزار بن گئی۔ ایک مکان کے بدلے اس نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ اپنی عزت نفس، اپنی عاقبت، اپنی بیٹی کی خوشی اور اس کا مستقبل۔ وہ تہ رہنے والے کیا فٹ پاتھ پر نہیں رہتے؟ عورتیں کیا تنگی میں خوش نہیں رہتیں اور کیا وہ محل کے بدلے اپنی عاقبت و آزادی کا سودا کرتی ہیں؟

اس جال میں اب میں گرفتار تھی اور ہر طرف سے زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ایک زنجیر میری اپنی زندگی تھی۔ دوسری ماں کا بڑھاپا اور بیماری۔ اور تیسری پیٹر کی محبت۔ میں اپنی ماں سے زیادہ مجبور تھی۔

"اگر تم نے ایک سال تک میرا حکم مانا اور کوئی غلط حرکت نہ کی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں طلاق دے دوں گا اور پیٹر کو آزاد کر دوں گا۔" پیڈرو نے کہا۔ "اس عرصے میں تمہیں پیٹر سے ملنے کی آزادی ہوگی۔ تم اس کے آرام کا اور اس کی صحت کا خود خیال

www.paksociety.com

سکتا چاہو تب بھی مجھے اعتراض نہیں۔ اس کو کھانا اور دوا کھلانا اور اُسے ہر آسائش فراہم کرنا تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی تو تم سب کچھ کر سکو گی۔ سوائے اس زنجیر کے جو پیٹر کے ہاتھ میں پڑی رہے گی۔ وہ کسی طرح بھی قید کی تکلیف نہیں اٹھائے گا۔ تم اُسے جو چاہو گی فراہم کر سکو گی۔ مثلاً اخبار، رسالے، ریڈیو۔ لیکن یہ سب میری منظوری سے ہوگا۔ جب میں دیکھوں گا کہ تم اپنے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہی ہو تو میں رعایت دیتا جاؤں گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمہیں اخلاقی حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت ہوگی۔ نہیں۔ اس کی دیکھ بھال اور خاطر مدارات کا کام تم میری موجودگی میں کرو گی۔ بات صرف ایک سال کی ہے۔ باقی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق حاصل کرنا ہے تو یہ سودا کر لو۔"

سودا کرنا میرے اختیار کی بات ہی کہاں تھی۔ وہ سال بھر بعد بھی مکر جاتا تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ وعدے کا پاس تو وہ کرتے ہیں جن کا کوئی ایمان ہو۔ اصول ہو یا ضمیر۔ پیٹر بھی ایک اُمید موہوم پر جی رہا ہے۔ پیڈرو سے وعدہ کر لیا کہ میں اس کی مدد کروں گی۔ ایک مہینے تک اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اور میں پیٹر سے مل کے اسے تسلی دیتی رہی کہ وہ حوصلہ نہ ہارے۔ سال ختم ہوتے ہی ہم نکل جائیں گے۔ اپنا نام، شہر، مذہب سب بدل لیں گے تاکہ پھر کبھی یہ سفاک مجرم ہمیں تلاش نہ کر سکیں۔ وہ کہتا تھا کہ پیڈرو کی بات پہ اعتبار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی بچھو سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ڈنک نہیں مارے گا۔ اور حالات سال بھر بعد بھی یہی ہوں گے بلکہ بدتر۔ مگر میں نے پیٹر کو سمجھانا بجھانا جاری رکھا۔ ایک مہینے میں اس کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی۔ ہتھکڑی کی زنجیر تین فٹ سے زیادہ لمبی تھی چنانچہ وہ بیٹھ سکتا تھا۔ کھڑا ہو سکتا تھا اور ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے ہاتھ پیر ہلا کے ورزش کر سکتا تھا تاکہ جسم کے رگ پٹھے ناکارہ نہ ہو جائیں۔ پیڈرو نے اتنی رعایت اور دی تھی کہ ہر تیسرے دن ہتھکڑی کو دوسرے ہاتھ میں ڈال دیتا تھا۔ ایک مہینے بعد پیڈرو نے مجھے بتایا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا اور کیا نہیں کرنا ہوگا۔ وہ وہاں تک وہ مجھے تفصیلات بتاتا رہا اور دنیا دیکھنے کے لیے کھلا رہا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ میری عدم موجودگی میں پیٹر کا ویسے ہی خیال رکھا جائے گا جیسے میں رکھتی ہوں۔ تیسرے دن وہ مجھے یہاں لے آیا۔ ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے۔ باقی تم جانتے ہو۔"

میں بہت دیر تک کچھ کہے بغیر لفظوں سے خیال کے چہرے بناتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "میرا خیال ہے اب سڑک تک جانے میں کوئی ہرج نہیں۔ دو گھنٹے ہو گئے ہیں وہ لوگ مایوس ہو کے واپس جا چکے ہوں گے۔ تمہیں اس شہر کے محل وقوع کا علم ہے؟"

"پیدائش سے اب تک میں نے دوسرا شہر نہیں دیکھا۔" وہ بولی۔

"کیا... کیا اس کا مطلب ہے کہ پیٹر بھی یہیں ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ گھر کہاں ہے؟"

"چوک جی ہمالی روڈ سے لگے جو سڑک مسلم ہائی اسکول اور ہولی فیملی اسپتال کی طرف جاتی ہے۔" وہ بولی۔ "... پلازہ کے قریب میری ماں کا گھر ہے۔ وہ گھر جہاں پیٹر قید ہے چاند شاہ ہی ٹاؤن میں ہے۔ مری روڈ اور سید پور روڈ کے درمیان۔ تم کیسے وہاں کیسے جاؤ گے؟ پیڈرو اور ڈولا اور وہاں پہنچ چکے ہوں گے پولیس کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔"

میں کہتے کہتے رک گیا کہ اگر اپنا حقیقت ایسا ہی ہو تو پولیس بھی وہاں جا کے کیا کرے گی۔ کون ملے گا وہاں۔

"لاحول ولا قوۃ!" میں نے کہا۔ "یہ تم کو پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔ ہم نے دو گھنٹے ضائع کر دیے ہیں۔ یوں چھپے رہنے کے بجائے ہم سیدھے وہاں جاتے اور پیٹر کو نکالتے۔" میں نے اپنی جیب سے وہ چابی نکالی جو مجھے پیڈرو کی جامہ تلاشی کے دوران ملی تھی اور یا شاید اسی ہتھکڑی کی چابی تھی جس نے پیٹر کو اسیر کر رکھا تھا۔

"یہ... یہ کہاں سے ملی تمہیں؟" روبی نے چابی میرے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ "یہی تو ہے وہ چابی... چلو اب دیر مت کرو۔" وہ میرا بازو پکڑ کے کھینچنے لگی۔ میں نے خود کو سنبھالا۔ مجھے بیساکھی بغل میں دبا کے چلنے کی عادت کہاں تھی۔ میری دائیں بغل اس مشقت سے درد کرنے لگی تھی اور شانے کے ساتھ سینے کے پٹھے بھی اکڑنے لگے تھے۔ ننگے پاؤں چلنے سے میرے پیر زخمی ہو رہے تھے۔ کنکریوں کی رگڑ سے تلوے چھل رہے تھے تو کئی جگہ کانٹوں کے چبھ جانے سے خون بہنے لگا تھا۔ یہ صرف میری قوت ارادی تھی اور زندگی کے لیے جدوجہد کو جاری رکھنے کا عزم تھا جس نے مجھے سڑک پر پہنچنے میں مدد دی۔ اب میں نئے مخمصے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا اڑ کے پہنچ جاؤں اور انکل شیر والی کے آفس میں شملہ کے سامنے جا آتا۔ پھر ٹیلی فون کر کے رابعہ سے بات کروں اور محسن کے بارے میں پوچھوں۔ مگر اس عورت کو بھی بے آسرا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا جو صد درجہ مظلوم تھی۔

یہ سوال اپنی جگہ جواب طلب تھا کہ دوبارہ گرفتار ہونے سے بچ کر میں روبی کی کیسے مدد کر سکتا ہوں۔ اگر میں اس کے ساتھ جاتا تو کتنی آسانی اور بے بسی کے ساتھ پھر پیڈرو اور ڈولا کے جال میں پھنس جاتا جتنی آسانی سے چوہا پنجرے میں پھنستا ہے۔ اپنے ادھ ادھورے جسم کے ساتھ اور کسی ہتھیار کی عدم موجودگی میں ان کا اور میرا کیا مقابلہ۔ قدرت نے مجھے ایک موقع فراہم کیا تھا۔ اسے گنوانا خودکشی کے مترادف تھا۔ اگر میں روبی کے ساتھ پولیس اسٹیشن جاتا تب بھی گرفتار ہوتا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک مجھے مفرور مجرم قرار دیا جا چکا ہوگا اور میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہوگی جیسے ہی میں نے بتایا کہ میں کون ہوں، وہ مجھے حوالات میں بند کر دیتے اور اس کے بعد دلاور ہی کو سب کچھ کرنا ہوگا۔ حالات آسانی کے ساتھ خراب بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ قطعی ناممکن تھا کہ میں روبی کو اس کے محبوب پیٹر سے ملانے کے لیے ان سب سے جدا ہو جاؤں جن کو اب میں اپنے بہت قریب محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس زندان سے دوسری بار رہائی نصیب ہی نہ ہو۔ ہم اب سڑک کے کنارے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔

"دیکھو روبی!" میں نے کہا۔ "یہ تو ظاہر ہے کہ میں اور تم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم پھر پکڑے جائیں گے۔ بعض وجوہات کی بنا پر میں تمہارے ساتھ پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتا۔ مجھے گرفتاری کا ڈر ہے۔ اس لیے تم ہی ہمت کرو اور پولیس کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

"وہ اتنی آسانی سے تو میرے ساتھ نہیں چلے چلیں گے۔" روبی نے مایوسی سے کہا۔

"وہ ضرور جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم تھانے جاؤ۔ آدھے گھنٹے میں ان کو کسی اعلیٰ پولیس افسر کا فون موصول ہوگا۔"

"تم جانتے ہو کسی اعلیٰ پولیس افسر کو؟" وہ بولی۔ اسی وقت مجھے ایک ٹیکسی نظر آئی۔

"ہاں، براہ راست تو نہیں لیکن میں فون کرا دوں گا۔" میں نے کہا اور ٹیکسی کو روک لیا لیکن وہ متذبذب کھڑی رہی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے اور مجھے اسلام آباد پہنچنے کے لیے ٹیکسی کا کرایہ بہر حال ادا کرنا ہے۔

"روبی!" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہارے پاس سو روپے ہوں تو مجھے ادھار دے دو۔ شام کو اسی پولیس اسٹیشن پہنچا سکے ملے اچھا یا اپنا پتا چھوڑ دینا۔ میں خود پہنچا دوں گا۔"

"تمہیں جانا کہاں ہے؟" روبی نے اپنی جیب سے ایک رومال برآمد کیا جس میں نوٹ لپٹے ہوئے تھے۔ سو کا ایک بوسیدہ نوٹ اس نے میرے حوالے کیا۔ میں نے شکریہ ادا کر کے قدرے خفت کے ساتھ نوٹ لے لیا۔

"مجھے پہلے تو اسلام آباد جانا ہے، پھر لاہور۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں تمہاری مدد کے لیے ایس پی سی کو فون کرا کے جاؤں گا۔" ٹیکسی ڈرائیور اس بی بی کے حوالے پر با ادب ہوشیار ہو گیا اور ذرا اب تک وہ مجھے میری بیساکھی کو اور میرے گرد و غبار سے اَٹے ہوئے زخمی پیروں کو انتہائی مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"پھر تم کو دوسری ٹیکسی لے کر جانے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ بولی۔ "مجھے راستے میں پولیس اسٹیشن کے سامنے اتار دینا۔"

"اچھا۔" میں نے اس کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ٹیکسی روانہ ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ اس وقت آزاد ہونے کے باوجود میری حیثیت ایک مفرور مجرم سے زیادہ نہیں جس پر ایک نہیں تین افراد کے قتل کا الزام ہے۔ کیا ایسی صورت میں انکل شیر والی کے گھر جانا مناسب ہوگا؟ ممکن ہے پولیس وہاں پہلے سے موجود ہو۔ انکل رضوی جیسے فرض شناس افسر سے کچھ بعید نہیں کہ انھوں نے میرے سارے ٹھکانے بتا دیے ہوں۔ کیوں نہ میں پہلے رابعہ کو فون کر لوں؟

"روبی!" میں نے کہا۔ "یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں سے میں فون کر سکوں۔ تم تو یہاں کی رہنے والی ہو۔ بہت سے لوگ جانتے ہوں گے تمہیں؟"

"تم فون آفس سے کیوں نہیں کر لیتے۔ راستے میں آئے گا۔" وہ بولی۔

"وہ... دراصل... وہاں اور بھی لوگ ہوں گے..." میں نے کہا۔ "اور مجھے ایک پرائیویٹ بات کرنی ہے۔"

"اچھا تو یہاں توپ خانہ بازار میں ایک ڈاکٹر رہتے ہیں۔ اس وقت وہ ڈیوٹی پہ ہوں گے۔" وہ بولی۔ "لیکن ان کی ماں مجھے جانتی ہے۔" اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو بائیں طرف ایک تنگ سی سڑک پہ مڑنے کا اشارہ کیا۔

پانچ منٹ بعد میں اس نامعلوم ڈاکٹر کے ڈرائنگ روم میں اکیلا بیٹھا رابعہ کا ٹیلی فون نمبر ملا رہا تھا۔ روبی اندر ڈاکٹر کی ماں سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ گھنٹی بج رہی تھی اور میرے دل کی دھڑکن میرے سینے سے باہر بھٹکنے لگی تھی۔ ریسیور میرے ہاتھ کی گرفت میں کانپ رہا تھا۔ بالآخر کسی نے ریسیور اٹھایا اور میں نے رابعہ کی آواز سنی۔ "ہیلو۔"

میرے دل نے سینے کے اندر قلابازی کھائی اور الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔ کچھ دیر میں بول ہی نہ سکا۔

"ہیلو۔ کون ہے؟" رابعہ کی آواز پھر آئی۔ "کس سے بات کرنی ہے؟"

"رابعہ۔" میرے حلق سے بڑی عجیب غریب آواز نکلی جو بالکل اجنبی لگتی تھی۔ خود میرے کانوں کو بھی۔

"کون صاحب بول رہے ہیں آپ؟" رابعہ نے کہا اور میں نے

www.paksociety.com

اس کی آواز میں بھی سی لرزش کو محسوس کیا۔

"میں سکندر بول رہا ہوں رابعہ۔" میں نے بالآخر اپنی آواز پر قابو پالیا۔

"تم... راسکندر ——— جیجو ——— رابعہ ——— میں سکندر بول رہا ہوں۔"

"جھوٹ۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔" وہ ہسٹریائی لہجے میں کانپتے ہوئے بولی۔ "تم کوئی اور ہو۔ ابھی جب میں یقین کرلوں گی تو تم غائب ہو جاؤ گے۔ دھوکے باز۔ تم نے میری آنکھوں کو۔ میرے کانوں کو ——— مجھے کئی بار ایسے دھوکے دیے ہیں۔"

"مگر یہ دھوکا نہیں ہے جانم۔" میں نے کہا۔ "میں ایک ڈاکٹر کے گھر سے بول رہا ہوں۔ یہاں راولپنڈی سے۔ تم تصدیق کرسکتی ہو۔ میں فون بند کر دیتا ہوں تم یہ نمبر ملاؤ۔" میں نے اُسے فون پر لکھا ہوا نمبر بتایا۔

"کیا کروں گی تصدیق کر کے؟" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ "تم اتنی دور ہو۔"

"میں شام تک پہنچ جاؤں گا۔ سنا تم نے۔" میں نے اُسے تسلی دینے کی کوشش میں اپنے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکا۔

"اس کے بعد کیا ہوگا؟ تم پھر کوئی مسخرہ کرنے نکل جاؤ گے۔ پھر چھوڑ جاؤ گے مجھے اپنی تنہائی کے جہنم میں۔" وہ اسی طرح روتی رہی۔ "میں پاگل ہوں کہ تم سے گلہ کر رہی ہوں۔ سارا قصور تو میرے نصیب کا ہے۔"

"رابعہ۔" میں نے کہا۔ "حوصلے سے کام لو۔ میں تو سمجھتا تھا تم بہت بہادر ہو۔ اتنی بڑی وکیل..."

"نہیں ہوں میں وکیل۔" وہ چلائی۔ "میں صرف رابعہ ہوں۔ اس سے زیادہ میں کچھ بننا بھی نہیں چاہتی۔ مت دو مجھے بہادر ہونے کا الزام۔ میں انتہائی کمزور اور بزدل عورت ہوں۔ بالکل حوصلہ نہیں ہے مجھ میں دکھ اٹھانے کا۔"

"اچھا دیکھو۔ میں جانتا ہوں کہ میری گرفتاری کے وارنٹ نکل چکے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "انکل رضوی کو معلوم ہوا تو وہ مجھے فوراً گرفتار کرلیں گے۔ میں صرف تم سے ملنے آؤں گا۔ دس بجے کے بعد کھڑکی کھلی رکھنا۔ سن رہی ہو نا۔ محسن کے سوا یہ بات کسی کو مت بتانا۔ جیجو۔ جیجو رابعہ۔ محسن کے بارے میں یہ بات غلط ہے نا کہ وہ مر گیا..."

لیکن لائن کٹ گئی تھی۔ نہ جانے کب۔ مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ رابعہ نے میری کتنی بات سنی اور کتنی نہیں سنی۔ میں نے دوبارہ کوشش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ فون اچانک ڈیڈ ہو گیا ہے۔ اب میں انکل شیرازی کے گھر بھی فون نہیں کر سکتا تھا۔

بوجھل دل کے ساتھ بادلِ ناخواستہ میں روبی کے ساتھ باہر آیا اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ مصروف پرہجوم بازاروں سے نکلنے کے بعد تمدن سے عاری آبادیوں کا علاقہ آگیا۔ پھر سٹلائٹ ٹاؤن کا وہ علاقہ شروع ہوا جو پوری طرح آباد تھا۔ روبی کی ہدایات کے مطابق ٹیکسی مختلف موڑ کاٹتی ہوئی بالآخر ایک کنال پر بنی ہوئی کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ اس علاقے میں خالی پلاٹ کافی تھے۔

"جاؤ۔" میں نے روبی کی طرف دیکھ کر حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "گڈ لک۔ پانچ دس منٹ تک میں یہیں ہوں۔ جاؤ۔"

"صاحب جی۔ ہم اتنا انتظار نہیں کر سکتے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے لجاجت سے کہا۔ "دھندے کا ٹائم ہے۔"

میں نے سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ سب کافی ہے تمھارے قیمتی وقت کے لیے؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ اس نے نوٹ لے لیا اور انجن بند کر کے بیٹھ گیا۔ روبی نیچے اتری اور وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اندر گئی۔ اندر داخل ہونے سے قبل اس نے آخری بار پلٹ کے دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ میں نے ہاتھ ہلا کے جواب دیا اور رسٹ واچ پر لگی ہوئی گھڑی کو دیکھا۔ دو بج کر پانچ منٹ ہو گئے تھے۔

"ہو سکتا ہے مجھے ایک دم روانہ ہونا پڑے۔" میں نے کہا۔ "انجن اسٹارٹ رکھو۔ جیسے ہی میں اشارہ کروں گولی کی طرح نکل جانا سیدھے اسلام آباد کی طرف۔"

"یہ کیا چکر ہے سر؟" وہ انجن اسٹارٹ کیے بغیر بولا۔ "کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟ انجن اسٹارٹ ہو جائے گا۔"

"نہیں۔ تمھارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے اطمینان سے کہا اور گھڑی کو دیکھا۔ دو منٹ ہو چکے تھے۔ میری نگاہ اندر ہی کہیں رہ پاؤں دیوار سے کسی کی جھلک بھی دکھائی دے تو ڈرائیور کو سگنل دے دوں۔ ڈائل پر رینگتی ہوئی گھڑی کی سوئی نے ایک اور چکر پورا کر لیا۔ تین منٹ۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اچانک اندر سے ایک خوفناک چیخ سنائی دی۔ پھر دروازہ جس سے روبی اندر گئی تھی پورا کھل گیا اور چیختی ہوئی روبی نمودار ہوئی۔

"چلو۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "جلدی کرو۔" مجھے یقین تھا کہ روبی کے تعاقب میں یقیناً شکاری ہوں گے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے عجلت میں چابی گھمائی۔ انجن ایک بار غرایا اور رک گیا۔ اس نے دوسری کوشش کی۔

"الو کے پٹھے۔ اسی لیے کہا تھا میں نے تم سے کہ انجن سٹارٹ کرو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ روبی پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی بھاگتی چلی آ رہی تھی۔ دہشت زدہ اور سراسیمہ۔ کسی آسیب زدہ کی طرح۔

"پتا نہیں کیا ہو گیا ہے سر۔" ڈرائیور سہم کر بولا۔ "ابھی تو ٹھیک اسٹارٹ ہے۔ پٹرول نہیں ہے شاید۔" اس کا خیال صحیح تھا۔ فیول میٹر کی سوئی ای کے نشان سے بھی نیچے چلی گئی تھی۔ میں نے اس وقت کو کوسا جب میں نے جلدی کے جلد...

مغلوب ہو کے روبی کے ساتھ آنا منظور کر لیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ وہ بھاگتی ہوئی دروازے تک آ گئی ہے لیکن ابھی تک کوئی شکاری کتا اس کمزور ہرنی کو دبوچنے کے لیے نہیں نکلا ہے۔ اسی وقت ٹیکسی کے انجن میں جان پڑ گئی۔

"اب کہاں سے آ گیا پٹرول؟" میں نے کہا۔ "تم نے تو مجھے مروا دیا تھا۔" فیول میٹر کی سوئی بدستور وہیں تھی۔

"اس کا میٹر ٹھیک نہیں ہے صاحب۔" وہ بولا۔ "دھوکا ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔" ٹیکسی نے حرکت کی۔

"ٹھہرو۔" روبی ہاتھ ہلا کے چلائی۔ ٹھوکر کھا کے گری اور پھر اٹھ کے دوڑنے لگی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کے شانے پر تھپکی دی اور راستے رکنے کا اشارہ کیا۔ اب جو ہو سو ہو۔ میں ایک عورت کو مصیبت میں مدد کے لیے پکارتا چھوڑ کے بزدلوں کی طرح بھاگ نہیں سکتا تھا۔ میں نیچے اترا ہی تھا کہ روبی نے میرا بازو اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں کس لیا۔ اس کے ہاتھ کنکروں کی رگڑ سے چھل گئے تھے اور بہنے والا خون میری آستین کو داغدار کر رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح مجھے کھینچنے لگی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شدتِ جذبات نے اس کو قوتِ گویائی سے محروم کر دیا تھا۔ وہ مسلسل ہچکیاں لے رہی تھی۔

"کیا بات ہے روبی؟" میں نے اسے جھنجوڑ کر کہا۔

"وہ... انھوں نے مار دیا اسے۔" اس نے چیخ ماری۔ "مار دیا اسے۔" وہ دونوں بازو مار مار کے رونے لگی۔

"اچھا اچھا۔ میں دیکھتا ہوں۔ تم حوصلہ رکھو۔" میں نے کہا۔ ٹیکسی کا دروازہ بند ہوا تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ موقع پاتے ہی بدحواس ڈرائیور نے ٹیکسی سمیت فرار ہو جانا بہتر سمجھا تھا۔ میں نے اس پر لعنت بھیجی اور روبی کے ساتھ اندر گیا۔ مجھے امید یہی تھی کہ اندر کوئی نہ ہوگا۔ ہوتا تو روبی باہر نہ آسکتی۔

کمروں کے درمیان راہداری جیسا تنگ سا راستہ تھا۔ دونوں طرف کے سب دروازے بند تھے۔ چلچلاتی دوپہر میں بھی وہاں اندھیرے اجالے کی ملی جلی کیفیت تھی اور باہر کی دھوپ سے یکلخت اندر آنے پر تاریکی کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ آخری دروازہ کھلا پڑا تھا۔ میں لرزتی روبی کے ساتھ تنگ راہداری سے گزرا اور آخری گوشے کے دروازے سے نیچے اتر گیا۔ تہ خانہ زیادہ گہرائی میں نہیں تھا۔ اس کی چھت دراصل گھر کا فرش تھا۔ تہ خانے کے فرش سے اس کی ... بھی نہ تھی .... دس فٹ کا یہ تہ خانہ غالباً سٹور تھا۔ جسے پہلے عقوبت خانہ بنایا گیا اور پھر قتل گاہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔

ایک دیوار کے قریب پیٹر مرا پڑا تھا۔ میں نے کبھی پیٹر کو دیکھا نہیں تھا لیکن وہ لاش کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی جو اردگرد پھیلے ہوئے خون میں اور فرش کی گرد میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کی کھلی آنکھیں دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔ امید اور انتظار کے آخری لمحات کا عکس ان آنکھوں میں منجمد ہو گیا تھا۔ ایک خنجر اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست تھا مگر لہو دوسرے زخموں سے بہا تھا جو اس کے لاغر جسم پر جا بجا نظر آ رہے تھے۔ روح کو جسم کی قید سے رہائی مل گئی تھی لیکن جسم ابھی تک اسیر تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے اور زنجیر کا دوسرا سرا دیوار سے ملا ہوا تھا۔ اسی طرح پیر ایک ہی رسی سے باندھ کر رسی کو ایک حلقۂ زنجیر کے ساتھ گرہ دے دی گئی تھی۔ روبی مسلسل رو رہی تھی لیکن میں اس شخص کو دیکھ رہا تھا جو اپنے خون سے محبت کے لازوال جذبوں کی ایک اور کہانی لکھ گیا۔ اس محبت کی جو کسی سے کچھ نہیں مانگتی اور سب کچھ محبوب کے قدموں میں ڈال دیتی ہے۔ اپنے سارے سکھ سب خوشیاں، جان و دل۔

میں نے جھک کر اس کے جسم کو ہاتھ لگایا۔ جسم ابھی بالکل ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ کہیں کہیں زخم سے ابھی خون رِس کر نیچے بہہ رہا تھا۔ ہر سمت سے بند تہ خانے میں گرم لہو کی بو بسی ہوئی تھی۔ مجھے ابکائی سی آنے لگی۔ آدمی کا خون براہِ راست اعصاب کو متاثر کرتا ہے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ایک ہاتھ نے مجھے پیچھے سے دھکیل دیا۔ میں لاش کے اوپر گرا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے روبی کی چیخ سنی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا مجھے دھکیل کر وہ دور جا کھڑی ہوئی تھی۔ "یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے اٹھتے ہوئے برہمی سے کہا۔ میرے سب کپڑے خون میں بھر گئے تھے اور جب میں اٹھا تھا تو دونوں ہاتھوں کی سب انگلیاں بھی پیٹر کے خون میں تر ہو چکی تھیں۔ روبی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اٹھنے کے بعد میں نے ان سب کو دیکھا جو خاموشی سے اندر آ گئے تھے۔ پیٹرو سمیت وہ چار تھے۔ پیٹرو زینے کے اوپر دروازے کے فریم میں کھڑا تھا۔ باقی تین جن کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا مجھے تین طرف سے محصور کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے روبی کو دیکھا۔ وہ کھڑ

www.paksociety.com

پیر ہاتھ رکھے مسکرا رہی تھی۔

"تم نے ایک اور قتل کر دیا ہے ہیرو۔" پیڈرو نے ایک خندۂ تحقیر کے ساتھ کہا۔

"ذلیل عورت۔" میں نے دانت پیس کے کہا۔ "تو یہ سب فریب تھا، تیرا رونا دھونا، تیری کہانی۔"

وہ ہنسی۔ "کہانی تو ایک رسالے میں پڑھی تھی میں نے، اداکاری میری اپنی تھی۔ اس کے بغیر میں تم سے خود کو کیسے بچاتی اور یہاں تک کیسے لے کر آتی۔ میں اسکول کے زمانے میں بھی ڈرامے کرتی تھی اور کچھ عرصہ ایکسٹرا بھی رہی تھی۔"

"ایکسٹرا تو اب بھی ہے۔ ایک فالتو پرزہ۔" پیڈرو نے اوپر سے کہا۔ "جس کی اب کسی کو ضرورت نہیں۔"

"ایسا مت کہو۔" روبی سہم کے بولی۔ "تمہارے لیے میں نے سب کچھ کیا۔ جو تم نے کہا۔"

"نہیں۔ تو نے جو کچھ کیا تھا، پیسے کے لیے کیا تھا۔" پیڈرو نے ایک ایک سیڑھی اترتے ہوئے کہا۔ "کیا میں نے کہا تھا کہ عقل سے کام نہ لینا؟ وہ کوئی ایسا زہر نہیں تھا جو ہاتھ پہ رکھنے سے جسم میں سرایت کر جائے۔ اگر تو اس وقت ہسٹریا میں مبتلا نہ ہوتی تو اسے سیمسن کی جان لینے کا موقع نہ ملتا۔ مجھے معلوم ہے تو اس کو یہاں کیوں لائی تھی۔ تو اس کو نکال کر لے جانا چاہتی تھی۔ اب مجھے بے وقوف بنا کے جان بچانا چاہتی ہے؟"

مجھے گھیرے میں لینے والے مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئے تھے۔ میں خالی ہاتھ تھا اور ان کے ہاتھوں میں لمبے پھل والے خنجر تھے۔ مجھے نفسیاتی طور پر خوفزدہ کرنے کے لیے انھوں نے ایک ساتھ بٹن دبائے تھے اور دستے میں چھپے ہوئے پھل جھٹ سے نکل آئے تھے۔ میں پوری طرح مستعد دیوار سے پشت لگائے کھڑا تھا تاکہ تینوں دشمن میرے پیچھے آ کے وار نہ کر سکیں۔ ریوالور صرف پیڈرو کے ہاتھ میں تھا۔ روبی کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اداکاری اس کے کام نہیں آئی تھی۔

"یہ تمہارا شوہر عنایت مسیح کیسی باتیں کر رہا ہے روبی؟" میں نے کہا۔

"میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔" روبی چلائی۔ "میں بے بس تھی۔ اس کو روکے رکھنے کے سوا میں کیا کر سکتی تھی؟"

"اور جب تو کچھ نہ کر سکی تو اس کی مدد سے تو نے پیٹر کو آزاد کرانا چاہا؟"

"کیا مجھے اس کا بھی حق نہیں تھا؟" روبی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "اسی لیے تو تم نے پیٹر کو یرغمال بنایا تھا کہ جب مطلب نکل جائے تو اسے مار دو؟ میں نے انکار تو نہیں کیا تھا کسی کام سے۔ پھر تم نے اس کی جان کیوں لی؟"

"سیمسن کی زندگی بہت قیمتی تھی۔ دس پیٹر جیسے مر جائیں تب بھی اس کا خون بہا ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ تیری بے وقوفی کی سزا ہے۔" پیڈرو بولا۔ "صرف آدھی سزا۔ باقی سزا تو خود بھگتے گی۔" اس نے اچانک ریوالور اٹھایا اور گولی چلا دی۔ روبی کے سر سے خون کی دھار نکلی اور وہ نیچے گر گئی۔ یہ سب ایسے اچانک اور اتنا غیر متوقع تھا کہ میں ساکت و صامت کھڑا روبی کو دم توڑتے دیکھتا رہا۔ تہ خانے میں سائلنسر والے پستول کی آواز دب گئی تھی اور روبی کو چیخ مارنے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ اپنا آخری جملہ مکمل ہونے سے پہلے پیڈرو فائر کر چکا تھا۔ اب وہ نزع کے کرب میں تڑپتی ہوئی پیٹر کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بس اس نے ہاتھ بڑھا کے پیٹر کو چھوا اور آخری جھٹکا لے کر ساکت ہو گئی۔

"اگر تم سب یہ خنجر ریوالور لے کر نہ آتے تو میں تم کو بہادری کا سبق سکھاتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم صرف کمزوروں کو زنجیر سے باندھ کے مار سکتے ہو۔ نہتی عورتوں کو قتل کر سکتے ہو عنایت مسیح۔"

"یہ نام تمہیں کس نے بتایا؟ اس عورت نے؟" پیڈرو مسکرایا۔ "اور تم نے یقین کر لیا؟"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں اس نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، سچ تھا۔ وہ کسی رسالے میں پڑھی ہوئی کہانی نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "اسے تم پر اعتبار نہیں تھا۔ اس نے تمہارے ایک دشمن کو قابل اعتماد سمجھا اور اسے تمام حالات سے آگاہ کر دیا تاکہ کوئی تو ہو جو تمہارے جرم کا گواہ بنے۔ اسے اندیشہ تھا کہ تم سب کچھ کر سکتے ہو۔"

"اس نے اعتراف کیا تھا تمہارے سامنے کہ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔" پیڈرو بولا۔

"یہ بات اس نے تم کو اچانک روبرو پا کے کہی تھی۔" میں نے کہا۔ "خوف نے اسے سچ سے انکار پر مجبور کر دیا تھا۔"

"اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" پیڈرو نے بے نیازی سے کہا۔

"فرق اس عورت کو ضرور پڑے گا جو روبی کی ماں تھی۔" میں نے کہا۔ "جسے تم بلیک میل کرتے رہے۔"

پیڈرو ہنسا۔ "اس کے لیے بھی دکھی ہونے کی ضرورت نہیں۔ تین دن ہوئے وہ بھی دنیا کے دکھوں سے چھوٹ گئی۔"

"اس بوڑھی اور بیمار عورت کے لیے بھی تم نے اگلی ناخنوں کی فوج تیز کی تھی؟" میں نے افسوس سے روبی کی طرف دیکھا جس نے جنت کی پناہ میں ایک ایسے مستقبل کے خواب دیکھے تھے جو اس کے لیے اور اس کی ماں کے لیے عمر رفتہ کی ہر تلخ یاد سے نجات کا ضامن ہو۔ مگر وقت ایک بے رحم جلاد تھا جو معاف کرنا نہ جانتا تھا۔ روبی کی ماں اپنی سزا کاٹتے ہوئے مر گئی اور بیٹی کو اس کی صورت بھی دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ پیٹر کے ساتھ روبی بھی مر گئی۔ ان کا یہ جنم تو امیدوں کا سراب تھا مگر وہ آبلہ پا چلتے رہے۔ اس منزل تک جہاں خون خون میں شامل ہو گیا تھا اور اس لکیر پر سفر تمام ہوا جہاں روبی کے بہتے ہوئے لہو کی لکیر نے پیٹر کے خون سے رشتہ استوار کر لیا تھا۔

"میں جا رہا ہوں پولیس کو بلانے کے لیے۔" پیڈرو نے زینے کا رخ کیا۔ "تم تیار رہنا اور اس کی طرف سے غافل مت ہونا۔ میرا اشارہ ملتے ہی تم کو یہاں سے نکلنا ہے۔"

بظاہر ان کا پلان یہی تھا کہ مجھے پیٹر کا قاتل بنا دیں اور پولیس کے حوالے کر دیں۔ اگر وہ مجھے ناک آؤٹ کر کے نکل جاتے تو ہوش آنے پر میں خود کو حوالات میں بند پاتا۔ شاید پیڈرو مجھے رنگے ہاتھوں پکڑوانا چاہتا تھا کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ میرے ہاتھ واقعی پیٹر کے خون میں رنگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی تہ خانے میں ایک عورت کی لاش پڑی تھی جس کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کا نام روبی ہے لیکن اس کا نام کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔

"یہ ریوالور اپنے پاس رکھو۔" پیڈرو نے زینے کے وسط تک پہنچ کے سوچا کہ وہ خود تو محفوظ رہے گا مگر ان تین افراد کی سلامتی سو فیصد یقینی نہیں ہے جن کے ہاتھوں میں صرف خنجر ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ خالی ہاتھوں سے بھی میں کیا کر سکتا ہوں اور اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ میں طے کر چکا تھا کہ باری باری ان سے نمٹ لوں گا اور یہ خنجر ان کو نہ بچا سکیں گے۔ وار کرنے کے لیے ان کو قریب آنا پڑے گا۔ پھل چونکہ میری طرف ہو گا اس لیے پہلا شکار تو حرکت بھی نہ کر پاتا۔ باقی دو ایک وقت جھپٹتے لیکن اس وقت تک میں ایک خنجر حاصل کر چکا ہوتا اور ایک دشمن کو ٹھکانے لگا دیتا یا اسے ڈھال بنا لیتا اور پھر باقی دو سے مقابلہ کرتا۔ اس سے میرے زخمی ہونے کے امکانات بھی تھے کیونکہ میں بالکل فٹ نہیں تھا اور دونوں ہاتھ میری مرضی کے مطابق استعمال نہیں کر سکتا تھا لیکن بڑے خطرے سے بچنے کے لیے چھوٹا خطرہ مول لینا ضروری تھا۔ ریوالور کی گولی سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا جو ابھی تک پیڈرو کے ہاتھ میں تھا۔

لیکن ریوالور اپنے ساتھیوں کو دینا اس کی غلطی بن گیا۔ اس نے زینے پر سے ریوالور اس کی طرف اچھالا جو عین میرے مقابل تھا۔ اس نے ریوالور کو کیچ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک جست لگا کے اس کو جسم کی ٹکر ماری۔ وہ سنبھل نہ سکا۔ خنجر کو اس نے دانتوں میں دبا لیا تھا۔ اس کے گرتے گرتے خنجر بھی فرش پر گر کے اچھلا۔ میں نے ریوالور پر قبضہ کرنے کے لیے غوطہ مارا تھا اور سیدھا اس کے اوپر جا پڑا تھا لیکن مجھے اٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ باقی دو اچھل کر مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ دوسرے نے مجھے فرش پر ہی دبانا چاہا لیکن میں کروٹ لے کر پلٹ گیا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں آ گیا تھا مگر تیسرے نے میرے کک ماری جو میری کہنی پر لگی اور ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اسی وقت پہلا شخص چلایا۔ وہ خنجر جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا تھا، اچھلنے کے بعد اس کے اپنے پیٹ میں گھس گیا تھا۔ میں نے دیکھا تو وہ پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے دبائے زینے کی طرف بھاگ رہا تھا اور اس کا اپنا خون دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں سے بہتا اس کے کپڑوں کو سرخ کر رہا تھا۔ وہ نہایت بھیانک آواز میں چلا رہا تھا۔

تیسرے نے مجھے ایک اور کک مارنے کی کوشش کی لیکن اس بار میں نے اس کا پنجہ اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں نے اسے ایک ٹانگ پر گھما کر دیوار سے ٹکرانا چاہا مگر اس کا جوتا میرے ہاتھ میں آ گیا اور وہ دیوار پر لگنے کے بجائے منہ کے بل فرش پر گرا۔ صورت حال کو بدلتا دیکھ کے پیڈرو بھی زینے سے لوٹ آیا تھا۔ اس نے زیادہ حاضر دماغی کا ثبوت دیا اور پلک جھپکتے میں وہ ریوالور دوبارہ اس کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے میرے سر پر ریوالور کا بٹ مارا۔ تہ خانہ تاریک ہو گیا اور میں دو لاشوں کے درمیان لیٹ گیا۔

آنکھ کھولنے پر مجھے اپنے ارد گرد بڑی چہل پہل نظر آئی۔ پولیس والے دہرے قتل کی اس واردات میں بڑی مستعدی دکھا رہے تھے جس میں سب کچھ تفتیش کی پریشانی کے بغیر مل گیا تھا یعنی قاتل بھی، مقتول بھی اور آلۂ قتل بھی۔ دو پھول والا ایک سب انسپکٹر مقتل کا نقشہ بنوانے میں مصروف تھا اور ایف آئی آر کی زبان میں جائے واردات کا منظر تمام تفصیلات کے ساتھ بیان کرنے میں اپنا سارا زور قلم صرف کر رہا تھا۔ اس کی ماتحت ٹیم ایک نائک اور دو کانسٹیبلوں پر مشتمل تھی۔

www.paksociety.com

ایک کانسٹیبل میرے قریب کھڑا بے زاری سے تمام کارروائی کو دیکھ رہا تھا کیونکہ اس تھانے میں لاشوں یا دیواروں کے سوا دیکھنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ ان کا افسر اعلیٰ تین پھولوں والا انسپکٹر، سو فیصد تھانیدار تھا۔ بھاری بھرکم، بے رحم اور کرخت چہرے والا، بڑی بڑی مونچھوں والا اور سب سے بڑی توند والا۔ اس کے لیے کہیں سے ایک کرسی برآمد کی گئی تھی۔ جب وہ حرکت کرتا تھا تو کرسی کراہنے لگتی تھی۔

صورت حال اچانک انتہائی سنگین ہوگئی تھی۔ چپہ رو کے ساتھی بھاگ گئے تھے اور جاتے جاتے مجھے مورد الزام بنانے کا پورا اہتمام کر گئے تھے۔ پولیس ان کے طلب کرنے پر ہی پہنچی ہوگی اور ریوالور پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات مٹا دیے ہوں گے۔ اگر بے ہوشی میں میرے ہاتھ سے میرے فنگر پرنٹ بنا گئے ہوں تو کچھ عجیب نہیں۔ یہ تو بہت بعد میں ثابت ہوگا کہ میں کسی مقتول کے نام سے بھی واقف نہیں۔ پہلے مجھے بتانا پڑے گا کہ میں کون ہوں۔ یہاں کیسے پہنچا اور کس طرح قتل کی اس واردات میں ملوث کیا گیا۔ اس سے پہلے ایف آئی آر میں ہر ثبوت میرے خلاف درج ہو جائے گا اور تفتیش ہوگی۔ تفتیش کیسے ہوتی ہے، اس کا مجھے عملی تجربہ تھا۔ پولیس مجھ سے ہر قیمت پر اعتراف جرم حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے گی اور میرے انکار کو اقرار میں بدلنے کے لیے تشدد کے سارے حربے آزمائے گی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہیں یا ناکام، یہاں میرے خلاف دُہرے قتل کا دوسرا مقدمہ درج ہو جائے گا اور اس کے بعد وہی ہوگا۔ وکیل اور ضمانت حاصل کرنے کی کوشش، سماعت کے مرحلے، فیصلہ ہونے تک انتظار مسلسل کا عذاب۔

تقدیر نے مجھے ایک زنداں سے رہا کیا تھا تو دوسرے زنداں میں اسیر کر دیا تھا۔ بے وقوفی میری تھی کہ ایک بار آزاد ہونے کے بعد خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے لاہور کا رخ نہیں کیا۔ میں اس نرس سے کہہ سکتا تھا کہ بی بی تم بہت مظلوم ہو لیکن میں بھی گرفتار بلا ہوں۔ سب کے پاس اپنے اپنے غم کا اور دکھوں کا بار ہے جو اسے خود ہی اٹھانا ہے۔ اللہ ہم دونوں کا مددگار ہو۔ اب مجھے سب کو مطلع کرنا پڑے گا۔ رابعہ اور شہلا کو جو بے چینی سے منتظر ہوں گی اور دونوں انکلوں کو۔ رابعہ کہے گی کہ تم نے تو فون کر کے مجھ سے کچھ اور کہا تھا۔ تم نے کسی نرس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ پھر تم اس کے ساتھ کہاں جا بیٹھے اور وہ منتظر پریشان ہونے کے باوجود قہقہہ مار کے کہے گا۔ جابجوتی کے ہر شہر میں قتل عام کر لیے ہم ابھی تو غم کیسا۔ انکل رضوی اور شیروانی بہت زیادہ خفا ہوں گے اور ان سب لوگوں کی پریشانی یا خفگی برحق ہوگی۔

اس بار شاید ضمانت پر بھی رہائی نہ ہو۔ مجھے بھی یہ بات معلوم ہوگی کہ مبینہ مجرم سکندر بخت پر لاہور میں تین افراد کے قتل کا الزام ہے جس میں ایک دُہرا قتل بھی شامل ہے۔ عدالت مجبور ہو جائے گی کہ ضمانت کی درخواست مسترد کر دے۔ ایسے مجرم کو چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ کیا پتا وہ پشاور یا کراچی جا کے کسی اور کا خون کر دے اور یہ بڑی مصیبت ہو جائے گی۔

قتل کے دو مقدمات لاہور میں تو ایک پنڈی میں۔ رابعہ اور منتظر کہاں کہاں سماعت کی تاریخ پر حاضر ہوں گے۔ بے شک اصل مسئلہ تو مجھے میر شرافت علی کے قتل کے الزام سے بری کرانے کا ہے۔ لاہور میں عبدل اور شیمے کا قتل اور پنڈی میں روبی اور پیٹر کا قتل مجھ پر ثابت نہیں ہوگا کیونکہ حالات اور واقعات کی شہادت سو فیصد میرے حق میں ہوگی لیکن طریقہ کار کے مطابق سماعت تو ہوگی۔ دلائل دیے جائیں گے، گواہ پیش ہوں گے اور باعزت بری کیے جانے تک کیا ہوگا یہ سب میں جانتا ہوں۔

اس مصیبت سے بچنے کی ایک صورت یہ تھی کہ میں سکندر بخت نہ رہوں۔ اپنا نام پتا غلط بتاؤں اور خود کو لاوارث ظاہر کروں۔ یا سمین کی طرح گونگا بہرا بن جاؤں۔ اُدھر یہ اعتراف کرتی ہے، اِدھر میں انکار کروں کہ قدرت کوئی صورت پیدا کر دے کہ میں خود کو بے گناہ ثابت کر سکوں۔ کوئی وکیل ترس کھا کے میری پیروی پر آمادہ ہو جائے اور کوئی اللہ کا نیک بندہ میرا ضامن بن جائے۔ یا مجھے فرار ہونے کا موقع مل جائے۔ گو اس کے امکانات بہت کم تھے لیکن مجھے رابعہ کو اور اپنے دوستوں ہمدردوں کو یہ ایس او ایس دیتے ہوئے شرم آتی تھی کہ آؤ مجھے بچاؤ کیونکہ میں نے یہاں بھی دُہرے قتل کا الزام اپنے سر لیا ہے۔ خواہ مخواہ مصیبت کو گلے لگا لیا ہے اور کوئے یار سے سوئے دار پہنچ گیا ہوں۔ صرف میری وجہ سے کتنے لوگ پریشان ہیں۔ ان کے لیے مزید پریشانیوں کا سامان کرنا غلطی نہیں تھی گناہ تھا۔ یہ ان کے پُرخلوص جذبات کا استحصال تھا لیکن کیا میں ان سب کی مدد کے بغیر اس عذاب سے چھٹکارا پا سکوں گا؟

ابھی میرا ذہن اس الجھن کا کوئی حل تلاش نہیں کر پایا تھا کہ کسی نے میرے ایک لات رسید کی۔ "اٹھ اوئے...!" کسی نے پوٹھوہاری لہجے میں ایک مقبول عام گالی دے کر کہا۔

"چھتر لا ایس... کی!" تھانیدار نے میرے نام کی جگہ گالی استعمال کی۔ "پتا لگ ولیسی۔" مگر لات مارنے والے نے اس مشورے سے قبل ہی جلتی ہوئی سگریٹ میری گردن پر لگا دی تھی۔ مجھے اٹھ کر بیٹھنا پڑا جو سپاہی اب تک میرے پاس کھڑا تھا مجھ پر

پل پڑا۔ میرے بال پکڑ کے اس نے کھینچے اور لاتیں مارتے ہوئے مجھے اپنے افسر اعلیٰ کے سامنے کھڑا کر دیا۔

نصف درجن کے قریب گالیاں دینے کے بعد تھانیدار نے پہلا سوال کیا۔ "ناں دس اپنا؟"

"جی... اس بندۂ حقیر و پُرتقصیر کو... لمے لمے لمے الزبادی..." میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے مستعلیق لہجے میں کہا۔

"لمے لمے..." تھانیدار نے میرے پیٹ پر چھڑی ماری۔ "نام پوچھا ہے میں نے...؟"

"وہی عرض کر رہا تھا حضور والا!" میں نے بلبلا کے کہا۔ "آغا احمد علی عرش الزبادی۔ یہی نام ہے احقر کا۔"

"عرش الزبادی؟ گویا شاعر ہیں آغا صاحب۔" تھانیدار نے میرا سر جھکا کے دو زنّاٹے دار تھپڑ رسید کیے اور میری کمر پر مکے مارے۔ میں نیچے گر پڑا۔ میں نے شدید تکلیف کا اظہار شور مچا کے کیا۔

"قتل تو نے کیے ہیں؟" تھانیدار نے کہا۔ "بھونکنا مت کتے کی طرح، سیدھی طرح جواب دے۔"

"جی... جی ہاں میں نے کیے ہیں۔" میں نے آنسو پونچھ کے کہا۔ "اس کے سوا چارہ نہیں رہا تھا ڈی ایس پی صاحب۔"

تھانیدار کو عزت افزائی پسند آئی۔ اسے یہ بھی یقین آیا کہ یہ شخص جو پھٹے کپڑوں میں بال بکھرائے، ننگے پاؤں اور شکستہ حال کھڑا ہے شاعر ہی نہیں پاگل بھی ہے۔ اس کے نقطہ نظر سے یہ ایک ہی بات تھی۔ "یہ عورت کون تھی تمہاری؟" وہ بولا۔

"منکوحہ تھی اس خاکسار کی بندہ پرور۔" میں نے کہا۔ "بے وفائی پر آمادہ تھی۔"

تھانیدار نے یوں سر ہلایا جیسے اس کا قائم کردہ مفروضہ درست ثابت ہوا ہے۔ "اور یہ اس کا آشنا تھا؟" وہ پیٹر کی لاش کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "اسے بھی تم نے قتل کیا ہے؟"

"جی حضور۔ اسی نابکار کے طفیل مجھ بدبخت کی ازدواجی زندگی کا یہ انجام ہوا۔" میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

تھانیدار کے اطمینان کے لیے اتنا کافی تھا۔ اس نے لاشوں کو سرد خانے پہنچانے کے انتظامات صادر کیے اور اپنی آل سپاہ کو حکم دیا کہ مجھے تھانے لے چلیں۔ "ہتھکڑی ڈال دو اس کے۔" تھانیدار بولا۔

"ابھی حضور ڈی ایس پی صاحب۔" میں نے فریاد کی۔ "خادم کے تو دست و بازو شکستہ ہیں، بغیر بیساکھی کے چل نہیں سکتا۔ میں تو خود تھانے حاضر ہونے والا تھا۔ میں بھلا فرار ہو سکتا ہوں؟ آپ سب کے ہوتے ہوئے؟"

میری بات سے وہ قائل ہونے والا نہیں تھا لیکن قتل کی اطلاع پا کے آنے والے اپنے ساتھ ہتھکڑی نہیں لائے تھے۔ ان کو معلوم نہیں تھا کہ جائے واردات پر قاتل بھی دستیاب ہوگا۔ ایک کانسٹیبل نے لات مار کے مجھے چلنے کا حکم دیا لیکن میں اسی طرح پڑا رہا۔

"میں تو سہارے کے بغیر اٹھ بھی نہیں سکتا جناب ڈی ایس پی صاحب۔" میں نے مظلوم بن کے کہا۔

بادلِ ناخواستہ دو افراد نے مجھے کھڑا کیا اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ میرے جسم، ہاتھ اور پیر پر پٹیاں تھیں۔ ان میں درد تو تھا لیکن ناقابل برداشت نہیں۔ بیساکھی وہ کہیں والا لے گیا تھا جس میں روبی مجھے اپنے ساتھ لائی تھی اور اس کے ساتھ چوبارے تک میں کسی سہارے کے بغیر آیا تھا۔ غالباً بستر پر پڑے رہنے سے اور پٹیوں میں بندھے رہنے سے میرے ہاتھ پیر سُن ہوگئے تھے اور دوران خون میں رکاوٹ کے باعث تکلیف زیادہ تھی جو تھوڑا سا چلنے سے کم ہوگئی تھی۔ اب پٹیاں کچھ اور ڈھیلی ہوگئی تھیں۔ چنانچہ میں مزید افاقہ محسوس کر رہا تھا لیکن میں نے ظاہر یہی کیا کہ جہاں پٹیاں ہیں وہاں ہڈیاں چور ہو چکی ہیں اور عضو مفلوج ہوں۔

قتل کی سنسنی خیز خبر نے گرد و نواح سے چند درجن تماشائیوں کو کھینچ لیا تھا۔ ان میں سے بیشتر ملازم یا راہ گیر تھے۔ یہ بے کار لوگوں کا علاقہ نہیں تھا۔ چنانچہ بچے اسکول جا چکے تھے اور مرد اپنے اپنے کام سے۔ خواتین دور اپنے اپنے دروازوں کے سامنے خوف زدہ اور سوالیہ نشان بنی کھڑی تھیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ خبر محدود رہی اور کسی اخبار کی نمائندگی تک نہیں پہنچی۔ کچھ لوگوں نے پولیس کے حکام زیر بحث سے قتل کے پس پردہ اسباب و واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی واجبی سی کوشش کی مگر انہیں مایوسی ہوئی۔ پولیس نے مجھے اٹھا کے ایک جیپ میں پھینکا۔ میرے ساتھ دو ماتحت اور دو افسر بیٹھ گئے۔ ایک اور دو پھول والے افسر ان کے پاس ریوالور تھے اور انہوں نے مجھے دونوں سیٹوں کے درمیان اپنے قدموں میں گاڑی کے فرش پر ڈال کے پیروں سے دبا رکھا تھا۔ تین پھول والا یعنی تھانیدار آگے فٹ ہوا اور جیپ روانہ ہوگئی۔ میں مسلسل کراہتا گیا۔

تھانے کی عمارت نئی تھی لیکن اس کے در و دیوار پر پھیلی ہوئی آسیب زدہ نحوست کی فضا پرانی تھی۔ میرے لیے اس کے ماحول میں بھی کوئی چیز اجنبی نہیں تھی۔ نہ پولیس کا رویہ، نہ گرفتار ہو کر آنے والوں کی مظلوم بے بسی۔ نہ حوالات میں بند افراد

www.paksociety.com

کی حالت زار، ناانصافی اور لاقانونیت کی فریاد لے کر آنے والوں کی کسمپرسی۔ مرغا بنے ہوئے مشتبہ افراد کی قطار اور دیواروں پر تھانے کی حدود میں ہونے والے جرائم کے بے بنیاد اور خود ساختہ اعداد و شمار کے چارٹ۔ ایس ایچ او کا کمرہ اور کمرۂ تفتیش جہاں مجھے لے جایا گیا۔

رات نو بجے ایک اے ایس آئی نے باضابطہ طور پر میرا بیان لینا شروع کیا۔ جماہیاں لیتے ہوئے ایک نیم خوابیدہ اور عمر رسیدہ حوالدار نے اسے ضابطۂ تحریر میں لانے کے لیے کرسی اور میز پر پوزیشن سنبھالی۔ میں یوں فرش پر پڑا رہا جیسے صرف ہاتھ پیر کی نہیں بلکہ میرے جسم کی بیشتر ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ یہ سب کچھ میں ایک موہوم سی امید پر کر رہا تھا اور اس میں ابھی تک مجھے صرف اتنی کامیابی حاصل ہوئی تھی کہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی نہیں ڈالی گئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر میرا نام پوچھا گیا اور میں نے ناشیوانے کی گردان شروع کی۔ ہائے اور آہ کے ساتھ۔

"بس بس۔" اے ایس آئی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے مجھے لات ماری۔ "عورتوں کی اولاد فرش میں گاڑ دوں گا۔ لکھو بھئی احمد علی۔" اس نے ناکس کو مخاطب کر کے کہا۔ "باپ تھا؟ نام رہا اس کا؟" میں مرغ بسمل کی طرح تڑپا۔

"ہائے مر گیا۔ اس میں ایک ہائے کم تھا جی۔" میں نے کہا۔

"آپ ارشد علی لکھ لیں۔ ورنہ وہ بھی آغا اور الہ آبادی تھا۔"

"مسکن؟" اے ایس آئی کے بجائے حوالدار نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "قوم اور ذات؟"

"کیا جی؟" میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا۔ "ہائے... اُف..." میں نے اپنا واویلا جاری رکھا۔

"اے رہتا کہاں ہے؟" اے ایس آئی نے پھر مجھے لات ماری۔ میں نے چیخ مار کے مزید شور مچایا۔

"کہیں نہیں جناب۔ اف۔ میں مر گیا تھانیدار صاحب۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "مجھے اسپتال بھجوا دیں۔"

"اسپتال؟" تھانیدار نے اٹھ کر مجھے ٹھوکریں مارنی شروع کیں۔ "تجھے ہم قبرستان پہنچائیں گے پھانسی کے بعد۔" بہت سی گالیوں کے بعد اس نے مجھ سے باقی سوالات کیے۔ مجھے حالات امید افزا نظر آنے لگے تھے۔ وہ میری بات مان رہے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ میرا اعتراف جرم جلد سے جلد مکمل ہو جائے تو وہ میرے دستخط لیں اور دہرے قتل کی اس واردات کے مجرم کو گرفتار کر لینے کے بعد عدالت میں پیش کر دیں۔ اس میں انہیں کوئی الجھن یا پیچیدگی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایسا ہوتا ہی رہتا تھا گاؤں میں بھی اور شہروں میں بھی کہ غیرت مند شوہر بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کر کے تھانے میں حاضر ہو جاتے تھے لیکن اس کارنامے کا سہرا تھانے کا عملہ اپنے سر باندھنا چاہتا تھا کہ ریکارڈ وقت میں چالان مکمل کر لیا۔ ورنہ بیشتر صورتوں میں وہ کامیاب ہوتے تھے تو مخبروں کی مدد سے یا مشتبہ افراد پر تھرڈ ڈگری طریقے کی مشق سے۔ سراغ رسانی یہاں صرف قصے کہانیوں تک محدود تھی۔ خود پولیس کو اعتراف تھا کہ چوری، ڈکیتی اور قتل جیسی وارداتوں کے ہاتھ نہ آنے والے مجرموں کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے اور برسوں پرانے مقدمات کی فائلیں سرد خانے میں ڈھیر ہو رہی ہیں۔

میں نے بے ربط الفاظ میں جو کہانی سنائی، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں اپنی بیوی اللہ رکھی کے ساتھ ناجائز طور پر ہندوستان سے پاکستان پہنچا تھا۔ سرحد پر گرفتاری کے بعد ہم اپنا سب کچھ دے کر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ لاہور پہنچے تو جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا اور رہنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ دن میں چھوٹا موٹا کام تلاش کرتے۔ کوٹھیوں میں ملازمت مل سکتی تھی بشرطیکہ ہم کوئی حوالہ پیش کر سکتے یا ضامن فراہم کر سکتے لیکن یہاں تو کوئی جانتا نہیں تھا۔ کئی جگہ صاحب لوگوں کو ایسی عورت کی ضرورت تھی جو کچن کا سارا کام سنبھال سکے اور مالی یا ڈرائیور کی جگہ بھی خالی تھی لیکن وہ سب پیسے والے لوگ تھے جن کو ہر اجنبی چور نظر آتا تھا۔ یوں گھومتے پھرتے کہیں نہ کہیں سے پیٹ بھر کھانا بہرحال مل جاتا تھا۔ بیگمات ہم پر ترس کھا کے مدد بھی کر دیتی تھیں لیکن صاحب کی اجازت کے بغیر گھر میں جگہ دینے پر تیار نہ ہوتی تھیں۔ سب صاحب ضرورت سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوتے تھے۔ اسی چکر میں لاہور کا ایک بدمعاش ہمارے پیچھے لگ گیا۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ ہم ناجائز طور پر پاکستان میں داخل ہوئے ہیں۔ وہ کوئی دلال یا بردہ فروش تھا جو اللہ رکھی کو ہتھیانا چاہتا تھا۔ میں اسے ساتھ لے کر راولپنڈی والی گاڑی میں بیٹھ گیا لیکن بدمعاش بھی ہمارے ساتھ سائے کی طرح رہا۔ ٹرین میں اس نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا۔ رات کا وقت تھا لیکن اللہ رکھی نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے زنجیر کھینچی تو وہ بھاگ گیا۔ میں دو ہفتے اسپتال میں رہا۔ وزیر آباد کے سرکاری اسپتال میں۔ پھر پنڈی آ گیا۔ یہاں بھی لاہور والا مسئلہ تھا یعنی نوکری کا اور سر چھپانے کی جگہ کا۔ ایک دن اس بدمعاش نے ہمیں دیکھ لیا اور میٹھی باتوں میں لگا کے ایک گھر میں لے گیا۔ اس نے کہا تھا کہ نوکری بھی ملے گی اور رہنے کی جگہ بھی۔

"اور تم بے وقوف۔ تم نے اسی پر اعتبار کر لیا جس نے تمہیں دھکا دیا تھا چلتی گاڑی سے؟" انسپکٹر نے افسوس سے مجھے دیکھا۔ "اور جو تمہاری بیوی کو اغوا کرنا چاہتا تھا۔"

"اس نے قسم کھائی تھی حضور۔" میں نے کہا۔ "کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں اور مجھے غلط فہمی ہوئی ہے اور وہ ایک شریف آدمی ہے صرف ہماری مدد کرنا چاہتا ہے۔ جو قسم پر بھی اعتبار نہ کرے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ میں اور اللہ رکھی اس کے ساتھ چلے گئے۔"

"کافر ہو جاتا ہے۔" انسپکٹر نے طنز سے کہا۔ "کیسے کیسے نمونے پڑے ہیں دنیا میں عقل سے پیدل۔ الو کے کھوتے تو نے اس الو کے پٹھے سے یہ نہیں پوچھا کہ آخر وہ کیوں مدد کرنا چاہتا ہے؟" اسے اب مجھ سے تھوڑی سی ہمدردی بھی ہونے لگی تھی کیونکہ اس کے خیال میں مجھ سے بڑا احمق کوئی نہیں تھا۔

"یہاں آتے ہی اس نے ریوالور نکال لیا حضور۔ اور ہمیں تہ خانے میں لے گیا۔" میں نے کہا۔ "میں نے قتل کر دیا۔"

"کسے قتل کر دیا؟" انسپکٹر بولا۔ "کیا ہوا تھا تہ خانے میں؟ پوری بات بتاؤ۔"

"بس جناب اس نے اللہ رکھی پر دست درازی کی۔ میں ہندوستان سے ایک خنجر لایا تھا۔" میں نے کہا۔ "جو میری جیب میں تھا۔ میں نے اسی سے مار ڈالا اس بدمعاش کو۔"

"لیکن پھر اس عورت اللہ رکھی کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" انسپکٹر نے مشکوک لہجے میں کہا۔ "اس نے تو کچھ نہیں کیا تھا۔ تم اسے لے کر فرار کیوں نہیں ہو گئے؟"

"آپ کو کیا معلوم جناب عالی۔" میں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ تو پہلے سے بھاگنے کو تیار بیٹھی تھی۔ میرے ساتھ دھکے کھاتے کھاتے تنگ آ گئی تھی۔ کہتی تھی کب تک ایسے بھیک کے ٹکڑوں پر گزارا ہو گا۔ رہنے کو جھونپڑا تک نصیب نہیں۔ مجھے نکھٹو اور بے غیرت کہتی تھی۔ کہتی تھی مزدوری کرو۔ ریلوے اسٹیشن پر جا کے قلی ہو جاؤ۔ میں نے کوشش کی تھی حضور مگر وہاں ٹھیکیدار نے مجھے دھکا دیا۔ اس تہ خانے میں اپنے سامنے ریوالور دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئی۔ یہ بھی بھول گئی کہ میں اس کا گھر والا ہوں۔ اس کے ساتھ میرا نکاح ہوا ہے اور اس کو دکھ میں بھی میرا ساتھ دینا چاہیے۔ میرے ساتھ مرنا پڑے تو مر جانا چاہیے۔ وہ تو فوراً اس کی طرف ہو گئی۔ اس سے کہنے لگی کہ گولی مار دو اسے اور مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ اس کے ساتھ تو میں فاقے کر کے مر جاؤں گی۔ وہ خبیث کہنے لگا کہ میں تجھے رانی بنا کے رکھوں گا عیش کراؤں گا۔ بس اسی وقت مجھے موقع مل گیا۔ میں نے اس کو مارنے کے بعد اس کے ریوالور سے گولی چلائی اور اس بے وفا عورت کو بھی مار دیا۔ وہ میرا ساتھ چھوڑنے کا فیصلہ تو کر ہی چکی تھی۔ وہ قتل کا گواہ بن جاتی اور جب مجھے پھانسی ہو جاتی تو اسے آزادی مل جاتی موج کرنے کے لیے۔"

"کیا تمہاری بیوی زیور پہنتی تھی؟" سب انسپکٹر نے کہا۔ "اس نے [illegible] رکھی تھی۔"

"وہ چوری کی تھی جناب۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "اس کے تن پر کپڑوں کا ایک ہی جوڑا تھا۔ وہ کب تک ساتھ دیتا۔ ایک رات ہم نے اسپتال سے چوری کیا تھا وزیر آباد میں۔"

بیان اس کی مرضی کے مطابق تھا اور بظاہر اس میں کوئی خامی نہیں تھی لیکن یہ پہلا بیان تھا۔ اس میں بہت سی باتیں تصدیق طلب تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ وزیر آباد کے سرکاری اسپتال سے ہمارے متعلق ضرور معلوم کریں گے۔ ممکن ہے ریلوے والوں سے بھی پوچھیں اور مقتول کے متعلق لاہور کی پولیس سے دریافت کریں۔ اس بات کا اندیشہ بہرحال نہیں تھا کہ وہ لاہور یا پنڈی میں ہمارے کسی آشنا کو تلاش کریں۔ میری کہانی کے مطابق تو پاکستان میں ہمارا کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ ہمارا وکیل کون ہو گا اور ضامن کون؟ یہ بعد کی بات تھی۔

"اس بیان پر دستخط کرو گے یا انگوٹھا لگاؤ گے؟" انسپکٹر نے کہا۔ "بیان عدالت میں بھی یہی دینا چاہیے ورنہ یاد رکھنا میں تمہیں پھر واپس ہندوستان بھیج دوں گا۔ کس شہر سے آئے تھے تم دونوں؟"

دو گھنٹے سے میرا بیان لیا جا رہا تھا اور اس عرصے میں صرف ایک بار چائے والا اندر آیا تھا چنانچہ حالات خاصے سازگار تھے۔

"بریلی سے حضور۔" میں نے کہا۔ "دستخط کہاں کروں؟" میں نے محسوس کیا کہ وقت آ گیا ہے اور اگر میں نے اس وقت کچھ نہ کیا تو پھر کبھی مجھے کچھ کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ حوالدار پہلے ہی میز کے نیچے ٹانگیں پھیلائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ انسپکٹر نے تھوڑا سا جھک کر مجھے بتانا چاہا کہ بیان کے نیچے مجھے کس جگہ اپنے دستخط کرنے ہیں۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ میں کچھ خالی جگہ چھوڑ کے دستخط کروں تاکہ بعد میں وہ بیان کو بڑھانا چاہیں تو اس کے لیے گنجائش ہو۔ اسے یہ اندیشہ ہو گا کہ کہیں میں آخری سطر کو دستخط سے نہ ملا دوں چنانچہ اس نے کاغذ پر ایک جگہ انگلی رکھ دی۔ میرا دل آخری بار اس خیال سے دھڑکا کہ عین وقت پر یا میرے پروگرام پر عمل درآمد سے قبل کوئی آ گیا تو میرا حشر کیا ہو گا لیکن یہ خطرہ مول لینا ہی پڑتا تھا۔ اس جوئے میں ہار جیت کے امکانات برابر تھے۔ جیت کا مطلب تھا اس دوہرے قتل کے جھوٹے الزام سے چھٹکارا۔ ایک بار یہاں سے نکل جانے کے بعد میں محفوظ تھا۔ اسلام آباد اور لاہور میں میری بے گناہی کے گواہ بہت تھے۔ خدانخواستہ پولیس مجھے پکڑنے میں کامیاب ہو جاتی تو انہیں سخت خفت اٹھا کے لوٹنا پڑتا۔

www.paksociety.com

ہمیں تجربے نے بازی ہارنے کا مطلب صرف سزائے موت تھا۔
پلک جھپکتے میں میرا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور ہتھکڑی جھنجھلی کا بھرپور وار انسپکٹر کی گردن سے ذرا نیچے شانے پر پڑا۔ دوسرا ہاتھ سیدھا آگے گیا اور حوالدار اوٹھتے خان کے نرخرے پر لگا۔ حوالدار کا تو سانس ذرا سی دیر کے لیے رک گیا۔ اس نے بے اختیار منہ کھولا لیکن چلانے کے لیے نہیں، ہوا کے لیے۔ لیکن ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ دوسرا سانس نہ لے سکا اور وہیں کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ انسپکٹر لڑکھڑا کے آگے جھکا اور اس کا سر میز پر لگا۔ اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ وہ کراہتے ہوئے کسی کو پکارنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کا سر میز کے کونے پر اس طرح مارا کہ چوٹ کنپٹی پر آئی۔ وہ بے سدھ ہو کے کرسی سے گرا تو کرسی کے گرنے سے تھوڑی سی آواز پیدا ہوئی۔ یہ آواز کسی کو بھی متوجہ کر سکتی تھی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر سب انسپکٹر کا ریوالور قبضے میں کیا اور دروازے کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اگر کوئی شامت کا مارا اندر آ جاتا تو مجموعی صورت حال کو سمجھنے سے پہلے ہی ریوالور کا بٹ اس کے سر پر پڑ جاتا اور وہ خود بھی لمبا لیٹ جاتا۔

ایک منٹ انتظار کرنے کے بعد میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ کمرے کے ساتھ ایک چھوٹا سا بیت الخلا قسم کا باتھ روم تھا جس میں صرف دو بالٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کو قیدی اور زیر تفتیش مجرم نظام اخراج کی ضروریات پوری کرنے کے لیے استعمال کر سکتے تھے اور کرتے رہے تھے۔ چنانچہ اس کی بدبو سے وہ کمرہ متعفن ہو رہا تھا۔ ایک رات میں بھی تھانے میں تفتیش کے پُرتشدد اور انسانیت سوز طریقوں کا شکار ہوا تھا۔ وہاں بھی ایسی ہی بالٹیاں تھیں۔ گندی بالٹی میں ان کی غلاظت بھی پھینکی جاتی تھی جو وحشیانہ جسمانی اذیت کی تاب نہ لاتے ہوئے گندگی اور آلائش پھیلاتے تھے الٹیاں کرتے تھے یا خون اگلنے لگتے تھے۔ دوسری بالٹی میں پانی تھا۔ چہرے کے لیے غلاظت صاف کرنے کے لیے یا بے ہوش ہو جانے والوں کو ہوش میں لانے کے لیے یا کسی ضدی مجرم کا سر ڈبو کے اس کی زبان کھلوانے کے لیے۔ تھانے میں گزری ہولناک رات کی یاد سے مجھے جھرجھری آ گئی۔

میں نے جلدی جلدی بالٹی کے پانی سے ہاتھ صاف کیے پھر کپڑے اتار کے چہرے اور جسم پر گیلا کپڑا پھیرا اور خون کے داغ رگڑے۔ پھر میں دروازہ بند کر کے واپس کمرے میں آیا۔ سب انسپکٹر تقریباً میرے سائز کا تھا۔ پانچ منٹ میں اس کی وردی اتار کے میں نے اپنے جسم پر چڑھا لی۔ اس وقت مجھے اپنے ایک ہاتھ اور پاؤں میں کسی قسم کی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوا۔ میرا ذہن سر پر منڈلانے والے خطرے سے نبرد آزما تھا۔ سب انسپکٹر کے جوتے پہننے میں بھی مجھے پانچ منٹ ہی لگے۔ اس کی ٹوپی سر پر لگا کے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ خود کو آئینے میں دیکھوں کہ میں اپنا حلیہ بدلنے میں کس حد تک کامیاب رہا۔ میرے چہرے پر کوئی لہو کا داغ تو نہیں ہے جو نمایاں ہو کے پکارنے لگے کہ دوڑو، پکڑو، مجرم فرار ہو رہا ہے۔ وردی مجھے چھوٹی بڑی تو نہیں ہے اور فرق اتنا واضح تو نہیں ہے کہ جو دیکھے وہ ایک نظر میں پہچان لے۔ لیکن وہاں آئینہ کہاں تھا۔ ہر طرف نصف شب کا ہولناک سناٹا تھا۔

میرے پاؤں پر بندھی ہوئی پٹی تو پتلون کے نیچے آ گئی تھی لیکن بائیں ہاتھ کی پٹی وردی کی آدھی آستین سے باہر تھی اور یہ انتہائی نمایاں خطرہ تھا۔ کوئی بھی پولیس مین یا افسر مجھے دیکھتے ہی شک میں مبتلا ہو سکتا تھا کیونکہ ان میں سے کسی کا ہاتھ زخمی نہیں تھا۔ سب انسپکٹر کی جیب سے چابیوں کے ساتھ چھوٹا سا ناخن تراش اور اس کے برابر جیبی چاقو بھی نکلا تھا۔ میں نے تین انچ کے بلیڈ جیسی دھار والے چاقو سے پٹی کو ایک جگہ سے کاٹا اور کھولنے لگا۔ پوری پٹی ہٹانے کے بعد مجھے اپنا سوجا ہوا بازو دکھائی دیا۔ یہ صرف ہڈی پر ضرب کا اثر تھا۔ ہڈی میں فریکچر نہیں تھا۔ چلتے چلتے میں نے سب انسپکٹر کی گھڑی اتار کے اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی میں پہنی۔ پھر حوالدار کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس میں سے سات سو بیس روپے نکلے۔ میں نے یہ بھی اپنی جیب میں منتقل کیے۔ ابھی میں نے سب انسپکٹر کی کوئی جیب ٹٹول کر نہیں دیکھی تھی لیکن میرا خیال تھا کہ حوالدار اوٹھتے خان جیب میں اپنی ماہانہ آمدنی سے دگنی رقم لیے پھر رہے تھے تو انسپکٹر کے پاس بھی ہزاروں ضرور ہوں گے۔ وہ بہرحال افسر تھا۔ انسپکٹر کے رومال سے میں نے ہر اس جگہ کو صاف کر دیا جہاں مجھے اپنے فنگر پرنٹ کا شبہ ہوا۔ پھر ریوالور ہاتھ میں لے کر میں نے اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور باہر جھانکا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا لیکن دوسری طرف سے ان آوازوں کا شور سنائی دے رہا تھا جو تھانے کی پہچان ہوتی ہیں۔ تھانہ ہی کیا ہر مقام آوازوں کی وجہ سے پہچان رکھتا ہے۔ ہر قسم کے جانوروں اور پرندوں کی آوازوں سے گونجتا جنگل، ہر طرح کی ٹریفک کے شور سے معمور شہر، ہر قسم کی مشینوں کی گڑگڑاہٹ سے بھرپور کارخانہ، طیاروں کی گھن گرج اور بموں کے دھماکوں سے لرزتا محاذ جنگ، سناٹے کی بازگشت کو دہراتے برف پوش کوہسار۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے وہ بیان سمیٹ کر جیب میں رکھ لیا جس پر مجھے

دستخط کرنے تھے۔ میں نے آہستہ سے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور مخالف سمت میں چلنے لگا۔ تھانے کی عمارت میں کسی عقبی دروازے کا ملنا یقینی تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اتنی بڑی عمارت میں آنے جانے کا ایک ہی راستہ ہو۔ چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک کمرے کا کھلا دروازہ نظر آیا۔ یہ کمرہ نہیں خاصا بڑا ہال تھا جس میں دونوں جانب دیوار کے ساتھ ساتھ چارپائیوں کی قطار تھی۔ ہر قطار میں تین چارپائیاں تھیں۔ ہر چارپائی کے بعد لکڑی یا ٹین کا ایک باکس رکھا تھا۔ یا میز تھی جس پر تیل کنگھے اور ٹوتھ پیسٹ قسم کی اشیا رکھی تھیں۔ جہاں میز نہیں تھی وہاں سرہانے کی جانب دیوار پر شیلف سا بنا لیا گیا تھا۔ تین چارپائیاں بالکل خالی تھیں۔ دو پر وہ پولیس مین تان کے سو رہے تھے جو ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ سر تک چادر لپیٹے بالکل سیدھے لیٹے وہ لاش نظر آتے تھے۔ صرف ایک شخص بنیان دھوتی باندھے سیدھا بیٹھا نسوار کی ڈبیا کے آئینے میں دیکھ دیکھ کر اپنی مونچھیں کتر رہا تھا۔ اگر وہ اس کام میں منہمک نہ ہوتا تو کسی افسر کو چراغوں کی روشنی میں رک سے گزرتا دیکھ کے ضرور چونکتا لیکن اس نے مجھے ذرا دیر سے دیکھا۔ ہڑبڑا کے کھڑا ہوا اور پھر بیٹھ گیا کیونکہ سیلوٹ کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ چالیس واٹ کے بلب کی مدھم روشنی میں وہ میرا چہرہ صاف طور پر دیکھ ہی نہ سکا۔

میں نے اطمینان کی گہری سانس لی اور سیدھا بیرک کے دوسرے دروازے سے باہر آ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک قطار میں چار غسل خانے بنے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے بائیں جانب ایک اور دو کمروں والے چھوٹے چھوٹے رہائشی فلیٹوں کی سہ منزلہ عمارات کے تین بلاک تھے جن میں پولیس کے لوگ اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ دائیں طرف احاطے کی دیوار تھی۔ اس میں دروازہ کوئی نہیں تھا لیکن فلیٹ میں بسنے والوں نے اپنی سہولت کے لیے دیوار کے ایک حصے میں شگاف ڈال دیا تھا جو اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس میں سے سر جھکا کر گزرا جا سکتا تھا اور تھانے کا چکر لگا کے نہیں جانا پڑتا تھا۔ میں بھی کسی دشواری کے بغیر اس سے گزرا۔ میرے ساتھ ہی ایک نوجوان لڑکے نے اندر آنے کی کوشش کی۔ تصادم میں اس کے ہاتھ سے کتابیں گر گئیں اور میرے سر سے ٹوپی۔ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے "معاف کرنا بھائی" نکل گیا جو بڑی غلط بات تھی۔ کوئی پولیس کا تھانیدار ایسے شائستہ اور نرم لہجے میں ایک نوجوان سے معافی نہیں مانگ سکتا۔ اگر اس کے بجائے میں گالی دے کر کہتا "اندھا ہے الو کے پٹھے" تو لڑکا بالکل برا نہ مانتا اور حیران بھی نہ ہوتا۔ جب میں نے ٹوپی سر پر رکھی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ کتابیں سمیٹنے کے بجائے غور سے میری صورت کو تک رہا ہے پھر اس کی نگاہ میری وردی کی جیب پر گئی جس پر نیلے پلاسٹک کی پٹی لگی ہوئی تھی اور جس پر اس افسر کا نام سفید حروف میں لکھا ہوا تھا جس کی یہ وردی تھی۔

"کون ہو تم؟" لڑکا ایک دم کھڑا ہو گیا۔ وہ یقیناً وہیں رہتا تھا۔ چنانچہ تھانے کے افسروں کو پہچانتا تھا۔

"تمہیں کیا نظر آتا ہوں میں؟" میں نے لہجہ بدل کے سخت الفاظ میں کہا۔ "شیشم کا درخت؟" لیکن میرے جواب اور لہجے نے نوجوان کو مطمئن نہیں کیا۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا تھا، کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں جو کہیں سے پڑھ کے لوٹ رہا تھا۔

"یہ وردی تمہاری نہیں ہے!" وہ کتابیں چھوڑ کے چلاتا ہوا بھاگا۔ اگر میں اس کے پیچھے دوڑتا تو اسے پچاس گز طے کرنے کے بعد پکڑ سکتا تھا اور خاموش بھی کر سکتا تھا لیکن پچاس گز دشمن کی سرحد کے اندر ہوتے۔ نوجوان کی چیخ پکار پر تھانے والوں کا متوجہ ہونا لازمی تھا۔ اس کے بعد میرا واپس پچاس گز دوڑ کر آنا اور فرار ہونا بہت مشکل ہو جاتا۔ میں نے غلط موڑ کے باہر نکل جانا بہتر سمجھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ باہر نکلنے کے بعد کیا ہوگا۔ مجھے فوراً کوئی سواری ملے گی یا نہیں۔ گلی ہوگی تو سڑک کس سمت ہوگی اور سڑک ہوگی تو مجھے کہاں لے جائے گی۔ تھانیدار کی وردی میں کے بازار تک دوڑ لگانا تھانیدار کی شان نہیں۔ یہ منظر پبلک نے کبھی نہیں دیکھا۔ خواہ مجرم فرار ہو رہا ہو۔ اکثر تھانیدار بار شکم کے باعث اس قابل نہیں ہوتے کہ ایک فرلانگ بھی بھاگ سکیں۔ نوجوان اور پھرتیلے مجرم فرار ہو جاتے ہیں اور تھانیدار ایک آدھ ہوائی فائر کر کے ماتحت کی نااہلی پر گرجتے برستے لوٹ آتے ہیں۔ میں تو اپنی ایک ٹانگ کے جزوی طور پر ناکارہ ہونے کے سبب سیدھا بھی بڑی مشکل سے چل رہا تھا اور اب مجھے سخت پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ دور کہیں سے کسی کلاک نے ایک گھنٹا بجایا۔

میرے اور تعاقب میں روانہ ہونے والوں کے درمیان تقریباً دو سو گز حائل تھے۔ جو دس منٹ کا فاصلہ بھی نہ تھا۔ نیلے پیلے سپاہی شکاری کتوں کی طرح دوڑتے ہوئے آتے تو میں چند قدم بھی نہ چل پاتا کہ پکڑ لیا جاتا۔ مجھ پر تشدد تو ہوا تھا لیکن بہت کم۔ صرف اس لیے کہ میں پولیس کے ساتھ تعاون کر رہا تھا اور ان کے لیے کیس میں کسی قسم کی الجھن پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لیکن فرار کی کوشش تو ان سب کا خاتمہ خراب کرنے کے مترادف تھی۔ وہ نااہل قرار پاتے۔ لائن حاضر کیے جاتے یا معطل ہو جاتے۔ چنانچہ میں دوسری بار گرفتار ہوتا تو ان سب کی

www.paksociety.com

انتقامی کارروائی کا نشانہ بنتا اور وہ میرے جسم پر تشدد کے وہ سب طریقے آزماتے جو برسوں کے تجربے کا ماحصل ہوتے اور جن کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بڑے بڑے سورما ان اذیت گاہوں میں محض شک کی بنیاد پر لائے گئے اور پھر حادثاتی موت سے دوچار ہوئے۔ ان کی لاشیں سڑکوں پر ڈال دی گئیں اور جب ان پر سے گاڑیاں گزر گئیں تو یہ حادثاتی موت کہلائی۔ تشدد سے ہلاک ہونے والوں کے بارے میں کہا گیا کہ انھوں نے خودکشی کر لی۔ اخبارات نے یا لواحقین نے واویلا کیا تو تحقیقات کی رسمی کارروائی بھی ہوئی لیکن اس کے بعد کچھ نہ ہوا۔

میں گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔ میری ساری جدوجہد ایک غیر متوقع اور معمولی سے واقعے کے باعث ناکامی بن رہی تھی۔ اسی کو کہتے ہیں تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔ قسمت نے ساتھ دیا ہوتا تو وہ ریوالور واپس پیڈرو کے ہاتھ میں کیوں پہنچتا جو میں نے ہر طرف سے محصور ہونے کے باوجود دشمنوں سے چھین لیا تھا۔ اس وقت بھی میرے پاس بھرا ہوا ریوالور تھا لیکن میں بازار سے فائرنگ کرتا ہوا فرار نہیں ہو سکتا تھا اور پیچھے آنے والوں کو بے دریغ گولی نہیں مار سکتا تھا البتہ وہ مجھے دور سے ہی نشانہ بنا سکتے تھے اور کتے کی موت مار کے بے فکر ہو سکتے تھے کہ انھوں نے ایک قاتل کے فرار کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ ابھی تک دیوار کے شگاف سے کوئی نہیں نکلا تھا لیکن مجھے کوئی رکشا یا ٹیکسی بھی نظر نہیں آئی تھی۔ یہ رہائشی علاقہ تھا جہاں کسی کی چند دکانیں تھیں۔ پیچھے سے ایک پرائیویٹ کار آئی مگر اس میں کسی کی پوری فیملی بھری ہوئی تھی۔ میں چلتا گیا اور پلٹ پلٹ کے دیکھتا رہا۔ ایک اسکوٹر والا میرے اشارے کی پروا کیے بغیر گزر گیا پھر دوسری کار ایک کوٹھی میں سے نکلی۔ میں نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا تو کار رک گئی۔

"میں صدر تک جا رہا ہوں۔" کار کے ادھیڑ عمر مالک نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا۔

"مجھے بھی صدر ہی جانا تھا۔" میں نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنی پتلون کا پائنچا اٹھا کے اسے پٹیاں دکھائیں۔ "میں کافی دیر سے پیدل چل رہا تھا۔ کوئی رکشا ٹیکسی نہیں ملی۔ پیر میں بہت تکلیف ہے۔"

کار کے مالک نے سر ہلا کے افسوس کا اظہار کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ "کیا ہوا تھا؟" وہ بولا۔

لیکن میں سامنے لگے ہوئے شیشے میں پیچھے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ تھانے کی دیوار کے شگاف سے بہت سے وردی والے نکل آئے تھے۔ میں نے کھڑکی سے سر نکال کے پیچھے دیکھا تو وہ سب بے بسی سے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کے چلا رہے تھے اور پھر کار کو اپنی دسترس سے دور جاتا دیکھ رہے تھے۔ شاید اس وقت تھانے میں کسی کی موٹر سائیکل یا کھڑی ہوئی گاڑی تک نہ تھی ورنہ وہ پیچھا ضرور کرتے۔ سب میری طرح ان کو بھی کسی سواری کا انتظار تھا جو فوری طور پر دستیاب نہیں تھی۔ یہ چند منٹ کی مہلت مجھے غالباً اس لیے مل گئی تھی کہ وہ پہلے اس سب انسپکٹر کی خیریت معلوم کر رہے ہوں گے جو یرغمال بنا لیا گیا تھا تاکہ نوجوان کے شکوک کی تصدیق ہو جائے پھر انھوں نے دیکھا ہوگا کہ بے وردی سب انسپکٹر بے جان تو نہیں ہے اور گھٹنے خان کو کانسٹیبل کی نیند تو نہیں سلا دیا گیا ہے۔

اپنی کامیابی نے مجھے بے پناہ مسرت عطا کی اور میرا حوصلہ ہمالیہ پہاڑ سے بھی بلند تر ہو گیا۔ یہ میری بہت بڑی فتح تھی۔ دشمنوں نے مجھے دوہرے قتل کے جھوٹے الزام میں ملوث کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور وہ ابھی تک مطمئن ہوں گے کہ اس کوشش میں کامیاب ہیں۔ ایک شکاری دوسرے شکاری کو مبارک باد دے رہا ہوگا کہ اس بار سکندر بخت ایسا پھنسا ہے کہ نہ اسے چالاکی بچا سکے گی نہ وکیلوں کی مدد۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سازش ناکام رہی۔ کسی کو میری گرفتاری کی خبر تک نہ ہوئی اور میں جھوٹ، مکر و فریب اور شیطانی حربوں کے جال سے صاف بچ کر نکل آیا۔ قانون مجھے بے گناہ تسلیم کر کے باعزت طور پر بری کرتا تو برسوں بعد۔ بہت اذیت برداشت کرنے اور بہت خوار ہونے کے بعد۔

"میں نے پوچھا تھا کہ اس ٹانگ کو کیا ہوا ہے؟" کار کے مالک نے کہا۔ "تم پیچھے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اپنی نظر ہمیشہ آگے رکھتا ہوں لیکن بقول شاعر کبھی گزری ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو۔"

گاڑی اب ایک کم آباد سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ "آپ نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟"

"نام نہ تم نے پوچھا تھا اور نہ میں نے بتایا تھا۔" وہ گھوری سے بولا۔ "ویسے مجھے غلام کہتے ہیں۔"

"صرف غلام؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اسی لیے آپ ہر ایک کی مان لیتے ہیں۔ مثلاً میرے لیے گاڑی روک لی تھی آپ نے اور ابھی میں آپ سے کہوں گا کہ گاڑی روک کے چابیاں میرے حوالے کر دیں تو یہ بات بھی مان لیں گے آپ۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں ایسی فضول بات کیوں مانوں گا۔" وہ برا مان کے بولا۔

"اس لیے کہ ہم دونوں کا بھلا اسی میں ہے۔" میں نے ریوالور نکال کے کہا۔ "گاڑی روک لیجیے غلام صاحب۔"

اس کا رنگ ریوالور دیکھ کے فق ہو گیا تھا۔ اس نے گاڑی روک دی۔ "یہ... یہ صلہ ہے شرافت کا؟ اگر کوئی قانون پسند شہری پولیس کی مدد کرتا ہے تو... تو پولیس یہ کرتی ہے اس کے ساتھ؟" وہ بولا۔

"پولیس جو کچھ کرتی ہے اس سے مجھے کوئی غرض نہیں۔" میں نے کہا۔ "اب آپ یہاں اتر جائیں اور سیدھے چلتے جائیں۔ پولیس کو رپورٹ کرنے کے چکر میں مت پڑیے۔ آپ کو کار واپس لینی مشکل ہو جائے گی اور مفت الٹے چکر میں پھنس جائیں گے آپ۔ میں اپنے محسن کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتا۔ آپ کی گاڑی اسی سڑک پر ایک میل آگے کھڑی ہوگی۔"

"مجھے شک ہے کہ تم پولیس کے بھیس میں چور ڈاکو ہو۔" اس نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"چور ڈاکو نہیں جناب۔ مفرور چور ڈاکو۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ شور ہنگامہ مت کریں اور پولیس میں رپورٹ کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ عین ممکن ہے وہ آپ کو بھی دھر لیں کہ آپ نے ایک مجرم کو فرار ہونے میں مدد دی اور آپ اس کے ساتھی ہیں۔ آپ گاڑی لیے تھانے کے باہر موجود تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ نہ میں چور ڈاکو ہوں، نہ آپ میرے ساتھی ہیں لیکن پولیس کی سمجھ کا کیا علاج۔ ایک میل زیادہ نہیں ہوتا۔ آپ اطمینان سے چلتے ہوئے بھی بیس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد مجھ سے ملاقات کو بھول جائیے۔ ایسا کوئی واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ آپ بیس منٹ دیر سے پہنچنے کی کوئی بھی معقول وجہ پیش کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ کا ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا۔ چابی گلوز کمپارٹمنٹ میں ہوگی۔" گاڑی کی گھڑی رات کے دو بجا رہی تھی۔ وہ مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہوا نیچے اترا۔ "خدا حافظ۔" میں نے ہاتھ ہلا کے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ جب میں نے دیکھا تو وہ اطمینان سے مارچ کرتا ہوا روانہ ہو چکا تھا۔ ایک میل سے کچھ آگے جا کے میں نے کار کو سڑک کے کنارے صحیح جگہ پارک کیا۔ انجن بند کر کے چابی گلوز کمپارٹمنٹ میں ڈالی اور دروازہ بند کر کے نیچے اتر آیا۔ چند منٹ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد میں نے ایک سائڈ اسٹریٹ میں چلنا شروع کیا۔ میری کامیابی پر اب مہر تصدیق ثبت ہو گئی تھی۔ اس تجربے پر میرا اعتقاد اور راسخ ہو گیا تھا کہ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ ہمیشہ زبردست رہا ہے اور رہے گا اور اس کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔ بالآخر میں پھر آزاد ہو گیا تھا اور وہ شکاری جنھوں نے مجھے زیر دام لانے کے لیے بہت مضبوط جال پھیلایا تھا پھر اپنی ناکامی پر نوحہ خواں تھے۔ کتنے اضافے کے ساتھ

دلاور نے مجھ سے کہا تھا کہ ہم تمھیں سات سال تک اسیر رکھیں گے۔ وقتاً فوقتاً تمھاری زندگی کا ثبوت فراہم کرتے رہیں گے لیکن تمھیں لاپتا رکھیں گے تاکہ تمھیں قانوناً مردہ بھی قرار نہ دیا جا سکے اور وراثت کا سرٹیفکیٹ کسی کو جاری نہ ہو سکے۔ یہ منصوبہ بہت مکمل تھا لیکن اس پر عمل درآمد کتنا مشکل ہوگا، اس کا وہ پوری طرح اندازہ نہیں کر سکے۔ میرے جیسے کسی بھی شخص کو سات سال تک ساری دنیا کی نظروں سے اوجھل رکھنا اور دن رات میری پہرے داری کرنا بہت دشوار کام تھا۔ سات برسوں کے ڈھائی ہزار سے زیادہ دنوں میں تقدیر مجھے ایک بھی موقع فراہم کر دیتی تو ان کی محنت اکارت جاتی مگر وہ ضدی اور کینہ پرور لوگ تھے۔ ان کو کم ہمت نہیں کہا جا سکتا اور غیر مستقل مزاج نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا سرغنہ چوہدری دلاور انتہائی ذہین اور ٹھنڈے دل و دماغ والا آدمی تھا۔ اس نے منصوبے کی جزئیات اور تفصیلات پر اچھی طرح غور کر لیا ہوگا۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتاتا کہ سات سال تک وہ مجھے کہاں کہاں رکھتے اور کیسے رکھتے۔ میرا قید خانہ کتنے دور افتادہ اور اجنبی مقامات پر کتنی بار بدلتے۔ مجھے کب تک بے ہوش اور پابہ زنجیر رکھتے۔ ابھی تو سات دن بھی نہیں گزرے تھے کہ میں قید سے نکل بھاگا اور آزادی کی اس جنگ میں داروغہ زنداں کے علاوہ بھی تین افراد مارے گئے۔ روبی، پیٹر اور روبی کی ماں۔ میں ان کو مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن قدرت پہلے ہی ان کو سزا دینے کا فیصلہ صادر کر چکی تھی۔ شاید یہ سزا انہی کے اعمال کا شاخسانہ تھی۔

میں جانتا تھا کہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کو اس ناکامی پر کتنا صدمہ ہوگا۔ پیٹر تو صرف ایک وحشی قوت تھا۔ اس کا جسم انسانی تھا لیکن عقل و فہم میں وہ لاکھوں کروڑوں سال پہلے کا انسان تھا جس کو سائنس داں بندر کے قبیلے کی مخلوق قرار دیتے ہیں۔ ایسے قصور وار نہیں سمجھا جا سکتا۔ دلاور کا سارا عذاب پیڈرو پر نازل ہوگا۔ اس نے اپنی بے وفا بیوی پر بھروسہ کیا۔ اس کے آشنا کو یرغمال بنا کے قید میں رکھا اور اس خدمت کے انعام میں لیلیٰ کو مجنوں کے وصل سے شاد کامی کا یقین دلایا۔ وہ روبی سے بہر صورت نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ پھر پیٹر کو وہ کیسے زندہ چھوڑتا لیکن اب اس پر الزام آئے گا کہ اس نے جو انتظامات کیے تھے ناقص تھے اور اسی کی کوتاہی کا نتیجہ ہے کہ سات سالہ منصوبہ سات دن میں چوپٹ ہو گیا۔ اب وہ یہی کر سکتے ہیں کہ پولیس کو میرے ٹھکانے کی اطلاع دے دیں لیکن ان کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ راجا اور منظر پولیس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ کون آغا علی احمد عرشی الہ آبادی؟ کہاں کھا گئے ہیں

آپ لوگ، پھر ایس آئی اکرام شیخ ہوگا اور ایس پی ضامن رضوی۔ وہ چکرا جائیں گے کہ بظاہر ملزم وہی ہے۔ شکل صورت میں بھی صرف اتنا ہی فرق پڑا ہے کہ بڑھی ہوئی شیو، بکھرے بالوں اور غلیظ کپڑوں کی جگہ اب وہی شخص کلین شیو، صاف ستھرے اور بہترین سوٹ میں ہے مگر اس کے علاوہ بھی یہ سکندر بخت ہے، ایک فیکٹری کا مالک، ولایت پلٹ انجینئر اور پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کے گھر میں مقیم۔ وہ بمشکل اتنا کہہ کے لوٹیں گے تو اپنی کوتاہی پر ایک دوسرے کو الزام دیں گے اور مفرور مجرم کو گالیاں دیں گے جو ان کی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں بے وقوف بنا گئے "ڈز" دے گیا۔ مگر ان کو یہ معلوم ہوگا کہ سیسن کون تھا اور جس کے گھر میں قتل ہوا وہ کون ہے، ان کا آپس میں کیا تعلق تھا؟ پوسٹ مارٹم رپورٹ مزید الجھن پیدا کرے گی کہ اسے زہر دے کر کس نے مارا۔ روبل اور بچہ کے قتل کو وہ سیسن کے قتل سے منسوب کر ہی نہیں سکیں گے۔ روبی کی ماں زندہ ہوتی تو شاید کچھ بتا دیتی۔ اب تو ان دونوں کو بھی لاوارث قرار دے کر دفن کر دیا جائے گا اور ان کی فائلیں بھی سیکڑوں ہزاروں فائلوں کی طرح کلوز ہو جائیں گی جن میں قتل کی وارداتوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس مصیبت سے نجات پاتے ہی مجھے محسن یاد آیا اور میں تڑپ اٹھا۔ اپنی اور اس کی دوستی اور رفاقت کے تیس برسوں کو یاد کرتا میں چلتا گیا۔ سڑک آگے جاکے دو حصوں میں تقسیم ہوگئی اور وہاں مجھے ایک ٹیکسی بھی نظر آگئی جس نے سواریاں اتاری ہی تھیں۔ بالکل تھا دیدار اسی نشان کے ساتھ میں نے دروازہ کھولا اور پیچھے بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے جو ابھی سواریوں سے کرایہ کے مسئلے پر مذاکرات میں مصروف تھا، بلا اجازت بیٹھنے والے کو سخت غصے میں پلٹ کر دیکھا، پھر اس کی آواز بند ہوگئی۔ "اسلام آباد چلو۔" میں نے اسے حکم دیا اور وہ خوف کے گھونٹ پی کر چل پڑا۔ اسے ڈبل نقصان ہوا تھا۔ ایک تو وہ میٹر سے زائد پیسے وصول نہیں کر سکا تھا اور اتنی دیر میں خالی ٹیکسی پر ایک مفت خور اجنبی سوار قابض ہو گیا تھا جس سے کرایہ ملنے کی کوئی امید ہی نہیں تھی۔ پھر راستے کے تین بجے خالی واپس آنا بھی نقصان ہی تھا۔

میرے دل پر اب محسن کی موت کا صدمہ ایک بار گراں بن گیا تھا۔ عدم تحفظ کے احساس سے نجات پاتے ہی اس کا غم جاگ اٹھا تھا اور جیسے جیسے میں اسلام آباد کی طرف بڑھ رہا تھا، میری جستجو جواب دیتی جا رہی تھی۔ اس گھر میں اب کون ہوگا جہاں محسن ہی نہیں؟ اس کی ماں بھی جوان بیٹے سے جدائی کے بعد کہاں زندہ رہی ہوگی۔ صرف شہلا ہوگی جس کی محبت کا چمن ـــــ فصلِ گل کی خبر سے پہلے ہی خزاں نے اجاڑ دیا۔ نخلِ محبت جو حالات کی سخت زمین سے پھوٹا تھا جل گیا، ہر خواب ابھی پورا بھی نہ ہوا تھا کہ ٹوٹ گیا۔ اپنی اس بہن کو میں کیسے تسلی دوں گا جو اپنا گھر بسنے سے پہلے ہی بیوہ ہوگئی۔ کیسے صبر کی تلقین کروں گا کہ جب خود مجھے صبر کا حوصلہ نہیں۔

"اسلام آباد میں کدھر جانا ہے سر جی؟" ٹیکسی ڈرائیور نے خوف زدہ ہو کے پوچھا۔ میں نے چونک کر اسے ہدایات دیں۔ چند منٹ بعد ٹیکسی انکل ظہیر والی کے گھر کے سامنے جا رکی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو کے نوٹوں کی ایک گڈی میرے ہاتھ میں آگئی جس میں کم سے کم بیس نوٹ تھے۔ دوسری جیب سے پچاس کا ایک اور دس دس کے دو نوٹ نکلے۔ میں نے اسے پچاس روپے دیے اور کہا "جاؤ"۔ وہ پچاس کا نوٹ پکڑے ہکا بکا مجھے دیکھتا رہا اور پھر "سلام سر جی۔ بڑی مہربانی" کہہ کے بھاگ لیا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے تین بج چکے تھے۔

میں دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ میرے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے ـــــ دل چاہتا تھا کہ یہیں سے لوٹ جاؤں لیکن یہاں سے بھاگ کر لاہور کے سوا میں کہاں جا سکتا تھا۔ محسن وہاں بھی نہیں ہوگا۔ صرف رابعہ ہوگی جو اب بھی کھڑکی کھولے بیٹھی ہوگی اور ویران آنکھوں سے خلا میں دیکھ رہی ہوگی۔ ہوا سے راہ گزر سے سوال کرنے والی آنکھیں انتظار کے بعد مایوس ہوگئی ہوں گی کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا مگر وہ بار بار دل کو سمجھاتی ہوگی کہ میرے وقت پر نہ پہنچنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ دیر بھی تو ہو سکتی ہے۔ سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے۔ ہو سکتا ہے وہ آج رات نہ آئے کل آ جائے۔

میں گیٹ سے اندر داخل ہوا اور لان میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری نظر میں رابعہ کا چہرہ گھوم گیا۔ اداس، پژمردہ، جیسے ان سب دکھوں کی تصویر جو دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں دیے۔ بے آسرا اور تنہا اس مسافر کی طرح جو منزل پر پہنچ کے لٹ جائے۔ ان خوابوں کے سوا اس کے پاس کیا رہا تھا جو اس نے اب میرے حوالے سے دیکھنے شروع کیے تھے۔ اپنے خوابوں کی اسے بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ اس کا گھر تباہ ہو گیا تھا۔ پریکٹس ختم ہو گئی تھی اور اس نے نیک نامی کی جگہ بدنامی کمائی تھی۔ خود اس نے عورت ہو کے بھی شدید مشکلات کا سامنا کیا تھا۔ دشمنوں کے ہاتھوں ذلت برداشت کی تھی اور وہ اذیت اٹھائی تھی جو کسی عام عورت کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے پیچھے ماضی فقط ایک پُرعذاب سفر تھا لیکن اس نے مستقبل کو بھی بہت اپنا لیا تھا۔ مجھ سے کہا تھا کہ سکندر میری طرح تم بھی سب کچھ قربان

کر دو اور چلو ہم اپنی دنیا کہیں اور بسا لیتے ہیں لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ کیوں انکار کیا تھا میں نے؟ کیا میں بزدل تھا؟ مجھے اپنی آرزوئے انتقام اس کی محبت سے زیادہ عزیز تھی؟ یا میری محبت میں اتنی وسعت نہیں تھی کہ سارے جہاں کو چھوڑ کے رابعہ کے خواب میں سمٹ کر مطمئن ہو جاتی؟ آخر کیا پایا میں نے اس زندگی سے؟ اپنے باپ کے علاوہ میں نے کتنے دوست گنوا دیے۔ منشی، فوما، نجو اور سلامت شاہ کو، رابعہ اور شہلا کی ماں کو، ان کے علاوہ ان گنت لوگوں کو اور بالآخر محسن کو۔ میرے گرد شکاریوں کا حصار تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا۔ خطرات بڑھ رہے تھے اور میری مشکلات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ابھی تک نہ کسی کو فتح ہوئی تھی نہ شکست لیکن نقصان دونوں طرف برابر ہو رہا تھا۔ پھر ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اصولوں پر مفاہمت کا کوئی سوال نہ تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں رابعہ کی مان لوں اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے نکل جاؤں۔ مجھ میں صلاحیت ہے، عزم اور حوصلہ ہے۔ اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم۔

میں اپنے خیالات میں کھو رہا تھا اور وردی کی جیب سے ملنے والی سگریٹ کو لائٹر سے سلگائے بیٹھا تھا کہ مجھے پودوں کے درمیان حرکت کا احساس ہوا۔ آخر شب کی مدھم چاندنی میں کوئی سایہ تھا جو شجر سے جدا ہوا۔ میں نے غور سے دیکھا اور شہلا کو پہچان لیا۔ وہ کسی بُت کی طرح کھڑی خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ میں نے سگریٹ کو نیچے ڈال کے بجھایا اور دھڑکتے دل کو سنبھال کے دبے پاؤں آگے بڑھا۔ اسے بالکل احساس نہیں ہوا اور میں اس کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔ اس نے آہستہ سے سسکی لی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ میرے دل میں یہ سسکی خنجر کی نوک بن کے اتر گئی۔

"شہلا!" میں نے آواز کی رقت پر قابو پا کے آہستہ سے کہا۔ "کیا رونے سے جانے والے لوٹ آئیں گے بہن؟" وہ بری طرح چونک کے پلٹی۔ چند لمحے کے لیے اس کی آنکھیں بے یقینی کی کیفیت میں میرے چہرے پر منجمد ہو گئیں۔ پولیس کی وردی میں وہ اچانک مجھے اپنے مقابل دیکھتی تو بے اختیار چیخ مار دیتی لیکن اس نے میری آواز کو شناخت کر لیا تھا اور پھر اس اجنبی حلیے کے باوجود میری صورت بھی پہچان گئی تھی۔

"سکندر بھائی!" اس نے بمشکل تمام کہا اور یوں لڑکھڑائی جیسے اس کے قدموں میں زمین متحرک ہو گئی ہے۔

"ہاں ہاں۔" میں نے اسے سنبھال لیا۔ "شہلا میں سکندر ہی ہوں۔ میں دشمنوں کی قید میں تھا لیکن اب نکل آیا۔"

روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ "آپ... آپ نے تو رابعہ باجی سے کہا تھا..."

"ہاں۔ میں نے اس سے آج رات پہنچنے کا کہا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"ان کا فون آیا تھا۔" شہلا نے کہا۔ "گیارہ بجے، پھر بارہ بجے۔" "میں اب بھی کھڑکی کھولے ویران راہ گزر کو تک رہی ہوں، تم آؤ گے، ضرور آؤ گے۔" رابعہ کی آواز آئی۔

"مجھے دیر ہو گئی۔" میں نے ندامت سے کہا۔ "لیکن اب میں لاہور ہی جاؤں گا۔ میں آخری بار تم سے ملنے آیا تھا۔"

"آخری بار؟" وہ رونا بھول گئی۔ "آخری بار کیوں سکندر بھائی؟"

"بس شہلا، اب مجھے ہار جیت کی پروا نہیں رہی۔" میں نے زخم خوردہ لہجے میں کہا۔ "میں اکیلا نہیں لڑ سکتا۔ اکیلے آدمی کی جیت بھی ہار سے زیادہ عذاب ناک ہوتی ہے۔ محسن میرے ساتھ تھا تو میں خود کو اکیلا محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد..."

شہلا نے تڑپ کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "خدا نہ کرے انہیں کچھ ہو۔ آپ ایسی بات منہ سے کیوں نکالتے ہیں سکندر بھائی! اپنی بہن کی خوشی کی تربت عزیز تھی آپ کو؟"

میں نے اس کی کلائی تھام کے ہاتھ ہٹایا اور اسے نظر بھر کے دیکھا۔

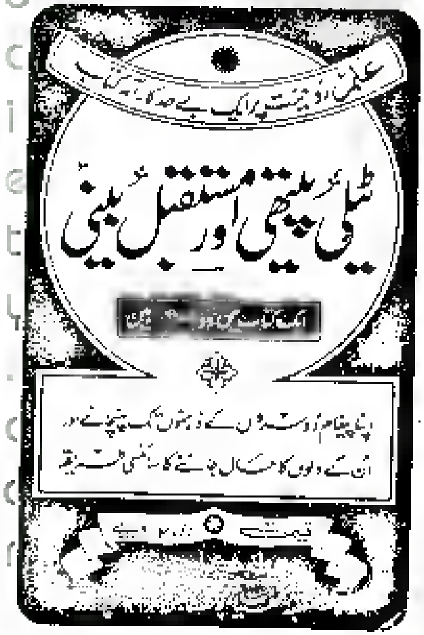

www.paksociety.com

"تمہارا مطلب ہے، محسن زندہ ہے؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ مجھے خوف آتا ہے۔" شہلا چلائی۔ "ابھی تو بات کی تھی انہوں نے انکل سے۔"

نہ جانے کتنی دیر بعد میں نے رکی ہوئی سانس کو خارج کیا اور یہ محسوس کیا کہ میرا دل پھر دھڑکنے لگا ہے۔ شہلا کی کیفیت بھی مجھ سے پوشیدہ نہ تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ "میں... دراصل... مجھے غلط بتایا گیا تھا۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "تم نے مجھے نئی زندگی بخش دی ہے شہلا۔" پھر فرط جذبات سے میرے آنسو بہہ نکلے۔ یہ تشکر کے آنسو تھے۔ احسان مندی کے جذبات تھے جو اشکوں میں ڈھل گئے تھے۔ میرے جسم کا رواں رواں ایک نئی مسرت سے سرشار ہو کے اس خدا کی حمد و ثنا کر رہا تھا جس نے مجھے جینے کے سہاروں سے محروم نہیں کیا۔ ان کو زندہ رکھا جن کے لیے میں زندہ ہوں۔ محلے کی کسی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ خدا بہت بڑا ہے۔ خدا بہت بڑا ہے۔ یہ آواز اسلام آباد کے کہساروں میں بازگشت بن کے پھیل گئی اور ساتوں آسمانوں تک کل کائنات پر محیط ہو گئی۔ میں بے اختیار سجدے میں گر گیا۔ یہ اپنے عجز کا اعتراف، اپنی بندگی اور اس کی بے پناہ عظمت کا اظہار، یہ تشکر کا سجدہ تھا۔

"سکندر بھائی!" شہلا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"شہلا!" میں نے سر اٹھا کے کہا۔ "مجھے بتاؤ محسن خیریت سے ہے؟ انکل رضوی کو معطل اور برطرف نہیں کیا گیا...؟"

"یہاں کسی کو کچھ نہیں ہوا سکندر بھائی۔" وہ بولی۔ "لیکن آپ کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں۔ آپ کی ضمانت منسوخ ہو چکی ہے کیونکہ آپ پولیس کی نظر میں مفرور، قاتل ہیں۔"

"مجھے دشمن اغوا کر کے لے گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "میں بلوچستان کے ایک گھر میں قید تھا لیکن میں یہ ثابت نہیں کر سکتا۔ مگر میں نے ثابت کرنے کی کوشش کی تو بہت سخت مشکل میں پڑ جاؤں گا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" شہلا نے کہا۔ "میں کچھ نہیں سمجھی۔ یہ صورت کس کی ہے، کس نے کی آپ سے؟"

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر کبھی سناؤں گا۔ میں سیدھا لاہور چلا جاتا مگر میں نے پہلے یہاں آنا بہتر سمجھا۔"

"اچھا ہوا کہ آپ دن میں نہیں آئے۔" وہ بولی۔ "اور مجھے نہیں لگتا کہ انکل شیروانی سے ملاقات ہو جاتی تو وہ فوراً پولیس کو بلا لیتے۔ انکل رضوی نے انہیں بہت سختی سے تاکید کی تھی۔ صاف کہا تھا کہ تم نے اس کے ساتھ رعایت یا نرمی برتی تو ہمارے ذاتی تعلقات پر برا اثر پڑے گا۔"

"انکل رضوی ایسے ہی آدمی ہیں۔" میں نے فخر سے کہا۔ "ذاتی رشتے ان کو فرض کی ادائیگی سے نہیں روک سکتے۔"

"اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں کہ آپ نکل جائیں۔" وہ بولی۔ "صبح ہونے والی ہے اور انکل شیروانی اٹھنے والے ہی ہوں گے۔ لاہور جا کے پہلے رابعہ باجی سے مل لیں۔ انہوں نے فون پر کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا؟" میں نے ہنس کے کہا۔ "اور کیوں کہا تھا؟"

"کیوں کا جواب میں کیا دوں؟" وہ مسکرائی۔ "آپ انہی سے پوچھیے گا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ سکندر نے فرار ہونے کے بعد اپنے گھر نہ آئے۔ انکل رضوی اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے اور ایک بات نہیں سنیں گے۔"

"تو رابعہ بی بی کیا کہہ رہی تھیں آخر؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں ان سے ملوں گا کیسے؟"

"پہلے کہیں سے ان کو فون کر لیں۔" شہلا نے کہا۔ "پھر جہاں کہیں وہ کہیں ملیں۔ وہ واقعی بڑی وکیل ہیں۔"

"خاک وکیل ہیں۔ وہ تم سے زیادہ احمق اور جذباتی خاتون ہیں۔" میں نے کہا۔ ذرا سی دیر میں میری کایا پلٹ گئی تھی۔ اس رنج و غم کا کہیں نشان تک نہ تھا جس کا بار میں اپنی روح پہ لیے پھر رہا تھا۔ محسن کی زندگی نے مجھے پھر سے سکندر بخت بنا دیا تھا۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ میں رابعہ کے گھر سے فون کر کے اسے بلا لوں گا لیکن ایک مصیبت زدہ کا بھائی بھی ہو آخر شناسائی تھی۔ میں انکل رضوی کے نقش قدم پر چلتا تھا۔

"اچھا میری بہن!" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ انکل شیروانی جاگیں، میرا یہاں سے نکل جانا بہتر ہے۔ لیکن میں اس حلیے میں کہیں نہیں جا سکتا۔ مجھے شریفانہ کپڑوں کا جوڑا چاہیے۔"

"آپ انتظار کریں..." وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "میرے کمرے میں جا کے سو جائیں۔ آپ کی حالت سے ظاہر ہے کہ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ لباس ہی نہیں آپ کو اپنا حلیہ بھی ٹھیک کرنا ہے۔ میں صبح جا کے ناشتے کا بندوبست کر دوں گی۔"

"بہت بہتر۔ پھر تم میرا اور انکل کا ناشتہ ایک ساتھ بنا دینا۔" میں نے کہا۔ "ناشتے کے بعد وہ دفتر چلے جائیں گے اور میں حالات جو بتاؤں گا اس کی روشنی میں سوچ لیں گے۔ مجھے آرام بہت ہے۔ حلیہ وہ خود ٹھیک کر دیں گے۔"

شہلا مسکرائی۔ "آپ گھبرائیں نہیں۔ میرے کمرے میں کوئی نہیں آئے گا۔ میں امی کو جگانے دوں گی۔ پھر انکل کے لیے ناشتہ بنا دوں گی۔ ان کے جانے کے بعد آپ کو ناشتہ دوں گی۔ تب تک آپ سوتے رہیں گے۔ میں خود آپ کو جگا دوں گی۔ نہا دھو کے اور شیو کر کے حلیہ بدل لیجیے گا۔ ویسے بہت جلدی ہے جانے کی تو جائیں۔" وہ شرارت سے بولی۔

"مفرور کے جانے کے بعد تم نے اس گھر کو سنبھال لیا ہے شہلا۔"

میں نے کہا۔ "بہت خوش قسمت ہیں انکل کہ بیٹی سے اچھی بہو ملی۔ ورنہ وہ دونوں کیا کرتے؟"

جب ذرا صبح وہ جاگ گئی اور میں چوری چھپے پیچھے سے گھر میں داخل ہوا اور اس کے کمرے میں گھس کر سو گیا لیکن نیند آنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ محسن جو میرے لیے مر گیا تھا ایک معجزے سے پھر زندہ ہو گیا تھا۔ اس کی جتنی خوشی مجھے ہو سکتی تھی وہی میری نیند اڑانے کے لیے کافی تھی۔ پھر میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ میں اس گھر میں تھا جسے ہوش سنبھالنے کے بعد سے میں نے اپنا ہی گھر سمجھا تھا لیکن آج میں یہاں مجرموں کی طرح چھپا ہوا تھا۔ میرے کان مختلف آوازوں کو سن رہے تھے۔ انکل شیروانی کے غسل کرنے کی، بار بار شہلا کو پکارنے کی۔ "ارے بھئی شہلا۔ وہ رومال نہیں مل رہا۔ شہلا تم نے وہ چشمہ ابھی تھا وہ تم نے کہاں رکھ دیا؟" ان کی عجلت سے چلنے کی آواز۔ "اب ایک چیز یا دوسری چیز ڈھونڈنے کے لیے جوان بیٹے گا۔ اچھا بھئی میں جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔ خدا حافظ انکل!"

گاڑی کا دروازہ بند ہونے اور اسٹارٹ ہونے کی آواز۔ کچن سے برتنوں کے کھنکنے کی صدا۔ وقفے وقفے سے بیگم شیروانی کے کچھ کہنے کی آواز جو صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ آہستہ بولتی تھیں اور اپنے کمرے میں ایک طرح چھپی رہتی تھیں۔ میں نے اب پہرے پر سے کوئی ایک امرودی تھی جو وصولی ہونے کے علاوہ بے صوت ہو چکی تھی۔ دن ڈھلنے سے پہلے ہی شہلا نے آہستہ سے دروازہ کھول کے جھانکا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ قریب آئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "سکندر بھائی!" پھر میرا شانہ دبا کے ہلایا۔ میں بے ساختہ چونک پڑا اور پھر ایک دم اٹھ بیٹھا۔

"السلام علیکم بھائی صاحب! صبح بخیر۔" اس نے ناشتے کی ٹرالی پاس کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ ایک ذرا پیچھے ہوئی پھر میں نے اس کا رنگ لال ہوتے دیکھا اور مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "میں بتاؤں گا محسن کو کہ میں ایک بات کہنا چاہتا تھا لیکن تم نے میرا منہ بند کر دیا تھا۔ اصل الفاظ میں بولوں گا۔"

"ان کی شکل دیکھنے والی ہو گی۔" "سکندر بھائی! تنگ مت کریں مجھے۔ ابھی تو امی کے کانوں تک بھی بات نہیں پہنچی تو میں کیا بتاؤں گی۔ دیکھیں، انکل صاحب اٹھیں۔ نہائیں اور آدمی بن جائیں۔" اس نے مجھے باتھ روم کی طرف دھکیل دیا۔ غسل کے بعد میں نے محسن کا ایک سوٹ پہنا جو ذرا ڈھیلا تھا۔ وردی کی جیب میں سے ایک شناختی کارڈ اور ایک فوٹو البم کے علاوہ وہ پانچ صفحے کا بیان بھی نکلا تھا جو میں نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا تھا۔ میں نے اسے بھی جیب میں منتقل کیا اور شناختی کارڈ کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ کوئی ماہر فن اس کی جگہ میری تصویر لگا دے تو یہ وردی اور شناختی کارڈ بہت کام آ سکتے ہیں، میں نے سوچا۔ جوتے ٹھیک تھے۔ میں نے وردی کو تہہ کر کے ایک بریف کیس میں پیک کیا۔ یہ بریف کیس بھی محسن کا تھا۔ اس کے استعمال کا سب سامان اس گھر میں ہی تھا۔ ناشتے کے بعد میں چلنے کے لیے تیار ہوا تو گیارہ بجے تھے۔

اچانک شہلا نے ایک انتہائی جذباتی حرکت کی۔ اس نے کپڑے کی ایک پٹی نکالی اور میرے بازو پر باندھ دی۔ "یہ امام ضامن ہے۔" وہ بولی۔ "خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے۔" اس کی آنکھوں سے قطرہ اشک کے موتی ڈھلک آئے۔ پھر اس نے مٹھی کھولی اور میرے سامنے پھیلا دی۔ "یہ کچھ سو روپے ہیں۔ آپ کے لاہور پہنچنے تک کام آ جائیں گے۔ مجھے امی نے دیے تھے کپڑے بنانے کے لیے۔ میرے پاس ابھی بہت کپڑے ہیں۔"

"مجھے شرمندہ کرتی ہے؟" میں نے اس کی مٹھی بند کر دی۔ "بے وقوف! بھائی جب بہن کے گھر آتے ہیں تو کچھ دے کے ہی جاتے ہیں، لے کر نہیں جاتے۔" میں نے اس کے آنسو صاف کیے۔ "سب سے زیادہ ضرورت مجھے دعاؤں کی ہے اور ایک ماں یا بہن سے زیادہ کس کی دعا قبول ہو سکتی ہے۔ اس امام ضامن کے ساتھ جو دعا تو نے دل سے دی ہے وہ میری سب سے بڑی محافظ ہو گی پگلی۔ ابھی میں مجبور ہوں کہ تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا لیکن زندہ رہا تو...."

ایک بار پھر اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "خدا حافظ بھیا! خدا کرے میری زندگی بھی تمہیں لگ جائے۔"

میں بریف کیس اٹھائے باہر آیا اور سڑک پر چلنے لگا۔ شہلا پیچھے برآمدے سے میرے جانے کو دیکھتی رہی۔ یہ سب لڑکیاں جب محبت کرتی ہیں تو اپنی ذات کو فراموش کیوں کر دیتی ہیں؟ وہ جسے چاہتی ہیں اسے ایسے ہی دل سے اتنا پیار کیسے بانٹ دیتی ہیں؟ بہن ہوں تو بھائی کے لیے، بیوی ہوں تو شوہر کے لیے اور ماں ہوں تو بیٹے کے لیے سب کچھ لٹا دیتی ہیں اور ان کے پیار کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ شہلا کی سابقہ اور موجودہ زندگی میرے سامنے تھی۔ ذہنی طور پر اس نے ایک رشتہ محسن سے استوار کر لیا تھا تو اس کے گھر سے بھی جذباتی طور پر پوری شدت کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھی۔ سارے رشتے اس کے اپنے رشتے ہو گئے تھے اور اس گھر میں وہ ایسے تھی جیسے ہمیشہ سے رہی تھی اور اسے اب ہمیشہ رہنا بھی یہیں ہے۔ اسے وہ سب مل گیا ہے جس کی تمنا تھی۔ اب صرف سکون ہے، قناعت ہے اور مسرت ہے اور شکرانہ ہے۔

اسلام آباد کی سنسان سڑک پر بہت سی ٹیکسیاں خالی لوٹ رہی تھیں جو افسروں کو اور دفتروں کے بابوؤں کو پنڈی سے سیکرٹریٹ پہنچا کر واپس جا رہی تھیں۔ ایک ٹیکسی نے مجھے کسی ہاتھ کے اٹھنے پہ

www.paksociety.com

پہنچا دیا جہاں سے لاہور اور پشاور کی ویگن سروس ملتی تھی۔ سولہ سال بعد بھی اس شہر کے رہنے والوں نے کبھی باغ کر لیا تھا تب بانا کھینچنے کی عادت اختیار نہیں کی تھی۔ میں نے اپنا بریف کیس اگلی سیٹ پر رکھا اور بیٹھ گیا۔ ابھی شاید مسافر پورے نہیں ہوئے تھے۔ میری عاجزانہ درخواست اور کال کی قیمت ادا کرنے کے وعدے نے ٹکٹ جاری کرنے والے کو تیار کیا اور اس نے مجھے ایک لوکل کال کی اجازت عنایت کی۔ یہ واضح کرنے کے بعد کہ یہ پبلک فون نہیں ہے۔

میں نے انکل شیروانی کے گھر کا نمبر ملایا۔ دو منٹ بعد شہلا نے ہی ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو!" وہ بولی۔

"شہلا!" میں نے کہا۔ "دیکھو میں ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔ تم ذرا لاہور فون کر دو۔"

"ایسی کون سی بات ہے جو آپ خود جا کے نہیں کہہ سکتے؟" وہ بولی۔

"بہتر ہو گا کہ ان کو میرے پہنچنے کی خبر ہو۔" میں نے کہا۔ "جس پر بتا دینا کہ آج کسی وقت میں اس سے رابطہ قائم کر لوں گا۔ میرے اچانک پہنچنے کا شاک نہ ہو انہیں۔"

"شاک تو انہیں نہ پہنچنے کا تھا۔" وہ بولی۔ "آپ کے جاتے ہی فون آیا تھا۔ میں نے خوشخبری دے دی ہے۔"

"اور کچھ تو نہیں بتایا؟" میں نے کہا۔ "یہی کہ میں کیسے آیا تھا؟"

"فکر مت کریں۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے آپ کی پوزیشن خراب ہو۔" وہ بولی۔ "بس اتنا ہی کہا کہ وہ چند منٹ کے لیے آئے تھے اور خیریت معلوم کر کے لاہور چلے گئے۔ ہاں اس کے بعد پولیس کی ایک جیپ آئی تھی۔"

"کیوں؟" میں نے سنبھل کر کہا۔ "کیا پوچھ رہے تھے؟"

"بڑا عجیب سا نام تھا۔" وہ بولی۔ "آغا علی احمد عرش الہ آبادی۔"

وہ ہنسی۔ "شاید تو مجبوری تھی لیکن میں نے ان کو بہت کوئی نا کہ منہ اٹھائے ہر جگہ گھسے چلے آتے ہو۔ یہ وزارت خارجہ کے ایک ڈپٹی سیکرٹری مسٹر شیروانی کی کوٹھی ہے اور یہاں کوئی مرد نہیں رہتا۔ ان سے بات کرنی ہے تو آفس جا کے کرو۔ فون نمبر بھی دے دیا تھا ان کا۔ وہ سخت پریشان واپس ہوئے، معافی مانگ کر۔"

"چلیں جناب چلیں۔" کنڈیکٹر نے ہانک لگائی۔ "گڈی فل ہو گئی ہے۔"

"اچھا شہلا! تھینک یو اور خدا حافظ۔" میں نے ریسیور رکھ کے بکنگ کلرک کا شکریہ ادا کیا اور اسے پانچ روپے نذر کر کے ویگن میں آ بیٹھا۔ میں بال بال بچ گیا تھا۔ پولیس مجھے کوٹھی سے نکلتے ہوئے بھی دیکھ سکتی تھی اور ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے بھی۔ اس پتے کی نشاندہی کرنے والے وہی ہو سکتے تھے جو شکاری بن کے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ شہلا کی احتیاط پسندی کے باعث وہاں میری موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ اگر بعد میں انہوں نے شیروانی صاحب سے آفس میں رابطہ قائم کر کے آغا علی احمد عرش الہ آبادی کے متعلق پوچھا تو اور بڑی ہو گی۔ انکل شیروانی بہت ڈانٹ پلائیں گے۔ "کون نامعقول ہو تم؟ نشے میں ہو؟ معلوم ہے کس سے بات کر رہے ہو؟ ابھی بات کرتا ہوں میں ڈی آئی جی سے۔ کیسے گدھے بھرتی کر لیے ہیں۔"

لیکن میری تلاش میں آنے والے گدھے نہیں تھے۔ اس طرح وہ پہنچے گئے ہوں گے جب مجھے دیکھ چکے تھے اور لباس بدلنے کے باوجود شناخت کر چکے تھے۔ اس سے مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ اب تک میرا حلیہ مشتہر کر دیا گیا ہو گا۔ پولیس کو انکل شیروانی کے گھر کا پتا بتانے والے اگر چوہدری والا دے کے گرگے تھے تو یہ بھی طے شدہ بات تھی کہ انہوں نے میرے لاہور کے ٹھکانے کی نشاندہی بھی کر دی ہو گی اور اگر شہلا جیسی لڑکی نے سمجھ لیا تھا کہ یہ عجیب و غریب نام میرے ذہن کی اختراع تھی تو رابعہ بھی سمجھ جائے گی۔ محسن اور انکل رضوی بھی سمجھ جائیں گے۔ اور یہ بہت بڑی تشویش کی بات تھی۔ اب تک میرا ایک گھر تھا جہاں میں خود کو محفوظ اور مددگاروں کے درمیان محسوس کرتا تھا۔ اب اگر مجھے وہاں بھی پناہ نہ ملی تو میرا ٹھکانہ کہاں ہو گا؟ شکاری پہلے دلاور کے ساتھی تھے۔ اب پولیس بھی میرے تعاقب میں تھی اور وہ خود بھی مجھے پولیس کے حوالے کر دینے پر مجبور تھے جو میری مدد کر سکتے تھے۔ سوائے رابعہ یا محسن کے میں کسی سے یہ امید نہیں رکھ سکتا تھا کہ وہ غیر قانونی طور پر مجھے قانون کے خلاف تحفظ فراہم کریں گے۔

اگر میں خود کو قانون کے حوالے کر دیتا تو میرے مقدمے کا تصفیہ ہونے تک میرا جیل سے باہر آنا بھی ناممکن ہو جاتا تھا اور چوہدری دلاور شاہ کمین کے راستے کا پتھر خود بخود ہٹ جاتا۔ وہ اس کے بعد بھی مجھے جیل کے اندر ہی نئے مقدمات میں الجھائے رہتے۔ اردیبٹ، فرار کی کوشش، کسی سے ساز باز کا الزام، اشتعال انگیزی۔ جیل کے اندر تو مجرم صرف مجرم ہوتا ہے اور اسے اندر ہی رکھنا مقصود ہو تو اس کے لیے جیل کے عملے کے پاس بہت سے اختیارات ہوتے ہیں۔ وہ خود ہی مدعی ہوتے ہیں اور خود ہی منصف۔ انہیں گواہ بھی مل جاتے ہیں جو ہر الزام ثابت کر دیتے ہیں۔ جھوٹے گواہوں کو نرم رویے کی یا سزا میں تھوڑی سی تخفیف مل جاتی ہے۔ معمولی سے جرم میں جیل جانے والے کی سزا کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اسے بے رحمی سے مارتے ہیں تو اسے الزام دے کر دیتے ہیں کہ قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی سے روکنے پر قیدی نے حملہ کیا۔ کہیں بھی قیدیوں میں جھگڑا ہو تو اسے دھر لیا جاتا ہے۔ عینی شاہد مل جاتے ہیں کہ جھگڑے پر اسی نے اکسایا تھا۔ اگر کوئی بہت شور مچاتا ہو اور بے بدل حق و انصاف کی بات کرتا رہے تو اسے پاگل خانے ارسال کر دیا جاتا ہے اور کبھی عدالت میں پیش نہیں کیا جاتا۔

میں یہ سب نہیں چاہتا تھا لیکن یہ جانتا تھا کہ میرے ساتھ بھی یہی ہو گا۔ شکاری مجھے اسیر کر کے آرام سے نہیں بیٹھ جائیں گے۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ ان کے پاس دولت کی طاقت ہے۔ وہ میرے لیے انصاف کے سارے در بند کر دیں گے۔ میں یہ جانتا تھا کہ اگر میں جیل گیا تو دوبارہ باہر کی دنیا نہ دیکھوں گا۔ میری سزا میرے جیسے جرم کے ساتھ طویل سے طویل تر ہوتی جائے گی۔ محسن اور رابعہ جیسے دوست میری کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔ مجھے پاگل قرار دے دیا جائے گا یا پاگل کر دیا جائے گا۔ وہ دوائیں اور انجکشن، نشہ اور دوا، ... انہیں پہنچا دیں اور کسی کام نہیں آتا۔ لیکن مجھے باہر رہنا تھا تاکہ میں ایک ایک مجرم کو زیر دام لا سکوں اور اس سے پوچھ سکوں کہ بتاؤ میرے باپ ذوالفقار کو کس نے بلیک میل کیا اور کیوں وہ ... ہونے کے باوجود غربت و افلاس میں ایسی بے کسی کی موت کیوں مرا؟ جو کچھ میرے ساتھ ہوا اور میرا ساتھ دینے والوں کے ساتھ ہوا کیوں ہوا اور اس کے بعد مجھے ایک ایک کو سزا دینی تھی۔ وہ سزا جس سے وہ اس لیے بچے رہے کہ وہ کسی عدالت انصاف میں پیش نہیں ہوئے۔ انہوں نے ثبوت، شہادت اور گواہ سب خرید لیے یا ختم کر دیے۔ اب میں کسی عدالت سے انصاف نہیں مانگ سکتا تھا۔ میری فریاد سننے سے پہلے قانون کے محافظ مجھے گرفتار کر کے پس دیوار زنداں پہنچا دیتے۔ چنانچہ اب انصاف بھی خود مجھے ہی کرنا تھا۔ ثبوت بھی مجھے ہی فراہم کرنے تھے۔ شہادت بھی مجھے ہی حاصل کرنی تھی اور گواہ بھی مجھے ہی تلاش کرنے تھے لیکن یہ سب کچھ مجھے چھپ کر کرنا تھا۔ پولیس کی نظر سے چھپ کر، دشمنوں کی نظر سے چھپ کر اور اپنوں کی نظر سے چھپ کر۔ کوئی بھی مجھے پکڑ سکتا تھا اور میرے مشن کو ناکام بنا سکتا تھا۔ اس مشن کو جس کے لیے بہت سے بے گناہوں نے بھی اپنی زندگی گنوا دی اور اپنی جان کا ... گئے۔

ویگن نے مجھے ریلوے اسٹیشن سے کچھ دور اتارا۔ اپنے ہی شہر میں مجھے سوچنا پڑا کہ کدھر جاؤں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا خاندانی عزت اور آسائش مجھے میسر تھی۔ دولت مند باپ ... اعلیٰ ترین اسکولوں میں پڑھتا رہا۔ کوٹھی سے باہر نکلا تو ہمیشہ کار میں۔ پھر ولایت میں اعلیٰ تعلیم کے بہانے عیش کرتا رہا اور واپس آیا تو ... ایک ایس ایس پی کی بنا لی اس کے گھرانے خاندان کے ایک فرد ... رابعہ اور محسن اب بھی دوست تھے لیکن میں ان کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ سارا شہر اجنبی ہو گیا تھا اور ہر نظر نامہرباں لگتی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ میں کسی ہوٹل میں کمرہ لے لوں اور وہیں سے فون کر کے رابطہ کروں۔ پھر میں طے نہ کر سکا کہ مجھے کس ہوٹل میں ٹھہرنا چاہیے۔ ... محفوظ نہیں تھے۔ اگر پولیس بہت زیادہ مستعد ہو گی تو سب ہوٹلوں کو چیک کرے گی۔ ایس ایس پی صاحب کو یہ تو معلوم نہیں کہ ... کس طرح ... کیا گیا اور کہاں قید رکھا گیا۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ ... مقدمات میں مطلوب زیر ضمانت ملزم کی گرفتاری کے وارنٹ نکل چکے تھے چنانچہ وہ جہاں نظر آئے اسے گرفتار کر لینا ضروری ہے۔ وہ عدالت میں اپنی غیر حاضری کا سبب بیان کر سکتا ہے اور عدالت مطمئن ہو گی تو پھر اسے ضمانت پر چھوڑ دے گی لیکن میں جانتا تھا کہ میں عدالت کو قائل نہیں کر سکتا کہ مجھے اغوا کر کے محبوس رکھا گیا تھا۔ اغوا کا الزام والد اور رابعہ یقینی پر عائد ہوتا تھا۔ یہ میں بتا سکتا تھا کہ اغوا کرنے والے کون تھے۔ خود میں پولیس کو وہ جگہ نہیں دکھا سکتا تھا جہاں مجھے ایک ہفتے تک عقیدہ کھا گیا تھا۔ اول تو میں اس مکان تک ہی نہ پہنچ پاتا اور اگر پہنچ جاتا تو نئی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔ وہاں حسین کی لاش اب تک پڑی ہو گی یا کسی نے دیکھ لی ہو گی تو تفتیش ہو رہی ہو گی۔ روبی اگر زندہ ہوتی تو شاید میری گواہ بن جاتی مگر وہ پیٹر کے ساتھ جا چکی تھی اور ڈبیر کے قتل کی اس واردات میں مجرم تھی جس میں پولیس کی تحویل سے فرار ہو گیا تھا۔ وہاں میرے خلاف متعدد مقدمات درج ہوں گے۔ تفتیش کرنے والے پولیس کے افسروں پر قاتلانہ حملہ، پولیس افسر کی وردی اور آتشیں اسلحے کی چوری، غلط بیانی۔ ممکن ہے اس شخص نے بھی کار چھینے جانے کی رپورٹ کر دی ہو جو پولیس اسٹیشن کے قریب ہی رہتا ہے اور جس کے سامنے میں نے معروف مجرم ہونے کا اعتراف کر لیا تھا۔ انکل شیروانی کے گھر سے تو پولیس ناکام لوٹ چکی تھی لیکن یہاں کی مجھے کوئی خبر نہ تھی۔ ایک بار وہ ہر جگہ سے ناکام ہو کے لوٹ گئے کہ یہاں اس نام اور حلیے کا کوئی شخص نہیں رہتا تو شاید صبر کر کے بیٹھ جائیں۔ نگران کو شبہ بھی ہو گیا تو مجھے پہنچنے والے بہت ہوں گے۔

مناسب یہی تھا کہ میں پہلے رابعہ یا محسن سے رابطہ قائم کر لوں۔ ایک جگہ پبلک ٹیلی فون کا بوتھ دیکھ کر میں نے اکرام شیخ کے گھر کا نمبر ملایا۔ کچھ دیر بعد نازک سی آواز آئی۔ "جی؟"

"میں ... اکرام شیخ صاحب گھر پر ہیں؟" میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ وہ ڈیوٹی پر ہیں۔" وہ کچھ دیر بعد بولی۔ "... فون کر لیں آپ۔"

"وہ کب تک لوٹیں گے؟" میں نے کہا۔

"رات آٹھ بجے کے بعد۔" وہ بولی۔ "کون صاحب بول رہے ہیں آپ؟"

... کی بجائے ریسیور رکھ دیا۔ ابھی شام کے سات بجے تھے۔ چنانچہ ڈیڑھ گھنٹے کی مہلت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ ... مجھے بیس منٹ میں اکرام شیخ کے گھر کے دروازے پر اتار دیا۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن گیٹ لائٹس ابھی آن نہ تھیں۔ روشنی برآمدے میں تھی اور اندر کے کمروں میں نظر آ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور میرے قدم بے اختیار رک گئے۔ پورچ میں رابعہ کی بالکل نئی ڈیزائن کی ... کھڑی تھی۔ اس کی چمک دمک دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

www.paksociety.com

مجھے اس کا اپنا حلیہ یاد آگیا کہ میں نے اس کی صورت کس طرح بگاڑ دی تھی۔ وہ شخص یقیناً ماہر فن تھا کہ اس نے ایک ڈھانچہ نظر آنے والی لاش کو ایسا بنا دیا جیسے وہ ابھی شو روم سے نکلی ہو۔

اب مسز اندرابی کی تشریف آوری کی اطلاع دینے کا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ رابعہ جو وکیل ہے میرے بچانے قانون کا ساتھ تو نہیں دے گی۔ پھر میں نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ میرے لیے رابعہ صرف وہ عورت تھی جو محبت کرنا جانتی تھی اور اس محبت میں میرے لیے آنکھیں بند کرکے اندھے کنویں میں بھی چھلانگ لگا سکتی تھی۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا اور دبے پاؤں اندر داخل ہو گیا۔ آگے دائیں طرف کے کمرے سے ٹی وی کی آواز آ رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ شیخ صاحب اور ان کی بیگم اسی کمرے میں ہیں۔ بائیں طرف نازو کے کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن کان لگا کر سننے پر مجھے اندر سے ان دونوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔

"شملا نے فون کیا تھا۔" رابعہ نے کہا۔ "سکندر لاہور کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔"

"فون تو سکندر نے مجھے بھی کیا تھا۔" نازو نے کہا۔ اس کے لہجے میں عجیب دکھ بھری حسرت تھی۔ "پھر کیا ہوا؟"

"سکندر آج تو وہ شملا سے ملا تھا۔ اس کی خیریت پوچھنے گیا تھا اور بالکل خیریت سے تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"پھر بھی اس کا یہاں آنا مشکل ہے۔" نازو بولی۔ "وہ آپ سے ملنے جائے گا یا محسن سے؟"

"میرا خیال ہے وہ گھر نہیں جائے گا۔" رابعہ نے کہا۔

"وہیں سے آپ کو فون کرے گا۔ محسن سے بات کرے گا۔" نازو نے کہا۔ "یہاں اس کا انتظار بے سود ہے۔"

"معلوم نہیں کیوں.... آج صبح منہ دھوتے وقت مجھے یہ خیال آیا۔" رابعہ نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "اس وقت تو مجھے شملا کا فون بھی نہیں ملا تھا تو بہت بے یقینی کرنا کتنا عجیب لگتا ہے مگر کبھی کبھی تنکے کا سہارا بھی ضرورت بن جاتا ہے اور اتفاقات ایسے ہو جاتے ہیں۔ منڈیر پر کوا بول رہا تھا۔ اسی وقت بیگم رضوی نے کہا کہ کوئی آنے کا... اور میں حیران رہ گئی کیونکہ اس وقت میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ رات بھر عجیب سی کیفیت رہی۔ کھانا کھا کے سوئی تو ڈراؤنے خواب... اچانک خواب دیکھا کہ سکندر میری گاڑی میں بیٹھا ہے لیکن گاڑی تمہارے گھر میں کھڑی ہے۔ اٹھنے کے بعد کسی کام میں جی نہ لگا۔ میں یہاں آگئی۔ بس ایسے ہی۔" اس کے لیے وضاحت مشکل ہو رہی تھی۔

"آپ کو یقین کرنا ہی ایسی باتوں پر۔" نازو نے کہا۔ "میں بھی تو کسی وقت ایسی ہی ہوں.... میں جمعرات کو داتا صاحب کی درگاہ میں حاضر ہوئی تھی۔ اسی رات سکندر نے فون کیا۔ صبح ایک فقیر آیا میں نے اسے ابو کا ایک جوڑا دے دیا۔ پرانی شلوار قمیص۔ اس نے دعا دی کہ اللہ تیری مراد پوری کرے اور بچھڑے ہوؤں کو ملائے۔ بہت عجیب بات۔ معلوم نہیں اس نے صورت دیکھ کر ہی باتیں ایسے ہی۔" نازو جانتی تھی کہ رابعہ کے علاوہ وہ کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ اس کے باوجود وہ مجھے چاہتی تھی اور بڑی بے تکلفی سے اس کا اعتراف کرتی تھی۔ رابعہ سے حسد کیے بغیر۔ اور رابعہ اس سے حال دل کہہ رہی تھی۔ رقابت کے جذبات کو بالائے طاق رکھ کر۔ ہم پر مشترکہ غم اور احسان غم الفت کے جز تجربے اور کوئی باتوں کو سمجھا رہا سکون بخش تعلق کی قربتی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔ اسے بہت کچھ کہا جا سکتا تھا۔ فریب نفس؟ سوچ کا نفسیاتی ردعمل۔ نیک تمنی پہلے میں نے سوچا کہ باہر رابعہ کی گاڑی میں جا بیٹھوں اور اس کا خواب سچ کر دوں لیکن رابعہ کا پتا نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر نازو سے گفتگو کرتی رہے اور یہ وقت ضائع ہو جائے۔ میں تو اس نیت سے یہاں آیا تھا کہ رابعہ کو قربان کرکے گھر والوں کا گروہ پہلے سے موجود تھی تو اس موقع سے فائدہ اٹھانا حالات کا تقاضا تھا۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا۔ دروازہ کسی آواز کے بغیر تھوڑا سا پیچھے ہو گیا۔ میں نے ایک انگلی خاموش رہنے کی تاکید کے طور پر ہونٹوں پر رکھی اور اندر داخل ہو گیا۔ نازو کا چہرہ میری طرف تھا۔ اس کے سامنے رابعہ بیڈ پر بیٹھی تھی۔ چنانچہ مجھے رابعہ نے پہلے دیکھا۔ اس کا رنگ متغیر ہو گیا اور وہ پلک جھپکانا بھول گئی۔ اس کی حالت کا یہ تغیر اتنا نمایاں تھا کہ نازو نے پلٹ کر دیکھا۔ رابعہ آہستہ آہستہ اٹھی مگر نازو نے ایک چیخ ماری۔ "سکندر!" وہ دیوانہ وار میری طرف لپکی۔ دونوں کے رویے کا فرق وہی تھا جو ان کی شخصیت میں تھا۔ رابعہ کی حیرت اور خوشی میں متانت کی روح تھی۔ ایک پرسکون ٹھہراؤ تھا جو جذبات کی گہرائی کا پتا دیتا تھا۔ نازو کے انداز میں برساتی ندی کی تیزی تھی اور جوش تھا جو میں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھالا۔

"خدا کے لیے عقل سے کام لو۔" میں نے خود کو نازو کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے سخت شرمندگی محسوس کی کیونکہ رابعہ بت بنی کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھی اور اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

"تم سے کہتے ہو عقل سے کام لو۔ خود کیا کرتے ہو۔" نازو نے رو کے کہا۔

"آہستہ بولو۔" میں نے اسے بیڈ کی پٹی پر بٹھا دیا۔ "میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے یہاں دیکھے۔" پھر میں رابعہ کی طرف پلٹا۔ "ایسے مت دیکھو مجھے۔" میں نے اس کے قریب پہنچ کر نرمی سے کہا۔ "اگر میں آ سکتا تو کل رات ضرور آتا۔"

رابعہ نے ایک گہری سانس لی اور پھر بیڈ پر گر گئی۔ "کاش تم نے انتظار کرنا بھی سیکھا ہوتا سکندر!" وہ بولی۔ "تم کو کبھی اندازہ ہوتا کہ انتظار میں کتنی اذیت جھیلنی پڑتی ہے۔" اس نے آنکھوں میں آنسو آنے دیے نازو نے ایک انگلی سے جھٹک دیا۔ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ خاموشی کا ایک مختصر وقفہ سب کی زبان بن گیا۔

"مجھے ڈر تھا کہیں شیخ اندر موجود نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "میں انہیں دشمن اور دوستی کی آزمائش میں مبتلا کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ کیونکہ ان کے لیے فرض مقدم ہے۔ میں نے سوچا خاموشی سے تمہاری گاڑی میں بیٹھ جاؤں۔"

حسب توقع نازو نے چونک کر رابعہ کی طرف دیکھا۔ رابعہ کا چہرہ روشن ہو گیا۔ سو فیصد جانبداری سے کام لیتے ہوئے میں نے اس کی بات کو فاتح قرار دے دیا تھا۔ رابعہ کا جذبۂ عشق صادق ہو گیا تھا۔

"پھر یہ سوچ کر میں اندر آگیا کہ نہ جانے تم کتنی دیر گپ شپ لگاؤ۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے شملا نے بتا دیا تھا کہ میری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں۔ انکل رضوی کے ڈر سے میں گھر نہیں گیا۔ تمہیں فون کرنا چاہتا تھا۔ میں بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا لیکن یہ بات کچھ کھانے پینے کے بعد سناؤں گا۔ صبح شملا.... اس سے ملنے کے بعد میں نے بازار میں ناشتا کیا تھا اور بس میں بیٹھ گیا تھا۔ اس کے بعد سے کچھ نہیں کھایا۔ بیل نازو کی تھی۔ "اٹھو میرے لیے کچھ کھانے کو لاؤ لیکن کسی کو یہاں میری موجودگی کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔ تمہیں میری قسم۔"

نازو یوں اٹھی کہ جیسے اس پر ترس آیا۔ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ میرے رویے نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ اور وہ صرف ایک ایسی عورت رہ گئی تھی جس کو دوسری عورت کی موجودگی میں ٹھکرا دیا گیا ہو۔ اس کا بس چلتا تو وہ رابعہ کو اس ایک لمحے میں قتل کر دیتی جب میں نے اس سے پہلی بات کی تھی اور اس نے فراق کی ساری کیفیت اپنے مختصر سے جواب میں کسی گلے شکوے کے بغیر بیان کر دی تھی۔ میں چند لمحوں میں رد ہو جانے والے اس انقلاب پر دنگ تھا کتنی اپنائیت کے ساتھ وہ رابعہ سے میری کہانی کہہ رہی تھی اور اب میں سامنے تھا تو شکست کے احساس نے اسے رابعہ سے کتنا دور کر دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ چائے کے بہانے میں اسے رخصت کرنا چاہتا ہوں تاکہ رابعہ سے وہ سب کچھ کر سکوں جو میں اس کے سامنے نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے مکھی نکال پھینکا تھا جیسے وہ کباب میں ہڈی ہے۔ سالے حبیب سا تھا کہ مناسب کیا تھا جیسے وہ میرے سامنے ایک بچی ہے۔ چنانچہ وہ جلنے لگی تھی اور یہ میری لگائی ہوئی آگ تھی۔ اس کی یہ کیفیت ناراضگی کی تذلیل کے احساس میں ڈھل گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی رابعہ کے سامنے اپنے رویے سے نازو پر واضح کر چکا تھا کہ میں مجبور ہوں صرف رابعہ سے محبت کر سکتا ہوں اور اس کی چاہت کا جادو مجھ پر چل ہی نہیں سکتا۔ ابھی ابھی میں نے اس کی انا کو ٹھوکر ماری تھی۔ اگر وہ یہ حقیقت پھر ان پر عیاں ہو جاتے۔ مجھ پر رابعہ کا اعتماد مضبوط ہوا اور میں ان خطرات سے محفوظ رہوں جو دو کشتیوں میں قدم رکھ کے سفر کرنے والے کو لاحق ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس طرح میں نے نازو کے اندر کی عورت کو مشتعل کر دیا تھا۔ اشتعال میں آکر وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اپنے بھائی کو بلا کے مجھے گرفتار کروا سکتی تھی کہ میں اس کے ساتھ نہیں تو رابعہ کے ساتھ بھی کیوں رہوں۔ کسی غلط اقدام سے باز رکھنے کے لیے ہی میں نے اسے اپنی قسم دی تھی۔

چند منٹ بعد نازو واپس آئی تو میں کرسی پر بیٹھا تھا اور رابعہ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھی ناخن چبا رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں برس کے کھل جانے والے بادل کی طرح نظر آنے لگی تھیں۔ نکھری نکھری اور دھلی سے اجلی۔

"ہو گئے سب گلے شکوے دور؟" نازو نے مسکراتے ہوئے طنز کا تیر چلایا۔ رابعہ نے نظریں جھکا لیں۔

"ہاں۔" میں نے ہمت سے کام لے کر کہا۔ "اب تم اپنی کہو گی یا میری سنو گی؟"

"مجھے کیا کہنا ہے۔" وہ پھیکی ہنسی ہنس کے چائے بنانے لگی۔ "آپ دونوں کہیں۔"

"ہم نے تمہارے اغوا کی رپورٹ درج کرا دی تھی۔" رابعہ نے تفتیش ختم کرنے کے لیے موضوع بدل دینا بہتر سمجھا۔ "لیکن ہم نے دیکھا کسی کو نہیں تھا۔ چنانچہ رپورٹ نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف درج کی گئی۔ وہ کار جس نے تمہارا راستہ روکا تھا ڈی ملو کے نام پر رجسٹرڈ تھی۔ پولیس کیا کرتی؟ ڈی ملو لاپتہ نہ ہوتا تو شاید اس سے پوچھ گچھ کی جاتی۔ چوہدری دلاور حسب توقع معصوم بن گیا اور اس نے بے حد افسوس اور حیرانی کا اظہار کیا۔ بتایا کچھ نہیں۔ میں نے تو کوشش کی تھی کم سے کم ایک کو تو لپیٹ میں لے لوں لیکن وہ بچ گئے۔ ان کی گاڑی بھی تباہ ہو گئی۔"

"اور تمہاری گاڑی تو؟" میں نے کہا۔ "اس وقت تم نے عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ ایک بار تم کو موقع ملا تھا پولیس میں جانے کا تو پھر آگے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ نکل جاؤ۔"

"میں نے سنا نہیں تھا اور سن لیتی تب بھی تمہیں اور محسن کو دشمن کے نرغے میں چھوڑ کر میں کہاں جاتی؟" وہ بولی۔ "مجھے اس کے سوا کچھ نہ سوجھا کہ اسی گاڑی سے ان سب کو کچل دوں۔ زخمی کر دوں یا مار ڈالوں۔ ان کے لیے فرار کے راستے بند کر دوں۔"

"تم خود بھی ٹکر سے زخمی ہو سکتی تھیں۔" میں نے کہا۔ "فائدہ کیا ہوا؟"

"نفع نقصان کا خیال مجھے آیا ہی نہیں۔ عقل ایسے وقت میں کہاں ساتھ دیتی ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "تصادم کے بعد میرا سر اسٹیئرنگ وہیل پر بڑے زور سے لگا تھا۔ ادھر ادھر سے اور بھی لوگ آگئے تھے چنانچہ وہ تو بھاگ گئے۔"

www.paksociety.com

"باقی دو مجھے اٹھا کے لے گئے۔" میں نے کہا۔ "وہاں سے تو کندھے پہ ڈال کے بھاگے ہوں گے۔ آگے ٹیکسی مل گئی ہو گی یا کوئی دوسری گاڑی۔ مجھے معلوم نہیں۔ میں جھاڑیوں میں جا گرا تھا اور بے ہوش ہو گیا تھا۔"

"انہوں نے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھایا۔" رابعہ بولی۔ "بعد میں سب نے ادھر اُدھر دیکھ لیا تھا لیکن تم نہیں ملے تھے۔ انکل رضوی وہیں آ گئے تھے۔ محسن نے کسی کو خبر دے دیا تھا کہ فون کر دے۔ ان کی گاڑی ابھی تک گیراج میں ہے اور سینہ بھر رہے گی۔ گیارہ ہزار کے قریب خرچ آئے گا اسے اصل حالت پہ لانے کے لیے۔ میں نے ایک بار انکل سے کہا تھا کہ غلطی میری تھی تو وہ برہم ہو گئے کہ غلطی کسی کی نہیں تھی۔ ایک رستم خان ہے تو دوسرا طارم خان ہے۔ اور تم خاک وکیل ہو جو عقل نام کو نہیں۔ میں گیارہ ہزار کا نقصان برداشت کر سکتا ہوں لیکن یہ حماقت برداشت نہیں کر سکتا جس میں تم مبتلا ہو۔ وہ خاصے پریشان رہے۔ ایک طرف تمہارا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ دوسری طرف تمہاری ضمانت منسوخ ہو چکی تھی کہ سب سے پہلے استغاثے نے دوڑ لگائی یا تباہ دل کرا لوں گا اور مہیرا زور ان پہ ایک ڈاؤن ہو جائے گا۔"

"بیچارے انکل رضوی۔ نہ بھی چھوڑ سکتے ہیں نہ اولاد کے فرض سے کنارہ کشی اختیار کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے اپنے اغوا، حبس بیجا اور قید سے فرار کی کہانی یوں سنائی کہ اس میں یسمین، روبی یا پیر کا ذکر بالکل نہیں آیا۔ میں یہ باتیں رابعہ کو بتا سکتا تھا لیکن نازو کے سامنے نہیں۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس تھا کہ اسی جذباتی کیفیت میں وہ کسی دن کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے گی جس سے رابعہ کو یا مجھے نقصان ہوگا۔ وہ کم عمری کے باعث ناپختہ شعور کی مالک تھی اور انتہا پسندی اس کی فطرت میں شامل تھی۔ وہ جتنی دیوانگی سے محبت کرنے کی اہل تھی اتنی ہی شدت کے ساتھ نفرت کر سکتی تھی۔ اس کا وجود ایک لمحے کے لیے گلیشیر تھا تو دوسرے لمحے آتش فشاں۔ کسی بھی کمزور لمحے کی یلغار سے مغلوب ہو کر وہ جان دے بھی سکتی تھی اور لے بھی سکتی تھی۔ خواہ اس سے اگلے لمحے کا حاصل صرف پچھتاوا ہی کیوں نہ ہو۔

اس کا ثبوت مجھے فوراً مل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اچانک کچھ خاموش اور اداس ہو گئی ہے اور منفعل نظر آنے لگی ہے۔ اس بچے کی طرح جو ایک غلطی کر بیٹھا ہو اور اسے چھپانے کی فکر میں ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس غلطی کے نتائج سامنے آئیں گے تو اس کے لیے کوئی جواز پیش کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ابھی میری بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دروازے میں اکرام شیخ نمودار ہوا۔ اگر وہ دوست بن کے آتا تو میں اور رابعہ بڑے جوش و خروش سے گلے ملتے لیکن وہ پولیس افسر بن کے آیا تھا۔ میں اس لیے بھی کہ اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کے رنگ گیا۔ پھر میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اس میں ابھی ساڑھے سات

تک بجے تھے اور نازو نے فون پہ مجھے بتایا تھا کہ آٹھ بجے سے پہلے ان کے آنے کا کوئی امکان نہیں۔ میری نظر نازو کی طرف گئی۔ اس کا چہرہ خفت سے زرد ہو گیا تھا اور اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ کسی سے نظر ملا سکے۔ اپنے بھائی سے بھی نہیں جسے اس نے فرض شناسی کے مظاہرے کا موقع فراہم کیا تھا اور خود اپنے قانون پسند ہونے کا ثبوت دے کر ثابت کر دیا تھا کہ وہ کس بھائی کی بہن ہے۔

"آؤ شیخ جی!" میں نے ہاتھ اٹھا کے بے تکلفی سے کہا۔ میرا طنز آمیز لہجہ نمایاں تھا۔ "بڑے وقت پہ پہنچے۔ ایک مفرور قاتل اور دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمہارے ہی گھر میں بیٹھا چائے پی رہا ہے۔"

"تم میرے مہمان ہو، پرانے دوست ہو۔" شیخ آہستہ آہستہ آگے آیا۔ "میں تمہاری عزت کرتا ہوں سکندر اور تمہارا احسان مند بھی ہوں کہ تم نے میری کئی بار مدد کی۔ لیکن......"

"اپنی صفائی پیش مت کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں جانتا ہوں تم اور انکل رضوی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ قانون کے معاملے میں تم کسی کو رعایت دے ہی نہیں سکتے۔ میری جگہ تمہارا سگا بھائی ہوتا تب بھی تم اپنا فرض ادا کرتے۔ افسوس مجھے نازو پر ہے۔ کاش وہ بھی تم جیسی ہی ہوتی۔" میں نے نازو کی طرف دیکھا جس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

"اس نے مجھے مطلع کیا تھا کہ تم یہاں موجود ہو۔" شیخ نے متانت سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن فرق اس جذبے کا ہے جس کے تحت تم ایک مجرم کو گرفتار کرتے ہو۔ تمہیں کوئی ندامت تو نہیں ہوتی نا خواہ تم اپنے گھر سے گرفتار کرو اور وہ تمہارا دوست ہی کیوں نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "نازو کی صورت دیکھو۔ اس کو شرمندگی کیوں ہے؟ اس نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا۔ پھر پریشانی کیوں ہے اسے؟ جیسے مجرم یہ خود ہو!"

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف لے جایا گیا۔" شیخ نے ریوالور کا رُخ میری طرف رکھتے ہوئے ایک خالی کرسی پر بیٹھ کے کہا۔ "لیکن مجھے عدالت سے تمہاری ضمانت کی منسوخی کے احکامات موصول ہو چکے ہیں۔ تمہارے اغوا کی رپورٹ بھی تو میں نے لکھی تھی۔ اب اگر میں عدالتی حکم کی تعمیل کروں تو یہ میری مجبوری ہے اور تمہیں میری مجبوری کو سمجھنا چاہیے۔"

"میں صرف اپنی مجبوری کو سمجھتا ہوں۔ یہ خود غرضی نہیں، میرے حالات کا تقاضا ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں کسی قیمت پر گرفتار ہونا نہیں چاہتا۔ اس لیے کوشش مت کرنا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا ریوالور میری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ تم اس مشینری کے بہت چھوٹے سے پرزے ہو جسے میرے دشمنوں کے بہت طاقت ور ہاتھ چلا رہے

www.paksociety.com

کیا تم ضمانت دے سکتے ہو کہ میرے ساتھ انصاف ہو گا؟ اور ایک بار جیل جانے کے بعد میں زندہ سلامت اور باعزت طور پر باہر بھی آ سکوں گا! تم کیا کر سکو گے میرے لیے؟

"میں جانتا ہوں یا نہیں جانتا۔" شیخ نے آہستہ سے کہا۔ "کل کیا ہو گا۔ مجھے تو اس وقت تم کو ہر حال میں گرفتار کرنا ہے۔"

"زندہ یا مردہ۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بے نا یہی بات! فرض اور دوستی کا کیا زبردست ملاپ ہے۔ لیکن میں تم کو کسی غلط فہمی میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتا۔ میں نے بار بار جان کی بازی لگا کے دشمنوں کی قید سے رہائی حاصل کی ہے۔ اس وقت بھی میں ہفتہ بھر ایک ایسے قید خانے میں رہ کے آیا ہوں جہاں سے رہائی کی کوئی امید نہیں تھی۔ لیکن میں نے ہمت کبھی نہیں ہاری اور امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ میں آخری سانس تک جدوجہد کیے بغیر شکست قبول نہیں کر سکتا! اور اس وقت بھی نہیں کروں گا۔ مجھے اپنی آزادی کا تحفظ کرنا ہے۔ اس وقت تک جب تک میرا کام ختم نہیں ہوتا۔ اس کے بعد میں خود کو تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔"

"لیکن میں اس وقت کا انتظار نہیں کروں گا۔ مجھے جو بھی کرنا ہے وہ ابھی کرنا ہے۔" شیخ نے ریوالور اٹھا کے کہا۔

"بھیا!" نازو نے ایک ہسٹریائی چیخ ماری اور اچانک میرے سامنے آ گئی۔ "تم گولی چلاؤ گے سکندر پر؟"

میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ بیڈ پر جا گری۔ "میں اس چیلنج کو قبول کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں اپنی مرضی سے یہاں آیا تھا اور اپنی مرضی سے ہی جاؤں گا۔ تم وہی کرو جو تمہیں کرنا چاہیے تو میں بھی وہی کروں گا جو مجھے کرنا چاہیے۔"

"تم دونوں پاگل ہو گئے ہو۔" رابعہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"تم جانتے ہو شیخ کہ میں قاتل ہوں یا نہ معلوم!" میں نے کہا۔ "میں وہ نہیں ہوں جو مجھے بنا دیا گیا ہے۔"

"میرے لیے قاتل ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ سکندر۔" شیخ نے بے بسی سے کہا۔ "تمہیں عدالت کو قائل کرنا ہے۔ میں تو استعفیٰ دے چکا تھا اسی لیے۔ تم نے مجھے مجبور کیا تھا کہ میں آزمائش سے نہ گھبراؤں۔ اب تم ہی میری راہ میں حائل ہو رہے ہو۔ جب تک یہ وردی میرے جسم پر ہے میں تمہاری بے گناہی کی دلیل کو عدالتی احکامات سے برتر نہیں سمجھ سکتا۔"

"رابعہ!" میں نے کہا۔ "بریف کیس لو اور چلو۔ اٹھاؤ اسے!" میں نے سخت لہجے میں کہا اور کھڑا ہو گیا۔

رابعہ نے بریف کیس اٹھا لیا۔ "یہ کیا ہونے والا ہے یہاں؟" وہ چلائی۔ "نازو، یہ کیا ظلم کرا رہے؟"

"تم جاؤ باہر۔" میں نے تسلی سے کہا۔ "میں آ جاؤں گا دیکھنا۔ یہ بندہ کتنا پاگل ہونے کے قابل ہی ہے۔"

نازو دروازے کی طرف بھاگی۔ "اچی ابو!" اس نے چلانا اور چیخنا شروع کر دیا۔ میں نے دروازے کی طرف ایک قدم بڑھایا۔ رابعہ وہیں بت بنی کھڑی رہی۔ پھر شیخ کے والد اور اس کی ماں بدحواسی میں ہانپتے کانپتے اندر آئے اور اس منظر کو دیکھتے ہی ٹھٹک کر رہ گئے۔ حیران ہونے کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔

"بھیا کو سمجھائیں ابو!" نازو نے دہائی دینے والے انداز میں کہا۔ "کیا یہ سکندر کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ سکندر جانا چاہتا ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔"

"یہ تیل فون کر کے مجھے بلانے سے پہلے سوچنا تھا۔" شیخ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں اور مجھے ایک مفرور ملزم کو گرفتار کرنا ہے جس کے لیے وارنٹ میری جیب میں ہے۔ آپ لوگ جائیں۔"

"آپ لوگ جائیں پلیز۔" میں نے کہا۔ "بات صرف میرے اور شیخ کے درمیان ہے۔ اسے مزید مشکل نہ بنائیں۔" میں نے رابعہ کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "چلو رابعہ!"

"میں آخری بار وارننگ دے رہا ہوں سکندر، میں گولی مار دوں گا۔" شیخ نے چلا کر کہا۔

"تو پاگل ہو گیا ہے کیا؟" شیخ کی ماں نے چلاتے ہوئے کہا۔ "خون کرے گا دوست کا؟ اپنے ہی گھر میں؟"

"نہیں امی، غلطی میری تھی تو سزا بھی مجھے ہی بھگتنی ہو گی۔" نازو نے پھر درمیان میں آ کر کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں قدم آگے بڑھاتا، نازو کو شیخ کے راستے سے ہٹاتا، وہ تیزی سے ایک جھٹکے پر کھیچی۔ اس کی دائیں ٹانگ سیدھی اوپر اٹھی اور شیخ کے ہاتھ پر لگی۔ ریوالور اس کی گرفت سے نکل گیا۔ جوڈو جاننے والی وہ لڑکی جسے میں نے ہمیشہ سکول گرل جیسی لکھنے اور پڑھنے کی کچی سمجھا تھا، بجلی کی طرح لہرائی اور میری حفاظت پر کمربستہ ہو گئی۔ شیخ سنبھلا بھی نہ تھا کہ اس نے دوسرا حملہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے بڑے بھائی کو اٹھا کے دور پھینک دیا۔ "جاؤ!" وہ چیخ کر بولی۔ "بھاگو!"

میں رابعہ کا ہاتھ تھام کے بھاگا۔ مجھے یقین تھا کہ شیخ مجھ پر گولی نہیں چلا سکے گا لیکن میرا یقین غلط بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ چند منٹ میں ماڈل ٹاؤن کی حدود عبور کر کے ہم کار میں جا بیٹھے۔ رابعہ بہت زیادہ خوفزدہ تھی چنانچہ اسٹیئرنگ میں نے سنبھالا۔ چابی لگاتے ہی انجن گرجا اور گاڑی تیزی سے آگے بڑھی۔ شاید اتنی دیر میں شیخ نے اپنا اوسان درست کر لیا تھا اور رکنے والا بازو کو تاب کر لیا تھا۔ فائر کی آواز اس وقت آئی جب گاڑی گیٹ سے نکل چکی تھی۔ شیخ نے اپنا ریوالور پھر حاصل کر لیا تھا لیکن وہ وقت گزر چکا تھا جب دوست کے ہاتھوں دوست کا قتل ہو جاتا۔ اب مجرم نازو ہو گئی تھی جس نے ایک پولیس افسر پر حملہ کیا تھا۔ رابعہ ہو گئی تھی جو ایک مجرم کو بھگا کر لے گئی۔

"وہ ہمارے پیچھے آئے گا۔" میں نے کہا۔ "اپنا اسکوٹر لے کر۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اب تم کہاں جاؤ گے سکندر؟"

"ابھی کچھ نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن حالات پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں اور سارے سہاروں سے محروم ہو گیا ہوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ رو رہی تھی۔

"ایسا مت کہو سکندر۔ مجھے تو اپنے ساتھ لے چلو۔ اکیلے ہی کہاں جاؤ گی؟" بلا یہ سوچ کر میں کہاں جاؤں گی؟

"تم ابھی تو گھر جاؤ۔" میں نے اس کے ہاتھ پر چٹکی دی۔ "تم تو ہر وقت میرے ساتھ ہو۔ دل و جان سے بھی قریب تر۔ تمہارا تصور اس وقت بھی میرا سب سے بڑا سہارا تھا جب خدا کے سوا کوئی بھی میرے کام نہیں آ سکتی تھی۔ آج اگر مجھے اعتماد ہے تو صرف تم پر اور محسن پر۔ انکل رضوی یا شیخ یا انکل شیر والی میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ کبھی ان کے گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

"پھر اس وقت تم کہاں جاؤ گے؟" رابعہ نے کہا۔ "کسی ہوٹل میں؟"

"ہوٹل میں! نہیں۔ کم سے کم ابھی دو چار دن نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ دونوں فرض شناس پولیس میں بہت ذہین بھی ہیں۔ شیخ اور انکل رضوی، یہ سب سے پہلے ہوٹل ہی دیکھیں گے۔ میرا خیال ہے اب تک اکرام شیخ نے فون کر کے ایس ایس پی صاحب کو سب بتا دیا ہوگا۔ اس نے فوراً نازو کو بھی گرفتار کر لیا ہو تو مجھے تعجب نہیں ہوگا۔ اس نے مجرم کو فرار ہونے میں مدد دی۔"

"اس کے والدین بھی تو ہیں۔ وہ اس کی اجازت نہیں دیں گے۔" رابعہ نے کہا۔

"تم بڑے شیخ صاحب کو نہیں جانتیں۔" میں نے کہا۔ "میں ان سے مل چکا ہوں۔ یہ انہی کی تربیت تھی جس نے اکرام شیخ کو اتنا کڑا اصول پرست بنا دیا۔ انہوں نے ہی شیخ کو سکھایا ہے کہ فرض کی ادائیگی لازم ہے، جان چلی جائے تو پیچھے ہٹنے کا سوال نہیں۔"

گیٹ سے کچھ فاصلے پر میں نے گاڑی کو اچانک موڑ لیا اور نیچے اتر گیا۔ ہم اس وقت تک تقریباً سات میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ جانتے بوجھتے میں نے گاڑی کا رخ رضوی صاحب کے گھر کی طرف رکھا تھا کیونکہ ادھر اکرام شیخ کے آنے کا امکان کم تھا۔ رابعہ کے گھر میں اب کیسے جا سکتا ہوں۔ اگر وہ تعاقب میں ہوتا تو ہماری مخالف سمت میں۔ اس کا اسکوٹر کسی طرح بھی فاکس ویگن سے زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتا تھا۔ چنانچہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس نے تعاقب کیا ہی نہ ہو۔

"تم اب جاؤ۔ میں تم سے صبح رابطہ قائم کروں گا۔" میں نے کہا۔ "صبح سات بجے۔ شب بخیر۔" اور اسے جواب کا موقع دیے بغیر چل پڑا۔ ایک منٹ بعد رابعہ گاڑی لے کر آگے بڑھ گئی۔ میں ٹھٹک گیا اور اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک اس کی ٹیل لائٹ نظر آتی رہی۔ یہ تقریباً وہی جگہ تھی جہاں سے مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ وہ دیوار اب بھی ٹوٹی ہوئی تھی جس سے بار بار اسے دیکھنے والی کار ٹکرائی تھی۔ میں نے اس شگاف سے تاریکی دیکھی اور آگے جا کے اندر جھانکا۔ قدرے کسی کوٹھی کا باغ تھا۔ اور تقریباً سو گز دور کوٹھی کی بند کھڑکیاں روشن تھیں۔ اس گھر میں رہنے والوں کو یقیناً اس رات کا حادثہ یاد ہوگا۔ شاید انہوں نے رابعہ، محسن اور انکل رضوی کے ساتھ مجھے تلاش بھی کیا ہوگا۔ میں نے پلٹ کے سوچا۔ اسی وقت اکرام شیخ اپنے اسکوٹر پر میرے سامنے سے گزر گیا۔ ایک بے مقصد حرکت کے باعث میں اس کے سامنے آنے سے بچ گیا تھا۔ فون کرنے کے بجائے وہ خود رضوی صاحب کو بتانے جا رہا تھا کہ ملزم سکندر بخت کس طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ رابعہ کو بھی موردِ الزام ٹھہرائے گا کہ وکیل صاحب! آپ کو تو قانون کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ وہ کیا کہے گی؟ یہ کہ میں بے بس تھی۔ سکندر زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یا صاف مکر جائے گی کہ میں نے تو سکندر کو دیکھا تک نہیں۔ میں تو ابھی کے کلب میں عید الوداع منظر سے بات کرنے گئی تھی۔ یقین نہیں تو فون کر کے پوچھ لو۔ منظر یاروں کا یار۔ بے فکرا وہ بے جھجک جھوٹ بولنے والا بالکل وہی کہے گا جو رابعہ چاہے گی۔ بیچارہ اکرام شیخ کس مشکل میں پڑ گیا۔

ابھی رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔ آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے پوری رات پڑی تھی۔ پہلا مسئلہ پیٹ کی آگ بجھانے کا تھا۔ اچانک مجھے بریف کیس کا خیال آیا جو رابعہ کی گاڑی میں رہ گیا تھا۔ اس میں پولیس انسپکٹر کی وردی تھی۔ اس کا ریوالور تھا اور پورے تین ہزار روپے تھے۔ اپنی جیب میں میں نے صرف چار سو چالیس روپے رکھے تھے اور اس میں سے بھی سو کم ہو چکے تھے لیکن باقی رقم ایک رات گزارنے کے لیے کافی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پولیس ایک رات میں سارے ہوٹل چیک کر لے؟ میں نے سوچا۔ جواب نفی میں آیا۔ شہر میں سیکڑوں ہوٹل تھے۔ فائیو اسٹار سے لے کر غریب نواز سرائے تک۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اسٹیشن سے میکلوڈ روڈ تک پھیلے ہوئے ہوٹلوں کے رجسٹر دیکھیں۔ گلبرگ ہوٹل تو اور بھی ہیں۔ انار کلی میں اور شاہ عالمی میں۔ اندراج رجسٹر دیکھنے سے کیا معلوم ہوتا ہے؟ میں اپنا نام کچھ بھی لکھوا سکتا ہوں۔ مسئلہ میرے خالی ہاتھ پہنچنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اسباب ساتھ ہو تو کسی کو قیام کے لیے آنے والے پر شک نہیں ہوتا کہ وہ مسافر نہیں ہے لیکن جس کے ہاتھ میں بریف کیس تک نہ ہو اس سے شناخت کا

www.paksociety.com

ثبوت مانگا جا سکتا ہے۔ بے شک میں نے سوٹ پہن رکھا تھا۔ میں صورت سے شریف آدمی لگتا تھا اور گفتگو سے بھی اور اسباب نہ ہونے کی معقول وجہ بھی بتا سکتا تھا۔ ہوٹل والے آدمی کو صورت سے پہچان لیتے ہیں اور انہیں ایڈوانس مل جائے تو ان کے لیے عدم اطمینان کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ رہنے کو منتظر کا گھر بھی بچا تھا مگر میں نئے سرے سے اس کو ساری آپ بیتی سنانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ استاد ڈیڈی کا پتا اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں بلا تکلف اور بے خوف و خطر اس کے گھر جا کے سو جاتا۔

میں نے شب بسری کے مسئلے کو التوا میں رکھا اور کھانے کے لیے بیڈن روڈ کے ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ رش کا وقت گزر چکا تھا چنانچہ بہت کم لوگ میزوں پر موجود تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے مجھے اچانک خیال آیا کہ کہیں رابعہ نے وہ بریف کیس کھول کے دیکھ لیا تو وہ کیا سمجھے گی؟ یہی کہ میں نے کسی سب انسپکٹر کو قتل کر کے اس کی وردی لوٹ لی اور حاصل کر لی۔ میں اسے تو پھر ساری کہانی سنا کے مطمئن کر لوں گا لیکن خدانخواستہ انکل رضوی نے پوچھ لیا کہ یہ بریف کیس کس کا ہے؟ یا محسن نے اپنے بریف کیس کو ان کے سامنے شناخت کر لیا تو رابعہ کے لیے ان کو اپنے جواب سے مطمئن کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اور رضوی صاحب نے شک رفع کرنے کے لیے حکم دیا کہ میرے سامنے بریف کیس کھولو تو رابعہ مجبور ہو جائے گی۔ خود اسے بھی معلوم نہیں کہ بریف کیس میں کیا ہے۔ جب اندر سے ایک سب انسپکٹر کی وردی نکلے گی تو صورت حالات بہت سنگین ہو جائے گی۔ وردی کے ساتھ انسپکٹر کا ریوالور اور اس کا شناختی کارڈ بھی ہے۔ اس کی ایک جیب میں میرا وہ بیان بھی ہے جو حوالدار منگتے خان نے تحریر کیا تھا۔ کل تک راولپنڈی سے پولیس آ جائے گی اور رضوی صاحب میری کوئی تصویر دکھا کے تصدیق کر دیں گے کہ دوہرے قتل کی واردات کر کے پولیس کی تحویل سے فرار ہونے والا آغا علی احمد عرش اللہ آبادی میرے سوا کوئی نہیں۔

یہ خیال اتنا پریشان کن تھا کہ میری بھوک اڑ گئی۔ میں نے فوراً رابعہ کو فون کر کے اسے بریف کیس کی حفاظت کرنے کی تاکید کرنے کا فیصلہ کیا۔ کاؤنٹر پر پہنچ کے میں نے ایک لوکل کال کی اجازت طلب کی۔ منیجر نے بڑی خوش اخلاقی سے ٹیلی فون میری طرف کھسکا دیا۔ نمبر ڈائل کرنے سے پہلے میں نے سوچا کہیں رضوی صاحب کی لائن پر آبزرویشن نہ ہو۔ میرے اغوا کے بعد انہوں نے ٹیلی فون والوں سے ہر کال ریکارڈ کرنے کا کہا ہو۔ لیکن اغوا کی بات پرانی ہو چکی تھی اور ٹیلی فون والے یہ سمجھے ہوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تو تین دن بعد آبزرویشن ہٹا دیتے ہیں۔ ہمت کر کے میں نے نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی دو بار بجی۔ پھر رضوی صاحب کی آواز آئی: "رضوی اسپیکنگ۔"

"ایس پی صاحب۔" میں نے حواس بحال رکھے اور آواز کو ذرا سا بدل کے کہا۔ "مجھے مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ سے بات کرنی ہے۔"

"کون صاحب ہیں آپ؟ نام بتائیے اپنا۔" انکل رضوی نے کہا۔ وہ آواز کے فرق کو محسوس نہیں کر سکے تھے۔

"غلام ربانی ایڈووکیٹ۔" میں نے کہا۔ غلام ربانی پہلے رابعہ کا ہم جماعت اور ماتحت وکیل تھا۔

"ہولڈ پلیز۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "میں بلواتا ہوں۔" اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے آواز بدل کے بات کرنے پر مجھے چونک کے دیکھا تھا لیکن خاموش رہنا بہتر سمجھا تھا۔ یہ نمبر کسی ایس پی کا تھا۔ میں ایک ایڈووکیٹ تھا اور دوسرے ایڈووکیٹ سے بات کرنا چاہتا تھا چنانچہ آواز کی تبدیلی کو گلے کی عارضی خرابی ہی سمجھا جا سکتا تھا۔ "غلام ربانی؟" رابعہ کی حیرت زدہ آواز آئی۔ "خیریت تو ہے۔ تم اس وقت....؟"

"مس رابعہ ایڈووکیٹ۔" میں نے پھر اصل آواز میں کہا۔ "میری ابھی ایس پی صاحب سے بات ہوئی تھی۔"

"سکندر۔" وہ سرگوشی میں بولی۔ "یہ تم نے کیا غلطی کی۔ اپنا بریف کیس چھوڑ گئے؟"

"ہاں۔ میرا بریف کیس تمہاری گاڑی میں رہ گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس وقت کہاں ہے؟"

"انکل رضوی کے پاس۔" رابعہ نے کہا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ وہ آس پاس موجود ہوتے تو رابعہ ان کا نام نہ لیتی۔ "کھول کے دیکھا ہے انہوں نے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ کوشش کی تھی لیکن اس کا قفل نمبروں والا ہے۔" رابعہ بولی۔ "انہوں نے مجھ سے لے کر اپنے کمرے میں رکھ لیا ہے۔ شاید پولیس کی تحویل میں دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے کہا۔ "کیا شک ہو گیا ہے انہیں؟"

"پہلے تو شک ہی تھا۔" وہ بولی۔ "انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا اور میں نے ٹال دیا تھا۔ پھر محسن آ گیا اور سوچے سمجھے بغیر بول پڑا۔ اس نے ایک مونوگرام بنوا رکھا ہے نا۔ وہ پہچان گیا۔ میرے اشارے پر وہ چپ ہو گیا مگر رضوی صاحب...."

"انہوں نے تاڑ لیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس بات کا ڈر تھا۔ تم نے اسے گاڑی میں کیوں نہیں رہنے دیا؟"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ اس سے بھی کوئی خرابی پیدا ہو گی۔" رابعہ نے کہا۔ "کیا ہے اس میں؟"

"یہ پوچھو کہ کیا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ پنڈورا کا صندوق ہے۔ اس کے کھلتے ہی ساری آفات نازل ہو جائیں گی۔"

"تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔" وہ ڈر کر اور خفگی سے بولی۔ "اب کیا ہو سکتا ہے۔ میرے ساتھ ہی اکرام شیخ پہنچ گیا تھا۔ تم بابا لاپتا ہو گئے تھے۔"

"میں نے اسے گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کس لیے آیا تھا وہ؟" میں نے کہا۔

"اپنا استعفا دینے۔" رابعہ نے کہا۔ "میرا خیال تھا وہ سخت مشتعل ہوگا اور مجھے دیکھتے ہی جھپٹ پڑے گا۔ رضوی صاحب کو اب ایک بات بتا دے گا لیکن وہ بہت دل گرفتہ اور خاموش تھا۔ اس نے استعفا دیا نہیں۔ اپنی وردی، شناختی کارڈ، ریوالور سب انکل رضوی کے سامنے رکھے اور کہا کہ میں ابھی اسی وقت پولیس کی ملازمت چھوڑ رہا ہوں۔ استعفا منظور ہو یا نا منظور۔ مجھے پروا نہیں۔ یہ اصولوں کے خلاف ہے تو آپ جو کارروائی کرنا چاہیں کر لیں۔ رضوی صاحب نے دیکھ لیا تھا کہ وہ جذباتی ہو رہا ہے اور فرض اختیار کا شکار ہے۔ انہوں نے کہا کہ تم فیصلہ کر ہی چکے ہو تو میں زبردستی نہیں کر سکتا لیکن اس فوری فیصلے کا سبب تو بتا دو۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ میں اپنا فرض ادا کرنے میں ناکام رہا۔ مجھے سکندر رفعت کو گرفتار کرنے کا موقع ملا تھا لیکن میں اسے گرفتار نہیں کر سکا۔ پھر وہ واپس چلا گیا کوئی تفصیل بتائے بغیر۔ لیکن اس کے بعد انکل رضوی نے مجھے طلب کر لیا اور جرح شروع کر دی۔ ابھی کہاں سے آئی ہو؟ محسن کا بریف کیس تمہیں کہاں دیا؟ تم تو خالی ہاتھ گئی تھیں۔ میں نے کہا کہ بریف کیس پہلے سے گاڑی میں موجود تھا اور محسن کا نہیں ہے۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ فرض کرو محسن کی غلطی ہوئی۔ اسے کیا معلوم کہ میں نے ابھی کیا بیان دیا ہے لیکن اس نے میری صورت پر ہوائیاں اڑتے دیکھیں تو تاڑ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اور جب بریف کیس دکھا کر اس سے پوچھا گیا کہ کیا یہ تمہارا ہے تو اس نے بڑے غور سے اس کا معائنہ کیا اور پھر انکار کر دیا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔ رضوی صاحب آپے سے باہر ہو گئے۔ بہت بگڑے کہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ رابعہ نے تمہیں اشارہ کیا تھا لیکن سچ تمہاری زبان سے پہلے ہی نکل چکا تھا۔ اب اپنی ہی بات کو جھوٹ ثابت کر کے میری آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہو۔ تم دونوں کو معلوم ہے سکندر کہاں ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بریف کیس اپنے کمرے میں رکھوا دیا کہ صبح تفتیش ہو گی۔ جس کا بریف کیس ہو گا اسے مل جائے گا۔"

"رابعہ صبح ہونے سے پہلے وہ بریف کیس وہاں سے غائب کر دو۔" میں نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "شک کی زد میں پہلے ہی تم اور محسن تو آ ہی گئے۔ اس کے علاوہ ان کی خواب گاہ میں جانا اور بریف کیس چرانا ناممکن ہے۔"

"تم محسن سے کہو۔" میں نے کہا۔ "انکل صبح جلدی اٹھتے ہیں اور گھاس پر چہل قدمی کرتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ تک اس وقت کمرے میں کوئی نہیں ہوتا۔"

"میں سمجھتی ہوں سکندر کہ یہ بہت خطرناک کام ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"تمہیں اندازہ نہیں ہے رابعہ کہ اس بریف کیس کی وجہ سے میں کتنی مشکل میں پڑ سکتا ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "جو کچھ میں نے اب تک کیا ہے۔ اور جو میں کرنا چاہتا ہوں سب خاک میں مل جائے گا۔ تمام عمر پچھتاؤ گی تم کہ ایک چھوٹا سا کام نہیں کیا تھا۔"

"اچھا۔ میں اسے غائب کر دوں گی۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھ میں اب اور بحث کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔"

"آئی ایم سوری رابعہ۔ میں تم کو دھمکی نہیں دے رہا تھا بلیک میل نہیں کر رہا تھا۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "میں خود آتا ہوں۔ تمہیں اور محسن کو سب بتا دیتا ہوں۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ بل کے علاوہ میں نے کال کے پانچ روپے اور دیے لیکن اس سے منیجر کی تشفی نہیں ہوئی۔ اس نے گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا تھا اور جو کچھ سنا تھا وہ انتہائی سنسنی خیز، پراسرار اور پریشان کن تھا۔

"یہ کیا مسئلہ ہے مسٹر؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "آپ نے ایس پی کے گھر فون کیا تھا۔ خیر بتائیں۔"

"ایس پی آغا احمد علی عرش اللہ آبادی کے گھر۔" میں نے متانت سے کہا اور اسے ایک نمبر بتایا جو کسی زمانے میں عرش اللہ آبادی کے گھر کا نمبر تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر سر ہلایا اور نمبر لکھ لیا اور مجھ سے کہا کہ ریکارڈ رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ میرا نام وہ پہلے ہی لکھ چکا تھا۔ میں کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر اطمینان سے چلتا ہوا باہر آ گیا۔ مال روڈ کی اکا دکا دکانیں اب بھی کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے رابعہ سے کہہ تو دیا تھا کہ میں آ رہا ہوں لیکن یہ نہیں بتا سکا تھا کہ میں کس وقت اور کس طرف سے آؤں گا۔ اتنا تو وہ خود بھی سمجھ سکتی ہے کہ میں اس طرح اندر نہیں جا سکتا جیسے پہلے جاتا تھا۔ میں چھپ کر جاؤں گا تو ایک کھڑکی کے راستے اندر پہنچوں گا جو رابعہ کے بیڈروم کی کھڑکی تھی اور احاطے کے اندر بائیں جانب کھلتی تھی۔ میرے ذہن میں خیالات کا ایسا انتشار تھا کہ میں یکسوئی کے ساتھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تھوڑی دور ہی پیدل گیا تھا کہ مجھے سوٹ کیس اور چمڑے کے سامان کی ایک دکان میں روشنی نظر آئی۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے تھوڑے سے کھلے ہوئے شٹر سے جھانک کر دیکھا۔ اندر ایک پہلوان نما شخص میز پر بیٹھا دن بھر کی فروخت کا حساب کر رہا تھا۔ شٹر بجا کے میں نے اسے متوجہ کیا۔ "دکان بند ہو گئی ہے۔" اس نے وہیں سے جواب دیا۔

www.paksociety.com

"تمہیں معلوم ہے۔ آپ ذرا ایک منٹ کے لیے قریب آ کے میری بات سن لیں۔" میں نے انتہائی عاجزی سے کہا۔

اُس نے میری صورت دیکھی اور لفظ سب پر غور کیا اور ہم کیش کو مقفل کر کے آگے آیا۔ "فرمائیے!"

"بات یہ ہے جناب کہ ابھی ایک ریسٹورنٹ سے کوئی میرا بریف کیس لے بھاگا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں کھانا کھا رہا تھا۔ اب مجھے رات کی فلائٹ سے کراچی جانا ہے۔ مجھے ایک بریف کیس کی اشد ضرورت ہے۔ چیک تو گیا سو گیا۔ اس کے ساتھ کاغذات بھی گئے۔ قیمت سے بے نکلت گھر پر تھا۔"

اس نے شکر ادا کیا اور "دیکھیے آپ کو کون سا پسند ہے؟ لیکن ذرا جلدی۔" اس نے ایک شیلف میں لگے ہوئے بریف کیسوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے سر ہلایا اور سب پر نظر ڈال لی۔ نمبر لاک والے بریف کیس بہت سے تھے مگر کسی کا سائز مختلف تھا۔ کوئی زیادہ موٹا تھا یا بہت پتلا۔ پھر مجھے ایک بریف کیس ویسا ہی نظر آ گیا، اس پر مصنوعی مگرمچھ کی کھال جیسا کور تھا۔ فرق رنگ کا تھا۔ محسن کا بریف کیس سیاہی مائل براؤن تھا اور یہ ڈارک براؤن۔ لیکن اتنا فرق چل سکتا تھا۔ دکاندار نے اس کی قیمت تین سو بتائی اور ڈھائی سو قبول کر لی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دکان سے باہر آ گیا۔ محسن اور رابعہ کا کام اب کچھ آسان ہو گیا تھا۔ چرانے کے بجائے اب بریف کیس بدلا جا سکتا تھا۔ صبح اگر رضوی صاحب کو رنگ کے فرق کا احساس بھی ہوا تو وہ سمجھیں گے کہ رات کو بلب کی روشنی میں اور صبح سورج کی روشنی میں دیکھنے سے ان کو رنگ کچھ ہلکا لگ رہا ہے۔ مونوگرام کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ایک اسٹکر تھا اور محسن اسے کسی دشواری کے بغیر اکھاڑ کے نئے بریف کیس پر لگا سکتا تھا۔ سب سے نمایاں پرانے اور نئے کا فرق تھا۔ محسن کو یہ سمجھانا پڑے گا کہ بدلنے سے پہلے دستے کو پرانا بنا دے۔ مٹی، ڈھکوں میں رگڑ کے اور کوٹ کر میلا کر دے۔

اب میں جلد از جلد انکل رضوی کے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن گھڑی میں دس بج چکے تھے۔ رضوی صاحب کا گیارہ بارہ بجے تک جاگتے رہنا بھی ممکن تھا۔ وہ پہلے ہی مصروف تھے اور اب مجھے خود رابعہ نے بتا دیا تھا کہ ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو رہا ہے اور آج کے واقعات کا ان کے ذہن پر اثر ہونا لازمی ہے۔ سوچنا مجھے یہی تھا کہ اس بریف کیس میں کیا بھروں۔ پھر میں نے اس مسئلے کو محسن اور رابعہ پر چھوڑ دیا۔ وہ خود باہمی مشورے سے سب ٹھیک کر لیں گے۔ انکل رضوی کے ذہن سے شک کو مٹانا تو ان کے لیے ممکن نہ ہوگا لیکن وقتی طور پر رابعہ کی پوزیشن محفوظ ہو جائے گی۔

مجھے افسوس تھا کہ میری وجہ سے شیخ کو مستعفی ہونا پڑا اور پولیس مستقبل کے ایک دیانت دار افسر کو جان کا قرض سمجھنے والے مخلص پولیس افسر سے محروم ہو گئی۔ اس کے اپنے گھر کی فضا کشیدہ ہو گئی۔ بہو کا اس کے بعد کیا ہوگا۔ نازو چھوٹی بہن تھی۔ بڑا بھائی پولیس افسر تھا اور اس سے شکست کھا گیا تھا۔ شیخ دل میں میل رکھنے والا آدمی نہیں تھا۔ مگر نازو کی اس حرکت کا وہ کیا مطلب نکالے گا؟ خود نازو کے والدین کی نظروں میں میری پوزیشن گر گئی تھی۔ اور اب میرے لیے اس گھر میں قدم رکھنا بھی محال تھا حالانکہ اب شیخ سے دشمنی کی کوئی وجہ نہ رہی تھی۔ وہ پولیس کی ذمے داریوں سے سبکدوش ہونے کے بعد صرف دوستی نبھا سکتا تھا لیکن مسئلہ اس سے کہیں زیادہ الجھا ہوا تھا۔ میں رابعہ کی خاطر دنیا کو چھوڑ سکتا تھا اور نازو واقعی ضد کی پکی لڑکی تھی کہ مجھے اس پر ترس آتا تھا کیونکہ میں نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔

میں اطمینان سے پیدل چلتا جا رہا تھا۔ ایک موڑ پر پلٹ کر دیکھنے سے مجھے اسٹریٹ لائٹ کے نیچے دو افراد نظر آئے۔ اگر وہ تیزی سے اندھیرے کی پناہ نہ لیتے تو مجھے کوئی شک نہ ہوتا لیکن ان کی اس حرکت نے مجھے چوکنا کر دیا۔ میں موڑ کاٹ کے ایک جگہ سڑک کے کنارے لگے ہوئے لیٹر بکس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں میرے سامنے سے گزر گئے۔

"کہاں گیا وہ؟" ان میں سے ایک نے تشویش سے کہا۔ وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑے تھے۔

"جائے گا کہاں؟" دوسرا بولا۔ "ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" پھر ان نے ایک رکشا کو روک لیا۔ رکشا کچھ دور جا کے رکا چنانچہ میں ان کی بات نہ سن سکا۔ لیکن روشنی پڑتے ہی میں نے ان کی صورت کو پہچان لیا۔ ایک بار وہ اور میرے سامنے چوبرجی چوک میں پیش کیے گئے تھے۔ یہ انہی میں سے دو تھے۔ رکشا روانہ ہو گیا تو میں لیٹر بکس کے پیچھے سے نکلا اور سوچنے لگا کہ یہ فرشتے کب اور کہاں سے میرے تعاقب میں تھے اور کہاں گئے ہیں؟ "ابھی دیکھ لیتے ہیں" کا کیا مطلب ہے؟ کیا انہوں نے ریسٹورنٹ میں ٹیلی فون پر میری اور رابعہ کی گفتگو سنی تھی اور وہیں سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے؟ یہ بھی اخذ کیا جا سکتا تھا کہ رکشا میں وہ مجھ سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے جہاں ان کو میرے پہنچنے کا یقین ہے۔ اگر بریف کیس بدلنے کا مسئلہ اتنا سنگین نہ ہوتا تو میں اپنا پروگرام یقیناً ملتوی کر دیتا۔

گیارہ بجے کے بعد میں نے رکشا کو دھرم پورہ شہر کے پل سے سیدھے ہاتھ مڑتے ہی روک لیا۔ حالات بدل گئے تھے۔ اب میں دندناتا ہوا مرد در تو کیا کونے جانا ان نہیں جا سکتا تھا۔ نصف فرلانگ کا فاصلہ میں نے بہت احتیاط کے ساتھ کسی درخت یا دیوار کے سائے میں ٹھہر ٹھہر کے طے کیا۔ چاند ابھی نہیں نکلا تھا لیکن کسی کسی کھمبے پر روشن بلب کا اجالا سا یوں

تاریکی سے اس حد تک فائدہ اٹھانے میں کامیاب تھا کہ کوئی حرکت ہوتی تو دیکھنے والے ضرور دیکھ سکتی تھیں۔ چشم براہ تو رابعہ کی آنکھیں بھی ہوں گی لیکن اس کے علاوہ شکاری آنکھیں بھی تاک میں ہو سکتی تھیں۔ احتیاط کے خیال سے میں نے بڑے دروازے سے داخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔

فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی اور موسم سرما کی آمد کا پتا شہر کے گرد و بازار سے بھی ملتا تھا جہاں بے رونقی نظر آتی تھی جو گرمیوں میں شام سے نصف شب کے بعد تک لوگوں کو گھر سے باہر رکھتی تھی۔ اب تو دس بجے ہی آدھی رات کا گماں ہوتا تھا اور ٹی وی پروگرام ختم ہونے کے بعد بہت کم لوگ جاگتے تھے۔ رضوی صاحب کے ساتھ والے گھر میں بھی اندھیرا تھا۔ میں خالی بریف کیس کے ساتھ اطمینان سے اندر داخل ہوا اور اس دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا جو رضوی صاحب کی کوٹھی کو اس کوٹھی سے جدا کرتی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر مجھ سے پہلے ہی کچھ لوگ یہاں پہنچ جانے والے دیوار کی دوسری جانب ہوں گے تو اس حرکت سے میری آمد پا کر ان کے چوکنا ہونا لازمی تھا۔ تعجب تو مجھے اس بات پر بھی تھا کہ وہ شکاری کب اور کیسے میرے پیچھے لگ گئے تھے لیکن اس سے زیادہ حیرت مجھے ان کے اعتماد پر تھی۔ رکشا میں بیٹھتے وقت انہیں یقین تھا کہ میں بچ کر کہیں نہیں جا سکتا اور وہ اسی یقین کے ساتھ روانہ ہوئے تھے جیسے میری منزل کا پتا وہ پہلے سے جانتے تھے۔

ہاتھوں کے بل پر خود کو تھوڑا سا بلند کر کے میں نے دیوار پر سے دوسری جانب جھانکا۔ اس گوشے کا چپہ چپہ جانا پہچانا تھا۔ نم آلود گھاس، خوابیدہ درخت، سب میرے دیرینہ ہمدم و ہمراز تھے لیکن اس وقت وہ بھی اجنبی ہو گئے تھے۔ میں نے نظر جھکا کے دیکھا اور تاریکی میں ایک جگنو سا فروزاں دیکھ لیا۔ اگر میں سامنے والے دروازے سے اندر آتا تو جھاڑی کے پیچھے دبکے ہوئے اس شخص کو ہرگز نہ دیکھ پاتا جو وہاں اطمینان سے چھپ کر سگریٹ پی رہا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ پتوں کی گھنی دیوار کے پیچھے یہ چنگاری کسی کو نظر نہیں آ سکتی۔

میں نے اس کے دوسرے ساتھی کو تلاش کیا اور ناکام رہا۔ اگر وہ بھی اندر تھا تو کسی ایسے مقام پر موجود تھا جہاں میری نظر کی رسائی نہ تھی۔ یہ بالکل ناممکن تھا کہ میں دیوار پر چڑھ کے دوسری جانب اتر جاؤں اور بے خبری میں اس کو دبوچ لوں۔ فاصلہ بہت کم تھا اور خاموشی اتنی گہری تھی کہ میرے دیوار پر چڑھنے کی سرسراہٹ بھی اسے چوکنا کر سکتی تھی۔ پھر دوسری طرف جانے کے لیے چند قدم چلنا تھا اور خواہ میں کتنی ہی احتیاط سے قدم کیوں نہ رکھتا، خشک گھاس اور سوکھے پتوں کی چرچراہٹ اسے چوکنا کر دیتی۔ کچھ بائیں طرف مجھے رابعہ کے بیڈروم کی کھڑکی کھلی نظر آ رہی تھی۔ اس میں زیرو واٹ کے بلب کا مدھم اجالا اس قدر ہو رہا تھا کہ اندر کوئی خواب سے محروم جاگتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہوگی۔ ایک میرے انتظار کی خلش تھی، میری ذات سے وابستہ اندیشہ ہائے دور و دراز تھے اور فکر سود و زیاں بھی، اس کی آنکھوں کے لیے نیند کہاں۔ اندر اپنی خواب گاہ میں محسن بھی جاگ رہا تھا۔ رفاقتوں کے یہ سلسلے نہ ہوتے تو وہ دونوں اپنے اپنے گھروں میں ساری دنیا کی طرح چین سے سوتے لیکن محسن میرے ماضی کا امین تھا تو رابعہ میرے مستقبل کی مالک تھی۔

گھات میں بیٹھے ہوئے شکاری کو فریب کے جال میں الجھا کے باہر نکالنا بہت مشکل تھا۔ اور اندر ہی اندر جنگ کھولنا خود اپنے منصوبے کی ناکامی کا سامان کرنے کے مترادف تھا۔ شور و غل پر رضوی صاحب تیسرے فریق بن کے آ جائیں گے اور دونوں کو پکڑ لیں گے۔ وہ پکڑا جاتا تو میری بلا سے لیکن اس مرحلے پر میں اپنی آزادی کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ صبر کے ساتھ انتظار کے علاوہ میں کیا کر سکتا تھا۔ ایک امید یہ تھی کہ شاید وہ مایوس ہو جائیں۔ آخر کب تک وہ انتظار کریں گے۔ بالآخر انہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان سے اندازے میں غلطی ہوئی اور اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔ رضوی صاحب کے ڈرائنگ روم میں لگے ہوئے خاندانی کلاک نے بارہ گھنٹے بجا کے نئے دن کے آغاز کا اعلان کیا۔ میں مسلسل دیوار پر لٹکا نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ وقفے وقفے سے میں تانک جھانک میں مصروف رہا لیکن وہ خبیث انتہائی مستقل مزاجی کے ساتھ وہیں براجمان نظر آیا۔ میرے ذہن میں اس کو بھگانے اور وہاں سے کھسکانے کی کوئی تدبیر نہ آئی۔ یہ ڈراما کسی اور کی مرضی کے مطابق میں نے خود آخری پوزیشن قائم کر رکھی تھی، اس کا کوئی مکمل مجھے پورا سمجھے لیکن تاریکی بڑھتے ہی حالات بدل گئے۔ اچانک اندر سے رضوی صاحب برآمد ہوئے۔ انھوں نے نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ ذہنی بے سکونی کے باعث وہ نیند سے محروم ہیں۔ انھوں نے لان پر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ لان کے دوسرے کنارے سے عین اس جھاڑی تک آتے تھے جس کے پیچھے دشمن کا ایک سپاہی چھپا بیٹھا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ جھاڑی سے ٹکرا کے آگے نکل آئیں گے لیکن وہ میکانکی انداز میں پلٹ گئے۔ اگر وہ چند قدم آگے آ جاتے تو وہ شخص چھپا نہ رہ سکتا اور مجبوراً وہ حملے میں پہل کرتا اور رضوی صاحب کو خاموش کر دیتا یا چوٹیاں بغل میں دبا کے بھاگ جاتا۔ اگر وہ حملہ کرتا تو مجھے ان کو بچانے کی خاطر سامنے آنا پڑتا اور اس احسان کا بدلہ انکل رضوی یوں چکاتے کہ مجھے فوراً گرفتار کر لیتے۔

www.paksociety.com

پھر اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ اس میں توجیہ کی بات بھی نہیں تھی کہ خود وہ شخص بھی خوف اور اضطراب کی کیفیت میں مبتلا ہو گا اور اس کے اعصاب کے تار اس حد تک کشیدہ ہو گئے ہوں گے کہ خفیف سا صدمہ بھی برداشت نہ کر سکیں گے۔ جیسے جیسے رضوی صاحب کے قدم اس کی طرف بڑھتے ہوں گے اپنی موجودگی کا راز افشا ہونے کا خوف بڑھتا جاتا ہو گا اور وہ چلتے ہوں گے تو اطمینان سے ایک لمحے میں وہ دعا کرتا ہو گا کہ اس چکر کے بعد وہ اندر چلے جائیں۔ میں نے نیچے سے تقریباً ایک پاؤ کا پتھر اٹھایا۔ بریف کیس کو دیوار سے لگا کے کھڑا کیا اور خود اس کے اوپر چڑھ گیا۔ اب میرا سر دیوار سے چند انچ اوپر تھا۔ اندیشہ بس یہ تھا کہ کہیں بریف کیس میرے وزن سے ٹوٹ نہ جائے یا دیوار سے رگڑ کھا کے پھسل نہ جائے لیکن مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ رضوی صاحب جیسے ہی جھاڑی تک پہنچ کے واپس ہوئے میں نے اطمینان سے نشانہ لیا اور پوری قوت کے ساتھ وہ پتھر اس کی کمر پہ دے مارا۔

اسے چوٹ یقیناً آئی ہو گی لیکن وار اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ چلا پڑا۔ رضوی صاحب ایک دم پلٹے اور اس سے پہلے کہ وہ شخص سنبھلتا رضوی صاحب نے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ عظمت خان ٹائپ تنومند پیٹ والے تھانیدار نہیں تھے۔ اعلیٰ پولیس افسر تھے اور انہوں نے خود کو جسمانی طور پہ ہمیشہ فٹ رکھا تھا۔ میرا شکاری خود شکار ہو گیا۔

"کون ہو تم؟" رضوی صاحب نے گرج کر کہا۔ "یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیوں چھپے بیٹھے تھے؟" اب ان کی ساری توجہ زیر حراست ملزم کی طرف تھی چنانچہ میں اطمینان سے سارا تماشا دیکھ سکتا تھا۔ اس شخص کے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ اس نے واجبی سی مزاحمت کی اور خود کو چھڑا کے بھاگنا چاہا لیکن حیرت انگیز طور پر رضوی صاحب نے کسی پیشہ ور باکسر کی طرح وار کر کے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ ہنگامے نے اندر ان کی بیگم کو متوجہ کر لیا تھا۔ انہوں نے باہر کی لائٹ جلائی۔ دو منٹ بعد وہ خود نکلیں۔ پھر ان کا نوکر اور آخر میں محسن۔

"اسے لے جاؤ اندر۔" رضوی صاحب نے حکم دیا۔ "اور باندھ کے ڈال دو۔"

محسن اور رضوی صاحب کا ملازم نیم بے ہوش شخص کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے۔

"کون تھا یہ؟" بیگم رضوی نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔ "کچھ ہوا تو نہیں آپ کو؟"

"نہیں۔" رضوی صاحب نے سکون سے کہا۔ "کوئی چور معلوم ہوتا ہے۔ یہاں چھپا ہوا تھا جھاڑی کے پیچھے۔"

"آپ نے کیسے دیکھ لیا؟" بیگم رضوی نے مخصوص تجسس کے باعث بیویوں کی طرح بے موقع جرح کی۔

"ارے بھئی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔" رضوی صاحب نے چڑ کر کہا۔ "ٹہل رہا تھا باہر۔ اسے شاید کسی کیڑے مکوڑے نے کاٹ لیا۔"

میرے لیے یہ مناسب ترین موقع تھا جب کوئی میری طرف متوجہ نہ تھا۔ میں نے بریف کیس کو دیوار پر رکھا۔ خود کو چڑھا کر دوسری طرف اتر گیا۔ بریف کیس اٹھا کے میں دبے پاؤں اس گلی میں غائب ہو گیا جس میں کھلنے والی رابعہ کے بیڈ روم کی کھڑکی مجھے پناہ دینے کے لیے بلا رہی تھی۔ میں کھڑکی کے راستے کمرے میں وارد ہوا تو رابعہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"یہ باہر کیا ہو رہا تھا؟" رابعہ نے جس لہجے میں کہا اس سے اس کے دلی اضطراب کی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"انکل رضوی نے ایک چور کو گرفتار کیا ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "کیا دیدہ دلیری ہے۔"

"میں تو ڈر گئی تھی کہ تم پکڑے گئے۔" رابعہ نے سرگوشی کی۔

"بات یہ ہے خاتون۔" میں نے کہا۔ "کہ آیا تو وہ بدبخت مجھے پکڑنے تھا لیکن وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔"

"تم جانتے ہو اسے؟" رابعہ نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بڑے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کو شاید یاد ہو کہ ایک دن میری اپنی فیکٹری میں مجھے زرعی آلات کی جگہ کریٹ میں بند کر دیا گیا تھا اور یہ کارنامہ جن افراد نے انجام دیا تھا جن کو میرے سامنے فریم میں بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ یہ انہی میں سے ایک ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اسے میرے حوالے کر دیا جائے؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "انکل اسے پولیس کے حوالے کریں گے۔ وہ مسلح بھی تھا؟"

"یقیناً ہو گا۔" میں نے کہا۔ "اچھا تم ذرا اندر جا کے انکل کو ذرا معلوم کرو۔ ویسے وہ بالکل خیریت سے ہیں اور محسن کے ساتھ مل کے ایک بیان دے دو کہ یہ مجھے اغوا کر کے لے جانے والوں میں سے ایک ہے۔ تم دونوں کی شناخت سے تفتیش کی لائن مل جائے گی اور اسے اچھی طرح ٹھوک بجا کے پوچھا گیا تو ممکن ہے وہ بہت سے انکشافات کرے۔ ورنہ تو وہ اتنا کہہ کے بچ جائے گا کہ چوری کی نیت سے آیا تھا۔ اس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ باقی پانچ فرد میں کون تھے؟"

فوری طور پر کسی کے ادھر آنے کا امکان نہیں تھا اس لیے

رابعہ کی واپسی تک میں اطمینان سے لیٹا رہا۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد آئی۔ رضوی صاحب کا فون خراب نہ ہوتا تو پولیس فوراً آ جاتی۔ فی الحال ملزم کو باندھ کر باتھ روم میں ڈال دیا گیا تھا۔ رابعہ اور محسن کے بیان پہ اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ رضوی صاحب نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اغوا کرنے والے باقی افراد کے نام بتا دے۔ یہ بتا دے کہ اسے کس نے اغوا پہ مامور کیا تھا اور وہ سکندر کو اغوا کرنے کے بعد کہاں لے گئے تھے تو اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ ورنہ اس کی کھال کے جوتے بنوا کے پھر تھانے میں تفتیش کے لیے رکھوا دیے جائیں گے۔ معلوم کرنے والے سب معلوم کر ہی لیں گے۔

"اس وقت گھر میں خاصی ہلچل ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی کون سوئے گا۔ کسی کو بھی نیند نہیں آئے گی۔ تم انکل کے ساتھ ڈرائنگ روم میں رہو۔ مجھے یہ بتا دو کہ وہ بریف کیس کہاں ہے؟ میں یہ بریف کیس لایا ہوں۔"

رابعہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "اب کیا فائدہ؟" وہ بولی۔ "انکل نے اسے کھول کر دیکھ لیا تھا قفل توڑ کے۔ اور بریف کیس اب ان کی الماری میں مقفل ہے۔"

"او مائی گاڈ۔" میں نے سر پیٹ کے کہا۔ "یہ تو بہت برا ہوا لیکن رابعہ مجھے بہرحال وہ بریف کیس حاصل کرنا ہو گا اس سے پہلے کہ میرے خلاف یہ شہادت ریکارڈ پر آئے۔ مجھے معلوم ہے الماری کی چابیاں ان کے تکیے کے نیچے ہوں گی۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو سکندر؟" رابعہ نے بے بسی سے کہا۔ "صبح انکل کو خالی بریف کیس ملے گا تو الزام کس پہ آئے گا؟ سب سے پہلے مجھ پر۔ اس کے بعد محسن پہ۔" اسی وقت محسن اندر آ گیا۔ اس نے رابعہ کی پوری بات سن لی تھی اور سب سمجھ گیا تھا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ انکل کے ساتھ موجود رہو۔ تم دونوں۔" میں نے کہا۔

"مگر اس سے کیا فرق پڑے گا۔ کیا تم انکل کو بیوقوف بنا لو گے؟" رابعہ نے پریشانی سے کہا۔ "وہ ہم دونوں سے ذکر کر چکے ہیں۔"

"صرف ذکر کیا تھا یا تمہیں... خود تم نے دیکھا تھا کہ اس میں کیا ہے؟" میں نے کہا۔

محسن نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"تمہارا مطلب ہے ہم بھی ان کے بیان کی تائید نہ کریں؟" رابعہ نے کہا۔ "یہ کیسے کریں پاپا صاحب؟ ہم نے تو آپ کے لبوں سے ایک بات سنی تھی۔ دیکھا کچھ نہیں تھا۔ ہمیں کیا معلوم کہ آپ جھوٹ بول رہے تھے یا سچ۔ مگر جو ذرا اس کے بعد ان کی نظروں میں ہماری کیا عزت رہے گی؟ اس شخص کو زیادہ دیانتدار تسلیم کرتا ہے اور اس کے ہم پر اتنے احسانات ہیں اور جس کے لیے ہم اپنے بچوں کی طرح ہیں، ہم اس کو منہ پر جھوٹا کہہ دیں؟"

"اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں دوسرے قتل کے ایک اور جھوٹے الزام میں پھنس جاؤں گا۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "جو راولپنڈی میں درج ہے وہاں میں نے اپنا جھوٹا نام لکھوا دیا تھا اور یہ تائید ہو چکی کہ میں اغوا کرنے والوں کی قید سے ہی نہیں پولیس کے ہاتھ پڑنے کے بعد حوالات سے فرار ہونے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ سب کہہ رہے ہیں ثبوت نہ ملے کوئی مجھے وہی مفرور مجرم قرار نہیں دے سکتا لیکن صورت کی مشابہت پیچھا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں لاہور میں تھا؟"

"بات ثابت کرنے کی نہیں..." محسن نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "جو وہ تو نہیں کیسے انکار کر سکتے ہیں؟"

"تم تو وکیل ہو رابعہ۔ مجھے بتاؤ کہ میرے خلاف دوسرے قتل یہ کچھ اور مقدمات راولپنڈی میں درج ہو گئے تو کیا ہو گا؟ تم کہاں کہاں پیروی کرو گی؟ اور کیا اس کے بعد میرے ضمانت پہ رہا ہونے کی کوئی صورت رہے گی؟" میں نے کہا۔

"ضمانت تو ویسے بھی منسوخ ہو چکی ہے تمہاری۔" وہ بولی۔

"ہاں لیکن ابھی مقدمات میں جو یہاں درج ہیں۔" میں نے کہا۔ "شیخ اور عبدل کا کیس تو تقریباً ختم ہو چکا۔ صرف میر شرافت علی کے قتل کا الزام ہے جو اتنا ہی بے بنیاد ہے جتنا یہ راولپنڈی والا الزام۔ مقصد مجھے جیل پہنچانا ہے۔ تم جیل کے اندر کے حالات جانتی ہو۔ میں ایک بار بند ہو گیا تو اس زندگی میں باہر نہیں آ سکوں گا۔ دشمنوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ میرے خلاف اندر ہی اندر مقدمات کی تعداد بڑھتی جائے گی۔ مجرم اندر پاگل بھی ہو جاتے ہیں، مر بھی جاتے ہیں۔"

"بس بس... اور کچھ مت کہو۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔" وہ چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا کے رونے لگی۔ "لیکن انکل سے یہ جھوٹ کیسے بولوں؟ اور پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اسی گھر میں رہوں؟" محسن نے اس کے شانے پر تھپکی دی اور تائید میں سر ہلایا۔

"یہ انتخاب تو تم کو کرنا پڑے گا اسی وقت۔" میں نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ انکل رضوی تم دونوں سے وقتی طور پر بدظن ہو جائیں گے۔ وہ دوبارہ تمہاری صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں کریں گے اور ان کو بہت صدمہ ہو گا۔ لیکن دوسری طرف تمہارے سچ کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑے گا۔ میں جانتا ہوں راولپنڈی میں دوسرے قتل کی واردات میں نے نہیں کی لیکن وہاں کے حالات اور واقعات کی ساری گواہی میرے خلاف ہے۔ سو فیصد۔ مجھ پر ناجائز اسلحہ رکھنے کا پولیس افسر پر تفتیش کے دوران

حملہ کرنے کا اور حقائق سے فرار ہونے کے الزامات الگ ہیں۔ تم کیا، پاکستان کے بڑے بڑے وکیلوں کا پینل بھی مجھے سزا سے نہیں بچا سکتا۔ ایسے سچ کا کیا فائدہ رابعہ جو کسی بے گناہ کو تختۂ دار تک پہنچا دے۔"

"لیکن یہ جھوٹ بہت مشکل ہے بہت مشکل۔" وہ روتے روتے بولی۔ "میں خود اپنی نظروں میں گر جاؤں گی کہ میں نے کیسے جھوٹ بولا۔ تم خود بھی یہ نہیں کر سکتے تھے۔"

"میرے لیے تمہارا یہ جھوٹ اشد ضروری ہے۔" میں نے کہا۔ "اس لیے کہ تمہارے باپ کو ثابت کرنے کے لیے آزاد ہوں۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں گے رابعہ تو ان کی گردن تک کیسے پہنچ سکوں گا جو اصل مجرم ہیں جو سب کچھ جانتے ہیں لیکن اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے مجھے مجرم بنانے پر کمربستہ ہیں۔ مجھے قربانی کا بکرا بنانے والے وہی ہیں جو میرے باپ کے قاتل ہیں۔ شہلا کی ماں کے قاتل ہیں۔ تمہیں تباہ کر چکے ہیں۔ ان کے دامن پر کتنے بے گناہوں کے لہو کا داغ ہے۔ وہ کس کس کو برباد کر چکے ہیں۔ یہ تم سے بہتر کون جانتا ہے۔ ان کی طاقت کا غرور آخر کون توڑے گا۔ وہ تو اپنے پیسے اور اپنی بدمعاشی کے بل پر سب کچھ کر رہے ہیں اور پھر بھی عزت دار ہیں کیونکہ قانون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ میں اس بے بسی کے ساتھ پھانسی نہیں چڑھوں گا رابعہ۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک ایک کو چن چن کے مارنے کے بعد مروں۔ تم نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا تو میں کیا کروں گا؟"

"میں تمہارے ساتھ تختۂ دار تک جا سکتی ہوں، مر سکتی ہوں لیکن یہ نہیں کر سکتی۔" رابعہ رو رہی تھی۔ "میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں، تمہارے منہ سے بے وفائی کا طعنہ نہیں سن سکتی۔ تم جانتے ہو کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ میں اسی وقت تمہارے ساتھ نکل جاؤں گی اور تم کو کیا ضرورت ہے؟ میں خود وہ بریف کیس اٹھا لائی ہوں۔ یہ الزام مجھے قبول ہے کہ رابعہ بھاگ گئی اور سکندر کی خاطر اس نے چوری بھی کی، اپنی زندگی بھی تباہ کر لی لیکن میں انکل کو ان کے منہ پر جھوٹا نہیں کہہ سکتی۔"

"نہیں رابعہ نہیں۔ میں جھوٹے الزامات کی یہ گٹھڑی تمہارے سر پر نہیں رکھ سکتا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں اس لیے مجرم نہیں بنا سکتا کہ تم نے مجھ سے محبت کی تھی، میری مدد کی تھی۔ ایسے وقت میں جب خدا کے سوا میرا کوئی نہیں تھا۔ اس محبت کی تمہیں پہلے ہی بہت سزا مل چکی ہے۔ باقی سزا مجھے اکیلے بھگتنے دو۔ تم میرے ساتھ کہاں جاؤ گی۔ میرا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے؟"

"میرا ٹھکانہ وہیں ہو گا جہاں تم ہو گے۔" وہ عزم مصمم کے ساتھ بولی۔ "میں نے تو تم سے پہلے بھی کہا تھا سکندر کہ ہم کہاں تک دشمنوں سے لڑیں گے۔ زندگی تو بہت مختصر ہے اور خوشیوں کی عمر اس سے بھی کم۔"

"میرا جواب اب بھی وہی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں بدنامی اور رسوائی کی سند کے ساتھ تمہیں نہیں اپنا سکتا۔ تمام زندگی تمہارے ساتھ گزارنی ہے۔ فرار ہونے کے بعد پکڑے نہ گئے تب بھی خود اپنی نظروں میں تو مجرم رہیں گے اور جو مجرم ہیں وہ فتح کا ڈنکا بجاتے پھریں گے کہ ہے کوئی ہمارے مقابل آنے والا۔ ہم سے کچھ پوچھنے والا۔ وہ مجرم ہو کے بھی سر اٹھا کے چلیں گے اور ہم بے گناہ ہو کے بھی چوروں کی طرح چھپ کر کسی گمنام گوشے میں بیٹھیں گے تو یہ خاک جینا ہو گا۔ میرے والد کی روح کتنی پریشان ہو گی اور کتنے بے گناہوں کا لہو ابھی الزام سے... کاش اتنے بزدل تھے تو مقابلے کی کیا ضرورت تھی۔ شوقی سلوا اور سرفراز نے ابھی سے شکست تسلیم کی ہوتی، قربانی کر لیتے۔"

"تو سمجھتا کیوں نہیں؟" محسن نے جھنجلا کے کہا۔ "جب تک انکل نے اسے کھولا نہیں تھا بات اور تھی، میں اسے غائب کر سکتا تھا۔ یہ دوسرا بریف کیس بالکل ویسا ہی ہے۔ انکل کو فرق کا احساس بھی نہ ہوتا لیکن صبح وہ غلط بریف کیس دیکھیں گے تو فرق بھی محسوس کر لیں گے۔"

"اس سے تو بہتر یہ ہے کہ اصل بریف کیس کو غائب کر دیا جائے۔ اس کا تالا تو ٹوٹا ہوا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"الماری کا تالا تو کھولنا ہی پڑے گا۔" محسن بولا۔ "چوری کا الزام تو ہر صورت آئے گا۔"

"لیکن اس بریف کیس پر میری زندگی اور موت کا انحصار ہے محسن!" میں نے کہا۔ "تم چوری کا الزام قبول کر لو یا مجھے پھانسی کے تختے تک پہنچا دو۔ اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے۔ رابعہ کے لیے بھی یہ الزام قبول کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا تیرے لیے مگر رابعہ عورت ہے۔ اس گھر کے علاوہ رابعہ کا ٹھکانہ بھی کوئی نہیں۔ اس کے علاوہ رابعہ کا یہاں موجود رہنا ضروری ہے تاکہ مجھے تازہ ترین صورت حال کا علم ہوتا رہے اور قانونی طور پر رابعہ جس حد تک میری مدد کر سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وہ بریف کیس غائب کر دوں گا اور خود بھی غائب ہو جاؤں گا۔" محسن نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "رابعہ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ انکل رضوی کیا کریں گے؟ میرے ڈیڈی سے شکایت کریں گے نا کہ محسن نے سکندر کی مدد کی جو قانون کی نظر میں ایک مجرم ہے۔ میں اعتراف کر لوں گا کہ میں نے ایسا کیا۔ میرے لیے دوستی کا رشتہ زیادہ اہم تھا۔ ہر شخص ایس پی صاحب رضوی جیسا نہیں ہو سکتا۔ رضوی انکل مجھے گرفتار بھی نہیں کروا سکتے۔ ایک تو ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں رہے گا۔ اس کے علاوہ میرے ڈیڈی ان کو یہ قدم نہیں اٹھانے دیں گے۔ خودکشی کی حالت کے پیش نظر انکل رضوی مجبور ہو جائیں گے۔ پھر اگر وہ امانت گم ہو جانے کی فرد جرم عائد کرتے ہیں تو کر دیں۔ مجھے پروا نہیں۔"

"میں اب دربدر ہوں محسن۔" میں نے کہا۔ "ایک طرف تمہاری

میرے لیے تم نے جال پھیلا رکھے ہیں، دوسری طرف پولیس کو میری جستجو ہے۔ میرا کام بہت کٹھن ہو گیا ہے لیکن ناممکن اب بھی نہیں ہے۔ مجھے اپنا کام چھپ کر کرنا ہے۔ تم کو نہ جانے کہاں کہاں میری مدد کرنی پڑے۔ مدد تو تم نے ہمیشہ کی ہے مگر اب تم ایک مجرم کی مدد کرو گے، چوری چھپے۔"

"میں جانتا ہوں، مگر میری نظروں میں تو آج بھی وہی ہے جو آج سے سال بھر پہلے یا دس سال پہلے تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تو مجرم نہیں ہے۔ تو واقعی مجرم ہوتا تو شاید میں تیرا ساتھ نہ دیتا لیکن مجھے حقیقت کا علم ہے۔ تیرے خلاف کتنے مقدمات درج ہیں۔ اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ تو سب جھوٹے مقدمات ہیں۔" محسن نے کہا۔ "کیا یہ بات تمہیں معلوم نہیں ہے؟"

"مجھے اپنی تقدیر سے کوئی شکوہ نہیں۔" میں نے اطمینان اور فخر سے محسن کو دیکھا۔ "خدا کا یہ احسان کیا کم ہے کہ میں اکیلا نہیں ہوں اور اس نے مجھے اتنے قابل اعتماد سہارے فراہم کیے ہیں تو مجھے ناکامی کا خوف کیوں ہو۔"

"میں بریف کیس لے کر آتا ہوں۔" محسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تیرا یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں۔" اس نے احتیاط سے دروازہ بند کیا اور غائب ہو گیا۔

"تم اب کہاں جاؤ گے؟" رابعہ نے ناخن کاٹتے ہوئے کہا۔

"معلوم نہیں، مگر میں... میں تم سے ملتا رہوں گا۔" میں نے خاموشی کے ایک بوجھل وقفے کے بعد کہا۔ "جب بھی موقع ملا۔"

"اور یہاں میں کیا کروں گی؟" رابعہ نے خلا کو گھورتے ہوئے کہا۔ "محض انتظار، کسی امید کے بغیر؟"

"کیا میں کسی امید کے بغیر یہ سب کچھ کر رہا ہوں؟" میں نے کہا۔ "میری کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے؟"

"میں تمہاری حوصلہ شکنی کرنا نہیں چاہتی لیکن حقیقت سے نظر نہیں چرائی جا سکتی۔" وہ بولی۔ "پہلے تم سخت حالات اور مشکلات کے جنگل میں تھے۔ اس سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتے کرتے تم دلدل میں پھنس گئے ہو۔"

"تمہارا مطلب ہے میں اپنے حالات کی خرابی کا خود ذمہ دار ہوں۔" میں نے کہا۔ "میری کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے؟"

"کوئی تمہاری مدد کرنا بھی چاہے گا تو کیسے کرے گا؟" وہ بولی۔ "جب تک تم روپوش رہو گے، عدالتی معاملات میں پیش رفت نہیں ہو گی اور منظر سے بے بس ہوں گے۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہ ہو گا کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو اور کیا کر رہے ہو؟ کہاں ہو اور کس حال میں ہو۔ یہ کم عذاب ہو گا ہم سب کے لیے؟"

"میں تم سے رابطہ رکھوں گا، تم سے اور محسن سے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گا...."

محسن کے اندر آنے سے میری بات ادھوری رہ گئی۔ "انکل نے غلط کہا تھا وہ بریف کیس لے آیا تھا۔ انہوں نے بریف کیس کھول کے نہیں دیکھا۔ اس کا تالا سلامت ہے۔" اس نے مسرت سے اطلاع دی۔

"پھر کیا مقصد تھا ان کی غلط بیانی کا؟" رابعہ نے سر اٹھا کے کہا۔

"میرا خیال ہے وہ تم سے اعتراف کروانا چاہتے تھے کہ بریف کیس سکندر کا ہے۔" محسن بولا۔ "اور ان کا خیال ہو گا کہ اس طرح کچھ اور باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ مثلاً یہ کہ سکندر کہاں ملا تھا اور اب کہاں ہے؟ اس نے بریف کیس کیوں دیا تھا۔ یہ ٹریک بھی آتی کی۔"

رابعہ کا مایوس چہرہ امید کی روشنی سے دمکنے لگا۔ "اچھا ہوا جو میں اپنی بات پر قائم رہی کہ بریف کیس میرا ہے۔"

محسن نے بریف کیس کو بیڈ پر رکھا اور اس کے نمبر ملانے لگا۔ بریف کیس اسی کا تھا چنانچہ مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کے کھلتے ہی وہ چونکا۔ "سکندر! یہ کیا ہے؟" اس نے سب انسپکٹر کی وردی نکال کے کہا۔ پھر وردی میں سے پولیس کا سروس ریوالور نیچے گرا۔

"اس میں تین ہزار روپے بھی ہوں گے۔" میں نے اطمینان سے کہا اور سامان نئے بریف کیس میں منتقل کرنے لگا۔

"لیکن یہ سب تیرے پاس کیسے آیا؟" محسن نے اپنی پریشانی کو چھپانے کی کوشش کی۔

"تو سمجھ رہا ہے کہ میں نے اس سب انسپکٹر کو قتل کر دیا ہو گا؟" میں نے کہا۔ "اور اس سے سب کچھ چھینا ہو گا۔ یہ وردی، ریوالور اور رقم؟" میں نے کن انکھیوں سے رابعہ کو دیکھا۔ رابعہ کا چہرہ پھر بجھ گیا تھا۔

"نہیں... یہ تو نہیں، لیکن اصل بات کیا ہے؟" محسن نے تذبذب کے ساتھ کہا۔

میں نے کم سے کم الفاظ میں وہ سب کچھ بتا دیا جو اغوا ہونے کے بعد میرے ساتھ ہوا تھا۔ ایک ویران اور غیر آباد گھر میں اپنی اسیری۔ دلاور سے میری ملاقات اور اس کے منصوبے کی تفصیل۔ جیسن کی موت اور رہائی کے بعد دوبئی اور پیٹر کے قتل میں ملوث ہونے سے گرفتاری کے بعد تھانے سے فرار ہونے کے واقعات تک۔ یہ باتیں میں نے شہلا کو نہیں بتائی تھیں لیکن رابعہ میری وکیل بھی تھی۔ اسے حقائق کا علم ہونا ضروری تھا۔ محسن ایسا دوست تھا کہ میرے اعتماد کو دھوکا دینے کے بجائے میری جگہ خوشی خوشی سزائے موت بھی قبول کر سکتا تھا۔ اتنا ہی اعتماد انہیں مجھ پر تھا اور میرے ذہن میں یہ خیال تک نہیں آیا کہ میری کوئی بات ان کے لیے قابل اعتبار نہیں ہو گی۔

"اسلام آباد میں تیری بزرگی نے کمال کیا۔" میں نے کہا۔ "اس نے میری تلاش میں آنے والوں کو بری طرح جھاڑا۔"

www.paksociety.com

"یہ کام تو تیری زوجہ بھی کرے گی یہاں۔" محسن نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ رابعہ کا رنگ لال پڑ گیا۔

میری بات ختم ہونے تک محسن نے پچھلے بریف کیس کا مونوگرام نئے بریف کیس پر چپکا دیا تھا۔ نیا بریف کیس بھی اب بالکل نیا نہیں رہا تھا کیونکہ محسن اسے زمین پر رکھ کے جوتوں سمیت اس پر چڑھ چکا تھا۔ میری موجودگی میں ہی رابعہ نے اس میں اپنی کچھ فائلیں رکھ دیں۔ اپنا ایک رومال ڈالا اور محسن نے اس کو کھولنے کا نمبر پوچھا جو ہم دونوں ایک ہی رکھتے تھے۔ سات سو چھیاسی۔ پھر محسن بریف کیس کو رکھنے گیا۔ رابعہ نے فوراً اپنی الماری کھولی اور اس کے سیف میں سے نقد رقم نکالی۔

"یہ پانچ ہزار روپے ہیں۔" اس نے رقم میرے سامنے رکھ کے کہا۔

"ابھی مجھے پچیس ہزار کافی ہیں۔" میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "ضرورت پڑے گی تو لے لوں گا۔"

"تمہیں کیا معلوم کہ ضرورت کہاں پڑے گی اور اس وقت تم کسی سے مانگ سکو گے یا نہیں۔" وہ ایک چیک لکھتے ہوئے بولی۔ "یہ چیک بھی رکھ لو۔ میں نے اپنے اکاؤنٹ میں صرف دس روپے چھوڑے ہیں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" میں نے کہا۔ "تم خود کیا کرو گی؟ اور میں کیا کروں گا اتنا پیسہ لے کر۔"

"اس سے اپنا خفیہ اکاؤنٹ کھول لینا۔" وہ بولی۔ "جہاں سے تم ضرورت پڑنے پر آسانی سے رقم نکال سکو۔ یہ رقم میرے اکاؤنٹ میں پڑی رہے یا تمہارے اکاؤنٹ میں، بات تو ایک ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں یہاں اکیلی نہیں ہوں۔ میری آمدنی بھی ہے اور انکل رضوی کے علاوہ محسن میری ضرورت پوری کرنے کے لیے موجود ہے۔ تم اکیلے ہو گے اس لیے تمہارے ساتھ پیسہ ہونا چاہیے۔ پیسہ بڑی طاقت ہے۔ بگڑے کام بنا سکتا ہے اور مشکل میں کام آسکتا ہے۔"

اس کی دلیل میں بہت وزن تھا مگر اس سے زیادہ قیمت اس کے خلوص کی تھی۔ چیک تو کاغذ کا ایک پرزہ تھا۔ اس پر لکھے ہوئے اعداد و شمار بھی محبت کی اس مہر کے بغیر بے وقعت تھے جو رابعہ نے اپنے دستخطوں کی صورت میں چیک پر ثبت کر دی تھی۔ بات تو ایک ہی ہے۔ اس نے اتنی اپنائیت اور یقین کے ساتھ کہا تھا کہ میں چیک لینے پر مجبور ہو گیا لیکن میں رابعہ کی محبت کا جواب اپنی محبت کے والہانہ جذبات سے نہ دے سکا۔ اس سے پہلے ہی محسن لوٹ آیا۔

"اب تو جا۔" اس نے اندر آتے ہی کہا۔ "اس وقت بال بال بچا ہوں میں۔ چابیاں تکیے کے نیچے رکھ کر نکل رہا تھا کہ انکل آ گئے۔ دروازے میں ٹکر ہوئی۔ کہنے لگے کہاں غائب ہو گئے تھے؟ ذرا اس بدمعاش سے پوچھو اس کے ہمدرد بن کر۔ پولیس کو شاید وہ کچھ نہ بتائے۔ میں نے فوراً کہا کہ اسی کی اجازت لینے میں آپ سے لینے آیا تھا۔"

"دیکھو محسن" میں نے بریف کیس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے رابعہ کو مخاطب کیا۔ "کیا تو اس موقعے سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو رضوی صاحب نے فراہم کر دیا ہے ورنہ تھوڑا سا ڈرامہ کرنا پڑے گا۔"

"کیسا ڈرامہ؟" محسن نے کہا۔ "پہیلیاں بوجھنے کا وقت نہیں ہے صاف بات کرو۔"

"تو ایسے موقعے دے کہ وہ تجھے ناک آؤٹ کر کے فرار ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "اس سے وعدہ کر کہ وہ باقی پانچ کے نام پتے بتا دے تو اس کی رہائی ہو سکتی ہے۔ اپنی نیک نیتی کا ثبوت دینے کے لیے اس کے ہاتھ پیر کھول دینا۔ باقی کام وہ خود کرے گا۔ اس سے اسلحہ تو لے لیا ہو گا۔ وہ ایک ہاتھ مارے گا تو فوراً لیٹ جانا۔ آدھے پونے گھنٹے میں رضوی انکل کو خود معلوم ہو جائے گا کہ جسے انہوں نے افسر تفتیش مقرر کیا تھا وہ اس کام کے لیے کتنا موزوں تھا۔"

رابعہ اور محسن نے پہلے ایک دوسرے کو اور پھر مجھے یوں دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔ "مطلب یہ کہ مار کھاؤں، مجرم کو فرار ہونے دوں اور اس کے بعد انکل کو جواب دہی کروں۔" محسن بولا۔

"جواب دہی کیسی؟ خود انہوں نے ہمدرد بننے کے لیے کہا تھا۔ تم نے ہمدردی میں اس کے ہاتھ کھول دیے تھے اور اسے سگریٹ پیش کی تھی۔ اس نے ناجائز فائدہ اٹھا لیا۔" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ تیرا سر اس بدمعاش کی ضرب سے خاصا مجروح ہوا ہے، اندرونی چوٹ ہے۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے کی فکر میں پڑ جائیں گے۔"

"اور اس مجرم کو فرار ہونے کا موقع فراہم کر کے تجھے کیا ملے گا؟" محسن نے کہا۔

"جب وہ فرار ہو گا تو سامنے والے حصے کا رخ نہیں کرے گا۔ ادھر مین گیٹ ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ ساتھ والی دیوار پھاندے گا۔ اُدھر میں اس کو پک کر لوں گا اور پھر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اگر پولیس اسے لے گئی تو چھڑانے والے اسے ضمانت پر چھڑا کے لے جائیں گے۔ اس نے چوری کی ناکام کوشش کی ہے، چوری ہوئی نہیں۔ تیرے اور رابعہ کے بیان سے یہ ثابت نہیں ہو گا کہ وہ مجھے اغوا کرنے والے گروہ کا رکن ہے۔ لالہ رائنڈ کی طرف سے پیش ہونے والا کوئی بہت بڑا وکیل اس الزام کو بے بنیاد ثابت کر دے گا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہمیشہ کی طرح اس کی زبان سے کوئی لفظ نکلنے سے پہلے ہی وہ اسے خاموش کر دیں۔"

"اور تو اس کا کیا کرے گا؟" محسن نے کہا۔ "کہاں لے جائے گا اسے؟"

"تفتیش کے لیے۔" میں نے کہا۔ "طریقہ میرا اپنا ہو گا جو میں نے پہلے کبھی اختیار نہیں کیا لیکن اب وقت بدل گیا ہے۔"

محسن کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کا ذہن تمام مثبت اور منفی پہلوؤں

کا جائزہ لے رہا تھا، کامیابی اور ناکامی کے امکانات پر غور کر رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اتنا بڑا خطرہ مول لینا عقلمندی ہے یا بیوقوفی۔ پھر اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔ رابعہ مجھے اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک میں دیوار پر سے دوسری جانب نہیں اتر گیا۔

رات کے تین بج چکے تھے۔ میں نے بریف کیس کو پھر پہلے والی پوزیشن میں دیوار سے لگایا اور اس کے اوپر چڑھ گیا۔ رابعہ اب بھی بیڈروم کے روشن دریچے میں تصویر بنی کھڑی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق محسن کو میرے پلان پر عمل درآمد میں دس پندرہ منٹ بہرحال درکار تھے۔ تشویش مجھے تھی تو صرف محسن کی طرف سے۔ محسن اسے آزاد کرتے وقت محتاط تو رہے گا لیکن اس کے باوجود رہائی پانے کے بعد اس بدمعاش نے بے رحمی کا مظاہرہ کیا اور بے ہوش کرنے کی بجائے محسن کو ختم کرنا چاہا؟ نہیں۔ میں نے خود کو تسلی دی۔ محسن اتنی آسانی سے نہیں مارا جائے گا۔ وہ مقابل کی نیت بھانپتے دیکھے گا تو زیادہ دفاع کرے گا۔ اسے پچھڑوا دے گا۔ محسن کی مدد کے بغیر وہ گھر سے نہیں نکل سکتا۔ اسے شک تو ہو گا کہ دشمن اچانک مہربان کیسے ہو گیا۔ ممکن ہے وہ پانچ غلط نام اور پتے بتا دے اور محسن کو اس کی خواہش کے مطابق "ناک آؤٹ" کر کے نکل آئے۔

میری پریشانی کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اس وقت میں اپنے قیدی کو کہاں لے کر جاؤں گا اور کیسے لے کر جاؤں گا۔ اتنی رات گئے کسی سواری کا ملنا محال تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ مجھے رات کے پہریدار دیکھ لیں اور شک میں پڑ جائیں کیونکہ مجھے اس کو کندھے پر ڈال کے ہی لے جانا تھا۔ میں صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا مجرم کے فرار کا راز افشا ہونے سے پہلے کرنا تھا۔ ممکن ہے پندرہ بیس منٹ بعد ہی رضوی صاحب تفتیش کے نتائج معلوم کرنا چاہیں اور محسن کو "بے ہوش" پڑا دیکھ لیں۔ اس کے بعد جو افراتفری پھیلے گی اس میں مفرور ملزم کی تلاش بھی ہو گی۔ اسے گھر کے اندر باہر، باغ میں اور آس پاس کے گھروں میں دیکھا جائے گا۔ میرے لیے ضروری ہو گا کہ اس سے پہلے ہی نکل جاؤں۔

مجھ پر انتظار کا ایک ایک لمحہ اس وقت بھاری محسوس ہونے لگا تھا کہ عقبی حصے کی جانب میں نے ایک سایہ سا متحرک دیکھا۔ دبے پاؤں تیز تیز قدم اٹھاتا دیوار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے پکڑنے کے لیے مجھے فوراً اپنی پوزیشن تبدیل کرنی پڑی۔ جب وہ دیوار پر چڑھا تو میں نیچے بیٹھا تھا۔ اس نے چھلانگ نہیں ماری بلکہ اٹھ جھکے ہاتھوں کے سہارے نیچے لٹکا۔ اسی وقت میں نے اسے دبوچ لیا۔ اس کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی۔ اسے حیران ہونے اور یہ

سمجھنے کا موقع بھی نہ ملا کہ اس کی رہائی درحقیقت دوسری قید تھی۔ میں نے اس کے نرخرے پر وار کیا اور وہ ڈھیلا پڑ کے مجھ پر جھول گیا۔ میں نے بریف کیس اٹھایا۔ اسے کندھے پر یوں ڈالا کہ اس کی دونوں ٹانگیں میری پشت کی جانب لٹکتی رہیں۔ باقی دھڑ اور دونوں ہاتھ آگے رہے۔ کسی توقف کے بغیر میں کوٹھی کے گیٹ سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ اس شخص کا وزن کافی تھا لیکن اسے خود اٹھا کے لے جانے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔

محسن کس حد تک کامیاب رہا تھا، اس کا فیصلہ قیاس کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن مجھے جلد از جلد اس جگہ سے دور چلے جانا ضروری تھا۔ سڑک بالکل اندھیری تھی۔ آخری دنوں کا چاند بھی غائب ہو چکا تھا۔ سو قدم کا فاصلہ طے کرتے کرتے میرا سانس پھول گیا۔ پھر دائیں جانب دیوار کا ادھ بنا ڈھانچہ آ گیا جو میرے اغوا کرنے والوں نے کار ٹکرا کے بنایا تھا۔ میں نے بے ہوش کو اس دیوار کے پیچھے ڈال دیا۔ اس کے بعد مجھے سنبھل سنبھل کر ملبے کے ڈھیر کو عبور کرنا پڑا۔ میرا پیر ذرا بھی لڑکھڑا جاتا تو پاؤں میں موچ آ جاتی۔ پھر میں سوچنے لگا کہ اس قیدی کو کس محفوظ مقام پر منتقل کروں اور اسے کیسے لے جاؤں۔ صبح کا اجالا پھیلنے تک میں اس جگہ انتظار کرتا تو خود بھی پکڑا جاتا۔ ایک ذریعہ یہ بھی تھا کہ میں کہیں سے ٹیکسی پکڑ لاؤں۔ ٹیکسی والا اس بے ہوش سواری کو دیکھ کر پریشان ہو گا یا شک میں مبتلا ہو جائے گا۔ ممکن ہے وہ انکار کر دے اور میں زبردستی کروں تو جھگڑا کر دے۔

رات کا باقی حصہ منظر کے گھر گزارا جا سکتا تھا۔ وہ صبح ہونے سے دو گھنٹے قبل آ سکے گا تو حسب عادت شور مچائے گا کہ خود تو شتر بے مہار کی طرح لاوارث پھر رہا ہے، شادی شدہ لوگوں کی ازدواجی زندگی کیوں خراب کرتا ہے لیکن اسے تمام حالات بتانے ضروری تھے۔ صبح اس کے کورٹ جانے تک کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ میں منظر کے ساتھ ناشتا بھی کر سکوں گا اور اس کے بعد دیکھی جائے گی کہ اپنا ہیڈ کوارٹر عارضی طور پر کہاں قائم کیا جائے۔ ٹرانسپورٹ کا انتظام پہلے کرنا تھا چنانچہ میں نے بریف کیس میں سے ریوالور نکالا اور پتلون کی جیب میں رکھ کے بے سدھ پڑے ہوئے شخص کا معائنہ کیا۔ میرے اندازے کے مطابق ابھی اس کا آدھے گھنٹے تک ہوش میں آنا مشکل تھا لیکن میں نے احتیاط برتی۔ اس کی قمیص پھاڑ کے میں نے ایک حصے کو دونوں پیر باندھنے کے لیے استعمال کیا اور دوسرے کو ہاتھ کمر کے پیچھے باندھنے کے لیے۔ بنیان اس کے منہ میں ٹھونسنے کے کام آیا۔

قیدی کی طرف سے مطمئن ہو کے میں نے شہر کی سمت چلنا شروع کیا۔ نہر کے کنارے کے ساتھ چلنے والی سڑک بالکل

www.paksociety.com

سنسان تھی اور گرد و پیش بالکل خاموشی سے سحر میں بہتا جا رہا تھا۔ سب سے پہلے آمدِ صبح کا اعلان کرنے والے مرغ بھی ابھی خاموش تھے۔ سائیکلوں اور ریڑھیوں پر دودھ لانے والے اور اخبار لے جانے والے بھی نمودار نہیں ہوئے تھے تو اس سڑک پر ٹیکسی کہاں سے آتی۔ میں دھرمپورے کے پُل کی جانب چلا گیا۔ ابھی میں پُل تک پہنچا نہیں تھا کہ پیچھے سے پڑنے والی ہیڈ لائٹس نے کسی گاڑی کی آمد کی اطلاع دی۔ میں رُک گیا۔ اندھیرے میں ہیڈ لائٹس کی خیرہ کن روشنی میرے چہرے پر پڑی۔ میں نے بڑی بے قراری سے ہاتھ ہلا کے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ ٹیکسی نہیں تھی۔ کوئی پرائیویٹ کار تھی۔ میرے شریفانہ حلیے نے یا میری اضطراری کیفیت نے ڈرائیور کو بریک لگانے پر مجبور کر دیا اور کار مجھ سے بیس گز آگے جا رکی۔ میں دوڑ کر ڈرائیور کے پاس پہنچا۔ وہ تقریباً تیس سال کا خاصا صحت مند جوان تھا۔ اسے خود پر اعتماد نہ ہوتا تو اس سنسان سڑک پر کسی اجنبی کے لیے کبھی نہ رُکتا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے رعونت آمیز سخت لہجے میں پوچھا۔

"دیکھیے پلیز۔ میری والدہ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" میں نے انگریزی میں کہا۔ "اور بدقسمتی سے میری گاڑی کا بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ دوسری سواری کوئی نہیں مل رہی ہے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن میری ماں کو فوراً ہسپتال نہ پہنچایا گیا تو وہ مر جائے گی۔"

بریک ڈاؤن کسی بھی کار کا ہو سکتا ہے۔ یہ بات سب کار والے جانتے ہیں اور کبھی نہ کبھی ان پر بھی ایسا وقت ضرور آتا ہے جب ان کو مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ خواہ مدد صرف اتنی ہو کہ گاڑی کو دھکا لگا کے اسٹارٹ کر دیا جائے چنانچہ کار والوں کے درمیان اشتراکِ باہمی کے جذبات پیدل یا بسوں میں سفر کرنے والے "بے کار" لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ملتے ہیں۔ ایک ذہنی، سماجی اور معاشرتی فرق کے باعث کار والے اور بے کار صرف اپنے جیسوں کی مدد کرتے ہیں۔

"آل رائٹ۔" وہ بولا۔ "میں ڈیوٹی سے آ رہا ہوں اور بہت تھکا ہوا ہوں لیکن میں تمہاری مدد کروں گا۔" اس نے دروازہ کھول کے مجھے بیٹھنے کی دعوت دی۔ گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈالا اور کھڑکی سے سر نکال کر پیچھے دیکھا کہ ٹائر فٹ پاتھ کے کنارے سے ٹکرائیں اور پیچھے کوئی پتھر یا کھمبا نہیں ہے۔ جب اس نے دوبارہ میری طرف رُخ کیا تو ریوالور کا رُخ اپنی طرف دیکھ کے ہونقوں سا رہ گیا۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے مشتعل ہو کے کہا۔

"یہ ریوالور ہے۔" میں نے اُسے انگریزی میں سمجھایا۔ "اس میں چھ گولیاں ہوتی ہیں۔ آدمی عموماً ایک ہی سے مر جاتا ہے اور اتنے کم فاصلے سے تو نشانہ خطا ہونے کا چانس ہی نہیں۔ سمجھے یہ کار چاہیے۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ بولا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ ڈاکو ایسے سوٹ پہن کر گھومنے لگے ہیں اور اتنے شریفانہ لہجے میں بات کرتے ہیں۔ بہت اچھے ایکٹر ہو تم۔"

"ٹھیک ہے لیکن دل اس پیشے سے آمدنی زیادہ ہے۔ کبھی فلم سازوں سے بات کروں گا۔" میں نے کہا۔ "ویسے اس وقت بھی فلم انڈسٹری کیا برے پیسے کما رہی ہے۔ اب آپ خود اترنا پسند کریں گے یا میں آپ کو باہر پھینک دوں۔ میرے پاس وقت کم ہے۔"

"ہاں۔" نیچے اُتر کے اس نے دھڑ سے دروازہ بند کیا۔ "تمہاری ماں مرنے والی ہوگی نا۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

"وہ اس وقت مر گئی تھی جب میں نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔" میں نے اس کی جگہ لیتے ہوئے کہا۔ "اب میں آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دے رہا ہوں، بالکل مفت۔ گاڑی آپ کو شام تک میانی صاحب کے قبرستان کے دروازے پر کھڑی ہوئی مل جائے گی۔ چابیاں گلو کمپارٹمنٹ میں ہوں گی۔ اس میں سے ایک چیز بھی غائب نہیں ہوگی۔ اس لیے آپ شام تک گزارا کر لیں اور پولیس کے پاس رپورٹ لکھوانے نہ جائیں۔ بہت وقت ضائع کریں گے وہ آپ کا۔ گاڑی مل جائے گی تب بھی اسے کسی نام سے ریلیز آرڈر لیے بغیر آپ کے حوالے نہیں کریں گے۔ دوڑ دھوپ اور پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا اور اگر آپ نے کنجوسی سے کام لیا تو ممکن ہے وہ ٹائر بدل دیں۔ ٹیپ نکال لیں یا کاغذات غائب کر دیں۔ جذبات سے نہیں عقل سے کام لیں۔ آپ تو مجھے شریف قطعی تسلیم نہیں کریں گے لیکن میری طرف سے یہ شریفانہ وعدہ ہے۔ گڈ ڈے آف کورس۔ ٹھیک ہے یوسر اور خدا حافظ۔ اور ہاں۔ کار کسی واردات میں بھی استعمال نہیں ہوگی۔ ڈرنے کی بات نہیں۔" وہ دم بخود کھڑا اُلّوؤں کی طرح میری شکل دیکھتا رہا۔ اس نے کار کے چھینے جانے کی خبریں تو بہت سنی اور پڑھی ہوں گی لیکن اس قسم کی گفتگو کبھی نہیں سنی ہوگی۔ "کوئی فون نمبر ہے آپ کا تو بتا دیں۔ ممکن ہے میں خطرہ محسوس کروں تو کار کہیں اور جگہ چھوڑ دوں اور آپ کو اطلاع دے دوں۔"

اس نے جیب سے ایک کارڈ نکالا اور مجھے تھما دیا۔ "معلوم نہیں تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔ شکریہ لو۔" اس کے پُرسکون لہجے نے مجھے مطمئن کر دیا کہ ذہنی طور پر وہ میرا مشورہ قبول کر چکا ہے۔

میں نے یوٹرن میں گاڑی کو موڑا اور اسپیڈ ایک دم بڑھا دی۔ پھر بانسوں والی سڑک پر مڑ گیا۔ وہ ٹیل لائٹ دیکھتا رہتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ وہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی جہاں میرا قیدی پڑا تھا اور کار کا مالک ایتھلیٹ ہوتا تو دوڑ لگا کے چند منٹ میں میری روانگی سے قبل ہی وہاں پہنچ سکتا تھا۔ کار روکنے کے بعد بھی میں نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا اور گاڑی سے اُتر کے دو منٹ میں قیدی کو اٹھا لیا۔ اسے پیچھے والی نشست کے نیچے ڈال کے میں نے ڈکی بند کیا اور گاڑی کو سیدھا لے گیا۔ وہ نئی ٹویوٹا کرولا تھی۔ اسی سال کا ماڈل۔ مضبوط اور طاقتور انجن والی لیکن بالکل خاموش۔

منظر کے گھر پہنچتے پہنچتے مجھے ساڑھے چار بج گئے تھے۔ میں نے گاڑی کو پچاس قدم دور پلاٹ کے وسط میں کھڑا کیا جس کے تین طرف دو منزلہ گھروں کی دیواریں احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ ڈکی کھول کر دیکھنے پر مجھے تقریباً دس گز لمبی رسی نظر آئی۔ شاید کار والے ایسی کوئی چیز ضرور رکھتے ہیں جس سے بریک ڈاؤن کی صورت میں گاڑی کو دوسری گاڑی کے پیچھے باندھ کر کھینچ کے لے جایا جا سکے۔ اس وقت یہ رسی مختلف کام کے لیے استعمال ہوئی۔ میں نے اپنے قیدی کو اس طرح باندھا کہ وہ کسی وقت ہوش میں آ جائے تب بھی ہلا نہ سکے یا ہاتھ مار کے کسی کو متوجہ نہ کر سکے۔ ڈکی لاک کر کے میں نے بریف کیس میں سے پولیس کی وردی نکالی اور گاڑی میں ڈال دی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ خالی بریف کیس رکھنے کا بھی کیا فائدہ۔ میں نے اسے بھی گاڑی میں چھوڑا اور گاڑی کو مقفل کر دیا۔

ابھی میں پلٹا ہی تھا کہ فاسٹ ویگن کی مخصوص آواز کے ساتھ ہی چمکتے ہوئے لال رنگ والی گاڑی زور سے گزر گئی۔ فرق چند ثانیوں کا تھا۔ اگر میں پکڑا گیا ہوتا تو انکل رضوی کی نظر مجھ پر ضرور پڑ جاتی لیکن وہ سامنے دیکھ رہے تھے۔ غالباً منظر کے گھر کو۔ گاڑی رابعہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ ان کی صرف ایک جھلک دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دونوں اعصابی کشیدگی کا شکار ہوں۔ رات کے اندھیرے میں ابھی صبح کاذب کا اجالا بھی شامل نہیں ہوا تھا اور یہ بھی میرے نظر نہ آنے کی ایک وجہ تھی۔ میں نے ان کو اس وقت دیکھا جب گاڑی ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے سے گزر رہی تھی۔

بے اختیار میرے قدم زمین میں گڑ گئے۔ میں نے پلٹ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور واپس ہوا۔ کسی انجانے خوف کے باعث مجھے خیریت اسی میں نظر آئی کہ اس جگہ سے فوراً نکل جاؤں۔ اس وقت انکل رضوی کا رابعہ کے ساتھ منظر کے گھر آنا بڑی تشویش کی بات تھی۔ کیا انہیں شک ہو گیا تھا کہ بریف کیس بدل دیا گیا ہے؟ محسن اور رابعہ نے حقائق کو چھپاتے ہوئے میری مدد کی ہے؟ لیکن یہ خیال میرے مجرم ذہن کی پیداوار تھا۔ رضوی صاحب یہ کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ پھر ان کا رابعہ کو یہاں لے کر آنا کیا معنی رکھتا ہے؟ سڑک پر گاڑی دوڑاتے ہوئے میرے خیالات کے گھوڑے ہر سمت میں دوڑتے رہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انہیں براہِ راست مجھ پر شک ہو کہ میں مجرم کو نکال کر لے گیا۔ محسن نے مجھے صرف شک سے محفوظ رکھنے کے لیے ظاہر کیا کہ خود مجرم اسے ناک آؤٹ کر کے بھاگ گیا۔ محسن کی یا گاڑی کی انہیں تلاشی تو کر سکتی تھی یا انہوں نے دیکھ لیا ہو کہ محسن کے سر پر کسی چوٹ کا نشان تک نہیں ہے۔ پرانے تجربہ کار اور ذہین پولیس افسر ہیں۔ ان کی نظروں کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ اور پولیس تو ہر قسم کے مفروضات قائم کر لیتی ہے اور سب کو قابلِ قبول سمجھتی ہے۔ رضوی صاحب نے سوچا ہوگا کہ میرے شکنجوں میں سر فہرست منظر کا گھر ہے۔ وہ میرا دوست بھی ہے۔ وکیل بھی اور کوئی ایس پی یا آئی جی بھی سرچ وارنٹ لیے بغیر اس کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد میں نے غور کیا تو گاڑی ماڈل ٹاؤن سے گزر رہی تھی۔ جسے کا دھندلکا افق کو روشن کر رہا تھا۔ سڑکوں پر اب بھی ویرانی کا بسیرا تھا اور گھنے درختوں میں چھپی ہوئی کوٹھیاں بے صدا تھیں۔ اذان فجر کی آوازیں بہت دور سے آتی۔ پھر چڑیوں کی چہچہاہٹ میں ہر آشیاں سے پرندوں کی چہکار کا غلغلہ شور مچانے لگا۔ میں نے بریک لگا کے گاڑی روک دی۔ وہ گھر جو کبھی میرا تھا آج بھی وہیں تھا۔ چشمِ تصور سے میں نے اندر کا ہر حصہ دیکھا۔ ڈرائنگ روم، راہداری، کو جانے والے راستوں کا۔ ان کی کھڑکیوں اور دروازوں کا تصور کیا۔ سقف و بام سے دیوار و در تک سب کچھ وہی تھا۔ لیکن اس میں رہنے والے وہ نہیں تھے۔ وہ مجھے کیا، میرے نام تک بھی نہ جانتے ہوں گے۔ ایک بار پھر مجھے وزیر خان کا خیال آیا۔ جب اس نے یہ بات مجبوری کی اس برسوں میں شب و روز کی محنت سے تعمیر ہونے والے گھر کی ملکیت سے محرومی قبول کی ہوگی تو اس کے دلی جذبات کی نوعیت کیا ہوگی۔

شہر جانے میں اور غریبوں آ گیا تھا، راستے تو بہت تھے، سارے شہر میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لاشعور تھا جس نے شعور کو الجھنوں میں گرفتار دیکھا تو مجھے اس سمت لے آیا۔ ایک نہ ایک دن مجھے یہ گھر پھر آباد کرنا ہے خواہ اس کے لیے مجھے موجودہ مالکوں کو دس گنا قیمت دینی پڑے۔ میں نے گاڑی کو دوبارہ اسٹارٹ کرتے ہوئے عزمِ نو کے ساتھ فیصلہ کیا۔ مجھے اپنا حق حاصل کرنا ہے۔ انصاف کا حق۔ انتقام کا حق۔ وراثت کا حق۔ وزیر خان کے خوابوں کو تعبیر دینے کا حق۔ اپنے وابستہ مستقبل کو حقیقت میں ڈھالنے کا حق۔ وقت کے تجربات نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ حق مانگنے سے نہیں ملے گا۔ مانگنے سے تو کوئی مجھے خیرات بھی نہیں دے گا۔ مجھے اپنا حق چھیننا پڑے گا۔ ان سے جو غاصب ہیں۔ آدمی اب حیوان کی سطح پر آ گیا ہے کہ جینے کا حق بھی اسے حاصل ہے جو طاقتور ہے اور یہ بقا و فنا کی جنگ رہ گئی ہے جس میں کمزور کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ سچا اصولوں اور قانون کا تحفظ مانگے اسے خود اپنی حفاظت کے لیے نااہل سمجھ لیا جاتا ہے۔ اگر یوں ہے تو پھر اس کی میں بتا دوں گا کہ مجھے اپنے لیے بھی زندہ رہنا آتا ہے۔ ورنہ یہ کس کی

www.paksociety.com

نے وزیر خان اور مجھ سے وہ سب کچھ چھینا جو اُن کا نہیں تھا۔ اس کے بعد مجھے ایک ایک سے سب واپس لینا ہے۔ جب غاصب کوئی نہیں رہے گا تو حق خود بخود حقدار کو پہنچ جائے گا۔

اگلا موڑ کاٹنے سے پہلے میری نظر ایک اور جانی پہچانی منزل، آسیب زدہ نظر آنے والی اور وسیع و عریض کوٹھی پر گئی۔ یہ نواب خسرو جمشید کا مسکن تھی، یہیں تھی اور اب اس کے ایک گوشے میں ان کا مدفن بھی تھا۔ ان کی قبر لوہے کی گرل والی چار دیواری کے آخری موڑ پر تھی۔ سنگِ مرمر کے چار ستونوں والی چھت کے نیچے۔ اس کی خاندانی کا ماتم پہلے کے مقابلے میں زیادہ عبرت آموز ہو گیا تھا۔ گھاس کچھ اور بڑھ گئی تھی اور سامنے بند کھڑکیوں اور دروازوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کی تعداد بھی زیادہ ہو گئی تھی جن سے کمروں کی تاریکی باہر جھانکتی تھی۔ گیٹ پوسٹ پر لگی ہوئی قصرِ جمشید کی پیتل کی تختی اپنی آب و تاب کھو چکی تھی۔ گزشتہ مرتبہ میں محسن کے ساتھ یہاں آیا تھا تو میری ملاقات ایک ضعیف العمر مالی سے ہوئی تھی لیکن اس وقت میری نگاہ نے ایک تبدیلی کو نوٹ کیا۔ لوہے کا بھاری بھرکم گیٹ جس کے دونوں پٹ زنجیروں سے مقفل تھے اور برسوں بند رہنے کے باعث جام ہو گئے تھے اس وقت آدھا کھلا ہوا تھا۔ اس کو سنبھالنے والا ایک ستون گر گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک پٹ بھی زمین بوس ہو گیا تھا۔ زنگ خوردہ زنجیر یا قفل کے ٹوٹنے سے دوسرا پٹ نہیں گرا تھا۔ نیچے گرنے والے فرش کی گرل میں مٹی بھر گئی تھی اور اس میں بھی گھاس اُگ آئی تھی۔ ٹوٹنے والے ستون کا ملبہ دوسری طرف پڑا تھا جو تھوڑی سی احتیاط کے ساتھ میں نصف کھلے گیٹ سے گاڑی گزار کے اندر لے جا سکتا تھا۔ مجھے یہ جگہ اپنی ضرورت کے عین مطابق نظر آئی۔ اس کی وسعت اور ویرانی میں میرا وجود ساری دُنیا سے پوشیدہ رہ سکتا تھا۔

میں نے کار کو بیک کیا اور موڑ کر دونوں طرف سے بچاتے ہوئے اندر لے گیا۔ ایک طرف لوہے کا گیٹ تھا تو دوسری طرف گیٹ پوسٹ کے ملبے پر پڑا ہوا ستون کا نصف حصہ۔ اگر کسی طرف سے گاڑی ذرا بھی لگ جاتی تو اس کی ہموار چمکیلی سطح پہ ڈینٹ پڑ جاتا یا پینٹ اُکھڑ جاتا۔ میں نے دیکھا تو دونوں طرف مشکل سے ایک ایک انچ جگہ تھی۔ اگر آگے وہ لوہے کا گیٹ نہیں پڑا ہوتا تو میں سیدھا گزر ہی جاتا لیکن گیٹ کے چوکور سریے ایک ایک انچ موٹے تھے اور ان پر سے گاڑی کے اگلے پہیے گزرے تو مجھے یوں لگا جیسے میں ریلوے لائن کے درمیان سلیپروں پر ڈرائیو کر رہا ہوں۔ گاڑی نے جھٹکے لیے اور اسٹیئرنگ وھیل بار بار اِدھر اُدھر ہوا تو پچھلا حصہ لوہے کے گیٹ سے چھو گیا۔ میں نے آگے جا کے گاڑی روکی اور نیچے اُتر کے دیکھا تو ٹیل لائٹ کے ساتھ والا حصہ پچک گیا تھا اور ٹیل لائٹ کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ مجھے افسوس ہوا لیکن میں مالک کے لیے پانچ سو روپے چھوڑ دوں گا تاکہ جو کوفت اور تقاضا اسے ایک دن کار کے بغیر گزارنے سے ہوگی اس کا بھی ازالہ ہو جائے اور وہ اپنی نئی نویلی دلہن جیسی کار کو پھر پہلے جیسا بنوا لے۔

گزشتہ بار مالی ہماری باتوں کی آواز پر چلا آیا تھا کہ گیٹ تک بند ہوئی تھی۔ اس وقت وہ گاڑی کی آواز پر بھی نمودار نہ ہوا۔ میں نے ہارن دیا اور انتظار کیا۔ پھر گاڑی کو قصرِ جمشید کے عقبی حصے میں لے گیا۔ جہاں روش اور راستے پر گھاس اور خود رو پودے قابض تھے۔ مگر وہ اینٹوں سے بنی ما بٹے جیسی چھ انچ اونچی لکیر اب بھی کہیں راستوں کی نشاندہی کر رہی تھی۔ میں گھوم کر پیچھے پہنچا تو مجھے قد سے مختصر بارہ اور مختصر عمارت کا ملبہ نظر آیا۔ اس کے دو ہی کمرے سلامت رہ گئے تھے۔ یہ دونوں گیراج تھے۔ ایک میں انیس سو چالیس کے ماڈل کی ایک زنگ خوردہ مٹی سے اٹا ہوا ڈھانچہ کھڑا تھا جس کے ٹائر فلیٹ تھے لیکن شیشے بند تھے اور دروازے مقفل تھے۔ شاید بیس تیس سال سے یہ کار اسی حالت میں اسی جگہ کھڑی ہوئی تھی۔ باقی عمارت سرونٹ کوارٹر معلوم ہوتی تھی۔ جھاڑ جھنکار کے درمیان اینٹوں کا ملبہ اور آدھی ادھوری بے چھت کی دیواریں۔ منہدم ہو جانے والی دیواروں سے لوگ کھڑکیاں اور دروازے نکال کے لے گئے تھے۔ لہٰذا اب "قصرِ جمشید" روحوں کا مسکن رہ گیا تھا۔ ماضی کا ایک لاوارث مزار۔ میں نے ایک بار پھر ہارن دیا کہ مالی اگر ایک کنال پہ پھیلی ہوئی عمارت کے کسی ایک کمرے میں مقیم ہو تو باہر آ جائے مگر اندر سے کوئی نہیں نکلا تو میں نیچے اُترا۔ آخر وہ مالی کہاں گیا جس نے مجھے اور محسن کو بتایا تھا کہ اصل نواب خسرو جمشید کو انتقال کیے زمانہ ہوا اور ان کے وارث جو صرف نام کے وارث تھے، تیس سال قبل انگلستان ہجرت کر گئے تھے تو وہیں کے ہو رہے تھے۔ ان کے اکلوتے بیٹے خسرو پرویز نے وہیں شادی بھی کر لی تھی اور ساٹھ سال میں ایک بار بھی نہیں آئے تھے۔

کار ایسی جگہ کھڑی تھی کہ سڑک پہ سے کسی کو نظر نہیں آ سکتی تھی۔ میں نے کار کی ڈکی کھولی اور اپنے قیدی کو دیکھا۔ وہ ہوش میں آ چکا تھا مگر تین گھنٹے تک دست و پا بستہ ڈکی میں پڑے رہنے سے نیم جاں تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پیر کھولے تو وہ مجھے خوف کے باوجود ایسی خونی نظروں سے گھورتا رہا کہ دلی جذبات اس کی صورت پہ تحریر ہو گئے۔ آزاد ہونے کے بعد بھی اسے اُٹھنے میں کچھ دیر لگی۔ دورانِ خون میں رکاوٹ کے باعث اس کے ہاتھوں اور پیروں کا دم نکل رہا تھا۔

"آپ خود تشریف لائیں گے یا میں آپ کو گھسیٹ کر نکالوں؟" میں نے طنز آمیز تمسخر لیے میں کہا۔

وہ حالِ مست سے نکل کر آہستہ آہستہ وہ دونوں ہتھیلیاں ٹکا کے فرش پہ جا کے اٹھا۔ ٹانگوں کو دو تین مرتبہ حرکت دی اور ڈکی سے اُتر آیا۔ ایک بار لڑکھڑایا اور پھر سنبھل کے کھڑا ہو گیا۔ "میں کہاں ہوں سکندر بابو؟" اس نے لمبے لمبے سانس لے کر کہا۔

"وہ تمہارا ساتھی قریب سے بے وفا نکلا۔" میں نے کہا۔ "تمہاری گرفتاری ہوتے ہی بھاگ گیا۔"

"آئے گا وہ بھی آئے گا اور بھی بہت سے لوگ آئیں گے تمہاری خبر لینے۔" وہ بولا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم پہلے سے یہاں موجود ہوں گے سب کا استقبال کرنے کے لیے۔ آؤ، بڑی حویلی ہے۔ سب کو الگ الگ کمروں میں دفن کرنا پڑا تب بھی جگہ کم نہیں ہوگی۔" اس کے ساتھ ہی میں نے بڑی پھرتی سے اس کے سینے پہ لات ماری۔ وہ ڈکی سے نکل کے اُچھلا اور نیچے گر گیا۔ میں نے نیچے جھک کر اس کو بالوں سے اُٹھایا اور پیروں پہ کھڑا کر دیا۔ "اندر چلو۔ پہلے تمہارا کریا کرم ہو جائے۔" میں نے اسے آگے دھکیلا۔ میں نے ایک دروازے کے ٹوٹے شیشے میں ہاتھ ڈالا اور جام ہو جانے والی کنڈی کو کھولنے کی کوشش کی لیکن زنگ نے چٹخنی کو تقریباً ویلڈ کر دیا تھا۔ وہ میرے پیچھے پڑا تھا مگر مجھے اس کی طرف سے کوئی تشویش نہیں تھی۔ میری لاک نے اس کی حالت بگاڑ دی تھی۔ اس میں اتنی جسمانی قوت نہیں تھی کہ مجھ پہ حملہ کر سکے۔

دروازے کو کھولنے کی اب یہی ایک صورت تھی کہ میں دھکا دے کر گلے ہوئے قبضوں کو پٹ سے جُدا کر دوں یا چٹخنی نکال دوں۔ دروازہ اتنی مضبوط لکڑی کا اور اتنا بھاری تھا کہ اس کے ٹوٹنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے کندھے سے ایک ٹکر ماری مگر دروازے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے دوسری مرتبہ زیادہ قوت صرف کی اور دروازہ کچھ اندر کی طرف جھکا۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ میں نے مسلسل دائیں اور بائیں شانے کو باری باری استعمال کیا۔ دروازہ جھولنے لگا تھا اور شاید اگلی ٹکر سے نیچے جا پڑتا لیکن اسی وقت کوئی چیز میرے سر سے ٹکرائی۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی۔ ضرب نے مجھے چکرا دیا تھا۔ اس بدمعاش نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کے پتھر اُٹھا لیا تھا اور مجھ پہ کھینچ مارا تھا۔ پتھر چھوٹا سا تھا اور نشانہ بے یقینی کا تھا مگر بہت کم قوت کے ساتھ پھینکا گیا تھا۔ اس کے جسم کی توانائی اس سے زیادہ ہوتی تو اسی پتھر سے وہ میرا سر پاش پاش کر دیتا۔ میں نے دم لینے کے لیے دروازے کا سہارا لیا اور جھک کر بیٹھ گیا۔ اس کا جواب دینے کے لیے میرے جسم میں آہستہ آہستہ قوت بحال ہونے لگی تھی۔ میں نے اسے دوسرے پتھر کے لیے رینگتے ہوئے اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے دیکھا۔ اس کا ہاتھ اُٹھا تو میں نے اپنے سر کو جھٹکا۔ پتھر زن سے گزرا اور میرے سر کو مس کرتا ہوا دروازے پہ جا لگا۔ اس دوسرے پتھر کو پھینکنے میں اس نے اپنی تمام قوت صرف کر دی تھی۔ اگر نشانہ خطا نہ ہوتا تو مجھے اس کی طرف سے غافل رہنے کی بہت سخت سزا ملتی۔ دو منٹ میں میرے حواس بحال ہو گئے۔ میں اُٹھ کے اس کی طرف بڑھا۔ میرے جارحانہ عزائم کا اندازہ کرتے ہوئے اس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن میں نے بڑی بے رحمی سے اس کے منہ پہ ٹھوکر ماری۔ وہ زمین پہ ہی لڑھک گیا۔ میں نے دوسری کک اس کی پسلیوں میں ماری۔ وہ بلبلایا اور دُہرا ہو گیا۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھایا اور ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ دروازے پہ دے مارا۔ دروازہ بڑی آواز کے ساتھ اندر گرا۔ خالی کمرے میں اس کی گونج کے ساتھ ہی اس شخص کی آخری چیخ بلند ہوئی۔ میں نے اندر قدم رکھنے کے بعد جھک کر اس کی نبض دیکھی۔ وہ زندہ تھا اور نبض کی رفتار کچھ کم ضرور تھی لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بھاری بھرکم دروازہ اس کے اوپر نہیں گرا تھا ورنہ اس کی ہڈیاں ٹوٹ جاتیں اور شاید وہ مر جاتا۔

کمرے کے فرش پہ گرد تھی۔ تنکے تھے اور اُن پرندوں کی بیٹ کے ڈھیر تھے جو اس وسیع و عریض کمرے کی بلند چھت میں آشیاں بندی کیے بیٹھے تھے۔ نہ جانے ان کی کتنی نسلیں اس ویرانے میں پیدا ہو کے ختم ہو چکی تھیں یا کائنات کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے پرواز کر گئی تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک فانوس کا آہنی ڈھانچہ لٹکا ہوا تھا جس میں نہ شیشہ تھا نہ ہولڈر تھے اور نہ بلب۔ پنکھوں کی جگہ صرف ان کی لمبی لمبی ڈنڈیاں چھت سے آویزاں رہ گئی تھیں۔ نکالنے والے وہ سب کچھ نکال کر لے گئے تھے جو نکالا جا سکتا تھا۔ دیواروں پہ سے سوئچ بورڈ اور بجلی کے تار تک اتار لیے گئے تھے۔ اگر خسرو پرویز نے ولایت جاتے وقت اس محل میں فرنیچر چھوڑا تھا تو اب اس کا نشان تک نہ تھا۔ میں نے اندر کے کھلے دروازوں میں سے گزر کے دوسرے کمروں کو دیکھا۔ ان سب کی کہانی ایک ہی تھی۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔

میں نے آدھے گھنٹے میں نیچے اور اوپر کے سب کمرے، باتھ روم، باورچی خانے دیکھ لیے۔ سب کمرے وسعت کے اعتبار سے ہال لگتے تھے۔ سب کی چھت کم سے کم سولہ فٹ بلند تھی۔ بجلی کا کنکشن بہت پہلے ہی کٹ چکا تھا۔ اب اندر پینے کے لیے پانی تک نہ تھا۔ کسی کمرے میں روشنی کا انتظام تک نہ تھا اور کوئی کمرہ اس قابل نہ تھا کہ رہائش کے لیے استعمال ہو سکے۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔ میں نے اس وقت محل کا نظارہ کر کے سوچا۔ کتنے شوق سے اور کتنے عزو سے نواب خسرو جمشید نے یہ قصر بنوایا اور سجایا ہوگا۔ بنانے والوں اور سجانے والوں نے اس کو نواب صاحب کے ذوق و شوق کے مطابق ڈھالنے میں کتنا وقت صرف کیا ہوگا اور کتنا پسینہ بہا کے

www.paksociety.com

کتنا پیسہ کمایا ہوگا؟ لوٹنے والوں نے اسے کیسا لوٹا کہ اندر کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ نہ جانے جیل کی وہ تختی کوئی کیوں نہیں لے گیا جس پر قصر جمشید کے الفاظ کندہ تھے۔ اسے سنگ لوح مزار کی طرح چھوڑ دیا۔

اپنے قیدی کو میں نے اوپر کی منزل پر ایک درمیانی کمرے میں منتقل کیا۔ اگر وہ وہاں چلاتا تب بھی اس کی آواز ان دیواروں کے سوا کوئی نہ سنتا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے اسے کارنس کی نائلون کی رسی سے پھر باندھ دیا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر نیچے اتر آیا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا اور بھوک سے میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ میں نے گزشتہ روز دوپہر کے وقت کھانا کھایا تھا۔ اس کے بعد مجھے چائے کی ایک پیالی بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ کار کو دوبارہ نکالنا ایک اور ڈرائیونگ ٹیسٹ ثابت ہوا لیکن اس مرتبہ میں نے کار پر خراش نہیں آنے دی۔ میری ظاہری حالت سوٹ پہننے کے باوجود ایسی ہو رہی تھی کہ میرا کار میں ہونا ضروری تھا۔ سڑک پر سے گزرنے والے مزدوروں نے اس حویلی سے نکلنے والی شاندار کار کو حیرت سے دیکھا۔ میں نے حسن آباد کے بازار کا رخ کیا۔

ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ناشتا کرنے کے بعد میں نے کچھ خریداری کی۔ ایک تھرماس میں چائے لے جانی تھی۔ بسکٹوں کے کچھ ڈبے، سگریٹ اور اسپرین لے کر میں نے واپسی اختیار کی مگر مجھے اسی ویرانے میں رہائش اختیار کرنی پڑی تو مجھے اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ پہننے کے کپڑے، دو چار برتن۔ کم سے کم چائے کافی بنانے کا سامان۔ لالٹین اور مٹی کا تیل، فرش صاف کرنے کے لیے ایک جھاڑو۔ سونے کے لیے ایک دری اور ایک تکیہ۔ لیکن یہ شاپنگ بعد میں بھی کی جا سکتی تھی۔ پہلے ضروری تھا کہ میں اپنے قیدی کو زندہ رکھنے کا سامان فراہم کروں۔ وہ مر گیا تو میری تفتیش دھری رہ جائے گی۔ جلدی کس بات کی نہیں تھی میرے کام میں مداخلت کرنے ...... والا کوئی نہیں تھا اور میں تہیہ کر چکا تھا کہ اس شخص کو مرنے دوں گا اور نہ قتل ہونے دوں گا۔ میں اس کی زبان سے وہ سب کچھ سنوں گا جو اسے معلوم ہے۔ اس بار میں نے گاڑی کو سڑک پر چھوڑا اور اندر پہنچا۔ وہ پھر ہوش میں تھا اور آنکھیں کھولے پڑا تھا۔ اس کے بدن پر صرف بنیان رہ گئی تھی۔ چنانچہ رسی کے مرئیل نشان، چوٹ کا ہر زخم اور ہر خراش اس کے شانوں، کمر، پیٹ اور سینے پر نمایاں تھے۔ آدمی وہ یقیناً سخت جان تھا اور بزدل بھی نہیں تھا ورنہ میرے سامنے گڑگڑاتا اور مجھ سے رحم کی بھیک مانگتا کہ وہ میرا دشمن نہیں محض حکم کا غلام ہے۔ لیکن ابھی تک اس نے شکست تسلیم ہی نہیں کی تھی۔ میں نے اسے آزاد کیا اور کھانے پینے کی چیزیں اس کے سامنے رکھ دیں۔

"اس تھرماس میں چائے ہے۔" میں نے کہا۔ "اور بسکٹ ہیں اور اسپرین ہے۔"

"تم مجھے قتل کیوں نہیں کر دیتے؟" وہ رک رک کر بولا۔ "مجھے زندہ کیوں رکھنا چاہتے ہو؟"

"اس لیے کہ مجھے تم سے چند سوال کرنے ہیں۔" میں نے اپنے بیٹھنے کے لیے رومال بچھا کے کہا اور سگریٹ جلالی۔ "تم اگر مرنا چاہتے ہو تو یہ سمجھ لو کہ تمہاری موت آسان نہیں ہے۔ تمہیں قتل کرنا ہی ہوگا تو میں خود نہیں کروں گا۔ تمہیں تمہارے ساتھیوں کے حوالے کروں گا مگر یہ میری مرضی پر منحصر ہے۔ مجبوری میں بہت سے لوگوں کو میں نے خود ٹھکانے لگایا ہے۔"

اس نے بسکٹ چبانے شروع کیے اور دیکھتے دیکھتے پورا ڈبا صاف ہو گیا۔ وہ بھی میری طرح بھوکا تھا لیکن اس کی جسمانی توانائی مجھ سے زیادہ خرچ ہوئی تھی۔ گرم گرم چائے کے ساتھ اس نے اسپرین نگل لی اور بالکل تازہ دم نظر آنے لگا۔ "تم سمجھتے ہو میں تمہیں سب بتا دوں گا؟" وہ بولا۔ "میری زبان آج تک پولیس نہیں کھلوا سکی۔"

"ہماری پولیس واقعی بہت نااہل ہے۔" میں نے کہا۔ "کچھ بھی نہیں کر سکتی لیکن میں سمجھتا ہی نہیں، جانتا بھی ہوں کہ تم میری ہر بات کا صحیح جواب دو گے۔ تم چوہدری ولاور کے لیے کب سے کام کر رہے ہو؟"

"کون چوہدری ولاور؟" وہ بولا۔ "میں تو اس کا نام بھی نہیں جانتا۔"

"لیکن میرا نام جانتے ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔ "ایس پی صاحب کے گھر میں کس سے ملاقات کرنے گئے تھے؟"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے جیب سے ریوالور نکال کے ہاتھ میں تھام لیا۔

"مسٹر فرمین۔" میں نے کہا۔ "مجھے تمہارے نام سے کوئی غرض نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم فرمین بھی نہیں ہو لیکن ایک شام تم نے دیگر پانچ افراد کے ساتھ مل کر مجھے لکڑی کے ایک کریٹ میں پیک کیا تھا۔ وہ بھی تمہاری طرح قلی بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو مجھے ٹرک میں ڈال کے روانہ ہوئے تھے لیکن لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ باقی تین کہاں ہیں؟"

"میں نہیں جانتا تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ بولا۔

میں نے سگریٹ کو فرش پر رگڑ کے بجھایا اور کھڑا ہو گیا۔ "ابھی وقت ہے یاد کرو وہ لوگ کون تھے؟" میں نے آگے بڑھ کر ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ وہ سیدھا بیٹھا اپنے سامنے والی دیوار کو دیکھتا رہا۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا۔ اس میں ابھی ایک فانوس کا ڈھانچہ معلق تھا۔ اس کے ہر سمت پھیلے ہوئے بازو یقیناً پیتل کے ہوں گے لیکن اب لوہے کے ہی نظر آتے تھے۔ میں نے رسی کا

ایک سرا اوپر اچھالا اور دوسری طرف سے کھینچ لیا۔ دوسرے سرے کا پھندا بنا کے میں نے رسی کو کھینچا۔ آہستہ آہستہ گرہ اوپر پہنچ گئی اور فانوس کو چھت سے معلق رکھنے والے پائپ کے گرد جم کر سخت ہو گئی۔ وہ کچھ خوف زدہ نظر آنے لگا تھا۔ اچانک اس نے مجھ پر حملہ کیا لیکن اس بار میں غافل نہیں تھا۔ میں نے لات ماری جو اس کے سینے پر پوری قوت سے پڑی۔ وہ کراہ کے الٹ گیا اور فرش پر جا پڑا۔

"اس رسی سے میں ایک ایک کو پھانسی دوں گا۔" میں نے کہا اور اسے ٹانگ سے پکڑ کے گھسیٹ لایا۔ رسی کے پھندے والے سرے کو میں نے دوبارہ فانوس کے اوپر سے گزارا اور پھر دوسری طرف ہو جانے والی رسی سے لٹک کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ جب میں نے پھندا بنایا تو اس کی صورت پر دہشت کے آثار پہلی مرتبہ نمودار ہوئے۔ "چلو اٹھو۔" میں نے کسی جلاد کی طرح اس کے قریب جا کر کہا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھا۔ اسے یقین آنے لگا تھا کہ میں اسے پھانسی دینا چاہتا ہوں۔ میں نے اچانک اس کے سر پر مکا مارا۔ وہ چکرا کے گرا تو میں نے اس کے دونوں پاؤں کے پنجے اٹھائے اور رسی سے باندھ دیے۔ پھر میں نے دوسرے سرے کو کھینچنا شروع کیا۔ وہ اوپر اٹھنے لگا۔ میں رسی کھینچتا گیا یہاں تک کہ وہ زمین سے تین فٹ کی بلندی پر الٹا جھولنے لگا۔ باقی رسی کو میں نے ایک دروازے کے ہینڈل سے باندھ دیا۔

"ولاور تم کو چھوڑے گا نہیں ...." اس نے مجھے ایک غلیظ گالی دی اور ہاتھوں سے اوپر اٹھ کے رسی کو تھامنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ زمین تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اور وہ محض جسم کی طاقت سے خود کو اٹھا کے رسی کا سہارا بھی نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے دھکیلا اور وہ پینڈولم کی طرح جھولنے لگا۔

"بہت جلد یاد آ گیا اپنے باپ کا نام۔" میں نے کہا۔ "ابھی تم کہہ رہے تھے کہ کون ولاور؟ اب میں جا رہا ہوں۔ تم اور باتیں بھی یاد کرنے کی کوشش کرو۔ اس طرح جسم کا خون سر کی طرف آ جاتا ہے اور سنا ہے یہ آسن یادداشت کو بہتر بنا دیتا ہے۔ میں واپس آ کے پوچھوں گا کہ کتنا یاد آیا۔ تم چیخنا چلانا چاہو تو اپنا شوق ضرور پورا کرو۔ تمہاری آواز بیٹھ جائے گی کسی کے کان تک نہیں پہنچے گی۔"

میں دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ صبح کے آٹھ بجے تھے۔ بنگلوں میں رہنے والے سو کر اٹھ چکے تھے لیکن باہر سے .... دیکھو تو کہیں انسانی آبادی کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ رہائشی علاقے سے گزرنے والی یہ مختصر اور تنگ سڑک عام آمد و رفت کے لیے استعمال نہیں ہوتی تھی اور یہ بائی لین سمجھی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی تک کسی نے مجھے اس ویران کوٹھی میں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ جب میں گاڑی میں بیٹھ رہا تھا تو سامنے والی کوٹھی سے ایک کار نکلی اور مخالف سمت میں چلی گئی جسے خود مالک چلا رہا تھا۔ وہ کام پر پہنچنے کی جلدی میں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مجھ پر نگاہ نہیں ڈالی۔ میں نے ایک شاپنگ لسٹ بنائی اور انارکلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ جی پی او کے سامنے گاڑی روک کے میں نے پبلک ٹیلی فون سے رابعہ کو کال کی۔ ریسیور بیگم رضوی نے اٹھایا۔ ہیلو کے جواب میں میں نے کہا کہ رابعہ سے بات کرنی ہے۔

"کون؟ تم سکندر ...؟" بیگم رضوی نے میری آواز فوراً پہچان لی۔ "کہاں سے بول رہے ہو؟"

"سوری آنٹی۔ یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "کیا فون آبزرویشن پر ہے!"

"مجھے نہیں معلوم۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن سکندر، یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں آپ کے اور انکل کے نقطہ نظر سے غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے یہی ثابت کرنا تھا کہ اس کے سوا میں اور کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے آپ سب کی مدد پر بہت بھروسا تھا لیکن زمانہ بہت خراب ہے آنٹی۔ سیدھی انگلیوں سے گھی پہلے نکلتا ہوگا، اب نہیں نکلتا۔ میری مشکلات میں اضافہ ہوا اور میں الجھتا چلا گیا۔ کیونکہ میرے دشمن غیر قانونی حربے استعمال کر رہے تھے۔ اینٹ کا جواب تو پتھر سے ہی دیا جا سکتا ہے۔"

"پتھر تمہاری عقل پر پڑ گئے ہیں۔ تمہیں کسی کا خیال نہیں۔" انہوں نے خفگی سے کہا۔

"آپ لوگوں کے لیے میرا وجود پریشانیوں کا سبب تھا اور سب کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "آپ کے گھر میں سکون برباد ہو رہا تھا۔ محض میری وجہ سے انکل کشیدگی میں مبتلا تھے اور خطرہ آپ سب کو لاحق تھا۔"

"میں اپنی بات نہیں کر رہی تھی۔ رابعہ کا خیال ہے تمہیں؟" بیگم رضوی نے کہا۔ "کبھی غور کیا اس کی حالت پر کہ وہ کیا تھی اور کیا ہو گئی ہے؟ آخر کتنی قربانی چاہتے ہو تم اس سے؟ اپنا سب کچھ تو گنوا چکی ہے وہ۔ سوچو ذرا وہ کتنی کامیاب وکیل تھی۔ اس کا اپنا گھر تھا۔ اپنی مصروفیات تھیں۔ اب کیا ہے۔ نہ کہیں آتی ہے نہ جاتی ہے۔ اپنے کمرے میں بند پڑی رہتی ہے۔ کھلاؤ تو کھا لیتی ہے نہ کھلاؤ تو اسے خیال ہی نہیں آتا۔ مجھ سے چھپاتی ہے لیکن کیا اس کی آنکھیں بتاتی نہیں کہ وہ روتی ہے۔ اس کی صحت کتنی گر گئی ہے۔"

"آپ درست کہتی ہیں؟" میں نے دل میں اٹھنے والی ٹیس کو دبا کے کہا۔ "ایک ایس پی کی بیٹی ہو کے ابھی سے ہمت ہار بیٹھی

www.paksociety.com

ہیں؟ رابعہ تو آپ کے پاس میری امانت ہے۔ میں سمجھتا تھا آپ اس کو سنبھال کے رکھیں گی۔ اسے سمجھائیں گی کہ عقل سے کام لے۔ بھلا اس طرح مسائل حل ہوتے ہیں؟"

"میں کسی کو کیا سمجھاؤں۔" انہوں نے کہا۔ "عقل میں تم سب افلاطون ہو۔ کسی کی مانتے ہو؟ جو سمجھانا ہے اسے خود ہی سمجھا دو۔ یہ امانت کا بار مجھ پر مت ڈالو۔ ایک پولیس افسر کی بیوی کسی مجرم کی امانت دار نہیں ہو سکتی۔"

انہوں نے رابعہ کو آواز دی اور ریسیور رکھ دیا۔ چند منٹ بعد رابعہ نے فون اٹھا لیا۔ "کیا بات ہے سکندر؟" وہ بولی۔

"بیگم رضوی تم سے بہت خفا ہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھ سے یا تم سے؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم خود جانتی ہو۔" میں نے کہا۔ "آج رات میں تم سے ملنے آؤں گا تو بتاؤں گا۔"

"ایسی حماقت مت کرنا۔" وہ بولی۔ "یہاں پہرہ گارڈ پوسٹ کر دی گئی ہے اور غالباً سادے کپڑوں والے بھی ہیں جو باہر سے ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتے ہیں۔ میں خود آ جاؤں گی۔ کہاں ملو گے تم؟"

"شام چھ بجے سیال پیر صاحب کے قبرستان آ جانا۔" میں نے کہا۔ "گاڑی گیٹ کے سامنے کھڑی رکھنا۔ میں چھ اور ساڑھے چھ کے درمیان کسی وقت بھی آ پہنچوں گا۔ یہ بتاؤ تم آج صبح وہ انکل کے ساتھ منظر کے گھر کیوں گئی تھیں؟"

"انکل کو شک تھا کہ ہم تمہاری مدد کر رہے ہیں۔" وہ بولی۔ "اور پہلے ہی تم کو کہیں چھپا رکھا ہے۔ اچانک ان کو منظر کے گھر چھاپا مارنے کا خیال آ گیا۔ تم کو کس نے بتایا؟"

"میں نے دیکھا تھا۔ اگر انکل صرف پانچ دس منٹ بعد آتے تو ان کا چھاپا کامیاب رہتا۔" میں نے کہا۔ "میرا ارادہ ان سے ملنے کا تھا۔ تمہاری گاڑی میرے قریب سے گزری۔ میں منظر کے گھر سے چار قدم دور تھا لیکن اندھیرے میں تھا۔ کیا بتایا منظر نے؟"

"وہ کیا بتاتا؟ حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔" رابعہ نے کہا۔ "کہنے لگا ایس پی صاحب اگر آئے ہیں تو سرچ وارنٹ دکھا دیجیے۔ ویسے آپ سکندر اور رابعہ کے انکل ہیں تو میرے بھی انکل ہی ہوئے۔ آپ کا گھر ہے شوق سے دیکھیے۔ میں الماری اور صندوق بھی کھول کے دکھا سکتا ہوں۔"

"محسن کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا۔ "اس پر شک تو نہیں ہوا انکل کو؟"

"نہیں وہ ایکٹر اچھا ہے۔" رابعہ ہنسی۔ "اس نے ملزم کو آزاد کرنے کے بعد چیخ ماری تھی اور اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اپنے سر پر پڑے دھرے کا ڈنڈا مار لیا تھا۔ خاصی کاری ضرب سے سر میں گومڑ نکل آیا۔ ہم سب نیچے پہنچے تو وہ سر پکڑے بے ہوش پڑا تھا۔ انکل پریشان بھی ہوئے اور پشیمان بھی کہ کس نالائق پر بھروسہ کیا۔ تفتیش مکمل بھی نہیں کی ملزم کو موقع دے دیا کہ مار کے بھاگ جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اسے ٹھیک طرح سے باندھا ہی نہیں گیا تھا۔ محسن کے باتھ روم میں داخل ہوتے ہی اس نے حملہ کر دیا اور بھاگ گیا۔ محسن نے اتفاق کیا کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ انکل نے کہا۔ خدا کا شکر ہے چوٹ زیادہ نہیں آئی۔ سر کی چوٹ خطرناک بھی ہو جاتی ہے۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ "مجھے بھی اس کی طرف سے فکر ہے۔ قیدی کو میں لے گیا تھا۔ مگر رابعہ۔ فون ایکسٹینشن پر تو نہیں ہے؟ ساری گفتگو ٹیپ ہو جائے گی؟"

"ابھی تک تو نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "محسن نے معلوم کیا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ تمہارا فون سنا جائے۔ یہ بتاؤ تم خود کہاں ہو اور اس قیدی کو کہاں رکھا ہے تم نے؟"

"شام کو چھ بجے۔" میں نے کہا۔ "محسن کو ساتھ لا سکو تو لے آنا۔" اور ریسیور رکھ دیا۔

تمام اسباب ضرورت گاڑی میں بھر کے اور اپنا پنچ ساتھ لے کر میں واپس قصر جمشید پہنچا تو ساڑھے دس بجے تھے۔ اب مجھے شام پانچ بجے تک باہر نہیں جانا تھا۔ چنانچہ میں کار کو اندر لے گیا اور پچھلے حصے میں کھڑا کر دیا۔ سوٹ کیس، تیل کا چولہا، برتن اور جانے کا سامان میں نے نیچے والے پچھلے کمرے میں ڈال دیا۔ اپنے ساتھ میں صرف ایک دری، تکیہ اور جھاڑو اوپر لے گیا۔ قیدی کی حالت ابتر تھی۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔

میں نے اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کے اٹھایا۔ "اپنا نام یاد آیا؟" میں نے کہا۔ "دوستوں کے نام یاد آ گئے؟"

"میں... میں بتاتا ہوں۔" وہ چلایا۔ "سب بتا دوں گا۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ سب پرانے حربے ہیں۔ تم کو دم لینے کی مہلت چاہیے۔ میں نے تمہیں چھوڑ دیا تو سنبھلتے ہی تم اپنے الفاظ سے پھر جاؤ گے۔ تم سخت آدمی ہو۔ آج تک پولیس تمہاری زبان نہیں کھلوا سکی۔" میں نے اس کا سر ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح چلانے لگا اور مجھے گالیاں دینے لگا۔ اس کا سانس پھول گیا اور وہ نڈھال ہو کے ہانپنے لگا۔ میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا اور ایک کش لیا۔

"ہاں۔" میں نے جلتی ہوئی سگریٹ کو اس کی ناک پر رکھ دیا۔ "کون تھے باقی تین آدمی؟"

وہ خنجر کیسے ہوئے بچے کی طرح بلبلایا۔ "بتاتا ہوں.... بتاتا ہوں..." اس نے تڑپ کر اپنا چہرہ ہٹا لیا جس پر زخم کا جلا ہوا سیاہ بدنما داغ نمایاں ہو گیا تھا۔ "ایک کو جانتا ہوں میں۔ وہ مجھے لے گیا تھا۔ رحمت کباڑی۔"

"تمہاری یادداشت بہتر ہونے لگی ہے۔" میں نے ایک اور سگریٹ سلگا کے دوسرا کش لیا اور آگے بڑھایا۔

"نہیں... نہیں۔" وہ چلایا لیکن سگریٹ کا روشن حصہ اس کے سینے پر دائیں طرف چپک گیا تھا۔ کمرے میں گوشت جلنے کی ہلکی سی بو پھیلی اور اس نے دلخراش چیخ ماری۔ میں نے تیل کا چولہا روشن کیا اور اس کے عین نیچے رکھ دیا۔

"کہاں رہتا ہے یہ رحمت کباڑی؟" میں نے اطمینان سے کہا اور تیسری سگریٹ جلائی اور اس کے ہاتھ باندھ دیے۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ چولہے کی اٹھتی ہوئی حرارت اس کے سر کو گرم کرنے لگی تھی۔

"معلوم ہو جائے گا۔" میں نے سگریٹ کو تیسری جگہ اس کے سینے پر بائیں طرف رکھ دیا۔ وہ اچھلا اور دو بار تڑپیں مار مار کے بلبلانے لگا۔ اس کا جسم سخت اذیت میں بل کھا رہا تھا، تڑپ رہا تھا اور جھول رہا تھا۔ اس میں اب اتنی بھی سکت نہ رہی تھی کہ سر اٹھا کے ہاتھوں سے رسی تھام سکے اور چمگادڑ کی طرح سیدھا اس سے چپکا رہے ..... وہ اونچا ہونے کے لیے ہاتھ اٹھاتا تھا اور سر اٹھانے کی بے سود کوشش کرتا تھا۔

"جب تک تم مجھے رحمت کباڑی کا پتا نہیں بتاؤ گے تمہاری گلو خلاصی نہیں ہو گی۔" میں نے کہا۔

"وہ... وہ خود آیا تھا... میرے پاس۔ اڈے پر۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ تپش اس کے لیے ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔

"کس کے اڈے پر؟" میں نے کہا اور چولہے کی بتیاں کچھ اونچی کر دیں۔ شعلہ اور بلند ہو گیا۔

"گامے ماچھی کے اڈے پر۔ سٹہ ہوتا تھا وہاں۔" الفاظ اس کے ہونٹوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

"کیا کام تھا اسے؟" میں نے کہا اور چوتھی سگریٹ کا کش لیا۔ "کہاں لے گیا تھا وہ تم کو؟"

"میں... میں نہیں بتا سکتا۔ رات کا وقت تھا۔" اس کے سر کے اندر اب بھیجا تک گرم ہونے لگا تھا۔

میں نے سگریٹ اس کے نرخرے پر لگا دی۔ "تم اس شہر کے رہنے والے ہو۔ رات کو راستے نہیں پہچانتے؟"

وہ چیخ مار کے تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ میں نے رسی کی گرہ دیوار سے کھولی اور آہستہ آہستہ اسے نیچے اتار لیا۔ وہ فرش پر کسی بے جان لاش کی طرح پڑا رہا۔ میں نیچے اترا اور اپنا اسباب ضرورت اوپر لے آیا۔ فرش کو جھاڑو سے صاف کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں نے صرف ایک کونے کی صفائی پر قناعت کی اور وہاں دری بچھا دی۔ سوٹ کیس، تکیہ اور باقی سامان میں نے دری کے پاس ہی رکھ دیا۔ میرا سوٹ تو پہلے ہی غارت ہو چکا تھا۔ صبح سے میں نے منہ تک نہیں دھویا تھا۔ رہی سہی کسر اب پوری ہو گئی اور میں گرد و غبار سے بھوت بن گیا۔ کپڑے بدلنے سے پہلے ضروری تھا کہیں سے پانی کا بندوبست کیا جائے۔ اتنے بڑے قصر جمشید میں نہ جانے کتنے باتھ روم تھے مگر سب کے نلکے خشک پڑے تھے۔ مجھے اس مالی اور چوکیدار کا خیال آیا جو پہلے سے یہاں رہتا تھا۔ آخر وہ اپنی ضرورت کہاں سے پوری کرتا تھا۔ حویلی کے گرد پھیلے ہوئے کئی ایکڑ کے جنگل نما باغ میں کوئی ٹیوب ویل یا کنواں تو ہو گا۔

میری تلاش کامیاب رہی۔ سرونٹ کوارٹرز کی منہدم شدہ عمارت کے ایک گوشے میں مجھے ہینڈ پمپ نظر آ گیا۔ میں نے اس کے ہینڈل پمپ کو اوپر نیچے کیا۔ کچھ دیر اس میں سے ہوا نکلتی رہی لیکن اوپر چڑھنے والا پانی خود اپنی موجودگی کی خبر دے رہا تھا۔ مجھے ہینڈل پر پہلے سے زیادہ قوت صرف کرنی پڑ رہی تھی۔ بالآخر پانی ہینڈ پمپ میں بولا اور اس کا شفاف دھارا نل کے باہر گرا ۔۔۔ میں اس دریافت پر اتنا ہی خوش تھا جتنا امریکہ ملنے .... پر کولمبس خوش ہوا تھا۔ اوپر آ کے میں نے اپنے قیدی کو دیکھا۔ وہ اس طرح بے سُدھ پڑا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ مکر تو نہیں کر رہا ہے میں نے اس کے تلوے کو ایک تنکے سے سہلایا مگر اس نے جنبش نہ کی۔ ایک برتن اور تولیہ لے کر میں نیچے اتر گیا۔ ہینڈ پمپ دو متصل دیواروں کے گوشے میں نصب تھا۔ تیسری طرف ملبے کا ڈھیر تھا اور چوتھی سمت میں حویلی کی فصیل دور ہونے کے باوجود پردہ فراہم کرتی تھی۔ میں نے اطمینان سے غسل کیا اور تولیہ لپیٹ کر اوپر پہنچا تو میرے ایک ہاتھ میں میلے کپڑوں کا بنڈل تھا اور دوسرے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا برتن۔ سوٹ کیس میں سے کپڑوں کا ایک جوڑا نکال کر پہننے کے بعد میں نے وقت دیکھا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ میرا قیدی کراہنے لگا تھا جس کا مطلب تھا کہ اب وہ ہوش میں آ رہا ہے۔ میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ "پانی...!" وہ بولا۔

میں نے رسی کو پھر کھینچا اور اسے اوپر اٹھا لیا۔ وہ زیادہ اونچی آواز میں کراہنے لگا۔ "پانی نظر آیا تمہیں؟" میں نے کہا۔ "دیکھو اس تسلے میں پانی ہے... ٹھنڈا اور میٹھا۔" میں رسی کو زور لگا کے کھینچنے لگا۔ اس مرتبہ وہ فرش سے دس فٹ اوپر چلا گیا اور اس کے پاؤں فانوس کے ٹوٹے پنجے کو چھونے لگے۔ میر

میں نے رسی کو ایک جھٹکے سے ڈھیل دی۔ وہ چار فٹ نیچے آیا۔ اس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی۔ اسے موت سامنے نظر آنے لگی ہوگی اور اس کا خیال یہی ہوگا کہ ایک لمحے بعد وہ دس فٹ کی بلندی سے سر کے بل فرش سے ٹکرائے گا لیکن میں نے رسی کو پھر پکڑ لیا اور اسے چھ فٹ کی بلندی پر لٹکا دیا۔

”تمہارے بیوی بچے یقیناً نہیں ہوں گے۔ ورنہ تم ان کے لیے زندہ ضرور رہتے۔“ میں نے کہا۔

”خدا... خدا کے لیے... رحم... رحم کرو۔ میری لڑکی... اس کی شادی ہونے والی ہے۔“ اس نے ہاتھ جوڑ کے میری منت سماجت شروع کی۔ ”اگلے مہینے... اس کی ماں نہیں ہے۔“

”بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”اب رخصتی کون کرے گا؟ کہاں رہتے ہو تم؟“

”محلہ بی بی پاکدامن میں۔“ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بولا۔

میں نے اسے نیچے اتار دیا۔ اسے پینے کے لیے پانی دیا اور دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔

”تمہاری بیٹی کو رحمت کباڑی کا پتا معلوم ہے؟“ میں نے کہا۔

”نہیں نہیں... وہ کچھ نہیں جانتی۔“ وہ چلایا۔ ”اسے تو میرے بارے میں بھی نہیں معلوم کہ میں کیا کرتا ہوں، کتنا خراب آدمی ہوں۔ محلے میں کوئی نہیں جانتا۔“

”بیٹی کو باپ کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”کیوں نہ اسے بھی بلا لیں یہاں؟“

وہ دیوانہ وار مجھ پر لپکا۔ ”تم اسے کبھی تلاش نہیں کر سکتے۔“

میں نے اس کے ایک مکا رسید کیا اور وہ وہیں جا گرا جہاں سے اٹھا تھا۔ ”لوگ کہتے ہیں ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ گاہے ماہی کے اڈے پر لوگ تمہیں جانتے ہوں گے۔“

”آج تک کسی کو میں نے گھر کا پتا نہیں بتایا۔“ وہ سر اٹھا کے بولا۔ ”تمہیں میرا نام بھی نہیں معلوم۔“

”تمہاری صورت تو بہت سے لوگ پہچانتے ہوں گے۔“ میں نے کہا۔ ”شام کو ایک فوٹوگرافر آئے گا۔ کل تک تمہاری تصویریں بن جائیں گی۔ محلہ بی بی پاکدامن میں کتنی گلیاں ہیں؟ کتنی دکانیں ہیں۔ تمہاری تصویر دیکھ کے کوئی نہ کوئی پولیس کو تمہارے گھر ضرور لے جائے گا اور جب پولیس اسے گرفتار کرے گی مثلاً اس جرم میں کہ تم اس سے عصمت فروشی کراتے تھے... تو یہ خبر...“

”نہیں!“ وہ چلایا۔ ”اس نے کچھ نہیں کیا۔ میرے جرم کی سزا اسے مت دو۔“

”رحمت کباڑی کہاں ملے گا؟“ میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

”میں بتا دوں گا لیکن ایک شرط ہے...“ وہ ہانپنے لگا۔ ”اسے معلوم نہ ہو کہ میں نے غداری کی تھی... پہلے مجھے چھوڑ دینا۔ بس میری بیٹی کی شادی ہو جائے۔ پھر وہ بے شک مجھے مار ڈالیں... مجھے پروا نہیں۔“

”مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہ مت بھولنا کہ تم نے چالاکی سے دھوکا دیا مجھے یا جھوٹ بولا تو اپنی بیٹی کے مستقبل کی تباہی کے ذمے دار تم خود ہو گے۔ میں پہلے تصدیق کروں گا کہ تم نے سچ بولا ہے یا نہیں۔ کوئی بات غلط ہوئی تو کل اسی جگہ تمہاری ملاقات بیٹی سے ہوگی جو تمہیں یاد رہے گی۔ تمہیں بھی اور تمہاری بیٹی کو بھی۔“

اس کی کمزور رگ میرے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھے رحمت کباڑی کا پتا کیسے نہ بتاتا۔ اس نے ٹریننگ ماری تھی کہ کیسی اس کی زبان نہیں کھلوا سکی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ انسان کا جسم کتنا کمزور قلعہ ہے اور تشدد کے ذہنی اور جسمانی طریقے شطرنج کی چالوں کی طرح ہیں۔ لاتعداد اور ایک سے ایک موثر، قوت مدافعت کو مات دینے والا اور برداشت کی طاقت سے کہیں زیادہ۔ ترقی یافتہ ملک میں تو تشدد ایک فن ہے اور سائنس ہے جس میں عقل انسان کی تمام ذہانت ہی نہیں، ذہن کو تابع فرمان بنانے والی ادویات سے لے کر الیکٹرانک مشینوں تک سب کا استعمال ہوتا ہے۔ میں کوئی ماہر فن نہیں تھا مگر میرے مقابل ایک معمولی آدمی تھا۔ ایک ادنیٰ درجے کا مجرم جس کی قوت ارادی بہت کم تھی اور جو مجبور بھی تھا۔

خلاف توقع مجھے بہت جلد کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ میں نے اسے کھانے کو دیا اور اس کے مانگنے پر سگریٹ بھی دی۔ کچھ دیر کے لیے میں نے اسے آزاد کر دیا اور ریوالور قریب رکھے دری پہ نیم دراز رہا۔ اس کی حالت قابل رحم ہو گئی تھی۔

”تمہاری حیثیت وعدہ معاف گواہ کی ہو گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس لیے میں تم سے اور کچھ نہیں پوچھوں گا اور کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ تم نے مجھے کیا معلومات فراہم کی ہیں۔“

”ان کو معلوم ہو جائے گا۔“ وہ مایوسی سے بولا۔ ”اب تک دلاور کو پوری رپورٹ مل چکی ہوگی کہ میں پکڑا گیا ہوں۔“

”لیکن دلاور نے یہ بھی معلوم کر لیا ہوگا کہ تم قید سے فرار ہو گئے ہو۔ ورنہ ایس پی صاحب اب تک تم کو پولیس کے حوالے کر چکے ہوتے۔ تمہارے خلاف رپورٹ ہو چکی تھانے میں۔“

”لیکن میں کیا بتاؤں گا کہ فرار ہونے کے بعد میں کہاں رہا؟ واپس کیوں نہیں پہنچا؟“ وہ بہت نروس اور پریشان تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اس نے بیٹی کا نام کیوں لیا۔ اسی مجبوری کے باعث وہ اپنے ساتھیوں سے غداری کا مرتکب ہوا۔ اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں

تھا کہ بیٹی سمیت اس شہر سے چلا جائے۔ اگلے مہینے اسے بیٹی کو رخصت کرنا تھا اور وہ خوفزدہ تھا کہ نہ جانے اتنی مہلت بھی ملے گی یا نہیں؟

”تمہارے ساتھ ایک اور شخص تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے واپس جا کے بتایا ہوگا تمہارے بارے میں؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”وہ باہر موجود تھا۔ میں اس سے پہلی بار ملا تھا۔“

”پھر وہ کیا رپورٹ دے گا؟“ میں نے کہا۔ ”اسے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ تم پکڑے گئے۔ فرار کا اسے علم نہیں ہوگا۔ تم کل شام تک اپنے گھر پہنچ جاؤ گے۔ ممکن ہے دوپہر کو ہی تمہیں چھوڑ دوں۔“

”وہ پوچھیں گے اب تک کہاں تھا؟“ وہ بولا۔ ”وہ میرے زخم دیکھ لیں گے اور سب سمجھ جائیں گے کہ گرفتار کرنے والوں نے مجھ پر تشدد کیا ہے۔ میری کون مانے گا کہ میں نے کچھ نہیں بتایا اور جب تم رحمت کباڑی کو پکڑ لو گے تو کیا وہ سمجھ نہیں جائیں گے کہ تم کو سب میں نے ہی بتایا ہوگا۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

وہ زار و قطار رونے لگا۔ یہ تمام عمر کے اعمال کا کفارہ تھا جو اسے اب ادا کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ قدرت کی وہ سزا تھی جس سے مفر نہ تھا۔ وہ سب بھی قصوروار کہاں تھے جو اب تک مارے جا چکے تھے مگر ان کی مجبوری کی نوعیت مختلف تھی۔ کچھ اپنی اصول پرستی کے باعث مجبور رہے۔ کچھ انسانیت کے رشتوں سے مجبور تھے۔ وزیر خان کو بھی کچھ مجبوری تھی کہ میرے سر پہ سہرا نہ دیکھ سکا مثلاً کہ رخصتی سے قبل اس کی ماں مر گئی۔ سائرہ بھی دلہن بنی مگر اس کی رخصتی نہ ہو سکی۔ سب کی مجبوریاں ان کی خواہشات کے سامنے دیوار بن گئیں۔ یہ پہلے بھی ہوتا آیا ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ تقدیر کے سوا آدمی کے ہر المیے کا الزام کسے دیا جا سکتا ہے۔ قصوروار ملک نہیں تھا۔ میں تو یہ نہیں چاہتا تھا کہ بیٹی کی ڈولی اٹھنے سے پہلے باپ کا جنازہ اٹھ جائے۔ قصوروار وہ خود بھی نہیں تھا جسے معلوم نہ تھا کہ اس شعبے میں ناکامی کا انجام یہ ہوگا۔ قصوروار اس کی بیٹی بھی نہ تھی۔

●

”ہو سکتا ہے دلاور تمہیں کچھ مہلت دے دے۔“ میں نے ہمدردی سے کہا۔ ”اور تم بیٹی کو رخصت کر سکو۔“

لیکن وہ ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ اس شخص کی طرح جسے سزائے موت دی جا چکی ہو اور جس کی رحم کی آخری اپیل بھی مسترد ہو چکی ہو۔ اس کے دامن میں امید کی ایک بھی کرن نہیں تھی۔

میں نے اسے ساتھ والے کمرے میں منتقل کیا اور اس کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ کر رسی کا دوسرا کنارہ نیچے کے دروازے سے گزارا کہ دونوں پٹ ایک کیل سے مل گئے۔ باقی رسی میں نے ایک تختے کے اوپر باندھ دی۔ پھندا بہت ڈھیلا تھا اور مجھے کوئی تکلیف نہیں دے رہا تھا مگر میرے پاؤں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اگر میرا قیدی زور لگاتا اور دروازہ کھینچ کر میرے قریب آنے کی کوشش کرتا تو رسی کا دباؤ پڑتا اور ٹانگ کھینچی جاتی تو میں فوراً اٹھ بیٹھتا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کوئی غلط حرکت نہ کرے اور اگر خود نہیں سو سکتا تو مجھے سونے دے۔

میں ٹھیک پانچ بجے اٹھا۔ کسی الارم کے بغیر وقت پہ جاگنا میرے لیے کبھی مشکل نہ تھا۔ ہر شخص تھوڑی سی قوت ارادی سے کام لے کر اپنے ذہن کو یہ تربیت دے سکتا ہے کہ وہ جس وقت چاہے اٹھ جائے اور بہت سے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں کہ سونے سے پہلے اٹھنے کا وقت طے کر لیتے ہیں۔ ان کا لاشعور ٹھیک وقت پہ شعور کو بیدار کر دیتا ہے۔ مجھے چھ بجے قبرستان میانی میر صاحب کے دروازے پہ پہنچنا تھا اور وہاں تک کم سے کم آدھے گھنٹے کا راستہ تھا۔ میں نے اپنا لباس بدل کے ایس آئی کی پوری وردی پہنی۔ اپنے قیدی کو اس طرح باندھا کہ وہ ہل بھی نہ سکے۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ وہ رسی کو فرش پہ گھسٹتا رہا ہے۔ اگر اسے زیادہ مہلت ملتی تو وہ کامیاب بھی ہو جاتا۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے ڈور کے ایک گوشے میں لالٹین روشن کی اور اس سے کوئی بات کیے بغیر کار سے نکل آیا۔ کار میں نے قبرستان کے سامنے دو میل دور کی ایک گلی میں روکا۔ وہاں سے ہر وہ جگہ صاف نظر آتی تھی جہاں مجھے اپنے نظر رپٹ کی موجودگی کا شبہ ہوا۔ پھر میں نے کار کے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے ایک بال پوائنٹ قلم اور کاغذ کا ایک پرزہ نکالا اور اس پر لکھا۔

”محترم۔ بارہ گھنٹے تک جیپ کا استعمال کرنے کی اجازت دینے کا شکریہ۔ آپ کو ہمدردی کا یہ جذبہ بہت مہنگا پڑا۔ غالباً آئندہ آپ کسی مستحق کو بھی لفٹ نہیں دیں گے۔ آپ کی پریشانی اور زحمت کے لیے معذرت۔ افسوس یہ ہے کہ احتیاط کے باوجود کار کا پچھلا حصہ معمولی سی رگڑ سے خراب ہو گیا۔ امید ہے پانچ سو روپے میں آپ اس کو بہترین ڈینٹ پینٹ کرا لیں گے اور یہ نقص نظر بھی نہ آئے گا۔“

اسی کاغذ میں سو سو کے پانچ نوٹ لپیٹ کر میں نے جابیاں بھی گلوز کمپارٹمنٹ میں ڈال دیں اور کار سے اتر کے گلی سے سڑک پر آ گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہیں میرے سمجھانے کے باوجود اس شخص نے پولیس کو رپورٹ نہ دے دی ہو اور اب پولیس سادہ کپڑوں میں میری منتظر ہو۔ عقلمند آدمی ہوتا تو ہرگز ایسا نہ کرتا لیکن اس نے میری بات کو قابل اعتبار نہیں سمجھا تھا۔ شاید اسے ڈر ہو گا کہ کار ڈکیتی یا اغوا کی واردات میں استعمال ہوئی اور اس نے رپورٹ بھی نہ لکھوائی تو وہ تفتیش کے لیے چکر میں پھنس جائے گا۔ پولیس اسے معلوم نہیں مجرموں کا ساتھی فرض کر سکتی۔ نتیجہ یہ کہ وہ قبرستان

www.paksociety.com

کے دروازے پر کھڑا اپنی چینی سے افری روڈ پر دونوں طرف دیکھ رہا تھا۔ فورٹریس اسٹیڈیم کی طرف سے آنے والی سڑک کو بھی اور دھرم پورے کے پل کی جانب بھی۔ بے حد مختلف اور مستعد پولیس والے وردی سمیت اس کے آس پاس موجود تھے۔ ان کی کھوپڑی میں یہ آیا ہی نہیں تھا کہ میں کسی دوسری سمت سے بھی آ سکتا ہوں۔ یعنی سامنے کسی بھی گلی سے۔ رابعہ کی سرخ فاکس ویگن بہت سی دوسری کاروں کے درمیان موجود تھی۔ دوسری کاروں والے فاتحہ خوانی کے لیے آئے تھے اور خطرات ہونے کی وجہ سے ان کی تعداد زیادہ تھی۔ میں اطمینان سے سڑک کے دوسرے کنارے پر چلتا رہا۔ پھر سڑک عبور کر گیا۔ پولیس کی نفری نے مجھے بالکل قابل توجہ نہیں سمجھا اور میں اچانک رابعہ اور محسن کے سامنے جا پہنچا۔ محسن خان آگے والی سیٹ خالی رکھنے کے لیے پیچھے تشریف فرما تھے۔ انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا لیکن میں ان کے اظہار حیرت سے پہلے دروازہ کھول کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"یہ کیا جعلسازی ہے؟" محسن نے کہا۔ "تو آدمی ہے کہ تھانیدار؟"

"آدمی بلبلہ ہے پانی کا۔ انسان نوے فیصد پانی کا اور پانی اس برتن کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے جس میں رکھا جائے۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح ارشاد کیا۔ "حالات کا یہی تقاضا تھا اور آئندہ بھی مجھے اپنا حلیہ اپنی ضرورت کے مطابق رکھنا پڑے گا۔ میں سکندر بخت بن کے نہیں رہ سکتا چنانچہ بظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی۔"

"ایسے کتنی بار اپنا حلیہ بدلو گے؟" رابعہ نے کہا۔ "اور کب تک چھپ چھپ کے رہو گے؟"

"اس کا جواب وقت دے گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو یہاں سے نکلو۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

روانگی سے قبل میں نے رابعہ سے قلم لے کر ایک چٹ پر لکھا۔ "آپ کی کار سامنے گلی میں کھڑی ہے۔" اور قریب سے گزرنے والے ایک بچے کو بلایا۔ "یہ ان کو دے دو بیٹے۔" میں نے کہا۔ "وہ جو پولیس کے ساتھ کھڑے ہیں۔"

یہ بات محسن نے کہی ہوتی تو بچہ بھاگ جاتا لیکن وہ میری وردی دیکھ کر ڈر گیا۔ رابعہ نے گاڑی نکالی تو میں نے دیکھا کہ بچہ وہ چٹ کار کے مالک کو دے رہا ہے۔ فاکس ویگن ان کی بھاگ دوڑ سے قبل ہی اتنی دور جا چکی تھی کہ اس کا نمبر کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ مالک سے زیادہ پولیس کو حیرانی ہوئی ہوگی کہ وہ کون ذہین پولیس افسر تھا جو سامنے نہیں آیا اور کار کا سراغ لگانے کی کامیابی کا اعزاز انہیں بخش گیا۔ رابعہ نے گاڑی کو گلبرگ کی طرف موڑ دیا۔

گلبرگ کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کے میں نے انہیں دن بھر کی روداد سنائی اور ان سے رضوی صاحب کے گھر پیش آنے والے واقعات کا خلاصہ سنا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے رابعہ کو بس اتنا بتایا کہ آج کی رات میں اور محسن رحمت کے بارے کا پتا لگانے جائیں گے۔ اگر میں اس کو اپنے حقیقی عزائم سے آگاہ کر دیتا تو وہ مجھے کبھی نہ نکلنے دیتی۔ نہ ایک وکیل کی حیثیت سے نہ اس عورت کی حیثیت سے جسے محبت بزدل بنا دیتی ہے۔ پھر محسن سگریٹ لینے چلا گیا۔

"قصر جمشید کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "ایک طرح سے دشمن کی سرزمین ہے۔"

"ہاں۔ لیکن دشمن وہاں سے کوچ کر گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں اور اس کے ایجنٹ ہیں تو انہیں یہ خیال کیسے آ سکتا ہے کہ میں انہی کے علاقے میں خیمہ زن ہوں۔"

"اور تم ان بھوتوں، چمگادڑوں اور الوؤں کے ساتھ کب تک رہو گے؟ جہاں بجلی تک نہیں ہے۔" رابعہ نے دکھی لہجے میں کہا۔ "خوف نہیں آئے گا تمہیں اتنے بڑے ویرانے کی تنہائی میں؟"

"نہیں۔ میرے ساتھ ایک تو یہ ہوگا۔" میں نے جیب کے اوپر نظر آنے والے ریوالور کو تھپک کر کہا۔ "دوسرے تمہارا تصور ہوگا۔ خوف کی گنجائش پھر کہاں ہوگی۔" لیکن میرے اس مذاق پر بھی وہ مسکرائی تک نہیں۔ تصور میں وہ مجھے گرد و غبار سے اَٹے ہوئے تاریک کمرے میں ابابیلوں اور چمگادڑوں کے شور میں گھونسلوں سے گرنے والے تنکوں کی بارش میں اور غلاظت میں دری پر سوتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ جو ایک مل اونر، چار سال برطانیہ میں تعلیم حاصل کر کے لوٹنے والا، ناز و نعم اور عیش و عشرت کی زندگی کا پروردہ تھا۔ بلندی کی چوٹیوں پہ آسمان نے ہم کو دے مارا۔ میں اب قاتل تھا اور مفرور مجرم تھا اور میری فرد جرم طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں زمانے کی نظر سے، پولیس کی نظر سے اور ہر صورت حال لے کر بھیڑنے والے شکاریوں سے چھپنے پر مجبور تھا اور وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔

"کس فکر میں مبتلا ہو؟" میں نے کہا۔ "میرا ساتھ دینا مشکل نظر آ رہا ہے؟"

"اب کیسی مشکل؟" وہ تلخی سے بولی۔ "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ مجبور میں ہوں، تم نہیں ہو۔ تم جو چاہو اپنی مرضی سے کر سکتے ہو۔ میں کیا کر سکتی ہوں فکر کرنے کے سوا؟"

"دیکھو رابعہ۔ میری تو یہی زندگی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس میں خطرات بھی ہیں اور مجھے معلوم نہیں کہ انجام کیا ہوگا۔ لیکن میں اپنی فطرت کو بدل نہیں سکتا۔ میں اپنے ارادے پہ قائم ہوں گا۔ تخت ہو یا تختہ۔ تم کسی امید پر انتظار کر سکتی ہو تو ضرور کرو۔ ورنہ مجھے میری تقدیر کے سپرد کر دو۔ میں واپس آیا تو صرف تمہارے لیے آؤں گا اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ وقت میری جان بہت قریب

نہیں ہے۔ لیکن میں نہ آؤں تو...؟"

"بس بس..." اس نے آنکھوں میں اتر آنے والے ایک قطرۂ اشک کو انگلی سے جھٹک دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "یہی ضروری باتیں کرنے کے لیے بلایا تھا تم نے مجھے؟"

میں نے ہاتھ پکڑ کے اسے پھر بٹھا دیا۔ "آئی ایم سوری لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم حقیقت کو نظر انداز نہ کرو۔ ابھی تک میں آزاد ہوں تو تمہاری ہی مدد کے طفیل۔ تم نے اپنی بساط سے بڑھ کر قربانیاں دیں لیکن اب حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ تمہاری مدد میرے کام نہیں آ سکتی۔ میں نے ابھی تک اپنا دفاع کیا اور قانونی جنگ لڑتا رہا۔ اس سے مجھے کیا ملا؟ میں ہر طرف سے محصور ہو گیا ہوں۔ اب میں نے کھلی جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے کیونکہ میں بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں۔ ساری عمر بھاگتے ہوئے کون گزار سکتا ہے۔ اب جو کچھ کرنا ہے خود مجھے کرنا ہے خواہ وہ قانونی طریقے سے ہو یا غیر قانونی طریقے سے۔ میرا مقصد بہرحال غلط نہیں ہے۔ یہ بھی غلط نہیں ہے کہ جنگ میں صرف ایک فریق کی جیت ہوتی ہے۔ میرا حوصلہ تم ہو، میرا مقصد تم ہو۔ اگر تمہاری آنکھوں میں آنسو ہوں گے تو... تو میں ہار جاؤں گا... میں مقابلہ ہی نہیں کر سکوں گا... مجھے سہارا دو پلیز۔ امید کے ساتھ اور خوشی کے ساتھ۔"

"خوشی مقدر میں ہو تو ملتی ہے سکندر۔" وہ زبردستی مسکرائی۔ "کوشش تو سب ہی کرتے ہیں۔ پھر بھی میں کوشش کروں گی کہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔"

"تم نے برا مانا میری بات کا؟" میں نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "میں کیا کروں رابعہ کہ تم ہی میری طاقت ہو اور تم ہی میری سب سے بڑی کمزوری بن گئی ہو۔"

"اچھا ڈائیلاگ ہے۔" محسن نے کیبن میں قدم رنجہ فرما کے کہا۔ "میں نے نوٹ کر لیا ہے۔"

"ساڑھے سات بجے تم کو 'قصر جمشید' پہنچنا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس طرح کہ کسی کو معلوم نہ ہو۔"

"وعدہ کرو کہ تم لوگ کوئی حماقت یا بہادری کا کارنامہ سرانجام نہیں دو گے۔" رابعہ نے کہا۔

"خطرے کی کوئی بات ہی نہیں۔ ہم دو چار گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔" میں نے محسن کو رابعہ کی نظر بچا کے آنکھ ماری اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ یہاں سے رکشا یا ٹیکسی لے لوں گا۔"

اگر میں شریفانہ لباس میں ہوتا تو اس وقت کوئی مجھے ماڈل ٹاؤن نہ لے جاتا لیکن وردی والے تھانیدار کو رکشا والا کیسے انکار کر سکتا تھا۔ راستے میں دو جگہ رکشا رکوا کر میں نے کچھ اور چیزیں خریدیں۔ ایک بہت مضبوط زنجیر اور دو انتہائی مضبوط تالے۔ ایک فٹ لمبا اور آدھے انچ موٹا لوہے کا کھونٹا جس میں لوہے کا ایک کڑا تھا۔ ایسے کھونٹے گوالے اپنی گائے بھینسوں کو باندھنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ پھر ایک ہوٹل سے میں نے اپنے قیدی کے لیے روٹیاں اور کباب خریدے۔ ماڈل ٹاؤن پہنچ کر میں نے رکشا کو سامنے والی کوٹھی کے دروازے پر روکا اور اسے وہیں رخصت کر دیا۔ اس نے سلام کیا اور بھاگ گیا۔ اندھیرے میں اوپر پہنچنے کے لیے مجھے لالٹین کی روشنی کا سہارا لینا پڑا۔ وہ اسی طرح بے بس بندھا ہوا پڑا تھا۔ کھانا قیدی کے سامنے رکھ کر میں نے کھونٹے کو ایک پتھر کی مدد سے دیوار میں ٹھونک دیا۔ پرانی ہونے کے باوجود دیواریں مضبوط تھیں اور کھونٹے کو پورا گاڑنا آسان نہ تھا۔ میں پسینے پسینے ہو گیا لیکن بیس منٹ کی محنت کے بعد صرف لوہے کا کڑا دیوار کے باہر لٹکتا رہ گیا۔ میں نے زنجیر کے ایک سرے پر دو حلقوں کو ملا کے ان میں کھٹکے سے بند ہونے والا ایک قفل لگا دیا۔ پھر میں نے اسے آزاد کر دیا۔ وہ میری اس کارروائی کو غور سے دیکھتا رہا تھا۔ "کھانا کھا لو۔" میں نے کہا۔ "مجھے واپس جانا ہے۔"

جب وہ کھانے سے فارغ ہو گیا تو میں نے زنجیر کے دوسرے کنارے کے آخری حلقوں کو آپس میں جوڑ دیا۔ یہ حلقہ اب اس کے ٹخنے سے ذرا اوپر دائیں ٹانگ پر پڑ گیا تھا۔ "جب تک میں نہ آؤں اس کو گھسیٹتے رہنا۔ بے کار رہنے سے کچھ کرنا اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ رسی نہیں کہ کٹ جائے۔" کمرے میں اب چمگادڑیں چکر لگا رہی تھیں اور ان کی صدائے احتجاج سے پورا محل گونج رہا تھا۔ میں نے ایک چراغ روشن کر کے ان کی راتوں کے سکون اور ان کی خلوت میں رخنہ اندازی کی تھی۔ وہ ان آوازوں سے وحشت زدہ لگتا تھا۔

"اگر تم چاہو تو یہ لالٹین بجھا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اندھیرے میں بدروحیں چمٹ جائیں گی تم سے تو گلہ مت کرنا۔ میں نے سنا ہے یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔" اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ بے بسی، مایوسی، خوف اور بے یقینی نے اس کی زبان گنگ کر دی تھی۔

ساڑھے سات ہو گئے تھے۔ میں نیچے اتر آیا اور سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ محسن دس منٹ بعد رکشا میں پہنچا۔ کرائے کے مسئلے پر ان کی تکرار جاری تھی کہ میں نے مداخلت کی۔ رکشے والے کی آواز بند ہو گئی۔ اس نے اچانک رکشے کو گیئر میں ڈالا اور کرایہ لیے بغیر فرار ہو گیا۔ کچھ دور جا کے اس کی رفتار کافی تیز ہو گئی تو اس نے سر گھما کے ہم دونوں کو ایک زبردست گالی دی اور رکشے کی رفتار بڑھا دی۔ میں اور محسن بے اختیار ہنسے۔

www.paksociety.com

"چودہ روپے آٹھ آنے میں ایک گالی۔ سوا سات روپے فی کس۔" محسن نے کہا اور قصرِ عشیہ کی تاریک عمارت کو دیکھنے لگا۔

"یہاں پہلے ایک مال تھا؟"

"ہاں۔ یا تو وہ سب کچھ سمیٹ کر نکل گیا۔ کب تک انتظار کرتا۔" میں نے کہا۔ "یا مر گیا۔ سرونٹ کوارٹر کا ملبہ ہو گیا ہے۔ میں نے اسے اوپر رکھا ہے۔ اس کے چیخنے چلانے کی آواز باہر نہیں آ سکتی۔"

"ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔" "تو سچ مچ بھوک لگ آئی ہے نا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ کام خطرناک ہے۔" کھانا ہم دونوں نے دریا کے دریچے کے ایک ہوٹل میں کھایا اور اسپیشل سروس کے باوجود ویٹر کے ساتھ وہی رویہ رکھا جو تھانیدار کی شان کے مطابق تھا۔ کھانے کے بعد پرتکلف سگریٹ منگوائی اور ڈکار لے کر باہر نکل گئے۔ بیرے اور ویٹر نے صرف سلام کیا۔ اگر ہم بل ادا کرنے پر اصرار کرتے تو وہ حیران ہوتا کہ یہ کیسا تھانیدار ہے؟ اور میں ہر طرح سے ایک عام تھانیدار نظر آنا چاہتا تھا۔

"ایک مثل ہے کہ جیسا دیس ویسا بھیس۔" میں نے باہر آ کے کہا۔ "دوسری مثل یہ ہونی چاہیے کہ جیسا بھیس ویسا رویہ۔"

"ہم کوٹ لکھپت تک مارچ نہیں کر سکتے۔" محسن نے کہا اور "ہمیں ان سے پہلے وہاں موجود ہونا چاہیے۔"

"سڑک اب بالکل سنسان تھی۔ میں نے محسن کو ایک درخت کے سائے میں تنے کے پیچھے چھپ جانے کے لیے کہا اور خود سڑک کے کنارے کھڑا رہا۔ پہلی ہیڈ لائٹس کے نمودار ہوتے ہی میں نے دستی آگے کا اشارہ کیا لیکن وہ ٹیکسی تھی۔" "ساڈا قصور مائی باپ نا۔" ٹیکسی ڈرائیور ہاتھ باندھ کے باہر نکلا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "کچھ نہیں، جاؤ۔ کوئی اور ٹیکسی دیکھی تھی تم نے ادھر آتے ہوئے؟"

"نہیں مائی باپ۔" ٹیکسی ڈرائیور نے اطمینان کا سانس لے کر خدا کا شکر ادا کیا اور بڑی گھبراہٹ میں روانہ ہو گیا۔ پھر جو کار آئی اس میں ایک فیملی تھی۔ میں نے اسے بھی روکا۔ رسمی تفتیشی سوالات کیے اندر جانے کی اجازت دی۔ وہ میرے اخلاق سے متاثر ہوئے لیکن تیسرے کو قانون سے تعاون مہنگا پڑا۔ وہ اکیلا تھا کانونٹ کے لہجے میں انگریزی بولنے والا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں تھا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اس کا ٹینس کا ریکٹ پڑا تھا۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔

"یس آفیسر؟" اس نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا اور میں نے درشت لہجے میں اسے نیچے آنے کا حکم دیا۔ وہ سخت برا مان کے باہر نکلا ہی تھا کہ محسن نے اسے پیچھے سے دبوچ لیا اور اس کے سر پر ریوالور کا بٹ مارا۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی محسن اسے گھسیٹ کر ایک طرف لے گیا۔ ایک منٹ بعد ہم دونوں گاڑی میں بیٹھے کوٹ لکھپت کی طرف رواں تھے۔ یہ فورڈ کورٹینا تھی، پرانا ماڈل مگر ستھری لگتی تھی۔

"زیادہ چوٹ تو نہیں آئی اسے؟" محسن نے پوچھا۔ "میں نے سخت وار تو نہیں کیا تھا۔"

"میرا خیال ہے اسے چوٹ بھی نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ "نازک مزاج تھا اس لیے بے ہوش ہو گیا۔ تھا کوئی رئیس زادہ۔"

ساڑھے نو بجے میں نے کار کو کچے راستے پر اتار دیا۔ نیو آباد علاقے میں مکان بہت دور دور بنے ہوئے تھے۔ میں نے نشانیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے آخری موڑ کاٹا اور ہیڈ لائٹس آف کر کے گاڑی کو ایک احاطے کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ باقی راستہ ہم نے پیدل طے کیا۔ چھوٹی سی مسجد کے مینار ہمیں صاف نظر آ رہے تھے۔

عشاء کی نماز قضا پڑھ کے نکلنے والے ایک شخص نے محسن کو غور سے دیکھا۔ "شاہ صاحب کا ڈیرا؟ کس سے ملنا ہے؟" میں اس سے ذرا فاصلے پر اس کی نظروں سے اوجھل سب کچھ سن رہا تھا۔

"شاہ صاحب سے؟" محسن نے کہا جو اس سوال کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔

"چھوٹے بادشاہ؟" وہ شخص ہنس پڑا۔ "پھر چالیس سال پہلے آنا تھا۔ وہاں تو اب ڈیرا بھی ٹوٹ گیا ہے۔"

"کوئی تو ہو گا وہاں؟" محسن نے کہا۔

"ہاں ہاں۔ مجاور ہیں۔" وہ بولا۔ "گدی نشینی کو اس کے بھائی نے مار دیا تھا۔ پھر تعویذ نے بکر کو مارا اور مجاور بن گیا۔ پتا نہیں گدی نشینی کی اس جنگ میں کتنے جان سے گئے۔ مرید بہت تھے بانٹ گئے۔"

"نذر نیاز سے بہت آمدنی ہوتی ہے کیا؟" محسن نے ایک اچھا سوال کیا۔

"تو اور کس لیے ہے یہ خون خرابہ چھوٹے بادشاہ؟" وہ شخص بولا۔ "لوگ ڈرتے ہیں ان سے۔ اور پھر یں... خیر جی۔ آپ جائے شاہ سے مل لیں۔ پہلے وہ گاما مانجھی تھا۔ میں نے سنا ہے۔ آگے بجا محلہ ہے اور گنبد ہے۔"

گاما مانجھی کے نام پر میں چونکا۔ وہ شخص جو میری قید میں تھا اس نے بتایا تھا کہ رحمت کباڑی اس کو لینے کے لیے گاما مانجھی کے اڈے پر آیا تھا اور وہاں سے سمجھتا تھا گویا اب گاما مانجھی رول کر رہا تھا۔ یہاں وہ گاما عشاہ تھا۔ بدمعاشی کے سارے کاروبار پر سجادہ نشینی کا پردہ۔ یہ پردہ تو عقیدت مندوں کی آنکھوں پر پڑا ہوا تھا جو حقیقت کو دیکھنے اور پرکھنے کے قابل نہ تھیں لیکن وہ باتونی شخص اندھا نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں اور کان سب کھلے ہوئے تھے اور وہ چھوٹا بادشاہ سب سمجھتا تھا۔ گنبد ایک قطعے کے حجرے پر تھا جس کا رنگ سبز تھا اور اس کے اوپر سبز رنگ کا پرچم بھی جس فٹ کی ڈنڈی سے باندھ دیا گیا تھا۔ یہ پرچم پرانے کپڑے کا ٹکڑا تھا جس کے کناروں پر گوٹا بھی کالا پڑ گیا تھا اور اوپر لگے ہوئے چھوٹے سے بلب کی مدھم روشنی میں ماحول زیادہ سوگوار اور پراسرار لگتا تھا۔ مزار کے دروازے بند تھے۔ حجرے سے متصل دیوار دونوں طرف پھیلی ہوئی تھی اور تقریباً اتنی ہی اونچی تھی جتنی مزار کی دیواریں۔ میں نے اور محسن نے اس فصیل کو ہر طرف سے گھوم پھر کے دیکھا لیکن ہمیں اندر جانے کا کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس سے زیادہ حیرت مجھے چاروں کونوں پر لگی ہوئی سرچ لائٹس کو دیکھ کر ہوئی جو گھومنے والی اور بہت بڑی تھیں۔ بالکل ویسی ہی جیسی میں نے سنٹرل جیل کی بیرونی دیواروں پر نصب دیکھی تھیں۔

"سکیورٹی کا یہ اہتمام کس لیے ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ دس فٹ اونچی دیوار، سرچ لائٹس؟"

"ایسے انتظامات کی ضرورت وہی محسوس کرتا ہے جسے کوئی ڈر ہو۔" محسن نے کہا۔

"اندر جانے کے لیے وہی ایک دروازہ ہے مزار والے حجرے کا۔" میں نے کہا۔

"دیوار کے اوپر بھی نوکیلے تیز دھار والے شیشوں کے ٹکڑے بچھ دیے گئے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"بقول شاعر، پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر، لیکن کبوتر کو بام یار پہ تو جانا ہے۔"

محسن نے میرے کندھے پر قدم جمائے اور اندر جھانکتے ہوئے رننگ کمنٹری شروع کی۔ "تین درجہ دائیں جانب شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ کمرے ہیں۔ ایک دو... تین چار۔ ان کی چھت دیوار سے ایک فٹ نیچے ہے اس لیے باہر سے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ بائیں طرف ایک ٹرک کھڑا ہے اور ایک ٹرک کا کیبن۔ سوری ایک جیپ۔ ایک کمرے میں روشنی ہے۔ بندہ بشر کوئی دکھائی نہیں دیتا۔"

میں نے اسے نیچے گرا دیا۔ "میں ٹرانسپورٹ کا دھندا نہیں ہوں کہ تیری تشریحات جلتی رہیں گی۔ یہ بتا اندر جانے کا راستہ کوئی نہیں تو ٹرک اور جیپ اندر کیسے پہنچے؟"

"یہ فقیر کا ڈیرا ہے، نابکار! یہیں کا اڈا نہیں۔" محسن نے کپڑے جھاڑ کر کہا۔ "اور فقیروں کی کرامات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہ سوئی کے ناکے سے اونٹ گزار سکتے ہیں تو دروازے کی جگہ سے ٹرک کیوں نہیں نکال سکتے؟"

"اب تو واپس جا، گاڑی میں رسّے کے فٹ سیٹ ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "چاروں نکال لا۔"

چار فٹ سیٹ ایک کے اوپر ایک رکھنے کے بعد نوکیلے شیشوں پر قدم جمانا کوئی مشکل کام نہیں رہا تھا۔ میں نے محسن کو اوپر اٹھایا اور وہ سیٹ پر کم سے کم دباؤ ڈالے بغیر دیوار پر چڑھ گیا۔ اس کے پاؤں میں ربڑ سول کے جوتے بھی تھے۔ چنانچہ وہ ایک فٹ چوڑی فصیل پر کھڑا ہوا تو اس کے وزن سے کچھ شیشے ٹوٹے۔ پھر اس نے ٹھیک کر میرا ہاتھ تھاما اور مجھے اوپر کھینچ لیا۔ احاطے کی بیرونی دیوار تقریباً سو فٹ لمبی تھی۔ ہم ٹرک کے بالکل پیچھے کھڑے تھے اور وہ روشن حجرہ ہم سے سو فٹ دور تھا جس میں کسی نے روشنی بجھائی تھی۔ بالکل سامنے سے اور بلندی سے ہم روشنی میں کم سے کم تین جانے تو کو دیکھ سکتے تھے۔ "بسم اللہ کیجیے قبلہ۔" میں نے کہا۔ "گر جائیے۔"

"پہلے آپ بندہ نواز۔" محسن نے کورنش بجا لا کے کہا لیکن میں نے اسے آگے دھکیلا۔ وہ دھم سے کودا۔ پھر میں نے چھلانگ لگائی اور محسن کے قریب ہی لینڈ کر گیا۔ دونوں کے گٹے ٹخنے سلامت رہے اور ہم ٹرک کی اوٹ میں آگے بڑھے۔ ابھی تک کسی کو شاہ صاحب کے حجرے میں دو عقیدت مندوں کے تشریف لانے کی خبر نہیں ہوئی تھی۔

"یہ تو ہے ٹرک۔" میں نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "اور میں ایک سنسنی خیز انکشاف کرتا ہوں۔ یہ میرو نز بینڈ لیکس کا وہی ٹرک ہے جس میں اس کے مالک نے خاکسار کو پیک کر کے ارسال کیا گیا تھا۔ میں نے اس کے نام "ایم ڈبلیو ٹی" کے حروف کھرچ کر ترمیم کی تھی۔ اس کے مٹے ہوئے حصوں پر نیا رنگ ہے حالانکہ اس کا نمبر اب وہ نہیں۔ مگر ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں۔"

"لیکن اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" محسن خان نے ٹرک کے اندر جھانک کر کہا۔

میں نے ریڈی ایٹر کے پانی میں رومال بھگو کر نمبر پلیٹ پر رگڑا۔ رومال سیاہ ہو گیا اور کچھ سیاہی اتری تو وہ صاف نظر آنے لگا۔ کمرشل نمبر پلیٹ کا رنگ کالا تھا اور حروف سفید تھے چنانچہ میں نے بھی نمبر آسانی سے بدل لیے تھے اور میرے طریقہ واردات کی نقل کے لیے عقل کسی کو استعمال نہیں کرنی پڑی تھی۔ تھوڑا سا اور رگڑنے پر جو حرف اصل نظر آتا تھا وہ "ای" بن گیا۔ محسن اسی عمل کے ذریعے جیپ کا نمبر دریافت کرنے میں مصروف تھا کہ پہلے کسی ٹرک کی ہلکی سی آواز اور پھر روشنی جھلملائی۔ میں نے اور محسن نے چونک کر دیکھا۔ زمین سے بلندی کی جانب دو عمودی روشن لکیریں تاریک آسمان میں صاف نظر آ رہی تھیں اور یہ روشنی زمین سے پھوٹ رہی تھی۔ پھر ہم سے پچاس گز دور بائیں جانب اور مزار کے بالکل سامنے کی دیوار کے قریب زمین جیسے نشیبی خلا سے ایک ٹرک طلوع ہوا اور ہماری طرف آیا۔ میں اور محسن ابھی تک ٹرک کے پیچھے تھے۔ اگر ہم وہیں کھڑے رہتے

تو یقیناً پکڑے جاتے۔

پناہ کی واحد جگہ ٹرک کے نیچے تھی۔ میں نے اور محسن نے غوطہ مارا اور ٹرک کے چاروں پہیوں کے نیچے سمٹ کر لیٹ گئے۔ دوسرا ٹرک سیدھا گزر گیا اور پھر ریورس میں واپس آیا۔ آہستہ آہستہ فاصلہ کم ہوتا گیا۔ ٹرک میں سے ڈرائیور کا نائب اتر کر پیچھے اتر آیا تھا۔ وہ ڈرائیور کو سگنل دیتا رہا۔ "آنے دو۔ آنے دو استاد۔ تھوڑا دائیں کو کاٹ کے۔۔۔ بس۔۔۔" اگر وہ کھڑے ہوئے ٹرک سے ٹکرا جاتا تو ہم دونوں کا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔ ہم پہیوں کے آگے بڑھنے سے کچلے جاتے یا ہاتھ پیر سے محروم ہو جاتے لیکن ڈرائیور ہوشیار اور بہت محتاط تھا۔ دونوں ٹرک چند انچ کے فاصلے سے یوں کھڑے ہو گئے کہ ایک کا منہ مشرق کی طرف تھا تو دوسرے کا مغرب کی طرف لیکن پشت کی جانب سے دونوں کے کھلے حصے تقریباً مل گئے تھے۔ زیر زمین لمبے چوڑے راستے کی موجودگی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ نہ جانے یہ راستہ کتنی دور تک نشیب میں جانے کے بعد بلندی کی طرف پھیلتا ہوگا اور کسی ایسے احاطے یا بیرک نما گیراج میں نکلتا ہوگا جس کا شاہ صاحب کے ڈیرے سے تعلق کسی کے وہم و گمان میں نہ آ سکے۔ بقیہ چند تو مزار کے قریب تک آ کے لوٹ جاتے ہوں گے۔ اندر کا حال انہیں کیا معلوم۔ ممکن ہے وہاں بھی زیر زمین راستے کا انکشاف بھی کسی ترپال یا تختے وغیرہ سے ڈھک کر بند کر دیا جاتا ہو۔

میں اور محسن دم سادھے لیٹے رہے۔ ڈرائیور نے اپنے ماتحت کو حکم دیا کہ وہ سامان رکھے اور خود گامے شاہ کو سلام کرنے چلا گیا۔ ہم نے نیچے سے سر گھما کے دیکھا۔ جس کمرے میں روشنی تھی اس میں سے تین افراد باہر نکل آئے تھے اور ڈرائیور انہی سے ملنے جا رہا تھا۔ اوپر کی دھمادھم سے میں نے اندازہ کیا کہ ماتحت ٹرک کے سامان کو منتقل کر رہا ہے۔ میں نے باہر نکل کے ٹرک کی سائڈ سے سامان کی منتقلی کے کام کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ چاروں سرچ لائٹس روشن ہو گئیں۔ ان کا رخ اندر کی طرف اور نیچے تھا۔ پورا احاطہ اس چندھیا دینے والی روشنی میں یوں نظر آنے لگا کہ گھاس کا تنکا بھی حرکت کرتا تو پتا چل جاتا۔ ڈرائیور نے باری باری تینوں افراد سے ہاتھ ملایا۔ ان کی آواز تو ہم تک پہنچ رہی تھی لیکن بات کوئی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ سب ہم سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔

"رانجھے کا کوئی پتا نہیں شاہ صاحب۔" ڈرائیور نے کہا۔ "اس کی لڑکی کو بھی معلوم نہیں۔"

"اسے معلوم ہوگا۔" گامے شاہ جی نے غرا کے کہا۔ "تم اسے یہاں لاتے۔ میں خود پوچھتا اس سے۔"

"وہ اکیلی تھی نا جی۔ ساتھ والوں کے گھر گئی ہے۔ وہ کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔

"خیر اس کا پتا تو چل جائے گا۔" گامے نے کہا۔ وہ بھاری بھر کم پہلوانوں جیسے جسم والا دراز قد آدمی تھا جس کی گھنی داڑھی تھی، لمبی زلفیں تھیں اور پاٹ دار آواز تھی۔ اس نے ریشمی شرٹ لاچے پر پہن رکھی تھی۔ کالر تک بٹن لگا تھا اور کندھے پر چار خانے والا رومال ڈالا ہوا تھا۔ "مال اب رحمت لے جائے گا۔ رحمت اور تم۔"

"گامے شاہ جی۔" ڈرائیور بولا۔ "کراچی میں کریم بھائی گروپ والے ہیں۔ اس کے شیر شاہ والے گودام پر کوئی چھاپا نہیں پڑا تھا۔ وہ اس کے اپنے آدمی تھے۔ سارا ڈراما تھا۔ وہ مال ہضم کر گیا۔"

"مال تو میں اس کے حلق سے نکلوا لوں گا۔" گامے شاہ نے کہا۔ "لیکن تو کیسے جانتا ہے؟"

"ایکسائز والوں نے بتایا ہے جی۔ اپنا ہی آدمی ہے۔ اخبار کی خبر جھوٹی تھی۔" ڈرائیور بولا۔ "اور صرف ایک اخبار میں آئی تھی۔ اس نے کسی سے مل ملا کے چھپوائی تھی۔ رحمت کی لڑکی کو بھی معلوم ہے۔"

"ایکسائز میں پیارا سالا انسپکٹر ہے جی۔" دوسرے شخص نے کہا۔

"پیار علی۔ اس نے میری بیوی کو فون کیا تھا۔"

"اپنے اس پیار علی کو سمجھا دینا کہ ایسی باتیں عورتوں سے کرنے کی نہیں ہوتیں۔" گامے نے بے رخی سے کہا۔

"میں نے اسے سمجھا دیا تھا جی۔ اور بیوی کو بھی کہ زبان سے ایک لفظ نکالا تو زندہ گاڑ دوں گا۔" ڈرائیور سہم کر بولا۔

"یاد ہے نا اس سے پہلے والے ایکسائز انسپکٹر کو اس کی غلطی کی کیا سزا دی تھی ہم نے؟" گامے نے کہا۔

"یاد ہے شاہ جی۔ یہ نیا ہے لیکن بے وقوف نہیں ہے۔" ڈرائیور اب پشیمان تھا کہ اس نے بیوی سے فون پر گفتگو کا حوالہ ہی کیوں دیا۔

"کام بچے گا تو سب سے زیادہ کام کا ثابت ہوگا۔"

"کام ٹھیک کرے گا تو خود بھی موج کرے گا۔ کریم بھائی سے میں بات کر لوں گا۔" گامے نے کہا اور واپس ہو گیا۔

"کتنا مال رہ گیا ہے بھیرے؟" ڈرائیور نے چلا کر کہا۔ "جانا بھی ہے گھنٹے بھر میں۔"

"ختم کیا استاد جی۔ بس دو منٹ۔" چھوٹے نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ "اور پھر چھٹی لے کے آ جا بالما" گانے لگا۔ بہت لہک لہک کر۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ چھوٹے سمیت چار افراد اپنی آرام گاہ کی جانب جاتے ہوئے رکے۔ انہوں نے احاطے کے وسط سے ایک تختے کو کھینچنا شروع کیا۔ تختے میں یقیناً پہیے تھے یا زنجیر تھی جس سے وہ اسے کھینچ رہے تھے۔ اس تختے کو انہوں نے زیر زمین راستے کے سوراخ پر رکھ دیا۔ پھر وہ دوسرا تختہ کھینچ

ہوئے لے گئے اور پہلے تختے کے برابر رکھ دیا۔ تختے یقیناً بہت بھاری تھے کیونکہ انہیں پوری طاقت صرف کرنی پڑ رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک کر کے چھ تختے لے گئے اور انہیں برابر جما دیا۔ سرچ لائٹس آف ہو گئیں تو میں اور محسن ٹرک کے نیچے سے نکلے۔ پہلے ہم نے اس مال کا جائزہ لیا جو ایک ٹرک سے دوسرے ٹرک میں منتقل کیا گیا تھا۔ یہ سب لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کریٹ تھے جن پر ہیروز اینڈ کمپنی لکھا ہوا تھا۔ لائٹر جلا کے دیکھنے پر مجھے ہر کریٹ کے اوپر ایک چھپی ہوئی سلپ بھی چسپاں نظر آئی۔ ہر سلپ پر مال کی کیفیت درج تھی۔ بظاہر ان میں نٹ بولٹ تھے اور مختلف سائز کے پیچ تھے اور سب پر "زرعی آلات کے پرزے" لکھا ہوا تھا لیکن ایک ہی کریٹ کو ہاتھ لگا کے دیکھنے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ مال کچھ اور ہے۔ اگر ان میں لوہے کے نٹ بولٹ ہوتے تو ان کا وزن چار گنا ہوتا لیکن اس وقت نہ کسی کریٹ کو کھول کر دیکھا جا سکتا تھا اور نہ اس احاطے کے باہر اسمگل کیا جا سکتا تھا۔ اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ یہ ایکسائز اور کسٹم والوں کی گرفت میں آنے والا مال ہے۔ "زرعی آلات کے پرزے" ہوتے تو اتنا لمبا چکر ہی کیوں ہوتا۔

"کیا خیال ہے اب؟" محسن نے کہا۔ "سب کو دھر لیں؟ تیری پولیس کی وردی کام آ سکتی ہے۔ ہم ایک ایک کو ہینڈز اپ کرا سکتے ہیں بلکہ گولی بھی مار سکتے ہیں۔"

"ابھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انڈر گراؤنڈ راستہ کہاں جا کے نکلتا ہے۔ اس کے لیے تجھے مال کے پیچھے چھپ کر جانا ہوگا۔ میرا خیال ہے سرنگ زیادہ لمبی نہیں ہو سکتی۔ سو سوا سو گز کے اندر ہی دوسری جگہ ہوگی جہاں سے ٹرک باہر نکلے گا۔ پھر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مال کہاں کہاں جاتا ہے۔"

"مال کراچی جائے گا سیٹھ کریم بھائی کے پاس جس کا گودام شیر شاہ میں ہے۔" محسن بولا۔

"ہو سکتا ہے میں کراچی چلا جاؤں۔" میں نے کہا۔ "مجھے دو نام معلوم ہوتے ہیں۔ کریم بھائی اور ایکسائز انسپکٹر پیار علی کا۔ یہ بہت بڑا لنک ہے۔ مجھے اس اخبار کے دفتر جانا پڑے گا جس میں چھاپے کی خبر شائع ہوئی تھی۔ وہ ایک ہی اخبار تھا۔ میں دیکھوں گا رپورٹر کون تھا۔ وہ کریم بھائی کے شیر شاہ والے گودام کا صحیح پتا بتا سکے گا۔ پیار علی کو تلاش کرنا تو کوئی مشکل کام نہیں ہونا چاہیے۔"

آہستہ آہستہ ہم اس طرف چلنے لگے جدھر سے دوسرا ٹرک اندر آیا تھا۔ یہ انتہائی حیرت کی بات تھی کہ اس جگہ کا اب پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ دس فٹ چوڑے اور کم سے کم بیس فٹ لمبے سرنگ جیسے راستے پر تختے بڑی صفائی سے بچھائے گئے تھے۔ تختوں کے اوپر بجری تھی اور مٹی میں برابر کی ہوئی گھاس تھی چنانچہ وہ جگہ باقی احاطے میں مل گئی تھی جس میں ایسی ہی گھاس تھی۔ فرق صرف اوپر چلنے سے محسوس ہوتا تھا۔ دیکھنے سے نہیں۔ ہر تختہ اسی لیے بھاری ہو گیا تھا کہ اس پر چار چار انچ مٹی اور گھاس کا وزن تھا لیکن وہ اپنے خفیہ راستے کو کیموفلاج کرنے میں کامیاب تھے۔ میں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہمارا آگے جانا خطرناک ہو سکتا ہے۔ اگر سرچ لائٹس اچانک روشن ہو گئیں یا وہ لوگ نکل آئے تو اس سپاٹ میدان میں ہم چھپے نہ رہ سکیں گے۔

"میرا خیال ہے کہ ٹرک کے ساتھ دو ہی آدمی روانہ ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جیپ ساتھ جائے۔ اگر جیپ پیچھے ہوئی تو میں کار سے کور کراؤں گا۔ گھبرانا نہیں۔ ضرورت پڑے تو بے دریغ گولی مار دینا۔"

"میں بھی اگر میں زندہ سلامت یہاں سے نکلنے میں کامیاب رہا تو پھر ملاقات ہوگی۔" محسن نے ٹرک پر چڑھتے ہوئے کہا۔

"پیچھے غالباً چھوٹو ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔ "جیسے ہی موقع ملے اسے ناک آؤٹ کر کے باہر پھینک دینا ورنہ اس نے تجھے دیکھ لیا تو یہی سلوک تیرے ساتھ ہوگا۔ میں سڑک پر گاڑی لیے کھڑا ہوں گا۔ یہ لوگ ایک گھنٹے میں روانہ ہوں گے۔"

میں نے چند کریٹ کھسکا کے محسن کے لیے جگہ بنائی۔ پھر اپنے ساتھ لے کر واپس اسی جگہ پہنچا جہاں سے ہم اندر کودے تھے۔ محسن نے مجھے اوپر اٹھایا اور میں دیوار پر قدم جما کے باہر کود گیا۔ کار تک پہنچنے میں میرے دس منٹ صرف ہوئے۔ یہ مشن جو رحمت کباڑی کی تلاش اور گرفتاری کے سوا کچھ نہ تھا اب غیر متوقع طور پر لمبا ہو گیا تھا کہ رحمت کباڑی کون ہے اور گاما پاچی کون ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ جس شخص کو میں نے قید کر رکھا ہے وہ رانجھا ہے۔ اس کا اصل نام یہ نہیں ہوگا۔ یہ اس کی عرفیت تھی۔ وہی ایک آدمی ہماری تحویل میں ہے جس کے بارے میں گامے کو تشویش تھی اور اس نے رانجھے کی بیٹی کا حوالہ بھی دیا تھا۔ یہ میرے لیے اطمینان بخش بات تھی کہ پنڈورہ میں رہنے والا کوئی ایسا بھی ہے جو اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔

لیکن کار سمیت سڑک پر پہنچا تو مجھے خیال آیا کہ اب رانجھے کا کیا ہوگا۔ وہ رات بھر بھوکا پیاسا اندھیرے میں پڑا رہے گا۔ کچھ کھائے پیے بغیر؟ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ رحمت کباڑی مل گیا تو اگلے دن دوپہر یا شام تک اسے رہائی مل جائے گی لیکن اب ہماری واپسی غیر یقینی ہو گئی تھی۔ محسن کی طرف سے میں مطمئن تھا کہ اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ ایک گھنٹے بعد وہ روانہ ہوں گے تو بالکل مطمئن ہوں گے کہ ان کے سوا ٹرک میں کوئی نہیں اور لکڑی کے بکسوں کے درمیان چھپا ہوا محسن ان کو نظر بھی نہیں آئے گا۔

قسمت ہی ساتھ نہ دے تو اور بات ہے۔ ایک چیکنگ اس کی موجودگی کا راز افشا کر سکتی ہے لیکن وہ مسلح ہے اور کسی کے قابو میں نہیں آ سکتا۔ وہ ایک آدھ کو مار کے بھی نکل آئے گا۔

سڑک کے کنارے کار روک کے میں نے سگریٹ سلگائی اور انجن کا بونٹ کھول دیا تاکہ معلوم یہ ہو کہ گاڑی گرم ہو گئی ہے یا کسی خرابی کے باعث میں وہاں رکنے پر مجبور ہوں۔ پولیس کی وردی پہن کے میں نے بہت اچھا کیا تھا۔ اگر میں سادہ کپڑوں میں ہوتا تو مجھے پکڑے جانے کا خدشہ لاحق رہتا۔ وردی سے مجھے دوسرا فائدہ یہ تھا کہ میں ہر تھانیدار کی طرح من مانی کر سکتا تھا۔ جیسے ضرورت ہونے کی صورت میں کسی سے بھی رشوت لے سکتا تھا۔ کسی بس یا ویگن والے سے جس نے زیادہ یا بغیر ٹکٹ سواریاں بٹھا رکھی ہوں، ٹریفک کی خلاف ورزی کرنے والوں سے کسی بھی بہانے سے میں مانگ سکتا اور بل ادا کرنے کے لیے رقم نہ ہو تو کہیں بھی کھانا کھا کے ڈکار لیے بغیر روانہ ہو سکتا تھا۔ سواری کے لیے کسی بھی رکشا ٹیکسی کو پکڑ سکتا تھا۔ شریفانہ لباس میں آدمی کتنا مجبور ہو جاتا ہے۔ تھانیدار کی وردی میں کتنا خود مختار۔ میری جیب میں ابھی ڈھائی ہزار کی نقد رقم موجود تھی اور یہ بھی اسی تھانیدار کی کمائی تھی جس کی وردی میں نے زیب تن کر رکھی تھی لیکن میں سوچ رہا تھا کہ وردی اور یہ رقم کب تک میرا ساتھ دیں گے۔

ابھی کچھ واضح نہیں تھا کہ گامے شاہ کے آدمی ٹرک لے کر کہاں جائیں گے۔ اپنا مال کسی مال گاڑی میں بک کرائیں گے یا سیدھا کراچی لے جائیں گے۔ میں نے محسن سے کراچی جانے کی بات تو کر دی تھی مگر کراچی جانا آسان نہیں تھا۔ یہ بھی مشکل تھا کہ میں کراچی نہ جاؤں۔ کریم بھائی اور سیار علی سے مل کر بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ میں محسن کو واپس بھیج دوں تو یہ بھی ضروری تھا کہ میں رحمت کباڑی کو کراچی پہنچنے سے قبل ہی گرفتار کر لوں۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ کیوں نہ میں ٹرک کو راستے میں ہی غائب کر دوں۔ رحمت کباڑی، پھوٹو اور ٹرک ڈرائیور کو گرفتار کر لوں اور ٹرک کو ایسے تباہ کروں کہ اس کا سراغ نہ ملے۔ گرفتاری کے بعد پھوٹو اور ٹرک ڈرائیور کو رہا کر دیا جائے تاکہ وہ واپس جا کے گامے شاہ کو اس واردات کی خبر دے سکیں۔ الزام پھر کریم بھائی پر آئے گا۔ اس نے پہلے ڈراما کیا تھا کہ گودام پر چھاپا پڑ گیا اور اسمگلنگ والے مال لے گئے مگر اس کا جھوٹ کھل گیا تھا۔ اب گامے شاہ کو شک ہوگا کہ ٹرک اس کے آدمی لے گئے۔ یہ رپورٹ بھی دلاور کو مل گئی ہوگی کہ ٹرک کی میرو ڈیپارٹمنٹ کمپنی کا تھا جس میں زرعی آلات کے پرزے تھے۔ وہ ضرور شک کرے گا کہ گامے شاہ اسے بتائے بغیر کراچی میں کریم بھائی کو خبر کر رہا ہے اور یہ اس نے دوسرا ہاتھ مارا ہے۔

کچھ راستے پر دور سے ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں تو میں نے بونٹ بند کیا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔ کار میں فیول میٹر کی سوئی آدھے سے زیادہ ٹینک فل بتا رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ میں سوئی تک ٹرک کا تعاقب کر سکتا ہوں۔ ٹرک کے پیچھے کوئی جیپ نہیں تھی جو بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ قریب آنے پر میں نے ٹرک کو پہچان لیا۔ ٹرک نے کراچی جانے والی سڑک پر سفر شروع کیا تو میں سو گز کا فاصلہ دے کر اس کے پیچھے ہو لیا۔ ایک موڑ پر ٹرک کی رفتار کم ہوئی تو میں نے ٹرک میں سے کوئی چیز اڑ کر جھاڑیوں میں گرتی دیکھی۔ محسن نے چھلانگ اس طرح اور ایسی جگہ لگائی تھی کہ اسے کم سے کم چوٹ آئے۔ میں نے کار روک کے دیکھا، وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور بہت دیر سے ہانپ رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" میں نے کار روک کے پوچھا۔ "کیوں شور کر رہے ہو؟"

"ابھی مر گیا میں تھانیدار صاحب۔ مجھے ٹرک میں سے پھینک دیا۔ وہ جا رہا ہے ٹرک!" اس نے فریاد کرتے ہوئے کہا۔

"کس نے پھینک دیا؟" میں نے کہا۔ "اور وہ ٹرک کہاں کا تھا؟"

اس کے پاس دونوں سوالوں کا جواب نہیں تھا چنانچہ وہ چلایا۔ "آپ پہلے اسے پکڑیں۔ وہ نکل جائے گا۔"

"اچھا اچھا۔" میں نے اس کی تسلی کے لیے کہا۔ "تمہیں چوٹ تو نہیں آئی ہے نا۔ اسی جگہ کھڑے رہو۔ میں پکڑتا ہوں اسے۔" میں نے کار کی رفتار بڑھائی اور دس منٹ میں ٹرک کو جا لیا۔ محسن نے کریٹ کے پیچھے سے سر نکال کے ہاتھ ہلایا۔ میں نے جواب میں دو انگلیوں سے وی بنایا اور مٹھی بند کر کے انگوٹھا دکھایا جس کا مطلب تھا کہ آل او کے۔ اب میں منتظر تھا کہ کہیں ٹریفک کم ہو تو ٹرک کو روکوں۔ اچانک ایک ریلوے کراسنگ آ گئی۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا کہ اتر آئے۔ وہ پلک جھپکتے میں سڑک پر کود گیا اور کار میں آ بیٹھا۔ وہ اپنے کارنامے پر بہت خوش تھا۔

"بڑے موڑ میں کان پہ ہاتھ رکھے ایکشن لگا رہا تھا۔ بہت ڈانٹ ڈپٹ تھا۔" محسن خان نے کہا۔ "ٹرک کا شور اتنا تھا کہ اسے میرے ٹیلنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ چوٹ تو نہیں آئی اسے؟"

"نہیں۔ میں اسے وہیں روک آیا ہوں۔ کسی اور سے اب کچھ نہیں کہے گا۔" میں نے کہا۔

تین میل بعد مجھے موقع ملا اور میں نے کار آگے نکالنے کا فیصلہ کیا اور رفتار بڑھا دی۔

"میں ان سے بات کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تو ایک جگہ کہیں سڑک کے کنارے رکو دینا۔ میرا خیال ہے کہ پہلے ڈرائیور اترے گا اور مجھے الگ سے جا کر معاملہ طے کرے گا۔ اسے فوراً

بی ڈالتا ہے پیچھے دوسرے سے نمٹ لوں گا۔"

میں نے کار آگے نکال کے ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا اور اس کا راستہ روکنے لگا۔ آہستہ آہستہ میں بالکل ٹرک کے سامنے آ گیا اور ٹرک ڈرائیور رفتار کم کر کے رکنے پر مجبور ہو گیا۔ میں اطمینان سے نیچے اتر آیا۔

"کیا بات ہے تھانیدار صاحب؟" ڈرائیور نے سلام کر کے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "کوئی غلطی ہوئی ہم سے مائی باپ؟" وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ نیا انسپکٹر کہاں سے آیا۔ اس راستے پر وہ سب کو جانتے ہوں گے اور سب کو ان کا حصہ پہنچا دیتے ہوں گے چنانچہ ان کے لیے خطرے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

"نیچے اتر گورنر کی اولاد۔" میں نے کہا۔ "کاغذات دکھا۔"

وہ کاغذات لے کر نیچے اتر آیا۔ کاغذات بالکل ٹھیک تھے۔ "کیا لے جا رہے ہو؟" میں نے پیچھے نظر ڈال کے کہا۔

"وہی جو ہمیشہ لے جاتے ہیں مائی باپ۔" وہ گول مول الفاظ میں بولا۔

"کیا لے جاتے ہو ہمیشہ، اپنی ماں کا سر؟" میں نے گرج کے کہا۔ "یہ اسپیشل چیکنگ ہے۔ خود ایس پی صاحب نگرانی کر رہے ہیں۔ منشیات کا ایک ٹرک پشاور سے آ رہا ہے۔"

"توبہ توبہ۔" ڈرائیور نے دونوں کانوں کو چھو کر کہا۔ "اللہ معاف کرے ایسے دھندے سے۔ ہم تو جناب مالی پرزے لے جاتے ہیں۔ ٹریکٹر کے، چاول اور کپاس چھڑنے کی مشینوں کے، کمپنی زرعی آلات بناتی ہے۔"

میں نے ریوالور نکال لیا۔ "زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس۔ کریٹ کھولو۔"

اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ "آپ مالک سے بات کر لیں جناب عالی۔ ہم تو نوکر ہیں۔"

وہ چلتا ہی تھا کہ میں نے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبا لیا۔ وہ تھوڑا سا تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ میں نے اسے وہیں ڈال دیا اور پیچھے گیا۔

"تم مالک ہو اس کے؟" میں نے کہا۔ "مجھے تلاشی لینی ہے۔ ڈرائیور کہتا ہے تم سے بات کروں۔" میں نے اسپیشل چیکنگ والی بات پھر دہرائی۔ رحمت کباڑی چالیس سال کا ضرور ہوگا لیکن اس کی صحت قابل رشک تھی۔ وہ آہستہ آہستہ نیچے اترا۔ اسی وقت میں نے محسن کو کار سے اتر کے ٹرک کی دوسری سائیڈ سے پیچھے جاتے دیکھا۔ "اس میں کیا ہے تلاشی کے لیے تھانیدار جی؟" رحمت نے مالکانہ نخوت سے کہا۔

"سب پتا نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں خود دیکھ لوں گا لیکن ایس پی...؟"

"ایس پی کون ہے؟" وہ بے نیازی سے بولا۔ "پرانے صاحب؟"

"ایس پی اینٹی کرپشن اے آر مغل۔" میں نے کہا۔ "بہت سخت آدمی ہے۔"

"سخت تو سب ہی ہوتے ہیں بادشاہو۔ نرم کر لیں گے ہم۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"اپنے ہاتھ اوپر رکھو۔" میں نے سخت لہجے میں حکم دیا لیکن وہ اتنی دیر میں ایک پیکٹ نکال چکا تھا۔

"ادھر آ جائیں سرجی۔" وہ بولا۔ "سڑک پر کھڑے ہو کے کیا کرنی۔ آپس کا معاملہ ہے۔"

وہ مجھے سڑک سے ذرا دور لے گیا جہاں دو درختوں کی اوٹ میں ہم کسی سڑک پر سے گزرنے والی گاڑی کی روشنی میں نہیں آ رہے تھے۔ "سو میں یہ روٹ پرمٹ مل جائے گا جناب؟" وہ معنی خیز انداز میں دانت نکال کے بولا۔ اس کی ہزار روپے کے سو نوٹوں کی تھی۔

"مال کیا ہے؟" میں نے دس ہزار کی گڈی پر نگاہ ڈالے بغیر کہا لیکن لہجہ بدل دیا۔

"مال تو پرزے ہی ہیں۔ چیک کر لو جی۔" وہ بولا۔ "ابھی کوئی اور رش آ جائے تو جھگڑے والے، ہم تو دونوں کے بھلے کی بات کرتے ہیں۔"

"ایسے مشکل ہے۔ پشاور سے پورا ٹرک روانہ ہونے کی اطلاع ملی تھی اور مخبر نے خود ایس پی صاحب کو بتایا تھا کہ پھیرا آج کا ہے۔" میں نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ہم اب دشمنوں کی طرح نہیں پارٹنرز کی طرح بات کر رہے تھے۔ رازداری کے ساتھ اور بے خوف و خطر۔

"چھڈو جی۔ یہ لو اب مت بولنا۔" اس نے دوسری گڈی برآمد کی لیکن وہ بہت چالاک آدمی تھا۔ اگر میں اس کی طرف سے غافل ہوتا تو یقیناً مارا جاتا۔ میرے ریوالور جیب میں رکھنے کے بعد اس نے سمجھا تھا کہ اب خوف ٹل چکا ہے اور اس کا کام آسانی سے تمام کیا جا سکتا ہے۔ نوٹوں کی دوسری گڈی کے ساتھ ہی اس نے دوسرے ہاتھ سے ریوالور نکال لیا۔ اس نے کچھ غیر معمولی جلدی کی یا گھبراہٹ میں اس طرح دوسرا ہاتھ جیب میں ڈالا کہ میں چوکنا ہو گیا ورنہ وہ مجھے گڈیاں تھمانے کے بعد بھی اطمینان سے ریوالور نکال سکتا تھا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ دیر سے کام خراب نہ ہو جائے اور کوئی گاڑی نہ آ جائے۔ گاڑیاں تو مسلسل گزر رہی تھیں لیکن شک کسی کو نہیں ہوا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ ایک کار اور ایک مال بردار ٹرک ساتھ ساتھ کھڑے تھے گویا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ممکن ہے ایک گاڑی خراب ہوا اور دوسرا اس کی مدد کر رہا ہو یا دونوں آپس میں الجھ گئے ہوں اور اب لڑ جھگڑ کے اپنے اپنے

www.paksociety.com

نقصانات کی تلافی کر رہے ہوں۔ محسن اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔

قاتل اس نے بڑی عجلت میں کیا تھا لیکن میں اس سے قبل ہی حرکت میں آ چکا تھا۔ عین اس وقت جب اس کی دوسری جیب سے ریوالور نکلا تھا، میں نے بڑی پھرتی سے گھٹنا اس کے ہاتھ پر مارا اور گولی آسمان کی طرف نکل گئی۔ ریوالور سائلنسر والا تھا چنانچہ اس کی آواز قریب سے گزرنے والی ایکسپریس میں کسی نے نہیں سنی۔ اس نے مجھے ٹکر مارنے کی کوشش کی اور میں نے اسے لات مار کے اچھال دیا۔ وہ منہ کے بل گرا اور پھر اٹھا لیکن میرے اگلے وار نے اسے خاموش کر دیا۔ وہ بے سُدھ ہو کے گر گیا۔ میں نے ریوالور اور بیس ہزار روپے جیب میں ڈالے اور اسے گھسیٹ کر لے گیا۔ "وہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"کریٹ ڈکی میں اور سامان پیچھے۔" محسن نے پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "ان کو کہاں رکھنا ہے؟"

"ابھی تو یہیں رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ رحمت کی باڈی کو اٹھا کے اندر پھینکا اور محسن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "یہاں سے نکل لے۔ بہت سی گاڑیاں گزری ہیں۔ معلوم نہیں کس نے کیا دیکھا ہو اور آگے پولیس کو بتا دیا ہو۔"

محسن نے کار اسٹارٹ کر دی۔ میں میل آگے جانے کے بعد مجھے ایک کچا راستہ نظر آیا جو گھنے درختوں کے بیچ سے کسی قصبے یا گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے محسن کو گاڑی موڑنے کو کہا۔ کچے راستے پر اترتے وقت میں نے آگے پیچھے دیکھا۔ اس وقت دونوں طرف سڑک خالی پڑی تھی۔ محسن نے کار کو تھوڑا اور درختوں کے گھنے جھنڈ کے پیچھے روک دیا۔

"ڈکی میں کوئی رسی ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کا بیگ تو نہیں تھی، ٹرک میں تھی۔" محسن نے کہا۔ "میں نے صرف کے خیال سے اٹھائی تھی۔"

"تمھاری عقل سے تو کبھی کبھی عقلمند ہونے کا ثبوت دے دیتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب چلتے تو ان دونوں کو باندھ کے ان کے منہ بند کرنے ہیں۔"

"رقم کتنی تھی؟" محسن نے رسی نکالتے ہوئے کہا۔

"بیس ہزار۔" میں نے جیب پر ہاتھ مار کے کہا۔ "اگر کچھ اور ملے تو رکھ لینا۔ سب مال اپنا ہے۔"

"ہاں کمائی تو میرو تو ریاض لمبی کے نام پر ہو رہی ہے۔" محسن نے کہا۔ ہم دونوں نے مل کر رحمت کیا ڈی اور جیبو کو ایک ساتھ ہاتھ کے لوں باندھ دیا کہ وہ تو من شدم من تو شدی کی تفسیر بن گئے۔ ان کے منہ میں رومال ٹھونس کر میں نے ان پر وہ چادر ڈال دی جو ڈرائیور کے کندھے پر تھی۔

"اب تو واپس تعبیر جنہ ہیا۔" میں نے کہا۔ مجھے سامنے ٹرک کے قریب آ رہے تھا۔

"تو ٹرک لے کر کہاں جانے لگا؟" محسن بولا۔ "اسے دیتے سے وہیں۔"

"کل صبح تک واپس پہنچ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اس کا نام و نشان مٹا کر۔"

محسن نے گاڑی کو واپس سڑک پر لا کے لاہور جانے والی سڑک پر موڑ لیا۔ مجھے ٹرک کے پاس آ کر اور احتیاط کی تاکید کر کے وہ نکل گیا۔ میں نے ٹرک ڈرائیور کی جگہ سنبھال لی۔ چابیاں وہیں لگی ہوئی تھیں جہاں ڈرائیور نے انھیں چھوڑا تھا۔ میں ٹرک کو لے کر چلا گیا۔ تقریباً پندرہ میل چلنے کے بعد مجھے ایک خشک برساتی نالہ نظر آیا۔ جس کا کنارا بہت اونچا تھا۔ میں نے جگہ دیکھ کر ٹرک کو نیچے اتارا اور اسے نیچے کچے راستوں پر احتیاط سے چلاتا ہوا پل کے نیچے لے گیا۔ ٹرک کی سیٹ کے نیچے ایک خالی بوتل آئل کا تھا۔ آتے میں نے آگے ہی چیک کر دیا۔ پیچھے اسپیئر وہیل کے درمیان پانچ گیلن پٹرول کا جیری کین رکھا تھا جو میں نے اسی وقت دیکھ لیا تھا جب ٹرک اڈے میں کھڑا تھا۔ گھاس پھوس جمع کرنے کے لیے مجھے کچھ دور جانا پڑا لیکن بالآخر میں کار کے نیچے دو پٹرول ٹینک کے نیچے خاصی مقدار میں خشک گھاس اور ٹہنیاں جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بات صرف آگ پکڑنے کی تھی۔ اس کے بعد ٹائر خود ہی جلنے لگے۔ ٹرک کا ڈھانچہ لکڑی کا تھا اندر لکڑی کے کریٹ تھے۔ آگے انجن کی سیٹوں پر موبل آئل پڑا ہوا تھا۔ اور پٹرول ٹینک خود ایک پٹرول بم تھا۔ میں نے پانچ گیلن پٹرول پانچوں جگہ مساوی مقدار میں چھڑکا۔ لائٹر سے جلا کر ٹائروں کے نیچے آگ دکھائی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ آگ ایک دم بھڑکی تھی اور میرے سڑک پر پہنچنے تک نیچے الاؤ روشن ہو گیا تھا۔ ایک مسافر بس سے بچنے کے لیے میں ایک درخت کے تنے کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ مسافر بس جنگل میں مشعل دیکھ کر رک گئی تھی۔ دوسری جانب سمت سے آنے والی بس وہ بھی رک گئی۔ دیکھتے دیکھتے کئی بسیں اور کاریں ٹھہر گئیں۔ میں نے اطمینان سے نکلا اور ہجوم میں شامل ہو گیا۔

اس دلچسپ تحریر کا [illegible]

[illegible]

[illegible]

www.paksociety.com

پسندیدہ رسائل و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں
عمران لائبریری
[illegible]

شکاری کتے

معاشرے کے ان ناسوروں کی روداد جو گوشت پوست کے گٹر ہیں، انسانی شکلوں میں ملبوس یہ تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے روز و شب موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن، سلگتی راتیں، آس و یاس، خوف و حزن

"کیا تماشا ہو رہا ہے یہاں؟" میں نے گرج کے کہا۔ "ساری ٹریفک بلاک ہو گئی ہے۔"

"وہ دیکھیں جناب!" ایک شخص نے کہا۔ "نیچے کہیں آگ لگی ہے۔"

"تو تم یہاں کھڑے رہ کر اسے بجھاؤ گے؟" میں نے اس کے ایک تھپڑ رسید کیا۔ "پھونک مار کے بجھاؤ گے۔ اوئے ہٹ جاؤ پیچھے جاؤ۔ جا کے فون کرو کوئی فائر بریگیڈ کو۔" باقی لوگ سہم گئے۔

"یہاں فون کدھر ہے؟ کسی پیڑ پر؟" ایک فیشن ایبل نوجوان نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔

دو تین بس والوں نے مسافروں سے بیٹھنے کو کہا اور تیز رفتاری سے گاڑی بھگا کر روانہ ہو جاتیں۔

"اسمارٹ بلڈ!" میں نے انگریزی میں کہا۔ "ویری فنی۔ اگر فون یہاں نہیں ہے تو کیا آگے کسی پیٹرول پمپ یا کسی پولیس اسٹیشن پر بھی نہیں ہو گا؟"

اسمارٹ بوائے فوراً اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے روک لیا۔ "ایک منٹ۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ خود فون کر دوں گا۔"

"لیکن میرے ساتھ میری بیوی ہے۔" اس نے احتجاج کیا۔

"ڈونٹ وری۔ میں پیچھے بیٹھوں گا اور اگر بک بک کرو گے تو دونوں کو مار دوں گا۔" میں نے کہا۔

اسمارٹ بوائے خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا۔ گلبرگ سے آگے میں نے ایک پیٹرول پمپ کے سامنے اسے رکنے کے لیے کہا۔ "تھینک یو ویری مچ۔" میں نے کہا۔ "آپ کو زحمت ہوئی تھی تو اس کے لیے معذرت۔" اسمارٹ بوائے نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اس کی بیوی نے مسکرا کے کہا۔ "یو آر ویلکم۔"

رات کے دو بج چکے تھے۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا اور بے حس کباڑی کو گرفتار کرنے کے علاوہ شکاریوں کے ٹھکانے دیکھ آیا تھا۔ مجھے تین شکاریوں کے نام معلوم ہو گئے تھے اور... ان کو ان کے گھروں کا نقصان پہنچانے کا بھی موقع مل گیا تھا۔ میں کچھ دیر پیدل چلتا رہا تھا۔ پھر میں نے لاہور جانے والی ایک ویگن کو روکا۔ "کوئی سیٹ ہے بھئی لاہور تک؟" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں جناب عالی!" کنڈکٹر نے کہا اور اگلی سیٹ کے مسافروں کو اٹھا دیا۔ "چلو بھئی زنانہ سیٹ خالی کرو۔"

"کدھر ہے زنانہ سواری؟" ایک شخص نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ میں بالکل بے تیاری سے گھرا رہا۔

"میاں تم کو بیٹھتے وقت ہی بتا رہا تھا کہ ضرورت پڑنے پر سیٹ خالی کرنی پڑے گی۔" ڈرائیور نے ناگواری سے کہا۔ "اب زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔" لوگ بڑبڑاتے ہوئے اتر کے پیچھے چلے گئے۔ اور میں پوری شان بے نیازی سے ان کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان ہو کے پبلک کی باتیں سنتا رہا جو وہ پولیس کے خلاف

کر رہے تھے۔ زنانہ سواری۔ پولیس زنانہ سواری ہوتی ہے؟ سب بدمعاشی ہے جی۔ خود پولیس یہ کرے گی تو کس اوسے کیا گلہ۔ لاقانونیت ہے سب۔ یہ قوم صرف باتیں کر سکتی ہے۔ قانونی کارروائی کی ہمت نہیں رکھتی۔ لاہور آتے ہی میں ویگن سے اتر گیا۔ اس وقت کسی رکشا یا ٹیکسی کا ملنا مشکل تھا چنانچہ مجھے ریلوے اسٹیشن تک مارچ کرنا پڑا۔

ایک رکشا کو میکلوڈ روڈ میں پکڑ کے سمن آباد پہنچا۔ رکشا کو میں نے قصر جمشید سے بہت پہلے روک لیا اور اس پر ترس کھاتے ہوئے پورا پچاس کا نوٹ بخش دیا۔ میرے پاس کھلے تھے ہی نہیں۔ رکشا والے نے سلام کر کے رکھ لیا۔ بعد میں اس نے بھی گالی دی ہوگی مجھے کہ میرے پاس کون سا حلال کا مال تھا کہ مجھے دس کے بجائے پچاس دیتے ہوئے دکھ ہوتا اور اپنی خوش قسمتی کا یہ واقعہ متعدد بار سنایا ہوگا۔

آخری موڑ کاٹتے ہوئے میرے قدم رک گئے۔ قصر جمشید سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اس کی پرانی لکڑی کے دروازے اور کھڑکیاں دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔

سڑک پر خاصے لوگ جمع تھے اور دور ہونے کے باوجود قصر جمشید کو ایک ملبے کا ڈھیر بنا دینے والی آگ کی حدت کو محسوس کر رہے تھے۔ اندر صرف ایک فائر بریگیڈ تھا جس میں سے پرانی وردیوں والے فائرمین اتر کے پائپ ہاتھ میں پکڑے ادھر سے ادھر دوڑ کر اپنی مستعدی کا مظاہرہ کر رہے تھے کیونکہ پبلک کے سامنے ان کو کچھ نہ کچھ بہرحال کرنا تھا۔ عام طور پر کابل اور بے کار پڑے رہنے والے فائرمین عموماً ایسی سنگین آتش زنی کی وارداتوں سے بہت کم دوچار ہوتے تھے عموماً تو وہ کسی دکان کی یا گھر کی راکھ میں دبکنے والی چنگاریوں پر پانی چھڑک کر لوٹ آتے تھے یا کسی کی احمقانہ شرارت پر شرمندہ و مشتعل ہو کر جو انھیں بے وجہ دوڑاتا تھا۔ اس وقت ان کی پریشانی کا سبب پانی کی نایابی تھا۔ ... قصر جمشید کی آگ بجھانے کے ... ایک ہینڈ پمپ کے سوا کچھ بھی نہ تھا اور اس میں سے صرف گلاس بھر بھر کے پانی ... تھا۔ ہوا میں تاثر جلنے کی بو تھی۔

میری نظر محسن کو تلاش نہ کر سکی لیکن اس نے مجھے دیکھ لیا اس کی کوٹھی نہ جانے کہاں تھی۔

"سکندر!" اس نے مجھے دور سے آواز دی اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ایک درخت کی شاخوں پر زمین سے تقریباً بیس فٹ کی بلندی پر براجمان تھا۔ "یہاں آجاؤ ورنہ کوئی دیکھ لے گا۔ یہاں سے سب صاف نظر آتا ہے۔"

درخت کا تنا اوپر دس فٹ تک سیدھا گیا تھا پھر ایک سے زیادہ شاخوں میں تقسیم ہو گیا تھا مگر سب سے بڑی شاخ کی موٹائی ایک فٹ کے قریب تھی اور وہ باقی درخت سے الگ ہو کے یوں اوپر جا رہی تھی جیسے مسلسل ترقی کو ظاہر کرنے والے گراف کی لکیر اوپر جاتی ہے۔ اس کے قریب ایک غلیل نما شاخ میں تشریف رکھنے کے بعد میں نے محسن سے سگریٹ لی اور سامنے کا پورا منظر دیکھا۔ فائر بریگیڈ والوں کی ایک اور خستہ حال ٹیم گھنٹیاں بجاتی پہنچی تھی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اسے غارت کرتا؟

"محسن خان!" میں نے کہا۔ "اس کھنڈر میں آگ پکڑنے والی کون سی چیز تھی۔ کھڑکیاں دروازے تک تو لے جانے والے لے جا چکے تھے۔"

"ایک چیز تھی جو آپ چھوڑ گئے تھے۔" محسن خان نے کمال اطمینان سے فرمایا۔ "مسٹر رانجھا کو۔"

"ہاں۔ اب کون بتائے گا کہ کھنڈر میں آگ کس نے لگائی۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ "اور کون جل گیا۔ تم نے کسی کو آتے جاتے دیکھا؟ ولاور اینڈ کمپنی کے کسی بندے کو؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب میں پہنچا تو یہی افراتفری کا عالم تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کون آیا اور کون گیا۔ فائر بریگیڈ کو بھی شاید کسی نے پاس پڑوس سے فون کیا ہوگا۔"

"اس وقت جب رانجھا کو آگ لگانے والے اپنا کام کر کے نکل گئے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ٹرک کا کیا ہوا؟" محسن نے کہا۔ "آگ لگا دی تو نے اسے! یا کہیں غرق کر دیا ہے؟"

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "ہاں لیکن تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"تیری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔" وہ ہنسا۔ "چوہدری ولاور کو بھی یہ خوش خبری سنا دیتا۔"

"اب ہم یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟" میں نے کہا۔ "یہ تماشا تو بے مقصد چل رہا ہے۔ نقصان کسی کا بھی نہیں ہوا سوائے رانجھا کے ... جان سے گیا اور اس کی بیٹی یتیم ہوئی۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" محسن بولا۔

"صرف دعا کر سکتے ہیں کہ خدا رانجھا کے گناہوں کو معاف کرے۔" میں نے کہا۔ "اور اس کی بیٹی سلامتی کے ساتھ رخصت ہو کے اپنے گھر جائے۔ دنیا میں بہت لوگ ہیں محسن خان جن کے لیے ہم صرف دعا کر سکتے ہیں دوا نہیں۔"

ہم دونوں ایک ساتھ نیچے اترے اور واپس چل پڑے۔ محسن نے کار کو موڑ کے پیچھے ایک احاطے کی دیوار سے لگا کے کھڑا کر دیا تھا۔ یعنی اگر کوئی دیکھے تو سمجھے کہ آیا ہوگا کسی کا مہمان۔ اس مختصر سے فاصلے کو طے کرتے ہوئے میں نے محسن کو بتا دیا کہ میں نے ٹرک کو کس طرح ٹھکانے لگایا تھا۔

"گویا چوہدری صاحب کو اب تک اطلاع مل چکی ہوگی۔" محسن نے کہا۔ "چھوٹو پہنچ گیا تھا۔"

"اس نے گلے شاہ یا گاما ماچھی کو بتایا ہوگا کہیں سے فون کر کے یا کسی طرح واپس پہنچ سکے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابھی وہ راہ میں ہو۔ یا گاما ماچھی سوچ رہا ہو کہ ولاور کو اس نقصان عظیم کی اطلاع کیسے دے اور اپنے دو قابل اعتماد کارندوں کی گمشدگی کا الزام کس پر عائد کرے۔ کراچی کے سیٹھ کریم پر یا ہم پر۔"

"پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ اس کریٹ میں کیا ہے جو ہم نے ٹرک سے اتار لیا تھا۔" میں نے کہا۔

بند کریٹ ابھی پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا تھا۔ اسے کھولنا آسان کام نہ تھا۔ چاروں طرف سے اس کے کناروں پر کیلیں ٹھوک دی گئی تھیں اور تختے آدھے انچ کے قریب موٹے تھے۔ ان پر دونوں طرف سے آدھی انچ چوڑی اور چمکیلی ٹین کی پتی مشین سے بیٹ کر کس دی گئی تھی۔ اسے کاٹے بغیر نہیں کھولا جا سکتا تھا اور ہمارے پاس اس کے لیے ضروری آلات نہیں تھے۔ کار کی ڈکی میں صرف بنیادی ضرورت کا سامان تھا۔ اسپیئر وہیل جیک اور وہیل اسپینر۔ اس میں اگر ایک معمولی سا پلاس بھی ہوتا تو ہمارا کام چل جاتا۔

"مجھے شک ہے۔" میں نے کہا۔ "شک ہی نہیں یقین ہے کہ اس میں منشیات ہوں گی۔"

"اب کہیں سے اسے کھولنے کا سامان ملے تو پتا چلے کہ آپ کس حد تک درست فرماتے ہیں۔" محسن نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"رانجھا تو مر گیا لیکن مرنے سے پہلے بہت کچھ بتا گیا۔" میں نے کہا۔ "شریف تاتپ بھی کون سا زندہ رہتا۔ ہم اب تین سے کرداروں سے متعارف ہو چکے ہیں۔ گاما ماچھی کراچی کا سیٹھ کریم اور ایک نزکا کوئی آدمی پیارعلی۔"

"ان دونوں کو کیوں بھول رہا ہے جو ہمارے ساتھ ہیں؟" محسن بولا۔ "ان کو اگر زیادہ دیر اسی طرح رکھا گیا تو وہ کچھ بتانے کے لیے زندہ ہی نہیں رہیں گے۔"

"اس وقت انھیں کہاں لے جائیں؟" میں نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ قصر جمشید بہت محفوظ رہے گا۔ شکاری شک تک نہیں کریں گے کہ شکار انھی کے سایہ عاطفت میں محفوظ بیٹھا ہے لیکن اب مجھے آنجہانی مسٹر رانجھا کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ادھر بھی بہت سے لوگ آئیں گے تمھاری خبر لینے۔ اس وقت میں نے سمجھا تھا کہ یہ کھوکھلی دھمکی ہے لیکن آتش زنی کی اس واردات نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ یہاں آتے رہتے ہیں۔ میرا تعاقب کسی نے نہیں کیا تھا کہ انھیں کچھ معلوم ہوتا۔ اگر یہ بات ہوتی تو مجھے اتنی مہلت نہ ملتی اور وہ فوراً آ پہنچتے۔ میں نے اس مالی کو بھی یہاں نہیں دیکھا تھا اور نہ اس بات کے آثار ملے تھے کہ وہاں کوئی رہائش پذیر ہے لیکن اب مجھے یقین نہیں کہ میرے اندازے صحیح تھے۔ ہو سکتا ہے وہی مالی بعد میں آیا اور اندر ایک نامانوس گاڑی کو دیکھ کر کھٹک گیا۔ ممکن ہے کہ وہ دبے پاؤں اوپر بھی گیا ہو اور میری تفتیش دیکھ گیا ہو۔"

"تیرا مطلب ہے وہ مالی بھی انھی کا ایجنٹ تھا؟ ... ہو سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔

"کوئی بات اب بعید از امکان نہیں رہی۔" ... نے کہا۔

"ان کے پاس ایک غریب آدمی کی وفاداریاں خریدنے کا سب سے مؤثر ہتھیار پیسہ ہے۔ پیسہ آج کی دنیا میں کیا نہیں ... ہے۔ دین ایمان شرافت اور انسانیت ضمیر اصول اور ... اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب کچھ خریدتے ہیں تو اس ... کے ساتھ خریدتے ہیں کہ انھوں نے پیسہ ضائع نہیں کیا۔ شاید وہ مالی مجھے دیکھ گیا اور اس نے سب کچھ سن کر ولاور کو مطلع کر دیا۔ میری قسمت کہ میں اس کی جوابی کارروائی میں جل کے راکھ نہیں ہو سکا۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ ولاور اینڈ کمپنی اس اڈے کو اپنے ناجائز کاروبار کے لیے استعمال کرتی ہے۔ ایسی ہی غیر آباد جگہ ان کے کاروباری نقطہ نظر سے انتہائی محفوظ ہو سکتی ہے جس پر کسی کی نگاہ تک نہ جائے اور جائے تو کسی کے دل میں یہ خیال ہی نہ آئے کہ اسی کھنڈر میں مٹی سے سونا بنایا جاتا ہے۔ وہ رات کی خاموشی اور ویرانی میں یہاں جمع ہو کے کچھ بھی کریں مال کی تقسیم اور ترسیل کا انتظام، میٹنگ یا رقم کی وصولی۔"

"تاہم یہ جگہ ان کا گودام یا فیکٹری نہیں ہو سکتی۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں — ورنہ وہ اتنی جلدی اسے آگ نہ لگا دیتے۔" میں نے اتفاق کیا۔ "انھیں مال یا مشینری کو شفٹ کرنے میں کچھ وقت لگتا۔"

"محسن!" میں نے ایک فوری خیال ... کہا۔ "کیا یہ آگ

www.paksociety.com

کوئی دھوکا تو نہیں ہے؟"

"نہیں — آگ بالکل حقیقی تھی۔" محسن بولا۔ "اس میں کوئی کیمرہ ٹرک نہیں تھی۔ اگر تو مرغی ہوتا تو میں تجھے روسٹ کر لیتا۔ میرا چھونک سے برا حال ہے۔"

"اسی لیے تیری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا مطلب کچھ اور تھا۔ فرض کر جیسے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے انھوں نے ایک کھنڈر میں اپنا ہیڈ آفس قائم کر رکھا تھا۔ ایسے ہی راز افشا ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتے ہی انھوں نے دنیا کی آنکھوں میں ایک نئی دھول اور جھونک دی ہو۔ آگ لگا کے انھوں نے دشمنوں کے تمام جھوٹے وسوسے مٹا دیے۔ ہمارا مقابلہ کسی عام شکاری سے نہیں ہے۔ انھوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ایک تو راجھا کو گرفتار ہونے کی سزا دی تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور وہ جان لیں کہ غلطی دانستہ ہو یا نادانستہ، بہرصورت اس کی سزا موت ہے۔ میرے یہاں آنے اور راجھا سے تفتیش کے علاوہ اس ویرانے میں قیام فرمانے کے ارادے نے انھیں شک میں ڈال دیا ہوگا۔ میں الو تو نہیں ہوں کہ ویرانوں میں رہوں۔"

"چشم بد دور! آپ تو جہاں بھی رہیں، الو ہی رہیں گے۔" محسن نے کہا۔

"آپ ٹوڈی ٹیوٹنگ فرما رہے ہیں، اس لیے جھانپڑ نہیں مارتا۔" میں نے کہا۔ "جو چور نو دل کے اندر ہوتا ہے محسن خان شیروانی اور آدمی کا تو چہرہ بتا دیتا ہے وہ بھی پرکر تنکا کہاں ہے۔ ولاور نے سوچا ہوگا کہ ہم سکندر اعظم نے کہاں تیرا ڈال دیا اور کیوں؟ کیا اس نے معلوم کر لیا ہے کہ یہ جگہ کس کام آتی ہے اور اب اپنا جال پھیلانا چاہتا ہے کہ جو آئے پکڑا جائے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک فقیری سے ہم کیا کام لے سکتے ہیں، البتہ وہ کسی گروہ کے ہیڈ کوارٹر کو ختم کرنے کے لیے خود بھی کس حد تک میدانِ عمل میں کود سکتے ہیں۔ چنانچہ اپنے تیر سے دوسرا شکار انھوں نے ہمارے اندیشوں کو کیا۔ آگ لگا کے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا کہ یہ سنسان کھنڈر کسی غلط قسم کے کام کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ ہمارے ذہن میں صرف یہی خیال آئے کہ آگ لگنے کا مقصد راجھے کو راکھ کرنا تھا۔ اس کے سوا کچھ نہیں اور بلاشبہ ہم یہی سمجھے تھے۔"

"کیا ہم غلط سمجھے تھے اے دور اندیش مرد دانا؟" محسن نے کہا۔

"ہاں عزیزم۔ غور فرما آتش زنی کے طریقے پر۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے اوپر نیچے ہر کمرے میں آگ کیسے پھیلائی؟ دیواریں تو پکی تھیں، چھت نہیں تھی، اندر نہ فرنیچر تھا نہ پردے، قالین اور لکڑی کے دروازے۔ پھر بھی دیکھنے سے تاثر یہی ملتا تھا کہ پورا قصر جمشید آگ کی لپیٹ میں ہے۔ میرا خیال ہے انھوں نے سب کمروں میں کھڑکیوں اور دروازوں کے پاس گھاس پھونس اور لکڑیاں رکھیں۔ ان پر پٹرول یا مٹی کا تیل ڈالا اور گھوم پھر کر خود آگ لگائی۔ تو نے تارکول کے جلنے کی بو محسوس کی تھی۔ وہ بھی انھوں نے ہی رکھے ہوں گے۔ پرانے ناکارہ ٹائر زیادہ دیر جلتے ہیں اور بہت دھواں دیتے ہیں۔"

"اور اس اہتمام کا مقصد کیا... میرا مطلب ہے تجھے خواب کیسے ہوا؟" محسن بولا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ سلسلہ بدستور زیر زمین چلتا رہے گا۔" میں نے کہا۔ "انڈر گراؤنڈ بزنس ہے اور وہ عملی طور پر انڈر گراؤنڈ ہی کام کرتے ہوں گے۔ اوپر کا کھنڈر مزار ہے یا مزبلہ۔ ان کا گودام، فیکٹری یا ہیڈ آفس محفوظ اور دنیا کی نظر سے اب بھی اوجھل ہے۔ پہلے کوئی اسے ویرانہ سمجھ کے قابلِ توجہ نہیں سمجھتا تھا۔ اب جلنے کے بعد اس کی ظاہری حالت پہلے سے زیادہ تباہ نظر آتی ہے۔"

"تیری ناقص عقل میں یہ قابلِ رشک خیال کیسے آیا؟" محسن نے کہا۔ "مجھے تو حسد ہو رہا ہے۔"

"واضح ہو کہ پہلے تہ خانے بنانے کا رواج عام تھا۔" میں نے کہا۔ "اور قصرِ جمشید کے نیچے بھی کوئی تہ خانہ ہو تو عین ممکن ہے۔ اس کی وسعت بھی قصر کہلانے والی اس عمارت کے مطابق ہوگی... ولاور اینڈ کمپنی کے وسیع کاروبار کے لیے تو ایسی کوئی جگہ ضرورت کے عین مطابق ہے۔ شاید اس سے بہتر کوئی جگہ ہی نہ ہو۔"

"رائٹ!" محسن نے بریک لگا کے کہا۔ "لیکن اس مرحلے پر میں تحریک التوا پیش کر کے منظور کرتا ہوں۔" اور گاڑی کو ایک ہوٹل کے سامنے روک لیا جہاں سے آخری گاہک رخصت ہو چکا تھا۔ چنانچہ بیرے پر اسٹر آمدنی کے علاوہ بہت سے مسائل پر غور فرما رہے تھے کہ کون سی چیز بچی اور کیوں بچی؟ زیادہ پکائی گئی تھی تو کیوں؟ کم کھائی گئی تھی تو کیوں؟ اور ظاہر ہے کہ اب اس بچی خوراک کو اگلے دن معزز گاہکوں کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے بچا کر رکھنے ہی والے تھے کہ ہم نے بچا کھچا مال خرید کے انھیں تکلیف سے نجات دلائی۔ دو میل دور جا کے میں نے اور محسن نے ڈنر تناول فرمایا اور گردوپیش کا جائزہ لیا۔ ہم شاہراہ روڈ پر تھے اور آبادی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ جس مکان کی اوٹ میں محسن نے گاڑی کو روکا تھا وہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا اور چھت پڑ جاتی تو مکمل ہی کہلاتا لیکن آثار یہ تھے کہ اسے نامکمل پڑے ہوئے زمانہ ہو گیا۔

میں پہلے گاڑی کی چھت پر اور اس کے بعد دیوار پر چڑھا۔ اندر نہ روشنی کا ڈیرا تھا اور نہ فرش کے روزنوں اور کھڑکیوں کے خلا سے اندھیرا جھانک رہا تھا۔ میں آہستگی سے اندر لٹک گیا اور ہاتھ چھوڑ دیے۔ پیروں کے زمین سے لگتے ہی میں

اس دروازے کی طرف بڑھا۔ اچانک اندر سے ایک بھاری چیختی ہوئی "اللہ ہو" گونجتی ہوئی آواز آئی۔

"بہت چوڑا کہیں اور جا۔" میں اچھل پڑا اور بے ساختہ اندر لپکا... پیچھے سے مجھے فرش پر ایک سایہ سا دکھائی دیا۔ میں نے ٹارچ جلائی۔ فرش پر ایک مست الست فقیر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر پیوند لگی ہوئی لمبی سی ایک قبا تھی جسے گدڑی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ میل اور گرد میں اس کے کپڑے کا رنگ خاکستری ہو رہا تھا۔ سر کے لمبے جٹادھاری بال داڑھی میں الجھ گئے تھے اور اس جھاڑ جھنکاڑ میں اس کی صورت کے نقوش چھپ گئے تھے۔ سامنے سے صرف ایک سیب جیسی لال لال آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کشکول اور چمٹا سرہانے دھرا تھا۔

"ہم نے کہا ہے کہیں اور جا نامراد۔" وہ جلالی لہجے میں بولا۔ "فقیر کے آرام میں خلل ڈال کے کیا ملے گا تجھے؟"

"مجھے تھوڑی سی دل لگی سوجھی۔ مال تو آپ کے پاس بھی کم نہیں ہوگا سائیں جی۔ تجارت میں بڑی آمدنی ہے۔"

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ اس کے گلے میں پڑے ہوئے رنگین منکے آپس میں ٹکرائے۔ اس نے فوراً چمٹا اٹھا لیا اور چوکنا ہو گیا۔ بے اختیار اس کے ایک ہاتھ نے سینے پر بنی خفیہ جیب کو گرفت میں لے لیا۔ میں نے ریوالور نکال کر رخ فقیر کی جانب کر دیا۔ "ذرا گستاخی کر رہا ہوں مگر پہلے یہ چمٹا ایک طرف رکھ دیں پھر مال نکالیں۔"

فقیر کی حالت غیر ہو گئی۔ چمٹا رکھ کے اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور گڑگڑانے پر اتر آیا۔ "قسم رب کی، سوکھی روٹی ہے جیب میں۔ مال کہاں سے آیا۔ یہ جان لینی ہے تو لے لے ظالم۔"

اسی وقت محسن اندر آیا۔ مجھے کافی دیر ہو گئی تھی اور وہ دروازہ کھلنے کا زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ "یہ کیا ڈرامہ ہو رہا ہے؟" وہ حیران ہو کے بولا۔ "کون ہے یہ؟"

"بہت پیسے والے درویش ہیں۔" میں نے کہا۔ "کبھی انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس میں ذرا حساب مانگ رہا تھا۔"

فقیر نے پھر غلغلہ بلند کیا اور یقین دلانے لگا کہ یہ غلط ہے۔ "پیسہ اب کہاں بابا۔ دنیا بڑی کنجوس اور کمینی ہو گئی ہے۔ چرس افیون کی ... ہے اگر ... مانگو۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ کسی سیٹھ ساہوکار کو لوٹو۔"

میں نے محسن کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ "ذرا دیکھ یہ اللہ لوک جھوٹ کہہ رہا ہے یا سچ؟"

محسن نے اسے کھڑا کر دیا۔ "آواز بند!" محسن نے ڈانٹ کر کہا اور اس کے پیچھے ہاتھ مارا۔ فقیر کی گھگھی بندھ گئی۔ اندر ایک تھیلے جتنی بڑی جیب تھی۔ اس میں سے نیلے کپڑوں میں لپٹے ہوئے سو اور پچاس کے نوٹ برآمد ہوئے۔ فقیر محسن کے قدموں میں گر گیا اور بڑے مضحکہ خیز انداز میں رونے لگا۔

"یہ میری تمام عمر کی کمائی ہے۔ پیسہ پیسہ جوڑا تھا میں نے بیس سال میں۔"

"کس لیے؟ اور کس کے لیے؟" میں نے کہا۔ "کیا محل بنوانا تھا یا مزار شریف؟ یا بچے بیاہنے تھے؟"

لیکن وہ کیا جواب دیتا۔ وہ ان دولت مند فقیروں میں سے تھا جو عادتاً مانگتے ہیں، کسی ضرورت کے تحت نہیں، اور دنیا سے پوشیدہ خزانہ ان کی متاع غرور ہوتا ہے۔ بیشتر دینے والے ان کے مقابلے میں فقیر اور زیادہ غریب ہوتے ہیں۔ اس خفیہ دولت کو پھلتا پھولتا دیکھ کر خوش ہونا ہی ان کا نصیب ہوتا ہے جو خود دنیا میں سکھ دیتی ہے اور نہ آخرت سنوارتی ہے۔ ایسے فقیروں کی نفسیات کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔

"ستائیس ہزار دو سو بیس روپے۔" محسن بولا۔ "کتنا انکم ٹیکس بنتا ہے؟"

"چل بخش دے سائیں بادشاہ کو۔" میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ فقیر کی حالت انتہائی قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا خزانہ جھپٹ کر واپس اندر کی جیب میں چھپا لیا اور سہم کر کونے میں دبک گیا۔ اس کی خوف زدہ نظروں میں بے یقینی تھی اور ایک سوال تھا کہ

آنکھیں بڑی نعمت ہیں

* کیا آپ کی آنکھیں کمزور ہیں؟
* کیا آپ کی آنکھیں دکھتی ہیں؟
* کیا آپ چشمہ لگاتے ہیں؟
* یا آنکھوں کے کسی مرض کا شکار ہیں؟

تو کتاب

کم نظری اور اس کا سدباب

قیمت ۱۵ روپے ڈاک خرچ ۱۰ روپے

آپ کو بتائے گی کہ

ہر شخص کے لیے یکساں طور پر مفید کتاب

www.paksociety.com

"اسے دوسرے کمرے میں ڈال دو۔" محسن بولا۔ "آجائے گا تھوڑی دیر بعد ہوش میں۔"

میں نے سر ہلایا اور رحمت کباڑی کے دونوں ہاتھ تھام کر گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ ڈرائیور اچانک ہنسا۔

"او مجھے کیوں تکلیف دیتے ہو مردے کو۔" وہ بولا۔ "پڑا رہنے دو بیچارے کو۔"

میں نے رحمت کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ فقیر متوحش انداز میں چلایا۔ "مر گیا؟ قتل کر دیا تم نے؟"

"میں نے کہا تھا آواز نہ نکلے۔" محسن نے دانت پیس کر کہا اور اس کے سر پر لات ماری۔

"غلطی اس کی تھی۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اس نے خود مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔"

"مگر یہ مر گیا۔" ڈرائیور بولا۔ یوں جیسے یہ بات ہم سے نہیں اپنے آپ سے کہی تھی۔ اس کی نظر رحمت کی لاش پر جمی ہوئی تھی جس کی کھلی آنکھیں آخرِ شب کے محوِ سفر ستاروں کو دیکھ رہی تھیں۔

"شاید چوٹ غلط جگہ پڑی۔" محسن بولا۔ لہجے سے وہ بھی متفکر نظر آتا تھا۔

ڈرائیور پھر ہنسا۔ "موت بندے کو کھینچ لاتی ہے، وہاں پر جہاں اس کو مرنا ہو۔ اس کم بخت نے تو سمجھا تھا کہ رحمت کی موت کا فرمان جاری کر دیا۔ جیسے رحمت کی زندگی اس کے اختیار میں تھی ایسے ہی موت بھی۔" اس نے اچانک جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک کاغذ نکالا اور ہماری طرف پھینک دیا۔

میں نے جھک کر وہ پرزہ اٹھایا اور کھول کے لائٹر کی روشنی میں تحریر کو دیکھا۔ اس میں لکھا تھا "کریم سیٹھ۔ رحمت واپس نہ آئے۔ کراچی کا سمندر بہت بڑا ہے۔"

"گویا کالے ماچھی کی طرف سے کریم سیٹھ کو پہلے ہی احکامات جاری ہو چکے تھے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ میں نے فقیر کو ایک سگریٹ میں کچھ بھر کے جلاتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔"

ڈرائیور اب یوں ہنس رہا تھا جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ اس نے زور زور سے انکار میں سر ہلایا۔ "او نہیں میری بھولی سرکار۔ ایہہ اچیاں گلاں نے۔ تمھاری سمجھ میں نہیں آتیں۔ تم تو دن کو دن اور رات کو رات سمجھنے والے بچے ہو۔ ایہہ دوجی دنیا ہے۔ یہاں کالے کا مطلب ہے سفید تو سفید کا مطلب کالا۔" "موتیاں والیو!" فقیر نے لمبے لمبے دو کش لگائے اور اس کی پتلیاں چڑھ گئیں۔ پھر وہ زمین پر لیٹ گیا۔

کیا پتہ یہ سچ ہم سے لوٹنے کا ارادہ ترک کر چکے ہیں؟ یہ مذاق ہے یا ہم پاگل تو نہیں ہو گئے ہیں؟" "اب اسی جگہ ایسے ہی خاموش بیٹھے رہنا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ..." میں نے پھر ریوالور نکال کے اسے دکھایا۔ اس نے زور زور سے اقرار میں سر ہلا کے وعدہ کیا کہ سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق ہوگا۔

رحمت کباڑی اور ٹرک ڈرائیور ہوش میں آ چکے تھے لیکن ان کی حالت خراب تھی۔ محسن نے انھیں آزاد کیا اور میں ریوالور کا رخ ان کی طرف کیے کھڑا رہا۔ تلاشی لینے پر محسن کو رحمت کباڑی کی جیب سے ایک اور ریوالور ملا جو اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا پھر محسن فقیر کا کشکول لے کر گیا اور صحن میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ سے پانی لے آیا۔ چند چھینٹے پڑتے ہی وہ ہوش میں آ گئے۔ کراہتے ہوئے انھوں نے کشکول سے منہ لگا کے تھوڑا سا پانی پیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ لائٹر کا شعلہ روشن رکھنے کے لیے ایک ہاتھ کے انگوٹھے کو دبائے رکھنا ضروری تھا۔ یہ انگوٹھا اب سُن ہونے لگا تھا۔ میں نے چند سیکنڈ کے لیے انگوٹھا ہٹایا تو دیے سے بھی کم روشنی دینے والا شعلہ بجھ گیا۔

رحمت کباڑی نے اتنی پھرتی سے کچھ ہی حرکت لگائی کہ میں حیران رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ جسمانی طور پر وہ اس قابل بھی نہیں ہوگا کہ اٹھ سکے۔ لائٹر میرے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ مجھے سنبھلنے میں دیر نہیں لگی۔ ایک میکانکی ردِعمل کے طور پر میں نے جوابی ٹکر ماری جو رحمت کباڑی کے سینے پر لگی اور وہ الٹ کر گرتے ہی ساکت ہو گیا۔ محسن نے اتنی دیر میں لائٹر اٹھا لیا تھا۔

"کوئی ذرا بھی ہلا تو میں گولی مار دوں گا۔" اس نے لائٹر جلا کے ریوالور نکال لیا۔

فقیر نے بھاگنے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ پھر جلدی سے فرش پر بیٹھ گیا۔ "یا میرے مولا! آدھی رات کو یہ موت کے فرشتے کہاں سے بھیج دیے۔ جل تو جلال تو۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

ڈرائیور ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ میں نے جھک کر رحمت کباڑی کو ہلایا لیکن اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔ اگر وہ مجھے دھوکے میں رکھ کر مجھ پر حملہ کرتا تو میں ریوالور کے بٹ سے اس کو یقیناً ناک آؤٹ کر دیتا لیکن وہ حملہ نہیں کر رہا تھا۔ شاید بے ہوش تھا۔ میں نے زمین پر بیٹھ کے اسے سیدھا کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی سانس نہیں چل رہی ہے۔ تشویش میں مبتلا ہونے کے باوجود میں محتاط رہا کہ سانس کو روک لینے کا مقصد بھی مجھے فریب دینا ہو۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ تھام کر نبض تلاش کی۔ نبض رکی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میری تشویش میں خوف اور گھبراہٹ شامل ہوگئی۔ محسن نے اندازہ کر لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

"سیدھی طرح بات کرو۔" میں نے اس کی گردن پکڑ کے جھٹکے دیے۔ "ہم اتنے بے خبر بھی نہیں ہیں۔"

"دو ٹرک کا مال شہر کراچی میں پکڑا گیا تھا اور اس چھاپے کی خبر سیٹھ کریم کا ہاتھ تھا۔" محسن نے کہا۔ "رحمت کباڑی نے اس کی ماچھی سے شکایت کی تھی۔"

"درحقیقت مخبری کرنے والا وہ خود تھا۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بات کالے کو معلوم تھی کہ سیٹھ کریم بے قصور ہے لیکن رحمت خود کو شک سے بچانے کے لیے اس کا نام لے رہا ہے۔ اگر کالا ماچھی یقین کر لیتا تو کریم سیٹھ کا قصہ پاک کر دیتا جو رحمت کے جرم کا واحد گواہ تھا لیکن کالے نے اپنے طور پر حقیقت جان لی تھی۔"

ڈرائیور ہنستے ہنستے رونے لگا۔ "تم نہیں سمجھو گے کیونکہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ جب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا مجھے نوٹ ہی نوٹ دکھائی دیتے تھے۔ سبز سبز نوٹ۔ سو سو کے ہزاروں نوٹ۔ کریم سیٹھ نے کہا تھا کہ تم گدھے ہو۔ یہ پوچھنے لگے تھے۔ تم ٹرک میں کیا لاتے ہو؟ کیا معاوضہ ملتا ہے تمھیں مہینے؟ اور میں نے بتا دیا کہ ہزار روپے مہینہ تنخواہ ہے جو کوئی نہیں دیتا۔ دوسرے اس کی آدھی تنخواہ بھی نہیں دیتے۔ کراچی کے پھیرے کے سو روپے الگ اور کھانا پینا مفت۔ اور کیا چاہیے۔ لیکن سیٹھ کریم نے کہا کہ تم واقعی گدھے ہو۔ تمھیں معلوم ہے جیسے تم کیا لاتے ہو؟ کتنے کا مال لاتے ہو؟ میں نے جواب دیا ٹرک میں جتنا مال آ جاتا ہے وہ سب لے آتا ہوں۔ یہ مرضی ہے ملوں کی کہ آدھا ٹرک دے کر بھیج دیں۔ قیمت یا مالیت سے مجھے کیا لینا دینا۔ کریم سیٹھ نے پھر کہا کہ اسی لیے تو تم گدھے ہو۔ لاکھوں کا مال لاتے ہو اور اس میں لاکھوں کا منافع ہوتا ہے کالے ماچھی کو اور اس سے اوپر والوں کو ملتا ہے۔ اس کا دسواں حصہ تجھے بھی مل جاتا ہے مگر تم کو تو وہی ہزار روپے ماہوار ملتے ہیں اور لاکھوں کے پھیرے پر سو روپے۔ سو روپے کیا ہوتے ہیں؟ کیا تمھاری زندگی کی قیمت سو روپے ہے؟ تم کو معلوم ہے کہ دس کا نوٹ تھما کے وہ تمھیں موت کے سفر پر روانہ کر دیتے ہیں اور تم پھر بھی خوش ہو۔ کبھی پکڑے جاؤ گے تو وہ تم کو شناخت کرنے سے بھی انکار کر دیں گے بلکہ تمھارے خلاف رپورٹ درج کروا دیں گے کہ تم ایک ٹرک سمیت فرار ہو گئے ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مارے جاؤ اور تمھارے بیوی بچوں کو ہزار روپے ماہانہ بھی بند ہو جائے۔ سو روپے کی خاطر تم ان کے لیے منافع اور اپنے لیے سارے خطرات کا بوجھ ڈھو کر یہ مال لاتے ہو۔ اسی لیے تم گدھے ہو۔" جب اس نے مجھے حقیقت بتائی تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ ٹھیک ہے، میں نے اسی بدذات کو مارنے کی کوشش کی جو خود کو سیٹھ کریم

HOW TO WRITE A LETTER

خطوط نویسی کے لیے قیمت ۔/۱۲ روپے

HOW TO WRITE AN ESSAY

مضمون نگاری کے لیے قیمت ۔/۱۲ روپے

HOW TO WRITE AN EXPLANATION

وضاحت و تشریح کے لیے قیمت ۔/۱۲ روپے

HOW TO LEARN CORRECT SPELLING

صحیح ہجے لکھنے کے لیے قیمت ۔/۱۲ روپے

HOW TO DO COMPREHENSION

ادراک و فہم کا اظہار کرنے کے لیے قیمت ۔/۱۲ روپے

CORRECT POSITIONS OF PREPOSITIONS

حروفِ جار کی پوزیشن کے صحیح استعمال کے لیے قیمت ۔/۱۲ روپے

HOW TO PUNCTUATE

رموزِ اوقاف جاننے کے لیے قیمت ۔/۱۲ روپے

15 DAYS TO TRANSLATION

اردو سے انگلش میں ترجمہ کرنے کے لیے قیمت ۔/۱۲ روپے

○ اندرونِ ملک ڈاک خرچ ایک یا ایک سے زائد کتابوں کا ۔/۱۰ روپے ہوگا جو پیشگی منی آرڈر یا ڈرافٹ سے ارسال کریں۔ ○ کتابوں کی قیمت اور ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا نام و پتا اور کتابوں کا نام ضرور لکھیں ○ کسی قسم کی نقد رقم خطوط میں ڈال کر ہرگز نہ بھیجیں۔ ○ بیرونِ ملک ... ڈاک خرچ ... پاکستانی روپے ○ بیرونِ ملک کتابیں منگوانے کے لیے رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ ارسال کریں۔

MAKTABA NAFSIAT A/C 688 H. B. L.
MANSFIELD STR. BR. KARACHI

ذاتی طور پر حاصل کرنے کے لیے:
Sales Office.
MAKTABA NAFSIAT 404 HUSSAIN
CENTRE.SHAHRAHE IRAQ SADDAR
KARACHI . PHONE : 526689

www.paksociety.com

کہتا ہے۔ اس بات نے مجھے یہ بات اتنے عرصے بعد کیوں بتائی کر رہا ہوں۔ غصے نے مجھے پاگل کر دیا تھا کہ سیٹھ کریم سب جانتا تھا تو اب تک خاموش کیوں رہا لیکن اس نے ریوالور نکال لیا اور مجھے گولی مار دی۔" ٹرک ڈرائیور نے بائیں ہاتھ کی آستین اوپر چڑھائی۔ کہنی سے ذرا اوپر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اور محسن نے سفید پٹی پر نظر آنے والے ننھے سے خون کے داغ کو دیکھا۔

"اس وقت تو اللہ نے جان بچالی۔ گولی ہڈی تک بھی نہیں گئی۔ گوشت میں سے گزر گئی۔ زخم بھر گیا تھا۔ آپ کی مہربانی سے پھر کھل گیا۔"

"تم سیٹھ کریم کی بات کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "تم اس کی باتوں سے گمراہ ہو گئے؟"

"گمراہ؟" وہ ہنسا۔ "پتا نہیں میں گمراہ میں پہلے تھا یا بعد میں ہوا۔ اس نے کہا بے وقوف مت بنو۔ اگر میں چاہوں تو اسی وقت تم کو ٹھکانے لگا دوں اور کہہ دوں کہ تم ٹرک لے کر پہنچے ہی نہیں۔ لیکن گھر کا معاملہ ہی کچھ نہیں ہے۔ وہ بہت سے ثبوت حاصل کرے گا کہ لاہور سے کراچی تک ٹرک کس کس نے دیکھا ہے۔ اس کے اپنے کارندے ہیں، پولیس کے مخبر ہیں، ایکسائز والے ہیں۔ سب اس کا نمک کھاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہو جائے گا کہ بے ایمانی میں نے کی ہے لیکن تم میرا ساتھ دو تو دونوں کے حصے میں پانچ پانچ لاکھ روپے آ سکتے ہیں۔ سیٹھ ڈر گیا تھا لیکن اس نے کہا کہ تم تو بالکل محفوظ ہو۔ میں ہمیشہ کی طرح ابھی فون کر کے گاہک کو بتا دیتا ہوں کہ سب مال پہنچ گیا۔ پھر تم پانچ لاکھ لو اور جاؤ۔ یہاں کا بندوبست مجھ پر چھوڑ دو۔ آپ نے بھی پانچ لاکھ لگتے ہیں جو نہیں دیکھے ہوں گے۔ میں نے دیکھے ہیں۔ ایک بار گاہک نے ماچس کے تھیلے میں ڈال کر رحمت کو دیے تھے اور میں رحمت کباڑی کو شاہ عالمی لے گیا تھا۔ وہ رقم اس نے وہاں جمع کرا دی تھی۔ پانچ لاکھ میں آدمی ساری دنیا کو خرید سکتا ہے۔ دنیا تو بہت چھوٹی چیز ہے۔ شاید ایک لاکھ میں بھی خریدی جا سکتی ہے۔ پانچ لاکھ کی گن کے میرا دماغ گھوم گیا۔ میں مجبور ہو گیا۔ صرف لالچ سے نہیں، خوف سے بھی کیونکہ سیٹھ کریم نے کہا تھا کہ یہ بات کرنے کے بعد وہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اس وضع میں ایمان داری کا یا ایمان کا کیا کام۔ تم نے جا کے گاہک سے یہی بات کہہ دی تو وہ میرا دشمن ہو جائے گا۔ میرا دھندا ختم اور شاید میں بھی ختم۔ پھر کیوں نہ میں تم کو ختم کر کے گاہک کا سارا مال پی جاؤں۔ خطرہ تو ہوگا میرے لیے لیکن میں کوئی نہ کوئی طریقہ سوچ لوں گا جس سے اپنی بے گناہی ثابت کر سکوں۔ میں نے پانچ لاکھ لیے اور واپس آ گیا۔ شاید میری حالت دیکھ کر ہی گاہک نے اندازہ کر لیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ خوف پانچ لاکھ کا بھی تھا اور گاہک کا بھی۔ پانچ لاکھ جوان آدمی کے پاس ہوں تو لگتا ہے بہت ڈر لگتا ہے تبھی میری حالت اس شخص کی طرح ہو رہی تھی جس نے پانچ لاکھ میں اپنی زندگی کا سودا کر لیا ہو۔ میں بیٹھتا تھا اور پھر ہوا میں اڑنے لگتا تھا۔ پانچ لاکھ میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ کبھی میں سوچتا تھا کہ اب بھی وقت ہے گاہک کو سب بتا دوں مگر دوسرے ہی لمحے میرے سامنے کوئی خواب آ جاتا تھا۔ ہر آدمی کے پاس خوابوں کا عجائب گھر ہوتا ہے اور اسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سب خواب کہاں سے آئے۔ یہی سوچنے اور خوابوں کی تعبیر دیکھتے بہت وقت گزر گیا۔ میری بڑی غلطی میں نے یہی کی جو سب کرتے ہیں کہ یہ بات اپنی بیوی کو بتا دی۔ عورت نے تو حضرت آدم کو بھی بہکا دیا تھا۔ میرے قدم تو پہلے ہی بہک چکے تھے۔ اس کی باتوں نے مجھے ہزار روپے ماہانہ کے بارے میں نہیں سوچنے دیا جس میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے خواب خریدنے شروع کر دیے۔ میں ان خوابوں میں پھنس گیا۔ پھر کراچی سے کریم سیٹھ نے اطلاع دی کہ گودام پر چھاپا پڑ گیا اور اخبار میں خبر بھی لگوا دی۔ اس نے کہا کہ وہ خود بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوا ہے لیکن یہی اس کی غلطی تھی۔ گودام تو کرائے کے تھے اور کرایہ نامہ فرضی نام سے بنوایا گیا تھا۔ اگر چھاپا پڑتا تو کریم کے بجائے پکڑے جاتے کرائے دار اور وہ نہ ملتے تو گرفتار ہوتا گودام کا مالک۔ اس نے رحمت کباڑی کو بھیجا اور سب کچھ معلوم کر لیا۔"

میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ "پھر اس نے رحمت ہی کو ختم کرنے کے بارے میں کیوں سوچا؟"

ڈرائیور ہنسنے لگا۔ "یہی تو اصل چکر ہے۔ اگر رقعہ رحمت کباڑی کو دیا جاتا اور اس میں لکھا ہوتا کہ ڈرائیور کو واپس نہ آنے دیا جائے تو رحمت مارا جاتا۔ پیغام کا مطلب ہمیشہ الٹا ہوتا تھا۔ سیدھا مطلب یہ ہوتا تھا کہ حامل رقعہ ہذا کو ختم کر دیا جائے۔"

"کیا یہ بات رحمت کباڑی نہیں جانتا تھا؟" میں نے کہا۔ "کہ تمہارے پاس ایک رقعہ ہے؟"

"نہیں۔" ڈرائیور بولا۔ "لیکن میں جانتا تھا۔ دو بار پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ ان دونوں نے میرے سامنے سیٹھ کریم کو رقعہ دیا تھا اور وہ دونوں لوٹ کر نہیں آئے۔ میں نے پھر کبھی ان کو نہیں دیکھا۔"

"اس کا یہ مطلب کیسے ہوا کہ وہ مارے گئے؟" محسن بولا۔

"سیٹھ کریم نے اگلے پھیرے میں مجھے ان کی موت کی خبر دی۔" ڈرائیور بولا۔ "یہ بتایا کہ ان کی لاشیں سمندر میں پھینک

نے نکالی تھیں۔ ایسی ہر خبر پھیلائی جاتی تھی تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔"

"ذرا اس کا خیال رکھنا۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا اور رحمت کباڑی کی لاش کے پاس بیٹھ کے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اندر کی جیب میں نوٹوں اور ذاتی کاغذات کے درمیان تہ کیا سفید کاغذ کا ایک پرزہ رکھا ہوا تھا۔ اس پر لکھا تھا: "کریم سیٹھ۔ ڈرائیور واپس نہ آنے پائے۔ کراچی کا سمندر بہت بڑا ہے۔" میں بہت دیر تک اس تحریر کو دیکھتا رہا۔ اگر وہ سب سچ تھا جو ٹرک ڈرائیور نے بتایا تھا تو گاہک کی طرف سے رحمت کی موت کا فرمان بھی جاری ہو چکا تھا۔ یہ نوشتہ تقدیر تھا کہ وہ کب کہاں اور کیسے مارا جائے۔ گاہک ماچس کا فرمان قدرت کا فیصلہ نہیں بدل سکتا تھا اور رحمت کباڑی کے پاس کراچی تک پہنچنے کی مہلت ہی نہ تھی۔ آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ مجھے پرانا گھسا پٹا شعر یاد آیا جو بہت حسب حال تھا۔ خود ٹرک ڈرائیور بھی جانتا تھا کہ وہ خود اپنی موت کا نامہ بر بن کے جا رہا ہے لیکن وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ رقعہ اسے آخری وقت میں یا چلتے وقت دیا گیا ہوگا۔ وہ کیسے کہتا کہ میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں۔ کہتا تو اسی وقت مارا جاتا۔ اس نے خاموشی سے موت کا پروانہ جیب میں رکھ لیا۔ صرف اس خیال سے کہ اس طرح کچھ مہلت تو ملے گی۔ لاہور سے کراچی تک کے سفر میں شاید کہیں فرار کا راستہ ہو۔ جہاں وہ رحمت کباڑی کو دھوکا دے کر نکل جائے۔ مشکل یہ تھی کہ وہ خود غیر مسلح تھا اور جانتا تھا کہ رحمت کے پاس ریوالور ہے۔ اگر اس نے بھاگنا چاہا تو رحمت اسے فوراً گولی مار دے گا۔

"یہ رقعہ دیکھو۔" میں نے کہا اور کاغذ ٹرک ڈرائیور کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ تم دونوں کا آخری پھیرا تھا۔"

ٹرک ڈرائیور نے رقعہ پڑھ کے ہنسنا شروع کیا۔ اس کی ہنسی بہت عجیب تھی۔ جنون آمیز، خوف زدہ کرنے والی اور پُر آسیب۔ وہ مجھے پاگل نہیں لگتا تھا اور نشے میں بھی نہیں تھا لیکن اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ گردش حالات اسے خود بخود ایسے موڑ پر لے آئی تھی جہاں وہ نہیں آنا چاہتا تھا۔ پہلے سیٹھ کریم کی نیت میں فتور آیا۔ اس نے پانچ لاکھ روپے زبردستی تھما دیے اور وہ مجبور آدمی اپنی ہی کمزوریوں کے جال میں پھنس گیا۔ وہ سیدھا سادہ ٹرک ڈرائیور تھا، شکاری نہیں تھا لیکن وہ شکاریوں میں گھر گیا تھا تو شکار کیسے نہ ہوتا۔ زندگی کے آگے جان لیوا موڑ پر موت اپنا جال پھیلائے کھڑا تھا۔ ایک اور شکاری جو اسی طرح حالات کی سازش کا شکار ہو کے شکاری بنا تھا۔ وہ سرحدوں پر دشمن فوجوں کے درمیان کھڑا درخت تھا جو ایک دوسرے پر گولہ باری کر رہی تھیں اور جن کو صرف فتح و شکست سے سروکار تھا۔ اس اکیلے درخت کی یا اس کی شاخوں میں بسیرا کرنے والے پرندوں کی سلامتی اتنی غیر اہم تھی کہ کوئی اس کے متعلق سوچتا بھی نہیں تھا۔ اس کے لیے دونوں طرف موت تھی اور موت تو موت ہی ہوتی ہے خواہ دشمنوں کے ہاتھوں آئے یا دوستی کا صلہ ہو۔

"جس بات کا تمہیں علم تھا،" میں نے کہا۔ "وہ بات رحمت کباڑی کو کیوں معلوم نہیں تھی؟"

"کون سی بات؟" ڈرائیور نے خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ قہقہہ اب بھی اتنا خفیف پڑا تھا۔

"یہی کہ اپنی جیب میں وہ اپنی ہی سزائے موت کا حکم لے کر جا رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"رحمت تو آج سال بھر کے بعد میرے ساتھ جا رہا تھا۔" وہ بولا۔ "میں نے سال میں بارہ پھیرے کیے اور بارہ آدمی میرے ساتھ گئے۔ ان میں سے اگر دو واپس آئے تو ان کے بارے میں رحمت کو کیسے علم ہو سکتا تھا۔ اسے تو یقین ہوگا کہ وہ پیغام میرے بارے میں ہے۔ اس کا مطلب وہی ہے جو... جو تم نے سمجھا تھا۔ اصل مطلب سمجھتا تو جاتا میرے ساتھ؟"

"تم بھی تو سب جاننے کے باوجود جا رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"میں مجبور تھا۔" ڈرائیور نے کہا۔ "گھر سے چلتے وقت بیوی نے کہا تھا آج مت جاؤ۔ رات میں نے ایک بہت برا خواب دیکھا تھا کہ تمہارے ٹرک کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں نے کہا نیک بخت! سب محبت کرنے والی بیویاں ایسے ہی خواب دیکھ دیکھ کر ڈرتی رہتی ہیں۔ وسوسے اور اندیشے ان کو سوتے میں بھی ڈراتے ہیں لیکن ٹرک تو ہر روز لاکھوں ہی چلتے ہیں۔ کسی ڈرائیور کی بیوی اچھا خواب دیکھے یا برا، موت کی طرح حادثے کا بھی وقت مقرر ہے۔ اس سے کون بچ سکتا ہے۔ وہ کہنے لگی میں نے ایسا خواب تو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کبھی پہلے بھی روکا ہے میں نے تم کو؟ بلکہ مجھے موت بلا رہی تھی۔ میں بیوی کے روکنے سے کیسے رک سکتا تھا۔ میں نہ جاتا تو کوئی قیامت نہیں آتی۔ ٹرک اگلے دن چلا جاتا یا میری جگہ دوسرا شخص ٹرک لے جاتا۔ پھر باہر آتے آتے میں دہلیز سے ٹھوکر کھا کے گرا۔" وہ پھر ہنسنے لگا۔

"اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"رونے سے کیا ہوگا؟" وہ بولا۔ "تقدیر کے اس مذاق پر آخری بار بھی نہ ہنسوں۔ خود اپنی موت پر کون روتا ہے؟"

www.paksociety.com

"لیکن تم ابھی زندہ ہو اور میں نے طے نہیں کیا ہے کہ تم کو قتل کروں۔ رحمت تو اپنی بہادری میں مارا گیا۔ مجھے اپنا دفاع تو کرنا ہی تھا۔ اسے قتل نہیں کہا جا سکتا اور عمداً میں نے ابھی تک کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "آئندہ کی بات نہیں کرتا۔"

"لیکن میں آئندہ کی بات کرتا ہوں۔" وہ بولا۔ "تم چاہے قتل نہ کرو، قتل تو میں ہو چکا۔ جب سمگلنگ کے وقت گاما ماچھی نے مجھے وہ رقم دیا تھا، تب ہی میں نے یہ بات کھول تھی۔ تم راستہ نہ روکتے تب بھی میرا انجام مختلف نہ ہوتا۔ میں گاما ماچھی کو دھوکا دے کر یا اسے قتل کر کے بھاگ جاتا۔ ناکام رہتا تو وہ مجھے گولی مار دیتا۔ اگر کراچی پہنچ جاتا تو سیٹھ کریم بھی قتل کرتا۔ بچ جاتا تو کب تک بچتا۔ کبھی نہ کبھی تلاش کرنے والے مجھے تلاش کر لیتے اور مار دیتے۔ میں نہ ملتا تو میرے بیوی بچے انتقام کا نشانہ بنتے جو مجھے منظور نہیں تھا۔"

"تم انھیں کیسے بچا سکتے ہو؟" میں نے ان سب کو ذہن میں رکھ کے کہا جن کا نام بھی ڈرائیور نہیں جانتا تھا۔ اب تک وہ ایک معمولی ڈرائیور تھا۔ غیر معمولی وہ اس لیے ہو گیا تھا کہ اس نے غداری کی تھی، غبن کیا تھا اور مالکوں کو پانچ لاکھ کا نقصان پہنچایا تھا۔ چنانچہ اس جرم کی سزا کسی نہ کسی کو بہر حال ملنی تھی۔ اسے نہ سہی، اس کے بیوی بچوں کو سہی۔ تو آدمی کے پاؤں کی وہ زنجیر ہوتی ہے جو اسے بے بسی کے ساتھ پھانسی کا پھندا خود اپنے گلے کا ہار بنانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

"مجھے معلوم تھا کہ بعد میں اس کے ساتھ کیا ہوگا۔" ڈرائیور بولا۔ "پھر بھی میں نے کوشش ضرور کی تھی۔ میں نے راستے میں ٹرک روک کے فون کیا تھا۔ میرے پڑوس میں ایک ڈاکٹر رہتا ہے۔ بہت شریف آدمی ہے۔ اسے ایک پیغام دے دیا تھا میں نے اپنی بیوی کے نام کہ جتنی جلد ہو سکے اپنا سب نقد اور زیور لے کر فوراً چلی جائے۔ وہ خود جانتی ہے کہ پانچ لاکھ میں سے کتنے بچے ہیں جو صندوق میں رکھے ہیں اور اس کا زیور کتنا ہے اور یہ سب کہاں سے کیسے آیا ہے۔"

"تمہارے خیال میں وہ کہاں جائے گی؟" میں نے کہا۔

"اور کیا اب تک جا چکی ہوگی؟"

"وہ یقیناً اب تک جا چکی ہوگی۔" ڈرائیور بولا۔ "کہاں گئی ہوگی، یہ میں مر کے بھی نہیں بتاؤں گا، نہ تمھیں نہ انھیں۔"

"اور اگر تم کو آزاد کر دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "تو تم اس کے پاس پہنچ جاؤ گے؟"

"ہاں، مجھے معلوم ہے۔ وہاں کوئی اور نہیں پہنچ سکتا۔" وہ بولا۔ "لیکن وہاں پانچ لاکھ میرے کام نہیں آئیں گے۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں کوئی لکھ پتی نہیں، زمیندار بھی نہیں، نمبردار بھی نہیں۔ اگر میں نے اس دولت سے سارا گاؤں خریدنا تو سب میرے دشمن ہو جائیں گے۔ میرے اور میری بیوی کے چاچے ماموں سب حسد کرنے لگیں گے۔ وہ خود ہی تھانے میں اطلاع دے دیں گے کہ یہ معمولی سا ڈرائیور کہیں سے ڈاکا ڈال کے لاکھوں لے آیا ہے۔ وہاں تو میں اسی طرح زندہ رہ سکتا ہوں کہ تھوڑی سی زمین خرید لوں اور ایک چھوٹا سا گھر بنا لوں اور اس سب دولت کو دفن کر دوں، کنویں میں ڈال دوں یا جلا کے راکھ کر دوں۔ ورنہ وہ آ جائیں گے اور کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے، میرے بچوں کو بھی نہیں۔"

"تم فرار ہو کے کسی ویسے ہی دوسرے گاؤں میں نہیں جا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔ "پنجاب کے رہنے والے ہو تو بلوچستان یا سندھ کے کسی گاؤں میں، یا ملک سے باہر۔ میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں، ایک شرط پر۔ تم مجھے کراچی کے ساحل ٹھکانوں کے پتے بتا دو۔ یہ بتا دو کہ مال کیا لے جاتے تھے۔"

"یہ تو مجھے آج تک معلوم نہیں ہوا، تمھیں کیسے بتاؤں؟" وہ بولا۔ اس کا لہجہ اب کچھ پُرامید محسوس ہوتا تھا۔ "لیکن ... کہیں اور جاتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔ باہر کی پولیس بہت چالاک ہوتی ہے۔ پھر ملک سے باہر بھی ان کے آدمی ہیں۔ کسی چھوٹے سے گاؤں میں اچانک کوئی اجنبی پانچ لاکھ لے کر کیسے وارد ہو سکتا ہے۔ کون قبول کرے گا اسے؟ اور یہ چوہدری، نمبردار اور تھانے دار، یہ کب برداشت کریں گے۔ نہیں جی، ہم سب اسی گاؤں میں رہ سکتے ہیں مگر اس دولت کے بغیر۔ اس دولت اور موت میں سے ہمیں ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ یہاں میں نے ایک لاکھ کا مکان خریدا تھا لاہور میں۔ پچاس ہزار کے قریب میری بیوی نے گھر کے سامان اور زیورات بنانے میں خرچ کیے تھے۔ ساڑھے تین لاکھ نقد ہوں گے۔ اس کے لیے میں اپنی، بیوی کی اور تین بچوں کی زندگی بیچ دوں؟"

"اچھا جو تمھارا دل چاہے کرنا۔" میں نے صبح کے آثار نمودار ہوتے دیکھ کر کہا۔ "یہاں سے رہائی کی شرط وہی ہے۔ حال ہم ابھی تم کو دکھا دیتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ کراچی چلو۔"

"میں تمھیں پتا بتا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "نام بتا سکتا ہوں۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ پتا غلط نہیں ہوگا؟" میں نے کہا۔ "ہم خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"خطرہ میرے لیے نہیں ہوگا تمھارے ساتھ جانے میں؟" وہ بولا۔

"تم وعدے سے بتاؤ گے۔ ہم میں سے ایک تصدیق کے

لیے جائے گا۔ ایک تمھارے ساتھ رہے گا۔" میں نے کہا۔ "اگر کوئی بات غلط نہیں ہوئی تو تم کو چھوڑ دیا جائے گا۔ آگے جو تمھارا نصیب۔"

میں ڈرائیور سے گفتگو میں اتنا مصروف تھا کہ محسن کی طرف متوجہ نہیں رہا تھا۔ وہ اطمینان سے دیوار کا سہارا لیے بیٹھا تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔ فقیر گہری نیند میں خراٹے لے رہا تھا اور رحمت کباڑی کی لاش اکڑنے لگی تھی۔ مجھے فقیر پر رشک آیا جو ایک دم لگا کے بے غم ہو گیا تھا۔ اسے اپنی ذات کی حد تک ہم سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ ہم نے اس کا پیسہ گن کر اسے واپس کر دیا تھا اور ہم اس کے دشمن بھی نہیں تھے لیکن جو کچھ اس کی نظروں کے سامنے ہو رہا تھا، وہ اس کو دہشت زدہ کر رہا تھا۔ اس کا آسان علاج یہ تھا کہ آنکھیں اور کان سب بند کر لیے جائیں اور احساس کو ختم کر دیا جائے۔ پھر ہوش آنے پر یا تو سب خیریت ہوگی یا ہوش آئے گا ہی نہیں۔ آنکھ کھلے گی تو معلوم ہوگا کہ یوم حساب آ گیا۔

طویل جسمانی اذیت برداشت کرنے کے باوجود ڈرائیور بھوک پیاس، تھکن یا درد کے احساس سے بے نیاز تھا۔ زندگی کا یقین ختم ہو جانے کے بعد جسم کی مادی ضروریات بھی ختم ہو گئی تھیں اور ان حالات میں اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے اسے زد میں رکھا اور محسن کے پاس بیٹھ کے اس سے مشورہ کیا۔ کچھ دیر بعد محسن باہر گیا اور گاڑی میں سے وہ کریٹ اٹھا لایا جو ہم نے ٹرک میں سے اتارا تھا۔ پھر وہ اسے کھولنے کے لیے کچھ تلاش کرنے نکلا۔

"تمھیں معلوم ہے ہم کون ہیں؟" میں نے ڈرائیور سے کہا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا جیسے اسے یہ بات معلوم ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ محسن ایک زنگ خوردہ سریے کا ٹکڑا لیے نمودار ہوا جو دو فٹ لمبا تھا۔

"ہم تمھارے نہیں، ان کے دشمن ہیں جن کی خاطر تم اب تک غلط کام کرتے رہے ہو۔" میں نے سوچ کے کہا۔ "مگر نہ ہم اسمگلر والے ہیں اور نہ پولیس والے۔" ڈرائیور نے ایک نظر میرا پولیس انسپکٹر کی وردی پر ڈالی۔

"ہم نے وہ ٹرک تباہ کر دیا ہے جو تم اور رحمت کباڑی لے کر روانہ ہوئے تھے۔" محسن نے اسے مطلع کیا۔

"بس یہ نمونہ بچا ہے۔" میں نے اسے سریے کی مدد سے کریٹ پر زور آزمائی کرتے ہوئے دیکھا۔ "ہمارے آئندہ پروگرام میں ان سب کو تباہ کرنا شامل ہے جو رحمت اور گاما ماچھی کے ساتھی ہیں۔ اس سے اوپر بھی بہت سے لوگ ہیں لیکن تم بھی اس نمونے کی طرح بچ سکتے ہو کیونکہ تم محض آلۂ کار تھے اور تمھاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم کو ان کے اصل دھندے کا علم نہیں تھا۔ ورنہ تم ان کا ساتھ نہ دیتے۔ کہیں اور ڈرائیور کی نوکری کر لیتے۔ پھر تم پھنس گئے اور تمھارا نکلنا مشکل ہو گیا۔ یہ نازک بات ہے۔"

ڈرائیور نے اقرار میں سر ہلایا۔ اسی وقت محسن نے کریٹ کے گرد لپٹی ہوئی پٹی کو توڑنے میں کامیابی حاصل کی۔ اب اوپر کے تختے کھولنے کا مرحلہ درپیش تھا جو زیادہ مشکل تھا۔ ہمارے پاس کوئی تیز دھار والی یا نوکیلی چیز نہیں تھی جسے تختوں کی درز میں پھنسا کے زور لگانے سے تختہ اکھڑ جاتا۔ یہ مسئلہ محسن خان نے اس طرح حل کیا کہ باہر سے ایک بھاری پتھر لا کے کریٹ کے کونے پر ضرب لگائی۔ تختے کا کونا ٹوٹ گیا اور لکڑی کی ایک چھوٹی سی مثلث الگ ہو گئی۔ اس سے کریٹ میں اتنا بڑا سوراخ بن گیا کہ آدھا انچ موٹائی کا سریا اندر ڈالا جا سکے۔ محسن نے سریا داخل کر کے لیور بنا لیا اور نیچے زور لگایا۔ نیچے کے تختے میں پیوست کیلوں نے مزاحمت کی اور تختہ چرچرایا لیکن بالآخر اوپر اٹھ گیا۔ اس کے بعد کام آسان ہو گیا۔ محسن سریے کو آگے کھسکا کے زور لگاتا گیا اور اوپر نیچے کے تختوں میں جڑی ہوئی کیلیں نکلنے لگیں۔

اچانک میری دلچسپی بڑھ گئی۔ انکشاف راز کا وقت آ گیا تھا۔ "میر وزیر اینڈ کمپنی" کے جائز کاروبار کی آڑ میں کون سا ناجائز کاروبار چل رہا تھا۔ یہ جاننے کے لیے میں نے کتنی ناکام اور پُراذیت جدوجہد کی تھی۔ میرا ساتھ دینے والوں نے کتنی سزا پائی تھی اور کتنی قربانی دی تھی۔ وزیر خان نے ایمانداری اور محنت کو اصول بنا کے "وزیر خان انجینئرنگ" کی بنیاد رکھی تھی۔ پھر بے ایمان اور بے ضمیر لوگ اس کے ساتھی بن گئے جنھوں نے اسے ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس میں تبدیل کر دیا۔ اس کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے غیر قانونی کاروبار شروع کیا۔ لاکھوں کمائے مگر وزیر خان کو ایمانداری اور اصول پرستی پر قائم رہنے کے جرم میں کاروبار سے الگ کیا۔ کوڑی کوڑی کو محتاج کیا اور ختم کر دیا۔ اس راز پر برسوں پردہ پڑا رہا اور جب پردہ اٹھنے کا خطرہ لاحق ہوا تو انھوں نے مجھے خریدنا چاہا۔ دس لاکھ نہیں لاکھ، پچاس لاکھ میں مجھ سے صرف اتنا چاہا کہ میں خاموش رہوں اور جو ہوا اسے بھول جاؤں۔ اس کے بعد تباہی و بربادی، قتل و غارت گری اور خوں ریزی کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ اب تک جاری تھا کیونکہ میں نے ان کی لگائی ہوئی بولی مسترد کر دی تھی جو سمجھتے تھے کہ دولت لے کر میں سب فراموش کر دوں گا۔ وزیر خان کو اس سے اپنے رشتے کو، اس بیٹے کی آبرو کو وزیر خان

www.paksociety.com

کے بے گناہ خون کی پکار کو مستقبل کی خوشی کے لیے ماضی کے غم بیچ دوں گا اور خوف زدہ ہو کے انتقام کے خیال سے تائب ہو جاؤں گا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا اور افشائے راز کے خوف نے دوست بن کر دیرینہ جان سے دشمنی کرنے والوں کی نیندیں بھی حرام کر دی تھی۔ لندن سے آنے کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا تھا اور سنا تھا اس کے بعد میرے ذہن میں سب سے پہلے یہی سوال آیا تھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ دوسرا سوال یہ تھا کہ ایسا کس نے کیا؟ ابھی تک مجھے کسی سوال کا جواب نہیں ملا تھا لیکن اس باکس یا کریٹ کا کھلنا میرے پہلے سوال کے جواب کی بنیاد بن سکتا تھا۔ پردہ میری آنکھوں پر سے اٹھنے والا تھا کہ وہ "مال" کیا ہے جو ایسے پُراسرار اور پیچیدہ طریقے سے میرو فرمیا ایجنسی سے کراچی پہنچتا ہے اور لاکھوں کے منافع کا ضامن ہے۔ ٹرک ڈرائیور کے بیان کے مطابق ایک پھیرے میں دس لاکھ کا منافع تھا جو اس نے سیٹھ کریم کے ساتھ ففٹی ففٹی کر لیا تھا۔ زرعی آلات اور پرزے سونے کے بنے ہوئے نہیں ہوتے کہ ایک ٹرک کا مال اتنا مہنگا فروخت ہو اور اتنا منافع دے۔

تختہ ہٹتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بالآخر مجھے معلوم ہونے والا تھا کہ چوہدری والا اور ایجنسی کا اصل دھندا کیا تھا۔ ایک بار یہی معلوم کرنے کے لیے میں سر سے کفن باندھ کے فیکٹری میں جا گھسا تھا لیکن وہاں چھ بدمعاشوں نے فورمین بن کر مجھے لکڑی کے تابوت میں بند کر دیا تھا۔ ایک فورمین رانجھا تھا جو اس راز کی حفاظت میں نااہلی کا مظاہرہ کرنے پر زندہ جلا دیا گیا تھا۔ دوسرا فورمین رحمت کباڑی تھا جس کی بے حس و حرکت لاش آدمی کی زندگی کے ہر یقین کا، ہر دعوے کا اور قسمت کے ہر عروج کے لیے تصویرِ عبرت بنی ہوئی تھی۔ باقی چار کون تھے اور ان کے لیے کاتبِ تقدیر نے کیا لکھا تھا، یہ کوئی وقت سے پہلے کیسے جان سکتا تھا۔

محسن نے کریٹ کے اندر بھری ہوئی گھاس ہٹائی۔ اس کے نیچے ایک گتا تھا۔ آخری تہ سیلوفین شیٹ کی تھی جو درحقیقت سیلوفین کی ہر طرف سے بند تھیلی تھی۔ بارش کا پانی کریٹ کے اندر پہنچ سکتا تھا لیکن سیلوفین کی تھیلی میں بند مال کو خراب نہیں کر سکتا تھا۔ محسن نے سیلوفین کو دانتوں سے کاٹا اور اس کا ایک منہ کھولا۔ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں اپنی اپنی جگہ منجمد ہو گئے ہم دونوں کی نظر "مال" پر جم گئی۔ ہم گردوپیش سے اتنے بے خبر تھے کہ اگر ڈرائیور چاہتا تو ہماری غفلت کے اس لمحے سے فائدہ اٹھا کے ہم پر حملہ کر سکتا تھا۔ وہی سریا ہمارے سر پر مار سکتا تھا جو محسن کے ہاتھ سے نیچے گر گیا تھا یا میرے ہاتھ سے ریوالور چھین سکتا تھا لیکن ہم اس کے لیے زندگی کی نئی امید کے نامہ بر تھے۔ وہ حیرت سے ہماری صورتوں کو دیکھتا رہا۔

"ہمارے ساتھ دھوکا ہو گیا محسن!" میں نے مایوسی کے اس حوصلہ شکن وقفے کو ختم کیا جس میں میری توقعات خاک میں مل گئی تھیں۔ کریٹ کے اندر مجھے نٹ بولٹ بھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

"صرف اس لیے کہ وقت کم تھا۔" محسن نے امید افزا لہجے میں کہا۔ "ہم نے سوچے سمجھے بغیر ایک کریٹ اٹھا لیا تھا۔ ہم کو دیکھنے میں سب ایک جیسے لگے تھے۔"

"لیکن ان سب میں نٹ بولٹ نہیں تھے۔" میں نے کہا۔ "شاید اوپر والے سب کریٹ ایسے تھے کہ ضرورت پڑنے پر کھول کے دکھائے جا سکتے تھے۔"

"ہاں! اصل مال نیچے تھا۔" محسن بولا۔ "یا مال کے چند ہی کریٹ تھے۔ ہم کھول کر کیسے دیکھتے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے محسن۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ "کہ نٹ بولٹ اوپر ہی ہوں۔ نیچے ذرا دیکھو۔"

محسن نے تھیلی کو کھینچ کر باہر نکالنا چاہا لیکن پلاسٹک کی تھیلی وزن سے پھٹ گئی۔ محسن نے کریٹ الٹ دیا۔ ایک بار پھر ہمیں مایوسی ہوئی۔ اس میں ایک ہی سائز کے نٹ بولٹ تھے۔

"شکر ہے تیرا میرے مولا!" فقیر نے صدا لگائی اور ہم نے پلٹ کر دیکھا تو وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا تھا لیکن ہماری طرف بالکل متوجہ نہ تھا۔ اپنی مایوسی کی کیفیت میں محسن کو اور مجھے یہ بات یوں لگی جیسے وہ ہمارا مذاق اڑا رہا ہو۔

"کس بات پر خدا کا شکر ادا کر رہے ہو؟" محسن نے جھنجلا کے کہا۔

"بڑا کرم ہے میرے رب کا۔" وہ رحمت کباڑی کو دیکھ کے بولا۔ "سوتے تو دونوں ایک ساتھ تھے۔ اٹھنا صرف مجھے نصیب ہوا۔" اس نے چمٹا اور کشکول اٹھایا۔ "جان اور مال دونوں کو بچانے والا وہی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن سواری کہاں چلی؟"

"سویرا ہو گیا بابا۔ پنچھی بھی دانہ دنکا چگنے نکل گئے۔" وہ بولا۔ "فقیر کا بھی وقت ہو گیا۔"

"ابھی آپ تشریف رکھیں۔" میں نے ریوالور سے اشارہ کیا۔ "ہم سے پہلے آپ نہیں جا سکتے۔"

"ارے بابا! پیٹ کھانے کو مانگتا ہے۔" فقیر فرش پر بیٹھ گیا۔ "آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔"

"فکر مت کرو۔ ایک دن کے فاقے سے اِنّا لِلّٰہ پڑھنے کی نوبت نہیں آئے گی۔" میں نے کہا۔ "ابھی تمہیں حسن وسلوٹے اترنے تک صبر کا پھل...."

"ارے بابا صبر کے پھل کا نہیں روزی کا سوال ہے۔" وہ جھلا کے بولا اور پھر کھڑا ہو گیا۔

"یار محسن۔" میں نے کہا۔ "یہ ایسے نہیں مانے گا۔ اس کا زرِ ضمانت ضبط کر لے۔ منہ ادھر کر کے سائیں بادشاہ ہو کے کندھا پکڑ کے اسے گھما دیا۔ محسن نے اس کی مزاحمت کے باوجود جیب میں ہاتھ ڈال کے اس کا تمام سرمایہ نکال لیا پھر اسے دھکا دیا تو وہ کونے میں جا گرا۔ اس کا چمٹا اور کشکول اس سے پہلے ہی گر گئے۔

"ارے ظالمو! قاتلو!" فقیر کی بدحواسی لو! وہ اپنی قبا سے ناک صاف کر کے چیخ چیخ رونے لگا۔ "میرا مال کھاؤ گے تو بری موت مرو گے۔ ہضم نہیں ہو گا تمہیں۔"

"آرام سے بیٹھے رہو گے تو مال واپس مل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ مال کیا ہم تمہیں بھی کھا جائیں گے اور ہضم بھی کر لیں گے۔" پھر میں محسن سے مخاطب ہوا۔ "میں گاڑی لے کر جاتا ہوں اور ناشتے کے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔"

"اس گاڑی سے فوراً نجات حاصل کرنی ضروری ہے۔" محسن نے فرشتے میں فرمایا۔ "جو میں اور وہ گزار کے کا جو تک جاتے تھے۔ اب کے مالک نے پولیس میں رپورٹ ضرور لکھوائی ہو گی۔"

میں باہر نکلا تو سورج بھی نکل رہا تھا۔ میرے پاس تقریباً اٹھائیس ہزار روپے نقد تھے۔ بیس ہزار میں نے خود لوٹ لی تھی۔ پانچ ہزار نقدرالہ نے دیے تھے اور تین ہزار اس وردی کے ساتھ ہی آ گئے تھے۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک چیک تھا۔ جس کے اعداد خیرا ہم تھے۔ ان سے کہیں زیادہ بیش قیمت خلوص، محبت اور اعتماد کا وہ جذبہ تھا جو اس کاغذ کے پرزے میں بھی خوشبو بن کے سما گیا تھا۔ ایک بار پھر مجھے تھرماس کی ضرورت کا احساس ہوا۔ میں نے ماڈل ٹاؤن کے بازار کا رخ کیا۔ ایک ریسٹورنٹ میں ناشتا کرتے ہوئے میں نے طے کیا کہ اب مجھے پولیس کی وردی میں پھرنے اور کاریں چھیننے کی مزید واردات کرنے کی ضرورت نہیں۔ خطرات جتنے کم ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔ نقد رقم اتنی تھی کہ ہم ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید سکتے تھے جو ہمیں کرائے پر ملتی۔ رجسٹریشن تو اس کی پہلے سے ہو گی بحر السفر کے لیے فرضی نام استعمال کرنے سے ہم محفوظ ہو جاتے تھے۔ بشرطیکہ ہم اسی نام سے ڈرائیونگ لائسنس بھی حاصل کر لیں۔

میں نے چار انڈوں کا آملیٹ بنوایا۔ ایک پوری ڈبل روٹی کے سلائس کٹوا کے مکھن لگوایا۔ تھرماس میں چائے بھروائی اور انتہائی مشتبہ نظروں سے دیکھنے والے منیجر کو گھورتا ہوا ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کسی ریسٹورنٹ کا منیجر اتنا بہادر کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک باوردی پولیس انسپکٹر کو اشتعال دلائے اور وہ بھی کسی وجہ کے بغیر۔ میں نے تو بل بھی پورا ادا کیا تھا۔ جب میں کار اسٹارٹ کر رہا تھا تو وہ ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا چکا تھا اور گردن آگے بڑھا کے کار کا نمبر نوٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ والی بات تھی۔

واپسی کے بجائے میں نے کار کو سیدھا دوڑایا اور چند منٹ میں کئی موڑ کاٹنے کے بعد ریسٹورنٹ سے کئی میل دور لے گیا۔ ریسٹورنٹ منیجر کے رویے نے مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ مزنگ کی ایک سڑک پر میں نے کار کو روکا ہی تھا کہ ایک اخبار والا میرے سامنے آ گیا۔ "اخبار صاحب۔" اس نے کھڑکی کے قریب آ کے کہا۔ میں نے اسے ایک روپیہ دیا اور اخبار خرید لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ گاڑی کو یہیں چھوڑ دوں اور رکشا یا ٹیکسی لے کر واپس جاؤں۔ تھوڑا سا دم لینے کے لیے میں نے اخبار کھولا اور سرخیوں پر نظر دوڑائی۔ لیکن صفحہ پلٹتے ہی میری نظروں کے سامنے برق سی کوندی اور پل بھر کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ مقامی

www.paksociety.com

خبروں والے صفحے پر میری تصویر مسکرا رہی تھی۔ وہی تصویر جو میرے پاسپورٹ پر بھی موجود تھی۔ تصویر کے اوپر لکھا تھا: "مطلوب ہے۔" اور نیچے تفصیلات میں یہ تھا کہ یہ شخص جو سکندر بخت ولد وزیر خان ہے اور کبیر بھی کہلاتا ہے پولیس کو قتل اور رہزنی کی متعدد وارداتوں میں مطلوب ہے۔ اس کے خلاف راولپنڈی اور لاہور میں دوہرے قتل کے مقدمات درج ہیں اور عدالت اسے مفرور قرار دے چکی ہے۔ اس نے پولیس انسپکٹر کی وردی اور ریوالور سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راہ چلتے لوگوں کو روک کر کم سے کم دو کاریں چھینی ہیں۔ اس کی گرفتاری یا نشاندہی کرنے والے کو دس ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔

اشتہار پولیس کی طرف سے تھا لیکن مجھے شک ہوا کہ اس میں اگر چودھری دلاور اینڈ کمپنی کا ہاتھ نہیں تو یہ عین ممکن ہے یہ انکل رضوی کی کوشش کا نتیجہ ہو۔ فرض شناسی میں وہ پہلے سے بہت نیک نام تھے لیکن اب میں ان کی بدنامی کا باعث ہو رہا تھا۔ انکل رضوی اب صف دشمناں میں شامل ہو چکے تھے اور مجھ پر ان کی شفقت کا سایہ نہیں رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ تصویر کتنے اخباروں میں چھپی تھی اور اب تک کہاں کہاں پہنچ چکی تھی۔

صورت حال انتہائی سنگین ہو گئی تھی۔ ایک ریسٹورنٹ کے منیجر نے مجھے یقیناً شناخت کر لیا تھا۔ اب تک اس نے پولیس کو فون کر دیا ہوگا اور یہ بتا دیا ہوگا کہ ملزم ۱۹۹۵ء ماڈل کی سفید کرولا میں کہاں دیکھا گیا ہے اور کدھر گیا ہے۔ شاید اس نے کار کا نمبر بھی لکھوا دیا ہوگا۔

فوری طور پر مجھے بہت سے لوگوں کا خیال آیا۔ رابعہ کا اور شہلا کا۔ انکل خیرو بابی کا اور فوزیہ کا۔ استاد جنیدی کا اور میرے دوسرے وکیل عبدالودود منظر کا۔ وہ سب کیا سوچیں گے اور کس طرح میری مدد کر سکیں گے۔ اچانک وہ سب جو کل تک میری طرف تھے چودھری دلاور اینڈ کمپنی میں شامل ہو گئے تھے اور پولیس ان کے ساتھ ہو گئی تھی۔ تین طاقتور دشمن ایک ہو گئے تھے اور میں اکیلا رہ گیا تھا۔ دو شکاری واقعی طاقتور تھے یعنی پولیس اور دلاور اینڈ کمپنی۔ تیسرا فریق اس لیے طاقتور تھا کہ ان کے مقابل میری جذباتی کمزوری تھی۔ وہ خود میری کمزوری تھے۔ وہ سب جانتے تھے کہ میں بے گناہ ہوں لیکن ان کا یقین کوئی قانونی دلیل نہیں تھا۔ یہ فیصلہ تو عدالت کو کرنا تھا اور وہ مجبور تھے کہ مجھے عدالت سے باعزت طور پر زندہ رہنے کا حق دلوائیں۔ دوسری طرف میری عملی دشواریاں جن کی وجہ سے میں انصاف حاصل کرنے کا مروجہ طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا اور اب جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا میرے اور دنیا کے نقطۂ نظر کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ انصاف حاصل کرنے کی جدوجہد میں میرے ساتھ ہونے والی ناانصافی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

میں نے بڑی عجلت سے گاڑی اسٹارٹ کی اور واپسی کی راہ اختیار کی۔ پہلی ویران سڑک پر آتے ہی میں نے کار کو ایک دیوار کے ساتھ روکا اور رومال سے اندر باہر وہ جگہ صاف کر دی جہاں میرے فنگر پرنٹس ملنے کا امکان تھا۔ اب اپنی وردی سے نجات حاصل کرنا بھی اتنا ہی ضروری تھا لیکن میرے پاس دوسرے کپڑے نہیں تھے اور میں بازار جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ابھی میں کچھ طے نہیں کر پایا تھا کہ میں نے اپنے سامنے سے سائیکل پر ایک پوسٹ مین کو آتے دیکھا۔ اسے تو یقیناً ڈاک خانے ڈیوٹی پر پہنچنا ہوگا۔ میں نے سوچا۔ اور اس غریب نے ابھی اخبار کہاں دیکھا ہوگا۔ اس ملک میں تو اخبار خرید کر پڑھنا بھی وہ عیاشی ہے جس کا شوق سب کو نہیں ہوتا خواہ ان کے پاس فرصت، تعلیم اور پیسہ سب کچھ ہو۔

میں اطمینان سے باہر نکلا اور پوسٹ مین کو اشارے سے قریب بلایا۔ وہ سراسیمہ نظر آنے لگا اور قریب آنے سے پہلے ہی سائیکل سے اتر گیا۔ جب وہ سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑی کر رہا تھا تو میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اس کی آواز تک نہ نکل سکی اور میں نے اسے کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ پانچ منٹ میں اس کی وردی میرے جسم پر تھی اور کھانے پینے کا سب سامان پولیس کی وردی سمیت ڈاک کے تھیلے میں سما گیا تھا۔ خاکی وردی خاصی بوسیدہ تھی چنانچہ جب میں کار کے دروازے بند کر کے اور چابی وہیں چھوڑ کے سائیکل پر پیڈل مارتا روانہ ہوا تو میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ میں نے شاید بچپن میں سائیکل چلائی تھی۔ اب اس پر سواری کرنا مجھے بہت مضحکہ خیز لگا۔ یہ خیال بھی بہت عجیب تھا کہ اس وقت مجھے دیکھنے والے کیا سمجھتے ہوں گے۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں کون ہوں۔ انگلینڈ سے اعلیٰ تعلیم پا کے لوٹنے والا۔ ایک صنعت کار۔ ایک بزنس مین یا دنیا کے نقطۂ نظر سے جعلی پولیس انسپکٹر۔ دوہرے قتل کی.... وارداتوں میں مطلوب ایک مفرور اشتہاری مجرم۔ کوئی کیسے سوچ سکتا ہے کہ ڈاکیے کے اس فرسودہ بیگ میں انسپکٹر پولیس کی وردی ہی نہیں، ایک ریوالور بھی ہے اور اٹھائیس ہزار روپے نقد بھی ہیں۔ پوسٹ مین کی ڈاک اور نقد رقم میں نے اس کے پاس کار میں ہی رکھ دی تھی۔

ایک جگہ مجھے "پبلک ٹیلی فون" کا سائن بورڈ نظر آیا۔ دکان ایک جیب اینڈ ہارڈ ویئر اسٹور تھی لیکن اندر اسٹول پر ایک بچہ بیٹھا تھا۔ عقبی حصے میں ایک دروازہ تھا۔

"میں ابا کو اندر سے بلا لاتا ہوں" وہ مجھے ڈاکیہ سمجھ کے بولا۔ "ناشتہ کر رہے ہیں وہ۔"

"نہیں بیٹا۔ رہنے دو" میں نے کہا۔ "مجھے صرف فون کرنا تھا۔"

"ایک روپیہ ہوگا" بچے نے بڑی متانت سے کہا اور روپیہ ایک صندوقچی میں ڈال دیا۔ اس شرح پر وہ بل ادا کر کے بھی کچھ نہ کچھ بچا لیتے ہوں گے۔ میں نے دلاور کے گھر کا نمبر ملایا۔

"چودھری صاحب۔ السلام علیکم" میں نے کہا۔ "میں رانجھا خود بول رہا ہوں جناب عالی۔"

"اچھا" دلاور نے خاصی دیر کے بعد کہا۔ "کہاں سے؟"

"عالم ارواح سے جناب عالی" میں نے کہا۔ بچہ عالم ارواح کا مطلب بالکل نہیں سمجھا۔ "کوئی پیغام ہے اپنے ڈپٹی سلو صاحب کے لیے؟ میرے ساتھ ہی ہیں جہنم میں۔ آپ کب تشریف لا رہے ہیں؟"

"دیکھو سکندر" دلاور کی آواز آئی۔ "ہم اب بھی بات کر سکتے ہیں۔ جتنا نقصان ہو چکا سو ہو چکا۔ لیکن آئندہ جو کچھ ہوگا اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ تم نے اخبار دیکھا ہے آج کا؟"

"دیکھا ہے" میں نے کہا۔ "اور اس سے مجھے خاصی مفید معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ کل کیا ہوگا، یہ علم غیب کے بغیر کوئی نہیں جان سکتا جو خدا نے نہ تمہیں دیا ہے اور نہ مجھے۔ اس لیے آج کی بات کرو۔ آج ایک خبر بھیج رہا ہوں میں تمہارے نام۔"

"کیا خبر ہے؟" دلاور نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

"ایک خوش خبری ہے" میں نے کہا۔ "اور ایک تحفہ ہے۔ ڈرو نہیں۔ کوئی ہلاکت خیز چیز نہیں ہے۔ فی الحال میرا کوئی ارادہ نہیں ہے تم کو جہنم رسید کرنے کا۔"

"تمہارا خیال ہوگا کہ وہ اشتہار میں نے لگوایا ہے؟" وہ بولا۔

"خیال تو آیا تھا مجھے لیکن خیال مجھے رضوی صاحب کا بھی آیا تھا" میں نے کہا۔

"راولپنڈی کی پولیس نے لاہور پولیس سے رابطہ قائم کیا تھا اور ان کے پاس تمہاری تصویر تھی۔"

"جو تم نے کسی طرح ان کو فراہم کر دی تھی" میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے تمہارے کسی آدمی نے۔"

"اس کی ضرورت پیش نہیں آئی" وہ بولا۔ "ہم نے فون پر بتا دیا کہ مفرور مجرم کہاں مل سکتا ہے۔ تصویر تمہارے انکل نے دکھا دی اور ساتھیوں نے شناخت کر لی۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ دلاور بات کو طول دینا چاہتا ہے اور اس کا مقصد صرف ایک ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے گھر میں دو فون تھے۔ اس نے بیوی سے کہہ دیا ہوگا کہ وہ دوسرے فون پر پولیس کو بتا دے کہ ملزم سکندر فون پر بات کر رہا ہے اور وہ ایکسچینج سے معلوم کر لیں کہ فون کہاں سے کیا گیا ہے۔ ایسی مستعدی کی توقع نہ مجھے اپنی پولیس سے تھی اور نہ اپنے ٹیلی فون کے محکمے والوں سے لیکن موجودہ حالات میں خطرے کے ایک فی صد امکانات سے بھی دور رہنا بہتر تھا۔

وہی فاصلہ جو میں نے کار میں آسانی سے بیس منٹ میں طے کر لیا تھا سائیکل پر ایک گھنٹے میں طے ہوا۔ سائیکل کو میں نے اس گھر سے کافی دور چھوڑا اور ڈاکیوں کی طرح تھیلا لٹکائے پیدل گھر تک گیا۔ اس وقت نو بج چکے تھے اور دھوپ میں تمازت آ گئی تھی کہ میں پسینے میں شرابور تھا۔ اندر پہنچنے کے بعد میں نے محسن کو چونک کر ریوالور اٹھاتے دیکھا۔ "میاں خان صاحب!" میں نے فریاد کی۔ "ذرا یہ کھڑا تو دیکھو گولی مارنے سے پہلے۔ ہم سکندر اعظم ہیں۔"

"اچھا کیا پہلے بتا دیا ورنہ ہم خان لوگ گولی پہلے مارتے ہیں، سوال بعد میں کرتے ہیں۔" محسن خان نے کہا۔

"یا میرے مولا" فقیر نے آواز لگائی۔ "کس عذاب میں ڈال دیا فقیر کو۔ دھندا گیا، مال گیا، اب جان جائے گی۔ گولی سے نہ مارا ان ظالموں نے تو بھوک سے مار دیں گے۔"

میں نے کچھ کہے بغیر اخبار محسن کے حوالے کیا اور ناشتے کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ ٹرک ڈرائیور کو اور دوسرا محسن کو دینے کے بعد میں نے باقی سلائس اور آملیٹ فقیر کے حوالے کیا تو اس کی شکل رونے والی ہو گئی۔ "اوئے ظالمو۔ اتنا انتظار کرانے کے بعد دو پراٹھے اور ایک پاؤ حلوہ بھی نہیں؟ اونٹ کے منہ میں زیرہ...."

"اونٹ کے بچے" میں نے اس کے ایک الٹا ہاتھ مارا۔ "خدا کا شکر ادا نہیں کرتا کہ یہ بھی مل گیا۔" اس کی آواز بند ہو گئی۔ باقی ناشتا اس نے خاموشی سے ٹرک ڈرائیور کے ساتھ کیا۔ چائے سب کو باری باری اسی مگ نما پیالے میں پی جو تھرمس کا کور تھا۔

"یہ تو معاملہ بہت بگڑ گیا ہے" محسن نے اخبار رکھ کے کہا۔ اور آواز کم رکھی۔ "اب کیا ہوگا؟"

www.paksociety.com

"اب آگے میں اکیلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "میں نے اپنا حلیہ بدل لیا ہے۔ تو واپس جائے گا۔"

"میں ان حالات میں تیرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔" محسن نے قطعی لہجے میں کہا۔ "گفتگو فرنچ میں فرمایئے۔"

"پہلے میری بات سن لے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ عورت ہے۔ وہ جب ملنا چاہے اکیلی گھر سے نہیں نکل سکتی۔ تو میرے اور رابعہ کے درمیان رابطے کا کام کر سکتا ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ میری وکیل ہے اور میں اس کا موکل ہوں۔ ہمیں باہمی صلاح مشورے کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ ہم ٹیلی فون پر بات نہیں کر سکتے اور میں نے کھوئے یار کا رخ بھی کیا تو شکاری پیچھے ہونے والے جائیں گے۔ وقت اور مقام طے ہو جانے کے بعد بچھڑے ہوؤں کو ملانا تیری کوشش پر منحصر ہے۔ اس کا ثواب تجھے مفت میں ملے گا۔ میں نے یہ طے کیا ہے کہ اس ٹرک ڈرائیور کے ساتھ کراچی جاؤں اور کار میں جاؤں جسے یہ ڈرائیو کرے۔"

"کوئی اور گاڑی چھین لی ہے کیا؟" محسن نے کہا۔ "اخبار دیکھنے کے بعد؟"

"نہیں۔ اب تو شہر جا۔" میں نے کہا۔ "کوئی اچھی سی چلتی گاڑی خرید۔ بیس بائیس ہزار تک اچھی گاڑی مل جانی چاہیے۔ مجھے ایک سوٹ کیس چاہیے اور کچھ کپڑے۔"

"اس تصویر کی اشاعت کے بعد تو ہر لباس میں پہچانا جائے گا۔" محسن بولا۔

"باہر پھرنے کے لیے میرے پاس تین ڈریس ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "ایک تھانیدار کا۔ ایک ڈرائیور کا اور ایک فقیر کا۔"

"اور ان تینوں میں سے کار کا مالک کون ہوگا؟" محسن نے کہا۔

"کار کسی فرضی نام سے آج ہی ٹرانسفر بھی کرا لی ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈرائیونگ لائسنس اس کے پاس ہوگا۔"

"تو اس ٹرک ڈرائیور پر بہت اعتماد کر رہا ہے۔" محسن نے کہا۔

"وہ کسی بھی وقت اس پوزیشن میں نہیں ہوگا کہ مجھے دھوکا دے سکے۔" میں نے کہا۔ "بیوی بچوں والا آدمی ہے اور زندہ رہنا چاہتا ہے۔ مرنا پسند نہیں کرے گا۔ شوروم دس بجے کھل جاتے ہیں۔ سو پچاس روپے خرچ کر کے تو ایک گھنٹے میں ٹرانسفر وغیرہ کی کارروائی مکمل کر سکتا ہے۔ باقی شاپنگ مکمل کر کے بارہ بجے تک لوٹ آ۔ شام تک اور بھی بہت سے کام ہیں جس کے بعد مجھے کراچی جانا ہے اور تجھے رابعہ کے پاس۔ وہ عورت پہلے سے وکیل بعد میں۔ اسے کسی قسم کی جذباتی حماقت نہ کرنے دینا اور یقین دلانا کہ میں بالکل خیریت سے ہوں اور بہت جلد واپس آجاؤں گا۔"

"وہ پوچھے گی نہیں کہ کل سے کہاں تھے؟" محسن نے کہا۔

"اور انکل کو کیا جواب دوں گا میں؟"

"انکل سے کبھی کہہ دینا۔ ناراض تو وہ بہرحال ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ سے کہنا کہ منظر سے مشورہ کرے اور میرے خلاف پنڈی والے مقدمات کی پیروی کرے۔ وہ خود پنڈی میں اس کا کوئی دوست۔ کہنا حقیقت یہ ہے کہ پولیس کی کہانی جھوٹی ہے۔ مقتدر بخت اغوا ہوا تھا اور اس کے بعد سے اب تک لاپتا ہے۔ اغوا کی رپورٹ لکھوائی گئی تھی لیکن پولیس اسے برآمد نہیں کر سکی تو اس کے خلاف یہ جھوٹا چکر چلا دیا ہے۔ اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لیے۔"

"لیکن تیری عدم موجودگی میں مقدمہ خارج تو نہیں ہو سکتا۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ حاضر تو مجھے ہونا ہی پڑے گا کبھی نہ کبھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس عرصے میں منظر کارروائی جاری رکھ سکتا ہے۔ گواہ وغیرہ پیش کر سکتا ہے کہ جس دن یہ واقعہ پیش آیا میں لاہور میں تھا۔ یا راولپنڈی میں تھا۔ اس بات کا پولیس کے پاس کیا ثبوت ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ اغوا کیا گیا تھا اور اس کے چشم دید گواہ نہیں۔ باقی وہ شخص خود بتا سکتا ہے کہ اغوا کرنے والے کون تھے اور اسے کہاں لے گئے تھے۔ اس عرصے میں کار

سے میرا رجسٹرڈ لیٹر موصول ہوگا۔ انکل رضوی کے نام۔ اس پر تاریخ بہت واضح ہوگی۔ میں ایک دردناک کہانی بیان کروں گا کہ اغوا کے بعد میری آنکھوں پر پٹی باندھ کے نامعلوم مقامات پر رکھا گیا۔ مجھے گاڑی میں ڈال کر مختلف شہروں میں لے جایا گیا لیکن میں کسی شہر کا نام بتانے سے قاصر ہوں کیونکہ عموماً میرا قید خانہ مضافات میں ہوتا تھا اور میں گھر سے نہیں نکل سکتا تھا۔ مجھے سخت اذیت دی گئی اور مجبور کیا گیا کہ میں اپنے وکیلوں کی معرفت حق وراثت سے دستبرداری قبول کر لوں تو انھیں بلایا جا سکتا ہے یا مجھے ان کے پاس لے جایا جا سکتا ہے ورنہ میں سات سال تک قید رہوں گا۔ سات سال بعد عدالت میں ایم ڈی کیو ڈی کا موجودہ مالک درخواست پیش کرے گا کہ میرے پارٹنر کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے کیونکہ اس کی مسلسل عدم موجودگی سنگین قانونی مسائل پیدا کر رہی ہے۔ میں یہ بھی لکھوں گا کہ میں نے ظلم و جبر کے سامنے سر جھکانے کے بجائے جان دینے کا تہیہ کر رکھا ہے اس لیے میں اغوا کرنے والوں کی کوئی شرط تسلیم نہیں کروں گا۔ ممکن ہے سات

سال کی قید سے پہلے کبھی کوئی موقع مل جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے مجھے یہ خط پہنچانے کا موقع مل گیا ہے۔ میرا یہ دستخط شدہ بیان عدالت میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور اخبارات کو بھی جاری کیا جا سکتا ہے۔ شناخت ہو جائے گی اور کیس بہت کمزور پڑ جائے گا۔ ایک امید وار بھی ہے۔ شاید میری تصویر اخبار میں دیکھ کر ایک عورت گواہی دینے عدالت پہنچ جائے۔ اس مقتول نزہی روبی کی ماں۔ وہ پہلے ہی بیمار اور لب گور تھی۔ روبی کی موت کے بعد پولیس نے اس سے کوئی بیان نہیں لیا تھا۔ یہ میں نے اخبار میں دیکھ لیا تھا۔ روبی کی ماں کہیں اصغر مال روڈ کے قریب رہتی تھی اور اس کا نام نبیا ہے۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا لیکن وہ سب کچھ جانتی ہے کہ روبی کو قتل کرنے والا کون ہو سکتا ہے کیونکہ روبی کی لاش پیٹر کی لاش کے ساتھ ملی تھی۔ وہ دونوں محبت کرتے تھے اور روبی کی ماں کو اس کا علم تھا۔ وہ عدالت میں حاضر ہو کے بیان دے سکتی ہے کہ روبی اور پیٹر کا قاتل عنایت مسیح ہے اور یہ بھی بتا سکتی ہے کہ درحقیقت میں عنایت مسیح نے اسے کتنی اذیت دی۔ پیٹر مشن ہائی اسکول میں ٹیچر تھا اور اس کا باپ ڈسکہ ضلع سیالکوٹ میں پادری ہے۔ ممکن ہے وہ بھی جانتا ہو کہ پیٹر کس کے بیٹے مارا گیا اور اسے مارنے والا کون ہو سکتا ہے۔ ایک مغرور پادری کی گواہی بہت اہم ہوگی۔ روبی کی ماں کا پتا شاید پنڈی کے آر اے بازار میں ایک ڈاکٹر سے رابطہ قائم کرنا۔ اس ڈاکٹر کا فون نمبر رابعہ کے پاس ہے کیونکہ اس کے گھر سے میں نے بعد کو فون کیا تھا اور رابعہ سے کہا تھا کہ مجھے فون کر لے۔ اس ڈاکٹر کی ماں روبی کی ماں کو جانتی ہے۔ شاید اسے بھی کچھ علم ہو۔ میرے خیال میں اتنا کافی ہے۔"

محسن نے تائید میں سر ہلایا۔ ایک نوٹ بک نکال کے اس نے کچھ باتیں نوٹ کر لی تھیں۔ "تو خط میں یہ کیسے لکھا نہیں کہ اغوا شدہ کون تھا؟ تو ان کو پہچانتا ہے یا نہیں؟"

"لکھنے کو میں دلاور کا نام بھی لکھ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کا فائدہ کوئی نہیں۔ وہ ثابت کر دے گا کہ یہ جھوٹ ہے۔ میں رحمت کباڑی کا نام لکھوں گا۔ باقی کے متعلق لکھوں گا کہ نامعلوم تھے۔ ابھی جب تو گاڑی خرید کر لوٹے گا ایک کیمرہ بھی لیتا آنا۔ میں رحمت کی آخری تصویر بھی اتار لوں گا۔ اس طرح کہ اس کا چہرہ آ جائے۔ یہ تصویر میں خط کے ساتھ ارسال کروں گا۔ معلوم ہو جائے گا کہ یہ پرانی تصویر ہے اور کہیں سے پھاڑی گئی ہے۔ عدالت میں پیش کر دو۔ بنا اور کسی طرح اس لاش کی بازیابی کے بعد اسے ملا دینا۔ لاش ملنے کا مقدمہ لاہور میں درج ہوگا کہیں

نہ کہیں تو یہ سب رابعہ کو بتائے گا اور منظر کو تو باقی کام وہ خود کر لیں گے۔ اب تو جا اور حتی الامکان جلدی لوٹ آ۔"

محسن کے جانے کے بعد فقیر نے پھر واویلا کیا۔ "ارے ہم کو بھی جانے دے ظالم۔ کس جرم میں قید کر رکھا ہے یہاں؟ ہمارا دھندا غارت کر دیا۔ خدا تجھے غارت کرے۔ ہم درویش۔"

"الو کے پٹھے۔" میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "مفت خورے۔ بٹا کٹا مشٹنڈا ہو کے بھیک مانگتا ہے۔ درویش کہتا ہے خود کو اور جیب میں ستائیس ہزار روپے لیے پھرتا ہے۔ بے وقوف بنا کر پھرتا ہے کہ روٹی کھانے کو پیسہ نہیں۔ میرے پاس وقت نہیں ورنہ تجھے شرکاروں کے ہاتھ بیچ دیتا اور وہ تجھے محنت کرنا سکھا دیتے لیکن اب تیری آنا کانی تو یہ سب مال حرام ضبط کر لوں گا اور تیری نظروں کے سامنے جلا کے راکھ کر دوں گا۔ قتل کر کے لاش یہیں چھوڑ جاؤں گا۔" فقیر کی حالت ابتر ہو گئی۔ وہ کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ایک لات مار کے میں رحمت جیسے شخص کو قتل کر چکا ہوں۔ میرے جیسے قاتل سے کیا بعید کہ دوسری لات مار کے اسے بھی فنا کر دوں۔ وہ اتنا خوفزدہ ہو گیا تھا کہ مجھے اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ پھر میں نے ٹرک ڈرائیور سے بات کی اور اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اندازہ اسے بھی ہو گیا تھا کہ ہم کا سے ماجھی اور رحمت کباڑی کے حریف ہیں تو کمزور کیسے ہو سکتے ہیں۔ میرا مقابلہ سوا سیر ہی کر سکتا ہے۔ وہ بہت اتفاق سے کرتا تو کیا کرتا۔ اس کے دشمن بھی وہی تھے جو ہمارے دشمن تھے چنانچہ ہم متحد ہو سکتے تھے اور یہ اتحاد اس کے لیے اور اس کے خاندان کے لیے سلامتی کی تھوڑی بہت ضمانت ضرور فراہم کرتا تھا۔

ایک بجے تک میں انتظار میں سگریٹ پھونکتا رہا۔ بار بار اخبار دیکھتا رہا اور اپنے خیالات کے گرداب میں غوطہ زن رہا۔ مستقبل انتہائی غیر یقینی ہو گیا تھا۔ رابعہ رگ جاں سے بھی قریب تر تھی اور ہر لمحہ میرے تصور میں اس پہلے دن کی طرح زندہ تھی جب وہ جیل میں مجھ سے ملنے آئی تھی۔ نیلی ساڑی پہ زرد پھول کھلائے۔ لیکن وہ گھر بے یقینی کی دھند میں کھو گیا تھا جہاں میں نے اور اس کو اپنی خوابوں کی دنیا بسائی تھی۔ محسن ٹھیک ایک بجے نمودار ہوا۔

"یہ لے گاڑی کی چابیاں۔" اس نے چابی میری طرف اچھالی۔ "کاغذات گلوو کمپارٹمنٹ میں ہیں۔ کپڑوں کا سوٹ کیس ڈگی میں۔ ایک ڈاکٹری اور ایک بیکار ڈبہ۔ ریڈ کراس کا نشان تک بنا ہوا ہے ونڈ اسکرین پر۔ کراچی تک کسی قسم کی تکلیف نہیں

www.paksociety.com

www.paksociety.com

دے گی لیکن ایک مسئلہ اور پیدا ہو گیا ہے۔ شہر میں جگہ جگہ پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تو کوئی انتخابی امیدوار ہے۔" اس نے جیب سے ایک پوسٹر نکالا۔ یہ تقریباً سات انچ چوڑا اور دس انچ لمبا پوسٹر تھا۔ اس میں میری تصویر بہت نمایاں تھی۔ وہی سامنے کا پوز جو اخبار میں تھا۔ لیکن اس کے اوپر لکھا ہوا تھا "تلاش گمشدہ" اور نیچے انتہائی مضحکہ خیز عبارت تھی۔ اس میں لکھا تھا۔

"مسٹر رحمت ولد وزیر خان مرحوم تیرہ نومبر کی شب سے لاپتا ہے۔ اگر وہ خود پڑھے تو واپس آجائے اسے کچھ نہیں کہا جائے گا اور اس کی ہر بات مان لی جائے گی۔ اس کی جدائی میں انکل رضوی اور اس کی بہن شملہ کی حالت خراب ہے۔ اس کا نام پتا بتانے والے یا اسے لانے والے کو شکریے کے ساتھ دس ہزار روپے پیش کیے جائیں گے۔ قریبی پولیس اسٹیشن یا براہ راست مسٹر رضوی ایس ایس پی لاہور سے آفس یا گھر میں اور رابعہ تاری ایڈووکیٹ سے فون پر رابطہ قائم کریں۔"

اس کے بعد ایک طرف انکل رضوی کے دونوں فون نمبر تھے اور دوسری جانب رابعہ تاری ایڈووکیٹ کے نام کے نیچے اس کے آفس کا فون نمبر تھا۔ تاریخ وہی تھی جب میں اغوا کیا گیا تھا۔

"یہ دلاور اینڈ کمپنی کا کمینہ پن ہے۔" محسن نے کہا۔ "ایک تیر سے کئی شکار کیے ہیں انھوں نے۔ دس ہزار کے انعام کا اعلان کر کے پبلک کو تیرے پیچھے لگا دیا ہے۔ براہ راست لاہور کے ایس پی اور ایک خاتون وکیل کا ایک اشتہاری مجرم سے تعلق ثابت کر کے ان کی پوزیشن خراب کر دی ہے اور تجھے اس حلیے میں اور اس شکل کے ساتھ دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔ اغوا کی رپورٹ تک جھوٹی سمجھی جائے گی اب۔"

"اور اب تک جن لوگوں نے اخبار میں میرا خوبصورت چہرہ نہیں دیکھا ہوگا وہ اشتہار میں دیوار پر ملاحظہ فرمائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور تھانے گئے تو دس ہزار ان کو ضرور ملیں گے۔ پولیس کہے گی کہ آپ نے مفرور مجرم پکڑ لیا۔ اس بہادری کے کارنامے پر انعام قبول فرمائیے۔"

"انکل رضوی اور رابعہ کیا کریں گے" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کس کے خلاف کارروائی کریں گے۔ کس کس کو بتائیں گے کہ یہ اشتہار انھوں نے نہیں لگوایا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک پریس کانفرنس میں تردید کر سکتے ہیں مگر اس تردید کو کتنے لوگ دیکھیں گے۔"

"اور اشتہار سارے ملک کے اخباروں میں چھپا ہوگا تو یہ پوسٹر بھی ہر جگہ لگائے گئے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "بڑے بڑے شہروں میں بس اسٹاپ اور ریلوے اسٹیشن۔ ائیرپورٹ اور بازار۔ وہ ایک لاکھ کیا دس لاکھ پوسٹر چھپوا سکتے ہیں۔ شہر کیا، ہر قصبے اور گاؤں تک پھیلا سکتے ہیں یہاں تک کہ سارا ملک مجھے پہچاننے لگے۔"

"اس لیے اب تیرا اس چہرے کے ساتھ باہر نکلنا مزید دشوار ہو گیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تو دس ہزار کا چلتا پھرتا چیک ہے جسے سب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پولیس والے بھی اور پبلک بھی۔"

"ابھی تو یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "میں نقلی داڑھی اور مونچھیں لگانے سے رہا۔"

"تو اپنا ہیئر اسٹائل بدل دے اور بالوں کا رنگ تبدیل کر لے۔" محسن نے کہا۔ "کراچی پہنچنے کے بعد شیو چھوڑ دینا۔ ایک ہفتے میں داڑھی مونچھوں کی فصل خاصی بڑھ جائے گی اور تو خود بھی اپنے آپ کو نہ پہچان سکے گا۔"

"اور اگر راستے میں پکڑا گیا تو کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "ممکن ہے پولیس نے ناکہ بندی کی ہو۔"

"اپنی ڈاکیے کی وردی پہن کے ڈاک خانے والوں کا سوٹو گرام بنا دے۔ تیرے اور ٹرک ڈرائیور کے قد میں معمولی سا فرق ہے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن خاکی وردی میں وہ شوفر لگے گا۔ تو معزز آدمی کی طرح پیچھے بیٹھنا۔ پیچھے کے شیشے ڈارک ہیں اس لیے جب تک کوئی اندر منہ نہ ڈال لے یا تو منہ باہر دکھائے کسی کو کچھ نظر نہیں آسکتا۔ تو ایک ڈاکٹر کی کار میں سفر کر رہا ہے اور آگے ریڈ کراس کا نشان بھی چھپا ہے۔ اس لیے کوئی زیادہ تردد نہیں کرے گا اور تو محفوظ رہے گا۔ مشکل یہ ہے کہ تیرا ہم سفر بھی ڈاکٹر نہیں تھی ورنہ تو زیادہ موزوں شوفر ہوتا۔"

محسن کے لائے ہوئے کپڑوں میں سے قمیص اور پتلون پہننے کے بعد میں نے ڈرائیور کو سمجھایا کہ اس کا حلیہ بدل کر سفر کرنا خود اس کے مفاد میں ہے۔ گاڑی ماجھی کا کوئی مخبر اسے تلاش نہیں کر سکے گا۔ ڈاکیے کے بیگ میں سے ریوالور نکال کر میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا تو محسن نے مجھے قریب بیٹھ مطلع کیا کہ اس نے اپنا ریوالور گاڑی کے گلوز کمپارٹمنٹ میں کاغذات کے نیچے رکھ دیا ہے کہ خدانخواستہ ایک خطرہ ہے تو دوسرا کام آسکے۔ جب وہ ڈرائیور کو ہمراہ لے کر نکل گیا تو میں فقیر کی طرف متوجہ ہوا جو ہماری ساری کارروائی سے سخت حیران و پریشان بیٹھا تھا۔ ہم نے نصف شب کو اس کی خلوت میں خلل ڈالا تھا

اور اب تک ایک قتل کر چکے تھے۔ اس کا مال چھین کر واپس کر چکے تھے اور جبراً چھین کر ضبط کر چکے تھے۔ اس کے دو جھاڑ جھنکار چکے تھے۔ اس کے پرائیویٹ حلوے کا ناشتا بند کر چکے تھے اور اس کو دھندے پر جانے سے روک چکے تھے۔ ہم نے اس کے سامنے حلیہ بدلا تھا۔ اردو، پنجابی کے علاوہ انگریزی میں اور کبھی فرانسیسی میں گفتگو کرتے رہے تھے جو اس کی خاک سمجھ میں نہیں آئی تھی اور اب ہماری روانگی کا وقت آیا تھا تو اس کا یہ اندیشہ بڑھنے لگا تھا کہ ہم اس کے ستائیس ہزار روپے ہرگز واپس نہیں کریں گے بلکہ عین ممکن ہے جاتے جاتے اسے بھی رحمت کے ساتھ ہی لٹا جائیں تاکہ گواہ کوئی نہ ہو۔

"فقیر بابا" میں نے کہا۔ "اب ہم چلتے ہیں۔ ہماری وجہ سے آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔"

"ارے تکلیف کو مارو گولی۔" وہ چلایا۔ "میرا پیسہ تو دے جاؤ ظالمو!"

"تکلیف کے بجائے ہم تمھیں گولی نہ مار دیں؟" میں نے کہا۔ "دونوں لاشیں پولیس اٹھائے گی۔"

یکلخت اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ بھی گالیاں دینے لگا۔ "تم خونی اور قاتل ہو ڈاکو ہو۔" پھر اس نے اچانک میرے پاؤں پکڑ لیے۔ "دیکھو میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں نے تمھارا کچھ نہیں بگاڑا ہے مجھ پر رحم کرو خدا کے لیے۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ اپنے پیر چھڑا کے میں نے اس کی کپڑے میں لپٹی ہوئی رقم نکالی۔ "یہ لو اپنا پیسہ۔" وہ جیب ہو کے ایک دم اٹھا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہو کے ہاتھ پشت کی جانب کر لیے۔ اس کا چہرہ لٹک گیا۔

"یہ سب رقم اگر میں دے دینا چاہوں تو تم مجھ سے چھین نہیں سکتے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر میں شریف آدمی نہ ہوتا تو تمھیں بھی گولی مار کے چل پڑتا لیکن میں تمھارے وعدے پر اعتبار کر رہا ہوں کہ تم کسی کے سامنے کچھ نہیں کہو گے۔"

"قسم خدا کی کچھ نہیں کہوں گا۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "کبھی نام تک نہیں لوں گا۔ ادھر لوٹ کر بھی نہیں آؤں گا۔"

"ہاں۔ دوبارہ ادھر مت آنا۔" میں نے رقم آگے بڑھائی لیکن جیسے ہی اس کا ہاتھ بڑھا پھر پیچھے کر لی۔ "ایک شرط اور ہے۔ میں تمھارا یہ شاہانہ لباس خریدنا چاہتا ہوں۔ ستائیس ہزار دو سو جس کا دام ہے یہ بولو منظور ہے؟"

"کیا؟ یہ تمھیں دے دوں؟" وہ بھونچکا رہ گیا۔ محسن نے اٹک کے قہقہہ مارا۔

"یہ چٹائی اور کشکول بھی۔" میں نے کہا۔ "ستائیس ہزار دو سو میں یہ بڑا اچھا سودا ہے۔"

"لیکن... میں خود... میں کیا پہنوں گا؟" وہ مری ہوئی آواز میں بولا۔ "ایسے ہی رہوں گا کیا؟"

"تمھاری مرضی۔" میں نے کہا۔ "منظور نہیں تو میں چلتا ہوں کسی دوسرے فقیر سے بات کرتا ہوں۔"

اس نے دوسرے کمرے میں جا کر وہاں سے کپڑے اچھال دیے جن میں منکوں کی مالا بھی شامل تھی۔ میں نے اس کے نوٹوں کی گڈی اس کی طرف اچھال دی۔ "اللہ کے نام پر ایک جوڑا نہ سہی ایک چادر تو لے کچھ تو دیتے جاؤ۔" وہ فوراً پہننے سے لگ کے بولا۔ "میں باہر کیسے جاؤں گا۔ اس لاش کے کپڑے ہی دے دو۔"

"نہیں۔ یہی تو ہم چاہتے ہیں کہ تم فی الحال باہر نہ نکلو۔" میں نے کہا۔ "شام تک تمھاری چیخ پکار پر متوجہ ہو کے کوئی ضرور آ جائے گا۔ اس سے مانگ لینا جو مانگنا ہو۔ ورنہ نکل جانا اسی قلندرانہ شان سے۔"

"ننگا فقیر ہیں شانِ سکندری کیا ہے۔" محسن نے ارشاد کیا۔

اس نے اندازہ کر لیا کہ ہم اس کی ایک نہیں سنیں گے۔ سینے پر صبر کی سل رکھ کر وہ ایک کونے میں دبک گیا۔ میں نے اور محسن نے رحمت کباڑی کی لاش اٹھائی اور باہر لے جا کر گاڑی کی ڈکی میں بند کر دی۔ دس منٹ میں ہم اس جگہ سے تین میل دور جا چکے تھے۔ نیلے رنگ کی ڈیلکس ماڈل اوپل کا انجن آئیں سوں ہی کا تھا اور بے حد طاقتور اور خاموش تھا۔

"اب ایک آخری کام۔" میں نے محسن سے کہا جو میرے ساتھ پیچھے بیٹھا تھا۔

"سب سے پہلا کام ہے یہ پاپی پیٹ بھرنا۔" محسن نے پیٹ کو ڈرم کی طرح بجایا۔ "دیکھ کیسی خالی برتن جیسی آواز آ رہی ہے۔"

"اچھا اس کے بعد مجھے دلاور کو ایک گفٹ پارسل بھیجنا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک بار اس نے مجھے کریٹ میں پیک کر کے عدم آباد کی جانب روانہ کیا تھا لیکن میں لوٹ آیا تھا۔ یہ اسی کے جواب میں ہے۔ مجھے ایک تابوت چاہیے۔"

"تابوت کہیں ریڈی میڈ تھوڑی ملتے ہیں۔" محسن بولا۔ "اور اتنے کم وقت میں بنوائے بھی نہیں جا سکتے۔"

"لمبا صندوق بھی تابوت کا کام دے سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

کھانا ایک رسمی کارروائی تھا۔ محسن نے مال میں ایک ریسٹورنٹ سے نصف درجن لنچ باکس خریدے۔ ان میں سے تین ہم نے

ختم کر دیے۔ باقی زادِ راہ کے طور پر محفوظ رکھے۔ پھر میں گاڑی لے کر دلاور کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا اور اس کے گیٹ سے دو فرلانگ کے فاصلے پر رک کر انتظار کرنے لگا۔ ڈرائیور نچلی سطح کا آدمی تھا جو دلاور کے نام سے بھی واقف نہ تھا اس نے ایک بار پوچھا کہ ہم کس کا انتظار کر رہے ہیں اور میں نے جواب دیا کہ خاموشی سے سب دیکھو اور غیر ضروری سوال مت کرو۔ محسن پون گھنٹے بعد نمودار ہوا۔ سڑک کے دوسرے کنارے پر ریڑھا رکا کہ اس نے موٹی چادر کا تقریباً پانچ فٹ لمبا اور اس سے نصف اونچائی کا اور چوڑائی کا صندوق اتارا۔ جب ریڑھی والا کرایہ لے کر چلا گیا تو محسن اور میں صندوق کو دونوں جانب کے کنڈوں سے اٹھا کر گاڑی کے پیچھے لائے۔ مناسب موقع دیکھ کر میں نے ڈگی کھولی اور محسن نے صندوق کا ڈھکنا اٹھایا۔ پلک جھپکتے میں رحمت کباڑی کی لاش صندوق میں جا گری۔ اسے ہم نے بڑی پھرتی سے اور خاموشی سے بے دردی سے .... صندوق کے اندر فٹ کر دیا۔ محسن نے اس کی دونوں کنڈیوں کو دبا کے بند کیا اور دونوں میں تالے ڈال دیے۔ پھر اس نے جیب سے مارکر نکالا اور صندوق کی بے داغ چادر پر لکھا "دلاور تمھاری طرف سے" میں گاڑی لے کر واپس گیا۔ ایک فرلانگ کے بعد مجھے دوسرا ریڑھا ملا جسے میں نے پیچھے بھیج دیا۔ "سڑک کے کنارے ایک صاحب صندوق لیے کھڑے ہیں" میں نے یوں کہا جیسے میرا ان صاحب سے کوئی تعلق نہیں اور شاید انھوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ کوئی ریڑھا نظر آئے تو بھیج دوں۔ گاڑی دیکھ کر میں دس منٹ بعد پھر لوٹا اور محسن کو تیز تیز قدموں سے آتے دیکھا۔

"ویری گڈ۔ ریڑھے والا صندوق لے گیا" محسن نے بیٹھتے ہوئے کہا "میں نے اسے پچیس روپے دیے"

"شک تو نہیں ہوا تھا اسے؟" میں نے کہا اور گاڑی واپس کی۔ ہم دلاور کے گھر سے دور ہوتے گئے۔

"نہیں۔ خوش ہو گیا اتنا کرایہ ملنے پر۔ میں نے کہا بیگم صاحبہ سے کہہ دینا کہ صاحب نے بھیجا ہے" محسن بولا۔

پبلک ٹیلی فون کا پہلا سائن نظر آتے ہی میں نے گاڑی رکوائی اور محسن کو گاڑی میں چھوڑ کر نیچے اتر گیا۔ میں نے ایم ڈبلیو ڈی کے کمپلیکس کا نمبر ملایا۔ حسب توقع ریسیور اس کے پی اے نے اٹھایا۔ "کون صاحب ہیں آپ؟" وہ بولا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔

"رحمت کباڑی" میں نے کہا۔ خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا۔ پھر دلاور نے ہیلو کہا۔

"چودھری صاحب" میں نے کہا "تحفہ آپ کے گھر پہنچ گیا ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا نا"

"سکندر! بہت جلد تم یہ مذاق وغیرہ سب بھول جاؤ گے" دلاور نے غرا کے کہا۔

"مجھے ایک خوش خبری بھی سنانی تھی" میں نے کہا "جو نرس مال لے کر کراچی جا رہا تھا اسے فرشتے مل گئے ہیں"

"یہ کیا بکواس ہے" چودھری دلاور کے لہجے میں پہلی بار مجھے گھبراہٹ محسوس ہوئی۔

"حساب کچھ برابر ہو رہا ہے چودھری صاحب" میں نے کہا "اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا، انشاء اللہ" میں نے ریسیور نیچے رکھ دیا اور پیسے دے کر دکان سے نکل آیا۔ دوسرا فون دس منٹ بعد دوسری جگہ سے محسن نے کیا اور بہت خوش لوٹا۔

"کوئی بہت فرض شناس۔ یا لالچی افسر بیٹھا تھا" محسن نے کہا "میں نے دلاور کا پتا بتایا اور کہا کہ وہاں قتل ہو گیا ہے اور لاش کو صندوق میں ڈال کے ٹھکانے لگانے کا بندوبست ہو رہا ہے۔ میں ان کا پڑوسی ہوں لیکن اپنا نام نہیں بتا سکتا۔ اس نے کہا ہم دس منٹ میں پہنچتے ہیں۔ کمال میری اداکاری کا تھا جس نے اسے قائل کیا"

"میرا خیال ہے دلاور نے بھی گھر فون کیا ہو گا" میں نے کہا "اور اسے معلوم ہوا ہو گا کہ ریڑھے والا اس کا نام لکھا ایک صندوق چھوڑ گیا ہے جو مقفل ہے۔ تو وہ بھی گھر کی طرف دوڑے گا"

"اپنا ایک یار اخبار کے دفتر میں سب ایڈیٹر ہے۔ ابھی آیا ہی تھا۔ میں نے کہا کسی رپورٹر کو اس پتے پر بھیج دو، قتل کی بہت سنسنی خیز خبر ہے" محسن بولا "خدا نے چاہا تو سب کا اجتماع ایک ساتھ ہو گا۔ دلاور پہلے پہنچا تو سب سے پہلے صندوق کو گم چھپانے گا یا تالے توڑ کر دیکھے گا۔ پولیس پہلے پہنچی تو پھنس جائے گا اور صندوق کو کھولنے پر مجبور ہو گا لیکن وہ کائیاں آدمی ہے کوشش کرے گا کہ پولیس کو کچھ دے دلا کے رخصت کرے اور لاش ٹھکانے لگا دے لیکن پولیس کے ساتھ ہی اخبار والے پہنچ جائیں گے تو کچھ نہیں ہو سکے گا"

"وہ رپورٹر کو بھی خرید لے گا" میں نے کہا "اس وقت پیسہ اہم نہیں رہے گا دلاور کے لیے"

"مشکل ہے۔ اخبار والوں کو خبر زیادہ عزیز ہوتی ہے" محسن نے کہا "ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بعد میں گھپلا ہو جائے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ سے موت طبعی ثابت کر دی جائے مگر پہلے وہ سب ایڈیٹر یار سب کا ملیدہ کر دے گا"

"اپنے اخبار والے دوست سے کہنا دوسرے رپورٹروں کو بھی پیچھے لگا دے" میں نے کہا "ڈاکٹر تو شاید صحیح رپورٹ دیتے ہیں لیکن بدنامی کا ڈر بھی ہو تو غلط رپورٹ دینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ دوبارہ پوسٹ مارٹم کا چکر چل جاتا ہے اور میڈیکل بورڈ بن جاتا ہے۔ یہ قتل تو دلاور کے نام لکھا گیا سمجھو"

"یہ دلاور کون ہے جی؟" ڈرائیور سے بالآخر ضبط نہ ہو سکا۔

"اس کے پہلے بہت سے نام تھے۔ ابلیس، شیطان وغیرہ" میں نے کہا "اب نام بدل لیا ہے اس نے۔ کام وہی کرتا ہے۔ اس سے زیادہ جاننا تمھارے حق میں نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے"

وہ پھر خاموش ہو گیا۔

ایک چوک میں میں نے کار رکوائی "اب جدائی کی گھڑی آ گئی ہے دوست" میں نے کہا "یہاں سے تو جا اپنے گھر۔ میں جاتا ہوں جدھر تقدیر لے جائے مگر فکر کی بات کوئی نہیں۔ ہر اتوار کی شام کو چھ بجے اور سات بجے کے درمیان عبدالودود منتظر کے گھر موجود رہنا۔ میں ٹیلی فون پر بات کروں گا۔ آج رات ملتان میں گزرے گی۔ کل سکھر سے بھی فون کروں گا"

"اور یہاں سے مجھے بات کرنی ہو یا خط لکھنا ہو تو؟" وہ بولا "کراچی کا پتا کیا ہو گا؟"

"ظاہر ہے اس وقت میں کچھ نہیں بتا سکتا" میں نے کہا "وہاں جاتے ہی کوئی بندوبست کروں گا۔ اتوار کو بتا دوں گا"

"تم مجھ سے مل کر نہیں جاؤ گے؟" محسن نے افسردگی سے کہا۔

"دل تو چاہتا ہے یار" میں نے دل کو دبا کے کہا "لیکن دل کی بات مانی تو دماغ کے ارادے گڑبڑ ہو جائیں گے۔ وہ میرے سامنے آ گئی تو میں کچھ نہ کر سکوں گا۔ اس کی مان لوں گا مجھے ایسے ہی جانے دے۔ خیال رکھنا اس کا"

"تم بھی اپنا خیال رکھنا" وہ اچانک اتنا جذباتی ہو گیا کہ مجھے مجبوراً ہنسنا پڑا۔

"ایسے وداع مت کر مجھے جیسے کوئی سہاگن اپنے اکلوتے شوہر کو لام پر بھیج رہی ہو" میں نے اس کے ایک ہاتھ رسید کیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میرے آنسو اس وقت نکلے جب بہت آگے جا کر میں نے پیچھے دیکھا اور محسن مجھے وہیں کھڑا دکھائی دیا۔ اس نے ایک ہاتھ ہلایا شاید رومال سے آنسو صاف کیے۔

حسب توقع پولیس نے لاہور سے باہر جانے والی سڑکوں کی ناکا بندی کر رکھی تھی اور یہ بھی کارروائی والی ناکا بندی نہیں تھی۔ شاید ان پر ایک طرف سے ایس پی ضامن رضوی کا دباؤ تھا تو دوسری طرف دلاور نے اپنے شکاری کتوں کو چوکنا کر دیا تھا کہ شکار نکلنے نہ پائے۔ میں جانتا تھا کہ پہلی چیک پوسٹ چونگی ناکے پر ہو گی۔ اگر میں وہاں سے نکل گیا تو آگے بہت شہر آئیں گے جہاں ایس پی ضامن رضوی اور چودھری دلاور کے حلقۂ اثر سے دور ہوں گے۔ ان کی ساری کوشش یہی ہو گی کہ مجھے لاہور میں رکھا جائے جہاں ان کا زور چلتا تھا۔ اگر میں اس پہلی رکاوٹ کو عبور کر گیا تو کراچی تک پہنچتے پہنچتے رکاوٹوں کا وجود ختم ہو جائے گا۔ چونگی ناکے تک پہنچنے سے پہلے میں نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔

"تمھارا نام کیا ہے؟" میں نے ٹرک ڈرائیور سے کہا "نام بتانے میں تو کوئی خطرہ نہیں"

"آپ سے اب کیا خطرہ۔ میں تو آپ کے ساتھ ہوں" وہ بولا "آپ ہی کے سہارے پر زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہوں ورنہ کوئی صورت نہیں تھی میرے بچنے کی ... میرا نام الطاف ہے جی۔ طافو کہتے ہیں سب"

"بات یہ ہے طافو کہ قسمت نے ہمیں ایک دوسرے کا ہمسفر بنا دیا ہے۔ ہم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں اور اسی طرح پار اتر سکتے ہیں کہ ایک دوسرے پر بھروسہ کریں۔ ہم دونوں کا دشمن ایک ہے اور بہت طاقتور ہے۔ اگر ہم نے مل کر اس کا مقابلہ نہ کیا تو وہ ہمارا بیڑہ غرق کر دے گا۔ تمھاری طرح مجھے بھی اپنی زندگی عزیز ہے اور ہم ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہیں۔ نہ تم اکیلے کچھ کر سکتے ہو اور نہ اکیلا میں۔ اب دیکھو یہاں سے چند میل کے فاصلے پر چونگی ناکا ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں پولیس مجھے پہچان لے۔ میں مجرم تو نہیں ہوں مگر بنا دیا گیا ہوں۔ تم گاڑی کو کچھ دیر کے لیے یہاں روکو۔ لیکن جیسے اس میں کوئی خرابی ہو گئی ہے اور میرا انتظار کرو"

اس نے گاڑی روک لی۔ میں نے ڈگی میں سے وہ بیگ نکالا جس میں ایک فقیر کی پوری کٹ موجود تھی۔ قبا اور کشکول منکے اور چمٹا۔ یہ سب کچھ لے کر میں کھیتوں میں گھس گیا۔ پندرہ منٹ بعد میں واپس آیا تو میں نے طافو کو بونٹ اٹھائے انجن میں سر ڈالے مصروف دیکھا "حق اللہ" میں نے نعرہ لگایا اور اس نے سر نکال کے ایک بار مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ میں نے وہ لبادہ نما خرقہ پہننے کے بعد منہ پر مٹی مل لی تھی اور بال بکھرا کے ان میں تنکے اور خس و خاشاک ڈال لیے تھے۔ شیو میں نے دو دن سے نہیں کی تھی چنانچہ گلے میں رنگین منکوں کی مالائیں ڈالے کشکول اور چمٹا لیے اور ننگے پاؤں میں بالکل فقیر لگتا تھا۔ میں نے جوتے کپڑے گاڑی میں اچھال دیے۔

"اب لائٹ جلائے بغیر چلو تم تو اس راستے سے واقف

www.paksociety.com

ہوئے میں نے پیچھے بیٹھ کر کہا۔ "جنگی ناکا جب ایک میل رہ جائے تو مجھے اتار دینا اور لائٹ جلا کے گزر جانا۔ وہ تم سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ پوچھیں تو کہہ دینا کہ ڈاکٹر امجد صاحب کی فیملی کو لینے ملتان جا رہا ہوں۔ میں پیدل آؤں گا۔ جنگی ناکے سے ایک میل آگے میرا انتظار کرنا۔"

ڈرائیور نے سر ہلایا۔ "یہ وردی نہ ہوتی تو میرے لیے بھی خطرہ ہوتا تھا اب کون پہچانے گا مجھے۔"

وہ چلنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے پھر روک لیا۔ "دیکھو! اوّل تو مجھے خطرے کی کوئی بات نظر نہیں آتی لیکن خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہو جائے مثلاً میں پکڑا جاؤں تو تم ایک گھنٹہ انتظار کرنا اور ملتان چلے جانا۔ صبح وہاں سے واپس لاہور جانا اور میرا نام لیے بغیر ایک وکیل سے ملنا۔ ان کا نام ہے منظر صاحب۔ یاد رہے گا نا یہ نام؟"

"یاد رہے گا جی۔ منظر صاحب۔" وہ بولا۔ "لیکن میں پکڑا گیا تو؟ آپ انھیں نہیں جانتے۔۔۔"

"میں سب کو جانتا ہوں طافو۔" میں نے کہا۔ "اگر تم کو کسی نے چنگی پر روکا تو میں چھڑا لوں گا۔ یہ میری ذمے داری ہے۔"

میں طافو سے کہنا چاہتا تھا کہ گلوز کمپارٹمنٹ میں ایک ریوالور بھی ہے لیکن ابھی اس پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کا مظاہرہ دانش مندی کے خلاف ہوتا۔ اسی لیے میں نے نقد رقم اور ریوالور کا ڈبا ہوا بیگ اپنے پاس رکھا تھا۔

جب گاڑی میری نظر سے اوجھل ہو گئی تو میں نے آگے پیچھے دیکھا اور جھوم جھوم کر چمٹا بجاتے ہوئے گانے لگا۔ "رکھ مولا سے آس بندے۔" یہ ٹیپ کا بند تھا جسے میں بلھے شاہ کی ایک کافی کے بیچ بار بار لے آتا تھا۔ اور پھر ایک نعرہ لگاتا تھا۔ "مولا ای مولا۔ باقی سب رولا اے رولا۔" میں سڑک کے وسط میں بھی نہیں تھا اور بالکل کنارے پر بھی نہیں تھا چنانچہ دونوں طرف کی ٹریفک سے محتاط تھا۔ آتی جاتی بسوں اور کاروں کے مسافر مجھ پر دلچسپی کی ایک نگاہ ڈالتے تھے اور گزر جاتے تھے۔ کسی ملنگ کی ذات میں دلچسپی بڑھ جائے تو عقیدت کے جذبات میں ڈھل جاتی ہے لیکن حیرانی کسی کو نہیں ہوتی۔ ایک گزرتی ہوئی بس میں سے کسی نے ہاتھ نکال کے مٹھی بھر سکے اچھال دیے۔ "سائیں بادشاہ! رب خیر کرے۔"

"مولا ای مولا۔ باقی سب رولا اے رولا۔" میں نے سڑک پر بکھر جانے والے سکوں پر نگاہ ڈالے بغیر نعرۂ مستانہ لگایا اور سیدھا چلتا گیا۔ چنگی ناکا اب مجھے سامنے دکھائی دے رہا تھا اور وہاں مختلف کاریں بسیں رک کر گزر رہی تھیں لیکن ان میں میری کار نہیں تھی۔ قریب پہنچ کے میں نے سڑک کے دونوں جانب دیکھا لیکن میری کار گزر چکی تھی۔ میں نے اب زیادہ لہک لہک کر گانا شروع کیا۔ میری آواز اگرچہ اچھی نہیں تھی تو اس تقریب کے تماشے کے لیے بری بھی نہیں تھی۔ دو تین مرتبہ میں رقص کے انداز میں گھوما اور کسی حال مست ملنگ کی طرح گرد و پیش پر نگاہ ڈالے بغیر سیدھا اس راستے سے گزرنے لگا جو پیدل چلنے والوں کے لیے تھا۔ گاڑیوں کو چیک کرنے کے لیے درمیان میں لوہے کا بانس جیسا ڈنڈا تھا جس نے چوڑائی کے رخ سڑک کو بند کر رکھا تھا۔ ڈنڈے کے ایک کنارے پر من بھر وزن کا سیمنٹ کا بلاک تھا اور دوسرا کنارا ایک ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ جب کسی گاڑی کو کلیئرنس مل جاتا تھا تو ایک شخص ڈوری کو چھوڑتا تھا اور بلاک کے وزن سے ڈنڈا خود بخود اوپر اٹھ جاتا تھا۔ گاڑی کے گزرتے ہی وہ شخص ڈوری کھینچتا تھا اور پھر سرا اشارے پر نیچے آ جاتا تھا۔

پہلے مجھے چنگی پر کوئی بات خلافِ معمول نظر نہ آئی تھی۔ راستہ کھولنے اور بند کرنے والے کے علاوہ وہاں دو افراد تھے۔ ایک پرچی کاٹنے والا اور دوسرا پرچی گزرتی ہوئی گاڑی کے ڈرائیور کو تھمانے والا۔ پھر مجھے مختصر سے کیبن میں ایک سب انسپکٹر کے ساتھ دو پولیس مین نظر آئے۔ پولیس والوں کے پاس رائفلیں تھیں لیکن سب انسپکٹر کا ریوالور اس کی وردی کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ ایک مسلح سنتری تو عموماً نظر آ جاتا ہے مگر چنگی ناکے پر پولیس کی اتنی نفری کا مطلب تھا ناکا بندی۔ اصولاً تو انھیں ہر گاڑی میں جھانک کر دیکھنا چاہیے تھا، وہ میری تلاش میں آئے تھے یا کسی اور کو پکڑنے۔ ہر صورت انھیں باہر کھڑے رہ کر گزرنے والوں پر نظر رکھنی تھی لیکن وہ کیبن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ انھوں نے میری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا لیکن اچانک ایک اور شخص کیبن میں سے برآمد ہوا۔

"سائیں بادشاہ!" اس نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔ "اک پیالا دی ساڈی وی پی جاؤ۔"

چائے پینے کے لیے کیبن میں جانا شیر کی کچھار میں داخل ہونے کے مترادف تھا لیکن وہ عقیدت مند مگ ہاتھ میں اٹھائے کھڑا تھا۔ "فقیر کا راستہ مت روک۔ منزل بہت دور ہے۔ سفر بہت لمبا ہے۔" میں نے گرج کے کہا لیکن وہ متاثر نہیں ہوا۔ ایسے کمزور عقیدہ لوگوں کے لیے کسی صوفی درویش کی برہمی بھی شانِ قلندری کی ادا ہے اور انھیں رام کرنے کا مطلب ہے تقدیر کو رام کر لینا۔ اس نے میرا راستہ روک لیا اور میرے پیر پکڑنے ہی والا تھا کہ میں پیچھے ہٹ گیا۔

"وچھ غریباں نے خنگ سائیں۔ ایسی واری ٹھنڈا چائیدا اے۔" وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

وہ ان بے عقل اور بد نصیب لوگوں میں سے تھا جو آج بھی جہالت کے اسی اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں جسے مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا۔ یکے بعد دیگرے چھ لڑکیوں کی پیدائش اس کے نزدیک ایک سانحہ تھی اور نحس تھی اور وہ مجھ سے ایک بیٹا مانگ رہا تھا۔ یہی اس کی سب سے بڑی بیوقوفی تھی۔ اُسے کون سمجھاتا کہ عورت تو تخلیق کا سرچشمہ ہے جس نے پیغمبر، سائنسدان اور فنکار پیدا کیے اور عورت تو اس کی ماں بھی تھی۔ ایک بیٹے کی آرزو میں وہ چھ بیٹیوں کا باپ بن گیا۔ شاید بیوی کو احساسِ جرم میں مبتلا کر دیا کہ وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کر رہی ہے اور میرے جیسے فراڈ درویشوں سے توقع رکھنے لگا کہ ان کی دعا سے اس بچے کی جنس بدل سکتی ہے جو ابھی ماں کی کوکھ میں اپنے وجود کی تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے۔

مجبوراً میں نے اس سے چائے کا مگ لے لیا جو اس نے کیبن کے اندر ہی سب کے لیے بنائی ہوگی اور اسے دعا دی کہ "اللہ سب ٹھیک کرے گا۔" جو درحقیقت کوئی دعا نہیں تھی حقیقت کا اظہار تھا مگر چند منٹ کی یہ تاخیر بڑی مہنگی پڑی۔ چنگی وصول کرنے والے کارندے کا کسی ٹرک ڈرائیور سے جھگڑا شروع ہوا۔ ٹرک ڈرائیور نے اسے سو کا نوٹ دیا۔ منشی نے اس سے کھلے پیسے کو کہا اور بات بڑھ گئی۔ اے ایس آئی معاملے کو رفع اور ٹرک ڈرائیور کو دفع کرنے کے لیے نکلا اور مسئلہ یوں حل کیا کہ سو کا نوٹ جیب میں رکھا اور ٹرک ڈرائیور کو پرچی کے بغیر نکال دیا۔ انصاف کے تقاضوں کے مطابق بدزبان ڈرائیور کو اتنا جرمانہ تو ہونا ہی چاہیے تھا۔

شامتِ اعمال کہ واپسی پر اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ وہ سیدھا میری طرف آیا اور مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ "کیا نام ہے تمہارا ملنگ سائیں؟" وہ بولا۔ شک اس کے لہجے سے عیاں تھا۔

میں نے نروس ہوئے بغیر پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "[illegible] دی گھری نئیں فقیر۔"

"میں نے نام پوچھا ہے۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔ "وہ نام جو ماں باپ نے رکھا تھا۔"

"او سے ساڈی کی ماں تھا ملدا۔ ناں سچا اس رب دا۔" میں نے اور بے پروائی دکھائی لیکن انسپکٹر کا شک ایسے دور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ مجھے اندر لایا جائے۔ میں نے خود کو ہنگامی صورتِ حال کے لیے تیار کر لیا اور دونوں

◎ ایک ایسے عامل کی کہانی جس نے ماورائی علوم کی مدد سے قتل اور غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

◎ ایک طاقتور دیوانہ جو قاتل ہونے کے باوجود انتہائی معصوم تھا۔

◎ ٹیلی پیتھی کی ماہر ایک خوبصورت عورت جو کوئی بھی قتل ہونے سے پہلے ہی اس واقعے کو دیکھ لیتی تھی۔ لیکن تمام جزئیات دیکھنے کے باوجود قاتل کا چہرہ دیکھنے سے معذور تھی۔

ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم اور دوسرے ماورائی علوم پر مشتمل ایک سنسنی خیز کہانی
ماہنامہ نفسیات کے ہر شمارے میں قسط وار پڑھیے۔

ماہنامہ نفسیات میں دلچسپ کہانیوں کے علاوہ زندگی بنانے، خوشیاں حاصل کرنے، کامیابیاں اپنانے اور دیگر نفسیاتی موضوعات پر انسانی علمی مضامین شائع ہوتے رہیں گے۔

قیمت فی پرچہ ۱۲ روپے — رجسٹری فیس ۶ روپے
زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری ۲۰۰ روپے

www.paksociety.com

سپاہی مجھے اندر لے گئے۔ تھانیدار نے اخبار اٹھایا اور کسی نے
"الٹہ ہو" کا نعرہ لگایا اور اس کے بہت قریب ہو گیا۔ وہ اب میری تصویر کو میری صحت کے خدوخال سے ملا رہا تھا۔ غلطی اس نے یہ کی کہ اسے ایک ماتحت سے تصدیق چاہی۔ اگر وہ کسی تذبذب کے بغیر ریوالور نکال لیتا تو میرا کام بہت مشکل ہو جاتا۔

سپاہی نے اقرار میں سر ہلایا ہی تھا کہ میں نے سب انسپکٹر کے نتھنوں پر لات ماری۔ وہ سامنے کھڑے ہوئے سپاہی سمیت منہ کے بل فرش پر گرا۔ دوسرے سپاہی نے فوراً پوزیشن سنبھالی اور رائفل کا رخ میری طرف کیا۔ میں نے رائفل کی نال تھام کے ایک جھٹکا دیا۔ رائفل میرے ہاتھ میں آ گئی اور جھٹکے سے وہ آگے آیا تو میں نے وہی رائفل پیچھے کی۔ رائفل کا چوڑا دستہ اس کے سینے پر لگا اور وہ ہاتھ اٹھا کے نیچے جھکا۔ میں نے الٹی پکڑی ہوئی رائفل کو گھما کے تھانیدار کے بازو پر مارا جو اٹھ کر ریوالور نکال چکا تھا۔ کہنی سے اوپر اس کے بازو کی ہڈی خاصی آواز کے ساتھ ٹوٹی۔ وہ بلبلایا اور اس کا ریوالور گرفت سے نکل گیا۔ دوسرا سپاہی چلانے کے علاوہ کچھ فاصلے پر پوزیشن لے رہا تھا کہ میں اس پر جا پڑا۔ اگر میں اپنی جگہ کھڑا رہتا تو اس کی رائفل سے نکلنے والی گولی کا نشانہ بن جاتا۔ دھماکے سے میرے کان سن ہو گئے لیکن اس کے ساتھ ہی گولی نے تھانیدار کا کام تمام کر دیا۔ وہ صحت والا آدمی تھا اور ایک ہاتھ ٹوٹ جانے کے باوجود ریوالور اٹھا چکا تھا۔ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ فرش پر گر کے تڑپنے لگا۔ دوسرے سپاہی کو میں نے ریوالور سے سر ٹکرا کے ناک آؤٹ کر دیا تھا لیکن اتنی دیر میں پہلا سپاہی اور مجھ سے اولاد ورثہ کی دعا کا طالب باہر نکل چکے تھے۔ "قتل ہو گیا! خون ہو گیا تھانیدار کا!" انھوں نے چنگی والوں کو پکارنا شروع کیا جو ایک بس کی پرچی بنا رہے تھے۔

بس والا اگر کسی برطانیہ جیسے قانون پرست معاشرے کا ذمہ دار شہری ہوتا تو بس روک دیتا۔ وہ بس نہ روکتا تو مسافروں میں سے کوئی اسے رکنے پر مجبور کر دیتا لیکن یہاں ہر شخص قانون کے چکر میں پڑنے سے ڈرتا ہے۔ کوئی کسی کے قتل کا چشم دید گواہ ہو تب بھی بھاگ جاتا ہے۔ عدالت میں سالہا سال حاضری دینے کے علاوہ اسے مقتول کے ورثا کی دھمکیوں اور پولیس کی بدتمیزی کا شکار بھی ہونا پڑتا ہے جو اس کو اپنی تفتیش کے مطابق بیان دینے پر مجبور کرتے ہیں۔ بس ڈرائیور نے سوچ پاتے ہی ... نال لی اور پرچی لیے بغیر فرار ہو گیا۔ چنگی والوں نے فائرنگ ... کا نمبر نوٹ ہی نہیں کیا ہوگا اور باقی معاملہ بس کے ... نے سنبھال لیا ہوگا۔ خود مسافروں نے ڈرائیور کی تعریف کی ہو گی کہ وہ سب کو بچا لایا۔ پتا نہیں وہاں قتل کرنے والے کتنے ڈاکو تھے۔

میں نے تھانیدار کا ریوالور اٹھایا اور باہر نکل کے ایک ہوائی فائر کیا۔ سپاہی تو وہیں لیٹ گیا۔ میرا مقصد چند قدم دور کے گرا۔ چنگی کا باقی عملہ مخالف سمت میں فرار ہوا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ خود بھی نکل جاؤں۔ سڑک پر ٹریفک جاری تھی اور کسی بھی کار یا بس میں کوئی شخص مسلح ہوتا تو مجھے نشانہ بنا لیتا یا میرے تعاقب میں دوڑنے لگتا تو دوسرے لوگ بھی ہمت کر کے پیچھے آ جاتے۔ اس نقاہت کے باعث میرے لیے تیز دوڑنا مشکل تھا۔ پھر بھی میں سڑک تک بھاگا۔ کیبن کے بالکل پیچھے کھیت تھے اور رات کے اندھیرے میں سیاہ قبا میرے لیے رکاوٹ بن رہی تھی تو مجھے بچا بھی رہی تھی۔ تقریباً ایک فرلانگ تک کھیتوں میں دوڑنے کے بعد میں نے رخ بدلا اور سڑک کے متوازی بھاگنے لگا۔ اندھیرے میں اونچے نیچے اور کچے راستوں پر ننگے پاؤں دوڑنا بہت مشکل کام تھا لیکن مجھے سڑک پر کھڑی گاڑی تک پہنچنے کی فکر تھی۔ میں نے طاہر کو ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے بعد وہ چلا جاتا تو میرے لیے اس مصیبت سے نجات کے راستے بند ہو جاتے۔

مجھے وقت کا کوئی احساس نہ تھا اور میں اندازاً خط مستقیم میں دوڑ رہا تھا۔ ایک جگہ ذرا سی دیر کے لیے رک کر میں نے وہ قبا اتاری اور اس کی گٹھڑی سی بنا لی جس میں میرے اپنے ریوالور کے علاوہ سب انسپکٹر سے چھینا ہوا ریوالور بھی تھا اور میری ساری نقد رقم بھی تھی۔ صرف انڈرویئر میں رہنا زیادہ آسان ثابت ہوا۔ اس وقت خنکی تھی اور نم آلودہ کھیتوں کے درمیان خاصی سردی ہو گی لیکن دوڑنے سے میرے جسم پر پسینہ آ رہا تھا۔ اندازے کے مطابق فاصلہ طے کرنے میں پھر دائیں جانب مڑا اور سڑک پر پہنچ گیا۔ کار کی پارکنگ لائٹ مجھے ایک فرلانگ دور نظر آئی۔ میں پھر بھاگا۔ سامنے سے اور پیچھے سے آنے والی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹ مجھ پر کئی مرتبہ پڑی۔ ہر بار مجھے اس خوف سے جھرجھری آ گئی کہ اگر کوئی گاڑی آگے جا رکی اور اس میں سے پولیس یا چنگی کے عملے کا کوئی شخص اتر آیا تو میں کیا کروں گا۔ شاید کوئی مجھے یوں ننگ دھڑنگ سڑک پر دوڑتے دیکھ کر شک میں مبتلا ہو گیا اور اس نے گاڑی روک کر مجھ سے سوال کیا تو میں کیا جواب دوں گا۔ اگر اچانک کسی بس میں سوار ہو کے چنگی والے مجروح پولیس مین نے بس روک لی اور مسافروں نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا تو میں کہاں فرار ہو سکوں گا۔ ان سب سے نمٹنا ناممکن ہوگا۔

کے باوجود میں بھاگتا گیا۔ لیکن اس وقت جب کار مجھ سے سو گز کے فاصلے پر بھی نہیں رہی تھی اس کی ہیڈ لائٹس روشن ہو گئیں۔ انجن غرایا اور کار روانہ ہو گئی۔ "طاہر!" میں دیوانہ وار چلایا اور اس کے پیچھے زیادہ قوت کے ساتھ بھاگا لیکن میں اس کی تیز رفتاری کا کیسے مقابلہ کر سکتا تھا۔ سردی کی وجہ سے ڈرائیور نے شیشے بھی بند کر رکھے ہوں گے چنانچہ میری آواز انجن کی آواز میں دب گئی ہو گی۔ کار چند منٹ میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

چند سیکنڈ پریشان و سرگرداں رہنے کے بعد میں سڑک سے نیچے اتر گیا لیکن اس طرف نہیں جدھر سے میں آیا تھا۔ کار تو محض میری بدقسمتی کے باعث عین اس وقت نکل گئی تھی جب میں اپنی کوشش کے کامیاب ہونے کا یقین کر چکا تھا۔ میرے سارے مسائل کا حل یہی تھا کہ میں کار میں بیٹھ کے نکل جاؤں۔ میں اپنے کپڑے بدل سکتا تھا اور آج کی رات بحفاظت ملتان پہنچ کر کسی ہوٹل میں سکون سے سو سکتا تھا۔ میں نے محسن سے وعدہ کیا تھا کہ سکھر سے اسے فون کروں گا لیکن اب سارا پروگرام چوپٹ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ فوری مسئلہ اپنے تحفظ کا اور رات گزارنے کا تھا۔ سڑک پر سے اب گاڑیاں گزر رہی تھیں لیکن میں ان کی روشنی سے دور تھا۔ اب مجھے سردی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے درختوں کے ایک جھنڈ کی اوٹ میں وہی فقیری لباس زیب تن کیا گلے میں وہی منکوں کی مالائیں ڈالیں اور دوسرے ریوالور کو بھی اندر کی جیب میں چھپا لیا۔

اندر کی تھیلا نما جیب بہت بوجھل ہو گئی تھی کیونکہ اس میں دو ریوالوروں کے علاوہ تقریباً آٹھ ہزار روپے نقد بھی تھے۔ میرے پیر کنکروں اور کانٹوں سے زخمی تھے اور اب ٹھنڈی زمین بھی تلوے کاٹ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ چنگی ناکے پر ہنگامہ آرائی کی خبر اوپر پہنچ چکی ہو گی اور اب تک مزید پولیس کی کمک پہنچ چکی تھی یا بہت جلد پہنچنے والی ہوگی۔ وہ میرا تعاقب کریں گے۔ تلاش کرنے والے ادھر ہی جائیں گے جدھر میں بھاگا تھا۔ وہ ٹارچ لائٹس لے کر آئیں گے۔ ممکن ہے شکاری کتے بھی لے کر پولیس کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ معاملہ ایک اشتہاری مجرم کا تھا جس نے سنگین جرائم کی فہرست میں مزید وارداتوں کا اضافہ کر لیا تھا۔ شاید وہاں موجود افراد طے کریں کہ سب انسپکٹر پر گولی چلانے کا الزام بھی مجھ سے ہی منسوب کر دیا جائے تو وہ سپاہی تو بچ جائے گا جس نے گولی مجھے مارنی چاہی تھی لیکن اس کا نشانہ خطا ہونے سے اس کے افسر کو جا لگی۔ وہ مل کر بیان دے سکتے ہیں کہ مفرور مجرم نے سپاہی سے رائفل چھین کر گولی چلائی اور پھر تھانیدار صاحب کا ریوالور لے کر ہوائی فائر کرتا... دھمکیاں دیتا فرار ہو گیا۔ اس آخری بات کا گواہ تو چنگی کا عملہ بھی تھا۔ صبح کے بعد خبر آگے چھوٹے دیہات اور قصبوں تک پہنچ جائے گی اور اس طرف میری تلاش پورے زور شور سے جاری رہے گی۔

میرے بچنے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ میں بالآخر رات ملتان جا پہنچوں اور اپنی کار کے ڈرائیور کو تلاش کر لوں۔ اگر وہ کسی ہوٹل میں قیام کرے گا تو اپنا نام ہرگز نہیں لکھوائے گا۔ ڈاکٹر امجد پرویز کا نام ہی لکھوائے گا جو گاڑی کے کاغذات میں درج تھا لیکن اس کا کسی اچھے ہوٹل میں قیام کرنا مشکل نظر آتا تھا۔ اسے یہ خوف بھی ہوگا کہ کہیں وہ پکڑا نہ جائے اور بڑے ہوٹلوں میں ٹھہرنے کا تجربہ بھی نہیں ہوگا۔ ملتان پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ میرے پاس معقول کپڑے ہوں اور اس ویرانے میں ان کا تصور بھی محال تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں سڑک پر پہنچ کر کسی موٹر سائیکل یا کار والے کا انتظار کروں جو مجھے لفٹ دینے پر راضی ہو جائے اور اس احسان کا بدلہ یوں چکاؤں کہ اس سے گاڑی بھی چھین لوں اور اس کے کپڑے بھی اتروا لوں۔ یہ کام ناممکن نہیں تھا لیکن اس واردات کی خبر عام ہونے کے بعد یہ ثابت ہو جاتا کہ مجرم میرے سوا کوئی نہیں اور یہ معلوم ہو جاتا کہ میرا رخ کس طرف ہے۔ اس کے علاوہ ملتان پہنچ کر ڈرائیور کو تلاش کرنا بھی مشکل کام تھا۔ میں اسے گنتی کے دو چار ہوٹلوں میں تو دیکھ سکتا تھا لیکن چھوٹے ہوٹلوں کا کوئی شمار نہ تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی ہوٹل کا رخ ہی نہ کرے۔ اپنے کسی عزیز دوست کے پاس رک جائے یا کار ہی میں سو جائے۔ اسے صبح لاہور واپس آنا تھا۔

چنانچہ اس سے ملاقات کی دوسری صورت یہ تھی کہ میں صبح ہوتے ہی سڑک پر آ بیٹھوں اور اسے واپس لاہور جاتے ہوئے روک لوں۔ آج کی رات کہاں گزاری جائے؟ یہ مسئلہ پھر بھی باقی رہتا تھا۔ اندھیرے میں فصلوں کے درمیان یا کھیتوں کی منڈیر پر چلنا تکلیف دہ ہی نہیں خطرناک بھی تھا۔ مجھے اس کی عادت نہیں تھی چنانچہ پیر کے نیچے کوئی کیڑا مکوڑا آ جاتا تھا تو میں اچھل پڑتا تھا اور پھر خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ پاؤں کسی سانپ بچھو پر نہیں پڑا۔ میری ہمت جواب دینے لگی تھی کہ کھیت اچانک ختم ہو گئے اور میرے سامنے ایک چھوٹا سا نالہ آ گیا۔ اس کے پار تھوڑا سا بائیں جانب مدھم روشنیاں کسی گاؤں کی موجودگی کا پتا دیتی تھیں۔ میں نے دونوں ریوالور اور نقد رقم ہاتھ میں اوپر اٹھا لیے اور نالے میں اتر گیا۔ برساتی نالے میں پانی بہت کم تھا لیکن اتنا

www.paksociety.com

ٹھنڈا تھا جیسے پگھلی ہوئی برف۔ نالے کی تہہ میں گول کنکر بچھے ہوتے تھے۔ میں سنبھل سنبھل کے ایک ایک قدم اٹھاتا اپنا توازن برقرار رکھتا آگے بڑھتا گیا۔ چکنی سطح والی کنکریاں بھی اب میرے پاؤں کے نیچے شیشے کی گولیاں بن گئی تھیں اور میری جسمانی طاقت بھی جواب دینے لگی تھی۔ مجھے پانی کی گہرائی کا اندازہ اگلا قدم بڑھانے کے بعد ہوتا تھا جو ابھی تک زیادہ نہیں تھی اور پانی میرے گھٹنوں سے اوپر نہیں پہنچا تھا۔ آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک گڑھا آ گیا اور اندازہ غلط ہو جانے کے بعد میں سنبھل نہ سکا۔

گرتے گرتے بھی میں نے اپنا اسلحہ اور سرمایہ بچا لیا چنانچہ پانی میں غرق ہونے کے باوجود میرے دونوں ہاتھ پانی سے باہر رہے۔ جب میں پھر کھڑا ہوا تو وہ خطرناک حد تک پانی میں تر تھی اور یخ بستہ پانی میرے جسم کو بھگو کر ہڈیوں میں پیوست ہو رہا تھا۔ سردی سے میرا پورا وجود کانپنے لگا اور دانت بجنے لگے۔ میں نے رہی سہی جسمانی قوت کو مجتمع کیا اور نالے کو عبور کر لیا۔ گاؤں کا پہلا گھر ایک فرلانگ کے بعد آ گیا۔ اب میرے لیے دوسرا مسئلہ پیدا ہوا۔ میں پانی سے تر کپڑوں میں ریوالور اور نقد رقم نہیں رکھ سکتا تھا اور اگر رکھ لیتا تو کپڑے بدلتے وقت انہیں نکال نہیں سکتا تھا۔ پناہ دینے والے خشک کپڑے، کھانا اور رات بھر کے لیے سونے کی جگہ دے سکتے تھے کیونکہ وہ سیدھے سادے مہمان نواز دیہاتی تھے لیکن کسی ملنگ کے پاس آتشیں اسلحہ اور اتنی نقد رقم دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو جاتے اور یہی سمجھتے کہ ملنگ کے بھیس میں کوئی ڈاکو ان کے گھر میں گھس آیا ہے۔

میں نے ایک جگہ نرم زمین دیکھ کر چھوٹا سا گڑھا بنایا۔ اس میں ایک درخت کے پتے بچھائے اور سب چیزیں اوپر رکھ کے پتوں کی دوسری تہہ ڈال دی تاکہ مٹی کسی کو خراب نہ کرے۔ ایک احتیاط میں نے یہ بھی کی کہ دونوں ریوالور رکھنے سے پہلے اوپر نیچے خشک نوٹ بھی پھیلا دیے تاکہ ایک ذرہ بھی ریوالوروں کی گراریوں کے نظام تک نہ پہنچے۔ مٹی برابر کر کے میں نے پیروں سے دبا دی اور اس تازہ کھدی ہوئی زمین کو چھپانے کے لیے اس پر سوکھے پتے اور گھاس کا کوڑا ڈھیر کر دیا۔ نشانی کے لیے میں نے اسی درخت کو ذہن میں رکھا جس کے پتے نوچے تھے۔ گڑھا اس کے تنے سے شمال کی جانب ایک فٹ کے فاصلے پر تھا۔ پھر میں نے اس کچے گھر کے بند دروازے پر دستک دی جس کے مکین شاید سورج ڈھلتے ہی کھانا کھا کے سونے کے عادی تھے۔

بار بار دستک دینے پر کسی نے اندر سے کہا: "کون اے بھئی۔ دم لے ذرا۔" پھر کنڈی کھلی اور ساٹھ ستر سال کا ایک بوڑھا دیہاتی لالٹین اٹھائے نمودار ہوا۔ لالٹین اٹھا کے اس نے میرا چہرہ غور سے دیکھا۔

"مسافر ہوں بابا۔" میں نے قلندرانہ انداز میں کہا۔ "ایک روٹی کا سوال ہے اور ایک رات کے لیے تھوڑی جگہ سونے کے لیے چاہیے۔"

"ہمارے بھاگ پیر بادشاہ۔" وہ فرطِ عقیدت سے سینے پر ہاتھ رکھ کے جھکا۔ "کہ آپ ہمارے مہمان ہوئے۔ اری بختے! دیکھ تو کون آیا ہے۔ رحمت کے فرشتے آئے ہیں ہمارے دروازے پر۔" اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے مجھے اندر آنے کے لیے کہا اور شاید اپنی گھروالی کو پکارا۔ وہ کچا گھر صرف دو کمروں پر مشتمل تھا۔ لالٹین کی روشنی میں مجھے ایک چارپائی پر بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت نظر آئی۔ اس نے تھوڑا سا اٹھنے کی کوشش کی اور کھانسی۔

"سب مبارک کرے۔" اس سادہ لوح عورت نے کہا۔ "شکر ہے تیرا مالک کہ یہاں بھی کوئی آیا۔"

"آپ بیٹھیں پیر بادشاہ۔" دیہاتی نے دوسری چھنگا چارپائی پر میرے لیے جگہ بنائی۔ "میں روٹی لاتا ہوں۔"

میں دل ہی دل میں اتنا شرمسار تھا کہ ممکن ہوتا تو اسی وقت بھاگ جاتا۔ اگر وہ مجھے دھتکار دیتے اور میری منت سماجت کے بعد کسی کونے میں ڈال کر ایک سوکھی روٹی تھما دیتے تو میں خدا کا شکر بجا لاتا اور شرمندہ تو نہ ہوتا۔ شہروں میں تو کسی اجنبی کے لیے کون گھر کا دروازہ کھولتا ہے خواہ دو ہزار گز کی کوٹھی خالی پڑی ہو۔ سب چور اچکا سمجھ کے بھگا دیتے ہیں۔ وہی شرافت سے کام لے تو کہہ دیتا ہے کہ معاف کرو بابا۔ لیکن یہاں میری ایسی پذیرائی ہو رہی تھی جیسے میں کوئی انتہائی اہم اور قابلِ احترام مہمان ہوں۔ یہ خیال میرے ضمیر کی خلش بن گیا کہ اگر ان سادہ دل، پُرخلوص اور نیک طبع لوگوں کو میری حقیقت کا علم ہو جائے تو انہیں کتنا دکھ ہو گا۔ مشکل یہ تھی کہ میں انہیں اس عزت و تکریم سے روک بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے پیر شاہ کہہ کر گناہ گار نہ کرو۔ میں تو ایک مفرور اشتہاری ملزم ہوں۔

بوڑھا دوسرے کمرے میں کسی کو جگا رہا تھا۔ "ارے اب اٹھ جا گلابو۔ مہمان آئے ہیں ہمارے گھر۔ ان کے کھانے کے لیے لا۔" لالٹین دونوں کمروں کے بیچ والے دروازے کی دہلیز میں اٹکا دی گئی تھی چنانچہ اس کا اجالا تقسیم ہو گیا تھا اور دونوں طرف پھیل گیا تھا۔ بوڑھا پھر نمودار ہوا اور بیٹھ گیا۔

"یہ کیا کرتے ہو؟" میں نے کہا۔ "یہاں میرے ساتھ بیٹھو۔"

"نہیں پیر بادشاہ۔ اس قابل نہیں ہوں میں گنہگار۔" وہ عاجزی سے بولا۔ "مجھے اپنے قدموں میں رہنے دیں۔ کرتوتوں کا زہر کرتا ہے جسے گاؤں والے پتھر مار کے بھگا دیتے ہیں۔ اپنے گھر کے سامنے کھڑا نہیں رہنے دیتے۔ آپ ساتھ بیٹھنے کی کہتے ہیں۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" میں نے ہمدردی، حیرت اور دکھ کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔ "گاؤں والے ایسا سلوک کیوں کرتے ہیں تمہارے ساتھ؟ کیا خطا ہوئی ہے تم سے؟" عورت اچانک کھانسنے لگی۔ کھانستے کھانستے اس کا دم پھول گیا۔ اس نے بہت سا بلغم تھوکا اور کم روشنی کے باوجود مجھے اس میں خون نظر آیا۔

"ٹی بی ہے اسے تو؟" میں نے کہا۔

"ہاں... ہاں جی۔ دعا کریں اللہ مجھے موت دے دے۔" عورت نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب اور نہیں جیا جاتا۔"

"مایوسی کفر ہے ماسی۔ اللہ سے شفا کی دعا مانگنی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "کب سے ہے ٹی بی اسے؟"

"جب سے گلابو جوان ہوئی ہے پیر بادشاہ۔" کرمو بولا۔ "روگ ہے اس کا۔"

"بیٹی تو خدا کی رحمت ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے برا کیوں کہتے ہو؟"

"جس کے نصیب برے ہوں اسے اور کیا کہوں جی۔" کرمو بولا۔ "خدا کو منظور نہ ہوتا تو اب تک ماں باپ کے گھر بیٹھی ہوتی؟ اتنی ذلت کے باوجود ہم زندہ رہنے پر مجبور ہوتے؟"

"ہر کام کا ایک وقت ہے کرمو۔" میں نے کہا۔ "اور خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں۔ رشتہ ضرور ملے گا اور ایسا ملے گا کہ...."

"رشتے تو بہت پیر بادشاہ۔ اس کی تو منگنی بھی ہو گئی تھی۔" کرمو نے کہا۔ "لیکن خدا غارت کرے اس کا جس نے ہم سے سب کچھ چھین لیا۔ ہمارا سکھ۔ ہماری خوشی۔ ہماری عزت۔ کرمو کی ماں کو ٹی بی دے دی اور گلابو کی رخصتی نہ ہونے دی۔"

"کون ہے وہ کرمو؟" میں نے کہا۔ اندر سے ایک لڑکی چنگیر اور ایک گلاس لیے اندر آئی۔ اگر اس کا نام گلابو تھا تو غلط نہیں تھا۔ غربت اور دیہاتی وضع کے کپڑوں میں بھی اس کا گلاب دمک رہا تھا۔ آنکھوں کے دیے روشن تھے اور اس کے حسن کی آب و تاب پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ چہرے پر وہ معصومیت تھی کہ گنہگار نظر کو حجاب آتا تھا۔

"یہی ہے وہ بدبخت پیر بادشاہ۔" میں نے کرمو کی دکھی آواز سنی۔

"کبھی کسی کو بدبخت مت کہو کرمو۔ تم کیا جانو کسی کے مقدر میں کیا ہے۔" میں نے بردباری سے کہا۔ "یہ سب جانتا ہے اور اسی کو معلوم ہے کہ زندگی میں دکھ کتنا ہے اور سکھ کتنا۔ تقدیر بدلتے دیر نہیں لگتی۔ بس اس کا حکم چاہیے۔" میں نے انگلی اوپر اٹھا کے کہا۔ گلابو روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

"اگر اس کی منگنی بھی ہو چکی تھی تو شادی کیوں نہیں ہوئی؟" میں نے چنگیر اپنی طرف کھسکا کے کہا۔ چنگیر میں مکئی کی گرم روٹی، مکھن کا پیالہ اور اچار تھا۔

"مر گیا جی وہ۔" کرمو نے گھٹنوں پر سر رکھ کے کہا۔ "میرے بھائی کا بیٹا تھا۔ ایسا گبرو جوان تھا۔ جل کے مر گیا۔ اپنے ہی گھر کی آگ میں۔ آگ لگانے والا اب بھی ہمیں معاف نہیں کرتا۔ نہ جانے کتنے دکھی لوگوں کی بددعائیں لے کر بھی سانڈ کی طرح دندناتا پھر رہا ہے۔"

"کون ہے وہ؟" میں نے کہا۔ نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا تھا۔ "کوئی بدمعاش ہے؟"

"نہیں پیر بادشاہ۔ وہ تو شریف زادہ ہے۔" کرمو تلخی سے ہنسا۔ "بدمعاش تو ہم ہیں۔ ہماری بیٹی ہے۔"

"رہنے دے کرمو۔" عورت پھر کھانستے کھانستے چلائی۔ "کس کس کے سامنے روئے گا اپنا دکھڑا اور کتنی بار سنائے گا۔ مجھے مت جلا اور پیر بادشاہ ایک رات کے مہمان... مہمان ہیں۔"

"ہم اسے نیست و نابود کر دیں گے۔" میں نے جلالی لہجے میں کہا۔ یہ ڈراما کیے بنا چارہ نہیں تھا۔

"جاگیردار کا بیٹا ہے، اکرم۔" کرمو نے سر اٹھا کے کہا۔ "اکرم بدمعاش کہتا ہے خود کو۔ باپ کی شہ ہے اور دولت کا گھمنڈ ہے۔ پولیس بھی اس کے ساتھ ہے۔ پہلے اپنے ملازم کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ وہ بیچاری سال بھر بھی نہ گزار سکی اور گلے میں پھندا ڈال کے لٹک گئی۔ پورے دنوں سے تھی۔ جتنا ظلم

www.paksociety.com

اس نے برداشت کیا تھا اس کے بعد وہ یہی سزا دے سکتی تھی، خود کو بھی اور جاگیردار کو بھی۔ اس نے اپنے ساتھ اکرم کے بیٹے اور جاگیردار کے پوتے کو بھی قتل کر دیا۔ تب سے اکرم بے مہار پھر رہا ہے۔ معلوم نہیں گاؤں میں کسی کی عزت اس کے ہاتھوں سے خراب ہونے سے بچی بھی ہے یا نہیں۔ وہ تو بے وقوف تھے جنھوں نے آبرو لٹنے کا شور مچایا، فریاد کی اور جوتے کھائے جاگیردار سے بھی اور تھانے میں بھی۔ ایک اس کا مشتاق تھا جس نے بہن کو کاٹ کے گاڑ دیا اور کلہاڑی سمیت تھانے میں حاضر ہو گیا۔ پچھلے مہینے ہی پھانسی ہوئی ہے اسے۔ دوسری فتو چمار کی بیٹی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میری طرف بری نظر سے دیکھا تو آنکھیں نکال دوں گی اور وہ سچ مچ ڈب میں خنجر لیے پھرتی تھی۔ اکرم نے اس کو کھیتوں میں اکیلا دیکھ لیا تھا۔ اس نے خنجر سے مقابلہ کیا مگر اکرم جیسے مشٹنڈے مرد کا مقابلہ کیا کرتی۔ اس کی ایک آنکھ ضائع کر دی تھی۔ وہ اچانک غائب ہو گیا۔

"اور... اس کا خود کیا بنا؟" میں نے سوال کا جواب معلوم ہونے کے باوجود پوچھا۔

"اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا پیر بادشاہ۔" وہ بولا۔ "کہیں نہ کہیں مل جائے گی۔ گاؤں میں یا گاؤں سے باہر کسی ویران سی جگہ میں، پاگلوں کی سی وحشت ناک حالت میں دربدر۔ آوارہ دو چار کتوں کو ساتھ لیے پھرتی ہے۔ انھی کے ساتھ رہتی ہے اور انھی کے ساتھ کھاتی ہے۔ جو بھی لوگ ڈال دیں۔ انھی کو اپنا خاندان کہتی ہے۔ اب تو بچے بھی پتھر نہیں مارتے۔ کوئی چڑیل بھی نہیں کہتا۔ صرف اکرم بدمعاش کہتا ہے کہ فتو چمار کی بیٹی کو دیکھا ہے نا؟ نہیں دیکھا تو اب دیکھ لو کہ اکرم سے دشمنی کرنے والے کا حشر کیا ہوتا ہے۔ وہ جب چاہے اسے مار سکتا ہے لیکن وہ مر گئی تو اکرم کی شہ زوری کا چلتا پھرتا نمونہ کہاں سے لے گا۔"

میں نے افسوس کیا کہ اپنی جان بچانے کے لیے میں بھاگ کر اس گاؤں میں آیا۔

"یہ قصور کس کا ہے کرمو؟" میں نے کہا۔ "کیا گاؤں کے مردوں نے ہاتھوں میں چوڑیاں پہن لی ہیں؟ یا وہ اتنے بے غیرت ہو گئے ہیں کہ پڑوسی کی بیٹی کو بے آبرو ہوتا دیکھتے ہیں تب بھی نظر چرا کے گزر جاتے ہیں؟"

"وہ سب کا ان داتا ہے پیر بادشاہ۔"

"کفر کا کلمہ مت بک کرمو۔" میں نے گرج کر کہا۔ "سب کا ان داتا وہ نیلی چھتری والا ہے۔ اپنی کمزوری کو مان لے۔ تجھے بھی ایک روٹی ایک بیٹی کی آبرو سے زیادہ عزیز ہے؟ اس نے تیرے بھائی کا گھر جلا کے راکھ کر دیا۔ تیری بیٹی کو سہاگن ہونے سے پہلے بیوہ کر دیا۔ تیری بیوی خون تھوک رہی ہے اور تو ڈر رہا ہے۔ اب بھی زندہ رہنا چاہتا ہے۔ جا کے اسے مار کیوں نہیں دیتا اور پھانسی کیوں نہیں چڑھ جاتا؟"

"میرے ہاتھوں میں اتنا دم نہیں رہا پیر بادشاہ کہ کلہاڑی بھی اٹھا سکوں۔" وہ رونے لگا۔ "میرا جوان بیٹا ہوتا کوئی تو میں قربان کر دیتا۔ کسی اور کو کیا کہوں۔ لوگ تو اس سے اتنا ڈرتے ہیں کہ اس کے خوف کے باعث ہم سے بات نہیں کرتے۔ ہمیں بلاتے نہیں۔ ہمارے گھر نہیں آتے۔ ہم بستی میں رہ کے اکیلے ہو گئے ہیں۔ شودر ہو گئے ہیں۔"

"اب کیا چاہتا ہے وہ؟" میرا خون آہستہ آہستہ گرم ہونے لگا تھا۔

"وہ گلابو کو مانگتا ہے۔" وہ بولا۔ "گلابو ضدی لڑکی ہے۔ کہتی ہے زہر کھا کے مر جاؤں گی۔ گلے میں پھندا ڈال لوں گی۔ میں فتو چمار کی بیٹی بھی نہیں ہوں۔ وہ بیاہ کر کے دیکھے مجھ سے اسی رات جنازہ نہ اٹھے اس کا تو کہنا۔ یا ولی لڑکی بھلا شادی کے بعد عورت کچھ کر سکتی ہے۔"

"عورت ہر وقت سب کچھ کر سکتی ہے کرمو۔" میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آخری بار کب بات کی تھی اس لفنگے نے؟"

"بات تو وہ کرتا ہی رہتا ہے۔ راہ چلتے دست درازی پہ بھی اتر آتا ہے لیکن اللہ نے اب تک عزت بچا رکھی ہے۔" وہ بولا۔ "اس نے ایک ہفتے کی مہلت دی ہے۔ سمجھو کہ آخری بار سوچ لے۔ میں کیا سوچوں پیر بادشاہ! گلابو نے تو کچھ اور ہی سوچ رکھا ہے۔ کہتی ہے ہاں کر دو۔ مہلت تو پوری ہو چکی۔"

"میرا بھی خیال ہے کہ تم ہاں کر دو کرمو۔" میں نے کہا۔

اسی وقت دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی۔ باہر سے کئی افراد کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز آئی۔

"اب کون آ گیا رب خیر کرے۔" کرمو اٹھا۔

"ایک منٹ کرمو۔" میں نے کہا۔ "ذرا میں دیکھ لوں پہلے۔" اور اسے حیران چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ جھری سے جھانکنے پر مجھے چار آدمی نظر آئے۔ میں پلٹ کر بھاگا۔

"باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے؟" میں نے کہا۔ "دروازہ میرے جانے کے بعد کھولنا۔"

"اُدھر دوسرے کمرے میں ایک کھڑکی ہے۔" کرمو گھبرا کے بولا۔ "پیچھے کی طرف کھلتی ہے۔"

میں دوسرے کمرے کی طرف لپکا اور کھڑکی کھول کے باہر اتر گیا۔

باہر گھپ اندھیرا تھا اور گلیوں میں بھونکنے والے آوارہ کتوں یا بہت دور چلانے والے پرندوں کی آوازوں کے سوا کہیں کوئی صدا نہ تھی مگر یہ بھی اس بھیانک رات کے سکوت کا ایک حصہ لگتی تھیں۔ مجھے صرف اتنا اندازہ ہو سکا تھا کہ حملہ آور تعداد میں چار ہیں۔ انھوں نے شب رنگ کپڑے پہن کے اپنے چہرے بھی لوئی سے چھپا لیے تھے کہ میں صرف تاریکی میں چار سائے دیکھ سکا تھا۔ زیادہ امکانات یہی تھے کہ وہ اسی غریب گھر کی عزت کو تاخت و تاراج کرنے والے لٹیرے تھے جو اپنی طاقت کے زعم میں، جوانی ہوس کے غرور میں اور شہ زوری کے فریب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ بھول گئے تھے کہ عاقبت کا سرمایہ اعمال کی نیکیاں ہیں۔ وہ فتوحات نہیں جو انھوں نے کسی مظلوم بے بس اور کمزور حریف پر انسانیت سوز مظالم ڈھا کے حاصل کی تھیں کیونکہ انھیں قوت تھی جس کے اس مظاہرے کا مواخذہ مالی وزر کی صورت میں ادا ہوتا تھا۔ یہ حریص شیطان بھول گئے تھے کہ ان کے ہوس پرست نظام اور بے ضمیر آقا کے مقابلے میں ایک انصاف پرور اور محافظ قدرت کا ہاتھ کہیں زیادہ طاقتور ہے۔

لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ شکاری کتے ہوں جو مسلسل میرے تعاقب میں تھے۔ ان کے لیے میرا سراغ لگانا مشکل ضرور تھا، ناممکن نہیں تھا۔ باہر نکل آنے کے بعد میں نے خود کو بہت پُراعتماد محسوس کیا۔ وہ مسلسل دروازہ پیٹ رہے تھے اور کچے گھر کی دیواریں اتنی مضبوط نہیں تھیں کہ دروازے کو ناقابل شکست سہارا فراہم کر سکیں۔ گھر کے اندر ایک بیمار عورت تھی جو زندگی اور موت کی بے رحم جنگ کا شکار تھی اور جس کا شمار نہ زندوں میں کیا جا سکتا تھا اور نہ مردوں میں۔ وہ مرنا چاہتی تھی مگر مر نہیں سکتی تھی اور زندہ رہنے میں اس کے لیے موت سے شدید تر عذاب کا سلسلہ تھا۔ دوسری وہ لڑکی تھی جس کی جوانی کا حسن اس کا دشمن ہو رہا تھا اور وہ اپنے وجود پر بھی شرمسار تھی کہ آج اس کی وجہ سے والدین کی رسوائی اور موت کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ وہ یقیناً سوچتی ہو گی کہ کاش وہ پیدا نہ ہوئی ہوتی یا خدا نے اسے بدصورت نہ سہی گاؤں کی دوسری لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت نہ بنایا ہوتا۔ اس کا اکیلا بوڑھا اور کمزور باپ اپنی بیٹی کی آبرو کے دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صرف یہ کر سکتا تھا کہ جان کی بازی لگا دے اور یہ بھیڑیے اس کی لاش کو پامال کرتے ہوئے گھر کی عزت کا جنازہ نکال کے لے جائیں۔

بستی کے گھر زیادہ فاصلے پر نہیں تھے لیکن ابھی تک کوئی دروازہ نہیں کھلا تھا، اور کسی نے آواز دے کر بھی نہیں پوچھا تھا کہ آدھی رات گئے یہ کیسا شور ہنگامہ ہے۔ گلابو کے باپ کی فریاد و فغاں تو گھر کی دیواروں میں محصور تھی لیکن ان کی آواز تو دور دور تک رات کی خاموشی کو مجروح کر رہی تھی جو للکار رہے تھے، بکار رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔ دروازے پر لاتیں مار رہے تھے اور کندھے بھی مار رہے تھے۔ ایک دیوار کی اوٹ چند قدم تھی۔ میں پنجوں کے بل تیزی سے آگے بڑھا اور کونے سے سر نکال کے دیکھنے لگا۔ چار میں سے ایک کے پاس کلہاڑی تھی جسے وہ کندھے پر بندوق کی طرح جمائے سب سے پیچھے کھڑا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کمزور دروازے کو توڑنے کے لیے دو افراد کی قوت بازو کافی تھی۔ دوسرا لاٹھی کو زمین پر ٹیکائے اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ باقی دو ہاتھ خالی تھے اور اب کندھوں سے دروازے کو ٹکریں مار رہے تھے۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات بھی تھی اور افسوس کا مقام بھی تھا کہ ابھی تک حقوق ہمسائیگی، انسانیت کے رشتوں اور شرافت کے تقاضوں نے کسی کو بیدار نہیں کیا تھا۔ کیا گاؤں میں لوگ سکھ چین کی اور بے فکری کی اتنی گہری نیند سوتے ہیں کہ کسی کا گھر لٹے یا کسی کی آبرو، ان کے کان کسی کی مدد کی پکار تک نہیں سنتے؟ نہیں۔ گلابو کے باپ نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ مظلوم و مجبور و حقیر لوگ ڈرتے ہیں۔ خوف خدا سے زیادہ ان کو زمین پر نمرود کی طرح خدائی کرنے والے مالکوں کا ڈر تھا۔ شاید وہ جاگ رہے تھے اور سب کچھ سن رہے تھے مگر انھوں نے اپنی مجبوریوں کی آڑ میں پناہ لے لی تھی۔ خود غرضی نے انھیں بزدل اور بے حس بنا دیا تھا۔ آخر ہمارے بھی تو بیوی بچے ہیں اور پھر ہم مقابلے کی طاقت کہاں رکھتے ہیں۔ کل ہمارے ساتھ ہوا تو کوئی نکلے گا اپنے گھر سے؟ پھر ہم کیوں جائیں اور کیسے جائیں۔

میں کونے سے نکل کر اچانک ان کے سامنے آ گیا۔ "کیسا ہے یہ شور و غل؟"

دروازہ گرانے کی کوشش کرنے والے رک گئے۔ ایک ساتھ ان سب نے سر گھما کے مجھے دیکھا۔ پھر کلہاڑی والا ایک قدم آگے آیا۔ "اپنا کام کرو سائیں بابا۔" اس نے درشت لہجے میں کہا۔

"اور ہمیں اپنا کام کرنے دو۔" لاٹھی والے نے کہا۔

"جاؤ سائیں۔"

"اوئے ملنگ ہے کوئی یار۔" دروازہ توڑنے کی کوشش میں مصروف ایک شخص نے جھنجلا کے کہا۔

"حق اللہ۔" میں آہستہ آہستہ جھومتا ہوا آگے بڑھا۔ "او بچو! کیوں اس گھر کو گراتے ہو۔ جس گھر میں بستے ہو اسی کی دیواریں ڈھاتے ہو۔" میری آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ میں نے چرس کا دم لگا رکھا ہے۔

"یہ ہمارا گھر نہیں ہے موتیاں والیو۔" لاٹھی والا میرے سامنے آ گیا۔

www.paksociety.com

سر تو بس گھر ہوتا ہے۔ اینٹ، پتھر، گارے کا۔" میں نے جلالی لہجے میں کہا۔ "کبھی تیرا، کبھی میرا۔ ایک جاتا ہے تو دوسرا آتا ہے۔ بندہ وہیں پہنچتا ہے جہاں سب گئے۔ تو بھی جائے گا۔"
"بس کر بابا، دفع ہو جا یہاں سے۔" کلہاڑی والے نے کہا۔

لاٹھی والے نے مجھے دونوں ہاتھوں میں لاٹھی تھام کے دھکیلا۔ میں اسی موقعے کا منتظر تھا۔ میں نے لاٹھی کو بیچ میں سے تھام کر جھٹکا دیا۔ لاٹھی پر اس کی گرفت بہت مضبوط نہ تھی اور اسے ایک چرس کے نشے میں وحشت خیز سے ایسی پھرتی اور قوت آزمائی کی امید بھی نہ تھی۔ لاٹھی میرے ہاتھ میں آ گئی اور وہ دو قلابازیاں کھا کے دور جا گرا۔ میں نے لاٹھی کو یوں گھمایا کہ اس کا ایک سرا کلہاڑی والے کی گردن پر جڑ دے مگر وہ کندھے پر رکھی ہوئی کلہاڑی دونوں ہاتھوں میں اٹھا کے مجھ پر وار کر چکا تھا۔ لاٹھی اس کی کلہاڑی کے دستے پر لگی۔ کلہاڑی کے دستے کی لکڑی لاٹھی کے مقابلے میں بہت کمزور اور پتلی تھی۔ لاٹھی اور کلہاڑی کا دستہ یوں ٹکرائے جیسے بیک وقت ایک دوسرے پہ وار کرنے والوں کی تلوار ٹکراتی ہے۔ کلہاڑی کا دستہ درمیان سے ٹوٹ گیا اور میرے حریف کے ہاتھ میں مشکل سے دو فٹ لمبا ڈنڈا رہ گیا۔

اس نے پیچھے ہٹ کر قدم جمانے کی کوشش کی۔ میں نے لاٹھی اس کے پاؤں میں اڑائی اور وہ منہ کے بل گر گیا۔ لاٹھی کا اصل مالک کمر پر ہاتھ رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے زمین پر سے ایک پتھر اٹھا کے پوری قوت سے میری طرف پھینکا۔ اندھیرے کے باوجود میں نے اسے جھکتے اور زمین پر سے کچھ اٹھاتے دیکھ لیا تھا۔ جب اس نے مجھے گالی دینے کے بعد ہاتھ گھمایا تو میں غوطہ مار گیا۔ پتھر زن سے میرے کان کے پاس سے گزرا۔ میرے پیچھے کلہاڑی والا سخت اشتعال کے عالم میں اٹھ کے مجھ پر جست لگا چکا تھا۔ پتھر کتنا بڑا تھا، اس کا اندازہ تو مجھے نہیں ہو سکا لیکن اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی اور وہ میرے قدموں کے پاس آ گرا تو میں سمجھ گیا کہ میرا ایک مدمقابل کم ہو گیا ہے۔ اس کی منہ زور بے مہار اور مخمور قوت ایک لمحے میں اس سنگِ راہ سے ٹکرا کے فنا ہو گئی جو فرشتۂ اجل نے اس کے اپنے ساتھی کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ اس رات اگر وہ ایک غریب اور مظلوم آدمی کا گھر جلانے اور اس کی جوان بیٹی کو اٹھا لانے کے لیے اپنے گھر سے نہ نکلتا تو زندہ رہتا۔ خود اس نے اپنی جرأت اور جواں مردی ثابت کرنے اور اپنی خدمت گزاری کا انعام لیتے وقت یہ سوچا تک نہیں ہوگا کہ کتنے کم داموں میں اس نے اپنی زندگی کا سودا کر لیا ہے۔ اس نے موت کی ہنسی نہیں سنی ہوگی جو طے شدہ وقت پر آدمی کو کسی نہ کسی بہانے وہیں پہنچا دیتی ہے جہاں وہ آخری بار سانس لیتا ہے۔ اسے حیران ہونے کی مہلت بھی نہیں ملی کہ آج کے دن تک یکسانیت اور تسلسل کے ساتھ جاری رہنے والا عمل یکلخت کیوں اور کیسے رک گیا۔ وہ عمل جس میں دل کا دھڑکنا، نبض کا گھڑی کی طرح چلتے رہنا، سانس کی آمد و رفت، حواسِ خمسہ کی صحت اور سلامتی اور جسم کے تمام اعضا کا اپنے اپنے افعال کی کارکردگی کو برقرار رکھنا شامل ہوتا ہے۔

صرف ایک لمحے کے لیے سکوت اور جمود طاری رہا۔ بے یقینی کا وہ لمحہ آیا جس میں لاٹھی والے نے محسوس کیا کہ اس نے کلہاڑی والے کو قتل کر دیا ہے۔ پھر یہ لمحہ خوف اور پشیمانی اور قہر و غضب کے طوفان میں ڈھل گیا۔ اچانک ان سب کو احساس ہوا کہ مجھے مخبوط الحواس، بے ضرر اور بے دھب ٹیک پڑنے والا فقیر سمجھ کے انھوں نے کتنی مہلک غلطی کی تھی۔ میں نے لاٹھی کو گھٹنے پر رکھ کے دو ٹکڑے کر دیا اور دونوں ٹکڑے دور اچھال دیے۔ میں نفسیاتی طور پر ان کو خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔

ان سب نے ایک ساتھ مجھ پر حملہ کیا۔ پہلا توپ کے گولے کی طرح میرے پیٹ میں لگا۔ میں نے اسے رکوع کی حالت میں دیکھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اس کو پیٹ کے نیچے سے پکڑ کے اٹھایا اور سر کے اوپر سے گزار کے پیچھے پھینک دیا۔ پھر میں نے ایک پنجے پر گھوم کے لات چلائی جو دوسرے کے پیٹ پر بالکل صحیح جگہ لگی۔ وہ بلبلایا اور ضرب کی قوت سے تقریباً پانچ گز دور گرا۔ میرے پیچھے گرنے والا اٹھ بھی نہ پایا تھا کہ میں چھلانگ لگا کے اس پر گرا۔ میرے گھٹنے اس کے منہ پر گرز کی طرح پڑے۔ میں نے اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کے اٹھایا اور زمین پر دے مارا۔ وہ بہت سخت جان اور طاقت ور حریف تھا۔ ورنہ پہلی بار ہی گر کے کے بعد اٹھ نہ پاتا لیکن اس نے مقابلہ کیا اور مجھے اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ پھر اس کے دونوں بازو اپنا دفاع کرنے کے بجائے میری کمر کے گرد لپیٹ لیے۔ کیونکہ اس نے اپنے آخری ساتھی کو پیش قدمی کرتے دیکھ لیا تھا۔

خود کو چھڑانے کی خاطر مجھے تھوڑی سی جدوجہد کرنی پڑی اور اسے تقریباً ختم کرنا پڑا لیکن یہ تاخیر مجھے مہنگی پڑی۔ اس نے آخری حریف کو مہلت دے دی کہ وہ اطمینان سے مجھ پر حملہ کرے۔ میں نیچے پڑے ہوئے شخص کی گرفت میں آدھا منٹ بھی نہیں رہا تھا لیکن اس آدھے منٹ میں چوتھے آدمی نے لاٹھی کے نصف ٹکڑے سے میرے سر پر وار کیا۔ یہ ٹکڑا وہیں پڑا تھا

www.paksociety.com

تھا جہاں وہ میری لات لگنے سے جا گرا تھا۔
ضرب اتنی شدید تھی کہ میں اٹھ بھی نہ سکا میرے ہاتھ پاؤں بے دم ہو گئے اور میں نے خود کو درخت سے ٹیک لگا کر نیم وا آنکھوں کی طرح زمین پر گرتے محسوس کیا پھر احساس نے ساتھ چھوڑ دیا اندھیری رات زیادہ سیاہ اور بے معنی ہو گئی۔ بے ہوشی کا یہ وقفہ بہت مختصر رہا۔ کوئی آواز میرے لاشعور کو جھنجھوڑتی رہی سکندر! اٹھو یہ لاش تمہارے ... ہیں اور جو تمہیں زندہ اور گرفتار رکھنا چاہتے ہیں باقی قید میں، جیل خانے یا پاگل خانے میں، یہ جونی اور قاتل ابھی بھی ایک بار تمہیں پہچانتے بھی نہیں مگر تمہیں معاف نہیں کریں گے۔ اپنے ایک ساتھی کے خون کا بدلہ تمہارے خون سے لیں گے کیونکہ قتل تم نے نہیں کیا لیکن قتل کا سبب تم ہی ہو۔ تم نے ان کی متحدہ قوت سے ٹکرانے کا ناقابل معافی گناہ کیا ہے۔ یہ تم کو اس دشت کی تنہائی میں ایسی جگہ گاڑیں گے جہاں تمہارے کسی دوست اور ہمدرد کے خیال کی رسائی بھی نہیں ہو سکتی وہ سب تو یہی سمجھ رہے ہیں کہ تم ایک کار میں کراچی کی جانب رواں ہو اور اس وقت ملتان کے کسی ہوٹل میں سو رہے ہو اور کل تم سکھر سے فون کرو گے۔

ہوش آنے کے بعد بھی میں نے اپنے ہی خیالات کی بازگشت سنی۔ آواز میری تھی اور بازگشت بالکل۔ خیال میرا تھا اور صدا اس کی لیکن یہ احساس کا فریب تھا اور آرزو کا سراب تھا۔ وہ آواز بالکل نہیں گلابو کی تھی۔ وہ میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھی۔ مجھے جھنجھوڑ رہی تھی اور پکار رہی تھی۔

میرا سر میرے کندھے پر رکھی ہوئی چٹان بن گیا تھا لیکن گلابو نے مجھے سہارا دیا تو میں اٹھ کے بیٹھ گیا میں نے دیکھا کہ گلابو رو رہی ہے پیچھے گھر کے دروازے کے اندر ایک لالٹین جل رہی تھی۔

"مجھے بتاؤ" میں نے کہا "رو کیوں رہی ہو؟ وہ ... وہ کہاں ہیں؟"
اور سر کو گھما کر ادھر ادھر دیکھا میرے سوال کا جواب میرے سامنے پڑا تھا ادھر ادھر چار افراد پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک وہ تھا جو اس جنگ میں سب سے پہلے کام آیا تھا۔ دوسرے کو کسی نے وار کر کے زخمی کر دیا تھا اور وہ بھی لاش کی طرح بے جان پڑا تھا دوسرے یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ وہ ابھی تک بے ہوش ہے یا مر چکا ہے تیسرا جسم دو حصوں پر مشتمل تھا۔ اس کا دھڑ گردن تک الگ پڑا تھا سر لڑھک کر چند قدم دور چلا گیا تھا دور سے آنے والی لالٹین کی مدھم روشنی میں لہو کی سرخی اور رات کی سیاہی نمایاں طور پر الگ نظر آتی تھی۔ یہ لہو گردن کی شہ رگ سے بہہ کر زمین کو رنگین کر رہا تھا آدھی گردن دھڑ کے ساتھ تھی اور آدھی سر کے ساتھ۔ دونوں حصوں کو اتنی صفائی سے کاٹنے والا تو گلابو کے باپ نے تمام رکھا تھا حالانکہ وہ بھی مر چکا تھا۔ اس کی لاش کا سر تن سے جدا تو نہیں ہوا تھا مگر وہ بھی

ہو گیا تھا۔ اس دہشت ناک منظر نے مجھے وہ الیکٹرک شاک دیا جس سے میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔
"گلابو!" میں نے اسے ہاتھ تھام کے اٹھایا "تمہارے باپ نے تو کہا تھا کہ تو بہت بہادر لڑکی ہے بہادر باپ کی بہادر بیٹی ہے۔"
"نہیں نہیں" وہ چلائی "میں منحوس ہوں، قاتل ہوں اپنے باپ کی، چڑیل ہوں اور ڈائن ہوں سب کو کھا گئی میں" بالآخر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی اور ہسٹریائی دیوانگی نے اسے مغلوب کر لیا۔ میں نے اس کو شانوں سے پکڑ کے جھنجوڑا اور اس کے منہ پر مسلسل تھپڑ لگائے روتے روتے اس کی آواز یکلخت بند ہو گئی وہ گرنے لگی تو میں نے اسے سنبھال لیا اور اٹھا کے اندر لے گیا اندر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے میری نظر گلابو کی ماں پر گئی وہ اسی طرح اپنے بستر پر دراز تھی اور سکون سے سو رہی تھی۔
میں جانتا تھا کہ ایسے وقت میں اس کے سکون سے سونے کا صرف ایک ہی مطلب ہے جب اس کی کنواری جوان بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والے دروازے کو توڑ رہے ہوں، گلابو کا ضعیف مگر غیرت مند باپ مدد کے لیے بہرے بن جانے والوں کو پکار رہا ہو اور مایوس ہو کے اپنی جان کی بازی لگانے نکل گیا ہو، باہر ایک عورت کی عزت کے تحفظ اور محافظوں میں خونریز جنگ جاری ہو تو وہ سکون سے کیسے سو سکتی ہے۔ اس کے نحیف و نزار جسم پر پڑا ہوا لحاف بے ترتیب تھا اس کا سر بھی تکیے پر نہیں تھا جیسے کی کوئی بات نہیں تھی کہ موت کی نیند نے جس نے اسے یہ سکون بخشا تھا اور اب وہ اس جنگ میں فتح و شکست کے غم سے بے نیاز ہے۔ جو اس کے گھر کی آبرو کی سرحد پر جاری تھی۔
میں نے گلابو کو دوسرے کمرے میں لٹایا اور فوراً باہر نکل گیا۔
میرے قدم پہلے اس درخت کی سمت بڑھے جس کے نیچے میرا ریوالور اور میرا تمام سرمایہ دفن تھا پھر پلٹ کر میں اس شخص کی طرف چلا جو تین لاشوں کے درمیان بے ہوش پڑا تھا۔ اندھیری رات کے ... میں اپنا لباس اتارنے میں مجھے دو منٹ بھی نہیں لگے لیکن اس بے ہوش شخص کے کپڑے اتارنے میں مجھے محنت کرنا پڑی میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا اور مجھے بار بار چکر سے آ رہے تھے ... دھوتی اچھا باندھ کے میں نے ... کا کرتا پہنا جو مجھے کچھ تنگ رہا لیکن صرف شانوں اور بغلوں تک۔ تاریکی میں رنگ کی تمیز ممکن تھی ... کے کرتے کا رنگ کیا تھا اور کالا زرد یا سفید کچھ بھی ہو سکتا تھا اس کی پگڑی کھل گئی تھی ... میں نے ... سر پر لپیٹا اور اپنا ... میرے ذہن میں تھی اور بہت واضح ... مشکل کام بہت تھا اور میں لوٹ کر آیا تو نقد رقم کرنے کی جیب میں تھی ...

جب کو وہ محض اتفاقاً ... تھا جس پر اس نے بڑے پیار سے محفوظ کیے تھے باقی ... تھے حساب کی حیثیت ... زبان کے الفاظ۔ ریوالور کو میں نے جیب میں اڑس لیا تھا لیکن اس سے ... نہ لگا تو میں نے اسے ہاتھ میں رکھا اور ... کو یوں لپیٹا کہ ... کاندھوں کو ... ڈھیری گرہ لگا دی۔ عقب کی ... ہوش میں آنا نصیب ہوا ... ناکامی کی سزا ... آسانی ہوگی۔ وہ اس کی پشت پر ... ادھر ادھر بکھر گئے تھے ... ہوئی تھیں۔
... جس کا مطلب تھا کہ وہ ... ہوش کی ... موت ... کا سر ... گلابو کی تصدیق ضروری تھی ... مگر اس کی لاش بھی نظر آ گئی ... پریشان نہ ہوتا۔ اس کی عدم موجودگی سے مجھے یہ ... کر نکل گیا ہوگا۔ ایسی صورت میں خطرہ زیادہ تھا کہ ... غیر متوقع شکست کا بدلہ لینے کے لیے ... آئے گا اور ... بہت زیادہ قوت کے ساتھ آئے گا۔
"ہوش میں آؤ گلابو!" میں نے اس کے پاس بیٹھ کر کہا "میری بات دیکھو میں کون ہوں" اس نے آنکھیں کھولیں تو ... آہستہ آہستہ ... اٹھنے کی کوشش کرنے لگی ... اپنے مددگار ... کی جگہ اس نے میرے ... میں ایک دشمن کو دیکھا ... سب کچھ چھین چکا تھا اس کے ماں باپ کو قتل کر چکا تھا ... ختم نہیں ہوئی تھی ... گلابو کے گھر میں ... گلابو پر جھپٹا ... جسم کی بوٹیاں نوچنے ... عصمت کو تار تار کرنے کے لیے۔ گلابو کی ... دیوانگی کی ایک نئی تڑپ پیدا ہوئی اور ... میں نے ریوالور کو جیب میں ڈال لیا۔
"... خون پی جاؤں گی تیرا" ایک وحشیانہ ... کے ساتھ اس کے ہاتھوں نے میری گردن دبوچ لی ... کوشش کی لیکن میں نے اسے جھٹک دیا اور اس کے ... تھپڑ ... دیا۔
"دیکھو گلابو! میں وہی ... صاحب ہوں" میں نے ... کے ساتھ کہا "... کپڑے بدلے ہیں ... دیکھو" آہستہ آہستہ اس کی ... مدافعت میں کمی آنے لگی میں نے

اس کے ہاتھ چھوڑ دیے اور چارپائی پر بیٹھا رہا۔ گلابو خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ وہ آنکھیں اب ویران تھیں نہ کچھ کے احساس سے عاری۔ اپنی تباہی کے غم سے، دکھ سے اور سارے اندیشوں سے بے نیاز۔ احساس سے یہ محرومی مستقل دیوانگی میں بھی بدل سکتی تھی۔ جب آدمی زندہ رہے لیکن احساس مر جائے تو نہ غم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور دنیا اس کے ساتھ کیا کر رہی ہے۔ جذبات ہی نہ ہوں تو غیرت، عزت اور شرم و حیا کا خیال ... تب ... بھی گیا۔
"تمہیں معلوم ہے گلابو! تمہارے باپ کے آنے سے پہلے میں اکیلا ان غیرت فروشوں سے لڑ رہا تھا" میں نے کہا۔ گلابو نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ یادداشت سے محروم نہیں ہوئی ہے اور وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور عقل و ہوش ... "میں دیکھ رہی تھی" وہ آہستہ سے بولی۔
"ایک دشمن نے کوشش کی تھی کہ میرا سر پھاڑ دے" میں نے کہا "پھر میں بے ہوش ہو گیا تھا لیکن اس کے بعد تمہارا باپ ٹوکا لے کر آ گیا تھا؟"
گلابو نے پھر آہستہ سے تائید میں سر ہلا دیا۔
"اور اس نے ایک کا سر تن سے جدا کر دیا تھا" میں نے کہا۔
گلابو کچھ دیر سوچتی رہی "مجھے معلوم نہیں" وہ بولی۔
"لیکن تم تو دیکھ رہی تھیں تم نے ابھی مجھے بتایا ہے" میں نے کہا۔
"جب ... جب اس نے ٹوکا اٹھایا تو ... تو میں چھپ گئی تھی" گلابو کے آنسو پھر اس کی آنکھوں سے ابل پڑے "اماں کے بعد وہ مجھے بھی مار دینا چاہتا تھا"
"باہر نکلنے سے پہلے اس نے تمہاری ماں کا گلا گھونٹ دیا تھا؟" میں نے پوچھا۔
"میری اماں نے خود ... خود کہا تھا ... اسے مجبور کر دیا تھا" وہ بولی "پھر ... مر جانا ورنہ وہ سب سے پہلے میرا خاتمہ کر دے میں بے غیرت اور بزدل نہیں ہوں۔"
"پھر تم کو بھاگ کر جان بچانے کا خیال کیوں آیا؟" میں نے کہا۔
"میں اس طرح پہلے بھی مرنے کے لیے تیار نہیں تھی" وہ بولی "ورنہ میں ... کنویں میں کود جاتی لیکن میں مرتی تو اسے مار کے۔ مجھے مرنے سے پہلے ایک شیطان کو مارنا ہے تاکہ پھر کوئی گلابو پیدا ہو تو اس کی طرف بری نظر سے دیکھنے والا کوئی نہ ہو اور ہو تو وہ کسی گلابو پر بھی تہمت ہو کر اسے کتے کی موت مار سکے۔"
"تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکو گی گلابو" میں نے کہا "تم عورت ہو اور کمزور ہو میرے ساتھ چلو میں تمہیں حفاظت کے ساتھ پہنچا دوں

www.paksociety.com

گا جہاں بھی تم جانا چاہو۔"

"مجھے کہیں نہیں جانا ویر۔" وہ بولی۔ "اب تو مجھے نہیں رہنا ہے۔ اپنے ماں باپ کے قاتلوں سے بدلہ لینا ہے اور اسے مار کے بھی کسی جگہ زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ یہ خیال مجھے زندہ نہیں رہنے دے گا کہ میرے ماں باپ کو قتل کرنے والا اور گاؤں کی لڑکیوں کی عزت کا لٹیرا اسی طرح دندناتا پھر رہا ہے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "ایک کو اس کے ساتھیوں نے مار دیا تھا۔ ایک کو تمہارے باپ نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسرے نے کلہاڑی سے تمہارے باپ کا سر پھاڑ دیا۔ میرے ہوش اڑ گئے لیکن تیسرے کا کوئی پتا نہیں۔ شاید وہی تمہارے باپ کا قاتل تھا۔ جو قتل کے بعد بھاگ گیا۔ اب تک وہ بیٹے آغا کو ساری بات بتا چکا ہوگا اور وہ بدمعاش اکٹھے ہو کر ضرور آئیں گے۔"

"آنے دو ویر۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "تم ان کے آنے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہارا احسان ہے کہ تم نے اس گھر کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی لیکن تمہارا آنا ہی احسان کافی ہے۔ اب معاملہ میرے اور ان کے درمیان ہے۔ باہر میرے باپ کی اور اندر میری ماں کی لاش پڑی ہے۔"

"نہیں تم کو چھوڑ کے نہیں جا سکتا۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھی اور دیوار کے ایک طاقچے کی طرف بڑھی۔ اس نے جزدان میں لپٹا ہوا قرآن اٹھایا اور چارپائی پر رکھ دیا۔ میں اس کی حرکت کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا تھا اور یہی سمجھا تھا کہ وہ میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ "میں تمہیں مسلمان سمجھ کے اس قرآن کی قسم دیتی ہوں۔" اس نے اچانک کہا۔ "مجھ سے بحث مت کرنا کہ نکل چلو۔ تمہارے اور میرے درمیان یہ مقدس کتاب ایک دیوار ہے۔ اس کے احترام میں آ نہ رہو تو خاموشی سے جس طرح آئے تھے اسی طرح لوٹ جاؤ۔"

میری زبان گنگ ہو گئی اور میں پتھر کے بت کی طرح منجمد کھڑا رہا۔

"تمہارا احسان کا قرض مجھ پر رہے گا۔ میرے ماں باپ یہ سمجھیں گے کہ تم رحمت کے فرشتے بن کر نازل ہوئے تھے۔ مہربان خدا کی رحمت ہوتا ہے اور تم نے تو اپنا فرض ادا کر کے مجھے قیامت کے دن تک اپنا مقروض کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ نہ تم پر فرض ہے اور نہ مجھ میں قرض اٹھانے کا حوصلہ۔ جاؤ میرے ویر۔ تمہارا رب راکھا۔ میں نے عہد کیا ہے کہ اس شیطان کو مارنے سے پہلے نہیں مروں گی۔ اللہ میرے ساتھ ہے۔ تم میری کامیابی کی اور مغفرت کی دعا کرنا۔"

خاموشی کا ایک بہت بوجھل اعصاب شکن ...... اور

عذاب جاں ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے آہستہ آہستہ جیب سے ریوالور نکالا۔ "تم نے میرے پاؤں میں دوسری زنجیر ڈال دی ہے۔ ایک اتنی بڑی قسم دے کر اور دوسری مجھے اپنا بھائی کہہ کر۔" میں نے کہنا شروع کیا۔

"بھائی تو بے غیرت نہیں ہوتے ہیں۔" وہ ریوالور کو دیکھ کر خوفزدہ ہونے لگی۔

"نہیں، میں بے غیرت بھائی نہیں بنوں گا گلابو۔ کیونکہ تیرا انتقام لینا یقیناً میں بتا نہیں سکتا کیونکہ وقت کم ہے اور مجھے سب کام کرنے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایسے ہی کچھ لوگ ہیں جو میرے باپ کو قتل کر چکے ہیں اور اب میری جان لینے کے درپے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میں زندہ رہوں گا تو ان کو دنیا میں کہیں امان نہیں ملے گی جیسے آج میرے لیے کہیں امان نہیں۔" حالات کی وضاحت کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

"تم نے مختصر سی کہانی جان رکھا تھا۔" وہ بولی۔ "کون ہو تم؟"

"میں اس سوال کا کیا جواب دوں۔ سخت مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ بس اتنا سمجھ لو گلابو کہ میں اور تم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ ہم دونوں عزت سے زندہ رہنا چاہتے تھے۔ ہمارے دشمنوں کو یہ بھی منظور نہیں کیا کیونکہ وہ عزت کا مطلب ہی نہیں سمجھتے تھے۔ نہ اپنی عزت کا اور نہ دوسروں کی عزت کا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم میرے ساتھ چلو تو میں اپنے دشمنوں سے نمٹ لوں کیونکہ وہ بہت بڑا ہو وقت میرے تعاقب میں ہیں۔ وہ بھی بہت طاقت ور اور بے ضمیر ہیں۔ ان سے نمٹنے کے بعد میں تمہارے ساتھ آ ملوں گا۔"

"نہیں ویر، تم جاؤ۔" وہ بولی۔ "اللہ تمہارا نگہبان ہو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"تمہارے والدین کی لاشیں باہر پڑی ہیں گلابو۔ کیا وہ ایسے ہی پڑی رہیں گی؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ گاؤں کے لوگ انہیں دفن کر دیں گے۔" وہ بولی۔ "دو قاتل اور دو مقتول ایک ہی جگہ ساتھ ساتھ جائیں گے۔ ایک ہی قبرستان میں۔ مشہور ہو جائے گا کہ انہیں ڈاکو مار گئے۔ تفتیش بھلا کون کرتا ہے۔"

"تم مجھے پہلی بھی لگتی ہو اپنی باتوں سے۔" میں نے کہا۔

"بدقسمتی ہے ویر کہ میں نے آٹھویں جماعت تک یہاں کے اسکول میں پڑھا۔ دسویں جماعت پرائیویٹ۔" وہ بولی۔

میری قوت فیصلہ مفلوج ہو چکی تھی۔ میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا تھا کہ میں اس لڑکی کو حالات کے سپرد کر کے بھاگ جاؤں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں کتنی کمزور ہے

لیکن جہاں تک کا بھی میں اس کی مدد کرتا تو خود پھنس جاتا۔ یہ بھی مشکل نظر آتا تھا کہ میں اسے عقل سے کام لینے کو اور صبر کرنے کو کہوں۔ جو زندہ رہنا ہی نہ چاہتا ہو اور جس کے لیے زندگی کا مفہوم ہی کچھ نہ ہو اسے زندہ رہنے کی تلقین کرنا بے سود تھا۔ وہ طے کر چکی تھی کہ بدلہ لے کر انتقام پورا کرے گی اور اسے احساس ہی نہ تھا کہ مارنے کے بعد مر جانا آسان ہو تو وہ کیا کرے گی۔ اس کے لیے والدین کی بے گور و کفن لاشوں کو چھوڑ کر جانے کا تصور بھی محال تھا۔ میرے دماغ میں الجھن بڑھتی جا رہی تھی اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔

"یہ لو۔" میں نے ریوالور آگے بڑھا کے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے یہ کس کام آتا ہے؟"

"ہاں۔" اس نے ریوالور کو اپنے ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ "اسی کی ضرورت تھی مجھے۔"

"تمہیں چلانا آتا ہے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"نہیں۔ مگر جانے سے پہلے یہ بتا دو کہ کوئی میرے قریب آئے تو میں کیا کروں؟" وہ بولی۔

"جب یہ تمہارے ہاتھ میں ہو گا تو تمہارے قریب آنے کی جرات کوئی نہیں کرے گا۔" میں نے کہا۔ "اور اتنے کم وقت میں تمہارا نشانہ اچھا نہیں ہو سکتا۔ تم یہ کر سکتی ہو کہ انہیں نزدیک آنے دو۔ اگر وہ بالکل تمہارے سامنے ہوں تو تم ایک گولی سے ایک جان لے سکتی ہو۔ اس میں چھ گولیاں ہیں۔ یہاں سے پکڑو اسے... ایسے۔"

"مجھے تو اپنا بدلہ صرف ایک آدمی سے لینا ہے۔" وہ بولی۔ "جس کی وجہ سے میرے والدین صرف اس لیے مارے گئے کہ میں ان کی بیٹی تھی۔ ایسے ہی اس کے ماں باپ کو بھی مرنا ہو گا صرف اس لیے کہ وہ اس شیطان کو جنم دینے کے ذمے دار تھے۔" میں نے سیفٹی کیچ ہٹا کے گلابو کو سمجھایا کہ اب گولی چلانے کے لیے اس کا صرف ٹریگر دبانا ہو گا۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس مظلوم لڑکی کے لیے کیا کروں۔ اس کی مدد کرنا جائز ہو گا یا نہیں، قانونی ہو گا یا غیر قانونی۔ اس کی حوصلہ افزائی بہتر ہو گی یا حوصلہ شکنی۔ اگر اس نے کسی کو قتل کیا تو کیا میں بھی مجرم ہوں، اعانت کا مرتکب ٹھہروں گا؟ کس کی نظر میں؟ قانون کی نظر میں یا خود اپنی نظر میں؟

اچانک میں نے اس کی کوئی چیز... باہر سے بھاگتے ہوئے بے شمار حملہ کرنے والوں کی آواز سنائی دی تھی۔ بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپ الگ الگ تھی جو نزدیک ہو رہی تھی۔ غالباً شکست خوردہ سپاہ نے اس کا انتقام لینے کے لیے دوسرا لشکر بھیجا گیا تھا جو بہت بڑا اور زیادہ اسلحے سے لیس تھا۔ میں نے گلابو کو اپنے ساتھ کھینچا اور باہر بھاگا۔ گلابو نے تھوڑا سا احتجاج کیا اور کچھ مزاحمت بھی کی لیکن خود کو بے بس پا کر ہتھیار ڈال دیے۔ میں اسے کندھے پر ڈال کے

بھی باہر نکل سکتا تھا۔

باہر آتے ہی قریب آنے والوں کی آوازوں کا ملا جلا شور زیادہ واضح ہو گیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک درخت کے سوا مجھے کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی۔ "اوپر چڑھ سکتی ہو؟" میں نے کہا۔ "شاید یہ لوگ ادھر سے ہی گزریں گے۔ مگر ایک ایک کو دیکھ کے پہچان ہو گی۔ بس مجھے بتانا۔" وہ درخت پر چڑھنے کی مجھ سے بھی زیادہ مشاق تھی۔ میں اسے اوپر کھینچے جاتا۔ میری بات کا مطلب اس نے یہ لیا کہ شناخت اور نشاندہی کے بعد ہر مجرم کو میں خود شوٹ کر دوں گا۔ یہ چال موثر ثابت ہوئی ورنہ میرے لیے اس کا بوجھ اٹھا کے یہ کارنامہ سرانجام دینا ناممکن ہوتا۔ کسی جوان اور صحت مند مچلتی اور مزاحمت کرتی ہوئی لڑکی کو گھسیٹ کر بھاگا تو جا سکتا ہے۔ عموماً سفر نہیں کیا جا سکتا۔

وہ گاؤں کی آزاد فضاؤں کی پروردہ لڑکی تھی جس کا بچپن اسی طرح درختوں پر آتے جاتے گزرا ہو گا۔ کبھی گھونسلوں میں جھانکنے کے لیے تو کبھی کچے آم توڑنے کے لیے۔ وہ بڑی پھرتی سے اوپر چڑھ گئی اور اس نے مجھے مشکل میں دیکھا تو اپنا ہاتھ نیچے بڑھا کے مجھے کھینچنے کے لیے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ زمین کی سطح سے دس گیارہ فٹ کی بلندی پر میں نے اس کے ساتھ ایک شاخ پر بسیرا کیا جو تنے کا ایک مضبوط بازو تھی۔ باقی دو بازو مختلف سمتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ابھی میں نے ٹھیک سے سانس بھی نہیں لیا تھا کہ چند قدم کے فاصلے پر وہ لوگ نمودار ہوئے۔ وہ سب ایک کے پیچھے ایک دوڑ رہے تھے اور ان سب کے کندھوں پر لاٹھیاں اور کلہاڑیاں تھیں۔

"اتنی جلدی وہ بھاگ کر نہیں جانے گا۔" کسی نے کہا۔ "تم چاروں طرف پھیل جاؤ۔"

"وہ گھر میں ہی ہو گا۔" کسی اور نے تائید کی۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے رکے۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا۔

"ہاں گلابو بھی تو اکیلی ہی ہو گی نا گھر میں۔" کسی کے غلیظ ذہن کی بات زبان پر آ گئی۔

میں اور گلابو دم سادھے بیٹھے رہے۔ وہ کچا مکان مشکل سے پچاس فٹ کے فاصلے پر تھا جس کے مکین زندگی کی آخری جنگ میں شکست کو اپنا مقدر سمجھ کے قبول کر چکے تھے اور مقابلے سے دستبردار ہو چکے تھے۔ قاتلین نے مکان کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا اور میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد بارہ تھی۔ ان میں دو یقیناً درخت کے نیچے کھڑے بعض ہدایات دے رہے تھے۔ اس حملہ آور تمام فوج کی قیادت خود بخود اس شخص کے ہاتھ میں آ گئی تھی جو گلابو کے باپ کو قتل کر کے بچ نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ گولی چلنے کی آواز آئی تو میں اچھل پڑا۔ گلابو نے ایک دشمن کا کام تمام کر دیا تھا لیکن مرنے والا

www.paksociety.com

ان کے باپ کا قاتل نہیں تھا۔ اس کو دوسری گولی نے ختم کیا۔ دونوں گولیاں بندوق کی نالی سے ان کے سینوں میں پیوست ہوگئیں۔

پھر سوچنے کا وقت ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے گلابو کو سمیٹ کے چھلانگ ماری۔ وہ میرے اوپر گری خود میرے اٹھنے سے پہلے ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ اپنے گھر سے دور بستی کی جانب دوڑ رہی تھی۔ وہاں کچھ راستوں کے نشیب و فراز اور پیچ و خم سے آشنا تھی اور کوئی نازک اندام شہری لڑکی نہیں تھی۔ عام حالات میں اس کو پکڑنا دشوار نہ ہوتا لیکن میرے لیے بہت سی مشکلات تھیں۔ رات کا اندھیرا، ناہموار راستے، کنکر، پتھر اور ریشمی لاچا۔ جو کچھ منہ سے پہلے بھی نہیں باندھا تھا کہ مجھے کسی دیہاتی لڑکی سے نصف شب کو کھلے کھیتوں کے درمیان ریس لگانے کے لیے پیر کہیں۔ وہ شلوار میں تھی اور زیادہ آسانی کے ساتھ بھاگ سکتی تھی۔ میں بھی شلوار یا پتلون میں ہوتا تو شاید چند قدم کے بعد ختم ہو جاتی۔ تھری ناٹ تھری میں کس کر باندھے ہوئے لاچے نے مجھے ہی چھلانگ لگانے سے روک دیا تھا۔ میں اسے آواز بھی نہیں دے سکتا تھا۔ دو گولیوں کی آواز نے سب حملہ آوروں کو متوجہ کر لیا ہوگا۔ ان پر پہلا انکشاف یہ ہوا ہوگا کہ وہ گھر اب قبرستان ہے جسے وہ تہس نہس کرنے کے لیے زیادہ تیاری کے ساتھ آئے تھے۔

دوسرا انکشاف مایوس کن ہوگا کہ اصل دشمن تو بھاگ گیا جس نے ان کی کامیابی کو ناقابل تصور ناکامی میں بدل دیا تھا اور وہ جاتے جاتے گلابو کو بھی نکال لے گیا۔ لیکن گولیوں کی آواز سن کے وہ دوڑے ہوں گے تو تیسرا اور آخری لرزہ خیز انکشاف ان پر یہ ہوا ہوگا کہ جن کو وہ گھر کے اندر تلاش کر رہے تھے وہ گھر کے باہر موجود تھے۔ وہ پہلے ہی ٹھکرا چکے ہوں گے کہ کھیت سے نکلنے والا کوئی خطرناک مجرم تھا۔ شاید کسی جیل سے بھاگنے والا۔ درخت کے نیچے خاک و خون میں غلطاں لاشوں کو دیکھ کر شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی ہوگی۔ گاؤں میں ریوالور تھا، نہ شکاری بندوق۔ زمیندار یا نمبردار کے سوا کس کے پاس ہوتا ہے۔ گلابو کے لیے تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ دونوں قتل اس نے ریوالور سے دو گولیاں چلا کے کیے ہوں گے۔

اگر میں گلابو کو آواز دیتا تو وہ سن لیتے اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ ہم کس طرف فرار ہوئے ہیں۔ گلابو اچانک رک گئی۔ اس کے اور میرے درمیان اس وقت مشکل سے دس فٹ کا فاصلہ تھا۔

"رک جاؤ، آگے مت آنا ویرا!" اس نے دونوں ہاتھوں میں ریوالور مضبوطی سے پکڑ کے اس کا رخ میری طرف کر دیا۔ "جیسے میں نے تم کو قرآن کا واسطہ دیا تھا اب اس رشتے کا واسطہ دے رہی ہوں کہ لوٹ جاؤ۔ مجھے بھی مجبور نہ کرو کہ بھائی پر گولی چلاؤں۔"

بالکل غیر ارادی طور پر میں نے اپنے ہاتھ اٹھا دیے تھے اور اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔

"کیا تم پاگل ہوگئی ہو گلابو!" میں نے کہا۔ یہ سوال بھی غیر ارادی تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ پاگل ہو چکی ہے۔

"ہاں، تم چاہو تو مجھے پاگل سمجھ سکتے ہو۔" وہ بولی۔ "لیکن مجھے معلوم ہے میں کیا کر رہی ہوں۔"

"تم... نہیں، تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ وہ لوگ ہمارے پیچھے آ رہے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ہاں اسی لیے میں دیر نہیں کرنا چاہتی۔"

"تم نے بہت جلدی کی گلابو!" میں نے کہا۔ "مجھے احساس ہو رہا ہے کہ یہ قاتل کھلونا میں نے نادان ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تم اپنی عزت کی حفاظت آخری وقت تک کر سکو اور جب دیکھو کہ اب آبرو پر جان قربان کرنے کے سوا کوئی صورت نہیں رہی تو آخری گولی خود پر چلا کے انہیں آخری شکست دے دینا۔ جو اب تک صحیح منزل کے نزدیک ہیں بدستور ہیں۔ لیکن تم نے پہلی گولی کا ناجائز استعمال کیا۔ ایک تو تمہارے باپ کا قاتل تھا لیکن دوسرا اس سزا کا مستحق نہیں تھا۔ وہ مجرم تھا اور دشمنوں کے ساتھ تھا لیکن سزائے موت...؟"

"وہ بھی سانپ تھا۔ ایک بار مجھے ڈس چکا ہے۔" گلابو نے کہا۔ "وہ گاؤں کا سب سے بڑا آوارہ عاشق کہلاتا تھا۔ وہ تین لڑکیوں کے خون کا ذمے دار تھا۔ ایک نے خودکشی کر لی تھی۔ دوسری کا آج تک پتا نہیں چلا۔ ظالموں نے تو یہ مشہور کیا تھا کہ وہ آوارہ تھی گھر سے بھاگ گئی لیکن میری طرح اور بھی بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ وہ اسی شخص کے چکر میں ہوگی ہے۔" اس نے چاروں طرف پھیلے ہوئے کھیتوں اور ویران جنگل کی طرف ہاتھ اٹھا کے اشارہ کیا۔ میں موقعے کی تاک میں تھا۔ اس نے ریوالور کا رخ بدلا ہی تھا کہ میں نے جست لگا کے اسے دبوچنا چاہا لیکن وہ بہت ہوشیار، چالاک اور پھرتیلی ثابت ہوئی۔ اس نے مخالف سمت میں چھلانگ لگائی اور مجھے تحت برست [illegible] وہ چند قدم مجھ سے دور اسی طرح ریوالور کے [illegible] رکھے [illegible] جہاں پہلے تھی [illegible] اور گلابو کی جگہ میں احمقوں کی طرح کھڑا تھا۔

"تیسری لڑکی سے تم خود مل سکتے ہو۔" وہ بولی۔ "وہ تو جب سے [illegible] تھی۔" گلابو نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس گاؤں سے باہر [illegible] جو دور تک سب پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سفید جھنڈے [illegible] والا پیر علمدار شاہ کا [illegible] جو وہاں ایک جھنڈا ہے اس کے [illegible] مراد پوری ہوتی ہے۔ وہ دو سال سے [illegible] بے حرمت [illegible] کے تو جوان ہو گئے [illegible] وہ دیوانوں کے ساتھ [illegible] اور اس کے جسم پر [illegible] کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ [illegible] اور سخت سردی کے موسم میں بھی کسی نے اسے کپڑوں میں نہیں دیکھا۔

اگر تم زمین کھودتے اس پر چادر یا کمبل ڈالنے کی کوشش کرو گے تو وہ چلانے لگے گی اور تم سے کسی لڑکے پہ جائے گی۔ تیری ماں ہو یا بہن کسی کو کپڑوں کی ضرورت ہے۔ بہت جلد پتہ ہو گیا۔ تب اس کا بیٹا بھی [illegible] نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں وہ کیا ماننے لگی تھی اور اس [illegible] زندہ ہے [illegible] تو شرم آتی ہے۔ موت جو اس کی یہ حالت بنانے کی [illegible] سینہ تانے چہرہ [illegible] کر کھولا آپ کے پاس ہوتا تو وہ سالہ پہلے ہی وہ سارے عذاب سے چھٹکارا پا چکی ہوتی اور جو کام میں نے آج کیا وہ خود کر لیتی۔"

اپنی ذہنی کیفیت کے اعتبار سے گلابو بھی دیوانگی کی سرحد پر کھڑی تھی۔ میں نے اسے ریوالور دیا ہوتا تو شاید گاؤں والے مجھے کہہ [illegible] شاہ کے مزار پر فریاد کرنے والے پاگل دو ہو گئے ہیں۔ دونوں کا موسم گویا [illegible] وجود ایک ہے۔ ان پر بیتے ہوئے ظلموں کے پھول ایک ہیں۔ دونوں کا دکھ ایک ہے اور دیوانگی کا سبب ایک ہے اور دونوں کے لباس وجود آدمیت کا وہ اشتہار ہے جسے پڑھ کے آدمی کو اپنے آدمی ہونے پر شرم آتی ہے۔ لیکن ریوالور ہاتھ میں آجانے سے اس کا ذہن جھٹکے سے [illegible] گیا تھا اور وہ جنون انتقامیت کا انتہائی جست [illegible] گئی تھی۔ لیکن اس کی سوچ کے کچھ دروازے بند ہو گئے تھے۔ اب اسے دکھ نہیں تھا کہ جیاں کو اس کے باپ نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ اسے فکر نہیں تھی کہ اس کی ماں کا جنازہ کون نکالے گا۔ باپ کو لوگ کیا کہیں گے اور وہ مرنے کے بعد بھی رسوا ہوں گے یا نہیں۔ اسے اپنے انجام کی بھی پروا نہیں تھی۔ صرف ایک خیال نے ذہنی و جسمانی طور پر اسے مغلوب کر لیا تھا۔ اس حادثے کے وہ دکھ کے احساس سے بھی نجات پا گئی تھی اور بالکل خوش بھی تھی۔ پہلے اس کی خواہش تھی لیکن اب اس کے ہاتھ میں ریوالور آ گیا تھا تو اسے پانچ گولیوں سے ان درندوں کا خاتمہ آسان نظر آنے لگا تھا جن کی سفاکی اور بربریت نے کئی گھر اجاڑے تھے۔ معصوموں کے چراغ گل کیے تھے اور زندگیوں کے نذرانے لیے تھے۔ وہ سب کا خون بہانے نکلی تھی اور قلم سے ان پانچ مجرموں کے وجود کو ختم کر سکتی تھی۔ چھٹی گولی اس نے اپنے مشن کی تکمیل کے بعد باعزت طور پر فتح مندی کے غرور کے ساتھ اور کامیابی کی سرخروئی کے ساتھ دنیا سے چلے جانے کے لیے رکھی تھی۔

دو مجرم اور گناہ گار اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے۔ باقی تین کون تھے، یہ وہ خود بتا چکی تھی۔ ایک وہ سانپ تھا جو گلابو کے والدین کو مار دینے کے بعد بھی اس کے سامنے پھن پھیلائے موجود تھا۔ دوسرے وہ مرد اور عورت تھے جنہوں نے اس سنپولیے کو دودھ پلا کے پالا تھا۔ اپنی تربیت سے اس کی سرشت میں بدی شامل کی۔ ڈسنا سکھایا اور اس کے خون میں زہر بھرا [illegible]

www.paksociety.com

کی سزا والدین کو نہیں ملنی چاہیے لیکن یہ فیصلہ میری عقل کا تھا گلابو کی عقل کا فیصلہ اس کے برعکس تھا مگر میری وجہ سے میرے والدین کو قتل کیا جا سکتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے والدین کو قتل کرنا بھی بالکل جائز ہے مضحکہ خیز ہے اور منطقی بھی ہے۔ میں اب پچھتا رہا تھا کہ میں نے جذباتی ہو کر اس کے ہاتھ میں ریوالور کیوں دیا۔ اب نہ میں اس کا فیصلہ بدل سکتا تھا اور نہ اس سے ریوالور چھین سکتا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ میں نے کوشش کی تو وہ گولی چلانے سے دریغ نہیں کرے گی۔ وہ اپنے مقصد کی راہ میں حائل ہونے والے ہر شخص کو جلا کر خاک کر دے گی اور اسے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ میں نے آخری بار اس لڑکی کو دیکھا جو نفرت اور سرکشی، انتقام اور دیوانگی کی انتہا کو پہنچ کر اور مصیبت جھیلنے کی قوت برداشت ختم ہو جانے کے بعد ایک تباہ کن قوت بن گئی تھی۔ ایٹم بم کی طرح جس میں فیوز لگا دیا گیا ہو اور جسے اب کوئی پھٹنے سے نہیں روک سکتا ہو۔

"اچھا گلابو! تم جاؤ۔" بالآخر میں نے کہا۔ "کیونکہ تمہیں میری مدد کی ضرورت نہیں رہی۔ میری دعا ہے کہ اچھا ہو یا برا لیکن وہی ہو جو تم چاہتی ہو۔" وہ سپاٹ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی اور میں پلٹ گیا۔ آہستہ آہستہ میں اپنے اندازے کے مطابق سڑک کی طرف چلنے لگا۔ تقریباً بیس قدم جانے کے بعد میں نے گھوم کر دیکھا تو وہ ابھی وہیں ریوالور لیے کھڑی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں اسے تعاقب کروں اور چھپ کر اسے روکنے کی کوشش کروں۔ اتنی دور سے اس کا نشانہ خطا ہو جانے کے امکانات بہت زیادہ تھے لیکن پھر میں نے سوچا کہ مجھے چلتے رہنا چاہیے۔ اس کی ایک گولی ضائع کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ وہ زندہ رہے گی تو روح اور جسم کی ذلیل اور ناقابل برداشت اذیت اٹھانے کے بعد پیر علمدار شاہ کے مزار پر اس حالت میں پہنچے گی جس حالت میں آج اس کی سہیلی ہے۔

میں نے پلٹ کر آخری بار اسے دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ "خدا حافظ میری بہن! چند گھنٹوں کا یہ مقدس رشتہ ختم ہوا۔ اب ہم میدان حشر میں پھر ملیں گے۔ اس سے پہلے میں کبھی ادھر نہیں آؤں گا۔ کبھی تیری بے نشان قبر تلاش کرنے، نہ پیر علمدار شاہ کے مزار پر تیری ناکامی کی سزا کا تماشا دیکھنے۔" اوپر آسمان پر صبح کا ستارہ چمکنے لگا تھا لیکن آج اس کی چمک ماند تھی۔ اس کی ہر کرن لہو سی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ وہ بھی جاگ رہی ہوگی اور شاید اس کی نظر میں بھی ستارہ ہوگا۔ وہ امید کی کوئی کرن تلاش کر رہی ہوگی۔ میرے پیچھے چند لاشیں پڑی تھیں۔ ان کی بے نور آنکھیں اس ستارے کی روشن کرن میں کھلی نظر آتی ہوں گی۔ ایسی لاش ایک عورت کی تھی میرے اپنے سے پہلے سے یقین ہوگا کہ ابھی وہ چند دن اور جیے گی۔ ایک لاش کا سر تن سے جدا پڑا تھا۔ دوسری لاش کو کلہاڑی کی ایک ضرب نے دو نیم کر دیا تھا۔ صبح ابھی بہت دور تھی۔ اس سے پہلے فرشتہ اجل کو یکے بعد دیگرے چار افراد کی کتاب زندگی کے آخری صفحے پر لکھنا ہے THE END ۔ اس کو بالکل غرض نہیں کہ انجام اچھا تھا یا برا۔ فلم اچھی تھی یا بری، ختم ہوئی اور اب جس کا جو دل چاہے کہے۔ میں نے اچانک خود کو ایک شکستہ چار دیواری کے مقابل پایا۔ یہ شہر خموشاں کی فصیل تھی۔ تین ساڑھے تین فٹ اونچی پختہ اینٹوں اور گارے کی دیوار پرانی ہونے کی وجہ سے ٹوٹ رہی تھی اور اس میں جگہ جگہ شگاف پڑ گئے تھے۔ میں نے دور تک پھیلی ہوئی قبروں پر نگاہ ڈالی۔ ان میں کچی اور پکی قبروں کے علاوہ جو بات غیر معمولی تھی وہ جگہ جگہ نظر آنے والے اونچے اونچے مقبروں اور چار دیواری والے احاطوں کی موجودگی تھی۔ اس وقت میں دیکھ سکتا تھا کہ کئی جگہ گنبد بھی ہیں جن پر مختلف وضع اور سائز کے جھنڈے لگا دیے گئے ہیں۔ جھنڈے مجھے درختوں میں بھی نظر آ رہے تھے جو قبرستان میں بہت کم تھے۔ کچھ لوگوں نے ہر مزار بنا دیا تھا کچھ خود ساختہ پیر تھے۔ آدمی کی ضعیف الاعتقادی کے نشان۔ خدا کے علاوہ ہر کسی سے مدد پانے کی آرزو کے مظہر اور کوشش کے بغیر منت مان کے خواہشات کی تکمیل چاہنے والوں کی بے چارگی کا ثبوت۔ اللہ نے تو کہا ہے کہ جس نے کوشش کی تو بلا شک اسے ملا۔

سفید جالی دار گنبد میرے ذہن میں تھا میرے قدم ہموار ہو جانے والی قبروں کو بچاتے آگے بڑھنے لگے۔ گنبد بہت نمایاں تھا لیکن ایک درخت کی پھیلی ہوئی شاخوں کے باعث میری نگاہ سے اوجھل تھا۔ صبح کاذب کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ میں مزار کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ایک موڑ کاٹتے ہی میں نے اسے دیکھ لیا جس کی خاطر گلابو نے پہلی گولی چلائی تھی۔ انسانیت کا وہ روپ جو انسان کی دنیا سے بدتر حالت میں فرش خاک پر پڑا تھا۔ میں نے اسے صرف ایک بار دیکھا۔ شرم، کراہت اور نفرت کے جذبات نے مجھے منہ پھیر کر گزر جانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے پہلے کبھی اپنے انسان ہونے پر ندامت محسوس نہیں کی تھی لیکن اس وقت ایک لمحے کے لیے مجھے شرم آئی کہ اشرف المخلوقات کیا اسی عورت کا نام ہے جسے میں نے دیکھا تھا اور میرے جیسے انسانوں نے ننگ انسانیت بنا دیا تھا۔

میں قبرستان کی دیوار پر بیٹھ گیا۔ صبح ہونے میں ابھی دیر تھی اور میں بہت تھک گیا تھا۔ لاہور سے روانہ ہوتے وقت میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میرا سفر اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے ختم ہوگا اور یوں ہوگا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی مجھے شناخت کرے اور پولیس کے حوالے کر دے یا خود پولیس مجھے گرفتار کر لے لیکن رات گزارنے کے لیے ایک فقیر بن جانا مجھے بہت مہنگا پڑا تھا۔ سب کچھ منجانب اللہ تھا۔ میں نہ آتا تب بھی وہ ضرور ہوتا جو نوشتہ تقدیر تھا۔ آج کی رات کا سورج طلوع ہونے سے پہلے گلابو کو اس کے ماں باپ کو اللہ جانے کس کس کی موت کی مہر ہو جانے والے ہاتھوں میں شامل ہونا تھا لیکن کتنا اچھا ہوتا اگر میں یہ کاروبار کرتا اور یہ سب نہ دیکھتا۔ خدا کی ہر صفت یکسر نہیں لیکن زندگی بھر ایسے ہی واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ جو بیوی کو رنڈیوں کے افسانے کی طرح پڑھتے ہیں۔ دیکھے اب آئندہ جب بھی یہ سب گزرے گا تو مجھے اس شب کے واقعات کی یاد کا عذاب تنہا برداشت کرنا ہوگا اور ان مناظر کو فراموش کرنا میرے لیے ممکن نہ ہوگا جو میرے تصور میں تصویروں کے مانند زندہ رہیں گے۔

گولی چلنے کی ایک آواز نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ دوسری اور تیسری آواز رات کے سینے میں خنجر کی طرح پیوست ہو گئی۔ میں سانس روکے گوش بر آواز نہ جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ افق پر صبح صادق کی روشنی پھوٹی۔ آسمان کا آخری کنارہ دمکنے لگا اور سورج کا نور آلود طلوع ہوا۔ نادیدہ منظر کا تصور کرنے کی ساری کوشش بے مصرف ثابت ہوئی۔ پہلی گولی کی صدا کا کوئی منظر سامنے نہ آیا کیسے اس لڑکی نے دشمن کے قلعے میں داخل ہو کے کہا ہوگا کہ سنو! میں یتیم اور لاوارث گلابو ہوں۔ میں اتنی خوبصورت تھی کہ تمہارے جیسے ہوس پرست بیٹے نے میرے جسم کی خاطر دو جسموں کی دیوار گرا دی۔ وہ دونوں جسم میرے والدین کے تھے جنہوں نے مجھے بڑے ارمانوں سے اور بڑی محبت سے پالا اور بڑا کیا تھا اس لیے نہیں کہ وہ تمہارے بیٹے کی ہوس پر قربان ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ میرا گھر بسے اور میں اس گھر میں سکھی رہوں۔ آباد ہو جاؤں۔ ان کو نواسے اور نواسیاں ملیں لیکن ان کے مقدر کی خوشی اور ان کے خواب تمہارے بیٹے نے قتل کر دیے۔ تم نے ایسے شیطان کو جنم دینے کا گناہ کیا تھا اس لیے میں تمہیں سزائے موت دیتی ہوں۔ کل دیکھنے والے دیکھیں گے کہ میرے والدین اور تمہارے فرعون صفت شیطان بیٹے کے ماں باپ ایک ہی زمین میں دفن ہوئے اور ان کے جنازے ایک ساتھ اٹھے اور وہ کتنے حیران ہوں گے کہ قوم نے گلابو جیسی لڑکی بن کے کیا بات۔

پھر تیسری گولی تھی جو ایک تصویر پیش کرتی تھی تمام تر قاتل کا قاتل اپنی طاقت اور برتری کے غرور میں سرشار خود کو سب کا ان داتا، سب کی جان و آبرو کا مالک اور ایک ناقابل تسخیر قوت سمجھنے والا ابھی اپنے سوتے میں غرق۔ محض ایک بے جان لاشہ، ایک عام فرد کی طرح ہو جانے والا جسم بنا پڑا تھا۔ اس کا نامۂ اعمال یوم حشر تک کے لیے لپیٹ دیا گیا تھا کہ دنیاوی سزا ختم ہوئی لیکن آخرت کا عذاب باقی ہے۔ اسے لگا ہوگا کہ وہ ایک بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کے وہ نمک خوار تو ایک تنگ کی دیوانگی کے سبب مارے گئے لیکن وہ عظیم سپاہ کہاں گئی جو چل ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے ارمان کی گئی تھی؟ بچوں گلابو کا یا گھاس کا تصور تو کیا جا سکتا تھا مگر گلابو کو یہ ریوالور کس نے تھما دیا؟ اس فقیر نے یا مگر فقیر بھی ریوالور تو نہیں لیے پھرتے۔ وہ ڈاکو ہوتے ہیں اور ڈاکو بھیس بدل کے کہیں پناہ لینے نہیں آتے اور کوئی ڈاکو ڈاکے کے بغیر لوٹ کر نہیں جاتے۔ اپنا ریوالور کسی گلابو کے سپرد نہیں کرتے۔ شاید اس نے زندگی کی بھیک مانگی ہوگی۔ موت کو اپنے قریب دیکھ کر سامنے گڑگڑایا ہوگا۔ آئندہ کے لیے برائی سے تائب ہونے کا وعدہ کیا ہوگا۔ اپنے ہاتھ جوڑے ہوں گے۔ تمہارے رسول کا واسطہ دیا ہوگا اور جب گلابو کے ٹرائیگر دبانے پر گولی اس کے دل میں اتر گئی ہوگی یا اس کے سر کو پاش پاش کر گئی ہوگی تب بھی اس کی حیرت کم نہیں ہوئی ہوگی۔ ریوالور دینے والے نے گلابو کو ریوالور چلانا بھی سکھا دیا اور یہ حقیقت ہے کہ وہ جو گولی داغے گی سب سکتا ہے حیران یا پشیمان ہونے کی مہلت ہی نہ ملی ہو۔

لیکن ریوالور میں ابھی ایک گولی باقی تھی۔ وہ آخری گولی جو گلابو کی باعزت موت کی ضمانت تھی وہ ابھی تک ریوالور سے کیوں نہیں نکلی۔ گلابو بے غیرت نہیں تھی۔ بے غیرت ہوتی تو خود کو بیچ دیتی۔ وہ زندہ رہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ گلابو بہت پہلے مر چکی تھی۔ وہ لڑکی جو ریوالور لے کر تین افراد کو قتل کرنے گئی تھی گلابو کے پیکر میں موت تھی۔ وہ بزدل بھی نہیں تھی کہ آخری گولی خود پر چلاتے وقت اس کا حوصلہ جواب دے گیا ہو لیکن رات کا ماتمی سناٹا برقرار تھا۔ جو چوتھی گولی کا منتظر تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وقت ٹھہر گیا ہے۔ سورج رک گیا ہے۔ آشیانوں سے صبح دم پرواز کر جانے والے پرندے بھی آنکھیں کھولے اس صدا کے انتظار میں دبکے پڑے ہیں۔

پھر وہ چوتھی گولی چلنے کی آواز نسیم سحر کے ساتھ تیرتی ہوئی مسکراتی ہوئی آئی۔ تم جاؤ۔ اب تم سب آ کے دیکھ لو کہ میں وہی گلابو ہوں۔ اتنی ہی خوبصورت اور دلکش جتنی زندگی میں تھی لیکن یاد رکھو صرف مجھے یاد رکھنا جیسی میں تھی یا ہوں۔ اب سے چند دن یا چند ماہ یا چند سال بعد میرا وجود زمین کے نیچے چھپا بھی نہ جائے گا کون ملنے گا کہ اس بگولوں کے پیچھے کے سینے پر کتنا خون بہا تھا۔ میں یکایک ہوش میں آ گیا۔ دل کو ایک قرار سا آ گیا تھا کہ میاں مسافر ایک شب کا قیام تھا سو وہ شب بیت گئی۔ اب اپنی زندگی ہے اور اسی زندگی کے مرحلے ہیں۔ یہاں تو نہ اب کوئی ظالم ہے نہ مظلوم۔ نہ کوئی تماشا ہے

www.paksociety.com

کون کس کا قاتل ہے اور کس نے کس کو کیوں قتل کیا۔ اس بحث میں پڑے کیا جائے گا۔ اس رات کو اپنی زندگی سے خارج کر دو۔

میں سڑک کی طرف روانہ ہوا تو میرے ذہن کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ میں بیک وقت دکھ کے گاؤں اور بیٹ کالونی کی زندگی کے لیے اور آدمی کے آغاز و انجام کی جدوجہد کے لیے عبرت آموز انجام پر دل گرفتہ تھا اور بے حد فکر مند ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں پھر اپنے مسائل کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور تھا۔ میری اپنی زندگی خطرات سے خالی نہیں ابھی ہوئی تھی لیکن میں گھبرا نہیں تھا کہ اپنے سارے مسائل کو ایک گولی سے حل کرتا۔ مجھے دم آخر تک جدوجہد کو جاری رکھنا تھا اور زندہ رہنا تھا۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ مجھے سکون اور عقل سے کام لینا تھا اور خیالات کے انتشار سے بچنا تھا۔

سیدھے قدم ایک سکا کی تلاش میں افسردہ تھے اور میں کچے راستوں پر ہرے بھرے کھیتوں کی منڈیر پر تو اترا رکھا۔ گرد و نواح سے اور راہ کی دکانوں سے بچتا سڑک کی جانب بڑھ رہا تھا تو تقریباً دو فرلانگ دور تھی مجھے دل سے لگا جانے میں اطمینان ہو رہا تو دل تو تلک نظر آ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ میری کار کے کر شاید جنت والا ڈرائیور سے لگا بھی یا نہیں۔ وہ بہت پریشان ہوا تو ہم کا ابھا پہنچے ہی چل پڑے گا۔ ایسی صورت میں لگتی ہے وہ لاہور کی جانب چل پڑا ہو۔ اگر وہ تنگ آکر رو دے سو یا تو دیر لگے گا اس صورت میں مجھے کافی دیر سڑک کے کنارے رک کر سواری کا کو دیکھنا پڑے گا اور تک ایک مصروف شاہراہ پر آنے جانے والوں کی نظروں کے سامنے رہنا بھی پر خطر تھا۔ کوئی بھی شخص جس کی نظر تیز ہو مجھے بدلے ہوئے حلیے میں بھی پہچان لے گا۔

اچانک میرے قدم رک گئے۔ میں نے نظر اٹھا کے دیکھا تو مجھے اپنے چاروں طرف اجنبی چہرے نظر آئے۔ ان کی دشمن آنکھیں بھیڑیوں کی نہیں کم سے کم چار افراد دھوپ میں کھڑی دھاردار کلہاڑیاں لیے میرے چاروں طرف موجود تھے۔ درختوں کے پیچھے یا کھیتوں میں کتنے آدمی اور تھے اس کا اندازہ کرنا ناممکن تھا۔ میں نے اندازہ کیا کہ صرف چار افراد سامنے آئے ہیں تاکہ میں ان سے نبرد آزما ہو جاؤں تو پیچھے ہوئے مددگاروں میں سے کوئی مجھ پر پیچھے سے بے خبری میں حملہ کر دے۔

"کون ہے تو؟" ان میں سے ایک نے اکھڑ اور درشت لہجے میں کہا۔

میں نے فوراً ایک درخت کے تنے سے پشت لگا کر کہا۔ "تم کو کیا میں آدمی نظر نہیں آتا؟" میں نے کہا۔

"لیکن تو اس گاؤں کا نہیں ہے۔" دوسرے نے غرا کر کہا۔

"ہاں میں اس گاؤں کا نہیں ہوں۔" میں نے اس کو گھور کے دیکھا۔ "مسافر ہوں۔"

"مسافر اس راستے سے نہیں گزرتے۔" تیسرے نے کہا۔ "تو تین میل پیچھے ہے۔ تو کیا ندی سے گزر کے آیا ہے۔ تیرے تو پاؤں بھی خشک ہیں۔"

"اس سے پوچھو کس گاؤں سے تعلق ہے اس کا؟" چوتھے نے کہا۔ "اور اسے جانا کدھر ہے؟"

اگر یہ سوال کیا جاتا تو میں لاجواب ہو جاتا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں لاہور کے نواح سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ میں نے سوال کے جواب میں سوال کر کے جان بچائی۔ "پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں آ کر یہ سب پوچھنے کا کیا مقصد ہے؟" میں نے کہا۔ "تم لوگوں نے میرا راستہ کیوں روکا ہے؟ کیا ادھر سے گزرنا منع ہے۔ کچھ چرا کے لے جا رہا ہوں کیں؟"

"ہاں" پہلے نے بدمعاشوں جیسے خطرناک لہجے میں کہا۔ "کپڑے کس کے ہیں؟"

"میرے تن پر تم یہ کسی کے کپڑے نہیں ہیں" میں نے کہا۔ "جیسے تم سب نے اپنے کپڑے پہن رکھے ہیں۔"

"جھوٹ بکتا ہے تو۔ میرے بھائی کے کپڑے ہیں یہ۔" ایک کر بولا۔ "یہ لا چا میں نے گرتا بھی اور تیری یہ پگڑی بھی۔ مرحوم بھائی کی ہے۔"

صورت حال یکلخت خطرناک ہو گئی تھی۔ کیا ان پر تمہارے بھائی کا نام لکھا ہوا ہے؟" میں نے بھی سخت لہجہ اختیار کیا۔ "تم نے پڑھوایا تھا اس نے یہ کپڑا؟ ایسا کپڑا بازار میں نہیں ملتا؟ کوئی نہیں خرید سکتا؟"

دوسرے نے ایک دم کلہاڑی اٹھالی۔ "یہ سید کی طرح تو بہ ہم کا ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟ تم ان کپڑوں کی خاطر مجھے قتل کر دو گے؟" میں نے بے خوف ہونے کی کوشش کی۔

"ہاں ہاں میں قتل کر دوں گا تجھے۔" پہلا شخص چلایا۔ "اوئے کسی نے اسی کپڑوں کے لیے میرے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔"

اس اطلاع سے مجھے افسوس ہوا کہ جو شخص بے ہوتا وہ بھی مر چکا ہے۔ میں نے ٹھوس سے اتنا ہی پوچھا۔

"ایسے دو کپڑوں کی خاطر؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "یہاں ایسا بھی ہوتا ہے؟ تم لوگ کر سکتے ہو ایسا؟"

"ہم نہیں کر سکتے مگر تو نے سو ہنگ جھلے کے لیے کیا بولا۔ جب تو کل رات آیا تھا۔ تو ملنگ کے حلیے میں تھا۔ تیرے گلے میں موٹے رنگین منکوں کی مالا تھی اور تو نے کلہاڑی چھپا رکھی تھا۔ وہ تو نے لاش کے اوپر ڈال دیا تو اس نے ہم کلہاڑی آشنائی۔ ہم تجھے تلاش کر رہے تھے۔"

"ٹھہرو۔" پہلے میری بات سن لو۔" میں نے کہا۔ "پھر تم چاہو تو مجھے مار دینا۔ تمہارے پاس کلہاڑیاں ہیں اور میں خالی ہاتھ ہوں۔ میں تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اس گاؤں کا رہنے والا نہیں ہوں اور آس پاس کے کسی گاؤں کا۔ میں لاہور میں رہتا ہوں اور پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ تم کس ملنگ کی بات کر رہے ہو۔ میری گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ گاڑی کا مطلب بیل گاڑی نہیں، کار ہے۔ میرا ڈرائیور کار کو مرمت کے لیے لے گیا ہے اور واپس آتا ہی ہوگا۔ تم میرے ساتھ سڑک تک چلو اور اس کی واپسی تک ٹھہرو تو تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں یا سچ۔ صرف وقت گزارنے کے لیے ذرا کھیتوں میں سیر کرنے آ گیا تھا۔"

"پھر تو نے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ تو مسافر ہے؟" جو بڑا تھا وہ بڑے ہو سے لہجے میں بولا۔ میری بات نے انھیں نفسیاتی طور پر متاثر کیا تھا۔ ان کے خطرناک جارحانہ تیور تو بدل گئے تھے لیکن ابھی تک انھوں نے میری بات کا پوری طرح یقین نہیں کیا تھا۔ باقی تینوں بھی مجھے غور سے دیکھ کر فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کیا شہر والے ایسے ہوتے ہیں؟

"جھوٹ کیا تھا اس میں؟" میں نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا۔ "میں لاہور سے ملتان جا رہا تھا۔ مسافر نہیں ہوں تو اور کیا ہوں۔ تمہیں تو ثبوت بھی دے رہا ہوں۔"

"کتنا پڑھا ہوا ہے تو؟" دوسرے نے کچھ سوچ کے کہا۔ "تیرا حلیہ تو بڑے سے مجھے بابو وں جیسا نہیں ہے۔"

"کیسی عجیب باتیں کرتے ہو تم لوگ۔" میں نے برہمی سے کہا۔ مجھے لگا کہ ان لوگوں کی قوت فیصلہ کو میرے اعتماد نے متزلزل کر دیا تھا۔ "اگر تم لوگ بھی شہری بابو کی طرح کوٹ پتلون پہن لو گے تو کیا پڑھے لکھے ہو جاؤ گے۔ تم میں سے کون زیادہ پڑھا ہوا ہے جو مجھ سے انگریزی میں بات کر سکے؟"

جواب کے لیے انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر مقتول کے بڑے بھائی نے کہا۔ "ہم تو نہیں لیکن گاؤں میں پڑھے لکھے بہت ہیں۔ اسکول ماسٹر ہے۔ ڈاک بابو ہے۔"

"تو پھر لاہور جا رہا تھا تو کسی واقف کار کے پاس جا رہا ہوگا۔ وہ کون ہے؟" دوسرے نے کہا۔ "ہم نے تو تیرا نام بھی نہیں پوچھا۔ تو ہمارے ساتھ چل۔ تھانے والے خود جھوٹ سچ کا پتا چلا لیں گے۔"

"تھانے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "کیا جرم کیا ہے میں نے کہ تم زبردستی مجھے تھانے لے جانا چاہتے ہو؟ وہ جو میرا ڈرائیور ہے۔۔"

"بھاڑ میں گیا تیرا ڈرائیور۔" مسرار ہا تو کر بولا۔ "تیری کار کے رعب میں آ کے ہم تجھے چھوڑ دیں گے نہیں۔ یہ قتل کا معاملہ ہے اور گاؤں میں رات کو کم سے کم تو قتل ہوئے ہیں۔"

"دو قتل؟" میں اچھل پڑا۔ "تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو۔ ایک آدمی اتنے قتل کیسے کر سکتا ہے؟"

"یہ تو ہم نہیں جانتے کہ سب قتل ایک ہی آدمی نے کیے ہیں یا نہیں۔ لیکن تجھے تھانے چل کے سب معلوم ہو جائے گا۔"

"کیا تم اسی طرح ہر اجنبی کو پکڑ پکڑ کے تھانے لے جاتے رہو گے؟" میں نے احتجاج کیا۔

"ہر شخص نے میرے بھائی کے کپڑے نہیں پہن رکھے ہیں۔" پہلا ایک دم کلہاڑی اٹھا کے حملہ آور ہوا۔ میں فوراً درخت کے پیچھے ہو گیا۔ سیکنڈ کے سوویں حصے کے فرق سے کلہاڑی کا تیز پھل درخت کے تنے میں اتر گیا۔

"اچھا اچھا۔" میں نے کہا۔ "تم لوگ کہتے ہو تو میں چلتا ہوں مگر تمہارا بھائی قتل ہو گیا ہے تو مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم کسی بھی بے گناہ کا خون کر دو۔" میرا مقصد انھیں فوری طور پر اشتعالی اقدام سے باز رکھنا تھا۔ وہ چاروں بیک وقت حملہ کرتے تو کسی ایک کی کلہاڑی یقیناً میرے دو حصے کر دیتی۔ لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ تھانے جاتے ہوئے مجھے کوئی موقع مل جائے۔ وہ ذرا بھی غافل ہوں تو میں ان کو لمبا لٹا کے نکل جاؤں۔ میرے تھانے پہنچ کر لوٹنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا راستے میں ہی کرنا تھا۔ اپنے اطمینان سے میں ان کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں خوفزدہ بالکل نہیں ہوں اور مقابلہ کرنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

معلوم نہیں اس وقت کس نے کیا اشارہ کیا کہ چار آدمی میرے پیچھے سے نمودار ہوئے اور انھوں نے مجھے دونوں طرف سے پکڑ لیا۔ ان کی گرفت بہت سخت تھی اور وہ سب صحت مند جوان آدمی تھے لیکن میں چاہتا تو ایک جھٹکے میں ان کو الٹ دیتا۔ اصل خطرہ چار مسلح افراد سے تھا جو اپنی کلہاڑیاں لیے بالکل تیار کھڑے تھے۔ میرا چیخنا چلانا اور میری یقین دہانی سب رائیگاں گئی۔ وہ جلوس کی صورت میں مجھے لے کر روانہ ہوئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ گرفتار کرنے والوں میں سے دو مقتول کے بھائی ہیں اور مقتولوں میں ایک بھائی کے ساتھ باقی اس کے کزن ہیں۔ چاچے اور ماموں کے لڑکے۔ کلہاڑی والوں میں سے تین پیچھے

www.paksociety.com

رہے اور ایک آگے چلتا رہا۔

اگر وہ مجھے گاؤں لے جاتے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ مجھے گلابو کی لاش بھی دیکھنی پڑتی اور شاید ان کی لاشیں بھی جن کو گلابو نے میرے دیے ہوئے ریوالور سے قتل کر دیا تھا۔ یہ نظارہ میرے لیے انتہائی باعث اذیت ہوتا لیکن اس میں خطرے کی کوئی بات نہ ہوتی۔ وہ سب مر چکے تھے جنھوں نے مجھے دیکھا تھا۔ میرا چہرہ پہچاننے والا کوئی نہ ہوتا لیکن تھانے کی صورت حال بالکل مختلف تھی۔ اگر میرا حلیہ اور تصویر انھیں بھی ارسال کی گئی ہوتی تو وہ مجھے فوراً شناخت کر لیتے۔ میرا حلیہ بھی بھیجا جا سکتا تھا اور ان گاؤں کے تھانے والوں کا کیا بھروسہ۔ وہ مجھ بیرلو کا دسیوں دو چار کے قتل کا الزام تھوپ دیں اور تفتیش کا آغاز کر دیں۔

"میرے ساتھ یہ سلوک کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں بھاگ تو نہیں رہا ہوں۔"

"ہم تجھے بھاگنے بھی نہ دیں گے۔" ایک بولا۔

"کوشش کی تو ختم کر کے اسی جگہ گاڑ جائیں گے۔" دوسرے نے کہا۔

پھر ایک فرلانگ تک ہم اسی طرح چلتے گئے۔ کسی نے کوئی بات نہیں کی لیکن مجھے خطرہ مول لیے بغیر رہائی پانے کی صورت نظر نہ آئی۔ مجھے گرفتار کر کے لے جانے والے پوری طرح مستعد رہے اور یوں آگے پیچھے ہوتے رہے کہ میں دو یا چار کو ٹھکانے لگا بھی دیتا تب بھی باقی چار ایک ساتھ مجھ کو گولی مار دیتے۔ لاچا پھر میری راہ کی سب سے بڑی دیوار بن گیا تھا۔ لاچے ان سب نے بھی باندھ رکھے تھے لیکن وہ اس لباس کے عادی تھے۔ میں نے پتلون پہن رکھی ہوتی تو خود کو چھڑانے کے بعد میں ریس لگا کر وہ مت دیکھتے رہ جاتے۔ ان کے پاس صرف کلہاڑیاں تھیں۔ ریوالور نہیں تھے جس کی گولی آدمی کو توقع سے پہلے آلیتی ہے۔ لیکن لاچے کے ساتھ میں نہ زیادہ تیز بھاگ سکتا تھا اور نہ زیادہ دور جا سکتا تھا۔ لاچار بس۔ یہ حیثیت ان کی ہوتی اور اس کا انجام بہت دردناک ہوتا۔ چار کلہاڑیوں سے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جاتے۔ چنانچہ میں چلتا رہا۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ مجھے مضبوطی سے بازوؤں کے شکنجے میں گرفتار رکھنے والے کچھ تھک سے گئے ہیں اور ان کی گرفت پہلے جیسی سخت نہیں رہی۔ یہ ایک امید افزا بات تھی لیکن میری سب امیدوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب کسی خبیث محافظ نے تجویز پیش کی کہ اسے باندھ دیا جائے۔ تجویز کو اکثریت کی حمایت حاصل ہوئی اور کسی نے نہایت بدتمیزی سے ہاتھ مار کے میری پگڑی اتار لی۔ میں نے بہت شور مچایا لیکن وہ مجھے کسی قسم کی رعایت دینے پر تیار نہ تھے۔ وہ سب ایک مقتول کے بھائی اور کزن تھے۔ سارے گاؤں یا ذات برادری کا ہوتا تو انتقام کی جنگ چلتی رہتی اور دونوں طرف کے لوگ مرتے رہتے لیکن یہ باہر کا آدمی تھا اور میرے بارے میں بھی ان کو شک تھا بلکہ یقین تھا۔ شک کا پلڑا ذرا بھاری تھا چنانچہ وہ قانونی کارروائی کر رہے تھے۔ ان کو اس قانونی کارروائی تک محدود رکھنے میں خوف کے عنصر کا دخل بھی تھا کہ ایک کارندے کو قتل کر کے وہ خود نہ پھنس جائیں۔

جب میرے ہاتھ پیچھے کر کے مضبوطی سے باندھ دیے گئے تو اپنے عبرتناک انجام کا نقشہ میری نظر میں پھر گیا۔ اب خدا کے سوا میری مدد کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ خدا یا بعد کی محبت، رحم کا خلوص۔ نہ رضوی صاحب کا اثر و رسوخ اور نہ قانون۔ تحفظ دینے والے تو بات اس کا رخ یہ پہچانے نہیں سکائیں گے کہ انھوں نے ایک خطرناک مفرور اشتہاری مجرم کو پکڑ لیا۔ حالانکہ مجھے پکڑنے میں ان کی کوشش کو ذرا بھی دخل نہ تھا لیکن اس کا سارا کریڈٹ وہ خود لے لیں گے۔ مقتول کے ورثا کو ما یہ ہوا کہ ان کے ہاتھوں سے ایک قاتل کو پکڑا تھا لیکن وہ ان کے بھائی کا قاتل نہیں تھا۔ میں نے غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے گاؤں کی طرف نہیں لے جایا جا رہا ہے۔

"تھانہ کیا گاؤں میں نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں اس گاؤں کا تھانہ چار میل آگے ہے۔" اس نے بادل ناخواستہ ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"یہ جگہ کون سی ہے؟" میں نے اس بستی کی طرف اشارہ کیا جہاں آج تو جنازے اٹھے تھے۔

"تھوڑا صبر کرو۔" ان میں سے کسی نے کہا۔ "اتنا بھولا ...!"

"اور تھانہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ تھکن، بھوک اور ہاتھ بندھے رہنے سے میرا چلنا مشکل ہو رہا تھا۔

"ہم تجھے جیپ کی سواری کے لیے تھانے لے جائیں گے۔" آگے چلنے والا پلٹ کر بولا۔ "اب بک بک نہ کر۔"

انھوں نے فرمایا تھا کہ گرفتار ہم ہی نے۔ اور ہوئے کہاں کس جرم کی پاداش میں۔ اپنی طرف سے میں نے ایک لڑکی کی عزت بچائی تھی۔ مارنے والے اور مرنے والے سب اجنبی اور میں کسی کا دشمن نہیں تھا۔ میرے ہاتھوں اگر کوئی مارا گیا تو وہ شخص جو پہلے ہی بے ہوش پڑا رہا تھا لیکن اس کو بھی قتل کہا جا سکتا تھا۔ میں نے اپنے دفاع کا حق استعمال کیا تھا، خود کو بچایا تھا۔ اگر حملہ آور نہ مارا جاتا تو میں مارا جاتا۔ مجموعی

طور پر صورت حال یہ تھی کہ ایک حملہ آور اپنے ہی ساتھی کے ہتھوڑی کی ضرب سے ہلاک ہوا تھا۔ قاتل اور مقتول اپنے اپنے انجام کو پہنچے۔ ایک کو گلابو کے باپ نے ترنگ سے دو ٹکڑے کر دیا تھا اور خود وہ دوسرے کے ہاتھوں کلہاڑی کے وار سے مارا گیا تھا۔ یہ مقدمہ بھی فیصل۔ باقی پانچ قتل گلابو نے کیے تھے اور پھر خودکشی کر لی تھی۔ اب کس کے خون کا دعویٰ کس پر رہا۔ نظام انصاف کے طویل مرحلوں اور تفتیشی عمل سے گزرنے کے بجائے سب نے اپنا فیصلہ خود ہی کر لیا تھا۔ پانچ قتل کرنے پر گلابو کو زیادہ سے زیادہ سزائے موت ہوتی۔ یہ سزا خود کو دے کر اس نے پولیس کا کام بہت ہلکا کر دیا تھا۔

اگر یہ لوگ اسی گاؤں کے رہنے والے تھے تو ان کو یقیناً علم ہوگا کہ ایک رات میں یہ نو آدمی کس کے لیے اور کس کے اشارے پر اور کیوں مارے گئے۔ ایک مقتول کے چار بھائی اور چار کزن اتنا تو جانتے ہوں گے کہ ان کا مقتول بھائی کس قماش کا آدمی تھا اور کس کے اشارے کا غلام تھا۔ گاؤں کی کوئی سی بات چھپی رہتی ہے۔ وہ یقیناً جانتے ہوں گے کہ گلابو کے گھر والوں پر یہ قیامت کیوں ٹوٹی۔ گلابو نے دو قتل کیے اور اپنی جان لی تو کیوں لی۔ وہ پاگل تو نہیں تھی۔

"کیا سب مرنے والے تمھارے عزیز اور دوست تھے؟" میں نے کہا۔

"ہمارا تو ایک ہی بھائی تھا۔" کسی نے جواب دیا۔ "جس کے کپڑے تو نے چڑھا رکھے ہیں۔"

"جھوٹ سچ کا تو پتا چل ہی جائے گا۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "لیکن مجھے اتنا تو بتا دو کہ باقی آٹھ مرنے والے کون تھے۔ ایک ہی گھر کے لوگ تھے یا الگ الگ؟"

"تو بتا دے، جانتا نہیں؟" ان میں سب سے کم عمر نظر آنے والے نے کہا۔

آگے چلنے والے نے پلٹ کر مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا اور تند لہجے میں کہا۔ "بتا دے اگر تیرے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہا ہے۔" باقی سب نے بھی اسے گھور کر دیکھا۔

"سارا قصہ اس ایک لڑکی کا تھا۔" سب سے چھوٹے بھائی نے کہنا شروع کیا۔ "ایک بہت طاقتور اور بارسوخ آدمی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ پڑھ لکھ گئی تھی۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔"

"واقعی پڑھنے لکھنے سے دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ میری حالت اس کا ثبوت ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن خیر۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا اس شخص نے لڑکی کے انکار سے مشتعل ہو کے اسے قتل کر دیا ہے؟"

"نہیں۔ الٹا یہ ہوا کہ لڑکی نے پہلے تو اس کے ماں باپ کو مارا۔" وہ بولا۔ "پھر وہ سامنے آ گیا تو اسے ڈھیر کر دیا۔ اور پھر خود کو گولی مار کے کنویں میں کود گئی۔"

چوتھی گولی چلنے کی آواز دیر میں کیوں آئی تھی، اس کا سبب معلوم ہو گیا۔

"بڑی خونخوار لڑکی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ گولی مارنے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ گاؤں کیا شہر میں بھی ایک پستول حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور پھر لڑکی ذات۔ اسے ریوالور چلانا کس نے سکھایا تھا؟ اس کا کوئی بھائی یا باپ فوج میں تھے؟"

"یہی بات تو کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔" وہ بولا۔ "گاؤں میں ریوالور صرف نمبردار کے پاس ہے اور اس کا لائسنس ہے۔ اس نے پولیس کو دکھا دیا۔"

"پھر وہ لڑکی ریوالور کہاں سے لے آئی؟" میں نے سخت حیرانی کا اظہار کیا اور جواب میں اس نے مجھے مفروضے کی بنیاد پر ایک کہانی سنائی کہ تاب او وہ جگہ نہیں تھا۔ کوئی مفرور قیدی یا ڈاکو تھا جس نے دشمنی میں گلابو کی مدد کی۔ وہ خود قتل کرنے آیا تھا لیکن اسے موقع مل گیا کہ وہ گلابو کے ہاتھوں سب کو قتل کرا سکے۔ ویسے یہ بات ابھی پولیس والوں نے نہیں مانی۔ وہ گھر گھر کی تلاشی لے رہے ہیں۔"

"یہ نہیں کہا کہتے کہ تیرے اپنے بھائی کو بھی اسی گلابو نے مارا یا اس نے جو کہ گینگ کے حلیے میں تھا۔" بڑے بھائی نے برہمی سے کہا۔ "کون تھا اس کا دشمن۔ کسی کا کیا بگاڑا تھا اس نے؟" وہ اچانک رونے لگا۔

"اب کیوں روتے ہو بھائی جی؟" چھوٹے نے ہمت کر کے کہا۔ "سب ابا کہتا تھا کہ بُرے کام کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا اور جن کو وہ دوست کہتا ہے وہی اس کے دشمن ہیں ..."

بڑے بھائی نے اس کے ایک طمانچہ مارا۔ اس نے گال پر ہاتھ رکھا اور چپ ہو گیا۔

تھانے میں قدم رکھتے ہوئے مجھے اپنی جدوجہد رائیگاں جانے کا صدمہ بھی تھا اور گلابو کی موت کا بھی۔ صبح کا سورج بہت اوپر آ گیا تھا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ شاید دس بجنے والے ہوں گے۔ تھانے میں صرف ایک ہیڈ کانسٹیبل موجود تھا۔ اس نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور کچھ پوچھے بغیر میرے منہ پر تھپڑ اور سر پہ مکے مارے۔ پھر اس نے حکم دیا کہ مجھے کھول دیا جائے۔ مجھے لانے والوں نے بیک وقت بولنا شروع کیا تو اس

www.paksociety.com

نے ایک کے سامنے سب کو گردن سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے فرض کر لیا تھا کہ میں چور یا ڈاکو ہوں ورنہ مجھے اتنے سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ نہ لایا جاتا۔

"یہ تو اس علاقے میں نیا ہے۔" اس نے میرے ایک لات رسید کی "کہاں ڈاکا ڈالنے آیا تھا؟"

"ڈاکا ڈالنے نہیں آیا تھا جناب عالی۔" سب سے بڑے نے کہا۔ "اس نے ہمارے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔ جو کپڑے اس نے پہن رکھے ہیں وہ میرے بھائی کے ہیں۔ ہم قلعہ ستار شاہ سے آئے ہیں۔"

ہیڈ کانسٹیبل کو سخت مایوسی ہوئی۔ "تمہارا بھائی بھی انہی میں شامل تھا، وہ جو نوشہرہ سے مارے گئے ہیں؟"

"ہاں جناب۔" وہ بولا۔ "یہ کھیتوں میں سے بھاگ رہا تھا کہ ہم نے دیکھ لیا۔"

"او میاں دیکھ لیا تھا تو ادھر کیوں تکلیف کی؟" ہیڈ کانسٹیبل نے درشت لہجے میں کہا۔ "ادھر ہی لے جاتا تھا۔ شیخوپورہ سے ڈی ایس پی صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔ یہاں سے تھانیدار صاحب بھی گئے ہیں۔ سب تفتیش تو وہاں ہو رہی ہے۔ وہ شام سے پہلے تو یہاں آئیں گے نہیں۔"

"ہمیں معلوم نہیں تھا... ہم تو رات سے اس کو ڈھونڈ رہے تھے۔" اس نے ایک بار پھر کسی ریلوے والے منگ کی کہانی کا خلاصہ پیش کیا اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ وہ حق سا کیا ہے تھا۔ لیکن اس تمام عرصے میں جو بات میرے لیے سب سے زیادہ اطمینان کا باعث بنی تھی، وہ کانسٹیبل کی بے خبری تھی۔ اس نے مجھے شناخت نہیں کیا تھا۔ تاہم اس نے شکایت کنندہ کی بات سننے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔

"اچھا۔ اب تم لوگ جاؤ۔" اس نے پوری بات سن کے کہا۔ "شام کو پھر آ جانا۔ یا میں بتا دوں گا ڈی ایس پی صاحب کو۔ وہ ضروری سمجھیں گے تو تمہیں بیان دینے کے لیے بلوا لیں گے۔ میں ملزم کو حوالات میں بند کر دیتا ہوں۔ اب یہ کیس بہت اوپر چلا گیا ہے۔ میں تو تفتیش بھی نہیں کر سکتا۔"

مجھے گرفتار کر کے لانے والے بے نیل و مرام واپس ہوئے۔ شاید ان کو افسوس ہوگا کہ اتنی محنت کر کے مجھے یہاں لانے کے بجائے وہ کلہاڑیوں سے میرا قیمہ کر کے گاڑ دیتے تو ان کے دل کو کچھ اطمینان تو حاصل ہوتا۔ یہاں تو واحد حاضر افسر اعلیٰ نے مجھ سے میرا نام پتا اور ولدیت کچھ نہیں پوچھا تھا، اعتراف یا اقرار کرانے کے لیے کوئی سوال تک نہیں کیا تھا۔ وہ جب بار تجربہ کار کے حوالات میں بند کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ان کی بس تب ہوتی جب ہیڈ کانسٹیبل مجھے مرغا بنا کے سترہ نمبر کے جوتے سے تفتیش شروع کرتا اور مجھ سے قتل کے جرم کا اعتراف کرا کے بنا زندہ نہ چھوڑتا۔ یہ سب تائید ایزدی تھی کہ میری جان بچ گئی۔

"ہیڈ کانسٹیبل!" میں نے اس قاتل ہجوم کے جانے کے بعد سکون کا سانس لے کر اطمینان سے کہا۔ "یہ تو بالکل جاہل لوگ ہیں۔ بلاوجہ مجھے قتل کرنے پر آمادہ تھے۔ آپ نے میری جان بچا لی۔"

"آپ کی جان تو بچانی ہی تھی سکندر بخت صاحب!" وہ عیاری سے مسکرا کے بولا۔ "میں تو آپ کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ اب آپ کو گرفتار کر کے پیش کرنے سے مجھے انعام بھی ملے گا، سند اور ترقی سب ملیں گے۔"

ہیڈ کانسٹیبل زبردست اداکار اور بہت چالاک آدمی تھا۔ اس معمولی سے تھانے میں اس جیسے چند صورت شخص سے مجھے اتنی ہوشیاری کی توقع بالکل نہیں تھی۔ میرے اطمینان کا وہ غبارہ جواب یقین کامل کے سہارے امید کے آسمان پر بہت اونچا اڑنے لگا تھا ایک دھماکے سے پھٹ گیا اور میں اوج افلاک سے زمین کی پستی پر آ گرا۔ تاہم میں نے اس ذہنی صدمے کے اثرات کو چھپانے کی بھرپور کوشش کی۔

"تم نے عقل مندی سے کام لیا۔" میں نے کہا۔ "مگر کیا یہ انعام کافی ہے؟"

"اور کیا مل سکتا ہے مجھے؟" وہ تلخی سے بولا۔ "گاؤں کے تھانے میں رہ کے۔ یہاں کسی کو پکڑو تو نمبردار کی سفارش اور زمیندار کا زور چلتا ہے۔ کسی کے پاس نقد نہیں ہوتا۔ چار چھ مرغیاں معمولی کیس میں۔ بڑا مسئلہ ہو تو بھینس۔ ورنہ دو من گندم۔ دودھ اور سبزی۔ زندگی میں عیش کے لیے کیش چاہیے۔" اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور کرسی گھسیٹ لی۔

"تم تو میری توقع سے بہت زیادہ سمجھدار ثابت ہوئے ہو۔" میں نے کہا۔ "سب سے بڑی طاقت کیش کی ہے اور کتنی تمہیں انعام میں ملا تو کتنا ملے گا۔ سو دو سو۔ حد سے حد پانچ سو۔ اتنی یہ تعریفی سند یا وردی میں ایک پٹی کا اضافہ تمہیں کیا دے گا۔ تمہاری ماہانہ آمدنی میں پچاس روپے کا فرق بھی نہیں پڑے گا۔"

"چالیس روپے کا۔" وہ بولا۔ "لیکن اگلے مہینے میری بیوی کے بچہ بھی ہونے والا ہے۔"

"گویا آمدنی سے خرچ بڑھ جائے گا۔" میں نے کہا۔ میں ہیڈ کانسٹیبل کی جسمانی قوت کا اندازہ کر رہا تھا۔

"کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہی ہے۔" وہ بولا۔

"اور اگر میں نکل جاؤں تو تم کیا کرو گے؟" میں نے کہا۔ مشکل یہ تھی کہ اب وہ عین دروازے میں بیٹھا ہوا تھا۔

"کیسے بھاگ جاؤ گے؟" وہ بولا۔ "دیوار میں سے؟ یا دھواں بن کے اڑ جاؤ گے؟"

"ہم دونوں خالی ہاتھ ہیں۔ مددگار نہ کوئی تمہارا ہے اور نہ میرا۔" میں نے کہا۔ "مقابلہ کرو گے یا سودا؟"

"مقابلہ؟" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اس گاؤں میں ایک شخص خود کو پہلوان، بدمعاش اور بڑا نڈر سمجھتا تھا اور کبڈی کا چیمپئن تھا۔ بغیر لڑائی کے کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرتا تھا۔"

"اور تم نے اس کو ہر مقابلے میں نیچا دکھایا؟" میں نے حیرت سے منہ کھول کے احمقوں کی طرح کہا۔ "مگر خیر۔ تم اپنا برا بھلا خود سمجھتے ہو۔ کہاں مقابلہ کرو گے؟"

"ادھر چلو۔" اس نے عقبی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "پیچھے والا کمرہ خالی ہے۔ صرف تفتیش کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت کوئی مجرم نہیں۔"

عقبی کمرے میں ایک فری اسٹائل کشتی کا مقابلہ ہوا۔ کچھ دیر میں نے مار کھائی اور ہیڈ کانسٹیبل کے غرور کا سر ذرا اونچا ہونے لگا۔ پھر پلک جھپکتے میں نقشہ بدل گیا۔ میں نے اسے مسلسل سر کے اوپر سے اٹھا اٹھا کے نیچے پٹخا اور اٹھنے سے پہلے ہاتھوں پر گھمایا۔ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک دوڑایا اور بلتے ہی الٹ دیا۔ دو منٹ بعد اس کی تمام چیمپئن شپ تمام ہو گئی۔

"اب بولو جوان!" میں نے کہا۔ "میں کس راستے سے جاؤں؟ اور یہ تو طے تھا۔ کہو تو دھواں بن کے دکھاؤں یا دیوار میں سے گزر کے۔ میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ تم سودا کر لیتے تو اچھا رہتا۔ خیر۔ خدا حافظ۔" میں نے پیچھے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ کراہتا اور گالیاں بکتا اٹھا مگر پھر گر گیا۔

"سودا اب بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے اچانک رک کر کہا۔ "ہو تم بھی مرد اور مرد اپنی زبان سے سودا کرتے ہیں۔ تم بلکہ تم رہنے کی بات کرو تو میں کچھ کروں؟"

"اب۔۔۔ اب کیا۔۔۔ چاہتے ہو تم؟" وہ بالآخر اٹھنے میں کامیاب ہوا۔ "دفع ہو جاؤ۔۔۔"

"میں تمہیں اپنی زبان بند رکھنے کا معاوضہ دے سکتا ہوں۔" میں نے جیب میں سے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ گرفتار کرنے والوں نے مجھے بے قابو کرنے کے بعد جامہ تلاشی ضروری نہیں سمجھی تھی اور تھانے میں تفتیش کا آغاز ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی ورنہ میرا یہ خزانہ کسی رسید کے بغیر ہی سرکار ضبط ہو جاتا۔ وہ خاموش رہا۔

"اگر تم سب کچھ بھول جاؤ۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "یہ کہ نہ کوئی مجھے یہاں لایا، نہ تم نے مجھے دیکھا۔ نہ پہچانا اور نہ پھنسایا۔ نہ کوئی ہار جیت کا مقابلہ ہوا۔ تو اس کی اب بھی قیمت ہے۔ انکار کر کے اپنا اور نقصان کرو گے۔ گورنمنٹ کا انعام تو گیا۔ یہ ہزار رکھ لو۔" میں نے دس نوٹ الگ کیے۔

"ہزار۔ ہزار تو کم ہے۔" وہ بمشکل تمام بولا۔ "اگر تم تین ہزار دے جاؤ تو تمہاری مہربانی۔"

میں چونک کر رہ گیا۔ "مہربانی؟ تم کو تو سودا کرنا بھی نہیں آتا۔ پانچ کیوں نہیں مانگتے تم؟"

"شاید بے وقوف ہوں میں۔ ڈرتا ہوں اور مجبور بھی ہوں۔ تم ہزار بھی نہ دو تو میں کیا کر لوں گا۔ مجھے یہ پہلا موقع ملا ہے۔ میرا مطلب ہے ایسا موقع۔ ورنہ بڑا ہاتھ تو افسر مارتے ہیں۔ اپنا حصہ وہی رہتا ہے جو میں نے بتایا تھا۔ اس سے قرض ادا نہیں ہوتا۔ رہن رکھی ہوئی زمین نہیں چھڑائی جا سکتی۔ بیٹی رخصت نہیں ہوتی اور گھر نہیں بنتا۔" وہ بولا۔ اس کے غرور کی جگہ اب شرمندگی، مایوسی اور افسردگی نے لے لی تھی۔

"تم کو کیا کرنا ہے؟" میں نے کہا۔ "کہاں کی ضرورت پوری کرنی ہے؟"

"بیٹی کو... وہ دینا ہے جو میں اس تنخواہ میں... اور یہاں رہ کے نہیں دے سکتا۔" وہ مجھ سے نظر ملائے بغیر بولا۔ "یہ سال بھی گزر گیا تو وہ منگنی توڑ دیں گے۔ دس تولے سونا مانگتے ہیں وہ۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ پھر میں نے تین ہزار الگ کیے اور زمین پر رکھ دیے۔ "یہ ان کمینوں کے منہ پر مار دینا جو تمہاری بیٹی کو تولتے ہیں۔ اور یہ ہزار میری طرف سے۔ اسے جو چاہو سمجھ لو۔ اپنی زبان کے مطابق معاوضہ۔ یا ایک احسان کی قیمت۔ یا اپنی بیٹی کے لیے میری طرف سے تحفہ۔" میں نے کہا اور دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ پورے یقین کے ساتھ کہ اب مجھے کسی ضمانت کی ضرورت نہیں۔ پیسہ دے کر نہیں شرافت سے بات کر کے میں نے اس کی زبان بند کر دی ہے۔

میں سڑک پر پہنچا تو دونوں طرف سے گاڑیوں کی آمدورفت پورے زور شور سے جاری تھی۔ بارہ بجنے والے تھے اور اب اس بات کا کوئی امکان نہیں رہا تھا کہ میری ملاقات ملتان سے لوٹنے والے قافلہ شوہ سے ہو۔ قریبی مسئلہ بھوک مٹانے کا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک جھونپڑا سا بنا ہوا تھا اور دو بھری

www.paksociety.com

سیٹوں کے گرد لکڑی کی چار بنچیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ اس وقت یہ کیفے سرِ راہ زیادہ آباد نہیں تھا۔ بیرہ یا منشی کے علاوہ صرف ایک شخص تھا جو بنچ پر اکڑوں اور گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ لیکن ہو سکتا تھا کہ اچانک کوئی کار یا بس وہاں رک جائے چنانچہ میں نے اس چارپائی کا انتخاب کیا جو فاصلے پر ایک درخت کے نیچے پڑی تھی۔

"دو گلاس چائے لے آؤ اور کھانے کے لیے جو کچھ ہے وہ سب لے آؤ" میں نے کہا۔ بوڑھے نے بیوقوفوں کی طرح میری بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی تو میں نے کہا "میرا مطلب ہے چار پیالی چائے ایک کیتلی میں۔ خوب ابال کے۔ اور کل شام سے میں بھوکا ہوں۔ اس لیے پیٹ بھرنے کو جو ملے۔" پھر میں چارپائی پر لیٹ گیا اور گہرے نیلے آسمان کی گہرائی اور وسعت میں پرواز کرنے والے پرندوں کو دیکھنے لگا۔ قید سے نجات کے بعد میں بھی اتنا ہی آزاد تھا۔ اس احساس میں بڑی طمانیت تھی۔ اگر تھانے والے تفتیش کے لیے خفیہ گئے ہوتے تو میرا اور اس بدبخت سنبل کا نہ مقابلہ ہوتا نہ سودا۔ اس وقت میں زنجیروں میں جکڑا ہوا حوالات میں یا لاہور جانے والی کسی گاڑی میں بیٹھا ہوتا۔ اور میرا مستقبل وہی ہوتا۔ مسلسل قید۔ نت نئے مقدمات کے بہانے زندگی کی آخری سانس تک جیل میں رکھنے کا انتظام۔ یا پاگل خانے منتقلی۔ یہ آئندہ بھی ہو سکتا تھا کیونکہ میرے دشمن شکاری بھی جانتے تھے۔

چائے کے ساتھ خستہ اسفنج ٹائپ کیک پیس کا مرتبان خالی کرنے کے بعد میرے جسم میں توانائی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ میری قوتِ طبیعت میں کمی آئی اور حوصلہ بڑھ گیا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں نے گزشتہ روز فرار ہوتے وقت قلعہ ستار شاہ کا رُخ نہ کیا ہوتا۔ میں دس قدم بھی دائیں یا بائیں ہو جاتا تو کسی اور گاؤں پہنچتا اور مجھے علم بھی نہ ہوتا کہ آج گلابو نام کی ایک لڑکی کا جنازہ اٹھے گا تو ساتھ آٹھ جنازے اور بھی اٹھیں گے۔ بدقسمتی کے مقابلے میں خوش قسمتی یقیناً قابلِ ترجیح ہے لیکن انتخاب آدمی کے ہاتھ میں کہاں ہے۔ انتخاب کا حق ملتا تو گلابو اس خوبصورتی کو یقیناً ٹھکرا دیتی جس کے ساتھ موت کے ایسے بھیانک سائے تھے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اس نے وہیں مرنے کے بجائے دریا میں ڈوب کر مرنا کیوں پسند کیا؟ موت کو یقینی بنانے کے لیے اس نے خود کو گولی بھی مار لی تھی لیکن گولی تو وہ جائے واردات پر چلا لیتی تب بھی اس کی جان لے لیتی۔ جواب ایک ہی ہو سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی لاش اس گھر سے اٹھائی جائے۔ وہاں مارا جانے والا اس کی عزت کا دشمن ہو رہا تھا اور یہ بات سب جانتے تھے۔ اب اس پر یہ الزام نہیں آتا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ بے آبرو ہو چکی تھی۔ پولیس کو ایک ریوالور بھی تو ملے گا۔ یہ تو پتا چل ہی جائے گا کہ اس کی چھ گولیوں سے کون کون مرا۔ لیکن کیا پیر علی شیر سے وہ معلوم نہیں کر لیں گے کہ ریوالور کس کا تھا؟ لیکن انہیں معلوم نہیں ہو جائے گا کہ اس مفرور اشتہاری مجرم نے کدھر کا رُخ کیا تھا۔ وہ ریوالور گلابو کو کیسے ملا۔ یہ تفتیش جرائم ہو جائے گی۔ اصل کامیابی میری سمت کا تعین ہوگی۔

میں کھانے کے بعد کھڑا ہوا۔ نہ جانے کہاں جانے والی ایک ویگن نے بریک کیا مگر چائے والا میری طرف لپکا۔ "پیسے تو دے میاں" وہ بولا۔ غالباً وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا کہ میں استطاعت سے زیادہ مال کھا کے بھاگنے کی فکر میں ہوں۔ میں نے نوٹوں کی گڈی نکالی تو وہ قدرے شرمندہ ہوا۔ میں نے ایک نوٹ اسے پکڑا دیا۔

"کھلا تو نہیں ہے میرے پاس" اس نے نوٹ ہاتھ میں لے کر کہا۔ میں بے نیاز کھڑا رہا اور اس نے ویگن کی طرف منہ کیا "میں پوچھتا ہوں کسی سے" لیکن کچھ دیر بعد وہ بڑبڑاتا ہوا لوٹا۔ پہلے اسے ڈر تھا کہ میں کھا پی کر بھاگ گیا تو اس کے پیسے مارے جائیں گے۔ پیسے اب بھی مارے جا رہے تھے مگر قصوروار وہ خود ہو گیا تھا۔

"اچھا چاچا" میں نے کچھ سوچ کے کہا "جتنے تمہارے پاس ہیں اتنے ہی دے دو"

"نہیں... میرے پاس تو بیس بائیس پیسے ہوں گے صبح سے" وہ بولا "دس کا نوٹ نہیں ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اچھا تم چائے کے پیسے کاٹ کر جو ہے وہ دے دو۔ اور جتنی رقم بچے اس سے پھول خرید کر ایک قبر پر چڑھا دینا۔ ادھر قلعہ ستار شاہ میں آج ایک لڑکی قتل کر دی گئی ہے۔ گلابو نام تھا اس کا"

چند لمحوں کے لیے وہ کچھ نہ کہہ سکا "پھول... پھول یہاں کون بیچتا ہے۔ ویسے ہی دل جانتے ہیں"

"اچھا تو اس کے نام پر خیرات کر دینا۔ کسی مستحق کو دے دینا اور اس کی بخشش کی دعا کرنا" میں نے کہا۔

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور واپس جانے لگا۔ اسے ویگن کے مسافروں کو بھی چائے دینی تھی۔

"کون تھی یہ لڑکی تمہاری؟" اس نے اچانک رک کر سوال کیا۔ اسے میرا رویہ بہت عجیب لگا تھا۔

"بہن سمجھ لو" میں نے کہا "بیٹی سمجھ لو یا ماں سمجھ لو"

وہ مجھے بیس روپے پکڑا کے سخت بدحواسی میں فرار ہوا۔

خطرناک تو میں نہیں تھا لیکن پاگل ضرور تھا۔ میری باتوں سے اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ جب میں واپس لاہور جانے کے لیے ایک بس میں سوار ہوا تو ایک بجنے کو تھا۔ میرا حلیہ خاصا بدل گیا تھا۔ اب میں عام دیہاتی لباس میں تھا جو کسی کو تھانیدار کی وردی یا جنگل کی قبا کی طرح متوجہ نہیں کرتا۔ میرے سر پر بھی پگڑی تھی اور داڑھی میں سفیدی خاصی بڑھ چکی تھی۔ کنڈکٹر سے لاہور کا ٹکٹ لے کر میں اس ڈرائیور کے متعلق سوچتا رہا۔ گزشتہ شب بھی میرے بیٹھنے سے وہ پریشان ہوا ہوگا۔ معلوم نہیں وہ کہاں تک گیا اور کب واپس ہوا۔ کوئی بات پورے یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی تھی۔ وہ کار چھوڑ کے فرار بھی ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے بعد میں میرے کسی ٹھکانے کا پتا لگانے کے لیے کار کی تلاشی لی ہو۔ اسے ایک تھانیدار کی وردی اور ایک ریوالور ملا ہوگا۔ وہ یقیناً پریشان سا ہوگا۔ اسے خیال ضرور آیا ہوگا کہ میں خفیہ پولیس کا آدمی تھا جس نے وردی اتار کے رکھ دی تھی اور جوگی فقیر کے کپڑوں میں اس کو بھی دھوکا دے رہا تھا اور گلاب شاہ کے مجرموں کو بھی۔ جتنا میں نے غور کیا مجھے اس کے گاڑی چھوڑ کر بھاگنے کے امکانات زیادہ نظر آنے لگے۔

وہ دھوبی کا قاتل ہو گیا تھا۔ مذکورہ گھاٹ کا سمگلر ساتھی سے غداری کا مرتکب ہو چکا تھا اور خفیہ پولیس کے جال میں پھنس گیا تھا۔ ان حالات میں اسے میرا سراغ لگانے کے لیے تردد کی کیا ضرورت ہے۔ کہ وہ مجھے تلاش کرتا ہوا لاہور پہنچے اور پھر پکڑا جائے۔ وہ یقیناً کار چھوڑ کے بھاگ گیا ہوگا۔ شاید اس جگہ سے روانہ ہونے کے کچھ دیر بعد جہاں میں نے اس سے ملنے کو کہا تھا۔

اس خیال نے مجھے اتنا قائل کر لیا کہ میری نظریں بس کے باہر بھاگتے ہوئے مناظر سے الجھنے لگیں۔ سفر زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ مشرق سے آغاز سفر کرنے والا آفتاب مغرب کی طرف ڈھلنے لگا تھا۔ کھانے اور سستانے کے بعد کسان پھر کھیتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں عورتیں ندی نالوں میں کپڑے دھو رہی تھیں اور بچوں کو نہلا رہی تھیں۔ بچے مویشی چرا رہے تھے اور دونوں طرف سے مسافروں کی ریل پیل جاری تھی۔ کوئی کچھ نہیں جانتا تھا چنانچہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ایک بستی میں آج کتنے جنازے اٹھے یا اٹھیں گے تو کیوں اٹھیں گے پانچ افراد کی قاتل یا اکیلی رہ جانے والی مظلوم عورت۔ اس نے

انصاف کیا یا خودکشی کر کے حرام موت مر گیا۔

میرے خیالات کی لڑی ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئی۔ گاڑی رک گئی تھی، میں چونک گیا۔

"کیوں؟ کیا ہو گیا ہے؟" کنڈیکٹر نے کہا اور بہت سے لوگوں نے سر گھما کے پیچھے دیکھا۔ ان میں ڈرائیور بھی شامل تھا۔

"وہ... میرا بچہ... گر گیا ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ڈرائیور نے بس سڑک کی اور میں کود کر اتر گیا۔ بس روانہ ہو گئی۔ یہ سوال بعد میں ضرور کیا گیا ہوگا کہ جو شخص کھڑکی سے دور بیٹھا تھا اس کا بچہ باہر کیسے گرا۔ اس کے اور کھڑکی کے درمیان تو دو مسافر حائل تھے۔ انھوں نے پورے یقین کے ساتھ کہا ہوگا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ خیر، اب ان کا جو دل چاہے سمجھیں۔ میں نے اپنی گاڑی کو سڑک کے کنارے کھڑا دیکھ لیا تھا۔ ایک مفروضہ بالکل ایک حقیقت بن گیا تھا چنانچہ وقتی طور پر میں سب کچھ بھول گیا تھا اور تیز تیز قدموں سے دو فرلانگ پیچھے رہ جانے والی گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔

گاڑی کے سب دروازے مقفل تھے سوائے ایک دروازے کے جدھر ڈرائیونگ سیٹ تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ چابیاں سوئچ میں موجود تھیں۔ زیادہ وقت گاڑی رات کے اندھیرے میں لاوارث کھڑی رہی تھی چنانچہ کسی نے دیکھا بھی تھا تو یہی سمجھا ہوگا کہ ڈرائیور کسی ضرورت کے تحت اترا ہے اور آس پاس ہی موجود ہوگا۔ صبح کے بعد سے اب تک چند گھنٹے ہی گزرے تھے۔ اگر صبح سے پھر شام ہو جاتی یا گاڑی اگلے دن بھی نظر آتی تو اس کی پوزیشن یقیناً مشتبہ ہو جاتی اور کوئی نہ کوئی پولیس کو بھی مطلع کر دیتا۔ میں نے گلوو کمپارٹمنٹ کھولا۔ اس میں ریوالور موجود تھا۔ میرا اٹیچی کیس دیکھا، اس میں کپڑوں کے ساتھ تھانیدار کی وردی بھی موجود تھی۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ کسی غیر متوقع مصیبت میں گرفتار ہونے کے خوف سے ڈرائیور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے فرار ہو گیا تھا۔

اس گاڑی کا ملنا کسی گم شدہ خزانے کے ملنے سے کم نہیں تھا۔ میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور کچھ سوچ کے واپس جانے کے بجائے آگے روانہ ہو گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ کس طرح چیک پوسٹ پر پکڑے جانے سے بال بال بچا تھا لیکن بچ جانے کی کوشش میں اس سے بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا۔ پھر کھجور سے گرا تو کنویں میں گیا۔ میرا تھانے جا کے نکل آنا تائید ایزدی کے بغیر ناممکن تھا اور اب گاڑی کا مل جانا نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ جدوجہد جاری رکھنے کا اشارہ تھا۔ میں نے سب کچھ گنوانے کے بعد پھر سب کچھ پا لیا تھا اور اب دوبارہ ملتان کی جانب یوں رواں تھا جیسے درمیانی وقفے میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ جو کچھ ذہن میں تھا ایک خواب پریشاں کا نقش لگتا تھا۔

میرا حلیہ مضحکہ خیز ضرور تھا لیکن اطمینان بخش تھا۔ رابعہ، محسن یا شمسہ مجھے اس حلیے میں دیکھ لیتے تو ہنستے ہنستے مجھے ایک سے ایک نیا خطاب دیتے۔ اکرام شیخ، نادرہ، انکل رضوی کی فیملی، استاد چھیدی اور منظر، یہ سب لوگ عام حالات میں میرے عینی وٹنس ہوتے سب بے حد محظوظ ہوتے لیکن اب نہ میں ان کے سامنے جا سکتا تھا اور نہ یہ سب لوگ اکٹھے ہو کر پہلے کی طرح جشن منا سکتے تھے۔ وقت نے اور حالات نے رشتوں میں دراڑیں ڈال دی تھیں اور مجھے سب سے الگ کر دیا تھا تو باقی سب کو ایک دوسرے سے دور۔ خیر، خدا وہ وقت لائے کہ اعتماد، خلوص اور محبت کے پرانے رشتے بحال ہوں اور ہم پھر ایک ہو جائیں۔ آمین۔

میں نے دعا مانگی۔

ملتان پہنچنے سے پہلے میں نے اپنا گلیٹ اتار دیا۔ ایک گروہ شخص کے لباس کو کفن ہی کہا جا سکتا ہے۔ اور اس کی جگہ شلوار قمیص پہن لی۔ شام کے سائے پھیلنے لگے تھے کہ میں نے کار کو ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل کے مقابل روکا اور اندر چلا گیا۔ رجسٹر میں اپنے نام کا اندراج میں نے وہی کیا جو گاڑی کے کاغذات میں تھا۔ چابیاں منیجر کے حوالے کیں کہ کسی کو بھیج کر اس کی سروس اور ٹیوننگ کرا دی جائے کیونکہ صبح مجھے کوئٹہ جانا ہے اور رقم پیشگی ادا کر دی۔ میرے انداز و اطوار میں متانت اتنی زیادہ تھی کہ حاکمانہ غرور جھلکتی تھی اور اس سے ظاہر یہ ہوتا تھا کہ میں کوئی بدتمیز، بدمزاج اور بد قسم کا سیٹھ قسم ہوں چنانچہ منیجر یس سر، یس سر کرتا رہا۔ اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد میں نے غسل کیا، کافی اور سینڈوچ طلب کیے اور پھر سویا تو رات کے دس بجے اٹھا۔ میں پوری رات جاگتا رہا تھا اور پھر پورا دن سفر کرتا رہا تھا چنانچہ میں پوری رات سو کے گزار سکتا تھا لیکن میرے لاشعور میں ایک بات تھی جس نے ٹیبل کلاک کے الارم کی طرح مجھے وقت پر بیدار کر دیا۔ میں نے محسن سے وعدہ کیا تھا کہ بہرصورت سکھر سے فون کروں گا۔ سکھر کے بجائے میں ابھی ملتان ہی پہنچا تھا لیکن اسی وقت منظر کے گھر میں محسن اور رابعہ میری کال کے انتظار میں ایک ایک لمحہ گن کر کاٹ رہے تھے۔ وقت تو گزر چکا تھا لیکن مجھے یقین تھا

کہ وہ اتنی جلدی مایوس ہو کے لوٹنے والے نہیں تھے۔ انھوں نے خواہ مخواہ اندیشہ ہائے دور دراز کو مد نظر رکھا ہوگا۔ اور کال میں تاخیر کے بہت سے اسباب تلاش کر لیے ہوں گے۔

میری ڈانٹ ڈپٹ کا اثر یہ ہوا کہ چند منٹ میں میرے کمرے کے فون کی لائن عبدالودود منظر اینڈ کمپنی کے فون سے ملا دی گئی۔ گھنٹی بجتے ہی وہ سب لپکے ہوں گے مگر لیڈیز فرسٹ کے اصول کی آڑ میں انھوں نے رابعہ کو ریسیور اٹھا کے پہلے بات کرنے کا موقع فراہم کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا دل اس گاڑی کی طرح دوڑ رہا ہے جس کے بریک فیل ہو گئے ہوں۔

"ہیلو!" رابعہ نے کہا۔ اور مجھے اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش محسوس ہوا۔

"رابعہ! میں..." میں نے بے حد جذباتی ہو کے کہا۔ "بولو، بولو۔ کچھ تو اور کہو۔ تصور میں تم میرے سامنے ہو اور کانوں میں تمھاری آواز رس گھولتی ہے۔ تم اداس تو نہیں ہو نا؟"

"تم خیریت سے تو ہو نا سکندر؟" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "کہاں سے بول رہے ہو؟"

"ملتان کے ایک ہوٹل سے۔" میں نے کہا۔ "سو رہا تھا کہ تمھاری یاد نے گہری نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔"

"تو... تم کو... تم نے کہا تھا سکھر سے فون کرو گے۔" وہ بولی۔ پھر منظر کی آواز سنائی دی۔ "ارے بھائی کھڑی کھڑی کانپ رہی ہو، بیٹھ جاؤ۔ یہ کرسی اسی لیے رکھی ہوئی ہے۔" اس کا زبردست قہقہہ گونجا جس نے تصور میں رابعہ کا چہرہ سرخ ہوتے دکھا دیا۔

"وہاں سے مجھے کچھ دیر ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "لیکن تشویش کی بات کوئی نہیں۔"

"یہ تو اچھا ہی ہوا۔" وہ بولی۔ "معلوم نہیں کیسے انکل رضوی کو اطلاع مل گئی تھی کہ تم حلیہ بدل کے گاڑی میں کراچی کی طرف جا رہے ہو۔ محسن کا خیال تھا کہ تم اب تک پکڑے جا چکے ہو گے۔"

"اور تمھارا خیال کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "فرض کرو ایسا ہی ہو جاتا۔"

وہ ہنسی۔ "بہت تنگ کرتے ہیں مجھے یہ دونوں، محسن اور منظر۔ ابھی کہہ کر گئے ہیں کہ ہم ذرا دو نفل شکرانے کے ادا کر آئیں۔ مجھے موقع دینا چاہتے تھے کہ تم سے اکیلے میں بات کر لوں۔ معلوم ہے کل رات کیا ہوا؟ میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ تم اور محسن باتیں کر رہے تھے۔"

"وہ... ایک بہت پرانا شعر ہے... کہ کہتے ہیں جس کو عشق..."

"وہ تمھارے دماغ کا خلل ہے۔ سچ بتاؤ کیا تم کل رات آئے تھے؟"

"رابعہ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں وہاں آؤں اور تمھیں دیکھے بغیر لوٹ آؤں؟" میں نے کہا۔ "خود سوچو کیا یہ ممکن ہے۔"

"میں نے تو صاف سنا تھا تم محسن سے کہہ رہے تھے۔" وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

"کیا کہہ رہا تھا، رک کیوں گئیں؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ میں اکیلا کراچی نہیں جا سکتا... اور... اور بس..." وہ بولی۔ "رابعہ کو ساتھ جانا چاہیے۔"

"پھر محسن نے کیا کہا؟" میرا دل ایک انجانی مسرت سے رقص کرنے لگا۔

"وہی جو تم نے ابھی کہا تھا۔" وہ بولی اور مجھے اس کا حیا سے گلنار چہرہ روبرو نظر آیا۔ "اس نے کہا کہ سوتے وقت تم کھانا کم کھایا کرو۔ ولیمہ زیادہ... اور پھر بھی برے خواب آئیں تو مجھے بلا لیا کرو۔ میں استخارہ کروں گا اور ان میں سے ... کو خارج کر دوں گا۔"

"وہ تمھارا خواب تھا۔ عشق کی چھٹی حس تھی یا ٹیلی پیتھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہوگا یہی۔ میں تو کل نہیں آیا تھا لیکن کل آ جاؤں گا۔ بات وہی ہے جو تم نے سنی تھی۔"

"اچھا تو محسن سے بات کرو۔" رابعہ نے کہا اور دوسرے لمحے مجھے محسن کی آواز سنائی دی۔

"جہاں تک میرا خیال ہے تو پیدل روانہ نہیں ہوا تھا۔" محسن نے کہا۔ "کار تھی تیرے پاس۔"

"کار کبھی کبھی بے کار بھی ہو جاتی ہے۔ اب ذرا میری بات غور سے سن۔ اس کار کو میں کل صبح دس بجے کے قریب ڈریم لینڈ سینما کے سامنے چھوڑ کے لاہور روانہ ہو جاؤں گا۔ میں ابھی لمبی بات نہیں کر سکتا اس لیے اتنی دیر میں ملتان پہنچنے اور کچھ کیے بغیر لوٹ آنے کے اسباب ملاقات میں بیان کر دوں گا۔ تو کل صبح لاہور سے نکل اور ملتان پہنچ۔ گاڑی کے اندر سیٹ کے نیچے چابیاں ہوں گی۔ ریوالور میں نکال لوں گا۔ تیرا کام کار کو واپس لانا ہے۔ میں بس سے سفر کروں گا۔"

"اس حلیے کا یا تھانیدار کا حلیہ بنا کے مت نکلنا۔"

"نہیں۔ وہ سب معلوم ہے مجھے۔ میں احتیاط کروں گا۔" میں نے کہا۔ "رات آٹھ بجے منظر کے گھر آ جانا۔"

"تم نے سیٹھ والا اور کے بارے میں نہیں پوچھا۔" محسن بولا۔

"وہ پوچھوں گا سب کچھ وہاں آ کے۔ کال لمبی ہو رہی ہے اور بل بڑھ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ منظر سے رسماً اور اخلاقاً

www.paksociety.com

غیر رسمی اور بے اخلاق گفتگو ہوئی جس میں گفتگو کم اور بکواس زیادہ تھی۔ پھر میں ریسیور رکھ کے سو گیا۔ اس سے پہلے کی ناقابل یقین ساعات کتنی قیامت خیز، خون آشام اور پُر آشوب تھیں۔ اس دوسری رات کے دامن میں سکون تھا، محبت کی دلنواز مہک تھی اور خوبصورت خوابوں کی ہفت رنگ کرنوں کا اجالا تھا۔ یہ رات گویا میرے لیے بھی پُرسکون ابدی نیند کا پیغام لے کر آئی تھی اور وہ اپنی عزت و عظمت کے پورے غرور کے ساتھ ـ تمام فکروں سے بے نیاز اور سارے دکھوں سے آزاد شہر خموشاں کے ایک گوشے میں بڑی معصومیت سے محو خواب تھی۔ اس کے قاتل بھی اسی زمین کے سینے پر تھے لیکن وہ شرمسار تھے اور خوفزدہ تھے کیونکہ وہ جانتے تھے ان کے نامۂ اعمال میں کیا کچھ لکھا جا چکا ہے۔

صبح ناشتے کے بعد میں نے حساب بے باق کیا اور گاڑی کی چابی لے کر نکل آیا۔ سروس کے بعد اس کی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی اور چال بھی بدل گئی تھی۔ میں نے ڈریم لینڈ سینما کا صرف نام سنا تھا یا کسی اخبار کے اشتہار میں دیکھا تھا۔ ملتان کا شہر میرے لیے اجنبی تھا۔ مختلف لوگوں سے راستہ پوچھتا ہوا ٹھیک دس بجے سینما کے سامنے پہنچا۔ ہر طرف سے جائزہ لینے کے بعد میں نے گاڑی ایسی جگہ کھڑی کی جہاں ڈرائیونگ کے بالکل ساتھ دیوار تھی۔ درمیانی فاصلہ میں نے اتنا کم رکھا تھا کہ دروازہ پورا نہیں کھلتا اور مجھے خاصی کوشش کے بعد خود کو اس تنگ سی جگہ میں سے گزارنا پڑا۔ جہاں اگنیشن سوئچ میں کنجی ہوتی صاف نظر آتی تھی۔ میں نے اسٹیئرنگ پر ایک رومال ڈال دیا اور دوسرے دروازے سے گلوو کمپارٹمنٹ کھول کر ریوالور نکالا۔ پھر شیشہ بند کیا اور ڈور ناب دبا کے دروازہ بند کیا تو خود بخود لاک ہو گیا۔

پھر مجھے سوٹ کیس کا خیال آیا۔ میں نے محسن سے کہا تھا کہ میں سوٹ کیس نکال لوں گا لیکن وہ ڈکی میں بند تھا۔ ڈکی کھولنے کے لیے میرا دیوار کے ساتھ ساتھ چل کر ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولنا اور پھر چابیاں نکالنا ضروری تھا۔ اب تک میں نے ہر کام پوری احتیاط کے ساتھ سب کی نظر بچا کے کیا تھا مگر اب کار کے سامنے ایک ریڑھی والا آ کھڑا ہوا تھا اور اپنے ٹھکانے پر ایک کار کی موجودگی سے خوش نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے سوٹ کیس نکالنے کا ارادہ ترک کیا اور ریڑھی والے کی طرف نظر ڈالے بغیر چل پڑا۔ اس کی موجودگی نے مجھے تھوڑا سا تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ محسن کو گاڑی نہ نکالنے دے اور اڑ جائے کہ گاڑی کھڑی کر کے جانے والے صاحب تو دردِ سر تھے۔ مگر یہ کوئی ایسی بڑی پرابلم نہیں تھی۔ محسن اس سے بخوبی نمٹنے کا اہل تھا۔ خود میرے حق میں خالی ہاتھ رہنا بہتر تھا کہ بھاگنے کا موقع آئے تو سوٹ کیس کا بوجھ ساتھ نہ گھسیٹنا پڑے۔ نقد رقم اور ریوالور کی طاقت اضافی تھی۔

بس کے بجائے میں نے ٹرین سے سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ بس ہر جگہ، ہر شہر کی آبادی کے درمیان سے گزرتی تھی اور اس میں بیشتر لوگ مقامی ہوتے تھے۔ کراچی سے آنے والی ٹرین یوں بھی کھچا کھچ بھری ہوتی تھی اور اس کے مسافروں کو طویل سفر درپیش ہوتا تھا۔ رش اور بد انتظامی کے باعث انھیں اپنا یا اہل و عیال کا ہوش نہیں ہوتا تھا اور اگر آدمی اس میں ایک بار بھی جگہ فٹ ہو جائے جہاں کوئی اسے دیکھ نہ سکے تو پھر آخر تک وہی لوگ رہتے تھے اور ٹرین کے ہزاروں مسافروں میں پولیس کی نگاہ ایک چہرے کو نہ تلاش کر سکتی تھی۔ جنھوں نے کبھی اس کی کوشش کی تھی۔ عملاً یہ ناممکن تھا چنانچہ ناکہ بندی کی صف میں اسٹیشن صرف بیان کی حد تک آتے تھے۔

اس کے باوجود میں نے احتیاط سے کنارا نہیں کیا۔ ٹرین کے آنے تک میں بنچ پر بیٹھا اپنا چہرہ چھپائے اخبار پڑھتا رہا۔ اب میں باہر تھا اور دیہاتی ڈھنگ اور حلیہ نیا رنگ ایک عام آدمی کے کپڑوں میں تھا، جو کسی کی توجہ کا باعث نہیں بنتے تھے۔ مجھے زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کی مہلت درکار تھی۔ اس عرصے میں یہاں شیو بڑھ جانے سے میری صورت میں اور بھی کا اضافہ ہو جاتا اور یہاں عام لوگوں کے ذہن سے بھی ہفتہ بھر پہلے اخبارات میں چھپنے والی تصویر کے خد و خال دھندلے پڑ جانے کا امکان یقینی تھا۔ سب لوگ ایک ہی اخبار نہیں پڑھتے بلکہ پچانوے فیصد تو شاید اخبار کھول کر بھی نہیں پڑھتے۔ سنی سنائی سے حالات حاضرہ کا اندازہ کرتے ہیں یا حالات حاضرہ کو اتنا اہم ہی نہیں سمجھتے کہ ان پر دماغ سوزی کی جائے۔ باقی جو اخبارات دیکھتے ہیں ان کے ہر روز ہر اخبار میں اتنی تصویریں چھپتی ہیں کہ ذہن میں سب گڈمڈ ہو جاتا ہے کہ صورت تو دیکھی بھالی لگتی ہے مگر تصویر کسی مفرور مجرم کی تھی یا سیاسی لیڈر کی؟

ٹرین ایک گھنٹے سے زیادہ لیٹ تھی اور مشکل یہ تھی کہ ایک پسنجر ٹرین عرف مردار گاڑی اور ایک تیز رفتار ریل کار دونوں اس کے بعد ملتی تھیں۔ میں نے کچھ وقت ایک پرانے ریسٹورنٹ کے ویران اور گھٹن والے ماحول میں کھانا کھانے گزارا اور وہاں سے اس وقت نکلا جب بیرا خود مجھے نکالنے پر بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ میرے باہر آتے ہی ٹرین آ گئی اور میں کھڑکی کے راستے اس بوگی میں داخل ہو گیا جس میں مسافر یوں بھرے ہوئے تھے جیسے انار میں دانے لیکن ایک اور دانہ بڑھنے پر ہی شور مچ گیا کیونکہ میں نے براہ راست نیچے کی برتھوں پر قابض ایک فیملی کے درمیان لینڈ کیا تھا۔ بدقسمتی سے فرش پر مقیم حضرات میں منحنی جسم اور دیہاتی وضع کے ایک ملنگ بھی تھے جو کچھ مراقبے کی حالت میں سر گھٹنوں میں دیئے اونگھ رہے تھے۔ میں ان پر گرا تو وہ بے سُری کال بیل کی طرح چلانے لگے: "اب گزارا اچھا پڑا راستے سے شرفا کے اندر آنے کا۔ بدمعاش کیا تلاش کے لیے ہیں۔ آئیں؟"

"معاف، معاف کیجیے گا۔" میں نے ان کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ دروازہ نہیں تھا؟ میری نظر کمزور ہے۔" ان کی فیملی کی ایک خاتون نے جو مزاج، صورت اور عمر کے اعتبار سے ان کی شریک حیات ہو سکتی تھیں، سر پہ دو ہتھڑ مارا۔

"ہوئے مشٹنڈے۔ آنکھ پھوٹی تو نہیں ہے تو۔ خاک کرتا ہے سر پھوڑنے سے؟ ناہنجار۔ اللہ نہ کرے ان کو کچھ ہو جاتا تو پیچھے دس بچے یتیم ہو جاتے۔" وہ بانسری کی طرح بجنے لگیں۔

"فکر مت کرو خالہ۔ یہ کہیں سے نہیں ٹوٹے۔" میں نے ملنگ کو ٹھوک بجا کے دیکھ لو۔" اور فوراً ان کے درمیان سے لپک کے کھڑے ہوئے مسافروں میں شامل ہو گیا جو اس ایک فیملی کی کامیڈی سے محظوظ ہو رہے تھے۔

"اسے چھوڑیں اماں!" ٹیم کے کپتان نے آہ و بکا جاری کی۔ "کم بخت ایک ٹن کا بیٹھا تھا۔ چپٹا کر دیا جیسے فرشتہ آسمان سے مجھ پر ٹپک پڑا۔ آہ۔" وہ شخص چیچنی بابا کا دوسرا ایڈیشن تھا۔

"آدمی کو ساتویں آسمان پر سے ہی زمین پر پھینکا گیا تھا۔" میں نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"نانا ہے؟ پتا ہوتا ہے کہ" وہ پٹاخے کی طرح پھٹے: "آپ اندھے ہے۔ اب بال دھوپ میں سفید ہو گئے ہیں کیا۔ اب بڈھے ہیں ہم۔ اب آج بھی تیرے جیسے جوان جیالوں کو ایسا پٹخ دیں تو پانی نہ مانگے۔"

"ایسا غضب مت کرنا دادا میاں۔" کسی نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔ "یہ کرکا کرلا مانگنے گا، مہنگا پڑ جائے گا۔"

"واپس جوانی ہے تو کر والو ایک اور شادی۔" کسی نے شور ڈال دیا۔ "گھر کی دو تنہیں ہو جائیں گی۔"

اب خوش گپی کی زد چچا کی باری تھی۔ اس نے معقد ثانی کی تحریک پیش کرنے والے کو آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ دلچسپ تماشا اس وقت تک جاری رہا جب تک چھیڑ چھاڑ کرنے والے خود ہی لوٹ پوٹ نہیں ہو گئے اور میاں خوجی کی قبیل سے محسوس نہیں کیا کہ عافیت خاموشی میں ہی ہے۔ میرے اس تماشے میں غیر جانبدار تماشائی سے کبھی اماں اور بابا کو دیکھتے تو کبھی ٹھٹھے لگانے والوں کو جو سب ہٹے کٹے جوان اور تعداد میں زیادہ تھے۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میاں خوجی بار بار ناک پر سے پھسل آنے والا چشمہ ٹھیک کر کے مجھے فوکس کرتے ہیں اور کچھ تشویش کا شکار ہیں۔ چور میرے دل میں تھا چنانچہ میں نے اس ہجوم میں سے کھسک جانا بہتر سمجھا۔

میں نے خوجی کو لوگوں کے درمیان سے گزر کے باتھ روم کی جانب جاتے نہیں دیکھا تھا۔ میں تو خود بھی باتھ روم جانا چاہتا تھا چنانچہ میں آگے بڑھ کے باتھ روم کے دروازے پر کھڑا ہو گیا کہ جیسے ہی کوئی برآمد ہو میں اندر چلا جاؤں۔ دس منٹ بعد بالآخر وہ ہاتھ میں لوٹا پکڑے نمودار ہوئے۔ "پہچان لیا؟" وہ مجھے روبرو پاتے ہی چلائے۔ "بالکل پہچان لیا!" اس سے زیادہ بولنے کی میں نے انھیں مہلت ہی نہیں دی۔ میں انھیں سمیٹتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور دروازہ دھڑ سے بند کر کے لاک کر دیا۔ چار فٹ مربع جگہ میں دو افراد کا صرف کھڑا رہنا ممکن تھا۔ میں نے خوجی کو دیوار سے لگا کے گھٹنے سے دبا لیا۔ ایک ہاتھ سے ان کی گردن دبوچی اور دوسرے ہاتھ سے ریوالور نکال لیا۔

"دیکھا ہے کبھی؟" میں نے لہجے کو انتہائی خونخوار بنا کے کہا اور ریوالور کی نال ان کی پیشانی پر رکھ دی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ان کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئی ہیں۔ رنگ ان کا پہلے ہی لاش کی طرح سفید ہو رہا تھا لیکن انھوں نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

"تم نے ٹھیک پہچانا ہے مجھے۔" میں نے بدمعاشوں کی طرح غرا کے کہا۔ "میں قتل کر چکا ہوں۔ چوری، ڈاکے، اغوا، سب کھیل ہیں میرے۔ جیل سے بھاگا ہوں اور ایک بار نہیں دس بار۔ آئندہ بھی بھاگ سکتا ہوں۔"

میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کی تو اس نے کانپتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ "خدا... خدا کے لیے... معاف۔"

"معاف کرنا نہیں جانتا میں۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "اگر تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو ساری گولیاں مار دوں گا اور چلتی ٹرین سے کود جاؤں گا۔ بہت مشق ہے

www.paksociety.com

مجھے اس کی ”اس کے ہاتھ سے لوٹا آ گیا۔

”قسم... قسم اللہ کی... میں... میں بولوں تو کافر“ وہ تھر تھر کانپتا رہا۔

”اچھی طرح سمجھ لو۔ تم اور تمہاری بیوی، چار بچے۔ یہ سب تمہاری بے وقوفی سے مر رہے تھے۔“ میں نے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ ”ویسے میں تم کو اسی جگہ بھی مار سکتا ہوں۔ گاڑی کے شور میں آواز باہر نہیں جائے گی۔ تمہاری لاش کا پتا چلنے تک میں پچاس میل دور نکل جاؤں گا۔“

اس نے ہاتھ جوڑ کے منت سماجت اور رونا دھونا شروع کیا۔ قسمیں کھانے لگا ”میری توبہ میرے باپ کی توبہ ڈاکو صاحب مجھے بخش دو۔ میرے بیوی بچوں پر رحم کرو۔“

”اچھا۔“ میں نے کہا ”میں تمہیں ایک موقع دیتا ہوں۔ زبان بند رکھنا۔ یہ مت سمجھنا کہ تم لوگوں کی مدد سے مجھے پکڑ لو گے یا کہیں پکڑوا دو گے۔ میں اگر جیل چلا گیا تب بھی میرے ساتھی باہر ہوں گے۔ تمہارے ایک ایک بچے کو تمہاری نظر کے سامنے ذبح کر دیں گے۔ یوں۔“ میں نے قصابوں کی طرح چھری چلائی۔ میرا مقصد صرف اسے دہشت زدہ کرنا تھا اور اس کی ذہنی کیفیت یہ تھی کہ اس کی عقل جواب دے چکی تھی ورنہ وہ مجھ سے سوال ضرور کرتا کہ تمہارے ساتھی میرے گھر کا پتا کس سے معلوم کریں گے۔ جب میں نے اسے آزاد کیا تو اس نے جھک کر لوٹا اٹھایا اور گرتا پڑتا باہر نکل گیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کے چلانے کی آواز آئی تو میں دروازہ کھول کے بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ ایک منٹ بعد میں بوگی کے آخری کنارے تک پہنچا اور ہاتھ بڑھا کے دوسری بوگی کے دروازے کا ڈنڈا پکڑ لیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ مرنا چاہتا ہے کیا؟ خودکشی کرنی ہے؟ پاگل ہوا ہے؟ مگر میں نے سب کو نظر انداز کر دیا۔ میں نے سو ڈیڑھ سو ٹرین والوں کو اسی طرح ایک بوگی سے دوسری بوگی میں جاتے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ تو پوٹلیوں کی بالٹی کا وزن بھی ہوتا تھا لیکن مجھے مشق نہیں تھی۔ گاڑی کم سے کم چالیس پچاس میل کی رفتار سے جا رہی تھی۔ اگر میرا اندازہ ذرا بھی غلط ہو جاتا یا توازن باقی نہ رہتا تو دوسرے لمحے میں پٹری پر گرتا۔ اسی گاڑی کے پہیوں کے نیچے آ کے کٹ جاتا یا پتھروں سے ٹکرا کے میرا سر پاش پاش ہو جاتا۔

بدقسمتی یا خوش قسمتی تھی کہ اگلی بوگی ڈائننگ کار تھی۔ وہاں معزز حضرات کا اجتماع تھا۔ انھوں نے چلانا شروع کیا۔

”یہ مسافروں کے لیے نہیں ہے۔ نکل باہر۔“

”بغیر ٹکٹ سفر کرنا چاہتا ہے؟“ دوسرے نے کہا۔ کسی نے زنجیر کھینچنے کی دھمکی بھی دی۔

”ٹکٹ ہے میرے پاس بھائی۔“ میں نے کہا۔ یہ غلطی ثابت ہوا۔ اگر میں تسلیم کر لیتا کہ میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے تو مجھ سے سو پچاس لے کر خاموش ہو جاتے اور مجھے بحفاظت لاہور لے جاتے۔ اب وہاں میری موجودگی کا جواز نہ رہا۔ انھوں نے مجھے دھکے دے کر دوسری بوگی میں دیا۔ تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ ڈائننگ کار تو دونوں طرف ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اگلی بوگی فرسٹ کلاس کی تھی جس میں برتھوں کے الگ الگ کیبن بنے ہوتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی خطرے کو قریب تر محسوس کیا۔ اب اگر مخبری کی باتیں کرتے ہوئے زیادہ جوشیلے اور فرض شناس جوان آ کر پیچھے دوڑے تو وہ سیدھے آ گئے۔ انھوں نے کوئی سر نکال کر مجھے فرار ہوتے دیکھ لیا ہو گا اور یہی میرے مجرم ہونے کا ثبوت بن جائے گا۔ اگر میں مجرم نہ ہوتا تو جان پر کھیل کر کیوں بھاگتا۔ اگلی بوگی میں داخل ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے وہ راہداری دیکھی جس کے دونوں طرف کیبن ہوتے ہیں۔ اس کے نصف حصے میں دوسرا باتھ روم تھا۔ اس سے پہلے کہ لوگ مجھے دیکھتے یا میں انھیں دھکیلتا ہوا آگے جاتا، پیچھے والا دروازہ کھلا اور ایک ویٹر چائے کی ٹرے لیے ہوئے نمودار ہوا۔ اس نے ہاتھ پر یوں اٹھا رکھا تھا کہ اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر میں نے ٹرے کھینچ لی اور اس سے پہلے کہ وہ احتجاج کے لیے منہ کھولتا میں نے ہاتھ سے اس کو اپنی طرف کھینچا اور اس کی ٹرے سے تھوڑی سی آواز پیدا ہوئی جو ٹرین کے شور میں گم ہو گئی۔ ویٹر پہلے حیران ہوا تھا پھر اس نے اپنا توازن بحال کرنے کی کوشش کی تھی اور مجھے دیکھتے ہی پہچان کر چیخنے والا تھا کہ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کو دبوچ لیا اور ہاتھ سے اس کا منہ دبا کر میں نے اسے باتھ روم میں کھینچ لیا اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ تندرست آدمی تھا۔ جدوجہد کرتے ہوئے اس نے منہ پر سے میرا ہاتھ ہٹا لیا۔ ”یہ... بدمعاش ہو“ وہ چلایا لیکن میں نے ریوالور نکال لیا۔

”اپنی آواز بند رکھو“ میں نے کہا ”میں تمہاری جان نہیں لینا چاہتا۔“

”تم پھر کیا چاہتے ہو؟ مفت کی چائے پینی ہے یا... جیب میں ساٹھ ستر روپے ہیں۔ وہ بھی لے لو...“

”مجھے یہ وردی چاہیے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا ”جلدی کرو۔“ اور اس کے سر پر بڑی صفائی سے رکھی ہوئی پگڑی اتار لی۔ پیچھے اس کے سر کی سطح کی تمام فصل کسی حجام کے استرے نے بالکل صاف کر رکھی تھی۔ اور یہ واردات بالکل تازہ تھی۔ چنانچہ اس کے سر سے چھت کے بلب کی روشنی منعکس ہو رہی تھی۔

”ہاتھ اوپر“ اس کا ہاتھ خود بخود سر کی طرف گیا اور اس نے ایک گالی دی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے ریوالور چھیننا چاہا اور پیچھے سے پکڑ لیا۔ میں لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا تو میرا ایک پیر اس گول سوراخ میں گیا جو دو قدموں کے درمیان بنا ہوا ہوتا ہے۔ گرتے گرتے میں نے اس کے سر کو دیوار سے دے مارا۔ اس سے خاصی آواز پیدا ہوئی۔ ریوالور اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ میں پھر سنبھل کے کھڑا ہوا تو وہ میرے اوپر آیا۔ اس کے سر پر چوٹ ضرور آئی تھی لیکن وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ میری وقتی پسپائی نے اس کا حوصلہ بلند کر دیا تھا اور اس نے پہلے سے زیادہ اشتعال انگیز گالی دی اور میرے سر پر مکا مارا۔ میں نے خود کو بچایا لیکن وہ پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ شاید اسے یقین تھا کہ میں گولی چلانے کی صرف دھمکی دے رہا ہوں۔ مجبوراً مجھے اس کے سر پر ریوالور مارنا پڑا۔ اس کی ساری گالی گلوچ اور مار پیٹ کی ہمت ختم ہو گئی۔ وہ آدمی یقیناً ایسا تھا کہ ریوالور دیکھ کر بھی ہراساں نہیں ہوا تھا۔ میں بھی خالی ہاتھ ہوتا تو مقابلہ سخت ہوتا اور مجھے کشتی یا باکسنگ کے بجائے جوڈو کا استعمال کرنا پڑتا۔

دروازے کو لاک کر کے میں نے ایک مرتبہ پھر کپڑے بدلنے کا عمل شروع کیا۔ اس کی بے داغ سفید وردی پہن کر پگڑی سر پر رکھی اور آئینے میں دیکھا۔ میرا یہ نیا روپ بہت بہتر تھا۔ اپنا سرمایہ اور ریوالور وردی کی جیب میں منتقل کرنے کے بعد میں نے اس بھاری بھرکم ویٹر کو شلوار قمیص پہنائی اور اس کی وردی سے نکلنے والی رقم اور دوسرے کاغذات بحفاظت قمیص کی جیب میں ڈال دیے۔ میں چاہتا تو اسے بے لباس چھوڑ کے بھی نکل جاتا لیکن یہ اس پر بڑا ظلم ہوتا۔ اس تمام کارروائی میں پانچ سات منٹ لگ گئے تھے اور میرے کان باہر کی آوازوں پر ہی رہتے تھے۔ غالباً مخبری کی بات کو سنجیدگی سے لے کے کچھ لوگ ڈائننگ کار کے راستے میری تلاش میں آ رہے تھے۔ ویٹر نے تصدیق کی ہو گی کہ اس حلیے اور لباس میں ایک شخص کو کدھر ارسال کیا گیا ہے۔

باہر نکلتے ہی میں نے ٹرے کو بالکل ویٹر کے انداز میں ایک ہاتھ پر رکھا اور ہاتھ کو کندھے کے شانے پر یوں رکھا کہ میرا چہرہ نمایاں نہیں رہا۔ تین افراد جو فرسٹ کلاس میں داخل ہو گئے تھے ہر کیبن میں جھانکنے کے بعد ناکام واپس آ رہے تھے۔ ”یار وہ بندہ آدمی ہے۔“ ایک شخص نے کہا۔ اور انگلی کو کنپٹی پر گھمایا جس کا مطلب یہ تھا کہ میاں خوجی کا دماغ خراب ہے۔ ”ایسے ہی بولتا آ رہا ہے۔“

”وہ نہیں... کی کوئی بول رہی تھی۔“ دوسرے نے کہا۔

”مگر بھائی وہ آدمی ایسے کیوں بھاگا؟“ تیسرے نے کہا ”میں نے خود دیکھا تھا۔“

”دیکھا تو میں نے بھی تھا۔“ پہلے نے سر کھجایا۔ ”اور بیرا... نے بھی بتایا تھا کہ وہ ادھر ہی سے آیا تھا۔ پھر گیا کہاں؟“

وہ ایک قطار میں چلتے ہوئے ڈائننگ کار سے گزر گئے۔ میں ان کے پیچھے رہا۔ ساڑھے دس بجے اب چائے کی ٹرے جا چکے تھے یا خالی ٹرے رکھ کے نئی ٹرے اٹھا رہے تھے۔ کم سے کم وقت میں ان کو ٹرین کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سب مسافروں کو چائے پہنچانی تھی چنانچہ کسی کو میری طرف غور سے دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ سب ایک دوسرے کو نمبر سے یاد کرتے تھے جو ان کی سفید پگڑی پر سامنے لگا ہوا تھا۔ پیتل کا بنا ہوا بیج جس کے درمیان میں یہ نمبر بہت نمایاں نظر آتا تھا۔ ان کے سلسلے میں صرف نمبر دو سو دس تھا۔ آنے جانے والے چلا رہے تھے ”او یار غلط ہے۔ دو سو چھتیس نے میرے تین آرڈر لے لیے۔“ ”دو سو ایک کا جھگڑا ہو گیا کسی مسافر سے۔ اس نے ٹرے کے پورے پیسے لیے۔“ میں سب کی نظر سے بچ کر واپس پہلی بوگی میں آ گیا جہاں سے میں نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

میری تلاش میں جانے والے اور ناکام واپس آنے والے خفیف بھی تھے اور حیران بھی۔

”تم بھی کمال کرتے ہو چاچا۔ وہ آدمی نہیں تھا جن تھا۔“ کسی نے کہا۔

”لاحول ولا قوۃ۔ اے میاں کیا جنّ شرفاء کو باتھ روم میں تنگ کرتے ہیں؟ پستول تان لیتے ہیں ان پر؟“ کوئی خفا ہو کے کہا ”سب نے دیکھا تھا اسے۔ کیا جنات نظر آتے ہیں؟“

”جنات ہر روپ میں نظر آ سکتے ہیں۔“ کسی نے فیصلہ دیا۔

”میرے دادا نے خود...“

”جنات وغیرہ سب فضول باتیں ہیں۔ آدمی کے ذہن کی پیداوار۔“ کسی ملحد دانشور نے کہا۔

www.paksociety.com

اس سے پہلے کہ جنات کے وجود سے انکار کرنے والے اور بادامذکور کے ذاتی تجربے کو فریب خیال قرار دینے کا مسئلہ زیر بحث آتا، ٹرین کی رفتار سست پڑ گئی۔ لاہور آ گیا۔ لاہور آ گیا کا شور مچا اور سب نے اپنا اپنا سامان اور بچے سنبھالنا شروع کیا۔ ٹرین تو کوٹ رادھا کشن کے بعد لاہور ہی رکی تھی۔ کینٹ سے پہلے گلبرگ اور نواحی بستی کے درمیان سے گزرتی تھی اور وہاں اسٹاپ جاری تھی۔ دھرم پورہ کی نہر کا پل آیا تو میں نے سر جھکا کے کھڑکی سے جھانکا اور مجھے بانسوں والی سڑک کی ایک جھلک دکھائی دی۔ پھر وہ سڑک آ گئی جس کا پھاٹک بند تھا۔ ایک طرف گاڑی تھا اور دوسری طرف سے آنے والی ٹریفک رک گئی تھی۔ ورکشاپ میں سے نکلتے نکلتے پانچ منٹ گزر گئے۔ پھر ٹرین بلند بالا چھتوں کے نیچے قلیوں اور لوگوں کے شور و غل سے گونجتے پلیٹ فارم پر جا رکی۔ میں نے چلنے کی تیزی سے ایک خالی ہونے والی سیٹ پر رکھی اور نیچے اتر گیا۔ یہ بھی ایک غلطی تھی میں باہر جانے والے گیٹ کی سمت بڑھ رہا تھا کہ ایک ویٹر نے مجھے دیکھا۔ "ارے دو سو دس! تو کہاں جا رہا ہے؟" وہ چلایا۔ "جانا تو مجھے تھا۔"

"تم بھی جاؤ۔" میں نے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔ "میں نے کیا راستہ روکا ہے تمہارا؟"

"لگتا ہے میری آواز پہچان گیا تھا۔ لیکن تو نے میری جگہ پشاور تک جانے کا وعدہ کیا تھا۔" پھر اس نے میرے قریب آ کے میرا گریبان پکڑا۔ "تو... تم دو سو دس نہیں ہو؟"

میں نے اسے پوری قوت سے دھکا دیا اور وہ پیچھے آنے والے بہت سے مسافروں کو گراتا ہوا گرا۔ کچھ مسافروں کے ہاتھ سے سامان چھوٹ گیا۔ ایک قلی توازن برقرار نہ رکھ سکا اور سامان سمیت گرا تو دو خواتین نیچے دب گئیں۔ انہوں نے برقعوں کے اندر سے چیخنا شروع کیا۔ پلیٹ فارم پر بھگدڑ مچ گئی اور باہر جانے کا راستہ بند ہوتے ہی پلیٹ فارم پر ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دوڑ لگائی اور اس کمرے میں داخل ہو گیا جس کے باہر "ٹکٹ کلکٹر آفس" لکھا ہوا تھا۔ نیم تاریک کمرے میں چار ٹکٹ کلکٹر لمبی سی میز کے آخری کنارے پر فارغ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔

ایک نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ "کسے تلاش کر رہا ہے پہلوان جی؟"

"وہ... آپ کے ساتھ ہوتے ہیں نا ایک لمبے سے پتلے سے؟" میں نے سوچے بغیر کہا۔

"پراچہ صاحب؟ کیا کام ہے ان سے؟" اس نے تاش پھینکتے ہوئے کہا۔ "نکالو اپنا انعام۔"

میں نے سو کا ایک نوٹ نکالا۔ "یہ دینا تھا ان کو۔ ادھار لیا تھا" میں نے وہیں سے کہا اور ساتھ والے کمرے کی طرف چل دیا۔ ٹکٹ چیکر نے دیکھے بغیر سو کا نوٹ جیب میں ڈال لیا تھا۔ نہ جانے یہ پراچہ کون تھا۔ شاید یہ چوہدری کا کوئی [illegible] نہ کوئی نکل ہی آتا۔ کنفیوژن اس وقت پیدا ہو گا جب نامعلوم پراچہ سو روپے کسی بھی ویٹر کو ادھار دینے کو نہیں مانے گا۔ اس وقت تو میں کسی بھی دروازے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ پھر مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں موجود ہوں۔ اس نے عینک لگا کے گھورا ہی تھا کہ میں "معاف کرنا جناب" کہہ کے پیچھے سے باہر نکل گیا۔

ریلوے اسٹیشن کے جنجال سے نکل کے میں نے فضا کا سانس لیا کہ مصیبت ٹل گئی۔ میں نے عظیم الشان کلاک دیکھا۔ اس میں چھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے [illegible] منتظر کے گھر پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔ تاہم یہ ایک گھنٹہ پہلے پہنچ جانے میں بھی کوئی ہرج نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ محسن صبح آٹھ بجے روانہ ہوا ہو گا تو آٹھ بجے تک ایک بجے ملتان پہنچا ہو گا۔ سے رابعہ اپنی کار میں لے گئی ہو گی۔ اگر وہ [illegible] اٹک کاروں میں واپس روانہ ہوئے تو سات بجے بعد ہی لاہور پہنچیں گے۔ مجھے اتنا وقت مل جائے گا کہ میں اس وردی کو اتار کے پھر سکندر بخت بن جاؤں اور وردی سنبھال کے رکھ لوں۔ تھانیدار اور ویٹر کی وردی حاضر اسٹاک میں دستیاب رہے گی تو وقت ضرورت کام آئے گی۔

میرا خیال تھا کہ رکشا لوں اور بازار سے گزرتے ہوئے اپنے سائز کا شلوار قمیص خرید لوں۔ لیکن میری مشکلات ختم نہیں ہوئی تھیں۔ تانگہ اسٹینڈ پر کوچوانوں نے مجھے دیکھ لیا۔ اپنی ٹیم کو دو تانگوں میں فٹ کر چکے تھے اور خود باہر کی طرح لٹکے رہ گئے تھے جس کے لیے جگہ کہیں نہ تھی۔

"تانگے میں تو جگہ ہے نہیں پہلوان۔ تھوڑے پیچھے"

کسی نے کہا اور میں ہنس پڑا۔ پلٹ کر دیکھتے ہی [illegible] چار ہو گئیں اور میں نے خود کو خوشی کی آتش فشاں نظارے دو فٹ کے فاصلے پر پایا۔ ان کے حلق سے ایک [illegible] چیخ نکلی۔ "اسے بدمعاش!" انہوں نے کہا جسے تانگے والے نے اپنی بات کا رد عمل سمجھا۔

"[illegible] نے کہا ہے بدمعاش پہلوان؟" تانگے والا

لے کر پیچھے آیا۔ خوش قسمتی کی پیروڈی سرے سے زنانہ گالیاں دینے شروع کر دی تھیں تو میں وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ خوشی کا جانچنے تانگے والے کی غلط فہمی دور کرنے اور اسے میرے بارے میں معلومات بہم پہنچانے میں جو چند منٹ لگے وہ میرے کام آئے۔ میں نے ایک موٹر سائیکل والے کو پان سگریٹ کی دکان کے سامنے رکتے دیکھا۔ اس نے موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا۔ انجن کو چلتا چھوڑ کے اترا اور جیب سے پرس نکال کے پیسے دینے کو بڑھا۔ اس کے خیال میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ موٹر سائیکل اس کے بالکل پیچھے دو قدم دور کھڑی تھی اور اسے دو منٹ میں لوٹ آنا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور میدان صاف پا کے دوڑتے ہوئے موٹر سائیکل اٹھاتے ہی گیئر میں ڈال دی۔ نئی موٹر سائیکل کی پک اپ اچھی تھی مگر اس کے مالک کو فوراً علم ہو گیا تھا کہ موٹر سائیکل گئی۔ وہ میرے پیچھے بھاگا۔ موٹر سائیکل نے پورا ایکسیلیٹر دینے کے باوجود زیادہ اسپیڈ نہیں پکڑی تھی لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ ایک بدحواس شخص سے ٹکرا گیا جو رکشا سے اترا تھا۔ شاید وہ لیٹ ہو گیا تھا اور اسے گاڑی نکل جانے کا ڈر تھا کہ اس نے بھی مخالف سمت میں دوڑ لگائی۔ ان کے باہمی تصادم نے مجھے اس آخری مشکل مرحلے سے کامیابی سے گزرنے کا موقع فراہم کیا۔

بہت سے لوگ ویٹر کی وردی میں ایک موٹر سائیکل سوار کو دیکھ کر خوش ہوئے اور یوں ہنسے جیسے سرکس میں لوگ جوکر کو موٹر سائیکل چلاتے دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسنے لگتے ہیں۔ موٹر سائیکل کو میں نے اطمینان سے ایک گلی میں چھوڑا اور وہاں سے تانگے میں بیٹھ گیا۔ کیا ایڈونچر تھا یہ مختصر سفر بھی۔ اچھی طرف سے میں نے بس کے سفر کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے ٹرین کا انتخاب کیا تھا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اب میاں خوشی کے علاوہ ان کے چند ہم سفر، باتھ روم سے برآمد ہونے والا بیہوش ویٹر اور وہ ویٹر جس نے پہچان لیا تھا کہ میں دو سو دس نمبر نہیں ہوں، ایک ٹکٹ کلکٹر، ایک تانگے والا اور ایک موٹر سائیکل والا میری جان کے دشمن تھے اور ان سب کی نظر میں میری حیثیت ایک مجرم کی تھی جسے وہ شناخت کر سکتے تھے۔ لاحول ولا قوۃ۔ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا کہ میں بس میں بیٹھتا اور سیدھا لاہور کے اڈے پر اترتا۔ مگر جیسے گیدڑ کی شامت اسے شہر کی طرف لے جاتی ہے، میری شامت اعمال مجھے ریلوے اسٹیشن لے گئی تھی۔ شلوار قمیص تو میں نے تانگہ ذرا سی دیر کے لیے رکوا کر خرید لیے مگر ان کو پہننے کی نہ جگہ تھی اور نہ فوری ضرورت۔

تانگے والے کو میں نے خوش کر کے ایک فرلانگ پیچھے ہی رخصت کیا اور باقی فاصلہ پیدل طے کر کے حسب الوعدہ منتظر کے گھر پہنچا۔ رابعہ کی گاڑی باہر موجود تھی۔ مجھے اس کے قبل از وقت پہنچ جانے سے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ اضطراب عشق نے اسے بہت پہلے کھینچ لیا تھا۔ محسن ابھی تک واپس نہیں آیا تھا ورنہ دوسری کار بھی وہیں موجود ہوتی۔ گھنٹی کا بٹن دبانے کی کوشش میں مجھے کرنٹ لگا۔ میں نے زیر لب منتظر کو گالی دے کر دروازہ بجایا۔

"کون ہے بے؟" منتظر نے ایک کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا ہٹا کے کہا۔

"تمہارا باپ۔" میں نے کہا۔ "نمبر دو سو دس جسے دو سو بیس وولٹ کا کرنٹ لگا ہے۔"

آواز پہچان کے منتظر نے دروازہ کھولا اور گلا پھاڑ کے ہنسا۔ "اسے بھوتنی کے۔ دو سو دس نمبر کی اولاد۔ آ گیا اپنی

www.paksociety.com

اصل اوقات پر۔ چلو اچھا ہوا کہیں نوکری سے تو لگا۔ اس نے بیسے بٹا ہے۔ دھپ مارا۔ میں نے اس کے دو ہاتھ مارے۔ "یہ خطیب کی گستاخی لگانے کا مقصد کیا ہے؟ اندر بھی الیکٹرک چشمہ رکھوالے۔"

اسی وقت رابعہ نمودار ہوئی۔ حیران ہوئی۔ ہنسی اور شرمائی۔ میں نے چشمہ درو بیٹھ کھاتا۔ میں کہا۔ "آپ چائے پسند کریں گی میڈم یا کافی؟ اور اس کے ساتھ کیا کھائیں گی؟ بلا تکلف کہئے اپنے اندر سے بولو۔"

آدھے گھنٹے بعد جب میں نہا کے کپڑے بدل چکا تھا اور کافی کے ساتھ سینڈوچ کی پلیٹ صاف کر رہا تھا جو رابعہ نے بنائے تھے تو مجھے محسن کا خیال آیا۔ "معاف کیجئے گا بھوسے تو آپ لوگ بھی ہوں گے مجھے خیال نہیں آیا پوچھنے کا۔ بڑی بداخلاقی کی بات ہے لیکن اس سے زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ شیروانی صاحب لیٹ کیوں ہو گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ارے وہ سالا کون سا کم ہے۔" منظر نے کہا۔ "جیسی روح ویسے فرشتے۔ بھاگ گیا وہ کار سمیت کسی کے ساتھ۔ ہمیں تو خیر کبھی ایسا موقع ہی نہیں ملا۔"

"یار منظر، اپنے چوہدری ولادر صاحب کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا۔

"شکار نہیں کی اولاد۔ پولیس ریمانڈ پر ہیں آج کل۔" وہ بولا "بچارے کے جنازے سالے کی ضمانت بھی نہیں ہوئی۔"

"ضمانت کیوں۔ یار ایسے شریف آدمی نے کیا جرم کیا تھا؟" میں نے کہا۔

منظر نے پھر مجھے ایک دھپ رسید کرنے کی ناکام کوشش کی۔ "اچھا پھنسایا ہے تم دونوں نے اسے۔ ادھر محسن نے وہ صندوق اندر اترا، یا ادھر پولیس پہنچ گئی چوہدری صاحب کے گھر۔ بیگم صاحبہ نے بڑی خوشی سے صندوق رکھ لیا اور محسن تو خیر باہر سے ہی کھسک لیا تھا۔ وہ تانگے والا بھی چلا گیا تھا۔ چوہدری صاحب پولیس کے ساتھ ساتھ ہی پہنچے۔ بس چند منٹ کا فرق تھا۔ اب وہاں بڑی گرما گرمی ہوئی۔ پولیس مصر تھی کہ اس میں کیا ہے۔ چوہدری ولادر بہت گرم ہوا کہ یہ کس الو کے پٹھے نے بھیجا ہے۔ وہ کوئی اکرام شیخ نامی انسپکٹر تھا۔ کہنے لگا کہ کسی نے سب کچھ دیکھ کر فون کیا ہے۔ بیگم صاحبہ کی حالت غیر تھی کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت نازل ہو گئی۔ میاں بیوی کا جھگڑا الگ شروع ہو گیا۔ چوہدری چلانے لگا کہ میرا نام لے کر کوئی دشمن دے جائے تو لے لینا اور کر دینا تباہ اس گھر کو۔ پھر پولیس سے لڑنے لگا کہ اندر آئے کیسے؟ خانہ تلاشی کے وارنٹ ہیں؟ یہ گھر کا سامان ہے۔ اس نے کہا کہ چھاپا مارا ہے ہم نے۔ وارنٹ بھی لے لیں گے لیکن اچھا ہے آپ صندوق کھول کر دکھا دیں۔ اس نے انکار کیا۔ شک تو تھا ہی کہ جائز نہیں ہے۔ انسپکٹر نے کہا پھر میں تمھیں اپنی ذمے داری پر گرفتار کر کے لے جا رہا ہوں اور یہ صندوق بھی۔ اس کے ساتھ پولیس کی نفری تھی۔ ولادر کی پوزیشن بڑی خراب ہونے لگی۔ انسپکٹر اسے ہتھکڑی لگانے پر مصر تھا اور یہ بڑی بے عزتی کی بات تھی۔ صندوق میں کیا ہے یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے انسپکٹر کو ایک طرف لے جا کے بات کرنی چاہی۔ مقصد تھا کہ وہ اسے رخصت کرے۔ اس نے دوسری ... چوہدری ولادر نے اس سے فون کرانے کی اور ... کرنے کی دھمکی دی مگر وہ انسپکٹر تو ایسا اکھڑا کہ اب تو نوکری جائے یا پھانسی مجھے ہو جائے۔ میں یا تو صندوق کھول کے دیکھوں گا یا ساتھ لے جاؤں گا۔ چوہدری کے پاس اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ صندوق کا تالا توڑے۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اندر سے کیا نکلے گا۔ خدا سے یہ امید تھی کہ ... شیخ کے علاوہ بھی پولیس میں کئی بگڑے ہوئے ... کے بعد اس پر ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ ان کی بیوی ... ہو گئی ... پولیس نے لاش آنے ... ولادر کو اٹھا کر لے گئے۔ ہارٹ اٹیک کو انھوں نے ... قرار دیا۔ اتنے بڑے جرم کے بعد وہ ولادر کی کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ معلوم نہیں وہ کیسے زندہ بچ گیا۔ ڈاکٹر نے اس کو تھانے میں آکر دیکھا تھا۔"

"اس نے اسپتال بھیجنے کی سفارش نہیں کی؟" میں نے کہا۔

"کی تھی لیکن وہ سرکاری ڈاکٹر نہیں تھا۔" منظر بولا۔ "فلاں کا فیملی ڈاکٹر تھا۔ پھر ولادر ٹھیک ہو گیا اور اس کے خلاف ایف آئی آر درج ہو گئی۔ خاصے سنگین الزامات عائد ہوئے اس پر۔ مزید یہ کہ اس کی شریک حیات کا نام بھی ... گواہوں میں آ گیا۔ اس کے اپنے ڈرائیور اور خانساماں کے ناموں کے علاوہ۔ اس نے تین باپ کے وکیل کیے ہیں۔ چودہ دن کا ریمانڈ ختم ہو گا تو ضمانت ہو گی۔"

"ویری گڈ۔" میں نے جوش سے ہاتھ مل کے کہا۔ "یہ انصاف برابر ہوتے جا رہے ہیں۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ حسب عادت منظر نے پردہ ہٹا کے جھانکا اور مجھے اشارے سے بلایا۔ میں نے دیکھا تو دروازے پر محسن کھڑا تھا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔

اُس کے ساتھ ڈاکیے کی وردی میں شوفر کی خدمات بجا لانے والا وہ ٹرک ڈرائیور بھی تھا جو پہلے ہمارے نکتۂ نظر سے صف دشمناں میں شامل تھا اور اب ہم سے مل گیا تھا۔ وہ بھی اس کی مجبوری تھی اور یہ بھی سچ تھا کہ اپنی نظر میں وہ دھوبی کا کتا ہو گیا تھا جو نہ گھر کا رہے نہ گھاٹ کا۔ تقدیر بھی آدمی کے ساتھ کیسے مذاق کرتی ہے۔ طافو صرف ایک ہزار روپے ماہانہ پر ٹرک چلا کے لاہور سے کراچی آتا جاتا تھا۔ سیکڑوں ہزاروں ٹرک ڈرائیوروں کی طرح جو مال برداری کے سوا کچھ نہیں کرتے اور یہ مال کسی بھی حیثیت سے ناجائز نہیں ہوتا۔ وہ ایک بہت بڑے قانون شکن گروہ کا آلۂ کار تھا لیکن یہ بات اسے معلوم نہیں تھی۔ پھر اچانک جرم و طمع سے گمراہ ہو جانے والے رحمت کباڑی نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ مال حرام میں برابر کا شریک بن جائے۔ وہ انکار کرتا تب بھی مارا جاتا۔ شریک جرم ہو جانے کے بعد بھی اسے سزائے موت دی گئی۔ اوپر والوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ رحمت کباڑی نے اور اس ٹرک ڈرائیور نے مل کر دس لاکھ کے مال کو خورد برد کر دیا ہے۔ اپنی طرف سے انھوں نے دونوں کے لیے موت کا فرمان جاری کر دیا تھا مگر قسمت کی طرف سے اپنے انجام کو وہ پہنچا جو اصل مجرم تھا اور اس سزا کا مستحق تھا۔ طافو کو پانچ لاکھ کے عوض اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی زندگی گروی رکھنا منظور نہ تھا اور وہ جینے کی آرزو میں بچارا اسے ملا پا کے نئی امید کے ساتھ جدوجہد کر رہا تھا۔

طافو بہت تھکا ہوا اور پژمردہ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور میں نے حیرت و مسرت کے ساتھ ہاتھ ملا کے اسے اندر کھینچ لیا۔ "میں تو سمجھا تھا تم گھر گئے۔" میں نے کہا۔ "کہاں چلے گئے تھے تم؟"

"میں نے ٹیکسی ناکے سے گزر کر آپ کا بست ..."

"مگر انتظار کیا۔" وہ بولا۔ "شیر شاہ میں نے فائر کی آواز سنی اور بہتری یہی سمجھا کہ گاڑی سے نکل جاؤں۔ گاڑی میں نے سڑک کے کنارے محفوظ جگہ پر چھوڑ دی تھی اور ملتان چلا گیا تھا۔"

"تمہیں مجھ سے زیادہ گاڑی کی فکر تھی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ تو کسی نہ کسی طرح ملتان پہنچ جائیں گے۔" وہ بولا۔ "گاڑی پکڑی جاتی تو بہت سے بھی مشکل پیدا ہوتی اور آپ کے لیے بھی پریشانی میں اضافہ ہوتا۔ کیا میں نے غلط کیا جناب؟"

"نہیں۔ تم نے عقل سے کام لیا۔ ہوتا تو ہم بھی گاڑی کے ساتھ یہاں نہ پہنچتے۔" میں نے کہا۔ "تم تو ملتان پہنچ گیا تھا۔ تم نے گاڑی کو پھر کیسے تلاش کر لیا؟"

"بس جی میرا خیال تھا کہ آپ اگر ملتان گئے تو آپ ہوٹل ہی میں ٹھہریں گے۔" وہ بولا۔ "میں نے ساری رات تمام فرسٹ کلاس ہوٹلوں میں دیکھا مگر گاڑی مجھے کہیں نظر نہ آئی تو مایوس ہو کے واپس لوٹ رہا تھا کہ گاڑی ایک جگہ کھڑی مل گئی۔ میں دور کھڑا دیکھتا رہا۔ تین گھنٹے بعد میں نے محسن صاحب کو دیکھا۔ وہ گاڑی لے جانے کے لیے آئے تھے تو میں نے ان کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا اور انھوں نے پہچان لیا۔"

"تم رات بھر مجھے تلاش کرتے رہے تو یقیناً سوئے نہیں ہو گے۔" میں نے کہا۔

"بس جی۔ فکر ہو تو نیند بھی کہاں آتی ہے۔" وہ بولا۔ "اپنا ڈر تھا۔ بیوی بچوں کا خیال تھا اور آپ کی طرف سے تشویش تھی۔ محسن صاحب نے بتایا کہ سب ٹھیک ہے تو تسلی ہوئی۔ راستے میں ... کیسا ہے۔"

"اچھا۔ اب تم نہا دھو کے کپڑے بدلو۔" میں نے کہا۔ "یہ ڈاکیے کی وردی اتار دو۔ کچھ کھا پی کے آرام کرو۔ کل دیکھیں گے کہ تمہیں اور تمہارے خاندان کو بحفاظت کہاں منتقل کیا جائے اور کیسے؟"

منظر نے اور رابعہ نے یہ سب گفتگو خاموشی سے اور توجہ سے سنی تھی۔ محسن کو ڈرائیونگ نے تھکا دیا تھا اور وہ جوتوں سمیت صوفے پر دراز تھا لیکن سویا نہیں تھا محض آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ طافو کی نظر بار بار منظر اور رابعہ کی طرف سوالیہ انداز میں اٹھتی تھی۔

"یہ اپنے دوست ہیں طافو۔" میں نے کہا۔ "بہت بڑے اور قابل وکیل ہیں۔ یہ منظر صاحب تو تم کو بھی نظر آتے ہوں گے کہ کتنے بڑے ہیں اور یہ قانون ......"

"یہ بہت قابل وکیل ہیں۔" محسن نے آنکھیں کھول کر کہا۔ "مگر ان کی قابلیت کے اور ان کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔"

www.paksociety.com

محسن نے بڑی متانت سے بات کی تھی لیکن طافو کیا سمجھتا۔ رابعہ کا رنگ گلابی ہوا اور اُس نے گھور کر محسن کی طرف دیکھا لیکن وہ مزے سے لیٹا ٹانگ ہلاتا رہا۔ پھر منظر نے ہو ہو ہو کر کے ہنسنا شروع کیا تو رابعہ مزید خفیف ہوئی لیکن محسن کی سنجیدگی میں فرق نہیں آیا۔

"یار منظر۔" میں نے کہا "یہ اپنے ساتھی ہیں، ان کے شایانِ شان دعوت کا اور قیام و طعام کا بھی انتظام کرو۔۔۔ اس پوسٹ مین کی وردی کی جگہ اگر شریفانہ کپڑے مل جائیں تو اچھا ہے۔"

"شریفانہ کیا۔۔۔ اپنے کفن ہیں جو ہم تیری خاطر سر سے باندھے پھرتے ہیں۔۔۔۔" منظر بولا "آپ اس سے بھی گزارا کر سکتے ہیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔۔۔ آئیے جناب۔" وہ طافو کو اندر لے گیا۔

میں نے جوتا اتارا۔ "تو بیچی! تمہاری زبان کے پر کیسے کھل جاتے ہیں یہ موقع؟" اور جوتا کھینچ کر اس کی طرف پھینکا مگر وہ بڑی پھرتی سے اٹھ بیٹھا اور بچ گیا۔

"خاتون! دیکھ رہی ہیں یہ ظالمانہ نیت؟" وہ چلایا۔ "آپ کی نظروں کے سامنے جو ہو رہی ہے یہ دست درازی۔۔۔ میں اس ظالمانہ حرکت کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔" اس نے جوتا اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ باہر سے کسی کے بلبلا پڑنے کی آواز آئی۔ میں کھڑکی کی طرف دوڑا۔

"مار دیا بچو! اپنے ماموں کو۔" میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر کہا "یہ ہیں وہ جوابی کارروائی کے لیے۔۔۔ جا ان سے جوتا وصول کر۔"

"جس کا جوتا اسی کا سر۔" محسن نے کہا اور اپنے دونوں جوتے سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ مجبوراً مجھے جانا پڑا۔ دروازہ کھولتے ہی میری نگاہ ایک پہلوان نما شخص پر پڑی جس کی شخصیت کا سب سے نمایاں حصہ مونچھیں اور پیٹ تھا۔

"مجھ پہلوان کے سر پر جوتا رسید کرنے کی جرأت کس نے کی ہے؟" وہ جوتا اٹھا کے پھنکارنے لگا۔ اپنے جسم کے مقابلے میں پہلوان کی آواز مضحکہ خیز حد تک نسوانی تھی لیکن میں نے ہنسی کو ضبط کیا۔

"ایسی جرأت کون کر سکتا ہے پہلوان جی!" میں نے مسکینی سے کہا "بچے نے غلطی سے باہر پھینک دیا۔"

"کس کا بچہ تھا اور جوتا کس کا تھا؟" پہلوان نے جوتا دیوار پہ مار کہا "تمہارا؟"

"توبہ توبہ۔۔۔ میں تو ابھی خود بچہ ہوں پہلوان جی! وہ بھتیجا ہے میرا۔" میں نے کہا "تھا نیدار ہے نا اس کا باپ، بچے کو عادت پڑ گئی ہے۔ شرفا کو جوتے مارنے کی۔۔۔ جوتا بے شک میرا ہے۔"

پہلوان کا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ "بھانجے اور جوتے کو سنبھال کے رکھو۔" اس نے جوتا مجھے تھما کر کہا۔ عین اس وقت جب پہلوان واپس جانے کے لیے مڑا اور میں نے دروازہ بند کیا، ایک جیپ دروازے کے سامنے آ رکی۔ دھند میں سے مجھے انکل رضوی کا چہرہ نظر آیا جو پولیس کی وردی میں تھے اور اپنے ساتھ پولیس کی نفری بھی لائے تھے۔ میں واپس بھاگا۔ ان کے یوں آنے کا مقصد میری گرفتاری کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا لیکن میں حیران تھا کہ انہیں منظر کے گھر میں میری موجودگی کی اطلاع کیسے مل گئی؟ یہ فرض کرنا محال تھا کہ گھر کے کسی فرد نے انہیں فون پر مطلع کر دیا ہو گا۔ شاید کسی نے یہاں آتے ہوئے دیکھا اور پہچان کر پولیس کو خبر کر دی۔ اس وقت یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں تھی، چند سیکنڈ میں، میں اندر جا پہنچا۔

"محسن! انکل رضوی نے میری گرفتاری کے لیے چھاپا مارا ہے۔" میں نے کہا۔ محسن ایک دم کھڑا ہو گیا اور اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ رابعہ کا رنگ اڑ گیا تھا اور وہ بت بنی کھڑی رہ گئی تھی۔

"وہ۔۔۔ وہ یہاں کیسے آ پہنچے؟" محسن نے کھڑکی بند کر دی۔

"مجھے نہیں معلوم۔۔۔ لیکن میں اس وقت گرفتار ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" میں نے کہا "باہر جو گاڑی کھڑی ہے وہ ڈاکٹر امجد کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔ اسے میں ساتھ لیے جا رہا ہوں۔"

"لیکن۔۔۔ کہاں؟" رابعہ نے گھبرا کے کہا۔ اسی وقت کال بیل بجنے لگی۔

"میں۔۔۔ اب دروازے سے تو نکل نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔ اسی وقت منظر نمودار ہوا۔

"منظر! باہر انکل رضوی اپنی پولیس فورس کے ساتھ کھڑے ہیں۔" میں نے کہا "مجھے گرفتار کرنے کے لیے۔"

"پھر کیا ہوا؟" وہ بولا "کھڑا رہنے دے۔۔۔ وکیل کا گھر ہے۔ انکل بھی وارنٹ کے بغیر اندر نہیں آ سکتے۔"

"انکل رضوی بے وقوف نہیں ہیں، وہ وارنٹ لے کر ہی آئے ہوں گے۔" میں نے گھبرا کے کہا کیونکہ کال بیل مسلسل بج رہی تھی۔ "تو چھت کے راستے۔۔۔ میں اوپر جا کے چھت سے ساتھ والے گھر میں اترنے کی کوشش کرتا ہوں، راستہ ہے نا؟"

"راستہ تو ہے۔" منظر بولا "مگر مجھوتے کے ایک اور مصیبت بن جائے گی۔ وہ محلے کا محاصرہ کر رہے ہیں۔"

"تو بلاؤ دروازہ کھول۔" میں نے کہا "اور محسن! طافو پر نظر رکھنا۔ میں پھر رابطہ قائم کروں گا۔" میں نے ایک نظر رابعہ کو دیکھا اور غائب ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا منظر کی زیادہ تر اولاد کہاں ہے۔ میں نے کبھی منظر کے گھر کے اندر کا نقشہ ہی نہیں دیکھا تھا۔ ایک کمرے سے گزرتے ہی میری نظر منظر کی بیوی پر پڑی جو اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے یوں شترِ بے مہار کی طرح اندر آتے دیکھ کر وہ اتنی حیران ہوئی کہ دوپٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ دوپٹے سے منہ چھپا کے اندر بھاگ گئی۔ زینہ اچانک میرے سامنے آ گیا۔ تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ منظر کی اولاد کا ہجوم میری راہ میں حائل نہیں ہوا۔ ان کو خبر ہونے تک میں زینے کے راستے چھت پر پہنچ گیا۔ چھت پر سب رنگ برنگے زنانہ اور مردانہ کپڑے لہرا رہے تھے۔ جو منظر کی ماں نے دھو کے سوکھنے کے لیے الگنی پر پھیلائے تھے۔ میں ان کے نیچے سے گزر کر چھت کی منڈیر تک پہنچا۔ ایک طرف تین منزلہ مکان کی سیدھی دیوار کھڑی تھی۔ پیچھے ایک دوسری قلعہ نما عمارت کھڑی تھی چنانچہ میرے لیے فرار کا راستہ صرف ایک طرف سے کھلا ہوا تھا۔ میں نے چھ فٹ کی دیوار کو دونوں ہاتھوں کے بل عبور کیا اور دوسری طرف کی چھت پر گرا۔ منظر کے گھر کی چھت اٹھارہ فٹ بلند تھی مگر ساتھ والے گھر کی اونچائی دس فٹ تھی چنانچہ میں آٹھ فٹ نیچے کودا تو دھمک سے چھت میں گونج اور لرزش پیدا ہوئی۔ ابھی میری آمد کا اعلان میں نے پہلے ہی کر دیا تھا۔ "کون کم بخت ہے چھت پر؟" نیچے سے کسی عورت نے چلا کر کہا "ابھی ذرا دیکھنا۔"

میں اطمینان سے ٹہلتا ہوا نیچے اتر گیا جیسے میں نے کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں کی اور یہ کسی اجنبی کا نہیں میرے ماموں کا گھر ہے۔ زینے سے نیچے قدم رکھتے ہی میں نے خود کو ایک مختصر سے صحن میں پایا۔ تب تک اہل خانہ کے لیے شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی کہ خلائی مخلوق کی اڑن طشتری چھت پر نہیں اتری ہے تو کسی چور ڈاکو نے یقیناً دھاوا بولا ہے۔ خاتون خانہ اپنے خداوند مجازی کو پہلے ہی متوجہ کر چکی تھیں اور اب صحن میں میرے مقابل تین افراد تھے۔ ایک ساٹھ ستر سال کی بڑھیا جو خشک ہو کے چھوارا بن گئی تھی، ایک نسبتاً جوان اور فربہ بدن عورت جو بڑھیا کی بہو یا بیٹی ہو سکتی تھی اور ایک بانس کی طرح لمبا پتلا مرد جو مذکورہ بڑھیا کا بیٹا یا داماد تھا۔

"کو۔۔۔ کون ہے۔۔۔ سب ہے تو۔" مرد نے کہا جسے زوجہ محترمہ نے کپڑے دھونے والا ڈنڈا پکڑا کے مسلح کر دیا تھا۔ بڑھیا نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے ریوالور نکال لیا۔ "خبردار! کسی کے حلق سے آواز بھی نکلی تو حلق میں ہی انڈیل دوں گا۔" میں نے پنجابی فلموں کے ولن کی طرح آواز کو خطرناک بنا کے کہا۔ بڑھیا کا منہ بند ہو گیا اور وہ پشت سے پیچھے گری مگر جوان عورت نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ جس سے ثابت ہوا کہ وہ بہو ہے۔

"اماں۔" مرد چلایا۔ پھر زاہد خفگی سے بیوی کو دیکھا "دیکھ اماں کو۔۔۔ مر تو نہیں گئیں۔"

"اونہہ۔۔۔ دس مرنے کی دھمکی دیتی ہیں۔۔۔ مرتی کہاں ہیں۔" عورت نے منہ بنا کر کہا اور بڑھیا کو اٹھانے کے لیے بڑھی۔

"تم کیا چاہتے ہو ڈاکو صاحب؟" مرد مجھ سے مخاطب ہوا۔ اس نے ریوالور سے نظریں چراتے ہوئے اپنے جسم کی کپکپی اور آواز کی لرزش پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی "قسم اللہ کی ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"میں ڈاکو نہیں ہوں۔" میں نے کہا "شریف آدمی ہوں۔"

"اچھا!" مرد کچھ لیکار گیا "بہت اگر تم زبردستی مہمان بننا چاہتے ہو تو الگ بات ہے۔۔۔۔"

"میں کسی کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کروں گا۔" میں نے کہا "مجھے تھوڑی دیر کے لیے پناہ چاہیے کیونکہ میرے پیچھے کچھ دشمن لگے ہوئے ہیں۔ ان کے جاتے ہی میں بھی چلا جاؤں گا۔"

"تم وکیل صاحب کے گھر سے ادھر آئے ہو؟" وہی گپ لگا کے وہ بولا۔

"نہیں۔۔۔ میں انہیں نہیں جانتا۔ وہاں بھی ایسے ہی گھسا تھا۔" میں نے کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بعد میں منظر پر کوئی الزام آئے تو ہمسایہ اس کے خلاف ایک گواہ بن جائے۔

"پھر تو تم واقعی شریف آدمی ہو۔" وہ بولا "ابھی میں دروازے سے جھانک رہا تھا اور میں نے پولیس کو آتے دیکھا تھا۔ اگر وہ بھی تمہارے دشمن ہیں تو تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری شرافت ثابت ہے۔"

"اچھا! میں بدمعاش ہوں۔" میں نے جھنجھلا کر کہا "اب تمہاری

www.paksociety.com

خیریت اسی میں ہے کہ جو میں کہوں وہی کرو۔ اپنی بیوی سے کہو کہ سالی کو اندر لے جائے اور اسے فی الحال بے ہوش رہنے دے —— تم آؤ میرے ساتھ چلو — مجھے بتاؤ کہ ضرورت پڑنے پر میں کس طرف سے باہر جا سکتا ہوں؟"

"باہر جانے کا ایک ہی راستہ ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن وہ گلی میں کھلتا ہے اور گلی میں پولیس کھڑی ہے۔"

"پھر میں پولیس کے واپس جانے کا انتظار کروں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔"

"لیکن پولیس یہاں بھی آ سکتی ہے۔ تمھارے ساتھ وہ مجھے بھی پکڑ کر لے جائیں گے۔" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں — وہ تمھارے گھر کا محاصرہ کر سکتے ہیں، اندر نہیں آ سکتے۔" میں نے کہا۔ "ان کے پاس وارنٹ نہیں ہو گا۔"

"آپ کیا بات کرتے ہیں آپ — پولیس کہاں پروا کرتی ہے وارنٹ کی۔" وہ بولا۔

"مگر جو پولیس افسر چھاپا مارنے ... میرا مطلب ہے پولیس کی نفری کے ساتھ آیا ہے وہ بہت اصول پرست اور شریف آدمی ہے۔" میں نے کہا۔ تنومند بیوی اپنی ادھ موئی بہن سالی کو گھسیٹ کے اندر لے گئی۔ زیر لب مجھے اور سالی کو کوستی ہوئی—

"یا اللہ — ایک تو رشتہ ... ہوں ... ایک وہ ... لیلیٰ جیسی ... جیسے فرشتے۔" وہ بولا۔ "... غریب آدمی ... ادھر سے تم ... ادھر سے پولیس — آگے کنواں پیچھے خندق۔"

"اندر چلو۔" میں نے غرّا کر کہا اور وہ لڑکھڑایا اور خاموشی سے میرے آگے اندر چل پڑا۔

"بات سنو جی۔" دروازے کی اوٹ سے خاتون خانہ نے پکار کے کہا۔ میں ان کے شوہر کے ساتھ اندر داخل ہوا اور خاتون نے ... "ذرا ... جی ایک منٹ بات تو کرنے دو ... میاں بیوی کی بات ہے ... ان سے کوئی چیز ... چھپائی ..."

"اچھا۔" میں نے کہا۔ "میں اندر کھڑا ہو جاتا ہوں، جو کہنا ہے آہستہ سے کان میں کہہ دو۔ ویسے میں بھی بہرا ہوں۔"

میں نے کمرے کے ایک گوشے سے میاں بیوی کو زور میں دیکھا اور بیٹی بی بی کو دیکھا جو مسہری نما پلنگ پر سیدھی لیٹی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں لیکن سانس ٹھیک چل رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ بیٹی بی بی مکر کر رہی ہیں اور بے ہوشی کو صرف تحفظ و سلامتی کی خاطر چھتری بنائے لیٹی ہیں۔

"کون سکندر بخت؟" صاحب خانہ نے اچانک بلند آواز میں کہا اور اپنے حق ہونے کا ثبوت دیا۔ بیوی نے دیکھا کہ تیر ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ میں اپنا نام سن کر چونک پڑا تھا اور وہ دونوں مجرم بنے کیسے کھوئے ہوئے تھے۔

"تو مجھے پہچان لیا ہے تمھاری بیوی نے؟" میں نے ...

"وہ ... دیکھیں — یہ عورت ناقص العقل ہے۔" مرد چلانے لگا۔ "بہت چالاک بھی ہے۔ معاف کر دیں اس بے وقوف کو۔"

"بے وقوف تم ہو۔ میں نے حیرت سے ... کی چلانے لگی تھی۔ بیوی نے اخبار میں ... مرد پر ..."

"اب تمھارے بچنے کی صورت نہیں رہی۔" ... سالی کے گھر آیا اور بڑی مہارت کے ساتھ ... ٹیلی وژن خبروں کے ... کی طرح — تم سب جانتے ہو، اخبار میں میری تصویر دیکھ چکے ہو۔ اچھا ہوا مجھے بروقت معلوم ہو گیا ورنہ میں تو ... کے خلاف پولیس کو بیان دیتے۔"

"نہیں نہیں ... قسم اللہ کی — ہم کچھ نہیں کہیں گے کسی سے۔" عورت نے رونا شروع کر دیا۔ اسی وقت انکل رضوی نے ... شروع کیا۔

"سکندر — میں تم کو دس منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ خود گرفتاری کے لیے پیش کر دو۔ تم فرار ہو کے کہیں نہیں جا سکتے۔ ہم نے ہر طرف سے گلی بند کر دی ہے۔" انکل رضوی کی آواز جیسے ... صاف آ رہی تھی ... میرا ذہن صورت حال کی اس ڈرامائی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے ... تھا۔ انکل رضوی کی ... کا اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ... جگہ پناہ لے رکھی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ خانہ تلاشی کا وارنٹ لے آئے ہوں اور منتظر ہوں ... گھر میں داخل ہو ... کے گھر میں میری موجودگی کا یقین نہ ہوتا تو وہ اتنی تیاری ... گرفتار کرنے نہ آتے۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ... کے گھر ... تلاش کرنے کے بعد ناکام ہو کے اس نتیجے پر پہنچے ہوں کہ ... سے ساتھ والے گھر میں اتر گیا — میں کوئی جن بھوت نہیں تھا ... ہو جاؤں یا مکھی بن کے اڑ جاؤں — وہ ذہین آدمی تھے اور ... گھر میں پہنچ کے انھوں نے فرار کے امکانات کا جائزہ لیا ہو گا ... اسی نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ میں اور کہیں نہیں جا سکتا ... نکلنے کا راستہ صرف ایک تھا جو ان کی نظر میں تھا اور وہ جانتے ... کہ میں اس راستے سے باہر نہیں گیا۔ میں ... گیا۔ اگر وہ مجھے مقتول کے گھر سے باہر آتے ... تو ... کے گھر سے نکلنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اگر وہ ... کہ میں ساتھ والے گھر سے نکل آؤں تو مجھے ... ڈالنے کا مطلب میرے لیے صرف شکست نہیں تھا ... جدوجہد کا خاتمہ تھا، میرے تمام مقاصد کی ناکامی تھی ... عزائم سے دستبرداری تھی جو مجھے زندگی سے زیادہ عزیز تھے۔

قانون کے حوالے کر دیتا تو فتح مند وہ شکاری کہلاتے جو مجھے شکار کرنے کے لیے گھیر کر ولایت سے پاکستان لے آئے تھے۔ میرے گرد ... کے جال بچھا رہے تھے تو مجھے ہر طرف سے محصور کرتے ... ابھی تک مقابلہ برابر تھا۔ شکاری خود بھی شکار ہوئے ... ان کے نقصانات بھی کر رہے تھے — ... اپنی متحدہ قوت، اپنی اجتماعی طاقت اور اپنی دولت سے ... جتنا غرور پہلے تھا اتنا اب نہیں ... انھوں نے تو مجھے تنہا جانا تھا اور بہت کمزور حریف سمجھا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ مجھے ... طاقت کے بل پر ... میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کے شکار کر لیں گے۔ جیسے وہ ایک ناتجربہ کار، کمزور اور کم عمر ... وہ ان کی ٹکر کا حریف بن گیا تھا جس کے ہاتھوں انھیں پے در پے ہزیمت کا سامنا تھا۔ یہ کتنی عجیب بات تھی کہ وہ سب ... باپ کو ایک ... کے قتل کرا چکے تھے۔ ان کے جائز وارثوں کی ... اپنا ... ناجائز کاروبار کر رہے تھے اور اپنے ... کے افشا ہونے ... بچنے کے ... قانون کے خوف سے اپنا دامن ... رکھتے تھے —

ان کی نظر میں معزز و معتبر لوگ ... تھے کیونکہ اس نظام ... کے لیے انھوں نے اپنے خلاف ہر ثبوت کو ... کر دیا تھا اور میں جو مظلوم تھا، انصاف چاہتا تھا، اپنا حق مانگتا تھا، آج اس مقام پر تھا جہاں عدالت کی نظر میں میری حیثیت ایک مفرور اور اشتہاری مجرم کی تھی جس کی ... الزامات ... تھے کہ اگر میں اپنا مقدمہ عدالت کے ... کرتا تو اپنے خلاف موجود شہادتوں اور گواہوں کے طفیل ... سزائے موت پاتا۔ حالات آج اس حد تک ... ہو چکے تھے کہ ... بھی ... شکاری بن گئے ... اب ... دشمن ... پولیس ... قانون بھی تھا جو ... سے نظر آنے والے ثبوت اور ... واقعات کی بنا پر مجھے مجرم گردانتا تھا۔ شکاری ... جنھوں نے میری صورت کو دیوار پر ... اور اخبارات میں دیکھا تھا۔ شکاری وہ سب لوگ ... کے ساتھ تھے اور مجھے گرفتار کرانے پر مستعد تھے — ... جانتے تھے کہ حقیقت کیا ہے اور صرف سکندر بخت کا چہرہ ... اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ پولیس کو قتل و خونریزی ... کے متعدد مقدمات میں مطلوب ہے — ... ہو گئے جتنے افراد نہیں ہیں ... نے وزیر خان ... کو ... بنایا اور ... کر دیا۔

یہ صرف نام کی تبدیلی نہیں تھی۔ اس تبدیلی نے حق دار سے حق چھین لیا تھا۔ ملک کو مجبور بنا دیا تھا اور جائز کو ناجائز کر دیا تھا — جو غاصب تھے وہ ظلم و استبداد سے سیاہ کو سفید ثابت کر چکے تھے۔ اب سیاہ و سفید کے مالک تھے اور حق داروں سے چھینا ہوا حق بھی لینا چاہتے تھے۔

انکل رضوی نے نہیں، ایس ایس پی خان رضوی نے ایک مجرم کو دس منٹ کی مہلت دی تھی۔ یہ دس منٹ زندگی اور موت کی سرحدوں کے درمیان ... کی طرح تھے۔ چاہو تو اس حد سے گزر جاؤ جہاں اندھا انصاف میزان عدل لیے تمھارے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کے لیے تیار ہے۔ چاہو تو اس حد سے گزر جاؤ جس کے بعد کوئی نہیں۔ وقت کا ہر لمحہ صدا دے رہا ہے — فیصلہ کر و سکندر! تم اس دنیا کے نظام انصاف کو قبول کرتے ہو تو اس میں تمھیں مجرم سمجھا جائے گا۔ غاصب انصاف لے گا۔ ... کی حق بعد میں ملے گا بشرطیکہ تم ... زندگی پا ... اور تم ثابت بھی کر سکو کہ تم حق دار تھے اور انصاف تمھارے ساتھ ہوا تھا اور بشرطیکہ تم وزیر خان، سلامت شاہ، ... اس کی مقتول بیوی اور بیٹے، ... کی ماں اور ... ان سب کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے پیش کر سکو جو سچ کو جانتے تھے۔ چنانچہ آج اپنی قبروں میں ... منتظر یوم مکافات ہیں۔ مگر کہاں یوم مکافات ... فیصلہ آج کرنا ہے۔ چنانچہ سکندر بخت! تم یہ بھی کر سکتے ہو کہ اس نظام انصاف کو مسترد کر دو۔ ... اپنے شعور اور اپنی سچائی کو ... خود اپنا انصاف حاصل کرنے کے لیے اپنا نظام انصاف بناؤ۔ اپنے ضمیر کو اپنی عدالت جانو اور اس عدالت میں اپنے ضمیر ہی کو منصف کرو۔ تم جانتے ہو مجرم کون ہیں اور ان کی فرد جرم میں کیا کچھ ہے۔ کیا تم ان کو جو سزا دو گے غلط ہو گی؟ وہ اسی کے مستحق ہیں مگر وہ جھوٹ اور مکر و فریب اور ... کے غیر انسانی اور شیطانی لبادے پہنے آج کے ... کی سزا سے محفوظ ہیں اور یوم حساب کی سزا کے خوف سے بیگانہ ہیں۔ قصور انصاف کرنے والوں کا نہیں اور انصاف کا نہیں — اس پورے نظام کا ہے جس میں سارے فیصلے ظاہر کی آنکھ کرتی ہے۔

انکل رضوی قانون کی آواز بن گئے تھے اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔ چیختا چلاتا، فریاد کرتا، بے رحم، سفاک اور خونی وقت، وہی وقت جو دست اجل کے نذرانے لے کر گزر گیا تھا، جو ستم کشوں کا وقت نہ تھا۔ یہ داوروں کا وقت تھا — اندھا وقت جس نے گناہوں کو نہ پہچانا۔ حق سے محروم ہو جانے والوں کا ساتھ نہ دیا۔ اب وہ دل سے انصاف کا اور انتقام کا طلب گار تھا تو عقل سے تقاضا ...

www.paksociety.com

تھا کہ ہر دس منٹ کے بعد سکندر بخت کی مراد پر گڑگڑانے سے پہلے ہتھیار پھینک دوں اور کوئی حق رسی کا شور بپا ہو اور کوئی انصاف نہ مانگوں اور سزا و جزا کو کل پہ اٹھا رکھوں جس کے بعد کوئی کل نہیں۔ ذاتی بھی سارے معمول، اخلاق کے معیار اور قانون کے تمام ضوابط کو بالائے طاق رکھ کے وہی شکاری جنہیں طاقت کا گھمنڈ ہو، جو آج کے حالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کا نام چوہدری دلاور ہو یا سکندر بخت۔ فنا و بقا کی جنگ میں نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میدان جنگ میں اپنے مقابل آنے والے کا صرف ایک نام ہوتا ہے — دشمن — یہ کون پوچھتا ہے کہ تم کون ہو، کس کے بیٹے ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ اس جنگ میں کیوں شریک ہو؟ میرے ہاتھوں کیوں مرنا چاہتے ہو؟ اور مجھے قتل کرنے آئے ہو تو کیوں؟ تمہارے اور میرے درمیان تو اختلاف نہ تھا اور نہ ہوتے۔ حکمران سب سوالات کا جواب مانگے بغیر پہلے گولی چلانے والا زندہ رہتا ہے۔ مانگنے والوں کو جینے کا حق کون دیتا ہے۔ یہ حق تو حاصل کرنا پڑتا ہے۔ وہ جو شکار ہونے والے بات سمجھتے تو اس طرح کسی کے سامنے نہ ہوتے۔

"سکندر — دس منٹ پورے ہونے والے ہیں۔" پھر خاموشی کی آواز آئی۔ "بھائی، ایک منٹ — صرف ایک منٹ اور ہے۔" ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور میرے سامنے وہ میاں بیوی بت بنے کھڑے تھے۔ بے یقینی ان کے اعصاب کو شکست دینے لگی تھی کہ اس ڈرامے کا انجام کیا ہوگا۔ جس کی کاسٹ میں انہیں یوں زبردستی شامل ہونا پڑا تھا کہ وہ خود ہی تماشا تھے اور خود ہی تماشائی۔ بڑھیا دبے دبے ہچکیوں سے مسلسل رو رہی تھی۔

"اے بھائی، خدا کے واسطے کچھ تو جواب دو۔" بالآخر مرد نے ہمت کر کے کہا۔ "یہ لوگ مہلت ختم ہونے کے بعد یہاں اندر گولا پھینک دیں گے۔ گولی مار دیں گے۔"

"اچھا؟" میں نے بے خیالی میں کہا۔ "یہ بتاؤ تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟ فرض کرو مجھے نکلنا ہو۔"

"ہم... ہم کیا کر سکتے ہیں۔ باہر وہ بندوق تانے کھڑے ہیں۔" مرد نے بیوی کی طرف دیکھا جو اب بے ہوش ہونے کی تیاری کر رہی تھی۔ "اندر تم نے ریوالور نکال رکھا ہے۔ میری مال مر جائے گی۔ بچے سکول سے آنے والے ہیں۔"

"میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میں خود کو آسانی سے پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔ اس کشت و خون میں کچھ بھی ہو جائے میں نہیں — مجھے اپنی جان بچانی ہے۔"

"منو جی! اسے ادھر سے نکال دو۔" بیوی نے روتے روتے میاں کے کان میں کچھ کہا۔

میاں نے سر ہلایا۔ "ایک بات ہے... مگر بتا سکتے ہو پہلے کہ تم مشکل سے نکل سکو گے... پیچھے والا کمرہ میرے بھائی کا ہے اور اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے جو پہلے کھلی رہتی تھی مگر پھر ادھر سے ادھر جنگل ہوتا رہتا تھا اس لیے ہم نے بند کرا دی۔ کھڑکی کے تختے کیلوں سے ٹھوک دیے ہیں۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ خوفزدہ مرد نے اٹھ کر چاہا کہ جا کر دروازہ کھول دیا جائے۔ میں نے مرد کو بازو پکڑ کر گھسیٹا۔ آتی رہیں مجھ میں عقل آ گئی تھیں۔ "کدھر ہے وہ کھڑکی؟ تمہارا سالا شور ہنگامہ تو نہیں کرے گا؟" گھر کا دروازہ بج رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ آیا اور مجھے پچھلے حصے میں لے گیا۔

"اپنی بیوی سے کہو دروازے پر جا کے بات کرے۔ کہنا انہیں کچھ دیر روکے..." عورت نے میری بات سمجھ لی اور دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھ کر دروازے کی طرف گئی۔

"میرا سالا اس وقت گھر پر نہیں ہوتا۔" مرد نے کہا۔ "بیوی بچوں کے پاس میکے گیا ہے۔ گھر بند ہوگا۔"

"ادھر باہر جانے کا راستہ ہوگا؟" میں نے کہا اور کھڑکی کو دیکھا جو مشکل سے ڈیڑھ فٹ چوڑی اور دو فٹ اونچی تھی۔ اس میں چوڑائی کے رخ چار چار انچ چوڑی اور آدھا انچ موٹی لکڑی کے تختے جڑے ہوئے تھے۔ دونوں جانب کی دیواروں میں لگی ہوئی کیلوں کے تختے نکالنے کے لیے لوہے کی سلاخ درکار تھی۔ لیکن یہ تختے جدا ہو سکتے تھے۔ جیب میں چاقو کی ضرورت محسوس کر رہا تھا تاکہ کھلنے میں مہارت کا مظاہرہ ہو سکتا۔ کسی بھی ایک ضرب سے دو تختے کمزور کر دیتا تھا۔ ایسے ہی تختوں کو توڑ کے رکھ دیتا تھا اور ان کی تعداد میں اضافہ کرتا جاتا تھا۔ تو کبھی ہاتھ مار کے ہوسٹل میں ایک انگریز طالب علم کی میز توڑ ڈالی تھی اور اس کے شور مچانے پر اسے چیلنج کیا تھا کہ آ رہا ہے، ایک ان میں حکمران قوم کی اکلوتی ہونی کی وجہ سے اس کا غرور بھی توڑ دوں گا۔ وہ مذاق اور تماشے کی بات اس وقت میری صلاحیت کا ثبوت ثابت ہوئی۔ میں نے ایک ہی مکا مار کے تختے توڑ دیے اور صاحب خانہ خشک ہو گیا۔ اس کے ذہن سے یہ خیال دور ہو گیا کہ وہ تختے نہ توڑے جا سکتے تھے۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ میرے لیے اس کی گردن یا پسلیاں توڑنا بھی ہاتھ کا کام ہے۔ لات مارنے پر کھڑکی کے دونوں پٹ کھل گئے اور میں نیم تاریک بند کمرے میں جھانکا۔

"میں جا رہا ہوں لیکن میری ایک بات یاد رکھنا،" میں نے کہا۔ "میں چھت پھاڑ کے بھی آ سکتا ہوں اور..."

www.paksociety.com

کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ تم کو بعد میں پولیس کے سامنے صرف یہ بیان دینا ہے کہ میں تمہاری عدم موجودگی میں اندر آیا تھا چنانچہ تمہیں کچھ معلوم نہیں کہ میں کس طرف سے داخل ہوا تھا۔ باقی سب تم جانتی ہو۔"

"لیکن۔۔۔ یہ کہ چلو کہ تم نے ریوالور نکال کر ہمیں مجبور کیا۔۔۔ کہ ہم فرار میں مدد دیں؟" اس نے کہا۔

"ہاں۔ بالکل یہی کہنا ہے۔" میں نے کھڑکی میں داخل ہو کے کہا۔ "یہ مت کہنا کہ میں اوپر چھت پر گیا تھا اور زینے کے راستے اترا تھا۔ تم نے مجھے نہیں دیکھا چنانچہ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ بیان ذرا بھی مختلف ہوا تو میں سمجھ لوں گا تم سے۔"

پولیس ان کے گھر میں داخل ہو چکی تھی۔ میں نے اُن کے دوڑتے ہوئے قدموں کی صدا سنی اور انکل رضوی کو چلاتے سنا۔ میں نے لپک کر سامنے والا بند دروازہ کھولا اور باہر نکلتے ہی بند کر دیا۔ دو کمروں سے گزر کر میں نے پچھلے دروازے کو باہر سے کنڈی لگائی تاکہ میرے تعاقب میں آنے والوں کو کچھ وقت لگے اور میں اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے نکل جاؤں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ گھر خالی ملا ورنہ یہاں بھی مجھے زبردستی تعاون حاصل کرنا پڑتا۔ گھر کا صدر دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے کھول کر میں نے گلی میں قدم رکھا۔ اسی وقت میرے قریب ایک موٹر سائیکل آ رکی۔ "تم کون ہو؟ ۔۔۔ اور کیا کر رہے تھے؟" موٹر سائیکل والے نے چلانا شروع کر دیا۔ "چور۔۔۔ چور۔۔۔" وہ ایک دم مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ چھ فٹ قد کا صحت مند جوان آدمی تھا۔ اور یقیناً وہی شخص تھا جس کے لیے محترمہ کی اسمگلنگ سے حاصل ہونے والے فوائد کا سرچشمہ یعنی درمیانی دیوار کی کھڑکی کو تختے لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ اس کم بخت کو بھی اسی وقت آنا تھا۔ میں نے خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتے ہوئے سوچا اور مجبوراً اس کو ایک گھونسا جڑ دیا۔ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی میں نے چابیاں چھین کر موٹر سائیکل میں لگا دیں۔ وہ اٹھ کر دوبارہ ایک بار تڑپا کر پھر لپٹ گیا۔ اس کے شور نے بہت سے لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا مگر میری راہ میں حائل ہونے کی غلطی صرف ایک نے کی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل کو اس پر چڑھانے کی دھمکی دے دی۔ وہ چھلانگ لگا کے ایک طرف گرا اور میں نے سڑک پکڑ لی۔ ابھی میں سو گز دور بھی نہیں گیا تھا کہ پہلا فائر ہوا اور گولی نہ جانے کدھر گئی۔ میرے لیے اتنا ہی غنیمت تھا کہ نشانے پر نہیں لگی تھی۔ انکل رضوی نے گھر سے ساتھ والے گھر تک پہنچنے اور چھتوں کی گلی کے نیچے میں تین منٹ بھی نہیں لگائے تھے۔ اگر وہ موٹر سائیکل والا شامت اعمال کے باعث فوراً نہ ہوتا تو میرے لیے علاقے سے نکلنا مشکل ہو جاتا۔ میں نے زیادہ انحصار کسی ٹیکسی یا گاڑی تک نکلنے پر کر رکھا تھا لیکن اس گلی میں کوئی سواری دستیاب نہ تھی۔ موٹر سائیکل نے میری جان بچائی۔

خطرے کی حدود سے نکل کے میں نے دوسرے شہر والی بس سواری کو اطمینان سے چلاتے ہوئے اس نئی صورت حالات پر غور کیا۔ بالآخر گردش فلک نے یہ دن دکھایا تھا کہ میں ایک بار پھر بھاگ نکلا تھا۔ دیتے گئے۔ آج انکل رضوی نے کسی تذبذب اور تامل کے بغیر مجھ پر گولی چلائی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ فائر کرتے ہوئے ان کا ہاتھ ذرا بھی نہیں کانپا ہوگا۔ انہیں ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہ آیا ہوگا کہ میں ان کے مرحوم دوست وزیر خان کا وہ بدنصیب بیٹا ہوں جس کے والدین اور بہن بھائی سب پہلے ہی قتل ہو چکے ہیں۔ ان کو قتل کرنے والے آج دشمن تھے مگر مجھے قتل کرنے کی کوشش کرنے والوں میں آج ایک پولیس افسر بھی شامل ہو گیا تھا۔ جذباتی تعلق کو اور رشتوں کے لحاظ کو فراموش کر کے کیونکہ ان کی نظر میں ایک مفرور اشتہاری مجرم سے سوا میری کوئی حیثیت اہم نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ میرے دشمن کون ہیں۔ مجھے کیسا نقصان پہنچا چکے ہیں اور مجھ سے کیا کچھ چھین چکے ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ ہر ناانصافی میرے ساتھ ہوئی ہے۔ ہر ظلم مجھ پر ہوا ہے اور ہر تیر ستم کا نشانہ میں رہا ہوں لیکن اس کی حیثیت ثانوی تھی۔ وہ میری مدد کر سکتا تھا بشرطیکہ میں عام لوگوں کی طرح اس کے پاس فریادی بن کے پہنچتا اور قانون کی مدد مانگتا۔ اس قانون کی جس کا وہ محافظ تھا لیکن خوب جانتا تھا کہ اس قانون نے وزیر خان کو تحفظ فراہم نہیں کیا تھا۔ اور اس کی پوری فیملی موت سے شروع ہونے والے خونی کھیل میں جتنے بے گناہ ماری جان سے گئے تھے سب قانون پرست اور پرامن شہری تھے لیکن قانون نے کس کے قاتل کا ہاتھ تھاما۔ کس مجرم کی زبان سے جواب مانگا کہ لہو کے چھینٹے تو کسی آستین پر بھی تمام شہر نے دیکھے ہوئے ہیں۔ پھر وہ سب جو داد بے زبانی میں مارے گئے۔ ان کا قصاص کس پر واجب ہے؟ بے گناہوں کی جان کا خون بہا کس سے لیا جائے۔ قانون کے ہاتھ تو بہت لمبے کہلاتے ہیں۔ کس قاتل کی گردن تک پہنچے؟ ہاتھ وہ صاحب رضوی کو بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ قاتل کون ہیں۔ ان سب کے نام پتے اور چہرے معلوم تھے مگر وہ ضوابط کی زنجیر میں جکڑا ہوا۔ سرکاری قوانین کا پابند اور کتابوں میں لکھے ہوئے قانونوں کو واجب الاحترام سمجھنے والا پولیس افسر تھا جو ثبوت اور شہادت کے بغیر کسی کا ہاتھ نہیں تھام سکتا تھا کہ اس کی آستینیں خون آلود ہیں۔ ایک پولیس افسر کی وردی پہن کے خود کو پابند کر لیا تھا کہ وہ دل کی نہیں عقل کی بات مانے گا اور اسی کو حقیقت تسلیم کرے گا جسے آنکھ سے اور ثبوت تسلیم کرے۔

موٹر سائیکل کو ٹوٹے ہاتھ کے کنارے روک کر میں نے جائزہ لیا۔ اسی میں ٹنگی بنیان لی۔ پھر جلدی سے موزے کے نکال لیے اور جیب میں ڈال کر ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ میری جیب میں صرف تین نوٹ تھے۔ ایک دس کا ایک پانچ کا اور ایک روپے والا ایک۔ باقی رقم ۔۔۔ میرے کپڑے اور رابعہ کا دیا ہوا چیک اور دوسرا ریوالور سب اس گاڑی میں تھے جو منظر کے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ گلی میں دو گاڑیاں بھی تھیں چنانچہ یہ گاڑی بالکل محفوظ تھی۔ رضوی صاحب کو یہ شک کیسے ہو سکتا تھا کہ ڈاکٹر امجد بھی میں ہی ہوں۔ اس گاڑی پر تو ڈاکٹروں کا نشان ایک ریڈ کراس تھا اور پیچھے کے ونڈ اسکرین پر یہ چپکا تھا۔ مسئلہ صرف اسے واپس لانے کا تھا۔ میرے فرار کے بعد منظر کے گھر میں کیا ہوا؟ یہ سب منظر، رابعہ یا محسن سے ملے بغیر معلوم نہیں ہو سکتا تھا اور فوری طور پر ان سے رابطہ قائم کرنا انہیں بھی مشکلات میں مبتلا کر سکتا تھا۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے غیر شعوری طور پر میں چوکس رہا۔ اور چور نگاہوں سے یہ دیکھتا رہا کہ کہیں کوئی نظر میرے چہرے پر تو نہیں۔ لیکن لوگ اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ دیواروں پر میری تصویر والے اشتہار ابھی تازہ تھے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ بہت جلد فلموں کے اور دواخانوں کے پوسٹر ان پر غالب آ جائیں گے اور لوگ جو کاروبار حیات میں صرف لمحہ گزراں کو یاد رکھتے ہیں سکنڈ ہینڈ کو بھول جائیں گے۔ اخبار کی تصویر بھی تو صرف چوبیس گھنٹے میں پرانی ہو کے ذہن سے محو ہو جاتی ہیں۔ بلکہ میری صورت میں نظر آتی ہیں اور نئی خبروں میں کسی مفرور مجرم کی خبر بھی دب جاتی ہے۔ کوئی اپنے دماغ میں کمپیوٹر نہیں لیے پھرتا کہ جیسے جیسے نظر آئے ان سیکڑوں تصویروں کو یاد رکھے کہ کون سی تصویر تلاش گمشدہ کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ حادثات اور قتل کی وارداتوں کا شکار ہونے والوں، اہم شخصیات، کبھی امتحان میں اوّل آنے والوں سے کر وظیفے پر بیرون ملک جانے والوں تک اور لاٹری کا انعام پانے والے خوش نصیبوں سے عاق ہونے والے بد نصیبوں تک سب کی تصویریں اخبار کی زینت بنتی ہیں۔ بعد میں کوئی چہرہ محفوظ رہے تب بھی یہ کیسے یاد آئے کہ اس سے منسوب خبر کیا تھی۔ لیکن ابھی بات پرانی نہیں ہوئی تھی چنانچہ مجھے مہلت ملا دینے کی ضرورت تھی۔ تازہ ترین واقعہ کل رات پیش آیا تھا۔ جب ناقابل یقین طور پر ایک عورت نے اخبار کے حوالے سے مجھے شناخت کر لیا تھا۔ ورنہ عورتوں کا اخبار سے تعلق فلم اور فیشن کے صفحات تک محدود رہتا ہے۔ موٹر سائیکل کی چابیاں میں نے اسی پہ رکھ دی تھیں کہ پھر بھاگنا پڑے تو اپنی دو ٹانگوں کے بجائے دو پہیوں پر بھاگوں۔ فیصلہ کسی نتیجے پر پہنچے بغیر خود بخود ہو گیا تھا اور اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یہ فیصلہ غلط نہیں تھا۔ اگر میں شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے انکل رضوی کا حکم مان لیتا اور خود کو قانون کے حوالے کر دیتا تو میرا انجام برا ہوتا۔ انکل رضوی مجھے اپنے گھر نہیں تھانے لے جاتے اور اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے۔ مجھ پر پہلا سنگین الزام تو ۔۔۔ میر فراست علی کے قتل کا تھا۔ جب کہ اب تک مجھ پر دو چشم دید گواہوں کے قتل کا الزام عائد ہو چکا تھا اور اگرچہ اس مقدمے میں عبدل نے مرتے مرتے جو بیان دیا تھا اس سے میری بے گناہی ثابت ہو گئی تھی تاہم عدالت نے باقاعدہ سماعت کے بعد ابھی تک مجھے باعزت طور پر بری کرنے کا فیصلہ صادر نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد میں کسی پیشی پر حاضر نہیں ہوا تھا چنانچہ مقدمہ اصولی طور پر ہنوز زیر سماعت تھا اور مسلسل غیر حاضری کی بنا پر میری ضمانت منسوخ ہو چکی تھی۔ دوسرے قتل کا کیس مقدمہ مجھ پر راولپنڈی کی سیشن کورٹ میں چل رہا تھا اور وہاں سے بھی میرے ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری بہت پہلے جاری ہو چکے تھے۔ ان حالات میں اگر میں خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا تو مجھے خطرناک مجرم قرار دینے کے بعد ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کے رکھا جاتا اور ہر مقدمے کی سماعت پر پیش کرنے کے لیے زبردست گارڈ اور پہرے میں لایا جاتا۔ رابعہ اور منظر کی قانونی قابلیت زیادہ سے زیادہ مجھے سزائے موت سے بچا لیتی یا مجھے شک کا فائدہ مل جاتا۔ لیکن ایک مقدمہ بھی میرے خلاف جاتا تو مجھے عمر قید کی سزا بہرحال ہوتی۔ ہائی کورٹ میں اپیل اور پھر سپریم کورٹ کے فیصلے تک چھ سات سال لگ جاتے

www.paksociety.com

اور یہ تمام وقت میں اور اس زندان کے چھوٹے زنجیر و سلاسل کے ساتھ کاٹ دیتا۔ نہ جانے اس عرصے میں چوہدری دلاور کے چہیتے کی طاقت اور ان کا اثر و رسوخ کتنے مسائل پیدا کرتا اور وہ اپنے وسائل سے کیا انتظام کرتے۔ میں پھر جو شہروں کی دنیا میں رہ کے کسی کے معاملات میں دخل نہ دیتا، جو سکوں سے وہ مجھے پاگل خانے بھجوا سکتے تھے۔ فرار کی کوشش کا الزام لگوا کے مجھے اندر ہی گولی کا نشانہ بنوا سکتے تھے یا دنگے فساد، بغاوت اور شرپسندی کے الزامات کی فہرست کو طول دے کر میرے لیے زندگی کی آخری سانس تک جیل خانے میں رہنے کا انتظام کر سکتے تھے۔ میرے مددگار اور معاون تو سب باہر تھے اور اندر صرف جیل حکام کی چلتی تھی۔

قتل کے ان الزامات کے علاوہ بھی میرے خلاف بہت سی رپورٹیں درج تھیں۔ زیادہ تر لوگوں سے کاریں چھیننے کی۔ پولیس پر حملے اور اُن کے فرائض کی انجام دہی میں مداخلت کی، اغوا اور حبس بے جا میں رکھنے کی۔ بسیں جلا کر دھرنا دینے کی اور مختلف مواقع پر مار پیٹ کی۔ اس کے علاوہ پولیس کے ریکارڈ پر باضابطہ طور پر جعلی کرنسی و فسادات کے تحت مقدمات درج تھے اُن کی صحیح تعداد خود مجھے بھی معلوم نہیں تھی۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کی کوششوں کے طفیل بلاشبہ میں قانون کے شکنجے میں اس طرح جکڑا جا چکا تھا کہ قانونی طور پر اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اگر میں قانون کے چکر میں پڑ جاتا تو [illegible] انجام وہی ہوتا جو یہ شکاری چاہتے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں تو کامیاب رہے تھے کیونکہ ہر منصب انصاف، جرم ثابت کرنے کے باوجود [illegible] کہ وہ کسی مشکل سے سامنے آتا تو دشمنی کرنے کے باوجود اور وزیر خان کے علاوہ میر شرافت علی اور کریم سے لے کر ایک درجن سے زیادہ بے گناہوں کے قاتل ہونے کے باوجود وہ قانونی طور پر بالکل محفوظ تھے۔ جس شخص سے اُن کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا وہ خود اپنے ہی جال میں گرفتار ہو چکا تھا اور روپوشی پر مجبور تھا۔

ان حالات میں میرے لیے بس ایک راستہ رہ جاتا تھا جو میں نے منتخب کیا۔ اگر قانون مجھے معاف نہیں کر سکتا تھا تو میں ان سب کو کیسے معاف کر سکتا تھا جو میرے تمام مصائب کے ذمہ دار تھے۔ بہت پہلے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ انہیں سزا ضرور ملے گی۔ اس شکارگاہ میں وہ اکیلے ہی شکاری نہیں اور میں وہ شکار نہیں جو خود نشانے پر آ بیٹھے۔ میں عملی طور پر ان کو سمجھا چکا تھا کہ شکاری میں بھی تھا اور میرا شکار وہ سب تھے جو وزیر خان کو کاروبار سے بے دخل کرنے کے لیے عزت اور املاک، ذلت و رسوائی اور بیماری و کس مپرسی کے عالم میں ہلاک کرنے کے بعد اب بے دھڑک کسی خطرناک اور ناجائز دھندے کو پھیلانے جا رہے

تھے۔ انہوں نے تو بار بار کے ذریعے مجھے حق وراثت سے محروم کرنا چاہا تھا۔ مگر میری مزاحمت کی قوت بڑھتی گئی تھی اور اس جنگ میں دونوں طرف کے لوگ مارے گئے تھے۔ چوہدری دلاور کے ساتھی تو اُن کے کارندے جرائم پیشہ لوگ اور زرخرید ملازم تھے مگر میرے لیے جان دینے والوں میں صرف وہ تھے جو حق کو تسلیم کرتے تھے، سچ بولنا جانتے تھے، خلوص کے جذبات رکھتے تھے اور وفاداری کی وضع داری کے قائل تھے۔ ان سب کا لہو مجھ پر قرض تھا۔ میرے لیے ممکن تھا کہ میں ان سب کے قاتلوں کو [illegible] دیتا۔ انہوں نے قانون سے تحفظ حاصل کر لیا تھا مگر مجھے ان کے تمام جرائم کا اتنا ہی یقین تھا جتنا اپنے وجود کا۔ [illegible] میرے ایمان کی طرح راسخ تھا۔ اگر میں اُن کو چھوڑ دیتا تو صداقت سے روگردانی کرتا۔ اور ضمیر کی قید سے فرار ہو کے کہاں جا سکتا تھا۔ یہ میرا فرض تھا کہ میں مجرموں کو وہ سزا دوں جس کے وہ مستحق [illegible] آنکھ کے بدلے آنکھ اور جان کے بدلے جان لینے کی اجازت [illegible] دینے سے تو مجھے دنیاوی قانون کی موشگافیوں نے [illegible] خود ہی پولیس ہوں، خود ہی وکیل استغاثہ، خود ہی منصف، خود ہی جیلر۔ فردِ جرم عائد کر کے سزا پر عمل درآمد تک ہر مرحلہ مجھے اکیلے سر کرنا تھا۔ اور یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ [illegible] آزادی تو حاصل تھی کہ میں بے خوف و خطر جہاں چاہوں جا سکوں لیکن اب میرے لیے روپوش رہنا شرطِ اول تھا۔ اس کے بغیر میرا پہلا قدم ہی آخری قدم ہوتا۔ میرے [illegible] تھے۔ دوسری طرف پولیس کو میری جستجو تھی تو تیسری طرف شان رضوی اور اکرم شیخ جیسے اصول پرست لوگ تھے جو قانون کو ترجیح دیتے تھے اور اُن کے ساتھ وہ سب تھے جو [illegible] تھے۔ اور مجرم کو قانون کے حوالے کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ میرے تین طرف شکاری تھے اور میرے [illegible] جمال، محسن اور رابعہ جیسے سہارے تھے [illegible] یہ سب ایسے لوگ تھے جو صرف [illegible] کوئی سروکار نہ تھا کہ میں مجرم ہوں یا بے گناہ، اچھا ہوں یا برا اور جو کچھ کر رہا ہوں وہ غلط ہے یا صحیح۔

چائے کی پیالی میرے سامنے رکھی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور یہ کوئی فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ نہیں تھا جہاں کے مؤدب ویٹرز [illegible] پیالی کو گھورتا ہے تو [illegible] کچھ نہیں کہتے۔

"اور کچھ چاہیے صاحب؟" ایک ویٹر نے [illegible] ٹرے میں [illegible] سوال کیا۔

میں چونکا۔ "ہاں۔ میرا خیال ہے کھانا لے آؤ۔ کیا پکا ہے؟"

[illegible] ویٹر نے فرفر مینو سنانا شروع کیا۔ بمشکل تمام میں نے اس کی زبان ایکسپریس کو آگے بڑھنے سے روکا۔ کھانے کے دوران میں سوچتا رہا کہ اب رابعہ یا محسن سے کیسے رابطہ قائم ہو؟ رضوی صاحب نے یقیناً منظر کے ٹیلی فون کو [illegible] پر لگا دیا ہوگا۔ تمام گفتگو ٹیپ ہو جاتی۔ رضوی صاحب کے گھر [illegible] کی پوزیشن بھی ایسی ہی تھی کہ میں آواز بدل کے کسی [illegible] سے بھی کال کرتا تو میرا پیغام ریکارڈ ہو جاتا۔ اور ان دونوں سے [illegible] ملاقات [illegible] پولیس پہنچ جاتی۔ سادہ کپڑوں میں [illegible] کی بات یہ تھی کہ رضوی صاحب اچانک منظر کے گھر چھاپا [illegible] تھے۔ وہ قانونی کارروائی پوری کر کے آئے تھے۔ انہیں کس نے اطلاع دی کہ میں منظر کے گھر میں موجود ہوں گا۔ اس سوال کا ایک جواب تو یہی ہو سکتا تھا کہ رضوی صاحب کو مخبری کی گئی اور مخبر ان کے [illegible] اتنا معتمد تھا کہ انہوں نے پورے وثوق کے ساتھ کامیاب [illegible] لیکن اس مخبری کا ذمہ دار کون تھا یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا۔ زیادہ قرینِ قیاس یہ بات لگتی تھی کہ رضوی صاحب نے [illegible] اور محسن کے پیچھے اپنے آدمی لگا رکھے تھے جو ہر جگہ اور ہر وقت ان کی نگرانی کرتے تھے۔ رضوی صاحب کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ کبھی نہ کبھی ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ تو رابطہ ضرور قائم کروں گا۔ [illegible] رضوی صاحب [illegible] فرشتوں [illegible] محسن [illegible] کہاں پہنچے ہیں [illegible] میری موجودگی کی تصدیق بھی کر لی ہو [illegible] باہر [illegible] اندر جھانک کر بھی دیکھ لیا ہو۔

اس کا مطلب یہ بھی نکلتا تھا کہ اب رابعہ اور محسن زیرِ [illegible] ہیں۔ ان پر کسی مجرم کو چھپانے کا جرم تو ثابت نہیں ہوتا مگر رضوی صاحب جانتے تھے کہ [illegible] مفرور [illegible] مجرم [illegible] وزیر خان کا [illegible] رابطہ قائم ہے لیکن وہ قانون سے [illegible] تعاون کر رہے ہیں [illegible] منظر بھی [illegible] وکیل تھا اور رضوی صاحب مجھے اس کے [illegible] کوئی قانونی کارروائی نہیں کر [illegible] تھے۔ رابعہ بھی آسانی سے [illegible] نہیں تھی اور محسن کو [illegible] علاوہ اپنے والد کی [illegible] حاصل تھی [illegible] رضوی صاحب [illegible] تجربہ [illegible] ان حالات میں [illegible] محسن کا رضوی صاحب [illegible] گھر [illegible] مشکل [illegible] رضوی صاحب جیسے پولیس [illegible] دوستی اور محبت کا حق ادا کریں۔

بہت سوچنے کے بعد مجھے نادر کا خیال آیا۔ ایک مسئلہ تو آسان ہو گیا اور کھانا ادھورا چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ بل کاؤنٹر پر چھوڑ کے میں باہر نکلا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ چوری کی یہ سواری کام تو آ رہی تھی مگر اس سے خطرہ زیادہ ہو جاتا تھا۔ کہ ایک ترین مجرم اور پھر شہر میں دندناتا پھرے چوری کی موٹر سائیکل پر، گویا [illegible] اور نیم چڑھا۔ ہزاروں افراد پر مشتمل پولیس اور خفیہ پولیس، سی آئی اے اور ایف آئی اے جیسے متعدد اداروں کی ساری نفری کے لیے ڈوب مرنے کا مقام۔ تاہم میں یہ جانتا تھا کہ چوری کی رپورٹ درج ہونے سے گشت ہونے تک سارا عمل کس رفتار سے ہوتا ہے۔ ابھی چند گھنٹے کوئی مجھے تو پکڑ سکتا تھا، موٹر سائیکل کو نہیں۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے موٹر سائیکل کے ٹول بکس میں سے ایک پیچ کس نکالا اور آگے پیچھے کی نمبر پلیٹ اتار دی۔ [illegible] شکل بنا کے میں سیکڑوں [illegible] نمبر پلیٹ بنانے والوں کے پاس گیا اور انہیں نمبر پلیٹوں کے چوری ہونے کی افسوس ناک کہانی سنائی۔ میری درخواست پر ایک عظیم پینٹر نے تین کی دو پلیٹوں پر [illegible] سے فرضی نمبر لکھے اور مجھ سے [illegible] روپے قبول کیے جو میری جیب میں تھے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے چالان سے بچا لیا۔ میں چلنے ہی والا تھا کہ میری نظر تین افراد پر گئی جو مجھ سے بہت قریب فٹ پاتھ پر کھڑے بحث کر رہے تھے۔ وہ سب تالوں کی چابیاں بنانے والے اور نمبر پلیٹ لکھنے والے لوگ تھے۔

"[illegible]" [illegible]

دوستوں نے مخالفت کی [illegible]
قسمت نے ہاتھ [illegible]
دشمن نہ ناچنے جائے گا

میں فوراً سمجھ گیا کہ ان کے اتفاق رائے سے قبل مجھے نو دو گیارہ ہو جانا چاہیے۔ ابھی تک تین میں سے صرف ایک ووٹ قانونی چارہ جوئی کے خلاف تھا مگر وہی مجھے پکڑنے کے لیے کافی تھے۔ بڑی پھرتی سے میں نے موٹر سائیکل کا رخ پلٹا اور گرتے گرتے بچا۔ معلوم نہیں کس نے چلا کے مجھے پکڑنے کے لیے کہا لیکن میں آنی کی آنی میں ہوا ہو گیا تھا۔ وہاں موٹر سائیکلوں کی کمی نہیں تھی اور وہ سب جو لاک ٹھیک کر رہے تھے تعاون کے جذبے کا مظاہرہ کرتے تو کئی شہسوار سڑکوں پر نکل آتے اور جو زیادہ جیالے ہوتے یا زیادہ طاقتور موٹر سائیکل کے مالک ہوتے وہ یقیناً ایک سنسنی خیز مقابلے کے بعد مجھے آ لیتے۔ پھر میں اس کے سوا کیا کرتا کہ ایک دو کو ناک آؤٹ کر دوں یا ہوا میں فائر کر دوں اور سب کی [illegible] کے نکل جاؤں۔ میں موٹر سائیکل چلانے کے معاملے میں مہارت کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میں نے [illegible] روڈ پر گھومتے ہی موٹر سائیکل کو ایک سنسنی [illegible]

www.paksociety.com

موٹر سائیکلوں کی صف میں کھڑا کیا اور خود ٹیلیفون بوتھ میں گھس گیا۔

"وہ ٹیلیفون ہے کہ مجھے ایک کال کرنی تھی"۔ میں نے کرسی کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

منیجر کا چہرہ بگڑ گیا۔ "یہ کوئی پبلک کال آفس نہیں ہے جناب۔"

اس نے میری بے تکلفی کے جواب میں رکھائی سے کہا۔

"اچھا۔ لیکن وہ اکرام شیخ نے تو کہا تھا کہ یہاں سے فون کر لینا۔ میں اس کی بات کر رہا ہوں۔ آپ نہیں جانتے انہیں؟"

"کیا نمبر ہے؟" منیجر نے چند سیکنڈ مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔

میں نے اسے نمبر بتا دیا جو اس نے خود ڈائل کیا۔

"یہ لیں۔ اکرام شیخ صاحب کا گھر ہے۔ آپ نے پوچھا تھا۔ لیجیے۔ بات کریں۔" اس نے کچھ خفیف ہو کے ریسیور مجھے تھما دیا۔

"کوئی خاتون ہیں۔"

"ہیلو۔ کون ہو... نازو۔" میں نے بشاشت سے کہا۔

"دلہنی میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔"

حسب توقع ذہنی صدمے نے اسے کچھ دیر کے لیے مفلوج کر دیا۔

میں ریسیور سے کان لگائے مسکراتا رہا۔ "تم... تم واقعی... سکندر ہو؟ کہاں ہو اس وقت؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کیا بتائیں جی، ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی... کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔ تم کو جاننی ہی ہو۔ تمہارے بھیا کہاں ہیں۔ وہ ڈیوٹی پہ گیا یا گھر پر ہے؟"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ ریسیور انھوں نے نہیں اٹھایا۔" وہ بولی۔

"دوسرے کمرے میں ہیں۔ جلدی سے بتاؤ کیا بات ہے؟"

"آج عجیب اتفاق ہوا۔" میں نے یوں کہا کہ منیجر کو کسی قسم کا شک نہ ہو۔ "میں اپنے دوست عبدالودود منظر کے گھر میں تھا۔ وہ ایڈووکیٹ ہیں نا۔ وہاں محسن بھی تھا۔ اچانک اپنے انکل ایس ایس پی صاحب آ گئے۔ ہاں انکل ضامن رضوی۔ ساتھ لے جانے پر مصر تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔ تم تو جانتی ہو، وہ جیسے آدمی ہیں۔"

"میں کچھ نہیں سمجھی۔" نازو بولی۔ "وہ تمہیں گرفتار کرنے پہنچے تھے اور تم پھر فرار ہو گئے۔"

"ہاں۔ اب ایسا ہے کہ فوری طور پر تو میں تمہارے گھر نہیں آ سکتا۔" میں نے کہا۔ "تم آ سکتی ہو۔"

"کہاں؟ جلدی سے بتاؤ۔ بھائی جان آ رہے ہیں شاید۔" اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

"شالیمار باغ کے گیٹ پر۔" میں نے کہا اور دوسری طرف سے ریسیور رکھے جانے کی آواز سنی۔ لائن کٹ گئی۔

منیجر اب مسکرا رہا تھا۔ اس نے یہ تجزیہ اخذ کیا تھا کہ معاملہ کچھ عاشقانہ ہے جو کچھ غلط نہ تھا لیکن ایس ایس پی ضامن رضوی کو انکل کہنے والا مگر کسی ایس ایس پی کی بہن کو بغرض ملاقات شالیمار بلا رہا تو اعتراض وہ کرے جسے قبول نہ کرنا مقصود ہو۔ منیجر نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور کچھ معذرت بھی کی۔ میں باہر نکلا تو بے چین تھا۔ اگر میرے تعاقب میں کوئی نکلا تھا تو بہت آگے نکل گیا تھا یا شاید دنیا کے گول ہونے کا ثبوت پیش کرنے کے لیے پھر وہیں آ گیا تھا جہاں سے چلا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل نکالی تو اس کا لاک والا لیور ٹوٹا ہوا تھا۔

"پولیس چاہیے ہیں بابو جی! نظر نہیں آ رہی ہیں؟" انہوں نے کہا۔ "ایک سو دو روپیہ۔"

"وہ کس بات کا؟" میں نے کہا۔ منیجر صاحب سکرا کر بولے۔ "آپ جس ٹیلیفون سے ایک سو دو روپیہ بیٹھتے ہیں تم تو جا کر جا کے ان سے مانگ لو۔ کہتا وہ صاحب جو ابھی فون کر رہے تھے... لوکل کال ہو کے نوٹ کیا تھا اور یہ بات انتہائی..."

میرے پاس ایک سو دو روپیہ ہوتا تو میں منیجر کے منہ پر مار دیتا۔ خطرہ کیوں مول لیتا۔ کسی پبلک کال آفس سے بات نہ کرتا۔ جیب میں نہ ہوتا تو نازو سے شالیمار باغ کے دروازے پر ملنے کی بجائے کسی ریسٹورنٹ میں نہ بلاتا۔

بیس منٹ بعد میں نے شالیمار باغ کے مقابل ایک درخت کی اوٹ میں موٹر سائیکل کھڑی کی۔ مجھے سگریٹ کی سخت طلب تھی لیکن میری جیب میں ایک پیسہ تک نہ تھا۔ خیر نازو آئے گی تو اس کے پاس تھوڑی بہت رقم ضرور ہو گی۔ اصل مسئلہ تو کسی ٹھکانے کا تھا۔ وہ بھی حل ہو گا اور نازو ناصر ہی کے ذریعے حل ہو گا۔ وہ موزوں ترین انتخاب ہے۔ اس پر کوئی شک کر ہی نہیں سکتا۔ وہ میری آلۂ کار رہتی ہے مجھے تھوڑی سی شرم بھی آئی کہ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر اس نوعمر لڑکی کے جذبات کی...

بے وقوف بنانا چاہتا ہوں جو یک طرفہ طور پر میرے عشق میں دیوانی ہے کہ میری خاطر آنکھیں بند کر کے اندھے کنوئیں میں کود... اب تک میں نے بڑے خلوص اور عزت کے ساتھ اس کی... تھی مگر آج میں مجبور تھا اور میری مدد صرف وہی کر سکتی تھی۔

ہاتھ بلند ہے تھکتا رہا اور شالیمار باغ کے دروازے پر بس سے اترنے والے چہرے دیکھتا رہا۔ گھڑی کی سوئیاں ہمیشہ کی طرح... کا فاصلہ پانچ منٹ میں پھر دس منٹ میں... طے کر رہی تھیں۔ ٹیلی فون پر آخری بات کیے ہوئے ایک گھنٹہ کتنا لمبا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ... اور میں نے دور سے ہونے کے باوجود نازو کو پہچان لیا۔

وہ آٹو رکشہ سے اتر کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل اس کے پاس روکی۔ "بیٹھو۔" میں نے کہا۔ "دیر مت کرو۔" گولی مار دو...

یہ نوٹ ہاتھ میں پکڑے ڈرائیور نے مجھے بڑی شجرہ بھیجا۔ سگریٹ پہ نہیں تھا کوئی لیسنس نہیں تھا۔ لڑکی بے خوف اور جھجک موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی تھی۔

"وہ نہیں کیا افراتفری ہے۔" نازو نے سنبھلنے کے لیے میرے کندھوں کو مضبوطی سے تھام لیا تھا کیونکہ میں نے موٹر سائیکل کو ایک جھٹکے سے اسٹارٹ کیا تھا اور رفتار ایک دم بڑھا دی تھی۔

"تم ایک مفرور اشتہاری مجرم کے ساتھ فرار ہو رہی ہو لڑکی!" میں نے کہا۔ "اور وہ بھی چوری کی موٹر سائیکل پر۔ ایک تھانیدار کی بہن ہو کر یہ بہت غلط بات ہے۔ وہ تمہارے پیچھے تو نہیں لگے تھے نا؟"

"معلوم نہیں۔" نازو نے کہا۔ "جرح کر رہے تھے کہ کس کا فون تھا۔ کیوں آیا ہوا ہے؟ اچھا ہوا ابھی تم نہیں ملے ورنہ میں نے ثابت کر دی کہ تم نگ کر رہے ہیں۔ میری سہیلی نے فون کیا تھا۔"

"اچھا سہیلی! ذرا جیب سے پانچ کا نوٹ تو نکالو۔" میں نے کہا۔

"اوئی دلا قوة... ابھی تمہاری جیب نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

میں موٹر سائیکل کو پچھلے راستے پہ لا کر چکا تھا۔ اب اس کی ویران سڑک پہ ہی ہوا تیز تھی... سے نکالی میں نے پلٹ کر اور میں قیدی رہ گئے تھے۔

نازو ہنسی اور اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ "پانچ کا نوٹ نکال کے کرو سہیلی؟" وہ بیگ کھول کر بولی۔

میں نے موٹر سائیکل روک دی۔ "سگریٹ چلاؤ۔ اپنی سہیلی کو جلدی سے جاکے ایک ڈبیا کیپسٹن اور ماچس لا دو۔"

نازو نے مجھے حیرانی سے دیکھا اور ایک درخت کے پیچھے بیٹھے دکاندار سے سگریٹ اور ماچس لینے اتری۔ ابھی اس نے ایک قدم آگے نہیں بڑھایا تھا کہ میری نظر نے پیچھے سے نمودار ہونے والے اسکوٹر کو دیکھ لیا جس پر اکرام شیخ سوار تھا۔ میں نے چلا کر نازو کو پھر سے روکا اور ابھی وہ ٹھیک سے بیٹھی بھی نہ تھی کہ موٹر سائیکل دوڑا دی۔ اکرام شیخ نے مجھے آواز دی اور رکنے کو کہا مگر میں پیچھے دیکھے بغیر چلتا رہا۔ میری رفتار ستر میل سے تجاوز کر گئی۔

"سکندر... تم بھاگ نہیں سکتے۔ رک جاؤ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔" اکرام شیخ نے چیخ کر کہا۔ اسکوٹر اچھی رفتار پہ اس کے قابو میں تھا لیکن موٹر سائیکل کی رفتار میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا اور اسکوٹر پیچھے ہو رہا تھا۔

"رک جاؤ نہیں سکندر۔" نازو نے ہذیانی لہجے میں چلائی۔ "وہ گولی چلا سکتے ہیں۔ پیچھے مت ہٹو۔"

"مجھے تم جھوٹ بول رہی ہو۔ بے وقوف لڑکی! بیٹھی رہو۔" میں نے کہا۔ اسی وقت نازو نے چیخ ماری اور مجھے جھٹکے سے لگا کہ وہ گر گئی۔ "کیا میں تمہارے بھائی کو نہیں جانتا؟"

میرا خیال تھا کہ نازو اچانک بریک لگانے سے مجھ پر گری ہے لیکن ابھی بات ختم ہونے سے پہلے ہی فائر کی آواز سنی۔ آواز کے مقابلے میں تیز سفر کرنے والی گولی اس سے پہلے ہی نازو کے وجود میں پیوست ہو چکی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل روکی تو وہ پھسل کر نیچے گر گئی اور میں نے اس کی پشت پر زرد ریشمی قمیص کے چاک سے پھوٹنے والی لہو کی سرخی کو دیکھا جو تیزی سے پھیل رہی تھی۔ دوسرے لمحے اسکوٹر میرے سامنے آ رکا اور میں نے ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ چھلانگ لگائی۔ اکرام شیخ اس کے لیے تیار تھا چنانچہ اسکوٹر کے رکنے سے پہلے ہی وہ کود کر الگ ہو گیا تھا۔ اس کا اسکوٹر میری موٹر سائیکل کے پاس جا لیٹا تھا اور اس کا پچھلا پہیہ ابھی تک گھوم رہا تھا۔ اکرام شیخ نے جست لگا کے خود کو بچا لیا۔ پیچھے گرا اور الٹی قلابازی کھا کے بڑی پھرتی سے پھر کھڑا ہو گیا۔ ریوالور بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ "رک جاؤ... وہیں ٹھہر جاؤ سکندر۔ میں اپنی بہن کو گولی مار سکتا ہوں تو تم کو بھی مار سکتا ہوں۔" اس نے چیخ کر کہا۔ میں پاگل ہو رہا تھا لیکن اسے دیکھ کر میرے قدم رک گئے۔ اس کی حالت مجھ سے زیادہ ابتر تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے خوف آ رہا۔ وہ اکرام شیخ کا نہیں کسی جنونی کا چہرہ تھا۔ اس کی آنکھیں دہکتے انگارے تھیں اور اس کی صورت پر وحشت عیاں تھی۔ زمین پر گر کے اٹھنے سے اس کے بالوں میں خس و خاشاک بکھر گئے تھے اور منہ پر گرد...

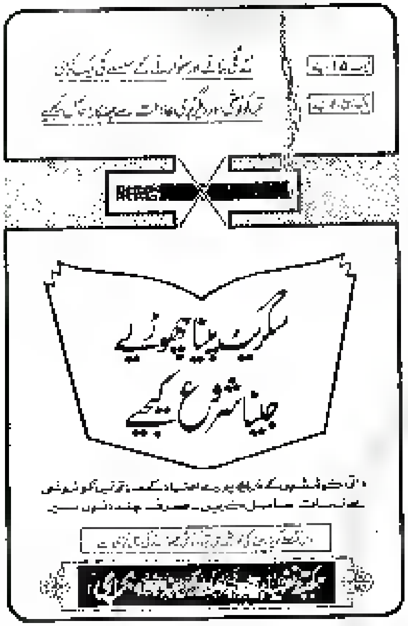

www.paksociety.com

جم گئی تھی۔ وہ کسی زخمی درندے کی طرح ہانپ رہا تھا۔
"اس کی جان بھی لے لی تم نے!" وہ چلایا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس کی آواز ہی نہیں، اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے ہیں۔ "اور کتنی زندگیوں کا خدا بنو گے آخر؟ بس کس کس کو اپنے انتقام کی آگ میں جھونکو گے؟ کوئی حد ہے تمہاری درندگی کی؟ وہ تھا تو ایک باپ مرا تھا... اس کی خاطر تم نے کتنے گھر اجاڑ دیئے ہیں اب تک؟ کیا سلامت شاہ، فوماجو اور غلام علی زیدار اور میر محمد باپ نہیں تھے۔ عبدل کی ماں، شملا کی ماں اور رابعہ کی ماں کسی بیٹی کی ماں سے کم تھیں؟ آج تم نے بھائی کے ہاتھوں بہن کے خون کی لالی بھی دیکھ لی۔" میری زبان گنگ ہو چکی تھی۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے بیٹھ گیا۔ میں نے نازو کو سیدھا کیا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن سانس چل رہی تھی۔ گولی اس کے شانے پر ذرا نیچے لگی تھی۔
"اسے ہسپتال لے چلیں۔ نازو بچ جائے گی اکرام شیخ!" میں نے کہا۔
اکرام شیخ نے نفی میں سر ہلایا۔ "اب یہ مر بھی گئی تو کیا؟ پہلے میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ تم فرار ہو گئے تو میں اس لڑکی کے ماں باپ کو کیا جواب دوں گا کہ اسے مار کے میں نے کیا پایا۔ اسے تو ایک دن گھر سے جانا ہی تھا سسرال نہ سہی قبرستان سہی۔ ماں باپ کو یہ اطمینان تو رہے گا کہ اس کی جان بلاوجہ نہیں لی گئی۔ میں نے سب کچھ سنتے سنتے مند کی توقع ہو کہ...." انتہائی ضبط اور حوصلے سے کام لینے کے باوجود اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔
"میں وعدہ کرتا ہوں شیخ! کہ اسپتال پہنچنے کے بعد خود کو..." میں نے کہا لیکن میرا جملہ نامکمل رہ گیا۔ میرے الفاظ پر اعتبار کرتے ہوئے شیخ نے ریوالور نیچے کر لیا تھا اور آہستہ سے اقرار میں سر بھی ہلایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں جھوٹ بول کر جان بچانے والے بزدلوں میں سے نہیں ہوں اور اگر میں نے وعدہ کیا ہے تو اب جان دے کر بھی الفاظ کی حرمت کا پاس کروں گا۔ مگر نازو نے بڑی پھرتی سے اٹھ کے ہاتھ مارا اور اکرام شیخ کے ہاتھ سے ریوالور اڑ کر میرے قدموں میں آ گرا۔ دوسرے لمحے نازو نے بھائی کی کلائی تھام کے جھٹکا دیا اور گھٹنا اوپر اٹھایا۔ اکرام شیخ تھوڑا سا اوپر اچھلا اور پانچ گز دور جا لیٹا۔ میں دم بخود کھڑا رہ گیا۔
"ریوالور اٹھا لو سکندر۔ اور بھاگو!" نازو نے کراہ کے کہا اور پھر نیچے گر گئی۔ میں ایک دم ہوش میں آ گیا اور میں نے اکرام شیخ کا ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ نازو نے جوڈو کی تھوڑی بہت مہارت کا استعمال بڑی کامیابی کے ساتھ کیا تھا لیکن اس سے زیادہ جرأت کا مظاہرہ اس نے حاضر دماغی اور قوت برداشت کا کیا تھا۔ اس نے ٹھیک وقت پر اندازہ کر لیا تھا کہ اولاً فرض کی راہ میں حائل ہوتے والی اکلوتی بہن کا محافظ کرنے والا بھائی مجھے کوئی رعایت نہیں دے گا۔ وہ مجھے گرفتار نہ کر سکا تو گولی مار دے گا اور نازو بھی بچ نہ سکے گی۔ جب میں نے موٹر سائیکل روکی تو وہ جان لڑا کے اپنی سہی گری جیسے بے ہوش ہو۔ اسے یقین تھا کہ تقدیر اسے ایک موقع فراہم کرے گی جب اس کی مدد سے میں جان بچا کے نکل سکوں گا۔ اس کا خون بہتا رہا لیکن اس لمحے کے انتظار میں وہ ہوش و حواس بحال رکھنے کی جدوجہد کرتی رہی۔ نازو جیسی نازک اور دھان پان لڑکی کے لیے اتنا خون ضائع ہو جانے کے باوجود جسم کی طاقت ضائع نہ ہونے دینا فقط قوت ارادی کا کمال تھا۔ اور جیسے کوئی سیدھ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اپنے سے چار گنا لمبے چوڑے طاقتور مردوں کو نازک نظر آنے والے ہاتھوں کے ایک جھٹکے سے چت کر سکتی ہے۔ ایسے ہی اکرام شیخ اور میں یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس حالت میں وہ بجلی کی طرح تڑپ کے جیت کا پانسہ پلٹ سکتی ہے۔ اس نے اپنی جسمانی قوت کو اکٹھا کر کے سنبھلنے رکھا اور جب وہ لمحہ آیا جس کا اسے انتظار تھا تو وہ ساری توانائی مجتمع کر کے بے خطر آتش نمرود میں کود گئی۔ اکرام شیخ اپنے فرض کی خاطر جان دے بھی سکتا تھا اور لے بھی سکتا تھا تو نازو بھی اس سے کم نہ تھی۔ وہ محبت کی خاطر جان کی بازی لگا کے بھائی کا راستہ روک سکتی تھی اور نتائج کی پروا کیے بغیر موت سے نبرد آزما تھی۔ جو گولی میرے جسم کا نشانہ لے کر چلی تھی اسے نازو نے ڈھال بن کے اپنے وجود میں سمیٹ لیا تھا۔
"مجھے... مجھے چھوڑ دو... چھوڑ دو مجھے سکندر!" اس نے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا اور اپنے کمزور ہاتھوں سے دھکیلا۔ "جاؤ تمہیں رابعہ کی قسم۔"
"میں اس حال میں تم کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا نازو!" میں نے کہا۔ اس کے الفاظ آگ کے تیر بن کے میرے دل میں اتر گئے تھے۔ اس وقت بھی مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی۔ اس نے مجھے اپنی قسم نہیں دی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں اسے کتنی محبت کرتا ہوں۔ اس نے مجھے اپنی محبت کی خاطر پر مجبور کرنا چاہا تھا۔
"اکرام شیخ! دیکھو۔ نازو کا زخم گہرا ہے لیکن ابھی شاید بچ جائے۔" میں نے کہا۔ "اگر دل تنگ نہیں ہو چکا تو شاید ہم کسی طرح نازو کی جان بچا لیں۔" اکرام شیخ آہستہ آہستہ آگے آیا اور گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "یہ تو نے کیا کیا پاگل! مجھے بہن کا دکھ..." اس نے نازو کا ہاتھ تھاما اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "بیٹا... روتا نہیں... تمہیں تو فخر ہونا چاہیے۔" آخر میں بہن کسی کی ہوں۔" نازو زبردستی مسکرائی۔ جیسے اکرام شیخ نے اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ "ٹھہرو بھیا! صرف ایک منٹ کی مہلت... لے دو... مجھے... مجھے کچھ کہنا ہے... تمہارے سامنے نہیں... اور دیکھو... وعدہ کرو آگے جانے دو گے... میری قسم تمہیں۔"
اکرام شیخ نے میری طرف دیکھا اور اس وقت مجھے اس کی آنکھوں میں نفرت کے الاؤ سلگتے دکھائی دیے لیکن بے بسی، غم اور پچھتاوے کے جذبات موجزن نظر آتے تھے۔ پھر اس نے آہستہ سے نازو کو زمین پر رکھ دیا۔ اپنے خون میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا اور چند قدم دور جا کے میری طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا۔
"وقت ضائع مت کرو نازو!" میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
"ابھی تک تم نے... وہ... وہ بات تو بتائی نہیں... کس لیے مجھے... بلایا تھا؟" وہ بمشکل ترنم بولی۔
"تمہارے ذریعے محسن کو پیغام دینا تھا۔" میں نے اسے بتایا۔ "وعدہ کرو کہ تم زندہ رہو گی... تم جیسی بہادر لڑکی مر نہیں سکتی۔ محسن آئے تو کہنا کل شام میں وہیں ملوں گا۔ جہاں قسمت نے ملایا تھا۔"
اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ پھر اس کا ہاتھ گر گیا۔ "شیخ! بیلے بے ہوش ہو گئی ہے اسے جلدی لے جاؤ۔"
"میری نظروں سے دور ہو جاؤ ذلیل آدمی!" وہ زہریلے سانپ کی طرح پھنکارا۔ "یہ مر گئی تو اس کے مرنے سے پہلے میں تجھے مار دوں گا اور اگر یہ مر گئی نا سکندر تو خدا کی قسم میں تجھے تلاش کر کے بدترین موت ماروں گا۔"
پھر اس نے نازو کو دوبارہ اٹھایا اور سڑک کی طرف چل دیا۔ بستی دور کسان کھیتوں سے لوٹ رہے تھے۔ شاید انہوں نے بھی دو مردوں کو ایک عورت کے ساتھ آتے دیکھا ہو گا۔ ایک موٹر سائیکل اور ایک کوٹ پر ایک سا تھ... اور یہی سمجھا ہو گا کہ دو دوست شہر کے اوباش لوگ ہیں جو اس ویرانے میں داشتہ بالوں کی نظروں سے چھپ کر رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ کسی کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان تین افراد کے درمیان محبت اور نفرت کے جذبات کی آگ کے شعلے کس طرح رشتوں کی آبرو کو خاک کر رہے ہیں۔ میں سڑک تک اکرام شیخ کے ساتھ گیا۔ جسمانی طور پر ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ پھر میں نے ایک ٹیکسی کو روکا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ایک نظر ہم دونوں پر ڈالی اور بے ہوش نازو پر بڑاں جسم کے خون سے اکرام شیخ کے ہاتھ اور کپڑے تر تھے اور اس کا رنگ میں سر چکرایا۔ وہ فرار ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ میں نے اس کی گردن پکڑ لی۔ "دیکھ یہ کوئی ایمرجنسی کیس ہے۔ تو اگر جلدی اجازت نہ ملی تو وہ مر جائے گی۔" میں نے کہا۔ "انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔"
"لیکن زبردستی ہے۔" وہ باہر نکل آیا۔ "میری ٹیکسی بیچ میں نہیں آنا۔ نہیں ہے کچھ میں انسانیت تم دو بندے ہی چھٹی سے ہو۔"
میں نے اس کے ایک تھپڑ رسید کیا اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔ شیخ نے نازو کو سیٹ پر لٹایا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ کے بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک بار پھر گرا تھا اور گالیاں بکتا مجھ پر حملہ آور ہوا۔
"... ساری سیٹ گندی کر دی۔ بدمعاش رنگ کھاتے ہو۔ تمہیں معلوم ہے یہ ٹیکسی ڈی ایس پی صاحب کی ہے۔"
"ایسی کی تیسی تیرے ڈی ایس پی صاحب کی۔" میں نے اس کے پیٹ پر لات ماری اور وہ چیخ کر دور جا گرا۔
"یہ کارڈ رکھو اپنے پاس۔" اکرام شیخ نے جیب سے کارڈ نکال کے اس کی طرف پھینکا۔ "ٹیکسی لینے کے لیے ڈی ایس پی کو تھانے بھیج دینا۔ اور خود بھی حاضر ہو جانا۔ تم پر مسافروں کے ساتھ بدسلوکی اور سواریاں بٹھانے سے انکار کرنے کا الزام ہے لیکن میں اس وقت تم کو گرفتار نہیں کر سکتا۔"
جب میں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر چابی گھمائی تو اکرام شیخ نے اسے کارڈ اٹھا کے دیکھتے دیکھا۔ "غلطی ہو گئی مائی باپ۔" وہ چلاتا ہوا ٹیکسی کے سامنے آ گیا اور ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ "اس بار معاف کر دیں۔ ہزار بار میری توبہ۔"
میں نے اس کی سیٹ خالی کی اور ساتھ والی سیٹ پر سرک گیا۔ اس نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کر دی کیونکہ سڑک پر اس کی درگت بننے کا تماشا دیکھنے والے جو پہلے اس کے ہمدرد تھے اب اس پر پھبتیاں کس رہے تھے۔ "بس اوئے... اوئے اپنا ہی زور سی ڈی ایس پی صاحب دیکھ۔" وہاں چھتنار درختوں پر ان میں دراگیر بھی تھے اور بچہ اس کے ہم پیشہ بھی۔ چنانچہ اس نے کسی کو جواب دینے کے بجائے نکل جانا بہتر سمجھا۔ میں نے کچھ دور جا کے اکرام شیخ کا ریوالور اسے واپس دینے کے لیے نکالا مگر کچھ سوچ کے واپس رکھ لیا۔ ڈرائیور نے اس کا مطلب کچھ اور نکالا اور اس کی حالت غیر ہو گئی۔
"باؤ جی! تھانیدار صاحب... رب دا واسطہ... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں اکیلا سہارا ہوں ان سب کا۔" اس نے گڑگڑانا شروع کیا۔ "پولیس میری ٹیکسی بھی بند کر دے گی

www.paksociety.com

اور مجھے بھی ۔۔۔ میں کیا بتاؤں چھو کر گاڑی میں خون کہیں کہاں سے اور کہاں سے آیا ۔ کون تھے کیا میری بات ۔ آپ تو نکل جائیں گے ۔"

وہ اپنے دل ہی دل میں خوف زدہ ہو رہا تھا کہ ہم کسی نے کسی لڑکی کو گولی ماری ہے اور جب ایک تھانیدار اور ایک معاشی شخص کسی جوان اور خوبصورت لڑکی کو ویرانے میں لے جا کر گولی مار دیں تو معاملہ انتہائی سنگین ہو جاتا ہے ۔

"دیکھو ۔۔۔ یہ میری بہن ہے " اکرام شیخ نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا " یہ ۔۔۔ اس کی اپنی بے وقوفی تھی ۔۔۔ کہ اسے گولی لگ گئی ۔۔۔ " میں نے پلٹ کر دیکھا مگر اکرام شیخ نے مجھ سے نظر نہیں ملائی ۔

"تمھارا نام کوئی نہیں لے گا ۔ تم ہمیں ایمرجنسی ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ تک پہنچا دو " اکرام شیخ نے کہا " اور جاؤ ۔۔۔ اس معاملے میں کبھی پریشانی لاحق ہو تو فون کر لینا یا میرے پاس آجانا ۔"

ٹیکسی ایک جگہ رک گئی تو میں نے اچانک کہا " مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اکرام شیخ نے نازو کو کہاں لے جانے کا فیصلہ کیا ہے " ڈرائیور نے تعمیل کی ۔ میں نے نیچے اُتر کے شیخ کو اس کا ریوالور واپس کر دیا ۔ اب مجھے یہ خطرہ لاحق نہیں رہا تھا کہ وہ پیچھے سے ریوالور میری گدی پر رکھ دے گا ۔ اس کے باوجود میں نے اپنا ریوالور نکال کے ہاتھ میں رکھا تھا ۔ ڈرائیور نے آنکھیں پھاڑ کے ایک شخص کی جیب سے دو ریوالور برآمد ہوتے دیکھے ۔

"جو کچھ ہوا ۔۔۔ اس کے لیے ۔۔۔ آئی ایم سوری ۔۔۔ "

میں نے بے ربط الفاظ میں کہا " خدا کرے نازلی ۔۔۔ "

"نازو کے ہتھے ۔ گاڑی چلاؤ " اکرام شیخ نے میری بات کاٹ کے اور ڈرائیور سے گرج کر کہا " میری بہن مر گئی تو میں تم کو بھی شوٹ کر دوں گا ۔"

ڈرائیور کے لیے یہ بہت منحوس رات تھی اور یہ سانحہ اسے بہت مہنگا پڑا تھا ۔ وہ ٹیکسی لے کر ہوا ہو گیا ۔

میں سڑک کے کنارے اکیلا کھڑا رہ گیا ۔ میرے بائیں ہاتھ پر شالامار باغ کا دروازہ تھا جہاں صرف چالیس منٹ پہلے میں نے نازو کو رکشا سے اترتے دیکھا تھا ۔ گل نوشگفتہ کی طرح اس کے حسن کی ہر ادا ۔ ادائے حسن کی معصومیت اور معصومیت میں ناز آفرینی کا انداز آشنا دلنواز اور ساحرانہ تھا کہ میں نے بہت سی نظروں کو اس کے حسن کی تجلی سے خیرہ ہوتے دیکھا تھا ۔ دائیں جانب وہ قبرستان جس وہ شالامار تھا جس پر اس کا لہو مٹی پر ایک داغ کی صورت میں موجود تھا ۔ یہ داغ میرے دل پر نقش ہو گیا تھا اور اکرام شیخ کے ذہن پر آ گیا تھا ۔ واپس جاتے ہوئے میرے کانوں میں اکرام شیخ کے الفاظ گونج رہے تھے ۔ اور کتنی زندگیوں کا تماشا نہ ہو گئے ؟ کسی کس کو اپنے انتقام کی آگ میں جھونک گئے ؟

اور میں ندامت و احساس جرم کے پہاڑ کے نیچے لیٹا رہا تھا ۔ میں نے تو نازو کو اپنی مدد کی خاطر بلایا تھا ۔ وہ میری مدد کرنی اور بھر پور قرض کا بوجھ چھوڑ گئی ۔ اسے کیا ضرورت تھی اس کو اس کا راستہ روکنے کی جو میرا مقصد تھی ۔ اپنے خون سے اس نے میری آزادی کی قیمت ادا کی اور شاید پہلی بار اکرام شیخ لعنتی قانون کی راہ میں شکست سے دوچار ہوا ۔ وہ فرض شناسی اور اصول پرستی میں کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو بہر حال ایک گوشت پوست کا بنا ہوا انسان تھا جس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر نہیں تھا ۔ مزاحمت اور قوت برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے وہ شیشے کا آدمی تھا جیسا اندر سے تھا ویسا ہی باہر سے نظر آتا تھا مگر اس میں لچک نہ تھی ۔ دباؤ نے اسے یکلخت توڑ دیا ۔ چھڑا چھڑا کر دیا ۔ اب وہ کیا کرے گا ؟ اپنے وجود کے ٹکڑے کیسے سمیٹے گا ؟ کیا ان سے وہ پورا آدمی بن سکے گا ؟ سوالات کی یلغار میرے ذہن کو ماؤف کر رہی تھی ۔ پیچھے راستے پر ایک ہوئے میں نے نازو کے تصور کو ہر کاپ دیکھا ۔ وہ ہسپتال کے بے داغ بستر پر لاش کی طرح پڑی تھی ۔ نرس اور ڈاکٹر تیزی سے آ جا رہے تھے ۔ کنڈیشن سیریس ہے مسٹر شیخ ! خون بہت ضائع ہو گیا ہے ۔ زخم تو اتنا خطرناک نہ تھا لیکن آپ نے دیر کر دی ۔ ایمرجنسی آپریشن کر رہے ہیں ہم لیکن آپ خون کا بندوبست کریں ۔ کم سے کم چار بوتل ۔ بلڈ گروپ کیا ہے ؟

اور اکرام شیخ اپنے گھر فون کر رہا ہے " ایمرجنسی ہسپتال میں آ جائیے ۔ نازو زخمی ہے ۔ نہیں ۔ کوئی خطرے کی بات نہیں !"

جھوٹ جھوٹ !۔۔۔ ایک جھوٹ تم نے ٹیکسی ڈرائیور سے بولا تھا ۔ کیا واقعی نازو اپنی غلطی سے زخمی ہوئی تھی ؟ غلطی تو کی تو میری جس نے اسے بلایا تھا ۔ یا تمھاری جس نے اس کا نشانہ لیا ۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے تھے کہ پیچھے تو وہ ہے اور میں بالکل محفوظ ہوں ۔ مگر تم کہہ سکتے ہو کہ غلطی نازو کی تھی ۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی میرے جیسے مجرم سے ملنے کی ۔ کیوں خاندان کی عزت آبرو اور اخلاقی و معاشرتی قیود کا خیال کیے بغیر گھر سے نکلنے کی ؟ کیا منہ دکھائیں گے وہ ماں باپ کسی کو جن کی جوان بیٹی ایک مفرور اشتہاری مجرم سے چوری چھپے ملنے پہنچی ہو ! بہن پر گولی چلانے والا بھائی کیا کہے گا کہ اس کی چھوٹی اور اکلوتی بہن نے اس پر ہاتھ کیوں اٹھایا تھا ؟ اسی مجرم کی خاطر ؟ کیا وضاحت پیش کرے گا وہ تھانیدار جو ایک نہتی لڑکی سے مار کھا گیا اور مسلح ہونے کے باوجود ملزم کو گرفتار نہ کر سکا ؟

جواب وہی تھا جو اکرام شیخ نے ٹیکسی ڈرائیور کو دیا تھا ۔ اس جواب میں سکندر بخت کا نام کہیں نہیں آئے گا ۔ وہ اپنی بہن کی عزت اور خاندان کی آبرو بچانے کا ۔ کوئی بیوقوفی کی جھوٹی کہانی سب کو قائل کرے گی ۔ جس کے واقعات روزمرہ زندگی کے مطابق ہوں گے ۔ مثلاً یہ کہ نازلی کو کالج سے واپسی پر چند غنڈوں نے اغوا کرنے کی نیت سے ٹیکسی میں ڈال کے جانا چاہا تھا ۔ اور اکرام شیخ نے ان کا تعاقب کیا مگر گولی لڑکی کی پشت سامنے ہونے کے باعث اسے لگ گئی ۔ غنڈے اس کا اسکوٹر چھین کر بھاگ گئے ۔ اسکوٹر بعد میں داروغہ والا پل کے قریب پڑا ہوا مل جائے گا ۔ وہ پولیس افسر ہے ۔ قانونی معاملات کی پیچیدگی کو سمجھتا ہے ۔ وہ خود کئی ایسی وارداتوں کا تفتیشی افسر رہا ہوگا ۔ مقدمہ کمزور ہے ۔ رپورٹ نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف درج ہو اور کیس داخل دفتر ہو جائے ۔ وہ اپنی ناکامی اور بہن کی بدنامی پر خاموشی سے پردہ ڈال دے گا کیونکہ جو کچھ ہوا تھا اس کا میرے سوا کوئی عینی گواہ نہ تھا اور میرا اس کے کسی بھی بیان سے اختلاف کرنا بعید از قیاس تھا ۔

موٹر سائیکل اور اسکوٹر اب بھی ساتھ ساتھ پڑے تھے لیکن وہاں دس بارہ افراد جمع ہو گئے تھے ۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ خون کس کا گرا ہے اور قاتل یا مقتول کہاں ہے ۔ یہ کس کا سامان ہے ؟ وہ سب ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے اور مشورے کر رہے تھے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے ۔ لیکن سب اپنی اپنی بولی بول رہے تھے ۔ آدھے تو اس چکر میں پڑنے کی مصیبت میں گرفتار ہونے کے لیے بالکل تیار نہ تھے ۔ باقی نصف پولیس کو رپورٹ کرنے کے حق میں تھے ۔ مگر اس بات پر اتفاق نہیں کر پا رہے تھے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کون جائے ۔ اسی وقت میں نے قدم رنجہ فرمایا اور تھانیدارانہ لب و لہجے میں صورت حال پر قابو پا لیا ۔

"سب تماشا دیکھنے جمع ہو ؟" میں نے ڈانٹ کر کہا " نام بتاؤ اپنا اپنا ۔ سب کے بیانات ہوں گے تھانے میں " میں نے کہا ۔ آدمی ریلیف فوراً چھٹ گئی ۔ باقی نے کہا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں تو بیان کیا دیں ۔ نازو کا پرس ایک شخص کے لاچے والا لیے کھڑا تھا اور مجھے خاصی مشکوک نظروں سے گھور رہا تھا ۔

"تم کون ہو جی ! کہاں کے تھانیدار ہو ؟" لاچے والے نے کہا ۔

میں نے اسے ایک خوفناک گالی دے کر اس کے ہاتھ کا طمانچہ اس کے منہ پر مارا ۔ اس کا رخسار لال پڑ گیا ۔ " یہ پرس کیسے اٹھایا تم نے ؟ کیا چرانا چاہتے تھے ؟ " میں نے گرج کر کہا " یہ اسکوٹر سب انسپکٹر اکرام شیخ کا ہے ۔ اور میں تھانیدار ہوں یہیں کا ۔ اس کا پتا تمھیں تھانے جا کر چلے گا ۔ اٹھاؤ یہ اسکوٹر " میں نے اچانک ریوالور نکال لیا ۔

لاچے والے ہی کو نہیں سب حاضرین کو بھی میرے تھانیدار ہونے کا یقین ہو گیا ۔ میں نے نازو کا زنانہ ہینڈ بیگ مجھے پکڑا دیا ۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو مجھے نوٹ دکھائی دیئے ۔ تقریباً آٹھ سو کے قریب ۔ دس اور پانچ کے ۔

"کتنی رقم پار کی ہے اس میں سے ؟ " میں نے لاچے والے کی گردن پکڑ لی جو اسکوٹر اٹھانے کے لیے جھک رہا تھا ۔

"قسم مولا کی سرکار عالی ! حرام ہے جو کھول کے بھی دیکھا ہو ۔ پوچھ لیں آپ ان سب سے " وہ رونے کے قریب ہو گیا ۔

"اسکوٹر چلا سکتے ہو ؟" میں نے اسے کچھ دیر گھورنے کے بعد قدرے نرم لہجے میں کہا ۔

لاچے والے نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ مجھے قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا " کہاں لے جانا ہے سرکار عالی ؟"

میں نے اسے تھانے کا پتا بتایا " تم چلو میں پیچھے آ رہا ہوں ۔ ادھر اُدھر ہوا تو قبر سے نکال لاؤں گا ۔ سارے گھر کو بند کر دوں گا " میں نے غمگین کلائمیکس میں پولیس مین کا شاندار کردار پیش کیا اور کامیاب رہا ۔ لاچے والے کو بھی لوگوں نے حوصلہ دیا کہ تھانیدار صاحب کچھ نہیں کہیں گے بس تم اسکوٹر تھانے پہنچا کے لوٹ آنا ۔ وہ ایک نے دست بستہ مجھ سے گزارش کی کہ میں ازراہ بندہ پروری لاچے والے کو گھر واپس آنے دوں ۔ اور میں نے اکڑی ہوئی گردن پر سر پر غرور کو جنبش دے کر صحیح تھانیدار کی طرح اس درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور کہا " وہ اسکوٹر تھانے کے باہر کھڑا کر کے بھاگ آئے " جب لاچے والا بڑے خشوع و خضوع سے اسکوٹر کو دھکیلتے جا رہا تھا تو میں ایک پبلک کال آفس سے ایمرجنسی ہسپتال فون کر رہا تھا ۔ ایمرجنسی کے نمبر پر میں نے ایک ڈاکٹر سے بات کی ۔

"میں ایس ایس پی رضا رضوی بول رہا ہوں " میں نے انگریزی میں کہا " ابھی ابھی ایک کیس آیا ہے میرے ایک ماتحت سب انسپکٹر شیخ کی سسٹر ہے ۔ غالباً وہ کسی حادثے میں گولی سے زخمی ہوئی تھی ۔ مس نازلی "

"یس سر ۔ وہ آپریشن تھیٹر میں ہے " ڈاکٹر نے کہا " بلٹ نے ہارٹ کو مس کر دیا ہے ۔ وہری لکی فار ہر ۔ شولڈر بلیڈ کے نیچے رہ گئی ۔ ہڈی پر معمولی سی خراش ہے ۔ بچیں ریکور کر جائے گی ۔"

"خطرے کی کوئی بات تو نہیں ہے نا ؟" میں نے کہا " مجھے یقین ہے وہ ماہر ہاتھوں میں ہو گی "

"آف کورس سر ۔ لیکن خون کافی بہہ گیا ہے ۔ ہم ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے " وہ بولا " چوبیس گھنٹے بعد معلوم ہو گا ۔"

www.paksociety.com

"حادثہ کیسے پیش آیا؟ شیخ نے کیا بتایا ہے؟" میں نے کہا۔

"تفصیلات تو مجھے نہیں معلوم۔" وہ بولا۔ "پولیس سرجن کی رپورٹ میں ہے کہ وہ اپنی سسٹر کے ساتھ جارہے تھے کہ چند افراد نے ان کا راستہ روکا اور انہیں لوٹنے کی کوشش کی۔ وہ اسکوٹر اور مس نازلی کا پرس چھین کر لے گئے جس میں کافی رقم تھی۔ مقابلے میں جو گولی انسپکٹر شیخ نے ایک ڈاکو پر چلائی تھی وہ ان کی بہن کو لگ گئی جو خود بھی چاقو وغیرہ چلا رہی تھی چنانچہ مقابلے میں شریک تھی اور اگر گولی نہ لگتی تو شاید وہ بدمعاش بھاگ نہ پاتے۔"

"اوہ نہیں۔ میں جانتا ہوں اُسے۔" میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ "ذرا میری ہیلپ کرلی۔ اچھا ڈاکٹر۔" دوسری طرف سے خیر۔ "میری لائن کچھ خراب ہے کسی سے کہو میرے گھر رنگ کرے میری وائف کو یا مس رابعہ کو۔ ورنہ وہاں محسن ہوگا ان کو اس حادثے کی اطلاع دی ہے۔ ٹھیک ہے۔"

ایک ٹیلی فون سے کئی مسئلے حل ہو گئے تھے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اکرام شیخ نے میری توقعات کے مطابق سب کو مطمئن کرنے کے لیے اور سب کی پوزیشن محفوظ رکھنے کے لیے تقریباً ویسی ہی کہانی گھڑ لی جو میرے ذہن میں آئی تھی۔ کچھ دیر میں بیگم رضوی، رابعہ اور محسن کے ساتھ اسپتال پہنچ جائیں گی۔ انہیں تو امریکہ لے کر اسپتال سے پیغام ملے گا۔ چنانچہ ان کے لیے شک کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اسپتال سے کسی نے پولیس کا حوالہ دیا تو تھوڑا سا کنفیوژن پیدا ہوگا مگر نقصان کوئی نہیں ہوگا۔ رضوی صاحب کا ذہن میرے سوا کسی کی طرف نہیں جائے گا کہ رابعہ اور محسن کو اسپتال بلوانے کے لیے میں نے ان کا نام استعمال کیا ہے۔ اکرام شیخ بھی یہ بات سمجھ جائے گا کہ اسکوٹر کو تھانے پہنچانے والا بھی میں ہی ہوں لیکن کیا یہ جانے گا کہ غالباً ڈاکو خود اسے وہاں پھینک گئے۔ حالات امید افزا تھے۔ اور اگرچہ ڈاکٹر نے واضح الفاظ میں امکانات کو ففٹی ففٹی قرار دیا تھا لیکن میرے دل کی آواز یہ کہتی تھی کہ وہ زندہ رہے گی۔ قدرت اتنی نامہرباں اور غیر منصف نہیں کہ ایک ناکردہ گناہ پر اس کو عمر کے دورِ بہار میں زندگی سے محرومی کی سزا دے۔ میری تسلی خاطر ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دل محفوظ رہا۔ ساری محرومی اس دل کی تھی جس کے ہاتھوں مجبور ہو کے وہ مجھ سے ملنے آ پہنچی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کبھی اس سے محبت نہیں کرسکتا۔ اس نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا تھا۔ کہ سکتی! یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی تو کوئی بات نہیں۔ کیا یوں بھی کوئی کسی کو چاہ سکتا ہے؟

ایک خوش آئند امکان یہ تھا کہ اگر کل رضوی کے تعینات کیے بھیجے فرشتے اس جانے سے خود وہ رابعہ اور محسن کے ساتھ اسپتال پہنچ جائیں مگر وارڈ سے دور رہیں۔ خصوصاً بیگم رضوی کے ساتھ ہجوم باعث… نازو اگر ہوش میں ہوتی تو محسن کو میرا پیغام ضرور دیتی لیکن ابھی تو اس پر چوبیس گھنٹے بھاری تھے۔ اس کے بعد بھی وہ کب اس قابل ہوگی کہ کسی سے بات کرسکے۔ یہ بالکل غیر یقینی تھا۔ مگر میں خود اسپتال میں موجود رہ کے اس سے رابطے کی کوئی صورت یقیناً نکال سکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں بھی اسپتال پہنچنے کا کوئی بندوبست کرلوں۔ موٹر سائیکل بے سروسامانی میں میری بہت مدد کررہی تھی۔ اس کا نمبر تو پہلے ہی بدل چکا تھا۔ اس کی ظاہری صورت کو بدلنے کے بجائے میں نے ٹول بکس کے اوزاروں کی مدد سے اس کے دونوں ہینڈل بار اتار دیے۔ کیریئر ہٹا دیا جو سیٹ کے پیچھے مڈگارڈ کے اوپر لگا ہوا تھا۔ اور ایک جگہ رک کر سیاہ ریگزین کی سیٹ پر پلاسٹک کا نیلے رنگ کا کور چڑھا لیا۔ موٹر سائیکل کو اب اس کا حقیقی مالک بھی شناخت نہیں کرسکتا تھا۔

اسپتال میں داخل ہونے کے لیے میں نے عام راستے کے بجائے عقبی دروازے کو استعمال کیا جو ڈاکٹروں اور میڈیکل اسٹاف کے لیے مخصوص تھا۔ ادھر نرسیں اور ڈاکٹر ہی نہیں میڈیکل کے اسٹوڈنٹ اور اسپتال کے ملازم بھی پھر رہے تھے۔ کینٹین انہی کے دم سے آباد تھی۔ اسپتال کے اندھیرے میں رات کی سیاہی کا رنگ گہرا ہونے لگا تھا چنانچہ ہر جگہ مرکری لائٹس اور ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ اور سائے میں صورتوں کی شناخت بھی دشوار تھی۔ میں نے کینٹین کی ایک خالی میز پر بیٹھ کے نازو کے ہینڈ بیگ کی رقم شمار کی۔ مجموعی طور پر اس میں تین ہزار سات سو پچپن روپے تھے۔ مجھے ایک پرانی کہانی یاد آئی جب کسی نے نصف شب کو اپنے دوست کے دروازے پر دستک دی تھی تو دوست تین چیزیں ساتھ لے کر باہر آیا تھا۔ شمشیر، بدرہ … کہ دشمنوں کا خوف ہو تو مقابلے کے لیے جان حاضر ہے۔ اشرفیوں کا توڑا کہ بنیادی ضرورت کے باعث تنگی ہے تو مال حاضر ہے۔ اور ایک کنیز۔ مدعا کہ شبِ تنہائی کا عذاب ہے تو چاندار… اب تیرے حوالے۔ نازو جانتی تھی کہ میں کیا… وہ خود تو مدد کے لیے سرِ شام پہنچی ہی تھی اپنی تمام متاع بھی ہمراہ لے آئی تھی کہ میرے کام آسکے تو… وہ لڑکی تھی جو اپنے ان کے لیے سو روپے ادھار دیتی تھی تو ڈیڑھ سو واپس لیتی تھی اور زبردست سود خور مشہور ہوئی تھی۔ سود ادا کرنے میں اس کے بھائی کا دیوالیہ نکل جاتا تھا اور ہر بار تو یہ سود مجھے بھی بہت مہنگا پڑا تھا۔ اب وہ…

جو گولی نے عجیب خوشی سے نپے تلے انداز کی تھی اور منہ دوست کی گولی تھی۔ اپنا خلوص اور اپنی محبت شاں کو کے میرے حوالے کرچکی تھی۔ میرا اسے بلانے کا اصل مقصد تو پیغام رسانی تھا مگر میں اس سے جو چاہتا وہ اب ضرورت نہیں کیونکہ اس وقت میں بالکل قلاش تھا۔

"مگر آپ برا نہ مانیں تو…؟" ایک نرس نے چائے کی پیالی اور دو ٹوس کے سلائس لے کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ دراصل جگہ نہیں ہے… اور مجھے جلدی ہے۔" اس نے توس دانتوں سے کاٹ کے کھاتے کھاتے مجھے دیکھا۔ "باہر کے آدمی تو یہاں نہیں بیٹھتے… یہ کینٹین…"

"جانتا ہوں۔ لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں ادھر نہیں جاسکتا۔" میں نے سخت مغموم صورت بنا کے رقت طاری کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی کچھ دیر میں پولیس آئے گی اور مجھے پکڑ کے لے جائے گی۔ میں کیا کروں؟"

"کیا کہا؟ تو اسے بھی بھاگ جاؤ۔" وہ گرم چائے کا گھونٹ لے کر جل گئی۔ "جرم… الزام ہے تم پر؟"

"کچھ نہیں۔ سب سے بڑا الزام میری غربت ہے۔" میں نے سر تھام کے کہا۔ "میرا دشمن وہ شخص ہے جس نے میری بہن کو گولی ماری۔ اور الزام لگا دیا کہ اسے اپنے دفاع میں گولی چلانی پڑی تھی مجھ پر۔"

"تم پر؟" نرس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ "یا تمہاری آن پر ہو؟"

"بات سمجھا کرو۔" میں نے کہا۔ "وہ سور کا بچہ دھوکے سے میری بہن کو ورغلا کے لے گیا تھا۔ اتفاق سے میں نے دیکھ لیا۔ وہ دست درازی پر آمادہ تھا کہ میں جا پہنچا۔ اس نے غصے میں مجھے شوٹ کرنا چاہا۔ بہن مجھے بچانے کے لیے سامنے آگئی لیکن الزام مجھ پر آیا۔ اس کے نوکروں نے گواہی دے دی کہ فائر کرنے والا میں تھا۔ بدلے میں بیٹھ کر گولی چلائی تھی جو میری بہن کے لگی۔ میری بہن سیٹھ کے پاس ملازمت کی درخواست لے کر گئی تھی۔ میں پولیس سے مار پیٹ کر کے فرار ہوا۔ لیکن میں جانتا ہوں رپورٹ میرے خلاف لکھی جا چکی ہے۔ اب وہ ایمرجنسی وارڈ میں ہے۔ معلوم نہیں زندہ ہے کہ مرگئی ہے۔ میرا ایک دوست دیکھنے گیا تھا مگر وہ بھی لوٹ کر نہیں آیا۔ اب میرے دل کو دھڑکا لگا ہوا ہے کہ کہیں وہ بھی پکڑا نہ گیا ہو۔ تم میری کچھ مدد کرسکتی ہو؟"

"کیا؟ میری ڈیوٹی ایمرجنسی وارڈ میں نہیں ہے۔" وہ جھجک کر بولی۔

"لیکن تم جا تو سکتی ہو وہاں۔ پلیز… سوچو تم مجھے مجرم سمجھو یا بے گناہ۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس مجھے اپنی بہن کی خبر لا دو۔ تم بھی تو کسی کی بہن ہو۔ آخر سوچو اگر میری جگہ تمہارا بھائی ہوتا…؟" میں نے گڑگڑانا جاری رکھا۔

"اچھا اچھا۔ نام بتاؤ۔" وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نازو… سب نازو کہتے تھے۔ یہاں نازلی لکھوایا گیا ہوگا۔ پرائیویٹ وارڈ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ایک منٹ کے لیے قلم دو اور… ایسے بھی وقت نہیں ہے میرے پاس۔" اس نے اپنا نازک سا بال پوائنٹ قلم مجھے تھما دیا۔

میں نے زمین پر سے سگریٹ کا خالی پیکٹ اٹھایا اور درمیان میں سے پھاڑ کے لکھا۔ "نازلی کا کیا حال ہے؟" اور نرس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "وہاں محسن کو دیکھ لینا۔ میرے ہی قد کا جوان آدمی ہے۔ درمیان سے مانگ نکالتا ہے۔ براؤن بال ہیں۔ … براؤن… یا ایک لڑکی ہوگی رابعہ۔ فلم اسٹار زیبا کی ہم شکل۔ نام نہ بتانا نہ ان کے متعلق پوچھنا۔ بس وہ نظر آجائیں تو یہ ان کے ہاتھ میں دے دینا لیکن کوئی دوسرا نہ دیکھے۔" میں نے جیب میں سے سو سو کے پانچ نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھاتے… "اس احسان کا بدلہ پھر کبھی ادا کروں گا۔"

"واہ! کیسا احسان؟ کیسی ڈیل؟ مجھے معاملہ گڑبڑ نظر آتا ہے۔" اس نے مختصر سے کارڈ کو پڑھ کر کہا۔ لیکن اس میں مشتبہ بات کوئی نہیں تھی۔ "تم رشوت دے رہے ہو مجھے؟"

"اوہ نو… کاش میں اس سے زیادہ کر سکتا۔ اس وقت میں بہت مجبور ہوں۔ معاملہ تو گڑبڑ ہے اور میں تم کو بتا بھی چکا ہوں۔ مجھے تم اعتماد کے قابل نظر آئی تھیں ورنہ میں یہ سب نہ بتاتا؟ مگر کیا میں نے غلطی کی ہے؟ کیا تم پولیس کو اطلاع دو گی؟ بولو… اگر تمہارا بھائی ہوتا…؟" بھائی کا ذکر اس کی کمزوری معلوم ہوتا تھا۔

"اچھا اچھا۔ میں جاتی ہوں۔" اس نے پانچ سو روپے رکھ لیے اور میری طرف دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی باہر نکلا۔ اور کینٹین کے روشن دروازے سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوگیا۔ انتظار ایک بار پھر میرے اعصاب پر مسلط ہوگیا۔ ایک ایک پل میں دوسری بار میں سسپنس کا شکار رہا۔ امید اور ناامیدی۔ خوف اور بے یقینی اور آرزو کا اضطراب جھیلتے اور ایک ایک منٹ بعد گھڑی دیکھتے بارہ منٹ گزر گئے۔ تیرھویں منٹ پر محسن نمودار ہوا۔ اس نے میری تحریر شناخت کرلی تھی اور ذاتی عقل سے کام لیتے ہوئے یہ بھی معلوم کرلیا تھا۔ کہ میں کہاں دستیاب ہوں۔ پانچ سو روپے ضائع نہیں ہوئے تھے۔ اس نرس نے اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے کیا تھا۔ باقی محسن کی ذہانت تھی کہ وہ غائب ہو کے یہاں آ پہنچا۔ سیدھا اندر جا کے اس جگہ بیٹھ گیا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے چند

www.paksociety.com

منٹ میں پہنچ گیا۔ دیکھا کہ اگر کوئی محسن کے تعاقب میں ہو تو نظر آ جائے۔ پھر میں اس کے سامنے جا بیٹھا۔

"تجھے کیسے معلوم ہوا کہ نازو کے کوئی گم گئی ہے؟"

محسن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ یوں جیسے کوئی دوست سے کوئی فضول سا سوال کرے جیسا وقت پوچھے۔ قطعی غیر جذباتی لہجے میں۔

"باہر میری موٹر سائیکل کھڑی ہے۔ یہاں سے نکل اور موٹر سائیکل اسٹینڈ پر میرا انتظار کر۔" میں نے کہا پھر محسن نے چائے ختم کی۔ میں نے اس کے اٹھنے کے بعد چائے منگوائی اور خاموشی سے پی اور پانچ منٹ بعد روانہ ہوا۔ محسن گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ "یہ موٹر سائیکل چھینی ہے کسی سے؟" اس نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یا چوری کی ہے؟"

"وہ نہیں ہے۔ جہیز میں ملی ہے سسرال سے۔" میں نے کہا۔ "مگر تجھے کیا موٹر سائیکل کے شجرہ نسب سے۔ تو یہ بتا آج صبح انکل جعفری نے اچانک اتنا کامیاب چھاپا کیسے مارا؟ ان کو کس نے بتایا کہ میں وہاں موجود ہوں؟"

"مجھے طافو پر شک ہے۔" محسن نے کہا۔ "منظر نے تو یہی کہا تھا کہ وہ گھر کا ملازم ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کی اور ایس ایس پی صاحب کی نظروں میں خفیہ پیغام رسانی ہو گئی تھی۔ کوئی بات تھی کہ طافو پولیس کو دیکھ کر ذرا بھی پریشان نہیں ہوا حالانکہ اس کی پوزیشن بہت خراب تھی۔ وہ سیٹھ کرم سے پانچ لاکھ لے کر ایک شرک کا حل خود دریافت کر چکا ہے۔ مجبوراً ہی سہی۔ اور اس بات کا علم ہو جانے کے بعد گلفام بابا جی نے ان دونوں کی موت کا فرمان جاری کر دیا تھا۔ رحمت تو اتفاقیہ مارا گیا لیکن طافو بچ گیا تھا۔ جانے بہت بعد میں جائے پر وہ تیار ہو گیا تھا کہ بیوی بچوں سمیت نکل جائے مگر تیرا ساتھ چھٹ جانے کے بعد اس کا حوصلہ پھر جواب دے گیا۔ وہ دھوبی کا کتا ہو گیا تھا۔ خوف اسے یہ بھی تھا کہ وہ لوگ اسے چھوڑیں گے نہیں اور وہ جہاں بھی ہو گا بالآخر تلاش کرنے والے اس تک پہنچ جائیں گے۔ جب تیرا مقابلہ پولیس سے ہوا تو وہ سمجھا کہ تو پکڑا گیا اور وہ جان بچا کے بھاگا۔ اسے یقین تھا کہ اب پولیس بھی اسے گرفتار کر کے ہی دم لے گی اور اگر ایک بار پولیس کے ہاتھ پڑ گیا تو مارنے والے اسے بڑی آسانی سے مار جائیں گے۔ خوف اور پریشانی کے عالم میں اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنے پرانے آقاؤں سے تعلق کو پھر استوار کرے جو ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا۔ طافو فرار نہیں ہوا تھا اغوا ہو گیا تھا اور اغوا کرنے والے ہم تھے جو اسے سب کچھ بتا چکے تھے کہ ہم کون ہیں۔ میں نے تجھے خبردار کیا تھا کہ تو اس شریف خوراک پر بہت

زیادہ اعتبار کر رہا ہے۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور وہاں پہنچتے ہی فون پر گلفام بابا جی کو بتا دیا کہ وہ کس جگہ ہے ... نہیں پہنچ سکا۔ یہ اپنی وفاداری ثابت کر کے جان بچانے کی ایک کوشش تھی جسے جوا کہا جا سکتا ہے۔ اس نے گلفام بابا جی کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی اور اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ ہمارے خوف سے پانچ لاکھ لینے پر مجبور ہو گیا تھا کیونکہ وہ شکار نہ کرتا تو رحمت کی طرح اسے بھی مار دیا جاتا۔ ... نہیں رہا تو وہ بتا رہا ہے کہ اس کا ارادہ کبھی غداری کا نہیں تھا اور اس کی نیت میں فتور نہیں آیا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا جبر کے باعث کیا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اعتراف جرم کر رہا ہے۔ سکندر اور محسن نام کے دو افراد کے متعلق مفید اطلاعات بھی فراہم کر رہا ہے۔ اس کے بعد گلفام بابا جی نے حکم دیا کہ ملتان کے چوکوں پر نظر رکھے اور جیسے ہی سکندر یا محسن نظر آئے انہیں فون کرے۔ تیری خوش قسمتی تھی کہ اس رات تو اڈے میں پہنچا۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ ڈرائیور نے جو کچھ بتایا وہ ... نے دلاور کو بتا دیا اور دلاور نے ہی طافو کے پیچھے ... حماد ... وہ سکندر بخت کے ساتھ ہے اور اسے منظر صاحب کے گھر ... ڈبل ایجنٹ بن جائے۔"

"محسن جان! آپ مفروضات پر بہت تنقید کر رہے ہو ... میں نے اسے تو ... جب ... ڈرائیور سے کہا تھا ... ملاقات نہ ہو تو منظر نام کے وکیل صاحب کے گھر پہنچ جانا ... وقت تو وہ موجود نہیں تھا۔ کیا طافو نے تیرے سامنے اعتراف جرم کر لیا ہے؟"

"ہاں۔" محسن نے دانت نکال کے کہا۔ "اس نے ... مجھے شک میں مبتلا کر دیا تھا ... سے زیادہ شک ... جعفری کے چھاپے سے ہوا۔ وہ طافو کو بالکل نظر انداز کر رہے تھے جیسا کہ وہ آسانی سے کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔ انہوں نے طافو کو پہلے تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ کیسے کم از کم اس سے یہ پوچھ سکتے کہ تم نے اس نام اور حلیے کے آدمی کو گھر میں دیکھا ہے؟ ... انہوں نے مجھ سے کیا۔ منظر اور راجہ سے پوچھا۔ منظر کی بیوی اور بچوں سے پوچھا کہ سکندر کہاں ہے اور ہم سب نے لاعلمی کا اظہار کیا کہ اس کا یہاں کیا کام اور کون کہتا ہے کہ وہ یہاں آیا تھا۔ کمال تو منظر کی بیوی نے کیا کہ انتہائی کم وقت میں تو رہا ... معاملے کی نزاکت کو سمجھ گئی اور اس نے بچوں کو بھی سمجھا دیا۔ منظر نے تو بہت ہنگامہ کیا لیکن وہ خانہ تلاشی کا وارنٹ لائے تھے۔ جعفری صاحب نے کسی کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ انہوں نے صاف بڑا ... بھی دیا کہ ہم سب مجرم ہیں کیونکہ ہم نے

ایک مجرم کو چھپایا ہے ... اور قانون کی مدد سے بچ رہے ہیں۔ منظر نے بھی ... نہیں دیا اور صاف کہا کہ یہ دھونس نہیں چلے گی۔ ... کسی کی جیب میں نہیں ہے اور یہ تو جامہ تلاشی سے ... کہ ... تیرا سب سامان وہیں تھا لیکن انکل جعفری کو ... تیری تلاش میں نکل گئے اور کامیاب بھی ہو جاتے اگر تو موٹر سائیکل پر فرار نہ ہوتا۔ وہ تیرے پیچھے ڈو ... اور پھر تلاش ... کے باہر نکل گئے۔ اور منظر نے فوراً قانونی نکتہ پیدا کر لیا۔ غالباً راجہ نے اس کے کان میں کسی بات کی تھی۔ اب دوبارہ ایس ایس پی صاحب تشریف لاتے تو ان کا ارادہ تھا کہ تیرا سامان دیکھیں اور تیری موجودگی کے ثبوت حاصل کریں۔ مگر منظر نے دروازے پر ہی روک لیا کہ ایک بار خانہ تلاشی کے وارنٹ تھے۔ وہ استعمال کر چکے۔ دوسری بار گھر میں داخل ہونے کے لیے دوسرے وارنٹ لے کر آئیے۔ ناکامی نے جعفری صاحب کو ویسے ہی مشتعل کر رکھا تھا۔ وہ منظر پر برس پڑے اور بس اپنی افسری کی شان میں جو ... کی وجہ سے زیادہ برا لگے۔ منظر نے کہا کہ ایک وکیل سے اس قسم کی زبان استعمال کرنے پر میں ہتک عزت کا دعویٰ کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ یہ ہتک عزت کا کیس ہے۔ اور جعفری صاحب کو واپس لوٹنا پڑا۔ میں اور راجہ اندر بیٹھے رہے۔ ان کے بعد میں نے طافو کو پکڑ دیا۔ میں حیران تھا کہ جعفری صاحب نے اس سے تیرے متعلق ایک سوال بھی نہیں کیا۔ اس نے رخصت ہونے ہی ... طافو سے کہا کہ سکندر کا سامان گاڑی میں رکھو۔ ابھی لے جانا ہے۔ اسے مجھ پر اتنا ... تیری نیت پر کوئی شبہ تھا ہی نہیں۔ وہ بے خوف ہو کے ... اور گلفام بابا جی کا ایجنٹ زیر دریا بیوقوف بنا میرے ساتھ چل پڑا۔ میں نے استاد ٹیڈی کے گھر لے گیا۔ وہاں ہم نے تفتیش کی۔ اور تیرا خیال درست ہے۔ جو کچھ اس نے بتایا مفروضات پر مشتمل نہیں تھا۔ طافو کے اعتراف جرم پر مبنی تھا۔ ہم نے سب ریکارڈ کر لیا ہے۔"

"اور وہ خود اب کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"استاد ٹیڈی کی قید میں۔ اسے چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔" محسن نے کہا۔ "گاڑی کی نمبر پلیٹ میں نے بدل دی ہے اور گاڑی اس وقت ہوٹل فاران میں ہے۔ جہاں کمرہ لیا ہے اور ... کے نام کرائے پر لیا ہے۔"

"کیوں؟ انکل جعفری سے کوئی بات ہوئی ہے؟"

"یار! جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد اس بات کی ضرورت کہاں رہتی ہے۔ ہم اب وہاں کیسے رہ سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ "اگر ہم وہیں رہتے تو ہماری حیثیت وہاں نظر بندوں کی سی ہوتی اور ہم کسی طرح بھی تیرے کام نہیں آ سکیں گے۔ اب اگر وہ نہیں

آئیں تو بن گئے ایک طرف اپنی تو پھر ہم دوسری طرف ہیں۔ جدھر تو ہے۔ تب میں چاہتا ہوں ... کہ انکل جعفری ہم سے پہلے پہنچ جائیں۔ رابعہ نے اپنا سامان پیک کر لیا ہے اور بیگم جعفری بہت افسردہ ہیں مگر معاملہ ایسا ہے کہ وہ دخل نہیں دے سکتیں۔"

"نہیں لیکن ... تم لوگ اتنی آسانی سے باہر نکل آئے! تو نے ... مجھے ... کرے گا؟" میں نے کہا۔

"میں تو نکل آیا تھا۔" محسن بولا۔ "کیونکہ میں منظر کے گھر سے لوٹ کر گیا ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے ایس ایس پی صاحب کے حکم کے غلام رابعہ کے تعاقب میں آئیں۔ گزشتہ چند دنوں سے مجھے بھی شک ہے کہ جہاں میں جاتا ہوں ایک چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور مڑی ہوئی ناک والا ... تو شخص میرے ساتھ جاتا ہے کل تو میں نے مذاق میں اسے روک لیا تھا اور اس سے ہاتھ بھی ملایا تھا۔ میں نے کہا کہ واہ بھئی خوب ملے۔ کہاں ہو آج کل۔ سنا ہے شادی کر لی ہے دوسری۔ آپ کے اسٹاک میں کتنی بیویاں ہیں؟ وہ ایسا بوکھلایا کہ آؤں باؤں کر تا رہ گیا اور میں نے دعب مارتے کہا کہ بھئی اس وقت تو جلدی میں ہوں کل آ جاؤ بھیا جان کے کمرے پر۔ اور چل پڑا۔ پہلے سے ٹیلیفون بھی ٹیپ ہوتے ہیں اس لیے میں رابعہ کو ایک ترکیب سمجھا کے آیا ہوں۔ امید ہے وہ بخیریت منزل مراد تک پہنچے گی۔ اب باقی باتیں ملاقات پر ... وہ بیگم جعفری کا بچی ہوں گی کہ میں غائب ہوں اور ایس ایس پی صاحب پہنچ گئے ہوں گے تو مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔"

وہ چند قدم گیا اور پھر پلٹ کر آیا۔ "تو نے میرے سب سے پہلے سوال کا جواب نہیں دیا تھا کہ تو یہاں کیسے پہنچا؟"

"ہاں۔ اور ابھی اس سوال کا جواب دینا ضروری بھی نہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تو جا۔"

میں موٹر سائیکل پر روانہ ہوا تو ہوٹل فاران پہنچا۔ "محسن خان شیروانی کون سے کمرے میں مقیم ہیں؟" میں نے کاؤنٹر کلرک سے سوال کیا۔

"محسن خان شیروانی؟" کلرک نے دہرایا اور ایک نظر اپنے رجسٹر پر ڈال کے نفی میں سر ہلایا۔ "یہاں تو اس نام سے کوئی بھی نہیں ہے۔"

"اچھا۔ تو مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہوں گی؟" میں نے سر کھجا کے کہا۔

کلرک نے پھر وہی عمل دہرایا اور پھر انکار کیا۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ محسن نے یقیناً فرضی ناموں سے بکنگ کرائی ہو گی۔ میں نے ان کے اصلی نام لے کر غلطی کی تھی۔ اب یہ ممکن تھا کہ کلرک کو دونوں نام یاد نہ رہ جائیں اور خدانخواستہ کوئی ان کا سراغ لگاتا ہوا آئے تو کلرک بتا دے کہ پہلے بھی ایک

www.paksociety.com

شخص فلاں کمرے میں مقیم ایک خاتون اور فلاں صاحب کے کمرے کی نام سے یا تھا۔ میں فوراً واپس پہنچا۔ اب یہ سلسلہ اس ہوٹل میں قیام مناسب نہیں تھا۔ یوں بھی احتیاط کا تقاضا تھا کہ ہم سب ایک ہی جگہ نہ ہوں۔ میرا اندازہ تھا کہ ابھی ایک گھنٹے سے پہلے وہ دونوں ہوٹل نہیں پہنچ سکتے اور اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے اپنے قیام کا بندوبست کر لینا چاہیے۔ میں نے لاہور ہوٹل کا انتخاب کیا جو اپنی کئی منزلہ عمارت کی وسعت کے باعث اندر ایک چھوٹا شہر ہے۔ اس کے چھوٹے سے چھوٹے کمرے سے لے کر بڑے سے بڑے کمرے تک مختلف شہروں سے آئے ہوئے ہر طرح کے لوگ ٹھہرے ہوتے ہیں۔ امیر سے فقیر بیگ تک اور نزاکت علی خاں سے شہزور خاں تک۔ اس بھیڑ میں میرا گم ہو جانا زیادہ آسان تھا۔ ڈاکٹر ماجد کے نام سے کمرہ لینے میں نسبتاً جعفر کا ترجیح تھا اور شیخی خوف والا کمرہ سانو رہے یہ سب حاصل کیا اور پانچ دن کا ایڈوانس بھی ایڈوانس کر دی۔ کلرک کچھ مرعوب تھا اور حیران بھی کہ ڈاکٹر صاحب خالی ہاتھ آ گئے۔ پہننے کے کپڑوں کا سوٹ کیس تک نہیں جیسے تو ڈاکٹر کے گلے میں اسٹیتھوسکوپ بھی ضرور ہونا چاہیے۔

"گاڑی کی پارکنگ کے لیے کوئی انتظام ہے؟" میں نے کہا۔

"ابھی کچھ دیر میں شوفر آتے ہوں گے۔ گاڑی کے علاوہ وہ میرا سامان لے کر۔ وہ مجھے ڈراپ کر کے ایک کام سے گیا ہے۔"

"آپ بالکل مطمئن رہیں سر!" کلرک نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ "انشاء اللہ آپ کو شکایت نہیں ہو گی۔" وہ مجھے چابی دینا چاہتا تھا لیکن میں نے کہا کہ شوفر کو دے دیجیے اور خود ڈائننگ روم میں چلا گیا جہاں ارتھ ڈوریوں سے فلمی گانے سننے کے شائقین جنہیں چینی کے پیالے رکھے تھے۔ ایئر کنڈیشنڈ ہال میں بجلی کی روشنی تھی اور پہلے قدرے سنگی تھی۔ بلیک اینڈ وائٹ ناظرین باہر کے عوام میں شامل تھے۔ اس طبقاتی فرق پر غور کیے بغیر میں نے کوئی تنہا دل خریدا اور عشقیہ گانوں میں شامل کرانے کے بجائے نقد ادا کی۔ بیرے نے ایک شان بے نیازی سے گھڑی دیکھ کر شوفر پر خفگی کا اظہار کیا۔ کاؤنٹر کلرک کو تاکید کی کہ وہ آئے تو اسے چابیاں دے دے۔ نئی ادویل ریکارڈ گاڑی ہو گی۔ اس میں سے سامان نکلوا کے کمرے تک پہنچوا دیا جائے اور گاڑی محفوظ جگہ پہنچا دی جائے۔ پھر میں باوقار طریقے سے باہر نکلا۔ چوری کی موٹر سائیکل تک پہنچا اور اپنی خودی کو بلند رکھتے ہوئے ہوٹل خاوران کی طرف چل پڑا۔ پندرہ منٹ تک میں نے ہوٹل کے دروازے کو نظر میں رکھتے ہوئے چہل قدمی فرمائی۔ اور مجھے اس وقت ایک خوشگوار حیرت ہوئی جب محسن خاں ادویل ریکارڈ چلاتے ہوئے تشریف لائے اور مس رابعہ قاری اپنی شوخ آفاق سرخ رنگ کی فاکس ویگن میں

آئیں بلکہ وہ دونوں ٹیکسی سے آئے۔ محسن کو شیروانی، جوڑی دار پاجامے اور ترکی ٹوپی میں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عصا بھی تھا۔ ٹیکسی چلی گئی تو میں نے منہ میں انگلی ڈال کر لوفروں کی طرح سیٹی بجائی اور محسن نے میری طرف دیکھا۔ اس نے رابعہ کو اندر جانے کو کہا اور خود کشف کھنچ کر کے میری طرف آیا۔ "شرم نہیں آتی شریف لڑکیوں کو دیکھ کر سیٹیاں بجاتے ہو۔ بدمعاش!" محسن خاں نے مجھے ڈانٹا اور عصا کو گھمایا۔

"معاف کر نا جناب!" میں نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ شریف زادیاں ہیں۔ ویسے آپ کو نہیں معلوم کہ میں ڈاکٹر ماجد ہوں۔ لاہور ہوٹل کے کمرہ نمبر ۵۰۵ میں مقیم ہوں اور آپ میرے شوفر ہیں۔ اب تک آپ کو میرا سامان لے کر وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ صورت سے آپ بالکل کاؤنٹ لگ رہے ہیں۔"

"اچھا۔" محسن نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ "شاید آپ کو بھی معلوم نہیں کہ ہم نواب تخنے خاں ہیں اور یہاں ہوٹل کے سوئٹ نمبر ۴ میں اپنی سیکرٹری کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ پرنسس صوفیہ کے ساتھ۔"

"میں یہاں محسن خاں شیروانی اور مس رابعہ قاری کو تلاش کرتا رہا معذرت چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر ماجد کی کار اور سامان لے کر لاہور ہوٹل پہنچ جانا نواب تخنے خاں! ورنہ شوفر کی نوکری بھی جائے گی۔"

"بس سر صرف سامان لانا ہے؟ کوئی اور آنا چاہے تو ساتھ لاؤں یا نہ لاؤں؟" وہ ترکی ٹوپی سر سے اٹھا کے بولا۔

"پولیس اور چوہدری رفا ورانیہ کپٹن کے سوا جو بھی آنا چاہے۔ تم چشم ما روشن دل ما شاد۔" میں نے کہا اور موٹر سائیکل کو کک ماری۔ اس نے تھوڑا سا شور مچایا اور خاموش ہو گئی۔ میں نے دوسری بار دو لتی جھاڑی اور نتیجہ پھر وہی نکلا۔ جب لاتیں ما کے میری حالت غیر ہو گئی تو مجھے خیال آیا کہ پٹرول چیک کر لوں۔ ٹینک خالی تھا۔ ڈھن کی طرح بجنے لگا۔ میں نے اسے زمین پر لٹا دیا اور چند منٹ بعد انجن غرّایا۔

"عام طور پر کاریں اور موٹر سائیکلیں بغیر پٹرول کے چلتی نہیں ہیں۔" محسن خاں نے جلتے جلتے بے حد اہم انکشاف کیا اور میں نے چلا کے کہا کہ ہم پر بھی حرام ہے جو اس میں ایک قطرہ پٹرول کا ڈلوائیں۔ ہم بس نامعقول سواری کو تین طلاق دے سکتے ہیں۔ موٹر سائیکل دیر تک دوڑنے کے بعد بھی جس کو میں نے قریب جا سکتی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ مجھے موٹر سائیکل کو کہیں چھوڑ دینا تھا۔ میں نے شیراز میں کافی پی اور رات دس بجے کے لیے وہیں دوسری موٹر سائیکلوں کی رفاقت میں چھوڑ کر ہوٹل پہنچا تو محسن خاں ٹیکسی کی

کمرے کی چابیاں لیے کھڑے تھے۔ کلرک نے مجھے مطلع کیا کہ شوفر آپ کی گاڑی اور سامان وغیرہ لے آیا ہے۔

"شوفر؟ چاہیے دو مت نواب تخنے خاں کو شوفر کہتے ہو؟ بیل نے بے ہم ہو کے کہا۔ میں شوہر سے شکایت کروں گا۔" "میں بہت نادم ہوں حضور نواب صاحب!" کلرک نے کورنش بجا لا کے کہا۔ "آپ کے مزاج بخیر ہیں پرنسس صوفیہ؟"

"بس ڈاکٹر صاحب! ہم نے بہت لی زمانے کی طوطا چشمی!" محسن خاں نے سرد آہ بھری۔ "شوفر آپ کا پیغام لایا تھا۔ ہم نے سوچا خود شرف ملاقات حاصل کریں۔ مگر یہاں مقصد یہ ہے عزت افزائی بھی تھی۔ خدا ہمشیرہ پرنسس صوفیہ والد ماجد نواب پھٹے خاں کی روح مزار مبارک میں تڑپ اٹھی ہو گی کہ آج ریاست ہوتی تو ہم والی ریاست ہوتے۔ اس گستاخ کے زن بچہ کو کولہو میں پلوا دیتے۔ جو ہمیں شوفر کہتا کو جہاں کہتا ہے۔ جی چاہتا ہے طمنچہ نکال کے دہائی سے داغ دیں۔۔۔ اور خود کشی فرمائیں۔"

کلرک سخت بدحواس اور پریشان تھا اور بار بار غلط فہمی کی معافی مانگ رہا تھا۔ بالآخر رابعہ یعنی پرنسس صوفیہ نے مداخلت کی اور ہم اوپر پہنچ کر کمرے میں پہنچے۔ "کیسی رہی؟" محسن خاں نے ٹوپی اور عصا پھینک کر کہا۔

"یہ ہنگامہ ذرا شروع کر دیتے ہو۔ اداکاری اور ایکٹنگ۔" رابعہ نے کہا۔ "آج کل نواب بھی ایسے حلیے میں نہیں ملتے۔ فیشن ایبل ہوتے ہیں۔"

"ہم ذرا وضع دار قسم کے نواب ہیں۔" محسن نے کہا اور اچھل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "تمہارے لیے ایک اندوہناک اطلاع ہے ڈیئر! سنانے والے کا منہ کو آتا ہے۔ جانتی ہو میاں ہسپتال کیسے پہنچا تھا؟ مس نازلی عرف نازو کی خاطر۔ اور حالات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ڈرامہ سی تھا کہ سنگ بھرا تھے اور زخم آئے مجھے۔ شبلی صاحب پنچھی کھواتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ سامنے نازو کے گولی لگنے کی اطلاع مل گئی اور اگر یہ دل سے دل کو راہ ہونے والا مسئلہ نہیں تو پھر بہت گمبھیر مسئلہ ہے۔ بصورت دیگر ثابت یہ ہوتا ہے کہ جب نازو کو گولی لگی تو میاں اس کے بہت قریب تھے۔ کتنے قریب تھے؟ اس کی وضاحت کرو ورنہ میں سمجھا کیا ہے۔"

رابعہ ہنسنے لگی۔ "اگر ہم نے اس کی وضاحت کر دی ہے گر گولی کیسے لگی؟"

"اسے یا بالکل کو مار دو گولی۔ یہ پوچھو کہ اسے کس نے خبر دی؟ محسن اللہ! میں نے پوچھا تھا تو یہ گول کر گیا تھا۔"

ایک بار پھر ہم ایک کمرے کی چار دیواری میں خوش و خرم اور محفوظ تھا۔ تم جہاں و غم دو جہاں سے بیگانہ۔ ایک دوست

کے خلوص اور ایک عورت کی محبت کے ناقابل تسخیر حصار میں امان کی ذہنی مہربان صورتیں تھیں اور وہی باتیں۔ دل نے چھوڑی چاہا کہ کاش وقت اسی مقام پر ٹھہر جائے۔ صور اسرافیل کی صدا تک اس شب کی سحر نہ ہو یا موت خوشی سے جھولوں اسی لمحے میں چپکے سے آ جائے لیکن دوسرے لمحے یہ طلسم خیال باقی نہ رہا۔ میں نے روم سروس سے کافی کے لیے کہا اور نازو کے زخمی ہونے کی اصل کہانی سنانے لگا۔ وہ دم بخود سنتے رہے۔ پھر محسن سگریٹ لینے چلا گیا۔

"حالات تمہارے میرے اختیار سے باہر ہو گئے ہیں سکندر!" رابعہ نے کچھ دیر بعد کہا۔

"ہاں۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟" میں نے کہا۔ "مجھے مقابلہ تو کرنا ہی تھا۔ دوسری صورت یہی تھی کہ میں وڈیرہ کی پیش کردہ شرائط کو قبول کر لیتا۔ اس کے ناجائز کاروبار میں شریک ہو جاتا۔ میں نے صرف اپنے ضمیر کو قتل کر دیا ہوتا تو وہ سب لوگ قتل نہ ہوتے جو بعد میں ہوئے۔ لاکھوں کے نقصان کے بجائے مجھے لاکھوں کا فائدہ ہوتا۔"

"ایک تیسرا راستہ بھی تھا جو میں نے تلاش کیا تھا۔" رابعہ نے نظر اٹھائے بغیر کہا۔ "مجھے ڈر تھا کہ ایک دن ایسا آ جائے جب میرے اور تمہارے لیے سارے راستے بند ہو جائیں اور آج وہ دن آ گیا ہے۔"

"مجھے افسوس تو ہے رابعہ کہ اس دن میں نے تمہاری بات نہیں مانی جب تم نے کہا تھا کہ یہ سب چھوڑ دو اور اس دنیا سے نکل چلو۔ آدمی اپنی جنت کہیں بھی بنا سکتا ہے مگر ہمیں کیا ضرورت ہے اس جہنم میں رہنے کی۔ وہ اپنی ذات کی حد تک تحفظ اور سلامتی کا راستہ تو تھا اور ہمارے لیے زندگی کے سارے خوابوں کی تعبیر کا ضامن بھی تھا لیکن فرار میرے نزدیک بزدلی تھا اور میں خود اپنی نظر میں بے غیرت ہو کے نہ خوش رہ سکتا تھا اور نہ مطمئن۔ ایک مسئلہ ذاتی انتقام کا تھا لیکن دوسرا مسئلہ زیادہ سوہان روح تھا۔ اگر میرے باپ کو بلیک میل کر کے قتل کرنے والے کیفر کردار کو پہنچتے تو میں صبر کر لیتا مگر دکھ کی بات یہی تھی کہ وہ چور، ڈاکو اور قاتل سینہ تانے بے خوفی سے انصاف کے اصولوں کا اخلاقی قدروں کا اور معاشرے کی اجتماعی قوت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ انہیں کسی کی گرفت کا خوف نہیں تھا اور انہیں دولت کی طاقت کا اتنا گھمنڈ تھا کہ ان کے حوصلے بڑھتے جا رہے تھے۔ انہوں نے کیا نہیں کیا ہمیں تباہ کرنے کے لیے؟ مجھے اور تم سے بہتر یہ کون جانتا ہے مگر یہ کیسی بے بسی ہے اس پورے نظام کی رابعہ کہ غاصب کو حقدار تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ناجائز کو جائز مان لیا گیا ہے اور بیٹے ہیں اہل ہوس مسند

www.paksociety.com

بھی منصف بھی، ان کی فردِ جرم میں کیا نہیں ہے مگر ان کو دولت کی دیوار نے تحفظ بھی فراہم کر رکھا ہے۔ وہ اس معاشرے میں شریف، معزز اور محترم ہیں۔ مجرم وہ ہے جو ان پر انگلی اٹھاتا ہے۔ ان سے اپنا حق مانگے یا انصاف کی بات کرے۔ یہ بات نہ جانے کتنے لوگ جانتے ہیں مگر وہ سب خود غرض ہیں کہ منہ بند رکھنے میں اپنا فائدہ دیکھتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جس سے ان کے دنیاوی مفاد وابستہ ہوں۔ اگر وہ اکٹھے ہوں تو بہت بڑی طاقت ہیں۔ ان کے پاس مواخذہ کرنے کا، احتساب کا اور عدل اور انصاف کا حق ہے مگر اسی خود غرضی کے باعث وہ الگ ہیں اور منتشر ہیں۔ نتیجہ یہ کہ طاقتور وہ ہیں جو معاشرے کا ناسور ہیں۔ اعتراف سب کرتے ہیں کہ یہ ناسور سرطان بن گیا ہے مگر اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی ہمت کوئی بھی نہیں کرتا۔ میرے لیے یہ پہلے بھی ممکن نہیں تھا کہ انھی خود غرض، بزدل اور بے ضمیر افراد میں شامل ہو جاؤں اور آج بھی نہیں۔ حالانکہ پہلے کے مقابلے میں آج حالات بہت سخت ہیں۔ پہلے میں قانون کی طاقت پر بھروسہ کرتا تھا، دوستی کے سہاروں پر انحصار کرتا تھا اور اس خوش فہمی کا شکار تھا کہ زبانِ خلق سچ کہنے والے کی حمایت ضرور کرتی ہے۔ آج میں اکیلا ہوں۔ قانون میرے خلاف، میرے دشمنوں کے ساتھ ہے۔ میرے سہارے ختم ہو چکے ہیں یا جھوٹے ثابت ہو گئے ہیں اور زبانِ خلق خاموش ہے۔ اس کے باوجود ذہنی طور پر میں ان کی بالادستی تسلیم کرنے کو تیار نہیں جو خود کو شکاری سمجھتے ہیں جو شرافت اور انسانیت کے شکاری ہیں، حق و انصاف کے شکاری ہیں اور آدمی کے ضمیر کے شکاری ہیں۔ اگر میں بھی خوف زدہ ہو کے بھاگ گیا رابعہ تو اس معاشرے میں کتنے جبر یکی دلاور اور سیدا ہو جائیں گے، کتنے ڈی سی سلو ا پھر جنم لیں گے۔ رحمت کباڑی، استاد سیڈرز و اور کریم سیٹھ جیسے لوگ غالب آ جائیں گے اور معاشرے کو اتنا بے بس کر دیں گے کہ کسی شریف یا کمزور آدمی کو زندہ رہنے کا حق بھی ان سے خیرات میں مانگنا پڑے گا۔"

"مگر ہم اکیلے..... ان سب سے نہیں لڑ سکتے۔" رابعہ نے مجھ سے نظر چرا کے کہا۔

"اکیلا کون ہے رابعہ! میرے ساتھ تم ہو، محسن ہے اور یہاں تک کہ استاد شیدی جیسا بدمعاش بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایسا وقت کبھی نہیں آیا کہ دنیا میں سچ کہنے والے اور سچ کہنے والوں کا ساتھ دینے والے نہ رہے ہوں۔ ایسا ہوتا تو سچ کا لفظ ہی لغت میں نہ ملتا۔ پہلے میری جدوجہد صرف اپنے دشمنوں کے خلاف تھی مگر بات اب ذاتی انتقام کی نہیں۔ یہ لوگ تو سب کے دشمن ہیں، معاشرے کے، ملک اور قوم کے اور انسانیت کے۔ ان کے خلاف جہاد تو عبادت کی طرح فرض ہے۔ اگر اکثریت اس فرض کو نہیں سمجھتی یا سمجھنے کے باوجود پہلو تہی کرتی ہے تو میں ان کی تقلید نہیں کر سکتا۔ میں ان لوگوں کو بتا دینا چاہتا ہوں، خدا نے ہر دور میں ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ ضرور پیدا کیا ہے، نعوذ باللہ۔ میں اپنی ذات کو خدا کی طرف سے حق اور سچائی کا مینڈیٹ یافتہ مجاہد نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں صرف ایک آدمی ہوں مگر میں ایک تحریک بھی ہوں۔ سقراط سے گیلیلو اور لنکن سے [illegible] جو غلامی کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے۔ آزادی کی تحریک کا بانی میں قید کی ہر صعوبت جھیل کے مرنے کو سر بلند ہو سرخرو ہوئے۔ لاکھوں گمنام سپاہی ہر عہد میں ایسے ہی کسی انسانی مقصد کی خاطر شیطانوں کے خلاف جہاد میں جان سے گئے۔ انھی میں سے ایک میں ہوں۔ میں ان کا غرور توڑ کر ان کو نیچا دکھاؤں گا۔ ان کے مذموم عزائم کو خاک میں ملا دوں گا۔ [illegible] کو وہ عبرتناک سزا دوں گا کہ پھر کوئی ولاور کسی وزیر خان کو مفلس و گداگر نہ کر سکے گا۔ یہ کام میں خود کروں گا جو میری سمجھ میں ہے اور توفیق خدا دے گا۔ انجام کی مجھے پروا نہیں۔ میں مارا جاؤں، میری بعد خاک بھی نہ ہو گی۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب میں کسی پر انحصار نہیں کروں گا۔ سوائے اپنے خدا کے اور اپنی ذات کے۔"

"مجھ پر بھی نہیں؟" رابعہ نے خلا میں دیکھتے ہوئے دکھی لہجے میں کہا۔

"تم مجھ سے الگ کہاں ہو؟" میں نے کہا۔ "میری ذات کا ایک حصہ ہو، ایسے ہی جیسے خدا پر میرا ایمان میرے وجود کا حصہ ہے۔ محبت اور دوستی یہی تو میری طاقت ہے۔ یہ جنگ اب شروع ہوئی ہے رابعہ!"

"معلوم نہیں تم کیا کرنا چاہتے ہو مگر جو کچھ بھی کرو گے تنہا نہیں کرو گے۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

"میرے ساتھ رہو گی؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے رابعہ!" میں نے کہا۔ "میں نے تو سب کچھ داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا ہے جیسے اب کھلے میدان میں لڑنا ممکن نہیں رہا۔ میں دن کے اجالے میں کسی کے سامنے نہیں آ سکتا۔ مجھے رات کے اندھیرے میں شب خون مارنے ہیں اور چھپ کر رہنا ہے۔ جنگلوں میں اور ویرانوں میں [illegible] کو تلاش کرنا ہے اور ان کے ٹھکانوں پہ حملے کرنے ہیں۔ [illegible] حق وراثت سے دستبردار ہوتا ہوں۔ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس [illegible] وزیر خان کی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد پر حق ملکیت سے [illegible] ہوتا ہوں۔ ذاتی انتقام کے جذبات سے دستبردار ہوتا ہوں۔ [illegible] بار سفر میں میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس نے [illegible] حضرت علیؓ کا ایک واقعہ سنایا۔ کہ آپ نے دشمنِ اسلام کو زیر کیا۔ اس نے آپ کے چہرۂ مبارک پر تھوک دیا۔ آپ کا خنجر بکف ہاتھ رک گیا اور آپ نے دشمن کو چھوڑ دیا کیونکہ پہلے دشمنی کے جذبات میں ذاتی مخاصمت نہیں تھی۔ تو میں نے بھی ذاتی دشمنی کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ اب تو یہ ایک مقصد ہے۔ معاشرے کو ظلم اور استحصال کے تسلط سے نجات دلانے کا۔ انسانی حقوق پامال کرنے والوں کے عزائم کو شکست دینے کا۔ قانون اور اخلاقی اقدار کی دھجیاں اڑا کے تماشا کرنے والوں کو تماشا بنانے کا۔ بدمعاشی اور زبردستی کے بل پر اکڑ کر چلنے والوں کی گردن توڑنے کا۔ قانون میرا ساتھ نہیں دے سکا تو نہ سہی۔ میں خود قانون کے مطابق سزا دینے کا فرض ادا کروں گا۔ کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے اور مجھ سے اتفاق کرے یا نہ کرے، میری یہ جدوجہد جاری رہے گی کیونکہ معاشرے کے یہ سماجی جراثیم بہت گہری جڑ پکڑ چکے ہیں۔ مجھے ان کا قلع قمع کرنا ہے۔ اکیلا چنا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے یا نہیں، یہ مایوسی کا فلسفہ میں قبول نہیں کروں گا۔ جب تک یہ زندگی ہے، میرا مشن جاری رہے گا۔ میں ایک راستہ تو بنا لوں، پھر دیکھوں گا اس پر چلنے کے لیے کون آگے قدم بڑھاتا ہے۔"

"میں اب بھی تمہارے ساتھ رہنے کے ارادے پر قائم ہوں۔" رابعہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "خواہ تم جنگل میں رہو یا ویرانے میں، رات کے اندھیرے میں شکار کرو یا دن کے اجالے میں یلغار کرو، زیر زمین رہو یا زمین کے نیچے یا پہاڑ کے اوپر، میں تم کو چھوڑوں گی نہیں سکندر! اکیلا کہیں نہیں جانے دوں گی۔ حالانکہ ابھی تک مجھ پر واضح نہیں ہے کہ تمہارا پروگرام کیا ہے۔"

"تم نے ابھی تک یہ نہیں سوچا کہ اس راہ میں کتنی سختی کا سامنا ہو گا۔" میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔ "کتنے خطرات ہوں گے، کہاں کہاں بھٹکنا پڑے گا۔ پتھروں کی ٹھوکریں ہوں گی اور کانٹوں کا بستر، ہر قدم پر دشمن چھپے ہوں گے اور موت مقابل۔ مجھے ایک ایک دشمن کا پتا چلانا ہے۔ اس کی فردِ جرم تیار کرنی ہے اور پھر اسے ٹھکانے لگانا ہے۔ تم انتظار کر سکتی ہو؟"

"نہیں۔ انتظار بہت مشکل ہے۔ اتنا صبر اور حوصلہ نہیں ہے مجھ میں کہ اکیلی تمہارے تصور میں نیند حرام کیے رات جاگ کر گزاروں اور دن خوف کے سائے میں لرزتے کانپتے۔" وہ اب رونے لگی تھی۔ "کسی امید کے بغیر، کسی سہارے کے بغیر، کسی یقین کے بغیر۔ مجھے اپنے ساتھ رکھو سکندر۔ جو کچھ تم جھیل سکتے ہو، میں بھی جھیل سکتی ہوں، بھوک پیاس، جسمانی عذاب، حالات کی سختی، زندگی یا موت۔ مجھے سب قبول ہے مگر تمہارے ساتھ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ کبھی شکایت نہیں کروں گی۔ کبھی پچھتاؤں گی نہیں اور تمہاری راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ تمہیں میری ضرورت ہو گی سکندر۔"

"ہاں، ضرورت تو ہو گی، روشنی کی جو مجھے راستہ دکھائے اور محبت کی جو مجھے قوت دے۔" میں نے [illegible]

"جیسے مجھے اس وقت اشد ضرورت ہے کافی کی اور کچھ زہر مار کرنے کی تاکہ میری فوتیدگی نہ ہو۔" محسن نے اچانک اندر قدم رنجہ فرما کے کہا۔ "اُف یہ کیا غیر نوابی زبان استعمال فرما گئے ہم۔" اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

"نواب تمھے خاں! میں نے ابھی ابھی پرنسس صوفیہ کو مطلع کیا ہے کہ میں دشمنوں کے خلاف گوریلا جنگ شروع کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "دشمن نے ہمارے لیے کھلے میدان میں مقابلے کو ناممکن بنا دیا ہے۔"

"میں تو شروع سے تیرے طریقِ جنگ کی افادیت کا قائل نہیں۔" وہ بولا۔ "میاں وہ دن اب نہیں رہے کہ جنگ پانی پت کے میدان میں ہوتی تھی اور بالیاں شہر چین کی نیند سوتے تھے اور جنگ بھی کرکٹ میچ کی طرح تھی کہ صبح ناشتے وغیرہ کے بعد طبلِ جنگ بجا تو صفیں وغیرہ درست کر لیں اور پھر کہا کہ قبلہ آئیے تو ذرا دو دو ہاتھ ہو جائیں اور ادھر سورج ڈوبا ادھر جنگ ختم۔ چوہدری ولاور جیسے دشمن جو قانون کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ان سے قانون کی جنگ لڑنے کا انجام دیکھ لیا۔ مگر خیر، دیر آید درست آید۔ اب بھی تو نے فیصلہ کر لیا ہے تو ملا ہاتھ۔ دیکھتے ہیں کون بڑا شکاری ہے۔ وہ کہ ہم۔ براہِ راست مقابلہ ہو جائے، بیچ میں قانون نہ پہلے تھا نہ آئندہ ہو۔"

"ہماری پرنسس صوفیہ بھی شانہ بشانہ میدانِ کارزار میں اپنے جوہر دکھانے کو کمر بستہ ہیں۔ حالانکہ نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے۔" میں نے کہا۔

"مرلوا ور تو اٹھ جائے گا۔" رابعہ نے کہا۔

"انگلی اٹھ جائے گا، یہ ایک بات ہے کہ نشانہ چوک جائے اور مارا جائے وہ جو پہلے ہی مارا ہوا ہے۔ تیغ نگاہِ ناز کا۔ اور وہ کیا کہتے ہیں، عشوہ و غمزہ و ادا کا۔ اور خنجر فراق کا۔" محسن خان نے کہا۔ "کیا غضب کی اردو بول رہے ہیں ہم، چشم بد دور۔"

"یہ تم اپنا ماجرائے دل بیان کر رہے ہو بیٹے؟" میں نے کہا۔ "میں لکھ دوں گا شہلا کو۔ اور لو لو۔"

"پرنسس!" محسن نے کہا۔ "ہم نے جو ترکیب بتائی تھی وہ کامیاب رہی؟"

"ہاں، ورنہ وہ فرشتے تو ساتھ ساتھ آتے۔" رابعہ ہنسی۔ "تم نے بہت اچھا کیا کہ لوٹ کر ہی نہیں آئے ورنہ عاقل رشیو [illegible] تو اتنے برہم تھے کہ تمہیں کبھی معاف نہ کرتے۔ ان حالات میں وہاں

www.paksociety.com

...ضمن تھا۔ پیچھا تو پہلے بھی کرتے تھے ان کے آدمی، مگر جو مہرہ بٹھا دیا تھا انھوں نے، ظاہر ہے یہ پابندی تم قبول نہ کرتے تھے اور نہ میں برداشت کرتی۔ پیر گاڑی بے کار ہو گئی تھی۔ ایک جیپ میرے پیچھے تھی جو دروازے پر کھڑی تھی اور آگے والے دونوں مار ڈالنے کو تیار ہو گئے۔"

"یہ کیسے؟" میں نے کہا۔ "کوئی جال بچھایا تھا؟"

"ہاں، محسن نے گاڑی کے دو چھوٹے چھوٹے شعلوں ... دونوں طرف کیلیں لگائی تھیں۔" وہ ہنسی۔ "میں نے نکل کے پیچھے دیکھا تو باہر جیپ میں دو آدمی بیٹھے ہیں، انہیں سمجھ آ گئی ... وہ سمجھ گئے ہوں گے۔ وہ اندر آئے تو [illegible] کسی کی ... میں ایک منٹ کے لیے باہر نکلا اور دونوں پہیوں کے بالکل پیچھے ... دو کیلیں رکھ آئی۔ دونوں میں کیلوں کے نوکیلے سرے اوپر تھے۔ چند منٹ بعد وہ دونوں باہر آئے اور سیدھے جیپ میں جا بیٹھے۔ ... گاڑی میں سامان رکھا اور باہر نکلی تو شاید انھوں نے وائرلیس پر انسپکٹر صاحب کو اطلاع دی اور گاڑی اسٹارٹ کر کے پیچھا ... کہ دونوں کیلیں دونوں ٹائروں میں ... مشکل سے دس گز دور آگے گاڑی رکو ... ٹوٹتے ہوں گے وہ کہ کسی نے جان بوجھ کے انہیں روکنے کا بندوبست کیا تھا لیکن انھوں نے ... یہی کہا ہوگا کہ گاڑی اچانک پنکچر ہو گئی۔ ورنہ بھاڑ کھانے کو اور بھی ہو سکتے تھے۔ یہ جانتے ہیں تھے کہ کوئی سامنے کیلیں رکھ گیا۔ انہیں صرف تعاقب کا حکم تھا، گاڑی روکنے کا نہیں ورنہ وہ گولی چلا کے میری کار کا ٹائر برسٹ کر دیتے۔ بیچارے بے بسی سے دیکھتے رہ گئے اور میں نکل آئی۔ یک بہ شد و شد۔ باری باری دونوں ٹائروں کو لات مار رہے تھے۔"

"اور اب گاڑی کہاں ہے؟" میں نے قہقہہ مار کے کہا۔

"تم تو ٹیکسی میں آئی تھیں۔"

"گاڑی میں نے گیراج میں چھوڑ دی ہے۔ ایک ہفتے بعد ملے گی۔" وہ بولی۔ "سفید رنگ کرنے کو کہہ دیا ہے۔ وہ لال رنگ ہر جگہ نظر آتا تھا۔ نمبر تو بدلا جا سکتا ہے۔"

"یہ تم نے عقلمندی کا ثبوت دیا پرنسس۔" میں نے کہا۔ "مگر تم دونوں کے یوں غائب ہونے سے انکل رضوی سمجھ گئے ہوں گے کہ اب ہم سب سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہیں۔ کھلم کھلا قانون شکنی کا تہیہ کر چکے ہیں۔ میں تو مفرور اشتہاری مجرم تھا ہی، اب تم دونوں بھی ہو گئے۔ وہ تمہاری تلاش میں بھی دن رات ایک کر دیں گے۔"

"اب تو ہم دن کو نکلیں گے ہی نہیں۔" محسن بولا۔ "رات کو اپنا کام کریں گے اور دن سو کر گزار دیں گے۔"

"میرا تو خیال ہے کہ اس طرح زیادہ عرصہ نہیں گزارا جا سکتا۔" رابعہ نے کہا۔ "ہمیں کچھ دن کے لیے اس شہر سے نکل جانا چاہیے۔"

"ہاں، ہم اس طرح بہت زیادہ دن چھپے نہیں رہ سکتے۔ یہ نام ابھی تو ٹھیک ہیں مگر ہر نئی جگہ ہمارے نام بھی نئے ہونے چاہئیں۔" محسن نے کہا۔ "بلکہ ہو سکے تو ہمیں صورتوں کو بھی بدل رہنا چاہیے۔ ابھی تو صرف سکندر کو تلاش کیا جا رہا ہے اور پولیس نے تو ایک بار اخبار میں اشتہار دے کر اپنی ضابطے کی کارروائی پوری کر دی۔ وہ ہر روز یا ہر ہفتے تصویر نہیں چھپوائیں گے مگر والد اور ایڈ کمپنی کے لیے ایسا کرنا مشکل نہیں۔ جب انہیں معلوم ہوگا کہ سکندر کے ساتھ ان کی ..... وہ ..... میرا مطلب ہے وکیل اور بیچ بچار جناب محسن خاں بھی روپوش ہیں تو وہ بہت خوش ہوں گے کہ ہم نے ان کا کام آسان کر دیا۔ آدمی کو ڈھونڈنا مشکل ہوتا ہے مگر ایک گروہ کو تلاش کرنا آسان ہوتا ہے اور بفضل خدا اب ہم ایک دہشت پسند گروہ بن چکے۔ تو خیال ہے اس کا کوئی نام بھی ہونا چاہیے کیونکہ اس کے بنیادی اراکین میں جو اتفاق رائے سے ایک منشور بھی رکھتے ہیں۔ ہاں علاوہ اعزازی رکن مس شہلا فرام اسلام آباد اور استاد چنگیز ..."

"میں اتفاق رائے سے خود کو اس کا تاحیات صدر منتخب قرار دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہ جمہوری طریقہ ہے اور دہشت پسندوں کا جمہوریت سے کیا تعلق۔" محسن نے اعتراض کیا۔ "یہ فیصلہ ڈوئل کے ذریعے ہوگا مگر ڈوئل میں جوڈو کے داؤ ممنوع ہوں گے۔ ویسے فرقہ سے نو ... ہوگی۔ ابھی جو بات میں سنجیدگی سے فرما رہا تھا وہ اشکال مبارک کی تبدیلی ہے۔ چوہدری صاحب ... رکھنے کے لیے اور انڈر گراؤنڈ رکھنے کے لیے ہماری تصاویر روز یا ہر ہفتے ... اشاعت دے سکتا ہے اور اسی طرح ہماری تصاویر سے مزین پوسٹر لگوا سکتا ہے تاکہ دیکھنے والوں کے ذہن میں ہماری صورت نقش ہو جائے جیسے روز ٹی وی پر یا فلموں میں بار بار نظر آنے والی ہیروئن کے ساتھ ہو جاتا ہے کہ بیچاری کی شاپنگ کے لیے بھی انار کلی جائے تو پبلک پہچان جاتی ہے اور ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔"

"ہر روز اشتہار چھپوانے کا کوئی سبب بھی ہونا چاہیے۔" رابعہ نے کہا۔

"سبب وہ ایجاد کرے گا۔ برادرم سکندر بخت کا نام محتاج تعارف نہیں۔" محسن بولا۔ "میری تصویر اس عنوان سے شائع ہو سکتی ہے: مسمی فلاں ابن فلاں جو ہمارے سیلز منیجر تھے، فلاں تاریخ سے دس لاکھ کا غبن کر کے روپوش ہیں۔ ان کے بارے میں اطلاع فراہم کرنے والے کو دس ہزار روپے انعام دیا جائے گا اور ان سے معاملہ کرنے والا اپنے نقصان کا خود ذمے دار ہوگا۔ ایسے اشتہار آتے ہی رہتے ہیں۔ رابعہ کا معاملہ زیادہ نازک ہے۔ یہ بھی اشتہار دیا جا سکتا ہے کہ میری زوجہ مسماۃ رابعہ ... فلاں تاریخ سے غائب ہے۔ اس کے بارے میں قریبی تھانے کو مطلع کیا جائے۔ لوگ کبھی غور کریں تو جوان لڑکیوں اور بیویوں کے گھر سے غائب ہونے کی وجہ ہمیشہ ایک ہی سمجھی جاتی ہے۔ اگر صرف غائب ہے لکھ دیا جائے تو لوگ کہیں گے کہ بھاگ گئی۔ اب میرے اور رابعہ کے بارے میں اس قسم کا اشتہار ہمارے ہوتے ہوئے بھلا کون دے سکتا تھا؟ ہم اخبار کو بھی قانونی نوٹس نہ داغ دیتے؟ لیکن اب کوئی کچھ بھی لکھے ہم نہ تو چیلنج کر سکتے ہیں اور نہ اس کی تردید کرنے کے لیے سامنے آ سکتے ہیں۔ میں ایک فرضی کمپنی کا سیلز منیجر ہو سکتا ہوں تو رابعہ بھی ایک فرضی شخص کی منکوحہ ہو سکتی ہے۔ اگر انھوں نے ہماری تشہیر کی ٹھان لی اور ساری دنیا کو ہمارے پیچھے لگانے کا فیصلہ کر لیا تو وہ کیا نہیں کر سکتے۔ سارے ملک کے اخبارات میں تصاویر چھپوا سکتے ہیں۔ ٹرینوں اور بسوں میں اور چند بڑے بڑے شہروں کے نمایاں مقامات پر پوسٹر لگانا بھی مشکل نہیں مگر اس سے ہمارے لیے کئی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔"

"مجھے اس کا اندازہ ہے۔ ابھی میری زیادہ پبلسٹی نہیں ہوئی تھی مگر اس کے باوجود میں کئی جگہ پہچانا گیا۔" میں نے کہا۔ "اور بال بال بچا۔ حد تو یہ ہے کہ منظر کے چہروں میں ایک خاتون نے اخبار نکالا جن کا اخبار سے کیا تعلق ... دور کا واسطہ نظر نہ آتا تھا۔ رابعہ تو برقع اوڑھ کے پھر سکتی ہے۔ ہمیں یا تو ... لینا پڑے گا یا پھر پہلے دو مہینے میں شیو چھوڑ کر داڑھی مونچھیں ... لمبی ہوں ... منڈوا سکتے ہیں۔ آنکھوں میں کاجل ... گلے میں ریشمی رومال ڈال سکتے ہیں اور ہو سکے تو ... لاچا پہن سکتے ہیں اور پان کھا کے اور کان میں ... لگا سکے ...."

ہنستے ہنستے رابعہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میرے لیے ... یہ بھی محال ہے۔ فرض کرو شہلا دیکھ لے محسن کو اس حلیے میں تو کیا اس کی ... قتل یا خودکشی؟"

"دونوں، پہلے میرا قتل پھر محسن کی خودکشی۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد کسی جوان رہنا ہے مقصد۔"

"آج کے ترقی یافتہ دور میں اتنا مشکل طریقہ اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" محسن بولا۔ "ہر ساخت اور رنگ کی داڑھی مونچھوں کے سیٹ ملتے ہیں۔ ہر قسم کی وگ دستیاب ہے۔ کانٹیکٹ لینز ہیں آنکھوں کا رنگ بدلنے کے لیے اور لباس تو اس وقت بھی ہمارے پاس چار ہیں۔ ایک انسپکٹر کی وردی۔ ایک پوسٹ مین کی۔ ایک ڈاکیے کی اور ایک ... کی۔ حسب ضرورت اور مزید ملبوسات اختیار کیے جا سکتے ہیں اور سلوائے جا سکتے ہیں۔"

"مذاق کی بات چھوڑو۔ کیا سچ تم فیصلہ کر چکے ہو کہ ... وغیرہ سب ختم۔" رابعہ نے کہا۔ "خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش ترک اور ... الحسن کی جائیداد سے ... جو تمہارا قانونی حق ہے؟"

"فیصلہ تو بہت پہلے سنا چکا ہوں میں رابعہ۔ مذاق کی کون سی بات ہے اس میں؟" میں نے کہا۔ "میں نے جس حد تک ممکن ہو کوشش کی۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں سوائے بغاوت کے۔ کیا تمہیں احساس ہو رہا ہے کہ تم نے قانون پڑھا، اتنا عرصہ پریکٹس کی اور نام کمایا، پیسہ کمایا اور میرے ساتھ ہی سب ختم۔ اب وکالت بھی ختم اور دنیا سے تعلق بھی ختم۔ الٹا تم کو ایک مفرور اشتہاری مجرم کے ساتھ فرار ہونا ہے اور ایک بالکل غیر قانونی جنگ میں شریک رہنا ہے۔ میں نے اسی لیے کہا تھا کہ یہ تمہارے لیے بہت مشکل ہوگا۔ میں تو مجبور ہوں، تم مجبور نہیں ہو۔"

"میں بھی مجبور ہوں۔ تم اپنی مجبوری کو سمجھتے ہو تو میری مجبوری سے کیوں انکار کرتے ہو؟" وہ نظر جھکا کے بولی۔

"تمہارے لیے ابھی سوچنے کا وقت ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تو اپنی کشتیاں جلا چکا۔ تم اسے بے وقوفی کہہ سکتی ہو۔"

"نہیں، دیکھو میں نے اپنی کشتیاں تم سے پہلے جلا دی تھیں۔ اسی گھر کے ساتھ جس کی راکھ میں میرا ماضی بھی خاک ہو گیا۔ کون رابعہ اور کون ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔ میں تو پرنسس صوفیہ ہوں۔" وہ تلخی سے ہنسی۔

"میرا کام اور میرا مشن بہت کٹھن ہے رابعہ۔ کون جانے میں کدھر نکل جاؤں۔ لوٹ کر آؤں یا نہ آؤں۔ اپنے ماضی سے کٹ کر میں کسی مستقبل کی راہ کا تعین بھی نہیں کر سکتا۔ کل میں کیا تھا اور آج کیا ہوں۔ آنے والے دن کا پتا نہیں کہ مجھے کس حال میں نوشتۂ تقدیر کو قبول کرنا پڑے۔" میں نے کہا۔ "مرد کے لیے دنیا میں اکیلے رہنا کتنا بھی مشکل ہو، ناممکن نہیں ہوتا لیکن تم عورت ہو۔"

"کیا میں نے کبھی کہا ہے کہ میں عورت نہیں ہوں؟" وہ

www.paksociety.com

بچی سے لڑی جو کسی بھی عورت کے مقابلے میں دنیا کے کسی امتحان میں پوری نہیں اتر سکتی۔ عورت اگر محبت دے سکتی ہے قربانی دے سکتی ہے اور سہارا دے سکتی ہے تو کیا یہ سب کچھ میں نے نہیں دیا؟ عورت اگر صبر و رضا اور استقامت رکھتی ہے تو کیا میں کم ہوں اور بار بار اکیلی عورت کیوں کہتے ہو مجھے؟ میرے ساتھ تم نہیں ہو؟"

"آئی ایم سوری رابعہ، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ مجھے معاف کر دو۔ تمہارا مقابلہ کوئی عورت نہیں کر سکتی۔" میں نے محسن کی موجودگی میں جذبات پر قابو رکھا ورنہ اس وقت رابعہ نے جس بے باکی سے اپنی محبت کا اعلان کیا تھا اس کے بعد میرے لیے ضروری تھا کہ میں اپنے عشق کا برملا اظہار کروں۔ خود محسن اس کی جرأت پر دم بخود رہ گیا تھا۔ یہ کوئی چھپ چھپ کے کی جانے والی، سماجی قیود سے ڈرنے والی مجرمانہ محبت نہیں تھی۔ اس میں نہ ہوس و خواہشات کی پکار نہیں تھی، جسم کی پیاس نہیں تھی اور نہ ہی تعلق کی بات نہیں تھی، یہ محبت ایک لازوال جذبہ تھی۔ ایک جسم بھر احساس تھی اور وجود کی قربت تھی۔ من تو شدم تو من شدی سے آگے کی منزل تھا۔ منصور کہتا ہے انا الحق۔ وہ مجھ میں ہے اور میں اس کے وجود سے جدا کہاں سے الگ کچھ نہیں ہوں اور فلمی شاعری کی زبان میں پیار کیا تو ڈرنا کیا۔

"آپ لوگ شدید جذباتی بحران میں مبتلا ہیں۔" محسن نے فوراً صورت حال کو سنبھالا۔ "اور میرا خیال ہے کہ یہ نتیجہ ہے اعصابی کشیدگی کا۔ ہم اب چلتے ہیں، تم آرام کرو کیونکہ کل رات بھی تو سو یا نہیں تھا۔ میں رابعہ کو گھر چھوڑ کر اپنے استاد حیدری کے پاس جاؤں گا۔ وہ قریب سے تفتیش کر رہا تھا اور میرا خیال ہے حالات کچھ بتا سکتا ہے۔ وہ بزدل آدمی ہے اور اس کی کمزوری ہے اس کے جوڑ ہیں۔ وہ غداری کے جرم میں ایک بار سزائے موت کا مستحق ہو چکا ہے۔ لیکن اسے ڈبل ایجنٹ کا رول دیا گیا تھا کہ وہ اپنی سابقہ غلطی کی تلافی کر دے۔ اب ناکامی کے بعد وہ ایک طرف سے تو گیا۔ چوہدری ولاور اور ان کا ٹولہ بھی اس کو سخت ترین عذاب دے کر ماریں گے۔ اس کے لیے کوئی چارہ نہیں ہے تو ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ جو کچھ جانتا ہے سچ سچ بتا دے تو ہم انتظام کر سکتے ہیں اس کو حفاظت کہیں پہنچا دیں۔" میں نے اسے ... وہ مسکرایا ... تو نے اپنے بارے میں کچھ نہیں کہا محسن، تو کس طرح

روپوش رہے گا۔" میں نے کہا۔ "تیرے ماں باپ ہیں ... ہے۔ تیرے خلاف کوئی سنگین الزام بھی نہیں ... تو نہیں ایسی ... تیرے معاملات ... تو......"

"... اب ... کو اتنے لمبے سفر میں ... ساتھ قدم ملا کے چلتے رہے ہیں تو اب ... کیسے ہو سکتے ہیں۔" وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میرا فیصلہ ہے۔ تو نے اپنے گھر کی ... ہے۔ ... آسمان ... ساتھ ہے ... نہیں ہے۔"

جب وہ چلے گئے تو میں نے محسوس کیا کہ میں ... جذبات تھے ... رابعہ کی محبت تھی اور محسن کا خلوص تھا اور ... اتنی بڑی دنیا کے مقابل اکیلا ہو کے بھی اکیلا نہیں اور ... اس نے سہارے ... جیتے ہیں ... خون کی پیاس ... سفاک شکاری ہیں تو ... ان کے مقابلے کے لیے میری پہلی طاقت اس کی ذات پر یقین ہے جس کا بچانے والا ہاتھ مارنے والے ہاتھ سے ہمیشہ زبردست رہا ہے۔ میری دوسری قوت رابعہ اور محسن ہیں جو محبت اور خلوص کے بیش بہا خزانوں کے ساتھ ہر قدم پر اس جنگ میں میرے ساتھ شریک ہیں اور یہ خزانے چوہدری ولاور اینڈ کمپنی کے ان دنیاوی مال و متاع کے خزانوں سے صد ہزار درجہ افضل و برتر ہیں جو خالی ہو جاتے ہیں اور لٹ بھی جاتے ہیں۔ تیسری قوت میری اپنی ذات ... اور ہر حال میں ثابت قدم رہنے کی صلاحیت ہے اور ... اگر تین طرف سے مجھے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں تو میں تینوں سے مقابلے کی قوت رکھتا ہوں۔

رات کے بارہ بجے میں نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا اور آپریٹر سے کہا کہ مجھے ... ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کا نمبر ... پانچ منٹ بعد گھنٹی بجی اور آپریٹر نے کہا۔ "بات کیجیے۔" "... وارڈ ..." میں نے کہا۔

"... ابھی تو بتایا ہے کہ کسی ... نے کہا۔ "کیا یقین نہیں آیا؟"

"سوری ڈاکٹر، وہ آپریشن تھا۔" میں نے کہا۔ "میں ڈاکٹر مجید بول رہا ہوں۔ آج شام حادثاتی طور پر گولی لگنے کا ایک کیس آیا تھا مس نازلی شیخ......"

"نرس۔" اس نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے چلا کر کہا۔ "یہ نازلی شیخ کو پوچھ رہا ہے کوئی۔" وہ یقیناً رات کی شفٹ میں آنے والا کوئی نیا ڈاکٹر تھا۔ پہلے میں نے جس ڈاکٹر سے بات کی تھی وہ اتنا بد تمیز نہیں تھا۔ "ہاں جی، کیا پوچھنا ہے آپ کو؟"

"یہ پوچھنا ہے کہ اس کی حالت کیسی ہے؟" میں نے کہا۔ "خطرے سے باہر ہوئی یا نہیں؟"

"ابھی تو انتہائی نگہداشت میں ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن اُن کے بھائی سے بات کریں۔" لیکن میں نے ریسیور رکھ دیا۔

اکرام شیخ خود بہن کے پاس موجود تھا اور میں اس کے ذہنی کرب کا اندازہ کر سکتا تھا۔ اس نے اولاً تو فرض کو مقدم رکھتے ہوئے بہن پر گولی چلا دی تھی مگر فرض اور محبت کی کشمکش کا وہ فیصلہ کن لمحہ گزر گیا تھا جب اس نے فیصلہ تو صحیح کیا تھا مگر اس کے نتائج بہت غلط نکلے تھے۔ اب وہ جذباتی بحران کا شکار ہو گا اور ہدفِ ملامت اس کی اپنی ذات ہو گی۔ جھوٹ بول کے اس نے الزام کسی پر نہیں آنے دیا تھا ورنہ اس وقت وہ ماں باپ کی نظر میں بھی فرض شناس پولیس افسر نہیں بہن کا قاتل ہوتا۔ اس کی ہمت کی تعریف کرنے والے کم ہوتے، اس کی حماقت پر افسوس کرنے والے زیادہ۔ اب بھی وہ سوچ رہا ہو گا کہ جو عشق نے نازلی سے کیا کیسے گا۔ اس سے معافی مانگے گا اور پھر اس سے کہے گا کہ ایک جھوٹ کو نباہنے میں مدد کرے۔ اپنے اس بھائی کی عزت رکھے جس نے اپنی طرف سے بہن کی جان لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور بہن کی زندگی کو اس لیے اہم نہیں سمجھا تھا کہ خود پولیس کی وردی میں تھا۔ ایک غلطی وہ پہلے کر چکا تھا جب بہن پر گولی چلانے کے بعد اس کے خون کو بہتا دیکھ کر وہ حوصلہ ہار گیا تھا اور اس نے بہن کی بات مان کے ایک مجرم کو فرار ہونے کا موقع فراہم کر دیا تھا ورنہ وہ دل کو پتھر کر لیتا تو بہن کو مرنے دیتا اور مجرم کو پہلے گرفتار کرتا۔ اب اس کے لیے اپنے احساسِ ندامت کا بوجھ عذاب تھا کہ اس نے نازو پر گولی کیوں چلائی تھی اور اگر چلا ہی دی تھی تو پھر اپنی کمزوری کا شکار کیوں ہوا۔ بہن کی جان جاتی لیکن مقصد تو پورا ہوتا جس کے لیے وہ بھائی نہیں رہا تھا صرف پولیس افسر رہ گیا تھا۔ اب تو خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم والی بات تھی۔ اس نے نازو کی بات مان لی تھی۔ کیا نازو اس کی بات مان سکے گی اور معاف کر دے گی؟ اگر اس نے بھائی کی خاطر جھوٹ بول دیا تب بھی اکرام شیخ تمام عمر اس کے سامنے شرمندہ

رہے گا اور اس کے احسان کے بوجھ تلے دبا رہے گا۔ یہ انکشاف بھی اس کے لیے کم تکلیف دہ نہ ہو گا کہ اس کی بہن نے محبت بھی کی تو کس سے۔ ایک مجرم سے جسے قانون کا محافظ بھائی اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ وہ اپنی ضد اور خود سری کی جذباتی فطرت سے واقف تھا۔ ایک انتہا پر وہ خود تھا۔ دوسری انتہا پر بہن پہنچ گئی تھی اور نتیجہ اس تصادم کی صورت میں برآمد ہوا تھا۔ اکرام شیخ کے ذہن کے لیے ایک صدمہ یہ بھی ہو گا کہ اس بیوقوف بہن کی محبت کے سیلِ بے عناں کی راہ میں بند کیسے باندھے۔ اسے کیسے سمجھائے کہ نادان لڑکی! سکندر بخت تجھ سے کبھی محبت نہیں کر سکتا، خواہ تو اس کی خاطر جان ہی کیوں نہ دے دے۔ اس کا جواب بھی شیخ کے لیے غیر متوقع نہ ہو گا۔ وہ صاف کہے گی کہ محبت کرنا یا نہ کرنا میرے اختیار کی بات نہیں۔ اگر سکندر مجھ سے محبت نہیں کر سکتا تو یہ اس کی مجبوری ہے اور اگر میں صرف سکندر کو چاہتی ہوں تو یہ میری مجبوری ہے۔ اپنی اپنی مجبوریوں کے ساتھ سب ہی جیتے ہیں اور نہیں جی سکتے تو مر جاتے ہیں۔ اسے بہن کی زندگی کی اس بے بسی اور تباہی کا دکھ ہو گا۔ نہ یہ ممکن ہو گا کہ وہ اس کے جذبات کا رخ موڑ سکے اور اسے مجبور کر سکے کہ وہ ماں باپ کی پسند کے مطابق شادی کرے اور اس شخص سے محبت کرے جو اس کا شوہر کہلائے گا۔ بفرضِ محال سب نے جبر کیا اسے کسی کے ساتھ رخصت کر دیا تو خواہ وہ دنیا کے نقطۂ نظر سے حسنِ صورت اور سیرت میں مثالی ہو، وہ سکندر بخت نہیں ہو گا جسے نازو اتنی شدت سے چاہتی ہے۔ وہ کبھی کسی سے محبت نہ کر سکے گی اور مجبوری کا یہی زہر اس کی زندگی کو آخری سانس تک ایک عذابِ مسلسل بنا دے گا۔

مجھے نیند کی اشد ضرورت تھی لیکن ذہن پر ہر سمت سے پریشان کن خیالات کی یلغار اتنی شدید تھی کہ نیند قریب بھی نہ آ پاتی تھی۔ کئی بار میں نے آنکھیں بند کر لیں مگر نہ جانے کب مجھے احساس ہوا کہ میں اندھیرے میں لیٹا چھت کو گھور رہا ہوں جس کی مدھم سی سفیدی تاریک سینما ہال کے پردے کی طرح میرے خیالوں کے عکس کو متحرک فلم کی طرح پیش کرنے لگی تھی اور یہ خیالات خوشگوار تصورات پر مبنی نہیں تھے۔ اس میں رابعہ کے اور میرے ارمانوں کی کسی خوشی کا اجالا نہیں تھا اور کسی خواب آرزو کا رنگ نہیں تھا۔ ان میں اندیشہ ہائے دور و دراز تھے اور خوف کے بھیانک فریب تھے جو شکلیں بدل بدل کے مجھے ڈراتے تھے۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی نے سکوتِ شب کو منتشر کر دیا ... آواز مجھے بیداری سے خبردار کرنے والے اس ... جو ... میں سمٹے ہوئے بند دروازوں کے پیچھے ...

www.paksociety.com

ہے نے دہشت زدہ شہریوں کے اعصاب کو جھنجوڑ دیے۔ میں
ایک دم اٹھ بیٹھا۔ اس وقت فون کرنے والا کون ہو سکتا تھا؟
میں نے ریسیور کی طرف دیکھ کر سوچا۔ گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔
اور محسن کے سوا تو کوئی بھی نہیں جانتا کہ میں یہاں ہوں۔ آپریٹر
نے کسی اور کمرے کی کال غلطی سے یہاں تو نہیں ملا دی؟ میں
نے ریسیور اٹھا لیا کیونکہ ٹیلیفون خاموش ہونے پر بے چینی بڑھ جاتی۔
"سوری سر۔" آپریٹر نے کہا۔ "میں نے تو کہا تھا کہ آپ سو
رہے ہوں گے لیکن مجھے مجبور کیا گیا کہ جب تک آپ نہ اٹھیں
رنگ دیتا رہوں۔ اور پھر بھی آپ نہ سنیں تو کسی کو بھیج کر جگا دیا
جائے کیونکہ معاملہ زندگی اور موت کا ہے۔" مہذب آپریٹر شاید یہ سوچ
رہا تھا کہ میں نصف شب کے بعد آرام میں مخل ہونے پر برہمی
کا اظہار کروں گا۔
"بعد از آل... " میں نے کہا۔ "بات کون کرنا چاہتا ہے؟"
"نواب تیغے خان صاحب۔ بہت دھمکیاں دے رہے تھے
کہ اپنے پیچ سمیت اٹھا کے لے جاؤں گا۔ ہوٹل خرید کے...
ڈال دوں گا۔"
"اچھا اچھا۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "بات کراؤ۔ ان
کی عادت ہی ایسی ہے۔ آدمی برے نہیں ہیں۔"
"سکندر۔" محسن کی آواز آئی اور میں حیران ہوا کہ اس
نے ڈاکٹر امجد کیوں نہیں کہا۔ "یار کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔"
میں نے اس کی آواز پر غور کیا۔ گو لہجہ وہی تھا مگر آواز میں
معمولی سا فرق تھا۔ محسن اتنا بے وقوف ہو گیا ہے کہ میرا اصل نام
لے رہا ہے اور پھر کسی گڑبڑ کی بات فون پر کرنا چاہتا ہے۔ کیا وہ
جانتا نہیں کہ درمیان میں آپریٹر بھی ہے۔
"کیا بات ہے؟" میں نے محتاط ہو کے کہا۔ "نواب تیغے
خان صاحب!"
"آپ اگر گھوڑے سے نیچے ہوں تو سونا موقوف کریں اور
نیچے آ جائیں۔" محسن نے کہا۔ "اور اپنی گاڑی لے کر بیٹن روڈ کے
راستے مال پر آئیں۔ پھر زمزمہ کی طرف چل پڑیں۔ میں کسی جگہ بھی
روک لوں گا۔ رفتار گولی سے کم رکھیں تاکہ میں دیکھ سکوں۔"
میں نے لائن منقطع ہونے کی آواز سنی اور یہ اندازہ بھی کر
لیا کہ معاملہ یقیناً سنگین ہے ورنہ محسن مجھے ایسے وقت میں بیدار
نہ کرتا۔ اس نے فون پر کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ صرف ذہنی پریشانی کا
اثر تھا کہ گفتگو کے آغاز میں اس نے میرا نام لے لیا۔ شاید خود اسے بھی
احساس تک نہیں ہوا۔ ریسیور رکھتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ محسن
نے جاتے وقت کہا تھا کہ وہ رابعہ کو ہوٹل میں چھوڑ کے خود استاد
ٹیڈی کے پاس جائے گا اور اب اس نے جس سمت بلایا تھا اس
سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ٹیڈی کے گھر کی طرف سے بول رہا
ہے اور اس نے راستے میں کسی جگہ سے فون پر بات کی ہے۔ کپڑے
اور جوتے پہننے میں مجھے دس منٹ بھی نہیں لگے۔ کاؤنٹر پر اس
وقت دوسرا کلرک بیٹھا تھا۔ میں نے چابیاں اس کے حوالے
کرتے ہوئے تاکید کی کہ کوئی بھی میرا پوچھتا ہوا آئے اسے میرے
کمرے کا نمبر ہرگز نہ بتایا جائے اور علاقائی ڈسپنسری ہو تو اس کو بھی
انتظار کرنے کو کہا جائے۔ اگر کسی کا پیغام موصول ہو تو نوٹ
کر لیا جائے مگر فون پر بھی کمرے کا نمبر بہرحال کسی کو معلوم نہیں
ہونا چاہیے۔ محض شکوک کا ازالہ کرنے کی خاطر میں نے وضاحت
کر دی کہ میرے مریض اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو دن رات دیکھ
دیکھنے میں خود مریض بن گیا تھا چنانچہ اب کچھ دن چھپ کر آرام
کرنا ہی میرا علاج ہے۔
فون موصول ہونے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد میں
گاڑی میں بیٹن روڈ سے گزرا۔ دودھ کی ایک مشہور دکان اس
وقت بھی کھلی ہوئی تھی جہاں جان بنانے والے بڑے بڑے
پیالوں میں لیمن سول ملائی والا ابلتا ہوا دودھ پھونک پھونک کر
پی رہے تھے۔ اکا دکا موٹروں اور سائیکلوں کے سوا سڑک
پر سے گزرنے والا کوئی نہ تھا۔ مال روڈ کے موڑ پر ایک جگہ
گشت کرنے والی پولیس نے روکا اور عادت کے مطابق سوال
کیا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے کار کے ریڈ کراس کے
نشان کی طرف اشارہ کیا۔ "نظر نہیں آتا کیا؟ ڈاکٹر ہوں، مریض
کو دیکھنے جا رہا ہوں۔" میں نے ان کے سامنے سے جھٹکے سے گاڑی
چلا دی۔ پھر ان میں سے کوئی چلایا اور میں نے جلدی سے دیکھا وہ
ڈنڈا اٹھا کر پیچھے دوڑ رہا تھا۔ میں نے ایک دم لائٹس آف کر دیں
تاکہ وہ گاڑی کا نمبر نہ پڑھ سکے اور رفتار ایک دم بڑھا دی۔
ظاہر تھا کہ بات کرنے والا تو مجھے نہیں پہچانتا تھا مگر اس کے
ساتھی نے غور سے دیکھ کر مجھے شناخت کر لیا تھا۔ میں بال بال
بچ گیا تھا۔ ورنہ مجھے ان سے دست بدست جنگ لڑ کے راستہ
بنانا پڑتا اور معاملہ سنگین واردات کی شکل اختیار کر لیتا۔ اب تو وہ آپس
ہی میں ایک دوسرے کو الزام دیں گے کہ اچھا بھلا دس ہزار کا انعام
تھا ہاتھ میں آ کے نکل گیا۔ اپنی کوتاہی اور نااہلی کا ذکر کسی سے
نہیں کریں گے۔
محسن نے مجھے جی پی او کے مین گیٹ کے سامنے روکا
دروازہ کھول کے میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ "یار وہ طافو مر گیا۔" اس
نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "آگے سنت نگر سے سیدھا نکل..."
"طافو مر گیا؟ وہ کیسے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "استاد
ٹیڈی کی تفتیش سے؟"

"نہیں، اس نے اور میں نے تھانے کا طریقہ بھی استعمال
کیا تھا مگر بہت واجبی۔" محسن بولا۔ "اس نے خودکشی کر لی۔ وہ تھا
ڈرپوک آدمی اور اسے جو کچھ معلوم تھا اس نے بتا دیا تھا۔ اس کے
باوجود ہم مطمئن نہیں تھے اور اسے گلے ماچھی کے سپرد کرنے کی
دھمکی دیتے رہے تھے۔ ٹیڈی نے اسے غسل خانے میں بند کیا تھا۔
اس نے سیفٹی میں سے بلیڈ نکال کے گلا کاٹ لیا۔ ٹیڈی بہت
پریشان ہے کہ خون نالی سے بہہ کر باہر چلا گیا ہے اور صبح صاف
نظر آئے گا۔ میں اسے تسلی دے کر آیا ہوں کہ فکر نہ کرے۔ ابھی
صبح ہونے میں بہت دیر ہے۔ ہم سارے سراغ مٹا دیں گے اور
لاش کو بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔"
"بیچارہ! ایسے چکر میں پڑا کہ جان سے گیا۔" میں نے افسوس
کے ساتھ کہا۔ "وہ تو اپنی دانست میں صرف ایک ٹرک ڈرائیور
تھا۔ تقدیر نے پانچ لاکھ کے جال میں پھنسا دیا تھا حالانکہ اس
کی نیت میں بے ایمانی تھی اور نہ دل میں دولت کی ہوس۔ وہ
بیتا تو رحمت اور کریم سیٹھ مار دیتے۔ بیچ میں تو مجرم بن گیا۔ ہماری
پناہ میں آیا تو خود کو غدار سمجھنے لگا اور وفاداری ثابت کرنے کی
کوشش کی تو گلے میں پھندا پڑ گیا۔ اسے اطمینان تھا تو صرف یہ کہ
بیوی بچے بحفاظت نکل گئے ہیں اور ان کے پاس پیسہ ہے۔ اس
نے سوچا ہو گا کہ خطرہ صرف میرے وجود سے وابستہ ہے۔ اب کسی
کی ذات کو خطرہ نہیں۔"
"طافو مصیبت میں پڑ گیا ہے جو اسے بلیک میل کر رہے
تھے۔" محسن نے کہا۔ "حالانکہ ہم واقعی یہ چاہتے تھے کہ اس سے تمام
معلومات حاصل ہو جائیں تو اسے نکال دیں۔ جہاں بھی وہ کہتا ہم
اسے بحفاظت وہاں ضرور پہنچا دیتے۔ آگے اللہ مالک تھا لیکن
اس نے بہت جلدی کی۔ سالا معلوم نہیں کہاں جانا چاہتا ہے۔"
"شاید اسے ہمارے وعدوں پر اعتبار نہیں تھا۔" میں نے
کہا۔ "اس نے کوئی کام کی بات بتائی؟"
"ہاں، استاد ٹیڈی کو بتا رہا تھا کہ کوئی بہت بڑی حویلی
ہے۔" محسن سوچتے ہوئے بولا۔ "جو نقشہ اس نے بتایا وہ ٹیڈی کی
سمجھ میں تو آیا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ قصر جمشید کا حوالہ دے
رہا تھا۔ وہ بڑی عجیب کہانی ہے۔"
"مگر قصر جمشید کے کھنڈر میں اب کیا ہے؟" میں نے کہا۔
"وہ کس زمانے کی بات کر رہا تھا؟"
"زمانہ حال کی۔" محسن نے کہا۔ "تجھے یاد ہے جب اس کھنڈر
میں آگ لگائی گئی تھی تو میں نے کہا تھا کہ یہ آگ بھی پردہ ہے۔
کھنڈر میں جلنے والی کون سی چیز تھی؟"
"تیرا مطلب ہے کہ وہاں واقعی تہہ خانہ ہے؟" میں نے
بے یقینی سے کہا۔ "زیر زمین کچھ گڑبڑ ہے؟"
"طافو کی بات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔" محسن بولا۔
"اس نے بتایا کہ وہ صرف ایک بار وہاں گیا تھا تو اس کے ساتھ
غالب چودھری، دلاور اور استاد پیڈرو کے علاوہ دو آدمی اور تھے جن کو
اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور وہ ایک نالے میں اتر گئے
تھے۔ کسی گٹر لائن کے مین ہول کا ڈھکنا ہٹا کے نیچے گئے تھے اور
پھر ایک سرنگ جیسے راستے سے ہو کے آگے ہی آگے تقریباً سو گز
تک گھٹنوں کے بل چلتے رہے تھے۔ وہ سرنگ اتنی اونچی نہیں
تھی کہ کوئی کھڑا ہو سکتا اور اندر گھپ اندھیرا تھا اور اس کی سطح
سخت اور کھردری تھی۔"
"گٹر لائن میں پانی نہیں تھا؟" میں نے کہا۔ "اگر گٹر لائن
زیر استعمال تھی تو اس میں غلاظت ہو گی۔"
"نہیں، یہی تو میں نے بھی پوچھا تھا اور طافو نے پورے
یقین کے ساتھ کہا تھا کہ لائن خشک تھی اور وہ سرنگ بالکل
نیچے سے شروع ہوتی تھی۔ انہوں نے اندر اترتے ہی اوپر کا ڈھکنا بند
کر دیا تھا۔" محسن بولا۔
"اس کا مطلب ہے وہ گٹر لائن نقلی ہی تھی۔" میں نے کہا۔
"اور پھر مین ہول کی طرح ڈھکنا لگا دیا ہو گا تاکہ وہ جگہ کسی کو مشتبہ
نظر نہ آئے۔"
"اس نے دوسری قابل غور بات یہ بتائی تھی کہ مین ہول
ایک ٹرک کے پیچھے تھا اور ٹرک بھی ایک کوٹھی کے احاطے میں
کھڑا تھا لیکن تہہ خانہ اس کوٹھی کا نہیں ہو سکتا کیونکہ کوٹھی مشکل
سے ایک کنال پر ہو گی جب کہ وہ تہہ خانہ کئی کنال کی حویلی کا
لگتا تھا۔" محسن نے کہا۔ "سرنگ کے ختم ہوتے ہی سیڑھیاں آ گئی
تھیں جہاں سے وہ سیدھے کھڑے ہو کر اوپر گئے تھے اور ایک
کال بیل بجائی تھی۔ دروازے سے گزر کر پھر نیچے جانے والی سیڑھیاں
آ گئی تھیں اور وہ تہہ خانے میں پہنچ گئے تھے۔ جو حلیہ اس نے
بتایا اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ ساتھ جانے والے
دلاور اور پیڈرو تھے۔"
"اور تہہ خانے میں کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "اس نے کیا
دیکھا بھالا؟ گودام وغیرہ؟"
"یہی تو اس نے بتایا نہیں۔ اگر اس نے تہہ خانے کی
وسعت کا اندازہ کر لیا تھا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کچھ بھی نہ دیکھا ہو؟"
محسن نے کہا۔
"اور یہ فرض کرنا بھی مشکل ہے کہ طافو کو آنکھوں پر پٹی باندھ
کے لے جایا گیا تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا کھلی آنکھوں سے دیکھا
تھا۔ یہ کچھ عجیب سی بات نہیں لگتی کہ اس نے باہر کا منظر تو اتنی
تفصیل سے بیان کر دیا اور اندر کے بارے میں کوئی بات نہیں
کی؟" میں نے کہا۔ "اگر وہ لوگ اس کو قابل اعتماد سمجھتے ہوئے

www.paksociety.com

رہ ہی گئے تھے تو یہ بھی مشکل ہے کہ اسے کچھ نہ بتایا ہو۔ پھر وہ اس کو لے کیوں گئے تھے؟"

عطا نو نے تو یہ بیان دیا اور اسی پر قائم رہا کہ اندھیرا تھا۔ وہ لوگ جو اس کے ساتھ تھے تہہ خانے کے راستوں سے واقف تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک پین ٹارچ تھی جس کا اجالا صرف قدموں سے ایک فٹ آگے محدود دائرے میں پڑتا تھا۔ ایک طرف تو دیوار تھی جس کے ساتھ ساتھ وہ چل رہے تھے۔ درمیان میں کمرے بہت وسیع تھے اور دوسرے کنارے تک کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ آخری حصے میں بیچ کے ایک حجرہ سا آ گیا۔ وہاں ایک قبر سی بنی ہوئی تھی۔ چوہدری دلاور اور استاد پیڈرو تو ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ عطا نو اور اس کے ساتھ جانے والے دونوں افراد کو کدال اور بیلچے دے کر قبر کھودنے پر لگا دیا گیا۔ وہ پکی قبر تھی۔ اوپر سے سنگ مرمر کے تابوت کی طرح بنی ہوئی۔

"نواب خسرو پرویز کی قبر؟" میں نے اچانک کہا۔ "مجھے یاد ہے اس محل کے کھنڈر میں باغ کے ایک گوشے میں آج بھی چار ستونوں پر وہ سائبان کھڑا ہے۔ وہاں ملنے والے مالی نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ نواب خسرو جمشید ہی کا مدفن ہے۔ ان کی اصل قبر نیچے ہو گی۔ یہ رواج پہلے تھا کہ اوپر علامتی قبر رکھی جاتی تھی اور عین اس کے نیچے تہہ خانے میں اصلی قبر بنائی جاتی تھی۔ تاج محل میں ملکہ ممتاز محل کی قبر ایسے ہی ہے اور کراچی میں قائد اعظم کے مزار میں بھی ایسا ہی انتظام ہے۔ فاتحہ خوانی کے لیے آنے والے اوپر ہی فاتحہ پڑھ جاتے ہیں۔ نیچے اصل قبر تک رسائی کا اعزاز بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ خیر تو آگے بتاؤ۔"

"وہاں اس قبر کو توڑ کے کھدائی کرنا بہت مشکل کام تھا۔ نیچے تک فرش انتہائی پختہ تھا اور شاید اسی لیے عطا نو کے علاوہ وہ دو اسی قسم کے مزدور ساتھ لیے تھے۔" محسن بولا۔ "دو گھنٹے کی سخت محنت کے بعد ایک لاش کا ڈھانچہ برآمد ہوا۔ چوہدری دلاور اور پیڈرو دونوں مایوس تھے۔ انہوں نے خود نیچے اتر کے دیکھا اور ادھر ادھر کی دیواروں کو ٹھوک بجا کے دیکھتے رہے۔ دلاور بہت برہم تھا کہ محنت رائیگاں گئی اور بار بار پیڈرو سے کہتا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے ڈھانچہ ہٹا کے نیچے سے بھی زمین کھودنے کا حکم دیا مگر وہاں سے مٹی ہی نکلی۔ سائڈ میں کھودنے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ معلوم نہیں وہ کیا تلاش کر رہے تھے۔ نواب صاحب مرحوم کا کوئی مدفون خزانہ، کوئی وصیت نامہ یا ان کے اہم ذاتی کاغذات۔ معاملہ پُراسرار تھا اور پُراسرار رہا۔ صبح ہونے کو تھی انہوں نے واپسی کا فیصلہ کیا لیکن عطا نو کے ساتھ جانے والے دونوں افراد کو وہیں چھوڑ دیا گیا۔ کوئی ان کو مارنے کے بعد یہ بات بتاتے ہوئے عطا نو کی حالت غیر ہو گئی تھی اور وہ ایسے کانپنے لگا تھا جیسے وہ دونوں قتل ابھی ابھی اس کی نظروں کے سامنے ہوئے ہوں۔ اپنی موت کا بھی سو فیصد یقین تھا مگر اس سے پہلے کہ کوئی اس کا خاتمہ کرتی وہ ان کے قدموں میں لوٹنے لگا اور بچوں کے پیٹ روٹی دھونے اور منت سماجت کرنے لگا کہ میرے چھوٹے بچے ہیں، اور نہ جانے کیوں دلاور اور پیڈرو کو رحم آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ دو آدمی صرف اس لالچ کی بات کرنے کیلئے مار دیے گئے ہیں۔ اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو بھول جاؤ کہ ہمارے ساتھ آئے تھے۔ اس بارے میں تمہاری زبان سے لفظ غلطی سے بھی نکلا تو تمہیں ہی نہیں تمہارے بیوی بچوں کو بھی اسی طرح دفن کر دیا جائے گا۔ عطا نو استاد وحشت زدہ تھا۔ اس نے خدا رسول اور قرآن کی قسم کھا کے انہیں یقین دلایا کہ جب تک زندہ ہے اس کی زبان بند رہے گی۔ پھر انہوں نے لاشوں کو قبر کے گڑھے میں ڈالا اور باہر آ گئے۔"

"اور آج اس نے ہر قسم توڑ ڈالی؟" میں نے کہا۔ "کیا فیصلہ کر چکا تھا مرنے کا؟"

"مرتے وقت تو کوئی گناہ کبیرہ کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ ہے کہ اس نے بیوی بچوں کی خاطر اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔ سوال جان بچانے کا ہو تو حرام شے بھی حلال ہو جاتی ہے۔ اسے یقین ہو گا کہ ان سنسنی خیز انکشافات کے بعد اس کی ... نہیں رہے گا۔ کہا ہے جو کچھ معلوم تھا وہ اس نے ہمیں بتا دیا۔ یہ تو تفتیش میں ہوتا ہی ہے۔ کوئی بھی ایک دم سب سچ نہیں بتا دیتا اور اگر اگل دے تو پوچھنے والا پھر بھی سمجھتا ہے کہ کوشش کر کے کچھ اور اگلوایا جائے۔ یہی ہم نے بھی کیا تھا۔ اسے بتا دیا تھا کہ خیریت چاہتا ہے تو سب بتا دے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس نے تہہ خانوں میں خالی کمرے نہیں دیکھے ہوں گے۔ وہاں ... یا فیکٹری ہو گی۔ کرنسی یا بوریاں ہوں گی لیکن وہ ... سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا تو اور کیا بتاتا۔ شدید ... عالم میں اس نے خودکشی کر لی۔" محسن نے کہا اور مجھے آنکھ کا اشارہ کیا۔ تھوڑا سا فاصلہ ہم نے ایک تنگ گلی میں طے کیا جس میں کار نہیں جا سکتی تھی۔ یہ گلی سامنے سے بند تھی اور دونوں جانب زیادہ مکان نہیں تھے۔ محسن نے ایک دروازے پر دستک دی جس کے پیچھے بظاہر تاریکی تھی۔

"کون ہے؟" استاد ٹیڈی نے بہت قریب آ کے پوچھا۔

"پولیس!" محسن نے لہجہ بدل کے کہا۔ "یہاں کسی کا قتل ہوا ہے؟" میں نے ہنسی کو بڑی مشکل سے ضبط کیا حالانکہ ...

... ہوا تھا۔ اندر سے چند سیکنڈ تک کوئی آواز نہیں آئی اور محسن اپنے مذاق سے محظوظ ہوا۔

"ارے یار! اس کا ہارٹ فیل نہ ہو گیا ہو۔" میں نے کہا۔ "زحمت استاد ٹیڈی! پولیس آئی تو پہلے ہمیں پکڑے گی۔"

"قسم مولا کی۔" ٹیڈی نے حسب عادت دروازہ کھول ... "کون سالا ڈرتا ہے پولیس سے۔ اور آپ ہمارے ... پولیس استاد ٹیڈی کی لاش پر سے گزر کر ہی پہنچ سکتی ہے یار لوگ تک۔ بھون کے رکھ دوں پولیس کو۔"

"مگر استاد یہ تم کانپ رہے ہو سردی سے یا تمہاری آواز کانپ رہی ہے؟" محسن نے کہا اور اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ میں نے دوستانہ طریقے پر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ابھی وہ کانپ رہا تھا۔

"ارے بھائی محسن! آپ بھی مذاق کر لو۔ یہ مصیبت بھی آپ نے ڈالی تھی۔" وہ مجھ سے فریاد کے انداز میں بولا۔

"گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اب ہم تمہارے ساتھ ہیں استاد ہم ہی نمٹنے کے لیے۔" میں نے کہا۔ "لاش کہاں ہے؟"

وہ مجھے اندر کے ایک کمرے میں لے گیا۔ لاش کو اس نے پلنگ بچھانے کے کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ میں نے وہ غسل خانہ دیکھا جہاں عطا نو نے اپنا کام تمام کیا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے پر چاقو چلانا آسان نہیں ہوتا۔ کسی بلند عمارت سے کود جانے، گاڑی کے آگے لیٹ جانے یا زہر کھانے میں ایک سیکنڈ لگتا ہے لیکن گلا کاٹنے میں قوت ارادی ہی نہیں اتنی جسمانی طاقت کی ضرورت بھی ... ہے کہ ہاتھ اس وقت تک نہ رکے جب تک خنجر کی دھار ... کر بھی نہ کاٹ دے۔ عطا نو نے تو یہ مشکل کام بلیڈ سے کیا تھا اور کامیاب رہا تھا لیکن اس کوشش میں اذیت کے باعث تڑپا تھا چنانچہ خون کے چھینٹے ہر طرف دیواروں پر پھیل گئے تھے۔ ... فرش سے بہہ کر نالی کے راستے باہر نکل گیا تھا۔ ٹیڈی نے ... کو دھو ڈالا تھا اور خاصا رگڑا تھا مگر چونے کی سفیدی میں ... لالی بدستور نمایاں تھی یا شاید مجھے نمایاں نظر آتی تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ داغ خون کے ہیں۔ معلوم نہ ہو تو ... انہیں صرف داغ سمجھتا جو باتھ روم کی دیواروں پر لگ جاتے ہیں۔ ٹیڈی نے فرش کو بھی دھو ڈالا تھا اور کافی مقدار میں پانی بہایا تھا۔

"خون تو کافی صاف کر لیا ہے تم نے۔" میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔

"وہ بھی ... آپ نے تو گرم پانی ڈالا، بالکل ابلتا ہوا اور سوڈا ... سے رگڑا۔" وہ بولا۔

"مگر گرم پانی سے باہر کی نالی میں بھی خون جما نہیں ہو گا اور پانی کے ساتھ بہہ گیا ہو گا۔ کوئی ٹارچ ہے؟" میں نے کہا۔

"ٹارچ تو نہیں ہے۔ موم بتی لاؤں؟" ٹیڈی نے کہا اور میرے اقرار میں سر ہلانے پر اندر سے ایک سالم موٹی موم بتی روشن کر لایا۔ باہر گلی بالکل سنسان تھی اور کسی کے اچانک آ جانے کا احتمال بھی نہیں تھا کیونکہ یہ بند گلی عام رہگزر نہیں تھی۔ گلی کے مکین سوئے پڑے تھے اور ہر طرف خاموشی کا تسلط تھا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں محسن نے اور میں نے جھک کر گھر سے باہر آنے والی اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے والی نالی کا معائنہ کیا۔ ٹیڈی نے ابلتے پانی کے استعمال سے عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ نالی پہلے ہی صاف نہیں تھی اور اس میں پڑی غلاظت کا رنگ سیاہی مائل تھا جس نے سرخی کو چھپا لیا ہوا تھا۔ اس میں خون کی سرخی کے آثار بہت کم تھے لیکن شک کی نظر سے دیکھنے والے کو واضح طور پر دکھائی دیتے تھے۔

"تمہارے پاس کالی نیلی کوئی روشنائی ہے؟" میں نے ... لوٹ کر کہا۔ "یا کوئی پینٹ ہے؟"

"نیلی سیاہی ہے جی۔ اور کپڑوں میں دینے والا نیل ہے۔ ایک لال روغن بھی ہے۔" ٹیڈی بولا۔

"سب لے آؤ۔" میں نے کہا۔ "پہلے یہاں کا مسئلہ حل کر لیں۔"

نیلی روشنائی کو میں نے باہر چھڑکا جہاں ابھی تک لہو کے رنگ کی جھلک محسوس ہوتی۔ باقی روشنائی کو اس نے اندر سے باہر آنے والی نالی کے دہانے پر شیشی توڑ کے پھیلا دیا۔ چھینٹے ہر طرف اچھلے اور کانچ کے ٹکڑے نالی میں گرے۔ یہ کیموفلاج کا طریقہ تھا۔ اب خون کے لال رنگ پر نیلا رنگ غالب آ گیا تھا اور گزرتے ہوئے دیکھنے والے کو ٹوٹی ہوئی دوات دیکھنے کے بعد نیلے رنگ کے سوا کچھ دکھائی دے ہی نہیں سکتا تھا۔ میدان جنگ میں فوجی اپنے سر کے فولادی خود پر جھاڑیاں رکھ لیتے ہیں اور جنگل کی ہریالی میں گم ہو جاتے ہیں۔ اوپر سے دیکھنے والے کو وردی کا خاکی رنگ نظر ہی نہیں آتا کیونکہ ہر طرف پھیلا ہوا ہرا رنگ غالب رہتا ہے۔ یہی نیلا پوڈر میں نے باتھ روم کے اندر بھی ڈالا اور جہاں جہاں سرخی نمایاں محسوس ہوئی وہاں پانی میں نیل گھول کے چھڑک دیا۔ اندر کا معاملہ اتنا باعث تشویش نہیں تھا۔ شک کا آغاز ہوتا تو باہر سے ہوتا لیکن اب صبح ہونے تک خون کے داغ دب جائیں گے اور کہیں نیلے چھینٹوں میں کوئی لال چھینٹا بھی نظر آیا تو اسے کوئی خون نہیں سمجھے گا۔

"یہاں تو خطرے کی کوئی بات نہیں رہی۔" میں نے کہا۔ "عطا نو کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ جانتے

www.paksociety.com

والوں نے تو اسے لاہور سے ٹرک پر مال کے ساتھ کراچی بھیجا تھا۔ اس سے زیادہ ان کو کچھ معلوم ہے تو یہ کہ ٹرک ہم نے تباہ کر دیا۔ رحمت کباڑی کی لاش چوہدری صاحب کو ارسال کر دی اور شیدو بھاگ گیا۔ طافو کے بارے میں بھی وہ یہی فرض کر لیں گے کہ بھاگ گیا مگر صبح ہونے تک چوہدری صاحب کی کوشش تھی دور ہو جائے گی۔"

"کیا یہی اسی کو ارسال کرنے کا پروگرام ہے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں، مگر ویسے نہیں جیسے رحمت کباڑی کو ارسال کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "گھر میں زمین کھودنے کے آلات ہوں گے؟"

"بس ایک بیلچہ ہے، وہ بھی آگے سے ٹوٹا ہوا۔" شیدی نے اپنی بے سروسامانی پر ندامت سے کہا۔

"کافی ہے۔ ہمیں زیادہ نہیں کھودنا ہے۔ اسے فوراً لے آؤ۔" میں نے کہا۔ "ہم اتنی دیر میں لاش کو لے جاتے ہیں۔"

طافو کی لاش اکڑ چکی تھی۔ مجھے اور محسن کو اس کے ہاتھ پیر سمیٹ کر کار کی ڈگی میں فٹ کرنے کے لیے مرنے والے کے ساتھ خاصی زبردستی کرنی پڑی۔ خون اب نہیں بہہ رہا تھا اور جو پہلے نکلا تھا وہ جم چکا تھا چنانچہ ہمارے ہاتھ اور کپڑے محفوظ رہے۔ پلاسٹک نے بھی خون کی نمی کو کمبل میں جذب ہونے سے روکا تھا۔ میں نے ڈگی بند کی اور اندر آ کے روشنی میں اچھی طرح اپنے جسم کو اور لباس کو دیکھا۔ صرف ہمارے ہاتھوں کی انگلیاں خون سے داغدار ہوئی تھیں۔ صابن سے ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر دھونے کے بعد کوئی نشان نہ رہا۔ شیدی نے بیلچہ بھی لاش کے ساتھ ہی رکھ دیا تھا۔ وہ خود پیچھے بیٹھا اور میں نے گاڑی کو ریورس کیا۔

"ہم اب چوہدری دلاور صاحب کے دولت خانے پر تشریف لے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تاکہ صبح ہونے سے پہلے ان پر ایک اور قتل کا الزام آ جائے۔ میرے خلاف اس کے پاس الزام ہیں، دو کا حساب تو برابر ہو۔"

"مگر اس وقت... یہ ویسے بھی خطرناک ہے اور ہماری پوزیشن؟" محسن نے کہا۔

"فکر مت کرو، ہماری پوزیشن وہی رہے گی جو اس وقت ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر چوہدری صاحب کی نہیں رہے گی۔ خطرہ تو وہ ہماری جان کے ساتھ ہے اور میں یہی کہتا ہوں کہ خطرے کو تقسیم کر دیں۔ جتنے خطرات سے ہم دوچار ہیں اتنے ہی خطرات فریق ثانی کو لاحق ہو جائیں تو ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہو جائیں گے۔ ابھی ہم کانٹے ہیں، اگر وہ بھی کانٹے ہو گئے تو کون کس کو کاٹے گا۔ ایک حمام میں سب ننگے ہوں تو کسی ایک پر ننگے ہونے کا الزام نہیں آتا۔ یہ ہماری دہشت پسند تنظیم کا پہلا کارنامہ ہوگا۔ کارنامے تو ہم پہلے بھی انجام دے چکے ہیں مگر اس وقت ہم منظر عام پر نہیں تھے۔"

محسن بولا۔ "کتنی خوشی کی بات ہے استاد، شیدی کو تو ... اب باقاعدہ دہشت گرد ہو گئے۔"

"دہشت گرد؟" شیدی بولا۔ "کی دہشت؟ کس بات کی ڈر... شودوں سے کیا ڈرنا۔"

مجھے ہنسی آئی۔ "تو ان کہتا ہے تم ڈرتے ہو۔ دہشت گرد کا مطلب ہوتا ہے نیا زمانہ، اپنا حق حاصل کرنے والا، ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والا، جیسے تنظیم آزادی فلسطین، کشمیر لبریشن فرنٹ....."

"میاں جی، اپنی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئیں گی۔" شیدی بولا۔ "ہم ٹھہرے ان پڑھ لوگ، تم جو ہو ٹھیک ہے۔"

"اپنے سکندر اعظم صاحب، چیئرمین کا انتخاب تو ایک نزعی مسئلہ ہے جس پر انشاء اللہ اختلاف جاری رہے گا۔" محسن نے کہا۔ "لیکن تنظیم کے نام پر تو اتفاق رائے ہو سکتا ہے۔ مجھ پر غیب سے ایک نام کا نزول ہوا ہے جو سب جانتے ہیں اس سے بہتر نام کوئی تجویز کر ہی نہیں سکتا۔ کرے گا تو شرمندہ ہوگا کیونکہ ہم اسے قبول نہیں کریں گے۔ ایم آر ایس کیسا ہے؟ مائٹ از رائٹ سوسائٹی؟"

"گویا جس کی لاٹھی اس کی بھینس سوسائٹی۔" میں نے کہا۔ "بہت خوب۔"

"آپ ایم آر ایس پر غور کریں، ایم سے یہ خاکسار، آر سے ... کی وجہ اور ایس سے آپ خود۔" محسن بولا۔ "کل پرسوں تک ... کے سو گرام چھپوا لوں گا، کیا زبردست پبلسٹی ملے گی اور کیا اچھا تاثر ہوگا۔"

"تو نے چوہدری دلاور کا گھر تو دیکھا ہے نا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اب دھیان سے میری بات سن۔ میں گاڑی ذرا آگے سے موڑ کر پیچھے لاؤں گا۔ ادھر تنگ سی گلی اور دلاور کی کوٹھی کی پچھلی دیوار ہے جس میں ایک چھوٹا سا دروازہ ہے۔ بارہ فٹ اونچی دیوار میں چار فٹ کا ایک پٹ والا گیٹ جو عموماً مقفل نہیں رہتا اور ادھر سے نوکر آتے جاتے ہیں یا دودھ والا آتا ہے۔ میں اسی راستے سے اندر جا کے لاش کو دائیں جانب ڈال دوں گا۔ پھر بالکل خاموشی کے ساتھ ہم سب بائیں طرف کے کھلے میں تھوڑی سی زمین کھودیں گے اسی جگہ کے قریب جہاں ویل کی موجودگی ہوتی ہے۔ وہاں زمین نرم ہے اور ایک ... کھودنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا، بس آواز نہیں ہونی چاہیے۔"

"طافو کو وہاں دفن کرنا ہے؟" محسن بولا۔

"اور چوہدری کو اطلاع دے دینی ہے کہ لاش نکال لے۔"

"نہیں، باقی باتیں بعد میں۔" میں نے گاڑی کی رفتار بڑھائی اور پھر انجن کو نیوٹرل کر لیا۔ گاڑی بالکل خاموشی سے دلاور کی کوٹھی کے مین گیٹ کے سامنے سے سیدھی گزر گئی۔ چوکیدار اندر بیٹھا تھا اور پورچ میں صرف ایک گلوب روشن تھا، جس کا اجالا کوٹھی کے دونوں طرف نہیں پہنچتا تھا۔ اس کے علاوہ روشنی صرف ایک روشندان میں تھی جو میرے خیال کے مطابق باتھ روم کا روشندان تھا کیونکہ اس کی بلندی سات فٹ کے قریب تھی۔ گاڑی چار کوٹھیاں چھوڑ کے بائیں طرف مڑی اور کارنر کی کوٹھی کا احاطہ ختم ہوتے ہی پھر بائیں جانب تنگ گلی میں داخل ہو گئی۔ موڑ پر ایک کھلا مین ہول تھا جو اچانک سامنے آ گیا تھا مگر اگلے دونوں پہیے دائیں بائیں رہے اور کھلا گٹر درمیان سے گزر گیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا ورنہ گاڑی کا ایک پہیہ مین ہول میں جاتا تو بہت بڑی مصیبت آ جاتی۔ ایکسل ٹوٹ جاتا یا پہیہ ٹوٹ جاتا اور پھر گاڑی کو نکالنے میں کامیابی ہو جاتی تب بھی اس کو وہاں سے ہٹانا ناممکن تھا۔ صبح ہو جانے کے بعد لوگ مدد کے لیے آتے اور گاڑی کو کرین سے اٹھا کر اور لوڈ کر کے لے جانا پڑتا۔ اس خیال سے ہی مجھے جھرجھری آ گئی کہ ایک غیر متوقع حادثہ ہمیں پل بھر میں ناکامی سے دوچار کر سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو ہم تینوں کو فرار ہونا پڑتا۔ کار کی ڈگی میں لاش تھی جو ہم اسے اٹھا کے فرار نہیں ہو سکتے تھے اور یہ بھی ناممکن تھا کہ گاڑی کو ہم میں سے کوئی اٹھوا لے جائے۔ حادثہ چوہدری دلاور کے گھر کے اتنے قریب تھا کہ اسے ضرور معلوم ہو جاتا اور ایسی صورت میں خود کو بچانے کی واحد صورت یہی ہوتی کہ ہم گاڑی کی ملکیت سے یکسر دستبردار ہو جائیں۔

گاڑی کو عین چوہدری دلاور کے بنگلے کی دیوار سے لگا کے میں نے بڑی پھرتی سے ڈگی کھولی۔ لاش کو میں نے اور محسن نے اٹھایا اور دبے پاؤں مختصر سے گیٹ کے راستے اندر لے گئے۔ شیدی نے اتنی دیر میں بیلچہ نکال کے ڈگی بند کی تو ایک دھماکا ہوا اور ایک لمحے کے لیے میں اور محسن مفلوج ہو گئے۔ شیدی نے بونٹ کو آہستہ سے دبا لینے کے بجائے زور سے دے مارا تھا۔ چند سیکنڈ ہم دونوں دم سادھے کھڑے رہے۔ پھر شیدی کی ... ہوا۔

"اگر ہم نے احتیاط نہ کی تو ہم اسی لاش کے ساتھ پکڑے جائیں گے۔" محسن نے کہا اور شیدی نے اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کیا۔ لاش اب دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ان دونوں کو اشارہ کیا اور ہم ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ ٹیوب ویل کی موٹر تقریباً پچاس فٹ کے فاصلے پر تھی۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں دو بند دروازوں اور چار کھڑکیوں کے سامنے سے گزرنا تھا۔ احتیاطاً ہم دیوار سے لگ کر رکوع کی حالت میں اپنا سر کھڑکی کی دہلیز سے نیچے رکھے گزرے۔ نہ جانے کیسے شیدی کا سر دہلیز پر بنے ہوئے سیمنٹ کے چھجے سے ٹکرایا اور شیدی کے حلق سے "آہ" کی آواز نکلی۔ میں اور محسن منجمد ہو گئے اور ہم نے ایک ساتھ پلٹ کر شیدی کو غصے سے دیکھا۔

ٹیوب ویل کے پاس پہنچ کر میں نے ایک جھاڑی کی اوٹ سے دیکھا، چوکیدار وہیں بندوق تانے کھڑا تھا۔ میں نے محسن اور شیدی کو اشارہ کیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے زمین صاف کرنے لگے۔ خشک پتے اور سوکھی ٹہنیاں احتیاط کے ساتھ ہٹانے کے بعد انہوں نے بیلچہ زمین پر رکھ کے پیر سے دبایا اور دونوں ہاتھوں کا زور لگا کے اٹھا لیا۔ تقریباً ایک مکعب فٹ مٹی نکالنے کے لیے بیلچہ چار مرتبہ کام آیا۔ میری نظر چوکیدار پر تھی اور میں ہر آواز پر سانس روک لیتا تھا۔ میں اس کے لیے بھی تیار تھا کہ اگر چوکیدار یا خود دلاور اچانک نمودار ہو جائے تو اس سے مؤثر طور پر نمٹ لوں۔ میری جیب میں ریوالور بھی تھا اور میرے خالی ہاتھ بھی بہت کچھ کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ہمارا مشن تو ناکام ہوتا لیکن مسئلہ اپنی جان بچانے کا ہو تو مشن قربان کرنے کے سوا چارہ نہ رہتا۔ گڑھا میری ہدایات کے مطابق تین فٹ گہرا رکھا گیا تھا۔ ابھی اس کی گہرائی ایک بالشت بھی نہیں ہوئی تھی کہ چوکیدار نے گیٹ پوسٹ سے روانہ ہو کے کوٹھی کا راؤنڈ لگانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے خطرے کا سگنل دیا اور ہم ایک ساتھ جھاڑیوں کے پیچھے روپوش ہو گئے۔ چوکیدار کے گھوم کر آنے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگے ہوں گے مگر ضبط کا یہ اعصاب شکن وقفہ مجھے بہت طویل لگا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دلاور نے حفاظت کے خیال سے کتے نہیں پال رکھے ہیں ورنہ ہمارا چوری چھپے اندر داخل ہوتے ہی پکڑا جانا یقینی تھا۔

چوکیدار مخالف گوشے میں نظر آیا۔ اس سے بہت کم فاصلے پر وہ چھوٹا سا گیٹ تھا جس کے ساتھ طافو کی لاش پڑی تھی لیکن وہ گوشہ تاریک تھا اور چوکیدار کی نظر کچھ نہ دیکھ سکی۔ تاہم باہر کھڑی ہوئی کار نے اسے متوجہ کیا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے لاش نکالنے کے بعد کار کو آگے پیچھے کسی اور گھر کے سامنے کھڑا کرنا چاہیے تھا۔ چوکیدار گیٹ کی طرف گیا تو میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ گاڑی میں تو شک کی کوئی بات نہ تھی کہ چوکیدار کو نمبر نوٹ کرنے کا خیال آتا مگر گیٹ سے چند فٹ دور ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ میں نے محسن کو خبردار کیا مگر اس نے اشارے سے مجھے انتظار کرنے کو کہا۔ چوکیدار آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ گیٹ پر پہنچ جانے کے بعد وہ کچھ ٹھٹکا۔ غالباً اس نے ان کی مذمت کی ہوگی جو

www.paksociety.com

www.paksociety.com

مہمان تو کسی اور کے گھر آئے تھے لیکن اپنی گاڑی کو چوہدری صاحب کے گھر کی طرف پارک کر گئے تھے۔ پھر وہ پلٹا اور گیٹ کی کھڑکی لگانے لگا۔ ہم سب سانس روکے بیٹھے تھے۔ اس کی نگاہ غلطی سے بھی اس کونے میں چلی جاتی تو وہ ضرور چونکتا۔ اور میں فیصلہ کر چکا تھا کہ جیسے ہی چوکیدار نے لاش کے قریب جا کر تصدیق کی ضرورت محسوس کی، میں اسے جا لوں گا اور کوشش کروں گا کہ اس کے حلق سے آواز نہ نکلنے پائے۔

چوکیدار نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو میں نے گہری سانس لی۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے ماتھے پر سردی کے باوجود پسینے کی نمی پھیل گئی تھی۔ یہ بات مجھے بعد میں سمجھ آئی کہ چوکیدار اس لاش کو کیوں نہ دیکھ سکا۔ لاش اگر عام کپڑوں میں ہوتی تو سیاہی میں سفیدی کی جھلک اسے ضرور متوجہ کرتی مگر لاش کالے کمبل میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ جاتے وقت اس کی نظر دیوار کے اوپر سے باہر کھڑی ہوئی گاڑی کی چھت کو دیکھ رہی تھی اور لوٹتے وقت اس کی پشت لاش کی طرف ہو گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ رائفل اٹھائے ہمارے بہت قریب سے گزرا۔ اس وقت ایک چھینک بھی آ جاتی تو ہم کسی دھماکے سے کم نہ ہوتی۔ مشن کی کامیابی کے امکانات خاک کرتے وقت انسان اپنی بدقسمتی کے امکانات کو کتنی آسانی سے نظر انداز کر دیتا ہے۔ میں نے محسن اور شیڈی کو کام پھر شروع کرنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ کام زیادہ جسمانی مشقت کا نہیں تھا لیکن احتیاط کے تقاضے بہت مشکل تھے۔ ابھی تک گڑھا ایک فٹ ہو گیا تھا اور ہم میں سے کسی نے خفیف سی آواز بھی نہیں نکالی تھی۔ بیلچہ انتہائی خاموشی سے مٹی نکالتا جا رہا تھا اور اس کی سرسراہٹ صرف ہمارے کان سن سکتے تھے۔ کوٹھی کے اندر کسی کلاک نے تین بجائے۔ ہمارے پاس اب زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے تھے۔ اس عرصے میں کئی ایک کام نمٹانے تھے جن کی ترتیب میرے ذہن میں تھی۔ میں نے محسن اور شیڈی کو ہاتھ تیز چلانے کو کہا۔

"ایسے حکم چلا رہا ہے جیسے خرکار ہو۔" محسن نے زیر لب کہا۔ "اور ہم کو بیگار میں پکڑ کے لایا ہو۔"

"میں ڈسپلن کا سخت قائل ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایم آر ایس کے چیئرمین کی حیثیت سے۔"

"چیئرمین کے انتخاب میں دھاندلی ہوئی ہے۔ میں نہیں مانتا۔" محسن نے کہا لیکن اس کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ کوئی کار ایک دم مڑ کر گیٹ کے سامنے آ گئی تھی۔ ہیڈ لائٹ کی روشنی سیدھی کوٹھی کے بائیں حصے کی خالی جگہ پر آئی لیکن زیادہ لائٹ گیٹ کے بند ہونے کی وجہ سے ہم پر نہیں پڑی۔ پلک جھپکنے میں ہم گڑھے میں سرنگوں ہو گئے۔ چوکیدار نے گیٹ کے دونوں پٹ کھولے تو روشنی کی تیز لکیر ہمارے اوپر سے گزری پھر کار پورچ کی طرف مڑی تو میں نے سر اٹھا کے دیکھا۔ یہ چوہدری دلاور کی کار تھی۔ وہ نہ جانے کہاں سے آ رہا تھا۔ شاید کالے ہاتھی سے مل کر یا قصر جمشید کے تہہ خانے میں کوئی ضروری کام نمٹا کر۔ اس کے سب ناجائز دھندے رات کے اندھیرے میں ہی کامیابی سے چلتے تھے۔ دن میں وہ ایک شریف اور معزز صنعتکار تھا۔

"چوکیدار!" دلاور نے آواز دے کر کہا۔ "کوئی آیا تو نہیں تھا؟"

"کون آئے گا سرکار؟" چوکیدار نے کہا۔ "میں جو یہاں موجود ہوں۔"

"تم کیا توپ چلاؤ گے۔" دلاور نے حقارت سے کہا۔ "ایس پی صاحب نے ایسے ہی تو نہیں کہا تھا کہ اپنی حفاظت کی فکر کرو۔ وہ تینوں... غائب ہو گئے ہیں۔" درمیان میں اس نے خاصی دیر سے ایک بھاری بھرکم گالی دی جو میرے، محسن اور رالجے کے لیے بالخصوص استعمال ہوتی تھی۔ میں مجبور ہنس پڑا۔ رضوی صاحب واقعی ذہین افسر تھے۔ انہوں نے قبل از وقت اندازہ کر لیا تھا کہ ہم تینوں اگر تخریبی کارروائی کریں گے تو اس کا پہلا نشانہ کون ہوگا۔ لیکن کیا ستم ظریفی تھی کہ ایک فرض شناس پولیس افسر ایک ایسے شخص کو خبردار کر چکا تھا جس کے کالے دھندوں کے متعلق اسے کوئی شبہ نہ تھا اور وہ کل تک ہمارا محافظ، نگراں، دوست اور مددگار اور ہم سب کا انکل تھا مگر آج دشمنوں سے زیادہ دشمن تھا۔ رضوی صاحب نے دلاور کو اس لیے بھی گرفتار نہیں کیا تھا کہ اس کے خلاف انہیں کوئی ثبوت نہیں ملا تھا اور کوئی شہادت سامنے نہیں آئی تھی۔ ہماری پوزیشن مختلف تھی۔ وہ جانتے تھے کہ پولیس کے ریکارڈ پر کیا کچھ ہے جو ہمیں مجرم ثابت کرتا ہے۔

دلاور نے چوکیدار کو ہوشیار رہنے کی تاکید کی اور اندر چلا گیا۔ ایک کھڑکی کے پٹ روشن ہوئے جو غالباً دلاور کا بیڈروم تھا۔ یہ مخالف سمت سے پہلی کھڑکی تھی۔ اس چھوٹے سے گیٹ کے بالکل سامنے جس سے ہم اندر داخل ہوئے تھے جس کی اندرونی دیوار کے ساتھ طافو کی لاش پڑی تھی اور بیرونی دیوار کے ساتھ ہماری جہازی سائز کی ادھل ریکارڈ کھڑی تھی۔ مجھے ایک بار پھر شدت سے کار کو وہاں پارک کرنے کی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے محسن اور شیڈی کو انتظار کرنے کے لیے کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر میں دلاور سو جائے گا۔" میں نے کہا۔ لیکن اسی وقت چٹخنی کھلنے کی آواز آئی اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھل گئے۔ روشنی کا ایک مستطیل ٹکڑا باہر پھیلا اور اجالا ہر طرف منعکس ہونے لگا۔

دلاور نے زور سے کہا۔ "الو کی بچی تھی۔" اور ایک بلی کو باہر پھینک کر زور سے کھڑکی بند کی۔ خوف، سنجیدگی اور پریشانی کے باوجود ہم سب نے بڑی مشکل سے ہنسی کو روکا۔ غالباً بلی ہر روز اس کے بیڈروم کو اپنا مستقر بنانے کی خاطر گھس جاتی ہوگی اور وہ ہر رات اسے نکالتے نکالتے عاجز آ گیا ہوگا۔ بلیوں کے معاملے میں میرا اپنا تجربہ ایسا ہی تھا کہ وہ ایک بار گھر دیکھ لیں تو میلوں دور چھوڑ آنے کے باوجود لوٹ آتی ہیں۔ یہاں تک کہ صاحب خانہ خود گھر سے نکلنے کی سوچنے لگتا ہے۔

"اسے کہتے ہیں تھیلے میں سے — بلکہ کمرے میں سے بلی نکالنا۔" محسن نے کہا۔ "مسٹر پرنس! میرا دم نکلنے والا تھا۔ خیریت ہوئی کہ اس نے محض غصے کی وجہ سے گرد و پیش پر غور ہی نہیں کیا۔ ورنہ گاڑی تو اسے صاف نظر آ جاتی اور وہ چوکیدار تو ہے نہیں کہ خلاف معمول کچھ بھی دیکھے تو نظر انداز کر دیتا۔ وہ تصدیق ضرور کرنے جاتا کہ گاڑی کس کی ہے۔"

"کیا طافو نے مخبری کرتے وقت گاڑی کے متعلق بھی بتا دیا تھا؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے نہیں۔" محسن بولا۔ "ورنہ جب انکل رضوی نے چھاپا مارا تھا تو گاڑی منظر کے گھر کے سامنے نہ سہی چند قدم کے فاصلے پر اسی گلی میں تو موجود تھی۔"

"انکل کا کچھ بھروسہ نہیں۔ یہ بھی ان کی چال ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "گاڑی کو قبضے میں لے کر انہیں کیا ملتا۔ اب وہ گاڑی کا تعاقب کر سکتے ہیں۔ معلوم نہیں یہاں کی پولیس کے پاس وہ جدید قسم کے سگنل دینے والے آلات ہیں یا نہیں جن سے تعاقب بہت آسان ہو جاتا ہے۔ گاڑی اگر بھیڑ میں بھی کھو جائے یا جُل دے کر نکل جائے تو پریشانی نہیں ہوتی۔ چھوٹا سا مقناطیسی ٹرانسمیٹر گاڑی کے نیچے کہیں چپکا دیتے ہیں اور وہ ایک مخصوص فریکوئنسی پر مسلسل کوڈ میں اپنے سگنل نشر کرتا رہتا ہے۔ پیچھے آنے والی گاڑی کے ریسیور میں اس کی ٹک ٹک صاف سنائی دیتی ہے۔ بس آواز کے پیچھے چلتے جاتے ہیں۔"

"اگر ایسا ہوتا تو وہ لاہور ہوٹل پہنچ کر ہم تینوں کو شرف ملاقات بخشتے۔" محسن بولا۔ "یا اب تک یہاں تشریف فرما کے ہماری کارروائی ملاحظہ کر کے ضرور خوش ہوتے۔"

"یار سکندر بادشاہ، گپ شپ چھوڑو۔" شیڈی نے ہانپتے ہوئے سرگوشی کی۔ "کیا یہاں کنواں کھودنا ہے؟"

"اچھا اچھا استاد، صاف کہو نا کہ دم نہیں رہا۔" میں نے کہا تو محسن نے تائید کی۔

"دم کی بات مت کرو۔ قسم مولا کی۔" استاد شیڈی کو جوش آ گیا۔ "نکال کے دکھا سکتا ہوں یہاں سے۔"

"پھر چھوڑو۔ ہماری گاڑی میں پٹرول ہے ابھی۔" میں نے کہا۔ "بس اب اس مٹی کو برابر کر دو۔"

استاد شیڈی کے ساتھ محسن نے بھی بے وقوفوں کی طرح میری طرف دیکھا۔ "لاش کا کیا کرو گے؟"

"لاش کو وہیں رہنے دو۔ زمین برابر کر دو اور چلو۔ وقت کم ہے۔" میں نے کہا۔

"وقت کے گھوڑے پہ چابک کس لیے تھی؟ ہم اتنے بے کار تو نہیں تھے۔" محسن بولا۔ "ورنہ کپڑے پھاڑ کے سینا بھی جائز ہوتا۔"

"تنظیم کا بنیادی اصول ہے ڈسپلن۔" میں نے کہا۔ "اور بحیثیت چیئرمین کے حکم دیتا ہوں..."

"ایسی کی تیسی چیئرمین کی۔" محسن نے کھودی ہوئی مٹی واپس ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں انتخاب کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تعمیل کرتا ہوں۔"

گڑھے کو پھر مٹی سے پُر کرنا اسے کھودنے کے مقابلے میں بہت آسان کام تھا۔ دس منٹ میں یہ کام ختم ہو گیا اور ہم نے مٹی کو پیروں سے اچھی طرح دبا دیا۔ اس کے باوجود وہ جگہ نمایاں تھی جو کھودی گئی تھی۔ میں نے محسن اور شیڈی کو واپسی کا سگنل دیا اور ہم دبے پاؤں لوٹے۔ ایک بار پھر سیاہ کمبل میں لپٹے ہوئے طافو کے بے جان جسم کے پاس سے گزرے تو میرے قدم پل بھر کے لیے رکے۔ نہ جانے کہاں ایک عورت اپنے بچوں کے ساتھ آنکھیں کھولے لیٹی ہوئی ہوگی۔ ہر روز کی طرح بچوں نے آج بھی پوچھا ہوگا کہ ابا کب آئے گا؟ اور ماں نے انہیں تسلی دے کر سلا دیا ہوگا کہ کل وہ ضرور آ جائے گا۔ تمہارا ابا ٹرک چلاتا ہے نا اور کراچی تک جاتا ہے۔ اس کا ٹرک خراب ہو گیا ہوگا یا مالکوں نے اسے پھر کسی ضروری کام کے لیے کہیں بھیج دیا ہوگا۔ اور جب بچے سو گئے ہوں گے تو اسے پیٹ کے جہنم کو بھرنے کا خیال آیا ہوگا جو اس کے پاس فاقے کے بے صرف لکیری کی طرح منتظر رہتے۔ پر کافقدان اس کے شوہر کا نعم البدل نہیں تھے چنانچہ وہ جاگ رہی تھی اور اپنے اندیشوں سے نبرد آزما تھی۔ آج کی رات کے بعد بھی ایسی ہی ان گنت راتیں آئیں گی جو انتظار کی اور تنہائی کے عذاب کی اور بے یقینی کے اندھیروں کی۔ بالآخر وہ کوئی جواب دے کر بچوں کو مطمئن کر دے گی لیکن یہ نہ بتا سکے گی کہ وہ اپنا اچھا بھلا گھر چھوڑ کے اس گمنامی میں کیوں آ گئے ہیں اور ابا آخر کس سڑک پر نکل گیا ہے کہ لوٹ کر آنا ہی بھول گیا۔

"چیئرمین کی دُم۔" محسن نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "یہ تیرے دماغ کہاں جام ہو گئے ہیں۔ کیا طافو کو بھی دلہن بنانے جا رہے ہو۔ دیکھیا گیر سازگی؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے ٹھٹک کر کہا۔ "طافو کو یہیں سونے دو۔ اس کی تجہیز و تکفین چوہدری ... کرے گے۔"

محسن نے اور شیڈی ... وہ سمجھ گیا تھا کہ میرے ذہن میں لاش کو دفن کرنے کا منصوبہ تھا ہی نہیں بلکہ میں اس لاش کو کسی مؤثر قسم کی جارحانہ کارروائی کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ جیسے گاڑی کی

چابی لے کر وہ کیبن میں بہت تھکا ہوا تھا۔ اگر یہ رات سکون سے سو کر گزر جاتی تو گزشتہ شب کی تھکان ختم ہو جاتی لیکن مقدر میں ایک اور شب بیداری لکھی تھی۔ اور یہ مسلسل دوسری رات تھی جو شدید اعصابی انتشار اور دباؤ سے میرا حوصلہ آزما رہی تھی۔

"گاڑی کو پیلس ہی میں رہنے دو نا؟" میں نے کہا۔ "کوٹھی پہ گزر کا ہی بھول گیا ہے؟"

"سامنے راستہ ڈھلواں ہے بہت آگے سے لوٹنا پڑے گا۔" محسن نے کہا اور گاڑی کا رخ پہلو نما ہموار ڈھلوان کی طرف لے گیا۔ میں ڈھلوان کے قریب پہنچ کر اتر گیا اور محسن کو ہاتھ سے اشارہ دیتا رہا جہاں تک کہ گاڑی کا اندھا غار گاڑی کے نیچے سے اگلے اور پچھلے دونوں پہیوں کے درمیان سے نکل گیا۔ میں پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا اور گاڑی صاف سڑک پر سبک رفتاری کی بھرپور قوت کے ساتھ دوڑنے لگی۔

"اب کدھر جانا ہے اور کیا کرنا ہے؟" محسن نے ٹینڈی کو اس کے گھر کے سامنے ڈراپ کرنے کے بعد کہا۔

"ہمارے حلیے خراب ہو رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہاتھ پاؤں کپڑے سب مٹی میں بھرے ہوئے ہیں۔ اس حالت میں ہم نہ تو ہوٹل لوٹ سکتے ہیں اور نہ نواب نتھے خاں؟"

"یہ تو اس مشن پر آنے سے پہلے سوچنا تھا۔" محسن نے کہا۔ "واپس ٹینڈی کے گھر جا کر سو جاتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "سونا کیسا، ارے ایکشن تو اب شروع ہوگا۔ یہ تو ہم نے ایک سیٹ اپ لگایا تھا اور اگلے سین کی شوٹنگ کا آغاز میری نئی فون کال سے ہوگا لیکن یہ فون کسی پبلک کال آفس سے کرنا ٹھیک نہیں لگتا۔ لمبی کال ہوگی جو کوئی نہ سنے تو بہتر ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے ہوٹل چلتے ہیں۔"

"کیوں نواب نتھے خاں اور پرنسس صوفیہ کی مٹی پلید کرانا ہے۔ اس حلیے کے ساتھ تشریف لے گئے تو ہوٹل والے سمجھیں گے کہ نوابی تو صرف نام کی ہے۔ نتھے خاں پاسٹ ٹائم گورکن ہیں۔" محسن بولا۔ "جو نہ ہو ذرا بھی نہیں؟"

"تو پرنسس کو فون کرو۔" میں نے کہا۔ "راستے میں کسی بھی جگہ سے۔ اس سے کہو کہ میرے دو جوڑے لے کر نیچے آ جائے۔ بنڈل بنا کے تمام کاؤنٹر پہ دے کہ کوئی لینے آئے گا۔ یا بہتر وہ خود ایک بریف کیس میں ڈال لے۔ ہم باہر گاڑی میں انتظار کریں گے اور کہیں بھی مناسب جگہ دیکھ کر بدل لیں گے۔ وہ جاگ ہی رہی ہوگی۔"

"تیرے فراق میں؟" محسن نے قہقہہ مارا۔ "مجھے تو شک ہے کہ وہ جاگ رہی ہوگی۔ ہو کے جا رہی گیا ایسا عشق جس میں سوچا نہ ہو سوچنے سمجھ پایا اور سمجھ جائے۔ محبت نہ ہوئی قیدِ بامشقت ہو گئی۔"

"لگاؤ شرط، وہ جاگ رہی ہوگی۔" میں نے ہاتھ بڑھایا۔

"مقصد پورا ہو گیا؟"

بادلِ نخواستہ محسن نے ہاتھ ملایا اور ہم نے میو اسپتال کے ایکسچینج سے ہوٹل فلیٹیز کا نمبر ملا کے پرنسس صوفیہ کا نمبر گھمایا۔ حسب توقع آپریٹر نے کہا کہ پیغام دے دیا جائے۔ وہ محو خواب تھیں اور انہیں ڈسٹرب نہیں کیا جا سکتا۔

"کون کم بخت ملنا چاہتا ہے؟" محسن نے گلا پھاڑ کے کہا۔ "ہم نواب نتھے خاں ہیں۔ خفا ہو گئے تو ہوٹل کو اصطبل بنا دیں گے۔ لات مار کے نکال دیں گے اور تیرا یہ ٹیلیفون توڑ دیں گے۔ پرنسس کے ہوا فون پر سب ہی نامعقول۔"

میو اسپتال کے ٹیلی فون آپریٹر نے ہمارے مشکوک حلیے اور اس بے سروپا گفتگو پر غور کیا۔ میں نے اسے پچاس کا ایک نوٹ پیش کیا اور کندھے پر تھپکی دی تو اس نے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ ایک منٹ بعد محسن کا رابطہ ہو گیا۔

"پرنسس۔ معافی۔ ہم نے آپ کو خواب شیریں سے بیدار کیا۔" محسن بولا۔

میں نے ریسیور چھین لیا۔ "تم سو رہی تھیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں، سونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "محسن کہاں چلا گیا ہے؟"

"تم ایسا کرو کہ میرے دو جوڑے بریف کیس میں ڈالو اور نیچے گیٹ کے باہر ہم اس اور ایک گاڑی میں ملیں گے۔ دراصل ہمارے کپڑے خراب ہو گئے ہیں اور ان کپڑوں میں ہم اندر نہیں آ سکتے۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ محسن نے سو کا نوٹ نکالا اور میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ آپریٹر نے پھر سر ہلایا۔ بہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کی۔ ہم اسے حیران پریشان چھوڑ کے باہر نکل آئے۔ میں نے محسن کی گاڑی پر سوار ہو کر دلی جذبوں کے ساتھ "ہم نے آپ کو خواب شیریں سے بیدار کیا" اس کی نقل اتاری۔ "شیریں اپنے فرہاد کے لیے جاگ رہی تھی۔"

"تم دونوں نے مل کر بے ایمانی کی۔" محسن بولا۔ "تم نے اپنا پیغام دیا اور اس نے جھوٹ بول دیا۔"

ساڑھے چار بجے رابعہ بریف کیس لیے خود آ رہی تھی۔ پھر یہ ہوا اس نے اصرار کیا کہ ہم دونوں کو باری باری ملاحظہ کیا۔ "لیے کیا بچا ایسا کیا آپ نے؟"

"جاؤ بی بی۔ جا کے اب تو سو جاؤ۔" محسن نے جھنجھلا کے کہا۔ "ہماری اصل صورت بھی ٹھیک آپ نے دیکھی ہے۔"

"ہم ابھی دو منٹ میں آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم یہیں رکو۔" اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ سڑک کے فاصلے پر ایک تاریک ویران نظر آنے والی کوٹھی میں داخل ہوتے وقت میں نے ہیڈلائٹ آف کر دیں۔

www.paksociety.com

www.paksociety.com

"ایم تھرا ایس کے مسز اراکین؟ یہاں لباس کا فخرو تبدیل کر لیں گے۔" میں نے کہا۔ "اندھیرا بھی ہے اور تکلیف بھی۔"

"یہ تو بڑی بے ڈھنگی بات ہوگی۔" محسن نے کہا "اور پھر خاندانی نواب ابن نواب۔"

"نواب صاحب... ہوتا ہے آنکھوں کا۔ ہم اپنی آنکھیں بند کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور آپ کو تین منٹ دیتے ہیں۔"

پانچ منٹ بعد ہم صاف ستھرے شریفانہ لباس میں لوٹے تو رابعہ ہوٹل کے باہر سب سے پہلے کھڑی ہوئی پریشان ہو رہی تھی۔ آنے جانے والے اسے کوئی غلط قسم کی عورت سمجھ رہے تھے۔ اس وقت کون سی شریف عورت ہوٹل کے باہر تنہا کھڑی ہوتی ہے اور وہ بھی ایک ہوٹل کے صدر دروازے پر۔ ہم نے اسے ساتھ لیا اور گاڑی کا اندر جا رکھی۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے کلرک نے سر اٹھا کے ہمیں دیکھا اور غالباً اس مشکوک صورت حال پر غور کیا کہ پرنس یا ابھی کچھ دیر پہلے تقریباً سو سوٹ کیس سے آ کر کہیں گئی تھی اور واپسی میں اپنے بھائی نواب ننھے خاں کے علاوہ ایک اور شخص کو ساتھ لے آئی۔ لیکن ہوٹل میں سب کچھ ہوتا ہی رہتا ہے اور ایک معمولی کلرک کو وہاں صرف ریزرویشن کے لیے بٹھایا جاتا ہے۔ پبلک کے اخلاق و کردار کی نگرانی کے لیے نہیں۔

"ہوٹل کلرک نے بھی ہمارے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کی۔" رابعہ نے اوپر جاتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم ننھے کے پیچھے سے ہوتے آجاتے تو وہ ہمارے بارے میں اس سے بھی بری رائے قائم کرتا۔" محسن نے جواب دیا۔

"مگر بقول شاعر تصویر ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔ اصل رائے وہ ہے جو ہم اپنے بارے میں رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

کمرے میں پہنچتے ہی میں نے ریسیور اٹھایا اور آپریٹر کو چوہدری دلاور کا نمبر دیا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی چنانچہ اس بات کا امکان نہیں تھا کہ آپریٹر ہماری گفتگو سنے گا۔ تین منٹ بعد دوسری طرف آواز آئی "ہیلو۔" نیند سے بوجھل آواز اور بیزار لہجے سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ ابھی سویا ہی ہوگا اور ایسے وقت میں ٹیلی فون کی مداخلت اسے گراں گزری تھی۔

"ہیلو چوہدری صاحب! گڈ مارننگ۔" میں نے بشاشت سے کہا۔ "آپ کا پارٹنر بول رہا ہوں۔ ایکسٹرا ڈی گریٹ۔"

"اچھا۔ تو اب اتنی جرأت ہو گئی ہے تمہاری کہ تم..." وہ یکایک غصے سے بے قابو ہو گیا۔

"میں نے تو آپ کی بھلائی کی خاطر فون کیا تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اب دیکھیں نا جب اس سے پہلے ہم نے آپ کو ایک گفٹ پارسل بھیجا تھا تو پہلے سے اطلاع کر دی تھی کہ کہیں بے وقت آپ کے لیے زحمت نہ بن جائے تو ہمارا کیا قصور؟"

"تم غارت کرو۔ ایسے ہتھکنڈوں سے تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" وہ بولا۔ "میری حفاظت کا انتظام ہو گیا ہے اور مقدر بھی یاور ہے تو جائے گا ہی۔ تمہاری طرح مفرور نہیں ہوں۔"

"مفرور! اوہ لاحول ولا قوۃ چوہدری صاحب۔ آپ کے خاندان میں کس بات پر فخر کریں گے۔" میں نے کہا۔ "خدا آپ کے برابر عزت، دولت اور اقتدار دے۔ اور نہ خاندانی شرافت اور عزت۔ میں نے سے چوہدری صاحب کہ سارے کھیل تقدیر کے ہیں۔ جیسے تقدیر کیا کیا کھیل کھلاتی ہے یہ آپ نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔"

"فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔" وہ ... گیا تھا۔ اس نے لہجے سے بے نیازی کا تاثر دینے کی کوشش کی مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کا تجسس اور خوف اسے بیدار کر چکا ہے۔

"ابھی تو آپ کو یہ بات فضول لگے گی مگر ہمارا کام آپ کو قبل از وقت خبردار کرنا تھا۔ ہم کو طرف دشمن نہیں ہیں کہ چھپ کر وار کریں یا آپ کو خبر کیے بغیر گرفتار کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صبح کا اجالا پھیلے گا تو دنیا دیکھے گی۔"

"کیا دیکھے گی؟ کیا مطلب ہے اس بکواس کا؟" دلاور نے کہا۔ اس کی آواز میں اب گھبراہٹ بہت نمایاں تھی۔

"مطلب کہ آپ قیمتی گھوڑا نشان پہ لگے گا۔" میں نے کہا۔ "اپنے محل کے پائیں باغ سے۔ مطلب کا نام ہے اطلاعات عرفت طارق۔"

"کون طارق؟ میں کسی اطلاعات عرفت طارق کو نہیں جانتا۔" دلاور ...

"صورت دیکھ کر تو بڑے شکل کے تو شناخت کر لو گے بڑی رحمت کو بھی تو پہچان ہی لیا تھا تم نے۔" میں نے قہقہہ مارا۔ "وہ پاگل تھا اور یہ ٹرک ڈرائیور۔ پہلے ٹرک اللہ کو پیارا ہوا پھر رحمت صندوق میں چھپ کر تمہارے گھر پہنچا اور اب یہ طارق تمہارے گھر کی زمین کی گھاس کر لیٹ گیا ہے۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ یہ کہنا چاہتے ہو مجھ سے کہ تم لوگ میرا گھر میں دفن کر گئے ہو؟" وہ نروس ہونے لگا۔

"کیا یہ کوئی بہت مشکل کام ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "ہم نے تو اس سے کہیں زیادہ مشکل کام کیے ہیں۔"

"یہ... ناممکن ہے۔ گیٹ پر چوکیدار کھڑا ہے۔ وہ تمہیں ہی گولی مار دیتا۔" وہ بولا۔ "لیکن یہ حکم ہے اور میں نے اس کو تمہاری تصویر بھی دے رکھی ہے۔"

"تصویر سے تو شاید وہ کچھ نہ بتا سکے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بات کی تصدیق وہ کر سکتا ہے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے اس نے تمہارے گھر کی پچھلی دیوار کے قریب ایک کار کھڑی دیکھی تھی۔ ایک اوپل ماڈل سنہ ۱۹۷۶ء۔ نیلا رنگ۔ ... بیٹھا شخص۔ اور اس نے کار کی لائٹ کے بجھا ہوا گیٹ بھی بند کیا تھا۔ وہ چھوٹا سا گیٹ جو پیچھے کی طرف ہے۔ میں پھر فون کروں گا۔ دو منٹ بعد۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"اس نے ایکسچینج کو بتایا تو کال ٹریس ہو جائے گی۔" محسن نے تشویش سے کہا۔ "وہ احمق۔" رابعہ میری گفتگو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی۔ "عام حالات میں وہ کرتا۔ مگر ایک تو وہ خوفزدہ ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر میں نے اسے دو منٹ کی مہلت دی ہے۔ دو منٹ میں وہ چوکیدار سے بھی بات نہیں کر پائے گا۔ ایکسچینج سے کیا کہے گا۔"

"پھر بھی احتیاط بہتر ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "عام لوگوں کے لیے یعنی ان لوگوں کے لیے جن کے کمروں میں ٹیلی فون لائن نہیں ہے، نیچے ہال میں پبلک ٹیلی فون ہے۔ شیشے کا ایک کیبن سا ہے۔ اندر کی آواز باہر سنائی نہیں دیتی۔"

"اچھا! یہ تم نے کام کی بات بتائی۔" عزیز میں نے کہا۔ "تم تمام لوگ نیچے سے دوسری کال کرتے ہیں۔"

اوپر سے نیچے تک آتے آتے ہمیں تین منٹ ہو گئے تھے۔ میں نے اور محسن نے کیبن میں گھس کر دروازہ بند کیا اور پھر نمبر ملایا۔ دلاور تصدیق کے بعد بہت بے چینی سے کال کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے گھنٹی بجتے ہی ریسیور اٹھا لیا۔ "چوکیدار نے کسی کو نہیں دیکھا۔" وہ مجھ سے پہلے بولا۔ "گاڑی نہ جانے کس کی تھی؟"

"جی ہاں!" میں نے آواز کو بھاری بنا کے اور لہجہ بدل کے کہا۔ "کیا چوکیدار اور کس کی گاڑی؟"

"اوہ... وہ... آپ کون ہیں؟" دلاور بوکھلا گیا۔ "دراصل میں ایک ... اور کال کے انتظار میں بیٹھا تھا۔"

"ہمیں خوشی ہوئی یہ جان کر کہ تم انتظار کر رہے تھے۔" میں نے اصل آواز میں کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ بکواس قرار دینے کے باوجود تم کو ہماری بات پر تھوڑا بہت اعتبار ضرور آ گیا ہے۔ تقریباً سو فیصد۔"

"تم اب پولیس کو فون کرو گے نا؟" دلاور کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "کر دو... کہ دلاور کے گھر میں فلاں جگہ ایک لاش دفن ہے۔ کر دو۔ میں آج سارا دن گھر سے باہر رہا ہوں۔ رات تک جہاں جہاں میں گیا میری موجودگی کے گواہ ہیں۔"

میں نے قہقہہ مارا۔ "تم اتنے بے وقوف تو نہیں ہو دلاور۔ تم کو بھی علم تو ہوگا کہ ان گواہوں کی باری تو بہت دیر میں آئے گی اور کون جانے تب تک کتنے گواہ منحرف ہو جائیں۔ قتل کے کیس میں کوئی اپنی گردن نہیں پھنساتا چوہدری صاحب۔ اور ہم پولیس کو فون کریں گے یا نہیں اس کا انحصار تمہارے رویے پر ہے۔"

"مجھ سے کیا چاہتے ہو تم؟" دلاور نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔ "کیا شرائط ہیں...؟"

"ہماری شرائط تم پوری کر سکو گے؟ مثلاً میں کہوں کہ مجھ پر چلنے والے مقدمات یہ سب ختم کرا دو صبح تک۔" میں نے کہا۔

"تم ... اتنی شرطوں کی ترتیب نہیں رکھتا۔ صبح تک تو نہیں۔ لیکن..."

اُردو ادب کا نیا رُخ

آپ کے جانے پہچانے مشہور ادیب اثر نعمانی کے قلم سے

طنز و مزاح سے بھرپور ... کہانیوں کے دلچسپ سلسلے کی چار کتابیں

گھر کی مرغی

قیمت ۲۰ روپے ○ ڈاک خرچ ۱۰ روپے

حکیمی ٹیکسی

قیمت ۳۰ روپے ○ ڈاک خرچ ۱۰ روپے

بے وقوف

قیمت ۲۰ روپے ○ ڈاک خرچ ۱۰ روپے

آپ کے سر پر

قیمت ۲۰ روپے ○ ڈاک خرچ ۱۰ روپے

کوئی بھی دو کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف

میں کوشش کروں تو۔۔۔"

"مگر مقدمے کا رخ بدل سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "وکیل استغاثہ کے دلائل، گواہوں کے بیانات، ثبوت اور شہادت کو بدلا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ تو تم کچھ تعاون پر آمادہ نظر آتے ہو۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم خود نہیں بدل جاؤ گے! تمہاری زبان پر کیسے اعتبار کر لوں۔"

"میں کیسے اعتبار کر لوں کہ تم مجھے بلاوجہ ہراساں نہیں کر رہے ہو؟" وہ جھلا کے بولا۔

"ارے چوہدری صاحب، آپ بھی ہراساں ہو سکتے ہیں! کبھی دیکھا نہیں آپ کو پریشان ہوتے۔" میں نے کہا۔ "ویسے بلاوجہ میں ہراساں کر رہا ہوں یا میری بات واقعی قابل توجہ ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو دیا تھا میں نے۔ دوسرا ثبوت خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرمالیں۔ آپ کے گھر کے پیچھے جہاں پانی کی موٹر نصب ہے وہاں ٹارچ لائٹ سے دیکھیں۔ آپ کو اطلاعات کا مدفن نظر آجائے گا۔ تازہ کھدی ہوئی زمین ہموار کر دی جائے تو بھی پتا تو چلتا ہے۔ اور آپ کی نظر تو ماشاء اللہ... چوہدری صاحب! ہیلو!"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور قہقہہ مارا۔ "بڑی اللہ اکبر کی ہے وہ سالا۔ ابھی وہاں ہی نہ مرے... نہیں۔ اس وقت تو مجاور یوں ہوگا کہ رات کو سورج نظر آجائے گا۔" میں نے پھر ایک نمبر ملایا۔

"ہاں بھئی کیا بات ہے؟" کسی نے خالص تھانیداروں کے لب ولہجے میں کہا۔

"ایس ایچ او سے بات کرنی تھی۔" میں نے کہا۔ "ایک قتل کا کیس ہے۔"

"تو ضروری ہے ایس ایچ او کو بتانا؟" ڈیوٹی پر موجود افسر نے کہا۔ "او میاں ہم بھی دس سال سے ایس آئی ہیں۔"

"اچھا ایس آئی صاحب، آپ کے علاقے میں قتل کی ایک واردات ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "اطلاعات عرف طافو نام کا ایک ٹرک ڈرائیور تھا۔ اسے آج دن میں چھرے سے ذبح کر دیا گیا ہے اور اس وقت قاتل اس کی لاش کو زمین میں گاڑ رہے ہیں۔ آپ اگر جلدی کریں تو جائے واردات پر پہنچ کے سب کو گرفتار کر سکتے ہیں اور لاش بھی برآمد کر سکتے ہیں جو وہیں پڑی ہے۔"

"تم کون ہو؟ یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو؟ نام بتاؤ اپنا۔" سب انسپکٹر ایک دم چوکنا ہو گیا۔

"میں اپنا نام نہیں بتا سکتا جی۔ اس گھر کا ایک معمولی سا ملازم ہوں، ڈرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "چوکیدار کی نوکری ہے۔ مگر جناب یہ لعنت بھیجی اس نوکری پر۔ کل کو میرا انجام کیا ہو سکتا ہے؟"

"او یار جلدی بس یہ بتاؤ... پتا بتاؤ۔ کس نے قتل کیا ہے؟" سب انسپکٹر گرم ہونے لگا۔

"وہ جی... چوہدری دلاور۔ بہت بڑے آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔ "فیکٹری کے مالک ہیں۔"

سب انسپکٹر نے مجھے گالی دی۔ "فیکٹری کا مالک ہو یا مل کا، ان کے پیچھے تو ایک ہی پھانسی کا تختہ ہے۔"

"بس جی آپ جلدی کریں گے تو رنگے ہاتھوں پکڑے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "ابھی میں نے ایس پی خادم رضوی صاحب سے بھی بات کی ہے۔ انہوں نے کہا تھانے والوں کو بتا دو۔"

"ایس ایس پی... وہ کیا لگتا ہے تمہارا ماما؟" سب انسپکٹر بولنے لگا۔ "جلدی جلدی کرتا ہے پتا بتا، آ رہے ہیں۔"

میں نے اب پولیس کی بھرپور کارروائی کو یقینی بنا لیا تھا۔ انسپکٹر اب رشوت لے کر بیٹھنے والا بھی نہیں تھا کیونکہ اس کو خبر تھی کہ یہ بات ایس ایس پی صاحب تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے ٹیلی فون کا پتا اور لاش کا محل وقوع دونوں بتا دیے تھے اور [illegible] صاحب کا خاندان [illegible] اثر انگیز ہے۔ اس لیے میں نے [illegible] ورنہ ایک غریب چوکیدار میں تو تھانے فون کرنے کی ہمت ہی نہیں [illegible] اور پیچھے ہی محسن نے مجھے بڑے جوش سے گلے لگا لیا اور میری بلائیں لے کر انگلیاں چٹخائیں۔

"برخوردار نور چشم۔ واللہ دل خوش کر دیا اس وقت تم نے۔ تم واقعی چیمپئن بننے کے مستحق تھے۔" اس نے بیٹھے بیٹھے ایک قلابازی کھائی اور حلق سے مرغے جیسی آواز نکالی۔ رابعہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"یہ تو اچھا بھلا گیا تھا پیچھے۔" وہ بولی۔ "اسے کیا ہو گیا ہے؟"

"مجھ پر ہونے والا ہے وہ دوسرا جنم [illegible] دست بدو ویسے۔" وہ آنکھیں بند کر کے بولا۔ "ہم جھانکتے ہیں کیا ہو رہا ہے۔ ہماری آنکھیں سب دیکھ رہی ہیں۔ چوہدری دلاور نے جو کیا ہے لیا ہے۔ وہ کدال بیلچے کی تلاش میں ہوگا پھر رہا ہے۔ اسے گھر کا ہی سب مل گیا ہے۔ مل اپنے باغبانی کے آلات گیراج میں رکھتا ہے۔ اب وہ چلا رہا ہے اور چوکیدار کو گالیاں دے رہا ہے اور کھودنے کا حکم دے رہا ہے۔ چوکیدار حقیقت میں پریشان اور [illegible] یہ کون ہے؟ او ہو۔ یہ تو اندر سے اس کی زندہ جب نکل آئی ہے [illegible] کی نہیں، چوہدری دلاور کی۔ وہ شور شرابے سے جاگ اٹھی [illegible] اسے اندر واپس ہو جانے کو کہہ رہا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ آدھ گھنٹے میں وہ لاش برآمد کر لے گا اور کہیں پھینک آئے گا۔ [illegible] یہ تو دوسرا منظر ہے۔ تھانے سے ایک جیپ روانہ ہوئی ہے [illegible] ایک تھانیدار، چار مسلح سپاہی [illegible] اس وقت تھانیدار ماتحت نفری کے ساتھ کہاں جا رہا ہے! [illegible] چوہدری صاحب کے گھر جا رہے ہیں۔ چوہدری صاحب رنگے ہاتھوں پکڑے جائیں گے۔ کوئی نہیں بچنے لگا کہ وہ لاش [illegible] تھے۔ لاش تو برآمد اس وقت وہ کمبل میں لپٹی ہوئی پڑی ہے [illegible] عرف طافو کی لاش ہے۔ وہ اسی کو گاڑنا چاہتے تھے۔ طافو کو [illegible]

گیا ہے اور حضرات و خواتین ناظرین سے کوئی مل گئی ہے۔ چوہدری صاحب تو پہلے ہی رحمت کمائش کے قتل کے الزام میں گرفتار تھے اتفاق کی [illegible] تو رحمت کی بیٹی کے ساتھ تھا۔ مقابلہ بہت سخت ہے اور بیسیوں حضرات [illegible] کی ٹیم نے یہ دوسرا گول کر دیا ہے۔ بہت ہی خوبصورت مووٹ بنائی تھی۔ سکندر نے محسن کو پاس دیا۔ محسن نے ٹیڈی کو [illegible] سکندر کے پاس آیا۔ "اور گول!" وہ چلایا۔ وہ واقعی پاگل ہو گیا تھا۔ اس پر اچانک انکشاف ہوا تھا کہ میں نے چوہدری دلاور کو پوری صفائی سے شکار کیا ہے۔ اسے پھر چھوٹنے کی مہلت بھی نہیں ملی ہوگی۔ میں نے پورا کھیلا تھا اور فرض کر لیا تھا کہ پولیس اتنی ہی دیر میں جا پہنچے گی جتنی دیر میں دلاور گڑھا کھودنا شروع کرے گا یا اسے کھودنے کے بعد پریشان کھڑا ہوگا۔ آخر میرے اس مذاق کا مطلب کیا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین نہیں [illegible] امکانات بالآخر اپنے حق میں پلٹنے کے نظر آتے تھے لیکن بری چال کا [illegible] اس کا پتا صبح ہونے سے پہلے نہیں چل سکتا تھا۔

محسن اب تفصیل سے رابعہ کو بتا رہا تھا کہ چوہدری دلاور پر دوہرے قتل کا یقینی الزام آنے کے بعد اس کی ضمانت منسوخ ہو جانا بھی یقینی ہے۔ "بہت ہوشیار بنتا تھا الو کا پٹھا۔ اب سمجھ لو کہ پھانسی کے تختے پر [illegible] کسی بات کو جھٹلائے گا۔ پہلے والا کیس بھی بہت خراب ہو گیا تھا [illegible] پہلے اس نے انکار کیا اور انسپکٹر سے لڑ پڑا تھا۔ پاگل ہو جائے گا آج تو وہ۔ ہتھکڑی اور جیل سے اس کا باپ بھی نہیں بچا سکتا اسے۔" وہ بہت جوش میں تھا اور بچوں کی طرح اچھل رہا تھا۔ رابعہ کا چہرہ تمتمانے لگا تھا اور میں خود اعصابی ہیجان میں مبتلا تھا۔

"ایسے بچوں کی طرح شور مچانے سے کچھ نہیں ہوگا ننھے۔ میرا مطلب ہے نواب ننھے خان!" میں نے کہا۔ "وہ لوگ بروقت وہاں پہنچ گئے تو ضابطے کی کارروائی میں کچھ وقت لگے گا۔ دلاور [illegible] معاملہ دبانے کی پوری کوشش کرے گا مگر اب وہ سب انسپکٹر ماننے والا نہیں ہے۔ اسے اپنی نوکری خطرے میں نظر آئے گی۔ ملزم سمیت وہ لوگ آدھے گھنٹے تک تھانے واپس آجائیں گے اور ابھی بجے ہیں صبح کے ساڑھے چار۔ ڈھائی گھنٹے کے لیے میں سوتا ہوں۔"

"سمجھ رہا ہے وہ کہتا ہے؟" محسن نے کہا۔ "ایم ڈرامہ کا چیمپئن کہتا ہے۔"

میں جوتوں سمیت رابعہ کے بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ بستر [illegible] سے اس کے وجود کی مہک اٹھ رہی تھی۔ وہی حواس پر چھا جانے والی اور ہوش سے مدہوش کر دینے والی خوشبو جو اس کے قرب میں بھی محسوس ہوتی تھی۔ نہ جانے کیسے میرے اعصاب کی کشیدگی کم ہونے لگی اور میرا ذہن پرسکون ہو گیا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ مجھے تھپک رہے ہیں۔ تصور عرش پر ہے اور میں سو جانے سا آتی پر سرشت کے آخری پہر میں اٹھنے والی شبنم کی مہک

میں بڑی لطیف ٹھنڈک تھی۔ نسیم سحر کے جھونکے خوابیدہ کلیوں کو جگا رہے تھے اور سورج کی پہلی کرن کی نوید دے رہے تھے۔ اور کلی چٹخنے لگی تھی، مسکرانے لگی تھی، خوشبو اور رنگ کا جادو جگانے لگی تھی۔ گہرا نیلا آسمان حد نظر تک پھیلا ہوا تھا اور افق کی لکیر تک سرسوں کے زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔ رابعہ پیلے رنگ کی ساڑی میں پہلی بار مجھے ملی تھی تو اس کے آنچل پر پیلے پھول جگمگا رہے تھے۔ "وہ پیلے پھولوں والی زرد ساڑی کہاں گئی؟"

محسن نے قہقہہ مارا۔ "بھیا چیمپئن، آج تو دیر ہو گئی ہے۔ وہ زرد پھولوں والی ساڑی شوق سے باندھ لینا۔ ابھی تو ہے نہیں۔"

پانی کے چھینٹے میرے منہ پر پڑے تو میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ محسن کو ہنستا دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آگئی۔ پھر بھی میں یہ سمجھا کہ بات کیا ہے۔ رابعہ کی طرف دیکھ کر مجھے شک ہوا کہ محسن کی ہنسی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ "کیا ہوا ہے مجھے؟ سینگ نکل آئے ہیں میرے سر پر؟" میں نے آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ کی۔

"ایسے کیا نظر آئے گا؟" محسن بولا۔ "شاعر کہتا ہے جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے۔ جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے۔ سوتے میں آپ خاتون ایڈووکیٹ سے سوال کر رہے تھے کہ وہ پیلے پھولوں والی نیلی ساڑی کہاں ہے؟ میں نے ان سے کہا بھی کہ ہے آپ کے پاس ہے تو جلدی لے آئیں مگر انہوں نے ڈانٹا۔ بلاوجہ کہہ رہے ہیں، میرے پاس تو ہے نہیں۔"

"اچھا؟" میں نے کہا۔ "نہیں ہے تو ہونی چاہیے۔ کیا خیال ہے؟"

"اٹھتے ہی شروع ہو گئی لائن پر گزرنا۔ چلو تم اٹھ کے منہ ہاتھ دھو تو ناشتہ تو کریں؟"

"ارے ایسے نہیں رابعہ۔ یوں کہو۔ اجی اب اٹھ جائیں نا۔"

محسن نے نقل اتاری۔ "اللہ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے... ارے... غضب خدا کا۔ مار ڈالیں گے۔ اچھا بی امی [illegible] ہماری طرف سے منہ ہاتھ کے اٹھا دو۔"

میں تولیہ اٹھا کے باتھ روم میں گھس گیا اور مجھے یہ سب بہت اچھا لگا۔ اس گھر کی زندگی کی ایک تصویر یا ایک جھلک جو کبھی ایک خواب، تمنا کی طرح ہمارے خیالوں میں آباد تھا اور اس کے خدوخال وقت کی سخت ترین آزمائش میں بھی روشن رہے تھے۔ ایک نہ ایک دن میرے خیالوں سے نکل کر وہ گھر زمین پر زندہ حقیقت کا روپ ضرور دھارے گا۔ بشرطیکہ زندگی نے مہلت دی۔ ایسا ہی ایک گھر آرزو اپنی آنکھوں میں بسائے یہاں سے میلوں کے فاصلے پر شہلا بھی آنے والے دن کا انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت مجھے اس تصویر میں اسی کی کمی محسوس ہوئی۔ جیسے چار رنگوں میں چھپنے والی تصویر مکمل تو ہو مگر ایک رنگ سے محروم رہ گئی ہو۔ وہ ہوتی تو یہ بھی

www.paksociety.com

اسے چھوڑ دیا۔ یہ محسن کی ہمت تھی کہ وہ اکیلا ہی ہنس رہا تھا اور ہنسا بھی رہا تھا۔ ورنہ باقی دنیا تو خون کے آنسو رلانے پر آمادہ تھی۔

باتھ روم سے نکل کر میں نے محسن کا ہی سوٹ پہنا جسے رابعہ نے بڑی صفائی سے پریس کر دیا تھا۔ وہ رضوی صاحب کے گھر سے کوچ کرتے وقت اپنی سفری استری بھی رکھ لائی تھی جو بہت چھوٹی سی اور ہلکی تھی مگر کام وہی کرتی تھی جو بڑی استری۔ جب اس نے مجھے چیک کر کے ہونٹ دبائے تو ایک لمحے کے لیے میری اور اس کی نظر ملی اور میرا دل چاہنے لگا کہ یہ سب کچھ چھوڑ دوں اور وہی کروں جو رابعہ نے بہت پہلے کہا تھا۔ اس زمین کے کسی دور افتادہ اور گمنام گوشے میں وہ گھر بسا لوں جس میں رابعہ ہر روز مجھے اسی طرح بیدار کرے جیسے محسن نے کہا تھا اور وہ اسی طرح...

"میاں جی تم نے جوتے بھی پرسوں سے پالش نہیں کیے ہیں۔ وضاحت ضروری ہے۔" محسن نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھ کر کہا اور ہنسا۔

"تم اگر اسی طرح ہمارے ساتھ رہا تو حالات دن بدن ابتر ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "شہلا کو بلوا لیتے ہیں۔"

"نہ جانے آج مجھے بھی وہ کیوں یاد آ رہی ہے۔" محسن نے آہ بھر کے کہا۔ "اور اس کے ساتھ ہی اماں کی یاد آتی ہے تو میں اپنے آپ سے نظر نہیں ملا سکتا۔ مجھ سے زیادہ بدقسمت بیٹا کوئی ہوگا جس نے ماں کے قدموں کے نیچے آباد جنت پا کے گنوا دی۔ اس وقت میں ان کی خدمت کر لیتا تو یہ تمام عمر کی خدمت سے بڑھ کر ہوتا؟"

وہ بے حد سنجیدہ اور جذباتی ہو گیا تھا۔ رابعہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ "تم آج ہی چلے جاؤ۔ اپنے ساتھ ہمیں احساس جرم میں مبتلا مت کرو۔ ان کی نظر میں تو گناہ گار ہم ہوں گے کہ ان کے بیٹے کو ان سے دور کر دیا ہے؟"

"نہیں۔ تم میری ماں کو نہیں جانتیں رابعہ۔" وہ اداس ہو کے بولا۔ "انہوں نے تمام زندگی ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنا سکھایا۔ عام لوگوں کی نظر میں وہ ایک سخت گیر ماں تھیں اور ایک ایسی بیوی جو شوہر پر حاوی رہی۔ لیکن یہ حقیقت ہے رابعہ کہ ان کے بغیر ہم لوگ اس ریوڑ کی طرح ہوتے جس کا گڈریا اتنا کمزور اور بے بس ہو کہ ان کی حفاظت نہ کر سکتا ہو۔ انہیں جنگلی درندوں سے اور جنگل کے راستوں سے بچا کے سلامتی کے ساتھ گھر تک لا سکتا ہو۔ میرے والد سرکاری قانونوں پر یقیناً بہت اچھے نوٹ لکھتے ہوں گے اور صحیح فیصلے صادر کرتے ہوں گے مگر ان کے پاس گھر اور ازدواجی زندگی کی ذمے داریاں نبھانے کے لیے وقت ہی نہ تھا اور وقت اس لیے نہیں تھا کہ ان میں اس کی صلاحیت نہ تھی۔ مجھے تعلیم کے لیے پردیس بھجوانے کا فیصلہ بھی میری ماں نے ہی کیا تھا۔ حالانکہ مائیں بہت جذباتی ہوتی ہیں۔ اولاد سے جدائی ان پہ بھی شاق گزری ہوگی مگر انہوں نے میری بہتری کی خاطر خود پہ جبر کیا۔ اور یہ بات میں آج بتا رہا ہوں۔ جب میں نے ان کے متعلق ڈاکٹروں کا حتمی فیصلہ سن لیا اور خود ان کو بھی معلوم ہو گیا کہ وہ اب چند دن کی مہمان ہیں تو میں نے ان کے پاس رہنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن انہوں نے کہا۔ محسن تو یہاں رہ کے میری کیا مدد کرے گا بے وقوف۔ مقدر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ زندگی کا فقط ایک لمحہ دست قدرت میں ہے اور کوئی چاہے نہ چاہے اس سے آگے ایک سانس کی مہلت نہیں ملتی۔ قدرت کی مہربانی ہے کہ کچھ لوگوں کو اس وقت کے آنے سے پہلے کچھ معلوم نہیں ہوتا اور موت اچانک آ لیتی ہے۔ میں تو خوش قسمت ہوں کہ مجھے پہلے پتا چل گیا اور میں نے وہ سب کام کر لیے جو ضروری تھے ورنہ مجھے بہت سی ان فرض شناس ذمے داریوں کا بار نہ اتار سکتی۔ اب فوزیہ اپنے گھر کی ہو گئی اور وہ خوش ہے۔ تیری فکر تھی تو خدا نے میری سن لی اور تم جیسے سب انتظام خدا کو منظور تھا۔ مجھ پر کیا یہ بیمار کہاں چھوڑ جائے کہ ہماری ماری پھرے گی۔ ماں کو بھولانے کا ارمان ہوتا ہے اور اس کی نظر خوب سے خوب تر کی تلاش میں اسے در در لیے پھرتی ہے۔ مجھ میں اتنا حوصلہ کہاں تھا۔ تم نے میرے کلیجے کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔ اب مجھے تیری بھی کوئی فکر نہیں ہے کہ بعد میں تیری۔۔۔ زندگی کیسی گزرے گی۔ خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔ زندگی دے۔ تم کو وہ ساری خوشی خود مل جائے گی جس کی سب لڑکیاں منتظر رہتی ہیں مگر پاتے خوش نصیب ہی ہیں۔ اس کے بعد بھی میں نے بہت کچھ کہا مگر انہوں نے کہا کہ ایسے وقت میں سکندر کو مت چھوڑو؟"

میں دم بخود بیٹھا تھا اور خود بھی بے حد افسردہ ہو گیا تھا۔ "یہ کہا تھا انہوں نے؟ وہ خفا نہیں مجھ سے؟"

"نہیں یار۔ یہی تو وہ فرق ہے جو میری آنکھ دیکھتی ہے۔" وہ بولا۔ "ان کی ناراضی وقتی ہوتی ہے۔ جیسے کوئی بچے کو اس کی غلطی پر جھڑک دے یا ایک تھپڑ مار دے اور پھر بھول جائے۔ تیرے لیے ان کے دل میں جذبات کی گہرائی اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی مجھے محسوس ہوتی ہے۔ ان کا ایک بیٹا میں تھا تو دوسرا تو تھا۔ ان کی جذباتی وابستگی کا ایک سبب یہ تھا کہ تقدیر نے تیرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ماں کو چھین لیا تھا اور تو نے بچپن ہی ان کے دل میں ماں کا درجہ پیدا کیا تھا۔ سالہا سال تک میں اور تو ایک گھر کی چھت کے نیچے رہے۔ ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے، سوتے اور کھاتے رہے اور اسکول جاتے رہے۔ خیر جب میں نے بہت ضد کی تو انہوں نے کہا۔ محسن یہ حکم ہے میرا۔ ان کا یہی طریقہ تھا۔ جب وہ کسی بات پر قائل نہیں کر پاتی تھیں تو اس طرح بات ختم کر دیتی تھیں اور اس کے بعد اختلاف کی جرأت نہیں کرتے تھے لیکن اس دن پہلی بار میں نے ان کے حکم کو بھی نہیں مانا تو انہوں نے مجھے قسم دی اور کہا کہ تو نے سکندر کو اکیلا چھوڑا اور واپس آیا تو میں تجھے دودھ نہیں بخشوں گی۔ اس کے بعد میں مجبور ہو گیا۔"

خاموشی کا ایک بوجھل اور سوگوار وقفہ آیا جس میں مجھے

دور اسلام آباد کے ایک گھر میں لے گیا جہاں وہ دو بیٹوں کی ایک ماں خاموشی سے فرشتۂ اجل کے قدموں کی چاپ سن رہی تھی اور دعا کر رہی تھی کہ "اے معبود ان دونوں کی حفاظت کرنا۔ مجھے اپنی زندگی سے کوئی گلہ نہیں کیونکہ میں نے جو چاہا وہ تیری رضا اور تیری حمایت سے پایا۔ میں بہت آسودہ ہوں۔ زندگی ان کو بھی وہ سب دے جس میں کوئی پچھتاوا نہ ہو اور ہر خوشی بن مانگے ملے۔"

"تجھے ایک اور بات بتاؤں؟" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "فوزیہ کے معاملے میں انہیں مایوسی ضرور ہوئی تھی... اور تو یہی سمجھتا ہے کہ ان کی خفگی کا سبب اور کچھ نہیں۔ بے شک وہ خفا تھیں تجھ سے لیکن اب نہیں ہیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ اگر تم دونوں کی شادی ہو جاتی تو شاید فوزیہ خوش نہ رہتی۔ تم دونوں ایک دوسرے کو خوش نہ رکھ پاتے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے سکندر کوئی ماں کہہ سکتی ہے کہ اس کی بیٹی میں یہ... خامی ہے۔ خامی ہی ہوتی نا کہ وہ جس کے ساتھ جائے اسے خوشی نہ دے سکے۔ تو میری نظر سے دیکھے تب بھی فوزیہ میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اور وہ بھی تو کلی طور پر ملک کو مورد الزام ٹھہراتی ہیں۔ مگر انہوں نے حقیقت کو تسلیم کیا اور رابعہ سے ملنے کے بعد انہوں نے صاف کہا کہ یہ قدرت کے کھیل ہیں۔ اور خدا جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے مگر ہم اس کی مصلحت کو نہیں سمجھتے۔ جو بات انہوں نے میرے اور شہلا کے بارے میں کہی تھی وہی تم دونوں کے متعلق کہی تھی۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ ایسے وقت میں ان سے کوئی غلط بات منسوب کر سکتا ہوں میں؟"

نہ جانے یہ ذکر کیسے شروع ہوا تھا اور بات کہاں سے کہاں آ گئی تھی۔ میں جوتے کپڑے پہنے بالکل تیار کرسی پر بیٹھا تھا۔ محسن اور رابعہ مجھ سے پہلے تیار ہو گئے تھے۔ ہم ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال جانے والے تھے اور اس کے بعد ہمارا خیال تھا کہ چوہدری دلاور کی خیریت دریافت کریں۔ محسن نے تو تجویز کیا تھا کہ ہم مٹھائی کا ایک ڈبا حوالات میں بھجوا دیں جس کے اندر ایک کارڈ پر "ایم آر ایس" کے حروف لکھے ہوئے ہوں۔ دلاور کو اس کا مطلب سمجھنے دیں۔ مگر اب ہماری بھوک اڑ گئی تھی اور ہمیں چوہدری دلاور کا خیال بھی نہ تھا۔

"میں پھر کہتی ہوں محسن کہ تم آج گھر چلے جاؤ۔" رابعہ نے بکھرتے اس وقفے کو ختم کیا۔

"ہاں۔ انہوں نے تمہیں میرے ساتھ رہنے کی تاکید کی تھی۔" میں نے کہا۔ "یہ تو نہیں کہا تھا کہ ان کی خیریت بھی معلوم نہ کرنا۔"

"اگر تم ایک گھنٹے میں روانہ ہو جاؤ تو شام چار بجے تک گھر پہنچ سکتے ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "اس وقت نو بجے ہیں؟"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں کل شام تک لوٹ آؤں گا لیکن تم دونوں ایک وعدہ کرو۔ میری واپسی پر اسی جگہ ملو گے۔ میری عدم موجودگی میں کچھ نہیں ہوگا؟"

"چلو اب ناشتا کریں۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد پہلے تو چوہدری دلاور کے متعلق پوچھنا ہے۔ تجھے ایک کام کرنا ہے۔ یہ گاڑی اسی ڈیلر کے پاس لے جا جس سے خریدی تھی۔ کہنا ضرورت پیش آ گئی اور کچھ پیسے کی ضرورت ہے۔"

"پیسے کی ضرورت ہے تو نکلوا لیتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"وہ تو نکلوا ہی لیں گے۔ نقد پاس رہنا چاہیے ورنہ پریشانی ہو کہ بینک بھی نہ جا سکیں۔" میں نے کہا۔ "میرا مقصد گاڑی بدلنا ہے۔ ڈیلر محسن کو شناخت کرے گا تو ہزار دو ہزار کم پہ گاڑی رکھ لے گا۔ اتنا تو ٹیکسی کا کرایہ بن جاتا اگر یہ گاڑی ہمارے پاس نہ ہوتی۔ ہزار دو ہزار ڈال کے کسی دوسرے ڈیلر سے بالکل مختلف گاڑی خرید لینا بہتر ہے جو کسی کی نظر میں نہ آئی ہو۔ اور اس کی رجسٹریشن پرنس صوفی کے نام سے ہوگی تو میری طرف کس کا ذہن جائے گا؟"

ڈائننگ ہال میں بیٹھ کے میں نے ناشتے کا آرڈر دیا اور فون کرنے چلا گیا۔ بوتھ میں ایک صاحب پہلے سے موجود تھے۔ جب میں نے انہیں مسلسل خشمگیں نظروں سے گھورنا شروع کیا تو انہوں نے دو منٹ بعد ریسیور رکھا اور مجھے ناخوش نظروں سے گھورتے ہوئے نکل گئے۔ میں نے پھر انکوائری سے پولیس اسٹیشن کا نمبر تلاش کیا اور اس مرتبہ خود ایس ایچ او صاحب سے بات ہوئی۔ رات کی ڈیوٹی والا سارا عملہ بدل گیا تھا اور مجھے اندیشہ نہیں تھا کہ کوئی میری آواز شناخت کرے گا۔

"کس کے بارے میں معلوم کرنا تھا؟" ایس ایچ او نے بے رخی کی حد تک بے حسی سے کہا۔

"وہ ہمارے ایک دوست ہیں۔ چوہدری دلاور صاحب۔" میں نے آواز کو تھوڑا سا بدلا۔ "شاہدرے میں فیکٹری ہے ان کی۔ مجھے ان کے گھر سے فون ملا تھا کہ پولیس انہیں قتل کے الزام میں گرفتار کر کے لے گئی ہے۔"

"کس تھانے میں فون کیا ہے سرکار والا شان۔ رہتے کہاں ہیں یہ تمہارے چوہدری بہادر؟"

"بہادر نہیں، دلاور۔" میں نے کہا اور ان کے گھر کا پتا بتایا۔

"اچھا۔ تو تم مجھے بتا رہے ہو کہ ہم نے اسے قتل کے کیس میں پکڑ لیا ہے! بہت چالاک بنتے ہو۔" وہ کتے کی طرح غرایا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ "چالاکی کیسی۔ جو بات مجھے معلوم ہوئی تھی وہ تم سے پوچھ لی۔"

"پولیس نہیں کرو گے تو پتے نہ بتاؤ۔ اپنا جنتا ہے تو یہاں مجھ سے آ کے پوچھو تو میں بتاؤں تمہیں۔ قتل کیا دن میں سو ہوتے ہیں میرے علاقے میں جو کیسے مجھے یاد رہیں۔ آخری واردات

www.paksociety.com

ایک بھنتے ہوئی تھی اور وہ ایک ہیرا ہیں جوالا تھا جس نے دوسرے رخ میں والے کو چیرا مار دیا تھا۔ سمجھ آئی؟ جو بہرام جو ہیرا مذاق تھا میرا وقت برباد کیا۔ اس نے کھیلے کا اختتام ایک اور بڑی چال پر کیا اور نہ سید رکھ دیا۔ میں الوؤں کی طرح چند سیکنڈ تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اترے ہوئے چہرے کے ساتھ باہر نکل آیا۔ میں نے ایک جوا کامیابی کے پورے یقین کے ساتھ کھیلا تھا اور ہار گیا تھا۔ بازی چوہدری دلاور نے جیت لی تھی۔ غلطی میرے اندازے کی ہو سکتی ہے یہ بات میرا دل نہیں مانتا تھا۔ کہیں نہ کہیں کھپلا ضرور ہوا تھا اور دلاور نے میری چال کو ناکام بنا دیا تھا۔ کھپلے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ دلاور نے گرفتاری کے لیے آنے والوں کو خرید لیا ہو۔ یہ اتنا بڑا سودا تھا کہ وہ پانچ لاکھ کیا دس لاکھ بھی خرچ کر سکتا تھا۔ بصورت دیگر اسے جیل جانا پڑتا۔ اس کی ضمانت نہ ہو پاتی اور ایک کیس سے چھٹکارا پانے کی خاطر ہی اسے سو جتن کرنے پڑتے۔ دو تین کیس کے بعد تو اس کے لیے نجات کے سارے راستے بند ہو جاتے بعد میں وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی آزادی، عزت اور زندگی سب کی قیمت لگا دی۔ اس نے سب کچھ مانگنے والوں پر چھوڑ دیا ہوگا۔ اور انھوں نے بڑا پیٹ بھرا ہوگا تو ہر کانسٹیبل کے لیے ایک لاکھ اور سب انسپکٹر کے لیے پانچ لاکھ طلب کیے ہوں گے۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ وہ ریٹائرمنٹ تک اپنی ساری تنخواہ جمع کرتے رہتے تب بھی اتنی کم ہی رہتی۔ رشوت کے کیس میں بھی یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا۔ خطرہ صرف یہ تھا کہ معاملہ ایس ایس پی کے علم میں ہے تو انھوں نے طے کر لیا ہوگا کہ صاف انکار کر دیں گے۔ ایس ایس پی صاحب کو ان سے جھوٹ دیدہ گواہ تھے۔ ان سے کہا جا سکتا تھا کہ کسی نے بیہودہ مذاق کیا تھا۔ ورنہ دلاور نے ان کو تسلی دی ہوگی کہ ایس ایس پی صاحب سے ابھی معلوم کر لیتے ہیں۔ کسی نے ان کا نام لے کر جھوٹ بولا تھا۔ مگر ان کے خانساماں نے بتایا کہ اس کا کوئی بھائی میرے پاس چوکیدار ہے تو جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا۔ اور جب اس نے فون کیا ہوگا تو سب انسپکٹر کے لیے راز داری کی قیمت وصول کر کے رخصت ہو جانا مشکل نہیں رہا ہوگا۔ رضوی صاحب کے گھر میں سرے سے خانساماں ہی نہیں تھا تو اس کا بھائی کہاں سے آتا۔

"کیا ہوا؟" محسن نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "بارہ کیوں بجے ہیں صورت پر؟"

"بازی الٹ گئی۔ سارا کھیل چوپٹ ہو گیا۔" میں نے خفت سے کہا کیونکہ اپنی طرف سے میں نے بڑی چالاکی کا ثبوت دیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ دلاور میرے بچھائے ہوئے جال میں اس طرح پھنس جائے گا جیسے چوہے دان میں چوہا پھنستا ہے۔

"وہ کیسے؟" محسن نے کہا اور میں نے اسے اپنی قیاس آرائی کے بارے میں بتا دیا۔ شکوہ اس نے بھی مجھ سے اتفاق کیا کہ لالچ کی قوت خرید نے معاملے کو بگاڑ دیا۔ ہماری بھوک مرتی تھی لیکن جسم کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ناشتا منگوایا گیا۔ رابعہ نے مذاق اڑانا شروع کیا۔

"کاہو برہو یہ تو دوسرا منظر ہے۔ تھانے سے ایک جیپ چوہدری صاحب کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ ہو رہی ہے۔" رابعہ نے محسن کی نقل اتاری۔ "کیا کشف و کرامات ہیں۔ بند آنکھوں سے غیب کا حال بیان کر دیا تھا۔ بہت ہی خوبصورت موومنٹ بنائی ہے سکندر نے محسن کو پاس دیا۔ محسن نے تیزی کو شیلڈ کی نے پھر سکندر... اور حضرات گول۔"

"تم دیکھنے رہی ہو۔" محسن نے دانت نکال کے ڈھٹائی سے کہا۔ "کیونکہ میں نے بھی تمھاری نقل اتاری تھی۔"

"اور محسن صاحب گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔" میں نے کہا۔ "خاتون کیا گری پڑی ہو یہ بات مت بھولیں۔"

پھر ہم نے سنجیدگی سے صورت حال کا جائزہ لیا اور اس پر ہر پہلو سے بحث کی۔ ایک بہت بڑی کامیابی کا خواب جو ٹوٹا تھا اس نے ہمیں وقتی طور پر تھوڑا سا صدمہ پہنچایا تھا۔ دلاور بار بار ہمارے جال سے بچ نکلا تھا چنانچہ اس بات کا یقینی امکان تھا کہ آئندہ وہ حفاظتی اور احتیاطی انتظامات زیادہ سخت کرے گا۔

"معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ سب انسپکٹر کون تھا جس نے رات کو یہ بات کی تھی۔" میں نے کہا۔

"تو نے اس سے نام نہیں پوچھا تھا؟" محسن بولا۔ اس کے لہجے میں برہمی نمایاں تھی۔

"نہیں یار۔ لیکن نام کا پتا چلانا کون سا مشکل کام ہے۔" "معاملہ اس کے ساتھ چار سپاہی بھی تھے۔"

"ہماری ناکامی کے غم میں دلاور ہی میں ساتھیوں نے طاقت کی ... سودا کیا ہے۔"

"یہ سودا انھیں مہنگا پڑے گا۔ وہ تو بغلیں بجا رہے ہوں گے کہ ساتوں بلائیں ایک احمق نے کھو کر بتا دیا۔" میں نے کہا۔ آہستہ آہستہ میرے لیے ناکامی کا احساس جھنجلاہٹ اور کوفت کا سبب بننے لگا تھا اور محسن کی طرح مجھے بھی غصہ آ رہا تھا۔

"اب تم ان کو سزا دو گے؟" رابعہ نے ہمارے جذبات کا رخ دیکھ کر کہا۔

"ہاں۔ مجرم وہ ہیں جنھوں نے اپنے فرائض کی قیمت وصول کی۔" میں نے کہا۔ "انھیں ایک ایک پیسے کا حساب دینا پڑے گا۔"

نکلتے نکلتے مجھے نازو کا خیال آ گیا اور اس بارے میں میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ البرٹ ڈکٹرا اسپتال فون کرے۔

"وہ دیا پڑ رو دیش بیہ ہوئے۔" محسن نے مجھے یاد دلایا۔ "انکل چوہدری ... انھیں یقین ہوگا کہ ہم سب ..."

"تم دونوں تو اسپتال میں اس کی حالت بھی دیکھ چکے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"ہوا اس کے بعد ہم نہایت پراسرار انداز میں باقاعدہ فرار ہو گئے۔" محسن بولا۔ "باہر نکل کے بات کرتے ہیں۔"

رابعہ نے ایک ٹیلر کی دکان سے فون کیا جہاں سے وہ کسی زمانے میں کپڑے سلواتی تھی۔ محسن کار سے جا چکا تھا چنانچہ میں اور رابعہ ٹیکسی سے پہنچے ہوئے تھے جسے ہم نے تین سو روپے میں رات آٹھ بجے تک کے لیے کرائے پر حاصل کر لیا تھا۔ دس منٹ تک میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ جب رابعہ دکان سے برآمد ہوئی۔ موٹر سائیکل پر گزرنے والے سیاہ جیکٹ پہنے ایک وکیل نے فوراً بریک لگائی اور رابعہ کا راستہ روک لیا۔ مجھے تھوڑی سی تشویش لاحق ہوئی۔ رابعہ کے لیے ایک مسئلہ یہ بھی تھا جس کا مجھے ابھی تک خیال نہیں آیا تھا۔ ... وہاں وکیل صورت سے جانتے تھے اور اس کے بارے میں افواہوں، قیاس آرائیوں اور خبروں کی بنیاد پر تجسس کا شکار ہوں گے اور لوگ پشت پیچھے جتنے منہ ہوں گے اتنی ہی باتیں ہوں گی۔ اتنی بڑی وکیل پر پچھلی خبریں ... اس کے متعلق اخبارات میں سنسنی خیز واقعات آنے لگیں اور میرے نام کے ساتھ اس کا نام بھی منسوب ہو جاتے تو تعلق کیا اور ڈرگل کی حد سے زیادہ مشہور ہونے لگے تو رابعہ کی ذات کا وکالت پر ... شروع ہو جاتا۔ ... بات نہیں تھی۔

وکیل نے بالآخر رابعہ کی جان بخشی کی۔ رابعہ تیز تیز قدم اٹھاتی ٹیکسی کی طرف آئی۔

"یہ کون تھا؟" میں نے پوچھا اور ٹیکسی کو چلنے کو کہا۔ رابعہ کا موڈ خراب تھا۔

"تھا ایک وکیل۔" رابعہ نے برہمی سے کہا۔ "ایسے سیکڑوں ہیں کچہری میں ... عورت کو بس چھیڑتے ہیں نا۔"

"مگر بات کیا کر رہا تھا اتنی دیر تک؟" میں نے کہا۔

"فضول باتیں۔ مجھ سے زیادہ اس کو پریشانی لاحق تھی کہ میں نے پریکٹس کیوں چھوڑ دی ہے۔"

"تھا بھے کے خون جلانے سے کیا فائدہ۔ ایسے تو بہت ہوں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"لیکن یہ بہت گھٹیا آدمی ہے۔ میں جانتی ہوں۔" وہ بولی۔ "بڑی بات ادھر لگانے کا ماہر۔ غلط بیانی اور غیبت کا شوقین۔ دل کا حاسد اور تنگ نظر۔ پریکٹس وغیرہ تو چلتی نہیں۔ مشہور ہے لوگوں کو جلانے کے لیے گھروں میں بھوت ڈالتا ہے۔ میاں بیوی کے اختلافات کو ہوا دیتا ہے اور جھوٹ فریب سے تعلقات کو طلاق اور علیحدگی تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر دونوں فریقوں کا مقدمہ لے لیتا ہے تاکہ ہار جائے تو اپیل تک روزگار لگا رہے۔"

"پھر تو یہ پرانی کار ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا کہ جناب قانون پڑھنے کے بعد پریکٹس کرنا کون سے قانون کے تحت ضروری ہے۔" رابعہ بولی۔ "اور اگر کوئی وکالت چھوڑ کے پنساری کی دکان لگا لے تو کیا یہ خلاف قانون ہے اور کوئی جرم ہے؟ واہیات آدمی ہے۔ کہنے لگا..."

"کیا کہنے لگا۔ خاموش کیوں ہو گئیں۔ کوئی غلط بات کی تھی تو مجھے بتاؤ۔"

"ہاں تاکہ تم جا کے اس کے دانت توڑ دو یا اس کی گردن۔" رابعہ نے کہا۔ "ایسے قدم قدم پہ اگر یہ مجھے مارنے کے فلسفے پر عمل کرو گے تو دو قدم نہیں چل سکو گے۔ دنیا تو نامعقول لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ جیسا ذلیل آدمی تھا ویسی ہی ذلیل بات کر گیا۔"

"تم بہت غصے میں ہو۔" میں ہنسا۔ "میں کچھ نہیں کروں گا۔ بات چھپانا چاہتی ہو تو تمھاری مرضی۔"

"آخر کیا تک ہے اس ہمدردی کی۔" رابعہ بولی۔ "ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے کہا کہ بہت بدنام ہو رہی ہو سکندر کی وجہ سے۔ تمھاری اتنی عزت ہے۔ تمھیں مجرموں کے بجائے قانون کا ساتھ دینا چاہیے۔ میں نے کہا یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور تم میرے گارجین نہیں ہو۔ اس لیے اپنی نصیحت کی پوٹلی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ کہنے لگا کیا یہ سچ ہے کہ تم سکندر سے شادی کر چکی ہو؟ میں نے کہا ہاں یہ بالکل سچ ہے اور جا کے بار روم کے نوٹس بورڈ پر یہ اطلاع عام چسپاں کر دو تاکہ پھر کوئی اس طرح میرا راستہ روک کر مجھ سے سوال جواب نہ کرے۔ سب کے شکوک دور ہو جائیں گے۔" اس کا چہرہ کچھ غصے کے باعث اور کچھ حیا سے لال ہو رہا تھا۔ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "اور اس نے سچ مچ نوٹس بورڈ پر لکھ کے لگا دیا تو... خیر چھوڑو۔ نازو کی کیا خبر ہے؟"

"نازو کی حالت خطرے سے باہر ہے۔" رابعہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اس کے بھائی سے بات ہوئی تھی۔"

"ابرام شیخ سے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "اس نے تو آواز پہچان لی ہوگی تمھاری؟"

"میں نے خود ہی اسے بتا دیا تھا۔" رابعہ بولی۔ "وہ کہنے لگا کہ اسپتال آ جاؤ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"جانا کدھر ہے جناب؟" ٹیکسی ڈرائیور نے سر گھما کے کہا۔ اب تک وہ اس امید میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا سیدھا جا رہا تھا کہ شاید کسی جگہ ہم خود ہی اسے دائیں بائیں کہیں مڑنے کو کہیں گے۔ لیکن ہم اپنی باتوں میں اتنے مگن ہو گئے تھے کہ اسے ہدایات دینے کا خیال بھی نہ رہا۔ اب

www.paksociety.com

وہ ملاوڈ کے آخری حصے میں کارپوریشن کے آفس تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے آگے ضلع کچہری تھی جہاں ہزاروں وکیلوں کا اژدہام تھا۔ میں نے فوراً ٹیکسی کو واپس چلنے کو کہا اور گلاب سیاہ ریسٹورنٹ کے سامنے رکوا لیا۔ اندر صبح کے وقت ہال خالی تھا اور صرف ایک میز پر دو بیٹھے مجنوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نہ جانے کیا دیکھ رہے تھے کہ انھوں نے ہم شہروں فرہاد کے جوڑے کو نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔

"اکرام شیخ تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا؟" میں نے لیلیٰ مجنوں سے ذرا دور بیٹھتے ہی کہا۔ "یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"اس نے استعفیٰ دے دیا ہے۔" رابعہ نے افسوس سے کہا۔ "کیا باضمیر آدمی کے لیے ایمانداری سے نوکری کرنا اتنا مشکل ہے؟"

"وہ انتہا پسند ہے۔ رضوی صاحب کی طرح۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی استعفے سے تمھارا کیا تعلق؟"

"اس نے لکھا ہے کہ وہ مجرمانہ کوتاہی کا مرتکب ہوا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اس نے زخمی ہو جانے والی بیوی کا خیال کیا اور فرار ہونے والے مجرموں کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان حالات میں وہ خود کو اس ملازمت کا اہل تصور نہیں کرتا۔ اس کا یہ فیصلہ حتمی اور ناقابل تنسیخ ہے۔"

"گویا میرا نام لیے بغیر اس نے سب کچھ کہہ دیا۔" میں نے کہا۔ "دراصل موقع تو اس نے مجھے ہی فراہم کیا تھا۔ نازو نے اسے مارا تھا اور وہ ڈر گیا تھا۔ اس نے اپنے ضمیر کی خلش کو میرے لیے باعث ندامت بنا دیا ہے۔ بہت عجیب آدمی ہے یہ شیخ بھی۔ حالات سے مصالحت کرنا جانتا ہی نہیں۔ اب نازو ہوش میں آنے کے بعد اس کی مرضی کے مطابق بیان دے گی تو وہ تو لے کے اس سے یہ بات کہے گا کہ دیکھو تمھارے رشتے پر میں اپنی نوکری قربان کر رہا ہوں۔ تم نے مجھے ادائے فرض سے روکا اور میں نے تمھاری جان کے لیے ایک جرم کیا تھا اس کا تدارک بھی میں ہی ادا کر رہا ہوں۔ پھر بھی تم سے اسے کیا مشورہ کرنا تھا؟"

"اس کا خیال تھا کہ یہ قانونی معاملہ بنے گا۔ اقدام قتل کا کیس تو تھا ہی۔ گواہ وہ خود ہے یا نازو۔" رابعہ بولی۔ "عدالت کے روبرو صفائی بہرحال پیش کرنی پڑے گی۔ ایک الزام اس نے خود اپنے آپ پر عائد کر لیا ہے چنانچہ اسے وکیل کی ضرورت ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ میں تو وکالت چھوڑ چکی ہوں اور آپ کو کیا وکیلوں کی کمی ہے۔ وہ بات کو طول دینا چاہتا تھا۔"

"یہ پتا چلانے کے لیے کہ تم نے فون کہاں سے کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کے سوا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے استعفے والی بات بھی محض کہانی ہو سکتی ہے۔"

"ہاں لیکن زیادہ پریشانی مجھے اس لیے لاحق ہو گئی تھی کہ وکیل بھی ادا ماتا جا رہا تھا۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھے تو ڈر تھا کہ نہ آ پہنچے۔ چھ سات منٹ تو شیخ نے لگا ہی دیے تھے اور اتنی دیر میں دوسرے فون پر ایکسچینج سے کہا جا سکتا ہے کہ فوراً ٹریس کرو۔ فون کا سب کچھ جانا ہے۔ اسی کے سامنے گرفتار ہو جاتی۔"

"وہ یہیں آ پہنچ جائیں گے۔ اپنی دیسی پولیس ... بے حرکت میں آتے آتے بھی وقت لگ جاتا ہے ... برطانیہ میں دیکھا تھا تین منٹ میں پولیس موجود۔ ان کے پاس ... اور گاڑیاں بہت ہیں اور یہاں ... ٹیکسی وغیرہ کر کے زبردستی پکڑ کے پہنچتے ہیں یا ٹرانسپورٹ کی قلت کا مسئلہ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ پولیس کو بہترین وسائل سے لیس کر دیا جائے تب بھی کوئی فرق ... ان کی مستعدی اور کارکردگی کا تعلق ان کے مزاج سے ہے۔ یہاں حاکم اور فرعون ہیں۔ وہاں عوام کے خادم اور دوست ... لوگوں کی حفاظت سے زیادہ لوگوں کو ہراساں کرنے کا ذریعہ ... نے کہا۔ "وہاں کمزور کا محافظ ہے۔"

"یہ تو ہے۔ اب وہ میرے پرانے نمبر کو پریشان کریں ..." رابعہ بولی۔ "وہ تسلیم کریں گے کہ رابعہ بی بی آئی تھیں اور ... کو پوچھ کے لیے لے جائیں گے کہ بتاؤ ان کے ساتھ کون تھا ... آئی تھیں اور کہاں گئیں ... پانچ سو ... لیں گے۔ میری ایک ... اسے بہت تنگی پڑے گی۔"

"محسن دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "دوسری گاڑی کا ... آ جائے گا۔"

"اسے تو گھر بھی جانا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"مگر یہ کام وہی کر سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ "تین چار ... جا سکتا ہے وہ۔ رات تک پہنچ جائے گا۔" میں نے کہا "... میں تھانے سے اس سب انسپکٹر کا نام پوچھوں گا جس نے ... گرفتار نہیں کیا تھا۔"

"ابھی تو وہ ڈیوٹی پر نہیں ہوگا۔" رابعہ بولی۔

"تھانے میں کوئی بات چھپانا مشکل نہیں ہوتا۔" میں نے کہا ... سب انسپکٹر اور انسپکٹر ہوتے ہیں جن کی ڈیوٹی مختلف ... سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے بارے میں ساری معلومات رکھتے ہیں کہ کس نے کب کون سا کیس ... وصول کیا اور کیسے بچا اور کس کے پاس کتنا مال ہے ... ہے تو کہاں کس کے نام پر اور کتنا کرایہ آتا ہے۔ کس کی ... سے سب مشہور ہے۔ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں سب ... سب خود حفاظتی کا تقاضا ہے۔ کوئی ان پر الزام لگانے ... اسی طرح سب ایک دوسرے کا پردہ رکھتے ہیں۔ رات ... ہوگیا تھا۔ اگر اس نے پانچ لاکھ لیے ہوں گے تو دولا کو انہیں ... صاحب کو بھی نقد دیے ہوں گے کہ ان کی سرپرستی حاصل ہے۔"

"پھر تم اس کا نام کیسے معلوم کرو گے؟" رابعہ نے کہا۔

"ایک صورت تو یہی ہے کہ سب کے نام معلوم کر لیے جائیں۔ ... پھر فرداً فرداً ہر ایک کا گھر دیکھا جائے اور براہ راست ملاقات کی جائے۔ اصل مجرم کتنا بھی چالاک ہو اپنے رد عمل سے پکڑا جائے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میں دولا سے بات کروں۔"

"وہ بہت چالاک آدمی ہے اور تمھیں کچھ نہیں بتائے گا۔"

"ایک چانس ہے کہ باتوں میں اس کی زبان سے خود ہی نام نکل جائے۔" میں نے کہا۔ "چائے پی لیں۔ نکلتے وقت بات کروں گا اس سے۔"

چوہدری دولا ور آفس میں ہی تھا۔ کال اس کے پی اے نے ریسیو کی۔ "کیا نام ہے آپ کا؟"

"نام تمھیں نہیں بتا سکتا میں۔" میں نے کہا۔ "پرائیویٹ...؟"

"چوہدری صاحب کی ایسی کوئی پرائیویٹ بات نہیں جو مجھے معلوم نہ ہو۔" وہ بولا۔

"بچا اس بندہ کو لو بچی ورنہ چوہدری آ کے دماغ درست کر دے گا۔ بات زیادہ ... ہوگا لیکن تم تو بھی فارغ ہو جاؤ گے۔ تمھارے چوہدری صاحب تم کو نہیں بچا پائیں گے۔ بات کی سمجھ آ رہی ہے نا؟" میں نے ... اس نے مجھے ایک منٹ ہولڈ کرنے کو کہا اور اسے انٹرکام پر بات کی۔ پھر لائن ملا دی۔

"کون ہے تم خان ہے بھئی۔ دماغ تو میرا ابھی خراب ہے۔ یہاں تک بہت کر دی۔" دلاور نے کہا۔

"پہچانے چوہدری صاحب؟" میں نے کہا۔ "مجھے مبارکباد پیش کرنی تھی آپ نے تو کمال کر دیا۔"

وہ ہنسا۔ "اگر کوئی کیسا کمال ہے سکندر صاحب۔ بچوں والی بات کی تم نے۔"

"یہ تو تمھیں اس وقت پتا چلتا جب پولیس نے مجھ پر یقین کر لیا تھا۔ تم نے اپنا کھیل ہی بدل لیا۔"

"تمھیں بتایا تھا کہ تمھاری بات پر۔" وہ بولا۔

"پر کہہ بھی تو کہا تھا انھوں نے ... لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ ... کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔"

"تمھارا کیا خیال ہے کہ پولیس ... تھی؟" وہ تمسخر آمیز انداز میں بولا۔

"سب جرائم خود بیٹھے ہیں۔ انھیں بہانہ چاہیے کچھ نہ کرنے کے لیے۔" میں نے کہا۔

"اسے تو تم نے ایس پی صاحب کے نام کا تیر بھی چلا دیا تھا۔"

"پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ نہ آتے۔" دلاور نے کہا۔ "مگر وہ سب انسپکٹر ... تو شیر کا بچہ تھا۔ اس کا باپ شیر خان تھا۔ اس نے دیکھ لیا کہ بات کچھ بھی نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کامیابی کے جذبات کو دبا کر ... لہجے میں کہا۔ "وہ اندھا تھا کیا؟"

"آنکھوں والے کو بھی کچھ ہوتا تو نظر آتا۔" دلاور کے لہجے سے اس کی کامیابی کے غرور کا اندازہ ہوتا تھا۔ "اس نے دیکھا کہ ہم ایک گڑھا کھود رہے ہیں۔ اس نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے کہا کہ بھئی گڑھا کھود رہے ہیں اور کیا۔ کہنے لگا وہ کس لیے؟ میں نے کہا کہ کیا اپنے گھر کی حدود میں گڑھا کھودنا جرم ہے جو وہ بولا کہ اتنی رات گئے؟ میں نے پھر جوابی سوال کیا کہ آدھی رات کے بعد کوئی اپنے صحن کے آنگن میں پیڑ پر چڑھ کے بیٹھنا چاہے یا گڑھا کھودے یہ اس کی مرضی۔ وہ مانا نہیں اور کہنے لگا کہ تم نے کوئی لاش دبانی ہے۔ میں نے اسے کدال پکڑا دیا اور اس کے ہاتھوں نے خاصی گہرائی تک کھدوا۔ پھر میں نے منع کر دیا کہ خوب دلیل ہے۔ فی الحال مجھے کنویں کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ آنے جانے کا کرایہ دے دیا میں نے۔"

"کوئی بات نہیں چوہدری صاحب۔ یار زندہ صحبت باقی۔" میں نے کہا۔

"اس مرتبہ ناکافی انتظامات سے تم کو موقع مل گیا تھا۔" وہ بولا۔ "لیکن آئندہ کی امید مت رکھو۔ تم تو ابھی معلوم نہیں کر سکو گے کہ میں

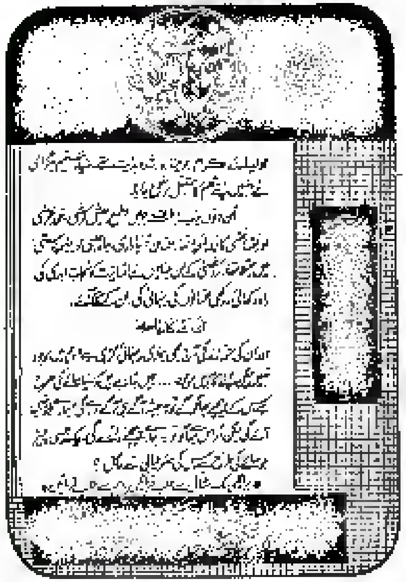

www.paksociety.com

کہاں ہوں۔ جیسے کہ وہ دس ٹھکانے ہیں سکندر اور وہ دس ٹھکانے دس قلعے ہیں۔ میں نے بلٹ پروف کار کا بھی آرڈر دے دیا ہے اور میرے ساتھ مسلح آدمی گارڈ رہیں گے۔"

"کیا وہ فرشتۂ اجل کو بھی روک دیں گے؟" میں نے سادگی سے کہا۔ "امریکی صدر کینیڈی کے حفاظتی انتظامات پر سی آئی اے اور ایف بی آئی جیسے ادارے کتنی رقم خرچ کرتے تھے چوہدری صاحب۔ موازنہ اس ایک گولی کی قیمت سے کریں جس نے سب کو چوپٹ کر دیا۔"

میں لیبوریٹری کے باہر آیا تو رابعہ ٹیکسی میں بیٹھی ناخن کتر رہی تھی۔ یہ اعصابی کشیدگی کی علامت تھی جس کا شکار ہم سب تھے۔

"مختصر بات نہیں کر سکتے تھے؟" رابعہ نے کہا۔ "اس کے آفس میں بھی دو فون ہیں؟"

"ہاں میرے ذہن میں بھی یہ بات تھی۔ وہ پہلے پی اے سے کہہ سکتا تھا کہ کال ٹریس کرو۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ یہاں سے بہت دور شاہدرے میں تھا اور اس کے لیے ٹیلیفون کے فون کو آپریشن پر رکھوانا مشکل تھا۔ میں نے رسک لیا لیکن اس کے نتائج حسب توقع نکلے۔ سب انسپکٹر راجہ فتح شیر ولد شیر خان تھا۔ اب کام کچھ آسان ہو گیا ہے۔ یہاں سے نکل کے تم اور کسی جگہ سے تھانے فون کرنا۔ کہنا میں فتح شیر کی بہن ہوں۔ میرا خیال ہے وہ راولپنڈی کے گرد و نواح کا رہنے والا ہوگا۔ مری کی طرف یا گوجر خان کے علاقے کا۔ تم بتانا کہ میں راولپنڈی سے آئی ہوں۔ اور انہیں اسٹیشن پہنچ کر... وہ ڈیوٹی پر نہیں ہے تو اسے اسٹیشن کون بھیجے گا۔ پھر تم گھر کا پتا سمجھ لینا۔ ہم کل پرسوں ملاقات کریں گے جب محسن واپس آ گئے گا۔"

یہ چال کامیاب رہی۔ تھانے میں کسی نے رابعہ کو راجہ فتح شیر کا پتا یوں سمجھا دیا کہ ہم کسی پریشانی کے بغیر پونے ایک بجے آسٹریا بازار کی ایک گلی میں جا پہنچے۔ میں نے اس کے مکان کو اچھی طرح ذہن نشین کیا اور لوٹ آیا۔ ایک بجے ہم واپس ہوئے اور پونے دو بجے ٹیکسی کو جنگل کے چوک پر چھوڑ دیا۔ میں نے محسن کو ایک کونے میں دیکھ لیا تھا۔ "مجھے رونق کھانی ہے صاحب۔" خارش بھی اور کام سے کام رکھنے والے ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

"تم اب جو چاہو کرو۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اب تمہاری ضرورت نہیں رہی۔"

"لیکن... آپ نے تو پورے دن کا سودا کیا تھا۔" ٹیکسی ڈرائیور کا چہرہ اتر گیا۔

"ہم تمہیں معاہدے کے مطابق پوری ادائیگی کر رہے ہیں۔" میں نے اسے سو سو کے تین نوٹ پکڑا دیے۔ "جاؤ عیش کرو۔"

اس فیاضی پر خوش ہو کے اس نے ہمیں زبردست سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔ پھر ہم سڑک پار کر کے محسن کی طرف گئے۔

"یہاں کیوں کھڑا ہے؟" میں نے کہا۔ "ہم نے گاڑی [illegible] کرنے کو کہا تھا۔"

"وہاں دال میں کچھ کالا تھا؟" وہ بولا۔ "پولیس [illegible]"

"اچھا؟" میں نے رابعہ کے ساتھ پیچھے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تو کب سے کھڑا ہے یہاں؟"

"ایک بجے سے۔ پولیس اس وقت جا رہی تھی۔" اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ہلکے نیلے رنگ کی یہ کورٹینا [illegible] اور چھپانے کا اول تھی۔ لیکن صرف [illegible] اور تھی۔ فرسٹ اور بھی کوئی بہت معقول آدمی تھا [illegible] بزرجمہر کی طرح محبت سے سنبھال کے رکھا تھا [illegible] وہ بہت مناسب تھی۔

"اب کہاں جانا ہے؟" اس نے گیئر [illegible] اس میں متعدد درج سیاحوں کی طرح گردش کر رہے [illegible]

"[illegible] مجھے چار شوروم دیکھنے ہیں اور کوئی چار میل [illegible] صبح کا ناشتا بھی خاک کیا تھا۔"

"یہ خطرناک علاقہ ہے۔" میں نے کہا۔ "[illegible] ٹیلر کی دکان پر بھی پولیس چھاپا مار چکی ہے اور یہ ٹیلر کی دکان ہے جہاں تم گاڑی لے کر کھڑا تھا۔"

"کس کی تلاش تھی انہیں؟" محسن بولا۔

"پہلے آنے والوں کو رابعہ کی۔" میں نے کہا۔ "بعد میں [illegible] ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے۔ انہیں بالترتیب [illegible] لاہور سے ہماری فون کال ٹریس کر کے بھیجا تھا۔"

"گویا اب میری باری ہے۔" محسن ہنسا۔ "لیکن میں [illegible] ریسٹورنٹ کھاؤں گا۔"

"ریسٹورنٹ میں کھانا یا ریسٹورنٹ۔" رابعہ ہنسی۔ "[illegible] زبان [illegible] ہے۔"

"پورا ریسٹورنٹ لے لیں۔ جو کچھ کچن میں ہے علاوہ [illegible] کے سب کھا جاؤں گا۔" محسن نے اسے گھور کر کہا۔

کھانے کے بعد میں نے ڈرائیونگ سنبھال لی اور ہم [illegible] باغ کے بس اسٹاپ تک چھوڑنے گئے۔ "رات کے ساڑھے [illegible] بجے تک گھر پہنچ جائے گا تو؟" میں نے کہا۔

"وہاں سے ہمیں فون کر دینا۔" رابعہ بولی۔ "ہم انتظار [illegible] ہوٹل [illegible] میں۔"

"میں بھی وہاں گیارہ بجے تک رکوں گا۔" میں نے [illegible] "لاہور ہوٹل جا کے سو جاؤں گا۔"

"اچھا کیا تم نے پہلے ہی وضاحت کر دی۔" محسن بولا۔ "[illegible] نصیحت کرنے والا تھا۔ تاہم ایک نصیحت اور بھی کر دوں [illegible]

واپس آنے تک نہیں ایک دوست کے سوا کسی سے نہیں ملنا ہے اور [illegible] چند دوسرے کام کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے آنکھیں چار کرنا، جلے جلے رومالی نکال لینا، وہ کھانے تحت اللفظ سنانا [illegible] سرور آ جائے تو [illegible] اور خیالی پلاؤ زردہ پکا کے کھا لینا مگر اور کچھ نہیں۔ [illegible] تمہیں گلی کوچوں میں تلاش کرتا پھروں۔ تم آرام سے کہیں فرار ہو جاؤ یا چوہدری صاحب کے مہمان بن جاؤ۔"

بس کے روانہ ہوتے ہی ہم بھی چل پڑے۔ گاڑی کے شیشے [illegible] رنگ اور شفاف تھے۔ ان میں ہلکا سبز رنگ جھلکتا تھا اور [illegible] باہر سے دیکھنے پر بیٹھے ہوئے آدمی کی محض پرچھائیں سی نظر آتی تھی۔ صورت نہیں پہچانی جاتی تھی۔ یہ اور بھی اچھی بات تھی کیونکہ سڑک پر کوئی ہمیں صرف سامنے سے دیکھ سکتا تھا۔ سامنے سے کسی کی نگاہ پڑنے کا امکان نہیں تھا۔ میں نے جہانگیر کے مقبرے کا رخ کیا۔ صبح کے مقابلے میں اس وقت آنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ میں اور رابعہ عقبی حصے کے لان میں ٹہلتے رہے۔ پھر ہم گھاس کے ایک تختے پر لیٹ گئے اور بہت اوپر چیلیں اڑتے ہوئے آسمان کے نیلے رنگ میں پرواز کرنے والے پرندوں کو دیکھتا رہا۔ رابعہ میرے قریب بیٹھی رہی اور باتیں کرتی رہی۔ وہ باتیں جو ہم بھول گئے تھے۔ جن کے لیے نہ ذہنی فرصت ملی تھی اور نہ حالات کی اجازت۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ آج ایک دن کے لیے میں صرف یہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا ہوں کہ میں سکندر ہوں اور تم رابعہ ہو اور میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ تمام [illegible] اور مسائل، تلخ آلام اور گزشتہ ایام [illegible] اور اندیشے، اندیشے اور امکانات۔ ان سب پر آج کے دن عقل و نظر کے اور [illegible] کے سامنے دروازے بند کر دو۔ فرض کر لو کہ [illegible] دنیا نئے سرے سے وجود میں آئی ہے۔ ہم آج ہی اس زمین پر اتارے ہوئے آدم و حوا ہیں جن کا ایک دوسرے کے سوا کوئی نہیں اور اب ہماری نسل سے تو اپنی دنیا بسانے کا۔

"تم نے محسوس کیا رابعہ! اس احساس میں کیسی خوشی کی لذت اور سرور کی کیفیت ہے۔" میں نے کہا۔ "ایسی کتنی شاموں کی، بہت سی راتوں کی اور صبحوں کی یاد میرا سرمایہ ہے۔ ایک شام تم اور میں گھر سے نکلے تھے اور شہر کی سڑکوں پر پھرتے رہے تھے۔ ایک رات تمہارے ساتھ میں اس کوٹھی کے مقبرے کے لان میں تمہارے ساتھ بیٹھا رہا تھا اور تم نے اپنی سرگزشت کی کہانی سنائی تھی۔ اور پھر چاند نکل آیا تھا مگر ہم بیٹھے رہے تھے۔ اور ایک ایسی ہی رات کے بعد سے صبح ہونے تک ہم [illegible] لان میں تنہا تھے۔ کتنی پرانے وقتوں کی بات لگتی ہے۔ یہ پیچھے سفر کے آغاز میں کی بھی گلشن سے گزرا تھا اور اس کے بعد کیا صحرا آ گیا۔ سراب، دلدلیں اور سراب۔ دھوپ کی تمازت میں جلتا ہوا [illegible] اور آج پھر اچانک میں جنت کی خوشبو سے معمور سایہ دار نخلستان میں ہوں۔"

"یہ راستہ بہت طویل ہو گیا ہے سکندر۔" رابعہ نے [illegible] "ہم چلے تھے منزل کی تلاش میں تو آنے والا دن ابھی دسترس [illegible] لگتا تھا۔ راہ کتنی آسان تھی۔"

"راستے اور منزلیں ایسے ہی فریب دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہمارے قدم بھٹک گئے ہیں۔" اس نے گھاس کا ایک تنکا توڑ کے چبانا شروع کیا۔ "سوچو ہم کیا چاہتے تھے سکندر؟"

"آلو چھولے، آئس کریم، کوک صاحب۔" ایک دس بارہ سالہ لڑکے نے قریب آ کے کہا۔

"میں قسم کھا سکتا ہوں کہ [illegible]" [illegible] ہم بھی چاہتے تھے۔ جاؤ سب لے آؤ۔" رابعہ بھی ہنسی اور [illegible] کے باوجود ہنسا اور [illegible] تعمیل کرنے دوڑ گیا۔

"زندگی کتنی ہے، آلو چھولے، آئس کریم اور کوک۔" میں نے [illegible] ترش اور تیز ہیں۔ گرم اور نرم۔ کوک کی طرح سنسناتی ہوئی اور [illegible] کی طرح سرد۔ اس لڑکے نے تو سارے سوالات کا جواب دے دیا۔"

شام ڈھلے ہم واپس ہوئے تو بچوں کی طرح خوش تھے اور بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ یہ کوئی وقتی جذباتی خلفشار تھا اور نہ ہی لذت کا بخار تھا اور نہ ذہنی انتشار کا دباؤ تھا۔ آج کی شام سے جو عجم و دولت ہی کے آئی تھی۔ شب [illegible] اچانک رابعہ کے حسن کا ماہ کامل طلوع ہو گیا تھا اور محبت کی چاندنی نے دل میں اتر کے مایوسی کی سب تاریکی مٹا دی تھی اور روح کے ہر گوشے کو روشن کر دیا تھا۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا، آزاد اور بدلا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ دن ختم ہو رہا تھا اور اب پھر ہوتا جا رہا تھا۔ کل پھر وہی دہشت کی مسافت ہو گی۔ نفرتوں، عداوتوں

www.paksociety.com

اور حقیقتوں کے کانٹوں سے زیادہ اچھے ہوں گے اور زندگی کے امتحان بھی ہوں گے لیکن آج کی شام تو اپنی ہے اور اس کے دامن میں بہت سے خوشبو کے پھول ہیں اپنے ہیں اور چاہتوں کے جتنے اُجالے ہیں اپنے ہیں۔ آؤ کہ کوئی خواب نہیں کل کے واسطے۔

میں نے گاڑی کو واشنگٹن مارکیٹ کے سامنے روک دیا۔ "اب یہاں کیا کام ہے؟" رابعہ بولی۔

"ایک ساڑھی خریدنی ہے۔" میں نے کہا۔ "جس کا رنگ آسمان کی طرح شفاف نیلا ہو اور اس میں تر و تازہ پھول ہوں۔"

"یہ کیا خبط ہے؟" رابعہ نے نظر جھکا کے کہا اور شفق کا سارا رنگ اس کے عارضوں میں اُتر آیا۔

"جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا اور یہ محسوس کیا تھا کہ تمہیں نہ چاہنا میرے اختیار کی بات نہیں تو تم نے ایسی ہی ساڑھی باندھ رکھی تھی اور عالمگیرہ جیل کا گرد ملاقات تھا لیکن تمہارا وہ روپ ایک لازوال نقش ہے۔ دل چاہتا ہے آج تمہیں پھر اسی انداز میں دیکھوں۔" پھر میں اس کے ساتھ مارکیٹ بازار کی بہت سی دکانوں پہ گیا۔ یہ پروا کیے بغیر کہ کہیں کوئی مجھے پہچان نہ لے اور میں نے ہر دکاندار سے ایک ہی سوال کیا۔ بالآخر میری جستجو کامیاب ہوئی۔ ایک دکاندار نے مجھے گہرے نیلے رنگ کی ہوا کی طرح سبک اور پرندہ اُنشا کی طرح چمکتی دھلتی ساڑھی نکال دی جس کے شوخ پھولوں کی ہیلاہٹ میں خوشبو بھی شامل لگتی تھی۔ رابعہ خاموش کھڑی ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ دوپٹے کے ایک کونے کو انگلی پہ لپیٹتی کھولتی رہی۔

"آج کی شام اور اپنی محبت کے نام۔" میں نے باہر آ کے پیکٹ اس کی نذر کیا۔ "پھر یہ تم فرزانہ ہو سرواری سپتا اور وقت کا ایک ٹھہرا ہوا لمحہ جگنوؤں کی طرح میری مٹھی میں آ جائے تاکہ میں سمجھوں کہ خواب میری دسترس میں ہیں۔"

"ایسی باتیں مت کیا کرو سکندر۔ وقت تو گزر جاتا ہے لیکن اس کی بازگشت آسیب بن کے میرا پیچھا کرتی ہے۔" وہ میرے کندھے پہ سر رکھ کے بولی۔ "کل بھی تو زندہ رہنا ہے مجھے۔ تنہائی میں یادیں زیادہ ستاتی ہیں۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا اور چند سیکنڈ کے لیے ماضی حال اور مستقبل اس ایک نقطے میں سمٹ گئے۔ سب کچھ کہے بغیر ہم نے عہد وفا کو استوار کیا۔ محبت کے یقین کی اتنی دولت سمیٹ لی کہ مسافت عدم تک دل کبھی مفلس نہ ہو اور وہ سب کہہ دیا جو ساری دنیا کے سارے زبانوں کے الفاظ میں نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن سمجھا جا سکتا تھا۔

"کیا تمہارا دل نہیں چاہتا رابعہ کہ وقت اسی لمحے کو جاوداں کر دے؟ سچ کہو؟"

"نہیں سکندر۔ میں اس وقت تک مرنا نہیں چاہتی جب تک ہر خواب آرزو کو تعبیر مل جائے۔ میں نے کتنے دن اور کتنی راتیں اپنے انھی خوابوں کو سجاتے سنوارتے گزار دی ہیں۔ اب تم چاہتے ہو ان سے دستبردار ہو جاؤں۔ یہ بھول کر وہ سب قریب تھا جو ہم نے خود کو دیا۔ اور خواب سب جھوٹے ہوتے ہیں۔" وہ آنکھیں بند کر کے بولی۔ "چلو آگے چلو۔ رکنے سے منزل نہیں ملتی۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم ہوٹل تاران پہنچے تو رات اپنا آنچل پھیلا چکی تھی۔

"تم تیار ہو کے آؤ۔" میں نے کہا۔ "میں اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا اور دیکھوں گا کہ گزرے ہوئے وقت کا ایک خوبصورت پیار کس طرح پھر زندہ حقیقت بن کے سامنے آتی ہے۔"

"اتنا دیوانہ تو مجنوں بھی نہیں ہوگا۔" رابعہ نے خمارِ عشق میں ڈوبی ہوئی سرشاری اور ادا کے ساتھ کہا۔

"ہاں۔ اسے پہلے بھی تو ایسی لیلیٰ نہیں ملی تھی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ اسے اندر جاتے اور شفاف شیشے کے دروازے میں غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ دروازے میں رک کر اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ بھی ایک پیغام دے گئی کہ تھوڑا سا انتظار کر سکتے ہو نا۔ اور میرے دل نے کہا۔ ہم انتظار کریں گے قیامت تک۔ خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے۔

میں اُتر کے تھوڑی دور تک گیا اور ہوٹل کے آرکیڈ میں باہر ہی ایک چھوٹی سی دکان سے سگریٹ خریدنے لگا۔ رابعہ کا دس پندرہ منٹ سے پہلے واپس آنا مشکل تھا۔ میں دروازے گیٹ سے ہوٹل کے کاریڈور میں لگے ہوئے فون تک گیا اور البرٹ وکٹوریہ ہسپتال کا نمبر ملایا گیا۔ پھر ایک نرس نے اٹھایا چنانچہ مجھے فوزیہ کی خیریت دریافت کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ خطرے سے بالکل باہر تھا اس کی حالت بہت تیزی سے بہتر ہو رہی تھی۔ بالآخر نرس نے یہ بھی بتا دیا کہ اسے دو بار خون کی ضرورت پڑی تھی اور یہ خون دونوں بار فوزیہ کے بھائی نے ہی دیا تھا۔ بہن بھائی ایک جیسے خون کے مالک تھے۔ ان کا بلڈ گروپ تو ایک ہونا ہی تھا۔ میں اطمینان کے احساس کے ساتھ پھر باہر آیا۔ گاڑی مجھ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر اور درخت موڑنے کے بعد کھڑی کی تھی۔ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر چابیوں کا خیال آیا۔ گاڑی کی چابیاں عادت کے مطابق میرے پاس نہیں تھیں۔ میں واپس ہوٹل گیا لیکن چابیاں وہاں نہیں تھیں۔ شاید میں سگریٹ خریدتے وقت چھوڑ آیا۔ میں نے سوچا اور سگریٹ والے کے پاس گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

"چابیاں کون اٹھاتا ہے جی۔ آپ نے یہاں کہیں رکھی ہوں گی؟ وہیں مل جائیں گی۔" وہ بولا۔

"شاید گاڑی میں ہی لگی رہ گئیں۔" میں نے معذرت خواہانہ

لہجے میں کہا اور پلٹ کر جانے ہی والا تھا کہ ایک گاڑی نے زبردست بریک لگائے۔ پھر تصادم کی آواز آئی۔ اور میں نے بے اختیار پلٹ کے دیکھا تو مجھے ایک اسکوٹر سڑک پہ پڑا نظر آیا۔ میرے پہنچنے تک اسکوٹر والا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور شاید بالکل اسی کی غلطی تھی کہ اس نے خود کو سنبھال کے سوچ لیا اور اسکوٹر اٹھانے لگا۔ کار والے کے علاوہ پولیس نے اسے ہمدردی سے ملامت کی اور خدا کا شکر ادا کرنے کو کہا۔ جب میں نے دیکھا کہ چیزیں نکل کر سڑک پہ بکھر گئی تھیں۔ میں نے لپک کر ہر چیز میں ایک پرس رکھ گئے اور ایک قلم اٹھا کے اسے دیا پھر مجھے اس کی کوئی کی گھڑی نظر آئی۔ وہ خود اتنا تو ہوش اور دیکھا اس کو اپنے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ ایک پہلوان ٹائپ شخص اسے اپنے ساتھ لے گیا کہ ذرا دیر بیٹھ جائے۔۔۔۔ اور ایک کپ چائے کا پی لے تاکہ اس کی حالت بہتر ہو جائے۔ ادرگرد جمع ہونے والے بھی اس معمولی سے حادثے پر اظہار خیال کرتے ہوئے منتشر ہو گئے تھے لیکن کار وہیں کھڑی تھی اور اس کا انجن چل رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی اور مجھے احساس ہوا کہ رابعہ میری منتظر ہوگی۔ وہ سوا آٹھ بجے اندر گئی تھی اور اب آٹھ بجنے کو ہو رہے تھے۔

ایک شخص میری راہ میں حائل ہو گیا۔ "تم سکندر بخت ہو؟" اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں۔" میں نے راستہ کاٹ کے نکلتے ہوئے کہا اور حواس بحال رکھے۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" وہ پھر میرے سامنے آ گیا۔ وہ جوان تو نہیں تھا لیکن صحت مند تھا اور شاید اسی کار سے اترا تھا جس سے اسکوٹر والا ٹکرایا تھا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ کچھ دیر پہلے حادثے سے متاثر ہونے والے کے لیے امدادی کارروائی میں شریک تھا تو مجھے دیکھتا رہا اور اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔" میں نے ایک قدم پیچھے ہو کے اپنی پوزیشن لیتے ہوئے کہا لیکن اسی وقت کار کے دونوں دروازے کھلے اور میں نے پلٹ کر دو افراد کو باہر آتے دیکھا ہی تھا کہ پہلے شخص نے بڑی پھرتی سے مجھے بیل کی طرح سر سے ٹکر ماری۔ میں لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا تو کار سے نکلنے والے ایک شخص نے مجھے تھام لیا اور میرا رخ بائیں طرف گھما کر سیدھا کار کے کھلے دروازے کے اندر گرا دیا۔ کار سے اُترنے والا دوسرا شخص میرے اوپر آیا اور میں نے آدھا اندر اور آدھا باہر ہوتے ہوئے بازو ہوا میں اسے دونوں لاتیں ایک ساتھ ماریں۔ وہ پیچھے گرا ہی تھا کہ اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور نے پیچھے پلٹ کر ریوالور میرے حلق سے چند انچ کے فاصلے پر تھام لیا۔ دو سیٹ پہ بہت پیچھے جھکا ہوا تھا۔ اور اس کا ہاتھ نیچے لٹکا ہوا تھا۔ میں اپنی حالت میں رہ گیا۔ باہر سے کوئی چیخا۔ "ارے۔ ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟" لیکن انھوں نے بڑی پھرتی دکھائی۔ پیچھے والا دوسرا دروازہ کھول کے ایک نے مجھے اندر کھینچا اور دوسرے نے میری ٹانگیں موڑ کے اندر کر دیں۔ اور دروازہ بند کیا۔ جس سے مجھے اندر دھکیلا گیا تھا جگہ بہت کم تھی اور وہ دونوں سیٹ پر بیٹھ کے مجھے دبائے ہوئے تھے۔ ورنہ مجھے ایک موقع اس وقت ملا جب ڈرائیور نے ریوالور اپنے ساتھی کو دیا۔ میں نے اٹھنے کی بھرپور کوشش کی اور تقریباً کامیاب بھی ہو گیا تھا مگر میرے سر پر سوار دونوں حملہ آوروں نے بیک وقت مجھ پہ مکے برسائے وہ مکے میرے سر پہ لگے اور سینے پہ۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایڑیاں اٹھا کر مجھے پیروں سے کچلا۔ اور میں بے بس ہو گیا۔ اب ریوالور کا رخ میرے سر کی طرف تھا اور میں یہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کی نال کے آگے سائلنسر بھی ہے۔ اس کے ایک وار نے مجھے ہوش سے بیگانہ کر دیا۔ پھر ہوش آیا تو میں ایک کمرے میں بند پڑا تھا اور وہ چاروں میرے سامنے موجود تھے۔ مجھے اچانک گرفتار کرکے اغوا کرنے والے شریف لوگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ ان کی عمروں میں فرق تھا لیکن شکل میں نہیں۔ سب سے کم عمر شخص پچیس چھبیس سال کا وہ ڈرائیور تھا جس نے سب سے پہلے مجھ پہ ریوالور تانا تھا۔ سب سے زیادہ عمر میری راہ میں حائل ہونے والے کی تھی۔ ان کے کپڑے بوسیدہ اور میلے تھے۔ انجن آئل، گریس اور مختلف رنگوں کے دھبے دیکھ کر میں نے اندازہ کیا کہ وہ کسی گیراج کے مالک یا ملازم تھے جو اپنی یا مرمت کے لیے آنے والی کسی گاڑی سے کر رہے تھے۔ مجھے انھوں نے اچانک اور اتفاقاً پہچان لیا تھا۔

"یہ کون ہے بادی؟ جو تیرے دو وہیں کے وہاں کی رقم لے کر بھاگ گیا تھا؟" ڈرائیور نے کہا۔

"اور پاگل مت بن۔ ریوالور ایسے ہی نکال لیا تھا تو نے؟" پہلے شخص نے کہا۔ "میں نے کہا تھا گولی نہیں چلانی ہے۔"

"اور کیا کرتا میں؟" ڈرائیور نے تیز لہجے میں کہا۔ "مار پیٹ ہوتی وہاں تو ٹھیک تھا؟"

"وقت تو پہلے ہی بچ گیا تھا استاد۔" دوسرے نے کچھ تیز لہجے میں کہا۔ "اس۔۔۔ اسکوٹر والے نے بھی آج ہی سامنے آ کے مرنا تھا۔"

"ایک مہینہ تیاری کی تھی۔ ایک منٹ میں ختم۔" تیسرا بھی بولا۔

"میرا کوئی قصور نہیں تھا اس میں۔" ڈرائیور نے تند لہجے میں کہا۔ "میں بہت احتیاط کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا لیکن وہ مجرم ہوٹل کے دروازے میں سے نکل آیا۔ جیسے سڑک پر کوئی نہیں۔ شکر کرو کہ اس کی جان بچالی میں نے۔ ورنہ لمبا چکر پڑ جاتا۔ خواہ مخواہ پکڑے جاتے۔"

www.paksociety.com

"مجھے کون الزام دے رہا ہے؟" استاد کہلانے والے نے ڈرائیور کو ڈانٹا۔ "سب ذرا سی بات میں گھبرا جاتے ہو۔"
"یہ ذرا سی بات ہے؟ لڑکوں نے گاڑی دیکھ لی۔" پہلے نے کہا۔
"یا گاڑی کو ڈبل مارو۔ دوسری بھی مل جائے گی؟" ڈرائیور نے کہا۔ "لڑکوں نے تو ہمیں بھی دیکھ لیا۔"
"کسی نے نہیں دیکھا ہمیں۔ اور دیکھا بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" استاد نے کہا۔ "اتنی خلقت بھری ہے وہاں۔ سب کی صورتیں کون یاد رکھتا ہے۔ ہم کل جائیں گے تو کوئی نہیں پہچانے گا۔ لوگ بھی دوسرے ہوں گے اور راستہ بھی۔۔۔"
"نہیں استاد ابھی دوبارہ وہیں جانا ٹھیک نہیں ہے۔" دوسرے نے کہا۔ "کوئی اور جگہ دیکھو۔"
"تم لوگوں کا دماغ خراب ہے۔" استاد نے بگڑ کے کہا۔ "او یارا چھوٹی چھوٹی باتیں تو ہوں گی۔ کتنا سمجھا چکا ہوں تمہیں کہ اس میں خطرہ کم ہے اور فائدہ بہت زیادہ۔ بینک کی بات مت کرو۔ وہاں صبح کو رش ہوتے ہیں اور پھر پیسہ کتنا ملے گا؟ ایک دو چار لاکھ۔ بہت ہوا تو آٹھ دس لاکھ لیکن بینک ڈکیتی میں ساری پولیس فورس حرکت میں آجاتی ہے۔ ہوٹل میں کام بہت آسان ہے۔ چوکیدار بس دروازے کھولنے کے لیے اور سلام کرکے ٹپ لینے کے لیے ہوتا ہے۔ آرام سے ایک آدمی نیچے سب کو قابو کرلے۔ باقی تین اوپر چلے جائیں۔ باری باری ہر مسافر کے دروازے پر دستک دیں اور جو کچھ اس کے پاس ملے رکھوالیں۔ سب بڑے لوگ ٹھہرتے ہیں وہاں۔ ہم نے معلوم کرلیا ہے آج کل کون کون ٹھہرا ہوا ہے۔ ایک تو کوئی پرنسس صوفیہ ہے۔ تم ہر ایک سے سارا نقد زیور لو اور لے لو نا، نوٹ کے باتھ روم میں ڈال دو۔ تین آدمی پانچ منٹ میں ایک کمرے سے فارغ ہوں تو آدھے گھنٹے میں اٹھارہ کمروں سے بہت کچھ مل سکتا ہے۔ ساتھ والوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ میں نے تین نام نوٹ کیے ہیں۔ صرف انہی سے اتنا مل جائے گا کہ سب کو کافی ہوگا۔ نقد رقم، بانڈ، زیورات اور بہت کچھ۔ کچھ نہیں تو خالی نہیں ہوگا۔ مجھے بیس تیس لاکھ کی امید ہے۔"
"وہاں سے نکلنے کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے استاد۔" دوسرا بولا۔
"خاک ٹیڑھا ہے۔ میں نے بتا دیا ہے کہ کسی ایک مسافر کو یرغمالی بنا کے نکلیں گے۔" استاد نے کہا۔ "ہوٹل والوں کو خبردار کردیں گے کہ انھوں نے پولیس کو بتایا یا تعاقب کیا تو ہم اسے ماردیں گے۔ فرض کرو ہم پرنسس کو ہی لے آئیں۔ ہوٹل والے دم نہیں مار سکیں گے۔ ایک تو وہ بدنامی نہیں چاہیں گے کہ ہوٹل میں چوری ڈاکا پڑے۔ وہاں کوئی ٹھہرنا پسند نہیں کرے گا۔ وہ تمام مسافروں کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑیں گے اور ان کے نقصانات کی تلافی کردیں گے۔ بیس تیس لاکھ کا نقصان ہوگا تو ہوٹل والوں کا بگڑے گا؟ وہ اس نقصان کو برداشت کرلیں گے اور کاروبار کو تباہ ہونے سے بچائیں گے۔ پرنسس کے علاوہ وہاں ایک نیا جوڑا بھی ٹھہرا ہوا ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی صنعت کار کی بیٹی ہے۔ لڑکا کسی بڑے زمیندار کا بیٹا ہے۔ دونوں نے چھپ کر شادی کی ہے۔ پرنسس کے ساتھ انھیں بھی لے آئیں تو ہماری پوزیشن اور بہتر ہو جائے گی۔ پھر ہوٹل والے بھی ہرگز نہیں چاہیں گے کہ معاملہ تین مسافروں کے قتل تک پہنچے۔ جب ان کو معلوم ہوگا کہ یرغمالی وی آئی پی قسم کے لوگ ہیں تو ان کی سٹی گم ہو جائے گی۔"
"صنعت کار کی بیٹی اور داماد کے بدلے کچھ وصول نہیں ہوسکتا؟" ڈرائیور بولا۔ "ماں باپ سے؟"
"نہیں۔ پھر کہیں پولیس کے پاس ضرور چلا جائے گا۔" استاد نے سختی سے کہا۔ "ورنہ وہ معاملے کو دبائیں گے اور ہوٹل والوں کو کچھ نہیں کرنے دیں گے۔ ان کی اپنی بدنامی ہوگی اگر خبر چھپی۔ یہ ہوسکتا ہے وہ مسافروں کا نقصان پورا کرنے میں ہوٹل والوں کے ساتھ تعاون کریں۔ وہ چار لاکھ دے دیں اور اپنے بچوں کے علاوہ اپنی عزت بچائیں۔ ہم چوبیس گھنٹے کے بعد سب کو رہا کردیں گے۔ پولیس کے چکر سے سب بچتے ہیں۔ نقصانات کی تلافی ہو جائے گی تو سب خاموشی سے نکل جانا بہتر سمجھیں گے۔ ڈکیتی کی خبر کیسی ہو تو اخبار شور مچا دیتے ہیں۔ یہ معاملہ تو ایسا دب جائے گا کہ بعد میں کسی مسافر نے ذکر بھی کیا تو ہوٹل والے اسے صاف جھوٹ قرار دیں گے اور اس کی تردید بھی شائع کرادیں گے۔ ہم بالکل محفوظ۔"
"استاد، یہ سب تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ سیدھا کیوں اٹھا لایا ہے؟"
"تم سب اندھے ہو گئے ہو کیا؟" استاد نے جھنجھلا کے کہا۔ "اسے پہچانتے نہیں؟ یہ ایک مفرور اشتہاری مجرم ہے۔ اس کی گرفتاری پر دس ہزار کا انعام ہے۔ اسے ہم پولیس کے حوالے کردیں گے۔ دس ہزار کے علاوہ اس سے ثابت ہو جائے گا کہ ہم کتنے قانون پرست شہری ہیں۔ بعد میں کسی نے جھوٹے سے بھی شک کیا ہم پر تو ہمارے پاس یہ سند ہوگی کہ ہم مجرم نہیں مجرموں کو پکڑ کے قانون کے حوالے کرنے والے شریف آدمی ہیں۔" اس نے فخر سے ان سب کی طرف دیکھا جو اسے استاد مانتے تھے۔ وہ سب ابھی اس کی استادی اور اس منصب کے لیے اس کی غیر معمولی صلاحیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔
میں بے ہوش بنا سب کچھ سن رہا تھا۔ ستم ایجاد تقدیر کا یہ نادر شاہکار تھا کہ اس وقت رابعہ کے پیکر میں حسن دلنواز فروزی اور اس کی دل کشی کی صورت کا نظارہ کرنے کے لیے میں وحشت میں پڑا تھا۔ خاک پر پڑا تھا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں وہیں ستم گر کا انتظار رہتا۔ قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند۔ اگر صرف ایک منٹ پہلے بھی میں نکل گیا ہوتا، وہ اسکوٹر سوار اس کار سے ٹکراتا اور میں اس کی مدد کرنے کے لیے رک جاتا تو میں اور رابعہ نکل جاتے۔ بے شک اس کے بعد ڈاکے کی نیت سے آنے والے ہوٹل کو پروگرام کے مطابق ضرور لوٹ لیتے۔

جو بہر حال محفوظ رہتے۔ یہ سب قدرت کے کھیل تھے۔ عین وقت پر ایک شخص کو اسی طرح بے ترتیبی سے نمودار ہو کے ان ڈاکوؤں کی گاڑی سے ٹکرانا تھا۔ قسمت کا مقصد فقط ان کے ادھیڑ پروگرام میں رخنہ اندازی تھا۔ اسے حادثے سے دوچار کرنا نہیں۔ چنانچہ اسکوٹر والے کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ نقصان مجھے صرف اس حد تک ہوا تھا کہ ایک شام جو اس کے حسن آرائی انجمن آرائی کی شام تھی شب فراق کی تنہائی پر تمام ہوئی تھی۔ وہ من زنی کی ادا میں شرمائی آرائش خم پکل سے اور جمال لب و رخسار سے جادو جگاتی داسی لباس میں پایل بہار اور رشک گلستان بنی آئی ہوگی۔ میری منتظر نگاہوں کی امید اور میرے اشتیاق و اضطراب کا نظارہ کرنے لیکن اسے کوئی نہ ملا ہوگا اور اس کا دل بجھ گیا ہوگا۔ آنکھوں میں ستاروں کی جوت مدھم ہوگی اور اس نے بڑی مایوسی کے ساتھ میری واپسی کا انتظار کیا ہوگا۔ یہ سمجھا ہوگا کہ اسے یوں سجا سنورا دیکھنا بھی میری شرارت ہے اور میں اسے کہیں سے چھپ کر دیکھنے میں محو ہوں۔ پھر انتظار تشویش میں ڈھل گیا ہوگا اور اب وہ اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار بنی کمرے میں پڑی رو رہی ہوگی۔ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہوگی کہ اب وہ کیا کرے۔ اسے مشورہ دینے والا بھی تو کوئی نہیں کہ اسے پولیس سے رجوع کرنا چاہیے یا نہیں۔ وہ جانتی ہے کہ پولیس کے پاس جانے سے صورت حال کتنی مضحکہ خیز ہو جائے گی۔ وہ ہنسیں گے اور کہیں گے بی بی وہ اغوا ہوا ہے یا نہیں۔ ہم تو اسے پہلے ہی گلی گلی گھر گھر تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ رات کو حسن کا فون آئے گا تو وہ کیا بتائے گی۔ اور حسن کے گھر میں یہ اتنا سمجھ سکتا تھا کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے چل پڑے گا۔ معلوم نہیں وقت کیا ہوا ہے۔ ممکن ہے اب تک اس کی کوئی کال آچکی ہو۔ میرے ہاتھ اس طرح بندھے ہوئے تھے کہ میں وقت دیکھنے سے قاصر تھا اور کمرے کے اندر سے رات کا اندازہ تو ہوتا تھا، وقت کا نہیں۔

اس غیر متوقع حادثے نے ہوٹل میں رہنے والوں کو اور ننکیوں کو بہت بڑی پریشانی سے بچا لیا تھا۔ یہ ڈاکو اگر کامیاب ہو جاتے تو اس وقت اٹھارہ بیس دولت مند مسافر اپنا سب کچھ گنوا چکے ہوتے۔ ڈاکہ پڑنے کے بعد ہنی مون منانے کے لیے اس ہوٹل میں قیام کرنے والے اب تک یرغمال بن چکے ہوتے۔ صرف پرنسس صوفیہ ان کے ہاتھ نہ آتی مگر اس بارے میں بھی پورے یقین کے ساتھ کچھ کہنا دشوار تھا۔ اگر وہ میرے خرمن عقل و ہوش پر بجلی بن کے گرنے کے لیے سولہ سنگھار کیے دیر لگا دیتی تو میری مشتاق نگاہوں کی جگہ خون آشام ڈاکو اس کا استقبال کرتے۔ انہیں بعد میں پتا چلتا کہ وہ جسے پرنسس سمجھ کے اٹھا لائے ہیں وہ ایک وکیل ہے۔ کون جانے وہ صنعت کار کی بیٹی بھی کسی ہیڈ کلرک کی دختر ہو اور زمیندار کا بیٹا اسی دفتر کا بابو۔ پرنسس کی طرح انھوں نے بھی اصلیت پر شان و شوکت کا پردہ محض تفریحاً کچھ روز بھرم رکھنے کے لیے ڈالا ہو۔ ان لوگوں کی گفتگو سے مجھے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ پیشہ ور مجرم نہیں ہیں اور کسی خطرناک گروہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ ایسا ہوتا تو وہ مجھے پولیس کے پاس لے جانے اور میرے عوض دس ہزار کا انعام حاصل کرنے کی کبھی نہ سوچتے۔ دس ہزار کی رقم ڈکیتی کی اور رہزنی کی وارداتوں میں ملوث ہونے والے مجرموں کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے۔ انھیں پولیس کے ریکارڈ پر خود کو نیک نام اور قانون کا معاون ثابت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور نہ پولیس انھیں یہ سند دیتی ہے۔ یہ اس میدان میں نو وارد کھلاڑی تھے اور ان سے نمٹنا مشکل نہیں تھا۔
مجھے اغوا کرکے لانے والے مجھے رسی سے جکڑ چکے تھے لیکن ان کو یہ کہاں معلوم تھا کہ اپنے خالی ہاتھوں سے بھی ان سب کا ملیدہ بنا کے پارسل کرسکتا ہوں۔ میرا ابتدائی اندازہ بظاہر درست ہی تھا کہ وہ گیراج میں کام کرنے والے مکینک ہیں۔ جس کمرے میں انھوں نے مجھے ڈال رکھا تھا وہ بھی آئل اور گریس کی بو سے معمور تھا۔ اس کے فرش پر میل کی سیاہ چکنی تہہ تھی اور جو دیوار مجھے نظر آرہی تھی وہ بھی کسی گھر کی اجلی دیوار نہیں تھی۔ کمرے میں فرنیچر بھی نظر نہیں آرہا تھا چنانچہ یہ جگہ گیراج ہی ہوسکتی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ کراہنا شروع کیا۔
"اسے ہوش آرہا ہے۔" نوجوان ڈرائیور نے کہا۔
"اس کا منہ بند کرنا ضروری ہے استاد؟" دوسرے نے کہا۔ "یہ چلانے لگا تو۔۔۔؟"
"اسے کیسے چلانے دیں گے۔" استاد مجرم نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں نے آنکھیں بند رکھیں اور کراہتے ہوئے پانی مانگا جو المونیم کے ایک گلاس میں پیش کیا گیا۔ استاد نے میرا سر تھام کے اٹھایا اور میں نے بڑی مشکل سے دو گھونٹ لیے۔ ایک شور سا میرا اس ریوالور لیے کے میرے سامنے کھڑا رہا۔ اس کا مقصد مجھ پر یہ واضح کرنا بھی تھا کہ میں خالی ہاتھ ہوں اور اگر میں نے ہنگامہ برپا کیا تو مجھے ہمیشہ کے لیے خاموش بھی کیا جاسکتا ہے۔ چوٹ کا اثر باقی تھا اور میرے سر میں ہتھوڑے چل رہے تھے لیکن میں زندگی میں اس سے کہیں زیادہ سخت جسمانی تشدد برداشت کرچکا تھا۔
"میں۔۔۔ میری بات۔۔۔ سنو۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔
"زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔ خیریت چاہتا ہے تو چپ چاپ پڑا رہ۔" استاد نے کہا۔
"ٹھیک۔۔۔ میں خاموش ہی رہوں۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں۔۔۔ کھول دو۔" میں نے لجاجت سے کہا۔ "میں بالکل

www.paksociety.com

"...بالکل شور... شور نہیں مچاؤں گا..."

انھوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور شش و پنج میں سر ہلایا۔ میری بے بسی کا مظاہرہ ان کو اپنی قوت کا احساس دلا رہا تھا۔ ان میں اعتماد پیدا کر رہا تھا۔

"تم... تم کو... کس بات کا ڈر ہے...؟" میں نے یوں کہا جیسے مجھ پر رقت کا عالم طاری ہے۔ "تم لوگوں... کے پاس ریوالور ہے... میں خالی ہاتھ ہوں... یہ میرا ہی ریوالور ہے... اگر میں... کوئی ایسی ویسی بات... کروں... تو تم مجھے گولی مار سکتے ہو... مار سکتے ہو یا نہیں؟... اکیلا آدمی... میں اکیلا ہوں۔ تم چار... پھر بھی ڈر ہے...؟"

میرا سوال براہ راست ان کی جرأت کو چیلنج کرنے کے مترادف تھا۔ انھوں نے پھر ایک دوسرے سے خاموش مشورہ کیا اور ذرا سی دیر کے لیے کمرے کے آخری گوشے میں چلے گئے جہاں سے میں صرف ان کی سرگوشی سن سکتا تھا۔ بالآخر ان کی کانفرنس ختم ہوئی اور سب سے کم عمر اور جوان شخص یعنی رشید نے میرے ہاتھ پیروں سے لپٹی ہوئی رسی کی گرہ کھولنے کا خطرہ مول لیا۔ استاد کے ساتھ دوسرا شخص بھی فلمی ولن کی طرح ریوالور لے کر میرے مقابل آ گیا۔ اب ایک تھوتھنا سا میرے دائیں ہاتھ پر تھا اور دوسرا بائیں ہاتھ کی جانب۔ وہ یقیناً خود کو اس آتشیں اسلحے کی توانائی کے سبب بہت بہادر محسوس کر رہا تھا۔ اس کے دونوں پیر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ اور مقابل... سے پہلے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ کی ایک انگلی ریوالور کے ٹریگر پر تھی جو ایک خطرناک بات تھی۔ کبھی کبھی اناڑی کے اضطراب کی ذرا سی غلطی ملاقاتی موت کا سبب بن جاتی ہے۔

میں نے "آہ... اوہ... ہائے" کرتے ہوئے آہستہ آہستہ ہاتھوں اور پیروں کو حرکت دی اور خاصی کوشش کے بعد دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ اب اس پورے کمرے کا منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ وہ واقعی گیراج تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ موٹی سی لمبی گھٹنے کی بینچ بنی ہوئی تھی۔ اس کے نچلے حصے میں جھنجھے اور مرمت کے... پیش رکھے ہوئے تھے۔ کچھ بند اور کچھ کھلے ہوئے۔ اندر ہر قسم کا کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ بینچ پر انجن کے پرزے ڈھیر تھے اور نیچے دو نامکمل انجن رکھے ہوئے تھے۔ اسی دیوار پر چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا اسپینر اس ترتیب سے آویزاں تھے کہ سیٹ کا ایک اسپینر بھی کم ہو تو جگہ خالی نظر آئے۔ زیر مرمت گاڑیاں یا تو باہر سڑک کے کنارے کھڑی تھیں یا پچھلے حصے میں کوئی احاطہ یا میدان تھا۔ بیشتر گیراج اسی طرح زمین پر ناجائز تصرف سے چلتے ہیں۔

"میں... میں تم لوگوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" میں نے ہاتھ سے کلائیوں کو رگڑتے ہوئے کمزور لہجے میں کہا۔

"تمھیں معلوم ہے تو کیا کرے گا۔ یہی نا کہ تجھے چھوڑ دیں۔" استاد نے قائد حزب اختلاف کی حیثیت سے کہا۔

"وہ تمھاری مرضی ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا تمھیں معلوم ہے مجھ پر کیا الزامات ہیں...؟"

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اپنی لاعلمی پر شرمندگی کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کی۔ "ہمیں معلوم ہے تجھ پر چوری اور ڈکیتی کے الزامات ہیں۔ ایسے کچھ تو کوئی اشتہاری مجرم ہی..."

"میں نے پانچ قتل کیے... یہ تو گیارہ ہیں مگر پولیس نے مقدمہ پانچ کا بنایا۔" میں نے بڑھتی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیر کے سوچتے ہوئے کہا۔ میرے پرسکون انداز میں بہت بڑے بدمعاشوں کی شان تھی جس سے وہ متاثر ہوئے۔ "چوری ڈکیتی کا حساب رکھنے والے رکھتے ہوں گے۔ میں تیسری بار جیل سے بھاگا ہوں۔ تم لوگوں نے تو ابھی جیل کو باہر سے دیکھا ہوگا۔"

تینوں کی نظروں میں اس اعتراف سے مرعوبیت یا شرمندگی کا... نظر آئے۔ استاد صرف اس لیے استاد ثابت ہوا کہ وہی ایک ... تھا جس نے جیل یاترا کی تھی۔ "میں سنا ہوں مجھے..." وہ بولا۔

"پھر بیٹے..." میں نے ہنسنا شروع کیا۔ "جیب کاٹی تھی! مارپیٹ کی تھی؟"

ایسے گھٹیا جرم پر بہت کم سزا ہوتی تھی لیکن میری شخصیت نے استاد کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔ وہ مشتعل ہونے لگا۔

"دیکھ... میں تمھارے فائدے کی بات کروں گا۔ ... ہی فائدے کے" میں نے کہا۔ "ہمارے ہی نقش قدم پر چلی ہے ... ہم سے کچھ سیکھ لو کام آئے گا۔ یہ ڈکیتی کی پہلی واردات تھی نا... والے تھے؟"

سیکنڈ سوال پر وہ سب بڑی طرح چونکے۔ "تو ... کر رہا تھا سوئر کے بچے" استاد نے میرے ایک لات ماری۔ میں اسے پیر کے پنجے سے پکڑ کر گدھے کی طرح گھما سکتا تھا اور ان سب کا گدھے سے لباس اتار سکتا تھا۔ وہ گولی چلاتے تو استاد ... میں ... کرنے کا خطرہ مول لیتے۔ لیکن میں نے صبر و تحمل سے کام لیا۔ ... نیچے لڑھکا اور پھر کراہتا ہوا اٹھا۔

"غلطی تم لوگوں کی تھی۔" میں نے کچھ دیر بعد کہنا شروع کیا۔ "تم کو احتیاط کرنی چاہیے۔ یہ کیسے فرض کر لیا تھا تم نے کہ میں بے ہوش ہوں... میں نے تمھاری گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا ہے۔"

میں نے ایک مختصر سا ڈرامائی وقفہ دیا اور اپنی بات کا اثر دیکھا۔ وہ سب ذہنی طور پر مرعوب ہونے لگے تھے۔

"میری فکر مت کرو۔ تم اپنے دس ہزار مجھ سے لینا چاہو تو لے لو۔ حکومت سے لینا چاہو تو تمھاری مرضی۔" میں نے

"پہلی صورت میں تمھارے اور میرے درمیان دشمنی کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسری صورت میں میرے ساتھی تم سے دس ہزار واپس لے جائیں گے۔ تم سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اکیلا آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ میں جیل سے تین مرتبہ انھی ساتھیوں کی مدد سے فرار ہوا تھا۔ چوتھی بار بھی ہو جاؤں گا۔ یہ تمھاری خوش قسمتی ہے۔"

"ہمیں خوش قسمتی ہے؟" استاد نے مایوسی سے کہا۔ "ایک معمولی سی بات تھی۔ سارے پروگرام کا ملبہ ہو گیا۔"

"استاد جی یہی تو خوش قسمتی ہے تمھاری۔" میں نے کہا۔ "تم پہلی واردات کر رہے تھے۔ کیا تیاری کی تھی تم نے ایک مہینے تک۔ تمھیں خاک بھی معلوم نہیں کہ تم وہاں جاتے تو انجام کیا ہوتا۔ ڈاکا ڈالنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ حفاظتی نظام کیسا ہے۔"

"وہ ہم نے دیکھ لیا تھا۔ چوکیدار کے پاس بھی ریوالور تک نہیں ہوتا۔" استاد نے خفت سے کہا۔

میں پھر ہنسنے لگا۔ "ریوالور نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ بہت کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ مثلاً خفیہ الارم اور کیمرے۔ جو ہر جگہ لگے ہوتے ہیں اور آنے جانے والوں پر نظر رکھتے ہیں۔ منیجر اپنے کمرے میں سب کچھ سنتا اور دیکھتا رہتا ہے۔ ذرا بھی شک ہونے کی صورت میں اسے صرف ایک بٹن دبانا پڑے گا۔ گھنٹی کی آواز سنائی نہیں دے گی لیکن پولیس دس منٹ میں آ جائے گی۔"

"کیا ثبوت ہے تمھارے پاس... تمھیں کیسے معلوم ہوا یہ سب کچھ؟" استاد کا اعتماد اب متزلزل ہو رہا تھا۔

میں پھر ہنسنے لگا۔ "تم میرے مقابلے میں ابھی بچے ہو۔ میں جب یہ سب کچھ سولہ سال پہلے معلوم ہو چکا تھا۔ جب میں نے پہلی بار ایک گھر میں چوری کی تھی تو میری عمر بھی سولہ سال تھی لیکن میں پکڑا نہیں گیا تھا۔ میں نے گھر والوں کے متعلق ضروری معلومات پہلے سے حاصل کر لی تھیں۔ وہ نہا کر سونے کے عادی تھے۔ خود کار الارم اور کیمرے استعمال نہیں ہوتے تھے لیکن اب یہ چیزیں عام ہیں۔ تم ثبوت مانگتے ہو تو واقعی ثبوت کوئی نہیں ہے لیکن تم خود سوچو یہ جو بات تمھاری کھوپڑی میں آ چکی ایسا بڑا ہوٹل چلانے والوں کے ذہن میں نہیں آئی ہوگی۔ ایک معمولی جوہری بھی دکان کھولتا ہے تو اپنی حفاظت کا انتظام کرنے کا پہلے سوچتا ہے۔ دنیا کے سب بڑے بڑے ہوٹلوں میں بہترین حفاظتی انتظامات ہوتے ہیں۔ تم نے ابھی کیا دیکھا ہے۔ میں یورپ اور امریکہ میں بھی رہ چکا ہوں فرار ہو کے۔ اور وہاں گورنر کی طرح رہ کے آیا ہوں۔ ان کے قریب پہنچنے پر پرائیویٹ سراغ رساں بھی ہوتے ہیں۔ ہوٹل والے جانتے ہیں کہ ان کے پاس ٹھہرنے والے معمولی لوگ نہیں ہوتے۔ ان کو دھوکا دینا اتنی بڑی بات نہیں لیکن انھیں اغوا کیا جا سکتا ہے۔ مجھے ایک آدمی کو اغوا کرنے کی سوچ رہے تھے۔ ان میں نامی سیاسی لیڈر بھی ہوتے ہیں۔ ان کو قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہوٹل میں اور وہاں کوئی واردات نہیں ہوئی تو آخر کس وجہ سے؟"

استاد کے یقین کا غبارہ جو بہت بلندی پر اڑ رہا تھا ہوا نکلنے سے اتنا پچکا ہو گیا تھا کہ استادی کا بھرم قائم رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ گروہ کے چھ ہزار لیکن مجھے انتہائی عقیدت و احترام سے اور اپنے سرغنہ کو افسوسناک ملامت بھری اور برگشتہ نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔

"اس کی باتوں میں مت آؤ۔ یہ الو کا پٹھا پولیس سے بچنے کے لیے جب جھاڑ رہا ہے۔" وہ بولا۔

"میں نے تم کو بتایا نا کہ دس ہزار معمولی رقم ہے۔" میں نے تمکنت سے کہا۔ "پولیس تم کو آسانی سے نہیں دے گی۔ پہلے تو وہ تفتیش کریں گے اور تمھیں اس میں شامل کریں گے۔ دس ہزار میں سے اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے ان کی کوشش یہ ہوگی کہ تم کو بھی میرا ساتھی ثابت کر دیں۔ میرو نمبر کے جیتے سے وہ واردات ثابت کر سکتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہوگا کہ تم نے باہمی اختلاف کے باعث مجھے پولیس کے حوالے کیا اور وہ تم سے ہزار طریقے آزما کر پوچھیں گے کہ اتنا خطرناک مجرم تمھیں کہاں ملا؟ تمھارے قابو میں کیسے آ گیا۔ مجھے کوئی خالی ہاتھ تو پکڑ نہیں سکتا۔ جب تک انھوں نے تم کو بچایا تو تم میرا ساتھی ہونے کا اقرار کر دیا نہ کرو لیکن وہ دوسرے جرائم کا اقرار کروا لیں گے جن کی خبر انھیں بھی نہیں۔ مثلاً میرے نقش کا ریوالور رکھنے کا۔ وہ پوچھیں گے ریوالور کہاں سے حاصل کیا؟ کب سے تمھارے پاس ہے اور اب تک اس کا استعمال کہاں کہاں کر چکے ہو؟ دس ہزار جوتے کھا کے تم جیل چلے جاؤ گے۔ اور اگر عقل سے کام لیتے ہوئے انعام کی رقم آدھی آدھی کرنے پر تیار ہو گئے تو وہ ضابطے کی کارروائی مکمل کریں گے۔ پھر افسران بالا کو رپورٹ کریں گے۔ معاملہ آئی جی تک جائے گا۔ وہاں سے منظوری آئے گی۔ پھر بل بنے گا اور سرکاری خزانے جائے گا۔ سال بھر تک پہلے تم چکر لگاتے رہو گے اور ان سے اپنا حق یوں مانگتے رہو گے جیسے خیرات مانگ رہے ہو۔ تم کو دس ہزار روپے مل سکتے ہیں کسی پریشانی کے بغیر اور مجھ سے دشمنی کا خطرہ مول لیے بغیر۔ میں تم کو رقم دیتا ہوں۔ تم میں سے ایک جائے اور رقم لے آئے۔ دس کی جگہ پندرہ مانگو گے تو مل جائیں گے اور تم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جو جائے گا وہ واپس لوٹ کر بھی آئے گا؟" استاد نے کہا۔

"ضمانت میں ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمھارے پاس۔ تم مجھے کسی اور جگہ لے جا سکتے ہو اور اپنے ساتھی کو وہ پتا دے سکتے ہو مجھے بتائے بغیر۔ وہ کسی کو پیچھے آتا دیکھے تو رقم واپس کر دے۔ لیکن میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ پیچھے کوئی نہیں آئے گا۔ جو یہ رقم دینا جانتے ہیں وہ تمھاری طرح گدھے نہیں ہیں۔ وہ بدمعاشی کرنے والے کے خاندان

www.paksociety.com

ٹک کو نہیں چھوڑتے تھے۔ وہ تمہارا سراغ لگالیں گے اور تمہیں یہ دس ہزار تو دینے ہی پڑیں گے، اس سودے میں اپنی جان بھی دینی پڑے گی۔ ورنہ کچھ نہیں ہو گا۔ دس پندرہ ہزار کی خاطر وہ وقت برباد نہیں کریں گے اور یہ سمجھ لیں گے کہ سو بار دوسروں کو لوٹا، ایک بار خود بھی لٹ گئے۔ آخر دنیا میں ایک سے ایک ہیں تو تمہیں [illegible] یہ در حقیقت دو حصے کی کر رہے ہیں اور کسی نے غلط فہمی کے باعث انھوں ہی کو لوٹ لیا۔"

میں نے انھیں سوچنے اور صورت حالات کو سمجھنے کا موقع دیا اور ان سے ایک سگریٹ طلب کی۔ جب میں وہ گھٹیا سگریٹ پی رہا تھا تو وہ دوسرے کونے میں سر جوڑے وہ آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے۔ میں نے ذہنی طور پر ان کو اتنا خوفزدہ کر دیا تھا کہ اب ان کے لیے پولیس کے پاس جا کے انعام وصول کرنے کا تصور بھی محال تھا۔ انھیں احساس ہو رہا تھا کہ مجھے گرفتار کر کے وہ خود مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ وہ تو ہرن کی نسل کے پیچھے دوڑے تھے اور سامنے آ گیا آدم خور شیر۔ میں دل ہی دل میں ان کی پریشانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مارے چلے تھے خدا کا ڈاکا ڈالنے۔ حلال کی کمائی کھانے میں محنت کرنی پڑتی تھی اور خون پسینہ ایک کرنا پڑتا تھا۔ عیش کے لیے کیش کا شارٹ کٹ انھیں یہی نظر آیا تھا۔ جرائم کی فلمیں دیکھ دیکھ کر اور جاسوسی ناول پڑھ کے احمقوں نے سوچا ہو گا کہ ڈکیتی بہت آسان کام ہے۔ آسان نہ ہوتا تو اخبارات میں ہر روز ڈاکا پڑنے کی خبر کیسے آتی۔ جیسے مل گیا ہو گا کہیں سے ایک ریوالور اور اس نے رہی سہی کسر پوری کر دی ہو گی۔ میکینک لوگ تھے۔ نہ جانے کب کس کی گاڑی چرائی اور اس کو بدل کے کیا بنا دیا۔ وہ تو خود پرزے جوڑ کے گاڑی کھڑی کر سکتے تھے۔ استاد محترم کے ذہن میں ہوٹل کے مسافروں کو لوٹنے کا اچھوتا خیال آیا اور گیراج میں تو استاد تھے ہی اگر وہ کے استاد بھی کہلانے لگے۔ اب ہوا خراب ہو رہی تھی۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں پولیس کے حوالے نہ کریں۔" استاد نے اتفاق رائے سے ہونے والا فیصلہ مجھ تک پہنچایا۔ "لیکن تم اپنا وعدہ پورا کرو گے؟"

"کون سا وعدہ؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"یہی کہ ... تمہیں پندرہ ہزار مل جائیں گے۔ ابھی۔" استاد نے کہا۔ "اور ہمارے تمہارے درمیان کوئی دشمنی نہیں رہے گی؟"

میں بڑے مشفقانہ انداز میں مسکرایا۔ یوں جیسے میں نے بڑی فراخ دلی اور وسیع ظرفی سے کام لیتے ہوئے بچوں کی اس غلطی کو معاف کر دیا ہو۔

"یہ وعدہ چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔" انھیں نے کہا۔ "رقم کہاں سے ملے گی اور کون دے گا؟"

"اس کے لیے تمہیں وہیں جانا پڑے گا۔ ہوٹل [illegible]۔" میں نے کہا۔ "رقم پرنسس صوفیہ ادا کرے گی۔"

میری بات کا اثر وہی ہوا جو ہائی جیک ہونے والے مسافروں پر اس وقت ہوتا ہے جب ایک اتھی جیسا مسافر اچانک کھڑا ہو کر دستی بم نکال لیتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی نے حرکت کی تو جہاز دھماکے سے اڑا دیا جائے گا۔ کچھ دیر تو سکتے کی حالت میں بیٹھے رہ جانے والے مسافروں کو یقین نہیں آتا کہ دھمکی انھیں دی گئی ہے اور جو گولا بم دینے والا ہاتھ میں اٹھائے کھڑا ہے وہ واقعی دستی بم ہے۔ گیراج میں موجود سب لوگ صدمے سے سُن کھڑے تھے اور یہ دیکھ رہے تھے کہ میری اس بات میں مذاق کا کون سا پہلو ہے۔ میں اطمینان سے ٹانگیں لمبی کیے دیوار کے سہارے بیٹھا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔

"پرنسس صوفیہ سے کیا تعلق ہے تمہارا؟" استاد نے بہت دیر کے بعد کہا۔

"وہی جو کسی بھی بیوی کا اپنے شوہر سے ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ انھیں چار سو چالیس وولٹ کا ایک اور شاک لگا۔

"تم بکواس کرتے ہو۔ بے وقوف بنا رہے ہو ہمیں۔" استاد چلانے لگا۔ "میں کہتا ہوں اس شخص کی چال میں مت آؤ۔ یہ بہت خطرناک اور عیار آدمی ہے۔ عیار اور مکار۔" [illegible] اس کی چیخ و پکار سے کوئی متاثر نہیں ہوا۔ باقی تینوں مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتے رہے۔

"تم تو بے [illegible]" میں نے کہا۔ "ہمت ہے تو مار دو مجھے اور دفن کر دو اسی جگہ۔ کون ہے تمہارے جرم کا گواہ؟ اور میرا جاؤ ہوٹل میں ڈاکا ڈالو۔ اگر [illegible] جاؤ تو [illegible] میں نے تو تمہیں خبردار کر دیا تھا۔ پرنسس صوفیہ میری بیوی ہے۔ وہ تمہاری ان بیویوں کی طرح نہیں ہے جو گھر میں بیٹھے بیٹھے [illegible] اور بچے پیدا کرتی ہیں۔ جو چھپکلی دیکھ کے تھر تھر کانپنے لگتی ہیں اور لال بیگ نظر آ جائے تو بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ وہ خود پوچھے گی تم سے میرے بارے میں اور سارا حساب بے باق کر دے گی۔ میں نے تو بڑا ٹھنڈے دل سے کام لیا ہے۔ وہ عورت ہے اور جس عورت کا سہاگ کوئی چھین لے وہ [illegible] نہیں، زخم خوردہ شیرنی کی طرح انتقام لیتی ہے۔" میں نے تھوڑا سا وقفہ دیا اور ایک گہری سانس لے کر دھیمے لہجے میں بات شروع کی۔ "تم اس کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے نا۔ اب وہ اکیلی ہے۔ جاؤ، لے اٹھا لاؤ۔ سب مرد ہو اور [illegible] ہو۔ پرنسس کے نام سے دھوکا کھا رہے ہو کہ وہ نازوں میں [illegible] انداز شہزادی ہو گی۔ اب کہاں رہی ہیں شہزادیاں سوائے [illegible] کے؟ ایسے معزز نام تو ہم اچھے لباس کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ تم کو ایک موقع اور دیتا ہوں۔ میری رقم لے جاؤ اور میری بیوی کے پاس بے دھڑک پہنچ جاؤ۔ رقم لو اور واپس آ جاؤ۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنا اپنا راستہ نپو۔"

"عجیب ہے۔ رقم لکھو۔" نوجوان ڈرائیور نے جوش میں آ کے [illegible] "پرواہ نہیں استاد، اگر اپنی واپسی ہم آ گئے تو اس کو زندہ گاڑ دینا۔"

"[illegible] قصے کر رہا ہوں۔ یہ کوئی جرم تو نہیں ہے کہ کوئی [illegible] دوں گا کہ مجھے یہ شخص سڑک پر ملا تھا اور اس نے مجھے [illegible] کے سو روپے دیے تھے۔ میں کیا جانوں وہ کوئی مفرور [illegible] کا مجرم تھا۔ یہ پرنسس صوفیہ اس کی بیوی ہوگی تو پولیس خود اس سے پوچھے گی۔"

استاد نے ذہین شاگرد کو قابل تعریف نظروں سے دیکھا۔ مجھے ایک جیبی ڈائری اور ایک بال پوائنٹ پین فراہم کیا گیا۔ سادہ [illegible] ڈائری کی ورق گردانی کرتے ہوئے میں نے ڈائری میں ایک نام [illegible] تھا۔ کلک برنگ ڈیفنز اینڈ ایڈیٹرز۔ اس کے آگے [illegible] رقم لکھی ہوئی تھیں۔ اس گیراج میں گاڑیوں پر رنگ کا کام نہیں ہوتا [illegible] کے وہ دیوار پر [illegible] اسپرے کے سہارے رنگوں کی پھوار [illegible] غالباً گیراج والوں کا رابطہ کسی ڈیفنز اینڈ ایڈیٹرز سے بھی تھا جو وہ پینٹنگ کا کام خود کرتے تھے اور رنگ روغن کے لیے رنگ برنگ [illegible] کتاب سے اخذ کیا کرتے تھے۔ یہ اسی کا حساب ہو سکتا تھا۔

میں نے ایک صفحے پر لکھا۔ "اس وقت میری خاطر ان کو پندرہ ہزار روپے دو۔" شاہ صفحہ پھاڑ کے آگے بڑھا دیا۔ استاد نے بہت سے [illegible] والے چالیس واٹ کے بلب کی مدھم روشنی میں یہ تحریر [illegible] اور باری باری گروہ کے اراکین کو ملاحظہ کے لیے پیش کیا۔ بات اتنی صاف اور سادہ تھی کہ شکوک پیدا کرتی تھی۔

"یہ تم نے ... کسی کو مخاطب نہیں کیا ... اپنے دستخط وغیرہ نہیں کیے۔" استاد نے کہا۔

"تم عقل سے بالکل پیدل ہو گئے۔" میں نے کہا۔ "استاد بنے پھرتے ہو۔ تمہیں تو ابھی دس سال شاگردی کرنی چاہیے میرے [illegible] میری بیوی کا نام تمہیں بھی معلوم ہے۔ سیدھے پرنسس کے پاس چلے جاؤ۔ وہ [illegible] تو نام کیوں [illegible] اور اس میں تمہاری ہی بچت ہے۔ خدانخواستہ تم [illegible] جاؤ تو اس کا امکان ایک فیصد بھی نہیں ہے [illegible] کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ تم [illegible] سے ملنے آئے تھے اور تمہیں کس نے بھیجا تھا۔ اس پرچے [illegible] تمہیں اصرار ہے تو لاؤ میں [illegible] لکھ دیتا ہوں۔ یہ سوچ لو کہ تمہارے پاس سے یہ تحریر برآمد ہوئی تو تمہارے لیے وضاحت مشکل ہو جائے گی۔ تمہیں میرا آلۂ کار سمجھا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں خود جاؤں گا۔" استاد نے کہا۔ "لیکن ہم کوئی [illegible] نہیں لیں گے۔ تمہیں ہاتھ پیر باندھ کے دوسری جگہ منتقل کرنا ضروری ہے۔"

میں نے شاہانہ طور پر انھیں یہ موقع فراہم کیا۔ اس وقت بھی وہ میری گرفت اور دسترس میں تھے اور اگر میں چاہتا تو پلک جھپکتے میں ان کے ہاتھ پیر توڑ کے سب کو ناکارہ کر سکتا تھا اور ان کا [illegible] ڈال کے رخصت ہو سکتا تھا مگر میں نے یہ ایکشن کو التوا میں رکھا۔ میں ان چاروں شوقیہ بدمعاشوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ان سے اور کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور اسی کے ذریعے رابطہ کر کے اپنی خیریت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کی تشویش ختم ہو۔ [illegible] یہ لوگ [illegible] کرتے تو میں ان سے مؤثر طور پر نمٹ لیتا۔ اور اپنی رقم وصول کر کے واپس آ جاتا مگر مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ ایسی صورت حال سے [illegible] کس طرح نمٹتی ہے۔ سامنے آنے کے بعد میرا ساتھ دیتا تھا تو اس سے کہیں زیادہ خطرناک حالات کا سامنا کرنا تھا۔ یہ اس کی پہلی آزمائش تھی۔ اس کے صبر اور حوصلے کی، جرأت اور استقامت کی، مشکل گھڑی میں صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت کی اور پرسکون رہنے کی اور میری مدد کے لیے عملی طور پر کچھ کرنے کی ہمت کی۔

اس بار انھوں نے ایک اور احتیاط بھی ملحوظ رکھی کہ باہر لاتے وقت میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تاکہ میں یہ نہ دیکھ سکوں کہ وہ علاقہ کون سا ہے۔ آس پاس خاموشی تھی۔ کہیں سے ٹریفک کے گزرنے کی اور کسی گوشے سے زندہ انسانوں کے وجود کی خبر دینے والی کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ یہ گیراج آبادی سے دور کسی مضافاتی علاقے میں ہے ورنہ ابھی نصف شب نہیں ہوئی تھی کہ سناٹا اتنا گہرا ہوتا۔ مجھے گاڑی میں پیچھے بٹھایا گیا اور دو افراد میرے دائیں بائیں بیٹھے۔ تیسرے نے ڈرائیونگ سنبھالی اور گاڑی خاصی تیز رفتاری سے روانہ ہوئی۔ حادثے کے وقت میں نے گاڑی پر سرسری نگاہ ڈالی تھی۔ اور مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ گاڑی بالکل نئی نہیں تھی۔ لیکن میکینک ہاتھوں میں اس کی کارکردگی نئی سے بہتر ہو گئی تھی۔ اگر مجھے روانہ ہوتے وقت اس جگہ کی صرف ایک جھلک دیکھنے کا موقع بھی مل جاتا تو میں سب منظر کو ذہن نشین کرتے ہوئے اپنی منزل کے راستوں کا تعین کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے تینوں افراد خاموش تھے اور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے [illegible] میری پسلیوں میں ریوالور کی نالیں چبھو کے مجھے یاد دلا رہے تھے کہ میں بے بس اور اسیر ہوں جس سے میں خاصا محظوظ ہو رہا تھا۔

"تمہارا استاد کیسے گیا ہے؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "گاڑی تو ہم لے آئے ہیں۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کہو کیا بات ہے؟" استاد نے

www.paksociety.com

آگے سے پلٹ کر جواب دیا۔
"اوہ... معاف کرنا، میں سمجھا تھا شیر دو شخص کیسے گیا ہے..."
"تم کیوں پریشان ہو؟" استاد نے کہا۔
"میں بالکل مطمئن ہوں، خصوصاً تم سب کے ہوتے ہوئے۔" میں نے کہا۔ "بس یہ خواہ مخواہ ریوالور کو دونوں طرف سے میری پسلیوں میں داخل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھیں سمجھاؤ کہ خود بھی آرام سے بیٹھیں اور مجھے بھی بیٹھنے دیں۔"
کسی نے میری بات کا جواب نہیں دیا لیکن دونوں طرف سے دباؤ کچھ کم ہو گیا۔
"کیا میرا پیغام لے جانے والا وہیں آئے گا جہاں تم مجھے لے جا رہے ہو؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔
"تم کو زیادہ بولنے کی عادت ہے۔" دائیں طرف والا بولا۔ "چپ نہیں بیٹھ سکتے؟"
"کیا تمھیں خطرہ محسوس نہیں ہوتا کہ میری بیوی تعاقب کرتی ہوئی اس کے ساتھ آ پہنچے گی؟" میں نے کہا۔
"ہم اس خطرے سے نمٹنے کا بندوبست کر چکے ہیں۔" استاد نے برہمی سے کہا۔ "اس بیوقوف عورت نے ایسا کیا تو...؟"
"وہ بیوقوف تو ہے لیکن اس بیوقوفی میں حد سے زیادہ خطرناک کام بھی کر جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایسی عورت ذات جانی کے ناقص العقل اور کمزور سمجھنے والے مرد بھی بعض اوقات مارے جاتے ہیں۔"
گاڑی اچانک رک گئی۔ میرے کان اب ٹریفک کی تھوڑی بہت آوازیں سن رہے تھے جو بند شیشوں سے گزر کر میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں اور ان سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ہم شہر کے بارونق حصے میں ہیں۔ دروازہ کھلا تو یہ آوازوں کا ریلا ایک دم اندر آیا۔ دوسرے لمحے دروازہ بند ہو گیا اور پھر یہ انکشاف ہوا کہ گاڑی میں تین نہیں چار آدمی تھے۔ میرے محافظ اسی طرح دونوں طرف موجود تھے اور گاڑی پھر سے رواں ہوئی تو ڈرائیور کی موجودگی بھی ثابت ہو گئی۔ اس کے باوجود کوئی دروازہ کھول کے اترا تھا۔ یہ حقیقت حساب کے سوال کا جواب بن کے عیاں ہوئی۔ انھوں نے مجھے اندھیرے میں اور دھوکے میں رکھا تھا کہ چوتھا آدمی میرا ناصر بن کے اتر گیا ہے جبکہ اس نے بھی ہمارے ساتھ اسی گاڑی میں سفر کیا تھا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا کیونکہ ہدایات کے مطابق اس کو خود کو غیر موجود ثابت کرنا تھا۔ شاید ان کی مجبوری یہ تھی کہ جہاں وہ مجھے لے گئے تھے وہاں کوئی اور سواری دستیاب نہیں تھی۔ اس مشکل کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ ایک ہی گاڑی کو دونوں مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ میری منتقلی کے لیے بھی اور ناصر کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے بھی۔ یہ نتیجہ اخذ کرنے سے مجھے بے حد مسرت اور تقویت حاصل ہوئی کیونکہ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ میں ہوٹل فاران کے سامنے ہوں گا۔ ... کی شدید خواہش سمندر کی طوفانی لہر کی طرح اٹھی لیکن میں نے ... مقابلہ کیا۔ اگر یہاں میں ہاتھ پیر بندھے ہونے کے باوجود ... لڑ سکتا۔ دونوں محافظوں کو ناک آؤٹ کر دیتا اور پھر ڈرائیور ... گاڑی بے قابو ہو کے رک جاتی۔ کسی درخت کھمبے یا ... گاڑی سے ٹکرا کے گاڑی الٹ بھی سکتی تھی اور فٹ پاتھ پر دو چار پیدل چلنے والوں کو بھی کچل سکتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ دونوں اناڑی بدمعاش گولی چلا دیتے تو وہ گولیاں نہ جانے کس کا رخ کرتیں۔ گاڑی میں یا مجھ میں۔ ایسا خطرناک قدم اٹھانے کی ضرورت کوئی نہیں تھی۔
گاڑی نے دائیں جانب ایک موڑ کاٹا۔ وقت اور فاصلہ ... کرتے ہوئے میں نے طے کیا کہ پہلا موڑ تقریباً دو منٹ بعد آیا ہے۔ اب میں نے سیکنڈ شمار کرنے کے ... دستی بم پھینکنے والے پن نکالنے کے بعد گھڑی دیکھے بغیر سیکنڈ اسی طرح شمار کرتے ہیں۔ میں نے زیر لب کہا۔ ایک ہزار۔ دو ہزار۔ تین ہزار۔ چار ہزار۔ پانچ ہزار۔ یعنی پانچ سیکنڈ کے وقفے گزرے۔ میں نے پیچھے بندھے ہوئے ہاتھوں کی انگلیوں پر حساب رکھا۔ ایک وقفہ میں پندرہ وقفے گزرے ... یا تین ہوئے یعنی سوا منٹ۔ گاڑی نے پھر دائیں طرف ... رفتار کو تیس میل کے اندر رکھتے ہوئے یہ فاصلہ کوئی ایک میل ... تھوڑا سا زیادہ یا کم۔ میں پھر وقت کے حساب میں مصروف ہوا۔ پانچ سیکنڈ کے چند ہی وقفے کے دوران میں گاڑی نے ... دایاں موڑ کاٹا۔ طے شدہ فاصلہ تقریباً نصف گویا آدھا میل یعنی چار فرلانگ کے درمیان۔ اگر پہلا موڑ بھی تین چار فرلانگ کے بعد تو میں تصور کی مدد سے طے کر سکتا تھا کہ ہم ایک ایسی مستطیل کا چار اضلاع طے کر چکے ہیں جس کے دو ضلعے دو تین فرلانگ ... باقی دو ایک میل کے ہوں۔ تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم ہوٹل ... گرد چاروں طرف گھوم کر پھر وہیں پہنچ رہے ہیں۔ اس خیال ... اس وقت ہو گئی جب دو منٹ بعد گاڑی پھر رک گئی۔ ... آوازوں پر غور کیا۔ ایک گنڈیری بیچنے والے کی صدا پر میرا دل زور سے دھڑکا۔ جب میں چھوٹا تھا تو یہی صدا آتی تھی "تے مٹھیاں تے رنگ والیاں"۔ اور یہ گنگناتی آواز اسی سڑک پر ... میرا دل مسرت سے معمور ہو گیا تھا کہ آنکھیں بند ہونے کے باوجود میں نے سب دیکھ لیا تھا۔ یہ ان کا مجھ پر اعتماد تھا یا ... حد تک بے خوفی کا مظاہرہ۔ لیکن وہ رقم وصول کرنے کے بعد ... دنیا سے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ اور شاید اس کے ... بخیر و عافیت لوٹ آنے کی صورت میں وہ مجھے کچھ ...

... چھوڑ دیتے۔
میں نے مطمئن ہو کر انتظار کا وقت کاٹنے کے لیے پھر ایک ... کی گردان شروع کی لیکن بہت جلد اس سے اکتا گیا۔ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ دل کی تقویت کے لیے یہی احساس بہت تھا کہ میں اپنے ٹھکانے کے بہت قریب ہوں۔ رابعہ اگر کچھ کرنا چاہے تو اسے دور نہیں جانا پڑے گا۔ دیکھنا یہ تھا کہ کیا واقعی وہ کچھ کر سکے گی؟ میرے ساتھی اپنی طرف سے مجھے تاریکی میں رکھ کے مطمئن بیٹھے ہوئے تھے اور میرے رویے نے ایک طرف ان پر اپنی ذات کا اعتماد متزلزل کر دیا تھا تو دوسری طرف مجھ پر ان کا اعتماد جائز ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے کسی قسم کی جھوٹ آرائی نہیں کی تھی۔ ڈکیتی اور بدمعاش کے سلسلے میں ... معلومات فراہم کی تھیں اور قابل قدر ہدایات دی تھیں چنانچہ میں ان کا استاد ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے گرفتاری کے لیے اب انھوں نے کتنی بچکانہ حرکت کی تھی اور خدانخواستہ اگر وہ مجھے بیچ دیتے تو اپنی سلامتی کو گروی رکھ دیتے۔ ایک طرف پولیس سے دس ہزار وصول کرنا شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا ہی جاتا تو دوسری طرف میرے جیسے نامی گرامی بدمعاش کے شاگرد ان عزیز ... بنے ہوتے۔ میرے لیکچر سے ان کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور انھوں نے اپنی غلطی کو محسوس کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں نے ایک بہت بڑے بدمعاش ... جیسے کرنے والوں کو دھمکی نہیں دی۔ ان کی تحقیق نہیں کی اور ان کے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے ... پندرہ ہزار روپے کا انعام دے دیا۔ وہ بہت فائدے میں رہے۔ پھر زیادہ کی ... کے لیے بھی ایک سرپرست کی حمایت کے امکانات پیدا ہو گئے۔ وہ چھوٹے بدمعاش تھے۔ ... مجھ سے پندرہ ہزار بھی کیوں لیتے۔ ڈکیتی میں بیس پچیس لاکھ کی امید رکھنے والے ... کر گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ اب ڈکیتی ان کو مشکل نظر آنے لگی تھی اور یہ پندرہ ہزار یقینی تھے۔
"کیا ہو گیا استاد گولی کو؟" میرے ساتھ والے نے کہا۔
"بیس منٹ سے زیادہ ہو گئے، یار ڈولی۔ ایسے کب تک ... آ جائے گا؟" دوسری طرف والے نے فوراً تائید کی۔
"آدھا گھنٹہ تو صبر کرو۔" آگے والے نے قائم مقام استاد کی حیثیت سے انھیں ڈانٹا جسے ڈولی کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔
"فرض کرو آدھے گھنٹے بعد بھی استاد نہ آیا؟" دائیں ہاتھ والا زیادہ مضطرب تھا۔
"پھر دیکھیں گے ابھی تو ہمارے پاس ہے۔" ڈولی نے ٹالنے کے انداز میں کہا لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سوال کا جواب دینے ... خود ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا ہے۔ میرا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ بیس منٹ بہت ہوتے ہیں۔ رابعہ کے پاس جا کے آنے میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگ سکتے تھے۔ پانچ منٹ اس کے لیے رکھ لیے جاتے کہ رابعہ نے سوال جواب کیے ہوں اور رقم شماری کی ہو۔ تب بھی پندرہ منٹ میں استاد گولی کو آ جانا چاہیے تھا۔ مگر اس کا امکان کم تھا کہ رقم وصول کرنے کے بعد استاد گولی خود کو محفوظ رکھنے کی نیت سے رابعہ کو ناک آؤٹ کر کے یا باندھ کے ڈال آتے لیکن اس کا انحصار رابعہ کے رویے پر بھی تھا۔ اگر اس نے راست اقدام کرنا چاہا تو استاد گولی بہر حال مرد ہے اور مسلح ہے۔ وہ آسانی سے گرفتاری قبول نہیں کرے گا۔ رفتہ رفتہ میرے ذہن میں بھی اس پریشان کن خیال نے فساد پھیلانا شروع کیا۔ رابعہ ذہنی انتشار اور جذباتی بحران کا شکار ہو گی۔ اچانک میری تحریر دیکھ کر وہ مضطرب ہو گئی تو کیا کرے گی؟ پیغام لانے والے پر حملہ کر دے گی۔ اس کے کپڑے پھاڑ دے گی، بال نوچ لے گی اور اس کی آنکھیں نکالنے کی کوشش کرے گی۔ چیخ چیخ کے پوچھے گی کہ بتا سکندر کہاں ہے؟ لیکن رابعہ اتنے کمزور اعصاب کی مالک نہیں ہے۔ وہ خود اغوا ہو چکی ہے۔ دشمنوں کی قید میں جسمانی عذاب جھیل چکی ہے۔ ماں کی موت کے بعد گھر کی تباہی کا صدمہ اٹھا چکی ہے اور ہر صدمہ برداشت کرنے کی اہل ہے۔
"پونٹ، کیا میں جا کے دیکھوں؟" دائیں ہاتھ والے نے کہا۔
"ڈولی سے پوچھو۔" دائیں ہاتھ والے نے بے چینی اور ناگواری سے کہا۔ مجھے ان ناموں پر ہنسی آ گئی۔ استاد محترم گولی تھے تو شاگردوں میں سے ایک پونٹ تھا اور دوسرا ڈولی۔ اس سے ان سب کا موڈ پکنک ہونا ثابت ہوتا تھا۔ یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ ان سب کے موجودہ نام ماں باپ کے دیے ہوئے نہیں ہو سکتے۔ غالباً یہ گیراج میں استاد گولی کے عطا کردہ تخلص تھے۔ آگے والا ڈولی تھا۔ دائیں ہاتھ والا پونٹ۔ اب اُلٹے ہاتھ کی طرف پپو یا گیزر ہو تو کچھ عجب نہیں لیکن بعد میں وہ پاپا ثابت ہوا۔
"اب تو آدھا گھنٹہ ہو گیا ڈولی۔" پونٹ نے زیادہ بے قرار لہجے میں کہا۔
"تو میں کیا کروں؟" ڈولی برہم ہو گیا۔ "مجھے وقت تمھیں دے کر گیا تھا استاد گولی کہ اتنی دیر انتظار کرنا۔"
"پھر کیا ہم ساری رات انتظار کرتے رہیں گے؟" بائیں ہاتھ والے نے کہا۔
"مجھے اس میں کوئی چال نظر آتی ہے۔" پونٹ بولا۔
"اس نے بتا دیا تھا کہ وہ عورت بہت خطرناک ہے۔" بائیں ہاتھ والے نے تشویش سے کہا۔
"یار پاپے، یہ سب کچھ مجھے معلوم ہے۔ لیکن تم بتاؤ میں کیا کروں؟" ڈولی نے بے بسی سے کہا۔ "اس سے کیوں نہیں پوچھتے جو تمھارے ساتھ بیٹھا ہے۔ چال ہو گی تو اسی کی..."

www.paksociety.com

"میں نے کوئی غلط چال نہیں چلی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہر طرح سے تمہارا دل کیا ہے؟"

"پھر دیر کیوں ہو رہی ہے؟" ڈولی نے کہا۔ "تو ہوگا بہت بڑا بدمعاش۔ لیکن استاد گولی کو کچھ ہوا تو ہم تیری لاش تیری بیوی کو بھیج دیں گے۔ کوئی --- ہمیں کچھ نہیں کر سکے گا۔" اس نے یکے بعد دیگرے ایک گالی فٹ کی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ان کی جھنجلاہٹ اور غصے میں اضافہ ہو رہا تھا اور خود میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کہیں رابعہ کو آزمائش میں ڈال کے میں نے حماقت تو نہیں کی۔ اگر وہ آسانی سے پندرہ ہزار گن دیتی تو استاد گولی اب تک لوٹ سکتا تھا۔ مگر رابعہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے کوئی جوابی کارروائی کی ہوگی۔ جوابی کارروائی کیا ہو سکتی ہے؟ ایک یہ کہ وہ استاد گولی کو میرے بدلے یرغمال بنالے۔ اور انتظار کرے کہ کوئی اسے چھڑانے کے لیے خود آئے یا فون کرے تو اس سے سودا کرے کہ سکندر کو لاؤ اور استاد گولی کو لے جاؤ۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والا معاملہ ہے۔ یا اس نے پندرہ ہزار دے کر ہوٹل کی انتظامیہ سے کہا ہو کہ اس شخص کو روک لیا جائے اور پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ الزام لگا دے کہ استاد گولی اس کے کمرے سے پندرہ ہزار روپے چرا کے جا رہا تھا لیکن رابعہ ایسا نہیں کرے گی۔ وہ جانتی ہے کہ میرے کیس میں پولیس سے بدلہ لینا مشکل ہے۔ اگر وہ مجھے اغوا کرنے والوں کے قبضے سے رہا کرانے میں کامیاب ہو گئی تو پولیس مجھے پکڑ لے گی اور میرا سامنا پھانسی کے پھندے سے ہوگا جو لٹکنے سے بدتر صورت ہوگی۔ نہیں، رابعہ ایسی حماقت نہیں کر سکتی۔ ایک آخری صورت یہ تھی کہ وہ اس کا تعاقب کرے۔ محسن ہوتا تو یہی کرتا لیکن رابعہ یہ کیسے کر سکتی ہے۔

"ڈولی! میں کہتا ہوں نکل چل۔" پانے نے اچانک کہا۔ "یہ کوئی گڑبڑ ہے۔"

ڈولی نے اسے گالی دی۔ "ایسے ہی بھاگ جائیں؟ استاد گولی کو چھوڑ کر؟"

"یہاں بیٹھ کے ہم استاد گولی کے لیے کون سی توپ چلا دیں گے؟" بونٹ نے تیز لہجے میں کہا۔

"تم میں ہمت ہے تو جا کے دیکھو۔ مگر ہم بتا دیتے ہیں کہ تیرا بھی صرف دس منٹ انتظار کریں گے۔" پانا بولا۔

"اور خود میں ہمت نہیں ہے تو چل۔ یہاں کھڑے رہے تو ہم بھی پکڑے جائیں گے۔" بونٹ نے کہا۔

"آدمی ہمارے پاس ہے۔" پانا بولا۔ "خود باہر ہوں گے تو استاد گولی کے لیے کچھ کر سکیں گے۔ اس کی بیوی سے بات کریں گے کہ شوہر چاہیے تو گولی دے جاؤ۔"

"ابھی پہنچے جا رہے ہیں..." اس نے دونوں کو غصے سے گھورا۔ "استاد گولی نہ آیا تو ہماری بھی خیر نہیں۔ وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اور اس کو مار کے بھی تم کو کیا ملے گا؟ وہ دوسرے ڈھونڈ لیں گے۔ بیوی بچوں سمیت چھپتے پھرو گے۔ ساری غلطی میری ہے کہ اس کی باتوں میں آ گیا۔"

"ڈولی! ابھی پانچ منٹ اور دوں گا۔" بونٹ نے کہا۔ "پھر مجھے جانا پڑے گا۔"

ڈولی نے اس کے لہجے کی خطرناک دھمکی کو محسوس کیا اور "پھر مجھ ہی سے بات منوانی؟"

"تیرا تو باپ بھی چلے گا۔" بونٹ نے ریوالور سر کی طرف کر کے کہا۔ وہ شاید ڈولی پر اسے تان چکا تھا۔ پانے نے بھی ریوالور نکال لیا تھا۔ ان دونوں کو بغاوت پر آمادہ دیکھ کر ڈولی خونخوار نظروں سے انھیں گھورنے کے سوا کچھ نہ کر سکا کیونکہ وہ مسلح تھے اور پیچھے بیٹھے تھے۔ وہ خود بھی کشمکش و تذبذب میں مبتلا ہو گیا تھا اور ذاتی سلامتی کے راستے پر کھڑا سوچ رہا تھا۔ وہ سب اندر سے ڈرے ہوئے تھے۔ ان کے جذبات میں شدت آتی جا رہی تھی۔

ابھی پانچ منٹ پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ڈولی کو سوچ میں جانے کیا آئی۔ انجن تھوڑا سا غرایا اور پھر گاڑی آہستہ آہستہ روانہ ہو کر سیدھی چلتی گئی۔ پھر سڑک کے نزدیک گئی۔

"اس سے پوچھو استاد کیوں نہیں آیا۔" ڈولی نے کہا۔ کسی نے میرے سر پر مکا مارا۔

"میں... میں تو تمھارے ساتھ ہی ہوں۔ جتنا تم جانتے ہو اتنا ہی میں بھی بتا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے غیب تو ہے نہیں۔ کیا معلوم کیا ہوا ہے؟"

اس مرتبہ بونٹ نے میرے پیٹ میں مکا مارا۔ "بتا وہاں کیا ہوا ہوگا؟"

"تو نے اس پیغام کے بہانے کچھ اور لکھا تھا؟ اپنے دونوں ساتھیوں کی طرح تُو بھی بازی میں شریک ہے۔"

"اس... اس میں کیا تھا...؟" میں نے کراہ کے کہا۔ "دیکھا تھا۔ تمھیں ایسی کوئی بات؟"

"کوئی بات ضرور ہوگی۔ کوئی خفیہ اشارہ ہوگا۔" ڈولی نے کہا۔ "جسے وہ عورت سمجھتی ہوگی۔"

"میرے متعلق تم جو چاہو کہو۔" میں نے کراہ کے کہا۔ "اس کے متعلق بات کرتے وقت زبان کو قابو میں رکھو۔ میں اب تمہاری مدد کر رہا ہوں اور میں نے تمہیں کسی مزاحمت

چاہیے تھا۔ وعدہ بھی اس لیے کر لیا تھا کہ تم کنگال ہو۔ بہت گھٹیا درجے کے بدمعاش ہو جن کو بدمعاش کہنا بھی بدمعاشی کی توہین ہے۔ تم شہدے اور لفنگے ہو۔ اچھا ہوتا اگر تم جلتے اور پکڑے جاتے۔ اس مار پیٹ سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ کسی کو باندھ کے مارنا کوئی بہادری نہیں ہے لیکن کسی بہادر آدمی کو مارنے کے بعد نتائج کا مقابلہ کرنے کی جرأت ہونی چاہیے۔ میں تو اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں اور وہ عورت جو میری بیوی ہے یہ بات جانتے ہوئے بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ جو شخص گیارہ قتل کر چکا ہو وہ تو پھانسی کے پھندے کو بالکل اہمیت نہیں دیتا۔ تم نے کبھی قتل کیا ہے؟ پھانسی چڑھنے کی جرأت ہے؟ تمھاری بیویاں تمھارے ساتھ سولی چڑھ سکتی ہیں؟"

ان سب کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ ذہنی طور پر بزدل تھے۔ میرے پُراعتماد لہجے نے ان کے حوصلے کو بالکل پست کر دیا۔ انھیں محسوس ہوا کہ وہ پہاڑ کے دامن میں پڑے ہوئے کنکر ہیں۔ ان کے مقابل گیارہ قتل کرنے والا، چوری ڈکیتی اور ہر قسم کے جرائم میں ملوث ایک مفرور اشتہاری مجرم تھا۔ وہ خود دلیر بھی نہیں تھے۔ اپنی بیویوں کا تصور کر کے ان کی حالت غیر ہو گئی۔ انھیں یقیناً میری بیوی پر رشک آیا ہوگا۔

"یہاں سے چلو۔" میں نے کہا۔ "پھر دیکھتے ہیں اب کیا قدم اٹھایا جائے۔ مجھ پر اعتماد کرو۔ جب ہم زبان دیتے ہیں تو اس پر قائم بھی رہتے ہیں۔ دھوکا دے کر نہیں مارتے۔ میں اسے فون کرتا ہوں۔"

"تمھارا دماغ خراب ہے۔" ڈولی نے کہا۔ "کہاں سے فون کرو گے اپنی بیوی کو؟ ہمارے پاس تو کوئی فون نہیں۔"

"پھر میں اس کے نام دوسرا پیغام دوں گا۔" میں نے کہا۔

ڈولی نے مجھے ایک اور گالی دی... "اب چاہتا ہے کہ دوسرا آدمی بھی جائے اور لوٹ کر نہ آئے۔ ایک ایک کر کے ہم سب جائیں اور پھنس جائیں۔" لیکن اس نے مجھے مکا نہیں مارا۔

"میں تم کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا۔" میں نے کہا۔ "پیغام رسانی کے دیگر ذرائع بھی ہیں میرے پاس۔ مثلاً میں وائرلیس پر بات کر سکتا ہوں۔ میری کلائی گھڑی دیکھی ہے تم نے؟ اس سے سگنل نشر ہوتا ہے۔"

مجبور ہونے کے باوجود اس بات نے ان کو یقین کرنے پر مجبور کر دیا کیونکہ جاسوسی قصے کہانیوں اور فلموں میں وہ جیمز بانڈ ٹائپ اور سپرمین جیسی حیرت انگیز ایجادات کے بارے میں دیکھ اور پڑھ چکے تھے اور یہ جانتے تھے کہ ترقی یافتہ ممالک میں مجرم اور پولیس دونوں ایسی چیزیں استعمال کرتے ہیں۔

"لیکن... وہ گھڑی تو استاد کے پاس تھی۔" ڈولی نے کہا۔

"استاد اپنے ساتھ تو نہیں لے گیا ہوگا۔" پانے نے کہا۔ "وہیں ہوگی۔"

"مگر استاد نے کہا تھا کہ لوٹ کر وہاں نہیں جانا ہے۔" بونٹ نے انھیں یاد دلایا۔

"اگر استاد واپس آتا تو ہم اسے وہاں ملتے جہاں اس نے کہا تھا۔" ڈولی نے کہا۔ "مگر وہ آیا ہی نہیں تو... پھر ہم وہیں چلتے ہیں۔"

گاڑی ایک مرتبہ پھر روانہ ہوئی۔ انتظار ختم ہو گیا تھا اور ان کے شک نے اب یقین کی صورت اختیار کر لی تھی کہ استاد گولی کسی مصیبت میں پڑ گیا ہے۔ ان کے یقین میں میرا یقین بھی شامل تھا مگر مجھے اس کی نوعیت کا اندازہ نہ تھا۔ بیس منٹ میں ہم پھر وہیں جا پہنچے جہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ مجھے اندر لے جا کر انھوں نے میری آنکھوں سے پٹی اتار دی۔ ڈولی اور بونٹ دو ریوالور لے کر میرے مقابل کھڑے ہو گئے اور پانے نے میرے ہاتھ پیر کھول دیے۔ میں نے ہاتھوں کی کلائیوں اور ٹخنوں کو رگڑا اور اطمینان سے دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ میں سگریٹ مانگنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ سب اس بری طرح چونکے جیسے دستک دینے والا پولیس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ ان کی گھبراہٹ اور چہرے پر خوف اور افراتفری اور چہروں پر اڑنے والی ہوائیاں دیکھ کر مجھے ہنسی آئی مگر میں ضبط کر گیا۔

"یہ... یہ کون آ گیا یہاں؟" ڈولی نے کہا۔ "استاد گولی؟"

"استاد تو یہاں نہیں آ سکتا۔" پانے نے کہا۔ "اور پھر اتنی جلدی؟"

"ہو سکتا ہے ہمیں روانہ ہوتے دیکھ کر وہ ٹیکسی لے کر چل پڑا ہو۔" بونٹ نے کہا۔ دستک پھر ہوئی۔

ڈولی نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی ہمارا تعاقب کرتا ہوا آیا ہے۔ میں اس کو نشانے پر رکھتا ہوں۔ تم دروازہ کھولو مگر ایک دروازے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو اور ریوالور ہاتھ میں رکھے۔"

بونٹ نے دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے لگ کر ریوالور سنبھال لیا۔ پانے نے دروازہ کھولنے سے پہلے کہا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں پانے... استاد گولی۔" باہر سے آواز آئی۔ ایک دم ان سب کے چہرے کھل اٹھے۔ مایوسی اور پریشانی کی جگہ مسرت نے لے لی اور وہ احتیاط کے سارے تقاضے بھول گئے۔ دروازہ کھلتے ہی ایک وجیہہ آدمی اندر آیا جو ہوٹل ملازمین کی وردی میں تھا۔ اس کے پیچھے رابعہ نمودار ہوئی جس نے ریوالور کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ سب اتنا حیرت سے منجمد ہو گئے۔ کیونکہ ویٹر کی وردی میں استاد گولی تھے۔ اب سمجھنے کے لیے مزید کسی مظاہرے کی

www.paksociety.com

تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے سر کے بل فرش پر قلابازی کھائی اور میرے دونوں پیر پوری قوت کے ساتھ پڑے۔ وہ پیچھے گرا اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ وہ پھر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میری ٹھوکر اس کے منہ پر پڑی۔ وہ بلبلایا مگر میں نے اسے مہلت نہ دی۔ پے در پے ٹھوکروں سے میں نے اسے نیم جان کر دیا۔

"میں گولی مار دوں گا۔" بونٹ چلایا۔

"مارو۔" رابعہ نے کہا۔ "تمہارے استاد کے دو ٹکڑے کر دوں گی میں۔ ریڑھ کی ہڈی توڑ دوں گی۔"

استاد گوگی کی حالت قابلِ دید تھی۔ ریوالور کی نوک اس کی کمر میں گڑ رہی تھی۔ اور وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈکی فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے اس کا ریوالور اٹھا لیا۔ رابعہ کو اپنی پناہ میں لے کر میں نے آگے قدم بڑھایا۔

"کیا خیال ہے اب؟" میں نے کہا۔ "پولیس کے پاس چلیں؟ کانے کی اولاد پانے دو سو ہزار مل جائیں گے تمہیں۔ تم کیا احمقوں کی طرح دیکھ رہے ہو بونٹ کے بچے۔ ریوالور نیچے ڈال دو۔ اور چلو سب لائن بنا لو۔"

بونٹ نے جان کی بازی لگا کے آخری کوشش کی اور ایک دم ریوالور اٹھا کے فائر کر دیا۔ لیکن اس کے ہاتھ کے حرکت میں آتے ہی میں ہوشیار ہو گیا تھا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے جست لگائی اور بونٹ کو دبوچ لیا۔ پلک جھپکتے میں سر سے اوپر اٹھایا اور پانچ فٹ پرے مارا۔ وہ دونوں ایک ساتھ دیوار سے ٹکرائے۔ اسی وقت استاد گوگی نے بھی ہمت کی اور بے بسی سے مارے جانے کے بجائے مقابلہ کر کے مرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اچانک پیچھے لات چلائی اور نیچے گر گیا۔ رابعہ نے گولی بعد میں چلائی۔ استاد گوگی کی لات رابعہ کے گھٹنے پر لگی تھی۔ وہ تھوڑا سا چلائی اور میں نے استاد گوگی کو اٹھ کے سنبھلتے دیکھا۔ "تم بہت جانباز رابعہ۔" میں نے چلا کر کہا۔ اس وقت میں یہ بھول گیا کہ مجھے اس کا نام نہیں لینا چاہیے تھا لیکن یہ بات کسی نے نوٹ نہیں کی۔ میں نے جست لگائی اور اڑتا ہوا گیا۔ فلائنگ کک اتنی زبردست تھی کہ استاد گوگی ایک دھماکے سے چت ہوا۔ پاپا اور بونٹ پھر ہمت کر کے کھڑے ہو گئے تھے لیکن اب میں آزاد تھا اور ایکشن کی فارم میں تھا۔ میں نے ان کو نمونے کے طور پر مارا کم بے دم زیادہ کیا۔ کراٹے کے وہ داؤ جو بے ضرر تھے انہیں ادھر سے ادھر گھمانے، اچھالنے اور الٹنے اور گھن چکر بنانے میں کام آئے۔ وہ تینوں ایسے پٹ رہے تھے جیسے وہ بچوں سے منہ زوری میں پٹ رہے تھے۔ ان کے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ جو شخص اس بے بسی کے ساتھ ان کا قیدی بنا رہا تھا وہ خالی ہاتھوں سے ان کی کیا درگت بنا سکتا تھا۔ دس منٹ بعد وہ سب ادھر ادھر پڑے تھے۔ ان میں سے کسی کی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ کسی کا خون نہیں بہا تھا اور کسی کا جوڑ نہیں ہلا تھا۔ مگر وہ بالکل بے جان فرش پر لیٹے ہانپ رہے تھے اور مجھے رحم کی التجا بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"چلو اٹھو سب... فوراً۔ میں تین تک گنوں گا۔" میں نے کہا۔ "دیوار سے لگ کر ہاتھ اوپر کر لو۔ ایک..."

وہ ہانپتے کانپتے اٹھے اور دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے ریوالور اب جیب میں رکھ لیا تھا۔

"استاد گوگی! کتنا پیسہ ملا؟" میں نے کہا۔ "دس ہزار کا چیک وہ نکالو۔"

استاد گوگی نے کانپتے ہوئے وردی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور براؤن رنگ کا ایک لفافہ مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اسے رابعہ کی طرف اچھال دیا۔ "ایک گولی کتنے کی آتی ہے؟" میں نے کہا۔ "اسلام ریوالور کی گولی جو تمہاری جان لے گی۔ تم نے کبھی سوچا تھا کہ ایک سی گولی قیمت میں تمہاری جان کے برابر ہو سکتی ہے؟ گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ تمہاری شامت آئی تھی کہ تم نے ہوٹل شاداں کا رخ کیا۔ اور موت آئی تھی کہ مجھ پر ہاتھ ڈالا۔" میں نے اس کے گال پر دو طمانچے رسید کیے۔ "کتنے لوگوں کے آوارہ کتے بنا کے بھونکنے لگے تھے۔ میرے ہاتھ پاؤں باندھ کے گولی مارنے کی دھمکی دیتے تھے مجھے! بہت آگے بڑھ گیا۔" اور یہ سب جانا تھا۔ "انھوں نے مجھے ہوا دیکھا تو اندر بازو آزمانے لگے۔" میں نے چند رسید کیے، وہ بلبلا کے نیچے گر گئے لیکن میں نے ان کو پھر کھڑا کیا۔ ان کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

"پرنسس! ان کی جیب میں جو کچھ ہے سب نکال لو۔" میں نے کہا اور رابعہ نے آگے بڑھ کے ایک ایک کی جیب خالی کرنی شروع کی۔ مجموعی طور پر ان کی جیبوں سے تیرہ سو روپے نکلے۔ لیکن زیادہ وہ کاغذات تھے جن سے ان کے نام پتے اور ان کے متعلق دوسری معلومات حاصل ہوتی تھیں۔

"تم لوگوں سے کیا کہا تھا میں نے؟" میں نے کہا۔ "اگر میری بیوی کو صورت بھوکے گدھ اور ناقص العقل فرض کر لیتے اور پھر اسی طرح مارے جاتے ہیں جیسے تم لوگ مارے گئے؟"

رابعہ نے مجھے گھور کے دیکھا اور میں بے اختیار ہنس دیا۔ بات ہم دونوں کے سوا کوئی بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ان کے خیال پر کامیابی اور غرور کی ہنسی تھی جب کہ میں رابعہ کے گھورنے پر ... رابعہ پر میرے فخر کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ "اوئے گینڈے کے بچو! ہم کو تشدد پسند ... کے انتقام سے ڈرو۔" میں نے کہا۔ "جو بھول میں سے کسی کی بیوی کا ایسی؟ یہ تو اکیلی ہی کافی تھی تمہیں۔" کچھ میں کہہ رہا تھا وہ ایک بے پایاں مسرت کا رد عمل تھا کیونکہ میری توقعات سے کہیں بڑھ کے ذہین، حاضر دماغ اور جرات مند ثابت ہوئی تھی۔ میں نے تو اس کے لیے آزمائش کو بہت سخت جانا تھا۔ مگر اس نے خود کو میری رفاقت کا اہل ثابت کر دیا تھا۔ اس نے تو مجھے بھی شرمندہ کر دیا تھا۔

"میرا خیال ہے اب انھیں معاف کر دو۔" رابعہ نے کہا۔ "بہت سزا مل گئی۔ آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کریں گے۔"

"کیسی غلطی، ڈارلنگ؟" میں نے پہلی بار رابعہ کے لیے یہ لفظ استعمال کیا۔

"یہی اپنی اوقات فراموش نہ کرنے کی۔" رابعہ نے کہا۔

"اچھا۔ تم کہتی ہو تو معاف کر دیتے ہیں۔" میں نے دریا دل شہزادے کی طرح کہا۔ "دے دو ان کے پیسے انھیں۔"

رابعہ نے براؤن لفافہ آگے بڑھایا۔ وہ سب ساکت و صامت کھڑے ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ کسی نے ہاتھ بڑھا کے لفافہ پکڑنے کی جرات نہیں کی۔ وہ کیسے یقین کر سکتے تھے کہ اتنی پٹائی کے بعد انھیں یہ انعام ملے گا۔ ان کے دل میں تو یہی خیال آیا ہوگا کہ ہم پھر کوئی چال چل رہے ہیں یا مذاق کر رہے ہیں۔ اور کسی نے ہاتھ بڑھایا تو اور پٹے گا۔

"لے لو۔" میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "تمہیں ضرورت ہے۔ پرنسس! لفافہ نیچے رکھ دو۔"

رابعہ نے لفافہ نیچے رکھا اور میرے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ وہ اسی طرح بت بنے کھڑے رہے۔

"آئندہ بھی کبھی پیسے کی ضرورت پڑے تو آ جانا۔" میں نے کہا۔ "آخر میں آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کل کسی کام کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔"

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کیا اس بات کا مطلب یہ نکالا جا سکتا تھا کہ میں ان کو اپنے 'گروہ' میں شرکت کی دعوت دے رہا تھا۔ اس بات کے تو وہ قائل ہو چکے تھے کہ لاہور کا سب سے بڑا اور خطرناک ترین بدمعاش میں ہوں۔ میری دہشت ان کے دلوں میں بیٹھ چکی تھی اور میں انھیں اپنے مقاصد کی خاطر استعمال کرنے کی سوچ رہا تھا۔

"جو ہمارے کام آئے وہ نقصان میں نہیں رہتا۔" میں نے بدمعاشوں کے پُرغرور لہجے میں کہا۔ "جیسے ہم سے ٹکرانے والا نقصان میں رہتا۔ جتنا پیسہ ضرورت پڑے گی ملے گا اور ہم حفاظت بھی کریں گے۔ تم سب کے نام پتے ہم ساتھ لے جا رہے ہیں۔ ویسے بھی ایک بار شکل دیکھ کے ہم آدمی کو ایسے نکال لیتے ہیں جیسے کنویں میں ڈوبا ہوا ڈول۔ یہ جگہ بھی دیکھ لی ہے ہم نے۔ پرنسس! تم چل کے اپنی گاڑی میں بیٹھو۔ میں آتا ہوں۔"

پرنسس کے سامنے میں یہ وردی نہیں مانگ سکتا تھا۔ میں نے استاد گوگی سے کہا۔ "یہ ہوٹل شاداں کی ہے اور ہم جہاں سے ... وہاں کی کوئی چیز نہیں اٹھاتے۔"

"لیکن... میں...!" استاد نے بمشکل تمام تھوک نگل کے کہا۔

"تمہارے ساتھ تین آدمی اور ہیں۔" میں نے کہا۔ "کچھ نہ کچھ لا دیں گے تمہیں۔ یہاں کون دیکھنے والا ہے اپنوں کے سوا۔"

جب استاد محترم نے شاگردانِ عزیز کے سامنے وردی میرے حوالے کی تو ان کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ بلاشبہ زمین پھٹ جاتی تو وہ اس میں سمانا پسند فرماتے۔ پہلے ہی ان کی کیا خاطر تواضع ہوئی تھی کہ چلتے چلتے میں نے ان کی عزت بھی اتار لی۔ وہ ایک کونے میں دبک کر اور منہ چھپا کے بیٹھ گیا۔

"میری بیوی کو جو اقرار کس نے کہا تھا؟" میں نے وردی کو سمیٹ کر گولا سا بنا لیا۔ "تم نے؟" میں نے ڈکی کو ... جو اب ... بیٹھا تھا۔ "باہر جاؤ۔ گاڑی میں پرنسس بیٹھی ہیں۔ ان سے کہو کہ میں ... کہنے کی معافی مانگتا ہوں۔ میں خود کتا ہوں۔"

یہ بہت سخت سزا تھی۔ ڈکی جیسے مرد کو جو خود کو بدمعاش سمجھتا تھا، ایک عورت کے سامنے حاضر ہو کے معافی ہی نہیں مانگنی تھی بلکہ اپنے آپ کو کتا بھی کہنا تھا۔ خود اپنی تذلیل اس حد تک کرنا بہت مشکل کام تھا۔ چنانچہ وہ بیٹھا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے بالوں سے پکڑا اور سیدھا کھڑا کر دیا۔ "جاتے ہو یا میں دوسرے طریقے سے لے جاؤں۔ کتے کی طرح گلے میں پٹا ڈال کے گھسیٹتا ہوا۔" میں نے وردی ... میں سے چمڑے کی بیلٹ نکالی اور اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔ وہ یوں آگے بڑھا جیسے پھانسی کے تختے کی طرف بڑھ رہا ہو۔

"استاد! جا کے معافی مانگ لوں۔ ورنہ مجھے پرنسس سے تصدیق کے لیے آنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی لیکن اسے مرعوب اور دہشت زدہ رکھنے اور نفسیاتی طور پر مزاحمت کے ناقابل بنانے کے لیے یہ سب ضروری تھا۔ وہ گیا اور پھر ... یوں بکھرا ہوا گیا جیسے اپنے باپ کو دفنا کے آیا ہو۔

"اب ہم جا رہے ہیں۔" میں نے ... کہا۔ "تمہاری گاڑی کے ... ہم ساتھ لے جائیں گے۔ شور مچانے کی تمہیں اجازت ہے۔ سب سے پہلے تمہاری مدد کے لیے ہم ہی آئیں گے۔"

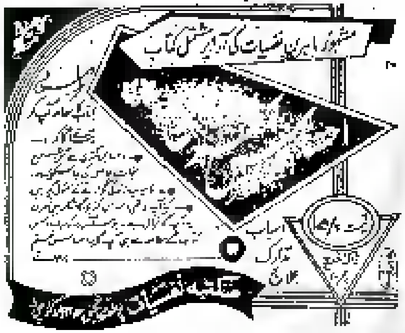

www.paksociety.com

جب ہم اس گیرج سے دور نکل آئے تو مجھ پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ میں اتنا ہنسا کہ میرے آنسو نکل آئے۔ اور رابعہ نے بھی جو گاڑی چلا رہی تھی ہنستے ہنستے کہا۔ "خدا کے لیے بس کرو۔ گاڑی تو الٹ جائے گی۔" لیکن میں ہنستا رہا۔ اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ بازار تو بند تھے لیکن میں نے سنیک پر اصرار کیا تھا۔ اور گاڑی لاہور ہوٹل کی طرف مڑ گئی۔

"عاشقی جیسی دُردِ سر ایسے فرشتے؟" میں نے کہا۔ "تم نے تو اس وقت وہ کمال کر دکھایا ہے کہ میرا جی چاہتا ہے..."

"کیا جی چاہتا ہے؟" رابعہ نے ہنستے ہنستے روانی میں پوچھ لیا۔

"بس چھوڑو۔ جو دل چاہتا ہے اس کا اظہار نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔ "سفر کے قوانین بہت سخت ہیں۔"

"بدتمیزی نہیں چلے گی جی۔" رابعہ نے مصنوعی غصے سے کہا۔ لیکن میری طرف دیکھا نہیں۔ چشمِ تصور سے میں نے اس کا حیا آلود چہرہ دیکھا۔

"دل کے جذبات کا اظہار کرنا بدتمیزی ہے یا جبر کرنا؟" میں نے کہا۔ "چلو یوں کرو کہ تم آج لاہور ہوٹل میں ٹھہر جاؤ۔"

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟" رابعہ نے میری بات کا بالکل مختلف مطلب نکال کے کہا۔

"نہیں۔ بقائمی ہوش و حواس یہ بات کہہ رہا ہوں۔" میں نے ہنستے ہنستے کہا۔ "لاہور ہوٹل کا یہ مطلب نہیں کہ جیسے ہی کمرے میں جاؤ... وہاں اور بھی کمرے ہیں۔ اور پھر نہ ہوں تو کیا۔ کوئی ڈبل سویٹ مل سکتا ہے کہ جس میں ہم ایک رات تو گزار سکتے ہیں۔ چار دیواری میں شرافت کی وہی دیوار حائل رہے گی جناب ہم نہ رہیں گے۔ کیا میں شریف آدمی نہیں ہوں؟"

"او ہوں۔ تم نے ابھی خود کو سب سے بڑا بدمعاش ثابت کیا ہے۔" وہ شرارت سے بولی۔

"خطرے کی بات تو نہیں۔ لیکن احتیاط بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "آج کی رات تم ذاتی ہوٹل نہ جاؤ کیونکہ وہاں محسن بھی نہیں ہے۔ میں اپنے ہوٹل سے تمہارے ہوٹل ٹیلی فون کر دیتا ہوں کہ کوئی مہمان آئے تو نام پتہ لے لیا جائے اور پیغام آئے تو لاہور ہوٹل میں ڈاکٹر امجد کو دے دیا جائے۔ محسن کی کال آئی تھی۔"

"آئی ہو گی تو ریسیو کرنے والا کوئی نہیں تھا۔" رابعہ نے کہا۔

گاڑی اس نے لاہور ہوٹل کے باہر روک دی اور میں اس کے ساتھ ریزرویشن آفس تک گیا۔

"ڈاکٹر امجد کے نام کوئی پیغام؟" میں نے کہا۔ "کسی ملاقاتی کا یا..."

"ایک فون آیا تھا اسلام آباد سے۔" کاؤنٹر کلرک نے ایک خانے میں سے کاغذ کا پرزہ اٹھایا۔ "بس یہی بات کر کے گئے۔ کوئی نواب نصیر خان صاحب تھے۔" اس نے لہجے کی [illegible]

"میری واقفیت کچھ ہی لندن سے ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اپنا کمرہ بدلنا ہے۔ کوئی ڈبل سویٹ مل سکتا ہے؟"

"یور آنر کل سہ پہر ہی کچھ دیر پہلے ایک ایئر کنڈیشنڈ سویٹ خالی ہوا ہے۔" بکنگ کلرک نے رجسٹر دیکھ کے کہا۔ "اس کے چارجز کچھ زیادہ ہیں... مگر وہ ہمارا سب سے اچھا سویٹ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پورٹر سے کہو میرا سامان شفٹ کر دے۔" میں نے کہا اور مجھ سے پہلے رابعہ نے ہینڈ بیگ سے دو ہزار روپے نکال کر بکنگ کلرک کے سامنے ڈال دیے۔ سامان شفٹ ہونے میں دس منٹ بھی نہیں لگے۔ یہ سویٹ واقعی شاندار تھا۔ اس میں کنگ سائز بیڈ کے علاوہ ایک کمرہ ملاقاتیوں کے لیے تھا جس میں ایک صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا اور ایک سینٹر ٹیبل۔ اس میں چار افراد کے لیے کھانے کی گول میز تھی۔ فرش پر دبیز قالین کا کارپٹ تھا اور بیڈ سائیڈ پر ایک چھوٹا سا ریفریجریٹر بھی موجود تھا۔ جتنی دیر میں میں نے غسل کیا رابعہ نے کافی اور سینڈوچ منگوا لیے۔ شاندار باتھ روم میں گرم اور ٹھنڈے پانی کی لائن تھی۔ اور اس وقت گرم پانی سے غسل ایک نعمت ثابت ہوا جس نے میری ساری تھکن دور کر دی۔ رابعہ نے صرف ہاتھ منہ دھونے پر اکتفا کیا۔

"کیا بدبختی کی انتہا ہے۔" میں نے کہا۔ "سوچا یہ تھا کہ آج ہو گیا۔ ایسا خوبصورت پروگرام بنایا تھا کہ رات کا کھانا تمہارے ساتھ چاندنی لا فورج میں کھاؤں گا۔ کینڈل لائٹ ڈنر ہو گا جو ہماری [illegible] میں اور تم ہوں گے۔ اور اس کے بعد راوی میں بوٹنگ کریں گے پار کی بارہ دری تک۔ قسمت کہاں لے گئی۔ ایک گیرج میں جہاں کھانے کو گالیاں ملیں اور تھپڑ ملے۔ ایک تو عشق کی مار۔ دوسری وردی والے کی مار۔ تیسری بھوک کی مار اور چوتھی استاد گولی [illegible] ڈکی اور پسنے کی مار۔"

رابعہ ہنسی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ویٹر نے ناک کیا اور اجازت ملتے ہی اندر آ گیا۔

"کھانا تو تم نے بھی نہیں کھایا ہو گا؟" میں نے ٹرے کو غور سے دیکھا۔ "یہ تو بہت کم ہے۔" پھر میں ویٹر سے مخاطب ہوا۔ "اتنا ہی اور لاؤ۔ ذرا جلدی۔ اس سے پہلے کہ یہ ختم ہو۔" ویٹر نے سر ہلایا اور غائب ہو گیا۔

"تم کو واقعی تو بہت بھوک لگی ہو گی۔ مجھے غائب پا کے" [illegible] نے سینڈوچ پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔ "سمجھا ہو گا کہ [illegible] محمل کا خیال ہے کہ [illegible] نکل گئے؟"

"نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ تم اپنی مرضی سے کہیں نہیں جاؤ گے۔"

وہ بولی اور ایک سینڈوچ اٹھا لیا۔

"بالکل ٹھیک سوچا تھا تم نے۔ بہ خدا فرشتہ اجل بھی آ جاتا تو مہلت مانگتا کہ ایک نظر اسے دیکھ تو لوں۔" میں نے کہا۔ رابعہ کے چہرے پر حیا کا رنگ بادل کے سائے کی طرح آیا اور گزر گیا۔ "میں بہت فکرمند ہو گئی تھی۔ کچھ دیر تو اس امید میں گزری کہ تم آ جاؤ گے۔ شاید سگریٹ وغیرہ لینے نکل گئے ہو کیونکہ چابیاں [illegible] تھیں۔ پندرہ منٹ بعد میں نے ادھر ادھر تلاش کیا۔ لوگوں سے پوچھا۔ یہاں کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا۔ اگر کسی نے زبردستی تم کو اغوا کیا ہو تو بھی ایک حادثہ کہلاتا۔ کوئی نہ کوئی مجھے بتا دیتا لیکن کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ دوسری جانب ایک شخص نے صرف اتنا کہا کہ حادثہ تو ہوا تھا۔ ایک سکوٹر والا کار سے ٹکرا گیا تھا شکر اللہ نے فضل کیا۔ کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی۔ میں آدھے گھنٹے تک پریشان رہی پھر یہاں لوٹ آئی۔"

"اور بستر پر لیٹ کر رونے لگی؟" میں نے کھاتے کھاتے لقمہ دیا۔ "ہوا تھا یہی کہ نہیں؟"

"جی نہیں۔" رابعہ جل کے بولی۔ "میں بہت خوش تھی چنانچہ بہت ہنسی اور پھر وہ گانا گانے لگی۔ تو کون سی بدلی میں میرے چاند ہے آ جا۔"

"اتنا پرانا! یہ تو غالباً تمہاری وہ... میرا مطلب ہے نانی دادی کے زمانے کا ہوگا تقسیم سے پہلے۔" میں نے کہا۔ "جیسے میرے ابا گاتے تھے۔ چل چل رے نوجوان۔ اور کیا تیری شان؟"

رابعہ ہنسی۔ "خیریت سے لوٹ آئے ہو تو کہتی ہو مجھ سے ہی۔ جب بتاؤ میری جو حالت ہوئی تھی اس کا اندازہ ہے؟"

وہ یکلخت سنجیدہ ہو گئی اور اس کی آواز بھرا گئی اور اس نے پلیٹ پرے رکھ دی۔ رنج والم کا وہ غبار جو اس کے دل میں چھپا تھا جیسے پھٹ پڑا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

"ارے پاگل۔" میں نے کھانا چھوڑ کے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "رو رہی ہو؟ اس وقت تو آئی محبت سے سامنے بٹھایا اور اب روتی ہو جب وقت گزر گیا ہے۔ خدا کی قسم رابعہ! میں اپنے دل کی [illegible] الفاظ میں وہ کیفیت کیسے بیان ہو سکتی ہے۔ میری نظر میں تم تھیں۔ تمہارا وجود جس کی آنکھیں منتظر تھیں۔ اس سے بڑا ظلم [illegible] کیا۔ اس [illegible] ساری [illegible] تھا تو میرے دل پر آرے چلنے لگتے تھے اور [illegible] آتا تھا۔ شکر ہے کہ [illegible] سامنا ہو [illegible] اگر ہم نے وہ لمحے [illegible] بیتے ہوتے تو ہمیں زیادہ خوشی ملتی [illegible] کی جدائی کے بعد پھر ملنے کی حاصل ہوتی ہے۔ یہ خوشی [illegible] ہے۔ یہ بات ہماری محبت پر ایک [illegible]

صداقت کی شہریت کر گئی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ نہ ایک دوسرے کے بغیر رہ سکتے ہیں اور نہ جی سکتے ہیں۔"

آہستہ آہستہ اس کے آنسو تھم گئے۔ پھر ویٹر دستک دے کر اندر آ گیا اور میں تھوڑا سا خفیف ہو کے اپنی جگہ جا بیٹھا۔ ویٹر نے مہذب ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے میاں بیوی کے "جھگڑے" کے متعلق اپنے تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن یہ ضرور کہا کہ ایک ٹرے کھانا کافی ہونے کے باوجود ہم نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔ وہ دوسری ٹرے رکھ کے نکل گیا تو میں نے رابعہ کو سینڈوچ پیش کیا۔ "رونے سے تمہارے دل کا اور آنکھوں کا غبار نکل گیا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "دھل کے رنگ اور نکھر گیا ہے۔ چشمِ بد دور۔ اب کچھ کھا لو اور سلسلہ وہیں سے شروع کرو جہاں سے اشکوں کے سیلاب نے توڑا تھا۔"

وہ شرمیلے انداز میں مسکرائی۔ "تم ان لوگوں کے نرغے میں کیسے پھنس گئے تھے؟"

"پھنس گیا تھا! وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ اب مجھے ہی دیکھو۔ کہاں چین سے لندن میں بیٹھا تھا۔ یہاں آ کے کہاں کہاں پھنس گیا۔" میں نے کہا۔ "کیوں اور کیسے کا جواب کوئی نہیں ہو سکتا۔ استاد گولی نے مجھے پہچان لیا تھا۔"

"میں نے بھی تمہاری تحریر پہچان لی تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "استاد گولی نے وہ ایک سطر کا پیغام پیش کیا تو میں نے سمجھ لیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔"

"اس میں تو گڑبڑ کا تذکرہ نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "کوئی ایسی ادا میں نہیں دیا تھا میں نے؟"

"اگر تم لکھتے کہ پندرہ ہزار دے دو۔" رابعہ بولی۔ "تو میں ٹھیک ٹھاک رکر تی۔ مگر اس میں تم نے لکھا تھا میری خاطر۔ اور یہی وہ لفظ غیر ضروری تھے جو مجھے کھٹکے۔"

"میرا پھر وہی دل چاہتا ہے بدتمیزی۔" میں نے کہا۔ "تم نے کمال ذہانت کا ثبوت دیا۔ یا میرے دل کی بات تمہارے دل نے سمجھ لی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا مقصد بھی اور کچھ نہیں تھا۔ ان کے سامنے میں کیسے لکھتا کہ میری جان خطرے میں ہے۔ پھر وہ پیغام لے کر آتے ہوئے ڈرتے۔ میں نے ان کو تسلی دی تھی کہ پولیس کا چکر چھوڑو۔ تم تو چکر میں آ جاؤ گے۔ جاؤ اور میری بیوی سے دس کے پندرہ لے لو۔" میں نے کھانا ختم کیا اور کافی کا کپ لے کر بستر پر لیٹ گیا۔

"اور بہت برا ہوا تھا جناب نے یہ دعوے کیے۔" وہ شرما کے ہنسی اور میرے پاس بیٹھ گئی۔

"پھر بھی ملیں گے کسی دن۔ دیکھ لینا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو دل پر [illegible] بیٹھے ہیں۔ اس نے [illegible] تم سے۔ کہ آپ کے وہ [illegible] رہے ہیں؟"

[illegible] ......

www.paksociety.com

اظہار کیا ہوتا تو وہ بھاگ جاتا۔ یا اپنی جان بچانے کے لیے میری جان لے لیتا۔ میں نے پیغام پر غور کیا اور اسے تشریف رکھنے کو کہا۔

اس سے پوچھا کہ سکندر صاحب خیریت سے تو ہیں۔ بولا، بالکل خیریت سے ہیں جی۔ بس وہ خود نہیں آسکتے تھے اس لیے مجھے بھیج دیا۔ میں نے کہا: تم دوست ہو ان کے؟ اور اس نے کہا: دوست کیا، خادم ہیں جی۔ پھر میں نے پوچھا: یہ پندرہ ہزار کس لیے منگوائے ہیں انھوں نے؟ اور وہ بولا کہ ہوگی کوئی ضرورت۔ مجھے نہیں بتائی انھوں نے۔ بس یہ کہا تھا کہ وہ کوئی سوال کیے بغیر دے دیں گی۔"

"وہ کون؟" میں نے شرارت سے کہا۔ گویا میری نو وارد کچھ نہ میں سمجھ گیا۔"

"اب تم شرافت سے نہیں سمجھو گے تو میں نہیں بولوں گی۔" وہ لال ہو کے بولی "یہ منہ اور مسور کی دال۔"

"مسور کی دال؟" میں نے حیرت سے پیار سے پوچھا۔ "منہ تو ٹھیک ہے۔ تم نے خود کو مسور کی دال کیسے سمجھ لیا؟ تم تو گھر کی مرغی ہو جو دال کے برابر ہوتی ہے۔ مگر دال کون سی ہوتی ہے۔ خدا کے سامنے طعام جاری رکھو۔"

"وہ کچھ ڈرا ہوا تھا۔" رابعہ نے میرا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے جتنی دیر میں پندرہ ہزار نکالے اور گنے اتنی دیر میں ترکیب میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے بڑی شرافت سے چائے کے لیے پوچھا اور اس کے انکار کے باوجود گھنٹی بجا دی۔ وہ نروس تو ہوا تھا لیکن ویٹر کے آتے ہی میں نے نوٹ اٹھا کے بغیر لیے فوراً جانے سے روکا تو استاد گولی کے ذہن سے خطرے کا خیال ہی نکل گیا۔ میں نے نوٹ گننے کا عمل ذرا سست رکھا۔ ویٹر چائے لے کر آ گیا تو میں نے استاد گولی سے کہا وہ چائے بنائے۔ اس نے ہو کے ریوالور صوفے پر اپنے قریب رکھا اور چائے بنانے لگا۔ میں نے ویٹر کو روکا اور [illegible] خالی چائے اٹھا لانے ہو کہاں بیٹھے ہو۔ تم ساتھ کچھ کھانے کے لیے لانا چاہیے۔ ویٹر شرمندہ ہوا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ استاد گولی نے اس کی طرف دیکھا اور اسے منع کر دیا۔ بس وہی ایک سیکنڈ تھا جب میں نے نوٹ پھینک کر جھپٹا مارا۔ اور ریوالور پر قبضہ کر لیا۔ وہ اور ویٹر دونوں حیرت سے بت بن گئے۔ استاد گولی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ عورت جو اتنی شرافت کا سلوک کر رہی ہے اور نوٹ گننے میں مصروف ہے پلک جھپکتے میں [illegible] بدل دے گی۔ میں نے کہا: 'اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ مجھے ریوالور چلانا نہیں آتا۔ کہو تو تمھارے کان کو اڑا دوں؟' اس کی حالت غیر ہوگئی لیکن اس سے زیادہ ویٹر کو پریشانی ہوئی۔ میں نے اسے دروازے سے دور ہو کے پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ پھر استاد گولی سے مخاطب ہو کے میں نے کہا: 'ویسے تو میں تم کو پولیس کے حوالے بھی کر سکتی ہوں اور ہوٹل والے خود یہ کام کر سکتے ہیں [illegible] سے خود نمٹنا چاہتی ہوں۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ سکندر تمھارے پاس کیسے پہنچا؟' اس نے بتا دیا۔ پھر میں نے کہا: 'اس وقت وہ کہاں ہے؟' استاد گولی نے جواب دینے میں تاخیر کی تو میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا کے نشانہ لیا اور کہا: 'میں کسی تذبذب کے بغیر [illegible] سے مار ڈالوں گی۔ میں اکیلی عورت ہوں اور تم ایک بدمعاش [illegible] میں مجھے لوٹنے کے لیے گھس آئے تھے۔ اس سے زیادہ سنگین الزامات بھی عائد کر سکتی ہوں میں اور ہوٹل والے میرے حق میں گواہی دینے پر مجبور ہوں گے۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔' ویٹر [illegible] کہ بیگم صاحب مجھے تو جانے دیں۔ میں نے اسے تسلی دی کہ وہ خاموش کھڑا رہے تو بالکل محفوظ رہے گا۔ استاد گولی نے بتایا کہ ایک گاڑی میں میرے ساتھیوں کے ساتھ باہر موجود ہے اور پندرہ ہزار لیتے ہی ہم نیچے جا کے اسے اتار دیں گے۔ میں نے کہا: 'اچھا! تو اٹھاؤ یہ پندرہ ہزار۔' اس نے پھر ایک امید میں پندرہ ہزار اٹھائے اور ایک لفافے میں ڈال لیے۔ میں نے ویٹر سے کہا کہ گھنٹی بجا کے منیجر صاحب کو بلاؤ اور کہو بہت خطرناک معاملہ ہے۔ کسی کو بتائے بغیر میرے کمرے میں آ جائیں۔' ویٹر نے تعمیل کی اور استاد گولی کو یقین ہو گیا کہ اب اس کا نکلنا محال ہے۔ اس لیے [illegible] پرنسس، تمھارے ... شوہر نے دھوکا کیا ہے اور تم سمجھتی ہو [illegible] طرح وہ بچ جائے گا۔ تم پندرہ ہزار تو پا لو گی لیکن اس کی جان نہیں بچا سکو گی۔ اگر میں واپس نہ گیا تو اسے کوئی نہیں چھوڑے گا۔' میں نے کہا: 'تم اور ہم ایک ساتھ واپس جائیں گے۔' [illegible] اتنی دیر میں منیجر آیا، اس نے دروازے سے اندر قدم رکھا [illegible]

ایک اجنبی کو ہینڈز اپ کرائے کھڑی ہوں اور وہ ویٹر بے حس و حرکت کھڑا ہے۔ میں نے انگریزی میں بات کی تو استاد گولی کی حالت قابل دید تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور وہ بول بھی نہیں سکتا تھا [illegible] اور وہ بڑی آسانی سے اپنے [illegible] ہوئے جال میں ایسا پھنسا تھا کہ نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی [illegible] سکتا تھا اور نہ فرار ہو سکتا تھا۔ میں نے منیجر سے کہا کہ [illegible] میرے شوہر ڈاکٹر امجد کو یرغمالی بنا لیا ہے۔ وہ لندن سے [illegible] اور کراچی سے لاہور پہنچے تھے۔ ایئرپورٹ پر ان بدمعاشوں نے انھیں ٹیکسی میں بٹھا لیا اور اب ان کا ایک آدمی مجھ سے پندرہ ہزار روپے وصول کرنے آیا تھا جسے میں نے قابو کر لیا ہے۔ منیجر سنتا رہا اور پھر بولا کہ میڈم کیا اس کیس میں خود کچھ کرنے کے بجائے پولیس کو طلب کرنا چاہیے۔ میں نے کہا: 'اگر کہیں پولیس بیچ میں آگئی تو میرے شوہر کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ ان لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ انھیں جان سے مار دیں گے۔' منیجر نے پوچھا تو کیا آپ پندرہ ہزار دینا چاہتی ہیں؟ اور میں نے کہا کہ پندرہ ہزار تو میں دے چکی ہوں۔ آپ دیکھیں اس کی جیب میں موجود ہیں۔ اور منیجر نے دیکھا تو رقم برآمد ہوگئی۔ 'پھر اب کیا کرنا چاہتی ہیں آپ؟' وہ بولا اور میں نے کہا: 'مجھے اپنے شوہر کو چھڑا کے لانا ہے اور اس کام میں آپ میری مدد کریں گے۔' اس نے کہا: 'مدد کیوں نہیں کروں گا میڈم، آپ حکم کریں۔' میں نے کہا: 'ڈاکٹر امجد نیچے ہوٹل کے قریب ہی کسی گاڑی میں اس شخص کے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گی اور انھیں ساتھ لے کر آؤں گی۔' منیجر نے کہا: 'یہ بہت خطرناک کام ہوگا میڈم۔' اور میں نے کہا: 'خطرہ تو مجھے مول لینا ہی پڑے گا ورنہ یہ بدمعاش پندرہ ہزار روپے لے گیا اور انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو مار دیا تو میں کیا کر لوں گی۔ ابھی تو میں اس کو گن پوائنٹ پر لے جاؤں گی۔ باہر میری گاڑی تک موجود ہے یا اسی میں جائے گا اور جب ڈاکٹر امجد کو چھوڑ دیا جائے گا تو میں اسے چھوڑ دوں گی۔ وہ لوگ بھی نیچے کسی گاڑی میں انتظار کر رہے ہیں لیکن نہ تو میں ان کی گاڑی پہچانتی ہوں نہ ان لوگوں کو۔' منیجر پریشان ہو گیا اور کہنے لگا۔ 'میڈم معلوم نہیں آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ یہی کام پولیس بھی کر سکتی ہے۔ بے شک آپ کی ہمت اور جرأت نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ آپ بہت غیر معمولی عورت ہیں کہ اپنے شوہر کی خاطر خود جان کی بازی لگا رہی ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ سب ضروری تو نہیں۔' میں نے کہا: 'منیجر صاحب، پولیس کو دیکھتے ہی انھوں نے میرے شوہر کو مار کے باہر پھینک دیا اور بھاگ گئے تو میں کیا کروں گی۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ کون ہیں اور انھوں نے ایسا کیوں کیا [illegible] لگتی نہیں اور یہ کام یقیناً بہت گھٹیا اور چھوٹے مجرموں کا ہے ورنہ وہ صرف پندرہ ہزار ہی کیوں مانگتے۔ پندرہ لاکھ مانگتے۔' منیجر نے کہا: 'اچھا جو آپ کہیں گی کروں گا لیکن بعد میں خدا کے لیے مجھے الزام مت دیجیے گا۔' میں نے کہا: 'آپ کچھ مت کریں اور کسی سے کوئی بات نہیں۔ آپ کا نام تک نہیں آئے گا اس کیس میں۔ بلکہ کسی کو معلوم تک نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر امجد کا [illegible] مجھے فراہم کر دیں۔' وہ اتنا حیران ہوا کہ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ میں نے وضاحت کی اور کہا: 'دیکھیے منیجر صاحب، یہاں سے کسی آدمی کے پیچھے ریوالور لے کر اور اسے ہینڈز اپ کرا کے نہیں جا سکتی۔ دس آدمی دیکھیں گے اور شک کریں گے۔ میں [illegible] جاؤں گی۔ اس کے سر پر میرا بریف کیس ہوگا جسے یہ دونوں ہاتھوں سے تھام کر رکھے گا جو نیچا اس کے دونوں ہاتھ تو خود ہی سر سے بلند ہوں گے۔ یہ آگے رہے گا اور میں دوپٹے کے نیچے ریوالور لے کر پیچھے چلتی جاؤں گی۔ یہ گاڑی تک جائے گا۔ سوٹ کیس ڈکی میں رکھے گا تو چوکیدار کو بھی شک نہیں ہوگا۔ آپ میرے ساتھ گیٹ تک چلیں تاکہ [illegible] کوئی شک نہ کرے۔ پھر یہ گاڑی ڈرائیو کر کے لے جائے گا اور میں اس کے پیچھے والی سیٹ پر ریوالور لے کے بیٹھوں گی۔ آپ کا کام اور آپ کی ذمہ داری ختم۔ بعد میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ نہ آپ نے کچھ دیکھا نہ سنا۔ کیا ہوا کیا نہیں ہوا آپ کو کچھ معلوم نہیں۔' منیجر نے تھوڑی سی بحث کی مگر میں نے اسے قائل کر لیا۔ پھر اسی ویٹر کو کہا گیا کہ وہ اپنی وردی اتارے اور استاد گولی کو دے۔ خود استاد گولی کے کپڑے پہنے اور کمرے میں اس وقت تک موجود رہے جب تک میں واپس نہ آ جاؤں۔"

"پھر تو وہ غریب ابھی تک کمرے میں ہی قید ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اور منیجر الگ پریشان ہوگا۔"

"استاد گولی کچھ پس و پیش کرنے لگا تو منیجر نے اس کے دو ہاتھ مارے اور کہا کہ خدا کا شکر ادا کرو جان بچا کے نکلنے کا موقع مل رہا ہے۔" رابعہ بولی، "ورنہ لاش جاتی یہاں سے۔ اس نے باتھ روم میں جا کے کپڑوں کا تبادلہ کیا۔ اور میں نے اسے پھر منیجر کے سامنے پندرہ ہزار دیے۔ منیجر گواہ ہے اور ضرورت پڑنے پر استاد گولی کو پہچان سکتا ہے۔ میں نے ضروری کاغذات اور کپڑوں والا سوٹ کیس استاد گولی کے سر پر اٹھوایا اور ویٹر سے کہا کہ وہ چاہے تو کمرے کو مقفل کر کے چلا جائے لیکن یہ نہ بھولے کہ آج جو کچھ اس نے دیکھا یا سنا وہ خواب تھا اور اس خواب کا وہ خواب میں بھی کسی سے تذکرہ نہ کرے۔ ہم یوں نکلے کہ آگے استاد گولی تھے، چند قدم پیچھے اور [illegible] بالکل پیچھے میں تھی جس کے ہاتھ نے ریوالور [illegible] گولی کی طرف رہے۔ یہ بات ان پر واضح کر دی گئی تھی۔ منیجر نے اسے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ پرنسس نے گولی مار دی تو ہوٹل والے کیا کہیں گے۔ ان کا موقف یہ ہوگا کہ کوئی بدمعاش ہوٹل کے بیرے کی وردی میں پرنسس کا سوٹ کیس لے کر فرار ہو رہا تھا۔ روکنے پر اس نے مقابلہ کیا اور بیچ میں ریوالور کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ پولیس [illegible] بگڑے گا۔ منیجر پریشانی کے باوجود [illegible] بڑی شرافت سے گیٹ تک آیا اور لوٹ گیا۔ میں نے اس کو چابی دے کر سوٹ کیس ڈکی میں رکھوایا اور اس سے پوچھا کہ ڈرائیونگ آتی ہے؟"

"اگر وہ انکار کر دیتا کہ نہیں آتی۔ پھر؟" میں نے کہا۔

"پھر میں منیجر کو بلاتی اور اسے کہتی کہ مجھے ایک ڈرائیور چاہیے۔" رابعہ نے کہا۔ "لیکن استاد گولی کی عقل ماؤف تھی۔ اس نے اقرار

www.paksociety.com

میں سر ہلا دیا اور میں نے کہا: "گاڑی اسٹارٹ کرو اور عمر ان سے بہتر جو عمر تمہاری گاڑی ہے لیکن اس سے کچھ فاصلے پر روک لو۔ ہیڈ لائٹس آف رکھو اور اس وقت تک بیٹھے رہو جب تک تمہارے سامنے پالیس ہو کے روانہ نہ ہو جائیں۔ میں ہوٹل کے سامنے ہی مار دھاڑ یا لسٹ وغیرہ کا فرمانا نہیں چاہتی تھی۔ ان سب کا ٹھکانا بھی دیکھنا چاہتی تھی۔ مشکل سے پانچ منٹ کے بعد آگے والی گاڑی چل پڑی۔ میں نے استاد گولی کو مناسب فاصلے سے تعاقب جاری رکھنے کا حکم دیا اور پھر بتادیا کہ وہ کس بن بھول چوک ہو تو بچے سے کھوپڑی اڑا دوں گی۔ استاد گولی کے ساتھی محسوس ہی نہ کرسکے کہ کوئی ان کے تعاقب میں ہے۔

"وہ استاد گولی کے ڈانٹنے سے بہت نروس تھے اور تقریباً نمازِ جنگی کا شکار تھے۔" میں نے کہا۔ "صرف ایک تھا جو وفاداری کا حق ادا کرنا چاہتا تھا۔ باقی سمجھ رہے تھے کہ بھاگ چلو۔ انہی کی باہمی چپقلش میں میری تھوڑی سی شکایت ہوئی لیکن تم کو کافی وقت مل گیا۔ اس کے باوجود تم نے آدھے گھنٹے میں بہت کچھ کرلیا۔ میرا دل بھر جاتا تھا.... خیر، آگے کہو۔"

"آگے کہنے کو کیا ہے۔" وہ خفا ہو کے بولی: "تم اپنے دل کے بریک چیک نہ کروگی۔ بار بار ڈیل ہو رہے تھے۔ یہ ڈر ہے مجھے سونے کے لیے واپس ہوٹل نادان جانا پڑے!"

"تم جاؤ گی تو کہا مجھے نہیں جانا پڑے گا۔" خیر قائل تو ہو کہ جمادوی پرنس کس طرح تم تنہا اپنے شوہر کو بدمعاشوں کے شکنجے سے چھڑا لائی۔ ان میں سے ایک نے پرنس کی شان میں گستاخی کی تھی جسے اسے معافی مانگنے کے لیے بھیجا تھا؟

رابعہ بے اختیار ہنس دی: "میں تو حیران رہ گئی اور ہنسی روک نہ سکی جب اپنے فاصلے پہنچنے کے بعد وہ نے جوتے کی طرح ہری آواز نکال کے کہا کہ پرنس میں نے آپ کو الو کہا تھا۔ میں کتا ہوں مجھے معاف کردیں۔ ہنسنے سے وہ اور خفیف ہوا۔ میں نے پوچھا تم کتنا سے کتے ہو! دو معافی کے بعد وہ جو صرف بھونکتے ہیں کاٹتے نہیں! وہ احمقوں کی طرح کھڑا رہا۔ میں نے کہا: جاؤ اچھے کتے بن کے رہو۔ مالک کے وفادار۔ پاگل کتے کو لوگ گولی مار دیتے ہیں۔"

"اور ماس سے بڑی دلچسپ منظر تھا۔" میں نے ہنستے ہنستے کہا۔ "استاد گولی سے جب ان کی نامردانگی کی گنوانی یار نے بخاطر جو سامنے وہ تھے بے حواس اور بے عزت ہوئے۔ چلتے چلتے میں نے استاد گولی کو گولی دی تھی کہ ہر دوسری بیوی کیب نکال کے لے جائیں گے جو ہم تمہیں لانے ملیں۔ ان کو صبح معلوم ہوگا جب وہ گاڑی چلانے کے لیے وہ سری دوسری بیوی کیب لائیں گے اور سخت جھنجلائیں گے کہ گاڑی بالکل ٹھیک اور قابلِ استعمال تھی۔ وہ خواہ مخواہ رات بھر خوار ہوئے!"

"وہ ڈھائی بج رہے ہیں۔" رابعہ نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "ہم آرام کی ضرورت ہے؟"

"ضرورت تو ہے لیکن نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"دل چاہتا ہے تم لیٹے ہی بیٹھی رہو اور باتیں کرتی رہو۔"

"باتیں لیٹ کر بھی کی جاسکتی ہیں۔" وہ بولی: "میں بہت تھک گئی ہوں۔"

"اچھا، تو تم یہاں لیٹو۔" میں نے بستر سے اٹھ کے کہا۔

"اور... تم کہاں جاؤ گے؟" وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

"جانا کہاں ہے اس وقت۔" میں نے کہا۔ "میں لیٹ جاؤں گا........ میرا مطلب ہے نیچے کارپٹ پر۔"

"صوفہ جو گھسیٹ لاؤ یہاں۔" رابعہ نے کہا۔

"ہاں، یہ ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا اور دوسرے کمرے سے چند منٹ کے بعد صوفہ گھسیٹ لایا۔

"تمہارے قد کے اعتبار سے تو یہ چھوٹا بہت ناکافی ہے۔" رابعہ مسکرائی۔

"اس کی تو مجھے فکر نہیں۔" میں نے کہا۔

"صبح اس کے آنے سے پہلے ہی صوفہ واپس ٹھکانے رکھ دینا۔" رابعہ نے لائٹس آف کی اور بیڈ سائڈ لیمپ جلا دیا۔ میں نے مدھم نیلگوں روشنی پھیل گئی۔ باہر سردی تھی لیکن کمرے کے ایئر کنڈیشنر نے بڑی خوشگوار حرارت پیدا کر دی تھی۔ رابعہ نے ایک کمبل میں نے لیا اور دھر کو صوفے کے بازو پر رکھ کے لیٹ گیا۔

"ایسی پرسکون رات میری زندگی میں پہلے کبھی نہیں آئی۔" میں نے سگریٹ جلا کے چھت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"دو آگ اور دھواں تو چھوڑو خدا کے لیے۔" رابعہ نے میرے لبوں سے چھین کر پھینک دی۔

"ایسے رہنے..." میں اٹھ کے دوسرا سگریٹ جلانے لگا۔ "ابھی سے یہ ذمہ داری کنٹرول۔ ایسے ہی حالات میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ سے جیتنی کی سلطان کی فوج سے۔ لیکن شہید ہوگئی فوج سے۔" میں سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھا کے پھر دوبارہ اپنی نظر کو میں نے رابعہ کے چہرے سے بھی دور رکھا جو اس خاموشی کا اس ماحول اور اس روشنی میں بھی دلکش ہو رہا تھا۔ کا جائزہ۔ اور مجھے اس کی کشش یوں جب دبا کر رہی تھی جیسے میں ہوں۔ اعصابی کشیدگی کو کم کرنے کے لیے میں نے باتیں ہوتی جیسے چھکے آہستہ آہستہ سرگوشی میں ہم گزرے وقت کی باتیں کرتے رہے۔ پھر آنے والے وقت کی بات خود بخود میرے لبوں پر اور میرے خواب میرے الفاظ میں ڈھل گئے۔ دل جانے کب تک بولتا رہا۔ جب میں نے دیکھا تو وہ سو چکی تھی۔ مسکراتی

www.paksociety.com

نیند میں بھی وہ مسکرا رہی تھی۔ اس بچے کی طرح جو کہانی سنتے سنتے سو جائے اور خواب اسی کہانی کا تسلسل بن جائے۔ شاید خواب سنتے سنتے وہ انہی خوابوں میں کھو گئی تھی۔ میں بھی اطمینان سے کروٹ بدل کے سو گیا۔

اس رات میں نے بہت سے ایسے خواب دیکھے جو قوسِ قزح کے سارے اُجلے رنگوں سے مزین تھے۔ میں گلشن رنگوں کے رنگ پر اترنے والی تتلیاں کاٹتے اُڑتے نیلے آسمان کی وسعتوں میں گم ہو جاتی تھیں اور ستارے ان سے لپٹنے لگتی تھیں۔ پھر آسمان نیچے اتر آتا تھا اور نیلے رنگ کی ساری کی ساری کالونی کے اُڑنے لگتا تھا ان زرد پھول دیکھتے تھے۔ برف پوش پہاڑ کی کسی چوٹی سے رابعہ مجھے پکار رہی تھی اور اپنا ایک ہاتھ پھیلا رہی تھی "سکندر! یہاں آؤ۔ یہاں سے دیکھو دنیا کتنی خوبصورت ہے۔" اور میں کہتا تھا "مجھے سب کچھ تمہاری آنکھوں میں نظر آ رہا ہے۔" پھر شفق جیسے لگتی تھی اور رابعہ اپنے گالوں کو چھو کر کہتی تھی "اسے یہ رنگ تو میرے گالوں پر اتر آیا ہے۔" اور اس کا شاداب گل جیسا بدن بل کھا کے کمان ہو جاتا تھا۔ خوابوں کے یہ سلسلے کسی سلسلۂ کوہ کی طرح حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور آپس میں یوں ملے ہوئے تھے کہ ایک دوسرے کو جدا کرنا محال تھا۔ آخری خواب جو مجھے یاد رہا آخری اور تھیا گلی کے کوہساروں کا تھا جہاں بلند و بالا یوکلپٹس کے گھنے درختوں کے لگتے تھے۔ اور ان کی شاخیں انتہائی اونچائی پر آپس میں یوں ملی تھیں کہ سر سبز چھت کے سوراخوں میں سے بادل گزرتے دکھائی دیتے تھے۔ بادل نیچے وادیوں میں معلق تھے اور اردگرد کے جنگل میں کہیں دھند کے پہاڑ سے کھڑے تھے۔ جنار کے مرغولے بن کر گھوم رہے تھے اور دھوئیں کی چٹان بن کر ہماری راہ میں حائل ہو جاتے تھے۔ تب نیچی بوندوں کے ساتھ یوکلپٹس کے بھیگے پتوں کی مہک نمی اور گہری وادیوں میں گونجنے والا بارش کا شور اپنی بازگشت کے ساتھ سنائی دیتا تھا۔ "رابعہ!" میں نے ادھر اُدھر دیکھ کے پکارا اور وہ اچانک ایک بادل سے نکل آئی۔ ہوا تیز ہو گئی۔

دستک کی آواز پر میں نے آنکھیں کھولیں۔ پانی کے چند اور چھینٹے مجھ پر گرے۔ میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ رابعہ کی ہنسی جلترنگ بجانے لگی: "جناب، اٹھیے۔ بس اب کہ رات خواب سو گئی۔"

"تو یہ تم تھیں جو مجھ پہ چھینٹے اُڑا رہی تھیں۔ میں سمجھا بارش ہو رہی ہے۔" میں نے آنکھیں مل کے کہا۔

"تمہیں تو اپنا نہیں میری زیادہ فکر تھی۔ نیند کی حالت میں بھی مجھے پکار رہے تھے ___" وہ پھر ہنسی۔ لیکن اس دم مجھ وہ شیلا تھا۔ اس کے پیچھے حسن کی تجلی نے میری نگاہوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ وہ ابھی غسل کر کے نکلی تھی اور اس کے دھلے دھلے چہرے کا رنگ میں آتشی تازگی اور شگفتگی تھی اور وہ آب و تاب تھی کہ آنکھ جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ سنگ مرمر سے تراشے ہوئے گردن پر نیلی ساری کی پٹی ہوئی تھی جس کے زرد پھول کر مسکرا رہے تھے اور شوخ اشارے کر رہے تھے۔ رابعہ کی آنکھوں میں حیا کا رنگ تھا اور پیار کا رنگ تھا۔ غرور کا رنگ تھا اور وہ سب رنگ تھے جو محبت کے رنگ ہیں۔

"کیا آنکھوں سے پیتے پیتے پھر سو گئے؟" رابعہ نے کہا اور میری آنکھوں میں جھانکا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"ایک شعر کی تفسیر۔ رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام / موسم گل ہے تمہارے سامنے آنے کا نام۔ ترنم کے لیے معذرت!"

"شکریہ یہاں ڈاکٹر صاحب!" رابعہ بولی۔ اسی وقت پھر دستک ہوئی۔ "اُف۔ آ گیا وہ رنگ میں بھنگ ڈالنے والا!" میں نے جھلا کر لٹکتے ہوئے صوفے کو گھسیٹا اور بڑی مشکل سے وہیں پہنچا جہاں رات کو تھا۔ کمبل کو سیٹ پہ پھیلا دیا۔ تکیوں کو سامنے رکھا اور ایک نظر اس سیٹ کو دیکھا جو بیڈروم پیش کرتا تھا۔ ان میاں بیوی کے بیڈروم کا بھی کیا انداز زندگی انتہائی قابلِ رشک ہو۔ رابعہ نے آئینے میں سب کچھ دیکھا آئینہ بھی لال ہو گیا۔ پھر دستک ہوئی تو میں نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا: "کون آ گیا اتنی صبح صبح؟" اور دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی میری نیند آنکھوں سے غبارے کی طرح اُڑ گئی اور میں بالکل پیچھے ہٹا۔ میرے سامنے محسن کھڑا تھا۔ تھکا ہوا، پژمردہ، نڈھال۔

"تم! رات کو فون آیا تھا، صبح خود آ گیا؟" میں نے کہا۔ رابعہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"ہاں!" وہ اندر آ کے دھڑام سے کرسی پر گر گیا۔ "مجھے اس لیے فوراً آنا پڑا۔ کہاں تھے تم دونوں؟"

"ہم؟ ... ہم کہاں تھے۔ یہیں تھے۔ کیوں رابعہ؟" میں نے اس بچے کی طرح کہا جس کی چوری پکڑی جائے۔ رابعہ نے مسکرا کے منہ پھیر لیا۔ محسن بیڈروم کے سیٹ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"جھوٹ بکتے ہو تم دونوں۔ رابعہ اپنے ہوٹل میں نہیں تھی۔" محسن بولا۔ "رات کے بارہ بجے تک۔"

"وہ کچھ ایسا ہے ... کہ ہم تو نیک بچوں کی طرح جلد لوٹ آنا چاہتے تھے مگر کہا نہ ... دیر ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "ایک جگہ پکنک پر جانا پڑا ... لیکن تیری شکل کیوں ایسی ہو رہی ہے؟ سب ٹھیک ہیں نا؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا اور دیوار کو گھورتا رہا۔ "شملہ کا انتقال ہو گیا۔ صبح چار بجے کے قریب۔"

"انتقال ہو گیا؟" میں نے یوں کہا جیسے یہ ناممکن تھا۔ رابعہ ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر سے اٹھی اور محسن کے قریب آ کے کھڑی ہو گئی۔ ہم سب جیسے بے حس و حرکت اور ساکت و صامت خلاؤں میں دیکھ رہے ہیں۔ سب باتوں کی بازگشت ایک پراسرار سرگوشی بن کے رہ گئی جو محسن نے مجھ سے اور رابعہ سے گزشتہ روز اسی وقت کی تھیں۔ وہی وقت تھا جب اس کی ماں کے سرہانے فرشتۂ اجل قبضِ جاں کی دھوئی کے لیے پہنچا تھا اور بیٹے کی دید کی منتظر نظروں نے اسے تصور میں دیکھا تھا۔ اس کے مجبور دل نے آخری بار دھڑکنے سے پہلے اسے یاد کیا تھا اور پیار سے سیکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وقت کی لہروں پر اس مقام تک پہنچی تھی جہاں برخوردار اس جنت کی بات کر رہا تھا جو ماں کے قدموں کے نیچے ملتی ہے۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ یہ ذکر اچانک کیسے چھڑ گیا۔ بات کہاں سے شروع ہو کے کہاں آ گئی؟ جواب میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ ایک ہی وقت تھا جب ماں نے بیٹے کو یاد کیا اور بیٹے کو ماں کی یاد آئی۔ ٹیلی پیتھی۔ رابطہ باہمی کی پراسرار قوت جو قلب و نظر کو ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ عالم بالا کی جانب محوِ سفر روح کے قیام کا مختصر وقفہ۔

"کتنی عجیب بات ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "کل صبح اسی وقت ہم انہی کی باتیں کر رہے تھے۔"

"اور کتنی بدبختی کی بات ہے سکندر۔" محسن بولا۔ "کہ اس وقت ان کے پاس شملہ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ نہ شوہر نہ بیٹا۔"

"انکل آفس میں ہوں گے۔" میں نے دکھ سے کہا۔ محسن کی آنکھوں سے بہنے والے خاموش آنسو اس کے رخساروں پر پھیل رہے تھے۔ اور اس کی گود میں گر رہے تھے۔

"نہیں۔ وہ اسپتال میں تھے۔ ایک دن پہلے ہی ان پر ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔" محسن روتے روتے بولا۔ "معمولی سا درد اٹھا تھا۔ ڈاکٹروں نے روک لیا۔ جب میں پہنچا تو تدفین بھی ہو چکی تھی۔ شملہ نے انکل رضوی کو فون کیا تھا مگر انھوں نے کہا کہ مجھے آ کر کیا کرنا ہے اور نہ رابعہ یا سکندر کو۔"

"یہ نہیں کہا انھوں نے کہ سب مصروف ہیں؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "وہاں کی پولیس کو خبردار نہیں کیا کہ ان میں سے کوئی بھی جنازے میں شرکت کے لیے آئے تو گرفتار کر لیا جائے۔ بھتیجوں کو تو مطلوب ہے؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "معلوم نہیں انھوں نے ایسا کیوں کیا؟" محسن بولا۔ "انھوں نے شملہ کو تسلی دی اور پھر اسپتال میں ڈیڈی کی حفاظت کی۔ ڈیڈی کو اب تک کچھ نہیں معلوم۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ یہ خبر سنانے میں خطرہ ہے۔ انکل رضوی نے ان سے ابھی کچھ نہیں کہا ... اور انکل رضوی نے کہہ دیا۔ سب ٹھیک ہیں۔ تم فکر مت کرو۔ وہ فرض شناس آدمی کتنا بھی سخت نظر آتا ہو، ویسے ہیں تو آدمی کا دل رکھتا ہے۔ اور دل پتھر نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی مجبور ہو گئے۔ پہلی بار انھوں نے افسری کو فراموش کر دیا اور جانتے بوجھتے اپنے نامۂ اعمال میں خود اپنے ہاتھوں ایک جرم لکھ دیا۔"

"یہ بات انکل شیروانی سے چھپائی تو نہیں جا سکتی؟" میں نے متفکر ہو کے کہا۔

"ہاں۔ ابھی ایک ہفتہ تو وہ اسپتال میں ہی رہیں گے۔" محسن نے کہا۔ "ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ وہ خود آہستہ آہستہ انھیں ذہنی طور پر تیار کریں گے اور پھر بتا دیں گے کہ وہ اکیلے رہ گئے ہیں۔"

"تو ان سے ملنے اُدھر ہی ہوگا؟" میں نے کہا۔ "شملہ بھی جاتی ہوگی؟"

"اس بیچاری نے تو سب سے زیادہ ظلم برداشت کیا۔" محسن بولا۔ "کوئی اور ہوتا تو اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا۔ دونوں طرف کی تیمارداری۔ گھر سے اسپتال اور اسپتال سے گھر۔ بے شک گاڑی تھی لانے لے جانے کے لیے۔ اسپتال میں ڈاکٹروں نرسوں کی دیکھ بھال بہت اچھی تھی اور گھر پہ بھی ڈاکٹر صبح شام آتا تھا۔ لیکن شملہ کی احساسِ تنہائی کا علاج کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ادھر گھر میں بھی ہر وقت خطرے کی تلوار کا سایہ۔ اسپتال میں بھی ہر لحظہ خوف کا آسیب اور یہ دھڑکا کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔ اسے تو کوئی تسلی اور حوصلہ دینے والا بھی نہ تھا۔ اس کی توجہ بٹانا، کچھ دیر کے لیے تفکرات سے نجات دلانا اور تھوڑی بہت تفریح فراہم کرنا اس کی ذہنی و جسمانی صحت کے لیے ضروری تھا۔ مگر وہ اکیلی تھی اور اس کا نہ کوئی غمگسار تھا نہ ساتھی۔ وزیر ہوتی تو اسے کوئی ہم عمر تو ملتا باتیں کرنے والا لیکن وہ نہیں آ سکتی تھی۔ امی کے انتقال کے بعد وہ بہت ہار گئی۔ ڈاکٹروں نے اسے سکون آور دوائیں دے کے سلا دیا۔ میں رات کو نو بجے پہنچا تو وزیر بھی آ چکی تھی۔ اس کا شوہر بھی تھا۔ وہ دونوں ابھی چہلم تک وہیں رہیں گے۔ میں رات ساڑھے نو بجے قبرستان گیا اور وہیں سے اسپتال پہنچا۔ چہرے سے رنج و غم کے آثار مٹا کے مسکراتا ہوا اور مطمئن۔ ڈیڈی بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے: "رضوی صاحب نے بھیجا ہوگا تم کو؟ حالانکہ میں نے کہا تھا کہ کوئی سیریس بات نہیں ہے۔"

"انکل رضوی جنازے میں شریک ہوئے تھے؟" رابعہ نے کہا۔

"نہیں۔ لاہور میں کچھ گڑبڑ تھی۔ اعلیٰ اختیاراتی میٹنگ تھی شام کو جو رات تک جاری رہی۔" محسن بولا۔ "انھیں بہت رنج تھا لیکن انھوں نے ٹیلی فون پر شملہ کو بہت تسلی دی۔ اور میرا خیال ہے اسی کی حالت کے پیشِ نظر سب خیریت ہے کے سوا کچھ نہیں کہا۔ شاید ہم چلے جاتے تب بھی وہ اس موقعے پر فرض شناسی کا وہ مظاہرہ کر لیتے جس کی وجہ سے وہ سنگدل اور بے حس مشہور ہو گئے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میٹنگ میں شرکت بہانہ ہو۔"

www.paksociety.com

"مہمان ہی ہوگا، ورنہ یہاں تو کسی قسم کی گڑبڑ نہیں۔" میں نے کہا۔

"ان کو اندیشہ ہوگا کہ وہاں سب کا سامنا ہوگا، اور وہ آزمائش کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔" محسن نے کہا۔ "چنانچہ وہ صاف واپس بچا گئے۔ جھوٹ بولنے پر بھی وہ اپنے آپ سے شرمندہ تو ہوں گے لیکن مطمئن بھی ہوں گے کہ ایک بڑا الم ناک موقعے پر جدوجہد اور جھگڑا بازی کے بجائے فرض شناسی کا مظاہرہ کرنے کی اذیت سے بچ گئے۔"

"مجھے ابھی وہیں رہنا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔

"اگر تم لوگ فون پر مل جاتے تو شاید میں سوئم کے بعد آتا۔" وہ بولا۔ "میں نے اسپتال سے واپس آتے ہی گھر سے فون کیا تھا۔ تمہارا نہ ملنا بہت غیر معمولی بات تھی کیونکہ میں تم کو بطور خاص ہدایت دے کر گیا تھا کہ میں فون کروں تو موجود رہنا۔ میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ شہلا تو سو بھی نہیں سکی تھی۔ میں نے فوزیہ سے کہا کہ مجھے وہاں کچھ گڑبڑ نظر آتا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ اس نے مجھے روکنے کی دو ایک سی کوشش کی مگر میں نے کہا کہ اب تم ہو اور تمہارا شوہر ہے۔ تم دونوں گھر کا، شہلا کا اور ڈیڈی کا خیال رکھ سکتے ہو۔ ویسے بھی جب میں ممی کے انتقال کے وقت نہ پہنچ سکا تو تدفین کے وقت تو اب رُک کے کیا کروں گا۔ سچی بات یہ ہے سکندر کہ مجھے اس گھر میں ویرانی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے ماحول سے وحشت ہوتی تھی۔ دیواریں کاٹنے کو دوڑتی تھیں اور ہر چیز مجھے ملامت کرتی نظر آتی تھی۔ میں بھاگ آیا۔ بارہ بجے فون کیا تھا رات ایک بجے ممی کی قبر پر جا کر لپٹ گیا اور وہاں میں دل کھول کے رویا تو میری روح سے بوجھ ندامت کچھ کم ہوا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے امی نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا ہے کہ محسن! خدا نے میری مشکل آسان کر دی ہے۔ رونا کیوں ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "ان کی زندگی کا عذاب بہت سخت تھا۔ خدا ان کو سکون دے اور ان کی روح کی مغفرت کرے۔ جب انکل شیروانی کو معلوم ہوگا تو کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ اس صدمے کے لیے ذہنی طور پر تو ہم سب بہت پہلے سے تیار تھے۔" محسن نے کہا۔ "یہ ان کی ریٹائرمنٹ کا آخری سال ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ایل پی آر لے لیں۔ چھ مہینے کی چھٹی مل جاتی ہے نا، اور شہلا کے ساتھ لاہور آ جائیں۔"

"وہ یہاں آئے تو انھیں بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوں گی جو اب تک معلوم نہیں۔"

"لیکن وہ اسلام آباد میں نہیں رہ سکتے۔" محسن بولا۔ "ان کو سرکاری کوٹھی ملی ہوئی ہے جسے وہ زیادہ سے زیادہ چھ مہینے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے وہ اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ اس گھر میں ان کا اکیلے رہنا انتہائی مشکل ہے۔ میں وہاں ایک دن نہیں رہ سکا۔ اور تو کوئی جگہ نہیں جہاں وہ جا سکیں۔"

"وہ فوزیہ کے ساتھ جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جا تو سکتے ہیں لیکن جائیں گے نہیں۔" محسن بولا۔ "پرانے خیال کے آدمی ہیں نا۔ فوزیہ اور اس کا شوہر بھی یہ چاہتے تھے۔ کا ٹیمل آباد والا گھر بہت بڑا ہے اور وہ اکیلے ہیں۔ ایک ایسا شخص گھر میں موجودگی کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو اس سے مجبور ہو جائیں اور یہی کریں۔"

"میرا خیال ہے کہ اب تم نہا دھو لو تو ہم ناشتہ کریں۔" رابعہ نے کہا۔ "تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"ہاں، میں بہت زیادہ تھکا ہوا ہوں۔" محسن نے اٹھ کر باتھ روم کا رُخ کیا۔ میں اور رابعہ وہیں بیٹھے اسے ہمدردی سے دیکھتے رہے۔

ناشتے کے بعد محسن نے میرے اور رابعہ کے منع کرنے کے باوجود سلیپنگ پلز کی دو گولیاں کھائیں اور بے سُدھ ہو کر پڑ گیا۔ ہم نے اسے گزشتہ شب کی ہنگامہ آرائی کے بارے میں کچھ بتانے سے گریز کیا۔ میں نے رابعہ کو ساتھ لیا اور باہر نکل گیا۔ البرٹ وکٹر اسپتال فون کرنے سے ہمیں معلوم ہوا کہ نازلی اب ہوش میں آ گئی ہے۔

"کیا ان کے بھائی موجود ہیں؟" میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ وہ ڈیوٹی پر ہیں۔ ابھی ان کا بھی فون آیا تھا۔" نرس نے جواب دیا۔ "وہ شام کو آئیں گے۔"

"ان کے پاس کون ہے؟" میں نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

"مس نازلی کے پاس؟"

"صرف ان کی والدہ۔" نرس نے کہا۔ "اور ایک کانسٹیبل ہوگا کمرے کے باہر بیٹھا ہے۔"

میں نے رابعہ سے کہا کہ اس وقت نازلی کو دیکھنے کے لیے جانے میں کوئی ہرج نہیں مگر اس نے میرے خیال کی شدت سے مخالفت کی۔ "انکل اور شیخ کا اعتبار نہیں۔ ہو سکتا ہے انھوں نے سادہ کپڑوں میں پولیس وہاں متعین کر دی ہو۔ حملے میں پولیس افراد شامل ہوں۔"

"نرس کے جوابات سے شک تو مجھے بھی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جتنا میں نے اس سے پوچھا تھا، نرس نے اس سے زیادہ بتایا۔"

"اچھا تو تمہارے ہوٹل چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے پولیس کو فون کر دے کہ یہاں ایک پرنسس مقیم تھیں جو

کا نشانہ بنا دیا تھا۔ وہ دھماکے کے بعد سے غائب ہو گئی ہیں تو پولیس کو شبہ کرنے والوں سے چھڑانے کے لیے خفیہ اور بظاہر نظر اور تفتیش کے علاوہ دیگر سلیقے کی تحقیق مگر ابھی تک نہ ملی ہیں۔"

"اور اگر اس نے پہلے ہی فون کر کے پولیس کو ساری کہانی سنا دی ہو تو پھر؟"

"پھر کیا، پرنسس غائب۔" میں نے کہا۔ "منیجر ثابت کرتا پھرے کہ اس نے نشے میں کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ شام تک ہمیں کسی بھی جگہ مل لینی چاہیے۔ ہوٹل فاران میں اب تمہارا کیا ہے؟"

"میرا تو کچھ نہیں۔ اپنے کپڑوں کا سوٹ کیس اٹھا لائی تھی بلکہ اٹھوا لائی تھی۔" رابعہ بولی۔ "محسن کے کپڑوں کا سوٹ کیس رہ گیا ہے۔"

"محسن میرے کپڑے پہن سکتا ہے۔ لیکن ہمارے وہ مخصوص ملبوسات اہم ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک پولیس افسر والا اور دوسرا وردی اور وہ فقیری لباس۔"

"وہ سب بیگ سوٹ کیس میں ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "محسن کے سوٹ کیس میں جگہ نہیں تھی۔"

"ویری گڈ۔ پھر تو کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی لوٹ کر جانے کی۔" میں نے کہا۔ "میں منیجر کو مطلع کر دیتا ہوں۔"

جی پی او کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے کار روکی اور فون کرنے کے لیے اندر چلا گیا۔ ہوٹل فاران کا نمبر مجھے ڈائریکٹری میں ڈھونڈنا پڑا۔ اس کے بعد کوئی بوتھ خالی ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد مجھے ہوٹل فاران کے آپریٹر نے منیجر کی لائن دی۔

"منیجر صاحب! دیکھیے آپ کے ہوٹل میں ایک پرنسس صوفیہ مقیم تھیں؟" میں نے کہا۔

"پرنسس صوفیہ؟" منیجر چلایا۔ "کہاں ہیں وہ خود؟ تم کون ہو؟ ان کی منحوس گھڑی تھی جب اس پرنسس نے میرے ہوٹل میں قدم رکھا تھا۔ خدا معلوم وہ پرنسس تھی کہ بدنام ڈاکو کی بیٹی۔"

"کیا ہوا منیجر صاحب؟" میں نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

"آپ یہ پوچھیے کیا نہیں ہوا؟" منیجر بولا۔ "الو کا پٹھا ہوں۔ اگر جانتا ہوتا میں کہ اس کی بات مان لی تھی۔ عقل خبط کر دی تھی اس نے میری۔ اگر اسی وقت پولیس کو بلا لیتا تو یہ مصیبت نہ آتی۔"

"کیسی مصیبت؟ آپ نے ابھی تک کچھ بھی نہیں بتایا ہے؟"

"ارے بھائی کیا بتاؤں؟ دھماکا ہوا ان کے کمرے میں۔" وہ روہانسے لہجے میں بولا۔ "آج ہی صبح۔"

"ان کا کمرہ تو بند تھا۔" میں نے کہا۔ "اور چابیاں آپ کے پاس تھیں۔"

"مگر تو مصیبت بن گئی میرے لیے۔" وہ بولا۔ "مگر تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟"

میں نے باہر دیکھا۔ کاؤنٹر سے خاصے فاصلے پر کھڑا ہوا ایک شخص مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹیلی فون کرنے کے لیے باری کے انتظار میں نہیں تھا اور کسی کاؤنٹر سے ٹکٹ یا لفافے بھی نہیں خرید رہا تھا۔

"میں پرنسس کا وکیل ہوں۔" میں نے کہا اور دوبارہ اس شخص کی طرف دیکھا۔

"تو آپ لے صاحب! خدا کے لیے میری جان چھڑاؤ۔" منیجر بولا۔ "یہاں تو پولیس نے دھاوا بول دیا ہے۔"

"دھماکا کس وقت ہوا اور کیسے؟" میں نے کہا۔ "آخر کوئی تو اندر گیا ہوگا۔"

"یہی تو غضب ہے کہ اندر کوئی نہیں گیا۔" منیجر بولا۔ "ساتھ والا کمرہ خالی تھا۔ ایک شریف صورت شخص نے لیا تھا۔ میں نے تو دیکھا بھی نہیں۔ ریسیپشن کلرک نے دیکھا تھا۔ بہت شریف لگتا تھا۔ شلوار کرتا، وہ ضعیف تو بہت ہی شریف۔ اس نے درمیان کی دیوار میں سوراخ کیا اور اندر بم پھینک دیا۔ دونوں کے باتھ روم ملتے ہیں نا۔ اس نے باتھ روم سے باتھ روم میں دستی بم اچھالا اور بھاگ نکلا۔ دھماکے سے افراتفری پھیلی تو وہ غائب ہو گیا۔"

میں نے پھر شیشے کے کیبن سے باہر جھانکا۔ وہ اجنبی بڑی مستقل مزاجی سے ہاتھ باندھے وہیں موجود تھا۔ مجھے اس کی صورت کچھ جانی پہچانی لگی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ وہ یقیناً مجھے پہچان گیا ہوگا۔ میں نے اچانک ٹیلی فون رکھا اور باہر نکل کے تیز تیز قدموں سے زینے کی طرف بڑھا۔ آدھا زینہ چڑھ کے میں نے پیچھے دیکھا تو وہ شخص میرے تعاقب میں آ رہا تھا۔ میں نے باقی زینہ طے کیا اور اوپر کی منزل کے مختلف راستوں، عملے کے افراد اور دفتروں کے بھرے کمرے سے گزرا اور دوسرے زینے سے نیچے اترا۔ اس وقت تک میں اپنے پیچھے آنے والے سے تقریباً پیچھا چھڑا چکا تھا۔ مجھے اس کی صورت ایک بار بھی نظر نہیں آئی تھی لیکن دوسرے زینے سے دوسری راہداری میں اترتے ہی میری نظر اس پر پڑی۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے پہلے سے اندازہ کر لیا تھا کہ میں کس راستے سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔

میں نے باہر کا رُخ کیا تو وہ میری راہ میں حائل ہوا۔ میں نے اسے دھکا دیا اور باہر کی طرف دوڑا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے پھر اٹھنے تک میں رابعہ کے ساتھ کار میں بیٹھ کے نکل جاؤں گا۔ لیکن گاڑی وہاں نہیں تھی جہاں میں اسے چھوڑ گیا تھا۔ گاڑی آس پاس کہیں بھی نہ تھی۔

www.paksociety.com

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رابعہ جسے میں انتظار کرنے کی تاکید کر گیا تھا اچانک کہاں غائب ہو گئی۔

میں تنہا ہوتا تو رکشا ٹیکسی جو بھی سامنے آتا اس میں بیٹھ کے فرار ہو جاتا لیکن مجھے یہ احساس بھی تھا کہ رابعہ لوٹ کر آئی اور اس نے مجھے غیر حاضر پایا تو وہ مجھ سے بھی زیادہ تشویش کا شکار ہو گی اور اس کے دل میں ہزار اندیشے جنم لیں گے۔ دوسری طرف وہ ابھی تک میرے تعاقب میں تھا جسے میں اب تک پہچان نہیں سکا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا کہ جب میں جی پی او کی عمارت کے ایک زینے سے اوپر غائب ہو گیا تھا تو اس نے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ میں واپس آنے کے لیے کون سا دوسرا زینہ استعمال کروں گا۔ میرے دیکھنے سے وہ ٹکرا گیا تھا اور میں نے اس کے دیوار پر سر ٹکرانے کی آواز بھی سنی تھی لیکن دوسری بار پلٹ کر دیکھنے پر میں نے اسے سر سہلاتے اور جھنجلاتے کھڑے ہوتے دیکھا تھا۔ مشکل سے آدھے منٹ کے وقفے سے وہ محرابی دروازے میں نمودار ہوا جو پوسٹ آفس کے برآمدے میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بنے ہوئے تھے۔ میں اتنی دیر میں سیڑھیاں اتر کے گیٹ تک جا پہنچا تھا جہاں رابعہ کو کار سمیت موجود ہونا چاہیے تھا اور اگر ایسا ہی ہوتا تو یہی آدھے منٹ کا فرق مجھے کافی ہوتا۔ جتنی دیر میں وہ تعاقب کے لیے کوئی سواری دیکھتا ہم نکل جاتے اور گم ہو جاتے۔

میں نے ایک بار پھر پیچھے نظر ڈالی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کہیں وہ مفرور مجرم کو روکنے کے لیے ریوالور استعمال کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتا۔ وہ عام آدمی بھی ہو سکتا تھا جس نے مجھے دس ہزار کا چلتا پھرتا انعام سمجھ کے فیصلہ کیا ہو کہ یہ رقم اس کے بینک اکاؤنٹ میں جانی چاہیے۔ وہ پولیس یا خفیہ پولیس یا سادہ لباس پولیس کا آدمی بھی ہو سکتا تھا جن کو قانونی طور پر یہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں کہ وہ قانون کی گرفت سے نکل بھاگنے والے مجرم کو شوٹ کر دیں۔ وہ آدمی جس کے عزائم اور قوت تسخیر کے سامنے کوئی رکاوٹ کوئی دیوار اور کوئی ہمالہ جیسا پہاڑ حائل نہ ہو سکے، جسے کوئی زنجیر بھی بے بس یا گرفتار نہ کر سکے اور جو خلا کی وسعتوں سے سمندروں کی تاریکی تک سب مقامات آہ و فغاں سے خندہ زن گزرنے کا حوصلہ رکھتا ہو اسے کتنی آسانی سے ایک چھوٹی سی گولی شکست دے کر رکھ دیتی ہے۔ وہ گولی جو اس کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے برابر بھی نہیں ہوتی وجود سے عدم کی مسافت کو ایک لمحے سے ایک لمحہ بنا دیتی ہے۔

وہ شخص اب چلانے لگا تھا۔ "روکو۔ پکڑو کوئی اسے۔" لیکن پوسٹ آفس میں اپنے اپنے ضروری کام سے آنے جانے والے بیشتر لوگ فارغ نہیں تھے اور کچھ لوگ متوجہ تو ہوئے تھے مگر سمجھ نہ پائے تھے کہ وہ کیوں شور مچا رہا ہے اور کسے پکڑنے کی اپیل کر رہا ہے۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا تھا پھر پلک جھپکتے میں ٹریفک کے سیلاب میں کود گیا۔ اور اندھا بالکل نہ تھا کہ گاڑیوں سے خود کو بچاتا اور کسی اچانک بریک لگانے والی گاڑی سے ٹکراتا سڑک عبور کر گیا۔ نہ جانے کتنی گاڑیوں کے ڈرائیوروں نے مجھے کھڑکی سے سر نکال کے گالیاں دیں۔

"سالا خود تو مرتا ہمیں بھی مشکل میں ڈال جاتا۔"

"اپنے مرتا ہے تو کسی ڈبل ڈیکر کے سامنے جا۔"

"پاگل کے بچے! اندھا ہے کیا؟"

مختلف آوازیں آئیں۔ میں نے دو گاڑیوں کے تصادم کی آواز بھی سنی۔ شیشہ ٹوٹنے کی اور لوہے سے لوہے کے ٹکرانے اور رگڑ کھانے کی۔ غالباً کوئی پیچھے والی کار جس کے بریک بہت زیادہ قابل اعتماد نہ تھے اگلی گاڑی میں گھس گئی یا اگلی گاڑی کی بریک لائٹ کام نہیں کر رہی تھی کہ پیچھے والی کار کا ڈرائیور بچ نہ کر سکا۔ اب دونوں ایک دوسرے کو قصوروار کہیں گے۔ اپنے اپنے نقصان کا اندازہ کریں گے اور پھر جھگڑتے اپنی راہ لیں گے۔

سڑک عبور کرنے کے بعد میں نے پھر پیچھے دیکھا۔ وہ شخص اب شور تو نہیں مچا رہا تھا لیکن اس کے ارادے نہیں بدلے تھے۔ میری طرح اقدام خودکشی کرنے کے بجائے وہ مجھ پر نظر جمائے ٹریفک میں مناسب وقفے کا انتظار کر رہا تھا جس سے اس کی مستقل مزاجی اور ٹھنڈے دل کے ساتھ کام لینے کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ میری بدقسمتی سے چند ہی سیکنڈ کے بعد ٹریفک کی لائن ٹوٹ گئی اور وہ گولی کی طرح میرے پیچھے آیا۔ میں اب سیدھا نیلا گنبد والے راستے کی طرف جا سکتا تھا مگر وہاں میں یقیناً پھنس جاتا۔ آگے انارکلی میں چلنے والا راستہ بہت تنگ تھا اور وہاں جلدی نکلنا تو کیا بعض اوقات پیدل چلنا بھی مشکل ہوتا تھا۔ دائیں بائیں انارکلی بازار میں رش ناممکن تھی۔ چنانچہ میں سیدھا لا ہائٹ اولڈ کیمپس اور یونیورسٹی کے عقب والی سڑک پر دوڑ سکتا تھا مگر یہ بہت زیادہ رکاوٹوں والی رش یقیناً تھا نہ انارکلی پر ختم ہوتی۔ چنانچہ میں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے ہوسٹل کا جنگلہ پھلانگ کے اوٹ بہتر سمجھا۔ بہت سے لوگ اب دلچسپی لے رہے تھے اور کچھ زیادہ جوشیلے عملی طور پر اس میں شریک ہونے کے خواہش مند نظر آتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں مجھے جیب کترا قرار دے کر بھی ہاتھ کی صفائی دکھانے بھاگا تھا اور شور مچاتا پیچھے دوڑنے والا شخص اس کے سوا کون ہو سکتا تھا جس کی جیب ہلکی ہو چکی تھی۔ مجھے اب پہلے جتنی مشق تو نہیں رہی تھی، اس کے باوجود میرا

کریں خاصا تیز دوڑ سکتا ہوں۔ گھوڑے کے علاوہ اگر کسی سواری کی مدد سے کوئی مجھے پکڑ سکتا ہے تو موٹر سائیکل کی مدد سے لیکن اس شخص نے میرے خیال کو باطل کر دیا۔ وہ یقیناً اتھلیٹ تھا یا رہ چکا تھا۔

جب اس کے اور میرے درمیان فاصلہ چند گز رہ گیا تو میں انارکلی کی ایک گلی میں گھس کے کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی وہ شخص نمودار ہوا میں نے اسے دبوچ لیا اور کچھ کہے بغیر مارنا شروع کر دیا۔ میں نے کراٹے کے پیشہ ورانہ وار آزمانے سے گریز کیا اور ایسے ہی اس شخص کی طرح چلانے لگا جیسے مار کٹائی کا تجربہ نہ ہو۔ فوراً ہی دور تماش بینوں کا اچھا خاصا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ میرا حریف بھی کم نہ تھا اور اس کی نیت حملے سے بچنے کے ساتھ ساتھ جارحانہ کارروائی کی تھی لیکن میں نے اپنا پورا دفاع کیا۔ جیسے ہم نے ایک دوسرے کو بتا دیا ہو کہ وہ قطعی بے ضرر ہے اور یہ جنگ دفاعی نوعیت کی ہی ہے۔ نقصان کسی کا بھی نہیں آواز کا ہوا جو مضحکہ خیز حد تک بلند تھی اور اس کے بھاری بھرکم وجود سے ذرا میل نہیں کھاتی تھی۔ شور تو اس نے بھی مچایا مگر میں نے لاؤڈ اسپیکر کی طرح چلا چلا کے اس کی آواز کو دبا دیا۔

"اوہ میں آج جانے نہیں دوں گا۔" میں نے گلا پھاڑ کے کہا۔ پھر میں نے اس کے شانے پر مکا مارا۔

"تو... تو کیسے... میں خود نہیں جانے دوں گا؟" وہ ممنایا اور اس نے ہاتھ گھمایا جو میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔

"ایک سال ہو گیا آج کل کرتے۔ باپ کا مال سمجھ رکھا ہے؟" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ہم نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے ایک دوسرے کے بال نوچنا اور کپڑے پھاڑنا جاری رکھا۔ کچھ لوگوں نے بالآخر مداخلت کی۔

"ارے میاں... ارے بندے دے پتر بنو۔" ایک بھلے بزرگ صورت نے بیچ بچاؤ کرنا چاہا۔ میں نے اس کے سر پر مکا مارا لیکن بے اتفاقی سے اس کا سر نشانہ بن گیا۔ صوفی نے "ہو" کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔

"میں آج پیسے کے بغیر نہیں جانے دوں گا۔" میں نے کہا۔ "کچھ لے اور دو الوں کو ہیں؟"

میرا حریف دم بخود رہ گیا۔ اس الزام نے اس کو اتنا حیران کیا کہ وہ لڑنا بھول گیا۔ "کون سے پیسے... بدمعاش؟"

"یہ بدمعاشی تھی میری یا شرافت... وقت پر مدد کی تھی تو امانت ہو جاتا۔" میں نے چیخ کر کہا۔ لوگ اب ہمارے درمیان حائل ہو گئے تھے اور دو معتبر قسم کے افراد نے ثالثی کے فرائض سنبھالتے ہوئے سوال شروع کر دیے تھے۔

"بات کیا ہے؟ زبان سے بات کرو یار۔ دونوں پڑھے لکھے لگتے ہو۔" ایک عینک والے بنک افسر قسم کے آدمی نے کہا۔

"بات کیا ہے۔" میرے حریف نے کہا۔ "جان بچا کے بھاگنا چاہتا ہے۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔"

"جان بچا کے تو بھاگ رہا ہے۔ سال بھر ہو گیا دو پیسے دس ہزار لیے تھے اس نے۔ کہتا تھا بیوی کا علاج کرانا ہے۔" میں نے چلا کے کہا۔ "اب ملتا ہی نہیں، صورت نہیں دکھاتا۔ گھر جاؤ تو قواعد ہے...؟"

"جھوٹ بکتا ہے یہ۔" وہ چلایا۔ "میں نے اس کا کچھ نہیں دینا۔ میں تو اس کو تھانے لے جاؤں گا۔"

"تھانے تو میں لے جاؤں گا تجھے۔" میں نے دہاڑ کر اس کو اور کچھ نہیں کہنے دیا۔ "دس ہزار جیسے کھا کے دس ہزار دے گا۔"

"یہ ایک مجرم ہے۔ قاتل اور مفرور۔" بالآخر میرے حریف نے چیخ کر کہا۔

"کیا؟ مجھے دنیا جانتی ہے میں ڈاکٹر ہوں۔" میں نے مجمع کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"ارے بھائی جب دونوں ہی تھانے جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔" کسی نے نیم سنجیدگی سے کہا لیکن میں نے یکلخت ثالث کو انگریزی میں مخاطب کیا اور کہا کہ میرا نام ڈاکٹر امجد ہے اور میں لاہور ہوٹل میں مقیم ہوں۔

"یہ سکندر بخت ہے، میں جانتا ہوں اسے۔" میرے حریف نے کہا۔ "پولیس نے اس کی گرفتاری پر دس ہزار روپے انعام رکھا ہے۔ اسے تھانے لے چلو سب معلوم ہو جائے گا۔"

"ہاں ہاں۔ تھانے چلو۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "روکو کوئی ٹیکسی کو۔" لیکن میرا اطمینان ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ اچانک دو افراد کو یاد آ گیا کہ میری صورت انہیں دیکھی بھالی کیوں لگتی ہے۔ وہ دونوں میرے دائیں بائیں ہو گئے۔

"یہ ٹھیک کہتا ہے۔" ایک نے میرے حریف کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرے نے تائید میں سر ہلایا۔ مجھے اسی بات کا ڈر تھا کیونکہ پرانی ہو جانے کے باوجود میری اخبار میں شائع ہونے والی تصویر اتنی پرانی نہیں ہوئی تھی کہ کسی کے ذہن میں اس کا دھندلا سا نقش بھی نہ ہوتا۔ ایک ٹیکسی کے فوراً نمودار ہونے سے میری مشکل کچھ آسان ہوئی ورنہ کچھ بعید نہ تھا کہ اس مجمع سے مجھے پہچاننے والے اور بھی نکل آتے اور وہ مجھے باعزت طریقے پر تھانے جانے کے بجائے مارتے ہوئے اور گھسیٹتے ہوئے تھانے کی طرف لے جاتے۔

"چلو اب رک کیوں گئے؟" میں نے بلا وجہ اپنے مخالفین کو ڈانٹا۔ انگریزی میں بات کی اور پہلے ٹیکسی کی طرف بڑھا۔

"ہاں ہاں ضرور، مگر کون ہے؟" میرے حریف نے کہا اور وہ پچھلی سیٹ کی طرف بڑھے۔

لیکن ذرا سی چوکسی قسمتی کے باعث میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ انہیں میری چالاکی پر شبہ نہیں ہوا کہ اس طرح دوسرے مسافر کے ساتھ میں بیٹھ گیا ہوں۔ اور وہ مجھے دونوں طرف سے نرغے میں لے کر نہیں بیٹھے۔ اس غلطی کا احساس کسی کو ہوا بھی تو دیر سے۔ جب پوزیشن بدلنے کا وقت گزر چکا تھا۔ درمیان میں میری جگہ وہ شخص آ گیا جس نے میرے حریف کی سب سے پہلے حمایت کی تھی۔ آگے والی سیٹ پر وہ بک جیمز بانڈ ٹائپ عینک پوش تھا جس کی ظاہری ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں اور جو ابھی تک پوری طرح قائل نہیں ہوا تھا کہ اتنی رواں اور شائستہ انگریزی میں بات کرنے والا ڈاکٹر امجد نہیں کوئی مفرور و مطلوب ملزم ہے۔ اسے شک تھا کہ معاملہ غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ میرے ساتھ بیٹھا ہوا دشمن نمبر دو ایک بانکا سا نوجوان تھا جس کو اپنا ہیئر اسٹائل بار بار درست کرنے کی عادت تھی اور اپنی پتلونوں کی کریز کی بہت فکر تھی۔ چنانچہ اس سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اصل خطرہ دشمن نمبر ایک سے تھا جو دوسرے پچھلے دروازے سے لگا بیٹھا تھا۔ بلکہ بار بار گردن بڑھا کے مجھے خونخوار نظروں سے گھورتا تھا۔ اس کو یہ فکر لاحق تھی کہ میں دروازہ کھول کے کود گیا تو وہ کیا کرے گا؟ اس کا یہ اندیشہ برحق تھا۔

میں نے آدھا مسئلہ حل کر لیا تھا۔ ایک خطرناک ہجوم کی جگہ اب میرے ساتھ صرف تین افراد تھے۔ ٹیکسی والا غیر جانبدار تھا۔ چنانچہ طاقت کا توازن برابر تھا۔ مجھے یہ کرنا تھا کہ میں کون سا راستہ اختیار کروں۔ دروازہ کھول کے چھلانگ لگاؤں اور بھاگ جاؤں۔ اس میں میری ٹانگ ٹوٹنے یا موچ سے پاؤں کے قابل استعمال نہ رہنے کے امکانات برابر تھے۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں بقول شاعر، اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے، وہ پھر مجھے پکڑ لیں اور زیادہ سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ تھانے پہنچا دیں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں دشمن اور اس کے حامی کو اندھی ناک آؤٹ کر دوں۔ پھر عینک پوش سے درخواست کروں کہ وہ اتر کر واپس جائے اور کسی سے اس واقعے کا ذکر نہ کرے۔ مجھے کہیں جانا ہی نہیں تھا۔ رہ گیا ٹیکسی والا تو اسے پچاس کا نوٹ یا ریوالور دکھا کے چلتے رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ تیسرا اور آخری طریقہ جو میری کامیابی کا سو فیصد ضامن ہو سکتا تھا یہ تھا کہ میں ریوالور نکال لوں اور ٹیکسی ڈرائیور کے علاوہ باقی سب کو کسی ایسی جگہ اتار دوں جہاں سے واپس جانے کے سوا ان کے پاس چارہ نہ ہو۔ وہ اب لاہور ہوٹل کی طرف جا رہے تھے جو کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ یہ تو ثابت ہو جاتا کہ میں ڈاکٹر امجد نہیں ہوں مگر اس کے بعد ڈاکٹر امجد کا لاہور ہوٹل میں رہنا مشکل ہو جاتا۔ اور لوگوں کو میرے ساتھ دیکھ کر لاہور ہوٹل والے تصدیق و تفتیش کے خبط میں مبتلا ہو جاتے۔ میں نکل بھی نہ پاتا۔

تاہم یہ غنیمت تھا کہ انہوں نے براہ راست تھانے پہنچانے کا ارادہ بدل دیا تھا۔ یہ سب میرے حامی عینک پوش کی کوشش کا نتیجہ تھا جس نے تھانے سے گریز کی خاطر یہ تجویز پیش کی تھی کہ پہلے اس چھوٹے مائنڈ کی بات بھی سن لو اور دیکھ لو کہ ہوٹل والے اسے ڈاکٹر امجد کی حیثیت سے پہچانتے ہیں یا نہیں۔ سوائے میرے حقیقی دشمن کے سب ہی تھانے کی کارروائی سے بچنا چاہتے تھے اور ان کے خیال میں یہ شبہ دور کرنے کا سب سے آسان طریقہ تھا۔ میری بات سچ ثابت ہو جائے تو معافی مانگی جائے۔ وہ اپنے اپنے راستے جائیں ورنہ کسی انعام لینے والوں میں شامل ہو جائیں۔ مختصر یہ کہ معاملہ ... مجھے کچھ بتائے بغیر نہ جانے کدھر نکل گئی تھی۔ وہ وہیں مل جاتی جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا تو یہ سب چکر پڑتا ہی کیوں۔

اب مشکل یہ تھی کہ راستہ کہیں بھی غیر آباد نہیں تھا۔ میں خود اتر جاتا تب بھی پکڑا جاتا اور انہیں اتارتا تو وہ فوراً کسی دوسری کار یا ٹیکسی میں تعاقب شروع کر دیتے۔ دشمن نمبر ایک میری دسترس سے کچھ دور تھا۔ درمیان میں وہ ہیرو ٹائپ ہیرو بیٹھا تھا۔ پہلے اسے ... کرتا تو اصل دشمن قدرے ہوشیار ہو جاتا۔ اور ٹیکسی کے اندر کی محدود جگہ میں حرکت پذیری کی گنجائش بہت کم تھی۔ میں اتنی آزادی اور بے فکری سے ہاتھوں اور پیروں کا استعمال نہیں کر سکتا تھا جیسے کھلے میدان میں۔ بادل ناخواستہ میں نے ریوالور نکالا۔ اتنے اطمینان کے ساتھ جیسے جیب سے سگریٹ نکال کے سلگانا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے درمیان میں ناز سے بیٹھے ہوئے شہزادہ گلفام نے ریوالور دیکھا۔ یہ آلہ اس نے ان گنت فلموں میں دیکھا ہوگا اور جب کسی ہیرو نے ڈراؤنے ... کے پیچھے لگتے ہوں گے تو وہ بھی تالیاں بجانے والوں میں شامل ہوا ہوگا لیکن اصلی ریوالور کے نظارے نے اس کے حواس گم کر دیے۔ اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے بائیں ہاتھ کی کہنی اس کے منہ پر ماری۔ کہنی اس کی ناک پر لگی اور ضرب میری خواہش کے مقابلے میں زیادہ شدید ثابت ہوئی کہ اس کا اوپر والا ہونٹ بھی کٹ گیا اور ایک دانت بھی ہل گیا۔ اس کا سر پیچھے جا لگا۔

"بس... ایسے ہی بیٹھے رہو۔" میں نے اس کو تنبیہ کی ... سے ریوالور کا رخ دشمن کی طرف کر دیا۔

"میں بلا سبب قتل نہیں کرتا لیکن اپنی جان کی حفاظت کے لیے قتل بھی کرنے پڑیں تو کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ میرے ... نے پلٹ کر دیکھا اور اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے پیچھے کا منظر دیکھا۔

"ٹیکسی کو ملتان روڈ پہ لے چلو۔" میں نے سکون سے کہا۔ "تمہیں پتہ ہوگا؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے فقط اقرار میں آہستہ سے سر ہلایا اور ٹیکسی موڑ لیا۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہوگی جناب۔" وہ بولا۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب میرا مطلب ہے آپ جو بھی ہیں..." میرے حامی عینک پوش نے کہا۔ "دیکھیے میں آپ سے متفق ہو گیا تھا۔ اور میں نے مخالفت تو نہیں کی تھی آپ کی..."

"آپ نے ڈیوٹی کے وقت میں سیٹ چھوڑ کے بہت ..." میں نے کہا۔ "اگر آپ پہلے ہی پہنچتے میں ٹانگ اڑا لیتے ... جانے پہنچ کے بعد اپنے کام کے لیے حاضر ہو جاتے تو آپ کو کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ اب ایک طرف آپ فرائض سے غفلت کے مرتکب ہوئے، دوسری طرف..."

میرے دشمن نے بے وقت حرکت کی اور مجھے غافل سمجھ کے ریوالور جھپٹنا چاہا۔ میں نے ہاتھ کو الٹ گھمایا اور ریوالور کا دستہ پوری قوت سے اس کی پیشانی پر ضرب لگائی۔ وہ کراہ کے رہ گیا۔ میرے حامی کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بلند آواز میں درود شریف پڑھنا شروع کیا لیکن اسٹیئرنگ پہ گرفت مضبوط رکھی اور سڑک پہ بالکل ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہا۔ وہ شریف آدمی مصیبت سے نجات کے لیے خدا سے دعا ہی مانگ سکتا تھا۔

"میں اس ریوالور کے بغیر بھی تمہاری گردن کاٹ سکتا تھا۔" میں نے لہجے کو خطرناک بنا کے خونخوار لہجے میں کہا۔ "اس ... ہاتھ درست نہیں تھا۔" ضرب اتنی کاری تھی کہ اس کا سر گھوم گیا تھا ... مجھے صاف دکھائی نہیں دیا ... پچھلے بیٹھے ہوئے دوسرے شخص کی ناک سے اور منہ سے خون بہہ رہا تھا جسے وہ رومال سامنے رکھ کر جذب کر رہا تھا۔ تکلیف کے آثار اس کی صورت سے عیاں تھے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

"تم ڈاکٹر امجد نہیں ہو۔" میرے حامی نے افسوسناک انداز میں سر ہلایا۔

"ڈاکٹر امجد ..." میں نے فلمی ولن والا قہقہہ مارا۔ "وہ کون ہے؟ میرا کیا تعلق ہے؟ ... ہوٹل کا نام لے کر کہہ دیا کہ ... تم مان لیتے کیونکہ تم احمق تھے۔" عینک والے نے سر ہلایا۔ اس میں اختلاف کی ہمت نہ رہی تھی۔ اب میں اس حد تک محفوظ تھا کہ بعد میں کوئی بھی فوراً لاہور ہوٹل جا کے کسی ڈاکٹر امجد کو تلاش کرتا تو خود کو گدھا سمجھتا۔ میں نے اپنے سچ کو جھوٹ تسلیم کر لیا تھا اور انہوں نے مان لیا تھا کہ یہ جھوٹ ہے۔

ملتان روڈ پر بھی ٹیکسی سیدھی چلتی گئی۔ پھر ڈرائیور نے کہا "مجھے پٹرول لینا ہے۔"

"اچھا۔ تو تم گاڑی سڑک پر روکو اور جا کے پٹرول لو۔" میں نے کہا۔

"میں ٹیکسی سے جا رہا ہوں۔ اس کے فیول میٹر کے مطابق ٹینک آدھا بھرا ہوا ہے۔" اپنی فضول سی کوشش پہ ٹیکسی ڈرائیور یقیناً بہت نادم ہوا ہوگا کیونکہ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا تو اس کی صورت رونے والی ہو رہی تھی۔ آبادی ختم ہوتی گئی تو میں نے ٹیکسی کو ایک پتلی سی سڑک پر مڑنے کا حکم دیا جو دائیں طرف کسی نئی آبادی سے گزرتی تھی۔ آبادی کا نقشہ ملکوں کے رنگین ڈیزائن اور پرکشش تفصیلات کے ساتھ ایک بہت بڑے بورڈ پر موجود تھا لیکن وہ آبادی ہنوز معماروں کی خیالی دنیا اور فائلوں میں بسی تھی۔ زمین پر اس کی بنیادیں تک نہیں کھودی گئی تھیں۔ مجھے ایسے بہت سے سائن بورڈ لے جن پہ مستقبل کی کسی حسین ترین اور آسائش اور ماڈرن آبادی کا مژدہ سنایا گیا تھا لیکن مجھے ہر طرف زمین اپنی قدرتی حالت میں نظر آ رہی تھی۔

موڑ کاٹنے کے بعد ٹھیک تیسرے میل پہ میں نے ٹیکسی رکوا لی۔ "اب آپ اتر جائیں۔" میں نے عینک والے سے کہا۔ "یہاں سے تین میل پیدل جانے میں آپ کو آدھا گھنٹہ لگے گا... آپ کو اتنا چلنے کی عادت تو نہیں ہوگی لیکن آج کے بعد آپ کی ایک عادت چھوٹ جائے گی، دخل در معقولات کی۔ پیچھے پلٹ کر مت دیکھنا۔"

"آدمی تم پڑھے لکھے ہو۔ اور مجھے یقین آنے لگا ہے کہ ڈاکٹر امجد ہی ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ مجھے ڈاکٹر سمجھ لیں۔" میں نے تشویش کی علامات ظاہر کیے بغیر کہا۔ "اس نے بھی ایک انسانی دل بدلا تھا اور میں نے بھی آپ کا دل اس حد تک ضرور بدلا ہے کہ آئندہ آپ صدق دل سے وہی کام کریں گے جس کی آپ کو تنخواہ ملتی ہے۔" جب وہ چل پڑا تو میں نے دشمن نمبر دو کو آگے تشریف رکھنے کو کہا۔ عینک پوش نے واقعی پلٹ کر نہیں دیکھا۔

"تم یقیناً یہ پسند نہیں کرو گے کہ میں تمہاری لاش یہیں چھوڑ کر چلا جاؤں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے کسی چیز کا غلط استعمال مت کرنا۔ نہ ہاتھوں کا، نہ عقل کا اور نہ ٹانگوں کا۔ تم گولی کی رفتار سے زیادہ تیز بھاگ سکتے ہو تو اور بات ہے؟"

پچھلے میل پر میں نے بانکے چھبیلے نوجوان کو اتار دیا۔ جیسا مجھ میں ٹانگ اڑانا کہتے ہیں اسے انگریزی میں ناک اڑانا کہتے ہیں ...

www.paksociety.com

ہے آئندہ تم کسی کے معاملے کو اپنی ناک کا مسئلہ نہیں بناؤ گے۔ اچھی خاصی ناک ہے تمھاری۔ ابھی تو جڑ جائے گی لیکن کٹ گئی تو بُرا ہوگا۔ دانت نکل کر لگ جاتے ہیں لیکن ناک نہیں لگتی۔ پیچھے پلٹ کے مت دیکھنا!"

"دائیں طرف ایک میل جا کے گاڑی کو پھر دائیں طرف موڑ لینا۔" میں نے کہا۔ ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھا۔

"دائیں طرف؟ ادھر کون سی سڑک ہے جی؟" اس نے فقط فریادی بن کے کہا۔

"مجھے بھی کوئی سڑک نظر نہیں آ رہی ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "پھر بھی گاڑی موڑ لو۔" ٹیکسی ڈرائیور نے خوفناک واویلا کیا اور پرانی ٹیکسی ہموار لیکن کچے میدان میں دوڑنے لگی تو اس کا جوڑ جوڑ صدا دینے لگا۔ اندر جھٹکوں سے خود مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں کنکریٹ مکسر میں سفر کر رہا ہوں۔ جھاڑیوں اور درختوں سے بچتا، خاردار اور نوکیلے پتھروں سے گریز کرتا اور جو گڑھوں سے کتراتا ٹیکسی ڈرائیور میرے احکامات کے انتظار میں پُرامید نظروں سے اس شیشے میں سے دیکھتا رہا جس میں اب صرف میرا چہرہ ہی قابلِ دید رہ گیا تھا۔ چار میل سفر کرنے کے بعد میں نے ٹیکسی رکوا لی اور دشمن کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ اس کا رنگ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا اور وہ باہر نکلا تو اس کی حالت مُردوں سے بدتر ہو رہی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ باقی دو کو میں نے رحم کھا کے چھوڑ دیا ہے لیکن اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو میری ساری پریشانی کا ذمے دار تھا۔ "تم... تم مجھے یہاں قتل کرنے کے لیے لائے ہو؟" وہ تختۂ دار پر کھڑے ہوئے شخص کی طرح لرزنے لگا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "اتنے قتل پہلے کیے ہیں، ایک اور سہی۔ وہ سب بھی مجبوری کے تحت کرنے پڑے تھے۔"

"خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ مجھے لالچ نے اندھا کر دیا تھا۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بے ربط الفاظ میں بولا۔ "مجھے... میری جان بخش دو۔"

"تم میرے عوض دس ہزار روپے لیتے تو کیا کرتے...؟ جیب کٹی نامی گرامی اشتہاری مجرم کی گرفتاری کا انعام ملتا ہے تو اس سے دشمنی کا تحفہ ساتھ آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اتنا بڑا بدمعاش اکیلا نہیں ہوتا۔ اس کے بڑے مضبوط سہارے ہوتے ہیں جو اس کے ان گنت ہاتھوں کی طرح ہر طرف پھیلے ہوتے ہیں۔ ان کی دسترس سے باہر کچھ نہیں ہوتا۔ وہ جسے چاہتے ہیں پکڑ لیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ میں تمھیں تو لی

مارنے کے بعد یہاں چھوڑ جاؤں تو تمھاری لاش گدھ یا پھر گیدڑ اور بھیڑیے کھا جائیں گے۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور [illegible] شریف گھرانے کے چکر میں پڑنے والا آدمی نہیں ہے [illegible] جانے کے بعد سب کچھ بھول جائے گا۔ کہو، اب [illegible] کہاں ہے تو کیا کہو گے؟"

"میں... میں... جو آپ چاہیں گے۔" [illegible]

وہ سوالیہ بےساختہ لہجے میں بولا۔

"ہاں۔ تم ملتان روڈ کی طرف تو گئے ہی نہیں [illegible] سوچی سمجھائی اور شاہ عالمی تک آتے جاتے رہے۔"

"لیکن... سرجی... وہ دو... انھوں نے تو [illegible]" وہ بولا۔

"نہیں۔ ان کو میں نے اسی لیے پلٹ کر دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ اور پھر اس شخص کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم کون ہو؟ پولیس کے آدمی؟ یا خفیہ پولیس کا [illegible]" میں نے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔" وہ بولا۔ "میرا ارادہ تمھیں پولیس کے لے جانے کا نہیں تھا۔ میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاتا۔"

"کہاں؟ اپنی سسرال؟" میں نے اس کی بات [illegible]

اس نے جیب سے ایک شیشی نکالی۔ "احتیاط [illegible] کرکے۔ یہ کلوروفارم ہے۔"

میں نے ہاتھ آگے بڑھا کے شیشی لے لی۔ [illegible] سونگھنے کا خطرہ مول لینا مشکل تھا۔ میں نے اسے جیب میں [illegible] میں بعد میں تصدیق کر لوں گا کہ اس میں کیا ہے۔ [illegible] تم مجھے بیہوش کیسے کرتے؟ آخر تم نے یہ کیسے فرض کر [illegible] کام بہت آسان ہے؟ یہ معاملہ الٹا بھی ہو سکتا تھا۔ [illegible] اگر میں تم کو سونگھنے دیتا تو وہی گھوڑے والا کیس ہو جاتا [illegible] نلکی میں دوا ڈال کر پلانی چاہی تھی مگر مالک کے بجائے [illegible] پہلے سونگھ ماری۔ دوسری بات یہ بتاؤ کہ کیا تم [illegible] شیشی اسی طرح جیب میں لیے پھرتے ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور میں نے اس [illegible] ماری۔ وہ نیچے گر پڑا اور بری طرح چلانے لگا۔

"[illegible] بیٹا جیب میں کلوروفارم [illegible] پھر تاکہ اسے کوئی مفرور اشتہاری مجرم مل جائے گا تو وہ [illegible] قابو کرے گا۔" میں نے کہا۔ "کیا تمھارے فرشتوں نے [illegible] فلاں دن فلاں وقت پر اور فلاں جگہ تم کو [illegible] تم مجھے اگر پولیس کے پاس نہ لے جاتے تو کہاں لے [illegible] مت بولنا ورنہ قتل کرنے سے پہلے پسلیاں توڑ دوں گا [illegible]

[illegible] تم کو مرنے جاتا۔ میرا ارادہ یہی تھا۔ میرا ایک جاننے والا [illegible] ہے۔ وہ مجھے دس ہزار کے آدھے دے کر تم کو لے جاتا۔ [illegible] نے دیا جاتا۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "مگر تھانیدار میرا جانی [illegible] ہے۔"

میں نے پے در پے اس کے گھٹنے پر مارے اور اس کو دو بار [illegible] کے زمین پر پٹخا۔ وہ نیم بیہوش ہو گیا۔

"تم کون ہو آخر؟" میں نے کہا۔ "تم خیر خواہ پولیس کے آدمی۔ یہ [illegible] ساتھ کیوں لیے پھرتے ہو؟ بچوں کو اغوا کرتے ہو؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے اس کو ٹھوکریں [illegible] مار کر زخمی کر دیا۔ "بچوں کو بیہوش کرکے کہاں لے جاتے ہو؟ فروخت کر دیتے ہو یا والدین سے رقم وصول کرکے ان کی زندگی کا [illegible] میرا خیال ہے تم اب بھی جھوٹ بول رہے ہو۔ اب [illegible] کے نئے اغوا کرنے ہیں اور کہاں سے؟ ان کے والدین [illegible] نام اور پتے بتاؤ۔ اگر جھوٹ بولا تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔" میں نے [illegible] جیب میں رکھ لیا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

وہ بزدل آدمی تھا اور اس میں مار کھانے کا بالکل حوصلہ نہیں [illegible] اگر [illegible] ہوتا تو اس کی چیخ پکار سے سارا محلہ جمع ہو جاتا۔ [illegible] اعترافات کے بعد ٹیکسی ڈرائیور بیچارہ کھڑا تھا۔ اب بھی اس [illegible] تھا کہ مجرم میں ہوں۔ اب اچانک اس پر انکشاف ہوا تھا کہ [illegible] مجرم کا منصب ہو چکا ہے جسے میں اغوا کرکے [illegible] لایا تھا۔

"[illegible] سے جی۔" ٹیکسی ڈرائیور نے نفرت اور [illegible] سے کہا۔ "اوئے بچے اٹھاتا ہے خنزیر؟ آپ اس کو پولیس [illegible] کیوں نہیں کرتے؟"

"پولیس؟" میں نے طنز سے کہا۔ "وہ تو ایسے مجرموں کی معاون [illegible] شریک ہے۔ وہ ان سے رشوت کھا کے [illegible] چھوٹ جائے گا۔ یہاں سے بچ کر کیسے جائے گا۔ [illegible] میں نے ٹیکسی کی [illegible] اور اس شخص کو [illegible] کر دیا۔ اس کا رخ پلٹ کے میں نے تلاشی لینے کے [illegible] جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس نے مزاحمت کی اور میں نے اس [illegible] دیا۔ وہ بلبلا اٹھا۔ "اوئے ہائے مر گیا۔ ہائے [illegible]" اس کی جیب میں سے بائیس ہزار روپے کی رقم برآمد [illegible] ہزار کی دو گڈیاں تھیں۔ ہر گڈی میں سو کے سو نوٹ [illegible] بینک کی مہر تھی۔ میں نے غور سے دیکھی تو بینک [illegible] کا نام صاف پڑھا جاتا تھا۔ باقی رقم کے نوٹ الگ [illegible] نے نوٹ [illegible] پھینک دیے جیسے وہ [illegible] گندگی کے ٹکڑے ہیں یا کوئی بہت غلیظ چیز۔ ٹیکسی

ڈرائیور مزید متاثر ہوا۔ اس کے خیال میں وہ شخص بدترین سزا کا مستحق تھا اور میں اس کے ساتھ بہت مناسب سلوک کر رہا تھا۔ کاغذات میں ایک کسی ڈاکٹر کا نسخہ تھا، ایک اسکول فیس کی رسید جس پر کسی بچی کا نام تھا۔ بچی چوتھی جماعت کی طالبہ تھی اور رسید پر آج کی تاریخ تھی۔ وہ دونوں دستاویزات کارآمد تھیں لیکن تیسری چیز ایک ڈرائیونگ لائسنس تھا جس پر اسی شخص کی تصویر تھی۔

"یہ تمھاری بچی ہے نا؟" میں نے رسید لہرا کے کہا۔ "فرض کرو میں تمھیں اسی جگہ درخت سے باندھ جاؤں اور کل صبح اسے اٹھا لوں۔ اس وقت جب وہ اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلے؟"

وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ "اور بدمعاش! تو نے بھی تو ایسے ہی دوسروں کے گھر برباد کیے تھے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے فرطِ جذبات میں اس کے ایک تھپڑ مار دیا اور اس کارِ خیر میں شریک ہونے کا ثواب حاصل کیا۔

"یہ کیا ہی کرتا ہے؟" میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی اس نے سچ نہیں بتایا۔ جن کے اپنے بچے اسکول میں پڑھتے ہوں وہ کسی کے بچے نہیں اٹھاتے۔ یہ بیس ہزار کہاں سے ملے؟"

تھوڑی سی مار کھانے کے اس نے اعتراف کر لیا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا اور اس نے کبھی کسی کا بچہ نہیں اٹھایا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی عقل خبط ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سچ کیا سمجھے اور جھوٹ کیا۔ حقیقت تو گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہی تھی۔ پہلے تو اس نے مجھے مجرم سمجھا تھا جیسے شریف لوگ تھانے لے جا رہے تھے کہ میں نے ریوالور کی مدد سے سب کو ہائی جیک کر لیا۔ پھر اس پر یہ عقدہ کھلا کہ بدمعاش تو وہ تھے جن کو میں پکڑ لایا تھا اور جو سب سے بڑا بدمعاش تھا وہ بھی ایک جرم کا اعتراف کرتا تھا تو کبھی دوسرے کا۔ میری حیثیت کا تعین وہ ابھی تک نہیں کر سکا تھا۔ میں پولیس کا آدمی ہوں تو اس کارروائی کا کیا جواز ہے۔ اصولاً مجھے یا تو مجرم کو بڑے تفتیشی تھانے لے جانا چاہیے تھا یا اب تک سودے کی بات کرکے رخصت کر دینا چاہیے تھا مگر میں نے تو ابھی خاصی رقم کو بھی پھینک دیا تھا اور اگر میں واقعی مجرم ہوں تو دوسرے مجرم کو سزا کیوں دینا چاہتا ہوں۔ جو کچھ اب اس کے سامنے ہو رہا تھا وہ بہرحال مجرم نہیں تھا۔ اگر میں ایسے مجرم کو زندہ گاڑ دیتا تب بھی وہ یہی سمجھتا کہ میں نے انصاف کیا ہے۔

"میرا خیال ہے کہ تم نے یہ بیس ہزار روپے کسی بینک سے نکلنے والے سے چھینے ہیں؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ اب سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ فرشِ خاک پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔

"کیسے؟ جیب کاٹنے والے کلوروفارم کی شیشی نہیں استعمال

www.paksociety.com

کرتے۔" میں نے کہا۔ وہ کچھ بتانے پر آسانی سے تیار نہ ہوتا تھا۔ بظاہر اس کی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ اس پر مزید تشدد جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ مگر وہ اتنا اداکار تھا کہ درد ناک آوازیں نکال لیتا تھا اور عالمِ نزع طاری کرنے کا ماہر تھا۔ بعد میں اس کی قوتِ برداشت کہیں زیادہ ثابت ہوئی۔ میں نے اسے کچھ اور دبایا تو اس نے حقیقت اگل دی۔ وہ بینک سے نکلنے والوں کو لوٹتا تھا۔ اس کے لیے وہ بینک اسکوائر کے مختلف بینکوں میں گھومتا رہتا تھا۔ کہیں نہ کہیں اسے کسی دفتر کا کیشیئر یا کوئی شریف بزنس مین مل جاتا تھا جو معقول رقم لے کر نکلتا تھا اور رکشا ٹیکسی یا اپنی سواری لے کر جانے کے بجائے پیدل روانہ ہو جاتا تھا۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ دن دہاڑے بھرے بازار میں اسے کون لوٹ سکتا ہے۔ وہ بیگ یا بریف کیس کو مضبوطی سے پکڑے رکھتے تھے اور اطمینان سے چلے جاتے تھے اور یہ بھی محسوس نہیں کرتے تھے کہ ان کے دائیں بائیں یا آگے پیچھے کون ہے۔ موقع پاتے ہی وہ کلوروفام میں بھیگا ہوا رومال ان کی ناک پر رکھ دیتا تھا اور جب وہ چکرا کے گرنے لگتے تھے تو وہ فوراً انہیں سنبھال لیتا تھا۔ یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ خود بھی اچانک بے ہوش ہو جانے والے شخص کے ساتھ ہے جیسے مرگی کا دورہ پڑا ہے یا ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اسے رکشا ٹیکسی میں ڈال کے اسپتال لے جاتے ہوئے وہ بے ہوش آدمی کا نقد سرمایہ اپنے قبضے میں کرتا تھا اور اسپتال پہنچنے کے بعد رکشا ٹیکسی ڈرائیور کو ایمرجنسی وارڈ کے باہر روک کر انتظار کرنے کو کہتا تھا تاکہ وہ اندر سے اسٹریچر منگوا لے۔ لیکن وہ ایمرجنسی وارڈ میں ایک طرف سے داخل ہو کے دوسری طرف سے باہر نکل جاتا تھا۔ انتظار سے گھبرا جانے والا ڈرائیور جب کسی سے بات کرتا ہوگا تو پھنس جاتا ہوگا۔ کرنے والے اس سے نہ جانے کتنے سوال کرتے ہوں گے کہ مریض کون ہے؟ اس کا مریض سے کیا رشتہ ہے؟ مریض کو کیا ہوا تھا اور اسے لے کر کون آیا تھا؟ سب کا جواب "بابو کے پاس" "مجھے معلوم نہیں" کے سوا کیا ہوتا ہوگا۔ پھر مزید قل غپاڑہ ہوش میں آنے والا کرتا ہوگا کہ وہ لٹ گیا اور سب سے پہلے تو پولیس رکشا ٹیکسی کے ڈرائیور کو مشکوک سمجھتی ہوگی اور اس مفروضے پر بیدردی سے اعترافِ جرم حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہوگی کہ وہ بھی اسی گروہ کا رکن ہے جو مل کر اس قسم کی وارداتیں کرتا ہے۔ ایک آدمی مارتا ہے اور دوسرا فوراً رکشا لے کر پہنچ جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے یہ تفتیش اس وقت تک جاری رہتی ہوگی جب تک پولیس کو یقین نہ آجاتا کہ اب ملزم کے منہ سے سچ نکلنے کے مقابلے میں اس کے تن سے جان نکلنے کے امکانات زیادہ روشن ہو گئے ہیں۔ یہ کام وہ مہینے میں ایک یا دو بار ہی کرتا تھا۔

یہ سب ٹیکسی ڈرائیور بھی سمجھتا تھا۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس جاسوسی اور شیلا ان سے لوگوں کا مال بھی چھینا ... کے ہم جیسا فراڈ کی برادری کو بھی جھوٹے الزامات میں ... بدنام کیا تھا اور تھانوں میں تختۂ مشق بنوایا تھا۔ وہ ان ... جن کے سبب کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ گالیوں کی ... کے ساتھ اس پر پل پڑا۔ میری تفتیش نے ملزم کو نیم جان ... ورنہ وہ ٹیکسی ڈرائیور سے کبھی مار نہ کھاتا اور نہ ... اتنی جذباتِ رعونت کا مظاہرہ نہ کرتا۔ اس وقت میں ... کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اگر میں خود مفرور مجرم ... مجرم کو پولیس کے حوالے کرنا اپنا فرض سمجھتا اور یہ فرض ... مطمئن ہو جاتا۔ اب بڑا چور جیسے چھوٹے چور کو کس منہ سے ... سامنے لے کر حاضر ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور اپنے انتقامی جذبے ... بجھا چکا تھا اور اگر میں یہ ذمہ داری اس کے سپرد کرتا تو ... کہ مجھے تو معاف رکھیے جناب۔ تھانے میں اپنی مرضی سے ... ممکن ہے وہاں سے آنا اپنی مرضی کی بات نہیں۔ وہ ... آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ایک لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش ... وہ کہیں کہ ایسا پھر بھی شرافت تو اپنی سے اعتراف کرا... اوڈش کی گئی ہے۔

اگر میں اس کو چھوڑ دیتا تو وہ اپنے جاننے والے کے ذریعے یہ خبر آگے پہنچا دیتا کہ ملزم سکندر بخت ... یوں پکڑا گیا اور فلاں ٹیکسی میں تھانے لے جانے والا ... روڈ کی سیر کرانے لے گیا۔

"ارے تم بتاؤ کہ بندہ ایسے کرتوت..." ... گوشمالی کے بعد اسے راہِ راست پر لانے کے لیے ... سمجھیں۔ اچانک مجھے اس کے ڈرائیونگ لائسنس کا خیال ... میں نے جیب کے اندر رکھ لیا تھا۔ یہ میری غلطی ... جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ٹرک یا بس چلاتا رہا ہے۔ اس ... الف دین تھا۔

"الف دین، تم کیا چلاتے تھے؟" میں نے ... کی مناسبت دیکھی۔ "بس یا ٹرک؟"

"ٹرک... لاہور سے کراچی آتا جاتا تھا۔" وہ بولا۔

"پھر یہ محنت کی کمائی چھوڑ کے اس بدمعاشی کے میں کیوں لگ گئے؟" میں نے کہا۔

"آدمی خود کیا کرتا ہے جی! سب تقدیر کراتی ہے۔"

"پولیس کی گالیاں کھانا اور ان کو حرام کھلانا بھی منظور ... بھی کرتا تھا میں مزدوروں کے اور ڈرائیوروں کی ... تھا۔ اطمینان تو تھا کہ میں اولاد کو حرام نہیں کھلاتا۔ ایک ... میری ... انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتی ہے؟"

"میں نے رسید پر اسکول کا نام دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "پھر تمہارے خیالات کیوں بدل گئے؟"

اس نے سرد آہ بھری۔ "بس جی۔ دنیا میں ہیرا پھیری کے بغیر کام نہیں چلتا۔ میں ایک چکر میں آ گیا تھا۔ کراچی سے کر جانا تھا مال کر تیا پانچ گیا۔ مجھے کہاں معلوم تھا کہ گڑ اور چاول کی بوریوں کے بیچ میں ایک بوری نشے کی بھی ہے۔ جیسے کا مال تھا وہ تو صاف مکر گئے کہ ہم تو اوکھے لوگ ہیں۔ ساری منڈی میں ساکھ ہے ہماری۔ یہ بوری کسی نے رکھی ہوگی۔ پتہ نہیں لگے گا کس کی ہے۔ ان کے پاس پیسہ بھی تھا اور بظاہر وہ آدمی بھی تھے۔ میرا کون تھا جو مجھے بچاتا۔ میں نے کریم سیٹھ کا حوالہ دیا۔ وہ تھانے آیا اور مجھ سے کہہ گیا کہ فکر مت کرو۔ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہم تمہیں بچا لیں گے اور انہوں نے مجھے بچا بھی لیا لیکن نوکری سے جواب دے دیا۔ پولیس کے سامنے تو وہ بھی اجنبی بن رہا تھا کریم سیٹھ۔"

"کس کریم سیٹھ کی بات کر رہے ہو؟" میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"کراچی کا بہت بڑا بدمعاش دلال ہے جی۔" وہ بولا۔ "ہر قسم کا ناجائز کاروبار کر کے سیٹھ بن گیا ہے۔ اسمگلنگ سے لاکھوں روپے بنائے ہیں۔ ہر قسم کا مال ادھر سے ادھر کرتا ہے۔ آج کل اسلحے کی ناجائز فروخت سے کروڑوں بنا رہا ہے۔"

"تم جانتے ہو یہاں اس کا بزنس کس سے تھا؟" میں نے کہا۔

"پہلے تو سنو بھائی عجب دین اینڈ کمپنی سے تھا۔" وہ بولا۔ "آج کل سیٹھ دلاور سے ملا ہوا ہے۔"

اگر وہ جیب سے توپ نکال کر میرے کان کے قریب داغ دیتا تب بھی مجھ پر وہ اثر نہ ہوتا جو دلاور کا نام سن کر ہوا۔ بے شک وہ دنیا میں واحد دلاور نہیں تھا لیکن اس سے پہلے الف دین سیٹھ کریم کا نام بھی لے چکا تھا جو کراچی میں تھا اور ان دونوں ناموں کا باہمی تعلق اتفاق نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور تو میری طرف دیکھ کر نہیں رہا تھا لیکن الف دین سے میری حالت کا تغیر چھپا نہ رہ سکا۔ حالانکہ اپنے طور پر میں نے پوری کوشش کی تھی کہ صورت سے کچھ ظاہر نہ ہونے دوں۔ میں چند منٹ تک بے یقینی کے خلا میں معلق رہا۔ پھر آہستہ آہستہ میں نے حواس پر قابو پایا۔

"تم... تم الف دین کو جانتے ہو؟ ... نام تھا اس کا۔" میں نے کہا۔ اب بات خراب ہو گئی تھی۔ اس کی مشتبہ کوشش سمجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ کچھ اپنا اور میں نے الف دین کو دیکھ کر مجھے اس کی صورت جانی پہچانی کیوں لگی تھی۔

اس نے سر ہلایا۔ "وہ میرا چھوٹا بھائی ہے جی۔" مگر اس کی صورت پر حیرانی نظر آنے لگی۔

"آج کل کہاں ہے وہ؟" میں نے کہا اور دونوں بھائیوں کی صورت کی مشابہت پر غور کرنے لگا۔

"معلوم نہیں، بڑک سے کر کہیں گیا ہوگا۔" الف دین نے کہا۔

"تم سے آخری بار کب ملا تھا؟" میں نے اس پر نظر جما کے کہا۔

"ایک مہینہ ہو گیا۔ شاید دو چار دن اوپر۔"

"تم دونوں بھائی کسی طرح مہینے میں ایک بار ملتے ہو؟" میں نے کہا۔ "تمہارے ساتھ رہتا ہے وہ؟"

"نہیں جی۔ اس کا اپنا گھر بار ہے، بیوی بچے ہیں۔" الف دین بولا۔ "مجھے اسی نے ٹرک چلانے کا لائسنس دلوایا تھا اور پھر مستقل کام دلایا۔ ہماری بیویوں کی آپس میں نہیں بنتی تھی لیکن وہ بہت خیال کرتا تھا میرا۔"

"چھوٹا بھائی ہونے کا اچھا حق ادا کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ نہیں بتایا تھا کہ مستقل کام میں اندر ہو جاؤ گے۔"

"یہ تو اسے بھی معلوم نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "وہ جانتے بوجھتے مجھے کنویں میں دھکا نہیں دے سکتا تھا۔ وہ دشمن نہیں تھا میرا۔"

"تم کو معلوم ہے وہ کس کے لیے کام کر رہا ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ٹرک اس کا اپنا تھا۔ وہ کسی کا ملازم نہیں تھا۔"

"یہ بھی اس نے جھوٹ کہا تم سے۔" میں نے کہا۔

"آپ... آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" الف دین کے لہجے میں اچانک تشویش کے آثار پیدا ہوئے۔

"تم نے دلاور کے لیے کام کیا تھا۔ کبھی ملے تھے اس سے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس کا صرف نام چلتا تھا کہ سیٹھ دلاور کا مال ہے۔" وہ بولا۔

"اور مال تمہارے حوالے کون کرتا تھا؟" میں نے کہا۔ "ادائیگی کون کرتا تھا؟"

"اس کا ایک ایجنٹ، کوئی ملازم یا منشی۔" وہ بولا۔ "رحمت نام تھا اس کا۔"

"رحمت کباڑی؟" میں نے کہا۔ "کبھی اس کے ساتھ کالا ماچھی بھی آتا تھا۔ یا چھوٹو نام کا ایک کلینر؟"

"چھوٹو کو میں نہیں جانتا۔" وہ بولا۔ "مجھ سے ماچھی کا نام بھی سنا تھا۔ رحمت کا پورا نام رحمت کباڑی تھا۔ آپ اس کو جانتے ہیں؟"

"میں اس کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "جن کا میں نے نام لیا، وہ سب دلاور کے کارندے ہیں اور افسوس کی بات یہ ہے الف دین کہ تمہارا چھوٹا بھائی طافو بھی اسی کے لیے کام کرتا تھا۔"

www.paksociety.com

"تمہارا کیا مطلب ہے؟" وہ چونکا۔ "کیا اس نے وہ کام چھوڑ دیا ہے؟ یا وہ اندر ہو گیا ہے؟"

"وہ قبر کے اندر ہو گیا ہے، قید حیات سے چھوٹ گیا ہے الف دین۔" میں نے کہا۔

الف دین کی حالت ابتر ہو گئی۔ "جھوٹ... تم جھوٹ کہتے ہو۔ کب ہوا یہ حادثہ...؟" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

"حادثہ؟ میں نے تو کسی حادثے کا ذکر نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ جھوٹ نہیں ہے الف دین کہ طافو مر چکا ہے۔"

"کیسے؟" وہ چلایا۔ "اور کب؟"

"اسے دلاور نے مروا دیا ہے۔" میں نے بے رحمی سے کہا۔ "جس کے لیے وہ کام کرتا تھا۔ اس بات کو آج تین دن ہو گئے۔"

اس کا جسم لرزنے لگا۔ "تین... تین دن ہو گئے... طافو کو مرے تین دن ہو گئے...؟" وہ کھوکھلے لہجے میں بولا۔

"ہاں۔ اسے بھی تمہاری طرح سازش کے جال میں پھنسا لیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی محنت مزدوری کر کے حق حلال کی کمانے کو اچھا سمجھتا تھا اور اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ جس کے لیے کام کرتا ہے اس کا اصل دھندا کیا ہے۔ وہ اپنی ہزار روپے مہینہ کی تنخواہ میں خوش تھا۔ پھر سیٹھ کریم نے اس کے ساتھ زبردستی کی۔ اس نے دلاور کا ایک مال سے بھرا ہوا ٹرک غائب کر دیا۔ رحمت کباڑی اور طافو کو خاموش رہنے کے پانچ پانچ لاکھ دیے اور دلاور کو اطلاع کر دی کہ گودام پر چھاپہ پڑ گیا ہے۔ اس نے کسی سے مل کر اخبار میں خبر لگوا دی تھی لیکن دلاور کو معلوم ہو گیا۔ اس نے رحمت کباڑی اور طافو کو مروانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ رحمت تو مارا گیا...." میں نے عمداً اس کی موت کے اصل واقعات بتانے سے گریز کیا۔ "طافو کو اتنا وقت مل گیا تھا کہ وہ رقم بیوی بچوں کے حوالے کر گیا اور انہیں تاکید کر گیا کہ وہ فرار ہو جائیں۔ طافو کو یقین تھا کہ دلاور کے کارندے انہیں کبھی تلاش نہیں کر سکتے۔ اپنی جان دے کر اس نے بیوی بچوں کی جان بچا لی ورنہ دلاور انہیں بھی نہ چھوڑتا۔ پیسہ ان کے پاس ہے۔ ان کے لیے زندہ رہنا مشکل نہیں ہوگا۔ وہ خوش رہیں گے۔"

"طافو کے بغیر؟" الف دین دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ "کیا پیسہ باپ ہوتا ہے؟ اس کی بیوی تو ہزار روپے مہینہ میں بھی خوش تھی۔ خوش نہ ہوتی تو اس کے ساتھ کیوں رہتی۔ کوئی بیوی اپنے گھر کو پانچ لاکھ میں بیچ کر خوش رہ سکتی ہے؟"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ طافو تو کسی صورت نہیں بچ سکتا تھا۔ اگر وہ پانچ لاکھ لینے سے انکار کرتا تو غبن کرنے والے اسے مار ڈالتے۔ غبن کرنے والوں کا ساتھی بنتا تو مالک سے نمک حرامی اور غداری کرنے کی سزا پاتا۔ سزا سے اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا مگر اس نے بیوی بچوں کے لیے کچھ تو کیا۔ صبر کرو اور ہمت سے کام لو۔"

"کیسے صبر کروں؟" وہ چلا چلا کے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کے بولا۔ "کہاں سے لاؤں ہمت...؟"

ٹیکسی ڈرائیور پاگل ہونے کے قریب تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی سی دیر میں صورت حال اس حد تک کیسے بدل گئی۔ ظالم و مظلوم ایک ہو گئے۔ کچھ دیر پہلے میں کسی کو زندہ گاڑ دینے اور اس کی لاش کو گدھوں اور گیدڑوں کے لیے چھوڑ جانے کی دھمکی دے رہا تھا اور مار مار کے جان سے مار دینا چاہتا تھا اب میں اس کے ساتھ ہمدردی کر رہا تھا۔ اسے ہمت سے کام لینے اور صبر کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اچانک اس بدمعاش کے بھائی سے میرا تعلق نکل آیا تھا اور میں اس کے خاندانی معاملات پر بات کرنے لگا تھا۔ باقی سب نام اس کے لیے غیر اہم اور اجنبی تھے۔ رحمت کباڑی، دلاور یا گلاب یا جگی کے نام سے اسے اندازہ لگانے میں مدد ملی ہوگی کہ وہ طافو کی موت کے ذمہ دار تھے۔ بے ایمان اور غلط قسم کا کاروبار کرنے والے لوگ تھے۔ میرا بھی ان سے تعارف ضرور تھا۔ اب یہ خدا جانے کہ میں بھی ان کا کارندہ تھا یا قانون کا نمائندہ۔ بدمعاشوں کو پولیس بھی جانتی ہے اور اکثر جاننے والوں سے زیادہ جانتی ہے۔

میں الف دین کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ بھی اپنی مرگ اور بھائی کے قتل کی خبر نے اس کو زخم خوردہ سانپ کی طرح انتقام کی آرزو میں پاگل کر دیا تھا۔ اس کی دشمنی کے اسباب جدا تھے۔ مختلف وجوہات کی بنا پر دلاور اینڈ کمپنی کا دشمن ہو رہا تھا۔ اس کے نقصانات کی نوعیت بھی مختلف تھی لیکن دلاور کے خلاف اس کے اور میرے جذبات کی نوعیت یکساں تھی اور میں نے اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ اس کے جذبات کو ہوا دینا اور اسے اندھے انتقام کے جنون میں مبتلا کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا کیونکہ وہ عقل و ذہانت میں اوسط درجے سے بھی کم تھا اور اگر میں احتیاط کے ساتھ اس کی ہمدردی حاصل کر کے اسے یقین دلانے میں کامیاب ہو جاؤں کہ اس کا اور میرا دشمن ایک ہی ہے تو وہ بھی میرے لیے اتنا ہی کارآمد ثابت ہو سکتا تھا جتنا استاد شیدی ہوا تھا۔ وہ بھی نچلے درجے کا بدمعاش تھا مگر میں نے اسے عزت دی اور عزت کا احساس دیا تو وہ شاطر اور عیار ذہن رکھنے والے اشرافیہ معتبر کہلانے والے دوست نما دشمنوں سے زیادہ مخلص دوست ثابت ہوا۔ لیکن یہ سب کچھ اس جنگل میں اور اس ٹیکسی ڈرائیور کے سامنے نہیں ہو سکتا تھا۔ احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور کو

کم سے کم معلوم ہو۔ الف دین کو اتنا ہی معلوم ہو جتنا اس کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے اور لائحہ عمل رابعہ اور محسن کی مشاورت سے ہی بنے۔

"اچھا اب اٹھو۔" میں نے پھر ریوالور نکال لیا۔ "مجھے سوچنا پڑے گا کہ ان حالات میں تمہارے ساتھ کیا رعایت کی جائے۔ تم کسی طرح بھی قانون سے کوئی رحم کی اپیل نہیں کر سکتے۔ اگر تم جیل چلے گئے تو تمہاری بیوی کو معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری آمدنی کے ذرائع کیا تھے۔ اب تک تم نے اسے کچھ نہیں بتایا ہوگا؟"

"نہیں، وہ سمجھتی ہے میں کمیشن کی بنیاد پر کسی کے ساتھ کاروبار کرتا ہوں۔" وہ بولا۔

"اور مہینے میں ایک دو بار جتنی رقم اسے جا کر دیتے ہو وہ تمہارا کمیشن ہوتی ہے؟" میں نے کہا۔ "جب یہ راز فاش ہو گیا تو اس کی سزا صرف تمہیں ہی نہیں، تمہارے بیوی بچوں کو بھی ملے گی۔ اس آمدنی میں وہ خاصی آسائش سے رہتے ہوں گے۔ تمہاری انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے والی بچی جسے فر فر انگریزی بولنا آتی ہوگی [illegible] مگر یہ خبر پھیلنے کے بعد اسے یقیناً اسکول سے نکال دیا جائے گا۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "اسکول سے اسے کوئی نہیں نکال سکتا۔ وہ اسکول میرا اپنا ہے۔"

میں چونک گیا۔ "اسکول تمہارا ہے؟ وہ کیسے؟"

"ایسے کہ اسکول میرے پیسے سے بنا ہے اور میری بیوی اسکول کی سرپرست ہے۔" وہ بولا۔ [illegible]

میرا دماغ گھوم گیا۔ یہ وہ تماشا ہے تو چشم تماشائی کو کیا کیا نظر آتا ہے۔ یہ دھوکے سے لوگوں کو لوٹنے والا شخص مال غنیمت سے اسکول چلا رہا تھا۔ قوم کے نونہالوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر رہا تھا۔ اس کی بیوی درس و تدریس کے معزز اور مقدس پیشے سے وابستہ تھی۔ اس کا ایک ہاتھ جرم اور گناہ کا رنگ تھا جو حرام کماتا تھا اور دوسرے ہاتھ میں تمہارا رنگ تھا اور یہ دوسرا ہاتھ کار خیر میں مصروف تھا۔ تمام شعور سے نوٹس کا سبب بنا۔ نیکی بنا جہاں تجدید و تالاب بنا۔ شاطر نے ہر کوشش سمجھایا کہ فیض کے اسباب بنانے کے لیے معاشی وسائل جائز طریقے سے پیدا کیے جائیں یا ناجائز طریقے سے، مجرم اور گناہگار وہ خود تھا مگر ایسا کام بھی کر رہا تھا جو فلاح انسانیت کا سبب تھا اور ثواب کا کام تھا۔ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ مال حرام سے جو تعلیم دی جا رہی تھی وہ حرام تھی یا ناجائز تھی۔ اور وہ بچے قصور وار تھے جنھوں نے الف بے پڑھا اور اس کے اسکول سے سند حاصل کی؟ نہیں، تعلیم تو تعلیم ہے۔ آدمیت کا لباس اور انسانیت کا گہنا۔ علم کی طلب رکھنے والے نیک نیتی کے ساتھ پہنچے اور خلوص نیت سے ساتھ فارغ التحصیل ہوتے۔ انھیں یہ کبھی نہ جاننا کہ اسکول کو چلانے والا پیسہ حلال کے راستوں سے آ رہا تھا یا حرام ذرائع سے۔ وہ کالا دھن تھا یا سفید۔ اسکول کا پرنسپل گورا ہو یا کالا، اگر وہ پڑھاتا ہے اور چوری کرنا نہیں سکھاتا تو واجب ہے کہ اس کی تعظیم کی جائے۔ میں نے الف دین کو جیل میں بند کرا دیا تو آمدنی کا وہ ذریعہ بند ہو جائے گا اور سینکڑوں بچوں کے لیے آدھی فیس پر اچھی تعلیم کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ کون یقین کرے گا کہ الف دین مجرم تھا۔ بددعائیں جو معصوم بچے دیں گے ان کو لگیں گی جس نے حصول علم کا یہ سرچشمہ بند کیا۔ آخر ثبات نے اعتبار پر بنا لو یہ فیصلہ مجرم تو چوری اور ڈاکے، رشوت اور اسمگلنگ سے حاصل ہونے والی دولت کو ذاتی شان و شوکت، عیش و عشرت اور دنیاوی جاہ و عزت حاصل کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ کس بدمعاش نے آج تک بینک لوٹ کے اسکول بنایا؟ کس جیب کترے نے طلبا کو وظائف دیے؟ کس اسمگلر نے اسپتال قائم کیا؟ چنانچہ الف دین کون ہے؟ مجرم اور گنہگار یا کار خیر کرنے والا محسن عظیم؟

لاحول ولا قوۃ۔ میں نے سر کو زور سے جھٹکا۔ خیالات سے چھٹکارا پانے کے لیے جھٹکا۔ یہ قانون شکنی کا معاملہ ہے۔ اسے اخلاقی نقطہ نظر سے یا مذہبی عقائد کی کسوٹی پر کیسے پرکھا جا سکتا ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ الف دین اپنی نوعیت کا منفرد مجرم تھا۔ ایسا کہ پہلے نہ دیکھا نہ سنا۔ مشہور تھا رابن ہڈ بھی ایسا ہی کرتا جو امیروں کی تجوریوں سے دولت نکال کر غریبوں میں بانٹ دیتے تھے جن کا خون چوس کے دولت اکٹھی ہوتی تھی مگر الف دین نے تو اسکول ہی قائم کی۔

"ٹیکسی میں بیٹھو۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اپنا سارا پیسا اٹھا لو۔" وہ اب بھی اپنے بھائی کو یاد کر کے رو رہا تھا لیکن اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ ٹیکسی اسی راستے سے واپس ہوئی۔ مجھے راہ میں وہ دونوں مسافر نظر آئے جن کو بالترتیب تین میل اور چھ میل مارچ کرنے کے لیے اتار دیا گیا تھا۔ اتنی دیر میں وہ سڑک تک پہنچ کے کسی بس کے ذریعے واپس جا چکے تھے۔ ملتان روڈ سامنے نظر آنے لگا تو میں نے ٹیکسی کو روک لیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمہارا وقت بھی ضائع ہوا۔" میں نے کہا۔ "اور تم کو بلاوجہ پریشانی اٹھانی پڑی۔" میں نے دو سو روپے ٹیکسی ڈرائیور کی خدمت میں پیش کیے۔ "امید ہے یہ اس تلافی کے لیے کافی ہوں گے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے نوٹ لے لیے۔ "مہربانی جی۔ میں تو سمجھا تھا آج ٹیکسی گئی یا جان گئی۔"

"اگر تم تعاون نہ کرتے تو ایک چیز ضرور جاتی۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"یہ دونوں آل جانی چیزیں ہیں۔ آئندہ بھی جا سکتی ہیں اگر تم نے وعدے کے مطابق سب کچھ فراموش نہ کیا۔ وہ سب جو تم نے دیکھا اور سنا۔ تمہاری ٹیکسی کا نمبر ہمارے پاس ہے اس لیے ہم تم کو تلاش کر سکتے ہیں مگر ہمارا پتا تمہارے پاس نہیں ہے اس لیے تم دوبارہ اکیلے یا کسی کے ساتھ ہم سے ملنے نہیں آسکتے۔" غیر شعوری طور پر میں نے جمع کا صیغہ استعمال کیا تھا اور ابھی سے الف دین کو اپنے ساتھ سمجھ لیا تھا۔

"خدا شکر ہے کہ پھر آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آج دو نفل شکرانے کے پڑھوں گا اور داتا صاحب کے مزار پر حاضری دوں گا۔" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ "آپ بھی کہا سنا معاف کر دیں۔ اب میں جاؤں؟"

"جاؤ۔ یہاں سے سڑک تک پہنچنے میں تم کو دس منٹ بھی پیدل نہیں چلنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"پیدل؟" وہ چلایا۔ "دیکھو یہ ٹیکسی میری نہیں ہے۔ میں کرائے پر چلاتا ہوں۔ مالک کو کیا جواب دوں گا میں؟"

"شام کو جہاں ریلوے اسٹیشن پر دیکھ لینا۔" میں نے کہا۔ "ٹیکسی مل جائے گی۔"

ٹیکسی ڈرائیور کا چہرہ بے یقینی کے باعث قابلِ رحم ہو گیا تھا۔ میں نے آگے بیٹھے ہوئے الف دین کے کندھے پر دیا اور سے تھپکی دی۔ "وہ بائیس ہزار روپے اسے دے دو ضمانت کے طور پر۔"

اب الف دین کا چہرہ اتر گیا لیکن اس نے بائیس ہزار روپے ٹیکسی ڈرائیور کو دے دیے۔

"ہو سکتا ہے کہ تمہاری ٹیکسی کی قیمت اس سے زیادہ ہو تمہاری نظروں میں۔" میں نے کہا۔ "ویسے اس چھکڑے کو خریدنا ہوتا تو میں پندرہ سولہ ہزار سے زیادہ میں نہ لیتا۔ پھر بھی یہ رقم ضمانت کے طور پر رکھو۔ شام کو ٹیکسی مل جائے تو واپس کر دینا۔ ورنہ مالک کو دے دینا۔ میرا خیال ہے وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے رقم جیب میں رکھی اور نیچے اتر گیا۔ ابھی تک اس کو پوری طرح یقین نہیں آیا تھا کہ میں اس کے ساتھ مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ میرا رویہ بہت عجیب اور ناقابلِ فہم رہا تھا۔ اسے تاڑنے کے بعد میں اسے کوئی مار دیتا اور پھر رقم چھین لیتا تو اسے بالکل تعجب نہ ہوتا۔ وہ آہستہ آہستہ مردہ قدموں سے چل پڑا۔

"تم بس اور ٹرک چلا سکتے ہو تو یہ ٹیکسی تمہارے لیے کھلونا ہے۔" میں نے الف دین سے کہا۔ "ڈرائیونگ کرو لیکن میری ہدایات کو غور سے سنتے رہو۔ یہ بات صاف سمجھ لو کہ معمولی سی خلاف ورزی یا غلطی پر میں گولی چلانے میں دیر نہیں کروں گا اور ابھی تمہارا دم بھی نہیں نکلا ہوگا کہ میں بوش سڑک پر چھپک کے نکل جاؤں گا۔" الف دین نے کسی

ردِ عمل کا اظہار کیے بغیر ڈرائیور کی جگہ سنبھال کر ٹیکسی کو آگے بڑھا دیا۔ دو منٹ میں ہم ٹیکسی ڈرائیور کے پاس سے گزرے اور شکرگزاری کے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے میں نے مسکرا کے ہاتھ ہلایا۔ وہ ذرا سے ایک طرف ہو گیا تھا کہ کہیں ہم اسے کچلتے ہوئے گزر نہ جائیں۔ ٹیکسی گزر گئی تو اسے اطمینان نصیب ہوا اور اس نے بھی جواب میں ہاتھ ہلایا۔ مین روڈ پر ٹریفک میں شامل ہونے سے پہلے الف دین نے ٹیکسی کو روک کر دائیں بائیں دیکھا اور اسی وقت میں نے پیچھے سے اس کی گردن پر ہاتھ مارا۔ وہ آواز نکالے بغیر اسٹیئرنگ پر جھک گیا۔ پیر کلچ پر سے ہٹا تو گاڑی نے ایک جھٹکا لیا اور اس کا انجن بند ہو گیا۔ میں اطمینان سے اتر کے آگے آیا۔ الف دین کو ساتھ والی سیٹ پر لڑھکایا اور انجن پھر اسٹارٹ کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آبادی میں پہنچتے ہی وہ ایسی اداکاری دینے لگے یا ایک دم کود کر فرار ہو جائے۔ ابھی مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا تھا۔ وہ تعاون پر آمادہ تھا لیکن اس کے دل میں کیا ہے! میں یہ کیسے جان سکتا تھا۔

آبادی شروع ہونے کے بعد میں نے ادھر ادھر کی دکانوں پر نظر رکھی اور جیسے ہی مجھے پبلک ٹیلیفون کا سائن بورڈ نظر آیا میں نے ٹیکسی روک لی۔ الف دین سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے سر لٹکائے بیٹھا تھا کہ نیند میں معلوم ہوتا تھا۔ میں نے لاہور ہوٹل کا نمبر ملایا۔

"نواب ننھے خاں صاحب اگر کمرے میں ہوں تو بات کرا دیں۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر راحیل کے کمرے میں ہوں گے۔"

"کیا کہوں ان سے؟" آپریٹر نے کہا۔ "کون بات کرے گا؟"

"نواب ننھے خاں کے ماموں۔" میں نے کہا۔ "لندن والے ماموں۔ وہ سو رہے ہوں تو ان کی ہمشیرہ پرنسس صوفیہ ہوں گی۔"

ایک منٹ کے بعد رابعہ نے ہیلو کہا تو میں نے اسے ڈانٹنا شروع کیا۔ "کوئی حد ہوتی ہے نامعقولیت کی۔ یعنی ہم نے آپ کو وہاں چھوڑا تھا تو آخر کس لیے؟ آپ لیٹے غائب ہو گئیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ.... مطلب وہی کہ گدھے کے سر سے۔"

رابعہ ہنسنے لگی۔ "جہاں سے بھی بول رہے ہو خوب بول رہے ہو۔ کوئی اور بھی ہے ساتھ؟"

"ہاں۔ چچا اور ننھے خاں ساتھ ہیں۔ ٹیکسی میں سو گئے ہیں۔" میں نے ٹیکسی کی طرف ایک نظر ڈالی۔

"ٹیکسی کس کی ہے؟" رابعہ نے بے حد عقلمند ہونے کا ثبوت دیا۔ میں بہت خوش بھی تھا کہ وہ بخیریت واپس پہنچی۔

"ابھی تو ابتدا ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم ادھر ہی آ جائیں گے تم اپنی بگھی لے کر آ جاؤ ٹھنڈی سڑک پر۔"

میں نے ریسیور رکھا تو دکاندار مسکرا رہا تھا۔ اگر یہ تماشا نہ

ہوتا تو وہ میری گفتگو کو مذاق سمجھتا۔ میرے ٹیکسی تک جانے اور روانہ ہونے تک وہ مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا کہ آج کل بھی والی کے کیسے کیسے نادر نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ میں نے الف دین کو سونے دیا۔ ابھی کم سے کم آدھے گھنٹے تک اس کے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مال روڈ شروع ہوتے ہی میں نے ہر کار پر نظر رکھی۔ جو سامنے سے گزری یا سڑک کے کنارے کسی نمایاں جگہ پر کھڑی ہوئی نظر آئی۔ رابعہ کی کورٹینا مجھے چڑیا گھر سے آگے گورنر ہاؤس کے گیٹ کے سامنے کھڑی ہوئی ملی۔ وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی مرد تھا جو اسے وہیں چھوڑ کے کسی کام سے گیا تھا۔ اور ابھی تک لوٹا نہیں تھا۔ چنانچہ وہ مستقل انتظار میں تھی۔ اس پر شک کیسے ہو سکتا تھا۔

میں نے ٹیکسی کو اس کے پہلو سے لگا کے روکا۔ "اکیلی ہو؟" میں نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا۔

"جی نہیں ماموں۔" محسن جو پچھلی سیٹ پر لیٹا تھا فوراً اٹھ بیٹھا۔ "ہم بھی ساتھ ہیں۔" اور میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو غور سے دیکھنے لگا۔

"یہ صورت تو پہلے بھی دیکھی ہے۔" رابعہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ اس کی نظر الف دین پر پڑ رہی تھی۔

"آنکھیں بند کا فرق ہے۔" محسن نے کہا۔ "ورنہ میں سمجھتا مُردہ پھر زندہ ہو گیا؟"

"بالکل۔ کیا یہ خالہ کا بھائی ہے؟" رابعہ نے یوں کہا جیسے کوئی بہت مشکل سوال حل کر لیا ہو۔

"یہ باتیں کرنے کی جگہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے جنگلی تیتر سمجھو۔ بہت اہم مہرہ ہے جو بازی پلٹ سکتا ہے۔ اس کو گاڑی میں منتقل کرنے کے بعد یہ طے کریں گے کہ اس کی حفاظت کے لیے کیا خصوصی اقدامات کیے جائیں۔"

رابعہ نے اور محسن نے الف دین کو کار میں ڈالا۔ اس وقت شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ میں نے ٹیکسی کی چابی محسن کو دی اور کہا کہ وہ ریلوے اسٹیشن کی جانب چلے۔ ٹیکسی کو اسٹینڈ پر پارک کر کے انتظار کرے۔

"کس کا انتظار کروں؟" محسن نے کہا۔

"ایک شخص آئے گا اور بائیس ہزار میں ٹیکسی خریدے گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "بات پکی ہو گئی ہے۔ بیعانہ بھی دے دیا ہے۔"

"یہ چکر کیا ہے؟" محسن نے میری بات میں مذاق کا کوئی پہلو تلاش کر کے کہا۔

"فکر نہ کرو ایسا ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ شخص ٹھیک چھ بجے آئے گا۔ میں شکل بتا دیتا ہوں۔ گلابی رنگ کی قمیص اور سفید رنگ کی شلوار۔ دُبلا پتلا آدمی

ہے خشخشی داڑھی اور پتلی مونچھوں والا۔ جب تک پیسے نہ دے ٹیکسی کی چابی اسے مت دینا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ ہم گاڑیاں خریدتے تھے، چرا لیتے تھے اور چھینتے تھے۔" محسن بولا۔ "یہ دھندا کب سے شروع کیا ہے اور یہ ٹیکسی آخر آئی کہاں سے؟"

"ابھی تو طوفان رونے آئی ہے۔" میں نے کہا۔ "اب آپ ویسا ہی کریں جیسا میں فرما رہا ہوں۔ ہم تمہارے پیچھے ہیں اور پیچھے کار پارکنگ ایریا میں موجود ہوں گے۔ شکنجہ ہو تو پلٹ کر دیکھ لینا۔ خطرہ ہو تو دوڑ کر آ جانا۔ ڈرائیور کے تیز گشتوں کے پیچھے لگائے نکل جائیں گے۔"

ٹیکسی ڈرائیور ٹھیک چھ بجے ادھر ادھر دیکھتا خود دار ہوا اور سیدھا اپنی ٹیکسی کی طرف یوں بڑھا جیسے دیہاتی گمشدہ بھینس سے گلے ملنے لپکتا ہے۔ محسن خاں ذرا فاصلے پر ٹہل رہے تھے معلوم نہیں ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی لیکن چند منٹ میں صورت حال واضح ہو گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے رقم ان کے ہاتھ پر رکھی اور انہوں نے چابیاں دے کر ہاتھ ملایا۔ پھر ڈرائیور اپنی ٹیکسی لے کر روانہ ہو گیا اور محسن پلٹا۔

"ویری گڈ۔" میں نے کہا۔ "آدمی شریف تھا یا بے عقل۔ ورنہ اکیلا نہ آتا؟"

"بائیس ہزار میں سودا برا نہیں رہا۔" محسن نے الف دین کو تھوڑا سا سمیٹ کر اپنے لیے پچھلی سیٹ پر تھوڑی سی جگہ بنائی۔ "میں نے اس سے کہا کہ خوش قسمت ہو ورنہ یہی ٹیکسی میں پندرہ سولہ ہزار سے زیادہ میں نہ خریدتا۔ بہت حیران ہوا میری بات پر۔"

"وہ تو ہونا ہی تھا۔ پیسے دینے سے انکار تو نہیں کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"کیا تھا۔ میں نے کہا پھر چلو ٹیکسی کے مالک سے بات کر لو۔"

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
گمراہ
۸ حصے شائع ہو چکے ہیں
جبار توقیر کا منفرد انداز بیان
کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس ۲۳ کراچی

www.paksociety.com

محسن بولا۔ "اس پر اور حیران ہوا کہ کون مالک؟ میں نے کہا محسن نے جابیاں دیتے وقت کہا تھا کہ بائیس ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں لینا ہے۔ وہ خود فنٹ سے گا تم ہے۔ اس کے بعد نہیں بولا۔ ویسے یہ ڈرامہ کیا ہے؟"

سامنے کلاں میں استاد ڈیڈی کے گھر پہنچنے تک میں نے ان کو مختصراً وہ سب بتایا جو پوسٹ آفس میں الف دین سے ملاقات کے بعد سے اب تک پیش آیا تھا۔ میرے انکشافات ان کے لیے سنسنی خیز ثابت ہوئے۔ ڈیڈی کے گھر پہنچ کر ان کا ایک بڑی تشویش کی بات تھی۔ ہم اس بے ہوش آدمی کو کب تک کار میں ڈال کے گھوم سکتے تھے۔ تھوڑی دیر میں اس کا ہوش میں آجانا لازمی تھا۔ اس بات کا امکان کم تھا کہ وہ شور ہنگامہ کرے۔ پہلے تو میں اکیلا ہی تھا لیکن اب میرے ساتھ محسن بھی تھا۔ اس کے باوجود اسے ہوٹل لے جانے میں خطرہ تھا۔

"یہ بہت غلط بات ہے کہ ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔" میں نے کہا اور گاڑی کو واپس کیا۔

"تنظیم کا ایک مستقل ہیڈ کوارٹر ضرور ہونا چاہیے۔" محسن نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"اگر ہم اسی طرح ڈیڈی کے گھر کو استعمال کرتے رہے تو ایک نہ ایک دن ہماری وجہ سے ڈیڈی مشکل میں گرفتار ہو جائے گا اور ہم اس کی مدد بھی نہیں کر سکیں گے۔" محسن نے کہا۔

"ہم کوئی چھوٹا سا مکان خرید سکتے ہیں۔" رابعہ بولی۔ "جو کسی گمنام سی جگہ پر ہو اور محفوظ ہو۔"

"مکان خریدنے کے لیے پچاس ساٹھ ہزار روپے کی رقم درکار ہو گی۔" میں نے کہا۔

"میں بینک سے اپنا سب پیسہ نکلوا لیتی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔ "ایک لاکھ سے اوپر ہی ہو گا۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں خطرہ ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ انکل جعفری نے بینک والوں کو ہوشیار کر دیا ہو۔"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "پولیس والے عدالتی احکامات کے بغیر کسی بینک منیجر کو پابند نہیں کر سکتے کہ وہ کسی اکاؤنٹ ہولڈر کو اس کا پیسہ نہ دیں۔ اور یہ بات انکل جعفری بھی سمجھتے ہوں گے کہ بینک منیجر صاف انکار کر دے گا۔ وہ کہے گا کہ اگر آپ خود گرفتار کر سکتے ہیں تو کرلیں، میں چیک نہیں روک سکوں گا۔"

"فرض کرو انہوں نے کہا کہ جیسے ہی کوئی چیک لے کر پہنچے تو پولیس کو اطلاع دے دی جائے۔"

"وہ تمہارے پہ ایسا کر سکتے ہیں۔" رابعہ بولی۔ "میں نے ابھی تک کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ پولیس کے پاس میرے خلاف کون سی رپورٹ ہے؟"

"تم ایک مجرم کا ساتھ دے رہی ہو اور اس طرح شریک جرم ہو۔" میں نے کہا۔

"انکل کو پہلے میرے خلاف اس الزام کے تحت رپورٹ لکھوانی پڑے گی۔" رابعہ نے کہا۔ "اور یہ کرنا تو آسان ہے مگر ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ خصوصاً ایک وکیل کے خلاف۔"

"یہ آخری پوائنٹ بہت اسٹرانگ ہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔ "کوئی عدالت آسانی سے پولیس کے الزام سے مطمئن نہیں ہوگی۔ الزام لگانے والے ایس ایس پی صاحب ہیں تو مقابل بھی کوئی عام عورت نہیں بلکہ کوئی عام وکیل۔ تمہاری ڈگری اب تک اچھی تھی؟"

"تھی کا کیا مطلب؟" رابعہ نے اسے گھورا۔ "کیا اب خراب ہے؟"

"یہ مسئلہ متنازعہ ہے۔" میں نے رک رک کے کہا۔ "آج محسن کو ایک ہم پیشہ وکیل ملا تھا۔ اس کے نقطہ نظر میں ابھی نہیں رہی جبکہ میرے خیال میں بہت بہتر ہے...... لیکن یہ مدام جو ہوں گے ان کا نام نہ ہو گا۔"

"خیر کل صبح میں خود بینک منیجر سے ملوں گی۔" رابعہ بولی۔ "چیک اسی کو دوں گی۔ وہ میرا بہت لحاظ کرتا ہے۔"

"کرنا بھی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "جو نہ کرے وہ ذوق جمال سے عاری ہے۔ یا اس کی نظر کمزور ہے۔"

"وہ آدمی نہیں [illegible] ہے۔" محسن نے فوراً تائید کی۔ "یا ابھی سن بلوغت کو نہیں پہنچا؟"

"یا وہ فرشتہ ہے۔" میں نے کہا۔ "کسی نامحرم کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتا۔"

"دنیا کی سب عورتوں کو اپنی ماں بہن یا بیٹی سمجھتا ہے۔" محسن نے گرہ لگائی۔

"اے ماؤں بہنو، بیٹیو، دنیا کی عزت تم سے ہے۔" [illegible]

"کیا مصیبت ہے۔ تم دونوں عامل معمول کی طرح بولنے پر آتے ہو تو رکنے کا نام نہیں لیتے۔" رابعہ نے جھنجلا کے کہا۔

"سوری۔ تو آپ فرما رہی تھیں کہ بینک منیجر مطلوبہ رقم آپ کو فوراً فراہم کر دے گا اور پولیس کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دے گا۔" میں نے کہا۔ "پولیس اگر وہاں پہلے سے موجود ہوئی تو کسی نے آپ سے کچھ نہ کہا مگر آپ کے ساتھ ہو لیا تو پکڑا جاؤں گا میں، ھو المطلوب۔"

"میں سیدھے راستے سے نہیں جاؤں گی۔" رابعہ نے کہا۔ "منیجر کے پاس پہنچنے کے لیے بینک کا دوسرا راستہ بغل کی گلی میں تھا اور بینکنگ کے اوقات ختم ہو جانے کے بعد سامنے کا دروازہ تو مقفل کر دیا جاتا ہے۔ بعد میں بھی وہ دوسرا راستہ استعمال

ہوتا ہے۔ ٹھیک ایک بجے بینک کے شٹر گرا دیے جاتے ہیں اور جو لوگ اندر موجود ہوں انہیں بھی اسی راستے سے نکالا جاتا ہے۔ اگر مجھے کوئی بات گڑبڑ نظر آئی تو میں منیجر سے بات کر لوں گی۔"

"ذرا سنبھل کے بات کرنا۔" محسن نے کہا اور رابعہ نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔

"مکان خریدنے کے بجائے کرائے پر لینا بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "اب ہم ایک فیملی ہیں جس سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا۔ اگر مکان چھوڑنا پڑا تو نقصان چار چھ ماہ کے ڈپازٹ کا ہو گا۔"

"میں یہ سوچ رہی ہوں کہ جس شخص نے نواب خسرو جمشید بن کے مجھے کوٹھی بیچی تھی وہ خود تو اتنے عرصے کے بعد [illegible] پہنچا ہو گا۔" رابعہ بولی۔ "اس نے ہم سب کو اس کوٹھی کے پیچھے بارودی سرنگ بچھا کے ایک ساتھ اڑا دینے کا سوچا تھا لیکن وہ سکیم ناکام ہو گئی۔ اسے لاکھوں کا گھاٹا خواہ مخواہ ہوا۔ اب کیوں نہ اسے بھی فروخت کر کے نقد رقم محفوظ کر لی جائے؟"

"تم اسے بیچو گی کیسے بی بی؟" محسن بولا۔ "ایس پی صاحب خریدار بن کے پہنچ جائیں گے۔"

"ایس پی صاحب نہ ہوئے فرشتۂ غیب ہو گئے کہ ہر جگہ موجود۔" رابعہ نے کہا۔ "میں منظر کو پاور آف اٹارنی دے دوں گی۔ جنرل پاور آف اٹارنی۔ رقم وہ اپنے اکاؤنٹ میں رکھ سکتا ہے اور فون کرنے پر ہمیں فراہم کر سکتا ہے۔ وہ بہت نڈر اور چالاک آدمی ہے۔ پولیس کے ایس پی صاحب بھی اسے چکر نہیں دے سکتے۔"

"تمہاری تجویز بھی قابل عمل ہے عزیزہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہاری بات سے ذہن کچھ اور سوچ رہا ہے۔ کیوں نہ فی الحال ہم اسی کوٹھی کو اپنا مستقر بنائیں جو آج تک مکینوں کو ترس رہی ہے۔ اپنی کوٹھی ہے کچھ دن تو رہ لیں اس میں؟"

محسن اچھل پڑا۔ "موزوں ترین وقت پر آنے والا یہ موزوں ترین خیال ہے۔" وہ جوش سے بولا۔

وہ کوٹھی کس مپرسی کے عالم میں خانہ ویرانی کا مرقع عبرت بنی پڑی تھی جو رابعہ کے نام لاٹری کی طرح نکل آئی تھی۔ ہمارا تو یہ خیال تھا کہ جیسے ہی ہم لاکھوں کا فائدہ دیکھیں گے تو فوراً اس میں منتقل ہو جائیں گے اور وہ دو چار لاکھ خرچ کر کے ایک ہی بار میں ہم سب وہاں شفٹ کر لیں گے۔ کوٹھی کی پیشکش کرنے والے نے ہمیں ایک انتہائی پراثر اور دلگداز کہانی بھی سنائی تھی تاکہ ہم شک کا شکار نہ ہوں۔ نواب خسرو جمشید بن کے آنے والے دو تھے جو ایک دوسرے سے ناقابل یقین حد تک مشابہ تھے۔ باری باری اصل بن کے آتے تھے لیکن وہ دونوں نقلی تھے۔ ہم نے عقل سے کام نہ لیا ہوتا تو یقیناً ان کی سازش کا شکار ہو جاتے مگر اس قاتلانہ سازش کے بعد بھی ہم نے

ایسا بندوبست کر لیا تھا کہ ایک کی موت یا عدم موجودگی میں دوسرا فوراً اس کا وارث اور جانشین ہو جائے اور ایک وصیت نامے کی رو سے ہم سات افراد یکے بعد دیگرے قانونی طور پر حق وراثت استعمال کر سکتے تھے۔ ہماری اس چال نے دشمنوں کے لیے ہمارے قتل کو بے مقصد بنا دیا تھا۔ اب اس بات کو بھی زمانہ بیت چکا تھا اور یہ کوٹھی کاغذات میں رابعہ کی ملکیت ضرور تھی لیکن یاد کسی کو نہ تھی۔

اندر داخل ہونے کے بعد مجھے پرانے واقعات کی یادوں نے گھیر لیا لیکن رات ہونے لگی تھی اور ابھی بہت کام کرنے تھے۔ میرے لیے سرفہرست کھانے کا مسئلہ تھا کیونکہ صبح ناشتے کے بعد سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ الف دین ہوش میں آ چکا تھا اور اسے اندر منتقل کرنے کے بعد اس سے ضروری معلومات حاصل کرنی تھیں۔ کوٹھی میں پانی تھا لیکن اور کچھ نہیں تھا۔ مثلاً بجلی تھی لیکن کسی ہولڈر میں بلب نہیں تھا۔ مجھے نازلی کے بارے میں بھی اسپتال سے خیریت دریافت کرنی تھی۔ اور لاہور ہوٹل سے اپنا سامان بھی اٹھا کے لانا تھا۔ رابعہ کے پاس اب صرف اٹھارہ سو روپے تھے۔ محسن کے پاس سات سو اور میرے پاس اللہ کا نام۔ الف دین کے بائیس ہزار البتہ تھے جن کو ہم مال غنیمت کے طور پر استعمال کر سکتے تھے۔ اس رقم پر الف دین کا قانونی یا اخلاقی حق نہیں بنتا تھا اور اصل مالک کا پتا چلا کے اسے رقم لوٹانا ناممکن تھا۔ اس قسم کی واردات کی خبر اخبار میں آتی بھی ہے تو یوں کہ فلاں علاقے میں کوئی شخص اتنے ہزار لے کر بھاگ گیا۔ لٹنے والے کا صرف نام ہوتا ہے اور اگر اس کا سراغ لگانا ہو تو تھانے سے رابطہ قائم کرنا پڑتا ہے جہاں وہ رپورٹ لکھوانے گیا ہو۔

میں نے اسی رقم سے دو ہزار لیے اور محسن کو الف دین کی نگرانی اور رابعہ کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر باہر نکلا۔ بلب تو مجھے قریب ہی ایک دکان سے مل گئے جو میں نے محسن کو پہنچا دیے تاکہ میری واپسی تک وہ اندھیرے میں نہ رہے۔ ریوالور محسن کے پاس بھی تھا لیکن الف دین کی جسمانی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ مقابلہ کر سکے۔ کار سے کر روانہ ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے نظر آنے والے صدر بازار کے ایک عام سے ریسٹورنٹ میں دو کپ چائے پی اور وہاں جو کچھ مل سکا غنیمت جان کے کھایا۔ ایک گھنٹے بعد میں نے لاہور ہوٹل میں اپنا بل ادا کیا اور جتنی دیر میں پورٹر نے سامان میری کار میں رکھا، میں نے البرٹ وکٹر ہوسپٹل کا نمبر ملایا۔ نازلی بہت تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھی اور ڈاکٹروں کو امید تھی کہ دو ہفتے میں وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گی۔ واپسی پر میں نے بازار سے گزرتے ہوئے ضرورت کا بہت سا اسباب خریدا۔ ان میں دریاں اور لحاف

www.paksociety.com

رکھے ہوئے تکیے اور تولیے تھے۔ بجلی کا ہیٹر اور برتن تھے اور چائے کافی بنانے کا سامان تھا۔ سگریٹ تھے اور بسکٹوں کے ڈبے تھے۔ حالی روڈ کی واحد کھلی ہوئی دکان سے میں نے ایک ٹیپ ریکارڈر لیا۔ پھر میں نے ایک ہوٹل سے لنچ باکس لیے اور واپس پہنچا تو رات کے نو بجے تھے۔ میری عدم موجودگی میں رابعہ نے محسن کو باہر بھیجا تھا کہ ایک جھاڑو لائے اور خود ریوالور لیے الف دین کی پہرے داری کے فرائض انجام دیتی رہی تھی جس کی عقل اتنی حسین اور جوان عورت کے ہاتھوں میں اتنا خطرناک آتشیں اسلحہ دیکھ کر خبط ہو گئی تھی۔ اسی عورت نے بعد میں انتہائی سگھڑ اور پھوہڑ خاتون خانہ کی طرح دوپٹے سے ناک منہ لپیٹ کے گرد آلود فرش کو جھاڑو سے صاف کیا۔ کہاں جھاڑو کہاں ریوالور۔ ایک ہتھیلی پر حنا ایک ہتھیلی پہ لہو۔

جب میں پہنچا تو رابعہ کمرے میں جھاڑو لیے کھڑی تھی اور محسن خان نے تفتیشی افسر کے فرائض سنبھال لیے تھے۔ کوٹھی میں تو شاید چار باتھ روم تھے مگر ہم نے اسی ماسٹر بیڈ روم میں ڈیرے ڈال دیے جو سب سے بڑا تھا اور اسی سے ملحق باتھ روم کو استعمال کیا۔ جتنی دیر میں رابعہ نے مناسب فاصلے سے تکیوں اور دریاں بچھائیں یوں کہ محسن درمیان میں رہا۔ ان پر تکیے رکھے اور لحاف رکھے۔ میں نے ٹھنڈے پانی سے غسل صحت فرمایا اور تقریباً بیمار ہو کے نکلا۔ محسن نے میری تقلید کی لیکن رابعہ بزدل ثابت ہوئی۔ اس نے ٹھنڈے پانی سے نہانے پر منہ ہاتھ دھونے کو ترجیح دی۔ پھر ہم سب نے لحاف لیے اور ہیٹر کو آن چھوڑ دیا تاکہ خالی کمرے میں کچھ حرارت پیدا ہو۔

"ابھی تک تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ مجھے جی پی او میں داغ مفارقت دے کر تم کہاں نکل گئی تھیں؟" میں نے تازہ دم ہو جانے کے بعد سگریٹ جلا کے دیوار سے ٹیک لگایا اور نیم دراز ہو گیا۔

"جب تم نے پوچھا نہیں تو میں کیا بتاتی! اور کیوں بتاتی کہ میں اس شخص کا استاد پیٹر دیکھ کے اس کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئی تھی۔" وہ بولی۔ "وہ کامرس بینک کے سامنے گاڑی سے اترا اور مجھے دیکھ کر پھر گاڑی میں بیٹھا اور بڑی عجلت میں روانہ ہو گیا۔ اسی سے مجھے شک ہوا۔ میں نے کار اس کے پیچھے لگا دی۔ ہائی کورٹ کے قریب سے وہ سیدھا گزر گیا لیکن مال روڈ کے چوراہے پر میں نے اسے جا لیا۔ وہ کوئی اور تھا۔"

"وہ کوئی اور تھا۔" میں نے اسی کے لہجے میں کہا۔ "اگر وہ سچ مچ استاد پیٹر ہوتا تو تم کون سی توپ چلا لیتیں۔ وہ پلٹ کر تم پر گولی چلا دیتا تو میرا انجام وہی ہوتا جو مجھ سے پہلے فرہاد اور مجنوں کا ہو چکا ہے۔"

"خواتین کو ویسے بھی سراغ رسانی میں ٹانگ اڑانے سے گریز کرنا چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "یہ جاسوسی ادب کی روایات کے خلاف ہے۔ کوئی عورت آج تک شرلاک ہومز یا جیمز بونڈ نہیں ہوئی۔"

"تم متعصب اور تنگ نظر ہو۔ دونوں۔" رابعہ نے غصے سے کہا۔ "ابھی کل ہی میں نے استاد گولی والا کا سارا انجام دیکھا ہے۔ تم تو فرہاد اور مجنوں بننے کا دعویٰ کرنے والے کہاں ہوتے ہو یہ حالات ہیں۔"

"مجھے شک ہے تمہارے کمرے میں دھماکا کرنے والا تھا۔" میں نے کہا۔ "استاد گولی کا گروہ۔ ان سے میں پھر ملاقات کرنے گئے اور اسے ہوٹل فاران کے منیجر کے پاس لے جائیں گے کیا پتا۔ کیا یہی وہ پیر شریف ہیں؟ ان کی خاصی تذلیل ہوئی تھی اپنا بدلہ لینے کے لیے۔"

"کیا تم لوگ رات بھر مجھے یہاں رکھو گے؟" الف دین نے مسلسل خاموشی کو ناقابل برداشت پا کے کہا۔

"ہاں۔ رات بھر۔ شاید مہینہ بھر۔ سال بھر۔" میں نے کہا۔

"یوم حشر تک۔" محسن نے کہا۔ "یہاں تمہاری تدفین یا دوسری آخری رسومات کی راہ میں کون حائل ہے؟"

"لیکن میرا قصور کیا ہے؟" الف دین بولا۔ "میں نے تم سے کچھ چھپایا تو نہیں اور تم سے تعاون کیا۔"

"محسن! یہ طارق کا بھائی ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "جسے ملاوہ نے مروا دیا تھا؟"

"وہ چوہدری ملاوہ کا ٹرک چلاتا تھا۔" محسن نے یکایک کا انداز برقرار رکھا۔ "پھر تو ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے۔"

"میری بیوی پریشان ہوگی۔ مجھے فون کرے گی۔"

"اچھا۔ تو تمہارے گھر میں ٹیلی فون بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "کر رہے ہو؟ یہاں لوگ لمبا عرصہ انتظار کرتے ہیں اور ضرورت مند ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی کے پروفیسروں کو فون نہیں ملتا اور تم بدمعاش کے گھر میں فون ہے؟"

"خیر بتاؤ اپنا نمبر ہم تمہاری بیوی کو بتا دیتے ہیں کہ تم آ نہیں سکو گے۔" محسن بولا۔ "بہانہ کیا کرنا ہے؟"

"کہہ دینا... طارق کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔" وہ بولا۔ اس کی آواز پھر بھرا گئی۔

"میں دیکھتی ہوں آس پاس کہیں فون ہوگا۔" رابعہ نے کرنے کے بعد کہا اور اکیلی باہر نکل گئی۔

"تمہاری بیوی بہت بہادر ہے۔" الف دین نے کہا۔

"بہت بے رحم بھی ہے۔ ذرا کوئی بات ناگوار گزرے تو..." میں نے کہا۔ "میرا اس کا ہم جو تھا... نہیں، پانچواں شوہر ہوں۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ ملاوہ نے تمہارے بھائی کو

قتل کیا ہے؟" محسن نے کہا۔

وہ چونکا۔ "نہیں... مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے... تم بتاؤ۔"

"ابھی ہمیں بھی یقین سے معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم معلوم کر سکتے ہیں۔ طارق کی لاش اس کے گھر سے غائب ہو گئی تھی۔ اس کام میں پولیس کی مدد بھی تھی۔ راجہ فتح شیر نام کا ایک سب انسپکٹر ملا ہوا تھا۔ اس نے رشوت لے لی اور لاش کو ادھر ادھر کر دیا۔ ہم اس سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ لاش کہاں ہے؟"

"اور یہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے قاتل کو بے گناہ ثابت کرنے کا کیا معاوضہ لیا ہے؟" محسن بولا۔

"تم نے جو کچھ مجھے بتایا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم پہلے کسی بادہ فروش کے لیے کام کرتے رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ منشیات بھی بیچتا ہے۔" الف دین نے احتجاج کیا۔ "وہ گڑ چاول کا دھندا کرتا تھا۔"

"جب تم پکڑے گئے تو تم نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ کیا اس نے تمہیں رہائی دلائی ورنہ تم جیل جاتے اور تم نے کا ہر حصہ دیا؟"

"میں کوئی غلط کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔" وہ بولا۔

"تمہارے جاننے کی بات نہیں۔ یہ لوگ کمبل ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اگر انہیں چھوڑنا چاہتے ہو تو یہ اس کو نہیں چھوڑتے۔ کیونکہ ان کو ڈر ہوتا ہے کہ کہیں کوئی بھید کی اطلاع دے کے پیش ہو جائے؟"

"انہوں نے مجھے یہی دھمکی دی تھی جو تم نے دی تھی۔" وہ بولا۔ "رحمت کباڑی نے کہا تھا کہ میری بچی کو میری نظروں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے رحمت کباڑی بھی پہلے منشیات کا دھندا کرتا تھا؟" محسن نے کہا۔

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جو مال میں لاہور سے کراچی کے لیے لے جاتا تھا اس میں چاول اور گڑ کی بوریاں تھیں۔ ایک بوری کی ہیروئن کی تھی۔" الف دین نے کہا۔ "سب پتا نہیں۔ انہوں نے اپنی شناخت کے لیے کوئی نشانی رکھی۔ کراچی میں مال پہنچانے سے آگے نکلتے ہی مجھے سڑک پر پولیس کے جوان نظر آنے لگے۔"

"رحمت کباڑی تمہارے ساتھ نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"تھا لیکن اس نے مجھ سے پہلے سمجھ لیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔ مجھے شک ہو سکتا تھا۔ پولیس تو شاید دس کلو [illegible] لیکن مجھے معلوم ہو [illegible] کیونکہ میں فوراً [illegible] کر سکتا تھا۔ [illegible] گھول کے چھلانگ لگائی اور کھیتوں میں

غائب ہو گیا۔ میں نے دوبارہ اس کو نہیں دیکھا۔ تھانے میں مجھے بہت مارا پیٹا گیا۔ میں وہی کہتا رہا جو سچ تھا۔ مال کے اصل مالک بھی مکر گئے اور سیٹھ کریم نے بھی پہلے تو عدالت کے سامنے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ یہ ڈرائیور پہلی بار آیا ہے اور ہیروئن کی بوری اگر کسی نے رکھی ہوگی تو اسی کو معلوم ہوگا۔"

"ایک پوری بوری ہیروئن کی؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس میں بھی گڑ اور چاول تھے۔" الف دین بولا۔ "درمیان میں چار کلو کی تھیلی چھپا دی گئی تھی۔ سیٹھ کریم بعد میں تھانے پہنچا اور مجھ سے ملا۔ اس نے رحمت کباڑی کے متعلق پوچھا اور یہ پوچھا کہ آخر پولیس کو کس نے خبر دی تھی۔ اسے یقین تھا کہ مخبری کی مدد کے بغیر پولیس کو کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تھانیدار سے باتیں کرتا رہا اور اس رات مجھے زیادہ مار پڑی۔ پہلے وہ پوچھ رہے تھے کہ مال کس کا ہے پھر وہ یہ پوچھتے رہے کہ میں نے کس کو بتایا تھا جس نے کسٹم کے ایک اعلیٰ افسر کو فون کر کے ٹرک کا نمبر تک بتا دیا تھا۔ جب انہیں میری بے گناہی کا یقین آ گیا اور میں مرنے کے قریب ہو گیا تو کریم سیٹھ پھر آیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ معاملہ دبا دیا گیا ہے۔ آدھی رات کو مجھے چھوڑ دیا گیا۔ باہر رحمت کباڑی موجود تھا۔ اس نے مجھے جیپ میں بٹھا لیا اور وہ مجھے کسی کوٹھی میں لے گئے۔"

"کہاں؟ کراچی میں یا لاہور میں؟" میں نے کہا۔ اسی وقت رابعہ اندر آئی اور میرے قریب بیٹھ گئی۔

"وہیں کراچی میں۔ مجھے تو اس علاقے کا نام بھی معلوم نہیں۔" الف دین بولا۔ "وہاں اور بھی دو افراد تھے۔"

"تم اگر تصویر دیکھو گے تو ان کو پہچان لو گے؟" میں نے کہا۔

"تمہاری بیوی بہت عجیب عورت ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "میری اطلاع پر چلانے لگی کہ وہ مر ہی جو گا۔ اسے بیوی کا خیال نہیں یہ بھائی کی خاطر نکل گیا۔ گھر والی مرتی ہے تو مر جائے۔ پھر وہ مجھ سے پوچھنے لگی کہ تو کون ہے اس کی؟"

"وہ زبان دراز عورت ہے۔ محبت کرتی ہے نا اس لیے ہمیشہ شک اور حسد میں مبتلا رہتی ہے۔" الف دین بولا۔

میں نے اور رابعہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ بھی کیا انداز ہے محبت کا۔ لیکن یہ خوبصورت مکالموں اور دوگانوں والی فلمی محبت نہیں تھی۔ حقیقی زندگی کی ایک تصویر تھی جس میں سارے رنگ بکھرے تھے۔ نفرت کے بھی اور محبت کے بھی۔

"میں نے پوچھا تھا کہ تم تصویر کی مدد سے سب کی شناخت کر لو گے؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے پہچان لوں گا۔" وہ بولا۔

"اچھا آگے چلو۔ ان لوگوں نے کیا کہا تم سے؟" میں نے پوچھا۔

www.paksociety.com

وہی جو میں نے بتایا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں بدستور کام
کرتا رہوں۔" الف دین بولا۔ "ایسا کبھی کبھار ہو جاتا ہے۔ انھوں
نے ہر ایک حصے کے بدلے مجھے پانچ ہزار کی پیشکش کی لیکن میں
نے انکار کر دیا کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔"
"اگر وہ تمھیں قتل کر دیتے؟" محسن نے کہا۔ "اور طافو کی لاش
کی طرح تمھاری لاش بھی غائب کر دیتے؟"
"ان کا ارادہ یہی تھا لیکن میں نے ان کے پاؤں پکڑ لیے
تھے اور رو دھو کر انھیں قائل کر لیا کہ میں کبھی اپنی زبان سے
ایک لفظ نہیں نکالوں گا۔" الف دین بولا۔ "انھیں رحم آ گیا اور
انھوں نے مجھے دھمکی دے کر چھوڑ دیا۔"
"لیکن آج تم نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے ہمیں ان کے
خلاف معلومات فراہم کر دی ہیں۔" میں نے کہا۔
"ہاں۔ اب وہ پہلے والی بات نہیں رہی۔ انھوں نے
طافو کو مار ڈالا ہے۔ میں خاموش نہیں رہ سکتا۔" وہ بولا۔
"تم کیا کرو گے؟ بدلہ لو گے ان سے؟" محسن نے کہا۔
"میں ان کے خلاف پولیس کو رپورٹ کروں گا۔" وہ بولا۔
"عدالت میں ان کے خلاف گواہی دوں گا۔"
مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "اور پولیس نے طافو کے قتل کا
کیس تم پر بنا دیا پھر؟"
"مجھ پر؟ میں اپنے بھائی کو کیسے قتل کر سکتا ہوں؟" وہ بولا۔
"جیسے ہابیل نے قابیل کو کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "دنیا میں ہر
روز ہوتا ہے یہ تماشا۔ سوال تو صرف یہ ہے کہ کون کس پر کیا ثابت
کر سکتا ہے اور تمھارے مقابلے میں ان کے پاس سب سے
بڑی دلیل ان کی دولت ہے۔ طافو کا قتل پہلے ثابت ہوگا۔ اس
کے بعد قاتل کی بات ہوگی۔ ابھی تو قتل کی خبر بھی صرف ہم کو ہے۔"
"یا اس سب انسپکٹر اصالی کے چار ماتحتوں کو جن کا منہ بند ہے۔"
محسن نے کہا۔ "ہم ان کا منہ کھلوانا چاہتے ہیں پھر وہ بتائیں گے کہ طافو کی
لاش کہاں گئی۔ عدالت میں نہ دلاور پہ جرم ثابت ہو سکتا ہے نہ اس
جرم پر پردہ ڈالنے والوں کے خلاف الزام لگایا جا سکتا ہے۔ یہ
جرم بھی ہم ثابت کر سکیں گے اور انھیں قانون کے مطابق سزا بھی
ہم دیں گے۔ تم کو چھوٹا سا تعاون دینا ہوگا۔ ہمت ہے تم میں؟"
"ہمت تو ہے۔ لیکن..... تم لوگ کون ہو؟" الف دین نے
متذبذب لہجے میں کہا۔
"وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "ابھی
صرف اتنا سمجھ لو کہ دلاور اور اس کے ساتھی ہمارے بھی دشمن ہیں۔
انھوں نے جتنا نقصان تمھیں پہنچایا ہے اس سے ہزار گنا نقصان
ہمارا کیا ہے اور وہ پکڑے نہیں گئے ہیں۔ وجہ وہی ہے کہ اپنی دولت

اور اثر رسوخ سے وہ … ثبوت …
ان کے خلاف ہوا اور وہ بچ نکلے …
"تم نے ذکر کیا تھا کہ دلاور نام کا ایک شخص …
کے ناجائز کاروبار میں لاکھوں کے کروڑوں بنا رہا ہے …
کہا۔ "تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا؟"
"مجھے طافو نے بتایا تھا۔ طافو کا ایسے لوگوں …
الف دین بولا۔
"تو تم نے کبھی دلاور کو دیکھا تھا؟" رابعہ نے …
"نہیں۔ بہت سے اجنبی چہرے بھی سامنے آئے …
دلاور انھی میں شامل تھا تو الگ بات ہے۔" الف دین …
رابعہ نے میرے بریف کیس میں سے ایک لفافہ …
اس میں سے چند تصویریں نکال کے الف دین کے سامنے …
"غور سے دیکھو، ان میں سے کس کس کو پہچان سکتے ہو۔"
الف دین نے ایک ایک تصویر اٹھا کے روشنی …
غور سے دیکھی۔ میں اس کی صورت سے تاثرات کا اندازہ
کرتا رہا کہ کسی تصویر کی شناخت کا رد عمل ظاہر ہو لیکن
اس کا چہرہ سپاٹ رہا۔ ڈی سلوا، استاد ویلیو، …
اور دلاور میں سے وہ کسی کو نہیں پہچان سکا۔ اس …
سی مایوسی ہوئی۔ رابعہ نے تصویریں واپس بریف کیس …
"جو ٹرک تم چلاتے تھے اس کا نمبر کیا تھا؟" میں نے …
"اب تو مجھے یاد نہیں۔" وہ بولا۔ "ایک سال پہلے کی …"
"اس ایک سال میں تم ٹرک ڈرائیوری سے ہٹے …"
میں نے کہا۔ "جب کہ تم کوئی غلط کام کرنے کے خلاف تھے؟"
"میں نے تو کوشش کی تھی کہ ٹرک ڈرائیوری …" الف
دین نے کہا۔ "لیکن ایک تو مجھے منع کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے …
اگر تم ہمارے لیے کام نہیں کر سکتے تو پھر کسی اور کے …
کرو گے۔ تم کسی اور ٹرک پر نظر آئے تو تمھاری خیر نہیں …
بھی کہہ رہا تھا کہ ایسا ہی گھپلا … ہو جائے۔"
"لیکن تم نے ڈرائیونگ لائسنس کی تجدید کرا لی …
ہے۔" میں نے کہا۔
"وہ بھی ایسے ہی کہ ضرورت پڑنے پر کام آ جائے۔
آدمی ٹیکسی کا ڈرائیور تو بن ہی سکتا ہوں میں۔ لاہور …
روٹ پر لاری چلاتا رہا ہوں مگر وہ ڈیوٹی بہت …
میں دو دو پھیرے کرنے پڑتے تھے۔ آدھی رات …
تھا اور صبح پھر … میں بیمار پڑ گیا اور …
آ گئی۔ ایک دن طافو مجھے دیکھنے آیا تو …
اس نے کہا بھائی الف دین یہ کوئی زندگی نہیں ہے …

… کرتے ہو۔ دیکھو کمانے والے کس طرح کما رہے ہیں
… کر رہے ہیں۔ ہمت نہیں ہے تو سب کو کوسا کرو اور
… سے کچھ کر کے دکھاؤ۔ یہ ہر خزانے کی چابی
… بہت ڈرا اور اپنی بیوی سے بھی ریوالور چھپا لیا مگر
… شیطان مجھے بہکانے لگا۔ ایک بار میرا سسر آیا ہوا تھا۔
… زمین بیچ دی تھی اور وہ شہر میں کاروبار لگانا چاہتا تھا۔
… بیٹے سب کماتے ہیں اور باہر رہتے ہیں جیسے رہتے ہیں۔"
"… اسی کو لوٹ لیا؟" محسن نے کہا اور رابعہ کو بے اختیار
ہنسی آ گئی۔
الف دین جھینپ کر مسکرانے لگا۔ "اسے کون سی ضرورت
تھی۔ وہ سو رہا تھا کہ میں رات کو اٹھا، منہ پر چادر کا ڈھاٹا
… اس کے کمرے میں گھس گیا۔ ریوالور دیکھ کر اس کی آواز بند ہو گئی۔
… تھے اس کے پاس جو اس نے سرہانے رکھے ہوئے
تھے … سو رہا تھا۔ میں نے سب باندھ لیے۔ پھر اسے باندھا
… کو باہر سے بند کر کے باہر گیا۔ سارا پیسہ زمین کھود کے
… دبا کے سو گیا۔ صبح میری آنکھ تو جلدی کھل گئی تھی
… میری بیوی جاگی اور اس نے باپ کو جگانا چاہا تو باہر
… کی۔ جب اس نے چیخ پکار مچائی تو میں اٹھا۔ مجھے
… کا سوال ہی نہ تھا لیکن طافو کو معلوم ہوا تو وہ
… بہت خوش ہوا۔"
… سب کو دور سے ہنسی آ گئی۔ "اچھا راستہ دکھایا
… نے بڑے بھائی کو۔"
"سب قسمت کے کھیل ہیں۔ وہ خود کس راستے پر نکل گیا ہے
… نہیں آنے لگا۔" الف دین ایک بار پھر رونے لگا۔ "شاید
… نے مجھے بچا لیا۔ میں خود کو بہت چالاک سمجھتا تھا۔ کسی
… کر دیتا تو پھانسی چڑھ جاتا۔"
"تمھارا وہ ریوالور اب کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ "اگر آج
… پاس ہوتا تو کام آتا؟"
"… میں نے ریوالور ساتھ رکھنا چھوڑ دیا تھا۔" الف دین
… ایک بار ستر ہزار کی رقم ہاتھ
… میرے دل میں لالچ جاگ اٹھا اور میں
… نہیں کر سکتے تھے۔ پاس پڑوس کے
… رشتے دار اور عزیز۔ مجھے معلوم ہو جاتا تھا کہ
… نقد رقم زیور کی صورت میں زیادہ مال ملنے کی
… کون کیسا … اور مقابلہ نہیں کرے گا اور کس کا گھر
… میں نے اس رات کو نشانہ بنایا جب گھر کی
… اور انھوں نے سارا گہنا پہن رکھا تھا۔

عام دنوں میں وہ زیور کو لاکر میں رکھتی تھیں۔ میں پہلے سے مشہور کر
دیتا تھا کہ رات کو بس سے کراچی جا رہا ہوں اور خود اچانک حیدر آباد
کے پہنچتا تھا۔ دو گھر ایسے تھے جہاں نقد رقم صرف ایک رات کے
لیے آئی تھی۔ ایک کا پرائز بانڈ نکلا تھا اور تین دن سے پچاس ہزار
نقد تھے اس روز دیر ہو جانے کی وجہ سے وہ رقم بینک میں جمع نہ
کروائی جا سکی۔ دوسرے گھر میں ایک ٹھیکیدار رہتا تھا وہ کہیں سے رقم
لے کر آ رہا تھا کہ بریف کیس کھل گیا اور سارے نوٹ گلی میں بکھر گئے۔
میں نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس کی مدد کی اور جب وہ ساری رقم
سنبھال کے چلا گیا تو اس کے پیچھے گیا اور اس کا گھر دیکھ آیا۔ دیکھنے والے
تو کتنے ہی لوگ تھے، وہ کس پر شک کرتا۔ پھر ایک رات خلاف
توقع میرا پردہ چاک ہونے لگا تو مجھے ریوالور استعمال کرنا پڑ گیا۔ وہ گھر
کا ایک لڑکا تھا جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میں اسے کمزور اور بزدل
سمجھتا تھا اور اس رات گھر میں وہ اکیلا تھا۔ اس کا بڑا بھائی اور اس کے
والدین تقریب میں کسی دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ وہ بیوی کی بیماری
کے باعث نہ جا سکا تھا۔ مجھے معلوم تھا اس کی بیوی کو شادی میں کتنا زیور
ملا تھا جو وہ گھر میں رکھتی تھی۔ اس لڑکے نے میرا راستہ روک لیا،
بیوی کے منع کرنے کے باوجود۔ شاید وہ نئی نویلی دلہن کے سامنے خود
کو بزدل شوہر ثابت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس پر گولی چلانی پڑی اور
میں بڑی مشکل سے جان بچا کے فرار ہوا۔ ایک مہینے تک وہ لڑکا
موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا رہا اور میں سخت اذیت میں۔ اگر
وہ مر جاتا تو میرے لیے مصیبت ہو جاتی۔ معلوم نہیں میں کیا کرتا۔ تمام
عمر ملامت کا عذاب جھیلنے کے بجائے شاید وہ چار سال کی قید کاٹنے
کو ترجیح دیتا یا پاگل ہو جاتا۔ اس کے بعد میں نے ریوالور کبھی ساتھ نہیں
رکھا۔ چوری ڈکیتی کی سزا دو چار سال ہی ہوتی ہے نا، پھانسی کے
تختے پر تو نہیں لٹکنا پڑتا۔"
"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم آدمی برے نہیں ہو۔" میں نے
کہا۔ "پہلے تم حالات کی سازش کا شکار ہو گئے۔ پھر تمھیں غلط موقع
بھی ملے۔ ایک ریوالور ہاتھ آ گیا۔ مفت میں ستر ہزار ہاتھ لگ گئے۔
تم خود ذہین تھے کہ تم نے آغاز گھر سے کیا۔ لوگ نیکی پہلے اپنوں سے
کرتے ہیں پھر غیروں سے۔ تم نے اس کا الٹا کیا۔ اگر تم پکڑے جاتے
تو شاید تمھارے خلاف سخت کارروائی نہ ہوتی۔ اس بات کا امکان
تھا کہ لوگ تمھیں مار پیٹ کے اور شرمندہ کر کے چھوڑ دیں۔ اس
سے تمھاری حوصلہ افزائی ہوتی۔ یہاں تک کہ آج قسمت نے تم کو
مجھ سے جوڑ دیا اور یہی تقدیر کی ستم ظریفی ہے۔ تم نے مجھے لوٹا نہیں
تھا، میں نے تم کو لوٹ بھی لیا اور گرفتار بھی کر لیا۔ اب بتاؤ تم کیا
چاہتے ہو؟"
"تم وہی کرو گے جو تم چاہتے ہو۔" وہ بولا۔ "پھر مجھ سے

www.paksociety.com

کیوں نہ پتہ ہو!

"تمہیں اندازہ نہیں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمارے مراسم بہت اونچی سطح پر پولیس سے بھی ہیں۔ اگر ہم تم کو پولیس کے حوالے کر دیں تو تمہیں اپنے سب گناہوں کی سزا مل جائے گی۔ وہ خود ایک ایک واردات کی تفصیل پوچھ لیں گے اور سب حساب برابر کر دیں گے۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جو ہمارا طریقہ ہے۔ ہم تمہارے کچہری کے لمبے چکر میں نہیں پڑتے جہاں چالان پیش ہونے سے آخری اپیل کے مسترد ہونے تک ہزار مرحلے آتے ہیں۔ سچ میں جھوٹ شامل کر دیا جاتا ہے اور جھوٹ میں سچ۔ انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والا سب کچھ سمجھنے کے باوجود فیصلہ انہی شہادتوں پر کرتا ہے جو اس کے سامنے اور وکیل کے سامنے پیش کی جا سکیں اور اس عمل کو پیچیدہ بنا کے اتنا طویل کر دیا جاتا ہے کہ فیصلہ کئی سال بعد ہوتا ہے اور بعض اوقات غلط ہو جاتا ہے۔ اس میں منصف کا نہیں نظامِ انصاف کی مشینری کا قصور ہوتا ہے۔ ہم حقائق سے آگاہی کے بعد ہی فیصلہ کرتے ہیں۔ مثلاً تم اپنا کیس لو۔ اب اس میں کیا ضرورت ہے کسی ثبوت کی یا گواہ کی، بحث اور جرح کی۔ ہم تم کو وہی سزا دے سکتے ہیں جو قانون کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔"

"کیا تم نے قانون کی کتابیں پڑھی ہیں؟" الف دین غیر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"ہاں، میں نے پڑھی ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "میں اپنا نام تمہیں نہیں بتاؤں گی لیکن نیچے سے اوپر تک سب وکیل، مجسٹریٹ اور جج مجھے جانتے ہیں۔ میں ہائی کورٹ میں مقدمات لڑ چکی ہوں۔ کبھی کوئی مقدمہ نہیں ہاری اور میرے ماتحت چار وکیل ہیں۔"

الف دین کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اسے رابعہ کی کسی بھی کسی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ اگر کوئی عورت واقعی اتنی بڑی وکیل ہو تو اسے کیا ضرورت ہے ایک مفرور اشتہاری مجرم اور دوسرے اتنے ہی بڑے بدمعاش کا ساتھ دینے کی اور اپنی کوٹھی چھوڑ کر اس خاک دھول سے اٹی ہوئی زمین پر بسیرا کرنے کی۔ اگر رابعہ کہہ دیتی کہ اس لاکھوں کی کوٹھی کی مالک بھی وہی ہے تو الف دین اسے سفید جھوٹ قرار دیتا۔ وہ رابعہ کو کوٹھی میں بھوت بنا جھاڑو دیتے بھی دیکھ چکا تھا اور اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس سنسان کوٹھی میں تنہا پہرہ دیتے بھی۔ اس نے رابعہ کو اندھیری رات میں تنہا باہر جاتے بھی دیکھا تھا اور خانہ دار عورت کی طرح بستر بچھاتے، چائے اور کافی بناتے بھی اور برتن دھوتے بھی۔ اتنی بڑی وکیل کیا ایسی ہوتی ہے؟ اول تو عورت وکیل ہوتی ہی کب ہے۔ جو چند نظر آتی ہیں ان میں اتنی نامور کا دعویٰ کون کر سکتی ہے۔

"تم جاننا چاہو گے کہ تمہارے جرائم کے پیشِ نظر تمہاری سزا کیا ہوگی؟" رابعہ نے کہا۔ "تم سمجھ گئے نہیں ورنہ تم یا تمہارا ... کی وفات کا حوالہ دے سکتی تھی۔ تم کو ایک لاکھ جرمانہ ... کم سات سال قید بامشقت کی سزا ہونی چاہیے۔"

"کیا تمہارا اپنا جیل خانہ بھی ہے؟" الف دین نے ...

"جیل کیا ہوتی ہے؟" اس نے کہا۔ "ایک ایسی جگہ ... اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ دوسروں کا غلام ہوتا ہے ... کا اپنا کوئی کام نہیں آ سکتا۔ اس دنیا میں رہ کے بھی آدمی ... رہ سکتا ہے۔ اس کے لیے زنجیروں کی ضرورت ہے ... کی۔ فرض کرو ہم جرمانے کے طور پر تمہاری ساری املاک ... تمہارے گھر کو آگ لگا دیں، جس کی کسی چیز پر تمہارا حق نہیں ... اندھا کر دیں؟"

"نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ دہشت زدہ ہو کر ...

"تم اندھیرے میں قید ہو جاؤ گے۔" میں نے اپنی بات ... اندھیرے کی دیواروں سے نکلنا تمہارے لیے جیل کی دیواروں سے زیادہ ناممکن ہوگا۔ تم دوسروں کے غلام رہو گے اور اپنے سب تمہیں چھوڑ جائیں گے۔ کوئی تمہارے کام نہیں آئے گا۔ ... گنوا دو گے پھر حاصل نہ کر سکو گے۔ اکیلے ہو جاؤ گے اور ... زیادہ عذاب جھیلو گے جو قید بامشقت کاٹنے والے ... کے پیچھے جھیلتے ہیں۔ تمہارے بیوی بچے جو تم پہ ساتھ ... رہے ہیں اس سے محروم ہو کے فٹ پاتھ پہ تمہارے ساتھ ... گے۔ بھائی ہوتا تو تمہارے کام آتا۔ شاید وہ وقت ...

"بس... بس کرو... خدا کے لیے بس کرو!" وہ ... لگا۔ "مجھے یہ سب کچھ مت بتاؤ۔"

"یہ سب تمہارے ہی سوال کا جواب ہے۔" ... نے کہا۔ "جرائم کا اعتراف تم کر چکے ہو۔ سزا دینے کا اختیار ... ہے اور اس کے ذرائع بھی ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا انتخاب ... تیسرا اور آخری راستہ توبہ کا ہے۔ تم نے جو کچھ کیا اسے ... زندگی کا آغاز کرو۔ جو سزا دنیا کا قانون تم کو نہ دے سکا ... حساب آنے پر ضرور ملے گی۔ دنیاوی زندگی میں اس ... جانو اور اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھو ورنہ تقدیر ..."

"میں... میں وعدہ کرتا ہوں، میں محنت کروں گا۔ کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔"

"تمہیں ابھی یہ خوش فہمی ہوگی کہ وعدہ کر کے تم ... تو پھر ہم کہاں اور تم کہاں۔" میں نے کہا۔ "تم نے دوبارہ ... اختیار کر لی تو ہم کو کیسے معلوم ہوگا؟ لیکن الف دین، ہم ... پھر ہم تمہارے گھر آئیں گے۔ تم پولیس کو دھوکا دے ... نہیں۔ تم اس شہر سے چلے جاؤ تب بھی ہم تمہیں تلاش ... اور جیب میں ... تو کچھ پوچھیں گے نہیں، صرف اپنی سزا پر عملدرآمد کریں گے اور لوٹ جائیں گے۔"

میرا اچھا بکار کر رہا۔ الف دین اتنا ڈر گیا تھا کہ کانپنے لگا تھا۔ اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"یہ عجیب اتفاق ہے کہ تم مل گئے۔" میں نے کہا۔ "آج کی رات ہم ویسے ہی نالے کے قتل کے سلسلے میں کچھ لوگوں کو سزا دینے کے لیے جانے والے تھے۔ وہ قاتل تو نہیں ہیں لیکن انہوں نے قاتل کی مدد کی ہے اور ... سزا دینے کا فرض ادا کرنے کی بجائے قاتل سے پردہ داری کی قیمت وصول کر کے اسے بچا لیا ہے۔ قاتل سے ہم بعد میں نمٹ لیں گے۔ پہلے فوراً ان کے مقدمے کا فیصلہ کر لیں جو قاتل کے مددگار ہیں۔ ان کو سزا ہوگی تو قاتل کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کے حفاظتی انتظامات کتنے کمزور اور ناقص تھے۔ اسے پیغام مل جائے گا کہ بالآخر اس کا نمبر بھی آئے گا۔ ہم آج رات یہی معلوم کرنے والی لاش کو کہاں ٹھکانے لگایا گیا ہے مگر لاش حاصل نہ کر سکے۔ اب تم لاش کے وارث ہو۔ کیا تم نہیں چاہو گے کہ لاش کی صحیح طریقے پہ تدفین ہو اور اس کی آخری رسوم ادا ہوں اور لاش نہ ملے تب بھی کیا تم ان کو سزا دینے والوں کے ساتھ نہیں رہو گے؟ ہمارا انصاف نہیں دیکھو گے؟"

"میں... میں خود ان کو سزا دوں گا۔" الف دین نے مٹھی بند کرتے ہوئے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "وہ میرا ایک ہی بھائی تھا، جیسا بھی تھا مجھ سے چھوٹا تھا، محبت بھی کرتا تھا مجھ سے۔ اگر میں اس کی جان نہ بچا سکا تو جان دے سکتا تھا۔" وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شاید اگلی پچھلی قربات کے وہی رنگ تھے۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے اس کے کندھے پہ تھپکی دی۔ "رونے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمارا ساتھ دو۔ تم خود دیکھو گے کہ انصاف کیسے ہوتا ہے۔ اگلے چند دنوں میں ہم کیا کرنے والے ہیں، یہ بتانا قبل از وقت ہے لیکن ابھی ایک گھنٹے میں ہم کو تمہارا جانا ہے۔ ہاتھ منہ دھو کے کھانا کھا لو۔"

ایک گھنٹے کے بجائے ہم صرف آدھے گھنٹے میں تیار ہو گئے۔ میں نے اپنا پورا پلان محسن کو بتایا اور الف دین کو اتنا ہی بتایا گیا جتنا اس کے لیے جاننا ضروری تھا۔ میں نے اسے تھانیدار کی وردی پہنی تو الف دین نے مجھے بڑی حیرانی سے دیکھا۔ اگرچہ رابعہ آخری وقت تک پھر کوئی ... میں الٰہی محسن باہر نکلے تو اس نے آہستہ سے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

مسکرانا ... ذرا احتیاط سے کام لینا، میری خاطر۔"

میں ہنسا۔ "مجھے محاذ پر جانے والے سپاہی کی بیوی کی طرح الوداع مت کہو۔ اس سے میرا حوصلہ کم ہوتا ہے۔ جیب میں تھا۔ تصور کرو ان تو میرے سامنے تمہارا مسکراتا ہوا ہنستا چہرہ ہونا چاہیے۔ پہلے بھی سمجھایا ہے تمہیں۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں تو سمجھتی ہوں، دل نہیں سمجھتا۔"

"وکیل صاحب، جب حسن کی عدالت میں عشق کا معاملہ پیش ہو تو دل کی دلیل سنتا۔" میں نے کہا۔ "اپنے دل سے کہو کہ وہ بیہودہ معاملات میں ٹانگ شریف نہ اڑایا کرے۔" میں نے اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو تھوڑا سا پیچھے کر کے بکھیرا۔

"اُف۔ اسے بھی تحسین کا یہ جذباتی سین کتنی دیر چلے گا؟" محسن نے کہا۔

"گویا کی ماں... میرا مطلب ہے میری گھر والی بھی یہی کہتی ہے۔" الف دین بولا۔ "میں لیٹ ہو رہا تھا، جب تک ... باندھتی تھی میں کہتا تھا ایک جنت ڈیوٹی پہ جا رہا ہوں۔ آخر دفتروں کے بابو، اسکول کے بچے اور کاروباری لوگ سب ہی روز جاتے ہیں۔ مگر شاید اسی لیے مجھے کبھی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا۔"

"اور شاید اسی لیے میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔" محسن بولا۔

میں نے رابعہ کو سمجھا دیا تھا کہ وہ لائٹ آف کر کے سو جائے اور اسے ایک ریوالور بھی دے گیا تھا۔ پھر بھی دل کو عجیب سی بے کلی تھی کہ میں اتنے بڑے لق و دق گھر میں اسے تنہا چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ وہ بہت نڈر اور جرأت مند لڑکی تھی۔ ضرورت پڑنے پر وہ اچھے خاصے مردوں سے زیادہ بہادری کا مظاہرہ کر گئی تھی۔ لیکن جب ضرورت نہیں ہوتی تھی تو وہ عام لڑکیوں سے زیادہ بزدل، ڈرپوک اور کمزور نظر آنے لگتی تھی۔ کبھی شعلہ، کبھی شبنم، کبھی پانی تو کبھی دہکتی آگ کا الاؤ۔ برگِ گل سے زیادہ نازک اور سنگِ خارا سے زیادہ سخت۔ یہی اس کے مزاج اور اس کی فطرت کے متضاد لیکن پراسرار قوت رکھنے والے رنگ تھے۔ لوہا یونگ میں کر رہا تھا کیونکہ راستہ صرف میرا دیکھا ہوا تھا۔ چنانچہ ریوالور میں نے محسن کو پکڑا دیا تھا۔ وہ الف دین کے ساتھ پچھلی سیٹ پہ بیٹھا ہوا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر آگے رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے ایک ریموٹ کنٹرول مائیکروفون لیا تھا جس کی رینج زیادہ نہیں تھی۔ لیکن پچاس گز کے فاصلے میں کار کے ایف ایم سیٹ پر اس کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ یہ مائیکروفون سائز میں ... کی ڈبیا کے برابر تھا اور مجھے خاصا مہنگا ملا تھا۔ دکاندار ایسی خلافِ قانون چیزیں فروخت کرتے ہوئے ڈرتے ہیں چنانچہ میں نے پانچ سو روپے دینے کے علاوہ دکاندار کو مطمئن کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی اور بالآخر وہ اندر سے مائیکروفون نکال لایا تھا جو اس وقت میری جیب میں تھا۔

رات کے دس بج کر دس منٹ ہوتے تھے ... نے

جیب کو اڑاتے بازار میں راجہ فتح شیر کے گھر سے دس گز دور پہلے روڈ پر گرا آیا اور اپنا لا اس کے دروازے تک گیا۔ سردی کی وجہ سے بیشتر لوگ سو چکے تھے اور ان کے گھروں میں کوئی روشنی نہیں تھی۔ حسب توقع آج فتح شیر کی نائٹ ڈیوٹی نہیں تھی چنانچہ میں نے دستک دی تو وہ خود ہی باہر نکلا اور مجھے دیکھ کر حیران ہوا۔ "ایں آئی" راجہ فتح شیر!" میں نے کہا۔

"ہاں میں فتح شیر ہوں۔" وہ ہاتھ ملا کے بولا۔ وہ چالیس سال سے اوپر کا بھاری بھرکم پیٹ والا پستہ قد آدمی تھا۔

"میں سب انسپکٹر جعفر باب ہوں، پولیس ہیڈ کوارٹر میں ڈی آئی جی کرائمز کے ساتھ۔" میں نے کہا۔

"خیر تو ہے نا جی؟" فتح شیر نے کہا۔ "ایک منٹ ٹھہریں، میں بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں۔"

اگرچہ محسن کلاس کے ایف ایم ریڈیو کو ٹیون کر کے میری آواز صاف سن رہا تھا لیکن میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی کہ میں اور وہ آپس میں بات کر سکتے۔ گویا ہمارا مواصلاتی رابطہ یک طرفہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک دو طرفہ مواصلاتی نظام جسے عام طور پر "واکی ٹاکی" کہا جاتا تھا ہماری اشد ضرورت تھی۔ اگرچہ اس کا رکھنا سخت خلاف قانون تھا مگر اسمگل کرنے والے باہر سے ہر وہ چیز لا رہے تھے جس کے یہاں ایک کی جگہ دس ملیں۔ ساری بات ضرورت۔۔۔ کی تھی اور قوت خرید کی تھی۔ تلاش کرنے پر اور منہ مانگی قیمت دینے پر واکی ٹاکی بھی مل سکتی تھا۔ لندن میں رہ کر مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ بلحاظ مالیت وہ پاکستانی کرنسی میں ہزار روپے سے زیادہ کی چیز نہیں ہوگی مگر یہاں نایابی کے باعث وہ یہ چیز ملی تو دس ہزار سے کم میں نہیں ملے گی۔

فتح شیر کا گھر باہر سے دیکھنے میں زیادہ بڑا نہیں لگتا تھا لیکن اندر اس کے ڈرائنگ روم کی وسعت اور آرائش دیکھ کر مجھے یقین آگیا کہ اپنی تنخواہ کے علاوہ فتح شیر اپنے اختیارات کی کیا قیمت وصول کر رہا ہے۔

"گھر تو بہت شاندار ہے آپ کا راجہ صاحب۔" میں نے ایک قیمتی صوفے پر بیٹھ کے کہا۔

"بس جی گزارا کرتے ہیں۔" وہ عاجزی سے بولا لیکن اس کی [illegible] کا غرور اس کے لہجے کی نفی کرتا تھا۔

"صوفہ مجھے یہاں کا تو نہیں لگتا۔" میں نے یوں کہا جیسے [illegible] متاثر ہو گیا ہوں۔

"[illegible] کویت سے منگوایا تھا جی۔" وہ بولا۔ "میں یہ گھٹیا [illegible] استعمال نہیں کرتا۔"

"[illegible] پڑا آپ کو یہ صوفہ سیٹ۔ اور یہ سینٹر ٹیبل بھی تو باہر کی ہے؟" میں نے کہا۔

"یہاں لانے کا خرچہ ڈال کے کوئی تین ہزار میں صوفہ سیٹ آیا۔" وہ بولا۔ "سات ہزار کا یہ ٹیبل سیٹ۔"

"کمال ہے راجہ صاحب! باوجود اس کے آپ یہاں رہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "کوئی کوٹھی لینی تھی گلبرگ میں۔"

وہ ہنسا۔ "کوٹھی تو بنوائی ہے گلبرگ میں۔ پورے چار کنال کی لیکن کرائے پہ اٹھا دی ہے۔ بڑی مجبوری ہے جی۔ بندے کے دس تیس تو سو دشمن۔ فوراً کوئی اوپر رپورٹ کر دے گا اور پھر یہ اخبار والے۔۔۔" اس نے ایک زبردست گالی عادت کے مطابق دی۔ "میں تو کسی ایسے ویسے کو اندر بھی نہیں آنے دیتا۔ اب دیکھیں آپ میں نے ایک ایک چیز باہر سے منگوائی ہے۔ یہ صوفہ اور دوسرا سامان دوبئی اور کویت سے آیا ہے۔ یہ پنکھا اور دیواروں کا رنگ بھی باہر کا ہے۔"

"اچھا جی! بڑا خرچہ ہوا ہوگا اس پر تو!" میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ "مگر شوق کا کیا مول!"

"مجھے کیا، میری گھر والی کہتی ہے کہ چیز ہو تو باہر کی۔ یہاں کا کوئی مال بھی پسند نہیں آتا اسے۔" وہ بولا۔ "خیر یہ بتائیں اس وقت کیسے تکلیف کی؟ اور ٹھنڈا ہو یا چائے تو پئیں گے۔ ویسے گھر میں سب سو گئے ہیں۔"

"معذرت کریں راجہ صاحب۔ آپس کی بات ہے۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں سرگوشی کی۔ "سب کو ایک دوسرے کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ کل کوئی بات ہمارے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔ میں تو آپ کو خبردار کرنے آیا تھا۔"

"میرے خلاف کسی نے کچھ لکھا ہے؟" تشویش کے آثار پہلی بار اس کے لہجے سے عیاں ہوئے۔ شاید اسے یہ بھی احساس ہوا کہ اب تک وہ میرے سامنے غیر محتاط انداز میں گفتگو کرتا رہا ہے۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ابھی تو کسی نے ڈاک سے کل ہی بڑی لمبی درخواست دی ہے۔"

"میں نے تم کو پہلے بھی دیکھا ہے۔" وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "انسپکٹر گیلانی کبھی تو وہ نہیں ہے؟"

"گیلانی صاحب نے ہی کہا تھا کہ آپ کو بتا دوں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں تو بس نام جانتا ہوں آپ کا۔ دو بار گیلانی صاحب کے ساتھ تھانے آیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا وہ ایک کیس تھا وسن پورے کا۔"

"اچھا اچھا۔۔۔ وہ جو اہل محلہ نے گیلانی کے سالے کے خلاف درخواست دی تھی۔" وہ اطمینان کا سانس لے کر بولا۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا جو نشانے پر جا بیٹھا تھا۔ وسن پورے کا علاقہ اسی تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ وہاں نہ جانے کتنے کیس ہوں گے جن میں فتح شیر نے دھاندلی کی ہوگی۔

"کیا بنا تھا اس کیس کا؟ گیلانی صاحب نے کہا تھا سب ٹھیک ہو گیا۔"

"او جی ٹھیک کیسے نہ ہوتا۔ سارے مدعیان کو بلوا لیا تھا میں نے۔ ایک بڑا استاد بنتا تھا۔ کہتا تھا میں ہیڈ ماسٹر ہوں اسکول کا۔" وہ بولا۔ "دوسرا لڑکا کسی کالج کا لیکچرار تھا۔ سب کو سیدھا کر دیا میں نے۔ دو دن بعد گھر والے اٹھا کے لے گئے۔ خود چل کر بھی نہیں جا سکتے تھے۔ اب کس نے شرارت کی ہے؟"

"آپ چوہدری دلاور کو جانتے ہیں؟" میں نے ہاتھوں کو سوچتے ہوئے کہا۔

"کون... کون چوہدری دلاور؟" وہ ایک دم نروس ہو گیا۔ "وہ شاہدرے والا؟"

"ہاں جی۔ اس کی فیکٹری ہے شاہدرے میں۔" میں نے کہا۔ "بڑا مشکل سا نام ہے۔"

"ایم ڈبلیو ٹی انجینئرنگ کمپلیکس۔" فتح شیر نے میری مشکل حل کی۔ "اس نے کچھ لکھا ہے؟"

"نہیں جی وہ کیوں لکھے گا۔ اس کی مدد کی تھی آپ نے۔" میں نے کہا۔ "کوئی بندہ مر گیا تھا اس سے۔ اس کا کوئی ڈرائیور تھا الطاف جس کا معاملہ وہ آپ کے پاس لایا تھا۔"

"اس کی گمشدگی کا پرچہ کٹوا دیا تھا میں نے۔" فتح شیر چہک کے بولا۔ "اور کیا چاہیے؟"

"وہ تو آپ نے ٹھیک کیا تھا اور ظاہر ہے اس نے بھی اتنا بڑا معاملہ دبانے کے لیے جو کچھ دیا اپنی جان بچانے کے لیے ہی دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اتنا سنگین معاملہ تھا کہ لاش اس کے گھر کے اندر موجود تھی اور وہ اس کو اپنی کوٹھی کے باغ میں گاڑنے کی کوشش کر رہا تھا جب میں نے چھاپا مارا۔" فتح شیر نے بے رخی سے کہا۔ "کوئی تیر مار آدمی مل جاتا تو پانچ لاکھ میں بھی جان نہ چھوڑتا۔ پھانسی لگوا دیتا لیکن اس کو پھانسی لگنے سے الطاف زندہ تو نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم نے بات ختم کی۔"

"سیانا بندہ تو بات ختم ہی کرتا ہے راجہ صاحب۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ چوہدری دلاور ذرا اوکھا بندہ ہے۔ کسی سے جانے نہیں رکھتا۔ معلوم نہیں ادھر ادھر کس سے گپ تھی ہے۔ کسی نے ادھر کی بات کر بھی دیکھی تو باہر نکل آیا اور دیوار کے اوپر سے سب دیکھتا رہا۔ اس نے درخواست دی ہے۔ نام نہیں لکھا۔"

"اگر نام نہیں لکھا تو اس پر کارروائی نہیں ہو سکتی۔ گمنام درخواست دینے والوں کا کیا ہے؟"

"وہ سب تو مجھے معلوم ہے جی لیکن وہ آدمی بہت ہوشیار ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے تو ڈی آئی جی صاحب کو بھی دھمکی دی ہے کہ تفتیش شروع کی تو وہ کیس اخبار والوں کو دے دے گا۔ اس نے تھانیدار کو بھی دیکھا تھا اور اس کے ساتھ آنے والے چار پانچ لوگوں کو بھی اور وہ سب کو شناخت کر سکتا ہے۔ انھوں نے ایک لاش اٹھائی تھی جو کالے کمبل میں لپٹی ہوئی تھی اور چوہدری دلاور کے گھر میں پیچھے والے گیٹ کے قریب پڑی تھی۔"

"کون... کون ہو سکتا ہے ایسا آدمی۔۔ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ واقعی اس نے سب دیکھا ہے۔" فتح شیر گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا۔ "اور کیا لکھا ہے؟ یہ بھی لکھا ہے کہ لاش کو ہم نے جیپ میں ڈالا تھا؟"

"ہاں جی! اس نے جیپ کا نمبر تک بتایا ہے۔ نام صرف آپ کا لکھا ہے اور کہا ہے کہ باقی لوگوں کو دلاور نے نام لے کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ ان سب کو انسپکٹر فتح شیر حکم دے رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"اچھا! کوئی تصویر تو نہیں لی اس نے۔ کچھ ٹیپ تو نہیں کیا؟" فتح شیر کی حالت ابتر ہونے لگی۔

"لکھا تو نہیں ہے لیکن اس نے کہا ہے کہ تفتیش کے وقت وہ اور ثبوت پیش کرے گا۔" میں نے کہا۔ "ایسے ثبوت جن کو جھٹلانا ناممکن ہوگا۔ تو ہو سکتا ہے کہ..."

"لیکن جعفر باب! رات کے اندھیرے میں فلیش کے ساتھ کوئی تصویریں اتارتا..." اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ اٹھ کے فون تک گیا اور ریسیور اٹھا لیا۔ اس وقت پورے گیارہ بجے تھے۔

"سب انسپکٹر راجہ فتح شیر۔" اس نے سخت بیزار اور اکھڑے لہجے میں کہا۔ پھر میں نے اس کی صورت کا رنگ بدلتے دیکھا۔ "ہاں۔۔ آج میری ڈیوٹی نہیں تھی اسی لیے گھر پر ہوں۔ تم کون ہو۔۔ کیا!۔۔ اس بکواس کا کیا مطلب ہے۔۔۔ میں کسی چوہدری دلاور کو نہیں جانتا۔ یہ جھوٹ ہے۔۔۔ میں پرسوں رات تھانے میں تھا اور تھانے سے باہر نکلا ہی نہیں۔ وہاں گواہ ہیں میرے۔۔۔ گواہ جھوٹے ہیں یا تم سچے ہو؟ کون ہے؟ ذرا نام بتاؤ نا اپنا تاکہ میں تصدیق کر لوں کہ تم رپورٹر ہو یا بلیک میلر۔۔۔ کوئی ثبوت نہیں ہے تمہارے پاس۔" وہ خوفزدہ بھی تھا اور مشتعل بھی۔ اس کے ہر جواب سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ محسن نے کیا کہا ہوگا۔ راجہ فتح شیر کی کیفیت اس عورت سے مختلف نہ تھی جو ہسٹریا کے شدید دورے سے گزر رہی ہو۔ اس کی مٹھیاں بند تھیں اور آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ چلانے لگا تھا اور اس کے بچگانہ ٹوٹے پھوٹے تھے۔ بے ربط الفاظ کی صورت میں ادا

www.paksociety.com

ہوئے بیٹھے تھے۔ میں اٹھ کر ان کے قریب گیا اور آہستہ سے اس کے کاندھے پر تھپکی دے کر ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ فون کس نے کیا ہے؟ فتح شیر نے درشتی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور مجھے بیٹھنے کو کہا۔

"کیسی تصویریں! بے وقوف بناتے ہو مجھے۔ گدھا سمجھتے ہو مجھے الو کے پٹھے۔" وہ گالیاں دینے لگا۔ "رپورٹر کے تم ہی بھی حقانیار ہوں۔ تمھاری نہیں کھودی ہے میں نے سات سال تک۔ ایک بھی تصویر اتاری ہوتی تم نے تو تفتیش کی جگہ ہوتی۔ میں وہی تمھاری...... کر دیتا۔ اچھا اچھا لاش غائب کی ہیں نے اور جیب میں لے گیا۔ تم آئی جی کے باپ ہو۔ جا کے بتا دو اُسے کہ میں نے لاش غائب کی ٹکڑے ٹکڑے کرکے نالہ لئی میں پھینک دی ہاکتوں کو ڈال دی۔ تم سمجھتے ہو میں ڈر جاؤں گا۔ لے آنا تصویریں بھی۔ ہاں مجھے بالکل یقین نہیں۔ کیا؟ کون سا کیمرا؟ کیسی لال شعاعیں... ؟ اچھا تو وہ کیمرا اندھیرے میں تصویریں اتارتا ہے؟ تمھارے پاس کہاں سے آیا؟ انفرا ریڈ کیا ہوتا ہے؟.... چلو وقت برباد مت کرو میرا، پھر فون کیا نا.... تو کر دوں گا۔"

اس نے دھڑ سے ریسیور رکھا اور ہانپتا ہوا میرے پاس آ بیٹھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اور منہ سے جھاگ نکلنے لگے تھے۔ اس نے دوران گفتگو ایک سے ایک فحش گالی دی۔

"کسی اخبار کا رپورٹر تھا۔" اس نے ایک اور غلیظ گالی دے کر کہا۔

"راجہ صاحب! آپ سیانے آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔ "فون پر ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔ یہ اخبار والے بہت خطرناک لوگ ہوتے ہیں۔ آپ کسی نئی پریشانی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔"

"وہ کوئی اخبار والا نہیں تھا۔" فتح شیر نے کہا۔ "ہوتا تو اپنا نام بتاتا۔ اخبار کا نام تو بتاتا۔ وہ بلیک میلر تھا۔"

"فرض کر لیں ایک منٹ کے لیے۔" میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ "اگر وہ سچ مچ کوئی رپورٹر ہی ہوا جو آپ کو بلیک میل کرنا چاہتا ہے تو اس نے یہ گفتگو ٹیپ کر لی ہوگی۔"

فتح شیر کا رنگ فق ہو گیا۔ "ٹیپ کر لی ہوگی؟.... نہیں.... وہ فراڈ تھا کوئی۔ ایک لاکھ مانگتا تھا مجھ سے۔ کہتا تھا دس لاکھ کیسے ہضم کر جاؤ گے۔ اس کے باپ نے دیے تھے دس لاکھ۔ مجھے تو دو ہی لاکھ ملے تھے۔ ایک لاکھ ایس ایچ او کو نہ دیتا؟ اور وہ جو چار فرشتے میرے ساتھ تھے، پچاس پچاس ہزار سے کم میں ان کا منہ بند ہوتا؟"

"میرا تو خیال ہے آپ سودا کر لیں.... میرا مطلب ہے راجہ صاحب کہ لاکھ دے کر جان چھڑائیں۔" میں نے کہا۔ "یہ معاملہ بڑھ نہ جائے۔ وہ انفرا ریڈ کیمرے کی بات کر رہا تھا نا، اخبار والوں کے پاس یہ کیمرے ہوتے ہیں۔ گھپ اندھیرے میں فلم بنا لیتے ہیں یہ لوگ۔"

"میں سوچ رہا ہوں یہ اخبار والا دلاور کے آدمی کا نام تو نہیں۔" فتح شیر نے پریشانی سے سر پکڑ کے کہا۔ "وہ سب دیکھتا رہا اور تصویریں اتارتا رہا۔ ایک طرف گمنام درخواست دے دی میرے خلاف اور ادھر فون کر دیا۔"

"یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر آپ نے اس کی بات مانی تو پھر وہ تفتیش کے لیے پیچھے پڑ جائے گا۔ اور یہی تصویریں تفتیش کے وقت پیش کر دے گا۔ ایک لاکھ دے دیجیے آپ نے تو خاموش ہو کے بیٹھ جائے گا۔"

"او نہیں یار۔ ایسے لوگ بہت چالاک ہوتے ہیں۔" وہ بولا۔ "اس نے لاکھ لے کے بھی تصویریں آگے ارسال کر دیں اور تفتیش کا معاملہ نہ دبا تو میرے لاکھ حرام گئے نا۔"

"یہ خطرہ تو ہے۔ آپ کو کیا معلوم وہ جیپ کے پیچھے بھی گیا ہو۔"

فتح شیر نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہاں دُور دُور تک چڑیا کا بچہ نہیں تھا۔ ہم لاش کو راول ڈیم کے پاس لے گئے تھے اور اس کے پیروں کے ساتھ پتھر باندھ کے نیچے پھینک دیا تھا۔ پڑا ہوگا وہ نیچے تہہ میں۔"

"پھر بھی راجہ صاحب! آپ بندوبست کر لیں۔" میں نے کہا۔ "ایک طرف تو وہ درخواست ہے۔ پھر یہ اخباری رپورٹر کہتا ہے کہ اس کے پاس تصویریں ہیں اور اب اگر اس نے ٹیلی فون پر ہونے والی یہ ساری بات چیت ٹیپ کر لی ہوگی تو...؟"

"بکواس بند کرو۔ تم کیا مجھے ڈرانے آئے ہو؟" فتح شیر کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "نوکری چلی جائے گی میری؟ اور پھانسی نہ ہو جائے گی مجھے؟ کیا ہوگا...؟"

"آپ خود جانتے ہیں کیا ہوگا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "آپ کا جو دل چاہتا ہے کریں۔ مجھے فارغ کر دیں۔"

وہ چونکا۔ "فارغ کر دوں؟ کیا مطلب.... تم اگر جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔"

"آپ اتنے بڑے بادشاہ تو نہیں ہیں راجہ جی! اتنی رات کوئی یہاں جھک مارنے نہیں آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ چاہتے ہیں میں وہ درخواست پیش آپ کر دوں؟"

"تو صاف کہو کہ تم بھی سودا کرنے آئے ہو۔" وہ مشتعل ہو گیا تھا۔

"ہاں، یہاں اکیلا کوئی نہیں کھا سکتا۔" میں نے کہا۔ "مل بانٹ کے کھانا پڑتا ہے۔ تم نے ایس ایچ او کو بھی تو ایک لاکھ دیے تھے پچاس ہزار مجھے بھی دے دو تو معاملہ ختم ہو جائے گا اور ایک بات بتا دوں وہ درخواست گمنام نہیں ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو مجھ سے۔ کس نے دی ہے درخواست؟" وہ چلایا۔

"نام بتانے کے پچاس ہزار۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "وہ میرا جاننے والا ہے۔ میں اسے خاموش کرا سکتا ہوں۔"

وہ ایک دم گالیاں بکنے لگا۔ اس کے منہ سے مغلظات کا دریا بہنے لگا۔ "پچاس ہزار درخواست آگے نہ کرنے کے، پچاس ہزار نام نہ بتانے کے، ایک لاکھ اس.... رپورٹر کے، میرے دو لاکھ ختم۔"

"نوکری ختم ہو گئی راجہ جی تو دو لاکھ کس کام آئیں گے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "نوکری میں تو ہزاروں روپے ملتے ہیں، دو لاکھ بنانے کے اوسان آپ نے بنا رکھے ہیں۔ گلبرگ کی کوٹھی" یہ سازوسامان سب کتنے لاکھ کا ہے۔"

"میں تم کو.... غلط سمجھا تھا...." وہ یوں صوفے پر گر گیا جیسے اس کا دم نکل گیا ہو۔ "میں سمجھا تھا تم میرے خیر خواہ بن کے آئے ہو لیکن تم تجھے ہو لالچی نکلے۔ مردار کھانا چاہتے ہو۔ جہاں تم بیٹھے ہو وہاں تم کو کچھ نہیں ملتا تو تم دوسروں سے چھینتے ہو۔"

"تم کیا میرے ماسے کے پتر ہو کہ میں تمھارا خیر خواہ بن کے آتا؟" میں نے کہا۔ "یہ نوکری کا نہیں زندگی کا معاملہ بھی ہے فتح شیر۔ تم قتل کیے ہو اور میں گواہ ہوں اب تو۔ تم نے میرے سامنے سب کچھ تسلیم کیا ہے۔ میرے سامنے ٹیلی فون پر بات کی ہے۔ میں پچاس ہزار بہت کم مانگ رہا ہوں۔"

وہ ایک دم مجھ پر حملہ آور ہوا۔ "میں تیری زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دوں۔ تجھے بھی وہیں نہ ڈال آؤں جہاں الطاف کو ڈالا تھا۔"

میں نے اس پر ایک معمولی سا داؤ آزمایا اور وہ پلٹ کر پیچھے جا گرا۔ "بس۔ وہیں سے بات کر فتح شیر! میں خالی ہاتھ آیا ہوں لیکن خالی ہاتھ جاؤں گا نہیں۔ اب میرا مطالبہ ایک لاکھ کا ہے۔"

فتح شیر پیٹ ہوئے کتے کی طرح ہانپتا اور کانپتا رہا۔ "ایک لاکھ، ٹھیک ہے میں ایک لاکھ دے دوں گا مگر تم سوچ کیا یہ کام تمھیں اور کرنا چاہیے؟ جرم کیا تھا چوہدری دلاور نے۔ یہ ان کو دینا پڑے گا۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اپنے پاس سے دے دو۔ سب مل کر دے دو یا دلاور سے لے لو۔"

"تم سب.... نہیں۔ ان میں سے کوئی نہیں دے گا۔"

وہ مایوسی سے بولا۔ "سارا الزام مجھ پر آئے گا۔ ماتحت کسی گنتی میں ہیں۔ راجہ فتح شیر نے حکم دیا تھا اور دھمکی دے کر مجبور کیا تھا۔ ایس ایچ او صاف مکر جائے گا لیکن دلاور دے گا۔ اس کا تو باپ بھی دے گا اس کے پاس بہت ہے۔ اگر دس لاکھ اور نکال دے گا تب بھی غریب نہیں ہوگا۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ اسے بتا دیتا ہوں کہ اس اخباری رپورٹر کی زبان بند رکھنی ہے تو رقم نکالو۔ درخواست دبانی ہے تو۔" وہ اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف لپکا۔ میں اطمینان سے بیٹھا رہا۔ راجہ فتح شیر نے ریسیور کان سے لگاتے ہی گالی بکی۔ کریڈل کو بار بار دبایا اور کھٹ کھٹ ٹیلی فون کی ساری بتیاں کو ایک کر دیا۔

"ابھی ٹھیک تھا کہ فون کا بھی مر گیا۔ ڈیڈ۔ اب کسی جگہ سے فون کرنا پڑے گا۔ پھر بھی کون آ جائے گا اس وقت ٹھیک کرنے۔ اور کسی جگہ سے ایسی بات نہیں کی جا سکتی۔" وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑایا۔

"ہم دلاور کے گھر جا کے بات کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہی سب سے محفوظ طریقہ ہے۔"

"ہاں.... تم نے ٹھیک کہا۔" وہ بولا۔ "میں تیار ہو کے آتا ہوں۔"

"نہیں راجہ فتح شیر! چلنا ہے تو اسی طرح چلو۔" میں نے کہا اور اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔

"کیا! میں بیوی کو بھی نہ بتاؤں؟" وہ ٹھٹک گیا۔

"مجھے کیا معلوم تم اندر جا کے بیوی کو بتاؤ گے یا ریوالور لے آؤ گے؟ مجھے شوٹ کرنے کے لیے۔ انھیں سونے دو۔"

"تم پاگل ہو۔ دلاور کے پاس خالی ہاتھ جا کے ایسی بات کرنا.... بہت خطرناک ہے۔"

"میں خالی ہاتھوں سے دس دلاوروں کو قابو میں کر سکتا ہوں۔ ایک پنکھ نہیں ہل سکتا۔" میں نے کہا۔ "تم اس کی بالکل فکر مت کرو۔ تمھاری حفاظت بھی میں کروں گا۔"

فتح شیر کچھ دیر مجھے قاتلانہ نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو دیکھا۔ وہ شلوار قمیص اور چپل پہنے ہوئے تھا اور یہ اس کے پہنے سونے کا لباس تھا باہر جانے کا نہیں۔

"میں ایک سویٹر تو پہن لوں۔ یا کمبل لے لوں۔" وہ بولا۔ "باہر سردی ہے۔"

"اگر تم اندر جاؤ گے تو میں تمھارے ساتھ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اور اگر تم نے بدمعاشی کی...."

"بدمعاشی تم دکھا رہے ہو۔" فتح شیر آپے سے باہر ہو گیا۔ "میرے ہی گھر میں.... میں شور مچا سکتا ہوں۔"

"کوشش کر کے دیکھو۔" میں نے غرا کر کہا۔ "ایک قدم آگے بڑھے تو تمھیں کچھ معلوم نہیں ہو گا۔ تمھاری گردن کا منکا ایسے توڑ دوں گا..." وہ چارپائی کی... خاطر جا... بیوی کی

www.paksociety.com

نکڑ ہو جاؤ تو بچنا کہ کوشش مت کرو۔ یہ پیسہ بھی تم اپنی پاکٹ سے تو نہیں دے رہے ہو۔ ولادت سے وصول کرنے جا رہے ہو۔ ابھی چپ چاپ چلو۔"

"لیکن... ہم جائیں گے کیسے؟" اس کا حوصلہ بالکل ختم ہو گیا۔ "موٹر سائیکل ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں، کار ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہاری طرح بھوکا نہیں ہوں۔ گیراج میں ٹھاٹھ سے رہتا ہوں اور ہر سال کار بدلتا رہتا ہوں۔"

میں نے کار کے انجن کی آواز سنی۔ پھر محسن نے باہر سے سیٹی بجا کے سگنل دیا اور میں نے فتح شیر کو اشارہ کیا۔

"تم... تم لے کر کے آئے تھے؟" وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم اغوا کرنے آئے تھے.... کون ہو تم؟... تم اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ۔" اس کا شک پل بھر میں یقین کی صورت اختیار کر گیا۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا۔ وہ میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے تڑپا لیکن اس کا مرا تڑا ہوا ڈھیلا جسم مقابلے کے قابل ہی نہ تھا۔ میں نے اسے صوفے پر گرا کے ایک ٹانگ سے دبا لیا۔ میرے دوسرے ہاتھ نے جیب سے کلوروفارم کی شیشی نکالی۔ اس کے چند قطرے رومال پر ڈال کے میں نے رومال اس کی ناک پر رکھ دیا۔ اس نے چند جھٹکے لیے اور ساکت ہو گیا۔ میں نے سانس روکے رکھی اور کلوروفارم کی شیشی بند کر کے دروازہ کھول دیا۔ تازہ ہوا میں سانس لیتے ہوئے بھی مجھے رومال سے اٹھنے والی بو کی چبھن کا احساس ہوا مگر اب میرے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔

"ویری گڈ۔" محسن نے آہستہ سے کار کا دروازہ کھول کے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "سب ریکارڈ ہو گیا۔ تم نے بھی کمال کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکرپٹ پہلے سے تیار تھا۔"

الف دین ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ "میں باہر آ جاؤں جی؟ مدد کے لیے؟" اس نے جھک کر کہا۔

"نہیں۔ ہم معقول کافی ہیں یہ جنازہ اٹھانے کے لیے۔" میں نے کہا۔ پھر محسن نے میری مدد کی اور ہم ساجد فتح شیر کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ گلی میں جھانک کر اطمینان کیا کہ باہر کوئی نہیں ہے اور فتح شیر کو پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ میں نے واپس ڈرائنگ روم میں جا کے رومال سے ہر اس جگہ کو صاف کیا جہاں میری انگلیوں کے نشانات کی موجودگی کا شبہ ہو سکتا تھا۔ لائٹ آف کی اور دروازہ باہر سے بند کر کے نکل آیا۔ ساڑھے گیارہ بجے ہم اسی راستے پر رواں تھے جس راستے سے آئے تھے۔

صدر بازار کا چوراہا پار کر کے میں نے ہیڈ لائٹس آف

کر دیں اور باقی راستہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اس دھندلی روشنی میں طے کیا جو پارکنگ لائٹس سے پھیل رہی تھی۔ گھر کے قریب پہنچ کے میں نے یہ چھوٹی لائٹس بھی بجھا دیں اور سیدھا عقبی حصے کے گیراج میں لے گیا۔ اوپر کی منزل پر کمرے کی روشنی ہوئی تو میں نے جھانک کر دیکھا۔ محسن نے فتح شیر کو الف دین کی مدد سے اٹھایا۔ الف دین اس کے درمیانی حصے کو نیچے سے سہارا دیا جو خاصا بھاری تھا اور ہم اسے سیڑھیوں کے راستے اوپر لے گئے۔ دروازہ کھولنے اور ہاتھ میں ریوالور لیے سجاد کے استقبال کے لیے موجود تھی۔

الف دین نے تمام گفتگو گاڑی کے الف ایم ریڈیو پر سنی تھی چنانچہ وہ پہلے سے مشتعل تھا اور راستے بھر مجھ سے پوچھتا آیا تھا کہ ہم اس شیطان کو کیا سزا دیں گے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ باولی ڈیم کی جھیل کتنی گہری ہے اور کیا اس کی تہ سے لاش برآمد کی جا سکتی ہے اور اس کی دلی تمنا تھی کہ فتح شیر کو اسی طرح پاؤں میں بھاری پتھر باندھ کر اسی جگہ غرقاب کرنے کا موقع فراہم کیا جائے جہاں فتح شیر نے اس کی لاش ڈبو دی تھی۔ ہم نے اس کے جذبات کو قابو میں رکھا اور اسے بار بار سمجھاتے رہے کہ غصے اور جلد بازی سے کوئی فائدہ نہیں۔ جب ہم نے فتح شیر کو فرش پر ڈال دیا تب بھی وہ وحشیانہ انداز میں اسے گھورتا رہا اور زیر لب کچھ کہتا رہا۔ اس کے لیے اپنے بچے کی موت اور غرقابی کا تصور اتنا اذیت ناک تھا کہ وہ ذہنی طور پر نیم دیوانگی کی کیفیت سے دوچار تھا اور اس کے سامنے آتا تو نہیں رہتا مگر وہ مجرم ضرور تھا جس نے ایک لاش کا سودا کیا تھا اور اپنا ضمیر دو لاکھ میں بیچا تھا۔ لاش کی بے حرمتی کی تھی اور ایک آدمی کے تن مردہ کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا تھا۔ یہ جذبات الف دین کو بار بار مغلوب کر لیتے تھے۔

"یہ ابھی فوراً ہوش میں نہیں آئے گا۔" میں نے الف دین کو کہنی کے فتح شیر سے فوکس کر دیا۔ "اور ہوش میں آنے کے بعد بھی کلوروفارم کا اثر رہے گا۔ اس سے صبح بات کریں گے۔"

"ابھی تم سو جاؤ۔" محسن نے کہا۔ "ہم بھی سونے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"اور صاحب کو یہ اٹھ کر بھاگ گیا پھر؟" الف دین نے کہا۔

"جب ہم نے اتنی محنت سے اسے یہاں لانے میں کی تو یہ اتنی آسانی سے نکل جانے دیں گے؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے اسے باتھ روم میں ڈال دو۔" الف دین کا کافی محسن بولا۔ "یہ دروازہ توڑ کے نہیں جا سکتا۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا اور ایک بار پھر ہم

نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اسے باتھ روم کے فرش پر لٹاتے ہیں یہ ظاہر ہے مقصد یہ تھا کہ صبح اسے سردی نہ لگ جائے۔

"ایک رات میں نہیں مرتا۔" محسن بولا۔ "زیادہ سے زیادہ نزلہ ہو گا، وہ منیجمنٹ کر لیں گے۔"

"اگر مر جائے گا تب بھی افسوس نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "مجرم کا اعتراف تو کر ہی چکا ہے۔"

"سزائے موت جرم کی نوعیت کے اعتبار سے زیادہ ہے۔" محسن کے پیچھے سے رابعہ نے کہا۔

"لیکن اس کے اعمال کی مناسبت سے کم ہے۔" محسن نے کہا اور دروازے کو کنڈی لگا دی۔ ہم دونوں ایک ہی لحاف میں گھس گئے۔

"کتنے ٹیپ استعمال ہوئے؟" میں نے کہا۔ "آواز صاف آ رہی تھی نا؟"

"بالکل صاف تھی۔ نوے منٹ کا ایک کیسٹ تقریباً دونوں طرف سے بھر گیا۔" محسن نے کہا۔ "مائیکروفون بہت حساس ہے۔"

"ریڈیو کے اسپیکر کی آواز باہر تو نہیں سنائی دیتی تھی؟"

"شیشے بند تھے۔" محسن بولا۔ "اس کے علاوہ گلی میں سے دو چار آدمی گزرے۔ انہیں بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ کار میں کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے ریڈیو سے ٹیپ کے لیے ڈائریکٹ کنکشن لے لیا تھا۔"

"تم نے لا الیکٹرانکس پڑھی کیا ہے محسن۔ تھوڑا سا وقت لگا لیتے اور الیکٹرانکس کی طرف توجہ دیتے۔ تیرا تو فطری رجحان ہے اس طرف۔" میں نے کہا۔ "ہمارے پاس دو طرفہ مواصلاتی رابطہ ہونا چاہیے۔"

"ہونا تو چاہیے۔ مارکیٹ بازار میں نہیں ملیں گے کیا؟ بالکل ملتے ہوں گے؟"

"معلوم کرنا پڑے گا۔ اگر ملے بھی تو کراچی میں ملیں گے۔" میں نے کہا۔

"کراچی تو جانا ہی ہے ہمیں۔ وہاں دیکھ لیں گے۔ دو پہر پھر باتیں کر لیں گے۔" محسن نے کہا۔ رابعہ اپنے لحاف میں گھس کے سر نکالے ساری گفتگو سن رہی تھی۔ الف دین تیسرے لحاف میں بلا سوچ سمجھے گھورتا رہا تھا اور شاید یہ غور کر رہا تھا کہ فتح شیر کا باقی تصفیہ اسے کہاں لے آئی۔ اگر وہ میرے پیچھے نہ لگا ہوتا تو یہ بازار سے گھر لوٹ جاتا اور چین سے سوتا۔ اسے کیا معلوم تھی یہ عمر کہ جاؤ کیسے مرا اور مر کے کہاں پہنچا؟

"مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "ٹیپ ریکارڈر لگا دو۔"

"لیکن ہم کچھ آرام کرنا چاہتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ڈیڑھ گھنٹے کا ٹیپ ہے صبح سن لینا۔"

"میں بے آواز لگا کے سنوں گی۔" وہ بولی۔ "اسپیکر بند ہے گا۔"

محسن نے ٹیپ ریکارڈر اسے دے دیا۔ کرے کی لائٹ جلتی رہی۔ پہلے محسن کو اور پھر مجھے نیند نے آ لیا۔ ریوالور جو میں نے رابعہ کو دیا تھا وہ اس کے تکیے کے نیچے تھا۔ دوسرا محسن نے اپنے تکیے کے نیچے رکھا تھا چنانچہ خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ میں زیادہ تھکا ہوا تھا اور نہ جانے کب تک سوتا رہتا اگر محسن مجھے جھنجھوڑ کر بیدار نہ کرتا۔ "سکندر! وہ بھاگ گیا۔" وہ بولا۔

"کون بھاگ گیا؟" میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ مجھے کھڑکی کے شیشوں سے دن کا اجالا نظر آیا۔ پھر رابعہ اور محسن کے متوحش چہرے دکھائی دیے۔

"الف دین کمینہ۔" محسن نے کہا۔ "اور وہ ہمارے لیے کرائے پر پانی پھیر گیا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے کہا۔ "فتح شیر کو اپنے ساتھ لے گیا؟"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا اور محسن نے باتھ روم کی طرف دیکھا۔ اس کی کنڈی کھلی پڑی تھی۔ ہوا میں مجھے ایک مخصوص مہک کا احساس ہوا جو گزشتہ شب اس کمرے کی محسوس ہوا میں نہ تھی۔ یہ بند کمروں کے گرد و غبار کی بو نہیں تھی۔ نئی دیواروں پر سیمنٹ کے تازہ پلستر کی بو نہیں تھی اور کوئی ایسی بو نہیں تھی جو ہاتھ سے دھو کی خبر دیتی ہو۔ یہ ایک دہشت زدہ کر دینے والی بو تھی۔ میں اٹھ کے باتھ روم کی طرف دوڑا اور دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ باتھ روم کے فرش پر خون ہی خون تھا۔ خون کے چھینٹے اس کی دیواروں پر تھے اور خون سے اس کا فرش لال ہو رہا تھا۔ خون بہہ کے نالی میں چلا گیا تھا اور مجھے خون آلود ہاتھوں کے نشان باتھ روم کی دیواروں پر نظر آ رہے تھے۔ درمیان میں فتح شیر مرا پڑا تھا۔ الف دین نے اس کو چھری سے پے در پے وار کر کے مار ڈالا تھا اور پھر اس کی گردن کاٹ کے الگ کر دی تھی۔ فتح شیر کا سر اپنی کھلی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا اور میں نے گھبرا کے دروازہ بند کر دیا۔

رابعہ

اور محسن کی نگاہیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ آخر اس لمحہ پھیرتے سکوت کو محسن ہی نے توڑا۔ "ہم نے اس پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کر لیا تھا۔"

"اس نے... پہلے کوئی حرکت نہیں کی تھی۔" میں نے بازی میں سب کچھ ہار جانے والے جواری کی طرح کہا۔ "وہ ٹھنڈا دکھ رہا تھا اور اس کی کسی بات پر دیوانگی کا شبہ نہیں ہوتا تھا۔"

"جب تک اس نے فتح شیر کی گفتگو نہیں سنی تھی وہ نارمل تھا۔" محسن نے کہا۔ "میں اس کے ساتھ تھا اور ریڈیو میں سب کچھ

www.paksociety.com

محسن کے اس کا ردعمل دیکھ رہا تھا۔ وہ چیخنے چلانے لگا تھا۔ گالیاں دینے لگا تھا اور قسمیں کھانے لگا تھا کہ وہ کسی کو نہیں چھوڑے گا۔ اس نے دو بار اپنا سر دیوار پر دے مارا۔ میں نے اسے قابو میں رکھا۔"

"ایسی حالت میں تو اس کو اکیلا چھوڑ کر بھی گیا ہوگا، جب تم فون کرنے گیا تھا؟"

"پہلے تو میں اسے چھوڑ کر چل پڑا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اس کا کوئی بھروسہ نہیں، کہیں فتح شیر کے گھر میں نہ گھس جائے اور ہنگامہ کر دے۔" محسن بولا۔ "پھر میں اسے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ ٹیلی فون کے تار بھی اسی نے کاٹے تھے۔"

"یہاں بھی وہ نارمل ہو گیا تھا یار۔" میں نے کہا۔ "چپ چاپ بیٹھا تھا۔"

"لیکن وہ نارمل نہیں ہوا تھا۔ اس کے اندر لاوا پک رہا تھا۔" محسن نے کہا۔ "اسی خیال نے اسے سونے نہیں دیا کہ مجرم اس کی دسترس میں ہے اور ہم اسے صبر و ضبط سے کام لینے کی تلقین کر رہے ہیں۔ وہ ہماری کارروائی سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ خود کچھ کرنا چاہتا تھا اور فوری! لیکن اس کی راہ میں ہم حائل تھے۔ ہمارے سوتے ہی اسے موقع مل گیا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا محسن۔" میں نے کہا۔ "کیا خیال ہے تمہارا یہ کام اس نے کب کیا؟"

"کم سے کم دو تین گھنٹے پہلے۔" محسن نے کہا۔ "سب سے پہلے میں جاگا تو مجھے باتھ روم کا دروازہ کھلا دکھائی دیا۔ اس وقت تک میں نے الف دین کی غیر موجودگی کو نوٹ نہیں کیا تھا۔ جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ واردات کر کے فرار ہو گیا ہے تو میں نے یہی سوچا تھا کہ قتل کس وقت ہوا۔ خون جما ہوا تھا اور کچھ سیاہ پڑنے لگا تھا۔ معمولی سی سیاہی کی جھلک ہے اب بھی۔"

"سردی میں خون جلدی ہی ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور باتھ روم میں خنکی زیادہ تھی۔" میں نے کہا۔

"اس وقت سات بجے ہیں۔" محسن بولا۔ "پانچ، ساڑھے پانچ بجے سے پہلے اجالا نہیں پھیلتا۔ اگر وہ اندھیرے میں نکل گیا ہوگا تو کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔" محسن بولا۔

"دیکھنے والا یہاں کون ہے؟" میں نے کہا۔ "جس نے بھی دیکھا ہوگا اسے سڑک پر پہنچنے کے بعد دیکھا ہوگا۔ اس کے ہاتھ اور کپڑوں پر خون کے داغ ہوں گے۔ وہ یقیناً پکڑا جائے گا۔ پاگل کا کیا بھروسہ۔"

"ہو سکتا ہے وہ پاگل نہ ہوا ہو۔ اس نے پورے ہوش میں ساری کارروائی کی ہو اور اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے بعد ہوش میں آیا ہو تو وہ چھپتا چھپاتا گھر پہنچ گیا ہو، اجالا پھیلنے سے پہلے۔" محسن بولا۔

"ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں محسن! اگر وہ گھر گیا تو بھی پھنس جائیں گے۔ پولیس کے ہاتھ پڑنے کے بعد تفتیش ہوگی۔ وہ سب بتا دے گا۔ وہ کم ہمت اور بزدل آدمی ہے۔ زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکے گا۔" میں نے کہا۔ "اسے سب کچھ معلوم ہے، ہم سب کے نام پتے۔ ممکن ہے گاڑی کا نمبر بھی یاد ہو۔ اس کی دیوار پر خون میں بھرے ہوئے ہاتھوں کے نشانات ہیں۔ یہ بھی الف دین کے ہاتھ کے ہوں گے۔ فتح شیر تو اتنا بھی نہیں ہوگا۔ الف دین نے بے ہوشی میں ہی اس کو قتل کیا اور اس کا سر کاٹ کر الگ کر دیا۔ ایسی دہشت اور ایسے جنون میں اس کو ہوش ہی کہاں رہا ہوگا۔ اس کے کپڑے اور ہاتھ خون میں بھیگ گئے ہوں گے۔ جب اس نے دیوار کا سہارا لیا تو ہاتھوں کا ٹھپہ لگ گیا۔ شکر ہے کہ ہم نے اسے ولاور کا پتا نہیں بتایا تھا ورنہ وہ [illegible] سے فارغ ہو کے ولاور کے گھر میں گھس جاتا۔ [illegible] یا تو خود مارا جاتا یا ولاور کا بھی یہی حشر کرتا۔ معلوم نہیں اب وہ کہاں ہے۔"

"باتیں کب تک کرتے رہو گے؟ کچھ کرو۔" رابعہ نے بے چینی سے لب کھولے۔ "یہاں سے نکلنے کی سوچو۔ اس لاش کا کیا کرنا ہے؟ یہ نہ ہو کہ پولیس اس کے ساتھ آ پہنچے۔"

"پولیس اتنی جلدی نہیں آ سکتی۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ پکڑا گیا تب بھی اسے تھانے لے جایا جائے گا۔ وہاں اس کا بیان ہوگا۔ شاید وہ بتا دے... لیکن اس کوٹھی کی نشاندہی کرنا اس کے بس کا نہیں ہوگا۔ جب وہ یہاں آیا تھا تو بے ہوش تھا۔ پھر ہمارے ساتھ پیچھے بیٹھا رہا تھا اور گاڑی میں نے چلائی تھی۔ واپسی پر تمام راستہ بتاتا آیا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں ہوگا۔"

"لیکن اب اسے یاد ہوگا۔ ڈرائیور سے پوچھ کر راستوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایک بار بھٹکنے کے بعد وہ راستہ نہیں [illegible]" محسن نے کہا۔ "ہمیں یہاں سے نکلنے کی فکر کرنی چاہیے۔"

"لاش کا ہم اس وقت کچھ نہیں کر سکتے۔ اتنا وقت کہاں ہے کہ اسے [illegible] اٹھائیں اور محفوظ طریقے سے [illegible] جائیں۔" میں نے کہا۔ "دفن کریں یا [illegible] میں ڈالیں۔ ہاتھ دھو کے صاف کریں اور خون کے نشانات مٹائیں۔ [illegible] بہتر ہے کہ ہم روپوش ہو جائیں اور اپنی موجودگی کے سارے نشان مٹا جائیں۔ یہ تکیے بستر تو چھوڑ دو لیکن برتن سب اٹھا لو۔ انگلیوں کے نشان ہوں گے۔ دروازوں پر جہاں کہیں ہاتھ لگے ہیں صاف کر دو اور نکل چلو۔ راستے میں دیکھیں گے کیا [illegible] مجھے معلوم ہے الف دین کا پتا کہاں سے ملے گا۔"

www.paksociety.com

ہم سب نے بڑی پھرتی دکھائی اور رابعہ نے دس منٹ میں سب برتن وغیرہ سمیٹ کر ایک تکیے کے غلاف میں ڈال دیے۔ ہم نے رات کو سگریٹ پی تھیں اور ٹکڑے فرش پر ہی بجھائے تھے۔ اس نے جھاڑو کی مدد سے سب اکٹھے کیے اور ہیٹر لگا کے اور ڈال دیے۔ ذرا سی دیر میں وہ راکھ ہو گئے۔ رابعہ نے جھاڑو سے فرش بھی صاف کر دیا۔ اور زینے کی تین کی گرد میں ہمارے نقش قدم نمایاں ہو گئے تھے۔ محسن نے اتنی دیر میں کپڑا لے کر سب دروازوں کے ہینڈل، کنڈیاں اور کنڈیاں لاک وغیرہ صاف کر دیے۔ میں نے تھوڑا تھوڑا کر کے سب سامان کار کی ڈگی میں منتقل کیا۔ آخری بار میں اور محسن اس گھر کا جائزہ لینے گئے جہاں ہمارا قیام صرف ایک رات رہا تھا۔ یہ رابعہ کا اپنا گھر تھا جہاں سے وہ مجرموں کی طرح فرار ہونے پر مجبور تھی۔ ایک مرتبہ پھر اسے اپنے کیے کی سزا مل رہی تھی۔ مگر جب پولیس تفتیش کے لیے آئی تو اخبار میں بھی خبر چھپی کہ مشہور ماڈل و ایڈووکیٹ خاتون رابعہ قاسمی کی کوٹھی میں پولیس افسر کا بہیمانہ قتل۔ خاتون وکیل روپوش۔ پھر یہ بالکل اخبارات نمایاں داستان کے لیے بنائیں گے، گڑے مردے اکھاڑیں گے۔ رابعہ سے منسوب افواہوں کو واقعات کی صورت میں پیش کریں گے اور قارئین کو یاد دلائیں گے کہ یہ وہی خاتون وکیل ہیں جن کا نام سکندر بخت کے ساتھ لیا جاتا ہے اور سکندر بخت وہ مفرور اشتہاری مجرم ہے... وغیرہ وغیرہ۔

کمرے میں اب صرف بستر لگے رہ گئے تھے۔ ان سے کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا تاوقتیکہ پولیس سراغ رساں کتے استعمال نہ کرے جو بستر کو سونگھ کر ہمارے جسموں کی بو پہچان لیں۔ ایک بستر میں رابعہ سوئی تھی دوسرے میں اور محسن ایک ساتھ تھے۔ اور تیسرے بستر میں الف دین تھا۔ میری اور محسن کی بو بھی تیسرے کتے یقیناً کنفیوژ ہو جاتے۔ الف دین اجنبی تھا چنانچہ صرف رابعہ تھی جس کے بدن کی خوشبو اس کے وجود کا سراغ دے سکتی تھی لیکن مجھے اس بات کا کوئی امکان نہیں نظر آتا تھا کہ قتل کی ایک واردات کے لیے پولیس اتنا اہتمام کرے گی۔ قتل ایک پولیس افسر کا تھا لیکن کسی غیر آباد کوٹھی میں کون آیا کون گیا یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ بیان کے لیے پولیس رابعہ کو یقیناً تلاش کرے گی اور شاید عثمان رضوی صاحب سے بھی رابطہ قائم کرے گی لیکن وہ کیا بتائیں گے۔ یہی کہیں گے کہ مجھے معلوم نہیں وہ یہاں سے نکل کے کہاں گئی۔ تاہم سامنے نہ آنے کے باعث رابعہ کی حیثیت بھی مفرور مجرم کی سی ہو جائے گی اور چونکہ کوٹھی کی مالک وہ ہے اس لیے جتنے منہ ہوں گے، اتنی باتیں۔ اس کے ہم پیشہ بھی اس کی داستان ماضی کے ہر ورق سے ایک کہانی کا سلسلہ قائم کریں گے اور یہ کہانی جہاں سنائی جائے گی رنگ بدلتی جائے گی۔

باتھ روم میں پڑی ہوئی لاش سے بھی کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ گزشتہ شب فتح شیر کو کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا تھا اس کے بیوی بچوں نے بھی نہیں اور میں نے اسے اندر نہیں جانے دیا تھا تو بہت اچھا ہی کیا تھا۔ اب تو اس کی بیوی بھی کسی کو نہیں بتا سکے گی کہ رات کو اس کے سونے کے بعد راجہ فتح شیر کہاں باہر گیا تھا اور کس کے ساتھ گیا تھا۔ وہ پہلے تو اس کا انتظار کرے گی۔ پولیس والے جنگی حالات میں کچھ بتائے بغیر بھی نکل جاتے ہیں۔ ممکن ہے وہ یہ سمجھ کے چپ رہے کہ فتح شیر ڈرائنگ روم کی کنڈی باہر سے لگا کے گیا ہے اور قریب ہی گیا ہوگا۔ اس کی وردی اور جوتے سب گھر میں موجود ہوں گے۔ تو دس بجے سے پہلے وہ بچوں کو ادھر ادھر بھیج کر محلے میں کسی سے پوچھیں، جہاں بھی وہ جا آ سکتا ہو، دوست عزیز یا رشتے دار کے گھر۔ تھانے میں وہ ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد فون کرے گی اور تب اسے معلوم ہوگا کہ راجہ تو غائب ہے۔ دس گیارہ بجے سے پہلے تھانے میں گمشدگی کی رپورٹ نہیں ہوگی۔

میں نے نیچے آ کے ڈرائیور کی جگہ سنبھالی تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ سورج نکل آیا تھا لیکن اس کی دھوپ بڑی عجیب سی زرد اداس اور مرجھائی ہوئی تھی۔ ایک سوگوار سی فضا میں سکوت سا محسوس ہوتا تھا۔ میں چلنے ہی والا تھا کہ محسن نے مجھے روک دیا۔ وہ باہر نکلا اور اس نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد ٹرنک سے گیلی مٹی اٹھائی۔ باہر ایک ننھا قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا اور اس کے آس پاس کچی زمین پر گھاس اگی ہوئی تھی۔ مجھے سے شام سے گرد جمی تھی اور درمیان میں تھوڑا سا پانی جمع ہو گیا تھا۔ اس نے کیچڑ کو آگے پیچھے کی نمبر پلیٹ پر یوں اچھال دیا کہ پڑھا نہ جا سکے لیکن یہ بھی معلوم نہ ہو کہ کسی نے جان بوجھ کے کی ہے۔ نظر یوں آئے جیسے گاڑی کہیں کیچڑ پانی سے گزری تھی تو دوسری گاڑیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے نمبر پلیٹ پر یہ چھینٹے پڑ گئے ہیں۔

"اب کہاں چلیں؟" محسن نے جھکتے ہوئے مایوس لہجے میں
"اچھا تھا کہ ٹال گیا تھا۔"

"میرا خیال ہے ٹیڈی کے پاس چلتے ہیں۔" میں نے
"صبح کا وقت ہے، وہ مل جائے گا۔"

"الف دین کے بیس ہزار روپے بھی تو جا رہے ہیں
ابھی ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"وہ اس کے نہیں تھے۔ اگر چھوڑ گیا ہے تو کوئی فرق نہیں ہے ہم پر۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اس سے بڑی تو وہ مصیبت چھوڑ گیا ہے ہم سب کی جان کے لیے۔ مجھے مل جائے تو..."

رابعہ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "کیا تم نروس ہو رہے ہو؟ ابھی سے..." وہ نرم پرسکون لہجے میں بولی۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور سر کو جھٹکا۔ رابعہ کے لہجے نے مجھے ہوشیار کر دیا تھا۔ میں اطمینان سے کار چلانے لگا۔

"تم نے کہا تھا کہ الف دین کا پتا معلوم کیا جا سکتا ہے؟" محسن نے پیچھے سے کہا۔

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے اس کی بچی کون سے اسکول میں پڑھتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اسکول میں اس کا پتا ہوگا۔ نام اور کلاس رجسٹر میں لکھے ہوتے ہیں۔ لیکن ابھی اس کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ الف دین رات اپنا ذہنی توازن ہی کھو بیٹھا تھا۔" رابعہ بولی۔ "اس نے جو کچھ کیا پاگل پن کے دورے میں کیا۔ اگر یہ پاگل پن عارضی ہوگا تو وہاں سے بھاگنے کے بعد اس کو اپنے جرم کی سنگینی کا احساس ہوا ہوگا۔ ممکن ہے اس نے ہاتھوں اور کپڑوں کو دھو کر خون کے داغ صاف کرنے کی کوشش کی ہو اور گھر پہنچ کے کپڑے بدل دیے ہوں۔ بیوی کو بتا دیا ہو کہ اس سے خون ہو گیا ہے۔"

"بیوی جیسی بھی ہے شوہر کو بچانے کی پوری کوشش کرے گی۔" محسن نے کہا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پولیس سے اور ہم سے بچنے کی خاطر بیوی بچوں سمیت بھاگ جائے۔" میں نے کہا۔ "اسے معلوم ہے دلاور سے بچنے کے لیے خانو نے بھی بیوی بچوں کو غائب کر دیا تھا۔"

"لیکن پاگل پن کے اثرات شدید اور دیرپا ہوئے تو... تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "وہ خودکشی بھی کر سکتا ہے۔"

"جو کچھ ہوگا شام تک معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اگر شام تک کوٹھی میں کوئی نہیں آیا تو میں اور محسن رات کو لاش نکال کے باتھ روم صاف کر آئیں گے۔"

"یہ حماقت ہوگی جرأت نہیں۔" رابعہ بولی۔ "پولیس کسی پاس سارے پڑوسیوں میں موجود ہوئی تو پکڑے جاؤ گے۔"

"استاد ٹیڈی کی شام کو معلوم کر آئے گا کہ پولیس آئی تھی یا نہیں۔" محسن نے کہا۔ "وہ ایک چکر تو لگا ہی لیں گے۔ جانے واردات کا سراغ کر لیں گے الف دین آ کر کیا نہیں گے اور اگر اس کے بعد انھوں نے کوٹھی کی نگرانی کا فیصلہ کیا تب بھی لاش کو اسی جگہ نہیں پڑا رہنے دیا جائے گا۔ یہ سب کارروائی ہوگی تو آس پاس کے لوگوں کے علم میں ضرور آئے گی۔ ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ٹیڈی کو ابھی بھیج دیں ایک گھنٹے کے اندر۔ اور اسے کہیں کہ وہ سارا دن دور ہی سے دیکھتا رہے۔"

"کیا پولیس رات کو نہیں آ سکتی؟" رابعہ نے کہا۔

"رات سے پہلے ہم الف دین کا سراغ لگا لیں گے۔ اگر وہ گھر سے بھی غائب ملا اور کسی تھانے میں بھی نہ ملا تو پریشانی اور خطرے کی کوئی بات نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "پھر وہ کسی کے ہاتھ نہیں آنے گا۔ نہ پولیس کے نہ ہمارے اور نہ دلاور کے۔"

"آج کے دن میں کوئی اور انتظام کر لو۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھے اپنا پیسہ نکالنے دو اور تم لوگ کوئی کرائے کا مکان تلاش کر لو۔ زیادہ بہتر ہے کہ کراچی چلو۔ اس شہر سے کچھ عرصے کے لیے نکل جاؤ۔"

"آج کا دن تو گزرنے دو۔" میں نے کہا۔ "ٹیڈی کے گھر ہم محفوظ ہیں۔"

"لیکن میں وہ پیسہ ضرور نکالوں گی۔ پیسہ پاس ہو تو سہارا رہتا ہے۔" رابعہ بولی۔ "یہ نہ ہو بعد میں اپنا پیسہ بھی اپنا نہ رہے۔ جیسے اپنا کوئی گھر اپنا نہیں رہا۔ کوئی رشتہ اپنا نہیں رہا۔ پیسہ تو بہت بے وفا چیز ہے۔"

"پھر اس کو سہارا کیوں کہتی ہو؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "اور اتنا دکھ ہے رشتوں کے ٹوٹنے کا اور گھر سے بے گھر ہونے کا تو ابھی وقت ہے، لوٹ جاؤ۔"

"تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔ میری بات کا الٹا مطلب کیوں نکال رہے ہو؟" رابعہ نے کہا۔

"مطلب نہیں نکال رہا ہوں، بات ہی الٹی ہے۔" میں نے برہم ہو کے کہا۔ "کیا مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟"

"اب بھی یہ سوال کرتے ہوئے شرم نہیں آتی تم کو؟" رابعہ نے چلا کے کہا۔

"گاڑی روک یہاں۔" محسن نے کہا۔ "ڈرائیونگ میں کروں گا۔ تم دونوں پیچھے بیٹھ کے لڑو۔"

ہم نے جگہ بدلی اور میں پیچھے آ گیا۔ رابعہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کے رو رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "مجھے معاف کر دو پلیز۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میری بات سے تمہاری دل آزاری ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "دراصل ہم سب اعصابی کشیدگی کا شکار ہیں، عدم اعتماد کا نہیں۔ بعض اوقات جو کہنا چاہتے ہیں کہہ نہیں پاتے۔ غلط الفاظ منہ سے نکل جاتے ہیں۔ ان الفاظ کا غلط مطلب سمجھ لیتے ہیں۔ حقیقت کیا ہے یہ ہم سب جانتے ہیں۔ ایک دوسرے کو جتنا ہم لوگ سمجھتے ہیں کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔"

"یہ غلط ہے۔" محسن نے کہا۔ "دلاور نے بھی ہم کو جتنا سمجھا ہے یہ وہی جانتا ہے۔ اتنا تو مجھے میرے باپ نے بھی نہیں سمجھا۔"

www.paksociety.com

اس کی نظروں میں آج بھی بن جیسی کی طرح سیدھا ہوں۔ بھولا بھالا اور معصوم۔"

بابر کو روتے روتے ہنسی آگئی۔ میں مسکرانے لگا۔ تھکا مسکرانے لگی۔ امید کی ہر کرن مسکرانے لگی۔

ٹینڈی ابھی سو رہا تھا کہ ہم نے بیل بجا دی۔ وہ ہم سب کو ایک ساتھ اور سازوسامان کے ساتھ دیکھ کر آلوؤں کی طرح دیدے گھمانے لگا۔ "صبح صبح کہاں سے نکالے گئے ہو بھئی آپ سب لوگ؟"

"کہیں سے نہیں۔" میں نے کہا۔ "نکالے گئے نہیں آئے ہیں۔ لیکن بے مروت تو تم ہو جو ہمیں اندر بلانے سے پہلے ہی نکالنے کی بات کرنے لگے۔ نکال دینا بعد میں یا خود نکل جانا۔"

"مہمان تو باعثِ رحمت و برکت ہوتے ہیں۔" ٹینڈی نے نعرہ لگایا۔ "خصوصاً بن بلائے مہمان۔"

"اچھا اب تم نہا دھو لو۔" محسن نے ٹینڈی سے کہا۔ "رابعہ تمہارے لیے ناشتہ وغیرہ بناتی ہے۔ لیکن ذرا پہلے باہر گاڑی سے سامان اٹھا لاؤ۔ شاباش۔ اور دیکھو تکلف مت کرنا۔ اپنا ہی گھر سمجھنا اسے بھلا کہ تم اقلیت میں ہو اب۔"

صحیح صورتِ حالات ٹینڈی پہ ایک گھنٹے کے بعد واضح ہوئی۔ وہ ہکا بکا سب سنتا رہا۔

"یہ تو بڑا لمبا مسئلہ ہو گیا۔" وہ ساری بات سن کے بولا۔ "اب کیا ہو گا؟"

"تم جاؤ سیدھے وہاں۔ ذرا دور سے نظر رکھو اس کوٹھی پہ جہاں وہ شیر کا بچہ مرا پڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھ سے دلاور نے چلتے چلتے یہ بات کہی کہ فتح شیر بھی شیر کا بچہ ہے۔"

"جب اسے معلوم ہو گا تو اس پہ کیا بیتے گی؟" محسن بولا۔ "اسے تنگ ضرور ہو گا کیونکہ یہی ہمارا کام ہے۔"

"مجھے تو ان چاروں کا، شیطانوں کا خیال آ رہا ہے کہ ان پہ کیسی بجلی گرے گی۔ احساسِ جرم کا شکار تو وہ پہلے ہی ہیں۔"

"رابعہ کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" محسن نے کہا۔ "ہم بینک سے رقم نکلوا لیں گے۔"

"اور میں الف دین کا سراغ لگاؤں گا۔" میں نے جیب سے رسید نکال کے سب کو دکھائی۔

"اس کا ڈیڈ ایڈریس بھی تو ہے؟" محسن بولا۔ "اس پہ پتا ہو گا۔"

"پتا اس کمپنی کا ہے جہاں وہ سب سے پہلے ٹرک ڈرائیور کی حیثیت سے ملازم ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کا فائدہ نہیں کوئی۔"

ہم سب ایک ساتھ نکلے۔ کار کی نمبر پلیٹ تو گندی تھی ہی صفائی سے پوری گاڑی گندی ہو رہی تھی اور ہم نے بہتر سمجھا کہ اسے دھو لیا جائے۔ ٹینڈی کی کرشن نگر میں شوروم والے مکینک سے شناسائی تھی۔ وہ ہمارے ساتھ گیا۔ پھر اس نے بس یا رکشا سے جانے کا ارادہ کیا اور ہم نے اسے تاکید کی کہ وہ محتاط رہے۔ "جانی چوکیدار اور پولیس بھی ہے۔" ٹینڈی نے کہا۔ "جو پہلے پہنچے دروازہ کھلوا لے۔"

"ہم تو دروازہ کھولے بغیر بھی گھس جائیں گے۔" کیسا "تم اندر مت ہو جانا۔"

"قسم مولا علی کی۔" وہ مونچھوں پہ تاؤ دے کر بولا۔ "اتنی عقل اپنے پاس بھی تھی۔ آپ سب نے مل کر دماغ درست کر دیا۔"

"یہ ٹھیک کہا تم نے۔ معلوم نہیں کس کس کا دماغ درست کر دیا اور کس کس نے ہمارا دماغ خراب کر دیا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر ہم نکل گئے۔ کار میں نے محسن کے حوالے کی اور اس نے مجھے ضلع کچہری کے پاس اتار دیا۔ وہ گھوم کر مال روڈ ہو گئے اور میں پیدل چل پڑا۔ جس اسکول کا پتا رسید پر درج تھا وہ دور نہیں تھا۔ دس منٹ بعد میں اسکول کی پرنسپل کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ "مجھے اس بچی سے ملنا ہے۔" میں نے رسید اسے دکھا کے کہا۔ "پتا مل جائے تو مزید بہتر۔"

"کس سلسلے میں؟" پرنسپل نے عینک کے شیشوں کے اوپر سے مجھے دیکھا۔ "کیا لگتے ہیں آپ اس بچی کے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے حقیقت کا اعتراف کرنا بہتر سمجھا۔ "میں ڈاکٹر امجد ہوں۔ اس بچی کا باپ اپنا پرس میرے کلینک پہ بھول گیا جس میں خاصی بڑی رقم کے ساتھ یہ رسید بھی تھی۔ میں امانت اس تک پہنچانا چاہتا ہوں۔"

اس نے گھنٹی بجا کے چپراسی کو بلایا اور اسے کہا کہ ... کی بچی کو بلا لائے۔ وہ پندرہ منٹ بعد لوٹا۔ اس تمام وقت پرنسپل نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور نہ جانے فائلوں میں کیا دیکھتی رہی۔ چپراسی نے مجھے مطلع کیا کہ وہ بچی آج نہیں آئی۔

"ضرور وہ بیمار ہو گی۔" پرنسپل نے کہا۔ "ورنہ تو وہ بہت ... چل رہے ہیں۔ خیر میں آپ کو پتا بتا دیتی ہوں۔" اس نے ایک ضخیم سا رجسٹر طلب کیا۔ جی ایم آر یا جنرل ایڈمیشن رجسٹر۔ اس سے ایک ہیلپر پر کچھ نوٹ کیا اور ہیلپر مجھے تھما دی۔

الف دین کا پتا معلوم کرنا بھی کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔ لیکن میں اس کے گھر تک پہنچا تو مجھے دروازے میں تالا نظر آیا۔ میں نے ادھر ادھر لوگوں سے دریافت کیا۔ اس وقت گھروں میں صرف عورتیں تھیں۔ انہوں نے مجھے سرسری طور پہ ٹال دیا۔ "نہیں کہاں گئے ہیں۔ گئے ہوں گے کہیں کسی سے ملنے۔ ہمیں بتا کے نہیں گئے۔ دوسری طرف والوں سے پوچھو۔"

سامنے کے دروازے سے ایک شخص برآمد ہوا۔ میرے سوال پہ اس نے مجھے خاصی مشکوک نظروں سے دیکھا۔ "کیا کام ہے جی آپ کو ان سے؟" وہ بولا۔

"کام اس سے ہے تو تم کو کیا بتاؤں؟" میں نے چڑ کر کہا۔ "میرا فرینڈ ہے وہ۔"

"کیا ہے؟" اس شخص کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"بھئی دوست ہے میرا۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "وہ کچھ پریشان تھا۔ اس نے کہا تھا کہ آپ راولپنڈی جائیں تو میری فیملی کو بھی جانا ہے۔ میرا نام ڈاکٹر امجد ہے۔"

"اچھا! تو یہ بات ہے ڈاکٹر صاحب۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "وہ نکل گیا۔ صبح صبح میں نے دیکھا تو تانگے میں سامان لدا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا الف دین کدھر کا ارادہ ہے تو بولا کہ پنڈی جا رہا ہوں۔ سسر کا انتقال ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ جھوٹ بول رہا تھا۔"

"تم نے کیسے اندازہ کیا؟" میں نے کہا۔

"لو جی سسر اس کی بیوی کا کون ہوا؟ باپ ہوا نا؟" وہ بولا۔ "بیوی کا باپ مرے گا وہ رونے دھونے کے بجائے گھر والے سے لڑے گی۔ رولا ... میں نے صبح فجر کی نماز سے پہلے سنی تھی۔ وہ تانگے میں بھی ایسے بیٹھی تھی کہ معلوم ہوتا تھا لڑ کر بیٹھی ہے۔ بچے بھی ڈرے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ سسر کی موت پہ کوئی اتنا سامان لے کر نہیں جاتا۔ آپ کی بات ٹھیک ہے۔ وہ کچھ پریشان تھا۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہوا۔ وہ چپ چاپ نکل گیا۔"

اس کی دلیل نے مجھے قائل کیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس چل پڑا۔ میرے اطمینان کے لیے یہ بات بہت تھی کہ وہ پولیس کے ہاتھ نہیں لگا۔ پاگل نہیں ہوا اور اس نے خودکشی نہیں کی۔ اس نے وقتی دیوانگی کے دورے سے مغلوب ہو کے ایک قتل تو کر دیا تھا لیکن اس کے بعد ہوش آیا تو وہ فرار ہو گیا۔ اسے میری دھمکی بھی یاد تھی کہ میں اس کی بچی کے اسکول سے پتا معلوم کر سکتا ہوں۔ اسے یہ بھی احساس ہو گا کہ اس نے جو قتل بلا ارادہ کیا ہے اس کی سزا میں کیا دوں گا اور میں نے خود کو قانون کیا دے گا۔ وہ شریف بھی مجرم بھی بن رہا تھا اور قانون سے زیادہ ہم سے خوفزدہ تھا جو مقدمہ چلائے بغیر سزا دینے کے قائل تھے۔ یہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

ایک بار پھر میرا ذہن منتشر اور نڈھال ہو رہا تھا۔ خطرے نے کچھ دیر کے لیے میری شکاری قوتوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ بادل سا سامنے کی طرح گزر گیا تھا اور صورتِ حال جو مخالف محسوس ہوتی تھی موافق نظر آنے لگی تھی۔ میں سوچتا گیا اور پیدل چلتا ہوا رنگیلا تک آ پہنچا۔ فتح شیر کو اپنے اعمال کی سزا ملی تھی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا ہرگز نہ تھا۔ میں تو اس سے پوچھتا کہ اس نے دلاور کے ساتھ مل کر اور کیا گل کھلائے ہیں۔ اب اس سے وہ سب پیسہ وصول کرتا جو اس نے دلاور سے اس کے جرم کو چھپانے کے لیے لیا تھا اور پھر دلاور سے بات کرتا۔ اس ٹیپ کی موجودگی میں جو محسن نے کار کے ریڈیو سے میری اور فتح شیر کی گفتگو سن کر تیار کیا تھا دلاور کو ایسے شکنجے میں کسا جا سکتا تھا کہ وہ رہائی کی خاطر منہ مانگی قیمت دینے پر تیار ہو جاتا۔ پھر کچھ دلاور نے سب اُسے کہہ کر فتح شیر کو دیا تھا اس کمائی کا حصہ تھا جس پر مجھ سے پہلے میرے باپ کا حق تھا۔ یہ کمائی اس کی میرے باپ کے کاروبار پر غاصبانہ قبضہ کر لینے سے ہوئی تھی۔ اس نے کاروبار ہی نہیں اپنے مجرمانہ حربے استعمال کر کے میرے باپ کو اس کے جائز حصے کی ملکیت سے بھی محروم کیا تھا۔ پھر اس کو پیسے پیسے کا محتاج کر دیا تھا اور اس کی ساری کمائی چھین لی تھی۔ یہاں تک کہ وہ ایمانداری اور محنت سے ترقی اور خوشحالی کی منزل حاصل کرنے والا مفلس ہو چکا تو اداس تنہا اور مجبور ہو کے زندگی کی آخری منزل تک پہنچا تو اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ایک شکستہ دل کے سوا۔ ایک فریاد کناں لبِ خاموش کے سوا۔ اپنی زندگی کی تمام جدوجہد کے رائیگاں جانے کے خیال کے سوا اور اس احساس کے سوا زندگی ایک سزائے ناتمام کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس نے اپنا پورا خاندان گنوا دیا۔ اپنا کاروبار گنوا دیا۔ محنت سے حاصل ہونے والی کامیابی کا فخر گنوا دیا۔ مجھے گنوا دیا جو مستقبل کے استحکام کی علامت تھا اور یہ سب کچھ گنوانے کے بعد اگر اس نے جان گنوا دی تو کون سا احساسِ زیاں رہا ہو گا۔

لیکن اب مجھے سارا حساب برابر کرنا تھا۔ اگر میں دلاور کو قتل کر دیتا تو یہ اس کے لیے کوئی سزا نہ ہوتی۔ مجھے اس کو اتنا ہی عذاب دینا تھا جتنا میرے باپ نے اٹھایا۔ اس سے وہ سب وصول کرنا تھا جو اس نے میرے باپ سے چھینا اور اسی طرح وصول کرنا تھا جیسے اس نے جمع کیا تھا۔

رنگیلا سینما کے ساتھ ہی ہوٹل ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر میں نے پہلے چائے پی اور پھر دوپہر کا کھانا کھایا اور اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسرا لائحہ عمل مرتب کیا۔ مسئلہ دلاور سے رابطہ قائم کرنے کا تھا۔ الف دین کے اس انکشاف نے میری سوچ کا رخ موڑ دیا تھا کہ وہ منشیات کے نیٹ ورک اسلحے کے ناجائز کاروبار میں ملوث ہے — پہلے وہ صرف میرا دشمن تھا۔ اب میری نظر

www.paksociety.com

میں ملک و قوم کا دشمن بھی ہو گیا تھا اور جتنی سزا میں اسے دینا چاہتا تھا اس سے کہیں زیادہ کا مستحق اسے حالات ثابت کر رہے تھے۔ یہ اطلاع ابھی تصدیق طلب تھی کہ وہ اس ناجائز کاروبار میں کس طرح ملوث ہے۔ وہ ناجائز اسلحہ منگواتا ہے یا بھیجتا ہے۔ منگواتا ہے تو کہاں سے اور بھیجتا ہے تو کسے بھیجتا ہے۔ بے شک ساری دنیا اسلحے کی منڈی بن گئی تھی اور فتنہ و فساد میں شیطان کی پیروی کرنے والے آدمی کو اب دنیا آباد کرنے کی، اسے آنے والے دن کے لیے زیادہ خوبصورت بنانے کی اور اپنے بچوں کے لیے بہتر زندگی کی ضمانت کے طور پر قائم رکھنے کے بجائے اسے تباہ و برباد کرنے کی فکر تھی۔ آدمی کے خون کے سمندر میں بہنے کی خواہش تھی اور جہنم بنا دینے کی آرزو تھی چنانچہ وہ جنگ و جدل اور قتل و خونریزی میں مصروف تھا اور اسے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کو ختم کرنے کے لیے ہر وقت ہر قسم کے اسلحے کی ضرورت تھی۔ بندوق کی گولی اور توپ کا گولا۔ بم اور ایٹم بم۔ اعصابی گیس اور مہلک جراثیم کے بم گھنٹوں کے بجائے منٹوں میں اور منٹوں کے بجائے سیکنڈوں میں لاشوں کے زیادہ اونچے انبار لگانے کا یہ مقابلہ مسلسل جاری تھا۔ اس تخریبی جذبے کی شدت تعمیر کی ضرورت پر غالب آ گئی تھی۔ اتنی ہی جدوجہد کا رُخ اگر آدمی کی خوشی اور خوشحالی کے حصول کی طرف ہوتا تو... مگر یوں نہ تھا اور جو کچھ ہو رہا تھا وہ نہیں تھا جو کہ ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ یہ ہو سکتا تھا کہ طارق کی اطلاع غلط نہ ہو۔

ابھی تو مجھے یہ طے کرنا تھا کہ میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے؟ ایک موقع تو ہاتھ سے نکل گیا تھا لیکن کیا دوسرے مواقع سے فائدہ اٹھانے کے امکانات پیدا نہیں ہو گئے ہیں؟ میں نے کھانا ختم کرنے کے بعد ولاور سے رابطے کا فیصلہ تو کر لیا تھا۔ بل ادا کرنے کے بعد میں نے رکشا لیا اور ٹیڈی کے گھر پہنچا۔ محسن اور رابعہ کو بینک سے کیش لینے کے سوا کوئی کام نہیں تھا لیکن وہ بھی واپس نہیں آئے تھے۔ میں نے بینک میں کسی قسم کی گڑبڑ کے امکانات پر غور کیا اور رابعہ کے اعتماد کے پیش نظر مسترد کر دیا۔ رابعہ کہیں کرائے پر مکان لینے کے حق میں تھی اور یہ ہو سکتا تھا کہ وہ محسن کے ساتھ مکان کی تلاش میں نکل گئی ہو۔ چابی دروازے کی چوکھٹ کے اوپر موجود تھی۔ اس بند گلی میں لوگوں کی آمدورفت نہیں تھی۔ صبح شام بچے اور مرد آتے جاتے دکھائی دیتے تھے لیکن رات کی طرح اس وقت بھی گلی سنسان پڑی تھی۔ مرد فکرِ معاش میں نکلے ہوئے تھے اور بچے اسکول سے تو واپس آ چکے تھے لیکن ابھی کھیل کود کے لیے باہر نہیں آئے تھے چنانچہ مجھے چابی اٹھانے اور ٹیڈی کے گھر میں گھسنے دیکھ کر اعتراض کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

دس منٹ میں فتح شیر کی گفتگو کا کیسٹ لے کر میں پھر باہر نکل آیا۔ کرشن نگر کی ہی ایک دکان سے میں نے اس کی دو کاپیاں بنوائیں۔ ضرورت تو مجھے صرف ایک کاپی کی تھی۔ دوسری میں نے احتیاطاً کسی ضرورت کے لیے بنوائی تھی۔ میوزک شاپ کا مالک مجھے اپنے آلات سے ہونے والی معیاری ریکارڈنگ بطور آزمائش اپنے کان پھاڑ اسپیکروں پر سنوانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے سمجھایا کہ کیسٹ میں گانے نہیں ہیں بلکہ کچھ پرائیویٹ گفتگو ہے۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور پرائیویٹ گفتگو کو پبلک کے سامنے سنوانے سے باز رہا۔ واپس لوٹتے ہوئے مجھے اس خیال سے کافی اطمینان بخش کہ میری تصویر کی اشاعت کے بعد ابھی تک مجھے شناخت کر لینے والوں کی تعداد بہت کم ہے، وجہ یہی تھی کہ تصویر پرانی ہو گئی تھی اور زیادہ تر لوگ زندگی کی مصروفیات میں اسے فراموش کر چکے تھے۔ اوّل تو کوئی غور سے ہر چہرہ نہیں دیکھتا اور اگر دیکھے تو فوراً یادداشت کے تہ خانوں میں محفوظ لاتعداد تصویروں سے نہیں ملاتا۔ بے شک میں سکندر بخت نہیں دس ہزار کا نوٹ تھا لیکن اپنے خوش بخت ہونے پر کسی کا یقین اتنا کامل نہیں ہوتا کہ میری تصویر لے کر صبح سے شام تک کوچہ و بازار میں سرگرداں رہے اور دولت ہو جانے کے راہ چلتے نصیب کھل جائیں۔

گلی کے نکڑ پر گاڑی کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ مجھے رابعہ اور محسن کے مشورے کی ضرورت بھی تھی۔ محسن کی عملی کی ضرورت بھی اور گاڑی کی بھی لیکن اندر صرف محسن کو دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔

"رابعہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ البرٹ وکٹر ہوسپٹل گئی ہے۔" محسن نے ٹیڈی کی بان والی چارپائی پر لیٹے لیٹے کہا۔ وہ ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھے اطمینان سے سگریٹ کا دھواں چھت کی جانب ارسال کر رہا تھا۔

"اور تو نے اسے جانے دیا؟" میں نے اس کے پاس ہی بید کی ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر کہا۔

"وہ نازو سے ملنے گئی ہے۔ [illegible]" محسن بولا۔ "بقول شاعر، ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے۔"

"اور وہاں جو ڈبل ایس پی آ کر بیٹھا ہے، ہم سب کا مشترکہ دشمن" میں نے برہمی سے کہا۔

"وہ اب سنگل ایس پی آئی رہ گیا ہے صرف سید اکرام شیخ" محسن بولا۔ "اس نے پولیس کی نوکری کو لات مار دی ہے۔ تارک الدنیا ہو گیا ہے۔ کسی سے نہیں ملتا اور کوئی بات نہیں کرتا۔

نازو بہت پریشان تھی۔ اس کے گھر والے بھی پریشان ہیں کیونکہ نازو خود کو مجرم سمجھتی ہے [illegible] ذہنی حالت کا شکار ہے۔"

"جبکہ اس کے والدین ساری خرابی کا ذمہ دار مجھے سمجھنے لگے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "میں نے ہی نازو کو بلایا تھا۔"

"رابعہ کو تو معلوم ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "اس نے تو خیریت معلوم کرنی چاہی تھی۔ نازو نے خود بات کی اور اسے بتایا۔ رابعہ کچھ تامل کر رہی تھی لیکن نازو نے اسے یقین دلایا کہ اس میں کوئی چال نہیں ہے اور اکرام شیخ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، وہ اب کچھ نہیں کرے گا کیونکہ وہ اس قابل ہی نہیں رہا۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ یہ ایک شدید نفسیاتی ردعمل ہے۔ نروس بریک ڈاؤن کی ایک صورت۔ اکرام شیخ کو نارمل ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ ابھی تو وہ چوبیس گھنٹے نازو کے پاس بت بنا بیٹھا رہتا ہے۔ کسی سے کچھ کہتا ہے نہ کسی کی بات کا جواب دیتا ہے۔ رات کو بھی اسے خواب آور گولیاں دے کر سلایا جاتا ہے۔ رابعہ نے کہا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اسے کون گرفتار کر سکتا ہے۔ ابھی تک اس کے خلاف کوئی الزام نہیں ہے۔ بے شک وہ رضوی صاحب کے گھر سے فرار ہوئی تھی لیکن رضوی صاحب اس کو زبردستی نہیں روک سکتے۔ وہ اپنی مرضی سے وہاں رہتی تھی، نظربند نہیں تھی۔ یہ بات آن ریکارڈ آجائے کہ پولیس کو اس کی نگرانی یا تعاقب پر مامور کیا گیا تھا تو رضوی صاحب کو جواب دینا مشکل ہو جائے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

"وہ اب بھی ایسا ہی کریں تو انہیں کون روک سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "اسپتال سے کوئی اس کے پیچھے لگ جائے گا۔"

"وہ اسپتال سے سیدھی یہاں نہیں آئے گی۔" محسن نے کہا۔ "منظر کے پاس جائے گی۔ اسے اپنی رقم بھی منظر کو دینا تھی کہ اپنے اکاؤنٹ سے نکلوا کے ایک لاکھ چوبیس ہزار نو سو اور کچھ تقریباً پچپن لیں۔"

"بینک میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

"ہوئی تھی۔ خیر گزری۔" محسن بولا۔ "ڈیپارٹمنٹ میں آتی کی خاتمہ ہو گئی عین کلوزنگ سے پہلے۔"

"الف دین غائب ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اس کے گھر گیا تھا۔ وہ صبح منہ اندھیرے بیوی بچوں کو لے کر نکل گیا۔"

محسن ایک دم اٹھ بیٹھا۔ "اس کا مطلب ہے وہ پکڑا نہیں گیا۔"

"ہاں۔ اس نے پاگل پن میں موقعے سے فائدہ اٹھایا اور فتح شیر کو قتل کر دیا۔ اگر اسے ولاور کے ٹھکانے کا علم ہوتا تو اس پاگل پن میں وہ ولاور کو بھی مار جاتا۔" میں نے کہا۔

"وہ اب بھی مار سکتا تھا۔" محسن نے کہا۔ "ہو جاتے تو معلوم ہوتا کہ یہ جرم ہے۔"

"وہ بھی جرم نہیں سمجھتا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ ضدی آدمی تھا۔"

"اس نے مجھے مجرم سمجھ کے ہی پکڑنے کی کوشش کی تھی۔" محسن بولا۔

"ہاں، لیکن بعد میں حالات نے اس کی سوچ بدل دی۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمارے ساتھ ہو گیا تھا اور ہم اس کے مجرم نہیں تھے۔"

"مجھے ڈر ہے وہ اپنی بدحواسی کے باعث نہ پکڑا جائے۔" محسن نے کہا۔ "خوفزدہ ہو کے فرار ہونے والے مجرم کا رویہ خود اس کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ ہمارے ساتھ رہتا تو ہم اسے کوئی بے وقوفی نہ کرنے دیتے۔ اب یہی حماقت کیا کم ہے کہ وہ بلاوجہ اپنا گھر چھوڑ، بیوی بچوں کو اپنے ساتھ لے کر بھاگ گیا۔"

"اس کے ایک پڑوسی نے بھی اسی قسم کے شک کا اظہار کیا تھا۔"

"شک تو ہوگا۔ وہ جہاں بھی جائے گا کسی عزیز کے پاس یا کسی دوسرے شہر میں۔ کیا لوگ پوچھیں گے نہیں کہ ایسی کون سی آفت آ رہی تھی لاہور میں جو تم نے ہجرت کی۔ بچی کا اسکول چھڑا دیا اور بیوی کو بے گھر کیا۔ اسے سب کو مطمئن کرنے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑیں گے۔ پہلے بھی کوئی جھوٹ تو بولا ہوگا اس نے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں، اس کے مڈل ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔ مجھے اسکول جا کے معلوم ہوا۔" میں نے کہا۔

"جب بھی اس کا جھوٹ پکڑا گیا وہ بھی پکڑا جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "اور پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو سب بک دے گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں، کم سے کم آج۔" میں نے کہا۔ "اور میں اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے موڈ میں ہوں۔ ظاہر ہے اب فتح شیر کی لاش کے دریافت ہونے کا امکان نہیں رہا۔"

"لیکن اب تک پولیس کو اس کی پُراسرار گمشدگی کا علم ہو گیا ہوگا۔"

"اس سے ہمارے لیے کوئی پریشانی پیدا نہیں ہو سکتی۔" میں نے کہا۔ "پولیس اسے تلاش کرتی پھرے۔ البتہ یہ خبر اپنے چوہدری ولاور صاحب کو ملے گی تو ان کے لیے فکر کی بات ہوگی کیونکہ انہیں بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔ فتح شیر کی گمشدگی کا ولاور سے بھی تعلق نہیں۔ ہے تو یہ بات صرف ہم جانتے ہیں یا اس پر وہ چار ماتحت شک کر سکتے ہیں جو اس کے شریکِ جرم تھے لیکن وہ بھی اپنے شک کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اگر یہ خبر کسی اخبار میں اشاعت کے قابل سمجھی گئی تو نہایت غیرنمایاں مقام پا سکے

www.paksociety.com

گی اور ہو سکتا ہے اپنے چوہدری صاحب اخبار کا مطالعہ سرسری کرتے ہوں۔ معروف آدمی سرخیوں پر ہی نظر ڈالتے ہیں۔ لیکن فرض کرو کل وہ خبر دیکھ لیتے ہیں، پھر بھی کافی وقت ہے۔ ابھی سوا تین بجے ہیں۔ کل صبح سات سوا سات سے پہلے وہ اخبار نہیں دیکھیں گے۔ سولہ گھنٹے میں ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"

"تیری کھوپڑی میں کوئی پلان ہے تو اس کا بلیو پرنٹ نکال۔"

"بلیو پرنٹ؟ لاحول ولا قوۃ۔ میاں کس قدر عریانی و فحاشی بھری ہوئی ہے تمہارے افکار و خیالات میں۔ کیا صرف پرنٹ کہہ دینا کافی نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "بلیو کا لفظ انتہائی غیر اخلاقی ہے میاں۔"

"لوگ صرف آسمان کیوں نہیں کہتے، نیلا آسمان کیوں کہتے ہیں۔" وہ بے خیالی سے بولا۔ "اور سمندر کے کنارے ایک کیڑا ملتا ہے بلیو بوٹل، اسے صرف بوٹل کیوں نہیں کہہ دیتے۔ بڈھے نورے کا ٹیپ ہے ظالم۔"

"تم کسے تو چشم بد اُنھیں کہو جو نیم عریاں اور نہایت بے شرمی سے مخلوط طریقے پر سمندر میں سرِعام نہانے کی جسارت کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمارا پلان نہایت پاکیزہ ہے۔ ہم چوہدری سے گلے ملنا چاہتے ہیں بلکہ گلے پڑنا چاہتے ہیں ان کے۔ اور اس وقت ہمیں ان کی بہت یاد آ رہی ہے۔ ان کی آواز ہی سننے کو مل جائے۔" میں نے ایک سرد آہ بھری۔

"اچھا۔ اتنا آزردہ اور آبدیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" محسن اُٹھ کھڑا ہوا۔ "باہر چل کر بات کر لیتے ہیں ان سے۔"

میں نے ٹیپ ریکارڈر اٹھایا۔ دو میں سے ایک فالتو ٹیپ کی کاپی ہم نے گاڑی میں رکھی اور اصل ٹیپ ریکارڈر میں فٹ کر دی۔ دوسری کاپی کو ہم نے ٹیڈی کے گھر کے ایک محفوظ گوشے میں چھپا دیا۔ میں اور محسن مختلف دکانوں پر پھرتے رہے جہاں "پبلک ٹیلیفون" کا بورڈ نظر آیا لیکن ہر جگہ ٹیلیفون ایسی جگہ ملا کہ دکاندار سر پر موجود رہتا تھا اور تمام گفتگو سن سکتا تھا۔ پھر ایک ہوٹل کے لاؤنج میں ہمیں موقع مل گیا۔ وہ بہت بڑا ہوٹل تھا اور اس کے ہال میں کاؤنٹر بائیں جانب تھا تو ٹیلیفون دائیں طرف دوسرے کنارے پر ایک کیبن میں لگا ہوا تھا۔ میں نے محسن کو سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔ نمبر ملاتے ہی اس نے پی۔ اے سے بات کی۔ میں نے ریسیور سے کان لگا دیا۔

"چوہدری دلاور صاحب نہیں ہیں۔" وہ عیاری سے بولا۔ "کیا کام ہے؟"

"جب وہ موجود ہی نہیں ہیں تو کام کیا بتاؤں۔" محسن آواز بدل کے بولا۔ "انھوں نے ہی کہا تھا کہ فون کر لوں۔"

"اچھا نام بتا دیں اپنا اور فون نمبر دے دیں۔" پی اے بولا۔ "آ جائیں گے تو بتا دوں گا۔"

"فتح شیر ہے میرا نام۔" محسن نے غرّا کے کہا۔ "بس اتنا ہی کافی ہے۔"

"کیا بات ہے بھئی؟" چوہدری دلاور کی آواز آئی۔ وہ کسی ایکسٹینشن پر تمام گفتگو سن رہا تھا اور شاید ٹیپ بھی کر رہا تھا۔ محسن نے ریسیور مجھے تھما دیا۔

"آپ کی گاڑی میں جو ریڈیو ہے اسے چوہدری صاحب" میں نے کہا۔ "اس میں ایف ایم بینڈ تو ہوگا؟"

"سکندر! کون اور کھیل کھیلنا چاہتے ہو؟" دلاور نے کہا۔ "یہ فتح شیر کون ہے؟"

"ریڈیو تو ہے تمہاری گاڑی میں۔" میں نے کہا۔ "دو بینڈ کا ہوا تو ایک ایف ایم ہوگا دوسرا لانگ ویو۔ اگر تیسرا بینڈ ہوا تو شارٹ ویو ہوگا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ایف ایم ریڈیو کو ٹیون کرنا۔ اگر تم پولیس کو بھی سامعین میں شامل کر دو گے تو ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ تم کو گرفتار کر کے لے جائیں۔ ہو سکتا ہے پہلے ہی لے جائیں لیکن نوے منٹ بعد تمہاری آزادی ختم ہو جائے گی اس لیے بہتر ہوگا کہ تم اکیلے ہی یہ نشریات سنو۔ اور اس بات کو کھیل مت سمجھنا دلاور۔ تمہارے اور گرفتاری کے درمیان بس نوے منٹ حائل ہیں۔ اتنا بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ محلے کی دیوار کے پیچھے آواز صاف سنائی دے گی۔ فیکٹری میں شیشے بند کر کے بیٹھو گے کار کے [illegible] والے کیا سمجھیں گے۔ اینٹینا اونچا رکھنا۔ ایف ایم بینڈ پر [illegible] کے بغیر شور زیادہ آتا ہے۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ مجھے اپنی کامیابی کا یقین آ گیا تھا۔ اگر چوہدری دلاور نے اسے مذاق سمجھا ہوتا تو وہ میری اتنی لمبی بات نہ سنتا اور درمیان میں دخل ضرور دیتا۔ برہم ہوتا یا دھمکیاں دیتا۔ میرا مذاق اڑاتا۔ پہلے سے بات ہی نہ سنتا لیکن اس نے میری بات پوری توجہ سے سنی تھی۔

چوہدری دلاور کو اپنی کار میں فیکٹری سے پارک تک پہنچنے میں بیس منٹ لگے ہوں گے۔ ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ پہلے پہنچ جائے تاکہ ہمیں آتا نہ دیکھے۔ آدھے گھنٹے بعد [illegible] ہم نے چالیس منٹ بعد کار کو لاہور سے گوجرانوالہ جانے والی سڑک پر ٹریفک میں شامل کر دیا لیکن پل سے پہلے ہی وہ نظر آ گیا اور ہم دائیں طرف گھوم گئے۔ میری نظروں نے چوہدری دلاور کی کار کو سو گز کے فاصلے پر بہت سی دوسری کاروں کے [illegible] دیکھ لیا۔ اسے نمایاں کرنے والا اس کی گاڑی کے ریڈیو کا اینٹینا تھا جو دس فٹ کے قریب اوپر نکلا ہوا تھا۔ [illegible] رہا تھا اور دھوپ میں چمک رہا تھا۔ میں نے [illegible]

[illegible] گز کے فاصلے پر اسی طرح پارک کیا جیسے بہت سی دوسری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک دوسرے کے متوازی اور سڑک سے تھوڑی سی ترچھی۔ یہ سب یادگار پاکستان دیکھنے کے لیے آنے والے لوگ تھے جو ہر روز اسی طرح آتے رہتے تھے۔ ملک کے کسی بھی حصے سے لاہور آنے والوں کے لیے اس تاریخی حیثیت رکھنے والی یادگار کا نظارہ بڑی اہمیت رکھتا تھا لیکن لاہور کے رہنے والے بھی اقبال پارک میں سیر و تفریح کے لیے آ جاتے تھے۔ دور دور تک پھیلے ہوئے پارک میں مردوں، عورتوں اور بچوں کی ٹولیاں لان پر بیٹھی تھیں یا ادھر اُدھر گشت کر رہی تھیں۔ ہماری اور دلاور کی کاروں کے درمیان کم سے کم بیس دوسری کاریں حائل تھیں۔ چنانچہ وہ کوشش کرتا تب بھی ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

میں نے ایف ایم مائکروفون نکالا اور وقفے وقفے سے ریڈیو کو مخاطب کرنے لگا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ وہ دس منٹ سے ریڈیو کی سوئی کو ادھر سے ادھر گھما رہا ہوگا کہ کہیں سے کوئی آواز سنائی دے۔ وہ اینٹینا بلند کیے بیٹھا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی تک وہ مایوس نہیں ہوا ہے۔ پانچ دس سیکنڈ بعد وہ پھر بینڈ کو ٹیون کرتا ہوگا۔ میں نے اسے دس منٹ دیے اور اس عرصے میں "ہیلو دلاور، ڈو یو ریڈ می؟ دس از ایم آر ایس۔ ہیلو دلاور" کہتا رہا۔ ایک بار ٹیون کر لینے کے بعد میری آواز اس کے کانوں میں ریڈیو کے اسپیکر کی زبان سے صاف پہنچ رہی ہوگی لیکن وہ جواب دینے سے قاصر تھا۔ محسن نے باہر نکل کر اس کی کار کی پوزیشن پر غور کیا اور یہ دیکھا کہ کوئی دوسری گاڑی اس وقت حرکت میں تو نہیں آئی۔ ہاتھ سے اس نے مجھے "آل اوکے" کا سگنل دیا لیکن میں وہی دہراتا رہا۔ "ڈو یو ریڈ می؟ دلاور۔ دس از ایم آر ایس۔" دل ہی دل میں اس نے جھنجلا کر کہا ہوگا "یس۔ آئی ریڈ یو ایم آر ایس۔" لیکن ایم آر ایس پر تحقیق میں جھنجلاہٹ میں مبتلا ہوا ہوگا کہ یہ بات سمجھ نہیں سکتا۔ اضطراب اور سسپنس میں اس نے آواز دے کر یہ بھی کہا ہوگا کہ آگے بھی تو کچھ کہو۔ ایم آر ایس [illegible] ایم آر ایس کیا ہے۔ اس کے متعدد مفہوم نکالنے کے بعد اس نے سوچا ہوگا کہ یہ مہمل اصطلاح ہے اور [illegible] ایم آر ایس سے محسن رانجھا سکندر سمجھ لینا [illegible]

دس منٹ تک بیکار اس سن سن کر وہ پاگل ہونے کے قریب ہوگا لیکن اس کے لیے ریڈیو بند کر کے چلے جانا بھی اتنا ہی مشکل کام تھا۔ وہ میری آواز پہچان کے رکنے پر مجبور تھا۔ بالآخر میں نے ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ لگایا اور اس کا والیوم اتنا رکھا کہ آواز گاڑی سے باہر نہ جائے۔ سردیوں کی وجہ سے لوگ گاڑیوں کے شیشے بند ہی رکھتے تھے۔ خصوصاً اس سرد ہوا سے محفوظ رہنے کے لیے ورنہ گرمیاں ہوتیں تو ہماری حالت خراب ہو جاتی اور نہ جانے کتنے لوگ ہمیں مشکوک نظروں سے گھورتے۔ ایف ایم مائکروفون کو میں نے ٹیپ ریکارڈر کے اسپیکر کے بالکل سامنے رکھا۔ جہاں اسپیکر کی آواز مدھم پڑ رہی تھی وہاں میں نے والیوم بڑھا دیا تھا۔ فتح شیر مر گیا تھا لیکن ٹیپ پر اس کی وہ آواز زندہ تھی جس میں اس نے گزشتہ شب اپنے ہر گناہ کا اور ہر جرم کا رضاکارانہ طور پر اعتراف کیا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو اس پر کتنے مقدمات قائم ہوتے؟

میں نے سوچا۔ طافو کی لاش کو راول ڈیم میں غرق کرنے کے علاوہ۔ راول ڈیم؟ اچانک میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ راول ڈیم تو لاہور سے ایک سو اسی میل دور تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ رات کے آخری پہر میں اتنی دور جائے اور اگلے دن یوں لوٹ آئے کہ کسی کو اس کی غیر موجودگی کا احساس نہ ہو۔ ستر اسّی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جانے والا بھی چار گھنٹے سے پہلے راول ڈیم تک نہیں پہنچ سکتا۔ شہر میں رفتار کا اوسط بہت کم ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ فتح شیر نے اپنی کارروائی رات کے اندھیرے میں مکمل کر لی؟ ناممکن۔ وہ کسی طرح بھی صبح آٹھ نو بجے سے پہلے راول ڈیم نہیں پہنچ سکتا تھا اور آٹھ نو بجے تو سورج نکل آتا ہے۔ راولپنڈی کی کہر آلود صبح میں دھوپ بھی چاندنی لگتی ہے لیکن روشنی ضرور دیتی ہے۔ ایسے وقت میں کسی لاش سے من بھر وزن کا پتھر باندھنے اور اسے ڈیم کی جھیل میں غرق کرنے کی کارروائی کیسے ہو سکتی ہے۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ بہت کچھ سچ بتا گیا تھا لیکن یہ ایک ایسی بات تھی کہ اس نے مجھے بھی غلط بتائی۔ خود مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ محض ایک لاش کو ٹھکانے لگانے کی خاطر کون چار سو میل آتا جاتا ہے اور پھر پولیس والے؟ جو زندہ کو دن دہاڑے ٹھکانے لگا دیں وہ ایک لاش لے کر راولپنڈی جائیں گے! راوی، جہلم اور چناب کو عبور کر کے راول ڈیم کی جھیل کے پانی میں لاش غرق کریں گے؟ معلوم نہیں اس وقت کیوں میں نے غور نہیں کیا۔ شاید میں نے غور سے سنا ہی نہیں تھا کہ وہ راول ڈیم کہہ رہا ہے۔ خیر وہ نہیں تو کیا۔ اس کے ساتھ جانے والے چار ماتحت تو ہیں۔ لاش انھوں نے بحکم افسر اعلیٰ ٹھکانے لگائی ہوگی اور فرض شناسی، فرمانبرداری اور تعاون کے

www.paksociety.com

اس مظاہرے کا انتظام ان کو یہ طاہر ہوگا کہ ماکون رات ان کے بینک بیلنس میں ایک لاکھ کے آدھے بڑھ گئے ہوں گے۔ وہ اب بھی صحیح بتا سکیں گے کہ لاش کہاں ہے۔ فتح شیر تو انہیں ہدایات دے کر گھر چلا گیا ہوگا۔ اصل کام کرنے والے تو وہی تھے۔ انھوں نے کس حد تک افسر اعلیٰ کے حکم پر عمل کیا یہ وہی بتائیں گے۔

کیسٹ ختم ہوا اور خودکار نظام نے کیسٹ ریکارڈر کو کھٹ سے آف کر دیا۔

"یہ انٹرول ہے چوہدری صاحب!" میں نے کہا۔ "کیسی فلم ہے؟" ظاہر ہے میرے سوال کے جواب میں دلاور نے کوئی زبردست گالی دی ہوگی لیکن وہ میں نے نہیں سنی۔ محسن ہنس پڑا۔

"تمہاری بے بسی پہ ہنسی آرہی ہے مجھے۔" محسن بولا۔ "تم ہماری آواز کتنی صاف سن رہے ہو مگر افسوس یہ ہے کہ ہم تین میل دور سے اپنی شبیہ مبارک تم کو ارسال نہیں کر سکتے ورنہ تم ہمارا دیدار کر کے بھی خوش ہو سکتے۔"

"یا سر زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں پکچر ٹیلی فون اور شارٹ سرکٹ یا کلوز سرکٹ ٹی وی عام ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہاں تو تمہارے جیسے وسائل رکھنے والے شخص کے پاس ایک ایم ایف مائکروفون تک نہیں۔" میں نے کہا۔

"حالانکہ یہ بہت معمولی سی چیز ہے۔ تم تو ہر چیز اسمگل کرتے ہو، یہ بھی منگوا لو۔" محسن بولا۔ "جیسے ہم نے منگوایا ہے جرمنی سے۔" ہماری ان تمام باتوں کا مقصد صرف اسے گمراہ کرنا تھا تاکہ وہ سمجھے کہ ہم واقعی تین میل دور سے بات کر رہے ہیں اور تین میل کی رینج کا یہ ایف ایم مائکروفون ہم نے لوکل مارکیٹ سے نہیں لیا۔

"اگر تم کوشش کرو تو ہمارے درمیان وائرلیس رابطہ قائم ہو سکتا ہے۔ چھوٹا موٹا سو پچاس گز کی رینج والا مائک شاید ہال روڈ سے مل جائے۔" محسن نے کہا۔

"میرا مشورہ ہے کہ تم آج ہی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔ "شام کو پھر بات ہوگی تم سے۔"

"شام تو ہوگئی ہے۔" محسن نے مجھے ٹوکا۔ "رات کہو، بینک چوہدری صاحب کی نظر میں دنیا اندھیر ہو رہی ہے۔"

"نہیں شام ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم سورج غروب ہونے سے پہلے ہی بات کرنا پسند کریں گے۔"

"پھر تو چوہدری صاحب کو اسی وقت جانا پڑے گا۔" محسن بولا۔ "میرا مطلب ہے یہ مزاحیہ پروگرام ختم ہوتے ہی۔"

"ہاں یار! خیر اب باقی پروگرام شروع کر دیں؟" میں نے کہا۔ "چوہدری صاحب بہت بے چین ہو رہے ہوں گے۔"

"بے چین؟" محسن ہنسا۔ "مشتعل ہو رہے ہوں گے۔ بھنا رہے ہوں گے۔ افسوس کہ ہم ایک نہیں سن سکتے۔"

"یہ پہلا اتفاق ہے کہ گالیوں کی بوچھاڑ ٹریفک پر ہے۔ ہم ان کے آبا و اجداد کا سارا شجرۂ نسب چھاپ سکنے والوں سے ملا سکتے ہیں لیکن ہم شریف آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔ "زبان خراب نہیں کر سکتے۔"

"لیجیے انٹرول ختم ہوا۔ گالیاں مت بکیے۔ ڈراما دیکھیے۔" میں نے کیسٹ کو پلٹ کر آن کر دیا۔ میں نے اور محسن نے اتر کر گاڑی لاک کی اور احتیاط کے ساتھ دوسری گاڑیوں میں آگے بڑھے۔ دلاور کے بارے میں ہمیں یقین تھا کہ تمام تر توجہ آواز پر ہوگی۔ بعد میں دوبارہ خود سننے کے لیے وہ سب ریکارڈ بھی کر رہا ہو تو عجب نہ تھا۔

محسن عین اس کی گاڑی کے پیچھے جا پہنچے۔ اب درمیان صرف ایک کار تھی۔ ادھر ادھر نگاہ ڈال کے محسن نے جھک کر تاکہ بیک ویو مرر میں نہ آسکے۔ پھر اس نے دلاور کی گاڑی کے پچھلے دونوں پہیوں کے نیچے وہی لکڑی کے ٹکڑے رکھے جن میں کیلیں ایک ایک انچ اوپر نکلی ہوئی تھیں اور جنہوں نے ایک بار پولیس کی پیش قدمی روک دی تھی۔

ہم لوٹ کر آئے تو کیسٹ کا آخری حصہ ختم ہونے کے قریب تھا۔ پانچ منٹ کے بعد اسپیکر میں صرف سرسراہٹ رہ گئی تو میں نے مائک اٹھالیا۔

"فی الحال جو کچھ تم نے سنا اس سے زیادہ سنانے کو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اس سے تم کو بخوبی اندازہ ہوگا کہ تم نے جس سہارے پہ بھروسا کیا تھا وہ کتنا ناپائیدار تھا۔ وقت آنے پہ وہ خود کو بچانے کے لیے تم کو نہیں اور کسی کی موجودگی میں فتح شیر کے بچنے کی امید بھی نہیں۔ تم چاہو تو اس پہ غور کر لو۔ تم نے ہماری آواز اور یہ گفتگو ٹیپ کرنے کا بندوبست ضرور کیا ہوگا۔ اس ٹیپ کو ایک بار پھر سن لو۔ ہم سے بات کرنا چاہو تو دو گھنٹے بعد۔ اس وقت پونے دس منٹ ہوئے ہیں پورے آٹھ بجے سگنل پہ۔"

"سگنل پہ ٹریفک کا شور و غل مخل ہوگا۔" محسن نے کہا۔

"باغ جناح کا پارکنگ ایریا جو لاہور جمخانہ کی طرف ہے انتہائی مناسب جگہ ہے۔ تم نہ آئے تو ہم یہ سمجھیں گے کہ تم بات نہیں کرنا چاہتے۔"

"یہ بات ذہن میں رکھنا کہ گفتگو ٹیلیفون پہ نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "ایف ایم بینڈ ہماری گاڑی میں بھی ہے۔"

مائکروفون بند کر کے میں نے ٹیپ کو بھی آف کیا اور باہر دیکھنے لگا۔ محسن نے گاڑی کو تھوڑا سا بیک کیا اور مجھے دلاور کی گاڑی کا پچھلا حصہ نظر آیا۔ گاڑی تھوڑا سا پیچھے ہوئی اور ان لکڑی کے ٹکڑوں پر چڑھ گئی جن پر ایک ایک انچ سے لمبی کیلیں ابھری ہوئی تھیں۔ اسے جھٹکا سا لگا ہوگا اور اس کے پہیے گاڑی بیٹھ گئی۔ میں نے دلاور کو باہر آتے دیکھا۔ بے بسی کے ساتھ دونوں ٹائروں کو فلیٹ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ دیر نہیں لگی کہ ہم نے اس کے انتخاب سے بچ نکلا اور کار کو بے کار کر گئے۔ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر کے مجھے بہت مسرت ہوئی۔ یہ ایک بچگانہ سی خوشی تھی۔ بیچارے دلاور کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ثابت ہوا ہوگا کہ ٹیلیفون پہ ہمارا پیغام وصول کرنے کے بعد اسے کیا کرنا چاہیے۔ پولیس کو رپورٹ کرنی چاہیے۔ کس کو ساتھ لے کر جانا چاہیے یا وہی کرنا چاہیے جو ہم نے کہا تھا۔ میں نے اتنے سنجیدہ لہجے میں بات کی تھی اور ایسے خطرناک الفاظ میں دھمکی دی تھی کہ وہ ڈر گیا۔ اسے اب ہمارے متعلق خوش فہمی کوئی نہیں تھی۔ یہ خواب و خیال کی بات ہوگئی تھی کہ ہم بلحاظ عمر کم ہیں یا ہمارا تجربہ اس کے مقابلے میں کم ہے۔ ہم پہ معاشی میدان میں اس کی طاقت کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے وسائل بہت محدود ہیں۔ لامحدود عیاری یا مکاری کے حربے استعمال کر سکتا ہے جو ہم جیسے سادہ لوح اور شریف لوگوں کو شکست دے سکتے ہیں۔ اس کا انداز یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس نے ہمیں برابر کا حریف تسلیم کر لیا تھا اور ہماری کوئی بات اس کے لیے غیر اہم نہیں رہی۔ میری اور فتح شیر کی گفتگو سنتے ہی یہ احساس شدت سے ابھر آیا ہوگا کہ ناانصافی کی جنگ لڑنے والے اب جارحیت پہ اتر آئے ہیں۔ وہ دشمن جو قانون کے مورچے میں رہ کر لڑ رہا تھا لاقانونیت پر اتر آیا ہے۔ اس کے برابر ہونے کا ثبوت دینے کے لیے کھلے عام کھیلنے لگا ہے۔ رحمت کی لاش اور سال کر ہم نے دلاور کے غرور پہ پہلی کاری ضرب لگائی تھی۔ ابھی وہ شکست کا ذائقہ بھولا بھی نہ تھا کہ ہم نے اسے طاقت کے نشے سے اتارنے کی کوشش کی۔ اس نے یہ محاذ پیسے کی طاقت سے سر کر لیا تھا لیکن اب اچانک اس پہ خوف ناک انکشاف ہوا تھا کہ وہ عارضی کامیابی اس کی کتنی بڑی شکست بن گئی ہے۔ اس نے پانچ لاکھ گنوا دیے تھے۔ یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ اس پہ دوسرے قتل کا الزام بھی آسکتا ہے جس کے بعد اس کی ضمانت منسوخ ہو جائے گی اور اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑے گا۔

شاید وہ سیدھا فتح شیر کے پاس جاتا۔ اسے ٹیپ سناتا اور گالیاں دے کر کہتا کہ پانچ لاکھ واپس کر دو یا مجھے اس مصیبت سے نجات دلانے کی صورت پیدا کرو ورنہ میرے ساتھ تم بھی گئے لیکن اب یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ ایک ٹائر تو وہ بدل سکتا تھا لیکن دوسرے ٹائر کے لیے ضروری تھا کہ کسی پٹرول پمپ تک جائے اور پنکچر لگوائے۔ میں نے اسے ایڑیاں پیچ کر چاروں طرف نگاہ ڈالتے دیکھا۔

"پاگل کا بچہ!" محسن ہنسا۔ "دیکھ رہا ہے کہ ہم کہیں آس پاس ہیں تو کہاں ہیں۔"

"سخت طیش میں ہوگا کہ ہم نے اتنی جرأت کی۔" میں نے کہا۔ "اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لوٹ گئے۔"

"اور اب وہ سوچنے پہ مجبور ہوگا کہ جو لوگ اتنا قریب آکے ٹائر فلیٹ کر سکتے ہیں وہ کار کے نیچے ٹائم بم رکھ کے یا ڈائنا مائیٹ لگا کے بھی جا سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ اسی وقت دلاور نے ایک ٹیکسی روکی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک ٹائر کی جگہ اسپیئر وھیل لگا کے اسی ٹیکسی میں دوسرا ٹائر لے جائے گا اور پنکچر لگوا کے لے آئے گا مگر دلاور نے اتنی جسمانی مشقت اور ذہنی کوفت برداشت کرنے کے مقابلے میں کار کو وہیں چھوڑ جانا بہتر سمجھا۔ وہ خود ٹیکسی میں بیٹھا اور سیدھا نکل گیا۔ غالباً اس نے طے کیا تھا کہ ڈرائیور بعد میں آکے گاڑی لے جائے گا۔

"کیا یہ ہو سکتا ہے محسن خان کہ ہم دلاور کی مدد کر دیں؟" میں نے کہا۔

"میرا مطلب ہے گاڑی کو یہاں سے لے جائیں؟" محسن نے خوش ہو کے کہا۔ "یہ تو میں بھی سوچ رہا تھا۔"

سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ ۔ مقبول ترین سلسلے

مغرور ۔ طالوت

صندلوں کا بیٹا

کتابی شکل میں تیار ہیں

آج ہی خط لکھ کر طلب فرمائیں یا اپنے قریبی بک اسٹال سے حاصل کریں

کتابیات پبلی کیشنز ۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی نمبر ۱

www.paksociety.com

www.paksociety.com

محسن نے کار کو ولاور کی گاڑی کے پاس لے جا کر روکا۔ ہم دونوں پورے اعتماد کے ساتھ اترے۔ میں نے دروازے کے بند شیشے میں جھانکا۔ ڈرائیور کی سہولت کی خاطر ولاور نے کار کی چابیاں لگی چھوڑ دی تھیں اور دروازہ لاک کر دیا تھا۔ اپنے حلیے اور اعتماد سے ہم کار چور نظر نہیں آتے تھے بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک کار والا دوسرے کار والے کی مدد کر رہا ہے۔

ہمارا سابقہ تجربہ یہ تھا کہ گاڑیوں کے دروازے کھولنا مشکل نہیں ہوتا اور عموماً کوئی نہ کوئی چابی ڈور لاک میں لگ جاتی ہے۔ محسن نے یکے بعد دیگرے تین چابیوں کو آزمایا اور ایک کو تھوڑا سا ہلانے سے اندر کی وہ ڈور ناب اٹھ گئی جس نے دروازے کو مقفل کر دیا تھا۔ میں نے اطمینان سے چابیاں نکالیں اور پیچھے سے ڈکی کھولی۔ اسپیئر وھیل اور جیک نکالے اور محسن نے ایک پنکچر ہونے والے ٹائر کا وھیل کھولنا شروع کیا۔ کسی نے ہماری اس کارروائی کو قابل غور نہیں سمجھا۔ نہ ہمارے قریب سے پیدل گزرنے والوں نے، نہ کسی دوسری گاڑی میں آنے جانے والے نے۔ میں نے محسن کی مدد کی اور جتنی دیر میں وہ اسپیئر وھیل لگا کے فارغ ہوا میں نے گاڑی کے دوسرے وھیل کو جیک پر اٹھا لیا۔ اس سب کام میں پندرہ منٹ بھی نہیں لگے۔ پھر میں نے دوسرا ناکارہ ٹائر اپنی گاڑی میں رکھا اور اسے ایک پٹرول پمپ پر لے گیا جو کچھ پیچھے ایک موڑ پر تھا۔ پنکچر لگوا کے ہوا بھروانے اور واپس وہیں آنے میں مجھے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ اس وقت تک آس پاس کھڑی کئی گاڑیاں جا چکی تھیں اور ان کی جگہ نئی گاڑیوں نے لے لی تھی۔ محسن اطمینان سے بونٹ کا سہارا لیے کھڑا تھا اور گاڑی جیک پر یوں کھڑی تھی جیسے کوئی ایک معذور ٹانگ پر سیدھا کھڑا ہو۔ میں نے ٹائر اس کے حوالے کیا اور اس نے دس منٹ میں اسے کس دیا۔ جیک کو گاڑی میں پھینک کر اس نے ڈکی بند کی اور اپنے ہاتھ صاف کیے۔ میرے اور ولاور کے پاس نئے کپڑے سے جیک کو بھی صاف کیا اور ٹائر کو بھی تاکہ ہمارے فنگر پرنٹ کہیں نہ رہیں۔

"اب میں ولاور کی گاڑی لے کر جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تو باغ جناح کی طرف جا۔"

"ابھی ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہے۔" محسن نے کہا۔ "میں تیرے ساتھ چلتا ہوں ورنہ تیرا واپس آنا مشکل ہو جائے گا۔"

"میں آ جاؤں گا ٹیکسی میں۔" میں نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ دیر ہو جائے اور ولاور لوٹ جائے۔"

"ولاور اب ہماری مٹھی میں ہے، وہ کہاں جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "وہ انتظار کرے گا۔"

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہوئیں۔ آدھے گھنٹے میں شہر کی ٹریفک سے گزر کے صدر پہنچنا آسان کام نہیں تھا۔ ہم دونوں ماہر ڈرائیور تھے اور دونوں کو اپنی اپنی منزل کا پتا تھا۔ رش میں کئی جگہ ہم ایک دوسرے کی نظر سے اوجھل ہوئے، پھر مل گئے۔ جب ہم نے دھرم پورے سے آگے صدر کے قریب ریلوے کراسنگ کو عبور کیا تو آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ کم سے کم دس منٹ کی مسافت باقی تھی لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ واپسی پر یہی فاصلہ نصف سے بھی کم وقت میں طے کرنا تھا۔ واپسی کا راستہ بھی صاف تھا۔ رابعہ کی اس کوٹھی کے قریب پہنچا جس کے باتھ روم میں فتح شیر کی لاش ہولے ہولے سڑ رہی تھی۔ میں نے ٹیڈی کو دیکھا۔ غالباً وہ کار کو پہچان کر آگے آیا تھا۔ میں نے آتے ہی ہاتھ ہلایا اور ولاور کی کار سیدھا کوٹھی کے گیراج میں لے گیا۔ ٹیڈی میرے پیچھے آیا۔ میں اس وقت کپڑے سے اسٹیئرنگ وھیل اور دروازے کو صاف کر رہا تھا جہاں میرے ہاتھ لگے۔

"یہ آپ نے کیا غضب کیا جی۔" ٹیڈی بولا۔ "یہاں پولیس ملتی آپ کو پھر؟"

"پولیس کیسے مل سکتی تھی؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "ٹیلیفون جو مل گیا تھا۔"

"میرا ٹیلی فون!" ٹیڈی کا منہ حیرت سے کھلا۔ "قسم مولا علی کی... میں نے کوئی فون نہیں کیا تھا۔"

"کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ سب خیریت ہے؟" میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا نا سکندر بادشاہ، یعنی حد ہے۔" اس نے مجھے غیر سنجیدہ دیکھ کے کہا۔

"اچھا چھوڑو، جب خیریت ہے تو خیریت ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "بس ہمیں معلوم ہو گیا تھا، پولیس نہیں آئی۔ ٹیلیفون کی جگہ تم نے ٹیلی پیتھی سے کام لیا۔"

"کس سے جی... ہم ذرا اردو میں بتاؤ، ہم جاہل ہیں۔" وہ بولا۔

"ٹیلی پیتھی۔ یہ ٹیلیفون کی سائنس ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "جیسے ٹیلی ویژن نشر ہوتا ہے، چلو چھوڑو۔"

ٹیڈی مذاق کو سمجھنے کے باوجود ہنسا اور میرے ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "تم کس کی گاڑی میں آئے تھے؟" وہ بولا۔ "کوئی نیا چکر لگتا ہے مجھے تو۔"

"یہ سب پرانے چکر ہیں استاد، آگے دیکھ کے چکر۔" میں نے کہا۔ "جنہوں نے ہمیں گھن چکر بنا دیا ہے۔"

"اور بقول شاعر، ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں۔" میں نے کہا۔ "پندرہ منٹ ہیں میاں خیر والی۔"

"پھر تو ایک منٹ فالتو ہے۔" وہ بولا اور گاڑی کو موڑ کر سڑک پر لے آیا۔ چودہ منٹ میں باغ جناح تک پہنچنے کے لیے اس نے کار کو سپرسانک جیٹ کی رفتار سے دوڑایا۔ میں تو اس قسم کی پرخطر مہمات کا عادی تھا لیکن ٹیڈی کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے کئی بار محسن کو ٹوکا۔ "کیا مروانا چاہتے ہو جانی۔" محسن نے رفتار اور بڑھا دی۔ "یار سکندر بادشاہ، ایسے تو اوپر پہنچ جائیں گے۔ کوئی پیچھے لگا ہوا ہے کیا؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"نہیں، محسن فرشتہ ہے۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں سرگوشی کی۔ "اس وقت کسی کی نہیں سنے گا۔"

"یا میرے مولا! ابھی سے مت بلا لینا، یہ تو کنوارا ابھی ارمانوں پر نکلا ہوا ہے۔" وہ اوپر منہ اٹھا کے بولا۔

پہلے ہم چڑیا گھر کی طرف سے داخل ہوئے لیکن اوپن ایئر تھیٹر اور ریسٹورنٹ کی طرف جانے والی سڑک کو ریلوے لائن کے ٹکڑے گاڑ کر یوں بند کر دیا گیا تھا کہ درمیانی فاصلے میں سے موٹر سائیکل والے تو نکل ہی جاتے تھے لیکن کار کا گزرنا ممکن نہ تھا۔ اگر ہم دوسری طرف جاتے تو ہم کو ولاور کی گاڑی کے بہت زیادہ قریب محدود سے پارکنگ ایریا میں رکنا پڑتا اور ان حالات میں کہ ہمارے لیے اس کی گاڑی کو پہچاننا بھی مشکل تھا، یہ بہت خطرناک اقدام ہوتا۔ معلوم نہیں کہ وہ کس کی کار لے کر آیا تھا۔ ٹیکسی میں وہ اس لیے نہیں آ سکتا تھا کہ عموماً ٹیکسیوں میں ریڈیو نہیں ہوتے اور ہوں بھی تو ولاور کسی ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی میں ہم سے بات کیسے کر سکتا تھا۔ اس نے دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں ایک کار کا انتظام بھی کیا ہوگا اور شاید مال روڈ سے کوئی ایف ایم ٹرانزسٹر فون بھی خریدا ہوگا۔

"جہاں اس وقت ہم کھڑے ہیں یہاں سے باغ کا دوسرا حصہ ایک فرلانگ دور ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ لاہور جمخانہ کے پاس موجود ہوگا اور ہر گاڑی کا نمبر نوٹ کر رہا ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "مواصلاتی رابطہ قائم ہوتے ہی وہ سمجھ جائے گا کہ ہم کس کار میں آئے ہیں۔"

"اگر ہم مال روڈ کے متوازی کچے راستے پر لیڈیز کلب سے ذرا پیچھے رک جائیں؟" میں نے کہا۔

"گورنر ہاؤس کے گیٹ کے بالکل سامنے؟" محسن نے کہا۔ "فوراً کوئی تفتیش کے لیے آ جائے گا۔ آگے رکیں گے تب بھی مشکوک نظر آئیں گے۔"

"یار کیوں نہ ہم جمخانہ میں ممبروں کے لیے مخصوص راستے سے اندر چلے جائیں؟" میں نے کہا۔ "چوکیدار روکے گا لیکن پروا نہیں، تو سیدھا گزر جا، میں بات کر لوں گا۔"

گاڑی نے ایک لمبا چکر کاٹا اور جمخانہ کی عمارت کے گیٹ میں پیچھے سے داخل ہوئی۔ حسب توقع ایک چوکیدار نے آگے بڑھ کے ہمیں بتایا کہ یہ جگہ صرف ممبروں کی گاڑیوں کے لیے ہے۔

"ہمیں بٹ صاحب نے یہاں ملنے کو کہا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم ذرا پہلے آ گئے ہیں، یہیں انتظار کریں گے۔"

"کون بٹ صاحب؟ قیوم بٹ صاحب یا نصیر بٹ صاحب؟" وہ بولا۔

"قیوم بٹ صاحب۔" میں نے بغیر سوچے کہا۔ "انہوں نے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت دیا تھا، ہم ان کے مہمان ہیں۔"

چوکیدار لوٹ گیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مذکورہ قیوم بٹ صاحب موجود نہ تھے ورنہ ہمیں ان سے شرف ملاقات حاصل کرنا پڑتا یا ان کے آنے سے پہلے جانا پڑتا۔ میں نے مائیک آن کر کے ولاور کو مخاطب کیا۔

"ہیلو ولاور، ڈو یو ریڈ می؟ دس از ایم آر ایس..." محسن نے کار کے ریڈیو کو ایف ایم بینڈ پر ٹیون کرنا شروع کر دیا تھا۔ ولاور کی آواز اچانک آئی۔ "...یہ کیا بکواس ہے، ایم آر ایس..."

"ویری گڈ، تمہیں بھی مل ہی گیا ایف ایم مائیک۔" میں نے کہا۔ "ایم آر ایس بکواس نہیں ہے اپنے چوہدری صاحب! بہت بڑی حقیقت ہے۔"

"محسن، رابعہ اور سکندر۔" ولاور نے میری بات کاٹ دی۔ "آواز صرف ایم اور ایس کی سنی ہے میں نے۔"

"ایم آر ایس کا ایک اور مطلب بھی نکلتا ہے الٹوں۔" میں نے کہا۔ "اور وہ ہے مائٹ اِز رائٹ سوسائٹی۔ مطلب سمجھتے ہو نا اس محاورے کا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ سمجھ لو یہ وہ تنظیم ہے جس کے تم بھی ایک ممبر ہو۔ ہم تو بعد میں شامل ہوئے، تم نے بہت پہلے اس اصول کو اپنا لیا تھا اور تم نے کیا، نہ جانے کب سے دنیا میں یہی اصول کارفرما رہا ہے۔ اسی نے لیگ آف نیشنز کے وجود کو بے مصرف بنا دیا تھا اور اسی نے اقوام متحدہ کو تماشا بنا دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ افراد، ادارے اور ممالک اس تنظیم کے رکن بنتے جا رہے ہیں اور جس کی لاٹھی اس کی

جیلس کا فلسفہ بین الاقوامی سچائی سمجھا جانے لگا ہے۔ یونیورسل ٹروتھ!"

"کیا تم نے مجھے بھی لیکچر دینے کے لیے یہاں بلایا تھا؟" دلاور کی آواز آئی۔

"نہیں، لیکچر دینے سے میرا بھی وقت ضائع ہوگا۔ میں تم کو حکم دیتا ہوں۔" میں نے کہا اور تھوڑا سا وقفہ دیا۔ "تم جہاں کھڑے ہو وہاں سے اپنی گاڑی نکالو اور کشمیر روڈ سے پانسوں والی سڑک پر چلو۔"

"میرے پاس دوسری گاڑی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا۔" وہ تلخی سے بولا۔

"گاڑی کا میک ماڈل، رنگ اور نمبر بتا دو۔" میں نے کہا۔ "اور ٹھیک تیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلتے جاؤ۔"

"میں کہیں جانے کے لیے نہیں آیا۔ تم سے بات کرنے آیا ہوں۔" وہ بولا۔ "تم مجھ سے سودا کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟"

"انکار نہیں کرنا چاہتا ہوں اور نہ تم کر سکتے ہو دلاور۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سودا کرنے کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ میں خود کو یہاں محفوظ نہیں سمجھتا۔ مجھے کیا معلوم تم اکیلے ہو یا مجھے قتل کرنے کے لیے اپنی شکاری ٹیم کے ساتھ ہو۔"

"یہ اندیشہ تو مجھ کو ہے۔" دلاور نے کہا۔ "اب تمہیں قتل کیسے کر سکتا ہوں میں!"

"تمہاری پوزیشن اس لحاظ سے بہتر ہے کہ تم اکیلے نہیں، پولیس بھی تمہارے ساتھ ہے۔" میں نے کہا۔ "جو کام تم خود سامنے آئے بغیر کرنا چاہو وہ پولیس سے بھی کروا سکتے ہو۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تمہارے آس پاس دوسری گاڑیوں میں سادہ کپڑوں والی پولیس کی نفری موجود نہیں؟ تم نے دو گھنٹوں میں کچھ تو کیا ہی ہوگا!"

"مجھے پورے دو گھنٹے ملے تھے۔" وہ بولا۔ "اگر میں اپنی گاڑی وہاں چھوڑ کے نہ آتا اور اس کے دونوں فلیٹ ہو جانے والے ٹائروں کو بدلتا تو مجھے ایک گھنٹا وہیں لگ جاتا۔"

"پھر تم کیسے آئے؟ کسی باڈی گارڈ کی گاڑی میں؟"

"میرے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ مجھے وہاں سے ٹیکسی لینی پڑی تھی۔" دلاور بولا۔ "گھر سے میں نے ڈرائیور کو اپنی گاڑی لینے بھیجا اور خود یہاں دوسری گاڑی میں پہنچا ہوں جو میری بیوی کے استعمال میں رہتی ہے۔ واکس ہال ہے، تین سال پہلے کا ماڈل۔ ڈارک گرین۔ نمبر ہے......"

"نمبر کو چھوڑو، دور سے نظر بھی نہیں آتا اور غلط بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں گاڑی کو پہچان لوں گا۔ جس کے پاس کوئی گاڑی نہیں ہوگی میں کسی بھی رکشا یا ٹیکسی میں آؤں گا۔"

"یہاں بات کرنے میں کیا حرج ہے؟ تم سامنے آئے بغیر بھی تو سودا کر سکتے ہو۔"

"سو کھیر دلاور، میں اس کھیل سے تنگ آگیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ تمہاری پہل آخر تمہارا بھی میں نے ایک جذباتی حماقت کی تھی۔ اس کا میں نے کیا خمیازہ بھگتا ہے تم بھی جانتے ہو لیکن اس وقت میری جگہ تم بھی ہوتے تو یہی کوشش کرتے۔ میں نیا نیا ولایت سے آیا تھا اور ذہنی طور پر اس شدید صدمے کے لیے تیار نہیں تھا جو مجھے یہاں پہنچتے ہی اٹھانا پڑا۔ ان حالات میں غصے نے مجھے پاگل کر دیا اور میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج کر دی تو یہ میرا قصور نہیں تھا۔ میرے جوان خون کا ابال تھا۔"

"کیا اب تم خود کو بوڑھا سمجھنے لگے ہو! اس عمر میں؟" وہ طنز سے ہنسا لیکن مجھے اس کے لہجے میں اطمینان کی جھلک محسوس ہوئی۔ وہ اطمینان جو آخری وقت میں شکست کی خبر کی جگہ فتح کی نوید ملنے سے حاصل ہوتا ہے۔ میں اس کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ بعد از خرابی بسیار، میں راہ راست پر آگیا ہوں۔ وہ کب نہیں چاہتا تھا کہ یہ معاملہ ختم ہو جس میں اندازوں کی غلطی کے باعث خود اسے بہت نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ وہ عدم تحفظ کے احساس کا شکار تھا اور مستقبل سے مایوس ہو چکا تھا۔ ایک ایسے وقت پر جب اس کا خیال تھا کہ حریف کی گوریلا جنگ کا نشانہ براہ راست اس کی ذات ہونے لگی ہے، یہ اطلاع انتہائی تسلی بخش تھی کہ صلح کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ وہ صلح کے لیے کچھ بھی قیمت دے سکتا تھا۔ اس کے ذہن نے میری بات کا منطقی تجزیہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ نقصان اگر دلاور کو ہوا تھا تو اس کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوا تھا میرے ساتھ اور بہت سے لوگوں کو نقصان کا بوجھ اٹھانا پڑا تھا۔ خون دونوں طرف سے بہا تھا لیکن میرا ساتھ دینے والے تعداد میں زیادہ تھے۔ دلاور نے سمجھا کہ اس حساب نے مجھے بے بس اور مجبور کر دیا ہے اور اب مجھ میں مزید نقصانات اٹھانے کی سکت نہیں رہی۔ وہ کاروباری ذہن رکھنے والا غیر جذباتی آدمی تھا۔ اگر وہ فتح کو انا کا مسئلہ بنا لیتا تو یہ نہ دیکھتا کہ نقصانات کا تناسب کیا ہے۔ اس نے صرف اپنے نقصان

دیکھا۔ صرف وہ شمار کیا جو اس نے گنوا دیا تھا اور آئندہ کے نقصانات کا تخمینہ لگایا۔ جیسے اگر دس گنا نقصان ہوتا تھا تو اس کے لیے کوئی فائدے کی بات نہیں تھی۔ فائدہ وہ تھا جو اپنے خسارے کو منافع میں بدلنے سے حاصل ہو سکتا تھا اور آخر الامر وہ وقت آگیا تھا کہ دشمن خود ہی حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کر رہا تھا کہ جنگ میں جیت کسی کی نہیں ہوتی۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے یقین کیا۔ محسن نے میرا اشارہ سمجھتے ہی ٹیڈی کو ہمراہ لیا اور باہر روانہ ہو گیا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ... تمہیں چیلنج کروں۔ بڑھا نہیں ہوں تمہارے مقابلے میں۔" وہ مجھے خاموش پا کے بولا۔

"ایک وقت تھا دلاور جب تم نے مجھے دس لاکھ مالیت پر اپنے کاروبار میں شریک ہونے کو کہا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور دوسرا متبادل یہ رکھا تھا کہ میں پچیس لاکھ لے کر واپس چلا جاؤں۔"

"اس وقت سے آج تک تم نے اپنا اور دوسروں کا کتنا نقصان کر لیا ہے؟" وہ ہنسا۔

"اس کا حساب کیسے لگایا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک آدمی کی زندگی کا کوئی بھی مول نہیں ہوتا۔"

"اور تمہارے پاس اب قربانی کے بکرے بھی نہیں رہے۔" اس کے لہجے میں فرعونیت کا غرور نمایاں ہونے لگا۔

"نہیں دلاور، ایسا مت کہو۔ قربانی کے بکرے تم نے خریدے تھے اور سب بکنے والے تھے۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "میری خاطر جان دینے والوں نے مجھ سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ کسی انعام کی توقع نہیں رکھی تھی مجھ سے۔ میں ان کو کیا دے سکتا تھا!"

"اچھا اچھا، غصے میں مت آؤ۔" دلاور نے محسوس کیا کہ اس کا رویہ بننے والی بات کو بگاڑنے کا سبب ہو سکتا ہے۔ "لیکن مجھے اس بات کا یقین تو دلا دو کہ یہ تمہاری کوئی نئی چال نہیں ہے اور تم واقعی تصفیہ چاہتے ہو۔"

"میں بتا چکا ہوں دلاور کہ وقت نے میرے جذبات بدل دیے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہر غم کی شدت بالآخر کم ہو جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جن حالات میں میرے والد کا انتقال ہوا اس کے ذمے دار تم تھے اور اس وقت انتقام ہی میری واحد خواہش بن گیا تھا۔ کسی حد تک میں نے انتقام لے بھی لیا۔ آج تم مجھ سے ڈرتے ہو اور مجھ سے برابری کی بنیاد پر بات کرتے ہو۔ یہ نہیں سمجھتے کہ تم مجھے چٹکیوں میں مسل دو گے۔"

"لیکن اب تمہارے لیے مقابلہ جاری رکھنا مشکل ہے کیونکہ تم ہر طرف سے محصور ہو چکے ہو۔"

"تم مقابلہ جاری رکھنا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں محصور ضرور ہوا ہوں دلاور لیکن مجبور نہیں۔ جب تک میں اکیلا بھی زندہ ہوں... ہتھیار نہیں ڈالوں گا... بات ختم۔"

"کسٹو سعد، بات ختم کرنے سے پہلے یہ بتا دو کہ تم کیا چاہتے تھے اور کیوں؟" وہ بولا۔

"اس کا کیا فائدہ جب تم مصالحت کی پیشکش کو میری کمزوری سمجھنے پر مصر ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ تو سودا تھا۔"

"میں نے سودا کرنے سے انکار نہیں کیا۔ بس یہ پوچھا ہے کہ تم کو سودا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"تم صاف سننا چاہتے ہو تو سن لو۔" میں نے کہا۔ "وہ بات کی راہ پرانی ہو چکی ہے۔ مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی کہ میں کبھی تم سے اپنا حق حاصل کر سکوں۔ اس دنیا کا قانون مجھے یہ حق دلانے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"اس کے باوجود کہ تمہارے پاس ایک سے ایک قابل وکیل ہے۔" وہ پھر طنز پر اتر آیا۔

"وکیل، عدالت میں دلائل کی جنگ لڑ سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اس جنگ میں جیت تمہاری ہو گئی ہے۔ یہ کسی عدالت میں پیش نہیں ہو سکتا لیکن دنیا بہت بڑا میدان جنگ ہے۔ اس میں یہ جنگ غیر معینہ مدت تک جاری رہ سکتی تھی اور آئندہ بھی یہ امکانات مساوی ہیں کہ اس جنگ میں تم نہ رہو یا میں نہ رہوں۔ کیا تم یہ چاہو گے کہ تمہارا کاروبار رہ جائے، تمہارے بیوی بچے رہ جائیں اور تمہاری موت کا جشن منانے کے لیے میں رہ جاؤں! ہم تم اکیلے ہوتے تو کوئی فرق نہ پڑتا لیکن ہم دوسروں کے لیے زندہ بھی رہنا چاہتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔ اب تم کو کسی کے لیے زندہ رہنے کی خواہش نے مجبور کر دیا ہے۔" وہ ہنسا۔

"بس تو یہ سمجھ لو کہ میری وہی مجبوری تمہارے ساتھ سودا کرنے کا سبب بنی ہے۔" میں نے کہا۔

"اس مجبوری کا نام رابعہ ہے۔" دلاور اب واقعی خوش تھا۔

"اس مجبوری کے بہت سے نام ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ مجبوری بہت سے رشتوں کی آبرو کا نام ہے۔ دوسروں کی مجبوری کے سامنے اپنا سر جھکانے کا نام ہے۔ میرے آس پاس اور بھی لوگ ہیں جو زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ان کا

www.paksociety.com

گھر مجھے عزیز ہے اور میں ان گھروں کو آباد دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کی واحد صورت یہ ہے کہ میں اس مقابلے سے خارج ہو جاؤں لیکن یہ شکست نہیں کہلائے گی۔"

"تم اس کو اپنی مرضی سے جو نام دینا چاہو دے لو۔" دلاور نے فیاضی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"میں اس پورے سیٹ اپ سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ اس طرح کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ سکندر کب گیا اور کہاں گیا۔" میں نے کہا۔ "جب وہ کہیں نظر نہ آئے گا، کسی زبان سے اس کا نام سنائی نہ دے اور اس کی غیر موجودگی ثابت ہو جائے تو دنیا جو چاہے تسلیم کر لے۔ یہ کہ وہ مارا گیا، اس نے خودکشی کر لی کیونکہ وہ مقابلے کے لیے ہمت ہار چکا تھا یا وہ روپوشی میں ہی ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔ دنیا بہت مصروف ہے اور کسی ایک آدمی کے بارے میں سوچنے اور باتیں کرنے کے لیے زیادہ وقت نہیں دے سکتی۔ خود تم بھی کوشش کرو گے تو مجھے تلاش نہ کر پاؤ گے۔"

"کہیں؟ گویا تمھیں اور رابعہ کو۔ بھئی! مجھے بھی فرصت کہاں ہو گی۔ ہماری طرف سے دعا ہے کہ جہاں رہو خوش رہو۔"

"اب میں صورت حال کی اس سے زیادہ وضاحت کیسے کروں۔" میں نے کہا۔ "بات کو مختصر کرو۔ میں یہاں بات نہیں کر سکتا۔"

"کس بات کا ڈر ہے یہاں؟ آخر اتنی دیر سے ہم بات کر رہے ہیں۔"

"میں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ تم اکیلے ہو۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بات ٹیپ نہیں کر رہے ہو۔ جب تم چلو گے تو میں دیکھ لوں گا کہ گاڑی میں تم اکیلے ہو اور تمھارے ساتھ دوسری گاڑیاں نہیں ہیں۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" دلاور نے کہا۔

"میں تم سے براہ راست بات کروں گا تمھارے سامنے آ کے۔" میں نے کہا۔ "اگر بات بن گئی تو میں ٹیپ تمھارے حوالے کر دوں گا۔"

"ایک ٹیپ دینے کے بعد یہ ضمانت کون دے گا کہ اس کی دوسری کاپی نہیں ہے؟"

"بھروسا تو تم کو کرنا ہی ہو گا دلاور۔ یہ جوا نہیں کھیلنا چاہتے تو تمھاری مرضی۔" میں نے کہا۔ "کچھ مجبوریاں تمھاری ہیں تو کچھ میری بھی ہیں۔ میں انھی مجبوریوں کا سودا کر رہا ہوں۔ میں عدالت کے ذریعے یا کسی اور طرح تم سے اپنا حق بھی نہیں لے سکتا۔ یہ میری مجبوری ہے۔ تمھاری مجبوری یہ ہے کہ تم عملی طور پر مالک ہونے کے باوجود غیر محفوظ ہو۔ اگر میں ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو اپنے ساتھ تمھیں بھی تباہ کر دوں گا۔ تمھارے کاروبار کو، تمھارے ساتھ کاروبار کرنے والوں کو، تمھیں اور تمھارے گھر کو اسی طرح ختم کر دوں گا جس طرح میرا سب کچھ ختم ہوا۔ مایوسی کی انتہا کو پہنچ جانے والا آدمی بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ وہ مرنے کا فیصلہ کرے تو اپنے ساتھ دوسروں کو لے کر مرتا ہے۔ ایک آدمی کو پھانسی تو صرف ایک ہی بار دی جا سکتی ہے نا۔ میں آج مجبور ضرور ہوں اور اسی لیے تم سے بات کر رہا ہوں کہ کچھ لو اور کچھ دو۔ مجبور اور بے بس ہو کر اس انتہا کو نہیں پہنچا ہوں جہاں میرے لیے عقل و تدبر سے کام لینا ممکن ہی نہ رہے۔ یہ نہ بھولو کہ تمھیں ایک بار گنوا دینے کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ادا کرنی پڑے گی جو تم آج ادا کر سکتے ہو۔ میرا کیا ہے، روپوش ہوں اور روپوش رہ سکتا ہوں۔ تم کھلے میدان میں میرے نشانے پر ہو۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ میں نے اس لمحے کے فیصلہ کن ہونے کا یقین کیا۔ اس ایک لمحے میں میری ساری کوشش بے مصرف ثابت ہو سکتی تھی اور کامیابی میری ہو سکتی تھی۔ "اچھا، یہ بتاؤ تم کہاں بات کرو گے؟" دلاور نے کہا۔ "اور میں اگر یہ اطمینان کرنا چاہوں کہ تم بھی اکیلے ہو تو کیا کروں؟"

"تمھارے لیے ڈرنے کی کون سی بات ہے؟" میں نے کہا۔ "اور اس سے پہلے تم کبھی نہیں ڈرے۔ میں نے تمھارے سامنے خود آ کے بات کی ہے یا تم نے مجھے بلا لیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے بھی تم اکیلے آ گئے تھے۔"

"تم ہال روڈ کے کسی ریسٹورنٹ میں نہیں آ سکتے؟" وہ بولا۔ "میں اکیلا ملوں گا۔"

"یقیناً پولیس تمھارے ساتھ ہے دلاور؟" میں نے طنزیہ لہجے میں تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔ "تم کو میری گرفتاری کا انعام لینا ہے۔"

"اچھا بتاؤ تم کہاں بات کرو گے؟" وہ کچھ شرمندہ ہو کے بولا۔

"میں تم کو اسی کوٹھی میں ملوں گا جو کسی جعلی نواب نے جمشید سے رابعہ کو فروخت کی تھی۔" میں نے کہا۔

"ناممکن۔ تم مجھے چوہے کی طرح چوہے دان میں پکڑنا چاہتے ہو؟"

"کیا فائدہ ہو گا اس سے مجھے؟" میں نے کہا۔ "کیا تم کو اغوا کر کے قید رکھنے سے میرے خلاف مقدمات ختم ہو جائیں گے؟ مجھے حق وراثت مل جائے گا؟ میں اگر تم کو قتل کر دوں تو میری فرد جرم میں ایک اور قتل لکھ دیا جائے گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو گا۔ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے تو میرا عدالت میں حاضر ہونا اور وراثت کا سرٹیفکیٹ لینا ضروری ہے مگر عدالت اس کے ساتھ ہی مجھے ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی تھما دے گی۔ تم کو اغوا یا قتل کرنا ہوتا تو یہ کون سا مشکل تھا دلاور! تمھارے لیے کیا رسک ہے اس میں؟ میں رسک لے رہا ہوں۔"

"معلوم نہیں کیوں میرا دل یہ تسلیم نہیں کرتا کہ تم پر امن تصفیے کی پیشکش نیک نیتی سے کر رہے ہو۔" دلاور بولا۔ "میری چھٹی حس کہتی ہے کہ اس میں میرے لیے خطرہ ہے۔ تمھاری فطرت کے خلاف ہے یہ بات۔"

"ٹھیک ہے پھر میں سمجھتا ہوں کہ میرا انتظار کرنا فضول ہے۔" میں نے کہا۔ "اب ایک آخری بات۔ میں [illegible] سے صدر کی طرف آنے والی سڑک پر موجود ہوں گا۔ نو بجے سے سوا نو بجے تک۔ تم جو راستے سے سیدھے گزرو گے تو میں تمھاری گاڑی دیکھ لوں گا۔ شیشے کھلے رکھنا تاکہ میں تم کو پہچان سکوں۔ اگر مجھے یقین آ گیا کہ تمھارے ساتھ یا تمھارے پیچھے کوئی نہیں ہے تو میں تم کو ہاتھ کے اشارے سے روک لوں گا اور تمھارے ساتھ بیٹھ کے چلوں گا۔ پھر ہم براہ راست سب معاملات طے کر لیں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔" وہ بولا۔ "اس وقت پونے نو بجے ہیں۔"

"ہاں! اپنا ریڈیو بند مت کرنا۔" میں نے کہا۔ پھر ٹیلی فون کو بند کر کے میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور جمخانہ کی عمارت کے احاطے سے نکل آیا۔ چند سیکنڈ کے بعد میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس بند کر کے وہاں روکا جہاں سے میں دلاور کی گاڑی کو باہر آتے صاف دیکھ سکتا تھا۔ گہرے جامنی رنگ کی واکس ہال جو دور سے ڈارک براؤن نظر آتی تھی آگے نکلی، دوسری ایک ٹیکسی تھی جو اس کے پیچھے آئی۔ دونوں ایک ساتھ [illegible] روڈ کی طرف روانہ ہوئیں۔ میں ایک فرلانگ کے فاصلے سے پیچھے گیا اور بانسوں والی سڑک پر انکل رضوی کے گھر کے سامنے سے گزرا۔ وقت کی یادوں نے میرا راستہ روکا لیکن میرا دھیان ان گاڑیوں کی طرف تھا جو آگے جا رہی تھیں۔ دلاور کی واکس ہال اور ٹیکسی سو گز کے فرق سے آگے پیچھے ایک رفتار سے چلی جا رہی تھیں۔ شہر کی طرف مڑنے کے بعد جب دونوں گاڑیوں نے نہر کا پل بھی ایک ساتھ عبور کیا اور پھر دائیں سمت کی سڑک پر بھی اسی فاصلے کے ساتھ رواں رہیں تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ دلاور اکیلا نہیں تھا۔ اگر وہ کار میں اکیلا تھا تو ٹیکسی میں اس کے ساتھ دوسرے افراد بھی تھے۔ اس کے اپنے ساتھی یا پولیس والے۔ دھرم پورہ تھانے کے بعد ٹیکسی آگے ہو گئی اور واکس ہال درمیان میں آ گئی۔ پھر میں نے رفتار بڑھائی اور دونوں سے آگے نکل گیا اور اوور ٹیک کرتے ہوئے میں نے ایک بس کو درمیان میں رکھا۔ بس پہلے ہی ان دونوں گاڑیوں کو اوور ٹیک کر رہی تھی۔ جب میں نے بس کو اوور ٹیک کیا تو سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ سامنے سے آنے والی ایک کار کی ہیڈ لائٹس نے مجھے اندھا کر دیا۔ اس نے زبردست بریک لگائی اور میں نے انتہائی خطرناک طریقے پر دوبارہ بائیں طرف ہونے کی کوشش کی تو بس کے سامنے آ گیا۔ میری رفتار بھی ساٹھ میل سے زیادہ تھی۔ اگر میں سامنے والی گاڑی کے تصادم سے نہ بچتا تو یہ حادثہ انتہائی خوفناک ہوتا کیونکہ مخالف سمت سے آنے والے کی رفتار بھی کم نہ تھی اور میں نے اس کے گزرنے کے لیے راستہ چھوڑا ہی نہ تھا۔ جب میں ایک دم بائیں طرف ہوا تو بس کے اگلے حصے اور میری کار کے پچھلے حصے کے درمیان ایک انچ کا فاصلہ بھی نہ رہا ہو گا۔ اگر میں ایک دم رفتار نہ بڑھاتا اور اس کے ساتھ ہی بس ڈرائیور فوراً بریک پر پیر نہ رکھتا تو تصادم خوفناک نہ ہوتا لیکن کار کا پچھلا حصہ یقیناً تباہ ہو جاتا۔ اس طرح اوور ٹیک کر کے میں نے خود کو دلاور کی نظر میں آنے سے تو بچا لیا مگر خود بھی بال بال بچا۔ اس رفتار پہ کار کے بے قابو ہو کے الٹنے کے امکانات بھی تھے۔ سامنے سے آنے والی کار اور بس کے ڈرائیوروں نے یقیناً مجھے گالیاں دی ہوں گی۔ کسی نے یہ نہیں سمجھا ہو گا کہ میں ایمرجنسی کے باعث اتنی تیزی سے اور اتنے خطرناک انداز میں گاڑی چلا رہا ہوں۔ بیشتر لوگوں نے فرض کیا ہو گا کہ میں نشے میں ہوں۔ مجھے جان کا خطرہ ہے یا میں کوئی جرم کر کے فرار ہوا ہوں۔

بس کے اچانک بریک لگانے اور مجھے بچانے کی خاطر بائیں طرف ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ڈرائیور اپنی پوری کوشش کے باوجود ٹیکسی کو نہ روک سکا اور وہ بس سے ٹکرائی تو پیچھے آنے والی واکس ہال بھی ٹیکسی میں گھس گئی۔ دونوں اپنی رفتار پہ کافی حد تک قابو پا چکے تھے چنانچہ نقصان کسی کا بھی زیادہ نہیں ہوا اور یہ سب مجھے بعد میں خود دلاور کی زبانی معلوم ہوا۔ اس وقت تو بس بھی رک گئی، ٹیکسی اور واکس ہال بھی۔ ہاں، تھوڑی بہت گرما گرمی ہوئی ہو گی۔ ٹیکسی

www.paksociety.com

ڈرائیور اور دلاور نے مجھے آگے نکلتے نہیں دیکھا تھا چنانچہ انھوں نے بس ڈرائیور کو گالیاں دی ہوں گی اور بس ڈرائیور نے مجھے پھر بس کے مسافروں کی گواہی سے یہ ثابت کر دیا ہوگا کہ اس نے ایک حادثے سے بچنے کی کوشش کی تھی اور یوں تھوڑی سی تک تک جھک جھک کے بعد معاملہ رفع دفع ہو گیا ہوگا۔ بس تو سرکاری تھی اور اس کی خوبصورتی میں فرق پڑنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ٹیکسی والے نے اور دلاور نے اپنی اپنی گاڑی کے ڈینٹ نکلوانے اور پینٹ کرانے کے اخراجات کا سرسری اندازہ کیا ہوگا اور چل پڑے ہوں گے۔

اس وقفے سے مجھے دو فوائد حاصل ہوئے۔ ایک تو میں آگے نکل کے سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گیا جہاں ایک گلی میں ہیجڑے رہتے تھے۔ اپنے روزمرہ کے کاروبار کے علاوہ ان کی آمدنی کا ایک ذریعہ یہ بھی تھا کہ وہ شادی بیاہ کے لیے ڈھولک کرائے پر دیتے تھے۔ میرا مقصد تو خود چھپنا اور کار کو چھپانا تھا۔ وہ بس ڈرائیور بعد میں دیکھتا رہا ہوگا کہ وہ کار نظر آ جائے تو اس کے مالک کو بے نقط سنائے۔ اگر وہ چاہتا بھی تو نمبر نوٹ نہیں کر سکتا تھا لیکن نیلے رنگ کی کورٹینا کو پہچان سکتا تھا۔ میں پیدل چلتا ہوا پھاٹک تک گیا اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ میں دلاور کے پہنچنے سے پہلے ہی ایک تاریک گوشے میں جا کھڑا ہوا۔ اگر ان کا بس نے راستہ نہ روکا ہوتا تو وہ میرے پہنچنے سے پہلے وہاں سے گزر جاتے۔ سوا نو کے بجائے میں نے نو بج کر بیس منٹ پر پہلے ٹیکسی کو اپنے سامنے سے گزرتے دیکھا لیکن اس کی رفتار بہت زیادہ تھی اور اس کے شیشے بند تھے چنانچہ میں کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ یہ بھی نہیں کہ ٹیکسی کو چلانے والا کون تھا اور اس میں وہ اکیلا تھا یا اس کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔

دلاور کی گرین ڈلکس ہال کار دو منٹ بعد آئی۔ میری ہدایت کے مطابق اس نے سردی میں بھی کار کے شیشے کھول دیے تھے اور وہ بہت آہستہ جا رہا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس گاڑی کی عقبی سیٹ پر کوئی لیٹا ہوا ملتا یا دلاور نے کسی کو چالاکی سے ڈکی میں چھپا دیا ہوتا لیکن اتنا سوچنے کے لیے وقت ہی نہ تھا۔ اس کے علاوہ دلاور اپنے ساتھیوں کو ٹیکسی میں بھیج چکا تھا۔ چنانچہ کار میں کسی کو ساتھ رکھنے سے اس کے پلان کے فیل ہونے کا امکان تھا۔ میں نے جوا کھیلا اور ایک دم کار کے سامنے آ گیا۔ دلاور نے دروازہ کھولا اور میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اگر کوئی پیچھے ہوتا تو اتنی دیر میں ریوالور میری گدی پر رکھ دیتا۔

"شیشے بند کر لو اور گاڑی اس جگہ روک لو" میں نے کہا۔

"یہاں؟ لیکن تم نے تو کہا تھا...."

"عقل سے کام لو دلاور! میں پہلے سے کوئی جگہ بتا کر تم سے ملنے کیسے آ سکتا ہوں" میں نے کہا۔ "تم اگر مجھ پر اعتماد کرتے ہو تو اس لیے کہ تم اس پوزیشن میں ہو۔ میں کسی پر بھی اعتماد نہیں کر سکتا۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔"

"بے وقوف تو تم ہو اپنے سکندر صاحب معاف کرنا" وہ گاڑی روک کر بولا۔ "تمھیں کیا معلوم کہ میں اکیلا ہوں یا میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"مجھے معلوم ہے کہ ایک ٹیکسی میں کچھ افراد تمھارے ساتھ آئے ہیں" میں نے اطمینان سے کہا۔ "میں تعداد نہیں بتا سکتا لیکن ٹیکسی کا نمبر بتا سکتا ہوں اور یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ ٹیکسی ابھی ابھی سیدھی گئی ہے۔ میں نے اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا تھا کہ تمھارے ساتھ کار میں کوئی مسلح شخص پیچھے بیٹھا ہو۔ تھوڑا بہت رسک تو مجھے لینا ہی تھا۔"

"یہ سب تم نے اس وقت دیکھا ہوگا جب وہ ٹیکسی بس سے اور میری کار ٹیکسی سے ٹکرائی تھی؟" وہ بے بسی سے بولا۔

"مجھے نہیں معلوم یہ حادثہ کہاں پیش آیا" میں نے حیرانی سے کہا۔ "میں تو تمھارے پیچھے ہی تھا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ حادثہ تو ویسے کراسنگ کے پاس ہی تو ہوا تھا" وہ بولا۔ "کسی الو کے پٹھے نے بس آگے مڑنے کی کوشش کی۔ بس والے نے اسے بچایا۔ ہم تو بچ سکے۔ خواہ مخواہ مجھے بھی لگا اور ہزار بارہ سو کا نقصان بھی ہوا۔ سرکاری بس نہ ہوتی تو معاملہ اتنی جلدی ختم بھی نہ ہوتا۔ مجھے ہی معافی مانگ کے نکلنا پڑا۔"

"اسی لیے تمھیں دیر ہوئی" میں نے کہا۔ "مزید پانچ منٹ بعد میں چلا جاتا۔"

"تم وہ کیسٹ لائے ہو؟" دلاور نے ناگواری سے کہا۔ اس کا موڈ حادثے اور اپنے منصوبے کی ناکامی کے باعث خراب ہو گیا تھا۔

میں نے کیسٹ اس کے سامنے رکھ دیا۔ "تم اس کو سن کے اپنی تسلی کر سکتے ہو۔"

"تسلی کی بات مت کرو۔ میرا اعتبار کرنے پر مجبور ہو" وہ بولا۔ "تمھارے پاس ایک دو یا دس نقلیں ہو سکتی ہیں۔"

"خود تم نے بھی تو ایک کاپی ضرور بنا کے دو بار سنی ہوگی؟" میں نے کہا۔

میں اس حرامزادے فتح شیر کو سنوانا چاہتا تھا۔" وہ بولا۔ "لیکن وہ غائب ہے۔ کل رات سے کیا وہ تمھاری قید میں ہے؟ اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی لکھی جا چکی ہے۔"

"فی الحال میں اس پر تبصرہ نہیں کروں گا۔" میں نے کسی گھاگ سیاستدان کی طرح کہا جس سے پریس کانفرنس میں کوئی چالاک صحافی انتہائی خطرناک سوال کر بیٹھے۔ "تمھارے ساتھ کون تھا اور انھیں ساتھ لانے کا مقصد کیا تھا؟"

"جواب وہی ہے جو ابھی تم نے مجھے دیا تھا۔" دلاور نے تلخی سے کہا۔

"تمھاری اس حرکت نے اعتماد کی فضا باقی نہیں رہنے دی" میں نے کہا۔ "اس لیے میں آگے نہیں جا سکتا۔ ایک بات ذہن میں رکھنا۔ ریوالور اگر تمھارے پاس ہے تو میرے پاس بھی ہے۔ تمھارے ساتھی تم سے کٹ گئے ہیں لیکن میرے ہاتھ میرے ساتھ ہیں اور جتنا بھروسا تم اپنے ساتھیوں پر کرتے ہو اس سے زیادہ اعتماد مجھے اپنے ہاتھوں پر ہے۔"

"تم بھی مجھے بے وقوف بنا رہے تھے کہ تم تصفیہ کر کے باہر نکل جانا چاہتے ہو۔"

"نہیں، وہ سچ تھا۔ میں اور رابعہ اپنی تمام عمر اس طرح ضائع نہیں کرنا چاہتے" میں نے کہا۔ "بے شک پہلے نہ میں ایسا سوچتا تھا اور نہ رابعہ کا یہ خیال تھا لیکن اس وقت حالات مختلف تھے۔ رابعہ صرف میری وکیل تھی اور میں اس کا موکل۔ اب ہم جیون ساتھی بننے کا فیصلہ کر چکے ہیں چنانچہ میں اس دلدل سے نکلنا چاہتا ہوں۔ یہاں رہ کر میں اس میں زیادہ ہی دھنستا جاؤں گا۔ میرا یہاں سے نکل جانا تمھارے مفاد میں بھی ہے لیکن میں اور رابعہ تمھارے لیے نہیں اپنے مستقبل کی خاطر ایک سودا کر سکتے ہیں۔ تم ہمیں یہاں سے نکلنے کے مواقع فراہم کرو۔"

"کس قسم کے مواقع؟" دلاور نے کہا۔ "تم نے تو زندگی ولایت میں گزاری ہے۔"

"ہاں اور میں ولایت ہی لوٹ جانا چاہتا ہوں۔ رابعہ کو بیوی کی حیثیت سے ساتھ لے جانا میرے لیے مشکل نہیں" میں نے کہا۔ "مشکلات یہاں ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ وسائل کا ہے۔"

"تمھیں پیسہ چاہیے؟" دلاور نے کہا۔ "کتنا؟"

"اپنے نفع نقصان کا حساب لگا کے بولی دو" میں نے کہا۔ "یہ بھی ذہن میں رکھو کہ ہمیں زندگی گزارنی ہے۔"

"میری آفر وہی ہے" دلاور بولا۔ "دس لاکھ ماہانہ پر وہاں میرے پارٹنر بن جاؤ یا پچیس لاکھ نقد لے لو۔"

"پارٹنرشپ پر لعنت۔ میں تم سے کسی قسم کا تعلق رکھنا نہیں چاہتا" میں نے کہا۔ "آئندہ کبھی نہ تم میرا نام سنو اور نہ ہم کبھی تمھارا ذکر سنیں۔ پہلے میں اکیلا تھا اب ہم دو ہیں۔"

"تمھارا مطلب ہے میں رقم دگنی کر دوں؟" دلاور بولا۔ "پچاس لاکھ لگانا چاہتے ہو مجھ سے؟ .... اتنی تو گڈیاں

ذہانت، چالاکی اور بہادری کی دلچسپ کہانیاں

مشہور ترین چور بک ویلوٹ
جو بے قیمت چیزیں گراں قدر
معاوضے پر چراتا تھا

بک ویلوٹ
کی چوریاں اب
بھی محدود تعداد میں
دستیاب ہے

قیمت
۲۵ روپے

پیشگی رقم
بھیجیے بس
ڈاک خرچ
معاف

کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس ۲۲ کراچی ۱

www.paksociety.com

نہیں کھیل ہی میں لے سکندر۔"

"پہلے مجھ سے تمہارے بارے میں اندازوں کی غلطی ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب میں تم کو کس حد تک سمجھتا ہوں۔ اس کا ثبوت تمہارے سامنے ہے۔ اگر میں تمہاری باتوں میں آجاتا تو رابعہ کی خالی کوٹھی میں تمہارے ساتھی مجھے گرفتار کر لیتے اور پولیس کے حوالے کر دیتے۔ تمہارے سارے مسئلے ختم ہو جاتے۔ وہ ہوں گے کوئی دو ٹکے کے بدمعاش جن کو دس ہزار کے انعام کا لالچ ہو گا۔ شاید دس ہزار تم نے بھی دے دیے ہوں۔ ان کو بھی تم سے زیادہ ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ تم سے پچاس روپے رشوت کے سے حاصل کرنا مشکل ہے چہ جائے کہ پچاس لاکھ۔ تم یہ پچاس لاکھ مجھے نہیں دو گے رابعہ کو دو گے۔"

"وہ کیسے؟ اور اس کے باوجود گارنٹی کیا ہوگی؟"

"تم اس کی کوٹھی خریدو گے پچاس لاکھ میں۔" میں نے کہا۔ "بے شک اس کی مالیت اتنی نہیں ہے لیکن کوئی ایک روپے کی چیز ایک لاکھ میں لینا چاہے تو یہ خرید و فروخت کسی طرح بھی غیر قانونی نہیں۔ اس کے خلاف کوئی الزام نہیں اور وہ تم سے سیل ایگریمنٹ کر سکتی ہے۔ اس میں کچھ رقم لگے گا تم ادائیگی اس وقت کرنا جب تمہیں میرے لندن پہنچنے کا ثبوت مل جائے۔ تمہارے وسائل بہت وسیع ہیں، تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں لندن کب پہنچا اور وہاں کس نام سے مقیم ہوں۔ مجھے ایک بار وہاں سے تمہاری کوششوں کے طفیل ڈی پورٹ کر دیا گیا تھا۔ مجھے نیا نام نئی شخصیت اور نیا پاسپورٹ حاصل کر کے لندن میں داخلہ ملے گا۔"

"اور تم پھر لوٹ کر پاکستان آگئے تو مجھے کیسے معلوم ہوگا؟"

"میں یہاں کیوں آؤں گا اور کیا لینے آؤں گا؟" میں نے کہا۔ "دوبارہ انھی مقدمات میں پھنسنے کے لیے جن کی وجہ سے میں یہاں روپوش رہنے پر مجبور ہوں۔ میں جانتا ہوں میں ساری زندگی روپوش رہ کے نہیں گزار سکتا۔ خصوصاً ان حالات میں کہ رابعہ بھی میرے ساتھ ہے۔ غلط نام سے باہر جانے سے میرا ایک جرم اور بڑھ جائے گا اور اگر تم سال چھ ماہ مجھ پہ نظر رکھو تو تمہیں یقین آجائے گا کہ میرا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"تم انتقام کی خاطر مجھے قتل کرنے کے لیے آسکتے ہو اور پھر فرار ہو سکتے ہو۔" وہ بولا۔

"ہم کیا تمہارے وارث، دوست اور ساتھی کا دعویدار، شریک اور وکیل سب مل کے بھی مجھے واپس نہیں لا سکتے۔" میں نے کہا۔ "وہاں تو میں ہر وقت تمہاری گرفت میں رہوں گا۔ کسی بھی وقت برطانوی وزارت داخلہ سے درخواست کی جاسکتی ہے کہ فلاں شخص جو اپنی بیوی کے ساتھ لندن میں فلاں جگہ مقیم ہے درحقیقت سکندر بخت ولد وزیر خان ہے جسے سال بھر پہلے برطانیہ سے ڈی پورٹ کیا گیا تھا لیکن وہ جعلی دستاویزات کی مدد سے پھر وہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ مجھے دوبارہ ڈی پورٹ کر دیا جائے گا اور واپسی پر مجھے پاکستان پولیس ریسیو کرے گی۔ تمہارے لیے تردد کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ بس ایک آدھ ...

"پچاس لاکھ کی تو کوئی بات نہیں۔" وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "لیکن یہ معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔ ہو سکتا ہے میں تم سے اتفاق کروں مگر یہ بھی ممکن ہے کہ میرے ذہن میں قضیے کا کوئی اس سے بھی بہتر فارمولا آجائے یا کوئی ایسا طریقہ نکل آئے کہ تم اور رابعہ پچاس لاکھ لے کر نکل جاؤ اور خطرہ نہ تمہارے لیے رہے اور نہ میرے لیے۔ دونوں طرف ٹھوس ضمانت ہو۔"

"میں اس وقت پچاس لاکھ نہیں مانگ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایک ہفتے میں تم میری تجویز کا ہر پہلو سے جائزہ لے سکتے ہو۔ میں تم سے پھر رابطہ قائم کر لوں گا۔ جب بھی اپنی گاڑی میں نکلو، ریڈیو کو آن رکھو اور اس جگہ ٹھہرے رہو جہاں اب ہے۔ بات کسی بھی وقت ہو جائے گی جیسے آج ہوئی تھی۔ تمہارا ریوالور کہاں ہے؟"

"میری جیب میں۔ لیکن میں ہتھیار ڈالنے نہیں جا رہا ہوں۔" ولاور غصے سے بولا۔

"میں بھی نہ مرنا چاہتا ہوں اور نہ گرفتار ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ریوالور اپنے پاس رکھو صرف گولیاں نکال کے مجھے دے دو ورنہ میں اتر جاؤں گا۔ اگر میں ویسے ہی اتر گیا تو تم مجھے بھاگتے کہاں روکو گے۔ تم کار میں ہو اور میں پیدل ہوں۔" میں نے ریوالور نکال لیا تو ولاور نے بادل ناخواستہ ریوالور نکالا اور خالی کر کے گولیاں مجھے تھما دیں۔

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔ "ہم ایک دوسرے پہ اعتماد نہیں کر سکتے۔" اور ریوالور کا رخ اس کی طرف کیے ہوئے ایک دم گلوو کمپارٹمنٹ کھول لیا۔ اس میں سائلنسر لگا ہوا ریوالور موجود تھا۔ ولاور کا چہرہ غصے اور احساس بے بسی سے سرخ ہو گیا اور اس نے مجھے دانت پیس کر گالی دی۔

"ہم ایک دوسرے کی فطرت کو اسی طرح سمجھتے ہیں جیسے سانپ اور نیولا ایک دوسرے کی جبلت کو۔" میں نے کہا۔ "اب مجھے یہ بھی شبہ ہے کہ تیسرا ریوالور تمہاری سیٹ کے نیچے ہو لیکن میں اتنا جوکھم لے لوں گا۔ میرے اترنے کے بعد پیچھے پلٹ کر مت دیکھنا اور سیدھے جانا۔ مجھے ذرا بھی شک ہوا تو میں اپنے دفاع کے لیے سب کچھ کروں گا۔ مجھے تمہیں قتل کرنا پڑا تو اس سے بھی گریز نہیں کروں گا حالانکہ میں یہ نہیں چاہتا۔" میں نے دروازہ کھولا اور ریوالور کا رخ ولاور کی طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔ ولاور نے کار اسٹارٹ کی۔ بمشکل بیس گز دور ہی گیا ہو گا کہ میں نے اس کے سائلنسر لگے ریوالور سے دو فائر کیے۔ اس کی کار کے دونوں پچھلے ٹائر برسٹ ہو گئے۔ میں پلٹ کے بھاگا اور ایک گلی میں گھس گیا جو دو مکانوں کے بیچ میں خالی پلاٹ سے گزرتی تھی۔ موڑ پہ طلوع ہوتے ہی میں نے اطمینان سے پیدل چلنا شروع کیا۔ فائروں کی آواز کسی نے نہیں سنی تھی لیکن ٹائر برسٹ ہونے کی آواز دور تک گئی تھی۔ ولاور نے پہلے کار کو سنبھالا ہو گا اور پھر نیچے اتر کے مجھے دیکھا ہو گا مگر میں غائب ہو چکا تھا۔ صدر بازار کی سڑک عبور کر کے میں پیدل چلنے والوں میں شامل ہو گیا۔ کوئی شک بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میری دو جیبوں میں تین ریوالور ہیں۔ ان میں ایک خالی ہے، دوسرا بھرا ہوا اور تیسرا سائلنسر والا جو کوٹ کی اندر والی جیب میں ابھی تک بارود کی بو بسائے ہے۔

کار وہیں موجود تھی جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا۔ ایک نیم ناخوشگوار سی شخصیت نے نشان بنا کے اور کمر تھپکا کے پہلے ہاتھی جیسی انداز میں کہا۔ "اسے لو وہ تو جا رہے ہیں۔ میں نے ... مفت کی سیر کرنے آ گئے تھے کیا؟" کوئی ... سے ہنسا اور میں نے دس کا ایک نوٹ جھٹک کر جان چھڑائی۔ کار کو بیک کر کے واپس جاتے ہوئے میں بہت مطمئن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ محسن اور ٹیڈی بھی اب تک لوٹنے والے ہوں گے۔ دراصل میری ساری کامیابی کا انحصار ہی ان دونوں کی بروقت کارروائی پر تھا۔ میں نے ولاور کو پندرہ بیس منٹ سے زیادہ روکے رکھا تھا جبکہ رابعہ کی کوٹھی وہاں سے پانچ منٹ کی ڈرائیو بھی نہ تھی۔ اس کا مطلب تھا ولاور کے ساتھی رابعہ کی کوٹھی میں ہی موجود رہے تھے اور میرے وہاں پہنچنے کے شدت سے منتظر تھے۔ ان کے لیے میں دس ہزار کا چلتا پھرتا نوٹ تھا۔ ولاور نے ان کو سمجھا دیا ہو گا کہ سکندر بخت اسی کوٹھی میں ملے گا چنانچہ انھوں نے نیچے اوپر ہر کمرے میں جھانک کر دیکھا ہو گا۔ ممکن ہے باتھ روم بھی کھول کر دیکھے ہوں۔ اس کارروائی میں دس پندرہ منٹ لگ سکتے تھے کیونکہ کم سے کم ایک آدمی کو انھوں نے باہر بھی چھوڑا ہو گا کہ گردوپیش پہ نظر رکھے اور کسی قسم کا خطرہ دیکھے یا محسوس کرے تو فوراً سگنل دے۔ دوسرا کوئی ڈرائیور ہو گا جو ٹیکسی میں بالکل تیار بیٹھا ہو گا کہ ضرورت پڑنے پر ان کو لے کر نکل جائے۔ وہ یقیناً کوئی بہت سلیم گروپ ہو گا۔ تاہم ٹیکسی کے متعلق میں خاصے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ چوری کی ہو گی۔ اوپر جا کے تلاشی لینے والا ایک ہی آدمی ہو گا یا زیادہ سے زیادہ دو ہوں گے۔ جنھوں نے وہاں سے چلتے وقت بیڈ بھی لگے چھوڑ دیے تھے۔ انھوں نے تینوں بستروں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا ہو گا اور ہماری وہاں موجودگی کے آثار تلاش کیے ہوں گے۔

لیکن ناکامی کے اندیشے سے دوچار کرنے والا خیال صرف ایک ہی تھا کہ انھوں نے اوپر والے باتھ روم کو دیکھا اور اس میں فتح شیر کی خون میں لت پت اور اکڑی ہوئی بے سر کی لاش دیکھ لی تو وہ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگیں گے۔ انھیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ انھیں یہاں بلانے کا مقصد اس سازش کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ قتل کے جرم میں پکڑے جائیں۔ وہ پکڑے جاتے یا نہیں یہ محسن اور ٹیڈی کی جرأت کی کوشش کی کامیابی پہ منحصر تھا۔ محسن کو اپنے رپورٹر دوست سے مدد لینی تھی اور اسے یہ سمجھانا تھا کہ وہ پولیس کے ساتھ اس پتے پہ پہنچے تو اسے سب انسپکٹر فتح شیر کی لاش بھی مل سکتی ہے اور قاتل بھی ہاتھ آسکتے ہیں۔ کسی بھی اخبار کے رپورٹر کے لیے رات کے نو ساڑھے نو بجے ایک سنسنی خیز خبر بہت بڑا انعام ہوتی ہے۔ اگر وہ کامیاب رہا تو صبح صرف ایک ہی اخبار کی سرخی چلا چلا کر کہے گی کہ گمشدہ پولیس افسر کو قتل کر دیا گیا۔ لاش کا سر کاٹ کے پھینک دینے والے قاتل گرفتار۔ اور یہ خبر دوسرے تمام اخبارات کے مالکوں سے رپورٹروں تک سب کے لیے باعث شرم اور نااہلی کے سرٹیفکیٹ کی طرح ہوگی کہ آخر انھیں کچھ معلوم کیوں نہیں ہوا۔ کہا بھی جائے گا کہ پولیس کی ملی بھگت ہے اور جس رپورٹر نے یہ تیر مارا ہے اس کا کوئی دوست یا مخبر وار پولیس میں ہو گا جس نے چپکے سے اسے بتا دیا اور پولیس نے بھی کون سا ذہانت سے

www.paksociety.com

کام سے لے کر سراغ لگایا ہوگا کس نے مخبری کی ہوگی۔ بیشتر کامیابیوں کے ذمے دار مخبر ہوتے ہیں جو پس منظر میں رہ کے انعام پاتے ہیں۔ کامیابی کا سہرا پولیس کے سر باندھا جاتا ہے چنانچہ وہ مخبر بھی رپورٹر کا دوست ہو سکتا ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست تھی۔

محسن کی کامیابی بہت سے عناصر سے مشروط تھی۔ ایک یہ کہ اس کو اپنا رپورٹر دوست مل جائے۔ دوسرا یہ کہ وہ فوراً اس کی بات پر یقین کر کے ساتھ چل پڑے۔ تیسرا یہ کہ تھانے میں کوئی اتنا ہی مستعد پولیس افسر بیٹھا ہو جو اس کامیابی کو اپنے ریکارڈ پہ لانے کے معاملے میں ذرا بھی تساہل نہ برتے اور چوتھا یہ کہ وہ اس وقت رابعہ کی کوٹھی میں پہنچیں جب "ملزمان" اندر ہی موجود ہوں۔ ولاور کی گاڑی گیراج میں موجود تھی اور اس نے ابھی تک گاڑی کی گمشدگی کی رپورٹ بھی نہیں لکھوائی تھی۔ اگر وہ خود آ جاتا تو کوئی جواب نہ دے پاتا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ اس کی قسمت تھی کہ وہ بچ گیا لیکن باقی لوگ پکڑے گئے تب بھی ولاور بہر حال پھنسے گا کہ اس نے فتح شیر کو قتل کیا تھا اور اب اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ثابت ہو جائے گا کہ فتح شیر کی موت کم سے کم سولہ گھنٹے پہلے ہوئی تھی۔ سردی اور باتھ روم کے سرد خانے میں دو چار گھنٹے کا فرق پڑ جائے گا اور یہ تسلیم کیا جائے گا کہ موت کو بیس گھنٹے بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسے موسم میں لاش کے سڑنے یا بو دینے کا کوئی امکان نہ تھا۔

محسن کے مقابلے میں ٹیڈی کا کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اسے لکڑی کے وہی بلاک ٹیکسی کے پیچھے والے پہیوں کے نیچے رکھنے تھے جن سے کچھ دیر پہلے ہم نے ولاور کی گاڑی کو جام کر دیا تھا تاکہ ٹیکسی بیک ہو تو وہیں بیٹھ جائے لیکن اس پلان کی کامیابی سو فیصد یقینی نہیں تھی۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب ٹیکسی باہر کھڑی ہوئی ملے۔ وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر ہاتھوں پیروں کے بل کوئی آہٹ کیے بغیر ٹیکسی کے بالکل پیچھے پہنچ سکتا تھا۔ ٹیکسی کے کوٹھی میں داخل ہو کر کھڑے ہونے کی صورت میں یہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا اور میں نے اسے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنی سلامتی کو خطرے میں ڈال کر کوئی کام نہ کرے۔ اس کا دوسرا کام چند افراد کو جمع کرنا تھا جو آس پاس کے گھروں میں اور راہ چلتے لوگوں سے یہ کہہ سکتا تھا کہ ساتھ والی کوٹھی میں ایک لاش پڑی ہے اور وہ اس کوٹھی کا چوکیدار ہے اور اگر وہ دس پندرہ افراد کو جمع کر سکے تو ہو جائے اور کسی سے پولیس کو فون بھی کرا دے تو خاموشی سے کھسک لے۔ لوگ خود مجرموں کا راستہ روک لیں گے اور جب محسن کا رپورٹر دوست پولیس کے ساتھ پہنچے گا تو جائے واردات پر گواہ کافی مل جائیں گے۔ سے ملے گا تو وہی ایک نامعلوم شخص جو گواہوں کو مدد کے لیے وہاں کھینچ لایا اور انھیں گواہی کے چکر میں ڈال کر غائب ہو گیا۔ ولاور اس جگہ تک تو نہیں پہنچا تھا جہاں میں نے سے رابعہ کی شکاری ہونے کا ثبوت دینے کی خاطر ایک جال پھیلایا تھا کہ وہ پھنس جاتا تو نکل نہ پاتا لیکن اس کی پوزیشن سو فیصد محفوظ نہ تھی۔ اس کی ایک کار واردات پر کھڑی تھی اور اگر وہ لوگ جو اس کے تھے پولیس کی گرفت میں آ گئے تو وہ بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے کہ ان کو وہاں بھیجنے والا ولاور تھا۔ پھر محکمہ اپنے ہی ایک افسر کے بہیمانہ قتل کے مجرموں کا جرم حاصل کرنے میں کسی کے ساتھ بالکل رعایت نہیں گا۔ اگر تقدیر نے ولاور کا ساتھ نہ دیا تو وہ بھی پکڑا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا کہ وہ اپنی دوسری کار میں جائے واردات کے اتنا قریب کیوں پہنچا تھا؟

اس سوال کا جواب وہ کیسٹ دے گا جس کی اصل پاس محفوظ تھی۔ بعد میں استغاثہ یہ ثابت کرے گا کہ الطاف کو قتل کیا تھا اور اس قتل کو چھپانے کے لیے پانچ لاکھ روپے دیے تھے مگر وہ مطمئن نہیں تھا۔ لگا لینے کے بعد اس نے قتل کے عینی گواہ کو بھی قتل ایسی جگہ لے جا کر جہاں الزام رابعہ پہ آ سکے۔ وہ آدمیوں کے ساتھ لاش کو ٹھکانے لگانے پہنچا تھا کرے کہ قتل کے جرم میں رابعہ کے خلاف رپورٹ گئی ہے یا خود اسے ہی یہ کام کرنا ہوگا۔ فتح شیر تو چنانچہ اس کے خلاف سارے جرم بھی ختم ہوتے اس کے اعتراف کا خمیازہ اب ولاور کو بھگتنا تھا۔

میں ٹیڈی کے گھر پہنچا تو رات کے سوا دو تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ دروازہ بدستور رابعہ کو بہت پہلے لوٹ آنا چاہیے تھا اور میرا خیال وہ سخت انتظار کے کرب میں مبتلا ہوگی اور مجھ پر گی کہ پرانے شکاری بنے پھرتے ہو یہ خیال نہیں کیا جل اور کتنی اذیت کا شکار ہوں۔ تالا کھول کے میں اکیلا بیٹھا رہا۔ میں نے ایک سگریٹ پی اور کمرے

ٹہلتے ہوئے بار بار گھڑی دیکھی۔ محسن اور ٹیڈی کی واپسی کب ہوگی یہ اپنی جگہ ایک سوال تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ پریشان کن رابعہ کا تھا جو صبح صرف چیک کیش کرانے نکلی تھی۔ اس بینک سے رقم حاصل کر لی تھی اور محسن کے بیان کے مطابق نازلی سے ملنے اسپتال جانا تھا اور پھر یہ ڈیڑھ لاکھ کی رقم منظر کے پاس بحفاظت رکھوائی تھی۔ وہ خود بھی بحفاظت منظر کے پاس پہنچی تھی یا نہیں یہ بھی ایک سوال تھا جس کا جواب صرف منظر دے سکتا تھا۔ یا شاید منظر بھی نہیں دے سکتا تھا۔ کوئی عورت جس کے پاس ڈیڑھ لاکھ کی نقد رقم ہو خطرات سے محفوظ نہیں بھی جا سکتی اور پھر رابعہ کا تو معاملہ ہی مختلف تھا۔ کیا اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ وہ اسپتال پہنچ کے کسی مشکل صورت حال سے دوچار نہیں ہوئی؟ کیا لیلیٰ دیوانگی کی حد تک چاہنے والی بے وقوف نازلی اپنے جذبات سے مغلوب ہو کے رابعہ کے خلاف انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتی؟ وہ پاگل لڑکی جس نے میری نافرمانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی کیا اپنے بھائی کی مدد کے ایک تیر سے دو شکار نہیں کر سکتی؟ اس کا ذہن یہ یقین کر سکتا ہے کہ اگر وہ رابعہ کو راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائے تو وہ مجھے حاصل کر لے گی؟

میں نے دماغ کو خراب کرنے والے خیالات سے کہ یہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرے اندر کی آواز ایسا نہیں ہو سکتا یا تم چاہتے ہو کہ ایسا نہ ہو۔ نازلی جیسی انتہا پسند لڑکی سب کچھ کر سکتی ہے۔ وہ اپنی جان لے سکتی ہے تو کسی اور کی بھی لے سکتی ہے۔ وہ تو تمھیں بھی قتل کر سکتی ہے کہ سکندر تم اگر میرے نہ ہوئے تو کسی اور کے لیے ہو ہوا۔

میں نے دروازے کو پھر تالا لگایا اور منظر کو فون کرنے کے لیے باہر نکل آیا۔

"منظر!" میں نے کہا "یار وہ رابعہ تیرے پاس ہے؟"

"پاس سے کیا مراد ہے؟ آخر تیری منگنی ہے" منظر نے کہا "اب اتنی پاس بھی تو نہیں ...."

"بکواس بند کر۔ یہ بتا وہ تیرے گھر پہنچی تھی؟ اب کہاں ہے؟" کہا۔

"اسی ... اب میرے پاس ہے۔ پاس کا مطلب سمجھتا ہے تو" وہ ہنسا۔

"یار کیا پریشان ہو رہا ہے" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "وہ ابھی تک وہاں کیا کر رہی ہے؟ واپس کیوں نہیں آئی؟"

"واپس کیوں نہیں آئی! یہ تیرے لیے واقعی پریشانی کی بات ہے اور ہونی چاہیے" وہ مکاری سے بولا "دراصل عورت کی ذات میں وفا نہیں۔ جیسے تجھ میں حیا نہیں۔ وہ مجھ سے عقد ثانی پر بضد ہے۔ اب میں کیسے انکار کروں۔ مجھ سے کسی کا دل نہیں توڑا جاتا۔ ویسے بھی اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے تھے .... تجھے پتہ ہے کیا ہے وہ شعر گیا قیس آخر"

"میں ٹیلی فون پہ گولی مار دوں گا" میں نے جھنجلا کے کہا "اس سے میری بات کرا دے۔"

"دیکھ مجنوں کے چچا! میری بات مان اور اسے بخش دے۔ وہ عورت ذات تم دونوں کی معرکہ آرائی میں ہر جگہ ساتھ دینے کا حوصلہ تو رکھتی ہے مگر عورت حوصلے سے کیا ہوتا ہے؟"

"بجا فرمایا آپ نے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ لیکن...؟"

"کوئی لیکن ویکن نہیں" منظر نے میری بات کاٹ دی "ابھی کا نروس بریک ڈاؤن تقریباً ہو چکا ہے۔ وہ بظاہر کچھ نہیں کہتی لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اس سکون اور خاموشی کے نیچے ابلنے والا آتش فشاں پھٹ گیا تو وہ پاگل ہو جائے گی۔ یہ مار دھاڑ، قتل و غارت گری کے خونی منظر، مسلسل ڈر اور خوف کا آسیب یہ سب مل کر اس کو اندر سے کھوکھلا کر رہے ہیں اور غیر معمولی قوت برداشت رکھنے کے باوجود وہ ٹوٹ رہی ہے۔ کیا تم نے کبھی غور نہیں کیا کہ وہ اب پہلے والی رابعہ نہیں رہی؟ پاگل! تو نے اسے کب دیکھا تھا۔ کب چاہا تھا اور موازنہ کر آج کی حالت سے۔ تو اتنا اندھا تو نہیں ہو سکتا کہ فرق تجھے نظر ہی نہ آتا ہو۔ بس بات اتنی ہے کہ وہ محبت کے نام پر جلنے کو بھی تیار ہے اور تو تیار ہے کہ اسے مار دے۔"

"تیری سوچ کا یہ انداز ہے منظر!" میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"میں تیری سوچ کے انداز کی بات کر رہا تھا" وہ برہمی سے بولا "یہ کون سا عشق ہے کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ یہ سب بکواس ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس سے ایک پل کی جدائی مجھے منظور نہیں اور اس سے بچھڑ کے میں ایک لمحہ نہیں جی سکتا۔ چنانچہ میں چار بار موت کے منہ میں بھی اسے ساتھ رکھوں گا۔ ارے بھائی! جدائی تو امتحان ہے اور تجھے واقعی اس سے محبت ہے تو جلد از جلد یہ امتحان پاس کرنے کے لیے محنت کر۔ محبت اور محنت میں ایک نقطے کا فرق ہے جو اوپر نیچے ہو جائے تو مفہوم بدل جاتا ہے۔"

"یہ آج تو کیسی فلسفیانہ گفتگو فرما رہا ہے؟" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"کیا تم نے رابعہ سے بھی یہ پوچھا ہے کہ وہ میرے ساتھ ہی مرنے پر کیوں کمربستہ ہے؟ میں نے تو اس سے نہیں کہا……"

"مجھ ہی سے۔ تو نے کیا نہیں کیا۔ ہر طریقے سے تو خود کو عاشق صادق ثابت کر دیا ہے۔ اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے سارے شاعروں کے دیوان پڑھ ڈالے۔ تمام فلموں سے ڈائلاگ بول دیے اور اب پوچھتا ہے میں نے کیا کیا۔ وہ عورت ذات، کمزور اور جذباتی وکیل ہے تو کیا۔ دل کے معاملے میں تو ہے وہی ناقص العقل۔ تیل تو نے چھڑکا، آگ تو نے لگائی۔ یہ عورت تو نے ڈنکے کی چوٹ پر بے خطر آتش عشق میں۔ اس سے کیا پوچھوں! وہ ابھی یہیں رہے گی میرے پاس۔ کم از کم ایک مہینہ — میں اس کے سارے معاملات ٹھیک کروں گا اور وہ ڈیڑھ لاکھ نقصان ہے، مکان بیچنا چاہتی ہے، مجھے پارٹنر بنانا چاہتی ہے اور اپنے آفس کے معاملات میرے سپرد کرنا چاہتی ہے تاکہ میں اس کی لیگل فرم اور ماتحت وکیلوں کے مقدمات کی نگرانی کروں۔ پریکٹس تو وہ اب نہیں کر سکتی لیکن قانونی طور پر اس کی حیثیت محفوظ ہونی چاہیے۔ تم دونوں کا انکل رضوی اور تیری ہونے والی سوکن کا بھائی... میرا مطلب ہے انسپکٹر رشید۔ یہ سب اسے معذور سمجھ کر چھوڑ دیں۔ کون سا جرم کیا ہے اس نے تیرا ساتھ دینے کے سوا اور ساتھ کسی جرم میں تو نہیں دیا ہے۔ کسی ضابطے تو حیات میں یہ نہیں لکھا ہے کہ ایک وکیل خاتون کسی چھوٹے ڈاکو یا قاتل سے عشق نہیں کر سکتی۔ یہ اس کا ذاتی فعل ہے جس سے اس کی ساکھ خراب ہو سکتی ہے مگر اس کو جرم کہنے والا خود مجرم ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ تیری چاہت کا اقرار کرنے کے باوجود اعتماد اور بے خوفی سے جیے اور ایک معزز شہری کی طرح سر اٹھا کے چل سکے۔ بزدلوں کی طرح بھاگتی نہ پھرے۔"

"وہ تیری بات نہیں مانے گی۔" میں نے کہا۔

"اس کا تو باپ بھی مانے گا۔" منظر نے کہا۔ "ابھی سو رہی ہے۔ میں نے ایک اسپیشلسٹ کو بلایا تھا اور کہا تھا کہ یہ میری بہن ہے۔ اس نے کہا مرض کوئی نہیں۔ وہی اعصابی کشیدگی، ڈپریشن، ذہنی و جسمانی تھکن اور فرسٹریشن ہے۔ وہ یہاں آرام کرے گی جب تک کہ اس کی صحت بحال نہیں ہوتی —— میں اسے لاک کر دوں گا اور اس کا کھانا پینا سونا جاگنا سب میری مرضی سے ہوگا۔ ورنہ نہیں ہوگا۔ خواہ تم دونوں زہر کھا لو اور خون تھوکو۔"

"گویا میں اور وہ اب اگلے جہان میں ملیں گے بشرطیکہ تو نے میدان حشر میں بھی فدائی تو میدار ہونے کا عہد ابھی برقرار رکھا۔" میں نے کہا۔ "اتنا تو بتا دے ظالم سماج کو دیوار بنا کر کب تک ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں تو کہتے ہیں۔ دنیا کا مسئلہ نہ میں ابھی کون سے ایسے ہوں؟"

"تو فرسٹ ایئر فول ہے ابھی۔ ایم اے کر کے بھی ان عاشقی کی ڈگری نہیں لے سکتا۔" منظر ہنسا۔ "دیوار پیار کی نہیں ہے۔ اگر دل کے آئینے میں ہے تصویر یار کی جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ ورنہ تو ڈھول سکتا ہے اور آپ تو ہتھیلی پر رکھ کے اور سر سے کفن باندھ کے آنا چاہیے تو ہے تو جو دیر چلا کے لیے۔"

"تو نے بہت پی لی ہے اور غالب کسی شاعر کے" میں نے کہا۔ "صاف بتا تو کب تک مدد ہے کہ وہ وہاں رہ بہوں اسے اغوا کرنے کے لیے اپنے گھر کو میری سسرال چاہتا ہے اور کے بیٹھے۔ میں اب کچھ مشہور ڈائلاگ بول... وہ ساری زنجیریں توڑ دے گی۔ ساری دیواریں گرا دے اور اس کا عشق سچا ہے تو اے ظالم سماج! شکست تیری، پیار کی جیت ہوگی یہی ہے عین المطلوب۔"

"تیرے ایک ہینڈ یہاں رہتے دے میں اور وہ تیرے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" منظر بولا۔ "لیکن اپنی حماقت کا ثبوت پیش کرتا رہ کہ۔ نہ تو فوت ہوا ہے اور نہ میری طرح جلوہ کثرت اولاد کہ مرنے سے پہلے مرنے کا رکھتا ہے۔ اس نے پیار کی پابندی نہیں جیسے چاہے مارا سے زیادہ نصیحت میں نے کبھی اپنے کو بھی نہیں کی۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا تو مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ واپس لوٹتے ہوئے میں نے خود کو ذرا دم سے بد خوش محسوس کیا۔ یہ احساس اتنا کم ہمت افزا نہیں تھا کہ منظر ایک بہن کے رابعہ کے سامنے آ گیا ہے اور اسے عورت ذات یا مجرم اور غیر محفوظ سمجھنے کی غلطی کرنے والوں کو چیلنج کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگرچہ رابعہ سے جدائی کے خیال ہی کا نہیں بھی مگر اس یقین میں بڑی طمانیت تھی کہ میں ہی نہیں جو محافظ اور حمایتی ہیں۔ مجھے ندامت بھی تھی اور میں نے رابعہ کی انتہا کو دیکھا، یہ نہیں سوچا کہ اس کی قوت برداشت بالآخر کی خواہشات کا ساتھ دے سکے گی۔ افلاک پر نظر رکھنے والوں کو کچھ نہیں ہوتا۔ طاقت پرواز محدود ہی ہے۔ وہ کہہ کر علیگڑھ جاں رہے میرے ساتھ رہنے اور جبر میں قدم ملا کے چلنے مگر کیا یہ اس کے ساتھ ظلم نہ ہوگا کہ آ

سہارا حاصل کرنے کے لیے کہ اسے اپنے عذاب میں شریک رکھوں؟ آخر میری نظر اس فرق کو کیوں نہ دیکھ سکی جو منظر نے دیکھ لیا؟ اور اس نے ٹھیک دیکھا ہی نہیں، ٹھیک قدم بھی اٹھایا۔ رابعہ کو وہ سب تو نہیں مل سکتا جو اس نے میری خاطر کھویا، لیکن بہت کچھ اب بھی مل سکتا ہے۔ ذہنی سکون، جسمانی آرام، پیشے کا وقار اور اپنی شخصیت کا احترام۔ اس سے وہ جذبہ کہاں مجروح ہوتا ہے جس سے میرے اور اس کے تعلق کی بنیاد ہے۔ مجھے واقعی اسے بخش دینا چاہیے۔ میں اور محسن اور ہمارے دوسرے مددگار ہر شکاری کو شکار کرنے کے لیے ایک عورت کی مدد کے محتاج تو نہیں۔ وہ خود کو اور اپنے معاملات کو سنبھالے جو میرا ساتھ دینے کے لیے بگڑ گئے تھے۔ جہاں ہم آج ہیں کل ہم نہ ہوں گے، یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں۔ اور جب فاصلے اہمیت اور وجود ہی ختم کر چکے ہوں تو جدائی کیسی؟

لیکن یہ سوال بھی ہے کہ کیا رابعہ اس منطقی فیصلے کو قبول کر لے گی۔ یہ معاملہ عقل کا تو نہیں ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ رابعہ اس پاسبان عقل کی نگرانی میں تحفظ کی ضمانت کو مسترد کر دے گی۔ لاشعوری حالات کو میرے ساتھ برداشت کرنا پسند کرے گی۔ یہ نہیں چاہے گی کہ وہ تمام خطرات سے بے نیاز اپنے ذہنی و جسمانی سکون کی خاطر میری رفاقت چھوڑ دے۔ وہ جانتی ہے کہ میرے دشمن کون ہیں، کہاں کہاں ہیں اور ان سے میری ذات کو لاحق خطرات کی نوعیت کیا ہے۔ وہ میری فطرت کو بھی سمجھتی ہے۔ ایسے میں یہ ناممکن تھا کہ وہ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دے اور تحفظ کے گوشہ پناہ گزیں ہو جائے۔ میری ذات سے منسوب الجھنوں اور وسوسوں کے ساتھ تو وہ جی سکے گی نہ مر سکے گی۔ وہ تو میرے ساتھ مرنے جینے کو ترجیح دے گی جب سلیمان اور بھولا کی ان حیدرآباد میں وہ ہر قدم پہ آخری لمحے تک میرے ساتھ تھی۔

میں نے خاصی قنوطیت اور کوفت کے ساتھ جسم کی ضرورت پوری کرنے کی خاطر ایک ہوٹل سے ریستوران میں چند لقمے زہر مار کیے اور واپس آتے ہوئے اپنے ساتھ کھانے پینے کا ضروری سامان لے آیا۔ محسن اور استاد وحیدی کی میرے واپس آنے تک بھی ان کا ناشتہ ہو جاتا ورنہ اگلی صبح ناشتے کا سامان ہوتا۔ دو کمروں کا یہ مختصر سے مکان کے کمرے بھی اتنے مختصر تھے کہ ایک کمرے میں استاد وحیدی کی جھلنگا بان کی چارپائی نے نصف کمرہ گھیر لیا تھا۔ اس کا سامان ٹین کے ایک صندوق میں بند اسی چارپائی کے نیچے رکھا ہوا تھا اور سر اٹھانے کی جگہ باقی سب کچھ بہتا تو تم ہی جیسے شخص کی ضروریات زندگی میں شامل تھا۔ شیر پنجاب سوپ اور لعب بنگال آلو میرا آکلی سے لے کر سگریٹ کی راکھ، خالی پیکٹ اور تاش کی گڈیوں تک۔ کمرے کی واحد کھڑکی میں نصف لنگی کو بطور پردہ لٹکا دیا گیا تھا۔ لنگی کا بقیہ نصف حصہ دوسرے کمرے کی کھڑکی میں آویزاں تھا اور دونوں میں تھوڑا برابر سوراخ تھے اور ایک جیسا میل تھا۔

میرے ذہن میں خلا تھا چنانچہ میں بان کی چارپائی پر جوتوں سمیت لیٹا سگریٹ کے دھوئیں کو جلی ہوئی چھت کی جانب اٹھتے اور تحلیل ہوتے دیکھتا رہا۔ میرا جسم تھکن سے چور تھا اور دماغ کی کیفیت اس گاڑی جیسی تھی جو مسلسل چلتی رہے اور اس حد تک گرم ہو جائے کہ انجن بند ہو جائے۔ میرا دماغ شل تھا، نہ میں رابعہ کے متعلق سوچ رہا تھا نہ ملاوہ کے انجام کے بارے میں اور نہ اپنے مستقبل کے بارے میں۔ نہ جانے کس وقت سگریٹ میرے ہاتھ سے گر گئی اور مجھے نیند نے آلیا۔ آنکھ کھلی تو بتی کے آجانے کو دیکھنے کے بعد میں نے کلائی کی گھڑی کو دیکھا اس میں نو بج رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ میں کم سے کم دس گھنٹے بے ہوشی کی نیند میں سویا تھا۔ میں ہڑبڑا کے اٹھا تو چارپائی کے قریب ایک اجنبی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ فرش پہ آلتی پالتی مارے دیوار سے ٹیک لگائے اور آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ وہ پینتیس سال کے قریب عمر کا... دبلا پتلا اور درمیانے قد کا ایک جوان آدمی تھا۔ اس کا رنگ صاف تھا چنانچہ شیو کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کے بال بھی اور اس حد تک الجھے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے سال بھر سے کسی نائی کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔ وہ نیلی کی سفید پتلون اور آدھی آستین کی نیلی قمیص میں ملبوس تھا حالانکہ موسم اس وقت بھی خاصا سرد تھا۔ اپنا چہرہ اس نے ایک ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں سگریٹ تھی۔ اس نے سگریٹ کو شہادت اور درمیانی انگلی کے درمیان چلم کی طرح پھنسا لیا تھا۔ جب اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک طویل کش لیا تب بھی اس کی آنکھیں بند رہیں۔ وہ گیان دھیان میں مستغرق درویش نہیں تھا چنانچہ میں نے فرض کر لیا کہ وہ سگریٹ کے ساتھ کوئی نشہ بھی کرتا ہے اور اس نے بیچ پہنچا کے اطمینان کے ساتھ گھر میں موجود کوئی دوست ہی ہو سکتا ہے دشمن نہیں۔ اور میرے لیے جسے میں نے اب تک نہیں دیکھا تھا محسن کا پسندیدہ دوست ثابت ہوا۔

"السلام علیکم جناب!" میں نے کھنکھار کے کہا۔ "میں سکندر ریخت ہوں۔"

www.paksociety.com

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔" وہ آنکھیں کھولے کے متعجب ہوئے بغیر بولا۔ "میں سو فیصد بھی نام کا غالب ہوں لیکن اس وقت مغلوب ہوں کچھ خواہشات سے۔ مثلاً اس وقت یہ شدید اندیشہ ہے کہ مجھے چائے کی ایک پیالی نہ ملی تو میری پیاسی روح خود فریاد کرنے خدا کے حضور حاضر ہو جائے گی اور ممکن ہے لوٹ کر نہ آسکے۔ غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟"

میں ہنس پڑا۔ "تم محسن کے دوست... وہی پلیڈر ہو؟"

"دونوں سے میری سیر کی ثابت ہوئی ہے؟" وہ بولا۔ "رپورٹر سے زیادہ لوفر نظر آتا ہوں اور محسن کی دوستی کے باعث مجھ کو پیاسا ہوں۔ صبح سے یہ آگ اور دھواں پی رہا ہوں اور بس۔"

"میں ابھی چائے بنا کے لاتا ہوں۔ ہم دونوں پئیں گے۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "ذرا اپنی روح کو روک کر رکھنا۔"

وہ آدمی دلچسپ تھا اور اس کی بے تکلفی مجھے پسند آئی۔ وہ محسن کا قابل اعتماد دوست تھا تو برا آدمی کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ابھی تک میں اور وہ نہیں ملے تھے لیکن گفتگو سے مجھے اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ یقینی طور پر وہ گزشتہ شب کی ہنگامہ آرائی میں شریک تھا۔ محسن اور ٹیڈی دوسرے کمرے میں فرش پر کمبلوں میں لپٹے پڑے تھے اور غالباً بہت دیر سے لیٹے تھے کہ ابھی تک بے سدھ تھے۔ میں نے ان کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور سیدھا کچن چلا گیا۔ پھر مجھے اس کافی کا خیال آیا جو میں رات کو مکھن اور ڈبل روٹی کے ساتھ خرید کر لایا تھا۔

"غالب صاحب!" میں نے کمرے میں لوٹ کر کہا۔ "اگر چائے کے بجائے کافی کا موڈ ہو تو بتا دیں؟"

"کافی؟" وہ اچھل پڑا۔ "یا مظہر العجائب۔ حوالات میں کافی؟ کیا واقعی کافی مل سکتی ہے یہاں؟ لاؤ لاؤ اے سکندر اعظم لیکن دیکھو ٹھیک۔ زلف محبوب یا شب مجبور کی تقدیر کی طرح۔ تو شکر... واہ بھئی واہ۔ اس وقت تو چلتے مولا سے کچھ بھی مانگ لیتا۔" وہ میرے پیچھے کچن میں آ گیا۔

"اب بھی وقت ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "مانگ کے تو دیکھو غالب صاحب۔"

"یہ دوسری بار گالی دے دی تم نے مجھے۔" وہ بولا۔ "آئندہ صاحب مت کہنا۔ ایک صاحب تو پہلے ہوتا تھا سفید کھچڑی والا صاحب بہادر تو خود تھا خطاب صحیحوں کو دیتا تھا۔ پھر رہ گیا کالا صاحب۔ آئی سی ایس اور اب سی ایس پی والا بیورو کریٹ صاحب۔ تو بھائی ہم غالب ہی اچھے۔ نہ سر ہیں نہ مولانا۔"

"غالب کیسے بن بیٹھے؟ ضرور بچپن شاعری کے تحت ہم ہو جاتی ہے بیٹے شعر کہو تو اور سناؤ تو پھر۔"

وہ ہنسا۔ "نہیں یار۔ بخت شرمندہ رہتا ہوں بچپن اور سے لیکن حرکت یہ آ جاتی ہی تھی۔ میرا ہونا اور پھر یہ اس قصور میں نے نہیں کیے۔ جو جانے کس کی خواہش نے لکھ دیا تھا کہ اولاد نرینہ ہو تو غالب احمد نام رکھنا۔ پھر غضب یہ ہوا کہ چودہ سال مجھ سے پہلا شعر تولد ہوا۔ شعر تھا کہ بس ایک بار ایسے اور مر گئے۔ فرہاد و قیس سے بڑا کام کر گئے۔ گھر والوں نے کہا کہ میاں غالب تو تم ہو۔ غضب خدا کا اس میں لعل کی شہرت ہو گئی۔ ہم نے بھی مان لیا اور اٹھتے بیٹھتے دنیا زمانہ شعر اس دور شباب کی غلطیاں شمار کرتا ہوں، ہوتا ہوں چھپتا ہوں اور روتا ہوں کہ کاش میں نے یہ نہ کیے ہوتے مگر اپنی کو کے چھپتے ہیں کیسے نہ کہوں گا مگر وہ بدصورت غلیظ اور متعفن شعروں نے نہیں کیے۔ خدا تو بندے کی غلطی شاید معاف کر دے گا مگر مرزا غالب روز حشر میں ہی ہر شعر پر ستر جوتے ماریں گے کہ میرا نام لے کر تھے۔ اب کر کے دیکھو۔"

کافی کا مگ میں نے اسے تھمایا اور ہم کمرے میں لوٹ آئے۔ وہ بے حد باتونی اور انتہائی ذہین آدمی تھا۔ اس کی گفتگو میں ہی نہیں شخصیت میں بھی ایک سحر کر لینے والی ادا تھی۔ کچھ اس کی بے تکلفی، کچھ بے باکی اور صاف گوئی اور سادگی۔

"رات تم لوگ کس وقت لوٹے تھے؟" میں نے ایک سلائس پر مکھن لگا کے اسے پیش کیا۔

"رات کہاں تھی وہ! صبح کی پہلی گھڑی تھی۔" پھر وہ ننگے پاؤں پھیلا کے دیوار کے سہارے بیٹھ گیا تھا۔

"چوہدری دلاور کا کیا بنا؟" میں نے کہا۔

"یار یہ چکر کچھ اپنی سمجھ میں نہیں آیا۔" وہ سلائس کو دانت سے کاٹتے ہوئے بولا۔ "ایک اپنے محسن نے مجھے دوڑایا تھا ایک گرما گرم خبر لے کے چوہدری دلاور کے گھر پہنچو۔ وہاں پولیس بھی موجود ہے اور ایک لاش بھی۔ یہ خبر ہو گی اور اپنے ایل کے پیچھے اس لاش کو دیکھ آؤ۔ بڑی مشکل سے وہاں پہنچا اور خدا کا کیا یہ ہوا کہ پولیس افسر بھی تھا اپنے ہی مطلب کا۔ جتنا مجھ سے دال نہیں گلی۔ اب کل پھر وہی ہوشیار صحافت دار... فلاں جگہ اسی گرما گرم خبر کا حصہ دوم ملے گا۔ یہ نہ ہو خبر رات گئے گم ہو جائے۔ اب ہمارا یار محسن مذاق تو کرتا ہے اپنے ساتھ لیکن یہ بات اور پہلی بار اس نے جو خبر دی تھی وہ انجانی خاصی سنسنی خیز تھی۔ چوہدری صاحب نے ایڈیٹر کا منہ بند کر دیا تھا کہ نہ

نے اور نام کے ساتھ حوالہ نہ آئے۔

"اور اس بار پوری تفصیلات ہوں گی؟" میں نے کہا۔ "پوری کی پوری آپ کے ساتھ۔"

"کہا تو تھا اس نے کہ تصویر کے ساتھ پورے کس کالم کی خبر ہونی چاہیے۔" وہ بولا۔ "بڑی افراتفری میں ایک مختصر سا نوٹ لکھ کے دیا تھا۔ کالم تیار تھا شہر میں نے جگہ نکالی۔ چالیس نسل پرست نے افریقی نسل پرست حکومت کے اقدامات کی مذمت کی تھی۔ میں نے وہ بیان خارج کیا اور چوہدری صاحب کے لیے جگہ نکالی۔"

"کیا کچھ دیا ہے اپنے نیوز فیچر میں؟" میں نے دلی اضطراب کو دبا کے ظاہری بے نیازی سے کہا۔

"سوالیہ دیا ہے کہ مشہور صنعت کار چوہدری دلاور پہلے بھی اپنے ایک ڈرائیور رحمت کیانی کے قتل کے الزام میں گرفتار اور ضمانت پر رہا ہوئے تھے۔" غالب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "پھر انسپکٹر فتح شیر کی گمشدگی کا ذکر ہے۔"

"الطاف عرف طافو کا کوئی حوالہ نہیں آیا؟" میں نے کہا۔

"آیا ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ رحمت کیانی اور الطاف نامی ڈرائیور ایک ہی ٹرک سے کر گئے تھے۔" غالب نے کہا۔ "طافو کا حوالہ اہم تھا ہے۔ دونوں زندگی شیری کے پنجوں سے بچے ہوئے ٹرک سمیت غائب ہو گئے تھے جو چوہدری صاحب کے کارخانے کا مال لے جاتے تھے۔ انسپکٹر فتح شیر کے قتل کے سلسلے میں سامنے آنے والی شہادت ناقابل تردید لگتی ہے۔"

"ایک شب کی محنت وہ رائیگاں نہیں گئی۔" میں نے کہا۔

"خوشی ہوئی یہ جان کر۔"

"کیوں بھئی! تمہیں کس بات سے خوشی ہوئی؟ قتل سے یا قاتل کی گرفتاری سے؟"

"قاتل کی گرفتاری سے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے کچھ لوگ انسپکٹر فتح شیر کے جانی دشمن ہوں لیکن میں ان میں شامل نہیں تھا۔ اس کا قتل بہرحال نہیں چاہتا تھا میں۔"

"لگتا ہے تم چوہدری دلاور کے دشمن ہو۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "اور محسن نے مجھے: انہیں کلیئر ہو! اسٹوری تو پہلے بھی دی تھی لیکن مزید کچھ بتائے بغیر بھاگ گیا تھا۔ خیر اس وقت میں نے کہا تھا محسن کو اتفاق سے ایک بات معلوم ہو گئی تھی جو اس نے مجھے بتا دی تھی لیکن یہ سلسلہ کچھ اور ہے۔ وہ بھی چوہدری دلاور کی جان کا دشمن ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ اس نے کیا بھی اس لیے ہے کہ چوہدری صاحب کے گلے میں پھانسی کا پھندا فٹ ہو جائے۔"

"کیا اب بھی کوئی کسر رہ گئی ہے؟" میں نے کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ اب پھندا ان کے گلے میں ہے۔" غالب نے کہا۔ "خبر چھپنے کے بعد سے۔ یا تو یہ صدا ہم ثبوت لگے ہیں سے واردات کی پوری تفصیل میرے سامنے آ گئی۔ میں نے ایڈیٹر سے کہہ دیا تھا کہ یہ خبر ایسی طرح شائع ہو گی جیسے میں کہوں گا ورنہ میں جا رہا ہوں اس کے حریف اخبار میں کرائم رپورٹر بننے کے لیے اور کل تو سب اخباروں میں کچھ نہیں ہو گا مگر جو پرسوں آنے والا ہے وہ دوسرا ایٹم بم ہے۔ کسی کے باپ کو وہ سب معلوم نہیں ہے جو مجھے معلوم ہے۔"

"تم کو سب کچھ معلوم ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں تو گڑبڑ ہے۔" وہ سگریٹ جلا کے بولا۔ "کہ مجھے سب کچھ معلوم نہیں ہے۔ بے شک محسن نے جھوٹ نہیں بولا تھا لیکن وہ کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا۔ اسے پہلے سے کیسے معلوم تھا اور اس کا یا تمہارا اس کیس سے کیا تعلق ہے؟"

"اچھا! میں سمجھا تھا تم جانتے ہو گے۔" میں نے کہا۔ "محسن نے تم کو بتا دیا ہو گا۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "خبر کو پریس اور چوہدری صاحب کو جیل بھجوا کے میں ادھر آیا کس لیے ہوں؟ پھر یوں تو دس گیارہ بجے تک ادھر ادھر جھک مارتا تھا۔ کسی تھانے سے کچھ لیا، کسی اسپتال سے معلوم کیا اور اگلے دن کے لیے عدالتوں کے کیس دیکھے۔ پھر عموماً گھر لوٹ جاتا تھا ورنہ پھر جو دل وحشی کیے کرتے دوست وہ رہ لینے میں چل۔ یا کسی زہرہ جبیں کے کاشانے میں چل۔ لیکن میں نے محسن سے کہا کہ میں تیرے ساتھ چل سکتا ہوں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آخر یہ چکر کیا ہے۔ اس نے جھٹک دیا مجھے کہ ابھی تو خیر سے یہیں تان کے سو جاؤ۔ صبح بتائیں گے سکندر اعظم خود۔"

"تم اخبار نویس ہو کے ظاہر کر رہے ہو کہ تم کو میرے بارے میں کچھ علم نہیں؟"

"علم تو ہے اور پبلک سے کچھ زیادہ ہے مگر پس پردہ بہت کچھ ہے جو محسن نے نہیں بتایا۔"

"وہ ایسا رازدار اور قابل اعتماد دوست ہے کہ جب تک میری مرضی نہیں ہو گی وہ چپ رہے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم پر اعتماد نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "جب وہ کسی پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ آدمی بھروسے کے قابل ضرور ہوتا ہے مگر پس پردہ واقعات کا سلسلہ اتنا دراز ہے کہ بات تفصیل سے بتانے میں شام ہو جائے گی۔ اور بات پھر بھی ادھوری ہو گی۔ یہ باتیں پھر بھی ہو سکتی ہیں۔ ابھی آپ مجھے یہ بتاؤ کہ وہاں کیا ہوا؟"

www.paksociety.com

"یعنی عجیب پُراسرار معاملہ ہے۔" وہ دوسری سگریٹ جلا کے بولا۔ "کس کا یقین کیا جائے کس کا نہ کیا جائے! دلاور چلا رہا تھا کہ اس کے خلاف سازش کی گئی ہے اور اسے باقاعدہ جال پھیلا کے شکار کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات اس نے پہلی واردات کا راز فاش ہونے پر بھی کہی تھی اور ہر مجرم کہتا تو یہی ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اگر واقعات کی شہادت اس کے خلاف جاتی ہو تو کہتا ہے دشمنوں نے اسے پھنسایا ہے۔"

"شک کس بات کا ہے؟" میں نے کہا۔ "تم دلاور کو بے گناہ کیوں سمجھتے ہو؟"

"وہ۔۔۔ مجھے اس پر دلاور کا کبھی گمان نہیں ہوا۔ ایسا لگتا تھا وہ سچ بول رہا ہے۔" غالب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "مگر دوسری طرف حالات و واقعات سے اس کا سچ بالکل جھوٹ ثابت ہوتا تھا۔ میں تو اخبار کے دفتر سے رپورٹ دے کر نکلنے ہی والا تھا جب محسن کا فون آیا کہ فوراً پہنچو۔ میں نے کہا۔ آج کا کام کل پر نہیں چھوڑا جا سکتا؟ وہ کہنے لگا کہ بعد میں شکایت نہ کرنا۔ یہ اسی خبر کی دوسری کڑی ہے۔ سیٹھ دلاور نے دو قتل کیے ہیں۔ ایک کی خبر سب سے پہلے تم نے دی تھی۔ یہ دوسری اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ دوسرے قتل کی واردات ہے اور ایک معاملہ تو بہت سنگین ہے۔ ایک پولیس سب انسپکٹر ہے فتح شیر، وہ رات اچانک غائب ہو گیا تھا۔ اس کی لاش فلاں جگہ پڑی ہے۔ میں نے کہا۔ تم کو کیسے معلوم ہوا؟ وہ کہنے لگا کہ خبر سے تعلق رکھو۔ کیوں اور کیسے مت کرو۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ سیٹھ دلاور نے رحمت کی گاڑی کے ساتھی ڈرائیور کو بھی قتل کر دیا ہے۔ وہ اس کو دفن کرنے والا تھا گھر کے عقبی حصے میں کہ کسی نے پولیس کو خبر دے دی۔ میں نے کہا۔ مجرم نے تو نہیں دی تھی؟ وہ کہنے لگا۔ یہی سمجھو۔ بہرحال انسپکٹر فتح شیر وہاں پہنچا اور اس نے سیٹھ دلاور کو لاش دفن کرنے سے پہلے پکڑ لیا۔ دلاور قبر کھود رہا تھا اور لاش وہیں کمبل میں لپٹی ہوئی پڑی تھی لیکن دلاور نے انسپکٹر کو پانچ لاکھ دے کر معاملہ ختم کر دیا۔ انسپکٹر کے ساتھ چار سپاہی بھی تھے۔ انہیں اپنا حصہ ملا اور ایس ایچ او تھانہ کو بھی ملا ہوگا لیکن دلاور نے بعد میں فتح شیر کو ٹھکانے لگا دیا تاکہ گواہ کوئی نہ رہے اور اسے پھر بلیک میل نہ کرے۔ میں نے کہا۔ میاں محسن۔ ہماری بھی کچھ صحافت۔ یہ تم اتنی بال کی کھال کیسے نکالتے ہو۔ نہ تم پولیس میں ہو نہ سی آئی ڈی میں۔ فرشتے بتا جاتے ہیں یہ سب کچھ تمہیں؟ وہ پھر کہنے لگا کہ اس وقت باتوں میں وقت ضائع کرو گے تو مرغ تیج کھو دو گے۔ آخر خوش و دوست بھول گیا تھا کہ میں بے وقوف نہیں بنا ہوں۔

میری بات غلط ثابت ہو تو مجھ سے کہنا۔ پھر میں کیا کرتا، مارے گیا۔ ایک شیطانی عجیب خبر ہے اپنے پاس۔ ایک ایسا ... کی دو موٹی چیلوں والی سواری۔ اس کو جھٹلانے پھر سے کہا ... میں۔ اب جو ویسے ہوئے ہیں پہنچا تو وہاں ایک کچھ ... باتیں افراد نے جا بلفظوں گھیر رکھا تھا جو ٹیکسی میں پہنچے تھے۔ کسی عقلمند نے ٹیکسی کی ہوا بھی نکال دی تھی۔ میں نے بتایا کہ میں بعد میں آیا ہوں اور بس لوگوں کے ساتھ پولیس کو ... لگ گیا تھا۔ پولیس کے ساتھ ایک لطیفہ ہوا کہ ایک شخص خود کو اس خالی کوٹھی کا چوکیدار بتایا۔ یہی کہا کہ کوٹھی دلاور ایڈووکیٹ کی ہے لیکن وہ اس میں رہتے نہیں ہیں۔ وہ ہفتے میں ایک دن کے لیے شہر جاتا ہے چھٹیوں سے ... باقی چھ دن یہیں رہتا ہے۔ اس نے آج واپس آنے لگا عجیب سی بو محسوس کی اور پھر دیکھا تو اوپر والے ایک باتھ روم میں لاش نظر آئی۔ اس نے فوراً پولیس کو فون کر دیا۔ جس وقت پولیس لاش کی شناخت کر رہی تھی اور ضابطے کی کارروائی میں مصروف تھی اس وقت خود کو چوکیدار کہنے والا غائب ہو گیا۔ کو اندر سے دلاور کی کار بھی ملی اور جب چاروں نے دیکھا کہ وہ ایک پولیس افسر کے قتل میں پھنس گئے ہیں تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ ان کو دلاور نے بھیجا تھا اور کہا تھا کہ یہاں ایک مفرور مجرم ملے گا جس کی گرفتاری پر دس ہزار کا انعام ہے جو خود اس نے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ بعد میں پولیس نے چوکیدار کو تلاش کیا تو وہ بھی غائب اور اس کے ساتھی بھی۔ جو پہنچے وہ صرف تماشائی تھے اور کچھ نہیں جانتے تھے لیکن دھر لیے گئے۔ پولیس نے کہا یہ نہ سمجھو بعد میں ایک گواہ نہ ملے۔ وہ بہت رونے پیٹنے لگے کسی نے ان کی ایک نہ سنی۔ وہ آگئے تھے جو پہلے پیش پیش تھے اپنا کام کر کے نکل گئے تھے اور اب بندۂ حقیر کا خیال یہ ہے کہ وہ صرف دلاور کو اور اس کے ساتھی کو پکڑوانے کے لیے بیٹھے تھے۔ یہیں سے مجھے شبہ ہوا کہ دلاور سچ کہتا ہو اور واقعی اسے پھنسایا گیا ہو۔ مگر وہ ... میں بہت سے دلچسپ انکشافات ہونے۔ پولیس نے فوراً تفتیش کا آغاز کر دیا تھا۔ قتل کسی عام آدمی کا ہوتا تو وہ مشتعل ہوتے مگر ایک پولیس افسر کا قتل ہوا تھا۔ پورے پولیس کے محکمے اور اقتدار اعلیٰ کے منہ پر طمانچہ تھا۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے نام سے تھر تھر کانپنے لگیں۔ ان کو دیکھ کر خفقان قلب میں مبتلا ہو جائیں اور ان کے اشارۂ ابرو پر عزت و آبرو اور مال کا نذرانہ پیش کر دیں۔ ان کی یہ جرأت کہ ایک پولیس افسر کو مار دیں، اسے قتل کر دیں جو قانون کو پکڑتا ہے اور تحقیق کے

پولیس کے اختیارات اپنے پاس رکھتا ہے۔ میں جناب سکندر اعظم! انہوں نے خیال کر لی میں نے آپ تحقیق اٹھنے کے، ڈنڈے اور ہر دختران کی سمتیاں اور اپنی ہتھیلیاں۔ پہلے تو چار ملزمان کی شامت آئی۔ انہوں نے بہت جلد اگل دیا کہ وہ کون ہیں۔ ترکھا اور مرادشٹی کے بدمعاش تھے۔ ٹیکسی چوری کی تھی۔ پھر گواہوں کی جا بھی سنی۔ پریشانی ہوئی مگر ان میں سے کسی نے قبول نہیں کیا کہ اس نے پولیس کو فون کیا تھا یا وہ ان میں سے کسی کو جانتا ہے جو کھیل تھے۔ یہ سب چھوٹے لوگوں کے شوفر اور نوکر وغیرہ تھے چنانچہ تمام بے اعتماد تھے کہ ان کا صاحب انہیں تھانے سے چھڑا لے جائے گا۔ جب کوٹھی کے اندر ہی سے دلاور کی کار بھی دریافت ہوئی تو کچھ اور شواہد سامنے آئے۔ ایک تو یہ کہ گاڑی پر گرد نہیں تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ گاڑی وہاں زیادہ عرصہ کھڑی نہیں رہی۔ اس کی بیٹری بھی ٹھیک تھی اور پیٹرول ٹینک بھی آدھا بھرا ہوا تھا۔ چاروں پہیوں میں ہوا پوری تھی صرف ڈگی میں رکھا ہوا ٹائر فلیٹ تھا۔ کاغذات دیکھتے ہی معلوم ہو گیا کہ گاڑی کس کی ہے۔ چابیاں اسی میں لگی ہوئی تھیں۔ جانے پولیس والے ادھر ادھر بھاگے کہ دلاور زیادہ دور نہیں ہوگا۔ اگر وہ بھی کرائے کے چار بدمعاشوں کے پیچھے لگا ہوا تھا پہلے سے کوٹھی میں موجود تھا مگر اس نے جب معاملہ بگڑتے دیکھا تو فوراً جائے واردات سے فرار ہو گیا۔ کیونکہ اس وقت گاڑی کا نکلنا مشکل تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ پہلے اپنی جان بچانے کی فکر کی جائے گاڑی نکالنے کی بعد میں۔ اب خدا آپ کا بھلا کرے گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ چوہدری دلاور کی شامت آئی تو وہ بھی جائے واردات کی طرف چل پڑا۔ معلوم نہیں کیوں بہت سے اعتماد تھا کہ وہ کرائے کے مجرم اس اشتہاری مجرم کو پکڑ سکیں گے۔"

"تم نے اب تک اشتہاری مجرم کا نام نہیں لیا۔" میں نے توجہ دلاتے کہا۔

وہ ہنسا۔ "بہت شوق ہے اپنا نام سننے کا! میاں سکندر اعظم! تم کوئی غیر معروف شخصیت ہو گئے ہو؟ ارے بھائی تم ان کی بات ہے جب تمہاری تصویر ہر اخبار میں چھپی تھی۔ پولیس کا حافظہ اتنا کمزور نہیں ہے مگر ایک تو پولیس کا چہرہ نہیں بھول سکتا۔ دوسرے ہم جیسے سرپھرے یادداشت پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔ تمہارے نام سے منسوب داستانیں کمال بندۂ حقیر نے ہی تحریر کیا تھا۔ اور خدا گواہ کہ اس میں زیب داستاں کے لیے کچھ نہیں بڑھایا تھا۔ ورنہ تو کرائم رپورٹنگ کی مرضی تھی کہ قاتل کو فرشتہ بنا دے اور فرشتے کو قاتل۔ تمہارا نام رابعہ

قانونی ایڈووکیٹ کے ساتھ یوں آیا کہ مجھے رشک آیا۔ مجنوں کی خاطر لیلیٰ نے خود کو یوں خوار و برباد کیا تھا نہ فرہاد کے لیے شیریں نے۔ میں نے رابعہ کو دیکھا بھی ہے بلکہ اس کی پہلی شادی میں شریک بھی تھا۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ "تم۔۔۔ تم جانتے ہو اس کے سابق شوہر کو؟"

وہ عیاری سے مسکرایا۔ "میں اس کا دوست تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اسے شادی نہیں کرنی چاہیے اور سوچا بھی تھا کہ ایک شریف لڑکی کی زندگی بچانے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ دوستی کا بھرم رکھنا زیادہ اہم ہے یا سچ بولنا۔ اور ظاہر ہے میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر وہ کہنے لگا کہ میرے معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اس کی زندگی تباہ نہیں کروں گا اور خود کو بھی باعزت طور پر بچا لوں گا لیکن تم نے سقراط بن کے دخل اندازی کی تو میرا کچھ نہیں، میں خودکشی کر لوں گا۔ اور بات ختم۔ مگر اس کے بعد میرے والدین بھی زندہ نہ رہیں گے۔ سب کے قتل کا الزام لینے کی ہمت رکھتے ہو تو نیک کام میں دیر کیسی؟ ان کو خوشیوں سے محروم کر کے کیوں مارتے ہو؟ خوشی کی تمنا سے پہلے ہی قتل کر دو۔ مجھے اور انہیں زہر دے دو یا گولی مار دو۔ میں ایک تحریری بیان چھوڑ جاتا ہوں تم کو کہ میں نے والدین کو قتل کر کے خودکشی کر لی ہے۔ تم اخبار نویس ہو، خبر کو مرضی کے مطابق بنا لینا۔ دنیا یہی سمجھے گی کہ میں پاگل ہو گیا تھا۔ یہ تو نہیں کہے گی کہ بے غیرت تھا۔ خیر میں نے اس سے بحث کی تو اس نے مجھے بتا دیا کہ وہ کیا کرے گا۔ اس کی دھمکی سے میں ڈر گیا تھا۔ بعد میں وہی ہوا۔ یعنی اس نے رابعہ سے نکاح تو کیا مگر رخصتی کو ٹالتا رہا۔ یہاں تک کہ والدین دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پھر اس نے رابعہ کو خاموشی سے طلاق دے دی۔ پرانی بات ہے۔ یہ میرا وہ دوست زندہ ہے اور بہت بڑے عہدے پر ہے۔ زندگی سے کیسے پیار نہیں ہوتا۔ اب اگر قدرت نے اس کے ساتھ ناانصافی کی تھی تو کیا ہوا۔ باقی ہر لحاظ سے تو وہ ایک کامیاب اور مکمل انسان ہے۔ جینے کا حق تو ہے اسے۔"

"اچھا۔ تو خوب گاڑھی چھن رہی ہے؟" محسن نے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کے منہ پھاڑا اور جمائی لی۔ "رات کو کیسے گھوڑے بیچ کے سو گیا تھا۔ میں اور ٹیڈی گھوڑے کی طرح ظلمات میں دوڑتے پھر رہے تھے۔ ہماری کوئی فکر نہیں تھی جناب کو خواب شیریں کے مزے لے رہے تھے۔" شیریں یعنی رابعہ! اس نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔

"کیوں؟ شیریں یعنی شہلا کیوں نہیں؟" میں نے غرا کے

www.paksociety.com

کہا: "ہم نے کبھی تیرے خواب جسٹس کیے ہیں گھوڑے۔ ہاں جی غالب جی۔ اے بھنبھناتے ورن آپ۔ بیان جاری رکھیں۔ پھر دلاور کہاں ملا؟" میں نے جلدی سے پوچھتے موضوع بدل دیا اور یہ ظاہر کیا کہ ہم رابعہ کی بات ہی نہیں کر رہے تھے۔

"بس بھی سکندر اعظم!" غالب معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "پہلے تو ادھر ادھر بھاگتی پھر رہی تھی اور اکا دکا راہگیروں سے مشغول پوچھ بھی رہی تھی کہ انھوں نے اس حلیے اور اس قماش کا کوئی آدمی تو نہیں دیکھا۔ ایک پولیس والے کے سامنے کون تسلیم کرتا کہ اس نے دیکھا ہے۔ میں نے سوچا کہ خبر تو بن ہی گئی۔ اب آفس چل کے لگا دیتے ہیں۔ فوری طور پر چھاپا دو معلوم ہونے کا امکان نہیں تھا۔ اب ضابطے کی کارروائی ہو گی تو تاریخ سب کو ہی معلوم ہوں گے لیکن صبح کسی اور اخبار میں یہ سرخی نہیں ہو گی کہ رحمت کباڑی کے قتل میں ضمانت پر رہا ہونے والے صنعت کار چوہدری دلاور پر انسپکٹر فتح شیر کے قتل کا الزام۔"

میرے ذہن میں ذیلی سرخیاں بھی تھیں اور کچھ خبر سے متعلق مواد۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اتنے کم وقت میں رحمت کباڑی اور دلاور کی تصویریں بھی نکالنی ہیں چنانچہ مجھے پہلے کیس سے ایڈیٹر کو فون کر دینا چاہیے۔ اچانک میں نے سڑک کے درمیان کھڑی ہوئی گاڑی کو دیکھا۔ وہ کچھ ترچھی کھڑی تھی۔ اس طرح کہ سڑک بلاک ہو گئی تھی۔ ادھر ٹریفک تو ہے نہیں اور رات کو تو بالکل نہیں ہوتی۔ ایک شخص کار کے پاس کھڑا تھا۔ میں سمجھا کہ گاڑی خراب ہو گئی ہے ورنہ شریف آدمی اپنی گاڑی کنارے پر کھڑی کرتے ہیں۔ اتنی دیر میں دلاور نے مجھے آواز دی۔ شامت اسی طرح بلاتی ہے آدمی کو۔ وہ بلاتا تو میں اس کی صورت پہ تھوکے بغیر نکل جاتا۔ مجھے فرصت بھی نہیں تھی کہ اس کی مدد کرتا اور گزشتہ ہفتے کی بیماری کے بعد اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ کم سے کم دھکا لگا کے گاڑی کو ایک طرف کرا دیتا۔ اس کی آواز پر میں مجبور ہو گیا اور دلاور نے کہا کہ اس کی گاڑی کا پچھلا ٹائر برسٹ ہو گیا ہے چنانچہ میں اگر ہاتھ لگاؤں تو وہ گاڑی کنارے پر لگا دے۔ میری ناک دیکھی تم نے؟"

اس غیر متوقع سوال نے مجھے دنگ کر دیا۔ "ناک! کیا ہوا تمہاری ناک کو؟ اور ناک کیسے آ گئی یہاں؟"

"یہ بہت اسپیشل ناک ہے۔" وہ اپنی ناک پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "تم اس کو کتے کی ناک کہو تو میں برا نہیں مانوں گا۔ لوگ تو میری عادتوں کی وجہ سے مجھے کتے کی دُم کہتے ہیں۔ میری ناک صرف حساس ہے ہر قسم کی بو کا بہت طاقت ور ڈیٹیکٹر ہے۔ مجھے کچھ ٹائر جلنے کی بو محسوس ہوئی۔ ٹائر برسٹ ہوتا ہے تو بو نہیں آتی۔ لیکن اس بُو سے الگ ایک بُو تھی۔ بارود کی! کسی نے کچھ دیر پہلے پستول چلایا ہو۔ لیکن پستول تو بے آواز بھی چلایا جاتا ہے اور چلاتا تو کیا میرے کان آواز نہ سنتے۔ مجھے شب برات کا بھی نہیں تھا اور اس وقت دور کوئی کیا بم کا بھی پتا نہ تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا تو مجھے ہو جانے والے ٹائر میں سوراخ نظر آ گیا جیسے کنارے سے ... ہو گئے تھے۔ "یہ ٹائر خود تو برسٹ نہیں ہوا؟" میں نے ... "نیا ٹائر تھا!"

"تم نے اندھیرے میں یہ سب کیسے دیکھا؟" میں نے پوچھا۔
"تمھیں کس نے بتایا کہ وہاں اندھیرا تھا؟" غالب نے مجھے غور سے دیکھا۔ یہ غلطی مجھ سے غیر ارادی طور پر ہوئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ دلاور کی گاڑی پہلے ہی میں نے کس جگہ کیا تھا اور جب غالب مجھے دلاور سے ملاقات کا حال سنا رہا تھا تو میری آنکھیں اس مقام کو دیکھ رہی تھیں جہاں سے میں دلاور کو بے بس اور مجبور چھوڑ کے فرار ہوا تھا۔ وہ اندھیری سڑک تھی اور کوئی اسٹریٹ لائٹ روشن نظر نہیں آ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے تھے یا نہیں، مجھے یاد نہ تھا اور میں نے فرض کر لیا تھا کہ اس اندھیری سڑک پہ اندھیرا ہی رہتا ہو گا۔ حالانکہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس وقت اسٹریٹ لائٹ بند ہو۔

"وہ... در اصل تم نے خود کہا ہے ناکہ رات؟" میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔ "ادھر چاندنی تو نظر آ رہی تھی؟"

وہ کچھ دیر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "آدمی ہو۔" اس نے بالآخر کہا۔ "اچھا نکتہ تلاش کر لیا اپنے لیے مگر کیا اجالا صرف چاندنی سے ہوتا ہے؟ اس کارپوریشن نے اور کینٹ بورڈ نے سڑکوں پر روشنی کا کوئی انتظام نہیں کر رکھا ہے؟ وہاں بھی ایک پول تھا اور اس کی روشنی پیچھے سے کار کی ڈکی کے نیچے پھیل رہی تھی۔ اسی روشنی میں مجھے گولی کا نشان نظر آ گیا تھا اور قریب سے دیکھنے پر میری ناک زیادہ فعال ہو گئی تھی۔ میں نے دلاور کی خاموشی پہ اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے کچھ نروس نظر آیا۔ اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا لیکن میں نے اسے فوراً شناخت کر لیا۔ 'در اصل... وہ بدمعاش بھاگ گیا جس نے مجھ پہ گولی چلائی تھی۔' وہ بولا۔ 'لوٹنا چاہتا تھا مجھے۔ اتفاق سے ایک گاڑی آ گئی۔' اس کی بات بالکل بے تکی تھی۔ اس نے سوچا ہی نہ تھا کہ دو کسی سے دھکا لگانے کے لیے مدد کرنے والا آخر کار ... ثابت ہو گا کہ ایک سیکنڈ میں ...

کے برسٹ ہونے کا سبب جان لے گا۔ اسے کچھ تو کہنا ہی تھا لیکن خوف زدہ مجرم 'الزام گناہ' والی بات ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "عجیب بے وقوف آدمی تھا۔ پہلے اس نے آپ کو روکنے کے لیے گاڑی کے ٹائر پہ فائر کیا اور یہ نہیں سوچا کہ اس طرح گاڑی بے قابو ہو کے الٹ بھی سکتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ پیٹرول ٹینک اس ٹائر سے چند انچ اوپر تھا۔ نشانہ ذرا بھی غلط ہوتا تو ٹینک برسٹ ہوتا۔ گاڑی میں آگ لگ جاتی۔ پھر وہ کسے لوٹتا؟ اور پھر وہ گاڑی کی آواز پر بھاگ گیا؟ وہ پولیس کی گاڑی تو نہیں تھی۔ اگر اس کا نشانہ اتنا ہی اچھا تھا تو وہ پروفیشنل ہو گا یا پرانا پاپی۔ ایسے لوگ ڈرتے نہیں۔ وہ ریوالور کا منہ آپ کی طرف کیے کھڑا رہتا اور مسکراتا۔ گاڑی والا دیکھتا تو سمجھتا کہ دو دوست باتوں میں مصروف ہیں اور سیدھا گزر جاتا۔ مگر اب میری بھی یہ شرط ہے کہ ضرورت سے زیادہ بولتا ہوں۔' چوہدری دلاور بھاگ گیا۔ کہنے لگا کہ میں نے تم کو مدد کے لیے بلایا تھا، دماغ چاٹنے کے لیے نہیں، سراغرساں کی اولاد۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ میں نے کہا کہ چوہدری دلاور صاحب۔ اگر میں دفع ہونے سے انکار کر دوں تو آپ کیا کریں گے؟ معلوم ہے اس نے جواب میں کیا کہا؟"

"اس نے تمہاری ناک پہ مکا مارا ہو گا اور اس کا راڈار سسٹم تباہ کر دیا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"بالکل۔ اس نے صرف راڈار سسٹم ہی نہیں، میرے دوسرے سسٹم بھی تباہ کر دیے تھے۔ کیا کہتے ہیں ان کو حواس خمسہ۔" غالب نے سگریٹ کا دھواں اچھال کے کہا۔ "جیسے ہی میرے ہونٹوں سے اس کا نام نکلا اس کے ہونٹوں سے ایک گالی نکلی اور وہ اچھلا۔ پلک جھپکنے میں اس نے جیب سے ریوالور نکال لیا۔ 'کون ہو تم؟ کتے کے بچے۔' وہ دانت پیس کر بولا۔ اب اس وقت میں کہتا کہ چوہدری صاحب میں باپ ہوں آپ کا تو وہ مانتا؟ بچا لیتا تو جان سے جاتا۔ وہ مجھے اپنے خلاف اتنا بڑا سکینڈل اخبار کے دفتر تک کبھی نہ جانے دیتا۔ چنانچہ میں نے کہا 'حضور۔ آپ کا پرانا نمک خوار ہوں۔ پہچانا نہیں آپ نے؟ ... صاحب کا اسسٹنٹ تھا ... دفتر میں۔ اکاؤنٹ اسسٹنٹ۔' میرا مقصد تھا کہ اب کسی طرح جان چھڑاؤں اور گاڑی کو ... دلاور کا شک دور کرکے جلد از جلد نکل جاؤں۔ میں سمجھا کہ جیسے میرے ساتھ زور لگانے لگا مگر وہ گھوم کر میرے قریب آ گیا۔ 'تم جھوٹ بول رہے ہو۔' اس نے میری صورت پر غور کر کے کہا۔ 'تم کبھی اس کے اسسٹنٹ نہیں رہے۔ تم نے اس کا نام استعمال کیا ہے اپنی جان بچانے کے لیے۔

سچ بتاؤ تم مجھے کیسے جانتے ہو؟ تم کوئی بہت چالاک اور مکار آدمی ہو مگر خیال رکھنا کہ میں بھی کم بے رحم نہیں ہوں۔ آدمی کو اتنی ہی آسانی سے گولی مار دیتا ہوں جتنی آسانی سے کارپوریشن والے کتے کو مارتے ہیں۔ تمہاری شکل مجھے دیکھی ہوئی لگتی ہے لیکن ذہن میں نہیں آ رہا ہے کہ تم دوست ہو یا دشمن۔ اس وقت تمہارا اور میرا یہاں ملنا اتفاق نہیں ہے۔' میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کہوں۔ شاید اتنی دیر میں اسے یاد آ گیا۔ اس نے ہاتھ گھمایا اور ریوالور میرے سر پہ مارا۔"

میں سوچ رہا تھا کہ ایک ریوالور تو میں نے دلاور سے خالی کرا لیا تھا۔ دوسرا سائلنسر والا خود گاڑی کے کمپارٹمنٹ میں سے نکال لیا تھا اور اسی سے نشانہ لے کر ٹائر پھاڑا تھا۔ یہ وہی خالی ریوالور ہو گا جو میں چھوڑ آیا تھا اور دلاور نے غالب کے سر پہ مارا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ غالب خاموش ہے۔ شیدی بھی باب اٹھ چکا تھا اور محسن کے ساتھ کچن میں مصروف تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"مجھے کیا معلوم؟" غالب بولا۔ "خبیث نے ذرا بھی تو لحاظ نہیں کیا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو وہ گاڑی سمیت غائب ہو چکا تھا۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح غالب کو دیکھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا؟" غالب بولا۔ "میں بے ہوش ہو گیا تھا اور گھنٹا بھر بے ہوش پڑا رہا تھا۔ اس لیے صرف قیاس آرائی کی بنیاد پر بتا سکتا ہوں کہ اس نے پہیہ وہیں بدلا ہو گا اور گاڑی نے سڑک کو بلاک تو کر رکھا ہو گا مگر اس نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ اس وقت پارکنگ کے اصولوں کا خیال رکھنا کتنی خطرناک حماقت بن گیا ہے۔ وہ جائے واردات کے بہت قریب تھا اور اس کے لیے فرار ہونے میں ہی عافیت تھی۔ وہ پکڑا جاتا تو انکار کیسے کرتا اور کیا بتاتا کہ گھر سے اتنی دور وہ کیا لینے آیا ہے؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو یا سچ۔" میں نے کہا۔ "پہلے تم نے کہا تھا کہ تم اس کے بارے میں تین کالمی سرخی اور تصویر کے ساتھ خبر دے چکے ہو۔"

"اس میں جھوٹ کیا ہے؟" وہ بولا۔ "اخبار دیکھ لینا۔ یقین آ جائے گا۔"

"لیکن تم نے یہ بھی تو کہا ہے کہ دلاور نے تمہیں ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ اور تم ایک گھنٹا بے ہوش پڑے رہے تھے؟"

"یہ بھی سچ ہے لیکن خبر میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ بے ہوش...

www.paksociety.com

میں آتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے ایڈیٹر صاحب کو فون کیا اور ساری خبر کٹوا دی۔" غالب نے کہا۔ "اخبار کچھ لیٹ تو ہوا مگر......"

"مگر مرزا غالب! جلاد گرفتار تو نہیں ہوا۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"نہیں! میں نے کب کہا ہے کہ وہ گرفتار کر لیا گیا ہے؟" غالب نے سکون سے کہا۔ "خبر اتنی ہی ہے جو میں نے سنائی ہے اور اس میں گرفتاری کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف الزام کی بات ہے جو پولیس نے عائد کیا ہے کیونکہ اس کی گاڑی جائے واردات پر ملی اور اس کے خلاف چار افراد نے ایک ہی بیان دیا ہے۔"

"لیکن یہ تو صریحاً قتل کی واردات تھی۔" میں نے کہا۔ "جلاد نے پہلے مالو کو قتل کیا۔ پھر اس معاملے کو دبانے کے لیے انسپکٹر فیروز کو استعمال کیا اور پھر بالآخر اسے بھی ٹھکانے لگا دیا؟"

"یہ تو وہ کہانی ہے جو مجھے محسن نے بھی سنائی تھی۔" وہ ہنسا۔ "میاں سکندر اعظم! اس قدر سنسنی خیز بات خبر نہیں بنتی۔ ممکن ہے تفتیش ہو تو یہ بات بھی ثابت ہو جائے لیکن ابھی کیا ثبوت ہے کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ کوئی چشم دید گواہ ہے نہ آلۂ قتل۔ یہ لکھ دیتا محض اس لیے کہ میرے دوست محسن نے بتایا ہے اس لیے یہ سچ ہے؟"

"ثبوت بھی مل جائیں گے اور چشم دید گواہ بھی۔" میں نے کہا۔

"جب جیسے کی ہاں کب تک خبر بنا سکے گی؟"

"ابھی تک تو یہ اخبار کی حد تک ہے۔" غالب بولا۔ "اب مجھ سے پوچھو کہ مجھے ناک آؤٹ کرنے کے بعد فرار ہو کے جلاد کدھر گیا ہوگا۔ بھاگ گیا ہوگا کسی تھانے اور وہاں اس نے تھانیدار کو رشوت دے کر ایک رپورٹ لکھوائی ہوگی کہ میری گاڑی اس علاقے سے چوری ہو گئی ہے۔ فرض کرو کسی تھانے میں آخری واردات کی رپورٹ شام چار یا پانچ بجے درج ہوتی ہے وہاں اگلی رپورٹ دس پندرہ منٹ کے فرق سے درج کی جا سکتی ہے۔ کسی دوسرے تھانے میں گنجائش نکل آتی ہے۔ گنجائش تو ہاں سے نکلتی ہے۔ اس نے کہا ہوگا کہ وہ کسی کام سے آیا تھا اور گاڑی کھڑی کر کے گیا تھا۔ واپس آ کے یہاں سے گاڑی کو غائب پایا۔"

"لیکن اس طرح لاہور کے ہر تھانے میں جانے کے لیے وقت ہی کہاں تھا؟"

"ہو سکے شاہ۔ وہ اپنے کسی واقف تھانیدار کے پاس گیا ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "اور جا قدرت کو گولی مارو۔ وہ سب سے قریب یعنی دھرم پورہ کے تھانے میں پہنچا۔ ہزار روپے پر رکھا ایس ایچ او کے ہاتھ پر کہ ٹیلی فون کر کے اتنا معلوم کر دے کہ کس تھانے میں رپورٹ لکھوائی جا سکتی ہے۔ ایس ایچ او نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ایک تو جلاد کی مدد کر دی پھر دوسرے کسی ایس ایچ او کو بتا دیا کہ ایک اسامی دو سال گزرنے ہے۔ فرض کرو تھانہ کرشن نگر کا ایس ایچ او کہتا ہے کہ میرے تھانے میں آخری ایف آئی آر پانچ بجے کاٹی گئی تھی۔ وہ دوسرے ادھر گھنٹے میں کرشن نگر جا کے اپنی رپورٹ سوا پانچ بجے کا ٹائم لکھوا دیا۔ اس کی پوزیشن محفوظ ہو گئی۔ سوا پانچ بجے کے بعد وہ قتل کیسے کر سکتا ہے؟ یہ پولیس معلوم کرے۔ سابقہ تعارف کی کوئی بات ہو تو سابقہ تعارف جواب دے ورنہ پولیس بتائے۔ اور پولیس یہ بتائے گی کہ گزشتہ روز سرقے کی فلاں واردات میں اس کا استعمال ہوئی تھی۔ کون تردید کرے گا پولیس کی؟"

"نہ یہ کسی کے سر تھوپ دیں گے کہ گاڑی تھی؟"

"میں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ اس سے عبرت پکڑ سکو تو ضرور پکڑو۔" غالب نے کہا۔ "سال بھر پہلے پولیس نے دو ڈاکو پکڑے۔ انہوں نے ایک ڈاکٹر کو لوٹا اور اس سے کار چھینی تھی جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ کسی دوست کے گھر سے لوٹ رہا تھا۔ پھر انہوں نے ایک جج کے گھر میں ڈاکا ڈالا جہاں سے ان کو دو لاکھ کے زیورات ملے، نقد اور پرائز بانڈ بھی اور ڈی ایف سی کے شیئر سرٹیفکیٹ اور کالے دھن کا کوئی اندازہ نہیں۔ پولیس کی ایک گشتی پارٹی نے انہیں اس وقت گرفتار کیا جب وہ گاڑی چھوڑ کر فرار ہو رہے تھے۔ ڈاکوؤں سے تو معاملہ طے پا گیا۔ نقدی یا مال کے بدلے آزادی کے معاہدے پر۔ وہ گرفتار ہوتے تو کتنے کیس بنتے؛ گاڑی چھیننے کا ایک، ناجائز طور پر ریوالور رکھنے کا دوسرا آرمز ایکٹ کے تحت، ڈی کا ڈاکہ تیسرا۔ وہ کم سے کم سات سال کے لیے اندر جاتے۔ پولیس نے مال تقسیم کیا اور گاڑی قبضے میں کر لی کہ فلاں جگہ کھڑی ہوئی ملی۔ کی تحویل میں ایک مخبر بھی تھا جو پولیس کا اپنا آدمی تھا۔ مشکوک چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ جس گھر میں وہ چوری کرنے گیا تھا اس گھر کے لوگوں نے چور کو تھانے پہنچایا اور بہت تھوڑی ہو کر پٹا تو مارا۔ وہ کریٹ ہولڈر لاکھ نقد چرا کے بھاگنے والا تھا۔ پولیس نے چور کو فوراً حوالات میں بند کر دیا اور اگلے دن تفتیش شروع کی۔ پہلے تو گھر والوں سے ثبوت مانگا گیا کہ دو لاکھ کہاں سے آیا تھا؟ کتنے دن کی کمائی تھی؟ ایک جج کی بیوی؟ جمع شدہ کمائی تھی ہوا۔ انہوں نے کہا کہ ایک عید اور آنا تھی جہیز کے باعث تین دن بند رہے تھے۔ پولیس نے کہا جہاں تو تین دن کی کمائی تھی۔ انکم ٹیکس کتنا دیتے ہو؟ نکالو۔ انہیں ہر روز تھانے بلا کے گھنٹوں بٹھایا جاتا تھا۔

www.paksociety.com

اور وہ دیکھتے تھے کہ چور واقعی حوالات میں بند ہے۔ ان کی اپنی حالت اس تفتیش کے چکر میں خراب ہو گئی۔ وہ کاروباری لوگ ہر روز کس طرح تھانے جاتے اور جاتے تو کاروبار کون سنبھالتا۔ رپورٹ کر کے پھنس گئے تھے۔ پانچ ہزار دے کر انھوں نے اپنی جان چھڑائی۔ پولیس کے پاس صرف مجرم رہ گیا۔ انھوں نے اس مجرم کو دوسری جگہ استعمال کیا۔ جب گاڑی چھین کر ڈاکا ڈالنے والے پولیس سے سودا کر کے نکل گئے تو اس مجبور نے ڈکیتی کی واردات کی ذمہ داری قبول کر لی۔ میں خود ایس ایچ او کے کمرے میں موجود تھا جب وہ میاں بیوی آئے اور ان کے سامنے "ڈاکو" پیش کیا گیا۔ میاں بیوی نے صاف انکار کر دیا کہ یہ وہ آدمی نہیں ہے۔ اب "ڈاکو" مصر ہے کہ آپ دونوں مجھے پہچانیے، میں ہی آپ کا خادم ہوں۔ وہ پولیس کی فراہم کردہ تفصیلات بیان کر رہا ہے کہ میں نے فلاں جگہ آپ سے گاڑی چھینی تھی۔ اس رنگ اور ماڈل کی گاڑی تھی۔ اس میں یہ سامان تھا مگر میاں بیوی اڑے ہوئے ہیں کہ یہ کوئی اور ہے، وہ دبلا پتلا لڑکا تھا، یہ کالا ہے وہ گورا تھا۔ پولیس بھی مصر ہے کہ یہی وہ شخص ہے۔"

"اور وہ شخص چوہدری کے الزام سے بچ کر ڈکیتی کے الزام کو قبول کر رہا تھا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

غالب ہنسا۔ "یہی تو کمال ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ محفوظ ہے۔ پولیس چالان پیش کرے گی اعتراف جرم کے ساتھ تو عدالت میں ملزم بیان دے گا کہ اس سے زبردستی بیان حاصل کیا گیا ہے۔ پھر کار کے مالک آئیں گے ملزم کو شناخت کرنے کے لیے شناختی پریڈ میں۔ وہ صاف کہیں گے کہ ان میں ڈاکو نہیں ہے۔ پولیس کا آدمی صاف چھوٹ جائے گا کہ پولیس نے غلط آدمی کو گرفتار کر لیا۔ اصل ڈاکو پہلے ہی نکل گئے تھے۔ اس کی جگہ لینے والا رہا ہونے کے بعد بھی پولیس کی خدمت کرتا رہے گا اور اسی طرح غلط ملزم بن کے پیش ہونے کا معاوضہ وصول کرتا رہے گا۔ تو میاں سکندر اعظم! کوئی چور یہ مان لے گا کہ وہ تمھاری گاڑی بھی لے گیا تھا اور واردات کے بعد اس نے گاڑی فلاں کھائی میں گرا دی تھی۔ اسے نہیں معلوم کہ کوٹھی کس کی تھی۔ چوہدری دلاور بھی محفوظ اور اس کا ایڈووکیٹ بھی محفوظ۔ وہ ملزم تو پولیس کے سایۂ عاطفت میں محفوظ ہے ہی۔ اب رہ گئے وہ چار کرائے کے بدمعاش۔ وہ کچھ بھی بکتے رہیں۔ کرائے پہ ملنے والے بدمعاش نہیں ہوتے، قسمت بھی نہیں ہوتے، بہت گھٹیا درجے کے شہدے ہوتے ہیں۔ چوہدری صاحب کے مقابلے میں ان کی کون مانے گا۔ کیس کی چوری کا اعتراف وہ کر ہی چکے ہیں۔ اب ایک اور واردات کا اعتراف پولیس کروا لے گی اور جب چالان پیش کرے گی تو چوہدری صاحب کا نام کہیں نہیں آئے گا۔ نہ وہ عدالت کے روبرو یہ کہیں گے کہ انھیں چوہدری صاحب نے کس لیے بھیجا تھا۔ انھیں پولیس کی طرف سے رعایت ملے گی اور چوہدری صاحب کی طرف سے انعام ملے گا۔ اب بولو تم چوہدری صاحب کے خلاف کن سے چشم دید گواہ لاؤ گے اور کیا ثبوت پیش کرو گے؟"

مجھے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ دلاور کے نکل جانے سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا تھا اور مجھے غالب کے بیان پر ذرا بھی شک نہیں تھا۔ چوہدری دلاور کا پیسہ اور اثر و رسوخ بہت بڑی طاقت رکھتا تھا جس کے مقابل پولیس بھی بے بس تھی لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی بازی مات نہیں ہوئی۔ میری تحویل میں ایک کیسٹ تھا اور فتح شیر کے مارے جانے کے بعد بھی چار افراد موجود تھے جو فتح شیر کے "ماتحت" تھے وہ جرم میں شریک تھے۔ انھوں نے پچاس پچاس ہزار وصول کیے تھے اور طافو کی لاش کو ٹھکانے لگایا تھا۔ ملتان ڈیم والی بات غلط تھی۔ طافو کو کہیں قریب ہی دریا کے سپرد کیا گیا تھا یا زمین میں گاڑ دیا گیا تھا۔ زمین میں دفن کرنا زیادہ قرین قیاس تھا کیونکہ دریا میں پھینکی جانے والی لاش بہتی ہوئی کہیں بھی برآمد ہو سکتی تھی اور وہ چاروں کرائے کے جانے پہچانے بتا سکتے تھے کہ انھوں نے طافو کو کہاں گاڑا تھا۔

"تمھاری خاموشی تمھاری بے بسی کی ترجمان بن گئی ہے۔" غالب نے کہا۔

"ایسی کی تیسی خود کو بے بس سمجھنے والے کی۔" میں نے کہا۔ "ابھی میں نے سارے پتے نہیں پھینکے ہیں۔ وقت آنے دو، میں ثبوت بھی فراہم کروں گا اور شہادت بھی لے آؤں گا۔"

"اور خود عدالت میں حاضر ہو کے پیش کر دوں گا۔" غالب نے تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا۔

"میں دعویٰ کر سکتا ہوں میرا کوئی وکیل تم سے بہتر کام کر سکتا ہے۔" میں نے مشتعل ہوئے بغیر کہا اور ٹیڈی کو آواز دی۔

"کیا بات ہے سکندر بادشاہ؟" اس نے سامنے آ کے کہا۔

"ٹیڈی آج کے اخبار لاؤ دوست جتنے بھی مہیا ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"قسم مولا علی کی! پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ میاں وہ چوہے بھی اتنے بھوکے ہیں کہ اندر دل جگر گردے اور آنتیں سب کھا گئے ہیں۔ خبروں سے پیٹ نہیں بھرے گا۔" ٹیڈی نے پیٹ پہ ہاتھ مارا۔ "دیکھو کیسی ٹن ٹن کی آواز آ رہی ہے۔ بالکل خالی کنستر جیسی۔ ذرا سا ناشتہ ڈال لوں اس میں پھر لاتا ہوں اخبار۔ یہ نہ ہو بھوک کا مارا جاؤں اور کل خود خبر بن جاؤں۔"

محسن اسی وقت باقاعدہ ناشتا لیے نمودار ہوا۔ "یہ خود تو ٹھونس ٹھونس کے پیٹ کا دوزخ بھر چکا ہے۔ اسے کیا معلوم ہم بھوکے فاقہ کشوں پر کیا قیامت گزر رہی ہے۔" اس نے درمیان میں پلیٹیں رکھی جانے کی بھی تکلیف نہ کی اور اطمینان سے آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔

"محسن بھائی کدی تو بچھانے دو۔" ٹیڈی نے کہا۔

"دری اس زمین سے بڑھ کر نہیں ہے۔ ہندو اس دھرتی کو ماتا کہتے ہیں۔" محسن نے ترکی بہ ترکی ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "ہم بلا تخصیص زمین کا حصہ بنتے ہیں۔ دری اور بارہ دری سب دھری رہ جاتی ہیں۔ اسی لیے ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے۔ تم بھی بیٹھو یہاں اور زمین کی عطا کردہ نعمتوں کو کھاؤ۔"

"ایک سانس میں اتنی عقلمندی کی باتیں! تیرے دماغ پہ بھوک کا اثر ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ سب کو اس کوٹھری میں دیکھ کر مجھے یقین نہیں آتا۔" ٹیڈی جذباتی ہونے لگا۔ "آپ سب اتنے معزز لوگ ہیں، اونچے گھروں کے پڑھے لکھے اور عیش و آرام میں پلنے والے۔ میں ایک بے نام اور لاوارث شخص۔ جس کے پاس کچھ نہیں۔"

"تمھارا سب سے بڑا اثاثہ یہی ہے۔" محسن نے اپنا فلسفہ جاری رکھا۔ "جس میں تمھارے خلوص کی خوشبو ہے استاد ٹیڈی۔ یہ خوشبو تو شرفا کی محفلوں میں بھی نہیں ملتی۔ اسی دوستی کی خوشبو نے ہم کو یہاں پہنچا دیا ہے اور ہمارے لیے تمھارا یہ گھر کسی گلدستے سے زیادہ محفوظ اور پرسکون جگہ بن گیا ہے۔"

"جب ایک بار تم کو دوست کہہ دیا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تم بادشاہ ہو یا فقیر۔" میں نے کہا۔ "اور تم نے بھی دوستی کا حق ادا کر کے ہمیں جیت لیا ہے ٹیڈی۔ چوہدری دلاور پچاس لاکھ دے کر بھی جسے نہ خرید سکا تھا مگر تم نے لبیک سے بے دام خرید لیا ہے۔ اب ہم ایک ہیں۔ ہم ایک ہی خاندان ہیں۔"

"میری زندگی بھی کتنی بدل گئی ہے اس خاندان میں شامل ہونے کے بعد۔" ٹیڈی بولا۔ "میں نے بہت کچھ چھوڑ دیا ہے جو پہلے کرتا تھا۔ وہ دوست اور قسم کے تھے اور دوست کہاں وہ تو دشمن تھے۔ اب تم جیسے دوستوں کے ساتھ میں خود کو بہت بڑا اور عزت والا محسوس کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کوئی مجھے بدمعاش کہے یا سمجھے۔ شاید میری بہن ہو گئی ہے تو مجھے ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جس پر کل اسے شرمندہ ہونا پڑے۔ کوئی اسے میرے نام کا طعنہ دے۔"

"ہونے والے سالے جی! ایسی باتیں مت کرو۔" محسن نے رقت طاری کر کے کہا۔ "یہ کس کا نام لے لیا کہ نوالہ حلق میں اٹک گیا ہے۔"

"نوالہ! میں تو سمجھا تھا جان حلق میں اٹک گئی ہے۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

ناشتے کے بعد ٹیڈی اخبارات جمع کرنے نکل گیا تو میں، محسن اور غالب بے تکلفی سے جا کے فرش پہ نیم دراز ہو گئے۔ ہمارے کپڑے گرد و غبار سے خراب ہو گئے تھے اور ہم نے دو دن سے نہ شیو بنائی تھی اور نہ منہ ہاتھ دھویا تھا۔

"تم بہت عجیب لوگ ہو۔" غالب نے کہا۔ "کہاں کی اینٹ کہاں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔"

"اس کنبے کا نام ہے آر ایم ایس۔" محسن نے کہا۔ "تم کو اس کا رکن بنایا جا سکتا ہے۔ میری سفارش پر۔"

"آر ایم ایس! یہ کیا بلا ہے؟" غالب نے حیرانی سے کہا۔

"مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔" میں نے کہا۔ "افسوس کہ تم دنیا کی سب سے بڑی، فعال اور حقیقی طاقت رکھنے والی تنظیم کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس میں دنیا کی ہر چھوٹی بڑی دہشت پسند تنظیم، دنیا بھر کے سرمایہ دار اور بڑے بڑے

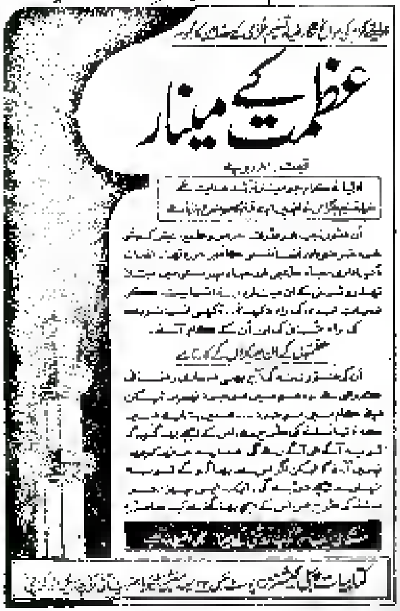

www.paksociety.com

قانون کے نام پہ لاقانونیت مسلط کرنے والے، استحصالی ٹولہ
ظالم حکمران اور وہ سب شامل ہیں جن کا بول بالا ہے۔ یہ
آج کے انسانوں کی تنظیم ہے جن کے ہاتھ میں لاٹھی ہے اور
جو باقی دنیا کو بھینس کی طرح ہانک رہے ہیں۔ نظامِ انصاف
انہی کا ہے۔ سچ وہی ہے جو لاٹھی والے کہتے ہیں۔ حق انہی
کی عطا کردہ خیرات کا نام ہے خواہ وہ جینے کا حق ہو یا مرنے کا۔
"تم اتنا سچ بولتے ہوئے ڈرتے نہیں؟" غالب نے کچھ
دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔
"پہلے ڈرتا تھا لیکن اب ڈر سے بھی لاٹھی اٹھالی ہے۔"
میں نے ہنس کر کہا۔ "میں نے کتابوں میں لکھی ہوئی خوبصورت مگر
کوئی حقیقت نہ رکھنے والی باتوں کو فراموش کر دیا ہے۔ جیسے
جنگل میں لاٹھی کام آتی ہے کتابی نظریات کا اخلاقی فلسفہ
نہیں چلتا۔"
"اگر سب لوگ تمہاری طرح ہو جائیں تو دنیا کا کیا بنے گا؟"
غالب نے کہا۔
"دنیا! کون سی دنیا؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ایک تو وہ
دنیا ہے جسے ہم بنا سکتے ہیں۔ انسان کی مثالی جنت کے خواب
کی تعبیر۔ اس کا وجود کہاں ہے؟ دوسری یہ عملی دنیا ہے
جس میں ہم اور تم زندہ ہیں۔ یہ دنیا ہی تو ایم آر ایلیں ہے۔ ایسا نہ ہوتا
تو آج کوئی سقراط زہر پیتا؟ کوئی منصور سولی چڑھتا؟ کوئی مسیحا نہ اٹھتا؟
سچ کون بول سکتا ہے۔ یہ اخبارات؟ یہ سیاستدان؟
یہ شیخ و برہمن؟"
ٹیڈی اخبارات کا ایک بنڈل لیے نمودار ہوا۔ غالب
نے فوراً اپنا اخبار الگ کر لیا اور جلدی سے اندر کا صفحہ کھول لیا۔ اس
کی نگاہ نے اوپر سے نیچے تک دلاور کی خبر تلاش کی۔ رحمت
کباڑی کی تصویر کو دیکھا اور میں نے غالب کی صورت پہ مایوسی
کے آثار نمودار ہوتے دیکھے۔ محسن نے اور ٹیڈی نے دوسرے
اخبارات پہ نظر ڈالی لیکن میں غالب کے تاثرات کا مشاہدہ کرتا
رہا۔ اس نے ہر کالم میں اوپر سے نیچے تک چھوٹی بڑی ہر سرخی
کو پڑھا اور آہستہ آہستہ اس کی مایوسی پہلے جھنجھلاہٹ اور پھر
برہمی میں بدلنے لگی۔ اچانک اس نے اخبار میز پہ پٹخ دیا
اور منہ کر کے میں ٹہلنے لگا۔ اس کا چہرہ اشتعال سے سرخ
ہو رہا تھا۔
"بزدل، بے ضمیر، گھٹیا اور دو ٹکے پہ بکنے والے
سالے لوگ!" اس نے مٹھیاں بھینچ کر چلاتے ہوئے
کہا۔ "یہ سارے غلام ولد غلام ولد غلام۔ یہ اخبارات کے مالک
بک گئے ہیں۔ ایڈیٹر اور صحافی کہلاتے ہیں۔ صحافت ان کے لیے
دکان ہے جہاں یہ اپنا اخبار بیچتے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ کوئی
ان کی دکان بند کرا دے۔"
"ہاں۔ لاٹھی والے ہر دکان بند کرا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔
"سچ کی دکان، ضمیر کی دکان اور حق کی دکان۔"
"بکواس بند کرو۔ لاٹھی میرے ہاتھ میں ہے۔" غالب
نے دہاڑ کر کہا۔
"تمہارے ہاتھ میں قلم ہے۔" میں نے نرمی سے جواب
دیا۔ "جو لاٹھی سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ جب ہم قانون پڑھا کرتے
تھے کہ قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہے تو تم یقین کرتے تھے۔ کتابوں میں
یہ پڑھتے تھے اس لیے ناتجربہ کاری کی باتیں کرتے تھے۔
تمہارا انویسٹی گیشن شائع نہیں ہوا تو تم کو جرم کا سبق ملا۔
"انویسٹی گیشن چند سطروں کی خبر تک نہیں ہے۔ میں بھول
گیا اس۔۔۔۔ ایڈیٹر ہے۔"
"تم لاٹھی ماسٹر بن کے بڑے بدلے بدلے نظر آتے ہو۔" میں نے کہا۔
"نہ چھاپنا اسے دینا ایڈیٹر کا حق ہے۔"
"اس نے اپنا حق استعمال نہیں کیا بلکہ میرا حق چھینا ہے:
حق کو بیچا ہے۔" غالب کسی زخمی بھیڑیے کی طرح غرایا۔
"خبر چھپ گئی ہے۔" محسن نے اچانک کہا اور قہقہہ لگایا۔
"لیکن یہ دوسرا اخبار ہے۔ ایک سرکاری اخبار۔"
غالب نے اس سے اخبار جھپٹ لیا اور خبر پڑھ کر
میری طرف پھینک دیا۔ اپنے مالک اور محسن کی شان میں
بھاری بھرکم گالیاں لڑھکاتے ہوئے میں نے اخبار دیکھا۔
اس میں لکھا تھا کہ پُراسرار طور پر غائب ہو جانے والے انسپکٹر
فتح شیر کی لاش ایک غیر آباد کوٹھی سے دستیاب ہوئی ہے۔
کسی نے انتہائی بے دردی سے گلا کاٹ کر ہلاک کیا تھا
اور پولیس کا خیال ہے کہ یہ واردات کم سے کم چوبیس گھنٹے
قبل ہوئی تھی۔ ابتدائی تفتیش سے سامنے آنے والے نتائج
کے مطابق قتل کسی پرانی دشمنی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ مرحوم کی
بیوہ نے ہمارے نمائندے کو بتایا کہ انسپکٹر فتح شیر انتہائی ایماندار،
اصول پرست اور فرض شناس افسر تھے۔ انصاف اور قانون کے
معاملے میں وہ کسی سے رعایت نہیں کرتے تھے۔ تاہم وہ ایک
شفیق شوہر، شفیق باپ اور نیک انسان تھے اور ان کی کسی
سے دشمنی نہیں تھی لیکن خاندانی زمین کے مسئلے پر ان کا ایک پرانا
تنازعہ چل رہا تھا۔ مرحوم کی میت کل ان کے آبائی گاؤں کو
ضرور راولپنڈی روانہ کر دی جائے گی۔ پولیس کے اعلیٰ حکام نے
ان کی ناگہانی موت کو ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیتے ہوئے گہرے رنج
سے دلی رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ قاتلوں کو بہت
جلد گرفتار کر کے کیفرِ کردار تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جائے گی۔ ضرورت
ہوئی تو خاندانی تنازعہ کے اسباب کی تفتیش کے لیے ایک خصوصی
ٹیم راولپنڈی روانہ کی جائے گی۔ مزید تفصیلات کا انتظار ہے۔
"گڈ۔ ویری گڈ۔" میں نے اخبار رکھ کے کہا۔ "ماسٹر اسٹروک۔
اسی طرح ایک دن جیسے چوہدری دلاور سے جا ملا۔ ایسے نہیں جیسے تم
نے چاہا تھا مائی ڈیئر رپورٹر۔ تمہاری صحافت کے زریں اصولوں
کا کیا بنے گا؟"
"میں استعفیٰ اس کے منہ پہ ماروں گا۔ دوسرے اخبار میں چلا
جاؤں گا۔" غالب نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "اس خبر کو بیچا گیا
ہے۔ اس کا مالک اپنا مفاد دیکھنے والا خود غرض اور بزدل سرمایہ دار
ہے۔ اس نے دوسرے سے کہا کہ یہ خبر چھپ تو لوٹا جا لیں گے۔ دوسرے
نے ایڈیٹر سے سودا کیا ہوگا اور ایڈیٹر نے دلاور سے رابطہ
قائم کر کے پوچھا ہوگا حضور والا! آپ کی شان میں ایک معمولی رپورٹر
نے ایسی خبر لکھی ہے، اسے کیسے لگایا جائے؟"
"سیاہ ترین خبروں سے سب کچھ کھل گیا۔ رابعہ تارڑ کا نام، چوہدری
دلاور کا نام، گواہوں کے نام، ٹیکسی ڈرائیوروں کے نام۔ کل مزید
تفصیلات کون دے گا؟ کل دوسرا دن ہوگا اور پرسوں تیسرے دن
کا خبر بھلا دی گئی۔" میں نے کہا۔ "مقتول کی خبر ہے کہ ایک غیر آباد کوٹھی
سے ملا تھا۔ اگر ضروری ہے جو اطلاع دی۔ وہ ایماندار تھا۔ فرض
شناس تھا اور نیک آدمی تھا۔ جیسے کہ تم ہو صحافی کی قوم۔ استعفیٰ
تو بہانہ ہے۔ ان دو تین سال میں ماردو گے۔ ہر اخبار صرف اخبار ہے اسے
اس کا مالک کوئی مرد مجاہد نہیں ہوتا جو حق کی جنگ میں
لڑتا ہو۔ وہ صرف اخبار فروش ہوتا ہے۔ تم خود بھی اخبار نکالو
گے تو یہی کرو گے مرزا غالب!"
"شٹ اپ۔ تم زیادتی کر رہے ہو۔" غالب نے چلا کے
کہا۔ "پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہیں۔ سب کو برابر کے میدان میں
کھڑے اور کھرے صحافی بھی ہیں۔"
"وہ کہاں کھو گئے ہیں؟" میں نے کہا۔ "یہ مولانا ظفر علی خان
مرحوم کے زمیندار اخبار کا یا مولانا محمد علی جوہر کے ہمدرد اور کامریڈ
کا زمانہ نہیں ہے۔ یہ ماسٹر اسٹروک کا شاہکار ہے۔"
"ایک اخبار سے ہمارے وقت ہو۔" غالب نے معنی خیز ہو کے
[illegible] کے لیے کہا۔ "دوسرا ہے روزنامہ حقیقت۔"
"پہلے اخبار کا ایڈیٹر جان بچا کے بھاگ گیا ہے۔" میں نے
ہنس کے کہا۔ "اس کا مالک بیرون ملک فرار ہو جاتا ہے اور شیخی سے بھر
[illegible] معافی مانگتا ہے اور جلد اسے معاف کر
دیا جاتا ہے کیونکہ وہاں تم جیسے سرپھرے لوگ ہیں جو دال روٹی کھا کے
[illegible] کاروبار بند ہیں۔ روزنامہ 'حقیقت' کا حال اس
سے بھی ابتر ہے... کسی دن کوئی چوہدری دلاور اسے خرید لے گا۔"
"ایم آر ایلیں کا منشور کیا ہے؟" غالب نے دھم سے زمین پہ
بیٹھ کے کہا۔
"حق و صداقت کی خاطر جان کی بازی لگا دو۔ ہر جھوٹے اور
ظالم فرعون کے خلاف آواز اٹھانا۔ جہاں ضمیر کی گواہی حق ہو وہاں
کسی کی گواہی تسلیم نہ کرنا۔ اثر و رسوخ اور دولت کی طاقت کے بل پہ
انصاف کو گمراہ کرنے اور سزا سے بچ جانے والوں کو نجی عدالتِ
انصاف سے قانون کے مطابق سزا دینا اور اس پہ عملدرآمد کرنا۔
ایک بے کردار معاشرے کی بدنام پولیس اور بکاؤ نظامِ عدل کے
بجائے اپنے وسائل، اپنی قوت بازو اور اپنے خدا کی امید پہ بھروسہ
کرنا۔" میں نے کہا۔
"میں اس منشور کے مطابق ایم آر ایلیں سے وفاداری کا
حلف اٹھاتا ہوں۔" غالب نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔
"قسم مولا علی کی، ہم تو پہلے ہی ساتھ تھے۔" ٹیڈی نے
کہا۔ "لیکن ہم بھی آج حلف اٹھاتے ہیں۔" پھر اس نے ہاتھ اٹھا دیا۔
"ایم آر ایلیں کے ممبر ہیں تم کو مصافحے کا شرف بخشتے ہیں۔"
میں نے غالب سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "وقت آنے پہ تم کو دوسرے
معزز ارکان سے ملوایا جائے گا۔ مسماۃ رابعہ تارڑ عرف شلا خانم اور
ایک غیر سرکاری رکن مس انلی۔"
"ایم آر ایلیں کے سات ارکان کی طرف سے میں تم کو خوش آمدید
کہتا ہوں اور تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔" محسن نے کہا۔
"کورم پورا نہیں ہے اس لیے میں آپ کو اٹھاتا ہوں۔"
میں نے محسن کو ٹیڈی کی گود سے اٹھایا اور سر کے اوپر سے پلنگ پہ
پھینک دیا۔ غالب دم بخود بیٹھا رہا۔ اس کی نظروں میں حیرت سے
بھی گہری بے یقینی تھی اور [illegible] کے جذبات تھے۔ اتنے میں ٹیڈی کی
[illegible] ساکت ہو گیا جیسے
[illegible] کی حسرت دل ہی میں لیے رہ گیا۔
"ابھی تو میں اپنے ایڈیٹر سے نمٹنے جا رہا ہوں۔" غالب نے
کہا۔ "شام کو کہاں ملو گے؟"
"اسی جگہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن خیال رکھنا، رازداری ایم
تمہارے لیے شرطِ اول ہے۔"
"مجھے ہر راز معلوم ہونا چاہیے۔" غالب نے کہا۔ "میں
اول تو آخر کرتا۔"
"شام کو ہم سب بتا دیں گے۔ اگر ہم نہ ملیں تو تشویش میں مبتلا
نہ ہونا، انتظار کرنا۔" میں نے کہا۔
غالب کے جانے کے بعد میں نے محسن کو نظر سے ہونے
والی گفتگو سنائی۔ محسن نے اتفاق کیا کہ فی الحال رابعہ کا ساتھ ہونا

www.paksociety.com

سب کے مفاد میں ہے لیکن یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ شاید رابعہ نہ مانے۔

"دلاور اپنی کامیابی پر بہت مسرور ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "خوشی سے بغلیں بجا رہا ہوگا۔"

"بجانے دو۔ وقت آنے گا تو دیکھیں گے ہم کیا بجاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس عارضی فتح نے دلاور کو پھر اپنی طاقت کے غرور میں مبتلا کر دیا ہوگا۔ وہ خود کو ہم سے زیادہ چالاک اور اپنے اثر و رسوخ کو ہم پر حاوی سمجھتا ہے تو زیادہ اچھا ہے۔ ہم کو اب اپنی حکمت عملی یعنی اسٹریٹیجی بدلنی ہے۔ ہم اب کھلی جنگ نہیں لڑ رہے ہیں۔ اسے دھوکا دو کہ ہم پسپا ہو گئے اور ہم نے خود کو کمزور مان لیا۔ خود کو کچھ فلاح کیے بغیر ہم کوئی کارروائی نہیں کرسکتے۔ کھل کر کارروائی کرنے سے کھیل بگڑ جائے گا۔ یہ اب میری اور دلاور کی جنگ نہیں ہے، یہ ملک کی بقا کے لیے دشمنوں کی اور محب وطن طاقتوں کی جنگ ہے۔ ہم نے ایک جگہ سامنے آکے ایک محاذ پر فتح حاصل کرلی تو وہ سب دشمن زیر زمین چلے جائیں گے جو اس وقت اطمینان سے وطن دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ یہ تو ثابت ہوگیا ہے کہ دلاور منشیات کا نہیں، ناجائز اسلحے کا کاروبار کرتا ہے۔ وہ ناجائز اسلحہ کسے فراہم کرتا ہے؟"

"چوروں اور ڈاکوؤں کو، سماج دشمن عناصر کو۔" محسن بولا۔

"یہ بھی ملک دشمن ہی کی صف میں آتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے یہ کاروبار وسیع پیمانے پر نہیں ہوسکتا۔"

"تیرا مطلب ہے وہ ناجائز اسلحے کی درآمد بھی کرتا ہے؟"

"بہت سے امکانات ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک تو یہ کہ وہ اسلحہ کسی بیرونی دشمن کو فراہم کرتا ہے لیکن دوسرا زیادہ سنگین مسئلہ اندرونی دشمنوں کا ہے۔ اس وقت کے سیاسی حالات پر غور کر، خصوصاً مشرقی پاکستان کے حالات پر جہاں کچھ شرپسند عناصر اور علیحدگی پسند عناصر کی تخریبی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ان کی مدد کون کر رہا ہے؟ ایک تو ہمارا ہمسایہ اور پرانا دشمن ملک ہے جو یقیناً ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔"

"یہ اندیشے تو اب کھل کر سامنے آگئے ہیں کہ وہاں بیرونی مداخلت جاری ہے۔" محسن نے کہا۔

"دشمن تو دشمن ہوتا ہے۔ وہ کچھ بھی کرے، ہم اس کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور اس کے لیے تیار بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن بات اندر کے دشمنوں کی ہے۔ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی آبادی کا تناسب کتنا ہے؟ کیا ان سب نے پاکستان کے وجود اور دو قومی نظریے کو صدق دل سے قبول کر لیا؟ ہندوؤں کا سرمایہ ہی علیحدگی پسندوں کی پشت پناہی کر رہا ہے اور انھیں اپنے مذموم مقاصد کی خاطر استعمال کر رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ دلاور بھی وہاں اسلحہ بھیجتا ہے۔"

"یہ ایک امکان ہے جسے مسترد نہیں کیا جاسکتا۔" میں نے کہا۔ "کیا یہاں غدار نہیں ہیں؟ بیس سال کی تاریخ گواہ ہے۔ اور دلاور کا کردار ایک ضمیر فروش کا ہی نہیں، وطن فروش کا بھی ہو سکتا ہے۔"

"یہ تو بہت خطرناک چکر ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہمارے علاوہ نہ جانے ہمارے کتنے دشمن ہوں گے؟"

"ہاں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ دلاور کسی کے مددگار ایجنٹ ہوں۔" میں نے کہا۔ "دلاور ان سے رقم بھی وصول کرتا ہو اور پھر دشمن ملک کے راستے یہ اسلحہ پاکستان پہنچتا ہو اور تخریب کاروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہو۔"

"اور دلاور کو یہ اسلحہ کون فراہم کرتا ہوگا؟ کیا دلاور ایجنٹ ہے؟" محسن بولا۔ "اسلحے کی تقسیم و ترسیل کا ایک ذریعہ ہے؟"

"میں دوسرے امکان پر غور کرتا ہوں تو بات سلجھتی نظر آتی ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ بن رہا ہے' دلاور کی فیکٹری میں۔ ایم ڈبلیو ڈی کی کیمپ اسلحہ ساز ادارہ ہے۔"

محسن بے وقوفوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا تھا۔ شیدا میری صورت کو دیکھتا تھا کبھی محسن کی۔ ہم قیاس نہیں بولے لیکن یہ باتیں اس کی عقل و فہم سے بالاتر تھیں۔

"میں سخت شرمسار ہوں کہ یہ معمولی بات میری عقل میں نہیں آئی۔ حالانکہ میں کافی باریک بیں ہوں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہاں جن مشینوں پر زرعی مشینری کے پرزے ڈھالے جاتے ہیں، ان ہی پر ریوالور بھی بن سکتے ہیں۔ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کوئی معمولی فاؤنڈری نہیں ہے اور وہاں صرف مشینیں نہیں ہیں۔ اس میں بالکل جدید قسم کی خودکار ہے جس سے ہر پیچیدہ پرزہ تیار ہوجاتا ہے۔ بم، پستول کیا چیز ہے۔ اس میں اعلیٰ فولاد سے ڈھلی نال کے علاوہ چند گنی چنی چرخیاں اور گراریاں ہی تو ہوتی ہیں۔ پرزے معمولی اور ساخت کے اعتبار سے سادہ۔ کام بس مہارت اور معیار کا ہے۔ تو وہاں جو وہ صنعت کے ہزارویں حصے کا فرق ہے

ٹھیک لگتا ہے۔ وہاں زرعی آلات کے بجائے یہ سامان تیار ہو رہا ہے۔ بھوکے انسانوں کا پیٹ بھرنے کی مشینری کے پرزے نہیں بن رہے ہیں بلکہ اسلحہ آرہا ہے، بھرے انسانوں کے پیٹ میں۔ میاں آپ نے کہا سامان ابھی تک اس کی تصدیق کیسے ہوگی؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" میں نے کہا۔ "تاکہ کچھ فلاح بے مروت ہے۔ دلاور کو بھی تاثر دینا ہے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ اور دشمنی ذاتی ہے۔ اس نے میرے باپ کو مارا، اس کا سب چھین لیا اور اسے بلیک میل کر کے خاموش رہنے پر مجبور کیا۔"

"وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے۔" محسن بولا۔ "وہ جانتا ہے ہمیں اس کے کاروبار کی نوعیت پر بھی شک ہے۔"

"ممکن ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہمیں شک ہے کہ وہ منشیات کے کاروبار میں ملوث ہے۔ ہمیں شور بھی مچانا ہے کہ ہمیں سب معلوم ہے۔ ہر جگہ یہی کہنا ہے اور دلاور کو بھی بتانا ہے کہ ہمیں ثبوت کا انتظار ہے، یہ دھندا نہیں چلنے دیں گے۔ باقی میرے ذاتی معاملات کا جھگڑا ہوگا۔ دلاور مطمئن رہے گا کہ ہم غلط راستے پر بھٹک رہے ہیں چنانچہ اس کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اور اس کے کارندے بھی کھوج لگاتے ہیں۔ دوسرا یہ ہم کو بھی کھوج لگانا ہے کہ کوکوں کا مال کتنا بنتا ہے۔ کس طرح کہاں کون لے آگے جاتا ہے۔ اس کا استعمال کیا ہے اور اس راستے پر منزل سے پہلے منزل پر پہنچنے کے بعد یہ اسلحہ کس کے ہاتھ میں تقسیم ہوتا ہے۔ یہ ایک زنجیر ہے اور ہمیں ایک کڑی سے دوسری کڑی کو پکڑنا ہے۔ اگر ہمارا راز فاش ہوگیا تو نہ صرف ہم دشمنوں کا نشانہ بن جائیں گے بلکہ ایک نیا کام شروع ہوجائے گا۔ لوگ چہرے بدل لیں گے، نام بدل لیں گے اور راستے بدل لیں گے۔ اگر یہ اسلحہ واقعی مشرقی پاکستان جاتا ہے تو اس کے دو ہی راستے ہو سکتے ہیں۔ ایک راستہ سمندری جہازوں کے ذریعے چٹاگانگ تک ہے جو سب سے محفوظ اور آسان راستہ ہے۔ اس سے زیادہ مال کم خرچ پر بھیجا جاسکتا ہے۔ بڑے بڑے کریٹ، کارٹن اور کنٹینرز۔ دوسرا متبادل راستہ خشکی کا ہے جو پہلا راستہ بند ہونے کی صورت میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اور راجستھان کے بعد بھارت کے اسمگلر یہ مال آگے لیکن ہمیں گلگت اور کشمیر کی طرف سے اخراج اور راستے بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے مگر یہ پہلے یہاں تصدیق کرنی ہے، مکمل رازداری کے ساتھ۔"

"میرے خیال میں تو اب تصدیق غیر ضروری ہے۔ یہ بات دو اور دو چار کی طرح سمجھ میں آتی ہے۔"

"یقین تو مجھے بھی ہے کہ میرے والد وزیر خان نے بھی اس کاروبار کی بھنک پالی تھی۔" میں نے کہا۔ "چنانچہ ان کا داخلہ فیکٹری میں بند کر دیا گیا اور جب انھوں نے شک کا اظہار کیا یا کوئی دھمکی دی تو ان پر یہ واضح کر دیا گیا کہ یہاں ان کی اور ولایت میں ان کے بیٹے کی زندگی ختم کر دی جائے گی۔ ممکن ہے اس کا فیصلہ بھی کر لیا گیا ہو لیکن میرے والد نے میری خاطر اس سے رحم کی بھیک مانگی ہوگی۔ انھیں اپنی زندگی عزیز نہیں تھی، صرف میرا خیال تھا۔ میری خاطر انھوں نے دلاور کی ہر بات مان لی۔ جیسا اس نے کہا ویسا ہی کیا اور لب نہیں کھولے۔ اس نے جہاں کہا وہاں دستخط کر دیے اور جیسی زندگی گزارنے پر مجبور کیا ویسی زندگی گزار لی۔ اس کے باوجود بھی دلاور شاید مطمئن نہیں تھا۔ انھیں اندیشہ لاحق ہوگا کہ وزیر خان چپکے سے بیٹے کو چٹھی نہ لکھ دے۔ چنانچہ وہاں میرے کمرے کی تلاشی لی گئی اور میرے سارے خطوط دیکھے گئے۔ میری مصیبتوں کا آغاز بھی اس لڑکی نے کیا تھا جو میرے کمرے میں میری چیزیں درازوں سے کچھ نکالنا چاہتی تھی۔ وہ اس لیے قتل ہوئی کہ پکڑی گئی۔ اس کی نگرانی کرنے والے شخص کتنے باخبر اور کتنے طاقتور تھے۔ پھر مجھے انگلستان سے یہاں بلوایا گیا تھا تو اس کا مقصد بھی یہ معلوم کرنا تھا کہ میں حقائق سے کس حد تک باخبر ہوں۔ ظاہر ہے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا چنانچہ میں زندہ ہوں۔ دلاور سے ذاتی دشمنی کوئی مسئلہ نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ اس کاروبار کو صرف دلاور کی ملکیت کیسے بتایا جائے۔ اب تو میں نے ایسا انتظام کر لیا ہے کہ میرے مرنے سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ میری جگہ رابعہ، رابعہ کے بعد شہلا۔ یہ انتظام تو ان کے گلے میں ہے اور وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اب اس کھیل کو یونہی چلنے دیں تاکہ اصل کاروبار پر نقاب پڑی رہے۔ ہم بھی یہی کریں گے کہ انجان بنے دشمن بنے رہیں گے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے کہ اصل راز کو ہم پا چکے ہیں۔"

"ہم تین جو اس وقت یہاں موجود ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ان کے علاوہ یہ بات اور کسے معلوم ہوگی؟"

"غالب کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟" میں نے کہا۔

"وہی جو تیرے اور شیدی کے بارے میں ہے۔" محسن نے کہا۔

"پھر اسے بتایا جاسکتا ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اگر ایسی کوئی مشتبہ واقعی مشتبہ ہوچکا ہے تو اسے ہمارے ساتھ ہونا چاہیے۔"

"شیخ تو بہت تیرا دشمن ہے۔ تو نے اس کا کیریئر ختم کر دیا

www.paksociety.com

اور ان کے گھر کی خوشی سب کو تباہ کر دیا۔"
"تم سمجھ کر نہیں جانتے۔ وہ میری ذات کا دشمن ہو سکتا ہے لیکن میرا دشمن وطن دشمنوں سے جا ملا ہو تو وہ ذاتی دشمنی کے جذبات کو فراموش کر سکتا ہے۔ میری حفاظت کے لیے اپنی جان دے سکتا ہے۔ اس کے لیے سب کچھ اس کے اصول ہیں۔ وہ ادائے فرض کے معاملے میں انتہا پسند ہے۔ وہ ایک انتہائی مضبوط سہارا ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ میں اور وہ ذاتی سطح سے ہٹ کر ایک عظیم تر مقصد کی خاطر اکٹھے ہو جائیں اور یہ ممکن ہے۔ اس نے پولیس فورس میں بھی اسی عزم اور یقین کے ساتھ شرکت کی تھی کہ وہ اپنی تمام توانائی بدی کے خلاف جنگ کرنے اور لوگوں کو قانون کی مدد سے تحفظ فراہم کرنے میں صرف کر دے گا۔ اسے شکست اس لیے ہوئی کہ وہ تنہا جنگ لڑ رہا تھا اور قانون کے دشمن اس لیے زیادہ طاقتور ہو گئے تھے کہ خود قانون کے محافظ ان کے پشت پناہ تھے۔ ہمارا مقصد بھی مختلف نہیں۔ وہ ذہین بھی ہے، یہ بات سمجھ لے گا مگر فوری طور پر اس سے رابطہ قائم کرنا ضروری نہیں۔ رابطہ کرنا جب تک یہ بات معلوم نہ ہو ٹھیک ہے لیکن بالآخر اسے شریک راز کرنا پڑے گا۔ وہ ثابت کر چکی ہے کہ ہمت اور حوصلے، قوت برداشت اور صبر و استقامت میں وہ لاکھوں مردوں سے بہتر ہے۔"
"اور شیزی تیرا کچھ لگتی ہے؟ وہ تیرے لیے بہت کچھ قربان کر سکتی ہے۔ کسی اور کے لیے نہیں۔" محسن بولا۔
"چل یوں ہی سہی۔ شگفتہ کو بتانا ہو گا ورنہ وہ ناراض ہو جائے گی مجھ سے۔" میں نے کہا۔
"ابھی شادی بھی نہیں ہوئی اور تو نے ڈرنا شروع کر دیا! بعد میں تیرا انجام عبرتناک ہو گا زن مرید۔"
"شیزی کا اس طرح یا کچھ بتانے سے نقصان ہو سکتا ہے جو ایک بزدل، بے وقوف اور کمزور لڑکی ہے۔ وہ امور خانہ داری میں تو بہت کچھ کر سکتی ہے لیکن باہر کچھ نہیں کر سکتی۔" میں نے کہا۔
"میاں ٹیڈی۔" محسن چلایا۔ "لانا گھوڑی توپ وغیرہ۔ اس نامعقول نے ایک سانس میں کیا کیا بک دیا۔ ہم کو چھپا قرار دے ڈالا۔ اپنی اہلیہ محترمہ کے بارے میں یہ گستاخانہ کلمات ہم برداشت نہیں کریں گے وہ کچھ نہیں کر سکتی لیکن ہم تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم قتل عام کر دیں گے۔"
"جب آپ کا موسم آئے تو قتل عام ضرور کرنا۔" میں نے کہا۔
"ابھی میرے ساتھ چل۔ کچھ لوگوں سے ملنا ہے۔"
"میں سمجھ گیا وہ کون لوگ ہیں۔" محسن بولا۔ "تو انسپکٹر فتح شیر کے ہمراہ جانے والے چار ماتحتوں سے ملنا چاہتا ہے تاکہ میرا خیال ہے پہلے مرزا غالب کو ان کے نام پتے معلوم کرنے ہے

اس کے لیے یہ کام مشکل نہیں۔"
"یہ تیرا اور پولیس والا دوست غالب رہتا کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کا والد فارسٹ ہے کوئی؟"
"سب ہیں۔ کراچی میں باپ کا بزنس ہے۔ وہ چاہتا تھا بیٹا اس کا کام سنبھالے۔" محسن نے کہا۔ "ایک کنسٹرکشن کمپنی تھی ریت کی دیواروں سے محل تعمیر کرتی تھی اور تاقیامت پائیداری اور استحکام کی ضمانت دیتی تھی۔ کوئی عمارت گر کے فوراً ہی اور اس میں خاصے لوگ ہلاک ہوئے۔ بیٹے نے تحقیقات میں باپ کے خلاف گواہی دی کہ سیمنٹ استعمال نہیں ہوا تھا۔ آٹے میں نمک ہوتا ہے تو عمارت کھڑی کیسے رہ سکتی ہے۔ نے باپ کی تمام دولت کی قلعی کھول دی اور اسے ان سب کا ٹھہرایا جو عمارت گرنے سے مرے تھے۔ باپ تو خیر رشوت اور سفارشوں کے زور پر بچ گیا لیکن اس نے ناخلف بیٹے کو عاق کر دیا جس کے سر پہ پہلے سے صحافت کا بھوت سوار تھا۔ کچھ لوگ ہیں تا پیدائشی طور پر موسیقار، کرکٹر یا مصور۔ تو ایسے ہی صحافی ہیں۔ شوق کے جراثیم موروثی طور پر خون میں شامل ہوتے ہیں عمر کے ساتھ ساتھ یہ شوق جنون بن جاتا ہے اور پھر جنون کی کوئی چیز ان کے شوق کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔"
"ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "موسیقار نے فلسفے میں ایم اے کیا، گولڈ میڈل لیا۔ پھر آئی سی ایس لی۔ اس زمانے میں کتنے مسلمان آئی سی ایس ہوتے تھے؟ اور بھائی بنے کیا، موسیقار۔ سب نام و نمود اور عزت و جاہ کے وعدوں کو چھوڑ دیا۔ گل جی کو دیکھو۔ انجینئرنگ کی ڈگری لی اور بن گیا مصور۔"
"تو ایسے ہی اپنا یہ نیا مرزا غالب ہے۔ پیدا ہوا تو صحافی بن کے مرے گا تو صحافی۔" محسن نے کہا۔ "اب کبھی کبھی چوری چھپے لاہور جا کے ماں سے مل آتا ہے۔ ایک شادی شدہ بہن سرگودھا میں ہے کسی ایئر فورس آفیسر کی بیوی۔ اس سے مل آتا ہے۔ لیکن گھر سے کوئی رشتہ نہیں۔ یہاں ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا ہے۔ بہت کم وہاں ہے۔ آفس میں جہاں رک کے سو جاتا ہے کبھی پارک میں بیٹھا جاتا ہے۔"
"رات کو سنتری بادشاہ تمہیں پکڑ کے آوارہ گردی؟"
"پکڑتے ہیں۔ پریس کارڈ دیکھتے ہیں تو فوراً ٹھیک ہو جاتے ہیں" محسن بولا۔ "اچھی خاصی تنخواہ ہے مگر سب کھانے پینے میں اڑا دیتا ہے۔ یار دوستوں کے ساتھ۔ کپڑوں کے بس دو جوڑے ہیں دھوتا ہے تو دوسرا پہن لیتا ہے۔ پورا مرد قلندر ہے یار۔

اپنا موٹر سائیکل ہے۔ اسے اپنی رفیق حیات کہتا ہے کہ ہر جگہ پورا ساتھ دیتی ہے۔"
"ویسا آدمی ہی ہمارے کام آ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جسے رستے عزیز ہوں وہ ڈرتا ہے۔ جس کی زندگی کا مقصد تن آسانی ہے پیسہ کمانا ہو وہ ڈرتا ہے۔ جو شہرت کا بھوکا ہو وہ ڈرتا ہے لیکن جس آدمی کو کچھ مطلوب ہی نہ ہو اور جو صرف اپنے لیے جیتا ہو وہ کیا ڈرے گا۔ اس سے شام کو بات کریں گے۔ تیرا خیال ٹھیک ہے۔ وہ چاروں سپاہیوں کا پتا وہ معلوم کر لائے گا تو باقی کام ہم معلوم کر لیں گے۔ لیکن اس وقت باہر نکل۔ ایک اور کام تو کر سکتے ہیں ہم۔ کام بڑا ہے مگر اس کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ الف دین نے بھی قمر جمشید کے نیچے ایک سرنگ کی موجودگی کی تصدیق کی تھی جو تہہ خانے سے کسی دوسری جگہ نکلتی ہے۔ جہاں سے ایمبولینس ... ہوتا تھا ہم وہ جگہ تلاش کر سکتے ہیں۔"
"قمر جمشید کے نیچے تہہ خانہ ہے۔" محسن بولا۔ "یہ تو میں جانتا ہوں۔ لیکن یہ کیسے معلوم ہو گا کہ وہاں سے نکلنے والی سرنگ کس طرف ہے؟"
"خدا نے جو چار سمتیں بنائی ہیں ان میں سے ایک سمت ہو گی۔" میں نے کہا۔ "تم باہر سے پچھلی سمت کا تعین کرنا پڑے گا اور یہ بھی آسان کام ہرگز نہیں ہے۔ پہلے سروے کریں گے اور امکانات کا جائزہ لیں گے۔"
"اور سروے کرتے ہوئے پکڑے گئے تو ہمارا کیا بنے گا؟"
"مزار شریف۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "اسی قمر جمشید کے تہہ خانے میں۔ اکیلے نہیں ہوں گے ہم وہاں۔ دیگر ارواح بھی ہوں گی۔"
ٹیڈی نے باہر جا کے صورت حالات کا مشاہدہ کیا اور سب خیریت ہے کی رپورٹ دی تو میں اور محسن باہر نکلے۔ ساڑھے گیارہ سے اوپر کا وقت تھا اور سورج سر پر کھڑا ہونے لگا تھا۔ ... خوشگوار تمازت اور اجلی دھوپ نے دل میں ... کو تازہ کیا اور میں نے اسٹیئرنگ سنبھالا تو گزشتہ شب ... کا احساس کم ہو چکا تھا۔ ... ٹیڈی نے ہماری ہدایت پر ایک پولیس انسپکٹر اور ایک ... کی وردی ساتھ رکھ دی تاکہ ضرورت پڑے تو ہم حلیہ بدل سکیں۔ ایک ایک ... ہم سب کے پاس تھا۔ علاوہ اس کا ... سائلنسر والا ریوالور ... اپنے پاس رکھا تھا۔
"وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کہ ہم شیو بنانا چھوڑ دیں۔" محسن نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ ہم دو ہفتے میں ...

قسم کی داڑھی مونچھ کے مالک بن سکتے ہیں۔ اصلی اور ناقابل استعمال۔ جن کو حسب ضرورت کاشت کیا جا سکتا ہے اور اپنے پسندیدہ شیڈ میں رنگا جا سکتا ہے۔ اس سے چہرہ پچاس فیصد بدل جاتا ہے۔"
"پچیس فیصد تبدیلی بالوں کا اسٹائل بدل لینے سے لائی جا سکتی ہے۔" میں نے تائید کی۔ "مثلاً میں عالم لوہار کی طرح زلفیں رکھ لوں اور تو یُل برائنر کی طرح اسمارٹ ہو جائے سر کو شیو کرتا تھا وہ ہر روز۔"
ٹیڈی ہنس پڑا۔ "قسم مولا علی کی کیا چیز نکلو گے۔"
"میں بحیثیت چیئرمین اس تجویز پر عمل درآمد کا حکم دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آج سے شیو تاحکم ثانی معطل۔"
"مجھے منظور ہے لیکن عالم لوہار میں بنوں گا۔" محسن بولا۔ "یُل برائنر کی طرح اسمارٹ تو ہو جا۔"
"ڈسپلن کے بغیر ایم آرمی نہیں چل سکتی۔" میں نے غرا کر کہا۔ "آرڈر از آرڈر۔"
"میں علم بغاوت بلند کر چکا ہوں۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟" محسن نے مسرت سے کہا۔ "تجھے گنجا ہونا پڑے گا۔"
"اچھا ہم ٹاس کر لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "نفاق سے کیا فائدہ۔ چاند میری ہو یا تیری؟" میں نے گاڑی روک کے جیب سے سکہ نکالا اور اوپر اچھال کے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا۔
"چاند تارا۔ اگر چاند تارا ہو گا اوپر تو میں جیتا۔ میں اپنی مرضی کا ہیئر اسٹائل منتخب کروں گا۔" محسن نے کہا۔
میں نے ہاتھ ہٹایا۔ سکہ الٹا تھا یعنی چاند تارا نیچے کی طرف تھا۔ میں نے قہقہہ مارا۔ "ہم گراؤنڈ آسترا؟" محسن نے کہا۔
"یہ بے ایمانی تھی۔" محسن نے کہا۔ "سکے پر چاند تارا تھا ہی نہیں۔ اس کے علاوہ جیتنے والے کو اپنی مرضی کا ہیئر اسٹائل اختیار کرنے کا حق حاصل ہوا ہے۔ ہارنے والے پر اپنی مرضی کا ہیئر اسٹائل تھوپنے کا نہیں ہے۔ شک لب تو چاہے تو عالم لوہار جیسی زلفیں رکھ سکتا ہے یا یُل برائنر کی طرح فارغ البال ہو سکتا ہے مگر میں مجبور نہیں ہوں گنجا ہونے پر۔"
"تو لفظوں سے کھیل رہا ہے۔" میں نے بڑبڑایا۔
"تم کس اسی لیے جاتا تھا۔" محسن بولا۔ "ویسے میں بھی بدل لوں گا بالوں کا انداز۔ میں کراچی کا ٹپ بن سکتا ہوں یا افریقی پاپ سنگر کا اسٹائل اختیار کر سکتا ہوں۔ بیاسے کے گھونسلے کی طرح۔"
اچانک میری نگاہ ایک دیوار پر گئی اور میں نے بریک

www.paksociety.com

لنگڑے کا گاڑی کو احاطے کے دروازے سے اندر موڑ لیا۔ "تم دونوں بیٹھو۔ میں ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔" میں نے اترتے ہوئے کہا۔

ایک بار میں پھر اسی اسکول کی پرنسپل کے مقابل پہنچا جس نے مجھے الف دین کا پتا فراہم کیا تھا۔

"میں...!" وہ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "اب کیا چاہیے؟ میں نے الف دین کا پتا دے دیا تھا ناں؟"

"وہ پتا غلط تھا۔" میں نے اطمینان سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

پرنسپل کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ "کیا پتا غلط تھا؟ تم جانتے ہو میں نے خود رجسٹر سے لکھ کر دیا تھا؟"

"اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہ کہ آپ نے پتا درست لکھا تھا؟" میں نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے میں نے جانتے بوجھتے تم کو غلط پتا لکھ کر دیا تھا؟" وہ بگڑ کے بولی۔

"نہیں، میرا مطلب کچھ اور تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے الف دین وہاں نہیں ملا تھا۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" پرنسپل جھنجھلا کے بولی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ گھنٹی کی طرف بڑھا۔ میں نے گھنٹی اٹھا لی۔

"مجھے وہ پتا دے دو، جہاں الف دین آج مل سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"آج...؟ آج بھی اسے وہیں ہونا چاہیے اور اگر اس نے پتا بدل لیا ہے تو میں کیا جانوں وہ کہاں گیا ہے؟"

"آپ کو اپنی بڑی بہن کے متعلق معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کہاں ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

میرے الفاظ کا وہی اثر ہوا جو میں چاہتا تھا۔ پرنسپل کا رنگ اتر گیا اور اس کے مزاج کا سارا کرارا پن رخصت ہو گیا۔ وہ شکست خوردہ اور نروس نظر آنے لگی۔ اس کی نگاہیں کچھ پڑھتی رہیں۔

"وہ آپ کی بڑی بہن ہی نہیں، اسکول کی مالک بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور ریکارڈ پر وہ ہیڈ مسٹریس ہیں حالانکہ وہ ایک ان پڑھ خاتون ہیں۔ پرنسپل آپ ہیں۔"

"تم... تم کون ہو؟ اور یہ سب کیسے جانتے ہو؟" پرنسپل نے میز پر سے گلاس اٹھا کے ایک گھونٹ پانی پیا۔

"مجھے خود الف دین نے بتایا تھا اور بھی باتیں ہیں جو شاید آپ کے علم میں بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کی اور بڑی بہن کی صورت میں حیرت انگیز مشابہت ہے لیکن کوئی شک بھی نہیں کر سکتا کہ الف دین کی جاہل بیوی سے آپ کو کیا تعلق ہے اور آپ اسی کی ملازم ہیں۔ میں اسے قابل نفرت نہیں، بہن کی شفقت بھی سمجھتا ہوں اور ضرورت بھی۔ اسے اسکول چلانے کا کوئی تجربہ نہ تھا اور نہ اس میں اتنی صلاحیت تھی۔ وہ کوئی بھی پرنسپل رکھ سکتی تھی لیکن چھوٹی بہن تعلیم یافتہ ہو تو سب سے بہتر۔ آپ کو باعزت روزگار مل گیا اور الف دین کو باعزت روزی کا ذریعہ۔ وہ بہت عظیم آدمی ہے۔ بہت اچھا ہے۔ اچھا آدمی وہ ہوتا ہے جس کا باطن اچھا ہو، ظاہر تو کبھی بھی اچھا نظر آ جاتا ہے...."

"کیا اس نے تمہیں اس لیے یہ راز دیا تھا کہ تم اس کی تشہیر کرو؟" پرنسپل نے بالکل بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ بات صرف میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یا آپ ہیں۔ کسی تیسرے شخص کو اس کا علم نہیں ہو گا۔"

"میرا خیال تھا وہ اپنے گھر جائیں گے۔ اپنے گاؤں۔" وہ افسردگی سے بولی۔ "لیکن الف دین بہت زیادہ خوفزدہ تھا۔ اس نے بیوی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے اور وہ ملتے ہی مجھے اطلاع کر دے گا۔ میں کیا بتاؤں کہ آج وہ کہاں ہے۔"

"اس کے کچھ دشمن ہیں۔ جو بہت بااثر اور طاقتور ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ کو خطرہ محسوس نہیں ہوتا کہ جو میں نے آپ سے کیا ہے، وہی سوال لے کر الف دین کے دشمن بھی آ سکتے ہیں؟ اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ یا تو سچ اگلوا لے کر جائیں گے ورنہ آپ کو لے کر جائیں گے۔ آپ کی دو چیزیں، آپ کا جسم اور جان۔"

پرنسپل کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑ گیا۔ "میرے سوا یہ بات کوئی نہیں جانتا۔" وہ بولی۔

"اگر آپ کو اتنا ہی یقین ہے تو ٹھیک ہے لیکن مشورہ ہے کہ آپ بھی اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہ ہوں۔ آپ کا یقین... غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ جاننے والے سب جان لیتے ہیں۔" میں نے کہا اور اٹھنے لگا۔

"ایک منٹ۔ آپ کے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟" وہ گھبراہٹ میں بولی۔

"آپ کو استعفا دے کر نکل جانا چاہیے۔ آج ہی۔" میں نے کہا۔ "کسی دوسرے شہر میں آپ پرنسپل نہیں ہوں گی تو ٹیچر تو بن ہی جائیں گی۔ کسی اجنبی شہر میں جہاں آپ کا شناسا کوئی نہ ہو۔ آپ ہوسٹل میں رہیں اور اپنا [illegible] نام

لیں۔ کم سے کم ایک سال تک۔ وہاں کون ہے؟ آپ کے آبائی گھر میں؟"

"کوئی نہیں۔ والدین تھے، دو سال پہلے۔ اب گھر بند پڑا ہے۔" وہ بولی۔

"پھر فکر کی کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"لیکن میں یوں غائب ہو گئی تو بعد میں ان سے کیسے رابطہ قائم ہو گا؟ ہو سکتا ہے الف دین خط لکھے۔"

"پہلے زندگی کو بچانے کی تدبیر کیجیے۔" میں نے کہا۔ "خدا چاہے گا تو ملاقات کی سبیل بھی نکل آئے گی۔ میں بس اتنا ہی کہنے کے لیے رکا تھا۔"

"اپنا نام پتا کچھ تو دے کر جاؤ۔" وہ ایک دم اٹھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خوف سے کانپ رہی ہے۔

"سوری!" میں نے کہا۔ "بس اتنا ہی یاد رکھنا کہ میں ایک خیر خواہ تھا۔ خدا حافظ۔"

محسن اور شیڈی پانچ منٹ کے بجائے پندرہ منٹ تک انتظار کر کے بور ہو گئے تھے۔ میں نے ان سے معذرت کی۔ "میرا خیال تھا کہ یہاں سے الف دین کا پتا مل سکتا ہے۔" میں نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

"اب الف دین کی ہمیں کیا ضرورت ہے؟" محسن نے چونک کے کہا۔

"وہ... دراصل اس نے وہ سرنگ دیکھی تھی۔ وہ جگہ دیکھی تھی۔" میں نے کہا لیکن میری بات نامکمل رہ گئی۔ میں نے ایک گاڑی کو تیزی سے اندر آتے دیکھا اور آخری وقت میں سامنے سے تصادم کو بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ گیٹ کافی بڑا تھا اگر پورا کھلا ہوا ہوتا تو دونوں گاڑیاں خیریت سے گزر جاتیں لیکن اس کا ایک لوہے کا پٹ بند تھا۔ دوسری گاڑی کی ہیڈ لائٹ سے ٹکرائی۔ اس کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ گیٹ ایک دھماکے سے اکھڑ گیا اور دور جا گرا۔ میں نے شیشہ ٹوٹنے کی آواز بھی سنی جو اندر جانے والی کار کی ہیڈ لائٹس کے پاش پاش ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔ بے اختیار میرے ساتھ محسن اور شیڈی نے بھی سر گھما کے دیکھا۔

"کیا گاڑی کے بریک فیل ہو گئے ہیں؟" میں نے کہا۔ "یا ڈرائیور کا دماغ خراب ہے؟"

"اندر داخل ہونے کا کون سا طریقہ ہے۔ کوئی بچہ آ رہا ہوتا تو کیا ہوتا؟" محسن نے کہا لیکن اس وقت تک میں گاڑی روک چکا تھا۔ خلاف توقع وہ دوسری گاڑی رکی نہیں تھی۔ یہ ممکن تھا کہ سامنے سے اس کا حلیہ نہ بگڑا ہو لیکن لوہے کے گیٹ کو اکھاڑ پھینکنے والے اپنے نقصان کی پروا کیے بغیر سیدھے جا رہے تھے۔ اس قسم کے ایکسیڈنٹ سے عام آدمی حواس باختہ ہو جاتا ہے اور اگر جان بچ جائے تو خدا کا شکر ادا کرنے کے بعد سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ نقصان کتنا ہوا۔ عام شریف آدمی کسی بچوں کے اسکول میں یوں طوفانی رفتار سے گیٹ توڑ کر داخل بھی نہیں ہوتے اور اگر ان سے یہ غلطی گاڑی کے بے قابو ہونے کے باعث سرزد ہو تب بھی ان کا رد عمل مختلف نہیں ہوتا لیکن اب مجھے شک ہو چلا تھا کہ یہ عام اور شریف لوگ نہیں تھے۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو سیاہ رنگ کی سوزوکی پرنسپل کے دروازے کے مقابل ٹھہر چکی تھی۔ اس کے پیچھے پولیس نمبر پلیٹ تھی۔ کسی پرائیویٹ کار کے پیچھے کمرشل نمبر پلیٹ لگانا ان کی بہت بڑی حماقت تھی۔

"محسن! یہ معاملہ گڑبڑ ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ لوگ پرنسپل کے پاس کیوں گئے ہیں؟"

"کیوں گئے ہیں؟" محسن نے میری طرف تشویش سے دیکھا۔ میری نظر نے تقریباً سو گز دور ایک شخص کو گاڑی سے اتر کے پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ ایک منٹ بعد وہی شخص پرنسپل کو گھسیٹتا ہوا باہر لایا۔ اسکول کے اندر ایک چیخ پکار مچ گئی تھی لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ آگے بڑھ کے پرنسپل کو اغوا کرنے والے کا راستہ روکتی۔ خود میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں دوڑ کر سو گز کا فاصلہ طے کرتا یا گاڑی کو پھر اسٹارٹ کر کے موڑتا اور ان سے براہ راست تصادم کا خطرہ مول لیتا۔ میں دوڑ کر اچھی جگہ آ بیٹھا۔ اندر سے ایک فائر کی آواز سنائی دی۔

"تم دونوں اتر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "ریوالور تیار رکھنا۔ میں ان کا راستہ کاٹتا ہوں۔"

"دیکھیے... تو کیا؟" محسن نے کہا۔ کار اب تیزی سے گیٹ کی طرف آ رہی تھی۔

"باہر نکل۔" میں نے چیخ کر کہا اور ان دونوں کو ایک ساتھ باہر گرتے دیکھا۔ سوزوکی دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے اس کی رفتار کا اندازہ کیا اور خدا پر بھروسا کرتے ہوئے گاڑی کو موڑ کر گیٹ کے سامنے لے آیا۔ میرے پاس ایک سیکنڈ کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں دروازہ کھول کے باہر کود ہی چکا تھا کہ سوزوکی نے گیٹ بلاک کر دینے والی گاڑی کو ٹکر ماری۔ تصادم کی قوت میں اسے چند گز دور تک گھسیٹتی لے گئی — دھات سے دھات کے ٹکرانے اور رگڑنے کی سمع خراش آواز کے ساتھ پھر شیشہ بکھرنے کا چھناکا سنائی دیا۔ ایک عورت نے

www.paksociety.com

دلنواز شیخ مارتی اور میں نے سیاہ مورس کا ونڈ اسکرین ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو کے غائب ہوتے دیکھا۔ گاڑی چلانے والا اچھلا اور اس کا لہولہان چہرہ انتہائی کرب میں نظر آیا۔ شیشے کے ٹکڑے اس کے سامنے چہرے میں چھروں کی طرح پیوست ہو گئے تھے۔ ہماری کورٹینا ایک سائڈ کے دونوں دروازوں کے پچک کر اندر گھس جانے کے بعد الٹ گئی تھی۔ سیاہ مورس کے پچھلے والے گیٹ سے دو افراد باہر کودے۔ ان میں سے ایک نے نشانہ لینے کے لیے ریوالور اٹھایا مگر محسن اور ٹیڈی غافل نہیں تھے۔ دوسرے فائر کی آواز کے ساتھ ہی سر پر نشانہ لینے والا گھوما۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور گر گیا اور وہ منہ کے بل سڑک میں گر کے لوٹنے لگا۔ دوسرے نے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے اس کے پیٹ پر لات ماری اور اسے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا کے گاڑی پر دے مارا۔ کورٹینا میں آگ لگ گئی تھی لیکن وہ کچھ دور تھی نہ

"خیال رکھنا یہاں کوئی رکنے نہ پائے۔" میں نے چلا کر کہا اور محسن نے ایک گاڑی والے پر فائر کیا جو رکنے لگا تھا۔ گاڑی ایک دم رفتار پکڑ کے نکل گئی۔ ایک اور فائر ہوا اور گولی میرے کانوں کو چھوتی ہوئی گزری۔ میں نے اپنے حریف کو اٹھنے سے پہلے دوسری زبردست ٹھوکر ماری کہ الٹا اور وہ کو رینگنا پڑ جانا پڑا۔ آگ نے اس کے کپڑوں کو لپیٹ میں لے لیا۔ وہ چیخا اور خاموش ہو گیا۔ میں پلٹ کر سیاہ مورس کی طرف دوڑا۔ اس کا ڈرائیور اٹھ کے پیچھے پلٹ رہا تھا۔ میں نے اپنا سائلنسر والا ریوالور اٹھا کے فائر کیا تو سیکنڈ کے ہزارویں یا دس ہزارویں حصے کی تاخیر نے اسے پہلے گولی چلانے کا موقع دے دیا۔ اس نے مجھ پر گولی نہیں چلائی تھی۔ میری گولی لگتے ہی وہ گرا اور اس کا جسم باہر کی جانب لڑھک گیا۔ میں اور محسن ایک ساتھ جست لگا کے مورس تک پہنچے۔ میں نے ڈرائیور کی خون آلود جگہ سنبھالی اور جب گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا تو خدا کا شکر ادا کیا۔ ہماری کورٹینا اب دھڑا دھڑ جل رہی تھی اور اسی کے ساتھ ایک بدمعاش کا ناپاک وجود بھی خاکستر ہو رہا تھا۔ سڑک پر چلنے والے دور تک خوف زدہ نظروں سے یہ عجیب تماشا دیکھ رہے تھے۔ دیر سے پہنچنے والوں کا خیال تھا کہ یہ حادثہ ہے مگر فائرنگ کی آواز سننے والوں کے نزدیک یہ حادثہ نہیں بدمعاشی کا مظاہرہ تھا۔

میں نے مشکل سے پچاس گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ جب کورٹینا کا پٹرول ٹینک ایک دھماکے سے پھٹا اور میں نے دھوئیں کے بادل کے ساتھ بھڑکتے شعلے بھی اوپر اٹھتے دیکھے۔ پلٹ کر دیکھا۔ پچھلی سیٹ پر محسن اور ٹیڈی پرنسپل کے بے جان جسم کو سنبھالے ہکا بکا بیٹھے تھے۔ وہ میرے ساتھ کسی اور کام کے لیے نکلے تھے اور یہ نہ بتا سکتے تھے کہ یہاں میں صرف الف دین کا پتا معلوم کرنے آیا تھا لیکن ذرا سی دیر میں موت کا ایک اور خونی ڈراما ختم ہو گیا۔ ان کی عقل یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ سب کیوں ہوا۔

"یہ... یہ زندہ ہے؟" میں نے کہا حالانکہ میرا یہ سوال بے مقصد تھا اور مجھے احساس تھا کہ میں خود فریبی کا سہارا لے رہا ہوں۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "گولی سر میں لگی تھی۔" اور پھر وہ منظر دیکھا جب زخمی ڈرائیور نے اٹھ کر پیچھے فائر کیا۔ سیکنڈ کے ہزارویں یا دس ہزارویں حصے کا فرق زندگی اور موت کا فرق بن گیا تھا۔ میری ہار بن گیا تھا اور یہ سب ختم ہو گئی تھی۔ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔ پرنسپل کی خون آلود لاش نے طنز سے کہا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اس سے کہا تھا کہ میں بس اتنا جاننے کے لیے رکا تھا کیا یہ اسے کچھ دیر پہلے نہیں بتا سکتا تھا۔ فلاں گزشتہ روز جب اس مشابہت کا احساس ہوا تھا۔ الف دین کی بیوی میں نے اس کے بچپن میں دیکھی تھی اور پرنسپل کو عمر کے فرق کے باوجود میں نے صورتوں کے تفاوت کو محسوس کر لیا تھا۔ دیر میں مرنے کی۔ میں ایک گھنٹا پہلے آسکتا تھا، آدھا گھنٹا یا پندرہ منٹ قبل بھی پہنچ سکتا تھا۔ منٹ پہلے اسے مجبور کر سکتا تھا کہ اسی وقت میرے ساتھ چلے۔ میں نے گاڑی روک کر اسٹیئرنگ پر سر رکھ دیا۔ سرد و سفاک مقدر میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ تم کچھ نہیں کر سکتے۔ نکل گئے آج! ذرا ایک گھنٹہ پہلے، ایک منٹ پہلے کوئی جو فرشتۂ اجل کے آنے اور جانے کا تھا اس وقت کو کیسے پہنچ سکتا تھا۔ وہ لمحہ کسی آدم خاکی کی دسترس میں ہوتا جو فنا کا لمحہ ہوتا ہے۔ "بس اتنا ہی!" اور لکھا گیا میں ایک تھا۔ میرے اپنے الفاظ کی بازگشت میری روح کے جسم بن گئی۔ اچھے بچے جو مریضوں کا خیال رکھنا۔

محسن نے میرا کندھا ہلایا تو مجھے ہوش آیا۔ ہم ویران گلی میں کھڑے تھے لیکن آنا گزرنے والوں کو سے جھانکنے والوں کی نظر بہت تصویر بنی تھیں۔ ایک کے گیٹ سے اور دوسری بار ہماری گاڑی سے ٹکرانے کے بعد سیاہ مورس کا سامنے والا حصہ بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ ریڈی ایٹر کا سارا پانی بہہ گیا تھا اور اب وہ چل بھی نہیں سکتی تھی۔ اندر خون ہی خون تھا اور شیشہ ہی شیشہ تھا۔ ونڈ اسکرین نہ ہونے سے گاڑی ایک کھنڈر نظر آتی تھی اور اس میں بیٹھے ہوئے ہم تین افراد اس صورت

رہے تھے۔ ہمارے ہاتھ اور کپڑے بھی خون آلود تھے جیسے ہی کوئی بھی پولیس والا نمودار ہو جاتا تو ہمیں دھر لیتا اور ہم ایک ڈھنگ کے ساتھ پکڑے جاتے۔ باقی کسر اسکول میں درجنوں افراد کی گواہی پوری کر دیتی۔ ہم بھی تین تھے اور سیاہ مورس میں پرنسپل کو اغوا کر کے لے جانے والے بھی تین تھے۔ ایک منٹ کے مختصر وقت میں ان کی صورتوں پر غور کرنے کا موقع کس کو ملا ہو گا۔ سب ہم پر ہی انگلی اٹھا دیتے کہ یہی وہ مجرم ہیں۔

"اب یہاں سے نکلنے کی فکر کرو۔" محسن نے کہا۔ "جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔"

"یا اللہ میری توبہ!" ٹیڈی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ کیا عذاب آ گیا!"

"اس حلیے میں باہر نکلے تو فوراً پکڑے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہم کسی کو مدد کے لیے بلا سکتے ہیں اور نہ اس کار میں فرار ہو سکتے ہیں۔ تم ایک گاڑی پیدا کرو۔ ٹیکسی ہو تو بہتر ہے۔"

محسن باہر نکلا اور چند قدم چل کے گلی کے موڑ تک گیا۔ پرنسپل کا بے گناہ لہو اس کے دامن پر اور آستین پر پھیل گیا تھا اور بے گناہ سے فریاد کرتا تھا۔ تاہم مجھے امید تھی کہ محسن عقل سے کام لے کر مسئلہ حل کر لے گا۔

"یہ کون تھی سکندر بادشاہ؟" ٹیڈی نے خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کیا۔ وہ جتنا بڑا بدمعاش اور ہمت والا بنتا تھا اس کا دل اتنا ہی چھوٹا تھا۔ گاڑیوں کی ٹکر، پرنسپل کا اغوا، فائرنگ اور خونریزی، ہماری گاڑی کی تباہی اور پرنسپل کی لاش کے ساتھ ہمارا فرار، یہ سب چند منٹ میں پیش آ جانے والے واقعات دیکھ کر اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔

"تھی ایک بدنصیب ٹیچر۔ اس کے مقدر میں بھی ہمارے سبب اسی طرح مرنا لکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے اسے بچانے کی بے سود کوشش کی۔ جب میں اسے بچا نہیں سکتا تھا تو کیا ضرورت تھی مجھے یہ الزام اپنے سر لینے کی۔"

گلی کے موڑ پر ایک ٹیکسی نمودار ہوئی۔ محسن ٹیکسی کو بہت تیزی سے جھٹکا ہوا لا رہا تھا۔ میں نے ٹیڈی کو ہوشیار کیا۔ ٹیکسی ایک سیکنڈ کے لیے رکی اور ہم کار سے ٹیکسی میں منتقل ہو گئے۔ محسن نے ٹیکسی کو پوری طرح روکا بھی نہیں تھا کہ پھر اسٹارٹ کر دیا۔ وہ بار بار پیچھے پلٹ کر دیکھتا تھا۔ ہم گلی کے آخری کنارے پہنچے جب پیچھے سے چند افراد دوڑتے ہوئے نمودار ہوئے۔ محسن نے ٹیکسی کو بار بار موڑا اور مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا علاقے سے باہر نکل آیا۔ "بڑی مصیبت ہو گئی تھی۔" محسن نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ٹیکسی والا مقابلے پر آمادہ تھا۔"

"تو نے کیا کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"میں تو زخمی اور بیمار بن کے کھڑا ہوا تھا۔" محسن بولا۔ "اس سے کہا، اسپتال لے چلو جو مانگو گے دوں گا۔ اس نے بٹھا تو لیا لیکن راستے میں کہنے لگا کہ تم زخمی تو نظر نہیں آتے۔ میں نے ریوالور نکال لیا اور کہا کہ چپ چاپ پیچھے اتر جاؤ لیکن وہ آدمی تیز وار تھا۔ اس نے شور بھی مچایا اور مجھ پر حملہ آور بھی ہوا۔ اب یا تو میں گولی چلاتا یا اسے ناک آؤٹ کرتا۔ میں نے ریوالور کا دستہ دو بار اس کے سر پر مارا اور پھر اسے پیچھے لڑھکا دیا لیکن اس کے ہنگامے نے لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا اور وہ اتنا سخت جان تھا کہ سڑک پر گر کر اس وقت بھی بے ہوش نہیں تھا۔ کچھ لوگ میرے پیچھے بھاگے تھے۔ ایک دو پتھر بھی آ کے لگے تھے ٹیکسی پر مگر خطرہ ایک لونڈے نے پیدا کر دیا تھا جو موٹر سائیکل لے کر تعاقب پر آمادہ تھا۔ ایک ہوائی فائر کیا تو وہ بائیک کا پیچھا چھوڑ کر بیٹھ کر بھاگا۔ مگر خطرہ یہ تھا کہ کوئی اور پیچھے نہ لگ جائے۔"

"ہم سب کے کپڑے خون آلود ہیں۔" ٹیڈی نے کہا۔ "گاڑی الگ گئی ہاتھ سے۔ اب کیا کریں؟"

"میری جیب میں تقریباً ڈھائی سو روپے موجود ہیں۔" محسن بولا۔

"چار سو کے قریب میرے پاس ہیں۔" میں نے کہا۔

"اپنی جیب میں تو سو بھی نہیں بچے ہوں گے۔" ٹیڈی نے نخوت سے کہا۔

"پیسے تو کافی ہیں۔ نئے کپڑوں کے تین جوڑے آ سکتے ہیں لیکن بازار جا کے لائے کون؟" میں نے کہا۔

تھوڑا سا غور و فکر کرنے کے بعد ہم نے مسئلے کا حل نکالا کہ ٹیڈی نے میری پتلون پہنی جس پر خون کا ایک داغ تو تھا لیکن اوپر کی جانب اور محسن کی قمیص جس کی ایک آستین پر خون کا رنگ آیا تھا۔ اس آستین کو اوپر چڑھا کے وہ قمیص یوں پہن سکتا تھا کہ دامن باہر رہے اور پتلون کے داغ کو چھپا لے۔ میری پتلون اسے بڑی تھی اور کچھ ڈھیلی بھی تھی۔ اسی طرح محسن کی قمیص اس کو ڈھیلی تھی لیکن وہ اپنی مضحکہ خیز حالت کی پروا کیے بغیر پیدل چلتا ہوا ایک دکان تک گیا۔ اپنا سائز اسے معلوم تھا اور میں نے اسے بتا دیا تھا کہ محسن کا اور میرا سائز میڈیم ہے۔ تقریباً آدھا گھنٹا ہم ایک محدود علاقے میں پھرتے رہے۔ ہم انار کلی کے قریب سے سیدھے مال روڈ پر زینب مارکیٹ تک جاتے تھے۔ چند منٹ قیام کرتے تھے اور واپس آ کے ٹیڈی کو دیکھتے ہوئے سیدھے نکل جاتے تھے پھر پاک ٹی ہاؤس کے قریب سے موڑ کاٹتے تھے اور چلا

www.paksociety.com

گنبد سے گھوم کر دوبارہ بینک اسکوائر کے پاس مال روڈ پر طلوع ہوتے تھے۔ ابھی دوسرا چکر جاری تھا کہ میں نے ٹیڈی کو بنڈل بغل میں دبائے یونیورسٹی کے بس اسٹاپ پر دیکھ لیا۔ ہم جھگیوں کی توپ کے پاس سے گھوم کر آئے اور اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ ٹیکسی کو ہم نے میوزیم اور پنجاب پبلک لائبریری کے درمیان روک لیا جہاں نسبتاً خاموشی تھی اور دو چار گاڑیوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ سب سے پہلے ٹیڈی گیا اور پنجاب پبلک لائبریری کے باتھ روم سے اپنے کپڑے بدل کے نکل آیا۔

”کسی نے دیکھا تو نہیں ہے؟“ میں نے کہا۔ ”کہ اندر کون گیا تھا اور باہر کون آیا؟“

”نہیں سکندر بادشاہ۔“ وہ بولا۔ ”اندر تو قبرستان سے زیادہ خاموشی ہے۔ وہاں بھی جھڑیاں کرتے کرتے ہیں۔ یہاں سب کتابیں کھولے بیٹھے ہیں۔ کسی کی نظر ادھر اُدھر جاتی ہی نہیں۔“

اب ٹیڈی باہر کھڑا ہوا اور اس نے ایک طرف سے شیشوں کو تھوڑا بہت کور کر لیا۔ دوسری طرف دیوار تھی۔ میں نے ٹیڈی کے بے داغ کپڑے محسن کو دیے۔ اس نے ٹیڈی کی روایت پر عمل کیا اور کچھ دیر بعد نیا شلوار قمیص پہنے نمودار ہوا۔ اس کے پاس وہ جوڑے اتارے ہوئے بھی تھے جن کو اس نے بنڈل بنا کے بغل میں دبا رکھا تھا۔

”شک کی کوئی بات؟“ میں نے کہا اور محسن نے انکار میں سر ہلایا۔

”کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ایک آدمی مجھے گھور رہا تھا۔ وہ اٹھ کے آگے آیا بھی تھا لیکن میں راستہ کاٹ کے تیزی سے باہر نکل آیا۔ اب تیرا اندر جانا ٹھیک نہیں۔“ محسن نے کہا۔ ”کھسیں اور چلتے ہیں۔“

میرا مسئلہ بینک اسکوائر کے عقب میں حل ہوا۔ اب ہم تینوں بے داغ نئے کپڑوں میں تھے اور یہ ضروری تھا کہ ہم اس ٹیکسی کو بھی کہیں چھوڑ دیں اور خون آلودہ کپڑوں سے بھی نجات حاصل کر لیں۔

”پیسے کتنے بچے ہیں؟“ میں نے نیچے اتر کے کہا۔ ٹیکسی کو میں نے باغ جناح سے پہلے اسمبلی بلڈنگ کے پیچھے روک دیا تھا۔ وہاں اور بھی گاڑیاں تھیں لیکن لوگ بہت کم تھے جو تھے وہ ہماری طرف متوجہ نہ تھے۔

”چار سو تو میرے پاس ہیں؟“ ٹیڈی نے کہا۔ ”مجھے سوا سو دیے ہیں۔“ محسن بولا۔

”ابھی گزارے کے لیے کافی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ہم تینوں اپنے اپنے کپڑوں کے بنڈل لیے پیدل روانہ ہو گئے۔

”اب پہلے کھانا کھاتے ہیں اور کافی پیتے ہیں تاکہ اعصاب نارمل ہو آ جائیں۔“ میں نے کہا۔

”پہلے ان کپڑوں کو کہیں پھینک دیں۔“ محسن نے کہا۔ ”جیبوں میں سے ہر چیز نکال لی ہے نا؟“

”نکال لی ہے۔ منظور ابھی کورٹ میں ہوگا۔ یا کورٹ سے [illegible] پڑا ہو گا تو راستے میں ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن تمہاری گھر والی تو گھر میں ہے۔ کبیر خان [illegible] کہا۔ اسے فون کر دے۔“

میں چونک پڑا۔ نہ جانے کتنے عرصے بعد اس نے [illegible] بیگم کا نام لیا تھا۔ میں بے اختیار ہنس پڑا اور محسن نے محسوس کیا کہ یہ حرکت غیر شعوری تھی۔ ٹیڈی کچھ نہ سمجھنے کے باوجود ہنسنے لگا۔ اس کے خیال میں یہ محسن کا کبیر [illegible] مذاق تھا۔ کپڑوں کو ہم نے موقع پا کر تین مختلف مقامات پر گٹر دیکھ کے غرق کر دیا۔ گٹر کے گندے پانی میں غلاظت کے ساتھ ایک مجرم کا خون ایک بے گناہ [illegible] کے مقدس پیشے سے وابستہ عورت کے خون کے ساتھ [illegible] لگا۔ موت سب کو برابر کر دیتی ہے۔ انگریز کہتے ہیں [illegible] کالے، امیر و غریب، معصوم اور گنہگار سب مر کے [illegible] ہوتے ہیں۔ وہی حشرات الارض ان کو کھاتے ہیں اور وہ [illegible] طرح مٹی ہو جاتے ہیں۔ بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے، تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ حشر [illegible] کے سوا کچھ نہیں۔

مجھے بھوک نہیں تھی لیکن مال پر آنے کے بعد سب [illegible] ریسٹورنٹ فیروز سنز کے ساتھ ہی تو تعمیر شدہ [illegible] کے سکون پرور ماحول میں بیٹھ کر میں نے اور محسن نے [illegible] کے ساتھ سینڈوچ کھانے کا فیصلہ کیا۔ ٹیڈی نے [illegible] لنچ طلب کیا۔ میں نے ان کو مختصراً پرنسپل کے قتل کے اسباب بتائے۔

”اس کو تو مرنا ہی تھا۔“ محسن نے کہا۔ ”ولاور [illegible] تھی کہ وہ کس کی بہن ہے۔“

”الف دین بھائی تھا طافو کا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ الف [illegible] سے پوچھنا چاہتے ہوں گے کہ طافو نے اسے ہمارے بارے میں کچھ بتایا تھا یا نہیں۔ جب وہ نہیں ملا تو ان کا [illegible] پرنسپل کی طرف گیا جو الف دین کی بیوی کی بہن تھی [illegible] سے الف دین کے بارے میں ضرور پوچھتے اور اپنے طریقے سے پوچھتے۔ اسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا تو وہ کیا بتاتی [illegible] کرتے مر جاتی۔ مگر وہ سمجھے کہ وہ بہن کو بچا رہی ہے [illegible] سے مری اور بہن کو ہر حال بچانے میں کامیاب [illegible]

”ہم اس واردات میں بلاوجہ ملوث ہو گئے۔“ محسن نے [illegible] ”کل یہ خبر بہت اچھل جائے گی۔ اس بار مسئلہ ایک اسکول کی پرنسپل کا ہے۔ جسے غنڈے دن دہاڑے اٹھا کے لے گئے اور قتل کر دیا۔ اس کی لاش تو مل ہی جائے گی۔“

”ہاں۔ پبلک کا اور پریس کا بہت دباؤ ہوگا پولیس پر۔“ [illegible] متفکر ہوتے کہا۔ ”ممکن ہے یہ خبر زیر تال کر دیں اور طلبا [illegible] جلوس وغیرہ نکالیں۔ گورنر اور آئی جی بھی خصوصی تحقیقات کا حکم دیں گے۔“

”ہمارا تو پرنسپل سے دور کا بھی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔“ محسن بولا۔

”ہاں۔ لیکن میں دو بار اس سے ملنے گیا تھا۔“ میں نے [illegible] ”نہ جانے کس کس نے مجھے دیکھا ہوگا۔ اب پولیس نے تصویریں دکھائیں تو شاید کوئی شناخت کر لے۔“

”پرنسپل کے پاس دن بھر میں بہت سے لوگ آتے ہیں۔“ محسن نے مجھے تسلی دینے کے لیے کہا۔ ”اس کے علاوہ گرلز اسکول میں سب لیڈی ٹیچرز ہیں۔ وہ گواہی سے دور رہیں گی۔ معاملہ بہت سنگین ہے۔ سب کو خوف ہوگا کہ تفتیش کا چکر لمبا ہوگا۔“

”کتنی بڑی کمزوری ہے یہ ہمارے قومی اخلاق و کردار کی۔“

”لوگوں کا اخلاق و کردار ٹھیک ہے۔ پولیس کا رویہ اور عدالتی طریق کار جو مشکل ہوتا ہے اور اتنی پریشانی پیدا کرتا ہے کہ اچھے بڑے با اصول اور ہمت والے بھی جان بچاتے ہیں۔ صرف ایک بار کی بات نہیں ہوتی۔ برسوں عدالت اور تھانے کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ اتنا فاضل وقت کس کے پاس ہے؟ اور مجرم حاضر بھی تو سیدھا نہیں چلتا۔ بعض اوقات سچی گواہی بھی جھوٹی کر دی جاتی ہے اور گواہ پھنس جاتے ہیں۔ مجرم قاتل کے بعض اوقات الگ پریشان کرتے ہیں کہ گواہ منحرف ہو جائے۔“

”مجھے تو ولاور کے تین آدمی اور اگر وہ بچ کر نکل جاتے تو یقیناً ہمارے متعلق اپنے آقاؤں کو سب بتا دیتے مگر کچھ شک اب بھی ہوگا ولاور کو۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے آدمی گولیوں سے ہلاک ہوتے تو وہ سمجھتا کہ یہ حادثہ تھا لیکن اس کیس میں پولیس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ ملے گی تو اس کا شک یقین میں بدل جائے گا [illegible] جب ریوالور کی گولی سے ہلاک ہوئے وہ ولاور [illegible] گاڑی تو جل کے خاک ہو جائے گی۔ جبکہ [illegible]“

”چلو اچھا ہے۔“ محسن بولا۔ ”ولاور یہ نہ سمجھے کہ ہم میدان چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ وہ تو کل بھی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ ہم نے اس [illegible] اپنی جان بچانے کے لیے کتنے پاپڑ بیلے اور [illegible]

”وہ ان چاروں کو اچھا انعام دے گا جو رابعہ کی کوٹھی میں گئے تھے میری گرفتاری کا انعام لینے مگر خود گرفتار ہو گئے۔“ میں نے کہا۔ ”اتنے کم حوصلہ لوگ تھے کہ دو چھوٹے بڑے اور ولاور کا نام بک دیا۔“

”غلطی ولاور کی تھی۔ اس نے اتنے کم حوصلہ آدمی منتخب ہی کیوں کیے تھے؟“

”اسے تو ناکامی کا خیال تک نہ ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”جیسے خود مجھے کامیابی کا پورا یقین تھا۔“

”وہ چاروں تو مارے گئے۔ دیکھ لینا ولاور انھیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ محسن بولا۔ ”آج کے تین آدمی بھی شمار کرو تو کل سے اب تک اس کے سات آدمی کم ہو گئے۔“

”مرنے والے بہت ہیں۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”بلیک کرنے والوں کے پاس پیسہ بہت ہے۔ یہ سب غربت اور معاشی بدحالی سے جنم لینے والی برائیوں کا شاخسانہ ہے۔ ایسے ہزاروں لاکھوں ہیں جو بچپن میں تلخئی حالات کے باعث گھروں سے بھاگ جاتے ہیں یا اسکول نہ جانے کے باعث بری صحبت میں پڑ جاتے ہیں۔ ہمت یا صلاحیت کی کمی ہوتی ہے اس لیے جرائم کی طرف راغب تو ہوتے ہیں مگر کوئی بڑا کام نہیں کر پاتے کہ اپنی تقدیر بدل سکیں۔ یونہی چھوٹے موٹے جرائم کر کے جیل جاتے ہیں اور باہر نکل کے پھر وہی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ولاور جیسے بڑے بدمعاش دس بیس ہزار میں ان کو زرخرید بنا لیتے ہیں۔ بساط ان کی ہوتی ہے بازی ان کی ہوتی ہے اور چال وہ چلتے ہیں لیکن پٹتے یہی مہرے ہیں۔ ان کی اہمیت پیادوں سے زیادہ نہیں۔ شطرنج میں بادشاہ کے ساتھ وزیر ایک ہوتا ہے۔ فیل دو اور پیادے آٹھ ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں بھی مفلسی اور بے روزگاری نے پیادوں کا حصول بہت آسان بنا دیا ہے۔ مایوس آدمی سوچتا ہے کہ ایسی زندگی سے کیا حاصل۔ دس بیس ہزار اکٹھے مل گئے تو واہ، ورنہ ہارنے کو کیا ہے؟“

”اب تک منظور اپنے گھر پہنچ گیا ہو گا۔“ محسن نے کہا۔ ”کچھ دیر بعد اپنے سسرال چلا جائے گا۔“

”تو فون کر لے اسے۔“ میں نے کہا۔ ”اس سے کہو کہ ہمیں بیس پچیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ کل تک انتظام کر دے۔“

”وہ تو دے گا۔ کہہ دوں کہ تمہارے لیے ایک نئی گاڑی چاہیے؟“ محسن ہنستے ہوئے بولا۔

”یار اس نے اپنی گاڑی دی تھی کہیں ڈھنگ سے ہونے کے لیے۔“ مجھے اچانک یاد آیا۔ ”اس سے کہنا کہ وہی گاڑی لے آئے اور اس کا ایک ٹرانسفر لیٹر بنائے۔ کسی بھی فرضی نام سے خواہ جس صورت میں ہی کے نام کر دے۔“

”اس کی نمبر پلیٹ پرانی ہو گی۔“ محسن بولا۔

www.paksociety.com

"اوّل تو کسی کو یاد نہیں ہوگا وہ نمبر" میں نے کہا "اور ہو اتو ہم حسب ضرورت اسے بدلتے رہیں گے۔ اس طرح ابھی پیدا خوب کرنے سے بچ جائیں گے اور وہ گاڑی بے حد آزمودہ اور قابلِ اعتماد ہے۔"

"تو نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا اس کی تعریف" محسن بولا "سنگ پیلئے کا زمانہ گزر گیا۔ اب لیٹنے کی کار ہی ناقہ بنی ہے۔"

"یہ ناقہ کیا ہوتا ہے سکندر بادشاہ؟" ٹیڈی نے ڈکار لے کر کہا "لیٹنے تو ہم سمجھتے ہیں۔"

"ناقہ نہیں سمجھتے؟ جبھی یہ پولیس اکثر ناکہ بندی کرتی رہتی ہے تاکہ اسمگلر وغیرہ آسانی سے گزر جائیں۔" میں نے کہا "جیسے اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر جاتا ہے۔ کچھ مجرم ہوتے ہیں چیونٹی کے برابر۔ وہ ناکہ بندی میں پکڑے جاتے ہیں۔ کچھ ہوتے ہیں اونٹ سے بھی بڑے۔ وہ ناکے سے نکل جاتے ہیں۔"

ٹیڈی کا منہ کھلا رہ گیا "اونٹ؟ ہم سے تو دھاگا نہیں گزرتا سوئی کے ناکے سے۔"

"یہی تو سارا فرق ہے دوست... تم دھاگا نہیں گزار سکتے۔ گزارنے والے ناکے سے اونٹ گزار دیتے ہیں۔" میں نے کہا "اٹھو اب چلیں۔ محسن خان ابھی واپس آ رہے ہیں۔"

"یہ آج کی باتیں اپنی کھوپڑی میں بیٹھ نہیں رہی ہیں" ٹیڈی نے سر کھجایا "محسن نے تم کو کبیر خان کہا تھا اور اب تم اس کو اچکن کہہ رہے ہو۔ اہم سے بھی کچھ چھپا ہے جو دوست ہے؟"

"ارے یار کیسی باتیں کرتے ہو" میں نے کہا "تم سے کیا پوشیدہ ہے۔ کبیر خان میرے بچپن کا نام ہے اور اچکن کسے کہتے ہیں شیروانی کو۔ اس کا نام محسن شیروانی ہے۔ اسی بات پر یاد آیا کہ ہم جو تم کو ہر وقت استاد ٹیڈی کے نام سے پکارتے ہیں تو آج تک تم نے اپنا اصل نام نہیں بتایا۔" میں نے محسن کو اشارہ کیا اور وہ پلٹ کر ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ہم معمولی ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔

"اصل نام تو ماں باپ نے نیک محمد رکھا تھا" ٹیڈی شرمسار لہجے میں بولا۔

"یہ شرمندگی کیسی؟ انھوں نے غلط نام نہیں رکھا تھا" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا "تم نیک آدمی ہو۔ نیک آدمی بُرے حالات میں پھنس جاتا ہے مگر اس کی فطرت کی نیکی ضائع نہیں ہوتی جیسے کیچڑ میں گرا ہیرا۔ اس کی آب و تاب باقی رہتی ہے۔"

"وہ تقلید خود آ رہی ہے" محسن نے کہا "قدرت کی ایک رات نے مجبور کر دیا۔ دونوں تھے ہم دونوں کو مجبور کر دیا۔ ایک ہم ہیں" شرم و حیا کے مجسمے" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"منع نے تو اسے منع نہیں کیا؟" میں نے کہا۔

"میں ظالم سماج نہیں ہوں اور منع کرتے سے وہ رک جائے تو جنات کی مجبوری نہ تھی؟" محسن بولا "وہ گاڑی بھی لے آئے گا۔ تیرا حال پوچھ رہی تھی میں نے کہا بُرا حال ہے۔ کبھی کہتا ہے زید کی طرح جسے قزاقوں کا ٹ ڈالوں؟ کبھی کہتا ہے مجنوں کی طرح تم کے صحرا کی طرف نکل جاؤں؟ کل رات اختر شماری کرنا چاہتا تھا مگر آسمان پر بادل تھے۔" اس کی مجھ اس ٹیکسی میں بیٹھنے تک جاری رہی۔ ٹیکسی کو ہم نے ہمیشہ کی طرح کچھ دور چھوڑا اور باقی فاصلہ پیدل طے کر کے ٹیڈی کی گلی میں پہنچے تو مرزا غالب کو عجیب کیفیت میں دیکھا۔ مقفل دروازے کے سامنے فرش پر خالص آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور پُرتکلف خوان میں کھانا تناول فرما رہے تھے۔

"بہت مہمان نواز لوگ ہیں تمھاری گلی کے" وہ بولا "بھوکا پیاسا بیٹھا تھا کہ ایک فرشتہ صفت بزرگ تشریف لائے۔ احوال پوچھا تو میں نے کہا مسافر ہوں۔ جس سے ملنے آیا تھا وہ موجود نہیں۔ انھوں نے کھانا بھجوا دیا۔"

"اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے؟" میں نے اس وقت کہا جب ٹیڈی دروازہ کھول رہا تھا۔

"وہ دراصل ان کے ساتھ ایک خاصی دلکش خاتون تھیں جو مجھے مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔ میرا خیال ہے مجھ میں کشش اب بہت زیادہ ہے۔ یہ انھی کی مہربانی ہوگی جو وہ اپنا خوان اٹھا اندر آ گیا۔

"لیکن تم نے تو شام کو آنے کو کہا تھا اور تم اپنا استعفا اخبار کے منہ پر مارنے گئے تھے" میں نے کہا۔

"گیا تو تھا لیکن راستے میں مجھے تمھاری بات یاد آئی کہ استعفا منہ پر مارو گے تو کون سا تیر مار لو گے۔ مرا اخبار کا مالک اخبار فروش ہی رہے گا۔ چنانچہ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا" وہ کھاتے ہوئے بولا۔

"یہ تم نے بہت عقلمندی کا فیصلہ کیا" میں نے کہا "کہ آزادی کی رکنیت کے بعد تم پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے وسائل کا بہترین استعمال کرتے ہوئے ہماری مدد کرو اور جتنے وسائل اس بڑے اخبار میں رہ کر تمھیں میسر ہیں وہ کسی چھوٹے اخبار میں نہیں ہوں گے۔ تم ایک قومی سطح کے اخبار کے رپورٹر ہو۔ چھوٹے اخبار میں جاؤ گے تو تمھاری یہ پوزیشن نہیں رہے گی جو اب ہے اور ہمیں تمھاری پوزیشن بہت فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ مثلاً تم ایک کام فوراً کر سکتے ہو۔"

"بولو بولو" وہ کھانا ختم کر کے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔

"انسپکٹر فتح شیر کے ساتھ چار ماتحت چوہدری دلاور کے گھر گئے تھے" میں نے کہا "انھوں نے رشوت لے کر طافو کی لاش کی لاش وہاں سے ہٹا دی اور دلاور پر کوئی حرف نہیں آیا۔ بعد میں وہ لاش کو کہیں اور پھینک آئے۔ دریا میں یا کسی اور جگہ۔ فتح شیر نے تو کہا تھا کہ راول ڈیم میں ڈال دی تھی مگر وہ جھوٹ تھا۔ راتوں رات راول ڈیم تک جا کے لوٹ آنا ناممکن تھا اور پھر اس کام کے لیے اتنے تردد کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ فتح شیر تو مارا گیا مگر وہ چار آدمی زندہ ہیں اور بتا سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو کتنا پیسہ ملا تھا اور طافو کی لاش کہاں ہے؟ مشکل یہ ہے کہ ہمیں ان کے نام پتے معلوم نہیں اور ہمارا ان سے ملنا بے حد ضروری ہے۔ ایک تو وہ دلاور کے خلاف گواہی دینے پر مجبور ہوں گے۔"

"گواہی کس کیس میں؟" غالب نے کہا "میری دلاور سے بات ہوئی تھی۔ اس نے خاصے تعجب کا اظہار کیا کہ کل رات اس کی گاڑی رابعہ قادری کی کوٹھی میں ملی۔ اس نے کہا کہ چوری کی رپورٹ لکھوانے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا تھا کہ گاڑی کسی غلط مقصد کے لیے استعمال نہیں ہوگی اور پولیس نے یقین دلایا تھا کہ مل جائے گی لیکن ابھی تک ان کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ میں نے اسے فتح شیر کی لاش اور وہاں پکڑے جانے والے چار افراد کے متعلق بتایا کہ وہ تمھارا نام لے رہے تھے تو وہ ہنسنے لگا اور بولا کہ رپورٹر صاحب، اگر وہ آپ کا نام لے دیتے تو کیا ہوتا۔ میں نے اپنی بار اس کی ملاقات کا ذکر کیا تو کہنے لگا کہ آپ خدانخواستہ چرس یا ہیروئن سے تو شوق نہیں رکھتے۔ کل شام چھ بجے سے رات بارہ بجے تک میرے گھر میں پارٹی تھی جس میں خاصے معزز لوگ مدعو تھے۔ تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن وہ سب گواہی دیں گے کہ میں ایک منٹ کے لیے بھی باہر نہیں نکلا تھا ایسے میں کام کیا کر سکتے ہو؟"

"یہ وقت بتلائے گا کہ تقدیر کس کو بگاڑتی ہے اور تدبیر کس کی تقدیر بناتی ہے" میں نے کہا۔ پھر میں نے محسن کو پیچھے دیکھا۔ محسن مجھے بڑے جسم سے اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے اس کا مفہوم اخذ کیا اور غالب سے اسکول میں پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ نہیں کیا "تم ہمارا اتنا ہی کام کر دو۔ کبھی نہ کبھی گواہ سامنے آ ہی جائیں گے۔"

"وہ کیس کون کرے گا اور کب کرے گا؟" غالب بولا "علاوہ اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ گواہی کا مرحلہ آنے تک تمھارے یہ گواہ اس دنیا میں ہوں گے؟ عالمِ ارواح میں تو عدالت کے سمن نہیں پہنچتے۔"

"ہم کوشش کریں گے کہ انھیں خطرات سے آگاہ کر دیں اور تحفظ فراہم کریں۔ زندگی اور موت ہمارے بس میں نہیں لیکن گواہی ہم آج بھی لے سکتے ہیں" میں نے کہا "جیسے فتح شیر تو مر گیا مگر خود اپنے خلاف گواہی ہمارے پاس چھوڑ گیا۔ میں ابھی تمھیں سناتا ہوں۔"

دروازے پر دستک ہوئی اور ایک بزرگوار اندر آ گئے۔

"بھئی وہ مہمان تھے تمھارے میاں نیک محمد!" وہ بولے۔

"بڑی مہربانی آپ کی جناب" ٹیڈی نے برتن اٹھا کے کہا "آپ نے ناحق تکلیف کی۔"

"تکلیف کیسی میاں! اس سے بھی ہمسایوں کا کچھ حق تو ہوتا ہے" وہ بولا۔

"آپ کی صاحبزادی نے بہت اچھا کھانا پکایا تھا" غالب نے بھی شرافت سے کہا "شکریہ ادا کیجیے۔"

"لاحول ولاقوۃ، میاں نیک محمد! واقعی یہ بدتمیز اور بد اخلاق بدزبان ہوتے ہیں تمھارے مہمان؟"

"جی... جی بہت... بہت معافی چاہتا ہوں" ٹیڈی نے ہکلا کے کہا "ان کو معلوم نہیں تھا۔"

"خاک معلوم نہیں تھا" بڑے میاں نے بیر پٹخ کے کمرے سے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا "مشکوحہ کو بیٹی کہتا ہے۔ نامعقول!"

"اُف! کیا کر دیا یہ تم نے سوچے سمجھے بغیر" ٹیڈی نے سر پکڑ کر کہا "غالب بھائی! وہ اس کی بیوی تھی۔"

"کوئی بات نہیں۔ یہ نظر کا دھوکا ہے۔ ہم نے تو کھانے کی تعریف کی تھی" غالب نے بے نیازی سے کہا "پھر وہ کیسٹ سننے لگا جس میں دلاور کی اور میری گفتگو الگ تھی جو ہم نے ایف ایم مائک سے ریکارڈ کی تھی۔ دوسرا کیسٹ وہ تھا جس میں فتح شیر کی اور میری گفتگو تھی اور جو میں نے اس کے گھر میں بیٹھ کے کی تھی۔ یہ گفتگو محسن نے باہر اپنی گاڑی میں ریکارڈ کی تھی۔ غالب بہت توجہ کے ساتھ سنتا رہا۔ پھر میں نے اور محسن نے اسے انگلستان میں قیام سے اب تک پیش آنے والے تمام واقعات ضروری تفصیلات اور ترتیب کے ساتھ سنائے۔ غیر اہم واقعات کو ہم نے اس روداد میں سے خارج کر دیا مگر باقی سب بتا دیا جو چوہدری دلاور نے اور میر شرافت علی نے پہلے میرے والد وزیر خان کے ساتھ کیا تھا اور پھر ہم سب

www.paksociety.com

کے ساتھ۔ آن میں رابعہ، محسن اور شملا سب ہی کو نقصان ہوا تھا۔ جتنا نقصان ہم دلاور کو پہنچا چکے تھے وہ بھی ہم نے تسلیم کیا۔ اس آپ بیتی میں سب کا ذکر بالترتیب آیا تھا۔ فواد بچے سے کر رابعہ کی ماں، سلامت شاہ، عبدل اور اس کی ماں، شیدے، شملا، مم علی اور ڈی سلوا سے لے کر رابعہ کے بدمعاشوں تک سب کے مارے جانے کا ذکر تھا۔ ہم نے واقعات کو اختصار کے ساتھ پیش کیا تھا پھر بھی بہت کچھ رہ گیا۔ باہر سے رابعہ کی کار کا ہارن سنائی دیا۔ میرا دل ایک دم دھڑکا اور میں نے ایک جست لگا کے دروازے تک پہنچنے اور دیدہ و دل فرش راہ کرنے کا ارادہ کیا مگر عقل کے پہرے دار نے مجھے روک لیا۔ دو منٹ بعد رابعہ اندر آئی اور چند لمحے ایسے گزرے جب ہم نے صرف ایک دوسرے کو دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اور اس کے درمیان جدائی کی صدیاں بیت چکی ہوں اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین اور دلربا تھی۔ ان چند لمحوں میں زمان و مکاں کے فاصلے مٹ گئے تھے اور وہ مجھ میں سما گئی تھی تو میں اس کے وجود کا ایک حصہ بن گیا تھا اور وقت ٹھہر گیا تھا پھر محسن نے چھینک ماری جو بے سبب تھی اور ہنسا۔

"یہ کم بخت عشق، مشک اور ناکام چھپائے نہیں چھپتے" غالب بولا۔ "اندر آئیں نا جی۔ اپنا ہی گھر ہے۔" رابعہ کا چہرہ تھوڑی سی دیر کے لیے اس کے گلابی لباس جیسا ہو گیا تھا۔ "میرا نام غالب ہے۔ میں بالکل شاعر نہیں ہوں اس لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں ایک سچا لیکن بے وقوف صحافی ہوں۔ آپ کو جانتا ہوں۔ آپ رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہیں۔" اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا اور اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔ مجبوراً رابعہ نے بھی مصافحہ کیا۔ وہ اس کی عادی نہیں تھی لیکن غالب کی ادا میں بے ساختگی تھی۔ محض نیت کا خلوص تھا اور دوستی کا عہد تھا۔ چنانچہ مجھے یہ حرکت ذرا بھی معیوب نہیں لگی۔

"یہ ایم آر آئی کے منتظر رکن ہیں اور اتنے ہی قابل اعتماد ہیں جتنے ہم سب۔" میں نے کہا۔

"تو تم نے ایم آر آئی کا مذاق بنا لیا ہے۔" رابعہ مسکرائی اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"مذاق؟ کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ جیسی سمجھ دار خاتون ایک سنگین حقیقت کو مذاق کہے۔" محسن بولا۔ "اس سے زیادہ سنجیدہ بات ہم نے پہلے کبھی کی ہے۔ کیوں میاں سکندر اعظم؟"

"میرا خیال ہے سنجیدہ بات کے لیے عقل و شعور رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔" میں نے کہا۔ "سنجیدہ ہوں۔"

رابعہ ہنسی۔ "اب تم لڑنے لگو گے۔ یہ بتاؤ ... کیا ہوا ہے؟"

"وہی جو اس سے پہلے دوسری گاڑیوں کا ہوا تھا" ... نے کہا۔ "اور اب تمھاری اس گاڑی کا ہوگا۔"

"خدا نے تمھیں عقل دی ہوتی تو بیل بار کے ... اس شخص کو دیتے خدا بھی۔" محسن نے کہا۔ "... کر فضل ہے دماغ کا۔ تو تحریری ہی! آپ یہ بتائیں کہ ... ہوتا ہے دخل در نامعقولات کرنے والا؟"

میں نے محسوس کیا کہ رابعہ نروس ہو رہی ہے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ محسن پر شوخی سوار تھی اور وہ دوسرا ... موجودگی کا خیال کیے بغیر رابعہ کے پیچھے پڑ گیا تھا لیکن بڑی وجہ یہ تھی کہ غالب اس کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ... شک گزرا کہ رابعہ نے غالب کو پہچان لیا ہے۔

"میں ابھی چند دن منظر کے گھر میں ہوں۔" رابعہ نے ...

"اپنے مکانات کی فروخت کے سلسلے میں اس کو جنرل پاور آف اٹارنی دے دی تھی۔ کل پرسوں یہ کام ہو جائے گا۔ آفس کا چارج ... نے اسے دے دیا ہے۔ وہ فرم کے سارے کاروبار کی نگرانی کرے گا۔ دوسرے چاروں وکیل اپنا اپنا کام ویسے ہی کرتے رہیں گے جیسے پہلے کرتے تھے۔"

"ان میں سے کسی نے احتجاج نہیں کیا کہ یہ ذمے داری اسے کیوں نہیں سونپی گئی؟" میں نے کہا۔

"ان میں جو سب سے سینئر ہے وہ میرے ساتھ سب سے زیادہ مخلص ہے۔" رابعہ بولی۔ "مجھے جاتے ہوئے دیکھ کر وہ خوش بھی ہوئے اور افسردہ بھی۔ ان میں سے ایک ... جائے لیکن باقی تین نے کہا کہ جیسی آپ کی خوشی۔" پھر اس نے ہینڈ بیگ میں سے ایک چابی نکالی جس کے ساتھ ایک ٹیگ ... بھاگے سے بندھا ہوا چھوٹا سا کارڈ۔

"یہ مکان خالی ہے اور بہت اچھا ہے۔" وہ بولی۔ "... پوری کیسے گا؟"

"کرائے پر لیا ہے تم نے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ابھی کرائے پر ہی ٹھیک ہے۔ جب ... والا میرا مکان تباہ ہو چکا ہے میں بے گھر ہوں۔ اب ... جائے تو خیال ہے کہ ایک مکان خرید لوں۔" وہ بولی۔ ... بات کچھ عجیب سی لگی۔ پہلے کبھی اس نے نہیں کہا تھا کہ وہ ... ہے۔ اس کو بے گھر کرنے کا واقعہ ذہن میں تھا چنانچہ ... سے بچانے کے لیے وہ اس ذکر سے بھی گریز کرتی تھی۔

بجھا سا احساس ہوا کہ دل کے اندر محرومی کے ایک کانٹے کی ... آج تک اسے تڑپا رہی ہے اور اگرچہ میری محبت کے جذبات قوی تر تھے لیکن ان سے خلش کا آزار کم ہوئی تھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

"یہ گھر بھی تو تمھارا ہی تھا۔" محسن نے کہا۔ "جو تم بیچ ... بنا رہی ہو"

"گھر جب بنائے جاتے ہیں تو بیچے نہیں جاتے آباد کیے جاتے ہیں۔" وہ بولی۔ "اس کوٹھی میں آباد کون ہو سکتا ہے؟ وہ تو ایک منحوس اور آسیب زدہ کھنڈر ہے جس کی دیواریں حویلی کی دیواروں سے زیادہ بے رحم ہیں۔ تم دیکھنا جب میں کوئی گھر خریدوں گی تو اس گھر کی دیواریں میرے لیے اجنبی نہیں ہوں گی۔ میں اب چلتی ہوں۔"

"میں تم کو چھوڑ آؤں؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے کچھ باتیں کروں اور کچھ باتیں پوچھوں لیکن اس نے مجھے اور محسن کو ہاتھ سے منع کر دیا جو میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

"میں ٹیکسی لے کر چلی جاؤں گی۔" وہ بولی۔ "تم لوگ ذرا احتیاط رکھو۔ نقد کا انتظام تو اس وقت ہو نہیں سکا۔ میرے پاس یہ دو ہزار ہیں۔" اس نے ہینڈ بیگ سے نوٹ نکال کر محسن کو تھما دیے۔

"کیا بات ہے؟ تم بہت عجلت میں ہو۔" میں نے کہا۔ "ذرا ... بیٹھو کوئی ادھار بھی نہیں۔"

اس نے مجھ سے نظر ملائے بغیر ایک چیک نکالا۔ "یہ بھی ... کام آئے گا۔"

"نہیں چاہیے مجھے یہ چیک۔" میں نے بڑی سے کہا۔ "کیسے بتاؤں کہ یکلخت تمھارے لہجے میں یہ اجنبیت کیوں ... ہونے لگی ہے مجھے؟ تم صرف ہماری ضرورت پوری کرنا چاہتی ہو؟ اپنے کاروبار، اپنے گھر اور اپنی ذات کے تحفظ کا خیال ہے تمھیں اور تم کہہ رہی ہو احتیاط رکھو۔ ... خیال تھا تم منظر کے گھر میں رہنا منظور نہیں کرو گی۔ ان حالات میں تم ہمارے ساتھ رہو گی۔ کچھ کر دیا نہ کہو سارا ہی ... لیکن معلوم ہوتا ہے تم ڈر گئی ہو۔ اچانک تمھیں مصلحت، مفاد ... اندیشی کے تقاضوں کا احساس ہو گیا ہے۔ تم نفع نقصان سوچنے لگی ہو۔"

"اس وقت تمھارا دماغ خراب ہو رہا ہے۔" وہ صاف ... بولی۔ "اس لیے میں کسی بات کا جواب نہیں دوں گی۔"

"صاف کہو کہ جواب دینا نہیں چاہتی ہو۔ ہمت نہیں ہے صاف جواب دینے کی۔" میں نے چلا کے کہا۔ "میرا دماغ تو شروع سے خراب تھا مگر تمھارا دماغ اب ٹھکانے پر آ گیا ہے۔ آدمی ایک کی مانتا ہے۔۔۔ دل کی یا دماغ کی۔ تم نے کیسے مایوس کیا ہے رابعہ!"

وہ اچانک اٹھی اور باہر نکل گئی۔ محسن نے گھور کر مجھے دیکھا اور رابعہ کے پیچھے دوڑا۔ چند سیکنڈ کے بعد فاکس ویگن کا انجن گرجا اور میں سمجھ گیا کہ محسن زبردستی رابعہ کے ساتھ اسے پہنچانے کے لیے نکل گیا ہے۔

غالب نے ایک قہقہہ مارا۔ "کتنا خبطی عشق ہے سچا اور کھرا۔ قسم خدا کی میں نے کسی عورت کو کسی سے سچی یوں محبت کرتے نہیں دیکھا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ یہ وکیل ہو گی لیکن یہ تو صرف عورت ہے۔ سچی اور کھری عورت۔"

"قسم مولا علی کی۔ تم نے اس وقت لاکھ روپے کی بات کہی ہے۔" شیدی نے غالب کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ میں کچھ دیر خالی الذہن کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے اپنے ہی الفاظ کے طمانچے اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگے۔ یہ میں نے رابعہ سے کیا کہہ دیا! یہ کیا تھا؟ حالات سے حسد، رقابت کا جذبہ، عشق کا جنون یا نروس بریک ڈاؤن؟ رابعہ ناراض ہو گئی؟ نہیں۔ وہ مجھ سے ناراض کیسے ہو سکتی ہے! وہ جانتی ہے کہ الفاظ بہت بے وقعت ہوتے ہیں اور جتنی محبت میں اس سے کرتا ہوں وہ لفظوں کی زبان میں نہیں کہی جا سکتی۔ جب وہ سب کچھ سمجھتی ہے تو فکر کی کیا بات ہے۔

چند منٹ بعد پھر فاکس ویگن کی آواز آئی جس کا مطلب یہ تھا کہ محسن اسے گھر تک نہیں قریب ہی کسی جگہ چھوڑ آیا ہے۔ "چلو سر سے بوجھ کچھ تو کم ہوا۔" محسن نے اندر آتے ہی کہا۔ "ایک مصیبت تو ٹلی۔"

"کہاں چھوڑ آیا ہے اسے؟" میں نے بے حد ڈھٹائی سے دانت نکال کے کہا۔ "گھر تک جاتے ہوئے موت آتی تھی؟"

"وہ کہنے لگی مجھے دلاور صاحب کے گھر کا پتا معلوم ہے۔" محسن نے کہا۔ "اچھا ہے ان سے عقد کر لے گی تو آرام سے رہے گی۔ نہ کوئی مصیبت ہو گی نہ پریشانی۔ جتنا ہمارا ساتھ دینے میں کھویا ہے اس سے زیادہ پا لے گی۔ میں نے تو کہا کہ دلاور ہر لحاظ سے بہتر ہے۔"

"شملا کو بھی قائل کر۔ چوہدری صاحب بہت فراخدل ہیں اور چار بیویوں کی بہرحال گنجائش ہے۔" میں نے کہا۔

"اور تو بھی ان کا پارٹنر بن جا۔ چھوڑ اس تمام قصے کو۔"

www.paksociety.com

محسن بولا۔ "باپ مر گیا تو مر گیا، تو اپنا فائدہ دیکھ۔ ہم بھی اپنے گھر جاتے ہیں۔" اس کا موڈ آف تھا اور وہ لڑنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔

"مجھے پتا ہے تو اس قسم کی زہریلی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ رابعہ نے بُرا مانا ہے میری باتوں کا؟" میں نے کہا۔

"بُرا مانا ہے؟ وہ رو رہی تھی ابو کے پیچھے۔" محسن نے اچانک چلا کر کہا۔ "سب کے سامنے ذلیل کیا تو نے اسے۔"

"سب کے سامنے اس سے معافی بھی مانگ لوں گا میں۔" میں نے کہا۔ "پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔"

"تجھے معلوم ہے اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" محسن نے اسی بیزاری سے کہا۔ "پولیس پہنچی تھی رضوی صاحب کے گھر۔ انھوں نے لاعلمی ظاہر کی تو کہا کہ غالباً وہ منظر ایڈووکیٹ کے گھر پہ ہوگی۔"

"انھیں کس نے بتایا؟ مطلب یہ کہ انکل رضوی نے کیا منظر کے گھر پہ پولیس متعین کر رکھی ہے؟"

"وہ ایس ایس پی ہیں۔ کیا نہیں کر سکتے۔" محسن بولا۔ "سادہ کپڑوں میں پولیس دور سے نظر رکھتی ہوگی کہ کون آیا اور کون گیا۔ پولیس نے منظر کے گھر پہنچ کے رابعہ کا بیان لیا۔ منظر اس کے ساتھ تھا چنانچہ وہ مایوس لوٹ گئے۔ وہ ایڈووکیٹ نہ ہوتا اور منظر کا گھر نہ ہوتا تو وہ سلسلہ آگے بڑھاتے یا دباؤ کا سہارا لیتے۔ اس پولیس انسپکٹر کے قتل کے سلسلے میں اعلیٰ افسروں کا بہت دباؤ ہے۔ رابعہ نے تو کہہ دیا کہ وہاں سے کسی انسپکٹر فتح شیر کی لاش برآمد ہوئی یا بہرِ خیریت۔ میں کیا بتاؤں جب کہ میں کئی ماہ سے اُدھر گئی ہی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر آپ نے وہ کوٹھی کیوں خرید کے ڈال دی ہے؟ منظر نے کہا کہ اگر یہ خلافِ قانون ہے تو بات کرو ورنہ دفع ہو جاؤ۔ انھوں نے چند سوالات اور کیے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ آپ کا ملزم سکندر بخت سے کوئی رابطہ ہے۔ اور رابعہ نے کہا کہ ہاں وہ میرا شوہر ہے لیکن میں بتا نہیں سکتی کہ وہ کہاں ہے۔ پولیس والے بتا گئے ہیں کہ وہ نام تو ایف آئی آر میں شامل نہیں کر رہے ہیں لیکن اس کیس میں ان کی تفتیش بہر حال ہوگی اس لیے وہ پتا بدلیں تو پولیس کو ضرور آگاہ کریں۔ منظر نے کہہ دیا کہ پتا میرے گھر کا لکھ لو۔ میں ان کا وکیل بھی ہوں۔ آج کی خبر میں رابعہ قادری ایڈووکیٹ کا نام نہیں تھا مگر کل ہوگا جب دوسرے اخباری نمائندے تفصیلات حاصل کریں گے۔ رابعہ اس وقت بڑا خطرہ مول لے کر یہاں پہنچی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ باہر سادہ کپڑوں والے پہلے گئے ہو

اس کا پیچھا کریں گے۔ اگر وہ گیراج تک جاتی تو گرفتاری کی شامت آ جاتی۔ وہ منظر کی بیوی کا برقع پہن کر نکل چکا تو کسی نے اس کا تعاقب نہیں کیا۔ گیراج تک پہنچنے سے پہلے اس نے برقع اتارا اور اپنی گاڑی لے کر یہاں آ گئی۔ وہ غالب کو اجنبی سمجھ کے اس کے سامنے کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ واپسی میں وہ پھر برقع پہن کر جائے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ منظر کو کچھ معلوم ہو۔ اس کی بیوی کو سات بجے کسی بچے کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جانا تھا اور منظر نے کہا تھا کہ وہ ساڑھے چھ بجے تک آ جائے گا۔ ظاہر ہے منظر کی بیوی کو برقعے کی ضرورت ہوگی۔ وہ دیر تک کیسے ٹھہرتی۔"

"میں شرم سے پانی پانی ہو چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب میں بلبلہ ہوں پانی کا۔"

"شاعر نے سچ فرمایا ہے۔" غالب بولا۔ "آدمی کے ہم میں شناخت قصہ پانی ہی ہوتا ہے۔"

"چابی کس گھر کی ہے؟" میں نے کہا۔

"اس نے اپنا آفس شفٹ کر دیا ہے۔" محسن بولا۔ "اور ریکارڈ سمیت منظر کے حوالے کر دیا ہے۔ منظر کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے آفس کو چھوڑ کر رابعہ کے آفس کے معاملات میں آ جاتا۔ منظر نے ایک بڑا فلیٹ لیا ہے جس کے ایک کمرے میں وہ خود بیٹھے گا اور باقی دو کمروں میں رابعہ کے ساتھ کام کرنے والے وکیل۔ کچھ قانونی کارروائی ایسی بھی ہو رہی ہے کہ رابعہ لیگل فرم مشترکہ طور پر رابعہ اینڈ منظر ایڈووکیٹس کے نام رجسٹرڈ ہو جائے۔ چابی رابعہ کے پرانے آفس کی ہے۔ یہ کارروائی پوشیدہ طور پر نہیں کی گئی تھی چنانچہ پولیس بھی جانتی ہے اور اس کی خبر انکل رضوی تک بھی پہنچ چکی ہوگی۔ پرانے آفس کی طرف اب کسی کا دھیان ہی نہیں جائے گا۔ اس نے کہا ہے کہ ابھی دو چار دن پرانے آفس کو تالا لگا رہے۔ وہاں رات کو بھی اندھیرا ہو تو اچھا ہے۔ اس کے بعد وہاں بھی کوئی خطرہ نہیں۔"

"تم نے کہا تھا کہ الطاف کے قتل کو چھپانے میں فتح شیر کے علاوہ بھی کچھ لوگ شریک تھے۔" غالب نے اچانک کہا۔

"ہاں۔ چار ماتحت تھے۔ کانسٹیبل ہوں گے یا ہیڈ کانسٹیبل۔" میں نے کہا۔

"کیسٹ سننے کے بعد میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا رابعہ ولاور کے خلاف استغاثہ دائر نہیں کر دینا چاہیے کہ اس نے فتح شیر کو مار کے یا مروا کے اس کے گھر میں پھینکا اور اسے کر کے اس کا کیریئر اور اس کی گڈول تباہ کرنے کی کوشش کی۔"

غالب بولا۔ "اگر وہ گواہ بھی ہوں تو ولاور اب بھی بچ نکل سکتا ہے۔ رابعہ کے لیے کیس کرنا کیا مشکل ہے لیکن وہ یہاں کسی بڑی الجھن میں الجھنا نہیں چاہے گی۔" میں نے کہا۔ "گواہ تو میں ہوں، ان کی گواہی بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔"

"اگر پولیس کے اپنے آدمی گواہ بن کے پیش ہو جائیں تو فتح شیر کا جرم ثابت ہو جائے گا۔" غالب بولا۔ "اس کے بعد فتح شیر کی گفتگو کے کیسٹ پیش کر کے ولاور کو گھسیٹا جا سکتا ہے۔"

"ہاں۔ صرف گھسیٹا جا سکتا ہے کیونکہ کیسٹ صرف فتح شیر کے خلاف ٹھوس شہادت فراہم کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ولاور کے خلاف نہیں۔ بے شک قتل کرنے کا سبب موجود ہے اور ثبوت بھی دستیاب ہو چکا ہے مگر ایک تو اس کے اپنے صفائی کے گواہ بہت مضبوط ہوں گے۔ دوسرے وہ ہمارے گواہوں کو راہ سے ہٹا سکتا ہے یا ختم کر سکتا ہے۔"

"میں اس کے خلاف خود بھی استغاثہ دائر کرنے کو تیار ہوں۔"

"صبر کرو مرزا غالب۔" میں نے کہا۔ "قانون کی بھول بھلیوں میں مت پڑو۔ جو حقیقت ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ تم بھی جانتے ہو۔ فتح شیر کو اس کے کیے کی سزا مل گئی۔ انھیں ہم خود سزا دیں گے جو اس کے شریکِ جرم تھے۔ تم صرف یہ معلوم کرو کہ اس رات تھانے میں ڈیوٹی پر کون لوگ تھے اور فتح شیر کے ساتھ گشت پر کون گیا تھا۔"

"چلو۔ مجھے اخبار جا کے اپنی رپورٹ دینی ہے۔" غالب بولا۔ "یہ بھی پوچھ لیں گے۔"

جب ہم باہر نکلے تو رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ میں نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھالی تو بہت سی پرانی یادوں نے مجھے اداس کر دیا۔ اس گاڑی کا رنگ زمانے کے ساتھ بدل گیا تھا۔ ایک وہ وقت تھا کہ میں اور رابعہ اسی میں راتوں کو شہر کی سڑکوں پر پھرتے تھے۔ اس نے بہت سے مشکل وقتوں میں ہمارا ساتھ دیا تھا اور ہماری ہر زیادتی برداشت کی تھی۔ اب اس کا رنگ سفید تھا اور یہ چلتی دیکھتی کار کسی نئی نویلی دلہن کی طرح ہر حقِ رفاقت ادا کرنے کے لیے موجود تھی۔ محسن غالب کی ہدایت کے مطابق گاڑی کو مختلف تھانوں کے سامنے سے گزارتا ہوا اس تھانے تک لے گیا جہاں وہ چند منٹ کے لیے رکا اور لوٹ آیا۔ تاریکی کی وجہ سے ہم سب اندر بیٹھے ہوئے لوگ بالکل محفوظ تھے۔ ڈارک شیشوں کے پیچھے کوئی ہماری صورت بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ وہی تھانہ تھا جہاں فتح شیر سب انسپکٹر تھا۔ غالب

وہاں سے دس منٹ بعد لوٹا تو کچھ پریشان سا تھا۔ اس نے مجھے گاڑی چلانے کا اشارہ کیا۔

"ان میں سے ایک تو آج ڈیوٹی پر آیا ہی نہیں۔" وہ میرے ساتھ بیٹھ کر بولا۔ "دوسرے کا ڈیوٹی پر آتے ہوئے حادثہ ہو گیا۔ ایک ٹرک اسے کچلتا ہوا نکل گیا۔"

"اور ٹرک کا نمبر کوئی نوٹ نہیں کر سکا۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "کل تک دوسرے کے متعلق بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس کو حوالات میں موت کیسے آئی۔ باقی دو کون تھے اور کہاں ہیں؟"

"ایک کانسٹیبل علی نواز ہے اور دوسرا ہیڈ کانسٹیبل چاند خان۔" غالب نے کہا۔ "دونوں ڈیوٹی پر ہیں۔ آٹھ بجے تک۔ دونوں کی حالت خراب ہے۔ بظاہر خود کو بیمار بتاتے ہیں لیکن میرا خیال ہے وہ خوف زدہ ہیں۔ انھیں کوئی دھمکی ملی ہے یا وہ خود سمجھ گئے ہیں کہ ان کا انجام بھی مختلف نہیں ہوگا جو ڈر ان کے دل میں ہے۔"

غالب کو اخبار کے دفتر میں چھوڑ کے ہم واپس گئے۔ مجھے اور محسن کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اب ولاور باقی دو گواہوں کو زندہ چھوڑ دینے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ ہمیں ان کو بچانا تھا اور یہ کام آسان نہیں تھا۔ اس میں براہِ راست ان سے تصادم کے امکانات بہت زیادہ تھے جو فتح شیر کی موت کے بعد اور الطاف دین کے غائب ہو جانے کے بعد فوری طور پر باقی چار افراد کے قتل پر مامور کیے گئے تھے۔ دو کو وہ ختم کر چکے تھے چنانچہ باقی دو کے لیے بھی بات صرف موقعے کی تھی۔ میں نے محسن کو تیار رہنے کو کہا۔ ہم بھی مشن پر نکلے تھے۔ اس کے لیے تمام ضروری سامان ہمارے پاس تھا۔ میرے پاس ولاور کا دیا ہوا سائلنسر والا پستول تھا جس میں ابھی چار گولیاں باقی تھیں۔ محسن کے پاس پورا بھرا ہوا ریوالور تھا اور ٹیپو کے پاس کلوروفارم کی وہ شیشی تھی جو ہمیں الطاف دین سے ملی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہمیں ان .... میں سے کسی کو اغوا کرنا پڑتا۔ اس کے لیے یہی سامان ہمارے کام آ سکتا تھا۔

تھانے سے کچھ فاصلے پر ہمیں ایک ٹرک کھڑا ہوا نظر آیا۔ ایک شخص ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور جب وہ کش لیتا تھا تو صرف ایک چنگاری سی روشن ہوتی تھی۔ اس کا اپنا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ دوسرا انجن کے اوپر چڑھا بونٹ میں سر ڈالے بظاہر کسی خرابی کو رفع کرنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن یہ کسی بھی جگہ ٹھہرنے کا وہ طریقہ تھا جو شک پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس

www.paksociety.com

آف کردیں۔

"یہ ٹرک پہلے تو نہیں تھا یہاں۔" میں نے محسن کو متوجہ کیا اور گاڑی کو ٹرک کے پیچھے لے جا کر روک لیا۔ "یہ وہی ٹرک تو نہیں ہے جس نے ایک گواہ ختم کر دیا۔ شاید وہ"

"محض شک کی بنیاد پر کیا ہو سکتا ہے۔" محسن بولا۔ "ہم جا کے کیسے پوچھ سکتے ہیں کہ یہاں کیوں کھڑے ہو؟ علی نواز اور چاند خاں کا انتظار کر رہے ہو کہ وہ ڈیوٹی کر کے نکلیں تو انھیں بھی کچل ڈالو!"

"ٹیڈی! ایک کام کرو استاد۔" میں نے کہا۔ "ذرا مکینک بن کے جاؤ۔ زبردستی اس شخص کی مدد کرو۔ میں ذرا پیچھے ہوں گا۔ ان کے رویے سے اندازہ ہو جائے گا۔ محسن، وہ اپنا پیکر نکال۔"

میں اور ٹیڈی آہستہ سے دروازہ کھول کے اترے۔ گاڑی کے دو شکنجے میرے ہاتھ میں تھے۔ جن پر موٹی کیلیں ایک ایک انچ ابھری ہوئی تھیں۔ ٹیڈی چند قدم آگے گیا اور رک گیا۔ میں سائڈ میں ذرا بیک سے بیٹھ گیا۔ کوئی آواز کیے بغیر میں نے گاڑی کے بلاک وہیلوں کے ساتھ لگا کے یوں رکھ دیے کہ کیلوں کا رخ اوپر کی طرف رہے۔

"کیا بات ہے بھائی؟" ٹیڈی کی آواز آئی۔ "کیا خرابی ہو گئی ہے؟"

"اپنا کام کر۔ خرابی کا ماما۔" انجن میں خرابی تلاش کرنے والے نے غرا کے کہا۔

"میں ایسے ہی نہیں پوچھ رہا ہوں۔" ٹیڈی بولا۔ "موٹروں کا کام کرتا ہوں۔ ایک نظر دیکھنے دو۔"

غالباً ٹیڈی نے بھی بمپر پر چڑھنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے ایک زبردست گالی سنی۔

"تو ٹھیک ہے تو میں چڑھی مار رہا ہوں۔ دفع ہو جا۔" ٹیڈی کو ایک اور گالی ملی۔

"پہلے دھکا دیا اب گالی دیتے ہو؟" ٹیڈی گرم ہو گیا۔ "نیکی کا زمانہ ہی نہیں ہے۔"

"کون ہے یہ؟" ٹرک کے ڈرائیور نے نسبتاً نرم لہجے میں سوال کیا۔

"ایسے ہی استاد۔ خواہ مخواہ مجھے لگ رہا ہے کہ مکینک ہوں۔" پہلے والے نے کہا۔ "کمبل ہو گیا ہے۔"

"میں واقعی بہت تجربے کار مکینک ہوں۔" ٹیڈی نے استاد کے پاس آ کے کہا۔ "میں نے کوئی پیسے تو نہیں مانگے تھے ایسے ہی مدد کے لیے رک گیا تھا۔ اس نے گالی بکی۔"

"اچھا بھائی معاف کرو۔" ڈرائیور نے کہا۔ "خرابی کوئی نہیں اور ہوئی تو ہم ٹھیک کر لیں گے۔ تم جاؤ۔"

میرا شک اب یقین میں بدلنے لگا تھا۔ ٹیڈی اب چند قدم دور جا کھڑا ہوا تھا۔

"اب کیوں کھڑا ہے۔ جاتا کیوں نہیں؟" ڈرائیور نے زیادہ سخت لہجے میں کہا۔

"اب سڑک پر کھڑے رہنے پر بھی پابندی ہے کیا؟" ٹیڈی بولا۔ "دیکھ رہا ہوں تم سے ٹھیک نہ ہو تو پھر..."

ڈرائیور ایک خوفناک گالی بک کے اترا۔ "تو لے نہیں جائے گا۔ پابندی کے بچے۔"

"ادھر چلا جا میاں۔ کیوں پنگا لیتا ہے۔" بمپر پر چڑھے ہوئے شخص نے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" ٹیڈی نے چیخ کر کہا۔ "تمھارے باپ کی سڑک ہے۔ تم کھڑے ہو تو میں بھی کھڑا ہوں۔"

ٹیڈی کے الفاظ کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ دونوں فوراً اس کی طرف لپکے اور ٹیڈی بھاگ کھڑا ہوا۔ پلک جھپکنے میں، میں نے کھلے دروازے سے ٹرک کی چابیاں نکال لیں اور واپس ہوا۔ ڈرائیور کے واپس آنے تک میں کار کے اندر تھا۔ ٹیڈی کے پیچھے وہ مشکل سے بیس قدم دور اور لوٹ آئے تھے۔ ان کا ارادہ تعاقب کرنے یا اس کے ساتھ جھگڑا کرنے کا تھا بھی نہیں۔ ڈرائیور واپس اوپر چڑھا اور پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ چابیاں غائب ہیں۔ اسے اچانک جانا پڑا تھا چنانچہ اس نے چابیاں نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ یہ کیسے فرض کر سکتا تھا کہ اسے بے وقوف بنایا گیا ہے اور دو منٹ کے مختصر وقفے میں کوئی چابیاں نکال کر لے گیا ہے۔ ٹیڈی نہ جانے کدھر نکل گیا تھا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ امید یہ تھی کہ وہ لوٹ آئے گا اور اگر نہ آ سکا تو گھر پہنچ جائے گا۔ میں نے گھڑی کے روشن ڈائل کو دیکھا۔ آٹھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ اچانک میں نے ٹرک ڈرائیور کو چلاتے سنا۔ اس کا کام اب ہونٹ بند کر چکا تھا۔ میری طرح وہ بھی سمجھ رہے تھے کہ عمل کی گھڑی آ پہنچی۔ آٹھ بجے ڈیوٹی سے آف ہونے والے اگر پانچ دس منٹ پہلے نکل آئیں تو انھیں تیار ہونا چاہیے۔ چنانچہ غیر ارادی طور پر "سب ٹھیک ہے" کا اطمینان کرنے کے لیے اس نے چابیاں گھما کے دیکھنا چاہا ہو گا کہ انجن بالکل ایک ثانیے میں اسٹارٹ ہو سکتا ہے یا نہیں۔

آوازیں صاف نہیں سن سکتا تھا لیکن ان کی بدحواسی سے اندازہ ہوتا تھا کہ چابیاں نہ ملنے پر مسئلہ سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے اور ٹرک کے اندر اور اوپر نیچے چابیاں تلاش کر رہے تھے۔ ٹرک کا رخ دیکھ کر میں نے اندازہ کیا کہ ڈیوٹی ختم کر کے نکلنے والے سپاہی کس طرف جائیں گے۔

"میں آگے جاتا ہوں۔" میں نے محسن سے کہا۔ "تو جیسے ہی انھیں نکلتا دیکھے تھوڑے سے وقفے کے بعد گاڑی لے کر آگے آ جانا۔ امید ہے ہم انھیں نکال لے جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔" میں نے آہستہ سے کار کا دروازہ کھولا اور اترنے ہی والا تھا کہ محسن نے مجھے روک لیا۔

"میں ان کو پہچانوں گا کیسے؟ یہاں تو لوگ مسلسل آ جا رہے ہیں۔"

"وردی والوں کو چھوڑ دے۔ وہ ڈیوٹی ختم کر کے نکلیں گے تو بغیر وردی کے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ ان دونوں کی کوشش ہو گی کہ الگ تھلگ رہیں۔ ممکن ہے وہ خوف زدہ ہونے کی وجہ سے ہر طرف دیکھیں اور روانہ ہونے کے بعد بھی مڑ مڑ کر دیکھتے جائیں۔ ٹرک والوں کا ردعمل بھی....."

میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اسی وقت تھانے سے دو افراد برآمد ہوئے۔ انھوں نے شلوار قمیص کے اندر کمبل سے یوں بکل مار رکھی تھی کہ سردی سے بچنے کے علاوہ اپنا چہرہ بھی چھپا لیں۔ وہ دونوں کچھ دیر گیٹ پر کھڑے رہے۔ پھر واضح طور پر ایک دوسرے کو سر کی جنبش سے چلنے کا اشارہ کیا اور وہ تھانے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ ایک بار انھوں نے پلٹ کر دیکھا تو میں روانہ ہو گیا۔

"اب کیا ہو گا۔" ٹرک کے ڈرائیور نے گالی دے کر کہا اور ٹرک کے لات ماری جو ایک احمقانہ اور اضطراری حرکت تھی۔ "تو اندھا ہو گیا تھا؟"

"مجھے الزام مت دو استاد۔ یہاں کوئی نہیں آیا۔ تم اندر بیٹھے تھے تو چابیاں تمھارے پاس تھیں۔"

"یہ سب اسی... کا چکر ہے۔ کون تھا وہ؟" ڈرائیور نے بوکھلا کر کہا۔ وہی وہ ٹیڈی کے لیے تھی۔

"کمال کرتے ہو۔ وہ باہر بھٹ بات کرتا رہا اور بھاگ گیا۔ تم نے ہی کہیں گرا دی ہے چابی۔" کلینر بولا۔

"کہاں گرا دی ہے؟ سب کچھ کتے کی طرح بھونکتا جا رہا ہے۔ سب جگہ تو دیکھ لیا۔" ڈرائیور نے چیخ کر کہا۔

ان دونوں کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے قطعی بے نیازی کا انداز اختیار کیا لیکن ان کی گفتگو کا کچھ حصہ ضرور سن لیا۔ فٹ پاتھ پر وہ بیک کر ساتھ ساتھ جانے والے دونوں مجرم کسی نادیدہ دشمن کے خوف میں مبتلا تھے چنانچہ بار بار پلٹ کر دیکھتے تھے۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ اس وقت ان کے دلی جذبات کیا ہوں گے۔ عام دنوں میں وہ چھوٹے موٹے کیس کورس میں پانسو پچاس لے نمٹا دیتے ہوں گے۔ قدرت نے پہلی بار ان کو پچاس ہزار کی گشت دلوائے تھے لیکن اب انھیں اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شیطان کا پھیلایا ہوا طمع کا جال تھا اور بازی الٹ جانے سے ان کی توقعات بھی غلط ہو گئی ہیں۔ انھوں نے پچاس ہزار میں کوئی بڑا کام کرنے کا سوچا ہو گا۔ کوئی مشکل حل کرنے کا سوچا ہو گا یا اس رقم سے اپنا مستقبل سنوارنے کا سوچا ہو گا۔ اب وہ خود مشکل میں تھے اور مستقبل خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اتنی عقل تو خدا نے ان کو بھی دی تھی کہ فتح شیر کے عبرتناک انجام کے بعد اپنے ایک ساتھی کے ساتھ پیش آنے والے حادثے اور دوسرے کی اچانک گمشدگی کا سلسلہ ملا سکیں۔ میں پچاس قدم کے فاصلے سے ان کے پیچھے رہا۔ جب انھوں نے موڑ کاٹا تو میں نے رفتار بڑھائی اور فاصلہ کم کیا۔ دس منٹ بعد میں نے انھیں جا لیا۔

"تم چاند خاں اور علی نواز ہو نا؟" میں نے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اچانک کہا۔

وہ دونوں اچھل پڑے۔ "تم... کون ہو تم؟ ہم تمھیں نہیں جانتے۔" ان میں سے ایک نے ہمت کر کے کہا۔

"ہاں، لیکن میں تمھیں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تمھارا دشمن نہیں، دوست ہوں۔ دشمنوں نے تو پورا بندوبست کر لیا تھا کہ تم کو بھی ٹرک سے کچل کر ہلاک کر دیں لیکن میں نے ان کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ پیچھے مت دیکھو، چلتے رہو۔"

"کیوں... کیا ثبوت ہے تمھارے پاس اس بات کا؟" دوسرا خوف زدہ لہجے میں بولا۔ "تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟"

"میں تم کو سب بتا دوں گا۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم بھی فتح شیر کے ساتھ چوہدری دلاور کے گھر گئے تھے؟" میں نے کہا۔ "اور وہاں سے تم نے ایک لاش اٹھائی تھی۔ اس کام کے تمھیں پچاس پچاس ہزار روپے ملے تھے۔ فتح شیر مارا گیا اور تمھارے ساتھ جانے والا ایک آدمی بھی۔"

"اس کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا۔" پہلے نے تھوک نگل کے خشک حلق کو تر کیا۔

"دوسرے کے ساتھ بھی حادثہ ہی پیش آیا تھا۔ تم کو بھی

www.paksociety.com

معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اگر میں کوشش نہ کرتا تو ابھی تم دونوں ایک ساتھ بالکل ویسے ہی حادثے کا شکار ہو جاتے۔ ایک ٹرک تم دونوں کے اوپر سے گزر جاتا۔ یقین نہیں تو جا کے تھانے کے باہر دیکھ لو۔ وہ ٹرک ابھی موجود ہوگا اور شاید تب تک وہیں کھڑا رہے گا۔"

"تم... تم کو کیا... میرا مطلب ہے تم نے ہمیں کس لیے بچایا؟" انسپکٹر نے کہا۔

"اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم ہی دوست ہو ان کے۔ جاؤ۔" دوسرا بولا۔ میں نے پیچھے سے فاکس ویگن کی آواز سنی۔

"دیکھو میں بھی واقعی دوست نہیں ہوں۔ میں چوہدری دلاور کا دشمن ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب وہ تمہارا دشمن بن چکا ہے تو میں اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ گاڑی آرہی ہے۔ ہمارے ساتھ بیٹھو اور اپنے گھر چلو۔ بیوی بچوں کو کہیں پہنچا دو، کسی عزیز رشتے دار کے گھر جہاں وہ محفوظ ہوں۔"

فاکس ویگن قریب آ رکی اور محسن نے اس کا دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ ہچکچانے لگے۔

"بیٹھو۔" میں نے کہا۔

"چاند خان! دھوکا ہے یہ۔" علی نواز نے کہا۔ "گاڑی میں مت بیٹھنا۔"

"جاؤ... جاؤ تم لوگ۔" علی نواز چلایا۔ مجبوراً میں نے ریوالور نکالا۔ ان دونوں کی آواز ایک دم بند ہو گئی لیکن وہ اپنی جگہ کھڑے رہے۔ میں نے سامنے سے ریوا فراز کو آتے دیکھا۔ ان کی مداخلت کام خراب کر سکتی تھی۔ شاید محسن نے میری مشکل کا اندازہ کر لیا۔ وہ باہر نکلا ہی تھا کہ میں نے چاند خان کے سر پر ریوالور کا دستہ مار کے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ گرنے سے پہلے اسے محسن نے سنبھال لیا اور گھسیٹ کر لے گیا۔ دوسرا اپنے ساتھی کا یہ انجام دیکھ کر رضا کارانہ طور پر آگے بڑھا۔ فاکس ویگن کے دو دروازوں نے ہمارے لیے تھوڑی سی مشکل پیدا کی۔ محسن ابھی چاند خان کو پچھلی سیٹ پر ڈال ہی رہا تھا کہ دو تین راہ گیر چلانے لگے۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" اور ہماری طرف دوڑے۔ میں نے دیکھا تو پیچھے سے بھی تین آدمی شور مچاتے آ رہے تھے۔ وہ ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے تھے چنانچہ دو کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ ٹرک کے ڈرائیور اور کلینر تھے جو ٹرک کے بیکار ہو جانے کے بعد وقت ضائع کیے بغیر اپنے شکار کے تعاقب میں روانہ ہو گئے تھے۔

"فائر کرو محسن!" میں نے چلا کر کہا۔ "ورنہ ہم پھنس جائیں گے۔" اور محسن نے جیب سے ریوالور نکال کے ایک ہوائی فائر کیا۔

ہماری طرف دوڑنے والے ایک دم رک گئے۔ ان میں سے کچھ گرا اور باقی پلٹ کر بھاگ گئے۔

"سیف لاکنگ آن رکھنا۔" میں نے چاند خان کے برابر والی سیٹ پر علی نواز کو دھکیلا اور خود محسن کے ساتھ بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ محسن نے گاڑی کو پورا ایکسلریٹر دیا اور فاکس ویگن ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھی۔ نٹ بالٹ پر اب ڈھیلا ہو گیا تھا۔ ٹرک ڈرائیور اور کلینر شور مچانے والوں میں شامل تھے اور اغوا کی اس واردات کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے تھے جو ایک تھانے کے سامنے پیش آئی تھی۔

دوسرے ہی منٹ میں فاکس ویگن کئی موڑ کاٹنے کے بعد جائے واردات سے بہت دور نکل آئی تھی اور ہم کسی فوری خطرے سے محفوظ تھے۔ ریوالور اب بھی میرے ہاتھ میں تھا اور آگے دیکھنے کے بجائے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ سیٹ کے اوپر ریوالور کا رخ علی نواز کی طرف تھا جسے اپنی موت کا یقین تھا۔ محسن نے گاڑی کو نور گرلس اسٹیڈیم کی دیوار کے سائے میں روک لیا۔ "تمہیں پچاس ہزار روپے جیب میں ڈالنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ جس شخص نے ایک لاش کو کسی اور جگہ پر دفن کرنے کا معاوضہ ادا کیا ہے وہ تمہاری لاش غائب کرنے کے لیے کسی اور کو بھی پچاس ہزار روپے دے سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"چوہدری صاحب نے ہمیں کبھی پچاس پچاس ہزار دیے تھے۔" محسن بولا۔ "چار افراد کے نام تھے، تینوں کے ساتھ۔"

"اب تم یہ بتاؤ کہ تم کو کہاں مرنا قبول ہے؟" میں نے کہا۔

"ایک فتح شیر تھا۔ اس کا سر اور باقی جسم ایک ساتھ دفن ہو گئے ہیں۔ دوسرے کی لاش کا قیمہ مردہ خانے میں پڑا ہے اور تیسرے کی لاش ابھی دو چار دن بعد دریافت ہوگی جب گل سڑ جائے گی۔ بیوی بچوں سے کچھ کہنا ہے تو بتا دو، پہنچا دیں گے۔"

"غلطی ہم سے ہوئی... مگر ہم کیا کرتے، حکم کی تعمیل پر مجبور تھے۔ فتح شیر افسر تھا۔" علی نواز نے بھرائی آواز میں کہا۔ "ہم نہیں جانتے کہ وہ کس کی لاش تھی۔"

"یہ تو معلوم ہوگا کہ وہ لاش کہاں ہے؟"

علی نواز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ہم تمہیں چھوڑ بھی سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "دیکھو" میں نے محسن کو مخاطب کیا۔

"ہاں استاد۔ سیدھے سودے کی بات ہے۔" محسن نے کہا۔ "ایک سودا ہم نے چوہدری صاحب سے کیا تھا۔ دوسرا ایسے بھی کر سکتے ہیں۔ چوہدری صاحب کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ ہم ان سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا کام ہو گیا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اور ان کو چھٹی دے سکتے ہیں کہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر بھاگ جائیں اور پھر کبھی چوہدری صاحب کے سامنے نہ آئیں۔"

"مجھے... مجھے منظور ہے۔ دیکھو میری بیوی کے بچہ ہونے والا ہے۔" علی نواز رونے لگا۔ "یہ پہلا بچہ ہے میرا۔"

"رو کیوں رہے ہو۔ کیا بچے یتیم پیدا نہیں ہوتے؟" میں نے بے رحمی سے کہا اور اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "تیری بیوی تو بیوہ ہوگی۔ پالے گی اسے کسی نہ کسی طرح اور اگر تجھے منظور نہیں تو ہم اس کو بھی ٹھکانے لگا سکتے ہیں۔"

"خدا کے لیے رحم کرو مجھ پر۔ تم کیا چاہتے ہو؟ جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب لے لو۔" علی نواز نے کہا۔

چاند خان نے آہستہ سے حرکت کی اور اٹھ بیٹھا۔ "بزدل ہے یہ!" وہ علی نواز کو حقارت سے دیکھ کر بولا۔ "اتنا ہی ڈرپوک تھا تو پولیس میں کیوں بھرتی ہوا تھا۔ کیا بگاڑ سکتے ہیں یہ میرے اور میرے بیوی بچوں کا۔ انھیں کیا معلوم وہ کہاں ہیں؟"

علی نواز نیا بھرتی ہوا تھا۔ چاند خان اس کے مقابلے میں پرانا ہی نہیں دلیر بھی تھا۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا اور پھر میری طرف دیکھا۔ "میں جانتا تھا تم دھوکے باز ہو۔ سیدھا اوپر سے کام شروع کرتے تم تو میں بتاتا تمھیں۔"

"استاد! یہ بہادر آدمی ہے۔" میں نے محسن سے کہا۔ "مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔"

"مردوں کی طرح ہو تو خالی ہاتھ سامنے آؤ۔" چاند خان نے اکڑ کر کہا۔ "ورنہ گولی مار دو... ہم موت سے نہیں ڈرتے۔"

"چلو استاد۔" محسن بولا۔ "ان کو اپنے تھانے لے چلتے ہیں۔ وہیں مقابلہ بھی ہو جائے گا اور تفتیش بھی کر لیں گے۔ تم اپنے تھانے میں تو روز ہی تفتیش کرتے ہو گے چاند خان۔ آج دیکھو کہ ہم کس طرح تفتیش کرتے ہیں۔"

اس وقت تک میں سمجھا نہیں تھا کہ اپنے تھانے سے محسن کی کیا مراد ہے۔ ان دونوں کو ڈیفنس کے گھر لے جانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہاں پورا محلہ آباد تھا اور وہ ہماری واحد جائے پناہ تھی۔ جہاں کسی قسم کی مشکوک کارروائی کرنا خطرناک ہوتا۔ دوسری جگہ وہ تھی جہاں پہلے مالیہ کا آفس تھا۔ اس کی چابی اب ہماری جیب میں تھی لیکن وہ جگہ بھی ناقابل محفوظ نہیں تھی۔ جب محسن نے گاڑی کا رخ مالیہ کی اسی کوٹھی کی طرف کیا جہاں فتح شیر کا قتل ہوا تھا تو میں نے اس کے انتخاب، اس کی ذہانت اور ہمت کی داد دی۔ لاش وہاں سے اٹھائی جا چکی تھی اور تفتیش کا عمل بھی مکمل ہو چکا تھا۔ اس وقت وہاں اب ایک کانسٹیبل کی ڈیوٹی ہوگی ورنہ وہ بھی نہیں۔ پولیس نے عمارت کو سیل کرا دیا ہوگا اور یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ اس عمارت کے اندر پھر کوئی واردات کی جا سکتی ہے۔ سڑک اب خالی تھی اور فاکس ویگن کی آواز اتنی تھی کہ چاند خان شور کرتا تب بھی بند شیشوں سے باہر اس کی کوئی نہ سنتا۔

"کہاں لے جا رہے ہو تم ہمیں؟" چاند خان نے کہا۔ "تم کو پہچانا ہے میں نے سکندر بخت! تم خود ایک اشتہاری مجرم ہو اور تم نے ایک اور جرم کیا ہے دو پولیس والوں کو اغوا کر کے۔ پولیس والے سرکاری ملازم ہوتے ہیں۔"

میں نے اس کے منہ پر ریوالور کا بٹ مارا۔ وہ بلبلایا اور اس کے لبوں کے گوشوں سے خون بہنے لگا۔

"سرکاری ملازم کی اولاد! وہ سرکار کا کام تھا جو تو نے پچاس ہزار میں کیا تھا؟ مجھے میرا جرم بتاتا ہے۔ اپنا جرم یاد کر۔" میں نے کہا۔ "میں تو اشتہاری مجرم ہوں۔ جہاں اتنے قتل کیے ہیں وہاں ایک اور سہی۔ لیکن دلاور جس کا نام ہے وہ اشتہاری مجرموں سے بڑا مجرم ہے۔ میں تو اتنا لحاظ کروں گا کہ تیرے جرم کی سزا صرف تجھ کو ہی ملے مگر وہ تیرے خاندان کے بچے بچے کو مار ڈالے گا۔"

"خدا کے لیے ہم اپنی غلطی مانتے ہیں۔" علی نواز کانپتے ہوئے بولا۔ "میں سب بتا دیتا ہوں۔"

میں نے اس کے بھی ایک جھانپڑ مارا۔ "ابھی اس سور سے پوچھنا ہے۔ تیری باری بعد میں آئے گی۔"

مالیہ کی اس کوٹھی کے گرد خاموشی تھی۔ اندر اندھیرا تھا اور آس پاس کسی کی موجودگی ثابت نہ ہوتی تھی۔ میں نے ریوالور محسن کو دیا اور خود نیچے اتر کے کوٹھی کے گرد ایک چکر لگایا۔ دیوار کے قریب سے مجھے باتوں کی آواز آئی۔ میں نے پنجوں کے بل خود کو اوپر کھینچا اور اندر جھانکا۔ دو کرسیوں پر دو پولیس والے بیٹھے تھے جن میں سے ایک کے کندھے پر ایک ستارہ تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ پولیس اس کیس میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی ہے اور رات کے وقت بھی ایک اے ایس آئی اور ایک کانسٹیبل جائے واردات پر پہرا دے رہے ہیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر مجھے لان کا ایک خالی حصہ نظر آ گیا جو نہ جلنے

www.paksociety.com

کپ سے یونہی پڑے پڑے زنگ سے گل گیا تھا۔ میں نے ڈبا دیوار کے اوپر سے اندر اچھال دیا اور خود بھی اندر کود گیا۔ ڈبا فرش پر گرنے سے آواز پیدا ہوئی۔ میں دیوار سے چپک کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ حسب توقع اضطراری حالت کو بھیجا۔ کانسٹیبل ٹہلتا ہوا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا آیا۔ وہ میرے سامنے سے گزرنے لگا تو میں نے اسے یوں دبوچ لیا جیسے گھات میں بیٹھی ہوئی بلی اپنے پنجوں میں چوہے کو دبوچتی ہے۔ اس کی آواز تک حلق میں اٹکی اور میرے ہاتھ کی ایک ضرب نے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔ میں نے اسے اپنے سامنے صاف جگہ پر لٹا دیا اور حلق سے ایک درد بھری آواز نکالی۔ "اے ایس آئی صاحب! ذرا آئیے!" "کیا بات ہے... کون ہے؟" ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی نظر نے زمین پر پڑے ہوئے کانسٹیبل کو فوراً دیکھ لیا۔ وہ بہت محتاط طریقے پر آگے بڑھا اور بے ہوش سپاہی پر جھک گیا۔ اسی وقت میں نے جست لگائی اور اے ایس آئی چند سیکنڈ کی مزاحمت کے بعد ساکت ہو گیا۔ میں نے اس کا ریوالور اپنی دوسری جیب میں ڈالا اور باہر نکلا۔ فاکس ویگن سو گز کے فاصلے پر ایک شکستہ مکان کے پیچھے موجود تھی جس کی صرف دو دیواریں سلامت کھڑی تھیں۔ میں نے ڈرائیونگ سنبھالی اور فاکس ویگن کی ہیڈ لائٹس جلا کے گاڑی کو اطمینان سے کوٹھی میں لے گیا۔

"باہر نکلو دونوں۔" میں نے حکم دیا "اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ ہاتھ اوپر اٹھائے رکھو۔"

انھوں نے تعمیل کی اور محسن نے ان کی جیب سے ہر چیز نکال لی۔ دونوں کی جیب سے بارہ سو روپے برآمد ہوئے۔ محسن نے ان کی گھڑیاں بھی اتار لیں۔

"جب کسی ملزم کو تھانے لایا جاتا ہے تو تم یہی کرتے ہو نا؟" میں نے کہا۔ "یہ ہمارا پرائیویٹ تھانہ ہے اور ہم یہاں تمہارے ساتھ وہی کریں گے جو تم بعض اوقات بے گناہوں کے ساتھ بھی کرتے ہو۔" جامہ تلاشی کے بعد میں ان کو اوپر لے گیا اور اپنا ریوالور محسن کو دیا۔ "اگر یہ بہادر سپاہی مرنا چاہے تو بلا تکلف گولی مار دینا۔ سائلنسر کی وجہ سے آواز باہر نہیں جائے گی۔"

نیچے آ کے میں نے دونوں بے ہوش پڑے ہوئے پولیس والوں کو دیکھا۔ باری باری میں نے ان کو کندھے پر ڈالا اور اوپر لے گیا۔ محمود ایاز کو ایک ساتھ خلعت فاخرہ سے محروم کرنے کے بعد میں نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ ہمارے بستر اب بھی وہیں بچھے ہوئے تھے۔ ان کی چادروں کو پھاڑ کے میں نے رسی کا کام لیا اور پھر ان کے حلق میں بھی ٹھونس دیا۔

"یہ بھی تمہارے افسر تھے؟" میں نے چاند خان سے کہا۔ "باوردی افسر تھے اور ڈیوٹی پر تھے۔ ان کا حشر دیکھ رہے ہو؟"

"حیوانات ایسے ہی پڑے رہیں گے اور اکڑ کے مر جائیں گے۔" محسن بولا۔

"آؤ میں تم کو فتح شیر کا مزار بھی دکھاؤں۔" میں نے چاند خان کی گدی پر ہاتھ رکھ کے ایک جھٹکا دیا۔ یہ اتنا کڑا تھا کہ میں نے اسے لات ماری اور وہ آگے جا کے دروازے سے ٹکرایا۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا تو چاند خان منہ کے بل گرا لیکن گرتے ہی پھر کھڑا ہو گیا۔ میں نے ریوالور ایک ہاتھ میں رکھا اور دوسرے ہاتھ سے لائٹ جلا دی۔

"یہ دیکھو۔ یہ سب فتح شیر کا خون ہے۔" میں نے فرش پر اور دیوار پر دکھایا۔ "اس کا سر یہاں پڑا تھا اور یہاں۔ تمہاری لاش کے بھی چار ٹکڑے کیے جائیں گے۔ باہر نکلو!"

"تم اس طرح مجھے دہشت زدہ نہیں کر سکتے۔" اس نے کہا۔ وہ ضدی اور باہمت آدمی تھا۔

میں نے ریوالور ایک طرف رکھ دیا۔ "اب ہم مقابل۔ ہم اور تم دونوں خالی ہاتھ ہیں۔" میں نے کہا۔

چاند خان نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ میں ریوالور کو ٹھوکر مار کے کمرے کے آخری گوشے میں پھینک کر کھڑا ہو گیا۔

"ڈرو نہیں۔ مقابلے میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔" میں نے کہا اور ہاتھ آگے بڑھایا۔ چاند خان کچھ دیر ساکت رہا پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اپنی طرف کھینچا اور میں اس کے پیچھے لپٹ گیا اور اس نے مجھے اپنے اوپر سے فرش پر پھینک دیا۔ اس کا اعتماد بے بنیاد نہیں تھا۔ وہ داؤ جانتا تھا۔ میں بڑی پھرتی سے الٹ کر اٹھا۔ وہ میرے اوپر جست لگا کے آیا تھا لیکن میرے ہٹنے سے اس کا اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ وہ فرش پر منہ کے بل گرا۔ میں نے اسے کمر سے پکڑ کے اٹھایا اور دیوار... اس کے پاؤں زمین سے اٹھ گئے۔ جب میں نے تو وہ دیوار سے ٹکرایا اور ایک دم پلٹ کر گرا۔ میں نے سینے پر فلائنگ کک ماری۔ تو ہر تصادم کی...

...کر دیا۔ وہ اب غیظ و غضب کا طوفان بنا ہوا تھا۔ آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں اور اس کے لبوں سے ... کے ساتھ لہو جاری تھا۔ اس نے پھنکارتے ہوئے ... ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا۔ میں نے دوسری لات اس کے سر پر ماری مگر اس نے اپنی گرفت نہیں چھوڑی۔ اگر میں پلٹتا تو وہ میری ٹانگ کو موڑ کر توڑنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ ... پیچھے کی طرف جست لگا کے اس کی گردن کے گرد ... حمائل کر دیے۔ وہ کمان بن گیا مگر میں اسے جھکاتا گیا۔ اگر وہ میری ٹانگ نہ چھوڑتا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ اتنا ہوتے ہی میں نے اس کے پیچھے آ کر جھٹکا دیا اور وہ گھوم کر کھڑا ہوا تو میں نے اسے ایک اور جھٹکا دے کر اٹھا لیا۔ کھیل ختم کرنے کے لیے میں نے اسے پوری قوت کے ساتھ دیوار پر دے مارا۔ وہ چلایا۔ نیچے گر کے اس نے ہاتھوں کے بل پر اٹھنے کی اچھی سی کوشش کی اور پھر گر گیا۔

"ہاں۔ اب بولو۔" میں نے پھولی ہوئی سانس پر قابو پایا۔ "کون سیر ہے اور کون سوا سیر؟"

گل نواز کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو چکا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سورما ساتھی کی حالت زار دیکھ رہا تھا۔

"اس کو بھی اشرف گشن سیل دکھاؤ استاد۔" میں نے فرش سے اپنا ریوالور اٹھاتے ہوئے کہا۔

محسن نے گل نواز کے ایک لات ماری۔ "چل آگے۔" اس نے خالص پولیس والوں کے انداز میں گالی دی۔ گل نواز ... باتھ روم کی طرف چل پڑا جہاں محسن نے اسے منجمد سیاہ ... دکھا کے نفسیاتی طور پر مفلوج کر دیا۔

"ہاں بھئی! اب بتاؤ ظفر کی لاش کہاں ہے؟" میں نے ... "اور وہ پچاس ہزار کہاں ہیں؟"

"میں نہیں بتاؤں گا۔" چاند خان نے کہا۔

"تمہارے تھانے میں جب ملزم لائے جاتے ہیں تو ... کہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "ان سے کیسے پوچھتے ہو تم ... سب کچھ۔ استاد! اس چھوٹے بدمعاش کو بند کر دو ... اس کے کپڑے۔ میں لاتا ہوں اس کے باپ کو ..."

محسن نے باہر کے درخت سے دو مضبوط شاخیں توڑیں ... صاف کر دیے۔ گاڑی میں سے جیک ... نکالا اور پھر اوپر آ گیا۔ محسن نے میرے احکامات کی حرف بحرف تعمیل کی تھی۔

"تیرہ نمبر کا چھتر تو نہیں ہے ہمارے پاس لیکن اس سے زیادہ موثر ہتھیار ہیں۔" میں نے ہری شاخ کو ہوا میں لہرا کے وار کیا۔ چاند خان تڑپا اور بلبلایا۔ "آج تم عامل نہیں معمول ہو۔ ہر بات تھانے میں دوسروں پر طاقت آزماتے تھے۔ آج دیکھتے ہیں تم کتنے طاقتور ہو۔" میں نے پھر لچک دار شاخ سے وار کیا۔ چاند خان کی جلد پر دو گہری سرخی مائل سیاہ لکیریں سی نمودار ہو گئیں۔ وہ کتے کی طرح چلایا۔ محسن نے دوسری شاخ سے کام لیا۔ وہ پھر چیخا۔

"اس کی آواز بند کر دو استاد۔" میں نے کہا اور محسن نے چادر پھاڑ کے اس کا منہ بند کر دیا۔ ہمارا ارادہ اس کو مارنے کا نہیں تھا لیکن اس کی فرعونیت اور ضد نے ہمیں مجبور کر دیا کہ اسے تھوڑی سی سزا ضرور دیں۔ دس منٹ بعد اس کی کھال ادھڑ گئی تھی اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ محسن نے باتھ روم میں سے دوسرے ملزم کو نکالا۔

"تم بھی تھانے میں یونہی اعتراف جرم کراتے تھے؟ بے گناہوں سے۔ لاوارثوں سے؟" میں نے کہا۔ "اسی طرح؟" میں نے زمین پر پڑے ہوئے چاند خان کی طرف اشارہ کیا۔

"میں سب بتانے کو تیار ہوں۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں پچاس ہزار بھی دے دوں گا۔" وہ چلانے لگا لیکن اسے بھی یہ بتانا ضروری تھا کہ جب "تفتیش" کی جاتی ہے تو زیر تفتیش ملزم پر کیا بیتتی ہے۔ ہر تھانے میں کسی بھی جرم کا سراغ لگانے کا سب سے موثر طریقہ تشدد کا ہے اور جس غیر انسانی بے رحمی سے وہاں لائے جانے والوں کو مارا جاتا ہے اس کا تجربہ مجھے بھی تھا۔ ان میں سے آدھے مجرم تو سب اگل دیتے ہیں۔ باقی آدھے مار کھا کے نکلتے ہیں تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ پولیس نے صرف مار کے چھوڑ دیا ان کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ کسی جھوٹے مقدمے میں ملوث کر کے جیل بھجوا دیتے۔ علاوہ بریں حوالات میں بند ہو کے تشدد برداشت کرنے والے پولیس کے خلاف حبس بے جا اور تشدد کا کوئی مقدمہ نہیں کرتے۔ پولیس سے دشمنی مول لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ان کے خلاف ثبوت اور شہادت پیش کرنا جوئے شیر لانے سے مشکل کام بن جاتا ہے۔

جتنی دیر میں وہ ہوش میں آئے میں نے اور محسن نے اطمینان سے ایک ایک سگریٹ پی اور یہ طے کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس کام میں زیادہ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ رات کے دس بجنے والے تھے۔

www.paksociety.com

چاند خان پہلے ہوش میں آیا اور کراہنے لگا۔ میں نے ہری شاخ پھر اٹھا لی۔

"ہاں بھئی چندا میاں!" میں نے شاخ کو ہوا میں لہرایا۔ "طافو کی لاش کہاں ہے اور وہ پچاس ہزار کہاں ہیں؟"

"میں بتا دوں گا۔" چاند خان نے روتے ہوئے کہا۔ "اور مت مارو مجھے۔"

میں ہنسا۔ "بڑے کمزور دل ہو یار۔ یہ تو تم روز ہی دیکھتے تھے کسی اور کی حالت پر بھی کبھی آنسو آئے تھے؟"

"میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں جہاں طافو کی لاش دفن ہے۔" چاند خان نے بُری طرح کراہتے ہوئے کہا۔

"اور وہ پچاس ہزار بھی جو تم نے اس شیطانی کام کے لیے تھے۔" میں نے کہا۔

"میں وہ بھی دے دوں گا۔ وہ بھی وہیں دفن ہیں۔" چاند خان نے کہا۔ شکست اور احساسِ ذلت نے اسے موت سے بدتر عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ نامعلوم قاتلوں سے تو ڈر رہا تھا لیکن یہ اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ کوئی "پولیس کو چکمہ دینے والی پولیس" بھی ہے جن کے تھانے میں وہی سب کچھ ہوتا ہے جو عام تھانوں میں ہوتا ہے اور یہ سب اس کے ساتھ بھی ہوگا۔

"تم لوگوں نے اس لاش کو کہاں دفن کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"قصور جانے والی سڑک پر، یہاں سے آٹھ دس میل دور۔" چاند خان بولا۔ "مجھے وہ جگہ یاد ہے۔"

"تم کہتے ہو کہ رقم بھی وہاں دفن ہے۔ رقم تمہارے گھر میں کیوں نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

"ہم نے پہلے گھر میں ہی رکھی تھی۔ آج فتح شیر کے قتل کی خبر سن کے میں ڈر گیا۔" وہ بولا۔

میں نے اچانک اس پر حملہ کیا اور شاخ سے بے درپے وار کیے۔ وہ فرش پر گر کے تڑپنے لگا۔

"اب بھی جھوٹ بولنے سے باز نہیں آئے۔ رقم دفن کرنے کے لیے تو اتنی دور گیا تھا؟" میں نے کہا۔ "آٹھ دس میل دور جہاں لاش دفن ہے؟ کیوں؟ لاش کے ساتھ ضروری تھا رقم گاڑنا۔ میں تمہیں بیس گاڑ جاؤں گا اگر سچ نہ بتایا۔"

"رقم دوسری جگہ ہے۔" چاند خان کراہتے ہوئے بولا۔ "علی نواز سے پوچھ لو۔"

علی نواز اب ہوش میں تھا۔ اس نے اقرار میں گردن ہلائی۔ "میں پورے ایک لاکھ دے دوں گا تمہیں۔ میرے گھر کے صحن میں دبے ہوئے ہیں۔"

میں نے محسن سے مشورہ کیا۔ "ان دونوں کو ساتھ لے چلتے ہیں؟"

"اور ان کا کیا کریں؟" اس نے فرش پر پڑے ہوئے اے ایس آئی اور پولیس مین کی طرف اشارہ کیا۔

"ان کو یہیں چھوڑ جانا چاہیے۔ ان کی وردی، بیلٹ وغیرہ سب۔" میں نے کہا۔ "ورنہ یہ دوسرا کیس ہو جائے گا۔"

"کیس تو اب بھی ہوگا۔ کیا یہ لوگ رپورٹ نہیں کریں گے؟" محسن نے کہا۔

"ہم میں سے کسی کی صورت نہیں دیکھی انھوں نے۔" میں نے کہا۔ "ہوش آنے پر سب کچھ موجود پائیں گے تو خود کو شرمندگی سے اور محکمانہ کارروائی سے بچانے کے لیے خاموش رہنا بہتر سمجھیں گے۔ ورنہ فرائض میں غفلت برتنے پر معطلی لازمی ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ رابعہ سے مزید پوچھ گچھ ہو۔ رقم سب نکال لو وردی میں سے اور ان کو بستروں پر لٹا کے نکل چلو۔ سردی سے مریں گے نہیں اور کچھ دیر میں ہوش آیا تو اپنی اپنی وردی پہن کے پھر مستعد ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے پہلے تو دیکھیں گے کہ کس نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا، کیوں کیا تھا اور جب وجہ کوئی سمجھ میں نہیں آئے گی تو ایک دوسرے سے رازداری کا سمجھوتا کر لیں گے۔ اپنی عزت اور نوکری بچائیں گے۔ ان کے شناختی کارڈ، پیٹی، وردی کا بلا محفوظ رہنے چاہئیں اور ہماری یہاں موجودگی کا کوئی سراغ باقی نہیں رہنا چاہیے۔ پھر کچھ نہیں ہوگا۔ میرا ارادہ تھا پہلے کہ در بولو اور اسے ایس آئی کی وردی لے لوں۔ جو وردی میرے پاس تھی وہ تو گاڑی میں جل کے خاک ہو گئی۔ لیکن پھر کیس بنے گا تو رابعہ کے لیے وضاحت مشکل ہو جائے گی۔" میں نے پلٹ کر ان دونوں کو حکم دیا کہ وہ کپڑے پہن کر تیار ہو جائیں۔

"ان دونوں کو کہاں لے جانا ہے؟" محسن نے کہا۔

"جہاں یہ ہمیں لے جائیں۔" میں نے کہا۔ "پہلے طافو کا مدفن دیکھنا ہے۔ لاش نکالنی نہیں ہے۔ پھر اب چھوٹے بڑے کے ساتھ جانا ہے۔ ایک لاکھ تو واپس لیں، اتنی سزا ضروری ہے ان کے لیے۔ یہ قانون کے محافظ کہلاتے ہیں اور اس طرح قاتلوں سے لاشوں کے سودے کرتے ہیں۔"

"اس کے بعد؟" محسن بولا۔ "ان کو کہاں چھوڑیں گے؟"

"یہ میں نے ابھی طے نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "ان کو آزاد چھوڑ دیں یا چوہدری صاحب کو ارسال کر دیں؟"

"وہ ان کو قتل کروا دے گا۔" محسن نے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟ محسن، کم جہاں پاک۔" میں نے کہا۔ "دنیا کو ایسے بے ضمیر شیطانوں کی ضرورت بھی کہاں ہے۔ ذرا اپنے چوہدری صاحب کو بھی تو پتا چلے کہ ایم آر ایس کا بھی ایک تھانہ ہے جہاں مجرموں کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے۔"

"کیا یہ لوگ چوہدری ولایت کو اس جگہ تک نہیں لے آئیں گے؟"

"مشکل ہے۔ رات کا وقت تھا۔" میں نے کہا۔ "ایک بے ہوش پڑا تھا۔ دوسرے کی عقل بھی ٹھکانے نہیں تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ راستہ کیا تھا۔"

"چاند خان یہ تو بتا سکتا ہے کہ اس کوٹھی میں فتح شیر کو قتل کیا گیا تھا۔" محسن نے کہا۔

"وہاں ہمارے یہ فرض شناس اے ایس آئی اور با ہمت کانسٹیبل بھی ہوں گے جو اسے فضول بکواس قرار دیں گے اور ثابت کریں گے کہ رات بھر انھوں نے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ مجال ہے کوئی پرندہ بھی پر مار سکتا۔" میں نے کہا۔

ہم نے چاند خان اور علی نواز کو اتنی مہلت دی کہ وہ ہاتھ منہ دھو لیں اور اگلے مرحلے کے لیے تیار ہو جائیں۔ محسن نے ان پر نگاہ رکھی اور میں نے اتنی دیر میں دونوں پولیس والوں کو گھسیٹ کر بستر میں ڈالا۔ پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ وردیاں بھی انھیں پہنا دوں اور ہم انھیں وہیں ڈال دیں جہاں سے وہ پکڑے گئے تھے۔ محسن نے میری تجویز سے اتفاق کیا تھا۔

"اس طرح دونوں کو شک بھی نہیں ہوگا کہ کسی نے اوپر بلکہ تفتیش وغیرہ کی تھی۔" محسن بولا۔

"وہ سمجھیں گے کہ حملہ آور چور لٹیرے تھے۔ جیب میں جو کچھ تھا وہ نکال کے لے گئے۔" میں نے کہا۔ "کتنی رقم ہاتھ لگی ہے؟"

"اے ایس آئی کی جیب میں ساڑھے چار ہزار تھے۔ کانسٹیبل کا شاید بڑا ان تھا۔ اس کی جیب سے صرف ساٹھ روپے نکلے۔" محسن بولا۔

"دونوں کی جیب میں دس دس روپے چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔ "[illegible] کنگال نہ ہوں۔"

اوپر سے اپنی موجودگی کے سارے آثار مٹانے کے بعد میں نے کانسٹیبل اور اے ایس آئی کو اسی جگہ لٹا دیا۔ بالکل اسی انداز میں کہ آنکھ کھلنے پر وہ سمجھیں کہ لوٹنے کے سوا کسی نے ان کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ بالفرضِ محال انھوں نے صبح ہنگامہ بھی کیا کہ کوئی چور ڈاکو رات کو ان کی جیب خالی کر گیا تو یہ رابعہ کے لیے تشویش کی بات نہیں ہوگی۔ کسی کے لیے فتح شیر کے قتل اور اس واردات کے درمیان تعلق ثابت کرنا ناممکن ہوگا۔ جب ہم پھر روانہ ہوئے تو ڈرائیونگ محسن کر رہا تھا اور میں نے چاند خان کو آگے بٹھایا تھا۔ اس کے لیے بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا اور ہر جھٹکے پر اس کے حلق سے آہ نکلتی تھی۔ علی نواز میرے ساتھ چوہے کی طرح دبکا بیٹھا تھا۔

"خیال رکھنا کہ ریوالور کی نال تمہارے سر کے پیچھے ہے۔" میں نے نال کو چاند خان کی گدی سے لگا کے کہا۔ "تمہارا کس بل تو نکال دیا ہے ہم نے لیکن بعض اوقات رسی جل جاتی ہے اور بل نہیں جاتا۔ ذرا سی غلطی کا انجام یہ ہوگا کہ کسی آواز کے بغیر اس ریوالور کی گولی تمہارے سر میں سوراخ کر دے گی۔ ویسے میں خالی ہاتھ سے منکا توڑنا بھی جانتا ہوں۔"

"پیچھے والے کا بھی خیال رکھنا۔" محسن نے کہا۔

"پروا نہیں استاد۔ ذرا ہلے تو سہی، گردن مروڑ کر باہر پھینک دوں گا۔" میں نے کہا۔

وہ ہمیں جلو موڑ کی طرف لے گئے۔ جب ان دونوں نے اتفاق رائے سے کہا کہ اب وہ جگہ چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے تو میں نے محسن کو اور چاند خان کو اتار دیا۔ "پیدل چلنے پر پتا لگے گا کہ انھوں نے لاش کہاں گاڑی تھی۔" میں نے کہا۔ "تو چاند خان کو سنبھال۔ میں واپس آنے کے بعد دوسرے کو لے جاؤں گا۔ کسی نے غلط بتایا تو پتا چل جائے گا۔"

"خطرہ مول لینے کا فائدہ نہیں استاد۔" محسن نے کہا۔ "تو گاڑی یہاں چھوڑ دے اور اسے بھی پیدل ٹہلاتا ہوا لے جا۔"

میں نے محسن کی تجویز سے اتفاق کیا اور گاڑی کو درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے چھوڑ دیا۔ یہ وہی سڑک تھی جس پر سے میں تین سال پہلے بھی گزرا تھا۔ یہ سڑک بھارتی علاقے میں واقع قصبے کھیم کرن تک جاتی تھی اور یہ قصبہ فتح ہوا تو پاکستانی افواج نے اسے عوام کے لیے کھول دیا تھا چنانچہ لاہور کے جیالے جوق در جوق سائیکلوں، تانگوں اور اسکوٹروں پر کھیم کرن پہنچے تھے۔ میں لندن سے چند دن کے لیے آیا ہوا تھا اور شوقیہ میں دشمن کی مفتوحہ سرزمین کو اپنے پیروں سے روندنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔ وہ عجیب سماں تھا۔ جلو موڑ سے آگے ٹریفک بند تھی کیونکہ سڑک پر ملٹری کے ٹینک اور ٹرک، آرمرڈ کاریں اور کانوائے آ جا رہے تھے۔ لوگ کچی زمین پر پیدل میلوں چل کے کھیم کرن پہنچے تھے۔ وہ زمین بھی محاذِ جنگ بنی تھی چنانچہ یہاں کے بجائے جنگلوں نے کسو دوائی تھی اور

www.paksociety.com

اس مٹی میں چلنے والوں کے پاؤں ٹخنوں تک گرد میں دھنس جاتے تھے لیکن ہوا ماندگان شوق کے لیے یہ مسافت کی سختی کچھ نہ تھی۔ میں نے کیمپ کرنا کے دیوان تھیٹے میں ہزاروں افراد کو فتح کی خوشی میں سرمست گھومتے اور فاتح افواج کو ان کا استقبال کرتے دیکھا تھا۔ آج اسی سڑک پر ہر سو سناٹا اور اندھیرا تھا۔ میں ایک اور دشمن پر فتح پا کے یہاں پہنچا تھا لیکن اس سفر کے مقاصد یکسر مختلف تھے۔

بستی اس سڑک پر ٹریفک نام کو نہ تھی لیکن میں نے احتیاط کو مقدم سمجھتے ہوئے سڑک سے کچھ فاصلے پر رہنا مناسب سمجھا۔ میں نے علی نواز کو دس قدم آگے رکھا تھا اور اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ شرافت سے چلتا رہے گا تو اسی راستے سے واپس بھی آئے گا ورنہ صبح تک اس کی تدفین بھی یہیں ہو جائے گی جہاں سے طافو کا مدفن دور نہیں ہے۔ راستے میں جھاڑیاں تھیں، درخت تھے اور اچانک گڑھے آ جاتے تھے۔ کئی بار علی نواز نے ٹھوکر کھائی اور خود میں بھی گرتے گرتے بچا۔ میرے اندازے کے مطابق ہم تین فرلانگ آ چکے تھے جب میں نے علی نواز سے کہا۔ "اب کیا صبح تک چلتے رہنا ہے؟"

"پہنچ گئے جناب! وہ سامنے دیکھیں۔ کھجور کے تین درخت۔" علی نواز نے کہا اور مجھے نیم روشن افق پر ان کا سایہ سا نظر آیا۔

تینوں درخت ایک دوسرے سے مساوی فاصلے پر تھے اور اگر ان کے درمیان خط کھینچا جاتا تو ایک مثلث بنتی۔ جس کے تینوں ضلعے برابر ہوتے۔ علی نواز وسط میں پہنچ کے رک گیا۔

"مجھے تو یہاں کوئی نشانی نظر نہیں آتی۔" میں نے کہا۔ "طافو کو دفن کرتے وقت کوئی پتھر وغیرہ رکھا تھا؟"

علی نواز نے نفی میں سر ہلایا۔ "دلاور نے کہا تھا زمین اس طرح برابر کر دینا کہ پتا نہ چلے کہیں جگہ ہے وہ۔"

"پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ہم طافو کی قبر پہ کھڑے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ثبوت تو کھودنے سے ہی ملے گا۔" علی نواز نے مایوسی سے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ گورکنی کا سامان تم اپنے ساتھ لائے تھے؟" میں نے کہا۔ "لائے تھے تو کیا واپس بھی لے گئے تھے؟"

"نہیں... سامان دلاور صاحب کی کوٹھی سے ملا تھا۔ فالتو لائے ہم یہیں پھینک گئے تھے۔"

"نہیں... یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یاد کرو کہاں پھینکا تھا؟" میں نے کہا۔ "یا میں یاد دلاؤں؟"

"میں... میں دیکھتا ہوں۔" وہ بولا۔ وہ کچھ دیر درختوں کے گرد و نواح میں پھرتا رہا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ وقت ضائع کر رہا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات مشتبہ تھیں۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اچانک میں نے اسے ایک لات ماری۔ وہ منہ کے بل مٹی میں گرا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں پے در پے ٹھوکریں ماریں۔

"ہائے جی میں مر گیا۔ اف اللہ جی۔" اس نے لوٹتے ہوئے بلبلانا شروع کیا۔ "یا رب جی۔"

میں نے اسے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ "تم کو معلوم ہے کہ وہ سامان کہاں ہے۔ سیدھی طرح بتا دو ورنہ مار مار کے ہڈیاں توڑ دوں گا اور لاش اسی جگہ چھوڑ جاؤں گا گیدڑوں اور گدھوں کے کھانے کے لیے۔"

"وہ جی... میں بتاتا ہوں۔ لیکن ایک مہربانی کریں۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر کلپتے ہوئے کہا۔ "قبر نہ کھدوائیں مجھ سے۔ میں بہت بزدل ہوں۔ دہشت سے مر جاؤں گا لاش کا ڈھانچہ دیکھ کر۔"

"اس وقت ڈر نہیں لگا تھا جب اسے گاڑا تھا؟" میں نے اس کے سر پر مکا مارا۔ وہ پھر گر گیا مگر ہمت کر کے اٹھا اور ذرا سی دیر میں ایک گڑھے میں پڑا بیلچہ اور کدال نکال لایا۔ میں نے اس کے ساتھ واپس مارچ کیا اور پندرہ منٹ میں پھر وہیں آ پہنچا جہاں محسن گاڑی سے باہر سخت سردی میں ٹہل رہا تھا۔ چاند خاں کو اس نے گاڑی میں بند رکھا تھا اور بتا دیا تھا کہ اس نے باہر قدم رکھا تو وہ گولی مار دے گا۔ چاند خاں کی جگہ علی نواز کو قید کر دیا گیا اور میں نے دوسری بار چاند خاں کے ساتھ اسی راستے کو طے کیا۔ چاند خاں چھ فٹ قد کا اور مضبوط جسم والا جوان تھا چنانچہ اتنی مار کھانے کے بعد بھی سیدھا چل رہا تھا۔ ایک فرلانگ چلنے کے بعد اس نے بائیں طرف مڑنے کی کوشش کی جہاں سے ایک پگڈنڈی الگ ہوتی تھی۔ میں نے پیچھے سے اس کے شانے پہ پستول کا بٹ مارا۔ وہ درد سے کراہا۔

"ابھی کتے کی دم سیدھی نہیں ہوئی۔" میں نے کہا اور ایک درخت سے انگلی کے برابر موٹی شاخ توڑ لی۔ "چاند تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ اس لیے مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ اتنا ماروں گا کہ تڑپ تڑپ کے مر جاؤ گے۔ یہاں تمہاری چیخ پکار سننے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ علاقہ [illegible]

کی۔ صبح تک تمہارا گوشت نوچ نوچ کھائیں گے۔ دن میں گدھ ہڈیاں صاف کر کے چھوڑ دیں گے۔" میں نے اس کو شانے سے سوٹی کر کے دیا۔ وہ ہر ضرب پر چلاتا رہا۔ پھر مجبور کے تینوں درختوں کی طرف چل پڑا۔ وہ علی نواز کو گالیاں دے رہا تھا اور اس کی ذہنی کیفیت نارمل نہیں تھی۔ جسمانی اذیت سے زیادہ اسے اپنی ذلت و رسوائی اور بے بسی کا ذہنی صدمہ تھا۔ اسے اپنے اختیارات پر کہیں زیادہ اپنی قوت بازو پر بھی ناز تھا اور میں نے اس کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس جیسا پرانا پولیس کا شاطر جوان جس نے ان گنت چوروں ڈاکوؤں کو پکڑ کے اور بڑے بڑے بدمعاشوں کو کتے کی طرح سیدھا کر دیا تھا، کبھی خود ایک گھٹیا مجرم کی طرح کسی "پرائیویٹ تھانے" میں اتنی بے عزتی برداشت کرے گا اور وہ سب کچھ اس کے ساتھ بھی ہو گا جو اس نے ہمیشہ دوسروں کا حق سمجھا تھا۔

"کھڑے کیوں ہو؟" میں نے کہا۔ "اٹھاؤ یہ بیلچہ اور کدال۔"

"یہ علی نواز نے لا کر دیے ہوں گے۔" وہ حقارت اور نفرت سے بولا۔ "اسی سے کہتا تھا نا کہ..."

جملہ مکمل ہونے سے پہلے میں نے اس پر وہ شاخ توڑ ڈالی۔ "زبان کے بجائے ہاتھ چلاؤ۔"

"اس لاش کو اب نکال کر کیا دیکھو گے۔ گل سڑ گئی ہو گی۔" وہ زمین کھودتے ہوئے بولا۔

"اس کو میں تمہارے کندھے پر اٹھوا کے لے جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اور تمہارے باپ کی قبر میں دفن کروں گا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "میرا کوئی باپ نہیں تھا۔ میری ماں کہتی تھی سب ہی میرے باپ ہیں۔ کیا طافو بھی میرا باپ تھا؟"

میں نے محسوس کیا کہ چاند خاں کا ذہنی توازن جواب دے رہا ہے۔ لاش زیادہ گہرائی میں نہیں دفن کی گئی تھی۔ چاند خاں کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے اور احساس شکست کے بعد وہ جرم و گناہ کے ادراک اور خوف کے رد عمل کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا تھا اور اچانک رک کر مجھے گھورنے لگتا تھا اور پھر زمین کھودنے لگتا تھا۔ کئی بار وہ بلاوجہ ہنسا اور ایک مرتبہ میں نے اس پر وار کیا تو اس نے چیخ کر مجھے گالی دی۔ میں محتاط ہو گیا۔ اس ذہنی شوریدگی کے سامنے دیوانے آدمی کو میں آسانی سے قابو نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ہوا کا ایک جھونکا آیا جو زمین کے کسی شگاف سے اٹھا تھا۔ چاند خاں چلا کے باہر نکل آیا۔ اس کے انداز و اطوار میں وحشت اور جنون کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے کدال اٹھا کے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے وار کو ایک ہاتھ پر روکا اور لات مار کے چاند خاں کو گرا دیا۔ وہ سیدھا قبر کے اوپر جا گرا جس کی نرم مٹی کا ڈھیر بکھر گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر دیوانگی کی چیخ بلند کی اور اٹھ کر بھاگا۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور اسے رکنے کو کہا۔

"چاند خاں! رک جاؤ۔" میں نے چلا کر کہا۔ "میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔"

"چھوڑ دے مجھے۔ طافو چھوڑ دے مجھے۔ جانے دے مجھے۔" چاند خاں نے چلانا شروع کیا اور اس کی رفتار میں کچھ اضافہ ہو گیا۔ "مر جاؤں گا طافو۔ مجھے معاف کر دے۔ طافو مجھے معاف کر دے۔"

"چاند خاں! میں گولی مار دوں گا۔" میں نے محسوس کیا کہ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا ہے۔ وہ عالم وحشت میں دیوانہ وار بھاگ رہا تھا اور یوں چلا رہا تھا جیسے طافو اپنی قبر سے نکل کر اس کے کندھوں پر سوار ہو گیا ہے۔ وہ یوں ہاتھ مار رہا تھا جیسے اپنے وجود سے چمٹ جانے والی متعفن لاش کو الگ کرنا چاہتا ہو۔ یہ اس بدبو کا اثر تھا جس نے چاند خاں کا دماغ الٹ دیا تھا۔ اس کا ذہنی توازن رفتہ رفتہ بگڑ رہا تھا لیکن اس دہشت ناک آسیب زدہ اور انسانی گوشت کی سڑی ہوئی بدبو نے چاند خاں کا دماغ ایک دم الٹ دیا۔ وہ بدبو اس لطافت کے وجود کا احساس بن کر اس پہ مسلط ہو گئی تھی۔

میں نے بہت احتیاط سے نشانہ لے کر اس کی ٹانگ پر فائر کیا تھا لیکن اس کی قضا تھی جو اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ وہ ایک کٹے ہوئے درخت کے ٹھنٹھ سے ٹھوکر کھا کے گرا۔ جب وہ گر رہا تھا تو ریوالور سے نکلنے والی گولی نے اسے جا لیا اور وہ گولی جو زیادہ سے زیادہ اسے لنگڑا کر دیتی اس کے وجود میں پیوست ہو گئی۔ پشت میں شانے سے ذرا نیچے لگنے والی گولی شاید اس کے دل میں ہی رک گئی اور جب میں نے قریب پہنچ کر اور جھک کر اسے دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کا جسم بڑے بے ڈھنگے طریقے پر الٹا پڑا تھا اور خون نیچے کی مٹی کو سیراب کر رہا تھا۔ یہ قتل نہیں تھا۔ میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا ہرگز بھی نہیں۔ وہ خود اپنی دیوانگی کا نشانہ بنا ورنہ میرا نشانہ خطا بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو ہم اس جگہ سے ایک فرلانگ دور نکل آئے تھے جہاں طافو کی تھوڑی سی کھدی ہوئی قبر کا شگاف اس کی لاش

www.paksociety.com

کے موجود ہونے کا ثبوت فراہم کر رہا تھا۔

ہم نے واپس جا کے محسن سے مشورہ کیا۔ "یہ تو نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ لاش کا کیا کریں؟"

"اگر اسے وہیں چھوڑ دیں؟" محسن نے کہا۔ "کیا یہ امکان ہے کہ کوئی اسے دیکھ لے گا؟"

"یہ امکان تو بہت کم ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "سڑک سے دو فرلانگ کا فاصلہ تو ضرور ہو گا اور وہ ٹھوکر کھا کے گرا تھا تو ایک گڑھے میں گیا تھا۔ گڑھا زیادہ گہرا نہیں ہے لیکن سڑک پر سے گزرنے والا لاش نہیں دیکھ سکتا۔"

"اگر ہم نے اسے قبر کھود کے گاڑا تو بہت وقت لگے گا۔" محسن بولا۔ "واپس لے جانا تو ناممکن ہے۔"

"لاش ایسے چھوڑ کے جانا بھی خطرناک ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر کل یا پرسوں لاش کسی کو مل گئی تو اس کی شناخت بھی ہو جائے گی اور دلاور کو معلوم ہوا تو وہ سمجھ جائے گا کہ اسے یہاں لا کے مارنے والا ہمارے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ جن کو اس نے قتل پر مامور کیا تھا، ان کا پروگرام دونوں کو ٹرک سے کچل دینے کا تھا۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آج رات میں اسے گیدڑ کھا جائیں۔ یہاں بھیڑیے بھی ہیں۔" محسن بولا۔

"میرا تو خیال ہے اسے بھی علی نواز کے ساتھ ہی دفن کر دیں۔" میں نے کہا۔ "وہ قبر آدمی سے زیادہ گہری ہوئی ہے۔"

علی نواز گاڑی میں تھا اور ہماری گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔ محسن نے اسے باہر نکالا اور وہ دوسری بار ہم دونوں کے بیچ میں روانہ ہوا۔ "اب کیا ہے؟ میں نے تو صحیح جگہ بتائی تھی۔" وہ بولا۔

"ہاں۔ اور اسی لیے ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔" میں نے کہا۔ "تمہارے ساتھی چاند خان نے ہوشیار بننے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ وہ مارا گیا۔ وہ بے وقوف آدمی تھا۔"

"چاند خان... مارا گیا...؟" علی نواز دہشت زدہ ہو کے بولا۔ "جھوٹ کہتے ہو تم۔ تم نے اسے مار دیا۔ اور اب تم مجھے بھی مارنے لے جا رہے ہو۔"

"تمہیں مارنا ہوتا تو ہم پہلے ہی نہ مار دیتے۔" میں نے کہا۔ "دوسری بار تمہارے ساتھ جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب جبکہ چاند خان کی لاش کو ٹھکانے لگانا ہے۔ تم اگر مدد کرو گے تو فائدے میں رہو گے ورنہ تمہارا حشر بھی چاند خان کی طرح ہو گا۔ تم زندہ رہنا چاہتے ہو علی نواز کیونکہ تمہاری شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ تم پہلے بچے کے باپ بننے والے ہو اور اسے یتیم پیدا نہیں ہونا چاہیے۔"

میری بات نے علی نواز کا حوصلہ بلند کیا۔ اس کی منت سماجت جاری رہی کیونکہ اسے ہمارے وعدے پر پورا اعتماد نہیں تھا لیکن وہ ہماری مدد کرتا رہا۔ اس نے قبر کھودی اور لاش کو گھسیٹ کر لایا۔ سردی کی وجہ سے خون جم گیا تھا چنانچہ زمین پر خون کی کوئی لکیر نہیں بنی۔ چاند خان کے مقابلے میں علی نواز مضبوط اعصاب کا آدمی ثابت ہوا۔ شاید اسے جینے کی زیادہ امید تھی جو ہم نے اسے حوصلہ عطا کیا۔ اس نے طاقت کی مشق لاش کے اوپر چاند خان کو لٹایا اور مٹی برابر کر دی۔ میں اور محسن کھڑے اپنی اپنی ناک پر رومال رکھے کھڑے تھے۔ اس تمام کارروائی میں ایک گھنٹا صرف ہوا اور جب ہم زمین کو ایک جیسا کرنے کے بعد کدال بیلچے کو دور پھینک کر واپس ہوئے تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔

"اب ہم تمہیں گھر کے قریب چھوڑ دیں گے علی نواز۔" نے کہا۔

"لیکن وہ پیسہ جو میرے پاس... میرے گھر کے صحن میں دفن ہے؟" وہ بولا۔

"اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہاری زندگی کی قیمت ایک لاکھ ہے۔" میں نے کہا۔ "تو یہ سمجھو کہ تم کو دوسری زندگی بہت سستی مل رہی ہے۔ چاند خان خود اپنی غلطی سے مرا۔ غلطی تم نے بھی کی تھی لیکن اس کی سزا باقی ہے۔ وہ ایک لاکھ لے کر بھاگ لو۔ اپنے بیوی بچوں سمیت غائب ہو جاؤ۔ یہ سمجھ لو کہ تمہاری جان کے دشمن شکاری تمہارے پیچھے ہیں۔ ایک ہم اور ایک دلاور کے کرائے کے قاتل۔ وہ تمہاری جان کا سودا کر چکے ہیں اور تمہیں جہاں دیکھ لیں گے وہیں مار دیں گے۔ یہی پوزیشن ہماری ہے۔ تم دوبارہ نظر آئے تو ہم بھی خطرہ محسوس کریں گے اور تمہیں قتل کرنے پر مجبور ہوں گے۔ بہتر یہی ہے کہ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ یہ سمجھ لو کہ تم کو دلاور کے ارادوں کا پتا چل گیا تھا اور تم جان بچا کر بھاگ گئے۔ ہم سے تمہاری ملاقات نہیں ہوئی۔"

"لیکن میں کہاں جاؤں گا؟" وہ فریاد کناں لہجے میں بولا۔ "نوکری تو چھوڑ دوں گا۔ ماں باپ کو اور بھائی بہن کو۔ گھر کو اور دوستوں رشتے داروں کو بھی چھوڑ دوں؟"

"یہی تو تمہاری سزا ہے کہ اب تم اکیلے ہو۔ دنیا میں تمہارا کوئی دوست ہے نہ رشتے دار۔" میں نے کہا۔ "تمہارا گھر ہے نہ ٹھکانا۔ یہاں رہو گے تو دو دن بھی نہیں جیو گے۔ خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔ بیوی بچوں کی اور اپنی زندگی کی خاطر

زندگی بچاؤ اور بھاگ جاؤ۔ شکاری بہت ہیں۔ کوئی جانے پہچانا نظر آ گیا تو سب کو خبر ہو جائے گی۔ اس لیے بالکل اجنبی بن جاؤ۔ اتنی دور نکل جاؤ کہ پھر لوٹ کر نہ آ سکو۔ بالکل اسی طرح جیسے تم مر گئے ہو۔ تمہارا واحد سہارا ایک لاکھ روپے ہوں گے۔ ان کی مدد سے زندہ رہنے کی کوشش کرتے رہو۔ اپنے بیٹے کو پالو۔ شاید وہ بھی ایک سہارا بنے۔"

ہم نے ایک جگہ گاڑی روک کر اسے اتار دیا۔ "میری بات یاد رکھنا۔" میں نے کہا۔ "تم تھانے سے نکلے تو تمہیں ڈر تھا کہ دلاور کے آدمی تمہیں قتل کر دیں گے۔ اس لیے تم گھر گئے اور بیوی بچوں کو لے کر بھاگ گئے۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر۔ نہ تم ہم سے ملے نہ ہمارے ساتھ کہیں گئے۔ اس کے علاوہ کچھ کہو گے تو اپنی موت کا سامان کرو گے۔ ماں باپ یا بھائی بہن، یہ سب تمہیں نہیں بچا سکیں گے۔ اس لیے جاؤ۔ صبح ہونے سے پہلے نکل جاؤ۔ بیوی اگر تمہارا ساتھ دینے والی ہے تو اسے ساتھ رکھو اور کوئی بھی بہانہ کر دو۔ پتا نہ بتاؤ۔ اپنی زندگی بچانا اب تمہارا کام ہے۔ سب سے بے خبر ہو کر رہو۔"

گاڑی اسے سڑک پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے تھوڑی دیر بعد پلٹ کر دیکھا تو وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس جا رہا تھا۔ "الطاف کے قتل کا کیس تو ختم ہوا۔" میں نے کہا۔ "اسے دلاور نے مروا دیا۔ تیغ شیر کو الف دین ختم کر گیا۔ چاند خان غداری کی اور اب علی نواز بھاگا ہے تو وہ لمبی سزا کاٹے گا۔"

"لیکن اصل مجرم پھر بھی محفوظ ہے۔ چھوٹے مہرے پٹ رہے ہیں۔" محسن بولا۔

"اسے بھی شہ مات ہونے لگی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ بچ گیا۔ خیر یہ بازی ابھی جاری ہے۔"

ایک ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ہم آخری مہمان بن کے شامل ہوئے۔ رات کی ڈیوٹی والے روم سروس کے ویٹر نے کچن میں جو کچھ تھا وہ کھانا لا کر دیا جسے بچا کھچا کہا جا سکتا تھا۔ مینو کی سب سے کم مقبول ڈش ہونے کی وجہ سے اس کی زائد مقدار اگلے دن کے لیے اٹھا کر رکھ دی گئی تھی مگر اس وقت ہم تھکن اور بھوک سے بے حال تھے چنانچہ ہم نے اسے کم وقت میں ختم کیا۔ بارہ بجنے کے بعد اگلا دن شروع ہو چکا تھا اور اصولاً یہ صبح کا وقت تھا چنانچہ محسن نے اس کھانے کو ناشتہ قرار دیا۔ کافی کے لیے ہمیں ہال کے ایک گوشے میں بیٹھنا پڑا۔

"معلوم نہیں شیندی کدھر نکل گیا تھا؟" محسن نے کہا۔

"اگر وہ ناک کی سیدھ میں نکل گیا ہو گا تو پھر وہیں پہنچے گا۔" میں نے کہا۔ "میں نے چھٹی کے جغرافیے میں دنیا کے گول ہونے کا یہی ثبوت پڑھا تھا اور بالکل یقین نہیں کیا تھا۔"

"ناک کی سیدھ میں بھلا کون سفر کر سکتا ہے۔" محسن نے مجھ سے اتفاق کیا۔ "خصوصاً شہر کا رہنے والا کسی کھمبے یا عمارت سے ٹکرایا یا کسی گاڑی کے نیچے آ جائے گا۔"

"پھر بھی پہنچے گا تو وہیں جہاں سے چلا تھا۔" میں نے کہا۔ "ایمبولینس میں، چارپائی پر یا چار کندھوں پر۔"

کھانے اور تھکان کے علاوہ اس گفتگو کا مقصد ذہن کو اس بوجھ سے آزاد کرانا تھا جو گزشتہ چند گھنٹوں کے دوران پیش آئے تھے۔ میں اور محسن بار بار ہنسنے کی اور بے فکری سے باتیں کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن کچھ ہی دیر بعد ہمیں احساس ہوتا تھا کہ ہم اپنے اپنے خیالوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ میرے ذہن میں وہ قاتل ٹرک تھا جس کی خدمات سامان کو ادھر سے ادھر لے جانے کے بجائے چار انسانوں کو عالم فانی سے عالم ارواح پہنچانے کے لیے مستعار لی گئی تھیں۔ ایسے ان گنت ٹرک شہروں کے درمیان اور ہر شہر میں بار برداری کے لیے

جاسوسی ادب کی معیاری کتابیں کم سے کم قیمت میں

جاسوسی ناولوں کے مقبول ترین مصنف ایچ اقبال کے قلم سے

ایک جلد میں دو کتابیں ○ قیمت ۲۰ روپے

ایک جلد میں دو کتابیں ○ قیمت ۲۰ روپے

آج ہی طلب فرمائیے

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس ۲۳ کراچی

www.paksociety.com

استعمال ہوتے تھے مگر یہ کمال تھا ایک آدمی کے ذہن کا جس نے اس غلام مشین کو آلۂ قتل کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلے وقتوں میں بادشاہوں کا عتاب نازل ہوتا تھا تو وہ حکم دیتے تھے کہ مجرم کو ہاتھی کے پیروں کے نیچے ڈال دیا جائے۔ اب دلاور جیسے بے تاج بادشاہ ہاتھی کی جگہ مشینی ہاتھی استعمال کر رہے تھے۔ وہ ٹرک اب تک وہیں کھڑا ہوا ہوگا۔ ممکن ہے ڈرائیور اتنی دیر میں ڈپلیکیٹ چابی لے آیا ہو اور کلینر نے پنکچر ہونے والے ٹائر بدل دیے ہوں اور وہ اپنی ناکامی کی رپورٹ دینے جا چکے ہوں۔ دلاور کا ردعمل کیا ہوگا؟ وہ دونوں سے سوال کرے گا کہ ٹائر کس نے پنکچر کیے تھے؟ انھوں نے کسی کو قریب آتے دیکھا تھا؟ وہ کس حلیے اور شکل کا آدمی تھا جو زبردستی ٹرک کی خرابی دور کرنے پر مصر تھا؟ پھر اس کا ذہن جس نتیجے پر پہنچے گا وہ بالکل درست ہوگا۔

پچاس فیصد کامیابی اور پچاس فیصد ناکامی پر شاید وہ ڈرائیور اور کلینر کو ایک موقع اور دے۔ اسے ابھی کہاں معلوم ہوگا کہ بالواسطہ طور پر ہم نے بھی اس کی مدد کرتے ہوئے تیسرے آدمی کو ختم کر دیا ہے لیکن چوتھا آدمی اس کی دسترس سے نکل چکا ہے۔ خیر مجموعی طور پر اس کو اپنے مقصد کے حصول میں مایوسی نہیں ہوگی۔ چار میں سے تین گواہ مارے جا چکے اور چوتھا جان بچا کے بھاگ گیا تو اب ڈر کس کا؟ وقت بھی کیا بازی گر ہے۔ ابھی آٹھ بجے دونوں واجب القتل گواہ تھانے سے نکلے تھے تو اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہ تھے۔ ان کو مارنے والے تو نہ مار سکے مگر ہم نے ان میں سے ایک کو مار دیا حالانکہ ہم محافظ بن کے بیٹھے تھے۔ چاند خان کو بہر حال مرنا تھا۔ ٹرک سے کچل کر موت نہ آتی کسی ویران جنگل میں آتی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہاں مرتا تو اس کا خستہ تن لاشہ دنیاوی رسوم کے مطابق سپرد خاک ہوتا۔ اب بھی وہ سپرد خاک تو ہوا مگر اسے کوئی پرائیویٹ قبر نہ ملی۔ اسے ایک پہلے سے موجود مردے کے ساتھ قبر شیئر کرنا پڑا۔ جیسے مجبوری میں لوگ ایک کمرہ یا ایک فلیٹ میں شیئر کرتے ہیں۔

"دلاور نے خود کو فتح شیر کے قتل میں ملوث ہونے سے صاف بچا لیا۔" محسن بولا۔

"ہاں، اس کے اور فتح شیر کے ٹیپ اب بھی ہمارے پاس موجود ہیں لیکن ہم ان کا استعمال نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔

"اگر رابعہ کیس کر دیتی۔ یا جیسا کہ غالب چاہتا تھا، وہ بھی استغاثہ کر دیتا تو یہ ثبوت ہم ان کے حوالے کر سکتے تھے۔" محسن بولا۔

"رابعہ کو کسی لمبے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو الف دین کے کہنے کا کیس تھا۔ ہم اس کو ثبوت فراہم کر دیتے اور وہ انھیں عدالت میں پیش کر دیتا لیکن اس نے [illegible] ہی مسلک اختیار کیا اور اپنے مجرم کو خود ہی سزا دے کر [illegible] جس کا وہ مستحق تھا۔ اس میں دلاور کے خلاف مدعی بننے کا [illegible] نہیں تھا۔"

"اصل مجرم تو دلاور تھا۔" میں نے کہا۔ "قتل کرتا تو [illegible] اسے کرتا نا۔"

"الف دین جیسے شخص کا کوئی بھروسا نہیں۔" میں بولا۔ "وہ غائب تو ہوا ہے لیکن اس بات کا ثبوت کوئی نہیں کہ شہر سے نکل گیا ہے۔ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ دلاور کی تاک میں ہو۔"

"تم نے اس ٹرک کا نمبر نوٹ کیا تھا؟" محسن بولا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہاں اندھیرا بھی تو تھا۔"

"ہاں، لیکن میں نے قریب جا کے دیکھا تھا۔" [illegible]

"اس وقت جب تم زبردستی کلینر کے گلے پڑ رہا تھا کہ خرابی دور کر سکتا ہے اور تو ٹرک کے نیچے اسپیڈ پر جھکا تھا۔ انھوں نے نمبر کو تھوڑا سا بدلا تھا۔ تین کو آٹھ بنا دیا اور ایک کو سات، دائیں کو بھی الف کر دیا تھا مگر ہم یہ چکر [illegible] میں نے اصل نمبر نوٹ کر لیا تھا۔"

"کیا خیال ہے اگر پولیس کو یہ نمبر دیا جائے اور بتایا جائے کہ اسی ٹرک نے ان کے دو آدمی مارے تھے؟"

"دلاور کچھ نہیں ہونے دے گا۔ ایک تو اس لیے کہ ہم ٹیلی فون ہی کر سکتے ہیں اور اگر وہ کوئی سوال کر بیٹھے کہ تم کو [illegible] معلوم ہوا تو ہم جواب سے مطمئن نہیں کر سکتے۔" محسن بولا۔ "پھر [illegible] ٹرک کے ٹائروں پر سے خون کے داغ ہزار بار دھو [illegible] پر بھی نہیں مٹائے جا سکتے لیکن وہ ٹائر ہی بدل دیے جائیں تو ممکن ہے۔"

"ہم نے فتح شیر سے اور دلاور سے اعتراف جرم کرنے کے لیے بہت محنت کی تھی۔" میں نے کہا۔

"ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہم وہ کیسٹ انکل رضوی کو ارسال کر دیں۔" محسن بولا۔ "جسے سن کر بے شک وہ [illegible] کہ فتح شیر اور دلاور کے ساتھ دوسری آوازیں ہماری ہیں بھی اندازہ کر لیں گے کہ ہم نے چالاکی سے یہ گفتگو [illegible] مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کریں گے جس کا اعتراف [illegible] بھی رضاکارانہ طور پر کیا ہے اور دلاور نے بھی۔ ہم نے [illegible] زبردستی کچھ نہیں کہلوایا ہے۔ فتح شیر تو مر گیا اور اس سے [illegible] نہ قانونی کارروائی ممکن ہے نہ محکمہ جاتی [illegible]"

[illegible] محسن نے کہا۔

"میری بات قابل عمل نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "اگر ایس پی صاحب نے تحقیقات کا حکم دیا تو اگلے مرحلے میں ہم یہ کر سکتے [illegible] پولیس کو طافو کے مدفن سے آگاہ کر دیں۔ رحمت کباڑی کے قتل کا کیس پہلے سے چل رہا ہے۔ اگر طافو کی لاش کی شناخت ہو گئی تو دلاور کے لیے وضاحت مشکل ہو جائے گی کہ رحمت کباڑی اور اس کا ساتھی پراسرار طور پر گم ہو گیا تھا۔ تحقیقات میں یہ بات بھی سامنے آ جائے گی کہ طافو کے ساتھ برآمد ہونے والی دوسری لاش کس کی ہے۔ تھانے سے پتا چل جائے گا کہ فتح شیر کے دو آدمی سپاہی مارے گئے تھے جن پر شک کیا جا سکتا ہے کہ وہ گشت کے بہانے نکلے تھے اور دلاور کے گھر جا کے انھوں نے طافو کی لاش پر پردہ ڈالنے کا معاوضہ وصول کیا تھا۔ یہ سوال تو خود بخود پیدا ہوگا کہ وہی چار آدمی ایسے پراسرار حالات میں کیوں ہلاک ہوئے؟ اگر ایس ایس پی صاحب نے سختی سے کام لیا اور ٹرک ڈرائیور کو کلینر کے ساتھ طلب کر لیا تو وہ قبول کر لیں گے کہ انھیں دلاور نے کس کام کے لیے کہا تھا اور باقاعدہ ادا کیا تھا۔"

"یہ بڑی گڑبڑ! ہم یہی کہتے ہیں۔" محسن بولا۔ "انکل رضوی [illegible] بھی کر لیں گے کہ ہم نے یہ گفتگو کہاں کب اور کیسے کی تھی اور اب ہم کہاں ہیں؟ لیکن اصل بات یہ ہے کہ ان کو دلاور پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل جائے گا۔ ہم کچھ زیادہ محتاط ہو جائیں [illegible] ایس ایس پی صاحب خصوصی [illegible] تشکیل دے سکتے ہیں اور تفتیش کرائم برانچ یا کسی [illegible] کے سپرد بھی کر سکتے ہیں۔"

"[illegible] طور پر دلاور کو نقصان ہوگا۔" اس پر نفسیاتی [illegible] میں نے کہا۔ "شکاری بھی خونخوار درندوں کو [illegible] کرتے ہیں تو اس کے گرد حلقہ تنگ کرتے ہیں۔ ڈھول [illegible] چاروں طرف سے مشعلیں لے کر آگے بڑھتے ہیں [illegible] ہوتا ہے اور خود شکار گاہ کی جانب بڑھتا ہے [illegible] جیسے شکاری کو بھی انھی الجھنوں میں اور ذہنی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا جائے کہ وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو جائے اور اس [illegible] خلاف کچھ کرنے کے بجائے اپنے دفاع میں کچھ کرتے [illegible] پریشان رہے۔"

"[illegible] مجھے پسند آئی۔ صبح کس کے ہاتھ وہ ثبوت [illegible] ارسال کر دیے جائیں؟" محسن نے کہا۔ "ڈیڈی ان کے [illegible] کسی کلرک یا چپراسی کو دے آئیں گے اور وہاں [illegible] ہم کیا ہیں۔ کوئی بعد میں ٹیلی فون کر کے ٹرک کا نمبر

بتا سکتا ہے۔ فقط یہ کام غالب کر سکتا ہے۔ وہ رپورٹر ہے اور رضوی صاحب اس کی بات کو ٹال نہیں سکتے۔ وہ اپنی معلومات کا ذریعہ بتانے کا بھی پابند نہیں۔"

"کچھ دن ہمیں باہر نہیں نکلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "نکلنے کے لیے رات کا وقت موزوں ہے۔ یہاں کی پولیس بکلفت پھر ہماری جستجو میں سرگرم ہو جائے گی۔"

"یہاں سے تو آٹھ ڈیڑھ [illegible] رہا ہے۔" محسن نے کہا۔ "ڈیڈی اگر گھر پہنچا ہوگا تو پریشان ہوگا۔"

ہمیشہ کی طرح ہم نے فاکس ویگن کو دو گلیاں چھوڑ کے ایک خالی پلاٹ پر کھڑا کیا اور پیدل گھر پہنچے۔ ڈیڈی جاگ رہا تھا اور خاصا پریشان تھا۔ "یار میرے دل میں تو ہول اٹھ رہے تھے۔" وہ بولا۔

"غالب صاحب تشریف نہیں لائے؟" محسن نے کہا۔

"کوئی بھی نہیں آیا۔ میں اکیلا تھا۔" ڈیڈی بولا۔ "وہاں دوڑ لگائی تو کالی آگے نکل گیا۔ چھٹ کے گیا تو تم لوگ غائب تھے۔ میں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔"

"اور وہ ٹرک وہاں موجود تھا؟" میں نے کہا۔ ڈیڈی نے اقرار میں سر ہلایا۔

www.paksociety.com

"تمہیں کو واپس وہاں جانے کا خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت تھی؟" محسن نے کہا۔ "اگر وہ تم کو پہچان لیتے تو کیا ہوتا؟"

"کیا ہوتا۔ میں نے کون سا جرم کیا تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "میں تو ان کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود ہی گھبرا گئے تھے کہ کہیں ان کا بنا بنایا کام نہ بگڑ جائے۔"

"کام تو ان کا بگڑ گیا۔" میں نے کہا۔ "وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ہم ان دونوں کو نکال لائے تھے۔ کانسٹیبل چاند خان اور علی نواز کو۔۔۔"

"اور ہم نے ان سے سب کچھ پوچھ لیا۔" محسن نے بے مسرت سے اطلاع دی۔ "انہوں نے طافو کی قبر بھی بتادی اور یہ بھی بتادیا کہ انہوں نے اپنے بھتیجے کا ایک لاکھ کہاں چھپا رکھا ہے۔ ہمیں ان پر تھوڑی سی سختی بھی کرنی پڑی کیونکہ ان میں سے چاند خان ذرا ضدی اور خود کو شاہ زادہ سمجھنے والا آدمی تھا۔"

"اسی ہٹ دھرمی کے باعث وہ مارا گیا۔ اس نے جسمانی طور پر مزاحمت کی مگر ذہنی طور پر وہ اتنا بزدل ثابت ہوا کہ طافو کی لاش نکالتے ہوئے اس کا دماغ الٹ گیا اور اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ مجبوراً مجھے اس پر گولی چلانی پڑی۔ علی نواز کو ہم نے چھوڑ دیا۔"

"چھوڑ دیا؟" ٹیڈی نے حیرانی سے کہا۔ "ایسے ہی چھوڑ دیا؟"

"ایسے ہی کا کیا مطلب۔ اس نے تو سب کچھ بتا دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم کیا اسے پھانسی چڑھا دیتے۔ ہمارے پاس تو اسے قید میں رکھنے کے لیے بھی جگہ نہیں تھی۔"

"اس کے علاوہ۔" محسن نے کہا۔ "ہم اسے بتا چکے تھے کہ وہ کہیں بھی محفوظ نہیں ہے۔ دلاور نے اسے قتل نہ کروایا تو ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔ اور اس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ ایک لاکھ لے کر اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ غائب ہو جائے۔ وہ حد سے زیادہ ڈرپوک آدمی تھا۔"

"لیکن استاد! اگر اس نے تمہاری بات نہ مانی اور دلاور کے پاس چلا گیا پھر؟" ٹیڈی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اور اس نے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی مان لیا کہ تم نے طافو کی قبر کی نشاندہی کر دی ہے کیونکہ وہ مجبور تھا۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ سکندر اور محسن مجھے بھی چاند خان کی طرح قتل کر دیتے۔"

"اسے ہمارے نام معلوم نہیں۔" محسن نے کہا۔ "ہم نے ایک بار بھی نام لینے کی غلطی نہیں کی۔"

"لیکن اس نے تم دونوں کے چہرے تو دیکھے ہیں۔" ٹیڈی بولا۔ "اگر اس نے دلاور کے سامنے حلیہ بیان کیا تو کیا دلاور سمجھ نہیں جائے گا کہ علی نواز کس کا ذکر کر رہا ہے؟"

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ بیک وقت ہم دونوں کو احساس ہوا کہ ٹیڈی کی بات میں وزن ہے اور یہ ایسا نکتہ تھا جو ہمارے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ علی نواز جیسے کمزور اور بزدل شخص سے یہ حماقت بھی سرزد ہو سکتی تھی کہ وہ جان بچا کر فرار ہونے کے بجائے سیدھا دلاور سے معافی اور پناہ مانگنے جائے۔ ایک لاکھ بھی اس کے سامنے رکھ دے اور اس کے پاؤں بھی پکڑ لے کہ میرا قصور معاف کر دیا جائے۔ اس کے لیے یہ ہونا بھی مشکل کام تھا۔ بھاگنے والے میں اتنی خود اعتمادی چاہیے کہ وہ بھاگنے سے نہ ڈرے۔ یہ نہ سوچے کہ وہ بھاگ کر کہاں جائے گا اور کب تک بھاگتا رہے گا۔ یہ نہ سمجھے کہ فرار کے راستے بند ہو جائیں گے تو کیا ہو گا۔ راستے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں لیکن یہ ہمت سے زیادہ ذہانت کی بات ہے کہ ہر مشکل میں آدمی نئی راہیں نکال لے۔ بے گمان خطرات سے بے نیاز ہو کر خدا کے بعد اپنی ذات پر بھروسا رکھتے ہوئے آگے بڑھتا جائے۔ علی نواز میں نہ ہمت تھی اور نہ ذہانت۔ نہ اسے یہ اعتماد تھا کہ اتنی بڑی دنیا میں وہ کہیں محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ اس کا یقین تھا کہ وہ پھر کبھی نہیں پکڑا جائے گا۔ وہ نفسیاتی طور پر دلاور سے بہت دہشت زدہ تھا۔ ہم نے بھی اسے خوفزدہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ علی نواز کو اپنے جرم کے فاش ہونے کا ڈر تھا اور وہ سمجھتا ہو گا کہ ایک پولیس والا کہیں نہیں جا سکتا۔ اس کے محکمے کے ریکارڈ پر سب کچھ ہے۔ اس کا نام پتا، تصویر اور حلیہ۔ اگر اس کے ساتھ ہی تمام ملک میں تشہیر ہوئی تو وہ کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی ضرور پکڑا جائے گا۔ اس بے وقوف آدمی سے کچھ بعید نہیں کہ وہ خود کو دلاور کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ "آسی سے کہے کہ مجھے بچا لو" اور ساتھ ہی مارا جائے۔ دلاور وہ شخص تھا جس کے سینے میں دل ہی نہیں تھا۔ اور اگر تھا تو اس کا جذبات سے اتنا ہی تعلق تھا جتنا پتھر کا زندگی کے احساس سے۔ شرافت اور انسانیت، رحم دلی اور نیکی یا مروت اور لحاظ اس کے لیے محض الفاظ تھے۔ تاوقتیکہ ان الفاظ سے اس کے مذموم شیطانی عزائم کی تکمیل ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے جیتے جاگتے انسان اس کے اپنے مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ تھے۔ ایک آدمی کا مرنا اس کے نزدیک ایک گاڑی کے نقصان سے زیادہ اہم واقعہ نہیں تھا۔ وہ کبھی غور نہیں کرتا تھا کہ کوئی ... نامہ بر ہوتا ہے اور آدمی سے رشتوں کی آہٹ ... کسی سے کوئی جذباتی تعلق نہیں ہوتا۔ اسے

کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پہنچ جائے تو کسی کو فرق پڑتا ہے۔ اور جو قتل کرنے کی نیت سے کرتا آ رہا ہے وہ قتل ہو جاتا ہے تو مالک کس کی اجرت کی ہے؟ مقتا کس کی امورات ہے اور نتیجہ کس کا مقصد ہوتی ہے۔

چنانچہ علی نواز نے دلاور کے ہاتھوں کو مضبوط کرتے ہوئے اگر اعتراف کر لیا کہ جان بچانے کے لیے اس نے سکندر اور محسن کے سامنے اقبال جرم کر لیا ہے اور وہ جگہ بھی بتادی ہے جہاں طافو کو دفن کیا گیا تھا تو دلاور بڑی شاطرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہے گا کہ "پریشانی کی اس میں کیا بات ہے؟ ڈر تو آدمی کے ساتھ ہے۔ اب دیکھو چاند خان نہیں رہا تو اسے کسی کا ڈر بھی نہیں رہا۔ تم کو بھی میں خوف اور پریشانی سے ہمیشہ کے لیے نجات بخشتا ہوں۔ جاؤ زیر زمین سکون چین کی ابدی نیند سو جاؤ۔ یوں کہ قیامت تک نہ اٹھو اور نہ تم کو کوئی اٹھا سکے۔"

پھر وہ ایک گولی سے علی نواز کا سارا قصہ ختم کر دے گا۔ اور اسے زمانے کے کسی گمنام گوشے کے سپرد کر دے گا۔ آج نہیں کل علی نواز کا انجام بہرحال یہی ہونا تھا۔ دلاور نے فتح شیر سے معاملے طے کرتے وقت ہی طے کر لیا ہو گا کہ طافو کی لاش ڈھونڈ نکالنے میں اس کی مدد کرنے والوں کا وجود اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ ایک بار پانچ لاکھ وصول کر لینے کے بعد بھی جب چاہیں گے بلیک میل کرنے اور سود وصول کرنے پھر آ جائیں گے۔ یہ کوئی اصول اور شرافت کی بنیاد پر ہونے والا سودا نہیں تھا۔ فتح شیر اور اس کے ساتھی دلاور کو بلیک میل کر سکتے تھے اور دلاور وہ شخص تھا جو جانتا تھا کہ بلیک میلر کی زبان پیسہ نہیں بند کر سکتا۔ بلیک میلر کو حوصلہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دست سوال ہمیشہ دراز رکھے۔ دلاور نے پانچ لاکھ دینے کے بعد انسپکٹر فتح شیر اور اس کے چاروں ساتھیوں کو موت کا پروانہ بھی تھما دیا تھا جسے ان کی آنکھیں نہ پڑھ سکیں۔ فتح شیر کو ختم کرنے کے لیے دلاور کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس کے چار میں سے دو ماتحت ٹرک کے نیچے آ گئے تھے۔ تیسرا چاند خان لاپتا ہو گیا تھا اور چوتھا علی نواز خود اس کی خدمت میں حاضر ہو گیا کہ چوہدری صاحب! یہ ایک لاکھ لیجیے اور مجھے تحفظ فراہم کیجیے تو دلاور اسے تمام دنیاوی مسائل خوف اور آلام سے محفوظ کر دے گا اور علی نواز کو طافو کی طرح کسی بے نشان مدفن میں لیٹ کر سو جانے اور یوم حساب کے کسی اور زمانے میں بیدار ہونے کا۔ اس کے بعد دلاور کے لیے صرف دو افراد کا مسئلہ رہ جائے گا۔ ان دونوں کا جو ملک الموت بنے ٹرک لیے پھر رہے تھے۔ دو افراد کو کچل کر مطمئن تھے کہ نصف کامیابی تو ہوئی۔ باقی نصف ان کو یقینی نظر آتی تھی۔ معلوم نہیں دلاور نے ان کو ملک الموت مقرر کرنے کا بندوبست کیا سمجھ کر کیا تھا تو اس کا مقصد لاکھ۔ مگر وہ چار لاکھ میں چار انسانوں کو مزاحمت کیے بغیر کام تمام کرنے والے نہیں جانتے تھے کہ ان کو وہ اپنی جگہ ملک الموت ہی سمجھتا ہے اور چار لاکھ میں انہوں نے چار قیمتی زندگیوں کا سودا نہیں کیا، بلکہ زندگی ختم کر دی ہے۔ پانچ افراد سے نجات پانے کے لیے دلاور نے ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ دو کے لیے وہ کسی ایک سے بات کرے گا اور اس آخری آدمی کا قصہ خود پاک کر دے گا۔

"پریشان مت ہو۔" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "علی نواز ہماری طرف سے جہنم میں جائے۔"

"ہاں۔ ہمارا کیا بگاڑ لے گا وہ۔" میں نے چونک کر کہا۔ "بے وقوفی کرے گا تو خود جان سے جائے گا۔"

"لیکن وہ دلاور کو اور بہت سی باتیں بتا دے گا۔ جو ہم نے اسے بتائی تھیں۔" محسن نے کہا۔ "وہ لاکھ بے وقوف سہی، ہے تو پولیس میں۔ اس کی نظر نے بہت کچھ دیکھ لیا ہو گا۔ مثلاً اس کوٹھی کا نقشہ جہاں سے فتح شیر کی لاش ملی تھی۔ سفید رنگ کی اس فاکس ویگن کا نمبر، رابعہ کی اس کوٹھی میں موجودگی، سب انسپکٹر اور پولیس ٹیم کے ساتھ ہمارا سلوک۔۔۔"

"وہ انکار کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "علی نواز کی کون سنے گا؟"

"دلاور۔" محسن بولا۔ "کوئی اور یقین کرے نہ کرے، دلاور جان لے گا کہ علی نواز جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔"

"اس سے معاملات بگڑ سکتے ہیں۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "ہو سکتا ہے پولیس کے کچھ کرنے سے پہلے ہی دلاور اپنا کام کر جائے۔ وہ طافو اور چاند خان کی لاشوں کو غائب کرا دے گا اور اس کے بعد ہمارے فرشتوں کو بھی خبر دینے والا کوئی نہ ہو گا کہ وہ دونوں لاشیں کہاں گئیں۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کتنے فاصلے پر الگ الگ یا ایک جگہ گاڑی گئیں۔ ان کے اعضا الگ الگ جلا دیے گئے یا غرق کر دیے گئے۔ کسی بات کا سراغ لگانا ممکن نہ ہو گا۔ فتح شیر کے قتل کے الزام سے بچنے کا انتظام اس نے پہلے ہی کر لیا ہو گا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "ہم نے کیسٹ پر جو گفتگو ریکارڈ کی تھی وہ انتہائی ناقص اور کمزور شہادت بن جائے گی۔ دلاور کے خلاف نہ کوئی مدعی نہ شہادت۔ نہ ثبوت نہ گواہ۔ مقتول اور لاشیں کچھ نہیں ملے گا تو محض کیسٹ پر ریکارڈ ہونے والی گفتگو کی کیا اہمیت رہے گی؟"

"وہ صاف انکار بھی کر سکتا ہے کہ یہ میری آواز نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔

"انکار کیسے کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ ابھی مرا تو نہیں ہے۔"

www.paksociety.com

شبنم کو وہیں وہاں جانا [illegible] ان حالات میں عام زندگی میں دو
محسن [illegible] رہنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ نقال ہو
بہروپیہ [illegible] بنا بھی لیتے ہیں۔ پہچان اس وقت اور مشکل
ہو جاتی ہے جب آواز ٹیپ پر ہو۔ انسانی آواز تو ٹیلی فون پر بھی
اصل آواز سے مختلف سنائی دیتی ہے۔ والد کہہ سکتا ہے کہ
سکندر کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر دوسری آواز میری
نہیں ہے، کسی ایسے شخص کی ہے جو میری طرح اور میرے لہجے میں بول
سکتا ہے۔ غالباً یہی مؤقف فتح شیر کے وکیل کا بھی ہوگا۔"

"پھر بھی کوئی طریقہ تو ہوگا اصل اور نقل میں فرق معلوم کرنے کا؟"

"ہاں۔ طریقہ بہت سائنٹیفک ہے۔" محسن بولا۔ "اتنا تو سبھی جانتے ہیں کہ آواز کی لہریں ہوتی ہیں۔ اور یہ لہریں چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ آواز کی ایک پچ ہوتی ہے۔ کسی کی آواز پتلی ہوتی ہے کسی کی بھاری۔ یہ پچ کا فرق ہے۔ باہر کے ملکوں میں ایسے حساس الیکٹرانک آلات موجود ہیں جن سے ہر شخص کی آواز کا گراف بنایا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح جیسے دل کی دھڑکن کا گراف بنایا جاتا ہے جو ای سی جی کہلاتا ہے۔ دماغ کی برقی لہروں کے گراف کو ای ای جی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر گراف پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور فرق کا پتا چلا لیتے ہیں۔ ایسے ہی الیکٹرانک آلات سے آواز کا فرق معلوم کیا جاتا ہے۔ میری یا تیری آواز کا گراف دس دفعہ کیا ہزار دفعہ بنایا جائے تب بھی ایک سا ہی ہوگا۔ آواز کسی اور کی ہوگی تو فرق آ جائے گا خواہ سننے میں وہ آواز سو فیصد اصل آواز لگتی ہو۔ یورپ اور امریکا میں جہاں سکیورٹی کے انتظامات انتہائی سخت ہیں [illegible] اب شناختی کارڈ چیک نہیں کیے جاتے۔ شناختی کارڈ جعلی بھی بن جاتے ہیں۔ غلط آدمی کو اندر داخل ہونے سے روکنے کے لیے بعض جگہ فنگر پرنٹ کا نظام ہے یعنی اندر جانے والا آدمی اپنا انگوٹھا ایک خاص جگہ پر رکھے۔ اندر کسی کمپیوٹر میں پہلے سے فنگر پرنٹ موجود ہے۔ دونوں ایک ہوں گے تو کمپیوٹر کا خودکار نظام دروازہ کھول دے گا ورنہ الارم بجے گا کہ سکیورٹی خطرے میں ہے۔ اس سے بھی جدید نظام یہ ہے کہ آپ دروازے کے مقابل کھڑے ہو کر [illegible] نام بتائیں۔ اصل آواز کا گراف اندر کسی کمپیوٹر کے ذہن میں محفوظ ہے۔ جب آپ نام بتائیں گے تو کمپیوٹر نام کی پروا کیے بغیر صرف آواز کے گراف ملائے گا اور ایک ہوں گے تو آپ کو اندر جانے کی اجازت دے گا۔ نام آپ کچھ بھی بتائیں [illegible] کمپیوٹر صرف اس گراف کو سمجھتا ہے جسے ساؤنڈ پرنٹ بھی کہا جاتا ہے۔ بیچارہ شیکسپیئر تو اسی لیے بہت پہلے کہہ گیا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔"

مجھے اس مثال پر ہنسی آ گئی۔ اس بات کا مطلب [illegible]

"تو اب یہ بھی ہو گا کہ جب والد انکار کرے گا تو اس کی آواز کی تصدیق کا سوال [illegible] ہو گا۔" محسن بولا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے ہاں کی کسی لیبارٹری میں اتنا جدید الیکٹرانک سسٹم موجود ہے جو والد کی اصل آواز اور ٹیپ کی آواز کو ایک ثابت کر سکے۔ اگر ہے تو وہ بیچارا کمپیوٹر خود عدالت میں حاضر ہو کے نہیں کہہ سکتا کہ مائی لارڈ! والد جھوٹ بولتا ہے اور ٹیپ پر اسی کی آواز ہے۔ یہ رپورٹ بھیجنے والے فرشتے بھی نہیں ہوں گے [illegible] سر پھرے بھی نہیں ہوں گے جو اپنی ذات پر ناقابلِ فروخت کا بورڈ کسی تمغے کی طرح سجا کے رکھتے ہیں۔ دنیا فتح کر لی [illegible] ہماری اسی فطرت سے نالاں ہے۔ وہ جو علامہ مرحوم نے کہا تھا کہ آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی۔ تو نہ جانے وہ دور گزر گیا۔ اب آئے گا [illegible] فی الحال تو اس فلسفے کی مٹی پلید ہو رہی ہے [illegible] والد کو بھی سکہ رائج الوقت میں [illegible] اور قابل قبول قیمت ادا کرنی پڑے گی پھر اسے رپورٹ بدل جانے کی جو وہ چاہتا ہے اور کوئی [illegible] دولت مند [illegible] عدالت میں یہ رپورٹ دے گا کہ مائی لارڈ! سکندر بخت کا پیش کردہ کیسٹ جعل سازی کا نمونہ ہے۔ اس میں [illegible] والد کی آواز بنانے کی بھونڈی کوشش کی گئی ہے اور یہ ریڈیو ڈراما صداکاری کا کمال قرار دیا جائے گا۔ عدالت اسے مسترد کر دے گی۔ من و عن المطلوب۔"

"بالکل ضروری تو یقین کر لیں گے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ ضرور یقین کر لیں گے کہ والد اور فتح شیر نے [illegible] کس جرم کی پردہ پوشی کی [illegible] کیا معاوضہ [illegible] تھا۔" محسن بولا۔ "وہ [illegible] پولیس افسر ہیں۔ [illegible] رکھیں گے کہ فتح شیر نے حرام کی کتنی دولت کمانے کا اعتراف کیا تھا۔ اور [illegible] دونوں کو کس طرح [illegible] کیا ہوگا۔ مگر وہ کوئی قانونی کارروائی اس ٹیپ کو بنیاد بنا کر نہیں کر سکیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ان کو اتنا تو معلوم ہو گا کہ ہم کس [illegible] صف آرا ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہماری جنگ کسی سے [illegible] ان کے نقطۂ نظر سے ہماری جدوجہد غیر قانونی ہے مگر ہم بھی تو اس لیے مجبور ہیں کہ ان کا قانون ہمیں تحفظ فراہم نہیں کر سکتا [illegible] مجرموں کے سامنے بے بس ہے [illegible] سمجھتے ہیں۔"

"لیکن ان کو [illegible] فرض سے [illegible] انصاف کی خواہش اور کوتاہیوں کو عذر بنا کر [illegible] تقاضا سے روگردانی نہیں کرتے۔" محسن نے کہا۔

رات کا آخری پہر تھا لیکن نیند ہم میں [illegible]

[illegible] بھی۔" محسن نے دو سگریٹ سلگا لیے [illegible] ان میں سے ایک بڑھا [illegible] "میاں نیک محمد! آخر ہم تمہارے مہمان ہیں۔ تم پر خاطر مدارات واجب ہے۔ اور کچھ نہیں تو چائے ہی پلا دو۔"

"اس وقت تو میرے گھر والی کی بھی ہمت نہیں اٹھنے کی [illegible]" ٹیڈی بولا۔

"حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں استاد!" میں نے کہا۔ "رات [illegible] کا اثر ہوگا کہ حالات [illegible] سے نہیں صحبت سے بھی ہم [illegible] نظر آئیں گے۔ [illegible] مجبوری میں آدمی اُلو ہوتا ہے۔"

"کبھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے۔" محسن نے کہا۔ "کبھی ندامت اعمال کے باعث۔"

"لیکن تم محض دو اُلّوؤں کی صحبت میں اُلو بن رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "جاؤ [illegible] اُلو! چائے بنا لاؤ۔"

چائے بنانے کے لیے جانے سے پہلے استاد ٹیڈی نے دلائل سے ثابت کیا کہ اس وقت دنیا میں ہر شخص کسی نہ کسی کو اُلو بنا رہا ہے۔ بیوی شوہر کو اور شوہر بیوی کو۔ بیٹے اپنے باپ کو۔ سیاست دان عوام کو۔ شاعر [illegible] تاجر گاہک اور مزدور [illegible] سب ایک دوسرے کو اُلو بناتے ہیں۔ چنانچہ دنیا میں انسان کوئی نہیں ہے۔ اُلو ہیں یا اُلو بننے والے ہیں۔ پھر وہ [illegible] کر گیا۔

"صبح کے اخباروں میں ایک خبر اس [illegible] کے اغوا اور موت کی ہوگی۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "ہاں۔ اور اس میں جو گاڑی [illegible] پائی جائے گی [illegible] صوفیہ کے نام [illegible] برآمد ہو گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پولیس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ نام [illegible] چنانچہ پولیس معلوم کرے گی کہ گاڑی کہاں سے خریدی گئی تھی اور وہ دکان دار الفاظ سے تیری تصویر بنانے [illegible] پہلے ایک گاڑی خریدنے کے لیے [illegible] بعد میں دوسری گاڑی [illegible] لے لی۔"

"ممکن ہے تفتیش کا سلسلہ پرنسس صوفیہ کے ساتھ پیش آنے والے [illegible] واقعات سے جا ملے اور ایک ہوٹل کا منیجر بھی گواہ [illegible] پرنسس صوفیہ کے باعث وہ خود کتنی تباہی و بربادی سے دوچار ہوا تھا اور [illegible] ہوٹل میں [illegible] دھماکے سے [illegible] ڈراما دیکھا تھا۔ وہ پرنسس کی تصویر اپنے الفاظ میں بنائے گا۔ ممکن ہے پولیس [illegible] کوئی پرنٹ نکال کر [illegible] وہ غارت گر عقل و ہوش جس کا شباب [illegible] ہے۔ اس کے بعد [illegible] ایس ایس پی تک بات پہنچی تو [illegible] مجھے [illegible] چنانچہ [illegible] پر فوراً [illegible] جائیں گے کہ [illegible]

سب کیس کی کارروائی ہو سکتی ہے۔ [illegible] تو اس کا مقصد سکندر [illegible] مائٹ از رائٹ سوسائٹی [illegible] مزاحمت کیے بغیر

"محسن خان [illegible] اپنے چاروں طرف دیکھو [illegible]

"اس [illegible] میرا مطلب تھا اس دنیا کو دیکھو جس میں ہم زندہ ہیں۔ آج یہ فلسفہ صرف حیوانوں ہی پر نہیں انسانوں پر بھی صادق آتا ہے کہ بقا صرف طاقتور کے لیے ہے۔ [illegible] قبل از تاریخ کے جانور مثلاً ڈائنوسار ختم ہو گئے۔ اب شیر، ہاتھی اور دوسرے بہت سے جانوروں کی نسل رفتہ رفتہ معدوم ہوتی جا رہی ہے کیونکہ ان میں حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت اور طاقت نہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں بدلتے ہوئے حالات میں ان کے لیے زندہ رہنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے ہی ایک دن نیک، ایماندار اور اصول پرست آدمی کے لیے اس معاشرے میں جینا مشکل ہو جائے گا اور معاشرے سے اس کا وجود خود بخود مٹ جائے گا۔ مائٹ از رائٹ سوسائٹی ہی ایسے آدمی کی گنجائش ہی نہیں رہنے دے گی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے یار۔" محسن نے کہا۔ "ڈھول تو [illegible] جاتا ہے کہ سب خیریت ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دیانتداری اور ایمان کی سلامتی کے ساتھ آج کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ نہ ملازمت، نہ کاروبار اور نہ محنت مزدوری۔ رزق حلال کما کے اپنا اور خاندان کا پیٹ بھرنے کے لیے کوئی پھاوڑا بھی لگانا چاہے تو [illegible] کا [illegible] ہے۔ پولیس کا [illegible] ٹھیلا [illegible] دیتا ہے اور فقیر بھی۔ کوئی مجبوری میں اپنا خون بھی بیچنا چاہے تو [illegible] ہسپتال کا ایک ٹھیکیدار ہے۔ پہلے وہ [illegible] لیتا ہے۔"

"یہی ہے مائٹ از رائٹ سوسائٹی دوست!" میں نے کہا۔ "جو کچھ ہم آج ہیں اسی کے طفیل ہیں ورنہ کیا ہم ایسے تھے؟ ہم نے تو اصول اور انصاف کے مطابق اپنا حق مانگا تھا۔ بہت مجبور ہو کے ہم نے مائٹ از رائٹ کے فلسفے کی بالادستی قبول کی۔ اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا نظریہ یہاں سکہ رائج الوقت تھا۔ اس کے بغیر حق تو کیا کوئی بھیک خیرات تک دینے پر تیار نہ تھا۔ [illegible] نہیں چھوڑ سکتا۔ ہم نے بھی اس معاشرے کی اصلاح کا ٹھیکا نہیں لیا ہے۔ ہم تو صرف اپنا حق حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنا حق غصب کرنے والوں کو یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ جو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی سکت رکھتے ہیں۔"

جب ٹیڈی چائے لے کر اندر آیا تو ہم فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے پیر پھیلائے بیٹھے تھے۔ رات کے آخری پہر میں سردی بڑھ گئی تھی چنانچہ ہم نے پیروں پر کمبل ڈال لیا تھا۔ میرے ہاتھ پھر

www.paksociety.com

"ہم تو وہیں رہ رہے ہیں... بھی ہوتی ہے... ناکافی محسوس ہوتا ہے۔"

"یہ تو ہے۔" محسن نے گرم چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ "سردی واقعی زیادہ ہے۔"

"تم اس ایک کمبل میں سردیوں کا پورا موسم گزار دیتے ہو؟" میں نے ٹیڈی سے کہا۔

"ایک کمبل سے کیا ہوتا ہے جی۔" ٹیڈی بولا۔ "صبح تک تو ہی کی قلفی جم جاتی ہے۔ میرا کمرہ ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ سردی باہر کتنی بھی ہو، اندر پتا بھی نہیں چلتا۔" اس نے پلنگ کے نیچے سے ایک ہیٹر نکالا اور پلگ لگا کے آن کر دیا۔ ڈبل بار والے ہیٹر کی چمکدار سطح سے روشنی کے ساتھ حرارت کمرے میں پھیلنے لگی۔ میں نے حیرانی سے ٹیڈی کی طرف دیکھا۔

"استاد... یہ ہیٹر تو ستر اسی روپے کا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ دو ہزار واٹ کا ہیٹر ہے۔"

"اس کا بجلی کا خرچ تو بہت زیادہ ہوگا۔" محسن نے کہا۔

"پتا نہیں جی... ہم نے تو مالک مکان سے دس روپے مہینہ طے کر رکھا ہے۔" ٹیڈی بولا۔

"دس روپے مہینہ؟" محسن نے کہا۔ "اور مکان کا کرایہ کتنا دیتے ہو؟"

"پچاس روپے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"کمال ہے! اس طرح تم دس روپے کی تو بجلی خرچ کر دیتے ہو گے۔" میں نے کہا۔ "مالک مکان تو روتا ہوگا۔"

"اس نے تو اپنے گھر کے تین کمروں میں ہیٹر لگا رکھے ہیں استاد..." ٹیڈی نے دانت نکال کے کہا۔ "بالکل ساتھ والا مکان اس کا ہے اور میٹر بھی ادھر ہی ہے۔ بڑی ایمانداری سے ہر مہینے پندرہ بیس روپے کا بل ادا کرتا ہے۔"

"اچھا! گویا چوری کے کنکشن سے رکھا ہے؟" میں نے کہا۔

"یا وہ خود واپڈا میں ہے۔"

ٹیڈی نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کا سالا میٹر ریڈر ہے۔"

"دیکھا محسن خان! اس معاشرے میں ایک میٹر ریڈر کتنا بااختیار ہے۔" میں نے کہا۔ "حکومت کیا کرے اور نظام انصاف کیا کرے۔ پولیس کا سپاہی ہو یا... سب کی طاقت ان قوانین کی طاقت سے زیادہ ہو گئی ہے جو بدعنوانی کو ختم کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔"

"قصور تو ان کا ہے سکندر، جو قانون شکن عناصر کا ساتھ دیتے ہیں۔ مثلاً جیسے استاد ٹیڈی کا مالک مکان۔" محسن نے کہا۔ "میں بھی سمجھتا ہوں کہ قانون ... کیا جاتا ہے مگر ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف۔"

"کہیں جورو کا بھائی، کہیں پیسہ اور کہیں غنڈہ گردی۔" میں نے کہا۔ "یہیں تو قانون ... کے سامنے ہیں جن کی وجہ سے ... حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک طرف ظالم دوسری طرف مظلوم۔ ایک طرف چوہدری، وڈیرے جیسے لوگ ہیں جن کے ہاتھ میں لاٹھی ہے، چاہے وہ سب کو بھینس سمجھتے ہیں اور جدھر چاہتے ہیں ہانک کے لے جاتے ہیں۔"

کمرے میں ہم تینوں وقت گزارنے کے لیے ... کوشش کر رہے تھے اور ذہن کو پریشان کن خیالات سے ... رکھنے کے لیے باتوں میں مصروف تھے مگر باہر مکمل سکوت تھا۔ دسمبر کی سرد رات کا گھپ اندھیرا تھا۔ کہیں بہت دور ... بولتا تھا اور وقفے وقفے سے چوکیدار کی سیٹی بھی سنائی دے جاتی تھی۔ میں نے زاہدہ کا تصور کیا اور اپنے دل کو خیالات سے بہلانا چاہا مگر دماغ پر وحشتناک واقعات کا اثر تھا۔ ایک نقش زاہدہ کی ... اور سکول کی پرنسپل کی المناک موت کا تھا۔ کیا عجیب ... تھا۔ الف دین ... کر رہا تھا ... ذات تھا اور سکول جہاں بچے کتابوں میں لکھی ہوئی باتیں پڑھتے تھے ... کسی کا حق نہ مارو... اور وہ بے گناہ عورت جو قوم کے نونہالوں کو یہ تعلیم دیتی تھی، استاد تھی اور جس کا مرتبہ ... تھا۔ تین بدمعاشوں کے ہاتھوں اغوا کی ناکام کوشش کے نتیجے میں ... سے قتل ہو گئی ... دوسرا نقش ... جانے والا ... ساتھ جانثار خان کی تدفین کا تھا۔ ایسے میں زاہدہ کا خیال ہی ... روح کی تسکین کا سامان فراہم کر سکتا تھا۔ ایک خلش سی ... تھی کہ میں نے آج اپنے غلط رویے سے اس کے جذبات کو مجروح کیا تھا اور اس کے دل کو صدمہ پہنچایا تھا۔ محسن نے کہا تھا ... رو رہی تھی۔ کیا اس وقت وہ بھی جاگ رہی ہوگی اور خود کو قصوروار سمجھ کے احساس پشیمانی میں مبتلا ہوگی۔

میری طرح محسن اور ٹیڈی بھی کچھ سوچ رہے تھے اور ... بیٹھے ہوئے سکوت کا ایک مختصر سا وقفہ آ گیا تھا۔ خاموشی ... اچانک میرے کانوں نے کسی کے اندر کودنے کی آواز سنی ... واضح تھی کہ بیک وقت محسن اور ٹیڈی بھی میرے ساتھ ... میں نے ایک ہاتھ کی انگلی ہونٹوں پر رکھ کے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ریوالور خود بخود میرے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔

"تیرا ریوالور کہاں ہے؟" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"دوسرے کمرے میں۔" محسن نے بھی پست آواز میں کہا...

"ابھی دروازہ مت کھولنا......." دروازے کی طرف ... محسن کو روکنے کے لیے کہا۔ ہم اس قدر آہستہ بات کر رہے تھے کہ باہر کوئی ہماری سرگوشیاں نہیں سن سکتا تھا۔

"... اسی میں ٹھہرا ہے۔"

"یا میرے مولا! اس وقت تو یہ ... ہو سکتا ہے ... بادشاہ!" استاد ٹیڈی نے گھبرا کے کہا۔

"میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہوتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم ... کھولو اور اسے اندر آنے دو۔"

"لیکن اندر آنے سے پہلے ہی اس نے مجھے گولی مار دی تو کیا..." ٹیڈی ... ہو کے بولا۔ "تم آرام ... کے پیچھے..." باہر اب بالکل خاموشی تھی۔ میں نے کمرے کی لائٹ آف کر دی۔

"شکریہ کرو استاد۔" میں نے دیوار کے ساتھ چپک کر ... "معلوم نہیں آنے والا دوست ہے یا ... اگر دشمن ہوگا تب بھی گولی چلانے کی حماقت نہیں کرے گا۔"

"کیا معلوم وہ کتنے ہیں۔" ٹیڈی نے کہا۔ "اور کون ہیں آخر؟"

"یہ تو دروازہ کھولنے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔" میں نے جھنجھلا کر ... "تمہارا دم کیوں نکل رہا ہے؟"

"دم کس کا نکل رہا ہے!" ٹیڈی نے تھوک نگل کے کہا۔ "لیکن ... انتظار کیوں کر رہے ہیں؟ کیا چاہتے ہیں آخر؟"

"ٹیڈی! وہ چاہتے ہیں کہ تم دروازہ کھول کے دیکھو۔" میں نے ... "فرض کرو وہ ہمیں قتل کرنا چاہتے ہیں... آگ ... کے اندر ہی ہلاک کر دینا چاہتے ہیں۔ جب وہ سامنے آئیں گے ... معلوم ہوگا نا... تم ... ہمت کرنا ... اٹھا تھا ... بھاگ جانا۔ وہ ایک ... ان سے ہم نمٹ لیں گے ... کھولو دروازہ۔"

خود کو استاد ٹیڈی کہلا کے خوش ہونے والے اور ... ہوائی فائرنگ کرنے والے ٹیڈی محمد نے اپنی کم ہمتی اور بزدلی ... بار بار دیا تھا مگر اس وقت مجھے ٹیڈی کی حالت ... تھا ... وہ مردہ قدموں سے آگے بڑھا ... کانپتے ہاتھوں سے کنڈی کھولی۔ چند سیکنڈ وہ اسی مجسمے کی طرح کھڑا ... کے لیے کھینچنے کا منتظر ہو مگر اس کے ... دیکھ سکتا ہو ... دروازے کی اوٹ سے ... محسن ... کوئی بھی نہیں تھا۔ مختصر سے صحن کا ہر گوشہ ... روشن ضرور تھا کہ کوئی کسی کونے ... نظر آ جاتا۔ کچن اور انتہائی مختصر باتھ روم کے دروازے کھلے ہوئے تھے جہاں ... ہو سکتا تھا کہ اندر کودنے ... کیا ہو۔ اس میں شک کی بالکل کوئی گنجائش نہ تھی کہ ... زیادہ بلند دیوار کو پھلانگ کر کوئی اندر آیا تھا۔ وہ ... آ سکتا تھا مگر اس نے حملے کے تقاضوں کا خیال نہیں رکھا تھا۔ اگر یہ حرکت اس نے جانتے بوجھتے کی تھی تو اس کا مقصد ہمیں متوجہ کرنا تھا۔ تاکہ ہم باہر نکل آئیں اور مزاحمت کیے بغیر ہتھیار ڈال دیں۔ اگر کوئی کچن یا باتھ روم میں اپنا مورچا سنبھالے بیٹھا تھا تو یقیناً ہم سے بہتر پوزیشن میں تھا لیکن میں اپنے دشمنوں کو بے وقوف نہیں سمجھتا تھا۔ اپنے طرز عمل سے بہت پہلے ہی ہم یہ ثابت کر چکے تھے کہ نہ ہم اتنے احمق ہیں اور نہ بزدل کہ کسی کے یوں دھمکانے سے ڈر جائیں۔ دوسرا سبب اس کی بدحواسی ہو سکتی تھی لیکن ایسا کون تھا جو گھبرا کے اس غریب خانے میں پناہ لے۔

"نظر تو کوئی نہیں آ رہا ہے استاد!" میں نے ٹیڈی کے کان میں کہا جو اب پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"لیکن... سکندر بادشاہ... وہ آواز...؟" ٹیڈی نے سر ہلایا۔ "کیا کوئی چور تھا... جو بھاگ گیا؟"

"چور تمہارے گھر سے کیا لے جائے گا؟" میں نے کہا۔ "کوئی قیمتی چیز ہے تو ہماری جان۔"

محسن نے دروازے کے ... سے جھانک کر دیکھا اور میرا اشارہ پاکے قریب آ گیا۔ کمرے میں ... ہیٹر کی مدھم سی روشنی بھی اس وقت بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ باہر تو کوئی ... نہیں ... "اگر وہ کچن یا باتھ روم میں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میں پہلے کچن میں دیکھتا ہوں۔ تم مجھے کور کرنا۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا اور میری جگہ ریوالور لے کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے کے دروازے سے کچن کا دروازہ مشکل سے دس فٹ دور ہوگا۔ میں نے ایک جست لگائی اور توپ کے گولے کی طرح کچن میں جا گرا۔ اگر کوئی دشمن بھی محسن کی طرح نشانہ لیے منتظر ہوتا تو اس برق رفتاری کے باعث آسانی سے مجھے نشانہ نہیں بنا سکتا تھا لیکن کچن میں کوئی نہیں تھا۔ اندر گرتے ہی میں یوں اٹھ گیا تھا جیسے ربر کی گیند زمین سے ٹکرا کے اچھلتی ہے اور میری نظر نے ہر گوشہ دیکھ لیا تھا۔ کوئی اندر ہوتا تو مجھے اتنی مہلت کیونکر ملتی۔ میں نے کچن کی لائٹ جلا دی۔ روشنی صحن میں بھی پھیل گئی اور میرے مقابل باتھ روم تک پہنچی۔ کھلے دروازے سے میں نے چار فٹ لمبے چار فٹ چوڑے غسل خانے اور اس سے ملحق لیٹرین کو دیکھا۔ نظر آتی تھی کہیں کچھ بھی نہیں ہے لیکن عقل اسے فریب نظر قرار دیتی تھی۔ وہ آواز صرف میرے کانوں نے نہیں سنی تھی۔ محسن اور ٹیڈی بھی اس آواز پر چونکے تھے اور انہوں نے بھی وہی نتیجہ اخذ کیا تھا جو میں نے۔ جب کہ اس کو وہم نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ ایک نظر میں نے دیوار کو دیکھا کسی کے دیوار سے پیچھے ہونے کے امکانات پہ غور کیا اور ان امکانات کو مسترد کر دیا۔ دیوار کے پیچھے گلی تھی اور گلی میں ... کی طرح کھڑا رہنے والا ...

www.paksociety.com

جا سکتی تھا۔ میں نے محسن کو آواز دی اور اسے باہر آ جانے کو کہا۔ میں خود بھی صحن میں آگیا تو محسن سمجھ گیا کہ اب لائٹ جلانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم نے اطمینان سے اندر اور باہر دیکھا لیکن کوئی ہوتا تو ہمیں نظر آتا۔

"یار میں نہیں مان سکتا کہ میرے کانوں کو دھوکا ہوا تھا۔" میں نے کہا۔

"اگر کوئی اندر کودا تھا تو پھر کہاں گیا؟" محسن بولا۔ "بلاوجہ اندر آیا اور لوٹ گیا۔"

"کوئی اتنی رات کو اپنی جمپ کی مشق نہیں کرتا۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "اور وہ بھی دوسرے کے گھر میں۔"

"سکندر بادشاہ! ہو سکتا ہے کسی نے کچھ پھینکا ہو۔" ڈیڈی نے بالآخر لب کھولے۔

"تمہارا گھر ہے۔ تم خود غور کرو کہ کون سی چیز مشتبہ اور غائب ہے جو ہمارے سامنے ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔" ڈیڈی نے سر کھجا کے کہا۔ "یہاں ہے ہی کیا۔ فقیر کا ڈیرا ہے۔ وہی دو چار برتن ہیں اور اپنا بوریا بستر ہے۔"

مگر محسن کچھ سوچ رہا تھا اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کے خیالات کی سمت کیا ہوگی۔ برسوں کے ذہنی اور جذباتی تعلق اور زندگی کے تجربات میں ہر قدم کی رفاقت نے ہمارے انداز فکر میں ایسی یکسانیت پیدا کر دی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے بارے میں خاصے وثوق کے ساتھ بتا سکتے تھے کہ مخصوص حالات میں ہمارا ردعمل کیا ہوگا۔

"میرا خیال ہے سکندر کہ کوئی آیا ضرور تھا۔" محسن نے کہا۔ "لیکن کچھ کرنے کی نیت سے نہیں۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم موجود ہیں یا نہیں۔"

"اور وہ خاموشی سے جائزہ لے کر چلا گیا۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

"خاموشی سے کیسے سکندر بادشاہ!" ڈیڈی نے کہا۔ "وہ تو دھم سے کودا تھا۔"

"ہاں۔ لیکن وہ اندر کودا نہیں۔ چند سیکنڈ میں پھر دیوار پر سے گلی میں اتر گیا۔" میں نے کہا۔ "جب لائٹ جلا کے ہم نے دروازہ کھولا تو شاید وہ دیوار کے اوپر سے جھانک رہا تھا۔"

"اگر وہ دیوار کے اوپر ہی سے مجھے ڈز کر دیتا پھر؟ تم نے تو آگے کر دیا تھا مجھے!"

"وہ شوٹ کرنے نہیں آیا تھا۔ شوٹ کرنے والے بعد میں آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ تو مخبری کرنے آیا تھا۔ دیوار کے اوپر سے اس نے مجھے اور محسن کو بھی دیکھ لیا ہوگا اور باقی منظر بھی دیکھ لیا ہوگا۔ اس کا مقصد ہمارے اس ٹھکانے کی تصدیق کرانا ہو گی۔ اب باقی کارروائی دلاور کی ہدایات کے مطابق ہوگی۔ میں کام کرنے کا قائل نہیں۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کیا اور کب کرے گا۔"

"گویا اب یہ جگہ بھی محفوظ نہیں رہی؟" محسن نے تشویش سے کہا۔ "یار سکندر! اب یہاں سے نکل جانا چاہیے اور عقل مندی یہی ہے کہ آج کا کام کل پر مت چھوڑو۔"

"تو کیا چاہتا ہے کہ ہم اسی وقت رخت سفر باندھ لیں؟"

"ہاں۔ اگر جانا ہی ہے تو یہاں سے فوراً چلے جانا بہتر ہے۔" محسن بولا۔ "دیر سے نقصان ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے شوٹ کرنے والے بعد میں آئیں گے لیکن کیا وہ صبح ہونے سے پہلے آ سکتے ہیں؟ اگر انھوں نے بھی سوچا کہ دیر کرنے سے نقصان ہو سکتا ہے تو وہ بھی آ جائیں گے۔ انھیں ڈر ہوگا کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آج یہاں ہیں تو کل کہیں اور چلے جائیں۔ ہم تو اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کس طرح اور کتنی جدوجہد کے بعد وہ پتا لگانے میں کامیاب ہوئے۔ وہ کیوں خطرہ مول لیں گے کہ ہم غائب ہو جائیں۔ اگر ایسی ویسی کوئی بات نہ ہوئی تو ہم واپس آ جائیں گے۔ یہ خطرے کی بات نہیں ہے۔"

محسن کی دلیل نے مجھے قائل کر لیا۔ ابھی تو صرف دو بجے تھے۔ اگر واقعی کسی کو پہلے اس ٹھکانے پر ہماری موجودگی کی تصدیق کے لیے بھیجا گیا تھا تو اس کے واپس جا کر رپورٹ دینے اور حملے کی تیاری میں کچھ وقت تو لگے گا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ ہمیں کتنا وقت ملے گا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ باقی لوگ کسی گاڑی میں ساتھ ہی اور گلی کے موڑ پر مخبر کے منتظر ہوں۔ ایسی صورت میں حملہ کے بارے میں تھی۔ اگر مخبر نے دلاور کو کہیں سے فون کیا اور دلاور نے اپنے ساتھی بھیجے تو ان کی کارروائی میں آدھا گھنٹہ لگے گا۔ تیسری اور آخری صورت یہ تھی کہ مخبر خود دلاور کو صورت حال سے مطلع کرے اور دلاور مکمل تیاری کے ساتھ کوئی مؤثر کارروائی کرنے کی منصوبہ بندی کرے۔

"محسن ٹھیک کہتا ہے استاد!" میں نے ڈیڈی سے کہا۔ "اسی وقت بھاگ جانا چاہیے۔"

"لیکن... ہم جائیں گے کہاں؟" ڈیڈی نے پریشان ہو کر کہا۔

"کہیں بھی جانا جہنم میں جانے سے بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ جا کے سامان سمیٹنے لگا۔

"ابھی کوئی شک کے دستی بم پھینک گیا تو خواہ مخواہ

سوٹ کیس میں بھرنا شروع کر دیا۔

"اپنا سامان لے کے ہوں میں بھی چلتا ہوں۔" ڈیڈی نے ہاتھ جوڑی "ساتھ کیا لوں؟"

"بس عقل ضرور ساتھ رکھنا۔" میں نے کہا۔ "باقی جو کچھ تم یہاں چھوڑ کر جاؤ گے، اصل مسئلہ تو جان کی سلامتی کا ہے۔"

"میں جا کر دیکھتا ہوں۔" محسن دروازے کی طرف لپکا۔ "کہیں آ تو نہیں گئے۔"

"باہر مت جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ دروازہ کھولتے ہی تم پر فائر ہو جائے۔"

"میرے پاس ریوالور ہے۔" محسن نے کہا۔ لیکن اتنی دیر میں اپنے ریوالور کے ساتھ اس کے پیچھے پہنچ گیا تھا۔ محسن نے دروازہ کھول کے گلی میں جھانکا اور پھر میری طرف دیکھا۔

"سامنے تو کوئی نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن گلی کے موڑ پر ایک سایہ سا دکھائی دیا تھا۔"

اب میں نے گردن نکال کے دیکھا۔ "ایک نہیں دو سائے ہیں۔" میں نے کہا۔ "دو کے چار بھی ہو سکتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے ناکہ بندی۔" محسن بولا۔ "دوسری طرف کا راستہ بھی نہیں۔ گلی بند ہے۔"

"استاد! اگر گلی دونوں طرف سے بند ہو تو ہم دشمنوں کی نظر سے بچ کر کیسے نکل سکتے ہیں؟" میں نے ڈیڈی سے کہا جو میرے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ "ہے کوئی صورت؟"

"بالکل ہم پہلے ہی خود کو الو ثابت کر چکے ہیں مگر ہم آرام سے نکل سکتے ہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔" محسن بولا۔

"ہم اسی طرح پکڑے جاتے ہیں سکندر بادشاہ!" ڈیڈی نے دیکھا۔ "گرمی کا موسم ہوتا تو یہ بھی مشکل ہو جاتا مگر آج کل سب نیچے کمروں میں سو رہے ہیں۔ یہ گھر کی چھت مالک مکان کی چھت سے ملی ہے۔ لیکن ہم چھت سے دوسری گلی میں نہیں اتر سکتے۔"

"کیوں نہیں اتر سکتے؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ چھت سے جو زینہ نیچے جاتا ہے وہ صحن میں کھلتا ہے۔" ڈیڈی بولا۔ "اور صحن پار کرنے کے بعد گلی میں کھلنے والا دروازہ ہے۔ ساتھ والے مکان دو دو منزلہ ہیں اور ان کی چھت بہت اونچی ہے۔"

"کیا ہم صحن پار نہیں کر سکتے؟" میں نے کہا۔ "یا دروازہ مقفل ہوتا ہے؟"

"دروازے کا مجھے صحیح علم نہیں۔ اسے بند کرنے کے بعد بیٹھا تالا لگاتا ہے یا نہیں مگر وہ خود رات بھر جاگتا ہے۔ وہ دمے کا مریض ہے۔" ڈیڈی بولا۔ "ذرا سی آہٹ پر وہ نکل آئے گا۔"

"دیکھو میاں نیک محمد! یہ موقع ڈھونے اور سوچ بچار میں وقت ضائع کرنے کا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "معلوم نہیں کیوں تقدیر نے اتنی مہلت فراہم کر دی ہے ورنہ شکاری تو تیار کھڑے ہیں۔"

"کیوں کھڑے ہیں؟" ڈیڈی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کس کا انتظار ہے انہیں؟"

"شاید مناسب وقت کا۔ ہمیں کیا معلوم کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "قتل کرنا ہوتا تو اب تک کر چکے ہوتے۔ اندر ہم بم پھینک جاتے یا مشین گن لے کر آتے اور سب کو بھون جاتے۔"

"ممکن ہے وہ ہمیں اغوا کر کے ساتھ لے جانا چاہتے ہوں۔ یا ہم سے کچھ لینے آئے ہوں۔ مثلاً وہ کیسٹ جس کی ایک نقل ہم چوہدری دلاور کو پہلے ہی دے چکے ہیں۔ یا چوہدری صاحب ہم سے پوچھنا چاہتے ہوں کہ ہم ان کے بارے میں کتنا جانتے ہیں اور کیا ثبوت ہم رکھتے ہیں۔" محسن نے کہا اور ایک بار پھر گلی میں جھانک کر دیکھا۔

"تیرا فرمایا ہوا بالکل درست تھا۔ دو سے چار ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ گلی کے اندر کھڑے ہیں۔" محسن بولا۔

"غالباً ان کو دلاور کا یا افسر بکار خاص کا انتظار ہے۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے اطلاع دے دی ہوگی کہ پنچھی موجود ہیں۔ اور اس تصدیق کے بعد دلاور نے کہا ہوگا کہ وہ جہاں ہیں وہیں ان پر نظر رکھو۔ کوئی نکلنے نہ پائے۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ اپنے پلان پر عمل کرے گا۔ مگر ناکامی کا امکان نہ رہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور ہم کو اٹھا لیا جائے۔ جیسے پولیس مجرموں کو تفتیش کے لیے اٹھوا لیتی ہے۔"

"ہاں بہت دن ہو گئے ہیں ہماری اس سے بالمشافہ گفتگو نہیں ہوئی۔" محسن نے کہا۔

"اور اس عرصے میں تم نے اسے پریشان بھی بہت کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ سمجھ چکا ہے کہ اب ہم سودا تو کریں گے نہیں۔ چنانچہ وہ خوف زدہ بھی ہوگا کہ کہیں ہم اس کے اصل کاروبار کا سراغ نہ لگا لیں۔ بس اب نکل چلو۔"

میں نے اور محسن نے اپنے اپنے سوٹ کیس اٹھائے۔ ڈیڈی نے خاکی رنگ کے ساتھ ٹین کا ایک صندوق کندھے پر رکھا جس کو بند کرنے کے لیے رسی لپیٹی ہوئی تھی۔ سوٹ کیس میں کپڑوں کے علاوہ ایک ٹیپ ریکارڈر اور ٹیلی فون بھی تھا۔ ایک ایک ریوالور میرے اور محسن کے ہاتھ میں تھا اور ایک ایک ہم دونوں نے سوٹ کیس میں چھپا لیا تھا۔ جو ریوالور میرے ہاتھ میں تھا وہ سائلنسر والا تھا اور میں نے

www.paksociety.com

چاہیئے تھا جتنی نقدی تم تھی وہ محسن کے پاس تھی۔ اس کے علاوہ ہمارے سوٹ کیسوں میں جانے کے کپڑے تھے اور ایک پوسٹ مین کی اور ایک ویٹر کی وردی بھی شامل تھی جنہیں میں استعمال کر چکا تھا۔ یہ سب سامان ضرورت تھا جسے ہم کہیں بھی چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے۔ ٹیڈی نے اپنے بکس میں کیا رکھا تھا، یہ ہم نے اس سے نہیں پوچھا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اپنے کپڑوں یا پیسوں کے سوا وہ کیا لے گا جبکہ وہ گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور تھا۔ چند منٹ پہلے وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اسے گھر کھلا چھوڑ کے بھاگنا پڑے گا اور وہ بھی آدھی رات کے بعد اتنی سردی میں۔ وہ زیر لب کچھ کہتا ہوا ہمارے پیچھے پیچھے چھت پر پہنچا تو سردی سے اس کے دانت بج رہے تھے۔

"آج تو مروا دیا تم نے سکندر بادشاہ!" وہ کانپتے ہوئے بولا۔ بے شک سردی زیادہ تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ آدمی ٹھٹھر جائے۔ ٹیڈی پر سردی کا ہی نہیں خوف کا بھی اثر تھا۔

"سکندر بادشاہ کو بھی تقدیر نے مروایا تھا استاد۔" میں نے کہا۔ "وہ دنیا فتح کرنے نکلا تھا اور ایک مچھر نے کاٹا تو ڈھیر ہو گیا۔ چنانچہ دنیا سے گیا تو دونوں ہاتھ خالی تھے۔ ہم خالی ہاتھ تو نہیں ہیں نا؟"

مجید بھٹی کے گھر اور اس کے مالک مکان کے گھر کی چھت کسی زمانے میں ایک ہی ہوگی جسے کسی نے گھر کے ایک حصے کو کرائے پر دینے کے لیے الگ کیا تو اس گھر کی چھت کو بھی چار فٹ کی دیوار اٹھا کے تقسیم کر دیا۔ میں نے اس دیوار پر لیٹ کر ٹٹول کے خطرناک علاقے میں پہلے قدم رکھا اور محسن نے مجھے دونوں سوٹ کیس پکڑا دیے۔ پھر ٹیڈی نے مجھے رسی سے بندھا ہوا ٹین کا کھڑکھڑاتا صندوق پیش کیا۔ غنیمت تو تھی وہ بہت بھاری تھا اور میرے ہاتھوں سے گرتے گرتے رہ گیا۔ اگر وہ چھت پر گر جاتا تو اس کا دھماکا مکان کے مالک کو بم کے دھماکے کی طرح سنائی دیتا۔ وہ دوڑتا ہوا آتا اور پھر اپنے فرار کے منصوبے کو ناکامی سے بچانے کے لیے ہمیں اس کو ناک آؤٹ کرنا پڑتا۔

"کیا بھرا ہے اس میں استاد؟" میں نے کہا۔ "لوہا یا سونا؟"

"دونوں سے آدمی کو اصل طاقت حاصل ہوتی ہے۔" محسن نے کہا اور اپنا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ ٹیڈی نے کوئی جواب نہیں دیا اور ہم نے دبے پاؤں چھت کو عبور کیا۔ زینہ اس کے شمال مشرق میں نظر آ رہا تھا۔ میں نے آخری زینے پر قدم رکھنے سے پہلے منڈیر سے نیچے جھانکا۔ صحن میں اندھیرا تھا۔ اچانک بند کمرے کے کسی دروازے سے روشنی کی ایک لکیر نکلی اور ٹیڈی کا لینڈ لارڈ کھانستا ہوا برآمد ہوا۔ ہم تینوں زینے میں دبک گئے۔ چند منٹ کی تاخیر نے ہمیں بچا لیا ورنہ ہم عین اس وقت پکڑے جاتے جب ہم دروازہ کھول رہے ہوتے۔ ایک ٹوٹا ہوا پتلا اور بوڑھا سا آدمی آہستہ آہستہ چلتا باتھ روم تک گیا۔ ہم دم سادھے اس کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔

"سکندر!" محسن نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "تم نے کچھ سنا؟"

ابھی تک میں نے کچھ نہیں سنا تھا لیکن اسی وقت میرے کانوں نے بھی دو افراد کو دھیمی آواز میں بولتے سنا۔ "ساتھ والوں کے گھر میں معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ محسن نے آگے جھک کر اور پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

"وہ لوگ ہمیں غائب پائیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ ہم یہیں سے فرار ہوئے ہیں۔" محسن بولا۔ "یہ ٹیڈی کا لینڈ لارڈ اندر جا کہاں ہے گیا؟"

"وہ ہمارے نقش قدم پر چلتے ہوئے آئیں گے اور ہم یہیں گرفتار کر لیں گے۔" میں نے کہا۔

"یا میرے مولا! اب کدھر جائیں؟" ٹیڈی نے لرزتی آواز میں کہا۔

"آگے کنواں پیچھے خندق۔ اوپر موت کے فرشتے نیچے تیرا لینڈ لارڈ۔" محسن نے کہا۔

"وہ اوپر آئے تو ہم ہی والے پھنس جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "میں جا کے انہیں روکتا ہوں۔ بہتر ہو آپ پیچھے سے بھاگ جانا۔ اللہ جو چاہا باہر سے نکلنے کے بعد آئیں تو بے چارے مالک مکان پر مصیبت نازل ہو۔"

"مار دھاڑ اور کشت خون کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں سکندر!" محسن نے مجھے روک لیا اور یہ وقت ہے جنگ وہ اس کی نظر میں بار بار اوپر جاتی تھی۔ ہم بھی جگہ چوہے کی طرح

"ہم اسی جگہ چوہے کی طرح پھنسے ہوئے پکڑے جائیں۔" محسن! میں نے کہا۔ "بہتر ہے ان کو مقابلہ کر کے روک دیا جائے کوئی نمودار ہو سکتا ہے۔"

"اس سے تو بہتر ہے کہ ہم دروازہ کھول کر نکل جائیں اور باہر سے کنڈی لگا جائیں تاکہ کوئی فوراً باہر نہ آ سکے۔" محسن بولا۔ "مالک مکان شور مچائے تو پھر لوگ روشنیاں جلا کر تعاقب میں آئیں گے تو وہ بتائے گا کہ میں تو باتھ روم میں تھا، نہ جانے کون اندر آ گیا اور جاتے ہوئے دروازہ باہر سے بند کر گیا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم میں سے کوئی مارا جائے یا ہم یہاں بند ہو کے اور باقی کو چھوڑ کے خود تو بھاگ جائیں اور بیچارا یہیں پولیس کے ہاتھ پڑ جائے۔ اور میاں ٹیڈی بھی کو بوسٹا کر بیٹا ٹیک کرایہ دار تھا۔"

ہماری گفتگو بڑے میاں کے باتھ روم سے نکلنے سے ختم ہو گئی۔ ویسے بھی میں نے محسن کی۔۔۔

رہی تھی اور جب وہ باہر نکلتا تو ہم بے خوف و خطر دروازہ کھول کے باہر نکل جاتے۔ ٹیڈی کے گھر میں سے کسی کی آواز سنائی نہ دی تھی اس کا یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا تھا کہ آنے والے بھی وہ خطرہ ختم ہو گیا۔ نہ جانے کتنے پولیس والے ہمارا ٹھکانا تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ وہ اتنی آسانی سے واپس جانے والے نہیں تھے۔

ٹیڈی کا بوڑھا لینڈ لارڈ آہستہ آہستہ چلتا اور زور زور سے کھانستا واپس اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا اور ہم پر وہ وقت بھی گراں گزر رہا تھا جو وہ ایک قدم اٹھانے میں صرف کر رہا تھا۔ بالآخر وہ زیر لب بڑبڑاتا تقدیر کو کوستا اور اللہ کو یاد کرتا ہوا کمرے میں گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا ہی تھا کہ ہم نے پیش قدمی کی۔ سب سے پہلے میں خالی ہاتھ آگے گیا اور میں نے بند دروازے کا جائزہ لیا۔ اندر زنجیر والی کنڈی تھی۔ شکر ہے اس میں کوئی قفل نہیں تھا۔ پوری احتیاط سے میں نے دروازے کے دونوں پٹ دبا کے کنڈی کو کھولا۔ دروازہ تھوڑا سا چرچرایا اور زنجیر کے الگ ہونے سے بھی معمولی سا کھٹکا ہوا۔ آواز بہت کم تھی لیکن اس وقت مجھے بہت زیادہ لگی۔ دونوں پٹ کھول کے میں نے گلی میں دیکھا۔ موسم سرما کی ویران رات کی تاریکی اور رات کی آخری گھڑی میں دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے محسن اور ٹیڈی کو "آل کلیئر" کا سگنل دیا۔ ایک منٹ میں وہ دونوں باہر آ گئے۔ محسن کے ایک ہاتھ میں اپنا سوٹ کیس تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں میرا۔ ٹیڈی نے اپنا ٹین کا بکس بڑی مشکل سے سنبھال رکھا تھا کیونکہ جلدی میں باندھی جانے والی رسی ڈھیلی پڑ گئی تھی اور اسے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ بکس کھل نہ جائے۔

میں نے دروازے کو بند کیا اور پھر اس بات کا خیال رکھا کہ دونوں پٹ ملیں تو آواز پیدا نہ ہو۔ ٹیڈی کی حالت ہم دونوں کے مقابلے میں قابل رحم تھی۔ وہ ہانپ بھی رہا تھا اور کانپ بھی رہا تھا۔ ہانپنے کا سبب تو وہ بوجھ تھا جو اس کے شکستہ حال صندوق میں بند تھا۔ کانپنے کو وہ سردی سے منسوب کرتا تھا مگر ہم جانتے تھے کہ وہ ڈرا ہوا بھی ہے۔

"میاں خوجی!" میں نے اپنا سوٹ کیس اٹھا کر کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ ہم کو اپنی گاڑی تک پہنچنا ہو تو ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ صراط مستقیم پر چلنے میں جان جانے کا خطرہ ہے۔"

"جو پہلے بھی رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ صراط مستقیم اور پل صراط میں کیا فرق ہے؟"

"معلوم نہیں آپ لوگ کیوں اتنی مشکل باتیں کرتے ہو۔" ٹیڈی چڑ کر بولا۔ "ادھر آؤ۔ لمبا چکر کاٹ کر جانا پڑے گا۔"

"خفا کیوں ہوتے ہو۔ ہم تو پہلے ہی لمبے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اگر چوکیدار نے یا گشت کرنے والی پولیس نے دیکھ لیا تو چکر زیادہ لمبا ہو جائے گا۔" محسن بولا۔ "لگیں گے ہم چور ہیں اور کسی کا گھر صاف کر کے فرار ہو رہے ہیں۔"

"اور میاں خوجی! جب وہ ہماری صورتیں ملاحظہ کریں گے تو ہمارا جرم بھی ثابت ہو جائے گا کیونکہ ہم صورت ہی سے چور لگتے ہیں۔ پھر جھگڑا ہمیں قتل بھی کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "جو بھی راستے میں آئے گا مارا جائے گا۔"

ٹیڈی سمجھ گیا کہ ہم اس ڈرامے کا لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ "یار سکندر بادشاہ! یہ دوسری بار تم نے مجھے خوجی کہا ہے۔ کوئی نیا نام رکھا ہے میرا؟" وہ بدستور لہجے میں بولا۔

"نہیں۔ تم بھی تو مجھے سکندر بادشاہ کہتے ہو۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ سکندر ایک بہت زبردست اور بہادر بادشاہ گزرا ہے۔ خوجی بھی ایک بہت بہادر شخص تھا تمہاری طرح۔ تم اس کا نیا ایڈیشن ہو۔"

"شکریہ مولا علی کی۔ اپنی تو کوئی خبر نہیں۔" ٹیڈی کی جرأت میں آ گیا۔ "لیکن انہوں نے بڈھے کو مارا پیٹا تو مجھے بہت افسوس ہو گا۔ ہے تو بہت کنجوس مگر اس نے میرے ساتھ کبھی برائی نہیں کی۔ کوئی میں اسے کچھ بتائے بغیر بھاگ کھڑا ہوا۔ نہ جانے وہ کیا سمجھے گا۔"

"وہ کچھ بھی نہیں سمجھے گا۔" میں نے ٹیڈی کو تسلی دی۔ "اگر کوئی اس سے ہمارے متعلق پوچھے گا تو خود ہی سمجھ جائے گا کہ تو وہ ہمارا ساتھی تھا اور اس نے ہمارے فرار میں مدد کی ہوگی۔ حالات خود اس کو بے قصور ثابت کر دیں گے۔ تم دو چار دن بعد آ جانا اور شور مچا دینا کہ لٹ گیا، برباد ہو گیا۔ کوئی ایسا بیان دینا کہ تم چند دن کے لیے گاؤں گئے تھے اور پیچھے سے چوروں نے ہاتھ صاف کر دیا۔"

"بکس چھوڑ پر ہاتھ صاف کر دیا؟" ٹیڈی بولا۔ "مالک مکان کو معلوم ہے کہ میں تو کرایہ بھی مشکل سے دیتا تھا۔ چور اس گھر میں کیا لینے آئیں گے؟"

"یار تم بات کو سمجھا کرو۔" میں نے کہا۔ "دنیا میں تم جیسے کنگال نظر آنے والے بہت ہیں جو لاکھوں دبائے بیٹھے رہتے ہیں۔ فقیرانہ حلیوں میں بھی پھرتے ہیں مگر ان کی گدڑی میں لعل ہیں۔ بعضے بھی بھیک مانگتے پھرتے نظر آتے ہیں مگر خاندانی زر و جواہر کو آباؤ اجداد کی نشانی سمجھتے ہوئے فروخت نہیں کرتے۔ تم بھی الٹ دینا یہ بیان کہ دادی کی یادگار خالص سونے کی اور ہیرے کے نگینے والی انگوٹھی تھی۔"

www.paksociety.com

دادا جان کی تصویر تھی جو سونے کے فریم میں تھی۔ مرتے وقت ابّا وصیت کر گئے تھے کہ ان کی حفاظت جان سے زیادہ کرنا۔"

"سکندر! مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔" محسن نے کہا۔ "وہ گلی کے موڑ پر کیوں کھڑے رہے؟ اور جب وہ ٹیڈی کے گھر میں پہنچے تو ہمارے پیچھے کیوں نہیں آئے۔ فرار کا تو ایک ہی راستہ تھا۔ ہم کوئی جوتیاں بغل میں دبا کے بھی نہیں بھاگے تھے، ان کو کافی وقت ملا تھا۔"

"آج میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ تو مجھے بھی سوچنا چاہیے تھا۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے سکندر کہ وہ ہمیں ہانک کر یہاں لائے ہیں۔" محسن بولا۔ "انھوں نے ہمیں اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اچھی بات ہوگی ہم پر ثابت کی۔ ان کی توقع کے مطابق ہم انھیں پیچھا کرتے دیکھ کر نکل آتے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسا ہی ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ٹیڈی کے گھر میں بھی اس وقت داخل ہوئے جب ہم وہاں سے نکل گئے۔ مقصد صرف ہمارے لیے واپسی کا راستہ بند کرنا تھا تاکہ ہم آگے جائیں۔ اور ہم نے بالکل وہی کیا جو وہ چاہتے تھے۔ ہانکا کرنے والے جانتے ہیں کہ شیر اُدھر ہی جائے گا جہاں ایک [illegible] آنے والا گڑھا موجود ہے۔"

میرے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس وقت جو بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی وہ محسن کی عقل نے اسے سمجھا دی۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ ہوتے ہیں۔ ایک بار پھر یہ ثابت ہو گیا تھا۔ میں نے اپنا سوٹ کیس ایک دیوار کے سائے میں رکھ دیا۔ محسن اور ٹیڈی نے میری تقلید کی۔

"تیرا خیال بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اپنا راستہ بدل دینا چاہیے۔"

"ہم نے بہت عقلمندی کی تھی کہ کسی ویگن کو وہ گلیاں چھوڑ کے کھڑا کیا تھا۔" محسن بولا۔ "جنھوں نے ٹیڈی کا گھر معلوم کر لیا تو انھوں نے کسی ویگن کی بھی تلاش کی ہوگی اور اب وہ وہیں ہمارے منتظر ہوں گے۔"

"تو نے اس وقت خود کو سکندر کا استاد افلاطون ثابت کر کے ہمیں بہت بڑے خطرے سے بچا لیا ہے۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "ورنہ ہم خود چل کر موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ اب تم ہی کچھ فرماؤ میاں خوجی کہ ان حالات میں ہم پیدل کدھر جائیں؟"

"کہاں جائیں اس وقت؟" ٹیڈی نے کہا۔ "رکشا ٹیکسی تو ملے گی نہیں یہاں۔"

"اچھا اگر ہم سیدھے چلے جائیں یا کسی اور سمت میں نکلنا چاہیں تو کون سا راستہ اختیار کریں؟" میں نے کہا۔

"یار سکندر بادشاہ! راستے تو بہت ہیں۔" وہ بولا۔ "گلیوں ہی گلیوں میں ہم ہر جگہ جا سکتے ہیں لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم پکڑے جائیں گے۔ حقیقت کی بات ہے کہ ابھی تک گشت کرنے والی پولیس پارٹی ہی ہے اور یہ نہیں کسی چوکیدار نے دیکھ لیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں... میرا مطلب ہے صندوق بہت بھاری ہے میرا... اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی۔ رات بھر جاگنے کا اثر ہے شاید۔"

"کس عقلمند نے کہا تھا تم سے کہ اتنا وزن ضرور لاؤ۔ آخر ایسی کیا چیز ہے اس میں؟" میں نے کہا۔

"صرف کپڑوں اور عام ضرورت کی چیزوں کا اتنا وزن نہیں ہو سکتا۔" محسن بولا۔ "کوئی فالتو اور بے مصرف چیز ہے تو اسے پھینک دو۔"

ٹیڈی کے ردعمل نے ہمیں حیران کر دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر صندوق کے سامنے یوں کھڑا ہو گیا جیسے اسے ہم سے خطرہ لاحق ہو گیا ہو کہ ہم اس سے صندوق چھین لیں گے۔ "اس میں کوئی فالتو اور بے کار چیز نہیں ہے۔" اس نے غصے سے بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور رسی کو پھر صندوق پر مضبوطی سے لپیٹنے لگا۔

"ٹھیک ہے، کوئی ہم تم سے یہ خزانہ چھین کر پھینکنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اتنا تو بتاؤ کہ کیا ہم صبح تک اسی طرح یہاں کھڑے رہ سکتے ہیں؟ ابھی کوئی آ گیا یا کسی نے دیکھ لیا تو تمھارے لیے بھی مشکل پیدا ہو جائے گی اور ہمارے لیے بھی۔ تم ایسا کرو کہ میرا سوٹ کیس اٹھا لو، میں تمھارا صندوق اٹھا لیتا ہوں۔"

"نہیں۔ میں اپنا صندوق اپنے پاس رکھوں گا۔" وہ بولا۔ ہم سے پہلے اس نے اپنا بوجھ اٹھا لیا۔ ٹیڈی کا رویہ میرے لیے بہت عجیب و غریب تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ آخر صندوق میں وہ کون سی چیز ہے جس کے بارے میں ٹیڈی اتنا حساس ہے لیکن یہ اپنے تجسس کے اظہار کا موقع نہیں تھا۔ ہم پھر چل رہے تھے مگر ابھی دس قدم بھی نہ چلے تھے کہ ٹیڈی لڑکھڑایا اور اس کا صندوق ایک زبردست دھماکے سے نیچے گرا۔ صبح کاذب کے سکوت میں یہ شور صورِ اسرافیل کی طرح تھا جو مردوں کو اٹھا دے۔ نتائج فوراً سامنے آئے۔ کسی نے دوسری منزل کی کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا۔ چند سیکنڈ تک وہ بھی ہمیں دیکھتا رہا۔

"کون لوگ ہو تم؟" بالآخر اس شخص نے سخت اور مشکوک لہجے میں کہا۔ "کس کا سامان ہے یہ؟"

"معاف کیجیے گا، ہم لوگ مسافر ہیں۔" میں نے شائستہ انگریزی میں جواب دیا۔ "ریلوے اسٹیشن سے آ رہے ہیں۔ رکشا والا

گلی میں آنے پر تیار نہیں ہوا۔ بھاری سامان تھا جسے ہم اٹھا کے لا رہے ہیں مجبوراً۔"

"کس کے گھر جانا ہے؟" سوال کرنے والا ذرا مطمئن ہوا۔

"مولوی عنایت اللہ کے گھر۔" میں نے سوچے سمجھے بغیر ایک نام لیا۔ "یہ اس کا ہونے والا سسر ہے۔" میں نے محسن پر ہاتھ رکھا۔

"کون مولوی عنایت اللہ... وہ چوہدری عنایت اللہ؟" وہ سوچ کر بولا۔

"ہاں... ہم لوگ بے تکلفی میں انھیں مولوی کہتے ہیں۔" میں نے بات بنائی اور ایک دم ٹیڈی کا صندوق اٹھا لیا۔

"آپ کی نیند خراب ہوئی، معذرت چاہتے ہیں۔" محسن نے بھی انگریزی ہی میں کہا۔

"آپ لوگ جالندھر کے چوہدری عنایت کے مہمان ہیں نا؟ وہ جو [illegible] رہے ہیں؟"

"جی ہاں... ہمیں معلوم ہے وہ کہاں رہتا ہے۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

"لیکن وہ اب وہاں نہیں رہتا ہے۔" اس شخص نے اوپر سے کہا۔ "ماڈل ٹاؤن چلا گیا ہے۔ ابھی ایک ہفتہ ہوا ہے۔ اس نے یہ گھر بیچ دیا ہے۔ آپ لوگوں کو نہیں معلوم؟"

"نہیں... ہمیں معلوم ہوتا تو یہاں کیوں آتے؟" میں نے پریشانی سے کہا۔ یہ پریشانی کی وجہ مگر وہ نہیں تھی جو خوابِ غفلت سے جاگنے والا سمجھ رہا تھا۔

"اچھا آپ ٹھہریں ذرا میں... آپ سامان ادھر اٹھا لائیں۔" وہ بولا اور کھڑکی سے غائب ہو گیا۔

"مروا دیا نا تو نے۔" محسن نے غضبناک ہو کے کہا۔ "یہ شخص تو چوہدری عنایت پھلکیدار کو میرا سسر بنا کے دم لے گا۔ کوئی اور نام نہیں سوجھا تھا تم کو؟"

"کمبل ہو گیا ہے سالا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "ہم تو بات کر کے [illegible]۔"

"ابھی کہاں... ابھی تو دیکھنا چوہدری عنایت پھلکیدار جالندھر والا اپنے ہونے والے داماد کا کیا حشر کرتا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "سب مولا کی دین ہے، جسے چاہے راہ چلتے سسر بخش دے۔"

"ذرا ٹھہریں جی۔" اس شخص نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ "مسلمان ہیں آپ؟ اصل میں بھی جالندھر کا ہوں۔ اچھی یاری ہے عنایت سے۔ شمشاد نام ہے میرا۔"

"اچھا جی!" میں نے کہا اور صندوق کو بیٹھک میں رکھ دیا۔ "مر گئے پھر تو..."

"کیا جی، کیا کہا آپ نے؟" وہ پلٹ کر بولا۔ میں نے سنا نہیں۔"

"میں کہہ رہا تھا کہ بڑی خوشی کی بات ہے۔" میں نے کہا اور بیٹھک کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تو ان سے رشتہ ہوا ہے عنایت کی لڑکی کا؟" اس نے دوسری کرسی پر بیٹھ کے محسن کو گھورتے ہوئے کہا۔ محسن کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا مگر شمشاد نے اسے شرم و حیا کا نتیجہ سمجھا۔ "تیرے آپ کا کیا لگتا ہے؟"

"چھوٹا بھائی ہے میرا۔" میں نے متانت سے کہا۔

"اچھا اچھا... تو آپ دونوں سیالکوٹ سے آئے ہیں۔ وہیں رشتہ ہوا تھا اس کی بڑی لڑکی کا۔ بڑی نصیبوں والی ہے جی۔ میں نے سنا تھا لڑکا دبئی میں ملازم ہے۔ ماشاء اللہ سے آج دیکھ لیا۔" شمشاد نے محسن کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا۔ "چلو آپ لوگ چائے شائے پی لیں پھر میں چھوڑ آؤں گا آپ کو۔"

"آپ تکلیف مت کریں۔" میں نے کہا۔ "بس ہمیں ماڈل ٹاؤن کا پتا بتا دیں۔"

"لو جی حد ہو گئی۔ اپنے گھر کی گڈی ہے۔ تکلیف کیسی!" شمشاد بولا۔ "عنایت کیا کہے گا کہ میرے گھر تک چھوڑنے بھی نہ آیا۔ اچھا بھلا معلوم بھی تھا کہ پوچھنے کہاں سے آئے ہیں۔" وہ اٹھا اور اندر چلا گیا۔

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی کیونکہ محسن کی حالت اس شخص کی سی ہو رہی تھی جسے بہت زیادہ کھا لینے سے بدہضمی ہو گئی ہو۔ ٹیڈی نے مجھے ہنستے دیکھا تو خود بھی ہنسنے لگا۔

"بہت ہنسی آ رہی ہے تجھے؟" محسن نے غرا کے کہا۔ "میں دبئی میں ملازم ہوں... یہ جھوٹ بولنے سے فائدہ؟"

"بہت فائدہ ہوا ہے اس وقت نورِ چشم!" میں نے کہا۔ "خوار ہونے سے بچ گئے، پکڑے جانے سے بچ گئے اور مارے جانے سے بچ گئے۔ صرف تیرے اس نادیدہ سسر کے صدقے میں۔ رشتہ مبارک ہو۔ نام آ گیا تھا زبان پر کہ سارے مسئلے حل ہو گئے۔ اب اطمینان سے گرما گرم چائے پیو، پھر اپنے گھر کی گاڑی میں چلتے ہیں یہاں سے۔"

"اس کو کہتے ہیں نیکی کر دریا میں ڈال۔" محسن بولا۔ "سمجھ کے بیٹھا؟ ابھی تھوڑی دیر میں اپنے سسر کے یار شمشاد جالندھر والے کے ساتھ پہنچیں گے تو پتا چلے گا کہ گھر کی گاڑی کو غیر لے گئے۔ آئندہ کسی بھی عنایت کے گھر جانے پر عنایت نہیں کریں گے۔"

"اب تو بن جا ایک شریف اور سعادت مند داماد۔" میں نے کہا۔ "بھلا اچھا لڑکا اور دست..."

"یار اس کو بھی تو دیکھو ان صاحب کی نسبت سے ہم سب کو یہ عزت ملی ہے؟" محسن بولا۔ "شکر کرو یہ وہ نصیبوں والی بھاگ

www.paksociety.com

بھری چیک پھری۔ دختر چوہدری عنایت ٹھیکیدار ....

اُس کی بجائے شمشاد کے اندر آجانے سے ختم ہو گئی۔ شمشاد نے ہمارے سامنے چائے کی کیتلی رکھی جس میں اتنی چینی اور پتی کا کھولتا ہوا لذیذ مکسچر تھا۔ اُس وقت جب ہمارے ہاتھ پیر سردی سے سُن ہو رہے تھے اور ہم جسمانی طور پر بھی تھکن کا شکار تھے، اُس گرما گرم مشروب نے ہمیں وہ توانائی اور حرارت عطا کی جس کی ہمیں اشد ضرورت تھی۔ شمشاد نے معذرت کی کہ ابھی گھر والے سو رہے ہیں اس لیے ناشتے میں کچھ دیر ہے۔ تاہم وہ ہمارے لیے ایک پلیٹ میں بسکٹ لے آیا تھا۔ جتنی دیر میں ہم نے تمام سامان خود ہی لوڈ کر کے سیٹ میں منتقل کیا شمشاد بھی تیار ہو گیا۔ گھر کی گاڑی ایک گیراج نما شیڈ سے نکالی گئی۔ یہ تقریباً چار سال پہلے کی قیمتی تھی جو آتنی بے دردی سے استعمال کی گئی تھی کہ دس سال پرانی لگنے لگی تھی۔ اُسے چلانے والا نہ جانے اس کو کتنی بار کس کس چیز سے ٹکرا چکا تھا کہ سب گاڑی کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں ڈینٹ کا زخم نہ ہو۔ ہمارا اسباب بڑے اہتمام کے ساتھ ڈکی میں رکھا گیا اور شمشاد نے مہمان نوازی میں یہ کام خود کیا۔ اس کی شرافت دیکھ کر مجھے شرم آئی کہ ہم اس شرافت کا کیا صلہ دینے والے ہیں۔ محسن نے غالباً ایسے ہی جذبات سے مغلوب ہو کر کہا کہ اچھا ہوا چائے میں نمک نہیں تھا اور ہم نے بھی نہیں چکھا تھا ورنہ ہم نمک حرام بھی کہلاتے۔ مری میں انجن ٹھنڈا پڑا تھا، چوک دینے کے باوجود اُسے سیلف اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی تو ہمارے میزبان نے شرم سے پانی پانی ہونے کے بعد ہم سے دھکا لگانے کی درخواست کی اور یہ تکلیف دینے پر ہم سے بار بار معافی مانگتا رہا۔ ”نامراد بیٹری بیٹھ گئی ہے۔“ اس نے متعدد بار وضاحت کی۔ ہم تینوں نے اسے تسلی دی اور جیسے پچیس گز کی مسلسل دھکا لگانے کے بعد گاڑی کا انجن غرایا تو ہم سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ شمشاد نے مزید شرمندگی سے بچنے پر اور ہم نے تھوڑی سی جسمانی توانائی بچنے پر۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم ایسے دھکا لگاتے لگاتے ماڈل ٹاؤن تک لے جاتے اور جب محسن کا سسرال آجاتا تو شمشاد کہتا بس جی... ہم پہنچ گئے... گھر کی گاڑی میں بیٹھنا تو آرام ہے... آپ کو تھوڑی سی تکلیف تو ہوئی مگر نامراد بیٹری بیٹھ گئی ہے......“

صبح کاذب کا اُجالا ذرا سی دیر کے لیے غائب ہو چکا تھا، جب ہم اس منزل پر سے گزرے۔ فیٹ کے شیشے بند تھے چنانچہ باہر سے کوئی ہماری صورت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگلی سیٹ پر میں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق بیٹھا تھا اور محسن کے ساتھ ثیلٹی پچھلی سیٹ پر تھا۔ گاڑی اس گلی کے سامنے سے گزر رہی جس میں ثیلٹی کا مکان تھا تو میں نے مڑ کر گلی کے کنارے کھڑے ہوئے ٹرک کو دیکھا۔ یہ وہی ٹرک تھا جسے علی نواز اور جہانداد خان کو بچانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ دو افراد جو اس کا بونٹ کھولے لٹکا ہر کسی خرابی کو دور کرنے میں مصروف نظر آتے تھے دراصل ڈرائیور اور کلینر تھے جن سے ثیلٹی کا جھگڑا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ بھی دو افراد کچھ فاصلے پر گلی کے اندر سے آرہے تھے لیکن میں ان کی صورت نہ دیکھ سکا۔ غالباً ثیلٹی کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔ اس خیال سے کہ اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔ اور اس کا یہ گھر بسا ہوا جیسا بھی تھا سب کے لیے ایک پناہ گاہ تھا جہاں وہ ہر خوف سے بے نیاز اپنی آزاد زندگی گزارتا تھا۔ اپنی مرضی سے آتا جاتا تھا اور اپنی مرضی سے سوتا جاگتا تھا۔ جلد اسے احساس ہو گیا کہ وہ بھی گھر سے بے گھر ہوا۔ اس نے ایک خاصی سرد آہ بھر کے کہا: ”واہ میرے مولا!“ اور اتنی دیر میں فیٹ اس گلی سے بھی نکل گئی جس میں رابعہ کی کھڑکی کھلی تنہا اور اداس کھڑی تھی۔ وہی کھڑکی جس کا چمکتا دمکتا رنگ کسی دلہن کے ہاتھوں کی مہندی سے زیادہ شوخ تھا۔ گردش حالات اس کھڑکی کی دلہن کو بھی کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔ وقت یوں بدلا تھا کہ کھڑکی کا حنائی رنگ بھی بدل گیا تھا اور اب سفید رنگ میں وہ سہاگن سے زیادہ بیوہ نظر آتی تھی۔ جس کی خوشیوں کو سفید کپڑوں کا کفن مل چکا ہو۔

راستے ہنوز غیر آباد تھے۔ کہیں کہیں ہمیں مخالف سمت سے آجانے والی کوئی گاڑی مل جاتی تھی۔ پیدل یا سائیکل سوار نظر آجاتے تھے۔ سحر خیزی میں سر فہرست رہنے والے اخبار فروش، اور دودھ والے بھی ہر روز کی طرح شہر کے باسیوں کو تازہ خبر اور خالص دودھ فراہم کرنے جہیں نکلے تھے۔ روزمرہ کی ضروریات بیچنے والے دکانوں پر آگئے تھے۔ ان میں بھی سب سے پہلے سبزی گوشت اور دہی دودھ والے اول رہتے تھے۔ میں نے کئی جگہ گشت کرنے والی پولیس پارٹیوں کو بیٹھے دیکھا۔ اُفق پر صبح صادق کی لکیر روشن ہونے لگی تھی اور شمشاد مجھ سے نہ جانے کیا باتیں کرتا ماڈل ٹاؤن کی طرف جا رہا تھا۔ غالباً وہ اپنے اور عنایت کے پرانے تعلقات کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔

”شمشاد صاحب!“ میں نے ضلع کچہری سے ایک میل آگے نکل کر نرمی سے کہا۔ ”گاڑی ایک طرف روک کر میری بات سُن لیجیے۔“

وہ میرے لہجے پر چونکا اور میرے چہرے کی متانت پر غور کرنے لگا۔ ”خیریت تو ہے ناجی؟“

”بالکل خیریت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”دراصل ہم کو ماڈل ٹاؤن

جانا ہی نہیں تھا۔ ہم کو یہاں اُتر جانا ہے۔“

وہ بُری طرح چونکا۔ لیکن اس نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روک لیا۔ ”چنگا مذاق ہے جی!“

”آپ نے جتنی ہماری خاطر تواضع کی ہے۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”اور جس شرافت کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد ہمیں آپ کے ساتھ یہ سلوک بالکل زیب نہیں دیتا لیکن ہم مجبور ہیں۔ جو کچھ آپ نے کیا اس کا بہت شکریہ۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آرہی یہ بات۔ یہاں اُترنے کی باتیں۔ آپ کا مطلب...“ وہ اس پستول کو دیکھ کر باقی جملہ بھول گیا۔ جو میں نے اپنی جیب سے نکال کر اس طرح گود میں رکھ لیا تھا کہ اس پر میری گرفت برقرار تھی۔

”مطلب بہت سیدھا اور صاف ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن آپ خود بہت سیدھے سادے آدمی ہیں اس لیے آپ کو صاف الفاظ میں بتانا پڑے گا کہ ہمارا کسی چوہدری عنایت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم تو چور ہیں اور ایک گھر کا سامان لے کر نکل رہے تھے کہ آپ مل گئے۔ ہمارا ارادہ نہیں تھا آپ سے ملاقات کا۔ مگر یہ تقدیر کا لکھا تھا۔ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے ایک نام لے دیا تھا۔ باقی سب اتفاق تھا کہ آپ نے ہمیں سمجھنے میں غلطی کی اور ہم وہ بن گئے جو ہم نہیں تھے۔“

شمشاد کا رنگ اُڑ گیا تھا اور وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔ اس شریف آدمی کو ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ اس کے سامنے شائستہ لہجے میں انگریزی بولنے والے پڑھے لکھے جنٹلمین اصل میں چور ہیں۔ اور اس نے اپنے سادہ لوح ہونے کا نہیں بلکہ بیوقوف ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

”تم آدمی تو... پڑھے لکھے ہو....“ وہ بڑی مشکل سے بولا۔ ”پھر... یہ غلط کام.....؟“

”غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم یہاں اس بحث میں وقت ضائع نہیں کریں گے۔ بہت سے پڑھے لکھے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور لاکھوں کی رشوت لیتے ہیں اور مال حرام سے اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں۔ ان کو نہ عاقبت کا ڈر ہے نہ ملک اور قوم کا خیال۔ پڑھے لکھے اسمگلر بھی ہیں، کسٹم افسر بھی ہیں اور کسٹم افسر بھی۔ یہ سب قانونی، مذہبی اور اخلاقی طور پر اُن کی اور ہماری کمائی کے طریقے ایک جیسے ناجائز ہیں مگر وہ چور نہیں کہلاتے۔ چور وہ کہلاتے ہیں جو بڑے چوروں کے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں۔ ہم تو بہت چھوٹے چور ہیں۔ چوری بھی کرتے ہیں تو اس کے گھر میں جہاں حرام کا مال بھرا پڑا ہو اور جہاں چوری سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو کسی کی

صحت پر۔ کا جھرتا ثبوت میں ضبط نہیں کرتے۔ کسی کا گھر نیلام کرا کے ایک خاندان کو بے آسرا نہیں کرتے۔ آپ نے ہمیں حفاظت سے نکلنے کا موقع فراہم کیا ورنہ ہم تو پکڑے گئے تھے کہ پکڑے گئے۔ اب آپ سے ایک آخری مؤدبانہ گزارش ہے کہ خود چپ چاپ یہیں اُتر جائیں۔ اور یہ کار ہمارے حوالے کر دیں۔“

”کیا؟ تم اب میری گاڑی بھی لے جاؤ گے؟“ شمشاد کی آواز اُس کے حلق میں پھنس گئی۔

”ہاں۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”چند گھنٹوں کے لیے۔ ہم یہ مال غنیمت کسی ٹیکسی میں تو نہیں لے جا سکتے۔ ٹیکسی ہے بھی کہاں؟“

”اگر... میں نہ آتا تمہارے ساتھ..... تب تم کیا کرتے؟“ وہ خوفزدہ نظروں سے ریوالور کو دیکھنے لگا۔

”پھر ہم کسی کی گاڑی چھینتے۔“ شمیم نے کہا۔ ”اور اُسے اپنی گاڑی تو مل جاتی مگر رپورٹ درج کرانے کے کئی دن بعد۔ وہ پولیس کے پیچھے پھرتا۔ مجسٹریٹ سے ریلیز آرڈر حاصل کرتا اور اس کے بعد بھی پولیس کی تحویل سے گاڑی چھڑانے کے لیے پولیس کو اور متعلقہ تھانے والوں کو دو چار ہزار مٹھائی کے دیتا۔ آپ کی مہمان نوازی اور شرافت کی وجہ سے ہم آپ کو بالکل تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ اس وقت صبح کے پانچ بجے ہیں۔ بارہ بجے سے پہلے پہلے گاڑی واپس مل جائے گی آپ کو۔“

”آپ کو کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“ محسن نے کہا۔ ”ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔“

”آپ کو واپسی پر رکشا یا ٹیکسی ذرا دیر سے ملے گی۔“ میں نے کہا۔ ”خاموشی سے گھر جائیے اور گاڑی کے متعلق گھر والوں کو بھی کچھ نہ بتائیے۔ کہہ دیں کہ مہمانوں کو چھوڑنے گیا تھا خراب ہو گئی۔“

”اگر آپ نے ہماری بات نہ مانی تو اپنا نقصان کریں گے۔“ محسن بولا۔ ”پولیس کے چکر میں پڑے تو خوار ہو گے۔ بارہ بجے کے قریب آس پاس کی گلیوں میں دیکھ لیں۔ گاڑی موجود ہوگی اور چابی گلوو کمپارٹمنٹ میں ہوگی۔ اپنی گاڑی چلا کے گھر لے جائیے۔“

”ہاں۔ بارہ بجے تک گاڑی نہ ملے تو بے شک آپ ہمیں جھوٹا سمجھ کے پولیس کو رپورٹ کر دیں۔ ہم یہ آپ کے بھلے کے لیے کہہ رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”چنگی بھلائی ہے جی۔“ وہ مُردہ آواز میں بولا۔ ”بھلائی والے تو زمانہ ای نئیں رہے۔“

”ہم پھر معافی چاہتے ہیں۔ اب آپ اُتر جائیں۔ ہو سکتا ہے ابھی یا کچھ دیر میں آپ کو سواری مل جائے۔“ میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ڈراما کر رہے ہو۔" وہ بولا۔ "ڈائیلاگ اچھے بول رہے ہو۔"

"بالکل ٹھیک خیال ہے آپ کا۔ جیسا آدمی ہوتا ہے ویسا ہی اس کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک بار نہیں، چار بار آپ ہمیں زبردستی بھی کرنی پڑی۔ پھر لوگ اتنے بے وقوف ہوتے ہیں کہ گولی سے بھی نہیں ڈرتے۔"

وہ فوراً اکڑ گیا۔ "تم بے وقوف تو نہیں بنا رہے ہو مجھے۔ یہ نہ ہو تم گاڑی کو ڈاکا ڈالنے کی کسی واردات میں استعمال کرو اور میں خواہ مخواہ پکڑا جاؤں۔" وہ رونی صورت بنا کے بولا۔

میں ہنس پڑا۔ "شہزادہ صاحب! میں نے کہا نا کہ ہم تو بہت چھوٹے چور ہیں۔ آپ ڈاکا ڈالنے کی بات کرتے ہیں۔ نہیں خدا رسول کی قسم کھاؤں تب اعتبار کریں گے آپ؟ کیا جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا میں؟ گاڑی جیسی ہم نے لی ہے ویسی ہی آپ کو واپس ملے گی۔" میں نے اس کی جگہ سنبھالی۔ اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو گیئر میں ڈال دیا۔ چند منٹ میں شہزادہ صاحب پیچھے رہ گیا۔

"وہ بیچارا۔ خدا کرے وہ پولیس کے پاس جانے کی غلطی نہ کرے۔" محسن نے کہا۔ "ٹھیک کہتا تھا کہ بھلائی کا زمانہ نہیں ہے۔ پھر کبھی کسی کے ساتھ آج کل کے بھی بھلائی نہیں کرے گا۔"

"اور ایسے ہی آہستہ آہستہ یہ زوال پذیر معاشرہ اخلاقی ابتری کا شکار ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ اس پر بے حس اور خود غرض سوسائٹی غالب آ جائے گی جس میں ولاور جیسے بے عقل، بے ضمیر اور بے ایمان لوگ ایک طرف ہوں گے اور ان کے ظلم کا اور ان کی شیطانی ہوس کا شکار ہونے والے دوسری طرف۔" میں نے کہا۔ "میرے والد وزیر خان میں اور رابعہ مثلاً۔ اس کی ماں اور ان گنت لوگ جو حق و انصاف کی بات کرتے تھے آج کتنے مظلوم ہیں لیکن ظلم جب حد سے گزر جاتا ہے تو مٹ جاتا ہے اور ہم جیسے کمزور لوگ بھی بڑی سے بڑی طاقت کے وجود کے لیے چیلنج بن کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے۔"

"تو ولاور کی گزشتہ شب کی کارروائی پر مشتعل ہے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں یار۔ آج اس کی وجہ سے ہمارے پیر ٹیڈی کو بھی اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔" میں نے کہا۔

"بیٹے تم کار ہی اس کے آدمی تھے۔ اب ہاتھ مل رہے ہوں گے کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا۔" محسن بولا۔

"معلوم نہیں وہ کیا چاہتے تھے۔" میں نے کہا۔ "مجھے ولاور سے بات کرنی پڑے گی۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتا ہے کہ مجھے یا تمہیں قتل کرنے سے اس کو حاصل کچھ نہیں ہو گا۔"

"ممکن ہے یہی بات وہ تجھ کو سمجھانا چاہتا ہو کہ لڑائی میں دونوں کا نقصان ہو جائے گا۔ وہ کچھ کسی سودے کی بات کرے گا۔"

"سودا کیسے ہو سکتا ہے!" میں نے کہا۔ "وہ چاہتا ہے کہ شہر سے الگ ہو جاؤں اور اگر مجھے پارٹنر بنانا ہے تو [illegible] کاروبار میں کسی طور پر دخل نہ دوں۔ یہ بھی پہلے کی بات تھی۔ اب وہ قرض بڑھا سکتا ہے۔ پچاس لاکھ کر سکتا ہے کہ [illegible] سے پہلے مجھ سے جان چھڑا لے۔ ایک کروڑ کا نقصان بھی برداشت کر لے گا وہ۔ مجھ سے جان چھڑانے کے لیے کیونکہ جس قسم کا دھندا وہ کرتا ہے اس میں ایک کروڑ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر اس کا راز فاش ہو گیا تو اس کے کروڑوں جاتے رہیں گے۔ وہ ملک کا غدار اور مجرم کہلائے گا اور آج وہ جتنی عزت کے ساتھ زندہ ہے کل اتنی ہی رسوائی کے ساتھ مرے گا۔ وہ اسی خطرے کے خلاف تحفظ چاہتا ہے۔"

"وہ تو سمجھتا ہے کہ ہم اسے منشیات کے دھندے میں ملوث سمجھتے ہیں۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ ابھی تو یہی سمجھتا ہے لیکن اسے ڈر تو ہے کہ ہم اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں تو کسی کی غلطی، کسی کی غداری، بدقسمتی یا تقدیر کے باعث ہم اصل کاروبار کا کھوج لگانے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔" میں نے کہا۔

"اس پریشانی کی وجہ سے جو تم نے پیدا کر دی ہے اس کا کاروبار بھی متاثر ہوا ہوگا۔" محسن نے کہا۔

"ہر کاروبار پوری توجہ چاہتا ہے۔ اور یہ تو ایسا کاروبار ہے کہ اس میں اپنوں سے بھی خطرہ رہتا ہے اور غیروں سے بھی۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ بات پھیل گئی کہ ولاور کے بھی بہت طاقتور دشمن ہو گئے ہیں تو اس کی ساکھ خراب ہو گی۔ اس پر اعتماد کرنے والے اس پر اعتماد کرنا چھوڑ دیں گے کیونکہ ان کو اپنی سلامتی عزیز ہو گی۔ ولاور کے لیے ایک خطرہ وہ بھی بن جائیں گے جن کو آج وہ اپنا ساتھی تصور کرتا ہے۔ وہ ملک اور قوم کے دشمن ہیں اور غدار ہیں۔ خود کو بچانے کے لیے وہ ولاور کو ختم کرنا بہتر سمجھیں گے۔ ایسے کاروبار میں کون کس کا دوست، کیسے اصول اور کہاں کی وفاداری!" میں نے کہا۔ گاڑی اب ماڈل ٹاؤن سے گزر رہی تھی۔

"یار۔ یہ ٹیڈی کیوں چپ ہے؟" محسن نے کہا اور اس کا کندھا پکڑ کے ہلایا۔ "میاں خوجی! واہ بھئی واہ! کیا مزے سے سو رہے تھے!"

"منہ سے تو ایسا لگتا ہے سو رہے تھے۔" وہ بولا۔ "ویسے ذرا جھپکی آ گئی تھی۔ یہ تم لوگ کدھر جا رہے ہو؟"

محسن نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ "بڑا زبردست [illegible] ہوا ہے۔"

"مسئلہ پھر وہی ہے کہ جائیں تو جائیں کہاں؟" محسن نے کہا۔ "گاڑی بھی وہیں رہ گئی۔ کیا اس وقت ہم دوبارہ گھر کے تہ خانے میں جا سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "وہ چابیاں مجھے مل گئی تھیں اور چابیاں میرے پاس ہیں۔ وہاں رہنا تو مشکل ہے۔ گاڑی کا کیا ہے! اپنا خرچ دے جائے گی۔"

"اس عمارت میں زیادہ تر دفاتر ہیں۔" محسن بولا۔ "سب سے اوپر والی منزل پر [illegible] کے خلیفے ہیں جن میں وہ کوئی پیتم کے لوگ رہتے ہیں۔ جبار بھی جو کیدار دروازے پر ہی روکے گا۔"

"ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ چابیاں ہمارے پاس ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور ہم چور بھی نہیں ہیں۔"

محسن نے قہقہہ لگایا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے تو ثابت کر چکا ہے کہ ہم چور ہیں۔ سچ کیا ہے؟"

"سچ بذاتِ خود کوئی چیز نہیں۔ کل یہ سچ تھا کہ زمین چپٹی ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ آج یہ سچ ہے کہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔

"ہمارے پاس آٹھ دس ہزار ہیں۔" محسن بولا۔ "[illegible] جائے خواہ مخواہ شکوک پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔ آج دن میں کوئی کرائے کا مکان تلاش کر لیں گے۔ بالکل ایسا ہی جیسا ہمارے دوست خوجی کا تھا۔ یار تم برا مت ماننا استاد ٹیڈی کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اور میاں ٹیڈی کچھ بھی خاصا مشکل ہے۔ سب سے مناسب میاں خوجی ہے۔"

"آج سے ہم تم کو میاں خوجی کہیں گے۔" میں نے کہا۔

"جو چاہو کہو سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے ایک آہ بھر کے کہا۔ "بچا مردوں کی بات کا برا نہیں مانتے۔"

جب ہم ماڈل ٹاؤن سے گزر رہے تھے تو افق پر طلوع ہونے والے سورج کا اجالا بادلوں کے ٹکڑوں میں گہرا نارنجی رنگ بکھیر رہا تھا۔ پھر یہ رنگ زرد ہوا اور پھیکا پڑ گیا۔ میں نے دلچسپی کے خیال سے گاڑی کو موڑا تو وہ سڑک آ گئی جس پر پہلے میرا پرانا گھر تھا اور دوسرے قصر جمشید کا پراسرار کھنڈر تھا جس کے متعلق ہم بہت سی باتیں سنتے تھے۔ کچھ ہولناک، بے بنیاد اور کچھ ناقابل فہم۔ ایک کہانی وہ تھی جو وزیر خان نے سنائی تھی اور جس سے ثابت ہوتا تھا کہ اس کھنڈر کے نیچے تہ خانہ ہے اور تہ خانے تک جانے کے لیے ایک سرنگ ہے۔ ہمارے ذاتی تجربات بھی بہت عجیب تھے اور ہم نے اس کھنڈر کو جلتے بجھتے دیکھا تھا۔ اس کھنڈر کی آگ میں ہم جل کر ہلاک ہو جاتے مگر قدرت کو ابھی کچھ اور منظور تھا۔ ہم بچ گئے اور آگ [illegible] ختم ہو گئی جس کو قضا اس [illegible] سے بڑی تھی۔

پھر پرانے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے گزرے ہوئے وقت کی بہت سی باتیں یاد آئیں اور بلا ارادہ میں رک گیا۔ چشم تصور سے میں نے اپنے بچپن کی مانوس فضا کو دیکھا اور مجھے وزیر خان کی یاد آئی۔

نواب خسرو جمشید کو تو انہیں قصر جمشید میں ہی ایک گوشہ عافیت مل گیا۔ وزیر خان کو کہیں اماں نہ ملی۔ نہ اس کوٹھی میں جس کا وہ مالک کہلاتا تھا نہ شہر خموشاں میں جہاں کوئی کسی کو ابدی نیند سے بیدار نہیں کرتا اور یوم حشر تک کوئی پیچھے رہ جانے والی دنیا کے جھمیلوں میں نہیں پڑتا۔ پھر وزیر خان بار بار جلا وطن کیوں ہوا؟ ایک بار تقسیم ہند کے وقت۔ دوسری بار میرے ولایت جانے کے بعد جب اسے اپنے ہی گھر سے نکلنا پڑا۔ اور تیسری بار جبر ہوتے ہوئے اس کی لاش سے اس کا مدفن چھینا گیا۔ یکایک ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا۔

"محسن! تجھے یاد ہے [illegible] نے کیا کہا تھا؟" میں نے کہا۔

"قصر جمشید کے بارے میں؟"

"اس نے تو بہت کچھ کہا تھا۔" محسن بولا۔

"اس نے کہا تھا کہ قصر جمشید تک پہنچنے کے لیے وہ ایک مین ہول میں اترے تھے۔" میں نے کہا۔ "وہ مین ہول عام گٹر کے مین ہول کی طرح نظر آتا تھا لیکن درحقیقت ایک زیر زمین سرنگ کا راستہ تھا اور یہ سرنگ سیدھی قصر جمشید کے تہ خانے تک پہنچتی تھی۔ تہ خانے سے بھی اوپر جانے کا ایک راستہ تھا۔ مجھے یاد ہے۔ اس نے شاید یہ بھی کہا تھا کہ ٹرک اسی مین ہول پر آ جاتا تھا۔"

"وہ بھی ایک سرنگ تھی جس سے ہم نے طافو اور رحمت کباڑی کو ٹرک میں لاش بھر کے روانہ ہوتے دیکھا تھا اور وہ ٹرک نکلا بھی زمین میں سے تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم اس ٹرک میں چھپ گئے تھے۔"

"ہاں۔ اوپر کوئی درگاہ بنا رکھی تھی۔" محسن بولا۔ "جب ٹرک آ جاتا تھا تو وہ زمین برابر کر دیتے تھے۔"

"اور ٹرک اسی زیر زمین راستے کو طے کر کے ایک گیراج کے احاطے میں نکلتا تھا اور وہاں سے سڑک پر آ جاتا تھا۔" میں نے کہا۔ "گیراج میں ٹرک آتے جاتے رہتے ہیں اس لیے کسی کو شک ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ مزار بھی ڈھونگ تھا جہاں کالے شاہ کا کام تھا کہ وہ ولاور کے مال کو آگے بھجوا لے۔ دیہات کے سیدھے سادے عقیدت مندوں کے لیے یہ سوچنا بھی گناہ کبیرہ سے کم نہیں کہ مزار شریف دراصل ناجائز کاروبار کا اڈا ہے۔"

"اس وقت ان باتوں کو دہرانے کا مقصد کیا ہے؟" محسن نے کہا۔

"میں ایک بہت بڑی بات کہنے کے لیے جواز تلاش کر

www.paksociety.com

رہا ہوں۔ میں نے کہا۔ "یہ تو ثابت ہو چکا ہے محسن کہ دلاور اور اس کے ناجائز کاروبار میں شریک افراد ایک گروہ کی صورت میں کام کرتے ہیں۔ ابھی یہ پتہ چلانا ہے کہ وہ ناجائز کام کیا ہے۔ کام کے بارے میں صرف قیاس آرائی کر سکتے ہیں اور اندازے لگا سکتے ہیں لیکن طریقہ کار ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہ لوگ زیر زمین راستے استعمال کرتے ہیں۔ ایک سرنگ میں ہم دونوں نے سفر کیا تھا۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ دوسری سرنگ کی بات بھی طاقت کے دماغ کی اختراع نہیں تھی؟"

"شک مجھے اس وقت بھی نہیں تھا۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ اور تو نے ایک بات کہی تھی کہ کھنڈر کو بلاوجہ آگ نہیں لگائی گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "وہ عمارت پہلے بھی ویران تھی۔ اسے جلا کے تباہ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم بھی لوٹ کر ادھر نہ جائیں خواہ اس کے نیچے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"کسی کو خیال تک نہ آئے کہ اس جلی ہوئی دیواروں کے ڈھانچے میں بدمعاشوں کے سوا کسی کا گزر بھی ممکن ہے۔" محسن بولا۔ "اور کوئی شک بھی نہ کر سکے کہ یہاں کوئی ناجائز کاروبار ہو سکتا ہے۔"

"اگر کوئی اس خانہ ویرانی کی طرف متوجہ ہوتا تھا تو اسے اندر جانے سے پہلے ایک چوکیدار روک دیتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب سمجھ میں آیا میری بات کا مطلب؟ چونکہ دلاور اپنی فیکٹری میں کوئی ناجائز کاروبار کر رہا ہے چنانچہ جب تم نے انکشاف کیا راز کے خوف سے میں نے دلاور کو بھی دور رکھا۔ اور وہ مجھے بھی ابھی بچہ دور رکھنا چاہتا ہے کہ میری طبیعت اپنے والد سے مختلف نہیں۔ میں دلاور کا ہم خیال ہوتا تو وہ مجھے بڑی خوشی سے اپنے کاروبار میں شریک کرتا۔ ساری گڑبڑ اسی وجہ سے ہے کہ جو خطرہ انہیں وزیر خان سے محسوس ہوا تھا وہی مجھ سے بھی محسوس ہوتا ہے۔ دلاور کی فیکٹری سے مال قصر جمشید پہنچتا ہے جو اس کا اسٹور سمجھا جا سکتا ہے۔ وہاں سے یہ مال آگے شاہ کو ارسال کیا جا سکتا ہے۔ سنتے ہیں موٹی دستری ہو تو فرض کر لیجئے ہیں۔ قصر جمشید سے کسی نے کبھی کوئی ٹرک نکلتے نہیں دیکھا ہوگا۔ وہاں تو بس ویرانی ہے۔ ٹرک آتے جاتے تو سب کو شک ہوتا کیونکہ ٹرک کسی اور جگہ سے لوڈ ہوتے ہیں اور وہ جگہ قصر جمشید سے دور ہے مگر قریب بھی ہے۔" میں نے کوٹھی کے اندر دیکھا۔ جو صبح ذرا ویران اور خالی نظر آئی تھی سڑک پر کھڑے رہنا شکوک پیدا کر سکتا تھا۔ میں گاڑی کو اندر لے گیا اور گیٹ سے کافی اندر جا کر روک دیا۔ انجن کی معمولی سی آواز نے کوٹھی میں سوئے ملازموں کو بیدار نہیں کیا تھا۔

"مجھے معلوم ہے میں یہاں کس لیے آیا ہوں۔" میں نے انجن بند کر کے کہا۔

محسن چونک گیا۔ "تیرا مطلب... تو کہنا چاہتا ہے..."

"ہاں۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ کیا قصر جمشید کے تہہ خانوں تک جانے والا راستہ یہاں نہیں ہو سکتا؟ مرحوم وزیر خان کے پرانے گھر میں۔ ہو سکتا ہے کہ وزیر خان کے کاروبار میں شریک بننے کے بعد دلاور نے رفتہ رفتہ اس کے جائز کاروبار کی آڑ میں اپنا ناجائز کاروبار پھیلایا ہو۔ اس کی پشت پناہی نواب خسرو جمشید مرحوم کا بدبخت بیٹا کر رہا تھا جسے نواب صاحب نے عاق کر دیا تھا۔ وہ اپنے باپ کا ہم شکل تھا اور انگلینڈ گیا تھا تو لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ فرض کرو یہاں آنے کے بعد اسی نے دلاور کے ساتھ مل کر ناجائز کاروبار کا آغاز اور ان دونوں نے مل کر یہ جال پھیلایا۔ انھیں کسی اور نے مشورہ دیا یا خود ان کے شیطانی ذہن میں یہ خیال آیا کہ کاروبار کے لیے زیر زمین پڑے ہوئے قصر جمشید کو استعمال کیا جائے۔ بعد میں باہمی مخالفت کے خیال سے اور اپنے کاروبار کو محفوظ رکھنے کے لیے انھیں سرنگ بنانے کا خیال آیا۔ اور اس کے لیے انھوں نے اپنے ہی ایک شریک کاروبار کی یعنی وزیر خان سے بات کی۔ وزیر خان کی کوٹھی ہر لحاظ سے موزوں تھی۔ اس کا لان کافی وسیع تھا اور اس کا فاصلہ بھی قصر جمشید سے زیادہ نہیں تھا۔ کسی اور کے گھر میں سرنگ کھودنا ناممکن تھا اور سرنگ کو میلوں دور لے جانا بھی اتنا ہی ناممکن تھا۔ انھوں نے وزیر خان کو سب سے پہلے یہ بتایا ہوگا کہ اس کاروبار میں کتنا زبردست منافع ہے۔ مگر وزیر خان دنیا کے مالی فائدے کی خاطر عاقبت کے خسارے کا سودا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے انکار سے حالات کی خرابی کا آغاز ہوا۔ پھر جو ہی دلاور اور خسرو جمشید غلط امیدوں سے حربے پر غلط ارادے غلط بات کرنے کی غلطی کر چکے تھے۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ بزنس میں برابر کا پارٹنر تھا اور اگر وہ مخالفت پر تل جاتا تو دلاور اور خسرو جمشید کا ٹھکانا جیل کے سوا کہاں ہوتا۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ تو نے وزیر خان مرحوم کے حالات کی یکلخت خرابی، اس کی ذلت و خواری، بلیک میل ہونے کے باوجود اور اس کی پراسرار موت کا سبب معلوم کر لیا ہے۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔

"یہ محض قیاس آرائی کی بات نہیں محسن، اس مفروضے کی منطقی استدلال بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "فرض کرتے ہیں وزیر خان کی جگہ میں ہوتا اور دلاور مجھ سے یہی بات کرنے آتا تو میں اسے جواب دیتا۔ میں اسے ذلیل و خوار کر کے نکال دیتا اور پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دیتا۔ وزیر خان اس وقت تک بارسوخ اور معزز صنعتکار تھا جس کی گڈ ول بہت اچھی تھی۔ رپورٹ دلاور اور خسرو جمشید کا بیڑا غرق کر دیتی۔ ان کے علاوہ

بکھر کے رہ جاتے اور کروڑوں کا منصوبہ خاک میں مل جاتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ایک سرپٹ دوڑتے وقتوں کے چھوٹوں پیسہ رہنے والے خبطی بوڑھے کی ایمانداری پر اپنا مستقبل خراب کریں۔ انھوں نے وزیر خان کو لالچ کے بعد دھمکی دی ہوگی اور جب ناکام رہے ہوں گے تو انھوں نے طے کر لیا ہوگا کہ اب اس سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ خطرے کو ختم کر دیا جائے۔ وزیر خان کو بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا اور وہ کسی بھی وقت ان کی بربادی کا سبب بن سکتا تھا۔ آج میں جو بھی کہہ رہا ہوں اسے زبانی قیاس آرائی کہہ سکتے ہیں لیکن دیکھ لینا کسی دن یہ ثابت بھی ہو جائے گا۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ دلاور اور خسرو جمشید نے وزیر خان کو کاروبار سے الگ کر دیا اور اسے گھر میں نظربند کر دیا۔ شاید اسے گھر سے نکلنے کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔ اس کی ٹیلی فون لائن بھی کاٹ دی گئی ہوگی اور اس کی نگرانی کے لیے دلاور نے چیف یا کسی معتبر خاص کو مقرر کیا ہوگا۔"

"انھوں نے وزیر خان کو قتل کیوں نہیں کر دیا؟" محسن نے کہا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ قتل کے ارادے سے پیچھے ہٹ گئے ہوں اور وزیر خان نے ہاتھ جوڑ کر زندگی کی بھیک مانگ لی ہو۔ وہ اپنے لیے نہیں اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے فکرمند تھا۔" میں نے کہا۔ "دلاور اور خسرو جمشید نے دھمکی دی ہوگی کہ یہاں آتے ہی یا ولایت میں مجھے قتل کر دیا جائے گا۔ وزیر خان نے وعدہ کر لیا ہوگا کہ وہ اپنی زبان بند رکھے گا۔ جیسا وہ کہیں گے ویسا ہی کرے گا اور ان کے کسی معاملے میں دخل نہیں دے گا لیکن سکندر بخت کو قتل کر دیا جائے۔ اب یا تو ان کو رحم آ گیا یا میر شرافت علی نے پرانے تعلق کا کچھ لحاظ کیا اور وزیر خان کو بچا لیا۔ میر شرافت علی نے دلاور اور خسرو جمشید کے نئے اور ناجائز کاروبار میں شراکت قبول کر لی ہوگی چنانچہ اسی لیے بے ضمیر ہونے کے باوجود اتنا ضرور کیا کہ وزیر خان کی جان بخشی کی سفارش کی۔ اس کے بعد وزیر خان نے اپنے وعدے کی حرمت رکھ لی۔ لیکن مجھے کبھی کچھ نہیں لکھا۔ دلاور اور انھوں نے کوٹھی اس سے چھین لی کہ اسے وہ اپنے کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ انھوں نے مشہور کر دیا کہ وزیر خان بیمار ہے اور اسے چراغ دین کے گھر منتقل کر دیا۔"

"اگر یہ سچ ہے تو کتنا خوفناک سچ ہے سکندر!" محسن نے کہا۔

"وزیر خان اپنی مرضی سے کسی نمک حرام چراغ دین کے گھر جا کر نہیں رہ سکتا تھا محسن!" میں نے کہا۔ "دلاور جانتا ہوگا کہ چراغ دین کے خلاف وزیر خان نے مقدمہ قائم کیا تھا جو چراغ دین ہار گیا تھا مگر اس نظام انصاف کی خامی یا کمزوری کے باعث جرم ثابت نہیں ہوا اور غبن کرنے والا سزا پانے کے بجائے عدالت سے بری ہو گیا اور معتوب ہو گیا۔ دلاور نے وزیر خان کو اس کے دشمن کے حوالے کر دیا کہ اس کی حفاظت کرو اور اسے کہیں مت جانے دو۔ کسی سے مت ملنے دو۔ چراغ دین کا گھر وزیر خان کے لیے ایک جیل تھی جہاں چراغ دین جیلر تھا۔ دلاور اور خسرو جمشید نے اسے بدلہ لینے کا موقع بھی فراہم کیا اور شاید اس سے کام لینے کا معاوضہ بھی ادا کیا۔ چراغ دین ایسا شخص تھا جو پیسے کی خاطر ہر کام کر سکتا تھا۔ اس نے وزیر خان کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا اور وزیر خان نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اب وزیر خان اس کی گرفت میں آیا تو اس نے اپنی تذلیل کا انتقام لیا۔ اس نے وزیر خان کو گھر کے نوکر کی طرح رکھا۔ اسے جھاڑو دینے اور برتن مانجھنے پر لگا دیا۔ ممکن ہے اس نے اٹھتے بیٹھتے وزیر خان کو گالیاں بھی دی ہوں۔ اور وزیر خان نے یہ سب میری زندگی کو ان دونوں شیطانوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر برداشت کیا۔ تو نے دیکھا تھا اسٹیٹ سوسائٹی میں کیا ہوا تھا جب چراغ دین نے کیا اور سزا وزیر خان کو ملی۔ وہ انصاف کے لیے فریاد تک نہ کر سکا۔ تب نے اپنا سب کچھ گنوا دیا کیا میری زندگی اتنی قیمتی تھی محسن؟"

"نہیں۔ وہ تیری زندگی نہیں اپنی زندگی بچا رہے تھے۔" محسن بولا۔ "وزیر خان کی جان بخشی کرنے کے بعد انھوں نے اس کو ہر طرح سے آزمایا۔ اس سے جہاں چاہا دستخط کرا لیے اور اسے پیسے پیسے کو محتاج کر دیا۔ اسے چراغ دین جیسے کمینے اور کمینہ پرور شخص کے سپرد کر دیا۔ اور ہر طرح سے اس کا حوصلہ آزمایا۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ تیری زندگی بچانے کے لیے لب نہ کھولنے کے وعدے پر کس حد تک قائم رہتا ہے۔ وہ مرتے دم تک اس عہد پر قائم رہا۔"

"اس کے باوجود وزیر خان کے بیٹے کو قتل کر دینے والے مطمئن نہیں ہوئے تھے۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے انگلستان میں مجھ پر نظر رکھی میری ٹریک سلسر کی اور یہاں وزیر خان کے پرانے نمک خواروں کو مطمئن رکھنے کی پوری کوشش کی۔ یہاں تک کہ جب وہ مرا تو اس کا جنازہ چراغ دین کی کوٹھی سے اٹھا اور اس کے دوست احباب، نمک خوار اور پرانے ساتھی بھی دھوکا کھا گئے۔ وہ سمجھے کہ یہ کوٹھی بھی وزیر خان کی ہوگی۔ انھیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ وزیر خان تو وہاں قید با مشقت کاٹ رہا تھا لیکن ان کے دشمنوں کی کوشش کے باوجود کسی نہ کسی طرح یہ راز فاش ہو گیا اور وزیر خان کی موت کے بعد کسی کے ضمیر نے اسے اتنی ملامت کی کہ اس نے فوراً مجھ سے رابطہ کر کے مجھے اصل صورت حالات سے آگاہ کر دیا۔"

"کیا یہ شخص خود تو کچھ نہیں ہو سکتا؟" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ وہ بھی وزیر خان کا پرانا ساتھی تھا۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے پہلے لالچ یا خوف کے باعث وہ خاموش رہا ہو۔ لیکن

www.paksociety.com

آدمی عمر کے آخری حصے میں پہنچتا ہے تو اُسے دنیا سے زیادہ عاقبت کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ شاید وزیر خان کی موت کے بعد فوبا پچو کا حوصلہ جواب دے گیا اور اُس نے بیان دے کر تفصیل سے مجھے حقائق سے آگاہ کر دیا۔ اس کی سزا فوبا پچو کو دی ہی جو متوقع تھی اور اُس کا نتیجہ نکلا کہ مجھے برطانیہ سے نکلوا کر یہاں لے آیا گیا۔

"میرا بھی دل گواہی دیتا ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔" محسن نے کہا۔

"یہ سچ ہے محسن۔ سچ کو گواہی کی یا دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔" میں نے کہا۔ "سچ کسی ثبوت کے بغیر اپنا وجود تسلیم کرا لیتا ہے۔ کبھی موقع ملا تو چراغ دین کی زبان سے اس سچ کا اعتراف کرواؤں گا۔ ابھی تو وہ جیل میں اپنی سزا کاٹ رہا ہے مگر یہ اُس جرم کی سزا ہے جو اسے بہت پہلے ملنی چاہیے تھی اور نہیں ملی تھی۔ جو کچھ اس نے بعد میں کیا اس کی سزا وہ جیل سے رہائی کے بعد پائے گا۔ ایک دن دلاور کی زبان یہ سچ بولے گی اور اگر مجھے خسرو جمشید ملا تو اس کی زبان بھی اسی سچ کی تصدیق کرے گی اور تو دیکھے گا کہ ان تینوں کا سچ ایک ہے۔ سچ ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے جس کا احساس مجھے اس وقت ہو رہا ہے۔"

"اس کا یقین مجھے بھی ہے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اندر سے کوئی نکل آیا تو کیا کہیں گے؟"

"وہی جو سچ ہے۔" میں نے کہا۔ "میں کہہ دوں گا کہ یہ میرا گھر تھا کیونکہ میرے باپ کا گھر تھا۔"

"اس سے تمہیں یہاں داخل ہونے کا قانونی حق نہیں حاصل ہوتا۔" محسن بولا۔ "بلکہ وزیر خان تو یہاں آنے سے پہلے ہی گھر بیچ چکے تھے کیا تو سب بھی تمہیں معلوم ہے؟"

"دیکھو محسن! اب میں نے ایک نظریہ قائم کیا ہے تو اس کی تصدیق بھی چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو دیکھنا ہی ہے کہ کیا واقعی یہاں کے کسی مین ہول سے شروع ہونے والی سرنگ قصر جمشید کے تہ خانے تک جاتی ہے۔"

"کوئی عقل کی بات کرو سکندر۔" محسن نے کہا۔ "اس کی اجازت تمہیں کون دے گا؟"

"ظاہر ہے اجازت تو کوئی بھی نہیں دے گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں بھی ابھی اسی وقت کھدائی شروع کرنا نہیں چاہتا۔ پہلے تو میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اب یہاں کون رہتا ہے اور اس نے کوٹھی کس سے خریدی تھی۔"

"یہاں جو بھی ہوگا انہی کا ساتھی ہوگا وہ ہمارا دوست نہیں ہو سکتا۔" محسن بولا۔

"پھر بھی مل لینے میں کیا ہرج ہے؟" میں نے کہا۔ "جو بھی ہوگا بات تو سنے گا ہماری۔"

"کیا کہے گا تو؟ یہ کہ میں سکندر بخت ہوں [illegible] دیکھتا تھا اور کوٹھی میرے باپ وزیر خان کی تھی جو [illegible] کرنے آیا ہوں۔" محسن نے خفگی سے کہا۔ "وہ فوراً دلاور کو [illegible] سکندر یہاں آیا تھا۔ یا پولیس کو طلب کرے گا کہ اپنے [illegible] کو لے جاؤ۔ اگر اندیشے سے ملا دو یا اس کا دست راست [illegible] نکل آئے تو مجھے تعجب نہیں ہوگا۔ ہم دشمن کے علاقے میں ہیں سکندر اور یہ محض بے وقوفی کی بات ہے کہ [illegible] سے جان بچانے کے لیے کتنی محنت جدوجہد کی اور [illegible] خود ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے کہ سر تسلیم خم ہے [illegible]"

"ہم اتنے بے بس تو نہیں ہیں۔" میں نے کہا [illegible] میری مزاحمت کمزور پڑ گئی تھی۔ اور محسن کی عقل کے دلائل [illegible] پر غالب آنے چاہیے تھے۔

"تو پھر [illegible]" محسن نے بے زاری سے کہا۔ "چل [illegible] بلوا لو [illegible] جو سامنے آئے گا گولی مار دیں گے [illegible] خونریزی کرنی تھی تو وہیں شوق پورا کر لینا تھا جہاں [illegible] تھے۔ وہاں سے تو سامان اٹھا کر بھاگ آئے۔ یہاں بلاوجہ [illegible] کی ضد ہے۔"

"کیا ہوا اسے کیا ہوا؟" ڈیڈی نے اچانک کہا۔ "کیوں [illegible] ہو تم بحث میں؟"

"تم پھر سو گئے تھے یہاں خوشی سے۔" میں نے کہا۔ "چلو [illegible] کر تم نے کچھ سنا نہیں۔"

"یہ کس کی کوٹھی ہے؟" وہ ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔

"میرے باپ کی۔" میں نے کہا اور محسن کی طرف دیکھا۔ "ہم پہلے میرے سسر کے گھر چلو۔ اچھا بھائی! اپنے والے [illegible] لیکن اب ذرا [illegible] کر کے میں تھک گیا ہوں۔"

اس وقت تک سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ میں نے گھڑی [illegible] وقت دیکھا۔ آٹھ بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ ہم نے شمشاد [illegible] میں چلنے [illegible] تو اب تک [illegible] ہمارا برا حال ہو رہا تھا [illegible] بہت پہلے وقت کا احساس [illegible] چابیاں اگنیشن میں لگی چھوڑ کے نیچے اترا [illegible] طرف گیا کہ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ جاؤں [illegible] پیچھے والا دروازہ کھول کے ڈرائیور کی جگہ سنبھالنے [illegible] وقت کوٹھی کا سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک [illegible] ستر سال کا بوڑھا شخص تھا جس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ [illegible] تھا جس پر گوشت نام کو نہ تھا۔ سیاہ کھال [illegible] آتی تھی جس نے بہت پرانا گول شیشوں والا نظر کا چشمہ [illegible]

[illegible] پہننے میں اس کے سوٹ کا اور ہیٹ کا بڑا دخل تھا۔ سوٹ کا اصل رنگ شاید براؤن تھا مگر کثرت استعمال سے ایک [illegible] رنگ کہیں گہرا تھا کہیں ہلکا [illegible] خراش کے [illegible] سوٹ کہنے کو تو بہت پرانا تھا۔ اس کی پتلون کے پائنچے [illegible] تھے۔ کوٹ کی آستینوں کے اور کالر کے دھاگے [illegible] تھے۔ قمیص کی حالت بھی ابتر تھی اور گلے میں بندھی ہوئی [illegible] ٹائی لٹکنے والے ازار بند کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس کا فیلٹ ہیٹ غالباً کسی انگریز کا چھوڑا ہوا تھا جب وہ ہندوستان چھوڑ کر گئے تو بہت سی [illegible] چیزیں پھینک گئے تھے اور بہت سی [illegible] رہ گئے تھے مثلاً نسلی تعصب، تنگ نظری، حاکمانہ [illegible] اور [illegible] لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی [illegible] تھا۔ اور مجھے خیال آیا کہ جب وہ باہر نکلا [illegible] میں مذاق اڑانے والے اسے پاسنگ شو کہتے ہوں گے۔ [illegible] سگریٹ [illegible] تصویر [illegible] تو ختم ہو گیا مگر اس پر بنے ہوئے صاحب بہادر کی [illegible] کہلاتے تھے اور کہیں [illegible] نظر آ جاتے تھے۔

وہ بالکل سیدھا چلتا تھا مگر اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی [illegible] تمکنت اور حاکمیت کی نشانی [illegible] چھڑی سے کار [illegible] "کون ہے تم؟ کیا کرتا ادھر؟" اس نے حقارت سے کہا۔ "تم کو [illegible]"

"سوری سر!" میں نے شائستگی سے کہا۔ [illegible] وہ لوگ [illegible] وہ مشرقی وضعداری کا نمونہ بھی [illegible] تھے۔

"سوری کا کیا مطلب ہے؟" اس نے [illegible] "ابھی [illegible] ہم تم کو بہت سخت سزا دے گا۔ ہم تم [illegible] ہم انگریز کا زمانہ میں مجسٹریٹ تھا۔ ایڈیشنل [illegible]"

"اچھا [illegible] آپ اس کوٹھی کے مالک ہیں سر؟" میں نے [illegible] انگریزی میں سوال کیا۔

"یس [illegible] تم کیا سمجھا [illegible]" وہ بولا۔ "[illegible] آؤٹ۔"

"دراصل ہم آپ ہی سے ملنے آئے تھے سر!" میں نے [illegible] پہلے یہ میرا گھر تھا۔ میں یہاں پیدا ہوا تھا۔ میرے والد نے خریدا تھا۔"

"کیا؟ [illegible] تمہارے والد کا گھر تھا؟" اس نے گویا شاہی [illegible] چھوڑ کر رواں انگریزی میں کہا۔

"ویل سر! آج بہت عرصے کے بعد ادھر سے گزرا تو میں نے سوچا کہ دیکھوں اب یہاں کون رہتا ہے۔ اور اگر وہ اجازت دے [illegible] تو [illegible] اندر بھی جاؤں۔" میں نے کہا۔ "میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔"

"کیا نام تھا تمہارے والد کا؟" اس نے عینک کے اوپر سے مجھے گھور کر کہا۔

"وزیر خان۔" میں نے کہا۔ "آپ اس مکان میں کب سے ہیں سر؟"

"تیس سال ہو گئے مجھے۔" وہ ایک دم افسردہ ہو گیا۔ "میں نے یہ مکان اپنی بیوی کی پسند پر خریدا تھا۔ اسے بہت اچھا لگتا تھا یہ اولڈ اسٹائل بنگلہ۔ مگر وہ مر گئی۔ اب میں اکیلا یہاں نہیں رہ سکتا۔ اس لیے میں اسے بیچ رہا ہوں۔ بلکہ بیچ چکا ہوں۔ اور تم ٹھیک کہتے ہو مکان کسی وزیر خان کا ہی تھا لیکن میں نے اس کے [illegible] سے خریدا تھا اور [illegible] میں اتنا بد اخلاق نہیں ہوں۔ میں غلط کہا تھا۔"

"غلطی ہماری تھی کہ ہم بلا اجازت [illegible] اندر آ گئے۔ اور اپنا تعارف بھی نہیں کرایا۔" میں نے کہا۔ "میرا نام کبیر خان ہے اور یہ میرا چھوٹا بھائی ہے امیر خان۔ یہ ہمارا دوست [illegible] ہم دوست [illegible] ہیں۔"

"ویل [illegible]" اس نے باری باری سب سے [illegible] کیا۔ ایک دم وہ برطانوی ادب آداب اور شائستگی کا مرقع بن گیا تھا۔ "میں [illegible] لیکن میں ایک اکیلا بوڑھا آدمی ہوں۔ [illegible] سب [illegible]"

میں اور محسن اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے بنگلے میں داخل ہوئے جیسے ہم نیند میں چل رہے ہوں۔ چند منٹ پہلے کے خواب کی تعبیر مل رہی تھی [illegible] میں اپنے گزرے ہوئے وقت سے ملنے جا رہا تھا۔ اسی گھر میں جہاں کوئی میرا دشمن نہیں تھا۔ اگر وہ بوڑھا چند منٹ بعد آتا یا میں نے بحث کیے بغیر محسن کی بات مان لی ہوتی تو ہماری ملاقات نہ ہوتی اور میں اپنے ماضی کے بند دروازے پر دستک دیے بغیر لوٹ جاتا تو شاید کبھی پلٹ کر نہ آتا۔ آخر یہ سب کیا تھا؟ وہ کون سی غیر مرئی قوت تھی جس نے مجھے پھر میرے گھر میں پہنچا دیا؟ گزشتہ رات شمشاد کے گھر میں زمین پر بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہوئے میرے ذہن میں اس کا خیال تک نہ تھا مگر پھر تقدیر کے ہاتھوں نے ایک چال چلی۔ ہم اس گھر سے نکلے شمشاد کے گھر پہنچے اور اس کی گاڑی میں یہاں آ گئے۔ آخر یہ سب انتظام کس نے کیا؟ کیا یہ ممکن تھا کہ کل رات میں

www.paksociety.com

یہاں آنے کے لیے کوئی منصوبہ بنا آپ کا کامیابی کا کیا سوال ہیں اس کے امکانات پر بھی غور نہ کرتا۔ خود میں اسے ناممکن سمجھتا جو صبح تک ممکن ہو گیا تھا۔

"مگر انکل۔ یک کیوں گئے؟" پال نے شفقت سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے تم جذباتی ہو رہے ہو۔"

"نیو آرلینز سر!" میں نے کہا "مجھے وہ وقت نظر آ رہا ہے جو ابھی تک اس گھر کی دیواروں میں موجود ہے۔ یہ احساس کی بات ہے۔ باقی دنیا کے لیے وقت بہت آگے نکل گیا ہے۔"

"ہاں، کبھی کبھی وقت رک بھی جاتا ہے۔" وہ بولا۔ "مجھے افسوس ہوتا ہے کہ مریم میرے ساتھ ہے اور بالکل اسی طرح جیسے تیس سال پہلے تھی۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ احساس میں زندہ رہتا ہے۔ تیجر! اندر آ جاؤ۔"

میں اور محسن ایک ساتھ اس کمرے میں داخل ہوئے جو کبھی ہمارا ڈرائنگ روم تھا اور وہ مجھے لگ رہا ہے۔ گھر کی پرانی دیواریں اپنے پرانے احساس شناسائی کے ساتھ موجود تھیں مگر اُن کا رنگ بدل گیا تھا۔ کمرے کا فرنیچر بھی مختلف تھا اور اس کی ترتیب کا انداز بھی جدا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے بھی دوسرے تھے۔ چنانچہ ماحول اجنبی تھا اور ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے مجھے گزر جانے والے وقت کی ایک ایک بات یاد آتی گئی۔ چشم تصور سے میں نے گھر کا پرانا نقشہ دیکھا۔ کون سی چیز کہاں تھی اور کیسی تھی۔ میرے اپنے کمرے میں بیڈ کہاں تھا، کس جگہ پڑھنے کی میز تھی، کپڑوں کی الماری کس طرف تھی۔ اپنے والد کے کمرے میں پہنچ کر شدت جذبات سے میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے انھیں ہر انداز میں دیکھا۔ نماز پڑھتے ہوئے، اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے، لان میں ٹہلتے ہوئے، کھانے کی میز پر۔

"یہ تمہارے والد کا کمرہ تھا؟" بوڑھے نے اپنا ہاتھ مضبوطی سے میرے کندھے پر رکھا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ محسن نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "ہم یہاں رونے نہیں آئے تھے۔" وہ بولا۔

میں نے آنکھوں کو رومال سے صاف کیا اور باہر نکل آیا۔ "آئی ایم سوری۔" میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

گھر میں سامان کی کمی نہیں تھی اور سامان زیادہ پرانا بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود گھر میں خانہ ویرانی کا راج تھا۔ ہر چیز لاوارث لگتی تھی، توجہ کی طالب تھی اور اپنی کس مپرسی پر نوحہ خواں تھی۔ مجھے فرنیچر پر ہر جگہ گرد کی تہ نظر آئی۔ میز کی شفاف سطح پر گرد تھی، چوکھٹ اور دہلیز پر گرد تھی۔ چھت سے آویزاں فانوس پر گرد تھی اور ان کتابوں پر گرد تھی جو جگہ جگہ ڈھیر تھیں زندگی کی دل چسپیوں سے، مصروفیات اور ہنگاموں سے آزاد ہو کر اپنے کمرے میں بند ہو جانے والے اس بوڑھے کی دنیا بہت مختصر تھی۔ مجھے سخت عجیب لگا کہ تیس برس تک اس کو کس طرح جیسے رہتا ہے۔

"آپ کے ساتھ اب کوئی نہیں ہے یہاں؟" میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"میرے ساتھ؟" وہ سوچ کے بولا۔ "یہ گزشتہ کی یادیں، نصف صدی میں یادوں کا اتنا ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے کہ آدمی اکیلا رہنا چاہے تب بھی نہیں رہ سکتا۔"

"میرا مطلب تھا آپ کے بچے...؟"

"بچے تھے۔ ایک دو نہیں، چھ۔" وہ دلیل سے بولا۔ "تین اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تین دنیا کو۔ دو لڑکیاں تھیں، ان کی شادیاں ہو گئیں۔ ہر اتوار کو اپنے شوہروں کے ساتھ آتی ہیں۔ چھوٹی لڑکی کا ایک بچہ ہے بہت شریر۔ عجیب عجیب لوگوں کا بہت اچھا بچہ ہے۔ وہ ہر ہفتہ آتا ہے.... کھلونوں کے لیے میں زندہ ہو جاتا ہوں۔ ہفتے کے باقی دن کتابیں پڑھتے اور اتوار کا انتظار کرتے گزر رہا ہوں جب یہ سب لوگ پھر آئیں گے۔"

"اور.... آپ کا لڑکا؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

اور تمہاری گزارنے والے نیک دل بوڑھے کی باتوں نے مجھے متاثر کیا تھا۔ محسن اور نینسی بالکل چپ بیٹھے تھے اور شاید میری طرح وہ بھی اس گھر کی فضا کا اثر تھا۔

"مجھے یہ تو نہیں کہنا چاہیے کہ وہ مر گیا۔" وہ بولا۔ "لیکن انگلستان میں یہی کہتے ہیں، میں اس کو نیک دل انسان بنانا چاہتا تھا۔ وہ تھا بھی بہت نیک۔ میں نے اسے مشن اسکول کے سپرد کر دیا تھا۔ چھ سال رہا لیکن نہ جانے کیوں وہ راہ مستقیم سے بھٹک گیا۔ شاید اسے شیطان نے بہکا لیا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ شیطان کو الزام زیادہ دیا جاتا ہے، اتنی فرصت کہاں کہ ہر شخص کو بھٹکاتا پھرے۔ شیطان تو آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ اگر آدمی کمزور ہو تو وہ غالب آ جاتا ہے اور پھر آج کل نیک بننا بہت مشکل ہے۔ کیا تم کو یہ ایک خبطی بوڑھے کا نقطہ نظر لگتا ہے؟"

"جی نہیں۔ میں آپ سے سو فیصد متفق ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایسے ہیں کہ نیکی کے راستے پر چلنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہے، بڑی آزمائش بن گیا ہے کہ شاید صوفیا اور اولیا ہی اس پر چل سکتے ہیں۔"

"خدا تم پر اپنا کرم کرے۔ تم سمجھدار آدمی ہو۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ "غلطی میری تھی کہ میں نے اسے اتنی بڑی آزمائش میں ڈالا۔ وہ سمجھ انسان ہی تو تھا۔ کوئی سینٹ نہیں تھا۔ اسے دنیا نے کھینچ لیا اور وہ خواہشات کی ترغیب کا شکار ہو گیا جس سے کوئی محفوظ نہیں۔ اس نے کہا میں بہت سا پیسہ کمانا چاہتا ہوں تاکہ مجھے عزت اور طاقت حاصل ہو۔ میں نے کہا، بے وقوف! کیا عزت اور طاقت کا سرچشمہ دولت ہے؟ خداوند یسوع مسیح کی قربانی کو دیکھو۔ ہر بتا اس کے پاس کتنی دولت تھی؟ مگر وہ سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ بیسویں صدی کا بیٹا اور اس میں بھائی کی اور علم کی طاقت سے کچھ نہیں بنتا۔ دولت تک نہیں جاتی۔ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ میں نے وقت کا خیال کیے بغیر شاید سختی کی تھی۔ خیر وہ باہر چلا گیا۔ اور اب بہت سی دولت کمانے میں مصروف ہے۔ وہ ہر مہینے مجھے باقاعدگی سے ایک معقول رقم بھیجتا رہتا ہے۔ جو میں اس کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتا ہوں۔ میرے گزارے کے لیے میری پنشن ہی کافی ہے۔"

"پنشن تو پہلی شرح پر بہت کم ہو گی۔" میں نے کہا۔ "آپ کو کیسے کافی ہوتی ہے؟"

"یہ تو ضروریات پر منحصر ہے کہ وہ زیادہ ہیں یا کم۔ پیسہ کبھی خواہشات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔" وہ بولا۔

"پھر بھی مہنگائی تو بڑھتی جا رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"صرف مہنگائی؟ بہت کچھ بڑھتا جا رہا ہے، ان سن آف...؟" وہ ملامت سے سر ہلا کے بولا۔ "زمین پر فتنہ و فساد۔ انسان کی فطرت میں لالچ اور کمینگی۔ مذہب اور اخلاق سے دوری۔ مجھے ہنسی آتی ہے ان باتوں کو... میری عمر کا ہر آدمی اسی طرح سوچتا ہے اور دنیا کتنی بے ڈھنگی ہو گئی ہے۔ تم بتاؤ کیا تم نے شادی کر لی ہے؟"

"نو سر! ابھی دنیا کے جھمیلوں سے فرصت نہیں ملی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"تم غلطی کر رہے ہو۔ نوجوان! دنیا کے جھمیلوں میں تم تنہا کھو کے رہ جاتے۔ تم فرصت کو تلاش کرتے رہ جاؤ گے۔ فرصت اگر دنیا کے جھمیلوں کے لیے ہے تو شادی کے لیے کیوں نہیں ہے؟ مگر ایسا لگتا ہے کہ تم شادی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ تمہارا یہ بھائی بھی ایسے ہی سوچتا ہے؟" وہ بولا۔

"ہم دونوں ایک جیسے بے وقوف ہیں۔ دونوں ہی غلط وقت پر غلط کام کرتے ہیں۔ جذباتی نقصان اٹھاتے ہیں لیکن پھر بھی کہتے ہیں جو ہمیں نہیں کرنا چاہیے اور وہ کرتے ہیں جو نہیں کرنا چاہتے۔" میں نے بات کو گول مول کیا۔ "شادی کی اہمیت ہم دونوں کے لیے دنیا کے سارے جھمیلوں سے زیادہ ہے لیکن کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ آدمی کمبل کو چھوڑنا چاہتا ہے مگر کمبل آدمی کو نہیں چھوڑتا۔"

"پھر تو تمہارے والد بھی اکیلے رہتے ہوں گے؟" وہ بولا۔ "جب تم دونوں ان کے ساتھ نہیں ہوتے۔"

"ہاں۔ اکیلے تو ہیں۔ اپنی قبر میں۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "آپ یہ کوٹھی بیچ کر کہاں جائیں گے؟"

"دیکھو! آخر تو مجھے بھی وہیں جانا ہے جہاں تمہارا باپ گیا۔ پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میری رہائش کہاں ہے۔ جیسے میری چھوٹی لڑکی کہتی ہے کہ میرے ساتھ رہو اور اس کا شوہر بھی بضد ہے۔ میرا خیال ہے میں انھی کے پاس چلا جاؤں گا جو رقم اس کوٹھی کو بیچ کر ملے گی، وہ میں دونوں میں بانٹ دوں گا جب تک بوڑھا اور مرنے والا ہوں اور اس کے پاس دولت بھی ہو تو وہ اولاد اسے بہت عزیز رکھتی ہے۔" وہ بڑے مضحکہ خیز طریقے سے ہنسا۔

"مجھے میں سودا کیا ہے آپ نے اس کوٹھی کا؟" میں نے کہا۔

"ساڑھے پانچ لاکھ میں۔" وہ بولا۔ "میں سلمان بھی چھوڑ جانا چاہتا تھا مگر بعد میں یہ طے ہوا کہ جو سامان وہ پسند کر لیں گے وہ اُن کا ہو گا۔ بہت کم چیزیں ہیں جو اُن کی پسند کی ہیں۔"

"اور خریدار کون ہے؟ معاف کیجیے گا یہ آپ کے ذاتی معاملات ہیں لیکن یہ میرا بھی گھر تھا اور میرا اس سے بہت گہرا جذباتی تعلق ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ میں پھر کبھی آنا چاہوں تو مجھے آپ کی طرح خوش آمدید کہا جائے؟"

"میرا خیال ہے وہ اچھا آدمی ہے۔ ایک ایڈووکیٹ ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ کسی کا انارنی ہے اور اس نے مجھے بتایا کہ ناگزیر وجوہ کی بنا پر اصل خریدار سامنے نہیں آ سکتا اور اس کا فوری طور پر اس کوٹھی میں رہائش اختیار کرنے کا خیال بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی طرف سے مجھے اجازت ہے کہ جب تک چاہوں یہاں رہائش جاری رکھوں۔"

"ایسا کون بے وقوف ہے؟" میرے منہ سے نکل گیا۔ "میرا مطلب ہے اس کو اتنی جلدی کیا تھی.... یہ مکان خریدنے کی جب اسے رہنا نہیں ہے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔ "میں نے پوچھا نہیں۔ ہر شخص اپنی ضرورت اور مصلحت کو بہتر سمجھتا ہے۔ ضروری تو نہیں وہ بے وقوف ہو۔ ہو سکتا ہے کہ مکان اس کو اتنا پسند آ گیا ہو کہ وہ مجبور ہو گیا ہو۔ جیسے میں مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے خریدار تو بہت تھے چنانچہ دیر کی صورت میں مکان کوئی اور خرید لیتا۔ کچھ لوگ بازار سے جو چیز خریدتے ہیں وہ اپنی قوت خرید کے مطابق لیتے ہیں۔ کچھ ذاتی

www.paksociety.com

پسند کی قیمت ادا کرتے ہیں شوق کی بات کہہ لو یا حسن نظر کی۔ ایک
مکان بھی اتنا ہی خوبصورت ہو سکتا ہے کسی کے لیے۔ جتنا جتنا
تمہارے لیے یہ مکان۔ مگر اگر تم کو اسے دوگنی یا تین گنا قیمت پر
بھی حاصل کرنا پڑے تو تم سمجھو گے پیسہ ضائع نہیں ہوا۔ لاکھوں
کی پینٹنگ آخر کیوں خریدتے ہیں لوگ! مصوری کا تعلق فنونِ
لطیفہ سے ہے اور اس کی ایک جمالیاتی قیمت ہوتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اصل بات جذبات کی ہے۔" میں بولا۔
"ایک عمارت بھی جذبات کو اسی طرح اپیل کر سکتی ہے جیسے ایک
خوبصورت تصویر یا مجسمہ یا کمپوزیشن کرتے ہیں۔ تب تو معلوم
تو ہو گا کہ اتنا بڑا فقرہ بولن کون پیدا ہو گیا اگر یہ اس کوٹھی کا؟"
میں نے کہا۔ "کس کا اثاثہ ہے وہ؟"

"دراصل میں نے یہ معاملات ایک وکیل کے سپرد کر دیے
ہیں۔" وہ بولا۔ "میرا اٹارنی اس کا اٹارنی تمام قانونی کارروائی
مکمل کر کے گا ہی تم کو تمام تفصیلات فراہم کر سکتا ہے مگر تم کیا
کرو گے جان کر؟"

"کچھ نہیں بس ایسے ہی ایک فضول سی تجسس تھی کہ شاید
میں اس مکان کو پھر خرید سکوں۔ اور جیسا کہ آپ نے کہا۔ اگر دگنی
قیمت پر بھی ملے تو کسی نہ کسی طرح مکان کی نسبت مجھے یہ
مکان عزیز تر ہو گا۔" میں نے کہا۔

"آئی سی۔ آئی سی۔" وہ مسکرایا۔ "دگنی قیمت پر تو اب بھی بیچ
دے گا وہ تم کو۔ اس کے پیچھے گھاٹے کا سودا نہیں۔ تمہارے لیے
اس کی جذباتی قیمت ہے۔ اس کے لیے نہیں۔ اگر تم قیمت ادا کرنے
کی استطاعت رکھتے ہو تو خریدار کے اٹارنی سے بات کر لو۔۔۔
ایڈووکیٹ اے ڈبلیو منظر سے۔"

"کیا ہے؟" میں نے یوں کہا جیسے دھوکا میرے کانوں کو
ہوا ہے مگر بالکل خاموش بیٹھے ہوئے محسن اور استاد ڈیڈی بھی بجلی کی
طرح چونکے تھے۔ میں نے ایک نظر محسن کو دیکھا جو میری طرف
سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اے ڈبلیو منظر۔" بوڑھا سمجھا کہ ہم کچھ نہیں سمجھے۔ "بہت حیران
تھا۔ مشکل سا نام ہے اس کا عبدالودود منظر۔۔۔"

"یہ مکان عبدالودود منظر خرید رہا ہے؟" میں نے احمقوں
کی طرح کہا۔

"کیوں کیسے؟" محسن نے بھی حماقت کے اثر سے مغلوب
ہو جانے والے شخص کی طرح کہا۔ "اتنا تو معلوم ہو گا آپ کو
کہ وہ عورت ہے یا مرد؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے! عورت بھی خرید سکتی ہے
پہلے بھی۔" وہ بولا۔ "تم لوگ اس قدر حیران کیوں ہو آخر؟"

میرا خیال ہے کہ تم میں سے کسی نے اس کی بات نہیں کی
اور اسی طرح ادھم مچاتے رہے۔ ہم سب کے لیے یہ انتہائی
غیر متوقع خبر تھی جس کے تذکرے نے ہمیں رابعہ کے علاوہ
کسی اور کے متعلق سوچنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔
میں شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی کہ وہ منظر کے ذریعے
کوٹھی کو خرید رہی تھی۔ منظر نے مجھے جتا دیا تھا کہ وہ اپنی
اس کوٹھی کو بیچنا چاہتی ہے جو اس کے نقلی نواب شوہر نے
خریدی تھی۔ اسی کی قیمت رابعہ نے یہ گھر خریدنے کا فیصلہ
کیا ہو گا۔ اور اس فیصلے کے پس منظر میں کیا جذباتی عوامل کارفرما
تھے، یہ میں بھی اتنی ہی اچھی طرح سمجھتا تھا جتنی اچھی طرح
وہ اس مکان کو میرے لیے خرید رہی تھی۔ پاگل۔ جذباتی عورت۔ اپنا گھر میری خاطر تباہ کر لیا اور مجھے میرا گھر
لوٹانا چاہتی ہے۔ ایک قرض تو رابعہ کے اس گھر کا تھا جو
میری وجہ سے اور صرف میری وجہ سے جل کے راکھ ہوا اور
خاک کا ڈھیر بن گیا۔ اسے بھی تو وہ گھر عزیز ہو گا جہاں اس کا بچپن
گزرا تھا۔ جہاں بچپن سے جوانی تک اس کی تمام زندگی گزری
تھی۔ جہاں سے پہلے باپ کا اور پھر اس کی ماں کا جنازہ بھی
اٹھا تھا۔ کیا اس کو اپنی عمر گزشتہ کی وہ کتاب عزیز نہ تھی
جس کے ہر ورق پر یادوں کا کوئی نقش تھا؟ اسے کوئی آرزو نہ
تھی کہ اپنے نشیمن کی خاک پر پھر آشیاں بنائے؟ بلکہ
وہ اپنی محبت کی تمام خوبصورتی کے ساتھ میرے تصور میں
جلوہ گر ہوئی۔ یہ تم کیا سوچ رہے ہو سکندر؟ جب میں نے
خود کو تمہارے سپرد کر دیا تو میرا کیا رہا۔ میری جذباتی وابستگی
تو اب اس گھر سے ہو گی جو میرا اور تمہارا گھر ہو گا اور جہاں
خوشیوں کے ساتھ خزانے ہمارے ہوں گے۔ میں نے جب
زندگی کے راستوں پر تمہاری رفاقت قبول کی تھی تو اپنے
ماضی کے سارے رشتے توڑ لیے تھے۔ میرا سرمایہ حیات میرا
مستقبل ہے جو تمہارے ساتھ وابستہ ہے۔ اس وقت میں کیا
کر سکتی تھی کہ تم کو ایک چھوٹی سی خوشی کا نذرانہ دے دوں
جیسے چھینا گیا تھا۔ جب وقت ہمارے ساتھ
ہو گا تو میں اپنی ہر خوشی تمہاری نذر کر دوں گی۔ اور وہ وقت
ضرور آئے گا۔ اعتماد کی یہ دولت تم نے مجھے بخشی ہے
محبت کے اس انمول خزانے کے بدلے جو تم نے بن مانگے
میری جھولی میں ڈال دیا۔ میرا یہ حقیر نذرانہ کیا ہے۔ پھر تم
کیوں کہو گے کیا مجھے تمہارے لیے اتنا کرنے کا بھی حق
نہیں؟

پھر وہ یکلخت غائب ہو گئی اور میں نے خود کو محسن

خرید لیا تھا۔ جس کی نظر میں میرے لیے ملامت تھی۔ میرے
اس سلوک پر جو میں نے رابعہ کے ساتھ روا رکھا تھا۔ میں نے
اس کے دل کو اپنے طنز کے تیروں سے چھلنی کر دیا تھا۔ میں نے
اس سے کہا تھا کہ آج وہ اپنے نفع نقصان کے متعلق سوچنے
لگی ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ آج اسے اپنے گھر کے تباہ
ہونے کا دکھ ہے اور میں نے اس سے کہا تھا کہ آج اس کے
رشتے میں میرے لیے بے رخی آ گئی ہے اور یہ سب
میں نے اس وقت کہا تھا جب وہ میرے لیے خوشیوں
کا ایک بہت بڑا سودا کر رہی تھی۔ جس کے بدلے وہ رو رہی تھی۔
لیکن اس نے پھر بھی مجھے یہ نہیں بتلایا تھا کہ وہ کیا کر رہی
ہے۔ آہستہ آہستہ بہت سی باتیں میری سمجھ میں آنے لگیں۔
منظر نے مجھ سے کہا تھا کہ رابعہ فی الحال میرے پاس رہے گی۔
کیونکہ اسے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔ اس نے رابعہ کی
لیگل فرم کا انتظام سنبھالنے کا ذکر کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ رابعہ
اور وہ کوٹھی بیچنی ہے جو خالی پڑی ہے۔ اس نے یہ بھی دلیل دی
تھی کہ رابعہ کو سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ عورت
ذات ہے اور ہماری پر خطر، پرجوش اور ہنگامہ خیز زندگی میں
وہ ہر قدم پر ہمارے ساتھ نہیں چل سکتی۔ اس کا نروس
بریک ڈاؤن ہونے والا ہے اور مجھے چاہیے کہ میں خود غرضی
سے کام نہ لوں۔ اسے کچھ دن یہ جس کی دلیل منظر نے
سب بجا اس کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ رابعہ کیا کرنا چاہتی ہے۔
اور رابعہ نے اسے منع کر دیا تھا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہونا
چاہیے۔ ورنہ میں اس کے ارادوں کی راہ میں حائل ہو جاؤں گا
اور اسے وہ سب نہیں کرنے دوں گا جو وہ کرنا چاہتی ہے۔
آرام کا محض بہانہ تھا۔ اگر میں ساتھ رہتا تو وہ یہ سودا کیسے
کرتی۔ یہی وہ ضروری کام تھے جو اسے مجھ سے چھپ کر کرنے تھے۔

"تم سب کو کیا ہو گیا ہے! میں نے تو ایسی کوئی بات
نہیں کی تھی۔" بوڑھے کی آواز مجھے پھر حقائق کی دنیا میں
کھینچ لائی۔ "تم نے ہی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ تم
دگنی قیمت بھی دے سکتے ہو اس مکان کی۔"

"ایسا ہی ہے۔۔۔ میں نے یہ کہا تھا۔" میں نے ایک گہری
سانس لے کر کہا۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس کی آدھی قیمت
بھی نہیں ادا کر سکتا۔ یہ محض ایک خواہش تھی اور خواہشات کا
کیا ہے، وہ بے لگام اور منہ زور گھوڑوں کی طرح ہوتی ہیں۔
کیا آپ نے اس مکان کا اشتہار دیا تھا؟"

"نہیں۔۔۔ اشتہار دیا تو نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "دینے کا ارادہ
تھا۔ کچھ بروکر تھے جو کبھی کبھی کوئی پارٹی لے آتے تھے جب
وہ وکیل۔۔۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"عبدالودود منظر۔" میں نے کہا۔ یہ بالکل غیر ارادی حرکت
تھی کہ میری زبان پر منظر کا نام آ گیا تھا۔

"یس۔۔۔ کیا تم جانتے ہو اسے؟" بوڑھے نے کہا۔ "جب
وہ میرے پاس آیا تو میں نے سمجھا اسے بھی کسی بروکر نے ہی بھیجا
ہو گا۔ اس نے پوچھا۔ آپ یہ مکان بیچنا پسند کریں گے؟
میں نے کہا۔ کوئی خریدار ملے گا تو ضرور بیچ دوں گا۔ ابھی تک
تو جو آتے ہیں وہ دیکھ کر چلے جاتے ہیں کیونکہ یہ پرانی طرز
کی کوٹھی ہے جن کے پاس پیسہ ہے وہ گلبرگ کی طرف جانا پسند کرتے
ہیں۔ اس وکیل نے کہا کہ میں اپنے موکل کی طرف سے مکان خریدنا
چاہتا ہوں تو مجھے کیا قیمت ادا کرنی ہو گی؟ اور میں نے اسے
قیمت بتائی تو اس نے اور کے کروڑ سال سے پہلے جو لوگ آتے
تھے انھوں نے بارگین کرنے کی کوشش کی تھی اور بروکر نے مجھ سے
کہا تھا کہ میں بارگین کا مارجن رکھوں کیونکہ خریدار منہ مانگی قیمت
دینی پسند نہیں کرتے۔ وہ کم ضرور کراتے ہیں۔ میں نے اس وکیل
کو قیمت زیادہ بتائی تھی۔ تقریباً پچاس ہزار روپیہ کم کر سکتا
تھا میں۔ لیکن اس نے بالکل اصرار نہیں کیا تو میں کیوں بولتا۔
ظاہر ہے وہ اپنی خوشی سے دے رہا تھا۔ کسی دباؤ کے تحت زیادہ
قیمت نہیں دے رہا تھا۔"

"آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کسی دباؤ کے
تحت یہ سودا نہیں کر رہا تھا؟" میں نے کہا۔ "آپ نے خود ہی
ابھی کہا تھا کہ دباؤ جذباتی بھی ہو سکتا ہے۔ کسی من پسند چیز
کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کا جنون۔۔۔"

"ہاں مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ پھر مجھے کیسے
معلوم ہو سکتا تھا؟" وہ بولا۔

"غالباً آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں مجھے ہماری وجہ سے شک
ہوا۔" میں نے کہا۔

"اوہ نو۔۔۔ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں ایک بوڑھا فالتو
آدمی ہوں۔ دنیا بہت مصروف ہے۔" وہ بولا۔ "آج تم
لوگ آ گئے تو کچھ باتیں کر لیں۔ افسوس یہ ہے کہ میں تم کو کچھ
پیش نہیں کر سکتا چائے کافی وغیرہ۔ لیکن۔۔۔ ایک نوجوان
ہے یہاں۔ وہ صبح کام پر چلا جاتا ہے اور پھر شام کو آتا ہے۔
یہاں سرونٹ کوارٹر میں اسے جگہ دے رکھی ہے وہ میرے لیے ناشتا
بنا لیتا ہے اور دوپہر کا کھانا پکا کر رکھ جاتا ہے۔ رات کو میں کچھ
نہیں کھاتا۔ میں اس کو نوکر نہیں سمجھتا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس ہم آپ سے مل

www.paksociety.com

لیے اور آپ چلے جائیں۔ اندر آنے کی اجازت دے دی میں نے۔ خلاف
چاہئے اور سکائی سے بہتر ہے ہم تھوڑی دیر میں چلے جائیں گے
کیا آپ کو یاد ہے کہ وزیر خان کا اناڑی کون تھا؟"

"ہاں۔ زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ کسی نے اس کو قتل کر دیا۔" وہ بولا۔ "میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ اس کا نام تھا میر شرافت علی۔ وزیر خان تمہارے والد تھے تو انھوں نے ملک کیوں چھوڑا تھا؟"

"یہ حالات ہی ہوتے ہیں جو آدمی کو اپنا گھر، اپنا شہر، یہاں تک کہ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں سر!" میں نے کہا۔ "میں یہاں ہوتا تو وہ اناڑی بھی کیوں مقرر کرتے۔ میں خود بیچ سکتا تھا مکان کو۔ اور شاید اچھا بھی ممکن تھا لیکن میں ان دنوں پہلی دفعہ لندن میں تھا۔" میں نے کہا۔

"کیوں گئے تھے تم لندن؟" وہ بولا۔

"اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہاں میری زندگی کے بہت دشمن پیدا ہو گئے تھے۔"

"اور تمہارے والد؟ ان کے ساتھ کون تھا؟"

"کوئی نہیں تھا۔ صرف خدا تھا۔" میں نے کہا۔

"تم کو شرم آنی چاہیے۔ جوان آدمی تھے۔ بوڑھے باپ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔" وہ بولا۔ "زندگی بہت عزیز تھی تم کو۔ اور اگر تھی تو ان کو ساتھ لے جانے میں کیا حرج تھا؟"

میں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ "مجھے اتنا وقت ہی نہیں ملا۔ انھوں نے ضد کر کے مجھے فوراً روانہ کر دیا تھا اور میری غیر موجودگی میں دشمنوں نے ان سے بدلہ لیا۔"

"تمہارا مطلب ہے ان کو قتل کر دیا؟" وہ چونک کر بولا۔

"ہاں سر! انھوں نے میرے فرار کا ذمے دار انھیں قرار دیا۔" میں نے کہا۔ "پھر وہ مجھے قتل کرنے لندن پہنچ گئے تو میں یہاں بھاگ آیا۔"

"تم کو مکان کی فروخت سے حاصل ہونے والا روپیہ مل گیا؟" وہ متفکر ہو کے بولا۔

"ابھی تو بہت کچھ نہیں ملا سر! میرے دشمن بھی نہیں جانتے کہ" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں آپ میرے یہاں آنے کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ یہ خبر میرے دشمنوں تک پہنچ جائے اور وہ آپ کو پریشان کریں۔ آپ کی جان کے خواہ مخواہ دشمن ہو جائیں۔"

"وہ جانتے ہیں مجھ سے دشمنی کر کے کسی کو کیا ملے گا۔ پھر بھی تم کہتے ہو تو میں کسی سے بات نہیں کروں گا۔ مگر تم یہاں ان سے چھپ کر کہاں رہو گے؟ اور تم آئے کیوں ہو آخر؟" وہ بولا۔

"بس اپنے معاملات ختم کر کے میں واپس چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ اس بوڑھے کو اصل حالات بتانا کچھ مناسب نہ تھا لیکن اس کو خاموش رکھنا ضروری تھا چنانچہ میں نے ایک قابلِ قبول جھوٹ بد قسمتی حالات کی کہانی سنائی اور اسے مطمئن کر دیا۔

"تمہارا چھوٹا بھائی بہت کمزور ہے۔" اس نے کہا۔

"جی بچپن سے ہی۔ یہ کچھ فاترالعقل ہے۔" میں نے کہا۔ "بولتا تھا، بزرگی مارتا تھا اور میرے والد کی یا کسی اور کی بے عزتی ہو جاتی تھی۔ اس کو جوتے پڑتے تھے لیکن ... اس کو ... گیا اور اس نے بات کرنی ہی چھوڑ دی لوگوں سے۔ اس کو مولا بخش لے جانے کا خیال ہے یا پاگل خانے۔"

"واٹ نان سنس۔ تم لندن میں رہے ہو اور باتیں ایسی کرتے ہو۔ پاگل خانے میں نہیں اسے نفسیاتی علاج کے لیے کسی کلینک میں داخل کرا دو۔" وہ بولا۔

"یہی کرنا پڑے گا۔" میں نے غصے سے محسن کو گھورا جو میری بات پر اندر ہی اندر کھول رہا تھا مگر صورت سے بے نیاز آنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ "چلو امیر خان۔ تم جاؤ خدا حافظ۔ ان کی گاڑی واپس کر دو۔ تم کو ہوٹل میں چھوڑ دیں گے۔"

"میں ہوسٹل میں نہیں رہوں گا۔" محسن بولا۔ "وہ لڑکے بہت تنگ کرتے ہیں۔"

"ہوسٹل میں نہیں احمق! ہوٹل میں۔ اور بیٹ ہوٹل میں۔" میں نے کہا۔ "تم چلو میں آ رہا ہوں۔"

"دیر نہ کرنا ورنہ میں بھوک سے مر جاؤں گا۔" محسن اٹھتے ہوئے بولا۔ وہ میرا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"تم انتظار مت کرنا۔ کھانا کھا لینا۔" میں نے کہا۔

"مرغی کھاؤں یا مرغا؟" محسن نے معصومیت سے کہا۔

"جو تمہارا دل چاہے کھا لینا مگر اب میرا سر مت کھاؤ۔ جاؤ۔" میں نے درشتی سے کہا اور محسن سر کو جھٹک کر نکل گیا۔ شیدی کچھ نہ کر سکا کہ وہ کیا کرے۔ ہماری بے سروپا باتوں پر ہنستے ہنستے اس نے ہماری صورتوں کی سنجیدگی کو دیکھا تو اسے بھی خاموش رہنا پڑا۔ وہ دونوں خاموشی سے چلے گئے۔

"تم کو اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔" بوڑھے نے ان کے جانے کے بعد کہا۔ "وہ معذور ہے۔"

"بعض اوقات میں برداشت نہیں کر پاتا۔" میں نے شرمندہ ہو کے کہا۔

"جب تمہارے والد کا انتقال ہوا تو یہ کہاں تھا؟" بوڑھے نے اچانک کہا۔

"اسے ہم نے پہلے ہی کراچی بھیج دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ایک

رشتے دار کے پاس۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اب بھی میں بہت سی باتیں اس کے سامنے نہیں کرتا کہ کہیں دوسروں سے نہ کہتا پھرے۔ اسی لیے اسے روانہ کر دیا ہے کہ مجھے آپ سے ایک ایسی ہی بات کرنی تھی۔ یہ بتائیے جب آپ نے یہ کوٹھی خریدی تھی تو کبھی ایسا ہوا کہ آپ نے کسی ٹرک کو اندر آتے جاتے دیکھا ہو؟"

وہ چونکا۔ "کبھی کا کیا مطلب۔ ایک ٹرک ہر روز اندر کھڑا ہوتا تھا۔ اب بھی ہوتا ہے۔"

"اب بھی ہوتا ہے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "کہاں؟ میرا مطلب ہے گیراج میں تو فورڈ کی گنجائش نہیں ہے۔"

"گیراج میں نہیں۔ ٹرک باہر کھڑا ہوتا ہے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "دراصل وہی نوجوان جو میرے ساتھ رہتا ہے وہ میرا کام کاج کرتا ہے، اپنے ٹرک کا ڈرائیور بھی ہے۔"

"اچھا! تو پھر ٹرک یہاں کیوں کھڑا کرتا ہے؟ کمپنی کے پاس جگہ نہیں ہے کیا؟"

"معلوم نہیں۔ مگر عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔" وہ بولا۔ "کمپنی والے بھی اعتراض نہیں کرتے کہ ڈرائیور ٹرک کو اپنے پاس رکھے۔ اسے ڈرائیور کو آنے جانے کی سہولت رہتی ہے۔"

"آپ نے کہا تھا کہ ڈرائیور صبح شام آپ کے لیے کھانا بنا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ صرف دن ہی میں ٹرک چلاتا ہے؟"

"تو ٹرک رات کو بھی چلتے ہیں۔ انھیں مال ایک شہر سے دوسرے شہر لے جانا ہوتا ہے۔ کراچی تک کا پھیرا ہو تو وہ ہفتہ ہفتہ لوٹ کر نہیں آتے۔"

"ہاں لیکن سب ٹرک شہر سے باہر نہیں جاتے۔ کچھ اندر ہی اندر شہر میں استعمال ہوتے ہیں۔" وہ بولا۔ "اور جس ٹرک کا نمبر میں تلاش کر رہا تھا وہ مجھے مل گیا۔ ... وہ ٹرک مال کو فیکٹری سے قصر جمشید کے گودام تک اور یہاں سے گودام شاہ تک لے جانے کے لیے مخصوص تھا۔ وہ دوسرا ٹرک تھا جس میں ... اور رحمت کباڑی روانہ ہوئے تھے اور ... کسی جگہ ... بھائی کو سامان پہنچانے گئے تھے۔"

"کیا وہ کوئی پرانا ٹرک ہے اور کیا اس کا نمبر ایل ای ... ہے؟"

"ہاں۔ بالکل یہی نمبر ہے۔ تم جانتے ہو اس ٹرک ڈرائیور کو؟" وہ خوش ہو کے بولا۔

"جانتا ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن یہ کوئی ... نہیں میرے لیے بہت خطرناک بات ہے کہ وہ میرے دشمنوں میں شامل ہے۔ اگر وہ مجھے دیکھ لے تو اسی وقت قتل کر دے۔"

بوڑھے نے غیر ارادی طور پر انگلی سے چشمے کو سنبھالا۔

"ہول کا رٹ ... وہ ایسا آدمی لگتا تو نہیں ہے۔"

"کوئی قاتل صورت سے پہچانا جاتا ہے تو پولیس اسے واردات سے قبل ہی گرفتار کر لے۔" میں نے کہا۔ "وہ آپ کے لیے واقعی بے ضرر ہے مگر میرے اور اس کے درمیان جانی دشمنی ہے۔"

"کیوں؟ تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ اس دشمنی کا سبب کیا تھا؟" وہ بولا۔ "جس کی وجہ سے تم کو فرار ہونا پڑا اور تمہارے والد پھر بھی قتل کر لیے گئے۔"

"بس ... یہ پٹھانوں کے خاندانی تنازعے ایسے ہی چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "نسل در نسل۔"

"اوہ۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ میں ایڈیشنل سیشن جج تھا اور ضلع ہزارہ میں بھی رہا ہوں۔ وہاں یہ چیز عام تھی لیکن تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ تم بھی اس خونریزی کی روایت کو نبھانا چاہتے ہو؟ تم معاف نہیں کر سکتے؟ انتقام کی خواہش سے دستبردار ہو کے انصاف کو خدا پر نہیں چھوڑ سکتے؟"

"یہ سب باتیں ہمیں خدا نے اپنی کتاب میں وضاحت سے سمجھا دی ہیں۔ حسن سلوک اور عفو و درگزر میں کتنا ثواب ہے، یہ ہمارے نبی نے اور صحابہ نے اپنے عمل سے ثابت کیا۔" میں نے کہا۔ "پھر انگریز نے ڈیڑھ سو سال تک اپنا نظام انصاف ہم پر مسلط کیے رکھا اور پھانسی والے ہمیشہ پھانسی پاتے رہے مگر روایت اپنی جگہ برقرار ہے۔ میں اکیلا کیا کر دوں؟ میں تو انھیں معاف کر دوں لیکن وہ مجھے بخشنے والے نہیں ہیں۔ میرا کوئی بیٹا تو ہے نہیں اور امیر خان کو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ وہ سمجھے گا آپ کی بات؟ میرے بعد وہ بندوق اٹھا لے گا؟"

اس نے بڑے افسوس سے سر ہلایا۔ "کتنا عجیب ہے یہ احساس کہ میں اس وقت تم سے باتیں کر رہا ہوں اور تم سے مل کر خوش ہوا ہوں۔ تم بہت مہذب، شریف اور ذہین آدمی ہو۔ لیکن معلوم نہیں تم کب تک ہو۔ کسی دن مجھے اچانک معلوم ہوگا ... یا شاید کبھی معلوم نہ ہوگا کہ اب تم نہیں رہے۔"

"آپ سے پھر یہی درخواست کر رہا ہوں کہ کسی کو میرے آنے کی خبر نہ ہونی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "میں تو کوشش کر رہا ہوں کہ خاموشی سے واپس چلا جاؤں۔ ہو سکتا ہے دشمن مجھے تلاش کرنے میں ناکام رہیں تو مایوس ہو جائیں اور قتل و خونریزی کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے لیکن ان کو معلوم ہوا کہ میں

www.paksociety.com

یہاں ہوں تو وہ پھر مستعد اور سرگرم عمل ہو جائیں گے۔ تحقیقی طور پر وہ سمجھیں گے کہ میں اپنے والد کا بدلہ لینے آیا ہوں۔ وہ پہل کر کے کام تمام کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"میں نہیں جانتا تھا۔ میں یہ گناہ اپنے سر کیسے لے سکتا ہوں؟"

وہ بولا۔ "مجھے تو تمام عمر یہ احساس رہے گا کہ میری زبان سے چند غلط بات نکلنے کے باعث ایک آدمی مارا گیا۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم زندہ رہو۔ لمبی عمر پاؤ۔ جتنی میری عمر ہے اس سے بھی زیادہ لمبی عمر۔ شادی کرو۔ جو شاید تم نے اسی وجہ سے اب تک نہیں کی اور اپنا گھر بساؤ۔ اور وہ گھر ایسا نہ ہو جیسا میرا گھر ہے۔ وہ ایک آباد اور خوشحال گھر ہو۔"

"یہ نیک تمنائیں اور دعائیں ضرور میری محافظ ہوں گی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "زندگی رہی تو میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آپ سے ملنے ضرور آؤں گا۔ آپ مجھے کہاں ملیں گے؟"

"اگر قبرستان میں نہ ملا تو اپنی چھوٹی بیٹی کے پاس ملوں گا۔ میں تم کو اس کا پتا لکھ دیتا ہوں۔" وہ جیب میں کچھ تلاش کرتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے ایک پرانی اور بوسیدہ نوٹ بک نکالی۔ دوسری جیب سے اتنا ہی پرانا قلم برآمد کیا اور نوٹ بک سے ایک صفحہ پھاڑ کے آہستہ آہستہ کچھ لکھنے لگا۔ یہ صفحہ اس نے مجھے پکڑا دیا۔ "میں تم سب کو خوش آمدید کہوں گا۔"

"خدا حافظ مسٹر پال۔" میں نے اس سے مصافحہ کیا اور باہر نکل آیا۔ وہ انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والا ایک پرانا آدمی تھا۔ اور میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اس نے اپنے منصب کی آبرو کو کس حد تک مقدس جانا ہوگا۔ ہر فیصلہ کرتے وقت اس نے اپنے ضمیر کی آواز سنی ہوگی۔ اور خدا سے دعا مانگی ہوگی کہ اسے انصاف کرنے کی توفیق دے۔ تاکہ اس کے قلم سے صرف گناہ گار کو سزا ملے۔ اگر اس سے غلطی ہو تو گناہ گار کو چھوڑ دینے کی، بے گناہ کو سزا دینے کی نہیں۔

باہر آ کے میں آہستہ آہستہ سڑک پر چلنے لگا۔ ابھی گیارہ بجے تھے اور مجھے امید تھی کہ ڈیڈی اور محسن میری ہدایت کے مطابق کاؤنٹی قبرستان کے آس پاس چھوڑ کر بارہ بجے تک اورینٹ ہوٹل میں کمرے حاصل کر لیں گے۔ میر خان اور کبیر خان کے نام سے۔

آج کا دن بہت اہم تھا اور انکشافات کا دن تھا۔ میرے بہت سے اندازے درست ثابت ہوئے تھے۔ قصر جمشید کے تہ خانے تک پہنچنے والا راستہ اب بھی اسی جگہ سے شروع ہوتا تھا اور بے خوف و خطر استعمال بھی ہو رہا تھا۔ بہت ہوشیاری کے ساتھ دلاور اور میر شرافت علی نے یہ کوٹھی میرے والد سے ہتھیائی تھی۔ میر شرافت اس کا مالک بن گیا تھا۔ اس کی معقول وجہ بھی۔ دنیا کو یہ باور کرا دیا گیا تھا کہ وزیر خان بیمار ہے۔ وہ اٹھ تک نہیں سکتا۔ اس نے کوٹھی کو فروخت کرنے کی قانونی کارروائی کیسے پوری کی؟ فرض اس نے اپنے دوست اور پارٹنر میر شرافت علی کے … دیا جس نے شرافت اور دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے یہ کام کیا۔ اگر کوئی سوال کرتا کہ وزیر خان نے یہ کوٹھی کیوں بیچی تھی تو اس کے دو معقول جواب تھے۔ پہلا تو یہ کہ اس کی جو چیز تھی وہ بیچنے کا اس کو اختیار ہے۔ دوسرا یہ کہ اس نے ایک کوٹھی بیچ کر دوسری خرید لی۔ جس نے تصدیق کی ضرورت محسوس کی تو کوئی تصدیق کر سکتا تھا۔ جس کوٹھی سے وزیر خان کا جنازہ اٹھا وہ اس کی نہیں اسی کے ایک نمک حرام ملازم چراغ دین کی ملکیت تھی۔ وزیر خان کے لیے وہ ایک عقوبت گاہ تھی جہاں وہ چھ برس گھٹ گھٹ کے ذہنی و جسمانی اذیت برداشت کرتا رہا تھا۔

ولسن اینڈ کمپنی نے ایک عقدہ یہ بھی کھولا کہ وزیر خان کی کوٹھی ان میں سے کسی کے علم پر نہ ہو۔ انھوں نے کوٹھی کو اشتہار … فروخت کیا ہوگا۔ اس کی قسمت کہ خریدار بھی ان کو اپنے مطلب کا مل گیا۔ ایک پرانے وقتوں کا اپنی ذات کے خول میں بند رہنے والا اور باہر کی دنیا سے عملاً کوئی تعلق نہ رکھنے والا بوڑھا … جس کا ایک بیٹا تھا جسے اس نے کانونٹ کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کی دونوں بیٹیاں بیاہی جا چکی تھیں۔ اور وہ صرف اتوار کو دو چار گھنٹے کے لیے باپ سے ملنے آتی تھیں چنانچہ ان کی طرف سے مداخلت کا سوال ہی نہ تھا۔ باقی رہ جاتی تھی صرف وہ عورت جو گھر کی مالک تھی اور جس کو پسند ہو اس کے شوہر نے یہ پرانی کوٹھی فوراً خرید لی تھی۔ ایک ذرا خیال کے تحت میں بیٹھا اور وہیں بیٹھنے لگا۔

دس منٹ بعد میں پھر کرم چند پال کے سامنے تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔

"کیا بات ہے؟ آپ نے کہا کوئی بات رہ گئی تھی؟"

"ویلیں سر۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کا تھوڑا سا وقت اور لوں گا۔" میں نے پھر وہیں بیٹھ کر کہا۔

"وقت تو بہت ہے۔ میرا زندگی کا … کا ڈھیر ہے۔ کوئی … کیا جتنا چاہے لے لے۔" وہ بولا۔

"میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میرے لیے خود … کی کتنی اہمیت ہے اس لیے میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس کا مقصد خدانخواستہ آپ کی نجی زندگی کے معاملات میں مداخلت نہیں ہے … میں آج پہلی بار آپ سے ملا ہوں۔ آئندہ کوئی … نہیں کہ میں نہ رہوں یا آپ نہ رہیں۔ اس لیے میری …"

"تمہید کے بعد … معذرت کافی ہے۔" وہ مسکرایا۔ "… آپ مجھ سے چند باتیں اور کرنی چاہتے ہیں۔ یہ خیال ہے"

… میں نے کہا۔ "… پوچھتے جاؤں گا۔ ایک … سے متعلق ہے مجھے اس کا نام نہیں بتایا تھا آپ نے …"

"اس کا نام تو دلدار ہے لیکن سب اسے کبوتر کہتے ہیں۔" وہ بولا۔

اس نام کی بازگشت جیسے ذہن میں تھی لیکن مجھے یاد نہ آیا کہ یہ نام میں نے کب اور کہاں سنا تھا۔ "یہ دلدار آپ کے پاس … کیا آپ نے کسی ملازم کی ضرورت کا اشتہار دیا تھا یا کسی نے بھیجا تھا اسے؟"

"دونوں میں سے کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "ہمارے یہاں آنے کے دو ایک یا تیسرے دن وہ خود آ گیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ سابقہ مالکوں کا ملازم ہے … سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا اور ان کی بہت خدمت کر سکتا تھا اپنا اخلاقی فرض سمجھ کے کرتا تھا۔ کوٹھی بیچتے وقت مالک نے خالی … کے لیے سرونٹ کوارٹر بھی خالی کرا لیا تھا۔ اور کہا تھا کہ نئے مالکوں کی … ممکن ہے ان کو سرونٹ کوارٹر کی ضرورت پڑے۔ اگر ضرورت ہو تو تم ان سے بات کر لینا۔ وہ تم کو رکھ لیں تو یہ ان کی مرضی۔ دلدار نے مجھے بتایا کہ وہ ٹرک چلاتا ہے اور صبح نو بجے ٹرک لے کر … شام کو چھ سات بجے لوٹ آتا ہے۔ صبح جانے سے پہلے … آنے کے بعد وہ ہمارا سب کام کرے گا۔ بازار سے سودا سلف لانا۔ باغ کی دیکھ بھال۔ چوکیداری اور ڈرائیوری۔ ہم نے کہا کوارٹر تو ہمارے کسی کام کا نہیں ہے۔ تم کو رہنے کے لیے جگہ چاہیے تو آ جاؤ۔ ہمارے پاس نوکر بھی نہیں ہیں اور سرونٹ کوارٹر خالی ہے تو ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ وہ اسی دن آ گیا اور اس میں شک نہیں کہ جو اس نے کہا تھا وہی کیا۔ ہمارا کوئی بیٹا بھی … ہر روز بازار جانا اور ادھر ادھر کے … مسئلے تھے۔ اس کے آنے کے بعد ہمیں بہت سہولت … بہت اچھا اور … نوجوان ہے جو … ایک … اور وہ … گیا۔ میری بیوی تو … بہت پسند … کی طرح رکھتی تھی۔ وہ ہم … کا خیال بھی رکھتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ایسے علاقوں میں … بہت ہوتی ہیں کیونکہ یہاں خوشحال لوگ رہتے ہیں اور … ایک کوٹھی میں جب بھی … والوں کو خبر ہوتی۔ لیکن اس نے کہا کہ چور اس گھر میں … نہیں جا سکتا۔ اس نے مجھے … بھی دکھایا تھا اور … ایسی خطرناک چیز کیوں ساتھ لیے پھرتے ہو تو اس نے کہا تھا کہ ٹرک ڈرائیور جو دور دور کا مال لیے پھرتے ہیں، انھیں اپنی حفاظت کرنی پڑتی ہے ورنہ چور ڈاکو لوٹ لیں۔"

"ویری گڈ۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اتنی ذہانت سے تمام منصوبہ بندی کرنا یقیناً دلاور کا کام ہوگا۔ کتنی خوبی سے انھوں نے اپنا آدمی اس گھر میں بٹھا دیا۔ انھیں سامنے کبھی نہیں آنا پڑا اور جو مقصد وزیر خان کی موجودگی میں حاصل نہ ہوا تھا وہ بہتر طور پر حاصل ہو گیا۔ ایک ایماندار اور اچھی شہرت رکھنے والے ریٹائرڈ ایڈیشنل سیشن جج پر کون شک کر سکتا ہے کہ اس کا گھر کسی ناجائز کاروبار کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ اگر بدقسمتی کے باعث کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی تو وہ صاف بچ نکلتے۔ دلدار عرف کبوتر غائب ہو جاتا اور ریٹائرڈ جج خود بے گناہی پیش کر کے بچ تو جاتا مگر یہ رسوائی بھی اس کے لیے کم جان لیوا نہ ہوتی کہ اس کا نام مشکوکوں میں شامل تھا اور نیک نامی کی عمر کا سفر تمام ہوا تو بدنام مجرموں کی طرح مشہور ہوا۔

"کبھی آپ نے اس سے پوچھا کہ وہ کس کا ملازم ہے؟" میں نے کہا کیونکہ خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگا تھا۔

"نہیں۔ اس کی مجھے کیا ضرورت تھی؟" وہ بولا۔ "اسے تنخواہ ملتی تھی اور پہلے مہینے اس نے کہا تھا کہ وہ کرایہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میں نے کہا کہ تم مجھے ایک چھوٹی سی نیکی سے محروم کرنا چاہتے ہو تو جاؤ کرایہ کا مکان کہیں اور لے لو۔ اس نے بہت معافی مانگی کہ وہ مجھے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"آپ کی بیوی کا انتقال کیسے ہوا تھا؟" میں نے کہا۔ "کیا وہ بیمار تھیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ان کی صحت قابل رشک تھی۔ عمر میں وہ مجھ سے دس سال کم تھی لیکن بیس سال چھوٹی نظر آتی تھی۔ میں تم کو ان کی تصویریں دکھاتا ہوں۔" وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دوسرے کمرے تک گیا۔ اس کی واپسی تک میں ان امکانات پر غور کرتا رہا جو میرے ذہن میں تھے۔ دو تین منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک ضخیم البم تھی۔

"اس میں ہماری سب تصویریں ہیں۔" وہ بولا۔ "شادی کے دن سے لے کر… اس کی آخری تصویر تک۔ ہمارے بچوں کی، ہمارے داماد کی … تم دیکھو۔ میں چائے بنا کے لاتا ہوں۔"

میرے بہت منع کرنے کے باوجود وہ چلا گیا اور میں نے البم کو پہلی تصویر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ ہر یادگار البم کی طرح اس میں کرم چند پال کی زندگی کے یادگار لمحے حنوط شدہ لاشوں کی طرح اصل حالت میں موجود تھے۔ پہلی … 1932ء کی تھی جس میں نوجوان … اور … کرم چند پال دولہا بنا اپنی بے حد حسین و جمیل بیوی کی بانہوں میں بانہیں ڈالے کھڑا تھا۔ اس نے بہترین سوٹ

www.paksociety.com

پچپن رکھا تھا اور تالی باندھ رکھی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی سجائی ہوئی تھیں۔ سفید لباس میں عروسی ہیں تھی اور وہ تمام تو بیاہتا جوڑوں کی طرح انتہائی پرجوش، مسرور اور ایک دوسرے کی رفاقت پر نازاں نظر آتے تھے۔ میں صفحے پلٹتا گیا اور وقت آگے بڑھتا گیا۔ جیسے نومولود کی تصویر۔ میں نے ان کی گود میں دیکھی تھی۔ اس لیے میں نے اپنے بچے کو گود میں لیے دیکھا۔ اس البم میں ان کی پوری زندگی کی کہانی محفوظ تھی۔ اور میں نے ایک عجیب سا کرب محسوس کیا۔ آدمی گھر کیسے بساتا ہے؟ اس عمر میں تنہائی کا دکھ اٹھانے کے لیے؟ وہی سب خوشیاں وہ اپنے بچوں میں بانٹتا ہے اور خود تہی دست رہ جاتا ہے اور کوئی اسے خوشی کی خیرات دینے والا بھی نہیں ہوتا۔ تو وہ رخت سفر باندھ لیتا ہے۔ یہ زندگی اسی طرح گزر رہی تھی۔ ہم کو اس سے خوشیاں حاصل ہوئیں اور ہم نے وہی خوشیاں آگے تقسیم کر دیں۔ ہم سے پہلے ہمارے والدین نے یہی کیا تھا اور ہمارے بعد ہمارے بچے یہی کریں گے۔

"معاف کرنا۔ میں ذرا کاہل ہوں۔" وہ چائے کا ایک مگ میرے سامنے رکھ کر بولا۔ "ایک تو مجھے یہی بڑھاپے کا مرض ہے لیکن ذیابیطس کی وجہ سے میں چل پھر نہیں سکتا۔ کبھی کبھی ہمت کر لیتا ہوں چائے بنانے کی۔"

"یہ تصویر کتنی پرانی ہے؟" میں نے کہا۔ "آپ کی بیوی کی وفات سے کتنا عرصہ قبل لی گئی تھی؟"

"شاید دو مہینے پہلے۔" وہ میرے ساتھ بیٹھ کر بولا۔ "تم نے دیکھا اس کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کو اتنی جلدی میرا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ اس نے بہت زیادتی کی میرے ساتھ۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ میں اس کے سہارے کا محتاج ہوں۔ اس کی مدد کے بغیر کیسے جیوں گا میں؟"

"آپ کو یقین ہے کہ انہیں کوئی بیماری نہیں تھی؟" میں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا اور تصویر پر نظر رکھی۔ "مریم کی صحت واقعی اچھی تھی۔ بعض اوقات بلڈ پریشر یا ہارٹ ٹربل کا پتا نہیں چلتا۔"

اس نے بڑے وثوق کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ "میرا ایک دوست تھا، ڈاکٹر کرپالی۔ معمول سرجن رہا اور ریٹائر ہونے کے بعد پریکٹس کرتا رہا۔ ابھی سال بھر پہلے انتقال ہوا ہے اس کا۔ وہ ہمارا فیملی ڈاکٹر تھا۔ زبردستی مجھے اور مریم کو ہر چھ ماہ بعد چیک کیا کرتا تھا۔ کہتا تھا تم اس عمر کو پہنچ چکے ہو جہاں یہ ضروری ہے۔ اس نے سب سے پہلے بلڈ شوگر لیول زیادہ ہونے پہ مجبور کیا تھا اور میرے کھانے پینے پر پابندی لگا دی تھی۔ شکر میں بہت پسند کرتا ہوں۔ میں سب کچھ کھاتا پیتا رہا لیکن بھی ہے۔ وہ جھنجھلاتا اور نتیجتاً یہ بھی نکلا کہ ذیابیطس کا روگ لگ گیا۔ ویسے بھی میرے خاندان میں موروثی ہے۔ یہ بیماری [illegible] بالکل صحت مند تھی۔ اس کا بلڈ پریشر کئی سال پہلے تھوڑا سا زیادہ ہوا تھا لیکن بہت جلد نارمل ہو گیا۔ دل ذرا بھی [illegible] تو سب سے پہلے کرپالی کو فکر ہوتی۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ اس صحت کو برقرار رکھو مریم! ضروری نہیں کہ آدمی بوڑھا ہو تو بیمار بھی ہو۔ وہ یورپ اور امریکہ کی مثالیں بہت دیتا تھا جہاں لوگ عمر [illegible] کے زیادہ قائل ہیں۔"

"اس کے باوجود آپ کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ کیا انہیں کبھی [illegible] نے آ لیا تھا؟"

کرم چند پال نے پھر ہولے سے انکار کیا۔ "بیگم [illegible] وہ بالکل تندرست تھی۔ وہ پیدل بازار تک گئی تھی اور شاید کچھ سیر سامان اٹھا کے لائی اور دو میل پیدل چل کے لوٹی تھی۔ رات کو سوتے وقت یہ شکایت کی کہ اس کا دل گھبرا رہا ہے۔"

"کیا سونے سے پہلے وہ کچھ کھانے کی عادی تھیں؟" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ وہ ملٹی وٹامن کی ایک گولی کھاتی تھی۔" وہ بولا۔ "دودھ کا ایک گلاس پیتی تھی۔ ہم دونوں ہی دودھ پیتے تھے۔ ہمارا پرانا معمول تھا کہ ہم رات کو کھانا نہیں کھاتے تھے۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟" میں نے بے چینی سے کہا۔ "جب انہوں نے شکایت کی...."

"ہاں میں نے کہا تم آرام کرو۔ بدہضمی سے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔ "یا تھکن کی وجہ سے۔ تم کو کیا ضرورت تھی گوشت سبزی اور پھل لینے کے لیے خود جانے کی اور اتنا وزن اٹھا کے آنے کی۔ دلدار لا دیتا۔ اور کیا واپسی میں سواری نہیں مل سکتی تھی؟ وہ کہنے لگی 'دلدار نے تو مجھے معذور کر کے بند کر دیا ہے گھر میں۔ سارے کام تو وہ کر رہا ہے مجھے بھی تھوڑا بہت چلنا چاہیے۔' خیر۔ اس کے بعد وہ سو گئی۔ لیکن صبح تک وہ خدا کے پاس پہنچ گئی تھی۔ میں نے اسے جگانے کی کوشش کی تب مجھے معلوم ہوا۔"

"اور آپ نے اس کی موت کو طبعی سمجھ کے قبول کر لیا؟" میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"نہیں طبی اعتبار سے نہیں کیونکہ اس نے [illegible] لیکن یہ دل بہت ناقابل اعتبار چیز ہے۔ اس کا دل دھوکا دے گیا۔" وہ بولا۔ "چلتے چلتے اچانک بند ہو گیا۔"

"کس نے کہا تھا یہ آپ سے؟ آپ نے کسی ڈاکٹر کو دکھایا تھا یا پوسٹ مارٹم رپورٹ لی تھی؟" میں نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ ڈاکٹر آتا تو کیا کرتا؟ وہ زندہ کر دیتا اسے؟" وہ برہمی سے بولا۔ "اور پوسٹ مارٹم کیوں کراتا میں؟ اس لیے کہ موت پراسرار حالات میں ہوئی تھی؟"

"آپ کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ دل بہت ناقابل اعتبار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی تمام سائنسی ترقی کے باوجود اس سے زیادہ پائیدار مشین نہیں بنا سکا۔ دل کبھی کسی وجہ کے بغیر اچانک جواب نہیں دیتا۔ دل تو اپنی خرابی کی اطلاع بہت پہلے دے دیتا ہے۔ اور اگر آپ کے دوست ڈاکٹر کرپالی نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ان کا بلڈ پریشر زیادہ ہے یا ان کے دل کی کارکردگی میں خلل ہے تو میں یہ نہیں مان سکتا کہ ان کی موت حرکت قلب بند ہونے سے واقع ہوئی تھی۔"

"آخر تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟" وہ چلایا۔

"میں معافی چاہتا ہوں سر! لیکن آپ ایڈیشنل سیشن جج تھے۔ آپ نے عدالت کی کرسی پر بیٹھ کے قتل کے بے شمار مقدمات کی سماعت کی ہوگی۔ لوگ کس کس طرح قتل کرتے ہیں، مجھے یہ آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں لیکن آپ مجھے یہ بتائیے کہ اس حالت میں آپ نے موت کو طبعی کیسے مان لیا؟ آپ کو شک کیوں نہیں ہوا کہ انہیں قتل...."

"شٹ اپ.... شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔" وہ کھڑا ہو کے چیخنے لگا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔ "میں مریم کے بارے میں ایسی بات سنتے ہو میرے سامنے۔ وہ فرشتہ سیرت عورت تھی جس نے کبھی اپنی زبان سے کسی کا برا نہیں چاہا۔ وہ سب سے محبت کرنے والی عورت۔ غمگسار اور نیک دل۔ اسے کون قتل کرے گا؟ یو ایڈیٹ۔ تمہارے دماغ میں یہ بے ہودہ خیال آیا کیسے؟ میں کہتا ہوں نکل جاؤ یہاں سے۔"

"میں چلا جاؤں گا۔ لیکن مسٹر کرم چند پال!" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اس سے میرے یقین میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کسی نے ان کو قتل کیا تھا۔ ان کی ملٹی وٹامن کی گولیوں میں ایک گولی زہر کی رکھ دی تھی۔ یا ان کے دودھ کے گلاس میں زہر ڈال دیا تھا اور یہ کام کسی ایسے شخص نے کیا تھا جو آپ دونوں کے معمولات پر نظر رکھتا تھا۔ وہ آپ کو بھی قتل کر سکتا تھا۔ اس کی بلا سے آپ دونوں مر جاتے۔"

"لیکن کیوں؟ کسے کیا مل سکتا تھا کسی کی جلدی موت سے؟" وہ ایک دم بیٹھ گیا۔ "ہم تو پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ ہمارا جو کچھ ہے وہ ہماری بیٹیوں کا ہے اور ہمارے داماد بھی ایسے نہیں ہیں۔ وہ بہت نیک لوگ ہیں اور محنت کی کمائی کھاتے ہیں۔ میں جانتا ہوں وہ لالچی نہیں ہیں۔"

"میں نہیں چاہتا کہ آپ ان پر شک بھی کریں۔" میں نے کہا۔ "میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ مریم کا کوئی دشمن نہیں تھا اور وہ فرشتوں کی طرح نیک تھی مگر کرم چند پال! کیا شیطان ایسے ہی لوگوں کو ستانے سے نہیں چوکتا؟ میں اپنے والد کے بارے میں بھی کہنا پسند کرتا ہوں کہ وہ بڑے ایماندار، خدا ترس اور نیک آدمی تھے مگر ان کو قتل کر دیا گیا۔ خیر یہ بات پرانی ہو گئی۔ لیکن جس بات نے مجھے واپس آنے پر مجبور کیا وہ آپ کو خطرے سے خبردار کرنا تھا۔ میری زندگی تو ہمیشہ خطرات میں گھری ہوئی ہے لیکن آپ نے مجھ سے بھی آج کی اس ملاقات کا یا ان باتوں کا کسی کے سامنے حوالہ دیا تو خود آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ مریم کو قتل کرنے والوں نے آپ کو اس لیے بخش رکھا ہے کہ آپ ان کے لیے بے ضرر ہیں۔ آپ کہیں کہ ہم یہاں نہ آئے، آپ سے ملے اور آپ نے ہمارے بارے میں کوئی بات کی۔ آپ نے کبھی کسی کو اپنا سمجھ کے بھی یہ بات نہ کہیں۔ خواہ اس پر آپ کا اعتماد اپنی ذات پر اعتماد سے زیادہ ہو۔ ورنہ وہ آپ کو بھی قتل کر دیں گے۔ سنا آپ نے؟"

"گیٹ آؤٹ۔ تم پاگل ہو گئے ہو۔" وہ پھر چلانے لگا۔ "تمہارا دماغ خراب ہے تمہارے بھائی کی طرح۔ تم خود کو جینئس دماغ کا سمجھتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ...."

اس کی بات سنے بغیر میں واقعی آؤٹ ہو گیا۔ مجھے اب احساس ہو رہا تھا کہ میں نے اس گھر میں قدم رکھ کر غلطی کی تھی۔ [illegible] کا کیا بھروسا۔ وہ میرے منع کرنے کے باوجود یہ بات کسی سے کرے گا کہ آج دو پاگل بھائی آئے تھے، امیر خان اور کبیر خان۔ کہتے تھے کہ ہم وزیر خان کے بیٹے ہیں۔ اور ان میں سے جو بڑا تھا وہ بڑا پاگل تھا۔ کہتا تھا مریم کو کسی گھر کے آدمی نے قتل کیا تھا اور اب وہ مجھے بھی قتل کر دے گا۔ وہ بہت ہنسے گا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مریم کے بعد دلدار کا ایجنٹ دلدار صرف کبوتر اس بوڑھے کی گردن [illegible] لگا دے گا۔ خود بوڑھے کی بیٹیاں [illegible] وہ اسی دن مر گیا تھا جس دن ہماری ماں کا انتقال ہوا تھا۔ اور اس خبر کی [illegible] ان کو ذیابیطس کا پرانا عارضہ بھی تھا چنانچہ یہ قتل بھی طبعی موت کا نام پا جائے گا۔

میں غصے میں تیز تیز چلتا گیا۔ غصہ مجھے اب خود پہ بھی آ رہا تھا۔ آخر مجھے کیا ضرورت تھی یہ مکان اپنے نام سے خریدنے کی۔ اگر یہ راز فاش ہو گیا کہ اب اس کا مالک کون ہے تو کیا اسے قبضہ نہیں کر دیا جائے گا؟ شاید دلدار [illegible] باقی سب وہ معلوم کر لے گا۔ میرے قدم اچانک ایک آواز پر رک گئے۔ ایک بچہ چلا چلا کر شام کا اخبار بیچ رہا تھا۔ "مشہور [illegible] دلدار کا قتل" [illegible] میں نے جھپٹ کر بچے کے ہاتھ سے اخبار چھین لیا اور اس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھ دیا۔

www.paksociety.com

خبر بالکل نمایاں اور مکمل تھی۔ شہ سرخی اس لیے نہیں بنی تھی کہ چوہدری دلاور ایک مقامی صنعت کار تھا اسے ملک گیر یا بین الاقوامی سطح پر وہ شہرت حاصل نہیں تھی جو کچھ عرصہ قبل پاکستان کی معیشت پر حاوی "بائیس خاندانوں" کو ملی تھی لیکن خبر میں سنسنی کا رنگ تھا اور قتل کی لرزہ خیزی تھی چنانچہ اسے نمایاں جگہ ملی تھی۔ دلاور کی زندگی یا موت میں میری دلچسپی کے اسباب بالکل مختلف اور عیاں تھے کیونکہ اس کی ذات سے براہ راست میری اپنی زندگی اور موت کے رنگین رشتے اور تنازعے منسوب تھے۔ ایسے چند اور بھی ہوں گے جن کے لیے دلاور کا جینا مرنا کسی اعتبار سے اہم تھا مثلاً اس کے خاندان میں شامل افراد یا اس کے کاروباری حریف اور حلیف اور دوست آشنا۔ لیکن میں یہ کبھی سمجھ نہیں پایا تھا کہ کسی بھی شخص کے قتل کی واردات میں غیر متعلقہ افراد کے لیے تجسس اور دلچسپی کے اسباب کیا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے قتل کی خبر سنسنی خیز کہلاتی ہے اور اخبار میں شائع ہو تو اعلان بن جاتی ہے۔ تمدن، تہذیب یا ازل سے آدمی کے ہاتھوں آدمی کا قتل ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ ہوس اور حسد کا وہ کمینہ جذبہ جو انسان کو شیطان کے ہاتھوں بے بس کر دیتا ہے آدمی کی سرشت میں شامل ہے۔ سڑک پر پیش آنے والے ٹریفک کے حادثات کی طرح قتل بھی روزمرہ کی زندگی کا جزو ہیں۔ اور جتنے افراد قتل کی وارداتوں میں یا حادثات میں ہلاک ہوتے ہیں اس سے کئی ہزار گنا زیادہ افسوسناک اور پر عذاب حالات میں دنیا سے رخصت ہوتے ہیں لیکن ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں دیتا اور کوئی جاننا نہیں چاہتا کہ وہ کیسے مرے اور کیوں مرے۔

دلاور کے قتل کی خبر کو بھی اخبار نے اور اخبار فروش نے زیادہ فروخت کا ذریعہ بنایا تھا اور اخبار خریدنے والے ایسے بھی تھے جو شاید دلاور کے نام سے بھی واقف نہ ہوں گے مگر قتل کے ساتھ سفاکانہ، بہیمانہ اور وحشیانہ کے الفاظ کا بے دریغ استعمال خبر کو مزید چٹ پٹا بنا دیتا ہے حالانکہ کسی بھی قتل کو شریفانہ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے آگ کو گرم کہنا مضحکہ خیز ہے کیونکہ آگ کے یخ بستہ ہونے کا تصور ہی نہیں۔ مگر اب میری طرح دوسرے لوگ بھی بڑے انہماک اور اشتیاق کے ساتھ خبر کی تفصیلات میں گم تھے کہ قاتل کون تھا؟ قتل کیوں ہوا؟ مقتول کیا تھا؟ پولیس کا نظریہ کیا ہے؟ اس کے ساتھ لواحقین کی آہ و بکا جو لاش پر گریہ کناں ہوں اور ممکن ہو تو ایک تصویر خون آلودہ لاش اور جائے واردات کے منظر کی۔ شاید یہ سب کچھ پڑھنے اور دیکھنے کے بعد لاشعوری طور پر آدمی یہ اطمینان قلب حاصل کرتا ہے کہ وہ خود سو فیصد زندہ ہے اور زندگی کتنی پرسکون، قیمتی اور اہم چیز ہے۔

اخبار بیچنے والا لڑکا میرے روپے پر تھوڑا سا حیران ہوا تھا اور پھر اسی خبر کو چلّا چلّا کر نشر کرتا روانہ ہو گیا تھا۔ اُسے زیادہ حیران ہونے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ اس نے فرض کر لیا ہو گا کہ میں دلاور کا کوئی قریبی عزیز ہوں جسے اس خبر نے دوسروں کے مقابلے میں شدید تر ذہنی صدمے سے دوچار کیا تھا چنانچہ دلچسپی کی حد تک متاثر ہونے والے اطمینان سے اخبار خرید کر قیمت ادا کرتے تھے تو میں نے اخبار جھپٹ کر چھین لیا تھا اور پانچ کا نوٹ پکڑا کر ایسا حواس باختہ ہوا تھا کہ باقی پیسے لینا بھی بھول گیا تھا اور یہ بھی بھول گیا تھا کہ میں سڑک کے درمیان میں کھڑا اخبار پڑھ رہا ہوں۔ پھر کسی شریف آدمی نے شانہ ہلا کر مجھے متوجہ کیا اور ہٹ جاؤ سڑک سے ہٹ کر جو فٹ پاتھ بنی ہوئی ہے اس پر اخبار پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ میں نے سر ہلایا اور چل پڑا۔

سرخی میں نے پڑھنے سے قبل ہی سن لی تھی۔ باقی تفصیلات کو ایک نظر ڈال کر ذہن میں نقش کر لینے کے بعد میں نے ہر لفظ کو غور سے پڑھا تھا۔ اخباری نمائندے اور پولیس کے اشتراک باہمی سے جو خبر بنی تھی وہ کچھ یوں تھی کہ رات کے وقت نامعلوم افراد نے چوہدری دلاور کو ان کی خوابگاہ میں گھس کر قتل کر دیا۔ قاتل نے کلہاڑی سے پے در پے وار کیے اور سر کے ٹکڑے کرنے کے بعد کلہاڑی وہیں چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ چوکیدار نے جسے پولیس نے سب سے پہلے گرفتار کیا تھا یہ بیان دیا کہ دلاور کے افراد خانہ راولپنڈی گئے ہوئے تھے اور ان کا پروگرام مری جا کے اسنو فال دیکھنے کا تھا لیکن سخت سردی کے باوجود اسنو فال کے لیے موسمی حالات سازگار نہیں ہوئے تھے چنانچہ وہ کسی عزیز کے گھر بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ برسنے کے قابل بادل برف کے گالے بن کر گرنے لگیں تو وہ مری جائیں۔ چوکیدار کو علم نہیں تھا کہ راولپنڈی میں وہ کہاں ہوں گے۔ اس نے کسی کو بھی بنگلے میں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا اور (پولیس کی حوصلہ افزائی کے باوجود) یہ اعتراف نہیں کیا تھا کہ وہ نشہ کرتا ہے یا رات کو حرام خوری کرتا ہے اور سو جاتا ہے۔ چوکیدار نے پورے وثوق کے ساتھ بیان دیا تھا کہ اس نے کوئی شور نہیں سنا۔ کسی کے اونچا بولنے، مار پیٹ کرنے یا چیخنے چلانے کی آواز نہیں آئی تھی اور کوئی کھڑکی یا دروازہ کھلا نہیں دیکھا حالانکہ وہ ہدایات کے مطابق رات بھر کوٹھی کے گرد پھرتا رہا تھا۔ اس نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ چوہدری دلاور جیسے شریف اور بااخلاق آدمی کا دشمن کوئی نہیں ہو سکتا لیکن وہ خود صرف چھ مہینے پہلے ملازم ہوا تھا اس

لیے یقین کے ساتھ کچھ نہیں بتا سکتا کہ ان کے دوست کتنے تھے اور دشمن کتنے۔ وہ ان کی نجی زندگی کے معاملات سے باخبر ہونے کا دعوے کیسے کر سکتا ہے۔ وہ اور گھر کے دوسرے ملازم کتنے بھی قابل اعتماد کیوں نہ ہوں بہرحال ملازم سے زیادہ کچھ نہیں۔ واردات کی شب چوہدری دلاور نصف شب سے کچھ پہلے سوئے تھے تو ایک مخبر پولیس کے سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ اگر کوئی شخص کار میں چھپا ہوا تھا اور چوہدری صاحب کے ساتھ ہی گھر میں داخل ہو گیا تھا تو وہ کیسے جان سکتا ہے۔ وہ چوہدری صاحب کی گاڑی دیکھتے ہی دروازہ کھول دیتا تھا اور رات کو بھی اس نے گاڑی کے گزر جانے کے بعد گیٹ بند کیا تھا۔ اس نے چوہدری صاحب کو گاڑی پورچ میں روک کر اترتے اور اندر جاتے اس لیے نہیں دیکھا تھا کہ وہ گیٹ کو دھکیل کر مقفل کرنے میں مصروف تھا تاہم اس نے گاڑی کے رکنے کی اور دروازہ بند ہونے کی آواز ضرور سنی تھی۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ اکیلے آئے تھے یا ان کے پیچھے کوئی اور بھی تھا۔ دوسرے نوکروں کے متعلق اس نے بتایا کہ مالی صبح آتا تھا اور شام ہونے سے پہلے اپنے گھر لوٹ جاتا تھا۔ اس کا گھر کے اندرونی معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا چنانچہ اسے اندر جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ خانساماں ایک بوڑھا آدمی تھا جو اپنی بیوہ بہن کے ساتھ کئی سال سے اسی گھر میں مقیم تھا لیکن واردات کی شب وہ بھی گھر میں نہیں تھے۔ چوہدری صاحب نے ان کو بھی اپنی فیملی کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ چوہدری صاحب معمول کے مطابق صبح سورج نکلنے سے پہلے لان میں ٹہلنے نہیں نکلے تو وہ سمجھا کہ شاید رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے وہ صبح اپنے وقت پر نہیں اٹھ سکے۔ چوکیدار نے تسلیم کیا کہ چوہدری صاحب رات کو دیر تک جاگتے تھے اور ان کو نیند نہ آنے کی شکایت رہتی تھی۔ کچھ عرصے سے وہ چڑچڑے بھی ہو گئے تھے اور انھوں نے کسی وجہ کے بغیر چوکیدار کو ڈانٹا ڈپٹا تھا کہ وہ ہوشیار رہے اور اگر کبھی اس کی طرف سے غفلت کا ثبوت ملا تو اسے برطرف کر دیا جائے گا۔ وہ چوکیدار کو ہزار روپے ماہانہ دیتے تھے جو عام چوکیدار کو ملنے والی تنخواہ کے مقابلے میں دگنی تنخواہ تھی چنانچہ چوکیدار خود بھی نوکری کو برقرار رکھنے کے لیے بے حد مستعد رہتا تھا۔ چوہدری صاحب نے اسے ایک ریوالور بھی لے کر دے رکھا تھا اور کئی بار کہا تھا کہ خطرہ محسوس ہو اور وہ کسی غلط آدمی کو زبردستی یا ناجائز طور پر اندر داخل ہوتا دیکھے تو بے دریغ گولی مار دے۔ باقی معاملات کو وہ خود سنبھال لیں گے۔

صبح نو بجے تک چوہدری صاحب کی گاڑی پورچ ہی میں کھڑی رہی تو چوکیدار کو تشویش لاحق ہوئی کہ کہیں ان کی طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔ اندر سے تو وہ چلّا کر آواز دیتے تب بھی باہر سنائی نہ دیتی۔ اسی اندیشے کی وجہ سے وہ حکم عدولی کرتے ہوئے اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر اندر گیا اور چوہدری صاحب کے بیڈ روم کے دروازے تک پہنچا۔ اندر داخل ہونے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اس نے کھلے دروازے سے ٹیبل لیمپ کو روشن دیکھا۔ چوہدری صاحب فرش پر مردہ پڑے تھے اور ان کا خون قالین کے زرد رنگ پر پھیلا ہوا تھا۔ لاش کی حالت دیکھ کر وہ اتنا دہشت زدہ ہوا کہ پہلے تو خود بے ہوش ہو گیا۔ اسے چکر سا آیا جس کے بعد وہ دروازے کے قریب ہی گر پڑا مگر چند منٹ میں وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے کمرے کی طرف ٹیلی فون کرنے بھاگا۔ ٹیلی فون تو بیڈ روم میں بھی تھا مگر اس میں اندر جانے کا حوصلہ نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دوسرا ٹیلی فون ڈرائنگ روم میں ہے۔ وہ اندر کے معاملات کی خبر رکھنے میں غیر ضروری دلچسپی نہیں لیتا تھا مگر اسے خود چوہدری صاحب نے کئی بار ڈرائنگ روم میں بلایا تھا اس لیے وہ گھر کے نقشے سے واقف تھا اور اسے معلوم تھا کہ کون سی چیز کہاں ہے، اس لیے وہ ٹیلی فون کرنے ڈرائنگ روم میں گیا تھا۔ اسے ڈائریکٹری میں کوئی نمبر تلاش کرنا نہیں آتا لیکن چوہدری دلاور نے اسے پولیس اسٹیشن کا ٹیلی فون نمبر یاد کرا دیا تھا۔

ان تمام باتوں سے پولیس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ چوہدری دلاور کو کسی دشمن کا ڈر تھا چنانچہ اس نے غیر معمولی حفاظتی انتظامات کیے تھے اور اس کے باوجود وہ عدم اطمینان کا شکار تھا۔ اس منطقی نتیجے پر پہنچنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چوکیدار کے اندازے کے مطابق گھر میں کوئی بھی چیز ادھر سے ادھر نہیں ہوئی تھی۔ چوہدری دلاور کے ہاتھ کی بیش قیمتی گھڑی، اس کی ہیرے جگمگانے والی سونے کی انگوٹھی اور بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھے ہوئے سترہ ہزار روپے بھی محفوظ رہے تھے۔ کسی نے سیف کو توڑنے یا اس کا تالا کھولنے کی کوشش تک نہیں کی تھی اور سامنے رکھی ہوئی ہر قیمتی چیز چھوڑ دی تھی۔ کمرے کے اندر مزاحمت کے آثار ناپید تھے چنانچہ ڈکیتی یا چوری کو خارج از امکان قرار دے دیا گیا تھا اور یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ کسی جانی دشمن نے ان پر سوتے میں وار کیا اور قاتل اپنے جذبۂ انتقام میں وحشت اور جنون کا شکار تھا ورنہ وہ دوسرا وار نہ کرتا۔ سر تو کلہاڑی کے تیز دھار والے پھل کی پہلی ضرب سے ہی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہوگا مگر قاتل نے چہرے کا قیمہ کر دیا۔ اخبار نے ایک پولیس افسر کے حوالے سے لکھا تھا کہ چوکیدار بظاہر بے قصور معلوم ہوتا ہے اور اصل حقائق کا انکشاف تو چوہدری دلاور کی فیملی کے

www.paksociety.com

دیگر افراد کے بیانات اور مزید تفتیش کے بعد ہی ہوگا۔ لیکن ابھی جو مفروضہ پیشِ نظر شہادتوں کی بنیاد پر قائم کیا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ چوہدری صاحب کا کوئی جانی دشمن گھر سے یا باہر ان کی گاڑی کے پچھلے حصے میں چھپ کر ہتھیار یا اور سامان کے ساتھ اندر جا پہنچا یا وہ کوئی ایسا قابلِ اعتماد آدمی تھا جسے وہ خود اپنے ساتھ اندر لے گئے اور جسے چوکیدار نہ دیکھ سکا۔ اس شخص نے چوہدری صاحب کو قتل کرنے کے بعد انتظار کیا کہ چوکیدار اپنی جگہ سے ہٹے تو وہ باہر نکلے اور جب بالآخر چوکیدار اپنی تسلی کے لیے اندر گیا تو قاتل اطمینان سے باہر نکل گیا۔ اسے قتل کے سارے سراغ مٹانے اور اپنے ہاتھوں یا کپڑوں کو نظر آنے والے ہر داغ سے محفوظ رکھنے کے لیے کافی وقت مل گیا تھا۔

خبر تفصیلی ہونے کے باوجود نامکمل تھی اور اسی جملے پر ختم ہوئی تھی کہ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔ وقت کی کمی کے باعث اخبار والوں کو چوہدری صاحب سے منسوب پرانی باتیں اپنے قارئین کو یاد دلانے کا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اگلے دن اخبارات اپنی فائلوں سے گزشتہ واقعات کا چربہ پیش کریں گے تو اس میں کیا ہوگا۔ جانی دشمنوں کی فہرست میں سب سے اوپر میرا نام ہوگا۔ پھر میری کیس ہسٹری ہوگی۔ یہ تذکرہ ہوگا کہ چوہدری ولاور پہلے سے رحمت کباڑی نام کے ایک ڈرائیور کے قتل کے الزام میں ملوث تھے اور حال ہی میں انھیں انسپکٹر فرخ شیر کے قتل میں ملوث کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی، کرنے والے نے بروقت بندوبست کر لیا تو کل کے اخبارات مجھے شیطان بنا کے پیش کریں گے کہ برطانیہ میں قیام سے اب تک میں نے قانون شکنی کے کتنے ریکارڈ توڑے ہیں اور کس کس نوعیت کے سنگین الزامات میں اشتہاری مجرم کی حیثیت سے مطلوب ہوں۔ اس کے برعکس چوہدری ولاور کو فرشتہ سیرت ثابت کرنے کے لیے بتایا جائے گا کہ کس طرح وہ "خود ساختہ" یعنی اپنی ذاتی صلاحیت اور محنت کے بل پر ترقی کر کے اس مقام تک پہنچنے والے آدمی تھے۔ کتنے خدا ترس تھے، کتنے رحمدل اور فیاض تھے۔ کتنے یتیموں کو پالتے تھے اور کتنی بیواؤں کی مدد کر چکے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مدح و ستائش یوں بھی ہر مرنے والے کا حق بن جاتی سمجھا اور اگر کوئی بُرا کہے تو لوگ کہتے ہیں کہ مرنے والے کی نیکی بدی اس کے ساتھ گئی۔ اب کرو تو دعائے مغفرت کرو یا لواحقین کے لیے صبرِ جمیل کی دعا۔ اگر اس اہتمام کے لیے دولت بھی صرف کر دی جائے تو چوہدری ولاور جیسے شیطان بھی مرنے کے بعد انسان کہلاتے ہیں اور ان کی وفات کو ناقابلِ تلافی نقصان بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ عمر بھر جرائم(?) کرنے والے کے لیے نیک نامی کی سند خریدی جا سکتی ہے یہاں تک کہ ان کو جنتی قرار دینے والے بھی مل جاتے ہیں۔

لیکن مجھے چوہدری ولاور کے جنتی ہونے کی نہ خوشی تھی اور نہ اس کا افسوس تھا۔ میرے سامنے تو ایک ہی سوال تھا کہ یہ کس نے کیا؟ اور اس سوال کا جواب نہ ہونے کے باعث میرا ذہن یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اب کیا ہوگا؟ کیا واقعی قتل و خونریزی کی سنگین انتقام(?) داستان کا حرفِ آخر آ گیا؟ وہ طویل جنگ ختم ہوئی جس میں بلاتعداد بے گناہوں نے زندگی کی رزم گاہ میں جان کا نذرانہ دیا؟ ان میں سے کچھ ایک طرف تھے اور کچھ دوسری طرف لیکن بیشتر کسی طرف بھی نہیں تھے مگر یہ تو ہر جنگ کا المیہ ہے کہ اس میں سب سے زیادہ وہی کام آتے ہیں جو امن اور صلح کے فلسفے پر کامل اعتقاد رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جنگ کیا مسئلوں کا حل کرے گی۔ جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے۔ کون کب مرا؟ کیسے مرا اور کہاں مرا؟ یہ سب بے معنی ہو گیا تھا اور سوال صرف ایک رہ گیا تھا کہ کیوں مرا؟ بالآخر ولاور بھی مر گیا تھا اور اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اُسے قانون کے ہاتھوں نے تختۂ دار تک پہنچایا یا کسی مظلوم نے کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ مارا تو اسے ایک ہی بار جا سکتا تھا خواہ اس کی موت کتنی ہی ذلت آمیز اور عبرت آموز کیوں نہ ہو۔ اب صرف میں رہ گیا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ یکلخت سب بارِ ملامت میرے کاندھوں پر منتقل ہو گیا ہے۔ چوہدری ولاور نے انکار کیا تھا۔ وہ مر کے سبک سر ہو گیا تھا اور میں سرگراں کہ اب حساب دوں تو کیا اور جواب دوں تو کیسے کہ یہ سب کیا تھا؟ معرکۂ حق و باطل یا خیر و شر کی جنگ؟ خود کو زیادہ طاقتور، زیادہ خوش قسمت اور زیادہ چالاک شکاری ثابت کرنے کی کوشش۔ اگر انجام یہی ہونا تھا تو آغاز سے کیا حاصل تھا؟ اس کا معاملہ تو یومِ حشر پہ گیا۔ جب اپنا اپنا حساب رکھنے والے ولاور کا گریبان تھام لیں گے مگر اس دنیا میں صرف میرے وجود کا مسئلہ رہ گیا جس نے سارے مسائل کھڑے کیے تھے۔ ولاور چین سے قبر میں سوئے گا۔ میں بدستور آج کے قہر اور کل کے اندیشوں میں گرفتار رہوں گا۔ چھپتا پھروں گا اور بھاگتا رہوں گا کسی مقصد اور کسی سمت کے بغیر زندگی سے فرار کے عذاب کو جھیلتا رہوں گا اور سوچتا رہوں گا کہ اب اس ایم ڈبلیو ڈی کا کمپلکس کا کیا بنے گا جسے وزیر خان سے چھین لیا گیا تھا اور جس کا وارث میں تھا؟ اس کا وارث اب کون ہوگا اور وہاں اب کیا ہوگا؟ وہی جو پہلے ہوتا تھا یا وہ جو پہلے نہیں ہوتا تھا؟ رابعہ... جو گرفتہ(?) جذبات کی رو میں بہہ کر تباہ ہو جانے

...زاں۔ تو کہاں جائے گی؟ کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے۔ اس ٹھکانے ... ہے جہاں تو نے تنکا آشیاں بندی کی تھی۔ اس گھر کی دیواریں ... صرف وقت کے آسیب زدہ رہ سکتے ہیں جہاں وزیر خان ... اور اب وہ تمہارا بیٹا ریٹائرڈ زندگی گزار رہے والا تیشن(?) بچ بھی ... یہ جگہ رین بسیرا بند ہے نہ تیرا نہ میرا۔

میں نے محسوس کیا کہ میں بیٹھا رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میرے ... کی دنیا بے وجود ہو گئی تھی جس میں انسان چلتی پھرتی اور ... پرچھائیاں بن گئے تھے اور ٹریفک کے شور میں بھی ... سناٹا تھا۔ گرد اڑ رہا تھا اور شہر کو شہرِ خموشاں کی ویرانی نے ... ڈھک لیا تھا جیسے ہزاروں صدیوں کی تہذیب کو مٹی ... جاتی ہے۔ میں نے اخبار پھر کھول کر دیکھا جس کا ہر لفظ مجھے ... ازبر ہو گیا تھا اور زینے سے اتر کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ تب مجھے خیال آیا کہ پیدل جانے کے بجائے میں ٹیکسی میں جا ... ہوں اور کم وقت میں زیادہ محفوظ طریقے سے اور جلد ... پہنچ سکتا ہوں جہاں محسن اور ٹیڈی میری واپسی کے منتظر ... اس دشتِ تنہائی میں جہاں خیالات کی یلغار ... سجھائی نہ دیتا تھا یہ خیال کسی نشانِ منزل کی طرح تھا۔ میں ... تنہائی اور احساسِ بے چارگی کو کم ہوتے محسوس کیا۔ ہاں ... وقت مجھے رفاقت کی اور دستگیری کی ضرورت ہے۔ ان ... کی ضرورت ہے جو میرے یقین کو اور میرے اعتماد ... کر سکیں اور میں اس قابل ہو سکوں کہ اس نئی اور غیر متوقع صورتِ حالات کا جائزہ عقلِ سلیم کی مدد سے لے سکوں۔

ایک رکشا والے نے کمال مہربانی مجھے بٹھا لیا اور اس ... بہت ناراض ہوا کہ میں نے اسے روکنے کے بجائے ... کے سامنے آ کر بیٹھنے کا طریقہ کیوں اختیار کیا حالانکہ میں پریشان خیالی کے باعث فٹ پاتھ سے سڑک پر اترتے وقت ایک ... رکشے کے نیچے آنے سے گرا تھا مگر فوراً کھڑا بھی ہو گیا تھا۔ سفر کے دوران ... بھی اس نے اپنی لن ترانی جاری رکھی اور مجھے چند مفید مشوروں سے مفت نوازا۔ ان میں ایک یہ تھا کہ ... اپنی ساری پریشانیوں کی تفصیل ایک خط میں لکھ کر پیر ... ہزار روپیہ سوا روپے نقد اور سوا تولے چاندی کے ساتھ ... تو اسی رات بابا مذکور خواب میں نمودار ہو کے سارے ... کا حل بتا جائیں گے۔ غالباً میری صورت سے اتنا پریشان ... کہ وہ رحم کھانے پر مجبور تھا۔ وہ نان اسٹاپ بولنے کا ... اچھا تھا اس نے آخری وقت میں ان شکوک کا اظہار ... کیا کہ اسے میری صورت دیکھ کر ہول لگتی تھی۔ میں سمجھتا ... ابھی تک اس کے لاشعور میں یا تحت الشعور میں میری

اخبار میں شائع ہونے والی تصویر محفوظ ہے۔ اس سے پہلے کہ تصویر کا نقش شعور کے خانے تک پہنچتا، میں نے رکشا رکوایا اور اس کی روانگی کے بعد پیدل چل کے اور بینٹ(?) ہوٹل پہنچا۔

خلافِ توقع محسن کو اور ٹیڈی کو ابھی تک اس خبر کا علم نہ تھا جو ہمارے لیے اتنی ہی بڑی خبر تھی جتنی دنیا کے لیے آخری ایٹم بم گرائے جانے کی ہوگی۔ انھوں نے انتظار سے اکتا کر قیلولہ شروع کیا تھا کہ میں نے دستک دی۔ اس سے پہلے کہ وہ مناسب الفاظ میں مجھے خوش آمدید کہتے اور میرے ساتھ وہی سلوک کرتے جو میں نے ان کے ساتھ اپنے پرانے رباب رابعہ کے گھر میں کیا تھا، انھوں نے میری صورت کے جغرافیے پر غور کیا اور نقشہ بدلا ہوا دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو گئے۔

"کیا ہے عزیزم!" محسن نے کہا۔ "تم پہ چلی پلاؤ کی سی کیفیت ہے!"

"قسم اللہ کی سکندر بادشاہ! تمھارا چہرہ تو گھنٹا گھر بنا ہوا ہے، بارہ بجے ہوئے ہیں۔" ٹیڈی بولا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے ان کے سامنے اخبار پھینک دیا اور خود ایک بیڈ پر دراز ہو گیا۔

"مشہور صنعتکار چوہدری ولاور کا قتل۔" محسن نے زور سے پڑھا اور اس کے الفاظ پہ ٹیڈی یوں اچھلا جیسے ہر لفظ ریوالور سے نکلنے والی گولی تھا۔

"کیا؟ کس کا... کون...؟" اس نے گویا جھپٹ کے کہا۔ اخبار چھین لیا۔ محسن نے بلا ارادہ اسے ایک گالی دی اور اخبار پھر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ پھر محسن نے اس کی درخواست پر خبر کو با آوازِ بلند پڑھنا شروع کیا۔ میں سگریٹ سلگا کے خالی الذہن لیٹا چھت کو دیکھتا رہا جس پر گزرتے ہوئے وقت کی پرچھائیاں اسی طرح گزر رہی تھیں جیسے میرے خیالات... محسن نے خبر دوسری بار خاموشی سے اور زیادہ توجہ کے ساتھ دیکھا۔

"یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے یار..." اس نے طویل خاموشی کے ایک مضطرب وقفے کے بعد کہا۔

"اخبار میں وہی آتا ہے جو ہو جاتا ہے۔ اور اس میں کون سی نہ ہونے والی بات ہے؟" میں نے کہا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "یقین نہیں آتا کہ چوہدری ولاور جیسے لوگ اتنی آسانی سے قتل کیے جا سکتے ہیں۔"

"قاتل بھی اس کی خواب گاہ تک اتنی آسانی سے نہیں پہنچا ہوگا جتنی آسانی سے میں یہاں اس کمرے تک پہنچ گیا۔" میں نے کہا۔

"یار یہ... اتنا بڑا کارنامہ کون سرانجام دے سکتا ہے؟"

محسن بولا۔ "ہم سے بڑا بھی کوئی شکاری تھا جو اس کی تاک میں تھا۔ کون تھا وہ شکاری؟"

www.paksociety.com

"اصل شکاری تو قضا کا نامہ بر ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ جسے شکار کرنا چاہے کر لیتی ہے۔ اُسے بہانوں اور وسیلوں کی کمی نہیں۔ ہم کس زعم میں اس کی جان کے طلبگار بنے پھرتے تھے۔"

"پھر بھی سوچنے کی بات ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ دلاور اس کی دوستی کس سے ہے اور دشمنی کس سے۔ میں اسے کاروباری رقابت کا نتیجہ نہیں سمجھتا۔ وہ لوگ جذباتی ہو کے قتل نہیں کرتے۔ ان کے لیے آدمی کی حیثیت مشین کے ایک پرزے کی ہے جو صحیح کام کرتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ بدل دیا جاتا ہے۔ ایسے بدلنے کے لیے وہ کوئی خاص تردد نہیں کرتے اور کوئی پریشانی مول نہیں لیتے۔ ریوالور کی ایک گولی سے سر میں ایک سوراخ کر دینا کافی سمجھتے ہیں اور وہ نعش پھر سڑک پر پڑی ہے یا مردہ خانے میں، وہ بھول جاتے ہیں اور اپنا کام کرتے ہیں۔ یہ تو کسی نے اس کے لہو سے انتقام کی پیاس آگ ٹھنڈی کی ہے۔ اور وہ آگ اتنی شدید تھی کہ تھوڑے سے خون سے نہیں بجھ سکتی تھی جو ایک جان لینے والی گولی کے زخم سے بہتا ہے۔ اس نے دلاور کو اتنی بار قتل کیا کہ اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نکل جائے اور ایک نظریہ میرا یہ بھی ہے کہ اس قاتل نے خنجر سے دل پہ وار نہیں کیا اور ریوالور کی سب گولیاں سینے میں نہیں اتاریں۔ اس نے ایک شیطانی دماغ کو نیست و نابود کیا۔ جسم کے اس حصے کو تباہ کیا جو اس کے خیال میں سب سے زیادہ مجرم تھا۔"

محسن کی بات نے مجھے متوجہ کر لیا تھا۔ اس کی توجیہ جذباتی نہیں عقلی تھی اور اس کی سوچ کا انداز میری سوچ کے مقابلے میں زیادہ ٹھوس اور منطقی تھا۔ "تیرے خیال میں ایسا شخص کون ہو سکتا ہے؟ ہمارے علاوہ؟" میں نے کہا۔

"میرے ذہن میں سب سے پہلے الف دین کا نام آتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اسی جنون کی کیفیت میں وہ فتح شیر کا سر کاٹ گیا تھا۔ طاقت کے ساتھ ہونے والے سلوک اور اس کی لاش پر ڈھائے جانے والے غیر انسانی مظالم کے ذکر نے اس کا دماغ الٹ دیا تھا۔ اس کی وحشت فتح شیر سے بدلہ لے کر کم نہیں ہوئی تھی۔ دیوانے کے دماغ میں ایک خیال سما جائے تو اسے کون سمجھائے۔ اس کی اپنی عقل سو فیصد یقین کے ساتھ خود کو حق بجانب قرار دیتی ہو تو وہ دنیا کی کیسے سنے۔ اس نے بیوی بچوں کے ساتھ فرار اختیار کیا تو صرف اس لیے کہ کہیں جذباتی رشتوں کا خیال اس کے ارادوں کو کمزور نہ کر دے۔ ایسے لوگ بہت خطرناک ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پاگل ہو جاتا تو پہلے سب رشتوں کو ختم کرتا پھر دلاور کو اور اس کے بعد اپنے آپ کو۔ مگر وہ پاگل نہیں ہوا تھا صرف ایک خیال سے مغلوب ہو گیا تھا چنانچہ اس نے عقل کی ساری سپاہ کو ایک محاذ پر مجتمع کر لیا اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو [illegible]۔ جیسے طاقت کے قاتل نہیں پکڑے گئے تھے ایسے ہی دلاور کے قاتل کو کبھی کوئی نہ پکڑ سکے گا۔ طاقت کا جسد خاکی بھی سامان عبرت بنا تھا اور دلاور کو بھی اس نے تماشائے عبرت بنا دیا۔"

"شاید تو ٹھیک ہی کہتا ہے!" میں نے کہا۔ "دشمن تو بہت تھے دلاور کے مگر ان میں الف دین کوئی نہ تھا۔ الف... اسی لیے یہ جرم خود بخود ہی اس کے نام لکھا جائے گا۔" محسن گہری [illegible] سے بولا۔ "الف دین کو بھلا کون جانتا ہے۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ الف دین نے ہمارے لیے ملامت کے در بند کر دیے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر دلاور زندہ رہتا تو شاید کسی دن ہم اسے دنیا کی عدالت میں بھی ثبوت اور شہادتوں کے ساتھ گھسیٹ لاتے اور خود اس کی زبان سے اعتراف کرا لیتے کہ مجرم کون تھا۔ اب تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔"

"میرا ذہن اس خبر کے بین السطور کچھ اور پڑھ سکتا ہے۔" محسن نے پھر اخبار پہ نظر جما کے کہا۔ "یعنی وہ بات سطروں کے بیچ میں جس کا ذکر نہیں ہے۔"

"ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نہ ہم ذہنی ہیں نہ منصف۔"

"حقیقت ہمیشہ ایک ہوتی ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اس مختلف زاویے سے دیکھا جائے تو حقیقت بدل جائے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ تو ہو سکتا ہے کہ زاویہ نگاہ بدل جائے تو حقیقت کا ظاہری روپ بدل جائے لیکن حقیقت تو وہی رہتی ہے۔ زمین کی سطح پہ کھڑے ہو کر دیکھنے سے زمین گول نظر آتی ہے اور نہ گردش میں محسوس ہوتی ہے۔ خلا کی بلندی سے یہ گول چمکتا ہوا سیارہ لگتی ہے۔ کبھی آدمی مریخ سے دیکھے گا تو کچھ اور لگے گی۔"

"بجا ارشاد! اب اس خبر کا پوسٹ مارٹم کرنے سے پہلے خبر کی لاش پہ ایک نظر ڈالتے ہیں۔ کوئی خاص بات؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "خاص بات تو خود خبر ہے۔"

"کیا تو نے اس سے پہلے قتل کی کسی واردات کا اتنا تفصیلی ذکر پڑھا ہے؟" محسن نے کہا۔ "تو پھر کل آئے گا وہ اس سے بھی زیادہ ہو گا اور اس میں دلاور بحیثیت سکندر کیس کی قسطیں ایک خاص زاویے سے پیش کی جائیں گی۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ یہ قتل کی خبر نہیں، [illegible] کسی رپورٹر نے خاصی محنت سے تیار کیا ہے اور ظاہر ہے کوئی غیر ضروری محنت کرتا ہے تو بلاوجہ نہیں کرتا اسے معقول معاوضہ دیا گیا ہو گا۔"

"اس خیال یا مفروضے کی کوئی اہمیت نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اسے مسترد کرتا ہوں۔"

"تو مجھے یہ بتا کہ اس خبر میں تصویر کیوں نہیں ہے؟" محسن نے اخبار اٹھا کے کہا۔ "کیا اخبار والوں کو دلاور کی تصویر نہیں مل سکی تھی؟ عموماً مقتول کی تصویر بھی خبر کے ساتھ شائع ہوتی ہے خواہ مردہ حالت میں یا زخمی چہرے کے ساتھ۔"

"اس کیس میں چہرہ اس قابل ہی نہیں رہا تھا کہ تصویر سے شناخت کیا جا سکے۔" میں نے کہا۔ "تصویر اتارنے سے فائدہ کیا ہوتا۔"

"اصل بات اسی میں ہے نکتہ توجہ طلب ہے۔" محسن نے کہا۔ "اگر چہرہ شناخت کے قابل نہیں رہا۔"

ایک دم مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ "تو پاگل ہو گیا ہے؟ یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ دلاور کا چہرہ نہیں؟"

"کیا یہ ناممکن ہے کہ چہرہ کسی اور کا ہو؟" محسن نے کہا۔ "تو نے سوچا کیا یہ ناممکن ہے؟"

"ناممکن بھی ہے۔" میں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ "دلاور کی شناخت چہرے کے بغیر بھی ہو گئی ہے۔ پولیس نے ایسے ہی نہیں لکھ دیا کہ مشہور صنعت کار چوہدری دلاور کو قتل کر دیا گیا ہے... اخبار کا نمائندہ [illegible] ہے..."

"کس نے شناخت کیا ہے چوہدری دلاور کو؟" محسن نے [illegible] "اس کے چوکیدار نے اور اس نے شناخت کی بنیاد بنایا ہے علامات اور واقعات کو۔ چونکہ گزشتہ شب گاڑی میں چوہدری دلاور ہی آیا تھا اور لاش بھی اس کے بیڈ روم میں پائی گئی۔ اس [illegible] اس کی گھڑی انگوٹھی کے ساتھ تھا اور وہ لاش دلاور کے قد و قامت کے مطابق بھی ہے اس لیے وہ دلاور کے سوا کون ہو سکتا ہے اور کون چلے گا کہ [illegible] کمرے میں اسی کے کپڑوں [illegible] کیا ہوتا ہے؟ میں اگر چاہوں کہ [illegible] اس کے گھر میں اس کی خواب گاہ میں اسی کا [illegible] اور پھر [illegible] شناخت ممکن نہ رہے... تو یہ ہو سکتا ہے؟"

"یہ کیا فضول بکواس ہے!" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ نہیں [illegible]"

"لیکن اگر دلاور یہ چاہے کہ دلاور مر جائے تو ہو سکتا ہے۔" [illegible] آواز میں کہا۔

میں [illegible] ہو گیا۔ "تیرا مطلب ہے دلاور نے قتل کا [illegible] کیا ہے؟ وہ زندہ ہے اور اس نے کسی کو مار کر اپنی جگہ [illegible] ہے؟" میں نے کہا اور استاد ٹیڈی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"میرا بالکل یہی مطلب ہے۔ میری ساتویں حس کہتی ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔" محسن بولا۔

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے کے کولر سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ "مجھے سخت شک ہو رہا ہے کہ اگر میں پاگل نہیں ہوا ہوں تو پھر تو پاگل ہو گیا ہے۔ باقی دنیا ویسی ہی ہے جیسی تھی۔"

"باقی دنیا پاگل ہے جو اس خبر پہ یقین کر چکی ہو گی۔" محسن نے کہا۔ "میں نے ابھی تک اس میں سے سچائی کے پچاس فیصد عنصر کو خارج کر دیا ہے... یوں سمجھ لے کہ اس میں پچاس فیصد جھوٹ کو تلاش کر لیا ہے۔ یہ تو تو بھی تسلیم کر چکا ہے کہ حقیقت کبھی پچاس فیصد نہیں ہوتی۔"

"دلاور یہ ڈراما اپنے لواحقین کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا۔"

"بالکل ٹھیک۔ مگر لواحقین تو کسی نامعلوم جزیرے کے گھر میں ہیں۔" محسن بولا۔ "اور انتظار کر رہے ہیں کہ مری میں برف گلنی شروع ہو تو وہ آ کے جائیں۔ افسوس کہ وہ لاش کی شناخت کے لیے دستیاب نہیں۔"

"مگر آج نہیں تو کل انھیں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"چوکیدار ان پڑھ ہے۔ اس نے اخبار نہیں پڑھا تھا مگر مجھے معلوم ہے کہ کل سے مری میں برف پڑ رہی ہے۔" محسن بولا۔ "وہ واپس آ کے حیران یا پریشان ہو سکتے ہیں کہ انھیں یہ خبر نہیں ملی۔ مری کے اسنو فال میں اخبار نہیں پہنچتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چوہدری دلاور ان کے ساتھ ہی لوٹ آئے اور ان سے زیادہ حیران پریشان ہو کر میرے گھر میں میرے نام سے کوئی مقتول ہو گیا اور پولیس بعد میں یہ گتھی سلجھاتی رہے کہ وہ کون تھا جس نے ایسا کیا؟ اور کیا تو کیوں کیا؟ ظاہر ہے ان سوالات کا دلاور کیسے جواب دے سکتا ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ مری میں برف باری کا نظارہ کر رہا تھا۔"

"پولیس چوکیدار کو پیش کرے گی۔ کیوں سکندر بادشاہ؟" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"چوکیدار کہے گا سوری! مجھ سے شناخت میں غلطی ہو گئی۔" محسن ہنسا۔ "اور دلاور کہے گا سوری! میں تم کو بتا کے نہیں جا سکا۔ میں اپنی گاڑی دفتر میں چھوڑ گیا تھا۔"

"پولیس سوال کرے گی کہ آپ اپنی گھڑی اور انگوٹھی گھر پہ چھوڑ گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"دلاور جواب دے گا کہ میرے پاس تین گھڑیاں اور چار انگوٹھیاں ہیں۔ میں اگر ایک بھی نہ پہنوں تو میری مرضی۔"

www.paksociety.com

"آپ کے پیچھے سوال جواب کیسے جائیں گے؟ یہ نہیں بتایا گیا کہ دلاور کو اپنے قتل کا یہ ڈراما کر کے آخر کیا ملے گا؟" میں نے جلدی کر کہا۔ "کیا فائدہ ہو گا اُسے؟"

"یہ تو ایک جواری بھی نہیں جانتا کہ کچھ داؤ پر لگانے سے کیا ملے گا۔" محسن نے کہا۔ "لیکن فرض کرو ہم اس خبر پر یقین کر لیتے ہیں یا اس کی صداقت جاننا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے ہم میں سے کوئی دلاور کی کوٹھی کا رُخ کرے گا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اب سانپ مر گیا ہے تو بل میں انگلی ڈالنے سے کیا ڈرنا۔ ہم خود کو ماشاء اللہ بہت ذہین، چالاک اور بہادر بھی سمجھتے ہیں۔ ہم ہاتھ ملائیں گے ایک دوسرے کو مبارکباد دیں گے کہ جو ڈراؤنا بنتا تھا، مارا گیا اسی خوش فہمی میں۔ اور ہم اس خوشی کے علاوہ خوش فہمی میں اگر دلاور کے گھر کے قریب پھٹکے یا جنازے میں شامل ہوئے اور قبرستان گئے تو پکڑوانے والے ہمیں فوراً پکڑوا دیں گے۔ یہ تو بعد میں ثابت ہو ہی جائے گا کہ الحمدللہ چوہدری دلاور بخیر و عافیت ہیں۔ اس جال میں پھنس کر ہم بخیر و عافیت نہیں رہیں گے۔"

"تیری بات سے میں قائل ہو جاتا ہوں کہ یہ سب جھوٹ کا جال ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہاں جیتو کے صرف الفاظ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہ سچ ہے تب بھی اور جھوٹ ہے تب بھی۔"

"تصدیق تو یقیناً کرنی پڑے گی۔" محسن بولا۔ "لیکن ہم بھی جوابی چال سوچ سمجھ کر چلیں گے۔ وہاں دلاور کی جگہ کوئی اور مر گیا ہے تو ہماری جگہ بھی کوئی اور پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً اپنے مرزا غالب ہیں۔"

"غالب نے دلاور کو قریب سے نہیں دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے صرف ہم پہچان سکتے ہیں اور یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں کون کون ہمارے لیے چشم براہ ہے۔ استاد پیڈرو اور نواب خسرو جمشید گاما بھی ۔۔۔ اس کا منیجر اور دلاور کے سب دست راست۔ جب جنازہ چوہدری دلاور کا ہو گا تو یہ صورتیں تو ضرور نظر آئیں گی۔ خواہ وفات اصلی ہو یا نقلی۔"

"بس تو ایسا کرتے ہیں کہ ہم خود چلتے ہیں اور چوہدری صاحب کی آخری رسوم میں شرکت فرما کے ثواب دارین حاصل کرتے ہیں۔" محسن بولا۔ "ہمارا فقیروں کا ہم جنس غالب۔ تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں۔ اگر یہ دام ابھی ہمارے لیے پھیلایا گیا ہو گا تو سب شکاری چوکنے ہوں گے۔"

"جو تسلیم بجا لائیں گے اور کہیں گے کہ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔" میں نے کہا۔ "آخر شرافت اور مروت بھی کوئی چیز ہے۔ وہ سب قبرستان سے گھر چلے جائیں گے اور ہم پڑے رہ گئے۔"

"میں نے جو شعر ابھی پڑھا تھا اس پر دوبارہ غور فرمائیے۔" محسن بولا۔ "اس میں تماشائے اہل کرم کے ساتھ فقیروں کا بھیس بھی ذکر تھا۔ ہم ایسا بھیس بدل لیں گے کہ خدانخواستہ قضا بھی ہو تو ایک بار خود فرشتۂ اجل بھی دھوکا کھا جائے۔"

"لیکن بھیس بدلنے کا فن مجھے تو نہیں آتا۔ بس تھوڑا بہت ظاہری حلیہ بدل کے کام چلا لیتا ہوں۔ صورت بدلنا اتنا آسان نہیں۔ وہاں ہر نظر کو دھوکا دینا محال ہو گا۔"

"جیسے تو میک اپ صرف خواتین ہی شوقیہ کرتی ہیں۔" محسن بولا۔ "لیکن فلم اسٹیج اور ٹیلی وژن کی دنیا میں کچھ ایسے ماہر ہوتے ہیں جو میک اپ مین کہلاتے ہیں اور ایسا کمال فن رکھتے ہیں کہ بادشاہ کو فقیر اور فقیر کو بادشاہ بنا کے دکھا دیں۔ جوان کو بڈھا اور بوڑھے کو جوان کر دیں یہاں تک کہ ہم چاہیں تو اصلی چوہدری دلاور اور استاد پیڈرو کا ایسا نقش ثانی بنا دیں کہ خود دلاور اور پیڈرو چکرا جائیں اور مشکل میں پڑ جائیں کہ اصلی کون ہے نقلی کون۔"

"تو جانتا ہے کسی ایسے ماہر فن کو؟" میں نے کہا۔ "ایک بات مت بھول، فوراً سوچ کر یہاں جو کچھ ہم سوچ سکتے ہیں ہمارے دشمن بھی سوچ سکتے ہیں اور انکل رضوی بھی سوچ سکتے ہیں۔ انکل رضوی کو بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ ان کی نظر پروفیشنل کا ایکس رے کر سکتی ہے۔ وہ ہم سے پہلے وہاں پہنچیں گے کیونکہ وہ بھی کسی الف وین کو نہیں جانتے اور یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ یہ واردات ہم ہی کر سکتے ہیں۔"

"وہ دلاور کی موت پر یقین کر سکتے ہیں مگر نہیں یقین کر سکتے کہ اس قتل میں ہمارا ہاتھ ہو گا۔" محسن نے پورے وثوق سے کہا۔ "وہ ہماری فطرت سے واقف ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ ہم اپنے دفاع میں تو قتل کر سکتے ہیں لیکن کسی سوتے ہوئے شخص کو اتنی بے دردی سے ہلاک نہیں کر سکتے۔ ہم اتنے سفاک نہیں ہیں۔ تاہم ان سے وہاں ملاقات یقینی ہے۔"

"میرا خیال ہے ابھی تو لاش پولیس کے قبضے میں ہو گی۔" میں نے کہا۔ "وہ پوسٹ مارٹم کی قانونی کارروائی مکمل کریں گے۔ کیا یہ زیادہ آسان نہیں ہو گا کہ ہم اسپتال میں ہی چوہدری صاحب کے درشن کر لیں۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "پہلے وہاں جا کے دیکھتے ہیں کہ وارثوں میں سے کون آیا ہے اور لاش کون لے جاتا ہے۔ وہاں ناکامی ہوئی تو پھر گھر پہنچیں گے۔ وہ جنازہ کریں گے اور جنازہ رات سے پہلے نہیں اٹھائیں گے۔"

"رات ہونے میں کتنی دیر ہے۔ کیا اتنے کم وقت میں چہرہ بدلا جا سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"میں اپنے مرزا غالب پر انحصار کر رہا ہوں۔ وہ ہمارا مرشد ہے۔" محسن نے کہا۔ "اس کے فلیٹ میں چلتے ہیں یا اس کے اڈے سے معلوم کرتے ہیں۔ ویسے تو اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں اور کوئی وقت نہیں کہ کب کہاں ملے گا۔ پھر بھی کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔ ہمارا حرج نہیں۔"

"مجھے رابعہ سے بھی بات کرنی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس کی گاڑی کہاں ہے؟"

"وہیں کھڑی ہے۔" محسن بولا۔ "ہم اس کے قریب جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔"

"شہزادی کی گاڑی کو کہاں چھوڑا تھا؟" میں نے کہا۔

"اس کے گھر سے دو گلیاں چھوڑ کر۔ جب تک اسے مل چکی ہو گی۔" محسن نے کہا۔

"رابعہ کو بتا دیتے ہیں کہ ہم اس کی گاڑی استعمال نہیں کر سکے۔" میں نے کہا۔ "بہتر ہے وہ خود بھی گاڑی لینے نہ جائے۔ گاڑی کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوائے، پولیس پہنچا دے گی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ دلاور کے قتل کی خبر بھی اُسے مل چکی ہو گی۔ اسے یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ ہمارا پروگرام کیا ہے۔" محسن بولا۔ "اگر فطر سیدھا دلاور کے گھر چلی جائے تو اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ ایک مشہور آدمی کے جنازے میں کوئی بھی شریک ہو سکتا ہے۔"

"اگر رابعہ بھی کہیں سے میک اپ کر لے تو بہت سی باتیں ہو جائیں۔" میں نے کہا۔ "اس کو یہ بتانا ہے کہ ہم نے اپنے پرانے گھوڑے کا جلالہ کیا دیکھا اور اس سے پوچھنا ہے کہ وہ اپنا پیسہ اس گھر کو خریدنے میں کیوں ترجیح کر رہی ہے جس میں رہنا شاید ہمارے نصیب میں نہیں۔"

"نصیب کا لکھا کون جانتا ہے سکندر بادشاہ!" استاد جلدی نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "اب ہم کو ہی دیکھو۔ کل کہاں تھے آج کہاں ہیں۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی اور رابعہ کی نیت اچھی ہے تو نتیجہ بھی اچھا ہی نکلے گا۔"

باہر سے بہت اونچی آوازوں میں کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز نے مجھے متوجہ کیا۔ دو افراد کی آواز نمایاں تھی اور وہ نہ جانے کس بات پر جھگڑ رہے تھے مگر وہ بیا چھٹی حس جو انسانوں کو خطرات سے نمٹنے کے لیے قبل از وقت ہوشیار کر دیتی ہے، میرے کام آئی۔ "یہ شور کیسا ہے میاں خیرو جی؟" میں نے کہا۔

"میں دیکھتا ہوں!" خیرو جی نے دروازے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"اس ہوٹل کا منیجر میں ہوں۔" دروازہ کھلتے ہی آواز صاف سنائی دی۔ "میں بتا چکا ہوں کہ یہاں کوئی نہیں۔"

"ہمارے پاس وارنٹ ہے۔" دوسری آواز نے کہا۔ "بندہ نہیں ملا تو ہم چلے جائیں گے۔"

"عجیب تماشا ہے! جہاں دل چاہا وارنٹ لے کر گھس گئے۔ ایسے بھائی یہ شریفوں کا ہوٹل ہے۔ آپ لوگوں کا یہاں اس طرح تشریف لانا ہی بدنامی کا سبب بن جاتا ہے۔ میں تو کسی پولیس والے کو کرائے پہ کمرہ نہیں دیتا۔ اگر وہ وردی میں ہو تو صاف انکار کر دیتا ہوں کہ کمرہ خالی نہیں ہے۔" منیجر نے بے بسی سے کہا۔

"جس دن میں آؤں گا اس دن دیکھوں گا۔" دوسرے شخص نے گرج کر کہا۔ "سامنے کمرے خالی ملیں گے۔"

"ہاں ہاں! اپنے ساتھ توپ لے آنا۔" منیجر بولا۔ "جیل خانے کی گاڑی لے آنا مسافروں کو اس میں بھر کر لے جانا اور توپ چلا کے ہوٹل گرا دینا۔ مجھے پھانسی لگا دینا بیشک۔ تم لوگ سب کچھ کر سکتے ہو اور کرتے ہو۔ بادشاہت ہے تمھاری۔ اسی لیے تو شریف آدمی تمھارے سائے سے بھی دور رہنا چاہتا ہے۔"

"بک بک مت کرو۔ یہ دوسرا کمرہ کھلواؤ۔"

خیرو جی کے اشارے سے قبل ہی صورت حال مجھ پہ واضح ہو گئی تھی۔ پولیس وہاں کسی کو تلاش کرتی ہوئی پہنچی تھی۔ ابھی تک میں نے مجرم کا نام نہیں سنا تھا لیکن سب سے بڑا مجرم میں خود تھا۔ زیادہ امکانات اسی بات کے تھے کہ وہ میری گرفتاری کے وارنٹ لے کر آئے تھے۔ اگر وارنٹ کسی اور کے لیے تھے تب بھی میں محفوظ نہیں تھا۔ سامنے تو پولیس اپنی خوش قسمتی شمار کرتی کہ وہ چھوٹے مجرم کو پکڑنے گئے تھے اور ہاتھ آ گیا بڑا مجرم۔

"کمرہ کس کے نام پہ ہے؟" میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے، ٹیڈی کا نام کیا لکھوایا ہے۔"

"خواجہ نیک محمد۔" محسن بولا۔ "میر خان تو لکھوا نہیں سکتا تھا، میر خان بھی مجھے ٹھیک نہیں لگا تھا۔"

"پولیس تو یہاں بھی آ جائے گی سکندر بادشاہ!" ٹیڈی نے بدحواسی میں کہا۔

"کل کتنے آدمی ہیں باہر؟" میں نے کہا اور کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔

"تین تو پولیس والے تھے۔ رائفل لیے ہوئے۔" وہ بولا۔ "ایک تھانیدار قسم کی چیز تھا۔ ہوٹل کا منیجر تھا اور اس کے ساتھ دو بیرے تھے۔ آٹھ دس آدمی تھے۔"

"دروازے سے باہر نکلنے کی تو کوئی صورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "اب تم ذرا ہمت سے اور عقل سے کام لو۔ ابھی دروازہ بند رکھو اور ان کے دروازہ بجانے کا انتظار کرو۔ ہم یہاں

www.paksociety.com

بیٹھے ہیں تب تک؟"

"کیا مطلب؟" ٹیڈی نے بوکھلا کے کہا۔ "مقابلہ کرو گے ان کا؟"

"نہیں۔ جب وہ دستک دیں تو تم ظاہر کرنا کہ سوتے سے اٹھے ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم کھڑکی کے راستے باہر چلے جائیں تو پھر دروازہ کھول دینا۔ ان پر خفا ہونا کہ...."

"وہ میں کر لوں گا۔ لیکن تم کھڑکی سے کیسے نکلو گے؟ کمرہ تو چوتھی منزل پر ہے۔" ٹیڈی بولا۔

"تم ہماری فکر مت کرو۔ ہم پیراشوٹ کے بغیر بھی کود جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "پچاس فٹ کیا ہیں؟"

"تمھاری ہڈی پسلی سلامت نہیں رہے گی۔" ٹیڈی کا رنگ اُڑ گیا مگر میں دیکھ چکا تھا کہ کھڑکی سے سات فٹ نیچے ایک چھجا ہے جو تیسری منزل کے تمام کمروں کی کھڑکیوں کے اوپر سے گزرتا ہے۔ دو فٹ چوڑے اس شیلف نما سائبان کا مقصد بارش کو براہِ راست کھڑکی پر گرنے سے روکنا تھا لیکن ہوٹل میں رہنے والوں نے اسے کوڑے دان کے طور پر بھی استعمال کیا تھا اور ہر فاضل چیز جو سڑک پر یا کسی راہگیر کے سر پر نہیں گر سکی تھی وہ چھجے پر جمع تھی۔

"ہم لندن میں تھے تو پارٹ ٹائم سرکس میں یہی کام کرتے تھے۔" محسن نے کہا۔ اس کے اطمینان سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی فرار کے اس راستے سے واقف ہے۔

"وہ تو سو فٹ کی بلندی ہوتی تھی جہاں سے ہم کپڑوں میں آگ لگا کے چھلانگ مارتے تھے اور سیدھے پانی کے تالاب میں غڑاپ۔" میں نے کہا۔ "اب بھی ہم چاہیں تو یہ پیشہ اختیار کر سکتے ہیں۔"

"اس کمرے میں کوئی نہیں ہے۔" باہر سے منیجر کی برہم آواز آئی۔ "دروازہ مقفل ہے۔"

"مجرم باہر سے دروازہ مقفل کر کے اندر بیٹھ جاتے ہیں۔" زیادہ تجربہ کار اور خرانٹ انسپکٹر نے کہا۔

"بیٹھ جاتے ہوں گے مگر یہ ہوٹل ہے۔ جو کمرہ بک نہ ہو اس کی چابی میرے پاس رہتی ہے۔" منیجر بولا۔

"یار گولی مارو چابی کو۔ میں کہتا ہوں دروازہ کھولو۔" انسپکٹر نے گرم ہو کے کہا۔ "ورنہ میں حکم دیتا ہوں دروازہ توڑنے کا۔"

"ایسا بہادر تو مجھے نہیں لگتا تم سب میں سے کوئی۔" منیجر نے طنزیہ کہا۔ "لیکن دیکھ لو۔ میں چابی منگواتا ہوں۔ یہ دروازے کا نقصان بھرتے ہوئے تمھیں ہیں تھانیدار صاحب۔ مارو مگر اگر دل چاہتا ہے تو۔"

"تم ضرورت سے زیادہ بھونکتے ہو۔" تھانیدار مشتعل ہو کے بولا۔

"زبان سنبھال کے بات کرو۔" منیجر نے بڑی دلیری سے جواب دیا۔ "تم کو نہیں معلوم کہ یہاں کون کون آتا ہے اور اس ہوٹل کے مالک کسے جانتے ہیں۔ تم تو مجھے بھی نہیں جانتے لیکن میں تم جیسے دس انسپکٹروں کو جانتا ہوں جو یہاں آئے اور گئے۔ تمھاری تنخواہ سے زیادہ یہاں ایک ویٹر کو تنخواہ ملتی ہے مگر وہ ٹپ لیتے ہیں اور تم رشوت لیتے ہو۔"

"اچھی مہذب لڑائی ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"منیجر بھی سیر کے مقابلے میں سوا سیر ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہر ہوٹل کے منیجر کو نڈر اور منہ زور بننا پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اچھے خاصے ہوٹل کے مالک بااثر قسم کے بدمعاشوں کو ذمہ داری سونپ دیتے ہیں تاکہ ہوٹل میں امن و امان رہے۔ غلط قسم کے لوگ ہوٹل میں داخل نہ ہونے پائیں اور ہو جائیں تو کوئی غلط کام نہ کر سکیں۔ منیجر پولیس کی مدد کے بغیر ہی ان سے نمٹ لے ورنہ ہوٹل چلتا نہیں۔"

"اس کے علاوہ یہ لوگ پولیس کو پیسے دیتے ہیں۔ ہر تھانے کو اپنے علاقے سے اسی بات کا وظیفہ ملتا ہے کہ جہاں کسی ہوٹل کا غیر قانونی یا غیر اخلاقی دھندہ چلتا ہو وہاں قدم بھی نہ رکھیں۔" محسن بولا۔ "اور یہ لوگ جن کا کھاتے ہیں انھی پر غرّائیں تو کون برداشت کر سکتا ہے۔"

"غالباً اس ہوٹل کا منیجر ایسے لوگوں میں شامل نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "جو غلط کام نہیں کرتا وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔"

"ممکن ہے اس کو اپنے اور مالکوں کے اثر و رسوخ پر اعتماد ہو۔" محسن بولا اور اس کا ثبوت فوراً ہی مل گیا۔

"لو دیکھ لو۔ چادر جھاڑ لو۔ تکیے کے اندر دیکھ لو۔ میز کے خانوں میں جھانک لو۔" منیجر نے دروازہ کھول کے کہا۔

"تم قانونی کارروائی میں رخنہ ڈال رہے ہو۔ میں تم کو بھی گرفتار کر لوں گا۔" انسپکٹر نے دہاڑ کر کہا۔

"پھر کیا ہوگا؟" منیجر نے مسکراتے ہوئے کے انداز میں کہا۔ "ایک فون آ جائے گا تمھارے ڈی آئی جی صاحب کا تو تمھاری ساری اکڑفوں نکل جائے گی۔ میں ان سے فون پر بات کر چکا ہوں کہ تم شریف مسافروں کو پریشان کر رہے ہو۔ اخباری بیان دے دیا کہ سنا ہے تم نے مسافروں کے کمروں سے سامان اٹھایا ہے اور کسی مسافر نے تائید کر دی تو یہ وردی اور پھول اتر جائیں گے کندھے پر سے۔ مجھے تو مالک دس منٹ میں [illegible]

گے۔ میری اور تمھاری نوکری میں فرق ہے۔"

"دیکھو منیجر صاحب! ہماری بھی مجبوری ہے۔" انسپکٹر کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "ہمیں مخبر نے اطلاع دی ہے کہ اس نے ایک انتہائی مجرم سکندر بخت کو خود یہاں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ ہم تصدیق کیے بغیر کیسے رپورٹ دے سکتے ہیں کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ بعد میں اس نے کوئی ہنگامہ یا خون خرابہ کیا تو تمھارے لیے بھی پریشانی ہو گی اور ہمارے لیے بھی۔ اس ساتھ والے کمرے میں کون ہے؟"

"اس میں... خواجہ نیک محمد۔" منیجر نے غالباً رجسٹر سے تصدیق کر کے بتایا۔ انسپکٹر کی وضاحت کے بعد اس کا رویہ بھی مصالحت آمیز ہو گیا تھا۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا اور ہم دونوں کھڑکی کی طرف لپکے۔

"تم کھڑکی بند کرو اور پردے ڈال کے لائٹ بجھا دو۔" میں نے سرگوشی میں کہا اور ٹیڈی نے سر ہلایا۔ جیسے ہی پچھلے دروازے پر دستک ہوئی، محسن چوکھٹ سے لٹک کر نیچے اتر چکا تھا۔ میرے اترتے ہی ٹیڈی نے آواز پیدا کیے بغیر کھڑکی بند کر دی۔

میں اور محسن اب زمین سے چالیس فٹ اوپر دیوار سے چپکے کھڑے تھے۔ جس چھجے پر جما کے قدم رکھے تھے اس کی چوڑائی اتنی نہیں تھی کہ ہم اس پر سیدھے چل سکیں۔ بہت نیچے ہر قسم کی گاڑیاں آ جا رہی تھیں اور انسانوں کی بستی کھلونوں کی دنیا نظر آتی تھی۔ راہ چلنے والوں میں سے کوئی اوپر منہ اٹھا کے نہیں چل رہا تھا لیکن بہت سے لوگ دکانوں کے تھڑوں پر اور گھر کے چبوتروں پر بیٹھے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی سر اٹھاتا تو ہمیں دیکھ لیتا۔ اس کے علاوہ تنگ سڑک کے پار دو منزلہ سہ منزلہ مکان بھی تھے۔ یہ شام کا وقت تھا اور سردی بڑھ گئی تھی اس لیے چھت پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا اور کھڑکیاں بھی بند کر دی گئی تھیں۔ اس کے باوجود پہچانے دیکھے جانے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ میں نے محسن کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور وہ دیوار کے ساتھ ساتھ ہاتھ پھیلا کے سرکنے لگا۔ ہم دونوں میں سے کسی کو بلندی کے خوف کا نفسیاتی مرض نہیں تھا ورنہ چکر آ جاتا تو ہم پہلے بجلی کے تاروں کو شارٹ سرکٹ کرتے۔ برقی رو ختم ہوتے اور تار ٹوٹ کے گلیوں میں اندھیرا کرتے ہوئے سڑک پر گرتے تو ہماری ہڈیاں کچل کر سرمہ ہو جاتیں۔

ہم ساتھ والے کمرے کی کھڑکی تک پہنچ چکے تھے جب کسی نے نیچے سے چیخ کر کہا۔ "دیکھو شوٹنگ ہو رہی ہے۔ فلم کی شوٹنگ ہے؟" اور میں نے دیکھا تو نصف درجن کے قریب افراد اوپر منہ اٹھائے کھڑے تھے۔ میں نے ہاتھ لہرا کے اشارے سے سب خیریت ہے کا مفہوم واضح کرنا چاہا اور مسکرایا بھی مگر اتنے نیچے کھڑے ہوئے لوگ تشویش میں مبتلا تھے کہ ہم کون ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے بھولے بھالے قسم کے بھی ہوں گے۔ کچھ نے کہا ہو گا کہ پاگل ہیں اور خودکشی کرنا چاہتے ہیں اور کچھ یہی سمجھے ہوں گے کہ ہم بل ادا کیے بغیر ہوٹل سے فرار ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کوئی ہمارے اشاروں سے مطمئن نہیں ہوا اور دیکھتے دیکھتے وہاں اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ میں نے کھڑکی کے قریب پہنچ کر شیشے پر آہستہ سے مکا مارا۔ شیشے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ محسن نے زیادہ عقلمندی سے کام لیا اور ہاتھ پر رومال لپیٹ کر بہت زیادہ قوت کے ساتھ مکا مارا۔ چٹخنے کے بجائے شیشہ ٹوٹ کر اندر جا گرا اور اس کا چھناکا ہمیں بم کے دھماکے سے زیادہ محسوس ہوا۔ میں نے شیشے کے خلا میں ہاتھ ڈال کے چٹخنی کھولی اور کھڑکی کو تھوڑا سا دھکیلا لیکن اس کے پٹ مضبوطی سے ملے رہے۔ محسن نے دوسرے پٹ کی چٹخنی کھولی۔ نیچے سے مجمع اب اونچی اونچی آوازیں لگا رہا تھا اور یہ ضروری تھا کہ ہم فوراً اندر غائب ہو جائیں۔ نچلی منزلوں کے رہنے والے اس شور و غل پر متوجہ ہو چکے تھے اور اپنی اپنی کھڑکی سے سر نکال کے اوپر دیکھنے کی کوشش میں مصروف تھے لیکن ان کے اور ہمارے درمیان چھجا حائل تھا۔ تاہم ہوٹل میں مقیم کچھ لوگ یقیناً سمجھ چکے تھے کہ اوپر کوئی گڑبڑ ہے جدھر مجمع اشارے کر رہا ہے۔

محسن نے چوکھٹ تھام کر کھڑکی کو کندھے سے دھکیلا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ اوپر سے بھی دونوں پٹ چٹخنی لگا کے بند کیے گئے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہمارا کام بہت مشکل ہو جاتا۔ زیادہ طاقت صرف کر کے دھکا لگانے میں ڈر تھا کہ ہم اچھل کر پیچھے نہ جا گریں۔ دوسری مرتبہ کی کوشش سے اندازہ ہوا کہ پٹ کچھ جام ہیں۔ تیسری دفعہ دھکیلنے سے کھڑکی کھل گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں نے ہاتھوں سے چوکھٹ کو تھاما اور اندر اتر گیا۔ محسن میرے پیچھے پیچھے آیا اور میں نے فوراً کھڑکی بند کر دی۔

"لوگوں نے دیکھ لیا۔ یہ بہت برا ہوا۔" محسن بولا۔

"لوگوں سے زیادہ ہوٹل کی نچلی منزل پر رہنے والوں سے خطرہ ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ فون اٹھا کے کاؤنٹر پر کسی سے کہہ دیں گے کہ اوپر کیا ہو رہا ہے اور ہوٹل والے باہر نکل کر دیکھیں گے تو انھیں سب معلوم ہو جائے گا۔"

"پولیس ابھی ہوٹل میں ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ فوراً تاڑ لیں گے کہ اصل بات کیا ہے۔"

"پھر اب کیا کریں؟" محسن بولا۔ "ہم آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئے ہیں۔ اس کمرے سے کیسے نکلیں گے؟"

www.paksociety.com

"کمرے سے باہر نکلنا کیا مشکل ہے۔ کمرے باہر سے مقفل ہوتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "اندر سے تو چابی کے بغیر کھولے جاسکتے ہیں۔ ہوٹل سے نکلنا زیادہ مشکل ہو جائے گا۔"

"بس یہی ہوگئی تسلی؟" میں نے منیجر کی آواز سنی۔ "میں جو کہہ رہا تھا کہ اس نام اور حلیے کا کوئی آدمی میرے سامنے سے نہیں گزرا۔" اس کے ساتھ ہی بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور میں نے ڈور لاک کے سوراخ پہ آنکھ رکھ کے دیکھا تو وارنٹ لے کر آنے والے واپس جا رہے تھے۔ انسپکٹر اور منیجر کی تکرار جاری تھی لیکن اب الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ یہ آوازیں دور ہوتے ہوتے معدوم ہوگئیں تو میں نے آہستہ سے دروازے کے گول ہینڈل کو گھمایا اور کوریڈور میں جھانک کر دیکھا۔ میرا اشارہ پاتے ہی محسن آگے بڑھا اور ہم باہر نکل آئے۔ چند سیکنڈ بعد ہم نے پھر اپنے کمرے کا دروازہ بجایا، دروازہ فوراً کھل گیا۔ یوں جیسے ٹیڈی دروازے سے لگا کھڑا تھا۔

"تم نے پوچھے بغیر دروازہ کھول دیا؟" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تمہارے سوا اب کوئی آ ہی نہیں سکتا۔" ٹیڈی نے دانت نکال کے کہا۔ "میں دیکھ رہا تھا۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"کیا دیکھ رہے تھے تم؟"

"تالے کے سوراخ میں سے جھانک رہا تھا۔" ٹیڈی بولا۔

"اگر ہم پیچھے کود گئے ہوتے تو اتنی جلدی لوٹ کر کیسے آسکتے تھے؟" میں نے کہا۔

"اے سکندر بادشاہ! اب ہم بے وقوف ضرور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں جتنا تم ہمیں بناتے ہو۔" ٹیڈی بولا۔ "جب پولیس چلی گئی تھی تو میں نے کھڑکی کھول کے دیکھا تھا۔ اس وقت تم دونوں ساتھ والے کمرے میں گھس رہے تھے۔"

"یہاں خیریت! ہم تو سمجھے تھے مصیبت ٹل گئی لیکن نیچے لوگوں نے ہمارا سرکس مفت میں دیکھ لیا۔" محسن بولا۔

"ابھی پولیس نیچے پہنچ گئی تو انہیں پتا چلے گا کہ اوپر گڑبڑ ہے اور وہ باہر جا کے تفتیش کریں گے تو کوئی چشم دید گواہ بتائے گا کہ دو بازیگر کس کمرے سے نکلے تھے اور کدھر گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"پھر اب کیا کریں؟" ٹیڈی کا سارا اطمینان رخصت ہوگیا۔

"تم تو فوراً کھسک جاؤ۔" میں نے کہا۔ "باہر جاتے وقت چابی کاؤنٹر پہ چھوڑتے جانا۔ میں ویٹر کی وردی بدل کر نکلتا ہوں اور محسن کے ساتھ آتا ہوں۔ محسن لباس ہی بدل لے گا تو پہچانا نہیں جائے گا۔ تماشا دیکھنے والے دونوں کا حلیہ بتائیں گے تو یہ بھی بتائیں گے کہ انہوں نے کیا کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہم دروازہ مقفل کر کے آئیں گے... تم جاؤ۔"

"کہاں جاؤں۔ تم لوگ کہاں ملو گے؟" وہ گھبراہٹ کے ساتھ بولا۔

"رتن سینما کے اندر پورٹر و بیٹھے رہنا۔ ہم وہیں آجائیں گے۔" میں نے اسے باہر دھکیل دیا اور سوٹ کیس کھینچ کر بیڈ کے نیچے سے نکالا۔ محسن نے اپنے لیے جو لباس منتخب کیا وہ بالکل مختلف تھا۔ اس نے کریم کلر کی پتلون اور نیلی جرسی کی آستین کے دونوں جرسی پہن لی جس پر سفید اور سرخ آڑی دھاریاں تھیں اور سیاہ پتلون چڑھائی۔ اتنی دیر میں اپنے کپڑے اتار کے میں نے ویٹر کی سفید وردی پہنی جو مدت سے محفوظ پڑی تھی۔ اس ہوٹل کا نمبر اور مونوگرام نہیں تھا لیکن مجھے امید تھی کہ اس وقت پولیس کی موجودگی کے باعث جو افراتفری پھیلی ہوئی ہے اس میں کوئی میری صورت یا وردی کے بارے میں غور نہیں کرے گا۔ بڑی عجلت میں اپنے کپڑے سوٹ کیس میں بند کرنے کے بعد میں نے سوٹ کیس کو پھر بیڈ کے نیچے کیا اور کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں کوئی بے ترتیبی نہیں تھی اور میں اپنے حلیے سے مطمئن تھا۔ خدشہ تھا کہ کسی بھی وقت پولیس پھر دوڑتی ہوئی آجائے گی۔ میں کمرے سے ایک منٹ پہلے نکلا اور جب میں زینے سے اتر رہا تھا تو میں نے پولیس انسپکٹر کو دو سپاہیوں کے ساتھ اوپر آتے دیکھا۔ اسی وقت محسن کمرے سے نکلا اور اس نے دروازہ بند کیا۔ آٹومیٹک ڈور لاک سے کمرہ مقفل ہوگیا۔ میں سر جھکائے نیچے چلا گیا۔ بظاہری اطمینان کے باوجود میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میری آزادی اور اسیری کے درمیان کہیں ایک نامعلوم خطرہ آنے والا لمحہ حائل تھا۔ اگر اس لمحے میں کوئی بھی مجھے ایک نظر دیکھ لیتا اور میری صورت کے نقوش پر دھیان دیتا تو میں اسی زینے کے وسط میں پکڑا جاتا لیکن پولیس والے اپنی دھن میں اوپر جا رہے تھے اور کسی بھی ویٹر سے ان کو سروکار ہی نہ تھی۔ خود میں نے باادب باملاحظہ ہوشیار ہو کے انہیں راستہ دیا اور ایک کونے میں دبک گیا۔ وہ پیر کو زور زور سے پٹختے نکل گئے تو میں آگے بڑھا۔ ابھی مجھے محسن کی فکر تھی۔ وہ پولیس کو کوریڈور میں ملے گا اور پولیس کا کیا بھروسا کہ اسے پوچھ گچھ کے لیے روک لے مگر اس کا امکان بہت کم تھا کیونکہ چشم دید گواہوں میں سے کوئی ساتھ نہ تھا اور ساتھ ہوتا بھی تو صورت سے محسن کو نہ پہچان پاتا۔ چالیس فٹ نیچے کھڑے ہوئے لوگوں نے صرف کپڑوں کا رنگ دیکھا ہوگا۔ صورت ان کو کہاں نظر آئی ہوگی اور محسن اب بالکل مختلف کلر اسکیم میں تھا۔

آخری زینے پر قدم رکھتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا تو محسن نے مجھے انگوٹھے کو بلند کر کے "آل اوکے" کا سگنل دیا۔

زینہ اترا نیچے گیا اور ایک ویٹر کے نقش قدم پر چلتا ہوا کچن میں داخل ہوگیا۔ میرا تجربہ یہیں کام آیا۔ میں نے چائے کی ایک ٹرے اٹھائی اور اسے ہتھیلی پر جما کے کندھے کی طرف کرلیا۔ اس طرح میرا چہرہ جزوی طور پہ چھپ گیا۔ "یہ کہاں لے جا رہا ہے؟" کسی نے بلند کہا۔

"روم سروس، ایمرجنٹ آرڈر ہے۔" میں نے کہا اور برتنوں کی بھری ٹرے کے ساتھ باہر نکل گیا۔ کاؤنٹر کے قریب خاصی گرما گرمی تھی۔ منیجر کے پاس دو پولیس والے کھڑے تھے اور کوئی درجن بھر شوقین مزاج لوگ جو ہماری بازیگری کے چشم دید گواہ تھے منیجر وغیرہ آف تھا۔ گواہ مصر تھے کہ انھوں نے جو کچھ دیکھا وہ نظر کا دھوکا نہیں تھا اور سب متفق بیان پر قائم تھے چنانچہ سب کو جھوٹا بھی نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ وہ سب پولیس کے ساتھ ہاتھ بٹانا اور رضاکارانہ جذبے کے تحت آئے تھے مگر اب پھنس گئے تھے کیونکہ پولیس والے تفتیش مکمل ہونے تک واپس جانے کی اجازت دینے پر تیار نہیں تھے۔ انھیں تھانے جا کے بیان لکھوانا تھا اور اگر مجرم پکڑے گئے تو ان کو شناخت کرنا تھا اور شاید ہر پیشی پر حاضر عدالت ہونا تھا۔ جب تک مقدمہ چلے اللہ بیلی ہو۔ وہ سب نوجوان، جوشیلے اور ناتجربہ کار لوگ تھے جن کے لیے قانون کی مدد کر کے مصیبت میں گرفتار ہونے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ آئندہ وہ ایسی غلطی کبھی نہیں کریں گے اور کسی مظلوم کو قتل ہوتا دیکھیں گے تو آنکھیں بند کر کے گھر میں گھس جائیں گے، دروازے بند کر کے سو جائیں گے اور زبان بند کر کے بیٹھ جائیں گے۔ سمجھدار وہ ہوں گے جو تھانے جا کر بھی نامعلوم کا نذرانہ پیش کر دیں گے اور نجات پا کے اطمینان سے لوٹ آئیں گے۔

منیجر سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ہوٹل تباہ ہو چکا۔ بظاہر تو اس نے ہر مہمان سے بڑی شرافت اور شائستگی کے ساتھ زحمت دینے پر معذرت کر لی تھی اور کہا تھا کہ یہ اتفاقی معمولی ہے لیکن اب پولیس دوبارہ ہوٹل کو کھنگالنے پر آمادہ تھی اور مجرم کو برآمد کیے بغیر نکلنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ "معلوم نہیں کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔" اس نے ٹیلیفون اٹھا کے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو... ہیلو... ہاں... سر، آپ فوراً آ جائیں اور معاملے کو سنبھالیں... یہاں میری کوئی نہیں سن رہا ہے۔ نہیں، ابھی تک نہیں گئے... آپ فون کر دیں نا جی کسی سے مگر ذرا جلدی... وہ بہت گڑبڑ پھیلا رہے ہیں۔" اس نے دھڑ سے ریسیور کو کریڈل پہ مارا۔ غالباً اس نے مالکوں کو فون کیا تھا۔ اس وقت تک میں دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ اگر اس کے سامنے یہ مجمع نہ ہوتا تو وہ ضرور مجھے روک کر پوچھتا کہ چائے باہر کہاں جا رہی ہے مگر مجھے بڑا اچھا موقع مل گیا تھا۔

یہ اندازہ مجھے باہر نکلنے کے بعد ہوا کہ ہوٹل کو ہر طرف سے پولیس نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ان کے مسلح آدمی ہر گیٹ پہ کھڑے تھے اور ہر آنے جانے والے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ٹیڈی پہلے ہی نکل گیا تھا۔

میں ہاف سیٹ چائے کی ٹرے اٹھائے لوگوں سے بچتا بچاتا فٹ پاتھ پر چلتا گیا۔ اب میں محفوظ تھا اور کوئی مجھ سے نہیں پوچھ سکتا تھا کہ یہ چائے کہاں سے لائے ہو اور کہاں لے جا رہے ہو۔ اچانک میرا پیر ایک رسی میں الجھا جو کسی نے کینوس کے سائبان کو دو کانوں پہ پھیلانے کے لیے باندھی تھی اور اس کا ایک سرا فٹ پاتھ کے ساتھ لگے ہوئے کھمبے پہ لپیٹ دیا تھا۔ مجھ سے ایک قدم آگے چلنے والے نے رسی کو دیکھ لیا اور اس کے اوپر سے گزر گیا مگر مجھے اتنا وقت ہی نہ ملا۔ میں چائے کی ٹرے سمیت منہ کے بل گرا۔ کینوس کے اس تنبو کے نیچے ایک عوامی ہیئر ڈریسر سیلون تھا جہاں اس وقت خلیفہ جی ایک گاہک کے سر کی کھیتی صاف کر رہے تھے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر مراقبے کی کیفیت میں سر جھکا کے بیٹھنے والے گاہک کے آدھے سر پہ استرا پھر چکا تھا۔ برتن گرے تو غالباً چائے والی گاہک کے سر پہ الٹ گئی، ورنہ وہ اسی طرح خلیفہ کے سنوا اٹھتا۔ گرما گرم چائے نے اس کے نصف سر کو زیادہ متاثر کیا ہوگا جس کی کھال پہ بال نہیں بچے تھے۔ وہ دھاڑا اور قینچی کہاں گئی یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ خلیفہ کے ہاتھ سے نکل کر فٹ پاتھ پر چٹ سے گری اور میرے ساتھ ہی تنبو نیچے آ گیا۔ میری ٹھوکر نے رسی توڑ دی تھی۔ پھر بہت واویلا مچا۔ خلیفہ نے مجھے اندھا بیل اور بہت کچھ کہا اور میں نے خالص بیروں کی زبان میں جواب آں غزل عرض کیا۔ فٹ پاتھ پر سے یوں کراہتا ہوا اٹھا جیسے میری پسلیاں ٹوٹ جانے کے بعد میرا چلنا محال ہے اور اس کا ذمے دار خلیفہ ہے جس نے مجھے گرانے کے لیے رسی باندھی تھی۔ گاہک بار بار چلا رہا تھا اور سر پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ "ہائے مار ڈالا، بیڑا غرق... ہائے میرا سر سلگ رہا ہے... ارے او خلیفہ! اب میرا باقی سر تیرا باپ صاف کرے گا۔" لوگ کسی کے طرفدار نہ تھے اور آگ بجھانے کے تماشے کو طول دینے کے موڈ میں تھے چنانچہ وہ دونوں کو شہ دے رہے تھے اور ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔

جب میں خالی ہاتھ روتا بسورتا وہاں سے روانہ ہوا تو

www.paksociety.com

محسن بھیڑ میں سے میرے ساتھ ہو لیا۔ "شرارت کا کوئی وقت ہوتا ہے۔" اسی نے مجھے ملامت شروع کیا۔ "اس شریف آدمی کے آدھے گنجے سر پہ چائے کی کیتلی پھینکنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اگر میں نے پہلے سے دیکھ لیا ہوتا تو میں ہاف سیٹ چائے اس کی ہاف چندیا پہ ٹونٹی سے گراتا لیکن میں تو خود گر گیا تھا..."

میں نے کہا۔ "خلیفہ اگر ہوتا کوئی پہلوان تو اتنی آسانی سے نہ جانے دیتا۔ میرا مطلب ہے ہم کشتوں کے پشتے لگائے بغیر نہ نکل پاتے۔ مار دھاڑ سے تو ہم نے ہوٹل میں بھی گریز کیا تھا ورنہ وہ تھانیدار اور اس کے چار یار کیا تھے؟ اسی کو اٹھا کے لے جاتے۔"

"جیل سے تو نکلنا مشکل نہ تھا۔ لیکن مسئلہ وہاں سے سامان نکال لینے کا ہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔

"اب خواجہ نیک محمد کو فوراً واپس بھیج دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تاکہ شک نہ ہو۔"

* * *

خواجہ نیک محمد عرف استاد ٹیڈی بڑے انہماک کے ساتھ رنگین پوسٹر دیکھ رہے تھے۔

"میاں ٹیڈی!" محسن نے ان کو پیچھے سے یوں پکڑا جیسے باپ اسکول جانے والے بچے کو سینما ہال میں پکڑ لے۔ "یہ آخر کیا ہو رہا ہے۔ پرائی بہو بیٹیوں کی تصویریں دیکھتے ہو... وہ بھی سرِ عام..."

"ہاں! واقعی یہ تو بڑی غلط بات ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ابھی تم کچھ نہ کہو میاں خوش خوا واپس ہوٹل جاؤ۔ جاتے ہوئے اپنے ساتھ کچھ لیتے جانا چپل وغیرہ۔ معلوم یہ ہو کہ تم ذرا سی دیر کے لیے نکلے تھے۔"

"پولیس پھر سرگرمِ عمل ہے۔ ممکن ہے تم سے بھی پوچھے کہ اس کمرے سے ساتھ والے کمرے میں کون گیا تھا، کھڑکی کے راستے۔" محسن بولا۔

"انھیں کس نے بتایا؟" ٹیڈی نے پریشان ہو کے پوچھا۔

"بہت سے تماشائی جمع تھے نا انھوں نے پولیس کی مدد کی اور اب پولیس کی گرفت میں آ گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم ذرا گرم ہونا۔ کہنا کہ ابھی سو کے جاگا تھا۔ ذرا سی دیر کے لیے چپل لینے گیا تو یہ نیا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ یہ ہوٹل ہے کہ شادی شدہ آدمی کا گھر۔" محسن بولا۔ "پھر ہنگامہ کرنا کہ میرا بل بناؤ میں جاتا ہوں اور آئندہ کے لیے اپنی سات نسلوں کو وصیت کر جاؤں گا کہ حوالات چلے جانا مگر فلاں ہوٹل میں مت جانا۔"

ٹیڈی نے سر ہلایا اور روانہ ہو گیا۔ پھر پلٹا اور واپس آیا۔ "تم لوگ اسی جگہ ملو گے؟ سامان لے کر آنے میں آدھا پونا گھنٹہ تو لگے گا۔"

"تم ایسا کرنا کہ وہاں سے تو سامان اٹھا کے ٹیکسی میں روانہ ہو جانا مگر گھوم پھر کے واپس آنا اور ہوٹل ویسٹ اینڈ میں ... سے قیام کرنا۔ تھوڑا سا آگے ہے یہ ہوٹل۔ میں اور محسن رات کسی وقت تمھارے قریب ہی دوسرے ہوٹل میں آ جائیں گے۔ ... سمجھ لو۔ ابھی ہم ذرا کام سے جا رہے ہیں اور کام تمہیں معلوم ہے اس لیے واپسی کا کوئی وقت نہیں بتا سکتے۔ تم ... سے کھانا کھا لینا اور زیادہ انتظار مت کرنا۔ صبح ہم نہ ملیں تو تم رابعہ سے ملنے کی کوشش کرنا یا منظر سے ٹیلی فون پہ بات کر لینا۔ جاؤ ورنہ وہ تمھارے کمرے کا تالا کھول لیں گے۔"

فرسٹ شو کا ٹائم ہو رہا تھا چنانچہ اندر اور باہر بڑی گہما گہمی تھی۔ ایک شخص نے مجھے کندھے سے پکڑ کر ... کہ ... ہو گئی ہے اسے ہاف سیٹ چائے کے لیے انتظار کرتے ہوئے اور وہ ٹیلی فون کیبن نمبر دو میں ہے۔ میں سمجھا کہ خلیفہ نے ... باندھی ہوتی تو چائے اب تک تصویر بیچ جاتی اور اسے پلانی زیادہ ... وہ جواب ہے بہت لگا چھوڑ کر چل پڑا۔ اندر ہی ایک ٹیلی فون کیبن تھا۔ میں نے منظر کا فون نمبر ملایا۔ وہ اس وقت گھر پہ مل ہی نہیں سکتا تھا یہ وقت اس کے ... تھا اور اپنے کام کے ساتھ اب وہ رابعہ کی فرم کا انتظام بھی سنبھال چکا تھا چنانچہ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اب وہ کتنا مصروف ہو گا۔ ریسیور اس کے کسی بچے نے اٹھایا۔

"دیکھو بیٹے! تمھاری آنٹی رابعہ گھر پہ ہیں؟" میں نے آواز کو بدل کے کہا۔ "یا منظر صاحب ہیں؟"

"آپ نام بتائیں اپنا۔" بچے نے کہا۔ "میں ان کو بتا دوں گا۔ ابھی تو وہ بازار گئی ہوئی ہیں۔ ابو آفس میں ہیں۔"

"اچھا آنٹی سے کہنا۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "کہ دو لوٹے کا ویٹر اب رتن سینما میں ہے اور اپنے محسن کے ساتھ ہے۔"

اس پُراسرار پیغام پر یقیناً چکرایا ہو گا۔ اس نے دوبارہ پوچھا تو میں نے کہا کہ وہ لکھ لے۔ وہ کہیں سے پنسل کا ٹکڑا لایا اور بار بار اس نے ہر لفظ پڑھ کے سنا دیا۔

"ابھی تو وہ گھر پہ ہی نہیں ہے۔" میں نے بالآخر کہا۔ "اور معلوم نہیں کب لوٹ کر آئے۔"

"جب بھی آئے گی پیغام پہ غور کرے گی تو سمجھ لے گی۔" محسن بولا۔ "تجھے وہ ریلوے ویٹر کی وردی میں دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔ کتنی تھی لیکن ابھی ایک لباس سمجھا ہے۔ لیکن مطلب شیروانی بھی نکال لے گی۔"

"لیکن ہم یہاں بیٹھے نہیں رہ سکتے۔" میں نے کہا۔ "چلو۔"

بجھ جانے کا آرڈر دے دے گا۔"

"ہم وقت ضائع نہیں کر سکتے۔" محسن نے کہا۔ "اتنی دیر ہم ہسپتال ہو آتے ہیں۔ دیکھتے ہیں چوہدری صاحب کا پوسٹ مارٹم ہوا ہے یا کسی اور کا۔"

"وہاں ہمیشہ پولیس ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "چوہدری دلاور کے پیچھے بھی ہوں گے۔"

"ہم کون سا براہِ راست پولیس سرجن کے پاس جا کے پوچھیں گے۔" محسن بولا۔ "یہ بات تو کسی سے بھی معلوم کی جا سکتی ہے۔ شعبۂ حادثات میں سب کو علم ہو گا۔"

"اور رابعہ یہاں پہنچے گی تو... خیر وہ انتظار کر لے گی۔" محسن ... اور ہم رتن سینما کے احاطے سے نکل آئے۔ سینما آنے والے ... خالی ہو کے قطاروں میں کھڑے تھے۔ ایک نے ہمیں دس روپے لے کر زندہ سلامت ہسپتال پہنچانے پہ آمادگی ظاہر کی حالانکہ ہم نے مردنی صورت بنا کے مردہ خانے کا نام لیا تھا۔

"تم دونوں مردہ خانے میں کام کرتے ہو؟" رکشا ڈرائیور نے ... کے بعد کہا۔

"ہاں، تم کو ضرورت پڑے تو آ جانا۔ ہم آدھے ریٹ پہ تمہارا پوسٹ مارٹم کر دیں گے۔" محسن نے پیشکش کی۔

"الو کے پٹھے! کیا ہم تمھیں مردے ڈھونے والے لگتے ہیں؟" ... نے کہا۔ وہ نہایت بدتمیز اور بد دماغ رکشا والا تھا۔ ... کہ اس نے رکشا روکنے کی بے وقوفی کی۔ خود میں بھی ... چاہتا تھا کہ اسے تھوڑی سی سزا دوں جس میں مروت کا لحاظ نام کو ... نہیں تھی۔ ہم نے سوچا کل کوئی مصیبت کا مارا واقعی مردہ خانے جانا چاہے گا تو یہ اس سے پانچ کے دس طلب کرے گا۔

"نکال کیبن کا ... ہے اشو دے پتر۔" اس نے نیچے اتر کے ... مجھے باہر کھینچ لیا۔ وہ خاصا تندرست آدمی تھا اور ... نظر میں میری اہمیت ایک ویٹر سے زیادہ نہیں تھی۔ ... زیادہ دیر نہیں لگائی۔ باہر آتے ہی میں نے اس کا ... ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا۔ وہ جیلو کے آگے آیا تو میں نے ... اٹھا دیا۔ وہ پلٹ کر سڑک پہ گرا۔ دوبارہ بڑی مشکل سے ... سیدھا کھڑا ہوا ہی تھا کہ میں نے پھر وہی داؤ آزمایا ... مخالف سمت میں زیادہ دور جھٹکا۔ پھر میں ... کر رکشا ڈرائیور کی جگہ سنبھالی اور رکشا اسٹارٹ ... اندھیرے میں ہوا اور دو کاروں اور چند راہگیروں ... اس مختصر وقفے میں کوئی نہیں گزرا۔ اگر ... تو کوئی دوسرا رکشا ڈرائیور آ جاتا اور اپنی برادری کے ایک بھائی کے ساتھ میدانِ کارزار میں کود پڑتا اور رکشے والوں کے معرکے میں ٹیکسی ڈرائیور بھی شامل ہو جاتے تو ہم پھنس جاتے۔ ہمارے پاس جنگِ عظیم کے لیے وقت نہیں تھا۔

میں نے رکشا چلانے کا پہلا تجربہ حاصل کیا اور خاصی مہارت کے ساتھ رکشا کو سول ہسپتال میں لے گیا۔ ایک چوکیدار میرے پیچھے دوڑا۔ "اوئے! رکشا اندر کہاں لے جاتا ہے۔" وہ چلایا اور میں نے فوراً بریک لگا کے رکشا کو واپس کیا۔ چوکیدار سے معذرت کرنے کے بعد میں نے رکشا سڑک پہ کھڑا کیا اور محسن کے ساتھ پیدل اندر پہنچا۔ اندر واقعی بہت پولیس تھی۔ چنانچہ ہم نے خاصے فاصلے پہ رک کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔

"میاں محسن خان!" میں نے بزرگانہ شفقت کے ساتھ کہا۔ "چشمِ بد دور، بہت اسمارٹ لگ رہے ہو اس وقت۔"

"اس وقت کیا ہمیشہ سے ہوں۔" محسن نے کہا۔ "تاریخ گواہ ہے۔"

"تاریخ مجھے یاد ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میں اس خلعتِ فاخرہ میں کوئی ایسا کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا جیسے کسی نرس سے گفتگو کرنا۔ اس حلیے میں تو یہاں کا کوئی جنگلی بھی مجھ سے مرعوب نہیں ہو گا اور مقصد ہمارا یہ معلوم کرنا ہے کہ چوہدری دلاور کہاں ہیں... یہاں... گھر پہ یا مرقد میں..."

"یہ کیا مشکل ہے۔" محسن بولا۔ "تو اشارہ کر... کس کی طرف دیکھوں جو ریشہ خطمی ہو جائے۔ ایک تو مجھ میں مردانہ وجاہت کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے پھر یہ کہ میں نظروں سے جادو کرتا ہوں۔"

"وہ جا رہی ہے تیری دور کے رشتے کی ایک کزن۔" میں نے کہا۔ "تھپڑ مارے تو رونا نہیں مسکراتے ہوئے ہوا شہ ہو واپس آ جانا۔"

محسن خان دوڑ سے اور چند تیز تیز قدم اٹھا کے نرس کو جا لیا۔ میں ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ محسن اسے روکنے میں تو کامیاب ہو گیا ہے لیکن ان کے درمیان ہونے والی گفتگو میں نہیں سن سکتا تھا۔ غالباً محسن کو کامیابی نے میرے سامنے خفت سے بچا لیا۔ وہ چلتی نرس کی جیب میں ہاتھ ڈالے میرے قریب سے گزرا تو چند قدم کا فاصلہ رکھ کے پیچھے ہو لیا۔ "وہ اور میں ایک ساتھ تھے ڈاکٹر صاحب!" نرس بولی۔

"اچھا! تو وہ روم میٹ تھی تمھاری، اسی لیے مجھے شک ہوا تھا کہ میں نے تم کو دیکھا ہے۔ خیر! اچھا ہوا اس نے شادی کر لی۔ اب کہاں ہے وہ؟" محسن نے کہا۔

www.paksociety.com

"وہ دونوں باہر ہیں۔ کوئی کام تھا اس سے آپ کو؟"

"کام...؟ ہاں کام بھی تھا لیکن اصل مقصد تو ملاقات تھا۔ اس سے دوستی تم سے ہو گئی۔" محسن غالب سے تو پیشہ ور عاشقوں کے انداز میں چشمی تھنگی جاری رکھی۔ "تم شاید ڈیوٹی پر ہو۔"

"نہیں! ابھی آف ہوئی ہوں ڈیوٹی سے۔ اس ایمرجنسی میں تو حالت خراب ہو جاتی ہے۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ارادہ تھا کہ..."

"میرا خیال ہے کہ اب تم ارادہ بدل دو۔" محسن نے کہا۔ "میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں اور بدقسمتی سے اکیلا بھی ہوں۔ تفریح کروں تو جہاں اکیلا جاؤں گا احمق نظر آؤں گا۔ تم ساتھ ہو سکتی ہو میرا ہوٹل تو اس سے میرے کمرے میں بیٹھ کے تھوڑی سی گپ شپ، کھانا تو آدمی کھاتا ہی ہے۔ پھر میں تم کو واپس ڈراپ کر دوں گا۔"

وہ ہنس پڑی۔ "لیکن میرا ارادہ تھا کہ پہلے کپڑے بدل آؤں۔ اس وردی میں باہر کیسے جا سکتی ہوں۔ تم کہتے ہو کہ ارادہ بدل دوں۔"

"اوہ!" محسن نے حجت سے سر کھجایا۔ "دراصل تم ایسے بھی اچھی لگ رہی تھیں مگر یہ ٹھیک ہے۔ آؤٹنگ کے لیے وہ ہونا چاہیے کیا کہتے ہیں اسے... سولہ سنگھار وغیرہ۔ او کے میں انتظار کرتا ہوں، تم تیار ہو کے آجاؤ۔"

"یہاں کہاں در بدر ہو گے؟" وہ بولی۔ "ہوسٹل تک چلو۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا تمھیں، سب کے کزن آتے رہتے ہیں۔"

"ویری گڈ! کتنا اچھا ہوا کہ میں اور تم کزن بھی نکل آئے۔" محسن بولا اور وہ ہنس دی۔

مجھے اس کی کامیابی پر جو رشک آیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ وہ نرس غالباً اپنی ہر شام اسی طرح آوارہ گردی کی عادی تھی۔ میں پھر پیڑ کے پیچھے آ کھڑا ہوا اور سگریٹ پینے لگا۔ میرے آس پاس لوگ آ جا رہے تھے مگر یہ کوئی تفریح گاہ نہیں تھی یہاں سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ سب پریشان تھے اور تقدیر سے نالاں تھے۔ وہ بھی جو کے زخمی ہو کے یا قتل ہو کے پہنچ رہے تھے اور وہ بھی جو ان کی جان بچانے کی جدوجہد میں مصروف تھے اور موت کے خلاف مسلسل نبرد آزما تھے۔ دیہات میں ڈاکٹر لوگ نہیں جاتے کہ وہاں مریضوں کے علاج کی سہولت نہ سو ساتھی اور نہ پیسہ گھما گھمی، شہر میں رہو تو یہ مصیبت کہ دن رات ایک سلسلہ ہے حادثات کا اور وارداتوں کا۔ لواحقین سے نمٹنا، پولیس کی ضابطے کی کارروائی اور کام کام بس پیسہ پیسہ، فرصت کا روبار شوق کے بشوق نظارۂ جمال کہاں۔

"اچھا ہوا تو نے شرط نہیں لگائی تھی۔" محسن نے پیچھے سے آکے میری گردن پر ہاتھ مارا۔ "کیسی رہی؟"

"تو آگیا... اور وہ تیری کزن کہاں ہے؟" میں سنبھلا۔

"وہ بغرض تفریح میرے ساتھ جانے کے لیے کپڑے بدل کے آنے والی ہے۔" محسن نے تو داد کرتے ہوئے کہا۔

"الو کے پٹھے! اس کام کا کیا ہے کہ جس کے لیے ہم آئے تھے؟" میں نے اس کی شاعری پر ہنستے کہا۔

"وہ تو ہو گیا۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھ لیا۔" محسن ہنسا۔ "اب چلتے رہیں۔ میری کزن کی آج کی شام تو ضائع گئی۔ نہ جانے کیوں اب مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ وہ بڑی بے چینی کے ساتھ انتظار کرتی رہے گی اور جب اسے یقین آ جائے گا کہ میں کسی اور کے ساتھ نکل گیا ہوں تو اسے دکھ تو یقیناً ہو گا۔ جھگڑا... جلنے کا اور نقصان میں رہنے کا..."

"ابھی ایک جھانپڑ رسید کروں گا۔" میں نے چلتے چلتے کہا۔ "بتایا اس نے؟"

"اس نے تو بڑی عجیب بات بتائی۔ پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا تھا مگر اس نے کہا کہ صبح سے اب تک وہی ڈیوٹی پر تھی اور اس کے ساتھ دوسری نرسیں بھی تھیں۔ سب تصدیق کر سکتی ہیں کہ اس قسم کا کوئی کیس نہیں آیا۔ نام تو اسے سب کے یاد نہیں تھے لیکن اس نے بتا دیا تھا کہ حادثات میں زخمی ہو کے کتنے آئے تھے اور لڑائی جھگڑے میں کتنے۔ ان میں سے کتنے مر چکے، کتنے ابھی پڑے ہیں، کتنے مرنے والے ہیں اور کتنے بچ جائیں گے۔ کوئی صنعت کار چودھری ولاور ہوتا تو اتنا غیر اہم نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ کلہاڑی کے وار سے سر کے ٹکڑے کرنے کی واردات تو ابھی تک نہیں ہوئی۔ اس نے کئی مہینے پہلے ایک کیس دیکھا تھا جس میں کلہاڑی سے سر پر وار کیا گیا تھا۔"

"تجھے یقین ہے وہ سچ کہہ رہی تھی؟"

"یار! اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی اور کیا ان سے جھوٹ بولا کہ وہ تو ایک دن کی مصروفیات کا حال سنا رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اخبار میں مشہور صنعت کار چودھری ولاور کے قتل کی جو خبر ہے اس کے بارے میں پولیس نے کچھ بتایا... ہوئی اور رہیر کہنے لگی کہ اس نے اخبار تو نہیں دیکھا مگر اس اسپتال میں یہ کیس نہیں آیا۔ اس کے علاوہ کہیں جا بھی نہیں سکتی۔"

"اس کا مطلب ہے چودھری ولاور کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا یا ہوا تو محض کاغذی خانہ پری کر لی گئی جس کا رسوخ کو علم نہیں... گویا لاش یہاں نہیں لائی گئی؟" میں نے کہا۔ "پھر اب چلتے ہیں واپس۔ رابعہ انتظار کر رہی ہو گی۔"

"کر رہی ہے اسے انتظار... انتظار میں جو مزہ ہے..." اس نے کہا لیکن میں نے اس کی بات سننے کے بجائے ہانک لگا کے

ایک رکشے کو روک لیا۔

رابعہ بیتاب سے احاطے میں ایڈیز کے ٹکٹ کاؤنٹر کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تین ٹکٹ بھی تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ فلم دیکھنے آئی تھی مگر اس کے باقی دو ساتھی نہیں پہنچے۔ شو کو شروع ہوئے ایک گھنٹہ گزر چکا تھا چنانچہ اس کی پوزیشن خاصی خراب تھی۔ انتظار کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہر شخص یا تو چلا جاتا ہے یا اندر جا بیٹھتا ہے۔ نظارہ کرنے والے پوسٹرز کے ساتھ رابعہ پر بھی غور کر رہے تھے اور خود میں نے بھی محسوس کیا کہ بے جان تصویروں کے مقابلے میں وہ یقیناً بہت زیادہ قابل غور ہے۔ رابعہ کی عمر کا اندازہ نہیں ہوتا تھا مگر لباس، تعلیم اور زندگی کے تجربات نے اس کے انداز و اطوار میں ایک پُر وقار متانت اور خود اعتمادی پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے اوباش قسم کے نوجوانوں کو بھی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس پر فقرے بازی یا جستہ کر سکیں۔ پھر بھی وہ گیٹ کیپر اور سینما کے دوسرے ملازمین کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

"یہ کیا مذاق ہے محسن بھائی!" اس نے غصہ آلود آواز دبا کے کہا۔ "کہہ کے چلے گئے مجھے یہاں... نہ میں کھیل دیکھ سکتی ہوں نہ جا سکتی ہوں۔"

"معاف کر دو باجی۔" محسن نے دانت نکال کے کہا۔ "گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ تمھارا موڈ اس سے زیادہ خراب معلوم ہوتا ہے چنانچہ اب یہ ٹکٹ کل پرسوں دیکھیں گے۔"

وہ نیم احتجاجی انداز میں محسن کے ساتھ روانہ ہوئی تو ان لوگوں نے کا ذہنی تشکیک دور کر لیے جو بلا وجہ پیدا ہو رہے تھے۔ لوگوں کو محسن اور رابعہ کے معتبر لباس سے دور دور تک کا اندازہ تھا اور ان کے درمیان کوئی تعلق نظر نہ آئے مگر میں ان کے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ رابعہ نے مجھے دیکھ لیا تھا مگر یوں کہ کسی نے نہ دیکھا تھا۔

باہر آنے کے بعد میں آگے بڑھا اور ان کے ساتھ ہو گیا۔ "آداب عرض! آداب بجا لاتا ہے یہ خادم صاحب!" میں نے کہا۔

"مسٹر خادم! آداب بجا لانے سے پہلے آپ معافی مانگ لیں کہ کیوں مجھے مفت ناراض ہوں۔" رابعہ مسکرائی۔ "اور کسی ایک تصویر کا بیٹھ کے تصور بہت بڑی تماشہ ہے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آج بھی کہانی ختم پر چھوڑ دی تو..."

"تو کیا؟" میں نے کہا۔ "بولو، ڈر کیوں رہی ہو؟"

"تو میں خود تمھاری جیب سے نکل جاؤں گی اور ایسی خبر لوں گی۔" ایک دم وہ ہنس پڑی۔

"افسوس، مجھے تم نے کوئی موقع نہیں دیا، شرمندہ ہونے کا، معافی مانگنے کا اور منانے کا۔ داستان شب ہجراں اور فسانۂ درد فراق کہنے کا۔" میں نے ہاتھ مل کے کہا۔ "میں نے خاصی ذہنی تیاری کی تھی کہ تم کو کس طرح بے وقوف بناؤں گا۔ میرا مطلب ہے عموماً یہ روٹھنا منانا بھی بہر حال ضروری ہوتا ہے۔ شاعر صاحب نے ایسے ہی تو نہیں فرمایا ہے کہ بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔"

"میں کسی ہیرے سے لڑتی ابھی نہیں لگوں گی۔" رابعہ نے کہا۔

"تم ہر حال میں اچھی لگو گی خواہ ویٹر سے لڑو یا ہیڈ ویٹر سے۔" میں نے کہا۔ "آخر اس ریلوے کے ویٹر کی بیوی بھی ہو گی جس کی وردی میں نے ترتیب تن فرما رکھی ہے۔ کیا اسے یہ خیال آتا ہو گا کہ میں اپنے میاں سے لڑتے ہوئے کیسی لگ رہی ہوں؟"

"میاں جی! ذرا اندر رہیں۔ میرا مطلب ہے جامے کے اندر رہیں۔" محسن نے کہا۔ "جامے سے باہر نہ ہوں ابھی۔"

"تم آئی کس طرح تھیں، ذریعہ آمد و رفت کیا اختیار کیا تھا تم نے عزیزہ؟" میں نے کہا۔

"پہلے بس پھر رکشا اور پھر ٹیکسی۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھے وہم ہو رہا تھا کہ کوئی میرے تعاقب میں نہ ہو۔"

"اگر یہ وہم مجھے بھی ہو جاتا تو تم کو میں اس بیفشی ڈریس میں نظر نہ آتا۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔ "میں ذرا سا غیر محتاط ہو کے گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا تھا۔ کوئی میرے تعاقب میں رہا اور ہوٹل تک پہنچ گیا مگر مجھے پتا نہ چلا۔"

"گاڑی کہاں ہے تمھاری؟" رابعہ نے کافی دور نکل آنے کے بعد کہا۔

"ہم فی الحال بے کار ہیں۔" محسن بولا۔ "اور وہ جو تمھاری کار تھی نا وہ بھی بے کار کھڑی ہے۔ ان حالات پر مفصل روشنی ڈالنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ پہلے چودھری ولاور کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔ تم نے اخبار دیکھا تھا شام کا؟"

"میں نے کبھی شام کا اخبار نہیں پڑھا۔ ایسی کون سی اہم خبر ہے؟"

"خبر ناقابل یقین حد تک اہم ہے۔" میں نے جیب سے تہہ شدہ اخبار نکال کر اسے تھما دیا۔ ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے رک کر اس نے صرف سرخی پر نظر ڈالی۔

"کیا یہ سچ ہے؟" اس نے چونک کر باری باری مجھے اور محسن کو دیکھا۔

"کیا اس میں بھی ہماری شرارت ہو سکتی ہے؟" میں نے کہا۔ "یعنی یہ اخبار ہے کوئی ہینڈ بل یا پوسٹر نہیں ہے جو ہم نے چھپوا لیا ہو۔ بے شک اخبارات میں جھوٹ سچ سبھی کچھ ہوتا ہے

www.paksociety.com

لیکن یہ ہاتھی سے بڑا جھوٹ ہے جسے چھپایا نہیں جا سکتا اور یہ نہیں لکھا ہے کہ "ایک افواہ کے مطابق" بلکہ اخبار کے رپورٹر نے پولیس کے حوالے سے تفصیلات ارسال کی ہیں۔"

رابعہ میری سننے کے بجائے خبر کا باقی حصہ پڑھنے میں مصروف تھی۔ میں نے اخبار اس سے چھین لیا۔ "یہاں کھڑے رہ کر دو کالم کی خبر پڑھنے میں کوئی معقولیت نہیں۔ ہم خلاصہ بتا دیں گے۔"

"تم نے کچھ معلوم کیا کہ یہ حرکت کس نے کی؟ اور کیوں کی؟"

رابعہ کا سوال بالکل فطری تھا۔

"ہم نے کچھ اور معلوم کیا ہے؟" محسن بولا۔ "چوہدری ولاؤر کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال نہیں لے جائی گئی۔"

"محسن خلجی کا نظریہ کچھ یہ ہے کہ قاتل الف دین ہو سکتا ہے جو انتقام کے جنون میں مبتلا تھا مگر ان کا دوسرا نظریہ جو پہلے نظریے کی نفی کرتا ہے کچھ اور ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ڈراما ہے۔" میں نے کہا۔

"یعنی چوہدری ولاور قتل نہیں ہوا۔" رابعہ نے غیر سنجیدگی سے کہا۔ "اور کل خبر آئے گی کہ مردہ زندہ ہو گیا۔"

"کل نہ سہی دو چار دن میں یہ خبر آ سکتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "ایسے مت دیکھو مجھے۔ میں نے کوئی چرس کا دم نہیں لگایا ہے یا ٹھرا نہیں پیا ہے۔ میں اس نظریے پر قائم ہوں کہ مرنے والا ولاور نہیں تھا۔"

"پتا نہیں تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "چلو تم پہلے تو آدمی بنو اور یہ کپڑے بدلو۔" اس نے ہینڈ بیگ میں سے ایک قمیص اور پتلون نکالتے ہوئے کہا۔ "تمہارے کچھ کپڑے میرے سوٹ کیس میں بھی پڑے ہوئے تھے۔"

"چشم بددور! تم نے بڑی دانائی کا مظاہرہ کیا سکندر کے لیے بخت آور۔" میں نے رقت انگیز لہجے میں کہا۔ "تم نے ثابت کر دیا کہ قاضی کے گھر کی چوہیا بھی سیانی ہوتی ہے اور اگر مجھے قاضی مان لیا جائے..."

"قاضی جی! جب مجھے وہ پیغام ملا تھا تو میں سمجھ گئی تھی کہ آپ کسی چکر میں لگیں گے اور آپ کے ساتھ کون ہو گا؟ میں اندازہ کر سکتی تھی کہ جیسی آپ نے شوقیہ نہیں بدلا ہو گا بلکہ ہو گی کوئی مجبوری اور جب مجبوری نہیں رہے گی تو پھر مناسب کپڑوں کا مسئلہ ہو گا جو کہیں سے خریدنے پڑیں گے۔" رابعہ نے کہا۔ "کیا باقی سامان بھی گیا؟"

"اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا۔" میں نے آداب بجالاتے کہا اور ایک گلی میں غائب ہو گیا۔ گلی خاصی تاریک تھی اور تھوڑا سا آگے جانے کے بعد مجھے ایک پڑے سے منہدم ہو جانے والے مکان کا ملبہ نظر آیا۔ مکان شاید خستہ حالی کے باعث

کسی بارش یا سیلاب میں بیٹھ گیا تھا اور مکین بجرت کر گئے تھے۔ اپنے مسکن میں ہی ان کا مدفن بن گیا تھا اب یہ خالی جگہ عبرت سے زیادہ متعلم ضرورت بنی ہوئی تھی اور مزید آگے تو میں نے مشکل سے تین منٹ میں ویٹر کی وردی اتار کر پتلون پہنی جو گی پھر ویٹر کی وردی کا بنڈل بنا کے بغل میں دبا کر وہاں سے نکل آیا۔ جب میں دوبارہ سڑک پر پہنچا تو محسن پتا نہیں کے ہنر سے کام لیتے ہوئے اہم واقعات کا خلاصہ دو منٹ کے کیپسول میں پیش کر دیا تھا چنانچہ رابعہ ہنستے ہنستے دہری ہوئی جا رہی تھی۔ بیٹ سے سرور ات بجنے لگے تھے کیونکہ ویٹر کی وردی پھر بھی کچھ غنیمت تھی۔ پتلون قمیص تو کرتی کا لباس تھے۔ محسن نے ایک ٹیکسی کو روکا اور میں نے قدرے بہتر محسوس کیا۔

"تمہیں سو فیصد عاقل و بالغ اور دور اندیش ہونے کا سرٹیفکیٹ مل سکتا تھا اگر تم نے یہ بھی خیال رکھا ہوتا کہ اس درجہ حرارت پر آدمی کم سے کم ڈبل نمونیے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔" میں نے قمیص بجاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو ٹھنڈ لگ چکی ہے۔"

"میرا ہینڈ بیگ کوئی بوری نہیں تھا کہ اس میں گرم جیکٹ بھی بھر لاتی۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"اچھا آپ کہیں سے لو بوری، وہی ڈالی ہوں تو ہم زندہ لاش ہیں۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔ محسن نے ٹیکسی کو روکا اور ایک دکان میں گھس گیا۔ چند منٹ میں وہ خاصی موٹی

چوہدری کی بیٹے والپس آیا۔

"دیئے ہوئے یہ اچھے گند لپیٹ کے جیسی ہے۔ زندہ ہے تو بس ہے۔"

میں نے چوہدری مجھ پر اچھال کے کہا۔

"محسن نے آج تمہارا سہاگ سلامت رکھا۔ خدا اسے سلامت رکھے اور ہماری طرح یہ بھی دو دو حصوں تمہارے لیے تو قوت بنے۔ آمین۔" میں نے ہاتھ ملا کے کہا۔ رابعہ نے مجھے ٹھوکا دیا۔ اشارہ تھا کہ میں زبان کو تالو میں رکھوں اور ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی کا خیال کروں۔ ٹیکسی ڈرائیور دانت نکال رہا تھا اور ٹیکسی جب بھی کسی پول کے قریب سے گزرتی تو میں نے رابعہ کے لال رنگ کو دیکھا۔ رخساروں میں حیا سے زیادہ غصے کا عنصر شامل تھا۔

محسن کی ہدایات سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ ٹیکسی کو ولاور کی کوٹھی کی طرف لے جا رہا ہے۔ سردی کی وجہ سے شیشے بند تھے اور ہم کسی قابل شناخت پرائیویٹ کار میں نہیں تھے چنانچہ اس کے قریب سے گزر جانے میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ ہم سب کی نظر ایک ہی سمت میں دیکھ رہی تھی۔ دور سے اس کی کوٹھی کا گیٹ روشن نظر آیا۔ باہر دو کاریں اور ایک جیپ کھڑی دیکھ کر میں چونکا ہوا کہ کوئی بات ضرور تھی ورنہ اس وقت گیٹ بند ہوتا تھا اور آس پاس کی دوسری کوٹھیوں کی طرح موسم سرما کی ویرانی اور رات کا سناٹا ہر جگہ محیط نظر آتا تھا۔ عین سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے کوٹھی کے اندر آٹھ دس افراد کو دیکھا جو برآمدے میں کرسیاں ڈالے مغموم اور سرنگوں بیٹھے تھے۔ کوٹھی کا باہر کا حصہ روشن تھا اور چار پانچ پولیس والے ذرا فاصلے پر بے مقصد ٹہل رہے تھے۔ محسن کا نظریہ مجذوب کی بڑ ثابت ہوا تھا۔ کوٹھی میں کوئی واردات ضرور ہوئی تھی۔ اب صرف یہی بات تصدیق طلب رہ گئی تھی کہ کیا مرنے والا ولاور تھا یا اس نے کسی اور کو مار کے اپنی جگہ ڈال دیا ہے اور خود غائب ہو گیا ہے؟ اور اس کی انتہائی کا مقصد میں ٹریپ کرنا ہے۔ فوری طور پر مجھے کوئی ایسی صورت نظر نہ آتی تھی کہ ہم اس مفروضے کو تسلیم کریں تو اس کی صداقت کا ثبوت کیسے حاصل کریں۔ اس کے لیے لاش کو ایک بار دیکھنا تو ضروری تھا ہی، یہ بھی ضروری تھا کہ ہم اس ڈرامے کو سمجھتے ہوئے کلائمکس کو اینٹی کلائمکس میں تبدیل کر دیں۔

اگر ہم اسی وقت اندر تشریف لے جاتے تو ولاور کے زندہ ہونے کی صورت میں بھی پکڑے جاتے اور زندہ نہ ہونے کی صورت میں بھی۔ میں اتنی رفتار سے اور اتنی دور سے گزرتے ہوئے بیٹھے ہوئے آنے والوں کی صورت پر غور نہیں کر سکا تھا مگر ان میں دشمنوں کا موجود ہونا یقینی تھا۔ پولیس بھی بہر صورت مجھے پہلے گرفتار کرنے کے لیے جاتی اور قتل کی تفتیش بعد میں کرتی۔

ہمیں اتنی مہلت ہی نہ ملی تھی کہ ہم مرزا غالب سے رابطہ قائم کرتے اور اس کے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے میک اپ سے بدلی ہوئی صورت میں ولاور کے گھر میں داخل ہو جاتے۔ میرا یقین پہلے بھی کامل نہیں تھا اب شک کی گنجائش بہت کم رہ گئی کہ وہ محسن کی بے مہار سوچ تھی ورنہ موت وہ حقیقت ہے جس میں ڈرامے کو دخل نہیں ہوتا۔ تاہم یہ بات میں نے فوراً نہیں کہی۔

"اب کدھر چلنا ہے صاحب جی؟" ڈرائیور نے قدرے بیزاری سے کہا۔

یہ شاید محسن نے بھی نہیں سوچا تھا اور اس کا ذہن بھی ولاور کی کوٹھی میں نظر آنے والے منظر کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا کہ وہ فوراً جواب نہ دے سکا۔ رابعہ اس لیے نہیں بولی تھی کہ اس کا خیال تھا جواب ہم دیں گے۔

"او جی کچھ بولو! کیا ایسے ہی سیدھا چلتا جاؤں، مجھے گاڑی بند کرنی ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے جھلا کر کہا۔

"ہاں ہاں! تم ایسا کرو کہ اگلے موڑ پر ہمیں اتار دو یا کسی ایسی جگہ جہاں سے ہمیں کوئی دوسری سواری مل سکے۔" میں نے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے خاصی مشکوک نظروں سے مجھے پلٹ کر دیکھا۔ "پھر بھی آپ کو جانا کہاں تھا؟ یہاں کون سی دوسری ٹیکسی ملے گی آپ کو؟ نرالی سواری ہے آپ کے ساتھ۔"

"اچھا تو تم ہمیں کرشن نگر پہنچا دو۔" میں نے کہا۔ میرے ذہن میں رابعہ کی گاڑی کا خیال آیا تھا۔ اگر اس وقت ہمارے پاس اپنی گاڑی ہوتی تو ہم کسی کے ذہن میں شکوک پیدا کیے بغیر کہیں بھی آ جا سکتے تھے۔

ڈرائیور نے ہماری بے وقوفی پر افسوس سے سر ہلایا۔ ہم سیدھا راستہ اختیار کرتے تو اپنا پیسہ بچا سکتے تھے اور اس وقت تفریح کے لیے نہ یہ جگہ تھی اور نہ یہ موسم تھا چنانچہ وہ کچھ بڑبڑایا اور پھر اس نے طوفانی رفتار سے کرشن نگر لے گیا۔ دس منٹ بعد ہم کچھ اس کو پیسے ادا کر کے سڑک پر کھڑے ہو گئے۔

"اب یقین آ گیا کہ تیری کھوپڑی الٹی ہے۔" محسن نے جھنجلا کے کہا۔ "نہ جانے کیوں میں اپنی ساتویں حس کو غلط اور ناقابل اعتبار سمجھنے پر تیار نہیں۔ بہرحال ولاور اگر مرا ہے تو اچھا ہے اور نہیں مرا ہے تو معلوم ہو جائے گا۔ مگر وہاں کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے لیکن ہم کہاں کوئی اندر جا کے پوچھ نہیں سکتا کہ کیا ہوا ہے۔"

"غالب پوچھ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس وقت وہ غالباً کے دفتر میں ہو گا۔ اسے فون کر لیتے ہیں۔"

"فون کرنے کے لیے اتنی دور آنے کی ضرورت نہیں تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "گاڑی کتنی دور ہے یہاں سے؟"

"گاڑی تو ایک فرلانگ آگے گلی میں ہوگی اور یہاں تک میں ٹیکسی اسی لیے لایا تھا مگر میری چھٹی حس..."

"تم دونوں کی چھٹی اور ساتویں حس بھی تمہاری طرح دخل در معقولات کی عادی ہے۔" رابعہ نے جھلا کر کہا۔ "جیسی صورت ویسے فرشتے۔ گاڑی کے حواس خمسہ درست ہونے چاہئیں۔ کیا خطرہ ہے گاڑی لانے میں؟ آخر ہماری اپنی گاڑی ہے اور کوئی ہمیں چور سمجھ کے تو روک نہیں سکتا۔"

"کوئی اور تو روک سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مثلاً فرشتہ اجل۔ وہ بغیر اپائنٹمنٹ کے ملتا ہے۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی ہے۔ کوئی نہ کوئی گیراج کھلا مل جائے گا۔ ہم پیچھے رہتے ہیں۔ رابعہ چابی لے کر آگے جائے اور کسی مکینک سے بات کرے۔ اُسے بتائے کہ میری گاڑی فلاں جگہ بند ہوگئی ہے۔ خرابی کوئی معمولی سی لگتی ہے۔ ذرا مسکرا کے بات کرے تو وہ سر کے بل جائیں گے اور طاقت کے بل پر گاڑی کو کھینچ کر بھی لانا پڑا تو لے آئیں گے۔"

"وہ کہیں گے آپ ہمارے ساتھ چلیں بیگم صاحبہ!" رابعہ نے منہ بنا کے کہا۔

"تو تم کہنا 'ہائے اللہ میں تو پہلے ہی اتنی تھک گئی ہوں دم نکلنے لگا ہے میرا۔'" میں نے تجربے دارانہ آواز بنا کے اور ہاتھوں کے ساتھ نزاکت کرکے کہا۔ "پھر مسکراہٹ سے بجلی گرانا۔"

"شرم تو نہیں آتی۔" رابعہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"کہتا یہ ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "چلو دیکھتے ہیں آگے گیراج کہاں ہے۔ مکینک کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔"

"اور اس میں شرم کی کوئی بات نہیں۔ وہ جائے گا اور گاڑی اسٹارٹ کرکے لے آئے گا۔" میں نے کہا۔ "تم کچھ جیالی کا اظہار کرنا اور پچاس روپے ٹپ دے دینا اُسے۔ اس طرح یہ ہوگا کہ کوئی تاک میں ہوگا تو سامنے آجائے گا اور پیچھا کرے گا تو ہم دیکھ لیں گے۔ نہ وہ مکینک کو روک سکیں گے نہ رابعہ کو اور اگر کوئی نہ ہوا تو ہم کو رابعہ آگے سے پک اپ کرے گی۔ آدھے گھنٹے میں گاڑی ہمارے پاس ہوگی۔" پھر میں نے اُسے بتایا کہ گاڑی کس گلی میں ہے۔

"اگر کوئی تعاقب کرتا ہوا آئے تو میں اُسے کہاں لے جاؤں؟"

"اس سے پوچھ لینا... لاحول! کار ادھر کیوں ہوتی ہو؟" میں نے کہا۔ "کہنے کا مطلب یہ تھا کہ انھیں چکر دے کر نکلنے کی کوشش کرنا ورنہ کسی چوک میں پولیس کی مدد لینا۔ اور جب یقین ہو جائے کہ وہ بھاگ گئے ہیں تو اب سے ایک گھنٹے بعد ہوٹل ویسٹ اینڈ میں خواجہ نیک محمد کے کمرے میں انتظار کرنا۔"

"گیراج!" محسن نے انگلی سے اشارہ کرکے کہا۔ ایک دکان کا آدھا شٹر گرا ہوا تھا لیکن اندر روشنی تھی اور باہر رکھے ہوئے بینر سائن بورڈ پر آٹو ورکشاپ کے الفاظ پڑھے جا سکتے تھے۔ میں نے چابیاں رابعہ کو دیں اور پھر سمجھانا چاہا کہ اسے کیا کرنا ہے لیکن وہ میری سنے بغیر روانہ ہوگئی۔

"تیری جورو ہے خیر کی بچی۔" محسن عالی نے ارشاد فرمایا۔ "تو نے اُسے جو سمجھایا تھا وہ ماضی کے پیچھے۔"

"اچھا چل تیری جورو سہی۔" میں نے کہا۔ "ایک بات ہے۔ خفا کیوں ہوتا ہے۔" اور اُسے سگریٹ پیش کی۔ سوز بڑھ گئی تھی لیکن اب سردی سے زیادہ بھوک کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ میں نے رابعہ کو گیٹ شٹر کے نیچے سے جھک کر بات کرتے اور پھر کسی کو باہر آتے دیکھا۔ ان کے درمیان تھوڑی سی گفتگو ہوئی۔ حسب توقع وہ اندر گیا اور پھر کچھ اوزار اٹھائے باہر نکلا۔ رابعہ جھک کر گیراج میں داخل ہوگئی۔

مکینک نوعمر لڑکا سا تھا جس نے تیل اور گریس کے داغوں سے سیاہ نظر آنے والی ڈانگری پہن رکھی تھی۔ غالباً استاد نے معمولی خرابی کا ذکر سن کے اُسے روانہ کر دیا تھا اور خود بیگم صاحبہ کو اطمینان سے تشریف رکھنے کو کہا تھا۔ اب وہ بمشکل دس قدم آگے چل رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں کو بغل میں دبائے اور سر کو جھکائے۔ وہ دن بھر کے کام کے بعد یقیناً تھکا ہوا تھا اور اس سردی میں یہ کام جو غیر متوقع طور پر آگیا تھا اسے بیگار لگتا ہوگا۔ وہ خود استاد اور گیراج کا مالک ہوتا تو کبھی باہر نکلتا مگر زمانے کے گرم و سرد کا مزہ چکھے بغیر استاد بھی کون بنتا ہے۔ سڑک پر آمد و رفت برائے نام تھی۔

"تو نے کسی شکل کو پہچانا تھا؟ دلاور کے گھر کے سامنے گزرتے ہوئے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ لیکن تو نے ایک بات نوٹ کی؟" محسن بولا۔ "لوگ برآمدے میں بیٹھے تھے۔ کیا کوٹھی کے اندر جگہ نہیں رہی تھی؟ زیادہ وہ لوگ ہوتے تو باہر گاڑیاں بھی زیادہ ہوتیں۔ یہ کوئی گارڈن پارٹی کا موسم تو نہیں ہے۔"

"اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔" میں نے حقارت سے ہونٹ شکن لیجے میں کہا۔ "اندر باہر سب دلاور کا گھر ہے۔"

"میں کہہ سکتا ہوں کہ باہر شکاری بیٹھے تھے۔" محسن نے کہا۔ "اور شکار کا انتظار کر رہے تھے۔"

"تو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ پولیس والے بھی تھے اور دلاور کے آدمی تھے جو وردیاں پہن کے کھڑے ہو گئے تھے کہ ہم کو بلا مطلب ہے مجھے ان کے اشارے پر گرفتار کرلیں۔" میں نے کہا۔

"میں سب کچھ کہہ سکتا ہوں اور کوئی مجھے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" محسن نے چلا کر کہا اور مکینک نے چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا اور رک گیا۔ اس کے خیال میں ہم دو راہ گیر تھے اور کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی۔

"میں صرف ایک بات کہہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ کہ دلاور کی جگہ کسی اور کی لاش پڑی ہے۔ ابھی ہم غالب سے پوچھ لیں گے اور اس کو بتا دیں گے کہ ہمیں کیا شک ہے۔ وہ معلوم کر آئے گا۔"

گلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم نے فاکس ویگن کو اسی جگہ کھڑا دیکھا جہاں میں نے اُسے آخری بار پارک کیا تھا۔ مکینک گلی میں مڑ گیا اور ہم سیدھے گزر گئے۔ اس گھر کی عقبی دیوار سے بیٹھک کے مالک کی دیوار ملی ہوئی تھی۔ مجھے اس بوڑھے کا خیال آیا جو سوچتا ہوگا کہ آخر نیک محمد کچھ بتائے بغیر کہاں غائب ہوگیا۔ اسی گلی میں آگے شمشاد کا گھر تھا جسے ہم نے مروت اور محبت کا ایسا بدلہ دیا تھا کہ اس سے گاڑی چھین لی تھی۔ خیر اب تک گاڑی اسے مل چکی ہوگی۔ وہ آئندہ سب کو بتائے گا کہ کس طرح شریف اور مہذب چور اس کے مہمان ہوئے تھے اور وہ کتنے با اصول لوگ تھے۔

دھماکا اسی وقت ہوا۔ ہم میسری گلی کے قریب پہنچ کر رکے تھے اور واپسی کی سوچ رہے تھے کہ دو مہانے دھماکے کی سماعت شکن آواز نے ہمیں بوکھلا دیا۔ ہم گھبرا کے ایک ساتھ پلٹے کیونکہ دھماکا پیچھے ہوا تھا۔ رات ابھی زیادہ نہیں ہوئی تھی اس لیے کئی گھروں سے نکلنے والے دوڑ دوڑ کر اس جگہ تک آرہے تھے جہاں فاکس ویگن کے ڈھانچے کو آگ کھا رہی تھی۔ اس کے منتشر ہو جانے والے ٹکڑے دور دور تک بکھرے ہوئے تھے اور جہاں گرے تھے وہاں روشن تھے۔ خالی پلاٹ کے تین طرف آباد گھر تھے۔ ان کی دیواروں میں سوراخ نظر آرہے تھے اور اندر سے عورتوں بچوں کے چیخنے کا شور بلند ہو رہا تھا۔ کوئی گھر گرا نہیں تھا لیکن یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ دھماکے کی شدت نے بالکل ساتھ والے گھروں میں کھڑکیوں کے شیشے چورا کر دیے ہوں گے۔ اندر الماریوں اور شوکیسوں کے شیشے والے پٹ بکھر گئے ہوں گے اور آرائش سے برتن گرے ہوں گے۔ جتنا بڑا دھماکا تھا اور پھر اس کے نتائج نے گھر کے مکینوں کو دہشت زدہ کر دیا تھا تو یہ ایک قدرتی بات تھی۔ شاید ایک لمحہ پہلے وہ بڑے سکون اور فراغت کے ساتھ دروازے بند کیے ہیٹر جلائے گرم کمروں میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے ڈراما دیکھ رہے تھے اور اس انہماک اور اطمینان کو یکلخت دھماکے نے منتشر کر دیا تھا۔

فضا میں عجیب سی بو تھی۔ تیل اور پٹرول کے جلنے کی بو اور سیٹوں کا ربر جلنے کی۔ بامعدوں اور ان سے الگ گوشت کے جلنے کی، صرف ہم جانتے تھے کہ یہ انسانی گوشت کے جلنے کی بو ہے۔ وہ نوجوان مکینک جو تھکا ہوا ہونے کے باوجود اس سردی میں ایک عورت کی مدد کرنے اور اپنے پیسے اور اپنے خاندان کے لیے کچھ کمانے کی خاطر چل پڑا تھا یہ نہیں جانتا تھا کہ اس خوب صورت عورت کو فرشتہ اجل نے اپنا نامہ بر بنا کے بھیجا ہے اور اپنی مسکراہٹ کی دلکشی سے اور ادائے حسن کی ساحری سے اس نے جھوٹ کا جو جال پھیلایا ہے وہ موت کا جال ہے۔ اب اس نوجوان کی زندگی کا وجود ایک تصور رہ گیا تھا۔ اس کے جسم کے اجزا منتشر ہو کے راکھ ہو رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ سب خواب بھی راکھ ہو رہے تھے جو خود اس نے کامیابی کے لیے اور خوشحالی کے لیے دیکھے تھے اور اس کے ماں باپ اور اس کے بھائی بہن اپنے گھر میں اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ان میں شامل ہو چکے تھے جن کی آنکھیں ہمیشہ انتظار کرتی رہتی ہیں اور روتی رہتی ہیں مگر آنسوؤں سے امید کی وہ کرن نہیں بجھتی جو دلوں میں روشن رہتی ہے اور دھوکا دیتی رہتی ہے کہ دروازہ کھلا رکھنا، وہ آئے گا۔ وہ ہمیں چھوڑ کے کہاں جا سکتا ہے۔ وہ تو کسی مصیبت زدہ عورت کی گاڑی ٹھیک کرنے گیا تھا۔ بڑا ماہر کاریگر بن گیا تھا مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اب تک اس نے خرابی دور نہ کی ہو۔

"ہوش میں آ سکندر!" محسن نے مجھے کندھا پکڑ کے جھنجوڑا۔

"میں رابعہ کو لے کر آتا ہوں۔"

میں نے چونک کر دیکھا تو ہم اس گیراج کے قریب کھڑے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں وہاں تک کیسے پہنچا۔ یہ خطرے سے دور ہو جانے کی لاشعوری خواہش تھی جس نے مجھے محسن کا ساتھ دینے پر مجبور کر دیا تھا ورنہ میرا ذہن تو نہ خطرے کے متعلق سوچ رہا تھا اور نہ فرار کے بارے میں۔ "کیا... کچھ کہا تھا تم نے؟" میں نے کہا۔

"تو بار بار کہہ رہا تھا وہ آئے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔" محسن نے کہا اور گلی میں غائب ہوگیا۔

میری آنکھیں خلا میں دیکھ رہی تھیں۔ فاکس ویگن دھڑا دھڑ جل رہی تھی اور اس کے آس پاس جمع ہو جانے والے سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ سب کیا تھا اور کیسے ہوا؟ یہ کس کی گاڑی تھی اور کون ہے اس کا مالک؟ انھیں بتانے والا کوئی نہ تھا کہ اس کی مالک بڑے اطمینان سے ایک گیراج میں بیٹھی ہے جہاں خوش اخلاق مالک نے اسے ایک کرسی فراہم کر دی ہے۔ گیس ہیٹر کو اس کے قریب کر دیا ہے اور اس کے

www.paksociety.com

بیٹے قلینڈا بھوسٹے سے بدنما کپ میں گرما گرم چائے منگوالی ہے۔ اور یہ لالچ نہیں نیکی کا جذبہ ہے اور شرافت کا سلوک ہے ورنہ وہ انکار نہیں کر سکتا تھا کہ اس وقت اتنی دور جانے والا... کوئی نہیں ہے جو جیپ گاڑی سے تانا ٹھیک کر دیں گے۔ ایک کار کے جلنے کا نظارہ دیکھنے والوں کو یہ بتانے والا کوئی نہ تھا کہ یہ ایک بم کا دھماکا تھا جو اس کے انجن میں فٹ کیا گیا تھا کہ ایک شخص سکندر بخت ولد وزیر خان اور اس کے کچھ مخلص و جاں نثار دوست اس میں فرار ہونے کے لیے انجن اسٹارٹ کریں تو ان کے وجود سے وابستہ مسائل پلک جھپکتے میں حل ہو جائیں مسکین تدبیر سے بڑھ کر شکاری تقدیر ہے۔ شکاری جن کو ختم کر دینے کا بندوبست کر چکے تھے وہ سلامت ہے اور ان کے حصے کی موت ایک بے گناہ محنت کش نوجوان کا مقدر ہوگئی مگر کیا کوئی کسی کی جگہ مر سکتا ہے؟ یہ تو سب قدرت کے فیصلے ہیں جن میں تحریف آدمی کے بس کی بات نہیں۔ ہر شخص اپنی موت مرتا ہے۔ کسی اور کی موت نہ وہ مر سکتا ہے اور نہ کوئی اسے اپنی موت دے سکتا ہے۔ اس میں وقت کے ایک ثانیے کا یا مقام کے فرق کا اختیار کسی کو حاصل نہیں۔ چنانچہ ہماری جگہ وہ نوجوان مکینک پہنچا اور اس نے زندگی پر مکمل اعتماد رکھتے ہوئے اگنیشن میں چابی لگا کے دیکھنا چاہا کہ گاڑی آخر اسٹارٹ کیوں نہیں ہوتی۔ اگر قدرت کو اسے زندہ رکھنا منظور ہوتا تو وہ انکار کر دیتا جانے سے۔ اپنی جگہ کسی اور کو بھیج دیتا یا انجن کو اسٹارٹ کرنے سے پہلے کھول کر دیکھ لیتا۔ شاید اسے دیکھتے بھالتے انجن کے درمیان کسی غیر مانوس چیز کی موجودگی کا پتا چل جاتا۔

لیکن یہ سب ایسے ہی اور اسی وقت ہونا تھا اور میرا پشیمانی کا احساس جو میرا جرم بن رہا تھا بے معنی...... بے مصرف تھا۔ میں نے رابعہ کو محسن کے ساتھ سڑک عبور کر کے آتے دیکھا اور بے خیالی ارادہ ان کے ساتھ چل پڑا مگر میرا دماغ غیر حاضر تھا۔ وہ بو کسی آسیب کی طرح میرا پیچھا کر رہی تھی جو ایک جیتے جاگتے انسان کے جسم کے جلنے کی بو تھی۔ جو ایک سیکنڈ پہلے تھا اور دوسرے سیکنڈ میں نہیں تھا۔

"تمہاری حالت کیوں غیر ہو رہی ہے سکندر!" رابعہ نے میرا بازو تھام کر کہا۔

"میں ہی تو ذمے دار ہوں اس کی موت کا رابعہ۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے جھوٹ کے خوب صورت جال میں گرفتار کر کے مرنے کے لیے بھیج دینا۔" میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"تم کو کہاں معلوم تھا کہ انجام یہ ہوگا۔" رابعہ نے نرمی سے کہا۔

"انجام کے بارے میں سوچ لینا چاہیے تھا مجھے۔" میں نے کہا: "میں نے خود کو بچا لیا اور اسے اپنی جگہ......"

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟ تمہارا تو صرف یہ خیال تھا کہ شاید کوئی اس کا تعاقب کرتا ہوا آئے گا۔ کوئی تمہارا پتا چلانے کے لیے وہاں موجود ہوگا تو معلوم ہو جائے گا۔ تم اس کا مقصد خود جان کر نہیں سمجھے۔" رابعہ نے کہا۔

"لیکن یہ خیال تو میرا ہی تھا۔" میں نے کہا۔ "کیا تمہیں معلوم..."

"یہ خیال تو مجھے بھی آسکتا تھا اور محسن کو بھی۔ اور زندگی یا موت تو خدا کی مرضی ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "ایسا نہ ہوتا تو اب تک ہم کب کے مارے جا چکے ہوتے۔"

محسن اور رابعہ خود بھی احساس پشیمانی کا شکار تھے لیکن میری جذباتی کیفیت ان سے مختلف تھی۔ ان کو افسوس تھا کہ وہ نوجوان مکینک بے گناہ مارا گیا تو مجھے خیال تھا کہ وہ میری وجہ سے مارا گیا۔ رابعہ اور محسن کے تسلی دینے اور ان کی منطقی باتوں اور دلائل سے اور تسلی سے میرے ضمیر کا بوجھ فوراً کم نہیں ہو سکتا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ یہ خلش آزار بھی میری روح میں کانٹا بن کے موجود رہے گی۔

"اس گیراج میں اور کون تھا؟" میں نے رابعہ سے پوچھا۔

"ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔" رابعہ نے کہا۔ "بڑی شرافت سے پیش آیا تھا۔ میں نے پوچھا تھا کہ یہ تمہارا بیٹا تھا جو گاڑی ٹھیک کرنے گیا ہے۔ کہنے لگا خدا کرے کہ میری ایسی اولاد ہو بچپن میں ہی گھر سے بھاگ آیا تھا۔ زمانے بھر کی ٹھوکریں کھاتا اور گاڑیاں صاف کرتے کرتے گاڑیاں ٹھیک کرنے لگا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے نکالا گیا کیونکہ ایک بُری عادت چوری کی پڑ گئی تھی۔ ورکشاپ میں تو ہر قسم کی گاڑیاں ہوتی ہیں اور ان میں سب کچھ ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو مالک نقد رقم وغیرہ تک بھول جاتے تھے۔ یہ سب غائب کر دیتا تھا۔ کبھی کسی کا ریڈیو نکال لیا، کسی کا پرزہ مار لیا۔ ورکشاپ کے سیکڑوں اوزار ہوتے ہیں۔ کوئی سب پر نظر نہیں رکھ سکتا لیکن یہ پکڑا جاتا تھا۔ آخر اس نے بتایا کہ چاہے تو اچھا کام کر سکتا ہے اور بہت کما سکتا ہے مگر نشے کی لت میں برباد ہو رہا ہے۔ اب محنت بھی کرتا ہے تو اسی لعنت کی خاطر اور چوری بھی کرتا ہے تو اسی کے لیے۔ جوانی کا ناس کر لیا ہے۔ میں نے پوچھا تھا کہ ماں باپ کچھ نہیں کہتے تو ہنسنے لگا کہ سات سال کی عمر میں گھر سے نکلا تھا اب اکیس برس کا ہے۔ اسے خود بھی یاد نہیں کہ کہاں کا ہے اور کون تھا۔ ایک بار بیٹھے بیٹھے رو دیا تھا مگر نہ گھر یاد نہ کوئی جاننے والا۔ میں نے کہا کہ تم ہی منع کیا کرو۔ وہ بولا کہ جو ماں باپ کا نہ ہوا اس کے لیے میرے کچھ کہنے سے کیا ہوگا اور وہ ہنستے ہنستے کا... میرا... بس

چھوڑ کر چلا جائے گا۔ کام تو مل ہی جاتا ہے کاریگر کو۔ ایسی زندگی بھی ہوتی ہے سکندر۔ یوں بھی جیتے ہیں لوگ۔ کسی رشتے کے بغیر۔"

"ہم سے اس کی زندگی کس طرح مختلف تھی۔" میں نے کہا۔ "ہم بھی تو اکیلے بچا ہیں۔"

"نہیں سکندر! ہم اکیلے نہیں ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "تمہارے ساتھ تو پہلے بھی محسن تھا۔ اکیلی تھی تو میں لیکن اب میرے ساتھ تم ہو اور محسن ہے شغلا ہے۔ اس کے علاوہ ہم کو زندگی سے پیار ہے۔ ہم جینا چاہتے ہیں اور اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کی خوب صورت دنیا بنانے کے لیے بھرپور جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ لڑکا آج نہیں مرتا تو کل زیادہ عذاب جھیل کے مرتا۔ نشے کی لت اسے چور تو بنا ہی چکی تھی۔ وہ جیل جاتا۔ نکلتا تو پھر چور بنتا اور نشے کی عادت اسے تباہ کرتی۔ وہ اس کے لیے ڈاکے ڈالتا یا دوسروں کو یہ زہر بانٹتا۔ وہ تو خود اپنی زندگی کا دشمن تھا اور کسی کو دلچسپی نہ تھی کہ اس کو زندگی سے محبت کرا سکتا۔۔۔"

محسن نے بالآخر ایک ٹیکسی کو روک لیا۔ میں نے خود کو چھوڑ کر اس بوجھ کو بہت کم محسوس کیا جو ابھی تک میرے لیے ناقابل برداشت بنا ہوا تھا۔ حقیقت تو کسی زندگی کی کم نہیں مگر کچھ لوگ مرتے ہیں تو جینے والوں کو مار جاتے ہیں اور سارا دکھ ان کے حصے میں آتا ہے جو زندہ رہنے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن اس نوجوان مکینک کی موت کا سب سے زیادہ صدمہ آج اگر تھا تو مجھے تھا۔ کل کو شاید وہ ایک گھر بسا لیتا تو اس کے بیوی بچے ہوتے جو اس کے اعمال کی سزا بھی کاٹتے اور عدم تحفظ کے باعث دنیا کے ہاتھوں بھی ان کا جینا دوبھر ہوتا۔

"یہ تو معلوم کرے گی پولیس کہ وہ گاڑی کس کی تھی۔" محسن نے انگریزی کے بجائے گفتگو کے لیے فرانسیسی کا سہارا لیا کیونکہ خاموش بیٹھنا بھی مشکل تھا اور ٹیکسی ڈرائیور کی توجہ سے گھبرا رہا تھا۔ انگریزی میں اظہار خیال میں خطرہ تھا۔ بیروزگاری کے سبب گریجویٹ ٹیکسی ہی نہیں چلا رہے تھے دفتروں میں چپڑاسی کی جگہ بھی لینے پر تیار ہوتے تھے۔

"انہیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ گاڑی میں کوئی شخص جل کر مرا ہے۔" میں نے کہا "اور جواب قریب میں ہی ہے یا ممکن ہے اس کی شناخت بھی ہو جائے۔"

"اس گیراج کا مالک بھی رابعہ کا حلیہ ضرور بیان کرے گا۔" محسن بولا "اور پھر پولیس رابعہ کو تلاش کرے گی۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ رابعہ اسی وقت جائے اور اپنی کار کے گم ہونے کی رپورٹ درج کرائے۔ طریقہ وہی استعمال کرے جو جاپانی والدہ نے استعمال کیا تھا یعنی رپورٹ درج کرانے کا وقت کم سے کم ایک گھنٹا پہلے کا ہو۔"

"تم رابعہ کے ساتھ چلے جانا۔ تاکہ تم صاحب لوگ سے لوگوں کی زبان میں بات کر سکے۔ اگر اس کے پاس گنجائش نہ ہوئی تو وہ خود کسی تھانے سے معلوم کرے گا۔ جہاں بھی وقت کا فرق زیادہ سے زیادہ ہو وہاں چلے جانا۔"

"اور تو کہاں جائے گا؟ آتی دیر کیا کرے گا؟"

"مجھے مرزا غالب کے دفتر کے سامنے اتار دینا۔" میں نے کہا "اس سے مل کر میں ہوٹل اوسس چلا جاؤں گا اور ایس بی کے خان کے نام سے کمرہ لوں گا اور تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا۔"

ایس بی کے خان میرے دونوں ناموں کا مجموعہ تھا۔ سکندر بخت کبیر خان اور محسن نے جس انداز سے سر ہلایا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی سمجھ گیا ہے۔ جب ٹیکسی مجھے اتار کے چلی گئی تو میں نے خود کو اخبار کے دفتر کی عمارت کے سامنے تنہا پایا۔ اس علاقے میں یہی ایک بلڈنگ روشنی اور گہما گہمی کا مرکز نظر آتی تھی۔ باقی کاروباری اداروں کے دفاتر تاریک اور ویران پڑے تھے۔ باہر ایک طرف موٹر سائیکلیں اور سائیکلیں قطار میں کھڑی تھیں تو دوسری جانب کاریں صف بستہ تھیں۔ میں ذہنی و جسمانی طور پر تھکن کا شکار تھا۔ دماغ پر ابھی تک اس نوجوان مکینک کی موت کا اثر تھا اور میری آنکھوں کے سامنے بار بار اس کی وہ تصویر آجاتی تھی جب وہ ہم سے دس قدم آگے ڈونگری پہنے اور ہاتھ بغل میں دبائے چل رہا تھا۔ ہم لوگوں میں سے کسی کو خواہش کے باوجود دل کا کھانے کا موقع نہیں ملا تھا اور اب یہی ایک صورت تھی کہ ہم اپنے اپنے طور پر جو ملے اسی سے پیٹ بھر لیں۔ سردی کے باعث مجھے گرم چائے یا کافی کی خواہش الگ تھی۔

اخبار کے دفتر میں میرا بنفس نفیس تشریف فرمانا کوئی دانش مندی کی بات نہ تھا۔ کوئی مجھے پہچان لیتا تو تازہ ترین خبر میری گرفتاری کی لگ جاتی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اخباری دنیا کے دانشور لوگ اس وقت کتنے مصروف ہوں گے۔ ایک مختصر سے وقفے میں شہر کی، ملک کی اور دنیا کی خبروں کو جمع کرنا، ان کو الگ کرنا اور طباعت کے آخری مراحل تک پہنچا کے صبح دم پورا اخبار پیش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا اور یہ وہ لوگ تھے جو ہر روز جوئے شیر لاتے تھے۔ مرتے اس اطمینان کے ساتھ رخصت ہوتے تھے کہ انہوں نے ایک کارنامہ سرانجام دیا ہے اور ہر شام اس احساس کے ساتھ لوٹتے تھے کہ انہیں پہاڑ کاٹنا

www.paksociety.com

ہے۔ چنانچہ ایسے مصروفیت کے وقت میں ان کی ذہانت، قوتِ مشاہدہ اور یادداشت پر کام کا دباؤ ہوگا اور کوئی نہ مجھے قابلِ توجہ سمجھے گا نہ نظر اٹھا کے دیکھے گا۔

کاؤنٹر پر بھی رش تھا۔ لوگ پریس ریلیز جمع کرا رہے تھے اور مصر تھے کہ ان کی انجمن کی تقریب یا ان کے جلسے کی خبر، کوئی بیان یا کوئی تصویر صبح کی اشاعت میں شامل کی جائے حالانکہ اب اس کا وقت گزر چکا تھا۔ پھر اندرونِ ملک نامہ نگاروں کے ٹیلی فون آ رہے تھے اور وہیں بیٹھا ہوا آپریٹر مسلسل چلا رہا تھا اور ادھر کی لائن اُدھر ملا رہا تھا۔ اس ہڑبونگ میں میری آواز بھی بڑی مشکل سے سنی گئی۔ "کیا ہے جی؟ کس کو ملنا ہے؟" آپریٹر نے دسویں بار پوچھا۔

"اسے بھئی مرزا غالب کو۔ کمرا نمبر ایک، ان کا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے کہا اور اس مرتبہ آپریٹر نے لائن ملا کے میری بات دہرائی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مرزا غالب نے خود ریسیور اٹھایا تھا۔ میں کاؤنٹر سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور انتظار کرنے لگا۔ غالب دس منٹ بعد نمودار ہوا۔ جاگر، ٹائٹ جینز، ٹی شرٹ کی گھٹنے تک لٹکی ہوئی اور بیہودہ منگولی شکلوں اور چہرے کی بجائے پریشان بال اور پریشان صورت۔ وہ مجھے دیکھے بغیر میرے سامنے سے تقریباً گھومتا گزر گیا۔ اس کے ذہن میں رابعہ کا نام تھا چنانچہ وہ صرف ایک مانوس زنانہ چہرے کو تلاش کر رہا تھا۔ باقی چہرے اسے نظر ہی نہیں آ رہے تھے۔ میں چند قدم اس کے پیچھے چلا اور جب وہ باہر نکل کے ادھر اُدھر دیکھنے لگا تو میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔۔۔

"السلام علیکم مرزا!"

وہ چونک کر پلٹا۔ "ارے تم۔ سکندر بادشاہ! تو یہ تم تھے۔"

"یار ذرا آہستہ۔ اچھا ہوا کہ تم نے باہر آ کے میرا نام لیا۔" میں نے کہا۔ "مجھے کام ہے تم سے۔ فرصت کب ہوگی؟"

"بھئی ہمارا کام تو ختم ہو گیا تھا۔ بس ایسے ہی دوسروں کے کام میں ٹانگ اڑا رہے تھے۔" وہ بولا۔ "لوگ جب کہتے ہیں کہ ایک کام ہے تو عموماً پیسا ادھار مانگتے ہیں۔ دس روپے ہوں گے تمہارے پاس؟"

میں ہنس دیا۔ "دس کیا سو لے لینا۔ لیکن کام ذرا لمبا ہے۔ میرے ساتھ چلو۔"

"اور کیسے چلیں بھئی، اپنا ہوائی گھوڑا لے لیں؟" وہ بولا۔ "مگر اس وقت بجز لات کی جگہ اگر تم خیالی میں گھومتے دوڑانے والی بات ہوگی۔۔۔۔۔۔ اسلاف میں شامل ہو جائیں گے۔"

"موٹر سائیکل چھوڑو، ویسے ہی چلتے ہیں۔ میں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔"

"وہ تو ہم نے بھی نہیں کھایا۔ اب تمہارے یاد دلانے پر یاد آیا۔" غالب نے کہا۔ "کس قسم کا کھانا کھاؤ گے؟"

"جیسا قریب ہے اور کھایا جا سکے۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ چوہدری ملاور کے کیس کی تازہ ترین صورت حال کیا ہے؟"

"چوہدری ملاور کا کیس؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "کون سا کیس؟ کوئی نیا گل کھلایا ہے اس نے؟"

"یار اتنی سردی میں گرما گرم لطیفے بھی مزا نہیں دیتے۔" میں نے کہا۔

"یار حد ہو گئی! ہم تو خود مانتے ہیں کہ ہم آدمی ہیں، اب آپ کیوں اُلّو بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ بخدا ہم کو اس کے کسی کیس کی خبر نہیں۔ بڑا کیس ہوتا تو بڑی خبر بنتی اور ہم بھی سن لیتے۔ ویسے"

"یعنی چوہدری ملاور کا قتل اتنی چھوٹی خبر ہے کہ کسی نے پڑھی ہی نہیں؟" میں نے جھنجھلا کے کہا۔

غالب چونکا اور ایک دم رک گیا۔ "قتل! اُسے قتل کر دیا ہے کسی نے؟" وہ چلایا۔ "یہاں آ کے بتاتے ہو بھئی یہ بات۔ چلو واپس۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچنا شروع کیا۔ "اسٹاپ پریس نیوز لائن ہے۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "ایک منٹ ٹھہرو۔ کیا واقعی تم کو نہیں معلوم؟"

"قسم خدا کی! ابھی اس شہر میں کسی اخبار والے کو معلوم نہیں۔" وہ بے چینی سے بولا۔ "دیکھو سکندر بادشاہ! اپنا تو یہی کیریئر ہے۔ تم ایکس کلیوسو اسٹوری لائے ہو۔ جو معلوم ہے وہ بتاؤ۔۔۔ بیٹا دو جھٹکا۔۔۔"

"مرزا غالب! کیا تم نے شام کا اخبار نہیں دیکھا؟ جو چھ بجے کے بعد آیا تھا۔" میں نے اسے پھر روک لیا۔

"کون سا اخبار؟" غالب نے کہا۔ "شام کے سارے اخبار میری ٹیبل پر پڑے ہیں۔"

"اور ان میں یہی خبر نہیں دیکھی تم نے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "بے وقوف بنانے کا ڈراما اب بند کرو۔"

"لاحول ولا قوۃ! تم نام بتاؤ اخبار کا۔ ہم تو ہر اخبار کا ایک ایک لائن تک خوردبین سے دیکھتے ہیں۔ ہماری اس عینک کے شیشے وہ بھی پڑھ لیتے ہیں جو شائع نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "کس اخبار کی بات کر رہے ہو تم؟"

میرا دماغ چکرا گیا۔ غالب سنجیدہ تھا اور ہوش میں بات کر رہا تھا۔ میں نے اسے نام بتایا تو وہ مجھے پانچ منٹ انتظار کرنے کا کہہ کر واپس گیا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ صرف ایک ہی اخبار کے

بندے کو سب سے پہلے خبر ملی ہو اور اس نے دوسروں کو بتائے بغیر دھماکا کیا ہو۔ مگر دھماکے کو بھی اب تو دس بارہ گھنٹے ہو چکے۔ جنگل کی آگ بن کر پھیلنے والی خبر تھی۔ اگر اس کو دبانا مقصود ہوتا تو اس وقت کچھ ہو سکتا تھا جب پہلا اخباری نمائندہ نمودار ہوا تھا۔ ایک اخبار میں چھپ گئی تو گویا سب میں چھپ گئی۔ لیکن کیا ہے کہ اتنے بڑے اخبار کا ایک آتا منیجر اور پرانا صحافی ابھی تک بے خبر ہے۔

پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں غالب پھر نمودار ہوا تو اس کے ہاتھ میں وہی شام کا اخبار تھا۔ "لو یہ دیکھو۔ بتاؤ کہاں ہے وہ خبر؟" اس نے اخبار مجھے تھما کر کہا۔ "یہی اخبار تھا نا؟"

"ہاں اخبار تو یہی تھا۔" میں نے پہلے صفحے پر ایک سرسری نظر ڈالی اور میری عقل خبط ہو گئی۔ میں نے اخبار کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس میں ہر خبر مختلف تھی۔ میں نے نظر اٹھا کے غالب کو دیکھا۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی سمجھدار باپ اپنے شریف زادے کو پہلی بار نشے میں گھر لوٹتے پر دیکھتا ہے۔ آہستہ آہستہ میرا ہاتھ اندر کی جیب میں گیا اور میں نے وہ اخبار نکال لیا جو اتفاق سے ابھی تک محفوظ تھا ورنہ بیگم محسن اور رابعہ کے پڑھ لینے کے بعد اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی کہ اسے ضرورت کے لیے سنبھال کر رکھا جاتا۔ میں نے وہ اخبار غالب کی طرف بڑھا دیا۔

غالب نے تہہ در تہہ اخبار کو کھولا اور اسٹریٹ لائٹ کی روشنی کے رخ کر کے پڑھا۔ وہ ایک دم ہنسا۔ "سکندر بادشاہ! تم وقت سے چوبیس گھنٹے پیچھے چل رہے ہو۔" وہ بولا۔ "یہ کل کا اخبار ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے!" میں نے اخبار اس سے چھین کر تاریخ دیکھی۔ تاریخ ایک دن پہلے کی تھی۔ "یار غالب! تم یہ مت سمجھنا کہ تم نے دانستہ نادانستہ چرس بھری سگریٹ پی لی ہے یا میرا دماغ ویسے ہی چل گیا ہے۔ یہ اخبار میں نے آج خریدا تھا اور ایک ہاکر سے۔ وہ چلّا چلّا کے اخبار بیچ رہا تھا اور یہی اعلان کر رہا تھا۔ تم دیکھو یہ خبر۔"

"خبر تو ہے مگر یہ کوئی گڑبڑ ہے۔" وہ اخبار دیکھ کر بولا۔ "چلو پہلے کچھ کھا پی لیں۔ پھر یہ معما بھی حل کرتے ہیں۔ تمہارے ساتھ کوئی فراڈ ہوا ہے۔"

"اخبار والوں نے فراڈ کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "ان کو کتنے نفل کا ثواب ملا ہوگا؟"

"اس میں ثواب عذاب کیا۔ کرام ہم سمجھتے ہیں بات کو۔ ابھی تم کو بھی سمجھا دیتے ہیں۔" اس نے ایک ریسٹورنٹ کا دروازہ کھولا۔ اندر سے گرم ہوا کا جھونکا آیا جس میں کھانوں کی اور چائے کی خوشبو تھی لیکن میری بھوک غائب ہو گئی تھی۔ البتہ غالب میرے مقابلے میں زیادہ پُرسکون رہا۔ اُس نے اصرار کر کے مجھے بھی کھانا کھلایا اور خود بھی ڈٹ کر کھایا۔ پھر اس نے کافی منگوائی اور میرے پیکٹ میں سے سگریٹ جلائی۔ درمیان میں اس نے مجھے بولنے ہی نہیں دیا۔

"اب بتاؤ ذرا احوالِ واقعی! آخر یہ سلسلہ کہاں سے شروع ہوا؟" وہ بولا۔

میں نے اسے کم سے کم الفاظ میں بتایا کہ کس طرح ہم ہیڈی کے گھر سے فرار ہوئے تھے اور کس طرح شامتِ اعمال ہمیں اس گھر میں لے گئی تھی جہاں پہلے میرے والد رہتے تھے اور اب ایک ریٹائرڈ جج رہتا ہے۔ میں نے جج کی زبانی ہونے والے انکشافات کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ اخبار میں نے واپسی میں ساڑھے بارہ ایک بجے کے قریب لیا تھا۔ بلکہ ہم وہیں سے کوئی میرے پیچھے لگ گیا تھا جس نے اورینٹ ہوٹل تک میرا تعاقب کیا اور پولیس کو اطلاع دی۔ ہم وہاں سے کیسے نکلے، کس طرح رابعہ سے ملے اور اس وقت کہاں سے آ رہے تھے، یہ سب غالب نے بڑی توجہ سے سُنا۔ پھر میں نے محسن کے خیال کا تذکرہ کیا جسے اب تک مجذوب کی بڑ سمجھتے ہوئے میں نے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

www.paksociety.com

لیکن اب میں اعتراف کرنے پر مجبور تھا کہ محسن واقعی صاحب کشف و کرامات ہے۔

"لاحول ولا قوۃ! ابھی اس نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا، نشانے پر لگ گیا۔ ایسے تو سب ولی ہونے کا دعوے کر سکتے ہیں۔ وہ باپ بیٹے تھے نا جو کہتے تھے کہ دنیا میں ہم سے سچا کوئی نہیں۔ باپ کہتا تھا کل بارش ہوگی بیٹا کہتا تھا کل بارش نہیں ہوگی۔ کبھی ایک کی بات سچ ثابت ہوتی تھی کبھی دوسرے کی۔ میں ابھی کہوں کہ صبح زلزلہ آئے گا، آ گیا تو میں صاحب کشف و کرامات ورنہ پاگل۔"

"مرزا غالب! اگر دلاور مرا نہیں ہے تو کون مرا ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ تم کو معلوم کرنا ہے لیکن اس سے پہلے مجھے وہ بات بتاؤ جو میری ناقص عقل میں نہیں آ رہی ہے۔ یہ ایک تاریخ کے دو اخبار کیسے ہو گئے؟"

"جہاں تک ہماری فہم و فراست کو دخل ہے۔" مرزا غالب نے کہا: "تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ توڑ اخبار والوں کے ساتھ ہو گیا ہے۔ کل جب اخبار چھپ گیا تو اس کی کاپی چرا لی گئی یا کسی سے ایمانی سے خرید لی گئی جو بے مصرف ہو گئی تھی۔ مطلب اس کاپی سے ہے جس پر خبریں جوڑی جاتی ہیں اور اخبار چھاپا جاتا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اسی جگہ کل دوسری خبر تھی۔ کسی افریقی ریاست میں فوجی انقلاب آنے اور ناکام ہونے کی خبر تھی۔ کسی نے اس خبر کو نکال دیا اور ایک نئی خبر کی کتابت کرائی گئی۔ سرخی لکھوائی گئی اور اصل خبر کی جگہ لگا دی گئی۔ کتابت تو ٹھیک ہے لیکن خبر کی زبان صحافیانہ نہیں ہے۔ اس میں کچھ پرسنل ٹچ ہے۔ رپورٹنگ میں اور اسٹوری رائٹنگ میں فرق ہے اور یہ کسی رپورٹر کی زبان نہیں ہے۔ اس میں افسانوی رنگ ہے۔ خیر تو یہ کل کی کاپی کمال مہارت کے ساتھ بدلی گئی۔ یہ خاصا ٹیکنیکل کام ہے اور بہت پلاننگ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ اسکیم پہلے ہی تیار کر لی گئی ہوگی۔ سرخی کے ساتھ خبر بھی کتابت کرائی جا چکی ہوگی۔ کسی کاپی جوڑنے والے سے بھی بات طے ہوگی۔ اب ممکن ہے یہ کوئی نہ بتا سکے کہ کاتب کہاں سے لیا گیا تھا اور کاپی جوڑنے والا کہاں سے۔ تاہم انھوں نے بھاری معاوضے پہ یہ کام کروایا۔ ایک کاتب یا کاپی پیسٹر کے لیے دس ہزار بھی بھاری معاوضہ ہے۔ پھر رات کے وقت کسی اخبار کے پریس میں مشین مین وغیرہ کی مدد سے بدلی ہوئی خبر کے ساتھ اخبار کی سو پچاس کاپیاں چھاپ لی گئیں۔"

"کیا ان کو الہام ہوا تھا کہ اس وقت میں فلاں جگہ سے گزروں گا؟"

"ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ تم کہاں ہو۔" غالب نے کہا۔ "انھوں نے کسی لڑکے کو چند منٹ کے لیے وہاں کھڑا کر دیا اور اس نے تم کو دیکھتے ہی اناؤنسمنٹ شروع کر دی۔ چند منٹ میں اس کے پاس سے کتنے اخبار نکلے ہوں گے۔ یہی چار پانچ اور وہ بھی غیر متعلق افراد نے محض تجسس میں خریدے ہوں گے کہ یہ پڑھتے ہی شام کا اخبار ہیں۔ خبر شہر میں کیسے پھیل گئی؟ اب تو ہم کہیں کہ خریدار بھی انہی کے تھے تو بعید از قیاس نہیں۔ اگر تم ادھر نہ جاتے تو یہ اخبار کسی اور جگہ تمھارے ہاتھ میں تھمایا جاتا۔"

"لیکن ہم تو کسی پروگرام کے بغیر ادھر چلے گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"نہیں تم کو بالکل ٹیڈی کے گھر سے نکالا گیا تھا۔" غالب بولا۔ "ان کی توقعات کے مطابق تم نے سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ تم پیچھے سے فرار ہوئے تھے جہاں وہ تم کو دیکھ رہے تھے۔ خلاف توقع صرف ایک بات ہوئی کہ جب تم شمشاد کے گھر پہنچ گئے تھے اور پھر اس کی کار میں روانہ ہو گئے تھے۔ میرا خیال ہے انھوں نے بعد میں شمشاد سے ہی پوچھا ہوگا کہ وہ صاحب کو کہاں چھوڑنے گیا تھا اور اس نے بتا دیا ہوگا۔"

"اسے ہم نے شملے کچہری سے ذرا آگے اتار دیا تھا، اس نے کیا بتایا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"باقی ان کا اندازہ تھا جو درست ثابت ہوا۔" غالب نے کہا۔ "تمھارا رخ کدھر تھا آخر؟ اسی سمت میں جہاں تم کو پلٹ سکتے ہیں۔ گاڑی کہاں کھڑی کی تھی تم نے؟"

"اپنے پرانے گھر کے اندر۔" میں نے کہا۔

غالب ہنسا۔ "انھوں نے گاڑی دیکھ لی ہوگی۔ کتنی دیر کھڑی رہی تھی وہاں گاڑی؟"

"کافی دیر تک۔ میرا خیال ہے ڈیڑھ دو گھنٹے تک۔" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

"کافی مہلت دی تم نے انھیں۔" غالب بولا۔ "شمشاد آدھے گھنٹے بعد ہی واپس اپنے گھر پہنچ گیا ہوگا اور اسے کیا ضرورت تھی تمھارے غیر شریفانہ سلوک کے بعد کچھ چھپانے کی۔ وہ ڈرا ہوگا یا ڈرا دیا گیا ہوگا کہ جھوٹ بولنے سے زیادہ خرابی ہوگی۔ انھیں بہت زیادہ وقت تو نہیں ملا لیکن ان کی خوش قسمتی تھی یا تمھاری بدقسمتی کہ ان کا اندازہ درست ثابت ہوا اور تم ماڈل ٹاؤن میں دریافت ہو گئے۔ باقی انتظام ممکن تھا۔"

"مرزا غالب! محسن کی بات کو تمھاری بات کے ساتھ ملا کے سمجھا جائے تو سب حل ہو جاتا ہے لیکن ابھی اس میں ایک بات مبہم ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے ٹیڈی کے گھر سے نکالنے والوں نے یہ نہیں چاہا تھا کہ میں زندہ سلامت نکل جاؤں۔ انھوں نے میری گاڑی میں بم فٹ کر کے ہمارا کام تمام کرنے کا پورا بندوبست کر لیا تھا۔ پھر اخبار کے ذریعے جعلی خبر کچھ بہت ... پہنچانے کا انتظام انھوں نے کیوں کیا تھا؟ یہ انتظام پہلے کر لیا گیا تھا اور بم بعد میں رکھا گیا۔ وہ مجھے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے تو اخبار کے ذریعے جھوٹی خبر پہنچانے کا بندوبست تو بے مقصد ہوتا۔ کیا وہ اس کی کاپی مجھے عدم آباد ارسال کرتے؟"

"[illegible]" غالب بولا۔ "آپ بھی ذرا عقل سے کام لیتے ہوئے ایک حقیقت کو تسلیم کریں جس پر سے ہم پردہ اٹھانے والے ہیں۔ چوہدری صاحب کو ہرگز آپ کی وفات مطلوب نہیں تھی۔ رابعہ کی کار میں بم رابعہ کو ختم کرنے کے لیے رکھا گیا تھا۔"

مجھ پر دہشت سے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ "رابعہ کو؟ اب وہ اس حد تک گر گئے ہیں!"

"وہ مقولہ ہمیشہ صحیح رہے گا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔" مرزا غالب نے کہا۔ "امریکی آج بھی کہتے ہیں کہ ہم ایٹم استعمال نہ کرتے تو جاپان ہتھیار نہ ڈالتا اور جنگ جاری رہتی تو اس سے کہیں زیادہ لوگ مارے جاتے جتنے ایٹم بم سے ہلاک ہوئے تھے۔ یہ مبنی بر توجیہ کا سیدھا سا سوال تھا لیکن اس کو دوسرے پہلو سے بھی دیکھا گیا کہ ایٹم بم سے ہلاک ہونے والے جارحیت کا ارتکاب کرنے والے ملک سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ہتھیار نہ ڈالتا تو مرنے والے دوسرے ہوتے جو بقول فاتح کے امن پسند تھے۔ چنانچہ برادر کلاں! ابلا رابعہ کا قتل ایک ایٹم بم ہوتا جس کے بعد تم جنگ میں اپنی ہار مان لیتے۔ اس نقصان عظیم کے بعد تمھارے لیے فتح بے مقصد ہو جاتی اور تمھارا حوصلہ اتنا پست ہو جاتا کہ شاید تم انتقام کے پاگل پن میں سیدھے دلاور کو قتل کرنے پہنچتے اور پھر خود کو گولی مار لیتے۔ تمھاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ بھی یہی کرتے۔ چنانچہ دلاور وقتی طور پر غائب ہو گیا اور تم کو یقین دلا دیا گیا کہ وہ خود بھی قتل ہو گیا۔ اب تم انتقام بھی لو گے تو کس سے۔ صرف اپنے آپ سے۔ دنیا کو چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے، پاگل ہو جاؤ گے یا خودکشی کر لو گے۔ یہی دلاور چاہتا تھا۔ اس کی اسکیم کسی کی تدبیر سے فیل نہیں ہوئی بلکہ ایک اور صداقت کا وجود قائم رکھنے کے لیے یہ اہتمام تقدیر نے کیا۔ صداقت یہ ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہے۔ تم گاڑی رابعہ کے پیچھے پیچھے پہنچے تھے۔ جب وہ تمھارے پاس گئی تو ان کو معلوم نہ تھا کہ وہ گاڑی تمھارے سپرد کر کے گئی ہے۔"

یکلخت مجھے ایک خیال آیا۔ "غلط۔ وہ مشکل سے چند منٹ رکی تھی۔ پھر محسن اسے چھوڑنے گیا تھا اور اگر اس عرصے میں انھوں نے بم رکھ دیا ہوتا تو وہ دونوں مارے جاتے مگر محسن دس منٹ میں لوٹ آیا تھا۔"

"اچھا! تو پھر انھوں نے بم بعد میں رکھا۔" غالب بولا۔ "محسن اور رابعہ کے آنے سے ان کو وقت نہیں ملا ہوگا اور وہ چھپ گئے ہوں گے۔ دس منٹ بعد وہ دیکھ نہیں سکے ہوں گے کہ گاڑی میں صرف محسن واپس آیا ہے یا اس کے ساتھ رابعہ بھی واپس آئی ہے۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ وہ دونوں کسی کام سے گئے تھے اور جلدی ہی لوٹ آئے۔ پھر انھوں نے بم فٹ کیا اور چلے گئے۔ ان کو وہاں رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دوسری ٹیم تھی جس نے تم کو ٹیڈی کے گھر سے فرار ہونے پر مجبور کیا اور عقبی گلی سے نکالا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ تم سامنے سے نکلو اور گاڑی میں جاؤ۔ ان کے خیال کے مطابق رابعہ اندر ہی تمھارے ساتھ تھی اور جب تم نکلے تو تمھارے ساتھ نہیں تھی۔ ظاہر ہے ان کو اپنی کامیابی کا یقین تھا کہ اب رابعہ اپنی گاڑی میں ہی واپس جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا اور گاڑی وہیں کھڑی رہی۔ کل کے اخبار میں گاڑی میں بم کا دھماکا ہونے کی خبر

www.paksociety.com

نہ ہوتی تو دلاور شاید ایک نمبر تم سے پوچھتا کہ یہ کیا ہے اور وہ دیکھتے جاتے لیکن اب تم سے معلوم ہو جائے گا کہ ایک نمبر تم بھی کامیاب رہی اور دو نمبر نے بھی اپنا کام بالکل پلاننگ کے مطابق کیا اور بوگس خبر والا اخبار سکندر بخت تک پہنچا دیا۔"

"اور وہاں سے پولیس کا کوئی مخبر میرے پیچھے لگ گیا۔" میں نے کہا۔ اس خیال سے میرا وجود ابھی تک لرز رہا تھا کہ بم کے دھماکے سے بیچ میں رابعہ ماری جاتی تو میرا کیا ہوتا۔ شاید وہی ہوتا جو دلاور چاہتا تھا۔ ذرا سی احتیاط پسندی کی عادت کے باعث میں نے رابعہ کو روک لیا اور رابعہ کی جگہ وہ مکینک مارا گیا۔

"اب دلاور کو خبر مل چکی ہوگی کہ رابعہ اس کار میں جل کے مر گئی۔ وہاں کچھ لوگوں نے بھی تصدیق کر دی ہوگی۔ بلکہ گیراج کے مالک نے کہ ایک عورت آئی تو تھی۔ اور اسے کوئی بلا کے لے گیا تھا۔" غالب نے کہا۔ "مرنے والا ایک مکینک تھا۔ کل تک یہ غلط فہمی رفع ہو جائے گی کیونکہ رابعہ اپنی کار کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے گئی ہے۔ یہ رپورٹ لکھوانے کا وقت دھماکے سے بہت پہلے کا ہوگا۔ دلاور سمجھ جائے گا کہ دھماکے سے رابعہ نہیں مری، مکینک مارا گیا ہے۔"

"لیکن اس ناکامی کی خبر دلاور کو بہت مشتعل کرے گی۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "اور وہ ایک ناکامی سے دل برداشتہ ہونے والا آدمی نہیں ہے۔ رابعہ کی زندگی کو سخت خطرہ لاحق ہے غالب!"

"میں اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "وہ دوسرا ایٹم بم بہت جلد گرائیں گے۔"

"مجھے فوراً کچھ کرنا ہوگا غالب۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "رابعہ کو اس طرح نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ میری شکست کا سبب بن سکتی ہے۔ وہ ہر جگہ ہر وقت شکاری کی نظر میں گھری ہوئی ہے اور ہر شکاری دشمن کے لیے سب سے آسان نشانہ ہے۔" میں نے سو کا ایک نوٹ میز پر رکھا اور باہر نکل آیا۔

"تم کیا کرو گے؟ اسے جیب میں ڈال کے پھرو گے یا جادو سے غائب کر دو گے؟" غالب نے کہا۔ "اور صرف چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر تم نے اسے دور بھیج دیا کسی ایسی جگہ جہاں کسی کے خیال و گمان کا گزر نہ ہو۔ تو پہلی بات یہ کہ وہ ایسی جگہ جانا قبول ہی نہیں کرے گی۔ بعد میں یہ ہوگا کہ خود تم جدائی کی تاب نہ لا سکو گے اور وہ تمہاری فکر میں نیم جاں، ادھر تم اس کے غم میں ہلکان۔ یہ تم سے نہ ہوگا۔"

"یہ تو ہمیں کرنا پڑے گا۔ وقتی دوری کی مجبوری اور زندگی میں سے ایک کا انتخاب کیے بغیر چارہ نہیں۔ دشمن سامنے آ کر اور بزدلی کا حربہ آزمایا تو میں نے شرافت اور اصول کو پیٹھ بالائے طاق رکھ چکا ہوں۔ پھر مجھے بھی یہی کرنا پڑے گا جو میں نے کبھی نہیں کی لیکن جواب اینٹ کا پتھر سے دینا ہوگا۔ وہ رابعہ کے بعد محسن کو میری کمزوری بنا کے وار کر سکتا ہے تو میں بھی اس کی کمزوریوں کو اپنی شہ زوری بنا سکتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے اس کی بھی ایک فیملی ہے۔ بیوی بچے ہیں۔ ماں ہے۔ ابھی اور میری ذات تک محدود ہے تو نقصان دونوں طرف برابر کا ہوگا۔"

"ابھی سر دست تمہارے دماغ کا انجن بہت گرم ہو رہا ہے۔ اس لیے ابھی یہ بات ختم کرو۔ بس اتنا طے ہے کہ تم کو رابعہ کی حفاظت کرنی ہے۔ کیسے کرنی ہے؟ یہ بعد میں اس وقت سوچنا جب دماغ سوچنے کے قابل ہو۔ اسی کام سے آئے تھے تم میرے پاس؟" غالب نے کہا۔ "یا کچھ اور بھی ہے؟"

"اصل کام تو میں نے تم کو بتایا ہی نہیں۔" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "تم کو ابھی دلاور کی کوٹھی پہ جانا ہے۔ وہاں کچھ سوگواران جمع ہیں اور پولیس بھی ہے لیکن وہ سارا انتظام کیے بنایا گیا ہے۔ تم جعلی خبر والا اخبار لے کر پہنچ جاؤ اور دیکھو کہ مرنے والا کون ہے۔ سارا ڈراما فلاپ ہو جائے گا۔"

"گویا آپ فرماتے ہیں کہ چڑھ جا بیٹا سولی پر رام بھلی کرے گا۔"

"یہ تمہارے لیے ڈرنے کی کون سی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہاری روانگی کے بعد میں ایک فون کر دیتا ہوں دلاور کی کوٹھی کے نمبر پہ کہ کچھ ایسی بات ہے اور ہمارا ایک نمائندہ مسٹر مرزا غالب بقلم خود تصدیق کے لیے آ رہا ہے۔ اس سے بڑی افراتفری پھیلے گی وہاں۔ وہ تم کو غائب کرتے رہے۔ ڈراما ختم کر دیں گے۔ یا تو لاش کو فوراً تدفین کے لیے روانہ کر دیں گے اور تم سے کہہ دیں گے کہ وہ غلط فہمی کسی شرپسند نے پھیلائی تھی اور الحمدللہ کہ چوہدری صاحب سو فیصد زندہ ہیں۔ اور صاف انکار کر دیں گے کہ یہاں اصل یا نقلی کوئی چوہدری دلاور نہیں مرا۔"

"ازروئے قانون رات دس بجے کے بعد کوئی لاش تدفین کے لیے قبرستان لے جانے پر پابندی ہے۔" مرزا غالب نے کہا۔

"پھر وہ صبح ہوتے ہی اس دلاور سمجھے جانے والے یا دلاور کی جگہ استعمال ہونے والے کو ٹھکانے لگانے کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم پولیس کو پیچھے لگا دو۔ وہ معلوم کریں کہ کون قتل ہوا تھا۔ ہوا تھا تو اس کی رپورٹ پولیس کو کیوں نہیں دی گئی۔ اصل اور نقل اخبار کا اسکینڈل اور چھوڑ دو۔ فی الحال اتنا

کافی ہے۔"

"ہمیں اپنے ہوائی گھوڑے پر جانا پڑے گا۔" مرزا غالب نے کہا۔ "منجمد حالات میں پہنچیں گے ہم۔"

"میں بھی سر سے کفن باندھ کے پیچھے بیٹھوں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے میکلوڈ روڈ کے کشمیر چوک پہ اتار دینا۔ ہوٹل پاورسس کے سامنے اور واپسی میں مرے پاس آنا۔ ایس پی کے خان کے نام سے میرا کمرہ بک ہوگا۔"

مرزا غالب تھوڑی دیر بعد سر پہ کنٹوپ چڑھائے پرانے موٹر سائیکل لیے نمودار ہوا اور میرے پاس آ رکا۔ میں نے اس کے پیچھے بیٹھنے کے بعد دونوں پاؤں کہیں ٹکانے کی جگہ تلاش کی مگر دونوں طرف فٹ اسٹینڈ تھے ہی نہیں۔ پیچھے کیریئر کا سہارا بھی نہیں تھا چنانچہ موٹر سائیکل کے کسی بھی جھٹکے سے نکل جانے کے امکانات بہت روشن تھے۔ خود موٹر سائیکل پہ دو افراد کا سوار ہونا بے رحمی کا مظاہرہ لگتا تھا۔ وہ خاصی بے جان چیز تھی۔ "یہ کیا مصیبت ہے مرزا جی! میں اپنے پیر کہاں رکھوں؟" میں نے کہا۔ "لٹکنے کی جگہ ہی نہیں۔"

"ہوائی گھوڑے کی رکاب نہیں ہوتی۔" غالب نے چلا کر کہا۔ سائیں سائیں کرتی سرد ہوا میرے کانوں کو سن کرتی گزر رہی تھی۔ میرے دونوں پیر بریکٹ کی شکل میں سڑک سے چند انچ اوپر تھے اور گردش کرتے ہوئے پہیے سے بھی دور تھے۔ اس پوزیشن کو بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ اگر پیر ذرا نیچے کرتا تو سڑک سے جا لگتے اور موٹر سائیکل زد سے نکل جاتی تو میں سڑک پر گھسٹتا چلا جاتا۔ اندر کرتا تو میری پتلون ضرور پہیے میں پھنس جاتی۔ جگہ ہوتی تو میں سیٹ کے پچھلے حصے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھنا پسند کرتا لیکن اب میری حالت قابل رحم ہو رہی تھی۔ آخر کوئی شخص کب تک پیروں کو ہوا میں معلق رکھ سکتا ہے اور وہ بھی اتنی سخت سردی میں اور ناہموار سڑک پہ۔ میرے پیر اکڑنے لگے تھے۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری کیونکہ سفر مختصر تھا۔ پانچ منٹ بعد جو میرے لیے پانچ گھنٹوں کی مشقت تھے میں ہوٹل پاورسس کے سامنے اترا تو میرے لیے سیدھا کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ میری ٹانگیں بدستور بریکٹ بنی ہوئی تھیں کیونکہ ٹخنوں کے درمیان فاصلہ چھ انچ کا تھا تو گھٹنوں کے درمیان ایک فٹ کا۔

"یار مجھے کمرے تک چھوڑ جاؤ۔ خالی ہاتھ جاؤ گے تو ہوٹل والے شک کریں گے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور میرا خیال درست تھا۔ اگر مرزا غالب اپنا اخبار کا پریس کارڈ نہ دکھاتے تو مجھے جگہ نہ ملتی۔ میں نے ایڈوانس ادائیگی کی اور کمرے میں جاتے ہی پہلے ہیٹر جلایا۔ پھر ہوٹل ریسٹ اینڈ فون کیا۔ گیس ہیٹر کی حرارت سے میری ٹانگیں کانپنا بند ہو گئیں۔ ایک ہوٹل کے آپریٹر نے دوسرے آپریٹر سے بات کی اور نمبر مانگا۔ میں ریسیور تھامے لحاف میں گھس گیا۔

"میں ایس پی کے خان بول رہا ہوں لحاف کے اندر سے۔" میں نے کہا۔

"باہر مت نکلنا، میں آ رہی ہوں۔" رابعہ ہنسی۔ "ابھی پانچ منٹ میں۔"

"وہ بھی کسی کے ساتھ۔ ایک محمد اور محسن زندہ ہوں تو انہیں ہی لے آنا۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ دوسری بار میں نے روم سروس کو چار افراد کے لیے چار چکن کڑاہی اور چار پلیٹ ارسال کرنے کو کہا۔ کاؤنٹر کلرک نے مجھے بھی جعلی اخبار والا سمجھ کے صرف "یس سر" کہا اور پھر پوچھا کہ کیا میرے مہمان آنے والے ہیں؟ میں نے اسے بتایا کہ ایک تو مہمان نہیں بلکہ جان ہے۔ اور اسے وہ شعر سنایا کہ بلا سے جان ہے غالب اس کی ہر بات عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا۔ اور ریسیور رکھ دیا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دس منٹ بعد دستک ہوئی تو میں نے لحاف کے اندر سے ہی چلا کر کہا۔ "یس!" پھر محسن نے لحاف کھینچ کر نیچے پھینک دیا۔ میں اٹھ بیٹھا اور میں نے محسن کا ہاتھ عقیدت سے پکڑ کے چوما اور آنکھوں سے لگایا۔

بچوں کے مشہور ادیب ... کی مقبول ترین کتابیں
پکاری لاشیں
جہنم کی بلائیں
مسٹر چکرم
تیسرا روپ
کتابیات پبلی کیشنز ... کراچی

www.paksociety.com

"اتنی سی دیر میں دشمنوں نے کچھ کر دیا؟" رابعہ نے تشویش سے کہا۔

"وہ سب گستاخیاں جو میں نے اب تک آپ کی شان میں فرمائیں۔" میں نے کہا۔ "اور آئندہ فرماؤں گا۔ ان سب کو معاف کیا جائے تو یہ بندہ حقیر آپ کو اپنا پیر بلکہ مشکل کشا اور بدھ تک تسلیم کرنے کو تیار ہے۔ میں بکواس کرتا تھا اور آپ سچ کہتے تھے۔ دلاور زندہ ہے اور صرف اس لیے زندہ ہے کہ ہمیں دنیا کا سب سے بڑا بیوقوف ثابت کر سکے۔"

"جمع کا صیغہ مت استعمال کرو۔" محسن نے بیٹھتے ہوئے گرج کر کہا۔ "ہم پہلے ہی جانتے تھے۔"

"یار سکندر بادشاہ! کتنا اچھا ہوتا اگر یہ چوہدری صاحب سچ مچ مر جاتے۔" استاد شیدی نے آہ بھر کے کہا۔ غالباً محسن انہیں پوری طرح بریف کر چکا تھا۔

"تم لوگوں نے کیا تیر مارا، رپورٹ لکھوا دی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ پانچ سو روپیہ سکۂ رائج الوقت نے کام آسان کر دیا۔" محسن بولا۔ "میں نے تو تھانیدار سے صاف بات کی کہ جتنی نقد سودا ہے تکلف کیسا اور اس نے کہا کہ صاحب ہم بیٹھے ہی خدمت کے لیے ہیں۔ اب یہ دستاویزی ثبوت موجود ہے کہ وہ حادثہ ہونے سے دو گھنٹے قبل مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ گاڑی کی چوری کی رپورٹ لکھوانے خود تھانے آئی تھیں۔ غالب ملا؟"

"ہاں۔ مجھے یہاں چھوڑ کے چوہدری دلاور کے گھر گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم لوگوں نے کچھ کھایا پیا؟"

"ہاں۔ بس اپنے خواجہ نیک محمد کے کمرے میں کچھ چر لیا تھا۔" محسن نے کہا۔ اسی وقت ویٹر نے دستک دی اور کافی کے ساتھ سینڈوچز لے کر دو ویٹر اندر آ گئے۔ انہوں نے اپنی اپنی ٹرے ایک ہی میز پر رکھی اور کچھ کہے بغیر نکل گئے تو میں نے ان کو بتایا کہ نامی سے ملاقات کے کیسے سنسنی خیز نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

"دلاور کی موت ہی جعلی نہیں تھی، وہ خبر بھی جعلی تھی یا اخبار بھی جعلی تھا؟" رابعہ نے سخت حیران ہو کے کہا۔ "کیا تیز ذہن ہے چوہدری دلاور کا۔ ایسے شیطانی منصوبے بنا سکتے ہیں۔"

"اور جتنا وہ چالاک ہے تم اتنی ہی وہ ہو۔" میں نے کہا۔ "کیا کہتے ہیں اسے محسن... عورت کو...؟"

"ہاں ہاں، ناقص العقل ہوں میں۔ تم جیسے عاقل و بالغ ہو۔" رابعہ نے کہا۔

"آخر کسی حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ اپنا سرمایہ اس گھر کو خریدنے میں لگا دو؟" میں نے کہا۔

"میں سمجھی تھی تم کو خوشی ہو گی۔" رابعہ نے روہانسی شکل بنا کے کہا۔ "میں تمہارے مستقبل سے ہی نہیں، ماضی سے بھی اپنا تعلق قائم کرنی تھی۔" اس نے اچانک رونا شروع کر دیا۔ "مگر تمہارے نزدیک میری یہ جذباتی حرکت حماقت ہے۔"

میں سخت شرمندہ تھا کہ میں نے مذاق میں وہ بات کہہ دی جس نے ایک عورت کے جذبات کے آبگینے کو ٹھیس پہنچائی۔ رابعہ نڈر اور بیباک تھی، خود مختار اور جرأت مند تھی، بلند حوصلہ اور عام عورتوں کے مقابلے میں خطرناک ترین حالات میں ثابت قدم رہنے کی اہل تھی لیکن اس کے باوجود وہ اندر سے وہی عورت تھی جو محبت کرتی ہے تو جذبات و احساسات کی ساری وارفتگی کے ساتھ...... اپنی چاہتوں کے سامنے ڈھیر ہو جانے والی، اپنے وجود کی ساری خوشیاں اور راحتوں کے سامان اپنی ذات کے سب رشتے ایک محبت پر قربان کر دینے والی۔ اسے بے وقوف کہنا میری سب سے بڑی بے وقوفی تھی۔

"دیکھو رابعہ آئی ایم سوری۔" میں نے کہا اور اس کے پاس جا بیٹھا۔ آہستہ سے اس کے ہاتھ چہرے سے ہٹائے اور اس کے آنسو صاف کیے۔ "میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ تم کو میری نیت پر شک تو نہیں کرنا چاہیے۔ کیا میں نہیں جانتا کہ تم جو کچھ کر رہی ہو کیوں کر رہی ہو۔ اور یہ تو ایسی بات ہے جو دنیا جانتی ہے۔ بات صرف وقت کی ہے ورنہ ہم نے زندگی بھر کی رفاقت کا جو عہد کیا ہے اس میں سب سے بڑا عنصر اعتماد کا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک عقلی فیصلہ ہے چنانچہ ہم کسی کے سامنے نادم نہیں اور پچھتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔"

اس وقت محسن نے بہت عقلمندی سے کام لیا۔ اس نے سگے بھائی کی طرح رابعہ کا سر اپنے کندھے پر رکھا۔ "سکندر کے بارے میں تم کو ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے کہ وہ مذاق میں کچھ کہتا ہے تو اس میں کوئی برا ماننے والی بات ہوتی ہے۔ میں نے تم کو آج بتایا کہا تھا لیکن کتنے سے پہلے بھی کیا میں ایسا ہی سمجھتا نہیں تھا؟ اور کیا مجھے معلوم نہیں کہ سکندر کے لیے شہلا واقعی چھوٹی بہن ہے سگے سوتیلے کچھ نہیں۔ یہ حقیقی رشتے ہیں۔ آپس کے یقین اور اعتماد پر مبنی، صرف نیک نیتی اور خلوص کے مظہر۔ ہم سب مل کے ساتھ چل رہے ہیں تو اسی اعتماد کے سہارے ہیں اور اسی امید پر کہ کل ہمارا ہے۔ اور گزرے ہوئے کل کے مقابلے میں آنے والا دن ہماری واقعی خوشیوں کا ضامن ہے۔ وہ ایک ہی گھر اور ایک ہی خاندان ہو گا جس میں تم اور سکندر، میں اور شہلا ساتھ ساتھ ہوں گے۔"

"ہاں جی۔ بس ایک ہم رہ جائیں گے فٹ پاتھ پر کشکول لے کر بیٹھے ہوئے۔" شیدی نے ایک سرد آہ بھر کے زور سے کہا۔ اور اس کی بات ایسی تھی کہ انتہائی بوجھل اور افسردہ فضا کے

باوجود ہم سب بے اختیار ہنس پڑے۔ خود رابعہ ہنسنے لگی۔

"تمہارا کشکول بھی خالی نہیں رہے گا دوست!" میں نے کہا۔ "بادل برستا ہے تو سب سوکھے کھیت سیراب ہوتے ہیں۔"

"مجھے تمہاری طرف سے بہت تشویش لاحق ہو گئی ہے رابعہ۔" محسن نے کہا۔ "اگر دلاور نے وہی چال چلا تھا جو غالب کا خیال تھا تو یہ بہت خطرناک چال ہے۔ اس نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کے بعد بھی محتاط تو رہنا ہی ہو گا۔ تم کو بھی سوچنا ہو گا کہ دلاور جیسے شکاری کی اس چال کو ناکام بنانے میں تم کس طرح ہماری مدد کر سکتی ہو۔"

"تم کو یاد ہو گا میں نے بہت پہلے ایک بات کہی تھی۔" رابعہ نے نظر جھکا کے کہا۔ "کہ اگر کبھی میں گھر بناؤں گی تو اس گھر کی دیواریں میرے لیے اجنبی نہیں ہوں گی۔ جو بات اس گھر میں ہے کسی نئے گھر میں نہیں ہو سکتی تھی۔"

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور یہی میرے لیے دنیا کی سب سے بیش بہا دولت ہے لیکن حالات پھر حقیقت پسندی کا تقاضا کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم اس گھر میں کیسے رہ سکتے ہیں!"

"کیا کبھی نہیں رہ سکتے؟" اس نے کافی بنا کے تھماتے کہا۔ "آج نہ سہی کل۔"

"یہ کون جانتا ہے! مستقبل کے یقین پر ہی تو ہماری جدوجہد کا انحصار ہے۔" میں نے کہا۔

"ابھی تو میں نے کہا ہے کہ آنے والا کل ہمارا ہے۔" محسن بولا۔

"لیکن وہ مکان آج بکنے والا تھا۔" رابعہ نے کہا۔ "کوئی اور اسے خرید لیتا تو پھر معلوم نہیں کیا ہوتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کل وہ مالک کسی قیمت پر مکان نہ دیتا یا اسے گرا کر اس کی جگہ ایک الٹرا ماڈرن اسٹرکچر کھڑا کر دیتا جو ہمیں بالکل نہ بھاتا۔ میں نے تو کل کی خوشیوں کی ایک انشورنس پالیسی لی ہے۔ جو اپنے وقت پر ہی کام آئے گی۔"

اس زاویے سے میں نے واقعی نہیں سوچا تھا۔ رابعہ نے بروقت فیصلہ کیا تھا ورنہ تمام عمر میں اس گھر کے باہر سے گزرتے ہوئے پچھتاوے کا شکار رہتا۔ یہ سوچ کر رہتا کہ اگر میں لندن نہ گیا ہوتا تو وزیر خان سے یہ مکان کوئی نہ چھین سکتا اور اس کا مالک میں ہوتا۔ رابعہ نے میرے بچپن کی یادوں کا مجموعہ خرید لیا تھا اور مجھے اپنے ہی وقت کی ٹوٹی ہوئی ڈور سے منسلک کر دیا تھا۔ اب کیا کہہ سکتا تھا کہ یہ گھر میرا تھا اور میرا ہے۔

"کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی؟" میں نے کہا۔ "سارا قصور میرا ہے۔ میں دماغ سے سوچ رہا تھا اور تم نے دل سے سوچا تھا اور آج کے مسائل نے مجھے اتنا گھیر رکھا ہے کہ میں کل کے بارے میں سوچنے کے قابل بھی نہ تھا۔ میں اب شکریہ ادا کر کے تمہارے جذبے کی توہین نہیں کروں گا۔ تم نے واقعی بہت اچھا کیا ورنہ موقع نکل جاتا تو سب کچھ مل جاتا مگر یہ گھر نہ ملتا اور اس کے بغیر میری زندگی میں ایک خلا رہ جاتا۔ ابھی ہم بھی انتظار کریں گے لیکن اس گھر کو بھی انتظار کرنے دو۔ یہی احساس کی خوشی کیا کم ہے کہ وہ ہمارا ہے اور ہم اس کے ہیں۔"

"تم ابھی کہاں جاؤ گی میری پیاری باجی!" محسن نے کہا۔ "مجھے کوئی شبہ نہیں رہا اب کہ دلاور گلے کی اس واردات کا نشانہ تم تھیں اور نشانہ خطا ہو جانے سے شکاری اپنے عزائم نہیں بدلیں گے۔ تمہارا موجودہ ٹھکانا ان کے علم میں ہے اور تمہاری وجہ سے منظر کا گھر بھی خطرے کی جگہ ہے۔ وہ براہ راست حملہ کریں گے تو تمہارے ساتھ منظر اور اس کے بیوی بچے بھی زد میں آئیں گے۔"

"کم سے کم منظر کو ہم سے دوستی کا یہ خمیازہ نہیں بھگتنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اس نے جس طرح ہماری مدد کی ہے اور اب بھی کر رہا ہے، اس کا یہ صلہ نہیں کہ ہم اسے بھی خطرات کی دلدل میں پھینک دیں۔"

"وہ جس حد تک ہم سب سے تعلق ہے اچھا ہے۔" محسن بولا۔ "اس طرح وہ رابعہ اینڈ منظر ایڈووکیٹس کی لیگل فرم کو بھی سنبھال سکے گا اور جانے تو قانونی مسائل سے بھی نمٹ سکے گا۔ پہلے تو رابعہ کا ایک سہارا بھی تھا، اب منظر کے سوا کون رہ گیا ہے۔"

"لیکن میں منظر کے گھر کے علاوہ کہاں رہ سکتی ہوں؟" رابعہ نے کہا۔

"ایک تجویز تو یہ ہے کہ تم اسلام آباد چلی جاؤ۔" میں نے کہا۔ "شہلا کے پاس۔"

"میں اس شہر سے دور نہیں جا سکتی۔" رابعہ نے قطعی فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "مجھے ہر روز نہ سہی وقتاً فوقتاً تمہاری، تم سب کی خیریت معلوم ہونی چاہیے۔"

"پھر دوسری تجویز یہ ہے۔" میں نے رک کر کہا۔ "کہ تم کسی گمنام آبادی میں گم ہو جاؤ لیکن وہاں تم اکیلی کیسے رہو گی اور ایسی جگہ ہم نے آنا جانا جاری رکھا تو تم کو فوراً غلط اور مشتبہ کردار کی عورت قرار دے دیا جائے گا۔ اس لیے میری تیسری تجویز یہ ہے۔" میں نے ایک بار محسن اور رابعہ کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ "کہ تم انکل رحمونی کے پاس چلی جاؤ۔"

میری بات کا اثر میری توقعات کے مطابق ہوا۔ وہ دونوں چونکے تو نہیں لیکن حیرت اور تذبذب کا شکار ہو گئے۔ "ان کو تم سے تھوڑی بہت شکایت ضرور ہو گی۔" میں نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔ "مگر وہ میرے جرم کی سزا تم کو نہیں دے سکتے

www.paksociety.com

...نے معقول آدمی ہیں کہ تمھاری مجبوری کو بھی معاف کر سکتے ہیں۔ تم مجھ سے اپنی جذباتی وابستگی کو میری قانونی پوزیشن کے باعث ختم نہیں کر سکتیں۔ نہ وہ تم سے توقع رکھیں گے کہ سکندر کو گرفتار کرانے میں ان سے تعاون کرو اور نہ تمھاری مجبوری کی وجہ سے مجھے کوئی رعایت دیں گے۔ یہ امان تم کو مل سکتی ہے اگر تم ان سے جا کر کہو کہ میری زندگی کسی اور جگہ محفوظ نہیں رہی۔ حالات سے وہ پوری طرح باخبر ہوں گے۔ دل سے وہ بھی قائل ہوں گے کہ میں مجرم نہیں ہوں اور جو کچھ کر رہا ہوں اس لیے کر رہا ہوں کہ قانون اور ضابطے مجھے میرے درد کا درماں فراہم نہیں کر سکے اور مایوسی نے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں میں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن وہ خود کیا کر سکتے ہیں۔ جب تک یہ سروس ہے وہ سروس رولز سے انحراف نہیں کریں گے مگر تمھارے لیے وہ گھر اپنے گھر سے کم نہیں۔ اور خدا کے بعد اگر کوئی تمھاری زندگی کی حفاظت کر سکتا ہے تو وہ انکل رضوی سے بہتر طور پر کوئی نہیں کر سکتا۔ وہی ایک جگہ ہے جہاں چوہدری دلاور جیسے بھی تم پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔"

"یہ... یہ سب تو ٹھیک ہے سکندر۔" رابعہ نے کہا۔ "لیکن میں اب کس منہ سے وہاں جاؤں۔"

"تمھارا یہ منہ اچھا خاصا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس سلسلے سے پوچھ لو۔"

ایک طویل مدت کے بعد میں نے محسن کو سالا کہا تھا۔ وہ بھولے بسرے وقتوں کی بات تھی جب اس کی بہن فوزیہ سے قریبی تعلق کو میں نے محبت سمجھ لیا تھا۔ وہ دونوں خاندانوں کی قربت اور اپنائیت کے ماحول کا اثر تھا کہ بچپن سے میں نے فوزیہ کو سب سے قریب اور سب سے بہتر پایا اور عمر کے ساتھ اس انس کو محبت سمجھ لیا۔ دونوں کے خاندان پہلے سے ایک تھے چنانچہ جانے کا ایک بوڑھے پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اسی نے جانے تعلق کو ایک ابتدائی قسم کی نسبت دے دی اور اس رشتے سے محسن میرا سالا بنا۔ پھر وقت کے ساتھ جذبات میں پختگی آ گئی اور عقل کے تقاضے تو بدلنے ہی تھے حالات بھی یوں بدلے کہ فوزیہ میری نظر میں وہ مثالی رفیق حیات نہ رہی جس کے ساتھ میں تمام عمر کا سفر طے کر سکتا۔ مجھے اس کی اور اپنی فطرت، مزاج اور عادات کا وہ فرق نظر آنے لگا جسے پہلے میری نظر نہیں دیکھ سکی تھی اور عین اسی وقت رابعہ نے ایک بند دروازہ کھول کے میری زندگی میں دوبارہ قدم رکھا تو فوزیہ خود بخود فیڈ آؤٹ ہو گئی۔ آج سے پہلے بھی محسن نے فوزیہ کو اسی طرح بڑی بہن سمجھا تھا جیسے وہ زندگی میں میرا کو سمجھتا تھا لیکن اچانک اس نے رابعہ کو ایک کہنا شروع کر دیا تھا۔ میری بات پر وہ چونکا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ متغیر ہوا۔ پھر وہ مسکرانے لگا۔ یہ سب کچھ رابعہ نے بھی دیکھا اور نوٹ کیا اور میں نے خفت محسوس کی۔

"ان کے لیے ہم سب بچے ہیں۔ بچے نادان بھی ہوتے ہیں۔" میں نے بات جاری رکھی۔ "سرکش اور نافرمان بھی۔ مگر رضوی جیسے حقیقت پسند اور معقول ہوں تو عمر کے اس تقاضے کو سمجھتے ہوئے سب معاف بھی کر دیتے ہیں۔"

"وہ... یہ نہیں سمجھیں گے کہ یہ کوئی چکر ہے... اور تم نے مجھے بھیجا ہے جاسوس بنا کے؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ انکل رضوی مجھے اور محسن کو پیدائش کے وقت سے جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ کبھی یقین نہیں کر سکتے کہ ہم ان کو بھی دشمنوں میں شامل کر سکتے ہیں۔ ان سے ہمارا اختلاف ہو سکتا ہے۔ وہ ہم کو مجرم سمجھ کے ہتھکڑیاں بھی لگا سکتے ہیں لیکن یہ بات نہیں بھول سکتے کہ ہم ان کے بچے ہیں۔ وہ اپنے بچے کے خلاف بھی قانون کے معاملے میں رعایت نہیں کریں گے۔ جو کچھ ان کو ہوا وہ اپنی جگہ ہے۔ مگر ان کو اب بھی بہت دکھ ہو گا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس سے اپنے لیے مشکلات میں اضافہ کرتے جا رہے ہیں اور وہ ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ بھی کم پریشان نہیں ہوں گے۔ تم جاؤ گی تو انہیں تھوڑی سی تسکین ملے گی۔ یہ احساس ہو گا کہ ان کے بچے اس گھر کو اب بھی اپنا گھر سمجھتے ہیں اور جب دنیا میں کہیں پناہ نہیں ملتی تو لوٹ آتے ہیں۔ ان کی عمر کے آدمی کو یقیناً بہت سہارا ملتا ہے کہ اس کے بچے اسے برا نہیں سمجھتے۔ اس کا احترام کرتے ہیں اور اس پر اعتماد کرتے ہیں۔"

"تم کو اپنی نادانی کا اعتراف کرنا مشکل تو ہو گا لیکن میرا خیال ہے تم میں اتنی اخلاقی جرأت ہے۔" محسن بولا۔ رابعہ نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ اسی وقت دروازے پر دھماکا ہوا اور مرزا نمودار ہوئے۔ اس کی حالت دیکھ کر ہم سب بے اختیار کھڑے ہو گئے۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور چہرے پر مار پیٹ کے نشانات تھے۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات

پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

پسندیدہ ... حاصل کریں ... لائیں

[illegible]

"یہ کیا ہوا غالب؟" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ کہا لیکن وہ سیدھا بیڈ کی طرف گیا اور جوتوں سمیت لحاف کے اندر گھس گیا۔

"ابے بھائی یہ پوچھو کیا نہیں ہوا۔" وہ لحاف کے اندر سے بولا۔ "مثلاً ثابت یہ ہوا کہ سب سے بڑا احمق اگر کرۂ ارض پر اس وقت کوئی ہے تو آپ دونوں حضرات میں سے کوئی ہے۔ بات ہوا یا نہیں؟"

"چلو تمھارا دل رکھنے کو مان لیتے ہیں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ ڈاکٹر کو بلائیں؟"

"نہیں، ابھی ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔" وہ بولا۔ "وہ دل کی دوا کرے کوئی بھی ایسی خوب صورت نرس کو بلاؤ۔۔۔"

"نرس تو نہیں، ایک وکیل ہے، وصیت نامہ لکھوانا ہے تو بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"سردی سے یہ پانی کا بلبلہ منجمد ہو رہا ہے۔" غالب بولا۔ "کوئی صورت ہے لحاف کے اندر ہی کافی پہنچانے کی؟"

محسن نے اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو میرے ساتھ کیا تھا۔ لحاف ہٹتے ہی وہ اٹھ بیٹھا۔ "والعصر، ... کافی دوستو! الٹیہ قدم لو ... سنو پھر داستاں میری۔" وہ کافی کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔ "یہ جو میری حالت ہے۔۔۔"

"اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمھاری خاصی ٹھکائی ہوئی ہے" محسن نے کہا۔

"نہیں، وہ تو بس اخبار نے اٹھایا اور باہر پھینک دیا تھا" وہ بولا۔ "مگر میں ہاتھ جھاڑ کے واپس کیسے آجاتا۔ میں پھر اُن سے الجھنے اندر گیا۔ میں نے کہا تھا کہ بھئی چوہدری صاحب مریں یا جئیں، مجھے میرا اخبار تو واپس کر دو۔"

"اخبار چھین لیا انھوں نے؟" میں اور محسن ایک ساتھ چونکے۔

"ہاں۔ اسی لیے تو میں نے کہا تھا کہ ہم تینوں حماقت میں لاثانی ہیں۔" وہ بولا۔ "آخر ہم میں سے کسی کی عقل میں یہ کیوں نہیں آیا کہ جب وہاں کچھ ہوا ہی نہیں ہے تو ہمیں کس نے رابطہ کیا ہوگا۔ وہاں سناٹا تھا۔ نہ سوگوار تھے اور نہ پولیس والے۔ چوکیدار غنیمت تھا، مجھے روک سکتا تھا مگر اس نے مجھ سے کہا کہ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ فون کس نے کیا تھا؟"

"میں نے، لیکن مقصد تو تمھاری حفاظت تھا۔" میں نے کہا۔

"اس سے میری حفاظت نہیں ہوئی۔ وہ پہلے سے ہوشیار ہو گئے۔ سارا اسٹیج ہٹا دیا اور سارا تماشا ختم کر دیا۔ میں نے اندر جا کے کہا کہ بڑا افسوس ہوا چوہدری صاحب کی وفات حسرت آیات کا، اور وہ شعر بھی پڑھا کہ حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے، مگر جو شخص مجھ سے بات کر رہا تھا کہنے لگا کہ کیا بکتے ہو۔ میں نے کہا کہ بجا نہیں سناتا ہوں اردو اخبار میں جو شائع ہوا تھا وہ سنانے لگا۔ بس اس نے ایک ہاتھ مارا۔ پہلے اخبار پر اور پھر میرے ... اور دو آدمی اگلے اشارے کے منتظر تھے۔ وہ مجھے باہر پھینکنے کے لیے اٹھا کر لے گئے۔ اخبار کی واپسی کے مطالبے پر تھوڑی سی ہاتھا پائی ہوئی۔ پائی تو نہیں صرف ہاتھا ہوئی۔ اُن کے ہاتھوں میری صورت خراب ہوئی اور میں پھر باہر پھینکا گیا۔ اپنی موٹر سائیکل کے پاس گیٹ بند ہو گیا اور میں آ کے تمھاری چوکھٹ پہ آنسو بہانے آگیا۔"

"واقعی یار! ہمیں اس اخبار کو تمھارے حوالے نہیں کرنا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔

"اس کی تو فوٹو اسٹیٹ کا پی ... دیتے۔" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔

"تو فوٹو اسٹیٹ کاپی اتنی رات کو بھلا کہاں سے بنتی؟" رابعہ نے سوال کیا۔

"بن جاتی سکندر کے لیے بخت آور۔" غالب نے کہا۔ "جب میں اپنے آفس کے سامنے کھڑا اس جعلی تحریر کو پڑھ رہا تھا تو میری عقل میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ اوپر اپنے آفس میں جا کے اس کی دس فوٹو کاپیاں بنوا لوں۔ اصل کو محفوظ چھوڑ کر جا سکتا تھا لیکن میں اور سکندر بھوکے تھے اس لیے ہماری عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی۔"

"اب معلوم نہیں باقی دو چار جعلی اخبار کس نے بیچے تھے۔"

"کسی نے بھی بیچے ہوں مگر اب ہمیں کیسے مل سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ وہاں کوئی لاش تھی؟"

"اندر جانے سے پہلے ہی تو میں دو بار باہر پھینکا گیا۔ میں کیا بتاؤں!" غالب بولا۔

"یہ تو ناممکن ہے کہ اتنے کم وقت میں انھوں نے لاش کو کہیں دفن کرنے کے لیے بھیج دیا ہو۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ بہت سے آدمی تھے مگر جیسا کہ تم نے بتایا، رات کو تدفین کی اجازت نہیں۔"

"تدفین ضروری بھی نہیں۔" محسن بولا۔ "اسے دریا میں ڈالا جا سکتا ہے یا سڑک پہ۔"

"تم نے ان لوگوں کو اچھی طرح دیکھا ہے۔ پھر دیکھو گے تو پہچان لو گے؟"

غالب نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ان میں سے ایک استاد پیٹرو تھا۔"

میں اور محسن اچھل پڑے۔ "تم کو کیسے معلوم ہوا؟" محسن نے کہا۔

"ایک شخص نے اس کا نام لیا تھا۔" غالب نے کہا۔

"مرزا غالب! تمہارا کوئی دوست میک اپ مین بھی ہے؟" محسن نے کہا۔ "جو اپنے کام کا ماہر ہو۔"

"دوست تو نہیں ہے، جان پہچان ہے۔" غالب نے کہا۔

"اگر ہم اس وقت یہ چاہیں کہ وہ ہمارا میک اپ کر دے" محسن بولا۔ "تو کیا یہ ممکن ہے؟"

"اس وقت!" غالب بھونچکا رہ گیا۔ "آدھی رات کو؟"

"اس وقت کہاں ملے گا وہ؟" میں نے محسن کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔ "اس کے گھر پہ میک اپ کا سامان ہو گا؟"

"میں... کچھ کہہ نہیں سکتا۔" غالب بولا۔ "اگر آدھی رات کے بعد کسی کو بیدار کر کے یہ درخواست کی جائے تو اس کا ردعمل کیا ہو گا، ہو سکتا ہے وہ میک اپ کے بغیر ہی حلیہ بگاڑ دے۔"

"اگر اس کو ایک ہزار روپے بھی کسی طرح مل جائیں۔" میں نے کہا۔ "تو وہ مجھے اور محسن کو کیا بنا سکتا ہے؟"

"وہ ہے تو لالچی آدمی۔" غالب سوچتے ہوئے بولے۔ "ایک بار میں نے افواہ سنی تھی کہ اس نے کسی مجرم کی مدد کی تھی اور وہ حوالات سے فرار ہو گیا تھا۔ حالانکہ جاتے جاتے اسے اتنا مل گیا کہ اس نے اپنا مکان بنا لیا۔ ثبوت کوئی نہیں تھا اس لیے وہ پکڑا نہیں گیا تھا مگر دوست! دھواں تو وہیں سے اٹھتا ہے نا جہاں آگ ہو۔ کچھ بات تو ہو گی۔"

"میرا خیال ہے تمہارا یہ دوست بہت کمینہ آدمی ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے ایک رات کی محنت کا معقول معاوضہ ملے گا تو وہ ہمیں اپنا باپ بنانے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔"

"لیکن اس کا باپ بن کے تم کیا کرو گے؟" غالب بولا۔ "وہ تو مر چکا ہے۔"

"ہم بھی مر جائیں گے اگر ضروری ہوا۔" محسن نے مذاق میں ایک فضول سی بات کہی لیکن اس جملے نے میرے ذہن میں ایک نئے خیال کو جنم دیا۔ یہ خیال ابھی ٹیکنالوجی کی اصطلاح میں چین ری ایکشن کہا جا سکتا ہے۔ جیسے ایک دوسرے سے ملے ہوئے فیوز یکے بعد دیگرے اڑتے جائیں یہاں تک کہ دھماکا ہو جائے۔ ایک خیال سے دوسرا خیال زنجیر کی کڑی بنتا گیا اور آخری خیال نے ایک بالکل نئے امکان کو روشن کر دیا۔ یوں جیسے پُرپیچ گلیوں میں بھٹکتے پھرتے جہاں ہر قدم پہ راستہ بند ملنے کا اندیشہ ہو آدمی اچانک کسی شاہراہ پہ آ نکلے۔

"مرزا غالب! محسن نے ٹھیک کہا۔ ضرورت پڑی تو ہم بھی مر جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "دیکھو نا اگر چوہدری دلاور زندہ ہوتے ہوئے بھی ہم کو یقین دلانے کی کوشش کر سکتا ہے تو کیا یہ کوشش ہم نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی کوشش میں ناکام رہا مگر ضروری تو نہیں کہ ہم بھی ناکام ہوں۔ فرض کرو پہلے مرحلے میں کل صبح میرا انتقال ہو جائے۔ آج کی صبح تو ہونے والی ہے چند گھنٹوں میں۔ یہ فرض کر لو کہ آج میری زندگی کا آخری دن ہے اور کل تم یہ خبر چھاپ دو کہ مشہور و مفرور مجرم سکندر بخت لیل تیر قضا کا نشانہ بنا۔ اور اگر دنیا یقین کر لے تو ہمیشہ کے لیے دنیا کے قانونی جھمیلے ختم۔ انتظام ایسا ہو کہ دلاور جیسا ہوشیار آدمی بھی نہ سمجھے کہ کوئی میرا داؤ مجھ پہ بھی آزما رہا ہے۔"

وہ سب منہ کھولے بیٹھے تھے اور ان کے لیے وہ بات سمجھنا محال تھی جو میرے ذہن میں تھی۔

لیکن محسن کے اور میرے درمیان جو ذہنی ہم آہنگی تھی وہ غیر محسوس طریقے پہ پھیل چکی تھی جیسے مواصلاتی رابطے کا کام کرتی تھی اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جو بات میرے دماغ میں آتی تھی وہ اس کے دماغ میں یوں پہنچتی تھی جیسے ایک ٹی وی اسٹیشن سے کیمرے کی آنکھ کوئی منظر دیکھے اور آواز کے ساتھ تمام تفصیلات اور سارے رنگ ٹی وی سیٹ میلوں دور تک پلک جھپکتے میں بھی پہنچا دکھاتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے مگر یہ شاعرانہ بات ہے۔ سائنسی وضاحت پیش کرنے والوں کا نظریہ ہے کہ خیالات کی لہریں بھی ایک فریکوئنسی رکھتی ہیں اور جہاں دو افراد کے خیالات کی یہ فریکوئنسی مل جائے وہاں الفاظ کا وسیلہ ضروری نہیں رہتا۔ حقیقت کچھ بھی ہو، یہ مشاہدہ میں نے بار بار کیا تھا کہ بات ابھی میں نے کہی نہیں تھی کہ محسن نے سمجھ لی تھی۔ یہی اس وقت بھی ہوا۔

"کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔" محسن نے سوچ کر کہا۔ "اور پلان کی کامیابی کا انحصار سب کی مشترکہ کوشش پر ہے... کیوں مرزا غالب...؟"

"یار دو... غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔" مرزا غالب نے نقش فریادی بن کر کہا۔ "ابھی تو پٹ کر لوٹا ہوں۔"

"کیسے بزدل صحافی ہو تم؟" میں نے کہا۔ "کیا تم نے سنا نہیں کہ قلم میں تلوار سے زیادہ طاقت ہے۔"

"ہو گی... ضرور ہو گی... لیکن مقابلہ تلوار سے نہیں ہے برادران عزیز... بندوق کی گولی سے ہے... فرق صاف ظاہر ہے۔" وہ بولا۔

"تم کو قلم ہی چلانا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "توپ نہیں چلانی ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم کرنے جانا ہے کہ وہ لاش کس کی تھی جسے دلاور مرحوم بنا کے رکھا گیا تھا اور جو دراصل لاش نہیں تھی، شکاریوں کا پھیلایا ہوا جال تھا کہ ہم تجسس سے مجبور ہو کے ان کا آخری دیدار کرنے جائیں تو یہ دنیاوی زندگی میں ہمارا آخری ایڈونچر ہو۔"

"اب بھی آپ لوگوں کے عزائم اچھے نہیں ہیں چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ انجام بھی وہی ہو گا۔" غالب نے کہا۔

"تم ایسی باتوں سے ہمارا حوصلہ کم نہیں کر سکتے... ہمارے ساتھ خواجہ نیک محمد جیسے سورما ہیں۔" میں نے کہا۔

"خواجہ نیک محمد؟" غالب حیران ہو کے بولا۔ "یہ کون اُلو کا پٹھا ہے؟"

استاد ڈیڈی نے منہ رضائی میں سے باہر کھینچ لیا۔ "ہم ہیں۔" وہ غالب کی ناک سے ناک ملا کے بولا۔ "اچھی طرح دیکھ لو تاکہ غلط فہمی نہ ہو... ورنہ قسم مولا علی کی..."

میں نے فوراً ڈیڈی کو پیچھے کھینچ لیا۔ محسن اور رابعہ دانت نکالے ہنسے۔ "کیا کرتے ہو استاد!" میں نے کہا۔ "خانہ جنگی کے لیے ایم آر ایس میں بالکل گنجائش نہیں۔ سب لاٹھی والے مل کر بیٹھے ہیں تاکہ بھینس ان کی رہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" غالب نے پھر لحاف میں پناہ لی۔ "ارے بھائی ہمیں کیا معلوم کہ تمہارا ایسا شریفانہ نام بھی ہو سکتا ہے۔"

"دیکھو سکندر بادشاہ۔" استاد ڈیڈی نے اکڑ کر مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "اب یہ کارٹون ہمیں بدمعاش کہہ رہا ہے۔ ابے ہمارا نام شریفانہ ہے تو کیا ہم خود شریف نہیں ہیں؟"

"شریف کیا تم بدمعاش بھی نہیں ہو۔ مجھے تو تمہاری یہ مونچھیں بھی نقلی لگتی ہیں۔" غالب نے جل کر کہا۔

اس سے پہلے کہ ایم آر ایس کے دو مستند اور معزز اراکین ابھی محض ذہنی اصطلاحاً تلواریں سونت کر ایک دوسرے کے مقابلے پر آ جاتے، ہم سب نے دخل در معقولات کیا اور جنگ بندی کرانے کے بجائے انھیں زبردستی ایک دوسرے کے گلے ملوایا۔ یہ کارروائی گلے ملنے سے زیادہ گلے پڑنے کے مترادف تھی۔

"لاش کے بارے میں قیاس آرائی کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم کو جا کے دیکھنا ہی پڑے گا اور چونکہ رات کے وقت اس کو ٹھکانے لگانا مشکل ہے اس لیے مجھے لاش کے کوٹھی میں ہی مل جانے کے امکانات خاصے روشن نظر آتے ہیں۔ جو کام آسانی سے کیا جا سکتا ہو اسے مشکل طریقے سے کوئی نہیں کرتا۔ کم سے کم دلاور گھبراہٹ میں جلدی کرنے والا آدمی نہیں ہے۔ ابھی تو اسے افسوس ہو گا کہ اس نے اتنی محنت سے جال پھیلایا تھا، اس امید میں کہ پکڑا جائے گا شیر لیکن آ پھنسا گیدڑ۔"

"غالباً آپ خود کو شیر سے اور مجھے گیدڑ سے تشبیہ دے رہے ہیں۔" غالب نے لحاف سے سر نکال کر کہا۔

"جی ہاں!" میں نے کہا۔ "دلاور غصے اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو گا۔ اسے لاش کی فکر نہیں ہو گی، اپنی ناکامی کا صدمہ ہو گا۔ اسے فوری طور پر یہ ڈر نہیں کہ ہم میں سے کوئی اس وقت وہاں جانے کی حماقت کر سکتا ہے چنانچہ لاش کا کیا ہے، صبح کہیں گاڑ دی جائے گی اور دوستو! جنگ کی حکمت عملی یہ ہے کہ حملہ اس وقت کرو جب دشمن کو اس کی ذرا بھی توقع نہ ہو تاکہ اسے دفاع کا موقع ہی نہ ملے۔ جنرل آئزن ہاور نے دوسری جنگ عظیم کے دوران فرانس سے نازی جرمنی کی فوجوں کو نکالنے کا سب سے خطرناک مرحلہ ایک ایسی حالت میں سر انجام دیا تھا جب موسم انتہائی خراب تھا۔ اس نے منصوبے کو آخری لمحے تک خفیہ رکھا اور چھ جون کو جبکہ ڈی ڈے

www.paksociety.com

بھی کہتے ہیں، رات کے وقت اتحادی فوجوں کو سخت بارش اور طوفان میں نارمنڈی کے ساحل پر پیراشوٹ سے اتار دیا۔ نازی فوجی مطمئن تھے کہ کم سے کم آج کی رات اتحادی افواج کوئی کارروائی نہیں کریں گی اور وہ فرانس کے احساس سے سرشار کچھ جشن منا رہے تھے چنانچہ بے خبری میں مارے گئے اور فرانس سے نکالے گئے آپریشن اوور لارڈ کامیاب رہا۔ بس اسے سرفروشانہ ایم آر ایس؟ ہم بھی آج کی رات کو "ڈی ڈے" فرض کرتے ہوئے جاتے ہیں۔"

"لاکھ ٹکے کی بات کہی سکندر بادشاہ تم نے۔" ٹیڈی نے کہا جو تاریخ کی ایک مشہور روایت کے ذکر سے سخت متاثر ہوا تھا۔ باقی لوگ جنگ عظیم کی تاریخ کے متعلق جانتے تھے چنانچہ وہ خاموش رہے۔

"اگر لاش گاڑی کے اندر ہی مل جاتی ہے تو ہم مارے جائیں گے" میں نے کہا۔

"وہ کیسے؟" محسن کہنے لگا۔ "جا کے کہا چاہیے چودھری صاحب ورنہ کہیں گے کہ میں اندر حاضر ہو سکتا ہوں جناب۔ اور وہ انتہائی شائستگی سے کہے گا کہ چشم ما روشن دل ما شاد... تشریف لائیے۔ پھر ہم کہیں گے کہ ازراہ عنایت وہ لاش عنایت فرما دیجیے جو ابھی کچھ دیر پہلے آپ کی جگہ لیٹی تھی اور وہ کہے گا کہ ابھی پیش کرتا ہوں۔ وہ لاش کیا آپ میری اصل لاش بھی لے جانا چاہیں تو بصد شوق لے جائیں۔ اس سے زیادہ لاشیں درکار ہوں تو میں آپ سب کو بھی لاش بنا دیتا ہوں۔"

رابعہ کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ اتنے سنجیدہ اور بھیانک موضوع پر محسن کا انداز بیان مسخروں والا تھا۔

"ابھی تم کہہ رہے تھے کہ میں تمہیں پیک اپ تک کے پاس لے جاؤں۔" غالب نے کہا۔ "تاکہ وہ تمہاری شکل بگاڑ دے۔"

"بہتر تو یہی ہوتا کہ ہم چہرے بدل کر جاتے۔" میں نے کہا۔

"لیکن کام زیادہ ہے۔ اسے کہتے کم کم چہرے بدلنے ہیں... میرا... محسن کا اور ٹیڈی کا۔ اور میرا خیال ہے کہ اس کام میں تین گھنٹے تو ضرور لگیں گے۔ اس وقت رات کے پونے دو بجنے والے ہیں۔ پانچ بجے کے بعد چودھری ولدور کے گھر پہنچے تو دیر ہو جائے گی۔"

"دیر کیوں ہو جائے گی؟" محسن بولا۔ "سورج سوا سات بجے سے پہلے نہیں نکلتا۔ چھ بجے تو فجر ہوتی ہے۔"

"ہاں۔ کام تو وہاں لمبا نہیں ہے۔" میں نے محسن کی بات پر غور کیا۔ "آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا۔ کیوں غالب خان معقول ہے؟ ہم اس وقت نکل جائیں اور تمہارے اس لالچی دوست یعنی میک اپ مین کو خواب غفلت سے بیدار کریں تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ایک گھنٹا فی چہرہ محنت کر کے ہمیں پانچ بجے تک بھگا اور بنا دے۔ نفست رنگیلا، مقبل یا شاہ وجاہت کا ہمشکل؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" غالب بولا۔ "اس کا کام ہے۔ وہ بتا سکتا ہے کہ تمہارے یہ چار ہینڈسم چہرے کتنی دیر میں ڈیفیٹ ہینڈسم کیے جا سکتے ہیں تاکہ ان کو گرہن لگ جائے۔"

"ہم معلوم تو کر سکتے ہیں اس سے۔" محسن نے جھلا کر کہا۔

"ہاں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اس کام پر رضامند ہو جائے۔" غالب بولا۔ "لالچی آدمی بھی بعض اوقات اڑ جاتا ہے یا ڈر جاتا ہے۔"

"آخر تم کس مرض کی دوا ہو؟" میں نے کہا۔ "تم کو اسی لیے تو ساتھ لے جائیں گے ہم کہ وہ مطمئن ہو جائے گا۔ تم اسے یقین دلاؤ گے کہ اس کے کاروبار کو کوئی خطرہ نہیں اور ہم اپنے ساتھ صرف پیسہ لائے ہیں، خطرہ نہیں۔"

"الگ الگ بات الگ ہے۔ اس کا علاج بھی الگ ہے۔" محسن نے جیب سے ریوالور نکالا اور پھر جیب میں رکھ لیا۔

رابعہ کچھ پریشان تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہم اس خطرناک مشن پر روانہ ہوں۔ لیکن وہ ہماری فطرت کو بھی سمجھتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ منع کرنے سے ہم ملتے ٹلنے والے نہیں ہیں۔ اس کے نقطہ نظر سے ہم خرابی میں مزید خرابی کا سامان کرتے چلے جا رہے تھے اور ہمارے معاملات کو سنبھالنے کی کوشش کا نتیجہ اب تک اس کے سوا کچھ نہیں نکلا تھا کہ معاملات زیادہ الجھ گئے تھے لیکن وہ شرط وفا نبھانے پر مجبور تھی اور بہت پہلے اپنی زندگی پر میرے حق کو اختیار کو دل کا فیصلہ سمجھ کے قبول کر چکی تھی۔ چنانچہ اب وہ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے کی عملی تصویر تھی۔ وہ خود کچھ نہیں تھی، اس کے لیے جو کچھ تھا بس وہ تھا۔ اس کی عقل، اس کی قوت فیصلہ اور قوت ارادی سب میری خوشی تھی۔

"میں تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔" اس نے اچانک کہا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"دماغ تو ہم سب لوگوں کا خراب ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "ہمارے درمیان یہ دیوانگی کا رشتہ نہ ہوتا تو ہم سب بہت پہلے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ چکے ہوتے۔"

"لیکن تمہارا وہاں کوئی کام نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم طے کر چکے تھے کہ تم انکل رضوی کے پاس لوٹ جاؤ گی۔"

"کیا میں آدھی رات کے بعد ان کو جگا کے کہوں گی کہ... پھٹک مارے کے واپس آ گئی ہوں؟" اس کی شکل رونے والی ہو گئی۔

"نہیں عزیزہ۔ تم وہ شعر پڑھنا کہ شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ۔ محفل میں اس خیال سے پھر آ گئی ہوں میں۔" غالب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ہمارے ساتھ رابعہ بھی مسکرانے پر مجبور ہو گئی۔

"میرا مطلب تھا کہ اس وقت کیا میں اکیلی ہوٹل واپس جاؤں گی؟" رابعہ نے کہا۔ "تم سب لام پر جا رہے ہو۔"

"تم کہیں بھی نہ جاؤ۔ یہیں دروازے بند کر کے سو جاؤ۔" محسن بولا۔ "اور ہماری بالکل فکر نہ کرو۔"

"اچھا! اب مجھے فکرمند ہونے کا حق بھی نہیں۔" رابعہ نے طنز سے کہا۔ "تم اطمینان سے سو سکتے تھے اگر میری جگہ ہوتے؟"

"چلو سونا ضروری نہیں تو صبح تک ہماری واپسی کا انتظار کرو۔" میں نے کہا۔

"صرف انتظار ہوتا تب بھی عذاب کم نہ ہوتا۔ اب ہزار جان لیوا اندیشے بھی ہوں گے اور میں اکیلی۔ مجھے اپنے ساتھ رکھو پلیز۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ کل ڈھیٹ بن کر انکل رضوی کے گھر چلی جاؤں گی۔" وہ بچوں کی طرح لڑنے لگی تھی۔

"سمجھنے کی کوشش کرو رابعہ۔" میں نے کہا۔ "ایک تو اس وقت ہمارے پاس اپنی ٹرانسپورٹ نہیں ہے۔ ایک تمہاری گاڑی کا آسرا تھا اب وہ بھی نہیں رہا۔"

"یوں تو ہم گاڑیاں تباہ کرنے کا عالمی ریکارڈ قائم کر دیں گے" محسن نے مسرت سے کہا۔

"اس وقت ہم چار آدمی ہیں اور کسی ٹیکسی میں پانچویں سواری کی گنجائش نہیں ہوتی۔" میں نے محسن کو گھور کر کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اتنی رات کو ٹیکسی ہی نہ ملے اور ہمیں... اپنی مدد آپ کے اصول پر متبادل انتظامات کرنے پڑیں۔"

"یعنی کسی سے گاڑی چھین لو گے اس وقت؟" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"ضروری نہیں... کوئی شریف آدمی یونہی لفٹ دینے پر تیار ہو جائے تو اچھا ہے۔" میں نے سر کھجا کے کہا۔ "لیکن ہمارے پاس وقت کم ہے۔ ہم صبح تک اس شریف آدمی کے انتظار میں کھڑے نہیں رہ سکتے اور صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کر سکتے کہ کاروں کے شو روم کھل جائیں تو ہم چلتی کا نام گاڑی لے لیں۔"

"دیکھو یارو!" میں نے ایئر آرائیں سے لفظ بالفظ اتفاق کیا تھا۔

غالب بولا۔ "لیکن ایسے مشکل کام میں نہیں کر سکتا۔ یہ مار دھاڑ اور مرنا مارنا، گنگسٹروں کے پیشے لگانا..."

"یہ کام ہمارے لیے چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔ "ایک اکیلا دو گیارہ۔ میں اور محسن گیارہ کے برابر ہیں لیکن ٹیم میں بارھواں کھلاڑی ضرور رکھا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب بارھویں کھلاڑی ہیں، اس کے بعد تم..."

"تیرہ نمبر... یا میرے خدا! کیا منحوس عدد ملا ہے۔" غالب نے کہا۔ "اپنی قسمت ہی ایسی ہے۔"

"اس وقت ہم چاروں کو جانے دو۔" میں نے رابعہ سے بات جاری رکھی۔ "کسی عورت کے ساتھ گھومتے ہوئے ہم پہلے ہی مشتبہ نظر آئیں گے اور اگر ہم نے مائٹ از رائٹ کے بنیادی فلسفے پر عمل کرتے ہوئے ذرائع نقل و حمل کا بندوبست کیا تو تمہاری موجودگی ہمارا راز فاش کر دے گی۔ رپورٹ لکھوانے والے کو کسی اور کا چہرہ یاد ہو نہ ہو لیکن تمہارا ذکر تو وہ یوں کرے گا کہ رپورٹ بھی غزل محسوس ہوگی اور جاننے والے جان لیں گے کہ یہ کس کا ذکر ہے۔"

محسن ہنسا اور رابعہ کا رنگ لال ہونے لگا۔ "صبح تک میں یہیں ہوں۔ کب تک لوٹ آؤ گے تم لوگ؟"

"سورج نکلنے تک۔" میں نے کہا۔ "لیکن دیر ہو جائے تو گھبرانا نہیں۔ انکل کے گھر چلی جانا۔"

"وعدہ کرو تم اپنا خیال رکھو گے۔" رابعہ نے روایتی بیویوں کی طرح کہا جو شوہر کو لام پر بھیجتے وقت کبھی یہ جملہ کہتی تھیں اور اب خود میکے جاتے ہوئے بھی ٹرین میں بیٹھ کے کہتی ہیں۔ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"ارے بابا! میں اکیلا تو نہیں۔ بھلا اپنا خیال رکھنے والا میرے ساتھ میرا خدا ہے۔ میرا اعتماد ہے۔ محسن اور ٹیڈی ہیں اور مرزا غالب ہیں... اور تم ہو... تمہارے خیال کی رفاقت بھی تمہارے ساتھ ہے کم تو نہیں۔"

"جو کچھ میرے پاس بچا ہے۔" رابعہ نے فوراً میرے جذبات کے دھارے کا رخ موڑ دیا کیونکہ محسن کے علاوہ ٹیڈی اور مرزا غالب یکلخت سنجیدہ ہو گئے تھے۔ "اس سے کل کوئی دوسری گاڑی لے لینا... اور..."

"آپ بالکل فکر مت کرو آپا جی۔" ٹیڈی اچانک بولا۔ "قسم مولا علی کی! ہم نے ابھی تک یاروں کے لیے کچھ بھی نہیں کیا سوائے باتوں کے... بلکہ بڑی شرم آتی ہے جی آپ کو دیکھ کر... آپ کے سکندر کو کچھ نہیں ہوگا۔ اس کا خیال ہم رکھیں گے مولا آپا جی... اب سارا انتظام ہم کریں گے۔ جان کی ضرورت ہوگی تو جان دیں گے اور مال کی ضرورت پڑے گی تو مال... استاد ٹیڈی ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔ ایسے ہی استاد نہیں بن گئے ہیں ہم۔"

ہم سب اسے حیرت سے دیکھتے رہے۔ وہ ایکدم جوش میں آ گیا تھا۔ اس نے پہلی بار رابعہ کو آپا جی کہہ کے مخاطب کیا تھا اور اس کے لہجے میں پہلی بار مجھے یقین اور اعتماد کی کمی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بے خبر نہیں لگ رہا تھا۔ معلوم نہیں اس میں یہ انقلاب کیوں آیا اور اس نے یہ اعتراف کیوں کیا کہ ابھی تک وہ دوستی کے کھوکھلے دعوے کرتا رہا ہے اور اس نے حق دوستی ادا کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا ہے۔

www.paksociety.com

"اس بات کا کیا مطلب ہے استاد؟ کیا ابھی تک تم سامنے نہیں آئے تھے؟" محسن نے مذاق میں کہا۔

"وقت آنے پر اس بات کا مطلب بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ اب چلو اٹھو۔" وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ محسن نے اپنی جیب سے ایک ریوالور نکال کے رابعہ کو دینا چاہا مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ ہم چند منٹ میں باہر آ گئے اور رابعہ نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ سردی اپنے شباب پر تھی اور سب سے زیادہ خراب حال غالب کا تھا۔ وہ ہوٹل چند قدم کے فاصلے پر تھا جہاں ہمارا سب اسباب خواجہ نیک محمد کے کمرے میں پڑا تھا۔ میں نے اور محسن نے پیچھے دیوار کے سائے میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ مرزا غالب اور ٹیڈی اوپر گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مسلح ہونے کے لیے گئے تھے۔ اب تک ہم نے مختلف ذرائع سے جو اسلحہ حاصل کیا تھا اس میں بارہ ریوالور تھے۔ لیکن ان میں سے آدھے ضائع ہو گئے تھے۔ باقی چھ میں سے ایک ریوالور سائلنسر والا میرے پاس تھا جو میں نے لاوارث سے چھینا تھا۔ بھیس بدلنے کے لیے ہمارے پاس صرف ایک وڈیرے کی وردی رہ گئی تھی۔ محسن نے مجھ سے اتفاق کیا کہ ہمارے پاس ایک پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر ہونا چاہیے اور ایک ایسی گاڑی جس میں ریڈیو فون ہو۔ کار کے ریڈیو عام ہیں اور ان میں "ایف ایم" بینڈ ہوتے ہیں۔ ایف ایم ریڈیو ہو تو سیل فون کے بغیر ایف ایم مائیکرو فون کے ذریعے بات کرنا ممکن ہو جاتا ہے اور پکڑے جانے کا ڈر بھی نہیں رہتا۔ جو "ایف ایم" مائیکرو فون ہم نے پہلے ہال روڈ سے خریدا تھا وہ بھی اب ہمارے پاس نہیں تھا۔ ہم نے طے کیا کہ اس سے زیادہ رینج کا مائیکرو فون لیں گے تاکہ ہم ایک میل دور رہ کے بھی بات کر سکیں۔ عمداً ہم نے مالی وسائل کے ذکر سے گریز کیا۔ پیسہ رابعہ کے پاس تھا اور اس سے لیا بھی جا سکتا تھا لیکن بار بار ضرورت کے لیے اس سے کچھ مانگنا معیوب لگتا تھا۔ یہ احساس اپنی جگہ تھا کہ رابعہ کا جو کچھ ہے میرا ہے۔ اس کے باوجود میں محسوس کرتا تھا کہ میری وجہ سے پہلے اس کی آمدنی کے وسائل ختم ہوئے۔ اب آمدنی نہ ہونے کے بعد میں اس کا بچایا ہوا پیسہ ختم کرتا جا رہا ہوں۔ جب یہ پیسہ ختم ہو جائے گا تو وہ کیا کرے گی اور پیسہ کہاں سے لائے گی اور اپنی ذاتی ضروریات کس طرح پوری کرے گی؟ یہ معاشی مسائل کا دوسرا غور طلب پہلو تھا۔ فی الحال نہ میں کچھ کر رہا تھا اور نہ محسن۔ ہم خرچ بھی اس انداز سے کر رہے تھے کہ مالی مسائل بڑھتے جا رہے تھے۔ ہوٹلوں کا خرچ تھا۔ باہر کھانے پینے کا خرچ تھا اور ہزار دیگر ضروریات کے اخراجات تھے۔ محسن اپنے تنخواہ دار اور محدود آمدنی رکھنے والے باپ سے کچھ نہیں منگوا سکتا تھا اور ہم دونوں میں سے کسی کو نہ جاگیر سے آمدنی تھی نہ کاروبار سے نہ ملازمت سے

چنانچہ صاف نظر آتا تھا کہ بہت جلد یہ صورت حالات سنگین تر ہو جائے گی۔ کہنے کو میں کھرب پتی باپ کا اکلوتا وارث تھا اور ایم جی بیسی کمپلیکس میں آدھے کا مالک لیکن وہی قانون جو مجھے جائیداد و لارڈ کے کاروبار میں برابر کا شریک تسلیم کرتا تھا اور مجھے میرا حق دلوا سکتا تھا اس وقت میرے خلاف استعمال ہو رہا تھا اور جو کچھ میرا تھا اس میں سے مجھے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں مل سکتی تھی۔ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش بارہا کی تھی کہ آخر ایم جی بیسی کے اثاثے، کاروبار اور گڈول سب کی مجموعی مالیت کیا ہو گی؟ جتنا ولارڈ مجھے دینا چاہتا تھا اس حساب سے تو میرا حق بہت زیادہ بنتا تھا۔ شاید پچاس لاکھ سے بھی زیادہ۔ مگر وہ پچاس لاکھ لینے کے لیے مجھے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا اور عدالت مجھے ایک ہاتھ میں وراثت کا سرٹیفکیٹ تھماتی تو دوسرے ہاتھ میں موت کا پروانہ۔ وہ رقم میرا عالی شان مقبرہ تعمیر کرانے کے سوا کسی کام نہ آتی۔ رابعہ کی رقم اب متوسط نے سنبھال لی تھی تو یہ امید کی جا سکتی تھی کہ رابعہ کو پانچ دس ہزار روپیہ ماہانہ کا منافع ملتا رہے گا مگر وہ غیر یقینی تھا اور ناکافی تھا۔ رابعہ نے وہ کوٹھی تو بیچ دی تھی جو اسے نواب محمود جمشید سے ملی تھی مگر رقم محفوظ رکھنے کے بجائے رابعہ نے میرے والد کی پرانی کوٹھی خریدنے میں لگا دی تھی۔ میں اسے ایک جذباتی قدم تو کہہ سکتا تھا حماقت نہیں کہہ سکتا تھا۔ رابعہ کی سوچ کے انداز کو غلط نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرے مستقبل کے ساتھ وہ میرے ماضی میں بھی شریک ہو گئی تھی اور اس نے اپنے لیے جو گھر منتخب کیا تھا وہ میرا گھر تھا۔ چنانچہ جس گھر سے وزیر خان کو نکالا گیا تھا وہ ہمارا گھر ہو گیا تھا۔ ہم دونوں کا گھر۔ وزیر خان کے بیٹے کا اور اس کی ہونے والی بہو کا گھر۔ خواب تو آپ نے بھی دیکھے ہوں گے کہ جب بیٹے کے علاوہ گھر میں بہو ہو گی تو گھر کتنا آباد ہو گا مگر اس خواب کی تعبیر دیکھنا ان کے مقدر میں نہ تھا اور ابھی تو میں اپنے بارے میں بھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ میرے اور رابعہ کے خوابوں کو بھی تعبیر ملے گی یا نہیں جو ہم چاہتے ہیں۔ فقط چاہنے سے خواب پورے ہوتے تو دنیا جنت ہوتی۔

"آج وال تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں۔" مرزا غالب نے ریوالور لہرا کے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "اس نمائش کا مقصد کیا ہے۔ ہمیں مصر لیے جاؤ گے کچھ کرنے سے پہلے۔"

"یہ تم نے کس کے ہاتھ میں کیا چیز تھما دی ہے۔" محسن نے خفگی سے کہا۔ "یہ خود بھی مرے گا ہمیں بھی مروائے گا۔"

"اصل بات تو یہی ہے یار دو۔" غالب نے ریوالور کو واپس جیب میں رکھ لیا۔ "ہمیں کہاں کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ ہم نے

دی صورت سے اتنے چند گئے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ زبان اور قلم کے سوا ہم کچھ چلا ہی نہیں سکتے۔ تم آج دیکھنا ہم کیا کر دکھاتے ہیں۔ تم میں سے جس کو دھوکا ہوا بھی آ رہا ہے۔"

ظاہر ہے کہ نہ وہ جگہ نشانہ بازی یا جرأت اور ہمت کے مظاہرے کے لیے مناسب تھی اور نہ یہ وقت آپس میں مقابلے کا تھا۔ چنانچہ ہم نے فوراً روانہ ہو جانے میں عافیت دیکھی۔ غالب بادل نخواستہ چند قدم پیچھے رہ کر خواجہ نیک محمد کے ساتھ چلے۔ منظور گیلانی کے درمیان خلوص اور دوستی کے سوا کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ غالب ایک اعلیٰ خاندان کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہین اخبار نویس تھا۔ خواجہ نیک محمد نے جیب کاٹنے سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا اور چوریاں کرتے کرتے بدمعاشی کے منصب پر فائز ہوئے تھے تو استاد ٹیڈی کہلانے لگے تھے۔ ٹیڈی نہ پڑھا لکھا تھا اور نہ وہ اپنے حسب نسب پر نازاں تھا۔ چنانچہ دونوں کے درمیان بڑی خلیج تھی جس کی وجہ سے ان کی آپس میں ٹھن جاتی تھی۔ میں نے جب حضرت غالب سے پیچھے ٹیڈی کے ساتھ رہنے کو کہا تھا کہ غالب نے احتجاج کیا کہ ایک شریف آدمی کو ایک بدمعاش کے ساتھ رکھنا گھوڑے گدھے کو ایک لاٹھی سے ہانکنے والی بات ہے۔ اس پر ٹیڈی نے چلا کر پوچھا کہ وہ جانتا ہے گدھا کون ہے اور گھوڑا کون۔ اور خود کو شریف کہنے والے کتنے شریف ہوتے ہیں اور آئندہ کسی سالے نے اس کو بدمعاش کہا تو وہ بتلائے گا کہ بدمعاشی کیا ہوتی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے انھیں خاموش کیا اور ڈسپلن بحال کیا۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کے ساتھ یوں چلتے رہے جیسے وہ میاں بیوی ہوں جو الگ ہو چکے ہوں۔

میں نے بہت مظلوم و مسکین بن کے سڑک پر گزرنے والی کار کے مالک کو لفٹ کا اشارہ کیا کیونکہ اس وقت ٹیکسی رکشا کا دور دور تک پتا نہ تھا لیکن کاریں زن زن گزرتی گئیں۔ اس ویران سڑک پہ اتنی رات گئے کسی اجنبی کو بٹھانے کا خطرہ مول لینے پہ کوئی تیار نہ تھا۔ بالآخر میں نے محسن سے مشورے کے بعد سڑک کے ایک کنارے پہ پوزیشن لی۔ محسن دوسرے کنارے پہ درخت کی اوٹ میں چھپا کھڑا رہا اور ہمارے باقی دو ساتھی فاصلے سے تماشا دیکھتے رہے۔ ایک کار کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں تو محسن سامنے آ گیا اور اس نے پہلے انگوٹھا دکھایا پھر گزرتی ہوئی کار پہ پتھر کھینچ مارا۔ کار فوراً رک گئی اور حسب توقع اس کا مالک سخت مشتعل ہو کے باہر نکلا۔

"تمھارا دماغ خراب ہے؟" وہ ڈرائیونگ سیٹ سے انگلی جھٹک کر بولا۔ "یا خود کو بدمعاش سمجھتے ہو؟"

"میں نے شرافت سے لفٹ مانگی تھی۔" محسن نے دانت نکال کے کہا۔ "تم نے کار کیوں نہیں روکی؟"

"الو کے پٹھے۔" کار والے نے محسن کے مکا مارنا چاہا... "تمھارے باپ کی..."

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے اسے پیچھے سے آ کے دبوچ لیا۔ اپنا ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھا اور اسے گھسیٹ کر دور لے گیا۔ وہ کمزور آدمی نہیں تھا چنانچہ اس کی مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے مجھے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مارنا پڑا۔ تاہم میں نے اس بات کا خیال رکھا کہ اسے چوٹ زیادہ نہ آئے۔ اسے وہیں سڑک سے دور فٹ پاتھ پر ڈال کے میں کار کی طرف لپکا۔ محسن کار میں لگی ہوئی چابیوں کی مدد سے انجن پہلے ہی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ ہماری ہدایات کے مطابق ٹیڈی اور غالب بھی پیچھے بیٹھ چکے تھے۔ میرے بیٹھتے ہی کار روانہ ہو گئی۔

"میاں سکندر عظیم! قتل کر دیا ایک اور؟" غالب نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"نہیں مرزا جی۔ بس تھوڑی سی دیر کے لیے سلا دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی دس منٹ میں اٹھ کھڑا ہو گا یا گشت کرنے والے پہریدار اٹھا کر لے جائیں گے۔"

"تم لوگ تو پیشہ ور مجرم ہو اور میں جذباتی ہو کے ایم آر ایس میں شامل ہو گیا ہوں۔" وہ بولا۔

"اس بات کا اختیار تم کو ہمیشہ حاصل رہے گا کہ جب چاہو الگ ہو جاؤ۔" میں نے بے رحمی سے کہا۔ "لیکن پھر بھی ہم کو پیشہ ور مجرم کہنے کی غلطی مت کرنا۔ ہم نے تو پیشہ ور مجرموں کی بیخ کنی کے لیے ایک تنظیم بنائی ہے اور ہمارا مشن نیک ہے۔ صرف وسائل کے حصول کا طریقہ غلط ہے لیکن یہ ہماری مجبوری ہے۔"

"ہر مجرم کسی نہ کسی مجبوری کو جواز بنا لیتا ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ اگر میرا حق مجھے مل جاتا تو ایسی دس کاریں خرید سکتا تھا میں۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "مگر میں اس وقت ایک ٹیکسی بھی حاصل نہیں کر سکتا تو کیا کروں۔ نہ کاریں چرانا میرا شوق ہے اور نہ پیشہ۔"

"قسم مولا علی کی، اب ایک لفظ بھی نکلا تمھاری زبان سے تو میں..." ٹیڈی نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔

غالب ہنس پڑا۔ "نیلی گولی مجھ پر چلاؤ گے تو ضرور چلاؤ۔ میں صرف بکواس سے ڈرتا ہوں۔ مگر سچ بولتے ہوئے نہیں ڈرتا۔"

"خدا کے لیے بند کرو یہ ڈراما۔ نہ یہ تم پہ گولی چلا سکتا ہے اور نہ تم اتنے بہادر ہو۔ تم بھی یہ بات جانتے ہو ورنہ کوئی راہ چلتے نقلی پستول بھی دکھا دے تو تم اسے تار کے دے دو گے۔" محسن نے سر کھجا کے کہا۔ "یہ بتاؤ جانا کدھر ہے؟"

کر آئی اس کا کتنا بُرا مانیں گے... تم اُلو نہیں... اُلو کا پٹھا ہے... پٹھا سمجھتا ہے نا... شاگرد... جیسے ہر پہلوان کا پٹھا ہوتا ہے۔"

"غالب تو بات مت کر... کیوں آیا ہے تو اس وقت؟" موٹے بھائی نے بگڑ کر کہا۔ "اور یہ کون لوگ ہیں تیرے ساتھ... اجنبی... اور کھوجی... اور یہ کیا لے پی سی ڈی فان... یہ کیا بکواس ہے؟ ان کا نام بھی تو نے غلط بتایا ہے۔"

"تم جیسے دولت مند آدمی کو اتنا کنجوس نہیں ہونا چاہیے موٹے بھائی۔" غالب نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میری طرف ہاتھ بڑھایا اور سگریٹ کا پیکٹ لے لیا۔ "اتنی بڑی کوٹھی کے مالک ہو۔ ساٹھ ستر ہزار روپے ماہانہ کرایہ آتا ہے۔ شاہ عالمی گیٹ کے اندر تمہارا جو میڈیکل اسٹور ہے اس کی جائز ماہانہ آمدنی بھی تین چار ہزار سے کم نہیں ہو سکتی۔ میڈیکل اسٹور کے نام پر تم کیا بیچتے ہو... اور کس کس کو بیچتے ہو۔"

"غالب! تو سالا رپورٹر نہیں، ایک دم خبیث بلیک میلر ہے۔" موٹے بھائی کا حوصلہ جواب دے گیا۔

"میں نے کبھی تم کو بلیک میل نہیں کیا موٹے بھائی۔" غالب بولا۔ "کبھی ضرورت پڑتی ہے تو تمہارے پاس آ جاتا ہوں لیکن اس میں کونسی بُری بات ہے۔ دنیا میں سب ہی ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ پہلے میں تمہارے کام آیا تھا اور وہ کام اتنا بڑا تھا کہ اب تم میرے لیے جو کچھ کرتے ہو وہ اصل کا سود ہوتا ہے۔ تم خود سوچو کہ میں نے تمہاری مدد نہ کی ہوتی تو اس وقت تم کہاں ہوتے۔ یہ چار سال پہلے کی بات ہے لیکن بات ایسی ہے کہ چالیس سال بعد بھی تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ بات ختم ہو گئی۔ ان چار سالوں میں کتنی بار آیا ہوں میں تمہارے پاس؟ شاید چار بار۔ مجموعی طور پر تم نے مجھے دس بارہ ہزار روپے دیے ہوں گے۔ وہ بھی اس لیے کہ میں واقعی ضرورت مند تھا۔ بے روزگار تھا اور سارے دوست ایک وقت کھانا کھلاتے تھے تو احسان کرتے تھے۔ ادھار تو کوئی بھی نہیں دیتا تھا۔ میں اس پوزیشن میں ہمیشہ تھا کہ چاہتا تو تم سے ہر ماہ دو ہزار روپے کا وظیفہ لیتا رہتا اور تم یہ وظیفہ دیتے موٹے بھائی۔ تم چیختے چلاتے گالیاں دیتے، مجھے قتل کرنے کی سوچتے یا خودکشی کرنے کی۔ مگر مجھے دو ہزار ملتے رہتے۔ اس لیے کہ تم میں مرنے کا حوصلہ ہے نہ مارنے کا۔ مگر میں نے تمہاری انتہائی مجبوری میں بھی دو ہزار لیے تو کبھی تین ہزار۔ اور جب میرا سخت وقت گزر گیا تو میں کبھی پلٹ کر نہیں آیا۔ تم کو کیا معلوم کہ تم جیسے آدمی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے میرے دل پر کیا گزرتی تھی لیکن مجبوری آدمی سے سب کچھ کرا لیتی ہے، چوری سے قتل تک۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

موٹے بھائی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "اچھا! ابھی بولو کیا چاہیے۔ میرے پاس زیادہ کیش نہیں ہے۔"

غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ایک کروڑ پتی کے منہ سے ایسی بات سن کر دکھ ہوتا ہے۔ اگر تم کروڑ پتی ہو گئے ہو تو برداشت نہ کرتا کہ میں نے فقیر سمجھ کے تمہیں بے عزت کر دیا۔ تم کو دس بیس ہزار تو ہاتھ میں رکھنے ہی چاہئیں ہم جیسے بے غیرت لوگوں کے منہ پر مارنے کے لیے... اور ننگے فقیروں کا کیا ہے... آدھی رات کو ہاتھ پھیلانے آ جائیں۔"

"قسم خدا کا غالب! ابھی اپنے پاس ایک ہزار بھی نہیں ہوگا لیکن تو بول، تیرے کو کتنا چاہیے۔ میں صبح بنک کھلتے ہی منگوا دوں گا۔" موٹے بھائی نے مردہ آواز میں کہا۔

میں نے پانچ ہزار کے نوٹ جیب سے نکالے اور میز پر رکھ دیے۔ موٹے بھائی کی نظریں نوٹوں پر جم گئیں۔ پھر اس نے باری باری ہم سب کی صورتوں کو دیکھا۔

"اٹھا لو موٹے بھائی۔" غالب نے کہا۔ "پورے پانچ ہزار ہیں۔ آج میں تم سے کیش لینے نہیں تم کو کیش دینے آیا ہوں۔ اس کو میرے حساب میں شمار مت کرنا۔ وہ دس بارہ ہزار الگ ہیں جو تم نے مجھے دیے تھے۔"

"پھر یہ کیا ہے؟" موٹے بھائی کی حالت غیر ہو گئی۔

"یہ ایک کام کا معاوضہ ہے جو تمہارے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔" غالب نے کہا۔ "تم اپنے فن کے ماہر ہو۔ میرے تینوں دوستوں کے چہرے بدل دو۔ کام ارجنٹ ہے اس لیے معاوضہ بھی اتنا بڑا ہے ورنہ تم کو اسٹیج پر تین آرٹسٹوں کے میک اپ کا کیا معاوضہ ملتا؟ زیادہ سے زیادہ سو روپے۔"

"لیکن... یہ کون لوگ ہیں... تم نے ان کا اصلی نام نہیں بتایا میرے کو..."

"نام کو چھوڑو موٹے بھائی، کام سے اور دام سے مطلب رکھو۔" غالب نے کہا۔ "جب میں نے کہا کہ میرے دوست ہیں اور تجھے تیرے کام کا پیسہ مل رہا ہے تو فضول سوالات میں وقت ضائع نہ کر۔ فرض کر لے کہ ان میں سے ایک نے سات خون کیے ہیں، دوسرا جیل سے فرار ہوا ہے اور تیسرا جاسوس ہے۔ صبح ہونے میں ساڑھے چار گھنٹے ابھی باقی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے میں ان کی صورت بالکل بدل جانی چاہیے اور یہ میک اپ وہ نہیں ہونا چاہیے کہ منہ پر پانی کا چھینٹا پڑے اور نیچے سے اصل چہرہ دکھائی دینے لگے۔ ان کو کافی عرصہ بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ گزارنا ہے اس لیے کام پکا ہوگا۔"

"کیسا بات بولتا ہے غالب... تین گھنٹے میں۔" موٹے

www.paksociety.com

غالب کا دوست جو پہلے اسٹیج پر میک اپ کرتا تھا اور اب فلمی دنیا سے بھی نکالا جا چکا تھا، کوئینز روڈ کی ایک گلی میں رہتا تھا۔ ہم نے کار کو چوراہے سے کچھ دور کھڑا کر دیا۔۔۔ جہاں اور بھی بہت سی گاڑیاں خاموش اور سرد رات میں چپ چاپ کھڑی ٹھٹھر رہی تھیں۔ محسن نے کار ہی سے ایک کپڑا اٹھا کر نمبر پلیٹ ڈھکنے میں چند منٹ صرف کیے۔ پھر ہم سب گلی میں غائب ہو گئے۔ غالب کے ساتھ میں ایک عمارت کی تیسری منزل تک پہنچا۔ محسن اور ٹیڈی دو تین منٹ بعد ... رک گئے۔ بلڈنگ کے سب مکین سو چکے تھے۔ اس کے باوجود ہم نے احتیاط سے کام لیا تھا اور دبے پاؤں اوپر گئے تھے۔ غالب نے کال بیل کا بٹن دبایا اور ایک دروازے کے پیچھے سے بزر کی کرخت آواز سنائی دی۔ کچھ دیر خاموشی سے انتظار کرنے کے بعد غالب نے پھر بٹن دبایا۔ اندر سے کسی نے خوابیدہ لہجے میں پوچھا "کون ہے بھائی؟" اور پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ دروازہ کھلا تو میں نے اپنے سامنے غالب کے دوست کو دیکھا۔ وہ دُبلا پتلا اور گنجا صورت سے چار نفر آنے والا اُدھیڑ عمر کا آدمی تھا جس کا رنگ اندھیرے میں نظر بھی نہ آتا تھا۔ اس نے اندر کی لائٹ جلائی تو میں نے سامنے غور سے دیکھا۔ وہ شکل سے ہی کمینہ، لالچی اور عیار لگتا تھا۔ ایسے آدمی پر بھروسا کرنے میں یقیناً خطرہ تھا مگر اس وقت ہمارے پاس اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ "غالب بھائی تم... اس وقت..." وہ اپنی حیرانی پر قابو پا کے بولا۔

"ہاں موٹے بھائی۔" غالب نے خوشدلی سے کہا۔ "تم تو ایسے پریشان ہو رہے ہو جیسے میں قبر سے اٹھ کر آ گیا ہوں۔ ابھی تک میں زندہ سلامت اپنے پیروں پر چل کے تمہارے دروازے تک پہنچا ہوں... تمہارا مہمان ہوں... کیا رات بھر باہر ہی رکھو گے سردی میں؟"

"نہیں یار! ایسی بات کاہے کو ہوتا غالب بھائی۔" وہ خفیف ہو کے پیچھے ہٹا۔ "اندر آؤ۔"

"میں اکیلا نہیں ہوں۔" غالب نے کہا۔ "میرے ساتھ چند مہمان بھی ہیں۔ ایک تو یہ دوست ہیں ہمارے ایس پی کے خان جو مجھ سے زیادہ شریف آدمی ہیں۔" پھر اس نے مجھے اشارہ کیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔

موٹے بھائی ہنسا۔ "اچھے ہم کیا تم کو جانتا نہیں ہے کہ تم کتنا شریف آدمی ہے۔ ایک دم نمبر ایک لفنگے باز۔"

"یہ ساری دنیا ایک لفنگا ہے۔ یہاں ہر شخص لفنگے باز ہے۔" مرزا غالب نے متانت سے کہا۔ "دروازہ کیوں بند کر دیا؟ ابھی سے میرے باقی مہمانوں کو بھی اندر آنا ہے۔"

"دیکھو یار غالب! ابھی میرے کو تھوڑا پریشانی ہونے لگا ہے۔" موٹے بھائی کے ماتھے کی ہر شکن گہری ہو گئی۔ "یہ ایک مہمان تو ٹھیک ہے لیکن اپنا گھر میں کوئی جلسہ جلوس کرنے کا جگہ نہیں ہے اور ابھی میرے کو سچ سچ بتا کہ تیرا کیا مقصد ہے آدھی رات کے بعد یہاں آنے کا... میں اکیلا ہوں گھر میں۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔" غالب نے کہا۔ "ویسے ایک بیوی تو تھی تیرے پاس جو ہر سال..."

"وہ ابھی اپنے میکے کے لیے گئی ہے۔ اپنا بھائی کا شادی بنانے کو۔" موٹے بھائی نے جلدی سے کہا۔ اسی وقت پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق محسن نے دروازے پر دستک دی۔ ہم نے محسن اور ٹیڈی کو بتا دیا تھا کہ ہمارے اندر پہنچ جانے کے ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ آ جائیں۔ موٹے بھائی سے پہلے غالب نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چٹخنی کھول دی۔ محسن اور ٹیڈی کے اندر آتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔

"موٹے بھائی! یہ بھی اپنے جگری یار ہیں۔" غالب نے کہا۔ "یہ میاں خوجی اور یہ دوسرا مسٹر ایجنٹ۔"

موٹے بھائی کا رنگ متغیر ہونے لگا تھا۔ "اچھا اچھا، تم سب بیٹھو۔" وہ خود بھی بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کمرے میں صرف ایک پرانی وضع کا صوفہ سیٹ تھا اور ایک گھسا ہوا قالین۔ درمیان میں رکھی ہوئی میز پر گرد تھی اور پرانے اخبار تھے۔ دواؤں کی آدھی بھری شیشیاں تھیں اور مجموعی طور پر کمرے کی ابتری سے مکینوں کی غربت کا اور عدم دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا۔ موٹے بھائی سو کے اٹھا تھا چنانچہ خود اس کے کپڑے شکن آلود اور میلے تھے۔ اس کی آنکھیں جو چہرے کی مناسبت سے بہت چھوٹی اور کچھ گول تھیں، انتہائی مشکوک انداز میں ہم سب کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مجھے وہ کسی ویرانے میں بسنے والا اُلو نظر آیا جس کی تنہائی میں ہم سب مخل ہو گئے تھے اور یہ بات اسے سخت ناگوار گزری تھی مگر وہ بے بس تھا۔ اس نے غالب کو دیکھ کر کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ غالب اور موٹے بھائی کے درمیان دوستی کے رشتے کی بنیاد خلوص یا محبت پر نہیں ہے۔ بہت جلد اس کی تصدیق ہو گئی۔

"معلوم ہوتا ہے تم کو خوشی نہیں ہوئی مجھ سے اور میرے دوستوں سے مل کر۔" غالب نے کہا۔ "ایک ہم ہیں کہ تمہاری یاد آئی تو آدھی رات کو چلے آئے۔"

"دیکھ یار غالب! ابھی ایسا چکر مت دے میرے کو۔" موٹے بھائی نے تیز لہجے میں کہا۔ "تو اُلو سمجھتا ہے مجھے؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہ

بھائی نے گھور کے کہا۔
"ہاں تین گھنٹے میں۔" غالب نے دھڑ سے میز پر ہاتھ مارا اور جیب سے ریوالور نکال لیا۔ "تین گھنٹے سے ایک منٹ اوپر نہیں۔ کام کرانے کے دو طریقے ہیں اور ابھی میں نے دوسرا طریقہ آزمانے کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔"
خوف سے موٹے بھائی کا دم نکلنے کو تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی ریوالور کو دیکھتا تھا تو کبھی پانچ ہزار کے نوٹوں کو۔ پھر باری باری ہم سب کے منجمد اور بے حس چہروں پر نظر ڈالی کہ وہ غالب کو گھورنے لگا تھا۔ خود میں اور محسن بھی دم بخود بیٹھے تھے کیونکہ غالب کے ہاتھ میں وہ ریوالور نہیں تھا جو اسے ہم نے فراہم کیا تھا۔ اس کے پاس ایک انتہائی بیش قیمت بالکل نیا اور غیر ملکی ساخت کا آٹومیٹک ریوالور تھا جس پر سائیلنسر بھی لگا ہوا تھا۔ میرے سامنے اس وقت وہ غالب نہیں تھا جو بات بے بات شعر پڑھتا تھا۔ صورت اور حلیے سے کاروباری لگتا تھا، بے وقوف اور بزدل نظر آتا تھا اور صرف صحافی تھا جس کو پیچ کی مار نے خوار کیا تھا، گھر سے بے گھر کیا تھا اور در بدر شہر بہ شہر بھٹکنے پر مجبور کیا تھا۔ جو بظاہر ایک کاہل آدمی تھا، زندگی کے تمام تکلفات سے بے پروا اور سارے مسائل سے بے نیاز۔ ایک غیر سنجیدہ اور بے مصرف زندگی گزارنے کا عادی۔ یہاں اس کا اسٹائل یکسر بدل گیا تھا۔ وہ کسی جرائم پیشہ تنظیم کا سرغنہ، کوئی خطرناک دہشت پسند یا جیمس بونڈ کا پاکستانی ایڈیشن بنا ہوا تھا۔ اس کا یہ بدلا ہوا روپ ایک دھماکے سے ہمارے سامنے آیا تھا چنانچہ حیرت کی انتہا کے ساتھ ساتھ ہم سب کو خوشی کا احساس بھی تھا کہ جسے ہم آرائیں کا عضوِ ضعیف سمجھتے تھے وہ درحقیقت کتنا مضبوط اور قابلِ اعتماد سہارا تھا۔
"تین گھنٹوں میں سے پانچ منٹ گزر چکے ہیں موٹے بھائی۔" غالب کی آواز آئی۔
"تم میں سے کون پہلے آئے گا؟" موٹے بھائی نے سر ہلایا اور نوٹ اٹھانے لگا۔
غالب نے ریوالور سے نوٹوں کی گڈی اپنی طرف کھسکا لی۔
"پہلے کام... پھر دام... ساحر جیسا کام ویسے دام۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کو اس سے زیادہ مل جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمہیں ایک پیسہ نہ ملے۔ یہ فیصلہ میں کروں گا کہ تم کو صرف معاوضہ ملنا چاہیے یا انعام بھی ملنا چاہیے۔ یا دونوں میں سے کچھ بھی نہیں ملنا چاہیے اور صرف سزا ملنی چاہیے۔ آرام سے بیٹھ جاؤ، کھال سے پہلے نمٹ لو۔ ایسا احتیاطاً لازمی ہے کہ کسی کی جیب میں ہاتھ مت ڈالنا۔ ہر جیب میں اسی قسم کی فضول چیزیں بھری پڑی ہیں۔" اس نے اپنا ریوالور لہرایا۔ اس کی بات کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے میں نے اپنی جیب سے سائیلنسر والا ریوالور نکالا اور موٹے بھائی کو دکھایا اور جیب میں رکھ لیا۔ ذرا سی دیر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ موٹے بھائی بیہوش ہو کے گر جائے گا اور ہمارا کام دھرا رہ جائے گا۔
"تم اطمینان سے اپنا کام کرو موٹے بھائی۔" میں نے نرم لہجے میں اسے تسلی دی۔ "پانچ ہزار تمہارا ہے۔"
موٹے بھائی کے ساتھ محسن اندر چلا گیا تو اس کمرے میں میرے ساتھ غالب رہ گیا اور استاد ٹیڈی جو بے وقوفوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا تھا۔
"تم بڑے چھپے رستم نکلے استاد۔" استاد ٹیڈی نے سوچ پلتے ہی کہا۔
غالب ہنسا۔ "اسے کہتے ہیں ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔ بس دنیا کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔"
"یہ ریوالور تم نے کہاں سے لیا؟" میں نے کہا۔
"پولیس سے۔" غالب بولا۔ "ان کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ ضبط کیا ہوا ناجائز اسلحہ اور اسمگلروں سے، تخریب کاروں سے یا ڈاکوؤں سے چھینا ہوا اسلحہ۔ اخبار میں تو صرف خبر آتی ہے۔ یہ کوئی کیسے جان سکتا ہے کہ اسلحہ کتنا تھا اور کس قسم کا تھا۔ زیادہ تر کیس فائلوں میں دب جاتے ہیں۔ مثلاً رات کو کسی پولیس پارٹی کا ڈاکوؤں کا آمنا سامنا ہو گیا تو کچھ دن اور کچھ روز کی بنیاد پر یہ خبر یوں آتی ہے کہ ڈاکو رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہو گئے یا جنگل میں روپوش ہو گئے۔ کبھی سچ مچ کسی کو پکڑ پا جائے تو اخبار میں ملزم اور اسے گرفتار کرنے والے کی تصویر کے ساتھ تھوڑا بہت اسلحہ بھی دکھا دیا جاتا ہے تاکہ پبلک متاثر ہو اور اپنے پیارے وطن کی فرض شناس پولیس کی جرأت، بہادری، فرض شناسی کی دھوم مچ جائے۔ دھوم کبھی نہیں مچتی کیونکہ اب پبلک بھی سارے ڈرامے کو سمجھتی ہے۔ اب اسی ریوالور کی مثال لو۔ کوئی باہر سے لایا تھا، مخبری ہو گئی اور وہ شخص پکڑا گیا۔ پولیس نے اسے ایئر پورٹ پر گرفتار کیا اور تھانے لے آئی۔ اس وقت میں ایس ایچ او صاحب کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ساری بات میرے سامنے ہوئی۔ اس شخص نے ریوالور سے دستبرداری قبول کی۔ پانچ ہزار روپے ایس ایچ او صاحب کی خدمت میں، بچوں کی مٹھائی کے لیے پیش کیے اور صبح ہونے سے قبل رخصت ہو کے اپنے گھر پہنچ گیا۔ ایئر پورٹ پر اسے پکڑنے والے مطمئن کہ ملزم کو حوالۂ پولیس کرنے کے بعد ان کا کام ختم۔ بعد میں کون آتا ہے پوچھنے اور مصیبت میں پڑنے کے لیے۔ ایس ایچ او نے مجھے ٹالنے کی [illegible]
مگر مجھے ریوالور پسند آ گیا تھا چنانچہ میں کرسی سے چپک گیا اور جب سارے معاملات طے ہو گئے تو میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ ایس ایچ او بہت جز بز ہوا مگر میں نے کہا کہ اپنے ساتھ بھی سودا کر لو گے تو فائدے میں رہو گے۔ تم پانچ ہزار کی مٹھائی کھا جاؤ۔ یہ خطرناک کھلونا مجھے دے دو ورنہ میں ساری تفصیلات کے ساتھ خبر چھاپتا ہوں۔ میں نے تو پکڑے جانے والے مسافر کا نام پتا اور پاسپورٹ نمبر سب ازبر کر لیا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کس فلائٹ سے کہاں سے آیا تھا۔ ایس ایچ او مجبور ہو گیا۔ اب تک اس کی گولیاں بھی فراہم کرتا ہے مجھے۔ بازار سے خرید اعلیٰ قسم کا ریوالور مل سکتا ہے اور نہ اس میں کام آنے والی گولیاں۔ ایک بار خراب بھی ہو گیا تھا کیونکہ میں اناڑی پن کے باعث۔ میں نشانہ بازی کی مشق کرتا تھا اور ظاہر ہے جس چیز کا استعمال نہ آتا ہو وہ خراب تو ہو ہی جاتی ہے۔ میں ایس ایچ او صاحب کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا کہ کسی ماہر اسلحہ کی خدمات مطلوب ہیں۔ اس نے مجھے پولیس کے ایک ماہر سے رجوع کرنے کو کہا۔ کافر ظالم تھا اس کا۔ کیا بتاؤں تمہیں یار، وہ کیسا ایکسپرٹ آدمی ہے۔ اس نے کام بھی کیا اور یہ بھی سمجھایا کہ ولایتی ریوالور ہے اس میں دیسی گولیاں کبھی استعمال نہ کروں۔"
"یہ گولیاں چلاتے کہاں ہو مرزا غالب؟" میں نے کہا۔ "خدا کی قسم میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم جیسا چغد صورت آدمی اتنا خطرناک ہتھیار رکھ سکتا ہے۔"
"اے بھائی سکندرِ اعظم امن آرم کرن واٹر۔" وہ اسی لہک سے بولا۔ "ہم کسی سے کچھ کہتے نہیں مگر بڑے کہا تھا کہ وقت آنے دو، ہم بتا دیں گے کہ قلم کے علاوہ ہم کیا کچھ چلا سکتے ہیں۔"
"تمہارا نشانہ کیسا ہے؟" میں نے کہا۔
"ابھی بتاتا ہوں۔" غالب اٹھا اور ادھر ادھر دیکھ کر اس نے کونے میں سے فرش پر پڑی ہوئی موم بتی اٹھائی۔ "اسے جلاؤ اور خواجہ صاحب کے ہاتھ میں دے دو۔"
میں نے لائٹر سے موم بتی جلائی۔ پھر موم بتی ٹیڈی کی طرف بڑھا دی۔ ٹیڈی کا رنگ فق ہو گیا۔ "اب تم دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔" غالب نے کہا۔ "اور یہ بتاؤ کہ موم بتی کو صرف بجھانا ہے یا درمیان سے دو ٹکڑے کرنا ہے۔"
"سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی چلایا۔ "قسم مولا علی کی میں یہ کام نہیں کرنے کا۔ موم بتی نہیں، یہ میرا ہاتھ اڑا دے گا۔ میں ٹنڈا ہو جاؤں گا... یہ موم بتی نہیں بجھائے گا، میری زندگی کا چراغ گل کر دے گا۔"
"واہ استاد کیا بات کہی ہے۔" میں نے کہا اور موم بتی سے
کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ غالب نے پوری سنجیدگی کے ساتھ نشانہ لیا۔ ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور موم بتی بجھ گئی۔ ٹیڈی دم بخود رہ گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ گولی موم بتی کو چھو کے گئی بھی نہیں۔ غالب کا نشانہ قابلِ رشک تھا۔
"یہ... یہ کیا ہوا؟" اندر سے موٹے بھائی دوڑ کر آیا۔ "گولی کس نے چلائی ہے؟"
"کسی نے نہیں۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔" غالب نے گھور کر دیکھ کر کہا۔ موٹے بھائی نے سب کو زندہ پا کے اطمینان کا سانس لیا اور اندر لوٹ گیا۔
صبح کے پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے جب موٹے بھائی نے اپنا کام ختم کیا اور مجھے اس کے فن کی مہارت کو تسلیم کرنا پڑا۔ محسن اور ٹیڈی کی صورت دیکھنے کے بعد میں پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ اب اگر میں خود سکندر بخت کے خلاف ایک اور پلیدٹ لکھوانے کے لیے حشمت خان کے پاس چلا جاؤں یا اکرام شیخ کے پاس تو مجھے صرف آواز اور لہجہ بدل کے بات کرنا ہوگی۔ وہ مجھے ہرگز شناخت نہ کر پائیں گے۔ میرے بال گھنگریالے اور مہندی رنگ کے ہو گئے تھے۔ میرے چہرے پر اسی رنگ کی گھنی چھدری داڑھی تھی۔ ناک میں دو اسپرنگ سے لگے ہوئے تھے جن سے نتھنے بہت پھیل گئے تھے اور میری ستواں ناک پکوڑا بن گئی تھی۔ موٹے بھائی نے مجھے بتایا کہ یہ اسپرنگ کس طرح نکالے جا سکتے ہیں اور پھر کس طرح لگائے جا سکتے ہیں۔ میرے سامنے کے دو دانت سونے کے نہ ہونے کے باوجود سونے کے بنے ہوئے نظر آتے تھے اور میری آنکھوں کا رنگ جو پہلے سیاہ تھا اب سبز ہو چکا تھا۔ یہ کنٹیکٹ لینسز کا کرشمہ تھا۔ موٹے بھائی نے مجھے مشورہ دیا کہ اس چہرے کے ساتھ میں چارخانے کی لنگی باندھوں اور کندھے پر دستر خوان نما رومال ڈال کر رکھوں۔ قمیص کے بجائے کھدر کا بغیر گلے والا کرتا استعمال کروں جس سے میری گردن بھی نظر آئے۔ جوتے کی جگہ پرانی پشاوری چپل استعمال کروں اور ممکن ہو تو تھوڑا سا جھک کر چلوں۔ اس کی ذہانت کا قائل میں یوں بھی ہوا کہ اس نے سو فیصد یہی حلیہ محسن کا رکھا تھا اور ہم دونوں کی شکلوں کو ناقابلِ یقین حد تک یکساں کر دیا تھا۔ قد و قامت میں ہم پہلے ہی برابر تھے۔ صورت مل جانے کے بعد جڑواں بھائی نظر آنے لگے۔ میں نے پانچ ہزار موٹے بھائی کو پیش کیے۔
"ابھی آپ دونوں ایک جیسا کپڑا پہن لیں گے تو بھائی غالب بھی دھوکا کھا جائے گا۔" موٹے بھائی نے اپنے فن کی قیمت سے زیادہ مہارت کی تعریف پہ خوش ہو کے کہا۔ [illegible]

www.paksociety.com

صرف وات کا رکھا ہے میں نے۔"

"ویری گڈ۔ تم نے بہت سے مسائل حل کر دیے۔" میں نے محسن کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔ "اب اصل اور نقل میں کوئی فرق نکالے گا بھی تو کیسے۔ پہلے کی جگہ دوسرا اور دوسرے کی جگہ پہلا آسانی سے لے سکے گا۔"

یہ بالکل نیا خیال تھا اور اپنی صورت کے بدل جانے سے زیادہ خوشی مجھے اس خیال پر ہوئی کہ اب ہم دو ہونے کے باوجود ایک ہیں۔ ہم شکل جن کے ہم ولاور اینڈ کمپنی کی عقل خبط کر سکتے تھے۔

اب تک میں نے ایسی بہت سی فلمیں دیکھی تھیں اور ایسے بہت سے ناول پڑھے تھے جن کی کہانی کا تانا بانا ایک جیسی صورت رکھنے والے دو افراد کے کارناموں سے بنایا جاتا ہے اور ہر قسم کی صورت حال محض صورتوں کی مشابہت کو بنیاد بنا کے پیدا کی جاتی تھی۔ بعض اوقات مضحکہ خیز اور بعض اوقات لرزہ خیز۔ کبھی ایک کے بدلے دوسرا پکڑا جاتا اور کبھی دونوں مل کر کچھ کریں تب بھی خود کو بے گناہ ثابت کر دیں۔ غالباً یہی خیال محسن کے ذہن میں بھی جاگزیں تھا کہ وہ اچانک ہنسا اور اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"یہ ہوئی نا وہی بات کہ ایک د شد دو شد" محسن نے کہا۔

"اگر فارسی ہی بولنا ضروری ہے تو کہو کہ من تو شدم تو من شدی" مرزا غالب نے محسن کو ٹوکا۔ "یعنی تو میں ہو گیا اور میں تو۔"

خواجہ تک محو عرفی استاد شیرازی کو بھی موتی بھائی نے ناقابل شناخت بنا دیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ چوہدری ولاور پر اس انقلاب سے جو گزرے گی سو گزرے گی ہمارے اس حلیے سے رابعہ کتنی محظوظ ہو گی اور اگر شہلا نے محسن کو دیکھا تو کتنا ہنسے گی۔ منظر یہی رو بہ رو ہا کر کتنی گالیاں دے گا لیکن اس تبدیلی سے لطف اندوز ہونے کا مرحلہ ابھی دور تھا۔ فوری طور پر شخصیت بدل جانے سے ہم محفوظ ہو گئے تھے اور ہمارے لیے شہر کی سڑکیں اور گلیاں، ہوٹل اور بازار علاقہ ممنوعہ نہیں رہے تھے۔ صبح ہونے میں ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت حائل تھی اور ہمیں اس مسافت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔

ہم روانہ ہونے ہی والے تھے کہ موتی بھائی نے جیب سے پانچ ہزار کے نوٹ نکالے اور غالب کی طرف پھینک دیے۔ "یہ اپنے ساتھ لے جاؤ غالب بھائی۔ اپنا کا حساب برابر ہے۔" وہ بولا۔

"حساب برابر ہے کا کیا مطلب؟" غالب نے حیران ہو کے کہا۔ "کون سا حساب؟"

"مطلب تم نے سمجھا ہے غالب بھائی۔ ہم نے بولا تھا تم کو ابھی کہ یہ سب چکر ہے اور تم اتر بتاتا ہے ہم کو۔ یہ بات ہم ایسے ہی نہیں کہا۔" موتی بھائی ہنسا۔ "ابھی ایک کام ختم ہوا ہوا میں تو ایک ہمارا ہاتھ ہی بچتا۔ ایک بار تم نے ہمارا زندگی ہم کو دیا تھا۔ آج ہم تمہارا دوست سکندر بخت کا زندگی تم کو دیتا ہے۔ یہ حساب برابر ہو گیا نا! پھر بھی ادھر مت آنا اور موتی بھائی کو بلیک میل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم نے کیا سمجھا تھا کہ ہم اندھا ہے۔ ارے غالب بھائی! ہم کو نقلی چہرہ دیکھ کر اصلی چہرہ بتا دیتا ہے۔ تمہارا دوست کو اس ٹینک کے خالی بنا کے لایا تو ہم دھوکا نہیں کھایا۔ ہم جانتا ہے اس کا گرفتاری پر کتنا انعام ہے۔ پانچ ہزار سے زیادہ اور ہم یہ بھی جانتا ہے کہ زندگی کا قیمت کوئی نہیں ہوتا۔ ابھی تم بھاگے گا تو ہم بھی بھاگے گا۔ ہم کو پھانسی ہو گا تو تمہارے فرید کو بھی پھانسی ہو گا۔ تم چپ رہے گا تو ہم بھی چپ رہے گا۔ اسی لیے تو ہم بولا کہ حساب برابر۔"

"ہاں موتی بھائی" غالب نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ حساب آج بیباک ہوا پھر بھی یہ پانچ ہزار تم رکھ لو کیونکہ یہ تمہارا حق محنت ہے۔ تمہاری خاموشی کی قیمت نہیں ہے۔ آئندہ ضرورت نے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کیا تو میں یہ ہاتھ تمہارے سامنے نہیں پھیلاؤں گا۔"

موتی بھائی ہنسا۔ "ابھی تم بولا تھا کہ ہمارا پاس بہت دولت ہے۔ تم ٹھیک بولا تھا۔ ہم یہ پانچ ہزار لے کر کیا کرے گا۔ تم اپنا پاس رکھو یا اپنا دوست کے پاس رکھوا دو۔ جب ضرورت پڑے تو مانگ لینا۔ کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچ جاؤ گے۔ تم سالا مصافی فرنگ ہو کر رہے گا ہمیشہ... تم خود کو بہت عقلمند سمجھتا ہے لیکن تم ایک دم... ارے بابا زبان کو دیکھو۔ تم کو خدا نے چانس دیا تھا۔ تم دو ہزار نہیں تو ہم سے تین ہزار روپیہ مہینہ لے سکتا تھا مگر تم نہیں لیا۔ ابھی کوئی چانس نہیں کیونکہ حساب برابر ہو گیا ہے۔ اب تم جاؤ۔ ہم محنت کا کچھ نہیں لے گا۔ یہ محنت ہم اپنا گلا سے پھانسی کا پھندا نکالنے کے واسطے کیا تھا۔ تمہارا مدد کے واسطے نہیں۔" اس نے دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔

ہم سب شکست خوردہ اور شرمسار سے نیچے میں کھڑے رہ گئے۔ موتی بھائی نے صحیح وقت پر ترپ کا پتا پھینک کر بازی جیت لی تھی۔ ہمارے کام نہ پانچ ہزار روپے آئے تھے اور نہ باتیں رہا اور۔ ہم خاموشی سے نیچے اترے اور اسی گاڑی میں بیٹھ گئے جس کا مالک شاید تھانے میں بیٹھا اپنی قسمت کو رو رہا ہو گا اور اپنی غلطی پر ماتم کر رہا ہو گا کہ اس نے ایک پتھر کو نظر انداز کر دیا ہوتا تو یوں بے کار نہ ہوتا۔ یہ اندازہ تو جب ہی ہے سے موتی بھائی کے گھر پہنچ کر فوراً ہی ہو گیا تھا کہ غالب سے اس کا تعلق کسی خاص نسبت سے ہے اور غالب وہاں ... غالب ہے۔ غالب نے پہلے یہ تو بتا دیا تھا کہ موتی بھائی

نے کسی مجرم کی مدد کی تھی جو اسے پکڑ سے فرار ہوتے وقت بہت کچھ دے گیا تھا لیکن مجھے یہ علم نہ تھا کہ وہ مجرم کون تھا اور اس نے اپنی زندگی میں کیا جرم کیا تھا۔ اب یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس مجرم سے غالب کا بھی کوئی تعلق تھا لیکن اس تعلق سے غالب نے فائدہ کیسے اٹھایا اور موتی بھائی کو مغلوب کس طرح رکھا۔ یہ اب بھی ایک راز تھا۔ گاڑی سنسان سڑکوں پر تیزی سے دوڑتی ہوئی چوہدری ولاور کے گھر کے قریب ہوتی جا رہی تھی اور ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ غالب سے اس مجرم کے فرار کی داستان سنتے اور یہ پوچھتے کہ وہ خود اس ڈرامے کا ایک کردار کیسے بن گیا تھا۔ میری ساری توجہ اس ڈرامے پر تھی جو گزشتہ شب چوہدری ولاور کے گھر شروع ہوا تھا اور بری طرح فلاپ ہو گیا تھا۔ اس نے کسی کو چوہدری ولاور بنا کے صرف مجھ پر یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ وہ قتل ہو گیا ہے۔ اس کا مقصد مجھے شکار کرنا تھا مگر ایک انتہائی ذہانت سے تیار کی جانے والی اسکیم آخری وقت میں فیل ہو گئی تھی۔ اب ہم جوابی چال چلنے والے تھے اور کامیابی یا ناکامی کا انحصار حسن تدبیر سے زیادہ خوبی تقدیر پر تھا۔

"میرے خیال میں اس سے آگے گاڑی لے جانا ٹھیک نہیں۔" محسن نے کار کو چوہدری ولاور کے گھر سے دو فرلانگ دور روکتے ہوئے کہا۔ "گاڑی کا مالک رپورٹ درج کرا چکا ہو گا۔"

"اور اس نے ہمارے حلیے بھی لکھوا دیے ہوں گے۔" شیدی نے اتفاق کیا۔ "اور اس سے پولیس نے یہ اندازہ بھی کر لیا ہو گا کہ گاڑی چھیننے والے کون تھے۔"

"مگر ہم اب وہ نہیں رہے۔" میں نے کہا۔ "یہاں کہاں تلاش کرتا ہوا کون آسکتا ہے۔ گاڑی دور ہو گی تو واپسی پر ہمارے لیے مزید مشکلات پیدا ہوں گی۔ ممکن ہے ہمیں فرار ہونا پڑے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کہیں ایک لاش اٹھا کے ساتھ لانا پڑے... گاڑی کو گیٹ کے سامنے سے سیدھا گزار کے لے جاؤ اور موڑ کاٹتے ہی دیوار کی اوٹ میں روک دو تاکہ ہم ضرورت پڑنے پر دیوار پھاند کر گاڑی میں بیٹھ جائیں۔"

"مرزا غالب! یہ تو ثابت کر دیا ہے تم نے کہ تمہیں بیوقوف سمجھنے والے زیادہ بیوقوف تھے اور تم قلم کے نہیں تلوار کے بھی دھنی ہو۔" محسن نے گاڑی کی رفتار بڑھا کے کہا۔ "یہ بتاؤ ڈرائیونگ بھی آتی ہے؟"

"سب کچھ ایسی ہی بات ہے جو چپ ہوں۔" مرزا غالب نے کہا۔ "ورنہ کیا بات کر نہیں آتی۔ جب اسلاف نے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیے تھے تو کیا ہم شہر کی سڑکوں پر گاڑی بھی نہیں دوڑا سکتے ہیں۔"

"ویری گڈ۔ تم کار میں شیشے بند کر کے بیٹھنا۔" میں نے کہا۔ "تاکہ اگر کوئی چوکیدار گشت کرتا ہوا گزرے تو تم نظر نہ آؤ لیکن تیار رہنا۔"

محسن نے گاڑی کو چوہدری ولاور کی کوٹھی کے ساتھ ساتھ موڑا اور روک لیا۔ گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے اندر کا جائزہ لے لیا تھا۔ گیٹ لائٹ کے سوا تمام کمروں کی لائٹیں آف تھیں اور کوٹھی آخر شب کے سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بند گیٹ کے پیچھے میں نے چوکیدار کو بھی دیکھ لیا تھا جو ایک آتشدان میں لکڑیاں جلائے بیٹھا تھا۔ آتی سردی میں چوکیدار بھی زیادہ مستعد نہیں رہ سکتا تھا اور اسے شاید یہ بھی یقین تھا کہ اس وقت کسی دوست دشمن کے آنے کا امکان نہیں۔ ہماری گاڑی گزری تھی تو اس نے فقط سر اٹھا کے دیکھا تھا مگر پھر ہاتھ تاپنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ سڑک پر سے ایسی سیکڑوں گاڑیاں گزرتی رہی تھیں۔

میں اور محسن پوری احتیاط کے ساتھ نیچے اترے۔ دروازے کو ہم نے آواز پیدا کیے بغیر کھولا اور اتنی ہی احتیاط سے بند کر دیا تھا۔ "میں چوکیدار کو قابو کرتا ہوں۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "اس کے بعد تم دونوں اندر آ جانا۔ شیدی لان کے کسی درخت کے پیچھے چھپ کر انتظار کرے گا اور ہم دونوں باری باری گھر کے اندر داخل ہوں گے۔"

"اور میں... میں... میں کتنی دیر تک انتظار کروں گا... سکندر بادشاہ۔" شیدی کانپتا ہوا بولا۔

"یہ کیا ٹیں ٹیں لگا رکھی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم ہمارے واپس آنے تک ٹھہرو گے۔ خدانخواستہ ہم کسی مشکل میں پھنس جائیں تو تم آگے آؤ ورنہ نہیں۔ ہم دس پندرہ منٹ میں نکل آئیں گے۔ اندر گڑبڑ ہوئی تو تم کو آواز دے لیں گے لیکن خدانخواستہ گرفتار ہو گئے تو دشمن سے تم ہی چھڑانے آؤ گے۔ ہمت کے ساتھ تاریخی عقل کو بھی استعمال کرنا اور ضرورت محسوس کرو تو غالب کو بھی بلا لینا۔" اس آخری بات کا شیدی نے خاصا برا مانا لیکن میں اور محسن دیوار پر چڑھ گئے۔ محسن دیوار کے موڑ پر رک گیا مگر میں ایک ایک قدم آگے بڑھتا گیا۔ درختوں کی وجہ سے دیوار پر اندھیرا تھا اور میں خود ایک سایہ بن گیا تھا۔ ہر قدم اٹھانے کے بعد میں رک جاتا تھا تاکہ چوکیدار کی نگاہ کو کسی مسلسل حرکت کا احساس نہ ہونے پائے۔

تیس پینتیس سال کا جوان چوکیدار مجھے خالی ہاتھ نظر آ رہا تھا لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کی جیب میں کوئی انتہائی خطرناک قسم کا خودکار آتشیں اسلحہ ضرور ہو گا۔ ولاور بیوقوف نہیں تھا کہ کسی کو روایتی قسم کا دربان بنا کے مطمئن ہو جاتے جن کا ایک کام تو یہ ہوتا ہے کہ اپنے آقا کے ولی نعمت یا ان کی بیگم صاحبہ کو

www.paksociety.com

شاہی سواری میں آتے جاتے دیکھیں تو دروازہ کھول دیں اور گاڑی گزر جائے تو حسب سابق سیلیوٹ جھاڑ کر دروازہ بند کر دیں۔ ان کا دوسرا کام پہرا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ خاص کی حد سے قدرے بڑا ہوتا ہے تاکہ اپنے گھر خاص تک صرف انہی کی رسائی ہو تو اس کے اہل ہوں۔ دوسری قسم کے چوکیدار سرکاری عمارات اور بنکوں کے دروازوں پہ محافظت کی رسمی کارروائی پوری کرتے ہیں لیکن وقت آنے پر ایسی فرسودہ اور ناکارہ رائفل سے زیادہ بے مصرف ثابت ہوتے ہیں۔ دلاور جانتا تھا کہ اسے خطرہ کس سے ہے اور اس نے جسے حفاظت پر مامور کیا ہوگا اسے بہت سوچ سمجھ کے منتخب کیا ہوگا۔ چنانچہ چوکیدار بہت صحت مند اور جسمانی طور پر مضبوط نظر آتا تھا اور اس کا اطمینان یہ ثابت کرتا تھا کہ خالی ہاتھ بھی وہ آسانی سے مغلوب ہونے والا نہیں ہے۔

میں ابھی گیٹ لائٹ سے چند قدم دور تھا کہ چوکیدار اٹھ کھڑا ہوا۔ میں فوراً دیوار کے اوپر سیدھا لیٹ گیا۔ احاطے کی دیوار تقریباً آٹھ فٹ اونچی تھی مگر اس کی چوڑائی ایک فٹ سے بھی کم تھی چنانچہ اس پر پیٹ کے بل سانس روک کر اور توازن برقرار رکھتے ہوئے لیٹنا آسان کام نہیں تھا۔ میں نے اپنے جسم کو اکڑا لیا تاکہ دیوار کی سرد سطح اور سرد ہوا سے طاری ہونے والی کپکپی رک جائے۔ میں ایک پتلون قمیص اور صرف ایک جرسی پہنے ہوئے تھا جو آخر شب کی اور کھلی فضا میں محسوس ہونے والی سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ چوکیدار آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس وقت میں کھڑا ہوا یا بیٹھا ہوا ہوتا تو دیوار کی ہموار سطح پر اندھیرے میں بھی نمایاں ہو جاتا لیکن دیوار پر چپک جانے کے بعد میں اس کی بلندی کا حصہ بن گیا تھا اور ساکت و صامت ہونے کے باعث تین فٹ نیچے سے گزرنے والا چوکیدار مجھے دیکھ نہ سکا۔ میں نے دل ہی دل میں یہ دعا مانگی کہ دوسری دیوار پہ محسن بھی عقل سے کام لیتے ہوئے خود کو کیموفلاج کر لے۔

اچانک کوٹھی کے عقب سے ایک کتے نے بھونکنا شروع کیا۔ چوکیدار کے قدم رک گئے۔ پھر دائیں اور بائیں جانب سے دو جرمن شیفرڈ نسل کے کتے نمودار ہوئے۔ وہ تربیت یافتہ محافظ کتے تھے جو اجنبی آدمی کی بو پر خطرے کے الارم کی طرح بجنے لگتے تھے۔ چوکیدار نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ریوالور نکال لیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا پھر کوٹھی کے چاروں گوشوں پر نصب سرچ لائٹس نے اندھیرے کو اجالے میں بدل دیا اور چوکیدار نے میری طرف دیکھا کیونکہ ایک کتا تیر کی طرح میری طرف آ رہا تھا۔ دوسرے کتے کو میں نے دائیں جانب کی دیوار کا رخ کرتے دیکھا جہاں سے محسن کو اندر کودنا تھا۔ ہوا کے غلط رخ نے قبل از وقت ہماری موجودگی کا راز فاش کر دیا تھا اور اب مجھے چند سیکنڈ میں فیصلہ کرنا تھا کہ میں دیوار سے باہر کی طرف کود کر فرار ہو جاؤں یا مقابلے کے لیے اندر آ جاؤں۔ اگر میں اسی طرح لیٹا رہتا تو وہ خونخوار کتا ایک زبردست جست لگا کے مجھے دیوار پر سے نیچے کھینچ لیتا یا شاید اس سے پہلے ہی چوکیدار مجھے شوٹ کر دیتا۔ یہی ہدایات ہوں گی کہ وہ مشکوک افراد کو دیکھتے ہی بلا تامل گولی مار دے اور میں یہ فرض کرتا کہ چوکیدار کا نشانہ خطا ہو جائے گا تو بڑی جان لیوا خوش فہمی ہوتی۔

میرا فیصلہ ایک فوری اور غیر شعوری رد عمل کا نتیجہ تھا۔ عین اس وقت جب کتا جست لگانے کو تھا میں نے خود کو دیوار سے نیچے گرا دیا اور کوٹھی کے اندر پہنچ گیا۔ میں نے سائلنسر والے ریوالور کی دبی دبی آواز سنی۔ یہ گولی یقیناً چوکیدار نے چلائی تھی اور اگر میں نے اندر آنے میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر بھی کی ہوتی تو یہ گولی میرے وجود میں پیوست ہو جاتی۔ جست لگانے والا کتا دیوار سے ٹکرایا اور میں نے بالکل نیچے سے اس پر فائر کیا۔

میں دیوار اور جھاڑیوں کے درمیان کی جگہ میں لیٹا ہوا تھا اور کھلی جگہ کے مقابلے میں کسی حد تک محفوظ تھا۔ کتے نے ایک بھیانک آواز نکالی اور جھاڑیوں پہ گرا۔ میں نے تیزی سے حرکت کی اور گھٹنوں کے بل چوپایوں کی طرح چلتا ہوا دیوار کے ساتھ ساتھ واپس ہوا۔ چوکیدار کی چلائی ہوئی دوسری گولی بھی ضائع ہوئی۔ اس نے اندازے کی بنیاد پہ اس جگہ کا نشانہ لیا تھا جہاں کتا گرا تھا مگر میں چند ثانیوں میں اس مقام سے دس فٹ دور ہو چکا تھا۔ میں ابھی سنبھلا بھی نہ تھا کہ میں نے تیسرے فائر کی آواز سنی اور دوسرے کتے نے بھونکتے بھونکتے ایک کربناک صدا بلند کی۔ میں سمجھ گیا کہ محسن نے بھی وہی کیا ہے جو میں نے کیا تھا۔ رات کی خاموشی میں دو دم توڑتے کتوں کی ہولناک آوازیں رفتہ رفتہ تھم چکی تھیں لیکن ان آوازوں نے دشمنوں کو پوری طرح ہوشیار کر دیا تھا۔ ہمارے لیے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی صورت تھی۔ ہم بھی زیادہ دیر چھپ کر بھی نہیں رہ سکتے تھے اور بے دھڑک باہر نکلنا خودکشی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چوکیدار بڑی آسانی سے ہم دونوں کو باری باری نشانہ بنا لیتا۔ مجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ محسن کی پوزیشن کیا ہے۔ اس نے دیوار کے اوپر سے کتے کو شوٹ کیا تھا یا میری طرح اندر گر کے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ باہر کود گیا ہو۔ ایسی صورت میں چوکیدار کا مقابلہ کرنے کے لیے میں اکیلا رہ گیا تھا۔ ٹیڈی کو اس وقت اندر آنا تھا جب ہم گھر میں داخل ہو جاتے۔ فائرنگ اور کتوں کی چیخ و پکار سنتے ہی وہ بھاگ گیا ہوگا اور گاڑی میں جا بیٹھا ہوگا اور شاید غالب کو بھی مجبور کر رہا ہوگا کہ صورتِ حال کے خطرناک ہو جانے کے باعث انہیں تو نکل ہی جانا چاہیے۔ یہ عجیب بات تھی کہ پیشانی میں استادی کا درجہ حاصل کرنے والا ٹیڈی جرأت اور ہمت میں سب سے کمتر تھا اس کے برعکس محض روایتی صحافی نظر آنے والا غالب کسی خطرناک ترین بدمعاش سے کم نہ تھا۔

اچانک چوکیدار نے ایک ٹارچ روشن کی۔ وہ بہت بڑی ٹارچ تھی جس کی روشنی کسی متحرک سرچ لائٹ کی طرح تمام جھاڑیوں کو کھنگال رہی تھی۔ اس کا دائرہ آہستہ آہستہ میری طرف سرک رہا تھا۔ میں نے اس کی زد میں آنے کے نتائج کا اندازہ کرتے ہوئے خود کو بچانا شروع کیا اور پیچھے ہٹتا گیا۔ پھر ایک اور فائر ہونے کی دبی ہوئی آواز سنائی دی اور ٹارچ کی روشنی غائب ہو گئی۔

"واہ مرزا غالب!" میں نے دل ہی دل میں بے اختیار کہا۔ کسی تذبذب یا سوچ بچار کے بغیر میں سمجھ گیا تھا کہ یہ کارنامہ وہی شخص سرانجام دے سکتا ہے جو موم بتی کے شعلے کو گولی کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ فائرنگ کی آوازیں سن کر خواجہ بیگ عرف استاد ٹیڈی اگر رزم گاہ سے فرار ہو رہے ہوں گے تو مرزا کو غیرت سے زیادہ جرأت مندانہ نے بے خطر آتش نمرود میں کود پڑنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ خود کو تب سے محفوظ پا کے میں نے قدرت کی عطا کردہ مہلت سے فائدہ اٹھایا اور ریوالور نکال کے ایک سرچ لائٹ کو گل کر دیا۔ اسی وقت دوسری سرچ لائٹ بھی گل ہو گئی۔ یہ بھی مرزا غالب کی ذہانت اور نشانے کی مہارت کا نتیجہ تھا کیونکہ فائر کی آواز بہت کم تھی گولی محسن نے چلائی ہوتی تو اس کا دھماکا انتہائی خوفناک ہوتا۔ ابھی تک جتنی گولیاں چلائی گئی تھیں ان سے اردگرد کے بسنے والوں کی نیند پر اثر نہیں پڑا تھا اور کسی طرف سے کسی نے نہیں پوچھا تھا کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کتوں کی چیخ نے کسی کو بیدار کیا ہو لیکن کتے کی آواز کو کون اہمیت دیتا ہے۔ سخت سردی نے بھی انہیں مداخلت بے جا سے محفوظ رکھا اور گولیاں چلنے کی معمولی سی آواز بند دروازوں کے پیچھے لحافوں میں منہ لپیٹ کر سونے والوں کے کانوں تک نہیں پہنچی۔

عقبی حصے کی سرچ لائٹس براہ راست ہم پر نہیں پڑ رہی تھیں مگر ان کی منعکس ہونے والی روشنی لان تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے چوکیدار کو ریوالور ہاتھ میں تھامے پوری طرح چوکس ایک ایک قدم پیچھے ہٹتے دیکھا۔ کھلی جگہ پہ وہ میرے اور غالب کے نشانے پر تھا اور غالب جیسا ماہر نشانہ باز آسانی سے اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر سکتا تھا لیکن ایک چوکیدار سے ہماری کوئی دشمنی نہ تھی۔ ہاں وہ ہمیں براہ راست خطرہ بن جاتا اور میں محسوس کرتا کہ اب اس پر گولی چلائے بغیر میرا بچنا ممکن نہیں تو میں بھی کوئی رعایت نہ کرتا یا کرتا تو صرف اس حد تک کہ چوکیدار کی جان نہ لیتا۔ اس کے دل یا سر کے بجائے اس کے شانے کو نشانہ بناتا اور اس ہاتھ کو ناکارہ بنا دیتا جو مجھ پر ریوالور اٹھا سکتا تھا۔

کوٹھی کے اندر ابھی تک کوئی ہلچل کے آثار نہیں تھے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اندر کوئی ہے ہی نہیں؟ یا ہے تو اتنی گہری نیند میں ہے کہ باہر کے شور سے بے خبر ہے؟ یہ دوسری بات عقل کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی کیونکہ چوہدری دلاور کا عیار ذہن تو اس وقت بھی پوری طرح ہوشیار اور بیدار رہتا ہوگا جب آنکھیں محو خواب ہوتی ہوں گی۔ ایک تیسری صورت یہ تھی کہ اس خاموشی کا مقصد ہمیں دھوکے میں مبتلا رکھنا تھا اور یہ تاثر دینا تھا کہ چوکیدار کے سوا کوٹھی میں کوئی بھی نہیں تاکہ ہم کسی طرح چوکیدار پہ غالب آ کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو جائیں تو اس پر فریب خاموشی کے جال میں گرفتار ہو جائیں۔ میں ابھی کچھ طے نہ کر پایا تھا کہ میں نے چوکیدار کے پیچھے دوسرا سایہ متحرک دیکھا۔ کوئی دبے پاؤں چوکیدار کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ محسن تھا یا غالب۔ اتنی دور سے میں صورت کے نقوش نہیں دیکھ سکتا تھا اور چال سے بھی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ آگے بڑھنے والا پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا۔ میں سانس روکے اور پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ چوکیدار نے ایک قدم پیچھے ہٹایا اور اسی وقت دوسرا سایہ جست لگا کے بڑھا۔ چوکیدار کو پلٹ کر دیکھنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ میں نے اس سائے کے ایک ہاتھ کو بلند ہوتے اور تیزی سے نیچے آتے دیکھا۔ محسن یا غالب میں سے کسی نے چوکیدار پر ریوالور کے دستے سے وار کیا تھا اور شاید پہلے اس کا منہ دبا لیا تھا کہ چوکیدار کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

اب میدان صاف تھا۔ میں نے جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل کر مختصر ترین راستہ اختیار کیا اور سر جھکا کے دوڑتے ہوئے لان کو عبور کر گیا۔ قریب پہنچ کے میں نے محسن کو شناخت کر لیا۔ چوکیدار اس کے قدموں میں ڈھیر پڑا تھا۔ محسن کے اشارے پہ میں نے ریوالور کو جیب میں ڈالا اور ہم دونوں نے مل کر چوکیدار کے بھاری بھرکم جسم کو دونوں طرف سے اٹھایا۔ لان کے آخری حصے میں جھاڑیوں کی دو فٹ سے کم اونچی باڑھ تھی۔ ہم نے چوکیدار کو اس کے سائے میں لٹا دیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر میں نے نبض کی رفتار پہ غور کیا اور پھر سر جھکا کے دل کی دھڑکن سنی۔ سابقہ تجربے کی بنیاد پہ میں اس نتیجے پہ پہنچا کہ محسن کا وار کاری تھا چنانچہ چوکیدار کے آدھے گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں۔ شکاری دشمنوں سے مسلسل معرکہ آرائی نے

www.paksociety.com

www.paksociety.com

محسن کو بھی گوریلا جنگ کا ماہر بنا دیا تھا۔ جس انداز سے اس نے چوکیدار کو بے بس کیا تھا وہ اس کا ثبوت تھا۔

"کیا اندر کوئی نہیں ہے؟" محسن نے سرگوشی میں کہا۔ ہم اب دیوار کے ساتھ چپکے کھڑے تھے۔

"اندر کوئی نہ ہوتا تو دروازے پر چوکیدار کو کیوں بٹھایا جاتا۔" میں نے اس کے کان میں کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس خاموشی کا مقصد ہمیں ٹریپ کرنا ہے۔" محسن بولا۔

"چنانچہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی کی آنکھوں سے یا کسی کیمرے کی آنکھ سے ہم کو بھی دیکھ رہے ہوں اور ہماری ماردھاڑ کی ساری کارروائی کو ایک کامیڈی سمجھ رہے ہوں۔" میں نے کہا۔

"پھر اب کیا کریں؟ واپس چل کے کہیں آرام سے بیٹھ جائیں؟" محسن بولا۔ "جیل بھی انتظار میں ہوگا۔"

"اس کے سوا ہم کر بھی نہیں سکتے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ واپسی بھی ہمارے اختیار کی بات نہیں۔ وہ نکل جانے نہیں دیں گے اور یہاں تک پہنچ کے اور اتنا کچھ کر کے لوٹ جانا بے وقوفی کی بات ہوگی۔ غالب کہاں ہے؟"

"معلوم نہیں۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم گولی یا سکوت چلانا۔" محسن بولا۔ "پھر وہ تھوڑی دیر کے لیے غائب ہو گیا تھا۔ دوبارہ نمودار ہوا تو کہنے لگا کہ پیچھے سے جاؤ اور چوکیدار کا راستہ روکو اور پھر غائب ہو گیا تھا۔"

"وہ تو گاڑی میں تھا، اندر کیسے آ پہنچا؟" میں نے کہا۔

"خواجہ صاحب کہتے تھے کہ آواز سنتے ہی وہ دوڑ کر کار میں گھس گئے تھے اور پلندے ... کر نکل چلو۔ غالب نے آ کر کہا کہ ہمارا ساتھ دینے نکل آیا۔" محسن بولا۔ "اب معلوم نہیں کہاں ہے؟"

"میرا اندازہ بھی بالکل یہی تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ غالب تو کمال کا پراسرار آدمی ہے یار۔ باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ۔ ہم بھی اس کی شخصیت کے ظاہر سے دھوکا کھا گئے۔ خیر اب میں ایک طرف سے جاتا ہوں تو دوسری طرف سے جا۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا۔" محسن بولا۔ "وہ ہر دروازے پر ہمارا استقبال کرنے کے لیے موجود ہو سکتے ہیں۔"

"اچھا تو آگے میں جاتا ہوں۔ تو پیچھے آ۔" میں نے برآمدے کی طرف قدم بڑھاتے۔ غالب کی عدم موجودگی مجھے بے سبب نہیں لگتی تھی۔ یہ فرض کرنا محال تھا کہ اس کارروائی میں پوری طرح شریک رہنے کے بعد وہ لوٹ کر گاڑی میں جا بیٹھا ہوگا۔ شاید یہ تھی کہ وہ کہیں نہ کہیں مصروف ہوگا اور دشمن کے قلعے میں ہمارے ساتھ داخل ہو جانے کے بعد ہمارے خیال سے غافل نہیں ہوگا۔

میں نے اپنے سامنے آ جانے والے پہلے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور پوری احتیاط کے ساتھ آہستہ سے گھمایا۔ معمولی سی کلک کے ساتھ پٹ تھوڑا سا وا ہوا اور میں نے گھپ اندھیرے میں قدم رکھا۔ محسن نے اندر آ کے دائیں جانب اور میں نے بائیں جانب چلنا شروع کیا۔ ہم اندھوں کی طرح ہاتھوں اور پیروں سے راستہ بناتے جا رہے تھے لیکن وہاں کوئی چیز تھی ہی نہیں جو ہماری راہ میں حائل ہوتی۔ بالآخر میں کمرے کے ایک کونے میں پہنچ گیا۔ دوسرے کونے پہ سگریٹ لائٹر کا ننھا سا شعلہ روشن ہوا اور بیک وقت ہم دونوں نے اس خالی کمرے کو دیکھا جس کے وسط میں صرف ایک لاش پڑی تھی اور یہ الف دین کی لاش تھی۔ ذہنی صدمے نے چند لمحوں کے لیے ہم دونوں کو مفلوج کر دیا اور ہم پلک جھپکائے بغیر اس دیوانے کی لاش کو دیکھتے رہے جو خود اپنے انتقام کی آگ میں جل کر خاک ہو گیا تھا۔ اس کی لاش الٹی پڑی تھی۔ یوں کہ دونوں ہاتھ آگے پھیلے ہوئے تھے اور دونوں پیر پیچھے کی طرف۔ بائیں ہاتھ کو دائیں پیر کی سیدھ میں رکھا گیا تھا اور دائیں ہاتھ کو بائیں پیر کی سیدھ میں۔ چنانچہ وہ جو الف دین تھا فرش خاک پہ انگریزی حرف ایکس کی طرح نظر آتا تھا لیکن اس کو لوٹ مارنے والوں نے ہماری آنکھوں کے لیے دوسرا پیغام عبرت الف دین کی کمر پہ نقش کیا تھا۔ کمر کے ہموار حصے پر اس کی کھال کو داغ کر ایم آر ایکس کے تین حروف لکھے گئے تھے۔ یہ کام جتنی سفاکی سے کیا گیا تھا اتنی ہی صفائی سے بھی کیا گیا تھا۔ لوہے یا کسی اور دھات کے دہکتے ٹکڑوں کو الف دین کے جسم پر یوں چپکایا گیا تھا کہ کھال جل گئی تھی اور نقش گہرے سیاہی مائل سرخی رنگ کے زخم کی صورت میں باقی رہ گئے تھے۔ زخموں کے ہر نقش کی گہرائی بتاتی تھی کہ وہ آگ کتنی بے رحم ہوگی جس نے ایک زندہ جیتے جاگتے آدمی کے گوشت کو جلایا تھا۔ یہ تین حرف ایک ہولناک موت کی پوری کہانی کہتے تھے۔ الف دین کی موت ہمارے لیے ایک پیغام تھا کہ شکاری دشمن ہماری ہر چال سے باخبر ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں اور یہ جتانا چاہتے ہیں کہ ایم آر ایکس سوسائٹی کے مقابلے میں ان کی طاقت کہیں زیادہ ہے۔ الف دین نے بیوقوفی کی تھی کہ بھائی کی موت کا بدلہ لینے کی کوشش کی تھی۔ وہ بھول گیا تھا کہ اگر بھائی تھا تو صرف اس کے لیے، اس کے قاتلوں کے نزدیک وہ صرف ایک غدار تھا۔ ایک حقیر پیادہ جو بساط پر سب سے پہلے مرتا ہے کیونکہ وہ سب سے آگے رہتا ہے ... شہ مات نہ ہو۔ شاہ ایک ہوتا ہے اور وزیر ایک ہوتا ہے مگر پیادے آٹھ ہوتے ہیں۔ بالکل ... اسی طرح ہم بھی تو جیسے ... تب بھی چوہدری دلاور کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں اور محسن گھٹنوں

کے بل الف دین کی لاش کے پاس بیٹھ گئے۔ لائٹر کے کپکپاتے شعلے کا عکس جھالا بنا ہر زخم کے نقش کو اجاگر کرتا رہا۔

"اسے پہلے قتل کیا گیا۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "جسم کو موت کے بہت دیر بعد داغا گیا۔"

"ہاں، کسی زخم سے لہو کی سرخی عیاں نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"بیچارہ پاگل کی دیوانگی میں اس انجام تک پہنچا۔" محسن نے کہا۔ "کیا ہوگا بھائی کے قاتل کو قتل کرنے اور خود قتل ہوا۔ اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا۔"

"مگر مرنے سے پہلے اس سے وہ سب کچھ اگلوا لیا گیا ہوگا جو اس کے علم میں تھا۔" میں نے کہا۔

"اس سوختہ تن کی تحریر سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔ "وہ تشدد کے تمام حربے جانتے ہیں اور الف دین کوئی فولاد کا آدمی نہیں تھا۔ اس نے ایم آر ایکس کے متعلق بھی بتا دیا۔"

"غالباً یہی وہ لاش تھی جس کو چوہدری دلاور کا جنازہ بنا کے رکھا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم تدفین میں شرکت کے لیے پہنچ جاتے تو دشمنوں کی چال کامیاب رہتی مگر وہ ڈراما چل نہیں سکا۔"

"اس کے سارے کردار، وہ پولیس والے، سوگوار اور تعزیت کے لیے آنے والے سب نکل گئے۔ خود چوہدری دلاور نے اپنا ٹھکانا بدل لیا۔" محسن بولا۔ "اسے ہمارے سارے عزائم کی خبر الف دین سے مل گئی ہوگی۔"

"پھر کوٹھی پہ چوکیدار کھڑا کرنے کا مقصد کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"ممکن ہے وہ صرف اس لاش کی حفاظت کر رہا ہو۔" محسن بولا۔ "اس کے علاوہ ابھی ہم نے دوسرے کمروں میں کہاں دیکھا ہے۔ اندر کوئی تو تھا جس نے سرچ لائٹس جلائی تھیں۔"

"ہم اس وقت شکارگاہ میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ کسی عام آدمی کا نہیں چوہدری دلاور کا گھر ہے۔ اگر ہر گوشے سے کسی کیمرے کی آنکھ ہمیں دیکھ رہی ہو اور ہر دیوار کے کان ہماری باتیں سن رہے ہوں تو عجب نہیں لیکن جب اوکھلی میں سر دیا تو پھر موصلوں کا کیا ڈر۔ اب دوسرے کمروں میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

دوسرے سب کمرے خالی تھے۔ ایک ایک کر کے ہم سارے دروازے کھولتے گئے۔ دروازہ میں کھولتا تھا۔ محسن ریوالور سے مجھے کور کرتا تھا مگر یہ دفاعی نظام اتنا کمزور تھا کہ ہم خود بھی اس پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ چوہدری دلاور نے حفاظت کے خیال سے کوٹھی خالی کر دی تھی اور اپنی فیملی کو کسی نامعلوم مقام پر شفٹ کر دیا تھا۔ شاید اسے خطرہ ہوگا کہ الف دین ... ہم کو معلوم ہوتا کہ عمل کی کوشش کا رد عمل کیا ہوگا۔ کوٹھی میں ایک تنکا تک نہیں چھوڑا گیا تھا اور

صفائی اتنی مکمل تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر جگہ سے فنگر پرنٹ تک مٹا دیے گئے ہوں گے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ اسی کوٹھی میں چوہدری دلاور اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا اور شاہانہ ساز و سامان کے ساتھ آباد تھا۔

"غالباً یہ چوکیدار صرف لاش کی حفاظت کر رہا تھا۔" میں نے باہر آ کے کہا۔

"رات۔ اور صبح ہونے کے بعد اسے ٹھکانے لگانے والے آ جائیں گے۔" غالب نے اچانک سامنے آ کے کہا۔

"تم کہاں تھے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"چھت پر۔" مرزا غالب نے کہا۔ "اگر کوئی چھت پہ چھپا ہوتا تو کب کا اسے جپ کرا لیتا۔ تم نے غور نہیں کیا کہ اس پرانی وضع کی کوٹھی کے ہر کمرے میں روشندان ہیں۔ گزشتہ رات میرے یہاں چکر لگانے کے بعد ان لوگوں نے خطرہ محسوس کیا ہوگا کہ کہیں میں اصلی پولیس لے کر نہ پہنچ جاؤں۔ وہ سب الف دین کی لاش چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ چوکیدار کو شاید معلوم بھی نہیں تھا کہ اندر ایک لاش پڑی ہے۔ وہ گیٹ پہ پہرہ دیتا رہا۔ پولیس آتی تو وہ پکڑا جاتا اور بکواس کرتا کہ لاش کس کی ہے اور اندر کیسے پہنچی..."

"مگر اندر کوئی اور بھی تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جو غالباً فرار ہو گیا۔ اس نے سرچ لائٹس جلائی تھیں... یا"

ہمارے قدم اچانک رک گئے۔ چوکیدار جسے ہم نے بیہوش کر کے جھاڑی کے پیچھے ڈالا تھا برآمدے کے سامنے مرا پڑا تھا۔ اس کی گردن کاٹ دی گئی تھی اور وار کسی تیز دھار آلے سے کیا گیا تھا کہ باقی جسم کے ساتھ سر کا رشتہ برائے نام رہ گیا تھا۔ خون ابھی تک بہہ رہا تھا اور جسم گرم تھا۔ خطرہ کسی صدا کی بازگشت کی طرح بار بار پکارنے لگا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" غالب نے کہا۔ "اندر یقیناً کوئی اور بھی تھا جس نے یہ قتل کیا ہے مگر اب ہمارا یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔ یہ کوئی سازش ہے۔"

غالب کا خیال غلط نہیں تھا۔ اچانک ایک گاڑی گیٹ کے سامنے آ رکی اور میں نے جیپ سے اترنے والی پولیس کو دیکھا وہ گیٹ کھولنے کے لیے اتر رہے تھے۔ ہم تینوں ایک ساتھ اس دیوار کی طرف لپکے جس کے پیچھے ہماری گاڑی کھڑی تھی۔

"کون ہے؟ خبردار!" کسی نے چیخ کر کہا۔ "ٹھہر جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔" لیکن ہم نے رکے بغیر وقت ضائع نہ کیا۔ پھر ایک فائر ہوا لیکن گولی کسی کو چھوئے بغیر نکل گئی۔ اگر گیٹ بند نہ ہوتا تو ہمیں اتنی مہلت بھی نہ ملتی کہ ہم دیوار تک پہنچ سکیں۔ محسن دیوار کے اوپر تھا جب دوسری گولی آئی اور دیوار میں اس جگہ پیوست ہو گئی جہاں میں نے محسن کو دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گولی محسن کو لگی ہے مگر دیوار

ہم نے ریت کے ذرات آتے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ غالب اور میں سر جھکا کے دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے۔ باہر سے کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ ہمارے پیچھے پولیس کی جیپ گیٹ سے سیٹی ہوئی اندر آئی۔

"میرا ریوالور لو اور جاؤ۔" غالب نے کہا۔ "میں پولیس سے نمٹ لوں گا۔"

"کیسے؟" میں نے ریوالور لے کر کہا۔ "وہ پوچھیں گے۔۔۔"

"سارے ملک میں اخباری شناخت والا ہوں! کہہ سکتا ہوں کہ مجھے کسی نے گمنام فون کر کے چوہدری دلاور کی کوٹھی میں قتل ہونے کی اطلاع دی تھی۔" غالب بولا۔ "مگر میرے پاس سے ریوالور برآمد نہیں ہونا چاہیے۔ تم جاؤ۔"

غالب کے ریوالور کو میں نے جیب میں ڈالا اور دیوار پر چڑھ گیا۔ کسی نے چلا کے پھر کہا۔ "کون ہے؟" مگر میں باہر کود چکا تھا۔ محسن کار کو تیزی سے آگے لایا۔ اس کا اگلا دروازہ پہلے کھلا ہوا جھول رہا تھا۔ ابھی کار کی رفتار کم ہوئی ہی تھی کہ میں اندر جا گرا۔ دروازہ بند ہوتے ہی محسن نے ایکسیلیٹر دبا دیا۔

"خطرے کی اب کوئی بات نہیں رہی۔" میں نے سیدھا بیٹھ کے کہا۔ "آہستہ چلو۔"

"کیوں؟ پولیس کی جیپ ہمارے تعاقب میں آسکتی ہے۔" محسن نے کہا۔

"نہیں، جیپ اندر پہنچ چکی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور ہمارے صحافی دوست مرزا غالب موجود ہیں۔"

"وہ پھنس جائے گا۔" محسن نے تشویش سے کہا۔ "اندر دو لاشیں پڑی ہیں۔"

"انہوں نے مجھے سمجھا لیا ہے۔" میں نے کہا اور غالب کی بات دہرا دی۔

صبح صادق کے آثار نمودار ہونے لگے تھے جب ہم نے کار کو ایک سڑک پر چھوڑا اور اس میں سے اپنی موجودگی کے تمام آثار مٹا دیے۔ ہم پہلی فرصت میں فرار ہونے تھے لیکن سازش کے ایک اور جال سے بال بال بچ کے نکل آئے تھے۔۔۔ چوہدری دلاور ہماری توقعات سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا۔ اس نے مجھے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے کے لیے رابعہ کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی مگر یہ بات نہیں بھولا تھا کہ میرے انتقام کا نشانہ اس کی بیٹی بھی ہو گی، چنانچہ اس نے کسی کو بتائے بغیر اپنے خاندان کو سازوسامان سمیت کہیں منتقل کر دیا تھا۔ پھر اس نے ایک جعلی اخبار کی جھوٹی خبر کے ذریعے مجھے متوجہ کیا تھا اور اگر میری جگہ مرزا غالب نہ پہنچتے تو میں اس کی توقع سے پہلے گرفتار ہو جاتا۔ پھر اس نے بڑی ہوشیاری سے وہ جعلی اخبار بھی واپس حاصل کر لیا اور اس دوران میں شامت کا مارا الف دین بھی اس کے جال میں پھنس گیا تو اس نے پہلے الف دین سے ہماری تمام خفیہ سرگرمیوں کے بارے میں سب معلومات حاصل کر لیں یہاں تک کہ ہماری اس تنظیم کا نام تک پوچھ لیا جو درحقیقت کوئی تنظیم نہ تھی۔ یہ ایک مقصد کے حصول کی خاطر چند افراد کی جدوجہد تھی۔۔۔

الف دین کی لاش پر "ایم آر ایس" کا نام کندہ کر کے اس نے بار بار طور پر ہمیں یہ پیغام پہنچا دیا کہ ہم جو خود کو تیس مار خاں سمجھتے پھرتے تھے اس کی نظر میں کیا ہیں۔ آخری کام اس نے ایک مفروضے کو بنیاد بنا کے کیا تھا یعنی اپنے کسی معتمد کو الف دین کی لاش کے پاس چھوڑ کر یہ سمجھا گیا تھا کہ اگر ہم چکر لگائیں تو اسے کیا کرنا ہے۔ معتمد نے وہی کیا جو اسے کہا گیا تھا۔ چوکیدار اس بکرے کی طرح مارا گیا جسے شیر کا شکار کرنے والے مچان پر بیٹھ کے نیچے باندھتے ہیں اور جو شکاریوں کی زبان میں گارا کہلاتا ہے۔ شیر اس بکرے کو کھانے آتا ہے اور خود شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں دلاور کے معتمد نے چوکیدار کو قتل کر کے پولیس کو مطلع کر دیا تھا کہ قاتل اندر ہی موجود ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر غالب ہمت کر کے پولیس سے نمٹنے کے لیے ڈٹ کر نہ رہتا تو میں دوسرے قتل کے ایک اور الزام میں گرفتار ہو جاتا اور شاید میری یہ آخری گرفتاری ہوتی مگر میں بچ کر نکل آیا اور چوکیدار کی جان بلاوجہ چلی گئی۔

افق کے آخری کناروں پر صبح کا دھندلکا نمودار ہونے لگا تھا۔ ذہنی و جسمانی طور پر میں تھکا ہوا تھا اور مجھے ایک شب کی جدوجہد کے رائیگاں جانے کا افسوس تھا۔ ٹیڈی کو شرمندگی تھی کہ وہ پوری طرح ہمارا ساتھ نہ دے سکا اور محسن کی خاموشی ظاہر کرتی تھی کہ وہ بھی اس صورت حال پر تشویش اور اضطراب کا شکار ہے۔ اگلا قدم اٹھانے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ ہم اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر اعتماد کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ہماری قوت عمل ہمارا ساتھ دے۔ ہم حالات کے مطابق مستقبل کے لیے صحیح لائحہ عمل مرتب کر سکیں۔ ہمارے خیال میں بہتر یہی تھا کہ ہم ہوٹل واپس لوٹ جاتے اور ایک دن سکون سے سو کر گزار دیتے تو شام تک وقتی ناکامی کے اس حوصلہ شکن تجربے کا اثر باقی نہ رہتا لیکن فوری طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ کچھ فاصلہ پیدل چلنے کے بعد میں نے محسن کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے کہیں بیٹھ کر چائے پینے کا فیصلہ کیا۔ بازار ابھی بند تھے چنانچہ ہمیں ریلوے اسٹیشن کا رخ کرنا پڑا۔ اسٹیشن کے باہر بہت سے ہوٹل تھے جو ہمیشہ کی طرح آباد تھے اور گرد و پیش کی رونق میں کوئی کمی محسوس نہ ہوتی تھی۔ بہت سے لوگوں نے نظر اٹھا کے ہمیں واجبی سی دلچسپی سے دیکھا۔ کیونکہ میں اور محسن الگ الگ لباس میں ہونے کے باوجود وہی ایک جیسی صورت سے نمایاں نظر آتے تھے۔ البتہ

ٹیڈی نے اپنا پرانا حلیہ بحال کیا لیکن ان کا وقتی تجسس زیادہ پریشان کن ثابت نہیں ہوا۔ اس ریسٹورنٹ یا چائے خانے کے آخری کونے میں بیٹھ کر میں نے اور محسن نے سگریٹ جلائی اور چائے کے انتظار میں خاموش بیٹھے دھوئیں کے ساتھ اپنے اپنے خیالات کی پرواز میں گم رہے۔ گرم چائے کا ایک کپ ہمارے جسم میں حرارت بن کر پھیل گیا تو ہم نے بہت بہتر محسوس کیا۔

"کیا واقعی غالب کسی مشکل میں نہیں پڑے گا؟" محسن نے خاموشی کے بوجھل وقفے کو ختم کیا۔

"میرا خیال ہے وہ اپنے تعلقات کی وجہ سے محفوظ رہے گا۔" میں نے کہا۔ "اس کے مددگار بہت ہیں۔ دیکھو، الف دین یا اس چوکیدار کے ساتھ غالب کا کوئی تعلق ثابت نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کوئی کیسے ثابت کر سکتا ہے کہ اس نے استغاثہ کا طریقہ یہ الف دین کو مارا اور جلایا اور چوکیدار کا گلا کاٹا۔ پولیس کو وہاں گولیوں کے خول ملیں گے۔ فائر گن کی نمبر تھی۔ چوکیدار نے اور غالب نے مگر ان کے پاس سے کوئی ریوالور برآمد نہیں ہو گا اور جائے واردات پر تین قسم کی گولیوں کے خول ایک معمہ بن جائیں گے۔"

"ممکن ہے پولیس کو تلاش کرنے پر وہ خنجر مل جائے جس سے چوکیدار کا گلا کاٹا گیا تھا۔" محسن بولا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "خنجر پر فنگر پرنٹ نہیں ہوں گے۔ اس کے علاوہ سوال وہی ہو گا کہ قتل کیوں ہوا؟ غالب پر کوئی شک کر ہی نہیں سکتا۔ وہ چالاک آدمی ہے۔ پولیس کو چکر میں ڈال دے گا کہ وہ تین ریوالور تلاش کرو جن سے تین قسم کی گولیاں چلائی گئی تھیں۔ ایک میرا تیس بور کا کولٹ تھا جو مجھے اپنے چوہدری دلاور سے ملا تھا۔ اس کا کوئی لائسنس کسی کے نام پر نہیں۔ دوسرا غالب کا اعشاریہ تین آٹھ کا۔ میرا ہے جو اس نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے میرے حوالے کر دیا۔ اس کا بھی کوئی ریکارڈ نہیں کیونکہ یہ مال غنیمت تھا۔ وہاں صرف چوکیدار کا ریوالور ملے گا۔"

"وہاں چوکیدار کا ریوالور بھی نہیں ملے گا۔" محسن ہنسا اور اس نے اپنا ایک ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا۔ پھر وہ ادھر ادھر دیکھ کر رک گیا۔ "وہ میں نے بھاگنے سے پہلے اٹھا لیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسلحہ ذخیرہ کرنا ریوالور ہے، چھوڑا کیوں جائے مگر وہ کچھ عجیب سی ساخت کا ہے۔"

"فکر اب غالب کی نہیں اپنی کرنی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "صورت سے تو ہمیں کوئی نہیں پہچان سکتا مگر بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ ہم لوٹ کر واپس ہوٹل نہیں جا سکتے۔"

"استاد ٹیڈی، تم بہت چپ چپ ہو۔" محسن نے کہا۔

"میں کیا بولوں محسن بھائی!" ٹیڈی زبردستی مسکرایا۔ "اللہ نے خیریت رکھی ورنہ۔۔۔ میں تو شرمندہ ہوں۔"

"شرمندگی کیسی یار؟ ہر کام ہر آدمی نہیں کر سکتا۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "یہی کیا کم ہے کہ تم ہمارا ساتھ دے رہے ہو اور ایسے حالات میں کہ اپنے پرائے سب چھوڑ چکے ہیں۔ نہ جانے کتنی بار تمہارے گھر نے ہمیں پناہ دی اور ہم نے تم سے دوری کو چن لیا۔ تم کو تو ہماری دوستی بہت مہنگی پڑی۔"

"یہ سب قسمت کا لکھا ہے سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی بولا۔ "تم نے مجھے عزت دی اور عزت کے ساتھ جینا سکھایا۔ مجھے اپنا سمجھا اور آج میرا ایک خاندان ہے۔ ورنہ میں اکیلا تھا اور اکیلا رہتا تو اسی غلط راستے پر چلتا رہتا۔ اب مجھے یہ خوشی ہے کہ میں برائی سے بچ گیا اور خدا نے مجھے توفیق دی کہ برائی کے خلاف جنگ میں شریک ہو کر تمہارے ساتھ رہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے ابھی کوئی تیر نہیں مارا اور کوئی بہت بڑا کارنامہ بھی سرانجام نہیں دیا۔"

"دل چھوٹا کیوں کرتے ہو استاد۔" میں نے اس کی پیٹھ تھپک کر کہا۔ "تمہارا ساتھ دینا ہی اتنا بڑا کام ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اب تم یوں کرو کہ یہاں سے سیدھے رابعہ کے پاس جاؤ۔ اسے ساری بات بتا دو اور پھر انکل رضوی کے گھر چھوڑ آؤ۔ اس کے حق میں یہی بہتر ہے۔ اسے بتا دینا کہ ہم اپنا حلیہ کیا بنا چکے ہیں تاکہ کبھی وہ دیکھے تو پہچان لے۔ اس سے کہنا کہ جتنی نقد رقم فراہم کر سکتی ہے کر دے۔ ہم کو سب سے پہلے تو سر چھپانے کا کوئی مستقل ٹھکانا بنانا ہے۔ پھر ہمیں ایک اور گاڑی بھی چاہیے۔"

"برا مت ماننا سکندر بادشاہ!" ٹیڈی نے کہا۔ "اپنی عورت کی کمائی کے قائل نہیں۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ٹیڈی نے میری غیرت کے منہ پر طمانچہ مار کے مجھے بے عزت کر دیا ہے مگر میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے اسے سخت جواب دینے سے گریز کیا۔ "قائل تو میں بھی نہیں ہوں۔"

"ساری بات حالات کی ہے استاد!" محسن نے میری بات کاٹ دی۔ "عام حالات میں کوئی بھی یہ پسند نہیں کرتا مگر سکندر کی اور میری پوزیشن مختلف ہے۔ سکندر محتاج یا مفلس نہیں ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس نے دلاور کے پچاس لاکھ قبول نہیں کیے تھے جو اسے بیچ کر دینا چاہتے تھے۔ جائز طور پر اس کی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا جائے تو سکندر کے پاس اس سے دگنی مالیت کا کاروبار ہے۔ ایک نہ ایک دن یہ حق تسلیم ہو گا مگر اس وقت کے آنے تک ہم سب کو اپنے اپنے وسائل پر بھروسا کرنا ہے۔"

www.paksociety.com

"اس کے علاوہ رابعہ مختلف قسم کی عورت ہے۔" میں نے بڑھی سے کہا۔ "کم سے کم میرے لیے۔"

"وہ تو ہے سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی عاجزی سے بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ اس نے تمہارے لیے اور تم نے اس کے لیے کیا نہیں کیا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن تم اس سے شادی کر لو گے اور جتنا آج اس نے دیا ہے، اس سے ہزار گنا اسے کرو گے۔ تمہارا سب کچھ اسی کا ہوگا۔ پھر بھی آج مجھے یہ اچھا نہیں لگتا، جب ہم خود ایک کام کر سکتے ہیں۔۔۔"

"اور پیسہ حاصل کرنے کے لیے ہم صرف ڈاکا ڈال سکتے ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "چیک نہیں کاٹ سکتے، کسی سے ادھار نہیں مانگ سکتے۔ ہمارے پاس تو بیچنے کو بھی کچھ نہیں ہے۔"

ٹیڈی اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو چھوڑو سکندر بادشاہ! یہ بتاؤ پھر کہاں ملو گے؟"

"رابعہ سے کہنا کہ ویسٹ اینڈ ہوٹل سے اپنا اور تمہارا سامان اٹھائے۔" میں نے کہا۔ "میرا بل کلیئر کرے اور تمہارے ساتھ انکل رضوی کے گھر چلی جائے۔ اپنا سب سامان الگ کر لے۔ باقی سامان کے ساتھ تم زمیندار ہوٹل پہنچ جانا، ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والی سڑک پر۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "کس نام سے کمرہ لوں؟"

"وہی امیر خان کبیر خان کا نام چلا دو۔" میں نے کہا۔ "دو کمرے کافی ہوں گے۔ اگر رابعہ نے کوئی بندوبست کر دیا تو کل کو اسے کسی گھر میں منتقل ہو جائیں گے۔ ویسے میں محسوس کرتا ہوں کہ اب لاہور میں رہنے کا فائدہ نہیں۔ آج چوہدری دلاور نے اپنا گھر بدل دیا ہے، کل تک وہ اپنا کاروبار بھی بدل دے گا۔ جب تک ہم اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل کریں گے، وہ اپنی پوزیشن محفوظ کر لے گا۔ وہ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس سے اپنے مجرمانہ کاروبار کا ہر سراغ مٹا دے گا اور یہ کاروبار کسی اور جگہ شروع کر دے گا۔ پھر اس کے لیے فیکٹری کو آگ لگوا کے تباہ کرنا یا دھماکے سے اڑا کے ملبے کا ڈھیر بنا دینا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ اس قسم کی تخریبی کارروائی کو آسانی سے میرے نام منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم فوری طور پر اس کے خلاف کوئی ٹھوس قدم اٹھائیں۔"

"لیکن ابھی تو اس کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ۔۔۔ کہاں غائب ہو گیا ہے۔"

"چوہدری دلاور کو گولی مارو۔" میں نے کہا۔ "کیا ہم کالے شاہ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ رحمت کباڑی اور طافو مارے گئے، پھندو لاپتا ہے۔ لنگڑا نواب خسرو، جمشید کا کوئی سراغ نہیں لیکن کالے شاہ کا ٹھکانا ہم نے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ کراچی میں ایک سیٹھ کریم بھائی ہے۔ اس کا پتا کالے شاہ سے مل سکتا ہے۔ کراچی میں ہی پیار علی ہے جو یہاں سے جانے والے مال کو کلیئرنس دلواتا ہے۔ یہ سب چوہدری دلاور کے دست و بازو ہیں۔ ان کو ختم کر دیا جائے تو چوہدری دلاور ختم ہو جائے گا۔"

"یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔" محسن بولا۔

"کام کوئی بھی آسان نہیں ہوتا اور ہم نے تو راستہ ہی وہ منتخب کیا ہے جس میں مشکلات کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے مقابل بہت طاقتور، منظم اور خطرناک شکاری ہیں لیکن ہم بھی اب اکیلے تو نہیں ہیں۔ تمہارے علاوہ غالب کو ملا کر ہم چار افراد ہیں اور ہم سب مسلح ہیں۔ سائلنسر والے تین ریوالور اس وقت بھی ہمارے پاس ہیں۔ بغیر سائلنسر کے کئی ریوالور رہیں۔ غالب ہماری مدد کرے تو پولیس کے اسلحہ خانے سے اور بھی بہت کچھ دلوا سکتا ہے۔ وائرلیس ریموٹ کنٹرول مائک مل سکتے ہیں اور لانگ رینج کے واکی ٹاکی مل سکتے ہیں جو لائسنس کر کے نہیں مل سکتا۔ اسی شہر میں دستی بم اور ڈائنامائٹ مل سکتے ہیں۔ بس نقد پیسہ چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اتنا پیسہ کہ کمایا جا سکے۔"

"چھوڑو سکندر بادشاہ! تم بھی پیسے کی فکر کرتے ہو۔" ٹیڈی بولا۔ "ارے ہم کو دیکھو، ہمارا تو نام ہی ٹیڈی ہے۔ ٹیڈی پیسہ کیا ہوتا ہے۔ مگر اب دیکھنا ہم کیا کرتے ہیں، اب تک نہیں کیا مگر اب کریں گے۔"

"کیا کرو گے استاد!" محسن ہنس پڑا۔ "سرکاری خزانے کی چابیاں ہمارے حوالے کر دو گے؟"

لیکن جواب دینے کے بجائے ٹیڈی چل پڑا۔ "دس گیارہ بجے تک میں آجاؤں گا۔" وہ جاتے جاتے بولا۔

"کیا عجیب آدمی ہے یہ بھی۔" اس کے جانے کے بعد محسن نے کہا۔ "استادی کا زور بھی نہیں رہا، مگر پھر بھی ڈینگ مارنے سے باز نہیں آتا۔"

"قسم مولا علی کی۔" میں نے ٹیڈی کے پیچھے میں کہا۔ "یاروں کا یار ہے اور سچا ساتھی ہے۔ کمزور سہارے بھی بعض اوقات بہت مدد کر دیتے ہیں۔ کشتی ڈوب جائے تو ایک تنکا ساحل تک لے جاتا ہے۔"

اس وقت تک سورج نکل آیا تھا اور اجلی دھوپ کی حرارت پھیلنے لگی تھی۔ میں نے اور محسن نے وہیں بیٹھے بیٹھے ڈبل روٹی مکھن اور چائے منگوا کے ناشتے سے فراغت حاصل کی اور بل ادا کر کے باہر نکل آئے۔ ہمارے پاس نقد رقم کی صورت میں اب ساڑھے سات سو روپے رہ گئے تھے اور اس میں سے کچھ رقم ہمیں اپنے لباس کو اپنے حلیے کے مطابق بنانے میں صرف کرنی تھی۔

ایک گھنٹے بعد ہم انار کلی میں تھے۔ میں نے محسن کو کپڑے لینے بھیجا۔

اور خود جنرل پوسٹ آفس کی طرف چل پڑا۔ میں اخبار کے دفتر یا پولیس اسٹیشن فون کر کے غالب کی خیریت دریافت کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس اس کو اپنے ساتھ تھانے ضرور لے گئی ہوگی اور اس نے وہاں سے اپنے دوستوں کو اور ساتھیوں کو مطلع ضرور کیا ہوگا کہ وہ کس مشکل میں پھنس گیا ہے۔ غالب جائے واردات پر پکڑا گیا تھا اور اسے شہادت کرنا تھا کہ کسی نے اسے واقعی گمنام فون کر کے چوہدری دلاور کے گھر میں ہونے والے قتل کی اطلاع دی تھی۔ اس کے اخبار کے ساتھی اپنی گواہی سے اس کو صاف بچا کے جا سکتے تھے۔ خود غالب کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی مگر میں اپنا اطمینان چاہتا تھا۔ چہرے بدل جانے کے بعد میرے اور محسن کے لیے لاہور کی سڑکوں پہ بے خوف و خطر پھرنا ایک تجربہ تھا۔ مجھے ایک بار خیال ضرور آیا تھا کہ رحمت بھائی نے مجھے پہچان لیا تھا اور وہ پولیس سے رابطہ قائم کر کے انہیں بتا سکتا تھا کہ مطلوبہ ملزم کس حلیے میں پھر رہا ہے مگر اس نے مجھے کہا تھا کہ حساب برابر ہے۔ کوئی ترپ کا پتا غالب کے پاس بھی تھا جس کی وجہ سے موٹے بھائی اب تک دبا ہوا تھا۔ خود اس نے مانا تھا کہ اب پھانسی دونوں کو ہو سکتی ہے۔ مجھے بھی اور اسے بھی۔ وہ میری گردن پھنسانے سے پہلے اپنی گردن ضرور بچائے گا کیونکہ وہ غالب کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یہی خیال میرے لیے تسلی کا باعث تھا۔

میں نے محسن سے جی پی او کے گیٹ پر ملنے کو کہا تھا۔ ابھی میں نیلا گنبد کی طرف سے گزر ہی رہا تھا کہ میں نے ایک کار کو سامنے سے آتے دیکھا۔ یہ چھوٹی سی فیٹ۔۔۔600 تھی جسے ایک لڑکی چلا رہی تھی۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اس کے ساتھ ہی بے اختیار میرے قدم رک گئے کیونکہ وہ لڑکی نازو تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو گاڑی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی طرف کاروں کی قطار میں لگ چکی تھی اور نازو اسی انداز محبوبی کی ساری معصومیت کے ساتھ شاخ گل کی طرح جھک کر باہر نکل رہی تھی جس کے نظارے نے زمانے کتنے دل خون کیے ہوں گے۔ اس کا رنگین آنچل لہرایا اور وہ سراپا قیامت بنی ایک دکان میں داخل ہو گئی۔ میرے تصور میں صرف اس کے پیرہن کے رنگ رہ گئے اور پرانی یادوں کا سیل جنوں خیز مجھے بہا لے گیا۔ کتنے زمانے سے چھپتا پھر رہا تھا مگر اس لڑکی سے منہ چھپاتے ہوئے مجھے شرم آئی جس نے عملاً مجھ پر اپنی جان چھڑکنے اور لٹانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ شرمندگی کا یہ بار تو کب سے اٹھائے پھر رہا تھا کہ اس شعلہ جوالہ، سیماب صفت اور فتنہ محشر لڑکی کو اس کی بے طلب چاہت اور دیوانہ وار الفت کے جواب میں میرے پاس دینے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس وقت بھی میں دامن بچا کے نکل جاتا تو یہ بار ندامت دوگنا ہو جاتا۔

میں نے سڑک عبور کی اور اس کی گاڑی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ کراکری کی دکان سے کچھ لینے آئی تھی۔ میں اسے دکان دار سے باتیں کرتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے رقم ادا کی اور دکان کا کوئی ملازم لڑکا گتے کا خاصا بڑا ڈبا اٹھائے باہر آیا۔ نازو اس کے ساتھ گاڑی کی طرف بڑھی۔ ملازم نے ڈبے کو پچھلی نشست پر رکھ دیا اور لوٹ گیا۔ نازو بچھڑ رہی تھی۔ اسپتال میں موت اور زیست کی کشمکش سے گزرنے والی نازو کا رنگ روپ ذرا بھی ماند نہیں پڑا تھا۔ صحت مند ہو جانے کے بعد وہ پھر برگ گل کی طرح شگفتہ اور تر و تازہ تھی اور اس کے حسن کی جہاں آفرینی کا سدا طلسم وہی تھا۔ کوئی زخم اگر دل میں رہ گیا تھا تو اسے میرے سوا کسی کی آنکھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس کے آس پاس چھڑنے والے دل پھینک قسم کے منچلے مداحوں کی نظروں سے بچ کر بیٹھی تھی لیکن وہ انہی اشتیاقوں سے کسی کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی اور پھر بھی یہ گمان ہوتا تھا کہ سب کی طرف دیکھ رہی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ معصوم چھوئی موئی نازک دکھائی دینے والی لڑکی ایک چلتا پھرتا آتش فشاں ہے۔ اگر غلطی سے کوئی اس کی طرف ہوس پرست ہاتھ بڑھاتا تو وہ ہرن بن کے گرتی اور دوسرے لمحے وہ بدبخت اپنا ٹوٹا ہوا ہاتھ لیے سڑک پر یوں چت نظر آتا کہ پھر اسے سٹریچر پہ اٹھایا جاتا۔

گاڑی بالکل نئی نہیں تھی مگر زیادہ پرانی بھی نہ تھی اور اس کے حال ہی میں لی تھی۔ لیکن بڑے بھائی نے اپنی شخصیت کا نقاب اوڑھ کے رکھی ہوئی بہن کو منانے کے لیے یہ رشوت لی ہو۔ وہ خود رشوت لینے والا آدمی نہیں تھا مگر یہ محبت کی رشوت اسے دینا ہی پڑتی تھی کیونکہ وہ اکلوتے بھائی کی اکلوتی بہن تھی۔ میرے دل میں خلش آزار بڑھ گئی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ریورس کر کے پوری احتیاط سے آگے بڑھائی۔ میں ابھی تک منہ موڑے کھڑا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے نازو نے جس گاڑی کا راستہ روک کے مجھے بچایا تھا، وہ اب میرے جگر میں پیوست ہو گئی ہے۔ میں تڑپ کے آگے بڑھا اور اس نے مجھے بچانے کے لیے پوری قوت سے بریک لگائے۔ اس کی شرربار نظروں نے میری جسارت کا جائزہ لیا مگر وہ مجھے پہچان نہ سکی۔

"آنکھوں والے اندھے ہو یا عقل کے اندھے ہو؟" اس نے برہمی سے کہا۔ "خود مر جاتے اور مجھے مصیبت میں ڈال جاتے۔"

"نہیں نازو۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "مرنا ہوتا تو کبھی کا مر گیا ہوتا۔"

"سکندر!" وہ چیخ کر بولی۔ "تم۔۔۔" پھر الفاظ اس کے حلق میں پھنس گئے۔ اس کی چیخ نے بہت سی نظروں کو متوجہ کر لیا تھا۔ میں نے جلدی سے کار کا ساتھ والا دروازہ کھولا اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "یہاں سے نکل چلو، ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے تم

www.paksociety.com

مصیبت میں پڑ جاؤ۔" میں نے کہا۔

"سکندر! ایسے نصیب میرے کہاں۔" وہ بے ساختہ سسکی۔ ایک دم خوف و ہیبت کے دورے کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کے نازک سے جسم کا ... اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں وہ گاڑی چلاتی تو یقیناً حادثہ ہو جاتا۔ جانے کب سے رکے ہوئے آنسو اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔

"چلو ہٹو اپنی جگہ سے۔" میں نے کہا۔ "گاڑی میں چلاؤں گا۔" اور پیچھے اتر کر سامنے سے اُدھر آیا جدھر وہ بیٹھی تھی۔ کچھ لوگ اس تماشے کو حیرت، دلچسپی اور شکوک کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ نازو جیسی آفت کی پرکالہ کو میرے جیسے کارٹون کے ساتھ دیکھ کر ایک لڑکے نے گزرتے گزرتے اپنے ساتھی سے کہا۔ "چلو بے حور کے پہلو میں لنگور! خدا کی قدرت!" اور وہ دونوں قہقہہ مار کے ہنسے۔ میں نے نازو کو زبردستی آگے کھسکایا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ وہ مسلسل کچھ گھٹ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

"یہ تم... تم واقعی... سکندر ہو نا؟ یا میرے کانوں کو دھوکا ہوا ہے۔ تم ایسے تو نہ تھے۔" وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر بولی۔

"ہاں۔ لیکن تم ذرا سیدھی طرح بیٹھو اور ہوش میں آؤ۔" میں نے کہا۔ "ہم سڑک پر ہیں۔ میرا بابا جیسے بستر پر مجبور تھا، وہ اس شہر میں نہیں رہ سکتا تھا۔"

"یہ سب کیوں کر رہے ہو سکندر اور کب تک کرتے رہو گے؟" اس نے سر میرے کندھے پر سے ہٹا لیا مگر رونا جاری رکھا۔ "حاصل کیا اس سے کیا ملے گا تمہیں؟ کیا ملا ہے آخر اب تک؟ سب کچھ تو گنوا دیا ہے تم نے۔ سب کو تو گنوا دیا ہے۔ اب تم کونسی دنیا میں ہو، جہاں کوئی پہنچنا بھی چاہے تو نہیں پہنچ سکتا۔"

"مگر میں تو تم تک پہنچ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "جب میں تم سے دور تھا تب بھی تمہارے خیال سے تو غافل نہیں تھا۔ میرے ساتھ ایک سہارا تمہاری یادوں کا بھی تھا۔"

نازو کا چہرہ یوں روشن ہو گیا جیسے برستے بادلوں سے نکلنے والے چاند کی روشنی سے آسمان پر اُجالا پھیل جائے۔ اس نے آنسوؤں کے درمیان مسکرا کے نظریں اٹھائیں تو اس کے رخسار گلابی ہو رہے تھے۔ "سچ... تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو مجھ سے؟ تم واقعی مجھے یاد کرتے رہے تھے؟"

"ہاں، میں بھی یاد کرتا تھا۔ رابعہ بھی یاد کرتی تھی۔" میں نے محتاط ہو کے کہا۔

نازو کی مسکراہٹ ماند پڑ گئی اور اس کا چہرہ بجھ گیا۔ "رابعہ... وہ بھی تمہارے ساتھ ہے؟" وہ آنسو پونچھ کے خفت سے ہنسی۔ "میں تو بھول ہی گئی تھی اسے۔ ظاہر ہے وہ تمہارے ساتھ ہی ہو گی۔"

میں نے نوکِ خار کی چبھن کو دل میں محسوس کیا۔ "ہاں، اس کے علاوہ محسن بھی ہے۔ ہم سب ساتھ ہیں۔"

"ہاں۔ بس میں اکیلی ہوں۔" وہ اداسی سے بولی۔ "کتنے اچھے تھے وہ دن جب..." وہ چپ ہو گئی۔

"ہاں، جب یہ سب کچھ نہیں ہوا تھا۔" میں نے دکھی دل سے کہا۔ "جب اکرام شیخ میرا دوست تھا اور رضوی صاحب کا گھر میرا گھر تھا۔ اب میں کسی کا نہیں ہوں اور اس دنیا میں سکندر بخت بن کے جینا میرے اختیار میں نہیں رہا مگر تم نے تو سب سنا ہوگا، اپنے بھائی سے اور دیکھا بھی ہوگا۔ ان اشتہاروں میں جن میں میری تصویر بھی تھی، تم نے اخبارات میں سب پڑھا بھی ہوگا۔ تو دیکھو کیا ہوا اب میں کیا ہوں۔ آج تم کو دیکھا تو نظر چرا کے گزر نہ سکا۔ تم نے اپنی جان کا قرض میرے لیے چھوڑ دیا ہے جو میں کسی طرح نہیں چکا سکتا۔"

"تم یہ قرض چکانا چاہتے ہو؟" اس نے نظریں سامنے رکھ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔

"میری جان لینی تھی تو اپنی جان دے کر کیوں بچائی تھی؟" میں نے اس کا مطلب سمجھ کر کہا۔

"میں کب کہتی ہوں کہ مجھے تمہاری جان کا قرض جان سے وصول کرنا ہے۔ میں تو تم سے دل کا قرض بھی نہیں مانگتی کیونکہ میں سمجھتی ہوں تمہارا ایک ہی دل ہے جو تم رابعہ کو دے چکے ہو۔" وہ پھر رونے لگی۔ "میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھے اپنا سمجھو اسی طرح جیسے تم محسن کو اپنا سمجھتے ہو، شہلا کو سمجھتے ہو۔ مجھے اپنے ساتھ رکھو۔ میں تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتی ہوں سکندر۔"

"کیا یہ جانتا نہیں کہ تم میری خاطر اپنی جان بھی دے سکتی ہو؟" میں نے کہا۔

"اس کے باوجود تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے؟" وہ دکھ سے بولی۔ "دیکھو، میں رابعہ کا حق نہیں چھینوں گی۔ میں تم سے نہیں کہوں گی کہ مجھے اس طرح چاہو جس طرح تم رابعہ کو چاہتے ہو لیکن مجھے اتنا حق تو دو کہ میں تمہیں چاہ سکوں، تمہارے قریب رہ سکوں۔ اس تمام عرصے میں جب تم میری نظروں سے اوجھل تھے..."

"دیکھو نازو، اس دیوانگی سے کچھ حاصل نہیں۔ مجھے ندامت ہوتی ہے اس احساس سے کہ میں تم کو کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ تم بہت اچھی، بہت پیاری لڑکی ہو مگر خدا کے لیے حقیقت کی دنیا میں زندہ رہنا سیکھو۔ میرا خیال چھوڑ دو، مجھے بھول جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یہ ساری دنیا تمہاری ہے۔ تمہاری قوتِ تسخیر بلا کی ہے۔ تمہاری زندگی کی راہوں میں پھول ہی پھول ہوں گے۔ اپنے دامن کے لیے کانٹوں کی آرزو کیوں کرتی ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے رابطہ رکھوں گا۔ یہ بتاؤ، کیا واقعی تمہارے بھائی نے استعفا دے دیا ہے؟"

"ہاں۔ اور مجھ سے زیادہ وہ تمہارے منتظر ہیں۔" نازو بولی۔ "تم کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔"

"کس لیے؟" میں نے کہا۔ "تاکہ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں؟"

"نہیں سکندر، جب سے انھوں نے نوکری چھوڑی ہے، ان کی حالت بدل گئی ہے۔ وہ عجیب سی ذہنی اذیت کا شکار ہیں۔ بار بار کہتے ہیں کہ میں بزدل تھا۔ میں نے نوکری کے تقاضوں اور ضابطوں کے لیے دوستی کے تقاضوں کو چھوڑ دیا حالانکہ وہ ضابطے کھوکھلے تھے اور سارے قاعدے قانون ایک ڈھونگ تھے مگر دوستی کے تقاضے حقیقی تھے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تم مجرم نہیں تھے مگر قانون کو اپنے ہاتھوں میں رکھنے والوں نے تم کو مجرم بنا دیا اور وہ تمہاری مدد نہ کر کے پچھتاتے ہیں۔ تم ان سے ملو۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو نازو!" میں نے کہا۔ "اکرام شیخ پر میں اعتبار کیسے کر سکتا ہوں؟"

"تم مجھ پر تو اعتبار کرتے ہو نا؟" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی۔ "نہیں کرتے ہو تو کہو۔"

"پاگل ہوئی ہو۔ تم سے زیادہ میرے لیے کون قابلِ اعتبار ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تو میں کہہ رہی ہوں کہ بھیا سے ملو۔ وہ تمہارے ساتھ ہوں گے، تمہارے خلاف نہیں۔ گرفتار کرانے کا کیا سوال! وہ تمہیں بچائیں گے اور اسی طرح جیسے میں نے بچایا تھا۔" وہ بولی۔

میں نے جواب نہیں دیا۔ میرا ذہن شدید الجھن کا شکار ہو گیا تھا... دل کہتا تھا کہ یہ لڑکی تم کو دھوکا دے سکتی تو اپنی جان نہ دے سکتی۔ عقل کہتی تھی کہ عورت کی فطرت کو سمجھنے کا دعویٰ کرنا حماقت ہے اور جو عورت محبت کی انتہا میں جان دے سکتی ہے وہ جان کا نذرانہ لے بھی سکتی ہے۔ اس کی انا مجروح ہوتی ہے تو عشق کے جذبے کی تسکین انتقام سے ہوتی ہے۔ میں گاڑی کو اس روڈ پر سیدھا چلاتا کلاس سے بھی آگے تک لے آیا تھا اور اب گھر تو دور کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ مجھے محسن کا خیال تھا مگر یہ بھی یقین تھا کہ وہ کم سے کم آدھا گھنٹا میرا انتظار ضرور کرے گا۔ چنانچہ میں فوراً بس اسٹینڈ سے پہلے کسی کلاک کے قریب سے واپسی اختیار کرنا چاہتا تھا۔ نازو سے گفتگو کے دوران مجھے بالکل احساس نہیں ہوا کہ کوئی میرے تعاقب میں ہے۔ نازو سے یوں غیر متوقع اور سرِ راہ ملاقات ایک ایسا غیر معمولی حادثہ تھا جس نے مجھے گرد و پیش سے بے خبر کر دیا تھا۔ پھر نازو کا ردعمل اتنا شدید تھا کہ اسے سنبھالنے کی جدوجہد میں مجھے اور کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ ہوش مجھے اس وقت آیا جب ایک جیپ نے اچانک سامنے آ کر میرا راستہ روکا۔ کھلی جیپ میں ڈرائیور کے ساتھ ایک شخص بیٹھا تھا۔ وہ کود کر میرے سامنے آ گیا۔ باقی دو اطمینان سے اترے۔

اگر میں ڈرائیونگ نہ کر رہا ہوتا تو شاید کچھ پھرتی کا مظاہرہ کرتا اور ریوالور نکال لیتا مگر بریک لگانے اور گاڑی کو سنبھالنے کی کوشش میں مجھے بالکل مہلت نہ ملی۔ وہ نہ جانے کب سے ہمارے پیچھے تھے اور شاید اسی انتظار میں تھے کہ گنجان آبادی سے آگے نسبتاً غیر آباد علاقہ شروع ہو تو ہمارا راستہ روکیں۔ پہلے اترنے والے کو میں نے پہچان لیا۔ وہ دلاور کا پی اے تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور نہیں، اسٹین گن تھی۔

"ہوشیار نازو، اب جو کچھ کرنا ہے جلدی کر لینا ہے۔" میں نے کہا اور دونوں ہاتھ اٹھا کے باہر نکل آیا۔ بعد میں اترنے والوں میں سے ایک نے نازو کو باہر کھینچ لیا۔ وہ میرا نام لے کر یوں چلائی جیسے مدد کے لیے پکار رہی ہو مگر وہ چاہتی تو ایک جھٹکے میں دونوں کو ہڈی پسلی توڑ کے ڈال سکتی تھی۔

"اس لڑکی کو میرے پاس لے آؤ۔" اسٹین گن والا بولا۔ "تم دونوں اس کی تلاشی لو، ذرا دھیان سے۔"

بعد میں اترنے والوں میں سے ایک نے جھٹکا دے کر نازو کو بازو سے کھینچا اور دلاور کے سیکریٹری کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ دوسرے نے میری جامہ تلاشی لی اور دونوں ریوالور نکال لیے۔

"ان میں سے ایک اسی کا ہے۔" میں نے دلاور کے سیکریٹری سے کہا۔ "دوسرا تمہارے باپ... میرا مطلب ہے صاحب کا۔"

"تم کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ درشت لہجے میں بولا۔

"میں سمجھتا تھا کہ میرے کارخانے میں تم ہی ایک شریف آدمی ہو۔" میں نے کہا۔ "مگر تم دلاور کے کتے ہو۔ تم شریف آدمی کیسے ہو سکتے ہو۔ اس کے کسی بھی آدمی کو شریف کہنا..." میری بات نامکمل رہ گئی۔ نازو نے جو مناسب موقعے کی منتظر تھی، ناٹک کے رونا دھونا اور منت سماجت کرنا شروع کیا اور ان سے التجا کرنے لگی کہ مجھے چھوڑ دیا جائے۔

"چھوڑ دیں کیسے دلِ جانِ جاں؟" دلاور کا پی اے بولا۔ "تمہاری مہربانی سے تو یہ شکار ہاتھ لگا ہے۔ میں نے اسے بہت پہلے ایک بار تمہارے ساتھ دیکھا تھا۔ آج اگر تم نے اس کا نام نہ لیا ہوتا تو میں بھی نہ پہچان سکتا۔ یہ میری خوش قسمتی یا اس کی شامتِ اعمال ہے کہ اسی جگہ میں بھی موجود تھا۔"

www.paksociety.com

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ایک شخص نے بالآخر دلاور کا راستہ روک کر سوال پوچھنے کی جرأت کی ورنہ اس وقفے میں کم سے کم چار دوسری گاڑیاں گزر چکی تھیں اور ان کے ڈرائیوروں نے اپنے انہماک میں سڑک کے کنارے ہونے والی اس غیر معمولی کارروائی پر غور نہیں کیا تھا یا وہ عمداً جان بچا کے نکل گئے تھے۔ اسٹین گن کا نظارہ بڑے بڑے سورماؤں کا حلق خشک کر دیتا ہے۔

"تمہارے باپ کی شادی ہو رہی ہے۔" دلاور کا چیلا سے دہاڑ کر بولا اور اس نے اسٹین گن کا رخ کار والے کی طرف کیا "دفع ہو جاؤ ورنہ تمہارا جہلم ہو جائے گا۔" کار والا سخت بدحواسی کے عالم میں فرار ہوا لیکن اس کی مداخلت نے تازو کو موقع فراہم کر دیا۔ ابھی تک اسٹین گن کا رخ میری طرف تھا۔ ایک سیکنڈ کے لیے رخ بدلا تو تازو بجلی کی طرح حرکت میں آئی۔ اس نے ایک ایڑی پر گھوم کے دوسری لات اتنی اتفاقی انداز میں پوری قوت کے ساتھ اسٹین گن والے کے پیٹ میں ماری کہ وہ اچھل کر پیچھے گرا اور اس کے ہاتھ سے اسٹین گن نکل گئی۔ ایک مسلسل حرکت میں تازو نے دلاور کے پی اے کو زمین تک پہنچنے سے قبل ہی ہاتھ پکڑ کے گھما دیا اور وہ … کی قوت سے سیدھا گیا اور جیپ کے عقبی حصے سے ٹکرایا۔ اسٹین گن اس سے ذرا دیر پہلے کھلی جیپ میں گری تھی۔ دونوں آوازیں میں نے اس وقت سنیں جب میں تلاشی لینے والے کو اوپر اٹھا کے زمین پر … چکا تھا۔ میری نظر شروع سے تازو پر تھی۔ چنانچہ اس کے حرکت میں آتے ہی … جیسے تازو کو اور مجھے ایک ہی اسپرنگ کی قوت نے روک رکھا تھا۔ مجھ سے ریوالور چھیننے والا دونوں ریوالور جیب میں رکھ رہا تھا اور مطمئن تھا کہ وہ خود محفوظ ہے کیونکہ میں اسٹین گن کی زد میں تھا۔ وہ بے خبری میں مارا گیا اور میں نے اسے ضرورت سے زیادہ مشتعل ہو کے پھینکا تو وہ اٹھ نہ سکا۔ اس کا سر غلط طریقے پر فٹ پاتھ کے اونچے کنارے پر لگا اور غالباً اسی جھٹکے نے اس کی گردن توڑ دی۔ دلاور کا پی اے بھی اتنی دیر میں جیپ کے پچھلے ٹائروں کے قریب نیم لیٹ چکا تھا۔

"تم جاؤ سکندر!" تازو نے چلا کے کہا۔ کیونکہ کچھ فاصلے پر گاڑیاں رکنے لگی تھیں۔

میں تیسرے شخص سے نمٹنا چاہتا تھا مگر اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ نہتا ہے۔ اگر اس کے پاس بھی کوئی ریوالور یا پستول ہوتا تو وہ اتنی دیر میں مجھے شوٹ کر دیتا یا تازو کو گولی مار دیتا۔ غالباً وہ ڈرائیور تھا اور اس نے ایک اسٹین گن اور ایک ریوالور رکھنے والے دو محافظوں کی موجودگی میں خود کو مسلح رکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی ہوگی مگر ایک منٹ میں اس کے دونوں محافظ اسلحے سے بھی محروم ہو گئے اور ہوش و حواس سے بھی تو وہ بھاگا۔ پھر بھی اس نے … پہلے تو کچھ دیر اسے یقین ہی نہ آیا ہوگا کہ جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا ہے وہ نظر کا دھوکا نہیں ہے اور ایک نازک سی اور حسین لڑکی نے خالی ہاتھوں سے اسٹین گن سے مسلح ایک جوان اور صحت مند آدمی کا بھرکس کر دیا ہے۔ تازو کی ایکٹنگ کام کر گئی تھی اور اسے کمزور سمجھ کر نظر انداز کرنے کا انجام سب کے لیے … تھا۔ تیسرے شخص کو تازو نے ٹانگ پکڑ کر جیپ میں سوار ہونے سے پہلے ہی کھینچ لیا تھا۔

"خدا کے لیے تم جاؤ۔" تازو نے پھر چلا کے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ ایک واقعی خطرے میں گھرنے لگا ہوں۔ تازو کے لیے تیسرے آدمی سے نمٹنا مشکل نہیں تھا لیکن اس وقت پولیس آ جاتی یا فرار کا راستہ مسدود ہو جاتا تو زیادہ پریشانی میرے لیے پیدا ہوتی۔ میں جلدی سے اس شخص کی طرف لپکا جو فٹ پاتھ کے پاس پڑا تھا۔ اس کی جیب سے دونوں ریوالور نکالتے وقت مجھے احساس ہوا کہ گردن ٹوٹ جانے کے باعث وہ مر چکا ہے۔ میں نے اس کا ریوالور بھی نکال لیا اور جیپ کی طرف بھاگا۔ … شخص دور سے چلایا اور میں نے دیکھا کہ … اس کے ہاتھوں پیروں کو ناقابل استعمال بنا دیا ہے … کا دایاں بازو ٹوٹ گیا تھا اور … خطرناک طریقے سے … لٹک رہا تھا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے گھٹنا پکڑے … سے اندازہ ہوتا تھا کہ تازو نے جوتی کی نوک پر … ہڈی کا بھی علاج کر دیا ہے۔

"میں ان بدمعاشوں کو پولیس کے حوالے کر دوں گی۔" میرے قریب آ کر تازو نے کہا "تمہارا نام بھی نہیں آئے گا لیکن مجھ سے رابطہ رکھنا۔"

"میں جیپ لے جا رہا ہوں۔" میں نے سر ہلا کے تازو کو خدا حافظ کہا اور آخری وقت میں آنے والے ایک خیال کے تحت دلاور کے پی اے کو سڑک پر سے اٹھا کے جیپ میں ڈال دیا۔ چابیاں اگنیشن میں ہی لگی ہوئی تھیں چنانچہ میں نے سیٹ پر بیٹھتے ہی جیپ کو اسٹارٹ کر دیا۔ دور دور کھڑی ہو جانے والی بہت سی گاڑیوں سے اترنے والے اب اکٹھے ہو کر دوڑتے ہوئے … تھے۔ چنانچہ واپسی اختیار کرنے کے بجائے میں نے جیپ کو آگے بڑھا دیا۔ کچھ لوگ مجھے بھی مشتبہ سمجھ کے اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ میں بھی ایک لڑکی پر حملہ کرنے والوں کا ساتھی ہوں اور اب فرار ہو رہا ہوں۔ ان میں سے کچھ "پکڑو، پکڑو" چلاتے۔ ایک نے چلتی جیپ میں چڑھ کر مجھے روکنے کی کوشش کی۔ میرے سیدھے ہاتھ کے وار سے وہ سڑک پر گرا۔ وہ بیوقوفی کی حد تک …

آدمی تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی کے سامنے ہیرو بن کے اپنی قسمت کو چمکانا چاہتا تھا۔ بہرصورت مجھے اس کو گرانے کا افسوس ہوا۔ جیپ کی رفتار خاصی بڑھ چکی تھی چنانچہ اسے سڑک پر گرنے سے چوٹ آئی ہوگی۔ وہ پیچھے آنے والی کسی بھی گاڑی کے نیچے آ سکتا تھا یا خود اسی جیپ کے پہیوں کے نیچے آ سکتا تھا جسے میں چلا رہا تھا۔ آگے سڑک صاف تھی چنانچہ میں نے جیپ کو جیٹ طیارے کی رفتار سے دوڑایا اور پانچ منٹ میں فورٹریس اسٹیڈیم سے آگے نکل کے ایک جانب مڑ گیا۔ پھر انفنٹری روڈ آ گیا اور میں اسی پرانے راستے سے گزرا جس پر سے ہزار بار گزر چکا تھا۔ … پارک کے … ہوئی طرف گیا تو بے اختیار میری نظر بائیں طرف گئی۔ ادھر … والی سڑک پر … کا گھر تھا اور میں نے سوچا کہ کیا اب تک استاد … نے دلاور کو … کے گھر پہنچا دیا ہوگا۔

بغل میں کپڑوں کا بنڈل دبائے محسن جمخانہ کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ٹہل رہا تھا کہ میں نے جیپ اس کے سامنے جا روکی۔ وہ چونک کر پیچھے ہٹا اور کچھ دیر مجھے احمقوں کی طرح دیکھتا رہا جیسے اسے شک ہو کر میرا حلیہ بدل کے کوئی اور اس کے سامنے آ گیا ہے۔

"… آ گئے …" وہ ایک دم بہت پریشان …

"پہلے … " میں نے ہنس کر کہا "…" … کیا شاندار … ہم نے سوچا … کے لیے …

"اس وقت … کسی سے جیپ چھیننا نہیں …" وہ … ہوئے بولا۔

"ہاں، … تو نہیں تھا۔" میں نے کہا "لیکن میرے ماموں … والے اور بہت فرمانبردار ہیں۔ انہوں نے جیپ … سے انکار کر کے بہت محبت کرتے ہیں مجھ سے … چودھری دلاور … کی طرف موڑ لیا۔"

"یہ دلاور کی جیپ ہے؟" محسن بولا۔ پھر اس کی نظر پیچھے گئی اور وہ … ہو گیا۔

"اب تو کوئی شک کی بات نہیں رہی نا، یہ دلاور کا چیلا ہے۔" میں نے مسرت سے کہا مگر محسن کچھ نہیں بولا۔ … جیپ میں اسے پڑا دیکھ کر وہ اتنا حیران تھا جتنا اس کے جسم کے نیچے دبی ہوئی اسٹین گن کو دیکھ کر۔

"تو نے آدھے گھنٹے میں جھک مار کے کیا خریدا …؟" … میں نے کہا "ادھر ہم اتنی دیر میں کیا … کے … اٹھا لائے، ایک اسٹین گن، ایک ریوالور، ایک جیپ اور ایک پی اے۔ سب بالکل اصلی اور بے عیب کارآمد۔ اس کے علاوہ میں نے ایک گولڈن گرل … شیریں سخن سے بھی ملاقات کی۔ کچھ دیر … اس کے ساتھ مال روڈ پر سیر کی، پھر…"

"سیدھی طرح بتا تو کہاں گیا تھا؟ یہ سب کیا ہے؟" محسن نے جھنجھلا کے کہا۔ میں نے اسے آدھے گھنٹے کے بجائے ایک گھنٹے میں واپس آنے کے اسباب و واقعات اور نتائج سے آگاہ کیا اور کم سے کم الفاظ میں اسے تازو سے ملنے اور اس کو چھوڑ کر آنے تک کی ساری کہانی کہہ دی۔

"اس نے پھر تجھے بچا لیا اور خود مصیبت میں پڑ گئی۔" محسن نے افسوس سے کہا۔

"وہ مصیبت میں نہیں پڑے گی۔" میں نے کہا۔ "مصیبت میں وہ شخص گرفتار ہوگا جس کو تازو نے چکنا چور کر دیا ہے۔"

"معاملہ تھانے کچہری تک جائے گا کیونکہ ایک آدمی مر گیا ہے۔" محسن متفکر ہو کے بولا۔

"مگر یہ قتل نہیں کہلائے گا۔" میں نے کہا "ایک لڑکی پر تین غنڈوں نے کار روک کر حملہ کیا تھا۔ لڑکی کراٹے جانتی تھی۔ اس نے خود کو بچایا تو کوئی غلطی نہیں کی۔"

"وہاں لوگ بھی تو جمع ہوتے ہوں گے۔" محسن بولا "جنہوں نے تجھے دیکھا ہوگا اور اس جیپ کو۔"

"ہاں، ممکن ہے نمبر بھی نوٹ کیا ہو۔" میں نے کہا "اس سے ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ معلوم ہو ہی جائے گا کہ جیپ کس کی تھی۔ سب نے یہی کہا ہوگا کہ جیپ میں تین افراد تھے جو لڑکی کو اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک مارا گیا، ایک پکڑا گیا اور تیسرا جیپ لے کر بھاگ گیا۔ بھاگنے والے کو صرف ایک شخص نے قریب سے دیکھا تھا۔ چنانچہ اس کا حلیہ بھی وہی بیان کرے گا۔ ظاہر ہے یہ حلیہ … سکندر … کا ہوگا نہ اس کے ساتھی محسن خان … کا۔ تازو صرف دلیر اور حوصلہ مند ہی نہیں ذہین بھی ہے۔ وہ پولیس کو کنفیوز کرے گی اور مجھے محفوظ رکھنے کے لیے بالکل مختلف حلیہ بتائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کچھ نہ کہے۔ تشہیر اور خواہ مخواہ کے اسکینڈل سے بچنے کے لیے سب کو چھوڑ کے نکل جائے۔ مددگار اور ہمدرد سمجھتے رہ جائیں کہ وہ لڑکی تھی یا چھلاوا۔ اب وہ پولیس کو کیا بتائیں کہ کیا ہوا تھا، کیوں ہوا تھا اور کس کے ساتھ ہوا تھا۔"

"اس کی گاڑی کا نمبر تو کسی نے دیکھا ہی ہوگا۔" محسن بولا۔

"جب میں نے نہیں دیکھا تو اور کسی نے کیا دیکھا ہوگا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تازو اپنی جان بچا کے فرار ہو گئی تو اسے … نہیں ہوگی کہ پھر

www.paksociety.com

پھنس جائے۔ اگر ایک بار وہ بھاگ جانے واردات سے غائب ہو گئی تو پھر وہ ہاتھ نہیں آئے گی۔ کوئی لاکھ کہے وہ صاف مکر جائے گی۔ نہ وہ کہیں گئی تھی نہ کہیں سے لی تھی اور نہ اس پر جیپ میں سوار مجرموں نے حملہ کیا تھا۔ وہ کوئی اور ہوگی جسے چشم دید گواہوں کو جیتے نکلتے دیکھنا چاہیے تھا اسے ثابت کرنے والے بہت ہیں۔"

"چلو وہ تو ٹھیک ہے مگر اب اس سب کا کیا کریں؟" محسن نے کہا۔ "تو جو اتنا مال غنیمت سمیٹ لایا ہے یہ کہاں لے جائیں؟ اتنا اسلحہ جس میں ایک اسٹین گن بھی ہے اور اس لاش کو لے کر ہم زمیندار ہوٹل میں نہیں جا سکتے۔ یہ جیپ بھی خطرناک ہے۔ اسے بہت دور چھوڑنا چاہیے۔"

"باغ جناح چلتے ہیں۔" میں نے تجویز پیش کی۔ "وہاں اس وقت کوئی نہیں ہوگا۔ لباس بھی بدل لیں گے۔ اپنا اسلحہ پرانے کپڑوں میں لپیٹ لیں گے۔ اور جیپ وہیں چھوڑ آئیں گے۔"

"اس آدمی کا کیا ہوگا؟ اگر اسے ہوش آ گیا تو ۔۔۔"

"ہوش آ گیا تو پھر اسے بے ہوش کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ بہت کام کا آدمی ہے۔ دلاور کا پالتو ہے۔ وہ سب جانتا ہوگا جو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کو تفتیش کے لیے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ چوہدری دلاور کے لیے اس سے بڑی پریشانی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا سیکرٹری اسٹین گن اور دو محافظوں کی موجودگی میں اغوا کر لیا جائے۔ اور وہ بھی اسی کی جیپ میں۔"

"اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس کی ذمے دار ایک لڑکی تھی۔ وہ لڑکی اب محفوظ نہیں رہ سکتی۔" محسن بولا۔

"یہ واقعی پریشانی کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ صفدر جیسے گرفتار ہونے والے کو پولیس سے چھڑا کے لے جا سکتے ہیں اور قتل کرنے سے پہلے اس سے سب پوچھ سکتے ہیں کہ لڑکی کون تھی۔ کیسی تھی، کس کے ساتھ تھی، دونوں کا حلیہ کیا تھا۔ وہ کہاں سے آئی تھی اور کدھر جا رہی تھی۔ گاڑی کا نمبر یاد رہا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ مگر اس جلد باز شخص نے تو بتا دیا کہ گاڑی کون سی تھی اور رنگ اور ماڈل وغیرہ کی تفصیل دے دی۔ تب بھی چوہدری دلاور کے لیے نازو کو تلاش کرنا دشوار نہیں ہوگا۔ اس شہر میں اس رنگ کی کتنی فیئٹ ۔۔۔ ہوں گی؟ اور ان کو چلانے والی لڑکیاں کتنی ہوں گی؟ پھر ان میں سے کتنی جوڈو کراٹے کی ایسی ماہر ہوں گی؟ ۔۔۔ شاید نازو کے سوا کوئی نہیں۔"

"میں نے کہا تھا کہ نکلنے جانے سے وہ مصیبت میں پڑ جائے گی۔"

"نہیں محسن۔ اب خواہ مجھے خود کو دلاور کے حوالے کرنا پڑے نازو پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔" میں نے کہا اور گاڑی کو شملہ پہاڑی سے نہر آگے دائیں طرف موڑ کے نکال کر پہلے

میں اپنے کپڑے سے کہ ایک جھاڑی کے پیچھے چھپا دیا۔ قمیص کی جگہ کشتی اور کُرتا اور بوٹ کی جگہ پشاوری چپل پہن لی۔ میں نے آئینے میں دیکھا تو حیران رہ گیا۔ جیپ کے بیک ویو آئینے میں ایک دیہاتی نظر آ رہا تھا جس کے گھنگھریالے بال مہندی رنگے تھے۔ اسی رنگ کی داڑھی کے ساتھ وہ کھدر کے کُرتے ڈھیلے پاجامے اور نیلی دھاریوں کے چیک والی لنگی باندھے پچاس سال کا بوڑھا آدمی نظر آتا تھا۔ اس نقشے میں میرا کانا تر اس لباس میں مکمل طور پر بدل گیا تھا۔ موچی بھائی نے جو رنگ کو پکا بنتے وقت جو ہدایات دی تھیں وہ کتنی اہم تھیں اس کا اندازہ مجھے اب ہو رہا تھا۔ قمیص پتلون میں صرف بڑا بدلا تھا۔ لباس بدلتے ہی میری پوری شخصیت میں انقلاب آ گیا۔ اور خود محسن نے ہنستے ہنستے اعتراف کیا کہ مجھے اللہ کے بغیر پہچان سکتی۔ کچھ دیر میں وہ بھی میری دوسری کاپی بن کے نکل آیا تو ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو کر ہم نے موچی بھائی کے کمال کا اعتراف کیا۔ ایک سے لباس میں ہم دونوں کے درمیان فرق کرنا آسان نہیں تھا اور ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی جگہ لے سکتا تھا لیکن ضرورت پڑنے پر ہم اپنے نقلی ہونے کے دانت دکھا کے فرق کو واضح کر سکتا تھا۔ پرانے کپڑوں کو ہم نے جیپ میں ڈال دیا اور وہاں سے چل پڑے کیونکہ اکا دکا راہگیر ہمیں بڑی دلچسپی اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ تین سو میں کوئی قریب آ جاتا تو اسے جیپ میں لاش کی طرح پڑا ہوا آدمی بھی نظر آ جاتا۔ اور ہمارا آتشیں اسلحے کا ذخیرہ بھی۔ ہم نے جیپ کو ریس کے گھوڑے کی طرح دوڑایا اور محسن نے جیپ کی تلاشی لی مگر اس میں کاغذات نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ "شاید اسے لانے والے محتاط تھے کہ جیپ پکڑی جائے تو وہ نہ پکڑے جائیں۔" محسن بولا۔

"تیرا خیال بالکل غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "جب دلاور نے پولیس نے مجھے دیکھا تھا تو وہ کس مشن پر تھا۔ میرا ان سے ٹکراؤ اتفاقی تھا ورنہ وہ اپنے کسی کام سے نکلے تھے جو پچھ... غلط ہے کہ گاڑی اغوا کرنے نے کسی اور سے لی ہوگی۔"

"کیا یہ آدمی اسی طرح اسٹین گن لے کر شہر میں گھومتے تھے؟" محسن نے کہا۔

"جیسے ان کے دھندے ہیں ویسے ہی حفاظتی انتظام بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "خطرناک کام کرتے ہیں تو خطرے سے نمٹنے کے اسباب بھی رکھتے ہیں۔ اب یہ بہت ضروری ہے ہم جلد از جلد اس جیپ سے نجات حاصل کر لیں۔ چوہدری کے کتے شہر بھر میں اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے اور جیپ کو ڈھونڈ

پھر رہے ہوں گے۔"

محسن نے پچھلی سیٹ کو پلٹ کے دیکھا۔ اس کے پیچھے پلاسٹک شیٹ میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ تھا۔ محسن نے پلاسٹک ہٹایا تو اندر سے کاغذ کا ایک لفافہ نکلا۔ ایک ایک کر کے محسن نے اس میں سے نوٹوں کی چار گڈیاں نکالیں۔

"چالیس ہزار روپے!" محسن نے حیرت اور مسرت سے سیٹی بجائی۔ "تیرے ماموں سسر واقعی تجھ پر بہت مہربان ہیں اور میری ہر ضرورت پوری کرتے ہیں۔"

"اللہ بڑا کارساز ہے محسن خان۔" میں نے کہا۔ "اب یہ ضروری نہیں رہا کہ ہم زمیندار ہوٹل میں جائیں۔ اتنے اسلحے اور ایک بے ہوش آدمی ساتھ لے کر ہم وہاں جاتے بھی کیسے۔ اب کوئی ٹھکانا تلاش کرنا ہوگا جہاں ہم رہ سکیں اور یہ سب بھی ساتھ رکھ سکیں۔" اچانک مجھے اپنے دائیں ہاتھ پر "یہ مکان خالی ہے" کا نوٹس نظر آیا جو لکڑی کے پرانے دروازے پر کسی نے چاک سے لکھا تھا۔ دروازہ ایک پرانی اینٹوں سے بنی ہوئی حویلی جیسی عمارت کا تھا جو تقریباً ساٹھ فٹ لمبی اور تیس فٹ چوڑی تھی۔ اس کے اوپر دو کمرے اور کچھ جھولتی چھت تھی اور چھجے کا رخ سڑک کی طرف تھا۔ ایک وقت وہ نام لکھے ہوئے تھے۔ ایک عبارت کسی پتھر پر انگریزی کے پیلے حروف سے لکھی تھی۔ وہ یہ بتاتی تھی کہ اس جگہ کوئی آرا مشین ہوا کرتی تھی۔ بیشتر حروف مٹ چکے تھے۔ دوسری عبارت اردو میں تھی اور غالباً کسی بے ہنر نے بقلم خود لکھی تھی۔ "یہاں ہر قسم کا فرنیچر بنایا جاتا ہے۔" یہ تحریر سیاہ تارکول کی تھی چنانچہ پختہ ہو جاتی تھی۔

"کیا خیال ہے محسن؟" میں نے جیپ روک کر کہا۔ "یہ کچھ نامناسب تو نہیں ہے؟"

"یہ جگہ ہر لحاظ سے ہماری ضروریات کے مطابق لگتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ ہم بات کس سے کریں۔ خیر میں پیچھے جا کے دیکھتا ہوں۔"

وہ علاقہ ملتان روڈ کا تھا لیکن زیادہ آباد نہیں تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مجھے اسی قسم کی بہت سی تعمیرات نظر آ رہی تھیں جن میں چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتوں کا سلسلہ تھا مگر لکھنے والوں نے ان پر فیکٹری اور مل کے نام بھی لکھ رکھے تھے۔ رہائشی مکان الگ تھے چنانچہ وہ رونق یہاں نظر نہیں آتی تھی جو صرف رہائشی آبادیوں میں ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ علاقہ ویران لگتا تھا۔ ہمارے محسن کے جانے کے بعد میں نے سیٹ ہٹا کے دیکھی اور یہ دیکھ کے دنگ رہ گیا کہ اس کے پیچھے اسٹین گن کے راؤنڈ رکھے ہوئے تھے۔

میں نے سیٹ کو پھر برابر کر دیا۔ زیادہ باعث تشویش وہ شخص تھا جو جیپ میں بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر اسٹین گن نکالی اور احتیاط کے ساتھ آگے والی دونوں نشستوں کے درمیان رکھ دی۔ اس کے اوپر میں نے وہ کپڑا پھیلا دیا جو گاڑی کو صاف کرنے کے لیے رکھا گیا تھا پھر میں نے دلاور کے سیکرٹری کو ہلا جلا کے سیدھا کیا۔ اور اس کا سرسری میڈیکل چیک اپ کرنے کے لیے نبض کی رفتار دیکھی جو قدرے سست تھی لیکن دل کے دھڑکنے کا عمل نارمل تھا۔

"خیریت تو ہے نا چوہدری؟" کسی نے بہت قریب سے کہا۔ "کیا ہو گیا ہے اس جوان کو؟"

میں نے چونک کر خمیدہ کمر بوڑھے کو دیکھا۔ "کچھ نہیں چاچا۔ چکر آ گیا ہے اسپتال لے جا رہے ہیں۔"

"اچھا اچھا رب خیر کرے گا۔" بوڑھے نے جاتے جاتے کہا۔ اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ کوئی شکی مزاج پولیس مین نہیں تھا۔ ورنہ میرے لیے اس کو مطمئن کرنا مشکل ہو جاتا۔ آدھے گھنٹے تک میں یوں بیٹھا رہا جیسے واقعی کسی بیمار شخص کا تیمار دار ہوں۔ انتظار مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا اور محسن نہ جانے کدھر غائب ہو گیا تھا۔ میں نے چار افراد کو اسی طرح مطمئن کیا۔ ان میں سے ایک زیادہ متجسس تھا اور اس نے مجھ سے یہ بھی پوچھا کہ بیمار کو کیا بیماری ہے؟ میں اسے کیا بتاتا کہ سڑک پر کیوں کھڑا ہوں؟ کس ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں؟ جیپ کا ڈرائیور ایسی حالت میں گاڑی چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے اور کیوں چلا گیا ہے؟ مریض بے ہوش ہے کہ سو رہا ہے؟ میں نے اس کو بھی اطمینان بخش جوابات سے ٹرخا دیا۔ دھوپ اب تیز ہو گئی تھی اور مجھے یہ اندیشہ لاحق ہو چلا تھا کہ کہیں بیمار کو ہوش نہ آ جائے۔

بالآخر محسن ایک پستہ قد اور موٹے آدمی کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس نے قفل کھولا اور وہ دونوں اندر غائب ہو گئے۔ محسن نے جاتے ہوئے میری طرف نہیں دیکھا تھا تاکہ میرے اور اس کے درمیان کسی قسم کا تعلق ثابت نہ ہو۔ اور وہ جیپ پر غور نہ کر پائے۔ پستہ قد اور موٹا شخص یقیناً لینڈ لارڈ تھا اور محسن کی جستجو کامیاب رہی تھی۔ میں نے دعا مانگی کہ ان کے مذاکرات بھی کامیاب رہیں۔ میری دعا فوراً قبول ہوئی اور وہ دونوں باہر نکلے تو موٹا آدمی بہت خوش تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے قفل کی چابی محسن کے ہاتھ پر رکھ دی اور وہ جھومتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔ انتظار کے اگلے دس منٹ زیادہ صبر آزما ثابت ہوئے پھر محسن کی صورت دکھائی دی۔

"ہو گیا مسئلہ حل۔" محسن نے پرمسرت لہجے میں اطلاع

www.paksociety.com

دی۔ تیرے ماموں سسر کا پیسہ کام آگیا ورنہ معاملہ لمبا ہو جاتا۔"
"کتنے کی بات ہوئی ہے؟" میں نے کہا۔
"ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ پر۔" محسن بولا۔ "بیچارا سخت ضرورت مند تھا۔ پہلے کسی کو آٹا مشین لگانے کی اجازت دی تھی۔ اس نے دُنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے دن کے وقت آٹا مشین چلائی، رات کو اس جگہ جعلی نوٹ چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا۔ جب چھاپا پڑا تو مالک کے ساتھ ساتھ مکان بھی گرفت میں آیا اور بڑی مشکل سے بچا۔ اس کے بعد کسی نے فرنیچر بنانا شروع کیا تھا۔ اس کا دھندا نہیں چلا اور وہ چھ ماہ کا کرایہ واجب الادا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ میں نے سال بھر کا کرایہ پیشگی دیا تو ساری جرح بھول گیا ورنہ بہت پوچھ رہا تھا کہ کیا کام کرو گے؟ اور کوئی ضامن ہے یا نہیں۔ اب کہہ رہا تھا کہ کرایہ نامہ وغیرہ ہوتا رہے گا۔ دراصل مقروض ہے بیچارا۔ یکمشت ملنے والے اٹھارہ ہزار کیسے چھوڑتا۔"
"یہ بہت اچھا ہوا۔" میں نے کہا۔ "اب میں یہ سارا سامان تیری تحویل میں یہاں چھوڑتا ہوں اور خود یہ جیپ لے کر جاتا ہوں۔"
"میں یہاں اکیلا کب تک انتظار کروں گا تیرا؟" محسن بولا۔ "میں بھی جاتا ہوں۔"
"نہیں۔ ویسے تیرا دل چاہے تو تالا لگا کے اپنے لینڈ لارڈ کے پاس چلے جانا اور گپ لگا کے بیٹھ جانا۔" میں نے کہا۔ "میں دو گھنٹے بعد واپس آؤں گا۔ خواجہ نیک محمد کو اور اپنے تمام سامان کو ساتھ لے کر۔ صبح میں غالب کے متعلق کچھ معلوم نہیں کر سکا تھا۔ اس کا پتا چلے تو اسے بھی بتاؤں کہ اب ہم کہاں ہیں۔ پھر نازو کی خیریت دریافت کرنی ہے۔ دونوں گئے تو اس قیدی کی حفاظت کون کرے گا۔ میں اس بات کا انتظام کر جاؤں گا کہ یہ ہوش میں آجائے تو بھی آواز نہ نکال سکے اور ہل جل نہ سکے۔ مگر پھر بھی تیری نگرانی بہت ضروری ہے۔"
ہم نے جیپ کو دروازے سے بلایا اور محسن نے قفل کھولا۔ جیپ میں چار ریوالور تھے۔ تین سائلنسر والے اور ایک سائلنسر کے بغیر۔ اسٹین گن اور اس کے راؤنڈ اندر منتقل کرتے ہوئے میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں کسی تربیت یافتہ تنظیم کے ہیڈ کوارٹر میں ہوں۔ یہ جگہ ظاہری طور پر بہت زیادہ ویران اور غیر نمایاں تھی کہ ہم کسی مکان کے مقابلے میں خود کو یہاں زیادہ محفوظ سمجھ سکتے تھے۔ آخر میں ہم نے ولادت کے پیکٹ کو منتقل کیا اور اس بات کا خاص خیال رکھا کہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ اسے باندھ کر ڈالنے کے لیے ہم نے پہلے اتارے ہوئے کپڑے پھاڑے۔ اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس کر میں نے محسن سے ایک ہزار روپے لیے اور جیپ میں روانہ ہو گیا۔ ایک میل آگے جا کے میں نے جیپ کو ایک ویران احاطے میں روکا۔ اس کے پچھلے حصے میں پٹرول سے بھرا ہوا جیری کین تھا جو پٹرول کا اضافی ذخیرہ رکھنے کے کام آتا تھا۔ وہ گیلن پٹرول جیپ میں بہا کر میں نے سگریٹ لائٹر سے ایک کاغذ جلایا اور درمیان میں پھینک دیا۔ پٹرول کی آگ بھڑکی تو میں دوسری طرف سے دیوار پھاند گیا۔ جب پٹرول ٹینک کے پھٹنے کا دھماکا سنائی دیا تو میں اس جگہ سے سو گز دور تھا۔ میں پیدل چلتا گیا۔ تقریباً دو میل چلنے کے بعد مجھے خالی تانگہ نظر آیا۔ تانگے والے نے آدھے گھنٹے میں مجھے مزنگ چوک پہنچایا۔ وہاں سے رکشا میں زمیندار ہوٹل تک پہنچنے پر مجھے مزید بیس منٹ صرف ہوئے۔ مجھے غالب کا خیال بھی تھا اور نازو کا بھی لیکن پہلے میں خواجہ نیک محمد عرف استاد ٹیڈی سے مل کر رابعہ کے متعلق معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ خیریت کے ساتھ انکل مضروی کے گھر پہنچ گئی ہے یا نہیں۔ ٹیڈی نے میری ہدایت کے مطابق دو کمرے امیر خان کبیر خان کے نام سے لیے تھے اور میرے انتظار میں تھا۔ وہ اپنے ساتھ تمام اسباب سمیٹ لایا تھا جو ان کے پہلے دو ہوٹلوں میں بکھرا پڑا تھا۔ اس میں ٹیڈی کا وہ بڑا سا آہنی صندوق بھی تھا جس کے راز سے ہم ابھی تک واقف نہ ہو سکے تھے۔ جب میں ہوٹل منیجر سے پوچھ کر اوپر گیا اور دروازہ کھول کے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے ٹیڈی کو وہی صندوق کھولے دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے صندوق کو ایک دم بند کر دیا اور اس کے اوپر بیٹھ گیا۔ اس نے نارمل نظر آنے کی کوشش کی لیکن میری نظروں سے اس کی صورت کا تغیر پوشیدہ نہ رہ سکا۔ وہ ایسے گھبرا گیا تھا جیسے وہ صندوق کا تالا توڑ رہا تھا کہ کسی نے چوری کرتے پکڑ لیا۔
"کیا ہوا استاد؟" میں نے کہا۔ "رنگ کیوں اڑ گیا ہے تمہارا؟ کیا ہے آخر اس صندوق میں؟"
"قسم مولا علی کی سکندر بادشاہ!" وہ زبردستی مسکرایا۔ "تم بھی کمال باتیں کرتے ہو۔ صندوق میں کیا ہو گا بھلا سوائے پھٹے پرانے دو جوڑوں کے۔"
"میں بھی چھوٹے بچے ہو دوست۔ یہ صندوق میں نے بھی اٹھایا تھا۔ اتنا وزن تو دو سو جوڑوں کا بھی نہیں ہو سکتا اور اگر واقعی پھٹے پرانے دو جوڑے ہیں تو پریشانی کی کون سی بات ہے؟" میں نے کہا۔
"پریشان کون اُلو کا پٹھا ہے۔" ٹیڈی نے بیزاری سے کہا۔ "اور اگر پریشانی ہے تو اس کی وجہ تم ہو کہ مجھے یہاں بٹھا دیا اور بھول گئے۔ اب کہاں جاؤں اور کس سے معلوم کروں کہ تمہارا پتا ہے؟"
"چلو ناراضگی چھوڑو۔ میں تم کو ساتھ لے جانے آیا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ہوٹل ہوٹل کب تک بھٹکتے۔ تنگ آگئے۔ اس بار بہت محفوظ انتظام کیا ہے کہ کوئی وہاں نہیں پہنچ سکتا۔ ٹھیک ہے، جو کچھ کیا ہے اس کی تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ رابعہ بی بی؟ تم نے انکل مضروی کے گھر پہنچا دیا؟"
استاد ٹیڈی کا چہرہ بے جان ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش میں لب ہلائے مگر آواز اس کے حلق سے نہ نکلی۔ وہ نظر چرا کے دوسری سمت دیکھنے لگا اور نروس نظر آنے لگا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کے ایک جھٹکا دیا اور اپنا سوال دہرایا۔ ٹیڈی کی خوفزدہ آنکھیں مجھ پر جم گئیں۔ پھر اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔
"اُس نے میری بات [illegible]" ٹیڈی نے مُردہ آواز میں کہا۔
"کیا بات نہیں مانی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
"وہ ایس پی صاحب کے گھر چلی گئی۔" ٹیڈی بولا۔ "میں نے تو بتا دیا تھا کہ سکندر نے مجھے کس لیے بھیجا ہے۔ وہ دوسری باتیں پوچھنے لگی کہ رات کیا ہوا تھا اور سب لوگ اس وقت کہاں ہیں۔ میں نے بتا دیا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کہنے لگی، تم یہ سامان وغیرہ سمیٹو اور جاؤ۔ میں پہلے غالب کا پتا کروں گی اور پھر وہیں پہنچ جاؤں گی۔ غالب کو وکیل کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور محسن یا سکندر میں سے کسی کے لیے کچھ کرنا مشکل بھی ہو گا اور خطرناک بھی۔ میں نے کہا کہ مجھے تو سکندر نے تاکید کی تھی کہ آپ کو بحفاظت مضروی صاحب کے گھر پہنچاؤں۔ تو سکندر بادشاہ معاف کرنا جو اس نے کہا وہی میں دہرا رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ ایسی کی تیسی تمہارے سکندر بادشاہ کی اور تم ان کی تاکید بھی واپس اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ان سے کہنا میری فکر نہ کریں، اپنی فکر کریں۔"
"اچھا۔" میں نے سنجیدہ ہوتے کہا۔ "اس کے بعد تم اپنا بوریا بستر سمیٹ کر یہاں آگئے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ یہاں سے بھی نکلنا تھا مگر رابعہ کے خیر و عافیت لوٹ کر آنے تک میں انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔"
"ابھی تو یہاں آ کے بیٹھے بھی نہیں تھے۔" ٹیڈی نے فریاد کے لہجے میں کہا۔ "اب کہاں جانا ہے؟"
میں نے مختصراً اسے بتایا کہ محسن کہاں ہے اور کس کے ساتھ ہے۔ وہ حیرت زدہ سنتا رہا۔
"مگر تو محسن سے کہہ آیا تھا کہ میں دو گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "اب وہ بھی سوچتا ہے گا۔"
"معلوم نہیں یہ اچھا ہوا کہ برا۔" ٹیڈی نے سر کھجا کر کہا۔ "بے شک یہ لڑکی بھی توپ سے کم نہیں۔ قسم مولا علی کی، ہم نے تو تمہاری زبان سے اس کی باتیں اتنی سنی ہیں کہ وہ شاہ جنات کی بیٹی لگتی ہے۔ اب تو ہمیں بھی شرم آتی ہے عورت کی ذات کو کمزور اور بزدل کہتے ہوئے۔ اور اس کی ہمت کو دیکھ کے وہ سب بھی ہمیں بس اپنی ہی طرح شہدے لگتے ہیں جو خود کو بدمعاش کہتے ہیں... یا کہلواتے ہیں۔"
"سچی بات نکلی ہے تمہارے منہ سے استاد۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اصل طاقت اپنے سے کمزور پر ہاتھ اٹھانے کا نام نہیں۔ طاقت تو اپنے دفاع اور اپنے سے کمزوروں کی حفاظت کی صلاحیت کا نام ہے۔"
"مجھے اس لڑکی سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا مگر اس کا بھائی بالکل اعتبار کے قابل نہیں۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا۔" ٹیڈی نے متفکر ہو کے کہا۔
"نازو نے مجھے بتایا ہے کہ وہ پہلے والا اکرام شیخ نہیں رہا۔ وہ ہمارا ساتھ دینا چاہتا ہے۔"
"ارے چھوڑو سکندر بادشاہ، میرا تو خیال ہے کہ وہ چکر دینا چاہتا ہے اپنی بہن کو بھی اور ہمیں بھی۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "ہم اس پر بھروسا کریں اور پکڑے جائیں۔ یہی اس کا مقصد ہو گا۔"
"نہیں استاد! وہ استعفیٰ بھی دے چکا ہے پولیس کی نوکری سے۔" میں نے کہا۔
"فرض کرو اس نے جھوٹ بولا ہو اپنی بہن سے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "وہ جانتا ہے کہ بہن سے مدد کی امید رکھنا حماقت ہے۔ وہ ایک بار پہلے ہی تم کو بچانے کے لیے اپنی جان دینے کی کوشش کر چکی ہے۔ قسمت اچھی تھی کہ بچ گئی ورنہ شیخ صاحب پر اپنی بہن کے قتل کا الزام آجاتا اور میں تو سمجھتا ہوں وہ ایسا آدمی ہے کہ عدالت میں بھی سر اٹھا کے کہتا... اور اسے کوئی شرمندگی نہ ہوتی کہ اس کی بہن اس کے فرض کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھی۔"
"تمہارا یہ تجزیہ غلط نہیں ہے استاد مگر جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے اس واقعے کا اکرام شیخ کے ذہن پر ایک منفی اثر ہوا۔" میں نے کہا۔ "آدمی فولاد کا عزم رکھتا ہو تو فولادی اعصاب کا مالک نہیں ہوتا۔ نازو اس کی ایک ہی بہن تھی اور بہن بھی ایسی جس پر کوئی بھی فخر کر سکتا ہے۔ فرض شناسی کا دورہ ختم ہوتے ہی جذبات کی یلغار نے ضمیر کے صحیح فیصلے کو بھی باعث شرمندگی بنا دیا ہو گا۔ پھر والدین کی ملامت ہوئی اور ندامت جو نازو کو موت اور زندگی کی کشمکش سے دوچار دیکھ کر محسوس کی ہو گی۔ اس نے کہیں اماں نہ پا کے خود کو فرض کے بار سے سبکدوش کر لیا۔"

www.paksociety.com

"دیکھو یار سکندر بادشاہ، ہم اتنی باریکی میں تو جاتے نہیں۔"
ٹیڈی بولا: "موٹی عقل کے آدمی ہیں۔ فرض کرو کہ نازو کے بچ جانے کے بعد اس کے خیالات پھر تبدیل ہو گئے۔ کسی شخص کی فطرت ایسے نہیں بدلتی کہ وہ واقعی بات فرشتے سے شیطان بن جائے۔ جیسے ہم ہیں۔ آہستہ آہستہ پرانی عادتوں کو چھوڑا... یادوں کو چھوڑا اور اب اتنے عرصے بعد سب کچھ چھوڑ کر تمہارے ساتھ ہو گئے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ پرانی زندگی اب بھی بہت یاد آتی ہے۔"

"اکرام شیخ کی بات کرتے کرتے تم اپنی بات کرنے لگے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے بعد میں اکرام شیخ پرانی ڈگر پہ آ پڑا ہو۔ وہ سمجھنے لگا ہو کہ تمہاری وجہ سے اس کے ہاتھوں اپنی بہن کا خون ہونے والا تھا۔" ٹیڈی بولا۔ "شرمندگی کے بعد اس نے تم کو ساری خرابی کا ذمے دار سمجھنا شروع کر دیا ہو۔ اس کا یہ خیال بھی ہو گا کہ تمہاری وجہ سے اس کی بہن پاگل ہوئی۔ یہ پاگل پن ہی ہے نا اس کے نقطہ نظر سے۔ وہ اسے عشق نہیں سمجھتا ہو گا اور اس کے ذہن میں یہی ہو گا کہ نازو کو اس عشق کی بیماری سے نجات دلانے کی ایک ہی صورت ہے کہ بیماری کے سبب کو ختم کر دیا جائے۔"

"تمہارا مطلب ہے اکرام شیخ مجھے ختم کر سکتا ہے؟" میں نے کہا۔
"ایسا لگتا ہے خواجہ صاحب!"

"ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی بولا۔ "تمہارے ساتھ رہنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ ہم دنیا کی اونچ نیچ کو تھوڑا بہت سمجھنے لگے ہیں۔ تم اپنی چھٹی حس پہ بھروسا کرتے ہو اور محسن بھی ساتویں حس سے کام لیتا ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ یہ بھی ہماری آٹھویں حس ہے..."

"آٹھویں حس!" مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "اچھا خیر، آگے کہو، مگر پہلے کچھ کھانے پینے کو منگوا لو۔"

"بس یہی کچھ ایسا لگتا ہے کہ اکرام شیخ جن کو بھی دھوکا دے رہا ہے۔" ٹیڈی نے تعمیل حکم کے بعد کہا۔ "اس کی مدد سے وہ تم پہ ہاتھ نہیں ڈال سکتا لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارا ساتھ دینے کی بات کرے اور جن اس پہ اعتبار کرتے ہوئے تم کو بھیج دے۔ وہ ہمارا حمایتی بن کے آئے اور ہم سے سب کچھ معلوم کرنے کے بعد ہمیں ایسا گھیرے کہ ہمارے لیے نکلنے کی کوئی صورت نہ رہے۔ یہ پولیس والے ایسے چکر چلاتے رہتے ہیں بعض اوقات۔ نازو کو کیا پتا کہ اس نے سچ مچ استعفا دے دیا ہے یا نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس نے استعفے کی نقل دیکھ لی ہو گی مگر یہ نازو نہیں معلوم کر سکتی کہ یہ استعفا آگے پہنچایا گیا تھا اور منظور بھی ہوا تھا یا نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ نازو پہ اعتبار کیا جا سکتا ہے، اس کے بھائی پر نہیں۔"

"تم نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا ہے دوست۔" میں نے فکرمند ہو کر کہا۔ "میں خوش بھی ہوں کہ تم سوچنے لگے ہو اور بالکل صحیح سمت میں سوچنے لگے ہو۔ پھر بھی میرا ذہن یہ قبول نہیں کرتا کہ اکرام شیخ اس حد تک بے غیرت ہو سکتا ہے کہ ایک بار اپنی بہن کو گولی کا نشانہ بنانے کے باوجود بھی وہ شرمندہ نہ ہوا اور پھر دوبارہ اسے دکھ دے۔"

"شرمندگی کیسی سکندر بادشاہ۔ آدمی غلط کام کر کے شرمندہ ہوتا ہے اور اکرام شیخ تو سمجھتا ہو گا کہ وہ بالکل ٹھیک کر رہا ہے۔" ٹیڈی بولا۔ "اس کے خیال کے مطابق غلطی اگر کر رہی ہے تو نازو، اور نازو کو وہ ایک ناتجربہ کار اور جذباتی لڑکی سمجھتا ہو گا۔ وہ تم سے کھلم کھلا دشمنی کا اظہار کرے تو نازو اس کے مقابلے پر تمہارا ساتھ دے گی اور تمہاری مدد کرتی رہے گی لیکن وہ جن کو قائل کرے کہ اب وہ خود بھی سکندر کے ساتھ ہے تو مدد کرنے والی نازو اس کی چال میں آ جائے گی اور کسی نہ کسی طرح خود ہی تم کو اس سے ملوا دے گی۔ وہ بہت بے وقوف لڑکی ہے سکندر بادشاہ!"

"کیوں، اس نے ایسی کون سی حماقت کی ہے؟"

"برا مت ماننا، یہ بے وقوفی نہیں اس کی تو اور کیا ہے؟" ٹیڈی بولا۔ "کیا اسے معلوم نہیں کہ تم کبھی اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتے۔ پھر کیا ضرورت ہے اسے تم سے پیار کرنے کی۔ آدمی غلطی سے تو دیوار سے ٹکرا جاتا ہے مگر وہ تو جانتے بوجھتے دیوار سے سر ٹکرا رہی ہے۔ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ اس سے دیوار کا کچھ نہیں بگڑے گا، دیوار پر کوئی اثر نہیں ہو گا لیکن جو شخص عقل کے بجائے جذبات کا غلام ہوا اور اس حد تک کہ اپنا برا بھلا بھی نہ سوچ سکتا ہو، وہ میری رائے میں بے وقوف ہے۔"

دلائل کے مطابق ٹیڈی کی بات بالکل درست تھی لیکن جو عشق نازو نے کیا تھا وہ عقل کی دسترس سے بہت بالاتر تھا اور اس میں دل والوں کے لیے سب سے بڑی سند دی جاتی تھی جس نے قیس بن عامری کو مجنوں کہلوایا۔ فرہاد کو تیشہ سنگ دیا کہ پتھر کے پہاڑ دل سے جوئے شیر لائے اور پھر اپنے وجود سے جوئے خون بہا کے اس میں شامل کر دے۔

"استاد ٹیڈی، کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی سوچ سمجھ کے عشق کرے؟" میں نے کہا۔

"پتا نہیں۔" ٹیڈی نے گردن ہلا کے کہا۔ "جب ہو گا تو پتا

چلے گا۔"
"ہاں۔ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ جب ہو گا تو پتا چلے گا۔ ابھی تم اس کو بے وقوف کہہ سکتے ہو۔ ایک تم ہی کیا، سارا زمانہ کہے گا کہ وہ بے وقوف ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس سے نازو کو ذرا بھی فرق نہیں پڑے گا۔"

"اس کے بھائی کا خیال بالکل الٹ ہو گا سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے میری دلیل کو مسترد کر دیا۔ "وہ سمجھتا ہو گا کہ ساری خرابی سکندر بخت کی وجہ سے ہے۔ سکندر بخت نہیں رہے گا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ نازو بھی کچھ دن روئے دھوئے گی، باپ بھائی سے بات نہیں کرے گی۔ کھانا پینا چھوڑ دے گی اور مرنا چاہے گی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہر زخم بھر جاتا ہے۔ لوگ ان سب کو بھول جاتے ہیں جن کے بغیر وہ سمجھتے ہیں کہ زندہ رہنا ہی ناممکن ہو گا۔ میں نے ان والدین کو دیکھا ہے جن کے جوان بیٹوں کو موت نے اچانک جدا کر دیا۔ ان بیویوں کو دیکھا ہے جن کے سہرے کے پھول مرجھانے بھی نہیں تھے کہ ان کے سہاگ اجڑ گئے۔ میں نے ان کا غم بھی دیکھا ہے جسے دیکھ کر کلیجہ پھٹتا تھا مگر بعد میں یہ بھی دیکھا ہے کہ جو ان کی قبروں سے لپٹ کر روتے تھے، وہ سال گزرنے سے پہلے جمعرات کے جمعرات قبر کے سرہانے چراغ جلانا بھی بھول گئے اور دنیا کے کاموں میں ایسے الجھے کہ انھیں برسی بھی یاد نہ رہی۔"

میں حیرانی سے ٹیڈی کو دیکھتا رہا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا لیکن عقل سلیم سے بے بہرہ نہیں تھا اور ذہانت تو ایک شرارہ تھی جسے اس سے پہلے کہ وہ اس ذہانت کے غلط استعمال میں بہت آگے بڑھ جاتا، قدرت نے اسے ہم سے ملوا دیا اور اس کی زندگی کی منزل بدل گئی۔ اپنی توبہ شاید وہ اس نے مجھے پہلے بھی بتایا تھا لیکن اس وقت تو میں قائل ہو گیا کہ وہ کسی طرح بھی ہم سے کم نہیں۔ میرے اور محسن کے پاس ڈگری تھی جو اس کے پاس نہیں تھی۔ باقی سب کچھ وہی تھا جس سے آدمی کے لیے انسان ہونے کی شرط پوری ہوتی ہے۔ عقل و شعور، ذہانت اور شرافت، خلوص اور محبت اور درد دل۔ دشمنوں کے احترام کی صلاحیت اور نیکی پر یقین۔ بھٹکنے کی طاقت۔

دروازے پر اسی وقت دستک ہوئی تو میں چونکا لیکن وہ ویٹر تھا جو چائے لے کر آیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں تو دوسرے ہوٹل میں ہوں۔ میں نے اپنے بدلے ہوئے روپ پہ ناز بھی کیا تھا کہ بے خوف و خطر فائل ڈھونڈنے چلا آیا تھا۔ مجھے ان امکانات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تھا کہ اس ہوٹل تک کوئی بھی شکاری ٹیڈی کا یا رابعہ کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچ سکتا تھا۔ ظاہری صورت تک تبدیلی صرف ٹیڈی کی شکل میں ہوئی تھی یا رابعہ رہی تھی۔ اور خدانخواستہ کوئی اسے پہچان لیتا تو اس کے پیچھے پیچھے ہر جگہ جا سکتا تھا۔ ایک تشویش ناک بات یہ بھی تھی کہ میرے اس بدلے ہوئے حلیے کو چوہدری دلاور کے کم سے کم تین آدمی دیکھ چکے تھے۔ ان میں سے ایک مر گیا تھا۔ دوسرا ہماری تحویل میں تھا لیکن تیسرا پولیس کی تحویل میں چلا گیا تھا اور یہ بھی فرض کیا جا سکتا تھا کہ اسے دلاور یا شیخ جی نے چھڑا لیا ہو گا تو اب تک وہ ہماری محنت پہ پانی پھیر چکا ہو گا اور بتا چکا ہو گا کہ سکندر بخت کا چہرہ اب کیسے پہچانا جائے گا۔ بے شک محسن کا ڈبل چہرہ میری حفاظت کے لیے تھا مگر پھر بھی افشائے راز کے بعد یہ حفاظتی انتظام سو فیصد موثر اور قابل اطمینان نہیں رہا تھا۔ اس میں پچاس فیصد بے یقینی کے خدشات بھی شامل ہو جاتے تھے۔

دوسری بار کسی نے دروازے پہ دستک دی تو پہلے گھنگھروؤں کی جھنکار سنی تھی اور اس فتنہ ساز کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن ہم آہنگ ہو گئی تو میں نے جان لیا کہ آنے والا کون ہو سکتا ہے۔ ٹیڈی نے دروازہ کھولا اور میں نے مرزا غالب کے ساتھ رابعہ کو اندر آتے دیکھا۔

"لو بھئی، اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔" غالب نے اپنی فطری شگفتگی اور مسخرے پن کے ساتھ کہا۔ "اور پہچان سکو تو دل کی آنکھ سے پہچانو۔"

رابعہ کے لیے دونوں جب کہ اجنبی تھے مگر وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ پھر اس پہ ہنسی کا دورہ پڑا۔ میرے کشیدہ قد کے کرتے، چارخانے کی لنگی اور لنڈا وزی چپل کے ساتھ مہندی رنگ کے گھنگھر والے بالوں کو اور اسی رنگ کی گھنی بھری داڑھی کو دیکھ کر شاید رابعہ کو میرا اصل روپ یاد آیا جو اس حلیے کے برعکس تھا۔ کہاں وہ روایت پسند کی ماڈرن عادت کہ میں سوٹ کے ساتھ وہ ٹائی بھی نہیں باندھتا تھا جو پسند نہ کرتی ہو اور لباس کے معاملے میں اپنے جمالیاتی ذوق کو بہت اہمیت دیتا تھا اور کہاں یہ دیہاتی وضع قطع۔ لباس سب قابل احترام ہوتے ہیں مگر یہ لباس میری شخصیت سے متصادم تھا۔

"ایمان سے بالکل وہی لگ رہے ہو۔" رابعہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ہاں ہاں۔ کہہ دو کارٹون۔" میں نے دانت نکال کے کہا۔
ٹیڈی مجھ سے زیادہ شرمسار کھڑا جھینپ رہا تھا۔

"کارٹون تو خیر نہیں۔ جب میں چھوٹی سی تھی نا تو ایک شادی میں گئی تھی۔" رابعہ نے اپنی ہنسی پہ قابو پا کے کہا۔ "وہاں

www.paksociety.com

ایک تماشا دیکھا تھا۔ ایسے ہی دو آدمی آگئے تھے اور انھوں نے حاضرین کے سامنے ایک ایکٹ کا مزاحیہ خاکہ پیش کیا تھا۔ ان میں سے ایک باپ تھا اور دُوسرا بیٹا۔ دونوں کے ہاتھ میں جُوتے کے تلے کی شکل کے بڑے بڑے چمڑے کے ٹکڑے تھے۔ ان میں سے ایک سوال کرتا تھا اور دوسرا کوئی نہایت ہی نامعقول قسم کا جواب دیتا تھا اور وہ چمڑے کو یوں ایک دوسرے کے رسید کرتے تھے کہ آواز تو بڑی زوردار آتی تھی لیکن چوٹ بالکل نہیں لگتی تھی۔ ان صوتی اثرات کے ساتھ انھوں نے مار مار کے ایک دوسرے کا بُرا حال کر دیا لیکن اس سے زیادہ بُرا حال انھوں نے حاضرین و سامعین کا کیا۔ ایک تو انھوں نے باری باری سب کو رگیدا۔ سب کا تمسخر اُڑایا اور جس پہ نظر انھیں۔ چھوڑ دیا اُسے تو بخش دیا مگر کنجوسی کرنے والے کے تو خاندان کی بھی ایسی تیسی کر دی۔ مذاق میں کہ کوئی بُرا مان ہی نہ سکے۔ ہنس ہنس کے لوگ الگ بے حال ہوئے اور ان کے ذومعنی جملے اور چٹکلے . . . .

"میں جانتا ہوں آپ کو خاتون۔ وہ بھانڈ کہلاتے ہیں" مَیں نے کہا۔ "یا میراثی۔ کہو تو تماشا بھی دکھا دیں؟"

"ابھی نہیں، جب تمھارا وہ چوہدری دار ہوگا تب ہوگا تماشا تو" وہ بولی۔ "ایک ایک جوتا دونوں ہاتھ میں رکھنا۔"

"پروا نہیں استاد" میں نے مُجرئی سے مخاطب ہو کے کہا۔ "یہ فیض لوگوں کو چلنے دو۔ ہیرا تو ہمیشہ ہیرا ہی رہتا ہے۔"

"خواہ وہ کھوا نظر آئے" مرزا غالب نے فرمایا۔ "میرے پیارے کوہِ نور، میرا تم دونوں ہیرو نہیں زیرو ہو جاتے اگر گزشتہ شب میں نے تمھاری سب بلائیں اپنے سر نہ لی ہوتیں۔"

"ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے" میں نے کہا۔

"مرگِ ناگہانی سے بھی نہ جانے کس کی دعا نے بچا لیا" مرزا غالب نے کہا۔ "ورنہ ایک گولی کافی ہوتی۔"

"مجھے ایک تو تمھاری طرف سے تشویش تھی" میں نے کہا۔ "مزید پریشانی خاتون نے پیدا کر دی تھی۔"

"رابعہ نے تو بہت جلد میری گلو خلاصی کرا دی" غالب بولا۔ "وہاں سب اس فکر میں تھے کہ مجھے کسی نہ کسی طرح اس چکر میں ملوث کر لیں۔ میں اپنی بات پر اڑا رہا اور انھیں دھمکی بھی دے دی کہ صبح تک اخبار کا مالک اور مدیر زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ حالانکہ ان کو خاک خبر نہیں تھی کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ وہ آدھی رات کے بعد اخبار پریس کے

پہنچ کر گھر جا چکے تھے۔ انھیں معلوم ہوتا بھی تو شاید رابعہ کے آتے ہی پولیس والوں کو پریشانی ہونے لگی تھی۔ اس سے پہلے ایک انسپکٹر بڑی خباثت دکھا رہا تھا کہ اب وہ رپورٹر قتل نہیں کر سکتے۔ وہ بضد تھا کہ میں چوکیدار کے قتل کا اعتراف تو کر ہی لوں۔ رابعہ نے وہ ڈانٹ ڈپٹ کی کہ معافی مانگنے پر اُتر آیا۔ پہلے تو کہا کہ تم نے میرے ایڈیٹر کی مستعدی دیکھی۔ اور کچھ دیر ہو جاتی تو تم پہ حبسِ بیجا کا مقدمہ ہو جاتا۔ نوکری چلی جاتی تمھاری۔"

"چلو ابھی تو خدا نے سب کی عزت و آبرو رکھی" میں نے کہا۔ "تم نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ورنہ سازش کامیاب ہو جاتی۔ مگر یار یہ سب باتیں کرنے کے لیے وقت چاہیے اور میں نے منیجر سے کہا تھا کہ دو گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔"

"کہاں واپس آجاؤ گے؟" رابعہ نے حیرانی سے کہا۔ "ہوٹل سے تو سامان اُٹھا لیا تھا۔"

"وہ بھی کوئی ہوٹل تھا" میں نے کہا۔ "ہم اب دوسرے فائیو اسٹار بلکہ سکس اسٹار ہوٹل میں ہیں۔ خواجہ نیک محمد اور غالب اور رابعہ باہر نکلے۔ یک قدم سامان اٹھاؤ اور . . . ."

"یہ کیا مصیبت ہے" بیگم نے خفگی سے کہا۔ "ابھی دو گھنٹے پہلے دو کمرے لیے تھے۔ امیر خان، دلیر خان کے نام سے۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے اُسے تسلی دی۔ "کہہ دینا کہ اب وہ نہیں آسکتے۔ دونوں غریب خان فقیر خان ہو گئے ہیں۔ ویسے اس میں کوئی بات خلافِ قانون نہیں۔ کوئی ایک دن کے لیے کمرہ لے اور ایک گھنٹے کے بعد چلا جائے۔ ادائیگی تو چوبیس گھنٹے کی کر دو گے۔"

میں رابعہ اور غالب ہوٹل کے اس حصے سے گزرے جو لاؤنج سمجھا جا سکتا تھا۔ تو منیجر اور چند دوسرے لوگوں نے ہم تینوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ دلچسپی کا سب سے بڑا سبب رابعہ کا حُسن تھا۔ پھر میری ہیئت کذائی تھی۔ غالب صورت سے احمق لگتا تھا تو رابعہ کی شخصیت میں دلکشی کے ساتھ ایسا وقار تھا جو سب سے جُدا تھا اور دیکھنے والوں کو ہمارے درمیان کوئی قدرِ مشترک نظر نہ آتی تھی۔ بیگم کے دوبارہ نمودار ہونے تک ہم کچھ فاصلے پر انتظار کرتے رہے اور اس مہلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے انھیں وہ سب واقعات سنا دیے جن سے وہ بے خبر تھے۔ میں نے یہ بھی بتا دیا کہ بیگم نے نازو کے بھائی الیاس آفریدی کی حیثیت پر کس قسم کے شبہات کا اظہار کیا ہے۔ غالب نے اس کے خیال کی تائید کی۔

"ان حالات میں اندھے اعتماد سے بہت نقصان ہو سکتا ہے" غالب بولا۔

"اس کے علاوہ وہ ہمارا ساتھ دینے سے نازو کے لیے مشکلات پیدا ہوں گی" رابعہ بولی۔ "وہ ہم سے الگ رہ کے ہماری زیادہ مدد کر سکتی ہے۔"

"ابھی تو معلوم کرنا پڑے گا کہ اس نے لیڈی ہیں صورتِ حال کیسے نمٹائی" غالب نے کہا۔ "تم ایسا کرو کہ مجھے اپنے سکس اسٹار ہوٹل کا جغرافیہ پوری طرح سمجھا دو۔ میں ایک گھنٹے کے بعد پہنچ جاؤں گا۔"

"اور اس ایک گھنٹے میں تم کیا کچھ کرو گے؟"

"ایک تو اپنے ایڈیٹر کو بتاؤں گا کہ رات کیا کچھ ہوا تھا۔"

"کیا مطلب۔ اُنھیں کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے" میں نے کہا۔

"یار میں اپنے بارے میں بتاؤں گا۔ تمھارا حوالہ تک نہیں ہوگا" غالب نے بُرا مان کے کہا۔ "مانا کہ صورت سے میں چغد نظر آتا ہوں لیکن اتنا عقل سے پیدل نہیں ہوں۔ اس کو یہی بتاؤں گا کہ مجھے ٹیلی فون پر کسی نے اطلاع دی تھی کہ چوہدری دلاور کی کوٹھی میں قتل ہو گیا ہے اور میں تصدیق کے لیے گیا تھا تو پھنس گیا تھا۔ ایڈیٹر کو معلوم تو ہونا چاہیے نا۔ وہ کہے گا کہ تم کو کتنا عرصہ ہو گیا رپورٹنگ کرتے ہوئے۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ ہر گمنام فون پر دوڑ جانا کوئی عقل کی بات نہیں۔ اکثر لوگ شرارت کرتے ہیں یا کسی کو جانا ہی تھا تو پتا کر جاتے۔ پھر مجھے یہ پتا چلانا ہے کہ چوہدری دلاور کے گھر سے اُٹھائی جانے والی الف دلہن کی اور اس چوکیدار کی لاشوں کے سلسلے میں پولیس نے کیا رپورٹ لکھی ہے اور آخری بات یہ کہ مجھے اس شخص کے بارے میں معلوم کرنا ہے جسے تم نازو کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے تھے۔"

"اگر وہ فوٹو گرافر چھوٹنے کے بعد خود زندہ بچا ہوگا تو اسے پولیس نے پکڑا ہوگا" میں نے کہا۔ "تم اس کے بارے میں یہ ضرور معلوم کرنا کہ اپنے بیان میں اس نے کیا کہا ہے۔ میرے متعلق کچھ بتایا ہے یا نہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ بیان سے پہلے اُسے وہی لوگ لے گئے ہوں گے جنھوں نے اُسے بھیجا تھا" رابعہ بولی۔

غالب نے تائید میں سر ہلایا۔ "اور اُس نے وفات پانے سے پہلے تمھارا نقشہ اپنے الفاظ سے کھینچ دیا ہوگا۔ خیر۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

"مرزا جی" میں نے کہا۔ "تمھارا یار موٹا بھائی تو کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا؟"

غالب ہنسا۔ "اس میں اتنی ہمت نہیں۔ اپنی جان کا دشمن کوئی نہیں ہوتا۔"

"تم نے اس سے کچھ قرض وصول کرنے کی بات کی تھی اور اس نے بعد میں کہا تھا کہ حساب برابر ہو گیا" میں نے کہا۔

"ہاں یار وہ" اس کا قصّہ بھی بہت پُرانا تھا" غالب نے سوچ کر کہا۔ "اس نے موقع سے فائدہ اُٹھا لیا۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی تھا جو بہت اچھا فوٹوگرافر تھا لیکن اس نے اپنے پیشے سے غلط فائدہ اُٹھایا۔ اس کا چھوٹا سا اسٹوڈیو تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے بہت بڑھ گیا۔ جیسا کہ میں نے سُنا تھا، وہ کچھ بلیک میلنگ کرتا تھا۔" غالب نے تذبذب کے ساتھ رابعہ کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ کھل کر بات کرتے ہوئے جھجک رہا ہو۔

"مرزا جی! یہ خاتون بڑی نامور وکیل ہیں۔ بلکہ رہی ہیں" میں نے کہا۔ "ہر طرح کے مقدمات میں ان کی شہرت تھی اور ڈاکٹر کے علاوہ صرف وکیل کا پیشہ ایسا ہے جس میں کوئی بھی حقائق کو چھپاتا نہیں۔"

"وہ کچھ لڑکیوں کا چکر تھا" غالب نے قدرے مطمئن ہو کر کہا۔ "اس نے لڑکیوں کو اور اُن کے والدین تک کو بلیک میل کیا۔ پھر کچھ غلط قسم کے لوگوں نے اس کی خدمات حاصل کرنا شروع کر دیں جو خود بلیک میلر تھے۔ ظاہر ہے اُسے بہت پیسہ ملا لیکن اس کے بعد کرنا خدا کا ایسا ہُوا کہ ایک لڑکی نے اُسے چکر میں ڈال دیا۔ ہم نے تو پہلے ہی فرما دیا تھا کہ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ اس کو ایسا عشق ہُوا کہ سب بھول گیا۔ [illegible] اس نے نامہ و پیام دیے اور بات خاصی اُمید افزا حد تک آگے بڑھ گئی تھی کہ لڑکی کے بھائی نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ خود اسی فوٹوگرافر کے ہاتھوں بلیک میل ہو کے بہت نقصان اُٹھا چکا تھا۔ وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ ایسا بدقماش آدمی اس کی بہن کا رشتہ ڈالے۔ اس نے اگر یہ سمجھا تھا کہ اب بہن بلیک میل ہوگی، تو غلط نہیں سمجھا تھا۔ جب فوٹوگرافر نے موٹے بھائی کے ذریعے شادی کا باقاعدہ پیغام دیا تو لڑکی کا بھائی سخت مشتعل ہُوا۔ اس نے موٹے بھائی کو بے عزت کر کے نکال دیا اور لڑکی پر سختی کی۔ لڑکی اڑیل تھی۔ باپ کے اور بھائی کے سامنے اڑ گئی کہ شادی کہیں اور نہیں کروں گی اور اگر زبردستی کی گئی تو گھر سے بھاگ کر عدالت میں شادی کر لوں گی۔ بھائی سخت پریشان ہُوا کہ اب بہن کو کیسے سمجھائے۔ لیکن صورتِ حال ہی کچھ ایسی بن گئی کہ پیش بندی کے طور پر کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ مزید تفتیش کرنے پر پتا چلا کہ موٹے بھائی بھی کم نہیں اور اپنے فوٹوگرافر بھائی کی طرح بدنام ہیں۔ اس نے بہن کو بتایا کہ وہ فوٹوگرافر خود بھی بدنام ہے اور اس کا بڑا بھائی بھی۔ ایک بلیک میلر ہے اور دُوسرا

www.paksociety.com

مجرموں کا معاون۔ بہن نے سن کر یقین کیا یا نہیں کیا غضب یہ کیا کہ ایک دن اپنے بھائی کو اپنے عاشق کے سامنے کھڑا کر دیا اور بتا دیا کہ تم پر کیا الزامات ہیں۔ پھر معلوم نہیں بات کتنی بڑھی اور کس نے کس سے کیا کہا۔ انجام یہ ہوا کہ لڑائی ہو گئی۔ لڑکی کے بھائی نے فوٹو گرافر پر حملہ کیا اور اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ لڑکی وہیں بے ہوش پڑی رہ گئی اور فوٹو گرافر وہاں سے بھاگ گیا۔ موٹے بھائی اُسے رات کے وقت میرے گھر لے کر پہنچا کہ پولیس اس کے پیچھے ہے۔ اسے رات بھر کے لیے چھپا لو۔ میں نے پوچھا بھی کہ آخر اس پر الزام کیا ہے مگر موٹے بھائی نے کہا کہ الزام قتل کا ہے لیکن جھوٹا ہے۔ اگر تم اس کے حق میں گواہ بن جاؤ تو یہ بچ جائے گا۔ موٹے بھائی کی حالت دیکھ کر مجھے ترس آ گیا۔ میں نے کہا کہ اچھا تم جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ پولیس اس کو تلاش کرتی ہوئی تمہارے پیچھے پہنچے۔ آدھی رات کے بعد یہی ہوا۔ مجھے خدا نے بچا لیا۔ نہ جانے کیوں مجھے اندیشہ تھا کہ اس چکر میں خود میں بھی پھنس جاؤں گا۔ میں موٹے بھائی کے بھائی کے ساتھ نکل گیا۔ اُسے ایک ہوٹل میں چھوڑا اور خود اپنے آفس چلا گیا۔

پولیس نے لڑکی کے بیان پر موٹے بھائی کو پکڑ لیا اور اس کے بھائی کا پتا پوچھا۔ پہلے تو موٹے بھائی نے انجان بننے کی کوشش کی اور لاعلمی کا اظہار کیا مگر ہماری پولیس کسی کی زبان پر اعتبار کرنے والی نہیں ہے۔ وہ موٹے بھائی کو تھانے لے گئے اور تھوڑا سا سمجھایا تو موٹے بھائی نے بک دیا کہ قاتل کہاں چھپا ہوا ہے۔ پولیس دو بجے رات کو میرے فلیٹ پر پہنچی تو میں غائب تھا لیکن انھوں نے اجازت کا رسمی تکلف نہیں کیا اور قانونی اجازت کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے تالا توڑ دیا۔ وہاں ان کو ناکامی ہوئی تو وہ اخبار کے دفتر پہنچے۔ ایک تو میں پہلے ہی سے وہاں اپنے دفاعی انتظامات مکمل کر چکا تھا۔ پھر پولیس خود ایک غیر قانونی کام کر چکی تھی۔ ان کو بعد میں پتا چلا تھا کہ مفرور کسی اخبار والے کا ہے۔ اُلٹا میں نے انھیں پکڑ لیا کہ ابھی خبر لگاتا ہوں اور آئی جی سے بات کرتا ہوں۔ وہ بڑی مشکل سے گلو خلاصی کرا کے بھاگے اور میں نے موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا کہ چلو میں تم کو معاف کرتا ہوں اور تمھاری نوکری تمھیں بخشتا ہوں۔ تم میرے دوست موٹے بھائی کو بخش دو اور گھر جانے دو۔ میری مدد سے موٹے بھائی صبح تک گھر پہنچ گیا۔ پھر اُس نے میری خدمت میں حاضر ہو کے کہا کہ آئندہ عمر بھر کے لیے وہ میرا غلام ہے کیونکہ میں نے اس کے بھائی کی جان بچائی۔ اس نے تھوڑی سی مدد اور چاہی۔ اپنے بھائی کے لیے اس نے دو پاسپورٹ بنوائے۔ ایک اصل صورت کی تصویر کے ساتھ۔ دوسرا میک اپ سے جعلی بنوائی تصویر والا۔ اس کا بھائی بدلی ہوئی صورت لے کر باہر نکل گیا۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے کہ میں نے اور موٹے بھائی نے پاسپورٹ پر تصویر کس طرح لگوائی۔ باہر جانے کے بعد اس نے میک اپ اُتار دیا اور میک اپ کی تصویر والا پاسپورٹ بھی ضائع کر دیا۔ اب وہ اصلی نام اور پاسپورٹ کے ساتھ باہر آیا ہے ....

میں .... یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے جرم کی نوعیت بھی مجھے معلوم ہو چکی تھی۔ میری مدد اور خاموشی کے بغیر موٹے بھائی کا بھائی محفوظ نہیں تھا۔ اس کے خلاف چشم دید گواہ بھی موجود ہے اور وہ ایک مفرور مجرم ہے۔ قتل کے کسی بھی مقدمے کی مدت ختم نہیں ہوتی۔ بلا ارادہ اور کچھ اپنی حماقت کی بنا پر میں بھی شریک جرم ہو گیا تھا۔ موٹے بھائی نے اس لیے میری مدد سے کبھی انکار نہیں کیا اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے بھی صرف انتہائی ضرورت پڑنے پر اس سے رجوع کیا۔ اسے بلیک میل کرنے کی نیت سے نہیں۔ جبھی میں نے اس کی مدد کی تھی تو کیا اس کا فرض نہیں تھا کہ میری مدد کرتا۔ اس حیثیت سے تم کو یہ جان لینا چاہیے کہ اب حساب برابر ہے۔ میں بھی نہیں بول سکتا اور اس کے بولنے کا تو سوال ہی نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے تم دونوں کی تصویر میک اپ میں اُتار لی ہو مگر کوئی بات نہیں۔“ غالب چپ ہو گیا کیونکہ خوجی بھٹی خواجہ میک محمد عرف استاد ٹیڈی بکمال برہمی کے عالم میں تشریف لا رہے تھے۔ باقی اسباب تو ایک قلی نامزد سے اُٹھوا رکھا تھا لیکن ان کا وہ موجودہ دور کے آثارِ قدیمہ کا نمونہ صندوق خود ان کے پاس تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کا بوجھ اُٹھا کے چلنا ان کے لیے بہت ہی مشکل ثابت ہو رہا تھا۔

”آج کچھ بھی ہو جائے، میں اس صندوق کو ضرور کھول کر دیکھوں گا“ غالب نے کہا۔

”ہاں یار۔ آخر اس صندوق میں اتنا عزیز کیوں ہے جسے کباڑی لوہے کے بھاؤ بھی نہ خریدے“ میں نے کہا۔ ”اور ... اس زنگ خوردہ صندوق میں آخر ہے کیا۔ اتنا بھاری تو صرف سونا ہی ہو سکتا ہے۔“

”سونا“ غالب جھنجلایا۔ ”میں سیر سے زائد سونا ہوتا اس کے پاس تو یہ ہمارے ساتھ ہوتا؟“

”کیا بات ہے۔ کیوں جل رہے ہو تم لوگ“ ٹیڈی نے ڈپٹتے ہوئے کہا اور پھر قلی سے مخاطب ہوا۔ ”رکھو بے سامان اِدھر ہی فٹ پاتھ پہ اور دیکھ یہ تو ابے اپنے یار۔ تو کیوں دانت نکال رہا ہے“ اس نے پرانی عادت کے مطابق فحش گالی بک دی۔

جس کا اُسے قطعی احساس نہیں ہوا۔ ”سامنے دانت نکال کے ہاتھ پہ رکھ دوں گا“

”کیوں اتنے غصّے میں ہو خواجہ صاحب؟“ میں نے کہا۔ قلی سخت بدحواسی میں فرار ہوا۔

”بھاڑ میں گئے خوجی صاحب اور خواجہ صاحب۔“ ٹیڈی نے صندوق کو نیچے رکھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”قسم مولا علی کی اپنا پرانا خون کبھی کبھی جوش میں آ جاتا ہے۔ ابھی ایک جیرا بچ گیا ورنہ انتڑیاں ڈھیر کر دیتا۔ پہلے مجھ پر فقرہ کسا اور میں پی گیا۔ پھر صندوق کے بارے میں ایک بات کی۔ میں پھر بھی خاموش رہا۔ سالا آخر میں کہنے لگا کہ امیر خان کبیر خان اتنی جلدی غریب خان فقیر خان ہو گئے۔ میں نے کہا۔ الو کے پٹھے میں تجھے، تیرے ہوٹل کو، اس کے مالک کو اور تیرے سارے خاندان کو خرید کے کوڑیوں کے مول بیچ سکتا ہوں۔ دو دوسرے درمیان میں پڑ گئے مگر وہ بھی سب بکواس کر رہے تھے۔ سب تم لوگوں کی وجہ سے ہوا۔ ایک تو میری صورت ایسی بنا دی ہے کہ اماں بھی خواب میں دیکھیں گی تو ڈر جائیں گی۔“

ہم سب بے ساختہ ہنسنے لگے۔ ٹیڈی نے ہم سب کو ہنستے دیکھا اور پھر خود بھی ہنس پڑا۔ ایک بار پھر ٹیکسی حاصل کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا۔ غالب نے پہلے ہی الگ جانے اور بعد میں پہنچنے کو کہہ دیا تھا۔ میں نے اُسے سگریٹ کا ایک پیکٹ پھاڑ کر اس جگہ کا نقشہ بنا دیا جہاں محسن تمام اسلحہ اور جنگی قیدی لیے ہماری آمد کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس نے یقین کامل کے ساتھ کہا کہ وہ ہمارے سکس اسٹار ہوٹل کو تلاش کرے گا۔ جانے سے پہلے اس نے ہمارے لیے ٹیکسی کے حصول کا مسئلہ حل کیا کیونکہ شرافت اور درخواست پر کوئی ٹیکسی والا ایسے ویران علاقے میں جانے کو تیار نہ تھا جہاں سے اس کو واپسی کی سواریاں ملنے کی اُمید نہ ہو۔ غالب نے ایک کانسٹیبل کو اپنا پریس کارڈ دکھا کر ڈرایا اور کانسٹیبل نے تقریباً ٹیکسی کے سامنے خودکشی کی نیت سے کود کر ایک ڈرائیور کو بیگار میں پکڑا۔ ”خبردار جو حساب سے پیسے لیے“ کانسٹیبل نے غرا کے کہا۔

”پھر تو آپ بھی بیٹھ جاؤ صاب“ ٹیکسی ڈرائیور نے طنز سے کہا۔ ”مفت کی سواری ہے“

”نہیں بھئی۔ ہم مفت کے نہیں ہیں“ غالب نے کہا اور چل پڑا۔ باقی سامان رکھنے سے پہلے ڈرائیور نے غلطی سے ٹیڈی کا صندوق اٹھانا چاہا جو اس کی توقع سے کہیں زیادہ بھاری تھا۔ چاہا تھا جھٹکے سے چھوٹا تو پیر پہ گرا۔ جلے بھنے ڈرائیور نے صندوق کو اور اس کو ... رکھنے والے کو گالی دینے پر اکتفا کی۔ وہ اس کے مالک کے بارے میں کچھ ارشاد کرتا تو پچھتاتا۔ ٹیڈی نے اُسے ڈانٹا کہ جب دم نہیں ہے تو نازک چیز کو ہاتھ کیوں لگاتے ہو اور صندوق خود اُٹھا کے ڈکی میں رکھ دیا۔ ڈرائیور نے دم نہ ہونے والی بات کا اتنا بُرا نہیں مانا جتنا اس بے ہودہ صندوق کو نازک چیز کہنے پر حیران ہوا۔ اس نے کہا کہ ابھی تو اس نازک چیز نے پیر ہی توڑا ہے کہیں آگے جا کے گاڑی کا ایکسل ہی نہ توڑ دے۔ ہم سب اس قسم کی گفتگو سے محظوظ ہوتے تھے۔ اس سے زیادہ لطف ہمیں اس وقت آیا جب منزلِ مقصود پہ پہنچ کر میں نے اُسے سو کا نوٹ دیا اور اس سے باقی رقم اپنے پاس رکھنے کو کہا۔

”ہم کسی پر ظلم نہیں کرتے“ میں نے فیاضی سے سرپرستانہ لہجے میں کہا۔

”لیکن ضروری ہے کہ تم لوگ بھی ظلم کرنا چھوڑ دو۔ ٹیکسی میں سب ضرورت مند لوگ ہی بیٹھتے ہیں“ ٹیڈی نے اُسے مشورہ دیا۔

جب ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے اشارے سے وہ جگہ بتائی جو ابھی وہاں سے سو گز دور تھی۔ ”یہ ہے وہ سکس اسٹار ہوٹل جہاں قیدی کے ساتھ جیلر بھی بند ہے“ میں نے کہا۔

”سکندر بادشاہ اتنی دور کیوں روک لیا ٹیکسی کو“ ٹیڈی نے اپنے بھاری بھرکم صندوق کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تو کیا عین دروازے کے آگے روکتے۔ جہاں سے بالکل میرا ہم شکل دوسرا نکل آتا“ میں نے کہا۔ ”ٹیکسی والا یاد رکھتا۔ تم چھوڑو یہ صندوق میں اٹھا لیتا ہوں“

”نہیں نہیں۔ یہ بات نہیں“ ٹیڈی جلدی سے بولا۔ ”اسے تو میں اُٹھاؤں گا۔ بس ذرا میرے سر پر رکھوا دو“

جب میں نے صندوق اُٹھوانے کے لیے ہاتھ لگایا تو ایک بار پھر مجھے اس کے غیر معمولی وزن کا احساس ہوا اور میں نے رابعہ کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اس عزم کا اعادہ کیا کہ آج اس صندوق کے راز سے آگاہی حاصل کر کے ہی دم لیں گے۔

دروازے پہ پہنچتے پہنچتے ٹیڈی کی حالت غیر ہو گئی لیکن اس نے صندوق کو گرنے نہیں دیا۔ میں اس کے پیچھے چل رہا تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ ... صندوق کے گرد وہی ایک رسّی لپٹی ہوئی ہے جو ہم نے ٹیڈی کے گھر سے فرار ہوتے وقت صندوق کو بند رکھنے کے لیے باندھی تھی۔ یہ رسّی بھی اب ڈھیلی ہو چکی تھی اور اگر صندوق گر جاتا تو کھل جاتی یا ٹوٹ جاتی۔ اس رسّی کے علاوہ مجھے صندوق کو بند رکھنے والی ایک پرانی کنڈی بھی نظر آئی مگر صندوق

www.paksociety.com

گرتا تو یہ کنڈی یقیناً الگ ہو جاتی۔ مجھے تو صندوق کے بارے میں بھی شبہ تھا کہ اتنے وزن کے ساتھ گرا تو اس صندوق کا کیا بنے گا۔ مجھے اچانک شرارت سوجھی اور میں نے پیچھے سے ٹانگ آگے بڑھا کے ٹیڈی کی ٹانگ میں اڑا دی۔ وہ پہلے ہی لڑکھڑا رہا تھا چنانچہ منہ کے بل گرا۔ صندوق اس کے سر سے کافی فاصلے پہ آگے گرا۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں خود ٹھوکر کھا کے سنبھل نہیں سکا تھا۔ رابعہ نے میری شرارت دیکھی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ مگر مسٹر ٹیڈی نے یہی سمجھا کہ ہم دونوں کا تصادم ایک حادثہ تھا۔

"معاف کرنا یار۔" میں نے خود اُٹھنے کے بعد ٹیڈی کو اُٹھایا۔ "چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں۔" وہ لنگڑاتا ہوا اُٹھا اور کپڑے جھاڑنے لگا۔ ٹین کا صندوق اس شیڈ نما عمارت کی دیوار سے ٹکرایا تھا جو ہم نے اور محسن نے کچھ دیر پہلے کرائے پر لی تھی۔ آواز پر محسن نے دروازہ کھولا۔

"آ گئی بارات؟" محسن بولا۔ "بڑی دھوم دھام اور دھماکے کے ساتھ آئی ہے۔"

"اور کتنی پابندیٔ وقت سے۔" میں نے اُسے چڑانے کے لیے کہا۔ "میں دو گھنٹے کا کہہ کر چار گھنٹے میں لوٹا تھا۔"

"آپ اکیلے تشریف نہیں لا سکتے تھے؟" اُس نے رابعہ کو دیکھ کر کہا۔ "یہاں خواتین کا داخلہ ممنوع ہے۔"

"میں کہاں محسن بھائی! میں اکیلی ہوں۔" رابعہ نے اندر جاتے ہوئے کہا اور ہنسی۔ "ان کے علاوہ میں خود ہی ساتھ آ گئی۔"

"ہاں، سکندر تو جب لائے گا تب لائے گا۔ ابھی تو مان نہ مان میں تیری مہمان اور بلائے جان۔" محسن بولا اور رابعہ نے اُسے گھور کر دیکھا مگر وہ باہر نکل آیا تھا اور سامان اُٹھانے میں مدد کر رہا تھا۔ ایک سُوٹ کیس رابعہ کا تھا، ایک محسن کا اور ایک میرا۔ آخر میں ہم نے مل کر ٹین کے صندوق کو دونوں طرف سے اُٹھایا کیونکہ اس میں کبھی کوئی ہینڈل تھا تو بہت پہلے داغِ مفارقت دے چکا تھا۔

"اسے مروا دیا۔ اس مصیبت نے ابھی تک ساتھ نہیں چھوڑا ہمارا؟" محسن اندر پہنچ کے ہانپتے ہوئے بولا۔

"میاں شیروانی۔ اس میں خالص سونا ہے۔ تقریباً ایک من تو ہو گا۔" میں نے کہا تو محسن نے ایک دم ہی صندوق کو چھوڑ دیا۔

"لعنت اس سونے پر جس سے ٹوٹیں ہاتھ۔" محسن نے محاورے میں مناسب تبدیلی کر کے کہا۔

"لعنت تجھ پر۔" میں نے کہا۔ "ابھی محاورے کا ہی نہیں ہیر کا بھی بیڑا غرق ہو جاتا۔"

"یہ کوئی میری بیوی کی سسرال نہیں ہے۔" محسن نے بگڑ کر کہا۔ "یہیں میرے باپ کا گھر نہیں ہے کہ چلے آ رہے ہیں۔" اور پھر دروازہ بند کر دیا۔ ٹیڈی جلدی سے اپنے صندوق پر بیٹھ گیا۔

"یہ ایم ایل اے کون ہے؟" رابعہ نے جگہ کا معائنہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"میاں بیوی بچوں سمیت۔" محسن نے کہا۔ "کون آ رہا ہے یہاں؟ سوچنا چاہیے کہ آس پاس رہنے والے اعتراض کرتے ہیں۔ آخر ہم بھی ہیں کہ خوشی کے ساتھ خدا کی گھڑیاں رہتے ہیں۔"

"کون سی گھڑیاں؟ رسٹ واچ، ٹیبل کلاک یا پنڈولم کلاک؟" رابعہ نے شرارت سے کہا۔ پھر اس کی نظر ٹیڈی پر پڑی، جو اس وسیع و عریض ہال نما بیرک کے ایک نیم تاریک گوشے میں سیدھا بیٹھا تھا۔

"یہاں لائٹ نہیں ہے؟" میں نے کہا۔ دروازہ بند کرنے سے اندر بہت کم روشنی رہ گئی تھی۔

"لائٹ تو ہے لیکن اندر صرف ایک ہی فیوز بلب لگا ہوا ہے۔" محسن بولا۔ "ٹیڈی سے کھانا بھی منگوا لے اور بلب بھی۔"

"اس کو کب ہوش آیا؟" میں نے آہستہ سے پوچھا اور ٹیڈی کو سو کا ایک نوٹ دے دیا۔

"دو گھنٹے ہو گئے۔" محسن بولا۔ "میں بہت پریشان تھا۔ اس نے کوئی غلط حرکت کی تو کیا کروں گا۔"

"میں سمجھ گیا تھا کہ گولی مار دیتا۔" میں نے کہا۔ "کوئی ایسی حرکت تو نہیں ہوئی نا؟"

"نہیں۔ لیکن ہو سکتی تھی اور ہم اسے یہاں قتل کرنے کے لیے تو نہیں لائے تھے۔" محسن نے کہا۔

"اس سے کچھ پوچھا؟" میں نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ٹیڈی جا چکا تھا اور رابعہ ایک میز پر چڑھی بیٹھی تھی۔

"پوچھا تھا۔ سالا کچھ بتانے پر آمادہ نہیں اور جو کچھ بتایا ہے وہ سب بکواس ہے۔" محسن نے کہا اور ہم دونوں اس کے سر پر جا کھڑے ہوئے۔ وہ چالیس پینتالیس سال سے زیادہ کا آدمی تھا مگر جسم کی ساخت کے باعث کچھ نوجوان نظر آتا تھا۔ ایک وجہ اس کے گھنے بال بھی تھے جن کا رنگ قدرتی سیاہ تھا یا ہیر کلر کے استعمال سے سیاہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور منہ میں اس وقت بھی کپڑا ٹھنسا ہوا تھا لیکن وہ پریشان نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی مکار آنکھیں جیسے اندھیرے میں چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اُس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے اپنی بے بسی کے باوجود وہ ہماری بے بسی کا تمسخر اڑا رہا ہے۔ میں نے اُس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔

"یہ تو تم اچھی طرح سمجھتے ہو گے کہ یہاں تمہارا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں آ سکتا۔" میں نے کہا۔ "اور آ جائے تو لوٹ کر جا نہیں سکتا۔ تم کو ہماری طاقت کا تھوڑا بہت اندازہ ضرور ہوا ہو گا۔ وہ ایک لڑکی تھی جس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ قیامت ہے۔ جن جوانمردوں مسلح تھے اور اسٹین گن لے کر آئے تھے اس کمزور سی لڑکی کا مقابلہ نہیں کر سکے تھے جو خالی ہاتھ تھی۔ ہمارا مقابلہ تو تمہارے چوہدری صاحب کی پوری فوج بھی نہیں کر سکتی۔"

رابعہ اُسی وقت اسٹین گن لے کر یوں ہمارے ساتھ آ کر کھڑی ہو گئی جیسے پی ایل او جیسی تنظیم کی کوئی مجاہدہ ہو حالانکہ وہ اس قتل عام میں کام آنے والے اسلحے کے طریقِ استعمال سے بھی ناواقف تھی پھر بھی اس نے اپنا پوز بالکل درست رکھا اور یوں مستعد کھڑی رہی جیسے ہمارے اشارے پر قیدی کے جسم کو چھلنی کر دے گی۔

"اس کی ضرورت نہیں رابعہ۔" میں نے کہا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میں نے رابعہ کا نام لینے کی غلطی کی ہے مگر رابعہ نے فوراً میری غلطی کی پردہ پوشی کی۔

"یہ ہر روز نام بدلنے سے کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔" وہ بولی۔ "جب تک ضرورت نہ پڑے. . . ."

دلاور کے پی اے کی ہنسی نے رابعہ کو خاموش کر دیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہی ہو۔" وہ بولا۔

"پھر تو تم سب کے بارے میں صحیح معلومات رکھتے ہو گے؟" میں نے متاثر ہو کے کہا۔

"ہاں، تم ہو ایک سکندر بخت ہے اور دوسرا اس کا دوست محسن خان شیروانی۔" وہ بولا۔

"کیا اتنا بول کے تم بے وقوفی نہیں کر رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تمہیں جانے دیں۔ تم تو ہمارے بارے میں ساری خفیہ معلومات کو نشر کر دو گے۔ سب کو بتا دو گے کہ ہم کہاں رہتے ہیں اور. . . ."

"لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہاں سے میرے زندہ سلامت نکلنے کا امکان ایک فیصد بھی نہیں۔" وہ بولا۔

"یہ تو ٹھیک ہے کہ فوری طور پر تمہاری رہائی ممکن نہیں۔" تاہم یہ کہ ہم تمہیں قتل نہ کریں؟"

"اس کا انحصار تمہارے رویّے پر ہے۔" محسن نے کہا۔ "اگر تم تعاون کرو۔"

وہ پھر ہنسنے لگا۔ "پولیس والا رویّہ اختیار مت کرو۔ میں تم سے کس طرح تعاون کر سکتا ہوں جبکہ میں تمہارا دشمن ہوں اور اگر میں یہ بے وقوفی کروں گا تو کیا وہ مجھے معاف کر دیں گے جو تمہارے دشمن ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب میرے لیے زندگی کی امید رکھنا محض خود فریبی ہے۔ خواہ میں تم کو کچھ بھی نہ بتاؤں۔ چوہدری صاحب تو مجھ پر یقین نہیں کریں گے۔ وہ بالکل یہی سمجھیں گے کہ میں اپنی جان بچانے کی خاطر ان سے جھوٹ بول رہا ہوں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک ایسا شخص جو دشمن کی قید میں ہو، وہ کچھ بتائے بغیر نکل آئے خصوصاً تم جیسے ہوشیار دشمنوں کا قیدی سب کچھ بتائے بغیر نجات کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ ہماری جاہل پولیس اپنے دقیانوسی طریقوں سے سب کچھ اگلوا لیتی ہے، تم ان کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور چالاک ہو۔"

"اس خراجِ تحسین کا شکریہ۔" میں نے کہا۔ "تم چوہدری دلاور کے پی اے تھے اور وقاص کے گھر کے بھیدی بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ پھر تم بے وقوف کیسے ہو سکتے ہو۔ مگر اب تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک ہم تم سے ایک ایک بات معلوم نہیں کر لیں گے اور اس کی تصدیق نہیں کر لیں گے، نہ تم کو مرنے دیں گے اور نہ ہی جینے دیں گے۔ تم یقیناً مرنا چاہو گے مگر یاد رکھو کہ تمہارے لیے یہ بھی آسان نہیں ہو گا۔"

وہ پھر ہنسا۔ اس کی ہنسی میں عجیب سی آسیب زدہ ویرانی تھی۔ وہ ہنس نہیں رہا تھا، غالباً تقدیر کو رو رہا تھا جس نے اس کے اعتماد کو بُری طرح شکست دی تھی۔ "کیا آسان ہے اور کیا مشکل، یہ سب فضول باتیں ہیں۔"

"تم اتنے مایوس کیوں ہو؟" میں نے کہا۔ "تم زندہ رہنے کی کوشش تو کر سکتے ہو۔"

"کوشش کسی اُمید پر کی جاتی ہے۔" وہ بولا۔ "میں کس سے اُمید رکھوں؟"

"ہمارے اور کس سے۔ اتنی بڑی دُنیا میں تم ایک گوشہ تلاش نہیں کر سکتے جہاں تم چھپ کر رہ سکو۔ تم ہمیں دیکھ رہے ہو۔ ہم کس طرح ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ وہ ابھی تک ہم پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔" میں نے کہا۔

"ہاتھ تو ڈالا تھا تم پر لیکن تم اکیلے تھے۔ جان کی بازی لگا کے نکل گئے۔" وہ بولا۔ "میں بھی اکیلا ہوتا تو مجھے کیا بُرا تھا مرنا لیکن میرے ساتھ میرے بیوی بچے بھی ہیں۔ ان سب کے ساتھ زندگی

www.paksociety.com

کہیں گم ہو سکتا ہوں اور نہ ہی میں تمام عمر چھپتے ہوئے گزار سکتا ہوں۔"

"پھر تم کیا کرو گے؟ فرض کرو کہ ہم تمہیں ابھی چھوڑ دیں۔" میں نے کہا۔ "تم سے کوئی سوال جواب کیے بغیر۔"

"میں باہر نکلتے ہی خودکشی کر لوں گا۔" وہ بولا۔ "صرف یہی ایک صورت ہے میرے بیوی بچوں کے بچنے کی۔ چوہدری والاور کو یقین آ جائے گا کہ میں وفاداری کے امتحان میں ناکام نہیں رہا۔ میں نے جان دے کر ان سے کیے ہوئے عہد کو نبھایا۔ یہ عہد ان سب کو کرنا پڑتا ہے جو چوہدری والاور کے اتنے قریب ہوں کہ ان کا اعتماد حاصل کر لیں۔ انھیں ثابت بھی کرنا پڑتا ہے کہ وقت آنے پر انھوں نے اپنے سینے کے دفن رازوں کو اپنے ساتھ دفن کرنا قبول کیا۔ پھر اس کو نہ صرف اس کے لواحقین کو جاں نثاری کا صلہ ضرور ملتا ہے ورنہ وہ غدار کہلاتے ہیں اور ان کی سزا میں بیوی بچے بھی شریک ہوتے ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تمہارے لیے یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کے ذمے دار تم خود ہو۔ تم نے چوہدری والاور کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرنے سے پہلے دونوں امکانات کو ذہن میں رکھا ہو گا۔ اب تک تقدیر نے تمہارا ساتھ دیا اور تم چوہدری والاور کا ساتھ دیتے رہے۔ اندازوں کی غلطی کہو اسے یا مکافاتِ عمل۔ نوشتۂ تقدیر سمجھو یا اپنی شامتِ اعمال کہ تم نے پوری قوت کے ساتھ ایک بہت چھوٹے سے بچے کو مسمار کرنا چاہا مگر تمہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے اور تمہارے بیوی بچوں کا بھی خدا نگہبان ہے لیکن تمہاری جگہ میں ہوتا تو مرنے سے پہلے یہ موقع غنیمت جانتا۔ میں کوشش کرتا کہ اپنے بارِ گناہ کو جس حد تک کم کر سکوں کر لوں۔ یہ تم بھی کر سکتے ہو۔ تم نے اب تک والاور کے انعام و اکرام اور دُنیاوی نعمتوں کو ترجیح دی لیکن وقت نے آج تمہیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ جہاں سے تم اپنی دُنیاوی زندگی کے اعمال کو بھی دیکھ سکتے ہو اور یہ بھی اندازہ کر سکتے ہو کہ تمہاری عاقبت کیا ہو گی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ والاور جو کچھ کر رہا ہے اور کرتا رہا ہے وہ خلافِ قانون تھا، گناہِ کبیرہ سے کم ہرگز نہ تھا اور اس کی معاشرے میں کچھ بھی حیثیت ہو حقیقت یہ ہے کہ وہ معاشرے کا بھی مجرم ہے اور ملک کا بھی۔ تم اس کے ساتھ تھے چنانچہ شریکِ جرم کی حیثیت سے تمہاری پوزیشن بھی مختلف نہیں۔ والاور کبھی نہ کبھی دُنیا کے قانون کی گرفت میں ضرور آئے گا اور ہماری کوشش بھی یہی ہے کہ اسے وہ سزا ضرور ملے جس کا وہ دُنیا میں مستحق ہے۔ اس نے کتنے لوگوں کی زندگی کو اپنی ناجائز خواہشات پر قربان کیا، کتنے گھر اُجاڑے، کتنے بچوں کو یتیم کیا اور کتنی عورتوں کو بیوہ کیا۔

مالِ حرام سے کیا گناہ کیے۔ یہ سب تم جانتے ہو لیکن اب قدرت نے تمہیں دُنیا کی ذلت و رسوائی اور زمین کے قانون کی طرف سے ملنے والی سزا سے خود بچانے کا موقع فراہم کیا ہے۔ یا یوں کہو تم مجبور ہو گئے ہو۔ اگر میں کہوں کہ اس وقت تم صحیح معنوں میں ایک قدم اُٹھا سکتے ہو۔ وہ کر سکتے ہو جو تم کو کرنا چاہیے تھا لیکن تم نے نہیں کیا تھا؟"

"اب بھی میں کیا کر سکتا ہوں؟" وہ ایک دم ہنسا۔ "تم چاہتے ہو آخر؟"

"تم کو یقیناً معلوم ہو گا کہ چوہدری والاور کیا کرتا ہے؟"

"ہاں۔ وہ ناجائز اسلحہ فروخت کرتا ہے۔ اسمگل بھی کراتا ہے۔" وہ بےنیازی سے بولا۔ "بناتا بھی ہے۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمارا اندازہ غلط نہیں تھا۔ "اسلحہ وہ آخر کہاں سے منگواتا ہے؟"

"دُنیا میں جہاں سے بھی سستا ملے۔"

"اور کسے فروخت کرتا ہے؟" محسن خان شیروانی نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے کہ زیادہ سے زیادہ قیمت دینے والے کو۔ آج کل مشرقی پاکستان بھیج رہا ہے۔"

اس سنسنی خیز انکشاف نے مجھے اور محسن کو ذرا سی دیر کے لیے مفلوج کر دیا۔ قیاس آرائی تو ہم نے بھی کی تھی مگر اب شک و شبہ کی کوئی بات نہ رہی تھی۔ والاور صرف ہمارا ہی نہیں اس سرزمین کا بھی دُشمن تھا۔ وہ غدار تھا جسے موت کے بعد اگر زمین میں گاڑا جاتا تو بھی اس مٹی کی رسوائی ہوتی ہے۔ یہ مادرِ وطن کی آبرو کو نیلام کرنے والا فرزند تھا جس کو دُنیاوی مال و دولت کی ہوس نے بےضمیر کر دیا تھا۔ میں بھول گیا کہ وہ میرے باپ کا قاتل تھا اور اس نے مجھے میرے حق سے محروم کر رکھا تھا۔ وہ تو اس ملک کی خاطر قربانی دینے والے لاکھوں افراد کی عزتوں کا اور اُمنگوں کا قاتل تھا۔ وہ شہیدوں کے اس خون کا سوداگر تھا جو اس ملک کو حاصل کرنے والوں نے راہِ طلب میں بہایا۔ ان لاکھوں جگر فگار انسانوں کے رشتوں کی آبرو کا تاجر تھا جن کے پیارے منزلِ مُراد تک پہنچنے سے قبل ہی جان دے کر سرخرو ہوئے۔ میرا ایک گھر بادالیہ کا ایک گھر گیا تھا۔ ایسے ہزاروں گھر جس مقصد کے لیے جل کر خاک ہوئے تھے وہ اسی کو بیچ رہا تھا۔ اسی شاخ کو کاٹ رہا تھا جس پہ کاروانِ آزادی کے ساتھ مسافت کی ناقابلِ بیان صعوبت اُٹھا کے بسیرا کیا تھا۔ فکرِ آشیاں بندی کر رہے تھے۔ انہی بُنیادوں کا سودا کر رہا تھا

جن پر ایک اللہ اور ایک رسول ﷺ کے نام لیوا اپنے لیے ایک جنتِ ارضی بنانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ اشتعال کی ایک لہر نے مجھے مغلوب کر لیا اور میں نے والاور کے پی اے کو پے در پے لاتیں اور ٹھوکریں ماریں۔

"او، تم ضمیر فروش شیطان۔ تم یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کے ناپاک ہاتھوں سے کاغذ کے نوٹوں کی گڈیاں لیتے رہے۔ اس غدارِ وطن کے وفادار رہنے پر فخر کرتے رہے۔ اس زمین سے اُگا ہوا اناج کھاتے رہے اور اسی کو دشمنوں کے ہاتھ بیچتے رہے۔ اب امان کس سے چاہتے ہو؟ کیوں اُمید رکھتے ہو کہ تمہارے مالِ حرام سے پلنے والے بچوں کو یہ زمین پناہ دے گی؟" میں نے وحشت میں اُس کو قتل کر دیا ہوتا مگر محسن نے مجھے روک لیا۔

"ہوش میں آؤ سکندر۔" محسن نے کہا۔ "یہ اکیلا نہیں۔ والاور کے علاوہ اور بھی ہیں۔ ہم صرف اسے مار کے سب کو ختم نہیں کر سکتے۔ یہ ایک چھوٹا سا سنپولیا ہے۔ نہ جانے کتنے سانپ اور اژدھے ابھی باقی ہیں؟"

"میں پاگل ہوں۔ تم پاگل ہو۔ ہم سب پاگل ہیں۔" والاور کے پی اے نے اچانک دیوانگی میں ہنسنا شروع کیا۔ اس کے لبوں سے لہو بہہ رہا تھا اور وہ کراہ رہا تھا مگر وہ خاک و خون میں غلطاں ہوش کی منزل سے گزر رہا تھا۔ "وہ اژدھے تم سب کو نگل جائیں گے۔"

"کون ہیں وہ وطن دشمن؟ وہی تخریب کار اور دہشت گرد جو مشرقی حصے میں علیحدگی پسندوں کی حمایت کر رہے ہیں؟" میں نے جھک کر کہا۔ "یہ اسلحہ انہی کو جاتا ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ان کو بھی اور دُوسروں کو بھی...."

"دوسرے کون؟" محسن نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا۔

"سرحد پار۔" وہ بولا اور بے ہوش ہو کے ڈھیر ہو گیا۔

"سرحد پار سے بھی یہ اسلحہ آگے وہیں جاتا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "وہ سب ایک ہیں۔ علیحدگی پسند۔ ان کی حمایت کرنے والے۔ جو اندر رہ کر ان کی مدد کر رہے ہیں اور جو باہر سے امداد دے رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔" محسن نے کہا اور اسے سیدھا کر دیا۔ "سرحد پار کون ہیں؟"

"وہ بھی دشمن ہیں۔" وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا اور ہانپنے لگا۔ "سرحد پار جو پھیلاتے ہیں۔"

"اور سرحد کے اس پار یہ اسلحہ لے جانے والے کون ہیں؟" محسن نے صبر و ضبط کے ساتھ جرح جاری رکھی۔

"میرے جیسے بدبخت، جن کے لیے دُنیا و عاقبت میں رسوائی ہے۔" وہ بولا۔ میری بات نے اس پر اثر کیا تھا یا خود اس نے اپنے آپ کو موت کی سرحد پہ پا کے اپنی تمام عمر کی غلطی کو محسوس کر لیا تھا مگر زندگی کے یہ چند لمحات اس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے بالکل ناکافی تھے۔ یوں بھی وہ توبہ قبول نہیں ہوتی جو دمِ آخر کی جائے۔ مجھے اس پر ترس آیا۔

"تم ان کے نام پتے جانتے ہو؟" محسن نے کہا۔

"نہیں۔ ان کے نام نہیں ہوتے۔" وہ شدید کرب کے باوجود ہنسا۔

"کیوں۔ آخر ڈی سلوا ایک نام تھا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے میر شرافت علی ایک نام تھا۔"

"تم کسی نواب خسرو جمشید کو جانتے ہو؟" محسن نے کہا اور گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ نواب تو نہیں ہے۔"

"ہاں نواب تو نہیں ہے لیکن وہ والاور کے کاروبار میں شریک ہے۔" میں نے کہا۔ "کہاں ملے گا وہ؟"

"کہیں نہیں۔ اس کا کوئی.... ٹھکانہ نہیں۔ بس آتا جاتا رہتا ہے۔"

"اور اس کے کاروبار میں کون شریک ہے؟" محسن بولا۔

"ایک.... ایک ڈی ایس پی.... سراج۔" وہ بولا۔ "یہاں سے اسلحہ بارڈر کے پار بھجوانے کا وہی ذمے دار ہے۔" وہ بڑی مشکل سے ایک ایک لفظ ادا کر رہا تھا۔ سراج کے نام نے مجھے بچھو کی طرح ڈنک مارا۔ اس کے نام سے میری زندگی کے اولین تلخ ترین تجربات کی یاد وابستہ تھی۔ دیارِ غیر سے ارضِ وطن پر قدم رکھنے کے بعد مجھے ذہنی اور جسمانی اذیت کا شکار کرنے والا ایک درندہ صفت، بےاعتبار اور بےضمیر شکاری جس نے بےخبری میں مجھ پر وار کیا تھا اور وہ سمجھا تھا کہ وہ اپنی ایذارسانی سے جسم کے ساتھ میرے عزم کو بھی شکست دے سکے گا۔ میں ایک قانون پرست جمہوری ملک کے مہذب معاشرے سے لوٹنے والا مہذب آدمی تھا۔ ایک دولت مند کا ناز و نعم میں پلا ہوا بیٹا تھا جو گھر سے ولایت تک حصولِ علم کی نیت سے گیا تھا اور جوانی کی راتیں اُمنگوں کے دن بڑی بےفکری سے گزارتا تھا۔ گھر لوٹتے ہی مجھے زنداں کی عقوبت سے پالا پڑا اور میرے ساتھ وہ غیر انسانی سلوک ہوا کہ میں آدمیت بھول گیا۔ اس نے مجھے ایک کم ہمت اور بےسہارا، ناتجربہ کار اور ناپختہ ذہن کا مالک اور کھلنڈرا لڑکا سمجھا تھا۔ ایک قانون کے محافظ کہلانے والے افسر نے میرے جسم پر اتنی مشقِ ستم کی تھی کہ اس کی یاد اتنا عرصہ

www.paksociety.com

گزر جانے کے بعد بھی میرے لیے ایک لرزہ خیز خواب کی طرح تھی۔

"گامے شاہ بھی ان کا ساتھی ہے؟" محسن نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "باقی سب ایجنٹ ہیں، ملازم ہیں اور کارندے ہیں۔"

"کراچی کا سیٹھ کریم بھائی بھی، کسٹم کا پیارے علی بھی؟" میں نے وہ نام گنوا دیے جو مجھے یاد تھے۔

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں صرف گامے شاہ ہی کو جانتا ہوں۔"

"گامے شاہ کے علاوہ کسی کو آتے جاتے دیکھا تھا؟ یاد کرو اور بتاؤ کسی کا فون نمبر یاد ہے؟"

اُس نے پھر نفی میں سر ہلایا: "سب دلاور کے پاس ہوتا ہے۔ اس کی نوٹ بک میں۔"

"تم بکتے ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔" میرا غصہ پھر بھڑک اٹھا۔ "جب تم اس کے اتنے قریب تھے تو تم کو بہت کچھ معلوم ہوگا۔ سارے نام، سارے پتے، ٹیلی فون نمبر۔" میں نے اسے پھر پسلیوں پر ٹھوکر ماری اور ہر ٹھوکر کے ساتھ وہ بلبلا کے لڑھکتا گیا۔ "سب بتانے پڑیں گے۔ ابھی۔" میں نے اُسے اُٹھایا اور دیوار پر دے مارا۔ محسن نے پھر مجھے روکا۔ میرا خون کھول رہا تھا اور میری کنپٹی میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ رابعہ نے میری آستین پکڑ لی۔

"ایسے تو تم اس کو جان سے مار ڈالو گے۔" رابعہ نے کہا اور مجھے دُور کھینچنے لگی۔

"یہ زندہ رہنے کا مستحق بھی کہاں ہے۔ میرے بس میں ہو تو اس کو دن بار ماروں۔ ہر بار زیادہ عذاب کے ساتھ۔"

"سب بے کار ہے سکندر۔" محسن نے اچانک جھک کر کہا۔ "یہ ہر عذاب کی حد سے گزر چکا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے رابعہ کے ہاتھ سے آستین چھڑائی اور محسن کے پاس گیا۔ "کیا یہ مر گیا ہے؟"

"ہاں۔ لیکن تمہاری مار سے نہیں۔ یہ بہت پہلے ہی مرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔" محسن بولا۔

میں نے دیکھی تو مجھے اس کی پتلیاں ٹھہری ہوئی نظر آئیں۔ قریب سے مجھے کڑوے باداموں کی بُو کا احساس ہُوا۔

"سائنائیڈ؟" میں نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ رابعہ دہشت زدہ اور سہمی ہوئی سی میرے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔

محسن نے اقرار میں سر ہلایا: "اسی لیے تو یہ اپنا فیصلہ بتا چکا تھا کہ یہاں سے نکلے گا تو خودکشی کر لے گا۔ موت اس کی دسترس میں تھی۔ غالباً اسی لیے اسے موت کا خوف نہیں رہا تھا۔"

"لیکن زہر اس کی جیب میں تو نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں نے تلاشی لی تھی۔" محسن بولا۔ "لیکن ایسے لوگ جن کے لیے زندگی کا ہر لمحہ پل صراط کا سفر ہو، خود کو موت سے بڑھ کر شدید تر عذاب کے لیے تیار رکھتے ہیں اور جب ضرورت محسوس کرتے ہیں تو دشمن کی قید سے یوں نکل جاتے ہیں کہ پہرہ بٹھانے والے اور حصار قائم کرنے والے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ہم بھی اسے روک نہیں سکتے تھے۔"

"چلو اچھا ہُوا، مرتے مرتے کچھ نیک کام کر گیا۔" میں نے کہا اور رابعہ کے کندھے پر تھپکی دی جو خوف سے کانپ رہی تھی۔ ٹیڈی نے کچھ دیر پہلے اندر آکے بلب لگا دیا تھا، دروازے کے بلب سے بھی اس بیرک میں واجبی سی روشنی ہو رہی تھی۔ جو کھانا ٹیڈی لایا تھا، وہ ایک بنچ پر پڑا ٹھنڈا ہو رہا تھا لیکن اب کسی کو کھانے کی خواہش نہ تھی۔

"میں نے تو اُسے کوئی زہر کھاتے نہیں دیکھا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"زہر اس کے کسی دانت میں محفوظ تھا۔" محسن نے کہا۔ "یہ لوگ مصنوعی دانت میں سائنائیڈ بھر کے لگوا لیتے ہیں۔ جب ضرورت پڑتی ہے تو دانتوں سے دبا کے اس کی سیل توڑ دیتے ہیں۔"

"کیا عام زندگی میں خطرہ نہیں ہوتا کہ کھانا چباتے میں سیل ٹوٹ جائے؟" رابعہ متحیر ہو کے بولی۔

"نہیں، سیل اتنی کمزور بھی نہیں ہوتی۔" میں نے کہا۔ "اور یہ لوگ خیال بھی رکھتے ہیں کہ اس طرف سے کوئی سخت چیز نہ چبائی جائے۔ ابھی اس نے فرش پر سے کوئی کنکر، پتھر دانتوں میں رکھ کے دبا لیا ہوگا۔ پوٹاشیم سائنائیڈ جیسے زہر سے چند سیکنڈ میں جسم سے روح کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔"

"چند سیکنڈ میں؟" ٹیڈی نے جھرجھری لے کر کہا۔ "کوبرا سانپ کے زہر کا سا تھا؟"

"تیرا کیا خیال ہے محسن کہ جتنا اُسے معلوم تھا وہ سب بتا گیا؟" میں نے کہا۔

"نہ بتانا ہوتا تو کچھ نہ بتاتا۔" محسن بولا۔ "اتنا بھی نہ بتاتا۔"

"اس کی بات سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصل کاروبار کو چلانے والے اور مالک تین ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک وہ نقلی نواب خسرو جمشید، دوسرا وہ خبیث سراج جو قانون کا محافظ ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"کیوں یقین نہیں آتا؟ ضمیر فروش کس محکمے میں نہیں ملتے؟" محسن بولا۔ "اب تو مجھے کوئی شک نہ

کی جوان کہیں گئی۔ ان کو اس وطن دشمن کاروبار کی خبر مل گئی ہوگی۔"

"ہاں۔ اور مجھے شک ہے کہ میر شرافت علی بھی اسی میں مارا گیا۔" میں نے کہا۔ "جب اسے علم ہُوا ہوگا کہ وزیر خان کے ساتھ انکار کرنے پر کیا ہُوا تو مجبوراً وہ دلاور سے مل گیا ہوگا۔ اس ڈر سے کہ کہیں اس کا حشر بھی وہی نہ ہو جو وزیر خان کا ہُوا لیکن وہ موقع کی تلاش میں رہا کہ مجھے مطلع کر سکے۔ منشی فوبا چوکو اسی نے نامزد بنایا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ میرے والد کا پرانا شناسا تھا اور کوئی بہت پارسا آدمی تو نہیں تھا مگر والد نے اُسے کاروبار میں شریک کیا تھا۔ وہ کسی بھی غلط آدمی کے ساتھ کبھی شراکت نہ کرتے۔ دلاور بعد میں گُھسا اور وزیر خان کو نکال باہر کیا۔ میر شرافت علی کے بارے میں اُس کو جیسے ہی خبر ملی کہ وہ اندر ہی اندر مخالفت رکھتا ہے تو اُس نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ شرافت علی کو پیڈرو کے ہاتھوں مروا دیا اور مجھے پاکستان بُلا کر قتل کے الزام میں ملوث کر دیا۔ آج میں سوچتا ہوں کہ میں نے اچھا کیا جو اپنے ہاتھوں سے شرافت علی کو نہیں مارا۔ وہ وقت مجھے یاد آتا ہے جب وہ مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا اور میرے سامنے گڑگڑا کر ہاتھ جوڑ رہا تھا کہ وہ بے قصور ہے۔ وہ واقعی بے قصور تھا لیکن میرے سر پر خون سوار دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ مجھے اس پر ترس آ گیا تھا۔ اگر میرا دل گواہی دیتا کہ میرے باپ کا قاتل وہی ہے تو مجھے کبھی اس پر ترس نہ آتا۔"

"یہ سراج کا نام تو بہت عرصے کے بعد سامنے آیا ہے۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ لیکن اس کی وجہ ہو گی۔" میں نے کہا۔ "اس زمانے میں وہ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ پھر اسے جان بوجھ کے پیچھے ہٹا لیا گیا۔ تاکہ زیادہ بدنامی سے اس کو نقصان نہ ہو۔ اس کی پوزیشن سے دلاور اینڈ کمپنی کو بہت فائدہ حاصل ہوتا ہوگا۔ ایک تو پولیس والا اور وہ بھی افسر۔ اعلیٰ افسران کی نظر میں آجاتا تو کسی دُور دراز کے علاقے میں تعینات کر دیا جاتا۔ یہاں وہ دلاور سے اشتراک کر کے جتنا فائدہ حاصل کر رہا ہے اتنا تو ساری عمر بھی حاصل نہ کر پاتا۔"

"دیکھنا پڑے گا کہ اس کی پوسٹنگ کہاں ہے؟" محسن بولا۔

"اس نے اپنی پوسٹنگ خود کسی ایسی جگہ کرا رکھی ہوگی جہاں کوئی بھی جانا پسند نہیں کرتا ہوگا۔ کسی غیر منافع بخش جگہ پر اپنی خوشی سے جانے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا اور عموماً وہ افسر جو معتوب ہوں یا ان کے پیچھے کسی زبردست آدمی کا ہاتھ نہ ہو وہ ایسے ناپسندیدہ مقامات پر پھینک دیے جاتے ہیں یا ہیڈ کوارٹر میں انتظامی نوعیت کے افسر بنا دیے جاتے ہیں۔ سکیورٹی کی ڈیوٹی کے لیے نامزد ہو جاتے ہیں یا افسر بکار خاص بن کے جھک مارتے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" محسن سے پہلے ٹیڈی نے کہا۔ "ہم نے تو تھانے فروخت ہوتے دیکھے ہیں۔ جس علاقے میں غریب اور لاوارث لوگ رہتے ہوں یا جہاں جرائم کے اڈے زیادہ ہوں وہاں پوسٹنگ کرانے کے لیے ایس ایچ او کو پچاس ہزار سے ایک لاکھ روپے نقد تک اُوپر والوں کو دینے پڑتے ہیں اور ہر ماہ کے نذرانے کا معاملہ الگ ہوتا ہے۔ بالکل کھلی بولی لگتی ہے سکندر بادشاہ۔ جو زیادہ دینے کا حوصلہ اور ارادہ رکھتا ہے وہی کامیاب رہتا ہے۔ وہ اپنے لیے دو حصے رکھتا ہے تو ایک حصہ ان کے لیے جو اس کو موقع فراہم کرتے ہیں کہ جیسے چاہے قسمت آزمائے۔ نیچے والے بھی زیادہ آمدنی کے تھانے میں جانے کی خاطر یا اُوپر سے سفارش لگاتے ہیں یا پھر نقد خرچ کر کے کام نکالتے ہیں۔ کوئی تھانہ چاندی کی کان ہے تو کوئی سونے کی اور کوئی ہیرے کی کان ہے۔"

محسن ہنسا۔ "یہ اچھی مثال دی تم نے۔ اب بھلا گلبرگ تھانے جا کے کسی کو کیا ملے گا جہاں سارے ہی بڑے خان رہتے ہوں اور پولیس افسر تک ان سے ڈرتے ہوں۔ وہ تو تھانے دار کو بھی ذاتی ملازم سمجھتے ہیں۔"

"تم لوگ کس بحث میں پڑ گئے یار۔" میں نے کہا۔ "یہ نئی مصیبت گلے پڑ گئی ہے۔ اس کا کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟ وہی جو دوسروں کا ہُوا۔" محسن بولا۔ "پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا۔"

"اس نے اپنے بیوی بچوں کو دلاور اینڈ کمپنی کے عتاب سے محفوظ رکھنے کی خاطر مرنا قبول کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کا یہ مقصد پورا ہونا چاہیے۔"

"اس کے کیے کی سزا اس کے بیوی بچوں کو واقعی نہیں ملنی چاہیے۔" محسن نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"غالب نے ٹھیک کہا تھا کہ عشق نے ہم کو نکما کر دیا۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔" میں نے کہا۔ "اکیلا آدمی صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے اور ہر سختی جھیلنے اور ہر آزمائش سے گزرنے کا حوصلہ رکھتا ہے لیکن شادی کر کے وہی آدمی بُزدل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے انجام سے نہیں، بیوی بچوں کے انجام سے ڈرنے لگتا ہے۔ خود ہر تکلیف اُٹھا لیتا ہے مگر اپنے بیوی بچوں کو ذرا تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ خاندان اس کی ایسی کمزوری بن جاتا ہے جس سے پورا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔"

www.paksociety.com

"اور پھر بھی لوگ شادیاں کرتے ہیں۔" اُستاد ٹیڈی بولا۔

"ہاں۔ اور پھر اسی طرح سامنے قدمدان پر ایک سائبان لگے رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "سائبان انھیں دھوپ سے اور بارش سے بچاتا ہے۔ زمانے کی گرم سرد ہوا سے محفوظ رکھتا ہے۔ سامنے پتھر جو دُنیا کے سنگسار کرنے والے ہاتھ اُٹھاتے ہیں اپنے سینے پر روکتا ہے اور انھیں ہر آفت سے پناہ دیتا ہے۔ اب دیکھو تو اس نے جان دی تو صرف اس لیے کہ انھیں یہ پناہ حاصل رہے۔ وہ دلاور کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ اس نے زبان کھولی، کسی کو کچھ بتایا نہیں لیکن اس کی لاش یہاں ملی تو دلاور اینڈ کمپنی کو شک ہوگا کہ مرنے والے نے وفاداری کے عہد پر جان قربان کرنے میں اتنی دیر کیوں کی۔ وہ گرفتار ہو کے اس مقام تک آنے سے پہلے ہی کیوں نہ مر گیا۔ عہد تو سب کرتے ہیں مگر اس اُمید میں کہ جان دینے کی آزمائش کا مرحلہ کبھی نہیں آئے گا۔ جب وقت آتا ہے تو کون بے دھڑک اپنی زندگی قربان کرتا ہے اور کون ڈر کے پیچھے ہٹ جاتا ہے یا تذبذب کا شکار ہوتا ہے۔ دلاور یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ اس کے پی اے نے بھی کمزوری کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ پہلے اپنی جان بچانے کی کوشش کی ہو۔ ہم سے سودا کیا ہو کہ اگر وہ سب کچھ بتا دے گا تو اسے بخش دیا جائے گا۔"

"دلاور جانتا ہے کہ ہم نے براہِ راست تشدد کے حربے آزمانے سے گریز کیا ہوگا۔ پہلے تو سمجھا بجھا کر اسے تحفظ کی ضمانت دی ہوگی اور اس سے تھوڑا بہت معلوم کر لیا ہوگا۔ پھر اس یقین کے ساتھ کہ وہ بہت زیادہ جانتا ہے اور جو کچھ اس کے ذہن میں ہے وہ سب اُگلوانے کے لیے جبر کیا ہوگا۔ یہاں تک کہ اس جسمانی اذیت کی تاب نہ لا کے وہ خودکشی پر مجبور ہوا۔ مجبوری کی اس انتہا تک پہنچنے سے پہلے وہ کتنے راز افشا کر گیا، یہی اس کی قربانی کو ناقابلِ قبول بنا دے گا۔" محسن خان شیروانی نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"اور بے چارہ وہ بھٹکتے رہیں گے بیوی بچے جن کی خاطر وہ جان سے گیا۔ انھیں سزا نہ ملی تو وفاداری کا صلہ از مرگ انعام بھی نہیں ملے گا۔" میں نے کہا۔ "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم والی بات ہو جائے گی۔"

"پھر اب کیا کریں؟" ٹیڈی نے کہا۔

"ظاہر ہے یہ لاش اِدھر پڑی نہیں رہ سکتی۔" میں نے کہا۔

"یہ تحفہ بھی چوہدری دلاور صاحب کو بھیج دیں؟" ٹیڈی نے کہا۔

"نہیں دوست۔ اس کو میدانِ کارزار میں ڈال آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پتا چلے کہ یہ وہیں لڑتا مارا گیا۔ اسیر ہونے سے پہلے ہی مر گیا۔"

"کون سے میدانِ کارزار میں؟" محسن نے کہا۔ "اسی جگہ جہاں اس کا اور تیرا مقابلہ ہوا تھا؟"

"ہاں۔ وہی سب سے مناسب جگہ ہے۔"

"لیکن یار۔ وہاں لوٹ کر جانے میں خطرہ بھی ہے۔" محسن بولا۔ "اور اب اس سے کیا فائدہ۔ سب کے سامنے تو وہاں سے فرار ہوا تھا۔ نازو رہ گئی تھی اور ایک لاش۔ پھر وہاں پولیس پہنچ گئی ہوگی اور اب ہمارے مرزا غالب آ کے بتائیں گے کہ نازو نے اس تیسرے شخص کا کیا حشر کیا تھا۔ وہ بھی اس خونخوار حسینہ کے ہاتھوں شہید ہوا یا پولیس کے ہاتھ لگا اور پھر پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا یا نازو اسے ملبا لپٹا کے خود وہاں سے نکل گئی تھی۔"

"تیری بات میں سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ہر صورت میں جو لوگ وہاں ذرا سی دیر کے لیے رُک گئے تھے وہ ذرا دیر میں کھسک گئے ہوں گے اور پولیس کے آنے تک کوئی چشم دید گواہ نہیں رہا ہوگا۔ ہوا بھی تو اس جھگڑے میں نہیں پڑے گا اور اپنی جان چھڑائے گا کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا۔"

"پھر بھی پولیس نے جائے واردات پر پہنچ کر ضابطے کی کارروائی کی ہوگی۔" محسن بولا۔ "اور وہاں نازو ملی ہو یا نہ ملی ہو ان کو ایک لاش ضرور ملی ہوگی۔ ممکن ہے دوسرا بھی زندہ یا مُردہ ہاتھ لگا ہو۔ اتنی رپورٹ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔ اس لاش کو اتنی دیر بعد وہاں ڈالنا بے وقوفی ہوگی۔ کون مانے گا کہ یہ بھی وہاں پڑا تھا لیکن کسی نے دیکھا نہیں۔ اس سے تو ثابت ہوگا کہ بعد میں ہم اسے ڈالنے وہاں پہنچے تاکہ دلاور پر واضح ہو جائے کہ یہ بھی ہمارا ہی کارنامہ تھا۔"

"تو مجھے اتنا احمق کیوں سمجھتا ہے جتنا تو ہے۔" میں نے کہا۔ "لاش کو جائے واردات سے تھوڑا ہٹ کے ڈال دیں گے۔ کسی جھاڑی یا درخت کی اوٹ میں۔ معلوم یہ ہو کہ جنگ کا پانسہ پلٹتا دیکھ کے یہ وہاں سے نکل گیا تھا لیکن فرار کے راستے مسدود تھے۔ چنانچہ کسی کے ہاتھ پڑنے سے پہلے اس نے اپنا خاتمہ کر لیا اور لاش ایسی جگہ تھی کہ فوراً کوئی نہ دیکھ سکا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے تصدیق ہو جائے گی کہ موت کس طرح واقع ہوئی۔ دلاور مطمئن ہو جائے گا کہ وہ کسی کے ہاتھ نہیں پڑا اور اسی جگہ خودکشی کر کے اپنا عہد نبھا گیا۔ لاش ابھی نہ سہی صبح تک ضرور دریافت ہو جائے گی۔ یہ ابھی چند گھنٹے پہلے کی بات ہے۔ پولیس بھی اب تو وہاں سے تفتیش کر کے رخصت [illegible]

میری بات نے محسن کو قائل کر لیا۔ ٹیڈی نے ہمیں یاد دلایا کہ شام ہونے والی ہے اور جو کھانا ہمیں دوپہر کے وقت کھانا تھا وہ ایسے ہی پڑا ہوا ہے۔ خواہش نہ ہونے کے باوجود ہم نے چند لقمے زہر مار کیے اور پھر اس جگہ کا جائزہ لیا۔ یہ اندر سے ویسی ہی تھی جیسی کسی ورکشاپ کی عمارت ہو سکتی ہے۔ چھت کی کڑیوں سے جالے اور گھاس پھوس لٹک رہے تھے اور بجلی کے تار ہر طرف پھیلے ہوئے نظر آتے تھے۔ دیواروں پر کبھی رنگ نہیں ہوا تھا چنانچہ سیمنٹ کے پلاستر کا رنگ بھی سیاہ لگتا تھا۔ لمبائی کے رُخ دونوں دیواروں میں دو دو کھڑکیاں تھیں مگر ان کو اندر سے لکڑی کے تختے ٹھونک کر ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔ دوسرا دروازہ آخری حصے میں تھا اور مختصر سے احاطے میں کھلتا تھا۔ احاطے میں پانی کا ایک نل تھا اور سابقہ کرائے داروں کا بے مصرف سامان لکڑی کے تختے، خالی ڈرم اور پرانے ٹائر۔ باہر سے جو تھوڑی بہت روشنی اندر پہنچتی تھی وہ ان روشندانوں کے ذریعے پہنچتی تھی جو دروازوں کے اور کھڑکیوں کے اُوپر بنے ہوئے تھے۔ روشندانوں کے پٹ بھی بند تھے لیکن کسی کا ایک شیشہ بھی سلامت نہیں تھا چنانچہ ہوا اور روشنی کے ساتھ چھت کے نیم تاریک اور ویران ماحول پر گھونسلے بنانے والے پرندے بھی اس راستے سے اندر آتے تھے۔ نیچے فرش پکا تھا اور غالباً توڑ کر دوبارہ بنایا گیا تھا — آمنے سامنے کی دونوں لمبی دیواروں کے ساتھ اور کھڑکی سے متصل لکڑی کی بھاری بھرکم اور بھدی بینچ نما میزیں تھیں جن کے پائے زمین میں پیوست تھے۔ اس پر قبضہ جمانے والے لکڑی پر رندہ مارتے ہوں گے یا شاید اس جعلی نوٹ چھاپنے والے نے اپنی مشینیں لگا رکھی تھیں۔ تاہم یہ سامان ساتھ لے جایا نہیں جا سکتا تھا چنانچہ یہیں رہ گیا تھا۔ مجھے کہیں لٹکتے ہوئے سوئچ بورڈ نظر آئے۔ ایک کونے میں بجلی میٹر کنکشن کے ساتھ سوئچ کا بورڈ البتہ سلامت تھا۔ پاور لائن کے کئی پوائنٹ فرش سے ذرا اُوپر دیے گئے تھے جو ہمارے لیے بے کار تھے۔ اُوپر چھت پر کئی ٹیوب لائٹوں کے کھوکے لٹکے ہوئے تھے مگر کہیں کوئی ٹیوب لگا کے اندر خاطر خواہ روشنی کا انتظام ہو سکتا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ میٹر بند ہے اور اس کی سیل بھی لگی ہوئی ہے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ حکومت کی بجلی کو مالِ مفت سمجھ کر فراخدلی سے استعمال کرنے کی اجازت ہے لیکن اجازت دینے والا الیکٹریشن ہر ماہ اپنا وظیفہ وصول کرنے ضرور آتا ہوگا۔ پچاس روپے اس کی نذر کرو اور پانچ سو بجلی کے بل سے بچاؤ۔ جیو اور جینے دو کا منطقی فلسفہ۔

"اس جگہ پر مزدور اور کاریگر قسم کے لوگ تو رہ سکتے ہیں۔" میں نے فیصلہ دیا۔ "مثلاً ہم تینوں حضرات۔ لیکن محترمہ خاتون آپ کو اپنا بندوبست کہیں اور کرنا ہوگا ورنہ شکوک پیدا ہوں گے اور آپ کی وجہ سے ہمارا یہ ٹھکانہ بھی محفوظ نہیں رہے گا۔"

"یہ ٹھکانہ نہیں اسلحہ خانہ ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "کہاں سے آیا ہے یہ سب کچھ؟ آٹو میٹک ریوالور کس کے ہیں اور یہ اسٹین گن جیسی خطرناک چیز!"

"نازو اس کھلونے سے کھیل رہی تھی۔" میں نے کہا۔

"دوسری تو میں بھی کھیل رہی تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "کیا میں نے اس کو بالکل ٹھیک نہیں پکڑا تھا؟ میں نے تو یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ کہاں کی بنی ہوئی ہے۔"

"اسٹین گن کی ساخت ہی بتا دیتی ہے کہ وہ یورپی یا امریکی طرز کی نہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ وہی اسلحہ ہے جو ایک طرف سے اسمگل ہو کے آتا تھا اور دوسری طرف اسمگل کر دیا جاتا تھا۔" محسن بولا۔ "اور اِدھر کی چیز کو اُدھر کرنے والے دونوں طرف کے خریداروں سے زیادہ فائدے میں رہتے تھے۔"

"میری بات پہ غور نہیں کیا تم نے؟" میں نے کہا۔

"ہم نے غور فرمایا اور بات کو فضول قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا۔" رابعہ ہنسی۔

"کیا مطلب؟ گویا تم اسی کارخانے میں ہمارے ساتھ رہنے پر مُصر ہو؟" میں نے کہا۔

"کارخانے سے پاگل خانے بلکہ مُردہ خانے تک میں تمھارے ساتھ رہوں گی۔" وہ فیصلہ کُن لہجے میں بولی۔

"تمھارا جذبہ فلمی عشق سے زیادہ صادق ہے مگر تمھارے ناقص العقل ہونے کا ثبوت ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ الزام تو ہم عورتوں کی ذات پر ہے اور رہے گا۔" رابعہ بولی۔ "میں نے اپنا فیصلہ بتا دیا۔"

"یہ کیا احمقانہ ضد ہے۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "تمھاری وجہ سے ہم بھی پریشانی میں مبتلا رہیں گے۔"

"پھر میں کیا کروں! پریشانی ہے تو سب کے لیے ہے۔ نہیں ہے تو کسی کے لیے نہیں ہے۔" وہ اسی لہجے میں بولی۔

"لیکن اس طرح یہاں کوئی عورت نہیں رہ سکتی۔"

"اس طرح نہ سہی میں بھی اپنی وضع قطع بدل لوں گی۔" رابعہ نے کہا۔ "جو تم کہو گے بن جاؤں گی۔"

"ولن چھڑائے بھیس چھڑائے کیا کیا کرے نہ پریت۔"

www.paksociety.com

محسن نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"ہم تو کارٹون بن گئے ہیں۔ تم کو اس کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "فیصلہ ہو گیا تھا کہ تم انکل رمتوی کے پاس چلی جاؤ گی۔"

"فیصلے بدل بھی جاتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "میں اب کہیں نہیں جا رہی ہوں اور تم اگر کارٹون بن کے رہ سکتے ہو تو میں بھی رہ سکتی ہوں لیکن الگ تھلگ رہ کے وہ ذہنی اذیت قبول نہیں کر سکتی جو اندیشوں اور وسوسوں سے ملتی ہے اور بے یقینی کا نتیجہ ہوتی ہے۔"

"تم ہمارے لیے اضافی مسائل پیدا کر دو گی اپنی حفاظت کے لیے۔"

"ہم سب ایک دوسرے کی حفاظت کے خیال سے ساتھ ہیں اور کون ہے جو دوسرے کو پریشانی یا مسئلہ سمجھتا ہے؟ کس موقع پر میں نے تمہارا ساتھ دینے میں کمزوری کا مظاہرہ کیا؟" وہ بگڑ کر بولی۔

"بی بی! تم ناحق خفا ہو رہی ہو۔" میں نے کہا۔ "تمہاری داستانِ شجاعت سے کون واقف نہیں لیکن تمہاری مدد کی نوعیت مختلف ہوتی تو زیادہ کارآمد تھی۔ تم الگ رہ کر ہمارے لیے زیادہ کچھ کر سکتی ہو۔ مثلاً ہماری قانونی مدد، مالی مدد، اور ہمیں حالات سے باخبر رکھنے کا کام۔"

"میں الگ رہنا ہی نہیں چاہتی تو بات ختم۔" وہ بولی۔ "قانونی مدد میں نے پہلے کی تھی اب نہیں کر سکتی کیونکہ تمہارے معاملات قانون کی حدود سے بہت باہر نکل گئے ہیں۔ مالی مدد کا یہ ہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ لے لو۔ ایک گھر کے سوا جسے میں نے بیچنے کے لیے نہیں خریدا ہے۔ رہی حالات سے باخبر رہنے کی بات تو تم کبھی حالات سے بے خبر نہیں رہے لیکن میں تمہاری جانب سے بے خبر رہ کے دیکھ چکی ہوں۔ مجھ میں اب اکیلا رہنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے صفائی!" محسن نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "اس بات پر مت لڑو۔ میں ایک بات سمجھ لو۔ ہم یہاں کچھ لکڑی کا کام کریں گے۔ کام کیا خاک کریں گے! ایک بورڈ رکھیں گے تاکہ ہم پس پردہ کچھ بھی کرتے رہیں۔ ہمارا حلیہ تم دیکھ رہی ہو۔ اس کاروبار کے لیے یہی سب سے بہتر حلیہ ہے۔ تم بھی یہاں مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ بن کے نہیں رہو گی۔ وضع قطع سے تمہارا الگ نظر آنا غلط ہو گا۔"

"میں بن جاؤں گی وہی جو تم ہو۔" رابعہ نے پُریقین سے کہا۔

"لیکن وہ لینڈ لارڈ۔ کیا وہ اعتراض نہیں کرے گا؟ جگہ کام کے لیے دی تھی رہائش کے لیے نہیں۔" میں نے کہا۔

"اس سے اپنی مجبوریاں بیان کر دیں گے کہ اکیلے نہیں رہ سکتے اور ایک عورت کھانے پکانے کے لیے ساتھ ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میری بہن ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور ہم کے ایک حصے میں پردہ ڈال کے کچھ گھریلو سا ماحول پیدا کر لیں گے۔ زنان خانہ بنا سکتے ہیں۔ دو چار برتن اور چارپائی ڈالنے کی جگہ ہے مگر یہ سب کل دیکھیں گے۔"

"ہاں۔ غالب آ جائے تو صورت حال کا پتا چلے۔" میں نے کہا۔ "مجھے نازو کی طرف سے تشویش ہے۔"

"عزیزہ۔ کیا اس بدبخت کی تشویش پر تم کو تشویش نہیں ہوتی؟" محسن نے مصنوعی تیز لہجے میں کہا۔

"اس تشویش کے بارے میں تم تفتیش کر کے مشورہ دو، کیا واقعی مجھے تشویش میں مبتلا ہونا چاہیے۔" رابعہ نے قدرے مسکرا کے کہا۔

"بات مذاق کی نہیں یار۔ نازو تو بھلا وہ کسی نہ کسی طرح نکل جائے گی۔" میں نے کہا۔ "وہ شخص جسے میں نازو کے گھر لایا تھا، انہیں اس نے ہمارا راز تو فاش کر دیا ہو۔ ہمیں پھر چلنا پڑے گا۔ میرا خیال تھا کہ کل گامے شاہ سے ملاقات کی راہ پیدا کی جائے۔ ایک نام کا سلسلہ دوسرے نام کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ گامے شاہ کسی اور کے متعلق بتا سکے۔"

"گامے شاہ تک پہنچنا آسان نہیں۔" محسن بولا۔ "ایک تو ہمارے پاس کوئی ٹرانسپورٹ نہیں ہے۔"

"ہمارے پاس چالیس ہزار چہرہ شاہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "سکۂ رائج الوقت اور اس کے نصف سے یہ بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

"دوسری بات یہ ہے کہ گامے شاہ واقعی انڈر گراؤنڈ ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے زیر زمین راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہم عقیدت مندوں کی طرح حاضری دے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اپنی موجودہ صورت میں ہم کو بھلا کون پہچان سکتا ہے۔ ایک اسٹین گن شوٹ میں تو نہیں چھپائی جا سکتی لیکن اس لنگی کے اوپر اور کھدر کے اس ڈھیلے ڈھالے کرتے کے نیچے تم کیا توپ باندھ کر لے جا سکتے ہیں۔ اس کو نکال لائیں زندہ تو بات بن جائے گی۔"

"وہ بھی دلاور کے پی اے کی طرح مر جانا قبول کرے گا۔" محسن نے مایوسی سے کہا۔

"ہم اسے مرنے نہیں دیں گے۔" میں نے کہا۔ "ایک بار تجربہ ہو گیا۔ اب یہ غلطی نہیں ہوگی۔"

ہم اپنی گفتگو میں اتنے مگن تھے کہ ہم نے ٹیڈی کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ پھر اچانک میری نظر نے اسے اپنے صندوق کو ٹٹولتے ہوئے دیکھا اور میں نے محسن کو اشارہ کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ صندوق ٹوٹا ہے اور نہ ہی کھلا ہے۔ جب میں نے ٹیڈی کو گرایا تھا تو میرا مقصد اس شرارت سے تھا کہ کسی طرح صندوق پر لپٹی ہوئی رسی کٹ جائے یا اس کا ڈھکن ٹوٹ جائے مگر محسن نکل آیا تو میں یہ بات بھول گیا۔ اب پھر مجھے تجسس نے گھیرا کہ آخر اس صندوق میں کیا ہے کہ ٹیڈی اسے جان سے عزیز تر رکھتا ہے۔ صندوق پر رسی کے بل اتنے ڈھیلے ہو گئے تھے کہ کسی کنڈی کی عدم موجودگی میں صندوق کھل جانا چاہیے تھا لیکن صندوق اب بھی بند تھا اور ٹیڈی اس کو چاروں طرف سے دیکھ کر نہ جانے کس بات کا اطمینان کر رہا تھا۔ میں نے محسن کی طرف دیکھا اور ہم دبے پاؤں ٹیڈی کی طرف بڑھے۔ وہ اتنا بے خبر تھا کہ اسے ہمارے سر پر پہنچ جانے کی خبر تک بھی نہ ہوئی اور پھر بیک وقت میں اور محسن صندوق پر جھپٹے۔

"میاں خوجی! آج تو ہم نے قسم کھائی تھی۔" میں نے کہا اور ٹیڈی کو ایک طرف دھکیل دیا۔

"کیا یہ جادو ٹونا کا باکس ہے؟" محسن بولا۔ "کہ تم اس کو کھولتے ہی نہیں۔"

ٹیڈی اس حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا میں اور محسن صندوق پر قبضہ کر چکے تھے لیکن ہماری یہ جدوجہد بے ثمر ثابت ہوئی۔ ہم صندوق کو کھول نہ سکے۔ میں نے اور محسن نے اسے ہر طرف سے الٹ پلٹ کے دیکھا لیکن وہ بند رہا۔ اس میں کوئی چٹخنی تالا نہیں تھا اور تین فٹ لمبا، دو فٹ چوڑا اور ایک فٹ گہرا یہ ڈبا ہر طرف سے ایک ہی جیسا تھا۔ وہ جگہ جہاں ایک لکیر سی نظر آتی تھی اور جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ڈھکن الگ ہے وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ اس لکیر کے ساتھ ساتھ بھی بکس کو ٹانکے لگا کے ویلڈ کر دیا گیا تھا۔ میں نے اور محسن نے خفت اور حیرت سے ایک دوسرے کی طرف اور پھر ٹیڈی کی طرف دیکھا۔ وہ بے چارہ الو کی طرح دل گرفتہ اور کچھ پریشان سا بیٹھا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا کہے۔

"یہ تو ہر طرف سے بند ہے!" میں نے صندوق پر ایک مکا مارا۔

"اور یہ تم کو کتنے عرصے سے دھوکا دے رہے تھے اُستاد؟" محسن نے کہا۔ "رسی لپیٹ کر بے وقوف بنا رہے تھے!"

"محسن خان۔ یہ صندوق بھی دھوکا ہے۔" میں نے اپنا ہاتھ سہلا کے کہا۔ "ایسے زنگ خوردہ اور پتلی چادر کے بنے ہوئے صندوق پر میں نے اتنی قوت سے مکا مارا تھا کہ اس ضرب سے تو ٹین کی چادر بھی اندر بیٹھ جاتی لیکن اس صندوق کا کچھ بھی نہیں بگڑا۔"

"تم اس کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتے۔" ٹیڈی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اس کے اندر بارہ انچ کی فولادی چادر کا ایک باکس ہے۔ اوپر والا ٹین صرف لفافہ ہے۔ بے شک پھاڑ کے دیکھ لو۔"

"یہ کیا اسرار ہے اُستاد؟" میں نے کہا اور تعجب سے محسن کی طرف دیکھا۔

"کیا ہے اس پُراسرار صندوقچی کا راز؟" محسن نے میرے ساتھ ہی کہا۔ ٹیڈی بے نیاز بیٹھا اپنے ناخنوں کو دانتوں سے کترتا رہا۔ ہماری گفتگو میں دلچسپی کے باعث رابعہ بھی ہمارے قریب ہی آ کھڑی ہوئی تھی۔

"اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔" ٹیڈی بولا۔ "میں بتا چکا ہوں۔" اس کا لہجہ بالکل کھوکھلا تھا۔

"ایسی کی تیسی تمہاری، ہم معلوم کر لیں گے۔" میں نے کہا۔

"بس اتنا ہمیں بتا دو کہ اس صندوق میں شاہ جنات تو قید نہیں ہیں؟"

"یا پھر یہ کوئی بم تو نہیں ہے کہ دھماکا ایک ہو اور بیوہ دو کو کر دے، بیوی بننے سے پہلے ہی؟" محسن بولا۔

دروازے پر دستک نے ہمیں صندوق کے راز سے واقفیت کی خواہش سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ایک نظر دلاور کے پی اے کی طرف دیکھا جس کی لاش کمرے کے آخری کونے میں بالکل سیدھی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے رابعہ کو مخالف سمت میں جانے کا اشارہ کیا۔ خود ایک ریوالور لے کر دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے لگ گیا اور پھر محسن خان شیروانی نے دروازہ کھولا۔

"ہم سب دیکھ رہے تھے باہر سے۔" مرزا غالب نے مسرت سے اعلان کیا۔ "دروازے کی جھری میں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ ماشاء اللہ سب بہت محتاط ہو اور ہوشیار بھی۔"

"بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔" میں نے ریوالور کو ڈب میں ڈال کر کہا۔

"ارے بھائی! خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ بالآخر صحیح جگہ پہنچے!" غالب نے اندر آ کے بیرک پر ایک نظر ڈالی۔ "ورنہ ایسی ہی جگہ تھی

www.paksociety.com

وہ بھی، جہاں سے ہم کوئی دس منٹ پہلے نکالے گئے۔ بلکہ باہر بھیجے گئے تھے۔"

"کیا ضرورت تھی تصدیق کیے بغیر وہاں گھسنے کی؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "نام پڑھ نہیں۔ ہاتھ آگیا؟"

"کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔" غالب نے سر کھجا کے کہا۔ "اس پرچی پر کچھ فلیٹ نمبر ٹیڑھا ہی لکھا ہوا تھا۔ ان کی بھی غلطی تھی نا۔ بلاوجہ دروازے کھلے رکھ کے بیٹھے تھے۔"

"تم کو سوچنا چاہیے تھا کہ ہم کبھی دروازے کھلے نہیں چھوڑ سکتے۔" میں نے کہا۔ "خیر یہ بتاؤ خبر کیا لائے ہو؟"

"خبر؟" غالب نے سر پر ہاتھ مارا۔ "وہ تو میں بالکل بھول ہی گیا۔"

"کیا بھول گیا یعنی یہ بھول گئے کہ تم کو کہاں جانا تھا اور کیا کرنا تھا؟" میں نے جھلا کر کہا۔

"ارے نہیں یار۔ وہ خبر تو باہر ہی رہ گئی۔" غالب دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے اسے روک لیا۔

"پہلے بتاؤ کون ہے باہر؟" میں نے کہا اور لائٹ آف کردی۔

"ارے بھئی بڑی اچھی خبر ہے۔" غالب مسکرایا۔ "تم اداکاری کیا تو بہت اچھی لگی۔ نازو ہے اس کا نام۔ بلکہ اس خبر کی سرخی ہے جو اس کے لبوں پر لپ اسٹک بن کر پھیلی ہوئی ہے اور اس کے عارض..."

"تم اسے یہاں لے آئے؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم سے پوچھے بغیر؟"

"اب کیا ہو سکتا ہے سکندر۔" رابعہ نے آگے آکے کہا۔ "وہ بے چاری کب باہر کھڑی رہے گی؟" اس نے دروازہ کھول دیا۔ غالب باہر گیا اور ایک منٹ سے بھی کم وقت میں لوٹ آیا۔ میں اور محسن پیچھے ہٹ گئے۔

"میں نے تم سے کہا تھا سکندر بادشاہ۔" محسن نے مجھے یاد دلانا چاہا۔

"ہاں۔ تم نے ٹھیک کہا تھا لیکن اسے میں نہیں لے کر آیا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ غالب نے اچھا نہیں کیا۔" محسن سوچتے ہوئے بولا۔ اتنی دیر میں نازو نے اندر قدم رکھا۔ اس نے ایک نظر مجھ پر، محسن اور رابعہ کو دیکھا۔

"کیا تم لوگ خوش نہیں ہو میرے آنے سے؟" وہ ہم سب کی سنجیدہ صورت دیکھ کر بولی۔

"تمہارا یہاں آنا کسی بھی صورت میں مناسب نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"مگر میں اکیلی نہیں آئی ہوں۔" وہ بولی۔ "مجھ سے بھی ساتھ آئے ہیں۔"

یک لخت مجھے بجلی کا جھٹکا لگا۔ "کون... اکرام شیخ..؟" میں نے کہا اور اس کے بعد بے اختیار میرا ہاتھ ریوالور پر چلا گیا۔

"ہاں میں۔" اکرام شیخ نے اندر آنے کے بعد کہا۔ "مگر تم سے ملنے آیا ہوں۔"

میں اور محسن دم بخود کھڑے رہ گئے۔ مجھے غالب پر غصہ آیا کہ میں نے اس کو مارنے کی خواہش بڑی مشکل سے دبایا۔ نادان کی دوستی جی کا جنجال۔ وہ میدانِ صحافت کا شہسوار، کاغذ کے میدان میں قلم کے گھوڑے دوڑانے والا ذہین تھا، مخلص تھا اور جرأت مند بھی تھا۔ اس کی زندگی کے تجربات شاید ہم سے بھی زیادہ تھے اور وہ شریف النفس والا بہت بڑا مبصر معاملہ فہم بھی تھا مگر اس کو اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے دوست کون ہیں اور دشمن کون... ہم پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے اور اکرام شیخ کو ہم پرکھ چکے تھے۔ وہ اپنی سرشت کے اعتبار سے قانون پسند تھا۔ ہمارا دوست نہیں بن سکتا تھا۔ ہم اور وہ دریا کے دو کنارے تھے جن کے درمیان بُعد ختم نہیں ہو سکتا تھا۔

"دوستی کے نام پر ہم دشمنوں کے فریب میں آنے کا ہرگز نہیں کر سکتے۔" میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا اور لائٹ جلا دی۔

"اور زبانی دعوے سے کسی کی دوستی ثابت ہوتی نہ ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اس دعوے کو پرکھ سکیں۔" محسن نے کہا۔

"قصور تمہارا نہیں ہے۔" اکرام شیخ نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔ "تمہارے حالات کا ہے کہ تم دوستی کو بھی سازش سمجھ کے ڈرتے ہو۔"

"اور بزبانِ غالب۔ ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں۔" غالب نے کہا۔

"ہماری جگہ تم ہوتے تو بلا سوچے سمجھے اعتماد کرنے کا خطرہ مول لے سکتے تھے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ لیکن میرے بارے میں تم جانتے ہو۔" اکرام نے کہا۔

"ہاں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ تم ایک انتہائی ایماندار، فرض شناس پولیس افسر ہو۔"

"میں پولیس افسر تھا مگر اب استعفا دے چکا ہوں۔" شیخ نے احتجاج کیا۔

"یہ بھی تم کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "کل تک تم کچھ اور کہتے تھے بالکل مختلف لہجے میں بات کرتے تھے۔"

"میں کل بھی تمہارا دوست تھا اور میں نے..."

"کل ہم سے زیادہ تم قانون کے دوست تھے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جب انتخاب کا وقت آیا تھا تو تم نے ہماری دوستی کو اپنی فطرت کے اصولوں پر قربان کر دیا تھا۔ قانون کے اصولوں کو تم بلا چون و چرا پورا کرتے تھے اور اپنے فرض کی راہ میں کسی رشتے کو حائل نہیں ہونے دیتے تھے۔ کیا میں وہ وقت بھول سکتا ہوں جب تم نے نازو کو گولی کا نشانہ بنا دیا تھا؟"

"میں اپنی اس غلطی، اس گناہ یا جرم کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔

"کفارہ؟" میں نے طنز سے کہا۔ "بچھو اگر کسی کو ڈنک مارنے کے بعد کہے کہ سوری۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا تو کیا میں اسے معقول کی طرح بے خطر اپنی ہتھیلی پر نہیں بٹھا لوں گا۔ مجھے تو شک ہے کہ کفارہ تم اس کوتاہی کا ادا کرنا چاہتے ہو جو تم سے ایک مجرم کے سلسلے میں ہوئی تھی، جو تمہاری گرفت میں آکے نکل گیا تھا۔ تمہاری فطرت میں اتنا بڑا انقلاب...."

"سکندر...... یہ تم کو کیا ہو گیا ہے؟" نازو نے جھلا کر کہا۔

"تم مت بولو نازو۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔" میں نے رکھائی سے کہا لیکن اپنی نظر شیخ پر رکھی اور اپنے ریوالور کا رخ بھی نہیں بدلا۔ محسن اور رابعہ کے ساتھ اب ٹیڈی بھی آکھڑا ہوا تھا اور برائے نام دوستی میں اندر کھڑے ہوئے افراد کے دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک طرف ہم چار تھے جن کے درمیان خیالات و نظریات، قول و فعل اور جذبات و احساسات کی مکمل ہم آہنگی تھی اور ناقابلِ شکست اعتماد کا رشتہ تھا۔ دوسری طرف کھڑے ہوئے تین افراد میں سے غالب نے خود کو اعتماد کا اہل ثابت کر دیا تھا لیکن اس وقت وہ اپنی جلد بازی کے باعث اور حماقت سے ایک غلطی کر بیٹھا تھا اور خود کو صفِ مجرماں میں پاکے بہت ہی شرمسار تھا۔ نازو قدرتی طور پر ایک جذباتی صدمے سے دوچار تھی کیونکہ ابھی تک وہ مجھے اپنی محبت کے خلوص کا یقین نہیں دلا سکی۔ لیکن بات اس کی نہیں، اس کے بھائی کی تھی۔ نازو کو یہ دکھ تھا کہ میں نے اس کے کہنے کے باوجود اس کے بھائی پر اعتماد نہیں کیا۔ یہ اس کی اور میری سوچ کا نہیں، نظر کا فرق تھا۔ وہ اکرام شیخ کو بہن کے جذبات کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ میں اکرام شیخ کو ایک اچھا آدمی ضرور سمجھتا تھا لیکن اسے موجودہ حالات میں اپنا دوست تسلیم کرنے سے ڈرتا تھا۔ وہ وقت بدل گیا تھا جب میرے اور اس کے درمیان پرخلوص دوستی کا قابلِ رشک رشتہ تھا۔ میرا ذہن اس بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ وقت کے ساتھ کسی کی فطرت بھی بدل سکتی ہے۔ چنانچہ میں تذبذب کا شکار تھا تو یہ ایک فطری ردعمل تھا۔

"اچھا!" اکرام شیخ نے مایوسی سے ہاتھ پھیلا کے کہا۔ "اب تو میں یہاں آگیا ہوں۔ تم میرے ساتھ جو بھی سلوک کرنا چاہو تمہیں اختیار ہے۔ میرا ضمیر صاف ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کوئی غلطی کی ہے۔"

"تمہارا ضمیر اس وقت بھی صاف تھا جب تم نے دوستی کو بھلا کے مجھے ایک مجرم کی حیثیت سے زندہ یا مردہ گرفتار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس وقت بھی تم سمجھتے تھے تم غلطی پر نہیں ہو۔"

"غلطی مجھ سے ہوئی کہ تمہیں یہاں لاکے بے آبرو کیا۔" غالب نے تلخ لہجے میں کہا۔

"یہ آبرو کا نہیں زندگی یا موت کا سوال ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم سب اچھے انسان ہیں لیکن ہمارے درمیان آج کے دشمنوں کی نوعیت مختلف ہے اور رشتوں کی پہچان وقت کے ساتھ ہوتی ہے۔ جب مجھے یہ ڈر نہیں ہوگا کہ تمہارے خلوص میں کوئی کھوٹ نہیں، تم نیک نیتی کے ساتھ مجھے گرفتار کرنے نہیں بلکہ میری مدد کرنے آئے ہو اور دوست کے پردے میں حقیقت کوئی پولیس افسر چھپ کر نہیں آیا ہے تو میں اسی طرح تم پر اعتماد کروں گا جیسے اس سے پہلے کرتا تھا اور جیسے آج محسن پر کرتا ہوں۔"

"اور مجھ پر نہیں کرتے؟ ابھی تک نہیں کرتے!" غالب نے برافروختہ ہو کے کہا۔

"محسن کا نام تو مثال دینے کے لیے تھا ورنہ تم ہو، ٹیڈی ہے، رابعہ اور شہلا ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں کس طرح خود کو اعتماد کا اہل ثابت کر سکتا ہوں؟" اکرام شیخ نے کہا۔ "اپنی نیت کے صاف ہونے کا یقین دلانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"اس کا کوئی ایسا ثبوت نہیں جو نصاب کے مطابق ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن اپنے عمل سے تم بہت کچھ ثابت کر سکتے ہو۔ پیشہ ور افراد کسی کو اپنے ساتھ شامل کرتے ہیں تو اس کی آزمائش بھی کرتے ہیں۔ تم ہمیں جرائم پیشہ افراد کا گروہ فرض کر لو۔ یہ تو

www.paksociety.com

"تمہیں دیکھنا ہی پڑے گا کہ تم میں طبیعت اور صلاحیت کتنی ہے اور کہیں مجرم کے جسس میں تم مخبر تو نہیں ہو۔ ہمارا اطمینان ہونے تک تم کو محتاط رہنا ہوگا۔ محسن، شیخ صاحب کی تلاشی لے۔"

"تمہارا رویہ بہت ہتک آمیز ہے سکندر۔" نازو نے خفگی سے کہا۔

"یہ احتیاط کا تقاضا ہے جسے میں تمہاری خاطر نظرانداز نہیں کروں گا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا: "تم اور غالب ایک طرف ہو جاؤ۔ تم اپنے ہاتھ اُٹھا لو شیخ اور اس بات کو ذہن میں رکھو کہ جس طرح تم نے ضرورت پڑنے پر گولی چلاتے ہوئے تذبذب کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، ایسے ہی میں بھی سوچوں گا نہیں۔ میری اُنگلی ٹریگر پر ہے۔"

شیخ نے مسکراتے ہوئے ہاتھ اُٹھا دیے۔ محسن نے اس کی اچھی طرح تلاشی لی اور اس کی جیب میں سے ایک ریوالور کے علاوہ باقی چیزیں بھی نکال لیں۔ نازو کا چہرہ آتش فشاں غضب سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا، غالب کا رنگ خفت سے زرد تھا مگر حمیدی خوش تھا کہ میں نے اس کے مشورے کو قابلِ غور سمجھا۔

"صرف ریوالور اپنے پاس رکھو، باقی چیزیں اکرام شیخ کو دے دو۔" میں نے کہا اور محسن نے میرے احکامات کی اس طرح تعمیل کی جیسے میں دہشت پسندوں کی کسی تنظیم کا کمانڈر ہوں۔ پھر میں نے بھی اپنا ریوالور ہاتھ میں رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ کشیدگی کی فضا جو میرے غیر دوستانہ رویے سے پیدا ہوئی تھی پھر بھی برقرار رہی۔

"ہم یہ سمجھتے تھے کہ اپنا چہرہ بدل کے اور اس محفوظ مقام پر سکونت اختیار کرنے کے بعد فوری طور پر ہمارے لیے خطرے کی بات نہیں رہی۔" میں نے کہا: "لیکن تحفظ کا احساس پہلے کی طرح اطمینان بخش نہیں رہا۔"

"تم چاہتے ہو کہ مجھے تمہارے اطمینان کے لیے کیا کرنا ہوگا؟" اکرام شیخ نے تلخی سے کہا۔

"اس کمرے کے آخر میں دیکھو۔" میں نے ایک ہاتھ سے اشارہ کیا: "کچھ نظر آتا ہے؟"

اکرام شیخ نے گھور کر دیکھا: "یہ ... یہ کون سو رہا ہے اُدھر ...؟"

"ایک بدبخت جس نے زندگی حرام کی اور پھر اپنے لیے حرام موت قبول کی۔" میں نے کہا۔

اکرام شیخ آہستہ آہستہ آگے بڑھا: "کون ہے یہ؟ میں اسے نہیں جانتا۔"

"یہ چوہدری دلاور کا سیکریٹری تھا۔" میں نے کہا: "نازو اس کو پہچان لے گی۔"

"یہ ... یہ تو وہی ہے بھیا۔" نازو نے قریب جا کے بھائی کا بازو تھام لیا: "یہی تو اسٹین گن لے کے اترا تھا۔"

"اس کو قتل کس نے کیا ہے؟" اکرام شیخ بولا۔

"اب بھی پولیس کے لہجے میں ہی سوال کر رہے ہو؟" محسن بولا: "اس کو کسی نے قتل نہیں کیا۔ اس نے خودکشی کرلی۔ یہ بہتر تھا کہ ہم اسے قتل کر دیتے لیکن اس نے خود کو عذاب سے محفوظ رکھا۔"

"اب ہم نے طے کیا ہے کہ اس لاش کو جائے واردات کے قریب ڈال دیا جائے۔" میں نے کہا: "تاکہ یہ لاش کل دریافت ہو جائے اور سمجھا یہ جائے کہ اس نے گرفتاری سے بچنے کے لیے خودکشی کرلی۔ تم یہ کام کر سکتے ہو ...؟"

"کون سا کام؟" اکرام شیخ چونک کر پیچھے ہٹا۔

"یہی کہ اس لاش کو لے جاؤ اور اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے صحیح جگہ ڈال آؤ۔" میں نے کہا۔

"لیکن کیسے؟ میرا مطلب ہے کہ میرے پاس تو کوئی گاڑی بھی نہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"ہم اپنے مسائل کے حل کے لیے وسائل خود پیدا کرتے ہیں۔" میں نے کہا: "تمھیں ایک سہولت یہ بھی ہے کہ ابھی تک تم دوستوں سے محروم نہیں ہوئے ہو۔ کوئی بھی تمہاری مدد سے انکار نہیں کر سکتا۔"

اکرام شیخ نے فرداً فرداً ہم سب کے چہروں کو دیکھا: "اگر میں پکڑا گیا ...؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"ہم تمہاری کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔" میں نے کہا: "ابھی ہمیں یہ جگہ چھوڑ کے فرار ہونا پڑے گا۔ یہ تمہاری ہمت کے لیے ہی نہیں، عقل اور ذہانت کے لیے بھی ایک چیلنج ہوگا کہ خود کو بھی محفوظ رکھو اور ہمیں بھی۔"

"ٹھیک ہے۔" اکرام شیخ نے کہا: "میں جاتا ہوں۔ کوئی گاڑی منگواتا ہوں یا خود لے کر آتا ہوں۔"

"ہم کو غافل یا کمزور مت سمجھنا۔" میں نے کہا: "تمہارے ساتھ اگر مسلح پولیس کی پلاٹون آ جائے تب بھی ہمیں آسانی سے نہیں پکڑ سکے گی۔ بہت کشت و خون ہوگا اور ہم زندہ ہاتھ آنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ہم سے مطلب ہے تمہارے علاوہ ہم چھ افراد جن میں نازو بھی شامل ہے۔ یہ پہلی آزمائش ہے بشرطیکہ کامیابی اصل مرحلہ کل درپیش ہوگا۔"

"اور ہمارے ساتھ ہر مرحلے میں کامیابی کا مطلب زندگی اور ناکامی کا مطلب موت ہو سکتا ہے۔" محسن خان شیروانی نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں۔" اکرام شیخ نے سر ہلایا پھر دروازے کی طرف بڑھا اور رُک گیا: "مجھے اپنی حفاظت کے لیے ضبط شدہ ریوالور تو دے دو۔"

"اگر اپنی حفاظت کے لیے چاہیے تو ضرور لے جاؤ۔" میں نے کہا اور محسن نے ریوالور اس کی طرف اُچھال دیا۔ اکرام شیخ نے ریوالور کو کیچ کیا اور جیب میں ڈال لیا۔ پھر وہ دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا سکندر۔" بوجھل خاموشی کو نازو کی آواز نے ختم کیا۔

"ابھی کون کہہ سکتا ہے کہ کیا اچھا ہوا اور کیا بُرا۔" میں نے کہا: "یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ ہو سکتا ہے کل خود تم کہو کہ میں نے اچھا کیا تھا۔ تمہارا بھائی میرا بہت قابلِ اعتماد دوست تھا مگر آج میں خودکشی کے لیے قابلِ اعتماد نہیں رہا تو یہ آگے بڑھنے والے میرے ہاتھ سے ڈرتا ہوں کہ میری دستگیری کرنے والا ہاتھ کس کا ہے اور میرے دامن تک پہنچنے والا کس کا۔ اگر اکرام شیخ نے واقعی فیصلہ کر لیا ہے کہ میری دوستی زیادہ اہم ہے تو اسے مجھ سے زیادہ جاں نثار دوست بھی کوئی نہ ملے گا اور دوستی کی آڑ میں یہ دشمنی کی چال ہے تو مجھ سے زیادہ خطرناک دشمن بھی اس کا کوئی نہ ہوگا۔ اس میں جو کچھ کرنا ہے تمہارے بھائی کو کرنا ہے۔ میرے ردِعمل کا انحصار اس کے رویے پر ہے۔"

"اس نے تمہاری شرط قبول کر لی ہے۔" نازو نے ایک احساسِ افتخار کے ساتھ کہا: "مجھے خوشی ہے کہ میرا بھائی منافق نہیں ہے۔ کل جو کچھ وہ کرتا تھا یقینِ کامل کے ساتھ خود کو یا کسی اور کو دھوکا دیے بغیر مردانہ وار کرتا تھا۔ آج بھی اس نے ثابت کر دیا کہ وہ میرا بھائی ہے۔"

میں ہنسا: "تم نے بھی تو ثابت کر دیا تھا کہ تم کس کی بہن ہو۔"

"طوفان کی بہن بجلی۔" غالب نے ایک گہری سانس لے کر یوں کہا کہ اتنی کشیدگی کے باوجود سب کے لبوں پر ہنسی آگئی اور پھر نازو ایک گہری سانس لے کر اسی جگہ فرش پر بیٹھ گئی۔

"اُف! ارے غضب خدا کا۔" غالب نے کہا: "اپنی زبانِ شیریں اور انگریزیت کو خاک میں ملا دیا۔"

"یہاں سب کو خاک ہونا ہے مرزا غالب۔" نازو نے کہا: "مُغل شہزادوں کو بھی اور فرنگی شہزادیوں کو بھی۔" پھر اس سے پہلے کہ مرزا غالب اس فتنۂ محشر کی اس شعلہ بیانی پر مزید فریفتہ ہوتے، اس نے ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور مرزا غالب دھپ سے اس کے قریب گرا۔ فرش سے نہ جانے کب کی جمی ہوئی دھول اُڑی۔ اس کی حالت اور اس کا چہرہ دیکھ کر میں ہنسا اور میں نے محسن کو کھینچ لیا۔ حمیدی ایک دم خود قلندرانہ شان سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"فرض کرلو کہ یہاں دال تو دال کا ریسٹ ہے۔" میں نے رابعہ کو تذبذب میں دیکھ کر جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"فرض ہی کرنا ہے تو ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ بکنگھم پیلس ہے اور ہم سب شاہی خاندان کے افراد ہیں۔" محسن بولا۔

"شاہی خاندان!" غالب نے حقارت سے کہا: "ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے۔"

"یہ بہت ہے کہ تم نے اس خاک کے پُتلے اور پانی کے بُلبلے کا کچھ حشر کیا جس کو میں تمہارے سپرد کر آیا تھا۔" میں نے نازو سے مخاطب ہو کے کہا۔

"اس کا حشر تو باقی سب کا حشر دیکھ کر ہی خراب ہو گیا تھا۔" نازو بولی: "جب تم نکل گئے تو میں نے اس کی تھوڑی سی پٹائی کی اور اس کے بعد وہ فوراً ہی معافی مانگنے پر اُتر آیا۔"

"پھر ...؟ معاف کر دیا تم نے اسے ...؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ میں تو چاہتی تھی کہ جو ہوا سو ہوا، اب نکل جانا چاہیے۔" نازو بولی: "لیکن وہاں میرے ہمدرد بہت جمع ہو گئے تھے۔"

"ہمدرد کا لفظ ذرا ... مناسب نہیں ہے، جمع ہونے والوں کے صحیح جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا۔" غالب نے کھنکار کر کہا۔

"ان کے صحیح جذبات نے ہی تو مجھے مشکل میں ڈالا۔" نازو نے غالب کو ڈانٹ کے کہا: "سب تم جیسے کھڑے تکتے رہ گئے تھے۔ بعد میں مجرم کو پکڑ کر تھانے لے جانے کی بہادری کا مظاہرہ کرنے۔ میں نے بہت کہا کہ بابا مجھے جانے دو، مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں لیکن بدقسمتی سے کسی نے پولیس کو فون کر دیا تھا۔ وہ اپنی کوٹھی میں سے یہ سارا دیکھ رہا تھا اور پولیس آگئی۔ انھوں نے لاش کو دیکھتے ہی ضابطے کی کارروائی شروع کر دی کہ یہ کیسے مرا اور کیوں مرا۔ میں نے بہت کہا کہ اسی سے پوچھو لیکن وہ مرزا نے اصل میں ... تو پولیس کو دیکھتے ہی فرار ہو گئے تھے۔ باقی سب نے بھی یہی کہا کہ انھیں کچھ نہیں معلوم

www.paksociety.com

اب ظاہر ہے پولیس یہ تو نہیں مان سکتی کہ مرنے والا طبعی موت مرا اور ایک شخص جو واویلا کر رہا ہے وہ بلا وجہ کر رہا ہے۔ پولیس لاش اور اس نیم جان کو جلوس کی صورت میں تھانے لے گئی۔ جلوس میں باقی تماشائی تھے۔ پولیس ان سب کو عینی گواہ بنانے پر تلی ہوئی تھی جنھوں نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔"

"تمھارے سوا کسی کو نظر بھی کیا آتا۔" غالب نے کہا۔ "آنکھیں خیرہ ہو گئی ہوں گی۔"

"میں الحمد للہ آدم زاد ہی ہوں اور تم شاعری کر رہے ہو۔" نازو نے کہا اور غالب نے جس طرح سر کھجایا اس سے سب محظوظ ہوئے۔

"جس شخص نے فون کیا تھا وہ سامنے نہیں آیا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ کیا ہے ضرب المثل مجلس میں چنگاری ڈال جمالو دور کھڑی۔" نازو بولی۔ "اس نے تھانے میں بھی فون کیا کہ فساد کی جڑ صفدر ہی لڑکی ہے یعنی یہ خاکسار... ہے نا غضب؟"

"سچا رشتہ بی جمالو۔ زمانہ ایسا ہے کہ کسی کو سچ بولنا ہی نہیں چاہیے۔" غالب نے اتفاق کیا۔

"تھانیدار میری گرفتاری کے خیال سے خاصا خوش تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ مجھے کیا معلوم وہاں کیا ہوا تھا۔ میں تو بس وہاں سے گزر رہی تھی، لوگوں کو جمع دیکھا تو رک گئی۔" نازو نے کہا۔ "جب دیکھا کہ وہ کسی طرح بھی ماننے پر آمادہ نہیں تو میں نے کہا کہ اچھا آپ ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب سے فون کر کے پوچھ لیں۔ وہ میرے ضامن نہ ہوں تو آپ کو اختیار ہے کہ بند کر دیں۔ تھانیدار کی ساری اکڑ فوں غائب ہو گئی۔ پھر میں نے کہا کہ اے ایس آئی اکرام شیخ میرا بڑا بھائی ہے۔ اُسے غالباً استعفے کے منظور ہو جانے کی خبر نہیں تھی۔ اس نے کہا کہ اچھا بی بی! آپ جائیں۔ ہم کسی اور کو ملزم بنا لیتے ہیں۔ ایک ملزم تو ان کے پاس پہلے سے موجود تھا۔ ٹوٹا پھوٹا جیسا بھی تھا مگر ملزم تھا۔ وہ اسی کو بجاتے رہے اور کچھ زیادتی کر گئے کہ وہ مر گیا۔"

"پولیس کی مار سے مر گیا...؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔ کیا پولیس کی مار سے لوگ مرتے نہیں؟" نازو نے حیران ہو کے کہا۔ "ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"تمھارے سامنے مارا تھا اسے؟" میں نے متفکر ہو کے کہا۔

"نہیں، میرے سامنے تو نہیں۔" نازو بولی۔ "لیکن میں تھانے میں ہی تھی جب ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا۔ اس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ اس نے تھانیدار کے کان میں کچھ کہا اور وہ تھانیدار بھی پریشان ہو کے اٹھا۔ تھوڑی دیر میں معلوم ہو گیا کہ تشدد کے دوران میں کوئی ضرب کاری پڑ گئی اور وہ بے چارہ جاں بحق ہو گیا۔ تھانیدار کے سامنے سب قسمیں کھا رہے تھے کہ ابھی تو ریہرسل بھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ تنبیہ کے طور پر دو چار چھتر رسید کیے تھے۔ وہ کچھ زیادہ ہی نازک یا بیمار تھا اور اسے مرنا ہی تھا۔" نازو کے بیان نے میرے شبہات کی تصدیق کر دی تھی کہ دوسرا آدمی بھی خودکشی سے مرا تھا۔

"ان پولیس والوں کی دفاعی منطق ایسی ہی ہوتی ہے۔" غالب نے اتفاق کیا۔ "ثابت یہ کرتے ہیں کہ موت کا ایک دن معین ہے اور اگر کوئی اس دن تھانے پہنچ کے فوت ہو جائے تو پولیس خواہ مخواہ بدنام ہو جاتی ہے۔ اچھے خاصے صحت مند آدمی کے بارے میں سند بھی لے آتے ہیں کہ یہ مرض الموت میں مبتلا تھا یا نفسیاتی مریض تھا جس نے طے کر رکھا تھا کہ تھانے میں خودکشی ضرور کرنی ہے تاکہ پولیس کا امیج خراب ہو۔"

"تمھارا اور مرزا غالب کا ملنا تو سمجھ میں آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیوں... کیا یہ بھی ستاروں کا کھیل ہے؟" محسن نے کہا۔ "اور جن کو ملنا ہو وہ تھانے میں بھی مل جاتے ہیں۔"

مرزا غالب نے دانت نکال کے مسرت کا اظہار کیا اور نازو کی طرف دیکھا جو محسن کے غلط مطلب نکالنے پر کچھ برہم نظر آ رہی تھی۔ میں نے فوراً مداخلت کی۔ "میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تمھارے بھیا کہاں سے ساتھ ہو گئے؟ کیا وہ بھی تھانے میں موجود تھے؟" میں نے نازو سے کہا۔

"نہیں۔ میں وہاں سے روانہ ہونے کو تھی کہ یہ پہنچے۔" نازو نے کہا۔ "مجھے پہچانتے تو تھے نہیں۔ مجھ سے ہی پوچھنے لگے کہ کیا آپ مس نازلی کے ساتھ ہیں۔ میں نے مذاق میں پوچھا یہ نازلی کیا بلا ہے تو کہنے لگے کہ بھائی وہ بلا ہی ٹھہرے۔ آتش جنگ ہے اور سارے دھاڑے لبریز عہدِ قدیم کی ہیروئن لاڈا یا کا ایڈیشن ہے۔ طلارڈن کو خنجر کی نوک پر مارتی ہے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ اپنا تعارف مکمل طور پر کرا دوں مگر پھر مجھے خیال آیا کہ میں تھانے کی حدود میں ہوں جہاں ابھی ابھی میں نے خود کو شرافت کا پیکر اور قطعی طور پر بے ضرر ثابت کیا ہے۔"

"واللہ ہم تو دریائے حیرت میں ڈوب گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہوگی کوئی چھ فٹ قد کی روڈ رولر ٹائپ چیز۔" مرزا غالب نے کہا۔ "اس نزاکت اور قد و قامت اور اس حسن و لطافت سے قتلِ عام کا خیال تو آتا ہے مگر جنگ و جدل کا نہیں۔"

خلافِ توقع غالب کے اس بے باکانہ خراجِ تحسین نے نازو کو برہم نہیں کیا۔ عورت بہرحال عورت ہے۔ میں نے سوچا اپنی تعریف سن کے خوش ہوتی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ نازو کے ناز و انداز اور عشوہ و طراز حسن نے اور اس کی ماورائی معصومیت نے غالب کے عقل و نظر کو اور ہوش و خرد کو منٹوں میں مبتلا کر لیا ہے لیکن نازو ایسی لڑکی نہیں تھی جو کسی کی باتوں سے متاثر ہو جائے۔ عجیب اتفاق یہ تھا کہ خود مرزا غالب کی شخصیت کا ظاہر بہت دھوکا دیتا تھا اور خود ہم جو اس کے ساتھ روز و شب کی رفاقت رکھتے تھے، اس کے نام، پیشے اور اس کی باتوں سے فرض کر بیٹھے تھے کہ وہ احمق اور بزدل قسم کا نکما طوطی کا مسخرہ ہے۔ وقت پڑنے پر اس نے ثابت کر دیا تھا کہ ہمارے اندازے کتنے غلط تھے۔ نازو اور مرزا غالب میں یہ بات مشترک تھی کہ دونوں یکساں خطرناک تھے مگر وہ ایک جیسے بے ضرر نظر آتے تھے۔ چنانچہ صورت سے غلط فہمی کا شکار ہونے والا مارا جاتا تھا۔ ابھی تک نازو بھی وہی سمجھ رہی تھی جو ہم سمجھے تھے۔ جس دن غالب کا دوسرا روپ سامنے آئے گا اس دن وہ کتنی حیران ہوگی۔ شاید اتنی ہی جتنا غالب اس کی صورت دیکھ کر حیران ہوا تھا۔

"خیر میں نے تسلیم کیا کہ آپ کی نظر کو جس کی تلاش تھی اور جسے ڈھونڈتے ہوئے آپ یہاں تک آ پہنچے ہیں....." نازو بولی مگر اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

"گویا کوئے یار سے سوئے دار تک آ پہنچے ہیں۔ خیر آگے کہیے۔" غالب نے دخل در معقولات اور معذرت ایک ساتھ ادا کی۔

"پھر انھوں نے بتایا کہ تم کو میری طرف سے پریشانی لاحق ہے۔" نازو نے کہا۔

"پریشانی نہیں، تشویش۔" اب محسن نے بات کاٹی۔ "کیوں رابعہ باجی! تشویش کی تفتیش۔"

"ان لوگوں کی زبان ان کے قابو میں نہیں اور یہ خود بھی کسی کے قابو میں نہیں ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "بولنے دو انھیں۔"

"میں نے پوچھا کہ سب لوگ ہیں کہاں؟" نازو نے مطمئن ہو کے کہا۔ "تو انھوں نے کہا کہ یہ تو ابھی میں بھی نہیں جانتا لیکن نقشہ میرے پاس ہے تو میں نے کہا کہ پھر کیا مسئلہ ہے۔"

"وہ تو جاننے والے ہیں تیرے صنم تجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔" محسن خان شیروانی نے تسلیم بجا لا کے کہا اور میری جوابی کارروائی کے ڈر سے مجھ سے ذرا دور ہٹ گیا۔

"قصہ مختصر... میں نے کہا بھیا بھی ان سے ملنا چاہتے ہیں اور یہ بتایا کہ وہ بھی بہت مخلص اور جاں نثار دوست ہیں تو انھیں غالب صاحب نے کہا کہ دوستوں کی تو ہمیں اشد ضرورت ہے۔" نازو بولی۔ "میں نے گھر فون کیا اور ان سے کہا کہ بھی انتظار اور بھوک دونوں کا مشکل ہیں۔ یہ فرمانے لگے کہ جیب خالی ہو تو آدمی کو بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مجبوراً میں ہی ان کو لنچ کے لیے لے گئی اور پھر بھیا صاحب بھی وہیں پر آ گئے، مجھے ڈانٹنے اور بل ادا کرنے کے لیے۔"

"گویا دعوت اس لیے ہوئی کہ جناب دعوت اڑا رہے تھے؟" محسن نے آنکھیں نکال کے کہا۔

"جتنا خوار انسان کو اس کا پاپی پیٹ کرتا ہے اتنا دلِ بیمار بھی نہیں کرتا۔" مرزا غالب نے ایک آہِ سرد کے ساتھ فرمایا۔

"اب مسئلہ یہ ہے نازو کہ جس حال میں ہم ہیں، وہ خود ہمارے لیے باعثِ حیرت ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو ان معاملات سے دور ہی رہنا چاہیے۔ ہم سب تو بے گھر لوگ ہیں... خانہ بدوش اور جان بکف پھرتے ہیں۔ ایک گھر محسن کا تھا جو ماں کی وفات اور بہن کی رخصتی کے بعد خالی ہو گیا کیونکہ والد اسپتال میں ہیں۔ خواجہ بیگ محمد نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ رابعہ کا گھر تباہ کر دیا گیا اور میرا گھر مجھ سے چھین لیا گیا۔ چنانچہ ہم اور رفاہ خرابی کے سامان لازم و ملزوم ہیں۔ تم بہت بلند حوصلہ اور بڑی بہادر لڑکی ہو لیکن تمھارے والدین بھی ہیں اور......"

"وہ مجھے اور بھیا کو ہمیشہ یہی تعلیم دیتے تھے کہ راہِ حق میں کسی قربانی سے دریغ کرو گے تو اس الزام کی شرمندگی مجھے ہوگی اور ضمیر کی آواز نہیں سنو گے تب بھی مجرم میں خود کو سمجھوں گا کہ میں تمھاری شخصیت اور کردار کی صحیح تعمیر نہ کر سکا۔ تم نے مفاد پرست، بزدل یا خود غرض ہونے کا ثبوت دیا تو مجھے احساس ہوگا کہ مجھ سے تمھاری تربیت میں کوتاہی ہوئی۔ پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے تم نے بھیا کے کردار کو

www.paksociety.com

بند کھاتے آبا ان پر فخر کرتے تھے۔"

• یہ تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "لیکن یہ بھی تو سوچو کہ تمہارے کسی فعل سے تمہارے والد کی بدنامی ہوتی۔ ان کو دنیا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا۔ ان پر الزام آتا کہ ان کی بیٹی ایسے افراد کا ساتھ دے رہی ہے جو قانون کی نظر میں مجرم ہیں اور ان کا بیٹا بھی قانون کی محافظت کا فرض ادا کرتے کرتے قانون شکن عناصر کا آلۂ کار بن گیا ہے تو کیا انھیں دکھ نہیں ہوگا؟ ہم جو کچھ کر رہے ہیں ہمارے نقطۂ نظر سے درست ہے لیکن پھر بھی قانون کی خلاف ورزی کہلاتا ہے۔ وجہ تم جانتی ہو۔ اصل مجرموں نے قانون کی پشت پناہی حاصل کر لی ہے۔ ہونے کیا اہل ہوس نے مٹی بھی اسعت تھی۔ چنانچہ ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور وہ بھیں بدلنے پر تلے ہوئے ہیں کیونکہ ہم ان کے معززترین اور شرفا ذہ چہروں سے نقاب ہٹا کے ان کا مکروہ اور گھناؤنا چہرہ دنیا کو دکھانا چاہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قانون غلط ہے یا پھر انصاف کرنے والے نادان ہیں۔ سادی بات یہ ہے کہ قانون بہت مظلوم ہو گیا ہے۔ اس کو غلط استعمال کیا جا رہا ہے اور اس کا غلط مطلب نکالنے والے بے ضمیر لوگ قانون کو کمزور کی حفاظت کے لیے استعمال نہیں کر رہے ہیں، کمزور کو ہراساں کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ وقت آئے گا جب ہم مجرموں کے خلاف ثبوت اور شہادت جمع کر لیں گے تو خود عدالت میں حاضر ہو جائیں گے اور اپنے ملک و قوم کے اور انسانیت کے ان دشمنوں کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیں گے۔ اگر ہم ایسا نہ کر سکے اور مارے گئے تو کیا۔ ہمارا مقصد تو زندہ رہے گا۔"

• قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم ... اور نکلیں گے عشاق کے قافلے۔" غالب نے جذباتی ہو کر کہا۔

• میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اپنے والدین کی خاطر ہمارے ساتھ مت رہو ورنہ ان کا بڑھاپے میں ان کی مٹی پلید ہوگی۔ ان کو تھانوں میں گھسیٹا جائے گا، ذلیل کیا جائے گا۔ شکاری ان کے پیچھے لگ جائیں گے تو ان کا جینا اجیرن کر دیں گے۔ تمام عمر کی کمائی ان سے چھین لیں گے۔ زندگی کی جدوجہد کا حاصل یہ سکھ چین ہے جو ان کو بڑی مشکل سے ملا ہے اور وہ تم ہو۔ تمہارا بھائی ہے۔ یہ سب نہ رہا تو وہ کتنے دکھی ہوں گے اور خدانخواستہ مرتے وقت ان کے لیے صرف تمہارے دیے ہوئے پچھتاوے اور عذاب ہوں گے تو تم سے زیادہ یہ ہم سب کے لیے ندامت کی بات ہوگی۔ ہم خود کو ان کا مجرم سمجھیں گے کہ ان پر جو افتاد آئی اس کا سبب ہم تھے اور ہماری دیوانگی تھی۔ تم اپنے گھر جا کر ان کی عزت و آبرو اور ان کے بڑھاپے کا سکھ چین غارت مت کرو۔"

• گویا میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی؟" نازو نے تحت دل گرفتہ اور مایوس لہجے میں کہا۔

• کرنے کا کیا مطلب؟ جب کوئی کسی کے لیے نیک تمنا رکھتا ہے تو بہت کچھ کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اخلاقی سہارا دیتا ہے، تب بھی بہت کچھ کرتا ہے۔ تم ہماری کامیابی کے لیے دعا کر سکتی ہو۔"

• صرف دعا!" نازو نے اسی افسوس کے ساتھ کہا۔

• ہاں۔ دعا بھی بہت بڑی طاقت ہے۔" میں نے کہا۔ "اور جو دعا نیت کے خلوص اور عقیدت کے جذبات کے ساتھ اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے مانگی جائے، دنیاوی دولت، جاہ و حشم کے لیے نہ مانگی جائے صرف راہِ حق و انصاف پر چلنے والوں کے لیے رب العالمین کی رحمت کی خاطر مانگی جائے وہ مستجاب ہوتی ہے اور مشکل وقت میں کام آتی ہے۔ ابدی شہرت رکھنے والے نابینا شاعر ملٹن نے کیا کہا تھا کہ خدمت تو وہ بھی کرتے ہیں جو صبر و استقامت کے ساتھ انتظار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ کبھی ہم خود تم سے کچھ کرنے کو کہیں کوئی ایسا کام جو ہمارے لیے مشکل ہو۔ ہم آزادی اور آسانی کے ساتھ دنیا میں گھوم پھر نہیں سکتے۔ کوئی ایسا بھی تو ہونا چاہیے جس پر کوئی نگرانی نہ ہو، جو ہمارے شکاری دشمنوں کے شک و شبہے سے بالاتر ہو اور پس پردہ رہ کے ہمارے لیے مفید ثابت ہو۔"

• تم تو ہمارا ففتھ کالم بن سکتی ہو۔" محسن خان شیروانی نے اچانک کہا۔

• رائٹ۔ ففتھ کالم بہت زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔" میں نے محسن کے خیال کی تائید کی۔

• کبھی اردو میں بھی بولا کرو سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تاکہ ہم ان پڑھ بھی سمجھ لیں۔ تم یا تو بہت مشکل اردو میں شعر وغیرہ پڑھ جاتے ہو یا پھر انگریزی میں کچھ کہہ دیتے ہو۔"

• ففتھ کالم کا مطلب بہت سے پڑھے لکھے نہیں جانتے۔" میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔ "یہ ایک مخصوص اصطلاح ہے۔ پہلے جب فوجیں کسی شہر پر حملہ کرتی تھیں تو چاروں طرف سے یلغار ہوتی تھی اور چار حصوں میں بٹ کر حملہ آور ہونے والی فوج

کا ہر حصہ ایک کالم کہلاتا ہے۔ پانچواں کالم اُسے کہتے تھے جو شہر کے اندر موجود ہو اور شہر والوں کا نہیں، حملہ آوروں کا مددگار ہو۔ ان میں غریب بھی غداروں کے علاوہ مظلوم و معتوب بھی ہوتے تھے جو انتقام کے آرزو مند ہوں۔ اپنے حاکم کے مقابلے میں حملہ آور سے زیادہ ہمدردی رکھنے والے یا حملہ آور کو بہتر حاکم سمجھنے والے بھی ہوتے تھے اور بعض اوقات چوری چھپے اندر گھس جانے والے بھی۔ فوج باہر سے حملہ کرتی تھی۔ یہ لوگ اندر تباہی پھیلا دیتے تھے۔ اندر کی توڑ پھوڑ اور انتشار سے اپنی مدافعت کرنے والوں کو دہری مصیبت پڑ جاتی تھی کہ ایک دشمن تو باہر کھلے میدان میں ہے اور دوسرا اندر اپنی ہی صفوں میں گھسا ہوا شکست کے اسباب پیدا کر رہا ہے۔ نازو ہمارا ففتھ کالم بن سکتی ہے۔ یعنی دشمن کے ساتھ مل کر دشمن ہی کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔" ٹیڈی نے میری وضاحت سے مطمئن ہو کے کہا۔

• ہاں۔ فرض کر دیجیے اور اس کا بھائی کسی طرح دلاور اینڈ کمپنی سے مل جائیں۔" میں نے کہا۔

• وہ بہت عیار آدمی ہے۔ فوراً ہی تاڑ جائے گا۔" محسن بولا۔

• اس کو قائل کرنا مشکل ضرور ہے، ناممکن نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "نازو کہہ سکتی ہے کہ سکندر کمینہ ہے۔"

• اس میں کون سی نئی بات ہوگی۔" محسن نے کہا۔ "یہ تو مجھے بھی معلوم ہے اور میں نے رابعہ کو بھی بتایا۔۔۔"

میں نے ہاتھ گھمایا لیکن محسن غوطہ مار گیا اور شرافت سے سانپ کی طرح بیٹھا ہوا ٹیڈی اس کی زد میں آ گیا۔ اس نے تو دے ہائے کی اور فرش پر لڑھک گیا۔

• خونِ ناحق کر دیا ایک نیک آدمی کا۔" محسن نے شور مچایا۔ "خواجہ نیک محمد کو مار دیا۔ ایسا ہی زمانہ ہے کہ نیکی کر اور جو نیکی کرے اسے دریا میں ڈال دے۔" نازو اور رابعہ نے ہنستے ہوئے ٹیڈی کو اٹھایا۔ وہ کافی دیر تک اپنے سر کو جھٹکتا رہا۔

• میری بات سمجھ میں آئی کہ نہیں؟" میں نے اس بحال ہوتے ہی کہا۔ "تم ذاتی تعلق و ذہانت سے کام لیتے ہوئے دلاور سے رابطے کی صورت پیدا کرو۔"

• صورت اچھی خاصی ہے۔ رابطہ ہو جائے گا۔" محسن نے پھر شرارت سے کہا اور اس مرتبہ مجھے کچھ نہیں کرنا پڑا۔ ایک جھٹکے سے نازو بلبلا کے اٹھی اور اس نے محسن کو ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور نہ جانے کیسے پیچھے پر اٹھا لیا۔ وہ ایک مسلسل حرکت تھی۔ جھٹکے سے محسن اوپر آ گیا تو پیچھے سے سہارا دیا اور محسن کو بیک قلابازی کھا کے فرش پر چت ہوتے دیکھا۔ میرے اور رابعہ کے لیے اس کی پھرتی کا یہ مظاہرہ غیر متوقع اور نیا نہیں تھا لیکن میں نے دیکھا کہ ٹیڈی کا منہ کھلا رہ گیا ہے اور غالب حیرت کے دریائے حیرت میں ڈوب چکا ہے۔ وہ کبھی نازو کو دیکھتا تھا اور کبھی محسن کو۔ محسن نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے اٹھنے کی زحمت نہیں کی اور وہ دور لیٹا مسکراتا رہا۔ نازو اپنے ہاتھ جھاڑ کے بیٹھ گئی۔

• تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ دلاور سے ملو۔" میں نے یوں کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ "تم اسے یقین دلا سکتی ہو کہ میری وجہ سے تمہارے بھائی کو مستعفی ہونا پڑا۔ تمہاری زندگی خطرے میں پڑی اور بھائی کے ہاتھوں بہن کا خون ہوتے ہوتے رہ گیا اور تاثر کچھ ایسا دینا کہ تمہاری اَنا مجروح ہوئی ہے اور تم بھی کسی عام عورت کی طرح انتقام کی آگ میں جل رہی ہو۔ تم کو اپنی اداکاری سے دلاور کو یقین دلانا ہوگا اور یہ بہت مشکل کام ہوگا کہ تم اس کی مدد کر سکتی ہو۔ اس سے نقد سودا کرو گی تو کامیابی کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے۔ ایسے لوگوں سے جس طرح بھی لیا جائے اور جتنا بھی لیا جائے جائز ہے کیونکہ خود انہوں نے بھی یہ دولت غلط ذرائع سے جمع کی ہے مگر ہمارے مقصد اور مشن کے لیے پیسہ بھی اہم ہے۔ وہ سمجھے گا کہ تم لالچ سے بھی مغلوب ہو اور انتقامی جذبات سے بھی۔ اگر اکرام شیخ کی مظلومیت کو بھی استعمال کرو تو اچھا ہے کہ سکندر کی وجہ سے اس کی لڑکی گئی اور اب وہ بے روزگار بیٹھا ہے۔ کچھ پیسہ ہوگا تو کوئی چھوٹا موٹا بزنس کرے گا۔ یہ کام تمہارے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہوگا کیونکہ دلاور ایسا شخص ہرگز نہیں جس کو اپنی باتوں سے بے وقوف بنایا جا سکے۔۔۔"

• خواہ باتیں کرنے والی تم جیسی ہی کیوں نہ ہو اور اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو ہو۔" محسن خان شیروانی نے دور سے کہا۔

• کیا تم واقعی چاہتے ہو کہ میں ایسا کروں؟" نازو نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس طرح تمہاری مدد ہوگی؟"

• کیوں نہیں ہوگی۔ تم اس کے تمام جاننے والوں کو جان لوگی۔ تم میں پوری صلاحیت ہے دلاور جیسے شخص کا اعتماد حاصل کرنے کی اور اس کی سیکرٹری بننے کی۔" میں نے کہا۔ "اور خطرہ تمہارے لیے کوئی نہیں کیونکہ تم اپنا دفاع کر سکتی ہو۔ ایک بار تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ دلاور کو چکر دینا آسان نہیں لیکن تقدیر جب آدمی کو چکر میں ڈالتی ہے تو

www.paksociety.com

بڑے بڑے سورما اور افلاطون چت ہو جاتے ہیں۔ عورت جیسی کمزور اور ناقص العقل کہلانے والی مخلوق کے ہاتھوں شکست کھانے والے فاتحین سے تاریخ بھری پڑی ہے اور کون جانے کہ جو کام ہم اپنی طاقت سے اور ذہانت سے نہ کر سکے وہ تم اپنی نزاکت سے کر لو۔ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔"

"تم کیا مشورہ دے رہے ہو مجھے؟ یہ کہ میں اس پر ڈورے ڈالوں؟" نازو نے یک لخت برہمی سے کہا۔

"ڈورے ڈالنا کیا ہے شکار کے لیے جال پھیلانا۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "ضروری تو نہیں کہ تم خود اس جال میں گرفتار ہونے کی کوشش کرو۔ یہ تو شکاری خود طے کرتے ہیں کہ کہاں کس موقع پر ان کو شکار کے لیے کیسا جال پھیلانا ہے جو جال تم پھیلا سکتی ہو وہ ہم نہیں پھیلا سکتے۔ وہ خود کو بہت بڑا شکاری سمجھتا ہے اور اس کے شکاری کتے بھی کم خونخوار نہیں مگر عیار لومڑی۔۔۔!"

"لومڑی!" محسن نے قہقہہ مارا۔ وہ جہاں گرا تھا وہیں بیٹھا تھا جیسے خاصا محظوظ تھا۔

"میں اس کہانی کا حوالہ دے رہا تھا جس میں لومڑی نے عقل سے کام لے کر شیر کو کنویں میں کودنے پر مجبور کر دیا تھا۔" میں نے کچھ شفقت سے کہا۔ "وہ شیر ہر روز ایک جانور کھاتا تھا اور اس دن لومڑی کی باری تھی۔ لومڑی اس کا کیا مقابلہ کرتی۔ اس نے شیر کو دھکا بھی نہیں دیا تھا۔ صرف پانی میں اس کا عکس دکھا کے کہا تھا کہ یہ آپ کا حریف ہے۔ پہلے اس سے نمٹ لیں تو بندی کی جان حاضر ہے اور جنگل کا بادشاہ ہونے کے باوجود شیر کی مت ماری گئی۔ اگر دلاور کی مت ماری گئی تو وہ آجائے گا تمہارے چکر میں اور اس کا حشر جنگل کے بادشاہ کی طرح ہوگا۔"

"اگر تم چاہتے ہو تو یہ میں کروں گی۔" نازو نے میری طرف دیکھے بغیر زیر لب کہا۔ "یہ بھی کروں گی۔"

میں نے رابعہ کو دیکھا وہ نازو کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی اور اس ایک لمحے میں نازو کے لیے اس کی آنکھوں میں حسد اور رقابت کا جذبہ اُتر آیا۔ اُسے نازو کا لہجہ اور اس کا جذبۂ ایثار اپنے عشق کی ہمسری کے دعوے کی طرح لگا۔ اس نے یوں محسوس کیا جیسے نازو اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے اور یہ بتانا چاہتی ہے کہ ایک تم ہی نہیں، سکندر کے لیے میں بھی ہوں۔ جتنا تم کر سکتی ہو اتنا ہی حوصلہ میرا بھی ہے اور اگر قسمت جدا ہے تو کیا۔ ہم پہ مشترک ہیں احسان غم الفت کے۔ رابعہ جس مقام پر تھی، وہاں وہ کسی اور کو نہیں دیکھنا چاہتی تھی اور نہ ہی قبول کر سکتی تھی۔ ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا مگر وہ ایک عورت کی نظر سے دیکھ رہی تھی کہ دوسری عورت جانتے بوجھتے کوشش ضرور کر رہی ہے کہ یہی مقام اسے بھی حاصل ہو جائے۔ آج کی ناکامی کے دکھ سے وہ کل کی کامیابی کی خوشی کا رشتہ استوار کر رہی تھی اور جھوٹی امید ولنکی ہو جانے کا خواب دیکھنا چاہتی تھی۔ اس ایک لمحے میں نازو نے بڑا ارادہ رابعہ کے مقابل آ کے کہا کہ سکندر کس کا ہے، یہ فیصلہ تو ابھی ہونا ہے اور رابعہ نے بڑے غرور سے اور حقارت سے کہا کہ فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا ہے بے وقوف لڑکی۔ وہ صرف میرا ہے۔ کل بھی تھا اور کل بھی ہوگا۔

"یہاں کوئی کسی کی خاطر کچھ نہیں کر رہا ہے۔" میں فوراً رابعہ کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔ "ہم سب ایک نیک اور عظیم مقصد کی جدوجہد میں شریک ہیں۔ پہلے یہ ذاتی انتقام کا مسئلہ تھا اور مجھے اپنا حق غصب کرنے والوں کو سزا دینا تھی۔ لیکن اب یہ وطن کے دشمنوں سے نمٹنے کا معاملہ ہے۔ یہ جنگ غداروں کے خلاف ہے اور یہ اہل وطن کی سلامتی کی جدوجہد ہے اور ہم سب کے مستقبل کے تحفظ کی ضرورت ہے۔ تم کو اس مقصد کی خاطر کام کرنا ہے۔"

نازو کا چہرہ مایوسی کے سائے سے بجھ گیا۔ "ان میرا بھی یہی مطلب تھا۔ کچھ اور نہیں۔" اس کے خفت زدہ لہجے میں تلخی کا زہر گھل گیا جسے میں نے ہی نہیں، رابعہ نے بھی محسوس کیا اور وہ اچانک اپنے شرمندہ نظر آنے لگی یا شاید یہ اس کے ذہن میں آنے والے خود غرضانہ خیالات کا ردِ عمل تھا جسے وہ چھپا نہ سکی تھی۔

"پھر وعدہ کرو تم واپس جاؤ گی؟" میں نے کہا۔ "اور ویسا ہی کرو گی جیسا کہ میں نے کہا۔"

نازو نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کوشش ضرور کروں گی۔"

"سب کوشش ہی کر سکتے ہیں۔" غالب نے اس کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔

"کامیابی سب کا نصیب نہیں ہوتی۔" محسن نے کہا جو اب قریب آ بیٹھا تھا اور سنجیدہ تھا۔ "پھر بھی اُمید نہ کوئی چھوڑتا ہے۔"

"احتیاط تمہارے لیے سب سے بڑی آزمائش ہوگی۔" میں نے کہا۔ "تم کو ہمارے دشمن کا ساتھ دینا ہے تو اس رول کو نبھانا بھی ہے۔ وہ تم پر ہر گھڑی نظر رکھیں گے۔ تمہاری نقل و حرکت پر نہیں، تمہارے ٹیلیفون پر بھی گفتگو پر یہاں تک کہ تمہارے گھر میں آنے جانے والوں کی نگرانی ہوگی۔ ان کے وسائل ان کے ارادوں کا ساتھ دیتے ہیں اور ان کی دسترس سے باہر کچھ

بھی نہیں۔ وہ تمہارے گھر کے اندر خفیہ مائیکروفون لگا دیں گے اور تمہارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی۔ تمہاری گاڑی میں ٹیپ لگا دیا جائے گا اور تمہیں معلوم نہ ہوگا۔ ان کے جاسوس تمہارے تعاقب میں رہیں گے اور تمہیں احساس تک نہیں ہوگا۔ تم خود سمجھدار ہو لیکن میں تم کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ میں انھیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہاری ایک چھوٹی سی غلطی سارا کھیل چوپٹ کر دے گی اور تم ان کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش میں ناکام رہو گی تو ان کے عتاب کا نشانہ بن جاؤ گی۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم اس کھیل کا آغاز کر کے پچھتاؤ۔ اگر اپنی ذات پر بھروسا ہے تو اپنا راستہ خود بناؤ ورنہ اطمینان سے گھر بیٹھو۔ اپنے لیے اور والدین کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا نہ کرو۔"

"میں تمہارے پلان کو سمجھ گئی ہوں۔" نازو نے کہا۔

"لیکن تم اکیلی نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "تمہارا بھائی بھی ہے۔ کیا وہ مخالفت نہیں کرے گا؟"

"اسے میں منا لوں گی۔ وہ جانتا ہے میں کتنی ضدی لڑکی ہوں۔" نازو مسکرائی۔

"تو آج سے ہم تم دشمن۔" میں نے کہا۔ "زبانی نہیں، بالکل عملی طور پر۔ دوستی کا خیال اگر رہے تو ذہن تک۔ لفظ ان کی زبان پر نہ آئے۔ یہ چوبیس گھنٹے مسلسل ایک اداکاری ہوگی اور تم کو اس کردار کو حقیقی روپ دینے کے لیے اپنی تنہائی میں بھی نبھانا پڑے گا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ نادیدہ آنکھیں تمہیں دیکھ رہی ہیں اور دیواروں کے بھی کان ہیں۔ وہ تم کو آزمائیں گے اور دلاور کی شیطانی ذہانت کا مقابلہ آسان نہیں۔"

"نازو کو تم نے کچھ نہیں سمجھایا؟" وہ جیسے خود سے بولی۔ "مطلب کیا ہے؟"

"نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے۔" مرزا غالب نے ارشاد فرمایا۔ "یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں۔" اس نے نازو کے بازو کی طرف اور پھر اپنی طرف اشارہ کیا۔ شعر کے اس مفہوم نے اس وقت ماحول ہلکا کر دیا لیکن اسی وقت باہر سے کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ کتا ایک مرتبہ زور سے غرایا اور پھر کسی نے دروازہ بند کیا۔

"سب اِدھر سے اُدھر۔" میں نے ایک دم اٹھتے ہوئے اشارہ کیا۔ "محسن اور غالب! تم ریوالور اٹھاؤ اور میرے ساتھ ہو۔ دروازے کے ایک طرف میں ہوں گا۔ اس کے پیچھے دوسری جانب تم دونوں۔ رابعہ کے ساتھ نیڈی ہوگا۔ اُدھر لائٹس کے پاس۔" دروازے پر دستک ہوئی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" نازو نے اطمینان سے بیٹھے بیٹھے ہوئے لوگوں کی افراتفری کا نظارہ دیکھ کر کہا لیکن باقی سب احتیاط کے تقاضوں کو سمجھتے تھے۔ میں نے میز کے نیچے سے اسٹین گن اٹھالی اور دروازے کے ساتھ دائیں طرف لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں سائلنسر والے ریوالور ہاتھ میں لیے محسن اور غالب نے مخالف سمت میں پوزیشن سنبھالی اور نیڈی نے تیسرا ریوالور اٹھا لیا۔ دوسری بار دستک کے ساتھ اکرام شیخ کی آواز بھی آئی۔

"اب تم دروازہ کھولو۔" میں نے نازو کو حکم دیا اور وہ محاذِ جنگ کے مورچے کی طرح نظر آنے والے منظر کو حیرت سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ ہم نے جس شخص کو خود ہی ایک کام کے لیے بھیجا تھا اس کی واپسی پر سراسیمہ ہونے کی کیا ضرورت ہے مگر میں سمجھتا تھا کہ ہم اپنے موجودہ حالات میں ایک فیصد خطرے کے امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس کھیل میں کچھ بھی بعید از قیاس نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ بظاہر اکرام شیخ بھی دوست بن کے آیا تھا مگر ابھی ابھی ہم نے نازو کو ایک سبق پڑھایا تھا کہ اس کو دوستی کے پردے میں دشمن تک کیسے رسائی حاصل کرنا ہے۔ اکرام شیخ پہلے پولیس کا ایک ذہین افسر تھا اور اس کے ساتھ ہمارے انکل دلشوی جیسے تجربہ کار اور گھاگ افسر تھے۔ یہ ناممکن نہیں تھا کہ ایسا ہی کوئی سبق انھوں نے اکرام شیخ کو پڑھا دیا ہو۔

نازو نے دروازہ کھولا اور شیخ اکرام سیدھا اندر آ گیا۔ میں نے لات مار کے دروازہ بند کیا تو وہ چونک کر پلٹا اور اس کی نظر نے میرے ہاتھ کی اسٹین گن کو پہلے دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" شیخ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "تمہاری نیت بدل گئی ہے؟"

"نہیں، احتیاط کا تقاضا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمہاری نیت صاف ہے تو ڈر کیا؟"

"میں گاڑی لے آیا ہوں۔" شیخ نے کہا۔

میں نے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر جھانکا۔ باہر کوئی کار نہیں تھی۔ ایک ٹرک کھڑا تھا جس کا رنگ اندھیرے میں کالا نظر آ رہا تھا۔ "ایک لاش کو لے جانے کے لیے ٹرک؟" میں نے کہا۔ "کس کا ہے یہ ٹرک؟"

"کسی کا بھی نہیں۔" شیخ نے کہا۔ "کرائے پر لایا ہوں۔"

"کرائے کے ٹرک میں لاش لے جاؤ گے؟" میں نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"یہاں کوئی چارپائی وغیرہ نہیں ہے جس پر تم اسے جنازے کی طرح اٹھا سکو۔" محسن بولا۔

"اس کے علاوہ یہ لاش تمہیں مردہ خانے نہیں پہنچانی ہے۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا۔ "مال روڈ پر ایک جگہ چیکنگ ہو رہی ہے یا چھاپہ مارا گیا ہے۔ وہ ٹرک والا دیکھ لے گا نہیں؟" محسن بولا۔ "اسے کس طرح مطمئن کرو گے؟"

"میں ایک صندوق بھی لایا ہوں۔" شیخ نے سر تھپک کے کہا۔ "تم لوگ بولتے چلے جا رہے ہو۔"

میں نے پھر دروازہ کھول کے دیکھا مگر مجھے آتشدان حصے سے ٹرک پر رکھے ہوئے باکس کے سائز کا اندازہ نہ ہو سکا۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا۔ "تم جا کے دیکھو کیسا صندوق ہے؟"

"میرا خیال تھا کہ... کہ ہم صندوق اندر لے آئیں گے۔" شیخ بولا۔ "پھر لاش اس میں ڈال کے لے جائیں گے۔"

"کیسی عجیب بات ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ زیادہ آسان نہیں ہوگا کہ ہم لاش اٹھا کے لے جائیں اور باکس میں ڈال دیں؟"

"ڈرائیور کو شک ہوگا۔" شیخ نے کہا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ کچھ نروس ہے۔

"ڈرائیور کو اس وقت شک نہیں ہوگا جب ہم باکس اٹھا کے لائیں گے اور پھر لے جائیں گے؟" میں نے کہا۔

"صندوق بہت بڑا ہے۔" محسن نے لوٹ کر واپس آنے کے بعد کہا اور دالان کے دروازے بند کر دیے۔ "ایک لاش کو لے جانے کے لیے اس کے جتنا آدھا سائز کا صندوق بھی کافی تھا۔"

"مجھے اس وقت یہی ملا۔" شیخ نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "یہاں سے لاش کو ٹرک تک اٹھا کے لے چلو۔"

"مجھے ایک بات بتاؤ۔ کیا تمہیں کوئی پرائیویٹ کار نہیں مل سکتی تھی؟" میں نے کہا۔ "اس کی ڈکی میں جگہ ہوتی ہے۔"

"میں نے کوشش کی تھی۔" شیخ بولا۔ "لیکن دوستوں میں سے ایک ملا نہیں، ایک نے انکار کر دیا۔"

اس وقت تک شیخ کے رویے نے میرے شکوک کو مزید تقویت پہنچا دی تھی۔ "میں پہلے صندوق کو کھول کر دیکھوں گا۔" میں نے کہا۔ "باہر چلو میرے ساتھ۔"

"خالی صندوق میں کیا دیکھو گے؟" وہ بولا۔

"اگر صندوق واقعی خالی ہے تو ہم اسے اندر لے آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"واقعی کا کیا مطلب؟" شیخ نے برہمی سے کہا لیکن میں نے دروازہ کھول کے اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ "تم دونوں میرے ساتھ رہو۔ ذرا بچ کے اور ذرا ہی باتیں۔" میں نے غالب سے کہا اور شیخ کی حالت میں واضح تغیر محسوس کیا۔ وہ بوجھل قدموں سے آگے چلنے لگا۔

قریب پہنچ کے مجھے ٹرک کا نیلا رنگ نظر آیا۔ پیچھے والے کھلے حصے پر نظر آیا جو دس فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا صندوق رکھا ہوا تھا جس کی گہرائی تین فٹ ہوگی۔ صندوق نیا تھا لیکن مقفل نہیں تھا۔

"تم ذرا شیخ صاحب کا خیال رکھنا۔" میں نے کہا اور ٹرک پر چڑھ گیا۔ "یہ تو خالی ہے۔" میں نے صندوق کھلا رکھا۔ آگے سے ڈرائیور نے سر نکالا اور پیچھے دیکھا۔ اس کا چہرہ اور اس کی مونچھیں دیکھتے ہی میرا شک یقین میں بدل گیا۔ وہ ٹرک بھی پولیس کا تھا اور ڈرائیور بھی۔

"غالب، ذرا ڈرائیور صاحب پر نظر رکھنا۔" میں نے کہا اور الفاظ ابھی میرے لبوں سے نکلے بھی نہ تھے کہ ڈرائیور نے دروازہ کھول کے جست لگائی۔ اس نے گرتے گرتے فائر کیا مگر اس کے مقابل غالب تھا جو مقابلے کے مطابق نہیں عمل آوری چوبار کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ اس نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے کا فرق سمجھتے ہوئے پہلے فائر کیا اور میں نے چیخ کر نے والے ڈرائیور کے لبوں سے ایک غلیظ گالی نکلی۔ غالب ڈرائیور کے ہاتھ کا ریوالور اسی طرح اڑ گیا تھا جیسے شیخ کے ہاتھوں کے طوطے فائر ہوتے ہی اڑ گئے تھے۔ اگر محسن نے اسے نشانے پر نہ رکھا ہوتا اور میرے ہاتھ میں اسٹین گن نہ ہوتی تو یقیناً پلٹ جاتا۔ ڈرائیور کچھ دیر بے بسی سے چلاتا رہا۔ پھر زخمی ہاتھ کو دبا کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے بند صندوق کی دونوں کنڈیاں لگا دیں جو بظاہر خالی لگتا تھا۔

"اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو۔" غالب نے کہا۔ "اور ٹرک سے لگ کے کھڑے ہو جاؤ۔"

"تم کو کچھ کہنا ہے؟" میں نے پتھر کے بت کی طرح منجمد کھڑے ہوئے شیخ سے کہا۔

شیخ کی نظر صندوق پر تھی اور اس نے نفی میں سر ہلایا۔ صندوق کے اندر اب بھی کوئی نقل و حرکت نہیں تھی۔

"اگر میں اس خالی صندوق کو چھلنی کر دوں تو تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔" شیخ چلایا۔

"کیوں؟ کیا بہت مہنگا صندوق ہے؟" میں نے کہا۔ "ہماری زندگی سے بھی زیادہ قیمت ہے اس کی؟" اس کے ساتھ ہی میں نے اسٹین گن کا رخ صندوق کی طرف کیا۔ شیخ نے محسن کی پروا کیے بغیر مجھ پر جست لگائی اور میری اسٹین گن پر حملہ کیا۔ یہ بات تو وہ خود بھی اچھی طرح سمجھتا ہوگا کہ میرے ہاتھوں سے اسٹین گن چھینی نہیں جا سکتی۔ اس کے جھپٹنے کا مقصد صرف گن کا رخ بدلنا تھا لیکن میں نے اسے قریب آنے کی مہلت بھی نہ دی۔ میں نے ایک ایڑھی پہ گھوم کے زوردار ٹھوکر شیخ کے سینے پہ لگائی۔ وہ ٹرک سے نیچے گر گیا۔ اسی وقت دروازے میں کھڑی ہوئی نازو نے چیخ ماری اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ کمرے کے دروازے سے رابعہ اور نازو باہر آ چکی ہیں۔

"کیا ہوا سکندر؟" نازو نے چلا کے کہا۔

"ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔ "اگر میں بے وقوف ہوتا اور احتیاط نہ برتتا تو بہت کچھ ہو جاتا۔ بس میں نے تمہاری طرح تمہارے بھائی پر اعتقاد نہیں کیا اور یہ بات مجھے بھی تمہاری نے سمجھائی تھی کہ انسان کی عادت بدل سکتی ہے، فطرت نہیں۔ شیخ نے وہی کیا جو اس کی فطرت کا تقاضا تھا۔ جو ایک ذمہ دار فرض شناس اور روشن خیال پولیس افسر کو کرنا چاہیے۔"

"تم نے مجھے پھر دھوکا دیا تھا۔" نازو کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم ایک بے وقوف لڑکی ہو۔" شیخ نے بے خوفی سے کہا۔ "ایک دن پچھتاؤ گی۔"

"میں تو اب بھی پچھتا رہی ہوں۔" نازو نے منہ چھپا کے رونا شروع کیا۔ "پہلی بار میں نے تمہاری غلطی کو معاف کر دیا تھا۔ اس غلطی کا خمیازہ تو مجھے اپنی جان دے کر ادا کرنا پڑتا۔ تمہیں زندگی یا پولیس میڈل مل جاتا۔"

شیخ نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "اور یہ میری غلطی ہے۔ وہ میری غلطی نہیں تھی۔"

"کیا تمہارے لیے کوئی رشتہ اہم نہیں رہا؟" نازو نے بڑے دکھ سے کہا۔ "تم اپنی ماں کو اور ماں جائے باپ کو بھی گولی مار سکتے ہو؟"

"ہاں، اگر وہ قانون شکنی کے مرتکب ہوں گے تو میرے لیے ان کی حیثیت ایک عام مجرم کی سی ہوگی۔"

"وہی بات ہے تو میں تمہارے اس رشتے سے پھر... جس کی قیمت تمہاری نظر میں ہیرا، ملنے والے تمغے سے زیادہ نہیں رہی۔" نازو انتہائی جذباتی ہو گئی۔

"رشتوں کو جذبوں سے مت تولو نازو!" شیخ سیدھا کھڑا رہا۔

"تم میری پیدائش کے دن سے میرے بھائی تھے اور اپنے ماں باپ کے بیٹے تھے۔" نازو نے روتے روتے کہا۔ "لیکن اب تم بلا زور کا یہ رہو۔ تمہارے جسم پر وردی ہے اور ہاتھ میں ریوالور اور تمہیں یہ اختیار حاصل ہے کہ جسے چاہو گولی مار دو۔ کتنے دن کی بات ہے، صرف تین سال پہلے تم ہم سب کے تھے۔ ہمارے تھے۔ آج اس پیشے کی خاطر جو تمہیں مل رہا ہے تم نے قواعد و ضوابط کو ہم سے زیادہ اہم سمجھ لیا ہے۔ پہلے تم نے دوستی کو قربان کیا۔ پھر بہن کی محبت کا خون کیا۔ سکندر کی گرفتاری کے لیے تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ مجھے آلۂ کار بنایا۔ اب میرے منہ پہ کہتے ہو کہ تم ماں باپ کو بھی قتل کر سکتے ہو۔ جاؤ اب ہم سب تمہارے لائق نہیں رہے۔ ہم سب مجرم ہیں اور تم پولیس افسر ہو۔ اپنی فرض شناسی کے ساتھ جیو۔ مت کہنا آئندہ مجھے بہن۔ اپنی زبان سے میرا نام مت لینا۔"

میں محسوس کر رہا تھا کہ نازو کے صبر کا پیمانہ شدت سے چھلکا جا رہا ہے۔ بھائی کی بے حسی نے اسے شدید ذہنی صدمے سے دوچار کیا تھا اور اپنے مضبوط اعصاب کی مالک ہونے کا اور جوش و جذبہ کا دعویٰ رکھنے والی نازو جذبات کے ریلے میں کمزور تنکے کی طرح بہہ گئی تھی۔ میں نے رابعہ کو اشارہ کیا کہ اسے اندر لے جائے۔ رابعہ کے لیے یہ کام زخم خوردہ شیرنی کو کان سے پکڑ کے لے جانے سے کم مشکل اور خطرناک نہیں تھا مگر نازو نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ خود کسی سہارے کی محتاج تھی چنانچہ وہ رابعہ کے کندھے پر سر رکھے روتی ہوئی لوٹ گئی۔ شیخ اسی طرح کھڑا رہا۔

"اس صندوق میں کتنے آدمی ہیں؟" میں نے اطمینان سے سوال کیا۔

"تم خود کھول کے دیکھ سکتے ہو۔" شیخ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"میں بتا چکا ہوں کہ میں احمق نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ چھ فٹ کا باکس ہے۔ اسے کھولتے ہی نہ جانے کتنی گولیاں ہم پر نازل ہو جائیں گی۔ میرے اندازے کے مطابق اس میں چھ آدمی چھپ کر بیٹھ سکتے ہیں۔ کیا وہ سب مسلح ہیں؟"

"دشمن کے شہر کی فصیل کے اندر اپنے لشکر کو پہنچانے کے لیے سب سے پہلے ٹروجن ہارس کا استعمال کیا گیا تھا۔ لکڑی کے اس دیو ہیکل گھوڑے کے پیٹ میں مسلح جنگجو چھپ کر بیٹھ گئے تھے اور شہر والے خود ہی اسے گھسیٹ کر لے گئے تھے۔" غالب نے کہا۔ "اس کے بعد علی بابا کے گھر میں ڈاکوؤں کے سردار نے اپنے چالیس چوروں کو پہنچانے کے لیے تیل کے سوداگر کا بھیس بدلا تھا اور چالیس مٹکوں میں چالیس چوروں کی فوج علی بابا کے گھر میں اتار دی تھی۔ تم نے بیسویں صدی کے علی بابا کا رول ادا کیا۔ کیا ہم بھی وہی کریں جو علی بابا کی ہوشیار ملازمہ مرجینا نے کیا تھا؟ مرجینا کا رول تو نازو بھی ادا کر سکتی ہے۔"

www.paksociety.com

"تم جو چاہو کرو" شیخ نے چلا کے کہا۔ "جب ان اتنے قتل پہلے کیے ہیں..."

"ابھی تک ہم نے کوئی قتل نہیں کیا۔" میں نے اسے ٹوک دیا۔ "کچھ لوگوں نے ہمیں قتل کرنے کی کوشش کی اور مارے گئے۔ ہم نے صرف اپنا دفاع کیا جس کا ہمیں قانونی طور پر پورا حق حاصل ہے۔"

"علی بابا کے اس صندوق..." ابھی غالب کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ سائلنسر والے ریوالور کا دھماکا سنائی دیا اور ٹرک ڈرائیور آواز نکالے بغیر پیچھے گر گیا۔ اس نے غالب کو مصروفِ گفتگو پا کے غافل سمجھنے کی غلطی کی تھی اور بڑی پھرتی سے اچھل کر غالب کے فلائنگ کک مارنی چاہی تھی لیکن غالب کا ذہن اس کی توقعات سے زیادہ مستعد تھا۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیور کے پیر غالب کو چھوتے، غالب کے ریوالور کی گولی اس کی پیشانی میں سوراخ کرتی ہوئی سر میں داخل ہو گئی اور وہ پیچھے گرا تو لاش تھا۔ میڈیکل سائنس کی اصطلاح میں اصل موت دماغ کی موت ہے تو اس ڈرائیور کے دماغ کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ اس کا جسم رگوں میں دوڑنے والے لہو کی حدت کے باعث کچھ دیر پھڑکتا رہا، پھر ساکت ہو گیا۔

"کیا تم اسے قتل کہو گے؟" میں نے شیخ سے کہا۔ "میرا خیال ہے ٹرک ڈرائیور نے خودکشی کی ہے اور اس کی موت کے ذمے دار تم ہی ہو جو اسے یہاں لائے تھے۔ غالب نے تو صرف اپنا دفاع کیا ہے۔ ٹرک ڈرائیور کو معلوم تھا کہ اس قسم کی غلط حرکت کا انجام کیا ہو گا۔ آنکھوں والا جانتا ہے کہ اندھے کنوئیں میں گرنے کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ پھر وہ قدم آگے بڑھائے تو قصور وار کون؟ ہاں کوئی اسے دھکا دے یا مجبور کرے تو وہ مجرم۔ تم اب محسن کے ساتھ اندر جاؤ اور وہ لاش اٹھا لاؤ۔"

وہ کچھ تذبذب کا شکار تھا۔ اپنی سازش کی ناکامی، شکست اور بے بسی کے احساس نے اسے خفت اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ سلوک وہ تھا جو نازو نے اس کے ساتھ ہم سب کے سامنے کیا تھا۔ محسن نے اسے کندھے سے پکڑ کے دھکیلا تو وہ آگے بڑھا۔

"قسم خدا کی میں تم سب کو چھوڑوں گا نہیں۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔

"یہ بات ہم کئی بار سن چکے ہیں کئی لوگوں سے۔" محسن نے کہا۔

"جذبات کو قابو میں رکھو۔" میں نے مشورہ دیا۔ "غلطی مت کرنا جو ٹرک ڈرائیور نے کی تھی۔"

"جس طرح تم فرض کی ادائیگی کے خیال سے غافل نہ ہوتے، ایسے ہی تم اپنی حفاظت کے خیال سے کبھی غافل نہ ہوتے۔" محسن نے کہا اور اسے دھکیلتا ہوا لے گیا۔ [illegible] صندوق پر ایسے لات ماری جیسے ڈرم بجانے والا بچہ [illegible] کے پیچھے رکھے ہوئے ڈرم کو ٹھوکر مارتا ہے۔ اس [illegible] ایک گونج سی پیدا ہوئی۔

"جیلر حضرات! میں باہر کی دنیا سے بول رہا ہوں" [illegible] نے خوش دلی سے کہا۔ "آپ لوگ اتنے گم صم کیوں ہیں؟ گپ شپ کریں۔ اتنے لوگ ہیں اور سب چپ [illegible] نہیں تو خدا کا شکر ہی ادا کریں کہ موت اتنی قریب [illegible] ٹل گئی۔ صرف اس لیے کہ ہم کچھ رحم دل ہیں اور بے [illegible] نہیں کرتے۔ یقیناً آپ سب کو بہت احتیاط کے ساتھ [illegible] کیا گیا ہو گا۔ آپ سب جرأت اور ہمت میں لاثانی ہوں [illegible] اور ممکن ہے تربیت یافتہ کمانڈو ہوں لیکن اس وقت تو چوہوں کی طرح اس چوہے دان میں بند ہیں۔ میرے پاس اسٹین گن ہے۔ اس کا ایک راؤنڈ چلا دوں تو گولیاں دونوں طرف سے نکلیں گی۔ آپ سب کی ارواح جنت کے [illegible] سے آپ میں سے کسی کا پیشاب تو خطا نہیں ہو گیا؟"

میرے الفاظ کا فوری ردِ عمل ہوا۔ اندر سے کسی نے باکس پر سر یا مکا مارا اور مجھے ایک فحش ترین گالی دی۔ "[illegible] سور مار! میں توں کلے توں پار آں دے۔ [illegible] تیرے میں رہ ساں تینوں۔" پھر اندر سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ ایک شخص بولنے سے سب کی موجودگی کا راز فاش ہو گیا تھا۔ اسلحہ یقیناً ان کے ساتھ تھا لیکن وہ مجھے دیکھے بغیر استعمال کرتے۔ اس کے علاوہ انہیں نقل و حرکت کے لیے جگہ [illegible] احتیاطاً میں نے اپنی جگہ بدل لی اور بچ گیا۔ کسی نے اندھا دھند فائر کیے اور گولیاں ٹین کی چادر میں سوراخ کرتی نکل گئیں۔ صندوق میں نظر آنے والے چھید مختلف فاصلوں پر دائرے بنا رہے تھے اور اگر میں پرانی جگہ پر ٹھہرا رہتا تو کسی گولی کا نشانہ ضرور بن جاتا۔ [illegible] نے اسٹین گن کا ایک برسٹ مارنے کا سوچا اور پھر ارادہ بدل دیا۔ [illegible] والوں نے خود ہی اشتعال میں پاگل ہو جانے والے [illegible] تھا۔ ان کی بالائی سمت اور اس محدود جگہ میں رہنے والی [illegible] کی آوازوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ [illegible] سے سننے والوں کے کان وقتی طور پر بہرے ہو گئے ہوں گے مگر یہ آوازیں باہر بھی سکوتِ شب کو منتشر کر چکی تھیں۔

"خبردار جو پھر کسی نے یہ حرکت کی۔ مجھوں کے [illegible]

[illegible] میں نے مڑ کے کہا اور [illegible] گھوم گیا۔ اب شیخ کی مخالفت [illegible] سب کو میں نے [illegible] صندوق کے پیچھے کھڑا تھا۔ میں نے شیخ کو لاش [illegible] باہر نکلتے دیکھا۔ لاش بالکل اکڑ گئی تھی چنانچہ اسے ایک تختے کی طرح غالب نے بھی سہارا دے رکھا تھا۔ قریب آنے پر شیخ نے مجھے یوں دیکھا جیسے مجھ سے صندوق نہ کھولنے کی وجہ جاننا چاہتا ہو۔

"لاش کو اوپر پھینکو اور ٹرک میں لمبائی کے رخ ڈال دو۔" میں نے کہا۔

"صندوق میں رکھ جاتے تو اچھا تھا۔" شیخ نے دبی آواز میں کہا۔

"کیا اچھا ہے اور کیا برا، یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے بھی اکڑی ہوئی لاش صندوق میں نہیں آ سکتی۔ اس میں پہلے ہی کافی لاشیں ہیں۔"

"لاشیں! کیا تم نے ان سب کو مار دیا ہے؟ جیسے؟" شیخ چلایا۔

"تم کو یقین نہیں تو ادھر سے آ کے یہ سوراخ گن لو۔" میں نے صندوق کی طرف اشارہ کیا مگر اندر والوں نے گالیاں دے کر او مجھے چلا کر مجھے جھوٹا ثابت کر دیا۔ غالب اور شیخ نے لاش کو دیکھے بغیر ٹرک کی دیوار کے اوپر سے گرا دیا۔

"تم پیچھے جاؤ" میں نے شیخ سے کہا "اور مرزا غالب! ٹرک میں دوسری لاش کو لٹانے کے لیے بہت جگہ ہے۔ خیال رکھنا، پہلے ہمارے دوست تھے۔" میں نے شیخ کی طرف اشارہ کیا جو اوپر چڑھ چکا تھا۔

"شیخ صاحب سے رحم دلانہ کی۔ شکر ہے زندگی تباہ کی۔" مرزا غالب نے شیخ کے سامنے بیٹھ کر کہا۔

"میں سب کو ٹھکانے لگا کے آتا ہوں۔" میں نے [illegible] آواز دے کر کہا۔ "محسن میرے ساتھ جا رہا ہے۔"

جب میں نے ٹرک کو اسٹارٹ کیا تو ارد گرد کے رہنے والے وڈیروں کے ملازموں نے سر نکال کر ایک دوسرے سے پوچھا ہے تھے کہ [illegible] جیسی کسی بزرگ واسطے کہا۔

"بچاتے میں جا جا پہنچتے" ایک نوجوان نے اعلان کیا۔

"کیوں؟ تمہیں سے بے چوری جیج دے۔ سور دے پتر!" [illegible] اعلان پہ تیج پا ہو کے کہا۔ "یہ عنایت گولیاں [illegible] واردات سے اچھے وقت پہ تو ہو نکل گئے [illegible] نے ٹرک کا نمبر نوٹ کیا۔ ٹرک بھی خود سے نہیں دیکھا تھا۔

"شیخ نے کسی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" محسن متفکر لہجے میں بولا۔ "[illegible] محسن کے ساتھ اور نہ ہمارے ساتھ۔"

"اس کے اعمال کو اپنے ضابطۂ اخلاق پر پرکھو۔" میں نے کہا۔ "یہ سوچ لے کہ اب کیا کرنا ہے۔"

"شیخ کو کسی بھی جگہ اتار دیں۔ جہاں سے وہ فوراً کچھ نہ کر سکے" محسن بولا۔ "اس نے جگہ دیکھ لی ہے۔ صبح ہونے سے پہلے سارے لاہور کی پولیس کے ساتھ یہاں گھیرے گا۔"

"ابھی نہ سہی صبح تو ہمیں ٹھکانا بدلنا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "غالب کی حماقت سے اچھی خاصی محفوظ جگہ بھی گئی اور اسلحہ ہزار بھی گئے۔"

"وہ کون سے ہمارے تھے۔ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔" محسن بولا۔ "جگہ بھی دوسری مل جائے گی۔"

"میں جگہ کے بارے میں نہیں، نازو کے بارے میں متفکر ہوں" میں نے کہا۔ "ہم اسے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔"

"تو کیا اسے چھوڑ دیں گے؟ کیا کیل بھی تمہیں چھوڑ دے گا نورِ چشم؟" محسن بولا۔

"یہ تو مجبوری ہے۔ نازو کی وجہ سے ہمارے لیے خطرات میں اضافہ ہو جائے گا۔ ہمارے دشمن بڑھ جائیں گے لیکن اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہوگی کہ نازو کے والدین کو بیٹی کی یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ ان کی رسوائی الگ ہوگی اور ہمارے دشمن ان کے بھی دشمن ہو جائیں گے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا ہوں گا کہ انہیں اس عمر میں ناکردہ گناہوں کی سزا ملے۔ میں نازو کو مجبور کر دوں گا کہ وہ واپس جائے۔"

"وہ جبر کے آگے جھکنے والی لڑکی نہیں ہے۔"

"ایسی کی تیسی جبر کرنے والے کی۔ اور یہ جتنی اس کو ماں باپ کے گھر پہنچانا ہے۔ سمجھا دیں گے" میں نے کہا۔ "بڑی خوشی سے نہیں جائے گی تو بہانہ بنا کے چھوڑ آئیں گے۔ آگے وہ خود سنبھالیں گے اور نازو جائے گی بھی کہاں۔ ہم پھر روپوش ہو چکے ہوں گے۔ اگر اسے ہمارے لیے کچھ کرنا ہی ہے تو پھر وہی کرے جو اسے سمجھا دیا گیا ہے۔"

"اس پروگرام میں شیخ بھی شامل تھا۔" محسن بولا۔ "نازو کے ساتھ۔"

"نازو چاہے تو اکیلی بھی وہ کام کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "شیخ کی اہمیت پہلے بھی ثانوی تھی۔"

"مگر یہ ناممکن ہوگا۔ کیونکہ شیخ اسے اجازت دے گا کہ وہ ہمارے لیے کام کرے اور دلاور کے کیمپ میں گھس جائے۔ اس کی سیکریٹری بنے۔ چوہدری دلاور جیسے افراد کی سیکریٹری کوئی نیک نام نہیں ہوتی۔" محسن نے کہا۔

"یہ بات تو ہے۔ اگر شیخ نے مخالفت کی تو نازو کچھ نہ کر

www.paksociety.com

سکے گی۔ خیر وہ پھوڑ کرے۔ اس کا کچھ نہ کیا جانا ہمارے لیے کچھ کرنے سے بہتر ہوگا۔" میں نے کہا۔

اس وقت رات کے ساڑھے نو بجے تھے جہاں صبح میری اور نازو کی چوہدری دلاور کے ساتھیوں سے دست بدست جنگ ہوئی تھی، وہاں اب اندھیرا تھا اور ویرانی تھی جس میں وقفے وقفے سے گزرنے والی کوئی گاڑی خلل انداز ہوتی تھی۔ وہاں اب کوئی لاش نہیں تھی۔ پولیس نے ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد اس شخص کی لاش مردہ خانے بھجوا دی ہوگی جس کی گردن فٹ پاتھ سے ٹکرانے کے بعد ٹوٹ گئی تھی۔ دوسرا مجروح تھانے میں خودکشی کر چکا تھا اور شاید اس کی لاش بھی اپنے ساتھی کی لاش کے ساتھ میو اسپتال کے مردہ خانے میں پڑی تھی۔ صبح تک اس تیسری لاش کو بھی وہیں پہنچنا تھا۔ میں نے ٹرک روکنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا کہ چوہدری دلاور کے سیکرٹری کی لاش کو کس بنگلے کی دیوار کے سامنے میں یا جھاڑی کے پیچھے ڈالنا مناسب ہوگا۔ اسی وقت میں نے غالب کے چلانے اور پھر فائر کرنے کی آواز سنی۔

جیپ میں چھلانگ مار کے اترا تو مجھے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں دو سائے ایک دوسرے کے تعاقب میں رواں نظر آئے۔ بلاشبہ ان میں جو آگے تھا وہ ایس آئی اکرام شیخ تھا۔ وہ نہ جانے کیسے غالب کو چکمہ دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ جسمانی طور پر زیادہ مستعد اور پھرتیلا تھا لیکن یہ کام ذہانت کے بغیر ناممکن تھا۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ چالیس برس کی عمر کی بہترین [illegible] حاصل کر چکا تھا۔ اب وہ چالاکی سے کام لیتے ہوئے سیدھا دوڑنے کے بجائے لہراتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو یقیناً پہلی گولی کا نشانہ بن جاتا۔ ہماری فردِ جرم تو پہلے ہی کم طویل نہیں تھی۔ اس میں قتل یا اقدامِ قتل کے ایک اور الزام کا اضافہ کسی صورت مستحسن نہ تھا۔ اس الزام کی سنگینی یوں بھی زیادہ ہو جاتی کہ جس پر گولی چلائی گئی تھی وہ پولیس آفیسر تھا۔ اس کا مستعفی ہونا اور معطل ہونا تو [illegible] ہر قسم کی امداد و حمایت کے ہاتھ سے پیچھے لگایا گیا تھا۔ وہ دوسرے گروہ کا شکاری تھا جو خود کو قانون کا محافظ سمجھتے تھے اور جیسے قانون شکن شکاریوں کے اس دوسرے گروہ میں سب دشمن نہیں تھے۔ ان میں اگر اکرام شیخ جیسے پرائے اور مخلص دوست شامل تھے تو انکل رضوی جیسے مہربان اور شفیق لوگ بھی تھے جن کی عنایات اور محبتوں کا بدلہ نہ تھا۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ شیخ اور انکل رضوی اپنے فرائضِ منصبی کے باعث انہی کا ساتھ دیتے تھے جو روزِ اول سے میری دشمنی پر مامور تھے۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی میرا واسطہ شکاریوں کے پہلے گروہ کے نمائندے اشتیاق پیرزادہ سے پڑا تھا جو مجھے میری شرافت کے قتل میں ملوث کرنے پر مامور تھا اور اس نے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا تھا۔ پھر مجھے دوسرے شکاری لے گئے تھے جن میں انسپکٹر حشمت خان سے ڈی ایس پی سراج تک مختلف سطح کے لوگ تھے اور انھوں نے بھی مجھے زیرِ دام لانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ پہلی قسم کے شکاری بھی چوہدری دلاور کے زرخرید تھے اور دوسری قسم کے شکاری بھی اسی کے حکم کے تابع تھے جو ایک طرف عوام کے ٹیکس سے بھرنے والے خزانے سے تنخواہ وصول کرتے تھے کہ عوام کو قانون کے ذریعے جان و مال اور آبرو کا تحفظ فراہم کریں مگر دوسری طرف چوہدری دلاور جیسوں سے ضمیر فروشی کا معاوضہ وصول کرتے تھے کہ اگر کوئی قانون کا نام بھی لے تو اس کی زبان بند کر کے حوالات میں ڈال دیں یا اسے کاٹ دیں۔

چنانچہ اب صورتِ حال یہ تھی کہ ہمارے دونوں طرف شکاری تھے۔ ایک وہ شکاری تھے جو کہتے تھے کہ خود کو قانون کے حوالے کردو اور انصاف کے عمل کی بالادستی قبول کرو۔ دوسری طرف وہ شکاری تھے جو کہتے تھے کہ قانون کیا ہے، قانون ہماری طاقت ہے اور ہماری دولت کی قوتِ خرید کا نام ہے اس لیے یا تو ہمارا ساتھ دو ورنہ ہم اسی قانون کے ہاتھوں تمھیں نیست و نابود کرادیں گے جس کو تم اپنا محافظ سمجھتے ہو۔ یہ اللہ کا کرم تھا یا قدرت کا انتظام تھا کہ جس نے ہمیں دونوں جانب سے [illegible] کا شعور عطا کیا تھا اور اپنی حفاظت آپ کرنے کا اہل بنایا تھا۔ شکاریوں کے ایک گروہ میں جو تمام تر جرائم پیشہ، کاروباری، زر پرست اور انسانیت سے دشمنی رکھنے والے افراد کا گروہ تھا، نازو اور غلام حسین جیسے افراد بھی شامل تھے جو اپنی جان دے کر اصول کی سچائی اور وفاداری کی عظمت کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔ اسی طرح شکاریوں کے دوسرے گروہ میں سب برائے فروخت نہیں تھے۔ ان میں اکرام شیخ اور انکل رضوی جیسے بھی تھے جو فرض شناسی اور اصول پرستی کی راہ میں کسی رشتے کو اور اپنی ذات کی کسی انسانی کمزوری کو حائل نہیں ہونے دیتے تھے۔ تاہم ایسے اصول پرستوں کا تناسب کم تھا۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کا تیسرا ایک نشانہ تھا اور ان سب کا شکار ہم تھے جو حق اور انصاف کے لیے لڑ رہے تھے اور ہمارے دو مقاصد واضح تھے۔ ایک یہ کہ اس پورے نظام کی سازش کو ناکام بنا دیں جو ہمیں مجرم ثابت کرنے کے لیے ہمارے خلاف بے بنیاد شہادتوں کا سلسلہ بہت دراز کر چکا تھا اور مجرم ثابت کرنے والے جھوٹے گواہ دنیا کے بازار میں [illegible] سے دستیاب تھے۔ ہمارا دوسرا مقصد انھیں مجرم ثابت کر کے کیفرِ کردار تک پہنچانا تھا جو ہر شیطانی خصلت کا مظاہرہ کرنے کے باوجود عزت داروں میں شمار ہوتے تھے کیونکہ وہ اپنے جرم کی شہادت اور ہر گواہ کو سامنے آنے سے قبل ہی ختم کردینے کی طاقت رکھتے تھے۔ ظاہر ہے ہم انھیں قصوروار نہیں کہہ سکتے تھے جو انصاف کے فیصلے سناتے تھے کیونکہ وہ غیب کا علم نہیں رکھتے تھے اور دلوں کے بھید نہیں جانتے تھے۔ وہ اپنی سمجھ بوجھ کو گواہوں اور شہادتوں تک محدود رکھنے پر مجبور تھے۔

لیکن ہم مجبور نہیں تھے چنانچہ ہم خدا کی عطا کردہ عقل کی روشنی میں اور ضمیر کی رہنمائی کرنے والی قوت کے سہارے یہ دو طرفہ جنگ لڑ رہے تھے اور ہر طرف سے محصور کرنے والے شکاریوں کے خلاف نبرد آزما تھے۔ ہماری تنظیم "ایم آر ایس" کا بنیادی مقصد تحریبی نہیں تعمیری تھا۔ ہم انصاف کو بزورِ بازو حاصل کرنا چاہتے تھے کیونکہ ہم قانون کی مجبوریوں کو سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہم ان سب کو سزا دینا چاہتے تھے جو سزا کے مستحق تھے مگر سزا سے بچے ہوئے تھے کیونکہ وہ قانون کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے۔ اس طرح ہم بھی شکاری تھے مگر ان کے جو شرافت اور انسانیت کے دشمن تھے۔ ان کے جو آدمی کے ضمیر کو بھی بازار کی جنس جانتے تھے۔ سچائی کو قابلِ شکست سمجھتے تھے اور خود کو فرعون۔ ہم ان کے شکاری تھے جو کمزوروں کا شکار کرتے تھے۔ ہم ان سب کے شکاری تھے جو انصاف کے طلبگاروں کا شکار کرتے تھے، ظلم کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کا شکار کرتے تھے۔ ہم حیوانی جبر و دہشت اور استحصالی قوت کا شکار تھے مگر پھر بھی ہم ان کے لیے شکاری تھے۔ بازی اب پلٹ رہی تھی۔ چوہدری دلاور کا قبیلہ ہمارا شکار تھا اور اس میں ان کے تمام زرخرید شامل تھے۔ پولیس ہمارے لیے شکاری تھی کیونکہ ہم اپنے خلاف مختلف دفعات کے تحت درج ہونے والی رپورٹوں کے مطابق مفرور اور مطلوب مجرم تھے اور ہم جیسی بے گناہوں کی ساری طاقت ان کا خصوصی ہدف تھا۔ اس پر یقینِ کامل تھا جسے نہ خریدا جا سکتا تھا نہ ہی اس ذات پر اعتماد تھا جس کا بچانے والا مارنے والے سے ہمیشہ زیادہ طاقتور رہا ہے۔ ہم سب شکاریوں کے شکاری تھے۔

اس وقت ہم پولیس کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہونے سے بچ گئے تھے مگر ابھی ہم خطرے کو اپنے ساتھ لیے پھر رہے تھے اور ہر گز خطرے سے باہر نہیں تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ غالب کے ہاتھوں شیخ مارا جائے اور یہ بھی کسی طرح قبول نہیں کر سکتا تھا کہ صورتِ حال اس کے برعکس ہو۔ غالب اپنے دفاع کا حق استعمال کیے بغیر مارا جائے اور ہم ایک اچھے دوست کے سہارے سے محروم ہو جائیں۔ میں نے ٹرک کی دوسری جانب سے محسن کو دوڑتے دیکھا۔

"غالب! گولی مت چلانا۔" محسن نے چلا کر کہا۔

غالب کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ ہماری نظر کے سامنے شیخ نے جست لگائی اور ایک بنگلے کی دیوار پر چڑھ گیا۔

"اب یہاں ٹھہرنا بہت خطرناک ہو گیا ہے محسن۔" میں نے محسن کا بازو تھام لیا۔ وہ حرکت میں تھا۔ اس جھٹکے سے وہ خود بھی نہ سنبھل سکا اور میں بھی اس کے ساتھ گرا۔ اس اتفاق نے ہماری جان بچالی۔ شیخ نے دیوار پر رک کر فائر کیا اور گولی ہمارے اوپر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے بے اختیار اپنا ریوالور اٹھا کے فائر کر دیا حالانکہ ابھی چند لمحے قبل میں خود ہی غالب کو اس حرکت سے روکنے کے حق میں تھا۔ جب اپنی زندگی کے وجود اور عدم کا مرحلہ آیا تو عقل کی کوئی دلیل کام نہ آئی۔

"یہ تو نے کیا کیا؟" محسن نے میری کلائی تھام لی اور دیوار کی طرف دیکھا۔ اس پر کھڑا ہوا اکرام شیخ کا سایہ جو رات کے اندھیرے سے جدا نظر آتا تھا غائب ہو چکا تھا۔ "تو نے اسے مار دیا؟"

"ہو سکتا ہے وہ اندر کود گیا ہو۔" میں نے کہا۔ گرنے کے بعد ہم غالب کے قریب ہو گئے تھے۔ "تم نے مجھے روک دیا تھا ورنہ وہ بچ سکتا تھا؟" غالب نے ہمارے قریب آتے ہوئے کہا۔ جوابی فائر کی آواز پر وہ فوراً لیٹ گیا تھا اور دوسری بار شاید صحیح نشانہ لینے کے موڈ میں تھا مگر محسن کی آواز پر اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا تھا۔

"میں نے بھی اس کا صحیح نشانہ نہیں لیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ بس جوابی کارروائی تھی۔"

"اب جیسے بھی ہو یہاں سے نکلو۔" محسن نے اٹھ کر کہا۔ اسی وقت شیخ کی چلائی ہوئی گولی نے رات کے سکوت کو منتشر کر دیا۔

"شیخ اس بنگلے کے اندر موجود ہے۔" میں نے محسن کو پکڑ کر زمین پر کھینچ لیا۔ "آگے جھک کے جاؤ۔" "اس کے پاس ریوالور کہاں سے آیا سکندر؟" محسن بولا اور میرے ساتھ رینگنے لگا۔

"واقعی۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"مرزا غالب! تم بیٹھے تھے اس کی نگرانی کے لیے۔"

"وہ... اس نے بڑا دھوکا دیا... بہت عیار آدمی ہے۔" غالب نے خفگی سے کہا۔ "مجھ سے کہنے لگا کہ اُدھر لاش پڑی ہے اور جگہ کم ہے۔ کیا میں ڈرائیور کے کیبن میں ریوالور کے ساتھ بیٹھ جاؤں؟ میں نے اسے صاف بتادیا تھا کہ چالاکی سے کام لوگے تو تمھارا یہ

www.paksociety.com

فعل جو دکشی کہلائے گا۔ مگر وہ میری بات ختم ہونے سے قبل ہی سرک چکا تھا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اس نے کسی خفیہ جگہ سے کوئی ریوالور برآمد کر لیا۔ اس صندوق کے نیچے سے یا کسی خفیہ خانے میں ہاتھ ڈال کے۔ بس میں اس کے ہاتھ کو حرکت کرتے نہ دیکھ سکا۔ بہت آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھایا ہوگا اس نے۔ ریوالور ہاتھ میں آتے ہی اس نے چھلانگ لگا دی۔ اس وقت ٹرک بھی رک چکا تھا۔"

"چلو جو ہوا سو ہوا۔ اب کیا کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ ہم تینوں ایک جھاڑی کے عقب میں کچی زمین پر پیٹ کے بل لیٹے ہوئے اور کیچوے کی طرح اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے تقریباً دس گز کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ رگڑ سے میری کہنیاں چھل گئی تھیں اور جب میں تھوڑا سا آگے کو کھسکتا تھا تو سخت زمین مجھے شیشے کی کرچیوں کا فرش لگتی تھی۔

"شیخ ہمیں دھوکا دے رہا ہے۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ وہ ابھی یہی ظاہر کرے گا کہ وہ بنگلے کی دیوار کے پیچھے موجود ہے اور پھر اچانک غائب ہو کے اندر چلا جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اور اندر سے وہ بہ آسانی پولیس ہیڈ کوارٹر فون کر دے گا۔" غالب نے کہا۔ "آخر وہ ایک پولیس افسر ہے اور اپنے با اختیار ہونے کا ثبوت بھی دے سکتا ہے۔ اس قسم کی کوٹھی میں فون نہ ہونے کا کوئی سوال نہیں۔"

"وہ ہمیں فائرنگ کر کے اسی جگہ دبکے رہنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اسے یقین ہوگا نا کہ جب تک ہم ٹرک میں رکھی ہوئی لاش کو ٹھکانے نہیں لگا دیں گے، واپس نہیں جائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"اور جتنی دیر میں پولیس یہاں منٹ بھر میں پہنچ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "شیخ جانتا ہے کہ ہم کہاں ہیں۔"

"پولیس کے آتے ہی وہ ہر طرف سے ناکہ بندی کرا دے گا۔ ہم محصور ہو جائیں گے۔" غالب نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"اس ٹرک کے اندر رکھے ہوئے باکس میں کم سے کم چھ مسلح سپاہی ہوں گے۔" محسن نے کہا۔ "بھاگنے کے بجائے اگر شیخ ایک فائر سے تالا توڑ دیتا تو باکس میں بند سپاہ باہر آ جاتی۔ پھر ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔"

"مقابلہ کرنا پڑتا تو ضرور کرتے۔ اتنی آسانی سے خود کو ان کے سپرد نہ کر دیتے۔ بلا سے ہم تینوں مارے جاتے اور وہ سب۔" میں نے کہا۔

"اب دیر سے کچھ حاصل نہیں۔ لاش بڑی کا بہت دل رہا۔" میں نے پیچھے دیکھ کر کہا۔ "ہم نکل جاتے ہیں۔ پولیس یہاں سے سیدھی اُدھر جائے گی جہاں رابعہ اور خواجہ نبیک ... ہماری عافیت واپسی کے لیے دعا گو ہیں۔"

ہم تینوں ایک ساتھ اٹھے اور بھاگے۔ کوئی گولی ہمارے تعاقب میں نہیں آئی۔ ٹرک اب ہم سے سو گز کے فاصلے پر تھا۔ بظاہر شیخ ہمارے اندازوں کے مطابق ٹیلی فون کر چکا تھا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا اور ہمیں بہت دور پہنچنا تھا۔

گورنر ہاؤس سے بہت پہلے ایک ٹیکسی ہمارے قابو میں آ گئی۔ اس کا ڈرائیور رات کے وقت کسی ایسی جگہ جانے پر رضامند نہ تھا جہاں سے واپسی کی سواری ملنا یا خود واپسی مشکل ہو۔ لیکن ہم نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ منہ مانگی قیمت پر تیار نہ ہوا تو ہم اُسے زبردستی لے جائیں گے اور پھر منہ مانگی قیمت دے کر چھوڑیں گے۔ ہمارے لہجے سے زیادہ اسے ریوالور کے نظارے نے قائل کیا جو مرزا غالب نے اسے دکھا کے پھر جیب میں رکھ لیا تھا۔ سارا راستہ وہ ہماری منت سماجت کرتا رہا۔

"دیکھو ڈاکو صاحب... آپ شہنشاہ لوگ ہو۔ دس سال کا بیٹا ہے، دو وسیلوں کی ٹیکسی چلاتا ہوں۔ پھر یہ ٹیکسی بھی قسطوں پر لی تھی۔ ابھی صرف دو مہینے پہلے قرضہ ختم ہوا ہے۔ اب آپ لوگ اس کو کسی واردات میں استعمال کرتے ہیں تو میں پھنس جاؤں گا۔ ٹیکسی پہلے پکڑی جائے گی۔ میں اس کے بعد پکڑا جاؤں گا اور اس کے بعد... اللہ توبہ... پولیس مجھ سے آپ لوگوں کا پتا پوچھے گی۔ میں کیا بتاؤں گا؟"

"ہم تمہیں اپنا پتا بتا دیں گے۔ پریشانی کی کون سی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ مذاق کرتے ہو جی... پولیس والے تو یہ بھی کہیں گے کہ میں بھی آپ کا ساتھی تھا۔" وہ تقریباً رونے لگا۔ "جیل جانے کے بعد بھی وہ میری بات کا یقین نہیں کریں گے۔ اگر تب بھی ٹیکسی تو گئی نا رشوت میں۔"

"یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟" غالب نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"بس جی آپ مجھے بخش دیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا اور جلدی سے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

"ایسے ہم کس کس کو بخشتے رہیں گے۔" محسن نے کہا۔ "کب تک؟"

"ہاں۔ صبح سے تین کو تو بخش چکے ہیں۔ ایسی ہی وارداتیں اپنی پہ" میں نے کہا۔ "اتنے رقیق القلب لوگ ہیں ہم۔"

"جبھی یہ ڈاکا ڈالنے والے قتل بھی تو کر دیتے ہیں۔" غالب نے ہمیں یاد دلایا۔

ٹیکسی ڈرائیور چلانے لگا۔ "حضور ڈاکو صاحب! میری بیٹا یتیم ہو جائے گی۔ بچے بیوہ ہو جائیں گے۔"

"اچھا بھئی! تم کو بھی بخش دیتے ہیں۔" میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "بس اسی جگہ ٹیکسی روک دو۔ ہم اتر جاتے ہیں۔ یا تو دیکھتے ہیں کوئی دوسری گاڑی مل جائے۔" ٹیکسی ڈرائیور کی بدحواسی پہ غالب کو ہنسی آ گئی۔

"اس مرتبہ کوئی ایسی ٹیکسی روکنا جس کا ڈرائیور اتنا بزدل نہ ہو اور بخشش جیسی بات نہ کرے۔" محسن نے مجھے ڈانٹا۔ ٹیکسی والے نے ہم سب کو مشکوک نظروں سے دیکھا اور ٹیکسی روک دی۔ نہ ہماری صورت ڈاکوؤں والی تھی اور نہ گفتگو۔ جب نیچے اتر جانے کے بعد ہم نے اسے پچاس کا نوٹ دیا تو اس کا شرمندگی سے برا حال ہو گیا۔ اس نے ہمیں بڑی بے یقینی کے ساتھ دیکھا۔

"آپ تو... شریف آدمی ہیں... میں بڑا گھبرا گیا۔ آپ لوگوں کو ڈاکو سمجھا تھا۔"

"ہم شریف ڈاکو ہیں گدھے۔" محسن نے گرج کر کہا اور ٹیکسی ڈرائیور ہوا ہو گیا۔ وہ بیرک ہمیں اپنے سامنے مشکل سے پچاس گز کے فاصلے پر دکھائی دے رہی تھی جہاں سے ہم ڈیڑھ گھنٹا پہلے روانہ ہوئے تھے۔

"کیا ہم رات کو یہاں قیام کریں گے؟" غالب نے کہا۔

"اگر ہم بے وقوف ہیں تو اتنے نہیں ہیں۔" محسن نے برا منہ بنا کر کہا۔ "سب بندوبست رکھتے ہیں۔"

"عزیزم! ہم اگر جائیں گے تو کہاں جائیں گے اور کیسے جائیں گے؟" میں نے کہا۔

"ایک صورت تو یہی ہے کہ ہم داد شجاعت دیتے ہوئے جیل یا جام شہادت نوش کریں۔" محسن بولا۔ "دوسری صورت یہ ہے کہ کسی ٹریول ایجنسی کو فون کر دوں۔ ہم کوئی چارٹرڈ پلین منگوائیں اور یہاں سے جا کر قطب شمالی پر پیراشوٹ سے اتر جائیں۔"

"تیسری اور آخری صورت بھی بتا دو ورنہ تیری صورت بگاڑ دوں گا۔" میں نے کہا۔

"تیسری آسان سی صورت یہ ہے کہ ہم اپنا بوریا بستر یہاں سے بھی گول کریں۔ ہمارے مقدر میں ہی خانہ بدوشی ہے اور زمین کے کسی گوشے میں پناہ نہیں ہے۔" محسن بولا۔ "آج سے پہلے کب سوچا تھا کہ ایک جگہ سے اٹھے تو پھر کہاں بیٹھیں گے۔ چلے جائیں گے کہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن ہمارا اسباب۔ اور اہلِ خانہ۔" میں نے کہا۔ "دو زنانہ سواریاں بھی تو ہیں۔"

"ان میں ایک یرغمالی ہے۔" محسن بولا۔ "اسے ہم یہیں چھوڑ جائیں گے۔"

"اور اگر وہ نہ رکی۔" غالب نے کہا۔

"اس کا تو باپ بھی رکے گا۔" میں نے کہا۔

"بھائی تو رکا نہیں، باپ کیسے رکے گا۔" غالب نے جل کر کہا۔

"تم لوگ اسباب سمیٹو۔ میں ایک بار مس پاور کی دولت راس لاتا ہوں۔" محسن نے کہا اور دروازے کے قریب سے پلٹ گیا۔ ہماری آواز نے اندر رابعہ کو متوجہ کر لیا تھا۔ اس نے دستک سے پہلے خود ہی دروازہ کھول دیا۔

"خیریت رہی نا؟" رابعہ نے کہا۔

"خیریت... یہ تو اس مار دھاڑ اور دھوکے فریب سے بھرپور حسینہ سے پوچھو۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"مجھے الزام مت دو۔ اس نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ میں نے اسے سزا دی اور اس کو چھوڑ دیا۔" نازو غرائی۔

"وہ الگ بات ہے۔ اس نے تمہیں سامنے رکھ کر اعتماد حاصل کرنے کا ڈراما کیا تھا۔ تمہیں کوئی سزا ہونی چاہیے یا نہیں؟" میں نے کہا۔ "اور تمہاری معصومیت نے مجھے بھی دھوکا دیا بلکہ ہم سب کو دھوکا دیا۔"

"یہ تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔" وہ چلائی۔ "کیا مجھے سب کچھ معلوم تھا؟"

"ہاں تم کو سب کچھ معلوم تھا۔ اسی لیے تم نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا اور اچانک اپنے ساتھ بھائی کو لے آئیں۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "تم نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ آخر کیوں؟"

"سکندر! تمہاری قسم..."

"میری قسم کوئی چیز نہیں۔ تمہاری یہ بات میں نہیں مان سکتا کہ تمہارے بھائی نے سازش کا اتنا بڑا جال پھیلایا۔ اس نے تم کو یقین دلایا کہ وہ مستحق ہو چکا ہے۔ اس نے تمہیں قائل کر لیا کہ وہ تمہاری خاطر ہمارا ساتھ دینا چاہتا ہے۔ وہ پورا بندوبست کر کے یہاں تک

www.paksociety.com

آپہنچا اور تم کو خبر نہیں ہوئی۔ میں سمجھتی ہوں تم اتنی نادان تو نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

"کیا تم بھول گئے ہو کہ اس نے میری جان تک لینے کی کوشش کی تھی۔" نازو ہسٹریا میں مبتلا ہونے لگی۔

"لیکن نادم نہیں تھا اور سیدھی صاف بات یہ ہے کہ تمہیں یرغمال بنا کے وہ مجھے پکڑنے کی کوشش آئندہ بھی کرے گا۔ میں یہ خطرہ کیوں مول لوں؟" میں نے کہا۔ "نہ تم سے رابطہ ہوگا نہ میرے لیے خطرے کی کوئی بات ہوگی۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں لیکن تم کو ساتھ نہ لے جا کر تمہیں۔ تمہارا بھائی کچھ دیر میں اپنی فوج کے ساتھ آ جائے گا اور ... ہو جائے گا۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" نازو نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بے یقینی بھی تھی، منت سماجت کا انداز بھی تھا اور کھلی دھمکی کا رنگ بھی۔ "میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ تمہارے ساتھ ہی مروں گی۔ تم اتنی جلدی بھول گئے کہ تم نے مجھ سے کیا کہا تھا؟"

"وہ حالات کچھ اور تھے جب ہم نے تمہیں بھی اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ "اور اب حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے تو ہم جانتے بوجھتے کنویں میں نہیں گر سکتے۔"

"تم نے تو ہماری آنکھوں جس کا مذاق اُڑایا تھا سکندر بادشاہ۔" شیدی بولا۔ "سب سے تو بتا رہا تھا کہ ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا اور تم نے دیکھا اگر مرشج نے محسن کو قائل کر لیا تھا کہ وہ بھی اب ہمارے ساتھ ہے اور یہ ایسے ہمارے پاس سے آئی۔"

"لیکن وہ دوبارہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔" نازو چلائی۔ "مجھ پر اعتبار کرو خدا کے لیے۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں دلاور کا اعتماد حاصل کروں اور اس کی سیکرٹری بن جاؤں۔ اور تمہیں اس کے عزائم سے باخبر رکھوں۔ میں اس سے بھی زیادہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"وہ سب کچھ اب ممکن نہیں رہا۔ تمہارا بھائی اس کی اجازت ہی نہیں دے گا اور اگر اس نے اعتراض نہ کیا تو صاف بات ہے کہ تمہیں خود ذریعہ بنا کر وہ ہم پر نظر رکھے گا۔ تم اس کا کام بہت آسان کر دو گی۔ ادھر تم نے ہم سے رابطہ قائم کیا ادھر اسے خبر ہو جائے گی۔ تمہارا ہم سے ملنا، ہمیں ٹیلی فون کرنا، کسی کی معرفت پیغام دینا یا کسی کو ہمارے پاس بھیجنا سب ہمارے لیے خطرے کا سامان ہوگا۔"

"جب بھی ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بھائی تو مجرموں کی جان کا دشمن ہو اور بہن انہی مجرموں کی آلۂ کار بنے۔ وہ بھائی بھی کوئی احمق نہیں ہے۔ تمہارے ہاتھ پیر بندھے ہیں مگر اس سے تم شیخ جیسے ہوشیار پولیس افسر کے ذہن کو شکست دینے کا سوچتی ہو تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم واپس جاؤ۔"

"میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ واپس نہیں جاؤں گی۔ تم مجھے زبردستی واپس نہیں بھیج سکتے۔" نازو چیخ کر بولی۔ وہ مقابلے پر آمادہ تھی اور اس کا مقابلہ صرف میں ہی کر سکتا تھا۔ اسی وقت محسن اندر آیا اور سب کو ساکت و صامت دیکھ کر ٹھٹکا۔

"تم لوگ سامان اٹھاؤ اور نکلو، میرا سوٹ کیس غالب اٹھا لے گا۔" میں نے کچھ دیر بعد پرسکون لہجے میں کہا اور نگاہ نازو پر رکھی۔

"شاہی سواری پیچھے کھڑی ہے۔" محسن نے کہا لیکن سب کی صورتوں پر تشویش آمیز سنجیدگی کم نہیں ہوئی۔

"درست کرو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "سامان نکالو، میری صورت مت دیکھو۔"

"کیا... تم... تم نہیں چلو گے؟" رابعہ نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "ان سب کو لے جاؤ اور میرا انتظار کرو۔"

نازو کی حالت میں رونما ہونے والا تغیر بہت واضح تھا۔ اس کی منت سماجت بھی رائیگاں گئی تھی اور دھمکی نے بھی کسی کو مرعوب نہیں کیا تھا۔ میرا درشت رویہ اسے سب کی نظروں میں ذلیل کر رہا تھا اور وہ ایسی لڑکی نہیں تھی جو اپنی شکست کے احساس کو کسی رد عمل کے بغیر تسلیم کر لے۔ اپنے عزم کا اظہار وہ پہلے ہی کر چکی تھی اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اپنی بات منوانے کے لیے وہ کس قسم کی احمقانہ جرأت کا مظاہرہ کرنے کی اہل ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی خوف ناک چمک پیدا ہوئی جو کسی چیتے کی آنکھ میں شکار پر جست لگانے سے پہلے نظر آتی ہے۔ اس کے جسم سے ایک کھنچاؤ کی کیفیت کا اظہار ہونے لگا اور اس کی نگاہ مجھ پہ مرتکز ہو گئی۔ میں نے محسن اور غالب کو سوٹ کیس اٹھائے احاطے کی طرف باہر جاتے دیکھا۔ رابعہ بدستور مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر بت بنی کھڑی تھی۔ شاید اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے چنانچہ وہ بے حد خوفزدہ تھی۔

"نازو! خدا کے لیے سمجھو۔" رابعہ چلائی۔

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" نازو نے اس کی طرف دیکھے بغیر خطرناک اور خیالات سے لہجے میں غرا کے کہا۔ "اور مجھے روک سکتے ہو تو چلاؤ مجھ پہ گولی۔ میرا بھائی مجھے نہیں تو میری لاش کو لے جائے گا۔"

میں نے اپنا ریوالور نکالا۔ "یہ مت سمجھنا کہ میں تم پر گولی چلانے کی ہمت نہیں رکھتا۔"

"سکندر!" رابعہ نے دہشت زدہ ہو کے چیخ ماری اور ایکدم آگے بڑھی۔ "پاگل ہو گئے ہو تم!"

ابھی وہ میرے قریب بھی نہیں پہنچی تھی کہ میں نے بائیں ہاتھ کو جھٹکے سے اسے پیچھے دھکیل دیا اور وہ دور جا گری۔ "اس بیوقوف عورت کو باہر لے جاؤ۔" میں نے شیدی کو مخاطب کر کے کہا جو بھاری بھرکم تجوری جیسے فولادی صندوق کو گھسیٹ کر باہر لے جانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور آہستہ سے سر ہلایا۔ پھر اس نے سہارا دے کر رابعہ کو اپنے پیروں پہ کھڑا کیا۔ رابعہ زار و قطار رو رہی تھی۔

"انہیں سمجھاؤ۔ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" وہ روتے روتے بولی۔

"سکندر سب ٹھیک کر لے گا، تم باہر چلو۔" شیدی اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے باہر کی طرف گھسیٹا۔ اس تمام عرصے میں میرے کان ہر آواز سنتے رہے اور میں ذہنی طور پر گرد و پیش سے غافل نہیں ہوا۔ میری نظر ایک لمحے کے لیے بھی نازو پر سے نہیں ہٹی اور نہ اسی لمحے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مجھ پہ جھپٹ پڑتی۔ محسن نے عقلمندی کی تھی کہ سب سے پہلے تمام اسلحہ سمیٹ لیا تھا سوائے اسٹین گن کے جو اس نے کندھے سے لٹکا لی تھی۔ سب ریوالور اس نے بیگ میں اٹھا کر اپنے سوٹ کیس میں بھر لیے تھے۔ نازو کو یقین آگیا تھا کہ اب میرے ارادے میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ عین اس وقت جب میں نے محسوس کیا کہ مایوسی کی انتہا کو پہنچنے کے بعد وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی ہے اور خوف کے احساس سے بیگانہ ہو کے مارنے یا مارے جانے کا فیصلہ کر چکی ہے میں نے اپنا ریوالور ایک طرف اچھال دیا۔ ریوالور پھسلتا ہوا گیا اور دیوار سے ٹکرا کے ایک ایسی جگہ پر ٹھہر گیا جو میرے اور نازو کے درمیان دس فٹ کے مساوی فاصلے پر تھی۔ میرا خیال تھا کہ میری چال کامیاب رہی کیونکہ نازو نے بڑی پھرتی سے گھوم کر جست لگائی اور ریوالور اٹھا لیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے نازو کو دبوچنے کے لیے جست لگائی مگر اس نے میری چال کو سمجھ لیا تھا۔ وہ ایک دم قلابازی کھا گئی اور اس کے پیروں نے مجھے اوپر سے گزار دیا۔ دیوار قریب نہ ہوتی تو میں دس بارہ فٹ دور تک چلا جاتا، کم فاصلے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ میرا سر دیوار سے نہیں لگا ورنہ تصادم کی قوت مجھے ہوش سے بیگانہ کر دیتی۔ میرے پیر دیوار پر پڑے۔ ناکامی کے احساس نے مجھے ایک دم چوکس کر دیا۔ میں بھول گیا کہ میرے مقابل ایک لڑکی ہے اور وہ لڑکی عام آدمی پر بھاری پڑ سکتی ہے مگر میری حریف ثابت نہیں ہو سکتی۔ میں نے دیوار کو پیروں سے دھکیلا تو اسپرنگ کی قوت نے مجھے واپس پھینکا اور میں نے سیکنڈ کے سویں حصے میں گھوم کر قدم زمین پر جماتے ہی نازو کی طرف الٹی قلابازی کھائی۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ میرے کھلے ہوئے پیروں کے درمیان آیا تو میں نے دونوں پنجے لاک کر کے شکنجہ سا بنا لیا اور نازو کی کلائی کو گرفت میں محسوس کرتے ہی جھٹکا دیا تو نازو کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ نصف دائرے میں گھوم کر گھسٹتی ہوئی مجھ سے تقریباً چھ سات فٹ تک دور گری۔ اگر اس کے بعد بھی وہ مقابلہ جاری رکھتی تو فیصلے میں چند سیکنڈ لگتے مگر نہ جانے کیسے اس کے ہاتھ میں آئے ہوئے ریوالور کا ٹریگر دب گیا۔ نازو نے ریوالور پر انحصار کرتے ہوئے پوری کوشش کی تھی کہ یہ ہتھیار اس کی گرفت سے نہ نکلنے پائے اور جیسے ہی موقع ملے وہ مجھے ہینڈز اپ کرا دے۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ خالی ہاتھوں سے میرا مقابلہ بے سود ہوگا۔ ریوالور مل جانے کے بعد طاقت کا توازن اس کے حق میں ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسے یہ موقع ملتا تو وہ کیا کرتی۔ کیا وہ سچ مچ مجھ پر گولی چلا دیتی یا صرف دھمکی پر اکتفا کرتی۔ وہ غیظ و غضب کے عالم میں بپھری ہوئی شیرنی بنی ہوئی تھی اور جب آدمی اپنی عقل سے زیادہ اپنی حیوانی جبلت سے مغلوب ہو تو وہ دوست دشمن یا اپنے پرائے میں تمیز کیسے کر سکتا ہے۔ غلطی مجھ سے ہوئی تھی کہ میں نے ریوالور پھینکتے وقت اس کے سیفٹی کیچ کو دیکھا نہیں تھا۔ ظاہر ہے سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا اور انگلی پر اتفاقیہ دباؤ سے گولی چل گئی۔

فائر کی آواز کا فوری رد عمل مجھ پہ ہوا۔ میں ایک دم ہوش میں آگیا اور میں نے اپنے جسم کی منہ زور وحشی قوت کو سرکش گھوڑے کی طرح عقل کی لگام کھینچ کر قابو میں کیا۔ سب سے پہلا خیال مجھے یہ آیا کہ نازو نے وہ گولی مجھ پر چلائی تھی لیکن اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ یہ ذہنی صدمہ بہت شدید تھا۔ اس نے مجھے اپنے دفاع کی خاطر رک جانے پر مجبور کر دیا۔ نازو اگر اس حد تک پاگل ہو چکی تھی تو اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ شکست تسلیم کرنے کے بجائے پہلے مجھے مار دے اور پھر خود کو۔ میرے ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھے مگر اس وقت جب میں نے دیکھ لیا کہ اس گولی سے خود نازو کو بھی کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ پھر باہر سے میں نے رابعہ کی چیخ سنی۔

"خبردار میرے قریب مت آنا۔" وہ ریوالور ایک ہاتھ میں تھام کر پیچھے ہٹنے لگی۔ "میں گولی چلا دوں گی سکندر۔" رابعہ طوفانی جھونکے کی طرح اندر داخل ہوئی۔ دوسرے لمحے میں وہ میرے سامنے تھی اور اس کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور

www.paksociety.com

وہ اپنے جسم کو سمیٹ کر بیٹھی ڈھال بنا چکی تھی۔ "اگر تم کو اتنا ہی شوق ہے تو اب پہلے مجھ پر گولی چلاؤ۔" اس نے چیخ کر کہا۔

نازو کے کپڑے پشت کی جانب سے پھٹ گئے تھے۔ اس کا دوپٹہ فرش پہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے بال پریشان تھے اور اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ لمحہ جو کسی کی جان کا طلب گار بن کے آیا تھا اپنا نشانہ لیے بغیر پلٹ گیا ہے۔ اس کے بعد آنے والا لمحہ پچھتاوا لے کر آیا تھا۔ پچھتاوا کچھ نہ کر سکنے کا اور پچھتاوا اس کا جو ہو چکا تھا۔ ریوالور اب نازو کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا اور وہ خود پلک جھپکائے بغیر رابعہ کو دیکھ رہی تھی۔

"نہیں، میں تم پر گولی نہیں چلا سکتی۔" شکست کے احساس سے دوچار نازو نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ اپنے بہادر بھائی کی بہن ہو۔" رابعہ نے تلخ اور نفرت کے زہر آلود لہجے میں کہا۔

"میرا بھائی واقعی بہادر ہے۔" نازو ایک دم ہنسی۔ اس کی ہنسی میں دیوانگی کی پکار تھی۔ "کون بھائی اتنا بہادر ہوتا ہے کہ اپنی ہی بہن پہ گولی چلا سکے اور یہ کام میں بھی کر سکتی ہوں۔ اس بھائی کی بہن پر میں بھی گولی چلا سکتی ہوں مگر میں اپنی ہار نہیں مان سکتی۔ میں ان سب کو شکست دے سکتی ہوں جو سمجھتے ہیں کہ جیت ان کی ہوئی ہے۔"

"ہار کیسی نازو؟" میں نے رابعہ کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا اور اسے ہٹا دیا۔ "یہ ہار جیت کا تو مسئلہ ہی نہیں۔"

"تمہارے لیے نہیں ہے لیکن میرے لیے ہے۔" وہ پھر ہنسی۔ "جب میں نے تمہارا اعتماد کھو دیا تو کیا یہ میری ہار نہیں۔ تم مجھے بھروسے کے قابل نہیں سمجھتے۔ تم سمجھتے ہو پولیس نے جانتے بوجھتے سب کو دھوکا دیا۔ تم مجھے بھی اس ڈرامے کا ایک کردار سمجھتے ہو جو میرے بھائی نے کیا تھا۔ تم سب کو یقین ہے کہ مجھے اپنے بھائی کے دھوکے کا علم تھا۔ تم یہ ماننے کو تیار نہیں کہ دھوکا میرے ساتھ بھی ہوا اور تم سب مجھ سے ڈرتے ہو۔ مجھے اپنے لیے خطرہ تصور کرتے ہو۔ مجھے ساتھ نہیں رکھنا چاہتے۔"

وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے اس پہ ہپناٹزم کا اثر ہو اور میں بڑی احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ رابعہ سانس روکے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ غالب اور محسن دروازے کے فریم میں ساکت کھڑے تھے۔

"رک جاؤ سکندر۔" نازو یکلخت ہوش میں آ گئی اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "مجھے معلوم ہے تم مجھ کو اپنے ساتھ نہیں لے جاؤ گے لیکن میں تم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکی ہوں۔ میں واپس نہیں جاؤں گی۔ بھائی میری لاش سے جا سکتا ہے میرے نہیں۔"

"ہم تمہیں ساتھ لے چلیں گے نازو۔" رابعہ نے کہا۔

نازو ہنسی اور مزید ایک قدم پیچھے ہو گئی۔ "تم بزدل ہو سکندر۔ اور جھوٹے ہو۔ نہ تم میں اتنی ہمت تھی کہ مجھے ساتھ رکھتے اور نہ تم میں مجھ پہ گولی چلانے کی ہمت تھی۔ تمہاری مشکل کو میں آسان کر دیتی ہوں۔" اس نے ریوالور اٹھایا اور اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔

"نازو! میری طرف دیکھو! میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"جھوٹ، اس وقت بھی جھوٹ بول کے بے وقوف بنانا چاہتے ہو مجھے۔" وہ ہنسی۔

"یہ جھوٹ نہیں ہے نازو۔ لاؤ یہ ریوالور مجھے دے دو۔" میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

نازو نے نفی میں سر ہلایا۔ "تاکہ پھر تم مجھے ناک آؤٹ کر کے یہیں چھوڑ جاؤ۔ مسٹر نیک حیلہ عرف سکندر اعظم۔"

"میں اس کی ضمانت دیتی ہوں نازو کہ ایسا نہیں ہو گا۔" رابعہ آگے بڑھی۔ "تم نہیں جاؤ گی تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" نازو ہنسی۔ "مگر تم سکندر کی دلیل بھی ہو۔ اس لیے قائل تو ہو گی — سکندر سے کہو کہ تمہاری قسم کھائے۔ کیا تمہاری جھوٹی قسم کھا سکتا ہے سکندر؟ نہیں کھا سکتا نا۔ مجھے معلوم تھا۔"

"میں رابعہ کی قسم کھا کے کہتا ہوں نازو کہ ہم جہاں بھی جائیں گے تمہیں ساتھ لے کر جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "لاؤ اب یہ ریوالور میرے حوالے کر دو۔"

نازو کی آنکھوں میں بے یقینی کے ایک لمحے کی جھلک تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں سے ہٹائی نہیں تھیں۔ اسی تذبذب کا عکس دیکھتے ہی میں نے جست لگائی۔ دوسرے لمحے میں نازو اس مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی جیسے ڈوری کا ایک جھٹکا پانی سے خشکی پر پھینک دے۔ اس کا نازک وجود اس پودے کی طرح زمین بوس ہو گیا جس پر پہاڑ ٹوٹ کر آ گرا ہو۔ میرے ہاتھ نے اس کی کلائی کو جھٹکا۔ ایک گولی نہ جانے کس سمت میں پرواز کر گئی اور ریوالور فرش پر پھسلتا ہوا دور چلا گیا۔

"چھوڑ دو... چھوڑ دو مجھے۔ مر جانے دو مجھے۔" نازو نے بل کھانا اور چلانا شروع کیا۔ میں نے اس کے رخساروں پر زور

زور سے طمانچے مارے۔ ہر تھپڑ سے اس کا چہرہ گھوم جاتا تھا اور اس کی مزاحمت ختم ہونے لگی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آواز کم ہونے لگی اور اس کا سر ڈھلکنے لگا۔ میں نے اسے کندھے پر اٹھایا اور دروازے کی طرف چل پڑا جو چند قدم کا فاصلہ تھا۔ نازو کے دونوں ہاتھ میری پشت کی جانب جھول رہے تھے اور اس کا سر بھی کسی بے جان وجود کی طرح ڈول رہا تھا۔ آگے صرف اس کی ٹانگیں تھیں۔ رابعہ خوف سے میرے ساتھ ہو گئی۔ دروازے میں کھڑے رہ کر تماشا دیکھنے والے محسن، غالب اور ٹیڈی نے راستہ چھوڑ دیا اور آگے آگے چلے گئے۔ میں نے باری باری سب کو غور سے دیکھا۔

اس صورت حال نے سب کو متفکر اور تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ کوئی بھی نازو کو اپنے ساتھ رکھنے کے حق میں نہیں تھا مگر نازو نے ایک بار پھر جان کی بازی لگا کے اپنے لیے یہ حق حاصل کر لیا تھا۔ اس میں شک کی کوئی بات نہ تھی کہ رابعہ نے بروقت مداخلت نہ کی ہوتی اور میں نے حماقت کے بجائے اس بحران سے نمٹنے کے لیے عقل استعمال نہ کی ہوتی تو نازو اپنے لہو سے خود کو سچا ثابت کر دیتی۔ لیکن اس کے بعد ہم سب خود اپنی نظر میں مورد الزام ٹھہرتے۔ وہ جذبات کے طوفان میں قیامت بن جانے والی لڑکی زندگی اور موت دونوں کو کھیل سمجھتی تھی۔ اس کا ہمارے ساتھ رہنا بھی کسی طور سود مند نہ تھا۔ ایک جذباتی شخصیت سر پہ بیٹھی تھی۔ انگریزی محاورے کے مطابق وہ بیک وقت دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے والا ڈوب جاتا ہے۔ ڈوبنا مجھے کبھی منظور نہ تھا لیکن کبھی ڈوبنا ہی ہوتا تو میں رابعہ اور صرف رابعہ کی خاطر ڈوبنا پسند کرتا۔ کسی اور کی وجہ سے یا کسی اور کی خاطر میں زندگی کے کسی بھنور میں اترنا قبول نہیں کر سکتا تھا اور اپنی محبت کو رابعہ کی امانت سمجھ کے اس کی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرا مسئلہ ہم سب کے لیے وہ خطرہ تھا جو نازو کے وجود سے الگ نہ تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ شیخ کی غیرت کے لیے یہ چیلنج بہت بڑا ہو گا۔ وہ فرض کے جنون کا شکار پولیس آفیسر کسی رشتے کی تعظیم کو کسی طرح بھی فرض کے تقاضوں سے زیادہ اہم نہیں مانتا تھا۔ یہ اس کے منہ پر طمانچے سے کم نہ ہو گا کہ اسی کی بہن جرائم پیشہ افراد کے ساتھ گھر سے نکل جائے۔ کسی بھی بھائی کی غیرت پہ حرف آئے تو وہ برداشت نہیں کر پاتا۔ اکرام شیخ کے لیے یہ دہری جنگ ہو گی۔ ایک اپنے فرض کی خاطر، دوسری ناموس کے تحفظ کی خاطر۔ اس کی فرض شناسی میں اب انتقام کی آرزو بھی شامل ہو جائے گی۔

"اچھی طرح دیکھ لو۔" احاطے کی دیوار کے قریب پہنچ کر میں سکا۔ "پیچھے تو کچھ نہیں چھوڑا ہے نا۔"

"ایک لاش چھوڑ دی ہے تاکہ سند رہے اور کام آئے۔" محسن بولا۔ "اسے ساتھ لے جا نہیں سکتے۔"

"لاش؟ کس کی لاش؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"اس ڈرائیور کی جو پولیس کا ٹرک چلا کے یہاں تک لایا تھا۔" غالب نے مجھے یاد دلایا۔ "اور جس نے مجھے شوٹ کرنا چاہا تھا۔"

"اچھا ہوا کہ میں نے دیکھ لیا ورنہ لاش باہر ہی پڑی رہ جاتی۔" محسن بولا۔

"لاش اب کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ "مجھے تو نظر نہیں آئی تھی۔"

"لاش اندر ہے، میزوں کے پیچھے —" محسن نے جواب دیا۔ "کہو تو اٹھا لاؤں؟"

"ابھی کچھ دیر میں پولیس پہنچنے ہی والی ہو گی۔ وہ لے جائیں گے۔" غالب نے کہا۔ "تم خود نکلو ورنہ وہ تمہیں بھی لے جائیں گے۔"

باری باری غالب اور ٹیڈی دیوار پہ چڑھے۔ انھوں نے ہاتھ نیچے بڑھایا اور رابعہ کو اوپر کھینچ کر دوسری طرف اتار دیا۔ پھر انھوں نے نازو کو کھینچا اور اس کا بوجھ میرے کندھے سے دیوار پہ منتقل ہو گیا۔ میں اور محسن دوسری طرف کودے اور نازو کو اسی بے ہوشی کے عالم میں محسن نے اٹھا لیا۔ اندھیرے میں کچھ فاصلے پہ مجھے ایک تانگا نظر آیا۔

"اس وقت کون جیالا کوچبان مل گیا؟" میں نے کہا۔

"تو میرے سکندر اعظم کی توہین تو نہیں کر رہا ہے۔" محسن ہنسا۔ "تانگا اسی کا ہے۔"

"تو نے اسی بے چارے کو چھوڑ دیا، اعتراض نہیں کیا تھا؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"ہاں۔ دن میں میرا پیارا مالک مکان مجھے اپنی بیوی سے گھر میں لے گیا تھا تو وہاں میں نے اس کا پیارا سا تانگا اور پیارا سا گھوڑا دیکھا تھا۔" محسن بولا۔ "مجھے بہت پسند آیا تھا بالکل نئے ماڈل کا گھوڑا ہے۔"

"تم لوگوں کے ساتھ تو نیکی کرنے والا بھی مارا جاتا ہے۔" رابعہ بولی۔

"وہ کیسے بی بی؟" محسن نے سخت برا مان کے کہا۔ "نیکی تو ہم نے کی ہے۔ اسے کیش اٹھارہ ہزار دے دیے۔ اس کا قرض بے باک ہو گیا اور ہم ایک رات کی یہاں نہیں رہے ہیں کہ کہے گا کو رحمت کے فرشتے تھے۔"

"جو آئے اور تانگا گھوڑا کھول کر لے گئے۔" غالب نے کہا۔

www.paksociety.com

"اب انھیں ڈھونڈھ چراغ رخ زیبا لے کر۔"

"اس تانگے گھوڑے کی قیمت بھی نکال دو تو وہ فائدے میں رہا۔ کم سے کم دس بارہ ہزار اسے خواہ مخواہ مل گئے۔ کل تک وہ اتنی رقم کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" محسن نے برہمی سے کہا کیونکہ غالب کی بات پر رابعہ ہنس پڑی تھی۔

"کل تک وہ تمہارے بارے میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ تم تانگا چور ہو۔" رابعہ نے محسن کو چھیڑا۔

"تانگا ہم اسے واپس کرا دیں گے اس تک۔ اپنی ضرورت کے لیے اس وقت یہی سواری دستیاب تھی۔" محسن نے کہا۔ "اور یہ تو ہم نے عزت افزائی ہی کی ورنہ ہم اس سے پہلے کاریں حاصل کرتے رہے ہیں۔"

"لیفٹیننٹ رڈ صبح دیکھے گا کہ کرائے دار بھی غائب اور تانگا گھوڑا بھی تو سمجھ جائے گا کہ کرائے داری تو محض بہانہ تھی۔" ٹیڈی نے کہا۔ "اصل مقصد گھوڑے تانگے کی چوری تھا۔ جیسے وہ دیہاتی جس کا رومال کھو گیا تھا سمجھتے ہیں۔ وہ کہتا پھرتا تھا کہ میلہ کیا تھا صاحب میرا رومال چوری کرنے کا کھیل تھا۔"

"صبح تو وہ حوالات میں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے شیخ اس کی گلو خلاصی کرا دے ورنہ ہمیں پناہ دینا اس کو بہت مہنگا پڑے گا۔ پولیس ابھی تھوڑی دیر میں ہی اسے جگا کے پوچھے گی کہ وہ لوگ کہاں گئے اور اسے بھی لاش کے ساتھ لے جایا جائے گا۔ یہ خبر شاید اسے حوالات میں ہی ملے گی کہ تانگا گھوڑا بھی نہیں ہے۔ وہ کیا بتا سکے گا کہ رشتے دار کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور کدھر گئے۔"

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا مرزا غالب۔" محسن نے کہا۔ اور تانگے میں آگے بیٹھ گیا۔

"ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا۔" غالب نے آہ سرد بھر کے فرمایا۔ "ہمارے لیے اس فتنۂ محشر کا آنا واقعی قیامت کے آنے سے کم نہیں ثابت ہوا مگر مجھے کیا معلوم تھا۔ اگر اس کا وہ خبیث بھائی ساتھ نہ آتا تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"گھوڑے کا اگنیشن سوئچ کہاں ہوتا ہے۔" محسن نے لگام تھام کے کہا۔ "کلچ اور ایکسیلیٹر، گیئر اور بریک سب کچھ یہ لگام ہے۔"

میں نے نازو کو آگے ڈال دیا اور اس کے پیر سیٹ دیے۔ وہ گٹھری سی بنی اس تھوڑی سی جگہ میں سما گئی جو اگلی سیٹ کے نیچے اور تانگے کے سامنے والے حصے کے درمیان تھی۔ اسے سیدھا بٹھانا ناممکن تھا اور گود میں لٹا کے لے جانا خطرناک تھا۔ راستے میں گشتی پولیس پارٹی دیکھتی تو یہی سمجھتی کہ ہم کسی کو اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ محسن اپنے پیچھے سے بالکل تانگے والا لگتا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا ٹیڈی بھی دیہاتی نظر آتا تھا۔ ہم نے ٹیڈی کے ساتھ غالب کو آگے بٹھایا تھا کیونکہ وہ کچھ دور جانے کے بعد اترنا چاہتا تھا اور اخبار کے دفتر پہنچ کر حاضری لینے کے موڈ میں تھا۔ ہم پیچھے بیٹھے اور اپنے پیر ان سوٹ کیسوں پر رکھ لیے جن میں سے ایک میرا تھا اور ایک محسن کا۔

"استاد ٹیڈی! تمہاری تجوری کدھر ہے؟" محسن نے تانگا چلانے سے قبل کہا۔

"وہ صندوق ادھر پیچھے ہے۔" ٹیڈی نے سیٹوں کے نیچے خلا کا حوالہ دیا۔ "تم کو اس کی اتنی فکر کیوں رہتی ہے؟"

"فکر نہیں رہتی ہے؟" میں نے کہا۔ "چلو ٹھیک ہے اس فکر سے چھٹکارا پا لیتے ہیں۔ اسے تانگے میں ہی چھوڑ دیں۔"

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" ٹیڈی نے گھبرا کر کہا۔ اس کی گھبراہٹ نے ایک بار پھر مجھے اس پُراسرار صندوق کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا جس کے راز سے آگاہی ابھی تک حاصل نہ ہو سکی تھی۔ محسن خان نے ماہر کوچبان ہونے کا ثبوت دیا اور لگام کھینچ کر گھوڑے کو ایک چابک رسید کیا۔ وہ ہنہنا کے اچھلا۔ میں اور رابعہ گرتے گرتے بچے۔

"آپ نے پہلے کبھی تانگا یا گھوڑا چلایا ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "نہیں تو گھوڑے سے جگہ بدل لیں۔"

"ایک ڈاکٹر نے بھی اپنے مریض سے ایسا ہی کہا تھا کہ کیا آپ پہلے کبھی فوت ہوئے ہیں؟" محسن نے گھوڑے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔ "ہر کام آدمی کو زندگی میں پہلی بار کرنا پڑتا ہے۔ وہ پہلی بار پیدا ہوتا ہے۔ پہلی بار عشق کرتا ہے۔ بدل جائے تو اس کا کیا قصور۔ اگر میں ایسا ہی سوال آپ سے کروں کہ آپ نے پہلے کبھی شادی کی ہے؟"

بیک وقت میں نے اور رابعہ نے محسوس کیا کہ سوچے سمجھے بغیر بولنے والا محسن پہلی بار طنز کا نشانہ بنا رہا ہے۔ کیا یہ بات دانستہ کی تھی؟ مجھے یاد دلایا تھا کہ میرا پہلا عشق... اب میں دعویٰ کرتا ہوں کہ میرا پہلا عشق رابعہ ہے۔ اور وہ جو شادی کی تھی وہ اس کی زندگی کا بہت بڑا المیہ ثابت ہوا۔ جھٹکا ہماری ہی میں بیٹھا ہوا راہی تو تیرے بھی صنم جھوٹے بھی صنم جھوٹے۔ شاید محسن کو احساس بھی نہیں تھا کہ اس نے کتنی بڑی حقیقت کے دکھوں کو کرید دیا ہے۔ محسن نے بالآخر گھوڑے پر قابو پا لیا تھا اور اب کسی ماہر کی طرح تانگا چلاتے ہوئے حلق سے وہ آوازیں نکال رہا تھا جو تانگے والے اور اس کے …

غالب اور ٹیڈی ہنس رہے تھے۔

تقریباً تین چار فرلانگ دور آ جانے کے بعد ہمیں رات گشت کرنے والے سپاہیوں کی پہلی ٹولی ملی۔ "کی حال ہے شہزادی بادشاہ خیر ہو۔" اس نے پھر گھوڑے سے عجلت یا لاعلمی میں کچھ کہا اور ہم خاموشی سے گزر گئے۔

"اب ارادہ کدھر کا ہے؟" میں نے محسن کی بات سے پیدا ہونے والی چبھن سے نجات پانے کے لیے کہا۔

"گھوڑا آٹومیٹک ہے۔ کسی کی مرضی کا غلام نہیں۔ چل پڑتی ہے سیدھے شہر کے سوا شیر۔" محسن بولا۔

"یار مجھے تو اتار دے۔" غالب نے کہا۔ "میں ایڈیٹر صاحب کو اپنی شکل مبارک دکھا دوں۔ کوئی تو گواہ ہو میری بے گناہی کا۔ شیخ صاحب چاہیں گے تو انھیں گواہی بھی فراہم کر دیں گے کہ ہم رات بھر وہیں تھے۔"

"اچھا اس دنیا میں پھر کہاں ملاقات ہوگی؟ جاتے جاتے یہ تو بتا جاؤ۔" محسن نے کہا اور بڑی جانفشانی سے گھوڑے کو بریک لگا کے روکنے میں کامیاب ہو گیا۔ "اور ہوگی یا نہیں ہوگی؟"

"مجھ سے آفس میں ہی رابطہ قائم کر لینا۔ میں کل صبح اخبار شائع ہونے کے بعد دیر تک سو جاؤں گا۔" غالب نے اترتے ہوئے کہا۔ "چوکیدار کو بتا دوں گا کہ کوئی ملاقاتی آئے تو جگا دے۔ فون اسی کمرے میں ہوگا۔"

"تمہاری امانت بھی اسی کو سونپ دیں؟ آخر وہ چوکیدار ہے!" محسن نے کہا۔ وہ سخت شرارتی موڈ میں تھا۔ غالب نے آگے جا کے نازو کو دیکھا، ایک سرد آہ بھری اور چل پڑا۔ اسی وقت دور سامنے سے موٹر سائیکلوں کی روشنی نمودار ہوئی اور پولیس کے سائرن سنائی دیے۔ "تم لوگ تانگے کو گلی میں موڑ لو۔" غالب نے جلدی سے کہا۔ "میں ان سے بات کرتا ہوں۔"

گھوڑے کو اس گلی میں موڑنا آسان نہیں تھا مگر محسن فوراً نیچے اترا اور اس نے لگام کو تھام کر گھوڑے کو گلی میں کر لیا۔ خالی اور خاموش گلی گھوڑے کی ٹاپوں سے گونجنے لگی۔ محسن نے گھوڑے سے آگے پیدل چلنے کو ترجیح دی۔

"یہ غالب ان سے کیا بات کرے گا؟" محسن نے سوال کیا۔ "اور بات کرنے کی ضرورت کیا ہے؟"

"ان کا دھیان ہماری طرف نہیں جانے دے گا۔" میں نے کہا۔ "غالب کا کیا ہے اس کے پاس پریس کارڈ ہے۔"

"اور اگر ان کے ساتھ شیخ بھی ہوا؟" محسن بولا۔ "وہ غالب کو پہچان لے گا۔"

"نہیں۔ میرا خیال ہے اسے گولی لگ گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "میں نے اس کی ٹانگ کا نشانہ لیا تھا۔ وہ ساتھ نہیں آ سکتا۔"

"ہو سکتا ہے یہ پولیس پارٹی ہماری تلاش میں نہ آئی ہو۔" محسن بولا۔

"ادھر اس وقت کوئی پولیس پارٹی چھاپا مارنے آئی ہے تو سو فیصد امکانات یہی ہیں کہ وہ ہم سب کو گرفتار کرنے کے لیے آئی ہوگی۔ اگر ہمارا تانگا راستے میں ملتا تو ہو سکتا ہے وہ چیک کرتے اور ظاہر ہے ہمیں پہچان لیتے۔ غالب بیوقوف نہیں ہے۔ وہاں سے کوئی ایسی بات کرے گا کہ ان کا ذہن گمراہ ہو جائے اور ان کا دھیان تانگے کی طرف نہ جائے۔ ویسے بھی شاید انھوں نے ہمارے تانگے کو گلی میں مڑتے نہ دیکھا ہو۔ اس کی لائٹس نہیں جل رہی تھیں۔" میں نے کہا۔

"اور اگر دیکھ لیا ہوگا تو وہ سیدھے گلی میں آ جائیں گے۔" رابعہ نے کہا۔ ان کی موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کی روشنی بہت تیز تھی۔

"اس وقت نہ ہم فرار ہو سکتے ہیں اور نہ ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔" میں نے رابعہ کے خیال کی تائید کی۔

محسن نے اچانک تانگے کو ایک کھلے گیٹ میں موڑ کر گھنے درختوں کی آڑ میں روک لیا۔ گیٹ کسی پرانی وضع کی کوٹھی کا تھا جس کے در و دیوار تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی معاملہ فہمی، دور اندیشی اور قوت فیصلہ کو سراہا۔ اس وقت بڑے خطرے سے نجات پانے کے لیے محسن نے ایک چھوٹا خطرہ مول لے لیا تھا جو بالکل صحیح قدم تھا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ سوٹ کیس اٹھا کے جھاڑیوں کے پیچھے رکھے جو بیرونی احاطے کے متوازی تین طرف پھیلی ہوئی تھیں اور بلندی میں احاطے کی دیوار سے اوپر نکل گئی تھیں۔ دیوار اور جھاڑیوں کے درمیان بہت کم جگہ تھی لیکن جہاں گیٹ تھا وہاں سے کچھ دور تک دیوار سے لگ کر کھڑے ہونے کی گنجائش تھی۔ سوٹ کیس رکھتے ہی میں نے رابعہ کو اس محدود سی جگہ میں دھکیلا۔ سخت خشک اور نوکیلی جھاڑیوں کی رگڑ سے اس کے چہرے پر اور ہاتھوں پر خراشیں آئیں اور اس کے کپڑے بھی جگہ جگہ الجھ کر پھٹے۔ وہ تھوڑا سا کراہی مگر چہرے کے سامنے دونوں ہاتھ رکھ کے آگے بڑھنے لگی۔ جب میں نازو کو اٹھانے کے لیے واپس ہوا تو ٹیڈی اپنے فولادی صندوق کو اٹھا کے لانے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ محسن نے صندوق کو تانگے کی سیٹوں کے نیچے سے نکال کر ٹیڈی کے سر پر رکھ دیا تھا لیکن اس بوجھ کے ساتھ جھاڑیوں اور دیوار کے درمیان کی جگہ میں گھسنا اس کے لیے آسان نہ تھا۔ جب میں نازو کو اٹھا چکا تھا تو میں نے ایک دھماکا سنا۔ صندوق ٹیڈی

www.paksociety.com

کے سر پہ سے گزر گیا تھا اور وہ اُسے پوری طاقت لگا کے گھوڑی اور ناہموار زمین پر گھسیٹ رہا تھا۔ میں نے سانس روک کر کوٹھی کی جانب دیکھا اور میرے ساتھ سب نے ہیڈی کو گھورا جو ندامت کے باعث کسی سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔

اندر سے کسی کی آواز سنائی نہیں دی۔ کوئی دریچہ روشن نہیں ہوا۔ کسی چوکیدار نے ہمیں نہیں للکارا اور کوئی کتا بھونکتا ہوا نہیں لپکا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ محسن نے پھر گھوڑے کی لگام تھامی اور اسے اپنے ساتھ کوٹھی سے باہر لے گیا۔ میں نے پیچھے دیکھا اس کی ٹاپوں کی آواز تھی۔ پھر اچانک گھوڑے کے ہنہنانے اور سرپٹ بھاگنے کی آواز آئی۔ میں نے نازو کو گیٹ کے پیچھے ڈال دیا اور خود ہیڈی کے ساتھ ٹک کر کھڑا ہو گیا۔

نازو آہستہ سے کراہی۔ "مر جائے... وہ... مجھے..."

"اسے بھی ابھی ہوش آنا تھا۔" ہیڈی نے خفت مٹانے کے لیے کہا۔ "خواہ مخواہ اٹھا لائے۔"

"اس کی آواز تھوڑا سا اس منحوس شکل والے مسند کے دھماکے سے بہت کم ہے۔" میں نے کہا۔ "تم بھی تو اس مصیبت کو خواہ مخواہ اٹھائے پھر رہے ہو۔"

"کیا میں پاگل ہوں سکندر بادشاہ؟" ہیڈی نے کہا۔ "اتنے عرصے سے تم مجھے جانتے ہو۔"

"تمہاری اس مسند کو اٹھا کے چوری کی حرکت اگر دیوانگی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟" میں نے کہا لیکن ہیڈی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کسی کو برٹ خفشن … شوق ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "ذرا آہستہ بات کرو۔"

"اور بوجھ کیا کم ہیں۔ ہم سب پر ایک دوسرے کی زندگی کا بوجھ ہے۔ سب کے ساتھ پہلے اپنے گناہوں کا بار ہے اور اس پر ہماری زندگی کے سامنے بھیدوں کا بوجھ ہے۔" میں نے کہا۔ "ذرا اپنی حالت کا تصور کرو۔"

"اس وقت تو ہماری ٹانگوں پر ہمارا وجود بھی ایک بوجھ ہے۔" رابعہ بولی۔ "کیا ہم سے یہاں رات بھر اٹھائے کھڑے رہیں گے۔"

"نہیں۔ ابھی کچھ دیر میں کوٹھی کا سخی مہمان نواز اور فرشتہ سیرت مالک مسکراتا ہوا نکلے گا اور انتہائی شائستگی کے ساتھ اپنے مہمانوں کو خاطر مدارات کے لیے اندر لے جائے گا۔" میں نے کہا۔ "پھر ایک شاندار ناشتہ۔ پھر پُرتکلف طعام۔ مغلئی، چینی اور انگلش کھانوں کا مزہ۔ گرما گرم کافی۔ اس کے بعد سینٹرل ہیٹنگ والے پُرآسائش بیڈ روم۔ یہاں کھڑے کھڑے ان سب کا تصور کرو تو بہت آرام ملے گا۔"

"آج سردی بھی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی ہے۔" نازو نے کہا۔

"سردی سے زیادہ مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے۔" ہیڈی نے کہا۔

"مقدر میں تو صرف دھکے کھانے لکھے ہیں۔" رابعہ بولی۔ "آخر چین سے بیٹھنا کب نصیب ہوگا۔"

"نکلنا تو یہاں سے بھی پڑے گا۔" ہیڈی بولا۔ "نہ جانے کس کا گھر ہے۔" اسی وقت نازو پھر بڑبڑائی۔

"نازو کو کچھ ہو نہ جائے۔" رابعہ نے فکرمندی سے کہا۔

"ہسٹریا کا دورہ اتنا شدید اور طویل نہیں ہوتا۔ کہیں تم نے … سے زیادہ جرأتِ مردانہ کا مظاہرہ تو نہیں کیا تھا؟"

"اگر اسے فوراً کمبل میں لپیٹ کر لٹا دیا جاتا اور کوئی گرم چیز پینے کو دی جاتی تو یہ آدھے گھنٹے سے پہلے ہوش میں آجاتی لیکن ہم اسے کس طرح اٹھائے پھر رہے ہیں۔ اعصاب کہاں کھو رکھا ہے۔" ہیڈی نے کہا۔

گلی کی خاموشی میں بیماری موٹر سائیکل کی آواز گونجی پیدا ہوا تو قریب آئی اور میں نے گیٹ کے سامنے روشنی دیکھی۔ تھوڑا سا جھک کر میں نے گیٹ کے گرل والے حصے میں سے دیکھا۔ پریشان کن شبہات کی تصدیق ہوگئی۔ موٹر سائیکل پر کوئی پولیس انسپکٹر تھا۔ وہ عین گیٹ کے سامنے رکا اور دو قدم ترچھی پہ جائے اس نے موٹر سائیکل کو موڑا تو اس کی بتی کے بیم نے پوری تیزی سے وہ جگہ… وہ تھوڑا سا آگے۔ اور اس نے ایکسلریٹر دبایا تو ہیڈ لائٹ نے گیٹ سے اندر والے راستے کو روشن کر دیا۔ میں نے پستول نکال لیا اور ہیڈی کی طرف دیکھا۔ اس نے انداز میں سر ہلا کے واضح کیا کہ وہ بھی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہے۔ موٹر سائیکل کا انجن دو تین بار تیزی قوت سے گرجا اور روشنی تیز ہوئی۔ ہم دم سادھے پتھر کے بت بنے کھڑے رہے۔ معلوم نہیں وہ موٹر سائیکل کی روشنی میں اندر کیا دیکھ رہا تھا اور اس نے خاص طور پر اسی کھلے گیٹ کو قابل توجہ کیوں سمجھا تھا۔ اگر وہ اندر آجاتا تو یہاں چھپے رہنا مشکل ہو جاتا۔ جب وہ واپس جاتا تو ہیڈ لائٹ میں ہم سب بالکل نمایاں نظر آتے اور لائٹ کی حرکت کے ساتھ اسے دیوار پہ جاتے مشکوک سائے فوراً متوجہ کر لیتے۔ میں طے کر چکا تھا کہ اگر وہ اندر آیا تو میں اسے مہلت نہیں دوں گا۔ پیچھے سے جست لگا کے اسے دبوچ لوں گا کہ اس کی آواز نہ نکلنے پائے لیکن یہ بہت

جھاڑیوں سے نکلنے کی معمولی سی آواز پہ چوکنا ہو جاتا تو کچھ نہ کچھ ضرور کرتا۔ مقابلہ کرنے کی گنجائش نہ دیکھتے تب بھی خطرہ ضرور تھا۔ پھر اس کی موٹر سائیکل بھی گھر گئی تو کم آواز نہ کرتی۔

جب لائٹ کا رخ بدلا اور موٹر سائیکل واپس ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ میرا دل پھر دھڑکنے لگا ہے۔ آدھے گھنٹے کی اعصابی کشیدگی نے ہم سب کو شدید ذہنی و جسمانی کرب میں مبتلا رکھا تھا۔ خوف کا احساس کم ہوا تو میں نے رابعہ کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ وہ کانپ رہی تھی مگر سردی سے نہیں۔ محسن ایک دم کود کر اندر آگیا۔

"کیا پولیس آئی تھی یہاں؟" محسن نے بڑی تشویش سے کہا۔

"آئی تو تھی لیکن آ کے ٹل گئی۔" میں نے سکون کی گہری سانس لے کر کہا۔ "نہ اس کا یہاں رکنا میری سمجھ میں آیا نہ اس کا یوں لوٹ جانا۔"

"کیا اسے شک ہو گیا تھا؟" محسن نے کہا۔

"شک ہوتا تو اسے اندر آنے سے کون روک سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو سب سے زیادہ ڈر نازو کی طرف سے تھا کہ ایکدم ہوش میں آکر چلانے نہ لگے۔" ہیڈی بولا۔

"تو نے تانگہ اور گھوڑے کو کہاں چھوڑا؟" میں نے کہا۔

"یہاں سے ایک فرلانگ آگے جا کے چوک سا آتا ہے۔ تین سڑکیں ملتی ہیں۔" محسن بولا۔ "میں نے ایک سڑک پر گھوڑے کے ساتھ دوڑتے ہوئے مسلسل چابک مارے اور اسے سرپٹ بھاگنے دیا۔ نہ جانے کہاں جا کے رکا ہوگا۔"

"خدا کے لیے یہاں سے نکلو۔" رابعہ نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا حوصلہ جواب دے رہا ہے۔"

"نکل کر کہاں جائیں؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ بھوک، سردی اور تھکن سے خود میری حالت ابتر ہونے لگی تھی۔ رابعہ تو عورت تھی اور اس نے ابھی تک جتنی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا تھا وہ غیر معمولی تھا۔

"کہیں بھی چلو۔ کوئی جگہ ہو بیٹھنے کی۔" رابعہ بولی۔ "ورنہ میں بے ہوش ہو کے گر جاؤں گی تو ایک نیا نازو والا مسئلہ پیدا ہو جائے گا تم سب کے لیے۔ نازو ایسے ہی پڑی رہی تو مر جائے گی یا اسے نمونیہ ہو جائے گا۔"

"کیا انھیں جگائیں؟ رات بھر کے لیے پناہ مانگیں۔" میں نے کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔

"پھر ہم سکندر بادشاہ کو لینے کے دینے پڑ جائیں۔" ہیڈی نے کہا اور مجھے اس کی آواز بھی کانپتی ہوئی لگی۔

"منٹ یہیں رکو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔" محسن بولا۔ "کوئی یہاں رہتا بھی ہے یا نہیں۔"

"تھوڑی سی ہمت سے کام لو۔ ابھی کچھ کرتے ہیں۔" میں نے رابعہ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔

"بلا سے کھانے کو کچھ نہ ملے۔ اتنا تو ہو کہ ہم اس سرد رات میں کھلے آسمان کے نیچے ٹھٹھر کر مرنے سے بچ جائیں اور صبح تک زندہ رہیں۔" رابعہ نے کہا۔ پھر وہ محسن کو آگے جا کر کھڑکیوں دروازوں کا جائزہ لیتے دیکھتی رہی۔

"تقدیر کا یہ کیسا امتحان ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم اتنی بڑی اور نامور وکیل! میں ایک صنعت کار، کیا نہیں تھا ہمارے پاس اور کیا نہیں ہے۔ اس وقت بھی ہمارے پاس بائیس تئیس ہزار کی نقد رقم ہے۔ اسٹین گن الگ ہے ہمارے پاس لیکن ہم کیسے چوہوں کی طرح چھپے پڑے ہیں اور کس حال میں ہیں۔"

"اس وقت ایسی مایوسی کی باتیں کر کے کیا ملے گا۔" رابعہ نے کہا۔

"محسن بہت تیز تیز قدم اٹھاتا آ رہا ہے کوئی خوش خبری لایا ہے شاید۔" میں نے کہا۔

"خوش خبری یہ ہے۔" محسن نے قریب آتے ہوئے میری بات سن لی تھی۔ "کہ مکان خالی اور مقفل ہے۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟" رابعہ نے مایوسی سے کہا۔ "اب کہاں جائیں گے؟"

"سامنے میں ایک گیراج ہے۔" محسن بولا۔ "رات وہاں گزاری جا سکتی ہے۔ کافی جگہ ہے ہم سب کے لیے۔"

"تو نازو کو اٹھا لو۔" میں نے باہر آ کے چٹکی بجائی۔ "میں دو سوٹ کیس اٹھاتا ہوں۔ خواجہ نیک محمد! تم اپنا مصیبت خانہ خود اٹھاؤ یا چاہو تو اس کے ساتھ یہیں پڑے رہو۔"

چند منٹ بعد ہم گیراج میں تھے۔ میں نے جیب سے لائٹر نکال کے روشنی کی تو مجھے ایک دیوار پہ لائٹ کے سوئچ نظر آئے۔ چھت سے ایک بلب بھی نیچے لٹکا ہوا تھا۔ خاتمے کی پروا کیے بغیر میں نے بٹن دبا دیا۔ سو واٹ کے بلب کی روشنی میں ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے گیراج کے دروازے کی طرف دیکھا۔ "اس کو بند کرنا ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

"شٹر کھینچنے سے تو بہت آواز ہوگی۔" محسن نے کہا۔

"اس وقت کون سنے گا۔" میں نے ہاتھ اونچا کر کے شٹر کو نیچے لانے کے لیے زور لگایا۔ میرا ساتھ محسن نے دیا اور شٹر جو کافی عرصے سے استعمال نہ ہونے کے باعث جام تھا تیز چیخ پکار کے ساتھ تھوڑا تھوڑا نیچے آ گیا۔ ٹین کے کھڑکھڑانے کا اور دھات کی رگڑ سے پیدا ہونے والا شور مجھے رات کی خاموشی

www.paksociety.com

میں کچھ زیادہ ہی محسوس ہوا لیکن سردی کو روکنے اور روشنی کو چھپانے کے لیے شٹر گرانا ضروری تھا۔ بالآخر شٹر ایک جگہ ایسا پھنسا کہ ایک انچ نہ ہلا۔

"یہ... اپنے خواجہ صاحب!" میں نے ہانپتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "کیا وہ بیچ میں وہیں رہ گیا اپنی مجبوری کے ساتھ؟"

"میں لاتا ہوں اس کو۔" محسن نے کہا اور اس دو فٹ کے خلا میں سے گزر گیا جو فرش اور شٹر کے درمیان باقی رہ گیا تھا۔ میں نے گیراج کا جائزہ لیا۔ اس کے فرش پر گاڑی کھڑی کرنے کے آثار واضح تھے۔ سیمنٹ پر انجن آئل کے دھبے تھے کچھ بہت پرانے لیکن کچھ ہفتہ دس دن پہلے کے۔ صاف ظاہر تھا کہ جب کوٹھی کے مکین یہاں تھے تو اپنی گاڑی بھی یہاں کھڑی کرتے تھے۔ ایک گوشے میں دو پرانے ٹائر اور گاڑی کے ناکارہ پرزے پڑے تھے جن کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ گیراج میں جیپ کھڑی کی جاتی تھی۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے دوسرے کونے میں لگی ہوئی پرانی چارپائی اور لپٹے ہوئے بستر کو دیکھ کر ہوئی۔ غالباً یہ بستر ڈرائیور کا تھا جو اب مالکوں کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ میں نے رابعہ کی مدد کی اور بستر کو پھیلا دیا۔ بستر جنت جیسا تھا گدے اور تکیے کی حالت ایک سی خستہ تھی اور تکیے پر سفید غلاف تیل سے چکنا ہو کے سیاہ پڑنے لگا تھا۔ لحاف اور گدے میں سے ایک جیسی بو آ رہی تھی۔ مگر ان حالات میں یہ غلیظ اور متعفن بستر کسی شاہزادی کے ریشم و کمخواب کی نرمی اور لطافت۔ بیٹھنے والے سفر اور تھکن کا لطف بستر سے کم نہ تھا۔ میں نے نازو کو پہلے لٹایا جو اب پہلے کی نسبت زیادہ ہوش میں تھی اور مسلسل "مجھے مر جانے دو... مجھے قتل کر دو۔" کی گردان کرنے لگی تھی۔ میں نے رابعہ کو بھی اس کے ساتھ بستر میں گھسنے پر مجبور کر دیا کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ سردی سے رابعہ کے ہونٹ بھی نیلے پڑ چکے ہیں اور اس کا گلابی چہرہ بے جان نظر آنے لگا ہے۔ جسمانی توانائی کی بحالی کے لیے اسے بھی آرام کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی نازو کو۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو کچھ دیر میں یقیناً رابعہ بھی بے ہوش ہو کر گر پڑتی۔

جب شٹر سے کسی کے ٹکرانے کی آواز آئی تو پلٹ کر دیکھے بغیر میں نے اندازہ کیا کہ یہ محسن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا مگر اسی وقت رابعہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور اس کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا تو میں نے گھوم کر دیکھا اور اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ بائیس بور کی دو نالی شکاری بندوق کا رخ میرے سینے کی طرف تھا اور یہ بندوق ایک عورت کے ہاتھ میں تھی۔ عورت کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی لیکن اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ موٹاپے کی طرف مائل تھی لیکن اسے موٹی نہیں کہا جا سکتا تھا مزید یہ کہ موٹی ہونے والی عورتوں کی طرح اس کا جسم غیر متناسب اور بھدا نہیں ہوا تھا۔ اس کا رنگ روپ اب بھی عہدِ رفتہ کی کہانی سناتا تھا جب اس کا اپنے حسن و شباب کی غارت گری کے چرچے خود بھی سنتے ہوں گے۔ اس کے بالوں میں سیاہی پر سفیدی غالب تھی اور وقت نے چہرے پر مکڑی کے جالے کی طرح جھریوں کو پھیلا کر چہرہ کر دیا تھا مگر اس کی آنکھوں کی سیاہ چمک اب تک دھندلی نہیں پڑی تھی۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت میں ایک پُر رعب اور باوقار تمکنت تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ چہرہ میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔

"میں اکیلی عورت ہوں اور جوان بھی نہیں ہوں۔" وہ متانت سے بولی۔ "لیکن اسے میری کمزوری مت سمجھنا۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ اور میں تم کو صفائی کا موقع دیے بغیر گولی مار دوں تب بھی کوئی مجھے قصوروار نہیں سمجھے گا۔ اس کے علاوہ میرا بیٹا..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی کیونکہ باہر سے استاد ٹیڈی اور محسن جھگڑتے ہوئے قریب آ رہے تھے۔ "خبردار!" حلق سے آواز بھی نکالی تو عورت نے ایک کونے میں پوزیشن سنبھال کے کہا۔ "میرے بیٹے نے جاتے وقت کہا تھا کہ جسے چاہو گولی مار دینا۔"

استاد ٹیڈی کا بدصورت اور بد وضع صندوق پہلے اندر آیا۔ ٹیڈی کے ساتھ محسن نے اسے باہر سے اندر دھکیلا اور پھر خود بھی سر جھکا کے اندر آ گئے۔ سیدھے کھڑے ہوتے ہی انھوں نے بندوق کی نال کو دیکھا۔ عورت نے انھیں میری طرف کھسکنے کا اشارہ کیا اور وہ پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتے ہوئے میرے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ آسمان سے گریں گے تو اس طرح کھجور میں اٹک جائیں گے۔

"کون ہو تم لوگ؟" عورت نے اسی سپاٹ آواز میں کہا۔

"ہم چور یا ڈاکو نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تو میں نے اندازہ کر لیا تھا کیونکہ تمھارے ساتھ عورتیں ہیں۔" وہ بولی۔ "لیکن تم شریف آدمی بھی نہیں ہو۔"

"یہ اندازہ کیسے کیا آپ نے؟" میں نے محسوس کیا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں اور اگر میں اس عورت کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر ہمارے حق میں بہت اچھا ہو گا۔

"اس لیے کہ شریف آدمی نہ راتوں کو اس طرح جوان عورتوں کے ساتھ پھرتے ہیں اور نہ ایسے بلا اجازت لوگوں کے گھروں میں گھستے ہیں۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔ "کیا سمجھ کے ڈیرا ڈال لیا تھا یہاں؟ معلوم ہے میرا بیٹا کون ہے؟"

"ہم سمجھے تھے کہ گھر میں کوئی...

پڑا ہوا تھا۔" محسن نے کہا۔

"تو کیا تم لوگ چوری کرتے ہو؟" وہ بولی۔ "جو گھر خالی نظر آئے اس پر قابض ہو جاؤ۔"

"قبضہ کرنا ہوتا تو ہم اس گیراج میں پناہ نہ لیتے۔ قفل توڑ لیتے۔" میں نے کہا۔

"قفل توڑتے تو کتے کی موت مارے جاتے۔" وہ بولی۔ "جب میرا بیٹا گھر میں نہیں ہوتا تو میں یہی کرتی ہوں۔ سامنے سے تالا ڈال کے باورچی خانے سے اندر چلی جاتی ہوں اور اندر کی ساری کنڈیاں بند کر لیتی ہوں۔ میرے بیٹے نے مجھے سختی سے تاکید کر رکھی ہے۔"

"کیا بیٹے ماں کو سختی سے تاکید کرتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہ ہمارا ماں بیٹے کا معاملہ ہے جی! تم کون ہوتے ہو بیچ میں ٹیکہ دینے والے۔" وہ برہمی سے بولی۔ "سیدھی طرح بتا دو کہ تم لوگ یہاں کیا کر رہے تھے؟ صورت سے تم لوگ فقیر تو نہیں لگتے۔ پھر کون ہو؟ بردہ فروش یا ان عورتوں سے......؟"

"کیا یہ عورتیں صورت سے آپ کو ایسی نظر آتی ہیں؟" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "اچھی نظر ہے آپ کی... ہم آپ کو چور ڈاکو نہیں لگتے، فقیر نہیں لگتے؟"

"پھر تم خود ہی بتا دو کہ تم کون ہو؟" عورت نے کہا۔ "ورنہ میرا بیٹا سب معلوم کر لے گا کہ وہ تم جیسوں سے نمٹنا جانتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ! آپ کا بیٹا آخر کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ آئے گا تو کون سی توپ چلا دے گا۔ ہم نے کوئی جرم کیا ہے تو صرف یہی کہ سردی سے بچنے کے لیے گیراج میں پناہ لے لی اور وہ بھی مجبوری میں۔ ہم چلے جاتے ہیں۔"

"ٹھہرو! پہلے بتاؤ کہ ایسی کون سی مجبوری تھی جس نے تمھیں آدھی رات کے بعد اور اس موسم میں گھر سے بے گھر کیا اور تم یہاں میرے گھر میں آ گھسے؟" وہ بولی لیکن اب اس کا لہجہ پہلے کے مقابلے میں بہت نرم تھا۔ "دیکھو جھوٹ بالکل مت بولنا اور مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش ہرگز مت کرنا۔ ورنہ میرا بیٹا..." وہ ذرا سی دیر کے لیے رکی۔ "خیر تم اس سے مل لو گے تو تمھیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ وہ توپ چلا کے تمھیں توپ دم کر سکتا ہے یا نہیں۔"

"آپ ہماری غلطی کو معاف کر دیں ماں جی۔" رابعہ نے انتہائی عاجزی سے کہا۔ "ہم گیراج خالی کر دیتے ہیں۔ ایک رات ہی کی تو بات تھی۔ رات بھی اب کتنی رہ گئی ہے۔"

"شکر ہے یہ نہیں کہا!" عورت کا رویہ ایک دم مشفقانہ ہو گیا۔ "میں تو جاننا چاہتی ہوں کہ آخر تم لوگوں پہ کیا آفت آ گئی تھی کہ تم گھر سے بے گھر ہوئے۔ کچھ بتاؤ تو سہی شاید میں تمھاری کوئی مدد کر سکوں۔ میں نے جو کچھ پہلے کہا تھا غصے میں کہہ دیا تھا۔ اس کا برا مت ماننا۔ تم صورت اور لہجے سے اچھے گھر کی لگتی ہو۔ چلو تم بستر میں لیٹ جاؤ۔ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی مجھے۔"

"آپ اس دو نالی توپ کو ہٹائیں تو ہم کچھ کہیں۔" میں نے کہا۔ "کہیں گولی چل گئی تو..."

"گولی کبھی خود نہیں چلتی۔" وہ مسکرائی۔ اس نے بندوق کو نیچے کر لیا اور اس کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ "اب بولو۔"

"ہم بڑے مصیبت زدہ ہیں بیگم صاحبہ!" میں نے مظلوم صورت بنا کے کہا۔ "زمانے کے ستائے ہوئے ہیں۔ میرا نام اول خان ہے۔ یہ میری گھر والی ہے خیرات النساء مگر سب خیراں کہتے ہیں۔ یہ سالا ہے میرا خیرات محمد اسے سب خیرا ہی کہتے ہیں۔ اور وہ جو لڑکی لیٹی ہے نا وہ میری سالی ہے۔ خیراں اور خیرا کی بہن... نازو۔"

"اور یہ شخص، یہ تم میں سے کسی کا بھائی نہیں لگتا۔" عورت نے شک سے استاد ٹیڈی کو دیکھا۔

"یہ میرا دوست ہے جی۔ اس نے ہم سب کی زندگی بچا لی۔" میں نے مظلوم لہجے میں اپنی فریاد جاری رکھی۔ "ورنہ ہم سب مارے جاتے۔"

"کس کے ہاتھوں؟ کھل کے بات کرو۔ جب میرا بیٹا آئے گا تو سب اسے بھی بتانا۔" اس عورت کو اپنے بیٹے پر بہت فخر تھا۔ "جس نے بھی ظلم کیا ہو گا تم پر سب کا دماغ درست کر دے گا۔"

"بات یہ ہے بی بی جی۔ ابھی ہماری شادی ہوئی ہے چھ مہینے پہلے۔" میں نے کہا۔ "ہم سب تحصیل و ضلع گوجر خان کے رہنے والے ہیں اور ہمارا گاؤں ہے کلیام اعوان۔"

"تم کلیام اعوان کے ہو؟" وہ بولی۔ "میں ایک رات رہی تھی وہاں۔ جب میرا بیٹا گوجر خان میں تھا۔"

ایسی کی تیسی اس کے بیٹے کی، ہر جگہ ٹپک پڑتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "میری بیوی نے تھوڑا سا پڑھ لیا تھا۔ دس جماعت تک میں نے بھی پڑھا ہے اور خیراں نے بھی۔ اس کا رشتہ پہلے سگے چچا کے لڑکے سے ہوا تھا۔ اس وقت یہ بچی تھی، دوسری یا تیسری میں پڑھتی تھی۔ دس جماعت پڑھ کے یہ گوجر خان میں پڑھانے لگی جہاں میں بھی پرائمری اسکول میں ٹیچر تھا۔"

"اور یوں تم دونوں کی ملاقات ہوئی۔ پھر تم ایک دوسرے

www.paksociety.com

سے محبت کرنے لگے اور تم نے شادی کر لی۔" عورت بولی۔

میں نے احمقوں کی طرح منہ کھول کر اس عورت کو دیکھا۔

"ہاں جی... بالکل۔"

"اور وہ چچازاد بھائی جس کی منگیتر تم نے چھین لی تھی وہ دشمن ہو گیا۔" عورت ہنس کر بولی۔

"آپ کو... یہ سب آپ کو کس نے بتایا جی؟" میں نے ہکلا کے کہا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے بیٹی۔ کون ہے وہ تمہارا دشمن؟"

"وہ بڑا بدمعاش ہے جی۔ پرائمری میں تھا تو اسکول سے بھاگ گیا۔ ماں باپ کی عزت کا دشمن ہو گیا۔ پہلے چھوٹی موٹی چوریاں کرتا تھا پھر ڈاکے ڈالنے لگا اور جیل گیا۔ ماں باپ اسی دکھ میں مر گئے۔" میں نے ایک فی البدیہہ کہانی کا تانا بانا تیار کر لیا۔ "جیل سے چھوٹا تو بہت بڑا غنڈہ کہلانے لگا۔ اب ایسے شخص سے نازو اور خیراتی کی شادی ہو سکتی تھی... اس نے مجھے بھی بہت دھمکیاں دیں اور خیراتی کو بھی۔"

"خیراتی اور خیراتن کے ماں باپ نہیں کیا؟"

"نہیں بیگم صاحب۔ خیراتی ہی بڑا بھائی تھا۔ وہ غنڈہ اس کا بھی دشمن ہو گیا مگر کون بھائی جانتے بوجھتے اپنی بہن کو جہنم میں جھونکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے ایسا ظلم کوئی نہیں کرتا۔" عورت نے ہمدردانہ لہجے میں کہا اور میں نے ان سب کو دیکھا جو بنسی ضبط کیے بڑی سنجیدہ صورت بنائے میری کہانی سن رہے تھے۔ گرم بستر کی حرارت پاتے ہی نڈھال ہو جانے والی نازو کو نیند آ گئی تھی۔

"بس جی شادی کے بعد ہماری زندگی عذاب ہو گئی۔" میں نے لہجے میں رقت پیدا کی۔ "ہم پولیس میں گئے رپورٹ لکھوانے تو پولیس نے مجھے بند کر دیا۔ اس غنڈے نے پولیس سے سازباز کر لی تھی۔"

"اچھا یہ بات ہے؟ آنے دو میرے بیٹے کو..." عورت نے خفگی سے کہا۔

"پھر جی میرے یار نے تھانیدار کو دو ہزار رشوت کے دیے تو اس نے مجھے چھوڑ دیا۔" میں نے کہا "لیکن اسی نے مجھ سے کہا کہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ بعد میں کچھ ہوا تو میں ذمے دار نہیں۔ تھانیدار بھی تو ڈرتا تھا اس غنڈے سے۔"

"اچھا۔ کیا نام ہے اس تھانیدار کا۔ خیر... میرا بیٹا معلوم کر لے گا۔"

"ہم بڑی مشکل سے پہننے کے کپڑے لے کر نکلے تھے مگر کسی نے اس کو خبر کر دی۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمارے پیچھے لگ گیا۔ ہم اگر بس یا ٹرین سے آتے تو وہ ضرور ہمیں قتل کرا دیتا۔ اس سے چھپاتے یہاں تک پہنچے ہیں۔ حالت دیکھ لیں آپ ہم سب کی۔"

"تم سب نے گلیم اعوان سے لاہور تک پیدل سفر کیا ہے؟" عورت نے بے یقینی سے کہا۔

"سارا راستہ تو نہیں جی... کبھی تانگے میں چڑھ لیا کبھی کسی نے بیل گاڑی میں۔" میں نے کہا۔ لیکن عورت ان خراشوں کو دیکھ رہی تھی جو ہم سب کے ہاتھوں پر اور چہروں پر لمبی لمبی لکیروں کی صورت میں نظر آ رہی تھیں۔ یہ خراشیں اسی عورت کے گھر کی جھاڑیوں میں چھپنے سے آئی تھیں مگر ہماری دکھ بھری کہانی نے اس کے دل میں رحم کے جذبات جگا دیے تھے۔ وہ غور کر رہا تھا بھی دیکھ سکتی تھی کہ زخم تازہ ہیں اور ہمارے پیروں میں اتنے لمبے سفر کے بعد بھی آبلے نہیں پڑے ہیں۔ اس نے رابعہ کے اور نازو کے جگہ جگہ سے پھٹ جانے والے کپڑوں کو بھی دیکھا اور ان کی بیمار صورتوں کو بھی۔ پھر وہ بندوق ایک طرف رکھ کے آہستہ آہستہ آئی۔ "اس لڑکی... کیا نام بتایا اس کا... نازو... اسے کیا ہوا ہے؟" وہ لحاف اٹھا کے دیکھنے کے بعد بولی۔

"کچھ نہیں بیگم صاحبہ۔ یہ بیچاری وسوسوں میں پڑ گئی تھی۔ وہ غنڈہ بعد میں اس کے پیچھے پڑ گیا تھا کہ چلو چھوٹی بہن ہی سہی۔ اور نکاح بات تو ایک ہی تھی۔ خیراتی نے ایک بہن پر ظلم برداشت کیا تو دوسری پر کیسے ہونے دیتا۔" میں نے کہا۔ "ہم اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اور بس عزت کے ساتھ جان بچا کر نکل آئے۔ نازو پر سردی کا اثر ہے۔ دو دن سے بھوکی بھی ہے۔"

"کھانے کا کسے ہوش تھا بیگم صاحبہ۔" محسن بولا۔ "بیمار پڑ بہت آ گئے تھے۔"

"چلو اٹھاؤ اس لڑکی کو... اور تم سب بھی اندر چلو۔ یہاں تو یہ ٹھنڈ کی مر جائے گی۔" عورت نے کہا۔ "میں ڈاکٹر کو بلواتی ہوں اور تمہارے کھانے پینے کا انتظام کرتی ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے تم سب ابھی مرنے والے ہو۔"

میں نے باری باری محسن اور ٹیڈی کی طرف دیکھا۔ صورت حالات میں یہ تبدیلی ہمارے لیے خوش آئند بھی تھی اور باعث تشویش بھی۔ وہ کسی بہت بڑے تیس مار خاں کا گھر تھا جس میں ہم انتہائی مجبوری کے عالم میں پناہ گزین ہوئے تھے کیونکہ آج کی رات ہمارے لیے کسی ہوٹل میں قیام کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ چوہدری دلاور کے گھر گئے تو پہلے ہی ہمارے بدلی ہوئی صورتیں ملاحظہ کر چکے تھے اب پولیس کو بھی پتا مل گیا تھا کہ ہمارا حلیہ اب کیا ہے۔ میک اپ سے حلیہ بدل کر چھپنے کا مقصد غارت ہو گیا تھا۔ اس سے تو نہیں بہتر تھا کہ میرا اصل شکل کو وہ اب ہماری اصلی شکلوں کے مطابق تلاش کرتے رہیں۔ اور پہلی صبح تک یہ تمام حلیوں کے مطابق ہی تلاش ہوتی تو ہم یقیناً اس حلیے کو تبدیل کر لیتے۔ دھوکا یہی کی صورت ہو جاتی تو ہم یقیناً اس حلیے کو تبدیل کر لیتے۔ دوسرا خطرہ تھا کہ اس مقفل دروازے سے شٹ دیا اور ہم گھر کو خالی سمجھے۔ وہ نالی جو بکاری بندوق والی خاتون نے بجلی میں جلا دیے اور تنبیہی گولی بن گئے۔ نازل ہم پر بات بات پر بیٹھنے کی دھمکی دینے والی اس عورت کو کیسے قابو کیا جا سکتا تھا لیکن ایک تو عورت عمر رسیدہ اور آسانی سے قابو میں آنے والی نہیں تھی۔ پھر یہ کہ وہ خطرناک نہیں لگتی تھی۔ اس کے پاس ہم سب کی ماں کے برابر تھی۔ پھر یہ کہ وہ اس کے دل کے آئینے کی طرح صاف نظر آتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اسے مطمئن کرنے کے لیے ڈال دوں لیکن میری جھوٹی کہانی نے بھی اس کے دل کو دکھی کر دیا اور جتنی آسانی سے اس نے ہمارا اعتبار کر لیا اسی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کتنی سادہ لوح ہے۔ اس کا رویہ ذرا سی دیر میں ہمدردانہ اور محبت بھرا ہو گیا تھا۔ اگر ہم غور کرتے تو مہمان داری کی یہ پیشکش بہت بروقت تھی۔ ہم سب کو صرف ایک گوشۂ عافیت کی ہی نہیں آرام کی اور خوراک کی بھی اشد ضرورت تھی لیکن دوسری طرف اس گھر میں قیام سے ہمارے جھوٹ کا پردہ چاک ہونے کا ڈر بھی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس عورت کا بیٹا کوئی پولیس افسر تھا اور ہم جیسے مجرموں کا کسی پولیس افسر کے گھر مہمان ہونا ایسا ہی تھا جیسے مرغیوں کے خول کا لومڑی کے گھر میں بسیرا کرنا۔ ایک خطرہ نازو کی طرف سے بھی تھا کہ ہوش میں آتے ہی وہ پھر چیخنا چلانا شروع کر دے اور ہماری منہ کھولی آپ بیتی سفید جھوٹ کا پلندہ بن جائے۔

"سامان اٹھاؤ، میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔" عورت نے ڈانٹ کر کہا اور پھر اپنی بندوق اٹھا لی۔

"پہلے خواجہ صاحب! اٹھائیے یہاں سے بھی اپنا یہ صندوق۔" محسن نے کہا۔

"چاہو تو اس گلی کے ڈبے کو پڑا رہنے دو۔ کوئی نہیں اٹھائے گا۔" عورت نے ٹیڈی کے خستہ حال صندوق کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں بیگم صاحبہ۔ اسے میں اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔" ٹیڈی نے ہماری طرف دیکھے بغیر کہا۔

"کوئی بہت اہم اور قیمتی سامان ہے اس میں؟" وہ مسکرائی۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"یہ ٹیک محمد ہے بیگم صاحبہ۔" محسن نے فوراً کہا۔ پھر اس نے نازو کو اٹھایا۔ میں نے ٹیڈی کے ساتھ مل کر بستر کو دوبارہ ویسا ہی بستر بنایا۔ دونوں سوٹ کیس پھر میں نے اٹھائے اور اس عورت کے پیچھے چل پڑا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم سب ایک کمرے میں تھے جہاں آرام و آسائش کے سب اسباب مہیا تھے۔ بیڈ صرف ایک تھا مگر فرش پر ایک کونے سے دوسرے کونے تک جو قالین بچھا ہوا تھا اس کی دبازت کسی بھی گدے سے کم نہ تھی۔ اس عورت نے کونے میں رکھے ہوئے ڈبل راڈ والے ریفلیکٹر ہیٹر کو آن کر دیا۔

"میں کچھ کمبل بھجوا دیتی ہوں۔" وہ بولی۔ "یہ مہمانوں کا کمرہ ہے اس لیے بیڈ تو یہاں دوسرا نہیں لگ سکتا۔ تمہیں نیچے ہی سونا پڑے گا۔ عورتوں کو بیڈ دے دو۔"

"جی بہت بہتر۔" میں نے کہا۔ "آپ کو ہماری وجہ سے بہت زحمت ہوئی۔"

"زحمت کیسی۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلی ہوں۔ مجھے جگہ کم تو نہیں پڑ رہی ہے۔" وہ بولی۔ "پہلے میں ڈاکٹر کو فون کر دوں۔"

"نہیں بیگم صاحبہ۔ اس کی بالکل ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "نازو بیمار نہیں ہے... بس... ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

"ہاں... اچھا دیکھو تم لوگ اگر ہاتھ منہ وغیرہ دھونا چاہو تو اس باتھ روم میں سب کچھ ہے۔ گرم پانی بھی ہے۔ میں تم لوگوں کے لیے کچھ کھانے پینے کا انتظام کرتی ہوں۔"

مجھے اب واقعی شرمندگی ہونے لگی تھی۔ "آپ آدھی رات کو کیا انتظام کریں گی۔"

وہ ہنسی۔ "اے ہے بیٹا! تھوڑا بہت تو فریج میں سے نکل آئے گا۔ پھر میرے ساتھ نوکر ہوتی ہے۔ اسے جگا لوں گی۔ وہ بنا کر دے گی سب کچھ۔ تم لوگوں کے پاس پہننے کے کپڑے تو ہوں گے۔" اس نے ہمارے سوٹ کیسوں کی طرف دیکھا۔ "اتنی دیر میں بدلنا چاہو تو بدل لو۔"

کچھ دیر پہلے میں نے مذاق میں ایک بات کہی تھی کہ آرام دہ بستر، گرم پانی سے غسل، بہترین کھانے اور گرما گرم کافی کا تصور کرو تو اس میں بھی بڑی راحت ہے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ خواہش ایک دعا بن کے ہفت افلاک سے اوپر خدا کے حضور اسی وقت پہنچی جب قبولیت کی گھڑی تھی اور پھر اس کا حکم ہوا تو خواب کو تعبیر ملی اور جو ناممکن سمجھا جا سکتا تھا وہ ممکن ہوا۔ جب وہ عورت چلی گئی تو کمرے میں ہم چاروں کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے اور پھر ایک ساتھ ہنس پڑے۔ "اسے کہتے ہیں معجزہ۔" میں نے کہا۔ "اور بھی کچھ مانگتے خدا سے تو مل جاتا۔"

"ابھی کی تو کوئی بات نہیں۔ صبح اس عورت کا توپ چلانے والا بیٹا آ گیا تو کیا ہوگا؟" رابعہ بولی۔

"صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔" میں نے رابعہ کو بازو پکڑ کے کھڑا کر دیا۔ "ابھی تو تم جاؤ اور موقعے سے فائدہ اٹھاتے

www.paksociety.com

غسل کر لو، اپنے کپڑے لیتی جاؤ اور دیر مت لگانا۔ ہم سب اپنی باری کے منتظر ہیں۔"

"میرے کپڑے تو تمہارے سوٹ کیس میں ہیں... اور سب... میرا مطلب ہے اچھے والے، شہری وضع کے۔"

"میں اسی لیے تم کو اس آزار سے بچا رہا ہوں۔" میں نے کپڑے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ "نازو کے کپڑے ابھی ٹھیک ہیں۔"

"ابھی تو نازو تھکن سے نڈھال ہو گئی ہے، اس لیے سو رہی ہے۔" محسن نے اپنا سوٹ کیس کھولتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ نیند کا وقفہ بہت مختصر ہو گا۔"

"میرا خیال ہے اکیلی رہنے والی یہ خاتون اعصابی سکون کے لیے کوئی دوا ضرور استعمال کرتی ہوں گی۔ تنہائی ان کا روگ ہو گی اور اس عمر میں کوئی بھی دن رات سو کر وقت نہیں کاٹ سکتا۔" میں نے کہا: "ان سے کوئی ایسی دوا مل جائے تو اچھا ہے کہ نازو ذرا پُرسکون ہو جائے۔"

محسن کے سوٹ کیس میں سب سے اوپر ہمارا اسلحہ تھا۔ اس نے سب ریوالور کپڑوں کے نیچے چھپا دیے۔ اسٹین گن کسی سوٹ کیس میں نہیں آ سکتی تھی چنانچہ میں نے اسے گیراج میں پلنگ کے نیچے چھوڑ دیا تھا۔ عورت کے اندر سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں دروازہ کھول کے نکلا اور دو کمروں سے گزر کے کچن تک جا پہنچا۔ باہر سے پرانی نظر آنے والی کوٹھی اندر سے شاہانہ طرز پر آراستہ تھی اور میرے اندازے کے مطابق انتہائی بیش قیمت فرنیچر بھی امپورٹڈ تھا۔ اتنی بھاری اور بڑی جگہ گھیرنے والی اشیاء کو باہر سے منگوانے پر کتنی لاگت آئی ہو گی، اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا لیکن یہ دولت مندی کی نمائش، یہ شان و شوکت اور سامان تعیش کی یہ فراوانی دیکھنے کے بعد مجھے یقین آ گیا کہ بڑی بی کا بیٹا واقعی بڑی چیز ہو گا۔ جب تو مجھے ان سے ویلیم کی گولیاں مل گئیں۔ میں نے پانی کا گلاس بھی کچن سے لے لیا جہاں ایک ادھیڑ عمر خادمہ بہت مصروف ہو گئی تھی۔ میں کمرے سے واپس آیا تو رابعہ غسل کے لیے جا چکی تھی اور محسن نے اپنے اور میرے لیے شلوار قمیص نکال لیے تھے۔ جو پہلے کے استعمال شدہ تھے مگر پھر بھی بہت صاف تھے۔ نازو اپنے ساتھ اس صندوق کے سوا کچھ نہ لا سکی تھی چنانچہ اسے بھی ہمارے ہی کپڑے ملے۔ میں نے قریب جا کے دیکھا تو نازو آنکھیں کھولے چھت کو گھور رہی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے ماحول بدلا ہوا نظر آیا تھا لیکن یہ اس کے اپنے گھر جیسا ماحول تھا۔ اگر اس کی آنکھ تانگے میں کھلتی جب وہ ہمارے پیروں کے قریب گھوڑے کے چارے پر سمٹی پڑی تھی یا اسے گیٹ کے پیچھے ہوش آتا تب وہ مٹی دھول پہ جھاڑیوں میں اور پتھریلی زمین پر لیٹی ہوئی تھی تو شاید وہ خوفزدہ ہو کے چلانے لگتی مگر اب وہ صاف ستھرے بستر پہ ایک سجے سجائے کمرے میں تھی اور اس کے آس پاس جانے پہچانے لوگ تھے۔ جذباتی ہیجان کا دورہ … تھا لیکن گزر جانے والے سیلاب کی طرح اپنے آثار چھوڑ گیا … وہ بچھا کر رو رو کے تھکی ہوئی اور بیمار نظر آ رہی تھی۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں نا سکندر؟" وہ آہستہ سے بولی۔

میں نے اس کا سرد ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا۔ "تم ہمارے ساتھ ہو اور ہمارے ساتھ ہی رہو گی۔"

اس کے زرد چہرے پر تھوڑی سی سرخی جھلکی۔ "اب واپس جانے کے لیے تو نہیں کہو گے؟"

"کبھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"کبھی مجھے دھوکا دے کر تو نہیں چھوڑ جاؤ گے؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے کہا۔

"اگر تم نے کبھی ایسا کیا نا... تو میں مر جاؤں گی... مت سمجھنا میرے لیے مرنا بہت آسان ہے۔" وہ بولی۔

"میں وعدہ کر چکا ہوں پھر ایسی باتیں کیوں کرتی ہو؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ... تم میرا اعتبار نہیں کرتے۔" وہ بولی۔ "یہ سمجھتے ہو کہ میں نے بھی تمہارے ساتھ دھوکا کیا تھا۔"

"اب میں ایسا نہیں سمجھتا۔ تم میرے لیے اتنی ہی قابل اعتبار ہو جتنی رابعہ ہے۔" میں نے کہا۔ "لو اٹھو۔ اب یہ دوا …"

"کیسی دوا ہے یہ؟ مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔" وہ … ہو کے بولی۔

"ہاں، ہوا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ دوا صرف اعصابی سکون کے لیے ہے۔" میں نے کہا۔

نازو نے خاموشی سے گولیاں لے لیں اور پانی کے ساتھ نگل لیں۔ "ان کی ضرورت تو نہیں تھی۔ تمہاری باتوں نے سکون دیا ہے مجھے۔"

اسی وقت رابعہ باتھ روم سے نکلی۔ تولیہ اس کے شانوں پر اور پشت پر پھیلا ہوا تھا اور گیلے بال تولیے میں لپیٹے ہوئے تھے۔ نازو کی بات اس نے بھی سنی اور میری طرف غور سے دیکھ کر مسکرائی۔ اس کا رنگ روپ گرم پانی سے دھل کر ایسا نکھر آیا تھا کہ نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا۔ اس کے کپڑے بھی ایک … ہو گئے تھے اور ان پر استری بھی نہیں تھی مگر ریشمی کپڑے کی آب و تاب باقی تھی اور جس طرح یہ پیرہن اس کے قالب کے سانچے میں ڈھلا تھا اس سے تناسب کا حسن نکھر آیا تھا … پتا چلتا تھا کہ حسن ملبوس اور ملبوس سے پیدا ہونے والے … کسی ماہر فن درزی کا کمال …

… نہیں لگتی تھی۔ مٹی کیچڑ دھو کر صاف کر لینے کے بعد میرا لباس اس قابل … کہ کسی اندر سے کو بھی دھوکا نہیں دیا جا سکتا تھا … کہ اس کے پاس دیہاتی وضع قطع کے اور کم قیمت کپڑے ہی نہیں۔

"یہ گھر کس کا ہے سکندر؟" نازو نے لیٹے لیٹے کہا۔

"میں جو کچھ … یہ ہے ایک ایسی جگہ جہاں ہم آج رات بھر کے مہمان ہیں۔" میں نے کہا اور محسن کو تولیہ لے کر باتھ روم میں گھستے دیکھا۔

"کل ہم کس کے مہمان ہوں گے، یہ ہم بھی نہیں جانتے۔" رابعہ نے بال سنبھالتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"اب تم نے خود ہی گھر بار چھوڑ کے ہمارے ساتھ خانہ بدوشی اور خواری قبول کی ہے تو آنے والے دن سے امیدیں ضرور وابستہ رکھو مگر اس کو یقین مت جاننا۔" میں نے کہا۔ "اب تمہیں نیند آنے لگی ہے لیکن ابھی مت سونا۔ ہماری میزبان ایک نیک دل خاتون ہیں۔ وہ تمہارے لیے گرم دودھ کا ایک گلاس لے کر آ رہی ہیں۔"

"کون ہیں وہ خاتون، نام کیا ہے ان کا؟" نازو بولی۔

"نام تو ہمیں ان کے عظیم خان بیٹے کا بھی معلوم نہیں جس کا یہ محل ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ خاتون یہ سمجھتی ہیں کہ ہم بڑے مظلوم لوگ ہیں۔ ہم نے انہیں ایک ایسی کہانی سنائی تھی کہ پتھر بھی ہوتا تو پگھل جاتا۔ مختصراً یہ سمجھ لو کہ تم نازو ہو۔ رابعہ تمہاری بڑی بہن ہے مگر اس کا نام خیرات النساء عرف خیراں ہے۔ محسن خان تم دونوں کا بھائی ہے۔ خیرات محمد عرف خیراتی۔ میں رابعہ کا گھر والا ہوں، اول خان۔"

"لو بچی، یہ دودھ پلا دو اسے۔ اور لٹا کے سونے دو۔" بڑی بی نے اندر آتے ہوئے کہا۔

نازو سونے لگی تھی اور شاید اس نے میری پوری بات سنی بھی نہیں تھی۔ میں نے اسے شانے سے پکڑ کے ہلایا تو اس نے پھر آنکھیں کھولیں۔

"لو بیٹی، شاباش، اٹھ کر تھوڑا سا گرم گرم دودھ پی لو۔ اور یہ اسپرین کھا لو۔" بڑی بی نے اپنی تمام شفقت نچھاور کرتے ہوئے نازو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "صبح تک بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ لو تم اس کو دودھ پلا دو۔" بڑی بی نے گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ جب وہ واپس جانے کے لیے مڑیں تو ان کی نظر رابعہ پر پڑی۔ ان کے قدم رک گئے۔

"یقین نہیں آتا کہ یہ دیہاتی لڑکی ہے۔" بڑی بی نے کہا۔ "خدا نظر بد سے بچائے۔ میں بھی کتنا غلط سمجھی تھی۔ مجھے معاف کر دینا بیٹی!"

"آپ کیوں شرمندہ کر رہی ہیں اماں!" رابعہ نے حیا سے سرخ ہو کے کہا۔

"خدا نہ کرے کہ کسی پہ برا وقت آئے۔ ہیرے کی قدر پتھر کے برابر نہیں رہتی۔" بڑی بی نے کہا۔ "اتنی مہذب شریف صورت اور نیک سیرت لڑکی کیا بن گئی تھی۔ میں تو کہتی ہوں کہ لاہور کی رہنے والی بڑے بڑے گھروں کی فیشن ایبل لڑکیاں تمہیں دیکھ لیں تو رشک سے مر جائیں۔ کھانا تیار ہے اور تم نے ابھی تک ہاتھ منہ نہیں دھویا۔" بڑی بی نے مجھے ڈانٹا۔

"بس ابھی دس منٹ میں ہم سب تیار ہو جاتے ہیں۔" میں نے ندامت سے کہا۔ بڑی بی کی شرافت اور شفقت میرے لیے باعث ندامت بن گئی تھی۔ وہ ہم سے ایسے پیش آ رہی تھیں جیسے ہم انہی کے بچے ہیں۔ ہم نے ضرورت کے تحت ایک جھوٹ بولا تھا مگر اب یہ خیال میری شرمندگی کا سبب بن گیا تھا کہ ہم نے ایک نیک دل عورت کی ساری عنایات اسے دھوکا دے کر حاصل کی ہیں اور اگر اسے حقیقت کا علم ہو جائے تو اسے کتنا صدمہ ہو گا اور کیا پھر وہ ہمارے ساتھ یہی سلوک روا رکھے گی؟ نہیں۔ وہ تو اپنے بیٹے سے ہمیں واقعی … کرا دے گی۔

نہا دھو کر کپڑے بدلنے اور کھانے سے فراغت پا کے سوتے سوتے ہمیں صبح کے تین بج گئے۔ کھانا جیسا بھی تھا اس وقت کسی دعوت شاہانہ سے کم پُرلطف نہیں لگا۔ کھانے کے بعد کافی تو نہیں ملی مگر گرم چائے مل گئی اور جب محسن نے ڈھیٹ بن کے سگریٹ مانگے تو بڑی بی نے اندر سے نیا پیکٹ لا دیا۔ ان کا بیٹا گھٹیا سگریٹ نہیں پیتا تھا چنانچہ ایک مدت کے بعد مجھے ہر آرزو کی تکمیل سے جو آسودگی ملی وہ میرے سارے رنج و غم اور دکھ درد کا مداوا بن گئی۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کے یوں سویا جیسے قبر میں سوتے ہیں اور میری طرح کسی کو بھی رات کے صبح میں اور صبح کے دوپہر میں ڈھل جانے کا احساس نہیں ہوا۔ سب سے پہلے نازو جاگی تھی۔ اس نے مجھے بیدار کیا۔ اندر سے مجھے بڑی بی کے علاوہ کسی مرد کی آواز سنائی دی۔

"شاید بڑی بی کا بیٹا آ گیا ہے۔" میں نے جماہی لے کر کلائی کی گھڑی دیکھی۔ دوپہر کے دو بج گئے! میرا خیال تھا کہ صبح نو دس بجے تک نکل جائیں گے۔ پھر میں نے محسن کو زور زور سے ہلایا۔ اس نے رابعہ اور ڈیڈی کو جگایا۔

"ہم بہت دیر تک سوتے رہے۔" محسن نے کہا۔ "اب بڑی بی کے جرنیل بیٹے سے بھی شرف ملاقات حاصل ہو گا۔"

"اخلاقاً اگر اس سے مل کر اس کا شکریہ ادا کر دیا جائے تو کیا ہرج ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "وہ ہمیں کھا تو نہیں

www.paksociety.com

جانے گا۔"

"بس ٹھیک وہ پولیس والا نہ ہوا۔" میں نے کہا۔ "اور میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی ہے کہ..."

"تم بھی کمال کرتی ہو ماں!" مرد نے ایک دم بہت اونچی آواز میں کہا۔ "کیا ضرورت تھی آخر انہیں گھر میں لانے کی؟"

"ارے بیٹا، وہ شریف اور مصیبت کے مارے ہیں۔" بڑی بی نے کہا۔

"آپ کو ساری دنیا شریف لگتی ہے مگر ایسا نہیں ہے ماں۔" مرد نے بگڑ کر کہا۔ "شریف نظر آنے والے چہرے دھوکا بھی دے جاتے ہیں۔"

"ارے چل رہنے دے۔ میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔" ماں نے کہا۔ "میں شرافت کو پہچانتی ہوں۔"

"اف! آخر میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ ہر اجنبی کو مہمان بنا لینا کوئی عقلمندی نہیں۔" بیٹا جھلانے لگا۔ "کسی دن آپ کو نقصان ہوگا تو آپ مانیں گی کہ میں غلط نہیں کہتا تھا۔ آپ اکیلی ہوتی ہیں۔ کوئی سب کچھ لوٹ کر لے جائے گا اور آپ کو قتل کر کے ڈال جائے گا۔ آپ کی انہی باتوں کی وجہ سے تو میں پریشان رہتا ہوں۔ ایک تو گھر سے باہر رہنے کی مصیبت، نہ وقت پہ کھانا نہ آرام، اوپر سے آپ کی طرف سے فکر کہ پیچھے کوئی آپ کی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں۔" اسے بالکل خیال نہیں تھا کہ اس کی بات کا ہم پر کیا اثر ہوگا۔

"میں خود اپنی دیکھ بھال کر سکتی ہوں۔" ماں نے کہا۔ "آخر اس عمر میں بندوق چلانی سیکھی ہے۔"

"اس کا کیا فائدہ۔ کوئی چور ڈاکو آ گیا تو اس کے پاس ریوالور ہوگا۔ یا اسٹین گن ہوگی۔" بیٹے نے کہا۔ "کیا کر لیں گی آپ بندوق سے۔ ہزار بار کہا ہے کہ رات کو کسی کے لیے دروازہ مت کھولیں۔ آپ نے پوری پلٹن کو گھر میں ڈال لیا۔ معلوم نہیں کون چور اچکے ہیں۔ یہ سب ایسے ہی گروہ بنا کے واردات کرتے ہیں۔ بڑی معزز اور شریف نظر آنے والی عورتیں بھی ہوتی ہیں ان کے ساتھ..."

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ "یہ آواز مجھے کچھ سنی ہوئی لگتی ہے محسن۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "میں اٹھ کر دیکھتا ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسی نیک اور شریف ماں کا بیٹا اتنا بداخلاق اور بدمزاج ہو سکتا ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں آخر یہ کون لوگ ہیں۔" مرد کی آواز آئی اور میں اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔ میرے ایک اشارے پر سب پھر سوتے بن گئے۔ رابعہ اور نازو نے بیڈ کا رخ کیا اور لحاف میں گھس کر ساکت ہو گئیں۔ پیچھے ہم سب نے کمبل میں سر لپیٹ لیے لیکن میں نے کروٹ لے کر کمبل کا ایک کونا تھوڑا سا اٹھائے رکھا کہ ایک آنکھ سے اندر آنے والے کی صورت دیکھ سکوں۔

"ایسے سو رہے ہیں جیسے باپ کا گھر ہے۔" مردانہ آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ دروازے سے نمودار ہوا۔ روشنی اس کے چہرے پر مقابل کی دیوار کی طرف سے پڑ رہی تھی۔ ایک ادھ کھلی آنکھ سے میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے خون میری رگوں میں منجمد ہو چکا ہے۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ڈی ایس پی کھڑا ہوا تھا جو میرا سب سے پرانا اور سب سے خطرناک، سب سے زیادہ کینہ ور دشمن تھا۔ اسی شخص نے مجھ پر سفاکانہ مظالم سے میرے مصائب کے دور کا آغاز کیا تھا اور جس سے جانا تھا کہ انسانوں کی دنیا میں کتنے شیطان صفت انسان چہروں پر نقاب ڈالے پھر رہے ہیں جو آدمی نظر آتے ہیں لیکن ان کا وجود آدمیت کی تذلیل ہے۔ اس سے پہلے آدمی کی سرشت میں شامل نیکی پر کامل اعتماد تھا اور میری نگاہ صرف آدمیت کے تقدس کو دیکھتی تھی۔ ایک بے رحم رات کی یاد نے میرے جسم پر کپکپی طاری کر دی اور میری روح نے پرانے وقت کے آزار کو دوبارہ اسی طرح محسوس کیا۔ میرے وجود میں سلگنے والا آتش فشاں پھٹنے کے قریب ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت میرے ہاتھ میں اسٹین گن ہوتی تو اپنے سامنے کھڑے ہوئے دشمن کے جسم کو چھلنی کر دیتا۔ میں نے انتقام کی سرکش قوت کو اس لیے قابو میں رکھا کہ میں نے ایک شریف النفس بوڑھی عورت کے گھر کا نمک کھایا تھا اور اس عورت نے ہم میں سے کسی کو بیٹا کہا تھا تو کسی کو بیٹی۔

وہ بڑی نخوت اور بددماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے آیا۔ نیچے جھک کر اس نے میرے چہرے پر سے کمبل کھینچ لیا۔ "اٹھیے حضور! صبح ہو گئی۔" وہ حقارت آمیز طنزیہ لہجے میں بولا۔ "خدام انتظار لیے دست بستہ کھڑے ہیں۔"

میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور بے وقوفوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔ سراج نے اسی طرح حمیدی اور محسن کے کمبل کھینچ لیے تھے۔

"شرم آنا چاہیے تم لوگوں کو۔" وہ بولا۔ "ایک رات کے لیے جگہ مل گئی کھانے کو مل گیا تو اب دفع کیوں نہیں ہو جاتے۔"

"ہم تو رات ہی کو جا رہے تھے سرکار۔" محسن نے کہا۔ "آپ کی اماں نے روک لیا۔"

"میری ماں... کیا اس [illegible]

اینٹھتے رہتا۔" سراج کا چہرہ

نے چوبیس گھنٹے کا کرایہ ادا کیا ہے؟ وہ جس کے بدمعاش کیا جواب [illegible] کھانا بھی مفت ملنے کی امید ہوگی نا۔" اس نے بدمعاشوں کی طرف نفرت سے دیکھا۔ ہماری بدلی بدلی ہوئی صورتوں کی وجہ سے وہ ہمیں پہچان نہیں سکا تھا مگر میری اور محسن کی ایک جیسی شکل و شباہت پر وہ حیران نظر آتا تھا۔ وہ وردی میں تھا اور پہلے کے مقابلے میں اس کا جسم کچھ بھاری ہو گیا تھا لیکن جو چیز نہیں بدلی تھی وہ اس کی فطرت کی خباثت تھی۔

"کیا تم دونوں بھائی ہو؟" وہ ہمارے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "جڑواں بھائی ہو؟"

"ہاں جی۔" میں نے دروازے کی طرف دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ سراج کی ماں سامنے نہیں تھی۔ اسے میں نے بتایا تھا کہ محسن میرا سالا اور رابعہ کا بھائی ہے۔

"تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟" وہ بولا۔ "تمہاری صورت اتنی زیادہ تو نہیں ملتی۔"

"بس جی۔ خدا نے جتنی ملا دی، ملا دی۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"باقی حلیہ تو تم دونوں نے ملا کے ایک کر لیا۔ کیوں؟" وہ بولا۔ "ہے نا یہی بات؟ ایک جیسے بال اور ایک جیسی داڑھی اور بالوں کا ایک جیسا رنگ۔ یہ سب مجھے قدرتی نہیں لگتا۔"

میں نے اور محسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سراج کی نظریں ہم دونوں پر جمی رہیں۔ وہ بہت چالاک آدمی تھا اور عیاری اس کی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ اس کی زندگی کے شب و روز مجرمانہ سرگرمیوں میں گزر رہے تھے اور اس ملازمت میں اس کا بیشتر وقت مجرموں کو پکڑنے اور ان سے نمٹنے گزرتا تھا۔ آدمی ذہین تھا مگر اس کی ذہانت منفی تھی۔ چنانچہ صف اول کے مجرموں نے خود ہی اسے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے موزوں جان کے منتخب کر لیا ہوگا۔

"یہ عورتیں کون ہیں؟ یہ تمہاری کیا لگتی ہیں؟" وہ پہلو بدل کے بولا۔

"ان میں سے ایک میری بیوی ہے۔ دوسری اس کی بہن۔" میں نے کہا۔ "یہ ان کا بھائی ہے نیک محمد۔" میں نے حمیدی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اس نے مجھ سے جرح شروع کر دی اور وہ ساری کہانی پھر سنی جو میں اس کی ماں کو سنا چکا تھا لیکن وہ مسکرا رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میری کسی بات کا یقین نہیں کر رہا تھا۔ اس کا سلوک ہمارے ساتھ ایسا ہی تھا جیسے ہم اس کے گھر میں نہیں تھانے میں ہیں۔ اور وہ ہم سے تفتیش پر مامور ہے۔

"ان دونوں عورتوں کو اٹھا کر میرے سامنے لاؤ۔" اس نے مجھے حکم دیا۔

اس کے ذلیل کرنے والے انداز تخاطب کو نظر انداز کر کے میں نے رابعہ اور نازو کو اٹھایا اور میرے کہنے پر وہ سراج کے سامنے آ گئیں۔ میرے علاوہ سراج کو محسن نے بھی شناخت کر لیا تھا مگر اس نے بھی میری طرح جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے اس وقت تک انجان بنے رہنا بہتر سمجھا تھا جب تک کہ خود سراج پہل نہ کرے اور ہمارے خلاف عملی قدم نہ اٹھائے۔ رابعہ نے بھی سراج کو پہچان لیا اور اس کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے اڑ گیا۔ یہ ناممکن تھا کہ سراج جیسے شخص سے یہ تبدیلی پوشیدہ رہ گئی ہو۔

"تم اس شخص کی بیوی ہو؟" سراج نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

رابعہ نے سر جھکا لیا۔ مجھے اس کے اقرار کا یہ انداز بہت اچھا لگا۔ بہت شرمیلا اور بہت دلنواز۔

"بولتی کیوں نہیں؟" سراج نے ایک دم گرج کر کہا۔ "تو بیوی ہے اس کی؟ بہن کون ہے؟ تیرا نام؟"

"جی سرکار۔" رابعہ نے بمشکل نام کہا اور اس کے ساتھ کھڑی ہوئی نازو سمٹ کر پیچھے ہو گئی۔

"اور تم سب کیا اعوان کے رہنے والے ہو؟" اس نے ہم سب کی طرف ایک نظر ڈالی۔ "تو پڑھاتی ہے [illegible] میں؟"

"جی سرکار۔" رابعہ نے میری طرف نظر اٹھا کے دیکھا۔ اگر سراج اس سے اسکول کا نام پوچھتا تو وہ کبھی نہ بتا پاتی لیکن سراج نے ایک دم ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ ہمیں آہستہ آہستہ نروس کرنے کے سارے طریقے آزمانا چاہتا تھا۔ اچانک وہ کھڑا ہو گیا اور ٹہلتا ہوا رابعہ کے بالکل سامنے اس سے چند انچ کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔

"میری طرف دیکھو۔" اس نے حکم دیا اور پھر اپنے ہاتھ سے رابعہ کا چہرہ زبردستی اوپر کر دیا۔ میرا چہرہ سرخ ہو گیا اور خون کی سنسناہٹ میرے کانوں میں سنائی دینے لگی۔ محسن نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے تمہاری صورت کچھ دیکھی ہوئی لگتی ہے۔" سراج نے کہا۔ "کہاں دیکھا تھا میں نے تم کو؟"

"میں کیا بتاؤں جناب۔" رابعہ نے کہا۔ وہ اب واقعی خوفزدہ تھی۔

"اچھا تو میں بتاتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا اصلی نام

www.paksociety.com

کچھ اور ہے۔ قاتل رابعہ۔ اور تم وکیل ہو۔" سراج نے کہا۔

میرا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا اور مجھے یوں لگا جیسے رابعہ بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ میں ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ سراج ایک دم پلٹا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر میں رک گیا۔ بظاہر کھیل ختم ہو چکا تھا۔ اچانک سراج کی ماں دروازے سے اندر آئی۔

"سراج۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ چلا کے بولی۔

"ڈراما ہو رہا ہے ماں۔" وہ ہنس کر بولا۔ "تم بھی دیکھو کیسے کیسے کردار ہیں۔ ان کے اصل چہرے دیکھو گی؟ اچھا جاؤ اپنی بندوق اٹھا لاؤ۔ آج استعمال کا وقت آگیا ہے۔"

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟" سراج کی ماں نے ہم سب کی طرف دیکھا۔

"جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو۔ تم ساری دنیا کو شریف سمجھتی ہو اپنی طرح۔ میں ابھی تم کو دکھا دیتا ہوں کہ دنیا کیا ہے۔" وہ بولا۔

میں نے نظر اٹھا کے نازو کی طرف دیکھا۔ وہ سراج کے پیچھے پہنچنے کے لیے آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی۔

"جب میں نے تمہیں پہچان لیا رابعہ بی بی... مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ۔" سراج پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "تو پھر دوسرے چہروں کو پہچاننا کیا مشکل ہے۔ ان دو جوکروں میں سے کوئی بھی تمہارا خصم نہیں۔ میرا مطلب ہے قانونی طور پر۔ ویسے تم جسے چاہو خصم بنا لو۔ ایک تمہارا موکل ہے۔ سکندر خان ولد وزیر خان۔ دوسرا اس کا ہمزاد۔ محسن حسن خان۔ دونوں کے کارناموں کی تفصیل سنانے لگوں تو آرسین لوپن، بلیک ٹائیگر اور جیرام ڈاکو کے کارنامے ہیچ نظر آئیں۔ لیکن تم سب کچھ جانتی ہو تو وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ تم کو تقدیر کہاں لے آئی۔ مہمان بھی تم ہوئے تو کس کے؟"

سراج کی ماں دو نالی بندوق کے ساتھ پھر اندر آئی۔ اپنے بیٹے کی بات سے زیادہ اسے ہماری مجرمانہ خاموشی نے شکوک میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر ہم سچے ہوتے تو تردید کرتے۔ احتجاج کرتے اور جھوٹ کو جھوٹ کہتے۔ سراج نے ماں کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت جب وہ میرے قریب سے گزر رہی تھی مجھے خیال آیا کہ میں اسے دبوچ لوں۔ ماں کی خاطر بیٹا ہم سب کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا اور ہم ماں کو یرغمال بنا کے اپنی جانیں بچا سکیں گے لیکن سراج کے ریوالور کا رخ ہم تینوں کی طرف تھا۔ وہ کسی کو بھی گولی مار دیتا۔ اس جیسے بیٹے سے یہ بھی بعید نہ تھا کہ ماں کی پروا بھی نہ کرے۔ پھر خود میرے ہاتھ اس لڑکی کی طرف نہ اٹھ سکے اور میں نے اضطراری سمجھا یہ ساری توقعات نازو سے وابستہ تھیں۔ نازو کی پہلی کوشش کا نتیجہ کچھ نہیں نکلا تھا کیونکہ سراج کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر اکیلی کھڑی رہ گئی تھی۔ نازو اسی طرح خاموشی سے سرکتی ہوئی سراج کی پشت کی جانب پہنچنے کی کوشش میں مصروف تھی اور اس کے اور میرے درمیان ایک ایسا فاصلہ یوں طے کر رہی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرتی محسوس ہی نہ ہوتی تھی۔

"تم اس عورت کو نظر میں رکھو ماں۔" سراج نے رابعہ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ذرا بھی حرکت کرے تو اس کی کھوپڑی اڑا دینا۔"

"لیکن بیٹا۔ یہ بے چاری تو اسکول ٹیچر ہے۔" سراج کی ماں نے ویسے لہجے میں احتجاج کیا۔

"اسکول ٹیچر؟" سراج قہقہہ مار کے ہنسا۔ "میری بھولی اور بے وقوف ماں، یہ مکار عورت وکیل ہے۔ اس کا نام نہیں رابعہ قاری ہے۔ یقین نہیں آتا تو پوچھ لو اس سے اور یہ اس کا گھر والا نہیں، اس کا یار ہے۔ ایک بڑا مجرم....."

سراج کی ماں نے رابعہ کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ دو نالی بندوق کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

"مسٹر اول خان، پہلے تم ادھر آؤ۔" سراج نے مجھے اشارہ کیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھیننا بہت آسان کام ہے مگر میری یہ بہادری رابعہ کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتی۔ وہ عورت کسی تذبذب کے بغیر گولی مار دیتی۔ میں نے خود کو صبر کی تلقین کی اور تعمیل حکم کے لیے آگے بڑھا۔ سراج کے ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آئے۔ اس نے کسی وحشی درندے کی طرح میری نقلی داڑھی نوچ ڈالی اور میرے گھنگریالے مہندی رنگ کے بالوں کی وگ کے ٹکڑے کر دیے۔ میں اپنی اصل صورت میں ننگے ہوتے ہوئے کی طرح کھڑا رہ گیا۔ سراج زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

"دیکھا تم نے ماں۔ تم اسے شریف اور معصوم مانتی تھیں۔ اب اس کی صورت پہچانو۔" سراج بولا۔ "میں دوسرے کو بھی اصل روپ میں تمہارے سامنے لاتا ہوں۔ یہ جو خیرات کا گھر والا تھا نا، یہ سکندر بخت ہے۔ کبیر ہے اور بہت کچھ ہے۔ اس کے اتنے ہی نام ہیں جتنے اس کے

جرائم۔ یہ جانے کتنے قتل کر چکا ہے۔ گاڑیاں چھیننا اس کا شوق ہے۔ یہ سب مجرم ہیں۔"

وہ میرے جرائم کی تفصیل اپنی ماں کو بتا رہا تھا اور میری نظر نازو پر تھی۔ میں اس کے اشارے کے انتظار میں تھا۔ نازو سراج کے بالکل پیچھے اس سے ایک فٹ دور رہ گئی تھی۔ جب اس نے اپنا بایاں ہاتھ تھوڑا سا اٹھا کے مجھے سگنل دیا۔ میں اڑتا ہوا گیا اور سراج کی ماں پر جا گرا۔ اس کی رائفل سے ہونے والے فائر کی آواز کمرے میں گونجی پھر وہ خود چلانے لگی۔ میں نے رائفل کو اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر گرتے دیکھا۔ جب میں سراج کی ماں کو سنبھال رہا تھا تو میں نے سراج کے چلانے کی آواز سنی۔ نازو نے اسے کرسی سمیت پیچھے الٹ دیا تھا۔ نازو کی نازک ہتھیلی کے ایک وار سے ڈی ایس پی صاحب کا مضبوط مردانہ بازو یوں ٹوٹ گیا جیسے کچی لکڑی والی شاخ۔ ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز خود میں نے سنی۔ نازو نے ریوالور محسن کی طرف اچھال دیا اور جب میں نے سراج کی ماں کو اس کے پیروں پر کھڑا کیا تو میں نے سراج کو انتہائی طیش کے عالم میں ٹوٹے ہوئے بازو کی پروا نہ کرتے ہوئے نازو کو لات مارنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ نازو نے بڑی پھرتی سے اس کا پنجہ تھام لیا اور اسے اپنے ہی زور میں گھما کے پھینک دیا۔ سراج صوفے پر گرا اور پیچھے لڑھک گیا۔ اس کا بازو کلائی سے ذرا اوپر ٹوٹا تھا اور بڑے مضحکہ خیز طریقے سے جھول رہا تھا۔ سراج کو حیران ہونے کا موقع تک نہ ملا تھا۔ اس کو اصل خطرہ مجھ سے تھا یا ہم تینوں مردوں سے تھا۔ اس نے رابعہ کا بھی بندوبست کر لیا تھا مگر اس نے نازو کو بالکل اہمیت نہیں دی تھی جو ایک کمزور نظر آنے والی معصوم صورت دبلی پتلی اور دھان پان سی لڑکی تھی۔ میں نے رابعہ کو بھی اپنے قریب کر لیا اور تماشا دیکھنے لگا۔

سراج اپنی مردانگی اور پولیس افسری کا بھرم رکھنے کے لیے آخری بار اٹھا اور آہستہ آہستہ نازو کی طرف بڑھا۔ پھر اس نے انتہائی پھرتی کے ساتھ نازو کو ٹکر مارنی چاہی۔ نازو صرف تماشا دکھانے کے لیے غوطہ مار کے فرش پر لیٹ گئی۔ اس کے دونوں پیر لیور کی طرح اوپر اٹھے اور سراج اس کے ساتھ ہی اٹھا۔ نازو نے تھوڑا سا جھٹکا دیا اور سراج ہوا میں کاغذی جہاز کی طرح تیرتا گیا۔ اس کے دیوار سے ٹکرا کے گرنے کی آواز پر اس کی ماں چلائی۔ سراج بے حس و حرکت پڑا رہا۔

"چھوڑ دو۔ خدا کے لیے میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں تمہارے سامنے۔" اس نے دہائیاں مار مار کے رونا شروع کیا۔ "میں نے تمہارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ اگر کوئی نیکی کی تھی تو اس کا واسطہ۔"

"ماں جی۔ آپ کے بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔ اگر ہم آپ کے مہمان نہ ہوتے تو آج ڈی ایس پی صاحب کو ضرور ساتھ لے جاتے۔ اس کا ہاتھ ٹوٹا ہے۔ دس پندرہ دن یا مہینے میں ٹھیک ہو جائے گا۔ بہتر ہوگا کہ آپ ہمارے آنے اور جانے کے متعلق کسی سے کچھ نہ کہیں۔ سراج کہہ سکتا ہے کہ وہ گر گیا تھا جس سے اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔" جیسے ہی میں سامنے سے ہٹا وہ چیخ مار کر سراج کی طرف لپکی اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر رونے لگی۔

محسن نے آگے بڑھ کر ریوالور اٹھا لیا۔ اس ماں کا سارا غرور خاک میں مل گیا تھا جو ہر بات پر اپنے بیٹے کا حوالہ دیتی تھی کہ وہ زمین اور آسمان ایک کر سکتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ایک کم عمر اور کمزور لڑکی کے سامنے بھی وہ کچھ نہ کر سکا۔ اس کی ماں کے جذبات بیٹے کو تکلیف میں دیکھ کر وہ ڈھے گئے تھے جو آنسوؤں کی صورت آنکھوں سے بہہ نکلا تھا۔ "تم سب کمینے اور بے غیرت ہو۔ ٹھیک کہتا تھا میرا بیٹا کہ تم سب مجرم ہو۔ یہ میری غلطی نہیں میرا گناہ تھا کہ میں نے تم کو مہمانوں کی عزت دی۔"

"یہ تو وقت خود آپ کو بتائے گا ماں جی کہ مجرم کون تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم بے اختیار لوگ تھے اس لیے مجرم بنا دیے گئے اور دنیا نے اس کی بات کو سچ مانا جو با اختیار تھا۔ میری ماں اس دنیا میں نہیں ہے۔ ہم میں سے کسی کی ماں نہیں ہے۔ آپ نے ہمیں اپنے گھر میں ماں کی شفقت دی۔ ایک وقت کی روٹی اور سر چھپانے کی جگہ تو فقیروں کو خیرات میں بھی مل جاتی ہے لیکن آپ نے ہمیں عزت اور شفقت کے ساتھ اپنے گھر میں مہمان رکھا۔ اس جذبے کی کوئی قیمت نہیں اور آپ کا یہ احسان ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔"

"بہت جلد بدلہ دیا تم نے اس احسان کا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس طرح میرے گھر میں چور ڈاکو اور قاتل گھس کر بیٹھ گئے ہیں۔ ورنہ میں تمہیں گولی مار دیتی۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ مجھے دھوکا دیا۔" وہ اسی طرح روتی رہی۔

"ہم مجبور تھے ماں جی۔" محسن بولا۔ "ہم سچ بولتے تو سر چھپانے کے اس ٹھکانے سے بھی محروم ہو جاتے۔ ہم تو شاید سردی، بھوک اور تھکان سب برداشت کر جاتے مگر یہ لڑکی ضرور مر جاتی۔ آپ نے اس کی حالت دیکھی تھی۔"

"اچھا تھا مر جاتی۔ جی کے بھی کیا کرے گی یہ۔ اگر اس

www.paksociety.com

عمر میں گھر سے نکل کے یہ تم جیسے بدمعاشوں کے ساتھ اس قسم کے دھندے میں پڑ گئی ہے۔" وہ بیٹے کا ٹوٹا ہوا ہاتھ اٹھا کے بولی۔ "دیکھ مراد۔ کیا حال کیا ہے تو نے میرے بیٹے کا۔ کتنی بھولی لگتی ہے صورت سے ناگن۔"

"اگر آپ کے بیٹے نے بھی ہمارے ساتھ یہی سلوک کیا ہوتا جو آپ کا تھا تو ہم اسے بھی سلام کر کے رخصت ہوتے مگر اس نے تو ہمیں جیل پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" میں نے کہا۔

"یہی کام ہے اس کا۔ تم کو جیل نہ بھیجتا تو کیا مہمان بنا کے رکھتا۔" عورت چلائی۔

"لیکن ہم اس طرح گرفتار نہیں ہو سکتے تھے۔" میں نے کہا۔ "جب تک ہم باہر تھے تمہارا بیٹا اور اس جیسے بہت سے ہمیں نہ پکڑ سکے۔ جب ہم اپنے پیروں سے چل کے خود اس گھر میں آ گئے تو ہمیں گرفتار کرنے میں کون سی بہادری ہے۔"

"ایسی ہی بہادری کا مظاہرہ ہم کرتے ماں جی تو کیا یہ گھر آپ کے بیٹے کے آنے تک محفوظ رہتا؟" محسن بولا۔ "یہ لڑکی جس نے صاحب بہادر کو دو منٹ میں چت کر دیا، کیا آپ سے بندوق نہیں چھین سکتی تھی؟ جو کچھ آپ نے دیا وہ ہم نے شکریے کے ساتھ احسان سمجھ کے قبول کیا۔ ہم آپ کو اور آپ کی خادمہ کو بند کر کے جو چاہتے خود لے لیتے۔ اور آپ کا بیٹا گھر لوٹتا تو اسی طرح پکڑا جاتا جیسے چوہے دانی میں جا کر چوہا پکڑا جاتا ہے۔"

"ہم تالا توڑ کے گھر میں نہیں گھسے تھے حالانکہ ہمارا خیال تھا گھر خالی ہے مگر ہم نے اسی گیراج کو کافی سمجھا تھا۔" میں نے کہا۔

سراج کراہنے لگا۔ "میں تم کو چھوڑوں گا نہیں۔"

"اس گھر کے باہر ہماری اور تمہاری کھلی جنگ ہے، ڈی ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "جنگ میں نہ تم نے کبھی رعایت کی اور نہ ہم کریں گے۔ ہم بھی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ اگر کبھی تمہاری جان بخشی ہوئی تو اس ماں کی دعاؤں کے طفیل ہوگی جس کا تم ایک ہی سہارا ہو۔ اور جو تم پر اسی طرح ناز کرتی ہے جیسے ہر ماں کرتی ہے۔ ہم اس رات کی مہربانی اور اس سلوک کے بدلے جو تمہاری ماں نے ہمارے ساتھ کیا صرف ایک بار تم کو ضرور چھوڑ دیں گے خواہ اس وقت تمہاری جان لینے کے لیے انگلی کو تھوڑا سا ہلانا ہی کافی ہو۔ صرف ایک بار سراج۔ دوسری بار کا کوئی وعدہ نہیں۔"

"تم کو ایک موقع بھی نہیں ملے گا۔" سراج نے اشتعال میں گالیاں دیتے ہوئے اپنی ماں کی موجودگی کا [illegible] کا بھی لحاظ نہیں رکھا۔

"ایک موقع تو اس وقت بھی ہمارے ہاتھ میں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم اس کو موقع شمار نہیں کرتے کیونکہ اس گھر میں خود کو اب بھی مہمان سمجھتے ہیں۔ نیت بدلی میزبانوں کی۔ ہم نے تو وہ روایت بھی سنی ہے کہ بیٹے تک میں مہمان ہونے والے باپ کے قاتل سے بھی انتقام نہیں لیا تھا۔" پھر میں نے محسن سے ریوالور لے لیا۔ "تم سامان گاڑی میں رکھو۔ استاد تم گیراج میں سے باقی سامان لے آؤ۔"

"کون سی گاڑی میں؟" محسن نے کہا۔

"جو بھی گھر میں ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم سامان سمیت خواتین کے ساتھ پیدل تو نہیں جا سکتے نا۔ ڈی ایس پی صاحب ہمیں اپنی جیپ کی چابیاں دینے سے انکار نہیں کریں گے۔"

"میں تم کو چابیاں دوں گا!" سراج نے چیخ کر کہا۔ غصے میں اس کا ٹوٹا ہوا ہاتھ ہل گیا تھا۔

"اچھا ہم خود لے لیں گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ڈی ایس پی صاحب کو فرسٹ ایڈ دو۔"

محسن کے ساتھ نیڈی بھی نکل گیا۔ وہ "باقی سامان" کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ رابعہ آگے بڑھ کر گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گئی۔ "میں اس ہاتھ کو صحیح طرح سے باندھ دوں تاکہ تکلیف نہ ہو۔" وہ بولی۔ "اور ہڈی کھسکنے سے زیادہ خرابی نہ ہو۔ بعد میں تو پلاسٹر کرا ہی لیں گے۔"

عورت نے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے بہنے والے آنسوؤں کو دوپٹے کے کونے میں جذب کرتی رہی۔ سراج شدید غصے اور احساس ذلت و شکست کا شکار زخمی سانپ کی طرح پھنکارتا رہا اور اپنی آنکھوں سے زہر برساتا رہا۔

"مجھے دو سیدھی لکڑیاں چاہئیں۔ پتلی اور چھوٹی تقریباً بالشت کی۔" رابعہ نے مجھ سے کہا۔

صرف سراج کو متاثر کرنے کے لیے میں نے اٹھا کے واپس اسی کرسی کے ٹکڑے کیے جس پر سراج بیٹھا تھا۔ ہاتھوں نے یہ کام اسی مہارت اور صفائی سے کیا جیسے لکڑی کے ہاتھ بڑھئی چھیل کو بھاری چھرے کے وار سے کاٹتے ہیں۔ دو منٹ سے بھی کم وقت میں میں نے رابعہ کو اس کی ضرورت کے مطابق دو لکڑیاں فراہم کر دیں۔ اس نے ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو سیدھا کیا اور ہڈی کو اس کی جگہ بٹھایا۔ پھر اوپر نیچے دونوں لکڑیاں متوازی رکھا۔ اب اسے پٹی کی ضرورت تھی۔ سوچ رہی تھی کہ

اس نے اپنا دوپٹا الگ کیا اور سراج کی کلائی کے گرد مضبوطی سے لپیٹنے لگی۔ سراج بہت تکلیف میں تھا۔ پھر بھی وہ رابعہ کی یہ نیکی برداشت نہ کر سکا۔

"اسے اپنا دوپٹا دے دو ماں۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

ماں نے اس کی بات کا مطلب کچھ غلط لیا۔ اس نے اپنا دوپٹا رابعہ کے سر پر ڈال دیا۔ رابعہ اپنے دوپٹے کو لپیٹنے میں مصروف رہی۔

"میں نے... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ اپنا دوپٹا میرے ہاتھ پر باندھنے کے لیے دینا تھا۔" سراج بولا۔

"ایک ہی بات ہے۔ ماں کے سر کا دوپٹا میرے سر پر میری عزت کا اتنا ہی رکھوالا ہے جتنا یہ دوپٹا تھا۔" رابعہ نے پٹی لپیٹنے کا کام ختم کرتے ہوئے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

"چابیاں تو گاڑی میں ہی لگی ہوئی مل گئیں۔" محسن نے اندر آ کے کہا اور اسٹین گن میری طرف اچھال دی۔ میں نے اسے تربیت یافتہ اور تجربہ کار کی طرح ہوا میں ہی پکڑ لیا۔ محسن اندر گیا اور تھوڑی دیر میں دونوں سوٹ کیس لیے گزرا۔

"یہ دیکھا آپ نے سراج صاحب؟" میں نے کہا۔ "ہم کتنے طاقتور تھے۔ خالی ہاتھوں ایک لڑکی نے تمہارا ہاتھ توڑ کر دیا۔ خالی ہاتھ ہم مل کر تمہاری ایک پلٹن کا بھرتا کر دیتے۔ پھر اس ہتھیار کے سامنے بھلا کون ٹھہر سکتا تھا لیکن دیکھو ہم نے خیال رکھنے کے باوجود تمہارے گھر کا تالا تک نہیں توڑا تھا اور تمہاری ماں کے ساتھ اتنی ہی تعظیم کا سلوک کیا تھا جتنا ہر ماں کا حق ہوتا ہے۔ ہم اس گھر سے ایک سوئی بھی اٹھا کے نہیں لے جا رہے ہیں۔ لے جا رہے ہیں تو بار احسان یا تھوڑی سی شرمندگی کا احساس کہ آپ کی وجہ سے تھوڑی سی زیادتی کے مرتکب ہوئے۔ تم دونوں چل کے گاڑی میں بیٹھو۔" میں نے رابعہ اور نازو کو اشارہ کیا۔

"تم سے جو کچھ ہوا۔" رابعہ نے چلتے چلتے رک کر کہا۔ "اس کے لیے ہمیں معاف کر دینا ماں جی۔"

"اور مجھے بھی۔ ایک نہ ایک دن آپ کو یقین آ جائے گا کہ ہم ویسے نہیں تھے جیسا آپ نے سمجھا تھا۔" نازو بولی۔

"خدا انھیں سیدھی راہ دکھائے۔" بڑی بی نے آنکھیں پونچھ کر کہا۔ سراج دیوار کا سہارا لیے سیدھا بیٹھا رہا۔

"تمہاری ماں کو تم پر بہت فخر ہے سراج۔" میں نے انگریزی میں کہا۔ "ہم اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے لیکن اس طرح تمہارے سارے جرائم کا پردہ بھی چاک ہو جاتا۔ اگر تمہاری ماں یقین کر لیتی تو اس کے غرور کی شکست کتنی اندوہناک ہوتی چنانچہ ہم اسے کچھ نہیں بتائیں گے لیکن تم نے اپنی روش نہ بدلی تو یہ غرور کب تک سلامت رہے گا؟ حقیقت سات پردوں میں اپنے وجود کو تسلیم کرا لیتی ہے اور سچ سامنے آتا ہے تو جھوٹ پر اعتقاد رکھنے والوں کے لیے یہ صدمہ زیادہ شدید ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے گھپ اندھیرے کمرے سے دوپہر کی دھوپ میں قدم رکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔"

"میں ایسا کام نہیں کر رہا ہوں کوئی۔ تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو آخر؟" وہ ہذیانی سے بولا۔ اس کا مقصد یہ جاننا تھا کہ ہمیں اس کے اور دلاور کے گٹھ جوڑ اور ان کے کاروبار کی اصل نوعیت کے بارے میں کیا معلوم ہے۔

"تم اور دلاور آج منشیات کا زہر پھیلا کر تباہ ہو جانے والوں کی زندگی کا معاوضہ وصول کر رہے ہو اور اپنی تجوریوں میں اپنے لیے جہنم کی آگ بھر رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم انسانیت کی اگلی نسل کو تباہ کر رہے ہو۔ مجھے صرف اسی بات کی سزا دے رہے ہو کہ میں نے تمہارے شیطانی کاروبار میں تمہارا ساتھ نہیں دیا۔ دولت کے لیے اپنے ضمیر کو نہیں بیچا۔ تم کو مجھ سے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں میں تمہاری سونے کی کان کو تباہ نہ کر دوں۔ تم نے مجھے تباہ کر دیا لیکن یہ بات خود بھی یاد رکھنا اور اپنے آقاؤں کو بھی سمجھا دینا کہ جب تک وہ میرا وجود نہیں مٹا دیں گے میں ان کے منشیات کے کاروبار کے لیے مستقل خطرہ بنا رہوں گا۔ آج وہ بھی اکیلے نہیں اور میں بھی اکیلا نہیں۔ لیکن تم دیکھو گے کہ کل وہ اکیلے ہوں گے جیل کی سلاخوں کے پیچھے یا اپنی قبر میں۔"

میری تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں اسے یہ تاثر دینے میں کامیاب رہا کہ میں کتنا گمراہ ہوں اور حقائق سے کتنا بے خبر ہوں۔ اسے یقین آ گیا کہ میں سراب کے تعاقب میں ہوں۔ وہ ناجائز اسلحہ بنانے، اسمگل کرنے، بلیک میں فروخت کرنے اور ملک دشمن عناصر تک پہنچانے کا جو مذموم دھندا کر رہے ہیں وہ میری نظر سے پوشیدہ ہے اور میں نے خود ساختہ مفروضات کی بنیاد پر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کا بزنس منشیات کی ترسیل و تقسیم ہے۔ وہ یقیناً میرے اس احمقانہ یقین پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا ہوگا لیکن صورت سے اس نے مجھے بے وقوف بنانے کی اداکاری جاری رکھی تھی۔

"یہ کاروبار پہلے بھی چل رہا ہے۔ تمہارے باپ نے مخالفت کر کے ہمارا کیا بگاڑ لیا؟" وہ حقارت سے بولا۔ "اور خود تم

www.paksociety.com

نے کون سا تیر مار لیا؟ ماری ہے تو اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ خود کو ہی نہیں، اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تباہ کیا ہے۔ تم دلدل میں آ پھنسے ہو اور تمہارا واپس لوٹنا ناممکن ہے۔ ہم پہ تو دو کنارے پر ہیں۔"

"تم آنے والے سیلاب سے بے خبر ہو۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے یہ ہونے کو تم تحفظ اور سلامتی کی ضمانت سمجھے ہوئے ہو مگر اسی یقین کے ساتھ تم سب ڈوبنے والے ہو۔ اگر تم صرف ایک پولیس افسر ہوتے تو تمہاری جان و مال اور عزت سب بچ جاتے لیکن اب کوئی تم کو بچانے والا بھی نہیں ہے۔"

"میری طرف سے تم جہنم میں جا سکتے ہو۔" وہ بولا۔

"جانے کے لیے اب ہمیں تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن تمہاری ماں سے ایک اجازت ضرور لینی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ کوئی خطرہ مول لے سکیں اور یہاں سے نکل کے کسی محفوظ مقام تک پہنچنے سے قبل ہی پکڑ لیے جائیں۔ ہمیں کوئی ایسا بندوبست ضرور کرنا پڑے گا کہ ہمارے جانے کے بعد تم کچھ نہ کر سکو۔" پھر میں اس کی ماں کی طرف مڑا۔ "انتخاب میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میں آپ کے بیٹے کو ساتھ لے جاؤں اور پھر ہم اس کو کسی بھی جگہ چھوڑ دیں جہاں سے یہ واپس آ جائیں۔"

"نہیں۔ اسے مت لے جاؤ۔ یہ زخمی ہے۔" سراج کی ماں چلائی۔ "اس کی جگہ مجھے لے چلو۔"

"آپ کو تکلیف ہوگی اور سراج کی طرف سے ہمارا اطمینان پھر بھی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "دوسری صورت یہ ہے کہ ہم آپ کو اور سراج کو ایک ساتھ لے جائیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ میں آپ دونوں کو ایک ساتھ یا الگ الگ کمروں میں باندھ کر ڈال جاؤں۔ کچھ دیر میں کوئی نہ کوئی آپ کو آزاد کرانے والا آ جائے گا۔"

"کیا تم میرے وعدے پر اعتبار نہیں کر سکتے کہ میں خاموش رہوں گی۔" سراج کی ماں نے کہا۔

"آپ کی بات پر میں یقیناً اعتبار کر لوں گا۔ لیکن آپ کے بیٹے کی بات پر نہیں۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی اتنا تو کرنا ہی پڑے گا کہ آپ کو کسی کمرے میں منتقل کر دوں۔ ہاں آپ صرف اپنے قول کی پابند رہیں گی۔ سراج کو میں دوسرے کمرے میں رکھوں گا۔ اب آپ مجھے بتا دیں کہ کس کمرے میں جانا پسند کریں گی۔ میرا مطلب ہے کس باتھ روم میں۔ اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کو باندھا نہ جائے۔ سراج کے لیے کوئی رعایت نہیں۔"

"مگر باتھ روم میں... ناہید۔ اس حالت میں تم مرا ہاتھ باندھ کر ڈال دو گے۔"

"مجبوری ہے ماں جی۔ باقی سب کمروں میں کھڑکیاں ہوں گی۔ انھیں مقفل نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "سراج کا صرف ہاتھ ٹوٹا ہے۔ وہ معذور نہیں ہوا ہے۔ اس کو ہمارے پیچھے دوڑنا یا ہمارے تعاقب میں آنا خود اسی کے لیے خطرناک ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی دوسرا ریوالور استعمال کرے۔ جواب میں انھیں بھی گولی چلانی پڑے گی۔ یہ بہت خطرناک چیز ہے۔" میں نے اسٹین گن لہرائی۔

"نہیں نہیں۔" سراج کی ماں چلائی۔ "میں اس کو کچھ نہیں کرنے دوں گی۔ تم جاؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اسے کمرے سے بھی نہیں نکلنے دوں گی۔ کوئی تمہارے پیچھے نہیں آئے گا۔"

"آپ کا بیٹا ایک پولیس افسر بھی ہے ماں جی۔ اس نے آپ کی بات نہ مانی تو آپ کچھ بھی نہیں کر سکیں گی۔" میں نے کہا۔ "اب آپ دیر نہ کریں۔ آپ اسی کمرے سے متصل باتھ روم میں چلی جائیے۔ انھیں آپ بھی سراج صاحب۔" سراج نے گالیاں بکنا اور دھمکیاں دینا شروع کر دیا تھا۔

"اچھا اس کو باندھ کر بستر پر ڈال دو۔ ایسے ہی دروازہ باہر سے بند کر جاؤ۔" سراج کی ماں نے التجا کی۔

"بہت بہتر۔" میں نے کہا۔ "آپ دونوں باتھ روم میں جا کر خاموش رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "اگر گاڑی کے روانہ ہونے سے پہلے میں نے شور مچانے کی آواز بھی سنی تو میں واپس آ کے اس کی ٹانگ بھی توڑ جاؤں گا۔ غسل خانے کے دروازے کی چابی کہاں ہے؟"

تمام دروازوں کی چابیاں ایک گچھے میں تھیں۔ میں نے سراج کی ماں کو بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے اور اسے سمجھاتے بجھاتے دیکھا۔ وہ بہت زیادہ ڈری ہوئی تھی۔ سراج غصے سے پاگل ہو رہا تھا اور ایسی ذلت آمیز شکست کے ساتھ اپنی بے بسی کا احساس اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ ماں نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ ماں کی وجہ سے مجبور ہو گیا ہے۔ یہ خود اپنی نظروں اور دوسروں کی نظر میں عزتِ نفس کو مزید مجروح ہونے سے بچانے کی فضول کوشش تھی۔ میں نے دروازے کو قفل لگا کے تمام چابیاں ایک میز کی دراز میں ڈال دیں تاکہ خادم بھی شور پہ متوجہ ہو کر آئے تو فوراً دروازہ نہ کھول سکے۔ چابیاں تلاش کرنے یا دروازہ توڑنے میں جتنا وقت لگتا وہ ہمارے لیے کافی تھا۔

باہر آ کے میں نے ٹیلیفون کی لائن کو دیکھا۔ جہاں سے...

سے گزر رہی تھی، وہاں میں نے اسٹین گن کے دستے سے کئی بار چوٹ ماری اور پھر تار کو موڑ کر الگ کر دیا۔ محسن جیپ میں سامان رکھنے کے بعد ٹیڈی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ رابعہ اور ناز دو پچھلی سیٹ پہ تھیں اور سامان بیچ میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسٹین گن کو ایک سیٹ کے نیچے چھپا دیا۔ سراج کا ریوالور میں نے محسن کو دے دیا۔

"چلو، دھکا لگاؤ۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب... گاڑی تو ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔

"مطلب باہر جا کے سمجھاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "دیر مت کرو۔ شاباش۔" میں نے رابعہ سے اسٹیئرنگ سنبھالنے کو کہا۔ ہم تینوں کے زور لگانے سے جیپ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھی۔ سڑک تک آنے میں ہمارے دو منٹ صرف ہوئے۔ آگے معمولی سا نشیب تھا۔ ہم سب کی متحدہ کوشش سے جیپ کی رفتار اتنی بڑھ گئی کہ ہمیں ساتھ دوڑنا پڑا۔ ذرا سی دیر میں ہم سراج کے گھر کو کافی پیچھے چھوڑ آئے۔ محسن اور ٹیڈی کا سانس پھولنے لگا۔

"یار یہ کیا مصیبت ہے۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔" محسن نے جھلا کر کہا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "اور کیوں دیکھ رہے ہیں یہ بدتمیز لوگ، پردہ دار خواتین بیٹھی ہیں۔"

"پردہ دار خواتین کیا مزے سے بیٹھی دانت نکال رہی ہیں۔" محسن نے کہا۔ "جیسے گدھا گاڑی جُتے ہیں گدھوں والی۔"

"یار سکندر بادشاہ، جس مصیبت کو ہم آتی دیر میں یہاں تک خود کھینچ کر لائے ہیں۔" ٹیڈی ہانپتے ہوئے بولا۔ "اسے چلا کر لاتے تو اب تک دو میل دور نکل گئے ہوتے۔"

"اچھا۔" میں نے حیرانی سے کہا۔ "یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی! چلو بیٹھو۔"

محسن نے فوراً ڈرائیونگ سنبھال لی۔ چابی گھماتے ہی انجن غرایا۔ "اب کدھر چلیں؟"

"جہاں سینگ سمائیں۔ یا جہاں تقدیر لے جائے۔"

"سینگ تو ہمارے سر سے غائب ہو چکے ہیں۔" محسن بولا۔ "اور جس پر ہم بیٹھے ہیں اسے جیپ کہتے ہیں، تقدیر نہیں۔"

"یہ جیپ بھی اُدھر ہی جائے گی جدھر اسے ہماری تقدیر لے جائے گی۔" میں نے کہا۔ "جیسے رات کو وہ گھٹیا خود ترنج گیا ہم پر پھنس گئے۔ ہماری شامت آئی تھی۔"

"یا جیسے ہم نکل گئے اور بھلا لیڈر ادا ڈ پھنس گیا۔" محسن بولا۔ "اس کی بھی شامت آئی تھی۔"

"تم نے حضرت سراج کو مع والدہ ماجدہ باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور ان سے کہا تھا کہ خبردار جو جیپ

کے روانہ ہونے تک آواز بھی نکالی۔ واپس آ کے ٹانگیں بھی توڑ دوں گا۔ وہ ابھی تک دم سادھے بیٹھے ہوں گے کہ جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز نہیں آئی۔ اب سمجھ میں آ گیا کہ میں نے اتنی دور آ کے انجن کیوں اسٹارٹ کیا تھا؟"

ٹیڈی نے گھور کے جیپ سر ہلایا۔ "پھر تو وہ نہ جانے کتنی دیر ویسے ہی بیٹھے رہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ابھی ہم نکلے نہیں۔"

"اس جیپ کو ہم شہر میں اپنے ساتھ لے کر نہیں پھر سکتے۔" محسن نے کہا۔

"پھر بھی اس علاقے سے تو نکلنا ہی ہے جہاں کل رات کو پولیس نے تلاش کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے وہ ابھی تک ناکا بندی کیے بیٹھے ہوں۔ کسی پولیس افسر کی جیپ کوئی نہیں روکے گا۔"

تھوڑا سا آگے جانے کے بعد میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ میں نے کئی جگہ پولیس والوں کو گاڑیاں روک کر اندر جھانکتے دیکھا۔ وہ تانگوں پر بھی نظر ڈال رہے تھے اور بسوں، ٹرکوں کو بھی دیکھ رہے تھے۔ اگر اس وقت ہم کسی پرائیویٹ کار یا ٹیکسی میں ہوتے تو ضرور دھر لیے جاتے۔ پولیس کی جیپ اپنے رنگ کی وجہ سے دور سے پہچانی جاتی تھی اور اس پر انگریزی میں لکھے ہوئے ... کے حروف اتنے نمایاں تھے کہ ہمیں کسی نے قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ راستے میں ہمیں مخالف سمت سے آنے والی اسی قسم کی دو جیپوں سے واسطہ پڑا مگر وہ زن سے گزر گئیں۔ کسی نے غور بھی کیا ہوگا تو یہی سمجھا ہوگا کہ کسی پولیس افسر کی فیملی بیٹھی ہے۔

خطرے کی حدود سے بہت دور آ جانے کے بعد میں نے محسن سے جیپ کو روکنے کے لیے کہا۔ محسن نے اور ٹیڈی نے تمام سامان اتار کے سڑک سے ذرا دور رکھا۔ یہ میانی صاحب کے قبرستان کا عقبی حصہ تھا۔ اسٹین گن کو میں نے سوٹ کیسوں کے نیچے چھپا دیا۔ "اب تم جیپ کو آگے لے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اور یہاں سے ایک میل دور چھوڑ کر ٹیکسی میں لوٹ آؤ۔"

"کہاں جانے کے لیے؟" محسن نے کہا۔ "میں ٹیڈی کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

"دور مت جانا۔" میں نے کہا اور محسن نے سر ہلایا۔ وہ جیپ لے کر روانہ ہو گیا۔ رابعہ اور ناز دو سامان پہ بیٹھ گئیں۔

"تم لوگوں کی حیات بہت بڑھ گئی ہے۔" ناز دو نے بہت دیر بعد ایک بات کی۔ "کسی بات سے نہیں ڈرتے؟"

"ہمارے لیے شاعر نے کہا تھا، مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اب تو احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم کیسے سنگین خطرات سے دوچار تھے۔ کسی نہ کسی صورت نکل

www.paksociety.com

ہی آتے ہیں۔ جھگڑے کا ڈر اس وقت تک رہتا ہے جب تک کسی آدمی کو ڈر اور خوف لگا رہتا ہے۔ جب ایک بار پانی میں غوطہ مار لیا تو ڈر ختم۔ کیا تم بہت خوفزدہ ہو؟"

"وہاں تو تھی، سراج کی کوٹھی میں۔" وہ بولی۔ "وہ بھی پولیس افسر ہے نا؟"

"لیکن وہ تم کو پہچانتا تو نہیں تھا کہ تم اکرام شیخ کی بہن ہو۔"

"اگر پولیس کے لوگ فون پر تمہارے بارے میں کچھ بتاتا تو میرے بارے میں بھی بتاتا۔" نازو بولی۔ "پھر اسے معلوم ہو جاتا۔"

"کیسے معلوم ہو جاتا؟" میں نے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو؟" رابعہ نے کہا۔ "اسے بھائی اب تک اکرام شیخ اپنی بہن کے اغوا کیے جانے کی رپورٹ لکھوا چکا ہو گا اور یہ رپورٹ ہر تھانے کو مل چکی ہو گی۔ اغوا کنندہ تمہارے سوا کوئی نہیں ہو گا۔ ایف آئی آر میں ہم سب کا نام بھی ہو سکتا ہے۔"

مجھے افسوس ہوا کہ اتنی موٹی بات میری عقل میں نہیں آئی۔ "اکرام شیخ کیا کہے گا؟ کہ ہم نازو کو گھر سے اٹھا لائے؟"

"نہیں، وہ کہے گا کہ اس کی بہن کو رہنما بنا کے مجرموں کے ٹھکانے پر چھاپا مارنے گیا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"لیکن مجرم زیادہ طاقتور تھے۔ مقابلہ کر کے نکل گئے۔" میں نے کہا۔ "اور میری بہن نازو کو بھی لے گئے۔ یہ بات وہ ثابت کیسے کرے گا؟ وہاں اسے کوئی چشم دید گواہ نہیں ملے گا جو کہے کہ یہاں پولیس آئی تھی اور ان کا مجرموں سے مقابلہ ہوا تھا جہاں تک میرا خیال ہے، وہ معطل ہو جائے گا۔ اس نے افسران بالا کو کامیابی کا پورا یقین دلانے کے بعد اس قسم کی کارروائی کا اختیار حاصل کیا ہو گا لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ ڈرائیور مارا گیا جو گرفتار کرنے گئے تھے خود گرفتار ہو گئے۔ سارے آپریشن کی ناکامی کا ذمے دار اکرام شیخ کو ٹھہرایا جائے گا جس کے اندازے غلط تھے — منصوبہ بندی غلط تھی اور توقعات غلط تھیں۔"

"معلوم نہیں غالب پر کیا بیتی۔" رابعہ نے کہا۔

"اسے تو اب رات ہی کو فون کروں گا کہیں سے۔" میں نے کہا۔ "جب وہ آفس میں ہو گا۔"

"اکرام شیخ کے بیان پر وہ حوالات میں بھی ہو سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"کسی اے ایس آئی کا بیان ایک اخبار کے اداریے کے بیان کو رد نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "غالب کے دوست بہت ہیں۔"

"داروغہ والا میں کون ہے؟" نازو نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کوئی بھی نہیں۔ بس اس جگہ سے جتنی دور ہوں اتنا ہی بہتر۔" میں نے کہا۔ "آج کی رات تو ہم ہوٹل میں بھی دیکھیں گے۔ کسی جگہ پناہ مل جائے تو اچھا ہے۔ کرائے کا کوئی مکان سب سے بہتر رہے گا۔ میں چاہتا ہوں تم دونوں اپنے چہرے اور لباس بدل ڈالو۔"

"لباس تو بدل جائے گا، چہرہ کون بدلے گا؟" نازو نے...

"وہ کیا مشکل ہے۔ اپنے پونیٹ کیے ہوئے کیسر ہیئر بائیک کے اشتہار میں نظر آنے والے بال بکھیر لو۔ ان کے ساتھ وہ مکمل چہرے کے خانہ بدوش عورتوں کی طرح گندے کر لو گی تو یہاں چٹک نظر آؤ گی۔ ایسے شاداب چہرے دعوت نظارہ دیتے ہیں اور تمہاری طرف کسی کی نگاہ بھی نہ اٹھے تو اچھا ہے۔ منہ پر تھوڑی سی سیاہی مل لو۔ عورتیں تو خود میک اپ کی ماہر ہوتی ہیں۔ اپنے ذہن میں کسی جاہل دیہاتی عورت کا حلیہ رکھو اور خود کو ویسا ہی بنا لو۔" میں نے کہا۔ "پھر ہم لا دیں گے گھگرا چولی یا لہنگا اور دھوتی۔ تو پھر میں آپ دونوں سے مخاطب ہوں۔"

رابعہ اور نازو ہنستے ہنستے بے حال ہو گئیں۔ وہ ہر بات نہ کر سکتے۔ انھوں نے مختصر کر اطلاعیہ جاری کیا۔

"کیوں؟" میں نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا۔ "محسن بھی تو کارٹون بن کے پھر رہے تھے۔ وہ تو مرزا جی نے میک اپ خراب کر کے ہمیں پھر ویسا بنا دیا جو ہم پہلے تھے۔ اور آئندہ بھی ہم جیسے بہروپ کے تو ہمیں پھر کچھ بھیس بدلنا پڑے گا۔ اس بار میرا خیال ہے میک اپ کے بغیر کچھ حقیقی رنگ دینے کا۔"

"کیا؟" رابعہ نے دلچسپی سے میری طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے ہم سر صاف کروا دیں۔" میں نے کہا۔ "میاں۔ بے آب و گیاہ۔ پگڑیاں باندھیں اور دھوتی کے چھینٹے پہن لیں۔ ہاتھ میں ڈنگی حقہ۔ پیروں میں گھسا ہوا کانوا۔ ہیں مسند ہاں اور اس آن بان شان سے ہم سب صبح گامے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ان کے معتقدین کے کوئی منت ماننے جائیں اور ان کے مریدوں میں شامل ہونے کی کوشش کریں۔ اجازت ملے تو وہاں چلہ کاٹیں۔ گامے شاہ کے چلتم کا بھی بندوبست ہو جائے۔" محسن اس وقت ٹیکسی سے کرنے کو اور بھول اس نے سب سے پہلے یہ خوشخبری دی کہ ڈرائیور کی مہربانی سے مکان مل گیا ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور عجیب صفت آدمی تھا اور اس نے داروغہ والا کی جانب لے جاتے ہوئے اپنے عجیب و غریب نظریات کی تبلیغ کی جو سارے زمانے سے نرالے تھے۔ کہنے لگا کہ وہ بہت عالی شخص تھا اور اس کو دولت میں کیا۔ وہ بہت جاہلی شخص تھا اور اس کو دولت سے محبت تھی۔ اب تک وہ چوبیس ناقربان جنات کو بیعت و تابعدار کر چکا ہے۔ ہم اور خدا کی وفاداری اس کے عتاب کو دعوت دینے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ شاہ صاحب کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی ان سے ڈرتے تھے۔

اس کے بارے میں متعدد ایسی روایات سے روشناس کیا جو مبالغہ آمیز اور کچھ مراد کن بھی لگتی تھیں مگر ہم نے ان کی تائید میں اصرار نہیں کیا۔ احمقانہ کی بات یہ تھی کہ اس نے ہم سے کوئی شرافت کی سند نہیں مانگی اور دو جوان عورتوں کو بے پردہ اپنے ساتھ رکھنے پر بھی ملامت نہیں کیا۔ موقع پاتے ہی میں نے اس سے مکان کے بارے میں سوال کیا۔

"مکان کیسا ہے!" وہ بولا۔ "سو پچیس اس کی چار دیواری ہیں، آگے پکی چھت ہے۔ اندر جانے اور باہر آنے کا راستہ ہے۔ ہور کیا چاہیے؟ خدا پڑا ہے تو تم کون سے نزلے ہوتے ہو۔"

یہ بڑی منطقی دلیل تھی۔ کیا پڑا ہے اور کیا پڑا نہیں ہے۔ یہ سب حالات اور دیکھنے والے کی نظر کا فیصلہ ہے۔ خرید کے بیچنے والے کے لیے دس سال پرانا مکان پرانا ہے۔ بیچنے والے کے لیے نیا بنا ہوا تھا۔ بعض لوگوں کے لیے گزشتہ سال کا کار ماڈل بھی پرانا ہے کچھ کے لیے دس سال پہلے کی کار بھی نئی ہے۔ پچاس سال گزر جانے کے بعد بھی اسلام آباد نیا شہر ہے گا۔ آدمی نیا پرانا کب ہوتا ہے؟ سال بھر کا بچہ، دس سال کا لڑکا، بیس سال کا جوان۔ سب جانتے ہیں۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ تم کون سے نزلے پیدا ہوئے ہو۔ اپنا گھر بنا لیں اور مکان کی اس نے ایک جامع تعریف کر دی تھی کہ اس میں بنیادی طور پر کیا کچھ ہونا چاہیے۔ باقی سب جو پچھلے میں آسائش ہے یا عیاشی کے سامان ہیں۔ کیا دری اور کیا قالین۔ کیا پنکھا اور کیا ایئر کنڈیشنر۔ کیا تخت اور کیا فوم ربڑ کا گدا۔ بیٹھ جہاں جگہ ہو پاؤں پھیلاتے جاؤ۔

"لو جی اس مکان میں بھی چار جنات نے وحشت ڈال دیا تھا۔" وہ بولا۔ "ہم خدا غافل ہوتے اور نامراد لوگوں نے کر لیا قبضہ۔ کرایہ دار کو مکان کے باہر پھینک دیا۔ وہ منشی بستر اٹھا کے لایا۔ انھوں نے پھر اٹھ دیا۔ سویرے وہ بھی گیا۔ پھر جی ہم نے... گامے شاہ کو بتایا اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ چار کلے فرمانے دار بنا لیے جی۔ ہم نے کہا کہ اب یاد رکھو تم جیسے ہیں۔ چالیس دن کا عمل تھا۔ خود ہم تو نکلے اب کوئی جن نہیں۔ ہم نے سب کا خاتمہ کر دیا۔"

"کچھ عرصہ رہا آپ نے؟" رابعہ نے کہا۔ "ہم جس مکان میں جا رہے ہیں وہ آسیب زدہ ہے؟"

"نہیں سو فیصد تھا۔" ٹیکسی ڈرائیور کے کان بہت تیز تھے۔

"ہم جہاں ڈیرا ڈالتے ہیں وہاں سے بھوت خود بھاگ جانا پسند کرتے ہیں۔" محسن بولا۔ "ورنہ خانہ جنگی کا امکان ہوتا ہے۔"

"اور بھوت کیا ان کے آباؤ اجداد بھی ہم سے ڈرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ضرور آپ کے پاس ہمارے پیر سائیں گامے شاہ کا تعویذ ہو گا۔" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

"گامے شاہ... ہاں انھی کی کرامت ہے سب۔" میں نے فوراً کہا۔

"بڑی اونچی ذات ہے جی ان کی۔" ٹیکسی ڈرائیور خوش ہو گیا۔ "ہم نے بڑی خدمت کی ان کی تو انھوں نے بڑا کرم کیا اور ساتوں زمین و آسمان کا اپنا خاص علم۔ بس جی اس دن سے بعد اسی سے کرو تا کو بتا جنات دا۔ گامے شاہ دی کیا بات ہے، سلو جنات نوں غلام بنا لیا... کسی عورت تے جن آ جاوے۔ بس اک نظر اور جن دا بیڑا غرق۔"

"اچھا جی، گامے شاہ جن اتارتے ہیں۔" محسن بولا۔ "اور وہ بھی عورتوں کے سر سے؟"

"لو جی! اور جن کیا مردوں کے سر آتے ہیں۔" وہ بولا۔

"بس جی آپ نے تو ہماری مشکل آسان کر دی۔" میں نے کہا۔ "یہ میری گھر والی ہے اور یہ اس کی۔ دونوں پر جنات کا اثر ہے۔ ہم اگر جائیں گامے شاہ کی خدمت میں تو جن اتر جائیں گے؟"

"اترنے والے جن تو نہیں ہیں۔" محسن آہستہ سے بولا اور رابعہ نے اس کو کہنی مار کے خاموش کیا۔

"آپ جا کے تو دیکھو۔ رب دی شان وڈی۔" وہ بولا۔ "مگر ایسی طرح نہ لے جانا۔ میرا مطلب ہے عورت ذات نوں۔ چہرہ ضرور ڈھکا ہونا چاہیے۔ شاہ صاحب کا حکم ہے کہ کسی زنانی دا منہ نہیں دیکھنا۔ برقعہ پہنا کے جانا۔"

"برقع پہنا کے لے جائیں گے جی۔ گامے شاہ کو پتا بھی کسی کا نظر نہیں آئے گا۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اسی وقت ٹیکسی رک گئی چنانچہ ٹیکسی ڈرائیور نے اس موضوع پر گفتگو ختم کی اور نیچے اتر کے ایک پرانے کواڑوں والا دروازہ کھولنے لگا۔ گلی میں دونوں طرف ایسے ہی پرانے مکان تھے۔ جن میں ایک منزلہ لیکن کہیں کہیں دو منزلہ گھر بھی نظر آ رہے تھے۔ سب کا رنگ وہی تھا جو اینٹوں کا رنگ تھا اور موسمی اثرات سے سیاہی مائل بھورا ہو گیا تھا۔ گلی کی چوڑائی اتنی کم تھی کہ ٹیکسی کے کھڑے ہو جانے سے راستہ تقریباً بند ہو گیا تھا اور باقی ماندہ جگہ میں سے کوئی پیدل چلنے والا ہی نکل سکتا تھا۔ جتنی دیر میں ہم نے اپنا اسباب ٹیکسی سے اتار کے اندر منتقل کیا۔ ایک سائیکل سوار نے ویٹ لفٹنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی

www.paksociety.com

سائیکل دونوں ہاتھوں میں سر سے اوپر بلند کی اور اسی جگہ پر سے گزر گیا۔ دوبارہ سائیکل پر بیٹھ کے ہوا ہونے سے قبل اس نے بآواز بلند ٹیکسی والے سے جو کچھ کہا، اس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ آخر وہ اپنی ضعیف والدہ کو یہاں کیوں چھوڑ گیا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے جواب میں برابر کی بات چلا کے کہی مگر بات اس سے آگے نہیں بڑھی۔ اسی وقت مخالف سمت سے دوسری ٹیکسی آگئی اور اس نے ہارن دینے کے علاوہ گلے بازی بھی شروع کی۔ "اوئے، کون اے اسیں گھوا چھی گاں دا مالک؟" اس نے چنگھاڑ کے کہا۔ "اوئے ہٹا انہوں تینیں تے اسی آنوں لنگ جاواں گے۔"

"کیڑا اے جیہی آنوں لنگن والا؟" ٹیکسی ڈرائیور باہر نکلا۔

"اینہاں تا ولا ایں تے غیر سے جا؟"

ہم اپنا سامان اتار چکے تھے اور ٹیکسی کا کرایہ بھی دے چکے تھے مگر مکان کے کرایے کے معاملات ابھی تصفیہ طلب تھے۔ ادھر دونوں ٹیکسی والوں میں براہ راست تصادم کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ دونوں مقابلے پر ہارن بجا رہے تھے اور ایک دوسرے سے مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ پیچھے جائے۔ پیچھے جانے پر کوئی آمادہ نہ تھا اور دونوں جانب رک جانے والے صرف اس بات میں دلچسپی لے رہے تھے کہ دیکھیں! آخر کون اپنی منواتا ہے۔ ایک کہتا تھا کہ تو ادھر سے کیوں آیا تو دوسرا پوچھتا تھا کہ تو ادھر کیوں آمرا۔ ان کی جنگ ختم ہونے والی نہیں تھی کیونکہ فریق ثانی سیر نہیں تھا اور اس قدر تندرانہ وضع کے ٹیکسی ڈرائیور کو مستقل کے مزہ سے رہا تھا تاکہ پبلک بھی کچھ فقرے بازی سے لطف اندوز ہو۔

"خدا کے لیے پہلے ہم سے بات کر لو۔" میں نے چلا کے کہا۔ "کرایہ لو اس مکان کا۔"

"کرایہ کیسے لے لیں جی؟" وہ جھلا کے بولا۔ "تو ہے نا کمال دی گل۔ رہے ابھی ایک دن بھی نہیں۔ کرایہ لے لو۔ او جی، جب رہو گے تو لے لیں گے کرایہ بھی۔ چل اوئے پچھان کرا یتی لے لے نوں۔"

میں اندر آگیا اور دروازہ بند کر لیا۔ ان کی آپس میں تکرار کی آواز کچھ دیر بعد آنی بند ہو گئی۔ معلوم نہیں ان میں سے کس نے اپنی ہار مان کر ٹیکسی پیچھے کی۔ محسن کا خیال تھا کہ دونوں ضدی تھے، اپنی ٹیکسی یہاں چھوڑ دوسرے کی ٹیکسی کے اوپر سے گزار کے لے گئے ہوں تو عجب نہیں۔ مکان واقعی آسیب زدہ تھا۔ نقشے کے اعتبار سے عام قسم کا عجیب سا مکان جس کے دو کمرے تھے دونوں ساتھ ساتھ۔ ان کے سامنے مختصر سا کچا باغ اور لیٹرین۔ آنگن بمشکل اتنا تھا کہ دو چار چارپائیاں ڈالی جا سکیں۔ دونوں کمروں کی ایک ایک کھڑکی گلی کی طرف کھلتی تھی اور ایک ایک پرانی سی ہر کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں جڑی تھیں ۔۔۔ خالی از گرد سے اندازہ ہوتا تھا کہ آسیب زدہ مشہور ہو جانے کے بعد گھر میں کوئی آباد ہونے آیا تھا تو یہ بہت پرانی بات تھی۔ کرائے دار کے ذاتی تجربات مختلف تھے اور ان کا ذکر کسی سے منسوب واقعات سے خود بخود متاثر ہو گیا تھا۔

"وہ ٹیکسی ڈرائیور تو ہمیں یہاں چھوڑ کے ایسے بھاگا جیسے ہم بھی خدانخواستہ وہ ہیں... جنات۔" محسن بولا۔

"اس میں شک کی کوئی بات ہے؟" رابعہ بولی۔ "شکل سے تو آدم زاد لگتے ہیں آپ حضرات..."

"خوش گمانی کرتا ہے نے ارواح خبیثہ کے تعلیے سے کہاتر فرما دیا۔" محسن بولا۔ "چڑیلیں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

"یار یہ لڑائی مت شروع کرو۔ ان کو گھر میں لے کر..." میں نے کہا۔

"کیا فائدہ؟" رابعہ نے شفقت سے گھر کا معائنہ کیا۔ "تم کون سے یہاں ٹک کر رہو گے۔"

"ارے بھئی ارادہ تو ہے۔" میں نے کہا۔ "کل کی تقدیر میں کیا لکھا ہے، یہ کون جانتا ہے؟"

"میں جانتی ہوں کہ کل ہم خود فرار ہو رہے ہوں گے تو یہاں بھی لگائے جانیں گے۔" رابعہ نے کہا۔ "میں حیرت ہوں کہ یہاں ہے ایسی ہی مجبوری کوئی ساز و سامان نہیں، کوئی انتظام..."

"تو کیا اسی طرح مٹی کے فرش پر سوئیں گے؟" ... نے کہا۔

"اے خاک کے پتلے۔ ایک دن تجھ کو مٹی کے اندر ہی سونا ہے۔" محسن نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔

"میں جا کے دری وغیرہ لاتا ہوں۔ فی الحال تو جھاڑو لو۔" میں نے کہا۔ "کھانا بھی بازار سے لے آئیں۔ فرض کرو ہمیں یہاں رہنے کی مہلت ملی! ایک مہینے تک ... سے لا کر یا بازار جا کر نہیں کھا سکتے۔"

"چلئے تو بازار کی پوری نہیں سکتے۔" محسن نے سب تائید کی۔

ایک بار پھر میں اور محسن بازار کی تلاش میں نکلے۔ ضرورت کا سامان کچھ وہیں سے مل گیا۔ ہم خواتین کی حفاظت کے لیے ان کو چھوڑ گئے تھے جو سچ کا کافی مطلق تھے۔ ... کے لیے ہمیں صدر جانا پڑا۔

"آخر یہ ٹیکسی ڈرائیور کرایہ کیوں نہیں لے رہا؟" میں نے کہا۔

"وہ ... کہنا چاہتا ہے کہ صبح تک کیا ہوتا ہے۔" محسن بولا۔ "جنات ہمیں رہنے بھی... دیتے ہیں یا نہیں۔ ابھی وہ ہم سے پیشگی کرایہ لے لیتا اور صبح ہم گھر چھوڑ کا بیٹھے اس کی خدمت میں حاضر ہوتے کہ بھائی ہمیں معاف کرو اور کرایہ واپس کرو۔ اگر ہم چلے گئے تو وہ کرایہ بھی لے جائے گا۔"

"اس نے ہمیں اپنا پتا تک نہیں بتایا۔"

"بتا دے گا۔ نہیں بتائے گا تو ہم معلوم کر لیں گے۔" میں نے کہا۔ "ٹیکسی کا نمبر مجھے یاد ہے۔"

"دیکھا اس کا اپنا گھر اس سے بھی بڑا اور اچھا ہو گا۔ کرایہ وصول کرنے یہاں نہیں رہتا؟" محسن بولا۔

"ممکن ہے اسے بھی جنات نے یہاں نہ رہنے دیا ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "مجھے کرایہ تو ملے گا ورنہ لوگ آسیب زدہ مکان سے دور بھاگتے ہیں۔ وہ کرائے دار تلاش کرتے ہیں جو خریدار ہے۔"

"مجھے تو وہ آدمی خبطی لگتا ہے۔ آخر اس نے خود کیوں نہ بتایا کہ یہاں جن بھوت ہیں۔" محسن بولا۔

"ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صاف گو آدمی تھا اور دھوکے باز نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "اس نے پہلے سے اپنی پوزیشن محفوظ کر لی، اس ڈر سے کہ ہمیں بعد میں معلوم ہو تو ہم اسے قصوروار سمجھیں گے۔ ہمیں اس نے ایک کام کی بات بتا دی ہے۔ گامے شاہ کے بارے میں۔ ہمیں گامے شاہ کی خدمت میں حاضر ہونا ہی تھا۔"

"ہمارے چہرے تو پھر اصلی ہو چکے ہیں۔" محسن بولا۔ "ہم وہاں جائیں گے تو گامے شاہ فوراً پہچان لے گا۔"

"یہ بھی اچھا ہی ہوا۔" میں نے کہا۔ "نقلی چہرے بہت سے لوگوں کی نظر میں آ چکے تھے۔ اب کچھ اور کریں گے۔ میرا ارادہ ہے کہ ہم کسی دور کے گاؤں سے آنے والے عقیدت مند بن کر جائیں۔ ہمارا حلیہ بالکل دیہاتیوں والا ہو۔"

"گامے شاہ کی نظر پھر بھی ہمیں شناخت کر سکتی ہے!"

"بات یہ ہے عزیزم!" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ اس مرتبہ خواتین ساتھ رہیں اور ان کے لیے میرے ذہن میں ایک اسکیم ہے وہ یہ ہے کہ رابعہ اور نازو بالکل دیہاتی وضع کے کپڑے اور سیاہ برقعے اوڑھ کر گامے شاہ کی درگاہ تک جائیں۔"

"ان کے لیے کپڑے اور برقعے کہاں سے ملیں گے۔ سنتے تو مل جاتے ہیں مگر پہنانے کون دے گا؟"

"وہ بھی مل جائیں گے۔ شہر کی کسی دکان سے خرید لیں گے۔" میں نے کہا۔ "سو دو سو میں وہ اپنی خلعت فاخرہ کیوں نہیں دیں گی جب کہ ان کی قیمت میں نئے کپڑے مل جاتے ہیں۔"

"سو خلعت فاخرہ ان کی آمدنی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ڈیوٹی کے بعد وہ امپورٹڈ کپڑے کے سوٹ پہنتی ہوں گی۔" محسن بولا۔

"ارے یار فضول ہے۔ کسی کسی غریب عورت سے لے لیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ ہے ہمارے گامے شاہ تک پہنچنے کا اور اسے قابو کرنے کا۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ اگر نازو اور رابعہ برقعے اوڑھ کے عام عقیدت مندوں کے ساتھ اندر داخل ہو جائیں اور پھر کسی طرح وہاں ٹھہرنے میں کامیاب ہو جائیں جب کہ وہاں کوئی نہ رہے..."

"گامے شاہ کی درگاہ میں حاضری تو سب دے سکتے ہیں مگر وہاں ہر وقت مجمع رہتا ہے۔" محسن بولا۔ "اس کے چیلے جانتے ہیں ہر ایک پر نظر رکھتے ہوں گے جیسے وہ فراڈ گامے شاہ ایک بار اپنی نظر کرم سے نواز دے اسے فوراً رخصت بھی ہونا پڑتا ہو گا۔ غرض جو تھا اور گامے شاہ کی دعا کے بعد ان کے رکنے کا کیا سوال۔ نازو اور رابعہ کو اتنی دیر کہاں ٹھہرنے دے گا کہ تخلیہ ہو جائے۔"

"وہ کوشش کریں تو ٹھہر سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "مثلاً وہ کہیں کہ ہمیں بشارت ہوئی ہے اور ہم یہاں چوبیس گھنٹے کا چلہ کاٹنے کی آرزومند ہیں۔ یا ہمیں حکم ہے کہ گامے شاہ کی درگاہ میں اپنا وظیفہ مکمل کرو۔ کوئی بھی کہانی تراشا دیں کہ وہ کس مراد کے لیے حاضر ہوئی ہیں۔ زیادہ تر عورتیں ان جعلی پیروں فقیروں سے کیا مانگتی ہیں؟ اولاد یا شوہر کی توجہ۔ سوکن کی موت یا ساس کے مظالم سے چھٹکارا۔ بیماری سے نجات خواہ وہ ملیریا ہو یا دل کی۔ نازو اور رابعہ بھی گریہ وزاری کریں، روئیں اور گامے شاہ کی درگاہ میں صبح سے شام تک نوافل پڑھنے کی اجازت حاصل کر لیں۔ میرا خیال ہے کہ پبلک کے سامنے وہ انکار نہیں کر سکیں گے۔ انہیں کوئی خطرے کی بات بھی محسوس نہیں ہو گی۔ اگر وہ عورتیں ایک گوشے میں وظیفہ پڑھتی ہیں یا نوافل ادا کرتی رہیں۔ اس طرح رابعہ اور نازو کو موقع مل سکتا ہے۔ رابعہ کے پاس بھی ریوالور ہو گا اور نازو کے پاس بھی لیکن خدانخواستہ ان سے اسلحہ چھن جاتا ہے اور وہ بدمعاش جو گامے شاہ کے ساتھ ہیں انہیں قابو کر لیتے ہیں پھر نازو وہی کر سکتی ہے جو اس نے سراج کے ساتھ کیا تھا۔ وہ سب کے ہاتھ پیر توڑ سکتی ہے اور ہمارے لیے راستہ صاف کر سکتی ہے۔"

"فرض کرو نازو کامیاب ہو جاتی ہے۔ پھر ہم کیا کریں گے؟" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ میں نے ابھی نہیں سوچا۔" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ ہم باہر منتظر ہوں اور وہ گامے شاہ کو اس کے مریدوں سمیت بے بس کر کے لے آئیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دوسری طرف سے داخل ہوں۔ گامے شاہ کی درگاہ کے احاطے میں پہنچنے کے لیے

www.paksociety.com

ایک تہہ زمین راستہ بھی استعمال ہوتا ہے جو ایک گیراج میں نکلتا ہے۔ ہم ایک مرتبہ ادھر سے باہر نکلے تھے۔ اگر ہم کسی اندر جانے والے ٹرک پر قابض ہو جائیں تو اندر پہنچنا مشکل نہیں۔ اندر ہماری فوج کا دوسرا بازو..."

"ایم آر اسپیں کی زنانہ فورس؟" محسن نے کہا۔

"ہاں، زنانہ فورس اندر سے آملے تو دشمن کا مورچہ سر" میں نے کہا۔

"تیری تجویز خطرناک مگر قابل عمل ہے۔" محسن بولا۔

"سراج سب کو خبردار کر چکا ہوگا۔ ان حالات میں دیر کرنے میں نقصان کا اندیشہ ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ پاگل کا بچہ تو یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم گدھے ہیں اور ہمیں ان کے اصل کاروبار کا علم ہی نہیں۔" محسن بولا۔

"ہمیں غالب سے بھی مشورہ کر لینا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"اس نے کہا تھا کہ مجھے آفس ہی میں فون کر لینا۔"

غالب ہمیں آفس میں سوتا ہوا ملا۔ ٹیلیفون پر اس کی آواز یوں سنائی دی جیسے وہ اب بھی سو رہا ہے۔ "ہاں بھائی ہاں۔ ہم سو رہے تھے۔ اور کیا کریں۔ مقدر میں سونا ہے یارو۔" وہ بولا۔

"رات کو خیریت رہی نا؟" میں نے کہا "شیخ صاحب سے تو ملاقات نہیں ہوئی؟"

"ہو چکی تھی۔ ہم نے کہا کہ میاں جاؤ۔ کہیں ہم قلندروں کے منہ لگتے ہو۔ ہم کہیں گئے نہ کہیں سے آئے۔" غالب نے گواہی دے کر کہا۔ "جھک مار کے تشریف لے گئے۔ البتہ ایک خبر ہے تمہارے لیے۔ تمہارے وہ چوہدری صاحب جن کا نام، وہ پھر روز ہیں آباد ہیں اسی کباڑی کی کوٹھی میں اور خبر ہے کہ وہ نہ کہیں گئے تھے اور نہ کہیں سے آئے ہیں۔ کوٹھی کبھی خالی نہیں رہی۔"

"وہ ڈرامے کرنے والا آدمی ہے۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ جب ہم واپس پہنچے تو رابعہ اور نازو جھاڑو دے چکی تھیں۔ ایک صحن میں لگا ہوا ہینڈ پمپ چلا رہی تھی اور دوسری آنگن دھو رہی تھی۔ جھاڑو انھوں نے چوکی پر سے اٹھائی تھی۔ خواجہ بیگ عرف استاد ٹیڈی بغور اپنے پُراسرار صندوق کا معائنہ کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ چونکا لیکن میں نے اسے کھینچ کر الگ کر دیا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ آج تو صندوق کھول کر دیکھوں گا خواہ کچھ بھی ہو جائے۔

ٹیڈی نے ہمارے تیور دیکھے اور ہمارے عزائم کا اندازہ کر لیا۔ میرے دھکے سے وہ کچھ دور جا گرا تھا لیکن اس نے اٹھنے کے بعد کوئی احتجاج نہیں کیا اور مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔

"آج سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ تمہارے اس [صندوق] میں کون سا قارون کا خزانہ ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ صندوق ایک تماشا بنا ہوا ہے۔" محسن نے کہا کہ "یہ ہماری عقل کے لیے ایک چیلنج بن چکا ہے۔"

"اور عجیب بات یہ ہے کہ جب بھی ہم نے پوچھا تم ٹال گئے۔" میں نے کہا۔ "اور جب خود ہم نے اس راز سے آگاہی کا فیصلہ کیا تو کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو گئی کہ ہم کچھ نہ کر سکے۔"

"خیر تم اس کو تماشا کیوں سمجھتے ہو؟" ٹیڈی نے کہا۔ "کوئی جاننے کی فکر میں دبلے کیوں ہو رہے ہو؟"

"ہم سے زیادہ تم اس کی حفاظت کے غم میں دبلے رہتے ہو۔ ہر جگہ یہ بوجھ اٹھائے پھرتے ہو اور اس فکر میں مبتلا رہتے ہو جیسے تمہاری جان اس ڈبے میں ہو۔" محسن بولا۔

"جیسے پرانے قصوں کہانیوں میں ہوتا ہے کہ کوہ قاف میں ایک جزیرہ ہے۔ اس جزیرے کے فلاں درخت کے نیچے ایک غار ہے۔ غار میں ایک پنجرہ ہے اور پنجرے میں ایک طوطا ہے۔ اس طوطے میں کسی ظالم کالے دیو کی جان ہوتی تھی۔"

"خواہ مخواہ خواجہ بیگ محمد کو مشتعل کیوں کر رہے ہو۔" کہا "نہ یہ کالا ہے، نہ ظالم اور نہ دیو۔"

"اس ڈبے میں بھی کون سا طوطا ہے۔ دیکھنے دو جو کچھ ہے وہ ہم دیکھ لیتے ہیں۔"

"قسم مولا علی کی، ایسے تمہیں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ آج دیکھ لو۔" ٹیڈی نے سنجیدہ رہتے ہوئے کہا۔

"پھر کیسے معلوم ہوگا؟" محسن بولا۔ "تم سمجھتے ہو ہم اس کو کھول نہیں سکیں گے؟"

"ہاں۔ ایسے خالی ہاتھوں سے تو بالکل ہی ناممکن، چھینی ہتھوڑی سے بھی مشکل ہے۔" ٹیڈی بولا۔ "کسی ویلڈر کے پاس لے جاؤ گے تو وہ اپنی ویلڈنگ ٹارچ سے کاٹ دے گا مگر اتنی تکلیف کیوں کرتے ہو۔ بات یہ ہے بادشاہو کہ ہمیں تم سے کچھ چھپانا ہوتا یا تمہیں بتانا نہ ہوتا تو ہم اسے یوں ساتھ لیے پھرتے؟ اس صندوق کو چھپایا جا سکتا تھا۔ اپنے لیے بہت سے ٹھکانے تھے۔ صندوق رکھ دیا جاتا تو کسی کو شک بھی نہ ہوتا۔ میں اس کو نئے سوٹ کیس میں ڈال کر اوپر اپنے کپڑے رکھتا اور اس کو تالا لگا کے کسی بھروسے کے آدمی کے حوالے کر دیتا جو اسے لے کے بیٹھا ہوتا۔ اول تو کوئی کھول کر ہی نہ دیکھتا۔ الحمد

میں اس صندوق کو کسی جگہ گاڑ دیتا تب بھی اس کا کیا خیال ہے۔ یہ تجزیہ تم خود سوچو کہ جب میں نے اس کو بند رکھنے کے لیے یہ انتظام کیا تھا کہ گھر میں چور بھی آ جاتا تو جھک مار کے لوٹ جاتا۔ اس پر اپنے بیہودہ صندوق پر وقت ضائع نہ کرتا۔ پھر یہ کون سا مشکل کام تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ اٹھائے پھرنے کی مصیبت مول لینے کے بجائے تمہارے ساتھ خالی ہاتھ پھرتا اور صندوق کی طرف سے بے فکر رہتا کہ صندوق محفوظ ہے مگر قسم مولا علی کی سکندر بادشاہ، ہم تو جس کے دل سے ہو گئے اس کے لیے اپنا دل کھول کے رکھ دیا۔ یاروں سے راز کو چھپایا تو وہ یاری کیسی۔ بس ایک دن تو تمہیں بتانا ہی تھا کہ آخر اس بوجھ کو گدھے کی طرح لاد کر پھرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم سب کا شک میں مبتلا ہونا قدرتی بات تھی۔ میں نے سب کچھ سنا اور خاموش رہا۔"

"کیوں خاموش رہے۔ اتنا سسپنس پیدا کرنے میں بھی کوئی مصلحت تھی؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ بس ایسے ہی تماشا دیکھ رہا تھا تم سب کے تجسس کا۔" ٹیڈی بولا۔ "پہلے تم سب حیران ہوئے تھے۔ پھر ناراض ہونے لگے تھے کہ یہ کباڑ خانہ ساتھ لیے پھرنے کی کیا تُک ہے۔ اس کے بعد تمہارے شکوک میں اضافہ ہوتا گیا۔ تم لوگوں نے میرا مذاق بھی اڑایا۔ کبھی اسے قارون کا خزانہ کہا، کبھی پنڈورا کا باکس اور کبھی پُراسرار صندوق۔ مجھے پتا تھا کہ ایک نہ ایک دن تم اس کو کھول کر ہی دم لو گے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ابھی لے جاؤ اور کھلوا کے دیکھ لو کہ اس میں کیا ہے۔"

"کیا تم خود نہیں بتاؤ گے؟"

"یہ بات نہیں۔ میں بتا دیتا ہوں۔" ٹیڈی بولا۔ "اس صندوق میں کم سے کم نصف وزن کا سونا ہے۔ باقی آدھا وزن تم اس فولادی سیف کا شمار کر لو جو ہر طرف سے بند ہے۔ اس کی مالیت کا اندازہ میں نہیں لگا سکتا۔ تم یہ حساب کتاب کر سکتے ہو کیونکہ تم پڑھے لکھے ہو لیکن یہ سچ ہے سکندر بادشاہ کہ اس میں قارون کا خزانہ ہے۔"

جب ٹیڈی نے اپنی بات شروع کی تھی تو رابعہ اور نازو بھی آ کھڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ہماری طرف اور ہم نے ان کی طرف ناقابل یقین نظروں سے دیکھا لیکن ٹیڈی کی متانت میں فرق نہیں آیا تھا اور اس کی بات کو مذاق سمجھ کے نہیں ٹالا جا سکتا تھا۔ قارون کا خزانہ تو ایک محاورہ تھا لیکن ٹیڈی کی بات کو حقیقت مان لیا جاتا تو اتنے سونے کی قیمت واقعی قارون کے خزانے سے کم نہ تھی۔

"تمہارے خیال میں یہ کتنا سونا ہوگا؟" ٹیڈی نے ہم سب کی حیرت زدہ خاموش صورتوں کو دیکھ کر کہا۔

"تمہارے اس پورے صندوق کا وزن ایک من سے زیادہ ہی ہوگا۔ اگر ایک من نہیں" میں نے کہا "تو بیس سیر فرض کر لیتے ہیں۔"

"اور تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں پندرہ سیر سونا ہے؟" محسن نے کہا۔ "خواجہ صاحب! ایک تولہ سونا بھی آج کل دو سو روپے میں ملتا ہے اور ایک سیر میں جتنے تولے ہیں اسی تو سے۔"

"پھر تو آپ مجھے بھی حساب لگا کے بتا دو کہ یہ سب سونا کتنے کا ہوا؟" ٹیڈی اسی سادگی سے بولا۔

"حساب تو ہم لگا لیں گے لیکن ٹیڈی، اتنا سونا تمہارے پاس آیا کہاں سے؟" میں نے کہا اور سب دم بخود اس کی صورت کو دیکھتے رہے۔

"یہ بھی بتا دوں گا، پہلے حساب تو لگاؤ۔" ٹیڈی نے کہا۔ "پتا تو چلے کہ ہم کتنے دولت مند ہیں۔ تم ہمیشہ فکر مند رہتے تھے کہ مالی ضروریات کیسے پوری ہوں گی اور میں نے ایک دن کہا تھا کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں اور وقت آنے کا تو ہم بتا دیں گے کہ دوستوں کی خاطر ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"اس سے پہلے بھی تم نے کم تو نہیں کیا استاد۔" ہم نے اس وسیع القلب مخلص اور عجیب شخص کو دیکھا جسے قدر ناشناس زمانہ ٹیڈی بدمعاش کہتا تھا لیکن جس کی ذات میں آدمیت کے تمام اوصاف حمیدہ ان سب سے زیادہ تھے جو خود ساختہ پارسائی کی کسوٹی پر اپنے آپ کو پرکھتے تھے تو انسان کامل ہونے کا دعوے کرنے لگتے تھے۔ ہم نے رفاقت کے اس دور میں جس کو حالات کی کسوٹی سمجھا جا سکتا ہے ٹیڈی کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کی فطرت کے اجزائے ترکیبی وہی ہیں جو ہماری فطرت کا حصہ ہیں۔ بے شک وہ اپنی تعلیم، اپنے ماضی کے رشتوں، اپنے ماحول اور اپنے ظاہری اعمال کے اعتبار سے مختلف نظر آتا تھا مگر اس کی باطنی صفات کا حسن ہماری نگاہ میں تھا۔ اس نے آزمائش کے ایسے دور میں دوستی کا حق ادا کیا تھا جب دنیا کی نظر بھی ہماری دشمن تھی۔ ہماری اور ٹیڈی کی دوستی کی عمر بہت کم تھی لیکن ہم نے فاصلے سے دوستی تک کے تمام مرحلے بہت کم وقت میں طے کر لیے تھے۔ کیونکہ ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا اور جان لیا تھا۔

"پہلے ہم نے کون سا تیر مارا ہے سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی بولا۔ "کچھ بھی تو نہیں۔ جتنا کرنا چاہیے تھا اتنا بہرحال نہیں کیا۔ مگر تم نے بھی تو ٹیڈی بدمعاش کو خواجہ بیگ محمد بنایا۔ اسے اپنا سمجھا اور اسے

www.paksociety.com

وہ عزت دی جو پہلے کسی نے نہیں دی تھی۔ دولت کا کیا ہے ناجائز ذرائع سے سب ہی حاصل کر لیتے ہیں مگر پیار کے رشتے، اخلاص، محبت اور خلوص، اپنائیت کا یقین اور اعتبار، یہ ناجائز ذرائع سے حاصل نہیں ہوتے، بازار میں نہیں ملتے اور اسمگل کر کے نہیں لائے جا سکتے۔ آج میں ایک دوسری دنیا کا آدمی ہوں۔ ہم سب ایک خاندان ہیں تو میں اس کا ایک رکن ہونے پر فخر کرتا ہوں۔ تم لوگ مجھ سے مذاق کرتے ہو تو مجھے وہ خوشی ملتی ہے جو پہلے کسی بدمعاش کو نیچا دکھا کے حاصل نہیں ہوتی تھی۔ میں تاریک راستوں کا مسافر تھا۔ تم نے مجھے اپنایا اور میرا ہاتھ تھام کے اپنے ساتھ رکھا۔ اب میں روشنی کو دیکھ سکتا ہوں۔ تم نے ایک اندھے کو منزل کی راہ دکھائی۔ کیا تمہارا یہ احسان کم ہے۔ کیا اس اطمینان قلب اور تسکین روح کا بدلہ میں سارے زمانے کی دولت دے کر بھی ادا کر سکتا ہوں جو مجھے آج میسر ہے۔ میں شہلا کا بھائی ہوں۔"

"میرے بھائی نہیں ہو؟" رابعہ نے اسے ضرورت سے زیادہ جذباتی ہوتے دیکھ کر کہا۔

ٹیڈی ہنس پڑا۔ "ایک بہن کا بوجھ بھی کم نہیں ہوتا۔ تم بھی ڈال دو اس رشتے کا بوجھ مجھ پر۔ میرے دونوں کندھے خالی تھے کیونکہ میں کسی کا بھی نہیں تھا۔ اب دو بہنوں کا بھائی ہوں۔"

"ہے بھائی محسن ایک ستم شدہ دو شدہ۔ ہم دونوں اب کیا کریں؟" میں نے کہا۔ "ساری خدائی ایک طرف...؟"

"اور ہم دونوں ایک طرف۔" محسن نے مظلوم لہجے میں رقت کے ساتھ یوں کہا کہ سب بے اختیار ہنس پڑے۔

"اب دیکھو ٹیڈی! تم یہاں بے کار وقت ضائع مت کرو۔" میں نے رابعہ اور نازو کو ڈانٹا۔ "یہ کوئی شریفانہ بات نہیں ہے کہ مردوں کے ساتھ بیٹھ کے جوان لڑکیاں بک بک کریں۔ جاؤ اپنا ہانڈی چولہا کرو۔ چائے بناؤ۔"

"بھاڑ میں گیا ہانڈی چولہا۔" رابعہ نے کہا۔ "اپنا اپنا کام کرو سب، ہم نوکر نہیں ہیں کسی کے۔"

"ہاں ۔۔۔ تم نوکر نہیں کنیز ہو۔" محسن نے کہا۔ "تو اے کنیزان خوبرو...؟"

"اپنے بھائی کے لیے ہی کچھ کر لو، قسم مولا علی کی نہ جانے خالی پیٹ میں دم کیسے اٹکا ہوا ہے۔" ٹیڈی بولا۔

"اچھا بھئی مجبوری ہے تو تمہارے لیے چائے بنا دیتی ہوں۔" رابعہ بولی۔

"خواجہ صاحب، اپنی ہمشیرہ سے ہماری بھی سفارش فرمائیے۔ دیکھیے نا، رابعہ کے رشتے سے سکندر تو ہوا آپ کا جیجا جی اور میں بھی شہلا کے رشتے سے ہوا آپ کا بہنوئی۔" محسن بولا۔

"بدتمیزی کی بھی حد ہوتی ہے۔" رابعہ نے نازو کا ہاتھ کھینچا۔ "ایک سیر ہے تو دوسرا سوا سیر۔"

"ایک شیر ہے۔" محسن نے کہا۔ "تو دوسرا سوا شیر، یعنی ڈیڑھ شیر۔"

"حساب کچھ یوں بنا تھا کہ محمد کا ایک سیر سونا [illegible] سولہ ہزار کا ہوا۔" میں نے کہا۔ "اور تمہاری بات کو بنیاد بنا کر ہم فرض کر لیں کہ صندوق میں تقریباً پندرہ سیر سونا ہے تو [illegible] تقریباً ڈھائی لاکھ کے قریب ہوگی۔"

"ڈھائی لاکھ..." محسن نے یوں آنکھیں چڑھائیں جیسے ابھی پشت سے بیہوش ہو کے گرے گا۔ "لاکھ وہی ہیں نا جن میں [illegible] ہوتے ہیں؟"

"تو نے اس سردار جی کی بات کی جو کرکٹ کا ٹیسٹ میچ دیکھنے آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "ایک پلیئر نے سنچری بنائی تو بہت شور مچا۔ سردار جی نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے [illegible] سبب پوچھا۔ اس نے بھی کہا کہ سنچری اور نعرے لگنے لگے۔ سردار جی نے اسکور بورڈ کی طرف دیکھا اور پوچھا [illegible] تالی بجانے والے نے کہا، پورے سو سردار جی۔ سردار جی نے [illegible] سے سر ہلایا اور کہا، اچھا سو کی رکھی تھی سنچری۔ اور [illegible] بجانے لگے۔"

"اپنی خاندانی تاریخ بعد میں سنانا۔" محسن بولا۔ "ہم یہ [illegible] گمشدہ [illegible] ہیں کہ تم بد دعا [illegible] دوست [illegible] نیک محمد لکھ رہی ہیں۔"

"ظاہر ہے یہ جھوٹ نہیں بول رہے ہوں گے کہ [illegible] ایک ہٹے پر بکنے والے ٹین کے صندوق میں دو [illegible] کا سونا بھرا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے..."

"ایک سوال نہیں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "مثلاً یہ کہ سونا کیسا ہے؟"

"سونا خالص ہے۔" استاد ٹیڈی نے سادگی سے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ مال حرام ہے یا مال غنیمت [illegible] ہو کہ بعض صورتوں میں مال غنیمت کو حرام نہیں سمجھا جاتا [illegible] لشکر میں اس کی تقسیم اسلامی تاریخ کے حوالے سے ثابت ہے [illegible] سونا ٹیڈی کے پاس کہاں سے آیا اور کب سے ہے [illegible] اس نے سونے کی حفاظت کرنا کیوں ضروری سمجھا [illegible] ذاتی استعمال میں لانے سے کیوں پرہیز کیا؟ کیا [illegible] ہے؟ اگر امانت ہے تو اب ہمارے لیے اس میں خیانت [illegible] باقی سوالات میں حسب ضرورت ایجاد کروں گا۔"

"میں تمہیں اول سے آخر تک سب بتا دوں گا۔"

بولا۔ "حرام حلال اور جائز ناجائز کا فیصلہ تم خود کر لینا۔"

رابعہ نے چائے کی ایک کیتلی ہمارے سامنے رکھی۔ سلور کی اس کیتلی میں صرف قہوہ تھا۔ چینی اور پاؤڈر کا دودھ نازو نے روگنگ جیسے الگ رکھے۔ پھر چائے بھی مگ میں ڈال دی گئی اور میں نے دودھ ملا کے تیز استعمال کی۔ ہماری عدم موجودگی میں یہ تمام بندوبست استاد ٹیڈی نے کیا تھا۔ وہ کسی سپاہی بیکری سے ایک کیک بھی لایا تھا اور خاصی مقدار میں انڈے مکھن اور ڈبل روٹی بھی۔ سگریٹ کے کارٹن ہم لائے تھے۔ اس وقت زمین پر آلتی پالتی مار کے بیٹھے ہوئے اور چائے پیتے ہوئے میں نے سکون اور اطمینان کے احساس کی آسودگی کو محسوس کیا۔ یہ احساس وقتی اور عارضی تھا مگر پھر بھی اس دور مصائب و آلام میں بہت غنیمت تھا۔ بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسی کو انشا۔ غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں۔ مجھے مرحوم انشاء اللہ خان انشا کی یہ بات بہت حسب حال لگی۔ کل ہم کہاں تھے کل کہاں ہوں گے، اس کی آج کیوں فکر کریں اور اس کا ذکر بھی کیوں کریں۔ شاید میری طرح دوسروں کو بھی احساس تھا کہ اس وقت ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور محفوظ ہیں۔ باہر کی دنیا کی دسترس سے دور ہیں اور جس حال میں بھی ہیں ایک دوسرے کی رفاقت، اس گوشہ عافیت اور قناعت سے ملنے والے احساس طمانیت کی ساری خوشی ہماری ہے۔ بے شک اس وقت کوئی کسی سے بھی پوچھتا کہ ان لمحوں میں ان کے دل کی وہ کون سی تمنا ہے جس کی تکمیل کی خاطر وہ ایسی ہزاروں خواہشوں کو قربان کر سکتے ہیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ تو سب کا جواب یہی ہوتا کہ کاش وقت یہیں رک جائے۔ اس احساس تحفظ و طمانیت کو دوام عطا ہو اور پھر خواہ ساری عمر اسی گھر میں اسی حال میں گزر جائے۔

میں نے اور محسن نے سگریٹ جلائی تو مجھے سراج کی ماں یاد آئی۔ یہ اسی کے دیے ہوئے سگریٹ تھے۔ اپنے دشمن کے گھر کی مہمانی کا تجربہ بھی اس اعتبار سے منفرد تھا کہ ہم وہاں شامت اعمال کے باعث جا پھنسے تھے اور پھر تقدیر کی یاوری سے بخیر و عافیت نکل آئے تھے۔ "کیا جو کچھ سراج کے ساتھ ہوا اس کی خبر بنے گی؟" محسن بولا۔

"اب چھوڑو بھی یہ فکر کہ اخبار میں ہمارے متعلق کیا آتا ہے اور کیا نہیں آتا۔" میں نے کہا۔ "ایک وقت آئے گا کہ ہمارے بارے میں مجرموں کی سنسنی خیزی بھی نہیں رہے گی۔ پھر بلند بانگ دعوے ہم پر قیاس آرائیاں تو ہم کا مرکز بن جائیں گی۔"

"نازو خاموش ہے۔" محسن نے نازو کی اتری ہوئی صورت کو دیکھا۔ محسوس تو میں نے بھی یہی کیا تھا مگر اس کا ذکر کرنے سے گریز کیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ضرور تھی لیکن ذہنی طور پر وہ عدم اطمینان اور ذہنی انتشار کا شکار تھی۔ یہ رد عمل بالکل فطری تھا۔ ہم سب اپنے جذباتی رشتوں کی قید سے آزاد تھے۔ ہم میں سے صرف محسن کی ایک بہن تھی جو اپنے گھر میں شاد و آباد تھی اور جسے بھائی کی خبر ہی نہیں تھی۔ محسن کبھی کبھار اسے چند سطروں پر مشتمل خط ڈال کے اپنی خیریت سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ اگر اپنے والد یا اخبارات کی معرفت اسے بھائی کی غیر قانونی، باغیانہ اور خطرناک مصروفیات کی اطلاع ملتی تھی تو وہ رونے دھونے والے کے لیے دعائے خیر مانگنے اور صبر کرنے کے سوا کیا کر سکتی تھی اور خود محسن اس کے لیے خیریت کی جھوٹی اطلاع بھیجنے پر قانع رہتا تھا۔ محسن کے والد عملاً دنیا سے منہ موڑ چکے تھے اور آخری اطلاع کے مطابق وہ اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ تھے جو انہیں بڑے اصرار کے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ بھی محسن کے لیے عملاً کچھ کرنے سے قاصر تھے اور محسن کا ہونا نہ ہونا ان کے لیے برابر تھا بالکل اسی طرح جیسے ان کا زندہ رہنا یا مر جانا محسن کے لیے ایک جیسے دکھ کا سبب تھا۔ میں، رابعہ اور ٹیڈی خون کے ان رشتوں کی کسی زنجیر کے غلام نہ تھے مگر نازو نے ابھی ابھی سب رشتوں سے قطع تعلق کیا تھا۔

اس نے اپنے بھائی کو سب کے سامنے ذلیل کیا تھا اور وہ ماں باپ کو چھوڑ آئی تھی۔ اس کی طبیعت بلا کی جذباتی تھی اور یہ زندگی کے سب سے بڑے جذباتی فیصلے کا رد عمل تھا کہ وہ چپ تھی۔ اب پر شبہات اور منطقی حقائق کا دباؤ تھا۔ عقل کے تقاضے مصلحت کو مد نظر رکھنے کے حق میں تھے تو دل کا فیصلہ جذبات کی صدا پر لبیک کہنے کے حق میں تھا۔ اگرچہ وہ دل کی بات مان چکی تھی مگر عقل اسے پریشان کر رہی تھی اور شاید اسے بار بار ان نتائج سے خبردار کر رہی تھی جو اس کی اپنے گھر سے وابستگی کی صورت میں برآمد ہوں گے۔ گھر کے رشتے جن کی جڑیں بچپن میں ہوش سنبھالنے کے زمانے سے بھی پہلے کے وقت تک پھیلی ہیں آسانی سے نہیں ٹوٹتے اور اگر ٹوٹتے ہیں تو آدمی کی شخصیت میں بہت شکست و ریخت کرتے ہیں۔ اسے ہماری طرح ہم جیسا بننے کے لیے ابھی کہیں زیادہ سخت اور کٹھن آزمائشوں کے جان لیوا مرحلے طے کرنے ہوں گے۔ میں نے بڑے ملال سے سوچا۔ کیا اس وقت تک وہ اپنے عہد وفا کو استوار رکھ سکے گی؟ ہم نے تو اسے بہت سمجھایا تھا کہ وہ اس راہ پر خار میں جانے

www.paksociety.com

ساتھ چلنے پر اصرار نہ کرے جہاں ایسے سخت مقام بھی آجاتے ہیں کہ پیروں کے ہر آبلے سے بہنے والے لہو کے ساتھ انگاروں پر بھی چلنا پڑتا ہے۔ مگر اس نے اپنے دل کی بات مانی تو اس میں کسی کا کیا قصور۔

"تم نے میرے کسی سوال کا ابھی جواب نہیں دیا ہے استاد۔" محسن نے کہا اور میں خیالات سے حقائق کی دنیا میں لوٹ آیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ اتنی دیر سے باقی سب لوگ بھی خاموش تھے مگر وہ منتظر تھے کہ استاد حمیدی ڈھائی لاکھ روپے سے زائد مالیت کے اس سونے کے بارے میں بات کرے جو آج تک ایک زنگ خوردہ اور پرانے صندوق میں بند اس کے گھر میں بے مصرف پڑا ہوا تھا لیکن میں نازو کو دیکھ رہا تھا۔ میری یہ حرکت غیر ارادی تھی۔ میرا ذہن اس کے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ چنانچہ میری نظر بھی اسی پر تھی اور وہ نظریں جھکا لینے کے بہانے میرے انہماک کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

"تقسیم ہند کے وقت میں اپنے والدین کے ساتھ کشمیری بازار کے عقب میں رہتا تھا۔" حمیدی نے کہا۔ "میں اس کہانی کو بہت پیچھے سے اس لیے شروع کر رہا ہوں کہ تم سب لوگ میری زندگی کے حالات کو سمجھنے کے بعد جو فیصلہ کرو، وہ غلط نہ ہو۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں، اچھا یا برا، استاد حمیدی ہوں یا خواجہ نیک محمد، انھی حالات کی وجہ سے ہوں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ ہر شخص اپنے حالات کے باعث ہی استاد حمیدی یا نیک محمد بنتا ہے۔ اس کی اپنی مرضی اور اس کے والدین کی خواہش کیا ہوتی ہے؟ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایسے تو سارے ماں باپ یہی کہتے ہیں کہ اپنے بیٹے کو انجینئر اور بیٹی کو ڈاکٹر بنائیں گے۔ خود بچوں کے دماغ میں بھی کامیاب مستقبل ایک ایسا خواب ہو جاتا ہے جس کی تعبیر کو وہ اپنے اختیار کی بات سمجھتے ہیں۔ مگر بعد میں ماننا پڑتا ہے کہ جو کچھ کرتی ہے تقدیر کرتی ہے۔ کشمیری بازار والے گھر میں میری عمر تیرہ سال تھی۔ چنانچہ مجھے اس وقت کی ہر بات یاد ہے۔ مڈل کے امتحان میں مجھے وظیفہ ملا تھا۔ اس زمانے میں آٹھویں جماعت کے سالانہ امتحانات کو مڈل کا امتحان کہا جاتا تھا۔ میری ذہانت اور شرافت پر والدین ناز کرتے تھے جن کی میں واحد اولاد تھا۔ میری پیدائش کے وقت کوئی ایسی بات ہو گئی تھی کہ میری ماں کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی اور ایک وقت ایسا بھی آ گیا تھا جب ڈاکٹروں نے انتخاب میرے باپ پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ جسے چاہے بچانے کی اجازت دے دے۔ ماں اور بچے میں سے کسی ایک کی زندگی بچائی جا سکتی تھی اور میرے باپ نے کوئی تذبذب نہ کیا تھا۔ اس نے میری زندگی قربان کر کے اپنی بیوی کی زندگی بچانے کا فیصلہ کیا تھا۔ بے شک اس نے مجھ سے بھی توقعات وابستہ کر رکھی ہوں گی مگر میرا وجود صرف ایک امید تھا جبکہ بیوی اس کی شریک حیات تھی اور ایک حقیقت تھی۔ مجھ سے اس کی جذباتی وابستگی اتنی نہیں ہو سکتی تھی جتنی بیوی سے تھی۔ خیر بعد میں خدا نے کرم کیا کہ دونوں کو بچا لیا گیا لیکن ڈاکٹروں نے صاف بتا دیا کہ میرے بعد وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ ان حالات میں ماں باپ مجھ کو کتنا عزیز رکھتے ہوں گے اس کا اندازہ تم لوگ کر سکتے ہو۔ میرا باپ ہنرمند کاریگر تھا۔ وہ سونے کے ڈلے کو زیورات میں ڈھالتا تھا تو ان کا حسن اور نقش و نگار کی خوبصورتی لوگوں کو حیران کر دیتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اتنی صفائی تھی کہ ماہر سنار اس کے بنے ہوئے زیور کو ایک نظر دیکھ کر پہچان لیتے تھے۔ باکمال کاریگر کو کام کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ اسے معاوضہ بھی اچھا ملتا تھا۔ اگر کوئی بات اس کو ناگوار گزرتی تھی تو وہ فوراً کسی دوسری جگہ چلا جاتا تھا جہاں اس کی آؤ بھگت بھی زیادہ اور معاوضہ بھی بہتر مل جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے اتنا بچا لیا کہ خود اپنی دکان چلا سکے۔ بعد میں پولیس نے اسے بدنام کیا کہ وہ ڈنڈی مارتا رہا۔ جو زیورات اس میں کھوٹ ملاتا رہا اور ماشہ ماشہ بچا کر اپنے کام لاتا تھا۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ میں یہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ میرا باپ کوئی بہت ایماندار اور پرہیزگار آدمی تھا۔ اس پیشے میں سو فیصد ایمانداری سے کام کون کرتا ہے۔ زیادہ تر چند ہی تھے۔ ان کی گنتی بھی ہر کاروبار میں بہت کم۔ پیشے ہمارے ہاتھ میں آئے تو بدنام ہو گئے۔ میرے باپ بھی نئے مالکوں کے ساتھ دو سال بڑی مشکل سے کام کر سکے پھر میرے باپ نے اندرون بھاٹی گیٹ دکان کھولی۔ علاقے میں رہائش اختیار کی۔ اس کے کام کی شہرت تھی۔ وہ چھوٹی سی دکان رفتہ رفتہ گاہکوں کی توجہ کا مرکز بننے لگی۔ کام بڑھنے لگا۔ میرے باپ کو اس پیشے کے دوسرے پہلوؤں کے بارے میں معلوم تھا۔ اس نے پہلے ایک کاریگر کو بہت اچھا معاوضہ دیا لیکن بات صرف معاوضے کی نہیں، فنکار عزت بھی مانگتا ہے خواہ وہ سنار ہو یا مصور۔ یا مجسمہ کو خوبصورتی تو اسی کے ہاتھ دیتے ہیں۔ سب نے اس کی قدر بھی کی اور لے بھائیوں کی طرح [illegible]

کاروبار اللہ بچایا تو اس نے دوسرے کاریگر کو بلا لیا۔

"اس نے تمہیں اس پیشے میں اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھا؟" میں نے موقع پاتے ہی کہا۔ "عموماً سنار بچپن ہی سے اولاد کو تربیت دیتے ہیں تاکہ وہ بڑی ہو کر ان کا ہاتھ بٹائے اور ان کے کاروبار کو چلا سکے۔"

"یہ اس کی جذباتی غلطی تھی۔" حمیدی نے سوچ کر کہا۔ "پیشہ کوئی برا نہیں ہوتا اور اگر وہ مجھے یہ کام سکھاتا تو آج شاید میں بھی اس کی طرح ایک ماہر کاریگر ہوتا ۔۔۔ اور زیادہ کامیاب رہتا مگر اس کی سوچ کا انداز عملی نہیں تھا۔ وہ بیوی سے کہتا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو سنار نہیں ڈاکٹر بناؤں گا۔ سنار کے پاس سونا ہوتا ہے ڈگری نہیں ہوتی۔ اس کو پیسہ ملتا ہے لیکن وہ عزت نہیں ملتی جو ڈاکٹر، پروفیسر یا وکیل کو ملتی ہے، انجینئر یا سرکاری افسر کو ملتی ہے۔ وہ مجھے بہت پڑھانا چاہتا تھا۔ اتنا پڑھانا چاہتا تھا کہ عزت مجھے بن مانگے مل جائے۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ پیسے کی مجھے کوئی کمی نہ ہوگی۔ وہ میرے لیے اتنا چھوڑ جائے گا کہ مجھے دولت کی آرزو ہی نہ رہے۔ میں صرف غریبوں کا علاج کروں اور سب شفا پانے والوں کی دعائیں لوں۔ وہ طے کر چکا تھا کہ جس دن میں ڈاکٹری شروع کروں گا، اسی دن وہ سنار کا پیشہ ترک کر دے گا۔ میں ایک ڈاکٹر کا باپ کہلانا پسند کروں گا اور اس کے کلینک میں کمپاؤنڈر کا کام بھی کروں گا تو بڑے فخر کے ساتھ۔ نہ جانے کیوں اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ سنار کی عزت نہیں ہوتی۔ خیر میں بات کر رہا تھا کاروبار کے پھیلنے کی۔ تین سال بعد اس نے دکان کو مال روڈ پر منتقل کر دیا جہاں پہلے 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' اخبار کا دفتر ہوتا تھا۔ اس کے بالکل سامنے مال روڈ کے دوسرے کنارے پر۔ اس نے دکان تو مہنگی لی ہی تھی، اس کی آرائش پر بھی بہت پیسہ خرچ کیا۔ اندر شیشے کے سامنے شوکیس آئینوں والے تھے اور جب خوبصورت روشنیاں جلتی تھیں تو اس آئینہ خانے میں نئی عکس نظر آتے تھے۔ دکان بہت بڑی اور بہت زیادہ جوڑی تھی اور اندر قدم رکھنے والے کی آنکھیں اس چمک دمک سے خیرہ ہو جاتی تھیں۔ میں اس زمانے میں ایف ایس سی کے فرسٹ ائیر میں اسلامیہ کالج کا طالب علم تھا۔"

"ہم ۔۔۔ تم نے ایف ایس سی تک پڑھا ہے؟" رابعہ اپنی حیرت کے اظہار پر مجبور ہو گئی۔

حمیدی شرمندگی سے ہنسا۔ "ایف ایس سی کیا نہیں۔ خاندان [illegible] تو فرسٹ ڈویژن ضرور دیتا۔ میرا خیال ہی نہیں میرے اساتذہ کا خیال بھی تھا۔ اس کے بعد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ بہت آسان تھا۔ تقدیر ساتھ دیتی تو میں اپنے ماں باپ کو بھی مایوس نہ کرتا اور پانچ سال میں ان کو ڈاکٹر بن کے دکھا دیتا مگر تقدیر کو یہ منظور نہ تھا۔ ایک سال میں دکان نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی کی اور میرا باپ صف اوّل کے جیولرز میں شمار ہونے لگا۔ ہم کرشن نگر میں شوری بلڈنگ کے قریب ایک بہت بڑے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس گلی کے ایک کمرے والے مکان کو تم نے دیکھا ہی ہے جہاں میں اب رہتا ہوں۔ ہمارا وہ گھر اس کوٹھری سے زیادہ دور نہیں تھا اور میں آتے جاتے اسے دیکھتا تھا۔"

"لیکن تم نے ہمیں کبھی نہیں بتایا۔" میں نے کہا۔

"بتانے سے کیا ہوتا۔ تم یقین نہ کرتے اور کر لیتے تو کون سا فرق پڑتا۔" وہ ایک سرد آہ بھر کے بولا۔

"تمہارے دل میں کبھی اس گھر میں لوٹ کر جانے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی؟" رابعہ نے کہا۔

"کیا تم اس گھر کو خرید نہیں سکتے تھے؟" نازو بولی۔

"کوشش کرتا تو ضرور خرید لیتا لیکن اس کے بعد میں وہاں رہ نہیں سکتا تھا۔" حمیدی نے کہا۔ "اس گھر میں صرف پرانی یادیں ہیں جو بہت تلخ ہیں۔ وہاں ہر چیز اجنبی ہے۔ رہنے والے ہی نہیں گھر کا سارا سامان تک نیا ہے۔ مکان کی صورت بھی وہ نہیں جو پہلے تھی۔ نئے مالکوں نے نئے فیشن کی کوٹھی میں ڈھال دیا ہے۔ نہ جانے کیوں خوش قسمتی ہمیں راس نہیں آئی۔ ابھی نئی جگہ کاروبار کو سال ہی ہوا تھا کہ لاہور میں ۔۔۔۔۔۔ فسادات شروع ہو گئے۔ مذہبی اختلاف نے بہت جلد جنون کی صورت اختیار کر لی اور اس میں شرپسند عناصر غالب آ گئے۔ غنڈہ گردی، لوٹ مار سے سن سینتالیس کا نقشہ سامنے آ گیا اور عام لوگوں کے لیے جان و مال اور آبرو کی حفاظت مسئلہ بن گئی۔ پیشہ ور بدمعاش ہر طرف دندناتے پھرتے تھے اور انہیں کسی کے منہ سے سروکار نہیں تھا۔ وہ جسے چاہتے تھے، لوٹ لیتے تھے اور [illegible] دکانیں اور مکان نذر آتش کر دیتے تھے۔ نہ جانے کتنے پرانی دشمنی کا بدلہ لیتے ہوئے ہمارے بارے میں ۔۔۔۔۔ غلط باتیں پھیلا دیں اور ۔۔۔ ایک مشتعل ہجوم نے دکان کو [illegible] کر کے پہلے لوٹا اور پھر اسے آگ لگا دی۔ دشمنی کا [illegible] میں اس لیے لگا رہا ہوں کہ بات صرف دکان کی تباہی پر ختم نہیں ہوئی۔ کسی نے دکان لوٹنے والوں کو یہ بھی بتایا کہ ہم [illegible] رہتے ہیں اور کچھ لوگ پورے انتظام کے ساتھ کرشن نگر پہنچے۔ انھوں نے وہاں بھی شرپسندوں کو اکسایا اور ہمارے گھر کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ ہم سوتے پڑے تھے۔ انھوں نے ہر طرف پٹرول چھڑک کے آگ لگائی اور فرار کے راستے بند کر دیئے

www.paksociety.com

آگ بڑی تیزی سے پھیلی۔ میں نے اپنے ماں باپ کے چلّانے کی آواز سنی۔ وہ مجھے پکار رہے تھے مگر میں اتنا بدحواس تھا کہ ان لوگوں کے پاس جانے کے بجائے اپنی جان کی فکر کی اور زینے سے چھت پر پہنچ گیا کیونکہ مجھے باہر نکلنے کا اور کوئی راستہ ہی دکھائی نہ دیا۔ آگ کے شعلے ہر طرف سے بھڑک رہے تھے۔ میں اپنے پڑوس میں چھت سے نیچے کود گیا۔ میری ایک ٹانگ ٹوٹی لیکن زیادہ نقصان سر کی چوٹ سے ہوا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں گنگا رام اسپتال میں تھا اور مجھے اپنا نام تک یاد نہیں تھا۔ میں جل کر خاک ہونے سے بچ گیا تھا لیکن میری یادداشت ختم ہو گئی تھی۔ وہاں بڑے بڑے ڈاکٹر آتے تھے جو مجھ سے باتیں کرتے تھے، بڑی نرمی سے اور محبت سے۔ کچھ کہتے تھے کہ یہ ذہنی صدمے کا اثر ہے۔"

"تمہیں گنگا رام اسپتال کون لے گیا تھا؟" میں نے کہا۔

"یہ تو ڈاکٹروں کو معلوم نہیں تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تب کوئی شیطانوں میں انسان۔ اس نے اتنا کیا کہ مجھے ہجوم سے نکال لیا ورنہ ممکن تھا کہ میں بھی مارا جاتا۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارے والدین اندر ہی جل کر مر گئے تھے؟" رابعہ نے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری طرح وہ بھی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔" محسن نے سر ہلایا۔

"یقین کے ساتھ میں کیا کہوں۔ اپنی آنکھوں سے میں نے … دیکھا تھا۔" ٹیڈی بولا۔ "میں یہ جانتا ہوں کہ ان کے لیے باہر نکلنا … تھا۔ اگر گھر کی کنڈی باہر سے لگا دی گئی ہوگی تو وہ اندر قید ہو گئے ہوں گے۔ دروازہ اتنا مضبوط تھا کہ وہ اسے توڑ کر باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ دوسری طرف کھڑکی تھی جس میں لوہے کی سلاخیں تھیں اور قاتلوں نے انھی سلاخوں میں سے پٹرول یا مٹی کا تیل اندر پھینکا تھا۔ میرے جسم پر بھی جلنے کے نشانات تھے مگر بہت معمولی اور ڈاکٹر ان سے کچھ اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے اسپتال پہنچانے والا کسی کو میرے متعلق کچھ بتائے بغیر بھاگ گیا تھا۔ اسے اپنی جان کا ڈر تھا یا وہ پولیس کی قانونی کارروائی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔"

"تمہارے دوست، رشتے دار اور جاننے والے بھی تو ہوں گے؟" میں نے کہا۔ "ان میں سے کوئی نہیں پہنچا؟"

"کیسے پہنچتا؟ کسی کو معلوم ہوتا کہ میں گنگا رام اسپتال کے جنرل وارڈ میں پڑا ہوا ہوں تب ہی آتا نا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "جس خدا کے بندے نے میری جان بچائی تھی یا تو وہ اجنبی تھا جو میرے دوستوں رشتے داروں کو جانتا ہی نہیں تھا…"

"لیکن وہ تمہارے پڑوس کے لوگوں کو تو بتا سکتا تھا؟"

محسن بولا۔

"ہاں۔ اور اسی لیے میرا خیال ہے کہ وہ شخص …" ٹیڈی نے کہا۔ "کسی حادثے کا شکار ہوا یا … ایسی ہی افسوسناک واردات ہوئی۔ ویسے سب … واقفوں، دوستوں اور ہمسایوں کو یقین تھا کہ ہم میں … نہیں بچا ہوگا۔ مکان میں جو کچھ تھا جل گیا تھا۔"

"کیا کسی کی تدفین نہیں ہوئی تھی؟" میں نے …

"ہوئی تھی۔ بتانے والوں نے بعد میں بتایا کہ … ہو جانے والی لاشیں جو پہچانی نہیں جاتی تھیں … گاڑ دی گئی تھیں۔" ٹیڈی نے کہا۔

"اس وقت کسی کو خیال نہیں آیا کہ گھر …"

"آیا ہوگا لیکن تفتیش کون کرتا اور رپورٹ …" ٹیڈی نے کہا۔ "بعد میں حالات پر قابو پانے کے لیے … نافذ کرنا پڑا تھا۔ یہ مارشل لا صرف لاہور تک محدود تھا۔ اس وقت فوج نے شہر کا نظم و نسق سنبھالا تھا۔ پڑوس کے لوگوں کو یہ بھی امید ہوگی کہ میں لوٹ آؤں … حالات کے معمول پر آنے کے بعد بھی میرا کوئی سراغ نہ … سب نے یقین کر لیا کہ میں زندہ نہیں ہوں۔ میرا اپنا یہ حال تھا … دماغ میں خلا تھا۔ میری یادداشت ایک کونے کا … ہو گئی تھی۔ میں اپنے متعلق ڈاکٹروں کو کچھ بھی نہیں بتا سکا … نے تین مہینے تک علاج کے علاوہ بھی سب کچھ کر کے … مگر انھیں مایوسی ہوئی۔ وہ آخر کب تک مجھے بستر پر ڈالے …"

"وہ تمہاری تصویر تو اخبار میں شائع کرا سکتے تھے؟"

"یہاں وہ سب کون کرتا ہے جو ہونا چاہیے؟" بولا۔ "مُردہ خانوں میں جا کے دیکھو تو کتنی لاوارث لاشیں … ہیں۔ میرا خیال ہے وہ سب لاوارث نہیں ہوتے۔ یہاں … دور دراز مقامات سے آتے ہوئے لوگ ہوتے ہیں جو حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اب وارث خود ہی پولیس کو گمشدگی کی رپورٹ لکھوائیں اور پھر تمام اسپتالوں میں پتا کرنے پہنچیں تو الگ بات ہے ورنہ کسے پروا ہوتی ہے۔ نہ پولیس … اسپتال والوں کو۔ ورنہ ان کے بھی فوٹو اخبار میں دیے جاتے۔ جب میں بھاگا تھا تو رات کے کپڑوں میں تھا۔ میری جیب … کچھ بھی نہیں تھا جس سے میری شناخت ممکن ہوتی۔ ایک … مجھے اسپتال سے بھی فارغ کر دیا گیا اور میں لاہور کی سڑکوں پر بھٹکتا پھرا۔"

"یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمہاری یادداشت … بحال ہونے کے بعد… تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"میں بارہ سال تک یادداشت سے محروم رہا۔" ٹیڈی بولا۔ "لیکن اس کے بعد دوسرا حادثہ پیش آیا۔ ایسا تو فلموں میں ہوتا ہے مگر میرے ساتھ بالکل یہی ہوا۔ میری یادداشت اچانک چلی گئی اور اچانک لوٹ آئی اور اس کے بعد … کے دن میں نے جو کچھ بھی کیا تھا، وہ سب مجھے یاد نہ … گنگا رام اسپتال سے نکلنے کے بعد لاہور میں ہی پھرتا رہتا تو … بہت امکان تھا کہ کسی دن کوئی جاننے والا مل جاتا اور مجھے شناخت کر لیتا مگر ہوا یہ کہ میں بے مقصد پھرتا ہوا اسٹیشن کی طرف چلا گیا۔ وہاں ایک گاڑی تیار کھڑی تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھ گیا اور پشاور پہنچ گیا۔ اگر گاڑی آگے جاتی تو میرا سفر بھی جاری رہتا لیکن پشاور آخری اسٹاپ تھا۔ میری حالت دیوانوں جیسی تھی۔ میرے جسم پر وہی پرانے کپڑے تھے اور میں ننگے پاؤں تھا۔ مجھے نہائے منہ دھوئے بھی کئی دن ہو گئے تھے۔ میں نے ادھر ادھر سے مانگ کر پیٹ بھرا تھا۔ پشاور میں دو بار مجھے پولیس نے آوارہ گردی کرتے پکڑا اور حوالات میں بند کر دیا لیکن بہت جلد وہ مجھے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ میں ان کے کسی کام کا نہ تھا۔ نہ میں … کر سکتا تھا اور نہ وہ مجھ پر کسی قسم کا الزام عائد کر سکتے تھے۔ پہلی پیشی پر ہی مجسٹریٹ مجھے ذہنی مریض یا پاگل قرار دے کر فارغ کر دیتا۔ اسی طرح پھرتے پھرتے میں فقیروں کے ایک گروہ کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ مجھ سے پشاور کی سڑکوں پر بھیک منگواتے رہے اور میری ساری آمدنی اپنے پاس رکھتے رہے۔ عملی طور پر میں ان کا قیدی تھا۔ وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ میں بھاگ نہ جاؤں۔ میں جوان اور صحت مند آدمی تھا اور لوگ مجھے بھیک کم دیتے تھے، طعنے اور گالیاں زیادہ دیتے تھے۔ وہاں ایک سے ایک بڑا فنکار تھا۔ کچھ آنکھوں والے اندھے تھے۔ کچھ ایسے … کے نکلے تھے اور … فٹ پاتھ پر پڑے رہتے تھے کہ لگتا تھا ابھی دم توڑ دیں گے۔ انھوں نے مجھے بھی بہروپ … کے گُر بتانا شروع کر دیا۔ وہ میرے چہرے اور پیروں پر … دیتے تھے اور مجھے … روڈ پر … جانے والی ایک گاڑی میں بٹھا کے چھوڑ جاتے تھے۔ مجھے … کمانے والا … آتا اور … فقیر … کے سامنے ڈراما کرتا تھا مگر درحقیقت مجھ پر نظر رکھتا تھا۔"

"پھر وہاں سے تمہاری گلو خلاصی کیسے ہوئی؟" رابعہ نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

"اللہ نے ایک نیک بخت کو اس کا سبب بنا دیا۔" ٹیڈی مسکرایا۔ "فقیروں کے ڈیرے پر عورتیں بھی تھیں۔ ان میں سے جو … تھیں وہ تو دوسرے مردوں کی طرح صبح ہوتے ہی کمائی کے لیے نکل جاتی تھیں۔ جوان لڑکیاں ڈیرے کو سنبھالتی تھیں۔ وہ صرف فقیر ہی نہیں، بردہ فروش بھی تھے۔ ان کے پاس دس سال سے سترہ اٹھارہ سال تک کی لڑکیاں آتی تھیں، کچھ دن ان کی قید میں رہتی تھیں اور پھر اجنبی لوگوں کے ساتھ چلی جاتی تھیں۔ بعض اوقات ان کو باندھ کر … رکھا جاتا تھا اور سخت جسمانی اذیت دی جاتی تھی، یہاں تک کہ وہ مزاحمت کرنا چھوڑ دیتی تھیں۔ ایک لڑکی ان کے ہاتھوں مر بھی گئی تھی۔ ایک نے خودکشی کر لی تھی۔"

"اور تم… تم یہ سب کچھ برداشت کرتے تھے، اپنے ساتھ بھی اور دوسروں کے ساتھ بھی؟" رابعہ نے کہا۔

"ہاں۔ میں ان سے ڈرتا تھا۔" ٹیڈی نے اعتراف کیا۔ "کیونکہ میں ان کا بہت ظلم برداشت کر چکا تھا۔ پولیس کو وہ باقاعدگی سے بھتہ دیتے تھے۔ چنانچہ ایک بار پولیس سے مدد مانگنے پر میری کھال … مار کے ادھیڑ دی گئی تھی اور مجھے الٹا لٹکا دیا گیا تھا۔ ایک خبیث وقفے وقفے سے میرے زخموں پر نمک ملا گرم پانی ڈالتا تھا۔ ذہنی طور پر میں ان کی طاقت سے اتنا خائف تھا کہ خود کو بے بس سمجھتا تھا اور سب کچھ دیکھنے کے باوجود کچھ نہیں کرتا تھا۔ میری سب سے بڑی کمزوری میرا یہ احساس تھا کہ دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میرے ماں باپ نہیں ہیں اور بھائی بہن نہیں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ مر چکے ہیں۔ اس ڈیرے سے میرے سامنے نہ جانے کتنی لڑکیاں بک گئیں اور میں نے ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ اپنی بزدلی پر آج تک شرم سے میرا سر جھک جاتا ہے۔ شاید میری ساری عمر اسی ڈیرے پر بیت جاتی مگر ہوا یہ کہ فقیروں کے سرغنہ کی بچی جو میری آمد کے وقت چھ سال کی تھی، کچھ سالوں میں جوان ہو گئی۔ خود میں سولہ سال کی عمر سے اٹھائیس سال کا ہو گیا اور نہ جانے کیا بات ہوئی کہ وہ مجھ پر مرنے لگی۔ بات یہ ہے سکندر بادشاہ کہ اپنی جوانی میں ہم بھی تم سے کم نہیں تھے۔"

اس کی بات نے ایک دم سب کو ہنسا دیا۔ "تم اب بھی کسی سے کم ہو استاد۔" میں نے ہنستے ہنستے کہا۔ "بزرگوں میں تو شامل نہیں ہوتے۔"

"… سپر ہٹ لو اسٹوری میں کیا زبردست موڑ آیا ہے۔" محسن بولا۔

"بالکل پاکستانی فلم کہ ابھی ہیروئن زار و قطار گا رہی تھی …"

"بدلا اور جنگل … گیا۔" رابعہ نے کہا۔

"سنو یار سنو! ایسی دردناک کہانی ہے اور تم لوگ ہنس رہے ہو۔" محسن بولا۔ "ہاں استاد۔ تو پھر کیا ہوا؟ پھر سوہنی کے بارے

www.paksociety.com

میں بتاؤں؟

"ہم نے تم سے اس کے بارے میں" استاد ٹیڈی سنجیدہ ہو گیا۔ "اس نے ایک دن مجھے شرمندہ کیا۔ کہنے لگی تم لوگوں کو ذرا احساس نہیں ہوتا کہ یہ زندگی کتنی خراب ہے۔ بھیک مانگنا کوئی اچھی بات ہے؟ آدمی بے عزت ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ اب عزت کا کیا سوال؟ وہ ناراض ہو گئی کہ مرد ہو کے خود کو بے عزت کہتے ہو۔ جاؤ ڈوب مرو۔ میں نے سمجھایا کہ میں کتنا مجبور ہوں لیکن اس نے میری ایک نہیں مانی اور کہنے لگی کہ جوان آدمی ہر مجبوری سے نمٹ لیتا ہے۔ میں تو عورت ذات ہوں اور اس کے باوجود میں سوچتی ہوں کہ کچھ کروں۔ تم ہمت کرو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں ڈرتا تھا مگر اسے جب بھی موقع ملتا تھا وہ مجھے اکسانے آ جاتی تھی۔"

"تم کو اکسانے یا ورغلانے؟" محسن نے کہا۔ ایک دفعہ پھر سب کے ہونٹوں پر ہنسی بکھر گئی۔

"جو چاہو سمجھو۔" ٹیڈی نے دانت نکال کے کہا۔ "آہستہ آہستہ وہ مجھے مجبور کرنے لگی کہ ہم دونوں کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ بڑی عجیب لڑکی تھی وہ۔ کسی فقیروں کے ڈیرے میں اتنی حسین لڑکی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں سب چیتھڑوں میں رہتے تھے۔ گدڑیوں میں سوتے تھے۔ غلیظ نظر آتے تھے مگر وہ صاف ستھرے کپڑوں میں ہوتی تھی۔ کچھ فقیر اس پر طنز بھی کس دیتے تھے کہ ہے فقیر کی بیٹی مگر رہتی ہے شہزادیوں کی طرح۔ اس کا باپ بڑا سخت گیر اور بے رحم تھا اس لیے زیادہ نہیں بولتے تھے۔ بری نظر سے دیکھنے والے بھی زبان نہیں کھولتے تھے۔ تم لوگ پھر ہنسو گے مگر سچی بات یہ ہے کہ سلطنت بادشاہ کی نہیں وہ بالکل اس کی طرح تھی … کی طرح … رنگ روپ بھی تھا اس کا … میں بھی اسے دیکھتا ضرور تھا مگر ہمت مجھ میں بھی نہیں تھی کہ اس سے بات ہی کر سکوں۔ جب خود اس نے بات کی تو یوں سمجھو کہ میری ساری بزدلی ختم ہو گئی۔ ہم روز ملنے لگے اور چھپکے چھپکے ہم نے فرار کا پورا منصوبہ بنا لیا۔ وہ لڑکی جاہل تھی لیکن ذہانت میں کم نہ تھی۔ اس نے ہی سب طے کیا کہ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ وہ موقع پڑتے ہی نوٹوں سے بھرا ہوا تھیلا نکال لائے گی۔ اس کے باپ نے بہت سے نوٹ تکیے کے غلاف میں بھر رکھے تھے اور اسے سرہانے رکھ کے سوتا تھا۔"

"نام تو بتا دو اس کا۔ یا نام لینے کی ہمت بھی نہیں پڑتی تھی؟" محسن بولا۔ "آپا جی کہتے تھے؟"

"فاطمہ تھا اس کا نام۔" ٹیڈی نے سب کی ہنسی کے درمیان کہا۔ "فاطمہ نے کہا کہ اسے کچھ اندازہ نہیں کہ تکیے میں کتنی رقم ہوگی مگر جتنی بھی ہے کافی ہے۔ ہم یہاں سے نکلیں گے تو سب فقیر شہر کے کونے کونے میں ہمیں تلاش کریں گے۔ ان کی مدد کرے گی اور ہم کو ہر بس اسٹاپ پر اور ریلوے اسٹیشن پر پکڑنے جائے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم رات کو نکلیں۔ رات کو سب فقیر نشے تک اتنا مشغول ہو جاتے تھے۔ کچھ نشے میں … دن بھر کی تھکن کے بعد جلدی سو جانا ضروری سمجھتے تھے۔ … وہاں سے رات کو دس بجے روانہ ہوتی تھی۔ فاطمہ کا خیال تھا کہ اگر ہم دس بجے خیبر میل سے نکلے تو رات کو ڈھائی بجے پنڈی جا اتریں گے۔ راولپنڈی بہت بڑا شہر ہے اور رات کے … سے صبح ہونے تک ہمیں چھپنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔ یہاں ہماری گمشدگی سے صبح تک کھلبلی مچے گی مگر اس وقت تک فرشتے بھی ہم تک نہ پہنچ سکیں گے۔ فاطمہ نے یہ بھی سمجھایا کہ میں نے ہمت نہ کی تو خود بھی تمام عمر اسی جہنم میں رہوں گا اور اس کو بھی کسی فقیر کے پلے باندھ دیا جائے گا۔ اس سے بھی بھیک منگوائے گا اور اس کے بچوں سے بھی۔ اس نے کہا کہ ہم بعد میں کسی چھوٹے … کے مولوی کے پاس جا کر سب کچھ بتا دیں گے اور شادی کر لیں گے۔ رفتہ رفتہ اس کی باتوں سے میرا دل بڑا ہو گیا۔ محبت آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔"

"سچ کہتے ہو بھائی۔" محسن نے ایک سرد آہ بھری۔ "ورنہ مجنوں آدمی تھے کام کے" اور میری طرف دیکھا۔

"آپ تو کبھی آدمی نہیں تھے۔" میں نے کہا۔ "اور ہم جیسے آدمی رہ گئے۔"

"اچھا۔ گویا آپ انکار کر رہے ہیں کہ کبھی شوہر نہیں رہے؟" محسن نے آنکھیں نکال کے کہا اور فوراً دور کھسک گیا۔

"تمہارے والد ماجد بھی ایک شوہر تھے۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "مگر کیا تو آدمی کا بچہ نہیں ہے؟"

"اوہو۔ تم دونوں بھی مصیبت ہو۔ شروع ہو گئے اب دونوں کی کائیں کائیں۔" لارا لپہ نے ہمیں ڈانٹا۔ حالانکہ اس کا چہرہ … رہا تھا اور … والے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ "چلو بھائی ٹیک محمد۔"

"ایک رات خدا نے ہمیں موقع دیا۔ فاطمہ کا باپ … کا دم … کے غافل ہو گیا تھا اور اس کی ماں بخار کی وجہ سے لپیٹ کر پڑ گئی تھی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ فاطمہ نے کہا اس سے اچھا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔" ٹیڈی بولا۔ "اس نے باپ کے سر کے نیچے سے نوٹوں والا تکیہ کھسکایا اور مجھے پکڑا دیا۔ بری طرح کانپ رہا تھا۔ کچھ سردی سے اور کچھ خوف سے۔ … نے کہیں سے ایک پلاسٹک اٹھایا اور ہم دبے پاؤں باہر نکلے۔ باہر نکلتے ہی ہم نے بھاگنا شروع کیا۔ فقیروں کا ڈیرا شہر سے باہر تھا۔ ریلوے اسٹیشن تک کا فاصلہ کسی طرح بھی دو میل سے کم نہیں تھا۔ پورا راستہ ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر طے کیا۔ ہمارے پاؤں کیچڑ میں بھر گئے اور کپڑے پانی میں شرابور ہو گئے لیکن ہم نے اس تکیے کو بھیگنے سے محفوظ رکھا۔ … پہنچے تو میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ خیبر میل کی روانگی میں دس منٹ رہ گئے تھے۔ جب ہم ایک کمپارٹمنٹ میں گھس گئے ایک بڈھے نے بڑی شفقت کا ثبوت دیا اور فاطمہ پر اپنا کمبل ڈال دیا۔ سفر مشکل سے چار ساڑھے چار گھنٹے کا تھا۔ جب ہم آدھی رات کے بعد راولپنڈی کے اسٹیشن پر اترے تو غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ ہمارے کپڑے بالکل خشک نہیں ہوئے تھے چنانچہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں فاطمہ بیمار نہ پڑ جائے۔ ہم باہر نکلتے تو خالی ہاتھ … پکڑے جاتے اور ہمارا تمام سرمایہ جو تکیے میں تھا پولیس ضبط کر لیتی۔ میں نے رات پلیٹ فارم کے مسافر خانے میں گزارنے کا سوچا اور فاطمہ کو کسی طرح گرم چائے لا کر پلائی۔ وہ بار بار کہتی تھی کہ یہاں سے نکل چلو۔ بالآخر میں نے فاطمہ کے ساتھ ریلوے لائن پر چلنا شروع کیا۔ کچھ آگے لکڑی کا ایک کیبن سا تھا۔ اندر لالٹین جل رہی تھی اور بستر بچھا ہوا تھا مگر کیبن خالی تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے بستر سمیٹا اور کندھے پر رکھ کے بھاگا۔ فاطمہ نے میرا ساتھ دیا۔ ہم نے ایک بار پیچھے کی اور خود کو سڑک پر پایا۔ ذرا آگے مال گودام تھا۔ میں نے اس کی بیرونی دیوار کے ساتھ فاطمہ کو بستر میں لپیٹ کر لٹا دیا اور خود بھی کونے میں دبک گیا۔ نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ سورج نکل آنے کے بعد ایک پولیس والے نے میرے لات رسید کی تو میں جاگا۔ ہمارے آس پاس دوسرے لوگ بھی کھڑے تھے اور ہمیں مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہم پولیس والے کے کسی سوال کا جواب اطمینان بخش نہ دے سکے اور وہ ہمیں تھانے لے گیا۔ راستے میں، میں نے فاطمہ سے کہا کہ کیوں نہ اسے کچھ دے دلا کر معاملہ ختم کر دیں۔ فاطمہ نے انکار کر دیا اور پولیس اسٹیشن پہنچنے کو ترجیح دی۔ پولیس اسٹیشن میں اس نے اپنا پورا بیان لکھوایا جو تمام اس کے باپ کے خلاف تھا۔ تھانیدار تو ہمیں معاملات کی تحقیق تک حوالات میں بند رکھنے پر آمادہ تھا لیکن ہماری خوش قسمتی کہ وہاں تھانیدار کا باپ بیٹھا تھا۔ وہ صورت سے نیک دل اور مہربان لگتا تھا اور اس کے کہنے پر تھانیدار نے ہمیں ایک ماتحت کے گھر بھیج دیا۔ تھانیدار نے کہا کہ … جائے گا۔ پنجاب کی پولیس سرحد کی پولیس سے رابطہ … وہ تمہارا … کا انتظام کریں گے اور اس کے بعد جب سامنے سے ملزم گرفتار ہو جائیں گے تو مقدمہ درج ہونے سے پہلے ہمیں سب کی شناخت کرنا ہوگی۔ تھانیدار کے بزرگ والد کے خیال میں ہم مظلوموں کو اتنا عرصہ حوالات میں رکھنا مناسب نہیں تھا۔ جس ماتحت پولیس والے کے ساتھ ہمیں بھیجا گیا تھا وہ حوالدار تھا اور تھانے کی حدود ہی میں رہتا تھا۔ فاطمہ بڑی چالاکی سے تکیے کو بچائے رکھنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ بستر اور تکیے کے علاوہ ہمارے پاس کپڑوں کا ایک بکس تھا جو کوئی رات کو لے گیا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ فی الحال ہم خود کو میاں بیوی ظاہر کریں گے۔ میں اس کی ہر بات مانتا جا رہا تھا مگر بہت ڈر رہا تھا کہ اب نہ جانے معاملات کیا رخ اختیار کریں گے اور اس سے کتنی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی مگر فاطمہ بہت پُرامید تھی۔ حوالدار کے گھر میں پیٹ بھر کے کھانا کھانے کے بعد فاطمہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ حوالدار کی بیوی کھانے کے بعد سو گئی تھی۔ فاطمہ نے اس کا برقع اوڑھا، باہر سے دروازے کی کنڈی لگائی اور پچھلی طرف سے ہم دونوں فرار ہو گئے۔ تکیے میں بھری ہوئی رقم ہمارا بہت بڑا سہارا تھی۔ ہم نے بازار سے کپڑے جوتے اور ایک صندوق خریدا اور لباس کے ساتھ ہی ہمارا حلیہ بالکل تبدیل ہو گیا۔ شام تک ہم کرائے کا ایک مکان تلاش کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے لیکن میں نے فاطمہ کو صاف بتا دیا کہ دنیا کے سامنے ہم میاں بیوی ہوں گے مگر ایک دوسرے کے سامنے نہیں۔ ہم اس وقت تک ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہیں جب تک ہمارا نکاح نہیں ہو جاتا۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے آخری وقت تک اس عہد کو نبھایا۔ اگلے دو تین دن تک ہم نے اخبار میں کوئی ایسی خبر نہیں دیکھی جس سے فقیروں کے کسی بردہ فروش گروہ پر چھاپا پڑنے کا ذکر ہوتا۔ غالباً تھانیدار نے معاملہ گول کر دیا۔ اس نے ماتحت کو بہت بے عزت کیا ہوگا۔ ماتحت نے بیوی کی گوشمالی کی ہوگی۔ تھانیدار نے حوالدار کو اس کوتاہی کا ذمے دار ٹھہرایا ہوگا۔ ہم سب سے بے نیاز اپنا گھر بنانے میں لگے رہے۔ ہم نے برتن خریدے اور گھر کا تھوڑا بہت دوسرا سامان۔ یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ اس تکیے میں سے سینتالیس ہزار کی رقم نکلی تھی مگر ہم بہت محتاط تھے۔ ہمارا مالک مکان بھی ایک سبزی فروش تھا جس نے مجبوری کے تحت اوپر والا کمرا ہمیں پچاس روپے مہینہ پر دے دیا تھا۔ میں یہ ظاہر کرتا تھا کہ صبح مزدوری کے لیے جاتا ہوں اور شام کو لوٹ آتا ہوں اور ہم جو کچھ خرچ کر رہے ہیں وہ اپنی بچت میں سے کر رہے ہیں۔ … ہفتہ بعد میرے لیے فاطمہ کے ساتھ اس کے اتنے قریب رہنا مشکل ہو گیا۔ تک

نے ایک چھوٹی سی مسجد کے مولوی صاحب سے بات کی اور اس سے تھوڑا سا جھوٹ بھی بولا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں ایک ہندو لڑکی کو مشرف بہ اسلام کر کے اس سے عقد کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ لڑکی کے گھر والے اس پر تیار نہیں اس لیے لڑکی اکیلی آئے گی اور کلمہ پڑھ لے گی۔ مولوی صاحب مان گئے۔ انھوں نے نکاح پڑھانے کے دو سو لیے اور "زہرہ پی تی" کا نام فاطمہ رکھا گیا۔ اللہ مجھے معاف کرے! میں نے بدنیتی سے کچھ نہیں کیا تھا۔ پھر وہ دلوں کے بھید جانتا ہے اور نیتوں کا حال بھی وہ جانتا ہے کہ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا بلکہ جو کچھ کیا گناہ سے بچنے کے لیے کیا۔ اس روز فاطمہ میری بیوی بن گئی اور میں نے خود کو دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی تصور کیا۔ ہم نے چھ مہینے بڑے سکون سے گزارے اور وہ میری زندگی کا سب سے خوبصورت زمانہ تھا جس کی یاد آج بھی مجھے خون کے آنسو رلاتی ہے۔ پھر فاطمہ امید سے ہوئی اور ہم نے وہ سب باتیں کیں جو میاں بیوی پہلی اولاد ہونے سے پہلے کرتے ہیں۔ ابھی خوابوں کی تعبیر ملنے میں تین مہینے باقی تھے کہ دشمن ہمیں تلاش کرتے ہوئے آ پہنچے۔

اس دن مجھے ایک آئل کمپنی میں ملازمت مل گئی تھی اور میں گھر پہنچا تو بہت خوش تھا۔ اب ہم اپنی غربت اور تنگی کو خیرباد کہہ سکتے تھے۔ بڑے اور زیادہ آرام دہ مکان میں منتقل ہو سکتے تھے اور گھر کو صحیح معنوں میں گھر بنا سکتے تھے۔ اب ہم مالِ غنیمت کو خرچ کرنے کا جواز پیش کر سکتے تھے۔ ایک محنت مزدوری کرنے والا ٹھاٹ سے نہیں رہ سکتا مگر ایک کلرک رہ سکتا ہے۔ لوگ فرض کر لیتے ہیں کہ اس کے پاس ناجائز آمدنی کے ذرائع ہوں گے اور حسد کرنے یا صبر کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے۔ میں گھر پہنچا تو فاطمہ سارے دروازے بند کیے بیٹھی تھی اور میرے بیل بجانے پر بھی اس نے دروازہ کئی بار کی تصدیق کے بعد کھولا۔ فاطمہ کا رنگ زرد تھا اور اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔

"یہ کیا ہوا ہے تمھیں؟" میں نے اس کی حالت دیکھ کر کہا۔ "پاگل تو نہیں ہو رہی ہو؟"

"تم کو نہیں معلوم۔" وہ کانپتے ہوئے بولی۔ "آج میں نے اسے دیکھا ہے۔۔۔"

"کسے دیکھا ہے؟ جن بھوت کو یا ملک الموت کو۔۔؟" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ اسے خوشخبری سنانے کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ جانے سے مجھے مایوسی ہوئی تھی۔ پھر میں نے اسے پلنگ پر بٹھا دیا اور اس کا برف جیسا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"وہ ملک الموت ہی ہے۔ وہ نیچے کھڑا تھا اور جب میں نے کھڑکی کھولی تو وہ مجھے گھورتا رہا۔ میں اتنی ڈر گئی کہ ایک دم پیچھے بھی نہ ہٹ سکی۔" وہ لرزتی ہوئی آواز [illegible] "اور جب میں نے پیچھے ہٹ کر کھڑکی بند [illegible] ہو چکی تھی۔ وہ مجھے اچھی طرح پہچان گیا تھا کیونکہ وہ مسکرا [illegible] اور اس کی مسکراہٹ بہت خطرناک تھی۔ پھر وہ چلا [illegible] کے بعد شام ہوتے ہی وہ دوبارہ نمودار ہو گیا تھا۔ میں [illegible] تو وہ اسی جگہ موجود تھا۔"

"آخر اس کا کوئی نام بھی ہو گا؟" میں نے فیصلہ [illegible] لیتے ہوئے نرمی سے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ ہسٹریائی [illegible] ہنگامی کی حد تک نہ جا پہنچے۔

"میرا باپ چاہتا تھا کہ میری شادی اس سے ہو۔" وہ بولی۔ "پہلے وہ کام چور تھا۔ میرے باپ نے شرط رکھی کہ جب تک سو روپے روز لا کے دو تو بات کروں گا۔ وہ سمجھ [illegible] وہ سو کی جگہ ایک سو دس ہر شام میرے باپ کے ہاتھ پر رکھ [illegible]"

"ایک سو دس روز لا کے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "یہ [illegible] کے تین ہزار تین سو۔ دس مہینے میں تینتیس ہزار۔"

"ہاں۔ اپنے آدھے بھی وہ میری خاطر میرے باپ کو دے رہا تھا۔" وہ بولی۔ "اور ظاہر ہے اس کی شرط کو پورا کر چکا تھا۔"

"آخر وہ یہاں تک کیسے پہنچا؟" میں نے کہا۔ "دنیا [illegible] دھوکا ہوا ہے۔ اس سے ملتا جلتا ہو گا کوئی۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ اسے میں نہیں پہچانوں گی [illegible] پہچانے گا۔" وہ بولی۔

"لیکن ہمارے اس ٹھکانے کا تو پولیس کو بھی علم [illegible] وہ ہمیں پہلے پکڑتے۔" میں نے کہا۔

"پولیس اس کیس کو بھول چکی ہے۔ میرا باپ نہیں بھولا ہو گا اور تمھیں بھی۔" فاطمہ نے کہا۔ "فقیروں کے بڑے خفیہ قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ اس نے یہاں کے فقیروں کو ہمارے پیچھے لگا دیا ہو گا۔"

"مگر ہم تو اب فقیر نہیں ہیں۔ تلاش کرنے والے مخصوص ٹھکانوں پر ہی جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اُفوہ۔ تم عقل سے بالکل پیدل ہو۔" وہ بولی۔ "فقیر گھر سے کہاں ہوتے ہیں۔ اہم شاہراہوں پر [illegible] میں اسپتالوں کے دروازوں پر، چوراہوں پر [illegible] سے سب گزرتے ہیں۔ تم کو کسی نے دیکھ لیا ہو گا۔ پھر [illegible] نہیں چلا اور تمھارا پیچھا کرتا ہوا کوئی یہاں تک آ گیا۔"

"ہوں۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔" میں نے

کہا۔ "گزشتہ دنوں میں کچھ پیدل ہی پھرتا رہا ہوں لیکن۔ کام کی تلاش میں بھی اسٹیشن بازار آنا جانا بھی رہا ہے۔"

"بس اب جیسے بھی ہو یہاں سے نکل چلو۔ اسی وقت۔" وہ بولی۔

"ابھی وقت؟ اس وقت کہاں جائیں گے؟" میں نے کہا۔ "دوسرا مکان تو تلاش کر لیں۔"

"مکان مل جائے گا ڈھونڈنے سے۔ اس کے آنے سے پہلے نکل جانا اچھا ہے۔" وہ بولی۔

"ایسے تو مالک مکان بھی ہمیں نہیں جانے دے گا۔" میں نے کہا۔ "اسے ایک مہینے کا نوٹس نہ سہی کرایہ تو دینا ہے۔"

"تو جاؤ ابھی دے دو۔ تمھارے پاس پیسے کی کمی تو نہیں ہے۔ وقت کب ہے۔" وہ بولی۔

"خدا کے لیے کچھ ہمت سے کام لو۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔" میں نے کہا۔ "تم تو مجھے بھی نروس کر رہی ہو۔ اب تو رات ہو چکی ہے۔"

"رات کے اندھیرے میں ہمیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہو گا۔"

"اور ہوا تو ہم اسے نہیں دیکھ سکیں گے۔ وہ چل پڑے گا ہمارے پیچھے۔" میں نے کہا۔ "رات کو خالی مکان بھی نظر نہیں آتے اور یوں سامان سمیت پھرنے والے کو مکان ملتا بھی نہیں۔ صبح دیکھیں گے۔"

"صبح!" وہ سپاٹ اور کھوکھلے لہجے میں بولی۔ "صبح تو بہت دور ہے۔ صبح تک نہ جانے کیا ہو جائے۔"

"سب تمھارا وہم اور خوف ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "ایک رات میں قیامت نہیں آ جاتی۔ کھڑکیاں دروازے سب بند کر کے سو جائیں گے۔ مالک مکان کی عادت کو تم جانتی ہو۔ وہ خود سونے سے پہلے سارے دروازے مقفل کرتا ہے۔ صبح میں تم کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ ہم دونوں کل مکان تلاش کریں گے۔ حالانکہ کل پہلا دن تھا اور مجھے ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔"

"ڈیوٹی۔ تو کیا تمھیں نوکری مل گئی ہے؟" وہ خوشی سے اپنا سب خوف بھول گئی۔

"ہاں۔ تم نے مہلت ہی نہیں دی۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں تو گھر میں قدم رکھتے ہی تمھیں یہ خوشخبری سنانا چاہتا تھا۔"

"ایک خوشخبری تو میرے پاس بھی تھی۔ فیصلہ کر لو کس کی خوشخبری بڑی ہے۔" اس نے میرے کان کے قریب سر لا کر سرگوشی کی۔ میں نے خوشی سے ایک چیخ ماری اور فوراً تسلیم کر لیا کہ سب سے بڑی خوشی کی خبر اسی کی ہے۔ وہ اصول ہے۔ میری نوکری تو صرف تین سو روپے مہینہ کی تھی۔ اس کا ہمارے ہونے والے بچے کی زندگی اور اس کے مستقبل اور اس کے وجود سے وابستہ ہماری خوشیوں کی قیمت سے کیا مقابلہ۔ میرے تسلی دینے اور سمجھانے پر وہ ایک رات کے لیے رک گئی۔ میں رات کو مٹھائی لیتا گیا اور میں نے دو ڈبے مالک مکان کے گھر میں بھی دیے۔ وہ بڑا حیران ہوا کہ دو ڈبے کیوں۔ میں نے اسے دہری خوشخبری سنائی تو وہ نیک دل آدمی بھی خوش ہوا جس کے گھر میں ہمیں کوئی تکلیف نہیں تھی اور جس کا رویہ ہمارے ساتھ بزرگوں کی طرح مشفقانہ تھا لیکن فاطمہ کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ صبح تک نہ جانے کیا ہو جائے۔ ہم آپس کی باتیں کرتے نہ جانے کتنی دیر تک جاگتے رہے تھے۔ میری آنکھ عجیب سے شور کو سن کر کھلی۔ یہ شورِ قیامت میں نے پہلے بھی سنا تھا۔ میرے ذہن نے اس کو تحت الشعور کے گہرے مدفن میں دبا دیا تھا۔ مجھے پاگل ہونے سے بچانے کے لیے میرے دماغ نے یہ چال چلی تھی کہ ایک ذہنی صدمے کی شدت کا ہر نقش مٹا دیا تھا۔ دوسری بار اس حادثے کا پیش آنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی دوبارہ مندمل ہو جانے والے زخم کو نوکِ خنجر سے چیر دے۔ میں دہشت سے چیخ مار کے اٹھا اور دروازے کی طرف لپکا مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ نیچے سے مالک مکان کے چیخنے چلانے کی آواز آ رہی تھی اور اس کے بیوی بچے آہ و بکا کر رہے تھے لیکن ان کے لیے بھی فرار کے راستے بند ہو چکے تھے اور پورے مکان کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس رات ہوا بھی نہیں چل رہی تھی کہ آگ اتنی تیزی سے پھیل جاتی۔ وہ آگ اس طرح لگائی گئی تھی کہ ایک دم بھڑک اٹھے اور ہر طرف پھیل جائے۔ دھواں تیزی سے کمرے میں بھر رہا تھا اور آگ کے شعلوں کی زبانیں چھت کی کڑیوں تک پہنچنے لگی تھیں۔ اندیشہ یہ تھا کہ چند منٹ میں ہمارا دم گھٹ جائے گا اور اگر ہم بے ہوش ہو کے گر گئے تو جلتی ہوئی چھت ہمارے اوپر گر پڑے گی اور صبح ہماری کوئلہ لاشیں اسی طرح ملبے سے نکلیں گی جیسے میرے والدین کی لاشیں نکلی تھیں۔ میں نے فاطمہ کو صبر اور حوصلے سے کام لینے کی تلقین کی اور گلی میں کھلنے والی کھڑکی کو دیکھا۔ اس کی اونچائی کچھ کم بارہ فٹ تھی لیکن اس وقت زندگی اور موت کے درمیان یہی بارہ فٹ حائل ہو گئے تھے۔ کھڑکی سے کود جانا خطرناک بھی ہو سکتا تھا اور مہلک بھی۔ مگر کمرے میں ٹھہرنا تو خودکشی کے مترادف تھا۔ میں نے ایک نظر کمرے میں ڈالی۔ پلنگ کی پائنتی سے بندھی ہوئی رسی کو کھولنے کا یہ وقت نہ تھا۔ پلک جھپکتے میں میں نے فاطمہ کو اٹھا کے کندھے پر ڈال لیا۔ میری اس وقت کی ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی جسے میں آج

www.paksociety.com

بیان کرنا چاہوں تب بھی نہیں کر سکتا۔ میرے کانوں میں جو شور گونج رہا تھا، وہ کچھ اور تھا۔ میرے دماغ میں اپنے والدین کی چیخوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ مجھے میرا نام لے کر پکار رہے تھے۔ یہ مالک مکان کے بیوی بچوں کی چیخ و پکار سے بالکل الگ آوازیں تھیں اور اتنی واضح تھیں کہ ایک بار میں نے چلا کے جواب بھی دیا اور کہا "میں آرہا ہوں۔" اس وقت میرا وجود دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ میری دوسری شخصیت جو بارہ سال تک مجھ پر حاوی رہی تھی، میری اصل شخصیت سے مغلوب ہو رہی تھی۔ میں پھر وہی بن رہا تھا جو تھا لیکن یہ انقلاب رفتہ رفتہ آرہا تھا۔ میں اپنے ماضی کی طرف لوٹ رہا تھا لیکن حال سے بے خبر نہیں تھا۔ میں نے فاطمہ کو اٹھا کے کھڑکی کا رخ کیا۔ پہلے اپنے پیر باہر نکالے پھر توازن قائم رکھتے ہوئے ونڈو پر بیٹھ کر فاطمہ کو باہر نکالا جو بے ہوش ہو چکی تھی۔ خوف سے یا دم گھٹنے سے۔ پھر اللہ کا نام لے کر میں باہر کود گیا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو میں سیدھا کودتا۔ پنجوں کے بل اترتا اور خود کو سنبھال لیتا مگر فاطمہ کے بوجھ کو کندھے پر لاد کے میرا کودنا اور اتنی بلندی سے گرنا برابر تھا۔ فاطمہ میرے کندھے پر سے اچھل کے نہ جانے کدھر گئی۔ اس بار میری دوسری ٹانگ ٹوٹ گئی لیکن میں ہمت کر کے اٹھا اور چلاتا ہوا فاطمہ کی طرف لپکا۔ وہ دیوار کے سائے سے عجیب طریقے پر اوندھی پڑی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ مر چکی ہے۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی اور ایسے مڑی ہوئی تھی کہ زندہ آدمی کی گردن مڑ ہی نہیں سکتی۔ میں پاگلوں کی طرح چیخا: "فاطمہ!" اور اسے گود میں اٹھا کے بھاگا۔ نہ جانے کیا چیز میری راہ میں حائل ہوئی اور میں ٹھوکر کھا کے گرا تو میرا سر کسی سخت چیز سے لگا اور میں فاطمہ کی لاش کے ساتھ ہی گر گیا۔ یہ بالکل ویسا ہی اور اتنا ہی بڑا حادثہ تھا جو میرے بچپن میں بارہ سال پہلے پیش آیا تھا۔ میرے گھر میں اسی طرح آگ لگی تھی۔ اسی طرح آگ نے میری دنیا کو خاکستر کیا تھا۔ ایسے ہی میری ٹانگ ٹوٹی تھی اور اسی طرح میرے سر میں چوٹ آئی تھی۔ یہ واقعات دوبارہ اس طرح پیش آئے جیسے کوئی پوری فلم دوبارہ چل جائے۔ ایسی ہی ایک فلم میں نے بارہ سال قبل دیکھی تھی مگر میں بھولا ہوا تھا۔ ہوش آنے پر مجھے پرانی فلم کے سارے واقعات یاد آگئے اور ذہن نے جب بارہ سال پیچھے سے سفر شروع کیا تو زمانہ حال تک ہر گزرا ہوا لمحہ ایک زنجیر کی کڑی بن گیا۔ فاطمہ کی موت سے مجھ پر کیا بیتی، اس کا بیان میں الفاظ میں کیسے کروں۔ مجھ سے سب کچھ چھن گیا تھا۔ میرا گھر، میرے بیوی بچے، میری ملازمت، مستقبل، میری خوشیاں اور میری امیدیں۔ سب اس آگ میں جل کر راکھ ہو گئے... بیالیس ہزار کے نوٹ بھی اسی آگ میں جل گئے

ہوں گے لیکن ان کا مجھے خیال تک نہیں آیا جو اس کمال ... میں بابا گر جو تھے دن میں اسپتال سے فرار ہو گیا۔ ٹرین میں لاہور آ پہنچا۔ یہ خدا کی بڑی مہربانی تھی کہ اس نے مجھے ... کا اور اس صدمے کو برداشت کر جانے کا حوصلہ دیا ... دی کہ ان حالات پر غور کر سکوں اور فیصلہ کر سکوں کہ ... فاطمہ مر چکی تھی اور میری دیوانگی سے واپس نہیں آسکتی۔ پیار کا جو دیا وہ میرے دل میں روشن کر گئی تھی، اس کا ... تھا۔ کئی بار میں نے اسے خواب میں دیکھا۔ وہ مجھے ... سے گئی کہ میں بہت ... دوں اور اپنے سب دشمنوں سے ضرور لوں۔ بدلہ لینا آسان نہیں تھا کیونکہ میں اکیلا تھا ... ساری قوت میری عقل ہو سکتی تھی جسے میں نے فاطمہ کے ... کیا کہ عقل سے کام لیتے ہوئے میں اس کے قاتلوں اور ... دشمنوں سے حساب ضرور چکاؤں گا اور اس کی محبت کو ... نایاب کی طرح دل میں چھپا کے مصروف عمل ہو گیا۔ مجھے اپنی پرانی دکان تلاش کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ... دکان کا نام بدل گیا تھا اور دکان پہلے کے مقابلے میں ... تھی۔ غالباً کوئی ساتھ والی دکان بھی خرید کر اس کے ... شامل کر لی گئی تھی لیکن اس کے باوجود اندر کا نقشہ ... تھا۔ میرا حلیہ فقیروں سے بھی بدتر تھا مگر میں اسی حالت ... دکان میں بے خوفی سے داخل ہو گیا ... آخر میں ہی تو اس کا مالک ہوں۔

"دکان کا مالک سیٹھ یا منیجر کہاں ہے؟" میں نے ... شو کیس کو انگلی سے بجا کر ایک سیلز مین کو متوجہ کیا۔

سیلز مین نے حقارت اور غصے سے میری طرف دیکھا: "ٹوٹ جائے گا شیشہ۔"

"سالے فقیر بھی بدمعاش بن گئے ہیں۔ کسی کو ... کرتے ہیں؟" دوسرے سیلز مین نے کہا۔

"باہر نکال سیٹھ کی اولاد کو۔" تیسرے سیلز مین نے ایک ... طرف پھینک کر کہا۔

"اپنی بکواس بند کرو۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔"

انھوں نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ...

"تمھیں سیٹھ یا منیجر سے ...؟" ایک نے کہا۔

"کام مجھے سیٹھ یا منیجر سے ہے، تم سے نہیں ..."

میں نے متانت سے کہا: "میرے سوال کا جواب دو۔"

"اب یہ ادا کاری کم ہے۔ سیٹھ یا منیجر سے ..." ایک سیلز مین میرا تمسخر اڑا ...

ہنس کے بولا۔

"میں اس دکان کا مالک ہوں۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

"ابے یار، یہ تو کریک ہے۔" ان کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ "نکالو اسے باہر۔"

"یہ پڑھا لکھا پاگل ہے۔" دو سیلز مین مجھے دھکے دینے کی نیت سے آگے بڑھے۔ میں نے گاہکوں کو بٹھانے کے لیے استعمال ہونے والا اسٹول اٹھا لیا۔

"اگر تم میں سے کسی نے بے وقوفی کی تو میں سارے شیشے اور شو کیس چکنا چور کر دوں گا۔" میں نے کہا۔

وہ اپنی جگہ پر منجمد ہو گئے۔ یہ ایسی خطرناک دھمکی تھی کہ وہ کچھ نہ کر سکے۔ میں اس آئینہ خانے کو پاش پاش کر سکتا تھا اور ٹیلیفون کر کے پولیس کو وہ بعد میں بلاتے یا چار مل کر مجھے قابو کر لیتے مگر اس سے انھیں کچھ حاصل نہ ہوتا۔ کسی پاگل اور فقیر نظر آنے والے کو پولیس کے ہاتھوں اتنا پٹوایا جاتا کہ وہ مر جائے۔ اس سے بھی نقصان تو پورا نہیں ہو سکتا تھا۔

"جو میں پوچھ رہا ہوں وہ بتا دو۔" میں نے کہا۔ "مجھے دکان کے مالک یا منیجر سے بات کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" ان میں سے ایک بولا۔ "تم یہ اسٹول رکھ دو۔ منیجر صاحب تو کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ مالک گھر پر ہوں گے۔ میں فون پر بات کر لیتا ہوں۔"

میں نے سر ہلا کے اسے فون کرنے کی اجازت دی۔ نمبر ملنے کے بعد ریسیور میں نے لے لیا۔ "ہیلو۔" کسی مرد نے کہا۔

"میں خواجہ نیک محمد بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس دکان کے اصل مالک کا بیٹا۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی سے میں نے اندازہ کیا کہ میرے الفاظ کا اثر کیا ہوگا۔ "آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟" بہت دیر کے بعد دکان کے مالک کی آواز آئی تو بالکل بدلی ہوئی تھی۔

"آپ کی دکان سے۔ یہاں ملازموں نے میرے ساتھ سخت بدتمیزی کا سلوک کیا مگر میں ان کو معاف کرتا ہوں کیونکہ یہ سب مجھے نہیں پہچانتے۔" میں نے کہا۔ "اب میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"بہت بہتر، میں حاضر ہوتا ہوں۔" وہ بولا۔ "آپ ریسیور منیجر کو دیجیے۔"

"منیجر کسی کام سے گیا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "اپنے سیلز مین سے بات کر لیں۔" اور ریسیور سامنے تھما دیا۔ وہ کچھ دیر ریسیور پر ... کرتا رہا۔ اس کی حیرت اور بدحواسی دیکھ کر مجھے بڑی ہنسی آرہی تھی لیکن میں نے اپنی متانت میں فرق نہیں آنے دیا اور صرف مسکراتا رہا۔ باقی سیلز مین بھی دم بخود کھڑے تھے۔

"آپ آفس میں تشریف رکھیے۔" ... سیلز مین گڑبڑا کے بولا۔ "ہم سے بڑی غلطی ہوئی۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں نے برا نہیں مانا۔" میں نے اسی شان سے کہا اور آفس میں جا بیٹھا۔ جو اتنی خوبصورتی سے سجا ہوا تھا کہ کسی چیز پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ منیجر پہلے آیا اور اپنے آفس میں ایک فقیر کو رونق افروز دیکھ کر اس کا رنگ پیلا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے نکالتا، کسی سیلز مین نے اسے اشارہ کر دیا جو اس نے شیشے کی پارٹیشن سے دیکھا اور باہر چلا گیا۔ چند منٹ میں وہ سر ہلاتا آیا اور مجھے خوف زدہ نظروں سے گھورتا ہوا خون کے گھونٹ پیتا اپنی جگہ جا بیٹھا۔ سیٹھ تھوڑی دیر بعد آیا مگر وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ پولیس بھی آئی تھی مگر انھوں نے احتیاط سے کام لیا تھا۔ دکان کا مالک صرف ایک انسپکٹر کے ساتھ اندر آیا۔ میں نے مالک کو حلیہ بدل جانے کے باوجود شناخت کر لیا۔ وہ اندر آنے کے بعد مجھے غور سے دیکھتا رہا۔

"تم کہتے ہو خود کو خواجہ نیک محمد؟" وہ بولا۔

"کہنے کا کیا مطلب؟ میں خواجہ نیک محمد ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور میں نے تمھیں بھی پہچان لیا ہے۔ تم وہی کاریگر ہو نا جس ... کی دکان میں میرے والد کے ساتھ کام ... کیا کرتا تھا؟"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ "اس جعلساز کو گرفتار کر لیجیے انسپکٹر صاحب۔"

میں نے بہت شور مچایا لیکن کسی نے میری ایک نہیں سنی۔ سیلز مین نے وہ سب کہہ سنایا جو میں نے کیا تھا۔ پولیس مجھے تھانے لے گئی اور کسی رپورٹ کے بغیر بند کر دیا۔ ایک بہت بڑے جیولر کے ملازم کا یہ کہہ دینا کافی تھا کہ میں نے اندر گھس کر توڑ پھوڑ کرنے اور دکان کو تباہ کرنے کی دھمکی دی تھی۔ میں نے ان کو اپنی کہانی سنانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ سب اندھے بہرے کر دیے گئے تھے۔ انھوں نے تین دن مار مار کر مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں خواجہ نیک محمد ہوں۔ مگر میں بہت ڈھیٹ تھا۔ میری ڈھٹائی کا مطلب میرا حوصلہ تھا جو مجھے سچائی عطا کرتا تھا۔ میں خود کو کیسے قائل کر لیتا کہ میں کوئی اور ہوں۔ جو نوکر تھا وہ غاصبانہ طور پر مالک بن چکا تھا اور اس نے مالک کو پاگل قرار دے کر بند کروا دیا تھا۔ میں مر جاتا مگر اصل حقیقت سے کبھی انحراف نہ کرتا۔ خدا نے میری یوں مدد کی کہ مجھے ایک اور حوالاتی کا ساتھی مل گیا جو وکیل تھا۔ میں اپنی سرگزشت

www.paksociety.com

اس حوالاتی کو بتا چکا تھا اور شاید وہ اس پر یقین بھی کر چکا تھا کہ اس نے اپنے ملاقاتی سے میرا ذکر کیا۔ وکیل نے مختصراً بات سنی اور پھر آنے کو کہہ کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد تھانیدار کے شور مچانے کی آواز آئی اور وہی وکیل پھر نمودار ہوا۔ اس نے تھانیدار کو دھمکی دی تھی کہ بغیر فرد جرم عائد کیے کسی قسم کی شکایت یا ایف آئی آر کی عدم موجودگی میں یہ حبس بے جا کا کیس ہے۔ اس نے مجھے اپنا بھائی ظاہر کیا اور تھانیدار کو بہت ڈرایا دھمکایا کہ وہ اس کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ کر دے گا۔ تھانیدار آسانی سے مجھے نہ چھوڑتا لیکن وکیل سیانا تھا۔ اس نے کہا کہ میرے بھائی کا دماغی توازن درست نہیں اور ہم اسے تین دن سے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ وکیل کی یقین دہانی پر تھانیدار نے مجھے آزاد کر دیا لیکن وکیل سے درخواست کی کہ مجھے سنبھال کر رکھے۔ تین دن میں وکیل کے گھر رہا اور وکیل نے میری ساری بات سننے کے بعد کہا کہ وہ تصدیق کرے گا۔ اگر تصدیق پر میری بات درست ثابت ہوئی تو وہ میرا کیس لڑے گا لیکن اس کے بعد شرط یہ ہوگی کہ میں اسے ایک لاکھ بطور فیس کے ادا کروں گا۔ ظاہر ہے یہ سودا مجھے دس لاکھ میں بھی مہنگا نہیں تھا۔ تین دن بعد اس نے مجھے بتایا کہ میں مر چکا ہوں۔

"یہ مذاق میری سمجھ میں نہیں آیا۔" میں نے کہا۔

"اس میں مذاق کی بات ہی نہیں۔ یہ عدالت کا فیصلہ ہے۔"

"عدالت ایک زندہ آدمی کو مردہ قرار نہیں دے سکتی۔" میں نے کہا۔

"تم قانون کو نہیں سمجھتے۔" وہ بولا۔ "اصل صورت حال یوں ہے کہ جب تمہارے گھر میں آگ لگی تھی تو گھر کے اندر تین افراد تھے، تمہارے ماں باپ اور تم۔ ملبے میں سے دو جلی ہوئی لاشیں نکلیں۔ ان کی شناخت ناممکن تھی چنانچہ انھیں تمہارے والدین کی لاشیں قرار دے کر دفن کر دیا گیا۔ تمہاری لاش نہیں ملی تھی چنانچہ تم لاپتا ہو گئے۔ تمہارے قریبی عزیز تو تھے نہیں۔ بس پاس پڑوس کے لوگ اور تمہارے والد کے دوست کیا کر سکتے تھے۔ وہ تمہاری واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ تمہارا جلا ہوا مکان اسی طرح لاوارث پڑا رہا۔ تمہارے والد کے ایک پارٹنر نے سات سال گزر جانے کے بعد عدالت کو درخواست دی کہ تمہاری موت کا سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے۔ از روئے قانون سات سال تک لاپتا رہنے والے کو مردہ قرار دے دیا جاتا ہے چنانچہ تمہارا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی جاری ہو گیا اور یوں وہ شخص جو نصف کاروبار کا مالک تھا پورے کاروبار کا مالک بن بیٹھا۔ اس نے کوئی خلاف قانون کام نہیں کیا تھا چنانچہ اسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ اگر تمہارا کوئی چچا، تایا یا دادا ہوتا تو ایک بات تھی۔ خود تم والدین کے اکلوتے تھے۔ سات سال میں کوئی دعوے دار سامنے آیا ہی نہیں تھا۔ حق ملکیت حاصل کرنے کے بعد اس نے دوسرا چکر چلایا۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ کو بنیاد بنا کر تمہاری جلی ہوئی کوٹھی بھی [illegible] کر دی۔ اس نے کافی لوگوں کو پیسہ کھلایا۔ کاغذات میں [illegible] اور مکان کا اسٹرکچر زمین سمیت ایک ایسے شخص کو [illegible] پر قابض رہنے کا اہل تھا۔ آجکل اس مکان میں ایک [illegible] اسمگلر رہتا ہے۔ اب تمہارا معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ [illegible] عدالت میں درخواست دینا ہوگی کہ میں زندہ ہوں۔ اپنی شناخت کے ثبوت اور گواہ لانے ہوں گے۔ ان حالات سے [illegible] گزرنا ہوں گے جن کی وجہ سے تم بارہ سال در بدر رہنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ معاملہ تمہاری یادداشت کی گمشدگی کا ہے۔ جس اسپتال میں تم زیر علاج تھے وہاں بارہ سال پہلے کا ڈاکٹر ہے اور نہ ریکارڈ۔ اب تمہیں کسی میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہونا پڑے گا جس میں ماہر نفسیات اور ڈاکٹر سب [illegible] اور وہ مل کر فیصلہ کریں گے کہ کیا واقعی بارہ سال تک تمہاری یادداشت تمہارے ساتھ نہیں تھی۔ یقیناً وہ سب تمہارے [illegible] وہ تو تمہارے دشمن ہیں اور تمہیں ہتھیانے سے [illegible] گے۔ یہ ایک نہیں ایک درجن مقدمات ہیں۔ فوجداری [illegible] تمہارے لیے ہر قدم پر قانونی ضابطوں کا مرحلہ ہے۔ [illegible] خواجہ نیک محمد ثابت کرے [illegible] یہ ثابت کرنا کہ تم بارہ سال [illegible] میڈیکل بورڈ کو قائل کرنا۔ یاد رہے کہ تمہارا حریف [illegible] تمہارے خلاف ہر ثبوت کو جھوٹ بنا سکتا ہے [illegible] کر سکتا ہے [illegible] منہ مانگی قیمت دے کر۔ وہ تمہیں مروا [illegible] تمہارا تو مدعی بھی کوئی نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ [illegible] دکان اور مکان کا قبضہ لینے کے ہیں۔ دونوں مقدمات [illegible] نوعیت کے ہیں اور فریق ثانی اس پوزیشن میں ہے کہ [illegible] طول دے کر ہائی کورٹ تک لے جائیں اور اگر فیصلہ [illegible] بھی تمہارے خلاف ہو تو [illegible] امکان نہیں۔ [illegible] اٹک ہے۔ اس حوالے سے تمہارے مکان میں رہنے والے [illegible] سب بدمعاش ہیں یا بدمعاش خرید سکتے ہیں۔ [illegible] کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ اور تم کیا [illegible] ان سے [illegible] رہ سکتا ہوں نہ غیر قانونی۔ [illegible] مجھے ایک لاکھ ادا [illegible] تمہاری وکالت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دینے کے [illegible] انکار نہیں کر سکوں گا۔ کیوں کہ تم سے مجھے پوری [illegible] ملنے کی امید نہیں۔ تم ایک لاکھ کی جگہ دس لاکھ بھی دے [illegible] کب دو گے۔ دس سال!

[illegible] ہو گئے۔ شاید تجھے اپنے بچنے سے [illegible] بے خطرہ ہے [illegible] ہے۔ آخری بات یہ کہ تمہارے دعوے کی [illegible] کمزور ہے۔ دعوے دائر کرنے کے لیے اس پر بہت کم [illegible] ہیں، پیسے لگیں گے، وہ کون دے گا۔ قصہ مختصر۔ اس نے مجھ سے کہا [illegible] کے لیے کچھ نہیں کر سکتا اور مجھے اتنا ہی غنیمت جاننا چاہیے کہ وہ مجھے پولیس کے شکنجے سے نکال لایا ورنہ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیا جاتا۔ اب بہتری یہ ہے کہ میں جان بچا کے نکل جاؤں۔ زندگی کی قیمت ایک مکان اور ایک چھوٹی سی دکان سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ میں نے کہا اچھا تو میں گیا مکان اور جہنم میں گئی دکان۔ مجھے تو بدلہ لینا ہے اپنے ماں باپ کے قاتلوں سے اور سزا دینی ہے ناجائز قابضوں کو۔ وکیل دل کا برا نہیں تھا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ جذبے کو عقل اور تدبر سے کام لینا چاہیے اور انتقام جیسے جذبے پر اختیار رکھنا چاہیے مگر اس نے دیکھا کہ میں [illegible] سوچنے کے قابل نہیں تو اس نے مجھ کو ایک آدمی کا پتا دیا کہ وہ تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ اس شخص کا نام تو کچھ اور تھا مگر وہ بہرام دادا کے نام سے مشہور تھا۔ وہ بہت طاقتور شخص تھا۔ [illegible] بھرا ہوا چھ فٹ قد اور بہت مضبوط کسرتی جسم کا مالک لیکن اس کی خاص بات کچھ اور تھی۔ وہ بہت بڑا بدمعاش تھا اور اس کے مقابلے میں خود کو بڑا بدمعاش کہنے والے جوکر لگتے تھے۔ اور بالکل ان لوگوں کی طرح تھے جن سے بہادرانہ [illegible] دیکھا ہو۔ اکثر لوگوں نے صرف اس کا نام سنا تھا اسے دیکھا نہیں تھا۔ وہ عام بدمعاشوں سے بہت مختلف بھی تھا۔ اس کے چیلے چانٹے بھی معمولی حیثیت کے بدمعاش نہیں تھے۔ چونکہ میں نے اسے قریب سے دیکھا ہے، اس لیے میں بہرام دادا کے متعلق وہ سب جانتا ہوں جو اس کی ذات سے وابستہ افسانوں اور روایات کی بنیاد تھا۔ بہرام دادا کو آپ چور، ڈاکو اور قاتل سب کچھ کہہ سکتے ہیں مگر اس کے چند اصول تھے جن پر وہ سختی سے کاربند رہا۔ ایک تو وہ ان کو لوٹتا تھا جن کے پاس دولت کا ذخیرہ ناجائز آمدنی یا حرام کی کمائی ہو۔ مشہور ہے کہ غلطی سے ایک بار اس نے کسی گھر میں ڈاکا ڈالا اور تقریباً دو لاکھ کا زیور اٹھا کر لیا۔ زیور کسی سیٹھ نے بیٹی کے جہیز کے لیے بنوایا تھا۔ سیٹھ اس کے قدموں میں گر گیا۔ اس نے بہرام دادا کو بتایا کہ وہ دیوالیہ ہو چکا ہے اس کا نام ہاتھی کے دانتوں کی طرح رہ گیا ہے جو محض دکھانے کے لیے ہوں۔ اس کے قرض خواہ بہت جلد اس کا سب کچھ نیلام کرا لیں گے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح بیٹی کو باعزت طریقے سے رخصت کر دے اور جو اسے دینا ہے وہ دے کر اپنا بھرم رکھ لے۔ اگر زیور چلا گیا تو شادی نہیں ہوگی۔ وہ دیوالیہ ہو گیا تو اس کا سب کچھ قرض خواہ لے جائیں گے اور پھر شاید اسے جیل جانا پڑے۔ بہرام دادا کو معلوم تھا کہ سیٹھ نے اسمگلنگ سے مال اکٹھا کیا تھا۔ مگر اسمگلر پر بھی برا وقت آ جاتا ہے۔ اس کی سزا بیٹی کو مل رہی تھی۔ اس نے سارا زیور واپس کر دیا۔ سیٹھ سے وعدہ لیا کہ آئندہ اسمگلنگ نہیں کرے گا اور اس کے قرض خواہوں کا نام پوچھا۔ اگلے دن سارے قرض خواہوں کو بہرام دادا کا پیغام ملا کہ وہ سیٹھ کے قرضوں کی رسیدیں اسے واپس کر دیں اور انھیں ایک ہفتے کی مہلت دی گئی۔ دو نے پولیس میں جانے کی حماقت کی اور بہرام دادا کو خود ان سے رسیدیں لینے کے لیے جانا پڑا۔ باقی نے مجبوراً دل پر پتھر رکھ کے یہ گھاٹا کھانا منظور کر لیا۔ وہ بہرام دادا کو سب کچھ دینے سے بہتر یہ سمجھتے تھے کہ ایک سیٹھ کا تھوڑا سا قرض معاف کر دیں۔ وہ سیٹھ سنبھل گیا۔ اس کی بیٹی کی شادی میں بہرام دادا بھی شریک تھا اور اسٹیج پہ بیٹھا تھا لیکن اسے کوئی نہ پہچان سکا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ بہرام دادا نے کبھی ان سیٹھوں پر ہاتھ نہیں ڈالا جنھوں نے اس کے کہنے پر رسیدیں واپس کر دی تھیں بلکہ انھیں ٹیلی فون کر کے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس مثال سے تم سمجھ گئے ہو گے کہ بہرام دادا کس قسم کا آدمی تھا۔ وہ بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتا تھا۔ انتہائی معزز نظر آتا تھا لیکن خود اس کے خاص آدمی بھی نہیں جانتے تھے کہ اس وقت وہ کہاں ملے گا۔ پولیس کبھی اس پہ کوئی جرم ثابت نہ کر سکی۔ چشم دید گواہ عدالت میں بیان سے منحرف ہو جاتے تھے یا شناخت میں غلطی کر جاتے تھے۔ اس کے بارے میں یہ کہانیاں بھی مشہور ہیں کہ وہ اچانک کسی حقیقی ضرورت مند کے پاس جا پہنچتا اور تعارف کرائے بغیر اس کی مدد کر کے لوٹ آتا۔ خیر یہ سب میں نے تمہیں سنا تھا کیوں کہ میں بارہ سال سے شہر بدر تھا۔ اس وکیل کے کہنے پر میں نے بہرام دادا کی تلاش شروع کر دی۔ میں ہر جگہ پہنچا اور ہر بدمعاش کے ٹھیے سے معلوم کیا۔ لوگ مجھ پر ہنستے رہے یا مجھے ڈراتے رہے مگر میں نے اپنی جستجو جاری رکھی۔ ہر جگہ میں یہی کہتا کہ خدا کے بعد دنیا میں میرا کام بہرام دادا کے سوا کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ کام کیا ہے، یہ میں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا۔ پندرہ بیس دن بعد میری کوشش کے نتائج ظاہر ہوئے۔ میں ایک جگہ چائے پی رہا تھا کہ ایک مظلوم، مسکین اور مریل سا آدمی اس ٹیبل پر آ بیٹھا۔ ہم دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ درمیان میں اس نے اچانک کہا کہ مجھے بہرام دادا نے بلایا ہے۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کہاں بلایا ہے تو وہ بولا کہ تمھیں اس سے کیا۔ وہ جہاں ہوگا مل جائے گا۔ میں نے اور کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے اٹھ کر اس مریل جیسے شخص کے ساتھ ہو لیا۔ باہر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ ہمارے بیٹھتے ہی ادھر ادھر سے دو افراد نمودار ہوئے اور انھوں نے دروازے بند کر دیے۔ میں

www.paksociety.com

سے دیکھا کہ دروازوں کو اندر سے کھولنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔

"تم کو بہرام داوا سے کیا کام ہے؟" ڈرائیور نے کہا۔

"جو کام مجھے بہرام داوا سے ہے وہ میں تمھیں نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔

"میں ہی بہرام داوا ہوں۔" ڈرائیور نے اسی بے فکری اور اطمینان کے ساتھ کہا۔ میں دوسری بار صدمے سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ میرے دونوں طرف اور آگے بہرام کے ساتھ بیٹھا ہوا آدمی سب مسلح تھے مگر بالکل خاموش تھے۔

"میری کہانی لمبی ہے۔ کیا ہم کہیں بیٹھ کے بات نہیں کر سکتے؟" میں نے کہا۔

"ہم کہیں بیٹھے ہوئے نہیں ہیں؟" بہرام داوا نے کہا۔ "گاڑی سارا دن چل سکتی ہے۔ اس شہر کی سڑکیں لمبی ہیں یا تمھاری بات ان سے بھی لمبی ہے؟"

میں نے اسے اوّل تا آخر سب بتا دیا۔ معلوم نہیں اسے پوری آپ بیتی سنانے میں میرا آدھا گھنٹا صرف ہوا یا ایک گھنٹا۔ لیکن جتنی دیر بھی میں بولتا رہا سب خاموش رہے۔ صرف ایک بار درمیان میں بہرام داوا نے کہا تھا "سگریٹ" اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے اسے سگریٹ جلا کر دی تھی۔ گاڑی ایک ہی رفتار سے مسلسل چلتی رہی۔

"اگر یہ سب سچ ہے" بہرام داوا نے میرے خاموش ہو جانے کے بعد کہا "تو تمھیں معلوم ہو جائے گا۔" پھر اس نے گاڑی رکوائی اور مجھے اترنے کے لیے کہا۔ "کل اسی جگہ تم کو جواب مل جائے گا۔" میرے کچھ کہنے سے پہلے گاڑی روانہ ہو چکی تھی۔ میری نظر نمبر پلیٹ پر پڑی مگر پلیٹ اوپر اٹھی ہوئی تھی اور سادہ تھی۔ اگلے دن میں اسی ریسٹورنٹ میں اسی میز پر سر جھکائے بیٹھا تھا کہ بہرام داوا میرے مقابل آ بیٹھا۔ وہ ہمیشہ اتنی غیر متوقع بات کرتا تھا کہ دوسرے آدمی کے ہوش گم ہو جاتے۔

"تم نے جھوٹ نہیں بولا تھا" وہ بولا "ورنہ تمھاری قبر تیار تھی۔ اب میں نے اسے پیغام بھجوا دیا ہے کہ قبر تیار رہے۔"

"کسے پیغام بھجوا دیا ہے؟" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"اسی کو جس نے تمھارے کاروبار پر قبضہ جما رکھا ہے" وہ بولا "تم کو وہ سب کچھ مل جائے گا جو تمھارا حق ہے۔"

"بہرام داوا! ابھی تو آپ حق دلوا دیں گے" میں نے کہا "بعد میں میری حفاظت کون کرے گا؟"

"تم خود اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے؟" وہ مجھے شرمندہ کرتے ہوئے بولا "کیا چاہتے ہو آخر؟"

"میں انتقام لینا چاہتا ہوں" میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ میرے والدین کو اسی شخص کے بیٹے نے مروایا تھا جو اب مالک بنا بیٹھا ہے۔ میں اپنی بیوی اور اپنے بچے کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ میں ان بارہ سالوں کی قیمت بھی وصول کرنا چاہتا ہوں جب مجھے مجبور کیا گیا کہ میں بھیک مانگوں۔ مجھے ہر چیز کا بدلہ لینا ہے۔" میں دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ بہت سے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے مگر بہرام داوا خاموش بیٹھا رہا۔

"اچھا چل میرے ساتھ۔" باپ سب کے ہی مرتے ہیں۔ اس نے مجھے تسلی دیتے اور لوگوں کو سنانے سے پہلے کہا۔ میں اس کے ساتھ چل دیا۔ باہر اس کی وہی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ ہم اندر بیٹھے ہی تھے کہ دو آدمی نمودار ہوئے اور آگے بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ آج شیشوں پر پردے تھے چنانچہ میں باہر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب گاڑی رکی تو میں نے خود کو ایک کوٹھی میں پایا۔ مجھے ایک کمرا دے دیا گیا اور یہ بتا دیا گیا کہ میں کوٹھی سے باہر نہ نکلوں۔ کوٹھی کے اندر میرے کہیں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی اور میں ایک ملازم سے ہر چیز طلب کر سکتا تھا۔ کوٹھی میں دو دن بہت آرام سے رہتا رہا۔ بہرام داوا سے میری پھر ملاقات نہیں ہوئی۔ تیسرے دن مجھے ایک اخبار نظر آیا۔ "مشہور صراف کی دکان میں ڈاکا۔" مجھے بہرام داوا نے دھمکی دی تھی۔ بدنصیب مالک کا بیان تھا۔ میں نے خبر کو غور سے پڑھا۔ یہ میری ہی دکان کے بارے میں تھی اور خبر میں یہ بھی تھا کہ ڈاکو دکان میں جھاڑو پھیر گئے ہیں۔ اس سے میں نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ میرے کاروبار پر غاصبانہ قبضہ کرنے والے نے بہرام داوا کے پیغام کو نظر انداز کیا ہو گا۔ وہ پہلے شرافت سے اپنا معاملہ نمٹا چکا تھا۔ پولیس کے سامنے اس شخص کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے بہرام سے ٹکر لینے کے لیے قانون کا سہارا لیا ہے۔ تاہم اس کے بعد بھی نہ مجھے بہرام داوا نظر آیا اور نہ اس کے بارے میں کوئی مصدقہ شہادت دستیاب ہوئی۔ رات ڈاکا پڑا بہرام داوا ایک شادی میں شریک تھا اور سارے باراتی ہر وقت اس کی موجودگی کے گواہ تھے۔ میں قید تنہائی سے گھبرا گیا تھا۔ میں نے گھر کے ملازموں سے کہا مگر وہ خود نہیں جانتے تھے کہ بہرام داوا کون ہے، کب آتا ہے اور کب جاتا ہے۔ ساتویں دن ایک شخص آیا جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تیار ہو جاؤ، جانا ہے۔ ایک سی کار کھڑی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کار پارک کرنے کے بعد دو افراد گاڑی رکوا کے ہمارے ساتھ آ بیٹھے۔ ان دونوں کو میں نے پہچان لیا۔ یہی مجھے پہلے دن بہرام کے ساتھ کار میں نظر آئے تھے۔ میں نے ان سے بات کرنا چاہی تو انھوں نے مجھے جھڑک دیا۔

"کیا تم مجھے بہرام داوا کے پاس نہیں لے جا رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"تم نے کیسے فرض کر لیا؟" ان میں سے ایک نے غرا کے کہا۔

"مجھے ان کا شکریہ ادا کرنا تھا۔" میں نے خواہ مخواہ بات بڑھانے کے لیے کہا۔

"انھیں تمھارے شکریے کی ضرورت نہیں۔" دوسرا بولا "بولو گے تو گاڑی سے اتار دیے جاؤ گے۔"

پشاور پہنچنے میں ہمیں چھ گھنٹے بھی نہیں لگے۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ گاڑی کو کتنا تیز چلا کے لائے ہیں۔ لاہور سے پشاور تک کا فاصلہ پونے تین سو میل ہے۔ جی ٹی ایس اڈے کے پاس گورنمنٹ ہائی اسکول آیا تو گاڑی رکی اور بہرام داوا نے ڈرائیونگ کی جگہ سنبھالی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔ اس نے خود اپنے کارنامے کا تذکرہ کیا نہ پروگرام کا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو اس کے ایک ساتھی نے پھر مجھے خاموش کر دیا۔

"تم راستہ بتاؤ" وہ بولا "تمھارا وہ ڈیرا کہاں ہے؟"

"اس وقت تو وہاں کوئی بھی نہیں ملے گا" میں نے کہا۔ "وہ سب رات کو آتے ہیں۔ بس کوئی ہوا تو عورتیں ہوں گی یا پھر وہ لڑکیاں جو کہیں سے لائی گئی ہوں گی۔"

"ہم دیکھ لیں گے" وہ بولا۔ میں ان کی رہنمائی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ ڈیرا سامنے نظر آنے لگا۔ گاڑی سڑک پر سیدھی کوہاٹ کی جانب نکل گئی۔ تقریباً ایک میل آگے جا کر ہم واپس ہوئے۔ گاڑی سے اترنے کے بعد بہرام داوا اور اس کے دو ساتھیوں نے میرے ساتھ پیدل چلنا شروع کیا۔ میں انھیں پیچھے کی طرف سے لے گیا تھا۔ ایک چٹان کی اوٹ سے بہرام داوا نے پورے علاقے کا جائزہ لیا اور ہم واپس آ گئے۔ بہرام داوا نے مجھے وہیں چھوڑ دیا اور انتظار کرنے کو کہا۔ میں گھبرا گیا کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں لیکن بہرام داوا کی مخالفت کیسے کرتا۔ دوپہر سے شام اور پھر رات ہو گئی۔ بھوک پیاس سے میرا برا حال ہو گیا اور میں ایک چٹان کے پیچھے لیٹ گیا۔ رات کے آٹھ بجے ڈیرے کی طرف کچھ شور ہوا۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے کچھ عورتوں کو دیوانہ وار سڑک کی طرف بھاگتے دیکھا۔ اسی وقت ڈیرے کو چاروں طرف سے آگ نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ آگ اتنی تیزی سے بڑھی کہ چند سیکنڈ میں ڈیرے کے درمیان آگ کا دریا حائل ہو گیا۔ اندر رہ جانے والوں میں کسی کے لیے بھی بچ کر نکل جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ڈیرے کی ہر چیز بڑی تیزی سے جل رہی تھی۔ اس کے آس پاس کا علاقہ بھی دور تک جل رہا تھا۔

کوئی نکلنا بھی تو کدھر سے نکلتا۔ میں اس نظارے میں محو تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تم یہاں تماشا دیکھنے نہیں آئے تھے" بہرام داوا نے کہا "ویسے بھی تماشا تو ختم ہو گیا۔"

"کیا وہ سب موجود تھے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ میں نے ان سے پوچھ لیا تھا اور انھوں نے اعتراف جرم کر لیا تھا۔" وہ بولا "لڑکیوں کو میں نے چھوڑ دیا۔"

میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ میرے ذہن پر سے آدھا بوجھ اتر گیا تھا۔ میں اپنے بیوی بچوں کے قاتلوں سے انتقام لے چکا تھا۔ ان سب کا انتقام لے چکا تھا جن کے گھروں کی آبرو کو ان خبیثوں نے نیلام کیا۔ میں ان کو نہیں جانتا تھا لیکن میرا ان سے انسانیت کے نام پر رشتہ تو تھا۔ میں اپنی ذلت و خواری کا انتقام لے چکا تھا جو میں نے بے غیرتی کی زندگی کے لیے اٹھائی تھی۔ یہ سب اس سے کہیں زیادہ سخت اور عبرت ناک سزا کے مستحق تھے مگر خدا ایک حد تک ظالم کی رسی دراز کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ رسی پھانسی کا پھندا بن کے انھی کے گلے میں اٹک جاتی ہے۔ واپس لاہور پہنچنے کے بعد بہرام داوا نے مجھے ریسٹورنٹ کے سامنے اتار دیا۔ میرا کام ابھی باقی تھا چنانچہ میں نے اسے روکنے کی اور یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ میں پھر کب اور کہاں اس سے مل سکتا ہوں لیکن وہ جواب دیے بغیر نکل گیا۔ تین دن تک میں لاہور کی سڑکوں پر چکر لگاتا رہا۔ بہرام داوا کا کوئی پتا ٹھکانا میرے علم میں نہیں تھا اور اس کے بارے میں مجھے کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ عام لوگوں میں یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ بہرام داوا کا حقیقی وجود کوئی نہیں اور کچھ پیشہ ور مجرم محض یہ نام اپنی دہشت بٹھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن کچھ لوگ بہرام کو افسانوی سمجھتے تھے۔ کچھ اس لیے کہ نام کے اعتبار سے بھی وہ بہرام تھا اور کچھ اس سے منسوب شجاعت اور ذہانت کی داستانوں کے باعث جن سے وہ سیٹھ ساہوکاروں کا دشمن اور غریبوں کا ہمدرد ثابت ہوتا تھا۔ یہی کیفیت پولیس کی تھی۔ اصل بہرام داوا ایک حقیقت تھا اور اسے دولت کی کوئی کمی نہ تھی مگر اس کی شخصیت بے حد پراسرار تھی۔ کئی بار بے حد بڑی وارداتوں پر موقع واردات والوں نے شناخت کیا تو اس کا حلیہ بھی اور صورت سے بھی... کئی بار اس کی تصویر بھی اتاری گئی۔ بعد میں ہر شہادت غلط ہو گئی۔ بہرام داوا کے زیادہ معتبر اور عزت دار گواہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ ایک بار گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن اس کی فوراً ضمانت ہو گئی تھی اور بعد میں اس نے پولیس کے خلاف متعدد مقدمات قائم کر دیے تھے۔ پولیس میں سے پہلے بھی ان کا اس سے سامنا ہوا تھا لیکن پیچھے والے سمجھتے تھے کہ اپنی دولت اور بڑے تعلقات کے باعث ہی وہ

www.paksociety.com

بہرام داور بنا ہوا ہے مگر بہت سے اس خیال کے بھی حامی تھے کہ بہرام داور سنسنی خیز خبریں پھیلانے والے صحافیوں کے ذہن کی اختراع ہے جنھوں نے پبلک کے لیے ایک دلچسپ کردار بنا دیا ہے تو دولت مندوں کے لیے ہوا کھڑا کر دیا ہے۔ بعد تک ایسے لوگ بھی ملے جو کہتے تھے کہ بہرام داور کی حیثیت کار ہے مگر وہ ایک ذہنی مریض ہے اور دوہری شخصیت کا مالک ہے وہ پیشہ ور مجرم نہیں ہے۔ جرم کرنا اس کی ذہنی بیماری ہے، جیسے کچھ لوگوں کو سوتے میں چلنے کی بیماری ہوتی ہے۔ خیر، تین دن کی آوارہ گردی میں میرا گزر ایک بار اسی دکان کے سامنے سے ہوا۔ دکان بند پڑی تھی۔ اس کے شٹر گرے ہوئے تھے اور باہر ہوتے سوتے آتے جاتے تھے۔ اسی دوران میں نے خبر پڑھی کہ انشورنس کمپنی نے دکان میں ہونے والی چوری کے نقصانات کی تلافی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ پولیس نے دکان کے مالک کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ شروع کر دی ہے کیونکہ جائے واردات سے چوری ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ ایک سیلز مین نے بیان بھی دیا ہے کہ اس دکان کا سارا مال خود سیٹھ نے بیمہ کمپنی سے رقم وصول کرنے کا منصوبہ خود سیٹھ نے بنایا تھا اور اسے بھی شریک کرنا چاہا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔ اب پولیس اس سے جعل سازی کا اقرار کرانے کے لیے تفتیش کے تمام حربے آزما رہی تھی اور اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ خود اپنی دکان میں ڈاکہ ڈال کے اس نے مال کہاں چھپایا ہے۔ اس خبر کو پڑھ کر میرا رواں رواں مسرت سے سرشار ہو گیا۔ اس خبیث نے جو کچھ کیا تھا اس سے زیادہ بھگت رہا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ اس میں بہرام داور کا اثر و رسوخ کار فرما ہے ورنہ اس نے پولیس کو رپورٹ دی ہوگی۔ جب خود پولیس چوری کو جھوٹا قصہ قرار دے تو مدعی کیسے ثابت کرے گا کہ چوری ہوئی تھی۔ رہی سہی کسر سیلز مین کے بیان نے پوری کر دی تھی۔ شاید اسے بھی بہرام داور نے ہی سمجھایا ہوگا کہ کس قسم کا بیان دینے سے وہ محفوظ رہے گا۔ اگر بیمہ کمپنی نقصانات کی تلافی کر دیتی تو وہ سنبھل جاتا مگر اسے تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ وہ بہرام داور کے خلاف بیان دینے کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔ دوسرے دن میں اپنے مکان کو دیکھنے گیا تو وہاں عجیب منظر تھا۔ ہر طرف پولیس پھیلی کھڑی تھی — شاید ادھر ادھر سادہ کپڑوں والے بھی ہوں گے جو ہر آتے جاتے مشکوک آدمی پر نگاہ رکھتے ہوں گے۔ کوٹھی کی دیواروں پر سرچ لائٹس نصب کی جا رہی تھیں اور بیرونی دیوار کے اوپر خاردار تاروں کی باڑھ لگائی جا رہی تھی۔ تار لگانے والوں کے ساتھ الیکٹریشن کام کر رہے تھے جس سے میں نے اندازہ کیا کہ ان تاروں میں کرنٹ بھی چھوڑا جائے گا۔ تمام انتظام یہ ثابت کرتا تھا کہ اس کوٹھی میں رہنے والے اسمگلر کو بہرام داور کا کوئی پیغام ملا تھا اور اس نے چیلنج قبول کرتے ہوئے

اپنی حفاظت کے لیے ایسا بندوبست کر لیا تھا کہ پرندہ بھی کوٹھی میں پر نہ مار سکے۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ [illegible] ہے اور بہرام داور کا مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ [illegible] تھا کہ بہرام داور نے اس کوٹھی میں رہنے والے اسمگلر [illegible] ہوگا۔ غالباً یہ کہ جس طرح جعلسازی کے ذریعے وہ کوٹھی کا مالک بن بیٹھا ہے اسی طرح شرافت سے وہ کوٹھی اصل مالک نیک محمد کے نام کر دے۔ اس نے صاف انکار کر دیا ہوگا اور کہا ہوگا کہ تم میرا جو کچھ بگاڑ سکتے ہو بگاڑ لو۔

اگلے دن کے اخبار میں تفصیل آ گئی [illegible] سے اڑا دیا گیا تھا۔ حفاظت کرنے والے [illegible] پولیس باہر کھڑے رہ گئے۔ جو اندر تھے وہ مکینوں کے ساتھ [illegible] ہو گئے۔ پولیس کو یقین تھا کہ باہر سے کسی نے [illegible] بارود کی مار عمارت کے نیچے ہی چھوڑ رکھا گیا تھا جس سے عمارت کی دیوار بھی سلامت نہیں بچی تھی۔ ابتدائی تفتیش میں [illegible] آئی تھی کہ دھماکا کرنے والوں نے پچھلی طرف سے [illegible] اپنا راستہ بنایا تھا اور غالباً پولیس کی وردی میں تھے [illegible] کی صورتوں پر غور نہیں کیا اور وہ اندر کے حصے میں [illegible] سے چلے گئے جہاں گیس لائن کے ڈھکن تھے۔ [illegible] وہ بھی نہیں کر سکے تھے کہ اس بارودی مواد کو آگ کیسے [illegible] اور کیسے دکھائی۔ کیا وہ صرف [illegible] استعمال کیے تھے۔ [illegible] صرف ایک رپورٹر نے اشارہ کیا تھا کہ ممکن ہے خود [illegible] کسی نے تخریبی کارروائی کی ہو جو حفاظتی انتظامات کر رہے تھے۔ اسمگلر نے چیلنج ملنے کے بعد اپنے بیوی بچوں کو کہیں منتقل [illegible] تھا چنانچہ وہ بچا کیونکہ وہی مر گیا۔ اس عمارت کے ملبے پر بعد میں [illegible] نے دوسری عمارت کھڑی کی جو آج تک موجود ہے لیکن اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ جس سے مجھے انتقام لینا تھا [illegible] چکا تھا مگر اب مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میرے [illegible] آیا۔ آخر مجھے بھی تو کچھ ملنا چاہیے تھا۔ یہ سب کچھ میرا ہی تھا۔ سوا بارہ سال تک میں بھیک مانگتا رہا اور میرے ساتھ [illegible] زمانے نے کی۔ اس کے بدلے مجھے کیا ملا؟ [illegible] کے لیے بھی تو کوئی سہارا ہونا چاہیے۔ بے شک یہ سب جو میرا تھا، میں قانونی طور پر حاصل نہیں کر سکتا تھا [illegible] کی مدد سے کر لیتا تب بھی اس پر اپنا قبضہ برقرار [illegible] اگر مجھے دس بیس ہزار ہی مل جاتے تو میں کوئی کام [illegible] کر دیتا۔

ان دنوں میں مجھے بہرام داور کی ہر وقت تلاش [illegible] اس امید میں کہ شاید کوئی خبر ملے [illegible] اسی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھتا جہاں پہلی بار ایک شخص مجھے [illegible]

[illegible] کے لیے جانے کے لیے پہنچا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس وقت تنہا ہو گے۔ [illegible] توقعات پوری ہو گئیں اور ایک شخص مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ [illegible] والی گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی کو وہی شخص چلا رہا تھا۔ [illegible] کئی موڑ مڑنے کے بعد کار چلتے چلتے [illegible] کا مجھے اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لانے والے کا چہرہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا اور اس نے [illegible] گفتگو نہیں کی تھی۔ کوٹھی میں بھی [illegible] مکمل سکوت تھا۔ ایک سے دوسرے کمرے میں ہوتا ہوا [illegible] آخر اس شخص کی رہنمائی میں [illegible] تک پہنچا۔ اندر ایک بیڈ کے گرد دو نرسیں بے داغ سفید لباس پہنے کھڑی تھیں۔ ایک ڈاکٹر سرہانے لگی ہوئی بہت سی شیشیوں پر نظر رکھے [illegible] تھا۔ دوسرا ڈاکٹر اس شخص پر جھکا ہوا تھا جو بستر پر سیدھا لیٹا ہوا تھا اور وہ بالکل کسی اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کی طرح نظر آتا تھا۔ بستر پر لیٹے ہوئے آدمی کو میں نے قریب جا کے پہچانا۔ وہ بہرام داور تھا۔ اس کے چہرے اور سر کے گرد پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں اور باقی جسم سرخ کمبل کے نیچے دبا ہوا تھا۔ دائیں بازو [illegible] نلکیاں لگی ہوئی تھیں اور ان میں سے ایک ایک قطرہ ٹپک کر بہرام داور کی رگوں میں اترتا جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ باہر نکالا اور ہلکا سا اشارہ کیا [illegible] ساتھ لانے والے [illegible]

"آپ سب لوگ ذرا سی دیر کے لیے باہر تشریف لے جائیں۔" وہ بولا۔

"ہم اس حالت میں —" ان میں سے سینئر نظر آنے والے ڈاکٹر نے احتجاج کیا۔

"حالت کا کوئی سوال نہیں، یہ حکم ہے۔" وہ بے رخی سے بولا۔ "جلدی کریں۔"

"لیکن ہماری عدم موجودگی میں کچھ ہوا تو اس کے ذمے دار ہم نہیں ہوں گے۔" ڈاکٹر نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے لیے آپ لوگوں پر کوئی ذمے داری عائد نہیں کی جائے گی۔" اس شخص نے کہا اور خود بھی سب کے ساتھ نکل گیا۔

"بہرام داور! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" میں نے دروازہ بند ہوتے ہی آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کچھ نہیں، چوٹ لگ گئی ہے معمولی سی۔" وہ بولا۔ "تیرا کام تو ہو گیا نا؟"

"کیا یہ چوٹ میرا کام کرتے ہوئے آئی ہے؟" میں نے صدمے سے نڈھال ہو کے کہا۔

"کس نے بتایا ہے تجھے؟" وہ بولا۔ "خیر چھوڑ، اصل بات یہ کہ جس کے لیے میں نے تجھے بلایا ہے۔ تو نے کہا تھا کہ تجھے مال و دولت کچھ نہیں چاہیے، تو صرف بدلہ لینا چاہتا تھا۔ مال تیرا تھا اور تجھے اس کو لینے کا پورا پورا اختیار تھا مگر تو ڈرتا تھا۔ میں نے ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ تیرا حق تجھے مل جائے اور تجھ پر حرف بھی نہ آئے۔ تیرے اصل دشمن جو تجھے جانتے تھے، باقی نہیں رہے۔ پھر بھی ذرا بچ کے رہنا۔"

پھر اس نے مجھے کاغذ کا ایک پرزہ دیا جس پر ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اس نقشے کے مطابق فلاں جگہ پہنچ کر اپنا حق حاصل کر لوں۔ یہ حقیقت ہے کہ بہرام داور کو اس حال میں دیکھنے سے پہلے میں یہی سوچ کر پچھتا رہا تھا کہ مجھے کچھ بھی تو نہیں ملا۔ اب مجھے بہت کچھ مل رہا تھا تو میں زیادہ پچھتا رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر بہرام داور نے اعتراف کر لیا تھا کہ اس کی یہ حالت میری وجہ سے ہوئی تھی۔ میں رونے لگا کہ بہرام داور اب مجھے کچھ نہیں چاہیے آپ کی زندگی کے سوا مگر اس نے مجھے رخصت کر دیا۔ اس نے سرہانے لگے ہوئے ایک بٹن کو دبایا تو وہی شخص پھر نمودار ہوا اور مجھے باہر لے گیا۔ اگلے دن میں نے اخبار میں جنت مکان بہرام داور کے انتقال کی خبر پڑھ لی۔ خبر میں موت کی وجہ حرکت قلب بند ہونا بتائی گئی تھی۔ میں اس کے جنازے میں شریک تھا لیکن کسی نے میری طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ جو لوگ وہاں موجود تھے ان میں بڑے اعلیٰ پولیس حکام بھی نظر آئے مگر ان میں سے کوئی دکھائی نہ دیا جو مجھے لاتے لے جاتے رہے تھے۔"

استاد مہندی خاموش ہو گیا۔ تب بھی ہم سب لوگ گم صم بیٹھے رہے۔ یوں جیسے مہندی کی بات ابھی تمام نہیں ہوئی۔ بات ختم ہو گئی تھی مگر مہندی کی آواز کسی صدائے بازگشت کی طرح ہمارے ذہنوں میں گونج رہی تھی اور ہمارے تصور میں ایک فلم چل رہی تھی جس کا ہر منظر حقیقی زندگی میں ہمارے تجربات کا حصہ لگتا تھا۔ مہندی استاد ستم رسیدہ اور مردم گزیدہ آدمی ہے! اس نے آلام و مصائب کے کٹھن [illegible] مراحل سے گزر کے جینا سیکھا ہے۔ زندگی کی مسافت میں آغاز سفر سے اب تک وہ انگاروں پر چلتا رہا ہے لیکن اس نے کبھی اپنے دکھ کا اظہار نہیں کیا۔ کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگی اور کسی کو دل کے زخم نہیں دکھائے۔ کبھی ہم سے بھی فسانۂ غم دل نہیں کہا کہ ہم اسے کہانی سمجھ کے اس کا تمسخر اڑائیں۔ ہمارے لیے وہ ایک بے وقوفی کی حد تک سادہ دل، اپنے دھیمے کا بے حساس اور لاوارث آدمی تھا" جس کو ہمارے خلوص نے اپنا لیا تھا۔ ہم نے اس بات پر قسم [illegible] رکھنے والے اور اپنی بہادری کی ڈینگ مارنے والے کی

www.paksociety.com

بزدلی بھی دکھی تھی۔ اسے خوبی بھی کہتا تھا اور اس کے ساتھ ہر خلاق روا رکھتا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ہم اسے اپنے سے بہتر اکثر سمجھتے ہیں۔ ہم نے اس کے خلوص اور اس کی شرافت کا ہمیشہ اعتراف کیا مگر یہ بات ہم سب کے ذہن میں تھی کہ اسے اپنی دوستی اور اپنائیت کے حلقے میں شامل کر کے اور اس کو جذباتی رشتوں کا امین بنا کے ہم نے اس کی عزت افزائی کی تھی اور ایک احسان کیا۔ ورنہ وہ غلط راستوں پہ چلتے چلتے نہ جانے کس عبرت ناک انجام سے دوچار ہوتا۔ ہم سب نے فرض کر لیا تھا کہ وہ بھی ان ہزاروں، صراطِ مستقیم سے بھٹک کر بدی کی راہ اختیار کرنے والوں کی طرح ہوگا۔ جن کا ماضی محض مفلسی اور احساسِ محرومی سے عبارت ہوتا ہے اور زندگی میں ان کی غلط روش درحقیقت ایک انتقامی ردِعمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اب ہم سب خود اپنی نظروں میں شرمسار تھے۔ ٹیڈی کا ماضی کسی طرح بھی ہمارے اپنے ماضی سے کم قابلِ فخر اور باعزت نہ تھا۔ وہ ہم سب سے زیادہ ناز و نعم کا پروردہ تھا۔ اسے والدین کی محبت ہم سے زیادہ ملی تھی کیونکہ وہ ان کا ایک ہی بیٹا تھا اور جو کچھ اس نے گنوا دیا تھا وہ بھی ہم سب کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ اس کی داستانِ حیات اور ہماری سرگزشت میں حیرت انگیز مماثلت تھی۔ اس کی زندگی کے بھی کئی ہی ملزم تھے۔ ایک وہ جو خوش ... جیسی خوش حال اور خوش باش ... کا دشمن تھا۔ دوسرا وہ جس کی بدولت وہ اپنے آپ سے بچھڑ گیا تھا اور بارہ سال تک بے خبری کا شکار رہا تھا اور تیسرا عنصر وہ تھا جس نے اسے اپنی تباہ زندگی کی طرف لوٹ کر دیکھا تھا۔ اسے ہر طرف غاصب اور قابض نظر آتے تھے اور ان سب سے انتقام لینے کے جنون میں جان کی بازی لگا دی تھی۔ اس کی زندگی میں بھی محبت کا تصور ... چرانے کے لیے ٹائم کی ایک لڑکی آئی تھی اور اپنی یادوں کا دکھ دے کر چلی گئی تھی۔ یہی میری آپ بیتی تھی اور یہی رابعہ کا افسانۂ حیات تھا۔ ہم بھی والدین کی آغوشِ شفقت سے اسی طرح محروم کیے گئے تھے۔ ہم سے بھی غاصبوں نے ہمارے جینے کے سہارے چھین لیے تھے اور اب ان سے ہمارے انتقام کی جنگ جاری تھی۔ فاخر کی طرح میری زندگی میں فوزیہ آ کے نکل گئی تھی اور رابعہ کو ایک ایسے شخص نے نکاح کے بعد چھوڑ دیا تھا جو کسی طرح بھی شادی کے قابل نہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ٹیڈی کے ذاتی انتقام کی آگ بہرام دادا کی مدد سے بجھ گئی تھی اور اس نے حقِ وراثت کی جنگ کو اسی کے ساتھ ختم کر دیا تھا۔ اب ہم سب واقعات، حادثات اور اتفاقات کے اس سلسلے پر غور کر رہے تھے اور ہمارے ذہن پر سوالات کی یلغار تھی۔ وہ صندوق جسے ہم نے حقارت اور تمسخر کے ساتھ ہر خطاب دیا تھا، ایک وقت تک اس کا خزانہ بھی ثابت ہوا تھا اور چند دنوں کا

بالکل بھی۔ اس میں دو لاکھ سے اوپر کا سونا تھا اور اسے استاد ٹیڈی کہلانے والے خواجہ شیخ محمد کا ... سبھی رقم یادوں کے ساتھ بند تھا۔

"تو اس میں وہی سونا ہے جس کا پتا تمہیں بہرام دادا نے دیا تھا؟" بالآخر محسن نے خاموشی کے اس جمود کو توڑا۔

"ہاں، وہ نقشہ بہت پیچیدہ نہیں تھا۔ میں [illegible] اسی کے مطابق گیا اور یہ صندوق نکال لایا۔"

"یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟" رابعہ بولی۔

"تقریباً چار سال ہوتے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"اور تم چار سال سے اس خزانے کو اسی طرح چھپائے بیٹھے ہو؟" "ہاں،" میں نے کہا۔ "کسی مقصد کے بغیر؟"

"تم نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا؟ [illegible] کیا؟ بلاوجہ عسرت اور تنگدستی کی زندگی بسر کرتے رہے۔"

"حالانکہ اس سے تم بہت کچھ کر سکتے تھے۔" محسن [illegible]

"اور جو کچھ تم کرتے وہ اس سے یقیناً بہتر ہوتا جو تم کرتے رہے تھے۔"

"تم لوگ تو مجھے بیوقوف ہی کہو گے۔" وہ بولا۔ "لیکن سکندر بادشاہ! جب بھی مجھے خیال آتا تھا کہ یہ اس سونے کو نکالوں تو مجھے بہرام دادا کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ میرا باپ تو نہیں [illegible] مجھے یقین ہے کہ اس سمگلر کی زندگی میں [illegible] ہونے کوئی ایسا حادثہ ضرور پیش آیا تھا جس میں وہ [illegible] ہو گیا تھا۔ آخر میری خاطر اس نے جان کا خطرہ کیوں مول لیا؟ کیا لگتا تھا وہ میرا؟ کون سی نیکی کی تھی میں نے [illegible] کا اسے قرض چکانا تھا۔ [illegible] دولت [illegible] تھا اور [illegible] اسے صنعت کاری بھی کی تھی۔ وہ صنعت کار تھا یا [illegible] مریض۔ مجھ سے پہلے اس نے جان کیوں دی [illegible] بھی نہیں چھوڑا کہ میں اس کا قرض چکا سکوں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے وارث کون ہیں ورنہ یہ ان کے لیے ہی [illegible] سونا مجھے بہرام دادا کے خون میں [illegible] نظر آتا تھا۔ [illegible] چھو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میں اس کا [illegible] ہوں۔ یہ سب میرا ہی تو تھا؟"

"کیا تم نے اسی لیے میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا؟" [illegible] نے کہا۔

"ہاں، جب میں نے تمہاری بات سنی تو مجھے لگا جیسے یہ میری اپنی زندگی کی کہانی ہے سکندر بادشاہ! [illegible] سوچا کہ استاد ٹیڈی، یہ معاشی توسیع کر لی۔ اب [illegible] تو آگے کے رستہ۔ تم بہرام دادا کو [illegible]

بیٹی کے کچھ ذکر کیے ہوں۔ وہ بہت بڑا آدمی تھا اور تم بہت چھوٹے آدمی ہو لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نیکی کا جذبہ تو ہر دل میں ہوتا ہے۔ جو فرض بہرام دادا نے چھوڑا تھا وہ ادا کرنے کا [illegible] بہرام دادا [illegible] کی بات تو دولت سے ایک موقع فراہم کیا ہے۔ [illegible] تو وہ کیا کام نہیں لگ سکتے۔ مقصد تو رہ گیا ہے۔ آج اگر کوئی [illegible] سڑک پار کراتا ہے تو یہ نیکی کا [illegible] دیتا ہے مگر کبھی وہ خود اندھا ہو جائے تو اس کا ہاتھ تھام کے سڑک پار کرانے کے لیے وہی اندھا شخص آتا ہے۔"

"تم بہرام دادا سے کسی طرح بھی کم عظیم آدمی نہیں ہو دوست!" [illegible] نے مرعوب ہو کے کہا۔

میں نے فرطِ جذبات سے [illegible] "معاف کر دینا کہ ہم سے آج تک تمہاری عظمت کی شناخت نہیں ہو سکی۔" محسن بولا۔ "تم اسی طرح ہنستے رہے، مسکراتے رہے، ہمارے مذاق کو برداشت کرتے رہے۔ تم نے کبھی نہیں کہا کہ تم بھی مظلوم ہو۔"

"تمہارا ظرف ہم سے زیادہ تھا۔" میں نے اعتراف کیا۔ "ہم نے انسانوں کی زیادتی کو، ان کے مظالم کو اور اپنی محرومی کو اتنے ظرف کے ساتھ برداشت نہیں کیا اور مخالف حالات میں اتنے پرسکون نہیں رہ سکے جتنے تم رہے۔"

"حقیقت چاہے غم سے [illegible] کیا مل جاتا ہے۔ دنیا بھر یہ منفی ہی ہے۔" ٹیڈی بولا۔ "ڈیڈی نے میری پہلے کیسے مدد کی تھی۔ [illegible] میرا بھی وہی ہوتا جو تمہارا ہوا، شاید اس سے بدتر ہوتا لیکن مجھے بہرام دادا مل گیا تھا۔"

"آخر کون تھا یہ بہرام دادا؟" میں نے کہا۔ "تم نے بعد میں اس کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں کی؟"

"اس کی زندگی میں کوئی اس کا سراغ نہ پا سکا تو اس کے مرنے کے بعد وہ کیسے مل سکتا تھا؟" ٹیڈی بولا۔

"اور اس کے ساتھی؟" محسن نے کہا۔ "وہ پھر نظر نہیں آئے؟"

ٹیڈی نے نفی میں سر ہلایا۔ "کبھی نہیں۔"

"تم لاہور میں پھرتے تھے۔ کبھی ان کوٹھیوں میں ایسی کوئی کوٹھی نہیں ملی جہاں تم جاتے تھے؟"

"نہیں، ایک زمانہ تو ایسا تھا کہ میں دیوانہ وار ان علاقوں میں پھرتا تھا جہاں ایسی کوٹھی مل سکتی تھی۔" ٹیڈی بولا۔ "لیکن میری کوشش رائیگاں گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ سب جادو کا کھیل تھا۔ ایک جادوگر نے میری مدد کی تھی۔ اس کا ایک شاہی محل تھا اور اس کے غلام جنات تھے۔ جادوگر کی موت کے ساتھ ہی سب غائب ہو گئے۔ بہرام دادا تھا یا نہیں، یہ آج بھی کوئی نہیں

جانتا، حالانکہ میانی صاحب کے قبرستان میں اس کی قبر بھی ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری پوری داستانِ حیات میں بہرام دادا کا کردار بے حد افسانوی لگتا ہے۔" رابعہ بولی۔ "[illegible] کے گرد [illegible] کی طرح۔ اس کا نام اور ذکر تو میں نے بھی سنا تھا مگر جیسا کہ تم نے کہا، اکثر وکیل بہرام دادا کو اخبار والوں کا اسسٹنٹ سمجھتے تھے۔ جرائم کی خبروں کو زیادہ سنسنی خیز اور پرلطف بنانے کے لیے اس کردار کا نام کسی منچلے نے ایجاد کیا اور جلد ہی وہ بہت مقبول ہو گیا۔ صنعت کار بہرام دادا صرف نام کی مشابہت کے باعث موضوعِ سخن بنا تھا۔ بدنام نہیں ہوا تھا لیکن حقیقت کو تم نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔"

"تم اس حقیقت کو تمام تفصیلات کے ساتھ غالب کے گوش گزار کر دو۔" محسن بولا۔ "وہ اس آپ بیتی کو شائع کرے گا تو تہلکہ مچ جائے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اب بہرام دادا کے نام کو [illegible] دوں؟" ٹیڈی ایک دم بھڑک اٹھا۔ "اس کی نیکی کا [illegible] کرا کے ایک دلچسپ اور پراسرار کہانی بنا دوں جس سے اخبار خوب بکے؟"

"سوری استاد! میں مذاق کر رہا تھا۔" محسن نے خفت سے کہا۔

"عملاً یہ بھی بہت خطرناک کام ہوگا۔" میں نے کہا۔ "بہرام دادا مر گیا ہے مگر وہ سب تو زندہ ہوں گے جو اس کے نمک خوار اور حلیف تھے اور ایسے رازدار تھے کہ آج تک خاموشی اور گمنامی کو قبول کیے بیٹھے ہیں، وہ چھوڑیں گے ٹیڈی کو؟"

"چلو چھوڑو یہ بات۔" رابعہ نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ کیا تم کو افشا ہو جانے کا اندیشہ نہیں تھا؟ تم پھر بھی صندوق کو ساتھ لیے پھرتے رہے۔ ہمیں شک تو ہونا ہی تھا۔"

"مجھے معلوم تھا مگر میں ایک فیصلہ کر رہا تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تم پوچھتے رہے اور میں ٹالتا رہا۔ بالآخر میں نے طے کر لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ جب میں نے تمہارا ساتھ دینے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ لی سکندر بادشاہ! تو یہ سونا کیا ہماری جان سے زیادہ ہے؟"

"مگر اس کو ہم نہیں لیں گے۔" محسن بولا۔ "یہ صرف تمہارا ہے، جتنا تمہیں ملنا چاہیے تھا اس کا سواں حصہ بھی تم کو نہیں ملا۔ جو ملا وہ ہم کیسے لیں؟"

"چار سال سے یہ سونا میرے پاس پڑا تھا، شاید اسی دن اور اسی مقصد کے لیے۔" وہ بولا۔ "یہ تمہارے کام بھی نہ آیا

www.paksociety.com

ترجمہ کسی کے کام آنے لگا۔ تم نے پوچھا تھا کہ یہ مال حرام تو نہیں ہے؟"
"اب اور شرمندہ مت کرو استاد۔" میں نے کہا۔
"آج سے یہ استاد اور شہزادی جیسے نام کوئی نہیں لے گا۔" رابعہ نے کہا۔ "پھر کبھی تم نے خوشی کہا تو میرے بھائی تو تم کو تمہیں چھوڑ دوں گی۔"
"ہم بھی تمہیں نہیں چھوڑیں گے، قسم مولا علی کی۔" میں نے سخت عاشقانہ انداز میں آہ بھر کے کہا۔ سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ایک دم ختم ہوگئی۔ محسن نے زبردست قہقہہ لگایا اور میری فریبانہ تو بلاول رابعہ کا رنگ اپنی بات کے یوں الٹ جانے سے گلنار ہوگیا مگر نازو بھی جو اسی طرح چپ بیٹھی رہی۔
"تم کو کیا ہوا ہے؟" میں نے بکی اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ "گھر یاد آرہا ہے؟"
نازو نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ ایک بار پھر سب سنجیدہ ہوگئے اور سب کی نظر نازو پر جم گئی۔
"ہم نے تو کہا تھا۔" محسن بولا۔ "مگر ٹھیرو ابھی بھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ تم واپس جاسکتی ہو۔"
"میں واپس نہیں جاؤں گی۔" نازو نے سر اٹھا کے کہا۔ "مجھے امی اور ابو کا خیال آرہا ہے۔"
"وہ یقیناً پریشان ہورہے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "اور قصور وار مجھے سمجھیں گے۔"
"تمہیں کیوں؟ جو کچھ کیا ہے میں نے۔ وہ میرا فیصلہ تھا۔" وہ بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ یہ بات ان کو بتا دوں۔"
"تمہارے بتانے سے ان کی مشکل آسان نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "لڑکیوں کا گھر سے چلے جانا عزت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔"
"وہ اس مسئلے کو الجھانے سے گریز کریں تو ان کی مشکلات میں کمی آسکتی ہے۔" نازو بولی۔
"اور تم ان کو سمجھانا چاہتی ہو کہ وہ اس مسئلے کو کس طرح ہینڈل کریں؟" محسن بولا۔ "آل رائٹ۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ کسی پبلک ٹیلیفون پر ان سے بات کرلو۔"
"ہوسکے تو ان کو بھی بتا دینا کہ ہم کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔" میں نے کہا۔
"ہم شیر ہیں اور لومڑی کے جال میں ہیں۔" محسن نے آغا حشر کا ڈائیلاگ دہرایا۔
"ہم احمق ہیں اور حماقتوں کے جال میں گرفتار ہیں۔" میں نے تصدیق کی۔ "تم اپنے والدین کو کیا سمجھاؤ گی؟ یہ تو بتا دو۔"
"میں ان سے صاف کہہ دوں گی کہ میری واپسی کا انتظار نہ کریں۔" وہ بولی۔ "اور بلاوجہ میری تلاش میں اس بات کی تشہیر نہ کریں کہ میں گھر سے نکل گئی ہوں۔ میں انھیں اپنی خیریت سے مطلع رکھوں گی۔ وہ مطمئن رہیں اور مجھ پر اعتماد رکھیں۔ میں جن لوگوں کے ساتھ ہوں انھوں نے ان کو وہ دنیا جو چاہتے ہیں اور کچھ مگر میں خود کو ان کے درمیان اتنا ہی محفوظ تصور کرتی ہوں جتنا اپنے گھر میں۔"
"وہ تمہاری اس جذباتی تقریر کو تمہاری کم عقلی کی دلیل سمجھیں گے۔ اور کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔
"میرا فرض اتنا ہی ہے کہ انھیں سمجھا دوں۔" وہ بولی۔ "وہ اپنی رسوائی چاہتے ہیں تو جتنا شور چاہیں کریں۔ اخبار میں میری تصویر شائع کرادیں اور پولیس کے ہر تھانے میں میری تصویر لگوادیں۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ لوگوں سے کہہ دیں کہ مجھے تعلیم کے لیے باہر بھیج دیا گیا ہے یا میری خالہ بیمار ہیں اور پشاور میں ہوں۔ بات بگاڑنے سے کیا فائدہ۔ وہ چاہیں تو بات بنا سکتے ہیں، نہ چاہیں تو میرا کوئی نقصان نہیں۔"
جب وہ محسن کے ساتھ چلی گئی تو شبو اور نیک محمد بیٹھے رہے۔ میں نازو کے بارے میں سوچتا رہا جو ناقابل یقین حد تک ضدی، نڈر، حوصلہ مند، خوبصورت اور خطرناک تھی۔ اس کی ہر خوبی انتہا تک پہنچتی تھی۔ مقابلہ حسن کا ہوتا تو وہ رابعہ سے کہیں زیادہ حسین تھی مگر معاملہ دل کا تھا چنانچہ اپنی تمام معصومیت اور نے حسن کی ساری غارت گری اور وفا کے ہر امتحان سے سرخرو گزرنے کی صلاحیت کے باوجود وہ کبھی رابعہ کو شکست نہیں دے سکتی تھی۔ کچھ لوگ پاگل پن کی حد تک امید پرست ہوتے ہیں۔ کیا نازو بھی انہی میں شامل ہے؟ میرے دل نے سوال کیا۔ اس نے ایک موہوم سی امید کی نازک ڈور کا سہارا لے لیا ہے کہ جذبۂ عشق سلامت ہے تو ہم دیکھیں گے۔ پچھے دنوں گئے ہیں چلے آئیں گے سرکار بن کے مگر صحرا کے آبلہ پا مسافر کی تشنہ لب اسی طرح سراب کے تعاقب میں چلتے چلتے بٹ جاتے ہیں۔ امید انسان کو اسی طرح دام فریب دیتی ہے۔ رابعہ سب کے لیے بستر بچھانے کے بعد صحن کے نل کا ٹھنڈا پانی لے آئی تھی۔ اس نے میرا، شبو اور نیک محمد کا بستر ایک کمرے میں لگوا دیا تھا۔ دریاں اور ان کے اوپر کھیس۔ تکیے غیر موجود مگر سر کے نیچے رکھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ لحاف کو یوں لپیٹ کر سونا کوئی مشکل نہ تھا کہ وہ سر کے نیچے بھی آجائے۔ نیک محمد شاید پرانی یادوں کے ساتھ سفر کر رہا تھا اور بہرام داد کو یاد کرکے ملول تھا۔ کتنا مغرور اور بے رحم لگتا تھا وہ شخص جسے ہم نے سطحی نظر سے دیکھا تھا۔ اس کی اہمیت اور قدر و منزلت پہلے بھی کم نہ تھی مگر اب وہ واقعی بہت اونچا نظر آنے لگا تھا۔ اس کی وسعت کو دونوں ہاتھوں کے سونے میں نہیں ناپا جاسکتا تھا۔ بہرام ایک کا دل تھا۔ اس کی شان قلندری تھی یا ایسی انسانیت تھی جو آدمی میں جوہر نایاب کی طرح عنقا ہوتی جارہی ہے۔

محسن آدھے گھنٹے بعد نازو کے ساتھ لوٹا تو نازو کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس کا سبب پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ والدین کی ڈانٹ سن کے اور ان کی ان سنی کرکے لوٹی تھی۔ اس نے والدین کی ہر دلیل اور خفگی سب کو نظر انداز کیا تھا اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ کسی دن اس کا یہ فیصلہ اس کے لیے مسائل پیدا کردے گا۔ وہ ناکامی اور شکست کو قبول کرنے والی لڑکی نہیں تھی۔ اگر اس نے نوشتۂ دیوار کو پڑھ لیا اور جان لیا کہ میرا اور اس کا میل مشرق اور مغرب کے میل کی طرح ناممکن ہے تو وہ کیا کرے گی؟ خاموشی سے اپنی دنیا میں لوٹ جائے گی یا نہیں؟ اس طوفان محبت، آتش فشاں، سیماب صفت اور محشر خیز لڑکی سے خاموشی کو کیا نسبت! وہ جان دے سکتی ہے اور جان لے سکتی ہے مگر ہار نہیں مان سکتی۔ بفرض محال اسے جان لینے یا دینے کا مرحلہ درپیش ہوا تو وہ کس کو ترجیح دے گی۔ جان دینے کو یا جان لینے کو؟ اس سوال کا جواب کوئی ماہر نفسیات، کوئی ریاضی داں، سائنٹسٹ یا کمپیوٹر، نجومی یا دست شناس نہیں دے سکتا تھا۔ جواب صرف وقت دے سکتا تھا اور میں صرف اندازہ کرسکتا تھا کہ جان لینے کا مرحلہ آیا تو وہ کس کی جان لے گی۔ وہ میری خاطر اپنی جان دے سکتی ہے۔ میری جان وہ کبھی نہیں لے سکتی مگر رابعہ اس کے لیے غیر اہم ہے۔ وہ رابعہ کو اپنا حریف مان لے تو اسے بلاجھجک ختم بھی کرسکتی ہے۔ اس کے برعکس وہ میرے لیے قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ میرا ذہن اس سوچ کے بھنور میں الجھ گیا تھا۔ دیکھنا ہے یہ لڑکی کیا کرے گی۔ اس کا واسطہ کسی ایسے نام نہاد کے ساتھ تھا جس کے فیوز پہ کسی کا کنٹرول نہ ہو۔ اسے نہ ٹھکرایا جاسکتا تھا اور نہ الگ کیا جاسکتا تھا۔ یہ اس کے پُرخلوص جذبوں کی توہین ہوتی۔ وہ ایم آر ایس کے نقطۂ نظر سے بے حد کارآمد تھی اور وہ کرسکتی تھی جو کوئی اور نہیں کرسکتا تھا مگر یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت تھی کہ وہ رابعہ کے سر پہ لٹکنے والی خطرے کی تلوار تھی اور میرے لیے یہ زیادہ ضروری تھا کہ میں رابعہ کی حفاظت کے خیال کو نازو کی رفاقت سے زیادہ اہم سمجھوں۔

رات کے کھانے کے بعد ہم سوئے تو صبح کوئی نہیں اٹھا۔ سورج نکل آنے کے بعد بھی نہ اٹھا اور شاید ہم ابھی مزید گھنٹا دو گھنٹا اسی طرح بے سدھ پڑے رہتے اگر کسی نے بیٹھک کے دروازے کو جیسے جنگ کی طرح بجانا شروع نہ کیا ہوتا۔ بیک وقت میں اور محسن ہڑبڑا کے اٹھے اور سہمی نظروں سے نظروں میں سوال کیا کہ یہ کون ہلا یا شیطان ہو سکتا ہے۔
"اٹھو شمو سو ہیلیو، سرکار سویر ہوگئی ہے۔" ہنگامہ مشروط کیا۔ "اچھا اسی فیر چلے۔"

"او جی ٹھیرو۔" میں نے نعرہ لگا کے نمازور نے دوڑتا۔ ایک بار پھر وہ ٹیکسی کو گلی کے اندر لے آیا تھا۔ میں نے نقص اس میں ہونے سے پہلے چند ضروری معاملات طے کیے اور باہر نکل کے بات کی۔
"اب آپ کرایہ بتادیں۔" میں نے کہا۔ "مکان کیسا پسند آیا اور بھوت بھی پرانے تماشت نکلے۔"
"بس جی آپ آس نے بیوقوفوں کی طرح کہا۔ "فیر آ گیا جیسے کوئی نامراد۔ اچھا آج شام کو ہم اسے بھی شامیث کردیں گے اور صبح تک یاد نہیں یا فیر ہم نہیں۔ ایک رات دا عمل اے۔"
"نہیں نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "ابھی دات کو عمل وغیرہ کچھ نہیں کرنا۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ آپ کرایہ بتائیں۔"
"کرایہ کی سو ہیلو۔ جو خوشی نال مل جائے او ای چنگا۔" وہ بولا اور میرے بہت اصرار کے باوجود اس نے کوئی رقم نہیں بتائی اور جب میں نے اس کے ہاتھ پہ پانچ سو روپے رکھے تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔
"او سچا رب تواڈوں خوش رکھے، تسی تینوں خوش کیتا ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن سچ بولو گے! آپ نے اپنی خوشی نال دیا ہے، زور زبردستی کوئی نئیں۔ دل وچ ناراضگی تے کوئی نئیں؟"
میں نے اسے یقین دلایا کہ پانچ سو دے کر میں واقعی خوش ہوں اور حالات سازگار ہوتے تو اس کی ٹیکسی کے پانچ ہزار دے کر بھی میں اتنا ہی خوش ہوتا۔ اس مرد قلندر نے بے اختیار نوٹوں کو چوم کر اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھا اور مجھے لگا کہ ضرورت سے زیادہ دیا لیکن میں نے برا نہیں مانا۔ اس کی خوشی کا ستیاناس مخالف سمت سے نمودار ہونے والی ٹیکسی نے کیا۔
"او جی... او نے فیر ایتھے لا کھڑا کیتا ہے بے بے نوں؟" مودے نے ڈرائیور نے عادتاً ہارن بجا کے جنگ کا آغاز کیا۔ میں فوراً اندر گھس گیا۔ ان کے درمیان شروع گالیوں کا اور جھگڑے کا تبادلہ کچھ دیر جاری رہا۔ پھر معلوم نہیں کس نے ٹیکسی پیچھے ہٹائی۔ اندر نازو اور رابعہ نے ناشتے کا اہتمام کیا۔ بہت عرصے بعد تحفظ کا احساس بڑی تسکین کا باعث بن رہا تھا۔ رات کو بڑی پرسکون نیند آئی تھی اور میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ دوسروں کی حالت بتاتی تھی کہ ان کی بھی یہی کیفیت رہی۔ ہینڈ پمپ کے پانی بھرے ہوئے تھے تو تھوڑا سا فساد ہوا لیکن بالآخر پرچی نکال کے معاملہ طے کیا گیا۔ غسل خانے میں جانے کے لیے پہلا نمبر نیک محمد کا نکلا، آخری محسن کا اور اس نے قرعہ اندازی میں الیکشن کمشنر جیسی بھرپور دھاندلی کا الزام عائد کیا۔ میں نے نازو کو حکم دیا کہ اس ناہنجار کو ڈسپلن خراب کرنے کی سزا دے مگر وہ کچھ بجھی بجھی سی تھی اور شاید رات کو روئی بھی رہی تھی۔ وہ بے دلی سے ک...

www.paksociety.com

رہ گئی۔ بعد میں محسن نے مجھے ان کی اور والدین کی گفتگو سے آگاہ کیا۔ والدین نازو کی کوئی بات ماننے پر آمادہ نہ تھے اور انھوں نے نازو کو واپسی کے لیے چوبیس گھنٹے دیے تھے۔

ناشتے کے بعد ہم نے پوری صورت حالات کا جائزہ لیا۔ ہمارے پاس مختلف مواقع پر مختلف افراد سے چھینے ہوئے اسلحے کی پوزیشن کچھ اس طرح تھی کل آٹھ ریوالور تھے جن میں سائیلنسر والے ریوالور میں سے ایک دو گولیاں چلائی گئی تھیں مگر باقی میگزین میں تھیں۔ اسٹین گن کا ایک ہی راؤنڈ تھا اور یہ خطرناک ترین ہتھیار صرف ایک بار کسی ایسی جنگ میں کام آسکتا تھا جب ہم ہر سمت سے محصور ہو جائیں اور ریوالور کم وقت لگنے میں ہمارے مددگار ثابت نہ ہوں۔ اس کے بعد اسٹین گن کو صرف ڈنڈے کی طرح گھما کے ہی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ ریوالور کے لیے ہر سائز کی گولیاں خفیہ ٹھکانوں سے بلیک میں خریدنا ممکن تھا مگر اسٹین گن کے راؤنڈ حاصل کرنا ناممکن تھا۔

"یہ قتل عام کرنے کا اسلحہ استعمال کہیں نہیں ہوگا۔" محسن نے کہا "اس کا دیدار ہوتے ہی سامنے سے مسلح شکاری اپنی ذلالت کے ساتھ ہتھیار ڈال دیں گے یا پسپا ہو جائیں گے۔"

"کرنا بھی کیا ہے؟" میں نے کہا "جہاں ضرورت ہو، ریوالور بھی۔ اسٹین گن کو ساتھ رکھنے سے دہشت قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آج ہم کچھ بھی نہ کریں؟" رابعہ نے کہا۔

"کچھ نہ کرنے سے کیا مطلب؟ کیا ہم سانس بھی نہ لیں؟" محسن نے کہا۔

"ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ایک پرانے اور کبھی نہ مٹنے والے دشمن کی قید سے نکل آنے پر جشن منائیں۔" رابعہ نے کہا۔ "بیٹھ کے گپ لگائیں، کچھ ہنسیں۔ حلوہ، زردہ وغیرہ پکا کے غریب اور مسکین لوگوں کو بھی اپنے آپ کھلائیں۔ تم ایک ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر لا دو تاکہ کچھ گانے سنیں۔ ایک دن کے لیے عام انسانوں کی زندگی سے لطف اندوز ہوں، جو کبھی ہماری زندگی بھی تھی۔"

"ہاں، ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بھی ہم کو محروم ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا۔" محسن گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکا کے بولا۔

"کسی بڑے مقصد کے حصول کی راہ میں زندگی کے چھوٹے اور غیر اہم تقاضوں کو نظر انداز کرنا ہی پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر بڑی خوشیوں کے پیچھے بھاگتے جا رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ کب تک بھاگتے رہیں گے۔ اب تک مجبوری اور محرومی، رسوائی اور ناامیدی کے سوا کیا ملا ہے؟" رابعہ نے کہا۔

"آخر یہ کیا ہے، فرسٹریشن یا ڈپریشن؟" میں نے کہا

"یہ تمھارا امر ہے۔ ایک دن میں تم کیا بدل لو گے۔" رابعہ نے چڑ کر کہا۔

"مگر ہم سے ہوسکتا ہے، ایک دن کو دیکھو۔ اس ایک دن میں کچھ ہو گیا" میں نے کہا "اگلے چوبیس گھنٹوں میں کچھ بھی ہو سکتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ہم ذرا سی کوتاہی یا غفلت کی بدولت کوئی موقع گنوا دیں تو پچھتاوے کا عذاب بھی جھیلنا پڑے۔"

"بکواس مت کرو۔ آج میرا دل چاہتا ہے کہ ایک دن کی چھٹی کی جائے۔"

"یہ دل کا معاملہ نہیں ہے نیک بخت، ذرا عقل سے کام لو۔"

"اب اس ناچیز ناقص العقل عورت ذات کے پاس عقل کہاں۔ نہیں۔" دل شکستہ رابعہ بولی۔

"ناقص تم ہو، یہ تہمت ہے تمھاری، محسن پھر کے پاس جاتا ہے سو آپ کرتے ہیں۔"

"گویا تو بھی بغاوت پر آمادہ ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"تم کیا کہتے ہو نیک محمد؟"

"ہم تو وہی کہتے ہیں سکندر بادشاہ جو ہماری بہن کہتی ہے۔" نیک محمد دانت نکالنے لگا۔

"پھر تو ہو گئی ساری تنہائی ایک طرف۔" میں نے کہا "اچھا بھائی، آج چھٹی، پکنک مناتے ہیں گھر میں۔"

وہ دن مزے میں گزرا۔ محسن بازار سے ایک ٹیپ ریکارڈر لے آیا اور کچھ فلموں کے گانوں کے کیسٹ بھی۔ سارا دن ہنگامہ رہا۔ میں اور محسن لگاتے رہے اور بیوی کو رابعہ پاشا سے منسوب کرتے رہے۔ رابعہ اور نازو نے کھانے میں بڑا تکلف کیا اور نیک محمد ضرورت کا سارا سامان لا دیا۔ وہ پکانے میں مصروف رہیں اور ٹیپ کے گانوں پر رقص فرماتے رہے۔ سوائے انگریزی کے جو میں نے اور محسن نے انگلستان میں سیکھے تھے۔ چنانچہ جب محسن نے گایا اور میں نے جھگڑا، خواتین کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ رات کو میرا دل چاہتا تھا رابعہ سے وہی آسمانی رنگ کی ساڑی پہنے جس پر زرد پھولوں کے بیل بوٹے تھے۔ شعلہ جوالہ کے دل کی باتوں سے خوب پھر لیکن میں نے کو چکانے سے کیا حاصل۔ میں پچھتاوے کے بعد حقیقتوں کی دنیا میں لوٹ کر زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر مجھے محسن کا خیال بھی تھا

زیادہ تنہا محسوس کرے گا۔ اگر میں رابعہ سے پوچھتا تو اس کے دل کی بات کہنا وہ خود بھی چاہتی ہوگی کہ اس کی زندگی میں جو ہر دم رواں ہیجان ہے وہ ایک ہنگامہ خیز اور مسلسل سے اور ہر قدم پر زمین و دار کے مرحلوں سے عبارت ہے۔ راحت کے چند پیار بھرے لمحے میسر آجائیں تو وہ کبھی انھیں کھونا نہ چاہے گی مگر میں نے مصلحت کے پیش نظر یہ تجویز پیش کر دی کہ ہم سب رات کے کھانے کے لیے باہر چلیں۔

رات کے وقت پہچانے جانے یا کسی دشمن سے سر راہ ملاقات کے امکانات کم تھے مگر تھے تو ہم نے انھیں نظر انداز کر دیا اور بے خوفی سے گھر سے نکل گئے۔ ہم نے ایک معروف ہوٹل میں پر تکلف کھانا کھایا۔ پھر ایک انگریزی فلم دیکھنے چلے گئے جو خلاف توقع بہت اچھی ثابت ہوئی۔ رات کو ہم واپس آ رہے تھے کہ لالہ زار سے کافی قریب محسن کو والد کا خیال آیا۔ وہ آخری اطلاع کے مطابق ریٹائر ہونے کے بعد وزیر کے گھر منتقل ہو گئے تھے۔

"آج موقع بھی ہے" میں نے کہا "ان کی خیریت تو پوچھ لے۔" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تمھیں شملہ سے بات کرنے کی اجازت مل گئی ہو گی۔" رابعہ نے کہا "واضح ہو کہ تمھاری منگنی ہو چکی ہے۔"

"ہاں واسطہ، تو اچھا ہوتا کہ میں بھی سکندر کی طرح بے شرم ہو جاتا۔" میں نے کی شرم ان کے پیچھے کر دی۔ محسن نے سردار وزیر کے گھر کا نمبر فوراً ملانے کے لیے ہم نے ٹیلیفون آفس کے ایک بہت با اختیار چپراسی سے مذاکرات کیے اور اس کو ٹیلیفون ڈیپارٹمنٹ کی فلاح و بہبود کے لیے پچاس روپے چندہ دیے جسے اس نے جیب خاص میں ڈال لیا اور ہمارے دل کی مراد پوری کرنے میں بہت معاون ثابت ہوا۔ جب محسن نے بات شروع کی تو ہم باہر فٹ پاتھ پر کھڑے اس کا انتظار کرنے لگے۔ ناگہاں وہاں ایک موٹر سائیکل آکر رکی۔ اس سے پہلے کہ موٹر سائیکل والا ہماری طرف متوجہ ہوتا میں نے اسے شناخت کر لیا۔ یہ حشمت خان تھا۔ میں نے رابعہ اور نیک محمد کو پیچھے کھینچ لیا اور ہم سائے میں ہو گئے۔

"نازو جیسے بھی ہو اس خبیث کو اندر جانے سے روکو۔" میں نے کہا "یہ انسپکٹر حشمت خان ہے۔" اس سے زیادہ کچھ کہنے کا وقت ہی نہیں تھا کیونکہ حشمت خان موٹر سائیکل کو سٹینڈ پر لگا کے اندر جانے لگا تھا۔ اگر وہ اندر چلا جاتا تو محسن کو فوراً دیکھ لیتا اور پھر محسن کا فرار کرنے کے سوا کچھ بھی نہ کر پاتا۔ نازو

ایک قدم آگے بڑھی۔ معلوم نہیں اس نے حشمت خان سے کیا کہا۔ وہ دونوں اتنے فاصلے پر تھے کہ ہم ان کی گفتگو کے الفاظ صاف نہیں سن سکتے تھے۔

"یہ کیا نئی مصیبت ہو گئی۔" میں نے پریشانی سے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ اندر سے محسن نکل آئے۔"

"اگر نازو اسے زبان سے قائل نہ کر سکی تو اپنے ہاتھوں سے کرے گی۔" رابعہ نے کہا اور اس کی بات درست ثابت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ محسن اپنی بہن سے بھی بات کرے گا تو اتنے عرصے کے بعد باتوں کا سلسلہ دراز ہو گا۔ ممکن ہے وہ شملہ سے بھی بات کرائے۔ رات کے وقت آدھے ریٹ پر وہ آدھا گھنٹہ بات کرتا تب بھی ٹرنک کال کا بل بمشکل سو روپے تک رہتا یا اس سے کم۔ خلاف امید محسن بہت جلد نکل آیا۔ ابھی تک حشمت خان کو وہاں سے کھسکانے میں نازو کو کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ محسن ٹیلیفون آفس کی سیڑھیوں سے اترا تو حشمت خان نے سر گھما کے اسے دیکھا۔ اس کی نظر محسن پر جم گئی۔ میں بلا ارادہ ایک قدم آگے بڑھا لیکن نیک محمد نے مجھے روک لیا اور اس نے اچھا ہی کیا ورنہ محسن کے ساتھ میں بھی حشمت خان کی نظر میں آجاتا۔

اس کے بعد وہ ہوا جو نہ ہوتا تو بہتر تھا مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔

"تمھاری یہ جرأت بدمعاش۔" نازو نے چلا کے کہا اور حشمت خان نے حیران ہو کے نازو کی طرف دیکھا ہی تھا کہ نازو کا تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ ایک بہت بے خطر قسم کا زناٹے دار تھپڑ۔ "لفنگے شہدے، میں تجھے پولیس کے حوالے کر دوں گی۔"

"سؤر کی بچی۔" حشمت خان نے غضب ناک ہو کے اسے دوسری گالی دی، جو پولیس والے ہی دے سکتے ہیں۔ "تو میں بتاؤں گا۔"

"ارے جا، تو کیا بتائے گا۔ شریف لڑکیوں کو اکیلا سمجھ کے چھیڑتا ہے۔ ماں بہن نہیں ہیں گھر میں۔" نازو نے اس کے دوسرا تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو معاملہ حشمت خان کی قوت برداشت سے باہر ہو گیا۔ اس نے نازو کی نازک کلائی تھامنے کی غلطی کی۔ کچھ لوگ دور سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان کی حیرت زدہ آنکھوں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ ایک دھان پان سی نوعمر اور بے حد حسین لڑکی نے اپنے سے چار پانچ گنا وزن والے خطرناک صورت کے پہلوان نما شخص کو کسی تنکے کی طرح ہوا میں اچھال دیا جیسے اس میں ہوا بھری ہوئی تھی اور دوسرے لمحے وہ شخص بھد سے ٹیلیفون آفس کی سیڑھیوں کے سامنے کنکروں کے فرش پر گرا۔ وہ زخم خوردہ شیر کی طرح اچھل کے اور

www.paksociety.com

عزرا کے اُچھالا مگر بے سود ہی ہُوا۔ اس لڑکی نے بجلی کی سی پھرتی سے ٹک ماری۔ ٹک مارنے سے پہلے وہ فضا میں ذرا سی دبک کے دونوں پیر اٹھا کے ہوا میں بلند ہو گئی۔ پھر اس کے پیر بہت قوت کے ساتھ ریلیز ہونے والے اسپرنگ کی طرح چلے اور اس بھاری بھرکم شخص کے سینے پر لگے۔ وہ ایک دم اُلٹ گیا۔ لڑکی نے انتہائی برق رفتاری سے پیروں کو سمیٹا اور پھر زمین تک پہنچ کے توازن برقرار رکھتے ہوئے اٹھی پیروں پر کھڑی ہو گئی۔ دوسری بار وہ بھاری بھرکم آدمی یوں دیوار سے جا ٹکرایا تھا جیسے کوئی جنگلی بھینسا دوڑتے ہوئے ڈبل ڈیکر بس کو ٹکر مارے۔ [illegible] کی علامت [illegible] بنا لی گئی تھی مگر [illegible] کے بعد کے [illegible] کا کچھ نہیں بگڑا۔ حشمت خان بڑے [illegible] طریقے پر [illegible] اور ساکت ہو گیا۔

محسن اپنی جگہ پر بیٹھ کھڑا رہا۔ اچانک اسے ہوش آیا تو وہ آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں کچھ ناظرین بھی اس مار دھاڑ سے بھرپور سین کے لیے نعرے لگانے اور تحسین بلند کرتے چلے آ رہے تھے۔ ناز دوڑ کر موٹر سائیکل کی طرف لپکی۔ نجانے کس کی باری اب میری تھی۔ بڑے کمال کے ساتھ اس نے موٹر سائیکل کو سنبھال کے چابی گھمائی۔ حشمت خان نے تھانیداری کے زعم میں نکالنا ضروری نہیں سمجھی تھی۔ ایک بک میں موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو گئی۔

”قلندر بخش!“ وہ محسن کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”پیچھے بیٹھو!“ یہ نام اس نے اتنی اونچی آواز میں لیا تھا کہ دوسروں نے بھی سنا۔

”لیکن گلبدن خانم! یہ موٹر سائیکل ہم نہیں لے جا سکتے۔“ محسن نے اس کی بات کا جواب بالکل صحیح دیا۔

”قلندر بخش! چلو۔ نکلو جلدی یہاں سے۔ موٹر سائیکل ہم تھانے پہنچا دیں گے۔“ ناز نے کہا۔ ”اس بدمعاش کے ساتھی نہ آ جائیں۔“

”گلبدن خانم! اس طرح تم کو اغوا کر کے نہیں لے جا سکتے۔“

محسن موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ گیا۔ قریب آنے والے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ان میں سے کسی کی ہمت نہ تھی کہ قلندر بخش اور گلبدن خانم کی راہ میں حائل ہو سکتا۔ وہ ہکا بکا اور آنکھیں پھاڑے کھڑے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ ابھی تک انھوں نے لاہور کی سڑکوں پر ہر قسم کے تماشے دیکھے تھے۔ لڑکیوں کو سائیکلوں پر کالج آتے جاتے دیکھا تھا۔ غنڈوں سے بدمعاشوں کی سینڈل سے مرمت کرتے بھی دیکھا تھا لیکن جو اس وقت دیکھا تھا وہ صرف فلموں ہی میں دیکھا تھا۔ حقیقی زندگی میں اس کا تصور تک نہیں کیا تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے اس معصوم صورت اور دبلی پتلی لڑکی نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور اپنے ساتھی کو لے کر بھگا لے گئی۔ یہ جیسویں صدی کا رومانس تھا۔ گلبدن اور قلندر

بیٹے مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصے دیکھنے والوں کو [illegible] مضحکہ خیز محسوس ہوتے ہوں گے۔ جنھیں اب جنجب [illegible] قبل کی گاڑیوں کے ماڈل لگتے ہیں، یا پھر جیسے [illegible] مقابلے میں کسی چوتھے درجے کا گراموفون باجا لگتا ہے۔ جس [illegible] چلایا جاتا تھا۔

”چلو اب ہم بھی نکل چلیں۔“ میں نے مسرت سے [illegible] کندھے پر وہ انتہائی اعتماد بھرا جو مجھے نیک محمد کے رسید کرنا تھا اور اپنی غلط حرکت پر معذرت کی۔ رابعہ کافی دیر تک [illegible] کرتی رہی۔

اس وقت ناز نے حیرت انگیز ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ [illegible] نیک نے کہا۔

”موٹر سائیکل بھی چلانی آتی ہے اسے تو۔“ نیک محمد نے سر ہلایا۔ ”اس لڑکی سے کچھ بعید نہیں۔ تو پھر چلائے۔ جیت جائے۔“

”تمھیں مل جائے ایسی لڑکی تو تم کیا کرو گے؟“ رابعہ [illegible]

”پھر صفت۔“

”میں بھی موت مرنا پسند کروں گا۔“ میں نے کہا اور [illegible] کا کوئی دوسرا مطلب بھی تھا۔ تو گویا گولی کی آواز کیا [illegible] ہی نہیں کرتا۔ وہ کوئی خطرناک قسم کی خود کار ایجاد ہے جو [illegible] سے بنا کر بھاگ تک سب کچھ کر سکتی ہے مگر اس وقت [illegible] نوعیت کر رہا تھا اس کے دماغ کی۔ کتنی خوش قسمتی ہے اس نے [illegible] گرا ہوا کو قابل کر لیا۔ اس نے ایک شخص کی [illegible] اس نے اپنے ساتھی کا نام بھی بتایا اور محسن نے بھی ویسا ہی [illegible] بتایا۔ دیکھنے والے یہ نام نہیں بھول سکتے۔“

”مگر حشمت خان اب کیا کرے گا؟“ نیک محمد نے کہا۔

”جب ہوش میں آئے گا تو اپنے سر کے بال نوچے گا کہ گرا ہوں کر تھانے لے جائے گا؟“ میں نے کہا۔

”غیرت مند ہوتا تو کہیں اور جا کے چلو بھر پانی میں ڈوب مرتا۔“ رابعہ بولی۔

”تھانے میں بہت گڑبڑ مچے گی۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”حشمت خان کہے گا کہ اس نے محسن کو دیکھا تھا اور [illegible] اس کے ساتھی بھی ——— گواہ انکار کر دیں گے اور بتائیں گے کہ لڑکی کا نام گلبدن بیگم تھا اور اس کے ساتھی کا قلندر بخش۔“

”معلوم نہیں وہ شہر کے منگیتر کو اغوا کر کے کدھر لے گئی اور واپس آئے گی بھی یا نہیں؟“ رابعہ نے تشویش سے کہا۔

”وہ ہم سے پہلے گھر میں موجود ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”اکیلا نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے منگیتر کو اسی طرح یا امانت سے [illegible] جائے گی مگر اس شرارت کے بعد سے نے کسی اور سے [illegible]

[illegible] قسمتی نوعیت کی انتہائی برودت منتظر ہو کے ساتھ سبھی گی کہ ٹھہر [illegible] نہیں ہو سکتی بلکہ گھوڑے یا ٹیک پر سوار ہو کے پہنچے گی اور وہ سپاہی کی طرح اُڑتے جانے گی جیسے پر تعویذ [illegible] سے بچوں کرنے گیا تھا۔“

”خدا مرزا غالب کی مغفرت کرے۔“ رابعہ بولی۔

”آمین!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”مگر یہ تمھاری نظر میں اس کے دل کے چور کو پہچان سکتی ہے؟“

”دل کا چور کہاں چھپ سکتا ہے۔“ رابعہ نے کہا۔ ”اس کی نظری مظلومیت تو سوال کرتی نظر آتی ہے کہ اللہ کے نام پر ایک نظر کرم کا سوال ہے بابا۔ ہے کوئی ایک غریب حمایتی سے پیار کرنے والا؟“

”یہ بھی بڑا اچھا پارٹنر ہے۔ اس اعتبار سے دونوں کے ہاتھ لیے ملنے نظر آتے ہیں بلکہ گھرانے نظر آتے ہیں۔“ میں نے مختصر [illegible] کے کہا۔

زمرّد محسن اور ناز و گھر پہنچ چکے تھے بلکہ مرزا غالب بھی بقلم خود موجود تھے۔

”کمال کر دیا آج تو تم نے۔“ نیک محمد نے بے اختیار ناز کی پیٹھ تھپکی۔

”ذرا سنبھل کے نیک محمد۔“ میں نے کہا۔ ”تم کو ہاتھ لگانے والوں کا حشر دیکھا ہے تم نے۔“

”حشمت خان کی شاہی سواری کہاں چھوڑی؟“ رابعہ نے کہا۔

”خود تھانے کے سامنے کھڑی کر دی۔“ محسن بولا۔ ”سمجھانے کو کہا تھا کہ چلو تھانے دیکھتے کا کنواں بھی ہے۔“

”کسی نے دیکھا نہیں ہوگا ورنہ خود اصرار کر کے لے جاتے۔“ نیک محمد نے کہا۔

”ان کے آگے جا کر میں نے اس کی باگ ڈور سنبھالی تھی۔“ محسن بولا۔ ”مرزا غالب بھی ایک کونے میں بیٹھے تھے کبھی دوسرے کا۔ جب ان کو تفریح تفصیلات کی تفصیل سے آگاہ کیا گیا تو اس کی حالت دیکھ کر دوسروں کو ہنسی آ گئی۔“

”مولانا مس ناز خیال آتا ہے کہ تم پر ایک پورا تصویری مضمون ہے۔“ غالب نے کہا۔ ”کہ دنیا کی سب سے خطرناک لڑکی سوچا تو کی… مگر اپنے انجام سے ڈرتا ہے۔ ایڈیشن نوانا جیسے بلیک کا کو کرم جیسے حضرت کا مزار بنانے کا خرچ نکل آئے۔“

”ابھی تو تمھارے مزار کی نہیں تمھاری ضرورت ہے۔“ ناز نے کہا اور غالب نے اس کے چہرے پر حیا کی لالی کو دیکھا تو مجھے اپنے فقرے کو واپس لینے کا خیال آیا۔ میں نے کہا تھا کہ وہ لڑکی نہیں ہے مگر یہ بالکل لڑکی تھی۔ غالب کے خراج تحسین کو اس نے شرم کے مظہر جھوٹی کے ساتھ قبول کیا تھا۔ وجود کے مجھے علامہ مرحوم کا ایک ہی مصرع یاد آ گیا تھا۔ پھول کی پتی اور ہیرے کا جگر والا۔ ناز کے جسم سے موزوں عنوان تھا۔ متضاد صفات کی حامل اس لڑکی کو اور کیا سمجھا جا سکتا تھا جسے سمجھنے کی کوشش کرنے والا پاگل ہو جائے۔

”ہم کل ایک اہم معرکہ سر کرنے والے ہیں۔“ میں نے غالب کو مطلع کیا۔ ”آج ہی کر لیتے۔“

”مگر ہمارے گھر ہی سے تحریک التوا پیش کر دی گئی۔“ محسن نے کہا۔ غالب ہنس پڑا۔ بالوں کی جگہ محسن نے گھر ہی سے کی اصطلاح کا استعمال کر کے رابعہ کو چھیڑا تھا۔ پرانے وقتوں کے لوگ اپنی بیوی کا حوالہ دیتے وقت اسی طرح ”ہمارے گھر سے“ کہتے تھے۔ اس کے بعد میں نے ایک اجلاس کی صدارت کی جس میں اس فیصلہ کن معرکے کی تفصیلات پر بحث کی گئی اور اس کا ہر پہلو سے جائزہ لیا گیا۔ غالب کو ہمارے اقدام خودکشی سے اختلاف تھا۔

”تم لوگ ان کی طاقت کا اندازہ ہے تمھیں؟“ اس نے کہا۔

”تمھیں کیا معلوم وہاں اس نے کیا حفاظتی انتظامات کر رکھے ہوں گے۔ اس کے پاس کس قسم کا اور کتنا اسلحہ ہوگا اور کتنے افراد سے مقابلہ کرنا پڑے گا؟“

”تمھارے خدشات بجا۔“ میں نے کہا۔ ”مگر ہم کوئی ان سے کھلی جنگ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔“

”ہم آرام سے تو گوریلا جنگ ہی لڑ سکتی ہے۔“ محسن نے کہا۔

”مگر تم تو گوریلا… میرا مطلب ہے گوریلا لڑکیوں کو آگے بڑھا رہے ہو؟“ غالب نے کہا۔

”یہی تو ان کی بہترین ہماری اسکیم کی خوبصورتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ لوگ اپنے ماتحتوں کے پہرے کا ارادہ کریں؟ کسے لڑکی کو نہ لانے کی اول ہیں۔ اگر وہ یرغمال بنایا جائے تو ہم جا کر جہاں تک مجھے امید ہے اس کے اندر وہ سب اسی کے پیچھے موجود رہتے ہوں گے اور اس کے باڈی گارڈ ان کے ہر آنے جانے والے پر نظر رکھے ہوں گے۔ دہشت کی صورت میں مردوں پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں اور ان کی تلاشی بھی لے سکتے ہیں مگر عورتوں کی بات مختلف ہے۔“

”فرض کرو ان کا مشن پورا ہو گیا۔“ غالب نے کہا۔ ”لیکن دوسری طرف سے تمھارا حملہ ناکام ہو سکتا ہے۔ اگر تم اندر داخل نہ ہو سکے تو کیا ہوگا؟“

”پھر لڑکیوں کے احباب فاتحہ پڑھیں گے۔“ محسن نے کہا۔ ”سوئم ہوگا، چہلم ہوگا۔ کیا اتنا کافی نہیں؟“

”کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ہم قلعے کے بیرونی حصار تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

www.paksociety.com

اگر کسی وجہ سے اندر جانے کا راستہ نہ بنا سکے تو یہ گڑبڑ کرے گی۔ میرا مطلب ہے وہ گوریلا لڑکیاں بھی اندر موجود ہوں گی کے سوچیں ' زنانگی کے جوہر دکھائیں گی۔ گلے میں ماچس کے سرے کفن باندھ کے اور اس کی جان ہتھیلی پر رکھ کے آگے لائیں گی اور بندوق والے کھڑے رہتے ہیں کامیاب رہیں گی۔ شرط یہی ہے کہ ایک گلے میں ماچس کو ڈھال بنائے رکھے اور دوسری اپنی حفاظت کرے۔ پہلا کام گلبدن بیگم کر سکتی ہیں اور دوسرا روشن بیگم۔ دلبا اور تو دونوں کے پاس ہو گا اور انھیں جو پہرے سے قتل عام کی اجازت ہو گی۔ ایک تیر نظر اور نیدو تی حسن اور شمشیر ادا سے اور دوسرا گولیاں چلائے گی۔"

"پہلے اس کو کیا کہتے تھے؟ میمنہ اور میسرہ؟" غالب نے کہا۔ "دائیں طرف سے اور بائیں طرف سے حملہ کرنے والے۔ تو کیا باقی بازو میں ہم بھی شامل ہو جائیں؟"

"اب تم کدھر ہو؟" میں نے کہا۔ "بہتر ہے کہ تم جہاں ہو وہیں رہو۔ کوئی ہم پر فاتحہ پڑھ کے تاریخ وفات حسرت کی بات کہنے والا اور شہادت کی خبر لگنے والا بھی تو ہونا چاہیے۔ تم رسید وفورن میں ہو۔"

"لیکن صبح سے شام تک ہم کیا کریں گے؟" غالب بولا۔ "بیٹھے وہیں تصویر بنا ان کیسے ہو سکے؟" اس نے چوہدری نازو کی طرف دیکھا لیکن نازو اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ اس مشن میں اہم ترین رول اس کا بھی ہو سکتا ہے مگر یہ رول کیا ہو گا اور اس کی ضرورت کب پڑے گی، یہ فیصلہ وقت سے پہلے نہیں ہو سکتا۔"

"آج سراج آیا تھا۔" غالب نے اچانک کہا۔

"کس لیے؟" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ کہا۔

"بظاہر تو مجھ سے ہی ملنے آیا تھا۔" غالب نے کہا۔ "ایک ٹوٹا ہوا ہاتھ گلے میں پڑا ہوا تھا۔ کسی نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس کو کہاں مل سکتا ہوں۔ بڑی اکڑ فوں میں تھا جیسے مجھے تھانے میں اُلٹا لٹکا کے میری کھال میں بھس بھروا دے گا اور سب کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہاں واسطہ پڑ گیا ایڈیٹر سے۔ وہ ایک خر دماغ آدمی۔ اس نے کہا کوئی ڈی ایس پی صاحب کوئی پبلک پلیٹ ہے یا وارنٹ ہے؟ نہیں ہے تو یہ بتایئے کہ آپ کو اوپر آنے کی اجازت کس نے دی؟ اشاعت کو پریشان کرنے آئے ہیں آپ؟ وہ کہنے لگا کہ میں کہیں بھی آنے جانے کا اختیار رکھتا ہوں اور کسی کو بھی شک میں گرفتار کر سکتا ہوں۔ ایڈیٹر تو آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے کہا تم ہو کون؟ اسی وقت نکل جاؤ ورنہ دھکے دے کر نکلوا دوں گا اور سارے رپورٹر تمہارے پیچھے لگا دوں گا۔ بال کی کھال نکالنے والے اور کھال کے جوتے بنا کے مارنے والے تمہارے اگلے پچھلے سامنے کرتوتوں کا کچا چٹھا چھاپ دیں گے۔ سراج کی حالت عجیب ہو گئی۔ جس قسم کا دھندا وہ کر رہا ہے اس کے لیے ایسا کرنا بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ چہرہ بنانا تو ... ہو گیا کہ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ایڈیٹر نے کہا کہ مطلب کیا ہے میں جانتا ہوں اس علاقے کا ڈی ایس پی کون ہے۔ تم کہاں سے آ گئے رعب اخبار کے دفتر میں گھس کر افسری کا اور اختیار کا رعب جمانے کے لیے۔ میں نے کہا کہ یہ ڈی ایس پی سراج صاحب ہیں اور غالباً بار بار کولیوٹی پر ہیں۔ ایڈیٹر اچھل پڑا کہ اچھا حضرت یہ بلڈنگ سے آؤٹ آف باؤنڈ ہیں۔ میں بات کرتا ہوں ... سے کہ ان کا ایک بہت فرض شناس افسر بے لگام ہو رہا ہے ... نکیل ڈال کے لے جائیں۔ سراج سخت مشتعل ہو کے گیا۔ چلتے چلتے میں نے پوچھ لیا کہ ڈی ایس پی صاحب! یہ اعزاز آپ کو کس معرکے میں داد شجاعت دیتے ہوئے ٹوٹا ہے کیا بازو اور کا تمغہ شجاعت ہے بڑا قدردان افسر ہے۔ ایک ایماندار افسر کی ایمانداری پر انعام دیتا ہے تو اس کی بہادری کی خبر بھی پڑھو۔ اس نے دل ہی دل میں مجھے کتنی گالیاں دی ہوں گی وہ ضبط کرنے پر مجبور تھا۔ سڑک پر ہوتا تو مجھے گولی مار دیتا۔"

ہم سب کو سراج کی حالت کا تصور کر کے بہت ہنسی آئی۔

"تم نے کچھ پتا چلایا کہ وہ کہاں ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"اتنا تو اس کے رویے سے اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ وہ واقعی بار بار کے کسی شعبے میں ہے۔" غالب نے کہا۔ "کہاں ہے یہ بھی پتا چل جائے گا۔"

صبح میں اور محسن الگ الگ گھر سے روانہ ہوئے۔ میرا کام زیادہ مشکل تھا۔ میری بغل میں زنانہ کپڑوں کے دو جوڑے تھے۔ دونوں رابعہ کے تھے اور خاصے قیمتی تھے۔ ان کے بدلے کوئی بھی غریب عورت اپنا پھٹا پرانا جوڑا مجھے دے سکتی تھی لیکن کسی عورت سے اس موضوع پر بات کرنا آسان نہ تھا۔ الٹا شک میں مبتلا ہو جانا یقینی تھا۔ کئی جگہ میں نے غریب عورتوں کو کام میں مصروف دیکھا۔ ان میں سڑک پر جھاڑو دینے والی بھی تھیں اور زیر تعمیر مکانوں میں مزدوری کرنے والی بھی لیکن کسی سے بات کرنے کی ہمت نہ پڑی چنانچہ پہلے میں نے یہ مسئلہ حل کرنے کا سوچا۔ مال روڈ پر ایسی دکانیں تھیں جہاں ملازمین کے لیے ہر قسم کی وردیاں تیار کی جاتی تھیں لیکن وہاں مجھے نئی وردیاں ہی مل سکتی تھیں۔ اچانک مجھے ایک دھوبی نظر آیا جو ریڑھے پر اپنی گھر والی کو بٹھا کر کپڑوں کے ڈھیر پہ بٹھائے جا رہا تھا۔ میں نے اسے روک لیا۔

"مہینہ بھر میں کپڑے دھو کر کتنے کما لیتے ہو؟"

اس نے ایک طرف لے جا کر کہا۔

"اب تو گزر اوقات بھی مشکل سے ہوتی ہے جی۔ ... کپڑے دھونے والی مشینیں آ گئی ہیں۔ ہزار روپے مہینے ہی ہو جاتے ہیں تو سب کے ساتھ اس جانور کا پیٹ بھی بھرنا پڑتا ہے۔" اس نے گدھے کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا ایک بات تمہارے فائدے کی ہے۔" میں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ "یہ سب پرانے کپڑے ہیں نا؟ اگر ان میں سے کوئی کھو جائے یا پھٹ جائے تو کیا کرتے ہو؟"

"بس جی اللہ پھر جوڑے کے معافی مانگ لیتے ہیں۔" وہ بولا۔

"اچھا فرض کرو میں تم سے چند جوڑے خریدنا چاہوں۔" میں نے کہا۔ "دو بہت پرانے اور زنانہ۔ ان کے بدلے تم کو دو جوڑے دوں۔"

"وہ میرے کس کام کے جی؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "مطلب کیا ہے آپ کا؟"

"اگر میں تم کو ایک ہزار نقد رقم ابھی دوں۔" میں نے صاف بات کرنا مناسب سمجھا۔ "اور تم سے دو زنانہ جوڑے مانگوں، تین مردانہ۔ ایک ایک جوڑے کی قیمت دو دو سو روپے۔ تم تو پورے ہزار کے فائدے میں رہو گے۔ اوپر ہر جوڑے کے نقصان سے بچ جاؤ گے۔"

"یہ کیا چکر ہے جی؟ آپ پرانے کپڑوں کے ایک ہزار کیوں دے رہے ہو؟" وہ بولا۔

"کوئی چکر نہیں۔ تم خواہ مخواہ ڈر رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "اگر ایک ہزار کم ہیں تو پندرہ سو لے لو۔"

"پندرہ سو؟" اس کی آواز بند ہو گئی۔ "دیکھو سرکار! یہ ضرور کوئی گڑبڑ معاملہ ہے۔ پرانے کپڑے تو لنڈا بازار میں سستے ملتے ہیں۔"

"مجھے بھی معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر وہاں جیسوں کے جوڑے ہوتے ہیں۔ مجھے انگریزی کپڑے نہیں دیسی کپڑے چاہئیں اور وہ بھی پرانے۔ ہم ایک ڈراما کر رہے ہیں کالج میں۔ اس کے لیے میلے اور پرانے کپڑوں کی ضرورت ہے ورنہ ایسے سستے اور قیمتی کپڑوں کی تو ہمارے گھروں میں کوئی کمی نہیں۔ تم کو چاہئیں تو پندرہ سو لے لو ورنہ میں کسی اور دھوبی سے بات کرتا ہوں۔"

"لے لیں سرکار لے لیں۔" وہ مجھے رضامندی اختیار کرتے دیکھ کر بولا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں دھوبی گھاٹ چلا گیا تو ... میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں نے ... ڈھیر سے چھانٹ کر تین پرانے مردانہ جوڑے ... کسی کی ... قد و قامت کے کیا دو دو وردیاں تھیں۔ ایک خاکی، ایک نیلی اور ایک سفید۔ پھر کچھ سوچ کے میں نے ایک نیلی وردی رہنے دی اور دو زنانہ جوڑے منتخب کر لیے۔ دونوں جوڑے بہت میلے تھے۔ ان میں سے ایک رابعہ پہن سکتی تھی اور دوسرا نازو۔ دونوں ہی کسی غریب عورت نے اپنے ہاتھ سے سیے تھے چنانچہ ان کا فیشن سے دور کا تعلق نہ تھا اور مجھے امید تھی کہ وہ رابعہ اور نازو کو تھوڑے بہت ڈھیلے ہی رہیں گے۔ دونوں بہت معمولی سوتی کپڑے کے پرنٹ تھے۔ پھر میں نے دو سفید لٹھے کے مینٹ ٹائپ برقعے منتخب کیے تو دھوبن نے احتجاج کیا کہ سودے میں یہ شامل نہیں تھا اور اس مرحلے میں مرعوب نہیں ہوا بلکہ اسے معاہدہ منسوخ کرنے کی دھمکی دے دی۔ وہ چپ ہو گیا اور میں نے گن کر اس کے ہاتھ پر سو سو کے پندرہ نوٹ رکھ دیے۔ دھوبن منہ کھولے اس کارروائی کو دیکھتی رہی۔ سو کے اتنے نوٹ اس نے ایک ساتھ پہلی بار دیکھے ہوں گے۔ وہ دھوبی کے مقابلے میں بہت صحت مند اور جوان تھی۔

"تھینک یو میڈم۔" میں نے دھوبن کی طرف دیکھتے ہوئے سر جھکا کے کہا اور تقریباً رکوع میں چلا گیا۔ دھوبن مسکرائی۔

"چلو اب جاؤ۔ یہ تقریر والی مسخری بس کرو۔ ہماری جورو کے ساتھ۔" دھوبی نے ترکمان کے کہا اور گدھے کے ایک دولتی ماری۔ گدھے نے بے سبب تشدد پر واجبی سا احتجاج کیا اور چل پڑا۔ گدھے کو کیا معلوم کہ درحقیقت دھوبی نے دولتی میرے رسید کی تھی۔ کپڑوں کے بنڈل کو بغل میں دبانے سے پہلے میں نے ایک گٹھڑی سی بنائی۔ نیلی وردی کے علاوہ وہ میں نے ایک برقعے میں ... ۔ وہ سفید اور ریشمی۔ وہ پرانے اور سوتی۔ دوسرا برقع بھی اسی میں ڈالا۔ برقع؟ میں نے گٹھڑی کو کندھے پہ ڈالتے ہوئے خود سے کہا اور واپسی اختیار کی۔ مجھے یقین وردیاں خریدتے وقت یاد آ گیا تھا کہ دو وردیاں تو پہلے سے ہمارے پاس ہیں۔ ایک ویٹر کی اور ایک پوسٹ مین کی۔ اسی خیال نے مجھے "فضول خرچی" سے روک لیا تھا۔

میں واپس پہنچا تو محسن لوٹ کر آ گیا تھا۔ اس کا ثبوت وہ ٹیکسی تھی جو گلی میں جشن کھڑی تھی۔ تھوڑا سا غور کرنے پر میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ ہمارے لینڈ لارڈ کی ٹیکسی تھی۔

"یہ ٹیکسی کہاں سے مل گئی تمھیں؟" میں نے کہا۔

"بس اپنے ہی سرکار ان سے ملاقات ہو گئی۔" محسن بولا۔ "زبردستی مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا کہ ... جلدی ہے؟" اس نے مالک مکان کی نقل کر کے بتایا۔ "میں نے اچانک اپنا ارادہ بدل دیا۔ ٹیکسی جو کام میں چٹکی بجانے سے ہو جاتے ہیں ان کے لیے ...

www.paksociety.com

ہے۔ میں نے کہا کہ اس وقت آپ خوب ملے۔ مجھے بھی ایک ایسی ہی گاڑی کی تلاش تھی جو چلتی ہو۔ ان سے دن بھر کے پہلے معاملہ طے کر لیا۔ بہت وضعدار آدمی ہے۔ کہتا تھا کہ آپ کی گاڑی ہے، جو خوشی ہو دے دینا۔ یہ بہت مسئلہ بن جاتا ہے۔ جب کوئی سب کچھ ہماری خوشی پر چھوڑ دے۔"

"ہاں، اپنے منہ سے وہ مانگتا تو کتنا کرایہ مانگتا۔ تین سو، زیادہ سے زیادہ چار سو۔" میں نے کہا۔ "میری خوشی پر چھوڑا تو مجھے پانچ سو روپے دینے پڑ گئے۔"

"میں نے بھی تین سو دیئے۔" محسن نے کہا۔ "اور یہ بھی بتا دیا کہ رات کو دیر ہو جائے تو فکر مت کرنا۔ ہو سکتا ہے ہم ٹیکسی کو دو دن استعمال کریں۔"

"اگر ہم لوٹ کر ہی نہ آئے۔" میں نے کہا۔ "یا کسی وجہ سے بھاگنا پڑا تو ٹیکسی کیسے واپس کریں گے اور اگر اس معرکے میں ٹیکسی بھی کام آ گئی تو کیا ہو گا۔"

"اسے قیمت دے دیں گے۔ آئی کو وہ اس سے بہتر حالت کی گاڑی خرید لے۔" محسن بولا۔ "ویسے ہم واپس آئیں گے۔"

میں نے سر ہلا کے اس کے یقین کی تائید کی۔ "اب آپ خواتین ذرا میلاد چیک کا لباس بدل کے آئیں۔" میں نے کہا۔

جب وہ دونوں میلے بدوضع اور انتہائی میلے کپڑے پہنے، اور سر پہ نہایت واہیات طریقے سے دوپٹہ ڈالے واپس آئیں تو ہنستے ہنستے میری اور محسن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رابعہ نے مجھے تھوڑا سا جھک کر اپنی چال بھی دکھائی اور بدلی ہوئی آواز بھی سنائی۔ پھر ہم نے وردیاں زیب تن فرمائیں۔ ان کی حالت بھی بہت زیادہ اچھی نہیں تھی۔

"تم پر تو کسی ویٹر کی وردی جچتی ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"ہاں، کیونکہ میں واقعی ویٹر ہوں، انتظار کرنے والا۔" میں نے سینے پہ ہاتھ رکھ کے اور آنکھیں بند کر کے انتہائی عاشقانہ انداز میں کہا۔ "کتنے جنم بیت چکے تمہارے انتظار میں مگر یہ ویٹر پھر بھی انتظار کر رہا تھا۔" رابعہ کا رنگ لال ہو گیا۔

"ہم سب ویٹر ہیں، انتظار کر رہے ہیں۔" محسن نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا۔ "اپنی اپنی امیدوں کے بر آنے کا۔ اچھے اچھے خوابوں کی تعبیر ملنے کا۔ دنیا کا ہر شخص ویٹر ہے۔ کسی نہ کسی کا انتظار کر رہا ہے، وقت کا، خوش قسمتی کا، اس محبوبہ کا جو رقیب رو سیاہ کے چھ بچوں کی ماں بن چکی ہے۔ گاڑی فلائٹ ہونے کا۔"

"ان دونوں کو موقع ملنا چاہیے۔ ایک مدبر لگتا ہے تو دوسرا گرو لگتا ہے۔" رابعہ نے ہنستے ہنستے نازو سے کہا جو خود بھی ہنس رہی تھی۔

"یہ گاڑی کے لیٹ ہونے کی کیا بات ہوئی؟" [illegible]

"وہ ہے ایک لطیفے کی بات۔" [illegible]

وہ بولا۔ "ایک سردار صاحب میرے دوست ہیں [illegible] رہے ہیں۔ ایک خاص وقت پر گھر سے [illegible] تقدیر کو کوستے نکل آتے۔ بالآخر ایک دن [illegible] پا کر یہ پکڑ کیا ہے۔ سردار جی نے سر پہ ہاتھ مار کے کہا [illegible] تقدیر کا ہے۔ کمال ہے جو گاڑی ایک منٹ لیٹ ہو جاتی [illegible] تھی، میں ایک سیکنڈ ہی تھا جب میں پورے دن کی تفصیل میں مسلسل [illegible] ہے اور اتنی دیر میں ٹرین آنے سے اس کے غصے کا [illegible] ہو جاتا تھا۔ ٹرین کے گزر جانے کے بعد باقی [illegible] نظر آتا تھا۔"

"مسٹر سینسر" رابعہ نے جلا کے کہا۔ "تم اپنی بات کو سردار جی سے منسوب کرتے ہو۔"

"چلو بھئی اب تیاری پکڑو۔" میں نے فوراً مداخلت کی۔ "سب کی ہنسی بند ہونی ہے۔ آپ دونوں لڑکے کے پاس [illegible] سائیلنسر والا ریوالور ہو گا۔ اسے کہاں محفوظ طریقے سے چھپایا جا سکتا ہے۔ یہ آپ دونوں کا مسئلہ ہے۔ ہم لوگ آپ کے ساتھ نہیں جا رہے ہیں۔ آپ دونوں پہلے نکلیں اور کسی [illegible] سے بات کریں۔ وہ آپ کو گامے تک [illegible] میرا مطلب ہے، گامے شاہ کی درگاہ تک پہنچانے کے بس ہمیں ہی پہنچانا ہے۔ آگے کیا کرنا ہے، یہ میں آپ کو سمجھا چکا ہوں۔ سب کچھ آپ دونوں کی اداکاری اور حاضر دماغی پر منحصر ہے۔"

"تم لوگ کتنی دیر میں پہنچ جاؤ گے؟" رابعہ نے کہا۔

"میرا اندازہ ایک گھنٹے کا ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر ہماری توقعات کے مطابق ہوا تو ہم دو گھنٹے کے اندر [illegible] دیر بھی ہو سکتی ہے۔ تم گامے ماچھی کو اور اس کے [illegible] ہو سکتا آپ رکھو گی۔ گن پوائنٹ پر انھیں کھڑا رکھنا اور ہماری [illegible] کی آواز سن کر آہستہ سے راستہ کھول دینا۔" ہم پہلے دروازے [illegible]

ٹیکسی کی ڈرائیونگ محسن نے سنبھالی [illegible] میں رہا اور نیک محمد پیچھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم [illegible] کو گامے ماچھی کے اڈے سے سو گز کے فاصلے پر روک [illegible] گھنٹے میں ٹھیک ایک بجے پہنچا اور ہم نے برستے [illegible] رابعہ اور نازو کو ٹیکسی سے اتر کے درگاہ کی جانب بڑھتے [illegible] میری نگاہ دروازے پر گئی جس میں سے لوگ آ جا رہے [illegible]

مجھے جب میں اسے دیکھ رہا تھا اس کی اور میری وہ شخص صورت آشنا لگا اور میں اس وقت ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے اس شخص سے بہت قریب تھا۔ ہم اپنی ٹیکسی میں بیٹھے تھے اور درمیانی فاصلہ ڈیڑھ دو سو گز کے درمیان تھا۔ چنانچہ اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ وہ شخص مجھے پہچان لے گا۔ ایک تو میں وردی میں تھا اور میرے سر پہ جو پی کیپ تھی وہ میرے آدھے چہرے کو چھپا لیتی تھی۔ پھر یہ کہ میرا چہرہ کھڑکی کے شیشے کے پیچھے تھا۔ اس کے برعکس وہ پوری روشنی میں تھا اور اس کی صورت کو میں ہر پہلو سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے باوجود میرے دل میں بیٹھا ہوا خوف مجھے پریشان کرنے لگا۔

"یار محسن! اب اچانک مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ ہم نے دونوں لڑکیوں کو اکیلا بھیج کر اچھا نہیں کیا۔" میں نے کہا۔

"دونوں اور اکیلی؟" محسن دانت نکال کر بولا۔ "یہ تو وہی بات ہوئی کہ چور اور لاٹھی دو۔ میں اور بابو اکیلے۔"

"ان کے ساتھ شمولا ہوتی تو یہ تینوں کو اکیلا مان لیتا سکندر بادشاہ۔" نیک محمد بولا۔

"بات مذاق کی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس شخص کو غور سے دیکھو جو گامے شاہ کے مزار کی عمارت کے بڑے دروازے پر کھڑا ہے۔ اس کے تیور خطرناک ہیں۔"

"اس کا مونچھوں کو بل دینے کا انداز بھی خطرناک ہے۔ اس کی مونچھیں بھی خطرناک ہیں۔" محسن بولا۔ "مگر یہ تو سارا مشن ہی خطرناک ہے۔ اس میں کسی ایک آدمی کے خطرناک ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیا تمہیں اس کا چہرہ جانا پہچانا محسوس نہیں ہوتا؟" میں نے کہا۔

"مجھے اور تمہیں ہر رسی اگر سانپ نظر آتی ہے تو قصور ہماری نظر کا نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس شخص سے ہماری سابقہ ملاقات انتہائی غلط حالات میں ہوئی تھی۔"

"حالات اس وقت بھی سازگار نہیں ہیں۔" محسن نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ... کہ ہم میں سے کسی کو ان کے ساتھ رہنا چاہیے۔" میں نے اترنے کی نیت سے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔" محسن نے میرا بازو تھام لیا۔ "اندر [illegible] تم ان کی طرح داخل نہیں ہو سکتے۔ اس نے تمہیں شناخت کر لیا تو سارا پلان چوپٹ ہو جائے گا۔ وہ ہوشیار ہو جائیں گے۔"

"اگر نیک محمد چلا جائے؟" میں نے قائل ہو کر مایوسی سے کہا۔ "اسے کون پہچانتا ہے؟"

"میں... میں اکیلا کچھ نہیں کر سکوں گا سکندر بادشاہ۔ یہی بات ہے کہ ہم تمہارے کہنے پر توپ سے لڑ جائیں مگر خود اپنی عقل سے کام لینا پڑے تو ساری ہوشیاری دھری رہ جاتی ہے۔" نیک محمد نے خفت اور عاجزی کے ساتھ اعتراف کیا۔ "یہ نہ ہو کہ بنا بنایا کام بگڑ جائے۔"

"اب منصوبے میں کوئی تبدیلی ہوئی تو کنفیوژن پیدا ہو گا۔" محسن نے کہا۔ "بس اب آگے چلو۔"

ابھی دل اور دماغ کی کشمکش جاری تھی کہ محسن نے ٹیکسی کو آگے بڑھا دیا۔ پندرہ منٹ کے بعد اس نے سڑک کو چھوڑ کر سیدھے ہاتھ پہ کچا راستہ اختیار کیا جو تانگوں، بیل گاڑیوں اور موٹروں کی آمد و رفت سے مٹی مٹی ہو رہا تھا۔ راستے کی چوڑائی اتنی تھی کہ ایک وقت میں اس پر سے ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ چنانچہ سامنے سے تانگا نمودار ہوا تو محسن کو ٹیکسی انتہائی بائیں طرف کرنا پڑی۔ اس کے دو پہیے ایک کھیت کی منڈیر پہ چڑھے اور دو نیچے راستے پہ۔ اس سے ٹیکسی بہت زیادہ ایک طرف جھک گئی تھی۔ گھوڑے کی ہر ٹاپ کے ساتھ گرد اڑتی تھی۔ تانگا گزر گیا تو محسن نے ایک دم کچھ دبا کے ایکسلریٹر دبایا اور انجن گرجا تو پیچھے دھول کا بادل سا اٹھا۔ تانگے والے نے ہماری شان میں کیا ارشاد فرمایا، یہ ہم کافی آگے نکل جانے کی وجہ سے نہ سن سکے۔ ہم اب ایک خاصی چوڑی گلی میں داخل ہو چکے تھے۔

"راستہ تو وہی ہے لیکن مجھے بہت سی تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں۔" محسن نے کہا۔

"تبدیلی تو ایک قدرتی امر ہے۔ بہت سے مکانات نئے بنے ہیں اور پرانے مکانات کا نقشہ تبدیل ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں اس مسجد کو پہچان رہا ہوں۔ یہ بھی بہت پھیل گئی ہے۔"

"اس سے آگے دائیں طرف جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "گیراج سامنے آئے گا۔"

گیراج کا بیرونی احاطہ موڑ کاٹتے ہی نظر آ گیا۔ محسن نے فوراً ٹیکسی کو روک لیا اور نیچے اتر کے بونٹ اٹھا دیا۔ چند منٹ وہ اس کے اندر گھسا انجن کا معائنہ کرتا رہا۔ پھر میں بھی اتر گیا اور میں نے اس کی مدد کی۔ میں نے ڈسٹری بیوٹر کیپ کھولا

www.paksociety.com

اور محسن نے اس کے اندر گھومنے والا "روٹر" نکال لیا۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس پر ایک پتھر سے ضرب لگائی۔ روٹر کے دو حصے ہو گئے۔ ہم یہی چاہتے تھے۔ دونوں حصوں کو آپس میں ملا کے میں نے پھر ڈسٹری بیوٹر کیپ کے اندر لگا دیا لیکن اس کا اپنی جگہ پر ٹھہرنا محال تھا۔ میں نے کیپ بند کی اور محسن نے بونٹ گرا دیا۔ اب ٹیکسی کے اسٹارٹ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اناڑی ڈرائیوروں کی طرح محسن نے اگنیشن سوئچ کو آن کیا اور سیلف کو گھماتا رہا۔ بیٹری کہاں تک ساتھ دیتی۔ ذرا سی دیر میں سیلف کے گھومنے کی رفتار کم ہو گئی اور کاربوریٹر میں بہت زیادہ پٹرول آ گیا۔ 'اوور' ہو جانے سے پٹرول کی بو آنے لگی۔ اب اگر بیٹری میں جان ہوتی تب بھی گاڑی دھکا لگائے بغیر اسٹارٹ نہیں ہو سکتی تھی لیکن محسن نے سیلف کو گھمانے کا عمل جاری رکھا۔ یہاں تک کہ بیٹری ڈسچارج ہو گئی اور ریڈی ایٹر کا پنکھا آخری بار تھوڑا سا ہل کے ساکت ہو گیا۔ اگنیشن سوئچ میں چابی گھمانے سے اب کٹ کٹ کی آواز سنائی دیتی تھی اور ہارن کا بٹن دبانے سے ایک بیٹھی ہوئی بے سُری اور مضحکہ خیز آواز نکلتی تھی۔

سر ہلا کے ہم نے ایک دوسرے سے "اوکے" کہا اور ہمارے اشارے پر نیک محمد بھی نیچے اتر آیا۔ اس نے پیچھے سے گاڑی کو دھکیلنا شروع کیا اور محسن کے ساتھ مل کر میں نے کھلی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر زور لگایا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو بھی کنٹرول کیا اور بیس منٹ کی سخت مشقت کے بعد ہم ٹیکسی کو گیراج کے بیرونی احاطے تک لے گئے۔ دوپہر کا سورج ڈھل چکا تھا چنانچہ دھوپ ہمارے چہروں پر سیدھی پڑ رہی تھی۔ نیچے زمین ناہموار تھی اور گرد میں آدھے دھنسے ہوئے پہیوں والی گاڑی کو دھکا لگانے میں دگنا زور صرف ہوتا تھا۔ گیراج کے بیرونی احاطے کی دیوار اتنی ہی بلند تھی جتنی جیل کی مگر اس کے اوپر پانچ پانچ گز کے فاصلے سے اینگل آئرن کے پول کھڑے کر دیے گئے تھے۔ پولوں کی بلندی تین فٹ تھی اور اس سے اوپر کا حصہ باہر کی جانب تقریباً ایک سو دس درجے کے زاویے پر مڑا ہوا تھا۔ اس مڑے ہوئے حصے کی لمبائی ایک فٹ تھی۔ خاردار تاروں کی تین قطاریں ایک دوسرے کے متوازی اور آپس میں ایک فٹ کا فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی چلی گئی تھیں۔ پولوں کے باہر کی جانب جھکے ہوئے حصے پر ایسی دو قطاریں تھیں چنانچہ ان کا درمیانی فاصلہ چھ انچ رہ گیا تھا۔ اتنا زبردست حفاظتی نظام خود شکوک کو دعوت دیتا تھا۔ گیراج کوئی ٹکسال یا سرکاری خزانہ، جیل یا انتہائی اہم اور ٹاپ سیکرٹ سرکاری ادارہ [illegible] جہاں مداخلت بے جا کو جرم تصور کیا جائے۔

"کیا ان تاروں میں کرنٹ بھی ہوگا؟" نیک محمد نے [illegible] ہانپتے ہوئے سر اٹھایا۔

"اگر ہو تو مجھے تعجب نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "تصدیق کے لیے تم کسی تار سے جھول کے دیکھ لو۔"

"ارے سکندر بادشاہ کیوں اس دنیا سے [illegible] ہو۔" نیک محمد بولا۔ "ابھی تک تو کسی کا برا بھی نہیں [illegible] ہم نے۔"

فصیل نما احاطے کی دیوار کے وسط میں لوہے کا بڑا گیٹ تھا جو کھلا ہوا تھا اور اندر پانچ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک بس تھی جس کے چاروں ٹائر غائب تھے۔ ڈھانچہ اینٹوں کے سہارے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے نیچے [illegible] نوجوان لیٹے ہوئے کچھ کر رہے تھے۔ دوسرا ٹرک تھا جو سب سے الگ کھڑا ہوا تھا اور بظاہر اس میں کسی خرابی کا [illegible] نظر نہیں آتا تھا کیونکہ ٹرک نیا تھا۔ ایک کار [illegible] رہا تھا اور اس کی حالت قبر سے نکلے ہوئے ڈھانچے [illegible] لگتی تھی کیونکہ آگے پیچھے کی تمام لائٹس، بمپر اور شیشے لے لیے گئے تھے۔ اس کی باڈی پر سلیٹی سا رنگ تھا جسے کم عمر لڑکے پانی ڈال کے ریگ مال سے گھسنے میں [illegible] تھے اور بار بار اس کی ہموار سطح پر ہاتھ پھیر کے دیکھتے تھے۔ ورکشاپ میں نظر آنے والے حصے کے مقابل ایک [illegible] بونٹ آگے سے اٹھا ہوا تھا اور دوسری کا پچھلا [illegible] گاڑی فاکس ویگن تھی مگر اس کا انجن غائب تھا اور [illegible] اوور ہال کرنے کے لیے نکال لیا گیا تھا۔ ان دونوں گاڑیوں پر کوئی بھی کام نہیں کر رہا تھا۔

ہم نے ٹیکسی کو ٹرک اور ورکشاپ کے درمیان روکا۔ ہمارے قدموں کی آواز اور ٹیکسی کے [illegible] برآمد ہونے والی فریاد و فغاں نے بس کے نیچے لیٹے نوجوانوں کو متوجہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنے منہمک تھے کہ انہیں گرد و پیش کی خبر نہ ہوتی۔ ان میں سے [illegible] تھا وہ سگریٹ پی رہا تھا اور شکل سے سولہ سال کا تھا مگر تیور بتاتے تھے کہ اپنے آپ کو بدمعاش ظاہر کر کے [illegible] حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا بیس پچیس سال کا [illegible] صورت مکینک تھا۔

"کیا بات ہے جی، حکم کرو۔" بڑے لڑکے نے کہا۔

"حکم صرف بڑے موتیاں والیو کہ اس گاڑی [illegible]

[illegible] نیک محمد بولا۔ "او جی! اس نے اب نہیں چلنا۔ [illegible] اتنی عمر میں تو بندہ بھی فوت ہو جاتا ہے۔"

اس کے جواب سے یوں محسوس ہوا جیسے ٹیکسی واقعی ستر اسی برس پورے کر چکی ہے۔ "تم اس عمر میں بے شک فوت ہو جانا لیکن ٹیکسی نے کا کا۔" نیک محمد نے خفگی سے کہا۔

"استاد کدھر ہے تمہارا؟" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ورنہ دونوں کی زبانی جنگ بڑھ جاتی۔

دوسرا جوان آگے بڑھا۔ "جی بتاؤ جی کیا ہوا ہے؟"

"[illegible] گاڑی چل نہیں رہی ہے۔ اسے چالو کر دو۔" میں نے کہا۔ نوجوان نے بونٹ کھول کر انجن کا ایک نظر میں جائزہ لیا۔ پلگ ہلا کے دیکھے۔ کوائل اور کنڈنسر کے تار چیک کیے اور محسن سے کہا کہ وہ گاڑی اسٹارٹ کرے۔ محسن نے تعمیل کی مگر پنکھا تھوڑا سا ہل کر رک گیا۔ مکینک نے بڑی مایوسی کا اظہار کیا کہ بیٹری بالکل گل ہو گئی ہے، [illegible] کیسے چیک کی جائے۔

میں نے اتنی دیر میں گرد و پیش کا جائزہ لے لیا تھا۔ احاطہ دو کنال کا تھا۔ ورکشاپ اس کے دائیں جانب دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ تو وہی عارضی سا شیڈ تھا جس کی دیواریں بھی لکڑی کی تھیں اور جس پر ٹین کی چھت تھی۔ دونوں زیر مرمت کاریں اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔ دوسرا حصہ چھوٹے ہوائی جہازوں کے ہینگر کی شکل کا تھا مگر اتنا بڑا نہیں تھا۔ یہ اینٹوں کی پختہ عمارت تھی جس کی دو دیواریں پندرہ فٹ اونچی اور بیس تیس فٹ لمبی تھیں۔ پچھلی طرف سے اس کی دیوار وہی تھی جو بیرونی فصیل پر اٹھائی گئی تھی اور اس طرح یہ ہینگر ایک کونے میں سما گیا تھا۔ مجموعی طور پر ورکشاپ اور ہینگر نے احاطے کا نصف کے قریب حصہ گھیر رکھا تھا۔ ہینگر کے سامنے والا حصہ جو بھاری بھرکم لوہے کے گاڈروں پر مشتمل تھا، لوہے کی موٹی چادر پر اینگل آئرن کو ویلڈ کر کے بنائے گئے تھے اور اس وقت مقفل تھے۔ انہیں کھولنے کا نظام عام دروازوں کی طرح نہیں تھا۔ پندرہ فٹ چوڑے دونوں پھاٹک دھکیل کر ادھر سے ادھر کیے جا سکتے تھے اور فرش کی ریلنگ پر چلتے تھے۔ احاطے کا دوسرا حصہ بالکل مخالف سمت میں تھا اور رہائش کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ یہ بات بلاشک و شبہ کہی جا سکتی تھی کہ [illegible] تک جانے والا زیر زمین راستہ اسی مقفل ہینگر میں تھا۔

"[illegible] کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا، استاد کو بلاؤ۔" محسن نے مکینک کو ڈانٹا۔

"بیٹری گل ہے تو استاد بھی کیا کرے گا۔" مکینک نے اپنی سبکی کو نظر انداز کر دیا مگر استاد کا وقار بلند رکھا۔ "وہ چھوٹا کام نہیں کرتا۔"

"چھوٹے کام کے بچے، وہ دوسری بیٹری لگا کے نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے ایک دم گرج کر کہا۔ "اتنی گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں۔ سب میں بیٹری ہوگی۔ پھر لگا دینا [illegible]"

مکینک پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے چھوٹے کی طرف دیکھا اور استاد کو بلانے کے لیے رہائشی مکان کی طرف چل پڑا۔ میں نے استاد کو گھر کے دروازے پر لٹکنے والا ٹاٹ کا پردہ ہٹا کے باہر آتے دیکھا۔ معلوم نہیں مکینک نے اسے کیا بتایا کہ وہ سر ہلا کے تیز تیز قدم اٹھاتا ہماری طرف آیا۔ وہ درمیانے قد لیکن مضبوط جسم کا آدمی تھا جس نے ڈھیلی ڈھالی اور میلی سفید جرسی کے ساتھ براؤن رنگ کی گرم پتلون پہن رکھی تھی۔ میں بے نیازی سے مخالف سمت میں دیکھتا رہا۔ اصل مقصد اسے اپنا چہرہ نہ دکھانا تھا۔ استاد نے کسی سے بات کیے بغیر انجن کو دیکھا اور پھر شاگرد محترم کے ایک تھپڑ رسید کیا جو اس کی گدی پر پڑا۔

"حرام خور، لیس تار دیکھ لیے اور کام ختم۔ یہ ڈسٹری بیوٹر کیپ تیرا باپ کھولے گا؟" استاد نے کہا اور جھٹ سے کلپ ہٹا کے کیپ کا اوپر والا حصہ الگ کر دیا۔ "یہ دیکھو۔" اس نے سینئر اور مظلوم صورت شاگرد کے دوسرا ہاتھ بڑی پھرتی سے مارا جس کے لیے وہ بالکل تیار نہیں تھا۔ "کیا ہے یہ، بھوتر کو دیکھ، یہ گاڑی چل سکتی ہے؟" پھر وہ محسن سے مخاطب ہوا جو اس کے بالکل سامنے آ گیا تھا۔ "یہ چیز لے آئیں۔ شہر ہی سے ملے گی۔" وہ ٹوٹے ہوئے روٹر کے دونوں حصے محسن کو تھما کے بولا۔

"ارے استاد، ان میں سے کسی گاڑی کا روٹر ڈال دو۔" محسن نے کہا۔

"وہ میرے باپ کی گاڑیاں نہیں ہیں۔ اگر کسی میں کیپ کا سائز بھی ہوا تب بھی گاہک کے ساتھ بے ایمانی [illegible]"

"بے ایمانی کیسی استاد۔" محسن نے خوشامدانہ انداز اختیار کر لیا۔ "تم بعد میں نیا منگوا کر لگا دینا۔ پیسے ہم سے لے لو، آنے جانے کے بھی مگر ہمارا کام کر دو۔"

استاد نے اضافی منافع کے امکان پر غور کیا اور محسن پر رحم کھاتے ہوئے سر ہلایا۔ "دیکھو! اس فاکسی کے انجن میں سے روٹر لگا دے، اسے لگاؤ تو بھی کھول کر باندھنے میں گھنٹہ لگے گا۔"

www.paksociety.com

استاد کو اس سے زیادہ کچھ کہنے کی مہلت دینا بے سود تھا۔ اصل مقصد یہ جاننا تھا کہ ضرورت پڑنے پر ہم کس گاڑی کی کیپ سے سامان پُرزہ نکال کے اپنی ٹیکسی کو رواں کر سکتے ہیں۔ میں نے اطمینان سے اپنا ریوالور نکالا اور استاد کی پشت سے لگا دیا۔ سامنے سے محسن نے یہی حرکت کی اور کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے نیک محمد نے تیسری طرف پوزیشن سنبھال لی جہاں دو بچے کار کی گھسائی میں مصروف تھے۔ ان دونوں کے ہاتھ رک گئے اور ان کی صورت پر خوف سے زیادہ حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ یہ خطرناک کھلونا اس سے قبل انہوں نے صرف فلموں میں استعمال ہوتے دیکھا تھا لیکن یہاں نہ مار دھاڑ ہو رہی تھی اور نہ کوئی ایسی صورت حال نظر آئی تھی کہ سچ مچ کے ریوالور نکال لیے جائیں۔ میں نے اس وقت استاد کی صورت کو غور سے دیکھا۔ اس کی صورت بھی اجنبی نہیں تھی مگر ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود مجھے یاد نہیں آیا کہ پہلے یہ صورت کب اور کہاں نظر آئی تھی۔ آدھے گھنٹے میں حافظے کا ساتھ نہ دینے کا یہ دوسرا واقعہ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ ولاور اینڈ کمپنی سے معرکہ آرائی میں مختلف مواقع پر ان کے ساتھ آنے والے بھی بہت سے تھے اور ان سب کے نام تک ہمیں معلوم نہ ہو سکے تھے۔ ان میں سے کچھ کو قضا لائی تھی کہ وہ رزقِ خاک ہوگئے اور دوبارہ نہیں ملے۔ یہ دونوں بھی ایسے ہی کرائے کے گوریلے یا حکم کے غلام تھے جو ولاور اینڈ کمپنی کی شیطانی بساط پر پیادوں سے زیادہ اہم نہیں تھے۔

"اس حرکت کا مقصد کیا ہے؟" استاد نے اپنی خود اعتمادی اور ظاہری حالت کے سکون کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"ہم بہت کچھ بے مقصد بھی کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کچھ لوگ بے مقصد جیتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "لیکن بے مقصد مرنا کوئی پسند نہیں کرتا۔ تم بھی نہیں چاہو گے۔"

"مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟" استاد نے غرّا کر کہا۔ اس کو اب یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ ہم اسے بے سبب قتل نہیں کریں گے۔ ہمیں یہی کرنا ہوتا تو اب تک تین طرف سے تین گولیاں اس کو چھید کر چکی ہوتیں۔ شاگردوں کے سامنے اس کو یہ بھی ثابت کرنا تھا کہ وہ واقعی استاد ہے اور ہر قسم کی خرابی سے نمٹ سکتا ہے خواہ وہ انجن کی ہو یا حالات کی۔

"سب سے پہلے تو تمہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم سب کے ہاتھوں میں جتنے ریوالور ہیں، اصلی اور ایک جیسے مہلک ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم تینوں کی صورت سے بھی اندازہ لگانے کی غلطی مت کرنا۔ ہم سب ایک جیسے بے رحم ہیں […] کے ساتھ کوئی رعایت کرنے کے قائل نہیں اور کسی […] کے بغیر گولی چلاتے ہیں۔ ہم سب کا نشانہ بھی خطا نہیں […]"

"اس فضول بکواس کا مطلب کیا ہے؟"

"انہیں یہ بتانا کہ ہم تمہیں قتل کرنے کے لیے یہاں آگئے ہیں مگر تم ہمارے ہاتھوں مرنا چاہو تو ہمارا […] کا مظاہرہ کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "اگر تم ویسا ہی کرو جیسا ہم کہیں گے تو کل بھی زندہ نظر آؤ گے۔"

"ویسے تو موت کا ایک دن معین ہے۔" محسن […] "تمہارے کیس میں وہ آج کا دن ہے تو اسے کون […] سکتا ہے۔"

"تمہارے یہ شاگرد دل عزیز تو بچے ہیں۔" میں […] "ان کو بھی سمجھا دو کہ دخل در معقولات نہ کریں۔ بہتر […] یہ رہتا کہ […] طور پر گیراج میں چلے جائیں اور […] ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں۔ منہ دیوار کی طرف […] سر سے اوپر۔"

استاد نے میری بات کو ظاہری بے نیازی کی […] اور سیدھا کھڑا رہا۔ اس کے شاگرد بھی ساکت و جامد […]

"تم ان سب کے سامنے پٹنا چاہتے ہو۔" میں نے […]

"ابھی اپنی عزت بچا سکتے ہو کیونکہ تم تین طرف سے […] اور ریوالور کا مقابلہ کوئی عقلمند آدمی نہیں کرتا جو […] ہاتھ ہو۔"

"تم اپنے عقلمند ہونے کا ثبوت تیس سیکنڈ میں […] سکتے ہو۔" محسن نے کہا۔ "ان سے کہو شرافت سے گیراج […] جائیں اور الٹے لیٹ جائیں۔ لیٹ کر ایک دوسرے […] گپ شپ کریں یا اخبار پڑھیں مگر آواز کا والیوم […] رکھیں کہ باہر کوئی کچھ نہ سنے۔"

"پہلے استاد کو خالی ہاتھ تو کر دو۔" میں نے […] کہا۔ "یہ خود کو مسیح سمجھتے ہوئے خواہ مخواہ موقع […] فرما رہے ہیں۔"

صورتِ حال پوری طرح ہمارے کنٹرول میں […] بڑے اطمینان کی بات تھی لیکن یہی اطمینان ایک غلط[…] سبب بن گیا۔ نیک محمد نے طے شدہ پروگرام کے مطا[…] اتنی دیر میں گیراج کا باہر والا گیٹ بند کر دیا تھا […] کی چپ بورڈ والی سطح پر چاک سے واضح الفاظ میں […] تھا "استاد کی زوجہ کے عقد کے باعث گیراج […]" جو بڑی فضول سی بات تھی مگر محسن کا خیال تھا کہ […] بھی کم فضول نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ اس نوٹس کے پڑھنے والے […] لوٹ جائیں گے اور اسے بالکل مذاق […] خاموشی سے […] ٹھیک ہونے والی گاڑی کو ریگ مال سے […] رگڑنے والے بچے قطعی بے ضرر تھے اور ہم نے انہیں اہمیت نہیں دی تھی مگر باقی دو سینئر شاگردوں کو سامنے رکھا تھا۔ […] یہ ہوئی کہ ہم نے انہیں استاد کے برابر خطرناک نہیں سمجھا اور میں اس وقت جب محسن نے میرے کہنے پر استاد کی جیب سے اسلحہ برآمد کرنے کے لیے قدم بڑھائے تھے، مظلوم صورت نظر آنے والے نوجوان نے بڑی پھرتی سے اچھل کے […] اس غیر متوقع حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے اڑ گیا۔ محسن لڑکھڑا کے پیچھے گیا اور نوجوان […] گرا کر اس سے پہلے ہی استاد نے ایک لات پیچھے کی طرف چلائی اور دوسرے پیر کی ایڑی پر گھوم کر میرے سامنے آنا چاہا۔ اس کا ہاتھ خود بخود ریوالور نکال چکا تھا مگر اس نوجوان نے محسن پر حملہ آور ہوتے ہی […] اور جسم کے خود کار […] سے پوری طرح مستعد ہو چکا تھا۔ نیک محمد نے دونوں […] کو للکارا اور پھر ایکشن […] کر لیا۔

میں نے ہاتھ کو استاد کی ٹانگ کی ضرب سے بچایا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹانگ کے پنجے کو گرفت میں لے لیا۔ ادھر استاد نے ایڑی پر گھومنے کی کوشش کی ادھر میں نے جھٹکا دیا اور استاد کا توازن بگڑ گیا۔ وہ منہ کے بل گرا۔ اس کے باوجود استاد نے پلٹ کر فائر کرنا چاہا لیکن میں اپنا ایک پیر اس کے ہاتھ پر رکھ چکا تھا۔ وہ درد سے کراہا۔

"بس استاد! اسے سجدۂ شکر سمجھو۔" میں نے کہا۔ "شاید خدا کو منظور نہیں تھا کہ تمہاری بیوی اس عمر میں بیوہ ہو اور تمہارے جتنے بھی بچے ہیں وہ یتیم کہلائیں لیکن یہ بالکل آخری موقع تھا۔ سو فیصد آخری۔"

محسن نے جھک کر ایک جھٹکے سے استاد کا ریوالور قبضے میں کر لیا۔ "استاد کہلاتے ہو تم۔ ایسے اناڑی پن کا ثبوت تو نہیں دینا چاہیے کہ ایک ہی جھٹکے میں چت ہو جاؤ۔ اور کتنا مال ہے تمہاری جیب میں؟" محسن نے ایک دم اس کی جرسی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ پیٹ کے قریب ایک نمایاں ابھار واضح طور پر کسی ریوالور کی موجودگی کا پتا دے رہا تھا۔

"شرم کرو دونوں کی...." استاد نے چیخ کر کہا۔ اس […] نے مجھے مشتعل نہیں کیا لیکن اس کے چلّانے کی وجہ […] ایک ہاتھ اس کے منہ پر ایک ماری۔ پلٹ کی تو اس کے جبڑوں […] اور وہ جیسے اس کے ہونٹوں کے کناروں سے خون رسنے لگا۔ محسن نے دوسرا ریوالور بھی اپنی پتلون کی دوسری جیب میں رکھ لیا۔

"میں نے تم کو خبردار کیا تھا کہ آواز باہر نہ جائے۔" میں نے کہا۔ "اس پستول کے فائر کی آواز بھی باہر نہیں جاتی۔"

"چلو بچو اندر۔" نیک محمد نے ان دونوں لڑکوں کو مخاطب کیا جو سہمے ہوئے کھڑے تھے اور گاڑی ریگ مال سے گھسنا بھول چکے تھے۔ انہوں نے فوراً ریگ مال کے ٹکڑے پھینک دیے اور سیدھے شیڈ میں جا کر الٹے لیٹ گئے۔

محسن نے استاد کے جانشین ہونے والے نوجوان کو چٹکی بجا کر متوجہ کیا۔ ان میں سے ایک نے جان پر کھیل کر نمک خوار ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے جانشینی کا مقابلہ بظاہر جیت لیا تھا اور زیادہ بہادر بننے والا اب زیادہ شرمندہ نظر آتا تھا کہ خود کو جانشین ثابت کرنے کا سنہرا موقع اس نے کچھ نہ کرکے گنوا دیا تھا۔

میں نے استاد کے مڑے ہوئے ہاتھ پر سے پیر کا وزن ہٹایا۔ وہ ایسی پوزیشن میں لیٹا ہوا تھا کہ کروٹ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ وہ زور لگاتا تو مونڈھے پر سے اس کا بازو اتر جاتا یا کلائی کے پاس سے ہاتھ ٹوٹ جاتا۔ وہ ہاتھ کو دباتا اور جرسی کی آستین سے منہ کو صاف کرتا اٹھا۔ سفید جرسی پر مٹی کا اور خون کا رنگ نظر آنے لگا۔

"اب ہماری گفتگو سننے والا کوئی نہیں رہا۔" میں نے کہا۔ "ہم تینوں کو تم ایک سمجھو۔"

"تم مار پیٹ کیے بغیر بھی اپنا مطلب بیان کر سکتے تھے۔" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

میں ہنس پڑا۔ "کیا واقعی تم شرافت کی زبان میں بات کر سکتے ہو؟ صورت سے تو ایسے نظر نہیں آتے مگر خیر! ابھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے جو سلوک تمہارے ساتھ روا رکھا وہ کس حد تک جائز تھا۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہاں سے منشیات اسمگل ہونے کے لیے جاتی ہیں۔"

"منشیات؟" وہ چونکا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو استاد۔"

میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کی ضرب لگائی۔ وہ پیچھے مڑ گیا۔ "دوبارہ خود کو میرا شاگرد مت کہنا۔ میری بے عزتی ہوتی ہے۔"

وہ اسی لب و لہجے میں بات کرنے کا عادی تھا اور میری برتری کو تسلیم کرتے ہوئے غیر شعوری طور پر اس نے مجھے استاد کہہ دیا تھا۔ میں اس کو ذہنی طور پر مرعوب رکھنا چاہتا تھا اور جسمانی طور پر مغلوب۔

www.paksociety.com

"میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ایک گیراج میں منشیات کا کیا کام؟" وہ پھر کھڑا ہو گیا۔

"یہی تو میرا بھی سوال ہے کہ ایک گیراج میں منشیات کا کیا کام؟" میں نے پھر اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "لیکن ابھی میں نے اس سوال کا جواب مانگا ہی نہیں تھا، سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ ورنہ تھپڑ کے مقابلے میں میری کک سے زیادہ چوٹ آئے گی۔"

"ہاتھ میں ریوالور لے کر بہادری کے دعوے کرنا کوئی بہادری نہیں ہوتی۔" وہ اٹھ کر بولا۔

میں نے ریوالور محسن کی طرف اچھال دیا جو اسے کیچ نہ کر سکا کیونکہ پہلے ہی اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا۔۔۔ بلکہ خود ہی گیراج میں چلا گیا تھا اور چاروں فرش خاک پر لیٹے ہوئے جنگی قیدیوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ محسن نے خود ہی جھک کر زمین پر گرنے والا ریوالور بھی اٹھا لیا۔ اب وہ ریوالور اس کی جیب میں تھا اور دونوں ہاتھوں میں بھی دو ریوالور تھے۔

"میں یہ عرض کر رہا تھا استاد صاحب۔" میں نے دونوں ہاتھوں کو رگڑ کر پھونک ماری۔ "کہ یہاں سے کئی بار ایک ٹرک کو جاتے دیکھا گیا ہے جس میں اوپر زرعی آلات اور مشینری کے پرزے ہوتے ہیں لیکن نیچے والے کریٹ منشیات سے بھرے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک ٹرک لے کر رحمت کباڑی اور عطا فور روانہ ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک کلینر چھوٹو بھی تھا۔ اس ٹرک کا نمبر بھی بتا سکتا ہوں میں لیکن آدمی اور نمبر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ شاید تمہیں معلوم ہوگا کہ اس ٹرک کا کیا حشر ہوا تھا۔ زیادہ افسوس ان دو افراد کے انجام پر ہونا چاہیے۔ رحمت کباڑی اور عطا فو کیسے مارے گئے تھے، کیا یہ تم نہیں جانتے؟"

استاد کا رنگ متغیر ہو گیا۔ "میں کسی کو نہیں جانتا۔ خدا کی قسم میں نے یہ نام پہلی بار سنے ہیں۔"

میں کچھ دیر اس کی صورت کو دیکھتا رہا۔ "ہم جھوٹ کو سچ سے الگ کرنا جانتے ہیں۔ اس میں آدمی کو اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے جتنی ناخن کو گوشت سے جدا کرنے میں ہوتی ہے۔ کیا تم اس محاورے کا مطلب سمجھتے ہو؟"

استاد نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم آدمی ہی نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہوتا ہے کہ رشتے توڑے نہیں جا سکتے لیکن سر توڑے جا سکتے ہیں تو رشتے کیوں نہیں توڑے جا سکتے فرض کرو ابھی میں تمہارے سب سے بڑے بیٹے یا بیٹی کو منگوا لوں۔۔۔"

استاد نے ایک دم مجھ پر حملہ کیا۔ وہ میری طرف آیا اور میں نے اسے ایک قدم پیچھے اور تھوڑا سا دائیں ہو کر جھکائی دے دی۔ ایک قلابازی کھا کے وہ پیچھے گرا مگر بل کھا کے پھر اتنی تیزی سے اچھلا جس کی مجھے امید نہ تھی۔ اس نے میرے قدم اکھڑتے ہی پے در پے وار کیے۔ اسے نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن وہ کراٹے جانتا تھا۔ اس کی ہتھیلی کی ضرب سے میرے دونوں بازو شل ہو گئے۔ اس نے لات گھمائی جو میری ٹانگ پر گھٹنوں سے اوپر لگی۔ میں گیا اور وہ اچھل کر میری پسلیوں میں کک مارنے لگا۔ میں پلٹا کھایا اور دوسری ٹانگ گھمائی۔ لات اس کے پیٹ پر پڑی اور ایک لمحے کے لیے اس کا منہ پورا کھل گیا کیونکہ وہ سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے بازوؤں کی توانائی واپس ہو گئی تھی۔ وہ گر کے پھر اٹھا ہی تھا کہ میں نے اسے لیا۔ چند منٹ میں اس کو اندازہ ہو گیا کہ مجھے چیلنج کرتے وقت اس نے اپنی صلاحیت کو بہتر اور میری صلاحیت کو بہت کمتر سمجھنے کی غلطی کی تھی اور خالی ہاتھ بھی میں اس کے مقابلے میں بہت زیادہ خطرناک ہوں۔ اب اس کے لیے اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے اس کو مارا نہیں تھا، جسمانی گزند نہیں پہنچایا تھا اور اس کی ہڈیاں سلامت چھوڑ دی تھیں مگر پھر بھی وہ واویلا کر رہا تھا جیسے کسی نے اس کو ایک گھنٹے تک شکنجے میں ڈال کے رکھا ہو۔

"تو بات تھی ناخن سے گوشت کے جدا ہونے کی۔" میں نے اطمینان سے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھے۔ "اگر تمہارے بیوی، بچے تم سے جدا کر دیے جائیں تو کتنی تکلیف ہوگی اور اس کے بعد ہم تمہارے سامنے پہلے ان کے گوشت سے ناخن جدا کریں تو تکلیف سے زیادہ چلاؤ گے تم یا تمہاری بیوی یا تمہارے بچے؟"

"دیکھو میں ان بچوں کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ کچھ نہیں جانتا۔" وہ بری طرح کانپنے لگا۔ "میں رحمت کباڑی یا عطا فو کے انجام کے بارے میں نہیں جانتا۔ میں چھوٹو کو جانتا ہوں۔"

"کون ہے چھوٹو؟"

"وہ اس ٹرک ڈرائیور کے ساتھ رہتا ہے جو اس ٹرک کو لے جاتا ہے۔" استاد نے کہا۔

"اس ٹرک ڈرائیور کا نام بتاؤ۔" محسن نے کہا۔

"اس ٹرک کا ڈرائیور کوئی ایک نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "ہر مرتبہ ٹرک ڈرائیور نیا آدمی ہوتا ہے۔"

لوگو! کامے ابھی یا چوہدری دلاور کا نیا طریقہ واردات ہے۔ میں نے سوچا۔ ہر بار آدمی بدلنے سے اتنا فائدہ یقیناً ہوتا ہے کہ کسی کو واقف راز ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ پرانے ڈرائیور صرف اس لیے مارے گئے کہ وہ کچھ جان گئے تھے اور ان کا قابل اعتماد ہونا بھی بالآخر نقصان دہ ثابت ہوا تھا۔ یہ زیادہ محفوظ اور آسان طریقہ تھا کہ کسی ضرورت مند اور بے وقوف اور بے خبر ڈرائیور سے ایک ٹرک کو کراچی تک لے جانے کا سودا کر لیا جائے۔ اگر وہ سلامتی کے ساتھ پہنچ جائے تو اس کو توقع سے زیادہ معاوضہ ادا کر دیا جائے، وہ پکڑا جائے تو کچھ نہ بتا سکے۔

"تمہارا اپنا نام کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"برکت۔" وہ بولا۔ "مگر تم لوگ کون ہو؟ پولیس کے آدمی؟"

"تمہیں کوئی سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔" میں نے غرا کے کہا۔ "استاد برکت، یہ ٹرک جو اس وقت بھی یہاں کھڑا ہوا ہے، یہ روانہ کب ہوگا؟"

"جب چھوٹو آئے گا، کسی ڈرائیور کو لے کر۔" وہ بولا۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ "تم نے بھی تو ڈرائیور فراہم کیے ہوں گے۔ تمہارا گیراج ہے۔"

"ہاں۔ دو۔۔۔ تین ڈرائیور تھے ایسے جن کو کام کی ضرورت تھی۔ میں نے ان کی سفارش کر دی تھی۔"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ تینوں کون تھے اور اب کہاں ہیں؟"

"وہ خود میرے پاس آئے تھے۔ میں کبھی ان کے پتے ٹھکانے پر نہیں گیا۔ وہ میرے دوست تو نہیں تھے۔" برکت بولا۔

"تم شروع سے اس گیراج کے مالک نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "پہلے یہ گیراج کس کا تھا؟"

"پیڈرو نام کا ایک شخص تھا، استاد پیڈرو کہلاتا تھا۔ میں نے اسی سے لیا تھا۔" وہ بولا۔

"استاد پیڈرو۔" میں نے فاتحانہ نظروں سے محسن کی طرف دیکھا۔ "چوڑی ناک، مسکراتیوں جیسے بال، کانوں میں مندریاں؟"

"تم۔۔۔ تم کیسے جانتے ہو اسے؟"

"تم نے پھر سوال کیا! یہ آخری بار معاف کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگلے سوال کے جواب میں دانت توڑ دوں گا۔ یہ بتاؤ کہ تم نے یہ گیراج کتنے میں لیا تھا اور کب لیا تھا؟"

"تقریباً دو مہینے پہلے۔ اس کا صرف کرایہ دیتا ہوں میں۔" برکت نے کہا۔ "صرف چار سو روپے مہینہ۔"

"صرف چار سو روپے مہینہ! اتنا تو تم روز کماتے ہو گے۔" میں نے کہا۔ "اتنا کم کرایہ لینے کی کوئی وجہ تو ہوگی؟"

"وجہ۔۔۔ وجہ کیا، اس کی مرضی۔" برکت نے کہا اور میں نے اس کی اچھی طرح پٹائی کی۔ اسے میں نے تین بار زمین سے اٹھایا اور اس کے منہ پر اور پیٹ پر مکے مارے۔ وہ نیم جان ہو گیا۔

"وجہ یہ تھی استاد برکت کہ استاد پیڈرو نے ایک چھوٹی سی شرط رکھی تھی۔" میں نے کہا۔ "شرط یہ تھی کہ کبھی کبھی ان کے ٹرک پر یہاں سے سامان لوڈ ہوگا۔" میں نے ریپنگ ٹاٹ، پیپر کی طرف اشارہ کیا۔ "اور تم اعتراض نہیں کرو گے بلکہ اس کا ذکر بھی نہیں کرو گے۔ یہ پیپر کے بدستور انہی کے قبضے میں رہے گی، یہی شرط تھی نا؟"

استاد برکت نے بڑی مشکل سے اقرار میں سر ہلایا۔

"اس دروازے کو کھولو۔" میں نے اسے پیروں پر کھڑا کر کے حکم دیا۔

"میں۔۔۔ میں کھولوں۔۔۔" وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ "کیسے کھولوں؟ اس کی چابی چھوٹو کے پاس ہوتی ہے۔"

"تمہارے گیراج میں گاڑیوں کی ڈینٹنگ پینٹنگ بھی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈینٹنگ کے لیے ویلڈنگ ٹارچ ضروری سامان میں شامل ہے۔ اس سے وہ میٹل بھی جا کر گرم نرم کرتے ہیں، جوڑ لگاتے ہیں اور مجھے تمہاری ورکشاپ میں دونوں طرح کی ویلڈنگ کا انتظام نظر آ رہا ہے۔ گیس ویلڈنگ کے لیے تمہارے پاس آکسیجن اور ایسی ٹیلین کے سلنڈر بھی ہیں اور تم الیکٹرک ویلڈنگ بھی کرتے ہو۔ تالے کو کاٹ دو۔"

"کاٹ دو۔۔۔ اس سے کچھ نہیں ہوگا۔" برکت ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔ "گیٹ اندر سے بھی بند ہیں۔ اوپر نیچے تین جگہ لوہے کی سلاخیں فٹ ہیں۔"

"اگر تمہیں یہ معلوم ہے تو تم یہ بھی جانتے ہوگے کہ وہ سلاخیں اوپر نیچے درمیان میں ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر کہاں کہاں ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن فرض کرو تمہیں یہ لوہے کے گیٹ اوپر سے نیچے تک کاٹنے پڑیں، الیکٹرک ویلڈنگ ٹارچ سے تو کتنی دیر میں ختم ہونے والا کام ہے؟"

www.paksociety.com

"تم..... تم سمجھتے نہیں۔ یہ بہت خطرناک کام ہے۔" وہ بولا۔ "اس لیے..... استاد پیڈرو نے مجھے بتایا تھا کہ کبھی کسی کے کہنے یا مجبور کرنے سے بھی میں نے اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تو بہت برا ہوگا۔"

"کیا برا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"اس نے کہا تھا کہ دھماکا ہوگا اور..... ان کو ویسے بھی پتا چل جائے گا۔" برکت بولا۔ "اس کے اندر الارم لگے ہوئے ہیں۔"

میں نے اس کے ایک جھانپڑ مارا۔ "پاگل کے بچے! تمہیں شک نہیں ہوا تھا کہ یہ خطرناک کام ہے۔ تم نے اس سے پوچھا نہیں تھا کہ آخر اتنا زبردست حفاظتی انتظام کرنے کا مقصد کیا ہے؟"

"پوچھا تھا۔ اس نے کہا اپنے کام سے کام رکھو اور منہ بند رکھو۔" برکت بولا۔ "اور مجھے یہ بہت فائدے کا سودا لگتا تھا۔ میں اپنا نقصان کرانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے ان کی شرط منظور کرلی۔"

"فائدے اور نقصان کا تو اب پتا چلے گا تمہیں۔" میں نے کہا۔ "الیکٹرک ویلڈنگ کا تار وہاں تک پہنچ جائے تو بہتر ورنہ گیس کے سلنڈر اٹھوا لاؤ اور جہاں سے ضروری ہو وہاں سے گیٹ کاٹ دو۔"

"میں یہ نہیں کرسکتا۔ یہ خودکشی ہوگی۔ میرے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔"

"ہاں۔ ہم تمہیں اور صرف تمہیں مارنا نہیں چاہتے۔ اگر اس کام میں کوئی خطرہ ہے تو وہ خطرہ ہمارے لیے بھی ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میں تم کو یقین دلا سکتا ہوں کہ دھماکا کسی قسم کا نہیں ہوگا۔ نیچے تالے کو کاٹو۔ پھر اوپر کی کنڈی کھولو۔ اس کے بعد اندر کی طرف کی سلاخیں اپنے اندازے کے مطابق کاٹو۔ اس کے لیے تمہیں گیٹ میں شگاف کرنا ہوگا۔"

"خدا کے لیے مجھے اس پر مجبور مت کرو۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" استاد کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"ہماری بات نہ مانی تو ہم بھی تمہیں مار ڈالیں گے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم پسند کرو گے کہ ہم تمہارے گھر میں گھس کر تمہاری بیوی کو باہر گھسیٹ لائیں۔ اس کے منہ میں اسی کے کپڑے ٹھونس کر، ویلڈنگ ٹارچ کو چھوڑو، دیا سلائی بھی جلا کے بجھا دی جائے اور فوراً جلد پر لگا دی جائے تو تکلیف کم نہیں ہوتی۔"

"نہیں، نہیں....." وہ ہکلانے لگا۔ "تم اتنے بے رحم نہیں ہو۔ تم ایسے نہیں ہوسکتے۔"

"یہ وضاحت میں نے آتے ہی کردی تھی کہ ہم ایک جیسے بے رحم ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا تم عملی مظاہرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر قائل نہیں ہوسکتے؟ ٹھیک ہے۔ محسن فوراً ہماری استانی جی کو لے آ..... کے بغیر۔"

"ٹھہرو میں..... میں دروازہ کھولتا ہوں۔" برکت نے محسن کو پلٹتے دیکھ کر کہا۔ "مگر مجھے یہ بتا دو کہ ان سے کیا کہوں گا؟"

"جب تم دروازہ کھول دو گے تو ہم تمہیں اور تمہارے شاگردوں کو ہاتھ پیر باندھ کے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر گیراج میں ڈال دیں گے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں کہنا ہوگا کہ ہم نے تمہیں بے بس کر دیا تھا اور پھر باقی کام تم سب کو اپنی جان پیاری ہے تو اسی بیان پر قائم رہنا۔ وہ خود ویلڈنگ کرکے دروازہ کاٹتے رہے تھے۔ تم کبھی غلط بتاؤ گے ورنہ یاد رکھنا ہم دوبارہ آجائیں گے۔"

استاد برکت نے آہستہ آہستہ گیراج کی طرف بڑھنا شروع کیا جہاں نیک محمد بھی چار افراد کو الٹا لٹانے کے کام سے فارغ ہونے لگا تھا۔ وہ چاروں شور مچا رہے تھے کہ انہیں کمر کے بل لیٹنے کی اجازت دی جائے اور ان میں سے ایک باقاعدہ بھوں بھوں کرکے رو رہا تھا۔

"چپ کرو منحوس کے بچو۔" نیک محمد نے کہا۔ "تمہیں ہم دفن بھی الٹا کریں گے۔"

"انہیں اٹھنے دو بھئی۔" میں نے کہا۔ "یہ استاد کی مدد کریں گے۔"

"اٹھو، جنے منحوس کے بچو۔" استاد برکت نے ان میں سب کے ایک ایک لات رسید کی۔ "کتنے مزے سے پڑے ہیں سالے۔"

وہ مزے میں بالکل نہیں تھے اور دونوں طرف ان کو ایک جیسے خطابات دیے گئے تھے مگر وہ احتجاج کر اٹھے۔ استاد برکت کے حکم پر انہوں نے ویلڈنگ کا سامان گھسیٹا اور بیرکی گیٹ تک لے گئے۔ گیٹ بیس گز کے فاصلے پر تھا لیکن خوش قسمتی سے الیکٹرک ویلڈنگ کا کیبل بہت زیادہ لمبا تھا۔ استاد برکت کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میرے ہاتھوں اس کی جو درگت بنی تھی وہ شاگردوں کے سامنے اس کی بے عزتی کا سبب بن رہی تھی مگر وہ مجبور تھا۔ اس نے ایک منٹ سے بھی پہلے تالے کو کاٹ دیا۔ وہ جھوٹ

کے اپنی جان بچانا چاہتا تھا ورنہ اس کو اندر کی جانب لگی ہوئی سلاخوں کی بالکل صحیح پوزیشن معلوم تھی۔ اس نے نیچے سے بیچ کی اس جگہ کو کاٹنا شروع کیا جہاں دونوں پٹ ملتے تھے۔ ذرا سی دیر میں چادر کٹ گئی اور شگاف اتنا بڑا ہوگیا کہ اس کے پیچھے جڑی ہوئی ایک انچ موٹی سلاخ نظر آنے لگی۔ ویلڈنگ ٹارچ سے چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ استاد برکت نے اپنی آنکھوں کے سامنے گہرے رنگ کے شیشوں والا مین کا ڈھکنا سا کر لیا تھا چنانچہ اندھا کر دینے والی روشنی اس کی آنکھوں کے لیے ناقابل برداشت ہوگئی تھی مگر ہم سب دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑے ہونے پر مجبور تھے۔ میں نے برکت کے دونوں بہتر شاگردوں کو اور دونوں بچوں کو سامنے کھڑا کیا تھا اور ریوالور ہاتھ میں رکھا تھا۔ خیرہ کن شعلے کی طرف نہ دیکھنے کے باوجود میں برکت کی طرف سے بے خبر نہیں تھا۔ اس نے ایک بار اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن جیسے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ پھر بیٹھ گیا۔

دس منٹ بعد پہلی سلاخ کٹ گئی تو میں نے پھر گھوم کر دیکھا۔ وہ جگہ اب بھی انگارے کی طرح دہک رہی تھی جہاں سے دروازہ کاٹا گیا تھا۔

"دھماکا تو کوئی نہیں ہوا نا۔" میں نے برکت کو تسلی دینے کے لیے کہا۔ "تم کو ڈرا دیا گیا تھا خواہ مخواہ۔"

"لیکن الارم تو بج رہا ہے۔" وہ بولا اور میں نے دروازے سے کان لگا کے سنا۔ اندر سے واقعی ایک سائرن کی ہلکی سی آواز کی گونج آرہی تھی۔

"اب تم جلدی کرو۔" میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ "وقت کم ہے۔ یہ نہ ہو کہ تمہارا کام ختم ہونے سے پہلے وہ لوگ آجائیں۔" مجھے یہ فکر بھی تھی کہ اندر نازو اور الماس کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا تو کیا ہوگا۔ ان کو بحفاظت نکالنے کے لیے ہمارا مقررہ وقت کے مطابق اندر پہنچنا ضروری تھا۔ الارم کی آواز میرے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی تھی اور میں اس اندیشے سے دوچار تھا کہ ہم دشمن کے حفاظتی انتظامات سے گزر سکیں گے یا نہیں۔ یہ تو ہمیں اس حصار میں قدم رکھنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے تھا کہ شکاری کتنا ہی پُراعتماد اور ہوشیار کیوں نہ ہو اپنی حفاظت کے خیال سے غافل کبھی نہیں ہوتا۔ دشمن کو کمزور سمجھنا ہی بے وقوفی کی علامت ہے۔ کسی الارم سسٹم کی موجودگی کی طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا اور ہم نے فرض کرلیا تھا کہ ہم زبردستی اور طاقت کے بل پر اس سرنگ نما راستے کے ایک کنارے سے داخل ہوگئے تو دندناتے ہوئے آگے ماچھی کے اڈے تک پہنچ جائیں گے۔ اب ایسا مشکل نظر آتا تھا۔ الارم نصب کرنے والوں نے اور بھی بہت کچھ نصب کر رکھا ہوگا جس سے غیر متعلقہ افراد کے داخل ہونے کی صورت میں مزاحمت کی جاسکے۔ اب الارم کی آواز نے انہیں خبردار کر دیا ہوگا اور وہ جوابی کارروائی کے لیے اپنی قوت مجتمع کرنے میں مصروف ہوں گے۔

"محسن! تو ٹرک کو اسٹارٹ کرکے یہاں لے آ۔" میں نے کہا۔

"اس میں چابیاں نہیں ہیں سکندر بادشاہ۔" نیک محمد نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ محسن سیلف کو ڈائریکٹ کرنٹ دے کر اسٹارٹ کرے گا۔" میں نے کہا۔ "تم اتنی دیر میں ان سب بچوں کو واپس گیراج میں لے جاؤ۔ ان کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھنا۔ گیراج میں تار بہت ہوں گے۔ وہی تار دوسرے آدمی کے لیے بھی استعمال ہو جائے تو اچھا ہے۔ دونوں کی پشت مل جائے۔ پھر دونوں کو ایک ساتھ جوڑ کر کسی کھمبے یا کھونٹے سے باندھ دینا۔ اور ہاں، ان کے منہ بند کرنا مت بھولنا۔ اندر پرانا سوت بھی ہوگا۔ نہ ہو تو انہی کے کپڑے پھاڑ لینا مگر یہ سب پھرتی سے کرنا۔ کوئی گڑبڑ کرے تو بس ایک گولی چلا کر سر کا بھیجا نکال دینا۔"

برکت کے چاروں شاگردوں نے احتجاجی شور بلند کیا۔ "یہ کیا ظلم ہے استاد؟"

"چپ کرو ظلم کے تخم۔" استاد برکت نے پلٹ کر کہا۔ "اس کے بغیر جان نہیں بچے گی۔"

"ہاں تم کو یہی کہنا ہے کہ ہمیں مار باندھ کر ڈال دیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ نہ ہمارے نام جاننا ہیں نہ حلیہ۔ نام تم نے کسی کی زبان سے سنا ہی نہیں تھا اور حلیہ تم اس لیے نہیں دیکھ سکے کہ ہم منہ پر نقاب ڈال کر آئے تھے۔ اگر تم نے کچھ اور کہا تو دونوں طرف سے مارے جاؤ گے۔ پہلے وہ ماریں گے۔ انہوں نے چھوڑ دیا تو ہم ماریں گے۔ اب جاؤ۔" وہ نیک محمد کے ساتھ چل پڑے۔ اسی وقت محسن نے ٹرک کو میرے قریب لاکے کھڑا کیا۔ میری پریشانی میں دم بدم اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ اسٹین گن نکال لائے۔ اس کے اترتے ہی میں ڈرائیور کی سیٹ پر چڑھ بیٹھا۔ اس کا انجن بند نہیں کیا۔

"نیک محمد!" میں نے چلا کے کہا۔ "ہم جا رہے ہیں۔ تم یہ ٹیکسی لے کر نکل جانا۔"

www.paksociety.com

نیک محمد گیراج کے دروازے تک آیا۔ "کہاں چلا جاؤں؟" وہ جھلا کے بولا۔ "واپس گھر؟"

"نہیں۔ گاما شاہ کے مزار پر، دروازے کے سامنے ہمارا انتظار کرنا۔" میں نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا۔ "ہم اگر شام تک نہ آئیں تو واپس گھر جا کے انتظار کرنا۔ ہوسکے تو غالب کو بلا لینا۔"

محسن ٹیکسی میں سے اسٹین گن نکال کے دوڑتا ہوا آیا اور میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"اسٹین گن کے استعمال کی ضرورت اچانک پڑ سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ مشکل مرحلہ اس کے بغیر ہی سر ہو گیا تو پھر اس کی ضرورت نہ جانے کب پڑے۔ تم تیار ہو نا؟"

محسن نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تم اپنی توجہ ڈرائیونگ پر رکھنا۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر ٹرک کو نکال کے لے جانا۔ کوئی سالا سامنے آئے تو اسے بھی مت دیکھنا۔"

"استاد برکت؟" میں نے پھر چلا کر سر نکالا۔ "ہٹ جاؤ سامنے سے۔"

"ابھی..... اوپر والی سلاخ باقی ہے۔" وہ ٹرک کو آگے بڑھتا دیکھ کر چلایا۔

"تم اتنے اوپر تک کیسے پہنچو گے؟" میں نے ٹرک کی رفتار بڑھائی اور اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"گیٹ تمہارے اوپر گرے گا۔" برکت نے چیخ کر کہا اور ایک طرف چھلانگ مار دی۔ اس وقت تک ٹرک اور گیٹ کا درمیانی فاصلہ گھٹ کر تین فٹ کے قریب رہ گیا تھا۔ میں نے ایکسیلیٹر کو دبایا اور طاقتور انجن کی گرج کے ساتھ ٹرک ایک دم آگے بڑھا۔ اس نے کسی دیو ہیکل اور بھاری جسم کے گینڈے کی طرح لوہے کے دروازے کو ٹکر ماری۔ ٹرک کی قوت کے سامنے پٹ یوں وا ہو گئے جیسے وہ لوہے کے گیٹ نہیں تھے، کپڑے کے دو پردے تھے جن کو اوپر سے ٹانکا لگا کے ایک ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔ اوپری سلاخ کے باقی رہ جانے سے دونوں پٹ ایک دم نہیں گرے۔ جتنی دیر میں سلاخ کا وسطی ٹوٹا، ٹرک نیچے سے اپنا راستہ نکال چکا تھا۔ تصادم کے جھٹکے نے مجھے اور محسن کو بھی ہلا دیا تھا مگر ہم اس کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ ہمارے کانوں نے مضبوط بمپر کی رگڑ کو سنا۔ پھر ہیڈ لائٹس کا شیشہ بکھرنے کی آواز آئی اور ٹرک کی باڈی —— دروازے کو دھکیلتی اور اس کی فولادی وضع جیسی رگڑ سے مجروح ہوتی گزری۔ ساتھ مڑ تڑ کر الگ ہوتے اور ڈنڈے کا ٹکڑا کھڑکاتے ایک سیکنڈ میں ٹرک کو راستہ مل گیا۔ میرے سامنے ایک تاریک اور نشیبی راستہ آ گیا۔ ٹرک کی رفتار میں تخفیف لازمی تھی اور میں نے ادھر ادھر ہاتھ مار کے بالآخر دونوں ہیڈ لائٹس جلانے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی وقت دروازے کے دونوں پٹ ایک خوفناک دھماکے سے ہمارے پیچھے گرے۔ پھر اینٹوں کی بارش ہونے لگی جو لوہے کے دروازے کو مضبوطی سے قائم رکھنے کی ضامن تھیں۔ چند سیکنڈ میں ہو جانے والی اس تباہی کا نظارہ میں نے صرف ایک بار پیچھے دیکھ کر کیا اور مجھے یقین آیا کہ ہم بال بال بچ گئے ہیں۔ اگر دروازہ نہ ٹوٹا ہوتا یا ٹرک کی قوت میں کمی رہ جاتی تو شاید ہم اس ملبے کے ساتھ نہ نکل پاتے اور کہیں الجھ جاتے تو دونوں فولادی گیٹ ہمارے اوپر گرتے جو اب چند فٹ پیچھے رہ گئے تھے۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے سامنے دیکھا۔ وہ سرنگ نما راستہ جسے ٹرک کی ایک سالم رہ جانے والی لائٹ نے کچھ روشن کر دیا تھا، اتنا ہی چوڑا اور بلند تھا جتنا اس میں داخل ہونے کا راستہ۔ اوپر چھت بھی پختہ تھی اور دونوں جانب کی دیواروں پر سیمنٹ کا پلستر تھا۔ ٹرک کے انجن کی آواز سے سرنگ میں زبردست گونج پیدا ہو رہی تھی۔

"ہم زمین کی کتنی گہرائی میں سفر کر رہے ہیں؟" محسن نے رومال سے ماتھے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرے اندازے کے مطابق چھ فٹ۔" میں نے کہا۔ "لیکن خدا کا شکر ہے کہ زندہ سلامت سفر کر رہے ہیں اور عالم بالا کی جانب روح کا سفر نہیں ہے۔" کم روشنی کی وجہ سے میں نے ٹرک کی رفتار کو بہت کم کر دیا تھا۔

"ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں،" سکندر و بادشاہ محسن نے کہا۔ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے شق ہو جانے والے دروازے کی روشنی بہت دور لگی۔ "مجھے تو حیرت ہے کہ ابھی تک ہماری راہ میں کوئی حائل نہیں ہوا۔ کیا انہوں نے خطرے کا الارم نہ سنا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"اگر ہم نے سن لیا تھا تو انہوں نے کیسے نہیں سنا ہوگا۔ الارم نے اپنا کام کیا تھا۔ وہ خبردار ہوں گے۔"

"اور خبردار ہونے کے باوجود وہ چپ بیٹھے ہیں؟" میں نے کہا۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟"

"اس کے دو ہی مطلب نکالے جا سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ "یا سب خیریت ہے یا خیریت بالکل نہیں ہے۔"

"ماشاءاللہ، کس قدر ذہانت کی بات کہی ہے تم نے۔" میں نے اسٹیئرنگ کو سنبھالے رکھا کیونکہ راستہ خم کھا رہا تھا۔ ٹرک کے ذرا سے بے قابو ہونے کی صورت میں شکستہ حال باڈی کے دیواروں سے ٹکرانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔

"میں حیران ہوں کہ اتنی لمبی سرنگ کی موجودگی سے سب بے خبر رہے۔" محسن بولا۔

"اب نہیں رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "آج دوسروں نے بھی دیکھ لیا ہے۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ استاد برکت کو کچھ بھی علم نہ ہو پھر بھی آپ نے اسے چھوڑ دیا؟"

"اسے اپنے کیے کی سزا مل جائے گی، ہمارے ہاتھوں نہ سہی کسی اور کے ہاتھوں سہی۔" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ گاما ملنگ کے ساتھیوں میں شامل نہیں ہے۔" محسن بولا۔

"صرف اس حد تک کہ اس نے سرنگ کے راستے ٹرک کے آنے جانے کے راز کو راز رکھا۔" میں نے کہا۔ "صرف اپنے فائدے کی خاطر وہ چپ رہا یا پھر خوف کے باعث۔ اسے نہیں معلوم جو ہم نے ہی جانا ہے کہ ٹرک میں منشیات روانہ کی جاتی تھیں۔"

"یہ معلوم ہو جانے اور افشائے راز کے بعد وہ کیا کرے گا؟"

"سمجھداری سے کام لے گا تو وہی کرے گا جو ہم نے سمجھایا تھا اور بے وقوفی کرے گا تو بھاگ جائے گا۔ مگر بھاگ کر وہ کہاں جائے گا۔ استاد پینڈو دراصل پھر پکڑے گا۔ وہیں سے جہاں سے وہ چلا آیا تھا۔" میں نے کہا اور ٹرک کو روک لیا کیونکہ ہمارے سامنے کا راستہ بلندی کی جانب اٹھتا نظر آتا تھا۔

"یہ سرنگ ایک فرلانگ لمبی تو ہوگی۔" محسن نے کہا۔ "کتنا خرچہ آیا ہوگا اس کو بنانے پر؟"

"کروڑوں کا بزنس کرنے والے لاکھوں خرچ کرتے ہیں اپنے فائدے کے لیے۔" میں نے کہا۔

"اب ہم گاما شاہ کے مزار کے احاطے میں ہیں۔ یقین نہیں آتا۔" محسن نے منہ اوپر اٹھا کے کہا۔

"ہاں، اور آگے جو چڑھائی ہے ساٹھ گز کی بلندی ہے، یہ شاید راستہ ہے جس سے ٹرک اندر اترتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم نے خود دیکھا تھا کہ کچھ لوگوں نے مل کر اس راستے کے اوپر بچھا ہوا حصہ ہٹا دیا تھا۔"

"ہاں، لان کی گھاس پر اس خلا کا پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ شاید ان لوگوں نے ایک پورا تختہ الگ کر دیا تھا۔" محسن بولا۔ "اس تختے پر مٹی ڈال کے گھاس اگائی گئی تھی جب اسے لان کے درمیان خالی جگہ پر رکھ دیا جاتا تھا تو لان برابر اور ایک جیسا نظر آتا تھا۔ اسے اٹھا لینے سے نیچے جانے کا راستہ بن جاتا تھا۔"

میں نے کہا۔ "اس میں کوئی مشینی نظام نہیں تھا اور نہ کوئی ایسا دروازہ تھا جیسا ہم پیچھے گرا آئے ہیں۔ اب میں ٹرک پوری رفتار سے اوپر لے جاتا ہوں۔ ٹرک کی باڈی کا اوپر والا حصہ اس تختے کو اٹھا کے ساتھ لے جائے گا اور ہم احاطے کے وسط میں طلوع ہوں گے۔"

"پہلے سوچ لے کہ باہر طلوع ہونے پر جو صورت حال درپیش ہوگی کیا ہوگی؟"

"غیب کا علم رکھنے کا دعویٰ میں نے کبھی نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "صورت حال جیسی بھی ہوگی اس سے نمٹنا تو ہے۔"

"یہ پراسرار خاموشی مجھے کسی طوفان کا پیش خیمہ لگتی ہے۔" محسن بولا۔ "انہوں نے ابھی تک کارروائی کیوں نہیں کی جبکہ انہوں نے ایسے سخت حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ کوئی ساری رکاوٹوں کو عبور کر کے اندر داخل ہو چکا ہے جو ان کا اپنا آدمی نہیں ہے۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ جب ہم پھر خدا کی بنائی ہوئی سطح زمین پر نمودار ہوں تو وہ دونوں جانب ٹینک اور توپیں لیے انتظار کرتے ملیں۔" میں نے کہا۔ "ان کے مقابلے میں ہماری اسٹین گن دھری رہ جائے گی۔"

"تاریک پہلو کو مت دیکھو۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ رابعہ اور نازو کی ٹیم نے اس غیر قانونی مملکت کے بے تاج بادشاہ سلامت کو یرغمال بنا رکھا ہو۔" محسن بولا۔ "اور اعلان عام کر دیا ہو کہ کسی نے جارحانہ کارروائی کی تو وہ بادشاہ سلامت کی جان کا دشمن ہوگا۔"

"خیر اب جو ہوگا سامنے آ جائے گا۔" میں نے ٹرک کو پھر گیئر میں ڈالا۔ "خدا کرے نیک محمد وہاں سے نکل گیا ہو۔ کوئی تو ہو جو ہماری خبر پہنچانے والا۔ آگے غالب ہے جو سب کی خبر لے سکتا ہے۔"

"بس تو پھر چڑھ جا بیٹا سولی پر، رام بھلی کریں گے۔" محسن نے کہا۔

میں نے کلچ چھوڑ دیا اور ٹرک چلا ہی تھا کہ سیکنڈ گیئر میں ڈال دیا۔ ٹرک بڑی گھن گرج کے ساتھ اوپر چڑھا۔ آگے فرش کی بلندی میں بتدریج اضافہ ہوا مگر چھت اسی مناسبت سے اوپر اٹھنے کے بجائے ہموار رہی اور اس کا ٹرک کے سب سے اوپر والے حصے سے فاصلہ بتدریج کم ہوا۔ پھر ٹرک کی باڈی چھت سے لگی اور چھت ایک دم اٹھ گئی۔ ٹرک آگے بڑھا تو

www.paksociety.com

چھت اس کے اوپر آگئی اور ٹرک اندھیرے سے اچانک اجالے میں پہنچا تو ذرا سی دیر کے لیے میری آنکھیں بھی چندھیا گئیں۔ ٹرک اس سرنگ سے باہر آنے کے بعد گامے شاہ کے مزار کے عقبی حصے میں لان پر پہنچ چکا تھا۔ میری حیرت زدہ نظروں نے ہر سمت خالی پڑے ہوئے میدان کو دیکھا۔ میں نے انجن کو بند کیا اور سوالیہ نظروں سے محسن کی طرف دیکھا جو خود بھی اس خاموشی اور ویرانی کا مطلب اخذ کرنے سے قاصر تھا۔

پہلے میں اترا اور میں نے اترنے سے پہلے ریوالور محسن سے واپس لیا۔ میرے بعد محسن نے نیچے قدم رکھا۔ وہ اسٹین گن لیے کھڑا رہا اور میں ریوالور تھامے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ ایک طرف قطار میں حجرے بنے ہوئے تھے۔ انہی حجروں سے متصل گامے شاہ کے مزار کی عمارت تھی جو ایک وسیع اور بلند دیواروں والے کمرے اور چاروں طرف بنے ہوئے برآمدے پر مشتمل تھی۔ برآمدہ بھی سطح زمین سے چھ سات فٹ اونچا تھا اور اس کی چھت محرابی دروازوں پر قائم تھی۔ وسط میں مزار کی عمارت کی ہر دیوار بیس فٹ بلند تھی اور سب سے اوپر نیلے رنگ کا گنبد تھا۔ عمارت کی چاروں دیواروں میں ایک ایک دروازہ تھا مگر اس وقت ہر دروازہ کھلا ہونے کے باوجود نہ کوئی آرہا تھا نہ جارہا تھا۔

"یہ معاملہ تو مجھے خطرناک لگتا ہے محسن۔" میں نے کہا۔

"کیا وہ رابعہ اور نازو کو بھی لے گئے؟" محسن نے وہ بات کہہ دی جو میں نہ کہہ سکا تھا۔ "لیکن کچھ فرض کرنے سے کیا حاصل۔ ہم دیکھ لیتے ہیں۔ پہلے ان حجروں میں جھانک لیں۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "میں آگے رہوں گا۔ تو اسٹین گن کے ساتھ میرے پیچھے آ۔"

ہر حجرے کی خاموشی ایک ہی کہانی کہتی تھی۔ وہاں چارپائیاں تھیں، بستر اور میلے کپڑے تھے مگر وہ لوگ نہیں تھے جو ان حجروں میں رہتے تھے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سکندر کہ وہ سب بھاگ گئے ہوں؟ وہ اتنے کمزور لوگ نہیں تھے۔ ان کا دھندا ایسا نہیں تھا کہ وہ اتنی آسانی سے میدان چھوڑ دیتے۔" محسن نے کہا۔ "اور سب سے بڑی بات یہ کہ انہوں نے اپنا ایک اڈا بنا رکھا تھا جو ہر جگہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اسے وہ کیسے خالی کر سکتے ہیں؟"

"مجھے ان کی نہیں، رابعہ اور نازو کی فکر ہے۔" میں نے محسن سے کہا۔ "وہ ہماری حماقت کی بھینٹ نہ چڑھ گئی ہوں۔ ہم نے انہیں ضرورت سے زیادہ بہادر اور نڈر سمجھ لیا تھا۔ ان کو تھپکی دے کر ایک ایسی مہم پر روانہ کر دیا تھا جسے سر کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ تھیں تو وہ لڑکیاں ہی، اور [illegible] مقابلے پر تھے پیشہ ور بدمعاش مرد۔"

"ان کو کچھ بھی نہیں ہوا ہوگا۔" محسن نے [illegible] کے لیے کہا مگر مجھے اس کے لہجے کا کھوکھلا پن اچھا نہیں [illegible]

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ وہ انہیں قتل نہیں کریں گے [illegible] قتل کا مطلب صرف جان لینا ہی تو نہیں ہوتا۔ وہ [illegible] زندہ رکھتے ہوئے بھی سو بار قتل کر سکتے ہیں۔" میں [illegible]

ہم شکستہ دل، آزردہ اور ملول ایک حجرے سے دوسرے حجرے میں جھانکتے گئے۔ کہیں بھی کوئی نہ تھا جو ہم [illegible] سکتا اور ہمارے ذہن پر یلغار کرنے والے سوالات [illegible] دے سکتا۔

"یہاں تو ان کے کارندے رہتے تھے۔ [illegible] اور مال ادھر سے ادھر کرنے والے۔" محسن بولا۔

"مزار کے مجاور کہاں گئے؟" میں نے [illegible] کے چیلے چانٹے کہاں گئے؟"

"تو ابھی سے پاگل کیوں ہو رہا ہے۔" محسن نے [illegible] کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "چل ہم مزار میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

"وہاں بھی کچھ نہیں ملے گا محسن۔ مجھے لگتا ہے [illegible] بے وقوفی کے باعث ہم نے ان دونوں کو کھو دیا ہے!"

"اگر وقتی طور پر کھو دیا ہے تو ہم انہیں پھر پالیں [illegible] سکندر۔" محسن نے دوست کی حیثیت سے غمگساری کا [illegible] ادا کرتے ہوئے کہا۔

"پالیں گے مگر کیا کچھ گنوانے کے بعد۔" میں [illegible]

اور ہم مزار کے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اس وقت تک شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے اور مزار کے اندر [illegible] میں باہر کی نسبت گہرا اندھیرا تھا۔ آگے پیچھے چلتے ہوئے [illegible] ایک ہی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ ہماری [illegible] ان کمانڈوز کی طرح تھی جو ہتھیلی پر جان رکھ کر اور [illegible] باندھے دشمن کے کسی مورچے کو سر کرنے جائیں اور [illegible] چلے کہ دشمن تو بہت پہلے مورچا چھوڑ کر جا چکا ہے [illegible] آگے نکل آئے ہیں اور محصور ہو چکے ہیں۔ ایک نامعلوم [illegible] اپنے وجود کا پتا دیتا تھا جو ہماری رگوں میں دوڑنے [illegible] کو سرد کرتا تھا اور ہمارے حوصلوں کو مفلوج کرتا تھا۔

بلند و بالا اور وسیع و عریض حجرے کے وسط میں [illegible] پر کوئی چیز پڑی تھی۔ اچانک بہت اوپر گنبد کی چھت [illegible] روشنی کا ایک دھارا چھوٹا اور یہ روشنی دس فٹ کے [illegible] پر محیط ہوگئی جس کے درمیان میں گامے ماچھی کا بے جان [illegible]

[illegible] اس آخری لمحے کی تصویر بنا پڑا تھا جب روح [illegible] قالب کے [illegible] جسم کا ساتھ چھوڑتا (جو فانی ہے)۔ بے اختیار میری نگاہ نے بہت بلندی پر آویزاں نظر آنے والے روشنی کے منبع کو دیکھا اور آگے بڑھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ موت کی تصدیق کے لیے گامے ماچھی کے دل کی دھڑکن کو سننے یا نبض کی رفتار کو محسوس کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کی کھلی آنکھوں کی ساکت پتلیوں میں زندگی کی رمق ہی نہ تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کے اوپر اٹھایا۔ ہاتھ دو جگہ سے مڑ گیا۔ ایک کہنی کے پاس سے اور پھر کہنی سے اوپر شانے کے قریب سے۔ اس کے بازو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔

"یہ تو کیا کر رہا ہے؟" محسن نے کہا۔ "یہاں سے نکلنے کی فکر کر، کہیں پولیس نہ آجائے۔"

میں نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور پہلو کے بل پڑے ہوئے گامے ماچھی کو سیدھا کر دیا۔ اس کی گردن سے نیچے کی کالر بون بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ ہاتھ سے دبا کر دیکھنے پر مجھے اس کے سینے میں دائیں جانب لچک محسوس ہوئی کیونکہ اس طرف سب سے نیچے والی دو پسلیاں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں لیکن اس کی موت کا سبب وہ چھوٹا سا سوراخ تھا جو بائیں طرف عین دل کے مقام پر سرخ دائرے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اس سے بہنے والا خون زمین میں ایک ہی جگہ پیوست ہو گیا تھا اور بہت کم تھا۔ گامے ماچھی کے سینے پر پستول [illegible] رکھ کر گولی چلائی گئی تھی یا زیادہ سے زیادہ ایک فٹ کے فاصلے سے۔ گولی دل میں اتر کے اپنا کام کر گئی تھی اور شاید ابھی تک دل میں چھپی بیٹھی تھی۔

"سکندر، یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔" محسن نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "باہر [illegible] آیا ہوگا۔"

"لیکن ابھی ہم کیسے جا سکتے ہیں؟" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو یہ کوئی سازش لگتی ہے۔ آخر سب لوگ کہاں گئے؟" محسن نے کہا۔

"ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ رابعہ اور نازو کدھر گئیں۔" میں [illegible] اضطراب، خوف یا پریشانی کے بجائے میرے ذہن پر عجیب سا اعتماد اور یقین دینے والا سکون غالب آنے لگا تھا اور [illegible] چیخنے چلانے، رونے دھونے اور واویلا کرنے [illegible] میں نے ایسا جانتے بوجھتے نہیں کیا۔ مجھے اس کی [illegible] محسوس نہیں ہوئی۔ اگر میں دیوانگی کا مظاہرہ کرتا تو [illegible] اس کی بنیاد منفی نوعیت کے جذبات پر ہوتی۔ یوں تو وجود آدم ہی تخلیق کائنات کا سب سے بڑا کرشمۂ قدرت ہے مگر اس کی ذات میں پوشیدہ قوت کے مظاہر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ثابت ہوتے ہیں۔ وہ کتنے بڑے چیلنج کو قبول کر سکتا ہے، سخت حالات کو ذہنی و جسمانی طور پر کس انتہا تک برداشت کر لیتا ہے، قوت ارادی کے بل پر کیسے ناقابل یقین کارنامے سرانجام دیتا ہے جن کی عقلی طور پر توجیہ ناممکن ہے۔ عام حالات میں ایک عام آدمی جتنی صلاحیت کو بروئے کار لاتا ہے غیر معمولی حالات میں وہ اس سے سو گنا یا ہزار گنا ہمت کے ساتھ بڑی سے بڑی قیامت سے گزر جاتا ہے۔ یہ ایک مثبت ردعمل ہوتا ہے اور میری ذہنی کیفیت بھی اس وقت میرے حق میں حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔

"جب وہ یہاں نہیں ہیں اور ہمیں بتانے والا بھی کوئی نہیں ہے تو ہم کس سے پوچھیں۔ یہ دیواریں تو کچھ بتانے سے رہیں۔" محسن نے کہا۔

"دیواریں بھی بہت کچھ بتا دیتی ہیں۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ اسی وقت وہ دروازہ بند ہوا جس سے ہم اندر آئے تھے۔ ہم دونوں اچھل پڑے۔

"ہاں، یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" ایک آواز نے کہا جیسے ایک لمحے کے لیے میں نے محسن کا جواب فرض کیا مگر ابھی وہ لمحہ گزرا بھی نہ تھا کہ میں اور محسن منجمد ہو گئے۔ وہ اجنبی آواز جس کی کوئی سمت نہ تھی، اپنی شناخت رکھتی تھی اور ایسے ہی وقت میں احساس دلا سکتی تھی کہ شکاری بے خبر نہیں تھے مگر ہم یہ بات بھول گئے تھے کہ یہ دلاور کی آواز تھی۔

"اگر دیواروں کے کان سب کچھ سن سکتے ہیں تو کیا ان کے لب کچھ نہیں بتا سکتے؟" اسی آواز نے کہا جو اس ویران مرقد کی دیواروں میں گونج رہی تھی اور اوپر سے آتی ہوئی روشنی کے ساتھ نیچے پہنچتی محسوس ہوتی تھی مگر ان بے جان اور بے حس دیواروں کے "لب گویا" کو نہ میری نظر دیکھ سکتی تھی اور نہ محسن کی۔

"وہ کیا کہتے ہیں اپنے سکندر صاحب! کہ آپ کے لبوں پر یہ مُہرِ خاموشی کیسی؟" دلاور کی طنز و تمسخر آمیز آواز نے کہا۔ آواز کسی پوشیدہ اسپیکر سے ہم تک پہنچ رہی تھی جو اوپر کسی دیوار میں نصب تھا۔ لیکن آواز بہت صاف تھی اور اصل آواز سے بہت مشابہ تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اسپیکر بہت اچھی کوالٹی کا تھا اور کم والیوم پر اس کی آواز میں خفیف سی سرسراہٹ تک نہ تھی۔

www.paksociety.com

"سانپ کیوں سونگھ گیا ہے تمہیں؟" دلاور آہستہ سے ہنسا۔ "میں نے تو بڑے چرچے سنے تھے تمہاری بہادری کے۔"

"رابعہ اور نازو کہاں ہیں دلاور؟" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ پھر ہنسا۔ "کیا مجنوں نے کبھی کسی سے یہ سوال کیا تھا کہ میری لیلیٰ کہاں ہے؟ اگر تم اسے تلاش کرنے نکلے ہو تو غالباً غلط جگہ آگئے ہو؟"

"اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں کہ اب وہ کہاں ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہاری طرح میری نگاہ بھی انھیں دیکھنے سے قاصر ہے۔ اس لیے میں کیا بتاؤں کہ اب وہ کہاں ہیں۔ ہاں تمہارے بارے میں بڑے وثوق سے بتا سکتا ہوں۔ تمہیں بھی اور تمہیں تلاش کرنے والوں کو بھی کہ تم کہاں ہو۔" دلاور نے بڑی عیاری سے کہا۔ "تم کچھ دیر پہلے آگئے ہوتے تو یہی شخص تم کو بہت سے سوالات کے جواب دے سکتا تھا جس کی لاش پر تم ریوالور اور اسٹین گن لیے کھڑے ہو۔ ڈرو نہیں یہ لاش تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

"میں نے رابعہ اور نازو کے بارے میں پوچھا تھا۔"

"تم نے انہیں خواہ مخواہ زحمت دی۔ عورتوں سے وہی کام لینے چاہییں جو ان سے سب لیتے ہیں۔" وہ معنی خیز طریقے پر ہنسا۔ "بھئی اگر اس شخص کو تم زندہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے تو مجھ سے کہہ دیتے۔ چلو تمہارا کام تو ہو گیا مگر اپنے سکندر صاحب! یہ کوئی مردوں والی بات تو نہ ہوئی نا کہ عورتوں کو برقعے پہنا کے اور ریوالور دے کر بھیج دیا۔"

"میں تمہارے کسی کارندے کا ذاتی دشمن نہیں ہوں۔ اس قتل کو مجھ سے منسوب مت کرو۔"

"پھر کس سے منسوب کروں؟" دلاور کی آواز میں حیرت نمایاں ہوگئی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے ایک ڈرامائی صورتِ حال پیدا کر دی تھی اور اب مجھ سے یوں مخاطب تھا جیسے پہلے سے لکھے ہوئے اسکرپٹ کے ڈائیلاگ کوئی منجھا ہوا اداکار اسٹیج پر بولتا ہے۔

"اب تمہیں نہیں معلوم کہ استاد برکت کی موت کیسے واقع ہوئی؟" دلاور نے خاموشی کے مختصر وقفے سے فائدہ اٹھایا۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ "تم نے اسے بھی مار ڈالا! شیطان کی اولاد!"

"کیسی بے معنی گالی دیتے ہو۔" دلاور ہنسا۔ "شیطان لاولد ہے۔ پولیس سے اتنا واسطہ پڑ چکا ہے۔ ابھی تک گالیاں دینے کا فن بھی نہیں سیکھا اور کچھ تو کیا کر سکتے تھے تم؟"

"میں کہتا ہوں برکت کا کیا قصور تھا۔ … سے مار ڈالنے کی دھمکی دی تھی۔" میں نے کہا۔

"اگر وہ تمہاری بات نہ مانتا تو کیا تم اسے … ڈالتے؟" دلاور نے کہا۔ "تمہاری بات مانی تو ہم نے … اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔ انتخاب برکت … میں نہیں رہا تھا۔ اپنے سکندر صاحب … خد کرتے تو اس کی زندگی یوں مختصر نہ ہوتی۔ … گاڑیاں ٹھیک کرتا رہتا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ … اس عورت کی دیوانگی کا اندازہ کرو جس کے شوہر کو … دیا گیا ہو۔ وہ ڈیڈ تک تار رہی ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں غیظ و غضب سے پاگل ہو کر دلاور کو گالیاں دیتا اور اسے بتاتا کہ گالیاں دینا اگر تو پولیس کو مجھ سے سیکھنا چاہیے، اسپیکر سے ایک شور ہوا جس میں کسی عورت کے دیوانہ وار چیخنے، بین کرنے کوسنے کی آوازوں کے ساتھ بہت سے بچوں کے بلک بلک کر رونے اور لوگوں کے بولنے کی آوازیں شامل تھیں۔ یہ سناٹا وہ میرے لیے تھے کھڑے کر دینے کے لیے … نے بڑی ذہانت سے یہ دہشت زدہ کرنے والی آوازیں … کر میرے ذہن کو ایک حوصلہ شکن الیکٹرک شاک دیا۔ اگر وہ اپنی زبان سے اس عورت کی حالتِ زار … کرتا تو اس کا یہ اثر نہ ہوتا جو ایک مختصر سے دورانیے … اثرات دینے سے ہوا۔ یہ حقیقی زندگی کا المیہ تھا … مجھے انسانیت کی لاش پر ننگے ناچنے والے شیطان … زیادہ وحشیانک لگا۔

"تم اس کی موت کا ذمے دار مجھے نہیں ٹھہرا سکتے۔" … نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے کہا۔ "یہ سب تم نے …"

"مجھے ایسا کرنے پر مجبور کرنے والا کون ہے؟" … غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"یہ غلط ہے۔ تم نے اس کی مجبوری کے عذر … نہیں کیا۔"

"کیا تم نے اس عذر کو قبول کیا تھا؟" دلاور نے … سے کہا۔ "اس نے یقیناً انکار کیا ہوگا۔ بتایا ہوگا کہ … انجام کیا ہو سکتا ہے۔ خود تم بھی اندازہ کر سکتے ہو … سے کیبنک کی کیا حیثیت ہے۔ پھر بھی تم نے جبر کیا … نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ بار … میری عادت اور … سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ رعایت دینے کی گنجائش … میں ان چاروں کو بہرہ

باندھ کر ڈال گیا تھا…"

"تو کیا تم نے ان بچوں کو بھی قتل کر دیا ہے…؟" میں نے چیخ کر کہا اور میرے لبوں سے مغلظات کا دھارا پھوٹ بہا۔

"بھئی میں خود کچھ بھی نہیں کرتا۔ اب یہ کام بھی میں کرنے لگوں تو دوسرے کام کون سنبھالے۔" دلاور نے بڑی سفاک بے نیازی کے ساتھ جواب دیا۔ "لوگوں نے تو بس یہی دیکھا کہ کسی نے ان چاروں بچوں کو جن میں دو خاصے جوان تھے اور سال باپ کا سہارا تھے۔ ایک اکلوتا تھا اور اس کا باپ کئی سال سے مفلوج پڑا ہے۔ دوسرا چار بہنوں کا ایک بھائی تھا۔ ان سب کو کسی نے اکٹھا کیا اور ان کی گردنوں کے گرد ایک ہی تار لپیٹ کر اتنا کس دیا کہ ان کا دم نکل گیا۔ بیچارے تڑپ بھی نہ سکے۔ تم لوگوں نے انہیں باندھ دیا تھا اور ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیے تھے۔"

اچانک ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح چمکا۔ دلاور جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے مجھے جو فریاد و فغاں کا اور آہ و زاری کا شور سنوایا تھا وہ پہلے سے ریکارڈ کر لیا گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بارِ ملامت جو شیطان سے بڑھ کر وہ ہمالیہ سے زیادہ بڑا ہو چکا تھا اور جس کے نیچے میری مجرم روح تڑپ تڑپ کر پکار رہی تھی اور مجھے چار معصوم لڑکوں کا قاتل قرار دے رہی تھی، ایک لمحے کے خون کا دھبہ دار کم ہو رہی تھی اور میری شرافت اور انسانیت کے دامن پر آنے والے لہو کے ہر داغ کو میرا کارنامہ قرار دے رہی تھی، وہ پہاڑ مخالف مفادات کی طرح فضا میں تحلیل ہو گیا ہے۔ میں اب انسانوں کی طرح سانس لے سکتا تھا کیونکہ میرا ضمیر میری فردِ جرم واپس لے چکا تھا۔ میں نے کسی مفلوج باپ سے بڑھاپے کا سہارا نہیں چھینا تھا۔ چار بہنوں سے ایک بھائی کی محبت کا غرور نہیں چھینا تھا۔ ایک عورت سے اس کا سہاگ نہیں چھینا تھا اور اس کے بچوں کے سر سے باپ کا سایہ نہیں چھینا تھا۔ اگر سچ مچ میری وجہ سے اتنے قتل ہو جاتے اور اتنی دیر میں سب قتل کی خبر بھی عام ہو جاتی تو کیا اب تک مشتعل انتقام کی خواہش سے مغلوب، مجرموں کو قانون کے حوالے کرنے کے خواہشمند، قتل ہونے والوں کے لواحقین اور مشتعل ایک فرلانگ سے بھی کم لمبی سرنگ کے دہانے ہم تک نہ پہنچ جاتے۔ انہیں روکنے والا کون تھا۔ سرنگ کا ٹوٹا ہوا دروازہ … خبر دے رہا تھا کہ قاتل اسی طرف گئے ہیں مگر ابھی تک اس طرف سے … کوئی آہٹ بھی سنائی نہ دی تھی۔

… پہنچ جانے کے باوجود میں نے دلاور پر کچھ … ہونے دیا … محسن کو اشاروں میں بھی کچھ نہیں بتایا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ دلاور صرف ہماری آوازیں ہی نہیں سن رہا ہو گا۔ ممکن ہے کہ اس سرچ لائٹ جیسی روشنی میں کسی کیمرے کی آنکھ سے وہ میری صورت کے تاثرات کا مشاہدہ بھی کر رہا ہو۔

"تم جیسے لوگ ہیجان کی علامت سے بڑی جلدی پریشان ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ بنتے بہت بہادر ہیں۔"

"بنتے بہت دلاور ہیں۔" میں نے تلخی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "حالانکہ خود شیطان بھی چاہے تو دلاور نہیں بن سکتا۔"

"اچھا لطیفہ پیدا کیا تم نے الفاظ سے۔ پڑھے لکھے آدمی ہو نا۔" دلاور طنزیہ بولا۔ "افسوس یہ ہے کہ تم نے اپنی عقل کا کبھی صحیح استعمال نہیں کیا ورنہ تم کو کرنے کے بعد یوں نہ پچھتانا پڑتا۔"

"میں اپنے اعمال کی سزا کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔" میں نے کہا۔ "فیصلہ کرنے والا اوپر بیٹھا ہے۔ اگر میرے لیے سزا یہاں بھی ہے اور وہاں بھی تو یہ اس کی مرضی۔ وہ نیتوں کا حال خوب جانتا ہے۔"

"گویا تم تسلیم کرتے ہو کہ تمہاری احمقانہ جرأت کے مظاہرے کے باعث جتنے لوگ مارے گئے ان کی موت کا تمہیں کوئی صدمہ نہیں…؟ خیر… اس طرح معلوم نہیں تم کسے دھوکا دینا چاہتے ہو۔ مجھے یا اپنے آپ کو۔ کیا تمہیں ابھی تک اندازہ نہیں کہ اس وقت تم کہاں ہو؟" دلاور نے کہا۔

"مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں یہ جاننا بھی نہیں چاہتا۔"

"تم صرف رابعہ اور نازو کے متعلق جاننا چاہتے ہو کہ تمہاری زنانہ فوج کی ان دلیر اور خوب صورت کمانڈوز کا کیا بنی۔" دلاور نے ہنس کر کہا۔ "لڑکیاں مجھے دونوں پسند آئیں لیکن میں شوقین مزاج آدمی نہیں ہوں۔ میں نے انہیں اپنے کمانڈوز کے سپرد کر دیا۔ یہی فاتح میں چار جو افراد بیٹھے تھے۔ قرعہ اندازی سے میں نے ان کے حق میں فیصلہ کر دیا۔"

"تم جھوٹ بکتے ہو بکواس کرتے ہو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"تم تو سچ سے بھی ڈرتے ہو۔" دلاور نے کہا۔ "اچھا بھئی انھیں ہم نے عزت و احترام کے ساتھ لوٹا دیا۔"

"دیکھو دلاور! میرا انجام کچھ بھی ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی میری زندگی مجھ سے چھین لے۔ تمہارے یہ انصاف کے جھٹکے وار خود تم یا تمہارے بھیجے ہوئے قاتل" میں نے کہا۔ "لیکن رابعہ یا نازو کو کچھ ہوا…؟"

"تو تم جنگیوں کی توپ سے بھی بڑی توپ لاکے ان سب کو توپ دم کر دو گے جو ان کے ساتھ کوئی زیادتی کریں گے… ذکر

www.paksociety.com

خوب صورت لڑکیوں کا ہو تو زیادتی کا لفظ بہت شریفانہ ہے۔ تم تو سانس بھی اس لیے لے رہے ہو کہ دلاور نے تمہیں رعایت دے رکھی ہے اور میں بے سبب قتل کرنے یا کرانے کا عادی نہیں ہوں۔ ایک آدمی صرف ایک آدمی ہوتا ہے جسے ایک گولی ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ کیا میرے پاس کوئی گولی نہیں ہے؟ تم اس وقت مجھ سے زیادہ بے بس ہو جو سینہ تان کے چوہے دان میں گھس گیا ہو۔"

"یہاں مجھے روکنے والا کون ہے؟" میں نے کہا۔ "دروازہ میرے سامنے ہے۔"

"لیکن دروازہ بند ہے اور ہر دروازہ آسانی سے نہیں کھولا جاسکتا۔ تم کوشش کر کے دیکھو۔" وہ بولا۔

"جو میری راہ میں آئے گا مارا جائے گا اور میں مرا تو کم سے کم دس کو ساتھ لے کر مروں گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو پھر باتوں میں وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔" دلاور نے کہا۔ "میں باہر موجود ہوں۔ یہ گفتگو تو بہت کم ملی کے... لیف ایم مائکروفون کے ذریعے ہو رہی ہے۔ میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کیسے نکلتے ہو۔"

خاموشی سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب میرے لیے دلاور کے دیے ہوئے چیلنج کو باعزت طور پر قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ میں اس روشنی کے دائرے سے نکل گیا اور محسن کی طرف ہو گیا۔

"سب دروازے باہر سے بند ہیں۔" محسن نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"دلاور بکواس کرتا ہے کہ اس نے برکت کو اور اس کے شاگردوں کو قتل کروا دیا ہے۔" میں نے اس کے کان میں کہا۔

"مجھے اندازہ ہے۔" محسن بولا۔ "رالجھا اور نازو کے متعلق بھی دلاور کی بات پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔"

"پھر بھی معلوم تو ہونا چاہیے کہ وہ گئیں کہاں؟" میں نے کہا۔ "ابھی تو صرف یہ اندازہ ہوا ہے کہ اندر داخل ہونے کے بعد نازو نے گاما ماچھی کو قابو کر لیا تھا اور غالباً مزاحمت کرنے کی وجہ سے ہی گاما ماچھی کی ہڈی پسلی توڑی۔ بعد میں اس کو بے بس دیکھ کر کسی نے گولی ماردی۔ کیا نازو اور رالجھا کو اپنے ریوالور نکالنے کا موقع ملا ہوگا؟"

"اگر گاما ماچھی کا یہ حشر نازو نے کیا تھا تو یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت تک رالجھا اپنا ریوالور نکال چکی ہوگی۔ ریوالور سے انہوں نے کیا کام لیا۔ جان بچا کر دفاع لیتے ہوئے نکل گئیں یا دو چار کو مارنے کے بعد... ماری گئیں یا پھر

کرنے سے پہلے ہی پکڑ لی گئیں؟ یہ ہم یہاں کھڑے کھڑے نہیں جان سکتے۔"

"ہاں۔ خدا کی مرضی کے بغیر تو کچھ ہو نہیں سکتا۔" میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ "اور تقدیر کے لکھے کو ہم مٹا نہیں سکتے۔ مقدر میں اگر یہی ساتھ تھا تو ہمت ہارنے سے کیا ہوگا؟ ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی... ہوئی اور ہم یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے تو بدلہ ضرور لیں گے۔"

"دروازہ باہر سے کس نے بند کیا ہے؟" محسن کا سوال تھا۔ "ہمیں تو کوئی نظر نہیں آیا تھا۔"

"لیکن اب تو شک کی بات نہیں رہی۔ باہر زیادہ لوگ موجود ہوں گے یا اتنی دیر میں آچکے ہوں گے۔"

"کہاں سے آچکے ہوں گے؟" محسن بولا۔

"سرنگ کے راستے۔ اگر دلاور باہر موجود تھا تو ممکن ہے... بھی ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہاں جتنے چہرے تھے ان میں... ان میں اپنے والے لوٹ آئے ہوں گے۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "جو لوگ ایک... کے لیے پوری سرنگ بنا سکتے ہیں اور اتنی رازداری کے ساتھ سب کچھ کر سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر چہرے کے پیچھے کوئی تہ خانہ ہو اور ہمارے اندر آنے سے پہلے... کے سب انڈر گراؤنڈ ہوگئے ہوں۔"

"اتنا مجمع اور کاروبار... خیال تیری عقل میں کچھ پہلے آجاتا تو شاید ہم اس صورت حال سے دوچار ہونے سے بچ جاتے۔" میں نے کہا۔

"انھوں نے تمام حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے۔" محسن بولا۔ "ظاہر ہے اس بات کا خیال رکھتا ہے لوگ نہیں بھولے تھے کہ اچانک چھاپا پڑ جانے کی صورت میں وہ خود کہاں جائیں گے اور مال کو کہاں چھپائیں گے۔"

"افسوس یہ سب ہمیں وقت پر نہیں سوجھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن جو ہونا تھا اسے کیا رونا۔ اب یہاں سے نکلنے..."

"ہم واقعی چوہوں کی طرح یہاں بند ہو گئے ہیں۔"

سپاٹ دیواروں کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ہم ابھی تک گفتگو کے معاملے میں بہت محتاط تھے اور باری باری... کے ہونٹوں کے سامنے رکھ کر اتنی دھیمی آواز میں بول رہے تھے کہ مائکروفون چاہے ہاتھ میں ہوتا تب بھی ایک لفظ نہ سن سکتا تھا۔ چھت کے وسط میں گنبد کی وضع گولائی... طرف محرابی در تھے اور ایک دائرے میں بنے ہوئے... فٹ نیچے سے کھڑکی کے

شیشہ تھا جس سے باہر کی روشنی تو آتی تھی مگر گرد و رنگ جاتی تھی۔ گنبد باہر سے گہرا نیلا تھا وہ اندر سے انڈے کی طرح سفید تھا۔ دریچوں میں سرخ، نیلے، زرد اور سبز رنگ کے شیشے لگے تھے۔ اس وقت گنبد کے زیریں حصے کے ساتھ ساتھ ایک رنگین جھالر سی دکھائی دیتی تھی۔ باہر شام کی روشنی ابھی باقی تھی لیکن کچھ دیر میں اندھیرا ہونے والا تھا۔ جانے کیسی... کے بغیر دیواروں پر چڑھنا اور شیشہ توڑ کے دریچوں سے باہر نکلنا بالکل ناممکن تھا۔

"ہم نے نیک محمد کو شام تک انتظار کرنے کو کہا تھا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"وہ رات تک انتظار کر کے گا مار کر چلا گیا۔" محسن بولا۔

"معلوم نہیں دلاور نے سچ کہا تھا کہ وہ باہر موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "یا دھوکا دے رہا تھا اور وہ اوپر چڑھا بیٹھا ہے۔"

محسن نے اوپر دیکھا۔ "کیا تو اپنا نشانہ آزمانا نہیں چاہتا؟"

"تیرا مطلب ہے اس روشنی کو گل کر دوں؟" میں نے ریوالور نکالا۔ "اس سے کیا ہوگا؟"

"یہ تو روشنی کو گل کرنے کے بعد معلوم ہوگا۔" محسن بولا۔ "کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہے۔ بہتر ہو کوئی اس روشنی کے دائرے کو گھونٹ کے ہم پر سے ہٹا لے۔ اندھیرا زیادہ موثر پناہ فراہم کرتا ہے۔"

"رائٹ۔" میں نے کہا۔ "تو بھی نکال اپنا ریوالور، ایک ساتھ فائر کریں گے۔"

"اس طرح تو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ کس کا نشانہ خطا ہوا۔"

"ہم یہاں آپس میں نشانہ بازی کا مقابلہ نہیں کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ہم صرف ایک کوشش میں کامیاب ہو جائیں۔ ممکن ہے کسی کی بھی نہ لگے۔ دوسری کوشش پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔"

محسن نے سر ہلایا اور اپنا ریوالور نکال لیا۔ ہم نے نشانہ لے کر چند سیکنڈ تک انتظار کیا پھر میں نے ون ٹو تھری کہا اور دونوں کی آواز گونج اٹھی... یک لخت تاریک ہو گیا اور گنبد کے... رنگین جھالر پہلے سے زیادہ روشن دکھائی دینے لگی۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ دیوار سے لگ کر ایک دروازے کے قریب کھڑا ہو جائے۔ خود میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دوسرے دروازے سے جا لگا۔

"دلاور۔" میں نے چلا کر کہا۔ "تم نے دیکھا میں باہر نکل گیا۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ باہر نکلنے کے راستے بند کر کے... قدم رکھ دوں۔ میں چوہے دان میں پکڑا جانے

والا چوہا نہیں ہوں دلاور۔"

میں نے چند سیکنڈ جواب کا انتظار کیا مگر روشنی کے ساتھ ہی آواز بھی گم ہو گئی تھی۔ شاید اسی روشنی کے ساتھ مائکرو تھا یا ہم دونوں میں سے کسی ایک کی گولی نے ساؤنڈ سسٹم کو اڑا دیا تھا۔ تاہم میں نے اس امکان کو مسترد نہیں کیا کہ مائکروفون بچ گیا ہو اور دلاور ہماری آواز سن سکتا ہو لیکن جواب نہ دے سکتا ہو۔ مکمل خاموشی میں سانس روکے میں ہمہ تن گوش رہا۔ ایک منٹ گزر گیا پھر میرے کانوں نے دیوار کی دھمک سنی۔ میں نے دیوار سے کان لگا دیے۔ ایسا لگتا تھا کہ اسی دیوار کے کسی حصے سے زینہ متصل ہے جس پر کوئی بہت تیزی سے نیچے اتر رہا ہے۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔ خود محسن نے میری تقلید کرتے ہوئے دیوار کی آہٹ سن لی تھی۔ دو دروازوں کے درمیانی فاصلے کو اس نے طے کیا اور باقی دو کو میں نے دیکھا۔ آواز ایک دروازے کے بالکل پیچھے سنائی دی تو میں رک گیا اور میں نے محسن کو ہاتھ سے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ محسن دیوار کے ساتھ ساتھ پھسلتا ہوا آیا۔

ابھی وہ دروازے سے کچھ فاصلے پر تھا کہ دروازہ ایک دم کھل گیا اور بیک وقت دو افراد نے اندر آتے ہی ہمارے چہروں پر ٹارچ سے روشنی ڈالی۔ روشنی اتنی تیز تھی کہ اس کے پیچھے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا مگر ہم نے اندازے سے وار کیا۔ ان دونوں کی پوزیشن ہم نے دروازہ کھلتے ہی دیکھ لی تھی۔ محسن نے ایک کے سر پر اسٹین گن کا بٹ مارا۔ میں نے اس کی دردناک آواز سنی "ہائے میں مر گیا۔" پھر وہ فرش پر گرا۔ دوسرے نے میرا ہاتھ اٹھتے دیکھ لیا تھا اس نے گولی تو چلائی مگر وہ پوری طرح سے نہ بچ سکا۔ میرے بائیں ہاتھ میں شانے سے ذرا نیچے آگ بھڑکی اور میں سمجھ گیا کہ گولی ضائع ہو گئی ہے۔ یہی گولی چند انچ سینے کی طرف آتی تو میرے دل میں جگہ بناتی اور میرے لیے قبر میں جگہ بناتی۔ بازو میں پیوست ہو کے بھی گولی زیادہ نقصان کا سبب بن سکتی تھی۔ اگر بازو کی ہڈی ٹوٹ جاتی تو میں عمر بھر اس ہاتھ کو لنگڑا اور بنا کے پھرتا اور ہڈی کا چورا ہو جاتا تو شاید بائیں بازو کا نہ رہتا یا میرے جسم کے جیوڑ... میں ہڈی کی جگہ اسٹین لیس اسٹیل کی راڈ شامل ہو جاتی لیکن مجھے یقین تھا کہ ہڈی محفوظ ہے اور جتنی تکلیف ہے وہ گوشت کے چھٹ جانے سے ہے۔ تھوڑی سی سرجری اور ڈریسنگ اور معمولی سے علاج کے بعد زخم کا مندمل ہو جانا یقینی تھا۔

میرا زخم خوردہ ہاتھ اپنا کام بہرحال کر گیا تھا۔ میں اس

www.paksociety.com

شخص کی صورت بھی نہیں دیکھ سکا تھا جو اس ضربِ کاری کا شکار ہوا۔ میں اس وقت اپنے دشمن کو رعایت دے کر خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرا وار مہلک ثابت ہوا۔ اس شخص کی گردن خاص آواز کے ساتھ ٹوٹی۔ اس کے حلق سے ایک ہچکی سی نکلی پھر وہ بار بار فرش پر گرا۔ وہ شخص خود فرش پر گرا تو مر چکا تھا۔ بغیر دیکھے مجھے اس کا یقین آ چکا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کو بھی غیر ضروری سمجھتے ہوئے میں نے وہ ٹارچ اٹھائی جو سلامت بچ گئی تھی اور واپس اسی دروازے کی طرف بھاگا جس سے وہ دونوں اندر آئے تھے۔ میرے بازو کے زخم سے خون بہہ کر آستین کو تر کرنے لگا تھا۔

"اسے رہنے دے محسن!" میں نے چلا کر کہا کیونکہ محسن اپنے حریف کی جیب میں کچھ تلاش کر رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ پیالے اور لکان چاہتا ہے مگر ٹارچ کی روشنی میں میری نظر نے ایک چمکتی ہوئی لکیر سی دیکھی جو محسن کے ہاتھوں ناک آؤٹ ہو جانے والے کی کمر سے اوپر نکلی ہوئی تھی۔ یہ کسی وائرلیس ریسیور یا ٹرانسمیٹر کا ایریل تھا جو اس شخص کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ محسن کے ماہر ہاتھوں نے بیلٹ کھولنے میں دیر نہیں لگائی اور وہ ایریل سے منسلک چار انچ چوڑے، آٹھ انچ لمبائی کے ایک انچ موٹے ریڈیو کو نکال لینے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ دو طرفہ تعلق والا پورٹیبل ریڈیو ریسیور بھی تھا اور شارٹ ویو ٹرانسمیٹر بھی، عام طور پر ایسے واکی ٹاکی بھی کہا جاتا ہے۔ محسن نے اس کے انٹینا کو دبا کے فولڈ کیا اور سیٹ کو اپنی پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیا۔ پھر ہم دونوں ایک ساتھ باہر نکلے تو ہمیں اپنے مقابل سیڑھیاں نظر آئیں۔ سیدھے سیدھے بغیر ہم اوپر چڑھنے لگے۔ محسن کے ہاتھ میں اسٹین گن فائر کے لیے بالکل تیار تھی۔ سات آٹھ زینوں کے بعد ایک موڑ آیا۔ ایک طرف کچھ اور سیڑھیاں تھیں لیکن دوسری طرف دروازہ تھا۔

"کیا وہاں اور لوگ ہوں گے؟" محسن نے رک کر کہا اور تشویش سے میرے بازو کے زخم کو دیکھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ اتنے قریب آنے کی حماقت نہیں کر سکتے۔ وہ یقیناً باہر سے بات کر رہا تھا۔ اور یہی دونوں تھے۔"

"پھر اوپر جانے سے کچھ حاصل نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں دوسرا دروازہ باہر جانے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔"

میں نے تائید میں سر ہلا کے دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ تھوڑا سا ہلا مگر اس کے پٹ بند ہیں۔ "یہ اندر سے بند ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ صرف اوپر سے چٹخنی چڑھا دی گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"صرف چٹخنی ہوگی تو کھل جائے گی۔" محسن نے کہا اور ہم نے ایک ساتھ دروازے کو اپنے شانوں سے ٹکر ماری۔ خلافِ توقع چٹخنی بہت کمزور ثابت ہوئی۔ پٹ ایک دم وا ہو گئے اور میں اپنے ہی زور میں آگے نکل گیا۔ آگے زینہ تھا جو نیچے جا رہا تھا۔ میں سنبھل نہ سکا اور پیچھے نیچے سے شور کے ایک ساتھ ٹارچ مجھ سے آگے گئی اور سات آٹھ زینوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے پہنچ کر بجھ گئی۔ آخری وقت میں محسن نے مجھے پکڑنا چاہا تھا لیکن اس کا ہاتھ میرے شانے تک ہی پہنچا۔ بازو کو گرفت میں لینے کی ناکام کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے ہاتھ نے میرے زخم کو چھوا اور آستین کو پکڑ لیا۔ آستین اگر خون آلود نہ ہوتی تو شاید محسن کی گرفت میں آ جاتی اور اگر میرے وزن کو سنبھال پاتی تو پھٹ کر الگ ہو جاتی مگر خون کی چکناہٹ کے باعث محسن کا ہاتھ میرے خون سے بھر گیا تھا۔ آستین اس کی انگلیوں سے پھسل کر نکل گئی۔ اس جھٹکے نے مجھے پوری قوت سے گرنے نہ دیا ورنہ میرا سر پانچویں زینے کے سخت دھار والے کونے سے ٹکراتا۔ میں تھوڑا سا ترچھا ہو کے گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے پہنچا۔ مجھے پکڑنے کی اس ناکام کوشش نے محسن کا توازن بھی بگاڑ دیا اور وہ بھی اسی طرح میرے پیچھے آیا۔

ہم دونوں ذرا سے فرق سے فرش پر گرے۔ ہر چیز کے ساتھ میرے بازو کا زخم میرے ہی جسم کے بوجھ تلے دب رہا تھا اور سخت کھردرے زینے کی رگڑ سے مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے چھری کے ہاتھ میرے زخم کو ادھیڑ رہے ہیں۔ چوٹ میرے سر پر بھی گری اور جسم کے دوسرے حصوں پر بھی آئی تھی مگر بازو کے زخم کا درد اتنا شدید تھا کہ مجھے کسی اور درد کا احساس بھی نہ ہوا۔ محسن کے ہاتھوں سے بھی اسٹین گن چھوٹ گئی تھی۔ محسن نے عقل مندی یہ کی کہ وائرلیس سیٹ کو سنبھالا اور اس پر دونوں ہاتھ رکھ کے پیٹ کو دبا لیا۔ اسٹین گن ٹوٹنے والی چیز نہیں تھی مگر واکی ٹاکی زینے پر گرتا تو ناکارہ ہو جاتا۔ بڑی آواز کے ساتھ ہر زینے سے ٹکراتی نیچے تک آئی۔ گھٹنے پر لگی۔ واکی ٹاکی کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں محسن خود کو نہ بچا سکا۔ مجبوراً دونوں ہاتھ اپنے سر کو بچانے کے لیے استعمال کرتا۔ مشکل سے آدھے منٹ کے بعد وہ میرے اوپر آ گرا۔ ایک بار پھر میرا زخمی بازو دب گیا مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔ اپنی فکر کرنے کے بجائے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ہم اب [illegible]

"تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" ہم دونوں کے منہ سے ایک ہی جملہ نکلا۔ پھر ہم نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ اس افسوسناک حالت میں ہونے کے باوجود ہنسی [illegible] نے ہم دونوں کو محفوظ رکھا تھا اور ہوش آئی تھی دو [illegible]

"تمہارے بازو کے زخم کی حالت خراب ہو رہی ہے۔" محسن نے تشویش سے کہا۔

"زخم خطرناک نہیں ہے اور [illegible]" میں نے کہا اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ گولی کا زخم ہے۔ سیپٹک ہو سکتا ہے۔" محسن بولا اور اس نے بھی اسٹین گن اٹھالی۔

"اتنی جلدی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا اور ٹارچ کو اٹھا کے [illegible] روشن ہو گئی تو مجھے خوشی ہوئی۔

محسن نے اسٹین گن کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد [illegible] پھر اس نے پیٹ سے لگے ہوئے واکی ٹاکی کو نکالا اور اس کا ایریل کھینچا۔ اس کے سامنے والے حصے میں صرف دو بٹن تھے۔ ایک آواز کو کم زیادہ کرنے والا اور دوسرا [illegible] آن آف کرنے کا سوئچ ساتھ میں تھا۔ محسن نے اس کی پوزیشن دیکھی پھر اسے آن کر دیا۔ چھوٹا سا اسپیکر ایک دم سگنل [illegible] سگنل مورس کوڈ میں تھا۔ محسن نے والیوم کم کیا اور ہم دونوں نے اسپیکر کی بیپ کو دھیان سے سنا۔ بیپ پی پی پی... بیپ... پی پی پ... ڈاٹ اور ڈیش تھے اور کبھی جلدی بولے سے [illegible] انگریزی زبان کے سب حروف بھی بناتے تھے۔ مورس کوڈ ہم نے لندن میں سیکھا تھا اور اس طرح پیغام رسانی کے بین الاقوامی نظام کی زبان [illegible] جوابی پیغام دینا بھی آتا تھا لیکن اس [illegible] کوئی خاص [illegible] نہیں تھی جس کو دوبارہ ہم مورس کوڈ [illegible] یہ بھی حیرانی کی بات تھی کیونکہ واکی ٹاکی براہِ راست گفتگو کے کام آنے والا آلہ تھا۔ ایک طرح کا چلتا پھرتا ٹیلی فون۔ [illegible] مورس کوڈ [illegible] نشر کر کے پیغام کی ترسیل کا راز داری کے [illegible] مقصد نہیں ہو سکتا تھا۔ عام فہم زبان میں گفتگو کرنے سے یہ خطرہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے کہ پیغام کسی اور ریسیور پر سن لیا جائے [illegible] شارٹ ویو یا [illegible] ٹرانسمیٹر سے نشر ہونے والے پیغام کو عام آدمی اپنے گھر کے ریڈیو پر بھی سن سکتا [illegible] تو وہ بھی نہیں کرنا پڑتا جیسے [illegible] کرنے کے لیے فریکوئنسی کا انتخاب کرنے کے بعد [illegible] گھمانا پڑتا ہے اور جہاں مطلوبہ اسٹیشن کی آواز سنائی دے [illegible] روک دی جاتی ہے۔ ایسے ہی سوئی گھماتے ہوئے [illegible] اتفاقیہ ریڈیو پر سنائی دے جانا عین ممکن ہے۔

[illegible] مورس کوڈ میں بات کر رہے تھے جو ریڈیو [illegible] سمجھ میں نہیں ہوتی۔ تربیت [illegible] بھیجنے والے اس زبان کو سمجھ سکتے ہیں۔ تاہم عام آدمی اس سے کوئی مفہوم اخذ نہیں کر سکتا۔

"یہ لوگ پوچھ رہے ہیں کہ جواب کیوں نہیں دیتے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں مگر یہ کون لوگ ہیں اور کیا جواب چاہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "جب تک یہ معلوم نہ ہو..."

"ہم جواب دے بھی کس طرح سکتے ہیں۔" محسن نے سیٹ کو اوپر نیچے سے دیکھا۔

"کیا وہ لوگ ہماری گفتگو نہیں سن رہے ہوں گے؟" میں نے کہا۔ محسن نے مجھے دوسری سائیڈ پر لگا ہوا "آن آف" جیسا دوسرا سوئچ دکھایا جو اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر "ریسیور" لکھا ہوا صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ ذرا نیچے "ٹرانسمیٹر" کا لفظ چمک رہا تھا۔ اگر یہ سوئچ نیچے ہوتا تو ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ نشر ہو جاتا۔ محسن نے پلاسٹک کور کی پلیٹ پر لکھے ہوئے باریک حروف کو ٹارچ کی روشنی میں پڑھا۔

"یہ بیس وولٹ کی ڈرائی بیٹری پر چلتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور اس کی رینج دو سو میٹر ہے۔ ایک فرلانگ سے کچھ زیادہ۔"

"کیا تم نے ان دونوں کی صورت پر غور کیا تھا؟" میں نے کہا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ سالوں نے اندھا کر دیا تھا۔"

"جو میرے سامنے آیا تھا وہ تو مارا گیا۔" میں نے کہا۔ "یہ ٹرانسمیٹر دوسرے کے پاس تھا۔ وہ کیسے جواب دیتا ہوگا۔"

اسپیکر پھر بولنے لگا۔ وہ اب پوچھ رہے تھے کہ کیا کوئی فنی خرابی ہو گئی ہے یا خطرے کی بات ہے۔

"ان کو کچھ نہ کچھ تو بتانا ہی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "تاکہ وہ مطمئن رہیں اور دور رہیں۔"

"اگر میں نے اپنی زبان میں کچھ کہا تو وہ آواز کے فرق کو محسوس کر لیں گے۔" محسن نے کہا۔

"آواز تو میری بھی مختلف ہوگی۔" میں نے کہا۔ "خیر میں ایک چال چلتا ہوں۔ شاید کامیاب رہے۔"

میں نے محسن کو انگلی سے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور واکی ٹاکی کے سوئچ کو نیچے ٹرانسمیٹر کی پوزیشن پر کر دیا۔ اسپیکر خاموش ہو گیا اور مائیکروفون کام کرنے لگا۔ میں نے پلاسٹک باڈی پر انگلی بجائی۔ ایک ڈاٹ کے لیے ایک بار کھٹ اور ڈیش کے لیے باڈی پر رگڑ۔ دو نقطوں کے لیے کھٹ کھٹ اور ڈیش لگانے کے لیے باڈی کے اوپر ناخن سے دو بار رگڑ۔ اس رگڑ سے ہلکی سی مگر مسلسل آواز پیدا ہوتی تھی۔ باڈی کے اندر کا مائیکروفون اسے یوں نشر کرتا ہوگا کہ سننے والوں کو اپنے

www.paksociety.com

اسپیکر پر چند سیکنڈ کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی ہوگی۔ اسی طرح میں نے لندن میں بہت سے شوقین لوگوں کو پریکٹس کرتے دیکھا تھا۔ وہ کسی بھی چیز سے کام چلا لیتے تھے۔ ایک کیل کو دیوار پر مار کے اور اسی سے لکیر کھینچ کر وہ ڈاٹ اور ڈیش بنا لیتے تھے۔ مجھے کو میز پر بجا کے اور ڈرم کے نقطوں اور لکیروں کا مفہوم پیدا کر لیتے تھے۔ نہ جانے کیسے مجھے خیال آگیا تھا کہ مورس کوڈ کو سمجھنے والا اگر وائرلیس کی بائی پر جواب دے گا تو اسی طرح دے گا۔ میں سیٹ پر ناخن مارتا رہا اور ناخن سے لکیریں بناتا رہا جو کچھ اس طرح سنائی دیتے تھے۔ ٹک ٹک... کھر... ٹک... کھر کھر... جو پیغام میں نے دیا وہ یہ تھا: سب خیریت ہے... ہم آرہے ہیں۔" پھر میں نے سوئچ کی پوزیشن بدلی اور اسے "ریسیو" پر کر دیا۔
چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اسپیکر نے چیخنا شروع کیا۔
"کیا تم کامیاب رہے اوور؟"
محسن کا چہرہ کھل اٹھا۔ آواز نکالے بغیر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے پھر ریسیور کی پوزیشن بدلی۔
"یس..." میں نے جواب دیا۔ "ہمارا انتظار کریں۔ اوور اینڈ آل۔" اور اس کو بند کر دیا۔
"ہم توقع کر سکتے ہیں کہ کچھ دیر کے لیے خطرہ ٹلا۔" محسن بولا۔ "حالانکہ ہم ابھی خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔"
"ہم خوش بھی ہو سکتے ہیں کہ اس مزار کی قید سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ ہم ابھی اندر ہی ہیں۔"
"لیکن اب اگلا مرحلہ اصل آزمائش ہے... ہم کو یہاں سے نکلنا ہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔
"پھر دیکھیں گے کہ یہ سب کیسے ہوا اور کیوں ہوا۔" میں نے کہا۔ "رابعہ اور نازو کی فکر کریں گے۔"
محسن نے حجرے کا دروازہ دوسری طرف سے کھولا۔ ہمارے سامنے وہی صحن آگیا جس میں خستہ و شکستہ ٹرک ہمارے علم کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ ہم نے زبردستی کر کے بالکل نئے ٹرک کو اسکریپ کر دیا تھا لیکن اس میدان میں کم سے کم دس افراد اسی واسطے میں دیوار بنے کھڑے تھے جو باہر کی دنیا تک پہنچنے کا واحد راستہ تھا۔ ہم اسی راستے سے اندر آئے تھے لیکن اس وقت کسی نے ہمیں نہیں روکا تھا۔ اتنے کم وقت میں دس مسلح افراد کی فوج کا نمودار ہو جانا کوئی معجزہ نہیں تھا۔ یقیناً وہ حجروں میں چھپے ہوئے تھے لیکن ہماری نظر ان کو دیکھ نہیں سکی تھی۔ محسن نے دروازہ پھر بند کر دیا۔ مخالف سمت کی دیوار میں ایک اور دروازہ تھا۔ اس سے گزر کر ہم دوسرے حجرے میں پہنچے۔ اس دوسرے حجرے میں بھی دو دروازے تھے۔ ایک صحن میں کھلنے والا اور دوسرا آگے والے حجرے سے ملا ہوا [illegible] آگے بڑھتے جانا بے سود تھا۔ ہر جگہ باہر نکلنے کا [illegible] تھا جس کے سامنے وہ لوگ [illegible] کے جاں نثار اور [illegible] کا [illegible] موت کے نمائندے بنے کھڑے تھے۔ [illegible] قدم پیچھے حجرے میں روک دی۔ اس کا دروازہ [illegible] سے ہم براہ راست ان کی نظروں میں نہیں آسکتے تھے [illegible] ٹرک آجاتا تھا اور تھوڑا سا چھت سے [illegible] آدھے صحن کو عبور کر کے ٹرک تک پہنچ سکتے تھے [illegible] اوپر سے لکڑی کا وہ لمبا چوڑا تختہ اتار لیا گیا تھا [illegible] لگا دی گئی تھی اور جو زیر زمین راستے کو بند کر رہا تھا۔
"ابھی کچھ دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔" میں نے [illegible]
"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہاں سرچ لائٹس روشن ہو جائیں گی۔" محسن بولا۔ "ابھی یہ لوگ ایک [illegible] کی دیوار بنے کھڑے ہیں پھر یہ پھیل جائیں گے کہ کہیں ہم پھاند کر نہ نکل جائیں۔"
"اس قلعے کی فصیل کو بھلا کون آسانی سے عبور کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر ہمیں سیڑھی یا رسی فراہم کر دی جائے تب بھی یہ ناممکن ہوگا اور اسی لیے یہ لوگ [illegible] طرف سے بھی نکل نہیں سکتے سوائے اس ایک واحد [illegible] وہ روکے ہوئے ہیں جب تک انہیں نہ ہٹا دیا جائے [illegible] نہایت مشکل ہے۔"
"مگر یہ ہٹنے والے لوگ نہیں ہیں۔"
"میں ہٹانے کی بات کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم ٹرک تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں تو..."
میری بات نامکمل رہ گئی کیونکہ میں نے ساتھ والے پانچویں حجرے میں سے باتیں کرنے کی آواز سنی۔ وہ دو [illegible] چپکے آپس میں کسی مسئلے پر الجھ رہے تھے۔ اختلاف رائے [illegible] سبب ہمیں اس لیے معلوم نہ ہو سکا کہ گفتگو کے الفاظ [illegible] یہ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا اور [illegible] ادھر ادھر دیکھ کر کمرے کی پچھلی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے [illegible] کو منتخب کیا۔ میں اور محسن اس کے نیچے گھس گئے [illegible] طرح کہ اگر لیٹنے کے بعد ہم سر اٹھا سکتے تھے اور [illegible] ٹانگیں پھیلا سکتے تھے۔ اپنے بہت قریب مجھے کوئی بھی چیز [illegible] آئی تو میں نے تار پیچ کو دور پھینک دیا۔ دروازہ ایک [illegible] کھلا اور وہ دونوں اندر آگئے۔
"تم نے بھی سنی تھی کوئی آواز؟" ایک نے کہا۔
"اور کیا میں بہرہ [illegible]" دوسرا [illegible]

وہ نشست جلا کے دیکھو۔"
"کوئی باہر تو نہیں گیا؟" پہلے نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ان کے قدم ایک ساتھ آگے بڑھے۔ میں نے اور محسن نے اپنے فیصلے پر عمل کیا۔ آگے بڑھ کے ان کی ایک ایک ٹانگ کو ٹخنے سے اوپر جکڑ کر پیچھے کھینچا۔ اس کے ساتھ ہی ہم باہر نکلے۔ وہ منہ کے بل نیچے فرش پر گرے۔ اس سے قبل کہ وہ اٹھنے میں کامیاب ہوتے میں ایک کی پشت پر سوار ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور مجھے گرانے کی کوشش میں وقت ضائع کر دیا ورنہ اتنی دیر میں وہ چلا کے باہر اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلا سکتا تھا۔ میں نے اس کا سر زمین سے ٹکرا دیا۔ اس کے لیے بڑی آسانی سے میسر اس کے بال ہاتھ میں آگئے تھے۔ وہ ایک زوردار "آہ" کر کے بے حس و حرکت ہو گیا۔ پھر میں نے دوسرے کی طرف دیکھا۔ محسن نے اسے بھی بالکل اسی طرح ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ ہم نے ان کی جیبوں کی تلاشی لی تو ہمیں ریوالور کے سوا کچھ نہ ملا۔ فی الحال ہمیں مزید ریوالور درکار نہیں تھے چنانچہ ہم نے جیب سے گولیاں نکال کے جیب میں ڈال لیں۔
"کیا ان کے چہرے بھی تمہیں شناسا محسوس ہوتے ہیں؟" محسن نے پھر اپنی گن اٹھا لی۔
"نہیں... یہ سب دوسرے اور تیسرے درجے کے خدمت گزار ہیں جو صرف جاں نثاری کا صلہ لیتے ہیں اور کوئی سوال نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "بعض اوقات یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، کس کے لیے کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں؟ اپنی زندگی کی طرح یہ اپنی موت پر بھی دنیاوی آقاؤں کا جبر و اختیار تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ آقا بھی عام فانی انسان ہوتے ہیں خدا نہیں ہوتے۔"
محسن نے اس دروازے کو دیکھا جس میں سے وہ دونوں اندر آئے تھے۔ بظاہر وہ بھی اسی قسم کا حجرہ تھا جس میں ہم ٹھہرے تھے لیکن اس میں ایک روشن مستطیل سی نظر آرہی تھی۔ میں نے محسن کو ایک چادر سے لمبی سی پٹی پھاڑتے دیکھا۔ چادر اسی پلنگ پر بچھی ہوئی تھی جس کے نیچے ہم نے پناہ لی تھی۔ چادر بالکل نئی تو نہیں تھی مگر بہت صاف تھی۔ میرے بازو کا زخم زور آزمائی کے سبب پھر رسنے لگا تھا۔ محسن نے آستین کا نصف حصہ پھاڑ کے الگ کیا اور زخم پر پٹی اس طرح لپیٹ دی کہ خون رک جائے۔
"تم نے دیکھا یہ دونوں تہ خانے سے اوپر آئے تھے؟" میں نے کہا۔
"تہ خانے کے سوا اور کہاں سے نکل سکتے ہیں۔" محسن بولا۔
"پہلے ہم انہی حجروں سے گزر چکے ہیں۔ اس وقت سب خالی پڑے تھے۔"
"یہ زیر زمین راستہ شاید بیچ کے حجرے میں ہے اور کہیں نہیں ہے۔" میں نے ساتھ والے کمرے کے فرش کی طرف اشارہ کیا۔
وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ہمیں فوری طور پر نازو یا رابعہ کے بارے میں تردد کرنے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ ٹیک محمد کا خیال تھا کہ وہ انتظار کرنے کے بعد مایوس ہو کر نکل گیا تو ہمیں اپنے فرار کے وسائل خود پیدا کرنے ہوں گے اور بعد میں اگر غالب نے کوئی عملی قدم اٹھایا تو یہاں آنے سے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا لیکن فوری طور پر ہم صرف اپنے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اگر ہم اس بار شکاریوں کے نرغے سے نکل گئے تو دوسروں کے لیے بھی کچھ کر سکیں گے ورنہ خدا کے بعد دوسروں کی مدد کے طلب گار ہوں گے۔ زخم کا اثر اب پورے بازو تک پھیلنے لگا تھا اور درد کا احساس میری انگلیوں کی پوروں تک اتر آیا تھا مگر میں اس بازو کو استعمال کرنے پر مجبور تھا۔
پانچویں حجرے سے نیچے اترنے والا راستہ ایک چوکھٹے پر مشتمل تھا بالکل کسی کھڑکی جیسا جو دیوار کے بجائے فرش میں نکالی گئی ہو۔ یہ چوکھٹا بالکل درمیان میں ہوتا تو پہلی بار اس کے اوپر سے گزرتے ہوئے ہمیں اس کی موجودگی کا احساس ضرور ہو جاتا۔ سیمنٹ کے پختہ فرش پر چلتے چلتے ہمارے قدموں کے نیچے لکڑی کا فرش آجاتا جس کے نیچے خلا تھا تو ہمارے پیروں کی دھمک بالکل جدا اور بالکل واضح ہوتی مگر چوکھٹا ایک گوشے میں تھا اور اسی مقام پر تھا جہاں دوسرے حجروں میں پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں اس کمرے میں سے پلنگ ہٹا دیا گیا تھا ورنہ وہی چوکھٹا کسی پلنگ کے نیچے آجاتا تو ہمیں بالکل دکھائی نہ دیتا۔ اس خیال نے مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبور کر دیا۔
"محسن! ایسے سوچے سمجھے بغیر نیچے جانا ٹھیک نہیں۔" میں نے کہا۔
"سوچنے سمجھنے کے لیے وقت نہیں ہے۔" محسن بولا۔
"ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہمیں تہ خانے میں پہنچانے کا انتظام ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک قید سے آدھے تو نکل آئے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ بدتر قید میں پوری طرح گرفتار ہو جائیں۔ پہلے ہم کم از کم اوپر تھے اب نیچے چلے جائیں تو کوئی مددگار بھی نہ پہنچ سکے۔"
"تم خوامخواہ ڈر رہے ہو۔"
"ڈر تو رہا ہوں مگر خوامخواہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "تو ذرا

www.paksociety.com

واقعات کو ذہن میں رکھو۔ پہلی بات تو یہ کہ ہمیں یہاں اسیر رکھنے والوں نے نازو کو چھوڑنا کیوں ضروری خیال کیا؟ وہ ہمیں بند رکھنا چاہتے تو رکھ سکتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ انھوں نے ہمیں گرفتار کرنے کے لیے ایسے اناڑیوں کو کیوں بھیجا۔ کیا ان کو معلوم نہیں تھا کہ ہم آسانی سے قابو میں آنے والے لوگ نہیں ہیں۔ وہ ذرا بھی مقابلہ نہ کر سکے۔ چودھری دلاور کی ذہانت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے ہمیں بڑی خوب صورتی سے ٹریپ کیا تھا اور جس طرح ہم سے مخاطب تھا وہ بھی اس کی عقل و فراست کا ثبوت تھا۔ گامے ماچھی کی لاش کو وہیں چھوڑ دینا بھی ایک ڈرامائی تاثر دینے کی کوشش تھی۔ مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہم جو کچھ پلان کرتے ہیں اسے پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ آخر اس کو کس نے بتایا کہ ہم یہاں آنے والے ہیں؟"

"یہ اسے راجو اور نازو میں سے کسی نے بتا دیا ہوگا۔" محسن بولا۔ "میرا قیاس کہتا ہے کہ نازو اپنے مشن میں کامیاب رہی تھی مگر گامے ماچھی کو یرغمال رکھنا بے سود ثابت ہوا۔ گامے ماچھی کے کسی اپنے آدمی نے جو اوپر والوں کا ایجنٹ تھا فوراً گامے ماچھی کا کام تمام کر دیا۔ اس سے قبل کہ نازو اسے اپنا اسیر بنا کے اس سے کچھ پوچھتی یا قیدی کو جانے حوالے کرتی اس کو قتل کر دیا گیا۔ ممکن ہے اس کے بعد قاتل بھی مارا گیا ہو۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کارِ خیر کے بعد وہ بھاگ گیا ہو۔" میں نے قائل ہوتے کہا۔ "اور چودھری دلاور کو خبر پہنچا دی ہو کہ دقیانوسی سلسلے کے تسلسل کا [illegible] دو خواتین نے گامے ماچھی کا تختہ اور خود گامے ماچھی کو الٹ دیا تھا مگر اس نے بروقت وہ زبان بھی خاموش کر دی جس سے افشائے راز کا ڈر تھا۔ باقی بندوبست خود چودھری صاحب نے کر لیا۔ اس نے فوراً تاڑ لیا ہوگا کہ یہ کیا [illegible] ہو سکتی ہیں ادا آنا آنا کس کے آنے کی تمہید ہے۔ چودھری دلاور نے جانتے بوجھتے ہمارے مقابلے پہ دو پیدل بھیج دیے۔ ان کے ہاتھ میں تو ریوالور تھا مگر وہ عقل سے بھی پیدل تھے۔ وہ مارے گئے تو کوئی بات نہیں۔ ہم کو غلط فہمی تو ہوگی نا کہ ہم مردانہ وار لڑ کے نکل آئے۔ تو خود سوچ، کیا فرار کے دروازے سے عقیدت مندوں پر بند کیے جا سکتے ہیں لیکن باہر عام لوگوں کے آنے جانے۔۔۔ میں استعمال ہونے والے دروازے پر ضرور کوئی نوٹس ہوگا یا عبارت ہوگی کہ خانقاہ کو مرمت تزئین اور آرائش کے بعد کھولا جائے گا۔ چودھری دلاور نے ماتحتوں کے ذریعے ہم سے مذاکرات کیے۔ کیا ایسے نظام کو نصب کرنے کے وسائل رکھنے والا یہ نہیں کر سکتا کہ اندر بے ہوش کرنے والی گیس چھوڑ دیتا۔ کلوروفارم یا [illegible] سی مقدار کافی تھی مگر اس نے ہمیں نکل جانے دیا۔ اس طرح کہ ہم اسے اپنی کامیابی سمجھیں۔ پھر اس نے ہم کو [illegible] بھی فراہم کیا۔ وہ ہم سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے درخواست کرنا چودھری دلاور کی شان کے خلاف تھا۔ اس نے مورس کوڈ میں پیغام دیا اور ہمارے جواب پر وہ بہت خوش ہوا ہوگا کیونکہ ہم نے اس کا اندازہ ثابت کر دیا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ یہ ولایت پلٹ جوان تا کچھ جانتے ہیں، مورس کوڈ سے بھی واقف ہیں۔ ہم نے جواب دیا تو اس نے مان لیا کہ جواب دینے والے اسی کے آدمی ہیں حالانکہ وہ اچھی طرح سمجھتا ہوگا کہ یہ ہم ہی ہیں۔ واکی ٹاکی میں مورس کوڈ کا استعمال عجیب ہے۔ براہِ راست گفتگو میں کیا حرج تھا۔"

"مسئلہ رازداری کا بھی ہو سکتا تھا۔"

"اور ہو۔۔۔ اتنی سی دیر میں پیغام کے کہیں اور پہنچنے اور اس سے کسی قسم کا نقصان ہونے کے امکانات ایک بھی نہیں تھے۔ دس ہزار میں ایک بھی [illegible] تھے کہ بس وہ چاہتا تھا کہ اپنی آواز نہ سنائے اور ہم میں جواب دیں۔ وہ ہمیں دھوکا دے رہا ہے کہ وہ خود دھوکے میں آ گیا ہے۔ ہم تو ہر طرف سے محصور ہیں [illegible] لیں ہیں۔ چودھری دلاور اندر کیوں نہیں آ جاتا؟ آئے گا کب؟"

"اچھا تیری بات مان لی جائے تو پھر اب کیا کریں؟" محسن نے کہا۔

"یہ کھڑکی یا زیرِ زمین راستہ بھی عمداً کھلا چھوڑا [illegible]" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ورنہ اس راستے سے [illegible] والے اسے بند کر کے بھی آ سکتے تھے۔ وہ [illegible] جگہ بنا لگا ہوا ہے یہاں سے بند بھی اٹھا دیا گیا ہے [illegible] روشنی بھی ہے۔ یہ ٹریپ ہے یا نہیں؟ مجھے تو ایک [illegible] کہ یہ جو سامنے سلیج [illegible] کا ایک پورا دستہ کھلا ہوا [illegible] ہیں۔۔۔ حکم کے غلام جن کو [illegible] کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ان کو نہیں معلوم کہ وہ سب مارے [illegible] ہیں اور ان کی موت سے آقاؤں کو صرف تماشا [illegible] کے ڈرامے کا ایک سین بالکل حقیقی نظر آئے گا۔ [illegible] بعض نے زندگی میں پہلی مرتبہ ریوالور اٹھایا ہوگا۔"

میں نے مان [illegible]

[illegible] آگے پڑھتا ہے، نیچے اترنا ہے یا ہمیں ڈر لگتا ہے؟"

ہو نہ ہو اب [illegible] چاہتا ہے کہ ہم سب کچھ دیکھ لیں اور پھر حیرت [illegible] دلاور چاہتا [illegible] تو ایسا ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔ "چل نیچے چلتے [illegible] سمجھتے ہیں کہ دلاور کا مقصد کیا ہے۔ اس بات کو ذہن [illegible] کہ وہ ایک چھوٹے ڈرامے سے جیسے پورا ڈراما [illegible] پہلے ہی فرزند اور بڑی سوداگری کر چکا ہے۔ [illegible] برکت یا اس کے کسی شاگرد کو قتل کیے بغیر ہمیں یقین دلا دیا تھا کہ ہماری وجہ سے ان کی جان گئی۔ اب وہ کیا ثابت کرنا چاہتا ہے، یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔۔۔ چل نیچے۔"

محسن نے مجھ سے پہلے زینے پہ قدم رکھا اور نیچے اترنے [illegible] کسی زیرِ زمین کمرے سے آ رہی تھی اور ہمیں راستہ دکھانے کے لیے کافی تھی۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے [illegible] ہم تہ خانے میں اترتے گئے یہاں تک کہ [illegible] ایک طویل ہال میں پایا۔ اسے ایک بہت لمبا برآمدہ [illegible] ہمارا بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ پندرہ فٹ چوڑا اور تقریباً [illegible] یہ پختہ فرش اور دیواروں والا تہ خانہ [illegible] ستونوں کی چھت کے نیچے پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی چوڑائی تو پندرہ فٹ ہی تھی مگر لمبائی ڈیڑھ سو فٹ سے بھی زیادہ تھی۔ درمیان میں کہیں کہیں سیمنٹ کنکریٹ کے [illegible] چھت کو سہارا دیتے تھے اور ایک ایک ستون چھوڑ کر [illegible] نصب کی گئی تھیں وہ بہت تیز تھیں۔ ایک کا [illegible] طرف تھا تو دوسری کا مخالف سمت میں اور یوں درمیان کا پورا علاقہ روشن تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنا طویل [illegible] تہ خانہ بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔

میں نے اور محسن نے ادھر ادھر نگاہ رکھتے ہوئے آگے بڑھنا جاری رکھا۔ کسی بھی ستون کی اوٹ سے کسی کے اچانک نکل آنے اور ہم دونوں کے جسم چھلنی کر دیے جانے کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ محسن ایک دم جھکا اور اس نے فرش پر سے کوئی چیز اٹھائی۔ یہ شفاف پلاسٹک کی چھوٹی سی [illegible] تھیلی تھی۔ چائے کی پتی کی چار پانچ آنے والی تھیلیوں کے [illegible] سفید چینی تو نہیں ہو سکتی۔" محسن نے کہا۔

"اتنے چھوٹے پیکٹ چینی کے نہیں ہو سکتے۔" میں نے [illegible] تھیلی کو محسن سے لے لیا جس کا وزن [illegible] آدھا سیر یا سیر کی تھیلی میں ہو سکتی تھی [illegible]

"پھر کیا ہے؟ ہیروئن؟"

[illegible] تھیلی کا ایک کونا دانت سے کاٹ کر اس سفید چیز کو ہتھیلی پر نکالا اور ایک انگلی کی پور پہ لگا کے چکھا۔۔۔

"ہیروئن۔" میں نے پورے یقین کے ساتھ فیصلہ دیا اور ایک طرف تھوک دیا۔ "میرا خیال غلط نہیں تھا۔"

"یہ خیال میرا تھا کہ یہ ہیروئن ہے۔" محسن نے کہا۔

"میں دلاور کے متعلق رائے دے رہا تھا۔" میں نے کہا اور ہیروئن کے پیکٹ کو جیب میں رکھ لیا۔ آخر تک جانے سے پہلے مختلف کونوں میں پڑے ہوئے دو پیکٹ اور ملے۔ بلاشبہ ان میں ہیروئن تھی اور جس انداز سے پیکٹ پھیلائے گئے تھے اس سے خیال یہی آتا تھا کہ یہ پیکٹ مال اٹھاتے وقت گر گئے اور کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ تہ خانے کے انتظامات اور تہ خانے کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ فرض کیا جاتا تو غلط نہ ہوتا کہ یہ گودام ہے جہاں بہت زیادہ مال آتا جاتا ہے اور سیکڑوں ہزاروں تھیلیوں میں سے کسی جگہ ایک تھیلی کا گر جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ پھر یہ کہ تھیلی سڑک پر تو نہیں گری۔ گودام میں پڑی رہی، اگلی بار اٹھا لی جائے گی۔

"مبارک ہو عزیزم کہ بزعم خود اپنی ذات کو احمق الاحمقین ثابت کرنے والے بالآخر چودھری صاحب کے طفیل ضمانت کی اعلیٰ ترین سند حاصل کرنے میں کامیاب ہے۔" میں نے کہا۔

"سلیس اردو میں ارشاد ہو کہ آپ کیا بک رہے ہیں؟"

"ہم یہ فرما رہے ہیں کہ اپنی کوشش کامیاب رہی۔" میں نے کہا۔ "ہم چودھری دلاور کو جس بات کا یقین دلانا چاہتے تھے اس بات کا انھوں نے یقین کر لیا۔ ہم یہ ظاہر کرنے میں مصروف تھے کہ ہمیں اصل کاروبار کی خبر ہی نہیں۔ وہ بیچتے ہیں اسلحہ اور گولہ بارود مگر ہم انھیں منشیات فروش سمجھتے ہیں۔ ان کو یقین آ گیا ہے کہ ہم اصلیت کو نہیں جانتے اور ضرورت اس بات کی تھی کہ ہمیں ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کر دیا جائے۔ ثبوت ہماری جیب میں پہنچ چکا ہے۔ ہم اب چودھری دلاور کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں گے تو یہی نا کہ اس خانقاہ کو منشیات کا اڈا ثابت کرنے کے لیے یہ تین تھیلیاں پیش کریں گے؟ اس سے کیا ہوگا؟ کیا ان تھیلیوں پر امپورٹر ایکسپورٹر کی مہر ہے یا ٹریڈ مارک ہے؟۔۔۔ نہیں تو کچھ نہیں۔ ہم ضعیف الاعتقاد اور جاہل عقیدت مندوں کے جذبات کو مشتعل کریں گے جو سجادہ نشین کی ذات پر ایسے ناپاک الزام کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم چودھری دلاور سے واکی ٹاکی پر بات کریں گے، اس پر واضح کریں گے کہ ثبوت ہمیں مل چکا ہے اور بہت جلد ہم ثابت بھی کر دیں گے کہ چودھری دلاور اینڈ کمپنی کی حقیقت اور اصلیت کیا ہے۔ وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوگا اور کہے گا کہ تم نے پہلے

www.paksociety.com

ہیرا کیا بگاڑ لیا ہے۔ جو کرنا چاہتے ہو شوق سے کرو۔ اپنی دانست میں وہ ہمیں گمراہ سمجھتا ہے۔ خالی گودام میں ہیروئن کے پیکٹ پھینک کر اس نے ہمیں صراط مستقیم سے زیادہ دور کر دیا ہے۔ اس نے ہمیں یقین دلا دیا ہے کہ وہ واقعی منشیات کے دھندے میں ملوث ہے اور اس طرح اپنے اصل کاروبار کو تحفظ فراہم کیا ہے۔ ہم بھٹک کر غلط راستے پر چلنے والے احمق ہیں محسن خان صاحب!"

"میں آپ کی حد تک اس رائے سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔" محسن کھنکار کر بولا۔ "ماشاءاللہ آپ بچپن سے ہی حماقتوں میں طاق تھے۔"

"اب اس بے وقوف بنانے اور بننے والے ڈرامے کا سب سے مشکل سین آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم فوراً گولیاں چلاتے غنیم کی صفوں کو چیرتے ہوئے نکل جائیں گے۔ اچھا سی ٹرک میں سوار ہو کے جسے ہم نے ٹینک سے زیادہ مضبوط بنا دیا ہے۔"

اوپر شام کا اندھیرا بڑھتے بڑھتے رات کے اندھیرے میں ڈھل چکا تھا اور احاطے کی فصیل کے اوپر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے سرچ لائٹس روشن ہو گئی تھیں مگر وہ صف دشمناں اپنی جگہ پر موجود تھی۔ وہ عجیب کاٹھ کے الو تھے کہ ان کے ہاتھ میں بندوق دے کر انھیں جہاں کھڑا کر دیا گیا تھا وہاں سے وہ ایک انچ بھی ہلنے پر آمادہ نہ تھے۔ شاید ان کے آقاؤں کا ان کو یہی حکم تھا۔ معلوم نہیں ان کو کیا سمجھایا گیا تھا کہ وہ جان کے خوف سے بے نیاز ایک راستے کو بند کیے کھڑے تھے۔ شاید ان سے کہا گیا ہو کہ ادھر سے وہ بدمعاش گزرنے کی کوشش کریں گے۔ ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کے پاس صرف خنجر ہوں گے۔ میں نے افسوس سے سوچا۔

"اب صورت حالات زیادہ موافق ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہم سر جھکا کے ایک قطار میں دوڑ لگاتے ہیں۔ قدموں کی آہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ ترچھا جانے سے ہم ٹرک کے پیچھے پہنچیں گے آڑ میں رہیں گے۔"

"اگر ضرورت نہ پڑے تو قتل عام مت کرنا۔ ریوالور سے کام نکالنے کی کوشش کرنا۔" میں نے کہا۔

پھر ہم دونوں نے اتفاق رائے سے پیٹ کے بل رینگتے ہوئے جانا مناسب سمجھا۔ ٹرک ہم سے کوئی پچاس گز دور کھڑا ہوا تھا مگر معلوم نہیں لگ رہا تھا۔ یہ فاصلہ طے کرنے کے بعد میرے لیے زخمی بازو کی کہنی پر جسم کے بوجھ کو آگے گھسیٹنا مشکل ہو گیا۔ میں رک کر لمبے لمبے سانس لینے لگا اور سر کو گھاس پر رکھ کے لیٹ گیا۔ محسن نے میری ہمت بندھائی اور پانچ منٹ بعد میں نے باقی راستہ طے کرنے کا آغاز کیا۔ ٹرک تک پہنچنے میں مجھے جسمانی کمزوری اور تکلیف کے سوا کسی پریشانی کا احساس نہیں ہوا مگر میں یہ سوچ کر پریشان تھا کہ کیا میں اس دیو ہیکل ٹرک کو چلا کے نکال لے جانے میں کامیاب ہو سکوں گا۔ اس کے اسٹیئرنگ وہیل کو گھمانے کے لیے دونوں ہاتھوں کی قوت درکار تھی جبکہ میرا ایک ہاتھ عملاً ناکارہ ہو رہا تھا۔ ٹرک کے قریب پہنچ کر مجھے چکر سا آیا۔ میں نے ہینڈل کو کھینچا تو دروازہ خود بخود کھل گیا۔

"سکندر! تو چلا سکتا ہے ٹرک؟" محسن نے میرا کندھا پکڑ کے پوچھا۔ "آگے سرنگ ہے۔"

"ہیں... میرا خیال ہے کہ مجھ سے حادثہ ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو پھر تو پیچھے جا۔" محسن نے اسٹین گن مجھے تھما دی۔ "اسٹین گن چلا لے گا؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا لیکن اسٹین گن پکڑتے ہوئے یہ میری حالت میں کچھ بہتری کے آثار نمودار ہونے۔ ٹرک میں بیٹھ ہو کے اسٹین گن چلانا بھی آسان کام نہیں تھا۔ ایک تو ٹرک چلنے سے پہلے میں اس پر چڑھتا تو سامنے کھڑی ہوئی فوج مجھے دیکھ لیتی۔ وہ مجھے اتنی مہلت بھی نہ دیتے۔ یہ کام اسی طرح ہو سکتا تھا کہ جیسے ہی ٹرک گھومے اور سرنگ کی طرف چلنے لگے میں دوڑ کر اس کے عقبی حصے میں پائدان پر قدم جماؤں اور چھلانگ مار کے دو فٹ سے زیادہ اونچے تختے پر سوار ہو جاؤں۔ پھر فوراً ہی پلٹ کر پوزیشن سنبھالوں اور پیچھے اندھا دھند دوڑتا ہوا ٹرک اس راستے کی فوج کو روندنے کی نیت سے آگے بڑھے میں فائر کھول دوں۔ یہ بہت بڑا اور مستعدی کا مشکل کام تھا جو ڈرائیونگ سے زیادہ توجہ اور حاضر دماغی مانگتا تھا۔ میں نے شکر ادا کیا اور اوپر چڑھ گیا۔

ڈرائیونگ کیبن کے اندھیرے میں میرے دشمن مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں ونڈ اسکرین کے پیچھے سیدھا بیٹھا گھورتا رہا۔ میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمے رہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں نے مفروضات کی بنیاد پر غلط نتائج اخذ کر لیے ہوں۔ سامنے کھڑے ہوئے دشمن اناڑی نہ ہوں مجھ سے ... ہوں۔ جن کو میں نے کاٹھ کا الو سمجھ لیا تھا وہ ... سخت خون آشام ہوں جو پلٹ ریوالور مجھ پر خالی کر دیں اور ... کی ایک گولی بھی ضائع نہ جانے۔

"کیا سوچ رہا ہے؟" محسن نے میرے قریب آ کے کہا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا اور اگنیشن سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سیٹ پر بیٹھا ہوا میں بہت اداس تھا۔ میں نے چابی گھمائی۔ انجن غرایا اور ایک سیکنڈ کا توقف کیے بغیر میں نے کلچ کو چھوڑ دیا۔ ٹرک کسی زخمی درندے کی طرح بپھر گیا۔ سامنے سے آنے والی گولی نے ونڈ اسکرین کو کا جالا بچھا دیا۔ میں نے اسٹیئرنگ وہیل کو اپنے ہاتھوں سے پھسلتے محسوس کیا۔ اسے پورا چکر دینے کے لیے ایک بازو کی طاقت ناکافی تھی اور دوسرے ہاتھ کی رگیں کھنچ کر ٹوٹنے لگی تھیں۔ میرا سر نیچے اور جھک گیا اور میں نے تیز رفتار موڑ کاٹا تو محسوس کیا ٹرک جسے سیدھا جانا چاہیے تھا ایک دم دائیں ہاتھ کی طرف مڑ گیا۔ میں نے اسے سنبھالا تو ٹرک تیزی سے بائیں جانب گیا۔ دوسری گولی ٹرک کی باڈی سے ٹکرائی پھر مسلسل فائر ہونے لگے۔

"یہ کیا کر رہا ہے تو...؟" محسن چلایا۔ "کدھر جا رہا ہے؟"

میں نے سر اٹھا کے دیکھا۔ "اچھا اچھا... راستہ تو ادھر ہے۔" میں نے کہا اور ٹرک کو پھر موڑا لیکن اسٹیئرنگ میرے قابو میں نہیں تھا۔ کبھی وہ ضرورت سے زیادہ گھوم جاتا تھا اور کبھی گھومنے سے انکار کر دیتا تھا۔ میں نے اسٹین گن کے فائر کی اصل آواز سنی۔ یہ بڑی خوفناک اور خونی آواز تھی۔ ٹرک کا ایک ٹائر دھماکے سے پھٹا۔ ٹرک لڑکھڑایا۔ میں نے سر اٹھا کے دیکھا دشمن تتر بتر ہو رہے تھے مگر میدان چھوڑ کر نہیں بھاگے تھے۔ راستہ میرے سامنے تھا لیکن نہ جانے کون درمیان میں آ گیا۔ پلک جھپکتے ہی ٹرک اس شخص کے اوپر سے گزر گیا۔ گولیاں اب بھی چل رہی تھیں مگر میں ٹرک کو سرنگ کے اندر لے جانے میں کامیاب ہوا۔ ٹرک کی ایک ہیڈ لائٹ کام کرتی تھی لیکن میں نے اسے روشن نہیں کیا تھا۔ مجھے اچانک خیال آ گیا کہ سرنگ کے آگے ایک موڑ بھی ہے۔ میں نے دائیں پیر کا دباؤ بریک پر بڑھایا اور سیدھے ہاتھ سے لائٹ کا سوئچ کھینچا۔ بائیں ہاتھ اتنی دیر میں اسٹیئرنگ کو چھوڑ چکا تھا۔ جب ایک ہیڈ لائٹ کا اجالا اس اندھیرے کی سرنگ میں پھیلا تو میں نے ایک دم سیدھے ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو بائیں ہاتھ کی جانب گھمایا مگر اس عمل میں سیکنڈ کے حصے کی دیر ہو گئی۔ ٹرک کی باڈی نے سرنگ کی دیوار سے رگڑ کھائی۔ ٹرک الٹتے الٹتے بچا۔ اس کی وہ سائیڈ جو دیوار کی جانب تھی اور اگلا مڈ گارڈ ٹائر کے ساتھ ٹکرانے لگا۔ پیچھے سے گولی چلائی اور ٹرک کا دوسرا پچھلا ٹائر پھٹا۔ اس کی آواز کسی بم کے دھماکے کی طرح تھی۔ پیچھے دونوں طرف دو دو ٹائر نہ ہوتے تو ٹرک پیچھے سے بیٹھ جاتا اور ایک قدم آگے نہ جاتا۔

میں نے سر اٹھا کے سامنے دیکھا۔ موڑ ایک دم آ گیا اور میری بچانے کی جدوجہد کے باوجود اس مرتبہ ٹرک کی دوسری سائڈ نے دیوار سے رگڑ کھائی۔ لکڑی کی باڈی بکھر گئی اور میں نے دوسری بار ٹرک کو الٹنے سے بچایا۔ میرا تمام جسم سردی کے باوجود پسینے میں تر تھا اور میری جسمانی توانائی بڑی تیزی سے زائل ہو رہی تھی۔ تعاقب کرنے والے شاید پیچھے دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ محسن نے پے در پے ریوالور سے فائر کیے۔ ہر فائر کی آواز اس سرنگ میں گونجتی رہی پھر ساری جدوجہد ختم ہو گئی۔ کسی گولی نے پیچھے والا دوسرا ٹائر بھی پھاڑ دیا۔ ٹرک ایک دم گھوما اور بریک لگنے سے پہلے ہی دیوار سے ٹکرا گیا۔ تصادم کی قوت نے ٹرک کو تقریباً سا گھمایا اور میں باہر جا گرا۔ میں نے محسن کو چیسس کے نیچے سے رینگ کر آتے دیکھا۔ ٹرک ترچھا ہو کے سرنگ میں اس طرح پھنس گیا تھا کہ نہ اسے آگے کھسکایا جا سکتا تھا نہ پیچھے ہٹایا جا سکتا تھا۔ اس کی موجودہ ظاہری حالت کو دیکھتے ہوئے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ کچھ دیر پہلے ایک بالکل نیا ٹرک تھا۔

محسن نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے کھڑا کیا اور اپنے ساتھ گھسیٹنے لگا۔ میں اس کے ساتھ یوں چلتا رہا جیسے انجن کے ساتھ بوگی چلتی ہے۔ یہ محسن کا سہارا تھا، میری قوت ارادی تھی یا زندہ رہنے کی خواہش جس نے مجھے گرنے نہ دیا۔ میرے سامنے اب وہ پھاٹک تھا جسے کاٹ کر اور گرا کر ہم اندر گئے تھے۔ اس کا آہنی وجود فرش خاک پر سرنگوں پڑا تھا۔

"ذرا سنبھل کے۔" محسن نے مجھے جھنجوڑا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کے دیکھا اور اگلا قدم اٹھایا مگر اندازہ غلط ہو گیا۔ میں لوہے کے پھاٹک پر منہ کے بل گرا۔ اندھیرے میں کئی گولیاں میرے سر پر سے سنسناتی گزر گئیں۔ وہ بہرحال کاٹھ کے الو اور اناڑی نہیں تھے۔ وہ ابھی تک مقابلہ کر رہے تھے اور پیچھے آ رہے تھے۔ محسن نے گھوم کر دو فائر کیے اور خالی ہو جانے والا پستول پھینک دیا۔ پھر اس نے مجھے اٹھایا۔ میرے ٹخنوں اور گھٹنوں پر چوٹ آئی تھی۔ محسن نے مجھے سہارا دیا اور میری کلائی تھام لی۔ "بس چند قدم۔" محسن نے کہا۔ "ہم باہر نکل آئے ہیں۔ تجھے تو بخار ہو گیا ہے۔"

"بخار... نہیں... وہ تو بس ایسے ہی۔" میں نے کہا۔

اسی وقت میں نے ٹیک محمد کی آواز سنی۔ تازہ ہوا میں میری طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ مجھے تعاقب میں آنے والے شاید

www.paksociety.com

مایوس ہو کے یا ڈر کے واپس چلے گئے تھے۔

"تم نیک محمد؟" محسن نے اندھیرے سے نکل کر سامنے آنے والے سائے سے کہا۔ "تم یہاں کہاں؟"

"ہم نے تو تمہیں خانقاہ کے دروازے پہ انتظار کرنے کو کہا تھا۔" میں نے کہا۔

"ابھی تک تو میں وہیں تھا۔" نیک محمد نے میرا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی اور سہارا لینے کے لیے وہی بازو پکڑ لیا جو زخم خوردہ تھا۔

"اسے چھوڑ دو۔" میں نے کراہ کے کہا۔ "گولی کا زخم ہے۔"

"گولی... کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے سکندر بادشاہ؟" وہ گھبرا کے بولا۔ گیارہ بجے کے احاطے میں بالکل خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔

"نہیں... معمولی سا زخم ہے۔ ہڈی بچ گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ اگر ابھی تک تم وہیں انتظار کر رہے تھے تو کیا تم نے فائرنگ کی آواز نہیں سنی تھی؟" ہم احاطے سے نکل کر نیک محمد کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

نیک محمد نے سر ہلایا۔ "بالکل نہیں، سنی ہوتی تو میں وہاں بھی اکتفا نہ کر لیتا۔"

"آج وہاں لوگ کیوں نہیں آ رہے تھے؟" محسن بولا۔

"میں نے ایک شخص سے پوچھا تھا۔" نیک محمد بولا۔ "وہ دروازے تک جا کے لوٹا تھا۔ اس نے بتایا کہ گامے شاہ صاحب کا چلہ ہے چالیس دن کا۔ وہاں دروازے کے باہر کوئی مجاور بیٹھا تھا۔ وہی آنے والوں کو واپس جانے کا کہہ رہا تھا۔"

"ان کا تو اب چالیس دن بعد چہلم بھی شاید ہی ہو۔" میں نے کہا۔ "وہ مارا جا چکا ہے۔"

"تم نے ہدایات کی خلاف ورزی کیوں کی؟ اگر ہم ادھر سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو تم ملتے۔ پھر ہم فرار کیسے ہوتے؟"

"تم لوگ ادھر سے نہیں نکل سکتے تھے۔" نیک محمد نے کہا۔ "میں نے دیکھا تھا دروازے کے باہر اتنا بڑا تالا پڑا ہوا تھا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے تالے کا سائز بتایا جو خاصا مبالغہ آمیز تھا۔ تربوز کے سائز کا تالا بھلا کہاں ہوتا ہے۔ "اس کے علاوہ وہاں کچھ اور بھی آدمی تھے ان کے سکندر بادشاہ... وہ وہیں آس پاس پھر رہے تھے اور باہر بیٹھے ہوئے مجاور سے بھی بات کر لیتے تھے۔ میں وہاں بلاوجہ ٹھہرتا تو وہ مجھے بھگا دیتے۔ میں نے ظاہر یہ کیا کہ گاڑی خراب ہو گئی ہے اور بونٹ کھولے کھڑا رہا۔ ان میں سے ایک نے قریب آ کے کہا ابھی تھا کر تیری ٹیکسی اسٹینڈ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اسٹیئرنگ کا پانی

بیئرنگ ٹوٹ گیا ہے اور بیٹری کا ... بیئرنگ بدلنے کے لیے شہر گیا ہے۔"

"لیکن ہم نے کہا تھا کہ مغرب کے بعد گھر چلے جانا ... غالب کو بتانا۔"

"ہاں ہاں... وہ ٹھیک ہے سکندر بادشاہ ... پہلے میری بات تو پوری سن لو۔"

"یہاں کھڑے ہو کر بات کرنے میں کون سی عقل ... یہاں سے تو نکلو۔" محسن نے کہا اور نیک محمد نے ...

"وہاں میں فالتو نہیں کھڑا رہا۔" نیک محمد نے ... "ایک ہوٹل ہے سڑک کے کنارے۔" وہاں جا کے بیٹھ ... بہت دیر بیٹھا رہا۔ ہوٹل کا مالک پہلے سے دیکھ رہا ... میری ہے۔ وہ باتیں کرنے لگا اور باتوں باتوں میں ... گامے شاہ بڑے جلال میں تھے۔ اُن کا مقابلہ جنوں کا ... ایک بہت بڑے جرنیل سے چل گیا۔ میں نے کہا کیا جنات بھی کرنل جرنیل ہوتے ہیں۔ وہ بولا کہ جنات کی ایک ... ہے۔ شاہ جنات اس کا نظام بہتر فوج کے ... جیسے ال بادشاہ ہوتا ہے وہاں وزیر بھی ہوتے ... کے عہدیدار بھی۔ خیر میں کیا پوچھتا۔ پھر اس نے بتایا ... آئی تھیں کسی دور دراز کے گاؤں سے۔ ان میں سے ایک ... آتا تھا اور سارے عامل اس سے ہار چکے تھے۔ سب کا ... جاتا تھا اور خود جن اتارنے کی کوشش کرنے والے ... لالے پڑ جاتے تھے۔ خون کی الٹیاں شروع ہو جاتی تھیں ... وہ ذبح کیے ہوئے کبوتر کی طرح پھڑکتا تھا۔ دستی ... کے رکنا مشکل ہو جاتا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ وہ کوئی معمولی ... تھا۔ جرنیل جن تھا۔ گامے شاہ صاحب نے ... بچھاڑ شروع کی۔ سنا ہے بڑی اٹھا پٹخ ہوئی اندر ... کو نکال دیا گیا اور شاہ جی کے ساتھ اس جرنیل جن کے ... دو ہاتھ ہوئے۔"

"وہ عورتیں کون تھیں؟"

"اپنی رابعہ اور نازو۔" نیک محمد نے یوں کہا جیسے ... سوال نے اسے مایوس کیا ہے کیونکہ وہ مجھے ... سمجھتا تھا۔ "میں نے اس ہوٹل والے سے حلیہ بھی پوچھا ... اور حلیہ انہی کا تھا۔"

"اچھا تو جن جرنیل اور گامے شاہ کے ڈوئل کا انجام ... ہوا؟" محسن بولا۔

"ہوٹل والے کے بیان کے مطابق ان عورتوں کو ... دیا گیا تھا۔" نیک محمد بولا۔ "مگر اس کے بعد ہی گامے

شاہ نے بھی مصافحہ کر دیا کہ یا وہ جرنیل جن بڑا شرمندہ ہوا۔ گامے شاہ نے کہا ہے کہ یہ عام جن نہیں ہے۔ چالیس دن کا چلا سخت عمل ہے۔ وہ پہلے کی طرح اسے اپنے بس میں کرنے کی کوشش کرے گا۔ اب دیکھو کس کا پلڑا بھاری رہتا ہے۔ گامے شاہ کے مرید تو سخت پریشان ہیں کیونکہ ایسا زبردست مقابلہ پہلے کبھی نہیں ہوا۔ انھیں ڈر ہے کہ گامے شاہ کے عمل میں شیطان رخنہ ڈالنے نہ آ جائے۔ جرنیل جن کے ہاتھوں گامے شاہ کی جان بھی جا سکتی ہے۔"

"بہت خبیث اور چالاک لوگ ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا کہانی گھڑی ہے۔"

"اور گامے شاہ کی موت کو باعزت بنانے کے لیے کیسے موافق حالات پیدا کر دیے ہیں۔" محسن بولا۔ "سب کہیں گے ایک اجنبی عورت کی خاطر جان کی بازی لگا دی۔ خلق خدا کو ارواح خبیثہ سے محفوظ رکھنے کے لیے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔"

"اس کو بھی یہیں گاڑ دیں گے اور مزار پر اس لعنتی آدمی کے سیاہ کارنامے لکھنے کے بجائے القاب و آداب لکھا کر آٹھ سال سے اس کا عرس مبارک شروع کر دیں گے۔ داستانیں پھیلا دیں گے کہ جرنیل جن کے ساتھ مقابلے میں ان کی شہادت کا کیا درجہ ہے اور بے چارے سادہ لوح دیہاتی کمزور عقیدے والے اور پریشان حال لوگ آنے لگیں گے ڈھول ڈھمکا لے کر چادریں چڑھانے۔" میں نے کہا۔

"یار بھاڑ میں گیا جن جرنیل اور جہنم میں گیا گامے شاہ۔ وہ خواتین کہاں گئیں؟" محسن بولا۔

"ان کی بھی عجیب کہانی ہے۔" نیک محمد نے ٹیکسی کو سڑک پہ موڑ لیا۔ "اسی کی وجہ سے میں ادھر آ گیا۔ میں نے سوچا تھا کہ اس راستے سے اندر چلا جاؤں اور تمہیں دیکھوں۔"

"ہم کیا سامنے کھڑے تھے کہ نظر آ جاتے؟" محسن بولا۔ "تم ایسے گھس رہے تھے دشمنوں کے قلعے میں؟"

"یہی بات ہے سکندر بادشاہ۔ ڈر تو بہت لگ رہا تھا مگر میں نے سوچا جہاں تک چھپ کے جا سکا جاؤں گا۔ واپس بلٹ کر جانے پہ طبیعت راضی نہیں ہوتی تھی۔ پھر جب اس ہوٹل والے کی بات سنی تو اور کچھ سوجھا ہی نہیں۔ اُس نے بتایا کہ وہ عورتیں گرتی پڑتی باہر نکلی تھیں۔ باہر ان کے گھر والے موجود تھے۔"

"گھر والے!" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ چونک کر کہا۔

"کون گھر والے؟ ایک تو ہوتے ہیں بھائی، بہن، ماں،

باپ وغیرہ۔" محسن بولا۔

"دوسرا مطلب عام فہم زبان میں خدا نخواستہ مجازی سے ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کم سے کم ایک کا گھر والا وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"مگر باہر دو آدمی ان کے گھر والے... میرا مطلب ہے ان کے وہ... شوہر بنے کھڑے تھے۔" نیک محمد نے خداوند مجازی جیسے مشکل لفظ سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ "انھوں نے بڑا ہنگامہ کیا۔ عورتوں نے بھی اور مردوں نے بھی۔ مرد زبردستی کرا رہے تھے اور ان کا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ عورتیں... میرا مطلب ہے رابعہ اور نازو بھلا کیسے مان سکتی تھیں! انھوں نے چیخنا چلانا شروع کیا کہ وہ ان کی صورت سے بھی واقف نہیں مگر مردوں نے اپنی بات منوا لی۔ لوگوں سے کہا کہ دونوں پہ جنات کا اثر ہے۔ اسی لیے گامے شاہ کے پاس لائے تھے کہ وہ کسی طرح یہ جن اتار دیں۔ دورے کی حالت میں یہ اسی طرح کی باتیں کرتی ہیں اور گھر کے ہر فرد کو پہچاننے سے انکار کر دیتی ہیں۔ پتہ نہیں کس کس کے نام لیتی ہیں جو سب جن ہی ہوتے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟ کیا وہ انھیں لے گئے؟" میں نے تڑپ کے کہا۔

"ہاں سکندر بادشاہ! وہاں ان کی کون مدد کرتا جہاں سارے ایسے ہی الو کے پٹھے موجود ہوں۔" نیک محمد نے کہا۔ "سب کی ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ کچھ مشتی ہوتی اور کچھ اپنے ناکارہ دماغ کی پیداوار۔"

"نازو نے کچھ نہیں کیا؟ اس کے ساتھ زبردستی کرنا آسان تو نہیں تھا۔" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔

"ہوٹل والے نے ہی بتایا تھا کہ ایک لڑکی پہ بڑا شدید جن سوار تھا۔" نیک محمد بولا۔ "اس نے پہلے تو اپنے گھر والے کو کئی بار دھولی چٹخا دیا اور پھر کئی حاجتی مٹا دیے۔ اس کے گھر والے کی تو حالت خراب تھی مگر پھر اتنے سارے لوگ چمٹ گئے کہ ہر طرف سے نازو بے بس ہو گئی۔ کسی نے ان کی ایک نہیں سنی اور انھیں باندھ کر گاڑی میں ڈال دیا۔"

"او مائی گاڈ... ان جاہلوں نے تو گاڑی کا نمبر تک نہیں دیکھا ہو گا۔" میں نے سر پکڑ کے کہا۔

"وہ ہوٹل والا کچھ سیانا ہے سکندر بادشاہ! میرا خیال ہے وہ سامنے بیٹھا رہتا ہے اس لیے گامے شاہ کے مریدوں کی کارستانی دیکھتا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ گامے شاہ کی پیری مریدی کا فراڈ کس طرح چلتا ہے مگر اس کے حق میں خاموش رہنا بہتر ہے کیونکہ اس کا تو کاروبار ہی گامے شاہ کے عقیدت مندوں کی

www.paksociety.com

بلاشبہ چلتا ہے۔ اگر وہ خود کو گامے شاہ کا سچا عقیدت مند نہ ظاہر کرتے تو سجاد اور لوگ اس کار ریسٹورنٹ والے سے کچھ وہاں اغوا ہیں۔ یہی سوال میں نے اس سے کیا تھا کہ گاڑی کا نمبر بھی دیکھا تھا کسی نے۔ وہ چونکا اور مجھے گھورتا ہوا پھر کہنے لگا کہ میں نے دیکھا تھا مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ میں نے کہا کہ جیسی ہو سکتا ہے وہ بدمعاش ان عورتوں کے گھر والے نہ ہوں اور لوگوں کی مدد سے انھیں اغوا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ خدانخواستہ ایسی بات ہوئی تو پولیس تک جائے گی مگر پولیس کو کم سے کم گاڑی کا نمبر تو معلوم ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر تو وہ کارروائی کا آغاز ہی نہیں کریں گے۔ پولیس کو ہڈ حرامی کے لیے بہانہ چاہیے۔ ہوٹل والے نے کہا کہ تم بندے سیانے ہو اس لیے تمھیں بتا دیتا ہوں۔ نمبر اس نے پنسل سے دیوار پر لکھ لیا تھا۔" ٹیک محمد نے اپنی ہتھیلی سامنے کی جس پر وہ بال پوائنٹ سے نمبر اتار لایا تھا۔

"نمبر کے علاوہ بھی کچھ دیکھا تھا اس نے؟" محسن بولا۔

"نمبر غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہاں۔ لال رنگ کی شیورلٹ گاڑی تھی، وہ پرانا امپالا ماڈل جس کا پچھلا حصہ بھانت کے پروں کی طرح اٹھا ہوا اور پھیلا ہوا لگتا ہے۔" ٹیک محمد بولا۔ "ہوتی بھی وہ گاڑی جہاز کے برابر ہی ہے۔ اس کے پیچھے کی ایک سائڈ لائٹ ٹوٹی ہوئی تھی اور پیچھے والا بمپر بھی غائب تھا۔"

"ویری گڈ۔ اس شخص سے ملنا کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔" محسن بولا۔

ہوٹل میں رات کے وقت بہت کم لوگ تھے۔ رش نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مریدوں نے خانقاہ پر آنے والوں کو شاہ جی کے چلے کی خبر سنا کے لوٹا دیا تھا پھر بھی ایک دو میزوں پر کچھ لوگ کھانا کھا رہے تھے اور چائے پی رہے تھے۔ سامنے کے ریسٹورنٹ والے نے چھت کو آدھی ٹوٹی ہوئی ٹیوب لائٹوں سے روشن کر رکھا تھا۔ پچھلے حصے کی جانب کھلے صحن میں کم سے کم سو چارپائیاں لگی ہوئی تھیں اور کاؤنٹر کے قریب لگی ہوئی تختی پر "منجی بستر پانچ روپیہ" لکھا ہوا تھا۔ جو رکے ریلوے اسٹیشن کے مقابل بنے ہوئے سرائے نما ہوٹلوں میں رات بھر کے لیے منجی بستر ایک روپیہ میں ملتا ہے مگر یہاں اس کے بھی بلیک کے ریٹ چل رہے تھے کیونکہ دور سے آنے والوں کے لیے قیام و طعام کا دوسرا ٹھکانہ کوئی نہیں تھا۔ ہمارے ایک میز پر بیٹھتے ہی بیرا بطرز بعجلت خود آیا۔ اس نے ٹیک محمد کو پہچان لیا تھا۔ ٹیک محمد نے اس سے پرانے دوستوں کی طرح ہاتھ ملایا۔

"ہم کھانا کھائیں گے۔" میں نے کہا۔ "جو بھی ملے لا کر لے آؤ۔"

"اور اس کے بعد تم سے کچھ بات کریں گے۔" محسن نے کہا۔ "تم ہمارے دوست کو جانتے ہو۔"

"ہاں۔ یہ بہت چالاک آدمی ہے۔" وہ بولا۔ "اس کی نظر میں خرابی کوئی نہیں تھی۔ یہ ایسے ہی یہاں کھڑا تھا۔"

"ایسے نہیں استاد...۔" ٹیک محمد نے اپنی صفائی پیش کرنی چاہی۔

"نہیں کیا... نہ کوئی ٹکٹ آیا، نہ تم نے کچھ کیا۔ لہٰذا گاڑی لے کر چل پڑے ہو۔"

"تم ہر چیز کو بہت غور سے دیکھنے کے عادی ہو۔" میں نے کہا۔ "اور تمھاری نظر سب پر رہتی ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔"

"ہم اسی لیے یہاں آئے ہیں کہ ہمارے اس دوست نے وہ سب بتا دیا تھا جو تم نے اسے بتایا تھا۔" محسن بولا۔

"اس کے علاوہ تو کوئی بات ہے نہیں جو میں بتاؤں۔" وہ بولا۔ "اور کیوں بتاؤں بابو جی؟ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ تم لوگ کون ہو؟"

"تم یقین کرو یا نہ کرو۔" میں نے افسردہ لہجے میں مغموم صورت بنا کے کہا۔ "ان میں ایک اس کی بہن تھی اور دوسری میری بیوی۔"

"یہ سالا ہے تمھارا؟" وہ محسن کو غور سے دیکھ کر بولا۔ "لگتا تو نہیں۔"

"کیوں؟ سالوں کے ماتھے پہ لکھا ہوتا ہے کہ وہ سالے ہیں؟" محسن نے چڑ جانے کے کہا۔ "وہ بہن تھی میری۔"

"تم لوگ پولیس کے پاس کیوں نہیں گئے؟" اس نے ایک جائز اور منطقی سوال کیا۔

"اگر خود کچھ نہ کر سکے تو جائیں گے۔" میں نے ایک سرد آہ بھری۔ "معاملہ عزت کا ہو تو پولیس کے پاس نہ جانا ہی اچھا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ غیرت مند آدمی مار دیتا ہے یا مر جاتا ہے۔" ہوٹل کے مالک نے میرے نکتۂ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا۔

"بس تو پھر ہماری کچھ مدد کر دو۔" میں نے لجاجت سے کہا۔ "اللہ تمھیں اجر دے گا۔"

"اللہ تو اجر آخرت میں دے گا۔" وہ سوچ کر بولا۔ "اس کے بندے دنیا میں میرا کڑاہی گوشت نہ بنا دیں۔"

"تم جن بندوں کی بات کر رہے ہو، انھیں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔" محسن بولا۔ "ہم تمھاری پوزیشن کو سمجھتے ہیں۔"

"اچھا جی۔ جو سوچتے ہو سب قبول منظور۔" وہ چوکی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ "آپ بھی بیوی بچے والے ہیں۔ ان کا خیال کرنا۔"

"تم نے گاڑی کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔" میں نے کہا۔ "ان دونوں کا حلیہ بھی بتا دو۔ تم نے یقیناً انھیں بھی غور سے دیکھا ہوگا۔"

"ایک تو تقریباً ہی قد اونچا تھا، پانچ فٹ سمجھ لو۔" وہ بولا۔ "جوان تھا اسی کی بھی۔ رنگ اس کا تھا کچھ رنگیلے ورنگا۔ آپ وہ وہاں کھڑے ہو گئے۔ اس نے لال بھار خانے کا ریشمی لاچا پہن رکھا تھا اور اوپر کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ دوسرا اچھا لمبا تھا، تقریباً آپ کے قد کا۔ وہ گندمی رنگ کا بھی صاف تھا۔ جوان تھا، آپ نے پہنی ہوئی تھی آسمانی رنگ کی قمیص اور سفید شلوار۔ وہ جو ٹھگو تھا، وہ بات کرتا تھا تو تھوڑا ہکلاتا تھا۔ دوسرا... اس کی آواز کڑکیاں نکلی خرگی تھی۔ زنانہ آواز تھی مگر تیز۔ جیسے اس نے اچار کھا کے اوپر سے ٹھنڈا پانی پی لیا ہو۔"

"وہ ایک دوسرے کو کس نام سے پکار رہے تھے؟" میں نے دل ہی دل میں اس شخص کی قوت مشاہدہ کا اعتراف کیا۔

"ایک تو تھا ٹھگو۔" وہ سوچ کر بولا۔ "وہی ٹھگو جس کا قد پانچ فٹ تھا، دوسرا تھا کولمبو۔"

"کیا؟" میں نے کہا۔ "یہ نام تو منہ سے جڑ کر فٹ ہو گئے۔"

"چلو جی کچھ بھی ہوا، جو سنا بتا دیا۔ اب پورا نام تو شناختی کارڈ والے جانیں۔" وہ اٹھنے لگا۔

"یار تم تو بلاوجہ خفا ہو گئے۔" محسن نے اسے فوراً ہاتھ پکڑ کے بٹھا لیا۔ "کچھ بتا سکتے ہو وہ کون تھے؟ پہلے کبھی ان کو یہاں دیکھا تو ہوگا تم نے...؟"

"ایک کو دیکھا تھا... کولمبو کو۔" وہ بولا۔ "وہ ایک موٹی سی کالی بھوری سی عورت کے ساتھ آتا تھا۔ وہ ماں تھی اس کی۔ گامے شاہ سے تعویذ لینے آتی تھی۔ ایک بار ادھر روٹی کھانی تھی اس نے تو کسی سے کہہ رہی تھی کہ ٹھنڈا دیا ہے۔ اس کی کوئی مانگ تھی۔ منگیتر چھوڑتے ہیں نا جی اسے۔ وہ غریب بیٹھی تھی کئی سال سے ماں ہو کے گھر۔" اس نے ایک فخریہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہم سمجھ گئے۔ مگر یار اس کی ماں نے بھی بیٹے کا اصل نام نہیں بتایا تھا؟" میں نے کہا۔

"وہ لوگ... وہ تو میرا پُتر، میرا پُتر کے سوا کچھ کہتی ہی نہیں تھی۔ ہاں، یہ ادھر کی ذات کی میراثن اور اس کا ایک کان تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ ادھر تیس میل دور کسی پنڈ سے ہے۔ پنڈ کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ ٹھگو، کولمبو، جینس کی ہم عمر اور ہم رنگ ایک کان والی میراثن جس کا گاؤں شمال میں تیس میل دور ہے۔" میں نے تمام نکات کو انگلیوں پہ شمار کیا۔ "پرانے ماڈل کی لال شیورلٹ امپالا یا بیلیر جس کی ایک ٹیل لائٹ نہیں ہے اور پچھلا بمپر نہیں ہے۔ تم نے تو اتنا بتا دیا ہے جتنا پولیس کی خصوصی تفتیشی ٹیم ایک مہینے میں معلوم کر کے نہ بتا سکتی۔"

"اب تم روٹی کھلاؤ جی اور پھر ہم چلتے ہیں۔ ہمارے بارے میں کسی سے بات مت کرنا۔" محسن بولا۔

"یہ بات تو میں کہنے والا تھا۔" وہ سر ہلا کے اٹھا۔ "دال فرائی دونوں کو آلو قیمہ۔"

کھانے کی خواہش کسی کو نہیں تھی مگر کھانا جسمانی ضرورت تھا اور جسم کی مشین اس ایندھن کے بغیر نہیں چل سکتی تھی۔ رہی سہی کسر کھانے کی اعلیٰ کوالٹی نے پوری کر دی۔ اس کے باوجود ہم نے ایک ایک روٹی کے ٹکڑے کو پانی کی مدد سے بہا کر حلق سے اتارنے میں کامیابی حاصل کی۔ صورت سے گاڈری نظر آنے والے عجیب ذہین یا بیک مین اور چالاک آدمی کا شکریہ ادا کیا جس کی مدد کے بغیر ہم اپنے راستے کا تعین بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اب اتنا تو تھا کہ ہم شمال کی سمت تیس میل تک اپنا سفر جاری رکھنے کے بعد مزید معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ ہوٹل کا مالک آخری وقت تک ہمیں دیکھتا رہا۔ وہ ذہنی الجھن میں مبتلا تھا کہ ہم سے اتنی باتیں کر کے اس نے غلطی تو نہیں کی؟

"اس کے میٹر پر نگاہ رکھو۔ اس وقت کیا ریڈنگ ہے؟" میں نے ٹیکسی میں پیچھے لیٹ کر کہا۔

"تیس ہزار سات سو تیس۔" ٹیک محمد نے کہا۔ "آٹھ سو تیس پہ رک لوں گا۔"

"یہ محسن کدھر رہ گیا؟" میں نے سر اٹھا کے کہا۔ محسن نہ جانے کون سی ضروری بات پوچھنے کے لیے واپس چلا گیا تھا۔

"میں نے سوچا کہ اس عالم فاضل شخص سے کسی ڈاکٹر حکیم وید کا پتا ہی پوچھ لوں۔" محسن نے واپس آ کے آگے بیٹھنے کے بعد کہا۔

"پھر کچھ بتایا اس نے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہاں سے تیس میل دور ڈونگا چن میں کوئی ایسا حکیم ہے جس کے سامنے دنیا بھر کے میڈیکل اسپیشلسٹ ہیچ ہیں۔"

"ڈونگا چن؟ ٹھیک تیس میل؟" میں اٹھ بیٹھا۔ "یہ تو کمال ہو گیا۔"

"ہاں۔ اس بہت ہوشیار آدمی نے ہمیں اس بہانے گاؤں

www.paksociety.com

کا نام بھی بتا دیا ہے۔" محسن نے کہا۔ جو وہ پہلے سے جانتا تھا مگر اس کی صحیح نشاندہی کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ "تیس میل کے اندر میں تیس گاؤں تو ایسے ضرور ہوں گے جہاں کم سے کم ایک حکیم لقمان کا شاگرد ضرور رہتا ہوگا مگر اس نے پتا دیا اتنی دور کا۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ یہاں سیدھے وہاں چلے جاؤ۔ سب کچھ مل جائے گا۔"

"تمہارا فیول میٹر کیا کہتا ہے؟" میں نے کہا۔

"میں نے ٹینک فل کرا لیا تھا۔ ابھی تو تین چوتھائی کے قریب بھرا ہوا ہے۔" نیک محمد نے جواب دیا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ بخار کا اثر اب مجھے بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ ایسے وقت میں اسپرین بھی مل جاتی تو بہت کارآمد ثابت ہوتی لیکن تقدیر لے جا رہی تھی کسی ڈونگے تیس کے حکیم کے پاس جو شاید نیم کے درخت کے نیچے اپنا کلینک قائم کرکے بیٹھا ہوگا اور حواشی کے ہر مرض کا علاج نیم کی چھال، نیم کے پتوں یا نمبولیوں کی گولیاں کھلا کے کرتا ہوگا۔ ویسے زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

پچھلی سیٹ پر آرام سے بیٹھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میری آنکھ جھٹکوں سے کھلی۔ ٹیکسی رک رک کر ہچکیاں لیتی چند گز چلی اور رک گئی۔ "کیا ڈونگا پتن آگیا؟" میں نے سر اٹھا کے کہا۔

"ابھی ہم منزل مقصود سے ایک محتاط اندازے کے مطابق آٹھ دس میل دور ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اور خواجہ نیک محمد صاحب کے محتاط اندازے کے مطابق جو ورکی یہ کیفیت انجن کی کسی خرابی کا نتیجہ نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے اندھیرے میں چاروں طرف پھیلے ہوئے جنگل کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

"کچھ نہیں، پٹرول ختم ہو گیا ہے۔" محسن نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔

"صرف بائیس میل میں؟ اس وقت پانچ گیلن کے قریب تھا۔" میں نے کہا۔

"اس وقت یہ گاڑی ایک گیلن میں بائیس میل جاتی تھی۔ اب بائیس گیلن میں ایک میل کر رہی ہے تو ہم کیا کریں۔" محسن بولا۔

"یار یہ کیا بکواس ہے۔ فیول میٹر غلط نہیں تھا۔ نیک محمد خود ٹینک فل کرا کے لایا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ خواجہ صاحب کا دعویٰ ہے۔ ہو سکتا ہے پٹرول پمپ والے نے میٹر کو زیر و زبر نہ کیا ہو۔" محسن بولا۔ "اب تو ٹینک خالی ہے۔"

"میں نے دیکھا تھا۔ اس نے پچیس گیلن پٹرول ڈالا تھا بلکہ میں خود دیکھتا رہا تھا۔" نیک محمد نے کہا۔

"پھر کیا پٹرول بہہ گیا یا کسی نے نکال لیا؟" محسن نے جھلا کر کہا۔

"یار سکندر بادشاہ... یہ تو بڑی زیادتی ہے نا۔ اب میں دیکھوں گا تو پتا چلے گا۔" نیک محمد روتی صورت بنا کے بولا۔

"یار محسن! اتنی پرانی گاڑی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی فیول لائن لیک کر رہی ہو۔" میں نے کہا۔

نیک محمد نے اتر کے دیکھا تو میرا خیال درست ثابت ہوا۔ سڑک پر سیاہ تارکول میں ایک زیادہ سیاہ لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ غالباً پہیوں سے اچھل کر کوئی نوکیلا پتھر پٹرول ٹینک کے زیریں حصے میں لگا تھا اور پرانے زنگ خوردہ ٹینک کی چادر میں سوراخ ہو گیا تھا۔ سوراخ بہت چھوٹا تھا مگر اس میں سے بہنے والی پتلی سی پٹرول کی دھار نے ہمارے سفر کو وسیلۂ ظفر نہیں ہونے دیا تھا۔ اب ہم انگریزی زبان میں سفر کر رہے تھے۔

"کیا ہم رات بھر اس سنسان سڑک پر کھڑے رہیں گے؟" میں نے باہر نکل کے کہا۔

"اس خوب صورت منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ذرا مختلف انداز سے سوچیے۔" محسن نے گاڑی کا سہارا لے کر سگریٹ جلائی۔ "فرض کریں یہ ایک پکنک ہے یا ایڈونچر ہے۔ لیلیٰ کی جستجو میں قیس سر سے کفن باندھ کے نکلا ہے۔ لیلیٰ کا سراغ ابھی نہیں ملا اور ناقۂ مجنوں پنکچر ہو گیا ہے۔"

"اونٹ پنکچر نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔

"کیا سہانا سماں ہے۔" محسن نے اپنی بات جاری رکھی۔ "جنگل میں منگل ہے... سوری... جنگل میں بدھ ہے۔ ہر طرف بھوت ڈسکو کر رہے ہیں۔ اور آپ جینیفر کی دلکش آواز میں لیلیٰ کی شرملی تان 'الوئس کا چیمپانا...'" وہ بات ادھوری چھوڑ کے دوڑا۔ دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئی تھیں۔ محسن سڑک کے درمیان میں ہاتھ پھیلا کے کھڑا ہو گیا تو آنے والی نئی اور بیش قیمت کار کے خوبرو مالک نے بریک لگا کے دروازہ کھولا۔

"میں اگر چاہتا تو تمہاری خودکشی کی کوشش کو کامیاب بنا سکتا تھا۔" وہ بولا۔ "اور تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ایڈیٹ۔ واٹ ڈو یو وانٹ۔"

"چاہتا تو میں بہت کچھ ہوں۔" محسن نے صاف انگریزی میں جواب دیا۔ "مثلاً یہ کہ آپ ہمارے لیک کرنے والے پٹرول

ٹینک کا سوراخ بند کر دیں اور پھر اس میں پانچ گیلن پٹرول بھر دیں۔ لیکن یہ آپ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ آپ ہمیں ڈونگا پتن پہنچا دیں۔"

"ڈونگا پتن؟" اس شخص نے حیرانی سے کہا۔ "وہاں گاڑی نہیں جا سکتی۔ اور پھر یہاں سے ڈونگا پتن ہے بھی کتنی دور... زیادہ سے زیادہ دو فرلانگ۔" اس نے بائیں طرف گھنے جنگل کی سمت اشارہ کیا مگر مجھے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔

"دو فرلانگ... آپ کا مطلب ہے اسی جگہ سے دو فرلانگ؟" محسن نے کہا۔

"ہاں تم پہلے کبھی ادھر نہیں آئے؟" وہ شخص بولا جو جدید سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔

"پھر تو واقعی افسوس ہے کہ میں نے آپ کو روکا اور بلاوجہ پریشان کیا۔" محسن نے کہا۔ "بہر حال بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں منزل مقصود تک پہنچا دیا۔"

"ایسے وقت میں جب ہم سمجھ رہے تھے کہ ہم منزل مقصود سے آٹھ میل دور ہیں۔" میں نے کہا۔

"کوئی اور بھی ہے تمہارے ساتھ۔" وہ شخص آگے بڑھا اور اس نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ "کوئی بیمار ہے؟"

"جی... بہت سے روگ لاحق ہیں اسے... سب ناقابل علاج۔" محسن بولا۔

"ڈونگا پتن میں قبرستان بھی ہے۔" وہ شخص اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ چند منٹ میں اس کی گاڑی کی ٹیل لائٹس بھی ہماری نظر سے اوجھل ہو گئیں۔ سڑک ایک بار پھر ویران ہو گئی۔

"کیا زبردست آٹومیٹک گاڑی ہے۔ صحیح جگہ پہنچ کر خود بخود رک گئی۔" محسن بولا۔

"غالباً اس نے حس لیا تھا۔" میں نے تائید کی۔ "مگر اس نیک لائن والی بھینس کا اندازہ کتنا غلط تھا جس نے ڈونگا پتن کو تیس میل دور بتایا تھا... کولمبس کی ماں۔"

"عورتوں کا حساب اور پھر دیہاتی عورت کا حساب۔" محسن نے کہا۔ "وہ عقل سے عاری ہیں، قابل معافی ہے محسن خان۔"

"دو فرلانگ تو ہم پیدل بھی جا سکتے ہیں سکندر بادشاہ۔" نیک محمد نے کہا۔

"تم تو اڑ کے بھی جا سکتے ہو۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو ہم ڈونگا پتن تک ہو آتے ہیں۔" محسن بولا۔ "پیچھے گاڑی میں اتنی بڑی دولت بھی نہیں رہ سکتی۔"

"تم یہیں لیٹے رہو۔ بہتر ہے سو جاؤ۔" نیک محمد نے مجھے نیک مشورہ دیا۔

"کوشش کروں گا لیکن تم اکیلے کوئی معرکہ سر کرنے کی کوشش مت کرنا۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ گاڑی نظر آجائے تو پتا لگانا، دیکھ کر لوٹ آنا کہ کس گھر کے سامنے کھڑی ہے اور کس کی ہے۔ گاؤں میں شاید ایک ہی گاڑی ہوگی۔ یہاں لوگ ایسی گاڑیوں کو لاک کرنے کا تکلف نہیں کرتے۔ تم کاغذات دیکھ سکو گے۔"

"تو بالکل فکر مت کر، ہم دھاوا بولنے نہیں، سراغ لگانے جا رہے ہیں۔" محسن بولا۔ "جو کارروائی کرنی ہوگی مل کر کریں گے۔"

"دو فرلانگ آنے جانے میں ایک گھنٹہ لگ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "گاڑی کو تلاش کرنے میں شاید ایک گھنٹہ بھی نہ لگے۔ اس قسم کے گاؤں کی حدود بہت مختصر ہوتی ہیں۔ میں دو گھنٹے بعد تشویش میں مبتلا ہو جانے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

"بخار کے ساتھ تشویش میں مبتلا ہونے سے فائدہ ہوتا ہے۔ بخار کے جراثیم کو بھی تشویش لاحق ہو جاتی ہے اور وہ ختم ہونے لگتے ہیں۔" محسن بولا۔ "تیرے پاس ریوالور ہے؟"

"ہے لیکن مجھے ریوالور کی اتنی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "جتنی تم دونوں کو ہے۔ اسٹین گن لے جاؤ۔"

"وہ ایک ڈنڈے سے زیادہ فائدہ مند نہیں رہی۔" محسن ہنسا۔ "اس کے راؤنڈ ختم ہو چکے ہیں۔ ریوالور سے کام چلائیں گے۔"

جب وہ چلے گئے تو میں ان کو ٹیکسی کی کھلی کھڑکی سے اندھیرے میں گم ہوتے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر ان کے باتیں کرنے کی آواز بھی سنائی دیتی رہی۔ پھر اجنبی رات کی آسیب زدہ خاموشی نے مجھے گھیر لیا۔ آسمان پر چاند نہیں تھا۔ اچانک میرے سر پر بجلی کا کوندا لہرایا۔ میں نے حیرانی سے آسمان کو دیکھا۔ بادل چپکے چپکے امڈ آئے تھے اور اب اپنی صف در صف سیلاب فوج کی آمد کا اعلان کر رہے تھے۔ بجلی کی چمک کے ساتھ ہی گرج کی ہلکی سی آواز آئی اور ہوا ایک دم تیز ہو گئی۔ بڑے بڑے درخت سنسنانے لگے جن کا وجود کالے آسمان کے کینوس پر سیاہی سے بنی ہوئی تصویر کی طرح تھا۔ ہوا میں جھومتے ہوئے ان کی شاخیں یوں آگے جھکتی تھیں جیسے میرے خیالوں کے عفریت مجھے اپنے منحوس بازوؤں میں اٹھا لینا چاہتے ہوں۔ میں نے رابعہ کا تصور کیا۔ اس کے رخ زیبا کی چاندنی سے اس رات کی تاریکی کو منور کیا جو میرے رگ و پے میں تنہائی کا خوف بن کے اترنے لگی تھی لیکن میرے اپنے خیالات میرے دشمن ثابت ہوئے۔ ان ہاتھوں نے رابعہ کی وہ تصویر مٹا دی جو میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرا تصور بھٹک رہا تھا اور یہ اذیت میرے لیے

www.paksociety.com

ناقابلِ برداشت تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرکے تمام خیالات کو ذہن سے خارج کرنا چاہا تاکہ میں سو سکوں۔

یکلخت میری پلکوں پر روشنی کی جھلملاہٹ اتری۔ میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ یہ بجلی نہیں چمکی تھی، پیچھے سے ایک کار آرہی تھی۔ اس کی روشنی نے پیچھے سے ٹیکسی کے اندر اجالا پھیلا دیا۔ میں نے ایک کہنی کے بل اٹھ کر دیکھا۔ کار تیزی سے آئی اور ٹیکسی کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ شاید کسی نے تجسس یا انسانی ہمدردی کے جذبے سے مجبور ہو کے گاڑی روکی ہوگی۔ بارش سر پٹخ رہی تھی اور ایسے میں کون ہے جس کی ٹیکسی اس بیابان میں نقشِ فریادی بنی کھڑی ہے۔ گاڑی کی ہیڈلائٹس ابھی تک روشن تھیں اور انجن چل رہا تھا۔ ڈرائیور دوسری طرف تھا چنانچہ میں اسے نہ دیکھ سکا لیکن میں نے اس شخص کو فوراً پہچان لیا جو میری طرف والے دروازے سے اتر چکا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں ریوالور نکالا۔ اس شخص نے جست لگائی اور میں نے دوسری بار ٹریگر دبایا۔ ہلکی سی "کلک کلک" کی آواز آئی۔ ریوالور کے میگزین میں ایک ہی گولی تھی جو شاید میں ضائع کرچکا تھا۔ پھر ایک اور شکاری نمودار ہوا اور چار مضبوط ہاتھوں نے مجھے گھسیٹ کر کار میں ڈال دیا۔

بیماری اور تھکن نے مجھے جسمانی طور پر مقابلے کا اہل نہیں چھوڑا تھا ورنہ وہ اتنی آسانی سے مجھے قابو نہ کرپاتے۔ میں نے واجبی سی مزاحمت کی مگر ان کا اسلحہ بھی ان کی بہت بڑی طاقت تھا۔ میرے گاڑی میں گرتے ہی ان میں سے ایک نے ریوالور کے دستے سے میرے سر پر وار کیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ چشم زدن میں ہوش و حواس میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ ریوالور کی جس گولی نے میرے بازو کو ناکارہ کردیا تھا اس کے درد کی شدت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھی۔ بے ہوشی نے مجھے اذیت کے عذاب سے بھی نجات عطا کی۔ آخری خیال محسن اور نیک محمد کا تھا کہ واپسی پر وہ مجھے غیر موجود پائیں گے تو کتنے پریشان ہوں گے۔

دوبارہ ہوش اور احساس کی دنیا میں واپسی ایک انتہائی ناخوشگوار تجربہ ثابت ہوئی۔ درد میرے بازو سے میرے سارے وجود تک اپنی جڑیں پھیلا چکا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے سر کو بھاری پتھر کی دو چٹانوں نے شکنجے کی طرح دبا رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں شدید گھبراہٹ اور بے چینی کا شکار تھا۔ میں نے سیاہی کو چیلے کی طرح ہر سمت محیط دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ شاید میری بصارت ابھی بحال نہیں ہوئی ہے۔ روشنی تو ہے لیکن میری آنکھیں اسے دیکھنے سے قاصر ہیں۔ میں نے کوشش کرکے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو جنبش دی تو مجھے یقین آیا کہ میں آزادی سے حرکت کرسکتا ہوں۔ میں کسی بستر پر لیٹا ہوا تھا جو بہت آرام دہ تھا لیکن جسم کو رسیوں یا زنجیروں سے باندھ کر رکھنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے اس بات کا یقین بھی آنے لگا کہ ابھی رات باقی ہے اور قصور میری آنکھوں کا نہیں، کمرے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ شاید یہ وہی رات تھی جب شکاری مجھے بے بس و تنہا پا کے اٹھا لائے تھے۔ درمیانی وقت کا اندازہ کرنا محال تھا۔ یہ اس رات سے اگلی رات بھی ہوسکتی تھی اور اس کے بعد آنے والی رات بھی۔ میرے شکاری مجھے ایک بار زیرِ دام لانے کے بعد ایک دن یا دن بھر بے ہوش رکھنے پر قادر تھے تاہم عقل کہتی تھی کہ میری بے ہوشی کا وقفہ بہت زیادہ طویل نہیں رہا اور بالآخر دن نکلنے پر مجھے وقت کا اندازہ بھی ہوجائے گا اور اپنی اسیری کا بھی۔ اسیری کے مقام اور اسیر کرنے والوں کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔ میری بے قراری اور میرے ذہنی اضطراب میں بڑا دخل جسمانی کمزوری کا تھا۔ میرا بدن بخار میں جل رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے کسی نے شکنجے میں مار کے میرے بند بند کو ڈھیلا کردیا ہے۔ یہ کسی بے ہوش رکھنے والی دوا کا اثر بھی ہوسکتا تھا اور بخار کی تیزی کا بھی جو بارود کے زہریلے ذرات کے خون میں سرایت کر جانے سے چڑھا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے یاد آنے لگا کہ میں کہاں تھا اور وہ کون لوگ تھے جو مجھے اغوا کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے شناخت کرلیا تھا جو میرے پاس آکے رکنے والی گاڑی میں سے پہلے اترا تھا۔ اس نے اپنی شناخت کی بہت سی علامات کو مٹا دیا تھا یا بدل دیا تھا مثلاً اس نے گھنگریالے سیاہ بالوں پر وِگ لگا لی تھی اور کانوں میں پڑی ہوئی پیتل کی مندریاں ہٹا دی تھیں مگر اس کے باوجود وہ اپنی صورت کے نقوش کو بدلنے میں ناکام تھا اور میں نے استاد پیڈرو کو پہچان لیا تھا۔ اندھیرے میں اس کے سیاہی مائل رنگ کے باعث چہرا چھپا رہتا مگر اس نے بولنے کی غلطی کی تھی اور یہ آواز ایسی تھی کہ برسوں بعد بھی سنتا تو شناخت کرلیتا۔ پھر جب انہوں نے مجھے گاڑی میں ڈالا تھا تو دروازہ کھلنے سے گاڑی کے اندر کی لائٹ جل گئی تھی اور اس کی روشنی میں میری آنکھوں نے پیڈرو کی صورت کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اتنے کم فاصلے سے مجھے اس کے کانوں کی لو کے سوراخ نظر آگئے تھے جن میں ہر وقت پیتل کی مندریاں لٹکی رہتی تھیں۔ چنانچہ کانوں کے نیچے کا گوشت بھی کچھ لٹک گیا تھا۔

پیڈرو کے ساتھ دوسرا شخص وہی تھا جس نے ہمیں کار روک کے "ڈونگا چن" کا راستہ بتایا تھا۔ وہ معزز تین پیس سوٹ میں تھا اور جس کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس سال لگایا تھا۔ اس کی جسمانی طاقت اس کی عمر کے مقابلے میں ناقابلِ یقین حد تک زیادہ تھی۔ جب وہ ہمیں ڈونگا چن کا پتا سمجھا رہا تھا تب بھی مجھے شک ہوا تھا کہ وہ اپنی اصل آواز میں گفتگو نہیں کررہا ہے مگر میں نے اس خیال کو اہمیت نہیں دی تھی کہ آخر اس سڑک سے گزرنے والے کسی اجنبی کو آواز بدل کر بات کرنے کی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے۔ بعد کے واقعات نے بالآخر یہ ثابت کردیا تھا کہ میرا شک قطعاً غلط نہیں تھا اور اب میں یہ بھی تصور کرسکتا تھا کہ اس کی پوری شخصیت بدلی ہوئی تھی ——— وہ ہمارے ہی تعاقب میں آیا تھا مگر وہ اکیلا کچھ نہیں کرسکتا تھا یا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مخالف سمت میں کہیں استاد پیڈرو موجود تھا۔ غالباً ہمارے تعاقب میں آنے والوں نے ہم پر نظر رکھی تھی اور آگے پیچھے سے ہمارے لیے فرار کے راستے مسدود کردیے تھے۔ اگر پیٹرول ختم ہوجانے کے باعث ہماری ٹیکسی اس جگہ کھڑی نہ ہوتی تو تھوڑا سا آگے جانے کے بعد پیڈرو ہمارا راستہ روک لیتا اور ہم واپس بھاگنا چاہتے تو وہ سوٹ والا گاڑی میں آجاتا۔

لیٹے لیٹے میں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ سوٹ والے نے گاڑی روک کر ہمیں اچھی طرح دیکھ لیا تھا اور پھر جاتے جاتے ہمیں غلط پتا بتا دیا تھا۔ اس نے ہمارے اندازے کو غلط ثابت کردیا تھا حالانکہ اپنے حساب کے مطابق ہم ڈونگا چن پہنچنے کو ہی تھے اور یہ حساب ٹھیک تھا۔ محسن کو اور نیک محمد کو غلط راستے پر ڈالنے کا مقصد مجھے اکیلا کرنا تھا۔ اس مقصد میں وہ کامیاب رہا۔ اس کی خود اعتمادی قابلِ تعریف رہی تھی۔ اس نے کسی تذبذب کے بغیر اس پر یقین کرلیا تھا کہ پیڈرو کی طرح روپ بدل کر آنے والا پرانا چہرہ ہمارے سامنے تو آئے گا، میں نے سوچا۔

ہمت کرکے میں اس بیڈ پر سے اٹھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اب تک میری آنکھیں اس اندھیرے سے مانوس نہیں ہوئی تھیں اور ایک گہرے سیاہ خلا کے علاوہ میں اپنے آس پاس کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ بڑی حیرانی کی بات تھی اگر اس کمرے میں کوئی دروازہ ہوتا تو اس کی درز سے باہر کی روشنی دکھائی دیتی اور اندھیرے کی چادر میں سفید ڈوری نظر آتی۔ کہیں کوئی کھڑکی ہوتی تو اس کے شیشوں کا رنگ اندر کی سیاہی کے مقابلے میں سفیدی کے ٹکڑوں کی طرح دکھائی دیتا لیکن اس کمرے کی تو جیسے دیواریں بھی سیاہ تھیں۔ اس کی چھت بھی کالی تھی۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر کالا پینٹ تھا اور ان پر کالے پردے پھیلے ہوئے تھے۔ میں اندھوں کی طرح ایک ہاتھ آگے بڑھا کر ٹٹولتا ہوا قدم قدم رکتا آگے بڑھا۔

مجھے مزید حیرانی ہوئی جب میری راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہوئی۔ میرے زخمی ہاتھ میں اینٹھن ہورہی تھی اور اس کی خفیف سی حرکت سے بھی درد کی ٹیس کسی الیکٹرک شاک کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ بالآخر میرے تندرست ہاتھ کی انگلیوں نے دیوار کے سخت اور سرد لمس کو محسوس کیا۔ میں نے اپنا رخ بدلا اور دیوار کے متوازی چلنے لگا۔ وقفے وقفے سے میں نے دیوار کے اوپر نیچے کی سطح کو دیکھا مگر مجھے سپاٹ دیوار میں کسی دریچے کے آثار بھی نہ ملے۔

کمرا بہت بڑا بھی نہیں تھا اور اتنا چھوٹا بھی نہیں کہ اسے جیل کی کوٹھری کہا جاتا۔ میرے اندازے کے مطابق کمرے کی لمبائی اور چوڑائی آٹھ اور دس فٹ تھی۔ یہ اندازہ میں نے دو دیواروں کو ہاتھ سے چھو کر جائزہ لینے کے بعد قائم کیا۔ تیسری دیوار میں اچانک دروازہ آگیا۔ تقریباً ڈھائی فٹ چوڑا اور ساڑھے چھ فٹ اونچا مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ اندر سے اس کی سطح دیوار سے مل گئی تھی اور اس میں اوپر نیچے کوئی کنڈی، قبضہ یا چٹخنی اور ہینڈل نہیں تھے۔ دروازہ کمرے میں کھلتا ہوگا چنانچہ اس کے قبضے چوکھٹ کے بیچ میں آگئے تھے۔ دروازے کو بڑی صفائی سے فٹ کیا گیا تھا۔ کہیں کوئی جھری تھی تو میری آنکھیں اسے دیکھنے سے قاصر تھیں اور ہاتھ پھیرنے سے بال برابر فرق کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ ایسے دروازے کو اندر کی طرف کھینچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ ٹکر مار کے میں اپنے کندھے توڑ سکتا ہوں مگر دروازے کو ہلا بھی نہیں سکتا۔

آدھے گھنٹے بعد میرے لیے شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی کہ میں ایک قید خانے میں ہوں جہاں ازراہِ مروت مجھے سونے، لیٹنے یا بیٹھنے کے لیے ایک بیڈ تو فراہم کردیا گیا ہے مگر اور کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے پابہ زنجیر یا دست بستہ رکھنا بھی

www.paksociety.com

ضروری نہیں تھا۔ خالی ہاتھوں سے اس زنداں کی دیواروں سے صرف میری روح نکل سکتی تھی۔ میں کمرے کے اندر پھرتے پھرتے اتنا تھک گیا تھا کہ بے دم ہو کے دوبارہ بیڈ پر گر گیا۔ مجھے بخار کی حرارت اپنے جسم سے خارج ہوتی محسوس ہوتی تھی۔ جو سانس میرے نتھنوں سے خارج ہوتی تھی وہ گرم ہوا کی طرح تھی اور میرا چہرہ تپ رہا تھا۔ یہ عجیب کسمپرسی اور بے کسی کا عالم تھا کہ مجھے مناسب دیکھ بھال کی، تھوڑی سی دوا اور آرام کی ضرورت تھی لیکن میں گھپ اندھیرے کی قید میں اکیلا تھا۔ مجھے محسن کا اور نیک محمد کا خیال آیا کہ شاید وہ "ڈو شکاچین" کو تلاش کرنے میں ناکام ہو کے لوٹ آئے ہوں۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ انہیں بے وقوف بنایا گیا تھا اور اس طرح گمراہ کر دینے کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ مجھے اغوا کر لیا جائے کیا نہیں ہو سکتا کہ انہیں بھی الگ الگ اغوا کر لیا گیا ہو اور اب وہ بھی میری طرح کسی تاریک زنداں کی تنہائی کے اسیر ہوں، میری طرح انہیں بھی معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں ہیں اور باقی دو کہاں ہیں۔ میں صرف خیالوں کے گھوڑے دوڑا سکتے ہوں۔ مجھے رابعہ اور نازو کا خیال بھی آیا جو ہم سے پہلے اغوا ہو گئی تھیں۔ نہ جانے تقدیر کو اب کیا منظور تھا کہ اس نے ایم آر ایس کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا تھا اور ہم سب کو ایک دوسرے سے اس طرح جدا کر دیا تھا جیسے خزاں کی ہوا ایک ہی ٹہنی سے گرنے والے پتوں کو مختلف سمتوں میں اڑا لے جاتی ہے۔

یہ سب جرأت رندانہ میں حد سے گزر جانے کا شاخسانہ تھا۔ ہم نے اپنی قوت تسخیر کا غلط اندازہ کیا تھا اور دشمن کے حصار میں قدم رکھ دیا تھا۔ مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اتنی بڑی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے اپنی حفاظت کے لیے مناسب انتظام نہیں کیا تھا۔ اس امکان کو ذہن میں نہیں رکھا تھا کہ ناکامی کی صورت میں کوئی ہماری مدد کے لیے پہنچ سکے گا یا نہیں۔ کم از کم دو افراد عملاً ہمارے کام آ سکتے تھے۔ بجیا او دو منظر اور مرزا غالب لیکن ان دونوں کو علم ہی نہیں تھا کہ ہمارے عزائم کیا ہیں اور اب تو ہم خود بھی نہیں جانتے تھے کہ ہم کہاں ہیں تو کسی اور کو یہ بات کیسے معلوم ہو سکتی تھی۔ جب تک ہم ایک ساتھ تھے ہمارا اعتماد ناقابل شکست تھا اور ہماری قوت ہمارا اتحاد تھا مگر اب ہم اکیلے ہو چکے تھے اور ایک دوسرے کی مدد کی امید بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔

میں نے چشم تصور سے ہر ہر [illegible] کرنا چاہا۔ میں نے کوشش کی کہ انہیں [illegible] اور اکٹھا دیکھوں لیکن میرا ذہن مایوسی کے احساس [illegible] شکست خوردہ تھا۔ میں نے ان سب کو اپنی [illegible] میں [illegible] بے بس اور اکیلا دیکھا۔ ان سب کو ایک [illegible] کا خیال تھا اور ایک دوسرے کی مدد [illegible] کی توقع تھی لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ وہ سب [illegible] بے بس ہیں۔ ذہنی انتشار کی اس کیفیت میں [illegible] خیال یہ بھی آیا کہ ممکن ہے ہم سب ایک دوسرے کے بہت قریب ہوں۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں [illegible] کے کمروں میں قید ہوں مگر ذہنی طور پر اس احساس کا شکار ہوں کہ ہمارے درمیان طویل فاصلے حائل ہیں [illegible] سمتوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

میں نے جسمانی اذیت کے احساس کو [illegible] لیے نیند کی آغوش میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ [illegible] کلائی پر سے گھڑی بھی اتار لی گئی تھی ورنہ میں [illegible] ٹٹولتا اور انگلیوں کی مدد سے ٹٹول کر سوئیوں [illegible] سے وقت دیکھنے کی کوشش کرتا۔ مجھے اتنا تو معلوم [illegible] کہ صبح کی منزل کتنی دور ہے۔ اس حالت میں [illegible] بھی جرم لگتی تھی اور اس کی خواہش ایک فریب [illegible] کے لیے ضرورت بن گئی تھی۔ میں آنکھیں بند کیے [illegible] رہا۔ بار بار میں آنکھیں بند کر کے ذہن سے خیالات جھٹکنے کی کوشش کرتا تھا مگر مجھے احساس ہوتا تھا کہ [illegible] بھی کم اذیت ناک نہیں۔ میری آنکھیں خود بخود کھل جاتی تھیں اور خیالات بے قابو بلوائیوں کی طرح [illegible] کو گراتے میرے ذہن کو تاخت و تاراج کرنے [illegible]

اب میں دیواروں کا نہیں وقت کا اسیر [illegible] آزادی سے زیادہ صبح کا اجالا دیکھنے کی [illegible] روشن افق کا تصور میری ساری توجہ [illegible] تھا مگر وہ رات تھی کہ طول شب فراق سے [illegible] صبر آزما تھی جاری تھی۔ اس کا ہر لمحہ ایک [illegible] ہر گھڑی ایک لمبی کالی رات کی طرح تھی۔ مجھے یوں [illegible] ہونے لگا جیسے اس رات وقت رک گیا ہے یا [illegible] رفتار کم ہوتی جا رہی ہے۔ انتظار کا عذاب مجھے [illegible] لگا۔ میرے چاروں سو سناٹا تھا اور اس خاموشی [illegible] دیواروں سے زیادہ مجھے محسوس ہوتی تھی۔ میں اٹھ [illegible] اندھیرے کو گھورتا رہا۔ پھر ننگے پاؤں فرش پر چلنے [illegible]

[illegible] کے ساتھ ساتھ۔ میں نے دروازے کو بجانا اور چلانا شروع کیا "کوئی ہے، کوئی ہے" مگر دروازہ بھی بے سود ثابت ہوا۔ اس [illegible] سے اتنی ہی آواز ہوئی جتنی دیوار پر مکے مارنے سے ہوتی۔ معلوم نہیں اس دروازے کے پیچھے کیا تھا کہ اس کی آواز میں کوئی گونج نہیں تھی۔

میرے جسم پر صرف میرے کپڑے تھے۔ میری جیب میں سے ہر چیز نکال لی گئی تھی اور کمرے میں ایسی کوئی بھی چیز نہیں تھی جس سے میں دروازے پر وار کر سکتا۔ میری نقاہت بڑھتی جا رہی تھی اور دروازے پر طاقت آزمائی کے بعد میں بالکل نڈھال ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر بستر پر لیٹ کر میں نے جسم کی تھکن کے احساس کو کم کرنا چاہا لیکن میں زیادہ دیر نہ لیٹا رہ سکا۔ میں چاہتا تھا کہ اب خواہ جلاد ہی آئے مگر مجھے اس قید خانے کی سیاہی سے نکالے۔ مجھے بتائے کہ میرے لیے کیا سزا تجویز کی گئی ہے اور پھر چاہے تو میری گردن اڑا دے۔ چوہدری کلاور، استاد پیٹرو میں سے کوئی بھی سامنے آئے، میرا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دے یا مجھ سے پوچھے کہ میں نے اس احمقانہ جرأت کا مظاہرہ کیوں کیا تھا؟ مجھ پر تشدد کرے اور مجھ سے حقیقت اگلوانے کی کوشش کرے۔ مجھے جسمانی اذیت منظور تھی۔ یہ اندھیرا، خاموشی اور اپنی [illegible] سے یہ ایک ناقابل برداشت ذہنی عذاب بن رہی تھی۔

میں نے چارپائی کو ہلا کے دیکھا۔ وہ لوہے کے پائپ کا بنا ہوا بھاری بیڈ تھا جس کے درمیان میں لوہے کے سپرنگ تھے۔ اس کے سرہانے کی طرف کا کچھ حصہ اٹھا ہوا تھا اور ایسے بستر میں نے اسپتالوں میں استعمال ہوتے دیکھے تھے۔ اسے توڑنا ناممکن تھا ورنہ میں ایک پٹی الگ کر لیتا اور دروازے پر مارتا۔ میں نے لوہے کے بیڈ کو گھسیٹ کر دروازے سے ٹکرانے کی خیالی سی کوشش کی اور مجھے احساس ہوا کہ ذہنی طور پر میں دیوانگی کی سرحد کے کتنا قریب ہوں۔ اگر جسمانی طور پر میں مکمل صحت مند ہوتا تب بھی اس لوہے کی چارپائی کو دو دو ہاتھ مار کے دروازے کو توڑ دینے کی امید نہ رکھتا۔ اپنی موجودہ حالت میں تو میں اس کو ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔

"فلاور!" میں نے چیخ کر کہا۔ "یہ کون سی بہادری ہے [illegible] تم سامنے آؤ [illegible] کے پیچھے بیمار اور زخمی آدمی کو دھوکے سے اٹھایا اور اس طرح قید کر دیا۔" میری آواز کے جواب میں کوئی آواز نہیں آئی۔ پھر سو ہی بے حس اور سفاک خاموشی [illegible] میں نے دروازے پر لاتیں ماریں اور [illegible] گالیاں دیں۔ پیٹرو کو پکارا اور پھر دو میں گر

کر بے ہوش ہو گیا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔ وہی بھیانک کالی رات ابھی تک مجھ سے چپٹی ہوئی تھی جیسے وہ رات نہیں، نہ مٹنے والی سیاہی ہے جس میں میرا وجود غوطہ زن ہے۔ میں کاجل کے پہاڑ میں گھس گیا ہوں اور اب روشنی کا ایک ذرہ دیکھنے کے لیے دیوانہ وار منہ زور تاریکی سے لڑ رہا ہوں جس کو شکست دینا میرے بس کی بات نہیں۔ رحم۔ رحم۔ میں نے خدا سے فریاد کی۔ میں اس رات کے منحوس اندھیرے سے پناہ مانگتا ہوں۔ مجھے تھوڑی سی روشنی چاہیے۔ کاش کوئی مجھے بتا سکے کہ صبح ابھی کتنی منزلوں کی مسافت پر ہے۔ وقت کا احساس فنا ہونے کے بعد میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس رات کی کوئی سحر نہیں ہے۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس رات کے اندھیرے میں دفن کر دیا گیا ہوں اور اب مجھے روشنی کی ایک کرن بھی نہیں مل سکتی۔ یہی رات میرا مدفن ہے اور یہی رات میرا مقتل ہے۔

ہوش اور بے ہوشی کے مختلف وقفوں میں مجھے صرف اتنا احساس رہا کہ میں فرش پر پڑا ہوا ہوں۔ پیاس سے میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے اور میری آواز مر چکی تھی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میرے جسم پر میرا کنٹرول ختم ہونے لگا ہے اور میں فرش پر اپنی ہی پھیلائی ہوئی غلاظت میں لوٹ رہا ہوں۔ میں نے فرض کیا کہ یہ جانکنی کا عالم ہے اور اس کے بعد موت ہے۔ یہ خیال بڑا تسکین دہ تھا کہ بہت جلد میرا سارا عذاب ختم ہو جائے گا مگر بہت جلد میں بھی بہت دیر تھی۔ میرے جسم کی حیوانی جبلت مجھے مغلوب کر رہی تھی۔ وہاں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا مگر مجھے یقین ہے کہ اس وقت کمرے میں گھاس پھوس، کنکر پتھر کچھ بھی ہوتا میں چبا ڈالتا۔ نیم دیوانگی کی کیفیت میں میرے ہاتھوں نے خود اپنے کپڑے پھاڑ کر چبانے اور نگلنے کی بے سود کوشش کی۔ میری زبان سوکھ کر چھوارا ہو رہی تھی اور میرے منہ میں اتنا لعاب بھی نہ تھا جو کپڑے کو تر کر سکتا۔ معلوم نہیں اس کمرے میں زندگی کی ایک بنیادی ضرورت کہاں سے پوری ہو رہی تھی۔ اس میں اتنی تازہ ہوا ضرور پہنچ رہی تھی کہ میں دم گھٹنے سے ہلاک نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ میری جلد چٹخنے لگی۔ میرے بدن کا پانی خشک ہو رہا تھا اور میں اپنی موت کو قریب آتے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس وقت محسن یا رابعہ کا خیال تک نہیں آیا۔ میں صرف اپنی زندگی کے لیے لڑ رہا تھا اور ایک ایک سانس کی خاطر رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔

www.paksociety.com

مجھے اب تک یقین آچکا تھا کہ یہ رات نہیں کوئی تاریک زنداں ہے جس کے راستوں سے سورج کی روشنی کی ایک کرن کا گزرنا محال ہے۔ باہر کی دنیا کے مقابلے میں یہ قید خانہ ایک قبر کی طرح تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کا عذاب قبر کے عذاب سے زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ باہر نہ جانے کتنی بار سورج نکل کر غروب ہو چکا تھا، گھڑیوں کی سوئیاں نہ جانے کتنی بار چکر کاٹ کے پھر وہیں پہنچ چکی تھیں۔ دنیا کی مصروفیات اور زندگی کے کاروبار اسی طرح چل رہے تھے مگر یہاں اندھیرا منجمد ہو گیا تھا اور رات ٹھہر گئی تھی۔ یہ رات موت کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بڑے بے رحم اور سفاک قاتل تھے جنہوں نے مجھے ایک طویل رات کے عذاب سے مارا۔ وہ مجھے بہت پہلے زیادہ آسانی کے ساتھ مار سکتے تھے لیکن وہ خونی شکاری بڑے اذیت پسند تھے۔ وہ مجھے گھیر کر اس اندھیرے کے جال تک لے آئے جو موت کی کمیں گاہ تھی۔

مجھے دوبارہ زندگی کب ملی یہ میں یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا۔ وہ قاتل سیاہ رات چوبیس گھنٹوں پر محیط تھی، اڑتالیس گھنٹوں تک پھیلی ہوئی تھی یا اس سے بھی زیادہ؟ اس کا اندازہ میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ احساس اور ہوش ختم ہونے سے قبل ہی میں وقت پر اپنی گرفت کھو چکا تھا۔ آزاد انسانوں کی دنیا میں صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے، سائے گھٹتے بڑھتے ہیں، اندھیرا روپ بدلتا ہے اور اجالا سمٹتا پھیلتا ہے تو گھڑی پر نگاہ ڈالے بغیر بھی وقت کے مسلسل آگے بڑھتے رہنے کی خبر ملتی رہتی ہے۔ یہ نہ ہو تب بھی نیند اور بھوک کی ضرورت انسانی جسم کو وقت سے آگاہ رکھتی ہے مگر میں ایک ایسی مصنوعی رات کے اندھیرے کا قیدی تھا جس میں وقت کا تصور بھی محال تھا۔ بہت پہلے مجھے یقین آچکا تھا کہ میں مر رہا ہوں اور مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ اسی کیفیت میں موت یوں آئے گی کہ مجھے خبر بھی نہ ہوگی۔

اچانک ٹھنڈک نے میرے جسم میں پھیلنا شروع کیا۔ زندگی... کا پہلا جھٹکا الیکٹرک شاک کی طرح تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں جھلسا دینے والی ریت میں پڑا ہوا تھا کہ مجھے اٹھا کر برف میں دفن کر دیا گیا ہے۔ میرا بکھرتا ہوا وجود پھر اپنی اصل حالت کی طرف لوٹنے لگا۔ آب حیات کا ایک ایک قطرہ میرے خشک حلق سے اترتا جا رہا تھا۔ میری خشک چٹخی ہوئی زبان ہر قطرے کو چوس رہی تھی، جذب کرتی جا رہی تھی اور نمی کا اثر پھیلنے لگا تھا۔ یہ کرب کی ایک نئی کیفیت تھی۔ جب میرے جسم کا صحرا ایک ہی بار میں سمندر کو پی جانے کے لیے تڑپ رہا تھا لیکن برسوں کی کڑی دھوپ میں جلنے والی زمین پر بادلوں کی پھوار پڑ رہی تھی۔ آرزو کی شدت سے گلا بھینچنے لگا۔ دوبارہ زندگی پانے میں بھی اذیت کا رنگ تھا لیکن اس میں میری جد و جہد کو آغاز ملا۔ پانی میں غالباً گلوکوز کی مٹھاس تھی اور [illegible] "اور پانی۔" میں نے اپنے ہونٹوں سے ادا ہونے والے الفاظ کو اپنے کانوں سے سنا۔

"ہاں ہاں۔ یہ لو۔" میری آواز کا جواب آیا۔ جواب دینے والی کوئی عورت تھی۔ چمچ میرے دانتوں سے ٹکرایا۔ ایک چمچ پانی میرے حلق سے اتر گیا۔ "تھوڑا تھوڑا کر کے... ایک دم نہیں۔" چمچ کسی گلاس کے کنارے سے لگا۔

میرے بے قرار ہاتھوں نے اچانک حرکت کی اور اندھیرے میں گلاس پر قبضہ کرنا چاہا تاکہ میں سارا پانی ایک سانس میں غٹاغٹ چڑھا سکوں۔ گلاس فرش پر گرا اور پانی کے چند چھینٹے میرے چہرے تک پہنچے۔

"گرا دیا سارا پانی۔" اسی عورت نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں نے تمہارے ہی فائدے کے لیے ایک بات کہی مگر تمہاری سمجھ میں نہیں آئی — اب صبر کرو۔"

"پانی... خدا کے لیے... میں پھر ایسا نہیں کروں گا۔" میں نے کراہ کے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چھوڑو میرا ہاتھ۔" وہ ایک جھٹکا دے کر درشت لہجے میں بولی اور اپنی کلائی چھڑا لی۔ میرے ناتواں ہاتھوں میں اتنا دم ہی نہیں تھا کہ میں اپنی گرفت قائم رکھ سکتا۔ "مجھے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں جا رہی ہوں۔"

"ٹھہرو، میری بات سنو۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "مجھے یہ تو بتا دو کہ میں کہاں ہوں... تم کون ہو؟"

جواب میں میرے کانوں نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی لیکن اس سے میرے گرد پھیلی ہوئی تاریکی کا کوئی فرق نہیں پڑا۔ جب وہ میرے قریب تھی اور میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا تب بھی میں اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ وہ تو ایک آواز تھی۔ اندھیرے کی آواز۔ اس کی صورت کا، اس کے پیکر کا تصور کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ میں نے آواز دے کر، چلا کر اسے روکنا چاہا اور اٹھنے کی کوشش بھی کی مگر نقاہت کے باعث میں وہیں گر گیا۔ میرے ہاتھوں نے فرش کی نمی کو محسوس کیا جہاں پانی گرا تھا اور بے اختیار میں نے اس ٹھنڈک کے لیے اپنے رخسار رکھ دیے۔ ایسا کرنے سے میں اپنی بصارت کو بچانے میں کامیاب رہا۔ اگر میرا چہرہ الٹا ہوتا، میری آنکھیں کھلی ہوتیں تو سوا نیزے پر کیفیت اتر آنے والے سورج کی سی روشنی مجھے ہمیشہ کے لیے اندھا کر دیتی۔ مسلسل تاریکی میں رہنے کے بعد میری آنکھیں اس قابل نہیں رہی تھیں کہ ہزاروں واٹ کی سرچ لائٹ سے یلغار کرنے والی روشنی کو برداشت کر سکیں۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے روشنی کسی طاقتور اور طوفانی سمندر کی موج کی طرح میرے جسم سے ٹکرائی ہے۔ میں اسی دہشت میں اس طرح سمٹ گیا جیسے خطرے کا احساس ہوتے ہی کچھوا اپنے خول میں سمٹ جاتا ہے۔ میں نے چہرے کو نیچے کر لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس روشنی کو روکا جو بند پلکوں سے گزر کے آنکھوں میں کرچیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔

"تم اس حالت میں کتنے قابل رحم لگ رہے ہو۔ ایک کیڑے سے بھی زیادہ حقیر اور کمزور۔" ایک آواز کی گونج نے کہا۔

"خدا کے لیے اس روشنی کو بند کر دو۔" میں چلایا۔

اس آواز کا قہقہہ میرا مذاق اڑانے لگا۔ "روشنی سے اتنا ڈرتے ہو؟ تم یقیناً تمام زندگی اسی اندھیرے میں گزارنے کے خواہش مند تو نہیں تھے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ پھر اجالا دیکھو؟ اگر ہم چاہتے تو ایسا ہو سکتا تھا۔ تم جس اندھیرے میں تھے، قبر کا اندھیرا اس سے مختلف نہیں ہوتا۔ تم کو معلوم بھی نہ ہوتا اور ہم تمہارے وجود کو اس جگہ سے تمہاری خاک کے ابدی مدفن میں منتقل کر دیتے مگر ہم نے ایسا نہیں کیا۔"

"کیوں نہیں کیا؟" میں نے ہاتھوں کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور آہستہ سے تھوڑی سی آنکھیں کھولیں۔

"اس لیے کہ ہم تمہیں سچ بول کر اپنی زندگی بچانے کا ایک موقع دینا چاہتے تھے۔" اس آواز نے کہا۔

میں اب بھی سجدے میں پڑا ہوا تھا اور میرا چہرہ زمین کی طرف تھا۔ اس طرح کہ دونوں ہاتھوں نے دونوں جانب سے آنکھوں کو پردہ فراہم کر رکھا تھا۔ ہتھیلیاں فرش سے آدھا انچ اوپر اٹھانے سے بھی جتنی روشنی آئی اس نے مجھے پھر پلکیں بند کرنے پر مجبور کر دیا لیکن میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے پھر آنکھیں کھولیں۔ دونوں طرف مجھے فرش یوں نظر آیا جیسے وہ چمک رہا ہو۔ آخر میری آنکھوں کی تکلیف کچھ کم ہوئی۔ جیسے میرے سوکھے ہوئے اور پانی کے ترسے ہوئے جسم کو تھوڑا تھوڑا پانی دیا گیا تھا ورنہ وہی آب حیات میرے حق میں زہر بن جاتا۔ اسی طرح میری اجالے کو ترسی ہوئی آنکھوں کو تھوڑی تھوڑی روشنی دی جا رہی تھی اور اس کی مقدار میں آہستہ آہستہ اضافہ کیا جا سکتا تھا۔

"میں نہیں جانتا تم مجھ سے کیا سچ جاننا چاہتے ہو۔" میں نے کہا اور ہتھیلیوں کو کچھ اور اوپر اٹھا لیا۔

"کیا تمہیں اندازہ ہے کہ موت کی جانکنی کی اذیت میں تم نے کتنا وقت گزارا؟"

"نہیں۔ لیکن مجھے اس اذیت کا اندازہ ہو گیا ہے۔" میں نے کہا اور آنکھیں کھلی رکھیں۔

"کیا دوسری بار اسی تجربے سے گزرنے کے بجائے تم موت کو قبول کر لو گے؟" اس آواز نے کہا جسے میں ابھی تک شناخت نہیں کر سکا تھا۔ وہ ولادر کی آواز بہر حال نہیں تھی۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے مرنے نہیں دو گے۔" میں نے کہا اور ہاتھ فرش سے اٹھا لیے۔ اب میری آنکھیں روشنی کو براہ راست تو نہیں دیکھ رہی تھیں لیکن میں فرش سے منعکس ہونے والی روشنی کو دیکھ سکتا تھا۔

"تمہارا خیال غلط نہیں ہے۔ تم سچ بولو گے۔" وہ ہنسا۔ "لیکن ہمیں جلدی نہیں ہے۔ ہم پہلے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ تم مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس میں آجاؤ۔ جب تمہاری ذہنی و جسمانی توانائی بحال ہو جائے گی تو تم بہتر طور پر سمجھ سکو گے کہ تمہارے لیے سچ بولنا کتنا ضروری ہے۔ اگر تم نے مزاحمت کی تو عذاب کا دوسرا دور طویل نہ ہوگا اور جتنا اذیت ناک ہوگا اس کا تم ابھی تصور نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہم تمہیں موقع دیں گے کہ تم صحیح فیصلہ کر سکو۔ تمہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ تم اپنی قوت ارادی کے بل پر اس عذاب کو جھیلنے میں کامیاب رہے تو اگلے عذاب سے بھی گزر جاؤ گے۔ تمہاری قوت برداشت کے غیر معمولی ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اسے ناقابل شکست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو۔" میں نے سر اٹھا کر کہا۔

"یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔" وہ ہنسا۔

"تم یہ تو بتا سکتے ہو کہ میں کہاں ہوں؟" میں نے کہا۔

"اس سے تمہیں کیا فرق پڑے گا اگر میں کہہ دوں کہ تم زمین پر نہیں آسمان پر ہو۔ اپنا پتا جان کر تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔ تمہیں اس پتے پر کون سی ڈاک موصول ہونی ہے؟" وہ میرا مذاق اڑانے لگا۔ "جو بات تمہارے پوچھے بغیر میں بتا سکتا ہوں اور جو تمہارے لیے صحیح فیصلے کو آسان بنا سکتی ہے یہ

www.paksociety.com

ہے کہ میں تم کو تمہارے دوستوں کے بارے میں بتاؤں یہ کہ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں۔"

میں سانس روکے بالکل سیدھا بیٹھا رہا۔ اب میں دیوار کی طرف منہ کیے آنکھیں کھولے اس کمرے کو جزوی طور پر دیکھ سکتا تھا جس میں مجھ پر ستم کی طویل سیاہ رات گزری تھی۔ میری آنکھیں روشنی کی عادی ہو رہی تھیں لیکن میں براہ راست اس اندھا کر دینے والی روشنی کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا جو میرے پیچھے والی دیوار پر نصب تھی۔ کمرے کی دیواروں کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ میرے مقابل کی دیوار شاید دس فٹ لمبی تھی۔ دائیں اور بائیں ہاتھ کی دیواریں آٹھ فٹ کی تھیں مگر سب پر جیسے تارکول مل دیا گیا تھا۔ اس سیہ خانے کی چھت بھی اندھیری رات کے آسمان سے زیادہ سیاہ تھی۔ چنانچہ میں فرض کر سکتا تھا کہ پیچھے والی دیوار اور اس کمرے کے واحد دروازے کا رنگ بھی کالا ہوگا۔ انتہا یہ تھی کہ کمرے کے فرش پر بھی کالک مل دی گئی تھی۔ اس پورے منظر میں جو میری نظروں میں تھا کہیں کوئی در یا دریچہ، کوئی روزن یا روشندان نہ تھا جس سے روشنی یا ہوا کا گزر ممکن ہوتا۔ پھر بھی کمرے میں نہ حبس تھا اور نہ گھٹن تھی۔ اس میں یقیناً ہوا کو گردش میں رکھنے کا کوئی نظام پوشیدہ تھا۔

"ابھی تم آرام کرو۔" اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "کچھ کھاؤ پیو اور سوچو۔ سوچنے کے لیے تمہارے پاس بہت اچھا دماغ ہے اور تم اپنے علاوہ دوسروں کے بارے میں سوچ سکتے ہو۔ تم امکانات پر غور کر سکتے ہو۔ مثلاً تم رابعہ اور محسن کے متعلق سوچو کہ اگر وہ بھی ہماری تحویل میں ہوئے تو کہاں ہوں گے؟ کیا ان کے ساتھ بھی وہی ہوا ہوگا جو تمہارے ساتھ ہوا۔ کیا ان میں بھی تنہا مزاحمت کی صلاحیت ہے جتنی تم میں ہے؟ اور اگر ہم نے تمہارے بعد ان سے سچ معلوم کرنے کی کوشش کی تو کیا ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے ذمے دار تم ہوں گے۔ تم انھیں بچا سکتے ہو یا بہادروں کی طرح جان دے سکتے ہو اور اپنا عذاب منتقل کر سکتے ہو۔ تمہارے بعد محسن، اس کے بعد رابعہ پھر وہ احمق جو دم چھلے کی طرح تمہارے ساتھ لگا پھرتا ہے۔ تو سعد نیک محمد عرف خوجی عرف استاد ٹیڈی؟"

میں سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں مجھے کس قسم کے ردعمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے کہ اسی وقت روشنی مدھم ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ۔ یوں جیسے آفتاب غروب ہوتا ہے۔ میں نے چت ہو کر دیکھا۔ کیا وہ اعصاب شکن اندھیرا پھر ایک لامحدود رات کی صورت میں نازل ہو رہا ہے۔ میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ سوچا۔ وہ روشنی چھت کے اوپر دیوار کے ساتھ پر نصب تھی اور اب ایک دہکتے سرخ انگارے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ پھر یہ انگارہ بھی بجھنے لگا اور ایک بار پھر میری اندھی آنکھیں اس سیاہ دیواروں والے زندان میں بھٹکنے لگیں۔

"تم کیا جاننا چاہتے ہو؟" میں چلایا لیکن ابھی کمزوری کا اثر باقی تھا۔ تھوڑے سے گلوکوز اور نمک ملے ہوئے پانی سے میری طاقت گویا ضرور بحال ہو گئی تھی مگر میں ابھی توانائی سے محروم تھا۔ میری سانس پھول گئی اور میں یوں ہانپنے لگا جیسے سخت مشقت نے مجھے نڈھال کر دیا ہو۔ میری آواز کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ پھر میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور اٹھ کر جھپٹا۔ نہ جانے مجھ میں ایک دم اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ میں پوری قوت کے ساتھ بند دروازے سے ٹکرایا اور نیچے گر گیا۔ کمرے کے اندر کوئی قہقہہ مار کے ہنسا۔

"زیادہ چوٹ تو نہیں آئی میرو؟" وہ بولا اور میں نے اس آواز کو پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جو مجھ سے کسی نہ کسی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے بات کر رہا تھا۔ اب میری نگاہیں دیکھنے سے قاصر تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی اس کمرے میں سر سے پیر تک سیاہ لباس پہن کر آیا ہے۔

"تم مجھے نہیں دیکھ سکتے لیکن میں تم کو دیکھ رہا ہوں" وہ بولا۔ "کیونکہ میں نے مخصوص عدسوں والی عینک لگا رکھی ہے۔"

میں مخصوص عدسوں کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ انفراریڈ شعاعوں کی مدد سے اندھیرے میں فوٹو گرافی کرنے والے کیمروں میں بھی استعمال ہوتے تھے۔

"میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان لایا ہوں۔" وہ بولا اور اس مرتبہ آواز دوسری سمت سے آئی۔ وہ محتاط تھا کہ کہیں میں آواز کی سمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس پر حملہ نہ کر دوں۔

"تم کو جو کچھ پوچھنا ہے پوچھتے کیوں نہیں؟" میں نے بڑی مشکل سے خود کو اٹھایا۔

"نہیں، اس کی جلدی نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم کو سوچنے سمجھنے کا موقع دیا جائے۔" وہ بولا۔ "اب تم دروازے کے سامنے سے ہٹ جاؤ تاکہ میں باہر چلا جاؤں۔"

"ہٹ کر کدھر جاؤں جب کہ میں کچھ دیکھ ہی نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ "ناک کی سیدھ میں روانہ ہو جاؤ۔ میں تمہیں دیوار تک پہنچنے سے پہلے روک لوں گا۔" وہ دوسری سمت سے بولا۔

میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ وہ چالاک آدمی آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔

"میرا مشورہ ہے کہ سوپ تھوڑا تھوڑا کر کے پینا اور اس کے بعد پانی پینا۔" وہ دروازے کی سمت سے آ گیا۔ "ابھی میرے جانے کے بعد اتنی روشنی کر دی جائے گی کہ تم یہ چیزیں دیکھ سکو۔ فی الحال تمہیں بہت زیادہ تو کچھ بھی نہیں دیا جا سکتا مگر وقفے وقفے سے اشیائے خورد و نوش کی فراہمی جاری رہے گی۔"

دروازہ بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی روشنی لوٹ آئی مگر اس بار میری آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں۔ میں نے کمرے کے ایک کونے میں دو پیالے فرش پر رکھے ہوئے دیکھے۔ بظاہر دونوں پیالوں میں پانی نظر آتا تھا لیکن ایک میں گرم اور نمکین سوپ تھا۔ میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے چمچے کی مدد سے پینا شروع کیا۔ درمیان میں وقفے وقفے سے پانی کے گھونٹ بھی لیتا رہا۔ ابھی میں اپنی آزادی کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ کرنے کے قابل ہونے کے لیے میرا ذہنی اور جسمانی طور پر کسی قابل ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے بلاوجہ عقل کے گھوڑوں کو ان ظلمات میں دوڑانے سے گریز کیا۔ معلوم نہیں اس پیالے کے سوپ میں کیا تھا کہ میری کھوئی ہوئی طاقت تیزی سے بحال ہونے لگی لیکن ابھی اسے پیے ہوئے مجھے دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

میں سو کر اٹھا تو مجھے اسی جگہ دونوں خالی پیالوں کی جگہ دو بھرے ہوئے پیالے نظر آئے۔ اس مرتبہ میں ضبط سے کام نہ لے سکا اور قحط زدہ کی طرح سوپ پر ٹوٹ پڑا۔ یہ سوپ زیادہ گاڑھا تھا۔ اسے میں نے چمچے سے کچھ پیا اور کچھ کھایا پھر پانی سے بھرا ہوا پیالہ حلق میں انڈیلا اور خود کو بہت حد تک آسودہ محسوس کیا۔ نیند نے دوسری بار مجھے دس منٹ میں آ لیا۔ ہوش میں آنے سے پہلے مجھے خیال آیا کہ خوراک میں مجھے خواب آور یا ذہن کو سن کرنے والی کوئی دوا دی جا رہی ہے۔ سوپ کے ذائقے سے کچھ پتا نہیں چل سکتا تھا۔ پانی کا ذائقہ مجھے عجیب سا لگا تھا۔ پھر سو کر اٹھا تو وہ پیالے اسی طرح بھرے ہوئے ملے۔ یہ سب ایک طلسماتی کھیل لگتا تھا۔ بالکل کسی جادوئی کہانی کی طرح۔ میں کسی دیو کی قید میں تھا اور وہ جگہ جہاں مجھے قید کیا گیا تھا خیالوں کی سرحد سے بھی دور تھی جہاں کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ وہ جب چاہتا تھا مجھے سلا دیتا تھا اور میری نیند کے دوران میں کوئی دو خالی پیالے اٹھا کے بھرے ہوئے پیالے رکھ جاتا تھا اور ان پیالوں میں جو کچھ ہوتا تھا وہ میں نے پہلے چکھا تھا اور نہ دیکھا تھا۔

بھوک محسوس کرنے کے باوجود میں نے کھانے کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ اب میں اس قابل ہو گیا تھا کہ سوچ سکوں۔ کمرے میں وہی ایک لائٹ اس چراغ کی طرح جل رہی تھی جس کی توانائی کم کر دی گئی ہو۔ یہی لائٹ تیز ہوتی تھی تو اس کی طرف دیکھنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ مجھے اس شخص کا خیال آیا جو مجھ سے لاؤڈ اسپیکر پر مخاطب تھا اور بعد میں کمرے کے اندر آ کر مجھ سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اندھیرے میں دیکھ سکتا ہے۔ اس نے خاص قسم کے شیشوں والی عینک کا ذکر بھی کیا تھا۔ وہ مجھے انفراریڈ یا الٹرا وائلٹ شعاعوں کی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔ سورج کی روشنی کے سات رنگ ہوتے ہیں مگر ان میں بھی یہ شعاعیں انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ مخصوص کیمرے اس روشنی کو دیکھ لیتے ہیں اور ایسی فلمیں بھی ہوتی ہیں جن پر ان شعاعوں سے تصویر اتاری جا سکتی ہے۔ ریموٹ کنٹرول والے آلات انہی شعاعوں سے کام کرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت اندھیرے میں وہ مخصوص قسم کی روشنی کس طرف سے آ رہی تھی جسے میری آنکھ نہیں دیکھ سکتی تھی؟

میں نے دیوار کا اور چھت کا بغور معائنہ کیا۔ دیواریں بالکل سپاٹ تھیں اور دروازے میں بھی کوئی درز نہ تھی۔ اگر اس مخصوص روشنی کی صرف ایک لکیر ہوتی یا وہ کسی محدود دائرے میں پڑتی تو وہ شخص مجھے پورے کمرے میں چلتا پھرتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ روشنی پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے چھت میں نصب واحد لائٹ کے عین نیچے جا کر دیکھا۔ یہ تقریباً ایک فٹ لمبی اور آٹھ انچ چوڑی چوکور لائٹ تھی جس کے اوپر روشنی کو تیز کرنے والا عدسہ لگا ہوا تھا لیکن عدسہ پوری لائٹ کے فریم پر نہیں پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف تقریباً تین انچ چوڑی پٹی میں لکیریں سی نظر آ رہی تھیں۔ ان لکیروں کے پیچھے اسپیکر تھا۔ لائٹ دیوار میں جڑی ہوئی تھی اور ایسے زاویے پر لگائی گئی تھی کہ روشنی سامنے کے حصے میں پورے کمرے کو روشن کر دے۔ اس وقت بھی روشنی

www.paksociety.com

ہر حصے میں پہنچ رہی تھی، سوائے اس جگہ کے جو لائٹ کے بالکل نیچے تھی چراغ تلے اندھیرا والی بات تھی مگر اندھیرا وہیں تھا جہاں دروازہ تھا۔ اگر میں اس جگہ کھڑا ہو جاتا تو دروازہ کھلتا اور انہیں فوراً معلوم ہو جاتا کہ میں دروازے کے پیچھے موجود ہوں۔

پھر میرے ذہن میں یکے بعد دیگرے دو خیال آئے۔ ایک یہ کہ جب روشنی تیز ہوتی ہے تو اسی میں پوشیدہ کیمرے کا لینس ایک سو اسی درجے کے زاویے پر کمرے کو فوکس کرتا ہے چنانچہ جب وہ مجھ سے بات کر رہا تھا تو کسی ٹی وی اسکرین پر میری تصویر بھی دیکھ رہا تھا۔ ابھی یہ لائٹ عام قسم کی روشنی تھی۔ اتنی کم روشنی میں کلوز سرکٹ کیمرا کام نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرا خیال زیادہ حوصلہ افزا تھا۔ وہ مخصوص رنگ کی روشنی جس میں کیمرا تاریک محسوس ہوتا تھا اسی سرچ لائٹ سے خارج ہوتی ہوگی گویا اس ایک سرچ لائٹ کے تین فنکشن تھے۔ اس وقت یہ ایک بلب کی طرح جل رہی تھی۔ اگر یہ تیز ہو جاتی تو کلوز سرکٹ کیمرے کی فلیش گن کا کام کرتی اور بند ہو جاتی تو اسی سے وہ مخصوص روشنی خارج ہونے لگتی جو نظر نہیں آتی۔

یہ دریافت کرکے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے کمرے کا دوبارہ جائزہ لیا اور اسی نتیجے پر پہنچا کہ اس زندان کا سارا جادو ایک لائٹ میں پوشیدہ ہے۔ اگر میں اس کا شیشہ توڑ سکتا تو شاید اس کے امکان پر غور بھی کرتا مگر میں خالی ہاتھ تھا۔ میرے پاس صرف چینی کے دو پیالے تھے۔ اگر وہ میں لائٹ پر کھینچ مارتا تو لائٹ کا کچھ نہ بگڑتا اور دونوں پیالے ٹوٹ جاتے کیونکہ لائٹ کے اوپر لوہے کی حفاظتی جالی بھی تھی۔ اس کے علاوہ لائٹ کے ٹوٹتے ہی انہیں معلوم ہو جاتا اور وہ مسلح ہو کر آ پہنچتے۔ میرے پاس سوچنے کی مہلت کم تھی۔ اصولاً جاگنے کے بعد مجھے کھانے کی طرف رجوع کرنا چاہیے تھا اور میں بھوک محسوس بھی کر رہا تھا مگر میں اس من و سلویٰ کو کھا پی لیتا تو پھر سو جاتا جبکہ میں ذہنی و جسمانی طور پر بہت مستعد اور فعال محسوس کر رہا تھا اور اس زندان سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا کرنے پر آمادہ تھا۔ رابعہ اور محسن کے خیال کو میں نے پیچھے دھکیل دیا تھا کیونکہ ان کے بارے میں سوچنے سے ذہن میں مایوسی اور انتشار کی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ اس سے صرف [illegible] پست ہوتا تھا۔ عمل کی قوت کا منفی ردعمل سے دوچار ہونا بہت نقصان دہ تھا۔ میرے لیے یہ بہت ضروری تھا کہ پہلے

خود آزادی حاصل کروں اور پھر دوسروں کے متعلق سوچوں۔ ممکن ہے شکاری صرف مجھے گرفتار کرکے لائے ہوں لیکن دوسرے بھی ان کی قید میں ہیں تو ایک قیدی کی حیثیت سے میں ان کی رہائی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا، تب بھی نہیں کر سکتا۔

ترکیب فوراً میرے ذہن میں آگئی۔ میں سالن کے پیالے کو اٹھایا اور فرش پر کم سے کم جگہ پر پھیلا دیا۔ اندازہ تھا کہ خواب آور دوا پانی میں ہے مگر یہ اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے کوئی رسک نہیں لیا۔ پیالہ پانی بہت زیادہ نہیں تھا۔ میں نے اسے اور سالن کو اپنے کپڑوں کو بھگو لیا اور زمین پر نہیں گرنے دیا۔ پیالوں کو اپنی جگہ پر رکھ کے میں عین اسی جگہ پر لیٹ گیا جہاں میں نے کھانے کا پیالہ خالی کیا تھا۔ گیلا سالن میرے کپڑوں کے نیچے آگیا۔ میں نے لائٹ کی طرف پشت رکھی اور اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کے علاوہ فرش پر گرنے کے طرح چپکنے والے سوپ کو روشنی سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہا۔ مجھے یقین تھا کہ اندر آ کے خالی پیالے جانے اور دودھ خوراک سے بھرے ہوئے پیالے چھوڑ جانے کا یہ وقت میں آتا ہوگا جب دیکھنے والے کیمرے کی آنکھ مجھے نیند میں مدہوش دیکھ لیتے ہوں گے۔ اگر لائٹ تیز ہوئی تو میرے خیال کی تصدیق ہو جائے گی۔ میں نے سوچا اور پلکوں میں بے حس و حرکت پڑا رہا۔

اسی وقت کمرا روشنی سے جگمگانے لگا۔ اگرچہ سیاہ چھت اور فرش روشنی کو جذب کر رہے تھے مگر میری آنکھ اس کی چکاچوند کو محسوس کر سکتی تھیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھنے سے گریز کیا اور آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ یقیناً اب وہ مشاہدہ کر رہے ہوں گے کہ ان کی دی ہوئی خوراک کے زیر اثر میں پھر خواب غفلت میں کھو گیا ہوں یا نہیں۔ آخر ان کا مقصد کیا تھا! اگر میں اسی طرح سوتا جاگتا رہتا تو میرے ذہن پر کیا اثرات مرتب ہوتے؟ ایک معلومات سے تو میں اب بھی محروم ہو چکا تھا یعنی وقت میرے احساس کی گرفت سے نکل چکا تھا۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ اس وقت دن ہے یا رات، آج مہینے یا سال کی کون سی تاریخ ہے اور میں اس قید خانے میں کتنے دن گزار چکا ہوں۔

روشنی اچانک کم ہوئی اور میرا دل دھڑکا۔ وہ لوگ مجھے بے حس پا کے مطمئن ہو گئے تھے۔ اب [illegible] کوئی آئے!

غالب اور کتنی دیر میں، میں اس کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تم نے والا مسلح ہو یا جسمانی طور پر طاقت ور حریف ثابت ہو کہ میں اس پر غالب نہ آسکوں۔

"سکندر، کیا تم اس وقت جاگ رہے ہو؟" لاؤڈ اسپیکر نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم اس آواز کو سن سکتے ہو سکندر۔" وہ بولا۔ "تمہارا جسم سویا ہوا ہے لیکن تمہارا ذہن بیدار ہے۔ تم اپنی مرضی سے ایک انگلی بھی نہیں ہلا سکتے کیونکہ تمہارے دماغ کا تمہارے جسم پر کوئی کنٹرول نہیں ہے۔"

وہ بہت عجیب باتیں کر رہا تھا اور میں اس کے مزخرفات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"تم صرف وہی کر سکتے ہو جس کا تمہیں حکم دیا جائے گا۔" وہ بولا۔ "تمہارے اور میرے درمیان عامل و معمول کا رشتہ ہے۔ تم معمول ہو اور میں عامل ہوں۔ تم میری آواز سن رہے ہو؟"

میں نے خاموشی سے اس کی یکطرفہ گفتگو سننا جاری رکھا۔ ابھی تک اس نے صرف میری کیفیت بیان کی تھی، مجھے کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ آخر وہ کون تھا؟ کوئی مسمریزم کا ماہر یا ماہر نفسیات، جادوگر یا عامل؟

"میں نے تم کو ہپناٹائز کرکے سونے پر مجبور کر دیا ہے۔ تمہارا دماغ اس نیند سے نجات نہیں پا سکتا۔ تم اگر جاگنا چاہو تب بھی نہیں جاگ سکتے۔ تمہاری ذہنی اور جسمانی مزاحمت کی قوت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ جو دوا تم کو دی گئی تھی اس نے تمہارے شعور کو سلا دیا ہے لیکن تمہارا لاشعور جاگ رہا ہے سکندر بخت یہی وجہ ہے کہ تم میری آواز سن رہے ہو اور ایک ایک لفظ کو سمجھ رہے ہو۔ سمجھ رہے ہو نا؟"

"ہاں..... میں..... سن رہا ہوں۔" میں نے نیند میں ڈوبی ہوئی بوجھل اور بھاری آواز میں رک رک کر جواب دیا۔

"جب تم خواب دیکھتے ہو تو بہت کچھ کرتے ہو۔" وہ بولا۔ "تم دوسروں سے باتیں کرتے ہو اور دوسرے بھی تم سے بہت کچھ کہتے ہیں۔ بعض اوقات آنکھ کھلنے کے بعد تمہیں سب یاد آ جاتا ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت کوشش کرنے کے باوجود تم کو خواب یاد نہیں آتا۔ تم سمجھتے ہو کہ گزشتہ رات تم نے خواب دیکھا ہی نہیں تھا۔ بات یہ نہیں ہوتی۔ تمہارا ذہن سوتے میں کوئی کام نہیں کرتا۔ سارا کام لاشعور کرتا ہے۔ وہ بہت سی باتیں خواب بنا کے دکھاتا ہے۔ اور ان میں سے کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو بھلائے رکھنا تمہارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ کیا یہ بات تم نے سمجھ لی؟"

"ہاں..... تم غلط کیسے کہہ سکتے ہو۔ یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے۔" میں نے اسی بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا اور یہ ثابت کیا کہ ایک مکمل طور پر مطیع ہو جانے والے معمول کی طرح میرا اپنے عامل پر اعتقاد کتنا راسخ ہو چکا ہے۔

"ویری گڈ۔" وہ میرے جواب سے خوش ہوا۔ "تم کو یہ بھی سمجھنا ہوگا سکندر کہ اس وقت بھی تم مجھ سے خواب میں ہمکلام ہو۔ جب تم جاگو گے تو تمہیں کوئی بات یاد نہیں رہے گی۔ اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔ تم خود کو ذہنی پریشانی سے بچاؤ گے سکندر اور مجھ سے تعاون کرو گے۔ اگر تم نے تعاون نہ کیا تو رابعہ بڑی مشکل میں پڑ جائے گی۔ اس کی موت انتہائی پُر اذیت ہوگی۔ تم اس کی موت کا منظر دیکھو گے تو پاگل ہو جاؤ گے۔"

"خدا کے لیے رابعہ کو چھوڑ دو۔ تم اس کی سزا مجھے دینا چاہو تو دے لو۔" میں نے کہا۔

"تم واقعی رابعہ سے بہت محبت کرتے ہو۔ کیا اس کی خاطر تم سچ بولو گے؟"

"میں سچ بولوں گا۔ کیا اس کے بعد تم رابعہ کو چھوڑ دو گے؟" میں نے کہا۔

"ابھی میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔" وہ بولا۔ "مجھے تمہارے سچ پر اعتبار آ گیا تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔"

"تم مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"کیا تمہیں چوہدری دلاور اور اس کے ساتھیوں کے کاروبار کی اصل نوعیت کا علم ہے؟" وہ بولا۔

"ہاں مجھے سب معلوم ہے۔"

"تمہارے علاوہ رابعہ اور محسن کو بھی معلوم ہے؟" وہ بولا۔

"ہم سب جانتے ہیں۔ جو بات ایک کو معلوم ہو وہ سب کو معلوم ہوتی ہے۔"

"تمہارے خیال میں چوہدری دلاور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کیا غیر قانونی کام کر رہا ہے؟" وہ بولا۔

"وہ منشیات کی اسمگلنگ کرتا ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو سکندر۔ تم اصل بات نہیں بتا رہے ہو۔" وہ بولا۔

"میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔" میں نے کہا

www.paksociety.com

"ہیروئن کے پیکٹ میرے پاس ہیں۔"

"یہ پیکٹ تمہیں کس طرح ملے تھے؟" وہ بولا۔

"گامے ماچھی کے اڈے سے۔" میں نے کہا۔ "وہ ایک جعلی پیر ہے اور مارا جا چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اسی کی خانقاہ کے تہ خانے سے یہ پیکٹ ملے تھے۔"

"تم وہاں کیوں گئے تھے؟"

"یہی دیکھنے کے لیے کہ کیا واقعی وہاں کے تہ خانوں سے ہیروئن باہر بھیجی جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"تم کو یہ کس نے بتایا تھا کہ وہ تہ خانے ہیروئن کے گودام ہیں؟"

"مجھے مختلف ذرائع سے اطلاعات ملتی رہی تھیں۔" میں نے کہا۔ "جب میں انگلینڈ میں زیرِ تعلیم تھا تو..."

"تو کیا سکندر؟" وہ بولا۔ "کیا تمہارے والد نے تم کو کچھ بتایا تھا؟"

"ہاں، انہوں نے اپنا شک ظاہر کیا تھا۔ خط لکھ کر۔"

"تم پھر جھوٹ بول رہے ہو سکندر۔" وہ بولا۔ "مجھے ان کا ایسا کوئی خط نہیں ملا تھا۔"

"ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں نے اس خط کو فوراً جلا دیا تھا۔"

"اس کے علاوہ تمہیں کس نے بتایا تھا؟" وہ بولا۔

"بہت سے لوگ تھے۔ ایک اکاؤنٹنٹ تھا غلام علی۔" میں نے کہا۔ "وہ بس کے حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے فتنی نواچو نے اطلاع دی تھی۔ پھر میں نے ڈی سلوا کی گاڑی میں لاکھوں روپے کی ہیروئن دیکھی تھی۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا سکندر۔" میری غلط بیانی نے اسے کنفیوز کر دیا تھا۔ "وہ گاڑی کسی اور کی ہوگی۔"

"ڈی سلوا کا گھر بھی ہیروئن کی اسمگلنگ کا ایک ٹھکانا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے وہاں گاڑیوں کی ڈکی میں ہیروئن بھری ہوئی دیکھی تھی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ہیروئن تھی؟" وہ ڈی سلوا کے بارے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ در پردہ اس نے دوسرا کاروبار بھی شروع کر رکھا تھا جس کی خبر دلاور کو بھی نہیں تھی۔

"میں ہیروئن کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔"

"اور وہ لوگ کون تھے جو ڈی سلوا سے ہیروئن لے جاتے تھے؟" وہ بولا۔

"میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا۔ اگر وہ بس کے حادثے کا شکار نہ ہوتا تو میں اس سے سب کے نام پوچھ لیتا۔" میں نے کہا۔ "وہ مجھ سے اسی لیے خوفزدہ تھا کہ میں سب کچھ جان چکا تھا۔"

"کیا تم نے ان گاڑیوں کے نمبر نوٹ کر لیے تھے؟" وہ بولا۔

"لیے تو تھے مگر پھر ایک نوٹ بک میں لکھ لیے تھے، میرا خیال تھا کہ وہ بوگس ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ڈی سلوا کی کار کی ڈکی میں کتنی ہیروئن تھی؟ کتنا وزن تھا اور وہ ہیروئن کہاں گئی؟" وہ بولا۔

"مجھے معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے پولیس لے گئی ہو۔ وزن کا بھی مجھے صحیح اندازہ نہیں۔ بہت سی تھیلیاں تھیں۔ پانچ سو گرام اور ایک کلو کی۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ گامے شاہ کے اڈے سے ہیروئن کہاں جاتی تھی؟" وہ بولا۔

"مجھے ابھی تک صرف یہ پتا چلا ہے کہ ہیروئن ٹرک سے پہنچائی جاتی تھی۔"

"تم ان لوگوں سے بھی واقف ہو جو یہ کام کرتے تھے؟" وہ بولا۔

"مجھے طافو نے کچھ نام بتائے تھے جو ڈی سلوا کے ایجنٹ تھے۔" میں نے کہا۔ "مگر طافو مارا گیا۔"

"وہ کیا نام تھے؟ تم کو ان کا پتا بھی معلوم ہوگا!"

"نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ یہ سب لوگ اڈے پر پہنچ کر ٹرک سے اپنا اپنا مال پہچان کر ہاتھ وصول کر لیتے۔ ایک لالو کھیت کا بلڈ مسٹری تھا۔ دوسرا لیاری کا شاہد اور ایک قصبہ کالونی کا ہزار خان تھا۔" میرا جھوٹ اسے یقیناً مطمئن کر رہا ہوگا۔

"تمہیں یاد ہے کہ تم نے ایک ٹرک تباہ کر دیا تھا۔ اس میں تو ایسی کوئی بھی چیز نہیں تھی۔" وہ بولا۔

"اس میں ڈی سلوا نے اپنا مال گھر سے رکھوایا تھا۔ رحمت کباڑی اس کا ایجنٹ تھا۔" میں نے کہا۔ "رحمت کباڑی نے مرنے سے پہلے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ دلاور کے علاوہ ڈی سلوا کے لیے بھی کام کرتا تھا اور دونوں کے مال کا ذمے دار تھا۔ اس نے کبھی دلاور کو معلوم نہیں ہونے دیا تھا کہ چوری چھپے ڈی سلوا اپنا کاروبار بھی کرتا ہے۔ رحمت کباڑی کو دونوں طرف سے فائدہ تھا۔"

"یہ اس نے تم کو خود بتایا تھا؟"

"ہاں، آسانی سے تو نہیں بتایا تھا۔ شرافت سے بتا دیتا تو مارا کیوں جاتا۔" میں نے کہا۔

"تم جھوٹ بول کے مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہے۔ میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ اس کا نتیجہ تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔" وہ بولا۔ "تم سے زیادہ رابعہ کو اس کی سزا بھگتنا پڑے گی۔"

"میں رابعہ کی قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ میں جو کچھ بتا رہا ہوں وہ سچ ہے۔" میں نے کرب زدہ لہجے میں کہا۔ میں نے رابعہ کی جھوٹی قسم کھائی تھی مگر میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ ایسے مخصوص حالات میں جہاں زندگی کو خطرہ لاحق ہو، مذہب نے بھی حرام و حلال کے فرق کو نظر انداز کرنے کی اجازت دی ہے۔ میرا مقصد اپنی حفاظت تھا اور رابعہ کو بچانا تھا اور اس کے لیے دشمنوں کو اپنے سچ کا یقین دلانا ضروری تھا۔ جتنا جھوٹ میں نے بولا تھا اس کو بھی گناہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا کیونکہ اس کے بغیر نجات کی توقع عبث ہوتی۔ میں نے بہت سے جھوٹ ان سے بھی منسوب کیے تھے جو اب دنیا میں نہیں تھے اور ان کے اعمال کا حساب قدرت کے سپرد ہو چکا تھا۔ تاہم یہ بھی دشمن کے خلاف بقا کی جنگ کا ایک حصہ تھا اور میرے کسی فعل کو بدنیتی پر مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

"اگر تم یہ بات معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتے کہ گامے ماچھی نے پیری فقیری کی آڑ میں ہیروئن کا دھندا چلا رکھا ہے...؟"

"مجھے یہ بات معلوم تھی۔ اور یہ ثابت بھی ہو گیا تھا۔"

"اس کے بعد تم کیا کرتے؟" وہ بولا۔

"میں معلوم کرتا کہ کراچی میں کون کون لوگ اس کاروبار میں ملوث ہیں۔ پھر میں پولیس کو بلا لیتا۔"

"تم خود پولیس کو کیسے بلا سکتے تھے۔ سب سے پہلے تم خود پکڑے جاتے۔" وہ بولا۔

"میں اسکل بھری کو جانتا تو وہ مجھ پر یقین کرتے۔" میں نے کہا۔ "میں یہ ضرور بتاتا کہ کہاں سے بول رہا ہوں۔ اس کے علاوہ ہمارا ایک دوست عبد الودود منظر اسپیکٹر پولیس ہے۔ میں اس سے بھی رجوع کرتا خواہ کام کتنا ہی کم ہوتی۔"

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا سکندر۔" وہ بولا۔ "یہ کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا اور تمہارے والد کی مخالفت کے باوجود تم کو اندازہ نہیں کہ کتنا نقصان ہوا؟ تم نے اتنی پریشانی اور مصیبت اٹھا کر یہ بات معلوم کر لی تو کون سا تیر مار لیا۔ مجرم تم ایک بنے اور جو کچھ تمہارے پاس تھا وہ سب تم نے گنوا دیا۔ کیا تم نہیں جانتے تھے کہ دلاور جب ہیروئن اسمگل کرتا ہے تو اس کاروبار میں اکیلا نہیں ہے۔ اس کے مددگار ایک سرے سے دوسرے سرے تک موجود ہیں جو منافع میں برابر کے شریک ہیں۔ ان میں پولیس بھی ہے جو ابھی کچھ دیر میں یہاں آئے گی اور تم کو سوتے میں اٹھا کے لے جائے گی۔ تم پر چرس کا ڈکیتی ——— اغوا اور قتل کے کتنے مقدمات ہیں۔ کیا ان سب کی سزا پھانسی سے کم ہو سکتی ہے؟"

"مجرم تم لوگ ہو۔ جب تک میں زندہ ہوں تمہارے خلاف برسرِ پیکار رہوں گا۔" میں نے کہا اور بہت اطمینان کا سانس لیا کہ اپنی کوشش سے بالآخر ایک جھوٹ کو سچ بنانے میں کامیاب رہا۔ اب میرے دشمنوں کو یقین تھا کہ مجھے ان کے اصل کاروبار کا علم نہیں اور میں اسلحے کی خرید و فروخت کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ ان کے لیے یہ ایک اچھا انکشاف تھا کہ مجھے ڈی سلوا کی وجہ سے ہیروئن کے کاروبار کا پتا چلا اور میں غلط راہ پر چل پڑا۔ ڈی سلوا نے دلاور کے اعتماد کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا اور اپنا کاروبار الگ چلا کے اچھا نہیں کیا تھا۔ اگر اس کی زندگی میں یہ بات دلاور کو معلوم ہو جاتی تو ڈی سلوا بہت پہلے مارا جاتا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی ذات سے منسوب ایک برائی کا انکشاف ہو رہا تھا مگر وہ سزا کی حد پار کر چکا تھا اور اس کی خرابی اس لیے قابلِ معافی ہو گئی تھی کہ اسی کی وجہ سے ہمارے شکوک و شبہات کی بنیاد غلط ہو گئی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی اور فوری طور پر دشمن مطمئن ہو گئے ہیں کہ ان احمقوں سے کوئی خطرہ نہیں جو میرے گھر خود بڑے تیس مار خاں اور سراغرساں بنے پھرتے ہیں۔

تشویش کی بات میرے لیے یہ تھی کہ وہ مجھے پولیس کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اپنی تفتیش مکمل کرنے کے بعد وہ یہاں سے نکل جائیں گے اور پولیس کو میرے بارے میں بتا دیں گے۔ پولیس بھی تو انہی کی ہے اور ان سے زیادہ میری دشمن ہے۔ لائٹ ایک دم بہت کم ہوئی تو میں نے کروٹ بدلی۔ میری ایک سائڈ بالکل سن ہو گئی تھی اور اگر مجھے فوراً اٹھنا پڑتا تو میں اٹھ نہیں سکتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرا بخار باقی نہیں رہا تھا اور میرے اس بازو کی حالت بھی بہتر تھی جس میں گولی کا زخم تھا۔ اس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ میری بے ہوشی میں وہ مجھے اینٹی بائیوٹک دوا کے انجکشن لگاتے رہے تھے

www.paksociety.com

اور شاید سوپ میں دوائیں شامل کرتے رہے تھے۔ ان کا مقصد میری جان بچانا نہیں تھا۔ وہ مجھے ضروری معلومات حاصل کرنے کے لیے زندہ رکھنا چاہتے تھے۔

آہستہ آہستہ میں نے خود کو ایک بازو کے سہارے پر اٹھایا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد سیدھا بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے کپڑے نمی اور غلاظت میں بھر گئے تھے لیکن مجھے ایک امید کا سہارا حاصل ہو گیا تھا۔ اگر خدا نے یہ امید کا وسیلہ بھی نہ پیدا کیا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میں اس قید خانے میں کسی سے کچھ کہے بغیر پاگل ہو جاتا اور دیواروں سے سر پھوڑ کر مر جاتا۔ عام زندگی میں آدمی روشن دیواروں کے درمیان رہتا ہے۔ زمین کی..... سرسبزی اور آسمان کی نیلاہٹ کے درمیان رہتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ یہاں ہر سو تاریکی کا احساس تھا اور روشنی ان کالی دیواروں میں آتی پر آسیب لگتی تھی کہ خوف آتا تھا۔ اوپر نیچے اور اپنے چاروں طرف ایک ہی سیاہ رنگ کو دیکھتے رہنے سے ذہن اور اعصاب پر اس آسیب کا اثر ہونے لگتا تھا۔ اب میں بے چینی سے منتظر تھا کہ کچھ ہو۔ تفتیش کے عمل کے بعد یکسانیت، جمود اور خاموشی پھر مجھے خوفزدہ کرنے لگے تھے۔ میں اس خیال سے بھی دور رہنا چاہتا تھا کہ میری امید کی کرن فقط سراب آئندہ ثابت ہوئی تو کیا ہوگا۔

دروازے کے پیچھے ہلکی سی آہٹ سن کر میں فوراً لیٹ گیا اور اپنا رخ یوں رکھا کہ میرے کپڑے اور فرش کی آلودگی اندر آنے والے کو فوراً نظر نہ آئے۔ وہ صرف یہ دیکھے کہ میں آنکھیں بند کیے مدہوش پڑا ہوں۔ میں نے آنکھوں کو اس وقت تک بند رکھا جب تک کوئی دروازہ کھول کے اندر نہیں آ گیا۔ میں قدموں کی چاپ پر کان رکھے لیٹا رہا۔ آہٹ میرے قریب آئی۔ کسی نے آہستہ سے میرے زخمی ہاتھ کو ٹھوکر ماری۔ میں درد کی ٹیس کو برداشت کر گیا اور اسی طرح پڑا رہا۔ ٹھوکر مارنے کا مقصد یہ اندازہ کرنا تھا کہ کہیں میں مکر تو نہیں کر رہا ہوں۔ اگر میں چاہتا تو اس وقت بھی ٹھوکر مارنے والے کو گھسیٹ کر گرا سکتا تھا۔ یہ تو میں سمجھ چکا تھا کہ اندر آنے والا کوئی مرد ہے۔ وہ عورت نہیں جس نے پہلی بار مجھے چپکے سے آب حیات پلایا تھا۔ آخر وہ کون تھی؟ اس کا لہجہ نامہرباں نہیں تھا اور اگر وہ آتی رہتی تو شاید میرے لیے کچھ کرتی۔ عورتوں کا دل کسی کو مصیبت میں دیکھ کر نسبتاً جلد پسیج جاتا ہے۔ ممکن ہے اسی وجہ سے بعد میں عورت کو نہ بھیجا گیا ہو کہ میں جسمانی توانائی کی بحالی کے بعد اسے [illegible] میں کامیاب نہ ہو جاؤں۔

پیالوں کی آواز پر میں نے ایک آنکھ کھول [illegible]

وہ پیالے پیچھے رکھ چکا تھا اور اب دونوں خالی [illegible] رہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی چنانچہ وہ مجھے [illegible] دیکھ سکا۔ یہ میرے لیے زندہ رہنے کے لیے جان لڑا دینے کا آخری موقع تھا۔ ہار جیت کی پروا کیے بغیر [illegible] تھا۔ اسی احساس نے مجھے غیر معمولی قوت عطا کی اور [illegible] جست میں اس کے اوپر جا پڑا۔ آخری وقت میں [illegible] ہو گیا تھا کہ میں نے اسے دھوکے میں رکھ کر [illegible] وہ ایک دم پلٹا تھا۔ اٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ جیب [illegible] میں نے اس کے بازو پر لات ماری اور ایک ہاتھ [illegible] پیچھے گرا دیا۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا تھا۔ وہ فرش پر [illegible] کا سر بڑی آواز کے ساتھ بیٹھنے لگا اور وہ تلملایا۔ [illegible] سال کا نوجوان لڑکا تھا مگر جسمانی طور پر اس کی صحت گوریلے سے کم نہ تھی۔ اس کا قد بھی ساڑھے چھ فٹ [illegible] تھا اور وزن شاید ڈھائی سو پونڈ سے زیادہ تھا۔ اس [illegible] توش کے باوجود وہ پھرتیلا تھا اور سخت جان بھی تھا۔ پھر اٹھ کر لپکا اور میری طرف آیا۔ میں نے جھک کر [illegible] اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے گھما کے دیوار پر دے مارا۔ [illegible] کے فرش پر گرتے ہی میں پھر اس کے سر پر [illegible]

میں نے اسے اٹھایا تو وہ شرابی کی طرح جھول [illegible]

میں نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال لیا۔ "تمہارا صرف ایک بازو ٹوٹا ہے۔" میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور نال کو اس کی گردن پر رکھ دیا۔ "اس وقت میں تمہاری گردن بھی توڑ سکتا تھا۔ میں نے تم کو زندہ رہنے کا ایک موقع عطا کیا ہے۔"

وہ بالکل سیدھا کھڑا اپنے سامنے دیکھتا رہا۔ اس کا ٹوٹ جانے والا بازو مضحکہ خیز طریقے پر جھول رہا تھا۔ اسے یقیناً بہت تکلیف ہو رہی ہوگی لیکن وہ درد کو برداشت کر رہا تھا۔ "میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔" وہ بولا۔

"اب میں اس کے بغیر بھی یہاں سے نکل جاؤں [illegible]

میں نے کہا۔ "تمہارے علاوہ جو بھی میری راہ میں حائل [illegible] کی کوشش کرے گا، مارا جائے گا۔ اس ریوالور کی ہر گولی [illegible] ایک آدمی تو یقیناً مرے گا۔ تم پر میں گولی ضائع نہیں [illegible]

"تمہاری مدد کر کے بھی میں مارا جاؤں گا۔" وہ بولا۔

"اور بعد کی موت زیادہ تکلیف دے گی۔ تم انتظار [illegible] توڑ دو۔" اس کی آواز اس کے بھاری بھرکم جسم کے مقابلے میں بہت پتلی تھی۔ کسی حد تک زنانہ۔

"تم کسی کو مدد کے لیے نہیں پکار رہے ہو؟" میں نے [illegible] سے کہا۔

"یہاں سے کوئی آواز باہر تک نہیں پہنچ سکتی۔" وہ بولا اور اس نے سر گھما کے سرچ لائٹ کی طرف مایوسی سے دیکھا۔

"میں سمجھ گیا۔ یہ دو طرفہ نظام اس وقت کام نہیں کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "چلو تم مدد نہ کرو۔ یہ تو بتا دو کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟"

اس نے آہستہ سے انکار میں سر ہلایا۔ "آخر میں کسی طرف سے تو آیا ہی تھا۔"

"باہر نکلنے سے پہلے مجھے کتنے لوگوں سے مقابلہ درپیش ہوگا؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ تین آدمی بھی دیکھے ہیں جن سے [illegible] میرا بس یہی کام تھا۔"

"کیا تم ان کے ساتھی ہو۔ یہ بتا سکتے ہو کہ ان کے [illegible] کیا ہیں؟" میں نے کہا۔

"وہ ایک دوسرے کو نمبروں سے یاد کرتے ہیں۔" وہ بولا۔ "مجھے ایک نمبر نے بلایا تھا اور کہا تھا کہ قید خانے میں ایک بہت خطرناک مجرم ہے۔ اس کو کھانا پہنچانا ہے جب [illegible] میں صرف نمبر ایک کو پہچان سکتا ہوں۔ وہ [illegible] لمبے لمبے کانوں والا۔"

"کیا تم واقعی نہیں جانتے کہ وہ استاد ویڈر ہے؟" میں نے [illegible] لہجے میں کہا۔ "تمہیں اس کے پاس کون لایا تھا؟"

"نمبر ایک نے مجھے چیئرنگ کراس سے اٹھایا تھا۔" وہ بولا۔ "وہاں میں بے روزگار بیٹھا تھا۔ [illegible] اور [illegible] کے ساتھ۔ اس نے پوچھا کہ گاڑی چلا سکتے ہو؟ میں نے [illegible] اس پر وہ بولا کہ گولی چلا سکتے ہو؟ میں نے کہا کہ [illegible] تو وہ بولا تم میرے ساتھ آؤ اور مجھے اپنی گاڑی میں یہاں لے آیا۔"

"تم نے پوچھا نہیں کہ گولی کس پر چلانا ہے؟"

"نہیں۔ کچھ لوگ ایسے چوکیدار بھی رکھتے ہیں جو بندوق [illegible]" وہ بولا۔

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے کہا۔ "کتنے دن ہو گئے تم [illegible]"

"دس دن ہو گئے ہیں۔" وہ بولا۔ "اس نے دس دن کی بات کی تھی۔ اور دس ہزار دیے تھے۔"

"دس دن کے دس ہزار۔ تم نے کسی شک کے بغیر قبول کر لیے؟"

"مجھے پیسے کی بہت ضرورت تھی۔ اور دس ہزار میں تو میرے سارے مسئلے حل ہو جاتے تھے۔" وہ بولا۔ "میں انکار کیسے کرتا؟"

"خواہ وہ تم کو کسی بے گناہ پر گولی چلانے کو کہتا؟"

"اس نے مجھ پر کام کی نوعیت واضح کر دی تھی۔" وہ بولا۔ "اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کے جانا پڑے گا۔"

"تم بہت احمق اور ناتجربہ کار لڑکے ہو۔ تم کو اندازہ نہیں کہ دس ہزار کے لیے تم نے اپنی زندگی ان کے پاس رہن رکھ دی۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہیں زندہ جانے دیں گے؟"

"تو کیا وہ مجھے مار ڈالیں گے؟" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ اب اس دیو زاد سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی نادانی کے باعث ایک ایسی ذمے داری قبول کر بیٹھا تھا جس کی صحیح نوعیت کا خود اسے بھی علم نہ تھا۔ ویڈر بہت چالاک اور بڑا شکاری تھا۔ [illegible] قسمت والے تقصرے باغیچے میں بیٹھنے والے بے روزگاروں کے ہجوم میں سے اس نے بالکل صحیح آدمی کا انتخاب کیا تھا تو میں یہ فرض کر سکتا تھا کہ اس نے اپنے طور پر ضرورت مند کے کوائف پہلے جمع کر لیے ہوں گے اور یہ بھی معلوم کر لیا ہوگا کہ اس کام کو ان میں سے کون سب سے بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ اب مجھے اپنی زیادتی کا احساس ہو رہا تھا جو مجھ سے دانستہ ہوئی تھی مگر ایک غلط فہمی کے باعث۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ لڑکا میرا دشمن نہیں ہے بلکہ جو کچھ وہ کر رہا ہے مجبوری میں کر رہا ہے تو میں اس کو بے بس کر دیتا اور صورت حال واضح ہو جانے کے بعد چھوڑ دیتا۔ اب مجھے یہ مشکل نظر آتا تھا کہ میں اس حال میں اسے بے یار و مددگار چھوڑ جاؤں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کوتاہی پر اسے موت سے کم سزا نہیں ہوگی۔ کوئی بھی اس کا عذر قبول نہیں کرے گا اور رحم کھا کے اسے معاف نہیں کرے گا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہارا بازو ٹوٹا۔ یہ ٹھیک ہو جائے گا بشرطیکہ ہم یہاں سے جان بچا کے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔"

"میرا نام تو ماں باپ نے نزاکت علی رکھا تھا۔" وہ بولا۔

www.paksociety.com

"سب پہاڑ خان کہتے تھے۔"

ایسی خطرناک اور سنگین صورتِ حال میں بھی مجھے ہنسی آ گئی۔ قصور بلکہ والدین بھی نہیں تھے جن کو نام رکھتے وقت قطعی اندازہ نہ ہو گا کہ ان کا نرم و نازک بچہ بڑا ہو کے پہاڑ بن جائے گا اور اس کے ساتھ نزاکت کا تصور ہی مضحکہ خیز محسوس ہو گا۔ قصور وار دنیا والے بھی نہیں تھے جو پہاڑ کو پہاڑ ہی کہہ سکتے تھے۔

"دیکھو پہاڑ خان! جیسے میں تمہاری مدد کے بغیر یہاں سے نہیں نکل سکتا۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "ایسے ہی تم بھی میری مدد کے بغیر شاید لوٹ کے زندہ گھر نہ جا سکو۔ گھر کہاں ہے تمہارا؟"

"گھر؟ ایک تو ہے ماسے کا گھر۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہاں ماسی مجھے چین لینے دیتی۔ تیسری بیوی ہے ماسے کی۔ دوسرا گھر چاچا کا ہے۔ اس کا بس چلے تو مجھے زہر دے کر ختم کر دے۔ ماں باپ اس کے حوالے کر گئے تھے مگر وہ دشمن ہے میرا۔"

"وہ کیوں؟ آخر تم اس کے بھائی کی نشانی ہو۔"

"وہ میرا گھر ہے۔ اس میں سب کچھ میرے ماں باپ کا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ پہلے وہ سب دے جو ہم نے تجھے چیونٹی سے پہاڑ بنانے میں لگایا۔" وہ بولا۔ "جتنا کھلایا، جو پہنایا، جو مصیبت تجھے پالنے اور زندہ رکھنے میں اٹھائی، سب کا معاوضہ دے تو مکان دیں گے۔ میں نے اتنا تو نہیں کھایا جی ان کا۔ دس سال کا تھا تب سے نوکروں میں برتن دھونے پر رکھوا دیا تھا۔ دس سال سے اپنا کما کے کھا رہا ہوں۔ انہیں الٹا اپنی کمائی دیتا رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا، پھر کریں گے یہ باتیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے چاچا سے بھی نمٹ لیں گے۔ اب یہاں دیر کرنے میں خطرہ ہے۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ تم نے کھانا رکھ کر آنے میں اتنی دیر کیوں کی۔"

"ان کو کیا معلوم۔" پہاڑ خان بولا۔

"ان کو سب معلوم رہتا ہے بے وقوف۔ وہ تم پر بھی نگاہ رکھتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ، تم ریوالور چلا لیتے ہو؟"

"ہاں جی۔ کچھ عرصہ میں ایک کرنل صاحب کا چوکیدار رہا تھا۔ انہوں نے سکھایا تھا۔"

"نشانہ کیسا ہے تمہارا؟" میں نے ریوالور نکال کے اسے تھما دیا۔

"آپ خود دیکھ لیں۔ اپنی جیب میں سے چونی نکال کے اچھالیں۔" وہ ریوالور اٹھا کے بولا۔

"نہیں نہیں۔ عملی مظاہرے کا یہ وقت نہیں [illegible]" کہا۔ "بس ضرورت پڑے تو اپنی حفاظت کرنا۔ جو سامنے آ [illegible] راستہ روکے بلا سے شوٹ کر دینا۔ ورنہ وہ تم کو شوٹ کر دیں گے۔"

"کیوں جی؟ میں نے کیا جرم کیا ہے ایسا؟" [illegible] کر بولا۔

"بات جرم کی نہیں۔ اور تمہارا جرم کیا کم ہے کہ [illegible] ساتھ فرار ہو رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے تم سے [illegible] کہا تھا کہ میں کوئی خطرناک مجرم ہوں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

"اچھے شریف آدمی ہو جی۔ میرا بازو توڑ دیا۔" وہ بولا۔ [illegible] مجھے حیرانی ہوئی۔ وہ بازو ٹوٹنے کا یوں ذکر کر رہا تھا جیسے کوئی تکلیف دہ بات نہیں، صرف افسوس کی بات ہے۔ [illegible] کو برداشت کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت کا مظاہرہ کر [illegible] اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بلبلاتا رہتا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں پہاڑ خان۔" میں نے [illegible] مجرم یہ لوگ ہیں۔ یہ مجھے اغوا کر لائے تھے۔ وہ قتل کر دینا چاہتے تھے۔ وجہ بعد میں بتاؤں گا۔ اب نکل چلو، تم آگے رہو۔"

"اور تم خالی ہاتھ چلو گے؟" پہاڑ خان نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"تم تو دیکھ ہی چکے ہو کہ میں خالی ہاتھوں سے [illegible] ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم کس طرف سے آئے تھے؟"

"وہ کمرا الگ ہے۔" پہاڑ خان نے کہا۔ "[illegible] دروازہ مگر اس میں سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں۔"

"کیا وہ بھی ایسا ہی سیاہ خانہ ہے؟" میں نے [illegible]

"نہیں، دیواریں تو اس کی دھوئیں سے کالی [illegible] ہیں کچھ۔" وہ بولا۔ "لیکن اس میں بس ایک کھڑکی ہے [illegible] اوپر اور اس میں بھی سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔"

مجھے پہاڑ خان کی سادہ لوحی اور ذاتی عقل [illegible] سے محرومی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ ایسا شخص تھا جس کا [illegible] عام جوان آدمی کے مقابلے میں قابلِ فخر حد تک بڑھ گیا [illegible] لیکن اس کا دماغ اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا تھا [illegible] ایک ناتجربہ کار لڑکے کا دماغ تھا۔ بہت سے چھوٹے [illegible] بچے بھی اس سے زیادہ ذہین اور چالاک تھے لیکن وہ [illegible] ذہانت سے محروم تھا تو اس میں قدرت کو موردِ الزام [illegible] جا سکتا تھا۔ خدائی کے رموز اور اس کے ہر کام میں [illegible] مصلحت کو خدا ہی جانتا ہے۔

[illegible] پہاڑ کی ذہنی استعداد کی پیمائش کرتے تو اس کا آئی کیو بہت کم بتاتے اور شاید اپنی اصطلاح میں اسے موروں قرار دیتے۔ عام آدمی کی اوسط عقل بھی نہ رکھنے والا۔ ایسے لوگ بہت زیادہ سوچ بچار نہیں کر سکتے۔ قوتِ فیصلہ سے محروم ہوتے ہیں یا تمام عوامل و عواقب کا تجزیہ کیے بغیر فوری فیصلے کرتے ہیں تو ان کے فیصلے غلط ہو جاتے ہیں۔ وہ معمولی سی مشکل میں گھبرا جاتے ہیں اور باریک بات ان کی موٹی عقل میں نہیں آتی تو وہ لوگوں کی تفریح اور تمسخر کا سامان بن جاتے ہیں۔ بچپن سے جوانی تک بے وقوف اور احمق کا خطاب پاتے پاتے وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ ذہنی اعتبار سے اپنے اردگرد بسنے والے لوگوں سے بہت کمتر حیثیت کی مخلوق ہیں۔

پہاڑ خان نے سوچے سمجھے بغیر استاد پیڈرو سے دس ہزار روپے لے لیے تھے۔ شاید اتنی رقم اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہو گی۔ وہ بہت خوش ہوا ہو گا کہ اب اپنے دوستوں اور ہمیشہ ذلیل کرنے والے رشتے داروں کے سامنے وہ بڑے فخر سے اعلان کرے گا اور قسم کھا کے کہہ سکے گا کہ یہ رقم اس نے کہیں سے چرائی نہیں ہے بلکہ اپنی محنت سے کمائی ہے۔ خلافِ توقع اپنی ذات پر پہاڑ خان کا اعتماد بحال ہوا ہو گا کہ وہ بھی بڑے کام کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس کی محدود عقل کے ساتھ اس کا تجربہ بھی محدود تھا۔ اس کے لیے یہ سمجھنا دشوار تھا کہ ایسے کاموں میں کیا خطرات مضمر ہو سکتے ہیں۔ اس نے تو جو کہا وہ کیا اور اس کے نقطۂ نظر سے کوئی بھی غلط کام نہیں کیا۔ کسی خطرناک مجرم کو کھانا پہنچانے میں گناہ یا جرم کی تو بات ہی نہیں تھی کہ وہ "مذبذب" یا شک میں پڑتا۔ کوئی اسے چوری کرنے یا قتل کرنے کو کہتا تو وہ یقیناً بھاگ جاتا۔

مگر جتنی آسانی سے وہ پیڈرو کی باتوں میں آ گیا تھا، اتنی ہی آسانی سے اس کے دماغ نے میری بات کی صداقت کو تسلیم کر لیا۔ وہ ایسا بچہ تھا جسے کوئی بھی ہوشیار آدمی باتوں میں لگائے تو انگلی پکڑ کے جہاں چاہے لے جائے۔ ظاہر ہے کہ اب اس کے ذہن میں پیڈرو کا طلسم ٹوٹ گیا تھا اور اس نے میری بات مان لی تھی کہ خطرناک مجرم میں نہیں، وہ ہیں۔ کسی دلیل کے بغیر، ثبوت مانگے بغیر اور اپنی عقل سے مشورہ کیے بغیر۔ خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔ ایک طرف آج کی دنیا میں وہ ہیں جن کے لیے شاعرِ مشرق نے کہا تھا "اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل، لیکن کبھی [illegible] دے۔" دوسری طرف پہاڑ خان جیسے بھی تھے کہ دل تو رکھتے تھے مگر پاسبانِ عقل نہیں رکھتے تھے۔ یہ جب تک جیتے تھے دوسروں کی عقل انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی کا سوال ہوتا تھا تو ان کی زندگی کو داؤ پر لگا کے قربان کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ اگر قدرت نے یوں ہم دونوں کو نہ ملایا ہوتا تو شکاری کامیاب ہو جاتے مگر مارنے والے ہاتھ سے بچانے والا ہاتھ ہمیشہ زبردست رہا ہے۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے زندگی کی امید بن گئے تھے۔

باہر بھی گھپ اندھیرا تھا لیکن میں نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تو باہر پہنچنے والی مدھم سی روشنی میں مجھے ایک سرنگ نما راستہ نظر آیا۔ راستے کی بلندی آٹھ فٹ اور چوڑائی اس سے نصف تھی۔ یہ راستہ میرے سامنے بیس پچیس گز تک پھیلا ہوا تھا اور اس کے دونوں جانب سپاٹ دیواریں تھیں جن کا رنگ اسی قید خانے کی طرح سیاہ تھا جس میں سے مجھے تین دن کے بعد رہائی نصیب ہوئی تھی لیکن مجھے یوں لگتا تھا کہ میں نے تنہائی اور عذاب کے تین ہفتے موت اور زیست کی کشمکش میں گزار دیے تھے۔ اس سے پہلے سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر مجھے یقین تھا کہ عام آدمی کچھ کھائے پیے بغیر ایک ہفتہ گزار سکتا ہے۔ پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا کہ صرف تین دن میں میری قوتِ برداشت صفر سے بھی کم ہو گئی؟ تین دن میں میرا یہ حال ہو گیا کہ میرا اپنے جسم پر کوئی کنٹرول نہ رہا اور بھوک پیاس سے میں مرنے کے قریب ہو گیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ اس سے پہلے ایسے بہت سے دن آئے تھے جب میں نے [illegible] صبح سے شام تک اور پھر شام سے صبح تک کچھ بھی کھایا پیا نہیں تھا اور مسلسل اپنے دشمنوں سے برسرِپیکار رہتے تھے۔ اس وقت ہمیں بالکل احساس تک نہیں ہوا تھا کہ تھکن یا نیند کی کمی اور بھوک پیاس کا ہمارے جسم کی توانائی پر اتنا برا اثر پڑا ہے کہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ مزید چوبیس گھنٹے اسی طرح گزر گئے تو ہم بستر پر پڑ جانے کے قابل ہو جائیں گے ورنہ اٹھ بھی نہیں سکیں گے اور تیسرے دن اس دارِ فانی سے کوچ فرماتے نظر آئیں گے۔

یقیناً تین دن تک مجھے کوئی ایسی چیز دی گئی تھی جس نے میری ساری توانائی سلب کر لی۔ مجھے کوئی زہر دیا گیا تھا یا کوئی نشہ کہ میں شدید جسمانی اذیت میں بھی مبتلا ہوا اور میرے حواس بھی بحال نہ رہے۔ پھر جب اس کا اثر زائل ہوا اور مجھے مناسب خوراک کے ساتھ آرام ملا تو میری جسمانی

www.paksociety.com

فرت کی بحالی میں وقت نہ لگا۔ اس برآمدے نما کوریڈور کے آخری حصے تک دبے پاؤں چلتے ہوئے میرے ذہن میں یہ سب خیالات آئے اور گزر گئے۔ میں نے چند قدم چلنے کے بعد اپنے پیچھے سے آنے والی روشنی کو سیاہی میں دم توڑتے محسوس کیا۔ باقی راستہ میں نے بہادر خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیچھے پیچھے چلتے ہوئے طے کیا۔ یوں جیسے وہ آنکھوں والا ہے اور میں اندھا ہوں۔ میری نظریں سامنے بھی دیکھ رہی تھیں۔ جہاں یہ سرنگ نما راستہ ختم ہوتا تھا وہاں چھت سے ایک بلب معلق تھا۔ بلب کی روشنی بہت کم تھی اور اس کے اوپر شیڈ تھا جو روشنی کو نیچے ایک مختصر دائرے تک محدود رکھتا تھا۔ دائرے کے تین جانب مجھے تین بند دروازے نظر آرہے تھے۔ ایک بالکل سامنے، دوسرا دائیں جانب اور تیسرا بائیں طرف۔ بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے میرے کان آہٹ پر تھے۔

بہادر خان میرے لیے ایک ڈھال بھی بنا ہوا تھا۔ اگر اچانک کوئی کمرے سے نکل آتا تو ایک سرسری نگاہ میں شاید مجھے دیکھ ہی نہ پاتا اور مجھے بہت قریب پہنچ کر حملہ کرنے کا موقع مل جاتا۔ جب آخری دروازے تک پہنچ کر بھی کچھ نہیں ہوا تو میں نے اطمینان کا سانس لے کر بہادر خان کے کندھے پر تھپکی دی۔ وہ بائیں طرف کا دروازہ کھول کر اندر گیا تو میں بھی بجلی کی پھرتی سے اندر پہنچ گیا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر کوئی دوسرے دروازے سے جھانک کر دیکھ لیتا اور جنگ اچانک چھڑ جاتی۔ اب میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا۔ بہادر خان نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کی ساری دیواریں ہموار تھیں۔ صرف ایک دیوار میں چھت سے ملی ہوئی ایک فٹ چوڑی اور تین فٹ لمبی کھڑکی تھی جسے روشندان کہنا زیادہ مناسب ہوگا مگر اس میں لمبائی کے رخ آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ہر سلاخ آدھ انچ موٹی تھی اور روشندان کے دونوں طرف کی دیواروں میں پیوست تھی۔ ایک فٹ کی چوڑائی میں ایسی تین سلاخیں تھیں چنانچہ اس روشندان سے اسی صورت میں گزرا جا سکتا تھا جب میں اپنے قالب کو بلی کے قالب میں ڈھالنے پر قادر ہوتا۔ جھری جیسی سلاخوں سے نظر آنے والے روشن آسمان کی جھلک نے مجھے بڑا حوصلہ دیا۔ "ذرا آہستہ بات کرنا۔" میں نے بہادر خان سے کہا۔ "کیا وہ لوگ ہر وقت موجود رہتے ہیں؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" بہادر خان بولا۔ "مجھے اس کمرے سے نکل کر سامنے والے کمرے میں جانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔"

"کیا یہ تیسرا دروازہ باہر جانے کے لیے ہے؟" میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"ہاں مگر اس میں اوپر سے نیچے تک تین تالے لگے ہیں۔" بہادر خان بولا۔ "ہر ایک کی چابی الگ ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے حیرانی سے کہا کیونکہ مجھے بہادر خان کی قوت مشاہدہ پر بالکل اعتبار نہیں تھا۔

"میں نے انہیں ایک بار باہر جاتے دیکھا تھا۔" وہ بولا۔ "پہلے ایک شخص نے ایک چابی لگا کے گھمائی پھر دوسرے نے۔ آخر میں نمبر وان نے تیسری چابی لگائی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ دروازہ کھولنے کے لیے کئی سے نمٹنا پڑے گا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "دروازہ توڑنے کا تو سوال ہی نہیں۔"

"اگر تم نے میرا ہاتھ نہ توڑا ہوتا تو میں یہ سلاخیں اکھاڑ دیتا۔" وہ بولا۔

"یہ ٹوٹنے والی سلاخیں نہیں ہیں۔ تم ان کو ہرگز نہ دیوار سے نکال سکتے تھے۔" میں نے کہا۔ "کیا تمہارے ہاتھ میں تکلیف محسوس ہو رہی ہے؟"

"ہاں۔ پہلے تو زیادہ درد نہیں تھا۔ اب ہو رہا ہے۔" وہ دردناک شکل بنا کے بولا۔

"اچھا فکر مت کرو۔ ابھی باہر نکلنے کی کوئی تدبیر کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پھر تمہارا بازو بھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس مختصر کمرے میں جو آٹھ فٹ لمبا چوڑا تھا اور باورچی خانے کے طور پر استعمال ہو رہا تھا چند برتن تھے اور ایک مٹی کے تیل کا چولھا۔ ایک طرف زمین پر وہ بستر بچھا ہوا تھا جس پر بہادر خان سوتا ہوگا۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس کمرے میں چوبیس گھنٹے قید تنہائی کے کیسے دن بہادر خان کیسے گزارتا ہوگا۔ ایک دو بار اندر جا کے مجھے کھانا دے آتا تھا۔ کھانا تیار کرنے میں اس کا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا صرف ہوتا ہوگا۔ باقی تئیس گھنٹے وہ کیا کرتا ہوگا۔

"بہادر خان! یہاں تمہارے لیے کوئی باتھ روم نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک کرسی نما چیز رکھی تھی۔ "میں یہی استعمال کرتا تھا۔ پانی کی بالٹی بھری ہوئی تھی جو اب خالی ہو گئی ہے۔"

"اچھا۔" میں نے غسل کی خواہش کرنا بھی غلط تھا مگر میں منہ پر چند چھینٹے ضرور مارنا چاہتا تھا۔ اب اس کو بھی میں نے التوا میں رکھا اور فرض کر لیا کہ میں حالت جنگ میں ہوں۔ دشمن کے علاقے میں کسی مورچے پر ڈٹے ہوئے یا خندق میں بیٹھے ہوئے سپاہی کے لیے اپنی مرضی کے یا ضرورت کے مطابق کھانے پینے یا نہانے دھونے کا کیا سوال۔ وہی اس کا بیڈ روم، وہی اس کا ڈائننگ روم اور وہی باتھ روم۔ اور وقت آ جائے تو وہی بے نشان مدفن۔

"کیا وہ خود تمہیں کھانے پکانے کا سامان لا کر دیتے تھے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ جو کہتے تھے میں ویسا ہی کرتا جاتا تھا۔" بہادر خان بولا اور مجھے حیرت ہوئی کہ اتنے معمولی سے کام کے لیے انہوں نے دس ہزار خرچ کیے اور ایک آدمی کی زندگی خرید لی۔ اتنے بڑے بڑے کام کرنے والے بہادر خان کی مدد کے محتاج تو نہ تھے مگر بات وہی تھی کہ تقدیر دھوکا دیتی ہے تو شامت کا مارا گیدڑ شہر کا رخ کرتا ہے اور بہت سیانا مجرم ذرا سی حماقت کرتا ہے تو کامیابی کی پوری عمارت کو اپنے ہاتھوں گرا دیتا ہے۔ اگرچہ ابھی میرے لیے بھی کامیابی کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا مگر حالات جس حد تک پہلے سے مختلف تھے اب اتنے ہی کافی محسوس ہوتے تھے۔

"ہمیں یہاں سے زندہ بچ کے نکلنے کے لیے کوشش کرنا ہی پڑے گی بہادر خان۔" میں نے کہا۔ "اور کسی ایک کی کوشش سے کام نہیں بنے گا۔ شاید اسی لیے تمہارا اور میرا ساتھ ہو گیا۔ اب جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔"

"میں وہی کروں گا جو تم کہو گے۔" بہادر خان نے اپنی زبان سے یہ بات دہرا کے گویا عہد وفاداری کیا۔

"معلوم نہیں اس وقت اندر کون کون ہے۔" میں نے کہا۔ "ان سب سے ایک ساتھ مقابلہ کیا تو ہم مارے جائیں گے۔ تم انہیں ایک ایک کر کے بلاؤ۔"

"اچھا۔ میں پہلے ایک کو بلاتا ہوں۔" بہادر خان دروازے کی طرف بڑھا۔

"یوں نہیں۔" میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا۔ "تم یہاں کوئی برتن زمین پر مارو جس سے شور ہو۔ بلکہ پانی کا لوٹا اس کو اٹھا کے پھینکو۔ ذرا دروازے سے دور ہو۔ دوسری طرف میں کھڑا ہو کے انتظار کرتا ہوں۔"

بہادر خان نے ایسا ہی کیا۔ اس نے ٹین کی بالٹی کو ہینڈل سے پکڑ کر زمین پر مارنا شروع کیا۔ اس سے خاصی بے ہودہ اور کرخت آواز پیدا ہوئی اور بے اختیار میرا ذہن اس رات کی طرف چلا گیا جب ایسی ہی ایک بالٹی تھی جو میرے سر پر الٹا کے بجایا گیا تھا۔ میرا سر گردن تک بالٹی میں تھا اور بالٹی کو لوہے کی سلاخ سے کوٹنے کا اعصاب شکن شور میرے کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا اور پھر میرے دماغ میں ایسا گونجنے لگا تھا کہ مجھے یہ شور اپنے وجود کو آری کی طرح ہر جگہ سے کاٹتا ہوا، کنکریٹ مکسر کی طرح گھماتا ہوا اور روڈ رولر کی طرح پیستا ہوا محسوس ہوتا تھا اور اس شور نے میرے ذہن کو اس طرح مفلوج و ماؤف کیا تھا کہ میری ساری مزاحمت ختم ہو گئی تھی۔ میں وقتی طور پر دیوانہ ہو گیا تھا۔

دروازہ کھلا تو میں ایک دم چونکا اور یاد ماضی کے عذاب سے نکل کر حقیقت حال سے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اندر آنے والے نے چیخ کر کہا اور اس کی نگاہ بہادر خان پر گئی۔ میں ایک دم حرکت میں آ گیا اور میں نے کھڑی ہتھیلی سے اس کے کان کے قریب وار کیا۔ میں بہت محتاط تھا اور اوچھے وار سے اس کے بچ جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی اور وہ لڑکھڑا کے گرا تو پھر اٹھ نہ سکا۔

"شاباش۔ بالکل اسی طرح نمٹا جا سکتا ہے ان بدمعاشوں سے۔" میں نے خوشی میں ہاتھ ملتے آہستہ سے کہا اور اس اجنبی شخص کو گھسیٹ کر دروازے سے دور اپنے پیچھے والے کونے میں ڈال دیا۔

"اب تم ایک چیخ مارو گے۔" میں نے کہا۔ "آواز کو بدل کے۔"

"میری آواز بدل سکتی ہے؟" حیرت سے بہادر خان کا منہ کھلا رہ گیا۔

"اچھا تم خاموش ہی رہو عقلمند۔" میں نے کہا اور حلق سے ایک کرخت آواز بلند کی۔

"دیکھو۔ اب ہو سکتا ہے کہ ایک کی جگہ دو آ جائیں۔" میں نے کہا۔ "ایک سے تم نمٹ لینا۔ سر پر ریوالور مارنا۔"

"کون ہے..... کیا ہو رہا ہے یہ؟" بیک وقت دو افراد نے چلا کر کہا اور تقریباً ایک ساتھ دوڑتے ہوئے اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے دیکھا اور اس کے ہاتھ کا ریوالور ایک دم اٹھا۔ میں ایک دم جھک گیا اور گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزری تو میرے دونوں کان سن ہو گئے۔ میں

www.paksociety.com

نے اسے دوسرے فائر کا موقع نہیں دیا اور اس کی ٹانگوں میں گھس گیا۔ میرے ہاتھوں نے اسے پیچھے پھینک دیا پھر میں بڑی پھرتی سے پلٹا اور دائیں پیر سے اس کے ہاتھ پر کک ماری۔ وہ بلبلایا۔ ایسی شدید ضرب کے بعد اس کی کلائی کی ہڈی سلامت رہنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ میں نے اسے دوسرا ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا۔ وہ اوپر اٹھا اور اپنے زور میں دوڑتا ہوا گیا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ دیوار بہت قریب ہے اور وہ خود کو روک بھی نہیں سکتا۔ میں نے اس کے دہاڑنے کی آواز پہلے سنی، اس کے دیوار سے ٹکرانے کی بعد میں۔ جب وہ پیچھے گر کر ساکت ہوا تو عجیب مزاحیہ انداز میں پڑا تھا۔ اس کا سر سجدے میں تھا، پچھلا دھڑ اوپر اٹھا ہوا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اس نے کانوں کو ڈھک لیا تھا۔ ایک زمانے میں سول ڈیفنس کی ٹریننگ میں مجھے بتایا گیا تھا کہ بمباری ہو رہی ہو تو میں اسی طرح کی حفاظتی تدبیر کروں اور اسی طرح زمین پر پڑا رہوں۔

دوسرے دشمن کو ٹھکانے لگاتے ہوئے میرا دھیان پہاڑ خان کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔ اب میں نے دیکھا تو وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ میری لڑائی کو دیکھ رہا تھا۔ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے دوسرے آدمی کو ریوالور کا دستہ مار کے ناک آؤٹ کر دیا تھا اور وہ آدمی بالکل چت پڑا ہوا تھا۔ اگر ان دونوں کے علاوہ بھی وہاں کوئی ہوتا تو اتنی دیر میں ضرور پہنچتا۔ اب میں نے ان تینوں کی شکل کو غور سے دیکھنے کے لیے انہیں ایک قطار میں لٹا دیا۔ وہ چہرے بالکل نئے تھے لیکن تیسرا وہ تھا جسے میں نے کالے ناچی کی خانقاہ کے دروازے پر کھڑا دیکھا تھا۔ میں نے ان کی جیبوں کو ٹٹولا۔ ان دونوں کی جیب میں سے ایک ایک چابی برآمد ہوئی جو میرے مقابلے پر آئے تھے۔ ان میں نمبر ون یعنی استاد پیڈرو شامل نہیں تھا چنانچہ تیسری چابی مجھے نہ مل سکی۔ میں اپنے گندے کپڑوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے ایک کی قمیص اور دوسرے کی پتلون پہنی۔ دو ریوالور پتلون کی دونوں جیبوں میں رکھے اور تیسرا ہاتھ میں رکھا۔ ان کی جیبوں میں سے مجموعی طور پر دو ہزار سات سو کی رقم برآمد ہوئی جو میں نے قمیص کی جیب میں رکھی۔ پھر میں نے پہاڑ خان کو اشارہ کیا۔

"اب یہاں سے باہر جانے میں کوئی رکاوٹ تو نظر نہیں آتی؟" میں نے کہا۔ "لیکن ہو سکتا ہے کہ تیسری چابی کے بغیر دروازہ نہ کھلے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی اور چالاک شخص ابھی چھپا ہوا ہو۔ اب تم ایسا کرو کہ چلاتے ہوئے دوسرے کمرے میں جاؤ۔ اپنا ٹوٹا ہوا بازو سہارا دے رکھنا۔ 'ہائے مر گیا' کا شور مچا دینا۔"

"وہ مجھے ماریں گے تو نہیں جی؟" وہ بولا۔

"نہیں۔ وہ سمجھیں گے تم کو میں نے مارا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "کوئی ہو تو تم چیخ کہنا۔ وہ باہر ضرور آئے گا۔ میں اسے سنبھال لوں گا۔ باہر نہ آیا تب بھی دروازہ کھولے گا۔ میں اسے ہینڈز اپ کرا لوں گا۔"

پہاڑ خان نے ایسا ہی کیا۔ اس نے دروازہ بجاتے ہوئے "ہائے مر گیا" کا شور مچایا۔

میں ابھی پہلے کمرے سے نکلا ہی نہیں تھا کہ دروازہ کھلا اور پیڈرو باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور وہ نشانہ لیے تیار کھڑا تھا اور میری ذرا سی احتیاط اور مستعدی پہاڑ خان کے لیے زندگی کا بہانہ بن گئی۔ جب پیڈرو نے ریوالور اٹھایا تو میں سمجھ گیا کہ اب کیا ہوگا۔ پیڈرو نے پہاڑ خان کو اس کی بے وقوفی اور نااہلی کی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ غالباً اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ میں قید سے نکل گیا ہوں اور شاید اس نے اپنے ساتھیوں کے واپس نہ آنے کا سبب بھی دریافت کر لیا تھا۔ مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ جب میں اپنے قید خانے سے نکلا تھا تو میں نے روشنی کے لیے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ پیڈرو نے دور سے اس کھلے دروازے کو دیکھا ہوگا۔ تاریکی میں روشنی کی مستطیل نظر آ رہا تھا اور سب سمجھ گیا ہوگا کہ خود اس سے بھی ایک غلطی سرزد ہوئی تھی جب اس نے میرے محافظوں میں پہاڑ خان جیسے بے عقل آدمی کو شامل کیا تھا۔ اس کی نظر میں سکندر بخت ایک بہت چالاک اور خطرناک شکاری تھا جسے شکار کرنے کے بعد اسیر رکھنے کے لیے حفاظتی انتظامات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔ بس نادانستگی میں اس نے پہاڑ خان کا انتخاب کر لیا جو حقیقت میں واقعی پہاڑ تھا مگر عقل کے اعتبار سے ان کے حفاظتی حصار کا سب سے کمزور حصہ تھا۔ میں اسی کمزور حصے ہی سے راستہ بنا کے نکلا تھا۔ پہاڑ خان کو ویسے بھی مرنا ہی تھا۔ اب اس کا بے وقوف ثابت ہونا ناقابل معافی جرم بن گیا۔

پیڈرو نے ریوالور اٹھایا ہی تھا کہ میں نے اس کی نیت کو بھانپ لیا۔ اس کا ارادہ اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا جب آدمی کسی دوسرے آدمی کی جان لینے کا تہیہ کرتا ہے۔ میری چھٹی حس نے مجھے پہلے سے خبردار کر دیا تھا۔ مگر استاد پیڈرو کے ریوالور اٹھانے ہی میں نے فائر کر دیا اور جب میرا نشانہ خطا نہیں ہوا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے ایک زندگی کو بچانے کا وسیلہ بنایا۔ ریوالور پیڈرو کے ہاتھ سے دور جا گرا اور اس کے ہاتھ کی پشت سے خون ٹپکنے لگا۔ اس نے ایک چیخ نکالی اور ایک دم واپس پلٹا۔

"ٹھہر جاؤ پیڈرو!" میں نے چیخ کر کہا اور گولی چلا دی مگر وہ بڑی تیزی سے پلٹ کر پھر کمرے میں گھس گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے افسوس ہوا کہ ہاتھ کا نشانہ لینے کے بجائے میں نے اس شیطان کی کھوپڑی کیوں نہ اڑا دی۔ میں اسے زندہ گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور اسی لاشعوری خواہش نے پیڈرو کو نکل جانے کی مہلت دے دی۔ میں سمجھتا تھا کہ پیڈرو بلاوجہ استاد نہیں کہلاتا۔ اس کے ہاتھ سے ایک ریوالور نکل گیا تھا لیکن اس بنیاد پر اسے خالی ہاتھ سمجھ لینا بے وقوفی ہوتا۔ کمرے کے اندر اس کے پاس سب کچھ ہو سکتا تھا۔ ریوالور سے مشین گن تک۔

"دروازہ توڑ دو پہاڑ خان!" میں نے باہر آتے ہی چیخ کر کہا۔ "میں اور تم مل کے زور لگاتے ہیں۔"

پہاڑ خان کا ایک ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا لیکن وہ حیرت انگیز جسمانی قوت برداشت اور طاقت کا مالک تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے دوسرے بازو کے شانے سے دروازے کو ٹکر ماری۔ میں نے اس کا ساتھ دیا۔ دروازہ جھٹکے سے ہلا مگر نہ ٹوٹا اور نہ کھلا۔

"میرے ہاتھ میں مشین گن ہے سکندر بخت!" اندر سے پیڈرو نے چلا کر کہا۔ "میں تم کو چھلنی کر دوں گا۔"

ذرا سی دیر کے لیے میں رک گیا پھر عقل نے مجھے سمجھایا۔ یہ دھوکا ہے سکندر بخت۔ اگر پیڈرو کے پاس مشین گن ہوتی تو اب تک وہ ایک برسٹ مار چکا ہوتا اور مشین گن کی گولیاں دروازے میں سوراخ کرتی ہوئی تمہارے جسم کے پرخچے اڑا چکی ہوتیں۔ وہ تمہارا لحاظ بھی نہ کرتا۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب کہ وہ خود محصور ہو اور اپنی زندگی کے لیے تم کو خطرہ سمجھتا ہو۔

"دھمکی مت دو مجھے پیڈرو!" میں نے چیخ کر جواب دیا۔ "آج یا تم نہیں یا میں نہیں۔"

میں نے پھر پہاڑ خان کو اشارہ کیا اور اس نے میرے ساتھ زیادہ قوت صرف کرتے ہوئے دوسری ٹکر ماری۔ دروازہ ایک دم پورا کھل گیا۔ اس کے اوپر نیچے کی چٹخنی نکل گئی تھی۔ پہاڑ خان اندر جا گرا۔ قدرت کو اسے بچانا منظور تھا۔ پیڈرو کے ریوالور کی گولی اس کے اوپر سے نکل گئی اور دیوار میں پیوست ہو گئی۔ پیڈرو کو میں نے اپنے بالکل سامنے دیکھا۔ وہ دوسرا ریوالور لیے بقا کی جنگ میں اپنے محاذ پر ڈٹا ہوا تھا اور ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ تھا۔ یکلخت مجھے وہ وقت یاد آیا جب میں نے پیڈرو کو پاکستان میں وارد ہونے کے بعد ائرپورٹ پر ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ سلامت علی کے گھر لے گیا تھا۔ پھر وہ اس وقت نظر آیا تھا جب میں شرافت علی کے گھر سے نکل رہا تھا۔ مجھے قتل کے جھوٹے جرم میں ملوث کرنے والا یہی شخص تھا جس نے میر شرافت علی کا خون کیا تھا اور میں یہ بھی یقین رکھتا تھا کہ اسی نے سلامت علی کو بھی مارا تھا۔ بعد میں مارے جانے والے بے گناہ شخص کے لہو کے داغ اس کے دامن پر صاف نظر آتے تھے۔ یہ انتقام کا اندھا جذبہ تھا یا ایک ایسے دشمن کو ختم کرنے کی خواہش جو میرے محسن اور رابعہ کے تمام مصائب کا ذمے دار تھا اور جس کے لیے موت سے کم کوئی سزا کافی نہ تھی کہ میں نے اندھا دھند فائر کیے اور دیوانہ وار پیڈرو پر جا پڑا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس نے جواب میں کتنی گولیاں چلائیں۔ جب میں نے اسے زمین پر پڑا ہوا اور خود کو اس کے اوپر سوار دیکھا تو مجھے یقین آیا کہ میں زندہ ہوں اور پیڈرو زخمی ہے۔ اپنی موت کو سامنے دیکھ کر اس کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ اس نے میری فائرنگ سے بچنے اور بھاگ نکلنے کی کوشش کی تھی اور اسی بدحواسی میں گولی چلائی تھی لیکن وہ نشانہ نہ لے سکا تھا۔ مجھ پر خون سوار تھا۔ میں نے پیڈرو کی گردن کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔

"تیرا وقت آ گیا پیڈرو!" میں نے وحشت زدہ آواز میں کہا جو اس حد تک بدلی ہوئی تھی کہ میرے کانوں کو بھی اپنی آواز نہیں لگی۔ "میں تجھے چند سیکنڈ دوں گا کہ خدا سے ہر گناہ کی اور ہر جرم کی معافی مانگ لے۔" میں نے اس کے منہ پر تابڑ توڑ تھپڑ مارے۔ "بول اپنے منہ سے۔ خدا کے سامنے اقرار کر کہ تو نے میر شرافت علی کو مارا [illegible]

www.paksociety.com

مارا، اس کی بیوی کو مارا، بیٹے کو مارا، سلامت علی کو مارا، غلام علی کو مارا۔" ہر بار میں اس کی گردن کو دبا کے اس کا سر اٹھاتا تھا اور فرش پر دے مارتا تھا۔

"اس کو گولی لگ گئی ہے۔" پہاڑ خان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "چھوڑ دے کیوں مار رہے ہو؟"

ایک دم مجھے ہوش آ گیا۔ ایک بے عقل نے مجھے عقل کی لگام ہاتھ میں تھما دی تھی۔ اگر وہ مجھے نہ روکتا تو پیڈرو وہیں میرے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔ میں نے سر سے دیوانگی کو جھٹکا اور کھڑا ہو گیا۔ گولی پیڈرو کی ٹانگ میں لگی تھی اور اب وہ بے ہوش پڑا تھا۔ پشیمانی کے ردعمل نے مجھے مغلوب کر دیا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ کہیں پیڈرو کے سر میں اندرونی چوٹ ایسی نہ آئی ہو کہ وہ ہوش میں ہی نہ آئے اور مر جائے۔ پیڈرو جیسے دشمن کا ہاتھ میں آنا تو دشمن کے سب سے مضبوط قلعے کی تسخیر سے بڑا کارنامہ تھا۔ مجھے اب جوش سے نہیں ہوش سے کام لیتے ہوئے پیڈرو کو زندہ رکھنا تھا۔ وہی ایک شخص تھا جو اول تا آخر ہر راز سے پردہ اٹھا سکتا تھا اور وہ سب کچھ بتا سکتا تھا جو میں جاننا چاہتا تھا۔ اس کی فرد جرم بہت طویل تھی اور اگر ہم کسی طرح اس سے اعتراف جرم کرانے میں کامیاب رہتے تو خود کو بہت سے الزامات سے بچا سکتے تھے اور قانون کے سامنے اصل مجرم کو پیش کر کے یہ ثابت کر سکتے تھے کہ ہم کس حد تک بے گناہ ہیں۔

اچانک میں نے اپنے پیچھے آہٹ سی سنی اور میں تیزی سے پلٹا۔ پیچھے گرتے گرتے میں نے گولی چلائی اور وہ شخص جو ہوش میں آنے کے بعد اٹھ کر خاموشی سے اندر آ گیا تھا چکر کھا کے نیچے گرا۔ اس نے پہاڑ خان کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریوالور چھیننے کی کوشش کی تھی اور کسی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہا تھا لیکن وہ گولی نہ چلا سکا۔ میری گولی اس کی گردن میں لگی تھی اور جب اس نے گولی چلائی تھی تو خود اسے علم نہیں تھا کہ اس کا نشانہ کون بنا۔ میں یا کوئی دیوار یا چھت۔

وہ حلق سے بڑی کربناک آوازیں نکال رہا تھا اور فرش پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ اس کی گردن سے پھوٹنے والا خون کا فوارہ دیکھ کر پہاڑ خان کا رنگ لاش سے زیادہ سفید ہو رہا تھا۔ اچانک وہ لڑکھڑایا اور نیچے گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اس نادان لڑکے نے جسمانی طاقت کا مظاہرہ تو پہلے بھی دیکھا ہوگا اور خود بھی اس میں شریک رہا ہوگا۔ اپنے دعوے کے مطابق ایک کرنل نے اسے گولی چلانا بھی سکھایا تھا مگر کسی جیتے جاگتے آدمی کا خون بہتے اس نے کم دیکھا ہوگا۔ یہ نفسیاتی کمزوری بہت عام ہے اور [illegible] لوگ جو بہت بہادر، نڈر اور جرأت مند ہوتے ہیں [illegible] کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ذہن یا جسم کا ردعمل ہوتا ہے جسے وہ روکنا بھی چاہیں تو نہیں روک سکتے۔ ایک ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ [illegible] ہوتا ہے۔ یہ اسی قسم کی کیفیت تھی۔

میں نے پہاڑ خان کو وہیں چھوڑا اور دوسرے کمرے میں آیا تا کہ باقی دو افراد کو ہوش میں آنے سے پہلے ہی باندھ کر ڈال دوں۔ انہیں باندھنے کے لیے میں نے انہی کے کپڑے پھاڑے اور دونوں کے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ دیے۔ پیروں کو ٹخنے کے قریب سے باندھ کر بعد میں نے ان کو یکجا کیا۔ اس طرح کمان کی طرح [illegible] گئی لیکن منہ مخالف سمتوں میں رہے اور دونوں کا ایک بنڈل بنا دیا۔ اس میں ان کے تقریباً تمام [illegible] استعمال ہو گئے جن میں میرے پرانے کپڑے بھی شامل [illegible]

اب دیر کرنا خطرہ مول لینے کے مترادف تھا۔ [illegible] دوسرے کمرے میں گیا۔ ابھی تک مجھے [illegible] غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اطمینان سے دیکھنے پر ایک ٹیبل پر تین چیزیں نمایاں نظر آئیں۔ ایک [illegible] دوسرا ٹیپ ریکارڈر اور تیسرا ویسا ہی واکی ٹاکی جیسا [illegible] گاسٹے ماچی کے اڈے سے ملا تھا یا وہاں کسی خاص مقصد کے تحت ہمارے حوالے کیا گیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ سیٹ ایک ہی فریکوئنسی پر ٹیون کیے ہوئے ہوں۔ اس چیز کو صرف باہر سے اسمگل کر کے لایا جا سکتا تھا۔ [illegible] یہ انتہائی کارآمد چیز تھی۔ بظاہر یہ شارٹ ویو [illegible] تھا جس سے طویل فاصلوں تک پیغام رسانی ممکن [illegible] رہتے اور ایک دوسرے سے الگ رہتے ہوئے بھی [illegible] رابطہ قائم رکھنے کی اس سے بہتر صورت کوئی نہیں [illegible] ٹیپ ریکارڈر میں یقیناً وہ سب گفتگو محفوظ ہوئی ہوگی [illegible] سے پوچھ گچھ کے نام پر کی گئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ [illegible] سچ دشمنوں تک پہنچ جائے چنانچہ میں نے صرف [illegible] اٹھایا اور باقی چیزوں کو چھیڑنے سے گریز کیا۔ ایک [illegible] کے ساتھ اسٹول سے ذرا بڑا ایک چپٹا سا باکس [illegible] تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اندر سب ساز و سامان [illegible] کو کنٹرول کرنے والا سوئچ بورڈ دکھائی دیا۔ اس [illegible] درجن کے قریب پش بٹن، گھومنے والی ناب اور [illegible] میٹر تھے۔ اسی سے وہ [illegible] کنٹرول ہوتی [illegible]

[illegible] بحران تھی۔ کبھی مجھے بصارت عطا کر دیتی تھی، کبھی [illegible] صرف میرا مقصد بنا دیتی تھی اور کبھی میری حالت کا [illegible] کی تصویر [illegible] کے آگے ارسال کرتی تھی۔ میں نے ریوالور [illegible] پے در پے اس پر فائر کیے۔ اس میں سے [illegible] چنگاریاں اڑیں، دھواں اٹھا اور دھماکے سنائی دیے۔ [illegible] قرار محسوس کیا جو شاید میں پیڈرو کے سینے [illegible] کر کے محسوس کرتا، اگر مصلحت کے تقاضوں نے [illegible] روک نہ لیا ہوتا۔ انسانوں کے ساتھ یہ آلات بھی [illegible] دشمن تھے اور اس مشین سے میں نے تین دن کی [illegible] اذیت کا بدلہ لے لیا۔ پھر میں نے دوسرا خالی ہو جانے [illegible] ریوالور بھی پھینک دیا۔

اب مجھے کئی مسائل درپیش تھے۔ سب سے پہلے مجھے پہاڑ خان کو ہوش میں لانا تھا۔ اس کو پہاڑ خان کہتے مجھے اچھا نہیں لگتا تھا لیکن اسے نزاکت علی کہنا اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز بات ہوتی۔ ایک جگ میں مجھے تھوڑا سا پانی ملا۔ میں نے پہاڑ خان کے منہ پر چھینٹے مارے اور ایک چمچے کی مدد سے کچھ پانی اس کے حلق میں اتارنے میں کامیاب رہا۔ وہ ہوش میں آنے لگا تو میں نے اس کے گال تھپکے۔ "پہاڑ خان... شاباش اٹھو... ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ ہمت سے کام لو۔ ایسا نہ ہو کہ پھر اور لوگ آ جائیں۔" میں نے اس کے کانوں میں کہا۔

"اور کون آ سکتا ہے؟" وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔

"کیا معلوم ان کے کتنے ساتھی تھے اور اس وقت وہ کہاں ہیں۔" میں نے کہا۔

پہاڑ خان کے اتنی جلد ہوش میں آ جانے سے مجھے خوشی ہوئی۔ اگر مجھے اس پہاڑ کو اٹھا کر لے جانا پڑتا تو یہ کام ناممکن ہو جاتا۔ ابھی میں سو فیصد فٹ نہیں تھا۔ اس کے بازو [illegible] کافی دیر ہو چکی تھی اور میں چاہتا تھا کہ جتنی جلد [illegible] ہاتھ پیر بلا سر چڑھ جائیں اور آتے وقت کو کم کرنے والی [illegible] اتنا ہی اچھا ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب ہم جلد از جلد اس جگہ سے نکل جائیں۔ معلوم نہیں ہم [illegible] میں تھے اور کسی سڑک سے کتنی دور تھے۔ [illegible] اٹھا کے لے جانا تھا اور اپنی موجودہ حالت میں [illegible] اٹھا کے بہت زیادہ فاصلہ طے کرنا محال لگتا تھا [illegible] بنانا پڑتا تب بھی مجھے خدا پر بھروسا کرتے [illegible] ضرور کرنا تھا۔

[illegible] کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور [illegible] ہاتھ [illegible] ایک تالا جو مضبوط اور موٹے [illegible] میں [illegible] اس کے [illegible] میں تھا۔ دوسرا وسط میں اور تیسرا بالکل نیچے۔ ان کے صرف سوراخ باہر نظر آتے تھے اور جس ترتیب سے تالے لگائے گئے تھے اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا کہ دیواروں کا حصہ بن جانے والے دروازے کو اتنی آسانی سے نہیں توڑا جا سکتا تھا جتنی آسانی سے ہم نے اندر والے دروازے کو کھول لیا تھا۔ اس کی توجیہ جو بھی معلوم ہوتی تھی لیکن یہ تالے بہت مضبوط تھے۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے تیسرے ریوالور کو بالکل تیار رکھا کہ باہر بھی کسی پہرے دار کا سامنا ہو تو اس سے نمٹا جا سکے لیکن انھیں اپنے حفاظتی انتظامات کے ہر طرح سے مکمل ہونے پہ اتنا اعتماد تھا کہ باہر کسی چوکیدار کی موجودگی کی ضرورت کو انھوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

مجھے اپنے مقابل کچھ سیڑھیاں نظر آئیں۔ میں شوق و اضطراب میں دوڑتا ہوا اوپر گیا۔ زینے پر آخری قدم رکھتے ہی میں نے خود کو ایک کھنڈر میں دیکھا۔ یہ کوئی پرانا مکان تھا۔ پتھروں سے بنے ہوئے بیرونی احاطے کی دیوار مجھ سے سو گز دور تھی اور مکان یا قدیم حویلی کے چاروں طرف اس کا فاصلہ اتنا ہی تھا۔ ہو سکتا ہے کسی زمانے میں یہ باغ رہا ہو مگر اب ایک جنگل تھا۔ کیکر کے خودرو کانٹے دار درخت تیزی سے پھیلے تھے اور بیشتر بے ترتیب تھے۔ کہیں کہیں ان سے اونچا نکل جانے والے شیشم اور پیپل کے درخت بھی تھے۔ نیچے لمبی تیز دھار کے پتوں والی خشک اور زرد گھاس پھیلی ہوئی تھی جس میں سانپ، گرگٹ اور دوسرے رینگنے والے جانوروں کی بھرمار ہوتی تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔

باقی مکان کی دیواریں بھی باہر سے پرانے پتھروں کو جوڑ کر اٹھائی گئی تھیں۔ مختلف کمروں کے درمیان اگر دروازے تھے تو وہ نکال کر لے گئے تھے چنانچہ سب کمرے مل کر ایک ہو گئے تھے۔ چھت صرف ایک کمرے پر باقی رہ گئی تھی مگر اس کے شہتیر اور کڑیاں بھی لٹکے جھکے تھے کہ وہاں بیٹھ کر محسوس ہوتا تھا اور لگتا تھا کہ چھت ابھی سر پر آ پڑے گی۔ باقی کمروں میں چھت کا ملبہ کمروں کی دیواروں میں ڈھیر تھا۔ پچھلی طرف جا کر دیکھنے سے مجھے باہر جانے کا راستہ نظر آیا۔ کم سے کم بیس فٹ چوڑے اور کنکروں والے راستے پر بھی جگہ جگہ گھاس اگ آئی تھی جسے حال ہی میں گاڑیوں نے روندا تھا۔ یہ پھیلی ہوئی گھاس مجروح تھی مگر پھر بھی سر اٹھا رہی تھی۔

میں بیرونی فصیل کے گیٹ تک گیا اور چاروں طرف پھیلی ہوئی ویرانی کو مایوسی سے دیکھا۔ میری نظر کسی آبادی کے آثار تلاش نہ کر سکی۔ ہر سمت ویسا ہی بیابان تھا جیسا فصیل کے اندر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے فصیل کی دیوار پر چڑھ کے دیکھا تو دو فرلانگ کے فاصلے پہ مجھے سڑک نظر آ گئی۔ میرا حوصلہ ایک دم

www.paksociety.com

بلند ہو گیا۔ میں فوراً واپس ہوا۔

"پیارا خان! ہمیں دو فرلانگ تک جنگل سے گزر کے سڑک تک پہنچنا ہے۔" میں نے کہا۔ "امید ہے وہاں کوئی نہ کوئی سواری ضرور ملے گی اور معلوم ہو جائے گا کہ ہم لاہور سے کتنی دور ہیں۔"

"میں دو فرلانگ تک پیدل جا سکتا ہوں۔" اس نے فخر سے یوں کہا جیسے یہ کام اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔

"تمہارے بازو میں یقیناً بہت تکلیف ہوگی۔" میں نے کہا۔ "تم دوسرے ہاتھ میں ریوالور رکھنا۔ میں اس شخص کو اپنے کندھوں پہ ڈال لیتا ہوں۔"

"وہ اور بھی تو ہیں۔" اس نے مجھے یاد دلایا۔

"ان کو ساتھ نہیں لے جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "صرف استاد پیڈرو کو اٹھانا ہے۔"

"اس کا نام تمہیں کیسے معلوم؟ یہ تو نمبر ون تھا۔" پیارا خان نے حیران ہو کے کہا۔

"میں جانتا ہوں ان سب بدمعاشوں کو۔" میں نے کہا۔ "جو بات میں سمجھنا چاہتا ہوں وہ کچھ اور ہے۔ دو فرلانگ کا راستہ بہت لمبا ہوتا ہے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ ہم باری باری اسے اٹھائیں گے۔ اس کا وزن بہت زیادہ ہے۔"

"تم تکلیف مت کرو۔ اس کو اٹھا کے میرے کندھے پہ ڈال دو۔" پیارا خان نے کہا۔ "اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور اگر میرا ایک بازو ٹوٹا ہوا نہ ہوتا تو میں ایسے ایسے دو کو اٹھا کے دو میل بھی جا سکتا تھا۔"

"تم واقعی پہاڑ سے زیادہ مضبوط ہو۔" میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔ "مگر نام پیارا خان کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"تو تم مجھے نزاکت علی کہہ سکتے ہو۔" وہ بولا۔

"میں تمہیں فولاد خان کہوں گا۔ تم فولادی آدمی ہو۔" میں نے کہا اور پیڈرو کو اٹھا لیا۔

"ابھی تک تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔" وہ چلتے ہوئے بولا تاکہ مجھے پیڈرو کو زیادہ دور تک نہ اٹھانا پڑے۔

"میں... تم سمجھ لو کہ میں بھی نمبر ون ہوں۔" میں نے کہا اور پیڈرو کو اس کے کندھے پر ڈال دیا۔ "نمبر ون لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ نمبر ون بدمعاش اور نمبر ون شریف۔ نمبر ون چالاک اور نمبر ون احمق۔"

وہ احمقوں کی طرح میری صورت دیکھتا رہا اور پھر آسانی سے کھڑا ہو گیا۔ "تمہارا نام کوئی نہیں ہے؟"

میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر اسے بتا دیا کہ میرا نام سکندر ہے۔ اس جیسے نادان سے کچھ چھپانے میں نہ کوئی نقصان تھا نہ اس سے کوئی فائدہ تھا لیکن اس سے آئندہ کبھی نقصان ہو سکتا تھا۔ صرف اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اپنا نام بتا دیا تھا کیونکہ فوری طور پر مجھے فولاد خان کو ساتھ رکھنے کے سوا چارہ نظر نہ آتا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ الگ ہو کے کہیں جانا پسند بھی نہیں کرے گا۔ جب تک کے باعث اس کا ٹوٹا ہوا بازو ٹھیک نہیں ہو گا تیمارداری کی ضرورت ہوگی اور اس وقت تک وہ مانوس ہو جائے گا۔ ایک ایسا شخص جس کے لیے اور چچا کے گھر میں جگہ نہ ہو کسی بھی ایسے گھر کو اپنا سمجھنے لگے گا جہاں کوئی اس سے نفرت نہ کرتا ہو۔ زمانے بھر کے دھتکارے اور ٹھکرائے ہوئے ستم رسیدہ اور مردم گزیدہ ایک چھپر کے نیچے جمع ہوتے تھے۔ یہ کسی اینٹ پتھر کا بنا ہوا چھپر نہیں تھا۔ کسی گھر کی چھت کا سایہ نہیں تھا جسے ہم میں سے کوئی اپنا کہہ سکتا۔ یہ تو رفاقت اور ہمدردی، خلوص اور اپنائیت کے احساس، محبت اور اعتماد کا وہ چھپر تھا جو سب کو تحفظ فراہم کر سکتا تھا اور سب کے کام آتا تھا۔ اس چھپر کا نام ہم نے شرارت میں ایم آر لیمون رکھ دیا تھا۔

میرے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرے میں واکی ٹاکی۔ میں نے جنگل میں سگریٹ والا راستہ دیکھ لیا تھا مگر اس سے ہٹ کر چلنا پسند کیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اچانک سامنے سے کوئی گاڑی نمودار ہو جائے۔ پیڈرو کو وہاں لانے والے کا نگران اعلیٰ بنا کے جانے والے کسی بھی وقت آ سکتے تھے۔ انہوں نے تفتیش کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں مداخلت کا خیال کا بھی گزر نہ تھا۔ میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ تفتیش ناکام ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے سچ اگلوانا چاہتے تھے۔ مقصد کے لیے انہوں نے تشدد کا حربہ آزمانے سے گریز کیا اور زیادہ سائنٹفک بنیادوں پر کام کرتے ہوئے ایسی ادویات استعمال کی تھیں جو واقعی ذہن کو مفلوج کر کے لاشعور تک رسائی ہو سکتی ہیں۔ ایسی ہی ایک دوا "اسکوپولیمائن" تھی کا دعویٰ تھا۔ شاید اب زیادہ موثر اور سریع الاثر دوائیں ایجاد ہو چکی ہوں۔ میڈیکل کیس میں اس قسم کی تفتیش کی جاتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کوئی شخص پہلے ہوش و حواس قتل کرے اور پھر پھانسی سے بچنے کے لیے پاگل بن جائے اور ثابت کرنا چاہے کہ اس کا یہ فعل ہوش کھو دینے کا نتیجہ تھا چنانچہ قابل مواخذہ نہیں۔ ان دواؤں کے زیر اثر جھوٹ بول ہی نہیں سکتے چنانچہ لیے گئے ٹروتھ سیرم دعا کیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ شکاری مجھے کوئی ایسی چکے تھے جس کے بعد میں

اور پہلے سے موجود تھی۔ وہ کیسے فرض کر سکتے تھے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اس تفتیش کے نتائج ان کے لیے بہت اطمینان بخش تھے۔ اب وہ مطمئن ہو کر بیٹھ سکتے تھے کہ تحقیقات اور غلط سوچ کے علاوہ ان کی کوشش سے ہم غلط سمت میں چل پڑے ہیں۔ وہ اسلحے کی اسمگلنگ میں اب کوئی خطرہ محسوس نہیں کریں گے کیونکہ ہم تو ہیروئن کے دھندے کو ختم کرنے کے چکر میں پڑ چکے ہیں۔ آئندہ بھی ہمیں بے خبر رکھنے کے لیے وہ مزید ثبوت فراہم کریں گے کہ وہ واقعی ہیروئن کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔

سڑک کوئی قومی شاہراہ نہیں تھی بلکہ کسی گاؤں، قصبے کو ملانے والی ذیلی سڑک تھی۔ میں نے فولاد خان یعنی سابق پیارا خان سے ایک پیپل کے نیچے انتظار کرنے کو کہا۔ صرف دو فرلانگ چلنے میں میرا سانس پھول رہا تھا اور میں کمزوری محسوس کر رہا تھا لیکن فولاد خان پر تھکن کا بالکل اثر نہ تھا حالانکہ وہ پیڈرو کا وزن بھی اٹھا کے لایا تھا۔

"تم اس پر نگاہ رکھنا۔" میں نے کہا۔ "اس کو اٹھنے مت دینا۔ یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"اگر یہ ہوش میں آ جائے گا تو کیا کروں؟" فولاد خان نے سر ہلایا۔

"اس کو پھر بے ہوش کر دینا۔" میں نے کہا۔ "تمہارے آس پاس اتنے پتھر پڑے ہیں۔"

"پتھر... پتھر مارنے سے اس کا سر پھٹ جائے گا۔" وہ بولا۔

"اچھا، یہ لو ریوالور..." میں نے کہا۔ "اس کو چلنے مت دینا اگر یہ ہوش میں آ جائے۔"

وہ کسی چھوٹے سے برساتی نالے کا پل تھا جو اس وقت خشک پڑا تھا۔ سڑک اس کے اوپر سے گزر رہی تھی اور پل سے ہٹے ہوئے واحد محرابی دروازے کے سامنے ایک بہت بلند اور پھیلی ہوئی چوڑی جگہ بہت محفوظ تھی۔ میں باہر نکلا اور برگد کے ایک درخت کے بہت چوڑے تنے کے پیچھے کھڑا ہو گیا جہاں سے میں دونوں جانب سڑک کو دور تک دیکھ سکتا تھا مگر سڑک پر سے گزرنے والے کسی شخص کی نگاہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ درخت کے آگے پیچھے وہ جال سا تھا جسے برگد کی داڑھی کہا جاتا ہے اور اس کے نیچے زمین میں جڑوں کی طرح پیوست ہو کر چھوٹے چھوٹے درختوں کا منظر آ رہے تھے۔ طویل اور اذیت ناک انتظار کی قید سے رہائی کے بعد اب پھر انتظار تھا کہ سڑک پر کوئی سواری نظر آئے تو ہم منزل کی جانب اور آگے روانہ ہوں۔ منزل کے تصور کے ساتھ ہی رابعہ کا خیال اندھیری رات کے مسافر کے لیے چاند کی طرح ابھرتا تھا اور میری بے قراری میں اضافہ کرتا تھا۔ ابھی تک میں خود آزاد نہیں تھا تو میں نے خیال کو بھی پابند کر رکھا تھا مگر اب دل ناصبور کے لیے ساعت دیدار کی خواہش ایک تڑپ بنتی جا رہی تھی۔ میں اس کے جمال لب و رخسار اور اس وارفتگی قلب و جاں کی محبت کے خیال کے طلسم میں گرفتار ہر دھڑکن کو شمار کر رہا تھا جو عالم فراق میں گزرتے ہوئے فرقت کی خبر دیتی تھی اور اس وقت جب میں اسے رگ جاں سے بھی قریب تر دیکھتا تھا وہ نہ جانے کہاں تھی۔ اس کے بارے میں آخری خبر یہ تھی کہ شکاری اغوا کر کے ڈونگا پتن کے کسی گاؤں کی طرف لے گئے تھے اور میں اس وقت جب ہم ڈونگا پتن کے قریب تھے شکاری اپنی دوسری چال میں کامیاب ہو گئے تھے اور مجھے بہت دور کسی نامعلوم مقام پر لے گئے تھے۔ محسن اور نیک محمد کامیاب لوٹے ہوں یا ناکام، مجھے غائب پا کے بہت پریشان ہوئے ہوں گے۔ کیا معلوم وہ رابعہ اور نازو کی تلاش میں جانے والے خود بھی گرفتار ہو گئے ہوں اور اب آس لگائے بیٹھے ہوں کہ میں ان کی رہائی کے لیے کچھ کروں گا کیونکہ میں آزاد ہوں۔

یہ تقدیر کی عجب ستم ظریفی ہوگی کہ وہ مجھے آزاد فرض کیے اور مجھے خدائی مدد کا وسیلہ سمجھے امید اور عذاب کی گھڑیاں کاٹ رہے ہوں۔ جبکہ میں ایسی جگہ قید تھا جہاں سے میرا زندہ بچ کے نکل آنا ہی تائید ایزدی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ میری پوزیشن مختلف تھی۔ میرے بارے میں ان کو علم نہیں تھا کہ دشمن مجھے کس طرف لے گئے ہوں گے۔ چنانچہ مجھے ان میں سے کسی کے آنے اور مجھے رہائی دلانے کی امید بالکل نہیں تھی اور یہ حقیقت ہے کہ وہ کبھی وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے جہاں میں قید تھا لیکن ان کے بارے میں مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ وہ ڈونگا پتن کی سمت گئے ہوں گے۔ واپسی پر ان میں سے کوئی بھی نہ ملا تو میری تلاش کا آغاز ڈونگا پتن سے ہی ہوگا۔ جو واقعات گلے ماچھی کی جعلی خانقاہ پر پیش آئے تھے ان کی کڑیاں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ نازو اور رابعہ کو وہیں سے لے جایا گیا تھا۔ پھر محسن اور نیک محمد میرے ساتھ ان کو تلاش کرنے نکلے تھے تو ان کا اتنا سراغ پایا تھا کہ دو افراد جن میں سے ایک لمبا اور دوسرا چھوٹا تھا انہیں ایک ایسی پرانے ماڈل کی ٹیوٹا میں ڈال کے لے گئے ہیں جس کی ایک ٹیل لائٹ نہیں ہے اور پچھلا بمپر غائب ہے۔ اس کے بعد کوئی جانتا تھا تو قصبے تک گیا تھا اور ٹھیک وقت پر شکاری آ پہنچے تھے۔

اس سوٹ والے نے جو کار میں گزرا تھا اور جس سے

www.paksociety.com

ہمیں بتایا تھا کہ ڈونگا بیٹن قریب ہی ہے صرف ہمیں اسی جگہ روکنے کے لیے غلط بیانی کی تھی اور آگے جاکر اپنے ساتھی اسٹاپ ویلڈو کو بلا لیا تھا کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شکاری صرف مجھے پکڑنا چاہتے تھے؟ نہیں۔ اگر میں ان کو وہاں نہ ملتا تو وہ مجھے ڈونگا بیٹن میں آ کے پکڑ لیتے۔ انھوں نے محسن اور نیک محمد کو بھی پکڑ لیا ہوگا جو ٹیکسی کو اسی جگہ چھوڑنے کے بعد زیادہ دور نہیں جا سکے ہوں گے۔ ممکن ہے ڈونگا بیٹن پہنچ یا وہاں سے قریب ہو جہاں انھوں نے رابعہ اور نادرہ کو رکھا ہوا اور بعد میں نیک محمد اور محسن کو بھی انہی کے ساتھ قید کر دیا ہو جو شامت اعمال کے باعث خود چل کے اپنے زنداں تک جا پہنچے تھے۔

لیکن انھوں نے سب کو گرفتار کیا ہوتا تو وہ سب کو ایک ہی جگہ رکھتے میں نے خالی سڑک پر ادھر ادھر نگاہ ڈال کے سوچا۔ جو "سچ" انھوں نے مجھ سے اگلوایا وہی "سچ" دوسروں سے بھی پوچھتے۔ اس کالے قید خانے میں تو سب کے لیے جگہ تھی اور وہاں سے کسی کا نکلنا ناممکن تھا۔ قدرت کی بات الگ ہے جس نے فولاد خان جیسے شخص کو مدد کے لیے بھیج دیا تھا حالانکہ اس کے پہاڑ جیسے وجود کی سب سے اوپر والی منزل تقریباً خالی تھی۔ شاید شکاری اس بار زیادہ محتاط تھے اور انھوں نے سب کو الگ الگ رکھا ہوگا اور سب سے اپنے طور پر "سچ" اگلوانے کی بھرپور کوشش کی ہوگی۔ وہ اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے، کون اس آزمائش اور عذاب کو جھیل کر وفا کے امتحان میں سرخرو ہوا اور کس نے ہمت ہار دی؟ جھوٹ بالآخر جھوٹ ثابت ہوگا یا میرا سچ ہی سب کا سچ بن جائے گا اس کا علم مجھے سب سے ملے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔

تشدد کے حربے کا مقابلہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی کیونکہ سب کی قوت برداشت ایک جیسی نہیں ہوتی اور سارے حربے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اگر انھوں نے محسن اور نیک محمد کو تشدد کا نشانہ بنایا ہوگا تو کچھ اور طریقے اختیار کیے ہوں گے اور نادرہ یا رابعہ سے کچھ پوچھنا چاہا ہوگا تو وہ دوسرے طریقے آزمائے ہوں گے لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو سائنٹیفک طریقہ کار مجھ پر آزمایا گیا تھا وہی انھوں نے باقی سب پر آزمایا ہوگا تو سب نے واقعی سچ بتا دیا ہوگا۔ میں تو اس لیے بچ گیا تھا کہ میں ایک بات کو سمجھ گیا تھا اور قدرت نے مجھے اس ذہن کو متاثر کرنے والی دوا سے بچنے کا ایک موقع عطا کر دیا تھا ضروری نہیں کہ دوسروں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہو۔ ان دواؤں کے زیر اثر مزاحمت ختم ہو جاتی ہے اور آدمی چاہے بھی تو جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اگر انھوں نے الگ الگ حاصل ہونے والے بیانات کا مقابلہ کیا ہوگا تو ان کو راز معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹ صرف میں نے بولا تھا اور معلوم ہو جائے گا کہ ہم حقیقت سے باخبر ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ منشیات کا نہیں اسلحے کی اسمگلنگ اور ناجائز تعمیر و فروخت تقسیم اور ترسیل کا کام کرتے تھے لیکن جب وہ پیڈرو کو میری حفاظت کے لیے چھوڑ کر کسی جگہ اکٹھے ہوئے ہوں اور ہم سب کے بیانات سے اصل سچ اخذ کرنے کے بعد یہ طے کرنا چاہتے ہوں کہ اس صورت میں ہمارا انجام کیا ہونا چاہیے۔

اگر انھیں واقعی علم ہو گیا کہ ہم سب جانتے ہیں تو وہ ہمیں زندہ چھوڑنے کا خطرہ کیوں مول لیں گے۔ اس کے بعد ان کے لیے تشویش کی صرف ایک بات رہ جائے گی کہ ہم نے اور کس کس کو شریک راز کیا ہے یا کون کون جانتا ہے کہ ان کا دھندا یا ان کی کمپنی کا اصل دھندا کیا ہے؟ پھر وہ اپنے اڈے بدلیں گے اور ایجنٹ بدلیں گے۔ نیچے سے اوپر تک سب کو خبردار کریں گے کہ محتاط ہو جائیں کیونکہ راز فاش ہو چکا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوا تو یہ بڑی مایوس کن اور حوصلہ شکن بات ہوگی۔ ہمارا سارا پروگرام چوپٹ ہو جائے گا اور ایم آر ایس ڈی جیسی مشن ملک و قوم کے غداروں کو چن چن کر ٹھکانے لگانا تھا ناکام ہو جائے گی۔ پھر یہ ہمدی دلاور کے خلاف میری جنگ محض ذاتی انتقام کی جنگ رہ جائے گی اور یہ جدوجہد صرف خود حفاظت کی جدوجہد بن جائے گی جس میں اب تک بہت سے بے گناہ اپنی اپنی جانوں کا نذرانہ دے چکے ہیں۔

انتظار میرے لیے آسان بھی صبر آزما ثابت ہو رہا تھا۔ پریشان خیالات کی یلغار میرے حوصلوں کو پست کر رہی تھی کہ اچانک میں نے ایک چیخ سنی۔ یہ چیخ فولاد خان کی تھی۔ میں ایک دم بھاگا لیکن پھر بھی مجھے دیر ہو گئی۔ فضل محمد سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ اس جگہ سے کچھ دور آگیا تھا جہاں میں نے سمجھ لیا پیڈرو کو بے وقوف فولاد خان کی تحویل میں چھوڑا تھا اور یہ فرض کر لیا تھا کہ ریوالور ہوگا تو پیڈرو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں نے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ آدمی کی اصل طاقت تو اس کی عقل ہوتی ہے۔ اسلحہ عقل کے بغیر استعمال کیا جائے تو فائدے کی جگہ نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔ میں نے ایک فائر کی آواز سنی۔ پھر مجھے پیڈرو ہاتھ میں ریوالور لیے نظر آیا۔ اگر میں فوراً درخت کے پیچھے نہ چھپ جاتا تو پیڈرو کی نگاہیں یقیناً مجھے دیکھنے میں کامیاب ہو جاتیں۔

وہ کچھ دیر مجھے تلاش کرتا رہا اور ایک بار اس درخت کی سمت بھی آیا جس کے پیچھے میں دبکا ہوا تھا۔

پیڈرو کو احساس ہو گیا کہ ریوالور کتنی بڑی طاقت ہے اور مسلح آدمی کے مقابل نہتا آدمی کتنا بے بس ہوتا ہے۔ اس وقت پیڈرو میری جھلک دیکھ لیتا یا میری آہٹ بھی پا لیتا تو مجھے شوٹ کرنے میں تاخیر نہ کرتا۔ وہ سخت مشتعل تھا اور ناکامی کی ذلت نے اسے زیادہ خطرناک بنا دیا تھا۔ ایک وقت وہ تھا جب میں اسے قتل کرنے والا تھا کہ ایک کم عقل شخص نے بے وقت کر اس کی زندگی بچالی تھی اور پیڈرو نے اس احسان کا بدلہ یوں چکایا تھا کہ سب سے پہلے اپنے اسی محسن کا کام تمام کر دیا تھا۔ اب وہ اپنی شکست کا بدلہ مجھ سے لینے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ دلاور کی موجودگی میں ایسے متعدد مواقع آئے تھے جب وہ مجھے قتل کر سکتا تھا مگر دلاور نے دیکھ لیا تھا کہ مجھے قتل کرنے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اصل شکاری تو صرف دلاور تھا جو پرسکون رہتے ہوئے عقل اور فراست سے چال چلتا تھا اور چال چھپاتا تھا لیکن اس وقت یہاں صرف پیڈرو تھا جس کو گولی چلانے سے روکنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اسے ایک ہی صدمہ تھا کہ اب دلاور کے سامنے وہ مجھے گرفتار کرنے کے الزام کو قبول کرنے پر مجبور ہوگا۔ بے شک وہ اسے معاف کر دے گا کہ بہادر خان کو جس کی کوتاہی سے سکندر فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا، وہ سزا دی جا چکی ہے جس کا وہ مستحق تھا اور جو اس کا مقدر تھی مگر میرے ہاتھوں اس کی شکست ہی تھی اور پھر جس طرح میں اس کو اٹھا لایا تھا، اس کا پیڈرو کو احساس ہر وقت میں مبتلا ہوتا اور مجھے بھی قتل کرنے کے جنون کا شکار ہونا شعوری رد عمل تھا۔

اگر وہ میرے راستے قریب آجاتا کہ میں ایک جست لگا کر اس پر جا پڑتا تو اپنے خالی ہاتھوں سے بھی میں اس کا کام تمام کر دیتا لیکن درمیانی فاصلہ زیادہ تھا۔ وہ پلٹ کر میرے حرکت میں آنے سے پہلے فائر کر سکتا تھا اور یہاں اس کا نشانہ خطا نہیں ہو سکتا تھا۔ بلاشبہ اسے انتقام کی خواہش نے پاگل کر دیا تھا۔ اگر وہ پاگل نہ ہوتا تو اتنی بے خوفی سے میری گولیوں کے سامنے نہ پھرتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میرے پاس بھرا ہوا ریوالور ہوتا۔ ایسی صورت میں وہ کتے کی موت مارا جاتا۔ مجھے اطمینان سے اس کا نشانہ لے کر اس کی کھوپڑی اڑا دیتا اور پھر اس کی لاش کو حشرات الارض جنگلی جانوروں اور گدھوں کے لیے پھینک کر جاتا۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتا تو صورتحال اس کے برعکس ہوتی۔

مجھے اسی وقت خیال آیا کہ کس طرح جلد بازی میں اور جذباتی ہو کے میں نے دو ریوالور خالی کر ڈالے تھے اور پھینک دیے تھے۔ اس شیطانی نظام کو ناکارہ بنانے کے لیے تو ایک گولی بھی کافی تھی۔ میں اسے زمین پر مار کے بھی توڑ پھوڑ سکتا تھا لیکن میں نے اس پر فائر کھول دیا تھا۔ وہ میرا انتقامی رد عمل تھا جس کا خمیازہ میں اب بھگت رہا تھا کہ شکار میرے نشانے پر تھا مگر میں خالی ہاتھ ہونے کے سبب اپنی جان بچانے کی جدوجہد میں مصروف تھا حالانکہ اس وقت مزاحمت عملی طرف بہادر خان عرف فولاد خان کی موت کے صدمے نے میرے ذہن کو شدید صدمہ پہنچایا تھا اور میں اس شخص کی بے بسی کی موت کا انتقام بھی لینا چاہتا تھا جو اپنا برا بھلا تک نہیں سمجھتا تھا۔ جو نہ کسی کا دوست تھا نہ دشمن۔ فقط ایک تماشا تھا دست قدرت کی صنعت گری کا ایک دیوزاد جس کا دماغ بچے جتنا تھا۔ اس کو مکر و فریب کی دنیا میں اسی طرح دوسروں کے مذموم مقاصد کے لیے استعمال ہو کے ایسے ہی مرنا تھا کہ کوئی اُسے رونے والا ہوتا نہ اس کی کمی کو محسوس کرنے والا۔ اب اس کے لالچی اور کمینے آقا کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں رہی۔ اس کا احمق بھتیجا جو اس کا خون تھا اپنا حق مانگنے کی بات کرنے کے لیے بھی نہیں آئے گا۔

بالآخر پیڈرو نے میری تلاش ترک کر دی۔ مجھے اس کو جاتے دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ یہ جنگل نہ ہوتا تو میں اس کا تعاقب کرتا لیکن یہاں پیچھا کرنا ناممکن تھا۔ خشک پتے اور سوکھی ٹہنیاں میرے قدموں کے نیچے چلانے لگتے اور اسے فوراً معلوم ہو جاتا کہ کوئی اس کے پیچھے آرہا ہے۔ میرے آس پاس صرف پتھر پڑے تھے اور میں چاہتا تھا کہ پتھر مار کے اس کا سر پھاڑ دوں مگر مجھے اپنے نشانے پر اعتماد نہیں تھا اور نشانہ خطا ہو جانے کے تمام نقصانات میرے ذہن میں تھے۔ پیڈرو اسی راستے پر چلا گیا جدھر سے کچھ دیر پہلے ہم آئے تھے۔ جب مجھے اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہا تو میں اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور اس جھاڑی کے سے پل کے نیچے گیا جہاں میں نے پیڈرو کی زندگی پر فولاد خان کو اختیار دیا تھا۔ تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔ میں بھول گیا تھا کہ زندگی اور موت پر اختیار صرف کسی کے ہاتھ میں ریوالور تھما دینے سے نہیں مل جاتا۔ یہ تو کاتب تقدیر کا وہ فیصلہ ہے جو کسی بھی فانی انسان کی مرضی کی بات ہی نہیں۔ دنیا سے ایسے ہی جانا پڑتا ہے جس کے لیے قدرت کی عطا کردہ فرصت عمر تمام ہو جاتی ہے۔

فولاد خان اپنے ہی خون میں غلطاں فرش خاک پر چت پڑا تھا اور برساتی نالے کی سوکھی مٹی اب تک اس کے بہنے والے لہو کو پی رہی تھی۔ یہ خون اس کے دل کے سینے کے سوراخ میں سے ہو کر باہر آرہا تھا۔ فولاد خان مر چکا تھا اور اس کی کھلی آنکھیں تماشائے اہل کرم دیکھ رہی تھیں۔ پہلے اُسے

www.paksociety.com

دس ہزار روپے کر ایک شکاری نے اسیر کیا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور دے کر کہا کہ دیکھو یہ خوفناک مجرم بھاگنے لگے تو اسے گولی مار دینا۔ پھر اسی خوفناک مجرم نے کہا کہ میں تو شریف آدمی ہوں اور خوفناک مجرم یہ ہے اور اس وقت شکاری نے بھی اس کو ریوالور تھما کے وہی بات کہی۔ وہ کس کی مانتا اور کس کی نہ مانتا۔ اس کی محدود عقل تجزیہ اور فیصلہ کرنے سے قاصر رہی اور انجام یہ ہوا کہ خود اسے مرنا پڑا۔ اس کے قریب بیٹھ کر میں نے بڑے دکھ سے اس وقت کو یاد کیا جب میں نے سوچا تھا کہ پیاز خان اب فولاد خان بن سکے گا۔ "ایم آر ایس" کا رکن ہو جائے گا جہاں اسے وہ سب ملے گا جو دنیا نے نہیں دیا۔ پیار، محبت، خلوص اور اعتماد و عزت نفس اور حوصلہ۔ ہم اسے بھی اس کا حق دلوائیں گے اور وہ ہم سب کا ہو کر ہمارے درمیان رہے گا۔ میں نے تو اس سے جینے کا حق بھی چھین لیا تھا۔

مجھے معاف کرنا میرے معصوم دوست! میں ایسا کبھی نہیں چاہتا تھا اور خدا میری نیت کا گواہ ہے پھر بھی میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا کہ اصل کوتاہی مجھ سے ہوئی تھی۔ مجھے تمہارے ہاتھ میں وہ قاتل کھلونا پکڑانا ہی نہیں چاہیے تھا جو تمہارے قاتل کے ہاتھ میں چلا گیا۔ پیڈرو موقع کے پیچھے رہا ہوگا اور موقع پاتے ہی ایک جست میں اس نے ریوالور پر قبضہ کر لیا ہوگا۔ ان سب باتوں کو میں نے پہلے سے ذہن میں رکھا ہوتا تو میں یہ غلطی نہ کرتا لیکن خود میرا ذہن گزشتہ تین دن کی اذیت برداشت کرنے کے بعد سو فیصد فعال اور مستعد نہیں رہا تھا۔ یہ بھول مجھ سے زیادہ میرے نادان نجات دہندہ کو مہنگی پڑی۔ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ فوری طور پر اس کی تدفین کا انتظام بھی کر سکتا چنانچہ میں نے خدا سے ہاتھ اٹھا کے دعا مانگی کہ اس بدبخت کی مغفرت فرما جس نے سکندر بخت کے لیے حق دوستی ادا کر دیا تھا۔

میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا تھا۔ پیڈرو کو دو فرلانگ جانا تھا۔ وہاں اس کے دو ساتھی بندھے پڑے تھے اور تھوڑی دیر میں ان کا ہوش میں آ جانا بھی یقینی تھا۔ وہ تینوں واپس لوٹتے تو پھر مجھے تلاش کریں گے۔ میں ایک سے تو بچ گیا تھا، تین سے کیسے بچوں گا۔ یہی سوچ کر میں پھر سڑک تک گیا اور اندازے سے سمت کا تعین کر کے چلنے لگا۔ دھوپ میں ابھی تیزی آنے لگی تھی۔ میرے جسم کے لیے اس سڑک پر پیدل سفر کرنا مشکل ہونے لگا اور ایک میل بعد میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ ابھی تک مجھے آبادی کے آثار کہیں نظر نہ آئے تھے جو بہت عجیب بات تھی۔ آخر وہ سڑک کس لیے بنائی گئی تھی۔ ایک سڑک تو متعدد گاؤں اور بستیوں کو ملاتی ہے۔ پر آمد و رفت کیوں نہیں؟ کوئی تانگہ یا ریڑھا یا گاڑی ابھی تک میرے قریب سے نہیں گزرے تھے اور مجھے ہر جانب صرف جنگل نظر آ رہا تھا۔ اگر کھیت ہوتے تو شاید ان میں کام کرنے والے کسی نہ کسی آبادی کا پتا ضرور بتا دیتے۔

تین دن.... ایک سیاہ تہ خانے میں تنہائی اور سخت ترین اذیت کی سزا کے برابر تھے۔ جتنا مجھے خوراک کی اور آرام کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی، کب سے میں نے ڈھنگ کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ مہک بھی بیٹھی تھی۔ اس وقت ایک وحشت کی ویرانی میں گزرا ہوا وقت یاد آیا۔ وہ وقت جو کسی اور کی زندگی کا خواب تھا جو ولایت میں شہزادگی کے شب و روز میں بسر ہوا اور عیش کوشی کا وہ زمانہ جو میں نے اور رحمی نے حسینان کے دلوں پر قسم کے جھنڈے گاڑتے گزارا۔ وقت جو اس کے بعد الرعد کے حسن دلآرام کے لطف و عنایات کا علم ہوا، رفاقتوں کے رنگ سے مہکتا گزرا اور دوستوں کے خلوص بن گئے تھا۔ ایسے وقت میں جب میں سب سے جدا اپنی تنہائی، خوف اور مایوسیوں کے حوصلہ شکن آسیب میں گھرا ہوا تھا تب وہ دوستی اور محبتوں سے معمور دن بہت یاد آئے۔ ان سب سہاروں کی ضرورت آج بھی تھی۔

اچانک میرے کانوں نے قریب آتی ہوئی کسی گاڑی کی آواز سنی۔ اس راستے پر ابھی تک مجھے ایک آدمی بھی نہیں آیا تھا۔ ادھر کسی گاڑی کا آنا چہ معنی دارد؟ یہ شک یہ سوال بالکل منطقی تھا چنانچہ میں تھوڑا سا کھسک کر ایک درخت اور اس کے دامن میں اگی ہوئی جھاڑی کے پیچھے ہو گیا۔ اس سنسناتے ہوئے انجن کی آواز کو میرے کانوں نے سن لیا تھا جب گاڑی ایک فرلانگ سے بھی زیادہ دور تھی۔ چند منٹ بعد ایک جیپ دھول اڑاتی ہوئی سڑک سے گزری اور مجھے شک گزرا کہ میں نے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر چوہدری دلاور کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ خاکی سفاری سوٹ میں تھا اور اس نے سر پر گرد سے بچنے کے لیے ہیٹ رکھ لیا تھا جس سے اس کا پورا چہرہ نظر نہیں آیا۔ میں نے اس کا سائیڈ پوز دیکھا اور وہ بھی گزر گیا۔ گاڑی کے پچھلے دروازے میں جیپ کے آگے والے دروازے تھے ہی نہیں کیونکہ وہ ۱۹۵۲ء کی ملٹری ماڈل جیپ تھی۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا جھاڑی کے عقب سے دیکھا تھا اس کے باوجود میرا

دل کہتا تھا کہ وہ دلاور کی تھی۔ یہ شک اس لیے بھی بے سبب نہیں لگتا تھا کہ جیپ کا رخ اسی قید خانے کی طرف تھا جہاں سے میں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا تھا اور جہاں اب اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے اور اس جرم کی سزا پانے کے لیے پیڈرو اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔

میں پھر اٹھا اور مخالف سمت میں دوڑنے لگا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ تنگ سی نیم پختہ سڑک ایک نسبتاً بڑی سڑک سے جا ملی اور میں نے سڑک پر دونوں طرف سے تانگے آتے دیکھے۔ میں رک گیا اور انتظار کرنے لگا کہ میری پھولی ہوئی سانس قابو میں آ جائے۔ دونوں تانگے بھرے ہوئے تھے اور میرے سامنے سے گزر گئے۔ کسی نے مجھے وہاں تنہا کھڑا دیکھ کر حیرت یا تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ پھر ایک سائیکل والا نوجوان نمودار ہوا۔ اسے میں نے اشارہ کر کے روک لیا۔

"یہ کون سی جگہ ہے جوان؟" میں نے نرمی اور شفقت سے پوچھا۔

"یہ سڑک ہے جناب عالی۔" نوجوان میرے سوال پر دم بخود رہ گیا۔

"سڑک تو ہے... لیکن یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟" میں نے کہا۔

نوجوان نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "ادھر پیچھے شیخوپورہ جانے والی سڑک سے مل جاتی ہے۔ آگے لاہور والی بڑی روڈ ہے۔"

"اور ادھر کوئی گاؤں ہے؟" میں نے کہا "کوئی آبادی ہے؟"

"ہے جناب عالی۔ آپ ادھر چلے جاؤ۔" اس نے میرے دائیں ہاتھ کی طرف پھیلے ہوئے جنگل کی طرف اشارہ کیا۔ "ایک پل آئے گا۔ یا دوسری طرف جانا ہو تو موضع کرباں والی ہے۔ مگر آپ نے جانا کدھر ہے؟"

"میں شکار کرنے آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "راستہ بھول گیا۔ اب بھوکا پیاسا بھٹک رہا ہوں رات سے۔"

نوجوان کی صورت پر تشویش کے آثار نمودار ہو گئے۔ "آؤ جی بسم اللہ... میں آپ کو اپنے گھر لے چلتا ہوں۔ کرباں والی نزدیک ہی ہے۔" اس نے مجھے بڑے خلوص کے ساتھ سائیکل کے کیرئیر پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں دونوں پیر بائیں جانب لٹکا کے اور ہینڈل تھام کے بیٹھ گیا اور نوجوان نے بڑی پھرتی سے سائیکل کو پیڈل مارنے شروع کیے تو میں نے سکون، فراغت اور تحفظ کے احساس کی وہ آسودگی محسوس کی جو میرے لیے ایک نیا اور سرشار تجربہ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں افریقہ کے آدم خور قبائل کے چنگل سے نکل بھاگنے کے بعد مہذب دنیا کی طرف لے جانے والی پہلی فلائٹ پر سیٹ حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔ میرے تھکے ہوئے جسم کو جتنا آرام اس سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھ کر ملا اتنی ہی تسکین میرے ذہن کو ملی۔

"یہ کرباں والی بھلا کیا نام ہوا؟" میں نے نوجوان سے کہا۔

"وہ ایک بڑی کرباں والی تھی جناب عالی۔ سائیں پاپڑ والے کی مہربانی سے ملنگ ہو گئی۔" وہ بولا۔

"سائیں پاپڑ والے؟" میں نے کہا۔

نوجوان نے میری حیرت پر تاسف سے سر ہلایا۔ "ہاں۔ وہ صرف پاپڑ کھاتے تھے۔ نذر لانے والے بھی صرف پاپڑ لاتے تھے۔ غریب تو وہی دال کے پاپڑ لاتے تھے لیکن کبھی کسی کے من کی مراد پوری ہو جاتی تھی تو وہ چاندی یا سونے کے پاپڑ بھی توڑتی سے نذر کرتا تھا۔"

"سونے چاندی کے پاپڑ؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "لوہے کے چنے چبانے کا محاورہ تو سنا تھا۔ سونے چاندی کے پاپڑ بیلنے کا آج پہلی بار سن رہا ہوں۔"

"نہیں جی۔ سائیں وہ پاپڑ کھاتے نہیں تھے۔ وہ تو انہیں ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔" وہ بولا۔ "کہتے تھے یہ ہوس اور لالچ کا زہر ہے۔ اسے مٹی میں گاڑ دو... دفنا کر دو۔ ان کی خوراک صرف دال کے پاپڑ تھے۔ جو بچتے تھے وہ تبرک کے طور پر بانٹ دیتے تھے۔"

"اچھا! اور کیا واقعی وہ سونے چاندی کے پاپڑ گاڑ دیے جاتے تھے؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"ہاں جی۔ ان کے حکم سے کوئی انکار کر سکتا تھا۔ وہ تو بس نذر قبول ہو جاتی تھی۔" نوجوان بولا۔ "اس کے بعد وہ مٹی میں مل کر مٹی۔ سب کو ایک دن مٹی ہو جانا ہے۔ پھر یہ سونا چاندی کیا ہے۔"

نوجوان کے فلسفے نے مجھے سائیں پاپڑ والا کی عیاری اور دیانت کے عقیدت مندوں کی سادہ لوحی کا قائل کر لیا۔ سونے چاندی کے پاپڑ لانے والے حرص و طمع سے بے نیاز سائیں کی شانِ قلندری سے بے حد متاثر ہوتے ہوں گے اور اتنا ہی کافی سمجھتے ہوں گے کہ ان کے نذرانے کو سائیں پاپڑ والے نے مسترد نہیں کیا۔ پھر وہ پیر کے ڈیرے کے آس پاس کہیں بھی وہ پاپڑ تھوڑی سی مٹی ہٹا کے گاڑ جاتے ہوں گے۔ گہری قبر کھودنے کی نہ وہ ضرورت محسوس کرتے ہوں گے اور نہ ان کے پاس زمین کو کھودنے کے لیے آلات ہوتے ہوں گے۔ آخر خالی ہاتھوں سے کوئی کتنی گہرائی تک کھودے گا۔ زیادہ سے زیادہ ایک فٹ۔

www.paksociety.com

سائیں باپڑ والے کے معتقد جیسے دیکھتے رہتے ہوں گے کہ بوری یا ڈولچی کا ڈھیر کہاں دفن کیا گیا ہے۔ یا بعد میں رات کے وقت خود سائیں باپڑ والے کو نذرانے کی رقم گنتے دیکھ کر اندازہ کرنا مشکل نہ ہوتا ہوگا کہ مال کہاں ہے۔ سب کے سامنے وال کے باپڑ کھانے والا کتنا دولت مند ہوگا، اس کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس سونے چاندی کو شہر کے ہوشیار ایجنٹ سناروں تک پہنچا کے دام کھرے کرتے ہوں گے۔ سائیں باپڑ والے کی سالانہ آمدنی کا کوئی حساب نہ تھا چنانچہ وہ انکم ٹیکس کے جھمیلوں سے بھی محفوظ تھا جن سے محنت کرکے رزقِ حلال کمانے والوں کے لیے مفر نہیں۔

"ان کے پاس دولت مند اور رئیس تو سونے کے باپڑ لاتے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی۔ جن کو خدا نے دیا ہے وہ راہِ خدا میں بھی دیتے ہیں۔" نوجوان نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "اور بزرگوں پیروں فقیروں کے آستانے پر تو غریب امیر سب کو آنا ہی پڑتا ہے۔ امیروں کو خدا سب دیتا ہے تو کبھی ایسی بیماری دے دیتا ہے جس کا علاج نہیں ملتا اور کبھی اولاد نہیں دیتا یا بیٹی پہ بیٹی دیتا جاتا ہے مگر ایک بیٹا نہیں دیتا۔"

"اور سائیں باپڑ والے کے حاضر اسٹاک میں بیٹے موجود رہتے تھے کہ جیسا کسی نے مانگا فوراً اسٹور سے نکال کر دے دیا؟" میں نے کہا۔ "اور غیرت سے سائیں میڈیکل اسپیشلسٹ بھی تھے؟"

"او جی، آپ کیسی کفر کی باتیں کرتے ہو۔" سائیکل سوار نے برا مانتے ہوئے کہا۔ "وہ تو سب کو دعا ہی دیتے تھے۔"

"کیا وہ سب جو اُن کے پاس مراد مانگنے آتے تھے، خود دعا کرنا نہیں جانتے تھے؟" میں نے کہا۔ "یا خدا کسی کی دعا قبول ہی نہیں کرتا تھا سوائے سائیں باپڑ والے کی دعا کے؟"

"آپ میرے مہمان ہو جی، اس لیے میں آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" نوجوان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "مگر ایسی باتیں گاؤں میں مت کہنا ورنہ برا ہوگا۔"

ایک میل کی مسافت ابھی طے ہوچکی تھی چنانچہ میں نے اپنی شرانگیزی بند کی۔ ایسی باتیں ان سادہ دل لوگوں کے ذہن میں انتشار پیدا کرتی تھیں۔ ان کے جذبات کو عقل کی تائید سے تقویت ملتی تھی۔ وہ فوراً تسلیم نہیں کرسکتے تھے کہ اب تک اُن کا عقیدہ غلط تھا اور ایسی بات ذہن سے خارج بھی نہیں کرسکتے تھے جو خود اپنی صداقت کا ثبوت ہو۔ کربان والی میں مشکل سے دو سو گھر ہوں گے۔ ان میں بیشتر کچے تھے۔ مسجد کے مینار کی بلندی اور سفیدی سب سے جدا تھی اور دائیں طرف ایک

پیپل کے درخت سے بندھے ہوئے چھوٹے چھوٹے رنگین جھنڈے اور گوٹے کناری والے سبز جھنڈے سے اعلان کرتے تھے کہ یہ سائیں باپڑ والے کی خانقاہ ہے۔

"یہ سائیں باپڑ والے کی خانقاہ ہوگی؟" میں نے کہا۔

"یہ ان کا مزار شریف ہے۔" نوجوان نے کہا۔ "وہ شہید ہوچکے ہیں۔"

"شہید؟ کیا انھوں نے پاک بھارت جنگ میں دشمن کے خلاف جہاد کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "یا راہِ حق میں جان دی تھی؟"

"آپ شہری لوگ بڑے بے پیر ہوگئے ہو۔" نوجوان نے ملامت سے کہا۔ "ان کے آستانے پر ایک رات شیطانوں کے لشکر بدبخت ڈاکوؤں کے بھیس میں حملہ کیا۔ آپ نے مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔"

"ڈاکو سب مالِ غنیمت لے گئے ہوں گے۔" میں کہنے لگ گیا۔ "سائیں باپڑ والے کے آستانہ عالیہ سے ان کو سونے کے باپڑ سیروں کے حساب سے ملے ہوں گے۔ باپڑ کا کوئی معیاری وزن تو مقرر ہے نہیں۔ ملانے والے ایک تولے کا بھی لاتے ہوں گے اور ایک چھٹانک کا بھی۔ مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ مگر سائیں پھر بھی شہادت کے منصب پر فائز ہوئے۔ خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔"

"اب وہاں کربان والی مجاور ہے۔" نوجوان نے کہا۔ "ان کی کرامات کا شہرہ دور دور تک ہے۔"

لیکن میں اب پیروں فقیروں کی جھاڑ پھونک اور کرامات پر اظہارِ خیال فرما کر اپنے میزبان کے جذبات کو زیادہ مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مشتعل ہوکے وہ مجھے مجروح کردے۔ "یہ ڈونگا چین کتنا بڑا گاؤں ہے بھلا؟" میں نے کہا۔ "یہیں آس پاس؟"

"ہاں جی ہے۔" وہ چونکا۔ اس نے اب اپنی سائیکل کا ہینڈل ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور ہم دونوں کھیتوں کی منڈیر پر آگے پیچھے چلتے جا رہے تھے۔ "یہاں سے پانچ کوس پر ہے۔"

"گویا دس میل۔ اگر میں وہاں جانا چاہوں تو کیسے جاؤں گا؟" میں نے کہا۔

"ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ تانگے پر چلے جائیں۔" نوجوان بولا۔ "گاؤں میں دو تانگے ہیں۔ ایک چوہدری صاحب کا، دوسرا ایک موچی کا، جو موچی کا بیٹا چلاتا ہے۔ وہ آپ سے پیسے لے گا۔"

"اور دوسرا طریقہ کیا ہے؟" میں نے بے خیالی میں کہا۔

"دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ شام تک انتظار کریں۔" وہ بولا۔ "ڈونگا چین کے نمبردار سادھو رام جی ہر جمعرات کو کربان والی

ہفتے میں حاضری دینے آتے ہیں اور سائیں باپڑ والے کے مزار شریف پر پھول چڑھا کے لوٹ جاتے ہیں۔"

"سادھو رام؟ یہ تو ہندوانہ نام ہے۔" میں نے حیران ہوکے کہا۔

"ہاں جی۔ سادھو رام ہندو ہے مگر دل سے سائیں باپڑ والے بابا کا معتقد ہے۔" نوجوان بولا۔ "آخر ہندوستان میں بھی کتنے ہندو ہیں جو خواجہ نظام الدین اولیا اور اجمیر کے خواجہ صاحب کی درگاہ میں جا کے منت مانتے ہیں۔ بمبئی میں حاجی علی کی درگاہ پر سب جاتے ہیں۔ ہندو، مسلمان، پارسی۔"

"تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟" میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "تم نے پڑھا ہے یا ہندوستان جا چکے ہو؟"

"یہ سب سادھو رام جی نے بتایا ہے۔ انھوں نے بہت سی باتیں بتائی ہیں کہ گرو نانک جی ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی اور کبیر داس بھی۔ راجہ اکبر ہندو اور مسلمان دونوں مذہب کو مانتا تھا اور اس نے دونوں مذہب کی عورتوں سے شادی کی تھی۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ گاؤں کا یہ جاہل لڑکا کیسی عالمانہ گفتگو کررہا تھا۔ بے شک بہت سے حوالوں سے یہ سب باتیں غلط بھی ثابت ہوسکتی تھیں لیکن کربان والی میں یہ باتیں پھیلانے والا سادھو رام تھا۔ اس نے اپنی چالاکی سے گاؤں والوں کے ذہن کو ہموار کر لیا تھا۔ وہ ہندو تھا اور اسلامی سمجھے جانے والے فلسفے پر عمل پیرا تھا۔ مگر اس نے اپنی عقیدت مندی کا جواز تاریخ کے حوالے سے پیش کردیا تھا اور اب گاؤں والے اس کی فراخدلی، بے تعصبی اور عظمت کے معترف تھے۔ یہ بات میرا ذہن تسلیم نہیں کرتا تھا کہ آج پاکستان کے ایک گاؤں میں جو شخص نمبردار بنا بیٹھا ہے وہ صوفیا کے ساتھ تھا اور ان کی تعلیمات سے جذباتی وابستگی ظاہر کرتا ہے تو یہ ڈھونگ ہے۔ وہ اپنے ظاہر میں سمجھتا ہے تو مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا۔ مسلمانوں کے ملک میں اپنے آبا و اجداد کا دھرم اور اپنے دھرم کا نام سنبھالے کیوں بیٹھا ہے؟

"تمہارا مطلب ہے کہ میں سادھو رام کے ساتھ ڈونگا چین چلا جاؤں؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی، وہ اپنی گاڑی میں آتے ہیں۔ بہت لمبی سی گاڑی ہے جی۔" نوجوان نے کہا۔ "آپ کو ضرور ساتھ لے جائیں گے وہ۔"

نوجوان کے گھر میں اس وقت صرف اس کی ماں تھی اور ایک بہن۔ اس کا باپ اور بھائی کھیتوں کی طرف گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ مجھے یاد ہے ناشتے کے ساتھ ایک جگ لسی کا رکھ دیا گیا۔ میں نے بمشکل حلق سے اتارا اور میزبانوں کا دل رکھنے کے لیے لسی کے گلاس کو بھی آدھا خالی کردیا مگر اس

کے بعد میری حالت اس شخص کی طرح ہوگئی جس نے ایک ساتھ کئی دیگیں کھالی ہوں۔ میں خوش خوراکی کے مظاہرے کے ساتھ جا رہا تھا اور اِدھر اُدھر کی باتوں کا جواب بھی دے رہا تھا لیکن میرا ذہن سادھو رام کی طرف تھا۔

"وہ چوہدری سی گاڑی ہے؟" میں نے اچانک کہا۔ "کیا وہ شیورلیٹ ہے پچاس کے ماڈل کی؟"

"کیا جی؟" نوجوان ہکا بکا رہ گیا۔ "وہ گاڑی ہے جی... چمکدار... کالے رنگ کی..." ظاہر ہے وہ کاروں کے ماڈل اور فرق کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میں نے ہاتھوں کے اشارے سے کچھ سمجھایا اور پھر اپنی مصوری کی صلاحیت سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ گھر میں کاپی پنسل قسم کی کوئی چیز نہیں تھی مگر کوئلہ وافر مقدار میں موجود تھا۔ میں نے فرش پر ایک ڈرائنگ بنائی اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ میں نے گاڑی کی بہت صحیح تصویر بنائی ہے۔ نوجوان نے سر ہلا کے اقرار کیا کہ سادھو رام کی گاڑی بالکل ایسی ہی ہے۔

رفتہ رفتہ مجھے اس کار کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوگئیں اور میرے شبہے کی گنجائش نہ رہی کہ سادھو رام کی گاڑی وہی ہے جس میں پالو اور نانو کو اغوا کرکے لے جایا گیا تھا۔ سائیں باپڑ والے خود بھی فراڈ تھے اور دیہاتی خرافات کے ماننے والوں کی سادہ مزاجی اور خوش اعتقادی تھی کہ انھوں نے اس لٹیرے کو ڈاکوؤں کے ہاتھوں جہنم رسید ہونے کے باوجود شہید کہنا شروع کردیا۔ وہ خود کچھ نہیں کہتے تھے، وہی کہتے تھے جو مشہور کردیا جاتا تھا اور یہ سائیں باپڑ والے کے چیلوں کی چالاکی کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے فوراً سائیں باپڑ والے کی خانقاہ تعمیر کردی اور اس جگہ نذر نیاز کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ سال کے سال عرس مبارک کا سوانگ رچانے کا موقع الگ ہاتھ آیا۔

سوچنے کی بات یہ تھی کہ سائیں باپڑ والے کی جانشین ایک عورت کیوں بنی؟ یہ سارا کھیل دھوکے بازی کا تھا اور اسے کوئی دھوکے باز ہی جاری رکھ سکتا تھا۔ کیا کربان والی دوسرے مریدوں اور چیلوں سے زیادہ سائیں باپڑ والے کی جانشینی کے قابل تھی؟ اس میں مریدوں سے زیادہ ذہانت اور صلاحیت تھی کہ اسے مجاور اور صحیح گدی نشین تسلیم کرلیا گیا یا دوسرے چالاک مریدوں نے اس کو اپنا آلہ کار بنا رکھا ہے۔ وہ کوئی بے وقوف عورت ہے جو بدمعاشوں کے ہاتھوں میں کھیلنے پر مجبور ہے۔ اگر اس فراڈ کا بھانڈا پھوٹنے کا وقت آیا تو وہ غائب ہو جائیں گے۔ پیچھے وہ جائے گی ایک بھولی، فاتر العقل قسم کی عورت جسے سب نے مجذوب کا درجہ دے رکھا ہے۔ سادھو رام کا اس

www.paksociety.com

جگہ آنا بے سبب نہیں تھا۔ ملاوڈ رائیڈ کمپنی کا ڈونگا پتن سے تعلق ثابت ہو چکا تھا۔ وہاں کوئی جگہ ایسی تھی جہاں نازو اور رابعہ کو لے جایا گیا تھا۔ جس گاڑی میں ان کا جانا ثابت ہوتا تھا وہ سادھو رام کی ملکیت تھی اور سادھو رام ڈونگا پتن سے یہاں آتا تھا تو یہ عجیب سی مثلث بنتی تھی۔ ملاوڈ رائیڈ کمپنی..... ڈونگا پتن اور کرماں والی؟

میں نے کرماں والی کے قریب پہ جانے کا فیصلہ کیا مگر مناسب یہ سمجھا کہ اپنے ارادے کو اپنے میزبان سے پوشیدہ رکھوں۔ یہ نہ ہو کہ میرے عزائم کی خبر مجھ سے پہلے صفدر وحشی تک پہنچ جائے۔

"کیا یہ گاؤں شروع سے کرماں والی کے نام پہ مشہور ہے؟" میں نے کہا۔ "یا پہلے پار پڑ والا کہلاتا تھا؟"

نوجوان تھوڑا سا حیران ہوا۔ "یہ تو ٹھیک ہے، پہلے یہ ایک گاؤں تھا۔ چک دو سو بارہ الف، پھر پار پڑ والا کہلانے لگا۔ مگر ابھی دو سال پہلے سائیں پار پڑ والا کے حکم پہ اسے کرماں والی کہا جانے لگا۔"

"ہلاکت کے بعد ان کا حکم کیا عزرائیل کے ذریعے پہنچا تھا؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "یا وہ کرماں والی کو خواب میں نظر آئے تھے؟"

"وہ خواب میں نظر آئے تھے۔" نوجوان نے برہمی سے کہا۔

"اسی طرح جب کرماں والی کسی دن ماری جائے گی تو اس گدی پہ بیٹھنے کا کوئی کرماں والا یا نصیباں والا..." میں نے کہا۔ "اور وہ جو شروع میں چک نمبر دو سو بارہ الف تھا پھر پار پڑ والا ہوا پھر کرماں والی بنا، کہلانے لگے گا نصیباں والا۔ اچھا میں اب چلتا ہوں۔ تمہاری مہمان نوازی کا بہت شکریہ۔ میری باتوں کا برا مانا ہو تو معاف کر دینا۔"

نوجوان کی ساری خفگی دور ہو گئی۔ "روٹی کھا کے جانا تھا جی۔ اب آپ ڈونگا پتن جاؤ گے؟"

"نہیں بھائی۔ میں لاہور جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "کھانا ابھی تو کھایا ہے۔ اچھا ماں جی اجازت۔"

"اچھا پتر رب راکھا۔ چنگا کلچے وٹی کھا کے جاندا۔" نوجوان کی ماں نے کہا اور میں ان سے اجازت لے کر باہر نکل آیا۔ نوجوان نے مجھے سڑک تک سائیکل پہ لفٹ بھی دی اور اس وقت تک سڑک پہ کھڑا رہا جب تک میں ایک لاری کو روک کر سوار نہیں ہو گیا۔ میری جیب میں اتنی رقم تھی کہ میں آسانی سے لاہور پہنچ جاتا مگر وقت کم تھا۔ میں نے ڈونگا پتن کا ٹکٹ مانگا تو کنڈکٹر نے بہت برا منہ بنایا۔

"یہ کوئی لوکل بس ہے۔ ایک اسٹاپ چڑھ کے اگلے پہ اتر گئے۔ وہ پورا ٹکٹ لاہور تک کا لگے گا۔"

"جو تمہاری خوشی شہنشاہ۔" میں نے [illegible] سے اور اسے پانچ کا نوٹ پیش کر دیا۔ اس نے کسی حساب سے بقایا پیسے لوٹا دیے۔ بس ایک منٹ کے لیے رکی تو میں سڑک پہ کود گیا۔ اب مجھے کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت تھی۔ میں نے اندازے سے ڈونگا پتن کی سمت سفر شروع کیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے ایک گاؤں دیکھا جو کرماں والی کے مقابلے میں قصبہ تھا۔ وہاں اگر دو سو گھر تھے تو یہاں دو ہزار ہوں گے۔ زیادہ فکر مجھے اپنا حلیہ بدلنے کی تھی۔ ایک مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے کھٹاکھٹ کی آواز آئی۔ یہ کھڈی پہ کپڑا بننے کے عمل کا شور تھا۔ میں نے ایک بڈھے کو اندر دیسی کھڈی پہ کام میں مصروف دیکھا۔

"چاچا! بھیوں چاہیدا اے اک لاچا۔" میں نے دہلیز میں سر نکال کر کہا۔ "اسلام علیکم۔"

چاچا نے مجھے گھور کر دیکھا۔ "سلام پہلاں کری دا اے پتر۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے ایک سوتی لاچا اور ایک قمیص صرف چالیس روپے میں دے دیا اور مجھ سے بغیر پوچھے کہ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں اور کدھر جا رہا ہوں۔ میں نے سب کے غلط جوابات دیے اور لاچا بدل کے قمیص لپیٹ کر چل پڑا۔ ایک بار پھر میں نے سابق موضع اور اب کرماں والی کا رخ کیا۔ مجھے ایک کچا راستہ نظر آیا تھا جس کی چکنی مٹی میں سائیکل کے ٹائروں، تانگوں اور بیل گاڑیوں کی آمد و رفت کے نشانات بہت نمایاں تھے۔ درمیانی فاصلہ بہت لمبا تھا اور میں چاہتا تھا کہ کوئی بھی سواری مل جائے۔ دونوں گاؤں کے درمیان چلنے والی واحد تانگہ یکہ بس ہی کی امید تھی مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ وہ سارا راستہ مجھے پیدل طے کرنا پڑا جو کھیتوں اور کہیں کہیں جنگل سے گزرتا تھا۔ مجھے ایک جگہ سانپ بھی نظر آیا جو سڑک پہ سے رینگتا ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اس کے گزر جانے کا انتظار کیا۔ وہ دوسری طرف جنگل میں غائب ہو گیا۔ کسی اور سانپ یا اژدھے سے ملاقات کا مجھے اتنا خطرہ نہیں تھا جتنا راستے سے بھٹک جانے کا۔ جنگل کے سانپ اور دوسرے جانور بھی جو عام طور پہ خطرناک سمجھے جاتے ہیں آدمی سے ڈرتے ہیں جو خدا کی پیدا کردہ مخلوق میں سب سے زیادہ ہلاکت خیز جانور ثابت ہوا تھا اور جب تک کوئی چھیڑا نہ جائے یا وہ مجبور نہ ہو جائیں آدمی کے سامنے خود سہمے رہتے ہیں۔

اب دوپہر ڈھل چکی تھی۔ پیدل چلنے سے میں تھک گیا تھا اور مجھ پر بھوک بھی غالب آنے لگی تھی لیکن میں نے ہر چیز کرماں والی میں کسی کے سامنے نمودار ہونے سے گریز کرنا چاہتا تھا۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر میں نے سمت کا تعین کیا اور اس راہ دوسری جانب سے اس پیپل کے درخت تک گیا جس کے نیچے کرماں والی کا ڈیرا اور سائیں پار پڑ والے کا مزار شریف تھا۔ پیچھے ایک برساتی نالہ آیا جس کے بعد قبرستان تھا۔ یہ گاؤں کا قبرستان تھا چنانچہ اس کی وسعت زیادہ نہیں تھی۔ زیادہ تر قبریں کچی تھیں اور ان پہ کتبے بھی نہیں تھے۔ انہیں لیپ پوت کر اور کنکر پتھروں سے گھیر کر محفوظ رکھنے کی کوشش ناکام ہو جاتی تھی۔ موسمی حالات خصوصاً برسات کی یلغار آدم خاکی کے مٹ جانے کا نقش عبرت بھی مٹا دی جاتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ قبرستان کے بائیں جانب زمین کی بلندی بتدریج بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک فرلانگ کے فاصلے پہ پتھریلی زمین کا آغاز ہو کر سیاہ چٹانوں سے جا ملتا ہے۔ پھر یہ چٹانیں بلند ہونے لگی ہیں اور افق پہ معمولی بلندی کی پہاڑیاں ایک سیاہ لکیر جیسی نظر آتی ہیں۔ اس سمت سے بارش کا ریلا آتا تھا تو نشیب کی سمت سیل آب کچی قبروں کو روندتا ہوا آتا تھا اور یہ پانی برساتی نالے میں بہہ جاتا تھا۔ کچی قبروں کی خستہ حالی کا سب سے بڑا سبب یہی تھا۔

قبرستان سے نکلنے کے لیے میں نے دائیں جانب کا رخ کیا اور درختوں کے اس جھنڈ سے گزرا جس کے بعد پیپل کا وہ بہت بڑا درخت تھا جو رنگ برنگے جھنڈوں سے سجا ہوا تھا۔ وہ ایک مختصر سا جنگل تھا جس کی وسعت دائیں اور بائیں طرف ایک ایک فرلانگ سے بھی کم تھی مگر زیادہ تر درخت شیشم اور پیپل کے یا ان جیسے تھے۔ وہ ایک بالکل نیم کی طرح کا درخت تھا اور معلوم نہیں کس فرق کے باعث مقامی لوگ اسے دریک کہتے تھے۔ سب اونچے مضبوط تنوں والے درخت تھے جن کی شاخیں زمین سے تقریباً پندرہ بیس فٹ اوپر جا کے پھیلتی تھیں۔ بلند شاخیں ہوتے ہوئے تنوں کی طرح تھیں اور ان سے پھوٹنے والی شاخوں کا سلسلہ چوٹی تک یوں پھیلتا تھا کہ ہر شاخ سے دو شاخیں پھوٹتی تھیں جو چھوٹی اور پتلی ہوتی جاتی تھیں اور ان کے پتے چاروں طرف ایک سر سبز چھتری سی تان دیتے تھے۔ درختوں کے درمیان زمین کی سطح ہموار اور صاف تھی۔ تنے کسی عمارت کو سہارا دینے والے ستونوں کی طرح لگتے تھے اور ان پہ کہیں کہیں شاخیں ایک دوسری میں مل جاتی تھیں کہ گھنے تنوں کا سائبان سا بن جاتا تھا جس میں سے آسمان کی جھلک بھی نہیں نظر آتی تھی۔ چنانچہ نیچے روشنی کم تھی اور ایک مہیب خاموشی کا یہ جنگل گرد و نواح کے روشن علاقے کے مقابلے میں تاریک محسوس ہوتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے نیچے خودرو نباتات کی کمی تھی۔

اچانک مجھے درختوں کے بیچ میں کھلی ہوئی گھاس اور جلے ہوئے پودوں کے ساتھ ٹائروں کے نشانات نظر آئے۔ میں نے جھک کر دیکھا تو مجھے یہ نشانات تازہ لگے کیونکہ پھول اور پتیاں ابھی خشک نہیں ہوئے تھے حالانکہ ان کے نازک تنے اور باریک ٹہنیوں جیسی شاخیں پس کر الگ ہو گئے تھے۔ کوئی گاڑی ابھی ابھی اس جگہ سے گزری تھی۔ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے سے۔ اس سے زیادہ وقت گزرا ہوتا تو پھول اور پتیاں کملا چکے ہوتے اور ان کے رنگ پھیکے پڑ گئے ہوتے۔ میرے خیال کی تصدیق آگے جانے سے بھی ہوئی۔ بھاری ٹائروں کے نشان زمین پہ نقش چھوڑ گئے تھے اور ایک ہی سمت کی نشاندہی کرتے تھے۔ ایک جگہ یہ نشان اتنے نمایاں تھے کہ میں نے ٹائروں کے پرنٹ کی چوڑائی دیکھ لی۔ یہ میری ایک بالشت سے زیادہ تھی۔ اتنے چوڑے ٹائر کسی ٹرک کے ہی ہو سکتے تھے۔ میں الجھن میں پڑ گیا۔ پلٹ کر دیکھنے پہ مجھے درختوں کا درخت نظر آئے۔ سب کی غور کرنے پہ میں نے اندازہ کیا کہ ایک ماہر ڈرائیور اتنی درختوں میں سے راستہ نکال سکتا ہے۔ بے شک اس کا راستہ سیدھا نہیں ہو گا۔ اسے دائیں بائیں نظر رکھتے ہوئے ایسے درخت تلاش کرنے پڑتے ہوں گے جن کی شاخیں ٹرک کی راہ میں حائل نہ ہوں اور جن کے درمیان سے بھی ٹرک کو گزارا جا سکتا ہو۔

ذرا سی دیر میں وہ راستہ بھی میری نظر نے تلاش کر لیا۔ اس پورے راستے پہ ٹرک کے بھاری پہیوں کے گزرنے سے جو نقش باقی رہ گئے تھے وہ خود راستے کی نشاندہی کرتے تھے مگر جو بات میں نے نوٹ کی وہ مختلف درختوں پہ جگہ جگہ نظر آنے والا زرد رنگ تھا۔ کہیں کہیں درختوں کے تنوں پہ زمین کی سطح سے دس فٹ اوپر گہرے اور شوخ زرد رنگ کا چکیلا دائرہ بنا ہوا تھا۔ مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ فلورسنٹ پینٹ تھا جو اندھیرے میں روشنی پڑنے پہ روشن نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ یہ زرد دائرے رات کے وقت آنے والے ٹرک کو صحیح راستہ دکھانے کے لیے بنائے گئے تھے۔ اندھیرے میں ٹرک کی ہیڈ لائٹس سے یہ دائرے روشنی کے سگنل نظر آتے ہوں گے اور ٹرک آدھی رات کے بعد آتے ہوں گے گاؤں کے لوگ تو زیادہ سے زیادہ عشاء کی نماز پڑھنے تک جاگتے تھے۔ اب میں نے محتاط ہو کے آگے بڑھنا شروع کیا۔

کرماں والی کا ڈیرا ایک پختہ عمارت تھی۔ اس کے لیے اینٹیں، سیمنٹ اور راج مزدور سب شہر سے لائے گئے

www.paksociety.com

ہوں گے۔ عمارت کے دو حصے تھے۔ سامنے والا حصہ ایک بڑے اور اونچی چھت والے حصے پر مشتمل تھا جس کے چار کونوں پر چار چھوٹے گنبد تھے اور وسطی گنبد کے ساتھ یوں لگتے تھے جیسے تربوز کے چاروں طرف چار سیب رکھے ہوں۔ اس پوری عمارت پر سبز رنگ تھا جو عام طور پر پاکیزگی اور طہارت کا مظہر سمجھا جاتا ہے مگر یہاں اس کا مقصد عمارت کو کیموفلاج کرنا معلوم ہوتا تھا تاکہ گھنے سبز درختوں میں یہ سبز عمارت دکھائی ہی نہ دے۔ عقبی حصے میں ایک بہت بڑا سیمنٹ کا پلیٹ فارم سا تھا جو میرے اندازے کے مطابق پچاس گز لمبا پچاس گز چوڑا اور زمین کی سطح سے ایک گز اونچا تھا۔ اس پلیٹ فارم پر سبز عمارت کی عقبی دیوار کا ایک دروازہ کھلتا تھا جو اس وقت بند تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کسی خانقاہ کے ساتھ اس قسم کے پلیٹ فارم کا کیا مصرف ہو سکتا ہے۔

مجھے عمارت کے آس پاس کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا لیکن میں قریب جانے سے احتراز کر رہا تھا۔ نہ جانے اس میں کیا بات تھی جس نے میرے قدم روک لیے۔ بظاہر ایک غیر معروف گاؤں کی اس غیر معروف خانقاہ میں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن میری چھٹی حس خطرے کی بو واضح طور پر محسوس کر رہی تھی۔ میں نے اپنی قوت مشاہدہ یا سراغرسانی کے باعث بہت سی غیر معمولی باتیں دریافت کر لی تھیں۔ ایک یہ کہ قبرستان اور جنگل کی سمت سے یہاں ٹرک آتا ہے۔ ابھی یہ معلوم کرنا باقی تھا کہ ٹرک کیوں آتا ہے؟ پھر یہ کہ ٹرک اس خفیہ اور پوشیدہ راستے سے معمولات کے وقت آتا ہے اور ٹرک کو یہاں لانے والے اتنے ہوشیار ہیں کہ انھوں نے تاریک جنگل میں روشن ہو جانے والے نشان لگا رکھے ہیں جو دن میں کسی دیہاتی کے لیے شک کا باعث نہیں بن سکتے۔ لیکن اس طرح ٹرک کو سیدھے اور آسان راستے سے لانے کے بجائے مشکل اور پوشیدہ پیچیدہ راستے سے لانے کا مقصد بھی نیک نہیں ہو سکتا۔ میری ناقص معلومات کے مطابق مرحوم سائیں پاڑے والے بھی کوئی نیک مقصد حیات نہیں رکھتے تھے۔ کیا وہ پیری فقیری کے ڈھونگ اور سونے چاندی کے پائپ جمع کرنے کے علاوہ بھی کوئی خفیہ اور خطرناک کاروبار کرتے تھے۔ لگتا ہے ماچھی کی جعلی خانقاہ کا راز فاش ہو جانے کے بعد مجھے سائیں پاڑے والے کا مزار شریف بھی بالکل شریف نہیں لگ رہا تھا یہاں کچھ اور بھی ہو رہا تھا......
ڈونگا چن کا سادھو رام یہاں عقیدت مندین کے صرف چراغ جلانے کے لیے نہیں آتا تھا۔

قدرتی طور پر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ سائیں پاڑے والے کی "شہادت" میں ڈاکوؤں کے علاوہ بھی کسی کا ہاتھ ہو... فعل یا غلط فہمی کے باعث سائیں پاڑے والے کو بھی... ان کی خودکشی "کرادی گئی" ہو یا بہتر سمجھا گیا ہو کہ اب... بنا دیا جائے۔ بعض اوقات زندہ پیر سے مردہ پیر زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

ابھی میں گھنے ماچھی سے ڈونگا چن کے سادھو... کریاں والی کے قریب تک سب کے درمیان مقامات... مشترک رستے کو تلاش ہی کر رہا تھا کہ کسی گاڑی کا... میں فوراً درختوں کے پیچھے ہو گیا جن کے تنوں کے درمیان ایک قدِ آدم جھاڑی پھیل گئی تھی۔ آواز بہت دور سے آرہی تھی مگر میرے کانوں نے اس کی سمت کا صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ میرے ہی دریافت کردہ راستے سے کریاں والی کے قبرستان کی طرف آرہا تھا چنانچہ اس کی رفتار بہت کم تھی۔ جب... اسے دیکھا تو ٹرک بڑی احتیاط کے ساتھ... کے درمیانی تنگ راستے سے نکل رہا تھا اور ڈرائیور... والے درخت سے بچا کے دائیں جانب موڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بیڈفورڈ ٹرک تھا جس کا پچھلا حصہ ایک... طرح تھا۔ اس حصے پر لکڑی کے کئی باکس ایک دوسرے پر... گئے تھے۔ سب باکس ایک ہی سائز اور ایک... تھے۔ سب کی لمبائی میرے اندازے کے مطابق چھ فٹ... دو فٹ تھی۔ ہر باکس آتا ہی... چنانچہ یہ سب... لگتے تھے۔ صندوقوں کو لمبائی کے رخ ٹرک پر لادا گیا تھا۔

ٹرک میرے سامنے تقریباً دس فٹ دور سے گزرا تو... نے دیکھا کہ لمبائی کے رخ تین تابوت نما باکس رکھے گئے... چوڑائی کے رخ مجھے چار باکس نظر آئے۔ ہر باکس کے اوپر... باکس تھے۔ اس طرح میرے حساب سے ٹرک میں... لدے ہوئے تھے۔ کسی بھی نوعیت کے سامان کی... ٹرانسپورٹ کے لیے یہ بہت عجیب سائز کے صندوق... پھل، انڈے اور سبزیاں بہت چھوٹے کریٹوں میں... بھیجے جاتے ہیں۔ مشینری بھی باہر بھیجی جائے یا باہر سے... تو ان کے باکس تابوت نما نہیں ہوتے اور کریاں والی... کا مشینری کی درآمد یا برآمد سے کیا تعلق؟ ایک قابل غور... یہ بھی تھی کہ سب باکس بڑی اچھی لکڑی سے اور بہت... کے ساتھ بنائے گئے تھے۔ اگر ان پر سیاہ رنگ کر دیا جاتا... تابوت تیار کیے جاتے اور کسی بھی ملک کے... سے گزارے جا سکتے تھے بشرطیکہ ان میں لاش کا بوجھ... ٹرک میرے بائیں ہاتھ پر بیس فٹ دور...

...نے اسے ٹیرس میں ڈال کے گھمایا اور اس کا پچھلا حصہ پلیٹ... فارم سے لگا دیا۔ اگلے حصے سے ڈرائیور کے علاوہ دو آدمی اترے... سائیں پاڑے والے کے مزار کا عقبی دروازہ کھلا اور دو افراد سبز... لباس پہنے نکلے۔ اس وقت میں نے غور کیا کہ ڈرائیور... کے ساتھیوں نے بھی سبز کپڑے پہن رکھے ہیں۔ صندوقوں کے... اوپر بھی سبز رنگ ہے اور ٹرک پر بھی۔ یہ سب کیموفلاج کرنے... کے لیے تھا اور یہ سب دور سے دیکھنے والے کو جنگل میں ہونے... والی کارروائی نظر نہیں آ سکتی تھی۔ ٹرک میں سے... اترنے والے دونوں ٹرک پر چڑھ گئے تھے لیکن خود ڈرائیور اپنے... ہاتھ میں اسٹین گن لیے مستعد کھڑا رہا۔ اس کی نگاہ ہر طرف تھی۔... دیکھتے ہی میں نے اسے شناخت کر لیا۔ وہ گھنے ماچھی... اصلی خانقاہ کے سامنے والے ہوٹل کا پروپرائٹر تھا جس سے... اور نانو کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔... کی حیثیت سے جو دیکھا تھا سب بتا دیا لیکن...

بعد میں... جانے کے بعد... کے بارے میں... کی شکایتوں کو تمام معلومات فراہم کر دیں۔... ایک شکاری ہاتھ سے تعاقب میں آیا اور پھر گروہ... کامیاب ہو گیا۔

ٹرک پر چڑھنے والے دونوں مزدوروں نے باری باری ہر باکس... اٹھایا اور ان دو افراد کے حوالے کرنا شروع کیا جو سائیں پاڑے... کے مزار سے نکلے تھے۔ صندوقوں کے دونوں جانب کنڈے...

...مزدوروں کے چہرے دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ باکس بھاری ہیں۔ ان کے بازوؤں کے پٹھے کھنچ جاتے تھے تو اس... مشقت سے ان کے چہرے بھی سرخ ہو جاتے تھے۔ یہی کیفیت... کی تھی۔ وہ بوجھ کو سنبھالتے ہوئے... اندازہ تھا کہ اگر ہر باکس کا وزن ایک من ہوتا تو وہ صحت مند افراد... کے لیے زیادہ نہیں تھا لیکن جتنی مشقت انھیں کرنی پڑ رہی تھی... اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وزن کسی طرح بھی دو من سے... کم نہ تھا۔ ہر باکس پیچھے آتے جاتے تھے انھیں وہی دو افراد... مزار کے اندر لے جاتے تھے۔ ابھی پہلا باکس اترا بھی... تھا کہ ایک اور موٹر کے انجن کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز... ٹرک کے انجن کی آواز کے مقابلے میں دھیمی تھی۔

...کی طرف سے جہازی سائز کی شیورلیٹ اسٹیشن... پلیٹ فارم کے قریب جا رکی۔ جب کار میرے سامنے... بہت قریب سے گزری تھی۔

وہ لیفٹ ہینڈ ڈرائیو کار تھی اور ڈرائیور کی صورت اسی کھڑکی میں نمایاں تھی۔ چہرہ شناسا تھا جسے دیکھتے ہی میرے ذہن کو دوسرا زیادہ شدید جھٹکا لگا کیونکہ سادھو رام کی گاڑی میں مجھے کوئی روایتی قسم کا ہندو نظر نہیں آیا تھا جس کے گنجے سر پر چوٹی ہوتی، ماتھے پر تلک اور گلے میں جنیو ہوتا اور جو صاف ستھری دھوتی اور کھڑاؤں پہنے ہوتا۔ وہ سوٹ میں تھا اور مجھے اس کو پہچاننے میں ذرا دیر نہیں لگی۔ اسی شخص نے مجھے ڈونگا چن کے بارے میں بتایا تھا کہ وہاں گاڑی نہیں جا سکتی اور پیدل پہنچنا مشکل ہے۔ چنانچہ محسن اور نینا مجھے ٹیکسی میں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور میں فیٹ آگے جا کے اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے آیا تھا۔ وہ بھی ایک تھکا ہوا تھا جو مجھے لے جانے والوں کا مددگار رہا تھا۔ میرے ذہن میں سادھو رام کی یہ صورت مگر نہ تھی اور اب مجھے بالکل شبہ نہ رہا کہ سادھو رام کا ظاہر اور باطن ایک مکر و فریب ہے۔

سادھو رام گاڑی سے اترا اور پلیٹ فارم کے چند زینے چڑھ کر عقبی راستے سے پاڑے والے کے مزار کی عمارت میں داخل ہو گیا مگر حسب دستور باکس اٹھا اٹھا کے اندر پہنچائے جاتے رہے۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ اس عمارت میں جو سائیں پاڑے والے کے مزار مبارک اور کریاں والی کی کرامت کے باعث مرجع خلائق ہے اتنا سامان کہاں رکھا جا سکتا ہے اور کیسے رکھا جا سکتا ہے۔ پھر یہ کہ مزدور ایک پھیرا تقریباً چھ منٹ میں پورا کر رہے تھے۔ اگر انھیں باکس اندر چھوڑ کے آنا ہوتا تو یہی کام اس سے نصف وقت میں ہو جاتا۔ زیادہ وقت اس لیے صرف ہو رہا تھا کہ وہ باکس کو نیچے لے جا رہے تھے۔ انھیں سیڑھیاں اتر کے کسی تہ خانے میں پہنچانا پڑتا تھا اور جو کچھ میرے سامنے تھا اس سے میں یہی اندازہ کر سکتا تھا کہ اوپر سے جو سیمنٹ کا مضبوط پلیٹ فارم نظر آتا ہے وہ درحقیقت ایک تہ خانے کی چھت ہے۔

خالی ہو جانے والا ٹرک روانہ ہو گیا مگر کار وہیں کھڑی رہی۔ تقریباً دس منٹ بعد سادھو رام پھر نکلا لیکن اس مرتبہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جس نے سر پر ایک میکسی ٹائپ سبز چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ کوئی بہت عمر رسیدہ عورت نہیں تھی لیکن وہ جید صحت مند تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ ضرور تھا اور جسمانی طور پر وہ چاق و چست نظر آتی تھی مگر اس کے چوغے نے جسم کے خد و خال کو چھپا رکھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ عورت کی قد و قامت و وضع بھی ایک مجلسی ہے۔ اچانک مجھے آسمان کی طرف سے عجیب قسم کی آواز سنائی دی۔ سادھو رام فوراً اٹھا کے اوپر دیکھنے لگا۔

یہ آواز مجھے بھی اپنے پیچھے جنوب مشرق کی سمت سے سنائی دے رہی تھی اور یوں لگتی تھی جیسے کوئی بغیر سائلنسر والی موٹر سائیکل چلا رہا ہو۔ جیسے جیسے آواز قریب آتی گئی اس کی شناخت نمایاں اور واضح ہوتی گئی۔ یہ کوئی ہیلی کاپٹر تھا۔ میں نے خود کو گھنے درختوں کے سائبان کے نیچے اس طرح چھپا لیا کہ اوپر سے پائلٹ یا اس کا کوئی ساتھی دوربین لگا کے دیکھتا تب بھی میں نظر نہ آتا۔ نیچے سادھو رام اور گرو سے ملنگ کے پیچھے والی صحت مند عورت اب آپس کی باتیں چھوڑ کر ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھ رہے تھے جو جنوز میری نظر سے اوجھل تھا۔ عورت کے بارے میں یہ فرض کرنا غلط نہیں تھا کہ وہی مرتا پیر سائیں بابا پڑا والے کی اس خانقاہ کی گدی نشین کرماں والی ہوگی۔ سادھو رام کے اور ان کے درمیان کوئی بہت بڑا اسرار قسم کا تعلق تھا جس کو سادہ دل دیہات کے رہنے والوں نے سادھو رام کی عقیدت مندی سمجھا تھا میرے سامنے ایک مرتبہ سادھو رام نے اس کی طرف کے گرد اپنا ہاتھ حمائل کرنے کی کوشش کی تھی مگر کرماں والی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔ اب وہ مجسم تصویر انتظار و اشتیاق بنے کسی تیسرے فریق کے بے چشم براہ تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ آنے والا کون ہوگا چنانچہ وہ متحیر زدہ تھے اور نہ خوفزدہ۔

سیمنٹ کے وسیع و عریض پلیٹ فارم کی تعمیر کا ایک مقصد بھی پورا واضح ہو چکا تھا۔ یہ ایک ہیلی پیڈ تھا اور یہاں ہیلی کاپٹر کو حفاظت سے اتارنے کا پیشہ ورانہ لیست کسی غیر معمولی ضرورت کے تحت تیار کیا گیا تھا۔ جب ہیلی کاپٹر قریب آیا تو میں نے اس پر بنے نشان کو آسانی سے پہچان لیا۔ یہ ایک پڑوسی دشمن ملک کا فوجی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والا ہیلی کاپٹر تھا۔ جس نے اسے یہاں دیکھا ہو انہیں بھی پڑھنا اور آنکھیں بند کرکے زیر لب کئی بار دہرایا تاکہ۔۔۔ ذہن نشین ہو جائے۔ ہیلی کاپٹر نیچے اترنے لگا۔ سیمنٹ کے اس پلیٹ فارم یا ہیلی پیڈ کے آس پاس سے درخت یقیناً صاف کر دیے گئے تھے۔ سادھو رام نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کے آنے والوں کو خوش آمدید کہا یا انہیں تسلی دی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔

میں نے اس شور سے فائدہ اٹھایا جو ہیلی کاپٹر کے اترنے اور درختوں کے پتوں کے تیز ہوا میں ہلنے سے پیدا ہو رہا تھا۔ اس وقت سادھو رام اور کرماں والی کی ساری توجہ بھی ہیلی کاپٹر کی طرف تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور ہیلی پیڈ کے سب سے قریبی جھاڑ جیسے درخت کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا۔ اب وہ مجھ سے دس بارہ قدم کے فاصلے پر تھے اور میں ان کی گفتگو سن سکتا تھا۔ خطرہ مجھے صرف یہ تھا کہ کہیں ان پر میری موجودگی کا راز فاش نہ ہو جائے۔ ایک چھینک بھی ایسے وقت میں بم کے دھماکے سے کم تباہ کن ثابت نہ ہوتی۔ میں بالکل خالی ہاتھ تھا اور ان کا مسلح ہونا مجھ سے بالاتر

تھا۔ مگر وہ مجھے خفیہ ہاتھ کی طرح استعمال کرتے قریب دروازے کو بلا توقف تباہ بھی کر دیتے۔ وہ جنگل کی زمین تھی جس پر حشرات الارض کا بسیرا تھا۔ کوئی دل اور ہمدردی میں ہمت کرکے بچا۔ کسی کے کاٹ لیتا تو اس کی یہ حماقت مجھے بہت مہنگی پڑتی۔ بعد میں ان کیڑوں سے دس بار کاٹنا چاہتا تو مجھے اعتراض نہ ہوتا۔

ہیلی کاپٹر کے اوپر گھومتے دانو (پنکھے) ابھی تک گھومتے جا رہے تھے۔ جانے کے بعد بھی کچھ دیر گھومتا رہا۔ اس کے تھمتے ہی دروازہ کھلا۔ مدہک کوتاہ تنو آنے والے کو ٹھیک پکھے کی نشاندہی کی ہیلی کاپٹر سے ایک بلند قامت، صحت مند اور بیابانی پال پوش والا شخص پہلے اترا اس نے گرے سے تعلق رکھنے والے آدمی کی قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ کلین شیو تھا اور اس کے بال کٹے ہوئے۔ چنانچہ اس کی عمر کا اندازہ مشکل کام تھا۔ وہ چالیس سال کا ہو سکتا تھا اور پچاس سے زیادہ کی عمر کا بھی۔ اچھی صحت کا وہ جوان، جوشیلا اور مستعد نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آرام کی پتلی سی سیاہ چھڑی تھی جس کے سرے پر گولڈ کا چمکیلا دھات کی منقش ٹوپی چڑھی ہوئی تھی۔ اسے وہ عادتاً اپنی پتلون کے پائنچوں کو جھاڑتا تھا۔ یہ چھڑی اس کے فوجی ہونے کی علامت تھی۔ اس کے بال بھی فوجی طرز کے تھے۔ اس کی چال میں فوج کی افسری کا نظم و ضبط بھی تھا اور وقار بھی۔ سادھو رام کے قریب پہنچ کر اس نے چھڑی کو ایک خاص انداز سے بائیں جانب بغل میں دبا لیا۔ یہ بھی ایک غیر شعوری حرکت تھی۔ چونکہ میں بہت توجہ اور انہماک سے سب دیکھ رہا تھا اس لیے یہ باتیں خود میری نظر میں آ گئیں۔

”نمستے کرنل صاحب!“ سادھو رام نے دونوں ہاتھ جوڑ کے کہا اور خوشامدانہ انداز میں مسکرایا۔

”ہیلو سادھو رام!“ کرنل نے دایاں ہاتھ بڑھا کے مصافحہ کیا۔ ”کیا حال ہے؟“

”سب بھگوان کی کرپا ہے۔“ سادھو رام نے کہا۔

”آپ خیریت سے ہیں کرنل جگن ناتھ؟“ کرماں والی نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کے ہاتھ کی گرم جوشی اور اس کی آواز کا لوچ محسوس ہوا۔ اس کے لہجے میں بولتی تھی جو سمجھتی تھی کہ اس کی ناز آفرین شوخی کے بارے میں۔

”اچھا ہا کماری تو مائی سویٹ گرل!“ کرنل جگن ناتھ نے

اسی لمحے میں نے سادھو رام کا چہرہ دیکھا جو کوشش کر کے جذبات کو چھپانے سے قاصر رہا تھا۔

”اس بار تو بڑی دیر کی مہربان آتے آتے۔“ کسی روٹھی محبوبہ کے شکوے کے لہجے میں کہا جب سے پلٹ کر

آپ کے لیے تو اس بار آتے ہوئے گزاری ہیں۔

”واپس ساری بات کو مناسب وقت اور موقع ملنے پر چھوڑیے۔ یہ کہ مجھے زمین لینڈ سے واپسی میں تاخیر ہوئی۔ بہرحال شیڈول اب نیٹ ہو گیا۔“

”زمین لینڈ کی صورت حال کیا ہے کرنل صاحب؟“ سادھو رام نے خیز لہجے میں مسکرایا۔

”حالات بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔“ کرنل نے کہا۔ ”سنہرے ریشے کے نایاب ریشہ دوانیوں کی سرزمین ہے۔ وہ ہیج بچ زمین لینڈ بن جاتی ہے۔ ایک تو وہاں یہ سوکر لیتی ہے جو سب ٹھیک ہے۔ آزادی جا رہی ہے۔ پھر مقامی انتظامیہ ہے جو اپنے طور پر تخریب کاری سے نمٹنے میں ناکام ہے۔ کس کس کو بچائیں اور کہاں کہاں حفاظتی دستوں کو بھیجیں۔ ہمارے لیے سب سے زیادہ موزوں وہی نیم فوجی گوریلا تنظیمیں ہیں جن کی قیادت علیحدگی پسند کرتے ہیں۔ مختلف مقامات پر آتش زنی کرنے والے۔ اس کے علاوہ جھتہ دیگ یعنی طلبا کی تنظیم جو صدر جوشیلی اور جذبات کے سیلاب میں بہہ جانے والی ہے۔ ہمارے مقاصد کے لیے کام کرنے والوں کے لیے سب سے موثر آزادی تحریک فیڈ ہی ہیں جن کی استحصال اور استعمار کے نعروں سے کسی بھی سمت موڑا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ کمی باسی، شمالی باسی اور دیسی کمیونسٹوں کے گروپ جو اپنے اپنے علاقوں میں ہمارے ایجنڈا کو ہاتھوں میں رکھتے ہیں چنانچہ خانہ جنگی اور مار کاٹ کے اسباب پیدا کرتے ہیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں سادھو رام کہ وہ خطۂ زمین اب کسی کا نہیں اور سب کا ہے۔ حکومت کسی کی نہیں جنگجو سب حاکم ہیں...

سلوس میں آسام اور دوسری ریاستوں کے درمیان محاذ آرائی کا آغاز کیا ہوگا۔ ہم تو اس صورت حالات کو ایک ایسی ہولی جلانے میں مدد دیتے ہیں جہاں کسی ایک فریق کی طرف سے ہم کو براہ راست مداخلت کرنے کی دعوت ملے۔ اور ظاہر ہے ہم دعوت قبول کریں گے جو غالب ہو۔ ہمارے مفادات کا تحفظ کر سکے۔“

”آپ کو بھگوان کی آشیرواد حاصل ہے کرنل صاحب! ایک دن آپ جنرل ہوں گے اور وہ دن دور نہیں ہے۔“ سادھو رام نے کہا۔

”میں سادھو رام! یہ کام بہت مشکل ہے۔ ابھی ایک مزاحمت کی قوت بہت زیادہ ہے۔“ کرنل جگن ناتھ نے کہا۔ ”مذہبی جنون، جمہوریت اور روشن خیالی کا جدید ہونا... کیا معاملہ ہے ہم تو خود کو پاکستانی سمجھتے ہی تھے... تم نے کیا کچھ کیا ہے؟“

”مندر کے سامنے کیا وہ آپ کی توقع سے زیادہ ہی ہوگا۔“ کرماں والی نے کہا۔

”ویری گڈ۔ میں اس دفعہ زیادہ توقعات لے کر آیا تھا۔“ جگن ناتھ نے کرماں والی کے شانے پر ہاتھ رکھ کے مسرت کا اظہار کیا۔ ”دراصل مجھے گزشتہ بار اپنے حریف کرنل راما راؤ کے مقابلے میں شرمندگی ہوئی۔ وہ راجستھان کی طرف سے تم لوگ نکال دیا جاتا کہ وہ راستہ زیادہ لمبا اور دشوار گزار ہے۔“

”اس راستے پر نگرانی اتنی کڑی نہیں ہے کرنل صاحب۔“ سادھو رام نے کہا۔ ”ریگستانی سرحد سے دن میں اونٹ بھی گزر جائے تو کچھ علاقہ کوئی نہیں ہوتا۔ میلوں تک غیر آباد علاقے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر سادھو رام تم خود سوچو کہ ہم کتنا رسک لے کر آتے ہیں۔“ کرنل جگن ناتھ نے ایک سگار سلگا کے کہا۔ ”بعض دفعہ لو لیول پر فلائنگ کرنی پڑتی ہے کہ راڈار کی آنکھ سے محفوظ رہ سکیں۔ پھر بھی اس ہیلی کاپٹر کی آواز تو رہتی ہے۔ ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ بارڈر پر ٹرول نے سن لی تو وہ صرف ایک فائر کریں گے۔ یہ کوئی میزائل نہیں ہے۔ اینٹی ایئر کرافٹ گن سے اس کا نشانہ لینا اتنا ہی آسان ہے جتنا میں تمہارے پستول سے تمہارے دل کا نشانہ لیتا۔“

”میرا دل تو پہلے ہی نشانہ بن چکا ہے جگن ناتھ۔“ عورت ہنسی۔

”اس مرتبہ آپ کرنل راما راؤ کے مقابلے میں زیادہ فائدے میں رہیں گے۔“ سادھو رام نے جلدی سے کہا۔

”ایڈ جسٹ... یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس بار تمہیں بہت زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی امید ہے۔ تم بہت لالچی ہوتے جا رہے ہو سادھو رام۔“ کرنل جگن ناتھ نے کہا۔

”صرف مجھے تو الزام نہ دیں کرنل صاحب۔“ سادھو رام نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”جب آپ زیادہ مال لے کر جائیں گے تو کیا آپ کو زیادہ فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ کو بھی تو وہی لوگ پیسہ دیتے ہیں۔ وہ بھی ضرورت مند ہیں اور ہم بھی۔ آپ دو ضرورت مندوں کے درمیان کمیشن ایجنٹ بنے ہوئے ہیں کہ ادھر کا مال ادھر پہنچا دیتے ہیں۔ ہمیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کو کیا دیتے ہیں۔ اور ہمارا منافع زیادہ ہے یا آپ کا کمیشن؟“

”تم بنگالی کا بہت سا معلوم ہوتے ہو سادھو رام۔“ کرنل جگن ناتھ نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

”آپ کو غلط بات نہیں کہنی چاہیے کرنل صاحب!“ سادھو رام بولا۔ ”لالچی ہم ہیں تو آپ کون سی ملک و قوم یا انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور کیا آپ کا یہی کام ہے جو آپ پیسہ کمانے کے لیے کرتے ہیں۔ ہزاروں کرنل صرف تنخواہ لیتے ہیں۔“

”شٹ اپ!“ کرنل جگن ناتھ نے بجھ جانے والے سگار کو دور پھینک دیا۔ ”میں یہاں کر رہا ہوں جو مجھ سے کرنے کو کہا گیا

www.paksociety.com

ہے اور یہ ایسا کام نہیں ہے جو میرا ایجنٹ کر سکے۔ یہ انٹیلی جنس کا مشن ہے اور میں کاؤنٹر کے آپریشن پلان کرتا ہوں۔ کیا تم کو معلوم ہے کہ میں کتنے خطرات مول لیتا ہوں۔ میں ہر جگہ جان ہتھیلی پر رکھ کے پھرتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری کامیابی کا انعام کیا ہے ایک میڈل، تھوڑی سی عزت یا محض تعریف۔ لیکن میری ناکامی کی سزا بہت سخت ہے۔ خواہ میں سرحد کے اُدھر پکڑا جاؤں یا اِدھر۔ تم کیا کرتے ہو؟ میرے دیے ہوئے پیسے سے اسلحہ خریدتے ہو اور بس۔ تمہارے لیے کوئی رسک نہیں ہے۔"

"یہ تم کہہ سکتے ہو مگر اپنا رسک میں جانتا ہوں۔" سادھو رام نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں ہندو ہوں اور میری وفاداری پہلے سے ہی مشکوک ہے۔ میرے بارے میں ایک اطلاع کافی ہے جو تم ہیں دے سکتے ہو۔ میں ملک کا غدار ہوں۔ مجھے کتے کی موت مار دیا جائے گا اور تمہارا دیا ہوا پیسہ مجھے نہیں بچا سکے گا۔ قانون کی سزا سے پہلے ہی لوگ میری تکا بوٹی کر دیں گے جو آج مجھے سلام کرتے ہیں۔"

"میرے خیال میں تم دونوں خواہ مخواہ کی بحث میں الجھ گئے ہو۔" کرپال والی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "کیا فائدہ ان باتوں سے، چلو اندر چل کے بیٹھتے ہیں۔"

"تو یہاں مجھے اچھا لگ رہا ہے۔" کرنل جگن ناتھ نے کہا۔ "تم یہاں کافی لا سکتی ہو ڈارلنگ؟"

"وعدہ کرو کہ تم دونوں پھر کوئی جھگڑا نہیں کرو گے۔" کرپال والی مسکرائی۔ "بلکہ بہتر ہوگا کہ اگر تم نیچے بار روم کا اندازہ کر لو تاکہ میں کافی بنا کے میں باہر ہی لے آتی ہوں۔"

"ناٹ اے بیڈ آئیڈیا۔" کرنل مسکرایا۔ "چلو سادھو رام اب بزنس کی بات پہلے ہو جائے۔"

وہ تینوں سامنے باہر والے کی خانقاہ کا عقبی دروازہ کھول کے اندر چلے گئے۔ جو کچھ میں نے سنا تھا اور دیکھا تھا، وہ حقائق کی منہ بولتی تصویر تھا۔ کرپال والی اور سادھو رام ملک دشمن ایجنٹ تھے اور وہ لوہے کے مال کو کرنل جگن ناتھ کے ہاتھ بیچتے تھے۔ وہ اس کی قیمت ادا کرتا تھا اور اسے بھارت کے راستے مشرقی بنگال کے علیحدگی پسند تخریب کاروں تک پہنچاتا تھا۔ تخریب کار غیر ملکی قوتوں کے آلہ کار تھے اور انھیں سرمائے کی کمی نہیں تھی چنانچہ لوہے کا مال دھڑا دھڑ بک رہا تھا۔ کرپال والی اور سادھو رام کے خزانے بھر رہے تھے اور اگرچہ کرنل جگن ناتھ اپنی حکومت کی پالیسی اور ہدایات کے مطابق کام کر رہا تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اس مشن سے بے حساب مالی فوائد بھی حاصل کر رہا تھا مگر اس کو پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ جو بات اب تک ایک خیال تھی یا مفروضہ تھی، وہ اچانک حقیقت بن کے میرے سامنے آ گئی تھی اور میں خوفزدہ

بیٹھا تھا۔

خوف مجھے اپنی جان کے جانے کا نہیں تھا۔ اس وقت رابعہ یا محسن اور اپنے سب دوستوں کی زندگیوں کو لاحق خطرات کے احساس سے بھی بے نیاز تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر خوفزدہ ہو رہا تھا کہ کرنل جگن ناتھ یا ماما راؤ کے علاوہ کتنے وطن دشمن اپنے پیچھے طاقت سے اور اپنے مذموم سیاسی عزائم کی تکمیل کی خاطر پیسے کے زور پر ملک کے دو حصوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی سازش میں مصروف ہیں۔ کتنی کرپال والی جیسی پُر فریب عورتیں اور سادھو رام جیسے کتنے وطن فروش دولت کی ہوس میں غداری کر رہے ہیں۔ انھی لوگوں نے مشرقی پاکستان کو کہا تھا جہاں ہر طرف علاقائیت کی مدد انتشار پسند قوتیں برسرِ پیکار تھیں۔ وہ صحافی جو محب وطن بنگالیوں کو شکست دے رہے تھے، نا پختہ ذہن رکھنے والے طلبا کی صفوں میں قدم جما رہے تھے۔ اور ان کے خیالات کا رخ وطن دشمنی کی طرف موڑ رہے تھے۔ وہ مزدوروں میں نفرت کا زہر پھیلا رہے تھے اور کاشت کاروں میں تعصب کا بیج بو رہے تھے۔ جو بے چینی کے اسباب پیدا کر کے عوام کو حکومت سے بدظن کر رہے تھے۔ مسائل اور مشکلات سے بغاوت کی آگ بھڑکا رہے تھے۔ طلبا لیڈروں اور سیاسی پسِ منظر کو فریب دے کر عوام کو گمراہ کر رہے تھے۔ جھوٹ اور بے بنیاد الزامات پر مبنی پمفلٹ، کتابچے اور پوسٹر شائع کر کے ایک صوبے کو پورے ملک کے خلاف کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے گوریلا جنگ کے لیے مختلف ناموں سے باغی تنظیموں کو ہتھیاروں کی فراہمی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ ملک کے اس حصے میں ہنگاموں کے دھماکوں سے لوگ ہلاک ہو رہے تھے۔ معیشت تباہ ہو رہی تھی۔ کارخانوں کی پیداوار رک گئی تھی۔ بے روزگاری مزید مسائل کو جنم دے رہی تھی۔ پل اور ریلوے لائنوں کی تباہی سے ذرائع مواصلات درہم برہم تھے۔ چنانچہ ملک تیزی سے خانہ جنگی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ غیر ملکی قوتیں ملک کو تقسیم کر کے اور ان کے درمیان نفرتوں کو ہوا دینے والے نئے حلیف پیدا کر کے مہاجر کو انصار سے، بھائی کو بھائی سے جدا کر کے مسلمانوں سے نفرت کی سازش کامیاب ہوتی نظر آ رہی تھی۔

میرا رُواں رُواں غیظ و غضب کی آگ میں جل رہا تھا لیکن اس سے زیادہ عذاب اپنی بے بسی کا تھا کہ میں کرپال والی یا سادھو رام جیسے شیطانوں کے خلاف کارروائی میں کچھ نہیں کر سکتا تھا اور کسی سے مدد بھی نہیں مانگ سکتا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ میری ایک معمولی غلطی اور میں مارا جاؤں گا۔ میری بات سننے سے پہلے ہی مجھے پاگل قرار دے کر پابند سلاسل کر دیا جائے گا۔ میری زبان کھلنے سے پہلے ہی مجھے قید خانے کی سلاخوں کے پیچھے کر دیا جائے گا۔ ان حالات میں جو کچھ کرنا تھا مجھے خود ہی کرنا تھا۔

بنا مطرب جی ہو وہاں کرتے ہوئے اور اپنے چند رفیقان باصفا کی مدد سے دفاع کرتے ہوئے۔ ایسے ان گنت سادھو رام چلے گئے اور وہ جانے کتنی کرپال والیاں ہوں گی جو اس ملک میں رہ کر اسی کی تباہی کے منصوبوں سے ضمیر کے سودے کر رہے ہوں گے۔ میں اکیلا ان سب کا کیا کر سکتا تھا۔ خدا نے مجھے کوئی غیبی قوت نہیں دی تھی اور نہ کوئی مافوق الفطرت صلاحیت عطا کی تھی۔ جو کچھ تھا میرا عزم تھا، حوصلہ تھا، یہ یقین تھا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ اگر میں ان وطن دشمنوں کے خلاف صرف کفن باندھ کے نکلوں گا تو اور نکلیں گے۔ جن کے لیے قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم اور سب کو جو ملک دشمنوں کو شکست دے سکا، تو کیا یومِ حشر برپا کرنے کا متمنی ہوگا۔

سادھو رام اور جگن ناتھ کے باہر آ جانے سے میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ انھوں نے مشکل سے دس منٹ اندر گزارے ہوں گے لیکن دس منٹ میں مجھے کچھ آرام مل گیا تھا۔ میرے کشیدہ اعصاب پر قابو پانے کی کیفیت میں بے حس و حرکت اور ساکت و جامد بیٹھا ہوا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہی کرپال والی ٹرے میں کافی کے مگ لیے نمودار ہوئی۔ مگر اب وہ کرپال والی نہیں رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر میرے جسم کا رُواں رُواں جھنجھنا اٹھا۔ گیروے رنگ کے چھوٹے کی بجائے اس نے بہت مختصر چست قمیص اور شلوار پہن رکھی تھی۔ قمیص کی آستینیں بہت مختصر تھیں۔ اس کے صحت مند بازوؤں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ قمیص کے سرمئی رنگ میں اس کی بے داغ جلد کا مرمریں رنگ بہت نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ یہی دلکش خیال قمیص کے گلے سے بھی نمایاں تھا۔ غضب کی انگیز وضع قطع اس نے اپنا رکھی تھی۔ اس کے الجھے ہوئے بکھرے ہوئے بالوں کی وگ بھی ہٹ چکی تھی اور نیچے شانوں تک آنے والے ریشمی زلفوں کی تراش سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بیٹھے بیٹھے سمٹ گئے ہوں۔ گھنگھریالے بال نمودار ہو گئے تھے اور کتنے ہی رنگ تبدیل کر کے ان کی طرح بکھرتے ہوئے تھا اس کے چہرے پر سے چھپ کر آب کی طرح لوٹ رہے تھے۔ اس کا یا کلپ ہو چکا تھا۔ چنانچہ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ کیا اس گیروے لباس کے نیچے یہ سب پہلے سے موجود تھا۔ میں نے چونکے کے ساتھ ہی اس نے وِگ بھی اتاری تھی اور بالوں کو تھوڑا سا برش کر لیا تھا اور جتنی دیر میں کافی تیار ہوئی تھی اس نے لب و عارض کو تھوڑا سا رنگ بھی دے دیا تھا۔ اس کا یہ تغیر انتہائی سحر انگیز تھا۔ یکلخت وہ ایک نوخیز، دلکش اور پُرکشش عورت بن گئی تھی جس کے حسن کی تاب لانا مشکل تھا۔ کوئی مرد انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

کرپال والی کی اس کایا کلپ پر مجھے آج تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ کرنل جگن ناتھ نے بہت بے تکلفی سے کرپال والی کو حسرت سے دیکھ کر کہا۔

"اب تو مجھے میرے نام سے پکار سکتے ہو تم۔" وہ شرما کے بولی۔

"سوری ڈارلنگ۔ تمہارا اصل نام بھی وہی ہے جو تم ہو۔" کرنل جگن ناتھ نے کہا۔

"یہ نام اس نے بعد میں رکھا تھا۔" سادھو رام نے ناگواری سے کہا۔ "ماں باپ نے تو..."

"چھوڑو اس نام کو۔ اس کا نام یہی ہونا چاہیے تھا۔" جگن ناتھ نے کہا۔

"وقت کم ہے جگن ناتھ۔ سودے کی بات کرو۔" سادھو رام نے رقابت کے پُر حسد لہجے میں کہا۔

"ہاں میں نے دیکھ لیا ہے۔" جگن ناتھ بولا۔ "دام تم بتا دو۔"

"پندرہ لاکھ نقد۔" سادھو رام بولا۔

"پندرہ لاکھ!" جگن ناتھ نے حیرانی سے دہرایا۔ "کیا تم پاگل ہو گئے ہو سادھو رام؟"

"پندرہ لاکھ اس سے نصف پاکستانی کرنسی میں نصف امریکی ڈالر۔" سادھو رام نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم حد سے بڑھتے جا رہے ہو۔" جگن ناتھ نے برہمی سے کہا۔

"جب تم نے سرحد عبور کر لی تو حد کہاں رہی۔" سادھو رام نے ڈھٹائی سے کہا۔ "تم کہاں بیٹھے ہو..."

"یہ... یہ تم دھمکی دے رہے ہو مجھے۔" جگن ناتھ نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔

"ناتھو...!" وہ بڑبڑائی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے جھپٹ کر ریوالور والے ہاتھ کو دبوچ لیا۔

"یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اچھا نہیں ہو رہا ہے۔" جگن ناتھ نے جھنجھلا کے کہا۔

"ہاں، کسی کے نقطۂ نظر سے بھی یہ اچھا نہیں ہو رہا ہے۔" سادھو رام بولا۔ "جاؤ تم اپنے اچھے کام کرو۔ جتنا مال اب تک کمایا ہے اس سے اپنے جیون کا پیا شبھ کرو۔ اناتھ آشرم... ہر دوار میں کوئی مندر، کوئی دودھ آشرم بناؤ... یہ بڑے کام چھوڑ دو۔ میرے لیے... میں کرنل ماما راؤ سے بات کر لوں گا۔"

"سادھو رام! میں نہیں چاہتا کہ تم کو واقعی قتل کر دوں..." جگن ناتھ نے ریوالور جیب میں رکھ کر وہاں کے باقی بچی ہوئی اور سگار جلانے لگا۔ "اگلی بار تو دلربا تمھیں نہیں بچا سکے گی۔ یہ اس سے نصف قیمت کا مال ہے جو تم مانگ رہے ہو۔"

"قیمت کوئی چیز نہیں ہوتی کرنل صاحب۔" سادھو رام بولا۔ "صرف ضرورت ہوتی ہے اور ضرورت کو پوری کرنے کے لیے آدمی سب کچھ کرتا ہے۔ تھوڑی سے اسمگلنگ، کم ضرورت زیادہ ہو تو قیمت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ تم کو یہ معمولی سی بات سمجھ ہی لینی چاہیے

www.paksociety.com

آگے جا کے تمھاری ضروریات میں اضافہ ہوگا۔ مال آنا ہی ہوگا اور مانگنے والے زیادہ دولت والوں سے جائے گا، وہی جو قیمت زیادہ لگائے گا۔ اس میں کون سی غلط بات ہے۔ منافع جیتنا تو زیادہ نہیں ہوتا جب یہ دن گزر جائیں گے تو تمہیں کون پوچھے گا۔ آج کچھ کما سکتے ہی تو کما لو نہ کماؤ ہیں۔"

"تمھاری یہ بکواس سننے نہیں آیا ہوں۔" جگن ناتھ نے کہا۔ "میں اس کے دس لاکھ دے دوں گا۔"

"پورے پندرہ لاکھ جگن ناتھ۔ مجھے معلوم ہے یہ تمھاری جیب سے نہیں جا رہا ہے۔" سادھو رام نے کہا۔ "لیکن تمھارے حصے کا منافع یقیناً کم ہو رہا ہے تو اس کا توڑ تمھارے پاس ہے۔ تم بھی وہی کرو جو میں کر رہا ہوں۔ جن کو مکتی چاہیے ان سے کہو کہ مکتی کا بھاؤ چڑھ گیا ہے۔ قیمت نہیں دے سکتے تو ڈنڈوں سے لڑیں۔ چمٹا چکی اٹھا لیں، چاقو چھری لے لیں۔"

"تم بہت بڑے رذیل ہو سادھو رام۔" کرن جگن ناتھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چھوٹے بڑے کیا یہاں تو سب ایک ہیں۔" سادھو رام بولا۔ "لنکا میں جو ہے سو باون گز کا۔ جو میرا نام سو تمھارا نام۔"

دلربا کا یار اب ٹھہرا کر خاموشی سے بیٹھا رہا تھا۔ دلربا اس کو بھی ایک جگ کافی کا ایک واجبی سی مسکراہٹ کے ساتھ دے آئی تھی۔ غالباً اسے قریب آنے کی اجازت نہیں تھی تاکہ مذاکرات کی رازداری برقرار رہے۔ اس نے جگن ناتھ کو اٹھتے دیکھا تو سگریٹ پھینک کر آگے بڑھا۔

"میرا دل چاہتا ہے دلربا کہ کسی دن تم کو بھی اڑا لے جاؤں۔" جگن ناتھ نے چلتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟" دلربا نے شوخی سے کہا۔ "نیل گگن کے اس پار، فلمی زبانی میں؟"

"کہیں بھی۔ ہمالیہ کی کسی پہاڑی کی چوٹی پر اتار دوں۔" جگن ناتھ ہنسا۔

"اور اگر تمھارا بجرا اسکول میں؟ تو تمھارے ساتھ میرا بھی بیڑا غرق۔" دلربا ہنسی۔ اس کے سامنے ناز و انداز طرز الفوں جیسے تھے۔

"اگر میں کہوں کہ میرے ساتھ بھاگ چلو تو؟" جگن ناتھ مسکرایا۔ "کیا کرو گی تم؟"

"میں تو ہر وقت تیار ہوں۔" دلربا ہنسی۔ "تم جھگڑے سے بچ جاؤ گے۔ اور تمھاری وہ دھرم پتنی جو تمھارے سات بچوں کی چھوڑ دیو ہے، وہ بھی ساتھ چلی تو تم کیا کرو گے؟"

سادھو رام یہ سب سنتے اور جانتے کے بعد بھی بڑی مشکل سے برداشت کر رہا تھا۔ ریلی کا بیڑا رکا تو وہ پھٹ پڑا۔

"مجھے یہ سب بالکل اچھا نہیں لگتا۔ تم اس کے سامنے ایسے انداز کرتی ہو... سب کچھ بھول جاتی ہو۔"

"تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ میں تمھاری دھرم پتنی ..." دلربا نے ترش ہو کر کہا۔ "میری یہی وجہ ہے وہ تم کو ... ہے۔ وہ تمھارے مال کی نہیں، میری مسکراہٹ کی قیمت دیتا ہے۔ جو کچھ میں کرتی ہوں وہ کاروباری ضرورت ہے۔ اس میں میرا نہیں تمھارا بھی فائدہ ہے۔"

سادھو رام کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ "پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے لیکن دلربا... دیکھ لینا کسی دن پاگل ہو کر اس کو گولی مار دوں گا۔"

دلربا ہنسی۔ "جس دن یہ کام کرنا ہو مجھے بتا دینا۔ میں زیادہ آسانی سے کر سکتی ہوں۔"

"سچ دلربا، میں تو سمجھتا تھا کہ تم اس پر ریجھ گئی ہو... خراب ہے میرا۔"

"دیکھو سادھو رام! ہم نے اور تم نے مل کر ایک کام شروع کیا تھا۔ سائیں بابا چڑ والے کا تم نے کام تمام کیا پھر تقدیر نے بہت بڑے کام کے لیے ہمیں منتخب کر لیا۔" دلربا نے کہا۔ "کتنا کما چکے ہیں ہم؟"

"ستائیس لاکھ اس کاروبار میں۔ تین لاکھ تمھاری مرضی سے۔" سادھو رام بولا۔

"میری مرضی کو گولی مارو۔ یہ تو ایک اوڑھنے کا ... کے لیے۔" دلربا نے کہا۔ "مجھے اچھی ہوا تھی یہاں جاہل عورتوں کو بیٹے تعویز لکھ کر دیتے اور بدبخت بدصورت لڑکیوں کی ... پہلے کرانے کے نذرانے لیتے نہیں گزارتی ہے۔ کوئی بات نہیں، بدنصیب نہ ہو۔ بدنصیبی کا تعویذ کہیں ... اور جو بیٹا اولاد ہیں ان کو بھلا بیٹیاں اولاد کہاں سے ... جب تم نے مجھے سائیں بابا چڑ والا کی مرضی میں دیا تھا تو ہمارا ایک ہی مقصد تھا۔"

"مجھے... نہ جانے کیوں شک ہونے لگتا ہے کہ ہم مقصد کو بھول نہ جائیں۔" سادھو رام نے خفت سے کہا۔

"وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ سمجھو یہ آخری سودا... سب ملک کے سامنے ... لگ بھگ ہو جائیں گے۔ تیس چالیس ... پاٹ پڑ بھی تو میرے پاس ہیں۔ اب بھی نکل جانا چاہیے۔"

"ہاں دلربا! میں بھی کچھ دنوں سے ایک ... محسوس کرنے لگا ہوں۔" سادھو رام بولا۔ "جیسے ... ہم نے سوچا تھا وہ نہیں ہوگا۔ میں اور تم وہ ..."

... ہر حرف، دشمن میں ... حقیقت آشکار ہوتے ہی یہ سب ... تمھارے خون سے پیاس بجھا کے بھی مطمئن نہیں ہوں گے۔ ... کے کتوں کے آگے ڈال کر بھی مطمئن نہیں ہوں گے۔ ... آسیب سوار ہے جسے صرف میں محسوس کرتا ہوں۔ ... تو سو نہیں سکتا۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی اندر ... ہے، وہ کہتا ہے کہ سادھو رام... میں تمھاری موت ہوں..."

"کیوں کرتے ہو ایسی باتیں؟" دلربا نے کہا۔ "دماغ پر زور مت ... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ اندر چلیں۔"

"تم بھی اپنا حلیہ ٹھیک کر لو۔ شام ہونے والی ہے۔" سادھو رام نے کہا اور دلربا کے ساتھ اندر چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔

"تمھارے خوف کا آسیب ایک زندہ حقیقت ہے سادھو رام!" میں نے اپنے دل ہی دل میں کہا۔ "لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ اس کا نام ... ہے اور وہ اس وقت بھی تمھارے بہت قریب ہے۔ وہ تم کو دیکھ سکتا ہے مگر تم اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ آج ... تم پھر مجھے دیکھو گے۔"

ایسا لگتا تھا اب کچھ دیر میں سادھو رام کی واپسی ہو گی۔ ... میں اندر جا کے کوئی تیر نہیں مار سکتا تھا اور باہر بھی سادھو ... نہیں روک سکتا تھا۔ ... خود روشن تھا چنانچہ اس کا صحیح ... بات تھی۔ وہ مجھے قریب آنے کی مہلت دیے بغیر گولی ... سادھو رام کی گاڑی مجھ سے پچاس گز دور کھڑی تھی۔ میں ... آرام سے بڑھنا شروع کیا اور سنبھل سنبھل کے قدم ... پہنچا۔ جس کی چابیاں گاڑی کے اندر ہی ... یہاں سادھو رام کو یہ خطرہ کسی سے نہیں تھا کہ کوئی ... لے جائے گا۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ میں گاڑی سے ... پہلے ڈھونڈ نکالوں جا پہنچوں مگر کچھ سوچ کر میں نے ... پروگرام کو مسترد کر دیا اور دوسرا زیادہ ... پروگرام بنایا جس میں کامیابی کے امکانات بھی زیادہ ... چابیاں اگنیشن سوئچ سے نکالیں اور اس کا ... ڈگی کھول کر وہ چابی اسی سوئچ میں لگا دیں کہ سادھو رام ... آخر میں ڈگی میں اترا۔ ڈگی ... اور جیک وغیرہ کے ساتھ انجن آئل کا ایک ڈبا ... ایک ڈبا پڑے تھے۔ ڈگی خاصی کشادہ تھی ... جگہ بنائی اور قفل کو کھولنے والے میکنزم کو ... کے بعد ڈگی کو بند کر دیا۔ ڈگی اب مقفل تھی اور ... چابی کے بغیر نہیں کھولا جا سکتا تھا۔

... میں آرام سے لیٹنے کی گنجائش نہیں تھی ... ہر حرف کو تہ کیے ہوئے

تھے اور اٹے پلٹے تھے جو میرے جسم میں کانٹوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ اس کی سخت سطح پر گرد تھی اور اندر رکھی ہوئی چیزوں کی ملی جلی بو تھی اور گھپ اندھیرا تھا۔ ڈر تھا کہ صرف ایک بات تھی کہ سادھو رام واپسی میں کوئی ہلکی یا بھاری چیز نہ اٹھا لے جسے ڈگی میں رکھنا ضروری ہو۔ تاہم اس خطرے سے نمٹنے کے لیے میں بالکل تیار تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب وہ ڈگی کھولے گا تو اس کے قفل میں چابی لگنے کی آواز آئے گی اور ایک سیکنڈ بعد مضبوط فولادی اسپرنگ ڈھکنے کو خود ہی اٹھا دیں گے۔ اس وقت سادھو رام مجھ سے ایک ڈیڑھ فٹ دور ہوگا اور ڈگی میں میری پالیسی اور کی موجودگی اس کے لیے ناقابل یقین سی بات ہوگی۔ اس کی حیرانی ختم ہونے سے قبل ہی میں اچھل کر باہر نکلوں گا اور اس کی گردن دبوچ لوں گا یا ہاتھ بڑھا کر اسے بھی اندر کھینچ لوں گا۔ اس طرح کہ وہ کوزے کی حالت میں سادھو رام کا جسم ڈگی کا نچلے۔ اس کا سر اندر میری گرفت میں ہو اور ٹانگیں باہر ہوں۔ اس حالت میں اس سے اسلحہ چھیننا بھی ممکن ہوگا اور اس کی مدد کے لیے آنے والے کو روکنا بھی۔

یہ بڑا سنسنی خیز انکشاف تھا کہ رمال والی درحقیقت سادھو رام کی ایجنٹ ہے جس کو خود اسی نے سائیں بابا چڑ والے کو قتل کرنے کے بعد میری نگرانی پر لگایا ہے۔ رمال والی کے حلیے میں وہ ایک غلیظ بالوں سے میلی کچیلی نظر آنے والی گدڑ سا اور پرانے کپڑے پہنے لباس میں ملنگ نظر آنے والی عمر رسیدہ عورت تھی جسے لوگ مجذوب کہتے تھے کیونکہ وہ فرش خاک پر بیٹھتی تھی۔ وہ کیا باتیں کرتی تھی جسے گاؤں والے "معرفت" کے اسرار و رموز سمجھتے تھے۔ وہ سیاہ دلی اسباب ظاہری سے بے تعلق نظر آنے والی بھی عورت دلربا کے روپ میں ایک خوب صورت عورت تھی۔ صاف ستھری اور نکھری ہوئی جو آرائش جمال کے فن سے آشنا تھی۔ لباس کی حسن آرائی کے انداز جانتی تھی۔ مردوں کے دلوں کو اپنی عشوہ گری سے غلام بنا سکتی تھی اور ایک خطرناک گروہ کی آلۂ کار تھی۔ اس کو سادھو رام نے کہاں سے حاصل کیا یہ سوال غور طلب تھا۔ وہ کوئی مقامی عورت نہیں تھی، اس کے نقش اسے شہری ثابت کرتے تھے اور اپنی باتوں سے وہ تعلیم یافتہ لگتی تھی۔ اس کی اداکارانہ صلاحیت کو تسلیم نہ کرنا بھی مشکل تھا کیونکہ وہ اپنی شان قلندری میں بھی یکتا تھی اور اپنے اصل کاروبار میں بھی۔ گمان کہتا تھا کہ وہ دشمن کی منتخب کی ہوئی اور ان کی تربیت یافتہ ایجنٹ تھی جسے سادھو رام کے پاس اس لیے بھیجا گیا تھا کہ اس مشکل مشن کے لیے کوئی بہتر عورت مل ہی نہیں سکتی تھی۔ معلوم نہیں وہ سادھو رام کے پاس کیسے پہنچی تھی مگر بعد میں سادھو رام نے اسے سائیں بابا چڑ والے کی خدمت میں پیش کر دیا۔ دلربا نے سائیں بابا چڑ والے کی عقل خبط کر دی ہوگی تاکہ

www.paksociety.com

دلربا کے سحر میں گرفتار ہونے کے بعد اس نے بیشتر مریدوں کو نظرانداز کرتے ہوئے دلربا کو اپنا گدی نشین بنا دیا۔ گاؤں والوں نے...... سائیں پانچ ماسے کی زندگی میں ہی دلربا کو اس کا جانشین بھی تسلیم کر لیا ہوگا اور اس کی پیری فقیری کا دھندا چل پڑا ہوگا تو سادھو رام نے اُسے ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔

اب دلربا جسے یہ مقام سادھو رام کی مدد سے حاصل ہوا تھا' اسے یقیناً طلب ہی تھی کہ ایک کروڑ کا ہدف حاصل ہوتے ہی وہ یہاں سے نکل جائیں گے۔ اس گاؤں سے اور پھر اس ملک سے لیکن صاف نظر آتا تھا کہ دلربا کو سبز باغ دکھا کر یہاں لانے والا اب دلربا کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ وہ جگن ناتھ کے عشق میں پاگل نظر آتی تھی اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اس شکست کا وہ فیصلہ باقی نہیں رہے گا جو سادھو رام کھلا رہا تھا۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا تھا۔ سادھو رام رقابت میں اچانک جگن ناتھ کو قتل کر سکتا تھا۔ ایک کروڑ کی رقم آتی نظر آتی تھی کہ سادھو رام باقی دو کو بھی ٹھکانے لگا سکتا تھا اور یہی کام دلربا بھی کر سکتی تھی۔ یہ اعتماد کا کھیل نہیں تھا۔ اس میں محبت بھی دھوکا ہو سکتی تھی۔ جگن ناتھ ایک خطرناک بدمعاش پیشہ اور خرانٹ شخص تھا۔ جذبات کو عقل کے تابع رکھے بغیر کوئی بھی کلاکار ایسے مشن میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ پھر وہ شادی شدہ اور بقول دلربا کے سات بچوں کا باپ تھا۔ بے شک وہ ایک دلکش اور وجیہہ مرد تھا مگر دلربا جیسی عورت کو سات بچوں کے باپ پر فریفتہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ خود جگن ناتھ کی دولت کو دل کی لگی سمجھنا محال تھا۔ وہ دلربا کو اپنی مٹھی میں رکھنے کے لیے اس کے عشق کی دیوانگی کا ناٹک رچا رہا تھا۔ یہ بلی چوہے کا کھیل تھا جس میں یہ طے کرنا بھی آسان نہ تھا کہ بلی کون ہے اور چوہا کون۔ وہ سب موقع ملتے ہی ایک دوسرے کے وجود کو ختم کر سکتے تھے۔

میرا جسم شدت سے اینٹھنے لگا تھا جب میں نے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی۔ پھر گاڑی کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ گاڑی کا انجن دو مرتبہ غرا کے خاموش ہوا اور تیسری مرتبہ اسٹارٹ ہو گیا۔ سادھو رام نے ریس دی اور گاڑی ایک جھٹکے سے واپس پلٹی۔ دلربا نے سادھو رام کو ساتھ لانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ شاید وہ پھر جوگن کا بھیس بنائے بے وقوف عقیدت مندوں کو جھوٹی دعائیں اور جعلی تعویذ دے رہی تھی اور ان کے نذرانے ظاہری قناعت کے ساتھ ٹھکراتی جا رہی تھی۔ دل کے پاپ چاندی کے چار پیسے کے لیے لوٹ طلب میں آدمی کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

گاڑی نے موڑ کاٹا اور دیکھے بھالے راستوں پر دوڑنے لگی۔ ہر جھٹکے پر میرا جسم ڈگی میں تہ و بالا ہو جاتا تھا اور بعض اوقات کیل کانٹوں کے چبھنے یا کسی لوہے کونے سے لگنے والی چوٹ کی ٹیس سے میری آہ نکل جاتی تھی تاہم میری آواز کے سادھو رام تک پہنچنے کا ذکر نہیں تھا۔ آتی بھی کار میں وہ بھی ... فاصلے پر تھا جہاں انجن کا شور زیادہ محسوس ہوتا تھا ... میں نے محسوس کیا کہ ڈگی میں دھواں بھر رہا ہے۔ سائلنسر کے نیچے سے گزرتا تھا کسی جگہ سے لیک کر رہا تھا ... کی آواز بھی زیادہ محسوس ہوتی تھی لیکن میرے لیے زیادہ ... کی بات یہ تھی کہ اس سوراخ سے خارج ہونے والا زہریلا دھواں اوپر اٹھ کر ڈگی میں داخل ہو رہا تھا۔ ڈگی ایئر ٹائٹ نہیں تھی ... کے نیچے والے حصے میں سوراخ تھے جن سے ڈگی کی دھلائی ... بھر پانی نکل جاتا ہے مگر اب انہی سوراخوں سے وہ دھواں آ رہا تھا جس میں انجن سے خارج ہونے والی کاربن مونو آکسائیڈ گیس کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اگر یہ گیس ڈگی میں جمع ہو ... اور میں اسی زہریلی ہوا میں سانس لیتا رہتا تو کچھ دیر میں بے ہوش ہو جاتا اور بالآخر اسی بے ہوشی میں دنیائے فانی سے کوچ کر جاتا۔

اطمینان کی بات یہ تھی کہ ڈونگا تک فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور میرا اتنے کم وقت میں انتقال فرما جانا مشکل لگتا تھا۔ آدمی کے جسم میں زندگی کے لیے جدوجہد کی قدرتی مدافعت کی صلاحیت کم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ڈگی میں تھوڑی بہت تازہ ہوا بھی آ رہی تھی۔ چنانچہ ڈگی میں کاربن مونو آکسائیڈ کے جمع ہونے کا ... کم تھا۔ میں خود بھی آکسیجن خرچ کر رہا تھا اور کاربن ... خارج کر رہا تھا۔ اگر میں آدمی نہ ہوتا پودا ہوتا تو اس عمل کو ... سکتا تھا۔ میں نے سوچا اور کسی تار موسے کے بغیر حساب لگانے کی کوشش کی کہ اندر کی ہوا سے آکسیجن کو ختم ہونے میں کتنی دیر لگے گی۔ گاڑی پہلے ڈونگا پہنچے گی یا میرے ہوش و حواس ساتھ چھوڑ جائیں گے؟ وغیرہ وغیرہ۔

چند منٹ بعد میرا سر بھاری ہونے لگا اور میری طبیعت مالش کرنے لگی۔ یہ کاربن مونو آکسائیڈ کے زہریلے اثرات کا نتیجہ تھا۔ الوداع اے دنیا! میں نے دکھی دل سے سوچا۔ تمہارا عاشق جو ہزار جان نیوا مرحلے طے کر کے تمہارے حضور پیش ہونے کا آرزومند تھا' ناشاد و نامراد اس دنیا سے جا رہا ہے۔ اب ... گے حشر میں دیکھا ... تیرے۔ چوہدری ولادر کے بیٹے ... کا داغ دل پہ ہے مگر موت سے کس کو رستگاری ہے ... فضول اور بے سروپا خیالات کے ساتھ آہستہ آہستہ میں ... اور بے حسی کے سمندر میں غرق ہو گیا جہاں ... دلربا۔ بس ایک خلا تھا جو موت کے بعد کی بے خبری ...

معلوم نہیں مجھے کتنی دیر بعد ہوش آیا۔ اندھیرا ... میرے گرد محیط تھا لیکن میں بہت کچھ محسوس کر سکتا تھا ...

... پر اثر ہو چکا ہے اور اب حرکت کرنا بھی باعث آزار ہے۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور میری توانائی کا لیول صفر تھا تاہم مجھے خوشی ہوئی ... اور یہی خوشی میرے لیے ... دنیا سے ناتا ... کے حصول کا سبب بن گئی۔ غالباً گاڑی کے رک جانے سے ... گیس کا اخراج بند ہو گیا تھا اور رفتہ رفتہ ڈگی میں زندگی بخش ... ہو گئی تھی۔ اگر گاڑی چلتی رہتی تو میرا ہوش میں آنا ناممکن تھا۔ ... کوشش سے ہاتھوں پیروں کو حرکت دی اور درد کی ... برداشت کیا۔ میرے کان کسی آواز کو سننے کی کوشش میں ... تھے لیکن آس پاس کوئی نہیں تھا۔

بالآخر میں اس قابل ہو گیا کہ ہاتھ بڑھا کے ڈگی کے قفل کو اندر سے کھول سکوں۔ اس کے لیے مجھے اندازے کی مدد سے ایک لیور کو ڈھونڈنا تھا جسے ایک اسپرنگ نے دبا رکھا تھا۔ ڈگی کے ڈھکنے کو اوپر اٹھانے والے اسپرنگ بھی اپنا کام کر رہے تھے چنانچہ لیور بڑی سختی سے جسم میں دبا ہوا تھا۔ اسے ہٹانے کے لیے ضروری تھا کہ لیور کو اوپر سے دبایا جاتا۔ میں نے ایک ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ڈگی کے ڈھکنے میں اندر کی جانب لگی ہوئی فولادی پٹیاں ایک کلاس کی شکل میں پھیلی ہوئی تھیں میرے ہاتھ نے ایک پٹی کو گرفت میں لے کر نیچے کھینچا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے میں نے لیور کو دبایا۔ لیور اپنی جگہ سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈگی کا ڈھکنا اٹھ گیا اور میں نے تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لے کر اپنے سر پر پھیلے ہوئے تاریک آسمان کو دیکھا جس کی وسعت کو ستاروں نے سجا رکھا تھا۔

میں ایک جست میں باہر آ گیا۔ مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا لیکن گاڑی ایک پکی فصیل کے اندر کھڑی ہوئی تھی۔ ایک طرف باغ تھا یا جنگل۔ دوسری طرف ایک مختصر سی عمارت تھی جس کے سامنے دروازے اور کھڑکیاں بند تھے مگر شیشوں کے پیچھے روشنی تھی۔ یہ روشنی کسی گھر ... کے جنریٹر سے پیدا ہونے والی بجلی کی روشنی تھی۔ پیٹرول یا ڈیزل سے چلنے والے جنریٹر کی آواز سکوت شب میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں اسی آواز کی طرف متوجہ تھا۔ یقیناً یہ سادھو رام کا گھر تھا۔ میں اس کو بیشتر فقیری سیاست ... مختصر عمارت قرار دے رہا تھا مگر گاؤں میں یہی ایک مکان تھا ... اس عمارت میں چار پانچ کمرے ہو سکتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ سادھو رام اکیلا رہتا ہے یا بیوی بچوں کے ساتھ تاہم حویلی میں نوکروں کی موجودگی کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے ہونے والے مکان کا ایک چکر لگاتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ خود دیوار کے سائے میں رہوں اور ... کوئی آہٹ تک سنائی نہ دے۔ اچانک ایک دروازہ کھلا اور کوئی شخص باہر نکلا۔ میں دیوار سے چپک گیا مگر وہ اپنے خیال میں سیدھا آگے بڑھ گیا۔ میں نے اس کو فصیل کے دروازے کی طرف جاتے دیکھا جو شاید سو گز کے فاصلے پر تھا۔ گاڑی اسی راستے سے اندر آئی تھی اور وہاں کھڑی ہوئی تھی جہاں ایک میدان سا آتا تھا۔ میں اندر داخل ہونے کی سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں تیزی سے گاڑی کی طرف گیا اور اس کا دروازہ کھول کر دیکھنے کی کوشش کی۔ دروازہ مقفل نہ پا کے مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے اندر جھک کر ڈیش بورڈ پر ہاتھ مارا۔ پھر گلوو کمپارٹمنٹ کو دیکھا اس میں کاغذات تھے مگر یہاں میں کوئی سخت ابھار سا تھا۔ میں نے کاغذات کو باہر کھینچا تو کوئی چیز آواز کے ساتھ گاڑی کے فرش پر گری۔ ربڑ میٹ کی وجہ سے آواز زیادہ نہیں ہوئی اور میں نے جھک کر سیٹ کے نیچے پڑے ہوئے ریوالور کو اٹھا لیا۔

یکلخت میں ایک بے بس آدمی نہیں رہا۔ میں ایک طاقت بن گیا ایک ایسی طاقت جس کے سامنے وہ چالاک اور دھوکے باز سادھو رام کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا اسی طرح جیسے طوفان کے مقابل گھاس کا تنکا اور سیلاب کی یلغار کے سامنے ریت کی دیوار کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اب تک میرے ساتھ صرف میرا عزم تھا اور میری قوت ارادی تھی اور میرا یقین تھا لیکن میرے ہاتھ خالی تھے۔ اب میں نے جانا اور مانا کہ اسی یقین نے مجھے پھر وہ قوت عطا کی جو ریوالور کی صورت میں میرے ہاتھ میں تھی۔ میرے ایمان کو تقویت حاصل ہوئی کہ وہ دست غیب میرے ساتھ ہے جو حق و باطل کی معرکہ آرائی میں ہمیشہ ان کے لیے اسی قسم کے اسباب فراہم کرتا ہے جو اپنے یقین کی راہ پر چلتے ہیں اور اپنے اندر کی سچائی کو تسلیم کرتے ہوئے اسی روشنی کو راہنما رکھتے ہیں جو ایک ازلی و ابدی حقیقت ہے۔

میں نے ریوالور کو چوما اور اس کے میگزین کو چیک کیا۔ اس کے چیمبر میں ... گولی تھی ... چار پانچ گولیاں ... یہ عام سائز کی گولیاں نہیں تھیں اور اس قسم کے ریوالور پولیس یا انڈر ورلڈ کے لوگ ہی استعمال کرتے تھے لیکن اسمگلنگ اور پیری فقیری نے کسی بھی چیز کا حصول آسان بنا دیا تھا۔ ابھی تک یہی خاموشی سے موقع محل اور حالات کا جائزہ لے کر یہ دیکھ رہا تھا کہ خود کو محفوظ رکھتے ہوئے میں کیا کچھ معلوم کر سکتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ دلربا ... اور نازو میں سے کوئی اب تک یہاں ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کہاں ہے اور سادھو رام کے حفاظتی انتظامات کس نوعیت کے ہیں۔ بعد میں اپنی پوری قوت کے ساتھ میں واپس آؤں تو میری کامیابی کے امکانات کیا ہوں گے۔ لیکن اب میں نے اندر گھس کر ... وہ کام آج ہی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جو پہلے میں کل ...

www.paksociety.com

اُٹھا رکھنا چاہتا تھا۔

میں اسی دروازے سے اندر گیا جس سے نکل کر کوئی باہر گیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے ایک دروازہ اپنے سامنے دکھائی دیا جو کھلا ہوا تھا اور اس میں سے ڈرائنگ روم کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔

یہ سادھو رام کا ڈرائنگ روم تھا جو اپنے جدید ترین فرنیچر اور سامانِ آرائش سے لاہور یا کراچی کے کسی بھی فیشن ایبل علاقے کی کوٹھی کے ڈرائنگ روم سے کم نہیں تھا اور ٹنگا پٹن جیسے پسماندہ علاقے میں اس منظر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حویلی کو باہر سے دیکھنے والا بھی کچھ نہیں جان سکتا تھا مگر یہ سب اس دولت کا کرشمہ تھا جو اس بے ضمیر شخص نے وطن فروشی کے کاروبار میں کمائی تھی۔ کمرے میں ٹیوب لائٹس کا دودھیا اجالا تھا اور ٹی وی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا وہ ایک مختصر سی راہداری یا ڈیوڑھی تھی۔ دوسرا دروازہ مجھے دائیں ہاتھ پر دکھائی دیا جو بند تھا۔ بائیں جانب دو دروازے تھے۔ ان میں سے ایک کھلا ہوا تھا اور اس کی روشنی بھی باہر آ رہی تھی۔ یہ سادھو رام کا بیڈ روم ہو سکتا تھا۔

"میوک! کہاں مر گیا کم بخت۔" کسی عورت نے تیز اور اونچی آواز میں چلا کر کہا۔

"ابھی خود تم نے اسے ملک صاحب کے گھر بھیجا ہے، آتے جاتے کچھ وقت تو لگے گا اسے۔" سادھو رام کی آواز آئی۔

"ایک نوکر سے کام نہیں چلتا۔ ہزار بار کہا ہے تم سے، مگر تم کو کیا۔" عورت اسی آواز میں بولی جو کان کو چھیدتی محسوس ہوتی تھی۔

"کہاں سے لاؤں دوسرا نوکر؟" سادھو رام بولا۔ "یہ ایک بھی کسی نے بھیج دیا ہے ورنہ کون ہے اعتبار کے قابل۔ سادھو رام کو سب ہمارے دشمن سمجھتے ہیں جن کو میں نے بڑی کوشش سے دوست بنا رکھا ہے۔ پھر بھی ان کی دوستی پر اعتبار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بچھو یا سانپ کو دودھ پلا کے پالے اور پھر اس سے توقع رکھے کہ وہ ڈنک نہیں مارے گا۔ کوئی اور مسلمان گھر میں نوکر بن کے آ گیا تو سارا بھانڈا پھوڑ دے گا۔ گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھاتا ہے۔ اُسے معلوم ہو ہی جائے گا۔"

"بس شروع ہو گیا تمہارا بھاشن۔" عورت نے جھلا کر کہا۔ "سر میں پہلے ہی درد تھا۔ ایک پیالی چائے بنانے کے لیے بھی خود ہی جانا پڑے گا۔"

"کومل! تم لیٹو، میں چائے بنا لاتا ہوں۔" سادھو رام نے نرمی سے کہا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بائیں ہاتھ کے دوسرے دروازے سے اندر چلا گیا کیونکہ اس آخری جملے کے بعد مجھے اندر ہونا ضروری نظر آیا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ کچن ثابت ہوا۔ سادھو رام چائے بنانے کے لیے اِدھر ہی آ رہا تھا۔ میں نے اس گھر کا نقشہ بنانے والے کو داد دی۔ جیسا کہ پیسہ آنے سے سلیقہ اور زندگی کے مہذب طور طریقے تو نہیں آ جاتے۔ یہ عجیب نقشہ ہوا کہ صدر دروازے کے فوراً بعد کچن۔ پھر بیڈ روم اور ڈرائنگ روم۔ شہر میں یہ نقشہ بڑا مضحکہ خیز ہو جاتا۔ ہونا اس کا الٹ چاہیے تھا یعنی پہلے ڈرائنگ روم، پھر بیڈ روم اور آخر میں کچن۔ مگر اس وقت گھر کا نقشہ نہیں بلکہ میری اسکیم کا نقشہ ایک دم بدل گیا تھا۔ میں نے دروازے کے پیچھے پناہ لی اور ریوالور سنبھال کے سادھو رام کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

سادھو رام اندر آیا اور اس نے دوسری طرف ہاتھ بڑھا کے کوئی سوئچ آن کیا۔ کچن میں پچیس واٹ کے بلب کی زرد روشنی پھیل گئی۔ ٹیوب لائٹس اور چھوٹے بلب استعمال کرنے کی وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ ایک جنریٹر سے پورے گھر کو روشن رکھنا تھا۔ جنریٹر چلانا ضروری تھا اور جنریٹر کی پیداوار کی صلاحیت محدود تھی۔ میری طرف دیکھے بغیر اس نے ماچس سے تیلی نکال کے چولہا جلا لیا۔ اسی وقت میں آگے بڑھا اور میں نے ریوالور اس کی کنپٹی پر پیوست کر دیا۔

"آواز مت نکالنا سادھو رام۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "ورنہ وہ تمہارے حلق سے نکلنے والی آخری آواز ہو گی۔"

سادھو رام اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ "تم... کون ہو... کون تم...؟" وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر ہکلایا۔

"میں سائیں پانچو والے کا ساڑھو اور تمہارا باپ ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ میرے ہاتھ میں جو ہے اس میں سائلنسر لگا ہوا ہے۔" میں نے اسے مزید دہشت زدہ کرنے کے لیے یہ جھوٹ بولنا ضروری سمجھا۔

"کیا... آخر کیا چاہتے ہو تم...؟" وہ بولا۔ "میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"تمہارے پاس تمہاری جان تو ہے۔" میں نے کہا۔ "نہ ملا تو مجبوراً وہی لینی پڑے گی۔"

"تم... وہی ڈاکو ہو جس نے... اس علاقے میں دہشت پھیلا رکھی ہے۔" وہ بولا۔

"وہ تو میرے ایک شاگرد کا بچہ ہے۔ شاگرد کا نام ہے اکو۔" میں نے کہا۔ "سنسنی اس وقت زیادہ پھیلے گی جب تمہاری لاش کو گاؤں والے کسی درخت سے الٹا لٹکا ہوا دیکھیں گے اور تمہاری دھرم پتنی کے کٹے پھٹے ٹکڑے درخت کی شاخوں پر ڈیکوریشن پیس کی طرح لٹکے ہوئے ملیں گے۔"

سادھو رام کے جسم کی کپکپی کو میں نے واضح طور پر محسوس کیا۔ "بھگوان کے لیے... سب کچھ لے لو..." وہ گھگھیانے لگا۔

"جو کچھ چاہیے مجھے خود ہی دیکھنا ہے۔ بھگوان کو اس دنیاوی مال سارا سونا چاندی کے پانچ دس اور گولا بارود کے ذخیروں سے کیا۔" میں نے کہا۔

میرے الفاظ کا خاطر خواہ ردِ عمل ہوا۔ وہ ایک دم پلٹا اور میں نے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اس کو گھسیٹ کر دروازے کے پیچھے کر دیا۔

"سادھو رام! یہ کیسی آواز تھی؟" اندر سے اس کی بیوی نے پکارا۔ میں خاموش کھڑا رہا۔

"سادھو رام... جواب کیوں نہیں دیتے؟" سادھو رام کی بیوی نے زیادہ تشویش کے ساتھ چلا کے کہا۔

"آہ..." میں نے حلق کی گہرائی سے ایک درد بھری آواز نکالی۔ "کومل..."

میری صداکاری رائیگاں نہیں گئی۔ کومل دوڑتی ہوئی آئی۔ اس کو دیکھ کر میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ کومل نام ہی تھا ورنہ نزاکت کا اس سے اتنا بھی واسطہ نہیں تھا جتنا اس کے پتی کا شرافت سے۔ وہ پانچ فٹ لمبی تھی تو تین فٹ چوڑی بھی تھی۔ کمر اور پیٹ کا محیط شاید چھ فٹ سے بھی بڑھ جاتا۔ وزن اور رنگ کے اعتبار سے بھی وہ کسی بھینس کی بالا وقت جوان ہو جانے والی صاحبزادی لگتی تھی۔ اپنے کالے رنگ کو کمتر سمجھتے ہوئے اس نے سرخ ساڑھی کا لہنگا اور چولی زیب تن کیے تھے اور گھر کے اندر ہونے کی وجہ سے دوپٹہ یا چنری نہیں اوڑھی تھی۔ اپنی بدصورتی میں اس نے میک اپ سے خاصا اضافہ کر لیا تھا۔ کالی چمڑی پر پاؤڈر یوں لگتا تھا جیسے دھوئیں سے سیاہ ہو جانے والے باورچی خانے کی دیواروں پر اناڑی ہاتھ چلنے والے نے سفیدی پھیر دی ہو۔ موٹے ہونٹوں پر لپ اسٹک خشک ہو جانے والے لہو کی طرح نظر آتی تھی۔ اس کا نام کومل رکھنا اتنا ہی مذاق تھا جتنا گوبھی کے پھول کو گلاب کے پھولوں کی نمائش میں رکھنا۔

مجھے دیکھتے ہی اس نے کا منہ کھولا لیکن حلق سے سیٹی نکلنے سے پہلے ہی میں نے فوراً کچن کا ایک میلا کپڑا (جسے عام طور پر صافی کہا جاتا ہے) اس کے حلق میں ٹھونس دیا۔ چیخ اس کے گلے میں گھٹ گئی اور میں نے اس کی چٹیا پکڑ کے ایک جھٹکا دیا تو وہ اندر آ گری۔ پھر اس نے اپنے پتی دیو کو لیٹا دیکھا۔

"افسوس کہ تم بیوہ ہو گئی ہو۔" میں نے کہا۔ "تمہارے سر کے درد کا اب کیا حال ہے۔ کہو تو اس کا بھی علاج کر دوں۔ میں سر توڑ کے اندر سے خرابی پیدا کرنے والی سب چیزیں نکال دیتا ہوں۔ مثلاً غرور اور ہوس، لالچ کے جذبات..."

وہ اپنی پھٹی پھٹی دہشت زدہ آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ خوف نے اس کی عقل کو اس حد تک مفلوج کر دیا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے وہ کپڑا بھی نہ نکال سکی جس نے اس کا منہ بند کر رکھا تھا۔ حالانکہ اس کے ہاتھ آزاد تھے۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے اور وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ اچانک اس نے اپنا ایک ہاتھ سینے پر دل کی جگہ رکھا اور میں نے اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہوتے دیکھا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ اس قد کے ساتھ اتنے وزن کی عورت ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہو سکتی ہے۔ وہ مزاج کے اعتبار سے بھی آتش فشاں تھی اور سادھو رام کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی ایک مسلسل خوف کے سائے میں بسر ہو رہی تھی۔ خوف اس کا کہ دولت مند اور اسمارٹ سادھو رام اسمگلر ہے اور کسی بھی وقت پکڑا جا سکتا ہے یا مارا جا سکتا ہے۔ خوف اس کا کہ ایسے خطرناک کام کرنے والا اسے ٹھکانے بھی لگا سکتا ہے اور پھر کسی خوب صورت عورت سے بیاہ رچا سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ کرپال والی کے اصل نسب سے بھی واقف ہو۔ ایسی صورت میں سادھو رام کی طرف سے یہ خوف بھی لاحق تھا کہ وہ اسے تنہا چھوڑ کر دلربا کے ساتھ بھاگ جائے گا۔

غالباً ان کی اولاد بھی نہیں تھی، چنانچہ وہ سب سے مضبوط بندھن جو میاں بیوی کو ہزار اختلافات کے باوجود نباہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، ان کے درمیان مفقود تھا۔ تفکرات کے روگ اور خوف سے متاثر ہونے والے اعصاب کے ساتھ ہائی بلڈ پریشر جیسا دشمن بھی شامل ہو جائے تو دل کا متاثر ہونا قدرتی بات ہے۔

میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا تو میرے خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ اس کا دل شدید صدمے کو برداشت نہیں کر پایا تھا اور اب اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی مگر میں اس کو پانی پلانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ہاتھوں سے اس نے گلاس کو منہ لگا کے دو گھونٹ پیے اور بے ہوش ہو گئی۔ میں نے اس کو بڑی مشکل سے اٹھایا اور بیڈ روم تک لے گیا۔ بستر پر لٹا کے میں نے اس کی نبض دیکھی جو بہت سست تھی۔ میں بہرحال کوئی ڈاکٹر نہیں تھا کہ نبض کی رفتار دیکھ کر کسی نتیجے پر پہنچ سکتا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور میرے لیے یہی اطمینان کافی تھا۔

www.paksociety.com

"کیا ہوا ہے مالکن کو؟" کسی نے میرے پیچھے سے کہا۔

میں چونک کر پلٹا۔ "کون... سیوک... غالباً ان کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے... گھر میں کوئی دوا ہے؟"

"دوا تو ہے مگر تم کون ہو؟" سیوک نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"بھاڑ میں گیا یار... عجیب آدمی ہو تم بھی... یہ نہیں دیکھتے کہ پہلے کیا کرنا چاہیے۔" میں نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کیا۔

سیوک نے ایک میز پر رکھی ہوئی بہت سی شیشیوں میں سے ایک اٹھائی۔ "ان کا منہ کھولیں۔" اس نے مجھے حکم دیا۔ میں نے تعمیل کی اور سیوک نے ایک قطرے سے کومل کے حلق میں چند قطرے ٹپکا دیے۔

"میں ساد ھورام جی سے ملنے آیا تھا۔" میں نے سیوک رام کی نظروں میں پلنے سوال کو پڑھ کے کہا۔ "وہ کہیں گئے ہوئے تھے میں کومل کے پاس بیٹھ گیا۔"

"جب میں گیا تھا تو وہ یہیں تھے۔" سیوک نے کہا۔ "ان کو کہیں بھی نہیں جانا تھا۔"

"جب وہ آجائیں تو پوچھ لینا کہ تم سے اجازت لیے بغیر انھوں نے کہیں جانے کی جرأت کیسے کی۔ تم نوکر ہو ان کے یا مالک؟"

"تم کومل... ساد ھورام کو کیسے جانتے ہو؟" وہ بولا۔

"میں تو تم کو بھی جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم ملک صاحب کے گھر گئے تھے۔ مجھے کومل نے بتایا تھا۔"

"میں نے تم کو پہلے کبھی اس گھر میں نہیں دیکھا۔" سیوک کا شک برقرار رہا۔ اس کا لہجہ ہرگز نوکروں کی طرح نہیں تھا۔ وہ مجھ سے جرح کر رہا تھا اور مطمئن ہونے پر آمادہ نہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی دشمنوں کا ایجنٹ تھا جو نوکر کے بھیس میں ساد ھورام پر نظر رکھتا تھا۔ کیونکہ وہاں بھی دشمنوں کی تربیت یافتہ ایجنٹ تھی اور انھیں جس مشن پر بھیجا گیا تھا اس میں ساد ھورام ان کا مددگار تھا لیکن وہ اس پر بھروسا نہیں کر سکتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے دو آدمی اس کے ساتھ لگا دیے تھے۔ وہ تینوں ایک ہی کام کر رہے تھے۔ یعنی پاکستان سے اسلحے کو بھارت کے یا دیگر ممالک کے راستے مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں تک پہنچانے کا انتظام۔ مگر ساتھ ساتھ وہ ایک دوسرے کی نگرانی کا کام بھی کرتے تھے تاکہ کسی کی نیت بدلتی نظر آئے تو اس کا کام تمام کر دیا جائے۔

"تم نے ابھی زندگی میں بہت کچھ نہیں دیکھا ہے لڑکے۔" میں نے کہا۔ "مثلاً کیا تم نے ایٹم بم دیکھا ہے؟"

"بکواس بند کرو۔" سیوک نے مشتعل ہو کے کہا۔ "ایٹم بم کے بچے۔"

"میں ایٹم بم کا بچہ نہیں خود ایٹم بم ہوں۔" میں نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔ "برہان شاہ عرف شکر خود ہی تماشا ہوں اور تم [illegible]... دیکھنا یہ ہے کہ تم کیا ہو؟"

میں پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ سیوک گھریلو نوکر نہیں... میں اس کی طرف سے محتاط تھا۔ اپنے سامنے ریوالور دیکھ کر وہ ہراساں نہیں ہوا۔ اس نے بڑی پھرتی سے جست لگائی اور فلائنگ کک مار کے گرانا چاہا۔ میں تھوڑا جھک گیا اور وہ فرش پر گرا لیکن قالین پر اس کو چوٹ نہیں آئی۔ وہ اسپرنگ کی طرح اچھلا اور پلٹ کر آیا۔ اس نے ایک ٹانگ کی ایڑی پر گھوم کر دوسری ٹانگ میرے سینے پر ماری۔ میں لڑکھڑا کے گرا تو وہ بھی اڑتا ہوا میرے اوپر آگرا۔ میں نے ایک جھٹکا لیا اور اسے دونوں پیروں کی مدد سے پیچھے اچھال دیا۔ پھر مجھے اٹھنے کی مہلت نہیں ملی۔ وہ آگے آیا ہی تھا کہ میری لات اس کے پیٹ پر پڑی۔ پیچھے جا کر دیوار سے ٹکرایا اور سیدھا کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس کے منہ پر جوڈو کراٹے کا گھونسا مارا... نیم جان ہو گیا اور سیدھا منہ کے بل گرا۔ اس کا ماتھا... فرش پر لگا اور یہ آخری ضرب اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کرنے میں کافی ثابت ہوئی۔ میں نے ہاتھ جھاڑ کر ساد ھورام اور کومل کو دیکھا تو مجھے ایک ہی صف میں کھڑے ہوئے محمود و ایاز والا مصرع یاد آیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں وہ کھڑے نہیں پڑے تھے اور یہ صف بے جاں تھی۔

سیوک کے فوراً ہوش میں آ جانے کا اندیشہ کم تھا لیکن... کو کسی مردہ کتے کی طرح گھسیٹا ہوا اس کے بیڈ روم تک لے گیا اور اسے قالین پر ڈال دیا۔ پھر میں نے اس کی بیوی کا معائنہ کیا۔ میری نگاہ نے فوراً زندگی اور موت کے فرق کو دیکھ لیا۔ سانس کی آمد و رفت سے پیدا ہونے والی خفیف سی حرکت بھی مفقود تھی۔ دل کا دورہ مہلک ثابت ہوا تھا۔ بلا اختیار میری نظر نے وہ دوا تلاش کی جو سیوک نے دل بچارہ کو زندگی کی جدوجہد... کے لیے استعمال کی تھی۔ بہت سی شیشیوں میں بھی... کرنا دشوار ثابت نہ ہوا کیونکہ وہ ایک ہی شیشی تھی جس کا ڈھکن نہیں رکھا گیا تھا۔ حالانکہ میرے سامنے وہ ایک رنگ کے ڈبے میں سے نکالی گئی تھی۔ تصدیق کے لیے... دوسری شیشیوں کو دیکھا لیکن وہ سب یا تو دوائی... ان کے رنگ مختلف تھے۔ پھر مجھے زرد رنگ کا... آ گیا جس میں سے یہ شفاف رنگ کی امرت دائی جیسے... نکالی گئی تھی۔ ڈبے پر... وٹامن بی کیمیکلس کے شربت... والی کمپنی کا نام تھا اور اجزائے ترکیبی سب لکھے ہوئے... یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ کومل کے دورے میں...

...کیمیکلس کے شربت کے چند قطرے کیا اعجاز مسیحائی دکھا سکتے تھے۔ ... اس شیشی کا ڈھکنا کھولا اور احتیاط کے ساتھ بے رنگ... کو سونگھا۔ یقین تو مجھے پہلے بھی تھا کہ یہ وٹامن بی کیمیکلس کا شربت نہیں ہے جو بہت کم شدید نارنجی یا سرخی مائل زرد ہو سکتا تھا... بو بھی نہیں۔ پھر بی کیمیکلس کی مخصوص بو ہے جو کچھ روز سے استعمال... کے بعد پسینے سے بھی خارج ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بو بالکل جدا... یہ ایک سفاک قاتل بو تھی۔ یہ کڑوے باداموں کی بو تھی۔ یہ سائنائیڈ کی بو تھی جو اتنا زود اثر زہر ہے کہ خود نگلنے والے کو بھی کوئی خبر نہیں ہونے دیتا۔

میں نے شیشی کو مضبوطی سے بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔

... میں سب سے پہلے ایک عورت کام آئی تھی۔ سیوک نے... تھا کہ سامنے حماقت اور دھوکہ دینے والے اختلافات... ختم ہو گئے ہیں اور ایک خطرناک دشمن اندھا ہو گیا ہے۔ وہ عام... نہیں تھا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ بھی کوئی سر لنک کا ذمہ... اس قسم کی صورت حالات سے نبرد آزما ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ راز کو راز رکھنے کی سب سے... صورت اس عورت میں ہے جو ساد ھورام کی بیوی تھی۔ اس نے... کومل کی زبان کو خاموش کر دیا۔ مجھے کومل کی موت کا بالکل افسوس نہیں ہوا۔ جس قسم کے کھیل میں وہ شریک تھی اس میں... انسانی جانیں بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ وہ کچھ کرتی تھی یا نہیں کرتی تھی ساد ھورام کی نصف بہتر ہونے کا جرم ایسا تھا کہ اسے نہ اپنے... کر سکتے تھے اور نہ بنگلہ... اس کے دشمن دونوں طرف تھے... اس کے شوہر کا دوست کوئی نہیں تھا۔ انگریزی کا وہ مقولہ پیشہ... کہ جاسوس اور غدار کا دوست کوئی نہیں ہوتا۔

ایک چادر پھاڑ کر میں نے احتیاطاً ساد ھورام کے ہاتھ پیر... باندھ دیے... خانے میں آیا جہاں سیوک اسی طرح بے ہوش... اسے گھسیٹ کے تیسرے کمرے میں لے گیا۔ ... ایک خودکار ریوالور اور بہت تھوڑا... وہ تجربے کے استعمال پر بھی پوری طرح قادر ہوگا۔ ریوالور... صورت میں وہ دو چار دشمنوں کی... جان کر سکتا تھا۔ اس کے پاس شناخت کی... نہیں تھی۔ اگر وقت ہوتا تو میں اس سے پوچھ گچھ کرتا... ساد ھورام سے تفتیش کے نتائج جلد برآمد... میں نے دوبارہ دوسرے بیڈ روم کا رخ کیا... ایک رسی کی مدد سے... کرسی کے ساتھ باندھ... ہوئے تھے... ایک کنارے سے... اس کے منہ میں...

نے اتنا گہرا صدمہ دیا کہ اس سے زیادہ یا کم شدت کھونا اس کے اختیار کی بات نہ رہا۔

ساد ھورام کو ہوش میں لانے کے لیے پانی کے چند چھینٹے اور تھوڑا سا گلوکوز ملا ہوا پانی کافی رہا جو میں نے چمچے کی مدد سے اس کے حلق سے اتار دیا۔ اس کے مکمل طور پر ہوش میں آنے تک میں ریوالور لیے اس کے سامنے بیٹھا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔ میں نے کچن میں ریفریجریٹر بھی دیکھا تھا اس میں مجھے کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے مل جاتا لیکن ایک ہندو کے گھر کا کھانا کھانے پر طبیعت مائل نہ ہوئی۔ وہ ہندو بھی کوئی نیک، چین اور پارسا نہیں تھا جو میرے لیے ایک نجس کتے سے زیادہ ناقابل برداشت تھا کیونکہ وہ نمک حرام پیارا ہموطن ہونے کے باوجود میرے وطن کے دشمنوں کی سازش میں شریک تھا۔ اگر میں اس کے گھر کا نمک کھا لیتا تو مجھے احساس ہوتا کہ میرے اور اس کے درمیان دشمنی کی بنیاد میں فرق آ گیا ہے۔ بالآخر وہ ہلا اور اٹھنے لگا۔

"جہاں ہو وہیں آلتی پالتی مار کے بیٹھ جاؤ ساد ھورام۔" میں نے ریوالور کا کتا لیتے ہوئے کہا۔

"کیا... یہ..." اس کی نظر اپنی بیوی کے ساکت جسم پر پڑ گئی۔

"ہاں اسے تمہارے سیوک نے زہر دے کر مار دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ... نمک حرام..." ساد ھورام چلایا۔

"نمک حرام؟" میں ہنسا۔ "یہ تو تم اپنی بات کر رہے ہو۔ جیسے تم تھے ویسا ہی وہ تھا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔"

"میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ مٹھی بند کر کے بولا۔

"اگر وہ زندہ رہتا تو تمہیں بھی زندہ نہ چھوڑتا۔" میں نے کہا۔ "خیر تمہارا کام میں نے کر دیا۔ اب صرف تم بچے ہو۔ جب تم بے ہوش پڑے تھے تو میں تم کو آسانی سے قتل کر سکتا تھا۔"

"پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟" وہ تلخی سے بولا۔

"کیا تم کو زندگی سے پیار ہے ساد ھورام؟" میں نے کہا۔

"زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی۔" وہ بولا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ جب آدمی فاقہ کشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دینے کی سوچے۔" میں نے کہا۔ "لیکن جس کے پاس ساری دنیا کی خوشیاں خریدنے کے لیے دولت ہو وہ کبھی مرنا نہیں چاہے گا۔ اسی لیے میں نے تم کو نہیں مارا کہ میں تم کو ایک چانس دینا چاہتا تھا۔"

"کیسا چانس؟" اس نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"اس دولت کو خرچ کرنے کے لیے زندگی کی مہلت ملنے کا چانس جو تم نے بڑے ناجائز مگر چالاک ذرائع سے حاصل کی

www.paksociety.com

تھی۔" میں نے کہا۔ "مجھے سب معلوم ہو چکا ہے کہ تم اور تمھارے ساتھی کیا کرتے ہیں۔"

"میں نہیں سمجھا کہ تم میرے کون سے ساتھیوں کی بات کر رہے ہو۔" وہ بولا۔

"دیکھو ساد ھو رام! میں نے پہلے یہ کھیل ہر صورت میں ختم ہو جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو جگن ناتھ... کرنل جگن ناتھ سے جتنا لینا تھا وہ تم لے چکے۔ باقی پندرہ لاکھ کا صبح تک نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ کرپال والی دلربا بڑی حسین عورت تھی۔ تھی میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کی زندگی کے باقی رہ جانے والے چند گھنٹوں کو شمار کرنے کا کیا فائدہ۔ موتی کرپال والی کے عقیدت مندوں کو صبح سے پہلے ایک المناک حادثے کا شکار ہونا پڑے گا۔"

"تم کون ہو... دھی...؟" ساد ھو رام کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔

"ہاں، میں سائیں جہاں پٹھر والا ہوں۔" میں نے کہا۔ "سائیں بابڑ والے کا باپ... میں نے تم کو... کرنل جگن ناتھ کو اور دلربا کو اصلی روپ میں دیکھ لیا ہے۔ دلربا کے لیے کوئی چانس نہیں۔ تم وہ سب دولت جو تمھارے پاس ہے اپنے ساتھ لے کر روپوش ہونا چاہو تو میں تمھیں ایک موقع فراہم کر سکتا ہوں، یاد رکھو! قسمت نے دراز کے بعد تمھارے لیے ہر راہ ادھر تباہ ہو گی اور ادھر ادھر۔ شاید وہی جو اب تک تمھارے دوست تھے تمھارے سب سے زیادہ بڑے دشمن ہو جائیں گے۔ لیکن خدا کی بنائی ہوئی زمین پر تم جیسے حشرات الارض کہیں بھی گم ہو سکتے ہیں۔ ساد ھو رام تو بولا سنگھ یا راک پدمن... تمھاری دولت تمھاری زندگی کی اور اس کی خوشیوں کی ضامن ہو گی لیکن تمھارے لیے ایک بہت سادہ سی شرط ہے۔"

"کون سی شرط...؟" میری باتوں نے ساد ھو رام کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔

"تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ رابعہ اور نازو کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"رابعہ اور نازو؟ میں نے یہ نام پہلے نہیں سنے۔" وہ بولا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب گیا۔ "میں سچ کہتا ہوں۔" ساد ھو رام نے خوف زدہ لہجے میں کہا اور اوپر دیکھا۔ میرے جوتے کی نوک سے اس کی ٹھوڑی پر لگ پڑی۔ وہ پیچھے گرا تو میں نے اس کی پسلیوں میں اس کے سر پر اور پیٹ میں اتنی ٹھوکریں ماریں کہ وہ مرنے کے قریب ہو گیا۔

"اب یاد آیا... رابعہ اور نازو کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"ایک رات تم نے ان کو گاتے ماچھی کی جعلی خانقاہ کے باہر سے اپنی کار میں اٹھایا تھا۔"

"اچھا... تم ان کی بات کر رہے تھے... میں ان کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

"اسی رات تم نے میرے دو ساتھیوں کو گمراہ کر کے [illegible] کی طرف بھیجا تھا۔" میں نے کہا۔ "تاکہ تم مجھے اغوا کر سکو۔"

"ان لڑکیوں کو چھوڑ دیا گیا تھا...!" ساد ھو رام نے کہا۔

"چھوڑ دیا گیا تھا یا میرے ساتھی چھڑا کے لے گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"وہ... وہ دونوں انھیں نکال کر لے گئے تھے۔" ساد ھو رام نے کہا اور میں نے خود کو بہت پُرسکون محسوس کیا۔ اگر یہ لڑکیاں چھوٹ گئی تھیں تب بھی بہت غنیمت تھا۔ اس کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ ساد ھو رام کی بات میں جھوٹ کتنا ہے اور سچ کتنا۔

"اٹھو ساد ھو رام۔" میں نے کہا۔ "تم کو میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"کہاں... اس وقت...!" ساد ھو رام نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

"مجھے معلوم ہے وہ لڑکیاں کہاں چلی گئیں۔ اگر وہ دوبارہ مل گئیں تو تمھارا یہ چانس ضائع ہو جائے گا۔ صرف ایک ہی چانس تمھارے پاس ہے۔" میں نے کہا۔

میں نے ساد ھو رام کو اٹھتے ہی ناک آؤٹ کر دیا۔ پھر میں نے اس کو باندھ کر باہر کھڑی ہوئی گاڑی کی ڈگی میں منتقل کیا۔ دوسرے پچھلی سیٹ بھی ڈگی میں بند ہو گیا۔ اب گھر میں صرف ایک لاش رہ گئی تھی۔ میں نے اس کو بھی اٹھایا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ ایک لاش مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ میں نے سب کھڑکیاں اور دروازے بند کیے باہر تالا ڈالا اور جنریٹر آف کر دیا۔ پوری عمارت تاریک ہو گئی۔ میں نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور سوئچ آن کر کے فیول میٹر کو دیکھا۔ ٹینک میں کم سے کم تیس گیلن پیٹرول تھا جو میری ضرورت کے لیے بہت کافی تھا۔

چند منٹ بعد میری گاڑی شیورلیٹ سڑک کی طرف جا رہی تھی۔ کچے راستے پر مجھے جھٹکے محسوس ہو رہے تھے۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ ڈگی میں پڑے ہوئے ساد ھو رام اور سیٹ پر [illegible] کا کیا حال ہو رہا ہو گا۔ یہ کچا راستہ تقریباً چار میل لمبا تھا۔ دھول اور [illegible] آخر کار گاڑی پکی سڑک پر پہنچی۔ سمت کا تعین کرنے کے لیے میں نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر دائیں جانب چل پڑا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس بہت دور تک اجالا پھیلا رہی تھیں۔ کبھی کوئی گاڑی میرے سامنے سے نمودار ہوتی تھی تو مجھے ڈِم کرنا پڑتی تھی کیونکہ تنگ سڑک پر [illegible] میری رفتار غیر معمولی طور پر زیادہ تھی۔ اس کا نتیجہ [illegible] گاڑی جب آتی تو میری رفتار سے مخالف سمت میں چلنے [illegible]

لائٹوں کی چمک کی آواز آئی۔ چند سیکنڈ میں دونوں گاڑیوں کا فاصلہ اتنا زیادہ ہو چکا تھا کہ دوسری گاڑی والا کچھ نہ کر سکا۔ جتنی دیر میں اس [illegible] لگے گاڑی روکی ہو گی اور نیچے اتر کے دُگرجے سے ساتھ [illegible] جانے والے ٹرینٹ کو دیکھا ہو گا اتنی دیر میں شیورلیٹ کی [illegible] فاصلہ طے کر چکی تھی۔ دوسری گاڑی کا نقصان یقیناً زیادہ ہوا ہو گا کیونکہ وہ نسبتاً چھوٹی گاڑی تھی اور اتنی مضبوط بھی نہیں تھی جتنی [illegible] ماڈل کی یہ شیورلیٹ۔ تب وہ خاک نوٹ کرتا۔ شیورلیٹ [illegible] تھا اور نہ ہی لائٹس تھیں۔ مجھے نقصان کی ذرہ برابر پروا نہیں تھی۔ میں تو ایک وجدانی کیفیت میں خیالوں کے ساتھ [illegible] رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار میرے تصور کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی جس میں رابعہ کی صورت کے سوا کچھ نہیں تھا اور یہ ایسی قوت تھی جس کی کشش مجھے نتائج کی پروا کیے بغیر تیز سے تیز چلتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ جب تک اس کی امید اور اس کا خیال نہ تھا میرے دل کی یہ حالت نہ تھی مگر اب اس کی ساعت دیدار سے پہلے چند منٹوں کا یہ آخری ایک [illegible] کے عذاب کو سمیٹنے کا کرب بننے لگا تھا۔

جس گلی میں ایک ٹیکسی داخل ہو جاتی تھی اس میں شیورلیٹ جیسی بڑی گاڑی کار نہیں جا سکتی تھی۔ مجبوراً میں نے اسے [illegible] کے موڑ پر چھوڑا۔ دروازے کا قفل خراب تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے چابی نکال کے قفل میں گھمائی [illegible] دروازہ پھر بھی نہ کھل سکا۔ میرے لیے ایک پریشانی کی وجہ [illegible] پچھلی سیٹ پر پڑے پڑے اکڑ گئی تھی۔ اب مجھے [illegible] کا احساس ہو رہا تھا۔ آخر مجھے اس لاش کو یہاں [illegible] کی کیا ضرورت تھی۔ میں ساد ھو رام کے گھر میں کوئی [illegible] چھوڑ کے آنا نہیں چاہتا تھا اور میں نے اس کے گھر کو ایسے [illegible] کہ بعد میں کوئی آئے تو اسے کوئی شک پیدا کرنے والی [illegible] نظر نہ آئے۔ وہ یہی سمجھیں کہ گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں۔ [illegible] کے بعد لاش باہر کہیں بھی گرائی جا سکتی تھی۔ راہ [illegible] سنسان موڑ آئے تھے اور ویران علاقے آئے تھے۔ [illegible] نالے میں ڈالا جا سکتا تھا۔ یہاں اس کی موجودگی [illegible] مشکلات پیدا کر سکتی تھی۔ بے شک باہر اندھیرا تھا اور [illegible] والے بھی بہت کم تھے لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ [illegible] یا دروازہ کھول کر شور مچا دیں۔ [illegible] کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ تھا تو یہ کہ وہ ہوش [illegible] ان کے ڈگی کو کھول کر فرار [illegible] بہت کم تھا۔

چند منٹ تذبذب میں گزر گئے۔ پھر میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں سب سے بچھڑا ہوا، دوستی کے سہاروں سے محروم ہو جانے والا، محبت کی روشنی کے گم ہونے سے مایوسی کے اندھیروں میں بھٹکنے والا وہ مسافر تھا جو پھر اپنے رفیقانِ سفر سے آ ملا تھا۔ پھر محبت کے اُجالے کو دل میں یوں اترتا محسوس کر رہا تھا جیسے دامنِ ابر سے بہنے والی چاندنی ہر گوشۂ چمن کو منور کر دے۔ اور اس مرحلے پر جب مجھے بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑنا چاہیے تھا، میری عقل کیوں محوِ تماشائے لبِ بام تھی۔ میں نے اپنی وارفتگیٔ عشق اور جذبات کی بے خودی کے سامنے سر خم کیا اور اس دروازے کی طرف لپکا جو اپنائیت، خلوص اور یگانگت، تحفظ اور عافیت اور اعتماد اور چاہت کے شہر کا دروازہ تھا۔ دھڑکتے دل کو سینے میں دبائے میں نے آہستہ سے دستک دی۔ دروازہ غالب نے کھولا۔

"تم... سکندر بخت...!" اس نے فرطِ جذبات میں میرے بازو تھام لیے۔ "تم آ گئے... تم تو مرحوم ہو گئے تھے۔"

"میں مرحوم ہو گیا تھا... تم سب؟" میں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ مارا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟"

"وہ... ہم ذرا یقین کر رہے تھے بھائی کہ تم بعلم خود ہو... بھوت نہیں ہو سکندر بخت کے۔" غالب نے آنکھیں مل کر کہا۔

"بھوت کے بچے... باقی سب کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"باقی سب بھوت کے بچے کہاں ہیں؟" غالب ہنسنے لگا۔ "آؤ... اندر آؤ... اطمینان سے بیٹھو۔"

"میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے فوراً واپس جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"لوٹ کر تو آنا ہے نا؟" غالب نے کہا۔ "نہیں آنا تو مجھے بتاؤ، میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔"

"یار مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ تم بکتے کیوں نہیں..." میں نے گھر کی ویرانی سے گھبرا کے کہا۔

"اپنے بھائی محسن حسن خان تو گئے ہیں بھیس بدل کے اسلام آباد۔" غالب نے کہا۔

"کیوں؟ بھیس بدل کے کیوں؟"

"اور کیا کرتا بے چارہ باپ کے جنازے کو کندھا تو دے نہیں سکتا۔" غالب نے کہا۔ "دل ہلکا کرنے کو قبر پہ فاتحہ پڑھے گا... اپنی بدبختی کا غم اور کچھ آنسو قبر کی مٹی پر بہائے گا۔ بہن سے ملے گا اور لوٹ آئے گا کل تک۔"

"اوہ... تو اکمل شیروانی بھی دنیا کے دکھوں سے چھوٹ گئے۔" میں نے بوجھل دل کے ساتھ کہا۔

"ہاں، اولاد کا سکھ دیکھنا ان کے نصیب میں نہ تھا۔ آخری وقت میں ان کے لب پہ محسن کا ہی نام تھا۔" غالب نے

www.paksociety.com

کہا: "مگر اتنے کم وقت میں محسن کو بلایا جا سکتا تھا اور نہ وہ جا سکتا تھا۔ چلا جاتا تو واپس نہ آتا۔"

"اور شملا... وہ کہاں ہے گی اب؟" میں نے کہا اور وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"ابھی تو فوزیہ کے ساتھ ہی تھی۔ ظاہر ہے اس کا وہی ایک ٹھکانا ہے۔" غالب نے کہا۔

پہلی بُری خبر سن کے میرا سارا جوش و خروش سرد پڑ گیا تھا اور اشتیاق کا جذبہ دکھ میں ڈھل گیا تھا۔ میں ایک بار پھر خود کو مجرم سمجھنے پر مجبور تھا۔ یہ میری دوستی نبھانے کی سزا تھی جو انکل شیروانی نے برداشت کی۔ ان کا بیٹا جو ان کے آخری دنوں کا سہارا بن سکتا تھا ان کا نہ رہا اور وہ شدید چاہنے کے باوجود اسی بیٹی کے گھر میں پناہ گیر ہوئے جسے وہ اپنے گھر سے رخصت کر چکے تھے۔ وہ پرانی وضع پر قائم رہنے والوں میں سے تھے۔ داماد کے گھر میں رہنا ان کو سخت گراں گزرا ہوگا مگر انھوں نے یہ بے غیرتی بھی بیٹے کی وجہ سے برداشت کی۔ محسن کی قربانی اتنی بڑی تھی کہ میں نے خود کو بہت چھوٹا محسوس کیا۔ کیا یہ سب کچھ میں کر سکتا تھا؟ شاید نہیں۔ محسن نے دوستی کا حق ادا کرنے میں صدیوں سے گزری ہوئی روایت قائم کر دی تھی جو شاید کسی نے نہ کی ہوگی۔ اس کو آخری وقت میں باپ کے پاس نہ ہونے کا کتنا رنج ہوگا، اس کا میں بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس بات سے محسن کے دل سے غم کا بارِ گراں کم نہیں ہوتا تھا۔ شاید یہ عمر کی خلش اس کے دل سے کبھی نہ جائے گی اور وہ کبھی فیصلہ نہ کر سکے گا کہ اس نے میرا ساتھ دے کر والدین کو جو دکھ دیے تھے وہ تقدیر کے گناہ تھے یا تدبیر کی مجبوریوں کے جرم۔ اس نے غلط فیصلہ نہیں کیا تھا مگر وقت نے اس فیصلے کو غلطی بنا دیا۔ اس نے کبھی نہ چاہا تھا کہ وہ دوستی پر والدین کے حقوق کو قربان کرے مگر آزمائش کے مرحلے بعد میں پیدا ہوئے اور پھر وہ بے بس ہو گیا۔ اس کے لیے ممکن ہی نہ رہا کہ وہ والدین کے لیے کچھ کر سکے۔ والدین نے اس کی مجبوریوں پر اسے معاف کر دیا تھا کیونکہ وہ سب جانتے تھے۔ پھر کیا خدا اس کے گناہوں کو معاف نہیں کرے گا جو نیتوں کا بھید جانتا ہے۔

"تازہ اسپتال میں ہے۔" غالب نے خاموشی کے وقفے کو توڑنے کے لیے کہا۔

"اسپتال میں؟ کیا ہوا اسے؟" میں نے چونک کر سر اٹھایا اور وہ آنسو پونچھ دیے جو میری اجازت کے بغیر آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔

"وہ زخمی ہو گئی تھی۔" غالب نے کہا۔ "مگر تشویش کی کوئی بات نہیں۔ اس کا بھائی اور والدین اس کے ساتھ ہیں۔"

"کس اسپتال میں؟" میں نے کہا: "زخمی کیسے ہوئی تھی وہ؟"

"دلاور کو زندان کرانے کی کوشش میں۔" غالب نے کہا۔ "تم اور تمہارا وہ استاد جیدی، خواجہ بیگ محمد تو جیل میں پہنچے تھے تم جانتے ہو نا اسے۔ اسے بھلا کون قید کر سکتا تھا۔ وہ تو ہم تو بیچ سے لڑ جاتے ہیں، کی عملی تفسیر ہے۔ بس نکل آیا اور رابعہ کو بھی ساتھ لائی۔ پھر اچھا ہوا کہ محسن اور بیگ محمد مل گئے۔ وہ بے ہوش ہونے ہی والی تھی۔ یہاں اس کی دیکھ بھال نہیں ہو سکتی تھی اور اسے کسی پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرانا بھی ناممکن تھا۔ وہ اس قسم کے کیس لیتے ہی نہیں۔ تازہ کے شانے میں ایک گولی لگی تھی اور پسلی ٹوٹی تھی۔ غالباً دائیں جانب کی... میاں سکندر بخت تم سب کی شان سکندری ایک طرف اور اس نازک سی لڑکی کا حوصلہ ایک طرف۔ اسے تو شاید موت بھی آسانی سے تسخیر نہ کر سکے۔ ہم نے یہی بہتر سمجھا کہ اسے سرکاری اسپتال لے جائیں۔ میں نے اسے تشدد کے واقعات میں پہنچایا اور ڈاکٹروں کے سپرد کر کے اس کے جاننے والوں کو اطلاع بھجوا دی۔ جس کے بعد پولیس کے کارندے نے مجھے پولیس کے پہرے سے محفوظ رکھا۔ میں نے کہا کہ تحقیق تفتیش جو چاہو کرلیں، اس کا اعلیٰ بھی سب انسپکٹر ہے۔ ابھی آ جاتا ہے۔"

"انھوں نے پوچھا تو ہوگا کہ یہ سب کیسے ہوا؟"

"ہاں، میں نے کہا کہ مجھے کیا معلوم۔" غالب بولا۔ "میں تو اس روڈ پر گورنر ہاؤس کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ ایک چیخ بھی۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی کچھ لوگ ایک گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ گئے۔ نمبر وغیرہ میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس لڑکی کو میں پہچانتا تھا چنانچہ میں اسے لے کر اسپتال بھاگا۔ اس کا بھائی میرا دوست ہے۔ میرا بیان وقتی طور پر چل گیا اور میں نے دیکھا کہ ... ہے تو پچھلی طرف سے بھاگ لیا۔ سیدھا اپنے اخبار کے دفتر پہنچا اور کام میں لگ گیا۔ صبح پہنچا تو میں غائب تھا۔ پولیس والے جو شب حادثات میں ڈیرا ڈالے رہتے ہیں کچھ بھی نہ دیکھ سکے۔ ادھر وہ دیکھا ہوگا مجھے اور سمجھ گئے ہوں گے کہ میں چکر دے کر نکل گیا۔ نام یاد تھا انھیں، بعد میں شیخ کا فون آیا۔ میں نے کہا کہ تازہ کی خبر دو وہ کیسی ہے؟ وہ کہنے لگا کہ مجھے معلوم تھا تم یہی پوچھو گے اور بات ختم کر دو گے کہ تم اخبار کے دفتر سے نکلے ہی نہیں، بہرحال تم نے ہمارا فرض تو پورا کیا۔ اس کے لیے شکریہ۔ میں نے کہا کہ میں نے قانونی فرض پورا نہیں کیا؟ تو کہنے لگا کہ وہ الگ معاملہ ہے۔ خیر تم کے بعد تازہ کی طرف سے ہمیں بے فکری ہو گئی۔ وہ اب خطرے سے باہر ہے۔"

"مرزا غالب! مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ اس لڑکی کا قرض کیسے چکاؤں؟" میں نے کہا "میرے..."

"اکثر لوگ قرض لے کر بھول جاتے ہیں، مثلاً ہم۔" غالب نے کہا۔ "تم بھی یہی کرو۔ عزت آنی جانی چیز ہے۔ کبھی کوئی قرض خواہ مل جاتا ہے تو..."

میں نے نفی میں سر ہلایا: "یہ وہ قرض نہیں ہے مرزا غالب۔ میں احساس کے قرض سے نجات پا کے کدھر جاؤں۔ وہ تو مجھ کو اسی طرح زیر بار کرتی رہے گی۔ ایک بار اس نے مجھے میری زندگی دی تھی۔ رابعہ کو بچا کے اس نے مجھے دوسری بار زندگی دی ہے۔"

"رابعہ بھی اسپتال میں ہے۔" غالب نے کہا۔ شاید وہ میرے ذہن کو آہستہ آہستہ ہر صدمے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ میں نے غالب کا گریبان تھام لیا: "جو کچھ بتانا ہے ایک ہی بار میں بتا دو... میں سب کچھ برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔"

"یہ تم اپنے اسی حوصلے کا ثبوت دے رہے ہو؟" غالب نے ملامت کیے بغیر نرمی سے کہا۔ میں نے شرمندہ ہو کے اسے چھوڑ دیا۔ "کیا وہ بھی زخمی ہوئی تھی؟" میں نے کہا۔

"نہیں، جسمانی طور پر وہ بالکل ٹھیک ہے۔" غالب نے اپنی قمیص کا کالر ٹھیک کیا۔ "وہ ایک نفسیاتی معالج کے زیر علاج ہے۔"

"نفسیاتی معالج؟ صاف کیوں نہیں کہتے کہ وہ پاگل ہو گئی ہے۔" میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"تم جیسے معقول آدمی کو ایسی نامعقول بات نہیں کرنی چاہیے۔" غالب نے کہا: "نفسیاتی مسائل، اعصابی کشیدگی، ذہنی دباؤ، صدمات اور نفرت۔ ان سب سے ذہن کا متاثر ہونا پاگل پن نہیں کہلاتا۔ کوئی انسان فولاد کا بنا ہوا نہیں ہوتا۔ عورت جذباتی طور پر بھی زیادہ کمزور ہوتی ہے۔ ہسٹیریا اس کے جذباتی دباؤ کے حد سے گزر جانے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جو کچھ رابعہ کے ساتھ ہوتا رہا ہے وہ اس نے عام عورت کے مقابلے میں بہت زیادہ حوصلے کے ساتھ برداشت کیا مگر بالآخر اعصاب نے ہمت چھوڑ دی۔"

"اب کیا حال ہے اس کا؟ میرا مطلب ہے اس کی کیفیت کیسی ہے؟" میں نے کہا۔

"کیفیت ٹھیک ہے۔ وہ کسی کو کاٹنے کے لیے نہیں دوڑتی، کپڑے نہیں پھاڑتی اور چیختی چلاتی نہیں۔" وہ بولا: "تم ... ہے اور صرف خواب آور انجکشن دینے سے سوتی ہے۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹے سے اس نے پلک نہیں جھپکی تھی۔ اس کے علاوہ... وہ کسی کو نہیں پہچانتی۔ وہ اپنے ہی عذاب میں مبتلا ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے جو ایک شاعر نے بیان کی ہے:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا"

"اور اس کی یہ کیفیت کب تک رہے گی؟" میں نے کہا۔

"تم یہ سمجھو کہ وہ ریت کا ایک کمزور پشتہ تھی۔" غالب بولا: "اس نے ہر سیلاب بلا کا مقابلہ کیا اور اسے روکے رکھا مگر بالآخر سیلاب اسے بہا کر لے گیا۔ جب سیلاب گزر جائے گا تو اس پشتے کی تعمیر پھر کرنی ہوگی۔ تمھیں... مجھے... ہم سب کو۔"

"وہ کون سے نفسیاتی اسپتال میں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ اسپتال نہیں ہے، ایک ڈاکٹر کا گھر ہے۔" غالب نے کہا: "وہ ڈاکٹر بہت مشہور تو نہیں ہے مگر ماہر نفسیات ضرور ہے۔ تحلیل نفسی کرنے والے نہیں ہوتے وہ اسپیشلسٹ ہوتے ہیں، برین اسپیشلسٹ۔ ذہن کے مخصوص امراض عارضی ہوں یا دیرپا، سب کا علاج کرتے ہیں اسی طرح جیسے دوسرے اسپیشلسٹ جسم کے دوسرے حصوں کا علاج کرتے ہیں۔ دواؤں سے اور جھوٹی آلات سے۔ وہ ڈاکٹر میرا جاننے والا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ یہ میری بہن ہے اور اس کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ اگر اس کے بارے میں کوئی افواہ بھی پھیلی تو رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ اس نے مکمل رازداری کی خاطر رابعہ کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔ وہ بالکل محفوظ ہے اور بہت اچھے ہاتھوں میں ہے۔"

"تم نے بھی موقع پاتے ہی مجھ پر ایک احسان کا قرض لاد دیا۔"

"یہ تمہارا کمپلیکس بنتا جا رہا ہے۔ اگر کوئی تمہارے لیے کچھ کرتا ہے تو اس لیے کہ تم دوست ہو۔ دوستی میں احسان کا لفظ گالی سے کم نہیں ہوتا سکندر بخت۔" مرزا غالب نے کہا۔ "کیا ضرورت پڑنے پر تم میرے لیے کچھ نہیں کرو گے؟"

"کیا میں رابعہ کو دیکھ سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "آج رات تو میرے پاس وقت نہیں... لیکن کل..."

"ڈاکٹر کا خیال ہے اور ہم سب اس خیال سے متفق ہیں۔" غالب نے کہا: "کہ اس کی ذہنی صحت کی بحالی میں دعا اور دوا کے بعد سب سے اہم کردار تمہارا ہے۔ تم ہی اسے واپس اپنی دنیا میں لا سکتے ہو۔ تمہارے بغیر وہ اس دنیا میں لوٹنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوگی۔ اور تم کو بھی اسے یہ یقین دلانے کی جدوجہد کرنی ہوگی کہ تمہاری دنیا بھی بدل گئی ہے۔ تمہاری وہ دنیا جس میں ... شکاری تھے۔ نفرتوں کے قتل و غارت گری کے ظلم اور ناانصافی کے آتش دان اور بے رحمی کے عفریت منڈلاتے تھے۔ موت کے خطرات کے سائے تعاقب کرتے تھے۔ خانہ بدوشی اور دربدری تھی۔ زندگی ایک مسلسل فرار تھی یا تعاقب تھی۔ شاید وہ اس دنیا میں لوٹ کر آنا ہی نہ چاہے۔ پھر تم کو اسے یقین دلانا ہوگا کہ اب تم اسی دنیا میں ہو جس کے خوابوں کی تعبیر تلاش کرتے کرتے

www.paksociety.com

وہ تمھاری دنیا سے اتنی دور چلی گئی۔ تب آپ بتا دُگے کہ اب دنیا ہی جنت ہے جسے وہ آباد کرنا چاہتی تھی۔ تمھارے ساتھ مل کر۔ پھر ہم سب اسے واپس لے آئیں گے۔ وہ یقیناً واپس آئے گی۔"

"غالب! تم اب بھی اصل حقیقت کو مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"اصل حقیقت یہی ہے جو میں نے بتا دی۔" غالب نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

"مجھے شک ہے کہ رابعہ کی یہ ذہنی کیفیت نفسیاتی مسائل اور صدمات کا نتیجہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا اس پر تشدد ہوا تھا؟ اسے اغوا کر کے لے جانے والوں نے اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی ہوگی۔"

"رابعہ سے ان کو کیا معلوم ہو سکتا تھا؟"

"وہی جو انھوں نے مجھ سے معلوم کرنا چاہا تھا۔" میں نے کہا۔ "ان کو ہماری طرف سے یہ اطمینان نہیں تھا کہ ہم ان کے اصل کاروبار کے بارے میں کتنا علم رکھتے ہیں۔ ہم نے ان کو تاثر دیا تھا کہ ہمارے نزدیک وہ ہیروئن کے اسمگلر ہیں اور خود انھوں نے بھی کوشش کی تھی کہ خود کو منشیات کے دھندے میں ملوث ثابت کر دیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ وہ اس سے زیادہ سنگین جرم میں ملوث تھے۔ وہ اسلحے کی اسمگلنگ کر رہے تھے اور یہ اسلحہ مشرقی بنگال کے غیر ملکی تخریب کاروں اور ان کا ساتھ دینے والے علیحدگی پسندوں تک پہنچا رہے تھے۔ منشیات کا دھندا تو اس کے مقابلے میں بہت معمولی جرم تھا۔ انھوں نے خود اپنے خلاف اپنے جرم کے ثبوت مہیا کیے اور موقع دیا کہ ہم یہ ثبوت دیکھ لیں... یہ کوشش ہمیں گمراہ رکھنے کے لیے تھی۔ اگر کوئی لڑکا شراب پیے تو اُسے یہ ڈر ہوتا ہے کہ شرابی کو ماں باپ اور سارے گھر، خاندان اور محلے میں کتنی منافقت اور نفرت کا سامنا ہوگا۔ وہ خود اپنے بارے میں مشہور کرائے کہ اس کو جوئے کی عادت ہے تو سب اسے بُرا کہیں گے مگر شرابی کے مقابلے میں جواری بہرحال قابل قبول ہوتا ہے۔ انھوں نے مجھے اسی لیے اغوا کیا تھا کہ مجھ سے حقیقت جان سکیں۔ انھیں اطمینان ہو جائے کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں وہی ہے جس کا ہم اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے بہت سائنٹیفک طریقے پر کام کیا۔ انھوں نے مجھ پر جسمانی تشدد نہیں کیا۔ میرے ذہن کو معطل کیا۔ ایسی دوائیں دینے کی کوشش کی جن سے میرا ذہن میرے اختیار میں نہ رہے۔ اور اگر مجھے شبہ نہ ہوتا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتے لیکن میں بچ گیا۔ میں بعد میں بتاؤں گا کہ کیسے... میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ کیا یہی رابعہ کے ساتھ کیا گیا تھا؟ اور کیا اس کے ذہن پر انھی دواؤں کا اثر ہے؟"

"تمھارا اندازہ درست ہے۔" غالب نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اعتراف جرم کرتے ہوئے کہا۔ "رابعہ پر ذہنی تشدد ہوا تھا۔"

"اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن کیا اس نے قبول دیا کہ ہم حقیقت کو جانتے ہیں؟"

"یہ وہ خود تو بتا نہیں سکتی۔ نازو کے کہنے کے مطابق اس نے بھرپور مزاحمت کی۔" مرزا غالب نے کہا۔ "اور ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ذہن کے ماؤف ہونے کے اثرات اسی مزاحمت کا نتیجہ ہیں۔ جسمانی یا ذہنی تشدد کے خلاف قوت برداشت کا مظاہرہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جسم ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور ناکارہ ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی ذہن پر ہونے والے تشدد کو برداشت کرنے سے ذہنی توازن میں شکست و ریخت ہوتی ہے۔ علاج سے جسم بھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ علاج سے اس کا ذہن بھی نارمل ہو جائے گا۔ یقین ہے کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھی ہے۔"

"اس وقت میں یہاں اتنی دیر رکنے کے لیے نہیں آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں اپنے ساتھ ایک تجزیہ لے کر آیا ہوں۔ مجھے آج رات ایک کام ختم کرنا ہے جو کل نہیں ہو سکتا۔"

"اس کا مطلب ہے تم واپس جاؤ گے؟" مرزا غالب نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے مدد کی ضرورت تھی۔ تم تینوں میں سے کوئی بھی ساتھ رہتا تو اچھا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن محسن ہے نہیں اور ٹیک محمد بھی غائب ہے۔"

"میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔" مرزا غالب نے کہا۔

"اور بعد میں ٹیک محمد آئے گا تو پریشان ہوگا۔" میں نے کہا۔ "کل محسن بھی آجائے گا۔"

"میں ان کے لیے پیغام چھوڑ جاتا ہوں۔" وہ بولا۔

"یہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے چند سطروں میں بتا دو فکر نہ کرے۔ میں خیریت سے واپس آ گیا ہوں اور عمر دراز کا پتا لگ گیا ہے۔ یہ اطلاع نازو کو بھی دے دے۔ محسن کو بتا دے کہ ہم ذوالفقار سے آگے موضع کرمان والا میں ہوں گے۔ اول تو ہم صبح تک لوٹ آئیں گے لیکن کسی وجہ سے نہ آ سکے تو محسن اور ٹیک محمد کو علم ہوگا کہ ہم کہاں گئے تھے۔"

غالب نے یہی بات کاغذ کے ایک پرزے پر لکھی اور پیغام کو ایک نمایاں جگہ پر رکھ دیا۔ میں نے غالب کو اپنے دو ریوالور رکھنے کو کہا اور اپنے لیے بھی ایک اور ریوالور لیا... مسروقہ، ضبط شدہ اور مال غنیمت کی صورت میں حاصل کیا گیا آتشیں اسلحہ جمع ہو گیا تھا کہ ہم جہاں جاتے تھے ایک اسلحہ خانہ لیے پھرتے تھے۔ ویسے تو ہمارے پاس دشمن سے چھینی ہوئی ... بھی تھی لیکن اس کے راؤنڈ ختم ہو جانے کے بعد وہ ...

یہ معروف ہو گئی تھی۔ اس ملک میں ایک معمولی پستول اور بھی پرمٹ اور لائسنس کے بغیر نہیں ملتا تھا اور لائسنس حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے مقابلے کی یہی ایک صورت رہ جاتی تھی کہ ہم دشمنوں سے ہی ان کا اسلحہ چھین کر جمع کرتے جائیں اور ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والا اسلحہ رکھیں۔ ابھی تک اسلحے کی ضرورت پوری کرنے میں سب سے زیادہ مددگار چوہدری دولت کے شکاری ہوتے تھے جو ہمارا شکار بنتے تھے۔ ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے یا بھاگ جانے پر مجبور ہوئے تھے تو اپنا اسلحہ چھوڑ گئے تھے۔

غالب نے دروازے کو مقفل نہیں کیا۔ وہ دونوں پٹ ملا کے چھوڑ دیا۔ جب میں چلنے لگا تو مجھے زہر کی وہ شیشی یاد آئی جو میری جیب میں پڑی تھی۔ میں نے واپس اندر جا کے اسے ایک محفوظ مقام پر چھپا دیا۔ جہاں اس پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ پھر میں غالب کے ساتھ گلی کے موڑ تک پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ میں رابعہ اور نازو، محسن، ٹیک محمد اور غالب سب کو اپنی اچانک آمد سے حیران کر دوں گا اور ان کی خوشی سے بھرپور آنکھیں دیکھ کر ان کے مسرت سے لبریز آنسو پونچھ کے لوٹ جاؤں گا۔ اسے سارا منصوبہ خاک ہو گیا... مجھے ویرانے میں تنہا بھٹکنے والی روح کی طرح غالب ملا تھا۔ باقی سب بکھری ہوئی شکلیں تھیں۔ پانچ دس منٹ کے بجائے مجھے آدھا گھنٹا لگ گیا تھا اور اب میں ڈر رہا تھا کہ اتنی دیر میں ایک حقیقی اور دو زندہ لاشوں کے وجود کا راز فاش نہ ہو گیا ہو۔

وہ مختصر سا مجمع میں نے دور سے ہی دیکھ لیا جو شیورلیٹ گاڑی کے پاس حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ منتظر بنا کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ سب باتیں ... اس آفت سے بچ جاتا لیکن باتوں باتوں میں آدھا گھنٹا گزر گیا اور اتنی دیر میں کسی نے گاڑی میں پڑی لاش کو دیکھ لیا۔ معلوم نہیں اب کیا ہونے والا تھا۔

"مرزا غالب!" میں نے کہا۔ "اس گاڑی میں ایک عورت کی لاش پڑی ہوئی تھی... ایک ہندو عورت کمل کی لاش۔"

"لاش... اور وہ بھی ایک عورت کی... عورت بھی ہندو۔" مرزا غالب نے سر پکڑ لیا۔ "سبحان اللہ... کیا بات ہے جناب کی۔ اپنے لیے مصیبت پیدا کرتے ہیں تو ایسی کہ 'ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے'۔"

"تشویش مت کرو۔ کام کرو۔" میں نے کہا۔ "اس مصیبت سے چھٹکارا پانا بے حد ضروری ہے۔ ورنہ یہ تو مصیبت ... ہو جائے گی۔ ... ذہن میں بھی بند ہے ... اب ہم قریب جا کے صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں۔"

یہ لوگ گاڑی والے کی واپسی کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"ممکن ہے کسی کو بھیج چکے ہوں کہ پولیس کو بلا لائے۔" مرزا غالب نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "بہرصورت تم قریب جا کے لوگوں سے بات کرو۔ عام تماشائی کی طرح پوچھو کہ بات کیا ہے۔ پھر جاؤ اور کسی باوردی پولیس مین کو پکڑ لاؤ۔ اسے دو چار سو کی جگہ ہزار بھی دینے پڑیں تو کوئی بات نہیں۔ کسی صورت اسے یہاں لے آؤ اور اس سے کہو کہ مجمع کو منتشر کر دے۔ ڈانٹ ڈپٹ کر کے بھگا دے۔ تمھارا پریس کارڈ کام آ سکتا ہے۔"

"کوئی پولیس والا اگر مل بھی گیا تو کیا وہ خود لاش کو نہیں دیکھے گا؟" غالب نے کہا۔

"ایک پولیس والا ایک آدمی ہوتا ہے اس سے نمٹا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اتنے بڑے مجمع سے میں اکیلا نہیں نمٹ سکتا۔"

"چلو میاں سکندر... تمھاری دوستی میں جو بھی ہو جائے کم ہے۔" مرزا غالب نے آہ بھری۔ "تم تو پوری کوشش کر رہے ہو کہ اپنے ساتھ ہمیں بھی فوت کر دو۔ مگر نہ جانے کیوں تقدیر ہمیں بچا رہی ہے۔"

گاڑی کے آس پاس دس بارہ آدمی جمع تھے۔ ان میں سے کچھ دہشت زدہ سے کھڑے تھے اور کچھ گاڑی کے شیشوں سے ناک لگائے اندر تاریکی میں پڑی ہوئی لاش کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر یہ شارع عام ہوتی تو اتنی دیر میں دس بارہ نہیں سو ڈیڑھ سو افراد کا ہجوم ہوتا۔ میں نے اور غالب نے انجان بن کے اپنے تجسس کا اظہار کیا۔

"کیا ہوا ہے جی؟" میں نے ایک بابو ٹائپ شخص سے کہا۔

"گاڑی میں لاش پڑی ہے۔" اس نے بے حد پُراسرار انداز میں سرگوشی کی۔

"اچھا! کس کی لاش؟" میں نے بھی آہستہ سے کہا۔

"عورت کی۔" بابو نے کہا۔ "دیکھو... دیکھو تم بھی..."

"گاڑی کس کی ہے؟" میں نے اسی لرزہ خیز انداز میں پوچھا اور لاش کو دیکھنے سے گریز کیا۔

"معلوم نہیں... یہاں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے کوئی۔" بابو نے بتایا۔

"تمھارا مطلب ہے گاڑی یہاں رہنے والے کسی شخص کی نہیں ہے؟" میں نے تعجب سے کہا۔

بابو نے نفی میں سر ہلایا۔ "اتنی بڑی گاڑی کس کی ہو سکتی ہے یہاں کسی کے پاس۔ یہاں تو کسی کے پاس سائیکل بھی ہو تو دولت مند بنتا ہے۔"

"ابھی آ جاتی ہے جی پولیس۔" کسی نے بہ آواز بلند کہا اور میں...

www.paksociety.com

نے اس لاؤڈ اسپیکر کو دیکھا۔ وہ کوئی پہلوان لگتا تھا۔

"کیا کوئی گیا ہے پولیس کو بلانے کے لیے؟" مرزا غالب نے معصومیت سے کہا۔

"ہاں، بھیجا تو تھا ایک بندہ۔" پہلوان بولا۔ "اب وہ گھر جا کے بیٹھ گیا ہو تو پتا نہیں... سب ڈرتے ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ... ڈرنے کی کیا بات ہے۔" مرزا غالب نے کہا۔ "میں لاتا ہوں ابھی پولیس کو... مگر آپ لوگ ایسا کریں کہ یہاں مجمع بالکل اکٹھا نہ ہونے دیں... آپ پہلوان جی... اور آپ مولانا صاحب... خان صاحب آپ بھی... آپ تینوں سب کو ملتا کیں اور کسی کو مت رکنے دیں۔"

"ٹھیک ہے جی..." پہلوان نے فوراً یہ ذمے داری قبول کرلی۔ "آپ ذرا فٹافٹ پولیس کو لے آؤ... اور ہاں... چلو باقی سب ادھر سے چلتے پھرتے نظر آؤ... کوئی دنگل نہیں ہو رہا ہے یہاں۔"

"ہاں بھئی، توبہ استغفار کرو۔" مولانا نے کہا۔ "اپنے گھر جاؤ اور موت کو تماشا مت سمجھو... خود تم نے بھی مرنا ہے ایک دن۔"

"واہ واہ رے صوفی... بات ایسے کرتا ہے جیسے خود کو نہیں مرنا۔" ایک نوجوان نے جاتے جاتے فقرہ کسا۔ "خود بھی تو گھر جا۔"

"چل اوئے شور مچانے والے... گھس مار کے دندا کا الٹ دوں گا..." پہلوان نے بجرا کے نوجوان کی بات کا جواب دیا۔ لوگ فوراً کھسکنے لگے۔ تیسرا شخص میں تھا جس کو غالب نے خان صاحب کہہ کے مخاطب کیا تھا۔ میں نے بھی حسب توفیق اس ڈانٹ ڈپٹ میں حصہ لیا اور یا تو خود وہاں ہم تین رہ گئے۔ اس کے بعد ہم نے کسی کو بھی وہاں نہیں رکنے دیا۔

غالب دس منٹ بعد ایک وردی والے ٹریفک کانسٹیبل کے ہمراہ نمودار ہوا۔ بے شک یہ ٹریفک کا مسئلہ نہیں تھا مگر کانسٹیبل تو کانسٹیبل ہی ہوتا ہے۔ اس نے قانون کے محافظ کی حیثیت سے فوراً جائے واردات کا معائنہ کیا۔

"تھانے کون چلے گا؟" کانسٹیبل نے پہلوان اور مولانا کی طرف گھور ڈالی۔

"میں تو مسجد جا رہا تھا۔ عشا کا وقت ہو گیا ہے۔" مولانا نے کہا۔ "مجھے تو آپ معاف ہی رکھیے۔"

"تم چلو گے خان صاحب؟" غالب نے پھر مجھے مخاطب کیا۔

"کیوں نہیں جی... مجھے تو جانا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"چلو اب چنگا ہو گیا۔ میں وی جاتا ہوں۔" پہلوان نے اطمینان کا سانس لیا۔ "کل دنگل ہے... کالو پہلوان توں لڑنا ہے۔"

جب میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر چابی لگائی تو کانسٹیبل حیران ہوا۔ "یہ گاڑی تمہاری ہے... تم نے پہلے نہیں بتایا؟" وہ مجھے ڈانٹ کر بولا۔ ہم تینوں آگے بیٹھ گئے۔ کانسٹیبل دوسری طرف میں رہا۔

"تم نے پوچھا ہی کب تھا۔" میں نے کہا۔ "اور ابھی تو کہا ہے کہ مجھے جانا ہی پڑے گا... گاڑی میری نہ ہوتی تو میں کیا جاتا؟"

"پھر تو میاں جی پھانسی ہو گی تمہیں... بیوی کو قتل کرکے چھپکنے لے جا رہے تھے؟" کانسٹیبل نے ماہر سراغ رساں کی طرح مفروضات پر کیس بنانا شروع کیا۔ "کس سے لگائی تھی؟"

"میں اپنا بیان تھانے جا کر دوں گا۔" میں نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔ راستے میں سب ٹریک کر دے گی۔ ٹریفک کانسٹیبل کا میری گستاخی پر غصے سے برا حال ہو گیا۔

"جھانپڑ پڑے گا... مجھے... میری تو..."

"ہاں تمھیں۔" مرزا غالب نے کہا۔ "دوسرا رسید کرو گے؟" اس وقت تک گاڑی بہت دور آ چکی تھی اور سنسان سڑک پر ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ کانسٹیبل کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

"چھوڑو یار! اسے بھی ٹھنڈا کرو۔ بہت گرم ہو گیا ہے۔" میں نے غالب سے کہا۔

"تم... تم دونوں منافق ہو..." کانسٹیبل کا رنگ اڑ گیا۔ "وہ قتل تم دونوں نے کیا تھا؟"

"ہاں، ہم یہ کام مل کر کرتے ہیں۔" مرزا غالب نے کہا۔ "قتل کیسے ہی اتفاق والے سے کیے ہیں۔ ویسے تم رہتے کہاں ہو؟"

"کیوں... میرے گھر سے کیا لینا ہے تم کو۔" کانسٹیبل اب سچ مچ پریشان ہونے لگا تھا۔

"ہم تمہاری سہولت کے لیے پوچھ رہے تھے۔" مرزا غالب نے کہا۔ "تمہارے دروازے پر ہی ڈال دیتے تمہیں۔"

"ورنہ لواحقین پریشان ہوتے پھریں گے مردہ خانوں اور جیل خانوں میں۔" میں نے کہا۔

"دیکھو یار! میں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ہے... مجھے..." کانسٹیبل کی حالت غیر ہو گئی۔

"اچھا... تم کو ہم یہاں گرا دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "شرط یہ ہے کہ تم پیٹھ پھیر کر چالیس قدم ناک کی سیدھ میں سفر کرو گے۔ ذرا بھی گردن گھمائی تو گولی کھوپڑی میں اتر جائے گی۔"

"توبہ... میرے باپ کی بھی توبہ... اب مجھے جانے دو۔" وہ منت سماجت کرنے لگا۔ ذرا سی دیر کے لیے گاڑی روکی اور وہ اتر جانے کا موقع پاتے ہی ہمیں ایک مشترکہ گالی دی اور سرپٹ بھاگا۔

"اس کو واپس وہاں پہنچنے کے لیے پانچ چھ میل چلنا پڑے گا۔ ڈیوٹی پہ تھا۔" مرزا غالب نے ہنس کر کہا۔

"کیا یہ ہمیں پھر تلاش نہیں کرے گا؟" میں نے کہا۔ "جہاں گاڑی تھی وہاں تک تو پہنچ ہی جائے گا۔"

"وہاں کیا معلوم ہوگا... میں تو نہیں۔" غالب نے کہا۔ "تم غائب تھے۔ لوگوں کے لیے ہم بھی اجنبی تھے۔ اتنی بڑی گاڑی کا پتا اسے کون بتائے گا۔ مگر اب آپ یہ وضاحت کریں کہ آپ نے اپنی جان کیوں خطرے میں ڈالی؟"

میں نے اسے کم سے کم الفاظ میں وہ سب بتا دیا جو فرار ہو جانے کے بعد سے میری واپسی تک ہوا تھا۔

"اس لاش سے تو کچھ معلوم ہو نہیں سکتا۔" مرزا غالب نے کہا۔ "اسے کیوں لیے پھر رہے ہو؟"

"کبھی کبھی آدمی کو حماقت بھی کرنی پڑتی ہے۔" میں نے کہا۔ "کہیں اس کا کریا کرم کر دیتے ہیں۔"

"اس میں سوچنے کی کون سی بات ہے۔" غالب نے کہا۔ "ایسے ہی چھوڑ دیں گے جہاں سے اٹھایا تھا۔ ہم واپس جا رہے ہیں؟"

"ہاں ابھی تو سادھو رام کے گھر ہی جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ دشمن کے بہت اہم آدمی ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" غالب نے کہا۔ "لیکن ایک رات میں کچھ معلوم کرنا مشکل ہوگا۔ یہ عام لوگ نہیں کہ فوراً سب کچھ بتا دیں۔ ان کی تربیت ایسی ہوتی ہے کہ ان کی ترجیحات سب بدل جاتے ہیں۔ عموماً یہ لوگ جان دے دیتے ہیں مگر بتاتے کچھ نہیں۔ بہت سخت جان لوگ ہوتے ہیں۔"

"ہوتے تو گوشت پوست کے انسان ہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "عذاب سہنے کی حد بالآخر آ جاتی ہے۔"

"بالکل آ جاتی ہے۔ لیکن ہمارے پاس تو آج کی پوری رات ہے۔" غالب نے کہا۔ "اور یہ رات بھی ہم تفتیش کرتے رہیں تو سادھو رام کو آئندہ استعمال کرنا ممکن نہیں۔ تمام ضروری معلومات اسی سے حاصل ہو جائیں، یہ ضروری نہیں۔ تمہارے دشمنوں کو پتا چلے گا تب بھی وہ ماریں گے اور ہمارے ہاتھوں عذاب سہہ کر ماریں گے۔"

غالب کی بات بہت معقول تھی۔ جیسے جیسے وہ کام کرتا تھا... سادھو رام کے معلومات برآمد کرنے کا عمل جراحی اس وقت تک جاری رہنا تھا جب تک ہمیں یقین نہ آ جائے کہ اب اس غدار ضمیر فروش کی کھوپڑی خالی ہو چکی ہے۔ میں نے گاڑی کو پچھلے راستے پر اتارا اور دس منٹ میں ہم پھر سادھو رام کی حویلی میں تھے۔ میں نے جنریٹر چلایا، دروازے کھولے اور بیڈ روم کی لائٹ جلائی۔ غالب نے میری مدد کی اور ہم کومل کی لاش کو واپس اٹھا کر اس کے بیڈ روم میں لے گئے۔ ہم نے اسے یوں لٹا دیا کہ وہ فطری انداز میں سوتی دکھائی دے۔

"بس اب جتنا مال غنیمت مل سکتا ہے وہ سمیٹو اور چلو۔" میں نے کہا۔ "یہ تو ہمارے ہی دشمنوں کا مال ہے۔"

"تو مال غنیمت جمع کرو۔ میں دیکھتا ہوں کاغذات اور دستاویزات۔" غالب نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایسے کام کرنے والے کوئی ثبوت گھر پر نہیں رکھتے جو کسی کے ہاتھ لگ جائیں تو مصیبت بن جائے۔"

"منطقی طور پر یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے۔" غالب نے کہا۔ "پھر بھی تلاش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

میں نے گھر کے اندر مختلف خانوں اور الماریوں کی تلاشی سے چالیس ہزار روپے کی پاکستانی کرنسی برآمد کی۔ تقریباً اسی قدر مالیت کی انڈین کرنسی ایک سوٹ کیس میں بند تھی۔ معلوم نہیں سادھو رام نے اسے کس مقصد کے لیے جمع کیا تھا۔ غالباً آڑے وقت کے لیے جب اسے اچانک بھاگنا پڑے تو وہ ایسا سوٹ کیس لے کر سرحد پار کر جائے۔ مصیبت کے وقت سب سے بڑا دوست اور سب سے زیادہ قابل اعتماد سہارا پیسے کا ہی ہوتا ہے جو سارے مسائل حل کر دیتا ہے اور تمام مشکلات سے نجات دلا دیتا ہے۔ سادھو رام جیسے لوگ بے یقینی کے خوف کے سائے میں جیتے ہیں۔ ایک طرف اپنے خزانوں کے بھرے جانے سے خوشی ملتی رہتی ہے تو دوسری طرف یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر تقدیر نامہربان ہو گئی تو ایک چھوٹی سی غلطی بہت بڑی سزا بن جائے گی۔ پھر پناہ کون دے گا۔ جن کی تھالی میں کھایا اور پھر انہی کی تھالی میں چھید کیا، وہ تو برا حشر کریں گے۔ جن کے لیے یہ سب کیا تھا، وہ بھی اس چھوٹی سی غلطی کو ناقابل معافی جرم بنا دیں گے۔ جیب بھری ہوگی تو کسی گوشہ گمنامی میں چھپ چھپا کے بھی زندگی گزارنے کی گنجائش رہتی ہے۔ میں نے اس سوٹ کیس کو بھی باہر لے جا کر ڈگی میں ڈالا۔

سادھو رام بدستور بے ہوش تھا لیکن کسی حد تک ہوش میں آ چکا تھا۔ آنکھیں کھولے پڑا تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر باہر نکال دیا اور پھر اپنے پیروں پر کھڑا کیا لیکن وہ دوبارہ گر گیا۔ میں اس کو گھسیٹ کر اندر لے گیا اور اس کے منہ میں سے کپڑا نکال کر اسے ڈرائنگ روم کے قالین پر ڈال دیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کے ہاتھ ابھی تک کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔

www.paksociety.com

"تمھارا اصل نام کیا ہے بیوک؟" میں نے کہا اور ریوالور لے کر اس کے سامنے یوں بیٹھ گیا کہ وہ سائیلنسر کو بھی دیکھ لے۔

"اصل نقلی نام سے تم کو کیا لینا ہے؟" وہ بولا۔

"ویسے تو تم سادھو رام کے ملازم تھے۔" میں نے کہا۔ "لیکن درحقیقت سادھو رام تمھارا ملازم تھا۔ کیا تمھارا تعلق بھی آرمی سیکرٹ سروس سے ہے۔ کرنل جگن ناتھ کی طرح۔ یا تم کمانڈوز میں سے ہو؟"

"معلوم نہیں تم یہ فضول سوالات کیوں کر رہے ہو۔" وہ حقارت سے بولا۔ "تم مجھ سے یہ توقع کیوں رکھتے ہو کہ میں تمھیں سوالات کے درست جواب بھی دوں گا۔ فرض کرو میں کہوں ہاں۔ اور میرا نام کیپٹن ٹام ڈک یا کرنل ہیری ہے۔"

"ٹام ڈک اینڈ ہیری۔ ایرا غیرا نتھو خیرا۔" میں نے کہا۔ "واقعی نام میں کیا رکھا ہے لیکن تمھارے جواب سے مجھے تمھارے تعلیم یافتہ ہونے کا پتا چل گیا ہے۔ تمھارے کام کی نوعیت کے پیش نظر میں فرض کر لیتا ہوں کہ تم خصوصی مقاصد کے لیے منتخب کیے جانے والے خاص آدمی ہو۔ ایسے خطرناک مشن کی نگرانی معمولی لوگ نہیں کر سکتے۔ یہ بات دلربا کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ وہ واقعی بہت غیر معمولی عورت ہے۔ میں نے اس کو اصل روپ میں دیکھا ہے اسی لیے میں ایسا کہہ رہا ہوں۔ وہ حسن و شباب کے اسلحے کو بے دریغ استعمال کرنا جانتی ہے مگر اس سے زیادہ خطرناک وہ ذہانت ہے جس سے کام لے کر وہ دلربا سے کرپان والی بن گئی۔ اس نے اپنی جگہ بنانے کے لیے سائیں بابا جی والے کو غائب کر دیا۔ یہ اسی کرپان والی کی کرامت تھی یا اسے وہاں پہنچانے والوں کی۔ مگر اس نے بہت ہوشیاری سے گاؤں والوں کے سامنے اپنی قلندری کا سوانگ رچایا۔ اس ڈرامے میں وہ بہت کامیاب رہی۔ لیکن وہ بات آج بھی سچ ہے کہ سو دن چور کے تو ایک دن کوتوال کا۔ تم نے فرض کر رکھا تھا کہ اس ملک کی انٹیلی جنس سوئی ہوئی ہے جب کہ وہ کھلی آنکھوں سے سب دیکھ رہے تھے۔"

"یہ میرے لیے کوئی حیرت انگیز انکشاف نہیں۔" وہ بولا۔ "جب کوئی اس قسم کے مشن پر دشمن کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے تو اسے کوئی خوش فہمی نہیں ہوتی۔ دشمن کو بھلا کون بے وقوف اور کمزور سمجھتا ہے۔ سب ہی جان ہتھیلی پر رکھ کے سرحد پار کرتے ہیں۔ اگر دوسرے ملک کی انٹیلی جنس باخبر ہے تو حیرانی کیسی۔ جنھیں جان عزیز ہوتی ہے وہ ایسے کام کرتے ہی نہیں۔"

غالب کا خیال ٹھیک تھا۔ بیوک جیسے تربیت یافتہ جاسوس یا کمانڈو سے کچھ بھی نہیں پوچھا جا سکتا تھا۔ اسے موت کی پروا ہی نہیں تھی۔ "پھر بھی صبح تک تم سوچ لو۔" میں نے کہا۔ "تم اپنے تمام ساتھیوں کے پتے ٹھکانے بتانا پسند کرو گے یا زندہ رہنا؟"

"تمھاری پیش کش احمقانہ ہے۔ میں غداری کا مرتکب ہونے سے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ خود کو گولی مار لوں۔" وہ بولا۔

"تمھاری مرضی۔ ویسے سادھو رام سے بھی کچھ نہ کچھ تو معلوم ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اس الو کے پٹھے کو تو میرا اصل نام تک معلوم نہیں۔" بیوک ہنسا۔ "وہ زیادہ سے زیادہ یہ بتا سکتا ہے کہ اس نے کتنا اسلحہ کس رقم میں بیچا تھا۔ جگن ناتھ... دلربا... یہ سب نام بے مقصد ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں نے جس ہیلی کاپٹر کا فیول ضائع کیا تھا وہ سب بھی بوگس تھا۔" میں نے کہا۔ "خیر... ہم معلوم کر لیں گے... ہم بہت کچھ معلوم کر چکے ہیں لیکن تمھیں نہیں معلوم۔"

"تمھارا تعلق بھی آرمی انٹیلی جنس سے ہے؟" وہ بولا۔

"بس؟" میں مسکرایا۔ "گویا تم نے اپنے آرمی انٹیلی جنس سے تعلق کو تسلیم کر لیا ہے۔ بس میرا تعلق بھی اسی سے ہے۔ تمھارے سب ایجنٹ... ان کی سرگرمیاں... ٹھکانے اور عزائم... ان کا ساتھ دینے والے ضمیر فروش، پیسے کے لالچ میں ملک کو بیچنے والے... یہ سب سامنے آتے جا رہے ہیں۔"

"یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟" وہ بولا۔

"مجھے کوئی کام کی چیز نہیں ملی۔" غالب نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "اس سے کچھ معلوم ہوا؟"

"معلوم تو ہو جاتا لیکن وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں سادھو رام کو لانا ہے اور جلدی جانا بھی ہے۔"

غالب نے میری جگہ سنبھال لی اور ریوالور لے کر بیٹھ گیا۔ میں دوسری بار باہر گیا اور سادھو رام کو اٹھا لایا۔

"دوبارہ غور کرنے پر میں نے اپنا خیال بدل دیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "سادھو مہاراج کو ہمارے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ یہ بہت کارآمد چیز ہے۔ اگر اسے ہم یہاں چھوڑ گئے اور کوئی چھڑانے آ گیا یا یہ بھاگ گیا تو نقصان ہمارا ہوگا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ چلو اسے ساتھ ہی رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر صبح واپس آئیں گے تو مسئلہ ہوگا۔ یہ گاڑی بھی واپس لانی ہے۔"

"نکال لیں گے اس کا بھی کوئی راستہ۔" غالب نے کہا۔ "کتنا ملا؟"

"چالیس تھی... سونا ہے کافی۔" میں نے کہا۔ "ایک سوٹ کیس بھرا ہوا تھا جو میں نے گاڑی میں رکھ دیا ہے۔"

"یار ٹھیک لگتی ہے۔" ہم نے وہاں سے اپنی موجودگی کے سارے نشانات مٹا دیے تھے...

"جیوں... ہاں... بیوک تو گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یار بندہ کام کا تھا یہ۔"

"کمانا تو بندہ نہیں ہوتا۔" مرزا غالب نے دلیل دی۔ "مشرقی پنجاب پاکستان میں ہیں۔ انھیں پاکستانی مرغیوں نے دیے ہیں۔ اور یہاں اس گھر میں تو جو کچھ ہے چھانا ہی ہے۔ آخر ان گھروں میں ہم جیسے مسلمان ہی رہتے تھے جو سادھو رام کے ہم مذہب چھوڑ گئے تھے۔"

"اچھا تو پھر آ جاؤ۔ اللہ کا نام لے کر کھائیں گے تو پاک ہوگا۔" میں نے کہا۔ "بعد میں نہ جانے کب کھانا ملے۔"

آدھے گھنٹے بعد ہم دوبارہ روانہ ہوئے تو سادھو رام اور بیوک دونوں پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ بندھے ہوئے ڈگی میں بند تھے۔ ہم میں سے کسی کو پروا نہیں تھی کہ وہ مر جائیں گے۔ زیادہ ان کو ہم جواب تھا۔ موضع کرپان والی تک کا راستہ رات کے وقت بہت دشوار گزار ثابت ہوا۔ اگر میں اس راستے سے پہلے نہ گزرا ہوتا تو ہم مشکل میں پھنس جاتے۔ ہیڈ لائٹس کو ہم نے آف کر رکھا تھا اور پارکنگ لائٹ کی روشنی جو صرف آگے تھی، راستہ دکھانے کے لیے ناکافی تھی۔ جب مجھے کرپان والی کا ڈیرا نظر آنے لگا تو میں نے گاڑی روک لی۔ رات کے وقت کچے راستے سے کسی کے گزرنے کا امکان نہیں تھا۔ لیکن میں نے گاڑی کو تھوڑی دور لے جا کر گھنی جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا کیا جہاں اسے کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

غالب نے اندر بیٹھ کر باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں سائلنسر والے ریوالور بالکل تیار تھے۔ وہ گاؤں میں گھپ اندھیرا تھا اور آدھی رات کے سناٹے میں جھینگر اور مینڈک ہر طرف بولتے سنائی دیتے تھے۔ ہم دونوں سمجھتے تھے کہ سب سے مشکل اور خطرناک مرحلہ اب درپیش ہے۔ اس میں کامیابی کا انحصار تمام تر تیز رفتاری پر تھا ورنہ ہم دونوں کیا مجھے بیسٹ کے بلیک نام پر چڑھنے کے ہم جیسے پاؤں آگے بڑھے۔ غالب کی مسکینی صورت پر سنتے والی حماقت آمیز بے چارگی سے کوئی بھی دھوکا کھا سکتا تھا لیکن میں اس کی جرأت، رندانہ بے جگری کا اعتراف آج بھی کرتا ہوں کہ اس کے نشانے کے بے خطا ہونے کا مشاہدہ کر چکا تھا اور اس کی مدد پر آنکھ بند کر کے بھروسا کر سکتا تھا۔ جب دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے غالب کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور دستک دی۔ تیسری دستک پر اندر سے پوچھا گیا "کون ہے؟"... تمام جگہ اپنا آنا آواز کسی مرد کی تھی... جگن ناتھ کی نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اندر اور بھی لوگ تھے۔

"میں ہوں سادھو رام۔" میں نے کہا۔ "دلربا سے بڑا ضروری کام ہے۔"

دروازہ پھر بھی نہیں کھلا۔ میں پوری طرح مستعد اور گوش بر آواز کھڑا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے جواب نے انھیں مطمئن نہیں کیا تھا۔

"سادھو رام۔ تمھاری آواز کیوں بدلی ہوئی ہے؟" اس مرد نے پوچھا۔

"گلا بیٹھ گیا ہے۔" میں نے کھانس کر کہا۔ "زکام سے گلا خراب ہو رہا ہے۔"

"کیا تمھارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"ہاں، بیوک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس جرح کا مقصد؟ آدھی رات کو یہاں میرے سوا اور کون آئے گا۔"

بیوک کے حوالے نے اسے مطمئن کر دیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور میں ریوالور ہاتھ میں لے کر اندر داخل ہوتے ہی فرش پر لیٹ گیا۔ پہلی گولی جو یقیناً کسی نے مجھ پر چلائی تھی، میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے دلربا کے چلانے کی آواز سنی اور اس کے بعد دوسری گولی کی، جس کے ساتھ ہی کوئی مرد بڑی دلخراش آواز میں چلایا اور اس کا بھاری بھرکم وجود دھم سے فرش پر گرا۔

"باادب۔ باملاحظہ۔ ہوشیار!" غالب نے اتنی خطرناک اور حیران کن صورت حال میں بھی اپنی عادت کے مطابق کہا۔ "کسی نے حرکت کرنے کی کوشش بھی کی تو گولی مار دوں گا۔ الف کی طرح سیدھے کھڑے رہو۔"

میں نے زندہ بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور کھڑا ہو گیا۔ غالب نے دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کو مفلوج کر لیا تھا۔ مارا جانے والا شخص وہ تھا جس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ غالب کو یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا چنانچہ وہ میرے زمین پر گرنے کے بعد آیا۔ اس وقت شاید ایک ہی شخص کا ریوالور اٹھا ہوا دکھائی دیا تو اس نے مہلت دیے بغیر اسے گولی مار دی۔ غالب کی گولی کا نشانہ بننے والا اب فرش پر تڑپ رہا تھا۔ گولی نے اس کے حلق میں سوراخ کیا تھا۔ یہ اتفاق نہیں تھا۔ غالب کے نشانے کا کمال تھا۔ وہ اگر چاہتا تو اس کی دائیں آنکھ غائب کر سکتا تھا یا بائیں نتھنے سے گولی اندر اتار سکتا تھا۔ خون کا فوارہ گردن کے سوراخ سے ابل کر جعلی خانقاہ کے فرش کو رنگین کر رہا تھا اور مرنے والے شخص کے حلق سے عجیب سی خرخراہٹ بلند ہو رہی تھی۔

مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر دلربا کھڑی تھی۔ غالباً اسے بستر سے اٹھا لایا گیا تھا چنانچہ وہ جس قسم کے لباس شب خوابی میں تھی اس کا تصور موضع کرپان والی کے عقیدت مند کر بھی نہیں سکتے تھے اور خود میرے لیے اس کا نائٹ گاؤن باعث حیرت

www.paksociety.com

تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ پیری فقیری نہیں بلکہ پاکستان جیسے غریب لیکن مذہبی ملک کا ایک دھندا تھا وہ گاؤں سے نکل کر پیری فقیری میں نہ رکھنے والی دلربا، سادھو رام، بیوک اور جگن ناتھ کی بیٹی ال جو لڑکی اپنے طور طریقے سے جماعت چلا رہی تھی ان کی بھی زندگی وہی تھی جو اوباش طبیعت دولت مندوں کی ہو سکتی ہے۔ دلربا کی خوبصورت آنکھوں میں خوف سے زیادہ پریشانی تھی شاید اس خیال سے کہ اس کی پیری فقیری کا پردہ چاک ہو گیا ہے اور اسے ایک ملنگی کے روپ میں پوجنے والے اس حالت میں دیکھیں گے تو اس کا کیا حشر کریں گے۔ سائیں یا پیر والے کا ڈھونگ جو کئی سال سے چل رہا تھا بڑی بے آبروئی کے ساتھ ختم ہو گا۔ شاید اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ خود اس کے ختم ہونے کا وقت آ گیا ہے اور اس کے دلبن فرضی کاروبار کا اور اس کی ساری کمائی کے ختم ہونے کا وقت آ گیا ہے جو اس نے خود کو اور اپنے ضمیر کو بیچ کر اکٹھی کی تھی۔ اس کی میلی ملگجی اور دھول اٹی ہوئی نظر آنے والی غلیظ آنکھیں اس وقت سیاہ اور روشن تھیں اور اجڑے ہوئے الجھے بالوں کی رنگت نہ ہونے کے باعث اصل نرالے ہوئے بالوں کے ریشمی غلاف نے اس کے تاثرات چھپا رکھے تھے۔ دلربا ایسی عورت تھی کہ اس کی خاطر جرنیل [illegible] میں کرنل جگن ناتھ اور سادھو رام ایک دوسرے کی جان بھی لے سکتے تھے۔
دلربا کے علاوہ کمرے میں دو افراد اور بھی تھے۔ یہ سب کرماں والی کے کاروباری ایجنٹ یا اس کے محافظ تھے جو ان کے جانے پہچانے چہرے تھے۔ خانقاہ کے خادم اور کرماں والی کے خصوصی حیثیت مند نظر آنے ہوں گے وہ سب بھی سرے سے اچھے تھے اور عام انسانوں کی طرح غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ غالب کی مستعدی نے ان کو بے بس کر دیا تھا اور ان کے ہاتھ اپنے اسلحے تک نہ پہنچ پائے تھے۔ وہ سب خطرناک قسم کے لوگ تھے جو کرماں والی کے کاروبار میں اس کے قابل اعتماد ساتھی تھے۔
"حضرت و خواتین، میرا مطلب ہے خاتون!" غالب نے کہا "ہتھیار ڈال دیجیے۔ سب سے ہاتھ سے نہیں۔ آہستہ آہستہ اپنا ہتھیار ریوالور نکالیے آہستہ آہستہ۔ پھرتی کا مطلب خودکشی ہو گا۔ ریوالور اپنے قدموں میں پھینک کر سب پیچھے والی دیوار کے ساتھ لگ جاؤ اور اپنے اپنے ہاتھ اوپر کر لو۔"
"ر بھوک... دونوں پیر بھی اٹھا لو۔" میں نے ریوالور سیدھا کر لیا۔
"کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔" غالب نے اچانک فائر کیا اور ایک موم بتی کو گل کر دیا مگر موم بتی اسی طرح کھڑی رہی۔ "میرا نشانہ آج تک خطا نہیں ہوا مجھے آپ سب کے سامنے ہیں۔ دولت جانب" اس نے مرجانے والے کی طرف اشارہ کیا۔
سب سے پہلے دلربا نے خود کو سنبھالا اور اپنا ریوالور نیچے پھینک دیا۔ ریوالور غالب کے پیروں کے پاس آ گرا۔ دلربا نے بڑی ہوشیاری چلی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید غالب جھک کر ریوالور اٹھانے کی حماقت کرے گا اور اسی ایک لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باقی

دو محافظ کچھ ضرور کریں گے لیکن غالب صرف مسکرایا اور سیدھا کھڑا رہا۔ اسے صورت سے بے وقوف سمجھنے والے پچھلے کئی [illegible] تھے۔ اس نے تیسری گولی چلائی جو دونوں محافظوں کے بیچ سے کانوں کو چھو کر گزر گئی۔ ان دونوں نے فوراً ریوالور نیچے پھینک دیے۔ وہاں سے جھک کر ہاتھ اٹھانے کے بعد وہ دلربا کے پیچھے [illegible] ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔
دلربا ذہین اور چالاک عورت تھی۔ صورت حال اس کے ہاتھ سے باہر ہو چکی تھی مگر اس نے بہت جلد ہی ہار مان لی اور [illegible] عورت کی طرح اترائی۔ اس نے مسکرا کے ایک باریک سی [illegible] "تم کون ہو آخر تم؟" وہ اپنی فطری مسحور کن آواز میں بولی۔
"یہ پوچھنے کی بجائے کہ غالب کون ہے؟" غالب نے [illegible] افسوس سے سر ہلایا۔
"کیا چاہتے ہو تم؟" دلربا نے ایک انگڑائی لے کر کہا [illegible]
"جاننا چاہتے ہیں کہ [illegible]" غالب نے [illegible] جواب دیا۔ "چاہتے ہیں [illegible] دلربا!"
"کرنل جگن ناتھ بھی تم کو چاہتا تھا اور سادھو رام بھی [illegible] کہا۔ "لیکن تم جانتی ہو کہ وہ تم سے زیادہ دولت کو چاہتے تھے [illegible] تمھیں اس کا بھی تمھیں علم ہے۔"
"لیکن تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اب اس کا علم [illegible]" غالب نے کہا۔
"سو ... کرماں والی کے علاوہ دل [illegible] خاص کرماں والی سے [illegible] چاہتے تھے۔" میں نے [illegible] رکھی [illegible] کے لیے [illegible] معلوم نہیں تھا کہ کرماں والی [illegible] حقیقت دلربا ہے [illegible] غدار اور بے ضمیر عورت ہے [illegible] چھپی ہے کہ کرماں والی نے تو اس زمین کو بیچنا چاہا تھا جس نے جنم دیا تھا اور جس میں اس کے آباؤ اجداد کی ہڈیاں [illegible] انھیں معلوم نہیں تھا کہ سادھو رام اور بیوک جیسے لوگوں کے ساتھ تم راستے کا کانٹا [illegible] کیا کر رہی ہو اور کرنل جگن ناتھ کے ساتھ اس سودے میں کتنا فائدہ حاصل کر رہی ہو۔"
"اور تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اس کا بھی علم [illegible] کل تمہارا ساتھ کرو قسمت کو بھی برداشت [illegible] تمھاری قسمت تھی مگر جیسے تمہارے خلاف [illegible] تھے ویسے ہی تم قسمت کے دھوکے میں آ گئیں اور [illegible] خوبصورت لگتی ہو شاید تمھیں اپنا [illegible] ہو گا ہم تمام عمر تم سے وہم خیال ہے۔"
"تم بہت دلچسپ باتیں کرتے ہو۔" دلربا مسکرائی [illegible]

ہوا اس بار اس نے غالب پر اپنا جادو چلانے کی کوشش کی جو [illegible] نازو غمزے کا بھی تھا۔ جمالی طور پر بھی وہ جہاں دیدہ کوشش [illegible] کا مالک نہیں تھا اور کسی خوبصورت عورت کا اس پر [illegible] ہونا مشکل لگتا تھا۔ دلربا یہ مشکل کام کر کے ایک تجربہ کھیلنے [illegible]
[illegible] وہ نہیں جانتی تھی کہ پتھر پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے لیکن غالب کی عقل کو کسی عورت کا حسن شکست نہیں دے [illegible] بہت پہلے محسوس کر لیا تھا کہ ان دونوں کا رونق [illegible] لوک [illegible] کے دل میں غالب کے لیے چاہت [illegible] عشق کا نہیں تھا اور نہ کسی قسم کا جذباتی عارضہ [illegible] انہوں نے غالب کے اندر چھپے ہوئے مرد کی صلاحیتوں کو [illegible] ایک احترام میں داخل کیا تھا اور احترام نے [illegible] حسین اور خوبصورت لڑکی کے دل کو موم کر دیا تھا۔ غالب [illegible] تو اس کی جان نثاری پر فخر تھی۔ وہ ستی [illegible] وہ سب اس کی شخصیت کے ایسے [illegible] تھے جو ایک نظر میں سامنے نہیں آتے تھے [illegible] وقت کے ساتھ ساتھ اس کی قامت کے سامنے اسرار کھلتے [illegible] تھا کہ وہ کیا ہے۔
"میں یہاں باتیں کرنے نہیں آیا ہوں۔" غالب نے اچانک [illegible] رویہ اختیار کر کے اپنا جملہ ایک انتہائی خوفناک [illegible] ختم کیا جو عام حالات میں کوئی مرد کسی عورت کی موجودگی میں نہیں [illegible] سکتا۔ یہ دلربا کے ذہن کو حقیقت سے آشنا کرنے والا دوسرا [illegible] تھا۔ غالب کے تیور اور اس نے دلربا کے سنبھلنے سے پہلے [illegible] ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ رسید کیا دلربا ایک چیخ [illegible] کہ غالب نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا [illegible] کی طرف پھینک دیا۔ وہ چیخ چلائی مگر غالب نے اسے زمین پر [illegible] دیا۔ "سیدھی کھڑی ہو جاؤ۔" اس نے دوسری گالی دی۔
اچانک مجھے غالب کی چال سمجھ آ گئی۔ وہ دلربا کے ساتھ یہ [illegible] اس کے محافظوں کو مشتعل کرنے کے لیے کر [illegible] ان کے حقیقی جاں نثار تھے۔ دلربا جیسی عورت اپنے [illegible] ان کے تن بدن پر مجبور کر دینے کی پوری صلاحیت [illegible] سے نہیں خوں خوار کیوں نہ ہوں ایک کے غیرت کے [illegible] اور غالب خوفناک کے ایک طرف رہ گیا۔ اور سیدھا [illegible] سامنے آ کر ہاتھوں لیا۔ دوسرے کی بات [illegible] چاہا کہ جب جوڑ کر ان کی طرف آیا ہاتھوں کے [illegible] سے ایسی خطرناک عورت کے [illegible] تھے۔ اس کا اندازہ مجھے اس [illegible] ہوا جب [illegible] رہا ہے نے ہوا میں اچھل کر

[illegible] لگانا چاہی۔ وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئی [illegible] سنبھل گیا اور وہ زمین تک پہنچنے کے ساتھ نہ پا سکا [illegible] نے دیکھ لیا تھا کہ غالب ریوالور لیے بہت ہوشیار کھڑا ہے مگر میرے درمیان میں آ جانے کا نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ دوسرا گنتا اس پر چھلانگ مارتے۔ غالب کا نشانہ باز تھا مگر دست بدست جنگ میں وہ یقیناً مارا جاتا۔ وہ میری طرح خالی ہاتھ لڑنا نہیں جانتا تھا جب کہ دلربا کے دوسرے محافظ کی صحت بہت بہتر تھی اور یہ بھی یقینی بات تھی کہ وہ جوڈو کراٹے کا ماہر تھا تو غالب کے مرحوم ہونے میں دیر نہ لگے گی۔
میں نے پہلے دفاع کو ہاتھ کی کلائی کے قریب سے پکڑ کے جھٹکا دیا اور وہ ٹانگ یا ہاتھ [illegible] وہ بلبلایا اور پیر اٹھ کے نیچے آیا۔ اس کا ایک ہاتھ تھا اور میں نے فوراً خود کو بچانے کے لیے جھک گیا ورنہ وہ ضرب میری گردن پر پڑ جاتی تو تجھے گٹھا دو مسلک ثابت ہوتی۔ میری گردن ٹوٹ جاتی اور مجھے عالم فانی سے عالم جاودانی تک کا سفر طے کرنے میں ایک منٹ بھی نہ لگتا۔ کراٹے کے ایسے وار صرف جانی دشمنی میں اس وقت استعمال کیے جاتے ہیں جب مقصد اپنے حریف کو ختم کرنا ہو اور اس جنگ میں جاپانیوں کے فن حرب کے اخلاقی اصولوں کی وسیعے بھی گنجائش نہ تھی۔ ایک فوری رد عمل کے طور پر میں نے دوسرا جوابی وار کر دیا اور دوسرے لمحے میرا حریف کٹے ہوئے درخت کی طرح گر گیا۔ مجھے اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا کیونکہ میرا فعل غیر ارادی تھا۔
"ان کو مزید مہلت مت دو۔" غالب نے کہا "یہ نہ ہو ان کے ساتھی آ جائیں۔ معلوم نہیں اور کتنے ہوں گے۔"
"تم فکر مت کرو۔" میں نے کہا "میں انھیں باندھ دوں گا۔" [illegible] دلربا اور اس کے ایک ساتھی کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کتنے بے بس ہیں۔ میں نے ان کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے اور انھیں آگے چلنے کا حکم دیا۔
"یہ خانے کا راستہ کدھر ہے؟" میں نے کہا۔
"کون سا تہ خانہ؟" دلربا نے سرکشی کے لہجے میں کہا۔ جس نے اس کے ایک لات رسید کی۔
"ابھی تک بیگم تم نخرہ۔" میں نے کہا "یہاں ایک ہی تہ خانہ ہے اور اس کا راستہ ہم خود بھی تلاش کر سکتے ہیں۔"
دلربا یک اٹھی۔ "کر سکتے ہو تو کر لو۔" وہ بولی "تم میں بھی نہیں بتاؤں گی۔ یہاں کوئی تہ خانہ ہے تو اس میں قدم رکھنے سے پہلے سوچ لینا کہ انجام کیا ہو گا۔ تمھارے پیچھے ازدہا لگ گئے ہیں۔"
"اس تہ خانے کا دروازہ تمھارے اسی کمرے کا دروازہ [illegible] کر دیکھ لو اور کھل جائے گا۔" دلربا کا محافظ [illegible]

www.paksociety.com

"اگر وہ تمہارے باپ کے گھر کا دروازہ ہوگا تب بھی میں کھلواؤں گا۔" غالب نے کہا۔ ظاہر ہے اس نے دریا کی دھمکی کا اثر نہیں لیا تھا۔ اگر یہ سچ تھا تب بھی ہم پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے اور جھوٹ تھا تو اس کے فریب میں آنے والے نہیں تھے۔

اندر والے ہال جیسے وسیع و عریض کمرے کے وسط میں سائیں باپڑ والے کی قبر تھی جس پر نہ جانے کتنے ریشمی سنہرے اور گدّ پلے غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ ان کے نیچے اصل قبر چھپ گئی تھی۔ اوپر ایک فانوس روشن تھا جو کسی عقیدت مند یا صاحب مراد کا تحفہ نہیں تھا تو باپڑوں کی کمائی سے بنوایا گیا تھا۔ اس کی روشنی میں کتبہ صاف پڑھا جاتا تھا۔ سائیں باپڑ والے کے نام سے پہلے بہت سے القاب و آداب تھے اور ایک شعر بھی تھا لیکن کارآمد معلومات صرف اس حد تک تھیں کہ موصوف انیس سو چودہ میں غالباً پہلی جنگ عظیم کرانے کے لیے دنیا میں وارد ہوئے اور ۱۹۷۱ء میں جنتم رسید ہوئے۔ اس کے قریب بیٹھ جانے والوں نے بہر حال اسے رحمۃ اللہ علیہ اور شہید وغیرہ لکھا تھا۔ قبر کے گرد چلتی ہوئی سنہری جالی تھی۔ میں نے اسے چھو کر دیکھا۔

"کیا یہ ٹھوس سونا ہو سکتا ہے؟" میں نے غالب کی طرف دیکھا۔

"سونے کے پاپڑوں سے سونے کا کتبہ تو کیا ہی جا سکتا ہے۔" غالب نے کہا۔ "تم کیا سناروں کی طرح پرکھ رہے ہو۔ اپنے مستقبل کی منکوحہ کے لیے نیکلس بنوانے کا خیال آ رہا ہے کیا؟"

"ہاں یار۔ ماں باپ تو ہیں نہیں جو سہرے کے لیے جوڑتے۔" میں نے کہا۔ "مگر خیر، یہ زیرزمین جانے کا راستہ دیکھتا ہوں۔"

چاروں دیواریں سپاٹ تھیں۔ میں نے ایک راؤنڈ میں ہر دیوار کو ہر اور کونے سے بجا کے دیکھا کہ کوئی دیوار اندر سے کھوکھلی ہو تو پتا چل جائے مگر میرے کانوں نے صرف ٹھوس دیواروں کی آواز سنی۔ میں نے دریا کو بڑی حوصلہ شکن مسکراہٹ کے ساتھ گھورتے دیکھا۔ میری ناکامی اسے واقعی خوشی دے رہی تھی۔ اس کا ساتھی شکست خوردہ اور بظاہر بے بس صورت بنائے کھڑا تھا اور بظاہر اس خیال سے دستبردار ہو چکا تھا کہ ہم اب ظاہر ہے دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔ خود غالب بھی یہ بات سمجھتا تھا لیکن دریا کا واحد جان نثار غالب کو نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے فرض کر لیا کہ غالب اب مطمئن اور بے فکر ہے اور اس کو بے خبری میں اچانک مغلوب کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک دم پلٹا اور اس نے ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود سر سے ٹکر مار کے غالب کو گرانا چاہا۔ غالب اطمینان سے ایک طرف ہو گیا اور جب وہ گزر گیا تو اس کو پیچھے سے ٹھوکے کی لات ماری۔ اس کی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور اس کا سر خوف ناک آواز کے ساتھ دیوار سے ٹکرایا۔ اس کی بدقسمتی کہ جہاں

اس کا سر لگا وہاں دیوار میں ایک کھونٹا سا لگا ہوا تھا۔ ایسے کھونٹے ہر دیوار کے وسط میں تھے اور معلوم نہیں ان کا مصرف کیا تھا لیکن وہ کھونٹا آخری محافظ کے کاسۂ سر کو توڑتا ہوا اندر پیوست ہو گیا۔ وہ بڑا دردناک اور دل گداز منظر تھا۔ وہ شخص ذرا اکھڑا ہوا تھا، بیٹھا ہوا اور نہ لیٹا ہوا۔ وہ ایک کھونٹے سے اٹکا ہوا تھا اور بُری طرح تڑپ رہا تھا۔ شدید اذیت کے باعث اس کے حلق سے دل خراش چیخوں کے سوا کچھ نہیں نکل رہا تھا۔ کھونٹے میں پھنسے ہوئے سر کے ساتھ پورے جسم کی حرکت سے اس کی اذیت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ کرب سے بار بار ہاتھ اور پاؤں ادھر ادھر چلا رہا تھا۔ اگر وہ کھونٹا سر میں سوراخ کر کے گھسا تھا تو وہ اس حرکت سے اور اندر چلا گیا تھا۔ بے شک اس کے اعمال ہی ایسے تھے کہ قدرت نے اس کے لیے ایک عبرت آموز موت کا اہتمام کیا تھا مگر ہم جیسے انسان جو سینوں میں پتھر نہیں دل رکھتے تھے، اپنے دشمن پر بھی رحم کھاتے تھے۔ اس کے عذاب کو ختم کرنے کے لیے میں نے ریوالور اٹھا کے نشانہ لیا اور اس کے سر میں بہت قریب سے گولی مار دی۔ وہ ایک بار تڑپا اور ساکت ہو گیا۔

"تم نے دیکھا دریا! قدرت سزا بھی دیتی ہے تو کس طرح۔" میں نے کہا۔

"تمہاری موت اس سے بھی زیادہ عذاب ناک ہو سکتی ہے۔" غالب نے کہا۔

دریا بالکل ساکت و صامت کھڑی حیرانی بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ سب کھیل تماشا ختم ہوا۔ نہ سیوک رام کام آیا اور نہ جگن ناتھ اور نہ سائیں باپڑ والا۔ اس کی دولت، سونے کے ڈھیر، وطن کی حرمت کی قیمت، جسم کا معاوضہ۔ وہ عقل اور ہمت پر اعتماد کرتے ہوئے اس نے کرماں والی بننا منظور کیا تھا، اسمگلنگ کرنے والوں کے پُرخطر مشن میں شرکت کی تھی۔ سب رائیگاں گئے۔ دولت سے اس نے مستقبل کے خوابوں کے شہر کے محل کھڑے کیے تھے، کھنڈر بن گئے۔ اس کے چاروں طرف لاشیں پڑی تھیں اور وہ اپنے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اس کے لیے اب جھوٹی امید پر تکیہ کرنا بھی مشکل تھا۔

"تمہیں موقع دیا جا سکتا ہے کہ جان بچا کے جہاں چلی جاؤ۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم یہ پیشکش کرو گے۔" وہ ایک دم ہنس پڑی۔ "میں بھلا کہاں جا سکتی ہوں؟"

"یہ تو ہے۔ تمہارے دشمن دونوں طرف ہوں گے۔" غالب نے کہا۔ "دوست کسی طرف نہ ملے گا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم یہ رعایت کی رشوت [illegible]

"تم مجھ سے تہ خانے کا راستہ پوچھنا چاہتے ہو؟" بالآخر اس کی حقیقت پسندی نے مجھے اس کی بہادری کا قائل کیا۔ اس صورت اب تک بے ہوش ہو چکی ہوتی۔ "اگر تم اتنی سمجھدار ہو تو خود ہی بتا دو۔" میں نے کہا۔

"تم مجھ سے سودا کر سکتے ہو۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی اور میں نے اس کے انداز حسن کی غارت گر قوت کو پوری طرح محسوس کیا۔ اس کام کے لیے وہ موزوں ترین عورت تھی۔ بدقسمتی سے اس کا واسطہ میرے اور غالب جیسے مردوں سے پڑا تھا جن کے سامنے اس کی قوت تسخیر بے اثر تھی۔

"سودا؟" میں نے تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا۔ "کیا تم اس پوزیشن میں ہو کر سودا کر سکو؟"

"نہیں، مگر رعایت کی پیشکش خود تم نے کی تھی۔" وہ بولی۔

"تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ ہم بھی راستہ تلاش نہیں کر سکیں گے؟" غالب نے کہا۔

"تمہیں دیر لگے گی۔ اور پریشانی ہوگی۔" وہ بولی۔ "پھر تم بم نصب کرو گے۔ بالآخر تہہ خانے کو تباہ کر دو گے لیکن اس میں تمہارا بہت نقصان ہوگا۔ میں تمہارا وقت بچا سکتی ہوں۔"

"کس شرط پر؟" غالب نے سوچ کر کہا۔

"تم مجھے آسان موت دے دو گے۔" وہ بولی۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے زندگی کی بھیک بھی نہیں مانگی۔ میرا معافی مانگنا، شرمندگی یا ندامت کا اظہار کرنا، آئندہ کے لیے توبہ کرنا سب غلط ہوگا، مکروہ فریب ہوگا۔ جب میں نے اس راستے پر قدم رکھا تھا تو مجھے پتا تھا کہ میری منزل ایک نہیں ہے۔ یہ راستہ دو منزلوں تک پہنچتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں اپنے بے حساب سرمایے کے ساتھ بیرون ملک فرار کا موقع پا جاتی اور سادھو رام کے سب ساتھیوں کو ملنے سے پہلے کہیں نکل جاتی اور ساری عمر عیش و عشرت کرتے گزارتی۔ میرے پاس فرانس یا سوئٹزرلینڈ دونوں جگہ شہریت ملنا ممکن تھا اور وہاں کوئی ہاتھ مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کسی مستند کاروباری یا فلم میکر سے بھی شادی کر سکتی تھی۔ دوسری طرف یہ بھی ممکن تھا کہ جگن ناتھ یا سیوک بھی بھاگ نکلنے میں پیش کر جاتے۔ سادھو رام بھی اس کی ... تھا۔ ان کی جگہ تم آ پہنچے۔ بات تو ایک ہی ہے۔ مجھے دوسری منزل ملی۔ آسیبوں کی تعبیر مل گئی۔ یہ ایک جوا تھا جو میں ہار گئی۔ میں نے جیت کی امید میں نہیں کھیلا تھا۔ [illegible] کامیابی نہیں تقدیر کی یاوری [illegible] مجھے ہار جانے کا افسوس نہیں ہے۔"

"تم ایک بہادر اور سمجھدار عورت ہو۔" میں نے کہا۔ "نادان

دوست سے دانا دشمن کی قدر کرنا بہتر ہوتا ہے۔ اگر تم نے وطن کے دشمنوں کے بجائے وطن کے محافظوں کا ساتھ دیا ہوتا تو یہ ترقی تم پر فخر کرتی۔ میں تمہاری شرط منظور کرتا ہوں۔ میں تم کو وہ موت دینے کی کوشش کروں گا جس میں تمہارے لیے عذاب کا احساس ہی نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ "قبر پر سے ساری چادریں اور غلاف ہٹا دو۔ نیچے جانے کا یہی راستہ ہے۔"

میں نے غالب کی طرف اور غالب نے میری طرف حیرانی سے دیکھا۔ گاؤں کے جاہل، کمزور عقیدہ رکھنے والے اور ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھنے والے سیدھے سادے لوگوں کے درمیان سائیں باپڑ والا کی خانقاہ کتنا زبردست مکر و فریب کا کارخانہ تھی جس کی حقیقت کو بڑے سے بڑے عاقل اور افلاطون نہیں سمجھ سکتے تھے۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ جس مرقد پر دنیا عجز و انکسار کے ساتھ ہاتھ اٹھا کے دعا مانگنے آتی ہے وہ مرجع خلائق ایک ضمیر فروش ٹولے کے اسلحہ خانے کا راستہ ہے اور پیر طریقت کے مزار کا ہر غلاف مکر و فریب کا ایک پردہ ہے۔ کسی کے دھیان میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ قبر کی جگہ ایک خلا ہے جس میں کبھی کسی سائیں باپڑ والے کو دفن نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی لاش تو نہ جانے کہاں پھینک دی گئی تھی، کسی ویرانے میں، کنویں میں یا جنگل میں۔ اسے ہلاک کرنے والے ڈاکو نہیں، دشمن کے ایجنٹ تھے اور ان کی آلۂ کار کرماں والی تھی۔ انھوں نے بڑی ہوشیاری سے ایک ایسا اڈا حاصل کر لیا تھا جہاں ان کا وطن دشمن کاروبار بھی جاری رہ سکے اور انھیں اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے سرمایہ بھی فراہم ہوتا رہے۔ سونے کے پاپڑ بکتے رہیں اور وطن کی یکجہتی کو پارہ پارہ کرنے والوں تک اسلحہ پہنچتا رہے۔

میں نے ایک ایک کر کے سارے غلاف ہٹا دیے اور ان کپڑوں کا ایک ڈھیر لگ گیا جن میں سے عطر کی تیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ یہ خوشبو اتنی کرخت تھی کہ دماغ میں چبھتی تھی اور اعصاب پر اثر انداز ہوتی تھی۔ اندر سالہا سال سے سلگنے والی اگربتیوں کی اور لوبان کی خوشبو کے ساتھ ان عطر میں بسے ہوئے غلافوں کی خوشبو خانقاہ کے اندر ہوا میں بسی ہوئی تھی اور دیواروں سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ اندر قدم رکھنے والوں کے حواس پر یہ خوشبو نکہت حملہ کرتی ہوگی اور وہ تقدس و احترام کے ماحول میں ذہنی طور پر وہ سب خود کو انتہائی کمزور اور بے بس پاتے ہوں گے۔

آخری غلاف کے ہٹتے ہی پکی بنی ہوئی قبر کا چوکھٹا نمودار ہوا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس قبر میں اوپر کی طرف سنگ مرمر کا کتبہ نہیں تھا۔ اس کی جگہ ایک دروازہ تھا جسے انگریزی میں ٹریپ ڈور کہا جاتا ہے۔ ایک کنڈی کھولتے ہی اس کے دونوں پٹ نیچے

www.paksociety.com

گر گئے اور تین فٹ چوڑا خلا نمودار ہو گیا جس میں جانے والا زینہ دو فٹ نیچے سے شروع ہو جاتا تھا۔ زینہ روشن تھا۔ اس کے آخری حصے کی روشنی اوپر تک آ رہی تھی۔ میں نے غالب کو اشارہ کیا اور اس نے ولر بابا کو آگے دھکیلا۔ میں نے غالب سے کہا کہ وہ ولر بابا کے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دے۔ جب وہ نیچے اتر گئی تو اس کے پیچھے میں نے پہلے زینے پر قدم رکھا۔

"یار کیا میں بھی نیچے تمہارے ساتھ چلوں؟" غالب نے اشتیاق اور تجسس کو دبا کے کہا۔

"اوپر کا خیال کون رکھے گا؟" میں نے کہا۔ "اگر کوئی اچانک آ گیا تو پھر؟" میں نے اس کا مایوس چہرہ دیکھا۔ "اچھا بھائی۔ آپ بھی آ جائیں۔ اللہ مالک ہے اوپر کا۔"

"بے شک اللہ اوپر نیچے سب کا مالک ہے۔" غالب نے سر ہلا کے کہا۔

آخری زینے سے اندر قدم رکھتے ہی میں اور غالب پتھر کے بت بنے کھڑے رہ گئے۔ وہ ایک بہت بڑا تہ خانہ تھا۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی اتنی ہی تھی جتنی اوپر ریل پیٹ کے طور پر استعمال ہونے والے پلیٹ فارم کی۔ دائیں جانب دیوار کے ساتھ ساتھ وہی لکڑی کے تابوت نما صندوق رکھے تھے جو ایک ٹرک سے اتارے گئے تھے۔ سامنے ذرا مختلف قسم کے بکس تھے۔ سائز میں کچھ چھوٹے مگر اونچائی میں زیادہ۔ میری اور غالب کی نظر ایک کونے سے دوسرے کونے تک اور تیسرے کونے سے چوتھے کونے تک پہنچی۔ ہر دیوار کے ساتھ صندوق تھے۔ ہر صورت اور سائز کے۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ ان سب میں اسلحہ بھرا ہوا ہے اور اتنا بڑا اسلحے کا ذخیرہ میں نے کسی فلم میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے تابوت نما صندوق کو پہلے کھولنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اندر ہی ایک ہتھوڑی اور کچھ دوسرے اوزار بھی مل گئے جو عموماً بڑھئی استعمال کرتے ہیں۔ یہاں یہ اوزار صندوقوں کو بند کرنے اور کھولنے کے کام آتے تھے۔ سامان لے جانے والے بھی پہلے ہر بکس کو کھول کر اپنا اطمینان ضرور کرتے ہوں گے کہ اس میں پتھر نہیں بھرے ہوئے ہیں۔ پہلے تابوت نما صندوق کو کھولنے میں مشکل سے دس منٹ صرف ہوئے۔ میں نے ایک درز تلاش کی اور اس میں لوہے کی وہ سلاخ پھنسا دی جس کا دوسرا کنارا پیچ کس کے سرے کی طرح چپٹا تھا۔ سلاخ کے دوسرے حصے کو نیچے دبا کر میں نے درز کو چوڑا کیا۔ مضبوطی سے لکڑی میں جڑی ہوئی کیلوں نے احتجاج کیا لیکن اس لیور کی طاقت کے سامنے کیلوں کی ایک نہ چلی۔ ڈھکنا آہستہ سے اوپر اٹھا اور میں نے سلاخ کو آگے بڑھا کے زور لگایا تو ڈھکنا الگ ہو گیا۔ میں نے بکس میں کسی لاش کو نہیں خود کار رائفلوں کو دیکھا جو اس میں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے شمار کیا تو اس ایک تابوت میں ... رائفلیں تھیں۔ اس ایک تابوت سے کتنے جیتے جاگتے انسان لاشوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ شاید سیکڑوں ہزاروں۔ ہر رائفل نہ جانے کس کس کے ہاتھ میں جائے گی۔ جب رائفل کو تھامنے والا ایک ہاتھ بے جان ہو گا تو یہ دوسرے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ دوست کے ہاتھ میں یا دشمن کے ہاتھ میں۔ رائفل اور رائفل کی گولی کسی کے دوست ہوتے ہیں نہ دشمن۔

"کس سوچ میں پڑ گیا ہے بھائی۔ یہ موت و حیات کے فلسفے پر غور کرنے کا نہ مقام ہے نہ وقت۔" غالب نے کہا۔

میں چونک پڑا۔ "ایسے ہی خیال آ گیا تھا یار کہ یہ کتنے بے گناہوں کی موت کا سامان ہے۔ کون حساب کر سکتا ہے اس کا؟"

"ہم اس ذخیرے کو تباہ کر دیں گے۔" غالب نے یقین دلایا۔

"ہاں۔ مگر ایسے اور کتنے ذخیرے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اگر یہ بھی معلوم ہو جائے تو فکر نہ کر۔ ہر وقت کے لیے ایک کام اور ہر کام کے لیے ایک وقت ہے۔"

میں نے سب بکس نہیں کھولے۔ ہر نمونے کا ایک بکس کھولا اور دیکھ لیا کہ اس میں کیا ہے۔ مختلف سائز اور شکل و صورت کے صندوقوں میں وہ سب کچھ تھا جو موت کہلاتا ہے۔ گولا بارود، پستول اور ریوالور، گولیاں اور مشین گنوں کے راؤنڈ، دستی بم اور مشین گنیں، بموں کے فیوز، ڈائنامائٹ سٹکس، بارودی سرنگیں۔ ایک بکس میں جو اپنی نوعیت کا ایک ہی تھا مجھے ... نظر آئے۔ یہ ٹائم بم تھے۔ میں آتشیں اسلحے کا ماہر نہیں تھا۔ چنانچہ یہ اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہر بم کی تباہ کاری کا دائرہ کس حد تک ہو سکتا ہے۔ مرزا غالب نے صحافت کے پیشے میں بہت پاپڑ بیلے تھے چنانچہ ... کی جنگ میں محاذ پر بھی نظر آئے تھے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ یہ بم بہت بڑے تو نہیں ہیں لیکن ہر ٹائم بم سے ایک ریلوے پل یا عمارت تباہ ہو سکتی ہے۔

"کون سی عمارت؟" میں نے اس بیان کو مبہم قرار دیا۔

"عمارت تو یہ بھی ہے اور القلاع بلڈنگ بھی۔"

"میرا مطلب درمیانے درجے کی عمارت سے تھا۔ مثلاً کوئی دفتر یا ریلوے اسٹیشن۔" غالب نے کہا۔

"کون سا ریلوے اسٹیشن؟" میں نے پھر اس کی بات کی۔

"وہی۔ لاہور کا یا ٹھنڈا چوہا۔"

"ٹھنڈا چوہا؟" غالب نے سر کھجا کے کہا۔ "یہ تو عمارت نہیں۔ جانور اور وہ بھی ....."

"یہ ایک اسٹیشن کا نام ہے۔" میں نے شرط لگا کے کہا۔ "زمانہ ہوا میں کہاں پنڈی سے لاہور تک پسنجر ٹرین میں سفر کر رہا تھا تو مجھے اتفاق ہوا تھا ٹھنڈا چوہا دیکھنے کا۔ ایکسپریس اور میل ٹرین نہیں رکتی ٹھنڈا چوہا ..."

"پھر تو میں گیا ٹھنڈا چوہا اور گرم چوہا۔" غالب نے کہا۔

"نہیں مانتے تو مت مانو۔ یہ تاہم ہم نہیں بحث کرنے آئے ہیں۔"

"وہ ... یار دراصل ... میرا مطلب تمہیں الو جیسا ثابت کرنا نہیں تھا۔" میں نے خفت سے کہا۔ "تم ان کو نیوٹرل کر سکتے ہو؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوشش کر سکتا ہوں مگر اسے خودکشی کی کوشش بھی کہا جا سکتا ہے اور وہ تم بھی کر سکتے ہو۔"

"پھر رہنے دو۔" میں نے کہا۔ "ہم کچھ اور کرتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی دستی بم پھینکا ہے؟"

"یار میں صحافی کی حیثیت سے محاذ پر گیا تھا۔ سپاہی کی حیثیت سے نہیں۔" غالب نے جھنجھلا کر کہا۔

"میں پھینک سکتا ہوں۔" میں نے اعلان کیا۔ "منہ سے پن نکالی۔ پانچ سیکنڈ شمار کیے اور پھینک دیا۔"

"یہ سب تو میں نے بھی فلموں میں دیکھا ہے۔" غالب نے کہا۔ "پانچ سیکنڈ ہو گئے تو کیا ہو گا؟"

"پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہو گا۔" میں نے کہا۔ "تاہم ہم غیر فوجی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔"

میں نے اور غالب نے لکڑی کے صندوقوں کو تہ خانے کے وسط میں جمع کرنا شروع کیا۔ یہ دشوار اور تھکا دینے والا کام تھا۔ ہماری نظر ولر بابا پر بھی تھی لیکن وہ عملاً دنیا سے قطع تعلق کر کے کونے میں فرش پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ اسے نہ جانے اب کس بات کا ... تھا۔ ہماری باتوں سے لیکن میں پھر بھی محتاط تھا کہ وہ اچانک کچھ کر نہ بیٹھے۔ مثلاً کوئی دستی بم اٹھا لے اور منہ سے پن نکال کے آخری قہقہہ لگا دے۔ انگریز کہتے ہیں کہ اپنی ... ہنسنے والوں کو ہنسنے دو۔ یہ دیکھو کہ آخری ہنسی کس کی ہوتی ہے۔ ... تاہم ہم نے بکس کو اتفاقی راستے سے الگ رکھا۔ ... بارہ ... وقت ہمارے لیے بھی کار آمد ہو سکتے تھے ... سوئیاں بارہ بجا رہی تھیں مگر صحیح وقت کا ... دیکھا جا سکتا تھا۔ ہم نے سب سے نیچے دستی بم رکھے ... صندوقوں کی گولیاں ریوالور پستول اور مشین گنوں کے راؤنڈ ... اور سب سے اوپر خالی مشین گنیں۔ خود کار رائفلیں اور ریوالور وغیرہ رکھ دیے۔ سارا بارود سے بھرا ہوا اسباب نیچے تھا اور اس کو دھماکے سے اڑا کے ہی باقی اسباب تباہ کیا جا سکتا تھا۔ ایک ایک رائفل پستول یا مشین گن کو توڑنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ یہ سارا کام ایک گھنٹے میں ختم ہو گیا تو میں اوپر گیا۔

سائیں پاپڑ والے کے مرقد پر عقیدت سے چڑھائے جانے والے سارے غلاف اور سب چادریں اس طرح ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ میں نے انہیں ایک ایک کر کے زینے سے نیچے پھینکا۔ پھر نیچے جا کر میں نے ایک چادر کے کونے کو دوسری چادر سے باندھا اور غلافوں کو پھاڑ کر ساتھ ساتھ رکھتا گیا۔ تہ خانے کے درمیان میں صندوق کے گرد لپیٹ کر میں نے اس کپڑے کی زنجیر کو زینے تک فرش پر بچھا دیا اور زینے پر چڑھتا ہوا اوپر لے گیا۔ جعلی خانقاہ کے عقبی دروازے تک پہنچنے سے قبل ہی چادریں ختم ہو گئیں۔ دروازہ اب مشکل سے ایک گز دور رہ گیا تھا جو کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔ اگلا مرحلہ زیادہ دشوار تھا جس پر ہماری کامیابی کا انحصار تھا۔

میں سادھو رام کی کار تک گیا۔ دروازہ کھول کے میں نے سوئچ آن کیا۔ فیول میٹر کی سوئی آگے بڑھنے لگی۔ میرا دل اس کی حرکت کے ساتھ چلنے لگا۔ شاباش۔ شاباش۔ اور آگے۔ میں نے ریس کورس میں بیٹھے ہوئے تماشائی کی طرح کہا۔ جو اپنے گھوڑے کو سب سے آگے دیکھنا چاہتا ہو۔ بالآخر سوئی ایک جگہ ٹھہر گئی۔

"وہ مارا پاپڑ والے کو۔" میں نے خوشی سے نعرہ لگایا کیونکہ ٹینک تقریباً فل تھا۔ گاؤں میں رہنے والا سادھو رام احتیاطاً اپنی گاڑی کا ٹینک فل رکھنے کا عادی ہو گا۔ اس کی یہ احتیاط پسندی آج میرے حق میں سود مند ثابت ہوئی۔ میں نے ڈکی کھولی جس میں کار کا مالک اور اس کا غلام [illegible] ایک ساتھ اکٹھے بندھے پڑے تھے۔ وہ زندہ ضرور تھے لیکن ہوش سے بیگانہ تھے۔ ادھر ادھر ہاتھ مارنے پر مجھے پلاسٹک کا نرم شفاف پائپ بھی مل گیا۔ میں سائیں پاپڑ والے کے اڈے میں گیا اور اندر سے ایک بالٹی اٹھا لایا۔ پائپ کو میں نے پٹرول ٹینک میں ڈالا اور اس کے دوسرے سرے کو منہ سے لگا کے سانس اندر کی طرف کھینچا۔ پٹرول تیزی سے آیا اور میں نے اس کا ذائقہ منہ میں محسوس کیا۔ پٹرول کی شفاف دھار بالٹی میں گرنے لگی۔ پٹرول ٹینک بہت اوپر تھا اور بالٹی بہت نیچے تھی چنانچہ سائفن سسٹم سے پٹرول بالٹی میں منتقل ہوتا رہا۔ میں نے دوبارہ تھوکا لیکن پٹرول کا تلخ ذائقہ میرے منہ میں باقی رہا اور میرے ہونٹوں پر جلن کی جلن برقرار رہی۔

بالٹی کے بھرتے ہی میں نے پلاسٹک کی نلکی کو کھینچ لیا۔

www.paksociety.com

میرے اندازے کے مطابق بالٹی میں دو ڈھائی گیلن پیٹرول تھا اور اتنا ہی گاڑی میں بھی ہونا چاہیے تھا۔ پیٹرول ٹینک کی کیپ کو لاک کر کے میں نے بالٹی اٹھائی اور سائیں پاپڑ والا کی خانقاہ کا نام و نشان مٹانے کی نیت کر کے چل پڑا۔ میں بہت محتاط تھا کہ کسی ٹھوکر سے پیٹرول کی بالٹی نہ چھلکے۔ گاڑی میں سے دوبارہ اتنا پیٹرول نکالنا مشکل تھا۔ جب میں بالٹی لے کر پیچھے پہنچا تو دلربا کسی بات پر غالب کو گالیاں دے رہی تھی اور غالب مسکرا رہا تھا۔

"خیال رکھنا اپنی دلربا کا۔" میں نے کہا۔ "یہ بالٹی نہ الٹ دے۔"

"تم اب کہاں جا رہے ہو؟" وہ بولا۔ "وقت کم ہے۔"

"ہاں — میں ذرا اس دلربا کے ہمسفر کو لے آؤں تو" میں نے کہا۔ "راہ عدم پر اکیلی کیسے جائے گی بیچاری عورت۔"

دلربا کے اعصاب طویل انتظار کے باعث جواب دے چکے تھے۔ وہ ہسٹیریا کا شکار تھی اور اپنے بال نوچ رہی تھی، چلا رہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی کہ مجھے مار دو۔ خدا کے لیے مجھے مار دو۔ میں لوٹ کر باہر گیا تو وین کی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے اس میں سے سیوک کو کھینچ کر باہر نکالا اور وین کی بند کر دی۔ اب میں تھک چکا تھا کہ سیوک رام کو اٹھا کے پلیٹ فارم کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ سیوک رام میرے کندھے پر سے نیچے گر گیا۔ میں نے رک کر سانس لیا اور پھر سیوک رام کو گھسیٹنا شروع کیا۔ دروازے کے اندر تک میں اسے آسانی سے کھینچ کر لے گیا۔ اسے اٹھا کے قبر کے گرد بنے ہوئے سنگ مرمر کے جنگلے سے قبر کے کھلے حصے تک پہنچانا پھر مشکل بن گیا۔ میں نے اسے بوری کی طرح اٹھا کے لڑھکا دیا۔ زینے سے اس کو کندھے پر اٹھا کے لے جانے میں یہ خطرہ تھا کہ میں خود بھی ساتھ ہی لڑھک جاؤں گا چنانچہ میں نے سیوک کو نیچے روانہ کر دیا۔ وہ قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے گیا۔ مجھے اس بات کی فکر نہیں تھی کہ وہ زندہ رہتا ہے یا نہیں۔ پھر میں خود اطمینان سے نیچے اترا۔

سیوک رام کو میں نے گولہ بارود کے ڈھیر پر رکھ دیا۔ "کیا غضب کی چتا ملی ہے اسے!" میں نے کہا۔ "لاکھوں روپے کی آتش فشاں چتا۔ سب اسمگل کیے ہوئے اور مقامی اسلحے کی وہ کھیپ ہے جو بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچی تھی مگر بڑی آسانی سے سیوک کو پرلوک پہنچا دے گی۔" میں نے کہا۔ "اور ہماری مس دلربا کو جہنم تک پہنچنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگے گا۔"

"نہیں۔" دلربا نے خوفزدہ ہو کے چیخ ماری اور دہشت سے کانپنے لگی۔

"میں اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس سے آسان موت کیا ہو گی۔ ایک دھماکا اور سب ختم۔ کسی زہر کا اثر بھی اتنی جلدی نہیں ہوتا۔ میں تمہیں گولی مار دیتا تب بھی پانچ منٹ لگ جاتے تمہاری جان نکلتے ہیں۔"

"خدا کے لیے۔" دلربا نے چیخ ماری۔ "مجھے چھوڑ دو... مجھے معاف کر دو۔" اس کا حوصلہ آخری وقت میں اس شخص کی طرح جواب دے گیا تھا جسے پھانسی دینے کے لیے تختے کی جانب قدم بڑھانے پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ وہ ایک دم اٹھ کر اور چیختی ہوئی بھاگی۔ غالب کا ہاتھ اٹھا اور پوری قوت سے نیچے آیا۔ سر پر ریوالور کی ضرب کاری پڑی اور دلربا ... پھر گری تو بے حس ہو گئی۔ میں نے غالب کی مدد کی اور ہم نے اسے بے ہوشی کے عالم میں سیوک کے ساتھ لٹا دیا۔

ایک مگ کی مدد سے میں نے اس کپڑے پر پٹرول ڈالنا شروع کیا جو پیچھے سے اوپر تک پھیلا ہوا تھا۔ کپڑا اتنی موٹی تھی کہ پٹرول جذب ہوتا گیا۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ پٹرول کی بھری ہوئی بالٹی آہستہ آہستہ خالی ہونے لگی۔ غالب نے ٹائم بم اٹھائے اور کیس کو گھسیٹتا ہوا زینے تک لایا۔ اس کو اٹھانا خاصا مشکل کام تھا چنانچہ میں نے غالب کی مدد کی اور کیس کو اوپر تک ہم دونوں نے مل کر اٹھایا۔

دروازے تک پہنچتے پہنچتے پٹرول بہت کم رہ گیا تھا۔ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ وہ پٹرول نہ اڑ جائے جو میں نے پہلے ڈالا تھا مگر کپڑے کی نمی سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ ... کے قریب آخری مگ ڈال لینے کے بعد میں نے دیکھا تو تھوڑا سا پٹرول باقی تھا۔ میں دوڑ کر نیچے گیا اور یہ پٹرول صندوقوں کے آس پاس پھیلے ہوئے کپڑے پر الٹ دیا۔ آگ کا اب ... تک پہنچ جانا چند منٹ کی بات تھی۔ اس کے بعد ... کے بنے ہوئے صندوقوں کو آگ سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اوپر پہنچ کر میں نے غالب کو دیکھا تو وہ ماچس ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔

"تم جا کے گاڑی اسٹارٹ کرو۔" غالب نے کہا۔

گاڑی کی طرف لپکا ہی تھا کہ مجھے ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی۔ ہیلی کاپٹر سیدھا ادھر ہی آ رہا تھا اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ چند منٹ میں کرنل جگن ناتھ سیٹھ کے جیوتے پہنچ جائیں گے۔ میں نے چلا کر غالب کو آواز دی۔ معلوم نہیں وہ کیا کر رہا تھا۔ ابھی تک مجھے ماچس کا شعلہ دکھائی نہیں دیا تھا۔

... ماچس کا شعلہ نظر آیا اور میں نے ہیڈ لائٹس جلا دیں۔ غالب ... اس کے بعد ہم گھنے جنگل کے مخصوص راستوں سے زیادہ دور نہیں جا سکتے تھے۔ غالب دوڑتا ہوا آیا اور میرے ساتھ بیٹھا ہی تھا کہ میں نے گاڑی چلا دی۔ جھٹکے سے دروازہ جو ابھی بند بھی نہ ہوا تھا پھر کھل گیا۔ میں اس وقت گاڑی موڑ رہا تھا۔ کھلا دروازہ ایک درخت کے تنے سے ٹکرایا اور ٹوٹ کر نیچے گر گیا مگر میں نے پروا نہیں کی۔ مجھے رات کے اندھیرے میں ہیلی کاپٹر کسی دیو ہیکل پرندے کی طرح اپنے سر کے اوپر منڈلاتا نظر آیا۔ پھر اس کی سرچ لائٹ جیسی تیز روشنی نیچے پڑی۔ ... کے باعث سابقہ تجربے کی بنا پر اب ... تاریکی میں سفر کیا تھا اور ہیلی کاپٹر کو بالکل ٹھیک جگہ تک ... اسے لینڈ کرنے کے لیے روشنی کی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنے ہیلی پیڈ کو دیکھ سکے۔

میں ایک منٹ بعد گاڑی کو جتنا ممکن تھا سو گز دور لے جا چکا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں درختوں پر چمکنے والے تند و تیز رنگ کے دھبے بالکل ٹریفک سگنل کا کام دے رہے تھے اور میری رہنمائی کر رہے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے سکندر بادشاہ...؟" غالب نے اعصابی کشیدگی میں پیچھے مڑ کر دیکھا۔ "دھماکا کیوں نہیں ہوا؟"

"کہیں آگ بجھ نہ گئی ہو۔" میں نے دل میں چھپے ہوئے اندیشے کا اظہار کیا۔

"نہیں یار ایسا نہیں ہو سکتا۔" غالب بولا۔ "سب کپڑے پٹرول میں بھیگے ہوئے تھے۔ شروع سے آخر تک ایک پیٹرول لائن تھی۔ آگ بجھ نہیں سکتی۔"

اسی وقت پہلا دھماکا ہوا جو اتنا شدید تھا کہ مجھے نیچے کی زمین ہلتی محسوس ہوئی۔

"وہ مارا پاپڑ والے کو۔" غالب نے نعرہ لگایا اور قہقہہ مار کے ہنسا۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا۔

"میرا خیال ہے جگن ناتھ بھی انہی کے ساتھ گیا۔" میں نے کہا۔ لذت سے میرے جسم کا رواں رواں سرشار ہو رہا تھا۔ بہت عرصے کے بعد میں نے زندگی کے اس نادر تجربے کی لذت کو محسوس کیا جو ... انتقام تھی۔ یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم۔ اب ... میرا نصب العین اور مقصد حیات رہا تھا۔ ... ایک محبت وہ تھی ... خون کے رشتے کی ... مجھے پاگل کر رہا تھا اور اپنے باپ کے قاتلوں سے ... محبت کا دوسرا روپ ان کے ... زندگی کی روشنی تھی جو ہر جگہ میرے ساتھ میری شریک سفر تھی۔ محبت کا ایک اور روپ ان کے خلوص اور رفاقت کے انداز میں نظر آتا تھا جو دوستی کی آن پر جان دینے کے لیے میرے ساتھ سر بکف پھرتے تھے۔ محسن اور نیک محمد۔ غالب اور نامدار۔ وطن کی مٹی سے جذباتی وابستگی محبت کا سب سے انمول روپ تھی جس نے مجھے ذاتی انتقام کے جنون کی راہ سے ہٹا کے اس راستے پر گامزن کر دیا تھا جس پر چلنے والے غازی اور مر جانے والے شہید کہلاتے ہیں۔ وہ سب میرے بھی دشمن تھے جو میرے وطن کے دشمن تھے۔ اور ان کا نام و نشان مٹا دینے کا مقصد بہت اعلیٰ و ارفع تھا۔ میرے ذاتی انتقام کے جذبات اس مقصد کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ میں وہ شخص تھا جو ریت کے ایک ٹیلے کو سر کرنے کی سوچتا تھا مگر قدرت نے مجھے اس عزم سے نوازا جو ہمالیہ سے بھی اونچے پہاڑ کو سر کر سکتا تھا۔

دھماکے ایک تسلسل سے ہو رہے تھے۔ غالباً ہر پیٹی جس میں ہر قسم کے بم بھرے ہوئے تھے اور بارود بھی ... باری باری آگ پکڑ رہی تھی۔ آخری دھماکا اتنا زبردست تھا کہ اس کی دھمک سے گاڑی کے شیشے بجنے لگے۔ میں نے گاڑی روک دی کیونکہ اب ہم خاصے محفوظ فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ میں نیچے اترا اور سائیں پاپڑ والے کو اس کی ... کو اور اس کے ساتھ سیوک کو بے وجود ہوتے دیکھنا چاہتا ... باطل اعتقادات اور جھوٹی کرامات پر یقین رکھنے ... کی شکست تھی جس کا تصور کرتے ہوئے میں نے دلربا کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کا حسن و شباب بارود کی تباہ کن قوت سے بکھر کر ریشہ ریشہ اور ریزہ ریزہ ہو گیا تھا اور اس کے خوبصورت جسم کے ذرات دور دور تک مٹی میں مل گئے تھے یا راکھ بن کے اڑ گئے تھے۔ اپنے وعدے کے مطابق میں نے اسے جو موت کا سامان فراہم کیا تھا اس میں احساس کی اذیت کا وقفہ انتہائی مختصر تھا۔ مجھے سیوک کا کوئی خیال نہیں آیا۔ اگر میرے امکان میں ہوتا تو میں اسے کسی شہر کے چوک میں پھانسی دیتا اور اس کی لاش کو عبرت کے لیے وہیں لٹکتا چھوڑ دیتا مگر میرے پاس اس کار خیر کے لیے وقت نہیں تھا۔

"اگر ہیلی کاپٹر بھی ساتھ ہی تباہ نہ ہوتا تو اتنی دیر میں یقیناً اڑ جاتا۔" غالب نے کہا۔

"ہیلی کاپٹر اور کرنل جگن ناتھ کے بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہیلی کاپٹر اس پلیٹ فارم پر اتر چکا تھا جس کے نیچے ہلاکت خیز مادہ ڈھیر کیا گیا تھا۔ بقول شاعر... بارود کے اک ڈھیر پہ بیٹھا تھا پرندہ۔"

"ہاں میرے کان بھی ابھی اس کے انجن کی آواز سے گونج رہے تھے۔" غالب نے کہا۔ "جو پہلے دھماکے سے چند سیکنڈ قبل ہی خاموش ہوا تھا۔"

www.paksociety.com

"چند سیکنڈ میں تو وہ بجلی کا چڑھ سے نکل بھی نہ پائے ہوں گے" میں نے کہا "صرف ایک سیکنڈ پہلے بھی کرنل جگن ناتھ کے تصور میں دلربا کا حسین چہرہ ہوگا۔ دوسرے سیکنڈ میں اس نے خود کو پرلوک میں پایا ہوگا تو سخت حیران ہوا ہوگا۔"

"حیران تو اس وقت موضع کرماں والی کے رہنے والے بھی ہوں گے کہ کیا واقعی قیامت آگئی۔ قرب قیامت کی نشانیاں تو بڑے بوڑھے کہہ رہے ہیں نظر آ رہی ہیں۔" غالب بولا۔

"دو مردوں کی جوانی کے دور میں" میں نے کہا ــــــ "دھماکے کے تو شاید ٹھڈا لگا تین اور گردو نواح کے دیہات میں بھی سنے گئے ہوں گے ــــــ اب وہ سادہ لوح مراد کہاں جائیں گے جو ہر خواہش کی تکمیل کے لیے منت ماننے یہاں آ جاتے تھے۔ خداوند تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔ جو دست دعا اٹھا کے تجھ سے کچھ مانگنے یا جدوجہد کرنے کے بجائے اس فراڈ سائیں بابا بڑ والے سے رجوع کرتے تھے۔"

"انھیں زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔" غالب نے کہا "اس پاس کوئی دوسرا قبر یا پیر پہلے سے موجود ہوگا اور اپنی ٹرک سب کرامات کا ڈھونگ رچا کے سیدھے سادے دیہاتیوں کو لوٹ رہا ہوگا۔ یہ سائیں بابا بڑ والا تھا جو صرف بھٹکا ہوا تھا کیونکہ سائیں کو بڑے والا ہوگا کہ گرمی کھاتا ہوگا اور چاندی کے ورق سے جمع کرتا ہوگا۔ نہ ہوا تو بہت جلد بیچ کسی بڑ کے کوئی مزار بن جائے گا۔ سائیں بابو رحمان اللہ پیر ٹکوٹ شاہ۔ بابا ورختاں والا جو زمین پر قدم نہیں دھرتا۔ کسی شاخ پر بسیرا کرتا ہے یہ ایک بہتر ہے سکندر بادشاہ! اگر تو بھی اختیار کرلیتا تو بڑا کامیاب رہتا اس بزنس میں صرف ذہانت اور موقع شناسی کام آتی ہے تقدس کا نقاب تو بڑی آسانی سے چڑھایا جا سکتا ہے۔ قلندرانہ وضع اختیار کرنے کے لیے رنگ برنگے چیتھڑے پہنے ہوئے منکوں کی مالا بکھرے بالوں کی وگ۔ ہر رنگ اور سائز کی داڑھی مونچھ یہ سب سامان آسانی سے مل جاتا ہے۔ کرامات کا شعبدہ کرنے کے لیے دو چار ڈرامے کافی ہوتے ہیں۔"

"اور کمال افسوس کی بات یہ ہے مرزا غالب کہ لوگوں کو ان دھوکے بازوں کے اصل چہرے دکھانے کی ہمت کوئی نہیں کرتا۔" میں نے کہا "کاش یہ ممکن ہوتا کہ ہم کرماں والی کو اس انجام تک پہنچانے سے پہلے اس کے تمام عقیدت مندوں کا اجلاس عام کرتے جس میں وہ خود اپنی زبان سے اپنے تمام جرائم کا اعتراف کرتی اور لوگ اس کا اصل روپ بھی دیکھتے۔"

"اب یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" غالب نے کہا۔

میں نے دھوئیں اور گرد و غبار کے اس بادل کو دیکھا جو اندھیرے میں سیاہ گھٹا کی طرح اٹھا تھا لیکن اب رات میں تحلیل ہونے لگا تھا دور دور سے میں لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تھا کہ موضع کرماں والی کے سب نرس دہرے تھے اور یہ ان پر نازل ہونے والی اس آفت ناگہانی کا نظارہ کرنے آ پہنچے گیا۔ میں زیادہ کمزور عقیدہ رکھنے والے اسے بھی سائیں بابا بڑ والا کی کسی کرامت کا نام دے دیں گے کہ بستی کے اعمال خراب تھے زمین پھٹ گئی اور سائیں بابا بڑ والا کرماں والی کو اپنے ساتھ جنت کی طرف پرواز کر گئے یا وہ اسے قہر خداوندی کے نزول کا شگون قرار دیتے ہوئے توبہ استغفار کریں گے کہ اب دنیا ختم ہونے ہی والی ہے۔ وہ جو حقیقت کو جانتے تھے وہ بھی غائب ہی نہیں تھے۔ سرحد کے پار کرنل جگن ناتھ اور دلربا کو اس پر بھیجنے والے بھی تھے۔ ان کے تین آدمی مارے گئے تھے اور ایک اکرم تین تو کیا غم ابھی دوسرے ٹھکانے ان کا اور ان کے راستے ہیں اور دوسرے بہت سے قابل خرید غدار ایسی جو کہ پیسہ سامنے اخلاقی روحانی اور جذباتی رشتوں سے زیادہ اہم ہے۔

اگر سائیں بابا بڑ والا کی جعلی خانقاہ کے آس پاس درخت ہوتے تو یقیناً جنگل بھی آگ کی لپیٹ میں آ جاتا لیکن احتیاط نے بیل کا پیڑ کے اترنے کے لیے ایک طرف پلیٹ فارم بنا رکھا تھا۔ تین طرف بیجا اس گز تک سب درخت صاف کر دیے گئے تھے۔ میں نے کی مشیت و قدرت کو اس جنگل سے گزار کے ڈوبتا میں جلنے والی سڑک پر ہونے کیا اگر کسی شاہراہ تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ تھا تو میرے علم میں نہیں تھا اور اس رات کی سحر ہونے میں بہت وقت رہ گیا تھا میں یہ وقت اسی علاقے میں بھٹکنے کا تجربہ کیسے نہیں گزار سکتا تھا۔ واپسی پر مجھے پیر سادھو رام کی حویلی کے سامنے سے گزرنا پڑا اور سبھے اس بدبخت عورت کا خیال آیا جس نے سادھو رام کے شیطان کے ساتھ مقدس آگ کے گرد سات پھیرے لیے تھے اور اس سے عہد رفاقت کا گناہ کیا تھا۔ شاید اس وقت بھی دل نے اسے دھوکا دیا ہوگا جو سادھو رام مر گیا ہوگا۔ وہ وجیہہ مرد تھا اور جوانی کے جذبات میں کوئی بھی لڑکی اس پہ فریفتہ ہو سکتی تھی۔ دل نے سادھو رام کی دھرم پتنی کو بھی دھوکا دیا تھا۔ جس دل نے پہلے زندگی کا سکون چھینا تھا اور خوشیاں چھین لی تھیں۔ دل نے اب زندگی بھی چھین لی تھی۔

"کس سوچ میں گم ہو ظل سفر بادشاہ؟" غالب نے کہا۔

"کچھ نہیں مرزا جی!" میں نے چونک کر کہا۔ میری طبیعت دنیا کی بے ثباتی کے خیال سے افسردہ ہو رہی تھی۔"

بڑی سڑک اب زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ کالوزیب کا دھندلا نمودار ہوکے غائب ہو چکا تھا۔ صبح قریب تھی۔ ہم نے اب تک بڑی محنت اور انہاک کے ساتھ

پھر چاند میں ذہنی طور پر بھی تھک چکا تھا اور جسمانی اعتبار سے بھی بار بار ادھر دیکھنے پر مجھے بائیں طرف ایک نشیب سا نظر آیا جہاں میں نے گاڑی اس میں اتار دی۔ یہ کوئی خشک ہو جانے والا برساتی نالہ تھا جو برسات کے موسم میں پانی سے بھرا رہتا ہوگا۔ گھاس اور جھاڑیوں کے کٹوروں سے چھوٹے چھوٹے گڑھے بن گئے تھے عقل حیران تھی کہ بھی جلنے والی جیپ کس حد تک صفائی پسند ہوتی ہے کیا اندازہ میرے چہرے کے باتھ روم میں غسل فرمانے والی جینوں کی ذہنیت کو کیا جا سکتا ہے۔

گاڑی جھٹکے سے رکتی اچانک ایک گہرے گڑھے میں جو گڑھل یہاں کے دونوں اگلے پہیئے گڑھے میں اتر گئے اور ناک گڑھے کے کنارے سے ٹکرا کر جلتی ہوگی۔ جھٹکے نے مجھے بھی ہلا دیا اور غالب نے سامنے والے شیشے کو ٹکر ماری۔ کچھ دیر ہم دونوں سنبھلنے کی کوشش کرتے رہے۔

"شیشہ ٹوٹ جاتا تو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔" غالب سر کو دبا کے بولا۔

"غالباً آز ورکے جوڈو کراٹے کی ادا سمجھا نہ تھے۔" میں نے کہا۔

"کاش سر کو تم نے توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" غالب نے میرے سوال کا جواب گول کر دیا اور یوں اعتراف کر لیا کہ ناز و ادا کے خیالوں سے کبھی دور نہیں رہتی۔

"مرکیا ہے؟" میں نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ "اور سے آئیں گھا۔ ادھر سے گڑھ گیا؟"

"یہ بازاری نہیں ہے۔ ایک سچے صحافی کا سوچ ہے۔" مرزا غالب نے مجھے ساتھ دے کر کھول کر سادھو رام کو باہر نکالا اسے کاندھے پر اٹھائیں۔ اور غالب نے رستی کا ایک ایک کنارا تھام اور گھسیٹتے ہوئے اوپر لے چلے۔ اس طرح کہ سادھو رام کی ٹانگیں ٹخنوں سے گھسٹ رہی تھیں مگر باقی جسم تھوڑا سا اوپر اٹھا ہوا تھا۔ ایک بار اسے ہوش آ گیا تھا لیکن وہ مرا نہیں تھا۔ بے ہوش تھا۔ بے سدھ خندق کی جانب گھسیٹ کر لے جانا بھی سخت آزمائش تھی بالآخر ہم سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اس وقت تک افق کے مشرقی کنارے روشن ہو گئے تھے اور درختوں میں بسیرا کرنے والے پرندوں کے شور سے جنگل گونج رہا تھا۔ آشیانوں سے نکلنے والے پرندے اور جنگلی پرندے تھے اور تلاش رزق میں نکلنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

"اس حالت میں ہم خود کو نہیں سنبھال سکتے۔" مرزا غالب نے کہا "ایسے کہاں تک سنبھالیں گے؟"

"ابھی تو گاڑی میں بھی ہمارا اسباب پڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ تو لے آتے ہو تو وہ بیٹی اُٹھالیے جس میں تمام ہم ہیں۔" "کھانے میں ایک جگہ تم ہر دو میں بیٹھ جائیں اور اس وقت

کا انتظار کریں جب سواری مشکل آسان ہو جائیں۔" وہ بیٹھنے کے بولا۔

"تم بھول رہے ہو کہ تمھیں کام ہم سیٹ کرنا نہیں آتا۔" میں نے کہا "خیر تم یہاں کچھ آرام کرو۔ ان درختوں کے پیچھے کوئی بھی تم کو نہیں دیکھ سکتا۔"

"یہاں ہے کون دیکھنے والا۔ ہم خود ہی تماشا ہیں اور خود ہی تماشائی۔" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"میں ایک گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے اشتعال مت کرنا میرا مطلب ہے کہیں مت جانا۔"

"تم بھی میری طبعی موت کا وقت آنے سے پہلے لوٹ آنے کی کوشش ضرور کرنا۔" غالب نے کہا۔

میں سڑک تک گیا اور پیدل چلتا رہا۔ میری جسمانی طاقت کا ذخیرہ تمام ہو چکا تھا اور اب میں قوت ارادی کے سہارے پر چل رہا تھا۔ اس اونٹ کی طرح جو ریگستان میں اپنے ہی کوہان کی چربی کو فیول کے طور پر استعمال کرلیتا ہے سڑک پر دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ سورج میرے سامنے تھیں سڑک کے وسط میں طلوع ہوا اور اس کی پھیکی روشنی میرے سرو جسم کو بالکل چاندنی کی طرح سے چاٹ رہی تھی۔ دس منٹ بعد دھوپ میں تھوڑی سی تمازت آگئی اور چلنے سے میرے جسم میں حرارت پیدا ہوگئی لیکن میں نے محسوس کیا کہ اب قوت ارادی کا فیول ٹینک بھی خالی ہو گیا ہے۔ عین اس وقت جب میں سڑک پر گرنے والا تھا ایک بیل گاڑی نمودار ہوئی۔ میں زمین پر بیٹھ کے اس کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ بیل بھی کمال مخلوق ہے۔ وہ بیل ایک گاڑی کو یوں ناخواستہ یوں کھینچ رہے تھے جیسے ان کے درمیان سست رفتاری کا مقابلہ ہے۔ اس گاڑی کو ایک گھوڑا دس گنا رفتار سے دوڑا کر لے جا سکتا تھا بالآخر چرچوں کرتی ہوئی گاڑی میرے سامنے آئی۔

"کیا ہوا ہے رے بھائی؟" بیل گاڑی کے مالک نے بیلوں کو رکنے کا سگنل دے کر پوچھا۔ بیل فوراً رک گئے۔ مالک جو ایک طرف ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا دھوتی سنبھال کے نیچے کودا۔ وہ اوپر صرف ایک واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ جوان آدمی ضرور تھا مگر بہت زیادہ صحت مند نہیں تھا پھر بھی وہ سردی کے احساس سے بیگانہ لگتا تھا۔ وہ میرے قریب پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

"میں بیمار ہوں بھائی۔" میں نے بمشکل کہا قیمتی آواز میں کہا۔

"گھبرانا نہیں بیمار دو... اللہ اچھا کرے گا۔"

"اور کھانے کو کون دے گا بھائی؟" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیسی کفر کی بات کرتے ہو بھائی۔" میں نے کہا "کھانے کو بھی دینے والا وہی ہے۔"

"مگر پکی پکائی تو حاضر نہیں کرتا بھائی۔"

www.paksociety.com

کمائی ہی بٹتی ہے۔ مجھے منڈی پہنچنا ہے۔"

"میں تم کو سو روپے بھی ادا کروں گا بھائی۔" میں نے کہا۔ "آج منڈی کی چھٹی کر دو۔"

"منڈی کی چھٹی کیسے ہو سکتی ہے بھائی۔" وہ بولا۔ ہم دونوں کے درمیان بھائی بھائی کی تکرار مسلسل جاری تھی۔

"جیسے دفتر سے چھٹی ہوتی ہے بھائی۔" میں نے کہا۔ "تم کوئی بہانہ کر دینا۔ مثلاً یہ کہ بیل کے ماموں جان کا انتقال ہو گیا تھا۔"

"بیل کے ماموں جان؟" وہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "میں اپنے ماموں کو مار سکتا ہوں بھائی... لیکن پیسے کتنے دو گے؟"

"کتنے کے ہیں تمہارے ماموں بھائی... میرا مطلب ہے تم ہی بتا دو کہ وہ کتنی رقم میں وفات پا سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ "بیس روپے ہو جائیں گے بھائی۔"

"مجھے منظور ہے بھائی۔" میں نے آنکھ مار کر گاڑی کا رخ کیا۔

"ادھار نہیں چلے گا بھائی۔" اس نے مجھے روک لیا۔ "وہاں پہنچ کر تم نے خالی جیب دکھا دی یا بے ہوش ہو گئے تو میں کیا کروں گا۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پچاس کا ایک نوٹ نکالا۔

"تم بڑے باشعور ہو بھائی... میرا مطلب ہے بہت اچھے آدمی ہو... بیوی۔"

"میرے پاس واپسی دینے کے لیے تیس روپے نہیں ہیں بھائی۔" وہ نوٹ اچک کر بولا۔

"میں واپس کب مانگ رہا ہوں بھائی۔" میں نے گاڑی میں قیمتی ہو کے کہا۔ "سب رکھ لو لیکن میرا ایک کام اور بھی ہے۔"

"ہر کام پیسے سے ہوتا ہے بھائی۔" اس نے پھر کاک پٹ میں پائلٹ کی جگہ سنبھال لی اور بیلوں کو ریسٹ گیر میں ڈالا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مجبوراً اس نے ایک نوکیلی لکڑی سے وہی کام لیا جو گاڑی کے ٹھنڈے انجن کو اسٹارٹ کرنے کے لیے چوک سے لیا جاتا ہے۔ بیل چل پڑے اور رینگنے لگے۔

"بیلوں کے ڈنگ بیٹری جواب دے گئے ہیں بھائی۔" میں نے کہا۔ "ان کی بیک اپ ختم ہو چکی ہے۔"

"کیا ختم ہو چکی ہے بھائی؟" میرے منہ بولے بھائی نے سخت تشویش سے کہا۔

"تمہاری بیلوں کے راستے میں تمہیں اور بیلوں کی بیلس لگے بھائی۔" میں نے کہا۔ "یہ شدید علیل بیمار ہیں۔"

"اللہ انہیں بھی شفا دے گا بھائی۔" اس نے بیلوں کو ٹاپ گیئر میں ڈالنے کے لیے ایک نہایت نازیبا حرکت کی۔

"شفا اسپتال میں ملتی ہے بھائی۔" میں نے کہا۔ "اگر تم انہیں شفا دینے پہنچا دو تو پورے پچاس تمہارے۔"

"یہ تو ایک عرفی گاڑی سا ہوا بھائی۔" وہ کچھ سوچ کر مجھے گھور کر بولا۔ "ایک نوٹ اور دے سکتے ہو؟"

"دے سکتا ہوں بھائی۔" میں نے کہا۔ زیر لب میں نے اسے گالی بھی دی۔ سو پچاس کی رقم میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی مگر وہ جس بے دردی اور بے حیثیت کا مظاہرہ کر رہا تھا وہ قابل نفرت تھی۔ عموماً دیہات میں بیل گاڑی چلانے والے اتنے چالاک اور ذہن کے مالک نہیں ہوتے۔ بھائی بھائی کرتے ہوئے اس نے مجھے بتا دیا کہ وہ اللہ کے فضل سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے یعنی مقامی اسکول سے درجہ کر کے ایک مڈل اسکول تھا) اعلیٰ ترین سند حاصل کر چکا ہے۔ چنانچہ اب پٹواری کا افسر بکار خاص ہے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ اس نے آٹھویں جماعت پاس جانی کر کے بیسے اینٹھنے کا فن دو سروں سے سیکھا ہے۔ اس کا باپ تو سیدھا سادہ شریف آدمی ہو گا مگر پٹواری کی صحبت اس نے سب کو بھائی کہہ کر سب کی جیب پر ڈاکا ڈالنا سیکھ لیا تھا۔ بھر کیف اس کی نمک روزی حلال کرنا تھی۔ پٹواری خود حرام کھاتا تھا۔ اسے دیکھ کر افسر بکار خاص کو حرام خوری کا شوق ہوا اور انتہا یہ تھا کہ بیل کا نمک حرام خور ہو چکے تھے انہی کے لیے غالب پریشان تھا۔ اب یہ سادہ دل بندے کہاں جائیں؟

بھائی نے کسی کام سے انکار نہیں کیا لیکن ہر کام کی قیمت وصول کی۔ جیسے جیسے اس کو اندازہ ہوتا گیا کہ ہماری قوت خرید زیادہ ہے اس کے نرخ بھی بڑھتے گئے۔ اس نے تالاب تک آنے میں ڈرائیور بھی گاڑی سے نکال کر سامان کو بیل گاڑی تک لانے اور اس سامان کو شہر تک ڈھونے کے مزید سو روپے طلب کیے۔

"یہ تمہاری گاڑی ہے بھائی؟" اس نے سادھو رام کی کار دیکھ کر کہا۔ "گڑھے میں کیسے گر گئی؟"

"اللہ کو یہی منظور تھا بھائی۔" غالب نے کہا۔

"میں اسے بھی کھینچ کر باہر نکال سکتا ہوں بھائی۔" وہ بولا۔ "بس دو سو روپے..."

"تم ایسا کیوں نہیں کرتے بھائی۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "بیلوں کو چھوڑو... اور خود یہ کار کھینچ کر لے جاؤ۔"

اس کے بعد بھائی چلنے کی فضا میں کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی اور غالب بیچارے کھاتی بیل گاڑی میں آ بیٹھے۔ سامنے پیچھے بیل گاڑی کا وہ حصہ جو ایک جھٹکے کی طرح فرش سے دو فٹ کے قریب اونچا تھا جہاں سکرین اور پسلیوں میں گڑ جاتا تھا اور اب پیچھے بیل یوں چلتے رہے کہ ہم اس سے زیادہ تیز رفتاری سے پیدل چل سکتے تھے لیکن سارا مسئلہ انرجی کا تھا۔ ہم میں تو اب بیٹھنے کی طاقت نہ تھی۔ مزید تعلیم یوں کہ ہم سکڑ سمٹ کر بیٹھے تھے۔ خالی پیٹ میں دھول بالکل اسی طرح سما رہی تھی جس طرح پیٹ میں سادھو رام کی طرف سے

برادرانہ تعلقات کا دہ تفتیش کے عمل کا آغاز ہونے سے قبل ہی ہو چکا تھا لیکن بالآخر شہر کے مضافات شروع ہو گئے اور مجھے سڑک کے کنارے ایک "ڈرائیو ان" نظر آیا۔ میں نے اپنی ٹوٹی انجن اپنے جیب سے نکال کر اسے روک لیا اور نیچے اتر گیا۔ اس مچھر نما عمارت کا بہرہ ہو چکا تھا وہ سہارا دے کر بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے خشک بسکٹوں کا سارا اسٹاک خرید لیا اور اسے حکم دیا کہ وہ ایک وقت میں جتنی چائے بنا سکتا ہو بنا لائے۔ اس نے نفاست کو برے کے اچھی میز پر دور کی کیتلی بھر لی۔ ہر چند کہ میز صاف کرنے کی کوشش بہت پہلے ترک کر دی گئی تھی مگر دہ گھنٹے میں ہمارے سامنے تقریباً ایک لیٹر چائے رکھی تھی جس میں پانی کے بعد سب سے زیادہ مقدار دودھ کی تھی۔ پھر ہم لوگ اور سب نے کہ ریتا کی یہ مشروب ایک تاکہ ضرور پکا ہوا تھا مگر وہ چائے نہیں تھی جو ہم شہری پیتے ہیں اور اپنی صحت برقرار رکھتے ہیں۔ تاہم اس وقت خشک بسکٹ اور یہی گرما گرم مشروب تھا جس سے میری اور مرزا غالب کی زندگی میں چند سانسوں کا اضافہ ہو گیا۔

سفر شروع ہوا تو ہمارے جسم میں توانائی لیول بحال ہو گئی تھی مگر مکمل بحالی ہونے والے طاقت میں کچھ گھنٹے کے بعد ہوا جب ہم سو کر اٹھے اور ناشتے کے بعد باتیں کرتے گئے اور سگریٹ سلگانے لگے تو اس وقت جا کر اس کا پاجامہ پہن لیا گاڑی کا افسر بکار خاص سخت حیران تھا۔ اس نے بھی بیمار بیلوں کو صرف چائے سے شفا پاتے یوں چٹکی بجاتے صحت مند ہوتے نہ دیکھا تھا۔ اس کو یہ بھی حیرانی تھی کہ ہم نے بیمار کو ایک چیت کیوں نہیں پلایا جبکہ ہم اس کا استحقاق رکھتے تھے اور تو اور وہ پیالی چائے کی بھی گئی تھی۔ بالآخر اس سے رہا نہ گیا۔

"تم نے چائے کیوں نہیں دی بھائی؟" وہ بولا۔

"اس لیے کہ چائے نہ پینے کے نقصانات ہوتے ہیں بھائی۔" میں نے کہا۔ "خالی پیٹ چائے پینا نقصان دہ ہے، ہم نے نہیں پی بھائی۔" وہ جرح کے انداز میں بولا۔ "تم نے بیماری کو دور کرانے سے بیمار ہو گئے تھے بھائی، تم بیمار نہیں تھے... جیسے کہ یہ ہے۔"

"نظر نہ لگاؤ بھائی۔" غالب نے کہا۔ "اب ہم پانچ روپے نہیں دیں گے۔"

"نہیں بھائی، تم لوگ بھائی تو ایک جھانپڑ دیں گے۔ ہم نے اتنا بھی نہیں کیا، تم کون ہو بھائی؟" غالب بولا۔ "پانچ بھی جائیں گے۔"

برادرانہ تعلقات اس کے بعد بالکل منقطع ہو گئے اور ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے غالب سے انگریزی میں بات شروع کی تو جانے سابقہ بھائی نے ہمیں گھور کر دیکھا مگر خاموش رہا۔

"یہ بہت چالاک اور خطرناک بھائی ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے سب کچھ دیکھا ہے۔ سادھو رام کی کار کو اس علاقے میں سب پہچانتے ہوں گے۔ جب یہ بات پھیلے گی تو اس کے کانوں تک بھی پہنچے گی اور یہ بک دے گا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔"

"میرا تو خیال ہے کہ یہ میاں آ خطرے سے دور رہے گا۔" غالب بولا۔ "اسے ہم سے بھی کوئی غرض نہ رہے گا۔"

"ہم سے کس بات کا ڈر...؟" میں نے کہا۔ "یہ ہمارے ہی بیان کرے گا۔"

"اس نے ہم سے دو سو روپے لیے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "یہ رشوت جرم سمجھا جائے گا۔"

"میرا خیال ہے اس کو اب رخصت کر دینا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "جب یہ واپس چلا جائے تو ہم باقی فاصلہ کسی ٹیکسی میں طے کر لیں۔"

"ٹیکسی یہاں کہاں ہے؟"

"ہے نہیں تو آ جائے گی۔ ورنہ کوئی رکشا کا ردوائی کا وقت دیکھا۔" میں نے کہا۔ "اس خبیث کو پیسے ٹھکانے لگانا نہیں ہو جانا چاہیے۔"

"ہم یہاں اتر رہے ہیں بھائی۔" غالب نے اتفاق کیا اور بائیں طرف کے کندھے پر تھپکی دی۔ "یہاں روک لو اپنی سپر ایکسپریس۔"

"مجھے جو کہنا ہے کہہ لو بھائی۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "لیکن میری بیل گاڑی کو گالی مت دو..."

جب ہم نے اپنا سامان اتار لیا اور سادھو رام کو سڑک کے کنارے لٹا دیا تو اس نے بیلوں کو واپسی کا سگنل دیا اور ہم اس وقت تک انتظار کرتے رہے جب تک کہ بیل گاڑی دور نظر نہ آئی۔ صبح کے نو بجنے والے تھے اور سڑک پر ٹریفک میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ کئی سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں والے ہم پر نگاہ ڈالے بغیر گزر گئے۔ چند ایک نے ہمیں دلچسپی سے تجسس کے ساتھ دیکھا مگر شک کی کوئی بھی بات نہیں تھی۔ ہم دونوں عام قسم کے انسان تھے۔ پتی وضع قطع سے دیہاتی لگتا تھا اور غالب کوئی کلرک ٹائپ چیز۔ ہم کسی بیمار کے ساتھ کسی سواری کے آنے کا انتظار کرتے تھے اور ہمارے سامان میں بھی کوئی بات عجیب نہ تھی۔ یہ کون اعتراض کر سکتا تھا کہ دیہاتی نظر آنے والا وہ سکندر بخت ہے جس کے پیچھے ہر جانب شکاری لگے ہوئے ہیں۔ ایک شکاری پولیس ہے جس نے مجھ پر ان گنت مقدمات قائم کر رکھے ہیں اور جو مجھے خطرناک اشتہاری اور مفرور مجرم قرار دے چکی ہے۔ دوسرے شکاری میرے آبائی چوہدری والد اور ان کے کارندے ہیں اور تیسرے

www.paksociety.com

اپنے ہی نام ہر یاں دوست ہیں جن میں انکل رضوی اور ڈی ایس پی آئی شیخ شامل ہیں۔ وہاں سے گزرنے والے یہ بھی تصور نہیں کر سکتے تھے کہ لکڑی کے باکس میں بارہ خطرناک قسم کے ٹائم بم ہیں اور جو شخص ہمارا رہنما ہے وہ درحقیقت ایک خطرناک وطن دشمن ہے جسے ہم ایک مفرور شخص کے بعد گرفتار کرا سکے ہیں۔ کوئی یہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ ہمارے سوٹ کیس میں نقد چالیس ہزار روپے ہیں۔ اس سے زیادہ مالیت کی انڈین کرنسی ہے اور اس سے بھی زیادہ قیمت کا سونا ہے۔ ایسے بے سروسامان مہاجر نظر آنے والے کتنے بے خبر گئے تھے مگر کتنے دولت مند تھے اور کتنے خطرناک تھے۔ غالب نے بالآخر ایک ریڑھے کو خالی آتے دیکھا اور روک

لیا۔ اس سے پہلے جتنے ریڑھے گزرے تھے وہ سب دودھ والوں کے تھے جو خالی برتن لے کر واپس جا رہے تھے۔ غالب نے ریڑھے والے سے پچاس روپے میں معاملہ طے کیا اور ہمارا سفر پھر شروع ہوا۔ اب ہم پہلے کی نسبت زیادہ رفتار سے جا رہے تھے اور بیل گاڑی کے مقابلے میں ریڑھا ایک لگژری کوچ محسوس ہوتا تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم نے ریڑھے کو گلی کے نکڑ پر روک لیا۔ ریڑھے والا بہت خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا۔ اس نے سامان اتار کے نیچے رکھا، پچاس روپے جیب میں ڈالے اور پلٹ کر دیکھے بغیر سیدھا نکل گیا۔ غالب وہیں کھڑا رہا اور میں چلتا ہوا اس گھر کے دروازے تک پہنچا جہاں اب نیک محمد کے سوا کوئی ہمارا منتظر نہ تھا۔ نہ وہاں رابعہ تھی اور نہ نازو... رابعہ میرے خیال و خواب کی دنیا میں تو میری تھی لیکن اس کے خیالوں کی دنیا میں شاید میں کبھی نہیں تھا۔ صرف غلط تھا۔ نازو دہرے عذاب میں اسیر تھی۔ ایک طرف اس کے جذبات کا طوفانی دھارا تھا جس کی راہ میں کوئی بند نہیں باندھ سکتا تھا لیکن دوسری طرف رشتوں کے محافظ تھے جو اس کے سامنے دیوار بن گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لڑکی سب زنجیریں توڑ کر اور تمام دیواریں گرا کے اپنے جسم کے زخموں کی پروا کیے بغیر یوں نکل جائے گی کہ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔ رابعہ کے بارے میں یہ سوچ کر میرا دل ایک بار پھر ٹوٹے شیشے کی طرح چبھنے لگتا تھا کہ اس کی واپسی کب ہو گی۔ جسمانی طور پر اس کا لوٹ آنا بے مقصد تھا۔ وہ اپنی چاہت کے سارے جانفزا جذبوں کے ساتھ پھر کب میرے دل کی تنہائی اور ویرانی دور کرنے آئے گی، یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

استاد ڈیڈی نے دروازہ کھولا اور چند سیکنڈ معصوم بچے کی طرح کھڑا رہا۔ پھر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ "یہ... یہ تم ہو سکندر بادشاہ..." وہ مجھے زور زور سے ہلانے لگا۔ "واقعی تم ہو... یا میری آنکھیں خواب دیکھ رہی ہیں؟"

"میں آ گیا ہوں نیک محمد..." میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ "میں پہلے بھی آیا تھا لیکن تم نہیں تھے۔"

"ہاں! میں نے غالب کا چھوڑا ہوا رقعہ دیکھ لیا تھا۔" وہ بولا۔

"غالب کہاں ہے؟"

"وہ گلی کے نکڑ پر کھڑا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "جاؤ اور اسے لے آؤ۔"

"کیا وہ خود نہیں آ سکتا تھا؟" نیک محمد کا چہرہ تشویش اور پریشانی کی تصویر بن گیا۔

"اسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔" میں نے نیک محمد کو تسلی دی۔ "اس کے پاس کچھ سامان ہے جو ذرا بھاری ہے۔ وہ خود اٹھا کے نہیں لا سکتا تھا... اور ایک مہمان بھی ہے۔"

"کون مہمان؟"

"خود جا کے دیکھ لو۔" میں نے کہا۔ "یہاں تم سوالات کرتے رہے اور میں جواب دیتا رہا تو پھر غالب بھی لیٹ جائے گا۔ اس کا بھی تھکن سے برا حال ہے۔"

"میں جاتا ہوں سکندر بادشاہ۔" نیک محمد جلدی سے بولا۔ "تم آرام سے لیٹ جاؤ۔"

"نیک محمد..." میں نے آواز دے کر کہا۔ "رابعہ کیسی ہے؟"

"وہ ایسی ہی ہے... میرا مطلب ہے ٹھیک ہے۔" نیک محمد نے دروازے میں رک کر کہا اور پھر غائب ہو گیا۔ میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ ایک بار پھر میں اپنے گھر کی چھت کے نیچے تحفظ کے سائے میں تھا اور یہ احساس ہی اتنا سکون بخش تھا کہ میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ جو کچھ مجھ پر بیت چکی تھی نقش ماضی بن گئی۔ گزشتہ چند دن کے واقعات محو ہو گئے اور میرا ذہن نیند کے تاریک خلا میں پناہ لینے کے لیے وقت سے کٹ گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو دن کا اجالا کمرے کے باہر صحن میں پھیلا ہوا تھا۔ مجھے اپنے قریب ہی دوسری چارپائی پر غالب گھٹنے سمیٹ کر پیٹ سے لگائے گٹھڑی کی طرح پڑا نظر آیا۔ کس وقت نیک محمد نے مجھ پر لحاف ڈال دیا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں تھا اور کسی سے چپکے چپکے باتیں کر رہا تھا۔

"نیک محمد۔" میں نے آواز دے کر اسے بلایا اور اٹھ بیٹھا۔

"اٹھ گئے سکندر بادشاہ۔" وہ دروازے میں نمودار ہوا۔ "قسم مولا علی کی... یوں گھوڑے بیچ کر سوتے تم کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"تم باتیں کس سے کر رہے تھے؟" میں نے کہا۔

"اپنے مہمان سے۔" وہ ہنسا۔

"وہ زندہ تو ہے نا؟" میں نے کہا۔

"زندہ تو ہے مرنا چاہے گا۔" نیک محمد نے کہا اور

"پھر کیا... میں اسے مرنے کہاں دوں گا۔"

"آج دن اور تاریخ کیا ہے استاد جی؟" میں نے انگڑائی لے کر کہا۔ "میں کب سے سو رہا ہوں؟"

"کل دوپہر سے تم اور غالب دونوں ہی مردوں کی طرح پڑے ہو۔" نیک محمد نے کہا۔ "میں نے تو کئی بار آ کے دیکھا۔"

"کہ سانس چل رہی ہے یا نہیں۔" میں ہنس پڑا۔ "ارے ہم ایسے ڈھیٹ ہیں ورنہ کب کے مر گئے ہوتے۔"

"یہ تمہاری حالت کیا ہو رہی ہے سکندر بادشاہ۔" نیک محمد بولا۔ "قسم اللہ کی میں تو ذرا سی دیر کے لیے چکرا گیا تھا تمہیں دیکھ کر۔ میں سمجھا کسی گاؤں کی مسجد کے پیش امام صاحب آ گئے ہیں۔ داڑھی... زلفیں اور... یہ لباس..."

میں نے اپنی کئی دن کی بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرا۔ "یہ تو فقیر منش کا حلیہ ہے۔ مجھے مرنے کی فرصت نہیں تھی۔ ہاتھ منہ تک میں دھو پاتا تو شیو کہاں سے ہو پاتا۔ لیکن باقی سب بھی ضروری تھا۔ بال بھی نے خریدا تھا۔ بال کٹوا لیے ہوئے زمانہ ہو گیا۔ اس لیے کچھ ضرورت سے زیادہ لمبے ہو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اپنی اس ابتر حالت کو فی الحال برقرار رکھوں۔"

"ضرور رکھو لیکن نہا تو لو۔" نیک محمد نے کہا۔ "یا صابن کو بھی ترک کرنے کا ارادہ ہے؟"

نیک محمد نے مجھے غسل کے لیے گرم پانی فراہم کیا۔ نہانے کے بعد میرے جسم کی تھکن بھی بہہ گئی اور میں بالکل تازہ دم ہو کے باہر نکلا تو میرا انتخاب غالب چارپائی پر بیٹھا تھا۔ بدھ کی طرح آلتی پالتی مارے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ میں نے اسے دھکیلا تو وہ لڑھک گیا۔ اپنے بیٹھے پھر سو گیا تھا۔ نیک محمد کے کہنے پر وہ اٹھا۔

"تمہارے ساتھ کیا کروں؟ مجھے کھانے دیں کہ اب تم بھی دھکے..." غالب نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔

"جاؤ نہا دھو کے پھر آدمی بن جاؤ۔" میں نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ اس وقت زندہ آدمی ہوں... مردہ لگ رہا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "اس عالم دیکھ دیا تو اپنی سوچ میں ہے مجھے بے آسرا سمجھو۔ ذرا سو لیا تو مجھے غسل کا حکم ہی ہو گئے۔ یہ بھی تم سے ہوا کہ ایک میں بھی تمہارے غسل سے کر دیتا ہو اور دنیا میں رہا کہ میرا خون تمہاری گردن پر ہو گا۔ سب نے تمہارا ہی بیت کو دوبارہ مت نہلانا۔ وہ شخص جو آدمی ہو تو دیسی ہی ہو گا کہ وہ عملی تصویر تھا۔ بے خطا اور شکست کو نہ جانتا تھا۔ دوستی کے نام پر جان بیچ کر آ گئے اپنی وفا کے اصول پر عمل کرتا تھا اور موت کے روبرو کھڑا تھا مسکراتے ہوئے جا رہا تھا۔"

میں نے پھر شیو بڑھا لی اور پھر آئینے میں اپنی صورت کو دیکھا تو مجھے استاد ڈیڈی کی حیرانی حق بجانب محسوس ہوئی۔ میں واقعی بہت بدل گیا تھا۔ میری صحت بھی اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ مسلسل تھکی حالت۔ بے آرامی اور فاقہ کشی اور مسلسل ٹینشن کا میرے جسم پر اثر انداز ہوئی تھی۔ میرا وزن یقیناً پہلے کے مقابلے میں چند پونڈ کم ہو گیا تھا۔ میرا چہرہ ستا ہوا لگتا تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے نمودار ہو گئے تھے۔ میرے رخساروں کے گرد بے قاعدہ قسم کی خشخشی داڑھی بھی نمودار ہو گئی تھی جس کا سلسلہ مونچھوں سے جا ملتا تھا۔ عمداً میں نے بال پیچھے کی طرف بنائے تو مجھے اپنی صورت میں کسی میک اپ کے بغیر خاصی تبدیلی کا احساس ہوا۔ نیک محمد کچن میں ناشتے کا اہتمام کر رہا تھا۔ میں دوسرے کمرے میں گیا جہاں سادھو رام بندھا پڑا تھا۔ غالب یا استاد ڈیڈی نے اسے چارپائی پر لٹا کے اس کے ہاتھوں پیروں کو الگ الگ چارپائی کی پٹی سے باندھا تھا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ وہ اب ہوش میں تھا اور بے بسی سے گردن کو ادھر ادھر جھٹک رہا تھا۔ اس کا رنگ نقاہت سے سفید ہو رہا تھا۔

"کیوں سادھو رام؟" میں نے کہا۔ "کیا دریا کی یاد آ رہی ہے؟ اس سے ملنے کے لیے تمہیں بہت دور جانا پڑے گا۔ اور معلوم نہیں پھر بھی وہ بے وفا عورت تمہیں ملے گی یا نہیں۔ وہ دنیا میں بھی کسی کی نہیں تھی مگر دنیا سے کنارہ کشی ناتھ کے ساتھ گئی۔ کیا پتا پرلوک میں وہ اسی کے ساتھ رہنا پسند کرے۔ دنیا میں تو اس کا دھرم ایمان، دھرو وفا اور پیار محبت سب پیسہ تھا۔"

سادھو رام کی آنکھیں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ اس نے میری بات کو بے یقینی کے ساتھ سنا تھا مگر میری سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے وہ مجھ پر یقین کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے کپڑا کھولا اور اسے سیدھا بٹھانے میں مدد دی۔ اس نے منہ میں سے کپڑا خود اس نے نکال دیا۔ پھر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس صورت حالات میں وہ کوئی غلط حرکت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ شور مچانا اس کے لیے بے سود تھا۔ جو اس کی مدد کے لیے آتے وہ ایک غدار اور وطن فروش پنڈت کا نام سنتے ہی اس کی تکا بوٹی کر دیتے۔ فرار کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔ وہ تو سیدھا بیٹھتے ہوئے بھی دشواری محسوس کر رہا تھا۔

"یہ بات تو پرانی ہو چکی..." میں نے کہا۔ "لیکن تمہارے لیے یقیناً ایک خبر ہو گی کہ ہم نے سامنے بانچ والے کی اس خانقاہ کو اڑا دیا جو تمہارا اڈا تھی جس کو بلوک رام اور دریا کو ہم نے تمام گولہ بارود اور اسلحے پر رکھ دیا تھا۔ ان کی تو راکھ بھی نہیں ملے گی کہ کسی جگہ نا تھ کو اس کی قضا ٹھیک وقت پر لے آئی۔ وہ اپنے جیل جانے سے

www.paksociety.com

آزما ہی رہا تھا کہ اگلی پسلی کا پٹھ صحیح سے اور اس مرتبہ گرل کی پرواز سیدھا پبلک پہنچی۔"

وہ کانپتے ہاتھوں سے ہاتھوں کی کلائیوں اور گھٹنوں کو رگڑتا رہا اور جھومتا رہا۔ اس کے لیے توازن برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

"تمہارے لیے اور بھی بہت سی دلچسپ تحریریں ہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے... مجھے تھوڑا سا پانی... دے دو۔" وہ بولا۔

"جو کچھ تمہارے مقدر میں ہے وہ تم کو ضرور ملے گا... جب تک تمہارا آب و دانہ نہیں اٹھتا۔" میں نے کہا: "ابھی تمہیں پانی ہی نہیں، چائے بھی ملے گی۔ کھانے پینے کو بھی ملے گا اور موت کے سوا جو مانگو گے ملے گا۔ یہی ایک چیز ہمارے اختیار میں نہیں۔"

اسی وقت نیک محمد اندر آیا: "کیا حکم ہے سکندر بادشاہ؟"

"اس کتے کو کچھ کھانے کے لیے لا دو نیک محمد... اور دو گھونٹ پانی بھی پلا دو۔" میں نے کہا: "اور پھر باندھ دو۔"

"تم بھی تو تماشا کرتے ہو۔" نیک محمد نے کہا: "غالب زندہ سلامت باتھ روم سے نکل آیا ہے۔"

استاد ڈیڈی نے میری ہدایت پر عمل کیا اور چند منٹ میں سادھو رام کو پھر سے لیس کر کے ڈال دیا۔ غالباً گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں اسے کچھ دیکھ کر کھانے پینے کو مل رہا تھا ورنہ اب تک وہ زندہ نہ رہتا۔

"ہم ابھی کچھ دیر میں پھر حاضر ہوں گے۔" میں نے کہا: "اس وقت تک تم تازہ نجوم کی روشنی میں سوچو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ ایک تجربہ یہ بھی ہے کہ تمہاری بیوی بھی تمہارا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ نہیں... وہ کسی کے ساتھ فرار نہیں ہوئی ہے۔ وہ اس دنیا سے ہی چلی گئی ہے جس میں تم جیسے بے ضمیر اور کمینے شخص کو وہ اپنا شوہر تسلیم کرنے پر مجبور تھی۔ میرا خیال ہے اب تک اس کا بھی کریا کرم ہو چکا ہوگا اور کریا کرم کرنے والے وہی ہوں گے جو تمہارے آقا تھے جن کے اشارے پر تم کتے کی طرح دُم ہلاتے جاتے تھے اور جو تم کو پیسے کا راتب ڈال کر تمہاری وفاداری خرید لیتے تھے۔ تم سے تو کتا بھی بہتر ہے جو اپنے مالک سے وفاداری کو نہیں چھوڑتا۔ تمہارے ان جگری ساتھی اور سیوک جیسے ایجنٹوں نے اب تک گرد و نواح کا سارا علاقہ کھنگال ڈالا ہوگا۔ وہ کرپال والا کے ڈیرے کے آس پاس سرگرم عمل ہوں گے اور یہ جاننے کی فکر میں ہوں گے کہ یہ کارروائی کس دشمن کی ہے لیکن اطمینان رکھو، ان کے فرشتے بھی ہمارا سراغ نہیں لگا سکتے۔ کچھ دیر بعد ہم تمہیں بہت سی چیزیں دکھائیں گے جو تمہارے لیے فیصلے کو آسان کر دیں گی۔ تمہیں ابھی بہت سے مشکل فیصلے کرنے ہیں۔"

سادھو رام جانتا تھا کہ یہ مشکل فیصلے کیا ہوں گے... ہم اس کی قوت مزاحمت کو کم سے کم کر دینا چاہتے تھے۔ اسے یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ وہ بازی ہار چکا ہے اور اس بات کا امکان ہی نہیں کہ بازی پھر پلٹ جائے گی۔ اس کی ہر امید کو ختم کر دینا تھا کہ وہ خوش فہمی کے فریب کا شکار نہ ہو اور یہ نہ سوچے کہ اس کو بچانے والے یہاں تک پہنچ جائیں گے کیونکہ وہ تربیت یافتہ کارکن جو بے حد ذہین اور نڈر ہوتے ہیں اور ان کے عقیدے میں یہ کہ... نہیں، ہم نے کوئی غلطی ضرور کی ہوگی جو ہمارا سراغ مل گیا اور وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر لیں گے جس کے لیے وہ آج تک سب کچھ کرتا رہا تھا۔ ایک بنیادی حقیقت اس نے پہلے نہیں سمجھی... سمجھے گا کہ جاسوس کا دوست کوئی نہیں ہوتا۔

غالب کے ساتھ میں نے لنچ کے وقت ایک پُرتکلف ڈنر... جو مجھے بہت دن بعد ملا تھا۔ اس چاشنی کے ذائقے کو میں ترس گئی تھی... تاہم پُرلطف، مجھے اپنے اطمینان اور آسودگی کے احساس میں وہ کمی محسوس ہو رہی تھی جو شہلا اور نازو کی عدم موجودگی کے باعث گھر میں ویرانی کا تاثر دے رہی تھی۔ ان کے بغیر یہ گھر خالی کھنڈر... اور ویرانیوں کے حصار میں افسردگی کا سونا پن لا رہا تھا۔

"یار! تو میری نوکری کا کیا بنے گا؟" غالب نے کہا: "اخبار والے میری جان کو رو رہے ہوں گے۔"

"نہیں مرزا غالب! اس دنیا میں کسی ایک آدمی کی موجودگی یا غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا: "کاروبار حیات جاری رہتا ہے۔ زمین کی گردش... سورج، چاند، ستاروں کا طلوع و غروب، پیدا ہونا، بڑا ہونا، مر جانے والوں کا ماتم، آنے والوں کے لیے جشن... دنیا، انسانوں کا سونا جاگنا... ہنسنا رونا... محبت کرنا، نفرت کرنا سب وہی رہتے ہیں۔ خواہ تم موجود ہو یا کہیں غائب ہو جاؤ۔ کیا تمہاری غیر حاضری میں اخبار شائع نہیں ہوا تھا؟ ذرا یہ تو بتاؤ..."

"مجھے نہ اخبار کی فکر ہے نہ دنیا کی۔ فرق تو مجھے پڑے گا جس کی نوکری نہیں رہے گی۔" غالب نے جھنجلا کر کہا: "معلوم نہیں اب تک کسی نے میری پُراسرار گمشدگی کی رپورٹ نہ لکھوا دی ہو۔"

"میرا مشورہ یہی ہے کہ تم آج سے پھر صحافت شروع کر دو۔" میں نے کہا: "تمہارے قول و فعل سے بہت سے لوگ واقف ہیں۔ تم ہی ایک ایسے شخص ہو جس پر کوئی الزام نہیں آ سکتا۔ تم ہمارے ساتھ بھی ہو لیکن اس دنیا میں ابھی تمہارا کوئی براہ راست رابطہ نہیں۔ اچھا ہے کہ یہ برقرار رہے۔ تم ہمارے بہت سے کام کر سکتے ہو۔"

"ہو سکتا ہے آج محسن بھی لوٹ آئے۔" استاد ڈیڈی نے کہا: "اور شہلا کو بھی لے آئے۔"

دروازے پر دستک... دشمن کے ہم سب جو تھے: "کون آ سکتا ہے اس وقت؟" میں نے کہا۔

"تم ٹھہرو! میں دیکھتا ہوں۔" استاد ڈیڈی نے کہا۔

"ذرا احتیاط کے ساتھ استاد!" میں نے کہا اور اپنا ریوالور لے لیا۔ غالب میرے ساتھ آیا۔ ہم نے کمرے کے دونوں دروازوں کے پیچھے پوزیشن سنبھالی۔ ان میں سے ایک صحن میں کھلتا تھا اور دوسرا ساتھ والے کمرے میں۔ دستک دوبارہ ہوئی اور اس مرتبہ بولنے کی بھی آواز سنائی دی۔ ڈیڈی کے قدم رک گئے۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر کنڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"اندر آ جاؤ۔" ڈیڈی نے دروازہ کھولے بغیر دیوار سے لگ کر کہا۔ دروازہ اندر کی طرف کھلا اور پھر میری آنکھوں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ ایک لڑکی اندر آئی جو بالکل دلہن لگتی تھی۔ وہ دلہن تھی جیسا کہ اس کے ہاتھوں پر مہندی کا رنگ بہت شوخ تھا۔ اس کی مانگ میں افشاں بالکل یوں لگتی تھی جیسے تاریک رات کے آسمان پر کہکشاں۔ اس نے دلہنوں کی طرح سرخ عروسی جوڑا نہیں پہن رکھا تھا مگر اس کے ریشمی لباس اور گوٹ والے دوپٹے، مسکراہٹ اعلان کرتی تھی کہ وہ دلہن ہے۔ اس کے عارض پر حیا کا لال اور اس کی آنکھوں کی ... اور فتح مندی بتاتی تھی کہ وہ کسی کی بیاہتا ہے اور کسی کو جیت چکی ہے۔ اس کے گلے میں پڑے ہوئے سونے کے نیکلس، کانوں کے جھمکے، آویزے اور ہاتھوں میں کھنکتی سونے کی چوڑیاں سب پکار پکار کر کہتے تھے کہ وہ ایک دلہن ہے۔ وہ دلہن شہلا تھی۔ دروازے کے سامنے استاد ڈیڈی کی جگہ گڑا ہوا تھا اس کے پیچھے ہاتھوں میں ریوالور تھامے میں اور غالب مجسمہ بنے کھڑے ہوئے تھے۔ یہ سب ناقابل یقین تھا۔ ابھی ہم نے محسن کا اور شہلا کا نام ہی لیا تھا کہ وہ آ گئے۔ ایسے مجھے زندگی میں صرف ایک بار اتفاق ہوا جب آدمی کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ پلک جھپکتے میں حقیقت بن جاتے ہیں۔

"کیا مجھے یہیں کھڑا رکھو گے بھیا! اندر نہیں آنے دو گے؟" شہلا کی آواز... اور حیرت و خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔

"شہلا! میری ننھی سی بہن!" ڈیڈی نے ریوالور پھینک کر اسے گلے لگا لیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا: "تو دلہن بن گئی۔ بھائی کو بھی نہیں بتایا۔ بھائی تو خود آتا۔" فرط جذبات سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ دلہن میری بہن ہے۔"

میں اور غالب آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ شہلا آگے آئی اور ... میں نے بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے علاوہ کچھ نہ کہا۔ کچھ نہ بول سکا۔ پھر محسن نمودار ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں مٹھائی کے ڈبے اٹھا رکھے تھے جو اس سے غالب نے لے لیے۔

وہ ایک دم میری طرف آیا اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگا۔ میں نے آنسوؤں کو آنکھوں تک نہیں آنے دیا۔ آنسو میرے دل میں محبت کی طوفانی لہروں کے اُٹھے اور انہوں نے میرے وجود کو اندر سے تہس نہس کر دیا لیکن میں نے اپنے مقابل شہلا کو دیکھا اور ضبط کی ساری قوت سے آنسوؤں کے بہائے جانے والے ریلے کو روک لیا۔

"خوشی کے اس موقعے پر روتا ہے پاگل۔" میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر خود پر جبر کرتے ہوئے مسکرا کے کہا: "تو شہلا کو اس گھر میں دلہن بنا کے لایا ہے۔" پھر میں نے شہلا کی طرف دیکھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

"اباجی نے مرنے سے پہلے کہا تھا کہ محسن کو رونے مت دینا۔" محسن نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا۔ "اس وقت میں ان کے ساتھ نہیں تھا ورنہ وہ یہی بات مجھ سے کہتے۔ اور خدا گواہ ہے میں ان کی قبر پر جا کے بھی نہیں رویا تھا۔ رو رو کے نوزیہ کا اور شہلا کا برا حال تھا مگر میں نے اپنی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دیے تھے۔"

"پھر اب رو کے ان کی روح کو کیوں تکلیف پہنچاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں... مجھے کیا ہو گیا تھا۔" وہ چارپائی پر بیٹھ گیا... غالب خاموش تماشائی بنا سب کی صورتوں کو دیکھتا رہا۔

استاد ڈیڈی نے شہلا کو سنبھال لیا تھا: "بیٹھ جا... تو بھی بیٹھ جا میری ننھی سی بہن۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تو بہت بڑی ہو گئی ہے... معلوم نہیں کتنے عرصے کے بعد تجھے دیکھا ہے۔ آخری بار دیکھا تھا تو شاید تو چھوٹی سی بچی تھی... یا مجھے لگتی تھی۔ کتنی خوب صورت لگ رہی ہے تو اس لباس میں۔" وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا اور شہلا کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔

"معلوم ہے ابھی کیا ہوا!" میں نے کہا: "ایک معجزہ۔ اسے کوئی کچھ بھی کہے لیکن میں نے ایسا ہوتے نہ دیکھا نہ سنا۔ ابھی خواجہ نیک محمد نے تمہارا نام لیا ہی تھا... صرف محسن کا نہیں... شہلا کا بھی۔ اس نے کہا تھا کہ ہو سکتا ہے آج محسن اور شہلا آ جائیں۔ اور اسی وقت شہلا نے دستک دے دی۔ اس کے لبوں سے الفاظ کے نکلتے ہی... بڑی طویل عمر ہوگی تم دونوں کی۔"

"معلوم نہیں شہلا کا خیال مجھے کیوں آیا۔" استاد ڈیڈی نے کہا: "ہمارا خیال تو یہ تھا کہ محسن اسے نوزیہ کے پاس چھوڑ کر آئے گا۔ کوئی وجہ نہیں تھی ایسا سوچنے کی۔"

"دنیا میں بہت کچھ بے سبب بھی ہوتا ہے استاد!" میں نے کہا: "مثلاً محبت... جادو ٹونے کی طرح جیتی کی عقل کیا تو تسخیر کرے گی۔ یہ بھی کچھ ایسی ہی بات تھی۔ یہ محبت کا کرشمہ تھا کہ تیرے دل میں وہ خیال آیا جو کسی اور کے دل میں نہیں آ سکتا تھا... اور یہ محبت

www.paksociety.com

وہ تمہی جو ہر بچ کی قوت رکھتی تھی۔ اُس نے خیال کو حقیقت بنا دیا اور پینٹ کر دیا۔ اس وقت تم کچھ اور کہتے تو وہ پینٹ نہ ہوتا۔"

"میاں غوری اور سکندر بادشاہ..." غالب نے اچانک ہاتھ مل کے کہا۔ "میں آتی دیر سے دیکھ رہا ہوں کہ تم دونوں ظالم سماج کی طرح دو محبت کرنے والوں کے درمیان حائل ہو... ایسے نہیں چلے گا... چلو اٹھو دونوں۔"

"یہ میری بہن ہے مرزا غالب سکے پچھے۔" استاد ٹیڈی نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"یہ تھی تمہاری بہن۔ اب اس کے ہاتھ پیلے... سوری لال ہو چکے اور اس کی رخصتی ہونے کے بعد یہ صرف محسن کی بیوی ہے اور تم جانتے... کتنے زیادہ سے زیادہ..." غالب نے کہا۔ "کیونکہ تم نے سنا ہوگا کہ بہن کے گھر میں بھائی کتا۔"

"وہ رخصت ہو کے میرے گھر میں آئی ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"تم بھول گئے ہو۔"

"جناب محسن اور شعلہ کا گھر ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "رخصت تم کو ہونا پڑے گا۔ ورنہ لمبے دوبارہ رخصت کرنا ہوگا۔ کہیں اور۔"

"ایسے ڈرتے کیوں ہو بھائیو؟" محسن بولا۔ "یہ ہم سب کا گھر ہے۔ ہم میں سے نہ کوئی رخصت ہوگا نہ کسی کو رخصت کرے گا۔ شعلہ اپنے میکے میں بھی ہے اور سسرال میں بھی۔ اس گھر کا ڈبل رول ہے۔"

"ڈبل رول ہے تو ٹھیک ہے۔" غالب بیٹھ گیا۔ "اب یہ بتاؤ کہ ایسا کیوں کر ہوا کہ سب ہو گئے کیسے ہوا؟"

"ڈیڈی کی آخری خواہش یہی تھی۔" محسن بولا۔ "انھوں نے فوزیہ سے کہا تھا کہ اس نیک کام میں دیر مت کرنا۔ سوئم چہلم کا انتظار ہرگز نہ کرنا۔ میں نے محسن کے آخری وقت میں قریب نہ ہونے کا قصور معاف کر دیا۔ مگر اس شرط پر کہ وہ میری اس وصیت پر عمل کرنے میں بالکل دیر نہ کرے۔ اس کو سمجھا دینا کہ میں اسے بالکل روتا دیکھنا نہیں چاہتا۔ اگر اسے میرا ذرا بھی خیال ہے کہ میری روح کو تکلیف نہ ہو تو وہ اس طرح شعلہ سے شادی کرے جیسے میں اپنی زندگی میں کرتا۔ فوزیہ نے سب مجھے بتا دیا... پھر میں مجبور ہو گیا۔ جس دن میں پہنچا اس دن ان کا سوئم تھا۔ اگلے دن ہماری شادی ہو گئی۔ میں سادگی سے نکاح چاہتا تھا لیکن فوزیہ نے کہا کہ ابا کی آخری خواہش کچھ تو پوری ہو۔ اس نے ہی شعلہ کو مہندی لگانے پر مجبور کیا اور دلہن بنایا۔"

ہم سب چپ چاپ بیٹھے رہے۔ بچشم تصور سے میں نے اس گھر کو دیکھا جس میں نوحہ ماتم تھم بھی نہ ہوا تھا کہ نغمہ شادی گونجنے لگا۔ دنیا نے کیا سمجھا ہوگا اور کیا کہا ہوگا۔ لیکن پھر میرے تصور میں انکل شیروانی کا مسکراتا ہوا چہرہ آیا۔ تم تو جانتے ہو سکندر کہ دنیا کیا دیکھتی ہے اور کیا سمجھتی ہے۔ اصل بات وہ ہے جسے ہمارا ضمیر قبول کرتا ہے۔ یہ دنیا کی خوشی کا معاملہ نہیں تھا، اور شعلہ کی اور ہم سب کی خوشی کا سوال تھا۔ کیا تم خوشی کا تصور اس وقت سکندر ہو؟

"چلو اب تم دونوں یا تو منہ دھو کے یا نہا کے تازہ دم ہو جاؤ۔ بڑے لمبے سفر سے آئے ہو اور تھکے ہوئے ہو۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "ہم تو لنچ یا ناشتے سے ابھی ابھی فارغ ہوئے ہیں۔ تمہارے ساتھ پھر شریک ہوں گے۔"

"پھر تم آرام کرنا۔ مفصل باتیں ہوتی رہیں گی۔" میں نے ٹیڈی کی تائید کی جو شعلہ کو باہر لے جا چکا تھا۔

"مجھے تیری شکل دیکھ کر ہول آ رہا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تو بالکل مجنوں لگ رہا ہے۔ دو دن کے فراق نے تیرا یہ حال کر دیا۔"

"معلوم نہیں یہ دو دن کی بات ہوگی کہ دو برسوں کی۔" میں نے کہا۔

"کیا تو اس سے ملا نہیں؟" محسن نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے اس کے ایڈریس کے بارے میں معلوم تو ہو گیا تھا۔ ملنے کی فرصت ابھی تک نہیں ملی۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" محسن نے کہا۔

"عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے۔" میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "حقیقت کسی خیال سے نہیں بدلتی... اس سے ملوں گا تو پتا چلے گا کہ وہ کہاں ہے۔ نازو یہ تو جانتی ہے کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے؟"

"شاید رابعہ تجھے دیکھے گی تو خود کو پہچان جائے گی۔" محسن نے کہا۔ "اس کی شناخت تجھ سے تھی اور کوئی بھی اس کی ذات کے خلا کو پُر نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ خود کو نامکمل محسوس کرتی ہے اور ادھوری ہے۔"

"محسن کا خیال بہت حقیقت پسندانہ ہے۔" غالب نے کہا۔ "اس قسم کے نفسیاتی کیس میں شاک ٹریٹمنٹ کی کامیابی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ ایک صدمہ ذہن پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ دوسرا خوشگوار صدمہ مثبت اثرات کا حامل ہوتا ہے، توازن پھر قائم ہو جاتا ہے۔ میں کوئی ماہر نفسیات تو نہیں ہوں لیکن رابعہ کے معاملے میں بہت پُر امید ہوں کہ اسے واپس لایا جا سکتا ہے۔ بس اس کے لیے سخت محنت کرنی ہوگی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ طریقہ کارگر نہ ہو... تم یہ کر سکتے ہو کہ اسے ماضی کی کسی خوشگوار یاد کی تصویر دکھا دو۔ مثلاً اسے وہاں لے جاؤ جہاں..."

"میں سمجھ گیا مرزا جی۔" میں نے کہا۔ "احباب میں پہلے سے زیادہ پُر امید ہوں۔"

شعلہ نے نئی شکل آئی تھی اور اس نے لباس بھی بدل لیا تھا۔ مجھے تھوڑا سا رنج ہوا کہ ہم سب اس خوشی میں پوری طرح شریک نہ ہو سکے اور شعلہ کی شادی جس دھوم دھام سے ہونی تھی وہ انکل شیروانی کے لیے بھی حسرت رہی۔ محسن کی ماں، فوزیہ اور ہم سب کے لیے بھی حسرت رہی اور شاید خود شعلہ کے لیے بھی۔ بھلا کون لڑکی نہیں چاہتی کہ اس کی شادی روایتی طریقے پر پورے انتظام و اہتمام کے ساتھ ہو جس میں ڈھولک بجے، مہندی کے گیت گائے جائیں۔ گھر سجے اور پنڈال ہو۔ زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں۔ تحفے تحائف، دعائیں اور مبارک باد ملے اور دعوتوں کے سلسلے ہوں۔ پھر شعلہ کی تو ساری زندگی ہی ایک المیہ تھی۔ تقدیر نے جتنا اسے دیا تھا اس سے زیادہ چھین لیا تھا۔ میرا دل خوف سے بیٹھنے لگا... بے اختیار میرے دل سے دعا نکلی کہ خداوندا اب تو اس لڑکی کو وہ سب خوشیاں بخش دے جن سے وہ اب تک محروم رہی ہے۔ اگر اس کو آئندہ زندگی میں محبت کی رفاقت اور چاہت کے اعتماد کی مسرت حاصل رہی تو اس کی سب محرومیوں کی تلافی ہو جائے گی۔ بینڈ باجے اور دھوم دھام سے ہونے والی شادی کی مسرت تو وقتی ہوتی ہے۔ اگر اس کے بعد خوشیوں کے خواب جھوٹے ثابت ہوں تو اس میں پچھتاوے کے سوا کیا رہ جاتا ہے جو تمام عمر ساتھ چلتے ہیں۔ اس سے وہ شادی لاکھ درجہ بہتر ہے جو خاموشی سے ہو جائے مگر مستقبل کی لازوال اور لامحدود خوشیوں کی ضمانت کا تحفہ دے جائے۔

"یہ دوسرے کمرے میں کون صاحب تشریف فرما ہیں؟" محسن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ تولیہ کندھے پر ڈال کر غسل خانے تک جانے کے لیے اٹھا تھا کہ اس کی نظر سادھو رام کو دیکھ لیا۔

"اپنے مہمان ہیں... اور ابھی کچھ دن ٹھہریں گے۔" میں نے کہا۔ "تو نہا دھو لے پھر تعارف بھی ہو جائے گا۔"

نہانے دھونے کے بعد استاد ٹیڈی نے اپنی چھوٹی بہن کو لیموں کی چائے پلا کے سلا دیا۔ اس نے شعلہ کے آتے ہی تمام ملبوسات اپنے نام منتقل کرا لیے تھے اور اس اجارہ داری کو قانونی حیثیت دینے پر مصر تھا۔ میں نے یہی سلوک محسن کے ساتھ کرنا چاہا مگر وہ شعلہ کی طرح فرمانبردار اور شریف نہیں تھا۔ اس نے نہایت سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سونے سے انکار کر دیا۔

"میں کون سا لمبا سفر کر کے آیا ہوں۔" وہ بولا۔ "صبح گیارہ بجے لاہور پہنچا تھا۔ میں بالکل تھکا ہوا نہیں ہوں اور اگر تم لوگوں نے میری موجودگی میں پیش آنے والے واقعات نہ سنائے تو مجھے رات کو بھی نیند نہیں آئے گی۔"

"اچھا آؤ چلو ادھر دوسرے کمرے میں۔" استاد ٹیڈی نے حکم دیا۔ "یہاں میری بہن سو رہی ہے۔"

"جانے... یہ تھانیداری نہیں چلے گی۔" محسن نے فخر سے کہا۔

"ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف۔" ٹیڈی نے آستین چڑھا کے کہا۔ "کیسے نہیں چلے گی تھانیداری۔"

میں محسن کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں اپنی داستانِ ستم جاں کا کچھ حصہ میں نے سنایا اور کچھ مرزا غالب نے۔ نیک محمد اور محسن دم بخود سنتے رہے۔ سادھو رام بالوں والے اور کرپان والے گروہ کا ایک رکن ان کے سامنے تھا اور اس تفصیلی تعارف کے بعد وہ سمجھ چکے تھے کہ سادھو رام کو شریف مہمان سمجھنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ غالب نے وہ سوٹ کیس کھول کے رکھا جس میں مال غنیمت تھا۔ اس میں اب بھی تقریباً چالیس ہزار کی پاکستانی کرنسی تھی۔ شمار کرنے پر انڈین کرنسی کی مالیت ستر ہزار روپے بنی ہوگی، کا تخمینہ استاد ٹیڈی نے اس سے لگایا۔

"یہ سب تو ہاتھ کا میل ہے جانے دیجیے۔" محسن نے کہا۔

"ہمارے استاد ٹیڈی بھی ایک قارون کا خزانہ رکھتے ہیں۔"

"انڈین کرنسی کسی مرحلے میں ہمارے کام آ سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن سب سے نایاب چیز یہ تاج محل ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔ چلو تو سادھو مہاراج کے پیچھے رکھیں گے۔" محسن بولا۔

"سادھو مہاراج اتنے قیمتی نہیں ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اگر ان پر ایک تاج محل ضائع کیا جائے۔ انھیں ایسے ہی ضائع کر دیں گے۔ ایک پتھر کافی ہوگا۔ یہ بتا مجھے تاج محل سیٹ کرنا آتا ہے۔"

"میں اس کا عملی مظاہرہ ابھی کر سکتا تھا۔" محسن نے سادھو رام پر حسرت کی نظر ڈالی۔ "آخر میں ایس ایس پی ہوں اور سول ڈیفنس کے دو کورس کر چکا ہوں۔ ایک عام کورس، دوسرا ہم سپیشل کورس۔"

"میں تو اب اپنے اخبار کے دفتر جاتا ہوں دوستو!" غالب نے شانہ مضمحل کر کہا۔ "صبح ملاقات ہوگی۔"

"میں بھی رابعہ کو دیکھنے جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "نیک محمد کو ساتھ لے جاؤں یا تمھارے ساتھ چلوں؟"

"میرے ساتھ چلو۔" غالب نے کہا۔ "رکشے کے پیسے بچ جائیں گے۔"

"اب ایک گاڑی بہت ناگزیر ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور... موجودہ حالات میں اگر دو گھر ہوں اور دو گاڑیاں تو مزید بہتر۔"

"اتنی فضول خرچی کا جواز پیش کیجیے۔" محسن نے کہا۔

"جواز دوسرے کمرے میں خوابیدہ ہے اور آپ اپنے ساتھ لائے ہیں۔" میں نے کہا۔ "نئے دولہا دلہن کو کچھ عرصہ مار دھاڑ اور کشت و خون کرنے والوں کی صحبت سے دور کہیں ہنی مون منانا

www.paksociety.com

چاہیے؟"

"السیما کی قیمتی بنی صلوں کی۔" محسن نے کہا۔

"کیا کہا؟" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "تیرا تو باپ... میرا مطلب ہے میں دیکھتا ہوں کیسے نہیں جاتا تو بنی صلوں پہ... ٹھیک محمد، کل ایک چھوٹا سا گھر تلاش کرو جو یہاں سے پانچ میل دور ہو۔ لٹے دلہا دلہن کی ضروریات کے مطابق آراستہ کرو۔ ان کے لیے دروازے پہ ایک کار کھڑی کرو، بلکہ کار یہاں سے آئے گی۔ ہم انھیں باندھ کر لے جائیں گے اور وہاں ڈال آئیں گے۔ دوسری گاڑی کا انتظام میں کروں گا جو جانے کے کام آئے گی۔"

"جو حکم سکندر بادشاہ۔" استاد وحیدی نے خوش ہو کے کہا۔

"یار یہ کیا پاگل پن ہے... جیسا ہمیں رہنے دو۔" محسن نے بے بسی سے کہا۔

"یہ ناممکن ہے۔" میں نے کہا۔ "تم دونوں کا گھر الگ ہوگا۔ اس گھر کا ہمارے کاروباری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ہم شعلہ کو ان تمام معاملات سے الگ رکھنا چاہتے ہیں جو ہمارے سب سے خطرات کا باعث ہیں۔ یہ ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اس کے علاوہ ہم سب کے لیے وہ گھر بھی ایک گوشۂ عافیت ہوگا۔ وہاں کوئی بھی پناہ لے سکے گا۔ یوں سمجھ لو کہ یہ 'اسٹینڈ بائی' قسم کا انتظام ہے۔ ایک گاڑی تمہاری تو دوسری ہوگی۔ یہ گوشہ ہوا تو دوسرا ہوگا۔ تاہم جب تک ممکن ہوا ہم اس دوسرے گھر کو ٹاپ سیکرٹ رکھیں گے۔ ممکن ہے مجھے رابعہ کو وہاں سے جانا پڑے اور اُسے شعلہ کی تیمارداری کی ضرورت ہو اور جناب! اس کے بعد سال بھر کے اندر اندر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ معاملہ الٹ جائے یعنی شعلہ کو رابعہ کی تیمارداری کی ضرورت پڑ جائے۔"

"بڑی دور کی کوڑی لائے جناب۔ لیکن اب میں کیا کروں، شرم سے لال ہو جاؤں؟ شعلہ ہوتی تو یوں کرتی۔" محسن ہنسا۔

"میاں جب شادی کی ہے تو اور بھی سب کچھ ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "جو ہم سب کو بھگتنا پڑے گا۔ کوئی چاچا کے منصب پر فائز ہوگا تو کوئی ماما بنے گا۔ مرزا غالب پھر ماما غالب کہلائیں گے..."

"تم کہاں سے بن بیٹھے ماما؟" وحیدی نے پھر اعلانِ جنگ کر دیا۔ "ماما صرف میں ہوں... وحیدی ماما۔"

"وحیدی ماما۔" غالب نے اس کی نقل اتاری۔ "شکل دیکھی ہے اپنی میاں جی... ہر وقت کی دھونس نہیں چلے گی۔"

"قسم مولا علی کی... دھونس بھی چلے گی اور دھاندلی بھی۔" وحیدی نے میز پہ مُکا مارا۔ "ماما بن کے تو دیکھے کوئی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" محسن کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ "سوت نہ کپاس، جولاہے سے لٹھم لٹھا۔"

مگر مرزا غالب کو فوراً اپنے ساتھ لے گیا اور [illegible] کی بے سبب جنگ مستقل جاری رہتی۔ وہ مجھے [illegible] کی ایک کوٹھی میں لے گیا جس کے دروازے پر [illegible] حالانکہ بیٹھا ہوا تھا۔ میرے قدم رک گئے۔

"بالکل بے ضرر لیکن پالتو قسم کا جانور ہے۔" غالب نے مجھے ملایا۔ "اور میں کوئی اجنبی ہوں؟"

"لیکن میں تو اجنبی ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ یہ کتے کے موڈ کی بات ہے کہ دوست کو کاٹتا ہے یا دشمن کو۔"

"چلو میں آگے چلتا ہوں... کیا نام ہے اس کا... لاحول ولا قوۃ..." مرزا غالب نے کہا۔ "ہیلو... ٹائیگر... ڈیو... اور بتاؤ یار کیا نام ہوتے ہیں کتے کے۔"

"کتے کو کسی بھی نام سے پکارو وہ کتا ہی رہے گا۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ اسی وقت کتے نے غرانا شروع کیا اور پھر بھونکنے لگا۔ بظاہر وہ مرزا غالب ہی سے زیادہ خفا لگ رہا تھا۔ [illegible] سے کسی نے اسے ڈانٹا۔ وہ کتا کال بیل بھی تھا جس نے ہماری آمد سے اہلِ خانہ کو مطلع کر دیا تھا۔ اس کے خاموش ہو جانے کے بعد غالب نے بڑی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ پیش قدمی کی۔ برآمدے میں بارہ سال کا ایک گول مٹول لڑکا کھڑا ہوا تھا۔

"آپ بھی موتی سے ڈرتے ہیں انکل؟" وہ بولا۔

"موتی؟ یعنی چھپے سے؟" غالب نے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ اللہ کے سوا ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔"

"مگر موتی کے بھونکنے پر آپ رک گئے تھے۔" لڑکے نے کہا۔

"موتی! اس کا نام موتی ہے؟ سنا تم نے سکندر!" غالب نے کہا اور [illegible] کو دیکھا۔ "خیر موتی کو... تم اس کا نام تبدیل بھی رکھ دو تو کیا... جا کے ابا سے کہو انکل غالب آئے ہیں۔"

"وہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔" لڑکا بولا۔ "وہ ڈرائنگ روم میں آپ کے منتظر ہیں... چلیے۔"

ڈرائنگ روم میں جس شخص نے ہمارا استقبال کیا وہ عمر میں غالب سے بہت زیادہ تھا۔ اس کے سر کے بال گھنے مگر بالکل سفید تھے۔ سرخ و سفید چہرہ اور دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجموعی طور پر اس کی شخصیت کا تاثر بہت خوشگوار محسوس ہوتا تھا۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔

"یہ غالباً سکندر صاحب ہیں۔" وہ بولا۔ "تمہارے دوست۔"

"آپ آدمی کو پہچاننے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "صورت دیکھ کر نام بتا سکتے ہیں۔"

"یہ ڈاکٹر لطیف ہیں، مشہور ماہرِ نفسیات۔ تیمور قریشی۔"

نے کہا کہ ان کی ڈگریوں میں اے سے زیڈ تک تمام حروف ہیں مگر ترتیب مجھے یاد نہیں۔ تم پوچھ لینا۔ میں تو چلتا ہوں۔"

"اتنی جلدی کیا ہے برخوردار؟" ایک معمر خاتون نے دروازے سے نمودار ہوتے ہوئے تقاضا شروع کیا۔

"آج کئی دن سے بھاگا ہوا ہوں ڈیوٹی سے۔" غالب نے کہا۔ "بہت مار پڑے گی اگر آج بھی دیر سے [illegible]" وہ خدا حافظ کہہ کے بھاگ گیا۔ میں نے خاتون کو غور سے دیکھا۔ غالب کے جانے کے بعد [illegible] اس کی صورت تھی جس نے بڑھاپے میں سادگی باندھ رکھی تھی۔ اس کی صورت کے نقوش بھی اتنے دلکش تھے کہ اس کی جوانی کے حسنِ بے مثال کا صرف اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

"بیٹھو بیٹا، تم سکندر ہی ہو نا۔" وہ بولی۔ میں پھر چونکا کہ [illegible] یہ اس کی شمال تھی۔

"آپ نے یہ صحیح اندازہ کیسے لگا لیا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"تم ایسے ہی ہو سکتے تھے۔" وہ مسکرائی۔ "بس میرے ذہن میں [illegible] اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ اور پھر تم آئے بھی تو غالب کے ساتھ تھے۔ چائے پیو گے یا کافی؟"

"کافی بڑے شوق سے پیوں گا۔" میں نے کہا۔ ان کے مشفق رویے نے اجنبیت کا احساس [illegible] ختم کر دیا تھا کہ چند منٹ [illegible] مجھے اپنا گھر محسوس ہونے لگا تھا جیسے یہاں پہلی بار نہیں بچپن سے آتا رہا ہوں۔ اس احساس نے مجھے بڑی تسکین دی۔ [illegible] اپنے ہی گھر کے ماحول اور ایسے ہی لوگوں کی توجہ کی ضرورت [illegible] میری سمجھ میں نہیں آتی تھی وہ غالب کے ساتھ [illegible] تھا۔ غالب نے تو ڈاکٹر کو اپنا دوست کہا تھا مگر عمر کے تفاوت کے ساتھ تو وہ دوست نہیں ہو سکتے تھے۔

"معاف کیجیے گا ڈاکٹر صاحب۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال تھا آپ غالب کے دوست ہوں گے!"

"اب تک یہی ہو رہا ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے مسکرا کے کہا۔ "اس کا باپ تو کالج کے زمانے میں میرا دوست بنا تھا۔ [illegible] تھا جب ہم دونوں کو دنیا میں آئے ہوئے تقریباً [illegible] سال ہو گئے تھے مگر لڑکا تو پیدائش کے بعد اول سے میرا دوست ہے۔"

"غالب نے... مجھے کبھی اپنے والد کے بارے میں نہیں بتایا۔" میں نے [illegible] سے اعتراف کیا۔

"ہاں، وہ عموماً کسی کو نہیں بتاتا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "[illegible] وہ بیٹے کو بھی ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا۔ اسی [illegible] اور اس کے درمیان لڑائی ہو جاتی تھی۔ میں کہتا تھا کہ زبردستی کسی کی شخصیت کو مت بگاڑو۔ اسے اپنی زندگی پر اختیار تو دو کہ وہ اپنی افتادِ طبع اور رجحان کے مطابق کچھ کر سکے... الگ بات ہے علم اور فطری صلاحیت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ غالب کبھی ڈاکٹر نہیں بن سکتا تھا۔ اس کے دماغ میں زبردستی ایم بی بی ایس کی ڈگری ٹھونسنا مشکل تھا۔ وہ فنکار قسم کا آدمی تھا۔ تخلیقی ذہن رکھنے والا... اور بے حد جذباتی آدمی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ وہ گیا۔ بلکہ اس کی قوتِ ارادی اتنی مضبوط تھی کہ وہ گھر سے نکل گیا۔ ایک ہی لڑکا تھا ماں باپ کا۔ ماں باپ نے اسے اپنی انا اور اپنی ضد پر قربان کر دیا۔ یہ ہمارے معاشرے میں ہوتا ہی رہتا ہے اور والدین کی دلیل ایک ہی ہوتی ہے کہ ہم تمہارا برا تو نہیں چاہتے۔ مگر ان کی اچھائی بالکل [illegible] ہے۔ غالب لوٹ کر گھر نہیں گیا۔ وہ دونوں ایک حادثے میں مارے گئے۔ میاں بیوی ایک ہی جہاز میں [illegible] ہونے والی کسی عالمی ادارۂ صحت کی کانفرنس اٹینڈ کرنے گئے تھے کہ جہاز گر گیا۔ غالب کو یقیناً پتا چلا ہوگا مگر وہ پھر بھی نہیں آیا۔ غالباً اپنے احساسِ جرم اور پشیمانی کے ساتھ وہ آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا گھر ابھی تک مقفل پڑا ہوا ہے۔ دس سال ہو گئے۔ معلوم نہیں اس کا کیا ہوگا۔ ابھی خاصی آٹھ دس لاکھ کی کوٹھی ہے اور قیمتی سامان ہے مگر اسے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اگر بھائی ہوتا یا کوئی بہن ہوتی تو اسے مل جاتا۔ اب لاکھوں کی جائداد غارت ہو رہی ہے۔"

"آپ نے کبھی غالب کو سمجھایا نہیں؟" میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے۔ میرے کانوں میں مرزا غالب کی آواز آئی۔ آج تم نے جانا سکندر کہ میں کون ہوں۔ میں کیا تھا۔ میں کچھ نہیں تھا۔ میں کچھ نہیں ہوں۔ مگر میں غالب ہوں۔

"ایک بار سمجھانا چاہا تھا۔ وہ غائب ہو گیا۔ دوبارہ بڑی مشکل سے ہاتھ آیا اور اس شرط پہ ملنے لگا کہ اس کے والدین اور ان کی چھوڑی ہوئی جائداد کے مسئلے پر بالکل بات نہیں ہوگی۔ میرے پاس کوئی قانونی اختیارات نہیں۔ ایک وارث کی موجودگی میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ اور وارث کچھ نہیں کرتا۔ ارے بھائی اگر تم کو یہ سب نہیں چاہیے تو کسی کو دے دو۔ بیچ کر تم کسی رفاہی ادارے کو دے دو۔ ریڈ کراس کو یا بلڈ بینک والوں کو۔ کوئی وارڈ بنوا دو کسی اسپتال میں۔ ٹرسٹ بنا دو غریبوں کے علاج کے لیے۔ مگر وہ کچھ بھی تو نہیں کرتا۔ خیر چھوڑو۔ کبھی موقع ملے تو تم ہی بات کر کے دیکھنا۔ شاید وہ تمہاری بات سن لے۔ تم [illegible] مگر میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے غالب سب بتا رہا ہے۔"

"کیا بتا رہا ہے؟" میں نے سنبھل کر کہا۔ اسی وقت ڈاکٹر لطیف کی بیوی ٹرے لے کر اندر آ گئی تھی۔

www.paksociety.com

"وہ سب جو ضروری تھا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "مجھے تمھارا انتظار تھا کیونکہ تم میری مدد کر سکتے ہو۔"

"رابعہ کے سلسلے میں؟" میں نے کہا۔ "وہ اب کیسی ہے؟"

"ویسے تو ٹھیک ہے۔ جسمانی طور پر بالکل صحت مند ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "وقت پر سوتی ہے۔ کھاتی پیتی ہے۔ ایک عام آدمی اُسے دیکھ کر کوئی غلط رائے نہیں قائم کرے گا۔ اگر اسے کسی سے ملوایا جائے گا تو وہ بڑی شائستگی سے ملے گی۔ تعارف کرایا جائے گا تو کہے گی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ پھر جب بیٹھ جائے گی۔ سوال کیا جائے گا تو صحیح جواب دے گی۔ اُٹھنے کو کہا جائے گا تو اُٹھ جائے گی۔ بیٹھنے کو کہو تو بیٹھ جائے گی۔ اس سے کہو کہ چائے پی لو تو چائے پی لے گی۔ منع کرو کہ چائے مت پیو، شربت پیو تو چائے کا کپ رکھ دے گی اور شربت کا گلاس اُٹھا لے گی۔ اُس نے خود کو مکمل طور پر پیچھے ہٹا لیا ہے۔ وہ ڈرا کر لیا ہے۔ مطلب یہ کہ ذہنی طور پر اس نے خود کو دوسروں کے حوالے کر دیا ہے تو پوری اطاعت کرے گی۔ میری بیوی کے سامنے ہو گی تو اس کے تابع ہو گی۔ بالکل ایسے جیسے عامل اور معمول کا رشتہ ہوتا ہے۔ خود معمول کی نہ کوئی سوچ ہوتی ہے اور نہ قوتِ ارادی۔ اس کی اپنی شخصیت بالکل صفر ہو گئی ہے۔ اس نے مزاحمت یکسر ختم کر دی ہے۔ تم بھی اس سے کہو گے کہ رابعہ آگے بڑھو اور اس کھڑکی سے نیچے کود جاؤ۔ تو تم پاؤ گے وہ کود جائے گی۔ اپنے تمام ذہنی فیصلے وہ خود نہیں کر رہی ہے... تم سمجھ رہے ہو نا میری بات کو؟"

"جی... مگر ایسا کیوں ہوا؟" میں نے مایوسی کے گھپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن تلاش کرنے کی جدوجہد کی۔

"اسباب... ان کا تعین مشکل ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "بہت سے عوامل تھے۔ اس کی بچی زندگی کے حادثات۔ کچھ جذباتی صدمات۔ شدید اعصابی دباؤ۔ مسلسل دباؤ۔ مگر اس کے علاوہ نروس بریک ڈاؤن میں کچھ... بقیہ جسمانی اذیت۔ میری تشخیص کے مطابق اس کے ذہن کو بریک اپ کرنے کے لیے کچھ دوائیں استعمال ہوئی ہیں۔ ایسی بہت سی دوائیں ہیں۔ ان کا اثر وقتی ہوتا ہے مگر اس کیس میں ابھی تک باقی ہے۔"

"اور کب تک باقی رہے گا ڈاکٹر صاحب؟ کیا ایسی دوائیں نہیں ہیں جو اُن کا اثر زائل کر سکیں؟" میں نے کہا۔

"میں محض تخمینہ نہیں کر رہا ہوں۔ یعنی صرف نفسیات کے اصولوں کے مطابق علاج نہیں کر رہا ہوں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "میں ایسی دوائیں بھی استعمال کرا رہا ہوں اور مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ اس کی پیش رفت بہت حوصلہ افزا ہے۔ میری یادداشت..."

"کیا اس کے سامنے آپ نے کبھی میرا نام لیا؟" میں نے کہا۔

"میرے متعلق کوئی بات کی؟"

"ہاں۔ لیکن اس کا ریسپونس بہت مبہم رہا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "وہ کچھ کنفیوز ہو گئی۔ ویسے تو اسے بھی ایک سر اٹھائی کی جگہ سکتا ہے کیونکہ کسی اور کے نام پر وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود کو کچھ یاد دلانا چاہتی ہے مگر ناکام ہے۔ وہ لاشعور کے بند دروازوں کے پیچھے سے دستک سنتی ہے مگر اس کا شعور خوابیدہ ہے۔ وہ دستک کو پہچانتی تو ہے۔ نام کے ساتھ میری ایسوسی ایشن ضرور ہے۔ اور نام کے ساتھ وابستگی زیادہ شدید ہو تو عمل پیدا کر سکتی ہے۔ میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ تم اوپر جاؤ۔" شید نے ہاتھ پر وہ... اس نے ایک زینے کی طرف اشارہ کیا۔ "میں اسی جگہ انتظار کروں گا۔"

میں دھڑکتے دل کو سنبھال کر اُٹھا۔ بے یقینی کے اس خواب سے میں پہلے کبھی نہ گزرا تھا۔ پہلے کبھی میں نے نہ سوچا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آ سکتا ہے جب رابعہ بھی مجھے [illegible] گی۔ پہچاننا چاہے گی مگر نہ پہچان پائے گی اور ان سب کا [illegible] ہو گی جو جانتے ہیں کہ میں مجرم نہیں اور چاہتے ہیں کہ میری مدد کریں لیکن مدد کر نہیں پاتے۔ زینے پر آگے بڑھنے والے ہر قدم کے ساتھ میں نے ایک دعا مانگی اور اس وقت کے خوف سے مضطرب ہو گیا جب میری ترسی ہوئی پیاسی آنکھیں اس کے دیدار کی دولت سے روشنی پائیں گی۔ اس وقت رابعہ کی آنکھوں میں کیا ہو گا؟ اقرار یا التفات، اجنبیت؟ کوئے یار سے سوئے دار تک وسوسوں اور اندیشوں کے کانٹے چبھ رہے تھے مگر میں اسٹول اور لیلان کے پھولوں کی خوشبو کے ساتھ چلا گیا۔ بند دروازے پر ایک بار پھر میرے قدم رک گئے۔ تھوڑے سے مجھے لے ناامیدی کا [illegible] ہے کہ وہاں خیالِ یار چھوڑ جائے ہر [illegible] سے۔

دستک دیے بغیر میں نے ہینڈل گھمایا اور دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ میں نے اندر قدم رکھتے ہی دروازہ بند کیا اور میری نظر اُٹھ گئی۔ سامنے دیکھا۔ وہ کھڑکی سے باہر خلا میں گھور رہی تھی۔ آہٹ پر وہ پلٹی اور اس کی نگاہ مجھ پر ٹھہر گئی۔ میرے ساتھ میرے دل کی دھڑکن ٹھہر گئی۔ وقت ٹھہر گیا۔ برسوں کے انتظار کا لمحہ امیدوں کو شکست دے رہا تھا۔ وہ سنگِ مرمر سے تراشے ہوئے مجسمے کی طرح کھڑی لاشعور کے بند دروازوں کی دستک سن رہی تھی مگر وہ بے بس تھی۔ نام کے لیے میری صورت سے شناسائی کا احساس بھی خوابیدہ شعور کو جگانے میں ناکام رہا تھا۔

"رابعہ..." میں نے سخت جدوجہد سے اپنے لہجے کو پُرسکون رکھا۔ "تم رابعہ ہی ہو نا؟"

"میں... ہاں... رابعہ ہی ہوں۔" اُس نے کچھ لمحے بعد بے یقینی کے بغیر کہا۔

"کس نے بتایا ہے تمھیں کہ تم رابعہ ہو؟" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں... مگر سب کہتے ہیں کہ میں رابعہ ہوں۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"میں سکندر ہوں... سکندر بخت..." میں نے کہا۔

اس کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا اور اس کی آنکھیں ویرانہ بنی رہیں۔ اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ صرف یہ بتانے کے لیے کہ اسے مجھ سے کوئی اختلاف نہیں ہے اور اگر میں خود کو سکندر بخت کہتا ہوں تو ٹھیک ہے۔

"کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا رابعہ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ الجھن کے آثار اس کی آنکھوں میں نظر آتے تھے۔ "میں نے آپ کو... پہلے دیکھا ہے کہیں؟"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں رابعہ۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "یاد کرو ہم کیا چاہتے تھے... ہم اپنا گھر بسانا چاہتے تھے۔ تمھارا محسن اور شہلا نے تو شادی کر لی ہے۔ وہ آتی جاتی رہی تھی۔"

رابعہ نے پھر آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور مان لیا کہ میں جو بکھر رہا ہوں اسے وہ تسلیم کرتی ہے۔

"دیکھو رابعہ! کیا تمھیں یاد نہیں کہ تم اور نازو کہاں گئی تھیں؟ اُٹھانے گاما ماچی کے پاس بھیجا تھا۔" میں نے کہا۔

"نازو اور گاما ماچی کون ہیں؟" وہ بولی۔

"گاما ماچی تو مارا گیا۔ وہ چوہدری ملاور کا ایجنٹ تھا۔" میں نے مختلف ناموں سے اس کے ذہن کو جھنجھوڑنا جاری رکھا۔ "اور کیا تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ چوہدری ملاور کون ہے؟"

"اُف... یہ نام میں نے سنا ہے... وہ کوئی اچھا آدمی نہیں۔" رابعہ کے لہجے میں پہلی بار تھوڑا سا یقین اُترا۔

"ہاں رابعہ... وہ ہمارا دشمن تھا۔" میں نے کہا۔ "اُس کی سازش کے باعث میرے والدین مارے گئے تھے۔ وزیر خان... اور تمھاری والدہ کے انتقال کے بعد اس نے تمھارے گھر کو بم سے اُڑا دیا تھا... اُن کا حشر تم اچھی طرح جانتی ہو۔"

کرب کے آثار رابعہ کی صورت پر عیاں ہوئے۔ اس کے نام کے ناسور کو چھیڑ کر میں احساس کو جگانے میں کامیاب ہو گیا۔ "اور رابعہ! اس چوہدری ملاور کے ساتھ استاد [illegible] کو بھی مار ڈالا تھا۔" میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ "اس نے [illegible] تھا اور اس قتل کے الزام میں مجھے گرفتار کرا

دیا تھا۔ ان کا ایک ساتھی ڈی ایس پی سراج بھی ہے۔ وہ اب تک بہت سے لوگوں کو قتل کرا چکے ہیں۔ یاد ہے تمھارے پاس لال رنگ کی ایک فاکس ویگن تھی؟"

"ہاں! ایک لال رنگ کی فاکس ویگن تھی... کہاں گئی وہ؟" رابعہ کا لہجہ اب سپاٹ نہیں رہا تھا۔ وہ کچھ متفکر نظر آنے لگی تھی۔

"اسی چوہدری ملاور نے تمھاری فاکس ویگن کو دھماکے سے تباہ کرا دیا تھا۔ وہ تم کو قتل کرانا چاہتا تھا لیکن خدا نے تمھیں بچا لیا تھا۔" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ پھر بلینک ہو گیا۔ اس ٹی وی کے اسکرین کی طرح جو بجلی جاتے ہی خالی رہ جائے۔ میں نے اسے اور بہت سے واقعات یاد دلائے۔ بہت سے نام لیے مگر وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ ایک وقت میں اس کا ذہن جس حد تک اپنے ماضی کی طرف پیش قدمی کر سکتا تھا کر چکا تھا۔ وہ اب مجھے زیادہ دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہی تھی مگر میری باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ تاہم میری ملاقات رائیگاں نہیں گئی تھی۔ اسے چوہدری ملاور کا نام یاد آنے لگا تھا اور اسے اپنی فاکس ویگن یاد آ گئی تھی۔ اب ضروری تھا کہ میں اسے پرانی یادوں کے روبرو کروں۔ اسے جانے پہچانے مقامات پر لے جاؤں۔ اسے محسن اور شہلا اور استاد جیدی کی صورت دکھاؤں۔ موجودہ حالات میں فوری کامیابی کی امید نہیں رکھی جا سکتی تھی لیکن اس امید کی بنیادیں استوار ہو گئی تھیں کہ رفتہ رفتہ رابعہ کو ذہنی خود فراموشی کے اس بحران سے نکالا جا سکتا ہے۔ یہ صبر آزما کام تھا اور بلاشبہ اس میں دوا علاج کے بعد سب سے اہم کردار میرا تھا مگر دوسرے لوگوں کو بھی اس جدوجہد میں اپنا اپنا کردار حسبِ ضرورت ادا کرنا تھا۔

"اچھا رابعہ! میں اب جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم... پھر آؤ گے؟" وہ آپ سے تم پر آ گئی تھی اور اس کا لہجہ التجا آمیز ہو گیا تھا۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ میں پھر آؤں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔" رابعہ نے کہا اور نظریں اٹھا کے مجھے غور سے دیکھا۔

"کیوں رابعہ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں کوئی آشنا جذبہ تلاش کرنے کی بے سود کوشش کی۔

"تم... اچھے آدمی ہو..." وہ بہت سوچ کر بولی۔ اس تمام عرصے میں اس کی نظر مجھ پر جمی رہی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے پہچاننے کی غیر شعوری جدوجہد کر رہی ہے لیکن اس کی یادوں کے زندان میں تاریکی ہے اور وہاں کہیں کوئی کھلا دروازہ نظر نہیں آتا۔ کسی دیوار میں کوئی روزن نہیں اور کوئی دریچہ نہیں۔ وہ اس اندھیرے میں صرف ان آوازوں کی سرگوشی سن سکتی ہے

www.paksociety.com

ملبوس صورتوں کے نقوش صالیطن کی طرح متحرک دیکھ سکتی ہے اور وقت کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کی کرچیاں چن سکتی ہے مگر وہ بے شک بری ہے اور اس کے بیٹے آوازوں اور صورتوں کو یکجا کرنا مشکل کام ہے۔ اس کے ماضی کا ہر لمحہ یاد کی ایک تصویر تھا جو تاریخ کی ترتیب اور وقت کے تسلسل کے ساتھ یادداشت کے فریم میں محفوظ تھا۔ ایک زلزلے نے اس تصویر خانے کو تہس نہس کر دیا۔ ہر تصویر اپنے فریم سے نکل گئی اور فریم گڈمڈ ہو گئے۔ اب ہر تصویر کو صحیح فریم میں فٹ کرنا اور فریم کو وقت کی ترتیب کے ساتھ یادوں کے تصویر خانے میں لگانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ چاہت کا ختم نہ ہونے والا جذبہ اپنی شدت اور قوت کے باعث صرف اس حد تک جاگا تھا کہ پسندیدگی کے اظہار کا ذریعہ بن گیا تھا اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ تم اچھے آدمی ہو۔ اگر میں اسی سے پوچھتا کہ وہ مجھے اچھا آدمی کیوں سمجھتی ہے تو وہ زیادہ کنفیوز ہوتی کیونکہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہے چنانچہ میں نے اس سے پھر آنے کا وعدہ کیا اور لوٹ آیا۔ اس سے مختصر سی ملاقات نے مجھے بہت سکون اور قرار دیا تھا۔ امید اور یقین دیا تھا اور حوصلہ دیا تھا۔ میں اب ذرا بھی مایوس نہیں تھا۔

"کیسی رہی ملاقات؟" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ وہ ڈرائنگ روم میں میرا منتظر تھا۔ "بہت جلد واپس آ گئے تم۔"

"زیادہ دیر ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟ کیا اس نے تمہیں بالکل نہیں پہچانا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا اور اپنی گفتگو کا ہر لفظ اس کے سامنے دہرایا۔

"یہ حوصلہ افزا علامات ہیں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "پھر تم اتنے مایوس کیوں ہو؟"

"شاید اس لیے کہ میں ضرورت سے زیادہ توقعات لے کر گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"تمہارا خیال ہو گا کہ تمہیں دیکھتے ہی اس کا ذہنی ردعمل شدید ہو گا... اور یہ شاک اسے نارمل کر دے گا۔" ڈاکٹر لطیف مسکرایا۔

"جی... میں کچھ ایسا ہی سوچ رہا تھا۔" میں نے خفت سے کہا۔ "کسی معجزے کی امید رکھنا میری بے وقوفی تھی۔"

"نہیں ینگ مین، اس عمر میں سب ہی امید پرست ہوتے ہیں اور معجزے کی توقع کرتے ہیں..." وہ ہنسا۔ "ان کے یقین کی ایک جذباتی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بے بنیاد یقین رکھتے ہیں۔ ہم سب اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کب تک؟" میں نے کہا۔ "جیسے تو امید پر تمام عمر بسر ہو جاتی ہے۔"

"اب تک علم طب پر کوئی کتاب میڈیکل سائنس یا سائیکولوجی کورس کے لیے نہیں لکھی گئی۔" وہ بولا۔ "کچھ بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جن کا ایک اندازے کے مطابق پیشگوئی کی جا سکتی ہے کہ وہ دو یا چار ہفتوں میں صحت حاصل ہو جائے گی لیکن دماغ کا مرض بہت پیچیدہ ہے۔ اس کے سب اسرار و رموز ابھی تک سامنے نہیں آئے۔ اس کی شعوری کیفیت کو کسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے مگر لاشعور اور تحت الشعور میں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے یہ ہم کبھی نہ جان سکیں گے۔ تشخیص کے سلسلے میں ہم کتنے بھی عجیب و غریب آلات اور مشینیں بنا لیں۔ ایکس رے، ای سی جی، سی ٹی اسکین، الٹراساؤنڈ اور ایکوگرافی۔ یہ سب ٹیسٹ مادی وجود رکھنے والے جسمانی نظام کے لیے ہیں۔ ذہن کا عمل کوئی مادی وجود نہیں رکھتا۔ چنانچہ میں نہیں بتا سکتا کہ ہماری کوشش دو ہفتوں میں بار آور ہوگی یا دو ماہ میں یا دو سال میں یا بار آور ہوگی بھی یا نہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" یکلخت میری امیدوں کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ "کیا یہ کیفیت دائمی بھی ہو سکتی ہے؟"

"سب کچھ ہو سکتا ہے ینگ مین۔ خود کو بدترین خبر کے لیے ہمیشہ تیار رکھو۔" وہ بولا۔ "پھر تمہیں ہر خبر ایک خوشخبری لگے گی۔ مت سوچو کہ صرف وہی ہو گا جو تم چاہتے ہو لیکن ویسا ہی ہو بھی تو ہو سکتا... میں بھی سمجھتا ہوں کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی لیکن ڈاکٹروں کے اندازے بھی غلط ہو جاتے ہیں۔ رابعہ جوان ہے اور کسی بھی وقت ممکن ہو سکتا ہے کہ تمام علامات نمودار ہو جائیں۔ اگر تمہارا دعا پر اعتقاد ہے تو تمہارے پاس ایک بہت بڑا سہارا ہے۔ اس کے لیے دعا کرو، دعا کارگر ہو۔ ہم کوشش کرتے رہیں گے۔ باقی سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ دوا یا دعا دونوں کا رابعہ کے لیے فائدہ مند ہونا یا نہ ہونا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔" میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا میں اسے ہر روز دیکھنے کے لیے آ سکتا ہوں؟"

"بالکل۔ کسی بھی وقت جب تم چاہو۔" وہ بولا۔ "تم ڈاکٹر سے کم تو نہیں ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ کل یا جب آپ اسے اجازت دیں۔" میں نے کہا۔ "تو اسے اپنے ساتھ کچھ ایسی جگہوں پر لے جاؤں جہاں اس کے ذہن کو بہت کچھ یاد آ سکتا ہے۔ اس کی جذباتی وابستگی بہت شدید رہی ہے، بہت طویل رہی ہے ان مقامات سے۔"

میری واپسی تک رات ہو چکی تھی۔ رابعہ سے مل کر میرے دل کو قرار بھی ملا تھا اور میری بے قراری بھی بڑھ گئی تھی۔ میری توجہ کا مرکز اس کی ذات تھی اور میری نظروں میں رابعہ کی تصویر پھر رہی تھی۔

خاموش، جذبات سے عاری چہرہ لیے۔ بے حسی اور جمود کا شکار نظر آنے والی۔ پتھر کی خوبصورت مورت جس میں کسی سنگتراش کے فنکار ہاتھوں کی صناعی نے حسن کو مجسم کر دیا ہو۔ کچھ سوئی سوئی، کچھ جاگی ہوئی۔ ماضی و مستقبل کے درمیان بے یقینی کے صحرا میں سرگرداں۔ خود اپنے ماضی کو پانے کی جستجو میں حیران۔ کانوں میں اس کی آواز گونج رہی تھی... "تم پھر آؤ گے نا۔ تم اچھے آدمی ہو۔" اس کے اتنے ہی الفاظ میرے لیے مژدۂ امید بن گئے تھے۔ امید کتنی تھی کہ آج اس نے دل کے کسی نامعلوم جذبے کی صدا سنی تھی۔ ایک دن اس کا دل احساس کی زبان بن کر کہہ دے گا کہ تم میرے سکندر ہو... تم میرے سکندر ہو۔ جو کبھی کسی کے نہ تھے اور نہ ہو سکو گے، جیسے رابعہ تمہاری تھی اور ہے... اور رہے گی... مگر وہ دن کب آئے گا۔

محسن اور نیک محمد کے درمیان کسی فضول سی بات پر ٹھنی ہوئی تھی اور شہلا ان کی زبانی جنگ سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔ تنازعہ شہلا کی بات پر شروع ہوا تھا۔ محسن نے نیک محمد سے کہا تھا کہ تم نے اپنا گھر بسانے کی کیوں نہیں سوچا۔ استاد کے کچھ عرض کرنے سے پہلے محسن نے خیال ظاہر کیا کہ گھر آباد کر سکتی ہے کوئی لڑکی اور وہ بدبخت لڑکی ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی جو اجڑی صورت والے نیک محمد کی زوجہ کہلا کے دنیا اور عاقبت میں رسوا ہو۔ نیک محمد کو آگ لگ گئی۔ اس نے جواب میں محسن سے کہا کہ اپنی شکل پہلے دیکھ لی ہوتی جو بگڑے ہوئے سول والی پشاوری چپل کی طرح ہے جسے کباڑیا بھی نہ لے۔

"اس صورت پر تو حسینائیں حلقہ فریفتہ ہیں۔ ایک تمہارے سامنے موجود ہے۔" محسن نے اعلان کیا۔ "باقی کے نام صیغۂ راز میں رہیں گے۔"

"یہ تو احسان ہے شہلا کا کہ تم پہ ترس کھا کے اس نے تمہارا رشتہ قبول کر لیا۔" استاد وٹیڈی نے کہا۔ "میری بہن نہ ہوتی تو تم جھک مار رہے ہوتے۔"

"تمہاری بہن میرے پیروں کی جوتی ہے۔" محسن نے ایک جوتے کو زور سے فرش پہ مارا۔ "محاورے کے مطابق۔"

"یہ جوتی تمہارے سر پہ پڑنی چاہیے۔" استاد وٹیڈی نے کہا۔

"اچھا؟ اپنی بہن کو اٹھا کے میرے سر پہ مار دو۔" محسن نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ..." میں نے ریفری کی طرح ہاتھ اٹھایا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں!" محسن نے دانت نکال کے کہا۔ "ایسے ہی وقت گزارنے کے لیے لڑ رہے تھے۔"

"وقت گزارنے کے لیے یہی شغل رہ گیا ہے۔ پھر شادی کیوں کی تھی؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "اور لڑنا ہے تو بیوی سے لڑو۔ کچھ فائدہ تو ہو گا اس ریہرسل کا۔ ورنہ ساری زندگی بغیر لڑے کیسے کٹے گی۔"

"تیری ملاقات کیسی رہی؟" محسن بولا۔ "اس نے جوتے کھا کر بھیج تو نہیں ماری تھی؟"

"نہیں یار۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ تو نک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنی رہی۔ علامات امید افزا ہیں۔"

"یہ سترہ شعور سے امید بہار رکھو۔" محسن نے کہا۔ "اگر اللہ نے چاہا تو اس صدی کے ختم ہونے کے بعد تیرا گھر بھی آباد ہو جائے گا۔ مزار پر کتبہ کچھ یوں لکھا جائے گا کہ عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن۔ دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں۔"

"مجھے خوشبو سے پلاؤ آ رہی ہے۔" میں نے ناک کے راڈار کو گھما کے سوں سوں کی۔ "اور کچھ بھنے کباب۔"

"آج ہماری طرف سے آپ سب کی دعوت ولیمہ ہے۔" محسن نے اعلان کیا۔ "کچھ فقیروں مسکینوں کو بھی دینا چاہیے ایسے مواقع پر۔"

"سب میں نے پکایا ہے سکندر بھائی۔" شہلا نے شرماتے ہوئے اعلان کیا۔

"یہ بھی بھیا دو کو میرا تجربہ ہے۔ سب اپنی ذمہ داری پر کھائیں گے۔" محسن نے کہا۔ "شہلا نے کا کوئی سوال نہیں۔ کھانے کے بعد تعریف ضروری ہے۔"

چونکہ ابھی کھانے میں دیر تھی اس لیے میں نے محسن کو دوسرے کمرے میں بلا لیا۔ سادھو رام کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ میری غیر حاضری میں اسے کچھ کھانے پینے کا موقع بھی ملا تھا اور آرام کرنے کا بھی۔ تاہم وہ بندھا ہوا تھا اور اس کے حلق میں کپڑا بھی تھا۔ میں نے یہ کپڑا نکال دیا۔

"سادھو رام! کیا تم زندہ رہنا چاہتے ہو؟" میں نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا۔

سادھو رام نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بھلا خود کو جانے رحم و کرم پہ چھوڑ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے اپنے اختیار میں کچھ نہیں رہا۔ وہ بازی ہار چکا تھا اور اس کی حیثیت جنگی قیدی سے بھی کم ہے۔ وہ ایسی جگہ ہے جہاں اس کی مدد کے لیے کوئی آ بھی نہیں سکتا اور وہ اگر خود فرار ہو کے جانا چاہے تو کہیں نہیں جا سکتا۔ اس کا کوئی گھر نہیں رہا تھا اور کوئی دوست آشنا نہیں رہا تھا۔ دلربا اور سیلوک سب مارے جا چکے تھے اور ساتھی پانچ والے کا اڈا پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس کی تحویل میں تھا۔ اگر وہ ادھر کا رخ بھی کرتا تو پکڑ لیا جاتا اور ہم سے تو وہ کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر زندگی کا سودا بھی کر سکتا تھا۔ انٹیلی جنس والے اس کے سر میں سے تمام مفید معلومات نچوڑ کر نکال لیتے اور پھر اسے لٹکا دیتے۔

www.paksociety.com

"یہ ٹھیک ہے۔" سادھو رام کریمان "اب تمھارے جینے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔" میں نے کہا۔ "مگر تم چاہو تو کسی نئے نام سے نئی جگہ پر نئی زندگی کے اسباب پیدا کر سکتے ہو۔ ہم تمھیں ایک موقع دے سکتے ہیں۔"

"اس موقعے کے ساتھ جو شرط ہوگی وہ مجھے معلوم ہے۔" سادھو رام نے مایوسی سے کہا۔

"کیا تم اب بھی پرانے آقاؤں سے وفاداری کے عہد پر قائم رہنے کو ترجیح دیتے ہو؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اس سے تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اگر تمھیں بحفاظت ان آقاؤں کے پاس پہنچا دیا جائے، تو یہ بھی بہت گھاٹے کا سودا ہوگا۔ وہ تمھیں زیادہ اذیت سے کر ماریں گے۔ تم انھیں کچھ بتا دو یا نہ بتاؤ، وہ اپنے طور پر یقین کرنا چاہیں گے کہ تم وفاداری کے امتحان میں پورے اترے تھے، تو بھی وہ تمھیں خلعت فاخرہ اور مشک کے ساتھ انعام و اکرام سے نہیں نوازیں گے۔ تم ان کے لیے بے مصرف ہو چکے ہو... وہ تمھارا کریا کرم تک نہیں کریں گے کہ تمھاری آتما کی شانتی ہے۔"

"ہماری شرط بہت آسان ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور یہ موقع تمھیں صرف ہم سے سودا کر کے مل سکتا ہے۔ کسی اور سے نہیں۔"

"تم ان سب کے نام بتا دو جن کو تم جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "ادھر بھی اور ادھر بھی۔"

"صرف نام بتانے سے کیا ہوگا؟" سادھو رام نے کہا۔

"سب کے پیچھے تمھیں نہیں معلوم تو کوئی بات نہیں۔" میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "جتنے نام بھی یاد آئیں وہ ایک کاغذ پر لکھ کر بھی دے دو۔ تم اس کاروبار میں کس کس سے ملتے رہے ہو اور کہاں ملتے رہے ہو، یہ کاروبار کب سے جاری ہے، تم کب سے شریک ہو، کس نے کتنا منافع کمایا۔ پہلے تم پاکستان میں بیٹھنے والوں کے متعلق بتاؤ۔"

"میں... میں سب کو نہیں جانتا۔" سادھو رام بولا۔ "یہ بندوبست ہی ایسا تھا کہ کوئی بھی سب کو نہیں جان سکتا۔"

"یہ ہم سمجھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ اس کا یہ سلسلہ بہت دراز ہے اور ایسے کاروبار میں ہر شخص زنجیر کی صرف ایک کڑی ہوتا ہے جسے ابتدا اور انتہا کی خبر نہیں ہوتی۔ مگر وہ اپنے پیچھے اور آگے والی کڑی سے ضرور منسلک ہوتا ہے۔ کڑی سے کڑی ملانا ہمیں آتا ہے۔ تم صرف ان کے بارے میں بتاؤ گے جن سے تمھارا رابطہ تھا۔ باقی رابطے ہم معلوم کر لیں گے۔"

"تمھاری یادداشت تازہ کرنے کے لیے میں صرف ایک نام لیتا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "یہ زنجیر کی پہلی کڑی ہے اور اس کا نام چوہدری ملاور ہے۔"

"اور جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے۔" میں نے کہا۔ "پاکستان میں اس زنجیر کا دوسرا سرا ایک پولیس افسر ڈی ایس پی کا سراغ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمیں ہماری سرحد میں یہ زنجیر اور لمبی ہے، ابھی درمیانی کڑیوں کا سراغ لگانا ہے۔"

"اس میں بھی ہم کسی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "مثلاً ہم وڈی سلوا کو جانتے تھے جو مارا گیا۔ گلاما بھی ایسی درمیانی کڑی تھا۔ ایک استاد ٹیڈی ہماری نظر میں ہے، جس طرح گاؤں کے ذریعے کھٹمنڈو سے ہمیں ڈونگا چین کا راستہ ملا۔ وہاں سے سائیں نذیر ماسٹر کا اور کریاں والی کا پتا چلا۔ دریا اور کرنل جنگی ناتھ کے نام معلوم ہوئے۔ تم سے ملاقات ہوئی۔ یہ سب ایک نام جاننے سے ہوا، گلاما کا پتا چلنے کے نام سے۔ اب تمھاری مدد سے ہمیں ایک اور نام معلوم ہو جائے تو اس سے مزید نام پوچھے جا سکتے ہیں۔"

"اور میرا خیال ہے کہ تم سے ایک نہیں، زیادہ نئے نام معلوم ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ سب تمھیں بتا کے ہم کوئی غلط مول نہیں لے رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اب کسی کو خبردار نہیں کر سکتے۔ کسی کو نہیں بتا سکتے کہ ہم کتنا جانتے ہیں۔ تمھارے لیے یہاں سے ہماری اجازت کے بغیر زندہ بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ تم خود سوچ لو کہ ہم کس حد تک خطرناک لوگ ہیں اور جانتے کیا ہیں۔ ہماری مدد کر کے تم جان بخشی کا وعدہ لے سکتے ہو، مگر یہ یاد رکھو کہ غداری میں دھوکے کی ایک فیصد بھی گنجائش نہیں ہوگی... ہم تصدیق کریں گے اور کوئی اطلاع غلط ثابت ہوئی تو یہ سب ختم ہو جائے گا۔"

"دوسری بات یہ کہ تم جتنا جانتے ہو سب بتاؤ گے۔ ایک فیصد بھی چھپاؤ گے تو پچھتاؤ گے۔" محسن بولا۔

"ہم تمھیں کل تک سوچنے کا موقع دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمھاری جگہ میں ہوتا تو تعاون کر کے جان بچاتا۔ پرانے دوست اب بالکل کام نہیں آ سکتے۔ وہ تمھارے بدترین دشمن ہیں۔ بھلا ساتھ مت کرو، دیکھو، شاید تمھیں پناہ اور عافیت مل جائے۔"

ہم باری باری بولتے رہے تھے اور ہم نے سادھو رام کو بالکل نہیں بولنے دیا تھا۔ ہمارا مقصد اس کے دماغ میں یہ ڈالنا تھا کہ اس پر زندگی کے سب دروازے بند نہیں ہوئے۔ ایک دروازہ کھلا بھی ہے جس کی چابی ہمارے پاس ہے اور وہ چاہے تو یہ چابی اسے مل سکتی ہے۔ فیصلہ اسے کرنا تھا۔ ہمارا مقصد کسی دشواری کے بغیر اس سے سب کچھ اگلوانا تھا اور ہمارا مقصد اسے تصویر کا دوسرا رخ دکھانا بھی تھا۔ میں نے کمرے کا دروازہ دوبارہ اس کے منہ پر بند کیا اور ہم دوسرے کمرے میں آ گئے جہاں سے اشتہا انگیز خوشبو براہ راست ہمارے معدے پر حملہ کر رہی تھی۔ دعا کے کب سے

ہماری زندگی ایک بیہودہ معمول بن گئی تھی جس میں کسی بات کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ نہ کھانے کا نہ سونے کا۔ نہ ہونے کا نہ چھپنے کا۔ وہ وقت خواب کی صورت لگتا تھا ہم گھومتے پھرتے تھے، ہوٹلوں میں وقت اڑاتے تھے، قہقہے لگاتے تھے اور مسکراتے تھے اور محبت کرتے تھے، چین کی نیند سوتے تھے اور اپنے شب و روز کے ہر لمحے کی مسرت پر مکمل اختیار رکھتے تھے۔ اب تو یہ تھا کہ جہاں جو ملا کھا لیا، جہاں ملا گزارا کر لیا۔ پسند ناپسند کا کوئی سوال نہ تھا۔ سو کبھی رات بھی خواہش سے نہیں ملتی تھی۔ بے خوابی، خوف، پریشانی اور بھاگ دوڑ میں گزرتی تھیں اور جسم مجبور ہو جاتا تھا تو سولی پر بھی نیند کی ضرورت پوری کر لیتا تھا۔

بہت عرصے بعد مجھے یہ پناہ گاہ ایک گھر کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ گھر جو چھین لیا گیا تھا مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ بچھڑ کر سالی سفر میں گزرے۔ دیار غیر میں گھر کا صرف تصور ساتھ تھا۔ واپس آیا تو یہ گھر ہو چکا تھا۔ گھر جانے اور بسنے کی آرزو کو رابعہ نے نئی زندگی خوشی دی مگر وہ گھر بھی جنون ایک خواب تھا جس کی تعبیر کے امکان تک خیالوں کی رسائی بھی نہ رہی تھی۔ تقدیر نے مجھے اور رابعہ کو ملا کے بھی دور رکھا تھا اور اس کے بیٹے بھی کوئی گھر نہ چھوڑا تھا۔ انکل رضوی کا گھر، رابعہ کی ماں کا گھر، فوزیہ کا گھر، انکل حیدری کا گھر، نادرہ اور کرم شیخ کا گھر، استاد ٹیڈی کا گھر۔ سب عارضی پناہ گاہیں ثابت ہوئے تھے جہاں سے ہم ایک بار نکلے تھے تو لوٹ کر نہ جا سکے تھے۔ یہ مکان بھی ایک ایسی ہی پناہ گاہ تھی مگر یکلخت اسے خلاف توقع رکھتے ہی یوں آباد کر دیا تھا کہ اس کی دیواروں کی حیثیت باقی نہ رہی تھی اور یہ ایک آباد گھر نظر آنے لگا تھا۔ اس نے پڑھنے بیٹھنے کے وقت کا اہتمام کیا تھا اور فرش پر دری بچھا کے اٹھنے بیٹھنے کا ڈھنگ لگایا تھا کر لی۔ بہت دیر تک اس منظر کو حیرانی سے دیکھتا رہا۔ ایسی پُرتکلف دعوت کا میں صرف خواب میں تصور کر سکتا تھا۔

"تو بہت خوش قسمت ہے محسن، تجھے تیری منزل مل گئی۔" میں نے کہا۔

"آہ! افسوس ہم جو منزل کی آرزو میں اور راستے کی مسافت میں تھکا دو، نڈھال۔" محسن نے درد ناک لہجے میں کہا۔ "منزل پر پہنچنے کے بعد کیا رہ جاتا ہے۔"

"ابھی وہ ماننے والی منزل باقی ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا اور محسن قہقہہ مار کے ہنسا، شعلہ کا رنگ لال پڑ گیا اور وہ بھاگ گئی۔ "یہ تو ایسا سفر ہے جس میں ایک منزل سے اگلی منزل انسان کا مقصد ہے۔" میں نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ "جب تو صاحب اولاد ہوگا تو تیری منزل ہوگی ان کی تعلیم و تربیت، جب وہ پرورش

کے مرحلے سے گزر جائیں گے تو ہمارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو ہم نے اپنے والدین کے ساتھ کیا تھا یعنی ہم دنیا سے رخصت ہوں گے تو وہ دنیا کے جھمیلوں میں پڑے ہوں گے اور ہم سے بہت دور ہوں گے۔"

"اتنے بدقسمت صرف میں اور تو ہی تھے سکندر۔" محسن نے اداسی سے کہا۔

"نہیں یار، یہ اتفاق ہے یا پھر دنیا کا چلن ایسا ہو گیا ہے کہ آپ بیتی بھی جگ بیتی لگتی ہے۔" میں نے کہا۔ "غالب کے ساتھ بھی ہوا تھا۔"

"غالب کے ساتھ؟" محسن نے کہا۔ "اس نے تو کبھی کچھ نہیں بتایا۔"

"ہاں، لیکن اس ڈاکٹر نے مجھے آج سب کچھ بتا دیا جو رابعہ کا علاج کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ غالب کے مرحوم باپ کا دوست تھا۔"

چونکہ شعلہ ابھی کھانا لگانے کے عمل میں مصروف تھی اس لیے میں نے چند منٹ میں مختصراً وہ سب بتا دیا جو ڈاکٹر لطیف سے معلوم ہوا تھا۔ استاد ٹیڈی اور محسن دم بخود سنتے رہے۔ ایک ٹیڈی کی سرگزشت ہی کیا کم عبرت آموز تھی کہ غالب کے افسانۂ حیات کا المیہ عیاں ہو گیا۔ دونوں بظاہر سطحی نظر آنے والے، اپنی ذات کے محاسن پر فاسق کا پردہ ڈال کر رہنے والے، "زندگی کے ہر دکھ پر خوش باشی کی مسکراہٹ کا پردہ ڈالے رکھنے والے اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لانے والے لوگ تھے۔ اندر سے ان کی شخصیت کے رنگ بالکل جدا تھے۔ وہ ہم سے زیادہ مردم گزیدہ تھے اور ان کے غم کی جڑیں ان کے وجود کی گہرائی میں اتری ہوئی تھیں مگر کسی نے ان کو روتے نہ دیکھا تھا۔ ان میں اب بھی دوسروں کے غم کا بار اٹھا لینے کی سکت تھی۔ دنیا نے ان کے ساتھ بڑی بے رحمی کا سلوک کیا تھا مگر ان کا دل پھر بھی پتھر نہیں ہوا تھا۔ وہ اب بھی خلوص و مہر و وفا پر یقین رکھتے تھے اور دوستی یوں نبھاتے تھے کہ جان بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی۔ ظاہری آنکھ سے دیکھنے والے کے لیے استاد ٹیڈی ایک بدمعاش تھا اور غالب ایک صحافی مگر ہم نے دیکھا تھا کہ دونوں ہی انسان تھے اور انسانیت کی صفات کی خوبیوں کا حسن دونوں کے باطن میں جلوہ گر تھا۔

دروازے پر ایک دھماکا ہوا تو ہم تینوں اچھل پڑے جو بڑی بے صبری سے شعلہ کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

"یہ کون ہو سکتا ہے۔" محسن نے کہا اور ایک دم اچھل کر میں دوسرے کمرے کی طرف دوڑا اور ریوالور لپکا۔

"کون ہے بھئی؟" استاد ٹیڈی نے درشت لہجے میں کہا۔

"ایک اور اُلو کا پٹھا۔" غالب نے دروازے پر لات ماری۔ میں رک گیا اور محسن نے دروازہ کھول دیا۔

www.paksociety.com

"آیئے… آیئے۔ بڑے وقت پر آئے۔" محسن بولا۔ "چشم ما روشن دل ما شاد۔"

"دل میرا شاد ہے اور نہ میری آنکھ روشن ہے۔" غالب نے چلا کر کہا اور اپنا ٹوٹا ہوا چشمہ لہرایا۔ "میں اندازے سے یہاں بیٹھا ہوں۔"

وہ اتنا برہم تھا کہ اس نے عورت کے سامان کی طرف بھی نہیں دیکھا اور اس خوشبو پر بھی توجہ نہیں دی جو کمرے میں بھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھ کے پاس ایک نیل تھا جو مار پیٹ کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔

"یہ کیا ہوا چچا غالب؟" میں نے کہا۔

"وہی جو تم لوگوں کے ساتھ رہ کر ہو سکتا ہے۔" غالب نے برہمی سے کہا۔ "اتنا پرانا صحافی ہوں میں۔ اور میری کتنی خدمات ہیں اس اخبار کے لیے۔ سامنے فٹ پاتھ پر جتنے سیر بکنے والے اخبار سے ایک معتبر اور باشعور اخبار بنانے میں میرا حصہ ہے… ایک ہوا۔ آج وہ ایڈیٹر کی اولاد چند دن کی غیر حاضری پر مجھے برطرف کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ مجھ سے پوچھتا ہے کہاں مر گئے تھے۔ میں نے کہا مر گیا تھا تو تم نے خبر لی جو کہنے لگا خبر تو اب لوں گا میں تمہاری بہت اچھی طرح۔ ابھی چھٹی کر دوں گا تو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ میں نے کہا کہ پھر بیہودگی کا نام لیا تو دھکے دے کر نکال دوں گا۔ پھر اس نے مکا لہرایا جو میری ناک پر لگا۔" غالب نے پھر ٹوٹی ہوئی عینک کو واقعاتی شہادت کے طور پر پیش کیا۔ "اور میں نے عینک ٹوٹ جانے کے بعد مکا تو اس کے سر پر مارا تھا مگر لگا اس کے ماتھوں پر… پھر ادھر گیا۔ وہ وانڈا انصار کے پاس چلا گیا۔"

ہنستے ہنستے ہم سب کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ "اب کیا ہوگا مرزا غالب۔ تمہارا، اس کا اور اخبار کا؟"

"جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب کیا ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "کل میں اور وہ دونوں اس واقعے کو بھول جائیں گے۔ اخبار تو نکالنا ہی ہے۔"

"چلو اچھا ہوا۔ نزلہ ہی بہتی… تم دعوت ولیمہ میں شرکت کے لیے پہنچے۔" محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہاری کمی واقعی محسوس ہو رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "آؤ… بیٹھ جاؤ۔"

"اب تک ہمارے ساتھ دھکے کھاتے رہے ہو یا جو رہے تھے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "آج پلاؤ زردہ کھا لو۔"

"یار آج اس دشمن کا بھی قلع قمع کرا دو۔" غالب نے منہ لہرایا۔

"پلاؤ زردہ تو اس کے سوئم پر بھی ملے گا۔"

"میں تو سوئم کا انتظار بھی نہیں کروں گا۔ تم مرے کے دیکھو۔ ابھی وقت ندرے کی دیگ تقسیم کرواں گا انتظام والوں سے۔" ٹیڈی بولا۔

"چلو چلو۔ ہر وقت لڑتے ہو۔" شعلہ نے اگر سب کو نانا… "آرام سے بیٹھو۔"

"ہاں۔ آرام سے بیٹھو۔" محسن نے فوراً تائید میں سر ہلایا۔ "بیگم ہماری نو بیاہتا ہے کہ حکم دیا ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کو دعوت ولیمہ سے اٹھا کے باہر گلی میں پھینک دیا جائے گا۔"

"اوہو واہ بھئی واہ…" کسی نے کھلے دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ "کیسی سوندھی خوشبو آ رہی ہے۔ ہم نے تو ٹنگسے انگلیوں سے تو لوار… یہ کیا معاملہ ہے حضرت؟"

یہ ہمارا لینڈ لارڈ ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ "آؤ بھئی آؤ… تمہاری کسر تھی۔"

"اور جی ہم تو آ ہی گئے ہیں۔" وہ جوتیاں اتار کے چار زانو آ بیٹھا۔ "لیکن دسو تے سہی ایہہ گل کی اے موتیاں والیو۔"

"یہ جو اپنا یار ہے نا۔" میں نے محسن کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ شادی کر کے آیا ہے۔"

لینڈ لارڈ نے غور سے شرمائی ہوئی شعلہ کو دیکھا۔ "پر… اس کے والد صاحب کے فوت ہونے پہ گئے تھے؟"

"ہاں جی… مگر وہاں حالات ایسے ہو گئے کہ بیوی کو ساتھ لانا پڑا۔" میں نے کہا۔

"اچھا جی… خیر خیر کی آکھاں۔" ٹیکسی ڈرائیور نے سر ہلایا۔ "بڑا افسوس ہے… یا بڑی خوشی ہے… چلو جی رب چنگا کر دے۔ اوئے یہ خیر پہ جانی نے سب خود پکایا ہے… واہ بھئی واہ… شروع کرو نا موتیاں والیو… یا مجھ کو کسے وانگ ہی رلاے؟"

ہم سب بھوکوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ غالباً شعلہ کو پہلے سے اندازہ تھا کہ ہم ترسے ہوئے لوگ ضرورت سے زیادہ کھائیں گے خواہ ہمیں ہیضہ ہو جائے یا پھر لینڈ لارڈ کی شمولیت کے باعث اس نے زیادہ پکایا تھا کہ دو افراد کے اضافے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ کھانے کے دوران میں بھی ایک جنگ محسن اور ٹیڈی کے درمیان ہوئی۔ ایک کا اصرار تھا کہ میری بہن سے اچھا کھانا کوئی نہیں پکا سکتا۔ محسن نے گرج کے کہا کہ میری بیوی سے اچھا تمہاری بہن نہیں پکا سکتی۔ پھر شعلہ نے محسن کو اس کے الفاظ یاد دلا کے شرمندہ کرنا چاہا جو اس نے کھانا چکھنے سے پہلے کہے تھے۔ محسن نے ڈھٹائی سے جواب دیا کہ وہ ہر بیان سے منحرف ہونے کی ہمت رکھتا ہے۔ درمیان میں باہر سے کسی نے چلانا شروع کیا۔

"او گھر… ایہہ تیرے ویر دی گلی اے۔ چلا اپنی ایس مال…" یہ ہمارے لینڈ لارڈ کا دیرینہ دشمن دوسرا ٹیکسی ڈرائیور تھا جس کی ٹیکسی پھر مخالف سمت سے نمودار ہو گئی تھی۔ لینڈ لارڈ نے حسب عادت اپنی ٹیکسی گلی میں اول پارک کی… رات ہلاک ہو گیا تھا۔

نکل ہو کے جوابی کاروائی کے لیے اٹھا ہی تھا کہ ٹیڈی نے اسے بٹھایا اور خود دروازے تک گیا۔

"کیا بکواس لگا رکھی ہے… شرفاء کا محلہ ہے یہ۔" ٹیڈی نے گرج کر کہا۔

"او جا شرفا… ٹیکسی ہٹوا دو… کدھر ہے اس کا مالک وڈی ٹیکسی والا الو۔"

"وہ ہسپتال میں ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "گاڑی کو اٹھا کے لے جا سکتے ہو تو لے جاؤ۔"

"ہسپتال میں؟" دوسرا ٹیکسی ڈرائیور ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ "کیا ہوا تھا جی اسے… کون سے وارڈ میں ہے؟"

"دل کے وارڈ میں ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "اس کی گاڑی کو دل کا دورہ پڑا تھا۔"

"اوہ… رب خیر کرے۔" دوسرا ٹیکسی ڈرائیور نے بدحواسی میں اٹھا کر لیا اور ٹیڈی کی بات پر غور نہ کر سکا۔

ہمارے لینڈ لارڈ نے گلا پھاڑ کے ہنسنا شروع کیا۔ "اوہ واہ جی وہ… کس طرح دوڑ گیا اے… پاگل دا پتر… گڈی نوں دل دا دورہ!" پھر منہ پھر کھانے پر حملہ کیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس ہنگامے میں سارا دھیان اس کی موجودگی نے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا۔ وہ دوسرے کمرے میں جب باپ بیٹھا تھا… بن بلایا مہمان یعنی ہمارا لینڈ لارڈ جانے لگا تو اس نے شعلہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر باقاعدہ … ٹوپی اتاری۔ اس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ اس نے گن کر کیا دو سو روپے نکالے اور شعلہ کو پکڑا دیے۔

"سنے نے پتر… اوہ بھئی شادی کوئی بار بار ہوندی اے۔ ماواں دی اک وار ہی ہندی اے۔" وہ بولا۔ پھر اس نے باقی نوٹوں والی ٹوپی کو احتیاط سے سر پر جمایا اور باہر نکل گیا۔ اس کی ایک لمحے کی جذباتی حرکت نے ہم سب کو خاموش کر دیا تھا۔ ایک عجیب… اس کا جذبہ انمول تھا۔ اس کی وضعداری انمول تھی اور خلوص کی سادگی انمول تھی۔ وہ باہر جا کے پھر اندر آیا۔

"اور میاں جی۔" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "تو پورے گنجا… ہوں تو تو… کے لیا… مگر یہ حساب فیر کدی… اج نے خوشی دا موقع اے۔" وہ پھر چلا گیا اور اپنی گاڑی سنبھالنے گیا۔ مجھے یہ سوچ کر پھر ہنسی آئی کہ اگر دوسرا ٹیکسی ڈرائیور ہسپتال پہنچا اور دل کے وارڈ میں جا کے لینڈ لارڈ کو تلاش کرتا پھرا تو مایوس ہو کے لوٹے گا اور سمجھ جائے گا کہ اسے بے وقوف بنایا گیا تھا۔ … پھر … اور ہمارے لینڈ لارڈ کی جنگ دلچسپ ہوگی۔ اس رات کوئی سونے کے موڈ میں نہ تھا۔ رات گیارہ بجے

شعلہ نے کافی بنائی جو اتنی سرور آور تھی کہ آسودگی اور راحت کا احساس میرے رگ و پے میں اترنے لگا۔ وقت بہت ناقابل اعتبار تھا۔ آج اس نے سب کو ملا دیا تھا اور سب کو چھڑا دیا تھا۔ ایک رابعہ کی کمی کا احساس سب کو تھا لیکن عمداً کسی نے اس کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ ہماری طرح خوش ہو سکتی تو ہم اسے بھی لے آتے مگر اب دل کی تسلی کے لیے یہ خیال غنیمت تھا کہ وہ محفوظ ہے۔ بخدا میں آج اگر ہم … تو کل ہم ہوں گے۔ یہ چند مقدرہ جال تو کوئی بات نہیں۔ یہ کس نے کہا تھا؟ یہ مجھے قریب نے لکھا تھا۔ وقت کی راہیں بدل گئی تھیں اور منزلیں بدل گئی تھیں۔ وقت ہر گزرتی ساعت ہر لمحے آدمی پر حاوی ہے۔ وقت آدمی کی تقدیر ہے۔ ناقابل فہم، غیر یقینی، خیال کی گرفت میں نہ آنے والا۔

ہم نے محسن اور شعلہ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ایک دو دن کے لیے کسی ہوٹل میں کمرا لے لیں کیونکہ یہاں سارے عوام کی موجودگی سب سے بڑا فتنہ تھی۔ ایک کمرے کو ہم حوالات کے طور پر استعمال کر رہے تھے اور وہاں کسی کا رات کو جاگتے رہنا ضروری تھا خواہ یہ کام باری باری کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ ہم پانچ افراد تھے۔ ہمارا سامان تھا اور کمرے زیادہ بڑے نہیں تھے لیکن شعلہ اور محسن نے تنگی میں گزارا کرنے کو ترجیح دی۔ شعلہ تو کسی دوست کے گھر میں جا رہنے کے لیے بھی تیار نہیں تھی مگر میں نے اسے باتوں سے قائل کر لیا۔

"یہ بھی کوئی گھر ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہارے لیے ہم ایسا گھر ڈھونڈ لیں گے جسے تم واقعی گھر بنا سکو۔ اس گلوبشت جس میں ہم سب آرام سے رہ سکیں۔ اسے تم اپنی مرضی سے سجانا۔ سارا سامان خود خریدنا۔ فرنیچر، پردے، برتن… وہ تمہارا اور محسن کا گھر ہوگا۔ ایم آر ایس کا ہیڈ کوارٹر نہیں ہوگا۔ اسے ہم سب ہر خطرے سے اور ہر آفت سے محفوظ رکھیں گے۔ جب ہم وہاں آئیں گے تو اپنے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں لائیں گے۔ وہاں ہم پیار سے کر آئیں گے، خوشی سے کر آئیں گے۔"

"جیسے کہ بھائی اپنی بہن کے گھر جاتے ہیں تو خالی ہاتھ نہیں جاتے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"ہاں! اور ہم سکھ چین، خوشی اور آرام کے لیے وہاں آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہماری ذمہ داری اب بہت بڑھ گئی ہے۔ پہلے بھی ہم ایک دوسرے کے محافظ تھے مگر اب محسن کو تمہارے لیے اور تم کو محسن کے لیے جینا ہے اور ہمیں تمہارے گھر کی حفاظت بھی کرنی ہے۔ ہم تمہارے خطرات اور تمہارے مصائب کا بار اٹھا سکتے ہیں، یہ نہیں کر سکتے…"

"کیا نہیں کر سکتے؟" محسن نے میری بات کاٹ دی۔ "تم یہ سمجھتے ہو کہ اب میں گھر میں بیٹھ جاؤں گا تو تمہارا خیال غلط ہے۔ میری زندگی کی فتح ماری تم سب نے بانٹ لی ہے تو پھر مجھے کس بات

www.paksociety.com

کا قلم مجھے تم ایم آرایس سے خارج نہیں کر سکتے۔"

"چپ کر کے سو جاؤ۔ ایم آر ایس کے بچو۔" غالب نے آنکھیں کھول کر کہا اور تب مجھے احساس ہوا کہ وہ جہاں بیٹھا تھا اور میں دھلک کر سو چکا ہے۔ استاد ٹیڈی کچھ کہنے والا تھا کہ میں نے اسے منع کر دیا۔ وہ رات ہم نے باری باری جاگتے اور پہرا دیتے گزاری۔

صبح شعلا نے پھر ایک شگوفہ اور امورِ خانہ داری میں ماہر بیوی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے سب کے لیے بہترین ناشتا تیار کیا۔ ہم نے اس دن کے کام تقسیم کر لیے۔ استاد ٹیڈی نے سادھو رام کے سونے کو ٹھکانے لگانے کی ذمہ داری قبول کی۔ جتنا سونا خود استاد ٹیڈی کے مطابق صندوق میں تھا اسے وہ پہلے ہی صحن میں دفن کر چکا تھا۔ اس مختصر سے قریبانہ گھر میں وہ سونا بہت محفوظ تھا اور ایسے وقت میں ہمارے کام آسکتا تھا جب ہمارے وسائل باقی نہ رہیں۔

"یہ ہمارے مستقبل کی ضروریات کے لیے ایک ضمانت ہے گا۔" میں نے کہا۔ "اگر کبھی ہمیں اچانک بھاگنا پڑا تب بھی بعد میں ہم ہی اس خزانے کو نکالیں گے۔ ہماری جگہ کوئی بھی آئے گا اسے مدفون خزانے کا سراغ بھی نہیں ملے گا۔"

"اور اگر ہم نہ آسکے؟" غالب نے کہا۔

"کب تک نہیں آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر ایک دن آیا تو دوسرا آئے گا، تیسرا آئے گا۔"

"یہ خطرہ تو بہر حال ہے گا کہ اس پکے صحن میں کوئی بھی نئی عمارت کے لیے بنیادیں کھودے تو سونا نکال لے۔"

"بنیادوں کی حد تک کوئی خطرہ نہیں۔" ٹیڈی نے کہا۔ "میں نے اسے چار فٹ کی گہرائی میں دفن کیا ہے۔"

"کسی نے چند فٹ کا بیسمنٹ لگایا یا کنواں کھودا تو...؟"

"اچھا تم بیٹھ جاؤ یہاں ڈنڈا لے کر۔" ٹیڈی نے جھنجھلا کے کہا "جو بنیادیں کھودے گا یا کنواں کھودے گا وہ پہلے تمہاری قبر کھودے گا۔"

"تمہارا خزانہ ہے تم بیٹھ جاؤ اس پر ناگ بن کر۔ اب تک بیٹھے ہی تھے۔" غالب نے آگ بگولا ہو کے کہا۔

میں نے ان کی لڑائی فوراً بند کرا دی۔ "جو ہمارے مقدر میں ہو گا وہی ہو گا۔ ابھی تو ٹیک ہے تم جاؤ۔ یہ سونے کے زیورات کسی کو بیچ آؤ۔ ان سے بھی ہمیں سات آٹھ ہزار ضرور ملیں گے۔ پھر آج رات کو اسی صحن میں دوسری جگہ انڈین کرنسی کو گاڑ دو۔ اس کی بھی جب ضرورت پڑے گی تب ہی کام آئے گی۔ ہو سکتا ہے ہمیں زنجیر کے دوست کے گاؤں تک پہنچنے کے لیے ہندوستان سے گزرنا پڑے اور مشرقی پاکستان تک جانا پڑے۔ وہاں بھی انڈین کرنسی چل جاتی ہے۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے سردار؟" محسن نے غیر موجود مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔

"تم کوئی اچھا سا مگر محفوظ گھر دیکھو۔" میں نے کہا۔ "شعلا کو ساتھ رکھو۔ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل۔"

"ناقص العقل۔" محسن نے کہا۔

"تم دونوں پچیس ہزار روپے لے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "آدھی رقم سے مکان کا ایڈوانس دو۔ آدھی سے ضرورت کا سامان خریدو۔ بزنس کو شاپنگ کراؤ۔ اس کی پسند سے سب چیزیں لو اور اس کی گھر بسانے کی شام تک یا رات تک واپس آجاؤ۔ گھومو پھرو۔ میں آدھی رقم لے کر جاتا ہوں اور کوئی گاڑی دیکھتا ہوں۔ اس کے کاغذات وغیرہ مکمل کراتا ہوں۔۔۔ اور مرزا غالب۔۔۔"

"غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں!" وہ منہ بنا کے بولا۔ "ہم تو میاں یہاں سو رہے ہیں لمبی تان کے۔"

"پھر آنخفاصت۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "اگر غیرت والے ہو تو۔۔۔" اور فوراً باہر نکل گیا ورنہ غالب اس کے پیچھے لپکا تھا۔

"ٹھیک ہے چچا غالب۔" میں نے کہا۔

"یاد ہے کیا کیا اس انگلا کھی ہے کل سے تم نے۔۔۔ میں چچا ہوں تمہارا؟" غالب نے دھونا مار کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ٹیڈی کا کے خلاف ہو تو جواب کا مداوا نہ کر سکنے کے باعث جھنجلایا ہوا تھا۔

"اچھا تایا غالب۔ تم آرام کرو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تمہیں تو نہ کر جاگتے ہو۔ تب بھی گھر پہ کسی کو سادھو رام کی حفاظت کے لیے رہنا تو تھا جس پر فوراً محنت طا اور بچو کس رہتا۔"

"یہ شہر کو واپسی پر معاملہ اٹھا لیے۔" محسن نے اُسے چھیڑنے کے لیے کہا۔ "تم بند ہے پڑے ہو اور سادھو رام۔۔۔"

"جاؤ بابا جاؤ! ایسوں فقیروں سے دل لگی کر کے بدد عا لیتے ہو۔" غالب نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہم سب اُسے چھیڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہم سب اپنے اپنے راستوں پر نکل چکے تھے۔ میں نے محسن اور شعلا کو ایک ساتھ رکشا میں روانہ ہوتے دیکھا۔ انھوں نے پلٹ کر ہاتھ ہلایا اور میں ان کے مسرت سے دمکتے چہروں کو دیکھتا رہا۔ شعلا کے رنگ روپ میں جو بہار کی آمد آمد تھی اور وہ ایک دوست کو پالینے کی خوشی کے احساس سے سرشار تھے۔ ان کی خوشی کو قائم و دائم رکھنا ہے۔ دل لے چلتے چلتے دعا کی کہ اگر ضرورت ہو تو میرے مقدر کی خوشیاں بھی ان کے دامن میں ڈال دینا۔ میں تو ابھی اس خوشی سے بہت دور ہوں اور اپنی محرومی کے دکھ سے سمجھوتا کر کے جینا ہی سیکھ چکا ہوں۔

گاڑی خریدتے ہوئے مجھے اچانک رابعہ کا خیال آیا۔ میں اس سے پہلے تین شو روم دیکھ چکا تھا۔ چوتھے شو روم میں مجھے سرخ رنگ کی ایک خاص ویگن نظر آئی جس نے مجھے ایسا لگا جیسے میری نظر کو جیسے کسی تصور نے فریب دیا اور مجھے یوں لگا جیسے یہ وہی

گاڑی ہے جس میں رابعہ پہلی بار میرے پاس آئی تھی۔ نیلے آسمان کے رنگ کی ساڑی پہنے جس پر زرد پھول ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے اور جس میں اس کا چہرہ ماہتاب کی طرح روشن نظر آتا تھا۔ اسی گاڑی میں ایک رات میں اور رابعہ شہر کی رات کی تنہائی میں سرگرداں رہے تھے۔ وہ رات بھی ماضی کا قصہ بن گئی تھی اور یادوں میں زندہ تھی لیکن وہ گاڑی دوسرا جنم پا کے میرے سامنے آ گئی تھی۔ رابعہ کو بھی یاد تھی۔ اس کو دیکھ کر ایسے اور بہت کچھ یاد آسکتا تھا۔ میں اس کے لیے ایک ویسی ہی ساڑی خرید کر لے جاؤں اور اسے رابعہ کے ساتھ چلے تھا یا آج کی رات بچھڑ کر گزرتے ہوئے وقت کی یادوں کو رابعہ کے حضور پیش کر سکوں۔

"آپ کو یہ ویگن پسند ہے تو اس سے اچھی حالت میں نہیں ملے گی۔" ڈیلر نے میری محویت کو دیکھ کر کہا۔

"جی۔۔۔ ہاں۔۔۔ اس کی قیمت بتایئے۔ سودے بازی نہیں ہوگی۔ بس ایک اور بالکل آخری بات بتایئے۔" میں نے کہا۔

"دیکھیے جناب! یہ ایک خاتون وکیل کی گاڑی ہے۔" ڈیلر بولا۔

"کس خاتون وکیل کی؟" میرا دل ایک دم دھڑکا۔ لاہور میں کئی عورتیں وکالت کر رہی ہیں۔ میں نے خود کو سمجھایا۔

"مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ۔" ڈیلر نے کہا۔ "ان کو سوا ہزار کا فرق ملا ہے مگر ستر میں آپ لے جائیں۔"

یکلخت مجھے یوں لگا جیسے میں خطرے کے حصار میں داخل ہو گیا ہوں۔ وہ ڈیلر بھی یقیناً ایک شکاری تھا یا کسی شکاری کا ایجنٹ تھا۔ یہ کوئی دھوکے کا جال تھا ورنہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ جو گاڑی بم کے دھماکے سے پرزے پرزے ہو گئی ہو وہ اپنی اصل صورت میں نمودار ہو جائے اور اس کے حقوقِ ملکیت، رجسٹریشن نمبر وغیرہ سب وہی رہیں۔ میں نے اپنی بے نیازی کا بھرم برقرار رکھا اور گاڑی کو ہر طرف سے گھوم پھر کر دیکھنے کے بہانے چاروں طرف ایک نظر ڈالی کہ خواستہ میرے آس پاس دشمن چھپے نظر نہ آئیں تو جنگ کے لیے تیار ہو جاؤں۔

"اس کے کتنے اونر تھے پہلے؟" میں نے اپنی جانب کا دروازہ کھول کے اندر جھانکا۔ اندر سیٹ کور تک وہی تھے۔

"یہ فرسٹ اونر کار ہے صاحب۔" ڈیلر بولا۔

"مالک کیوں بیچ رہی ہیں؟" میں نے کہا۔

"انھوں نے جاپانی کار لے لی ہے۔ تو یوٹا کرونا مارک ٹو۔" ڈیلر بولا۔

"آپ تو ایسے ہی... آپ ان سے واقف معلوم ہوتے ہیں؟" میں نے نہ کہا؟ لیکن کون ہیں یہ؟"

"ان سے مل کر آپ کو کیا لینا ہے؟" ڈیلر بولا۔ "گاڑی پسند کیجیے اور لے جایئے۔"

میں مسکرایا۔ "آپ تو کمیشن ایجنٹ ہیں جس کی گاڑی ہے اُسی سے ٹرانسفر لیٹر تو لینا ہی ہو گا۔"

"وہ ہمارے پاس ہے۔ اوپن لیٹر۔" وہ بولا۔ "ہم ان کو رقم ادا کر کے تمام کاغذات لے چکے ہیں۔ آپ کو ٹرانسفر کرا کے دیں گے اپنی قسمت جاری ہے جناب۔"

"وہ میں کرا لوں گا۔" میں نے کہا اور اپنی نظر ہر طرف رکھی۔ شو روم کے آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ "آپ مجھے کاغذات دکھا دیں۔"

ڈیلر اندر گیا اور کاغذات اٹھا لایا۔ یہ اُسی گاڑی کے کاغذات تھے۔ اسی گاڑی کے کاغذات جو رابعہ کے پاس تھی۔ مجھے شامتِ اعمال یہاں لے آئی تھی۔ میں سب سمجھ رہا تھا مگر مجبور تھا۔ میں اس گاڑی کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

"آپ اس کا انجن نمبر اور چیسس نمبر چیک کر لیں۔" ڈیلر نے کہا۔

میں نے انا ڑی پن کا مظاہرہ کیا اور انجن میں نمبر تلاش کرنے کے بہانے اس کے پرزوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ بعد کی گاڑی کے اندر گیئر پر و میانی میں ایک ڈینٹ تھا۔ اس میں نیا کاربوریٹر ڈالا گیا تھا۔ اس کے کوائل پر سفید اسپرے پینٹ تھا۔ جو انجن میرے سامنے تھا اس میں پہچان کی نشانیاں نہیں تھیں لیکن انجن پر نمبر وہی تھا۔ آخری چیز چیسس نمبر تھا۔

"چیسس کا نمبر فاکس ویگن میں پیچھے والی سیٹ کے نیچے ہوتا ہے صاحب۔" ڈیلر نے کہا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کے ڈرائیور کی سیٹ کو آگے جھکایا اور پیچھے والی سیٹ اٹھائی۔ اندر روشنی کم تھی مگر میں نے جعلسازی کے نشانات دیکھ لیے۔ یہ کسی دوسری گاڑی کا چیسس تھا جسے رگڑ کر مٹانے کے بعد اسی جگہ نئے نمبر ٹھپے کیے گئے تھے۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دھماکے سے گاڑی کا چیسس تباہ ہو گیا تھا اور باڈی کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ چیسس اور باڈی دوبارہ نہیں بنائے جا سکتے تھے۔ انجن پیچھے تھا۔ اس کو جزوی نقصان پہنچا۔ انجن کے باہر کے حصے یقیناً تباہ ہو گئے ہوں گے۔ والو ٹنگ، ڈسٹری بیوٹر کیپ اور کوائل، سیلف اور کاربوریٹر وغیرہ۔ لیکن درمیانی حصہ جس میں اسپارک پلگ لگتے ہیں اور نمبر ہوتا ہے محفوظ رہا ہو گا۔ کسی نے اسی حصے کے ساتھ باقی سب پرزے ڈالے۔ باڈی کسی اور گاڑی کی تھی۔ اس کا اصل نمبر مٹا دیا گیا اور رابعہ کی گاڑی کا چیسس نمبر ٹھپ کر دیا گیا۔ کاغذات شاید گاڑی کو تباہ کرنے والوں نے پہلے ہی نکال لیے تھے۔ اب اسی نمبر اور نام سے دوسری گاڑی کھڑی کر دی گئی ہے۔ اس کی نمبر پلیٹ بھی نئی بنوا کے لگا دی گئی ہے اور اب چیکنگ ہو تب بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جعلسازی کہاں ہوئی ہے۔ چیکنگ

www.paksociety.com

میں بھی دیکھنے والے صرف کاغذات دیکھتے ہیں۔ رجسٹریشن، اونر شپ سرٹیفکیٹ، انشورنس، ڈرائیونگ لائسنس، انجن نمبر کون دیکھتا ہے اور گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو باہر نکال کے سیٹ کے نیچے جعلی اور اصلی نمبر کے فرق کو دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

لیکن جو سوال میرے ذہن میں تھا وہ کچھ اور تھا۔ یہ سب کارروائی کس نے کی تھی؟ کسی کباڑیے نے گاڑی کا ڈھانچہ اٹھا لیا اور کسی میکینک کو بیچ دیا۔ نہیں... میکینک کو جعل سازی کر کے ایک ختم ہو جانے والی کار کو پھر زندہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور پھر کباڑیے نے کاغذات کہاں سے حاصل کیے۔ یہ کام تو اسی نے کیا جس نے کاغذات چرا لیے تھے۔

"پولیس صاحب! اشارٹ کروں گاڑی؟" ڈیلر نے میرے تذبذب کو دیکھ کر کہا۔

"کرو!" میں نے سر ہلایا۔

ڈیلر نے چابیاں میری طرف بڑھائیں۔ "آپ ٹرائی لے لیں۔ چکر لگا آئیں۔"

"نہیں، تم چکر لگا کے دکھاؤ۔" میں نے کہا۔ میرے ذہن میں اگنیشن کے ساتھ ہی دھماکا ہونے کا خیال بھی تھا۔ اگر سولا تو اینڈ کمپنی کا ایجنٹ تھا اور یہ چکر انھوں نے چلایا تھا تو سب کچھ ہو سکتا تھا۔

"آپ ساتھ تو بیٹھیں گے۔" ڈیلر نے کہا۔ اس نے فرض کر لیا تھا کہ مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی یا میں خریدنے سے پہلے کسی گاڑی کو ڈرائیو کرنے کا رسک لینے والوں میں نہیں ہوں۔ میرے انکار نے اسے حیران کیا۔

"میں اکیلا گاڑی لے جاؤں اور چلا کے لے آؤں؟" وہ بولا۔ "ایسے آپ کو کیا پتا چلے گا صاحب؟"

"پتا چل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "گاڑی چلے گی تو چلتی ہوئی نظر آئے گی۔ چلتی کا نام گاڑی۔" میرا جواب سخت احمقانہ تھا لیکن میں ڈیلر کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے حیرانی سے سر ہلایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بلا ارادہ میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور چابی نکال کر میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ پھر اس نے اگنیشن سوئچ میں چابی لگائی۔ میں نے ہاتھ سے گاڑی کے کاغذات نیچے گرا دیے اور انھیں اٹھانے کے بہانے نیچے جھکا۔ اس طرح میں کم سے کم چند گاڑیوں کے پیچھے ہو گیا۔ میں ابھی جھکا ہوا ہی تھا کہ میں نے انجن کے گرجنے کی آواز سنی۔ میں نے بے یقینی میں چند سیکنڈ گزارے اور پھر آہستہ آہستہ سیدھا ہو گیا۔ گاڑی قطار سے نکل کر سڑک پر چلی گئی تھی۔ کوئی دھماکا نہ ہونے سے مجھے خفت سی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے ذہن میں مار دھاڑ، قتل اور غارت گری سے بھری ہوئی فلموں کے مناظر تھے۔ جاسوسی ناولوں کے سین تھے اور وہ سب کچھ تھا جو افسانوی لگتا تھا مگر میرے ساتھ ہو چکا تھا۔ گاڑی میری نظروں کے سامنے سڑک پر چلی جا رہی تھی اور میں احمقوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اب بھی مجھے کسی انہونی کے ہونے کی امید تھی۔ ممکن ہے گاڑی کے پہیے نکل جائیں یا اس کے بریک فیل ہو جائیں۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ گاڑی جو میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی کسی ملحقہ اسٹریٹ سے مڑی اور پھر میری آنکھوں کے سامنے سے دوسری جانب کی طرف معتدل رفتار سے گزر گئی۔ ڈیلر نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے ہاتھ ہلایا اور سیدھا گزر گیا۔ چند منٹ بعد وہ واپس اسی طرف سے نمودار ہوا۔ اس نے گاڑی کو میرے سامنے فاتحانہ انداز میں یوں روکا جیسے وہ کسی جہاز کی خلائی پرواز کے بعد کامیاب لوٹا ہے۔ اس نے چابی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔

"اب کیا خیال ہے جناب؟" وہ بولا۔ "لے دن گاڑی ہے۔ اگر آپ میری مانیں..."

"میں نے تمھاری بات مان لی ہے۔" میں نے کہا اور جیب سے دس دس ہزار کی دو گڈیاں نکالیں۔ اس میں سے تین ہزار الگ کیے اور باقی اسے تھما دیے۔ "گن کر اپنی تسلی کر لو اور پھر میرے ساتھ چلو۔"

"میں چلوں؟ کہاں صاحب؟" وہ رقم گنتے ہوئے بولا۔ "رسید تو میں ابھی دے دیتا ہوں۔"

"تم نے کہا تھا کہ رجسٹریشن آفس تک تمھاری ذمے داری ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں کوئی گھپلا ہوگا تو کون ذمے دار ہوگا؟"

"ذمے داری تو ہم لیتے ہیں۔ لیکن میرا کمیشن..."

"تمھاری وکیل صاحبہ کو سولہ کی آفر ملی تھی۔ وہ ان کو ساڑھے چودہ۔ باقی تمھارا کمیشن۔" میں نے کہا۔ "اور اب چلو..."

اس نے رقم اپنے آفس کی تجوری میں بند کی اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھے وہ آدمی بالکل بے ضرر لگا۔ یہ اس کی اداکاری نہیں تھی۔ اسے شاید کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ اگر معلوم تھا تو صرف یہ کہ چیسس نمبر بدلا گیا ہے مگر یہ اس کے لیے پریشانی کی بات نہیں تھی۔ اسے ٹرانسفر کی ساری کارروائی کسی ایجنٹ کو سو روپے دے کر مکمل کرانی تھی۔ چیکنگ کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ میں نے آدھے راستے میں گاڑی روک کر ریوالور نکال لیا۔

"یہ... یہ کیا ہے صاحب؟" اس کی زبان ریوالور دیکھ کر لڑکھڑانے لگی۔

"یہ گاڑی کس کی ہے؟" میں نے کہا۔ "تمھارے پاس کس طرح آئی...؟ سچ سچ بتا دو گے تو چھوڑ دوں گا ورنہ تمھاری لاش پھینک کے نکل جاؤں گا۔"

اس نے بہ آواز بلند کلمہ پڑھا۔ "دیکھیں صاحب! جس نے گاڑی ناظم آباد میں دی اس نے اتنا ہی بتایا تھا۔"

"وہ خاتون ایڈووکیٹ مر چکی ہے۔" میں نے کہا۔ "کاغذات بھی اس کے ہیں، انجن بھی وہی ہے مگر باڈی وہ نہیں ہے۔ چیسس کا نمبر بدل گیا ہے۔ رجسٹریشن، نمبر پلیٹ، اسٹیٹس سب وہی ہیں۔"

وہ بھونچکا رہ گیا۔ "آپ نے... آپ نے دیکھ لیا تھا کہ نمبر بدلا ہوا ہے... قسم خدا کی..."

"قسم مت کھاؤ۔" میں نے ریوالور اس کی پسلیوں میں چبھو دیا۔ "نام بتاؤ اس کا جو یہ گاڑی لایا تھا... میں دس تک گنوں گا۔"

"یا میرے خدا... اب کدھر جاؤں..." وہ بلبلانے لگا۔ "ادریس نے مروا دیا مجھے... صاحب میں اس کو نہیں جانتا... ہاں ایک اور شخص بھی اس کے ساتھ آیا تھا جو اس کو استاد پیڈرو کہہ رہا تھا۔"

"استاد پیڈرو..." میں بری طرح چونکا۔ "تم کو اچھی طرح یاد ہے؟"

"بالکل صاحب... یہ نام ذرا عجیب لگا تھا مجھے... اس نام کی تو ایک انگریزی فلم تھی۔" ڈیلر بولا۔ "اس میں شیخ محمود کے ساتھ بجارہا تھی۔ اسی لیے مجھے یاد رہ گیا۔ انھوں نے کہا تھا کہ پندرہ سو اوپر چاہیں میرے... لیکن انھوں نے کہا تھا کہ خریدار کو ایسا لگے کہ جو ہم کہیں اور جب کوئی اس قسم کا خریدار آ جائے... انھوں نے ایک تصویر دکھائی تھی صاحب... تو ہمیں بتا دینا۔"

"تم ان کو کیسے بتاتے؟" میں نے کہا۔ "وہ اپنا پتا یا فون نمبر چھوڑ گئے تھے؟ مگر پہلے استاد پیڈرو کا حلیہ بتاؤ؟"

ڈیلر نے جو حلیہ بتایا وہ بالکل ٹھیک تھا۔ "وہ ہر شام معلوم کرنے آتے ہیں... یا ان کا فون آ جاتا ہے۔"

میرے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔ شکاری جال پھیلا کر انتظار کر رہے تھے۔ شکار کا پھنس جانا کبھی یقینی نہیں ہوتا لیکن کامیاب شکاری کا صبر اور حوصلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہے تھے۔ انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ ہم باذن گاڑیاں خریدتے ہیں۔ انھیں بدلتے رہتے ہیں اور چھوڑ بھی دیتے ہیں مگر اس سے زیادہ اہم یہ بات تھی کہ وہ لال رنگ کی اس فاکس ویگن سے میری جذباتی وابستگی کو سمجھتے تھے۔ ان کا یہ خیال درست تھا کہ کبھی میں اس گاڑی کے سامنے سے گزروں گا تو میرے قدم خود ہی رک جائیں گے۔ ڈیلر کو انھوں نے جو سمجھایا تھا اس میں کوئی بات غلط یا خطرے کی نہیں تھی کیونکہ کاغذات اصلی تھے اور ان پر واحد اونر کا نام بھی وہی تھا جو اس نے بتایا تھا۔ اس سمجھتے تھے کہ وہ دس ہزار بنا چکا تھا۔ چیسس نمبر کے فرق کو چھپانے اور خریدار کے بارے میں یہ اطلاع دینے کے بعد لکھ کر وہ تصویر دکھا دی تھی۔ باقی کام استاد پیڈرو یا اس کے ساتھی کر سکتے تھے۔ وہ موٹر رجسٹریشن آفس سے معلوم کر سکتے تھے کہ گاڑی کس کے نام ٹرانسفر ہوئی ہے مگر اس میں غلط نام اور پتے کے اندراج کا امکان تھا۔ انھوں نے کچھ اور سوچا ہوگا۔ گاڑی کے صحیح آدمی کے ہاتھ فروخت ہونے کی اطلاع پاتے ہی وہ ایک طرف پورے شہر میں اپنے جاسوس چیلوں کو ہوشیار کر دیتے تو دوسری طرف پولیس کو اطلاع کر دیتے کہ ان کا مجرم بڑی شان سے اس نمبر کی لال فاکس ویگن میں گھوم رہا ہے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر میں پکڑا جاتا یا مارا جاتا۔

"دو ہزار تم کو مبارک ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن دو ہزار سے زیادہ زندگی ہے جو میں تمھیں بخش رہا ہوں، صرف ایک شرط پر... تم استاد پیڈرو کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

"مگر وہ پوچھیں گے کہ گاڑی کہاں گئی۔"

"کہنا کہ تم نے منظوری کے چوہدری نعمت اللہ نامی ایک پیسے والے ٹیکنیکل آدمی نے خریدی ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا سمجھے؟"

ڈیلر نے لفظ بہ لفظ دوہرا دیا جو میں نے کہا تھا۔

"شاباش! اگر تم نے ذرا بھی غلط بیانی کی تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اور پھر تمھیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ تم نے دو ہزار میں بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کر لیا۔ استاد پیڈرو نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ گاڑی کسی اور کو نہیں بیچنی ہے؟"

"نہیں جی... یہ تو نہیں کہا تھا۔" ڈیلر نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"پھر تمھارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس یہ ہرگز مت کہنا کہ گاڑی اسی نے لی ہے جس کی تصویر تھی۔ اس کے علاوہ تم جو چاہو کہہ دو... کوئی بھی نام بتا دو اور جو حلیہ چاہو بیان کر دو مجھے فرق نہیں پڑتا۔ مجھے منظوری، ماڈل ٹاؤن یا اسٹیٹ آباد کا بتانا چاہو تو مجھے اعتراض نہیں لیکن میرا اصل حلیہ بتایا یا اس گفتگو کا حوالہ دیا جو اس وقت ہو رہی ہے تو پھر وہی ہوگا جو ابھی میں نے کہا۔ تم شریف آدمی ہو۔ لالچ میں یہ بھول گئے تھے کہ بڑے بدمعاشوں کی جنگ بھی ہو سکتی ہے۔ ہاتھی لڑتے ہیں تو حشرات الارض پس جاتے ہیں۔ تم اپنے دو ہزار رکھو اور خدا کا شکر ادا کرو کہ سچ بول کے بچ گئے۔"

"جھوٹ بول کر جناب..." وہ بولا۔

"جھوٹ تو اب بولو گے... ابھی تک تو نہیں بولا ہے۔" میں نے کہا اور اس کو دو ہزار روپے پکڑا دیے۔ "یہ میری طرف سے۔ میں بھی تم سے جو کام لے رہا ہوں اس کا معاوضہ ادا کر رہا ہوں۔"

www.paksociety.com

کام میری مرضی کے مطابق نہ ہوا تو صرف ایک پیپر نہیں لوں گا۔ تمہاری جان... اب اتر جاؤ اور چلتے بنو۔"

وہ نیچے اترا اور واپس چل پڑا۔ اس کی چال دیکھ کر مجھے ہنسی بھی آئی اور یہ یقین بھی آیا کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ نہیں بولے گا۔ وہ حد سے زیادہ دہشت زدہ تھا۔ وہ کبھی نہیں کہے گا کہ گاڑی وہی شخص لے گیا ہے جس کی تصویر دکھائی گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ استاد پیڈرو بھی اس کے سینے پر ریوالور رکھ دے اور اسے سچ بولنے پر مجبور کر دے۔ تب فیصلہ اور انتخاب تو کرنا ہی پڑے گا کہ کس کے ہاتھوں مارا جائے۔ جو سمجھدار ہو گا تو وہ استاد کے بدمعاشوں سے نمٹنے کا بندوبست پہلے سے کرے گا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچا۔

اس گاڑی کو لے کر پھرنے میں خطرہ تھا مگر فوری نہیں۔ میں نے یہ اکیس ہزار روپے کا جوا کھیلا تھا۔ صرف اس امید پر کہ شاید اس گاڑی میں بیٹھ کر ساتھ جانے سے رابعہ کا ذہن اپنے ماضی کے مانوس راستوں کو اور آشناؤں کو پہچان لے۔ یہ مقصد حاصل ہو جاتا تو میں سمجھتا کہ اکیس ہزار کی بازی میں نے جیت لی۔ رابعہ کی ایک پرانی محبت بھری مسکراہٹ پر ایسے اکیس ہزار تو میں اکیس ہزار بار قربان کر سکتا تھا۔ اگر میں اپنے مقصد میں ناکام رہا تو میں کیا کروں گا، یہ میں نے ابھی طے نہیں کیا تھا۔ شاید میں گاڑی کو ایک ٹائم بم کے ساتھ چوہدری وزیر کے دروازے پر چھوڑ آؤں گا اور دھماکا ہو گا تو وہ خود ہی پیڈرو کے انجام کو سمجھ لے گا۔ پھر شکل میں وہ کار ٹریس کرے گا جو مجھے سیلز مین نے بیچی تھی۔ استاد پیڈرو اسے جھوٹ بولنے کی سزا دے گا۔ اس نے خود سے ٹھیک ٹھاک فرہاد کی نقل کر لی کہ مر جاؤں۔ اب وہ سچ بھی نہ بولے اور جھوٹ بھی نہ بولے تو پھر کیا بولے۔ بہتر ہے کہ وہ کچھ نہ بولے اور اپنا بوریا بستر سمیٹ کر گول ہو جائے۔ کسی دوسرے شہر میں چلا جائے لیکن کچھ عرصہ روپوش رہنے کے بعد۔

ہر گاڑی اپنی مخصوص پہچان رکھتی ہے اور جو اسے چلاتا ہے وہ گاڑی کی عادتوں کو جانتا ہے۔ گاڑی کی پک اپ کیسی ہے۔ بریک کس حد تک کاٹتے ہیں اور کتنی رفتار پر گاڑی کم سے کم کتنے فاصلے پر رک سکتی ہے۔ کلچ کو کتنا دبانا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ انجن یا باڈی کے کس حصے سے کوئی مخصوص آواز آتی ہے تو کیوں آتی ہے۔ جو گاڑی ایک ہی ہاتھ پر رہے اس کے مالک کے کان معمولی سی نئی آواز پر خود بخود کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رابعہ کی گاڑی بھی اتنا عرصہ میرے پاس رہی تھی کہ میں اس کی چال پہچانتا تھا اور اس کے انجن کی آواز کو سمجھتا تھا۔ اس گاڑی کو چلاتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے یہ گاڑی دھوکے باز ہے۔ اس نے میک اپ سے رابعہ کی پرانی فاکس ویگن کی صورت بنا لی ہے لیکن جیسے کوئی ایکٹریس ماہر ترین میک اپ کے ہاتھوں رابعہ کی شکل و صورت اختیار کر کے اسی کے لہجے میں بات کرے اور اسی کے انداز و اطوار اپنا کر بھی رابعہ نہیں بن سکتی تھی ایسے ہی یہ گاڑی ظاہری شباہت سے مجھے دھوکا دینے میں ناکام تھی۔ تاہم یہ گاڑی اسی طرح اس کام آ سکتی تھی جس طرح کوئی ایکٹریس کسی رول میں اپنا کردار نبھاتی ہے۔ فلم بنانے والے اور دیکھنے والے سب ہی جانتے ہیں کہ یہی ایکٹریس جو دیہاتی لڑکی کا کردار کر رہی ہے فلاں فلم میں کلب ڈانسر بنی تھی مگر وہ فلم فلموں کو کہانی دیکھنے والوں کے ذہن ظاہری حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہانی اور فلم کے تاثر کو قبول کرتے ہیں۔ مجھے امید تھی کہ رابعہ پر اس گزشتہ رفیق اور یادگار ہمسفر کو پھر دیکھنے سے خوشگوار نتائج برآمد ہوں گے۔

ڈاکٹر لطیف کے گھر جاتے ہوئے مجھے استاد پیڈرو پر ہاتھ ڈالنے کے اس موقع کے ضائع ہو جانے کا خیال بھی تھا۔ لیکن میں کر سکتا تھا کہ میں کار ڈیلر کو صرف پانچ ہزار کا بیعانہ ادا کر کے اور اس سے کہتا کہ باقی رقم میں شام تک ادا کروں گا۔ تمام دن یا رات کو۔ اس کی اطلاع پاتے ہی استاد پیڈرو یا اس کا کوئی گرگا، غلام اپنی شکاری فوج کے ساتھ ضرور موجود ہوتا۔ میں جان پر کھیل کر استاد پیڈرو کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش ضرور کر سکتا تھا مگر ایسی کوشش میں میری کامیابی کے امکانات بہت کم تھے۔ میرے ساتھ غالب اور محسن یا نیک محمد کے سوا کون جا سکتا تھا اور وہ دوستی میں جان کی بازی لگانے سے گھبرانے والے لوگ نہیں تھے مگر مقابلے میں کوئی بھی مارا جاتا تو مجھے پیڈرو کی گرفتاری مہنگی پڑتی۔ میں ان میں سے کسی کے کم ہونے کا رسک لے ہی نہیں سکتا تھا۔ محسن تو ایک نئی دلہن کے لیے مانگ کی افشاں تھا، ہاتھوں کی حنا، کاجل مہندی کا رنگ چڑھنے سے قبل ہی اس کو بیوگی عطا کرنے کا گناہ بڑا ہوتا کہ میں تمام عمر خود کو بدترین سزا دے کر بھی مطمئن نہ ہوتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیڈرو کے ساتھ پولیس بھی محاصرہ کر لیتی اور ہم مقابلے کے بغیر گرفتار ہو جاتے۔ بے شک مجھے پیڈرو سے ہر قتل کا اعتراف جرم کرانا تھا جن میں سب سے پہلا قتل میرے باپ وزیر خان کا تھا اور اس سے پوچھنا تھا کہ وزیر خان کو اس نے مرنے کے بعد دفن سے کیوں محروم کیا تھا اور پھر اس کی نعش کو زمین کے کس گمنام گوشے میں چھپایا تھا لیکن اپنے ساتھ دوستوں کی زندگی خطرے میں ڈال کر یہ کام کرنا ہرگز عقلمندی نہ کہلاتا۔ زندہ صحبت باقی۔ کبھی نہ کبھی میں شکاری بن کے اس کو ضرور اسیر کروں گا کہ اس کی زبان خود اپنے ہر گناہ کا اقرار کرے گی اور لمبے ساعت ترقی جاتے ہوں گے۔ میرا یقین ابھی سلامت تھا کہ وہ دن ضرور آئے گا۔

ابھی پیڈرو کی گرفتاری سے زیادہ اہم رابعہ کی آزادی تھی۔ وہ فراموشی کے زندان میں قید تنہائی کاٹ رہی تھی جہاں نہ امید تھی نہ انتظار تھا، نہ خیال ماضی و حال تھا نہ احساس ہجر و وصال تھا۔ نہ خوشی نہ غم کا سوال تھا اور نہ اپنے آپ پر ملال تھا۔ اس کو پھر سے درمیان لانا تھا اور اس کے احساس کو زندہ کرنا تھا کہ جانے پہچانے میرے اور اس کے درمیان کوئی تعلق تھا۔ نہ وقت کے فاصلے تھے اور نہ احساس کے بے جوڑ تقاضے نہ ہوں گے۔

ڈاکٹر لطیف کے گھر جانے سے پہلے میں نے گاڑی کو لاہور کی سڑکوں پر گزرتی ہوئی ٹریفک میں شامل کر دیا۔ اور خود بدل گیا۔ میرے چہرے میں قدرتی تبدیلی اتنی زیادہ آ چکی تھی کہ میں خود کو نیا محسوس کرتا تھا۔ خوف اب بھی تھا کہ کسی کی خوردبینی نظر نے مجھے غور سے دیکھا تو پہچان جائے گی مگر انارکلی کی گہما گہمی میں کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ سب اپنے کام اور اپنے دھیان میں گزرتے جاتے تھے اور جو ٹھہر کر دیکھتے تھے انہیں صرف آنکھ دیکھتی تھی، بے حس دماغ کے کمپیوٹر تک جواب ہی نہیں تھا۔ انارکلی کی بھیڑ میں کھو جانا اور کسی شناسا صورت کو تلاش کرنا ایک الگ بات تھی اور انارکلی سے گزر جانا ایک الگ عمل تھا۔ میں بھی کسی طرف دیکھے بغیر چلتا گیا۔ بانو بازار اور اس کے آس پاس ساڑیوں کی دکانیں چھان لینے کے بعد میں مایوس ہونے لگا تھا۔ میری پسند پر پورا اترنے والی ایسی ساڑی نایاب تھی جس کی گہری نیلی زمین پر شوخ زرد رنگ کے پھول بنے ہوئے تھے۔ ایسا گزشتہ بار بھی ہوا تھا اور ایک مرتبہ پھر آخری دکان پر مجھے ساڑی مل گئی۔ یہ بالکل ویسی ہی ساڑی تھی جیسی میں پہلے لے جا چکا تھا۔

"آپ تو پہلے بھی ایسی ساڑی تلاش کرتے ہوئے آئے تھے!" دکاندار نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔

"اچھا... میں... مجھے یاد نہیں تھا کہ یہی وہ دکان ہے..." میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ اس نے یقیناً مجھے خبطی سمجھا ہو گا۔ ایک ہی عورت کے لیے دوسری بار ویسی ہی ساڑی لے جانا ظاہر ہے عورت کو ایک ہی قسم کی ساڑی پیش کرنے کے تجربے کا شکار تھا۔

"ایسی کچھ ساڑیاں بنی تھیں، یہ آخری ہے۔" وہ ساڑی کو پیک کرتے ہوئے مسکرایا۔

"گویا آئندہ... خیر... مسئلہ یہ ہے کہ مجھے ایک بلاؤز بھی سلوانا ہے۔" میں نے سر کھجا کے کہا۔

"بلاؤز کا کپڑا اسی میں شامل ہے۔" دکاندار نے مجھے سمجھایا۔ "انگلی بھی کہتے ہیں۔ آپ پیمائش لا دیں۔ کوئی دوسرا بلاؤز ناپ کا بھیج دیں۔"

لاحول ولا قوۃ۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ تو نیا چکر ہے۔ اب مجھے گھر جانا ہو گا اور رابعہ کے سامان میں سے پیمائش کے لیے بلاؤز لا کر دینا پڑے گا۔ پھر یہ ٹیلرنگ بھی آناً فاناً تو نہیں ہو جائے گی۔ میں نے اپنی مشکل کا ذکر کیا تو دکاندار نے میری ناتجربہ کاری کو معاف کرتے ہوئے بتایا کہ بلاؤز بنے بنائے بھی مل جاتے ہیں بیشتر ٹیلر رنگ میچ کر جاتے ہیں۔ میرا یہ مسئلہ ایک اور دکاندار نے حل کیا جو اس معاملے میں مجھ سے زیادہ سمجھدار تھا۔ جب میں بلاؤز لے کر نکلا تو اس نے مجھے یاد دلایا کہ اس کے ساتھ ایک چیز اور ہوتی ہے جو پیٹی کوٹ کہلاتی ہے۔ اس نے میری گھبراہٹ پر مسکراتے ہوئے پیٹی کوٹ بھی نکالا اور میں نے دکان سے باہر آ کر اطمینان کا گہرا سانس لیا کہ بالآخر معرکہ سر کر لیا۔ حالانکہ اس سے پہلے میرا خیال صرف اصل معرکے کی طرف تھا جو مجھے ابھی سر کرنا تھا۔

تمام پانچ بجے میں گاڑی کو ڈاکٹر لطیف کی کوٹھی کے اندر لے گیا تو موتی بھونکتا ہوا دوڑا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا کیونکہ اب میں محفوظ تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ فاکس ویگن کو کاٹ سکتا تھا مگر اس نے یہ حماقت نہیں کی اور واپس لوٹ گیا۔ السیشن نسل کے کتے قد میں اونچے اور صحت مند ہوتے ہی ہیں۔ موتی کچھ زیادہ ہی بڑا تھا چنانچہ اس کا نام واقعی مضحکہ خیز لگتا تھا۔ اندر سے بچہ دوڑتا نکلا اور اس نے موتی کو ڈانٹا۔ پھر وہ مجھے سرخ رنگ کی گاڑی سے نکلتا دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے گاڑی کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔

"انکل! میں نے گاڑی لی تو فاکس ویگن ہی لوں گا۔" اس نے مجھے مطلع کیا۔ "اور وہ بھی سرخ رنگ کی... بالکل ایسی ہی۔"

"بس تو پھر ٹھیک کام ہی دیکھو!" میں نے کہا۔ "ابھی لے لو۔"

"ابھی... ابھی تو مشکل ہے۔" وہ سوچ کر بولا۔ "اور یہ تو آپ کی ہے۔"

"میری؟" میں نے کہا "یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟"

"وہ جو تمہارے گھر میں رابعہ آنٹی ہیں نا... یہ ان کی ہے۔"

"میں سمجھ گیا کہ آج بھی وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میرے پاس ایک لال رنگ کی فاکس ویگن تھی۔ نہ جانے کہاں گئی۔"

"اچھا؟ اور کیا کہہ رہی تھیں؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"اور... اور یہ پوچھ رہی تھیں کہ کیا آج سکندر صاحب آئیں گے۔ میں نے کہا کہ میں تو کسی سکندر کو نہیں جانتا۔ سوائے سکندر اعظم کے۔ وہ ہنسنے لگیں۔ میں حیران رہ گیا کیونکہ میں تو سمجھتا تھا کہ انہیں ہنسی آتی ہی نہیں۔" وہ بولا۔ "ہنستی ہوئی وہ بہت اچھی لگتی ہیں۔"

www.paksociety.com

میں نے اپنے جذبے کو دو چند محسوس کیا اور اندر گیا تو مجھے مسز لطیف نظر آئیں۔

"یہ بہت باتونی لڑکا ہے۔" انھوں نے میرے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔ "بالکل باپ پر گیا ہے۔"

"جی... یہ بھی بہت اعتماد کے ساتھ بات کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتائیے رابعہ کیسی ہے؟"

"بہت بہتر جب سے وہ یہاں آئی ہے میں نے پہلی بار خوش دیکھا ہے۔" وہ مسکرائیں۔ "اور اس خوشگوار تبدیلی کے ذمے دار تم ہو۔"

"میں آج ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ تو ابھی کلینک سے نہیں لوٹے۔ رابعہ سے ملنا ہے تو ان سے اجازت لینی ضروری نہیں۔" مسز لطیف نے کہا۔ "تجربہ کیسا ہے؟"

"وہ... میں رابعہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کے لیے میں کچھ کپڑے لایا تھا۔ ان کپڑوں سے اس کی کچھ یادیں وابستہ ہیں... اُسے بہت سی باتیں یاد آ سکتی ہیں... اور میں اس کی گاڑی بھی لایا ہوں... جو اس کی نہیں ہے۔"

"تم کچھ کنفیوز ہو رہے ہو۔" مسز لطیف نے ہنس کر کہا۔ "جاؤ، اگر وہ جانا چاہے تو لے جاؤ... ہمارے ساتھ تو کہیں جاتی نہیں۔"

میں نے اوپر پہنچ کر دروازے پر دستک دی اور رابعہ کی آواز سن کر اندر داخل ہو گیا۔

"سکندر صاحب!" وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ "معلوم نہیں کیوں اس وقت مجھے آپ کا خیال آیا تھا۔"

"کیا تم میرا انتظار کر رہی تھیں رابعہ؟" میں نے دلی مسرت کو چھپا کے کہا۔

"انتظار نہیں... میرا مطلب ہے ہاں..." وہ بولی۔ "آپ نے کہا تھا نا کہ میں پھر آؤں گا۔"

"ہاں... اور دیکھو میں آ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں ایک تحفہ بھی لایا ہوں تمھارے لیے۔"

اس کی مشتاق سوالیہ نظریں اٹھیں اور میں نے ساری کو اس کے سامنے پھیلا دیا۔ "اسے پہچانتی ہو؟"

اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ "یہ... یہ تمھیں کہاں سے ملی... یہ تو... ہاں... میں اسے پہچانتی ہوں۔"

"یہ تمھاری ساری ہے نا؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"ہاں... مگر یہ تمھارے پاس... تم میری چیز مجھے ہی تحفے میں دینے کے لیے لائے ہو؟" وہ بولی۔

"تمھیں یاد نہیں ہے رابعہ... یہ وہی ساری ہے مگر میرے پاس محفوظ تھی۔ تم اسے میرے پاس چھوڑ آئی تھیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا... اسی لیے تو میں حیران تھی۔" وہ مطمئن ہو گئی۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم یہ ساری باندھ لو۔" میں نے کہا۔ "میں تمھیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"کہاں...؟" وہ بولی۔ "اچھا تم بیٹھو... میں تیار ہو جاؤں۔"

اس نے میرے جواب سے پہلے کہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا لہجہ اور اس کا چہرہ اب پہلے کی طرح جذبات سے عاری اور سپاٹ نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی امنگوں اور مسرتوں کے جاگتے خوابوں کا رنگ اتر آیا ہے اور اس کے رخسار دہکتے تھے۔ آرام اور علاج کے ساتھ صحیح دیکھ بھال نے اس کو صحت کی شادابی اور رعنائی تو عطا کر دی تھی لیکن وہ کچھ بجھی بجھی سی تھی۔ خوشی کے احساس کی روشنی پھیلی تو مجھے لگا جیسے تاب میں نہ تھا۔ رابعہ کو کھلکھلاتے دیکھ کر میرے سحر خیالوں کو امید کے پر لگ گئے تھے۔ اور میں خود کو اس خلا نورد کی طرح محسوس کر رہا تھا جو چاند کی سطح پر اترنے والا ہو... میرے خوابوں کی مسافت سیکڑوں صدیوں پر پھیلی ہوئی تھی لیکن بالآخر میرے تصور کو حقیقت کی منزل تک پہنچانے والا لمحہ آیا تھا۔ میں اس لمحے کی سرگوشی سن سکتا تھا جو کامیابی کا نقیب تھا۔ یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم... محبت فاتح عالم... ہاں ہاں... محبت فاتح عالم... جیسے غالباً ٹی وی پر قوال پڑھتے زور شور سے گا رہے تھے... محبت فاتح عالم...

رابعہ شگفتہ نمودار ہوئی۔ میں نے خود کو ایک نخلستان میں دیکھا جہاں اس کے وجود نے پتھر کی دیواروں اور آہنی سلاخوں میں امیدوں کے گلشن کھلا دیے تھے۔ وفا کی خوشبو کا جھونکا... محبت کی چاندنی کی اولین کرن اور چاہت کا پہلا تعارف کروا چکی احساس پر چھا گئی تھی۔ پھر وقت بدل گیا۔ میں نے اسے ایک رات اپنے بہت قریب پایا۔ اس رات شہر کی سڑکوں کا راز داں اندھیرا ہم آوارگان کو نہ جانے کہاں کہاں لے گیا تھا۔ مال سے شہر جہانگیر کی ملکی محلوں تک۔ اس شب کے دامن میں عہد وفا کے لمحے خوابیدہ تھے۔ اس رات بھی رابعہ کا یہی نیلے آسمان کا تاروں بھرا پیرہن تھا۔ پھر تیسری بار میں نے خواہشوں کی بے تابی سے مجبور ہو کے اسے کہا تھا کہ چلو رابعہ... آج پھر اسی مہرباں رات سے ملنے چلتے ہیں۔ ہم تلخی آلام اور تلخی ایام سے بھاگ کر صرف ایک شب کے سہانے بادلوں کے سائے میں پناہ لیتے ہیں مگر اس رات وہ مجبوراً انتظار کرتی رہی تھی اور شکاری مجھے اغوا کر کے لے گئے۔ یہ چوتھی بار تھی کہ میں نے یادِ ماضی کے خوب صورت جزیرے کی طرف لوٹ جانے کا اہتمام کیا تھا جہاں میرے اور رابعہ کے خوابوں کی حسین دنیا آباد تھی۔ مجھے دیوانہ کر دیا تھا غم روزگار نے اور رابعہ وحشت تنہائی میں بھٹک رہی تھی لیکن میں چاہتا تھا کہ ہم دونوں

ایک ساتھ ان منزلوں کے نشان تلاش کریں جو گلشن حیات میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" رابعہ کے سوال نے مجھے چونکا دیا اور مجھے احساس ہوا کہ نہ جانے کتنی دیر سے میں اس پیکر رعنائی کے نظارے میں گم تھا جس کی پہلی جھلک نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا۔ جانے اس کے عارض میں شفق کے اجالے کی روشنی اتر آئی تھی۔

"تمھیں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور جی چاہتا ہے تم اسی طرح کھڑی رہو اور تمھیں ایسے ہی دیکھتا رہوں... تمام عمر..."

وہ ہنس پڑی۔ "لیکن تم نے تو کہیں باہر چلنے کو کہا تھا۔"

"ہاں... ہاں... آؤ چلتے ہیں۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ وہ آگے تھی اور میں پیچھے تھا چنانچہ میری نظر نے ڈاکٹر لطیف کی آنکھوں میں کامیابی کی پیشگی موصول ہونے والی مبارک باد دیکھی اور ان کو دونوں انگلیوں سے کامیابی کا نشان بنا کے دکھایا۔ ان کی بیگم بھی پیچھے کے پاس آئیں اور وہ رابعہ کو دیکھ کر حیران ہو گئیں۔

"کدھر کے ارادے ہیں بھئی؟" ڈاکٹر لطیف نے خوش مزاجی سے پوچھا اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "تیاری تو بڑے زوروں کی ہے۔"

"دیکھو بھئی نظر مت لگا دینا میری بچی کو۔" ان کی بیوی نے رابعہ کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ "خدا تم دونوں کی خوشیوں کو سلامت رکھے۔"

اس دعا میں جتنی بے غرضی تھی اور جتنا خلوص تھا، جتنا پیار تھا اور جتنی ممتا تھی اس نے مجھے جذباتی کر دیا۔ صرف میری اپنی ماں ہی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے یہ دعا مانگ سکتی تھی۔ مگر اس ماں کا میرے ذہن میں کوئی تصور نہ تھا۔ بے نگاہ شفقت کا ایک لمحہ میں نے تو زینہ کی ماں یعنی محسن کی مرحومہ والدہ کی محبت میں دیکھا تھا لیکن ایک وقت ایسا آیا تھا جب ان کا دل بھی مجھ سے بدظن ہو گیا تھا۔ تھوڑی سی شفقت مجھے بیگم رضوی نے بھی دی تھی لیکن جب میں قانون کا مجرم بن گیا تو انھوں نے اپنے فرض شناس پولیس افسر شوہر کا ساتھ دیا اور مجھے فراموش کر دیا۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کسی نے مجھ سے میرا ماضی اور حال نہیں پوچھا تھا۔ اس سے سروکار نہیں رکھا تھا کہ قانون کی نظر میں میری حیثیت کیا ہے اور رابعہ سے میرے تعلق کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ شریف النفس اور بے غرض محبت کرنے والے صاف دل لوگ تھے۔ خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی لیکن وہ صرف جسم کے روگ دور نہیں کرتے تھے۔ وہ دلوں کے زخموں پر بھی مرہم رکھتے تھے اور خوشیوں سے محروم ہو جانے والے تنہا انسانوں کی جدوجہد میں بھی ان کا ساتھ دیتے تھے۔ وہ صرف دوا سے نہیں، اپنے پیار سے بھی علاج کرتے تھے۔ ان کی رفاقت اور مفاہمت تھی۔ وہ انسانوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے تھے۔ میرا انجانا ان کے لیے ایک مریضہ تھی جس کی صحت یابی ان کا مشن تھی۔ ان کے لیے حقیقی مسرت کا سرچشمہ یہی احساس تھا کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوں۔ ان کی کوشش سے جب اپنا خوشی کی تعبیر مل جائے تو یہی کامیابی ان کا انعام تھی۔ وہ اس معاملے میں کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے کہ دنیا مجھے کیا سمجھتی ہے یا کیا کہتی ہے۔ ان کی نظر نے مجھے پہچان لیا تھا اور ان کے لیے اتنا اطمینان کافی تھا۔ شاید وہ اپنے دوسرے مریضوں کے ساتھ بھی ایسے ہی حسن سلوک سے کام لیتے تھے۔

"اب جاؤ بھئی..." ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "کیا روایتی انداز میں ہم سے اجازت ملنے کے انتظار میں کھڑے ہو؟"

میں شرمندہ ہو گیا۔ "آپ کی عنایات کے بعد کیا مجھے معاوضے کے اتنے مظاہرے کی اجازت بھی نہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"تم تو ایسے رخصت ہو رہے ہو جیسے واپس آنے کا ارادہ ہی نہیں۔" بیگم لطیف نے کہا۔

"ہو سکتا ہے رابعہ واپس نہ آئے۔ یہ دونوں اپنے گھر چلے جائیں گے۔" ڈاکٹر لطیف نے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

"تم چاہتے ہو کہ یہ واپس نہ آئیں؟" بیگم لطیف نے خفگی سے کہا۔ "رابعہ کو نکالنا چاہتے ہو؟"

"نہیں، میرا مطلب کچھ اور تھا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "میں تو چاہتا ہوں کہ ایک مریض کی حیثیت سے رابعہ ڈسچارج ہو جائے۔ بعد میں جب یہ آئیں گے تو اس طرح نہیں آئیں گے۔"

"اور جس طرح یہ آئیں گے اس سے آپ زیادہ خوش ہوں گی۔" میں نے کہا اور رابعہ کو لے کر باہر نکل گیا۔

رابعہ نے اپنی گاڑی کو دیکھا اور ٹھٹک کر رک گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں الجھن دیکھی۔ "یہ... یہ وہی گاڑی ہے سکندر؟" رابعہ نے کہا۔

"ہاں! تمھیں شک کیوں ہے؟" میں نے دروازہ کھولا اور وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

"کیا تم بھی مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو؟" رابعہ نے اچانک کہا۔ "وہ گاڑی... وہ تو شاید... کیا ہوا تھا اسے... وہ چوری ہو گئی تھی شاید... نہیں... آگ لگ گئی تھی اس میں..."

میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور ریورس میں باہر لے گیا۔ رابعہ کی یادداشت جاگ رہی تھی۔ اس کے لاشعور کے دریچے وا ہونے لگے تھے اور یادوں کی دستک سے اس کا شعور بیدار ہو رہا تھا۔ وہ ونڈ اسکرین سے باہر خلا میں دیکھ رہی تھی۔

"تم بتاتے کیوں نہیں..." وہ اچانک میری طرف پلٹی۔ "کیا ہوا تھا میری گاڑی کو... یہ گاڑی میری نہیں ہے۔"

www.paksociety.com

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔" میں نے کہا اور گلوو کمپارٹمنٹ میں سے کاغذات نکال کے اُسے تھما دیے۔ "کیا یہ کاغذات ثابت نہیں کرتے کہ گاڑی تمھاری ہے۔"

اس نے کاغذات میرے ہاتھ سے لے کر دیکھے اور اس کی الجھن بڑھ گئی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ پیشانی پر رکھ لیا... وہ سوچ کی لہروں کے ساتھ بہنے لگی تھی۔ سمندر کی موجوں کی طرح جو ہوا کے ساتھ آتی ہیں اور اپنے مدوجزر میں تموج پیدا کرنے کے بعد پھر ساحل کی طرف اچھال دیتی ہیں۔

"یہ مال روڈ ہے نا؟" وہ باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا تم شملہ پہاڑی کی طرف جا رہے ہو؟ یا باغ جناح میں؟"

"ابھی میں نے طے نہیں کیا تھا۔" میں نے انجان بن کے کہا۔ "تم کہاں جانا پسند کرو گی؟"

"وہیں... جہاں ایک بار میں اور تم گئے تھے۔" وہ بے خیالی میں بولی۔ "اس رات پورا چاند تھا۔"

میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں رابعہ...!"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے؟" اس کے لہجے میں دکھ تھا۔

صورت حال خلاف توقع بہت تیزی سے معمول پر آنے لگی تھی۔ میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ اس کے وجود میں پیدا ہونے والے انقلاب نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پرانی رابعہ نئی رابعہ پر حاوی آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کشمکش کا انجام بہتر نہ ہو۔

"میں تمھیں کہیں چھوڑ کر نہیں گیا تھا رابعہ۔" میں نے کہا۔ "میں محسن کے ساتھ گیا تھا... اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا نا۔"

"انکل شیروانی کا؟" وہ ایک دم بولی۔ یادوں کا ایک اور دریچہ کھل گیا تھا۔ "کب؟"

"ایک ہفتہ ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "محسن اور شعلہ کی شادی ہو گئی ہے۔"

یہ بہت بڑا شاک تھا اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ "ان کی شادی ہو گئی... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔" میں نے نارمل رہتے ہوئے کہا۔ "محسن مجبور تھا وہ شعلہ کو کہاں چھوڑتا... اُسے وہ ساتھ ہی لے آیا۔"

رابعہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "یہ مجھے کیا ہو گیا ہے سکندر... مجھے یہ سب کیوں معلوم نہیں...؟"

"اب تو معلوم ہو گیا ہے نا...؟" میں نے کہا اور گاڑی کو باغ جناح میں روک لیا۔ "آؤ اوپر چلیں۔"

"نہیں... نہیں سکندر... مجھے شعلہ اور محسن کے گھر لے چلو۔ وہ کہاں رہتے ہیں؟" رابعہ نے میرا بازو تھام کے کہا۔

"ان کے گھر ہم کل چلیں گے۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے کہا تھا کہ ہم سب کی دعوت کریں گے... میری تمھاری... استاد ٹیڈی اور مرزا غالب کی۔"

"یہ... استاد ٹیڈی... اور مرزا غالب..." وہ چلتے چلتے رک گئی۔ "یہ مجھے دیکھنے کیوں نہیں آئے سکندر... میں بیمار تھی اور اسپتال میں پڑی تھی۔"

"نازو بھی تو اسپتال میں پڑی ہے۔" میں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ "کیا تمھیں معلوم ہے؟"

"نازو...؟" رابعہ نے ایک چیخ ماری۔ "کیا ہوا ہے اُسے... ہاں... اُسے گولی لگی تھی... کیسے لگی تھی اسے گولی؟"

"تمھیں یاد نہیں؟" میں پہاڑی پر سبزہ درختوں اور پھولوں سے گھرے ہوئے کنج کے درمیان لگی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا۔

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی تھیں اور میں سمجھ رہا تھا کہ وہ گرد و پیش سے بے خبر ہے۔ اس کا ذہن ماضی کے الجھے ہوئے راستوں سے نکلنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ وہ بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی مگر اسی امید کے ساتھ کہ بالآخر وہ بند راستوں سے لوٹ کے کسی دوسرے راستے سے باہر جانے کی راہ لے گی۔

"تمھیں گاسے ماچھی کی جعلی خانقاہ سے نازو کے ساتھ اغوا کیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ تمھیں ایک بہت بڑی سیاہ گاڑی میں ڈال کر لے گئے تھے۔"

"وہ کون؟" رابعہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "کون گاما ماچھی؟"

"وہ جو چوہدری دلاور کا ایجنٹ تھا... وہ مارا جا چکا ہے۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "مجھے وہ... گاڑی تو یاد ہے لمبی سی کالے رنگ کی گاڑی تھی... مگر اور کچھ نہیں..."

"اچھا... آؤ میرے ساتھ چلو۔" میں نے مایوس ہونے سے پہلے ہر کوشش کر دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ "میں تمھیں وہاں لے چلتا ہوں۔"

رابعہ چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کا ذہن پھر لاپروائی اختیار کر گیا ہے۔ وہ ایک وقت میں جتنا اپنی یادداشت کی گہرائی میں جا سکتی تھی جا چکی تھی۔ اس سے زیادہ فی الحال ممکن نہیں تھا۔ وہ جدوجہد کرتے کرتے تھک گئی تھی اور اس کے اعصاب ذہنی کشمکش کا دباؤ اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ شاید اسے تھوڑا سا وقفہ دینے کی ضرورت تھی کہ وہ پھر اُسے یاد آئے؟

سی لے جانے میں اُلجھی ہے۔ اس کے لیے ایک جست میں حال اور ماضی کے درمیان حائل خلیج کو عبور کرنا محال تھا... وہ ٹوٹے پھوٹے قدموں سے اٹکتی ہوئی آگے بڑھتی تھی اور ٹھہر کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی تھی۔ پہچاننے کی کوشش کرتی کہ وہ کہاں ہے اور کس کے ساتھ ہے۔ اس نے اپنوں کو پہچان لیا تھا۔ محسن اور شعلہ، نازو اور استاد ٹیڈی اور مرزا غالب... یہ سارے نام اسے یاد آ گئے تھے مگر اس کے ذہن میں جو خوف بیٹھا ہوا تھا وہ دشمنوں کو پہچاننے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

گاسے ماچھی کی جعلی خانقاہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی وہ خالی نظروں سے دونوں جانب دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار ضرور عیاں ہوئے تھے مگر وہ خود اس خوف کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ مجھے اب مایوسی ہونے لگی تھی۔ ذہن پر میں نے ایک اور جوا کھیلا۔ میں رابعہ کو استاد ٹیڈی کی جائے رہائش گاہ کی طرف لے گیا۔ کرشن نگر کے آخری حصے میں اس ٹھکانے پہنچنے سے قبل ہی رابعہ کی حالت میں نمایاں تبدیلی آ گئی۔

"سکندر... واپس مت جاؤ... ادھر خطرہ ہے۔" وہ میرا بازو پکڑ کے بولی۔

"خطرہ؟ کس سے خطرہ ہے؟" میں نے انجان بن کے کہا۔

اسی وقت رابعہ کی نظر نے اس گیراج کو دیکھا جس کا ایک نوجوان مستری اس کی کار میں دھماکے کے ساتھ ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ رابعہ نے ایک چیخ ماری۔

"یہ... یہ وہی جگہ ہے۔" وہ ہکلانے لگی اور اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

میں نے گاڑی روک دی۔ "یہ کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ اچھا میں اس گاڑی کو دھکیل کر ایک طرف گلی میں کھڑی کر دیتا ہوں۔ تم جا کے اس گیراج سے کسی مکینک کو بلا لاؤ۔"

"نہیں..." رابعہ نے چلا کے کہا۔ "وہ اس کو بھی بم سے اڑا دیں گے... انھوں نے میری کار کو بھی اُڑا دیا تھا۔"

"یہ تم کس کی بات کر رہی ہو؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "کیا یہ تمھاری کار نہیں ہے... اسے کون بم سے اُڑائے گا بھلا؟"

"وہی جو... جو میری اور تمھاری جان کے دشمن ہیں۔" رابعہ بلا توقف بولنے لگی۔ "دلاور اور اس کے ساتھی... مجھے بے وقوف مت بناؤ... یہ میری کار نہیں ہے... واپس چلو سکندر... یہ تم جو نازو کو دیکھ لے... تم ہٹو... گاڑی میں چلاؤں گی۔"

"کہاں جانا چاہتی ہیں آپ؟" میں نے گاڑی سے اتر کے دوسری طرف جاتے ہوئے کہا۔ رابعہ میری جگہ آ گئی اور اس نے گاڑی کو اسٹارٹ کرکے میری طرف دیکھا۔ میں بے تعلق بیٹھا رہا۔ میں اس وقت بھی کچھ نہیں بولا جب اس نے گاڑی واپس کی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اب وہ مجھے کہاں لے جاتی ہے؟

رابعہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بہت محتاط تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کس توجہ اور انہماک کے ساتھ گرد و پیش پہ نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ ہر سمت سے آنے والی گاڑیوں، ٹریفک کے قواعد سے بالاتر رہ بڑھتی ہوئی تانگوں، شور مچاتے رکشاؤں، فیل پیکر ویگنوں، بسوں، سائیکل سواروں اور پیدل چلنے والوں پر نظر رکھے ہوئے ہے اور اس بات سے پوری طرح باخبر ہے کہ میری نگاہ صرف اس پر ہے۔ وہ ذہنی طور پر پوری طرح حاضر تھی اور کوئی بھی اس کی گفتگو یا انداز و اطوار سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ذہنی عدم توازن کا شکار رہی ہے۔ یہ ذہنی عدم توازن سمجھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس میں اگر کوئی تبدیلی آئی تھی تو یہ کہ اپنے ماضی کی سب دکھ دینے والی یادوں اور پُر آزار لمحوں کو وہ طاقِ نسیاں پہ رکھ کر بھول گئی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو یقیناً پاگل ہو جاتی لیکن کچھ عرصہ یاد ماضی سے دامن چھڑا کے جینے سے اس کے عزم و یقین اور حوصلے کی تھکن دور ہوتی تھی اور آہستہ آہستہ ذہنی و جسمانی صحت کی بحالی کے ساتھ وہ پھر اس قابل ہو گئی تھی کہ تلخ حالات اور مصائب و آلام کا بار اٹھا سکے اور میرے ساتھ قدم ملا کے چل سکے۔ اس کی مثال کسی ایسے بوجھ ڈھونے والے مزدور سے دی جا سکتی تھی جو اپنی جسمانی قوت برداشت سے زیادہ محنت کرتے کرتے بالآخر اتنا تھک جائے کہ کام کو بھول کر سو جائے اور جب تک سوتا ہے اسے یہ احساس ہی نہ ہو کہ ابھی اس کے لیے اپنے بارِ گراں سے نجات نہیں لیکن سو کر اٹھے تو پھر مشقت کے لیے تیار ہو۔ نیند جو احساس سے بیگانگی کا وقفہ ہوتی ہے ذہنی و جسمانی قوت کے قریب ہو جانے والے ذخیرے کو پھر بھر دیتی ہے۔

رابعہ بھی اپنے ماضی سے آنکھیں بند کیے خود فراموشی اور احساس سے بیگانگی کا وقت گزار چکی تھی اور میرے آنے سے ہی آہستہ آہستہ اس کا ذہن پھر حال اور مستقبل کے مسائل کو سمجھنے کے لیے بیدار ہو رہا تھا جیسے میری باتوں نے پھر اس ساڑی نے جو اب رابعہ کے وجود پہ رنگ گل اور میری بہار کا عنوان بنی ہوئی تھی اور آخر میں سرخ رنگ کی اس فاکس ویگن نے اس کی خوابیدہ یادوں کو جھنجوڑ دیا تھا۔ وہ مجھے پہچان رہی تھی پرانے راستوں کو پہچان رہی تھی اور اس وقت کو پہچان رہی تھی جو ان راستوں سے نسبت رکھتا تھا۔ اُسے وہ سب کچھ من و عن کی تفصیل کے ساتھ یاد آ گئے تھے جو میری اور اس کی ذات کے حوالوں سے دوستی اور دشمنی کے

www.paksociety.com

خانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اس کی سوچ میں ہر نقش ابھر رہا تھا جو خود فراموشی کے مختصر وقفے میں اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔ چھوٹے چھوٹے مقامات، رشتے، خوف اور اندیشے، رنج و غم کے واسطے اور خوشیوں کے وسیلے، نفرتوں کے صلے اور چاہتوں کے سلسلے، خواہشوں اور امانوں کے روشن جذبوں کے رنگ اور نا امیدی کے تاریک سائے، یہ سب اس کے سامنے آتے جا رہے تھے اور اسے پکار رہے تھے۔ رابعہ ہم سب تمہارے وجود کا حصہ تھے اور ہیں... ہمیں جانو... پہچانو اور مانو۔

گاڑی ریلوے اسٹیشن سے علامہ اقبال روڈ کی طرف مڑی اور گڑھی شاہو کے مختصر سے بارونق بازار سے گزری۔ میں نے سوچا کہ اسے کچھ یاد دلاؤں۔ پھر یہ ارادہ ترک کر دیا اور اس کے ذہن کو اپنی مدد آپ کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تاکہ وہ اپنی خود فراموشی کے سہانے پر یادوں کی زنجیر تھامے چلتی جائے، جہاں تک بھی اسے گزرتے ہوئے وقت کی روشنی نظر آئے وہ خود ہر شے کی شناخت کرے اور احساس کی الجھی ہوئی ڈور کو سلجھاتی جائے۔ بالکل ٹھیک جگہ پہ اور میری توقع کے عین مطابق اس نے گاڑی کو لاؤنج سینما والی سڑک پر سیدھے ہاتھ کی طرف موڑ لیا۔ میری نظر بار بار رابعہ کی صورت پر جاتی تھی اور لوٹ آتی تھی۔ میں ایک عجیب سی بے چین کر دینے والی اور اعصاب شکن کیفیت سے دوچار تھا کیونکہ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ رابعہ کو ایک دم سب کچھ یاد آ جائے گا تو وہ زندہ یادوں کی یلغار سے دہشت زدہ ہو جائے گی یا اپنے خوف پر قابو پالے گی۔ اپنے گھر کے بے نشاں آثار پر اس کا ردعمل کیا ہوگا؟ وہ چیخ مار کے بے ہوش ہو جائے گی یا دیوانہ وار گاڑی سے اتر کر بچپن سے جوانی تک ساتھ دینے والے مہربان گھر کے تصور سے لپٹ کر رونے لگے گی۔ وہ بالکل چپ تھی مگر اس کے جذباتی انتشار کا عکس اس کی صورت کے تغیر میں دکھائی دیتا تھا۔

رابعہ کے والدین کا گھر اور وہ گھر جہاں اس نے ہوش سنبھالا، آغازِ شباب کی امنگوں کو خوش آمدید کہا۔ جوموں سے بھرے تصور سے خانۂ خیال کو آباد رکھا۔ وکالت کے کامیاب دور کا آغاز کیا۔ رسم دنیا نبھانے کے لیے ایک ایسے مرد کو شوہر مانا جو اس قابل ہی نہ تھا اور پھر رخصتی سے قبل ہی واپس دوشیزگی اختیار کی۔ گھر سے ملی اور سب سے بچھڑی... ماں سے محروم ہوئی اور بالآخر بے گھر ہوئی۔ یہ سب فنا ہو جانے والے وقت کے عکس تھے جو اس کے ماضی کی یادوں سے بھرے تصور میں جھلملائے اور وہ ساکت و صامت اس گھر کی جگہ ایک ملبے کے ڈھیر کو دیکھتی رہی جس کے گرد کھنچی ہوئی چار دیواری بھی زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکی تھی۔ کھنڈر کے چلے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں

کی ہر چوکھٹ پہلے ہی غائب ہو چکی تھی۔ اب ضرورت مند انھیں نکال نکال کر لے جا رہے تھے۔ تھوڑے سے بنا دینے کے لیے وہ جو ہر چیز کھینچ کے لیے مسندوں کے نیچے رکھنا اور کسی تخت یا چارپائی کے کسی پائے کی جگہ استعمال کرنے کے لیے جیسے بھی دو چار یا پانچ دس اینٹوں کی ضرورت پڑتی تھی وہ اس لاوارث اور بے آسرا گھر کے ملبے سے یا اس کی چار دیواری سے نکالتے ہوئے نہیں شرماتا تھا۔

"سکندر..." رابعہ نے اچانک کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں میں یہاں کیوں آگئی... یہاں تو اب کچھ بھی نہیں ہے۔"

"میرا بھی خیال ہے کہ ہمیں کہیں اور جانا چاہیے۔" میں نے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔ رابعہ یادوں میں لوٹ رہی تھی اور وہ وقت کی زنجیر تھامے آگے بڑھ رہی تھی جو درحقیقت پیچھے کا سفر تھا۔ وہ خود فراموشی کے اندھے کنویں سے نکلنے کی جدوجہد میں مصروف تھی اور اس کی آنکھیں اوپر کھلے آسمان کی وسعت میں روشنی دیکھ رہی تھیں۔ رابعہ نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی اور واپس ہوئی۔ اتنے عرصے بعد کسی نے بھی رابعہ پر اور لال گاڑی پر توجہ نہیں دی۔ کوئی اس کھنڈر کے پرانے مکینوں کو یاد کرنے والا نہ تھا۔ سب زمانۂ حال میں جینے والے لوگ تھے جو گزر جانے والوں کو بھولنے میں دیر نہیں کرتے تھے ورنہ رابعہ وہی تھی جو ان کی نظروں کے سامنے پیدا ہوئی، پلی اور بڑھی اور اسے جاننے والے سب پرانے لوگ ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ رابعہ کی آنکھوں سے ایک قطرہ اشک ٹپکا۔ یہ زندگی کی علامت تھی۔ احساس کو گلیشیر پگھلنے، سورج کے سامنے میں طوفان اٹھنے اور ہمالیوں کی برف کے پگھلنے کی علامت تھی۔ رابعہ جاگ رہی تھی اور اپنی پرانی دنیا کی جانب لوٹ رہی تھی۔ میرا عشق کامیابی سے ہمکنار ہونے لگا تھا مگر میرے لیے اس خوشی کے لمحات پر قدم رکھنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

"تم مجھے بتاتے کیوں نہیں سکندر! مجھے کہاں جانا ہے؟" رابعہ نے اچانک کہا۔

"تمہیں میرے ساتھ جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے تمہارے ساتھ جانا ہے۔ ہماری منزل الگ تو نہیں ہے۔"

رابعہ نے گاڑی کو نہر کے پل سے پہلے سیدھے ہاتھ کی طرف موڑا۔ وہ انکل رضوی کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس میں میرے لیے کتنا خطرہ ہے مگر میں نے بچاؤ کا فیصلہ [illegible] آسرا... مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ان کی کوٹھی پہ گارڈ متعین ہوئے تو وہ نئے محافظ ہوں گے اور راستے مستقل کہاں ہوتے... گزرنے والی گاڑی میں سکندر بخت کی صورت تلاش کرتے ہوں۔

رضوی [illegible] میں سے کوئی دل رنگ کی فاکس ویگن کو بھی پہچان [illegible] مجھے بھی اور رابعہ کو بھی مگر ان سے امید نہ تھی کہ وہ انکل [illegible] کی طرح قانون پرستی اور فرض شناسی کا مظاہرہ کریں۔ البتہ خود [illegible] رضوی سے مڈبھیڑ ہو جانے کی صورت میں بچنا محال تھا۔ ابھی [illegible] کوٹھی کے دروازے سے دو گز ہی تھے کہ رابعہ نے ایک دم بریک [illegible] لگا کے گاڑی روک دی۔

"یہ... ادھر تو انکل رضوی مل سکتے ہیں۔" وہ گھبراہٹ میں بولی۔ "کیا تم منہ بند کیے بیٹھے ہو۔ مجھے روکا کیوں نہیں۔" اس نے بڑی [illegible] میں گاڑی کو واپس موڑنا چاہا مگر فاکس ویگن اپنے بڑے [illegible] کے باعث کم جگہ میں ایک چکر نہیں کاٹ سکتی۔ رابعہ کو سڑک [illegible] سے جہاں ہیوی گاڑیوں کی قطار رواں تھی [illegible] پیچھے آنے والی ایک کار ذرا سی دیر [illegible] مجبور ہوئی۔ فاکس ویگن جب آگے بڑھی تو میں نے [illegible] کے ڈرائیور کو دیکھا اور ایک لمحے کے لیے میرے دل کی [illegible] رک گئی۔ وہ انکل رضوی کا ڈرائیور تھا جسے ہم نے [illegible] سے بے دخل کیا تھا اور ترقی کا بھاشن [illegible] بنا تھا کہ اس نے جاتے جاتے تک پالش کیے تھے۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا اور یا انسوں والی سڑک پہ تاریکی زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ ایک بار ہم دونوں کی نظریں ملیں، پھر گاڑیاں ایک دوسرے کو کراس کر گئیں۔ میں نے سر گھما کے دیکھا تو انکل رضوی کی [illegible] ابھری ہوئی تھی۔ اس کے پچھلے والے شیشے میں سے مجھے دو سر نظر آئے مگر فاصلہ بڑھ جانے کے باعث میں فیصلہ نہ کر سکا کہ اس وقت کار میں خود انکل رضوی تھے یا ان کی فیملی تھی۔ ڈرائیور نے یقیناً انھیں بتا دیا تھا کہ ابھی ابھی اتنے قریب سے گزرنے والی فاکس ویگن میں کون تھا۔ انکل رضوی ہوتے تو پلک جھپکتے [illegible] باہر نکلتے اور فاکس ویگن کے ٹائروں پر فائر کرتے یا ڈرائیور سے کہتے کہ گاڑی کا تعاقب کرو۔ مگر کار چند سیکنڈ کے وقفے سے [illegible] روانہ ہو چکی تھی۔ میں نے احتیاطاً [illegible] گاڑی

[illegible] انکل رضوی اندر بیٹھے تھے۔ لیکن مجھے تھوڑی سی تشویش بھی لاحق [illegible] کہ اس [illegible] ڈرائیور کے ساتھ کبھی اچھا سلوک [illegible] نہیں کیا تھا بلکہ کسی حد تک اس سے دشمنی مول لے لی تھی۔ وہ یقیناً ایس ایس پی صاحب کو بتائے گا کہ مفرور ملزم سکندر بخت [illegible] رابعہ نیازی [illegible] اپنی سرخ فاکس ویگن میں کوٹھی [illegible] کی جانب مشتبہ حالت میں گھومتے ہوئے پائے گئے تھے۔

"تم نے ابھی تک [illegible] نہیں جلائی۔" میں نے کہا۔ "ویری [illegible]"

"اس میں ویری گڈ کی کون سی بات ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "تمہیں یاد دلانا چاہیے تھا۔ خیریت ہوئی کہ..."

"اگر میں نے تمہیں یاد دلا دیا ہوتا تو خیریت ہرگز نہ رہتی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "نمبر پلیٹ اندھیرے میں کسی سے نہیں پڑھی جاتی۔ روشنی ہوتی تو مونچھ والا فوراً نمبر دیکھ لیتا!"

"کون مونچھ والا...؟" رابعہ نے حیرانی سے کہا۔

"انکل رضوی کا ڈرائیور... ابھی ابھی جو کار گزری ہے نا اُسے وہی چلا رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "آنٹی پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں۔"

"اوہ مائی گاڈ..." رابعہ نے ایک دم رفتار بڑھا دی۔ "انھوں نے ہمیں ضرور دیکھا ہوگا۔"

"ہاں! لیکن انھوں نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔" میں نے کہا۔ "خدا انھیں اس نیکی کا اجر دے۔"

"انھیں بہت دکھ ہوا ہوگا کہ ہم ان سے مل بھی نہیں سکے۔" رابعہ نے کہا۔ "اور یوں اجنبی ہو کے نکل گئے ہیں۔"

یہ ہماری کتابِ زندگی کا ایک اور باب تھا جو رابعہ کو یاد آ چکا تھا۔ میں اپنی کامیابی پہ بے حد مسرور تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں نے رابعہ کو ہار کر پھر جیت لیا ہے۔ میرے دماغ میں قوالی کے بول یوں گونج رہے تھے جیسے ریکارڈ پلیئر چلانے سے سوئی ایک ہی جگہ اٹک گئی ہو۔ "محبت فاتحِ عالم... محبت فاتحِ عالم... ہاں ہاں... محبت..."

"اب تو بتا دو کہ ہمیں کدھر جانا ہے؟" رابعہ نے بے بسی سے کہا۔

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے رابعہ..." میں نے کہا۔ "میری زندگی کے سفر میں ہر موڑ پر تم میرے ساتھ رہی ہو... میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمہیں راستہ کہاں تک یاد ہے۔"

"تم مجھے آزما رہے ہو؟" وہ مسکرائی۔ "اچھا میں ایک کوشش اور کرتی ہوں..."

رابعہ نے گاڑی کو دائیں جانب موڑا اور نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ راستے میں صرف ایک جگہ اس نے رفتار کم کی جہاں سڑک کے بیچ میں دو پولیس والے رائفل لیے کھڑے تھے۔ ابھی تو رات شروع ہوئی تھی۔ عموماً اس قسم کی چیکنگ پولیس والے نصف شب کے بعد شروع کرتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے خوف نے مجھے مغلوب کر لیا۔ یہ ناکہ بندی آخر کس لیے ہے؟ کیا اتنی سی دیر میں انکل رضوی نے پولیس کو خبردار کر دیا تھا کہ ایک لال رنگ کی فاکس ویگن کو اسی علاقے میں تلاش کریں جس میں مفرور اشتہاری مجرم سکندر بخت موجود ہے۔ میں رابعہ سے کہتے کہتے رک گیا کہ وہ

www.paksociety.com

انسپکٹر ڈرائیور گاڑی کو نکال لے جاتا اور اس بات کی پروا نہ
کرتے کہ راستہ روکنے والے مارے جاتے ہیں یا اپنی جان بچاتے
ہیں۔ پھر مجھے عقل نے لگام دی۔ پولیس والے مسلح تھے اور اگر وہ
بچ جاتے تو بڑی آسانی سے ایک فائر کر کے ہماری گاڑی کو لنگڑا لولا
کر دیتے۔ اس کے علاوہ پولیس کی جیپ سڑک سے ذرا ہٹ کے کھڑی
ہوئی تھی اور اس میں کسی افسر کا ہونا یقینی تھا کیونکہ جیپ کے
سامنے والے حصے پر وائرلیس کا انٹینا لہرا رہا تھا۔ وہ پلک جھپکنے میں ریڈیو رابطے
سے ہمارے فرار کی اطلاع دے دیتا اور ہمارے پاس جو تھوڑا بہت
چانس تھا کہ بچ جائیں، وہ گرفتاری کے بعد ختم ہو جاتا۔ رابعہ نے
میری طرف دیکھا اور بریک لگا دیئے۔ ایک پولیس مین نے بائیں طرف
آ کے اور دوسرے نے بائیں جانب سے ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی۔ وہ
بادل ناخواستہ ایک ضابطے کی کارروائی پوری کر رہے تھے۔
"کیا بات ہے بھئی...؟" میں نے متانت اور سکون کے
ساتھ کہا۔
"کس کس کو بتائیں جی کہ کیا بات ہے؟" کانسٹیبل نے بیزاری
سے کہا۔ "ایک ڈاکہ پڑا ہے۔"
"جاؤ جی جاؤ..." دوسرے نے آل کلیئر کا سگنل دیا کیونکہ پیچھے
دوسری کار آ گئی تھی۔ جب ہم سو گز دور نکل گئے تو میری جان میں جان
آئی۔ اس وقت بھی جب ہماری کار ٹھہری ہوئی تھی، وائرلیس پر
انکل رضوی کا پیغام موصول ہو سکتا تھا اور میرا مشن جس کا مقصد
رابعہ کی واپسی تھی، پس دیوار زنداں پہنچ کے پورا ہوتا جہاں سے بچ نکلنے
کی امید رکھنا بھی محال تھا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ جیتے جی کھوتی
اور تھے آن کھلوتی۔ سارا عشق دھرا رہ جاتا۔ مادر وطن کے لیے جان
کی بازی لگانے کے سامنے منصوبے خاک میں مل جاتے۔
"اس وقت تو بال بال بچے۔" میں نے رابعہ کی طرف دیکھ کر
کہا جو مجھے دیکھ رہی تھی۔
"تم کانپ رہے تھے۔" وہ مسکرائی اور اسی وقت گاڑی نہر
کی سڑک پر چڑھ گئی۔ رابعہ نے ایک دم بریک نہ لگائے ہوتے تو دوسرے
لمحے میں ہم فاکس ویگن کے ساتھ سمر سالٹ کر رہے ہوتے۔
"تم سامنے دیکھ کر گاڑی چلاؤ۔" میں نے گہری سانس لے کر
کہا۔ "فی الحال میں تم کو دیکھتا ہوں کیونکہ میں فارغ بیٹھا ہوں... تم
مجھے بعد میں دیکھ لینا۔"
رابعہ ہنسی۔ اور مجھے اس ہنسی میں وہی پرانی رفاقتوں کی
بے تکلف تازگی محسوس ہوئی۔ پرانی اپنائیت کا بے ساختہ پن محسوس
ہوا اور چاہت کے صادق جذبوں کی سرخوشی محسوس ہوئی۔ رابعہ نے
کلچ دبایا اور گاڑی واپس نیچے اتر آئی۔ اس سڑک پر روشنی نہ ہونے
کے برابر تھی اور فاکس ویگن کی ہیڈ لائٹس میں سب کچھ واضح ہونے کے سبب

تھے چنانچہ ان کی روشنی بھی سڑک پر چھوڑ گئی تھی۔
"انکل رضوی کی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے تم کیسا سوچ رہی
تھیں؟" میں نے کہا۔
"یہی تو میں بھی سوچ رہی تھی... اور مجھے یاد نہیں آ رہا
کیا تھی... لیکن اُدھر کچھ خطرہ تھا۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھے یک دم
یہ خیال آیا کہ ہمیں اُدھر نہیں جانا چاہیے تھا... اگر ہمیں کوئی دیکھ
لیتا تو اچھا نہ ہوتا۔"
"اور تم کو یہ بالکل یاد نہیں کہ وہاں ہم کیوں نہیں جا سکتے؟"
میں نے کہا۔ رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے اسے بہت سے واقعات
یاد دلائے جو انکل رضوی کی کوٹھی میں قیام کے دوران پیش آئے
تھے مگر اس کو صرف ایک بات یاد تھی کہ ایک رات ہم اس کوٹھی
کے لان میں رات بھر شبنم سے بھیگی ہوئی چاندنی میں بیٹھے رہے تھے۔
اسے ہر اچھی بات یاد تھی۔ ہر ناخوشگوار یاد کو اس کے ذہن نے واقعی
سے خارج کر دیا تھا تاہم اسے نامعلوم خطرات اور اندیشوں کے وجود
کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں باتیں کرتا رہا۔ اس کے ساتھ گزر جانے
والا وقت، حادثات، واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا لیکن
میں نے نوٹ کیا کہ اس نے یاد ماضی سے منسوب ہر خوشگوار تذکرہ
قبول کر لیا تھا، جن باتوں سے اس کے ذہن کو صدمہ پہنچ سکتا تھا وہ
اسے یاد ہی نہیں آ رہی تھیں۔ اس کا اپنا اغوا، دلاور اور وڈیرے سے
تصادم، نواب خسرو جمشید کی کوٹھی میں پیش آنے والے واقعات،
قصر جمشید کی آتش زدگی اور کالے ماچھی کے اڈے سے اپنے اغوا کے
بعد کے واقعات بالکل یاد نہیں تھے۔ اس کی ذہنی کیفیت کا موازنہ
کسی ایسے مریض سے کیا جا سکتا ہے جس نے حالات کے دباؤ اور
اعصابی کشیدگی کے باعث خودکشی کی کوشش کی ہو اور جس کی
حالت اب ڈاکٹروں کی کوشش سے خطرے سے باہر ہو مگر ڈاکٹر
صرف ان ہی لوگوں کو ملنے کی اجازت دینے پر تیار ہوں جن سے ملاقات
کا رد عمل ناخوشگوار نہ ہو اور انہیں مریض کے سامنے جانے کی اجازت
نہ ملے جن سے اندیشہ ہو کہ ان کو دیکھ کر مریض نفرت یا غصے کے رد عمل
کا شکار ہو گا اور یہ ممکن ہے کہ اس کے لیے یہ ذہنی صدمہ کسی پاگل پن یا
جنون کے دورے کی شکل اختیار کر جائے۔ رابعہ بھی اپنی یادداشت
سے فی الحال خوشگوار یادوں کو منتخب کر رہی تھی۔ یہ ایک لاشعوری
عمل تھا۔ وہ ماضی کی محفوظ گلیوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے لاشعوری خوف
بے جا قتل و خونریزی، تباہی و غارت گری اور جان لیوا خطرات کی یادوں
سے رشتہ استوار کرنا ایک غیر محفوظ عمل تھا۔ اس کی ذہنی صحت
کی مکمل بحالی تک یہ حفاظتی انتظام ضروری تھا تاہم مجھے یقین تھا کہ
مکمل خود فراموشی کا دور ختم ہو چکا ہے اور رفتہ رفتہ اس کا ذہن تلخ
حقائق کو بھی قبول کرنے لگے گا اور جب اس کا اعتماد بحال ہو جائے

یہ سب یاد آ جائے گا جو لاشعور سے کہیں نیچے تحت الشعور
کی گہرائیوں میں دفن ہو گیا ہے۔
میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہی ہے۔ آج کے لیے میری اتنی
ہی کامیابی بہت تھی کہ اس نے مجھے، محسن اور شہلا کو، انکل شیرازی اور
رضوی کو، غالب کو اور استاد دیگچی کو پہچان لیا تھا اور اس نے
ان کا ماضی سے رشتہ جوڑ لیا تھا اور اس آڑے وقت سے
ان کی یاد مسرت کے احساس کی ضامن تھی۔ اس نے مجھے اور
میری محبت کو قبول کر لیا تھا۔ ایک ازلی اور ابدی حقیقت کے طور پر
جو ابتدا سے تھی۔ اسی ابتدا کے وقت کا
تعین وہ نہیں کر سکتی تھی۔ اسے صرف یہ خیال تھا کہ میرے علاوہ
اس نے کسی کو چاہا تھا اور نہ یہ ممکن تھا کہ مجھے بھی فراموش کر سکے۔ اُسے
یہ احساس نہ رہا تھا کہ درمیان میں خود فراموشی کا ایک ایسا وقت
آیا تھا جب وہ مجھے بھی پہچان نہ سکتی تھی۔ اگر کسی بچے
سے ہوش سنبھالنے کے بعد کسی دن اچانک یہ پوچھا جائے کہ تمہیں سر
پر آسمان کی موجودگی کا احساس کب ہوا تھا تو وہ پریشان ہو جائے گا
کیونکہ آسمان تو شروع سے ہے اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ
اس دنیا کو بغیر آسمان کے تصور کر سکے۔ یہی حال رابعہ کا تھا۔ اسے
یقین تھا کہ محبت سے اس کی زندگی نہ کبھی خالی تھی نہ ہو سکتی تھی۔ اگر
میں اس سے کہتا کہ وہ دن یاد کرو جب تم پہلی بار مجھ سے ملنے کے
لیے میری وکیل بن کر جیل میں ملاقات کے لیے آئی تھیں اور اس وقت
تمہارا لباس یہی تھا تو اسے بالکل یاد نہ آتا اور میں اس کو بتاتا
کہ یہی اور اس کی محبت کے آغاز کا پہلا لمحہ تھا جب میں
نے اس کا یہ روپ دیکھا تھا تو وہ حیران ہوتی۔
اس نے حسن آباد میں میرے آبائی گھر میں گاڑی روک دی۔
گھر تاریک اور آسیب زدہ نظر آتا تھا۔ اس کے سب دروازے
بند تھے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ اس کے آگے والے باغیچے میں پودے
سرنگوں کھڑے تھے اور سناٹے میں جھینگروں کی آوازیں
آ رہی تھیں۔ کسی دور افتادہ گوشے سے ایک مینڈک کے ٹرانے
کی آواز سنائی دے رہی تھی ورنہ مکمل خاموشی تھی۔ میں نے رابعہ کو
بتایا کہ میں نکل گیا تھا۔ چند لمحوں میں میری آنکھوں نے اپنے
بچپن کی یادوں کے ان گنت زندہ عکس دیکھ لیے جو میری
یادداشت میں محفوظ تھے۔ پھر مجھے وہ ریٹائرڈ سیشن جج یاد آیا جو
کسی سازش کا شکار ہو گیا تھا اور جس نے یہ مکان رابعہ کو تحفے میں
دیا تھا مگر خود اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا تھا۔ جس تصور سے
نفرتیں جھلکتے ہوئے وقت کہاں دیواروں میں محبوس ہو گیا۔
مجھے یاد تھا کہ ... وزیر خان... تم کب تک بھٹکتی تنہائی
کو آنکھوں میں رکھو گے۔ آؤ اور وزیر خان کے وارث کی حیثیت
سے اس گھر کے چراغ روشن کرو۔ حویلیوں سے اداسیوں کے جالے

توڑ کر پھینک دو اور ویرانی کو بے دخل کر دو۔ اس کی فضا میں
خوشی کے نغمے اور مسرت بھرے قہقہے پھیلا دو۔ یہ وقت رابعہ
کے لیے بانہیں پھیلائے کھڑا تھا کہ آؤ... تم رنگ پھیلا گئی ہو۔ تم
تو اس گھر کی مالکن ہو۔ تمہیں تو اس گھر کو جنت بنانا ہے۔ اپنی محبت
کو پیار اور چاہت سے اس میں زندگی کے سات شوخ رنگ بکھیرنے
ہیں اور اس گھر کو وہ خوشی، خوب صورتی اور خوشحالی دینا ہے جو
وزیر خان کا ارمان تھی۔ خواب تھی اور حسرت تھی اور اب اس کی
روح کی خلش ہے جسے تم ہی دور کر سکتی ہو۔ اس کی بے کل روح
تب ہی قرار پائے گی جب اس ویرانی کے وجود کو اس کا پوتا یا
پوتی دنیا میں اپنی آمد کے اعلان سے توڑیں گے اور پھر ان کی معصوم
ہنسی اور شرارتی قلقاریوں سے گھر دیں گے۔
"سکندر!" رابعہ نے میرے شانے پر سر رکھ کے کہا۔ "یہ گھر
تو ہمارا ہے نا... یہاں آ کے تو میں نے کوئی غلطی نہیں کی؟"
میں نے اس کے سر کو پیار سے تھپکا۔ "یہ ہمارا ہی گھر ہے۔
لیکن آج اس کے دروازے بند ہیں۔ ایک دن یہ دروازے تم
اپنے ہاتھوں سے کھولو گی۔ اس دن تمہارے ہاتھوں میں مہندی
ہوگی اور تمہاری مانگ میں افشاں۔ اس گھر کے دروازے پر وزیر خان
اپنی بہو کا استقبال کرنے کے لیے خود موجود ہوگا۔ یہاں چراغاں
ہوگا۔ سیج کے لیے پھولوں کی خوشبو ہوگی اور شادیانے کے نغمے ہوں
گے اور جب تم لباس عروسی میں میرے ساتھ اس گھر میں قدم رکھو
گی تو پھر یہ گھر ہمارا نہیں ہوگا۔ ہم اس گھر کے ہو جائیں گے... ہمیشہ
کے لیے..."
میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ چاندنی اس کے رخ پر نثار
ہو رہی تھی اور اس کی بند آنکھیں خواب کو حقیقت کی طرح دیکھ
رہی تھیں۔ وہ تصورات کی دھنک کے جھولے میں پرواز کرتی جا
رہی تھی اور خوشیوں کو آسمان کے تاروں کی طرح اپنی جھولی میں بھرتی
جا رہی تھی۔ اس ماحول اور اس کے ساحر حسن کا طلسم بے خودی کا
احساس بن کر چھا گیا اور اس وقت کا نقش دائمی ہو گیا۔ میں نے اپنی
خوش بختی پر ناز کیا کہ میں اپنے گھر کے سامنے ہوں اور میرے ساتھ میری
محبت ہے اور رابعہ ہے جس کے حسن بے مثال کی تابندگی سے کائنات
روشن ہے اور میرے دل میں اجالا ہے۔ دوسرے لمحے یہ خواب
ٹوٹ گیا جو حقیقت سے زیادہ حقیقی تھا۔ رابعہ نے سر اٹھا کے
مجھے دیکھا اور آہستہ سے مسکرائی۔ چاندنی بکھر کر نکھر گئی۔ دل پھول کر
پھیل گیا لیکن میں رابعہ کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے میں اس کے
دل میں اتر گیا۔ "محبت فاتح عالم... محبت فاتح عالم... ہاں جی
ہاں ہاں... محبت فاتح عالم..." ہر طرف سے صدا آنے لگی۔
"چلو رابعہ..." میں نے جھوٹ موٹ کر کہا۔ "میں تمہیں واپس لے
چلتا ہوں... رات بہت ہو گئی ہے..."

www.paksociety.com

"کیا تم رات سے ڈر تے نہیں سکندر؟" وہ بولی۔ "میں بہت ڈرتی ہوں... میں اکیلی رہ جاتی ہوں نا... مجھے اپنے ساتھ لے چلو یا میرے ساتھ چلو... ڈاکٹر لطیف کے گھر۔"

"میں وہاں نہیں رہ سکتا رابعہ۔" میں نے کہا۔ "اور تمھیں اپنے ساتھ بھی نہیں رکھ سکتا۔ کل میں پھر آؤں گا۔ پھر میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں تمھیں محسن اور شہلا کے گھر لے چلوں گا اور پھر تم ان کے ساتھ ہی رہو گی۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟" وہ بولی۔ "کھاؤ میری قسم۔"

"میں تمھاری اور تمھاری محبت کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ کل تمھیں ضرور لے جاؤں گا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ "وعدہ کرو کہ آج رات تم نہیں ڈرو گی۔ سکون سے سوتی رہو گی۔"

"اگر نیند نہ آئی تو میں تمھاری یاد کو ساتھ رکھوں گی۔ پھر مجھے ڈر نہیں لگے گا۔" وہ بولی۔ "اور نیند آ گئی تو خواب میں تمھیں ساتھ رکھوں گی... یہ کیسی عجیب بات ہے سکندر کہ یہاں مجھے بالکل ڈر محسوس نہیں ہوتا حالانکہ یہاں کتنی ویرانی ہے، اندھیرا ہے اور خاموشی ہے مگر ڈاکٹر لطیف کے گھر میں سب کے درمیان رہ کے بھی میں ڈرتی تھی... پریشان رہتی تھی۔"

"مجھے تو اب بھوک پریشان کر رہی ہے۔" میں نے رونی آواز میں کہا۔ "اگر میں نے آدھے گھنٹے کے اندر اندر کہیں بیٹھ کر چکن تکے نہ کھائے تو رات کو خواب میں مجھے مرغے ڈرائیں گے... کہ تمھارے لیے ہم جان سے گئے اور تم نے ہمارے تکے چکھے بھی نہیں۔"

رابعہ ہنس پڑی۔ "اگر تم کہتے کہ ہم کھانے چلتے ہیں تو میں انکار کر دیتی۔ میں خود چکن تکے کھانے کا ارادہ کر کے گھر سے نکلی تھی۔ اور بھوک مجھے اس وقت ہی لگ گئی تھی۔"

"اور اپنے ساتھ مجھے بھی بھوکا پیاسا لیے پھرتی رہیں...؟" میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔ "چلو بیٹھو... اب گاڑی میں چلاؤں گا۔ ورنہ تمھارا کیا ہے... لے جاؤ گی کہیں اور... جہاں جانا ہے وہاں کیا بتاؤ۔"

رات کے گیارہ بجنے میں دس منٹ تھے جب میں نے گاڑی کو ڈاکٹر لطیف کی کوٹھی میں موڑا۔ میں رابعہ کے قریب اور اس کے ساتھ گزری ہوئی شام کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا کہ روش نے دو ہاؤ ہاؤ کر کے حملہ کیا۔ میں اچھل پڑا اور میں نے بے اختیار روش کو الو کا پٹھا کہا۔ "ڈاکٹر لطیف بھی کہا کرتے ہیں۔ اس کا نام رکھ دیا روش یعنی چوہا۔ کم بخت کے بریک کتا ہے۔ خیر کا قسم کا نام رکھتے۔" میں نے کہا اور رابعہ ہنسی۔ گاڑی کی آواز پر ڈاکٹر لطیف باہر آئے اور انھوں نے روش کو بھگایا۔

"آپ ماہر نفسیات ہیں ڈاکٹر صاحب۔" میں نے نیچے اتر کر کہا۔ "آپ کے پاس آنے والے نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ ان کا تو نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہوگا۔ یہ کیا خوفناک چیز رکھ دی ہے آپ نے

استقبالیہ ہے..."

ڈاکٹر لطیف ہنسنے لگے۔ "اسے بھی وہ شوق ہے جو اس دل والے کا... ویسے بہت بے ضرر جیب ہے۔"

"کون؟ آپ کا دل والا؟" میں نے کہا۔ "بالکل بجا... مگر اس کی تو آواز سے ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے... آپ اجازت دیں تو پچھلے پیچ کا جوڑا پال لیں۔ وہ واقعی بے ضرر ہوتا ہے۔ لیکن شکل ایسا ہی ہے جیسے ہم کو ماتی کہتا۔"

رابعہ پھر ہنسی اور ڈاکٹر لطیف کا چہرہ مسرت سے روشن ہو اٹھا۔ انھوں نے رابعہ کی اس خوشی کا اندازہ کر لیا جو ہنسی میں اس کے لبوں تک آئی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلے چاندی کے سکے کے کھوٹے یا اصلی سونے کا اندازہ اس کی کھنک سے کیا جاتا تھا۔ فرش پر بجنے والی خالص چاندی خود اپنی پہچان بتاتی تھی۔

"کیسی رہی تم لوگوں کی شام؟" ڈاکٹر لطیف نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بہت اچھی۔" میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ کو ابھی نہیں لگ رہی ہے؟" وہ رابعہ شرما کے ہنسی اور اندر غائب ہو گئی۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ تم کامیاب رہو گے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "کتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے؟"

"سو فیصد تو یقیناً ہوئی۔ اگر میں مبالغے سے کام نہ لوں۔" میں نے کہا۔ "کل وہ محسن اور شہلا کے گھر جانا چاہتی ہے... میرا خیال ہے وہاں رہ کے وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

"میں تمھارے یقین کی نفی نہیں کرتا... مگر کیا وہ وہاں محفوظ رہے گی؟"

"اگر مجھے ایک فیصد بھی شبہ ہوتا تو میں یہ رسک نہ لیتا۔ گھر سے محفوظ تر جگہ کا میرے ذہن میں تصور ہی نہیں لیکن رابعہ خود کو ایک کلینک میں محسوس کرتی ہو گی۔ بے شک آپ کا اور یہ گھر اور یہ ماحول مریض کے لیے اچھا نہیں۔ یہ اس کے دماغ میں ہو سکتا ہے... جہاں وہ جانا چاہتی ہے وہ اپنے گھر کی طرح ہے... اپنے گھر لوٹ کر آنے کے بعد مریض ذہنی طور پر خود کو صحت یاب محسوس کرتا ہے..." میں نے کہا۔

"میں تم سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں... جب اسے اپنے والے مل گئے اور وہ ماحول سے مطابقت پیدا کر لے گی تو اس کے ٹوٹے ہوئے رشتے قائم ہو جائیں گے مگر احساس تحفظ کا شرط ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔

میں نے ان کو شب بخیر کہا اور گاڑی کو واپس لے گیا۔ یہ تھا میری نظر اوپر کے ایک روشن دریچے پر گئی۔ روشنی کے مستطیل فریم میں رابعہ کا پیکر حسن ایک عکس جمیل کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھایا اور میں نے جواب میں ہاتھ ہلا کے الوداع کہا۔ وہی تھی مگر اس کی چاہت کا احساس نیا تھا۔ عشق کی دو...

... وصال کے بعد ہجر کی شب کی کسک بھی تھی... نیا آزار تھی وہ نئی نئی تھی۔ میں اس کی ہے حسن کے نشے اور خمار میں گم تھا۔ میری نظروں میں اس کا چہرہ تھا اور میرے کانوں میں اس کی آواز... مجھے گردو پیش کی خبر ہی نہ تھی اور میں ذہن کے اندر... کے مطابق گاڑی کو ساٹھ ستر میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلا رہا تھا۔ مجھے بالکل پتا نہیں چلا کہ وہ کار کہاں سے میرے

رات کے ساڑھے گیارہ بجے سڑکیں ویران تھیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ موڑ کاٹتے ہوئے میں نے رفتار کم کی تو عادت کے مطابق بیک مرر دیکھا۔ ایک کار کی ہیڈ لائٹس کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ کار میرے پیچھے تھی۔ پتا نہیں میں نے اس کی ہیڈ لائٹس کیوں نوٹ کیں اور موڑ گیا۔ پھر میں نے دیکھا تو وہ گاڑی اتنے ہی فاصلے پر مجھے اپنے پیچھے نظر آئی۔ میں نے رفتار کم کی اور تیس پچیس میل پر آ گیا۔ وہ گاڑی اس کے باوجود پیچھے رہی۔ اس کا فاصلہ بھی کم نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو پہلے ساٹھ ستر میل فی گھنٹا کی رفتار سے میرا تعاقب کر رہی تھی اب اس کی رفتار بھی تیس پچیس میل کر لی گئی تھی ورنہ وہ چند منٹ میں مجھے اوور ٹیک کر جاتی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ تصدیق کے لیے میں نے رفتار بڑھائی۔ میرے سامنے ایک سیدھی اور خالی سڑک تھی جس پر ستر اسی میل فی گھنٹا کی رفتار ممکن تھی۔ مجھے اس سڑک پر ایک میل آگے جا کے پھر بائیں جانب مڑنا تھا لیکن میں سیدھا چلتا گیا۔ میرا شک اس وقت یقین میں بدل گیا جب پیچھے آنے والی کار نے اتنے ہی فاصلے پر موجود رہی۔ اس کی رفتار بھی اتنی ہی ہو گئی تھی۔ اس کار میں جو بھی تھا وہ ماہر ڈرائیور تھا کہ دور رہ کر خود اپنی رفتار کو ضرورت کے مطابق کم یا زیادہ کر لیتا تھا لیکن فاصلے میں فرق نہیں آتا تھا۔

میرے ذہن سے رابعہ کا خیال نکل گیا اور ایک رومانی شام کی خیالات کا نشہ ہرن ہو گیا۔ دشمن اچانک نمودار ہوا تھا کہ خطرے کا احساس تمام خیالوں پر غالب آ گیا۔ میرا ذہن تیز اور مستعد ہو گیا تھا اور میرے جسم کا رواں رواں ... ہو گیا تھا۔ فوری طور پر مجھے ایک خیال یہ آیا کہ ... کون ہو سکتے ہیں؟ شکاری تھے تو کون سے شکاری؟ ... شکاری چوہدری دلاور اینڈ کمپنی والے تھے۔ ... کے محافظ تھے جن کو میری اور ہر وقت ایک ... کی جستجو تھی۔ اب تیسری قسم کے ... تھے جو میری ذات کے دشمن نہیں تھے مگر ... تھے لیکن ان کے عزائم کی راہ میں حائل ہو کے میں نے ... سلوک اور سادھو رام ... والے شکاری تھے۔ سائیں بابا جیسا ...

اور وہ بابا کے آلو سے کی تباہی کے بعد اگر یہ شکاری بھی میرے پیچھے لگ چکے ہوں تو عجب نہیں۔ وہ انتہائی جنس کے لوگ تھے اور ان کے تجربہ و معاون جانے کتنے درمیان موجود تھے۔ ان کے لیے میرا سراغ لگانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہ تیسری قسم کے شکاری اپنی خونریزی اور تباہ کاری کی صلاحیت کے اعتبار سے پہلے نمبر پہ آتے تھے۔ ان کے لیے ایک فرد یا ایک گاؤں کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ پوری بستی کو اپنے مذموم عزائم کی بھینٹ چڑھا سکتے تھے اور ان کا مقابلہ کرنا سب سے زیادہ مشکل تھا۔

دوسرا خیال مجھے یہ آیا کہ آج تعاقب کرنے والے کب سے میرے پیچھے ہیں؟ میں تو رابعہ کے ساتھ دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا تھا کیا وہ ہر جگہ میرے پیچھے تھے لیکن بازاروں اور سڑکوں کی ٹریفک میں وہ نمایاں نہ ہوئے تھے۔ ان کا ارادہ میری جان لینے کا ہوتا تو وہ اس وقت گولیاں برساتے ہوئے نکل جاتے جب میں نے اپنی گاڑی کی رفتار کم کی تھی لیکن وہ بڑی مستقل مزاجی سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ میں نے ایک موڑ کاٹا اور تقریباً دو فرلانگ تک نسبتاً چھوٹی سڑک پر چلنے کے بعد دوسری بڑی سڑک پر مڑ کے واپس ہو گیا۔ یہ دوسری شاہراہ پہلی سڑک کے متوازی تھی۔ مجھے اس کار ڈرائیور کا خیال بھی آیا۔ کیا اس نے اشارہ بھیجا دیا تھا کہ گاڑی کس رخ گئی ہے؟ رضا کارانہ طور پر یہ سمی اس کے پوائنٹ سے پہ اطلاع بھیجے کہ اپنی جان بچانی ہوگی۔ اگر ایسا ہی ہوا تو کل اس خبیث کی خیر نہیں۔ ابھی تو مجھے اپنی جان بچانے کے لیے کچھ کرنا تھا۔

میری نظر نے اچانک بائیں ہاتھ پہ ایک کوٹھی دیکھی جس کے دو دروازے تھے۔ ایک اندر جانے کے لیے اور دوسرا باہر آنے کے لیے۔ گیٹ کھلا ہوا اور خاصا کشادہ تھا اور اس کے اوپر لائٹس تھیں جن کا پورا راستہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ گزرتے گزرتے میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اندر پورچ میں کوئی گاڑی نہیں ہے اور گیٹ پر چوکیدار نہیں ہے۔ میں کوٹھی کو ذہن میں رکھتے ہوئے سیدھا گزر گیا۔ میرے ذہن میں ایک اسکیم آ رہی تھی لیکن اس پر عمل کرنے سے پہلے میں ہر قسم کے امکانات پر اچھی طرح غور کر لینا چاہتا تھا۔ میں نے چند لمحے گہرے سانس لیے اور گاڑی کی رفتار کم کر کے سکون سے چلتا گیا۔ تقریباً سو گز کے بعد ایک چوک سا آ گیا جس میں دائیں اور بائیں جانب دو گلیاں تھیں۔ بائیں طرف کے بارے میں میرے ذہن میں کوئی نقشہ نہیں تھا لیکن دائیں جانب مڑ جانے کے بعد مجھے پھر اسی بڑی سڑک پر پہنچ جانے کی امید تھی جس سے میں چند منٹ پہلے گزرا تھا۔ اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ میں نے ایک مستطیل میں سفر کیا جس کے دو متوازی ضلعے دو فرلانگ لمبی اور زیادہ چوڑی سڑکوں پر مشتمل تھے اور چوڑائی کے رخ کے دونوں ضلعے تنگ گلیاں...

www.paksociety.com

تھیں جو سو گز یا اس سے کچھ کم لمبی ہوں گی۔

ایک بار پھر میں بڑی سڑک پر پہنچا تو موڑ کاٹتے ہوئے میں نے دوسری کار کو دیکھا۔ وہ پچاس ساٹھ گز پیچھے تھی۔ تعاقب کرنے والے بڑی مستقل مزاجی کا ثبوت دے رہے تھے۔ میرا پورا چکر تقریباً ڈیڑھ میل بنتا تھا اور پیچھے آنے والے بیوقوف نہیں تھے۔ وہ یقیناً سمجھ چکے ہوں گے کہ مجھے تعاقب کا علم ہو گیا ہے اور میں نے جان بوجھ کر انہیں چکر دیا ہے۔ اب میں پھر اس راستے پر دوسری بار گزر رہا تھا جس پر سے پانچ دس منٹ قبل گزرا تھا۔ میرا منصوبہ میرے ذہن میں مکمل ہو گیا تھا اور اس کے تمام خطرات کو سامنے رکھتے ہوئے بھی میں نے اس پر عمل کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے اسپیڈو میٹر پر نگاہ ڈالی۔ میری رفتار تیس میل فی گھنٹہ تھی۔ وہ فرلانگ بھر میں دائیں طرف مڑا اور بائیں لین میں سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پھر دائیں جانب موڑ کاٹ کر بڑی سڑک پر آ گیا۔ یہ اسی محدود علاقے میں میرا دوسرا چکر تھا جس کی حد بندی چار سڑکوں سے ہوتی تھی۔

وہ کوٹھی جس کے دو گیٹ کھلے ہوئے تھے اپنی مخصوص ساخت کی گیٹ لائٹس کے باعث مجھے دور ہی سے نظر آ گئی تھی۔ میرے دشمن ابھی پیچھے تھے۔ بڑی سڑک پر آتے ہی میں نے ایکسیلیریٹر کو دبایا اور فاکس ویگن جس کے انجن کی پک اپ کا مقابلہ بہت کم گاڑیاں کر سکتی ہیں اپنی قوت میں آ گئی۔ گاڑی کسی چیتے کی طرح جست لگا کے بڑھی اور دو ہی سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اس کی رفتار اسی میل تک پہنچ گئی۔ اس سے پہلے کہ میرے پیچھے آنے والی کار پچھلا موڑ کاٹتی میں کوٹھی کے پہلے گیٹ میں داخل ہو چکا تھا۔ اندر جاتے ہوئے میں نے رفتار کو قابو میں رکھنے کے لیے بریک پر پاؤں کا پورا دباؤ ڈال دیا تھا۔ گاڑی کے پہیوں کی گردش رک گئی مگر گاڑی اپنے زور میں گھسٹتی ہوئی بڑھتی گئی۔ ٹائر کھردری زمین پر رگڑ کھا کر گھوم گئے اور گاڑی خود بخود نوے درجے کے زاویے پر مڑ گئی۔ اتنی زیادہ رفتار پر اچانک بریک لگنے سے یہی ہوتا ہے۔ ڈرائیور پہلے سے تیار ہو اور ہوشیار ہو تو گاڑی کو گھوم جانے کے باوجود سنبھال لیتا ہے۔ ہموار سطح والی سڑک پر گاڑیاں اس حد تک بھی گھوم جاتی ہیں کہ ان کا رخ پلٹ جاتا ہے۔ اور سطح حد سے زیادہ چکنی ہو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ گاڑی الٹ سکتی ہے یا کئی قلابازیاں کھا سکتی ہے۔

یہاں میری توقع کے مطابق ناہموار کنکروں کی نیم پختہ سڑک پر گاڑی نے تھوڑا سا اثر لیا تو میں نے بریک پر سے پاؤں ہٹا لیا اور گاڑی پھر آگے بڑھی۔ گیٹ کے اندر مجھے ایک نیم دائرہ سا نظر آیا۔ پہلے گیٹ سے شروع ہونے والا راستہ پورچ سے نکلتا ہوا دوسرے گیٹ تک جا رہا تھا اور یہ نصف دائرہ کوٹھی کی چوڑائی تک پھیلا ہوا تھا۔ میں پورچ کے نیچے سے دوسرے گیٹ پر پہنچ گیا۔ میں نے گاڑی موڑی لیکن انجن بند نہیں کیا۔ میرے حواس اب اس شکاری سے زیادہ بیدار تھے جو اندھیرے سنسان جنگل میں کسی مچان پر بیٹھا شیر کے قریب آنے کی ساری علامات نوٹ کر رہا ہو۔ مجھے اس یقین پر حیرت تھی کہ پیچھا کرنے والوں نے مجھے کوٹھی کے گیٹ میں غائب ہوتے نہیں دیکھا ہو گا اور وہ سڑک کو اچانک خالی پا کے حیران بھی ہوئے ہوں گے اور پریشان بھی کہ زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ احتیاطاً میں نے گاڑی کی لائٹس آف کر رکھی تھیں اور گاڑی کا سرخ رنگ رات کی سیاہی کا جزو بن گیا تھا۔ فاکس ویگن کے انجن نے کوٹھی کے اندر رہنے والوں کو اپنی آمد کی اطلاع اپنی آواز سے دے دی تھی لیکن ابھی تک کوئی باہر نہیں نکلا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ پورچ کی لائٹ آن ہو گئی تھی۔ میں آواز پر کان لگائے بیٹھا رہا۔ چند سیکنڈ کے انتظار کا یہ وقفہ بہت مختصر ہونے کے باوجود انتہائی اعصاب شکن ثابت ہوا۔ جو کچھ میں کرنا چاہتا تھا اس میں میری کامیابی کا انحصار میرے اندازے کی درستگی پر تھا۔ ایک سیکنڈ کے فرق سے بھی میرا نشانہ خطا ہو سکتا تھا۔ میں ایک پاؤں سے کلچ دبائے اور دوسرا پاؤں ایکسیلیریٹر پر رکھے اسی طرح بیٹھا تھا جیسے شکاری بندوق کے ٹریگر پر انگلی رکھے نشانہ لیے شکار کے اس جگہ تک پہنچنے کا انتظار کرتا ہے جہاں اس پر چلائی جانے والی گولی کا ہلاکت آفریں اثر یقینی ہو اور زیادہ سے زیادہ ہو۔ چند سیکنڈ کے بعد میں نے اس کار کی آواز کو بہت قریب سے سنا۔ اس کی ہیڈ لائٹس سے پہلے والے گیٹ کے سامنے کا کچھ حصہ روشن ہوا۔ پھر میں نے کار کو پہلے گیٹ کے سامنے سے گزرتے دیکھا۔ پہلے اور دوسرے گیٹ کا درمیانی فاصلہ مشکل سے تیس گز تھا۔

میرے دماغ کے کمپیوٹر نے از خود مجھے اطلاع دی کہ دوسرے گیٹ کے سامنے سے وہ گاڑی تین سیکنڈ میں گزرے گی۔ بالکل ٹھیک وقت پر اسی خودکار دفاعی نظام نے مجھے گرین سگنل دیا اور میں نے اللہ کا نام لے کر کلچ پر سے پیر ہٹا لیا۔ ایکسیلیریٹر پہلے ہی دبا ہوا تھا۔ میری گاڑی اندھیرے میں سے یوں باہر نکلی جیسے کمین گاہ میں بیٹھا ہوا خونخوار درندہ اپنے شکار کو سامنے سے گزرتے دیکھ کر جھپٹتا ہے۔ عین اس وقت جب وہ کار دوسرے گیٹ کے سامنے تھی فاکس ویگن نے پوری قوت کے ساتھ اس کی سائیڈ میں ٹکر ماری۔ آگے فاکس ویگن کا انجن نہیں تھا۔ خالی ڈگی اور اس سے آگے بہت مضبوط بمپر تھا۔ پھر دوسری کار کے اگلے دروازے پر لگا تو ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ میں اس تصادم کے لیے تیار تھا۔ میں نے سر اور سینے کو بچانے کی کوشش میں اسٹیئرنگ پر دونوں کہنیاں لگا دی تھیں اور کچھ جھک گیا تھا۔ پھر بھی تصادم کی قوت نے مجھے سیٹ سے اچھال دیا اور میں چھت سے ٹکرا کے نیچے آیا۔ میرے کانوں نے شیشے ٹوٹنے اور دھات کی چادر کے پھٹنے کی آواز سنی اور اپنے ہاتھوں اور چہرے پر سوئیوں جیسی چبھن محسوس کی۔ یہ شیشے کے ذرات تھے جو اڑ کر میرے جسم سے چپک گئے تھے مگر میں نے آنکھیں مضبوطی سے بند رکھی تھیں ورنہ وہ کرچیاں میری آنکھوں میں اتر جاتیں۔ ان کی نوکیلی تیز دھار آنکھوں کو چیر دیتی اور میں ہمیشہ کے لیے اندھا ہو جاتا۔ اب مجھے ماتھے، سینے اور بازوؤں پر آنے والی گہری خراشوں کی ٹیسوں کا احساس ہو رہا تھا اور جو خون بہہ کر لبوں تک پہنچا تھا اس کا نمکین ذائقہ بھی مجھے محسوس ہو رہا تھا۔

جب میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو نقشہ بدل چکا تھا۔ گاڑی کو فاکس ویگن نے غیر متوقع طور پر بائیں جانب سے اتنی قوت سے ٹکر ماری تھی کہ وہ...... الٹ گئی تھی اور قلابازیاں کھانے کے بعد سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک اور کوٹھی کی دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔ دیوار بہت زیادہ مضبوط نہیں تھی۔ ٹوٹ گئی تھی اور اس کا ملبہ بھی الٹی ہوئی گاڑی پر گرا تھا۔

میری اپنی گاڑی کا سامنے کا حلیہ بگڑ گیا تھا۔ اس کا بونٹ پچک گیا تھا اور درمیان سے اوپر اٹھ گیا تھا۔ بمپر ٹوٹ کر لٹک رہا تھا اور مڈ گارڈ پچک کر ٹائروں سے لگ رہے تھے۔ ظاہر ہے ہیڈ لائٹس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا تھا۔ ڈگی پچک کر دب جاتی تو پٹرول ٹینک پچک جاتا۔ فاکس ویگن میں پٹرول ٹینک بالکل پیچھے اور ڈگی میں سب سے آگے فاضل ٹائر کھڑا رہتا ہے جس میں ہوا ہوتی ہے۔ اس فاضل ٹائر نے ہی بچاؤ کیا اور شاک کو کم کر دیا۔ اسٹپنی ٹیڑھی ہو گئی مگر پٹرول ٹینک نہ پھٹا ورنہ گاڑی میں آگ لگ جانا یقینی تھا۔

تصادم کے پہلے دھماکے کے بعد کئی دھماکے تسلسل سے ہوئے۔ دوسری گاڑی کے سر بار الٹنے سے ایک دھماکا ہوا تھا۔ اس کے دیوار سے ٹکرانے کے بعد ایک دھماکا ہوا تھا اور جب شکستہ دیوار کے ٹکڑوں نے گاڑی کو سنگسار کیا تھا تو دھماکے ہوئے تھے۔ خوفناک آوازیں رات کے سناٹے میں دور تک گئی تھیں اور وہ سب لوگ جو اپنے گھروں کے اندر بستروں میں دبکے ہوئے تھے، ٹیلی ویژن پر کوئی فلم دیکھ رہے تھے یا ڈرائنگ روم میں کسی کے ساتھ گپ لڑا رہے تھے، سب کے سب باہر آنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان میں سب سے آگے اسی کوٹھی کا مکین تھا جس کی حدود میں غیر قانونی طور پر داخل ہو کے میں نے یہ تخریبی کارروائی کی تھی۔ اب میں گیٹ سے باہر نکل چکا تھا اور پھر سڑک پر تھا۔

میری گاڑی کا انجن بند ہو چکا تھا اور میں قریب آنے والوں کی آوازیں سن رہا تھا۔ میں نے چابی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ چابی اپنی جگہ پر موجود تھی اور سوئچ آن تھا۔ ڈیش بورڈ پر سرخ دائرے روشن تھے۔ میں نے چابی گھمائی تو انجن نے اسٹارٹ ہونے میں دیر نہیں لگائی اور دونوں سرخ نشان غائب ہو گئے جس کا مطلب یہ تھا کہ آئل پریشر نارمل ہے اور ڈائنمو بھی چارجنگ کر رہا ہے۔ میں نے ایک بار پھر خدا کو یاد کر کے اس سے امداد مانگی اور گاڑی کو گیئر میں ڈال دیا۔ گاڑی آگے بڑھی اور میں نے اسٹیئرنگ گھمایا۔ گاڑی سڑک پر چل پڑی تو میں نے وہی اطمینان کی خوشی محسوس کی جو دشمن کا ایک مضبوط مورچہ کسی جانی نقصان کے بغیر سر کر لینے سے کسی کمانڈر کو ہو سکتی ہے۔ گاڑی کا نقصان کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی صرف صورت بگڑی تھی۔ کارکردگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ گاڑی کے وہیل آؤٹ ہو جاتے۔ اس کا ایکسل ٹوٹ جاتا یا ٹیڑھا ہو جاتا۔ بال جوائنٹ یا ٹائی راڈ ناکارہ ہو جاتے۔ میں نے ایک بڑا خطرہ مول لیا تھا مگر اس کے دامن میں نہ جانے کتنے چھوٹے چھوٹے خطرات پوشیدہ تھے۔ گاڑی کے ٹوٹے پھوٹے مڈ گارڈ سے ٹائر کے گھسٹنے ہوئے حصے اور دوسرے شکستہ حصوں سے بہت سی عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں مگر گاڑی چل رہی تھی۔

میں نے اپنے پیچھے بہت چیخ و پکار سنی۔ یہ دونوں طرف کی کوٹھیوں سے نکل آنے والے تھے جو دیکھ رہے تھے کہ تصادم کے بعد ایک گاڑی فرار ہو رہی ہے۔ انہیں بالکل معلوم نہیں تھا کہ حادثہ کیسے ہوا اور وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ حادثہ نہیں ایک جنگی اقدام تھا۔ میں نے اپنی گاڑی کو ٹینک کی طرح استعمال کرتے ہوئے غنیم کی قوت پر کاری ضرب لگائی تھی اور اسے ختم کر دیا تھا۔ فاصلہ اور اندھیرے میں کوئی بھی گاڑی کا نمبر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان میں سے کسی نے پتھر بھی پھینکا جو گاڑی کے پچھلے حصے پر لگا اور اتنی خطرناک صورت حال میں بھی میرے ہونٹوں پر ہنسی آ گئی۔ بے بس لوگ اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ شاباش جیتی رہو بچی! میں نے فاکس ویگن سے کہا اور خود ہی ہنسا۔ مجھے اپنی حالت کا بالکل خیال نہ تھا۔ صرف یہ احساس تھا کہ میں ایک نادیدہ دشمن کے عزائم کو خاک میں ملا چکا ہوں اور میں نے جان ہتھیلی پر رکھ کے جو بازی لگائی تھی وہ میں نے جیت لی ہے۔ وہ کون تھے اور کیا چاہتے تھے یہ جاننا اتنا اہم نہیں تھا۔ وہ میرے خیر خواہ بہرحال نہیں تھے اور نیک عزائم ہرگز نہیں رکھتے تھے۔

ایک دھماکا سن کر میں نے گاڑی روکی اور پیچھے دیکھا۔ آواز بہت دور سے آئی تھی لیکن میرے کانوں نے سن لی تھی۔ یہ تباہ ہو جانے والی کار کے پٹرول ٹینک کے پھٹنے کا دھماکا تھا۔ جہاں وہ گاڑی الٹی تھی وہاں اب ایک الاؤ روشن تھا اور شعلے بھڑک کر رقص اجل پیش کر رہے تھے۔ معلوم نہیں اس گاڑی میں کتنے آدمی تھے، کتنے زخمی ہوئے تھے اور کتنے مر گئے تھے۔ لوگ کسی کو

www.paksociety.com

باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے یا نہیں، میں نے سوچا۔ خیال یہی تھا کہ ان میں سے کوئی نہیں بچا ہوگا۔ اس قسم کے حادثے میں کون سلامت رہ سکتا ہے۔ اگر کوئی فوراً ہلاک نہیں ہوتا تو ڈھانچے میں پھنسا رہ جاتا ہے جسے نکالنے کے لیے اکثر ڈھانچے کو کاٹنا بھی پڑتا ہے۔ مدد کے لیے آنے والوں کو اتنا وقت ہی کہاں ملتا تھا کہ وہ کسی زخمی کو نکال سکتے۔ پیٹرول ٹینک پھٹنے کا اندیشہ سب کو اپنی حفاظت پر مجبور کرتا ہے اور کسی کو قریب جانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ کوئی جوشِ جذبات میں بہت آگے بڑھ گیا ہوگا تو اسے شعلوں نے ہی دبوچ لیا ہوگا۔

میں نے پھر گاڑی آگے بڑھائی۔ معلوم نہیں وہ شکاری تھے یا پیشہ ور اور کیا چاہتے تھے۔ آدمی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سارا کھیل تو تقدیر کا ہے۔ وہ والدرا یڈ کمپنی یا کسی دشمن عناصر کے آلۂ کار تھے تو ان کو اس مشن سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ اس کام کا معاوضہ لیتے وقت انھوں نے پورے عزم اور اعتماد کے ساتھ سوچا ہوگا کہ یہ کون سا مشکل کام ہے اور کام کے معاوضے میں ملنے والی رقم ان کو اتنی بڑی محسوس ہوئی ہوگی کہ وہ مستقبل کے منصوبے بنانے لگے ہوں گے جو دولت کے بغیر ہوائی قلعے تھے۔ اب وہ اپنے منصوبوں اور ان کی تکمیل کے خوابوں، امیدوں اور حوصلوں کے ساتھ راکھ ہو رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے کاغذ کے نوٹ جل کر راکھ ہو جاتے ہیں، ان کے کاغذی خیالوں کے محل ان کے وجود کے ساتھ جل کر فنا ہو رہے تھے۔

اب میں گاڑی سیدھا چلتا جا رہا تھا اور ذہنی انتشار کی کیفیت میں یہ بھول چلا تھا کہ میں سڑک پر ہوں۔ نہ جانے کتنی گزرنے والی گاڑیوں نے فاکس ویگن کے شکستہ ڈھانچے کو دیکھا ہوگا اور کیا سمجھا ہوگا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ جائے واردات پر پہنچنے والوں میں سے کوئی اپنی کار نکال کر میرے تعاقب میں روانہ ہو سکتا ہے اور کسی دشواری کے بغیر مجھے پکڑ بھی سکتا ہے۔ میرے لیے ضروری تھا کہ فوراً اس گاڑی سے نجات حاصل کر لوں۔ یہ میری اصل گاڑی نہیں تھی لیکن کاغذات اس کو یہی ثابت کرتے تھے۔ چنانچہ اس کا لاوارث یا ہماری رہائش گاہ کے قرب و جوار میں پایا جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اگر ممکن ہوتا تو میں اسے کسی پل سے دریا یا سمندر میں غرق کر دیتا مگر اس حال میں میرا پل تک پہنچنا ہی ناممکن تھا۔ پھر میں گاڑی کو کہاں چھوڑوں؟ میں نے سوچنا شروع کیا۔ یہ ماڈل ٹاؤن کا علاقہ تھا جہاں رات کے وقت چھوٹی بڑی سڑکوں پر ایک جیسی ویرانی تھی۔ میں نے ابھی تک اپنے راستے کا تعین نہیں کیا تھا اور صرف یہ کوشش کر رہا تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو خطرے کی حدود سے گزر جاؤں۔ اب میں اتنی دور آ چکا تھا کہ تعاقب میں آنے والے مجھے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ میں سوچے سمجھے بغیر چھوٹی بڑی سڑکوں پر مڑتا گیا اور آخر ماڈل ٹاؤن تک آ گیا تھا۔

پھر میں نے ایک موڑ کو پہچان لیا۔ یہاں سے قصرِ جمشید زیادہ دور نہیں تھا۔ قصر بہت پہلے کھنڈر بن چکا تھا۔ اس کھنڈر کو پھر والدرا یڈ کمپنی نے بھی استعمال کیا تھا اور جب اس خفیہ اڈے کی پوزیشن مشتبہ ہونے لگی تھی تو وہ اسے آگ لگا کے مٹی میں ملا کر چلے گئے تھے اور اس کھنڈر کے ملبے کو اپنے ماضی پر ڈال کر رخصت ہو گئے تھے۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا اور مجھے اس وقت وہی ایک ایسی محفوظ جگہ نظر آئی جہاں میں اس کار کے ڈھانچے کو چھوڑ سکتا تھا اور جہاں یہ ڈھانچہ کسی کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکتا تھا لیکن بعد میں اپنی تباہی کی داستان سنانے چوہدری والدرو تک یہ پیغام ضرور پہنچا سکتا تھا کہ اغوا کرنے کے لیے جو جال پھیلایا تھا ہم اس میں گرفتار نہیں ہو سکے۔

قصرِ جمشید کے ملبے میں ایک پُر آسیب وحشت تھی۔ اس کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر کی ویرانی میں قبرستان کا سکوت تھا اور موت کی ہولناکی سایہ فگن تھی۔ ایک بار پھر مجھے دنیا کی بے ثباتی کے خیال نے درسِ عبرت دیا۔ اجاڑ باغ کے ایک گوشے میں قصرِ جمشید کے معمار اور مالک نواب خسرو جمشید کا ڈھانچہ اب تک موجود تھا اور شاید ان کی روح بھی اپنی آنکھوں سے عہدِ رفتہ کی شان و شوکت، تزئین و آرائش اور حسن و زیبائش کے گم شدہ آثار تلاش کرتی تھی جو دولت پر غرور کی دنیاوی علامت کا طرۂ امتیاز تھے۔ شاید وہ جھونپڑیاں اب بھی آباد تھیں جن میں قصر کی ملکیت کے مہربان "خدام" اور وفا شعار رہتے تھے مگر محل والے خاک ہو کر فنا بن گئے تھے۔

گاڑی کو میں گھاس پھوس اور کوڑے کرکٹ پر سے گزار کر پچھلے حصے میں لے گیا اور حقیقت یہ ہے کہ میں ہیڈ لائٹس کے بغیر یہاں تک پہنچ جانا ہی تائیدِ ایزدی کی علامت تھا ورنہ یہ ہو سکتا تھا کہ میں کسی دوسرے حادثے کا شکار ہو جاتا یا پکڑ لیا جاتا۔ گاڑی کی اور میری حالت دیکھ کر گشت کرنے والی پولیس مجھے روک لیتی۔ … میں ان سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ … یہ گاڑی بہت شور کرنے لگی تھی اور جھٹکوں سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ ہل رہا تھا۔ اب مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میں زخمی بھی تھا۔ اندرونی چوٹوں سے بھی خستہ حال ہوں اور میرا پورا وجود درد کا … بن گیا ہے۔ گاڑی کو روکنے کے بعد میں بڑی مشکل سے باہر نکلا۔ بیٹھے بیٹھے میری کمر شل ہو گئی تھی اور ٹانگوں کے پٹھے اکڑ گئے تھے۔ زمین پر کھڑا ہونے کے بعد میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ٹانگیں سلامت تھیں۔ میں نے کوشش سے بازو گھمائے اور اوپر نیچے کیے۔ ٹانگوں

کو سیدھا کیا اور چند قدم چلا۔ میری پیشانی پر پسینہ تھا اور ہاتھوں پر زخموں سے نکلنے والا خون جم چکا تھا۔ حرکت سے یہ زخم کھلنے لگے۔ تھوڑا سا گھوم پھر کے میں نے کھنڈر کے ایک حصے کو منتخب کیا۔ ایک دیوار اندر کی جانب گر جانے سے کھلا راستہ بن گیا تھا۔ میں نے فرش پر بکھری ہوئی اینٹوں کو اس طرح ہٹایا کہ گاڑی کے پہیوں کے لیے گزرگاہ بن جائے۔ اس میں مجھے جزوی کامیابی ہوئی۔ پھر بھی سارے ملبے کو صاف کرنا عملاً ناممکن تھا اور گاڑی کا اندر پہنچنا اب بھی دشوار نظر آتا تھا لیکن میں اس وقت … کرنے سے بہتر سمجھتا تھا۔ میں پھر گاڑی میں بیٹھا اور آہستہ آہستہ چلاتا ہوا پیچھے لے گیا۔ اندھیرے میں وہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا جو میں نے دو پہیوں کے لیے بنایا تھا۔ … اپنی ڈرائیونگ کی صلاحیت سے زیادہ خدا کی مدد پر بھروسا … گاڑی کو تیزی سے چلاتا ہوا اپنے اندازے کے مطابق سیدھا … گیا۔

میرا اندازہ بہت زیادہ غلط نہیں ہوا۔ گاڑی اچھلتی جھٹکے کھاتی ملبے پر چڑھ گئی اور آدھی سے زیادہ کمرے کی تین دیواروں … داخل ہو گئی۔ میں نے گاڑی کے فرش کے نیچے زبردست رگڑ … اور گاڑی کئی بار اوپر اٹھ کے نیچے گری۔ اینٹوں کے ڈھیر نے … گاڑی کے فرش کو ادھیڑ دیا تھا اور دونوں جانب کے مڈگارڈ … تار ہو گئے تھے۔ میں نے ایک آخری کوشش کی اور گاڑی کو فرسٹ گیئر میں رکھتے ہوئے ریس دی۔ گاڑی آخری بار اچھلی اور کسی ملبے … کو عبور کر کے اتری تو سامنے والی دیوار سے ٹکرا گئی۔ میرا دل … دیر کے لیے دہل گیا۔ اگر تصادم کی قوت زیادہ ہوتی تو دیوار … گر جاتی۔ پھر بے سہارا چھت نیچے آتی جو اب تین دیواروں پر … ٹکی تھی۔ دو دیواریں اس کا بوجھ نہیں سہار سکتی تھیں۔ پھر وہ … بھی چھت کے ساتھ زمین بوس ہو جاتیں اور میں اسی … ویگن کے تابوت میں دفن ہو جاتا۔

باہر نکل کے میں نے بہت سی گھاس پھوس اور خشک … جمع کر کے گاڑی میں ڈالیں۔ کوڑے کرکٹ میں کاغذ … بھی تھے۔ دیا سلائی دکھاتے ہی کاغذ نے اور پھر گھاس نے آگ پکڑ لی۔ میں اس ملبے سے دور ہو گیا اور آگ کو بھڑکتے دیکھتا … میں اب چمڑے کے جلنے کی بو بھی شامل ہو گئی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ آگ نے سیٹوں کو جلانا شروع کر دیا ہے۔ میں … کی پناہ میں دروازے کی طرف چلنے لگا۔ ایک محفوظ … پہنچ کر میں نے چند منٹ انتظار کیا۔ پھر میرے کانوں نے پیٹرول ٹینک کے پھٹنے کا وہ دھماکا سنا جو سب کچھ تباہ کر دیتا تھا۔ آگ کا گولا سا اٹھا مگر اس کے ساتھ ہی عجیب سی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور میں سمجھ گیا کہ دھماکے نے باقی تین دیواروں کو اور چھت کو گرا دیا ہے۔ فضا میں گرد کا طوفان سا اٹھا۔ ایک چھت کے گرتے ہی اس کے اوپر تمام دیواریں بے سہارا ہو گئیں۔ اوپر کی منزل کا ایک پورا حصہ مسمار ہو گیا اور آگ کا شعلہ غائب ہو گیا۔ فاکس ویگن ملبے کے ایک بہت بڑے پہاڑ کے نیچے دفن ہو چکی تھی اور اس بات کا فوری طور پر کوئی امکان نہیں تھا کہ کوئی اس کو اپنے مدفن سے کھود نکالے گا۔ والدیکی سرخ فاکس ویگن کا یہ دوسرا جنم بھی تمام ہو چکا تھا۔

جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو میں نے آس پاس کے کچھ لوگوں کو باہر نکل کے باتیں کرتے سُنا۔ وہ شور سن کر سمجھے تھے کہ زلزلہ آ گیا ہے لیکن انھوں نے دیکھا کہ ایک پرانا کھنڈر گر گیا ہے تو وہ مطمئن ہو کے اپنے اپنے محفوظ گھروں کی خواب گاہوں میں لوٹ گئے۔ میں کچھ دور پیدل چلا گیا۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک سائیکل سوار نمودار ہوا۔ وہ رات کو گشت کرنے والا چوکیدار تھا۔ میری حالت دیکھ کر وہ رک گیا۔

"مجھے ایک گاڑی والا ٹکر مار کے بھاگ گیا بھائی۔" میں نے کہا۔ "خدا کے لیے مجھے کسی اسپتال تک پہنچا دو۔"

"اسپتال تک تو میں نہیں جا سکتا بابو۔" وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میری اسی علاقے میں گشت کی ڈیوٹی ہے۔ کتنی دور جانا ہے تم کو؟"

"باغبان پورہ سے آ گیا۔" میں نے مسکین صورت بنا کے کراہتے ہوئے کہا۔

"باغبان پورہ سے آ گئے؟ اس وقت؟" چوکیدار حیران ہو کے بولا۔ "اتنی دور جانے کے لیے تو سواری بھی ملنا مشکل ہے۔ تم کیا پیدل چل پڑے تھے؟"

"نہیں چاچا... سائیکل لے کر نکلا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کا بھی بیڑا غرق کر دیا ظالم نے... اوپر سے کار گزار دی۔"

"چلو مٹی ڈالو سائیکل پر... شکر کرو جان بچی۔" وہ ہمدردی سے بولا۔ "تم نے نمبر نوٹ کیا تھا؟"

"نمبر کیسے نوٹ کرتا چاچا... ٹکر لگی تو میں ادھر جا کے گرا... دس گز دور..." میں نے کہا۔ "ہوش میں آنے سے پہلے تو وہ گاڑی لے کر بھاگ گیا۔ سائیکل کا بھرتا کر دیا... کباڑیا قبول کرے گا تو لے گا۔"

"پھر وہی سائیکل... او میاں اگر سائیکل بچ جاتی اور گاڑی تیرے اوپر سے گزر جاتی پھر کیا ہوتا۔ کباڑیا تجھے قبول کر بھی نہ لیتا۔ عجیب ناشکرا آدمی ہے۔" چوکیدار خفا ہو گیا۔ "آخر آفت کیا تھی اس وقت نکلنے کی؟"

www.paksociety.com

"چاچا جی فوت ہو گئے ہیں... وہاں کے گھر جا رہا تھا... ابھی ڈیوٹی سے آیا تو ماں نے بتایا۔" میں نے رونے کی اداکاری کی۔

"آدھی رات کو ڈیوٹی سے آیا تھا؟" چوکیدار نے اپنی جرح جاری رکھی۔

"ہاں... سینما میں گیٹ کیپر ہوں... آخری شو ختم ہوتا ہے تو چھٹی ہوتی ہے۔" میں نے کہا اور ہائے بندگی۔ ادھیڑ عمر چوکیدار شاید رات کے وقت مشکوک حالت میں گھومنے والوں سے اسی طرح پوچھ گچھ کرتا تھا۔ میں اس علاقے میں اجنبی بھی تھا اور میری حالت یقیناً شکوک پیدا کرتی تھی تاہم میری اداکاری نے اسے میری مظلومیت کا قائل کر لیا اور وہ میری مدد پہ تل گیا۔

"پہنچ سکتا ہے ادھر سائیکل پہ...؟" وہ کچھ دیر بعد بولا۔

میں نے گھگھیا کے جیسا سر ہلایا۔ "بڑی مہربانی ہوگی۔ باغبانپورے سے..."

"میں باغبانپورے نہیں جا سکتا... میں تجھے ایک اور جگہ سے چلتا ہوں...؟" وہ بولا "رب نے چاہا تو تیرا کام ہو جائے گا۔"

اپنی پرانی چرچوں کرتی سائیکل پہ وہ میرے بوجھ کو گھسیٹ کر تقریباً آدھے میل تک لے گیا اور پھر ایک کوٹھی کے عقبی حصے میں سرونٹ کوارٹر تک لے گیا۔ مجھے اپنی سائیکل پکڑوا کے اندر فرار نہ ہونے کی تاکید کر کے اس نے دیوار پھاندی جو مشکل سے تین فٹ اونچی تھی۔ میں نے اس کو ایک کوارٹر کے دروازے پہ دستک دیتے سنا۔ کوارٹر کے روشندان میں لائٹ نے کسی کے بیدار ہونے کی خبر دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ چاچا کو چاچی کے فوت ہونے کی کہانی سنا کے اور اس کے ساتھ یہاں تک آ کے میں نے اپنا وقت تو ضائع نہیں کیا۔ لیکن مجھے کوئی نہ کوئی کہانی تو سنانا ہی تھی اور پھر اس جھوٹ کو نبھانا بھی تھا ورنہ میری حالت تو ایسی ہو رہی تھی جیسے میں جوئے کے اڈے سے ہار کے اور مار کھا کے یا دنگے فساد میں بہادری کے جوہر دکھا کے آ رہا تھا۔ چوکیدار کے مذاکرات نتیجہ خیز رہے اور وہ پانچ منٹ میں پھر دیوار پہ نمودار ہوا۔

"سلے بھلی تیرا کام بن گیا... یہ بھانجا ہے اپنا... تجھے چھوڑ آئے گا جہاں تو کہے گا۔" وہ بولا۔ "تو اسی جگہ انتظار کر... میں جاتا ہوں گشت پہ..."

میں دس منٹ تک وہیں کھڑا بھانجے کا انتظار کرتا رہا۔ پندرہ منٹ بعد جب میری تشویش بھی مایوسی میں ڈھلنے لگی تھی، ایک کسی کی جانب سے گھوڑے کے ہنہنانے اور پھر اس کے سموں کے سڑک پہ بجنے کی آواز آئی۔ وہ کار نر پلاٹ پہ بنی ہوئی کوٹھی تھی جس کا ایک دروازہ بڑی سڑک کی طرف میرے سامنے تھا تو دوسرا کہیں سائڈ روڈ کی جانب۔ تانگا ادھر سے ہی نمودار ہوا جسے کوچبان

چلاتا ہوا لا رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کی لگام تھام رکھی تھی اور خود آگے چل رہا تھا۔ اس آدھی رات کی ناوقت ڈیوٹی سے گھوڑے صاحب اور اس کے آقا دونوں کو یقیناً بیگار میں پکڑے جانے کا احساس تھا اور وہ دونوں ابھی تک سو کے پورے نہیں تھے تاہم گھوڑا اپنے مالک کا اور مالک اپنے ماموں کا فرمانبردار تھا۔

"معاف کرنا جاتی... تمھیں میں ہرگز تکلیف نہ دیتا... وہ تو تمہارے ماموں نے مجبور کر دیا...؟" میں نے کہا۔

"تم کو کیا مجبور کر دیا؟" تانگے والا بولا۔ "مجبور تو ہم کو کر دیا پیدا کر کے... ایک ہی ماما ہے... خود ہوتے تو اس وقت جگہ پر ایک کو گولی مار دیتا... سارا دن کے بعد رات کو بھی آرام نہ ملے ایسی زندگی پہ لعنت...!"

"اللہ تو تمھیں اس کا اجر دے گا ہی۔" میں نے تانگے پر بیٹھنے کے بعد کہا۔ "میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور دوں گا۔" میں نے جیب میں سے سو کا ایک نوٹ نکالا اور آگے بڑھا دیا۔ تانگے کے لیمپ کی مدھم روشنی میں اس نے یقین کیا کہ نوٹ جعلی نہیں ہے اور پلک جھپکتے میں اس کی بیزاری اور خفگی کافور ہو گئی۔ اس نے نوٹ کو چوم کر جیب میں اڑسا اور اپنا چابک لہرا کے گھوڑے کو رسید کیا... "چل اوئے نامراد... ہوا لگا پاں..." اس نے نعرہ سا لگایا۔ گھوڑے کے لیے یہ سلوک بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ ہنہنایا، اچھلا اور ہوا ہو گیا۔ سو کے نوٹ نے تانگے والے کی بشاشت میں خاطر خواہ اضافہ کیا تھا۔

"میرا ماما آپ کا کیا لگتا ہے جی؟" وہ بولا "کیا یار ہے وہ آپ کا...؟"

"ایک شریف آدمی دوسرے شریف آدمی کی مدد کرتا ہے تو وہ یار ہی سمجھا جا سکتا ہے۔" میں نے ایک فلسفیانہ جواب دیا۔

"شریف آدمی...؟" بھانجے نے طنز سے کہا۔ "اس کے کرتوت تو میری ماں سے پوچھے... مری بیچاری... تمام عمر وہ جوتیاں ہی کھاتی رہی۔ یہ سے جاتا رہا۔ ایک مراثن کو دیتا رہا جو اس کو لوٹ کے دیتی رہی اور بھاگ گئی ایک کباڑیے کے ساتھ۔ اس نے کباڑیے کو تلاش کیا اور اس کا سر پھاڑ دیا۔ تین سال جیل میں کاٹے... پھر ایک عشق پیہم رشتہ..."

سو روپے کی آسامی لانے والے ماموں کو بھی ناقدر بھانجا رسوا کرنے پہ تلا ہوا تھا حالانکہ وہ ماما جی کی ناخلف، سگی سے یہ اقتباسات پیش نہ کرتا تو میں اس کا زیادہ شکر گزار ہوتا کیونکہ میں سکون سے سوچنا چاہتا تھا مگر سفر ختم ہونے تک بھانجے میاں دل بہلانے کا شغل جاری رکھا یعنی اپنی بکواس جاری رکھی۔ ماما جی کی رنگین جوانی میں مراثن اور بھنگن کے ناکام رومانس کے

بعد بھی کئی پیدا لیٹیوں کے نام آ گئے جو میں نے نہیں گنے۔ "اب چوکیدار... بتے ہیں چوکیدار..." وہ بولا۔

"اس نے مجھے اسی جگہ اتار دو۔" میں نے کہا "کسی دن ماما جی سے زبان سے ہی تمہاری بابت ضرور پوچھوں گا۔ تم بھی مجھے فرشتے نہیں لگے۔ جیسے میں خود ایک گنہگار آدمی ہوں ویسے ہی سب ہیں۔ کیا ماما کیا بھانجا... کیا راجہ کیا پرجا...؟"

تانگے والا میری طبیعت اور میری فلسفیانہ گفتگو سے مرعوب ہو گیا۔ دل میں وہ شرمندہ ضرور ہوگا کیونکہ اس نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر تانگا موڑا۔ گھوڑے کو چلا کے گالی دی اور چابک رسید کیا اور فرار ہو گیا۔ میں اس وقت تک کھڑا رہا جب تک تانگے کے ساتھ لیمپ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ پھر میں پیدل چلتا ہوا گلی کے نکڑ تک گیا اور گلی میں داخل ہو گیا۔ بند دروازے پہ دستک دینے سے پہلے میں نے چند سیکنڈ توقف کیا۔ دروازے کے پیچھے روشنی تھی اور وہ لوگ جاگ رہے تھے۔ نہ جانے کہاں سے رات کے تین گھنٹے بجنے کی آواز آئی۔ اسے رات نہیں صبح ہی کہا جا سکتا تھا۔ میں سارا دن اور تقریباً ساری رات پھر غائب رہا تھا۔ شام کے بعد بھی وہ رات نو دس بجے تک انتظار کرتے رہے ہوں گے مگر اس کے بعد تشویش میں مبتلا ہوئے ہوں گے اور اب یقیناً پریشان ہوں گے۔ میرے دستک دیتے ہی اندر کھلبلی مچی... "کون ہے؟" محسن نے کہا اور میں نے درز میں سے جھانک کر دیکھا۔ تو وہ ریوالور لیے کھڑا ہوا تھا۔ شعلہ اس کے پیچھے تھی بلکہ اس کی بائیں طرف کھڑی تھی اور ان دونوں کے سوا کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔

"پولیس...!" میں نے بارعب اور بھاری آواز بنا کے کہا۔ "خبردار جو کسی نے فرار ہونے کی کوشش کی... تم محصور ہو گئے ہو۔" میں نے پھر درز میں سے اندر جھانکا۔ شعلہ کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ اس نے سر گھما کے محسن کے کان میں سرگوشی میں کچھ کہا۔ محسن کا اطمینان دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ اس نے شعلہ کے بازو پہ تھپکی دی اور اسے حوصلہ رکھنے کو کہا۔ اسی وقت خواجہ ٹیپ محمد نمودار ہوئے جو غالباً دوسرے کمرے میں یا دروازے کے باہر دفاعی مورچہ سنبھالے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی صورت دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ "دروازہ کھولتے ہو یا ہم توڑ دیں؟" میں نے دوبارہ دروازے پہ دستک دینے کے بجائے لات ماری... معلوم نہیں میری آواز کا فرق چھپ گیا تھا یا محسن پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ حرکت میری ہے۔ بچپن سے اب تک کی رفاقت اور دن رات کے ساتھ نے ہمیں ایک دوسرے کی اتنی پہچان کرا دی تھی کہ اب ہم ساری دنیا کو دھوکا دے سکتے تھے لیکن ایک دوسرے کو نہ چہرہ بدل کے فریب دے سکتے تھے اور نہ آواز بدل کے... اگر میں یہ کہوں کہ شعلہ دروازے

کے پیچھے سے بھی اس نے میری خوشبو سونگھ لی تھی تو شاید مبالغہ نہیں ہوگا۔

"آپ دروازہ توڑ دیں۔" محسن نے کہا "بلکہ سرکار کے دیوار توڑ دیں... ہم دروازہ نہیں کھولیں گے۔"

"اچھا بھئی ہم پولیس نہیں ہیں... ایک یتیم کے پیاسے... زخموں سے لہولہان یتیم اور لاوارث شخص ہیں... لاوارث اور یتیم ہیں۔"

"یہ یتیم خانہ ہے نہ ہسپتال اور نہ قبرستان۔" محسن نے کہا۔ "یہاں شرفا رہتے ہیں۔"

"شرفا کی اولاد... جہاں سب یتیم بستے ہیں وہ یتیم خانہ نہیں تو کیا ہے۔" میں نے چلا کر کہا۔

"اس دلیل نے ہمیں قائل کیا۔" محسن بولا اور دروازہ کھول دیا۔ وہ دروازے سے لگا کھڑا تھا اور اتنی دیر میں اصل صورت حال سب پہ واضح ہو چکی تھی چنانچہ شعلہ مسکرا رہی تھی اور استاد ٹیڈی کی بتیسی دکھائی دے رہی تھی لیکن مجھے دیکھتے ہی ان کی ساری شوخی کافور ہو گئی۔

"بھائی جان... یہ کیا ہوا ہے آپ کو؟" شعلہ چلائی۔

"سکندر بادشاہ... قسم مولا علی کی... ایک بار بتا دو جھگڑا کس سے ہوا ہے؟" استاد ٹیڈی نے عادت کے مطابق اپنی ہانکی اور مجھے اس کی دو منٹ پہلے کی حالت کا تصور کر کے ہنسی آ گئی۔

"آخر یہ کیا حرکت ہے؟" محسن بولا "بظاہر تو شدید مجروح تا قریب المرگ ہے مگر پھر بھی دانت نکال رہا ہے۔"

"آرام سے بیٹھ جاؤ ساتھیو۔" میں نے چارپائی پہ بیٹھ کے کہا "کلیجہ تھام لو بیٹے سنو پھر داستاں میری۔"

"بعد میں سنیں گی داستان۔" شعلہ لپک کر میرے پاس آئی۔ "پہلے کپڑے بدلیے... میں گرم پانی لاتی ہوں... زخم صاف کر کے دوا لگا دوں پھر آپ لیٹ جائیں۔"

"لیٹ جائیں گے... ہم لیٹ آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس کی وجہ بھی تو بتا دیں۔" مگر شعلہ نے میری ایک نہیں سنی... محسن اور ٹیڈی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ میری چوٹیں اور خراشیں معمولی نہیں ورنہ میں ناچنے میں دیر لگاتا بھی نہ ہو سکتا اور اس طرح بات بھی نہ کرتا۔ یہ صرف میں جانتا تھا کہ تھکن اور جسم کی چوٹوں کے علاوہ... بھوک اور ایک خونریز معرکے نے مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر کتنا بے حال کر دیا تھا لیکن میں دروازے سے پہلا اندر قدم رکھتے ہی گر پڑتا تو وہ سب بدحواس ہو جاتے۔ میں نے سخت جدوجہد کر کے اپنی بشاشت کو برقرار رکھا تھا اور انھیں اطمینان

www.paksociety.com

دلانے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ شعلہ نے وہ کام کیا جو صرف ایک عورت کرسکتی ہے۔ اس نے میری باتوں کو اور وضاحتوں کو غیر اہم سمجھتے ہوئے پہلے میرے آرام اور علاج کی طرف فوری توجہ دی۔ اس نے مجھے زبردستی پلنگ پر لٹا دیا اور مجھے لیٹتے ہی اتنا سکون ملا کہ میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور راحت کا احساس میری رگ رگ میں سکون بن کے اترنے لگا۔

دس منٹ میں شعلہ پانی گرم کرلائی... اس نے ایک صاف کپڑا بھگو کے میرے جسم کی خراشوں پر جم جانے والے خون کو صاف کیا۔ درد کی ٹیسیں پھر اٹھیں اور گرم پانی زخم پر تیزاب کی طرح لگا مگر مجھے اس تکلیف میں بھی مسرت کا احساس ہوا۔ یہ خیال آیا کہ موت سے متصادم ہونے کے باوجود میں اس وقت زندہ ہوں اور اپنوں میں ہوں۔ باہر کی دنیا کے خطرات سے محفوظ ہوں اور اپنی ناکامیوں کے باوجود کامیاب ہوں۔ شعلہ کے ہاتھوں میں بہن کا پیار تھا اور ماں کی ممتا تھی۔ یہ وہ ہاتھ تھے جو دعا کے ساتھ دوا بھی دیتے تھے اور دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی دعا قبولیت کا شرف پا کے لوٹتی تھی تو پیغام شفا دیتی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک سے میرے وجود کا درد قریب مٹ رہا تھا اور درد کھنچ کر نکلتا جا رہا تھا۔ وہ ایک نرس تھی... ڈاکٹر تھی اور ایک کمزور لڑکی ہونے کے باوجود اعجاز مسیحائی کی ناقابل فہم قوت رکھتی تھی۔ اس نے میرے کپڑے بھی خود ہی بدلے اور اس کام کو ایک مقدس فرض کی طرح سرانجام دیا۔ بےتکلفی سے اس نے صورت حال کی سب ذمے داری قبول کرلی تھی۔ سب کی کمان سنبھال لی تھی اور اب میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے شوہر سمیت سب اس کے حکم کے تابع ہوچکے ہیں۔ آدھے گھنٹے میں وہ زخم صاف کرکے خشک کرچکی تھی اور جہاں ضرورت تھی وہاں اینٹی سپٹک پاؤڈر چھڑک چکی تھی یا مرہم لگا چکی تھی۔ اس کے حکم پر ہی محسن نے دودھ گرم کیا تھا اور گلاس بھر دیا تھا... پھر ڈانٹ کھا کے وہ دودھ میں گلوکوز ملانے گیا اور تیسری مرتبہ سر کھجاتا ہوا گیا تو اسپرین کی گولیاں لے کر آیا۔ پھر شعلہ نے مجھے سہارا دے کر اٹھانے کے احکامات جاری کیے اور حیدری آگے بڑھا ہی تھا کہ میں اٹھ بیٹھا۔

"بہت ہوچکا میرا پوسٹ مارٹم..." میں نے کہا... "میں ہٹا کٹا ہوں۔"

"اور بہت بڑا الو کا پٹھا ہوں... یہ بھی فرمائیے۔" محسن نے کہا۔ "قسم خدا کی اتنی خدمت اس نے کبھی میری نہیں کی... اور مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہاری بہن زیادہ ہوگی... میری بیوی تو پارٹ ٹائم ہے گی۔"

"بس... ہوگیا جل کے کوئلہ۔" میں نے کہا۔ "کل تیرا بھی ایسا ہی حال کردوں گا... حکومت کر۔"

"چلیں بھائی جان یہ گولیاں کھا کے دودھ پئیں اور سو جائیں۔" شعلہ نے تنک کر کہا۔

"اور اگر میں یہ حکم نہ مانوں...؟" میں نے ضدی بچے کی طرح کہا۔

"تو میں... میں رو پڑوں گی۔" شعلہ نے عاجز ہو کے کہا۔

"دیکھا گڈو! بالکل مت ماننا اس کی بات مگر..." محسن بولا۔ "کل کو یہ بات بات پر مجھے بھی رونے کی دھمکی دے گی۔"

استاد حیدری نے ریوالور نکال کے میری کنپٹی پر رکھ دیا۔ "میں دس تک گنوں گا۔ اس وقت تک دودھ ختم ہو جانا چاہیے۔"

"اور پھر بچ گیا تو..." میں نے فوراً گولیاں منہ میں ڈال کر دودھ کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

"تو میں گیارہ سے آگے گنتی شروع کروں گا۔" حیدری نے ریوالور جیب میں رکھ کے کہا۔ میرے ساتھ شعلہ بھی ہنس پڑی۔ مگر اس نے دودھ ختم کرنے کے بعد بھی مجھے بولنے نہیں دیا... محسن اور حیدری بھی میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات جاننے کے لیے اتنے ہی بےچین تھے جتنے میں بتانے کے لیے تھا مگر شعلہ کے آگے کسی کی نہیں چلی۔

"باتیں صبح بھی ہوجائیں گی... آپ فوراً سو جائیں۔" وہ بولی۔

"نیک دل خاتون... اگر آپ غور فرمائیں تو آپ دیکھ سکتی ہیں کہ صبح ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "رات گزر گئی اور تڑکا ہوا۔ ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا۔"

"بس اب چپ..." شعلہ نے کہا۔ "چلو جی تم دونوں اُدھر یا پھر خاموشی سے یہاں لیٹے ہو جاؤ۔"

"یہ شادی سے پہلے کتنی مسکین بنتی تھی... ہٹلر کی بچی..." محسن نے زمین پر لیٹنے کی تیاری کی۔ "اصل روپ اب سامنے آیا ہے۔"

"ایک سوال کی اجازت دو بی بی۔" میں نے کہا۔ "وہ تیسرا کس حال میں ہے؟"

"اسے ہم نے زندہ رکھا ہے۔ وہ ابھی نہیں مرے گا۔" شعلہ نے کہا اور وہ بھی دوسری جانب دراز ہوگئی۔ استاد حیدری نے خاموشی سے دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ آرام دہ بستر، گرم دودھ اور اسپرین نے میرے تھکے ہوئے ٹوٹے ہوئے اور شکستہ حال جسم کو اتنا آرام پہنچایا تھا کہ نیند سے میری آنکھیں خود ہی بند ہونے لگی تھیں۔ شعلہ کے حکم نے میری ذہنی مزاحمت بھی ختم کردی ورنہ شاید میں جاگتا رہتا۔ چند منٹ میں مجھے اپنا ہوش نہ رہا۔

میری آنکھ کھلی تو دن کی روشنی میں سب سے پہلے میں نے شعلہ کو دیکھا۔ شاید وہ اسی وقت میرے قریب آکے کھڑی ہوئی تھی۔ میری حالت بہت بہتر تھی۔ جسم کا درد تقریباً ختم ہوچکا تھا۔ ذہنی طور پر میں بالکل مستعد تھا۔

"کیسی طبیعت ہے بھائی جان؟" شعلہ نے مسکرا کے کہا۔

"میری منی سی بہن تیرے ہوتے ہوئے مجھے کیا ہوسکتا ہے۔" میں نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں... وہ تیرا میاں نظر نہیں آرہا ہے۔"

"وہ غالب بھائی کے ساتھ گئے ہیں... نئے گھر کو ٹھیک کرنے۔" شعلہ شرما کے بولی۔

"اچھا؟ تو ہم سب یہاں کیوں بیٹھے ہیں... بلکہ پڑے ہیں؟" میں نے کہا۔ "ہم بھی چلتے ہیں۔"

"ہم... ہم چلیں گے! پہلے آپ ناشتا تو کرلیں۔ وقت تو دوپہر کے کھانے کا بھی گزر چکا ہے۔" شعلہ بولی۔

"کیا بجا ہے؟" میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے تین... "اس نے ٹھیک کہا۔ مجھے کسی وقت کا ناشتا کرنا ہے۔"

"تم تو پورا اصطبل بیچ کے سو گئے تھے سکندر بادشاہ۔" حیدری نے نمودار ہو کے کہا۔

"اچھا ہوا اس اصطبل میں تم نہیں تھے۔" میں نے کہا۔ "اس کالونی کے [illegible] کا کیا بنا؟"

"وہ بھی بچ گیا میرے ہاتھوں قتل ہونے سے۔" حیدری نے [illegible] اس کے اخبار میں اسی کے سوگ کا اشتہار آجاتا۔ مجھے کہہ رہا تھا کہ تمہاری شکل ہرگز شعلہ کا بھائی بننے کے لائق نہیں۔"

"پھر کس لائق ہے؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"کہتا تھا کہ تم ڈریکولا کے بھائی بن سکتے ہو۔" حیدری نے مسکرا کے کہا۔ "وہ خود ڈریکولا کی اولاد..."

"میرا مطلب تھا کہ اس کالے اخبار کے ایڈیٹر سے جو جنگ چل رہی تھی اس کا انجام کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"وہ تو [illegible] تھی۔" حیدری نے حقارت سے کہا۔ "اگلے دن [illegible] بنے ہوئے تھے۔ غالب نے اس کو وہیں بلیک میلنگ کے الزام میں [illegible] کی رپورٹ دی اور فوری گرفتار کروا دیا۔ اس خبر نے تہلکہ مچا دیا۔"

"غالب نے اصل واقعات اور حالات کی طرف تو اشارہ نہیں کیا؟" میں نے تشویش سے کہا۔ "میرا مطلب ہے یہ تو نہیں لکھ مارا کہ وہاں جو عورت کرپان والی بنی ہوئی تھی وہ کون تھی اور کیا کرتی تھی؟ کرنل جگن ناتھ سیوک یا سادھو رام کا حوالہ تو نہیں دے دیا؟"

"یار سکندر بادشاہ! یہ غالب کمینہ ضرور ہے مگر بے وقوف

روشنی کے مینار
اسلام کے خاموش مبلغوں اولیائے کرام کے دلچسپ اور پُراثر واقعات ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے
قیمت ۱۵۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

عظمت کے مینار
ضیا تسنیم بلگرامی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ
قیمت ۱۵۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

ایمان کا سفر
محی الدین نواب کی معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ وہ فن پارے جن کی آپ کو تلاش ہے
قیمت ۱۴۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

کچرا گھر
محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے
قیمت ۱۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

آدھا چہرہ
محی الدین نواب کا پہلا طویل معاشرتی ناول ان لوگوں کے لیے ایک تازیانہ جو کھرے کہلاتے ہیں اپنا اصل چہرہ چھپا کے رکھتے ہیں
قیمت ۲۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

کالی کہانیاں
جرائم، جادو، شیطانی [illegible] طنز و مزاح، اسرار و خوف، سسپنس اور تجسس پر مبنی ۲۶ کہانیاں
قیمت ۳۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

ٹوٹکے اور [illegible] کی چوپال
[illegible] قیمت [illegible]
ڈاک خرچ ۱۶ روپے

www.paksociety.com

نہیں ہے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"وہ کیفیت بھی نہیں ہے استاد۔" میں نے کہا۔ "اس گیمنی دنیا میں ہمارا واسطہ جن کیفیتوں سے پڑ رہا ہے ان کے مقابلے میں وہ ہیرا ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے کہ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔ وہ ایسا ہی دل رکھتا ہے جو خلوص کی ایک نظر سے پگھل جاتا ہے مگر تم جانتے ہو نفرت کے اعتبار سے وہ کتنا سخت جان ہے۔ گولی کیا توپ کا گولا اس سے ٹکرا کے پاش پاش ہو جائے۔"

"معلوم نہیں سکندر بادشاہ! کبھی کبھی تم عجیب باتیں کرنے لگتے ہو جو اپنی سمجھ میں نہیں آتیں۔" ٹیڈی نے مایوسی سے کہا۔

"خبر تو دوسرے اخبارات نے بھی دی ہوگی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ خبر کہاں چھپائی جا سکتی تھی۔" ٹیڈی بولا۔ "سب نے ہی اپنے نمائندوں کی معرفت موصول ہونے والی خبر کو شائع کیا تھا۔ حقیقت کسی کو نہیں معلوم۔ کسی نے اسے پُراسرار دھماکا قرار دیا ہے تو کسی نے صرف ایک بم کا دھماکا۔ ایک اخبار نے لکھا ہے کہ وہاں ڈاکوؤں کا ٹھکانہ تھا۔ دوسرے نے لکھا ہے کہ وہاں غیر قانونی طور پر آتش بازی کا سامان تیار ہوتا تھا۔ ایک نے حد کر دی۔ اس نے انکشاف کیا ہے کہ وہ قومک قسم وہاں جوا ہوتا تھا اور جوا کھیلنے والوں میں سے ایک شخص اپنا سب کچھ ہار جانے کے بعد دستی بم پھینک کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ بم اس کے گھر پڑا تھا اور وہ ہارنے کے بعد مشتعل ہو کے گھر سے لایا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ باقی سب نوسرباز ہیں۔ میرا خیال ہے سکندر بادشاہ کہ جان بوجھ کر اصل بات کو چھپایا گیا ہے۔"

"میرا خیال ہے استاد کہ تمہارا خیال ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "ان اخبار نویسوں کو پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس والوں نے قریب کہاں پھٹکنے دیا ہوگا۔ انہیں وہاں سے اسلحے کی موجودگی کے یقینی سراغ ملے ہوں گے۔ اصل بات عام ہو جاتی تو تفتیش مشکل ہو جاتی۔ ہو سکتا ہے پولیس یا ملٹری کے ذرائع نے خود ہی پریس کی بریفنگ کی ہو اور انہیں مطمئن کر کے ٹال دیا ہو یا پھر دشمن کے ایجنٹوں نے یہ افواہیں پھیلائی ہوں۔ وہ بھی اسی علاقے میں موجود اور مصروف عمل ہوں گے یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہوں گے کہ اس تباہی کے پیچھے کسی کا ہاتھ تھا یا محض حادثے کے باعث ان کا ذخیرہ تباہ ہوا۔ ملٹری کی انٹیلی جنس کو تو سب معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہاں کس قسم کا اور کتنا اسلحہ تھا۔ انہیں ہیلی کاپٹر کے ٹکڑے بھی ملے ہوں گے۔ اب یہ ایک سیاسی معاملہ بھی بن چکا ہے اور اس کی تحقیقات بہت اعلیٰ سطح پر ہوں گی۔ مفادِ عامہ میں نہ سمجھا گیا تو کسی کو حقیقت کی خبر بھی نہیں ہونے دی جائے گی۔"

"پھر بھی وہ لوگ تو خبردار ہو گئے ہوں گے سکندر بادشاہ جو یہ کام کرتے تھے۔"

"ہاں! وہ اپنے ٹھکانے بدل دیں گے۔" میں نے کہا۔ "لیکن بہرحال دری رہیں گے۔ وہ اس کاروبار سے تائب نہیں ہو پائیں گے۔ اس حادثے یا واردات کے بعد وہ نئی حکمت عملی وضع کریں گے۔ نئے افراد کا انتخاب کریں گے اور ہو سکتا ہے پرانے راستوں کو چھوڑ دیں۔ وہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ کسی کی مخبری کا نتیجہ تو نہیں تھا اور اگر کسی نے مخبری کی تھی تو وہ کون تھا۔ وہ غدار اپنے درمیان کسی غدار کو تلاش کریں گے۔"

"کیا ان کا ذہن ہماری طرف نہیں جائے گا؟" ٹیڈی نے کہا۔

"ضرور جائے گا... لیکن ہم اس ڈر سے اپنا کام تو نہیں روک سکتے۔" میں نے کہا۔ "ایم آئی ایس کا مشن تو ختم نہیں ہو سکتا... جب تک کہ ہمارے اور ملک کے دشمنوں کا پتا چلا کے ان کے ایک ایک ٹھکانے کو... سب ساتھیوں کو اور تمام وسائل کو بالکل ختم نہ کر دیا جائے۔ ہم نے ابھی تک کوشش کی ہے کہ یہ جنگ زیر زمین رہے لیکن کھلی جنگ کی نوبت آ گئی تب بھی جنگ تو ہر حال جاری رہے گی۔"

"جنگ... جنگ... جب دیکھو جنگ۔" شعلہ نے ناشتے کے ساتھ اندر آتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ ڈھنگ کی کوئی بات نہیں کر سکتے... مل کر بیٹھو گے تو آپس میں لڑنے لگو گے۔ خواجہ صاحب اور غالب کی ٹھنی رہے گی۔ سکندر اعظم اور محسن خان لڑتے رہیں گے۔"

میں نے قہقہہ مارا۔ "جارو بھوکے بیٹھے ہیں اس لڑکی کو گھر والی بنا کے ایسی کیسے ڈانٹ رہی ہے جیسے ہم بچے ہیں۔"

"جب تک آدمی خود گھر والا نہ ہو بچہ ہی رہتا ہے۔ ابھی کوئی قصے داری کا بار نہیں ہے سر پر اس لیے شتر بے مہار بنے پھرتے ہو۔" شعلہ نے مزید ڈانٹا۔ "محسن کو تو سیدھا کر دوں گی۔"

"وہ بیچارا تو پہلے ہی کتے کی دم سے زیادہ سیدھا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اوپر سے مل گئی ہے تم جیسی بیوی جو جلیبی سے زیادہ سیدھی ہے۔ رب نے ملائی جوڑی..."

استاد ٹیڈی نے سر کھجایا۔ "یار سکندر بادشاہ... کیا زمانہ آ گیا ہے۔ نئی نویلی دلہنیں کیسی بے شرمی سے منہ پھاڑ کر اپنے گھر والے کا نام لیتی ہیں۔ ایمان سے ہماری اماں تو کہتی تھیں۔ ابا جی نیک محمد کے ابا... حوالہ دیتا ہوا تو یوں کہ ان کو بتا دوں گی... وہ آئیں گے تو پوچھوں گی... نام لینے سے تو کہتے ہیں کہ نکاح کمزور ٹوٹ جاتا ہے۔"

"اور اوپر سے دعوے دیکھو کہ میاں کو سیدھا کر دوں گی... بلکہ وہ سرتاج ہوتا ہے اور شاید مجازی کا عہدہ رکھتا ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "نگوڑیاں نیک محمد زمانہ الٹا آ گیا ہے اور یہ سب قرب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ پہلے جورو کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا تھا اب جورو کے غلام ان کی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں۔ شوہر زن مرید ہو تو بیوی کر سکتی ہے ایسا دعویٰ۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"قسم مولا علی کی! ہم تو زبان کھینچ لیں۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "ایسے تو اب تک کتوائے بیٹھے ہیں کہ لڑکیوں کی زبان تو علاج بھری۔ کم بخت کیا سر پر چڑھ کے ناچتی نہیں۔" شعلہ ایکدم بپھر گئی۔

"شعلہ بی بی۔" میں نے ناشتے پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم بھی اپنے میاں کو نظر بند کر دو گی کہ خبردار جو گھر سے باہر قدم نکالا یا آوارہ گردی کی تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔ چراغ جلتے گھر واپس نہ آئے تو زندہ دفن کر دوں گی... وغیرہ وغیرہ..."

ہنستے ہنستے شعلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "یہ سب تو زبانی ہے گا... اگر اس نے تمہارا ساتھ نہ دیا... شادی میں نے اس لیے نہیں کی ہے کہ وہ گھر میں بیٹھ جائے اور تمہاری جگہ ایسے غیر مخلص کی نذر ہو جائے۔"

"تم کو اپنے سہاگ کو داؤ پر لگاتے ڈر نہیں لگتا؟" میں نے کہا۔

"میں نے تو اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگا رکھا ہے۔" وہ بولی۔ "اور میری زندگی کیا ہے؟ تم سب کی زندگی... مجھے معلوم ہے کہ تم اس کی حفاظت مجھ سے بہتر طور پر کر سکتے ہو۔ یہاں رشتے اہم نہیں کہ کون کس کا شوہر ہے اور کس کا بھائی ہے۔ وہ اتحاد زیادہ اہم ہے جس کی بنیاد پر یہ رشتے قائم ہیں۔ کیا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو کہ میں جو اس شخص سے پیار کرتی ہوں اسے تمہارے ساتھ کسی بھی مقابلے کے لیے اکیلا جانے دوں گی کہ یہ مجھے چھوڑ جاؤ... یا خود محسن میرے منع کرنے سے تمہارا ساتھ چھوڑ دے گا... ہم اگر اتنے کمینے اور خود غرض ہوتے تو ابھی تک اکٹھے رہنے کے باوجود ایک خاندان نہ بناتے۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ ہمارا خاندان اور خاندانوں سے زیادہ مضبوط ہے جو خون کے رشتوں کے باعث اپنا وجود برقرار رکھتے ہیں۔"

شعلہ کی باتیں میرے جذباتی رشتوں کی تقویت کا سامان [illegible] تو اس کا پیار کیا جاتا تھا مجھے جسمانی قوت سے [illegible] ہم دونوں کے کھانے کا وقت تھا۔ رات کے کھانے [illegible] حماقت خانہ ہونے کا ثبوت

دیتے ہوئے سینڈوچ بنائے تھے اور کافی تیار کی تھی۔ دونوں چیزوں کا اہتمام اس نے میری بھوک کا اندازہ کرتے ہوئے کیا تھا۔ پھر بھی میں سب صاف کر گیا۔ وہ مسلسل مجھے تمیز سے کھانے اور آہستہ آہستہ کھانے کی تاکید کرتی رہی مگر میں نے ندیدوں کی طرح کم سے کم وقت میں سب کچھ پیٹ کے اندر پہنچانے کی کوشش کی اور پھر نہایت بےتکے پن سے اور مانگا۔ شعلہ نے کہا کہ اب رات کو کھانا ملے گا۔ اس وقت تک صبر کرو۔ مجھے معلوم تھا وہ یہی کہے گی۔

میرے جسم کا درد برائے نام رہ گیا تھا اور حواسوں کی حالت بھی بہت بہتر تھی۔ میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں ساؤ جو رام کو دیکھنے کے لیے گیا۔ بے شک وہ زندہ تھا لیکن اس کی حالت ابتر تھی۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا اور برسوں کا بیمار لگتا تھا۔ اسے ہم نے بستر پر پٹہ باندھ کے ڈال رکھا تھا اور اس طرح پڑے رہنے سے وہ مفلوج ہو رہا تھا۔ میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگائی اور ایک کش لیا تو وہ مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"سگریٹ پیو گے ساؤ جو رام جی؟" میں نے کہا اور اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ میں نے سگریٹ اس کے لبوں کی طرف بڑھائی۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا تھا۔ میں نے کپڑا نکالا تو اس کے ہونٹ سگریٹ کو گرفت میں لینے کے لیے بڑھے۔ میں نے ایک بار سگریٹ آگے تک لے جا کے پیچھے ہٹالی... اطمینان سے ایک اور کش لیا اور ولن کے انداز میں دھواں اس کے منہ پر چھوڑا۔ وہ کچھ نہیں بولا اور رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ دوسری بار بھی میں نے یہی حرکت کی لیکن تیسری بار جلتی ہوئی سگریٹ میں نے اچانک اس کی گردن پر لگا دی اور دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبا لیا۔ وہ تڑپا مگر اس کی چیخ حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ میرے ہاتھ نے سگریٹ کو اس کی جلد پر دبائے رکھا یہاں تک کہ سگریٹ بجھ گئی اور اس کی کھال میں ایک گڑھا سا نمودار ہو گیا۔ گوشت کے جلنے کی بو جو تکوں اور کبابوں سے اٹھتی ہے تو بڑی اشتہا انگیز لگتی ہے مگر انسانی جسم سے اٹھے تو کراہیت کم اور بربریت کا احساس ہوتا ہے مگر اس وقت یہ بو میرے اعصاب پر گراں نہیں گزری۔ اس نے میرے جذبۂ انتقام کو ایک وحشیانہ مسرت عطا کی۔ جو شخص میرے سامنے تھا وہ میرا بدترین دشمن تھا۔ اگر وہ میرے باپ کا قاتل ہوتا تب بھی میں اس کے خلاف اتنے شدید نفرت کے جذبات میں مبتلا نہ ہوتا۔ میں اسے قانون کے حوالے کر دیتا یا خود انصاف کرتا تو اسے کم سے کم اذیت کے ساتھ موت کے حوالے کر دیتا مگر یہ میرے وطن کا دشمن تھا اور اس کے لیے سزائے موت بہت کم تھی۔ اسے زیادہ سے زیادہ عذاب کے ساتھ ہلاک کر کے بھی مجھے احساس رہتا کہ اس کو

www.paksociety.com

جرم کی مناسبت سے بہت کم سزا ملی۔ اس نے جتنا اسلحہ دشمنوں تک پہنچایا تھا اس سے کتنے بے گناہ مارے گئے تھے، ملکی معیشت کو کتنا نقصان پہنچا تھا۔ دشمنوں کے ہاتھ کتنے مضبوط ہوئے تھے اور ملک کی سالمیت کو لاحق خطرات میں کتنا اضافہ ہوا تھا۔ اس سب کا اندازہ کرنا ناممکن تھا۔

جب میں نے سادھو رام کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا تو وہ تقریباً بے ہوش تھا اور آہستہ آہستہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ "آخر... تم مجھے کب تک اس حال میں رکھو گے...؟" وہ کراہ کے بولا۔

"یہ تو ہم بھی نہیں جانتے اور اگر جانتے تو تمہیں پھر بھی نہ بتاتے۔" میں نے کہا۔ "ہماری پوری کوشش ہوگی کہ تمہارے لیے موت سے زیادہ کربناک موت کا انتظار ہو۔ ابھی سے کیوں پریشان ہو... موت ابھی تم سے بہت دور ہے۔ بس اس کی آرزو کرتے رہو اور دیکھتے رہو کہ موت کتنے بھیانک روپ میں ایک ایک انچ، ایک ایک ثبوت تمہاری طرف بڑھ رہی ہے۔ تمہارے وجود کا زوال، زوال مقدر ہے سادھو رام... یہ لہو ہے تمہاری دولت کے عوض اپنی جان نذر کرنے والے معصوم بچوں کا۔ بوڑھوں کا اور عورتوں کا جو تمہارے جیسے لالچی تنخواہ داروں کی فطرت کبھی سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ یہ لہو ہے ان اصولوں کا اور نظریات کا جن کی بقا کے لیے لاکھوں مسلمانوں نے ترک وطن کیا اور اپنے رشتے جانیں دیں۔ آباؤ اجداد کے ترکے ان کی یادگاریں اور ماضی کے ورثے سب قربان کر دیے تھے اور یہ لہو ہے ان کے اعتقاد کا اور یقین کا جس پر وطن کی بنیاد رکھی گئی تھی مگر جس میں تم جیسے مار آستین بھی چھپے بیٹھے تھے جنھوں نے سب کو دھوکا دیا۔ تمہارا زوال، زوال اس لہو کا قرض ادا کرے گا سادھو رام... تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ اپنی موت مرے گا۔ تمہارے ناپاک خون کا ہر قطرہ تمہارے وجود کے ناسور سے پیپ بن کے ٹپکے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے تمہارے ہاتھ مر جائیں جو ظلم زدہ نوٹوں قاتلوں کے سامنے پھیلائے گئے تھے۔ پھر تمہارے پیر مر جائیں گے جو تم کو غداری اور وطن فروشی کے راستے پر لے گئے۔ پھر تمہاری آنکھیں مر جائیں گی جو ایک طرف زر و جواہر کے انبار سے حاصل ہونے والی دنیاوی خوشیوں کے خواب دیکھتی تھیں تو دوسری طرف اس ملک کی تباہی و بربادی کا نظارہ کرتی تھیں جسے تم نے کبھی صدق دل سے ایک علیحدہ خداداد مملکت تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ پھر تمہارے کان مر جائیں گے جو ڈالر، روبل اور رنگین ناچتے جیسے سوداگروں کے سکوں کی کھنک تو سنتے تھے جو شرافت اور ایمان کا ضمیر خریدتے پھرتے تھے مگر خود اپنے ضمیر کی آواز سننے سے قاصر تھے۔ پھر تمہارا دماغ مرے گا جو اصل مجرم ہے۔ جس نے تمہیں سادھو سے شیطان بنا دیا۔ تمہاری موت کی تو فلم بننا چاہیے ٹیلی ویژن میں۔ ان کیمروں سے جو کلی کو کھل کر پھول بنتے اور ایک ایک پتی کو کھلتا دکھا دیتے ہیں حالانکہ یہ اتنا سست رفتار عمل ہوتا ہے کہ آنکھ دیکھ ہی نہیں سکتی۔ پھر تمہاری موت کے بہروپ کی یہ تصویر عبرت تم جیسے ہر غدار وطن کو سزائے موت سنانے سے پہلے دکھانا چاہیے۔"

سادھو رام آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ وہ اتنا بے بس تھا کہ ہم سے رحم کی التجا تک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا چیخنا چلانا بھی بے کار ہے کیونکہ ہم اس کی ایک نہیں سنیں گے اور وہی کریں گے جو ہم پہلے سے طے کر چکے ہیں۔ پہلے اگر اس کے دل میں امید کی کوئی کرن ہوگی کہ شاید اس کا کوئی نجات دہندہ اسے اغوا کرنے والوں کا پتا لگا لے اور اس کو چھڑا کر لے جائے تو اتنا وقت گزر جانے کے بعد یہ امید بھی دم توڑ چکی ہوگی۔ ہمارے اطمینان اور اعتماد کو دیکھتے ہوئے وہ اپنی شکست کو پوری طرح قبول کر چکا تھا۔ استاد ٹیڈی اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا اور میری گفتگو سے خاصا متاثر نظر آتا تھا۔

"ہم نے تمہیں ایک پیشکش کی تھی۔" میں نے قصداً کہا۔ "اس پہ غور کرنے کے لیے تمہیں کافی وقت ملا ہے۔ تم کسی نہ کسی نتیجے پر اب تک پہنچ گئے ہو گے؟"

"میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔" وہ بولا اور اس کی آنکھوں سے کرب کے آنسو بہنے لگے۔

"تم بتانا نہیں چاہتے تو سمجھ لو کہ تمہارے لیے اپنی مرضی پہ کاربند رہنا کل کے بعد ممکن نہیں رہے گا۔" میں نے کہا۔ "اور کل تم کچھ نہیں بتا سکو گے کیونکہ تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں تو تمہاری وفات سے قبل تمہارے دماغ کے ہر ذرے کو کھول کر ہم خود دیکھ لیں گے۔"

"ابھی تو ہم نے تفتیش شروع ہی نہیں کی۔ تم نے ابھی ہمارا تھانہ نہیں دیکھا۔" استاد ٹیڈی بولا۔

"تب تک یہ زخم تمہیں یاد دلاتا رہے گا کہ کل تک کا انتخاب تمہارے ہاتھ میں ہے۔" میں نے کہا۔ اس کے بعد میں نے چیتھڑا پھر اس کے منہ میں ٹھونسا اور واپس ہو گیا۔

شعلہ دوسرے کمرے میں تنہا کھڑی تھی اور دانتوں سے اپنا ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ غالباً اس نے میری کارروائی دیکھی تھی اور سادھو رام کے ساتھ ہونے والی گفتگو بھی سنی تھی۔ مزاج کے اعتبار سے شعلہ بالکل مختلف تھی۔ نہ وہ رابعہ کی طرح مضبوط قوت ارادی کی مالک اور حوصلہ مند تھی اور نہ اس کو نازو نعم کی طرح خطرات سے کھیلنے کی عادت تھی۔ ... جانے ساتھ رونما ہوا تھا جس میں ہمارے ساتھ اس نے معرکہ آرائی میں شرکت کی تھی اور زندگی کی رزم گاہ میں ہمارے ساتھ موت کو سر پر آزما دیکھا تھا لیکن اس کے بعد بیشتر وقت اس نے انکل شیروانی کے گھر کی چار دیواری میں گزارا تھا۔ وہ عام قسم کی لڑکی تھی جو جانتے بوجھتے آنکھیں بند کر سکتی تھی کہ اس کے اعصاب مزید صدمات برداشت کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اس کے کمزور اور بزدل ہو جانے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پہلے کی طرح اب اس کی زندگی کا مقصد صرف اپنے لیے جینا نہیں رہا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اسے محسن کے لیے جینا ہے اور شاید اس کی آنکھیں مستقبل کو دیکھتی تھیں تو اسے یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ اسے اپنے بچے کی ماں بن کے بھی بہت ساری ذمے داریاں پوری کرنی ہیں۔

"تم ڈر رہی ہو شعلہ بی بی۔" میں نے ہنس کر اس کے سر کے بالوں کو چھیڑا۔

"مجھے اس آدمی سے ڈر لگتا ہے بھائی جان۔" وہ بولی۔

"وہ ایک مجبور اور بے بس قیدی ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن یہ گھر ہے، قید خانہ نہیں۔" شعلہ نے کہا۔ "اور معلوم نہیں کیوں مجھے اس کا وجود ایک منحوس علامت کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ اس کی موجودگی نے گھر کو آسیب زدہ کر دیا ہے یہ احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا۔"

"چلو آج کا دن تھا... وہ بھی گزر گیا۔" میں نے کہا۔ "شام ہو گئی ہے۔ رات تک تم اپنے گھر پہنچ جاؤ گی اور وہ صرف تمہارا گھر ہوگا... قید خانہ نہیں۔"

"یہ نحوست زدہ شکل والا تو وہاں نہیں جائے گا نا؟" شعلہ نے کہا۔

"ہرگز نہیں جائے گا... تم دوبارہ یہ شکل نہیں دیکھو گی..." میں نے کہا۔

محسن اور غالب دس منٹ بعد آئے تو بڑی عجلت میں تھے کیونکہ غالب کو ڈیوٹی پہ پہنچنا تھا۔ انھوں نے تمام اسباب سمیٹا اور ایک ریڑھے میں ڈال کر لے گئے۔ استاد ٹیڈی کا خزانہ رکھنے میں سب سے نامعقول چیز لگتا تھا اور اس پرانے زنگ خوردہ صندوق کو دیکھنے والا کبھی اس کی اصل مالیت کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ سب سے زیادہ وزن اس لکڑی کے بکس کا تھا جس میں بارود ڈائنامائٹ رکھے ہوئے تھے۔ وقت کی سوئیوں کے ساتھ موت کا پیغام پہنچانے والے اور زندگی کے سفر کی آخری ساعتوں کو مختصر کرنے والے۔ ابھی وہ چابی کے کھلونے سے زیادہ بے ضرر تھے مگر چابی بھرنے کے بعد ان کی ہلاکت خیزی وقت کا دوسرا نام بن جاتی تھی۔ ... وقت ایک منٹ سے بارہ گھنٹے کے درمیان کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جب تمام سامان اور اسلحہ وغیرہ رکھا جا چکا تو ریڑھے کے ساتھ محسن روانہ ہوا۔ میں، شعلہ اور غالب تانگے میں پیچھے پیچھے اور تانگے ریڑھے کی باہمی چپقلش شروع ہوئی تو دونوں کے پائلٹ مقابلے پر اتر آئے۔ انھوں نے سڑکوں پر اندھا دھند گھوڑے دوڑانا شروع کر دیے جیسے لاہور نہیں بلکہ ... ہے۔ جن کو اپنی جان عزیز تھی وہ بروقت راستہ چھوڑتے گئے۔ لاہور کے رہنے والے اس قسم کے مقابلوں کے عادی ہیں اور زندہ دلی کا یہ عکس صرف تانگوں کی دوڑ تک محدود نہیں۔ میں نے بسنت پر سابقہ منٹو پارک اور اب اقبال پارک میں بڑے پتنگ بازی کے مقابلے دیکھے تھے جن میں محمود و ایاز یکساں جوش و خروش سے شریک ہوتے تھے اور کاروں کی قطاریں دیکھ کر اندازہ یہ ہوتا تھا کہ یہاں پتنگ بازی کا مقابلہ نہیں سرکاری پارٹی کا جلسہ ہو رہا ہے۔ پھر میں نے پتنگ بازوں کو ہزاروں کی شرطیں ہارتے اور پتنگ کے ساتھ سو سو کے نوٹ لٹا کر اڑاتے دیکھا تھا اور اس قسم کے مقابلوں میں پبلک پتنگ بازوں کا آخر تک اشتیاق سے ساتھ دیتی تھی جتنے شوق سے اپنے حلقے کے سیاسی امیدواروں کا۔

ریڑھے اور تانگے کی دوڑ میں پہلے ریڑھا آگے رہا۔ پھر تانگا آگے نکل گیا اور تانگے والے نے گزرتے گزرتے منہ پہ ہاتھ رکھ کے ریڑھے والے کی طرف دیکھا اور حلق سے عجیب سی آواز نکالی جو اپنے حریف کو غیرت سے ڈوب مرنے کا سگنل تھا۔ ریڑھے والے نے جواب دینے کے بجائے گھوڑے کو ایک چابک کالی سے نوازا اور اس پر کوڑے برسانے لگا۔ نتیجہ یہ کہ اگلے چند منٹ میں ریڑھا آگے نکل گیا اور اب ریڑھے کے ڈرائیور نے حلق سے وہی صدا بلند کی اور اپنا رخ تانگے والے کی طرف رکھتے ہوئے جوابی کارروائی کے طور پر قہقہہ مارا۔ "بس بادشاہ... پھوک نکل گئی۔ اوئے ایس ٹٹو نوں کبڈی کول لے جا... چھوٹے مل جان گے۔"

اب تانگے والے کی غیرت جاگی۔ اس نے اپنے گھوڑے پہ ملامت کا فقرہ اتارا۔ "حرامخور... تینوں تے اج بجلی لاواں گا۔" اس نے گھوڑے کو چابک رسید کیے اور اسے بجلی بھی لگائی جو ایک نہایت غیر شریفانہ اور نامعقول حرکت تھی مگر نتائج خاطر خواہ برآمد ہوئے۔ ریڑھا ابھی دس گز آگے ہی تھا لیکن اس فاصلے کو کم کرتے کرتے پانچ منٹ گزر گئے۔ پھر ایک کلک گھوڑا آگے نکل گیا۔ تانگے والے کا جوش انتقام ابل پڑا۔ اس نے منہ پہ ہاتھ رکھ کے بڑک ماری۔

"بس اوئے... شوکے پیو..." اس نے ریڑھے والے کی طرف دیکھا اور ہانک لگائی۔ "اوئے تین تے معاف کر دے اپنے پیو نوں... جوان مرد بن تے آپ اپنی جگہ لے لے۔" یہ بہت

www.paksociety.com

اشتعال انگیز بات تھی کہ ریڑھے والے کو اس کے گھوڑے کی ضعیفی کا طعنہ دیا جائے اور یہ بھی کہا جائے کہ وہ ضعیف جانور اس کا باپ ہے جس کے ساتھ وہ نہایت ناروا سلوک کر رہا ہے چنانچہ وہ خود ریڑھا کھینچے اور گھوڑے کو اپنی جگہ بٹھا دے۔ اس کے بعد بہت سخت مقابلہ ہوا جس میں ایسا وقت بھی آیا جب دونوں گھوڑے ایک رفتار سے جان کی بازی لگاتے ہوئے مسافروں کی جان کی بازی اور ریڑھا تانگا بہت کم چوڑی سڑک پر متوازی دوڑتے رہے۔ ایک بار دونوں کی باڈی مس ہوئی اور شہلا کا خوف سے بُرا حال ہو گیا۔ اس کو یقین تھا کہ دونوں کے پہیے نکل کے نکل جائیں گے اور ایک ایک پہیے پر دوڑنے والے تانگے ریڑھے کے معزز مسافر اور ان کا اسباب سڑک پر یوں بکھر جائیں گے جیسے منتشر ہو جانے والے جلسے میں پبلک کے جوتے ٹوپیاں، لیکن مشکل یہ تھی کہ ایک طرف سے محسن اور دوسری طرف سے مرزا غالب دونوں کوچبانوں کو شہہ دے رہے تھے اور مقابلے میں شدت پیدا کرنے کے لیے آگے نکل جانے پر شاباش کا نعرہ لگاتے تھے تو راستے پر غیرت کو للکارنے لگتے تھے۔ ایک ٹریفک کانسٹیبل نے اس ریس میں دخل در معقولات کی واجبی سی کوشش کی اور پھر چھلانگ مار کے اپنی جان بچائی۔ وہ بھی لاہوریا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس وقت قانون کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہے فتح ہے یا شکست ہے۔

بالآخر میں نے مجبور ہو کے تانگے والے سے کہا۔ "بھائی... خدا کے واسطے ہماری جان معاف کر دو۔"

تانگے والا بھونچکا رہ گیا۔ "کیوں صاحب... کیا ہو رہا ہے؟"

"ہوا تو کچھ نہیں مگر ہو جائے گا۔ یہ لڑکی بیمار ہے۔ حادثہ ہوا پھر تو سب ہی اللہ کو پیارے ہوں گے مگر یہ اس سے پہلے ہی مر جائے گی۔" میں نے کہا۔ "میں مان لیتا ہوں کہ تم ریس جیت گئے۔"

تانگے والے کا دل ٹوٹ گیا۔ اسے ہم سے ایسے حوصلہ شکن رویے کی امید نہیں تھی۔ اس وقت وہ آگے نکل چکا تھا اور اس کے عزائم بلند تھے۔ ہمارے مجبور کرنے پر اس نے گھوڑے کو بریک لگائے اور پلک جھپکنے میں ریڑھا آگے نکل گیا۔ ریڑھے والے نے اندازہ کر لیا تھا کہ تانگے والا مقابلے سے دستبردار ہو گیا ہے اور ریڑھے کو واک اوور مل گیا ہے۔

"ہا... اوئے مک گیا تیرا شوق۔" ریڑھے والے نے حلق سے قلقاریاں ماریں اور بہت اُدھم مچائی۔ "ایس نے کی مقابلہ کرنا سی جیہڑے شیر نر وا۔"

تانگے والے کا حقارت سے بُرا حال ہو گیا۔ "اوئے گھوڑا تے میرا وی شیر ہے... پر کی کراں... سواریاں..."

جو بات اس نے چاہتے ہوئے بھی کی وہ ہمارے لیے باعث شرم تھی۔ اس نے اپنے گھوڑے پر الزام نہیں آنے دیا اور صاف کہہ دیا کہ گھوڑا تو کبھی نہ ہارتا مگر سواریاں ہی ایسی مل گئیں۔ اس نے جو لفظ استعمال کیا تھا اس سے ہم بزدل... بے غیرت... احمق اور نہایت گھٹیا درجے کی مخلوق ثابت ہوتے تھے تاہم اس الزام کو قبول کرنا موت کو قبول کرنے سے بہتر تھا جب دونوں گھوڑے وقت کے معمول سے فرق کے ساتھ آگے پیچھے رکے تو دونوں کے ڈرائیور ایک ساتھ اترے اور چائے پینے چلے گئے۔ مقابلہ ختم ہو جانے کے بعد معاملہ بھی ختم اور دل صاف۔ دوستی کمال کی وہ چیز تھی جسے انگریزی میں اسپورٹس مین اسپرٹ کہا جاتا ہے۔ وہ دونوں ہم سے ناراض تھے اور چائے پینے کے لیے جانا باہم تعاون کی تحریک تھی جس میں دونوں حریف ایک ساتھ شریک تھے۔ مجبوراً ہم نے اپنا سامان خود ہی اتارا اور گھر کے اندر لے گئے۔

وہ دونوں دس منٹ بعد سگریٹ کے دھوئیں اڑاتے ہوئے نمودار ہوئے تو میں نے ان کو سو سو کے نوٹ پیش کیے۔

"یہ تم دونوں کا انعام۔ مقابلہ زبردست رہا۔" میں نے کہا۔

"اوجی مٹی پاؤ مقابلے تے..." تانگے والے نے کہا۔ "اسی کوئی پیسے لے کے تماشا دکھاتے ہیں جی؟"

"ساتوں لوگ پیسے چاہییں نہ تہ جناب... اپنا انعام اپنے کول رکھو۔" ریڑھے والے نے بے رخی سے کہا۔ میں نے شرمندہ ہو کے سر کھجایا اور انھیں پچیس پچیس روپے دے دیے۔ ان کے جذبے نے مجھے متاثر کیا تھا۔ ان کے لیے پیسہ اور انعام حقیر اہم تھا۔ مقابلہ تو لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ... کی روایت تھی اور میں نے ان کا لہو ٹھنڈا کر دیا تھا تو اس کی تلافی پیسہ نہیں کر سکتا تھا۔

گھر رنگ کی ایک گلی میں تھا اور باہر سے اتنا اچھا نہیں لگتا تھا جتنا اندر سے اچھا تھا۔ اس میں چار کمرے تھے۔ باہر کے بڑے کمرے کو جو ڈیوڑھی سے ملحق تھا ڈرائنگ روم کا نام دیا جا سکتا تھا۔ یہ پرانی طرز کا مکان تھا اور اسے بنانے والوں نے باہر کی طرف مردانہ بنایا ہوگا۔ ڈیوڑھی کے بعد مختصر سا دالان آ جاتا تھا جو شاید ٹوٹ میں فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ باقی تین کمرے دالان عبور کرنے کے بعد آتے تھے اور زینہ پیچھے تھے۔ تینوں کمروں کے دروازے صحن میں ہی کھلتے تھے۔ ان کے درمیان کی دیواریں ہر کمرے کو بالکل جدا رکھتی تھیں۔ دائیں جانب ایک برآمدہ سا تھا اور بائیں طرف کے حصے میں باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا۔ باتھ روم کا وہ حصہ جس میں باتھ نہیں کیا جاتا اوپر چھت پر تھا۔ جیسا کہ لاہور کی پرانی آبادی کے ہر گھر کے

باوجود مکان روشن اور ہنا بنا ہوا لگتا تھا۔ اس کے اندرونی حصے میں وسیع پیمانے پر مرمت کی گئی تھی۔ دیواروں پر سارا پلستر نیا تھا اور رنگ نیا تھا۔ پرانی کھڑکیوں کی جگہ نئی بڑے شیشوں والی کھڑکیاں لگائی گئی تھیں۔ غالباً پلستر جھڑ چکا تھا اور پرانی کھڑکیوں کی لکڑی میں دیمک لگ گئی تھی۔ اب جو کھڑکیاں دروازے لگائے گئے تھے ان کے فریم لوہے کے تھے۔ گھر کی پرانی وائرنگ بھی بدل گئی تھی جو پچاس سال پہلے کی ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ باہر سے پرانا نظر آنے والا مکان اندر سے نیا بنا ہوا لگتا تھا۔ تحسین کے اس نادر کرنے انداز کے تعمیر اور نئی آرائش سے بھی بہت مدد ملی تھی۔ اس نئے گھر میں سب سے زیادہ شہلا خوش تھی۔ بالآخر اسے اپنی منزل اور اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔ یہ اس کا گھر تھا جسے اس نے اپنے ذوق سے سجایا تھا۔ اس کے لیے تمام سامان اس نے اپنی مرضی کے مطابق خریدا تھا۔ وہ سامان جو انکل شیروانی کی بیگم نے شہلا کو جہیز میں دینے کے لیے جمع کیا تھا ابھی قدیم کے گھر میں رکھا تھا۔ بیگم شیروانی کو قدرت نے بہت کم مہلت عطا کی تھی، فوزیہ کے لیے انھوں نے تمام عمر جمع کیا تھا مگر اس کی شادی کے بعد جب شہلا ان کے پاس پہنچی تو وقت اتنا نہیں تھا کہ وہ اپنے ارمان نکال سکیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ شہلا کی پوزیشن کیا ہے۔ اس کا کوئی گھر نہیں تھا جہاں سے اس کی رخصتی ہوتی۔ اسے انکل شیروانی کے گھر سے رخصت ہو کے اسی گھر میں رہنا تھا۔ وہ ان کی بیٹی بھی تھی اور بہو بھی۔ بیگم شیروانی نے اندازہ کر لیا تھا کہ انھیں شہلا کی شادی یہاں بیٹے کو کرنا ہوگی اور پھر اسے بہو بنا کے گھر میں رکھنا ہوگا۔ دوسرے مرحلے کے آنے سے قبل ہی انھیں اجل نے آ لیا مگر پہلے مرحلے کی تیاری انھوں نے دیر نہیں کی تھی۔ وہ بہت کچھ بنا گئی تھیں اور جو کسر رہ گئی تھی وہ انکل شیروانی نے یوں پوری کی تھی کہ اپنا سارا بینک بیلنس شہلا کے نام کر دیا تھا اور اسے بتا دیا تھا کہ یہ اس کو باپ سے ملنے والی رقم ہے جس سے وہ جہیز کا باقی سامان خود خرید لے۔ یہ رقم بہت زیادہ نہیں تھی۔ شہلا کے کہنے کے مطابق تقریباً اسی ہزار تھی۔ انکل شیروانی ایک وضعدار، خدا ترس اور دیانت دار افسر ہوتے تھے ورنہ آج ان کے گھر ہوتی۔ وہ تقدیر اتنی نہ چھوڑتے تب بھی پاکستان کے بڑے شہروں میں ایک کوٹھی ضرور چھوڑ جاتے۔ ان کے لاکھوں سے کہیں زیادہ مختلف منافع بخش کاروبار میں ہوتے یا محسن ایک فیکٹری کا مالک ضرور ہوتا لیکن انھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد سرکاری کوٹھی خالی کر دی تھی اور بیٹی داماد کے پاس زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے۔ اپنی پرانی گاڑی انھوں نے داماد کو دے دی تھی جو پرانی تھا اور اسے صرف فیملی کے ساتھ آنے جانے میں استعمال کرنے تھے۔ غالب، نیک محمد اور میں کہ ہم اس کے نالائق بھائی ثابت

ہوئے تھے جو اس کے لیے کچھ نہ کر پائے تھے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم کچھ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کو شرمندگی کا احساس تھا اور اپنی ایک بہن کی خوشیوں کے لیے ہم سب کو بہت کچھ کرنا تھا۔

مرزا غالب نے چلتے چلتے شہلا کے سر پر پیار کیا۔ "تیرے نصیب میں یہی پر انس لکھا تھا۔ اللہ کی رضا سمجھ کے اس یتیم للعادت کو قبول کر لینا اور خوش رہنا۔"

"خواجہ صاحب کے برادر ان لاکورٹ اس کہہ کر تم پاگل ہو کہ تم کھینچ رہے ہو مرزا جی۔" میں نے کہا۔ "وہ ہوتا تو تم کو بھی اللہ کی رضا سمجھ کے بہت کچھ قبول کرنا پڑتا۔" شہلا ہنسی ہوئی ناک بھوں چڑھاتے ہوئے جیز سے اور غالب کا سر۔

"جیو ہم اسے بتاویں گے۔" محسن نے کہا۔ "سکندر نے بھی اسے پاگل کہا ہے۔ ابھی تم جاؤ اپنے پاگل خانے ورنہ وہ ایڈیٹر پھر تمھیں کاٹنے کو دوڑے گا اور تم رہتے کاٹو گے۔" شہلا کو ہنسی آ رہی تھی۔ وہ ہنسنا چاہتی تھی جتنا کہ اس کا چہرہ کھلا جا رہا تھا۔ جب میں نے واپسی کا ارادہ کیا تو اس نے مجھے روک لیا کہ کھانا کھا کے جانا۔ اس وقت کچھ پکانے کا سوال ہی نہ تھا۔ محسن ہر ٹکٹ چوک تک گیا اور دارالماہی سے تلی ہوئی مچھلی لے آیا۔ میں نے محسن کو گزشتہ دنوں کے واقعات سنائے جس میں گاڑی کی خریداری سے تباہی تک سب کچھ آ گیا۔ وہ ہکا بکا بیٹھا رہا اور شہلا تو کھانا بھول گئی۔ اس کے لیے ایک دن کے یہ واقعات ایک پوری قسم کی اسٹوری سے زیادہ حیران کن اور سنسنی خیز تھے۔

"اگر یا تجھ کو فائدہ منظور ہوتا تو میں یقیناً یہ کہتا کہ تو نے سولہ ہزار روپے غارت کر دیے۔" محسن بولا۔ "مگر اس کی ذہنی کیفیت میں اتنی جیش رفت ہوئی ہے تو سولہ ہزار کچھ بھی نہیں۔ تجھے کل بھی سولہ ہزار خرچ کرنے کی اجازت ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ اس ہفتے کے ختم ہونے تک وہ پرانی لالہ پھر جائے وہ میاں ہوگی۔" میں نے کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" محسن نے کہا۔ "لیکن یار وہ کون لوگ تھے جو تیرے پیچھے لگ گئے تھے؟"

"شکاری۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔ "اس سے زیادہ میں کیا کہوں۔"

"یہ تو ویسی ہی بات ہے جو ایک تھانیدار نے چوری کی واردات میں بہت تحقیق و تفتیش کے بعد کہی تھی۔" محسن بولا۔ "کہ واردات میں چوروں کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ ایسے یار شکاری تو سب ہیں۔"

"میں اپنے جواب پر قائم ہوں۔ میں یہ نہیں دیکھ سکا کہ

www.paksociety.com

وہ شکاری کس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ پولیس سے، چوہدری دلاور اینڈ کمپنی سے یا سادھو رام کے ساتھیوں سے۔ یہ کاسہ وانی اندھیرے میں ہوئی تھی اور میں وہاں سے فوراً بھاگ کھڑا ہوا تھا۔"

"تو نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ تیرے پیچھے کہاں سے لگے... کیسے لگے...؟"

"میں صرف ایک چیز دیکھ رہا تھا برادرم۔" میں نے کہا۔ "میں پیچھا اور دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے والی کیفیت تھی۔ رابعہ کی تلاش میں میرا تعلق باقی دنیا سے کٹ گیا تھا۔"

محسن نے صبر کیا اور میری دلیل کو تسلیم کیا۔ "پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے گاڑی کا پتا کیسے چلا لیا؟"

"ایک نظریہ تو یہ ہے کہ اس سیلز مین نے خود استاد پیڈو کو مطلع کر دیا اور انھوں نے شہر بھر میں اپنے کتے چھوڑ دیے جنھوں نے بالآخر ہمیں ڈھونڈ نکالا۔ اب وہ ہمارے پیچھے اس لیے لگے ہوئے تھے کہ ہمارا موجودہ ٹھکانا دیکھ لیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس شوروم کے سیلز مین کو سچ بولنا پڑا ہو۔ سامنے بندوق کی نال سے موت جھانک رہی ہو تو کوئی بہادر بننے کی بیوقوفی نہیں کرتا لیکن دوسرا نظریہ یہ بھی ہے کہ گاڑی کو وہاں کھڑا کرنے کے بعد اور سیلز مین کو تمام ہدایات دینے کے باوجود استاد پیڈو نے اپنے انتظامات کو ناکافی سمجھا اور شوروم کے باہر کسی کی ڈیوٹی لگا دی جس کا علم شوروم والوں کو بھی نہ ہو اور وہ شخص دیکھتا رہا کہ یہ گاڑی کب کس کے حوالے ہوتی ہے۔ یہ ایسا جوا تھا جس میں کامیابی کے امکانات دس فیصد بھی نہیں تھے کیونکہ شہر میں درجنوں شوروم ہیں جہاں سیکڑوں کاریں برائے فروخت کھڑی ہیں۔ یہ استاد پیڈو کی نہیں چوہدری دلاور کی ذہانت کا کرشمہ تھا۔ اس نے کہا ہوگا کہ وہ سکندر اعظم کا گھوڑا! اسے فاکس ویگن پسند ہے اور لال رنگ کی فاکس ویگن تو اس کی جذباتی کمزوری ہوگی۔ جیسے مجنوں کو سگ لیلیٰ سے بھی پیار تھا ایسے ہی سکندر کوئی پرانی گاڑی تلاش کرنے نکلا تو ممکن ہے ادھر آ جائے اور پھنس جائے اور جناب محسن خان خیروانی... ہم جو اکیسویں صدی کے سب سے بڑے عاشق اور احمق ہیں، اس کی توقعات پر پورے اترے اور پھنس گئے۔ اس کو ہم اپنی حماقت اطفال اور دلاور کی خوش قسمتی بھی کہہ سکتے ہیں۔"

"بشرطیکہ ہم پیچھا کرنے والوں کو دلاور کے نمائندے مان لیں۔" محسن بولا۔

"میری چھٹی حس کہتی ہے کہ وہ اسی کے بھیجے ہوئے شکاری تھے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ پولیس ہوتی تو ہمارے نقش قدم... میرا مطلب ہے نقش پا تو ہر کہیں چلتی رہتی، آ کر گرفتار کر لیتی۔"

"ہماری عقل مند پولیس بعض اوقات وہ نہیں کرتی جو اسے کرنا چاہیے۔" محسن بولا۔

"بعض اوقات! پولیس کبھی وہ نہیں کرتی جو اسے کرنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "مگر رات کی بات مختلف تھی۔ اگر وہ دلاور کے دشمن ہوتے تو اتنی دیر کبھی نہ لگاتے۔ وہ چند منٹ میں ہم پر پہنچتے یا ہم کسی گن سے بھونتے ہوئے نکل جاتے۔"

"یار یہ کیا ہے؟" محسن نے اچانک اخبار کا ایک صفحہ میرے سامنے کر دیا جس میں وہ پچھلی رات آیا تھا۔ صفحہ تیل سے چکنا ہو رہا تھا اور کچھ پھٹ بھی گیا تھا مگر اس خبر کو پڑھا جا سکتا تھا جس پر محسن نے انگلی رکھی تھی۔ خبر کے ساتھ جو تصویر تھی اسے بھی میں نے فوراً شناخت کر لیا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ یہ گزشتہ شب شائع ہونے والا ضمیمہ تھا۔

"یہ تو وہی سیلز مین ہے محسن!" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اس کا خون کس کے حساب میں لکھا جائے گا؟ ایک طرف میں اسے دھمکی دے آیا تھا تو دوسری طرف وہ تھے جو دھمکی بھی نہیں دیتے تھے لیکن معاف بھی نہیں کرتے تھے۔"

"اس نے یقیناً تیرے متعلق بتانے سے انکار کیا ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "اور جھوٹ بولا ہوگا کہ گاڑی کوئی دوسرا شخص لے گیا ہے۔"

"اور ان کے اپنے ذرائع سے یا طاقت کے استعمال سے حقیقت سامنے آگئی ہوگی۔ سیلز مین کو اسی کی سزا ملی۔" میں نے کہا۔ "اب تو کوئی شک کی بات ہی نہیں رہی کہ پیچھا کرنے والے استاد پیڈو کے آدمی تھے۔"

"آدمی ان میں کوئی نہیں... وہ قاتل ہیں یا غدار ہیں یا شیطان ہیں یا ضمیر فروش ہیں اور درندہ صفت ہیں۔ خونخوار شکاری درندے سے ملتے آدمی نہیں ہیں۔" محسن نے کہا۔ "یہ کیسی فضول خبر ہے۔ 'نامعلوم افراد کی کارروائی کے شوروم پر فائرنگ۔ ایک شخص ہلاک۔ شوروم کے مالک کا کہنا ہے کہ وہ گاڑی یا اس کا نمبر کچھ نہیں دیکھ سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گاہک کی حیثیت سے آئے تھے مگر باہر کھڑے ہوئے سیلز مین نے ان کی نیت بھانپ لی اور شور مچایا جس پر وہ فرار ہونے پر مجبور ہوگئے... خوف و ہراس پھیلانے کے لیے انھوں نے گولیاں چلائیں، ان میں ایک سیلز مین کو لگ گئی۔' سب جھوٹ بکواس۔ وہ اطمینان سے آئے ہوں گے اور انھوں نے شوروم کے سیلز مین کو گردن سے دبوچ کر پوچھا ہوگا کہ وہ لال گاڑی کون لے گیا؟ اور اس نے کہا ہوگا کہ چوہدری شجاعت بخش تو انھوں نے ریوالور سیلز مین کے سر سے لگا کر ایک گولی چلائی ہوگی جس سے اس کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا ہوگا۔ پھر وہ مالک کو بھی بیان دینے کی تاکید کر کے چلے گئے ہوں گے۔ مالک نے وہی بیان اپنی جان بچانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ نامعلوم افراد تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہوگا کہ وہ کون تھے۔ اس نے انھیں آتے جاتے دیکھا ہوگا، گاڑی اور گاڑی کا نمبر سب اسے معلوم ہے مگر وہ بزدلی کا بول بالا کرے۔ اسے زندہ رہنا ہے۔"

"میں اب چلتا ہوں یار! بہت دیر ہوگئی۔" میں نے کہا۔ "استاد بلی اکیلا بیٹھا ہم سب کی جان کو رو رہا ہوگا۔"

"میں بھی چلتا ہوں۔" محسن نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے سر دبا کے پھر بٹھا دیا۔

"خبردار جو باہر نکلنے کا سوچا۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہاں یا شہلا اکیلی رہ گئی؟"

"یہ تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو... ایسے بالکل نہیں چلے گا۔" محسن نے بے بسی سے کہا۔ "تم لوگ مجھے بیچارہ یا پالتو شوہر بنا کے گھر میں قید کرنا چاہتے ہو۔ مجھے اپنے سے الگ کر رہے ہو۔"

"نہیں۔ جب تمھاری ضرورت ہوگی تو ہم کہیں گے کہ اٹھ باندھ کر کیا کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن آج کی رات تو کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ کوئی کام نہیں ہے۔ میں تیرے جذبات کی قدر کرتا ہوں مگر تو شہلا کے جذبات کی قدر کر۔ شب بخیر... صبح کسی وقت ہم زندگی بیٹھیں گے۔" باہر نکل کر میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور گلی میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ موڑ تک جاتے ہوئے مجھے ایک رکشا ملا جو در حقیقت ایک متحرک ہیولا تھا اور آگے آتا تو خیر چلتا تھا مگر دائیں بائیں بھی ڈولتا تھا۔ تمام راستے مجھے اندیشہ رہا کہ اس کا کوئی حصہ یا تمام حصے کسی ایک طرف گر جائیں گے۔ پھر میں سڑک پر بکھرا جاؤں گا اور رکشے والا اپنی سیٹ پر پریشان اس حصے کے ساتھ نکل جائے گا جس میں دو پہیے اور انجن باقی بچے ہوں گے لیکن اللہ نے فضل کیا اور میں پہلے کا پورا منزل مقصود تک پہنچا۔ دونوں گھروں کے درمیان کچھ سات میل کا فاصلہ تھا مگر میٹر کے حساب سے چودہ میل ثابت ہوا۔ غالباً ہیولا جھلانے کے باعث بڑھا تھا۔ میں اپنے گھر کی گلی میں داخل ہوا تو مجھے ذرا عجیب سا لگا۔ ابھی میں جس گھر کو پیچھے چھوڑ آیا تھا وہ بیٹی کا گھر تھا۔ جیتا جاگتا... محفوظ... خوشیوں سے معمور اور بارونق... اس گھر میں اب کچھ نہیں رہا تھا جہاں سادھو رام قید تھا۔ سب کے چلے جانے کے بعد یہ واقعی ایم آر ایس کا تھانہ رہ گیا تھا اور ایک عارضی پناہ گاہ۔ دروازے کے سامنے مجھے بابے لینڈ لارڈ کی کھڑکی کھلی ہوئی دکھائی دی۔ "اللہ آؤ جی سوہنیو!" وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "ہم تو آ گئے تھے کہ پھر کب آسمان سے کا؟ مگر یہاں تو بندہ ہے نہ بشر۔"

"کیوں! اچھا بھلا نیک محمد صاحب کو آپ بندوں میں شمار نہیں کرتے۔" میں نے کہا اور استاد ٹیڈی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خلاف معمول کچھ اترا ہوا تھا۔

"بندہ تو اُدھر بھی ایک رکھا ہوا ہے تم نے۔" وہ بولا۔ "مگر ایسے... جیسے چوری کا مال ہو... کیا قصہ ہے جی؟"

"قصہ بڑا عجیب ہے جناب!" میں نے صحن کے ساتھ فرش پر بیٹھ کے کہا۔ "یہ بھارتی جاسوس ہے۔"

لینڈ لارڈ ایسے اچھلا جیسے کسی نے پیچھے سے آ کر اس کے کان کے پاس پٹاخہ چلا دیا ہو۔ "کو... کون... بھارتی جاسوس... یار یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے... ابھی یہ تمھارا دوست کہتا تھا کہ اس کا دماغ خراب ہوگیا تھا اس لیے باندھ کر ڈالا ہوا ہے اور یہ تمھارے والے کا چچا ہے... تم کہتے ہو بھارتی جاسوس ہے۔"

"یہ واقعی بھارتی جاسوس ہے۔" میں نے کہا۔ "نیک محمد بیچارا مرضی کے بغیر تم کو اصلیت نہیں بتا سکتا تھا۔"

"یا میرے مولا۔" لینڈ لارڈ نے سر تھام کے فریاد کی۔ "یہ بھارتی جاسوس کدھر سے آ گیا یہاں... اور یار وہ خدا کا کچھ خوف کرو... کیا بھارتی جاسوس بھی کوئی چیز ہوتا ہے جو تمھارے ہاتھ لگ گیا۔"

"ایک تو ہمیں تمھارا نام معلوم نہیں... کچھ بتایا تو ہوگا تم نے...؟" میں نے کہا۔

"میرے کو تو بہت نام ہیں جی... ماں باپ نے کچھ رکھا تھا۔ یاروں نے کبھی کچھ کر دیا۔" وہ بولا۔ "کبھی کچھ... آج کل سولا جیت کہتے ہیں۔ یہ جیت چلاتا ہوں نا جو آپ کے دروازے کے باہر کھڑا ہوا ہے۔ بیوی چن ماہی کہتی ہے۔"

"واہ واہ... سب سے اچھا یہی ہے... چن ماہی۔" میں نے کہا۔ "تو بھائی چن ماہی... ہم نے اس بھارتی جاسوس کو بڑی بھاگ دوڑ اور کوشش سے گرفتار کیا ہے..." میں نے اور ٹیڈی نے بیک وقت ریوالور نکالے اور جیب میں ڈال لیے۔

"تم نے گرفتار کیا ہے... کون ہو آخر تم لوگ؟" چن ماہی کا رنگ اڑ گیا۔ "پولیس والے یا فوجی؟"

"تم کچھ بھی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔ "ہمارا کام یہی ہے۔ اس لیے ہم خود کو چھپا کے رکھتے ہیں اور اپنے بارے میں اصلیت کسی کو نہیں بتاتے۔ نہ اپنا صحیح نام اور نہ پتا۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو جانتے ہو ساتھ ہمارے گھر والوں کی زندگی بھی محفوظ نہ رہے۔"

"وہ... وہ تو ٹھیک ہے جناب والی..." چن ماہی کا حلق خشک ہونے لگا تھا۔ "لیکن کسی کو معلوم ہو گیا تو میرا کیا بنے گا؟"

"کسی کو آخر کیسے معلوم ہوگا؟" میں نے اطمینان سے کہا۔ "ہم تو بتانے سے رہے۔ تمھاری زبان سے ہی کچھ نکلے گا تو بات پھیلے گی ورنہ یہاں کسی کا بھی آنا جانا نہیں ہے۔ تمھارا تو شہر چند روز رہنا چاہیے۔"

www.paksociety.com

"سب دیکھ لوں... میں نے مرنا ہے ہی تو کھل کے۔" وہ بولا۔
"لیکن جناب عالی..."
"یہ کیا جناب عالی/جناب عالی شروع کر دی ہے تم نے... اسے بھی ہم تمہارے گزشتہ وار ہیں اور اس کے علاوہ دوست ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس حد تک ہم میں کوئی فرق نہیں کہ ہم بھی سچے پاکستانی ہیں اور تم بھی۔ یہ جاسوس بھی خود کو پاکستانی ہی کہتا تھا اور تقسیم کے وقت ہجرت کر کے یہیں آگیا تھا۔ یہاں کے لوگوں نے اس کے ساتھ محبت کا سلوک کیا اور اسے برابر کی عزت دی۔ کبھی اسے ہندو سمجھ کر اس سے تعصب نہیں برتا۔"
"یہ ہندو ہے؟" چمن ماہی پھر اچھلا۔ "کیا نام ہے اس کا؟"
"نام تم کو بتا دیتے ہیں۔ اس کا نام ہے سادھو رام۔" میں نے کہا۔ "کام یہ شیطانوں والے کر رہا تھا۔ یہ پاکستان سے بھارت کی سرحد تک اسلحہ پہنچاتا تھا اور وہاں سے اسلحہ آگے جاتا تھا مشرقی پاکستان... جہاں ہمارے دشمن ملک کے اندر گڑبڑ پھیلانے میں مصروف ہیں اور بھائی کو بھائی سے الگ کر دینا چاہتے ہیں۔"
"توبہ رب دی!" چمن ماہی نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔ "ایسے ذلیل بندے کو آپ نے زندہ کیوں چھوڑا ہوا ہے بادشاہو! آپ تو مجھے اجازت دو کہ میں اس کی گچی مروڑ دوں۔"
"ابھی نہیں۔ بعد میں اپنی خواہش ضرور پوری کرنا۔" میں نے کہا۔ "پہلے ہمیں اس سے پوچھ گچھ کرنے دو۔ ہمیں اس سے ان سب کے نام پوچھنے ہیں جو یہاں اس کے مددگار تھے اور پھر ان کو بھی پکڑنا ہے... یہ کام بہت مشکل اور خطرناک ہے لیکن تم کو ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔"
"او جی! ڈرتا کون کافر ہے۔" چمن ماہی بولا۔ "ہم تو آپ کے ساتھ ہیں۔ یہ جان کب تک بچا کے رکھیں گے اور اگر مرنا ہو تو سب سے اچھی موت وہی ہے جی جو... جو شہادت کی موت ہو... وطن کے لیے نصیب ہو یا کسی نیک کام میں جان قربان کرتے ہوئے ملے۔ وہ کیا شعر ہے جی علامہ صاحب کا...؟"
"مسلمان کے لیے دنیا دونوں میں سرفرازی ہے۔" میں نے کہا۔ "مرنے سے شہید اور زندہ رہ جانے سے غازی ہے۔"
"اللہ بھلا کرے آپ کا۔ میں نے کسی سے سنا تھا۔" وہ خوش ہو کے بولا۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر مجھے غازی یا شہید کر دو۔"
مجھے اس کی بات پر ہنسی آئی مگر اس کی حب الوطنی کے جذبات نے مجھے متاثر بھی کیا۔ "تم اس جہاد میں ہمارے ساتھ شریک ہو چکے ہو چمن ماہی... اس گھر کو استعمال کرنے کی اجازت دے کر اور رازداری کی قسم کھا کر تم ہمارے ساتھی بن گئے ہو۔ بس تمہارا اتنا ہی کام ہے کہ کسی کو کچھ پتا نہ چلنے دو۔ یہی کہتے رہو کہ ہم تمہارے کرائے دار ہیں اور کوئی حرج نہیں اگر اسے پاگل بنا دو، ہم تمہارا کسی کا بھی رشتے دار کہہ دو۔"
"خدا نہ کرے کہ ایسے ذلیل رشتے دار ہوں جی آپ کے۔" چمن ماہی بولا۔ "مگر آپ بالکل فکر مت کریں۔ آپ کسی کے منہ سے بھی سنو تو مجھے غدار کہہ کے گولی مار دینا۔"
"اول تو تمہیں نقصان ہوگا نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہوا تو گورنمنٹ تمہیں اس کا معاوضہ دے گی... شکریہ گھر..."
"توبہ توبہ... معاوضہ کس بات کا جی۔ اجی پیارا پاکستان اس گھر سے کم ہے کیا؟ ایسے ہزار گھر وطن پہ قربان۔" چمن ماہی بولا۔ "اب آپ نے ساتھی بنا لیا ہے تو ساتھ دیں گے مرنے کی طرح۔ بولو تو ابھی جیٹ طیارہ سیدھا بارڈر کے پار لے جاؤں۔"
"تمہارا جیٹ طیارہ ایک بار جنگ میں کام آ چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر ضرورت پڑے گی تو لے لیں گے۔ سارا خرچہ گورنمنٹ کا اور تم اگر باقاعدہ طور پر اس محکمے میں شامل ہونا چاہتے ہو تو بتاؤ... ہم تمہاری سفارش کریں گے۔ تمہیں تربیت دی جائے گی اور پھر تم ہمارے ساتھ کام کرو گے۔ جب تک تربیت جاری رہے گی، تم کو وظیفہ ملے گا پانچ سو روپے ماہانہ علاوہ اخراجات۔"
چمن ماہی کا منہ کھلا رہ گیا۔ "پانچ سو روپے... علاوہ اخراجات... یعنی کھانا پینا... کپڑا سب مفت۔"
"ہاں... اور اگر تم نے تربیت کے سخت مراحل سے گزر کے خود کو اس کا اہل ثابت کر دیا تو کچھ عرصے بعد ہم دوسری رپورٹ بھیجیں گے کہ تم کو لیفٹیننٹ کا عہدہ دے دیا جائے۔" میں نے یوں کہا جیسے میں ملٹری انٹیلی جنس کا کوئی بہت بڑا اور با اختیار افسر ہوں۔
"لیفٹیننٹ... میں... میں لیفٹیننٹ...؟" چمن ماہی ہکلانے لگا۔ "آپ مذاق تو نہیں کرتے جی... میں لیفٹیننٹ بن سکتا ہوں... پکا لیفٹیننٹ...؟"
"ہاں بھئی... مگر دیکھو... ہم لوگ وردی نہیں پہنتے۔" میں نے کہا۔ "نہ میں کسی کو بتاتا ہوں کہ میں کرنل ہوں اور تیک محمد ہے کہ یہ کیپٹن ہے۔ یہ سب خفیہ عہدے ہیں، ہم ایم آئی ایس کے..."
چمن ماہی کبھی میری صورت کو دیکھتا تھا تو کبھی تیک محمد کی۔ "ایم آئی ایس... یہ کیا مطلب ہوا جی...؟"
"وہ بے ساختہ منہ سے نکل گیا۔" میں نے کہا۔ "تم بھی نام بتا لینا... ملٹری انٹیلی جنس سروس بنتا ہے اس سے۔"
ان پڑھ چمن ماہی یہ نوٹ نہ کر سکا کہ اس سے تو ایم آئی ایس بنتا ہے۔ وہ مسلسل انکشافات سے اور یہ سوچ سوچ کے پاگل ہو رہا تھا کہ کبھی ڈرائیوری چھوڑ کے وہ صرف چھ ماہ میں لیفٹیننٹ بن سکتا ہے۔ اس نے مجھے کرنل مان لیا تھا اور استاد جیلانی کو کیپٹن۔

لیکن کے معاملے میں وہ بے حد جذباتی تھا اور اب صرف یہ دیکھنا تھا کہ وہ راز کو کس حد تک راز رکھ سکتا ہے۔ پھر اسے اپنا ساتھی بنانے میں کوئی نقصان نہیں تھا۔
"ایک بات بہت اچھی طرح سمجھ لو۔" میں نے کہا۔ "اس کام میں کرنل، میجر، کیپٹن یا لیفٹیننٹ ہونا پڑتا ہے مگر اس سے زیادہ اہم فرض رازداری کا ہے۔ راز کی ایک بات منہ سے نکلی اور دشمن کے کانوں تک پہنچ گئی اور پھر برسوں کی محنت کے بدلے ناکامی ملتی ہے۔ ہم نے تو اپنی بیوی کو بھی نہیں بتایا کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم پولیس میں ہیں اور ہمارا کام اسمگلروں کی نگرانی کرنا ہے۔ تم بھی اپنی بیوی کو زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہو کیونکہ اس کام میں بعض اوقات رات رات بھر باہر رہنا پڑتا ہے۔ آدمی پھنس جائے تو ہفتہ ہفتہ گھر نہیں آتا اور تقدیر ساتھ نہ دے تو کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ یہ سب کر سکتے ہو؟"
"میں... میری خوش قسمتی ہوگی جناب... آپ میری سفارش کر دیں اور مجھ سے قسم اٹھوا لیں۔ میری ماں کے سر کی قسم... بچوں کی زندگی کی قسم... میں قرآن پہ ہاتھ رکھ کے وعدہ کرتا ہوں کہ جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی کروں گا۔ کبھی کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا اور اپنی زبان بند رکھوں گا۔ بس آپ سفارش کر دیں تو مجھے لیفٹیننٹ بنا دیا جائے..."
"چمن ماہی! وہ وقت ابھی دور ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو بھرتی کیا جا سکتا ہے مگر تم لیفٹیننٹ چھ مہینے سے پہلے نہیں بن سکتے۔ ان چھ مہینوں میں ہم تمہاری کارکردگی پر نظر رکھیں گے۔ تم سے ہر طرح کے کام لیے جائیں گے اور تم کو ہر طرح آزمائیں گے۔ اگر تم ہر آزمائش میں پورے اترے تو کوئی وجہ نہیں کہ تم لیفٹیننٹ نہ بن جاؤ۔ کیا آج رات تم دیکھو گے کہ ہم جاسوسوں سے کس طرح پوچھ گچھ کرتے ہیں؟ تمہارا دل مضبوط ہے نا؟"
"چمن ماہی کا دل فولاد بھی ہے اور شیشہ بھی... آپ دیکھ لو گے۔" وہ فخر و غرور سے بولا۔
"واہ! کیا بات کہی ہے تم نے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ "یہ تم نے تو بالکل علامہ اقبال کی طرح کہا ہے۔"
"او جی! ہم جاہل ان پڑھ بندے علامہ اقبال کی جوتیوں کی خاک بھی نہیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "کیا فرمایا ہے انھوں نے؟"
"ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم، رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن۔" میں نے کہا۔
"ذرا اور بھی بتاؤ جی۔" وہ سر کھجا کے بولا۔ "بڑی مشکل بات ہے۔"
"مطلب یہ ہے کہ مسلمان کا دل دوستوں کے لیے ریشم ہے اور دشمنوں کے لیے فولاد۔" میں نے کہا۔ "تم نے بھی تو یہی کہا تھا۔ اب یہ بتاؤ کہ اس وقت تم کہیں سے ایک ٹب لا سکتے ہو؟"
"ٹب؟" وہ حیران رہ گیا۔ "ٹب تو نہیں... ڈرم لا سکتا ہوں۔"
"اچھا تو ڈرم لے آؤ... اور یاد رکھو... ہمارے پیشے میں حکم کی تعمیل ہوتی ہے... سوال کیے بغیر۔" میں نے کہا۔
"ڈرم تو چھت کے اوپر پڑا ہے جی... میں ابھی آتا ہوں۔" وہ بولا اور صحن کی دیوار پر چڑھ گیا۔
"سکندر بادشاہ! یہ کیا ڈرامہ کر رہے ہو؟" جیلانی نے موقع پاتے ہی کہا۔ "قسم مولا علی کی! مجھے تو لگتا ہے تم پر بھی رابعہ کی طرح کچھ... وہ ہو گیا ہے۔"
میں ہنسا۔ "ابے میاں خوجی... دیکھتے جاؤ... ہمارا یہ چمن ماہی بھی پیارے دل کا... اس کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے چمن ماہی کو اپنے ماضی کی پوری الف لیلیٰ سنانا ضروری نہیں ہے۔ یہ تو پاگل ہو جائے گا سوچ سوچ کے کس پر یقین کرے اور کس پر نہ کرے۔ اور جب اسے معلوم ہوگا کہ ہمارے تین طرف شکاری ہیں تو وہ خود جانے گا کہ ایک وقت پولیس سے اور شہر کے بدمعاشوں سے بھی دشمنی اور ملک کے دشمنوں سے بھی جنگ۔ ابھی تو ہم جو کچھ کریں گے وہ جذبہ حب الوطنی میں ہمارا ساتھ دے گا۔ تم نے دیکھا لیفٹیننٹ بننے کا سن کر اس کا خوشی سے کیا حال ہوا تھا۔ وہ ہماری مدد کرے گا تو دل ہی دل میں فخر کرے گا کہ وہ وطن کی خدمت کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہا ہے۔ کوئی بہت زیادہ غلط بات بھی نہیں ہوگی کیونکہ پہلے جو میری ولادور کے ساتھ ذاتی دشمنی تھی وہ اب ذاتی معاملہ نہیں رہی۔ میں ولادور کو صرف اپنے باپ کے قاتل کی حیثیت نہیں دیتا۔ اس سے بڑھ کر وہ غدار وطن کی حیثیت سے سزا کا مستحق ہے۔ مجھے پہلے ایک وطن دشمن کو بے نقاب کرنا ہے اور پھر اس پر اپنے باپ کے قتل کی فرد جرم عائد کرنا ہے اور تم بھی جانتے ہو کہ یہ سارا سلسلہ ایک ہی تھا۔ میرے والد کو کاروبار سے الگ کرنا، ان کو بلیک میل کر کے خاموش رہنے پہ مجبور کرنا اور بالآخر ان کی جان لینا، یہ سب اسی لیے ہوا کہ میرے والد بھی ولادور کے کاروبار کی اصل نوعیت کو سمجھنے لگے تھے یا سمجھنا چاہتے تھے۔ ولادور نے اس ملک کے خلاف سازشی عناصر کا ساتھ دے کر پیسہ کمانا اسی وقت شروع کر دیا تھا اور آج تک وہ جو کچھ کر چکا ہے، وہ سب وطن دشمنی ہے۔ اس میں وہ چند افراد کے خون کو قطعی اہمیت نہیں دیتا۔ میرے والد بھی اس کے عزائم کو ناکام بنا سکتے تھے چنانچہ ولادور نے انھیں ختم کر دیا۔ غالباً میر شرافت علی بھی اسی لیے مارا گیا کہ اس کو عذیر خان کی موت تک اصل حالات کا علم نہیں ہو سکا تھا۔

www.paksociety.com

جیسے ہی دلاور کو اس سے خطرہ محسوس ہوا اس نے میر شرافت علی کو بھی ختم کر دیا۔ میں وضاحت کر رہا ہوں تو میرا انجام تمہارے سامنے ہے۔ جس جس نے بھی اس کی مخالفت کی یا جس پر بھی اسے شک ہوا کہ وہ خطرے کا سبب بن سکتا ہے اسے دلاور نے ختم کر دیا۔ اب تو ہمارے اور اس کے درمیان کھلی جنگ ہے اور یہ جنگ اب صرف دلاور کے خلاف نہیں رہی' وطن دشمن ایجنٹوں تک پھیل گئی ہے۔ اگر چن ماہی بھی ہمارا ساتھ صرف اسی وجہ سے دے سکتا ہے تو اسے اپنے ذاتی مسائل اور معاملات بتانے سے کیا فائدہ۔"

"لیکن سکندر! ابھی اسے معلوم ہو گیا تو..." شیڈی متفکر ہو کے بولا۔

"کیسے معلوم ہوگا۔ وہ کراچی ہیڈ کوارٹر سے تو رابطہ قائم کرنے سے رہا۔" میں نے کہا۔ "وہ تو اب اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں نکالے گا کیونکہ اس نے تم کو ایم آئی ایس کا کیپٹن اور مجھے کرنل مان لیا ہے۔ میرا خیال ہے محسن کو میجر بنا دوں اور غالب کو... اسے بھی میجر تو بنانا ہی پڑے گا۔ ہماری آئندہ کی سب کارروائیاں منظم طریقے پر ایک ہی مقصد کی خاطر ہوں گی۔ پھر اسے شک کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی ہم سادھورام کی زبان سے جو کچھ اگلوائیں گے اس سے ہماری باتوں کی تصدیق ہو جائے گی۔"

"لیکن یہ ڈرم... اس ڈرم کا تفتیش سے کیا تعلق؟" شیڈی نے کہا۔

"اگر پانی کا تفتیش سے تعلق ہو سکتا ہے تو ڈرم کا کیوں نہیں ہو سکتا کیپٹن۔" میں نے کہا۔ "تمہیں یاد ہے ڈی ایس پی سراج نے پہلے ہی دن مجھ سے کس طرح اقبال جرم کرایا تھا۔ مجھے ایک بالٹی سر کے اوپر ٹوپی کی طرح اڑھا کے اور ڈنڈے سے کوٹ کر... میں آج بھی اس کا تصور کرتا ہوں تو میرا سارا وجود لرزنے لگتا ہے۔"

"تم نے اس کا ذکر کیا تھا۔" شیڈی بولا۔ "مگر یہ چن ماہی اتنی دیر سے اوپر کیا کر رہا ہے۔"

اسی وقت چن ماہی کی آواز آئی۔ "او بھائی ذرا باہر نکلو... نیچے سے پکڑو... یا میں ڈرم کو نیچے گرا دوں؟"

"نہیں نہیں۔" میں نے صحن میں آ کے کہا۔ "نیچے گرا دو گے تو سارا محلہ پہلے ہی جاگ اٹھے گا۔"

"اتنی دیر سے کیا کر رہے تھے تم چن ماہی؟" استاد شیڈی نے سر اٹھا کے کہا۔

"ڈرم خالی کر رہا تھا۔" چن ماہی بولا۔ "اس میں ریت بھری ہوئی تھی۔ چھت پر پلستر کرایا تھا تو بچ گئی تھی۔"

بمشکل استاد شیڈی نے نیچے سے ڈرم کو تھاما اور صحن میں لے آیا۔ یہ درمیانہ سا چالیس گیلن والا تارکول کا ڈرم تھا لیکن اسے صاف کر لیا گیا تھا اور اندر کی دیواروں پر صرف تارکول کی سیاہی رہ گئی تھی۔ میرے کہنے پر شیڈی نے اسے دھویا اور اندر سادھورام کے کمرے میں پہنچا دیا۔ پھر چن ماہی اور استاد شیڈی نے اس کو بھرنا شروع کیا۔ وہ بالٹی بھر کے پانی لاتے تھے اور ڈرم میں انڈیل دیتے تھے۔ سادھورام اس کارروائی کو بڑے غور سے دیکھتا رہا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ آخر میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ کیا اسے پانی میں غوطے دے کر اس سے کچھ اگلوانا چاہتا ہوں یا سردی کے موسم میں اس کو پانی میں ڈال کر ٹھنڈ سے ہلاک کرنے کے موڈ میں ہوں لیکن میرا پروگرام اس سے بالکل مختلف تھا۔

"تم نے کچھ سوچا سادھورام؟" میں نے اس کے ہاتھ پیر کھول کے اسے آزاد کر دیا۔ "کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

سادھورام نے ہاتھوں پیروں کو حرکت دی اور کمر کو اوپر نیچے جھکایا۔ اس کی جسمانی حالت آج بہت بہتر تھی۔ "جو کچھ کرنا ہے تم کو کرنا ہے۔" وہ بولا۔ "تشدد کرنا ہے یا قتل کرنا ہے۔ قید کرنا ہے یا آزاد کرنا ہے۔ پیار کرنا ہے یا پاگل کرنا ہے۔"

"میں واقعی یہ سب کچھ کر سکتا ہوں، اس سے بہت زیادہ بھی کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم کو تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کرنا ہے صرف وہ نام اور پتے بتانے ہیں جو تمہارے دماغ میں محفوظ ہیں۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ میں کسی کو نہیں جانتا تھا سوائے ان کے جن سے تم مل چکے ہو۔" وہ بولا۔

"کرنل جگن ناتھ اس زنجیر کا اگلا سرا یا اگلی کڑی تھا۔" میں نے کہا۔ "دلاور درمیانی کڑی تھی۔ اس کے پیچھے والی کڑی تم تھے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے پیچھے اس زنجیر کی کون سی کڑی تھی۔ میں فرض کر لیتا ہوں کہ تم کرنل جگن ناتھ سے آگے کی کڑی کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتے تھے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ تمہیں پیچھے کی کڑی کا علم نہ ہو۔"

استاد شیڈی کے ساتھ اب چن ماہی بھی کمرے میں رک گیا تھا اور وہ دونوں بھی یہ گفتگو سن رہے تھے۔ آدھا ڈرم بھر جانے کے بعد میں نے انہیں ڈرم میں مزید پانی ڈالنے سے منع کر دیا تھا۔ چن ماہی کا جوش اور جذبہ، اشتیاق اور تجسس قابل دید تھا۔

"سادھورام! تم زندہ رہ سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تمہیں یقین دلاتا ہوں میں وعدہ کر سکتا ہوں کہ تمہیں نکل جانے دوں۔ اس کے بعد تمہارے پرانے دوست تم کو زندہ نہ چھوڑیں تو میں ذمے دار نہیں۔ سالہا سال سے خود کو بچانا اور محفوظ رکھنا تمہارا اپنا کام ہوگا اور میں یہ بھی بتا دوں کہ تم کو میں نے کبھی دوبارہ دیکھ لیا تو چھوڑوں گا نہیں لیکن

مجھے پتہ ہے یہ ملک کراچی سے گلگت تک پھیلا ہوا ہے۔ تم اپنے بارڈر کراس کر کے اپنے ہم مذہب لوگوں میں شامل ہو سکتے ہو اور نئے نام سے نئی زندگی کا آغاز کر سکتے ہو۔ تمہارے لیے پکڑے جانے کے امکانات کم ہوں گے اور پکڑے جانے کے زیادہ۔ اس کا انحصار تمہاری عقل اور ذہانت پر ہے اور تم اس صلاحیت سے محروم نہیں ہو۔ تم خود کو کہاں چھپاتے ہو اور کیسے چھپتے ہو، یہ تمہارا کام ہے۔ شکاری کتوں سے پیچھے لگے رہیں گے تو جھوٹ نہیں۔ اگر تم سال بھر بھی گمنام رہنے میں کامیاب رہے تو پھر کبھی نہیں پکڑے جاؤ گے۔ لیکن..." میں نے ایک ڈرامائی وقفہ دیا۔ "لیکن تم نے ہم سے تعاون نہ کیا تو اس ٹب کی صورت دیکھو گے۔ تمہاری لاش کا کیا ہوا... کتے اور چیل کوے کھائیں گے۔"

"میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں۔" وہ کانپتے ہوئے بولا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔"

"سادھورام! یہ آخری موقع ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہارے پاس اسلحہ کون لاتا تھا؟ کرنل جگن ناتھ یہاں سے اسلحہ سرحد کے پار تک کس کی مدد سے پہنچاتا تھا؟ کرنل جگن ناتھ بھارتی ایجنٹ تھا۔ تمہارے سیوک رام اور اس کے دونوں ساتھیوں کی طرح... کرنل جگن ناتھ تم کو صرف ادائیگی کرنے آتا تھا اور مال چیک کرتا تھا۔ وہ بھی مارا جا چکا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی تم کچھ لوگوں کو جانتے ہو... مثلاً وہ کون ہیں جو ٹرک سے کرسیاں یا پرچے والے کا جعلی مال تھا وہ کہاں تک آتے تھے اور سارا اسلحہ لوڈ کر کے لے جاتے تھے۔ تم نے ان کو دیکھا ہے؟"

"میں نے ان کو دیکھا ضرور تھا لیکن وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتے تھے۔" سادھورام بولا۔ "وہ کہتے تھے کہ تم کو رقم مل گئی۔ اب اپنے کام سے کام رکھو۔"

"تم نے اس ٹرک کا نمبر وغیرہ تو دیکھا ہوگا؟"

"نمبر ہمیشہ بدلا ہوا ہوتا تھا۔" سادھورام بولا۔

"کیا ٹرک ہمیشہ وہی ہوتا تھا؟" میں نے کہا۔ "ڈرائیور اور اس کے ساتھی سب وہی ہوتے تھے؟"

سادھورام نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ سب بی ایس ایف کے لوگ تھے۔"

"گڈ! تم نے کچھ تو بتایا۔" میں نے کہا۔ "بی ایس ایف میں ان کے رینک کیا تھے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"پھر تم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ بی ایس ایف کے آدمی تھے؟" میں نے کہا۔

"کرنل جگن ناتھ نے کہا تھا۔" سادھورام بولا۔ "مگر اس نے کسی کا نام نہیں بتایا تھا۔ وہ سب آپس میں بھی بات نہیں کرتے تھے اور بالکل خاموشی سے کام کر کے چلے جاتے تھے۔"

"وہ ٹرک کون سا تھا... کس کمپنی کا بنایا ہوا؟"

"بیڈ فورڈ کمپنی کا۔" سادھورام بولا اور میرا ہاتھ بجلی کی طرح گھوم کر اس کے منہ پر پڑا۔ کمرہ اس کی آواز سے گونج گیا۔ "وہ انڈین ٹرک تھا، اشوک ٹاٹا کمپنی کا بنایا ہوا۔" میں نے کہا۔ "وہ ریلی کا ٹرک جس میں کرنل جگن ناتھ آتا تھا اس کا نمبر تو تم نے دیکھا ہوگا؟"

"وہ ایک ہی ریلی کا ٹرک نہیں آتا تھا۔" سادھورام نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہر بار مختلف..."

میں نے اس کے دوسرے گال پر الٹا ہاتھ مارا۔ وہ پیچھے گر گیا مگر میں نے اسے پھر کھڑا کر دیا۔ "یہ دروازہ بند کر دو۔" میں نے شیڈی سے مخاطب ہو کے کہا۔ "ہاں تو سادھورام! یاد کر کے بتاؤ گزشتہ بار وہ جس ریلی کے ٹرک میں آیا تھا اس کا نمبر کیا تھا؟"

"مجھے... مجھے نہیں یاد..." سادھورام نے لرزتے ہوئے کہا۔

"اس کا نمبر میں بتا سکتا ہوں۔" میں نے کہا اور نمبر دہرا دیا۔ "یہ ٹھیک ہے نا؟" سادھورام نے اقرار میں سر ہلایا اور میں نے اس کے ایک اور چھانپڑ رسید کیا۔ "اگر یہ ٹھیک ہے تو پہلے کیوں کہا تھا کہ مجھے نمبر معلوم نہیں۔ خیر... وہ ریلی کا ٹرک بھی تمہاری والا کے ساتھ آ گیا اب سوچنے کی بات نہیں... یہ بتاؤ کہ جو رقم تم کو کرنل جگن ناتھ دیتا تھا وہ تم سے کون لینے آتا تھا؟"

"میں... میں اسے نہیں جانتا۔" سادھورام نے آستین سے وہ خون صاف کیا جو اس کی ناک سے بہنے لگا تھا۔

"تم اسے جانتے ہو۔" میں نے اس کی ناک پر مکا مارا۔ "وہی شخص تم کو اسلحہ بھی پہنچاتا تھا۔ ممکن ہے وہ ایک آدمی نہ ہو ایک گروہ ہو... تم بہرحال سب کو جانتے ہو گے۔ وہ تم سے حساب لیتے ہوں گے... تم صرف کمیشن ایجنٹ تھے... اور ہر کمیشن ایجنٹ دونوں پارٹیوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔"

"میرے پاس چار آدمی آتے تھے... کبھی کوئی کبھی کوئی۔" سادھورام نے رو کے کہا۔ "مجھے کیا معلوم وہ اپنا جو نام بتاتے تھے وہ صحیح ہوتا تھا یا غلط۔"

"تم غلط نام ہی بتا دو۔" میں نے کہا۔ "پہلے ان کے سرغنہ کا۔ پھر باقی افراد کا۔"

"سرغنہ... سرغنہ تو تیرون کہلاتا تھا۔" سادھورام بولا۔ "وہ کبھی ساتھ نہیں آیا... وہ اس کا حوالہ دیتے تھے۔ باقی چار کے نام... لال دین... چوہدری بشیر... عبدالرزاق... اور کمال خان تھے۔"

اس نے ہر نام بہت سوچ کے لیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ نام اس نے ابھی ابھی گھڑے تھے اور اسی لیے وہ سوچتے

www.paksociety.com

پر مجبور ہوا تھا۔ اصل نام بتانے کے لیے اس کو سوچنا ہرگز نہ پڑتا۔ پھر جھوٹ اس کی صورت پر خوف بن کے پھیل گیا تھا۔ ہم سے پہلے وہ خود جانتا تھا کہ یہ سب ناقابلِ یقین ہوگا اور ہم اس کی بات نہیں مانیں گے۔

"اچھا..." میں نے کچھ دیر سوچ کے کہا۔ "یہ لوگ کس طرح آتے تھے؟ ٹرک میں یا کار میں؟"

"مال ٹرک میں لاتے تھے۔" سادھو رام بولا۔ "پیسہ لینے کے لیے کار میں آتے تھے۔"

"اور ٹرک میں بھی وہی لوگ آتے تھے جو کار میں آتے تھے؟" میں نے کہا۔

"پیسہ وصول کرنے کے لیے ایک آدمی آتا تھا، سر جی۔"

"ٹرک اور کار کے نمبر کے بارے میں تم پھر وہی کہو گے کہ ہر بار بدلے ہوئے ہوتے تھے؟" میں نے کہا۔

سادھو رام نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کبھی وہ نمبر پلیٹ پر پینٹ ہوتے تھے یا اسٹیکر چپکے ہوتے تھے۔"

"ٹرک کون سا ہوتا تھا؟"

"بیڈفورڈ کا۔" سادھو رام بولا۔

"اور کار...؟" میں نے کہا۔ "اس کا رنگ، ماڈل... تمہارے پاس کار رہی ہے اس لیے تم ضرور جانتے ہو گے؟"

"کار... فورڈ زیفر بھی لاتے تھے... انیس سو ساٹھ ماڈل۔" سادھو رام بولا۔ "اس کا رنگ نیلا ہوتا تھا۔ دوسری اوپل ریکارڈ تھی۔ اسی سال کا ماڈل، رنگ اوپر کالا، نیچے سے سرخ۔"

"اب ذرا سوچ کے بتاؤ کہ یہ سلسلہ کب شروع ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"سوا سال پہلے... گزشتہ سال اگست کے مہینے سے۔" سادھو رام بولا۔

"پہلا سودا کیسے ہوا تھا... وہ تم تک کیسے پہنچے تھے؟"

"دارنا کے ذریعے۔" سادھو رام نے کہا۔

"اور اس پہلے سودے میں تمہارا کمیشن کتنا بنا تھا؟"

"ستر ہزار روپے۔" سادھو رام بولا۔ "ستر ہزار دے گئے تھے۔"

"اس کے بعد؟" میں نے کہا۔ "کتنی بار آئے وہ لوگ؟"

"یہ سب... مجھے تفصیل سے تو یاد نہیں..." وہ بولا۔ "آئے ہوں گے دس بارہ مرتبہ۔"

میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اور جب وہ گر گیا تو ٹھوکریں مار مار کے اس کا حال خراب کر دیا۔ "ابھی کہا تھا کہ ایک آدمی تم سے ہر مہینے پیسے لینے آتا تھا۔ مان آیا سوا سال میں دس بارہ مرتبہ۔ پیسے لینے والے آتے رہے ہر مہینے۔ میرا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ تم اب بھی جھوٹ بولنے کا حوصلہ رکھتے ہو۔" میں نے اسے پھر پیروں پر کھڑا کر دیا اور دیوار سے لگا کے اس کے پیٹ پر اپنی ایک کہنی سے دباؤ ڈالنے لگا۔ "اب ایک بار پھر بتاؤ کہ وہ چار آدمی کون تھے؟ ان کے کیا نام تھے؟"

"بتاتا ہوں... بتاتا ہوں..." سادھو رام ممیانے لگا۔ "میں مر گیا... میرا سانس رک جائے گا۔" وہ چلانے لگا اور میں اپنا سوال دہراتا رہا۔ دوسری بار اس نے جو نام بتائے وہ بالکل مختلف تھے۔ اسے امید نہ تھی کہ یہ سوال پھر پوچھا جائے گا اور چونکہ اس نے جھوٹ بولا تھا اس لیے وہ ناموں کو غلط ملط کر گیا۔ اس نے بشیر خاں، چوہدری مشتاق، کمال دین اور لال خان بتائے۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

"تم نے سنا کیپٹن۔" میں نے استاد جیدی کو مخاطب کیا۔ "اس نے پہلے کیا نام لیے تھے؟"

"یس کرنل۔" استاد جیدی بولا۔ "اس نے لال دین، کمال خان، چوہدری بشیر اور عبدالرزاق کہا تھا۔ کیوں لیفٹیننٹ؟"

چمن ماہی بھونچکا رہ گیا۔ اسے ابھی سے لیفٹیننٹ کہہ کے مخاطب کیا گیا تھا۔ "یس سر۔" وہ فوراً سنبھل کر بولا۔ "یہی نام تھے۔"

"یہ جو کچھ کہتا رہا ہے وہ سب جھوٹ تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نے اسے جو موقع دیا تھا وہ اس نے گنوا دیا۔ اب تم اس کے ہاتھ پیر باندھو اور اسے ڈرم میں ڈال دو۔ اس کا منہ پانی سے باہر رہے۔ گلے میں رسی باندھ کے پانی میں معلق کر دو اور رسی کا سرا اپنے ہاتھ میں رکھو۔ اس طرح کہ یہ اچھلے تو خود کو پھانسی دے۔ جھٹکے سے اس کی گردن کا منکا ٹوٹ جائے۔ ابھی یہ اچھلے گا... بہت اچھلے گا... شور بھی بہت کرے گا اس لیے اس کے منہ کو بند کر دو۔"

میں نے سادھو رام کے ڈرم میں ڈالے جانے کی تمام کارروائی کی خود نگرانی کی اور چونکہ ڈرم نصف کے قریب بھرا ہوا تھا اس لیے سادھو رام کے گھٹنے موڑ کر پیچھے کر دیے گئے اور اس کے دونوں ہاتھوں کو باندھ کر اسی رسی سے پیر بھی باندھے گئے اور سادھو رام کو پانی میں ڈالا گیا تو وہ گھٹنوں کے بل ڈرم میں کھڑا ہو گیا۔ اس کا منہ پانی کی سطح سے اوپر رکھنے کے لیے وہی رسی جس سے سادھو رام کے ہاتھ پیر باندھے ہوئے تھے اس کی گردن میں پھندا بنا کے ڈالی گئی اور پھر اس رسی کا آخری سرا ڈرم کے کنارے پر سے گزار کے ہاتھ میں پکڑ لیا گیا۔ اب سادھو رام انتہائی تکلیف دہ پوزیشن میں ڈرم کے اندر غرق ہو چکا تھا۔ نصف بھرے ہوئے ڈرم میں سادھو رام کے ڈالے جانے سے پانی کی سطح بلند ہو گئی تھی اور پانی

گالوں سے تھوڑا ہی نیچے تھا۔

اگر سادھو رام کے پاؤں گھٹنوں کے پاس سے کاٹ دیے جاتے تو اس کا قد چار فٹ سے بہت کم رہ جاتا۔ گھٹنوں کے بل کھڑا ہوا ساڑھے تین فٹ کا ہی رہ گیا تھا اور سخت اذیت میں تھا۔ گردن کی رسی نے اس کو بری طرح جکڑ رکھا تھا اور وہ ڈرم کی ایک دیوار کے ساتھ یوں لگا ہوا تھا کہ بالکل حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے گلے میں پڑے ہوئے پھندے سے لے کے اسے پیچھے کھینچ رکھا تھا۔ چنانچہ اس کا وجود ڈرم کے تین چوتھائی حصے میں سما گیا تھا۔ وہ بے حد دہشت زدہ تھا اور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کارروائی کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ خود استاد جیدی اور چمن ماہی سخت کنفیوژن کا شکار نظر آتے تھے۔

یہ ساری کارروائی مکمل ہو گئی تو میں دوسرے کمرے میں گیا اور وہاں سے وہ راڈ ہیٹر اٹھا لایا جو ہم غسل کا پانی گرم کرنے اور چائے بنانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ایک ہزار واٹ کا یہ ہیٹر بجلی کا بنا ہوا تھا اور محض خود خرید لیا تھا۔ اس کی وضع الگ تھی۔ اس میں تیلیں جتنی کی موٹائی پنسل کے برابر یا کچھ کم ہو گی۔ آخری حصے اس کے دونوں سرے تھے ایک کوائل یا لچھے کی شکل میں ملی ہوتی تھیں اور گرم ہونے والا سارا ان کی عکس پنسل نما شاخوں کے اندر تھا۔ یہ بہت عام چیز تھی جو کسی بھی بجلی کے سامان کی دکان سے تیس پینتیس روپے میں مل جاتی تھی اور اس کی مجموعی لمبائی آٹھ انچ کے قریب تھی۔ اسے پانی سے بھری ہوئی کیتلی میں بھی لٹکایا جا سکتا تھا اور بالٹی میں بھی۔ اس کی تمام حرارت پانی کے اندر جذب ہوتی تھی۔ چنانچہ پانی سے بھری ہوئی جو بالٹی چولہے پر ایک گھنٹے میں گرم ہوتی وہ اس ہیٹر سے دس منٹ میں اتنی گرم ہو جاتی تھی کہ پانی سے بھاپ نکلنے لگتی تھی۔ ایک کیتلی پانی تو دو چار منٹ میں ابل جاتا تھا۔

ڈرم میں کئی بالٹی پانی تھا چنانچہ اس کے درجۂ حرارت کو ابلنے کے پوائنٹ تک پہنچنے کے لیے میرے اندازے کے مطابق تیس چالیس منٹ درکار تھے۔ راڈ ہیٹر کو دیکھتے ہی استاد جیدی کی سمجھ میں آ گیا کہ میں کیا کرنے والا ہوں اور سادھو رام کی حالت بھی غیر ہونے لگی۔ اس نے دہشت زدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دم بخود ہو کر دیکھا مگر میں نے سمجھ لیا تھا کہ سادھو رام آسانی سے سب کچھ نہیں بتائے گا۔

"تم سمجھ رہے ہو نا سادھو رام کہ میرا ارادہ کیا ہے؟" میں نے اسے بوائلنگ پوائنٹ تک لے جاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا سوپ بنانا چاہتا ہوں... افسوس یہ ہے کہ تمہارے بیوی بچے نہیں ہیں ورنہ وہ بھی تمہارا سوپ پی کر محظوظ ہوتے۔ میں ان کو یہ سوپ پلاتا۔ کالی مرچ، نمک اور کھٹا میٹھا مسالہ ڈال کے۔ اب یہ سوپ پینے والا کوئی نہیں۔ بکرے کا گوشت عموماً ایک گھنٹے میں گل جاتا ہے۔ گائے بھینس کا گوشت زیادہ وقت لیتا ہے۔ تمہارا گوشت حرام ہے۔ سور کے گوشت سے بھی زیادہ۔" میں نے راڈ ہیٹر کو پانی میں ڈال دیا۔

"ہیٹر آن کر دوں کرنل؟" چمن ماہی نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

"ابھی نہیں لیفٹیننٹ۔" میں نے کہا۔ "دیکھو اس وقت ہمارے پاس کیسی نایاب ڈش ہے۔ افریقہ کے جنگلی قبائل جو آدم خور ہوتے ہیں اس ڈش کو بڑے چٹخارے لے کر کھاتے ہیں مگر مہذب دنیا میں سالم مرغ اور سالم بکرا روسٹ کر کے کھانے والے تو مل جاتے ہیں لیکن سالم انسان کو ہضم کرنے والا کوئی نہیں... مجھے پھر ملال ہوتا ہے کہ یہ ڈش ضائع ہو جائے گی۔"

"کیوں سر؟ کیا یہ کتے بلیاں اسے نہیں کھا لیں گے؟" استاد جیدی نے کہا۔

"نہیں کیپٹن۔ یہاں کے تو جانور بھی حب الوطنی کا جذبہ یا حیوانی جبلت رکھتے ہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہر جانور کوئی ایسی چیز نہیں کھاتا جو اس کے لیے نقصان دہ ہو۔ ہاں اس جیسے دو چار ہمارے ہاتھ لگ جاتے تو ہم ان کی ضیافت کرتے اور آدھے سادھو رام کا پلاؤ بنا دیتے تو آدھے سادھو رام کا قورمہ۔ اب تو یہ گلنے کے بعد پانی میں ہی گھل جائے گا۔ اس کا حلیم بن جائے گا۔ ذرا دیکھو پانی کا ٹمپریچر کیا ہے؟"

استاد جیدی نے انگلی ڈال کے پانی کو دیکھا۔ "ابھی تو معمولی سا گرم ہوا ہے سر۔"

"اچھا کیپٹن، سادھو رام کو آج گننے دو۔" میں نے گھڑی دیکھی۔ "تم کافی بناؤ... چمن ماہی اس کی رسی ڈھیلی مت کرنا۔"

"نو سر!" چمن ماہی نے فرض شناس ماتحت کی طرح کہا۔ "آپ فکر ہی نہ کریں۔"

میں دوسرے کمرے کی طرف جاتے جاتے رکا اور پلٹ کر سادھو رام سے مخاطب ہوا۔ "اب تمہارے لیے مہلت بہت کم رہ گئی ہے سادھو رام۔ آدھے گھنٹے میں پانی اتنا گرم ہو جائے گا کہ تمہارے جسم کو جلانے لگے گا۔ چالیس پینتالیس منٹ میں تم فل بوائل ہو جاؤ گے... مگر مرو گے نہیں... میں تم کو ہاف بوائل کر کے رکھوں گا... صبح تک۔" میں نے سادھو رام کو بے بسی سے سر ہلاتے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ کہنے کی اجازت طلب کرتے محسوس کیا اور اس کی صورت پر موت کے خوف کا سایہ لرزاں دیکھا لیکن میں پروا کیے بغیر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"ہاں تو سکندر بادشاہ۔" استاد جیدی بولا۔ "کیا آسان نسخہ ایجاد کیا ہے زبان کھلوانے کا... نہ کوئی مار پیٹ کی محنت نہ مشقت

www.paksociety.com

نہ وقت کی بربادی... ملا ابھی سب کچھ بتا دے گا۔"

"ضرورت ایجاد کی ماں ہے استاد۔" میں نے کہا۔ "ایسے بہت سے طریقے ہمارے ہاتھ میں تھے لیکن اس سے پہلے کوئی ہمارے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ جو ہاتھ لگے تھے وہ خود مر گئے یا مار دیے گئے۔ پہلی بار دشمن کا ایک اہم ٹیپ ہاتھ آیا ہے۔ اس کو بچا کے رکھنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ساد ھورام ہاف بوائل ہونے کے بعد بکنے لگے گا۔"

"تم نے اچھا کیا جو شملا کو ساتھ نہیں لائے۔" ٹیڈی بولا۔ "لیکن محسن کیوں نہیں آیا ہے؟"

"آج اپنے گھر میں ان کی پہلی رات ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر شملا اکیلی رہ جاتی تو ٹھیک... یہاں کی کارروائی میں محسن کی موجودگی غیر ضروری تھی۔ میں اکیلا ہوتا تب بھی کافی تھا۔"

"یار سکندر بادشاہ! یہ تم کو ڈرم کا خیال کیسے آیا؟" استاد ٹیڈی بولا۔ "اگر اس وقت ڈرم نہ ملتا تو...؟"

"میں ڈرم کو بہت پہلے دیکھ چکا تھا استاد۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ڈرم نہ ہوتا تو آج میں دیگ کا انتظام کر لیتا۔"

دوسرے کمرے میں چن ماہی نے ساد ھورام کو مخاطب کر کے اپنے غم و غصے کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ وہ ساد ھورام کو غدار، نمک حرام... بے غیرت کافر... وطن فروش وغیرہ کے علاوہ بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا اور اس کے ہر جملے میں ساد ھورام کی والدہ یا ہمشیرہ کا حوالہ مختلف انداز سے آتا تھا۔ وہ ساد ھورام کو دہشت گردی کرنے کے لیے بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا اور اس کے سامنے اگلے آدھے گھنٹے کی اذیت کا نقشہ بڑے موثر طریقے سے کھینچ رہا تھا۔

چن ماہی کے لیے اب ہمارے مشن کی نوعیت اور خود ہمارے بارے میں ایک فیصد شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس نے ساد ھورام کی زبانی سب کچھ سن لیا تھا اور وہ بہت جوش میں تھا کہ آج رات وہ قومی سلامتی کے ایسے بڑے مشن میں ایک کرنل اور ایک کیپٹن کے ساتھ شریک ہونے کا اعزاز حاصل کر چکا ہے۔ وہ خود کو بے حد اہم اور ذمہ دار محسوس کرنے میں حق بجانب تھا کہ آس پاس تمام محب وطن اور اس کے تمام ساتھی ہمیشہ سوتے پڑے رہتے تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے محلے کے گھر میں کتنی اہم کارروائی جاری ہے۔ اسی شہر میں ایک سے ایک جانباز پیدا ہوا تھا... نہ جانے کتنے اعلیٰ عہدوں والے افسر تھے اور دولت مند تھے مگر یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔ قدرت نے چن ماہی کو اس عظیم قومی خدمت کے لیے منتخب کیا تھا۔

میں نے اطمینان سے کافی ختم کی اور سگریٹ جلا کے اس کے لمبے لمبے کش لیتا رہا۔ مجھے ملا جبر کا خیال بھی آیا اور اس گھر کا بھی

جہاں محسن اور شملا کم سے کم آج رات غم جہاں سے بے نیاز تھے۔ یہ ایک رات بھی بہت غنیمت ہے۔ کیا خبر کل صبح نکلے کس طرح آفتاب... جب موت اور تم ہوں وقت جب اپنی گرفت میں ہو تو اس کے ہر لمحے سے مسرت کشید کر لینا چاہیے تاکہ گزر جانے کی ایام میں ناموافق حالات کی تشنہ کامی میں تمہاری شب ہی حسرتوں کے ساتھ ہو۔ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی۔ وقت کا کیا بھروسا کہ کب پھر مہلت دے۔

"ہاہا... اب بول تیری..." چن ماہی کی آواز نے مجھے خیالوں کی دنیا سے کھینچ لیا۔ "اچھل... اور اچھل... ابھی تو تیرا جسم پکے گا۔ بوٹی بوٹی پھٹے گی۔ اندر تیرا دل جگر سب پکے گا۔ تیرا گوشت خون اور ہڈیاں سب بھیج ناک گل جائیں گی۔ تمہیں گلیں گی تو تیری کھانے کا سوچ ڈالوں گا۔ اور پھر تیرا حلیم تیرے یاروں میں تقسیم ہوگا بدبخت کے یار... اب تو گائے کو ماں کہنے والے اسے کھانے بھی لگے ہیں اور تم تو بچے... بھو... ماں کو کھا جاؤ... بس چلے تو بہن کو بھی کھا جاؤ... باپ کو کھا جاؤ... بڑے مزے لے کر کھائیں گے تیرے یار تیرا حلیم... میں خود سرحد پار کر کے جاؤں گا اور تقسیم کروں گا۔ کون سا گاؤں ہے تیرا، تجھ سے معلوم کر لوں گا... ہو سکا تو تیرے گاؤں والوں کو کھلاؤں گا۔ وہاں تیرے ماں باپ بھی جائیں گے اور ان کے پتر بھی ہوں گے۔ ایسے مسالے ڈال کر لے جاؤں گا کہ وہ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔"

جب میں دوبارہ دوسرے کمرے میں گیا تو ساد ھورام شدید عذاب میں مبتلا تھا۔ میں نے انگلی ڈبو کے پانی کا ٹمپریچر دیکھا۔ پانی اتنا گرم ہو چکا تھا کہ سخت سردی میں بھی اس سے نہانا مشکل تھا۔ یہ آہستہ آہستہ بڑھنے والی حرارت ساد ھورام کے جسم نے بھی جذب کی تھی اور اس کا وجود اندر باہر سے اتنا ہی گرم ہو چکا تھا۔ کچھ بھاپ اٹھنے سے اور کچھ اندر کی گرمی کے خارج ہونے سے ساد ھورام کا چہرہ پانی میں اور پسینے میں تر تھا... وہ نہایت بے ڈھنگے طریقے پر اچھل رہا تھا اور تڑپ رہا تھا۔ اس کے گھٹنے بار بار ڈرم کے فرش پر ٹکتے تھے اور وہ دیوانگی کی کیفیت میں کوشش کر رہا تھا کہ ڈھکن کو کھینچ لے اور اس کا تانا ٹک کرے مگر چن ماہی نے رسی کو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ ساد ھورام کے ہاتھ پاؤں پیچھے بندھے ہوئے تھے چنانچہ وہ صرف اپنے منہ سے کوشش کر سکتا تھا مگر منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا لیکن کپڑا نہ ہوتا اور وہ کسی طرح اپنے دانتوں سے تار کاٹ دیتا تو ڈرم پانی میں آ جاتا اور وہ فوراً ہلاک ہو جاتا۔ میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔

ساد ھورام نے بلبلا کے چیخ ماری۔ "ہائے... ہائے مارا... اٹھ میں مر گیا... اف... اے بھگوان کے لیے... مجھ کو بچاؤ...

رسول اور خدا کا واسطہ... اسے بند کر دو... مجھے معاف کر دو... میں سب بتاتا ہوں۔"

میں نے سوئچ آف کر دیا۔ اس سے پانی کا درجہ حرارت کم ہو جاتا مگر ساد ھورام کو ایک نفسیاتی قرار حاصل ہوا کہ پانی اس سے زیادہ گرم نہیں ہوگا۔ "مجھے باہر نکالو... ہائے گرمی... رام رام... میرے شریر میں آگ بھر گئی ہے... مار دے کوئی ہے... دوڑو... دوڑو... یہ مجھے قتل کر رہے ہیں۔" اس نے اچانک چیخنا شروع کر دیا۔ میں نے فوراً اس کا منہ بند کر دیا۔ اس نے گردن کو ادھر ادھر ایسے جھٹکے دیے کہ ڈھکن کے گلے میں پڑی ہوئی رسی نے اسے بے بس کر رکھا تھا۔ یوں گردن ہلانے سے رسی گوشت میں دھنس گئی اور ساد ھورام کی گردن کے چاروں طرف خراشیں آ گئیں جن سے خون رسنے لگا۔

باہر سے کسی نے دروازہ بجانا شروع کیا۔ یہ یقیناً ساد ھورام کی چیخ پکار سے جاگ کر آنے والے ہمسائے تھے۔ میں نے چن ماہی کو اشارہ کیا کہ وہ صورت حال کو سنبھالے اور ساد ھورام کے گلے کی رسی ٹیڈی کو تھما دی۔ پھر میں خود دوسرے کمرے میں جا کے چارپائی پر لیٹ گیا۔ میں نے بال بکھرا کے اور کپڑے بے ترتیب کر کے اچھلنا اور چلانا شروع کیا۔ "ہائے... اف مار ڈالا... قتل کر دیا..." میں نے چارپائی پر کسی غیر موجود مخلوق سے کشتی لڑتے ہوئے خود کو بچانا جاری رکھا۔ "آہ... میں مر گیا... مار دے کوئی آؤ... خدا کے لیے بچاؤ... یہ مار دے گا مجھے..."

دروازہ پھر بجا تو چن ماہی نے کنڈی کھولی... تین آدمی اندر آ گئے جو خاصے برہم نظر آ رہے تھے۔ "کیا ہو رہا ہے آدھی رات کو؟" گھبرایا ہوا ایک بزرگ نے خفگی سے کہا۔

"معاف کرنا چاچا جی..." چن ماہی بولا۔ "یہ میرے کرمانے کا مالک ہے... گاؤں سے آیا ہے... اس پہ پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں... گاؤں کے مولوی صاحب نے کہا تھا کہ اس پہ جن سوار ہے۔" میں نے اس وقفے میں اچھل کود تین قلابازیاں کھا کر جن سے لڑنا جاری رکھا۔ میں اسے مکے مارتا رہا اور خود بھی گرتا رہا۔

"یہ تو... بڑی مشکل ہے..." بزرگوار نے کہا۔ ان کا غصہ ایک دم ہمدردی میں بدل گیا تھا۔

"ہاں جی... اب علاج کراؤں گا..." چن ماہی نے مظلوم شکل بنا کے کہا۔

"علاج کیا میاں... اس کو لے جاؤ کسی اچھے سے عامل کے پاس۔" بزرگ نے کہا۔ "داتا صاحب کی خدمت میں حاضری دو۔"

"اسے پاگل خانے لے جاؤ جی۔" دوسرے کو سر پھرے سا اور اڑا قسم کے جوان نے کہا۔ "اس کا یہ عمل بہت خطرناک ہے۔"

"نہیں بھائی... یہ خطرناک نہیں ہے... بے شک آپ قریب جا کے دیکھ لو... آپ سے کچھ نہیں کہے گا۔" چن ماہی بولا۔

بزرگوار آگے بڑھے اور انھوں نے میرے شانے پہ تھپکی دی۔

"نوجوان... آیت الکرسی پڑھو۔"

"بابا جی... مجھے بچاؤ..." میں بزرگوار سے لپٹ گیا۔

"میں مر گیا... ہائے... بڑا بے رحم... قاتل... ہائے..."

بزرگوار نے بمشکل تمام خود کو چھڑایا۔ میں شور مچاتا رہا اور ان کے آگے ہاتھ جوڑتا رہا... باہر اتنی دیر میں کچھ اور لوگ بھی آ گئے تھے۔ بزرگوار نے کچھ پڑھ کے مجھ پہ پھونک ماری۔ میں نے ان کو یہ عمل کرتے دیکھا تھا۔ چند سیکنڈ میں میرا شور و غوغا کم ہو گیا۔ پھر میں ساکت ہو گیا اور پلنگ پہ آنکھیں بند کر کے پڑ گیا... بزرگوار اپنے عمل کی کامیابی سے یقیناً بہت خوش ہوئے ہوں گے۔

"اچھا میاں... ہم چلتے ہیں..." وہ بولے۔ "خدا رحم کرے اس پہ... دوبارہ دورہ پڑے تو ایک بار آیت الکرسی اور دو بار سورۃ فاتحہ پڑھ کے پھونک دینا... قرار آ جائے گا... اللہ کے کلام میں بڑی تاثیر ہے۔"

باغی خیالات رکھنے والا جوان کچھ نہ بول سکا کیونکہ باقی سب بزرگوار کے ہم خیال ہو گئے تھے اور ہمسائے ہونے کے ناتے چن ماہی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہ تھے۔ سب کو چن ماہی سے ہمدردی تھی۔ چند منٹ میں وہ سب اپنے اپنے گھر لوٹ گئے تو چن ماہی نے کنڈی لگا دی۔

"مان گئے سو شیو... میرا مطلب ہے کرنل صاحب۔" وہ بولا۔

"دیکھو! آئندہ کبھی مجھے کرنل صاحب کہنے کی غلطی مت کرنا۔" میں نے کہا۔ "تمھیں عادت پڑ گئی تو باہر بھی تمھارے منہ سے کرنل ہی نکلے گا... ہم پہچانے ہو گئے ہیں اس لیے چھوڑتے نہیں۔ تم بالکل اسی طرح اپنے لہجے میں بات کرتے رہو تاکہ کسی کو شک بھی نہ ہو۔"

"اچھا مائی باپ... غلطی ہو گئی۔" چن ماہی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "اب ویسا ہی کروں گا جیسا آپ کہو گے۔"

"چن ماہی! تمھارے لیے یہ آزمائش کا زمانہ ہے... اگر تم غلطیاں کرتے رہے تو ہم تمھاری سفارش نہیں کر سکیں گے... اور تم کو بتائے بغیر غائب ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم بھی ہمیں تلاش نہ کر سکو گے لیکن کسی سے ہمارا ذکر بھی کرو گے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور تمھیں بہت نقصان ہوگا۔ ہم تمھیں بھلی کرانے والے جاسوسوں کو نہیں چھوڑتے تو تم کیا ہو۔"

چن ماہی کا رنگ اڑ گیا۔ "آپ بالکل فکر نہ کریں جناب! میرا پکا وعدہ ہے کہ آپ یقین جانیں یا نہ جانیں میں جس

www.paksociety.com

حد تک آپ کی خدمت کر سکا ضرور کروں گا اور پھر کبھی میری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو آپ سے پہلے میں خود اپنے آپ کو شوٹ کرلوں گا۔"

یہ چین ماہی کی برین واشنگ تھی اور اس کے ذہن کو مکمل طور پر اپنے اختیار میں رکھنے کے لیے یہ ضروری بھی تھا۔ وہ ہمارے لیے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا تھا اور اس سے ہمیں بہت سے فائدے حاصل ہونے کی امید تھی۔ ایک تو اس کا یہ گھر تھا جسے ہم استعمال کر رہے تھے۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور بھی تھا اور شہر بھر میں گھوم پھر کے ہمارے لیے ہر قسم کی خبریں فراہم کرنے کا ذریعہ بن سکتا تھا۔ وہ خبریں جو کسی خبر رساں ایجنسی یا اسٹاف رپورٹر کے ذریعے مرزا غالب تک نہیں پہنچتی تھیں وہ چین ماہی اکٹھی کر سکتا تھا اور ہم اسے ٹیکسی کے ساتھ کہیں بھی بھیج سکتے تھے۔ مثلاً یہ ہو سکتا تھا کہ کبھی وہ ہمارے دشمنوں کو ٹیکسی میں بٹھا لے۔ اس کے لیے وہ پہلے سے ان کے ٹھکانے کے قریب موجود ہو... اور اگر ٹیکسی میں بیٹھنے والے آپس میں گفتگو کریں تو وہ سن بھی سکتا تھا اور ریکارڈ بھی کر سکتا تھا۔ اس کی ٹیکسی میں ٹیپ ریکارڈر فٹ کرنا معمولی کام تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو عام طور پر لوگ اہمیت نہیں دیتے اور اس کی موجودگی کو رازداری کے لیے غیر اہم سمجھتے ہیں۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ ٹیکسی ڈرائیور ایک غیر جانبدار فریق ہے جو اُن سب کی سنتا ہے مگر اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔

میں نے دوسرے کمرے میں آ کے دیکھا تو گرم پانی میں پڑے رہنے سے سادھو رام کی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی اور وہ تقریباً نیم بے ہوش تھا۔ میں نے اُسے ذرا سی دیر کے لیے باہر نکالا۔ اس کے جسم پر ایک بالٹی بھر کے ٹھنڈا پانی انڈیلا اور اُسے پھر ڈرم میں ڈال دیا۔ مجھے دوبارہ سوئچ آن کرتا دیکھ کر سادھو رام اچھلا۔ وہ دوبارہ اسی بھٹی میں جھونک دیا گیا تھا جس کی اذیت وہ آدھے گھنٹے تک برداشت کرتا رہا تھا۔ اب میں نے کسی قسم کے خوف کے بغیر اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔

"تم کو شور مچانے کی اجازت ہے سادھو رام..." میں نے کہا۔ "جو تمہاری مدد کر سکتے تھے وہ آ کے چلے گئے۔ اب وہ دوبارہ نہیں آئیں گے۔"

سادھو رام مجھے گالیاں بکنے لگا۔ میں مسکراتا رہا۔ بند کمرے سے اس کی آواز سنائی دیتی ہو گی لیکن اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ سادھو رام کی قوتِ مزاحمت میری توقع سے بڑھ کر ثابت ہوئی تھی۔ ابھی تک اس نے سچ نہیں اُگلا تھا حالانکہ وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ اس کے لیے نجات کی کوئی صورت نہیں رہی اور پانی کے اُبلنے تک وہ ہوش کھو بیٹھے گا اور صبح تک اُبل اُبل کے بالآخر مر جائے گا۔ اس کے سامنے موت کا جو نقشہ کھینچا گیا تھا وہ غلط نہیں تھا اور سادھو رام جانتا تھا کہ یہ موت انتہائی خوفناک اور بھیانک ہو گی۔ مجھے اب یہ فکر ہونے لگی تھی کہ کہیں جانے سے پہلے ہی سادھو رام کا دماغ الٹ گیا تو میری ساری کوشش رائیگاں جائے گی لیکن یقین کرتا تھا کہ دماغ مزاحمت کرے گا لیکن موت کو قبول کرنے کے بجائے شکست تسلیم کرنے کو ترجیح دے گا۔ سادھو رام کا گالیاں بکنا اور دیوانوں کی طرح چلانا بھی ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اسے پاگل تسلیم کر لیں یا خود اپنی کوشش ترک کر دیں مگر میں تہیہ کر چکا تھا کہ خواہ سادھو رام پاگل ہو یا اگلے جہان چلا جائے، میں کوشش جاری رکھوں گا۔

دس منٹ میں سادھو رام کا پاگل پن درست ہو گیا۔ وہ تقریباً اُبلتے پانی میں زور زور سے اچھلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کے لیے جسم کے اس عذاب سے نکلنا ناممکن تھا۔ اس کی کھال کا رنگ عجیب سا ہو گیا تھا اور اس نے اپنے گھٹنے یقیناً زخمی کر لیے ہوں گے۔ بالآخر اس کی دردناک چیخوں کا سلسلہ رک گیا اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہنے لگا۔ "میں سب... سب کچھ بتاؤں گا... میں بتاؤں گا... جو پوچھو گے... سب سچ..." اس نے گردن کو ادھر ادھر یوں مارنا شروع کیا کہ اس کا سر ڈرم کی چادر سے ٹکرانے لگا اور گردن کے گرد زخموں کے حلقے گہرے ہو گئے... میں نے اُسے باہر نکالنے کا حکم دیا۔ استاد ڈیڈی اور چین ماہی نے اسے کھینچ کر باہر نکالا اور فرش پر ڈال دیا۔ اس کے جسم پر ٹھنڈے پانی کی ایک بالٹی اچھالی گئی تو اسے ہوش آ گیا لیکن وہ اسی طرح پڑا رہا۔ ہاتھ پیروں کی رسی کھول دینے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا اور وہ بڑے مضحکہ خیز انداز میں سمٹا ہوا لیٹا رہا اور کراہتا رہا۔ میں نے جھک کر اس کی کھال کو چھوا تو وہ چلایا... یوں جیسے میں نے انگلی نہیں، انگارا چھوا دیا ہو۔ اس کی کھال کچی پڑ گئی تھی۔ اس پر سے سارے بال اُتر گئے تھے اور آہستہ آہستہ وہ کھال آبلہ بننے لگی تھی۔

"بولو سادھو رام..." میں نے کہا۔ "تمہارے پاس اسلحہ لے کر کون آتا تھا؟ ان کے نام بتاؤ۔"

"وہ... وہ دو آدمی تھے..." سادھو رام نے بڑی مشکل سے کہا اور چپ ہو گیا۔

"شاباش... نام بتاؤ ان کے... نام پتے بتا دو گے تو تمہارا کام ختم... پھر تمہارا علاج کیا جائے گا... تمہیں آرام کا موقع ملے گا۔ جب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے تو تم کو جانے کی اجازت ہو گی..." میں نے کہا۔ "تم آزاد ہو جاؤ گے... نہیں بتاؤ گے تو ہم پھر تمہارا سوپ بنا دیں گے..." وہ مردے کی طرح لیٹا رہا تو میں نے اس کے بازو میں چٹکی بھری۔ وہ تڑپا اور چلایا مگر میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ "بتاؤ

اسلحہ کون لاتا تھا... تم سے پیسہ کون وصول کرتا تھا؟... بولو... بولو ورنہ مار ڈالوں گا۔"

"وہ... وہ چوہدری ملاوے کے آدمی تھے۔" سادھو رام تڑپتے ہوئے بولا۔

میں نے بازو کا گوشت چھوڑ دیا۔ "کیا تم نے چوہدری ملاوے کو دیکھا ہے...؟"

اس نے زور زور سے سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔ "میں نے اس کا صرف نام سُنا تھا..."

"کیا تم کو اس کے کسی ٹھکانے کا علم ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں... میرا واسطہ صرف دو آدمیوں سے پڑتا تھا۔" سادھو رام بولا۔ "ان میں سے ایک استاد پیڈرو تھا..."

"اور دوسرا..." میں نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کہا اور اس کی ران پر زور سے چٹکی توڑی۔

"دوسرا... دوسرا ایک سب انسپکٹر ہے... پرویز ڈوگر..." وہ چلایا۔

"کیا یہ پرویز ڈوگر کسی ڈی ایس پی سراج کا حوالہ دیتا تھا...؟" میں نے کہا۔

"ہاں... اس کا نام میں نے کئی بار سُنا... مگر میں نے اُسے دیکھا نہیں..." وہ بولا۔

"استاد پیڈرو کا حلیہ بتاؤ؟" میں نے کہا۔

سادھو رام نے اس کا جو حلیہ بتایا وہ بالکل ٹھیک تھا... اس حلیے کا دوسرا آدمی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"کیا استاد پیڈرو نے کبھی سکندر بخت... محسن یا رابعہ کا نام لیا؟" میں نے کہا۔

"سکندر بخت کا نام وہ اکثر لیتا تھا... کہتا تھا کہ اس کے باپ کو مارتے تو بیٹا آسانی سے قابو میں آ جاتا... اور وہ کہتا تھا کہ سکندر بخت کے گردے اپنے کتوں کے سامنے نہ ڈالے تو پیڈرو نام نہیں۔" وہ بولا۔

"رابعہ یا محسن... استاد ڈیڈی یا شہلا کا کبھی نام نہیں لیا اس نے...؟"

"مجھے یاد نہیں... کبھی لیا ہو گا تو میں نے غور نہیں کیا تھا۔" سادھو رام بولا۔

"استاد پیڈرو کہاں رہتا ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کی کوٹھی کا نمبر بتاؤ..."

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہتا ہے۔" سادھو رام بولا۔

"گرم پانی کی ایک پیالی میں دو چمچے نمک کے گھول کر لاؤ۔" میں نے ڈیڈی کو حکم دیا۔ ڈیڈی نے تعمیل کی۔

"ذرا دماغ پر زور دو۔" میں نے نمک ملا ہوا پانی سادھو رام کی گردن کے زخموں پر ٹپکا کے کہا۔ "اس کا کوئی پتا ٹھکانا ہے؟"

سادھو رام بلبلا کے تڑپا۔ اس کے گھٹنے جو اب تک مڑے ہوئے تھے سیدھے ہو گئے۔ "وہ... وہ کل آئے گا... پیسے لینے۔ جس دن جگن ناتھ مال لے جاتا تھا اس کے تیسرے دن وہ آتا تھا۔ یا پرویز ڈوگر آتا تھا۔" سادھو رام نے روتے اور ہانپتے ہوئے کہا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور وہ نشے میں محسوس ہوتا تھا مگر یہ مدہوشی ناقابلِ برداشت جسمانی تکلیف کا نتیجہ تھی۔

"وہ اب نہیں آئیں گے... انہیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ سائیں بابا چھوارے کا اڈا تباہ ہو چکا..." میں نے کہا۔ "ان کا دوسرا ٹھکانا بتاؤ..."

"وہ... ایک ایمبولنس... نمبر ایل آر زیڈ... سیون زیرو سکس زیرو..." سادھو رام کراہا۔ "اس پر ریڈ کراس کا جعلی نشان ہے۔ اسلحہ اسی ایمبولنس میں آتا ہے۔ ماکروبلس پہ خاکس ویگن کی... اور یہ گھومنے والی لائٹ ہے... اسے کوئی نہیں روکتا۔ جب وہ سائرن بجاتی ہوئی گزرتی ہے... اسے پرویز ڈوگر کا بھائی چلاتا ہے۔ ان کی بہن نرس کے لباس میں ساتھ رہتی ہے... سونیا ڈوگر..."

"ماشاء اللہ، پورا خاندان ہی غداری میں مصروف ہے۔" میں نے دل ہی دل میں مجرموں کے حسنِ انتظام کو سراہا۔ واقعی جب کوئی ایمبولنس سائرن بجاتی گزرتی ہے تو سب لوگ سہم کر ایک طرف ہو جاتے ہیں اور راستے کھلے چھوڑ دیتے ہیں جو زندگی کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے ہیں، سائرن موت کی آواز بن کے ڈرانے لگتا ہے اور احساس دلاتا ہے کہ عین اس لمحے جب زندگی کی ساری گہما گہمی عروج پر ہے۔ بچے اسکولوں میں آنے والے دن کے مسائل سے بے پروا تعلیم حاصل کرنے کا درس لے رہے ہیں، دفتروں میں قلم اور ٹائپ رائٹر چل رہے ہیں تو فیکٹریوں میں مشینیں اور دنیا بھر کی سڑکوں پر کاروانِ حیات رواں دواں ہے۔ بسوں اور چھکڑیوں، ہوائی جہازوں اور ٹرینوں میں لوگ مسکراتے ہیں، جام صحت پی رہے ہیں اور محبت کر رہے ہیں، تو ایک آدمی زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہے اور جب ایمبولنس گزر جاتی ہے تو وہ سوچتے ہیں کہ نہ جانے اس کشمکش میں جیت کس کی ہو گی اور پھر اپنی صحت اور زندگی کے احساس سے ان کا دل بھر جاتا ہے۔ وہ خدا کے شکر گزار ہوتے ہیں کہ اس وقت جو ایمبولنس گزری تھی اس میں وہ خود نہیں تھے اور ان کا اپنا پیارا کوئی نہیں تھا۔ ایمبولنس انسان اور موت کے درمیان جدوجہد کی علامت ہے اور اس سے ایمرجنسی وابستہ ہے۔ کوئی بھی یہ تصور ہی نہیں کر سکتا کہ کسی ایمبولنس میں مریض اور اس کی زندگی کے لیے اپنی صلاحیت کے مطابق کوشش کرنے والے مسیحا کی جگہ موت کا سامان ہو سکتا ہے۔ جہاں بر لب مریض کی جگہ [illegible]

www.paksociety.com

افسروں کے بھیس میں وطن کی آبرو کے سوداگر ہو سکتے
ہیں۔ ایمبولنس کی آواز پر ٹریفک رک جاتی ہے اور کانسٹیبل راستہ
صاف چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ڈرائیور سے لائسنس نہیں مانگتا۔ کاغذات
طلب نہیں کرتا اور ثبوت نہیں لیتا۔ ناکا بندی کرنے والے محافظ
پہریدار... سب ایک ایک لمحے کی اہمیت سمجھتے ہیں اور ایمبولنس
تمام رکاوٹوں سے صاف گزر جاتی ہے۔

بے شک مجرموں نے بہت چالاک ہونے کا ثبوت دیا
تھا اور بے حد ذہانت سے کام لیا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال
آیا کہ یہ بھی چوہدری ملادر کے شیطانی ذہن کی خلافت ہو گی۔ وہ
ڈرامے کرنے کا ماہر تھا اور ایمبولنس بھی ایک چلتا پھرتا ڈراما تھی۔
اس کو ایک سپاہی چلاتا تھا۔ جبکہ اس میں نرس کے فرائض سر انجام
دیتی تھی اور پچھلے حصے میں رہتی تھی۔ سپاہی اسے سمجھ سوچا کہتا
ہوگا تو بالکل ٹھیک کہتا ہوگا۔ وہ تینوں بھائی بہن ایکٹو آدمی ہیں۔
کسی کیچ میں اچھا خاصا انگریزی فر فر بولتے ہوں گے۔ اگر کبھی کسی نے
غلطی سے یا شک کی بنا پر ایمبولنس کو روکا ہوگا تو حقیقی ستھرے
سے سفید وردی والی نرس نے انگریزی میں شور مچا دیا ہوگا کہ مظلوم
پیشنٹ سیریس ہے ڈیڈ ہو... ایک منٹ کی دیر بھی ہو گئی، تو تم بھی
مارنے والوں میں شمار کیے جاؤ گے۔ اور ممکن ہے وہ سب ان میں
اسٹریچر پر سفید چادر اوڑھے مریض کو لیٹا دیکھ کر پیچھے ہٹ جانے
پر مجبور ہو گئے ہوں۔ حالانکہ چادر کے نیچے اسلحہ ہوں گی اور سیٹوں
کے نیچے دستی بم۔

ساڈھو رام اب بے ہوش ہو چکا تھا اور استاد شیدی کے ساتھ
چمن ماہی منتظر تھا کہ میں کچھ کہوں۔ بالآخر شیدی نے ہمت کی "اب
کیا کرنا ہے سر؟" وہ کھنکار کر بولا۔

"ہاں... کچھ نہیں... ابھی اسے چارپائی پر ڈال دو" میں نے
کہا۔ "جب ہوش میں آئے گا تو دیکھیں گے۔"

چمن ماہی اور استاد شیدی نے ساڈھو رام کو ٹانگیں اور ہاتھ
پکڑ کے اٹھایا اور بستر پر ڈال دیا۔ اس کی کھال نرم اور چکنی ہو رہی
تھی۔ جیسے اس پر گوند مل دیا گیا ہو۔ اس کا رنگ بھی سفید پڑ
گیا تھا اور ساڈھو رام کی شکل بہت ڈراؤنی لگ رہی تھی۔

"تم اب جاؤ چمن ماہی" میں نے کہا "یہ ٹیکسی چھوڑ جاؤ اور
اگر صبح ٹیکسی سڑک پر کھڑی نہ ملے تو گھبرانا نہیں... تمھیں
گورنمنٹ کی طرف سے پورے دن کا کرایہ ملے گا" میں نے سو کا
ایک نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"نہیں جناب! میں کچھ نہیں لوں گا اس کام میں" وہ بولا۔
"رکھ لو" میں نے ڈانٹ کر کہا "میں اپنی جیب سے کچھ نہیں
دے رہا ہوں اور تم گورنمنٹ کے لیے کچھ کرو گے تو کیا گورنمنٹ
تمھارے لیے کچھ نہیں کرے گی... تم کو ہم نے بیگار میں نہیں پکڑا ہے
بس یہ خیال رکھنا کہ معاملہ ملکی سلامتی اور راز داری کا ہے۔ اگر تم نے
اپنی بیوی سے ذکر کیا تو بہت بڑی بے وقوفی ہوگی۔"

"توبہ جی! عورت ذات کو راز کی بات بتانے کا مطلب ہے
بات کو لاؤڈ اسپیکر پر نشر کرنا۔" چمن ماہی بولا۔

"رائٹ... بیوی تمھارے سر کی قسم کھائے یا بچوں کی جان
کی... اس پر بھروسا نہیں کرنا ہے اور کوئی دوست کتنا ہی پرانا اور
قابل اعتماد کیوں نہ ہو اسے بھی کچھ نہیں بتانا ہے... یہ لوگ کون
ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ لیفٹیننٹ بننے کی خوشی میں بے خیال مت ہو
جانا ورنہ پہنچ جاؤ گے جیل کے پیچھے... اور وہ عام جیل نہیں ہوگی
لاہور کے شاہی قلعے کے نیچے جانے والے بہت کم اوپر آتے ہیں۔
ہاں اگر تم نے تربیت کے مرحلے طے کیے تو تمھاری سفارش میں
خود کروں گا اور جب تم لیفٹیننٹ بن جاؤ گے تو سب کو بتایا بھی
جائے گا۔ سال بھر کی بات ہے مگر سال میں ایک دن کی غلطی ہو
تو سکو ایمانی کرائے گی، آخری دن بھی غلطی کی تو سب ختم۔"

وہ سر ہلا کے چابیاں مجھے دے کر نکل گیا تو میں نے استاد شیدی
کی طرف دیکھا "میرا خیال ہے ٹھیک محمد کو ہوا اور کچھ بتانے کی
پوزیشن میں نہیں رہا... اب اسے ہوش نہیں آئے گا۔"

"تمھاری ہمت ہے سکندر بادشاہ کہ اس سے کچھ معلوم کر
لیا۔" شیدی بولا "ورنہ یہ بتانے والا نہیں تھا۔"

"ہمارے لیے نئے راستے کھل گئے ہیں" میں نے کہا "ہمیں
لستا لیس آئی پیرو ڈوکٹر کا پتا چلانا ہے۔ وہ اس ضمیر فروش ایجنسی کا
سرغنہ کا لوکل ایجنٹ ہوگا۔ اب اس پورے نظام کی کچھ تصویر میرے
سامنے ہے۔ بچہ ہمش ملادر کے کسی ٹھکانے سے پیرو ڈوکٹر ملا لے
کر ایک ایمبولنس میں ساڈھو رام تک پہنچاتا ہوگا۔ ساڈھو رام
کی بیوی دل کی مریضہ تھی۔ چنانچہ مہینے میں ایک بار اس کے گھر کسی
ایمبولنس کے آنے پر کوئی حیرت نہیں ہوتا ہوگا۔ ساڈھو رام کہتا
ہوگا کہ بیوی کو دورہ پڑا تھا اور اچانک اسپتال لے جانا پڑا تھا۔
اس کے گھر کے ملازم بھی یہی بات مشہور کرتے ہوں گے۔ ساڈھو رام
کے گھر میں ان کی موجودگی کے اسباب بھی زیادہ واضح ہو گئے
ہیں۔ وہ مال وصول کرنے والے تھے اور یہ دیکھتے ہوں گے کہ ہر چیز
آرڈر کے مطابق ہے۔ وہ ساڈھو رام پر بھی نظر رکھتے ہوں گے
کسی اور سے سودا نہ کرے۔ ساڈھو رام کا ایمان بھی متزلزل ہو سکتا
جگن ناتھ سے زیادہ روپے والا مل جاتا تو ساڈھو رام بے ایمانی بھی
کرتا مگر اس کی نگرانی کرنے والے وہاں اسی لیے رکھے گئے تھے کہ
ساڈھو رام کو بدعہدی نہ کرنے دیں اور پھر ساڈھو رام کے گھر سے
وہ مال سیوک اور اس کے دونوں ساتھی دلدار کے ہاتھ تک

www.paksociety.com

یعنی ساہیں پاڑہ والے کی جل منائقہ وغیرہ تک پہنچاتے ہوں گے۔"

"مگر تم نے مال کسی ٹرک میں آتے دیکھا تھا؟" ٹیڈی بولا۔

"ہاں۔ وہ ضرورت کے وقت ٹرک منگوا لیتے ہوں گے۔ ان کے پاس ہوا ایمبولینس ہوگا یا کیری ڈبہ۔" میں نے کہا۔ "پیغام ملتے ہی کہیں سے ٹرک آ جاتا ہوگا۔"

"سکندر بادشاہ! ابھی تم نے اس سے کہا تھا کہ وہ انڈین ٹرک تھا... اشوک لیلا کا۔"

"وہ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا جو نشانے پر لگا۔" میں نے کہا۔ "غالباً ایمبولینس کے دو پھیروں میں جتنا سامان سادھو رام کی حویلی میں جمع ہوتا ہوگا وہ ایک ٹرک میں ساہیں پاڑہ والے کے ذریعے پہنچا دیا جاتا ہوگا۔ وہاں سے والیا اپنے کرنل بھگن ناتھ کو سگنل دیتی ہوگی کہ ڈلیوری ہو گئی ہے۔"

"کیا... کیا ہو گیا ہے؟" استاد ٹیڈی نے گڑبڑا کے کہا۔

"پھر سمجھنے..."

میں بے اختیار ہنسا۔ "میرا مطلب تھا کہ وہ سامان وصول ہو جانے کی اطلاع دیتی ہوگی اور کرنل بھگن ناتھ ادائیگی کرنے آ جاتا ہوگا۔ مال دیکھتا ہوگا اور رقم والیا کو دے جاتا ہوگا۔ اس کے بعد کسی وقت سرحد پار سے ٹرک آتا ہوگا اور یہ مال لوڈ کر کے لے جاتا ہوگا۔ سرحد پار کرنے میں ایک طرف سے تو کوئی دشواری نہیں۔ دوسری طرف جانے دشمنوں کے یار ایسی ہی سراغ موجود ہیں۔ وہ اپنی وطن فروشی کی قیمت وصول کر کے ٹرک کو بحفاظت دوسری طرف پہنچاتے ہوں گے اور جب دوسری طرف سے مال مل جانے کی اطلاع والیا کو ملتی ہوگی تو وہ اپنا کمیشن کاٹ کر سادھو رام کو ادائیگی کر دیتی ہوگی۔ سادھو رام اپنا کمیشن وضع کر کے باقی رقم ہیرو یزدی کو دیتا ہوگا جو اس رقم کو چوہدری ملا وردی تک پہنچاتا ہوگا۔ ہیرو یزدی کی تنخواہ بھی یا تو کمیشن ملتی ہوگی یا چوہدری ملا وردی کا ملازم ہوگا۔ اب ہم نقطۂ آغاز سے چلیں گے یعنی سب سے پہلے ہیرو یزدی کو تلاش کریں گے۔ پھر اس کے بھائی بہن تک پہنچیں گے۔ ان کی ایمبولینس کا سراغ لگائیں گے اور دیکھیں گے کہ اب وہ مال کہاں پہنچاتے ہیں۔"

"یہ تو بہت مشکل کام ہے سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی بولا۔ "وہ بھائی بہن ہمیں قریب کہاں پھٹکنے دیں گے۔"

"ظاہر ہے یہ کام آسان ہوتا تو تم اکیلے بھی کر لیتے۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر فیضی تک پہنچنے کے دو ذریعے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم چھپ کر اور بھیس بدل کر ان کے آگے پیچھے لگے رہیں اور دوسرا یہ کہ ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ دونوں صورتوں میں خطرہ برابر ہے مگر تیسری صورت کوئی نہیں ہے۔ جہاں ان کے ساتھ ساتھ یا ان کے پیچھے پیچھے چلنا پڑے گا تب ہی ہمیں ہر راستے کا اور ہر منزل کا سراغ ملے گا۔"

"ٹھیک ہے کرنل! جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہوگا۔" ٹیڈی نے کہا۔

"میرے چاہنے کی کیا بات ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آج ہی سب پتا چل جائے۔" میں نے کہا۔ "یہ تو میرا پیچھا ہے۔ سب خدا کی مرضی اور تائید پر منحصر ہے۔ تقدیر ساتھ نہ دے تو تدبیر سے کیا ہوتا ہے۔"

"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔" ٹیڈی نے بڑی سنجیدگی سے نصف شعر پڑھا۔ "اور اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ وہ ساتھ نہ ہوتا تو ہم سب کیسے ملتے؟ اسی نے ہمیں ملایا کیونکہ وہ ہم سے کوئی بڑا اور نیک کام لینا چاہتا ہے اور اسی نے ہمیں حوصلہ دیا۔ اس سے ملاقات نہ ہوتی تو کیا اب تک ہم زندہ ہوتے؟ آئندہ بھی حق کا ساتھ دے گا۔"

میں نے ٹیڈی کو گلے سے لگا لیا۔ "تمہارا یقین اور ایمان دیکھ کر مجھے حوصلہ ملتا ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو دوست۔"

ٹیڈی کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ اس کے دل کی آواز تھی۔ وہ کوئی بہت عالم فاضل شخص نہیں تھا کہ ایسی جذباتی تقریر کر سکتا لیکن یہ اس کے دلی جذبات تھے جو خالص اور کھرے تھے جو خود بخود الفاظ میں ڈھل گئے۔

"اب اس کا سوچو سکندر بادشاہ... یہ کہیں مر نہ جائے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے استاد کہ یہ مرنے والا ہے۔" میں نے کہا۔ "چلو اس کو دنیا کے عذاب سے نجات دلا دیں۔ دنیا کو اس کی اور اسے دنیا کی ضرورت ہی نہیں رہی۔"

ہم دونوں نے مل کر سادھو رام کو اٹھایا اور باہر کھڑی ہوئی ٹیکسی کی ڈکی میں ڈال دیا۔ پھر میں پیچھے بیٹھا اور استاد ٹیڈی نے ڈرائیونگ شروع کی۔ ٹیکسی سڑک پر آئی اور میں نے ٹیڈی کو دریا کی سمت چلنے کو کہا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ سادھو رام کو شہر سے باہر لے جا کر گولی ماروں اور پھر اسے دفن کر آئیں مگر بعد میں میں نے سوچا کہ اتنی تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے غرقِ دریا کرنے میں آسانی رہے گی۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے اور سڑکوں پر ہو کا عالم تھا۔ جگہ جگہ پر گشت کرنے والے چوکیدار تھے لیکن ٹیکسی کو کسی نے نہیں روکا۔ ٹیکسی نے شاہی قلعے کے پیچھے اور اقبال پارک کی درمیانی سڑک سے نکل کر راوی کی طرف جانے والی سڑک کا رخ کیا۔ دس منٹ بعد ہم پل پر پہنچے۔ وہاں پولیس تھی اور اگر خطرہ تھا تو اسی جگہ کہ وہ روک کر تلاشی نہ لیں۔ مگر عین وقت پر پولیس والوں کا ایک ٹرک ڈرائیور سے جھگڑا شروع ہو گیا۔ میرے کہنے

ٹرک ڈرائیور نے پولیس کانسٹیبل کو تھپڑ مارا۔ کانسٹیبل کے ساتھی نے پیچھے سے ڈرائیور پر حملہ کیا اور اس کو ٹرک کی باڈی سے دے مارا۔ اتنے میں ٹرک میں سے دو اور پولیس والے نکلے اور ان تینوں نے ڈرائیور کا حلیہ بگاڑ دیا مگر اتنی دیر میں پیچھے کھڑے ہوئے ٹرکوں کا قافلہ... ڈرائیور اتر کے آنے لگے۔ ان سب کے ہاتھوں میں سریے، ہاکی اسٹک اور جیک کو گھمانے والے ہینڈل تھے۔ اپنے ساتھی کے ساتھ پولیس کے ظلم کے خلاف وہ سب متحد ہو گئے تھے اور اب پولیس کا مار کھانا یقینی تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں پولیس کی بالادستی قائم رکھی جاتی اور سب ڈرائیوروں کو گرفتار کر کے الگ الگ تھانوں میں اس سرکشی کی سزا دی جاتی۔

"ٹیکسی نکال لو استاد..." میں نے ٹیڈی سے کہا۔ "موقع اچھا ہے۔"

"ہاں!" ٹیڈی چونکا۔ "میں تو پولیس کی پٹائی کا سین دیکھنے لگا تھا۔"

پولیس اور ٹرک ڈرائیوروں کی مارپیٹ کے باعث پل پر جب طرف سے آنے والا ٹریفک جام ہو رہا تھا تو دوسری طرف کا ٹریفک رک گیا تھا۔ ہماری ٹیکسی کے نکل آنے کے بعد صرف دو تین اور گاڑیاں نکل آئیں۔ گاڑیاں پل سے آگے نکل گئیں۔ اب پل کے آخری حصے میں کوئی نہیں تھا۔ شہر کی طرف سے آنے والی بسیں اور گاڑیاں بھی رات کو کم ہو جاتی ہیں مگر لاہور سے اور گرد و نواح کے مضافات سے دودھ والوں کے ٹرک آنے شروع ہو گئے تھے۔ نصف سے زیادہ پل عبور کرنے کے بعد میں نے ٹیڈی کے کندھے پر تھپکی دی۔

"یہاں روک لو استاد... اس طرح کہ ڈکی سامنے نہ رہے۔ خود بونٹ کھول کے کھڑے ہو جاؤ۔"

ٹیڈی نے گاڑی کنارے پر روکی اور گیئر کو نیوٹرل میں رکھ کر تھوڑا سا پیچھے ہٹایا۔ گاڑی ایک شہتیر کے سامنے آ گئی۔ ٹیڈی نے نیچے اتر کر ڈکی اور پھر بونٹ کھولتے چلا گیا۔ میں نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ دروازہ کھول کر ڈکی میں جا کر ہاتھ لگا دیا۔ اس کا پچھلا حصہ اٹھ گیا۔ میں نے سادھو رام کو کھینچ کر نکالا اور کندھے پر ڈال لیا۔ اب ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا کم سے کم وقت میں کرنا تھا۔ مخالف سمت سے کوئی گاڑی نمودار ہو جاتی تو ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سب کچھ نظر آ جاتا۔ میں نے سادھو رام کو ایک عمودی شہتیر پر ٹکایا اور جنگلے کے دوسری جانب اتر گیا۔ ایک بار پھر اسے سنبھالا اور دوسرے شہتیر پر رکھ دیا۔ میں ایک تیسرے شہتیر پر کھڑا تھا اور دریا کے راوی کا پانی بہت نیچے تقریباً

سو فٹ کی گہرائی پر خاموشی سے بہتا جا رہا تھا۔ اگر میرا پیر پھسل جاتا یا توازن بگڑ جاتا تو سادھو رام وہیں لیٹا رہ جاتا اور میں نیچے دریا میں جا گرتا لیکن اس جگہ جہاں پانی کی گہرائی سب سے زیادہ تھی۔ لیکن اس سے میرے لیے کوئی پریشانی نہ پیدا ہوتی۔ استاد ٹیڈی فوراً ٹیکسی میں بیٹھ کے بھاگ جاتا اور میں تیر کر نکل جاتا مگر سادھو رام بچ جاتا۔ اسے کوئی نہ کوئی ہسپتال پہنچا دیتا جو میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کے سادھو رام کو دھکا دیا اور دوسرے لمحے اس کے جسم کو اندھیرے میں ایک فولادی شہتیر سے ٹکرا کے اچھلتے اور پھر نیچے جاتے دیکھا۔ مجھے اس کے پانی میں گرنے کی آواز بالکل سنائی نہیں دی اور نہ میں نے اس کا انتظار کیا۔ میں فوراً اوپر چڑھا اور شہتیر سے سڑک پر کود گیا۔ ایک کار میرے قریب رکی۔

"یہ تم کیا کر رہے تھے؟" کار سے اترنے والے ایک شخص نے کہا۔ وہ مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے میں تخریب کار ہوں۔

"میں کوئی اچھا کام نہیں کر رہا تھا۔" میں نے انگریزی میں جواب دیا۔ "یہ ٹیکسی گھنٹا بھر سے خراب پڑی ہے اور یہاں کوئی باتھ روم نہیں ہے... میں کب تک برداشت کرتا۔ ادھر سے ٹریفک بند پڑی ہے۔"

وہ آدمی ہنس پڑا۔ "میں سمجھا تم... خیر... آئی ایم سوری۔" وہ پھر کار میں بیٹھا اور کار روانہ ہو گئی۔

"تمہاری انگریزی کام آ گئی سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے فوراً بونٹ بند کیا اور اندر آ بیٹھا۔

"ہاں۔ انگریزی بڑے بڑے کام نکال دیتی ہے۔ انگریزی بولنے والا معتبر ہو جاتا ہے۔" میں نے تمکنت سے کہا۔ "انگریزی شرافت کی سند بن جاتی ہے۔"

"معلوم نہیں کون تھا... خواہ مخواہ اڑ گیا۔" ٹیڈی بولا۔

"اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی رک جاتا۔" میں نے کہا... "آدھی رات کے وقت کوئی پل پر چڑھے تو شک یہی ہوتا ہے کہ کہیں پل کو اڑانا تو نہیں چاہتا... ہم تو نہیں رکو رہے، گاڑی اب موڑ لو۔"

"سادھو رام کا کریا کرم تو ہو گیا۔" ٹیڈی نے گاڑی کو نصف دائرے میں موڑ لیا۔

"ہاں... ابھی وہ زندہ تھا۔ وقت ہوتا تو میں اس کے وجود سے راوی کے پانی کو گندہ نہ کرتا۔" میں نے کہا۔ "اسے زندہ گاڑ دیتا کسی ویرانے میں... یا جنگل میں پھینک آتا گولی مار کے۔"

ٹرک ڈرائیوروں اور پولیس کا جھگڑا ختم ہو چکا تھا مگر ایک پولیس والے نے ٹیکسی روک لی کیونکہ ٹیڈی کے پاس ٹول ٹیکس کی پرچی نہیں تھی۔ "جاتے وقت پرچی کیوں نہیں لی تھی؟" سنتری

www.paksociety.com

غور کیا۔

"وہ جناب عالی! آپ کا اور ٹرک والوں کا جھگڑا چل رہا تھا۔" ٹیڈی نے معصومیت سے کہا اور پچاس کا نوٹ آگے بڑھا دیا۔ "پچی بچیں کون دیتا... اب لے لیں آپ..."

"چلو منتری بادشاہ! یہ بچا رہ گئے رکھ لو۔" میں نے کہا اور منتری نہایت ڈھٹائی سے مسکرایا۔ ٹیکسی کو آگے جانے کی اجازت مل گئی۔ صبح کے ساڑھے تین بجے ہم واپس پہنچے تو ہم نے ٹیکسی سڑک پر ہی روک دی اور باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے تالے کو دیکھا وہ جوں کا توں لٹک رہا تھا۔ ٹیڈی نے تالا کھولا اور پھر کنڈی کی مگر اسے حیرت ہوئی۔ جب دروازے کے پٹ کھلے تو وہ اندر کی جانب لڑھک گیا اور سر پکڑا تھا۔

"لاحول ولا قوۃ! تم آدمی ہو کر سانڈ۔" غالب نے ٹیڈی کو گھور کے کہا۔ "تم آوارہ وشنک... مجھے چلتے ہو شریف لوگوں کے بے حد پرائیویٹ خواب میں۔ سب کے ساتھ اچھا بھلا خواب توڑ دیا اور وہ بھی دو چار ہاتھ جب کہ لمبا سلام رہ گیا تھا۔"

"میں تو سمجھا تھا کوئی پاگل کتا آ کے دروازے پر بیٹھ گیا ہے۔" ٹیڈی نے جواب میں عرض کیا۔ "اچھا ہوا پتھر نہیں مارا۔"

"اور میاں غالب یہ گلی میں بیٹھ کے کب سے پرائیویٹ خواب شریف لوگ دیکھتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"خواب میں کسی کے باپ کا اجارہ ہے۔" غالب نے تیوری چڑھا کے کہا۔ "میں گلی میں بیٹھ کے دیکھوں یا کلفٹن وی کے اسٹینڈ پر بیٹھ کر یا گرم توے پر بیٹھ کر۔"

"اچھا بھائی... ناراض کیوں ہوتے ہو۔" میں نے پلنگ پر بیٹھ کے کہا۔ "یہ تو بتاؤ وہ خواب کس کا تھا؟"

"تھا خواب میں خیال کو ان سے معاملہ۔ جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا۔" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"ان سے کیا مراد ہے۔ وہی جو بڑے توڑ تانک موڑ اور سر پھوڑ حسینہ؟" میں نے کہا۔ "کتنی بار پٹ چکی تھی؟"

"تم تو بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہو سکندر بادشاہ۔" غالب نے کہا۔ "بھلا تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

"ہم کو خواب میں بیٹھے بیٹھے ہی نظر آ گئیں گے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تم بھی خواب دیکھو گے تو اس سے مار کھاتے گا۔"

"تمہارے باپ نے بھی کبھی محبت کی تھی کسی سے۔" غالب برہم ہو گیا۔ "تم کیا جانو پیار کی مار... اور پھر دونوں طرف سے آگ برابر لگی ہوئی۔ وہ بھی تو خواب میں مجھے ہی دیکھ رہی ہو گی۔ تم تم کے دکھاؤ کبھی کسی کے خواب میں۔"

"بس بس... امن صلح آشتی۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تم آج

آفس میں کیوں نہیں پڑے رہے۔ کیا ایڈیٹر نے نکال دیا ہے؟"

"پہلے تم بتاؤ کہ اس وقت کون سی توپ چلا کے آ رہے ہو؟" غالب بولا۔ "کیا موڑ سونگ والے کے پیچھے گئے تھے؟"

میں نے اسے بتایا کہ ہم نے سادھو رام کو پولیس کا پہنچا دیا ہے اور اس نے عالم فانی سے کوچ کرنے سے قبل جو مفید معلومات فراہم کی تھیں وہ کیا ہیں۔ استاد ٹیڈی نے اتنی دیر میں ہمارے لیے کافی تیار کی۔ ہمارے ساتھ رہتے رہتے اس کے مزاج، عادات و اطوار اور ذوق میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی جو بے حد خوشگوار تھی۔ اس نے ذہنی طور پر ہمارے ساتھ مطابقت ہی نہیں کی تھی، ہماری سوچ کا انداز بھی اختیار کر لیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ذہین تھا اور ایک اچھے خاندانی پس منظر کا مالک تھا۔ حالات نے اسے جس ماحول میں پھینک دیا تھا وہاں اس کی شخصیت بے معنی تھی اور گمنامی میں اس کی زندگی کی گرد جم گئی تھی جسے اس نے ہماری رفاقت سے دھو ڈالا اور اندر سے وہی پرانا اجلا نیک محمد نکل آیا جو استاد ٹیڈی نہیں تھا۔ وہ اب ہم میں سے ایک تھا تو ہمارے ہی سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ ہم پیش گوئی کر سکتے تھے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ محسن میں اور مجھ میں ظاہر و باطن کا کوئی فرق نہیں رہے گا۔ وہ کیریئر کے ڈھنگ سے بیٹھنے لگا تھا۔ گفتگو میں تسلی بخش جواب دیتا تھا۔ کافی پینے کا عادی ہو گیا تھا اور اپنے ماضی کو فراموش کر چکا تھا۔

"سادھو رام کے ساتھ تو تم نے ٹھیک کیا۔" غالب نے کافی پیتے سگریٹ کا دھواں پھیلاتے اور غور فرماتے ہوئے کہا۔ "لیکن میری صحافتی حس کہتی ہے کہ تم نے جین ماہی پر بہت زیادہ اعتماد کر لیا ہے۔ یہ ڈراما چلے گا نہیں۔"

"کیوں نہیں چلے گا... وہ بھروسے کا آدمی ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"بالکل ہے... لیکن حد سے زیادہ جذباتی ہونا اس کی کمزوری ہے۔ ایسے لوگ بعض اوقات جوش میں حد سے بڑھ جاتے ہیں اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مرواتے ہیں یا ان کے جذبات کی رو شکست منفی ہو جائے تو وہ اتنے ہی خطرناک دشمن بھی ہو جاتے ہیں جتنے اچھے دوست تھے۔ اعتدال پسندی سے ہی مستقل مزاجی آتی ہے۔"

"یہ تم نے بہت عقل مندی کی بات کہی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"میرا مشورہ ہے کہ فی الحال ہم غائب ہو جائیں۔" غالب نے کہا۔ "یہ ممکن ہو کہ جین ماہی کی کسی جذباتی حماقت کے باعث ہم ابھی جگہ ایسے گھر جائیں کہ نکل ہی نہ سکیں۔"

"مگر وہ آدمی ہمارے کام آ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ضرورت پڑنے پر کھوٹا سکہ بھی کام آ جاتا ہے مگر ایسے

بے ہیں یہ لیے پھرتے اور اس پر بھروسا کرنے کو عقل مندی نہیں کہا جا سکتا۔" غالب نے کہا۔ "یہ تم نے اچھا کیا کہ سادھو رام کو اس کے سامنے پیش نہیں کیا۔ اب اس کے لیے ایک رقعہ چھوڑ کر کہ ہم سادھو رام کے ساتھ ایک ایسے سیکرٹ مشن پر جا رہے ہیں اور مکان کو تالا لگا کے کھسک لو۔ جب بھی ضرورت پڑے گی اس سے رابطہ قائم کر لیں گے اور مکان کی چابی ہمارے ہی پاس رہے گی۔"

"جین ماہی اگر مطمئن نہ رہ سکا تو سخت مایوس ہو گا۔ اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اس کو لیفٹیننٹ بنا دینا سال بھر بعد۔ درمیان میں اس سے ملتے رہنا اور اسے وظیفہ بھی دیتا مگر اس کے سامنے جانے کی اور اپنا ٹھکانا بتانے کی ضرورت نہیں۔" غالب نے کہا۔ "اس عرصے میں پتا چل ہی جائے گا کہ وہ کس حد تک قابل اعتماد ہے۔"

"تیری بات میرے دل کو لگی ہے غالب کے بچے۔" میں نے کہا۔ "صبح ہونے سے پہلے ہم غائب ہو جاتے ہیں مگر غائب ہو کر جائیں گے کہاں؟"

"دیکھے کہاں تک ہیں... ملک خدا تنگ نیست..." غالب نے کہا اور گدھا کو جاتے بوجھتے گھورا کستے ہوئے ٹیڈی کی جانب دیکھا۔

"سکندر بادشاہ! سمجھا لو اس صحافی کی دُم کو۔ پہلے اس نے مجھے سانڈ کہا تھا اب گدھا کہہ دیا ہے۔" ٹیڈی بگڑنے لگا۔

"تم نے بھی مجھے پاگل کتا کہا تھا۔" غالب نے کہا۔ "اور تم تو برجھوٹ بک رہے تھے، میں سچ کیوں نہ بولوں۔"

ایک بار پھر میں نے ان کے درمیان سیز فائر کرا دیا۔ "جب ہم تا عمل محسن میاں کی زوجہ کے سایۂ عاطفت میں چلے جاتے ہیں تو اپنا ٹھکانا تلاش کر لیں گے۔"

نہ جانے کیوں اس وقت مجھے غالب کی بات میں دور اندیشی نظر آئی۔ جین ماہی پر اعتماد کا مظاہرہ ٹیڈی کو بھی پسند نہیں آیا تھا۔ شاید فطرت کی بات کو بہت آگے بڑھا دیا تھا۔ جین ماہی کی نیت کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ دماغ سے زیادہ دل کی بات پر عمل کرتا تھا۔ یہ اس کی فطرت تھی جو ایک دم نہیں بدل سکتی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کچھ عرصے بعد وہ بھی سمجھ جائے کہ بعض معاملے دل سے نہیں اور دماغ کے فیصلے زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔ لیکن فوری طور پر اس کی جذباتی طبیعت میں ہمارا دوست ثابت ہونے کے امکانات نظر انداز نہیں کیے جا سکتے تھے۔ ہمارا سامان اب بہت کم رہ گیا تھا اور جو ضروری بچا تھا وہ ٹیکسی میں رکھ کر جایا جا سکتا تھا۔ ٹیکسی کی چابی ہمارے ہاتھ میں تھی اور جین ماہی کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ تھا کہ ٹیکسی نہ ملی تو وہ پریشان ہو جائے گا۔ چند منٹ میں ہم نے اپنا اسباب اٹھا لیا اور گھر کے دروازے میں قفل ڈال دیا۔ غالب نے اپنی تحریر میں دروازے کی کنڈی میں ایک رقعہ لکھ کر چھوڑ دیا۔ اس میں صرف ایک جملہ تھا: "ہم ایک خطرناک مشن پر چلے جا رہے ہیں۔"

صبح کا ملگجا اجالا شہر پر اترنے لگا تھا جب ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر ایلس کے اس ٹھکانے سے بھی رخصت ہو رہے تھے جسے ہم نے کچھ عرصے کے لیے بہت محفوظ فرض کر لیا تھا۔ سادھو رام کے یہاں آنے سے خطرے کا احساس خواہ مخواہ ساتھ آ گیا تھا اور مجھے کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ کہیں دشمنوں کے ایجنٹ کتے ہماری بو سونگھتے ہوئے یہاں بھی نہ پہنچ جائیں۔ وہاں سے نکل کر میں نے خود کو کچھ ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ ایک عجیب سا اطمینان تھا کہ ہم بہت مناسب وقت پر وہاں سے نکل آئے۔

"میں نے ابھی تک تمہارے ایک سوال کا جواب نہیں دیا۔" غالب نے اونگھتے اونگھتے سر اٹھا کے کہا۔ "سوال بتاؤ۔"

"پہلے تم جواب بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں سوال دوبارہ بنا لوں گا۔"

"میں جو آفس کی میز پر لمبی تان کے سونے کا عادی ہوں۔" غالب بولا۔ "اور اخبار کی آخری کاپی چلے جانے کے بعد ایڈیٹر کو تشویش تک نہیں کرتا۔ صبح سے پہلے اس در پہ کیوں آ پڑا تھا۔"

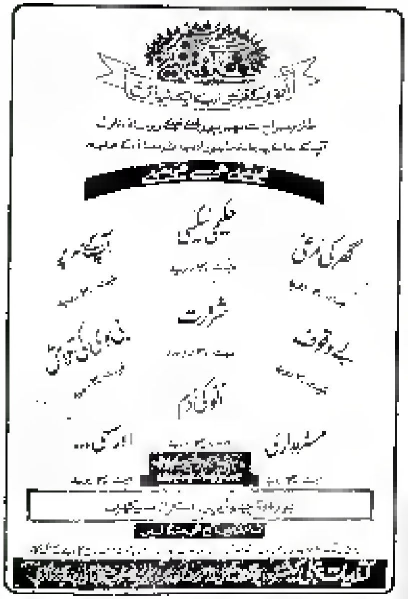

www.paksociety.com

"ہاں، یہی میرا سوال تھا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں ایڈیٹر نے باہر پھنکوا دیا ہوگا کہ رات کو دفتر میں کوئی گڑبڑ نہیں ہونا چاہیے۔"

"کبھی ایسا ہوا تو تم دیکھو گے کہ باہر کوڑے کے ڈھیر میں ایڈیٹر پڑا نظر آئے گا۔" غالب بولا۔ "مجھے تو ایک پیغام ملا تھا بلکہ یوں کہوں کہ میرے لیے کسی کا پیغام آیا تھا تو زیادہ مناسب بات ہوگی۔ اس نے مجھے الٹی میٹم دے دیا ہے۔"

"کس نے... نازو نے؟" میں نے کہا۔ "کیا کہا ہے کہ آدمی بن جاؤ ورنہ عاق کر دوں گی۔"

"اس نے کہا ہے کہ شام چار بجے تک مجھے اسپتال سے لے جاؤ۔" غالب نے کہا۔ "ورنہ آدھے اسپتال کو تباہ کر کے نکل جاؤں گی اور پھر تمہارے اخبار کے دفتر آ کے تباہ کروں گی۔ میں بہت سخت دہشت زدہ ہوں۔ اخبار کی تو کوئی بات نہیں، لوگ دوسرا چھاپ لیں گے لیکن غالب دوسرا کہاں سے آئے گا۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا..."

"اور وہ جو تم کہتے تھے کہ غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟" میں نے کہا۔

"اس وقت تک مجھے نازو سے یعنی نازو کو مجھ سے... گویا کوئی وہ نہیں تھا... جو آپ کو رابعہ سے یا رابعہ کو آپ سے ہے۔ امید ہے آپ سمجھ رہے ہوں گے۔" غالب نے کہا۔

"یہ تو بڑے ٹریفک سے مرزا جی... آگ ایک طرف لگی ہوئی ہے۔ تم نے کبھی نازو کے منہ سے کچھ سنا؟" میں نے کہا۔

"جو سنا ہے وہی تو سنا رہا ہوں۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہیے؟" وہ بولا۔ "یعنی اس نے صرف مجھے ہی پیغام کیوں بھیجا! یہ کیوں کہا کہ آ کے مجھے لے جاؤ۔ آخر تم بھی تو بڑے نامزد بنے ہوئے ہو۔"

"لیکن مجھے وہ کس پتے پر پیغام بھیج سکتی تھی؟" میں نے کہا۔ "ایک تم ہی تو تھے جس کے بارے میں وہ جانتی ہوگی کہ اخبار کے دفتر میں مل جاؤ گے۔"

"گویا تم نہیں مانو گے۔" غالب نے جھنجھلا کے کہا۔ "میرے چاند! وہ کہلوا سکتی تھی کہ نازو اور رستم سے کہہ دینا مگر اس نے براہ راست مجھ سے کہا کہ آ کے لے جاؤ۔ غور کریں آپ مجھے آ کے لے جاؤ پر... یہ ہیروئن کی پکار ہے جو ظالم سماج کی قید میں ہے... ایسے میں ہیرو کیا کرتا ہے؟"

"پہلے تو ایک گانا گاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یا ادھر ایک بند ہیروئن گاتی ہے، ادھر دوسرا بند ہیرو گاتا ہے... اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ صرف فلموں میں ہو سکتا ہے۔"

"جاؤ تم سب جاؤ بھاڑ میں... میں کل اسے لینے جا رہا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "آدھے اسپتال کو وہ تباہ کر دے گی۔ باقی آدھے کو میں کر دوں گا... پھر کون روکے گا ہمارا راستہ... ہم سیدھے چلے جائیں گے قطب شمالی کی طرف یا ٹانگا نیکا۔"

"کیا اس کی حالت اب ایسی ہے کہ وہ یہ سب کچھ کر سکے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"وہ تقریباً صحت مند ہے لیکن اس پاگل اسپتال میں کچھ دن اور رہنا چاہتی ہے کہ اسے لوٹ کر گھر جانا منظور نہیں۔" غالب نے کہا۔ "وہ سمجھتی ہے کہ گھر سے پھر نکلنا مشکل ہو جائے گا اور اطلاعاً ریڈیو نے خبر دی ہے کہ مس نازو بفضل خدا فل آف ایکشن ہیں۔ وہ تو اکیلی بھی نکل آتی لیکن وہ جو اس کا بے حد چالاک بھائی ہے نا... وہ سب سمجھتا ہے اور اس نے بڑے سخت حفاظتی انتظامات کیے ہیں۔ اسپتال میں کمرے کے دروازے کے باہر ایک شخص بیٹھا رہتا ہے جو مسلح بھی ہوتا ہے اور شاید سابق کانسٹیبل ہے۔ وہ نازو کو ہاتھ پیر توڑ کے مزید دو ماہ کے لیے لٹا سکتا ہے۔ اندر بھی پاپا تو نہیں شیخ خود موجود رہتا ہے عموماً دن میں... رات کو اس کے ابا جی ہیں۔ شیخ سے یوں نمٹنا مشکل ہے کہ وہ مجھے فوراً پہچان جائے گا اور اس کے ابا کو ناک آؤٹ کرنا اس لیے مشکل ہے کہ وہ ایک شریف اور وضع دار آدمی ہیں... بزرگ ہیں۔"

"یہ سب اطلاعات اس پیغام کے ساتھ ملی تھیں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"نہیں... وہ دراصل... پیغام ملنے کے بعد میں نے بھی جاسوسی کی تھی، دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔" غالب نے سر کھجا کے خفت سے کہا۔

"فکر مت کرو دوست۔" میں نے مرزا کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "تم کو ایسے ملاؤں گا جیسے اب خوابوں میں ملتے ہو۔"

ابھی سورج نکلا ہی تھا کہ ہم نے گھر کے دروازے پر جا کے میں نے بیٹھ کر دیکھا تو استاد ٹیڈی سویا پڑا تھا۔ وہ جاگ رہا ہوتا تو اتنی دیر خاموش نہ رہتا اور کسی نہ کسی بات پر اس کی غالب سے جھڑپ ضرور ہو گئی۔ میں نے دستک دی تو محسن آنکھیں ملتا نکلا۔ اتنی صبح ہمارے آنے کی شاید وہ بھی نہیں سوچ سکتی تھی چنانچہ وہ بھی اپنے گھر والے کے پیچھے متفکر نظر آئی۔

"آخر کیا... خیر تو ہے؟" محسن نے کہا۔ "شہر کا کیا؟ ابھی تو مرغے بھی سوئے پڑے ہیں۔"

"ہم کیا کریں... علامہ صاحب نے فرمایا ہے کہ اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو۔" میں نے سامان اتارتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں غریب نہیں ہوں۔" محسن بولا۔ "میں عجیب و غریب ہوں... وہ میرا سالا بھی بھول آئے ہو کیا؟"

"نہیں... وہ پچھلی سیٹ پر پڑا ہے۔" غالب نے کہا۔

www.paksociety.com

فدا ہوں آپ سے۔" محسن نے کہا اور آگے بڑھ کے دروازہ کھولا۔ پھر ٹیڈی کے کان پہ منہ رکھ کے سائرن کی طرح آواز نکالی۔ ٹیڈی ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" اس نے کان میں انگلی ڈال کے ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ صور اسرافیل تھا فرشتے!" غالب نے کہا "اپنی قبر سے نکل آ۔"

اندر پہنچ جانے کے بعد ہم نے محسن کو اپنی ہجرت کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا اور ساوھورام سے تفتیش کے نتیجے میں حاصل ہونے والی معلومات کا خلاصہ پیش کیا۔ شعلہ نے فوراً امور خانہ داری سنبھال لیے تھے اور ہمارے پیچھے جا کے ناشتے کا انتظام کرنے میں لگ گئی تھی۔ اس نے ساوھورام سے تفتیش اور اس کے انجام کے بارے میں کچھ نہیں سنا ورنہ وہ خواہ مخواہ دہشت زدہ ہوتی۔

"تم لوگ وہ سب کچھ وہیں مدفون چھوڑ آئے؟" محسن بولا۔

"استاد ٹیڈی کا خزانہ اور وہ ڈائمنڈ کرنسی؟"

"اتنا وقت نہیں تھا اسے کھود کر ساتھ لاتے۔" میں نے کہا۔ "اور پھر ابھی اس کی ضرورت بھی کہاں ہے۔ جب ضرورت پڑے گی نکال لائیں گے۔ ہمارے ساتھ لیے پھرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"لیکن ایک چیز ہے جسے ہر حال نکال کے لانا ہے۔" غالب نے کہا۔ "وہ زیادہ مشکل کام ہے۔"

میں ہنسا "معاف کرنا دوست... میں اسے بالکل ہی بھول گیا تھا۔"

"یہ کس چیز کا ذکر ہو رہا ہے؟" محسن بولا۔ میں نے اسے نازو کے پیغام کے بارے میں بتایا۔

"یہ کام تو خطرناک ہے۔" محسن نے کہا۔

"وہ لڑکی بھی بہت خطرناک ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے جو کہا ہے وہ کر دکھائے گی۔ موجودہ حالات میں وہ ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ ہمیں ایک ایسی ٹیم کی ضرورت ہے جو ساوھورام سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں کچھ کر سکے۔ رابعہ کے نکل جانے سے اور شعلہ کے بیاہ رچا لینے سے اہم آسامیں کا زنانہ شعبہ خالی پڑا ہے۔ رابعہ کا کچھ پتا نہیں کہ وہ پھر کب ہمارا ساتھ دینے کے قابل ہوگی اور شعلہ کو ہم ساتھ رکھنے کے خلاف ہیں۔ نازو ہی وہ لڑکی ہے جو کسی بھی خطرناک مشن پر ہمارے ساتھ جا سکتی ہے۔ نازو جیسی لڑکی ہر مرحلے میں کام آ سکتی ہے۔"

"تم لوگ بہت خود غرض ہو کے سوچتے ہو۔" غالب نے کہا۔ "اسے صرف اس لیے لانا چاہتے ہو کہ وہ تمہارے لیے کارآمد ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ نازو ہے اور اس لیے نہیں کہ میں اسے چاہتا ہوں۔"

"وہ ویسے بھی وہاں رکنے والی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "جہاں تک اس کے کارآمد ہونے کا تعلق ہے تو مرزا ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں اور سب پار اتر جائیں گے یا سب ڈوب جائیں گے۔ مگر وقت آنے پہ ہاتھ پیر تو سب ہی چلائیں گے۔"

"اب تم نے طعنہ دیا ہے تو خواہ کچھ بھی ہو جائے... ہم اسے لے آئیں گے۔" محسن بولا۔

"لیکن کیسے؟ جہاں وہ قید ہے وہاں محاورے کے مطابق پرندہ پر نہیں مار سکتا۔" غالب نے کہا۔

"ہم پرندے نہیں ہیں۔" محسن بولا۔ "اور اگر کچھ مارنا ہی ہو تو ہم پر نہیں مارتے، گولی مارتے ہیں۔"

"صبح صبح کس کو گولی مار رہے ہو؟" شعلہ ناشتا لے کر آ گئی۔

ناشتا کرتے ہوئے ہم نے نازو کو نکال لانے کا پلان اتفاق رائے سے منظور کیا۔ پھر ہم جو رات بھر کے تھکے ہوئے تھے سو گئے اور محسن ضروری انتظامات کرنے چلا گیا۔ فی الحال ہم نے ٹیڈی کی واپسی کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ جب ہم سو کر اٹھے تو محسن واپس آ چکا تھا۔ اس نے بڑی مسرت کے ساتھ اعلان کیا کہ سب بندوبست ہو گیا ہے اور کھانے کے بعد ہم ٹھیک دو بجے روانہ ہوں گے تو ان شاء اللہ ایک گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔ شعلہ نے دوپہر کے کھانے میں بھی بڑا اہتمام کیا تھا۔

"لوگ کچھ بھی کہیں... شادی کے فائدے بہت ہیں سکندر بادشاہ..." غالب نے کہا۔

"ہاں۔ بشرطیکہ بیوی نازو جیسی نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ سال کے چھ مہینے آدمی ہسپتال کا کھانا کھاتا ہے۔"

"اور سال کے باقی چھ مہینے اس سے مار کھاتا ہے۔" استاد ٹیڈی نے تائید کی۔

"تم دونوں کو ایسے ہوتے شرم آنی چاہیے۔" غالب نے کہا۔ "ایک تو غریب ابھی لنڈورے ہی پھر رہے ہیں، دوسرے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ میرا خیال ہے وہ جانتے بوجھتے ایسا کر رہی ہے۔ یادداشت کھو جانے کا بہانہ ہے ورنہ وہ تو پیچھا چھڑانے کے لیے ڈراما کر رہی ہے۔"

زیادہ باتوں کا وقت نہیں تھا۔ میں نے محسن اور شعلہ کو بتایا۔

ہو جانے کا مشغلہ رہا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

پسندیدہ رسائل و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں

بہت مدت کے بعد ہمارے ساتھ کسی مہم میں شرکت شہلا کے لیے جاذبی تھی اور اگرچہ یہ معقول ہے کہ اسے مہم کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ ناز کو جو رضا والبت اور صحیح سلامت اسپتال سے جیک کر لانے میں مار دھاڑ اور قتل و خونریزی کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ جب شہلا نے نرس کا لباس پہنا تو سب سے زیادہ محسن کے دل پر اثر ہوا۔

"دل چاہتا ہے اسی وقت بیمار ہو کے یہیں لمبا لیٹ جاؤں۔" اس نے نہایت ندیدہ پن سے آہ بھر کے کہا۔

"لیٹ جاؤ۔ نرس صرف تیمارداری کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"علاج تو میں ہی کروں گا نا۔ اور میرا طریقہ علاج ایسا ہے کہ آنکھ بند ہونے والے امراض بھی بھاگ جاتے ہیں۔ مریض کو مرض ہی بھاگنے دیتا ہے۔"

"اپنے جیسے بڑے مریضوں کا خیال اچھا ہے۔" غالب نے کہا۔ "ارے بھائی مریض یہاں نہیں ہسپتال میں جشن برپا ہے۔ اس نے میاں بیوی کا خوبصورت ایڈ ہے۔ فرسٹ ایڈ تو ان خوش نصیبی پر باتیں کرنے میں اور ہم یہاں ان سے زیادہ امن کر خوش ہو رہے ہیں۔ تم لوگ جاؤ ورنہ رہ جاؤ گے؟"

جن مابین کا ہم ہمیشہ گلی کے رات سے پڑا باقی جن کی تعداد چار تھی فوراً اس میں سوار ہو گئے میں ایک ڈاکٹر کے

ڈریس میں اسپیشلسٹ لگتا تھا۔ میں نے شیو کرنا چھوڑ رکھا تھا چنانچہ میری داڑھی ایک ہفتے کے بعد گھنی ہو گئی تھی مگر جھنڈ جھنکاڑ نہیں تھی۔ نفاست سے تراشی ہوئی تھی اور سر کے بالوں کی بڑھی ہوئی قلموں سے مل جاتی تھی۔ محسن کے منصوبے پر بیوٹی پارلر جا کر اس نے سیاہ رنگ کو کھچڑی بال جیسا کر لیا تھا۔

میرے سر کے بال پہلے تو دلہنوں جیسے ہو گئے تھے۔ بیوٹیشن نے ایک ہیر ڈریسر کے منصوبے سے ان بالوں کو درمیان سے بنانا شروع کیا اور گنجا پن سے بڑھا سا تھا۔ انگلی سے جب میں نے پہلے آنکھوں میں نیلے رنگ کے کانٹیکٹ لینز لگائے تو بقول مرزا غالب کے میں "ملعون فرنگی" نظر آنے لگا۔ گاؤن اور گلے میں اسٹیتھوسکوپ ڈال کر میں سیدھا اسپتال کے سینکڑوں ڈاکٹروں کی بھیڑ میں شامل ہو جاتا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

اس حالت میں ایک مکمل نرس کی شکل ساز و سامان کے ساتھ ہمراہ ہو۔ غالب کو عمداً ٹیم سے ڈراپ کر دیا گیا تھا۔ اس کا ہر جگہ ہمارے ساتھ نظر آنا اور پہچانا جانا دانش مندی کے تقاضوں کے خلاف تھا۔ وہ پس منظر میں رہتے ہوئے ہماری بہت زیادہ مدد کر سکتا تھا۔ اخباری دنیا سے پرانے تعلق کے باعث اس کے مراسم اور اثر و رسوخ کا دائرہ بہت وسیع تھا اور وہ ہر جگہ سے

نظر نہیں آسکتا تھا۔ غالب کو بھوک سے بلبلانے کی اصل وجہ یہی تھی مگر شیخ اس نے کہا کہ وہ مجسم حماقت ہے اور نازو کو دیکھتے ہی اس کی عقل گھاس چرنے چلی گئی تو وہ اول فول بکنے لگے گا اور سب کا کونڈا کردے گا۔ غالب نے جواب میں کہا کہ عقل آخر گھاس سے بڑی چیز ہے۔ گھاس نہیں کھائے گی تو بھوکا رہنے دو گی۔ مجھ جیسے کے سر میں پہلے ہی عقل کی جگہ بھوسا بھرا ہوا ہے اس جانور کو تو گھاس کھانا چاہیے۔ ان کی لڑائی محسن نے ٹیکسی اسٹارٹ کرکے ختم کر دی۔

میو اسپتال کے اندر پہنچ کر ٹیڈی نے محسن کی جگہ لے لی۔ اس نے مجھے ایمرجنسی کے گیٹ پر اتارا۔ پھر ٹیکسی کو واپس لے گیا اور اسی بلاک کے پیچھے شہلا کو اتار دیا۔ شہلا کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں چند شیشیاں، ایک پیالی میں روئی اور تھرمامیٹر وغیرہ تھے۔ اس کی اور میری ملاقات ایمرجنسی وارڈ کے اندر یوں ہوئی کہ برآمدے کے پچھلے حصے سے وہ نمودار ہوئی اور دوسری جانب سے میں اندر گیا۔ وہ دائیں جانب مڑی اور میں بائیں طرف ملے۔ تقریباً ایک ہی جگہ ہم ساتھ ہو گئے۔ اس طرح کسی کو احساس نہیں ہو سکا حالانکہ وہاں ایمرجنسی کیس آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ پولیس والے اور لواحقین جمع تھے۔ ڈاکٹرز، نرسیں اور وارڈ بوائے سب کا اجتماع تھا لیکن سب کی مصروفیت اور انہماک کا یہ عالم تھا کہ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی نہ فرصت تھی اور نہ ضرورت۔ ماتحت نرسوں کی طرح شہلا مجھ سے دو قدم پیچھے رہی اور میں ڈاکٹروں کی سی شان بے نیازی سے کسی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے بغیر چلتا گیا۔ ہم پچھلے دروازے سے نکلے اور اسی طرح آرتھوپیڈک یعنی ہڈیوں کے وارڈ تک گئے۔ وہاں محسن گیٹ کے سامنے درخت کے پیچھے گم سم کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی مریض کے ساتھ آیا ہے جس کی حالت تشویشناک ہے چنانچہ وہ لوٹ کر گھر بھی نہیں جا سکتا اور منتظر ہے کہ موقع ملے تو نظر بچا کے وارڈ کا ایک چکر لگا لے۔ بائیں جانب کچھ فاصلے پر ٹیڈی اپنی خلقی بشرٹ اور پتلون کے ساتھ بلیک کیپ پہنے بالکل ٹیکسی ڈرائیوروں کے انداز میں بونٹ کا سہارا لیے موجود تھا اور کسی سواری کا انتظار کرتا نظر آتا تھا مگر وہ محسن کے اشارے کا منتظر تھا جب اسے ٹیکسی کو ٹھیک وارڈ کے دروازے کے سامنے سیڑھیوں تک لے جانا تھا۔

ہم نے سر کی خفیف سی جنبش سے ایک دوسرے کو سب ٹھیک ہے کا سگنل دیا۔ پھر میں شہلا کے ساتھ اس وارڈ میں سے گزرا جو جنرل وارڈ تھا۔ دو چار مریضوں کے پاس خواہ مخواہ کا اور ان کے بیڈ سائڈ پر آویزاں چارٹ وغیرہ دیکھے۔ ایک مریض کو تسلی دی جو بہت شور کر رہا تھا اور چند سرے کی شکایت کر رہا تھا جیسے سب بگڑ گیا تھا۔ نرسوں سے ڈاکٹروں کی غفلت اور تمام دواؤں سے خرابی تھا کہ

تک۔ اس وارڈ سے نکلتے ہی ہم کسی پرائیویٹ وارڈ شروع ہو گئے جہاں ایک کمرے میں دو مریض رکھے جاتے تھے۔ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ سات نمبر کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت کوئی ڈاکٹر پہلے سے موجود ہوتا تو میں اپنی ایک جھلک دکھاتا اور "سوری" کہہ کر دروازہ پھر بند کر دیتا۔ دوسرا ڈاکٹر یہی سمجھتا کہ میں غلطی سے غلط نمبر میں داخل ہونے والا تھا لیکن اندر نازو کے علاوہ صرف ایک عورت تھی جو غالباً کسی حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر پلاسٹر تھا اور یہ ٹانگ چھت سے متعلق اسپرنگ والے ہینگر میں لٹکا دی گئی تھی کہ اسے خفیف سا جھٹکا بھی نہ لگے۔

نازو بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے نرس اور ڈاکٹر کے آنے پر بے زاری کے رد عمل کا اظہار کیا۔ دوسرے لمحے میں اس نے شہلا کو پہچان لیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ کمرے کے باہر دروازے پر بیٹھے ہوئے پولیس کے اے ایس آئی نے ہم پر سرسری نگاہ ڈالی تھی اور پھر اخبار دیکھنے لگا تھا۔ اس کے لیے ایک ڈاکٹر کا کسی نرس کے ساتھ آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اور یہ پوچھنا بھی ضروری نہیں تھا کہ ہم دونوں میں سے کس مریض کے چیک اپ کے لیے آئے ہیں۔ دوسری زخمی عورت نے آنکھیں کھول کے ہمیں دیکھا اور کراہنے لگی۔

"ڈاکٹر صاحب۔ بڑی تکلیف ہے ٹانگ میں۔ مگر تختہ ہو گئی ہے اوپر سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ گھنٹی دبا دبا کے میری انگلیاں درد کرنے لگتی ہیں۔ کوئی پانی پلانے بھی نہیں آتا۔" اس نے ایک ہی سانس میں ذاتی تکالیف اور مسائل کا رونا شروع کیا۔

"ابھی دیکھ لیتے ہیں آپ کو بی بی۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "اس مریض کو ڈسچارج کرنا ہے پہلے۔"

"مجھے تو ڈاکٹر صاحب سوئی لگا دیں۔ کچھ آرام آ جائے۔ رات بھر نیند نہیں آئی۔" وہ اسی طرح بولتی رہی لیکن میں نازو کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیا بات ہے مس نازیہ؟" میں نے کہا۔ "تمہارے ساتھ کوئی محافظ نہیں ہے؟"

"بھائی جان ہیں۔" اس نے انگریزی میں جواب دیا۔ "سگریٹ پینے گئے تھے۔ آتے ہی ہوں گے۔" ابھی اس کا جملہ مکمل ہوا ہی تھا کہ شیخ اندر آ گیا۔ میں نے فوراً شہلا کی طرف پشت کر کے میز سے تھرمامیٹر اٹھا لیا اور نازو کے منہ میں لگا دیا۔ شیخ چپ چاپ ہمارے پیچھے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے بلڈ پریشر چیک کرنے والا آلہ اٹھایا اور بیڈ سائڈ پر رکھ کر نازو سے آستین اوپر کرنے کو کہا۔

نازو نے منہ بناتے ہوئے آستین اوپر کر لی اور میں نے ماہر ڈاکٹر کی طرح اس کے بازو پر پٹی لپیٹ کر اس ربڑ کی جو بلڈ پریشر چیک کرنے والے آلے سے منسلک تھی۔ پھر میں نے ربڑ کے غبارے کو ہاتھ سے دبا کے ہوا بھرنا شروع کی اور پارے کو اس آلے کی نالی میں چڑھتا دیکھتا رہا۔ ایک خاص بلندی تک پہنچ جانے کے بعد پارا نیچے آنے لگا اور میں نے ہوا کو تھوڑا تھوڑا کر کے نکالتے ہوئے نظر بلڈ پریشر کی ریڈنگ پر رکھی۔

"لو آر فاتن مس نازی۔" میں نے کہا۔ اس وقت میری آواز بھی اتنی بدل گئی تھی کہ شیخ اسی طرح بیٹھا رہا۔ اندیشہ شہلا کی طرف سے تھا مگر اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنی پشت اکرام شیخ کی جانب رکھی۔

"یار یہ تو میں آپ لوگوں سے پہلے بھی کہتی تھی۔" نازو نے کہا۔

"آپ کے کہنے اور ہمارے کہنے میں فرق ہے۔" میں نے کہا۔ "فیصلہ کرنا ڈاکٹر کا کام ہوتا ہے۔ ابھی آپ کو کمزوری ہے۔ بلڈ پریشر ۱۱۰/۷۰ ہے جو ۱۲۰/۸۰ ہونا چاہیے۔ ذرا تک بڑھ جائے۔ جسم دبلے کے شوق میں ڈائٹنگ کا روگ پالنے سے اینیمیا ہو جائے گا۔"

"میں تو بہت کھاتی ہوں ڈاکٹر صاحب۔" نازو نے کہا۔

"کیا کھاتی ہو بالا بلا۔" شیخ نے پیچھے سے کہا۔ "یہ بھی بتا دو۔ چھولے اور دہی بھلے۔ قلفی فالودہ۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "بہت زیادہ پروٹین ہونے چاہئیں غذا میں۔ گوشت، انڈے، مچھلی۔ سیب کا جوس ایک گلاس ہر روز پی سکیں تو سب سے بہتر۔ مکمل ریسٹ۔ ویسے کسی چیز سے پرہیز نہیں ہے۔"

"یعنی گول گپے۔ آلو چھولے۔ دہی بھلے کھا سکتی ہوں میں؟" نازو نے مسرت سے کہا۔

"ہاں۔ مگر دیکھیے یہ خوراک نہیں ہے۔ زبان کا چٹخارا ہے۔" میں نے کہا۔ "دوائیں کیا دی گئی ہیں؟" میں نے میز پر رکھی ہوئی دوا دیکھ کر ایک نظر ٹرالی اور پھر چارٹ پر۔ "انہیں کلاکس بند کر دیں۔ آئرن کے کیپسول صبح شام۔ درد ہو تو پیناڈول لے لیں ورنہ نہیں۔ سوکسی ایک کر دیں۔ صرف رات کو۔ آپ کے ساتھ کون ہے؟"

"بھائی ہیں میرے۔" نازو نے کہا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور اکرام شیخ کرسی سے اٹھ کر آگے آیا۔ اس نے اخلاقاً مجھ سے ہاتھ ملایا۔ یہ میرے لیے سب سے خطرناک لمحہ تھا۔ وہ مجھے شناخت کر لیتا تو مجھے اس کو ناک آؤٹ کرنا پڑتا۔ اس کا ردِ عمل پر دوسری عورت سائرن کی طرح چیخنے لگتی تو اسے بھی فوراً خاموش کرنا ضروری ہو جاتا لیکن اکرام شیخ نے میری صورت سے زیادہ میری بات پر توجہ دی۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ شک نہیں تھا کہ میں کوئی جعلی ڈاکٹر ہوں اور وہ بہت ذہین اور انتہائی تیز نظر رکھنے والا آدمی تھا۔

"آپ ان کو گھر لے جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آفس سے سلپ بنوا لیں۔ ایمبولینس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ٹیکسی میں بھی جا سکتی ہیں۔"

"میرے پاس ٹرانسپورٹ ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "میں گھر فون کر کے والد صاحب کو بلا لیتا ہوں۔"

میں نے فقط سر ہلایا اور دوسری عورت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شہلا نے یوں رخ بدلا کہ وہ میری اوٹ میں رہی۔ اتنی دیر میں اکرام شیخ بھی باہر جانے کے لیے دروازے کا رخ کر چکا تھا۔ میں نے واجبی سی دلچسپی کے ساتھ دوسرے کیس کو بھی دیکھا۔ شہلا نے نازو کو اٹھ کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ شہلا میری ہدایات کے مطابق زخمی عورت کا بلڈ پریشر چیک کرنے کے لیے اس کے بازو پر پٹی لپیٹ رہی تھی کہ میں نے دروازہ کھول کے سر نکالا۔

"انسپکٹر۔ یہ جو صاحب ابھی نکلے تھے انسپکٹر اکرام شیخ" میں نے کہا۔ "ذرا اسے فوراً بلا لاؤ۔ وہ ایمرجنسی میں گیا ہے ڈاکٹر اشرف کے پاس۔"

انسپکٹر بادل ناخواستہ اٹھا اور تعاون کرا دیکھ کر مخالف سمت میں چل پڑا۔ کاریڈور کے آخری حصے میں کھڑے ہوئے محسن نے جو اب کپڑوں پر لیب اسسٹنٹ کا سفید کوٹ پہن چکا تھا، ایک اسٹریچر کو دھکیل کر آگے لانا شروع کیا۔ ٹائمنگ ابھی تک بالکل ہمارے پلان کے مطابق جا رہی تھی۔ محسن کو دروازے پر متعین پولیس والے کے ہٹتے ہی آگے آنا تھا۔ میں نے دروازہ بند کر کے نازو کو نکل چلنے کا اشارہ کیا۔ شہلا اسے آہستہ سے کہہ چکی تھی کہ انھی کپڑوں میں جانا ہے اور چادر ساتھ لے جانی ہے۔ میں دوبارہ اس زخمی عورت کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کے سرہانے بہت سے ایکس رے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ایکس رے کو روشنی کے رخ کر کے دیکھا۔ قدرتی طور پر عورت کی نظر بھی ادھر ہی رہی اور اس نے نازو کو چادر بغل میں دبا کے چوروں کی طرح نکلتے نہیں دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ باہر کیا ہو گا۔ نازو فوراً اسٹریچر پر لیٹ جائے گی اور شہلا اس پر چادر کو یوں پھیلا دے گی جیسے نیچے کوئی لاش ہے۔ جہاں زندگی اور موت کا کھیل دن رات جاری رہتا ہو اور ہر روز ایسے کئی درجن افراد رخصت کیے جاتے ہوں وہاں اسپتال کا عملہ بالکل متوجہ نہیں ہوتا۔ ان کے لیے وہ زیادہ قابل توجہ ہوتے ہیں جن کے لیے زندگی کی جدوجہد جاری ہو۔ صرف غیر متعلق افراد جو مریضوں کے لواحقین ہوتے ہیں اس سفر کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور دل ہی دل میں دعا کرتے ہیں کہ ان کے عزیز یا دوست کی واپسی یوں نہ ہو۔ وہ بھی اسٹریچر دھکیلنے والوں کی طرف نہیں اس کی طرف دیکھتے رہتے

www.paksociety.com

پلیا جو اسے شفاخانے لے کر آیا تھا مگر نہیں جانتا تھا کہ موت تو پہلے ہی یہاں اس کے انتظار میں ہے۔

میں نے عورت کو پھر تسلی دی۔ دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور کھڑکی کے راستے باہر کود گیا۔ اس عورت کو پہلے تو کچھ بھی نہ آئی ہوگی کہ ایک معتبر اور سنجیدہ صورت ڈاکٹر نے ایسی حرکت کیوں کی۔ اگر بات والا میں کالا محسوس ہوا ہوگا تو اس نے گھنٹی کا بٹن دبا کر کسی کو پکارنا شروع کیا ہوگا۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس کے لیے تو بستر سے اٹھنا بھی محال تھا۔ اسپتال کا عملہ اتنا مستعد نہیں تھا کہ گھنٹی سنتے ہی آجاتا اور دروازے پر بیٹھنے والا لمبے ایس آئی کی ایمرجنسی وارڈ میں شیخ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا یا کسی ڈاکٹر اشرف کو پوچھ رہا ہوگا۔ اشرف نام کا ڈاکٹر مل گیا تو زیادہ مشکل کی بات ہوگی۔ وہ کہے گا کہ ابھی لمبے ایس آئی اکرام شیخ آپ کے پاس آیا تھا۔ ڈاکٹر کہے گا کہ میں کسی اکرام شیخ کو نہیں جانتا تو وہ کہے گا کہ اچھا آپ چلیں ملت نمبر کسی پرائیویٹ میں۔ ڈاکٹر صاحب بولو۔ ہے ہی۔ ظاہر ہے ڈاکٹر مزید حیران ہوگا کہ ایمرجنسی کا آرتھوپیڈک سے کیا تعلق اور یہاں سے میں وہاں کیسے جا سکتا ہوں۔ کون ہے وہ ڈاکٹر جو مجھے بلا رہا ہے۔ یہ سب سوچتے ہوئے میں نے کھڑکی سے دوسری کے انگلوں سے بنے ہوئے تین فٹ چوڑے راستے پر چلنا شروع کیا اور پھر سڑک کی طرف مڑ گیا۔ اسٹیتھسکوپ اب میرے ہاتھ میں تھا۔ بہت سے میڈیکل کے جونیئر طلبا نے مجھے بلاوجہ یا عادتاً سلام کیا۔ میں کٹنگ ایڈ ورڈ میڈیکل کالج کے گیٹ کی طرف سے باہر آیا اور نیلا گنبد تک چلا گیا۔

دس منٹ تک بے مقصد کھڑے رہنے کے بعد مجھے تشویش ہونے لگی۔ دس منٹ میں ٹیکسی کو یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اندیشوں نے مجھے گھیر لیا۔ کہیں شعلا اور محسن کا اس وقت تو اکرام شیخ سے آمنا سامنا نہیں ہو گیا جب وہ اسٹریچر کو دھکیلتے لے جا رہے تھے یا محسن کے پہچانے جانے کے امکانات بھی استے ہی تھے جتنے شعلا کے۔ اکرام شیخ بے خیالی میں قریب سے گزر جاتا مگر کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ اس کے ذہن میں کیا تھا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ مجھے یا شعلا کو پہچان کے بھی انجان بنا رہا ہو اور خاموشی سے باہر نکل گیا ہو تاکہ ہماری گرفتاری کو یقینی بنانے کے لیے صحیح انتظام کر سکے۔

پندرہ منٹ بعد میری بے چینی بڑھ گئی اور میں ہر دو سیکنڈ کے بعد گھڑی دیکھنے لگا۔ ٹیکسی کو پانچ سات منٹ میں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن ٹیکسی دوسری گاڑیوں کی طرح ایک مشین تھی جس کے ان گنت پرزے اسے حرکت اور قوت دیتے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک فعال پرزہ خراب ہو جائے یا ٹوٹ جائے تو اسے معمولی واقعہ کہا جا سکتا ہے۔ حادثہ یہ صورت ان کے لیے ہوتا جو

ٹیکسی میں سوار تھے۔ ٹائر کا فلیٹ ہو جانا تو بہت عام سی بات تھی مگر وہ پہیہ بدلنے لگتے تو اس عمل میں دس منٹ لگ جاتے اور اتنی دیر میں تعاقب کرنے والے آ جاتے۔ معاملہ منٹوں کا تھا گھنٹوں کا نہیں۔ دس منٹ سے کم وقت میں لمبے ایس آئی واپس لوٹ آیا ہوگا جسے میں نے دروازے کی پہرے داری سے اٹھا کے ایمرجنسی وارڈ میں شیخ کی تلاش کے لیے بھیج دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اکرام شیخ بھی لوٹا ہوگا اور اندر سے دروازہ بند پاکر کے بعد آنکھیں سکھنے میں دیر نہیں لگی ہوگی کہ معاملہ کیا ہے۔ دروازہ توڑنا زیادہ مشکل تھا۔ اکرام شیخ جس پچھلی طرف جا کر کھڑکی کے راستے کمرے میں پہنچا ہوگا اور وہاں اس بوڑھی عورت نے سب کچھ بتا دیا ہوگا جو ٹیک ٹانگ کے باعث کچھ لیٹی ہوئی تھی۔ یہ تفتیش تو بعد میں ہوگی کہ وہ ڈاکٹر کون تھا اور وہ نرس کون تھی۔ اکرام شیخ فوراً سمجھ جائے گا اور اپنی ہی ٹیم کو اغوا کیے لے جانے والوں کو کوئی مار دینے کے لیے دوڑے گا۔ وہ اسے کہا جیسے دروازے پر پہرا دینے کے لیے بٹھایا گیا تھا اس منٹ میں ملازمت سے اس کو فوراً معطل کر دیا جائے گا۔ کوئی یہ عذر قبول نہیں کرے گا کہ حکم دینے والا ڈاکٹر تھا یا کمشنر۔

بیس منٹ بعد میرے وسوسے یقین میں بدلنے لگے کہ محسن اور شعلا کے ساتھ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس نے انہیں روک لیا یا پھر حالات بدل کے کسی اور سمت میں نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے چند سیکنڈ تک سوچا اور پھر واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے دیکھنا تھا کہ وہ نکل چکے ہیں یا اندر ہی پھنس گئے ہیں۔ دوسری صورت میں مجھے ان کی مدد کرنا تھی اور ہر طرح ان کو گرفتار ہونے سے بچانا تھا۔ وہ ان پر بہت سے سنگین الزامات عائد ہو جاتے اور ایک طرف تو نئے نویلے میاں بیوی کی رات اپنے بیڈ روم کے بجائے حوالات میں بسر کرتے تو دوسری طرف ناز کو گھر لے جا کر سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ قید کر دیا جاتا۔ واپس جاتے ہوئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس بار ناز بچ نکلی تھی تو والدین اس کے پاگل پن کا روایتی علاج کرنے لگے یعنی اسے فوراً بیاہ کر اپنے گھر سے اس بلا کو نکالنے میں ذرا بھی دیر نہیں کریں گے جس کی وجہ سے ان کی ناک کٹنے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

ٹیکسی وہاں نہیں تھی جہاں میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ میں اندر کی سڑکوں سے واقف تھا۔ ٹیکسی اگر اس راستے سے نہیں آ سکی تھی جدھر سے میں آیا تھا تو یہ ہو سکتا تھا کہ دوسری طرف کے راستے سے نکل گئی ہو۔ ابھی میں کینٹین کے پیچھے پہنچا ہی تھا کہ میں نے ٹیکسی کو زمین پر بیٹھا ہوا دیکھ لیا۔ اس کے دونوں پچھلے ٹائر پرسٹ ہو کر فلیٹ ہو چکے تھے اور غالباً ٹیکسی بے قابو ہو کر ایک درخت کے تنے سے ٹکرا گئی تھی۔ ٹیکسی کے چاروں دروازے

کھلے ہوئے تھے اور اندر کوئی نہیں تھا۔ باہر دس گز کے فاصلے پر کچھ لوگ ایک حلقہ بنائے کھڑے ہوئے تھے اور ٹیکسی کے پاس دو مسلح پولیس مین کھڑے سب کو دفع ہو جانے کی تلقین کر رہے تھے لیکن تجسس کے مارے ہوئے تماشا دیکھنے والے زیادہ مستقل مزاج تھے اور وہیں جمع تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ ناز کو حفاظت نکالنے کا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ حضرات و خواتین پر کیا بیتی۔

اگر میں اس مجمع عام میں پہنچ کر براہ راست سوال کرتا کہ وہ جب قافلہ لٹا تو مسافر کہاں گئے، تو ایک ڈاکٹر نظر آنے والے کے لیے بہت نامناسب بات ہوتی۔ براہ راست پولیس سے بھی کچھ پوچھنے میں خطرہ تھا چنانچہ میں چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوئے طلبا کے ایک گروپ کی طرف بڑھا۔ گروپ میں دو طالب علم ایک خاصی دلکش نقوش والی نرس اور ایک واجبی صورت والی طالبہ شامل تھے۔

"یہ کیا ہوا ہے یہاں؟" میں نے آواز کو بارعب بنا کے انگریزی میں کہا اور اپنے پیچھے اشارہ کیا۔

"فلمی ڈراما،" ایک طالب علم نے ہنس کر کہا۔ "ذرا گڑبڑ ہو گیا ورنہ بہت دلچسپ سین تھا۔"

"ایک مریضہ کو کچھ لوگ اغوا کر کے لے جا رہے تھے،" دوسرے نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ اسپتال کے کپڑوں میں تھی پھر ایک پولیس کے آدمی نے ان کا راستہ روک لیا۔ وہ اسکوٹر پر آیا تھا۔ ان سب کے ہاتھوں میں کولڈ ڈرنک کی بوتلیں تھیں۔"

"اور اس نے اسکوٹر کو بالکل ٹیکسی کے سامنے لٹا دیا تھا۔ ٹیکسی اس کے اوپر سے گزر جاتی،" پہلے والے طالب علم نے کہا۔

"لیکن وہ بہت ہوشیار تھا۔ اسکوٹر کو بالکل ٹیکسی کے سامنے گرا کے وہ خود جیپ لگا گیا،" دوسرے نے کہا۔ "ٹیکسی ڈرائیور نے اس کے باوجود ٹیکسی نکال کر لے جانے کی کوشش کی۔ اسکوٹر والے نے دو فائر کیے اور ٹائر پھاڑ دیے۔"

"وہ کوئی پولیس والا تو نہیں لگتا تھا،" نرس نے نیل پالش پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"سب پولیس والے وردی میں نہیں ہوتے،" خوبصورت نرس کے مقابلے میں کم توجہ پانے والی بدصورت طالبہ نے حقارت سے کہا۔

"چلو خیر۔ پکڑے گئے سب کے سب؟" میں نے کہا۔ "اسپتال میں اس قسم کی وارداتیں ہونے لگی ہیں۔"

"ابھی تو آپ نے انٹرول دیکھا ہے سر،" پہلے والے طالب علم نے ہنس کر کہا۔ "اصل فلم تو بعد میں شروع ہوئی۔ ٹیکسی کے درخت سے ٹکراتے ہی... آپ کو کیک نہیں لگے؟"

"نو پلیز،" میں نے کہا۔ "کیا وہ سب بھاگ گئے؟"

"ہاں... مگر اس وقت تو ہم نے یہاں کھڑے وہ دیکھا کہ ٹیکسی کے رکتے ہی دروازہ خود بخود کھل گیا اور اندر سے ایک عورت باہر آ گری جس نے اسپتال کے مریضوں کے کپڑے پہن رکھے تھے،" دوسرے طالب علم نے کہا۔ "ہم نے بھی دیکھا کہ وہ بے ہوش ہے۔ باہر گر کے بھی وہ پڑی رہی اور وہ پولیس افسر بالکل سر پر پہنچ گیا جس نے فائر کر کے ٹیکسی روک دی تھی۔ اس نے چلا کر کہا کہ خبردار جو کسی نے باہر آنے کی کوشش کی۔ ابھی وہ آ ہی رہا تھا کہ بے ہوش پڑی ہوئی عورت..."

"عورت نہیں۔ وہ بڑی خوبصورت لڑکی تھی،" پہلے غیر سنجیدہ اور چلبلے طالب علم نے کہا۔ "بالکل فلم اسٹار رانی۔"

"اس لڑکی نے ایک دم اچھل کر ٹیکسی پر فائر کرنے والے کو ناک آؤٹ کر دیا،" دوسرے طالب علم نے مسکرا کے بات جاری رکھی۔ "اس نے ایک ہاتھ مار کے ریوالور گرا دیا اور دوسرا ہاتھ مار کے ریوالور والے کو۔"

"بالکل بجلی تھی بجلی،" پہلا طالب علم بولا۔ "میں بال بال بچ گیا۔ وہاں لیٹا ہوتا،" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "میں کچھ دیر رہنے کی سوچ رہا تھا مگر ہوا یہ کہ دو اچھے خاصے پہلوان ٹائپ مرد آگے بڑھے اور پلک جھپکتے میں غتربود ہو گئے۔ فلیٹ ہو گئے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے انجان بن کے کہا۔

"مارے گئے۔ ٹھیر ہو گیا ان کا۔ اندر یا باہر،" پہلا طالب علم ہنسا۔ "وہ لڑکی جوڈو کراٹے جانتی تھی۔ ایسے ہاتھ پیر چلانے لگی کہ جو آگے بڑھا اس کا چورا ہو گیا۔ وہ اپنی مرضی سے اغوا ہو کے جا رہی تھی۔ بلکہ مجھے تو شک ہے کہ وہی اغوا کنندہ تھی۔"

"یہ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"اس لیے کہ سب کچھ تو اسی نے کیا تھا،" پہلا لڑکا بولا۔ "کوئی کچھ کر ہی نہیں سکا اور ہم سے زیادہ تندرست مرد جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اس کے دھوکے میں آ گیا۔ چند سیکنڈ میں اس نے ٹیبل ٹرن کر دیا۔ یہ انگریزی محاورہ ہے۔ پھر اس نے دخل در معقولات کرنے والوں کو فنا کیا اور ریوالور اٹھا لیا۔ اس نے چلا کے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یار نکل جاؤ۔ وہ بھی کم نہیں تھے۔ وہ ٹیکسی سے نکلے اور انھوں نے ڈاکٹر گیلش کو روک کر اس کی موٹر سائیکل چھین لی۔"

"کون ڈاکٹر گیلش؟" میرے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

"آپ ڈاکٹر گیلش کو نہیں جانتے؟" نرس نے بے حد افسوس کر کے حیرت کا اظہار کیا۔ "وہی اٹالوی والے۔ جن کے باغ میں کچھ بھی نہیں سب بیچ ڈالنے پر جس کے گیلش کے..."

www.paksociety.com

"اچھا... وہ؟" میں نے کہا۔ "پھر وہ لڑکی کدھر گئی؟"

"ابھی اس کی تلاش جاری ہے۔" سو طالب علم بتا رہا تھا۔ "اگر وہ پکڑی گئی تو میڈیکل بورڈ چیک اپ کرے گا کہ وہ لڑکی تھی یا بھوت یا چھلاوہ۔ آگے اس کے دونوں ساتھی موٹر سائیکل لے کر بھاگ گئے ادھر وہ فرار ہو گئی۔ کسی نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ حالانکہ ابھی وہ کم خطرناک نہیں تھی۔ ریوالور اٹھا لینے کے بعد تو وہی اس کے سامنے جا سکتا تھا جس کے ہاتھ تک توپ ہو۔"

ان کی گفتگو میں ابھی تک شہلا کا کوئی حوالہ نہیں آیا تھا۔ نازو نے ایک مرتبہ پھر اپنے بھائی کا راستہ روکنے کے لیے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ شیخ بعد میں اس دن کو روئے گا جب اس کے گھر والوں نے نازو کو جوڈو کراٹے کی تربیت حاصل کرنے کی اجازت دی تھی۔ نازو نے دلیل دی ہوگی کہ اپنے دفاع کے لیے ہاتھ پیر استعمال کرنے کا فن سب کو آنا چاہیے۔ خصوصاً لڑکیوں کو جن کو کمزور سمجھ کے اس معاشرے میں غلط قسم کے لوگ راستہ بھی نہیں چلنے دیتے۔ اب یہ دفاع کا فن بیچارے گھر والوں کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ بڑے بھائی جو بھائی نیاز تھے، شیخ ہونے کے باوجود پٹ گئے تھے۔ محسن اور سیّد کی بھی موٹر سائیکل پر نکل بھاگے تھے۔ ان کے ساتھ شہلا ہوتی تو اس گروپ کے چار افراد مجھے یہ بتلاتے کہ موٹر سائیکل پہ دونوں مردوں کے ساتھ ایک نرس بھی فٹ ہو گئی تھی۔ وہ اس واردات کے عینی شاہد تھے اور اس وقت بھی یہیں کھڑے سردی کے موسم میں ٹھنڈا کوکا کولا پی رہے تھے جب یہ واردات ہوئی تھی۔ ایک نرس دوسری نرس کو یوں فرار ہوتا دیکھتی تو چپ نہ رہتی مگر ان میں سے کسی نے شہلا کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ ان سے یہ پوچھنے میں کوئی عقل مندی نہیں تھی کہ کیا ان کے ساتھ ایک خوبصورت سی نرس نہیں تھی اور وہ مار دھاڑ کرنے والی حسینہ فرار ہو کے کس سمت گئی تھی۔

میں نے باوقار طریقے پر "ایکسکیوزمی" کہا اور کینٹین میں داخل ہو گیا۔ جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی متعدد وجوہ تھیں۔ انھیں میرا چہرہ اجنبی لگا ہوگا۔ میری دلچسپی انھیں عجیب لگی ہوگی اور رات کو میرا اس کینٹین میں جانا عجیب لگا ہوگا جو پچھلے دروازے کے لیے نرسیں اور ہاسپٹل اسٹاف کے لیے تھی۔ ڈاکٹرز کی کینٹین دوسری طرف تھی اور عموماً ڈاکٹر اپنے کمپلکس کے باعث بھی اس طرف آنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ میں نے سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا اور فوراً باہر نکل آیا لیکن واپس جانے کے بجائے میں دوسری طرف روانہ ہو گیا۔ صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ جانے والی واردات اور کینٹین کا میرے سامنے پر آ گئے تھے۔ اس لیے میں رک گیا تھا۔ کینٹین کے پیچھے ایک جیپ کھڑی تھی۔ جیپ کا چکر کاٹ کر میں پھر اسپتال کی مرکزی عمارت کی جانب ہو لیا۔ میرا

ذہن عجیب اُلجھن میں مبتلا تھا میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ ان حالات میں مجھے لوٹ جانا چاہیے یا نازو کو اور شہلا کو تلاش کرنا چاہیے۔ آخر محسن اور سیّد کی کے ساتھ شہلا کیوں نہیں تھی؟ اور اگر تھی تو وہ اس کو کیوں چھوڑ گئے۔ مجھے یہ بات ناممکن نظر آتی تھی کہ محسن جیسا عاشق نامراد اپنی دلہن چھوڑ کر بھاگ جائے۔ یا تو شہلا پہلے ہی الگ ہو گئی تھی یا حادثے کے بعد وہ کسی اور طرف نکل جانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور محسن نے دیکھ لیا تھا کہ شہلا خطرے کی حدود سے دور جا چکی ہے۔

مرکزی عمارت میں وہی گہما گہمی اور آنے جانے والوں کا رش تھا۔ کہیں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی تھی۔ اکرام شیخ کو شاید ایمرجنسی میں پہنچایا گیا ہوگا جہاں ابتدائی طبی امداد کے بعد وہ ہوش میں آگیا ہوگا اور اب وہ بھی اسپتال میں اسی طرح پھر رہا ہوگا جیسے جنگل میں زخم خوردہ شیر گھومتا ہے۔ اس نے پولیس طلب کی تھی یا واردات کے بعد پولیس خود پہنچی تھی۔ اگر اسے معلوم ہوا ہوگا کہ کسی میں سے نکلنے والے دو فرد تو ایک موٹر سائیکل چھین کر بھاگ گئے تھے مگر وہ لڑکی جس نے اپنے تماشے مردوں کو تہس نہس کر دیا تھا اندر کی طرف گئی تھی تو ممکن ہے وہ نازو کو تلاش کر رہے۔ مریضوں کے کپڑے پہن کر وہ گیٹ سے باہر نہیں نکل سکتی تھی لیکن نازو سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ کہیں گئی ہو۔ کر بھی ٹال دے۔ ایک دھان پان سی نازک لڑکی کے سامنے اگر سب غلط فہمی میں مارے جاتے ہیں۔ آنکھیں اس کے چکا چوند پیدا کرنے والے حسن کا نظارہ کر کے رہ جاتی ہیں اور ذہن سوچ بھی نہیں سکتا کہ اتنی نازک کمزور اور دھان پتلی سی لڑکی جو بظاہر چغتائی نظر آتی ہے آفت کی پرکالا ہے۔ برقِ خرمن ہے اور آتش سوزاں ہے۔

میں محتاط طریقے پر ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ میں نے ہلکی سی "شش ش" سنی۔ میرے قدم رک گئے اور میں نے پلٹ کر اس گوشے میں دیکھا جو ایک دیوار کے ستون اور زینے کے نیچے حصے میں تھا۔ وہاں شہلا دبکی کھڑی تھی۔

"تم... یہاں کیا کر رہی ہو بے وقوف؟" میں نے اس کی طرف پشت کر لی۔

"میں نازو کو تلاش کر رہی تھی۔" وہ بولی۔

"یہ کون سا طریقہ ہے تلاش کرنے کا؟ کوئی تم نے کیا کسی ہوئی ہو؟" میں نے خفگی سے کہا۔ "تم کو نکل جانا چاہیے تھا۔"

"وہ... جیسے آپ گئے اور میں نے دیکھ لیا۔ ایسے ہی میرا خیال تھا کہ کہیں نازو بھی مل جائے گی۔" وہ بولی۔ "میں اس سے پہلے تین بار جگہ بدل چکی تھی۔ آپ کے جانے کے بعد۔"

"مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "محسن اور سیّد بھاگ گئے۔ تم کو کسی نے نہیں دیکھا تھا؟"

"جب اکرام شیخ ہمارے پیچھے آیا تو ہم گھبرا گئے تھے۔ نازو نے کہا کہ میری فکر مت کرنا۔ جیسے موقع ملے وہ نکل جائے۔" شہلا نے کہا۔ "جلد فرار ہو تو وہ باہر گئی۔ دوسری طرف کا دروازہ خود ہی کھل گیا تھا۔ میں چپ چاپ نکل کر وہیں کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے نازو کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ محسن کو میری فکر تھی لیکن میں نے اسے اشارہ کر دیا کہ نکل جائے۔ وہاں کچھ میڈیکل کے لڑکے ایک نرس کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایک اور لڑکی بھی تھی۔ وہ بھی سمجھے کہ میں پہلے سے اس جگہ موجود تھی اور حادثے کا شکار ہوتے ہوتے رہ گئی۔ انھوں نے مجھے جیسے گھسیٹ لیا تھا۔"

"میں ان سے مل چکا ہوں۔ انھوں نے ہی سب بتایا تھا مجھے۔"

"لڑکے بھی یہی سمجھے کہ میں ادھر سے گزر رہی تھی۔ ادھر نرسوں کی ایک کینٹین ہے۔" شہلا بولی۔ "میں اندر جا کے بیٹھ گئی تھی۔"

اچانک میری نگاہ نے اکرام شیخ کو دیکھ لیا۔ وہ لوگوں کی بھیڑ سے بچتا بچاتا میری طرف آ رہا تھا اور اس کی نظر ہر چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ "شہلا اب یہاں سے کھسک جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اکرام شیخ آ رہا ہے۔ سیدھی گھر جانا یہاں سے۔" اتنی دیر میں اکرام شیخ بہت قریب آ چکا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور میں نے جان لیا کہ اس کی نگاہ میری صورت کے اصل نقوش میں شناسائی کے آثار تلاش کر چکی ہے۔ بے شک میری تبدیلی نے اسے وقتی طور پر دھوکا دیا تھا۔ غور سے دیکھتے ہی وہ مجھے پہچان گیا۔ میں ایک دم پلٹا اور بھاگا۔ سب سے بڑے اطمینان کی بات یہ تھی کہ شیخ کے پاس ریوالور نہیں ہے۔ اس کا ریوالور نازو لے جا چکی تھی۔ اس نے بھائی کو معمولی سے وار سے بے ہوش کیا تھا۔ چنانچہ ہوش میں آتے ہی اکرام شیخ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

مجھے فرار ہوتا دیکھ کر شیخ میرے پیچھے لپکا۔ میں برآمدے میں دوڑتے ہوئے ایک نرسنگ بوائے کو گرایا اور دو نرسیں چیخ مار کر ہٹ گئیں۔ میں اس گاڑی کی طرح ان سے گزر جاتا جس کے بریک فیل ہو گئے ہوں۔ برآمدے میں ہنگامہ بپا ہو گیا تھا۔ شیخ مسلسل میرے تعاقب میں تھا اور مجھے اپنے دائیں ہاتھ پر جو راستے نظر آ رہے تھے مگر میں رسک نہیں لے سکتا تھا کہ کسی کمرے میں بند ہو جاؤں۔ دوسری طرف کھلا میدان سا تھا لیکن وہاں بھی میرا پکڑا جانا ممکن تھا کیونکہ شیخ اب شور بھی مچا رہا تھا۔ "پکڑو، پکڑو۔" وہ گنگنا کر ایک ساڑھے چھ فٹ قد کے گورے چٹے نے میرا راستہ روکنے کی غلطی کی۔ اسے اپنے ڈیل ڈول پر ناز تھا۔ وہ بالکل میرے سامنے آ گیا اور ہاتھ پھیلا کے کھڑا ہو گیا۔ اس کے قدم فرش پر جمے ہوئے تھے۔ میں ایک سیکنڈ کے لیے رک گیا اور اسے

حملہ کرنے کا موقع دیا۔ اس نے اپنے بڑھے ہوئے شہتیر جیسے بازوؤں میں مجھے گھیرنے کے لیے جست لگائی اور میں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ وہ زور میں آگے آیا تو اسے دوسرے ہاتھ سے اوپر اٹھایا اور سر سے گزار کے پیچھے پھینک دیا۔ وہ فرش پر دھماکے سے گرا اور گلا پھاڑ کے چلایا۔ "ہٹ جاؤ سب پیچھے" میرے پیچھے دوڑنے والے دو چار جیالے اس رکاوٹ کے اچانک سامنے آ جانے سے ٹھٹک کے رک گئے۔ ملنے والوں نے پلٹ کر دیکھ لی کی فریاد شکر کرو عورت پکڑیں اور مجھے راستہ دے دیا لیکن میں نے پلٹ کر دیکھا تو شیخ بدستور میرے تعاقب میں تھا۔

"سکندر، رک جاؤ۔ سکندر... ورنہ میں گولی مار دوں گا۔" وہ چیخ کر بولا۔ "تم بچ کر نہیں نکل سکتے سکندر بخت۔" اس کی دھمکی کا مجھ پر کیا اثر ہوتا لیکن اس کی چالاکی نے مجھے قائل کیا۔ میرا نام بار بار لے کر وہ گواہ پیدا کر رہا تھا کہ جس شخص کا وہ تعاقب کر رہا تھا وہ سکندر بخت تھا۔ کل کو وہ ثابت کر سکے گا کہ اس کی بہن نازو کو اغوا کرنے والا سکندر بخت ہی تھا اور اسی نے اسپتال میں اتنی بڑی بونگ مچائی تھی۔ اس کے اور میرے درمیان مشکل سے بیس قدم کا فاصلہ ہوگا۔ میں نے برآمدے کی دیوار کے ساتھ ایک خالی اسٹریچر دیکھا اور رک کر اسے زور سے پیچھے دھکیل دیا۔

"میرا نام استاد پینڈو ہے ڈیوڈ۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"میں چوہدری دلاور دا پتر ہوں آں میں۔" یہ بات ان سب نے سنی جو اکرام شیخ کے ساتھ ہو گئے تھے۔ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ بھاگنے والا مجرم ہے یا اپنی جان بچا کے بھاگ رہا ہے۔ وہ پکڑنے والے کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ اکرام شیخ نے اسٹریچر کو تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا اور اپنی اسپیڈ پر کنٹرول نہ کر سکا۔ وہ اسٹریچر سے ٹکرایا اور منہ کے بل گر گیا۔ میرے سامنے اوپر سے ایک لفٹ آ کر رکی اور اس میں سے چار مرد عورتیں باہر آئے۔ دو آدمی آگے بڑھے ہی تھے کہ میں نے انھیں دھکا دیا اور وہ دور جا گرے۔ لفٹ میں لے جانے والا لڑکا وہیں تھا کہ میں نے اسے گھسیٹ لیا۔ میں نے ایک بار پھر دہرایا کہ میں کون ہوں اور دھمکی دی کہ کسی نے لفٹ میں قدم رکھا تو مارا جائے گا۔ اس کے باوجود اکرام شیخ عین اس وقت اندر پہنچ گیا جب لفٹ کا دروازہ بند ہو رہا تھا اور میں اسے ساتویں منزل تک لے جانے کے لیے بٹن دبا چکا تھا۔

دروازہ بند ہونے سے قبل ہی میں نے اکرام شیخ کو دبوچ کر دیوار سے لگا دیا۔ "کیا چاہتے ہو تم آخر؟" میں نے غرا کے کہا۔ "مجھے گرفتار کرنا؟ وہ ایسا تمہاری زندگی میں ہوگا اور نہ میری زندگی میں۔"

"تم... تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ نازو کہاں ہے؟" اکرام شیخ

www.paksociety.com

باچھتے ہوئے بولا۔

"اسے میں نہیں لے گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ محسن اور ٹیڈی کے ساتھ گئی تھی۔"

"لیکن اس گروہ کے سرغنہ تم ہو۔ یہ سارا پلان تمھارا تھا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"میں کمرے میں رہ گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "بعد میں مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا۔ لوگوں نے نازو کو الگ فرار ہوتے دیکھا تھا۔"

لفٹ اوپر پہنچ چکی تھی۔ میں نے پھر گراؤنڈ کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ رکی اور پھر نیچے چلنے لگی۔

"میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ اب میرا پولیس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔" وہ بولا۔ "بس تم نازو کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔"

"میں نے ہمیشہ نازو کو یہی سمجھایا ہے کہ وہ گھر میں رہے۔" میں نے کہا۔ "اس سے کبھی نہیں کہا کہ ہمارا ساتھ دے۔ اگر وہ خود ہی گھر میں رہنا نہیں چاہتی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

"سب قصور تمھارا ہے۔" اکرام شیخ نے چیخ کر کہا۔ "جب تک اس نے تمھیں نہیں دیکھا تھا وہ ایک شریف لڑکی تھی۔"

"وہ اب بھی ایک شریف اور معصوم لڑکی ہے۔" میں نے اکرام شیخ کا گلا دبوچ لیا۔ "اگر وہ ہمارے ساتھ رہے گی تو یہ سمجھ کہ وہ بدمعاشوں کے ساتھ رہے گی۔ ہم اس کی عزت کرتے ہیں۔ ہر عورت کی عزت کرتے ہیں جو کسی کی ماں ہوتی ہے یا بہن اور بیٹی ہوتی ہے۔ ہم اس کی عزت کی حفاظت کرنے کے اہل ہیں۔ اس بارے میں تمھیں کوئی شبہ نہیں۔" میں نے لفٹ کو پھر اوپر جانے کے لیے بٹن دبا دیا۔

"سکندر۔ میں تمھارا دوست تھا۔ اب بھی دوستی کا وہ پرانا رشتہ استوار ہو سکتا ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"رشتہ جو ٹوٹ جائے اس میں گرہ آ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھاری اور میری دوستی مختلف حالات میں ہوئی تھی۔"

"حالات پھر بدل گئے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "میں پھر تمھارے ساتھ ہوں۔" میں نے لفٹ کو اوپر ہی روک دیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہماری فطرت ایک ہے مگر ہمارے جذبات کی نوعیت الگ ہے۔ تمھارے والد بھی ایک شریف، امن پسند اور قانون پرست شہری ہیں۔ تم انھی کے بیٹے ہو۔ تمھارے ساتھ وہ سب نہیں ہوا جو میرے ساتھ ہوا۔ ہوتا تو تم خود کو قانون کے حوالے کر دیتے اور اس کے فیصلے کو غلط ہونے کے باوجود قبول کر لیتے۔ جو کچھ میں کر چکا ہوں وہ تم کبھی نہ کرتے۔ میں ایک باغی ہوں۔ مجرم ہوں اور تمھارے قانون کی نظر میں چور، ڈاکو اور قاتل ہوں۔ صرف میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں یا میرا خدا جانتا ہے۔

میرا ضمیر صاف ہے مگر اس ضمیر کو عدالت میں پیش نہیں کیا جا سکتا اور قانون کی نگاہ ضمیر کو نہیں دیکھ سکتی۔ میرے سامنے ایک مشن ہے جو میرے نزدیک جائز ہے اور بہت نیک ہے۔ اتنا اعلیٰ و مقدس ہے کہ میں اس کو جہاد سے کم نہیں سمجھتا لیکن مجبوری یہ ہے کہ میں تم کو اس میں شریک نہیں کر سکتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم بھی اس کو جہاد سمجھو گے مگر تمھارے اور میرے طریق کار میں بڑا فرق ہے۔ تم قانونی راستہ اختیار کرو گے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس راستے کو اختیار کرنے سے شکست میری ہوگی کیونکہ دشمن بہت طاقت ور ہیں اور بہت با اثر ہیں۔ قانون کے لمبے ہاتھ ان کو چھو بھی نہیں سکتے۔ وہ چھپ جائیں گے یا فرار ہو جائیں گے۔ مجھے اپنے راستے سے ہٹا دیں گے اور میرے مشن کو ناکام بنا دیں گے کیونکہ ان کے ساتھی ہمارے اپنے بھی ہیں۔ ہماری صفوں میں غدار ہیں۔ ففتھ کالم کہلانے والے ہیں۔ اس لیے میں مجبور ہوں اکرام شیخ۔ شاید پھر کبھی ہم ملیں گے تو دوست ہوں گے۔"

وہ میری بات بڑے دھیان سے سن رہا تھا جب میں نے یکلخت اس کی کنپٹی پر مکا مارا اور وہ وہیں کھڑے کھڑے دیوار کے ساتھ سر ٹکاتا ہوا لفٹ کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے دروازہ کھولا اور زینے کی طرف چلنے لگا۔ زینے کے راستے کچھ لوگ شور مچاتے اوپر آ رہے تھے۔ میں نے ان سب کو اوپر آنے کا موقع دیا۔ چار جوان آدمی یکے بعد دیگرے بے خبری میں میرے ہاتھ لگے اور بلا مقابلہ لیٹ گئے۔ میں نے گاؤن اتار کے اسٹیتھوسکوپ کے ساتھ پھینکا اور تیزی سے نیچے اترنے لگا۔

"وہ نیچے بھاگ گیا۔" میں نے چلا کر کہا اور اوپر آنے والے کچھ لوگ فوراً پلٹ گئے۔ انھوں نے فرض کر لیا کہ یہ آواز لگانے والے چار افراد میں سے کسی کی تھی۔ سیکنڈ فلور پر آ کے میں نے لفٹ کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ اس فلور پر وارڈ تھے جہاں سے ملاقاتی نکالے جا رہے تھے۔ ملاقات کا وقت تو بہت پہلے ختم ہو چکا تھا مگر ڈھیٹ قسم کے لوگ اندھیرا ہونے تک براجمان تھے۔ مجھے ان سب کے درمیان مل کر نکلنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ طویل برآمدے کے دوسرے کنارے والے زینے سے اتر رہے تھے۔ میں اسی ہجوم میں شامل رہا اور محفوظ رہا۔ مجھے اس اندھیرے نے بھی پناہ فراہم کی جو ہسپتال کے زینے میں بلب نہ ہونے کے باعث پھیلا ہوا تھا۔ فیوز ہو جانے والے بلب کو بدلنے کی ضرورت پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی اور بد انتظامی کا یہ بہت چھوٹا سا نمونہ تھا۔ اتنا چھوٹا کہ اس کی اہمیت ہی نہ تھی۔

پبلک کے اس ریلے نے مجھے باہر پہنچا دیا ورنہ ہر گیٹ

پر پولیس موجود تھی۔ یہ بے حسی اور عدم دلچسپی قومی مزاج کا ایک حصہ بن گئی تھی جس نے فرض شناسی میں مستعدی اور دیانت داری کے جذبے کو کھا لیا تھا۔ پولیس نے گیٹ پر ناکا بندی کر کے ضابطے کی کارروائی ضرور پوری کی تھی مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے پہلے سے فرض کر لیا ہوگا کہ اتنے بڑے اسپتال میں ایک مجرم دو دن روپوش رہ سکتا ہے یا اس کے دس دروازوں میں سے جب چاہے نکل سکتا ہے۔ معلوم نہیں اس کی داڑھی اصلی تھی یا نقلی۔ وہ سوٹ پر سفید گاؤن پہن کر آیا ہوگا تو صرف سوٹ میں نکل جائے گا۔ چالاک مجرم تو برقع اوڑھ کر بھی نکل جاتے ہیں۔ چونکہ پولیس بہت زیادہ خرد برد کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے وہ بہت سے بہانوں کی آڑ لے سکتی تھی۔ دوسری بار نیلا گنبد پہنچ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پینے کے بعد میں نے سگریٹ جلائی اور اس عرصے میں شہلا کے اور نازو کے بارے میں سوچتا رہا۔ محسن اور ٹیڈی کی مجھے قطعی فکر نہیں تھی۔ وہ اب تک خیریت کے ساتھ گھر پہنچ چکے ہوں گے اور ہماری واپسی کے خدشات سے مضطرب ہوں گے۔ شہلا کے لیے بھی واپسی کے راستے کھلے ہوئے تھے۔ صرف نازو کے متعلق کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرنا جانتی تھی اور وحشی مردوں کا حلقہ توڑ کر نکل سکتی تھی لیکن الجھن یہ تھی کہ نکل کر وہ کہاں جائے گی۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ نازو جسمانی طور پر بالکل فٹ تھی۔ اگر اسے گولی لگی تھی تو اس کا زخم سطحی تھا یا اسے صرف خراشیں آئی تھیں۔ وہ خود بھی تو اسپتال سے اسی طرح مار دھاڑ کر کے فرار ہو سکتی تھی۔ پھر اس نے غالب کو پیغام کیوں بھیجا تھا؟ وہ غالب سے پوچھ سکتی تھی کہ آج کل تم لوگوں کا ٹھکانا کہاں ہے۔ شاید وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اب ہم اسے لینے آتے ہیں یا نہیں۔ ہم نے تو خود ہی اسے واپس اپنے گھر والوں کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ ہم انکار کر دیں گے۔ اس نے غالب کو بلایا۔ ہر عورت جانتی ہے کہ وہ کسی شہ زور مرد کی کمزوری بن سکتی ہے۔ وہ غالب کی نظر کا مفہوم سمجھ چکی تھی اور اس کے دل کی آواز سن چکی تھی۔ میری طرف سے مایوس ہو کے اس نے غالب کی طرف التفات کیا تھا۔ آہستہ آہستہ غالب نے اس کے خیالوں میں جگہ بنا لی تھی۔ آگ جو پہلے ایک طرف لگی تھی اب دونوں طرف تھی برابر لگی ہوئی۔ نازو نے غالب کو پیغام بھیجا کہ میرے لیے کچھ کر سکتے ہو تو آؤ اور مجھے لے جاؤ۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی۔ محبت بالآخر کس کی ہوتی ہے۔ مصلحت کے تقاضوں کی یا وارفتگی عشق کی۔ عقل کی یا جنون کی۔

اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ نازو نے غالب کو کیوں بلایا تھا۔ میں یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ اسپتال سے نکل کر وہ کہاں جائے گی۔ شہلا احمق تھی جو اسپتال میں اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ میں اٹھ کر کاؤنٹر تک گیا اور ٹیلی فون کرنے کی اجازت مانگی۔

"غالب سے بات کرنا ہے۔" میں نے آپریٹر کی آواز سن کر کہا۔

"غالب صاحب آئے تھے۔ واپس چلے گئے۔" آپریٹر نے کہا۔ "آپ کون صاحب ہیں؟"

"میں ان کا بھائی ہوں۔ وہ کچھ بتا کے نہیں گئے؟" آپریٹر نے نفی میں جواب دیا۔

"وہ کسی خاتون کے ساتھ گئے ہیں؟" میں نے کہا۔ "دبلی پتلی نازک سی لڑکی کے ساتھ؟"

"جی... جی..." آپریٹر نے حیرانی سے کہا۔ "کہہ کر گئے تھے کہ ابھی آتا ہوں۔ کوئی پیغام؟"

"پیغام؟" میں نے سوچ کر کہا۔ "ہاں... کہہ دینا... آتے ہے سینے کشتی عشق پہ رہنا غالب۔" اور فون رکھ دیا۔ بل ادا کر کے میں باہر نکلا اور رکشا میں بیٹھ گیا۔ رات کے آٹھ بجے میں شہلا اور محسن کے گھر پہنچا تو حسب توقع وہاں سب موجود تھے۔ شہلا کچھ دیر پہلے پہنچی تھی اور نازو اس کے بعد غالب کے ساتھ آئی تھی۔ اب ان کو میرا ہی انتظار تھا۔

"مجھے تو فکر ہونے لگی تھی آپ کی طرف سے۔" شہلا نے کہا۔ "میں تو اسی وقت نکل آئی تھی۔"

"میں ذرا اس نازو کے ڈرامے کا آخری سین کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "خاصے لوگ بلاوجہ پٹ گئے۔"

"ہم نے ایک شریف آدمی کو موٹر سائیکل سے اتار کے پھینک دیا تھا۔" محسن ہنسا۔ "اس کی موٹر سائیکل میوزیم کے سامنے کھڑی ہے۔"

"ہاں۔ وہ ڈاکٹر کلیکس تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی آتا ہی ہوگا یہاں۔ ممکن ہے اس کے ساتھ اکرام شیخ بھی آ پہنچے۔"

"اسے کیا معلوم کہ اب ہم کہاں ہیں؟" محسن نے کہا۔

"یہ نازو سے پوچھو۔ آخر کیا ضرورت تھی اس کو غالب کے نام ایس او ایس بھیجنے کی؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "کیا یہ خود نکل کر نہیں آ سکتی تھی؟"

"نکل کر یہ کہاں جاتی؟ اس کو بھی ہمارے موجودہ ٹھکانے کا علم نہیں تھا۔" شہلا نے کہا۔

"تم سب گدھے ہو۔" میں نے کہا۔ "اب نازو یہاں تک کیسے آگئی؟ یہ غالب کے پاس پہنچی اور غالب اسے یہاں

www.paksociety.com

سے آیا۔ کیا ہم سب کو وہاں بلا کے ہنگامہ آرائی کا خطرہ مول لینے پر مجبور کرنا ضروری تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ نازو زخمی ہے اور جسمانی طور پر مجھنے کے بھی قابل نہیں۔ اس طرح تو یہ خود بھی نکل سکتی تھی۔ اکرام شیخ کو اس نے ناک آؤٹ کر دیا تو وہ تھا بیڈ روم کے دروازے پر بیٹھا تھا کیا اسے ناک آؤٹ کرنا مشکل تھا۔ پھر پیسے یہ اب تک غالب کے پاس اسی طرح پہنچ جاتی۔"

"یا مجھے معلوم تھا کہ تم شک کرو گے۔" نازو نے افسردگی سے کہا۔

"شک کی بات نہیں۔ تم نے بے وقوفی کی۔ خدانخواستہ ہم میں سے کوئی دیوار پھلانگ جاتا تو کیا ہوتا؟" میں نے کہا۔ میری بات دوسروں نے بھی سمجھ لی تھی اور سب کی سوالیہ نظریں اب نازو پر ہی ہوئی تھیں۔

"مجھے بے وقوف کہنے سے پہلے تم کو میری بات سن لینی چاہیے تھی۔" نازو نے خفگی میں کہا۔ "تم سے مجھے گلہ ہے سکندر کہ تم نے مجھے کبھی اعتماد کے قابل نہیں سمجھا حالانکہ میں نے ایک بار نہیں متعدد بار جان کی بازی لگا کے اپنے جذبات کا ٹھیک ٹھیک کا اور خلوص کا یقین دلانے کی پوری کوشش کی ہے۔ کیا وہ بھی ڈراما تھا جب میں نے تمہاری جان لینے والی گولی کا راستہ روک لیا تھا؟ رابعہ سے پوچھنا کہ میں کس طرح اسے نکال کر لائی تھی۔ یہ سب اس کا صلہ ہے؟"

"آئی ایم سوری۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "محسن نے تم کو بے وقوف ضرور کہا تھا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ ہم تمہیں غیر سمجھتے ہیں۔ تمہارے جذبات کی قدر نہیں کرتے اور تم پر بھروسا نہیں کرتے۔"

"یار سکندر اعظم سے اب تم افلاطون اعظم بھی بن رہے ہو۔" نازو نے تلخی سے کہا۔ "بہت ناز ہے تم کو اپنی عقل پر لیکن اس عقل سے تم نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ سو فیصد غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ایسا نہ کرتی تو کبھی تم تک نہ پہنچ پاتی۔ میرا بھائی بھی میری طرح ضدی اور انتہا پسند ہے۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جس طرح میں چھوٹے بڑے کا، خاندان کی عزت کا اور خون کے کسی رشتے کا لحاظ نہیں کرتی اسی طرح وہ بھی مجھے چھوٹی بہن کی حیثیت سے کوئی رعایت نہیں دے گا اور جان نہ بخشی جائے یا اس کی، وہ مجھے تم تک نہیں پہنچنے دے گا۔ یہ انا اور خاندانی وقار کا مسئلہ بن گیا تھا۔ میرے والد بہت غیر جانبدار رہتے ہیں مگر یار وہ بھی کیا کر لیتے کہ میں لڑکی ہوں۔ وہ دنیا سے نہیں کہہ سکتے کہ اولاد نا خلف اور … ہے۔ لڑکا ہوتا تو اسے نافرمان اور سرکش کہہ کر خود کو بچا لیتے یا عاق کر دیتے۔ لڑکی کے معاملے میں سارا الزام والدین

پر آجاتا ہے کہ انھوں نے بے پروائی میں کوتاہی کی اور پھر بیٹی نے بھی انھی کو قتل کیا ہے۔ ماں تو مجھے دوڑ کر لاتی تھی کہ ایسی دنیا میں یوں رسوا کرنے سے تو بہتر تھا کہ تو پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔ وہ مجھے دھمکی بھی دیتی تھی کہ میں نے اپنی روش نہ بدلی تو کسی دن وہ کچھ کھا کے سو جائے گی۔ ان کی باتوں نے مجھے بہت پریشان کر رکھا تھا اور انھوں نے مجھے صاف بتا دیا تھا کہ فوٹ کی گنجائش نہیں ہے۔ مجھے ویسے ہی رہنا ہوگا جیسے سب لڑکیاں اپنے ماں باپ کے اور پھر شوہروں کے گھر میں رہتی ہیں۔ بیٹے باہر کچھ بھی کرتے پھریں انھیں کوئی کچھ نہیں کہتا مگر لڑکیاں لڑکیاں ہوتی ہیں۔ وہ کسی غیر شخص کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوں اور گھر تک چھوڑ دیں تو لوگ اس کا مطلب کچھ اور نکال لیتے ہیں۔ کوئی نہیں مانتا کہ وہ حق اور انصاف کا پرچم بلند کرنے نکلی ہیں اور مظلوم کی حمایت میں جہاد کرتی پھر رہی ہیں۔"

"اور اس کے باوجود تمہارے خیالات میں تبدیلی نہیں آئی؟" محسن نے کہا۔

"خیالات تو آدمی کی فطرت کا عکس ہوتے ہیں۔" نازو نے کہا۔ "میں اپنی فطرت کے تقاضوں کو کیسے بدل دوں۔ جب میں شہلا کو دیکھتی ہوں اور رابعہ کو دیکھتی ہوں تو مجھے غیرت آتی ہے۔ یا آخر وہ بھی تو بے بس، ناقص العقل اور کمزور سمجھی جانے والی عورتیں ہیں۔ وہ کس طرح ساتھ نبھا رہی ہیں؟ میں اتنی خود غرض کیسے ہو جاؤں کہ صرف اپنی زندگی کی خوشیوں سے تعلق رکھوں اور باقی سب بھول جاؤں۔ میں اپنی آنکھیں بند کر سکتی ہوں لیکن ذہن کی سوچ کے راستے بند نہیں کر سکتی۔ اکرام شیخ نے بھی مجبور ہو کے طے کر لیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر میرا راستہ روکے گا۔ فلموں میں تو ایسا ہوتا ہے کہ تم کو میری لاش پر سے گزر کے جانا ہوگا۔ کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ وہ مجھے صاف بتا چکا تھا کہ سکندر بخت کا مظلوم اور برحق ہونا اپنی جگہ مگر والدین کی آبرو سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ میں اس کو کبھی بھول جاؤں، چنانچہ میں نے اس کی نیت کو بھی سمجھ لیا۔ پھر بار بار بہت سوچ بچار کے بعد میں نے ایک منصوبہ بنایا۔ میں نے اسے قائل کرنے کے لیے اپنے خیالات میں رونما ہونے والے انقلاب کی باتیں شروع کر دیں۔ میں نے باتوں باتوں میں بھائی سے اپنے سابقہ رویے پر ندامت کا اظہار کیا۔ یہ کہا کہ سکندر جیسے شخص کے لیے میرا جذباتی ہونا میری بے وقوفی تھی۔ وہ … کے علاوہ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ میری بات پر اکرام شیخ نے سکندر کے خلاف الزامات اور اس کے جرائم کی تفصیل بتا کے مجھے سمجھایا کہ سکندر ایسی دلدل میں اتر چکا ہے جس سے وہ مر کے ہی نکلے گا۔ اس کے گرد دشمنوں کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ کہاں تک

بھاگے گا اور کب تک چھپے گا۔ شکاری ہر سمت سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ جیسے چوہدری دلاور کے ساتھی، پولیس کا ہر سراغرساں اس کی گرفتاری پر ایک لاکھ کا انعام حاصل کرنے کے بجائے سب اسے تلاش کر رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ میں نے سکندر بخت کے خلاف نفرت کے جذبات کو نمایاں کیا۔ یہ تبدیلی اگر فوراً آجاتی تو شک ہو جاتا۔ مگر میں نے یہ ظاہر کیا جیسے اسپتال میں بستر پر … سوچنے کے بعد میں ایک منطقی نتیجے پر پہنچی ہوں۔ جو میرے منفی رد عمل کا نتیجہ ہے کہ اگر جان کا خطرہ مول لے کر رشتوں کو ٹھکرا کر اور رسوائی مول لے کر بھی میں ایک شخص کے پتھر دل کو موم نہیں کر سکی تو ضد ہے اس کی نے مجھے نفرت پر مجبور کر دیا ہے۔"

ذرا سی دیر کے لیے وہ خاموش ہوئی۔ میں اور محسن اور شاید ہمارے ساتھ شیڈی اور جمیلہ بھی ایک ہی بات سوچ رہے تھے کیا واقعی نازو نے بھائی سے جھوٹ بولا تھا اور حقیقت اس کے برعکس تھی یعنی وہ اب تک مجھ سے محبت کرتی ہے؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں رابعہ کے علاوہ کسی کا نہیں ہو سکتا! یہ کیسا عشق ہے اور کیسی دیوانگی ہے کہ جس پتھر کے موم ہونے کا امکان ایک فیصد بھی نہ ہو وہ اسی پتھر کو پوجتی رہے اور اسی سے سر ٹکرا کے مر جانے کے عہد پر قائم ہو۔ حقیقت تھا کہ رابعہ سامنے رہتی اور نازو اس عشق کی انتہا تک پہنچ جانے بھی شرمسار کر دیتی اور حسد میں مبتلا کر دیتی۔ مجھ پر اور میری وفا پر کامل اعتماد رکھنے کے باوجود وہ اس خیال سے کیسے دامن چھڑا لے کہ مجھے کوئی اور بھی چاہتا ہے۔ کوئی اور بھی مجھے دل سے پیار کرتا ہے اور یہ وہ عشق ہے جو بے طلب ہے۔ جو حقیقی ہے۔ عشق مجازی کی اگلی منزل ہے اور سودا کہیں جنون کہیں وحشت کہیں اسے۔ مگر اس کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ پیار میں کوئی بھی عورت کسی کی جذباتی شراکت بھی گوارا نہیں کر سکتی خواہ یہ شراکت یکطرفہ ہو۔ میرے سامنے غالب تھا جو نازو کے عشق میں اسی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بے شک اب نازو بھی اس کی طرف ملتفت تھی مگر غالب کے احساس سے یہ بات فراموش نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کی محبت نازو کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ شاید یہ محبت نہیں نازو کی شناسائی کی خیرات ہے۔ مجبوری ہے یا حالات کا تقاضا ضرورت ہے۔ نازو کی محبت کے جس آسمان تک پہنچنا چاہتا تھا وہاں اس کے لیے جگہ نہیں تھی۔ وہاں پہلے سے رابعہ کی محبت کا حصار کھنچ چکا تھا۔ نازو نے اس بلندی سے ذرا نیچے غالب کو بلا لیا تھا اور اس کا سہارا اپنا منظور کر لیا تھا کیونکہ وہ عرش سے فرش تک گرنے والی زخمی نہیں تھی۔ تاہم اس کی نظر اب بھی اوپر تھی۔

"جب بھیا کو یقین آنے لگا کہ میرے جذبات کا رخ بدل گیا ہے۔" نازو نے کہا۔ "تو آہستہ آہستہ انھوں نے مجھے اپنا ہم خیال بنانا شروع کیا۔ وہ مجھے قائل کرنے لگے کہ سکندر بخت کا خود کو قانون کے حوالے کر دینا ہی سب سے بہتر ہے ورنہ اس کے معاملات خراب سے خراب تر ہوتے جائیں گے۔ میں نے ان سے اتفاق کیا۔ انھوں نے افسوس سے کہا کہ کاش اس کا سراغ مل سکتا تو میں خود اس سے بات کرتا اور اسے سمجھاتا کہ میں آج بھی اس کا دوست ہوں اور اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ اچھے وکیل اس کے حالات کی مجبوریوں کو جواز بنا سکتے ہیں اور اعلیٰ عدالتوں میں سزا محض جرم دیکھ کر نہیں دی جاتی۔ عدالت مجرم کی ذہنی کیفیت اور اسے جرم کے ارتکاب تک لے جانے والے تمام عناصر پر غور کرتی ہے۔ بالآخر ایک دن میں نے غالب کا نام بتایا کہ شاید وہ سکندر بخت کے متعلق بتا سکے۔ بھیا نے مایوسی کا اظہار کیا کہ وہ بہت چالاک صحافی ہے۔ نہ اسے قائل کیا جا سکتا ہے اور نہ مجبور۔ پھر میں نے بے شرم بن کے کہا کہ یہ کام میں کر سکتی ہوں۔ اگر میں اسے بلاؤں تو کچے دھاگے سے بندھے چلے آئیں گے سرکار بہہ گئے۔"

"سرکار تو مگر جیتے رہے، جان کی بازی لگانے پہنچ گئے دوسرے۔" محسن نے کہا۔

"کچے دھاگے سے نہیں ان کو تو کسی مضبوط رسی سے باندھ کر لایا جا سکتا تھا۔" شیڈی بولا۔ "جیسے لوگ مشکی سے گرا لاتے ہیں۔"

خفت اور شرمندگی سے غالب کا رنگ لال ہو گیا۔ وہ خفت بے عزتی محسوس کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ نازو اس کی طرف لپکی اور دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کی راہ میں حائل ہو گئی۔

"کمال ہے یار، میں نے تو کچھ نہیں کہا تم سے۔" وہ ہاتھ پھیلا کے بولی۔ "تم جانتے ہو میں جھوٹ نہیں بولتی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم آ جاؤ گے لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ تمہیں یہ لوگ نہیں آنے دیں گے۔"

"میں اپنے آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔" غالب نے افسردگی سے کہا۔ "تمہاری نظر سے مجھے کوئی گلہ نہیں۔ ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات۔ بس تم نے ہمارا نام استعمال کر لیا۔"

"غالب، میری طرف دیکھو۔" نازو نے کہا۔ "میری آنکھوں میں دیکھو یار، تمھیں کیا نظر آتا ہے۔ میری نظر میرے دل کا آئینہ ہے۔"

معلوم نہیں غالب نے اس کی آنکھوں میں کیا دیکھا جو ہم نہ دیکھ سکے مگر دوسرے لمحے میں سب کچھ بدل گیا۔ وہ پلٹا تو اس کی صورت پر مسکراہٹ تھی۔ یہ زیر لب کی مسکراہٹ نہیں تھی اس مسکراہٹ میں سما جاتی تھی۔ پھر اندھیری خوشی کی ایک روشن کرن تھی اور امید کا سب سے دلکش رنگ تھا۔ اس میں احساس کی ندامت نہیں تھی، غرور و محبت کی خود فراموشی تھی۔ نازو نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور وہ کچے دھاگے سے بندھا چلا آیا۔

www.paksociety.com

غالب کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ کبھی کسی سے خفا نہیں ہوتا، خصوصاً دوستوں کے مذاق سے لیکن آج ہماری بات نے اس کے جذبات مجروح کر دیے تھے۔

"تم واقعی روٹھ کر جا رہے تھے یا صرف اداکاری کا نمونہ پیش کر رہے تھے؟" ٹیڈی نے کہا۔

"ہم آہ بھی بھرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام۔" غالب نے آہ بھر کے کہا۔ "وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا۔ اب کیا اداکاری بھی نہ کروں؟"

"ضرور کرو۔ بس محبت میں اداکاری مت کرنا۔" شہلا نے اچانک کہا اور ذرا سی دیر کے لیے اس کی بات نے سب کو متحیر کر دیا۔ اس کی بات سب پر عیاں ہو گئی تھی۔ نازو ہنس پڑی۔

"اب آ گیا تم لوگوں کو سمجھ شریف میں کہ غالب کو بولنے میں کیا مصلحت تھی؟ بھتیا کو غالب کا انتظار تھا۔ تم لوگوں کا نہیں۔ اگر غالب آ جاتا تو خاموشی سے اس کا پیچھا کیا جاتا یا پھر ایسا بندوبست ہوتا کہ کوئی پولیس مین سادہ کپڑوں میں ٹیکسی لے کر نمودار ہو جاتا اور غالب کے لیے مشکل پیدا ہو جاتی۔ ظاہر ہے میں غالب کو بتانے پر مجبور ہو جاتی کہ یہ جال ہے اور وہ مجھے جہاں جا رہے ہیں لے جانے کے بجائے سکندر بخت کے پاس نہ لے جائے۔ میں نے ایک جوا کھیلا تھا جو کامیاب رہا۔ غالب کے بجائے تم لوگ آ پہنچے اور بھیا دھوکا کھا گئے۔ اگر تم لوگوں کے آنے کا ذرا بھی شک ہوتا تو ہسپتال میں اور آس پاس پولیس کی نفری بھاری تعداد میں موجود رہتی۔ سادہ کپڑوں میں بھی اور مسلح بھی۔ غالب کو ایک صحافی اور بے ضرر سمجھتے ہوئے ایسا کوئی انتظام نہیں کیا گیا اور یہ مجھ پر چھوڑ دیا گیا کہ میں غالب کے ذریعے سکندر بخت کے موجودہ ٹھکانے کا پتا چلاؤں اور پھر بھیا کو مطلع کر دوں۔ اب انھیں سخت رنج اور غصہ ہو گا کہ میں نے انھیں بے وقوف بنایا اور دھوکا دے کر نکل گئی۔ شاید یہ میرے لیے آخری چانس تھا۔ میں دوبارہ ان کے ہاتھ لگی تو کبھی زندہ نہ نکل سکوں گی۔ انھوں نے تو اس مرتبہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ... کہ بس اب وہی کیا جائے گا جو لڑکیوں کے معاملے میں آخری علاج سمجھا جاتا ہے۔"

"وہ کون سا علاج ہے؟" شہلا نے سادگی سے کہا۔

"ارے یار، وہی جو تم نے کیا۔ شادی۔" نازو نے بے تکلفی سے شہلا کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ہم سب ہنس پڑے۔

"کون تھا وہ بدبخت جسے تمھاری غلامی میں دیا جا رہا تھا؟"

"معلوم نہیں کون تھا یار۔ میں کون سا گھونگھٹ نکال کے سر جھکائے بیٹھی تھی؟" نازو نے کہا۔ "اگر زبردستی کی جاتی تو عین وقت پر اٹھ کھڑی ہوتی اور کہتی کہ اسے قبول کرنے والے پر لعنت۔ اسلام نے زبردستی سے منع کیا گیا ہے لیکن یہاں چھوٹے سے زبردستی اور بڑوں کی مجبوری کو اس کی فرمانبرداری سمجھا جاتا ہے۔ میری گردن میں سب سے [illegible]"

"ویری ہینڈسم۔" غالب نے کہا۔ "یہ پہلا کیس ہو گا میں دلہن کے ہاتھوں دولہا کو جوتے مار کے گلی میں پھینکا جاتا اور شجرہ والیس کیسے لے جایا جاتا؟" ہم سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

"یار تم اب جاؤ اپنے اخبار کے دفتر۔ مجھے شک ہے کہ کسی ڈیکس کو وہاں بھیج چکے ہوں گے۔" نازو نے کہا۔ "یہ ذرا ڈیوٹی تھی۔ اب وہ خود اس پر چلیں گے۔ تم کو ادھر آنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ کم سے کم ایک ہفتہ۔"

"ایک ہفتہ!" غالب نے مردہ آواز میں کہا۔ "ایک ہفتہ لوگ میری صورت دیکھے بغیر رہ سکو گے؟"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ اب ایک ہفتہ تم کسی کی صورت دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔" محسن ہنسا۔

"اب جاتے ہو کہ نہیں۔" نازو نے ڈانٹ کر کہا۔ "یا میں پانی ایڈ گلی تک استعمال کروں؟"

"جاتا ہوں بابا جاتا ہوں۔" غالب نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ "اب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھ کہ تمھاری بات نہ مانوں۔ لیکن اتنا تو بتا دو کہ یوم حشر سے پہلے ملنا ہو تو میرا کوئی ٹھکانا بھی ہے۔۔۔"

"تو ہم خود رابطہ قائم کر لیں گے۔" میں نے کہا۔ "تمھیں تو دفتر کریں گے۔ تم تو رات کو بھی آفس میں پلنگ پر پڑے ہوتے ہو۔"

"اس کا... کوئی گھر نہیں ہے؟" غالب کے جانے کے بعد نازو نے حیرانی سے کہا۔ "کیسی عجیب بات ہے یار؟"

"ہاں۔ یہ مرد قلندر دوست ہے جس کے بارے میں کہا تھا علامہ اقبال مرحوم نے کہ نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کا باپ ایک مشہور صحافی تھا اور یہ اس کا بیٹا تھا۔ وہ کنا ڈا گیا تھا کسی میڈیکل کانفرنس میں۔ واپسی پر کریش ہو گیا۔ غالب کے ماں باپ دونوں مارے گئے تھے مگر غالب اس سے پہلے ہی گھر چھوڑ چکا تھا۔"

"مگر... مجھے تو کچھ اور بتایا تھا انھوں نے؟" محسن بولا۔

"ہاں۔ ڈاکٹر لطیف نے اصل بات مجھے بتائی ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "وہ اس کے والد کے دوست تھے۔ باپ چاہتا تھا بیٹا اس کی طرح نامور ڈاکٹر بنے۔ بیٹے میں صحافت کے اور شاعری کے جراثیم پیدائشی طور پر موجود تھے اور مزاج میں درویشی تھی۔ یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ماتا پر عمل کی طرح گھر سے نکل گیا تھا۔ والدین کے انتقال کے بعد پلٹ کر گھر نہیں گیا۔ ڈاکٹر لطیف نے کہا کہ لاکھوں کی کوٹھی بند پڑی ہے اور کھنڈر ہو رہی ہے۔ تمام جائیداد چھوڑ گیا۔۔۔ غالب کہتا ہے وہ گھر جانے سے اسے ماں باپ یاد آتے ہیں جنھیں ذہنی اذیت پہنچانے کا وہ ذمہ دار ہے۔ اس موضوع پر بات کرو تو خفا ہو جاتا ہے۔"

"بڑا انسان ہے۔" نازو نے سوچ کر کہا۔

"ہاں... یہی سمجھا جا سکتا ہے۔" میں نے جونک کر کہا۔ "شدید احساس جرم اس کے لاشعور میں موجود ہے۔ اب وہ اپنے باپ کا وارث بنتے ہوئے خود کو مجرم محسوس کرتا ہے جس کی خواہش کو ٹھکرا کے وہ گھر سے رشتہ توڑ آیا تھا۔ وہ کس دل سے اس گھر میں جائے۔ ڈاکٹر لطیف نے کہا تھا کہ سب بیچ ڈالو اور رقم کسی فلاحی ادارے کو دے دو۔ کوئی ٹرسٹ بنا دو۔ کسی اسپتال میں وارڈ بنا دو۔ وہ یہ بھی نہیں کرتا۔ اس میں شاید ہمت نہیں ہے۔ یہ سب اس کے باپ کی تمام عمر کی کمائی تھی۔ یہ اسے مل سکتی تھی مگر وہ خود اس سے دستبردار ہو گیا تھا۔ اب اس کا حق وراثت حاصل کرے تو مشکل اور پھر اسے بیچ کر مزید مشکل۔ چنانچہ وہ کچھ بھی نہیں کرتا اور اس نے خود کو پریشانی اور پریشانی سے محفوظ رکھنے کے لیے سب کچھ بھلا دیا ہے۔"

"کیسی عجیب بات ہے سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے کہا۔ "کروڑوں کا اور بھرا ہوا گھر سب ہے مگر وہ کہتا ہے کہ میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔ آفس میں ٹیبل جوڑ کے سو جاتا ہے۔ تم کہتے ہو اس میں ہمت نہیں۔ ہم نے تو اس کا نشانہ دیکھا ہے۔ گولی سے موم بتی کا شعلہ گل کر دیا تھا مگر موم بتی کھڑی رہی تھی اور ہمارے ساتھ جان کی بازی لگانے میں وہ کب پیچھے رہا؟"

"وہ ہمت والا اور بے انتہا بڑے شیر بہادر اور نڈر لوگ کسی نہ کسی جذباتی کمزوری کا شکار ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں نے ایک بہت خطرناک مجرم کو دیکھا تھا۔ وہ نہ جانے کتنے قتل کر چکا تھا۔ خون بہتے دیکھ کر اسے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ کانپنے لگتا تھا۔ وہ پکڑا بھی ایسے ہی گیا تھا۔ کہیں ڈاکا ڈالنے گیا تھا۔ عورت کو اس نے باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔ ایک بچہ سوتے سے اٹھ گیا۔ پانچ سات سال کا بچہ تھا وہ رونے لگا اور اس کے پیروں سے لپٹ گیا کہ میرے ڈیڈی کو مت مارو۔ اس کے ہاتھ پیر پھول گئے کیونکہ وہ خنجر کا ایک وار کر چکا تھا۔ اس نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور زخمی شخص کو خود ہسپتال لے کر دوڑا۔ بچہ مسلسل رو رہا تھا کہ تم نے میرے ڈیڈی کو مار دیا اور وہ اسے چپ کراتا رہا کہ نہیں بیٹا، وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہسپتال میں پولیس نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ بعد میں پھانسی ہو گئی اسے۔ جو کام پولیس اپنے وسائل کی طاقت سے نہیں کر سکتی تھی وہ ایک بچے کے آنسو کر گئے۔ غالب بھی اس گھر کے آسیب سے ڈرتا ہے۔"

"اس کا آسیب میں دور کر دوں گی۔" نازو نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی اسے اس کے گھر میں۔"

"آمین۔ اور اس کے بعد تم دونوں ہنسی خوشی اسی گھر میں رہنے لگو گے۔" میں نے کہا۔ "وہ دونوں شادی کر کے ٹوٹ پھوٹ گئے۔"

نازو کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے لال پڑ گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ میں اس کی بات کو یوں موڑ دوں گا۔ رات کے ساڑھے نو بجنے کو تھے۔ ٹیڈی بازار سے روٹی سالن لے کر آیا تو ہم سب شکم سیر ہو کر پڑ کے سو گئے۔ میں اور ٹیڈی ایک کمرے میں لیٹے جہاں ساتھ والا بیڈ روم شہلا اور محسن کا تھا۔ نازو کو اس کے مقابل کا بیڈ روم دے دیا گیا۔ ٹیڈی کو بہت جلد گہری نیند میں خراٹے لینے لگا۔ اسے فکر تھی تو صرف یہ کہ جو ٹیکسی اسپتال میں رہ گئی تھی اس کی مدد سے پولیس ملک کا سراغ لگا لے گی اور اس سے ہمارے متعلق معلوم کرے گی تو وہ سب کچھ بک دے گا۔ جیسا کہ معلوم ہو گا کہ ہم خفیہ پولیس کے آدمی تھے۔ ترنطری اٹیک جس کے کرنل سنجیدہ طور پر اشتہاری مجرم تھے تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے پولیس سے تعاون کرے گا اور ہمارے بارے میں ہر بات تفصیل سے بتا دے گا۔ ٹیڈی کو یہ ڈر تو نہیں تھا کہ پولیس ہمارا سراغ لگا لے گی مگر اس دولت کی فکر تھی جو ہم ٹیکسی ڈرائیور جان ماہی کے گھر میں مدفون چھوڑ آئے تھے۔ ایک صندوق سونے کا بھرا ہوا اور ایک اٹیچی کرنسی سے بھرا ہوا اس گھر کے آنگن میں دفن تھے اور انھیں فوری طور پر نکالنے کی کوئی صورت نہ رہی تھی۔ میں نے ٹیڈی کو تسلی دی کہ ابھی ہمیں اس پیسے کی ضرورت بھی نہیں۔ جب ضرورت پڑی تو دیکھا جائے گا۔

ٹیڈی کو نے محسوس کیا کہ میں اس کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہا ہوں اور یہ بھی کہ میں تھکن کے باعث نیند سے مغلوب ہوا جا رہا ہوں۔ وہ منہ پھیر کے سو گیا مگر میں جاگتا رہا کیونکہ میں رابعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک دن اس کے دیدار سے محرومی کا نذر ہو گیا تھا۔ کیا اس نے میرا انتظار کیا ہو گا؟ یقیناً کیا ہو گا اور کیا خبر وہ اس وقت تک جاگ رہی ہو اور میرے متعلق سوچ رہی ہو کہ آخر میں کیوں نہیں آیا۔ اس کے اور میرے درمیان احساس کی اجنبیت کے فاصلے تقریباً ختم ہو گئے تھے۔ ایک دن یا زیادہ سے زیادہ دو دن میں اس کی نظر کے علاوہ اس کا دل بھی مجھے پہچان لیتا۔ میں اسے اپنے ساتھ رکھتا اور ان تمام مقامات پر لے جاتا جہاں کبھی وہ میرے ساتھ تھی۔ اسے محسن اور شہلا کے گھر لاتا۔ اتنے مہرباں آشنا چہرے دیکھ کر وہ تنہائی کے اس جنگل سے نکل آتی جہاں اس کے ساتھ خوف اور بے یقینی کے ڈراؤنے سائے تھے اور خود شناسائی کے احساس سے محرومی کا اندھیرا تھا۔ وہ روشنی مانگتی تھی اور میں اسے روشنی کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ روشنی دیکھنے لگی تھی مگر آج میں نے اس کو پھر نا امید کیا۔ انتظار کے

www.paksociety.com

بعد ناامیدی کتنی دل شکن ہوتی ہے۔

اس وقت نہ جانے کیوں دل ناامید نے مجھے اتنا بے اختیار کیا کہ میں چپکے سے اٹھا اور دروازہ کھول کے باہر آ گیا۔ گلی میں آج تو چاند کا اجالا تھا۔ رات کے گیارہ بجے لوگوں کی آمدورفت بھی ختم تھی اور بیشتر گھروں کی تاریکی مکینوں کے بے خبر سونے کی خبر دیتی تھی۔ آتی رات گئے ڈاکٹر لطیف کے گھر جانا اخلاق و آداب کے اصولوں کے خلاف تھا لیکن رابعہ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے میں نے خود کو بدتمیز اور بدتہذیب کہلوانا منظور کیا۔ ابھی میں پچاس قدم ہی چلا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے سے رکشا کی آواز آئی۔ وہ کسی سواری کو اتار کے خالی لوٹ رہا تھا مجھے یوں لگا جیسے تقدیر بھی میرا ساتھ دے رہی ہے۔ چند منٹ بعد میں رکشا میں سوار اپنی منزل کی سمت رواں تھا اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے رکشا اپنے انجن کی طاقت سے آگے نہیں بڑھ رہا ہے اور انجن کو پٹرول کی توانائی حرکت نہیں دے رہی ہے۔ یہ مقناطیسی کشش جیسی لیکن اس سے بہت زیادہ عظیم محبت کے جذبے کی کشش تھی جو مجھے رابعہ کی طرف دھکیل رہی تھی اور میرے ساتھ رکشا بھی اسی سمت میں جا رہا تھا جدھر رابعہ تھی۔ میرا تصور مجھ سے بہت آگے محو پرواز تھا اور اس کے سہرے سپنوں کی تصویریں پیش کر رہا تھا جیسے سینما کے اسکرین پر سلائیڈ پروجیکٹر یکے بعد دیگرے اشتہار دکھاتا جاتا ہے۔

گیارہ بج کر بیس منٹ پر ڈاکٹر لطیف کی کوٹھی کے دروازے پر اتر جانے کے بعد میں نے خود کو سست احمق تصور کیا جسے اپنے آپ پر ذرا بھی اختیار نہ تھا۔ دل کے ہاتھوں یہ دیوانگی اب میری ذات سے بڑھ کر دوسروں کے لیے زحمت کا سبب ہونے لگی تھی۔ ڈاکٹر لطیف کی فراخدلی اور روشن خیالی کا صلہ یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ میں وقت بے وقت ان کے دروازے پر کھڑا نظر آؤں۔ ان کا یہی احسان کیا کم تھا کہ میرے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور رابعہ کا نام و نسب پوچھے بغیر اپنے گھر میں جگہ بھی دی اور علاج کے ساتھ وہ ماحول بھی فراہم کیا جو اس کے لیے نئی زندگی کا ضامن ہوا۔ دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا تو میرے جذبات پر عقل غالب آنے لگی اور میں تذبذب میں مبتلا ہو گیا کہ آگے بڑھوں یا لوٹ جاؤں۔ چند گھنٹوں کی ایک رات گزر ہی جائے گی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ موتی نے بڑی گھن گرج کے ساتھ گیٹ پر یلغار کی۔ میں گیٹ سے باہر تھا اس کے باوجود میں اچھل کے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ غالباً یہ ڈاکٹر لطیف کی ظرافت طبع کا نتیجہ تھا کہ اچھے خاصے صحت مند بھیڑیے جیسے کتے کا نام موتی رکھ دیا گیا ورنہ لوگ تو ٹائیگر قسم کے نام رکھتے ہیں۔ نا سمجھ جانور نہیں جانتا تھا کہ اسے جو کام کرنے لایا جا رہا ہے وہ سخت ہتک محسوس کرتا۔

موتی کے دہاڑنے کا فائدہ یہ ہوا کہ اندر ڈاکٹر لطیف کو میری آمد کی اطلاع مل گئی۔ ایسی کرخت اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز میں بھونکتا ہوا کتا انسان اور وہ بھی ڈونگ ڈانگ والا کال بیل کہاں جس کو صرف انگلی سے چھونا پڑتا ہے۔ اندر سے کم روشنی سے ڈاکٹر لطیف نے گیٹ لائٹ آن کی اور کھڑکی میں سے مجھے کھڑا دیکھا۔ اتنی دور سے انھوں نے مجھے پہچانا تو نہیں ہوگا مگر ایک آواز سے انھوں نے موتی کو سچ مچ موتی بنا دیا۔ وہ بچے کی طرح دم ہلا کے ایک طرف کھڑا ہو گیا تو میں گیٹ کھول کر اندر آیا اور موتی کے عزائم سے ہوشیار پہرے دار کی انداز میں چلتا ہوا برآمدے تک پہنچا جہاں ڈاکٹر لطیف گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔

"آئی ایم سوری۔" میں نے ہاتھ ملا کے کہا۔ "اس وقت مجھے آنا تو نہیں چاہیے تھا۔ آپ سو رہے ہوں گے۔"

وہ ہنسنے لگے۔ "اس عمر میں نیند کی ضرورت بہت کم ہو جاتی ہے ینگ مین۔ میں ایک بجے تک ضرور جاگتا ہوں۔ کچھ کرتا رہتا ہوں۔ کچھ پڑھتا ہوں ورنہ خطوں کے جواب لکھتا ہوں۔ آؤ۔" وہ آگے آگے چلنے لگے۔

"اتنے خط کسے لکھتے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔

"لوگوں کو۔ جو مجھ سے مشورے مانگتے ہیں۔" وہ بولے۔ "اگر معمولی مسائل ہوں تو انھیں کلینک میں نہیں بلاتا۔ زیادہ تر تو محض لاعلمی یا وہم کی پیداوار ہوتے ہیں۔ مثلاً یہی نیند کا مسئلہ۔ عرض اب میری عمر کا آدمی دس گھنٹے کی گہری نیند مانگتا ہے تو اسے بیماری کوئی نہیں۔ یہ کم علمی کی بات ہے۔ اسے بتا دیتا ہوں بھائی نیند نہ آئے تو کوئی کام کرو۔ یہ گولیاں وغیرہ کچھ نہیں۔ نیند نہ آنے کے غم کو روگ مت بناؤ۔ جب نیند آئے سو جاؤ نہ آئے تو کوئی بات نہیں۔ عورتیں زیادہ خوش قسمت ہوتی ہیں نیند کے معاملے میں مثلاً ہماری بیگم۔ تم نے اچھا کیا کہ اس وقت آ گئے۔ ہم اطمینان سے بات کر سکتے ہیں۔"

"میں زیادہ وقت نہیں لوں گا آپ کا۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں تمہارا کافی وقت لوں گا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "اس لیے پینے میں کافی بنا لیتا ہوں۔ پیو گے نا؟"

"بڑے شوق سے۔" میں نے کہا اور ان کے ساتھ کچن میں پہنچ گیا۔ انھوں نے مجھے ایک اسٹول پیش کیا اور خود ایک کیتلی میں پانی ڈالنے لگے۔

"میں تمہارا منتظر تھا۔" انھوں نے ٹیک لگا کے کہا۔ "مسئلہ

ہے رابعہ کا۔"

میں ان کے رویے سے اندازہ تو کر ہی چکا تھا کہ وہ رابعہ کے بارے میں بات کریں گے۔ "کوئی... نیا مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ تو نیا نہیں۔ ایک معمولی سی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔" وہ اٹھ کر کافی پھینٹنے کھڑے ہو گئے۔ "میں بتا نہیں سکتا کہ ایسا کیوں ہوا۔ نفسیاتی اسباب کی تشخیص مشکل کام ہے۔ بیمار کی ٹیسٹ اور مشینی آلات اس میں کام نہیں آتے۔ اب تم خود جانتے ہو کہ کل رات رابعہ کی پروگریس بہت اچھی تھی۔ میری توقعات سے کہیں زیادہ اور یہ سب تمہاری وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ تم نے جس ذہانت کے ساتھ اس کو ہینڈل کیا۔ وہ بہت خوش تھی اور ظاہر ہے اس کو نارمل دیکھ کر میں خوش تھا مگر تمہارے چلے جانے کے بعد رات کو ہم سب سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا اس نے چلانا شروع کر دیا..."

"ڈاکٹر صاحب۔ میں نروس ہو رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ بتائیے وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"او یس۔ وہ سو رہی ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے ابلتے پانی کو کافی پر ڈالا اور مگ میں چمچہ ہلانے لگے۔ "اس کی چیخ و پکار سن کر میں سب سے پہلے بھاگا کیونکہ میں جاگ رہا تھا۔ وہ کمرے سے نکل آئی تھی اور نیچے آ چکی تھی۔ میں نے اسے پکڑ لیا کیونکہ وہ باہر جانا چاہتی تھی۔ ایک بار تو اس نے خود کو چھڑا لیا مگر دوسری بار میں نے اسے قابو کر لیا۔ وہ مسلسل چیخیں مار رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ انکل مجھے جانے دیں۔ چھوڑ دیں مجھے۔ میں نے کہا کچھ بتاؤ تو سہی کہ کہاں جانا ہے۔ اس پر مسئلہ کا منکشف ہوا۔ وہ تھا اس نے چیختے ہوئے کہا کہ سکندر زخمی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ مچلتی رہی اور خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتی رہی مگر سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ مسلسل تمہارے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا ذکر کر رہی تھی۔ میں نے کہا کہ ہوش میں آؤ رابعہ۔ سکندر بالکل ٹھیک ہے لیکن وہ چلاتی رہی کہ آپ نہیں جانتے۔ آپ کو نہیں معلوم۔ اس کی گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا ہے۔ وہ لال رنگ کی فاکس ویگن تباہ ہو گئی ہے۔"

میں کچھ دیر پتھر کا بت بنا بیٹھا رہا۔ "یہ رات کتنے بجے کی بات ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"وقت... میرا خیال ہے ڈیڑھ یا دو بجے کی بات ہو گی۔" ڈاکٹر لطیف نے کافی کا مگ میری طرف بڑھایا۔

"پھر تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔" میں نے بے خیالی میں مگ پکڑ لیا۔

"کیا مطلب؟" ڈاکٹر لطیف نے مجھے غور سے دیکھا۔

"کل رات تقریباً اسی وقت میں ایک حادثے کا شکار ہو چکا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں تو بچ گیا لیکن گاڑی مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔ رابعہ نے خواب دیکھا تھا یا... کچھ اور بات تھی۔ آپ ڈاکٹر بھی ہیں اور ماہر نفسیات بھی۔ خود سمجھ سکتے ہیں۔"

"ہاں۔ اس ماورائی کیفیت کے مختلف نام ہیں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "ای ایس پی۔ چھٹی حس کی ہم آہنگی۔ خیالات کی ترسیل کا ایک ہو جانا۔ ٹیلی پیتھی۔ مگر میڈیکل سائنس اس کی وضاحت نہیں کر سکتی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میرے اپنے پیشہ ورانہ تجربے میں یہ کوئی پہلا کیس نہیں ہے۔ ہر ڈاکٹر کا واسطہ کبھی نہ کبھی ایسے حالات سے پڑتا ہے اور عام لوگوں کے مشاہدے میں ایسے واقعات آتے رہتے ہیں جن کی منطقی توضیح ممکن نہیں۔ میں اس چکر میں پڑتا بھی نہیں کیونکہ میرا فیلڈ سائیکولوجی ہے پیراسائیکولوجی نہیں۔ رابعہ کی ذہنی کیفیت نے وقتی طور پر مجھے پریشان کر دیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ رد عمل کا رد عمل تو نہیں۔ یہ بھی ایک چکر ہوتا ہے۔ اب تم نے جو کچھ بتایا ہے وہ میری سمجھ میں آ رہا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم کو زندہ اور صحیح سلامت دیکھ کر رابعہ کے ذہن پر خوشگوار اثر ہو گا۔ وہ پھر نارمل ہو جائے گی۔"

"کیا ابھی وہ نارمل نہیں ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نہیں۔ صبح تک میں نے اس کو بہت اسٹرانگ انجکشن دے کر سلائے رکھا تھا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "عموماً چھ سے آٹھ گھنٹے تک سکون آور دواؤں کا اثر رہتا ہے لیکن ذہن زیادہ ڈسٹرب ہو تو تین چار گھنٹے میں ہی بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔ میں نے دوبارہ انجکشن دیے۔ دوپہر کے بعد اس کو ہوش آنے لگا تو میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیا۔ شام کو اس نے کچھ کھایا اور مجھ سے بات کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ وہ تمہارے بارے میں ہی پوچھتی رہی کہ سکندر کا کیا حال ہے؟ کیا وہ زیادہ زخمی ہوا ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ سکندر کو کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور وہ بالکل خیریت سے ہے مگر اس نے میری ایک نہیں مانی... کہنے لگی کہ انکل مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش مت کریں۔ مجھے سب معلوم ہے کہ اس کی گاڑی حادثے میں ختم ہو گئی ہے۔ خدا کے لیے مجھے بتا دیں کہ سکندر کون سے اسپتال میں ہے۔ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے ہر ممکن طریقے سے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ بضد رہی کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں اور اس کو اسپتال لے جانا نہیں چاہتا۔ رفتہ رفتہ اس کی کیفیت میں پھر جنون کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ وہ رونے لگی کہ سب نے مجھے قید میں ڈال رکھا ہے۔ میرا ہمدرد کوئی نہیں۔ کوئی نہیں بتاتا کہ سکندر زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ مر گیا ہے تب بھی مجھے بتا دو تاکہ مجھے قرار آ جائے

www.paksociety.com

پاگل بھی مر جاؤں۔ زندہ ہے تو مجھے ایک بار اس کی صورت دکھا دو اسے میری ضرورت ہے۔ میں اسے سنبھال لوں گی۔ بس ایک پاگل پن کا دورہ تھا جس میں ایک بے بنیاد خیال نے یقین کی شکل اختیار کر لی تھی۔ شام تک اس کا رونا دھونا زیادہ ہو گیا اور تم بھی نہیں آئے تو وہ چلانے لگی کہ دیکھا۔ سکندر ٹھیک ہوتا تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وعدہ کر کے نہ آئے۔ بس میاں۔ جب اس کی حالت تمہارے نہ آنے سے بگڑنے لگی تو میں نے مجبوراً وہی کیا جو میں کر سکتا تھا۔ میں نے اس کو زبردستی انجکشن دے دیا اور بے ہوش کر دیا۔"

"سارا قصور میرا ہے لیکن میں کیا کرتا۔ میں خود پھنس گیا تھا۔" میں نے خالی مگ کو سنک میں رکھ دیا۔

"میں نے کوشش کی تھی کہ غالب کے ذریعے تم سے رابطہ قائم کروں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "سات بجے تک تو وہ اخبار کے دفتر پہنچا نہیں تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے پتا چلا کہ وہ ذرا سی دیر کے لیے آ کر چلا گیا۔"

"کیا اب میں اس سے مل سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"اگر مقصد دیکھنا ہے تو جاؤ دیکھ لو۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "لیکن بات کرنا چاہتے ہو تو ابھی مشکل ہے۔ وہ صبح تک سوتی رہے گی کیونکہ تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی میں نے اس کو دوسرا انجکشن دیا تھا۔ یہ نیند ایسی ہے جس سے اس کو جگایا جا سکے۔ اگر اس نے آنکھیں کھولیں تب بھی اس کا ذہن تو بیدار نہیں ہو گا۔ تم صبح نو بجے آ جاؤ تو یہ ہو سکتا ہے کہ میں رابعہ کو ذہنی و جسمانی طور پر اس ملاقات کے لیے تیار رکھوں اور وہ تم سے بات کرتے ہوئے اپنے ہوش و حواس میں ہو۔ یہ بہت ضروری ہے سکندر کہ وہ ایک حقیقت کو عقل و شعور کے ساتھ تسلیم کرے کہ تم زندہ اور بالکل صحیح سلامت ہو اور اسے یقین آ جائے کہ جو کچھ اس نے سوچا تھا وہ خواب تھا اور گزشتہ دن کے واقعات اسی خواب کا حصہ تھے۔ وہ پوری طرح ہوش میں نہیں ہو گی تو تمہیں سامنے پا کر بھی سمجھتی رہے گی کہ آنکھیں اسے دھوکا دے رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری صحت اور سلامتی کا یقین رابعہ کی موجودہ ذہنی کیفیت کو ختم کر سکتا ہے۔ اس یقین کے بغیر تمام دوائیں اور علاج میری تسلی اور ہمدردی کے الفاظ اور ماحول کی موافقت۔ سب بے کار ہو جائے گی۔ وہ تم کو چھو کر تمہارے مادی وجود کو تسلیم کرے گی تو اس کے ذہن میں بیٹھا ہوا خوف خود بخود دور ہو جائے گا۔ اس خوف سے رابعہ کو صرف تم نجات دلا سکتے ہو صرف تم سکندر۔"

"میں صبح نو بجے آ جاؤں گا ڈاکٹر انکل۔" میں نے کہا۔ "اس وقت آپ کو جو زحمت ہوئی۔۔۔"

"او شٹ اپ۔ میں ایسی فضول رسمی گفتگو سے الرجک ہوں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "تم نے آ کر بہت اچھا کیا۔ رابعہ کا مسئلہ ایسا ہے جس کو ہم دونوں مل کر حل کر سکتے ہیں۔ مجھے بھی تمہاری مدد چاہیے جو کام تم کرو گے وہ کوئی دوا نہیں کرے گی اور کوئی ڈاکٹر نہیں کر سکے گا خواہ وہ رابعہ کا چچا ہی ہو۔ میرا مطلب ہے اگر اس کا بھائی ہوتا یا والدین ہوتے۔ تو ان سب کی نیک خواہشات اور دعائیں۔ محبت اور شفقت وہ کرشمہ نہیں دکھا سکتے تھے جو تم نے اس سے ملاقات کے بعد دکھایا تھا۔ صرف چوبیس گھنٹوں میں تم اس کرشمے کی منزل کے بہت قریب آ گئے تھے۔ تمہارا طریقہ مجھے پسند آیا تھا۔ بہت سائنٹفک اور عقل و عمل طریقہ۔ تم نے اس کو سوچ کی راہوں پر ڈالا تھا اور آہستہ آہستہ سوچ کو یادوں سے منسلک کر دیا تھا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا کہ ڈاکٹر میں ہوں مگر تم نے ایک ڈاکٹر کی طرح سوچا ایک جذباتی نوجوان کی طرح نہیں۔ میں خاصے یقین کے ساتھ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ کل وہ تم کو اپنی نظر سے دیکھے گی اور عقل سے پہچان لے گی تو پھر اس مقام پر آ جائے گی جہاں تم اسے کل شام چھوڑ گئے تھے اور پھر آگے سفر کرے گی۔ بہت جلد تمہارے اور اس کے درمیان وقت کا خلا باقی نہیں رہے گا اور وہ اسی طرح تمہارے ساتھ ہو گی جیسے پہلے تھی۔"

"مجھے بھی اس کا یقین ہے ڈاکٹر انکل۔ لیکن آپ نے جو کچھ اس کے لیے کیا اس کے بغیر شاید رابعہ مجھے کبھی نہ ملتی۔ اگر ملتی تو [illegible] معلوم نہیں وہ کیسے زندہ رہتی اور اس کے بغیر میں کیسے زندہ رہتا۔ آپ کے احسان کا بدلہ میرے شکریے کے الفاظ نہیں ہو سکتے۔"

"کسی بھی ڈاکٹر کے لیے شکریے کے الفاظ میں خوشی نہیں ہوتی اس کی کامیابی ہی اسے خوشی دیتی ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "وہ کسی ایک مریض کو زندگی اور صحت کی خوشی دیتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ اس کے نامۂ اعمال میں خدا نے ایک چھوٹی سی نیکی ضرور لکھ دی ہو گی۔ یہ نیکی ایک صدقۂ جاریہ کی طرح عاقبت تک ساتھ دیتی ہے۔ جب رابعہ ٹھیک ہو جائے گی اور میں تم دونوں کو خوش اور شاد و آباد دیکھوں گا تو یہ ایک دائمی مسرت ہو گی جو مجھے حاصل رہے گی۔ تمہاری زندگی کی ہر خوشی تمہاری کامیابی۔ تمہارے بچوں کی خوش حالی۔ جو کچھ بھی میں دیکھوں گا اس میں یہ خیال شامل ہو گا کہ خدا نے مجھے رابعہ کو صحت دینے کی توفیق عطا نہ کی ہوتی تو یہ سب کہاں ہوتا۔ ایسی نہ جانے کتنی خوشیاں ہیں جو میری زندگی کا وہ اندوختہ ہیں جس پر میں فخر کر سکتا ہوں۔ مال و دولت تو اسمگلر اور چور ڈاکو بھی کما لیتے ہیں لیکن وہ سب انھیں نہیں ملتا جو مجھے ملا۔ خیر۔ اب تم جاؤ ورنہ میں بولتا رہوں گا اور صبح ہو جائے

گی۔" وہ اٹھے اور انھوں نے مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "مجھے ہوش کی چیک پوسٹ سے بے خوف و خطر گزرنے کے لیے ٹکٹ بھی میرے ساتھ ہی رہے۔"

"واپسی پر سواری کا ملنا مشکل ہو گا" یہ بات مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی معلوم تھی چنانچہ میں نے انتظار کیے بغیر پیدل سفر شروع کیا۔ "چل چل رے نوجوان۔ اونچی تیری شان" مجھے ایک بہت پرانا فلمی گانا یاد آیا جو میں اور محسن ایسے ہی حوصلہ آزما مواقع پر گاتے تھے۔ عاشق صادق کی واپسی۔ ناکام و نامراد۔ دیار یار کے نصیب زہرا اور خیرے پھر بھی گھر کو آئے مگر بھائی عشق میں تو یہی ہوتا ہے۔ چڑیاں چہچہانے میں مجنوں کا ریکارڈ تو قائم ہے۔ جو صحرا میں نہ جانے کتنا پھرا۔ یہ کم غنیمت ہے کہ اس عہد کے عشق میں صحرا کے بجائے تارکول کی پختہ سڑک ہے۔ وہ خار مغیلاں اور نہ آبلہ پا ہونے کی آزمائش۔ زیادہ سے زیادہ سڑک پر بھونکنے والے کتے ہیں مگر کتوں سے کیا ڈرنا۔ کتے بھونکتے رہتے ہیں۔ قافلہ چلتا رہتا ہے۔ چنانچہ چل چل رے نوجوان۔ چھ سات میل ہی تو جانا ہے۔

میں خوش باور اور پر امید تھا چنانچہ میرے ذہن کے اور بیٹنگ خیالات میں بھی مایوسی اور ملال نہیں تھا اور ڈاکٹر انکل سے ملنے کے بعد مجھے اس بات کی پروا نہیں رہی تھی کہ واپسی پر مجھے پاشید ہی نے قفل کھول کے گھر سے داخل ہوتے پکڑ لیا تو انھیں کیا جواب دوں گا۔ میں ان کو دندان شکن جواب دینے کا حوصلہ رکھتا تھا۔

ابھی میں ایک میل بھی نہیں چلا تھا کہ مجھے مسافت کے طویل ہونے کا احساس کچھ شرمندہ کرنے لگا۔ پہلی حماقت تو میں نے گھر سے نکلنے کی تھی کہ اس سے کچھ فائدہ ہو گیا۔ یہ دوسری حماقت تھی کہ میں واپس چل پڑا۔ اگر ڈاکٹر لطیف سے کہہ دیتا کہ صبح تک ٹھہر جانا چاہتا ہوں تو کیا وہ انکار کرتے۔ وہ کہتے کہ میاں اپنا گھر ہے۔ جگہ کی کون سی کمی ہے۔ اب تو گھر پہنچتے پہنچتے میرے پاؤں میں چھالے پڑ جائیں گے اور ٹانگیں شل ہو جائیں گی کہ بقول مرزا غالب سے بعد مرگ بھی میرے کفن میں پاؤں۔ اس کے بعد محسن کی ڈانٹ ڈپٹ۔ ناشتے اور گھومنے یار کی جانب مراجعت۔ تکلف میں تکلیف کے سوا کیا ہے۔

ایک جیپ میرے پیچھے سے نمودار ہوئی تو میں نے پلٹ کر دیکھا اور سڑک سے ذرا ہٹ کر چلنے لگا۔ جیپ میرے قریب پہنچ کر رک گئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ اب یہ رات کو گشت کرنے والی پولیس سوال جواب کرے گی کہ جاتے ہو کس طرف کو کہاں کا خیال ہے اور ان کی فضول بک بک کا ایک انجام تو یہ ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے آوارہ گردی کے جرم میں پکڑ کر تھانے لے جائیں اور دوسرا یہ کہ ان کی فیس ادا کر کے شرافت کی سند حاصل کر لوں۔ وہ چلتے رہتے جائیں اور میں اپنی راہ پکڑوں۔ یہ بڑی افسوس ناک بات تھی کہ سواری پچاس روپے خرچ کر کے بھی نہیں مل سکتی تھی مگر سفر ختم ہونے تک تین چار جگہ آوارہ گردی کے الزام سے بچنے میں ڈیڑھ دو سو روپے خرچ ہو سکتے تھے۔ راہِ عاشقی میں فرہاد یا مجنوں کو کسی کانسٹیبل نے بہرحال نہیں پکڑا تھا اور انھیں کسی کو رشوت نہیں دینا پڑی تھی۔

جیپ رکے ایک پھول والا افسر میری طرف بڑھا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کہاں جا رہے ہو اس وقت؟" اس کے لہجے میں تھانیداری کا رعب یا افسرانہ تکبر نہیں تھا لیکن مجھے احساس ہوا کہ وہ اردو صاف نہیں بول سکتا۔ اس کی زبان کچھ اجنبی محسوس ہوتی تھی۔ جیسے کوئی انگریز روانی سے اردو بولے یا مدراس کا رہنے والا فرنچ میں بات کرے۔

"بالکل۔ تمہیں اس کا قانونی اختیار حاصل ہے آفیسر۔" میں نے انگریزی میں جواب دیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کانوینٹ زدہ نہیں ہے کوئی اینگلو انڈین ہے۔ "تم ڈاکٹر لطیف کو یقیناً جانتے ہو گے؟"

"کون ڈاکٹر لطیف؟" وہ یکلخت محتاط اور شائستہ ہو گیا۔

"وہ... جو نیچے رہتے ہیں؟"

"بالکل وہی۔" میں نے پچاس روپے بچ جانے کے خیال سے خوش ہو کر کہا۔ "مجھے بڑی خوشی ہوئی..."

"شٹ اپ۔ تم ڈاکٹر لطیف نہیں ہو میں ان کو پہچانتا ہوں۔" اس نے غرا کے کہا۔ "دھوکے باز..."

"پلیز آفیسر۔ میں نے ڈاکٹر لطیف ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔" میں نے بھی لہجہ سخت کر لیا۔ "میں ان کے گھر سے آ رہا ہوں۔"

"کون ہو تم ان کے، مریض؟" وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولا۔ "وہ تو پاگلوں کا علاج کرتے ہیں۔ کیا تم فرار ہو رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں کسی کو دیکھنے گیا تھا اور جسے میں دیکھنے گیا تھا وہ پاگل نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہارا اپنا گھر کہاں ہے؟ ڈاکٹر لطیف کو چھوڑو۔" وہ تیز لہجے سے بولا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟ اپنی شناخت کرا سکتے ہو یا میں لے جاؤں..."

"ضرور لے جائیے۔ ڈاکٹر لطیف کا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ مجھے شناخت کر کے تمہیں مطمئن کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں پاگل نہیں ہوں کہ آدھی رات کو انھیں جگاؤں صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ وہ تم کو پہچانتے ہیں یا نہیں۔ کسی شریف آدمی کے لیے خود کو شریف ثابت کرنا مشکل نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "تم اپنا نام تک نہیں بتا رہے ہو۔" اب اس کے لہجے میں دھمکی بہت واضح تھی اور جیپ میں سے ایک رائفل بردار کانسٹیبل بھی اتر کے

www.paksociety.com

افسر کے ساتھ اکھڑا ہوا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر لطیف کا حوالہ دے کر میں نے اپنے لیے مشکل پیدا کر لی ہے۔ ڈاکٹر لطیف مجھے صرف اس صورت میں پہچانتے جب میں اپنا نام سکندر بخت بتاتا اور اصل نام بتاتا تو اس بات کا امکان تھا کہ اسے ایس آئی جو مجھے صورت سے نہیں پہچان سکا تھا نام سے فوراً پہچان جاتے۔ پھر وہ مجھے ڈاکٹر لطیف کے پاس کبھی نہ لے جاتا۔ اتنے بڑے کارنامے کو عطیۂ قدرت جانتا اور مجھے زندہ یا مردہ افسرانِ بالا کی خدمت میں پیش کر کے سرخرو ہوتا۔ ترقی اور تعریفی سند پاتا اور انعام کا مستحق ٹھہرتا۔ اصل نام بتانے میں بہت خطرہ تھا چنانچہ میں نے ظاہری سکون کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا ”آئی ایم سوری... میں سلیم جرأت ہوں۔“

”تم کرسچین ہو؟“ اس کے لہجے میں رونما ہونے والی تبدیلی نے مجھے حوصلہ دیا۔ ”کیا کرتے ہو؟“

”مشن ہائی اسکول میں سائنس پڑھاتا ہوں۔ ایم ایس سی پاس ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس لیے سیکنڈ ہیڈ ماسٹر بھی ہوں۔“

”کون سے مشن اسکول میں؟“ وہ بولا۔ ”یہاں لاہور میں؟“

”نہیں۔ راولپنڈی کے مشن اسکول میں۔“ میں نے کہا۔ ”راجہ بازار کے پاس فوارہ چوک کے قریب ہے۔“

”وہ مجھے معلوم ہے۔“ اس کی دلچسپی اور ماتحت کانسٹیبل کی بیزاری بڑھ گئی۔ کانسٹیبل انگریزی میں ہونے والی گفتگو سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں مصروف تھا کہ اچانک ملنے والا افسر کا یار ہے یا معاملہ کچھ اور ہے۔ ”کب سے ہو تم وہاں۔ بہت سینئر ہو گئے؟“

”ہاں۔ تقریباً سات سال سے ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھ سے پہلے میرے والد تھے۔“

”سات سال پہلے میں نے مشن اسکول راولپنڈی سے ہی میٹرک کیا تھا۔ مجھے تمہاری صورت دیکھی ہوئی نہیں لگتی۔“ وہ بولا۔

میری ساری محنت جو میں نے اس اینگلو انڈین کا نام و نسب بلکہ رعایت حاصل کرنے کے لیے کی تھی ضائع ہو رہی تھی۔ میں نے جھوٹ کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کی جدوجہد میں کمی نہیں آنے دی۔ ”سو سے اوپر ٹیچر تھے اور اس وقت میں نیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”جو کچھ تم نے بتایا ہے اس کا کوئی ثبوت دے سکتے ہو؟“ وہ بولا۔ ”یہاں کس کے پاس ٹھہرے ہو؟“

میں نے ایک ایسے علاقے کا نام لیا جہاں بہت سے عزیز کرسچین رہتے تھے اور اپنا ایک بھائی ایجاد کیا جو انجینئرنگ یونیورسٹی میں لیکچرار تھا کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا شک بڑھ رہا ہے۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہوا۔ وہ بہت کائیاں شخص تھا۔

غالباً اس نے تاڑ لیا کہ میں خود کو کرسچین ظاہر کر کے اسے بے وقوف بنا رہا ہوں اور اپنی جان چھڑانا چاہتا ہوں۔ ایک جھوٹ چھپانے کے لیے مجھے دوسرے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ پھر تیسرا جھوٹ بولنا پڑا۔ آہستہ آہستہ جھوٹ کا یہ جال میرے لیے وبالِ جان بننے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں خود اپنے جال میں گرفتار ہو رہا ہوں۔ کسی نہ کسی موقع پر میرا ایک جھوٹ دوسرے جھوٹ کا پول کھول دے گا۔ اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ میں سو پچاس کا نذرانہ دے کر نکل جاتا لیکن خود کردہ را علاجے نیست۔ لیکن ایس آئی اسے بخشنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔

”تم کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔“ وہ بولا۔ ”تم مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔“

”تم میرے ساتھ چل کے میرے بھائی سے پوچھ سکتے ہو۔“ میں نے کہا اور فوری طور پر مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔

”میں اس علاقے میں گشت پر ہوں۔ تمہارے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”لیکن تم اپنے بھائی کو تھانے بلوا سکتے ہو۔ اس کے گھر میں فون تو ہو گا؟“

”نہیں۔ فون تھا۔ زیادہ بل آنے کے بعد کٹ گیا۔“ میں نے کہا۔ ”بہت افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے اسکول کے ایک ٹیچر...“

”شٹ اپ۔“ اس نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔ ”تم ٹیچر نہیں ہو۔ اگر ہو تو مجھے بتاؤ۔ ہیڈ ماسٹر کون ہے وہاں اب، سات سال پہلے کون تھا؟ دوسرے سب ٹیچرز کے نام بتاؤ جو تمہارے ساتھ تھے۔“

”اس ریوالور کے سامنے تو مجھے اپنا نام بھی یاد نہیں آئے گا انسپکٹر۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ ابھی تک وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑا ہوا تھا لیکن مجھے اس کا نام دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ہم ایک اسٹریٹ لائٹ سے کافی فاصلے پہ تھے اور قریب کے کھمبے پہ کوئی بلب نہیں تھا۔ تھوڑی بہت مدھم سی روشنی میرے چہرے پہ پڑ رہی تھی۔ وہ خود روشنی کی طرف پیٹھ کیے کھڑا تھا۔ نام کا چھوٹا سا بیج اس کی جیب پر لگا ہوا تھا لیکن آدھے انچ سے بھی کم چوڑی اور تین انچ لمبی پٹی پر انگریزی کے سفید حروف بھی اندھیرے میں پڑھے نہیں جا سکتے تھے۔ اس نے ریوالور والے ہاتھ سے مجھے جیپ کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے صورت حال پر دکھ اور بے بسی اور احساسِ ذلت اور بے عزتی کے جذبات ظاہر کیے اور آہستہ سے ایک قدم جیپ کی طرف بڑھایا۔ دوسرے لمحے میں نے پیچھے کی طرف ٹانگ گھمائی اور میرے جوتے کی ٹو سب انسپکٹر کی کلائی پر لگی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کانسٹیبل کو کھینچ لیا اور اس کی گردن پکڑ کے جھٹکا دیا۔ وہ قلابازی کھا کے گیا اور اس کی رائفل وہیں گر گئی۔ میں نے غوطہ مار کے رائفل اٹھائی

اور ڈنڈے کی طرح گھمائی۔ اس کا بٹ سب انسپکٹر کے شانے سے ٹکرانے لگا۔ اگر وار اس کے سر پر پڑتا تو شاید اس کی کھوپڑی تڑخ جاتی۔ وہ بھی ریوالور سے محروم ہو چکا تھا مگر میں نے نہیں دیکھا تھا کہ میری ٹانگ سے اچھلنے والا ریوالور کدھر گیا تھا۔ رائفل کا بٹ پڑتے ہی وہ پیچھے گرا اور اس نے چلا کر جیپ میں بیٹھے ڈرائیور کو ہدایت دی ”شوٹ ہم۔ باسٹرڈ۔ گولی مار دو اس... کو۔“ اس کی یہ دھمکی کمال میرے لیے تھی۔

پہلا کانسٹیبل اتنی دیر میں پھر اپنے پیروں پہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ پر حملہ کرنے کی بے وقوفی کی۔ اس نے اپنے افسر کا حکم سنا تھا مگر یہ نہیں سمجھا تھا کہ حکم کسے دیا گیا ہے۔ وہ خود رائفل کے بغیر مجھے کیسے شوٹ کرتا۔ بدحواسی میں وہ میرے سامنے آ گیا۔ اسی وقت ڈرائیور نے نشانہ لے کر گولی چلائی۔ ڈرائیور یا بالکل مطمئن گاڑی کے انجن کو اسٹارٹ رکھے بیٹھا تھا اور اسے بالکل امید نہ تھی کہ انگریزی بولنے والوں میں اچانک خوفناک جنگ چھڑ جائے گی۔ اس نے رائفل نکالنے میں کچھ دیر ضرور کی مگر وہ بدحواس نہیں ہوا۔ وہ ہر حملے سے بالکل محفوظ تھا اور اپنے افسر کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مجھے آسانی سے گولی مار سکتا تھا۔ وہ کیسے جان سکتا تھا کہ اس کا اپنا ساتھی گولی کے راستے میں آ جائے گا۔ گولی مجھ پہ حملہ کرنے والے کانسٹیبل کو لگی۔ تھری ناٹ تھری کی رائفل کے دھماکے سے اور کانسٹیبل کی چیخ سے رات کا سکون درہم برہم ہو گیا۔

صورتِ حال غیر متوقع طور پر انتہائی پرخطر اور پریشان کن ہو گئی تھی۔ میرے لیے مقابلے سے زیادہ ضروری یہاں سے فرار ہونا تھا۔ فوری خطرہ تو ڈرائیور کی طرف سے تھا کہ وہ رائفل کی دوسری گولی مجھے ضرور مار دے گا۔ میری وجہ سے اس کا ایک ساتھی قتل ہو چکا تھا اور یہ بات اسے مشتعل کرنے کے لیے کافی تھی۔ دوسرا خطرہ سب انسپکٹر کی طرف سے تھا۔ اس نے ضرور دیکھا ہو گا کہ ریوالور کس سمت میں گیا تھا۔ وہ ریوالور تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا تو مجھے کبھی فرار نہ ہونے دے گا۔ کانسٹیبل گولی لگنے کے بعد گر گیا تھا مگر اٹھ رہا تھا کہ میں اس پہ جا گرا۔ میرا گرنا میرے کام آیا۔ ڈرائیور نے اپنی رائفل سے جو دوسری گولی چلائی تھی وہ میرے سر کے اوپر سے گزر کے نہ جانے کدھر گئی۔ پھر میں نے سب انسپکٹر کو اٹھا لیا اور ڈھال بنا لیا۔ اس کے دونوں بازو موڑ کے پیچھے لاک کر کے میں نے اسے سامنے رکھا اور چلا کر کہا ”چلاؤ... چلاؤ گولی... اپنے اس کتے کو بھی۔“

ڈرائیور نے اتنی دیر میں نشانہ لے لیا تھا مگر یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ نشانہ کون بنے گا۔ سب انسپکٹر نے خود کو چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن میں اسے دھکیلتا ہوا آگے لے گیا۔ بچارا ڈرائیور جیپ سے باہر کھڑا ہوا اپنے افسر کی بے بسی کا نظارہ کرتا رہ گیا اور خود بھی بے بس ہو گیا۔ پولیس میں ریوالور صرف افسروں کو ملتے تھے چنانچہ گشت کرنے والی پارٹی کے باقی دو ارکان کے پاس وہی گھوڑوں کے وقت کی رائفلیں تھیں۔ پہلے اترنے والے کی رائفل میدانِ کارزار میں اس کے قریب لیٹی ہوئی تھی۔ پیچھا کرنے والے کانسٹیبل نے اپنی رائفل پیچھے کہیں رکھی ہو گی۔ ضرورت پڑتے ہی وہ بھی جنگ میں کود گیا تھا لیکن اس کی بہادری نے اپنی ہی شکست کا سامان کیا تھا۔ ایک خالی ہاتھ شخص تین مسلح افراد پہ غالب آ چکا تھا اور یہ ان سب کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔

”رائفل پھینک کر دور ہٹ جاؤ۔“ میں نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ ”ورنہ تمہارے افسر...“

”اس بدمعاش کی بات مانی تو میں تم کو گولی مار دوں گا۔“ سب انسپکٹر نے چلا کر کہا۔ ”شوٹ کر دو اسے بے وقوف...“

رائفل لے کر جیپ کے ساتھ کھڑے ہوئے ڈرائیور کی عقل خبط ہو گئی۔ وہ بھی پولیس کی وردی میں تھا اور اتنے کم فاصلے سے یقیناً تیسرا فائر کرتا تو اپنے ایک افسر کے قتل کا مجرم ہوتا لیکن افسر حکم دے رہا تھا کہ گولی چلاؤ۔ افسر خودکشی کرنا چاہتا تھا یا پاگل ہو چکا تھا لیکن وہ پاگل نہیں تھا چنانچہ اس نے رائفل کی ہلاکت خیزی کا تیسرا تجربہ نہیں کیا۔ اسی وقت سب انسپکٹر نے ثابت کیا کہ اس کا حکم غلط نہیں تھا۔ یکلخت میں نے خود کو فضا میں بلند ہوتے محسوس کیا۔ پھر میں سخت زمین پہ گرا۔ ایک پل میں مجھ پہ یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ سب انسپکٹر بھی جوڈو کراٹے کے داؤ پیچ جانتا ہے اور اس نے میرے ہاتھوں گرفتاری پر بے بسی کا مظاہرہ صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ مناسب موقعے کے انتظار میں تھا۔

”ادھر لاؤ رائفل سور کے بچے۔“ میں نے سب انسپکٹر کی آواز سنی اور ایک قلابازی کھا کے اٹھا۔ تیسری گولی جو سب انسپکٹر نے چلائی تھی اس جگہ زمین میں گھس گئی جہاں ایک سیکنڈ پہلے میں کھڑا تھا۔ میں نے دونوں دشمنوں کو مساوی فاصلے پر دیکھا اور کانسٹیبل کا انتخاب کیا۔ پھر میں ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا اور میری فلائنگ کک نے کانسٹیبل کو سب انسپکٹر پر گرا دیا۔ حیران ہونے کی باری اب سب انسپکٹر کی تھی کیونکہ جو وار میں نے کیا تھا وہ کوئی ماہرِ فن ہی کر سکتا تھا۔ اپنی طرف سے اس نے بہت چالاکی سے کام لیا تھا اور وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جواب میں نہلے پہ دہلا ملے گا۔ یہ ہم سب کی فطری کمزوری ہوتی ہے کہ ہم خود کو سیر سمجھتے ہیں تو یہ توقع نہیں رکھتے کہ سوا سیر

www.paksociety.com

پالا پڑ جائے گا۔ اس ایک لمحے میں جیپ اچھلی اور افسر ایک ساتھ گرے تھے۔ افسر کو یقین آ گیا ہو گا کہ میں کوئی بہت بڑا جیلر اور مکار مجرم ہوں جس نے پہلے اپنی شستہ انگریزی سے اور اچھے جھوٹ سے کام نکالنا چاہا تھا لیکن اس میں ناکامی ہوئی تو میں بے خوف و خطر گن مسلح پولیس والوں سے بھڑ گیا۔ شاید لاہور میں اس کا واسطہ ایسے کسی بدمعاش سے نہیں پڑا ہو گا جو اتنا مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہو۔ اتنا اچھا اداکار بھی اور جوڈو کراٹے کا ماہر بھی۔

کانسٹیبل تو جیپ پر پڑنے والی کک کے بعد اٹھ ہی نہ سکا۔ اس کے دوبارہ اٹھ پانے کا بالکل امکان نہیں تھا اور وہ اتنا کمزور بھی نظر نہیں آتا تھا کہ ایک کک سے بے ہوش ہو جائے۔ غالباً اس نے دانش مندی اسی میں جانی کہ چپ چاپ لیٹ جائے اور خود کو مزید پریشانی سے بھی بچا لے، ایک اور قتل کے الزام سے بھی اور افسر کی حکم عدولی کی سزا سے بھی۔ افسر کو میں نے اٹھتے ہی جا لیا مگر وہ بہت پھرتیلا تھا کہ اس نے غوطہ مار کر میرا وار خالی کر دیا اور میں اس کے اوپر سے گزر کر گرا تو وہ بڑی پھرتی سے میرے اوپر سوار ہو گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ بلند ہوتے دیکھا وہ بڑا مہلک وار تھا جسے دشمن کو یقینی طور پر ختم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ عام نمائشی مقابلوں میں یا معمولی لڑائی جھگڑوں میں اس کا استعمال کوئی نہیں کرتا۔ جوڈو اور کراٹے کا فن بنیادی طور پر دفاعی کھیل ہے۔ چنانچہ اس میں جارحانہ نیت کو غیر اخلاقی تصور کیا جاتا ہے اور نقصان پہنچانے والے داؤ پیچ استعمال کرنے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے مگر جہاں معاملہ زندگی یا موت کا ہو وہاں اخلاقیات کا سبق بے معنی ہو جاتا ہے۔ سب انسپکٹر بھی جو کچھ کر رہا تھا موجودہ حالات میں جائز تھا۔ میں نے فوراً اپنا دفاع کیا اور اسی طرح اچھل کر کروٹ لی کہ دوسرے لمحے میں سب انسپکٹر نیچے تھا۔ [illegible] زیادہ دیر تک جاری رکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ [illegible] کھیتوں میں فائرنگ کے دھماکوں سے [illegible] نکل گئی تھی۔ میں نے سب انسپکٹر پر تابڑ توڑ حملے کیے اور ذرا سی دیر میں وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ دور طرف سے جو کہیں رہنے والے یا گھر کے ملازموں نے شور مچا رکھا تھا لیکن وہ قریب نہیں آ رہے تھے۔ جنگل میں پولیس ایک نمائش تھی اور وہ راہگیری بھی نہیں بننا چاہتے تھے۔ ایک گھر سے کسی نے چلا کے پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ دوسری طرف سے کسی نے کہا کہ پولیس [illegible] خدا جانے کون زندہ دل تھا جو اس صورت حال سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے ہنس کر کہا کہ ہاں یار مزید پولیس کو بلاؤ، یہ پولیس تو کم ہے۔

میں نے بڑی عجلت میں اے ایس آئی کو اٹھا کے جیپ میں ڈالا اور جیپ میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جیپ کا انجن ابھی تک چل رہا تھا۔ اسے گیئر میں ڈالتے ہی میں نے ایکسلریٹر دبا دیا۔ جیپ ایک دم بھاگی۔ اسی وقت نہ جانے کدھر سے ریوالور کی ایک گولی آئی اور جیپ کے پیچھے لگے ہوئے دو پیٹرول کے جیری کین میں لگی۔ رات کی خاموشی میں فائر کی آواز سے میں نے اندازہ کر لیا کہ گولی اعشاریہ چار پانچ کے سروس ریوالور سے چلائی گئی تھی جو ملٹری آفیسر کے پاس ہو سکتا تھا یا پھر پولیس اور رینجرز وغیرہ کے پاس۔ ان میں سے کسی نے مجھے فرار ہوتے دیکھا تھا اور فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اسے جزوی طور پر کامیابی ہوئی۔ گولی اگر پیٹرول ٹینک میں لگتی تو میں اتر کر بھاگنے پر مجبور ہو جاتا۔ جیری کین میں سوراخ ہوتے ہی پیٹرول نے آگ پکڑ لی تھی اور جیپ کے پچھلے حصے میں شعلے بھڑکنے لگے تھے۔ بہنے والا پیٹرول جیپ کے کینوس پر بھی گر رہا تھا اور سڑک پر بھی پھیلتا جا رہا تھا لیکن اس کے خالی ہونے تک پوری جیپ کا آگ کی لپیٹ میں آنا یقینی تھا مگر جیری کین اچانک پھٹ گیا۔ دھماکا کسی دستی بم کی طرح تھا۔ میں نے جیپ کو ایک دم پورا ایکسیلریٹر دے کر آگے بڑھا لیا۔ ایک سیکنڈ کے وقفے سے میں نے پلٹ کر دیکھا تو جیری کین کے جلتے ہوئے ٹکڑے فضا سے زمین کی جانب سیدھا اڑ کر آتے نظر آئے۔ کچھ جلتا ہوا مٹیریل سڑک پر بھی روشن تھا لیکن جیپ کے پیچھے اب کینوس کا تھوڑا سا حصہ جلتا رہ گیا تھا۔ جیری کین کی آگ جیپ کی تیز رفتاری کے باعث پیچھے رہ گئی تھی اور جہاں پہلے جیری کین تھا وہاں ٹین کا ایک ٹکڑا کلیمپ میں اٹکا رہ گیا تھا۔

جیپ کو روک کر میں نیچے اترا۔ اگر میرے پاس خنجر ہوتا تو میں پیچھے والے حصے کا کینوس کاٹ دیتا لیکن اب مجھے وہ سب بٹن کھولنے پڑے جن سے جیپ کا اوپر والا حصہ بندھا ہوا تھا۔ کینوس کے ٹاپ والی جیپ میں شفاف پلاسٹک کی کھڑکیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ کینوس کے مقابلے میں پلاسٹک پر آگ نے فوراً اثر کیا اور وہ سائڈ پر بھی آگ پھیل گئی۔ میں نے اپنے حواس برقرار رکھے۔ آگ ابھی پیٹرول لائن اور پیٹرول ٹینک سے بہت دور تھی لیکن اندیشہ تھا کہ جلتا ہوا کینوس اگر سیٹوں پر گرا تو [illegible] تباہ ہو جائیں گی۔ میں نے کچھ کھوٹ کا کھینچ کر اور جھٹکا دے کر توڑ دیے اور باقی کینوس کو ان سوراخوں سے میرے ہاتھوں کی جگہ نمودار ہو گئے تھے۔ وہاں جلا ہوا پلاسٹک اب بھی اتنا گرم تھا کہ میری ہتھیلیوں سے چپک گیا۔ میں بڑی کوشش سے کینوس کی فولڈنگ باڈی کو جیپ سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کینوس کو سڑک پر ڈال کے میں نے پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ میں گرفتاری سے بچ گیا تھا۔ فائرنگ سے بچ گیا تھا۔ سب انسپکٹر کے جوڈو کراٹے کے داؤ پیچ سے بچ گیا تھا اور آخری وقت میں آگ لگانے والی گولی کی تباہ کاری سے بھی بچ گیا تھا۔ یہ سب بمشکل پندرہ منٹ میں ہو گیا تھا۔ پندرہ منٹ پہلے میں بہت اچھے موڈ میں ڈاکٹر لطیف کے گھر سے نکلا تھا۔ پندرہ منٹ بعد میں ایک جیپ لے کر فرار ہو رہا تھا۔ جیپ میں ایک اے ایس آئی پڑا ہوا تھا۔ اس کے باقی دو ماتحتوں میں سے ایک کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ ہو گا۔ دوسرے کے بارے میں مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ اپنے ساتھی کی چلائی ہوئی گولی اس کے جسم میں کہاں لگی تھی۔ ان دونوں کی رائفلیں بھی وہیں پڑی رہ گئی تھیں اور جائے واردات کے قریب ہی اے ایس آئی کے ریوالور کا مل جانا بھی یقینی تھا۔ صبح ہونے سے قبل ہی وہاں مزید پولیس پہنچ جائے گی اور اس سنگین واردات کی تفتیش شروع ہو گی جس میں بدمعاش ایک پولیس والے کو مجروح یا مقتول کر گئے تھے۔ ایک کو بے ہوش چھوڑ گئے تھے اور ان کے افسر کو جیپ سمیت اغوا کر کے لے گئے تھے۔

خالی جیپ کو میں نے دو میل آگے ایک اسکول کے احاطے میں روکا۔ اسکول اجڑا پڑا تھا اور سارے کلاس روم تاریک تھے۔ اس کے گیٹ پر کوئی چوکیدار نہ تھا جس سے میں جیپ کو اندر لے گیا تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے ہی میں نے ہیڈ لائٹس آف کر دی تھیں اور انجن بھی بند کر دیا تھا۔ جیپ اپنی رفتار میں خاموشی سے اندر گئی۔ میں نے اسے موڑ کر دیوار کے متوازی کھڑا کر دیا۔ جہاں ایک طرف قدِ آدم جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اب میں نے زیادہ اطمینان کے ساتھ جیپ کی تلاشی لی۔ اس کے ڈیش بورڈ کے خانے میں کاغذات تھے۔ سائڈ پاکٹ سے مجھے ایک ٹارچ ملی۔ میں نے ٹارچ کو روشن کیا۔ اتنے میں بے ہوش پڑے ہوئے اے ایس آئی کے چہرے پر روشنی ڈالی۔ بھرپور روشنی کا مختصر سا دائرہ آگے بڑھایا اور ایک لمحے کے لیے میری نظر بھی منجمد ہو گئی۔ جس پر لگی ہوئی نام کی تختی کے حروف سے پرویز وکٹر کا نام بہت واضح پڑھا جا سکتا تھا۔

میں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے راستے کے اندھیرے کو گھورنے لگا۔ یہ ایک نئی مصیبت تھی جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ پرویز وکٹر کا نام پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔ لاہور کی پولیس میں آخر کتنے اینگلو انڈین سب انسپکٹر ہوں گے۔ مشکل سے دو چار۔ قدرت نے مجھے حادثاتی طور پر اپنے ایک ایسے دشمن کے روبرو کر دیا تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ سادھو رام کے لبوں سے یہ نام اگلوانے کے لیے مجھے اس پر سخت تشدد کرنا پڑا تھا لیکن اس سے حاصل ہونے والی معلومات نے ہمارے لیے وہ راستے کھول دیے تھے جو ولیم اور کرنل بگٹی کے ساتھ اور جیوک رام کے بعد سادھو رام کی موت پر بند ہو گئے تھے۔ سائیں بابا بچہ والے کا اڈا تباہ ہو گیا تھا اور دشمن کے جتنے ایجنٹ اس اڈے سے منسوب تھے مارے جا چکے تھے یہاں تک کہ سادھو رام کی بیوی بھی زندہ نہیں تھی۔ ایسے وقت میں سادھو رام نے پرویز وکٹر، اس کے بھائی اور اس کی بہن سونیا وکٹر کے نام بتا کے ہماری جدوجہد کو نئی سمت عطا کر دی تھی۔ اب پرویز وکٹر کسی جستجو کے بغیر ہی مجھے مل گیا تھا اور میں بجا طور پر کہہ سکتا تھا کہ تقدیر مجھے اس سے ملوانے کے لیے سوچ سمجھ کے لائی تھی۔ راستے کا خوش دیدار تو ہو جانا بن گیا۔ اُسے دیکھنا تو نصیب نہ ہوا۔ نصیب نے اپنے نیاز گنّی بھلا دیا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ میں پرویز وکٹر کا کیا کروں۔ کوئی دوسرا سب انسپکٹر ہوتا تو میں اسی جگہ جیپ چھوڑ کر بھاگ جاتا لیکن پرویز وکٹر کا معاملہ مختلف تھا۔ ہم نے ابھی تک کوئی لائحہ عمل طے نہیں کیا تھا کہ پرویز وکٹر اور اس کی بہن سونیا کا سراغ لگا لینے کے بعد ہم کیا کریں گے۔ اب اچانک فیصلے کا وقت آ گیا اور میں ذہنی الجھن کا شکار ہو گیا۔ میں اسے شمشاد کے گھر نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ دوسری جگہ چمن ماڈل ٹاؤن والا گھر تھا جس کی چابیاں ابھی تک ہمارے پاس تھیں۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں اور محسن اس کو اسی ایم آئی کے ٹھکانے پر لے جائیں جہاں سادھو رام سے تفتیش کی گئی تھی اور پرویز وکٹر سے بھی پولیس کے انداز میں سب کچھ پوچھ لیں مگر میرا دل اس سے مطمئن نہیں تھا۔ تشدد کے سامنے سادھو رام نہ ٹھہر سکا تھا مگر یہ ممکن تھا کہ پرویز وکٹر مر جاتا مگر کچھ نہ بتاتا۔ اگر وہ کچھ بتائے بغیر مر گیا تو ہمیں فائدے کے بجائے نقصان ہو گا۔ پولیس تو یہی سمجھے گی کہ جیپ اور ڈاکو اے ایس آئی پرویز وکٹر کو ملاقات کے بعد اٹھا کے لے گئے مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو پرویز وکٹر کے اغوا کا مطلب کچھ اور نکالیں گے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ سائیں بابا بچہ والے کا اڈا تباہ کرنے والوں نے ہی پرویز وکٹر کو اٹھایا ہے اور اب وہ اس سے مزید معلومات

www.paksociety.com

حاصل کریں گے اور ظاہر ہے اس کے بعد اگلا وار کریں گے۔ مگر دشمن اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔ وہ ضرور حفاظتی تدابیر اختیار کریں گے۔ وہ ٹھکانے بدل دیں گے جو پرویز ڈاکٹر کے علم میں ہوں گے کیونکہ انہیں پتا ہے کہ وہ کچھ بتانے پر مجبور ہو جائے تب بھی نقصان نہ ہو اور پرویز ڈاکٹر سے جتنے راستے ہم تک پہنچنے والوں کی مایوسی کے سوا کچھ نہ ملے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سونیا کو غائب کر دیں، ہمیشہ کے لیے یا وقتی طور پر۔ پرویز ڈاکٹر کے دوسرے بھائی کو بھی ختم کر دیں اور اس ایمبولینس کو بھی جسے وہ چلاتا تھا۔ دشمن کے ایجنٹ تو فقط مہرے ہوتے ہیں۔ ایک چال غلط ہو جائے تو مہرے پٹ جاتے ہیں۔ ان کے مارے جانے سے اوپر والوں کو فرق نہیں پڑتا جن کے ہاتھ مہروں کو آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ نئے مہرے منتخب کر لیتے ہیں، راستے بدل دیتے ہیں اور پہلے کے سب سراغ مٹا دیتے ہیں۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ دشمن ہوشیار ہو جائے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پرویز ڈاکٹر کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔ ہم خاموشی سے اس کا تعاقب کریں اور اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب پرویز ڈاکٹر کو پتہ نہ ہو۔ وہ یہی سمجھے کہ اس کا واسطہ کسی خطرناک مجرم سے پڑ گیا تھا۔ اس نے مجھے بالکل نہیں پہچانا تھا اور میرا موجودہ حلیہ اتنا بدلا ہوا تھا کہ اس واردات میں میرا نام آنے کا بہت کم امکان تھا۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ پرویز ڈاکٹر کو اسی جگہ چھوڑ کر بھاگ جانا چاہیے یا اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا چاہیے اور پھر اس سے معذرت کر کے اسے گھر چھوڑ آنا چاہیے اور اس بہانے پرویز ڈاکٹر کے گھر اور اس کی بہن سونیا کو دیکھ لینا چاہیے؟ یقیناً پرویز ڈاکٹر ہوش میں آنے کے بعد مجھے معاف نہیں کرے گا۔ بات صرف مار پیٹ کی نہیں رہی تھی۔ فائرنگ سے ایک کانسٹیبل زخمی ضرور ہوا تھا۔ میں نے فرائض کی انجام دہی میں مداخلت کی تھی۔ سرکاری اہلکاروں کو مارا تھا اور ان کی جیپ پر قبضہ کیا تھا۔ ان سے اسلحہ چھینا تھا۔ میرے جرائم ناقابلِ معافی تھے۔ میں نے جھوٹ بول کر خود کو کرسچین اور مشن ہائی اسکول کا ٹیچر ظاہر کیا تھا۔ اپنے ایک بھائی کو انجینئرنگ یونیورسٹی کا لیکچرار بتایا تھا۔ ان سب معاملات کی تحقیق و تفتیش کے بغیر وہ مجھے کہاں چھوڑے گا۔

فیصلہ کرنے کی کوشش میں میرا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس سارے معاملے کو ایم آر ایس کے دیگر ارکان سے صلاح مشورے پر اٹھا رکھوں۔ یہ فیصلہ سب سے بہتر فیصلہ تھا جس نے میرے ذہن کو کچھ ہلکا کر دیا۔ ان حالات میں وہی لوگ آزادانہ سوچ سکتے تھے جو اس واردات میں ملوث نہیں تھے۔ میرا دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

میں نے جیپ کو پھر اسٹارٹ کرنے سے پہلے پرویز ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ بظاہر وہ بے ہوش تھا لیکن مجھے شک ہوا کہ وہ ڈراما کر رہا ہے۔ اس جیسے چالاک شخص سے کچھ بعید نہ تھا کہ مجھ پر پیچھے سے حملہ کر دے۔ ابھی اس کا موقع نہیں تھا۔ اگر وہ کوشش بھی کرتا تو میں اسے اٹھنے نہ دیتا لیکن ذرا بے خبری ہوتے ہی بازی پلٹ جاتی۔ میں آگے اپنے راستے پر نظر رکھنے کی کوشش بھی کرتا اور پیچھے مڑ کر بھی پرویز ڈاکٹر کا جائزہ لیتا۔ میں نے اسے ہلا جلا کے دیکھا اور پھر مطمئن ہو کر جیب سے سگریٹ نکالی۔ سگریٹ جلاتے وقت بھی میں محتاط تھا۔ ایک کش لے کر میں نے جلتی ہوئی تیلی بجھائی اور باہر پھینکنے کا ارادہ کیا لیکن ایک دم پلٹ کر اس کا دہکتا ہوا سرا پرویز ڈاکٹر کی ناک پر رکھ دیا۔ وہ ایک دم حرکت میں آیا اور اس کا ہاتھ بے اختیار ناک پر گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ ڈراما نہیں چلا تو اٹھ کر پیچھے سے میرے گلے میں بازو ڈالنے کی کوشش کی۔ سگریٹ پھینک کر میں نیچے جھک گیا۔ اس کا ہاتھ میرے شانے پر لگا اور میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ میں نے پیچھے گھوم کر اس کے سر پر مکا مارا۔ وہ جیپ کی سائڈ سے ٹکرایا۔ اس کے سر پر جیپ کی باڈی کے فریم سے خاصی چوٹ آئی ہوگی کیونکہ وہ پھر اٹھنے کی کوشش میں ناکام رہا۔ میں نے اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر جیپ کی سیٹ کے فریم پر مارا۔ اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی تو میں نے بال چھوڑ دیے۔ سر جیپ کے فرش پر گرا لیکن وہ ساکت رہا۔

دس منٹ بعد میں نے جیپ کو شملا کے گھر کے دروازے پر روکا تو اندر سے کلاک کے تین گھنٹے سنائی دیے۔ میں اسی کھڑکی سے اندر گیا جس سے نکل کے فرار ہوا تھا۔ اندھیرے میں مجھے ایک جگنو سا چمکتا نظر آیا۔ یہ مرزا غالب تھے، جو میرے بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔

"تم... تم اندر کیسے آئے؟" میں نے خفت سے سر کھجا کے کہا۔

"جیسے تم باہر گئے تھے۔" غالب نے کہا۔ "کوئی ملاقات ہوئی؟"

"ہاں اس کے سوا بہت سے ملے۔ ایک میرے ساتھ بھی آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم یہاں کیوں آئے ہو؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم کو ادھر قدم رنجہ فرمانے کی سختی سے تاکید کی گئی تھی۔"

"سختی سے تاکید تو بہت سی باتوں کی سب کو کی گئی ہے۔ مثلاً نماز پڑھنے کی اور ممنوعہ لٹریچر نہ پڑھنے کی۔" غالب نے اپنے دفاع میں فلسفہ پیش کیا۔ "جب کوئی اور کسی کی نہیں سنتا تو ہم کیوں سنیں۔ بس ہم نے قدم رنجہ فرما دیا۔"

"یہ کیا ترش کر رکھی ہے۔ شرفا کا سونا حرام ہے۔" ٹیڈی نے لحاف سے منہ نکال کے کہا۔ "یہ سالا صحافی پھر آ مرا یہاں۔"

"یار شرفا، ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں ذرا چہل قدمی کے لیے گیا تھا۔ واپسی پر ایک مہمان ساتھ چلا آیا۔ اب مجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا کروں۔ تم ذرا فوراً محسن خان علیوانی کو خوابگاہ سے برآمد کرو کہ ایم آر ایس کا ہنگامی اجلاس ہے مگر ٹیڈی کو سونے دو۔"

واپسی سے ہنگامے کے بعد ہنگامی اجلاس شروع ہوا۔ میں نے ٹیلی گرام کے الفاظ میں اپنے جرائم کی تفصیل پیش کی جو سب کے سو جانے کے بعد مجھ سے سرزد ہوئے تھے۔ کیونکہ تقدیر میں یہی لکھا تھا۔

"تقدیر کے گھوڑے! آخر کیا تکلیف تھی کہ سوتے سوتے تو چھلانگ مار کے نکل گیا۔" محسن نے کہا۔

"تکلیف تو پرانی ہے دوستو! تم جانتے ہو سب۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "یہ بھی تو دیکھو کہ میں کیا چیز اٹھا لایا ہوں۔"

"اور اب اسے گلی میں ڈال رکھا ہے۔" غالب نے کہا۔ "تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں اور وہ ہم لوگوں کو اور ہمارے ٹھکانے کو دیکھ لے۔"

"اس کو میں اندر لے آتا ہوں۔ ابھی تو اس کے اندر اور باہر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔" میں نے اور محسن نے پرویز ڈاکٹر کو بڑی پھرتی سے کھڑکی کے راستے اندر ڈالا۔ پھر اس کے ہاتھ پیر باندھے۔ منہ بند کیا اور آنکھوں پر بھی پٹی باندھ کر باتھ روم میں ڈال آئے۔

"یہ جیپ کس کی ہے؟" مرزا غالب نے کہا۔

"سرکاری اور کس کی۔" میں نے کہا۔ "کاغذات تو نہیں دیکھنے پائے مگر..."

"مگر کیا۔ تم نے نمبر بھی نہیں دیکھا۔" مرزا غالب نے سر پر ہاتھ مارا۔ "بلکہ جیپ تک نہیں دیکھی۔ دیکھی ہوتی تو سمجھ لیتے کہ ابھی تک سرکار نے ہماری پولیس کو جو جدید ترین گاڑیاں دی ہیں وہ سیکنڈ ورلڈ وار کی فوجی ماڈل جیپ ہیں۔ ان کی نمبر پلیٹ پر ویسٹ پاکستان پولیس لکھا ہوا ہے۔ یہ نئی جیپ ہے۔ پرائیویٹ نمبر ہے اس کا۔ جاؤ اور کاغذات نکال کے لاؤ۔ اور میاں محسن، اپنی چھوٹی سے کہو کہ شرفا کے لیے شرافت سے اٹھ کے کافی بنا لے۔"

"شرافت کی اولاد، تیرے باپ کی نوکر نہیں ہے وہ۔" ٹیڈی نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "خبردار جو اسے جگایا۔"

"مگر میں تو جاگ رہی ہوں۔" شملا نے دروازے سے جھانک کر کہا۔ "کافی بن رہی ہے بھائی جان۔" جب میں کاغذات لینے جا رہا تھا تو بھائی جان یعنی خواجہ نیک محمد بھی سب سن رہے تھے۔ چند منٹ بعد میں واپس آیا تو ٹیڈی اور غالب ایک ہی سگریٹ سے باری باری کش لگا رہے تھے۔ وہ بالکل بچوں کی طرح لڑتے تھے۔ ایک منٹ کے بعد وہ لڑائی کی وجہ بھی بھول جاتے تھے۔

"یہ لو اپنے پرویز ڈاکٹر صاحب کی جیب سے جناب عالی۔" میں نے کاغذات کو روشنی میں دیکھ کر کہا۔

"تو اس میں پرویز ڈاکٹر کے گھر کا پتا بھی ہوگا جناب عالی۔" محسن نے کہا۔ پتا واقعی تھا اور سب نے باری باری دیکھا۔

"یہ کیا ضروری ہے کہ پتا درست ہو یا رہائش یہی ہو۔" غالب نے آخری کش کے بعد سگریٹ باہر پھینک دی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ ابھی اس میں دو سوٹوں کا دم تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔

"اچھا تو باہر جاؤ اور دو سوٹے لگا لو۔" غالب نے کہا۔ "پڑی ہوئی ہے ٹوٹے بھی کر چکی ہوگی۔"

"اگر تم نے پہلے ہی کاغذات دیکھ لیے ہوتے تو اسے یہاں لانے کے بجائے اس پتے پر لے جاتا۔" محسن نے مجھ سے کہا۔ "معلوم ہو جاتا کہ پتا اصلی ہے یا نقلی۔"

"میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔" میں نے کہا۔ "اب یہ کام کسی اور کو کرنا ہوگا۔ جسے سونیا ڈاکٹر نہ دیکھے اور اس کا دوسرا بھائی بھی نہ دیکھے تو اچھا ہے ورنہ تینوں نے میری صورت دیکھ لی تو سمجھ جائیں گے کہ جس نے مار پیٹ کی تھی وہی مجرم اتنی دیدہ دلیری سے گھر تک آ گیا تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا۔" مرزا غالب نے کہا۔ "خرابی کے اسباب تو آپ پہلے ہی بہت کر آئے ہیں۔ آخر تمہیں ڈاکٹر لطیف کا نام لینے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بھی خواہ مخواہ پریشان ہوں گے اب۔"

"وہ... بس غلطی ہو گئی... بلکہ غلطی بن گئی۔" میں نے کہا۔ "مگر انہیں پریشانی کیوں ہوگی۔ وہ صاف انکار کر دیں گے۔"

"یار عقل سے کام لو۔ پرویز ڈاکٹر صرف نام سے تصدیق نہیں کرے گا۔" غالب نے جھنجلا کے کہا۔ "نام پر تو اسے پہلے ہی غلط ہونے کا شک تھا۔ وہ حلیہ بتائے گا کہ اس قسم کے ایک

www.paksociety.com

شخص نے آپ کا نام لیا تھا۔ وہ آپ کو کیسے جانتا ہے اور ڈاکٹر لطیف بتا دیں گے کہ وہ رابعہ کو دیکھنے آیا تھا۔ ہم اگر نہ بتایا تب بھی کہیں گے کہ ایک خاتون مریض سے ملنے والا تھا۔ پرویز وکٹر پہلے کچھ نہیں کہے گا کہ وہ کیوں پوچھ رہا تھا۔ بعد میں سب بتا دے گا اور . . . ہو سکتا ہے رابعہ سے ملے؟"

"رابعہ سے . . . ڈاکٹر لطیف اس کی اجازت نہیں دیں گے۔" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔

"اس وقت نہ دیں۔ بعد میں وہ کورٹ سے آرڈر لے آئے گا کہ رابعہ سے اس ملزم کے بارے میں پوچھنا ہے۔ ڈاکٹر لطیف کورٹ کے احکامات کو نہیں ٹال سکتے۔ پرویز وکٹر کے لیے یہ بہت سنگین معاملہ ہوگا۔ خدانخواستہ وہ کانسٹیبل مر گیا تو قتل کا کیس درج ہو جائے گا اس میں رابعہ کو شامل تفتیش کرنا ضروری ہو جائے گا۔"

"یہ تو بڑی خرابی ہوگی۔" میں نے پریشانی سے کہا۔ "وہ رابعہ کو تنگ کرے گا۔ رابعہ پھر جانے کس پوزیشن میں نہیں ہے۔"

"ہاں۔ لیکن اس کو عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔" غالب نے کہا۔ "ڈاکٹر لطیف کی طرف سے کو مسترد بھی کیا جا سکتا ہے اور رابعہ کا کیس میڈیکل بورڈ کی رائے کے لیے بھیجا جا سکتا ہے جو حتمی فیصلہ کرے گا کہ کیا واقعی اس کی یادداشت متاثر ہوئی ہے۔ سوچو ذرا اس کے نتائج کتنے غلط نکل سکتے ہیں۔ استغاثہ اصرار کر سکتا ہے کہ مقدمے کی اس اہم ترین گواہ کو سول اسپتال کے نفسیاتی وارڈ میں منتقل کیا جائے جہاں شفایاب ہونے تک اسے زیر نگرانی رکھا جا سکے یعنی وہ پولیس کے پہرے میں رہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ ڈاکٹر لطیف کے گھر سے اس کو فرار کا موقع مل جائے گا۔ کہاں ڈاکٹر لطیف کے گھر کا ماحول اور کہاں پولیس کے ساتھ نفسیاتی وارڈ کی فضا۔"

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں اسے ابھی لے آتا ہوں۔"

"بیٹھو۔ ایک حماقت کے بعد دوسری حماقت کرو گے تو ہمارے لیے کچھ کرنے کی گنجائش نہیں چھوڑو گے۔" غالب نے مجھے ہاتھ کھینچ کر پھر بٹھا دیا۔ "وہاں اب شملا کو جانے دو۔ وہ ڈاکٹر لطیف کو سمجھا دے گی کہ تمہارے ساتھ واپسی پر پولیس کا جھگڑا ہوا تھا اور تم نے حوالے کے طور پر ان کا نام لیا تھا مگر اب کوئی پوچھے تو وہ انکار کر دیں۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ میرا نام تو دروازے کی نیم پلیٹ پر لکھا ہوا ہے۔ ہر شخص جو دھوپ گزرتا ہے دیکھ سکتا ہے مجھے امید ہے کہ رابعہ کے حق میں بہتری کی خاطر وہ جھوٹ بولنا قبول کر لیں گے۔"

"لیکن انھوں نے مجھے تو کچھ بتایا تھا مجھے۔ اور میرا جانا بے حد ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

"تم فی الحال اُدھر نہیں جا سکتے۔ جاؤ گے تو پکڑے جاؤ گے۔" غالب نے کہا۔ "پرویز وکٹر سے کچھ بعید نہیں کہ وہ ڈاکٹر لطیف کی بات پر بھی اعتبار نہ کرے اور باہر سادہ کپڑوں میں پولیس آنے جانے والوں کو دیکھتی رہے۔"

"یار خدا کے لیے یہ بحث ابھی چھوڑو۔ پہلے پرویز وکٹر کو یہاں سے لے جاؤ۔" محسن بولا۔ "صبح ہونے والی ہے۔"

"چلو میں اور تم چلتے ہیں۔" غالب نے محسن سے کہا۔ "اس پنچھی پر سونیا وکٹر یا اس کا بھائی ملے تو اچھا ہے۔ میں کہوں گا کہ ہم رات کی ڈیوٹی کر کے لوٹ رہے تھے یہ عجیب گھڑی دیکھی۔ اس میں یہ آدمی پڑا تھا۔ آدھا اندر آدھا باہر۔ ہم اسے یہاں لے آئے کیونکہ کوئی اور ٹھکانہ نہیں پتا تھا۔"

"وہ پوچھیں گے کہ تھانے میں کیوں نہیں لے گئے تھے؟" محسن بولا۔

"سیدھی صاف بات کہ ہم کسی کی مصیبت میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔" غالب بولا۔ "یہ آپ کا آدمی ہے تو اسے سنبھالو اور جو آپ کا دل چاہے کرو۔ ہم جاتے ہیں۔ تھانے کچہری سے ہمیں معاف رکھو۔"

"تمہارے ساتھ میں چلتا ہوں۔" شیڈی بولا۔ "محسن کو شملا کے ساتھ جانے دو۔ یہ بھی صبح ہونے سے پہلے ہی ڈاکٹر لطیف کے گھر پہنچ جائیں تو اچھا ہے۔"

غالب اور شیڈی اتفاق رائے سے پرویز وکٹر کو اٹھا کر لے گئے۔ صبح چار بجے ان کی جیپ گلی سے نکل چکی تھی اور میرا خیال تھا کہ آدھے پونے گھنٹے میں وہ پرویز وکٹر کا پتا تلاش کر لیں گے۔ مجھے یہ ڈر ضرور تھا کہ کہیں پرویز وکٹر کا بھائی اور سونیا انھیں زبردستی نہ روک لیں مگر مجھے غالب کی عقل اور معاملہ فہمی پر بھی بھروسا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح جان بچا کے اپنے ساتھ شیڈی کو بھی نکال لائے گا۔ انھیں پرویز وکٹر کو گھر والوں کے حوالے کرنے سے پہلے اس کے ہاتھ پیر بھی کھول لینے تھے اور منہ پر بندھی ہوئی پٹی بھی کھولنا تھی۔ خدا کرے راستے میں پرویز وکٹر کو ہوش نہ آئے ورنہ غالب اور شیڈی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ پرویز وکٹر سخت مشتعل ہوگا اور آسانی سے مطمئن نہیں ہوگا تاہم غالب کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اگر تھانے بھی جانا پڑا تو غالب کے لیے یہ ثابت کرنا مشکل نہ ہوگا کہ آدھی رات کے بعد تک وہ اخبار کے دفتر میں تھا اور شیڈی اس کے ساتھ تھی۔

"اگر ڈاکٹر لطیف نے جھوٹ بولنے سے انکار کر دیا تو کیا ہوگا سکندر؟" محسن نے تشویش سے پوچھا۔

"بہت برا ہوگا۔ رابعہ پھنس جائے گی اور اسے نکالنا بھی آسان نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میرے سارے بہانے کیس نکل آئیں گے . . ."

"مگر اسے نکالنا بھی تو نقصان دہ ہوگا۔" محسن بولا۔ "وہ اسی گھر میں رہے گی تو ٹھیک ہوگی۔"

"ڈاکٹر لطیف نے تو کہا تھا کہ وہ مجھے زندہ سلامت دیکھے گی تو ٹھیک ہوگی۔" میں نے کہا۔ "اب صبح تو مجھے میں نہ گئی تو بہت زیادہ خرابی نہ ہو جائے محسن۔ وہ رابعہ کو ذہنی طور پر مجھ سے ملنے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ میں نہ پہنچا تو وہ سمجھے گی کہ ڈاکٹر لطیف بھی جھوٹ بول رہے تھے۔ ایسے کیس میں مریض کا ڈاکٹر پر سے اعتماد اٹھ جائے تو سارا علاج بے معرف ہو جاتا ہے۔ مجھے جانا چاہیے محسن اور میں جاؤں گا۔"

"سکندر تیری عقل پر جذبات غالب آ رہے ہیں۔ وہاں جانے سے بہتر ہے کہ تو سیدھا تھانے جا کر خود کو قانون کے حوالے کر دے کم از کم پولیس کے سر تو تیری گرفتاری کا سہرا نہ بندھے۔" محسن نے خفگی سے کہا۔ "کیا تو اندازہ نہیں کر سکتا کہ تیری گرفتاری سے کتنے لوگوں کا مفاد وابستہ ہے۔ اس بار وہ تجھے جیل، ضمانت اور سماعت پر پیشی کے انتظار میں قید رکھنے کا رسک نہیں لیں گے۔ میں شرط لگا کے . . . میرا مطلب ہے کہ مجھے ایک فی صد بھی شبہ نہیں کہ وہ تجھے مار دیں گے۔ خود پولیس کے ہاتھوں مروا دیں گے۔ ایسے جھوٹے پولیس مقابلوں میں خطرناک مجرم اور ڈاکو اکثر مارے جاتے ہیں۔ پولیس اپنی فائلیں بند کر دیتی ہے اور عدالت میں زیر سماعت مقدمات ختم کر دیتی ہے ثبوت، شہادت، جرح اور اپیل کے چکر ختم کر دیتی ہے۔ تیرے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ کہا جائے گا کہ تو نے پولیس پر فائر کر کے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ تیرے کسی ساتھی نے تجھے ایک ریوالور پہنچا دیا تھا۔ سب شکاری یہی چاہتے ہیں کہ ایک بار تو زیر دام آ جائے تو سارے جھگڑے جو تیرے دم سے ہیں ختم کر دیے جائیں گے۔ تو خود سوچ۔ اس سے کس کس کا بھلا ہوگا۔ نقصان ہوگا تو صرف ایم آر ایس کا شکاری تو تیری زندگی کی قیمت دس لاکھ تک لگا سکتے ہیں اور دس لاکھ ایک آدمی کو قتل کرنے کا استا زیادہ معاوضہ ہے کہ کوئی بھی اس کام کے لیے تیار ہو سکتا ہے خواہ بعد میں پھانسی ہو جائے۔ نقصان ہوگا ہمارا۔ کیا ہماری دوستی کی قیمت دس لاکھ ہے؟ رابعہ کی قیمت دس لاکھ ہے؟ ایم آر ایس کا مشن دس لاکھ میں ختم کیا جا سکتا ہے؟ مگر دس لاکھ یا دس کروڑ میں بھی شکاری تجھے شکار کرنے میں کامیاب رہے تو سونے والا صرف ساتھ بخت نہیں ہوگا۔ پھر رابعہ بھی مر جائے گی۔ محسن اور شملا بھی مر جائیں گے۔ غالب اور سہیل کچھ بھی نہ کر سکیں گے . . . یہ شکست ہم یوں قبول نہیں کر سکتے۔ اس سے تو یہی بہتر ہوتا کہ تو ابتدا میں والدین سے سودا کر لیتا۔"

میں نے دیکھا تو شملا دروازے کی دہلیز سے لگی رو رہی تھی۔ خطا کے لیے بس کرو۔ چپ ہو جاؤ۔" شدہ چلائی۔

"اگر صبح تو پہنچے میں رابعہ سے ملنے نہ پہنچا محسن تو اسے ہمیشہ کے لیے کھو دوں گا۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ دیوانگی کی سرحد عبور کر کے اتنی دور نکل جائے گی جہاں سے میرے لیے اس کو واپس لانا بالکل ناممکن ہو جائے گا۔"

"میں ایک بات کہوں سکندر؟" محسن نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد کہا۔ "فرض کر لیا وقت آیا کہ تجھے رابعہ کی محبت اور اپنے فرض میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے . . . تو تیرا فیصلہ کیا ہوگا؟ تو رابعہ کو چھوڑ دے گا یا اس مشن کو جس کا مقصد وطن کی سرزمین کو غداروں اور اس کی آبرو کا سودا کرنے والوں سے پاک کرنا ہے۔ اس مشن میں ہم سب ایک طرف ہیں۔ ہم صرف تیری وجہ سے اپنے مشن کو ختم نہیں کر سکتے۔ جب تک یہ وزیر پرشادی کے قتل کا انتقام لینے کا مسئلہ تھا یہ تیرا ذاتی مسئلہ تھا لیکن اب یہ کسی کا بھی ذاتی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم سب اس مشن میں برابر کے شریک ہیں اور کوئی بھی مشن محض ایک فرد کی کمی سے ختم نہیں ہوتا۔ مشن کسی فرد کا نام نہیں ہوتا۔ یہ ایک جذبہ ہوتا ہے۔ مقصد ہوتا ہے اور تحریک ہوتی ہے۔ افراد آتے ہیں۔ ایک مشعل کی طرح لے کر چلتے ہیں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ ایک ہاتھ کٹ کر گرتا ہے تو اس مشعل کو روشن رکھنے والے دوسرے ہاتھ اٹھ جاتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کل میں یا تو۔ نیک محمد یا غالب نہ رہیں۔ لیکن ہماری جگہ کوئی ضرور لے گا۔ اس کا نام کچھ بھی ہو مگر ہماری جگہ خالی نہیں ہوگی۔ اس مشن کو اسی جذبے اور لگن کے ساتھ تکمیل تک پہنچانے والے کبھی کم نہ ہوں گے۔"

میں پتھر کے بت کی طرح بیٹھا ہوا دیوار کو دیکھتا رہا۔ محسن نے یکلخت سچ کو یوں میرے روبرو کر دیا تھا کہ میں اس سے نظر چرا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس حقیقت کو تسلیم کیے بنا چارہ ہی نہ تھا کہ آزمائش کا دورانیہ اس سفر کے کسی بھی مرحلے میں کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ جب مجھے یا خود محسن کو ایک راستے کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ ایک وہ راستہ جو اپنی ذات کے تحفظ اور اپنی خوشیوں کی بقا کا راستہ ہوگا۔ ایک اپنے لیے جینے کا راستہ۔ خود غرض زندگی کا راستہ جس میں دل اتنا تنگ ہو جائے کہ وہ کسی اور کے لیے اپنی ایک سانس بھی وقف کرنا منظور نہ کرے۔ نہ وطن کے نام پر، نہ انسانیت کے نام پر، نہ رشتوں کے نام پر اور نہ اعلیٰ و ارفع مقاصد کے نام پر۔ دوسرا راستہ قربانی کا راستہ ہوگا۔ جس پر چلنے کے لیے اپنی ذات کو فراموش کرنا پڑے گا۔ اپنی خوشیوں کو قربان کرنا ہوگا اور اپنے جذبات کا گلا گھونٹنا ہوگا۔ یہ ادائے فرض کا راستہ ہوگا جب وطن، انسانیت کی آبرو، صداقت کی روشنی، رشتوں کی بقا . . . سب کچھ دوسرے راستے سے منسوب ہوگا۔

www.paksociety.com

"مگر... اگر یہی انتخاب تجھے کرنا پڑا محسن...؟" میرے ضمیر نے مجھ سے کہا۔

"میں تو بہت پہلے طے کر چکا ہوں۔" محسن بولا۔ "مجھے اب کسی فیصلے کا مرحلہ درپیش نہیں۔ فیصلہ تو میں نے اسی دن کر لیا تھا جب میں ولایت سے تیرے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ میرے والدین اور میری بہن سب میری خوشیوں سے اپنی امیدوں کا دامن باندھے میرا انتظار کرتے رہے تھے مگر میں لوٹ کر ہی نہیں آیا۔ نگری نگری پھرا۔ مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔ انتظار کرنے والے انتظار کرتے کرتے رخصت ہو گئے۔ میں واپس پہنچ کے بھی ان سے اتنا ہی دور رہا جتنا ولایت میں تھا۔ میں نے تیرا ساتھ دیا تھا۔ میرے لیے بہت آسان تھا کہ میں اپنے گھر میں سارے غموں سے محفوظ رہتا۔ والدین کی محبت اور شفقت پاتا۔ ان کے ارمان پورے کرتا۔ وہ میری شادی بڑی دھوم دھام سے کرتے۔ مرنے سے پہلے میرے لیے کسی اعلیٰ ملازمت کا بندوبست کر جاتے یا مجھے بزنس لائن پر لگا جاتے۔ میں کسی بیوروکریٹ یا بزنس مین کی طرح بے فکری اور عیاشی کی زندگی گزارتا اور بس۔ کبھی یاد کر لیتا کہ ہاں ایک یار تھا اپنا سکندر۔ شاید کوئی گلہ ہوتا مجھ سے نہ مجھے اپنی خود غرضی پر شرمندگی ہوتی۔ مگر سکندر! اس وقت میں نے اپنا گھر، اپنے رشتے اور اپنا مستقبل سب قربان کر دیا تھا تو آج مجھے کون سی آزمائش میں مشکل ہو گی۔ میں بہت پختہ ہو چکا ہوں۔ اب مجھے انتخاب کرنا پڑا تو شاید میں سوچوں گا بھی نہیں۔ میں وہی راہ اختیار کروں گا جو پہلے کی تھی۔ میں پھر اپنے رشتے اور اپنا گھر، اپنا مستقبل اور اپنی خوشیاں سب قربان کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ تو آج اس آزمائش سے دوچار ہے۔ اس سے پہلے تو نے صرف دولت کو چھوڑا ہے۔ آج شاید تجھے جذبات کے رشتوں کو چھوڑنا پڑے۔ رابعہ کو چھوڑنا پڑے۔ اپنے مستقبل کے خوابوں کو اور خوشیوں کو چھوڑنا پڑے۔"

"میں سب چھوڑ دوں گا محسن۔" میں نے اچانک کہا۔ "میری آنکھیں شاید بند تھیں۔ تو نے یہ اچھا کیا کہ میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے آئینہ دکھا دیا۔ مجھے اس میں اپنی صورت دیکھ کر شرم آنے لگی ہے۔ میں بہت نیچے گر کر سوچ رہا تھا۔ حیوانی سطح پر جہاں ایک مرد کے لیے صرف ایک عورت اہم رہ جاتی ہے اور اس کا حصول۔ کیا میں اندھا ہو گیا تھا کہ میں نے تیرے نقش قدم بھی نہیں دیکھے، حالانکہ یہ ساری مسافت تو نے میرے ساتھ اور میرے سامنے طے کی تھی۔ تجھ سا یار راستہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے انھی نقش قدم پر چلنا ہے جو تو نے بنائے ہیں۔ میں رابعہ کو خدا پر چھوڑتا ہوں۔ اگر وہ چاہے تو ایک دن رابعہ بھی ٹھیک ہو جائے گی اور مجھے وہ سب مل جائے گا جس کی آج مجھے آرزو ہے مگر اس آرزو پر میں اپنے مشن سے روگردانی کروں تو مجھ پر لعنت۔ میں ایسا سوچ کر بھی شرمندہ ہوں۔"

"میں جانتا ہوں کہ وقت آتا تو سکندر بخت وہی کرتا جو اس نے کیا۔ میں سکندر بخت کو جانتا ہوں۔" محسن بولا۔ "بس میں نے تمہارا رستہ صاف کیا ہے جس پر جذباتی الجھنوں کی وجہ سے تذبذب اور شکوک کے کانٹے پھیل گئے تھے۔ خدا ہم سب کو ساتھ رکھے اور ہماری امیدوں کے چراغ نہ بجھنے دے لیکن کوئی اکیلا رہ جائے اور اندھیرے میں گھر جائے تب بھی اسے اپنے مشن کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔"

پھر خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں شہلا، محسن اور میں اپنے اپنے خیالوں اور اندیشوں اور امیدوں کے ساتھ تنہا رہ گئے۔ یہ وقفہ بڑے کرب اور عذاب کا تھا جس میں ہم سب نے سچ کے زہر کی تلخی کو آب حیات سمجھ کر قبول کیا۔ یہ دل شکستگی کا وقفہ تھا جس میں عقل نے سارے آبگینے توڑ ڈالے۔ میں نے رابعہ کا تصور کرنا چاہا اور نہ کر سکا۔ سارے عکس بٹ گئے تھے اور گڈمڈ ہونے لگے تھے پھر اس کے سارے روپ بکھر گئے اور میں نے اسے ایک دل شکن روپ میں دیکھا۔ وہ ایک پاگل خانے میں بند تھی۔ وہ مجھے پہچانتی ہی نہیں تھی۔ "اگر اس دن ختم ہو جاتے سکندر بخت" میرے کانوں میں ڈاکٹر لطیف کی آواز آئی۔ "تو آج یہ بے حالی نہ ہوتی۔" اس حال میں نہ ہوتی۔ میں نے رابعہ کو جن نظروں سے دیکھا۔ "تم مجھے نئے منزل دو گے۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ تم ہی تو میری شریک سفر تھی۔ آج میری مجبوری کو تم بھی نہیں سمجھو گے تو پھر کون سمجھے گا۔ سفر جاری رہتا ہے۔ سفر کو جاری رہنا چاہیے۔ جو تھک کے بیٹھ گیا اسے منزل سے کیا... میں کیسے رک سکتا ہوں رابعہ۔"

دروازہ کھلا اور غالب کے ساتھ ٹیڈی نمودار ہوا۔ "تم لوگ ابھی بیٹھے ہو؟ اسی طرح جیسے ہم چھوڑ گئے تھے۔ ہم تو اپنا کام کر آئے۔" ٹیڈی نے مسرت سے اعلان کیا۔ "سونیا سے بھی مل آئے۔"

"اس نے کچھ خاطر مدارت بھی کی؟" محسن نے کہا۔ "جانچ کیسی ہوئی؟"

"اچھے خواجہ صاحب تو سونیا کو دیکھتے ہی سب بھول گئے تھے کہ کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔" غالب نے کہا۔ "پھر اس کا دوسرا بھائی نکل آیا سلیم وکٹر۔ بس تو دھونے لگی ہو جاتے پیچھے پڑ گیا تھا خبیث۔ ہم نے مختصراً وہی کہا جو سوچ کر گئے تھے وہ ہمیں روکنے پر آمادہ تھا۔ مجھے اتفاق سے موقع مل گیا۔ اسے دھکا دیا۔ پیر سے ٹنگڑی لگائی اور جوتیاں بغل میں دبا کے بھاگ گئے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"گویا سلیم وکٹر ہی وہ شخص ہے جو ایک طرف ملاوٹ سے رابطہ رکھتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس سے اطلاع ملتی تھی اور اپنی نرس بہن سونیا کے ساتھ ایمبولینس میں ڈال کر سادھو رام کو پہنچا آتی تھا۔"

"ہاں اور پھر یہی سلیم وکٹر سادھو رام سے پیسہ وصول کرتے جاتا تھا اور رقم طاہر کو پہنچاتا تھا۔" غالب نے کہا۔ "دوسرا بھائی پرویز وکٹر پولیس میں ہونے کی وجہ سے براہ راست ہی ڈی ایس پی سے رابطہ رکھتا تھا۔ وہ مال کو لاہور سے کراچی تک پہنچانے میں مدد کرتا ہوگا۔ ممکن ہے ایمبولینس کے ساتھ جیپ میں چلتا ہو تاکہ راستے میں کسی جگہ ایمبولینس کو روکنے کی ہمت کوئی نہ کر سکے۔ آگے بارڈر کراس کرانے میں ڈی ایس پی سراج ساتھ دیتا تھا۔"

"وکٹر فیملی کو اس کاروبار میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔" میں نے کہا۔ "ان سے ہمیں دونوں طرف کی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔"

"ہاں، بشرطیکہ ہمارا ایک جاسوس ان کے درمیان ہو۔" غالب نے کہا۔ "بظاہر جہاں وہ رہتے ہیں وہاں کسی کو بھی ان پر شک نہیں ہوگا کہ کسی قسم کے کاروبار میں ملوث ہیں۔ محلے والے بھی کچھ بھی نہیں بتا سکیں گے۔ سب یہی کہیں گے کہ تینوں بہت شریف اور بے ضرر لوگ ہیں۔ بہن کسی اسپتال میں نرس ہے۔ پھر وہ نرس کی وردی بھی پہن کر نکلتی ہوگی تو سب دیکھتے ہوں گے۔ ممکن ہے ایمبولینس اسے لانے لے جانے کے لیے آتی ہو۔ محلے میں انھوں نے بہت اچھی گڈول بنا رکھی ہوگی۔ نرس کا پیشہ بہت معتبر اور محترم شمار ہوتا ہے۔ اگر دوسرا بھائی ایمبولینس ڈرائیور ہے تو یہ بھی اچھی بات ہے۔ محنت کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے۔ تیسرا پولیس میں ایس آئی ہے۔ وہ اگر بدنام ہوا تو یہ کون سی انوکھی بات ہوگی۔ سارا محکمہ ایک جیسی شہرت رکھتا ہے۔ اس میں اچھے بھی برے ہی سمجھے جاتے ہیں۔ تاہم اے ایس آئی پرویز وکٹر کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ ایماندار اور فرض شناس مشہور ہوگا۔ پاس پڑوس کے لوگوں کی رائے اہمیت نہیں رکھتی۔ ممکن ہے آدھے اس کی شرافت کے قائل ہوں اور باقی آدھے اسے بھی ڈھونگ سمجھتے ہوں۔ ان کا رہن سہن اچھا ہوا تو اسے پولیس میں بھائی کی آمدنی سے منسوب کیا جاتا ہوگا۔ ایک نرس اور ڈرائیور کی آمدنی ہی کیا ہے۔ لیکن افسران بالا اور پرویز وکٹر کے ساتھیوں سے پوچھا جائے تو وہ اس نوجوان اے ایس آئی کے بارے میں اچھی خیالات کا اظہار کریں گے جیسے خیالات سابق اے ایس آئی اکرام بیگ کے بارے میں پائے جاتے تھے مزید یہ تو گالیاں ہی دیتے ہوں گے کہ سالا خود کھاتا ہے اور نہ ہمیں کھانے دیتا ہے۔"

"پرویز وکٹر کو کیا ضرورت ہے رشوت کی۔" محسن بولا۔ "دوسرے راستے سے اس کی آمدنی کی کوئی حد نہیں۔ اس آمدنی کے مقابلے میں رشوت کی کمائی تو ایسے ہے جیسے ندی کے سامنے نالا۔ ایمانداری اور فرض شناسی کی شہرت تو ایک ڈھال ہے جو اسے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ انکل رضوی جیسے افسران بالا اس کی بہت عزت اور قدر کرتے ہوں گے۔"

"سوال یہ ہے کہ اتنی آمدنی کے باوجود وہ موہنی روڈ کے اس پرانے اور چھوٹے سے مکان میں کیوں رہتے ہیں۔ کیا یہ بھی ایک ڈھونگ ہے؟" غالب نے کہا۔ "وہ دوہری زندگی گزار رہے ہیں۔ دیکھنے میں فرشتے مگر کرتوتوں میں شیطان۔ ظاہر میں غریب اور درحقیقت دولت مند۔ وہ شام کو ایسے جاتے ہوں گے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں جہاں ان کے محلے کا کوئی آدمی انھیں دیکھ ہی نہیں سکتا۔"

"دوستو! وہ اندر سے کیا ہیں اور باہر سے کیا ہیں۔ اس پر بحث اور قیاس آرائی کا کیا فائدہ۔" غالب نے کہا۔ "ہمیں تو اصلیت معلوم کرنی ہے اور اس کا وہی ایک طریقہ ہے کہ ہم ان پر چوبیس گھنٹے نگاہ رکھیں۔ ان کے روز و شب کا ہر لمحہ ہماری نظر میں ہو۔ ہم ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سنیں تاکہ ہمیں ان کے پروگرام کا قبل از وقت پتا چل سکے۔"

"یہ ناممکن ہے وہ اپنے سائے سے بھی محتاط ہوں گے۔" محسن بولا۔ "اور کسی نے ایک دن بھی ان کا تعاقب کیا تو انھیں معلوم ہو جائے گا۔"

"تعاقب سے مسئلہ حل بھی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "مزید مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ کوئی اندر ان کے ساتھ ہوگا تو کام بنے گا۔"

"میں کوشش کرتا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "ابھی تک انھوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ دستک دے کر کہوں گا کہ حضرات، خواتین کیا آپ مجھے گھر کو اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دینا پسند کریں گے۔ یقین کیجیے میں شریف آدمی ہوں جیسا کہ میں آپ کو نظر آتا ہوں۔"

"ان کے گھر میں کسی کا رہنا اصلاً ناممکن ہے۔" غالب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اپنے خطرناک کاروبار کی وجہ سے وہ کسی پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ ان کے گھر میں گھسنا تو درکنار ان سے تعلقات بڑھانا بھی آسان نہیں ہوگا۔"

"جو کچھ میرے ذہن میں ہے وہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے اور یہ تو کسی کام میں ہاتھ ڈالنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے مشکل قرار دیا جائے یا ناممکن سمجھ کر چھوڑ دیا جائے۔ مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے اس کے لیے جتنی لگن اور محنت درکار ہے، اتنی ہی عقل اور ذہانت سے کام لینے کی بھی شرط ہے۔ مزید یہ کہ دشمنوں کے درمیان رہنا اور محفوظ رہنا الگ کی بات ہے اور عقل کے گھوڑے ہر طرف دوڑانے کے بعد

www.paksociety.com

انھوں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ رابعہ کا یقین پختہ ہو جائے گا کہ سب اُس سے جھوٹ بولتے رہے ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ سکندر اس دنیا میں ہوتا تو وعدہ کر کے نہ پہنچتا۔ اس کی راہ میں ندیاں اور پہاڑ، سمندروں کے طوفان اور زلزلے حائل ہوتے تب بھی وہ آتا۔ میرا نہ پہنچنا رابعہ کے لیے سب سے بڑا ثبوت بن جائے گا کہ وہ یقین کے فریب کا شکار نہیں ہے۔ ڈاکٹر لطیف نے ابھی تک جو اُمید کی کرن روشن رکھی تھی وہ گم ہو جائے گی اور رابعہ ایک بار پھر اس اندھے خلا میں گر جائے گی جہاں سے اس کے لیے تنہائی کا جہنم شروع ہوتا ہے۔ پھر وہاں سے واپسی کسی کے اعجازِ مسیحائی اور دستِ امکاں میں نہ ہوگی۔ کتنی کوشش اور جتن کے ساتھ میں نے اُسے ایک بار خود فراموشی کی آخری سرحد سے واپس لے آیا تھا۔ اس سرحد کے پار دیوانگی کا صحرائے بےکنار تھا، جس میں کسی یاد کا سایہ بھی نہ تھا اور محرومیوں کی کڑی دھوپ تھی۔ کتنی اُمید تھی مجھے کہ بہت جلد میں اس کے ماضی، حال اور مستقبل کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو وقت کی ایک ہی زنجیر سے منسلک کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ رابعہ تو اس اندھے کی طرح تھی، جسے میں نے انسانوں کی دوڑتی بھاگتی، کچل دینے والی، مار دینے والی مشینی سواریوں کے ہجوم سے نکال کر سڑک پار کرانے کا عزم کیا تھا مگر اب سڑک کے درمیان میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا کہ وہ راہ گم کردہ جدھر چاہے جائے۔ حالات کی اس مجبوری کے سامنے میں بھی بے بس تھا۔ رابعہ کو مجھ سے ایسے اندازِ تغافل کی اُمید نہ ہوگی لیکن حالات نے میرے لیے ایک کے سوا سارے راستے بند کر دیے تھے۔ مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں محبت کو بھول جاؤں اور اپنا فرض یاد رکھوں۔

"تم کو بہت دکھ ہے سکندر کہ تم رابعہ کو لا سکتے تھے مگر نہ لا سکے۔" نازو نے کہا۔

میں نے چونک کر نازو کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں پیر سمیٹے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے اپنے پیر کے ناخن تراش رہی تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر نہیں تھیں لیکن اس کے دل میں میرا خیال تھا۔ مجھے دکھی دیکھ کر وہ دکھی تھی۔ "ہاں... نہیں... اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"وہ آئے گی۔ میں تمھارے لیے لے آؤں گی۔" وہ مجھ سے نظریں ملائے بغیر بولی۔ "تم اپنے دل کو دکھی مت کرو۔"

اس کی بات نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ ایک بار پہلے بھی وہ جان پر کھیل کر رابعہ کو بچا لائی تھی۔ اُسے اغوا کر کے کرایہ والی لے جانے والے بہت طاقت ور اور خطرناک مرد تھے۔ اگر وہ چاہتی تو کھیل خراب ہو کر آ سکتی تھی۔ اس پر کوئی الزام نہ آتا۔ کوئی بھی اُسے محبت کی رقابت میں خود غرض ہو جانے کا مجرم قرار نہ دیتا۔ لیکن اُس نے رابعہ کو فراموش نہیں کیا۔ اس پاگل لڑکی کی محبت بالکل بےغرض تھی۔ اُسے مجھ سے محبت تھی مگر یہ بالکل بے طلب اور بےغرض محبت تھی۔ اُسے بالکل پروا نہیں تھی کہ محبت کے جواب میں اُس کو بھی محبت کیوں نہیں ملتی۔ وہ رابعہ سے بالکل حسد نہیں کرتی تھی اور میں نے دنیا میں اتنی بےلوث محبت کو صرف اُن کے دل میں دیکھا تھا جو خدا کو پہچان گئے اور ظاہر کی حقیقت کو پا لینے کے لیے اپنے وجود کو یوں فراموش کر دیتے تھے کہ بے وجود ہو جاتے تھے۔ اُن کی ذات کی خواہشات بے وجود ہو جاتی تھیں اور ان کے ساتھ دوسروں کا رویہ، دکھ سکھ، رنج و راحت، اپنا جسم اور جذبات بے معنی ہو جاتے تھے لیکن نازو ایک جوان عورت تھی، جس کا دل طوفانی خواہشات کا گہوارہ ہوتا ہے اور اس کی عمر کی لڑکیاں دل کے ہاتھوں اس حد تک مجبور ہو جاتی تھیں کہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہتی تھیں مگر یہ دنیا سے نرالی لڑکی تھی۔ حسن کے پاگل پن کے انداز میں بھی ضبطِ نفس تھا، ڈسپلن تھا اور خود اختیاری تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ مانگنے سے سب کچھ نہیں ملتا مگر آرزو تو جرم نہیں، خواب تو جرم نہیں اور آرزو یا محرومی کی خلش تو جرم نہیں۔ اس کی محبت یہ تھی کہ وہ محبت کرنے کا مجھے حق دے۔ مجھے اپنی خواہشات کا اسیر نہ کرے بلکہ میری خوشی کو اپنی سب خوشیوں پر مقدم رکھے اور اس کی خوشی یہی تھی کہ مجھے کوئی دکھ نہ ہو۔ نہ وہ اپنے اس لازوال اور ناقابلِ تسخیر جذبۂ عشق کو دنیا سے چھپاتی تھی اور نہ اس سے مغلوب ہوتی تھی۔ اُس نے بہت پہلے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ مجھے حاصل نہیں کر سکتی اور میں رابعہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب ہی اب اُس نے کسی عام عورت کی طرح میرے اور رابعہ کے درمیان حائل ہونے کی اور رابعہ کو اپنی راہ سے ہٹانے کی، خود کو الگ کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی تھی۔ اُس نے اپنی خوشیوں کو میرے لیے وقف کر دیا تھا۔ جسم و جان کی ساری توانائیوں کے ساتھ، میں ایک ضدی بچے کی طرح تھا جو اڑ گیا ہو کہ وہ ایک کھلونے کے سوا دنیا کی کوئی چیز قبول نہیں کرے گا۔ اگر وہ مٹی کا کھلونا ہے تب بھی اُس کو وہی کھلونا چاہیے۔ اس کے سامنے کوئی آسمان کے تارے بھی ڈال دے، چاندنی کے ٹکڑے پھیلا دے اور قوسِ قزح کی کرنیں بکھیر دے تب بھی وہ خوش نہ ہو۔ اب نازو نے صرف رابعہ کو میری خوشی جان لیا تھا تو اُسے سنبھال کے رکھنا اور اُسے بالآخر میرے حوالے کرنے کو اس نے اپنا فرض جان لیا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ عقل و ہوش سے بےگانہ نہیں ہوئی تھی اور اُس نے تارک الدنیا ہو کے رہبانیت اختیار نہیں کی تھی۔ اُسے زندگی کے تقاضوں کا احساس تھا اور خود کو ان خوشیوں

سے محروم رکھنا نہیں چاہتی تھی جو قدرت نے عطا کی تھیں۔ اس نے اپنے آس پاس بسنے والوں سے آنکھیں بند نہیں کی تھیں چنانچہ وہ غالب کی چاہت کو اُس کی آنکھوں میں پڑھ سکتی تھی اور اس کے دل کی دھڑکن میں سن سکتی تھی۔ بالکل اُسی طرح جیسے وہ اپنے استاد ویلڈی کے جارحانہ جذبات کے خلوص کو سمجھ سکتی تھی۔

اور اس معاملے میں نازو کا رویہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اُس نے کبھی غالب کی دل شکنی نہیں کی تھی اور اس کے ڈھکے چھپے اظہارِ عشق کا برا بھی نہیں مانا تھا۔ کسی حد تک اُس نے غالب کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ زبان سے کچھ کہے بغیر اُس نے غالب کو سمجھا دیا تھا کہ ایک محبت میری روح کی ہے جو سکندر کے لیے وقف ہے لیکن تم چاہو تو نازو سے محبت کر سکتے ہو۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ غالب میرا خیال چھوڑ دو کیوں کہ میں سکندر کی ہو چکی ہوں اور اب کسی کو یہ حق نہیں دے سکتی کہ وہ مجھ سے محبت کرے۔ اُس کی شخصیت کے یہ دونوں پہلو بالکل جدا تھے اور ان میں کوئی کشمکش نہیں تھی۔ میں یہ پیشین گوئی کر سکتا تھا کہ وہ غالب کی محبت کا جواب نفرت سے نہیں دے گی۔ اگر اس سے شادی کر لے گی تو بہت اچھی بیوی بھی ثابت ہوگی جسے اپنے شوہر، اپنے گھر اور اپنے بچوں کے لیے جان بھی دینا پڑے تو دریغ نہ کرے۔ وہ غالب سے وفادار رہے گی اور اُسے اتنی ہی محبت دے گی جتنی کوئی بھی شوہر پرست بیوی دے سکتی ہے لیکن اُس کے دل میں جہاں میری محبت کا چراغ روشن ہے وہ گوشہ صرف میرے خیال سے آباد رہے گا۔ غالب یا کوئی اور چاہے کہ اس خیال کی روشنی کو بجھا دے تو یہ ناممکن ہوگا۔

"کیا سوچ رہے ہو اتنی دیر سے؟" نازو نے اچانک کہا۔

میں چونک پڑا۔ "کچھ نہیں... کوئی ایسی بات نہیں۔"

میں نے کہا۔ "محسن اور شہلا کو بہت دیر ہو گئی۔"

"ہاں... دو گھنٹے ہونے کو ہیں۔" نازو نے کہا۔ "تم لوگوں نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"تمھارے بارے میں...؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "اپنے فیصلے تم خود کرتی ہو بی بی۔ کس کی مجال ہے جو دخل دے سکے۔"

"میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "تم کوئی کام لینا چاہتے تھے مجھ سے۔"

"کام تو ہے... لیکن نازو... میں پھر کہتا ہوں کہ گھر لوٹ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "والدین کے گھر سے باہر پناہ بڑی مشکل سے ملتی ہے۔"

"میں کس سے پناہ مانگ رہی ہوں؟" وہ خفا ہو کے بولی۔ "اور کیا یہاں میں تم سب کی پناہ میں نہیں ہوں۔ میں بہت مطمئن ہوں۔"

"مگر تمھارے ماں باپ اور تمھارا بھائی... وہ مطمئن نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ سمجھتے ہوں گے کہ تم صرف ان کی رسوائی کا سبب بن رہی ہو۔ انھیں دکھ دے رہی ہو۔ تمھاری عمر کی لڑکیاں..."

"میری عمر کی لڑکیاں تو غلط راستے پر بھی نکل جاتی ہیں۔" وہ تنک کر بولی۔ "مجھے یہ اعتماد تو ہے کہ میں نے غلط قدم ابھی تک نہیں اٹھایا۔ میرا کردار بے داغ ہے اور میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔ میں خود کو اتنا ہی محفوظ سمجھتی ہوں جتنا اپنے گھر میں تھی اور یہ سب تو نیت کے کھیل ہیں ورنہ عصمت مآب پردہ دار کہلانے والی لڑکیاں کیا نہیں کرتیں۔ کہاں نہیں جاتیں۔ ان کے اپنے خاندان میں انھیں کزن مل جاتے ہیں ورنہ محلوں میں کوٹھیوں کی دیواریں پھلانگنے والے بھی مل جاتے ہیں۔ وہ اسکول اور کالج جانے کے لیے کتابیں لے کر اور برقعے اوڑھ کر نکلتی ہیں تو شالامار اور مقبرۂ جہانگیر پہنچتی ہیں۔ کیا تم یہ سب نہیں جانتے؟ کون نہیں جانتا۔ کچھ لوگ اپنا بھرم رکھتے ہیں اور اسے پردہ کہتے ہیں۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں، سب کے سامنے کر رہی ہوں اور غلط نہیں کر رہی ہوں۔ عزت و ذلت اور رسوائی یا نیک نامی کی سند دینے والے اکثر وہی ہیں جو چوری چھپے غیر اخلاقی اور غیر قانونی کام کرتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں، غیبت کرتے ہیں، امانت میں خیانت کرتے ہیں، حقوق ہمسائیگی اور حقوق العباد کی پروا نہیں کرتے۔ جہاں ڈر نہ ہو وہاں غیر قانونی کام سے بھی نہیں چوکتے۔ کتنے ہیں ایسے جن کو موقع ملے اور پھر بھی وہ رشوت نہ لیں، سفارش قبول نہ کریں، کسی لالچ یا دباؤ میں نہ آئیں۔ پورے لاہور میں ہے کوئی ایسا جو رات کو ویران سڑک پر ٹریفک سگنل کی لائٹ سرخ دیکھے اور رک جائے۔ وہ سب کسی نہ کسی طور مجرم ہیں جو دوسروں پر فردِ جرم عائد کرتے ہیں۔ میں اُن سے نہیں ڈرتی۔ ایک دن میرے والدین کو اور میرے بھائی کو یقین آ جائے گا کہ میں نے بغاوت نہیں کی تھی، جو کیا تھا جائز اور صحیح کیا تھا۔ جرأت نہ ہو تو آدمی نتائج کی سوچ کے ڈر جاتا ہے۔ میں نتائج کی پروا نہیں کرتی کیوں کہ میں جانتی ہوں، نتائج غلط نہیں ہو سکتے۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ معاشرتی اقدار کے پیمانے سے اس کے خیالات یقیناً سرکشی اور باغیانہ تھے مگر اس بات سے انکار ناممکن تھا کہ وہ سچ کہنے کا حوصلہ رکھتی ہے اور اس کی بات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ "تم اپنے گھر سے بالکل قطع تعلق کر لو گی؟"

"اس حد تک کہ میں اپنے گھر میں نہیں رہوں گی۔ میں اُن سے رابطہ رکھوں گی۔" وہ بولی۔ "تاکہ انھیں یقین رہے کہ میں زندہ ہوں۔"

www.paksociety.com

"وہ خود تمہارے بغیر محض اس یقین پر زندہ رہ سکیں گے کہ تم زندہ ہو" میں نے کہا۔ "اور کچھ نہیں سوچیں گے کہ تم کہاں ہو اور کس حال میں ہو۔ لڑکی تو ایک پل کے لیے نظر سے اوجھل ہو تو ماں باپ جن اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"

"ایک تو میرے ماں باپ جانتے ہیں کہ میں کس قسم کی لڑکی ہوں" وہ بولی۔ "پھر وہ دوسری قسم کے ماں باپ ہیں۔ ماں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ وہ صرف ماں ہے لیکن میرے والد اور میرے بھائی مجھ سے غافل نہیں ہیں۔ انھیں مجھ پر اعتماد ہے۔"

"اور مجھ پر...؟" میں نے کہا۔

"اعتماد تو تم پر بھی ہے" نازو نے کہا۔ "وہ تمہارے جرائم کی نوعیت کو بھی سمجھتے ہیں۔ انھیں بالکل شک نہیں کہ تم ایک مضبوط کردار کے مالک اور شریف آدمی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ جو کچھ تم نے کیا وہ غلط تھا۔ ان کے لیے ہر غیر قانونی کام غلط ہے، خواہ وہ شریف آدمی کرے یا بدمعاش۔ تاہم انھیں میری طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا کہ میں غلط لوگوں کے درمیان ہوں۔ میرا بھائی اور میرا باپ مل کر میری ماں کو بھی سمجھا لیں گے کہ میرے لیے دعا کرے اور میری بحفاظت واپسی کا انتظار کرے۔"

"ٹھیک ہے نازو، میرا کام تمھیں سمجھانا تھا لیکن تم خود سمجھدار ہو" میں نے کہا۔ "ہم سب کوشش کریں گے کہ تمھیں ایک دن پھر والدین کے گھر پہنچا دیں، بالکل سلامتی اور حفاظت کے ساتھ۔ اسی حالت میں جیسے تم گھر سے نکلی تھیں۔ ہم اس بارِ امانت کو اٹھا لیں گے، حالانکہ اس سے ہماری ذمے داریوں میں اضافہ ہوگا مگر ہم سب جانتے ہیں کہ کسی رشتے کی عدم موجودگی میں سب سے مضبوط رشتہ انسانیت کا ہوتا ہے جس نے ہمیں ایک خاندان بنا دیا ہے اور دکھ سکھ میں ساتھ دینے کا حوصلہ عطا کیا ہے۔"

"حوصلہ تم میرا بھی آزما چکے ہو۔ یہ بتاؤ میں کس طرح تمھارے کام آ سکتی ہوں؟" وہ بولی۔

"بتاؤں گا، سب کے سامنے بتاؤں گا" میں نے کہا۔ "وہ کام ایسا ہے جو بہت مشکل اور خطرناک ہے۔ جب میں نے اس کام کے بارے میں سوچا تھا تو مجھے خیال آیا تھا کہ تمھارے سوا یہ کام کوئی نہیں کر سکتا۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے لیکن فیصلہ میں نہیں کروں گا۔ سب کا متفق ہونا ضروری ہے تاکہ کل کو خدانخواستہ... کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے... تو الزام صرف مجھ پر نہ آئے۔"

"میں تمھیں کبھی الزام نہیں دوں گی" وہ بولی۔ "مجھے بتانے میں کیا حرج ہے؟"

"یہ بات سب کے سامنے ہوگی" میں نے کہا۔ "وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ میں باہر جا کر ڈاکٹر لطیف کے گھر فون کروں۔ آخر اتنی دیر کیوں کی انھوں نے؟" نازو نے سر ہلایا اور میں باہر نکل گیا۔

ایک دکان پر میں نے پبلک ٹیلی فون کی تختی لگی دیکھی۔ وہ ایک جنرل اسٹور تھا جس پر گاہکوں کا ہجوم تھا۔ کئی بار چلانے کے بعد میں دکان کے مالک پر واضح کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ مجھے آٹے دال کا بھاؤ نہیں معلوم کرنا بلکہ فون کرنا ہے۔ اس نے ہاتھ ہلا کے مجھے اس کی اجازت دی اور میں نے یادداشت کی مدد سے ڈاکٹر لطیف کا نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی چار مرتبہ بجی، پھر ان کی بیگم نے ریسیور اٹھا لیا۔

"آنٹی، میں سکندر بول رہا ہوں" میں نے کہا۔ "وہ محسن... اور شہلا آپ کی طرف آئے تھے؟"

"یہاں... نہیں تو... میں نے نہیں دیکھا" وہ بولیں۔ "تم خود کیوں نہیں آئے آخر...؟"

"مجھے کچھ ایسی مجبوری تھی کہ مجھے اپنی جگہ محسن اور اس کی بیوی کو بھیجنا پڑا" میں نے کہا۔

"تم بھی کمال کرتے ہو۔ ڈاکٹر صاحب بہت ناراض تھے" وہ بولیں۔ "کہ اس لڑکے نے بہت غلط حرکت کی ہے۔ اگر وہ نہیں آ سکتا تھا تو اس نے آنے کا وعدہ کیوں کیا تھا۔ اب [illegible] کو غلط اثر ہوا تو کون ذمے دار ہوگا۔"

"کیا وہ موجود ہیں؟ میں خود انھیں بتا دیتا ہوں کہ میں کیوں نہیں آ سکا" میں نے کہا۔

"ان کے کلینک میں کوئی بیٹھا ہے۔ وہ چلا جائے تو میں بات کروں" انھوں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے محسن بھی وہاں بیٹھا ہو۔"

"آپ فون انھیں دے دیں" میں نے کہا۔ "کلینک میں بھی تو فون ہوگا۔"

"ہے... لیکن... میرا خیال ہے چوہدری دلاور کے سامنے وہ بات نہیں کریں گے۔"

"چوہدری دلاور؟" میرے ذہن کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ "کون چوہدری دلاور؟ وہ ایم ڈبلیو ڈی والا؟"

لائن یکلخت کٹ گئی۔ میں ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑا رہ گیا جس میں اب لائن کے بزی ہونے کی ٹوں ٹوں آ رہی تھی۔ پھر دکان دار نے ریسیور مجھ سے لے لیا اور ایک خاتون کے لیے نمبر ملانے لگا۔

یکلخت کسی نامعلوم خطرے کے احساس نے میری پریشانی کو تشویش میں بدل دیا۔ ڈاکٹر لطیف کی بیگم نے بہت کچھ بتا دیا تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ چھپا لیا تھا اور میرے ذہن کو ان گنت پُرخطر اور زہریلے خیالوں کے سرسراتے، کلبلاتے اور پھنکارتے سانپوں سے بھرے جنگل میں بھٹکتا چھوڑ دیا تھا۔ ان میں ایک سوال اژدہے کی طرح سر اٹھاتا تھا اور مجھے ڈراتا تھا۔ چوہدری دلاور کا ڈاکٹر لطیف کے گھر میں کیا کام؟ اس کا ایک منطقی جواب کوئی بھی دے سکتا تھا کہ ڈاکٹر کے گھر کے دروازے تو سب ہی کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ اگر وہاں رابعہ جا سکتی ہے تو چوہدری دلاور کیوں نہیں جا سکتا۔ لیکن ڈاکٹر لطیف ایک نیورو فزیشن تھے جو ہر مرض کا علاج نہیں کرتے تھے۔ وہ نفسیاتی امراض کے معالج تھے اور میرے لیے یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ چوہدری دلاور کوئی نفسیاتی یا ذہنی مریض ہوگا۔ جب سے میرا اور اس کا رابطہ ہوا تھا، میں نے اس کی شخصیت کے مختلف روپ دیکھے تھے۔ ابتدا میں وہ میرے والد کا ایک پارٹنر بن کے سامنے آیا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ایک شفیق سرپرست کا رویہ اختیار کیا تھا۔ پھر مجھے پتا چلا تھا کہ وہ تو میرے باپ کا قاتل ہے اور میں نے اسے اپنے دشمن کی حیثیت سے شناخت کیا تھا۔ میں نے اس کی فراخدلی دیکھی تھی جب اس نے مجھے کاروبار سے علیحدگی اختیار کرنے کی پیش کش کی تھی اور میرے سامنے دو متبادل راستے رکھے تھے۔ میں یکمشت رقم لوں اور بھول جاؤں کہ میں ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کے بانی مقتول وزیر خان کا جائز قانونی وارث ہوں۔ دوسرا یہ کہ بہت معقول معاوضے پر اس کاروبار میں خاموش تماشائی کی حیثیت سے شریک رہوں۔ اپنے ضمیر کا ماہانہ معاوضہ لے کر ہوں اور اس کے مذموم کاروبار میں ایک ایجنٹ بن کے دولت منڈی کے اس کبھی خشک نہ ہونے والے سرچشمے کو رواں دواں رکھوں۔ میں نے دونوں راستے اختیار نہیں کیے تھے اور اصولوں کی جنگ میں کود گیا تھا۔ پھر میں نے دلاور کو ایک شکاری کے روپ میں دیکھا تھا اور اس کے ذہن کی عیاری، معاملہ فہمی، دور اندیشی، حالات کے نشیب و فراز سے متاثر ہوئے بغیر پُرسکون رہنے کی صلاحیت اور شاطرانہ فطانت کا اعتراف کیا تھا۔ اس کا پیشہ اخلاقی اور قانونی اعتبار سے مجرمانہ تھا لیکن اس کاروبار کے تمام داؤ پیچ اور جوڑ توڑ، خطرات سے نمٹنے کے طریقے، راستوں کی رکاوٹوں کو صاف کرنے کے گُر، خود کو محفوظ رکھتے ہوئے پیچھے سے وار، حریف تمام دشمنوں سے مقابلے کا حوصلہ اور بلا کا اعتماد... تمام مرحلوں سے خیر و عافیت گزر جانے کی صلاحیت۔ یہ سب چوہدری دلاور کے دماغ کا ہی کام تھا۔ اس راستے کو غلط کہا جا سکتا تھا جس پر وہ چل رہا تھا مگر اس کے قدم کسی تذبذب کے بغیر آگے بڑھتے تھے تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ذہنی طور پر وہ شکوک و شبہات اور اندیشوں کے جال میں گرفتار نہیں ہوتا تھا۔ اس کی سوچ بالکل واضح رہتی تھی۔ اس کا یقین و اعتماد اور اس کی قوتِ فیصلہ و قوتِ عمل سب قابلِ رشک تھے تو صرف اس لیے کہ اس کو خدا نے بہترین دماغ عطا کیا تھا۔ یہ اس کی بدبختی تھی کہ اس دماغ کی توانائی کا رخ اس نے تخریب کی جانب موڑ دیا۔ چوہدری دلاور کبھی وہ ذہنی یا نفسیاتی مریض نہیں ہو سکتا تھا جو ڈاکٹر لطیف سے رجوع کرنے پر مجبور ہو۔ اس کے تصور میں کوئی الجھن اور کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ دنیا کے تین ہزار مذاہب پر راسخ اعتقاد رکھنے والے دل اور دماغ کی یکسوئی کے ساتھ اپنے عقائد کو مصائب سے نجات اور روح کے سکون کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے یقین میں صرف جذبات کی شمولیت کی بھی تائید شامل ہوتی ہے۔ پھر بھی ایک مذہب کا ماننے والا یہ کہے کہ دوسرے مذاہب کی تعلیمات اور نظریات کو ماننے والے نفسیاتی مریض ہیں تو یہ غلط ہوگا۔ ذہن ایک مجرم بھی ہو سکتا ہے اور معمار بھی۔ دنیا میں تعمیری قوت اور تخریبی عناصر کے درمیان ازل سے جو برابر کی جنگ چل رہی ہے وہ ابد تک جاری رہے گی۔

گھر میں داخل ہونے سے قبل مجھے ایک فضول سا خیال یہ بھی آیا کہ کیا ڈاکٹر لطیف اور دلاور کے درمیان کوئی کاروباری تعلق بھی ہو سکتا ہے؟ اس کاروبار میں قانون کے محافظ اس کے ساتھ تھے۔ جعلی پیر اس کے سرپرست تھے جن کی روحانی قوت کے سامنے سادہ دل مرید سر جھکا دیتے تھے۔ سابق نواب خسرو جتوئی کا دل و جان اس کے ساتھ تھا تو پھر ایک ڈاکٹر بھی اس کا ساتھی بن سکتا ہے مگر اس خیال پر مجھے خود ہی شرم آئی۔ بے شک میں نے انسانیت کش ڈاکٹر بھی دیکھے تھے جو پیسے کی خاطر اپنے پیشے کی آبرو بیچتے تھے مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھی اور ڈاکٹر لطیف تو ان لوگوں میں سے تھے جو انسان کے روپ میں فرشتہ ہوتے ہیں۔ [illegible] اپنا ایمان بیچتے ہیں تو [illegible] ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر لطیف کو [illegible] کہ چوہدری دلاور خرید سکتے ہیں، نہ اپنی طاقت سے سرنگوں کر سکتے ہیں اور نہ اپنے مقصد سے ہٹا سکتے ہیں۔ وہ مقصد ہے دکھی انسانوں کے جسم و جان کی شفا اور ان کی روح کے ناسوروں کے لیے دوا کرنا۔ انھوں نے اپنا تمام وقت، ساری توانائی، سب صلاحیت اور خدا کی دی ہوئی استطاعت کے ساتھ اپنے آپ کو بھی اسی مقصد کے لیے وقف کر دیا ہے۔ انھیں مال و زر سے کیا۔ نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا

www.paksociety.com

ہے۔ کہاں دلاور کا بیٹا، کہاں ڈاکٹر لطیف کا بیٹا۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک! معلوم نہیں ان کے بارے میں اتنا گھٹیا خیال میرے ذہن میں آیا کیوں۔ شاید اس لیے کہ سانپ کا ڈسا رسّی سے بھی ڈرتا ہے۔ مجھے تو رسّی بھی پھانسی کا پھندا نظر آتی تھی۔ میں سانپ اور رسّی دونوں سے ڈرنے لگا تھا۔ حسب عادت غالب ہوا ہوا تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی میری متفکر صورت اور پریشان حالی نے استاد ٹیڈی اور نازو کو مضطرب کر دیا۔ "کیا ہوا سکندر بادشاہ۔ کیا خبر لائے ہو؟" ٹیڈی نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے میرا چہرہ اوپر اٹھایا۔ "شکل پر ابھی سے بارہ بج گئے ہیں۔"

"خبر اچھی نہیں ہے استاد۔" میں نے ماتھے پہ ہاتھ پھیر کر کہا اور بیڈ پہ نیم دراز ہو گیا۔ "محسن اور شہلا تو وہاں پہنچے ہی نہیں۔"

"کہاں؟ ڈاکٹر لطیف کے گھر؟"

"ہاں۔ گئے تو وہیں تھے۔" نازو نے کہا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آئی بات۔"

"اس سے بھی زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ چوہدری دلاور اس وقت ڈاکٹر لطیف کے گھر میں ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا؟" استاد ٹیڈی یوں اچھلا جیسے میں نے اس کے سر پر پٹاخہ پھوڑ دیا ہو۔ "چوہدری دلاور۔ کیا کہہ رہے ہو سکندر بادشاہ؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہ ڈاکٹر لطیف کے کلینک میں موجود ہے اور محسن یا شہلا کی کوئی خبر نہیں کہ وہ اندر ہیں یا نہیں ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" نازو نے کہا۔

"میں نے فون کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "خود ڈاکٹر لطیف کی بیگم نے مجھے یہ بات بتائی ہے۔"

"وہ جانتی ہیں دلاور کو؟" ٹیڈی نے کہا۔

"ہاں۔ ان کی بات سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ میں کیسے پوچھ سکتا تھا کہ دلاور وہاں کیوں آیا ہے۔"

"تیرا کیا خیال ہے؟"

"میرا کوئی خیال نہیں۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ "اس کے ہزاروں اسباب ہو سکتے ہیں۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا کہ چوہدری دلاور خود اپنے کیس میں طبی مشورے کے لیے گیا ہو گا۔ نہ وہ پہلے نفسیاتی مریض تھا اور نہ اب ہو سکتا ہے۔ اس کے اعصاب فولاد کے بنے ہوئے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ اسے بھی اپنے خاندان کے کسی فرد کے سلسلے میں مشورہ لینا ہو۔" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس عرصے میں دلاور کی بیوی کے اعصاب مسلسل دباؤ اور کشیدگی کے باعث جواب دے گئے ہوں۔ وہ میرے خیال کے مطابق ایک عام قسم کی گھریلو عورت ہے۔" استاد ٹیڈی کہنے لگا۔ "ورنہ وہ کہیں تو دلاور کے ساتھ نظر آتی اور دلاور کی معرکہ آرائی میں برابر کی شریک ہوتی مگر اس کا تو نام بھی سننے میں نہیں آیا۔ ہم نے شاید صرف ایک بار اسے دیکھا ہے۔ جب ہم ایک لاش کا تحفہ لے کر دلاور کے گھر گئے تھے۔"

"تمہارا خیال درست ہو سکتا ہے۔" نازو نے اس کی تائید کی۔ "دلاور کتنا بھی پرسکون رہتا ہو اور باہر کے معاملات کو گھر سے دور رکھنے کی بھی کوشش کرتا ہو مگر یہ ناممکن ہے کہ اس قسم کے حالات سے گھر کی فضا متاثر نہ ہو۔ بیوی جاہل ہو یا بہت پڑھی لکھی، اپنے شوہر کی صورت دیکھ کر اس کی ذہنی پریشانی اور اس کے مسائل کا اندازہ کرنے کی قدرتی اور فطری صلاحیت رکھتی ہے۔ کچھ عرصہ شوہر اپنی اداکاری سے سب خیریت ہے کا ڈراما چلا سکتے ہیں مگر پھر چھوٹی چھوٹی باتیں سب راز کھولنے لگتی ہیں۔"

"ایسے بول رہی ہے جیسے تجھے بڑا تجربہ ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"واہ۔ تجربہ ہی سب کچھ ہے کیا۔ مشاہدہ کچھ نہیں؟" نازو نے ٹیڈی کے طنز کا فوراً موثر جواب دیا۔ "آدمی بہت کچھ سنتا ہے۔ پڑھتا ہے۔"

"آدمی کی بات اور ہے۔ تو ابھی عورت کہاں، لڑکی ہے۔"

"مجھے صرف لڑکی سمجھنے والے غلط فہمی میں مارے جاتے ہیں۔" نازو نے غرور آمیز رعونت سے کہا۔ "کیا میں نے غلط کہا تھا سکندر؟"

"اسے کیا معلوم۔ اس کی ابھی تک ایک بھی بیوی نہیں۔"

"اچھا شہلا آئے تو اس سے پوچھ لینا۔" نازو نے چڑ کر کہا۔ اسے چڑانا ہی استاد ٹیڈی کا مقصد تھا۔

"وہ اپنے میاں کے ساتھ بھاگ گئی۔" ٹیڈی نے کہا۔ "ناک کٹوا دی ہماری۔"

ایسے سنگین حالات میں بھی یہ بات سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔

"خدا کا شکر ہے کہ شکل سیدھی ہوئی۔" ٹیڈی بولا۔ "پریشانی اپنی جگہ مگر رونے سے کیا ہو گا۔ عقل بھی کام نہیں کرے گی۔"

"یہ تم نے ٹھیک کہا استاد۔" میں نے کہا۔ "اس وقت عقل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے مگر سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں؟"

"محسن اور شہلا کی واپسی کا انتظار۔" ٹیڈی بولا۔

"انتظار آخر کب تک۔ ڈھائی گھنٹے میں وہ دو بار جا کے آ سکتے تھے۔ چھ سات میل کا فاصلہ طے کرنے کے لیے آدھا گھنٹا...؟" میں نے کہا۔

"بشرطیکہ باہر نکلتے ہی سواری مل جائے۔ وہ پیدل تھے۔" ٹیڈی نے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے مطمئن اور پُرسکون رکھنے

کے لیے اس قسم کے دلائل کا سہارا لے رہا ہے۔ اس کی یہ مخلصانہ کوشش میرے ذہن کو انتشار سے بچانے کے لیے تھی مگر بے سود تھی۔ جو مجھے میرے اندیشوں کو یقین میں بدل رہا تھا اور محسن کی واپسی میں جتنی دیر ہو رہی تھی اتنا ہی میرا یہ احساس شدت اختیار کر رہا تھا کہ مجھے ہاتھ پہ ہاتھ رکھے نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔ مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ اپنے لیے۔ رابعہ کے لیے۔ محسن اور شہلا کے لیے۔ مگر کیا؟ اس کا ابھی تک میرے ذہن میں کوئی جواب نہ تھا۔

"آخر ہم کب تک صرف سوچتے رہیں گے؟" میں نے کہا "کہ یہ ہوا ہو گا اور وہ ہوا ہو گا۔ خود ہم کچھ نہیں کریں گے۔"

"کریں گے کیوں نہیں سکندر بادشاہ۔" استاد ٹیڈی کہنے لگا۔ "تم ہو عملی آدمی۔ ہم سے جو بھی بن پڑا کر ہی لیں گے۔"

"مگر کب... سوچو ذرا استاد کہ تین گھنٹے ہونے کو ہیں۔"

"ابھی ہوئے تو نہیں ہیں۔" استاد ٹیڈی نے نازو کی طرف دیکھا۔ "بس تھوڑی دیر اور دیکھ لیتے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد تین گھنٹے پورے ہو جائیں گے۔"

"مجھے بتاؤ کہ تین گھنٹے بعد ہم کیا کریں گے؟" میں نے طنز اور تلخی کے ساتھ کہا۔ "بھنگیوں کی توپ سے کربلی جنگ۔ بھاگتے ہوئے کوچ کریں گے اور کشتوں کے پشتے لگا دیں گے؟"

"تین گھنٹے بعد میں جاؤں گی مورچے میں۔" نازو نے یکایک کہا۔ "مجھے کوئی وہاں نہیں پہچانتا۔ جو میرا راستہ روکے گا میں اس کی چڑی پپل ایک کر دوں گی۔ محسن اور شہلا اندر ہوئے تو انہیں بھی نکال لاؤں گی ورنہ رابعہ کو اٹھا لاؤں گی۔ وہ اچھی ہے یا بُری، رہے گی یہاں۔"

"تم نے تو فرض کر لیا ہے کہ تمہارا راستہ روکنے والا کوئی نہیں ہو گا اور جو ہو گا تو خالی ہاتھ ہو گا۔" میں نے کہا۔ "چوہدری دلاور تو سوتے وقت بھی مسلح رہتا ہے اور خواب میں بھی اسلحہ ساتھ لے کر پھرتا ہے۔ تم اس کی چڑی پپل کیا ایک کرو گی، وہ تمہاری پسلیوں کے اندرون کو چھلنی کر دے گا۔"

"تم نے خواہ مخواہ فرض کر لیا ہے کہ چوہدری دلاور کا ڈاکٹر لطیف کے گھر جانا ہمارے معاملات سے کوئی تعلق رکھتا ہے۔" نازو نے خفگی سے کہا۔

"امکانات کو نظرانداز مت کرو نازو۔" میں نے کہا۔ "ذرا سوچو کہ رابعہ کتنے دن سے وہاں ہے۔ ڈاکٹر لطیف کوئی غیر معروف شخصیت نہیں ہیں اور ان کے علاوہ احباب ہیں، مریض ہیں۔ ملنے جلنے والوں میں نہ جانے کتنے وکیل بھی ہوں گے۔ سب وکیل رابعہ کو پہچانتے ہیں۔ سو فیصد نہ سہی... تو اسی فیصد ہوں گے۔ وہ بھی بہت شہرت یافتہ وکیل تھی۔ اس کی وجہ شہرت کا ایک سبب تو یہی تھا کہ خواتین وکلا کی تعداد محدود ہے۔ گنتی کی چند عورتیں پریکٹس کرتی تھیں اور ہائی کورٹ کی ایڈووکیٹ خواتین تو دو چار ہی تھیں۔ پھر رابعہ کی ذہانت اور اس کی وہ صورت جو ایک بار دیکھنے والا آسانی سے بھلا نہیں سکتا۔ بعد کے واقعات نے اسے مزید شہرت دی۔ اب اگر کسی وکیل نے اسے ڈاکٹر لطیف کے گھر میں دیکھ لیا ہو گا تو فوراً پہچان لیا ہو گا اور ایک وکیل سے یہ بات بار ایسوسی ایشن کے تمام ارکان تک پہنچ سکتی ہے۔ چوہدری دلاور کے بھی وکیل رہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ... چوہدری دلاور وہاں رابعہ کی وجہ سے گیا ہو گا؟" استاد ٹیڈی نے تشویش سے کہا۔

"اگر ایسا ہی ہے تو ڈاکٹر لطیف خواہ مخواہ مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔" میں نے کہا۔ "دلاور ان کے لیے خطرہ بن جائے گا۔"

"میرا اندازہ ہے کہ دلاور وہاں رابعہ کی وجہ سے نہیں گیا۔" نازو نے سوچ کر کہا۔ "وہ بہت چالاک اور مکار آدمی ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ رابعہ اس گھر میں موجود ہے تو وہ اپنے شکاری باہر بٹھا دیتا۔ اس یقین کے ساتھ کہ جہاں رابعہ ہو گی وہاں تم ضرور جاؤ گے۔ یہ تو کوئی احمق ہی کر سکتا ہے کہ منہ اٹھا کے اندر گھس جائے اور رابعہ کو یا ڈاکٹر لطیف کو ڈرانے دھمکانے لگے کہ سکندر کا پتا بتاؤ۔"

نازو کی بات اتنی مدلل تھی کہ میں فوراً قائل ہو گیا۔ اس سے مجھے کچھ سکون ملا۔ پھر بھی ایک بے نام سی بے کلی اور خلش باقی رہی جس کا علاج کوئی نہ تھا۔ نازو نے اور ٹیڈی نے سوچے سمجھے بغیر تین گھنٹے گزر جانے کے بعد کچھ نہ کچھ کرنے کا اعلان تو کر دیا تھا جس میں صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ یہ خود ان پر واضح نہیں تھا کہ اسی وقت سے کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دیا گیا تو زیرو آور پہ کیا ہو گا۔ پندرہ منٹ کے بعد دس منٹ۔ پانچ منٹ۔ چار... تین۔ دو۔ ایک۔ پھر سیکنڈ۔ ساٹھ پچاس... دس۔ نو۔ آٹھ سات... چھ... پانچ چار۔ تین دو۔ ایک۔ زیرو۔ زیرو کے بعد؟ زیرو کے بعد تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ صرف زیرو ہوتا ہے۔ زیرو لامحدود ہے۔ خلا کی طرح۔ حیات بعد الموت کی طرح... دشت امکاں کی طرح...

ابھی پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی اور بیک وقت ہم سب اچھل پڑے جو اپنے اپنے خیالات کے ڈراؤنے جنگل میں الگ الگ بھٹک رہے تھے۔ میں نے ٹیڈی کو دوسرے کمرے میں روپوش ہونے کا اور نازو کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ احتیاط کے ان تقاضوں پر عمل کرنا اب ہماری عادت سی ہو گئی تھی۔ خدانخواستہ اندر آنے والا کوئی اجنبی یا شکاری ہوتا تو ہمیں بالکل تیار پاتا۔ سامنے میں آتا اور مجھے ٹیڈی کا تحفظ حاصل ہوتا جو سامنے نہیں تھا۔ نازو ایک طرح کی گائیڈ فورس تھی جو ہنگامی صورت حالات میں غیر متوقع طور پر حملہ کرنے کی

www.paksociety.com

اہل تھی اور یقینی ناکامی کو کامیابی میں بدل سکتی تھی۔ اس وقت ہم سب محسن اور شہلا کی واپسی کے انتظار میں تھے لیکن ایک غلط بات یہ ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر لطیف کے گھر میں چوہدری دلاور پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ رابعہ کا پتا چلا سکتا تھا مگر یہ بھی عین ممکن تھا کہ اسے محسن اور شہلا نظر آ جاتے اور وہ ان کا خاموشی سے پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ پہنچے۔ یا اللہ پر کسی طرح اپنے شکاری کتوں کی مدد سے قابو پالے اور انھیں زبردستی یہاں تک لے آئے۔ محسن اور شہلا سے دباؤ کے سامنے آسانی سے سر جھکانے کی مجھے توقع نہیں تھی لیکن شادی کا بندھن ان کے درمیان ایک ایسی کمزوری بن گیا تھا جس سے شکاری فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ خدانخواستہ یہ میرے ساتھ ہوتا کہ مجھے محسن کی جان خطرے میں نظر آتی تو میں شہلا کے سہاگ کو بچانے کے لیے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوتا۔ باقی سب کا بھی یہی تھا کہ محسن اور شہلا کی ازدواجی زندگی جس کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا سب کو عزیز تھی۔ خود محسن یا شہلا کو اس کمزوری سے مبرا کیسے سمجھا جا سکتا تھا جو میاں بیوی تھے۔ بیوی کو بچانے کے لیے محسن اور شوہر کی زندگی کے لیے شہلا اگر ہمیں گرفتار کرانے کی شرط بھی منظور کر لیتے تو ہم شکوہ نہ کرتے۔ ہر آدمی بالآخر خود اپنی ہی کسی کمزوری کے جال میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اس کی کمزوری ایک ناگزیر مجبوری بن جاتی ہے۔

رات بکھر جانے والا غالب اب سو رہا تھا۔ ہم نے اسے سونے دیا اور دروازے کے قریب کھڑا دوسری دستک کا منتظر رہا اور باہر کھڑے ہوئے محسن اور شہلا یہ بات جانتے تھے چنانچہ محسن نے اپنی آواز میں کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ہم نے دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں میاں بیوی شاید باہمی صلاح مشورے سے طے کر آئے تھے کہ انھیں بہت زیادہ مایوس اور پریشان نہیں دکھائی دینا چاہیے چنانچہ اندر آتے ہی محسن نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"سکندر اعظم کیوں رو رہا ہے؟" محسن بولا۔ "اور کیسے [illegible]"

میں نے دروازہ بند کر دیا اور پلٹ کر محسن کی طرف دیکھا۔

"تم دونوں ڈاکٹر لطیف کے گھر نہیں گئے۔ پھر واپسی میں اتنی دیر کیوں کی؟"

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" محسن ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"وہاں چوہدری دلاور پہنچا ہوا تھا نا؟" میں نے کہا۔

"تمھیں کیسے معلوم؟" محسن نے اسی لہجے میں کہا۔

"فون کیا تھا میں نے۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "بیگم لطیف سے بات ہوئی تھی۔"

"وہ یار... بڑی عجیب سی بات ہو گئی۔" محسن کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "ہنسی کی بات ہے کہ پہلے تو میں گھبرا گیا تھا کہ اس وقت چوہدری دلاور کا یہاں کیا کام؟"

"تو نے کیا اسے باہر ہی دیکھ لیا تھا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس وقت میں اور شہلا اندر پہنچ چکے تھے۔" محسن بولا۔ "بس قسمت اچھی تھی کہ ڈاکٹر لطیف کو صبح ہی ایئرپورٹ جانا پڑا کسی دوست کو چھوڑنے کے لیے۔ وہ اس وقت تک واپس نہیں آئے تھے لیکن کہہ گئے تھے کہ سکندر آئے تو اسے رابعہ سے ملوا دینا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ رابعہ سے کہہ چکے تھے کہ میں آؤں گا؟" میں نے سخت دل شکستہ لہجے میں کہا۔

"ہاں یار... انھیں صبح ساڑھے چھ بجے ہی جانا پڑ گیا۔ وقت بھی طے نہیں تھا چنانچہ دوست نے انھیں فون کر دیا اور وہ گاڑی لے کر نکل گئے۔ رابعہ جاگ رہی تھی ماں سے باتیں شروع کر دیں اور ڈاکٹر لطیف نے اس کا موڈ اپ کرنے کے لیے بتایا کہ سکندر نو بجے تمھیں لینے آئے گا۔ بے وقوف لڑکی پھر تو مانو گی کہ اسے کچھ نہیں ہوا۔ وہ سب تھا جس سے دماغ کا فتور تھا۔ یہ بات مجھے بیگم لطیف نے بتائی ہیں۔"

"اور... رابعہ پر کیا اثر ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے کہ اچھا اثر ہوا تھا۔" محسن بولا۔ "یوں کہنا چاہیے جیسے وہ سوتے سوتے اچانک بیدار ہو گئی ہو۔ نہ جانے کیوں اس نے ڈاکٹر لطیف کی بات کو جھوٹ نہیں کہا۔ جیسے کہ وہ کہتی تھی اور ان کی تردید بھی نہیں کی۔ وہ کچھ مضطرب اور بے چین نظر آنے لگی اور ڈاکٹر لطیف کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ ساڑھے آٹھ بجے بیگم لطیف نے اسے دیکھا... تو وہ بالکل تیار تھی۔ میک اپ وغیرہ سے فارغ ہو گئی تھی اور اس نے لباس..."

"محسن..." شہلا نے اسے گھور کے تنبیہ کی۔

"اس نے وہی ساڑی باندھی تھی۔ نیلی... جس پر زرد پھول ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں... مجھے بہت افسوس ہے یار..." محسن نے کہا۔ "تمھیں یقیناً بہت مایوسی ہوئی ہو گی۔"

"مایوسی تو پہلے بھی ہوتی رہی ہے۔ لیکن اب کے لفظوں میں کچھ اشارہ جدا۔ نہ جانے یہ مایوسی کیا گل کھلائے۔" میں نے زخمی دل کی تڑپ کو الفاظ دے کر کہا۔ "کون جانے وہ کب تک [illegible] نکل جائے۔ اتنے قریب آ کے..."

"قسمت اچھی تھی کہ ہم جس کمرے میں بیٹھا تھا اس کے بالکل سامنے بہت بڑی کھڑکی تھی۔" محسن بولا۔ "پٹ بند تھے مگر پردے ہٹے ہوئے تھے اور میں شیشے سے باہر دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اچانک ایک گاڑی کو اندر آتے دیکھ لیا اور وِنڈ اسکرین کے پیچھے

مجھے چوہدری دلاور کی صورت نظر آ گئی۔ چند سیکنڈ کے لیے تو میں منجمد ہو گیا تھا اور میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ اس کا آنا کسی بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ہے اور ہم محصور ہو چکے ہیں۔ پھر میں نے بیگم لطیف سے پوچھا کہ یہ شخص کون ہے اور انھوں نے کھڑکی سے گاڑی کو دیکھا تو لاعلمی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ ڈاکٹر لطیف کے سب مریضوں سے واقف نہیں ہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ یہ چوہدری دلاور ہے جو ایک بہت خطرناک آدمی ہے۔ میری حالت کے تغیر نے ان کو پہلے ہی حیران کر رکھا تھا۔ میری بات سن کے انھیں مزید حیران کیا۔ میں نے کہا کہ زیادہ لمبی بات کا وقت نہیں ہے۔ یہ رابعہ کا ایک خاندانی دشمن ہے۔ اس کے والد کی موت۔ پھر والدہ کی موت اور اس کے گھر کی تباہی میں بہت حد تک اسی شخص کا ہاتھ تھا چنانچہ آپ اسے رابعہ کی یہاں موجودگی کا بالکل پتا نہ چلنے دیں اور نہ ہمارے یہاں آنے کا۔ ورنہ وہ چالاک آدمی ہے۔ یہ نتیجہ اخذ کر لے گا کہ ہم رابعہ کی وجہ سے یہاں آتے ہیں۔ نوکر نے دلاور کو ڈرائنگ روم میں نہیں بلایا بلکہ کلینک میں بٹھا دیا۔"

"اس وقت رابعہ کہاں تھی؟" میں نے کہا۔

"رابعہ اوپر اپنے کمرے میں تھی اور تیرا انتظار کر رہی تھی۔" محسن نے کہا۔

"تجھے اس سے مل لینا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا تھا کہ وہ تجھے اور شہلا کو پہچان جاتی اور اگر تم میرے نہ آنے کی وجہ بتاتے تو مان بھی جاتی۔"

"تم نے یہی کہا تھا یاد ہے؟" محسن بولا۔

"مگر میں نے کہا تھا۔ خود تمھاری عقل میں نہیں آئی تھی یہ بات۔" شہلا بولی۔

"اچھا بابا۔ اب روایتی بیویوں کی طرح ہر جگہ شوہر کو احمق اور خود کو عقل کل ثابت کرتی پھرو۔" محسن نے جھنجلا کے کہا۔ "جب ہم ایک ساتھ اور ایک ہی مشن پر گئے تھے تو یہ ٹیم ورک تھا۔ ایک بات کا کریڈٹ میں لوں اور دوسری کا تم تو کیا فائدہ دونوں کا؟"

"تم بھی شوہروں کی طرح زبردستی اپنی بات منواؤ۔ عقل کی ایک بات میں نے کی تھی تو مان لو کہ بیویاں بھی بالکل ناقص العقل نہیں ہوتیں۔" شہلا بولی۔

"مجھے بتاؤ کہ رابعہ سے مل کے کیا ہوا؟" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"رابعہ سے ملنا اچھا ہوا۔" محسن بولا۔ "وہ پہلے تو شش و پنج کا شکار ہو گئی مگر کہنے لگی کہ دونوں سے ملاقات ہو چکی ہے لیکن یاد نہیں آتا کہ کہاں۔ میں نے کہا کہ سکندر کے ساتھ اکثر ملاقات ہوئی تھی۔ وہ کہنے لگی کہ سکندر آنے ہی والا ہے۔ عجیب سی اجنبیت تھی ہمارے لیے مگر تمھارا نام لیتے ہی جیسے اس کا لہجہ اور اس کا رویہ بالکل بدل گیا تھا۔"

"میں تو اس کی صورت دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کے سامنے جذبات کی روشنی اس کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔" شہلا نے کہا۔

"اسی وقت میں نے بتایا کہ سکندر نہیں آ سکے گا اور میرے الفاظ کا رد عمل اتنا شدید ہوا کہ میں تو ڈر گیا تھا۔" محسن بولا۔ "اس کی صورت ایک دم بجھ گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے لائٹ کے ساتھ ہی ٹی وی کا زندہ متحرک تصویر دل والا اور روشن اسکرین بے جان اور تاریک ہو جائے۔ پھر شہلا نے اسے سمجھایا کہ موقع ملتے ہی سکندر آئے گا مگر اس نے نہیں مانی۔ وہ اسی طرح سر ہلاتی رہی کہ نہیں۔ سب مجھے بے وقوف بنانے آتے ہیں۔ مجھ سے جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ کیسے آ سکتا ہے؟"

"کوشش میں نے بھی کی تھی کہ اسے تمھارے بخیر و عافیت ہونے کا یقین دلا سکوں لیکن اس کے ذہن کے سامنے وہ دروازے جو صبح سے تمھارے انتظار میں کھلے ہوئے تھے یکلخت بند ہو گئے تھے۔" شہلا نے کہا۔

فیض کی ایک نظم صدائے بازگشت بن گئی۔

ڈھل گئی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔

مگر میں آؤں گا۔ ایک دن اپنے خواب پلکوں کی چلمن اٹھا کے میں تمھاری آنکھوں میں جھانک کر کہوں گا کہ دیکھو، میں وہی سکندر ہوں۔ میں تمھارا بھولا ہوا خواب ہوں۔ یادوں کا نقش رہگزر ہوں۔ میں اس وقت کا عکس ہوں جو تمھارا اور میرا تھا اور کسی جگنو کی طرح تمھاری مٹھی سے نکل کر اڑ گیا تھا۔ میں ان گنت فروزاں لمحوں کے جگنو سمیٹ کر تمھاری مانگ میں افشاں کی طرح سجانے لوٹ آیا ہوں اور تب تم دیکھو گی کہ میری آنکھوں میں تمھارا تصور ہے اور مجھ جیسا کون اور کون ہو سکتا ہے جو تمھاری تصویر نگاہوں میں سجائے ہجر کی صدیوں کا سفر کرے اور کسی تھکن کو قریب نہ آنے دے مگر میرے آنے تک انتظار کرنا۔ اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو مگر ان کواڑوں کے پیچھے امید اور انتظار کا سورج روشن رکھو۔

www.paksociety.com

"تم میری بات نہیں سن رہے تھے۔" محسن نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں...!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "نہیں... میں سب سن رہا تھا۔"

محسن نے میرے جھوٹ کو معاف کر دیا یا سچ مان لیا۔ "میں نے رابعہ سے کہا کہ اس وقت چوہدری دلاور یہاں بیٹھا ہوا ہے تم خود ہی سوچو کہ سکندر کیسے آتا۔ چوہدری دلاور کے نام پر وہ کچھ خوف زدہ نظر آنے لگی تھی لیکن پھر وہ ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ تم سمجھتے ہو میں پاگل ہوں۔ یہاں چوہدری دلاور کا کیا کام؟ میں نے کہا کہ تم چاہو تو دیکھ لو۔ نیچے اس کی گاڑی کھڑی ہے یا نہیں۔ اس نے نیچے جھانکا اور بولی کہ جھوٹ کی بھی حد ہوتی ہے۔ یہ اس کی گاڑی نہیں ہے۔"

"تو کیا وہ گاڑی دلاور کی نہیں تھی؟" میں نے کہا۔

"گاڑی اسی کی تھی۔" محسن بولا۔ "مگر وہ پہلے والی گاڑی نہیں تھی۔ اس نے اتنے عرصے میں گاڑی بدل لی ہے۔ میں نے بھی براہ راست اس کو ونڈ اسکرین کے پیچھے دیکھ لیا تھا ورنہ گاڑی دیکھ کر تو میں بھی کچھ نہ سمجھتا۔ یہ میری بھول تھی یا بدقسمتی۔ دلاور نے گاڑی نہ بدلی ہوتی تو شاید رابعہ کے حق میں اچھا ہوتا۔ اس کے ذہن میں پرانی گاڑی تھی اور اسے یقیناً یاد تھا کہ چوہدری دلاور تمہارا دشمن تھا کیوں دشمن تھا' یہ بات ممکن ہے اسے پوری تفصیل کے ساتھ یاد نہ ہو۔ رابعہ کے ذہن میں پرانی گاڑی کا تصور تھا۔ نئی گاڑی دیکھتے ہی اس کا میری بات پر سے اعتبار بالکل اٹھ گیا۔ وہ ایک دم بگڑ گئی اور چلانے لگی۔ مجھ پر اور شہلا پر خفا ہونے لگی کہ تم دونوں جھوٹے اور دھوکے باز ہو۔ سازشی ہو کیا پتا نہیں کون ہو۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ میں تمہیں نہیں جانتی میری اور شہلا کی سب منت سماجت رائگاں گئی۔ اس نے ہماری ایک نہیں سنی۔ اس وقت یہ ہو سکتا تھا کہ میں رابعہ کو نیچے لے جاتا اور کسی طرح اس کو موقع فراہم کرتا کہ وہ دلاور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے مگر ایک تو گاڑی والی بات غلط ہو گئی پھر اس کی آواز پر بیگم لطیف آ گئیں۔ انھوں نے پریشان ہو کر ہم دونوں کو کمرے سے باہر بلا لیا۔ وہ ڈر رہی تھیں کہ کہیں رابعہ پر ہسٹریا کا شدید دورہ نہ پڑ جائے۔ ڈاکٹر لطیف بھی آنے ہی والے تھے۔ ان کا موڈ یکدم بگڑ جاتا کہ سکندر کیوں نہیں آیا اور رابعہ سے ہم نے کیا کہہ دیا ہے کہ ان کے تمام کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ ہم رابعہ کو چھوڑ کر نیچے ڈرائنگ روم میں آ گئے اور بیگم لطیف نے کسی طرح رابعہ کو خاموش کر لیا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا محسن۔ بہت ہی برا ہوا!" میں نے کہا۔

"برا تو ہوا لیکن سب برا نہیں ہوا۔" محسن بولا۔ "کچھ اچھا بھی ہوا۔"

"اس میں کون سا پہلو نکلتا ہے اچھائی کا؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ایک بات ہمارے خلاف گئی تو ایک حق میں بھی رہی۔" محسن نے کہا۔ "ہم نیچے آ کر بیٹھے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی اور مجھے ریسیور اٹھانا پڑا۔ میں نے صرف ہیلو ہی کہا تھا کہ دوسری طرف سے کوئی پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔ "میں سب انسپکٹر [illegible] ہوں۔ مجھے ڈاکٹر لطیف سے بات کرنا ہے۔"

میں ایک دم محتاط ہو گیا۔ "بول رہا ہوں۔" میں نے [illegible] "ذرا تحمل سے اور آہستہ بات کرو۔ میں بہرا نہیں ہوں۔"

اس لہجے اور رویے نے اسے احساس دلا دیا کہ وہ کسی عام آدمی سے نہیں ایک بہت بڑے ڈاکٹر سے مخاطب ہے۔ "آئی ایم سوری ڈاکٹر۔ کل رات آپ کے گھر کے قریب کسی [illegible] نے مجھے مارا۔ میں گشت پر تھا دو سپاہیوں کے ساتھ کہ مجھے ایک مشتبہ شخص نظر آیا۔ میں نے اسے روکا۔ پہلے تو اس نے آپ کا نام لیا۔"

"خود اس نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟" میں نے کہا۔

"غالباً... سلیم جوزف۔" وہ بولا۔ "اس نے کہا تھا کہ آپ اسے جانتے ہیں اور وہ اپنے کسی عزیز کو دیکھنے گیا تھا جو آپ کے گھر میں زیر علاج ہے۔"

"میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور انسپکٹر! یہ میرا گھر ہے' اسپتال نہیں۔ یہاں میں کسی کو زیر علاج نہیں رکھتا۔"

"لیکن اس نے آپ کا نام لیا تھا سر۔ آخر کیوں؟" وہ بولا۔

"اگر اس سڑک سے گزرنے والے ڈاکو میرا نام دیکھ جائیں اور بعد میں کہیں کہ ہم ڈاکٹر لطیف کے بھائی ہیں تو کیا اس سے ڈاکو میرے بھائی بند ہو جائیں گے انسپکٹر۔ تم کو عقل سے کام لینا چاہیے۔ یہاں ہر آوارہ کو دروازوں پر نیم پلیٹ نظر آتی ہے۔" میں نے خفگی سے کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں سر۔" وہ بولا۔ "مجھے معلوم تھا وہ آدمی ہے کوئی بعد میں پتا چلا اس نے اپنے بارے میں غلط بیانی کی تھی۔ سوری سر۔" [illegible] اس نے فون بند کر دیا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک بہت خطرناک مرحلہ حسن اتفاق سے دو منٹ میں بڑی آسانی سے گزر گیا تھا۔ اس وقت بیگم لطیف موجود ہوتیں یا خود ڈاکٹر لطیف ہوتے تو معاملہ گڑبڑ ہو جاتا۔ ان کے لیے ان کو سمجھانا بھی مشکل ہوتا اور انھیں جھوٹ بولنے پر [illegible] کرنا بھی۔ میں یہی سوچ کر پریشان تھا کہ ڈاکٹر لطیف نہ مانتے تو کیا ہوگا۔ وہ کرنا خدا کا کچھ ایسا ہوا کہ فون ریسیو بھی کیا تو کس نے؟ خود میں نے۔ جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا مگر بعض اوقات تقدیر بڑے عجیب انتظامات کرتی ہے اور ہونے والی بات ہو کے رہتی ہے۔ اس میں ایک سیکنڈ کے وقت کا فرق نہیں پڑتا۔ جتنی دیر میں بیگم لطیف اوپر سے آئیں' ڈاکٹر لطیف بھی آ گئے اور گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وہ سیدھے ڈرائنگ روم میں آئے۔ یہاں ہم کو دیکھ کر مایوس ہو گئے۔ ہم نے بتا دیا کہ ناگزیر وجوہ کی بنا پر سکندر نہیں آیا۔

"ناگزیر وجوہ...؟" وہ ایک دم بگڑ گئے۔ "کیا آسمان ٹوٹ پڑا تھا یا قیامت آ گئی تھی۔ اتنا سمجھا دیا تھا اس کو میں نے کہ اس کا آنا بے حد ضروری ہے۔ نہیں آ سکتا تھا تو بتا دیتا۔ میں رابعہ کو تیار نہ کرتا۔ اس سے بات ہی نہ کرتا کہ سکندر تو نیچے آئے گا۔ جیسے وہ ایک فریب خیال کا شکار تھی۔ اب اسے یقین ہو گا کہ جھوٹ ہم سب بولتے تھے۔ ہم اس کے لیے بالکل قابل اعتبار نہیں رہے کیونکہ ہم اس کے سچ کی نفی کرتے تھے اور ایک حقیقت کو جھٹلاتے تھے کہ سکندر خیر و عافیت اور زندہ سلامت ہے۔ اب تو خود سکندر کے لیے سامنے آ کر اپنے وجود کو حقیقی ثابت کرنا مشکل ہوگا۔ وہ سمجھے گی کہ پہلے بھی اس کی نظر کو دھوکا ہوا تھا اور وہ نظر کے فریب میں آ گئی تھی۔ دوسری بار اس کا ذہن پوری مزاحمت کرے گا۔ ناگزیر وجوہ۔ مائی فٹ! رات کے دو بجے تک وہ یہاں تھا۔ بے وقوف آدمی یہاں رک جاتا۔ خواہ مخواہ گیا۔ اب پیغام بھیج دیا کہ وہ تشریف نہیں لا سکتے۔ چند گھنٹوں میں ان کے لیے ناگزیر وجوہ پیدا ہو گئیں!" وہ اتنے برہم تھے کہ درمیان میں بول کر انھیں کچھ بتانے کی کوشش کرنا بے سود تھا۔ جب وہ خاموش ہوئے تو محسن نے آہستہ سے کہا کہ رات کو واپس جاتے ہوئے سکندر کو ایک معمولی سا حادثہ پیش آ گیا تھا۔ اس کا ردعمل دیکھنے والا تھا۔ ڈاکٹر لطیف کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ ایک دم پریشان نظر آنے لگے۔

"ایکسیڈنٹ؟ کس چیز سے... اور وہ ہے کہاں؟" انھوں نے کہا۔

"اسپتال میں نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے ایک جیپ ٹکرا کے نکل گئی تھی۔ وہ اس کا نمبر وغیرہ کچھ نہیں دیکھ سکا تھا۔ جیپ شاید گزر رہی تھی کہ وہ کنارے پر تھا چنانچہ اس کا مونڈھا جیپ کی باڈی سے لگا اور وہ گر گیا۔ دو چار دن میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔ فریکچر یا کوئی گہرا زخم نہیں ہے۔"

انھوں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "یہ سب بدقسمتی کی بات ہے۔ دو چار دن بعد اس کے آنے سے رابعہ کو کیا فائدہ ہوگا۔ وہ نقصان تو ہو گیا۔ اب نہ جانے کب تک رابعہ اس خود فراموشی کی کیفیت کا شکار رہے گی۔ میں تو بہت خوش اور پرامید تھا اس کی پیش رفت دیکھ کر۔ لیکن وہ آخری سیڑھی سے پھسل کر پھر نیچے گر جائے گی۔ معلوم نہیں دوبارہ اوپر پہنچے گی بھی یا نہیں۔ پھر اپنے آپ کو پانے کی خواہش بھی باقی رہے گی یا نہیں؟"

"یہ سب قدرت کے کھیل ہیں ڈاکٹر لطیف۔" میں نے کہا۔ "ہم سب اپنی طرف سے اچھا کرتے ہیں مگر برا ہو جاتا ہے۔ اب رات کو سکندر یہاں آنے کی حماقت نہ کرتا تو کچھ نہ ہوتا۔ مگر اس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ اس کے آنے پر خوش تھے اور آپ کا خیال تھا کہ اس نے ٹھیک کیا۔ آئندہ بھی ہم سب اور آپ مل کر رابعہ کے لیے کوشش کرتے رہیں گے۔ امید کا دامن تو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

"ہاں... اب اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہی امید تو آدمی کے لیے زندہ رہنے کی جدوجہد کا سبب بنتی ہے۔" وہ بولے۔ "اللہ مالک ہے رابعہ کا بھی۔ جو اس کے مقدر میں ہے وہ تو اس کو بھگتنا ہے۔" وہ جانے والے تھے کہ میں نے انھیں روک لیا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کے کلینک میں ایک شخص بیٹھا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ چوہدری دلاور۔ کیا بات ہے؟" وہ رک کر بولے۔

"آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟" میں نے کہا۔ جو ایک احمقانہ سوال تھا۔

"اسے تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میرا مطلب تھا کہ کیا وہ آپ کا مریض ہے؟"

"نہیں۔ اس کی بیوی کچھ عرصے سے میرے پاس زیر علاج ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "بیماری وہی ہے۔ ذہنی اور اعصابی کشیدگی۔ سبب وہ بتاتا نہیں۔ غلط بیانی کرتا ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اس طرح میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ وکیل اور ڈاکٹر کو حقائق کا علم ہونا چاہیے۔ ورنہ کیس بگڑ جاتا ہے۔ دوائیں اس وقت تک بے اثر رہیں گی جب تک بیماری کے اسباب دور نہیں ہو جاتے۔ بھئی ایک سیدھی سی بات ہے۔ تمہارا گلا اگر کھٹائی کھانے سے خراب ہے تو پہلے گھر سے یہ اچار چٹنی وغیرہ ہٹاؤ۔ کھٹائی کھانا چھوڑو۔ مگر یہ عجیب آدمی ہے۔ کہنے لگا کہ اسباب کو میں دور نہیں کر سکتا۔ اسے دور بھیج دیتا ہوں۔ جہاں اسباب نہ ہوں۔ اب دیکھتا ہوں کہ کیا بتانے آیا ہے۔"

اس وقت تک بیگم لطیف نیچے آ گئی تھیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ دلاور کے بارے میں خود کچھ نہ کہوں۔

www.paksociety.com

"میں نے بیگم لطیف سے کہہ دیا تھا۔" شمسہ بولی۔

"ہاں ہاں۔ میں سن رہا تھا۔" محسن بولا۔ "اور اسی لیے میں نے آگے بات نہیں کی۔ اجازت لی اور چلا آیا۔"

"فی الحال رابعہ کے لیے ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔" میں نے ایک تلخ حقیقت کو دل پر پتھر رکھ کے تسلیم کیا۔ "اور صرف رابعہ ہی ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔" استاد ٹیڈی نے فوراً کہا۔

"تمھارے مقدر میں صرف دکھ ہیں۔ محبت کی بات تم کیوں کرتے ہو؟" محسن نے کہا۔

یہ استاد ٹیڈی کی دکھتی رگ تھی۔ وہ تلملا کے رہ گیا۔

"تمھارے آنے سے پہلے میں اور نازو ایک بحث کر رہے تھے جس کا تعلق ایم آر ایس کے اگلے مشن سے ہے۔" میں نے کہا۔ "اس میں نازو کا مرکزی کردار ہے۔"

"ایک فلسفیانہ نکتہ ذہن میں آیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "کہ آدمی کی تمام جدوجہد میں مرکزی کردار پیٹ کا ہے جو اس وقت خالی ہے۔"

"اور پیٹ کا تعلق براہِ راست دماغ سے ہے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"تم بھرے ہوئے۔ تمھارے پاس ہے دماغ؟" محسن نے کہا۔

"ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" استاد ٹیڈی ایک دم اٹھا۔ "پہلے تمھارا سر توڑ کر دیکھتے ہیں کہ اس میں کیا ہے۔ ذرا ہتھوڑی لانا میری بہن۔"

"خبردار زوجہ محترمہ۔ آپ کو ہمارے سرِ عزیز کی قسم جو آپ نے اس کو توڑنے کا بندوبست کیا۔" محسن نے کہا۔

"میں جاتی ہوں کھانے کا انتظام کرنے۔" شمسہ ہنسنے لگی۔ "ورنہ تم دونوں ایک دوسرے کو کھا جاؤ گے۔"

"میں مسلمان ہوں۔ کم از کم سؤر نہیں کھاتا۔" ٹیڈی نے فوراً وار کیا۔

"سنا تم نے۔۔ کیا کہا گیا ہے تمھارے سرتاج کو۔" محسن چلایا۔ "اس وقت عاق کر دو اس بھائی کو ورنہ سوچ لو تم کیا کھلاؤ گی۔"

محسن اور نازو نے نامعقولیت کی اس محفل سے اٹھ جانا ہی بہتر سمجھا۔ سالے بہنوئی کی جنگ جس طرح شروع ہوئی تھی اسی طرح ختم بھی ہو گئی اور وقت گزارنے کے لیے انھوں نے ایک عجیب کھیل شروع کیا جس میں رشتوں کے الٹ پھیر کو سمجھ کے صحیح جواب نکالنا پڑتا تھا۔

"اب فرض کرو کہ تمھاری ممیا ساس کے پوتے سے میری سمدھن کے نواسے کا نکاح ہو جاتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تو وہ تمھارا کیا ہوئے؟"

"وہ تمھاری سمدھن ہے نہ میری ممیا ساس۔ دوسرا سوال کرو۔"

"سوال ہے فرض کرنے کا۔" محسن بولا۔ "میں نے فرض کیا تھا کہ تمھارے پاس عقل ہے۔ بھلا پوتے کا نواسے سے نکاح ہو سکتا ہے؟ بے عقل شخص۔ دونوں مذکر ہوں گے تو میرا تمھارا یہی جواب رہے گا۔" غالب کھانے کے وقت بھی ہوتا رہا۔ کھانے کے بعد میں نے اپنی تجویز پیش کی۔

"میرا خیال ہے کہ نازو کو ڈاکٹر فیصل کے گھر میں پہنچا دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "یہ کام نازو بہت اچھی طرح کر سکتی ہے۔"

"بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟" محسن بولا۔ "اس کو اندر چھوڑنے کون جائے گا اور جو جائے گا وہ واپس کیسے آئے گا۔"

"وہ خود اسے باہر پھینک دیں گے۔" ٹیڈی بولا۔ "اسے زیادہ پھر آ جائے گا۔"

"یار یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے سب سوچ لیا ہے کہ یہ سب کیسے ہوگا۔ نازو اس گھر کے اندر ایک ملازمہ بن کے رہ سکتی ہے۔ خود اندر پہنچ سکتی ہے۔ یہ بہت سخت، خطرناک اور مشکل کام ہے مگر میں نازو پر پورا بھروسا کرتا ہوں۔ کہنے کو یہ کام شمسہ بھی کر سکتی تھی لیکن وہ ایک کام نہیں کر سکتی۔ وہ خالی ہاتھ اپنی حفاظت نہیں کر سکتی۔"

"اور جو میری گھر والی کر سکتی ہے وہ نازو نہیں کر سکتی۔" محسن نے کہا۔ "خادمہ کو کھانا پکانا پڑتا ہے۔ جھاڑو دینا پڑتی ہے اور برتن مانجھنے پڑتے ہیں۔"

"خواہ مخواہ میرے خلاف غلط پروپیگنڈا مت کرو۔" نازو نے کہا۔ "تم سے کس نے کہا ہے کہ میں یہ کام نہیں کر سکتی؟"

"میں نے تو ہمیشہ تمھیں جب بھی دیکھا قتلِ عام کرتے دیکھا۔ اسے اٹھایا اُسے پٹخا، اس کی ٹانگ توڑ دی اس کی پسلی باہر کی۔" محسن بولا۔ "اب اس وقت جو ما حضر تناول فرمایا ہے سب حرام خوروں نے مثلاً یہ جو زردہ تھا۔۔"

"وہ تو نازو نے ہی پکایا تھا۔" شمسہ بولی۔ "ورنہ اتنی جلدی سب کیسے ہوتا؟"

"کیا واقعی کہ۔۔۔ خیر۔" محسن نے گڑبڑا کے کہا۔ "آپ کچھ فرما رہے تھے؟"

"جی۔ میں عرض کر رہا تھا کہ نازو اس گھر میں خادمہ کی حیثیت سے داخل ہو جائے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔" میں نے سلسلہ پھر جوڑا۔ "یہ کام ایک اچھی ایکٹریس کے لیے مشکل نہیں ہے اور نازو غالباً۔۔۔"

"غالباً۔۔ تمھارا مطلب ہے غالب کی وہ۔۔۔ خیر آگے کہو۔" محسن نے کہا۔

"پہلے میں تمھاری گرامر ٹھیک کر دوں۔" نازو جھپٹ کر اٹھی۔ محسن فرار ہونے کے لیے اٹھا پھر دونوں بیٹھ گئے۔

"نازو بہترین ایکٹریس ہے۔ جب بھی فلم بناؤں گا تو اسے ہیروئن لوں گا اور غالب کو ہیرو۔" محسن نے کہا۔ "مگر برادر! اصل سوال یہ ہے کہ ایک ایسی خادمہ کو جو اچھی اداکارہ بھی ہے ڈاکٹر فیصل قبول کرے گا؟ انھیں ضرورت ہے خادمہ کی؟"

"ضرورت تو سب کو ہوتی ہے۔ اس کی شدت کا احساس دلایا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر ملازمت کی امیدوار اپنی مظلومیت کا رونا روئے۔ ہاتھ پیر جوڑے اور بے حد عاجزی کرے کہ لاوارث ہوں۔ رہنے کا ٹھکانا نہیں ہے۔ بس رہنے کو جگہ دے دو اور دو وقت کی روٹی۔ تو بعض اوقات آدمی کا دل پسیج جاتا ہے۔"

"ان کے دل ایسے نہیں ہو سکتے۔" ٹیڈی بولا۔ "وہ سنگدل لوگ ہیں اور ایسے کام کرتے ہیں کہ آسانی سے اعتبار نہیں کر سکتے۔"

"مشکل مرحلہ یہی ہے۔ اندر داخل ہونے کا۔" میں نے کہا۔ "اور انھیں اعتبار پر مجبور کرنے کا۔ فرض کرو نازو پر انھیں رحم آ جاتا ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ ایک نوکرانی مل رہی ہے۔"

"اور وہ بھی اتنی خوبصورت۔" شمسہ بولی۔

"او نو۔ اس کا تو حلیہ بگاڑنا پڑے گا۔" میں نے شرماتی ہوئی نازو کو دیکھا۔ "اس رنگ روپ پر بدصورتی کا پردہ ڈالنا پڑے گا۔ یہ بھی محنت طلب کام ہے مگر ناممکن نہیں کہ ہم نازو کو ایک سیاہ فام بدصورت اور عمر رسیدہ عورت بنا دیں۔ پھر یہ ڈاکٹر اور ان کی بری نظر سے تو محفوظ ہو جائے گی۔ آج کل گھریلو ملازم ملتے ہیں تو لوگ انھیں گھر میں جگہ دیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ مردوں کے لیے تو ویسے ہی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ گھروں میں بہو بیٹیاں ہوتی ہیں۔ لڑکے بھی ملتے ہیں تو گھروں سے بھاگے ہوئے اور اٹھائی گیرے قسم کے۔ جوان عورت کو گھر والیاں نہیں رکھتیں۔"

"کہ کہیں صورتِ حال دلکش نہ ہو جائے۔" محسن بولا۔ "سب شوہر ہماری طرح شریف اور نیک نفس تو نہیں ہوتے نا۔ بعد میں پتا چلے کہ اب خادمہ کو بیگم کا اور بیگم کو خادمہ کا مقام حاصل ہو گیا ہے۔ پتہ کٹ گیا ہے۔"

"چنانچہ ادھیڑ عمر کی عورتیں سب سے موزوں خادمہ ثابت ہوتی ہیں اور پسند کی جاتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "زیادہ بوڑھی۔ جسے سمجھا جاتا ہے کہ وہ روگ ساتھ لائیں گی اور دو دن خدمت کر کے چار دن کرائیں گی۔ میں سمجھتا ہوں نازو کی کامیابی کے چانس ففٹی ففٹی ہیں۔ کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ فرض کرو نازو کسی طرح ان کے گھر میں خادمہ بن گئی۔ تو دو چار دن آزمائش کے پہلے گزریں گے۔ وہ لوگ اس پر گہری نظر رکھیں گے۔ صبح سے رات تک اور رات سے صبح تک۔ کام بہت سخت ہے۔ نازو تمھیں دن بھر محنت کرنا ہوگی۔ پہننے کو میلے کچیلے کپڑے ہوں گے اور سونے کو کسی کوٹھری میں جھلنگا چارپائی یا فرش پر بستر۔ کر لوگی یہ سب؟"

"تم جانتے ہو کہ میں اس سے کہیں زیادہ قوتِ برداشت کا مظاہرہ کر چکی ہوں۔" نازو نے کہا۔

"اگر تم نے انھیں مطمئن کر دیا۔" میں نے کہا۔ "تو میرا خیال ہے کہ تمھارا کام ایک مہینے میں ہی ختم ہو جانا چاہیے۔ دو چار دن یا ایک ہفتے بعد جب انھیں تمھارے بے ضرر ہونے کا یقین آ جائے گا تو تمھیں کچھ آزادی مل جائے گی۔ میرا مطلب ہے ان کی نگرانی کچھ کم ہو جائے گی۔ اس عرصے میں تم گھر کے اندر آنے جانے والوں کا جائزہ لو گی۔ ہر گوشے کو دیکھو گی۔ بظاہر بالکل بے نیاز نظر آؤ گی مگر تمھارے کان بھی کھلے رہیں گے اور تمھاری آنکھیں بھی سب کچھ دیکھتی رہیں گی۔ تم خود کو بالکل جاہل ظاہر کرو گی۔ تمھیں اپنے لیے ایک بیک گراؤنڈ بھی بنانا ہوگا کہ تم پہلے کہاں تھیں اور اس حال تک کیسے پہنچیں۔ تمھاری کہانی ہم سب مل کر تیار کر لیں گے۔ جس میں کوئی سقم نہیں ہوگا اور کوئی بات ناقابلِ یقین نہیں ہوگی اور اس کی تصدیق کوئی بھی آسانی سے نہیں کر سکے گا۔ یہ کہانی تم کو انتہائی ستم رسیدہ اور مردم گزیدہ عورت ثابت کرے گی جس کے باپ نے شوہر نے یہاں تک کہ بیٹوں نے اس کا استحصال کیا اور اسے دنیا کی ٹھوکریں کھانے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ ایسی زندہ کہانیاں بکھری پڑی ہیں جن سے ہم راستے کاٹ کے اور نظر بچا کے گزر جاتے ہیں۔ ہر دستِ طلب دراز کرنے والے محتاج و گداگر کو پیشہ ور بھکاری سمجھ کر حقارت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں۔ ہر راہ گزر پڑے ہوئے معذور یا بیمار پر طنز و استہزا کا جملہ پھینک کر اپنی راہ لیتے ہیں کہ مانگنے والے بھی کیسے کیسے ڈرامے رچاتے ہیں۔ بے شک اکثریت خیرات کی مستحق نہیں ہوتی مگر سو میں سے پانچ نہ سہی تو ایک کی کہانی وقت کی بے وفائی۔ عاقبت نااندیشی۔ اپنوں کے کرم اور غیروں کے ستم کی منہ بولتی داستانِ عبرت ہوتی ہے جسے سننے کی نہ کسی کو ضرورت ہوتی ہے نہ فرصت۔"

"یہ ٹھیک کہتا ہے تو۔" محسن نے کہا۔ "فلمی دنیا میں تو ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنے وقت میں نمبر ون کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے منہ مانگے معاوضے لیتے تھے اور دولت کو ہاتھ کے میل سے زیادہ بے وقعت جانتے تھے۔ پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ وہ کاسۂ گدائی لیے پھرتے تھے اور کوئی پوچھتا نہ تھا۔ ایس زادے فقیر

www.paksociety.com

ہوئے۔ عیاشی طبع کے باعث مصنف نادر و لاثانیہ ہو گئے۔ روگ
آخری دم تک تجربے میں ہار گئے یا پھر لالچی اور لادھے ان کا
سب کچھ چھین لیا۔ دنیا میں یہ ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"ہاں۔ مگر نازو کو یقین دلانا ہے کہ ایسا کچھ اس کے ساتھ بھی ہوا تھا تو آپ نے کہا۔ اور دکھ بھی پوشیدہ درد ناک کہانی انسانی ہے جو پتھر کو بھی پگھلا دے۔ اس کے علاوہ نازو کا میک اپ بھی ایسا ہونا چاہیے کہ ہم بھی اسے نہ پہچان سکیں۔"

"میک اپ کرتے کرتے میں بھی اب اتنا ماہر ہو گیا ہوں کہ تیرا میک اپ کر دوں تو تجھے آدمی بنا دوں۔" محسن بولا۔

"اچھا فرض کرو یہ سب ہو گیا۔" استاد شیدی نے کہا۔ "یعنی نازو نے میک اپ میں ایک بہت بڑی قسمت آزمائی ... کے آخری خادمہ بننے میں کامیاب رہی تو کیا ہو گا؟"

"ایک ہفتہ تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "نازو اپنی پوزیشن مستحکم کرے گی۔ اس کے بعد بھی ہم اس سے رابطہ قائم نہیں کریں گے۔ وہ خود جب بھی مناسب سمجھے گی اور جیسے بھی چاہے گی ہم سے رابطہ قائم کرے گی اور ظاہر ہے نازو یہ کام اس وقت کرے گی جب اس کی اپنی پوزیشن کو خطرہ لاحق نہیں رہے گا۔ یہ سب سے اہم پہلو ہے۔ پہلے اپنے قدم مضبوطی سے جمانا اور تمام شکوک و شبہات دور کرنا۔ جلدی میں کام بگڑ سکتا ہے۔ جتنی نازو کی پوزیشن اچھی ہو گی وہ اتنی ہی آزادی اور بے خوفی سے کام کر سکے گی۔ وہ لوگ ایک بار مطمئن ہو جائیں گے تو اس پر عائد بہت سی پابندیاں نرم کر دیں گے۔ جتنا یہ کہ گھر کے کس حصے میں جانا ہے کس طرف نہیں جانا ہے۔ کس کے سامنے اور کس وقت آنا ہے اور کب نہیں آنا ہے۔ نازو کے خود کو بے ضرر ثابت کرنے کی شرط ہے۔ پھر وہ خود بے پروا ہو جائیں گے۔ یہ ایک فطری چیز ہے کہ ہم پہلے بہت محتاط رہتے ہیں لیکن مطمئن ہونے کے بعد ہمارا ذہن ایزی ہو جاتا ہے۔ اس سنتری کی طرح جو مسلسل نگرانی پر مامور ہو اور جب اسے بالآخر بتایا جائے کہ اب وہ آرام کر سکتا ہے تو وہ بیٹھے اور سو جائے۔ ان سب کا دوسرا ردعمل بے فکری کا ہو گا۔ وہ ایک مظلوم اور لاوارث بڑھیا کو یکسر نظر انداز کر دیں گے اور ان کے ذہن میں یہ خیال تک نہیں آئے گا کہ یہ بڑھیا آفت کی پڑیا ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس کے سامنے کھل کر بات نہیں کرنا چاہیے یا اسے باورچی خانے تک نقل و حرکت کی اجازت دینا چاہیے اور بس۔"

"میں نے ایک انگریزی ناول پڑھا تھا۔" محسن بولا۔ "اس میں ہوٹلوں کے ویٹرز نے ایک خفیہ بین الاقوامی تنظیم بنا رکھی تھی اور وہ ملکوں کے راز ادھر سے ادھر کرتے تھے۔ جن ہوٹلوں میں وہ کام کرتے تھے وہاں ہر ملک کے سربراہ، وزرا اور سفیر، تاجر اور فوجی وفد سب ہی آتے تھے۔ کانفرنس کرتے تھے اور یہ پتہ آزادی سے کہ ان کی ساری گفتگو سن سکیں۔ انھیں بار بار کمرے میں جانا تھا۔ وہ کانفرنس ہال میں موجود رہتے تھے لیکن کوئی ان کا نوٹس بھی نہیں لیتا تھا کہ یہ تو ویٹرز ہیں۔ ہوٹل کے ادنیٰ ترین ملازم کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چنانچہ خبر رکھنا اور کے لوگ اسی ذہنی رویے کے باعث وہ باتیں بھی کہہ جاتے تھے جو نقول گئے۔ دیواروں کے کان بھی نہیں لیں تو بہت کچھ ہو جاتا ہے۔"

"درست۔ نازو اسی کمزوری سے فائدہ اٹھائے گی۔" میں نے کہا۔ "بعد میں ہم اسے سب کچھ فراہم کر دیں گے۔ اسلحہ، موبائل جس سے ہم اپنے ریڈیو کے ایف ایم بینڈ پر پیغام وصول کر سکیں کوئی فون نمبر بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ کوڈ میں خفیہ پیغام رسانی کا بھی وضع ہو سکتا ہے۔ نازو سب کچھ لکھ کر ڈاک سے بھی بھیج سکتی ہے۔ اندر کے حالات کا اندازہ اندر پہنچنے کے بعد ہو گا اور سارے فیصلے نازو کو خود کرنے ہوں گے۔ اپنے رسک پر۔"

"اور سکندر بادشاہ! اگر انھوں نے اس کو پہچان لیا؟" استاد شیدی بولا۔ "اس کا میک اپ اتار دیا اور اصلیت معلوم کر لی، پھر؟"

کچھ دیر کے لیے ہم سب خاموش ہو گئے۔ استاد شیدی کی "پھر" کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک جواب کے سوا جو انگریزی کا مشہور ہے۔ جاسوس کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ نازو پکڑی گئی اور اس کی رہائی کی کوشش بھی ناکامی کا شکار ہوئی تو اس کی مدد کون کر سکے گا، سوائے خدا کے۔ وہ اعتراف جرم پر بھی مجبور کر دی جائے گی اور اگلوانے والے اس سے سب اگلوا لیں گے۔ بہت معلوم نکمہ ہو گا کہ بیٹھے بیٹھے میں اس پر کیا بیتی۔ میری نظروں میں بہت سے لرزہ خیز مناظر آ گئے۔ شاید اس وقت جب نازو کو تشدد کی اذیتیں کے حصار میں پہنچا کے ہم مطمئن ہوں گے کہ بہت بڑا کارنامہ سر انجام دیا اور رات کو چین سے سو رہے ہوں گے، نازو کسی ٹارچر تشدد کا عذاب جھیل رہی ہو گی۔ زندگی کا عذاب جھیلتے، بے بس اور بے بس ہو گی۔ ایک نوجوان عورت کے ساتھ بے ضمیر شیطان کیا نہیں کر سکتے۔ عزت آبرو کی بات تو الگ رہی موت بھی بہت آسان ہے۔ موت سے پہلے کا عذاب جھیلنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ خود میں نے سادھو رام سے کس طرح ہر بات اگلوائی تھی۔ راوی کے ٹھنڈے پانی میں پہنچ کے تو اس کے مردہ جسم کو بھی بہت قرار ملا ہو گا۔

"اب چپ کیوں ہو گئے؟" استاد شیدی کی آواز آئی۔

"میں اس لیے چپ ہوں استاد کہ اس سوال کا جواب کون دے سکتا اور اگر کوئی جواب ہے تو نازو کو معلوم ہے۔ ہم سب

تو دیکھ جائیں گے، نازو کو نہیں بچا سکیں گے۔ اس حقیقت کا اعتراف آج اور ابھی سب کے سامنے کر لینا چاہیے تا کہ نازو اس مشن میں تنہا ... ساتھ ... اس کی تقدیر ہو گی ... نتیجہ اس کی ذہانت اور جرأت ... سمجھ لینا چاہیے کہ اندر جانا شاید آسان ہو۔ وہ خود دروازہ کھول کر باہر آ سکے گی ... بھی اپنے اختیار کی بات نہیں ہے۔"

"یہی صورت ہو گی تو ہم نازو کو موت کے منہ میں دھکیلنے کی قرارداد پاس نہیں کر سکتے۔" استاد شیدی کہنے لگا۔

"یہ قرارداد نہیں ہے، چیلنج ہے۔" میں نے کہا۔ "نازو پر کسی قسم کا دباؤ نہیں۔ اگر کوئی اسے مجبور کرے یا اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے تو جرم ہے۔ وہ اپنے فیصلے میں بالکل آزاد ہے۔ زندگی میں ایسے مشکل مقام سب کے لیے آتے ہیں جب یہ جوا کھیلنا چاہیے ہے۔ مثلاً اس وقت جب ڈاکٹر کسی مریض کے لواحقین کو بتا دیتے ہیں کہ آپریشن کی کامیابی اور ناکامی کے امکانات برابر ہیں اور کسی کو یہ فیصلہ ضرور کرنا پڑتا ہے کہ آپریشن ضروری ہے ورنہ یہ ففٹی ففٹی کا چانس بھی نہیں رہے گا۔ فیصلہ کرنے والا باپ بھی ہو سکتا ہے اور بیٹا بھی مگر کیا ڈاکٹر اس فیصلے میں اس کی مدد کر سکتا ہے؟ نازو انکار کر دے تو یہ اس کا حق ہے۔"

"اس کا یہ حق میں استعمال کرتا ہوں۔" استاد شیدی نے کہا۔ "وہ نہیں جائے گی۔"

"میں ضرور جاؤں گی۔" نازو نے قطعی لہجے میں کہا۔ "تم بھائی بھی کے موقع ہے ... یہاں سب نے رشتوں کو نظر انداز کیا ہے۔ محسن نے بھی اور سکندر نے بھی۔ اس معاملے میں تمھاری کل بھی نہیں چلے گی چچا۔"

"نازو! یہ خود کشی بھی ہو سکتی ہے۔" شیدی نے مایوسی سے کہا۔

"خود کشی بھی بعض اوقات ناگزیر ہوتی ہے۔ وہ موت یقیناً حرام ہے جو کسی ناکامی سے فرار کی خاطر خود کشی سے ملے مگر اس موت کو کیا کہتے ہیں جو سپاہی کو محاذ پر نصیب ہوتی ہے۔ اگر محاذ پر جیالا سے زندہ واپسی کے ایک فیصد امکانات بھی نہیں ہوتے اور جانے والے جانتے ہیں کہ وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے کیا وہ شہادت کی ابدی زندگی نہیں سمجھی جاتی۔ فرق صرف مقصد کا ہے۔ جنگ عظیم دوم میں جاپانی فوجوں کے پاس آسمانی ... بم کے ... آگے بڑھ کر موت کو گلے لگاتے تھے ... دشمن کا راستہ روک دیتے تھے۔ یہ خود کشی کرنے والے ... پر مشتمل ہوتے تھے ... ٹینک کے سامنے لیٹ جاتے اور لوہے کے اس ہاتھی کی پیش قدمی روک کر اپنی جان دیتے ہوئے یہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ ان کا گوشت، ہڈیاں سب پس کر مٹی میں مل جاتے تھے۔ نہ ان کا مزار بنتا تھا نہ مدفن نہ انھیں بہادری کے سب سے مشکل کارنامے پر میڈل، بس ... دیا جاتا تھا اور نہ ان کے لیے کوئی قومی دن منایا جاتا تھا۔ غالباً ایسے ہی وہ بھی تھے جو اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر ہوائی جہاز سے کود گئے تھے اور دنیا کے سب سے بڑے بحری جہاز "پرنس آف ویلز" کی چمنی کے اندر اتر گئے تھے۔ اس جہاز کو تباہ کرنے کی اور کوئی صورت نہیں تھی۔ ایک آدمی نے اس فولادی قلعے کے دو ٹکڑے کر دیے۔ ایک ہزار یا ایک لاکھ آدمی اپنی ساری طاقت صرف کر کے اس جہاز کو یوں توڑ سکتے تھے جیسے ایک انگلی سے ماچس کی تیلی ٹوٹ جاتی ہے۔ کیا وہ خود کشی تھی؟ خود کشی کو جاپانی اپنے پرانے عقیدے کے مطابق کار ثواب سمجھتے ہیں۔ اسے "ہارا کاری" کہا جاتا ہے۔ ہم اپنے عقیدے کی کسوٹی پر "ہارا کاری" کو حرام موت کہہ سکتے ہیں لیکن جو کچھ "سوئی سائڈ بمبار" نے کیا وہ جرأت کے اعلیٰ ترین کارنامے تھے۔ ان کی طرح کوئی بم کھا کے جان دے تو شہید کا مرتبہ پاتا ہے اور بہادری کے اعلیٰ ترین اعزاز کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ پھر یہاں جانا خود کشی کیسے ہوا؟ میں جان کو ایک ہتھیلی پہ لیے پھرتی ہوں۔ دل کو دوسری ہتھیلی پہ۔ یہ دونوں چیزیں بے مصرف ہیں اگر کسی کے کام آ جائیں تو مجھے زندگی سے اور کچھ نہیں لینا۔"

میں بہت دیر تک دم بخود بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا دنیا میں نازو جیسی دوسری لڑکی کہیں ہو گی؟ حسن و نزاکت میں یکتا، حوصلے اور جرأت میں بے مثل۔ ذہانت اور جذبوں کی صداقت میں کھری۔ اتنا وہ پہلے کبھی نہیں بولی تھی۔ آج اس نے سب کو بولنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ اس کی سوچ کا انداز اتنا منفرد تھا کہ منفی رجحانات رکھنے والے معاشرے کی تمام اقدار کی نفی کرتا تھا۔ معلوم نہیں یہ لڑکی یہاں کیوں پیدا ہو گئی۔ اسے فلسطین میں ہونا چاہیے تھا اور ہر اس دور میں پیدا ہونا چاہیے تھا جب حق و صداقت اور انصاف کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ اس کے حقیقت شناس ذہن کے دلائل چٹانوں سے زیادہ مضبوط تھے جو گہرے سمندروں میں قدم جمائے کھڑی ہوں اور کوہ شکن لہروں اور قیامت خیز طوفانوں پہ خندہ زن ہوں۔

"میں نے اپنی بات کہہ دی۔" نازو نے ہی خاموشی کے اس سکوت کو توڑا جس میں ذہنی طور پر ہم سب ایک ہی طرح نازو کو خراج عقیدت پیش کر رہے تھے۔ "تم نے اپنے عزم کا اظہار کر دیا لیکن پھر بھی کل تک سوچ لو۔"

"کل... کل کس نے دیکھی ہے؟" وہ مسکرائی۔ "پھر آج کا کام کل پر کیوں چھوڑیں۔ میں اس سوچ کی قائل ہی نہیں جو آج ہوں۔"

www.paksociety.com

کو متزلزل کرنے لگے۔ دیمک کی طرح حوصلے کو چاٹنے لگے۔ اندیشوں کا جال پھیلا گئے۔ میں نے ایک بار سوچ لیا اور فیصلہ کر لیا تو دوبارہ کیا سوچنا۔ کیا تم نے پہلے بھی مجھے اسی نظریہ حیات پر عمل کرتے نہیں دیکھا۔ میں پچھتانے اور افسوس کرنے کی قائل کبھی نہیں رہی۔ فیصلہ کر لیا تو کر لیا۔ غلط ہوا تو کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ جان ہی جائے گی نا۔ کتنی بار جائے گی؟"

استاد ٹیڈی نے بڑی عقیدت اور شفقت کے ساتھ اپنی چھوٹی بہن کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ "تجھ پر کتنا فخر ہے نازو۔ خدا نے سب کو ایک سا بنایا۔ تجھ کو دی اور نکال کر دی۔ کاش اتنی ہی جرأت اور بے خوفی محسن میں بھی ہوتی۔ افسوس کہ تو اپنے بھائی پر فخر نہیں کر سکتی۔ وہ ایک بزدل آدمی ہے۔ صرف زبانی باتوں سے جانوروں کی ٹریننگ دینے والا۔ مولا علی کی قسم کھا کے کچھ نہ کرنے والا۔ اکثر بیکار۔ جس کے اتنے بڑے وجود میں چیونٹی کے دل کے برابر ہمت نہیں۔ جو موت سے ڈرتا ہے۔"

"میں بھی سخت شرمندہ ہوں نازو۔" میں نے یکلخت سنجیدہ ہو جانے والی صورت حال کو ختم کرنے کے لیے آواز میں مصنوعی رقت پیدا کی۔ "میں بھی موت سے نہیں ڈرتا، تو آپ سے نہیں ڈرتا۔ یہاں تک کہ بھوت سے نہیں ڈرتا مگر میں موش سے ڈرتا ہوں۔ جانتی ہو موش کیا ہوتا ہے؟"

نازو کو سب کے ساتھ ہنسی آ گئی۔ "تم چوہے سے ڈرتے ہو؟"

"مجھے پتا تھا تم یہی کہو گی۔" میں نے رونی شکل بنا کے کہا۔ "وہ چوہا نہیں ڈاکٹر لطیف کا کتا ہے۔ گدھے کے سائز کا جب وہ بھونکتا ہے تو بھونچال آ جاتا ہے میرے پیٹ میں۔ کاٹنے کا تو پتا نہیں کیا ہوگا۔"

ایک دم سب کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔ سب ضرورت سے زیادہ جذباتی اور سیریس ہو رہے تھے اور میں یہ کامیڈی پیش نہ کرتا تو فضا بہت دیر تک بوجھل اور ناقابل برداشت حد تک افسردہ رہتی۔

"ابھی سب فیصلے کر لو۔" نازو نے پھر سب کو متوجہ کیا۔ "میرا اپنا خیال ہے کہ دیر سے کچھ حاصل نہیں۔ مجھے فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔ مسٹر میک اپ! تم اپنا کام کتنی دیر میں ختم کر سکتے ہو؟"

"کون سا کام؟" محسن بولا۔ "تمہاری صورت بگاڑنے کا؟ وہ میں غالب سے اجازت بلکہ باقاعدہ این او سی لیے بغیر نہیں کر سکتا۔" یہ اس کی بدقسمتی کہ وہ اپنا محل وقوع بھول گیا۔ وہ نازو کے بہت قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک اس نے خود کو تھپڑ کھا کے اڑتا ہوا پایا۔ نازو نے اتنی پھرتی سے ہاتھ اٹھایا تھا کہ خود میں حیران رہ گیا۔ یہ اس کے دبلے پتلے جسم کے روح کا کمال تھا کہ وہ خود کان ہو جاتی تھی مگر اس کے ہاتھ میں ... محسن نے ہانپتے ہوئے کے ساتھ تقریباً غسل کے سامنے ... اسے چوٹ نہیں آئی تھی مگر اس نے دیدے گھما کے ...

"الوداع اے حور۔ اب مجھ سے جنت میں ملنا" ... بولا۔ "میرا بدلہ ضرور لینا کسی سے بھی لے لینا۔"

"ٹھیک کے بیٹھو میرے شیر" غسلانے آ کے ... جیسی بھی آئی۔ محسن اس کے اور میرے درمیان بیٹھا ... گھورنے لگا جو اس تماشے پر بہت خوش تھا۔

"سالے۔ نازو سے کس کو رستگاری ہے۔ آج ہم کو ... بار مجھے پہ" محسن نے خفت مٹانے کے لیے کہا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب ابھی تک نہیں دیا" ...

"جواب اس کا یہ ہے کہ قاتل حسینہ کی ... ہوں۔ اجازت ہو تو شام تک مجھے یہاں سے ... غالب تک ڈور کے پیچ مارے اور ایسا بھاگے کہ پھر ..." محسن بولا۔

"بس تو میں آج ہی رات کو نکل جاؤں گی۔" نازو نے ...

"آج رات؟" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "نازو تم بہت جلدی کر رہی ہو؟"

"دیر کی گنجائش کہاں ہے بھیا؟" نازو بولی۔ "ہم ... اطمینان کے لیے وقت نکالیں گے تو اتنی دیر میں ... کھیپ نکل جائے گی۔ ایک کھیپ کتنے ... اور دشمن کا وجود مٹائے گی ... پلنے کی طاقت دے گی۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر میں بھی ساتھ چلوں گا۔" ...

"تمہارا وہاں کیا کام؟" نازو نے اور میں نے تقریباً ایک ساتھ کہا۔

"وہی جو تمہارا کام ہے لڑکی" ٹیڈی بولا۔

"وہ کام تم نہیں کر سکتے" نازو نے اسے ...

"میں تجھے بھی اس گھر میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا" ٹیڈی ... گیا۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے بھی ملازم رکھ لیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نازو کا چانس بھی خراب کرو گے استاد اور وہ فوراً کھٹک جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"میری طرف سے بے فکر رہو" نازو بولی۔ "میں جانتی ... بھی جانتی ہوں اور جان دینا بھی ... میں اپنی حفاظت کر ... تم کو یہاں بہت سے دوسرے کام ہوں گے۔"

"اچھا میں ہر دو تین دن بعد تمہاری خبر لینے آؤں گا" ٹیڈی نے ... کہا اور گردن جھکا لی۔

"خیر تو وہ تمہاری ایسی لیلیٰ لے گی کہ تم خود مجنوں بن جاؤ گے" محسن نے کہا۔

"یار محسن! مجھے ایک خیال آیا ہے ٹیڈی کی بات پر" میں نے کہا۔ "جس سے ہم نازو کے ساتھ رابطہ رکھ سکتے ہیں۔ اگر اپنے استاد ٹیڈی بھی اس گھر کے قریب چیک پوسٹ قائم کر لیں۔"

"کیسی چیک پوسٹ؟" محسن بولا۔ "وہاں کوئی گھر...؟"

"گھر نہیں... گھر میں رہ کے ہر وقت دروازے پر نگاہ نہیں رکھی جا سکتی۔ سگریٹ پان کی کوئی دکان ہو۔ ریڑھی ہو" میں نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے استاد۔ اگر تم وہاں مونگ پھلی کی ریڑھی لے کر کھڑے ہو جاؤ تو بہت آسان کام ہے۔ منافع اچھا اور بہانہ معقول۔ تم سب آنے جانے والوں پر نظر رکھنے کے ساتھ ان کی تصویریں اتار سکتے ہو، گاڑیوں کے نمبر نوٹ کر سکتے ہو اور بعد میں نازو کے اور تمہارے درمیان کوئی مواصلاتی رابطہ بھی قائم ہو سکتا ہے۔ تم درمیانی رابطہ بن سکتے ہو۔ رات بارہ بجے تک وہاں پٹرومیکس لیمپ لے کر کھڑے رہنا کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جس پر کوئی شک کر سکے۔ دن میں بھی اگر نازو کو موقع ملے گا تو تم وہیں موجود ہو گے۔ رات کے بارہ بجے کے بعد تم ہمیں دن بھر کی رپورٹ دے سکتے ہو۔"

"یہ کام تو میں کر سکتا ہوں۔ مان گئے سکندر بادشاہ" ٹیڈی نے خوش ہو کے کہا۔

"سارا دن کھڑا رہنا پڑے گا اور رات بارہ بجے تک سردی میں مونگ پھلی بیچنا ہوگی۔ ٹانگیں ٹیڑھی ہو جائیں گی" محسن نے اس کا حوصلہ کم کرنے کی کوشش کی۔ "آواز نکالتے نکالتے آواز بیٹھ جائے گی۔"

"یہ ایک مہینے کا مشن ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ" میں نے کہا۔ "اس عرصے میں ہمیں جو کچھ معلوم ہونا ہے معلوم ہو جائے گا۔ اگر نہ ہوا تو پھر وہاں وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"میری شکل مونگ پھلی بیچنے والے کی طرح ہے؟ او محسن بھائی؟" ٹیڈی بولا۔

"تمہاری شکل پہلے ہی مونگ پھلی جیسی ہے" محسن نے کہا۔ "ذرا مجھے ایک سریلی صدا لگا کے تو دکھاؤ۔ مونگ پھلی چٹخنے لگے ... ٹریلر پیش کرو۔"

ٹیڈی نے کھنکار کے گلا صاف کیا اور ایک ہاتھ کان پر رکھا۔ پہلی صدا نہایت بے سُری نکلی۔ سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ دوسری کوشش اس سے بھی بدتر رہی۔ ٹیڈی کا منہ لال ہو گیا تھا۔

"تم مونگ پھلی تک نہیں بیچ سکتے سالے" محسن بولا۔

"میں تمہیں بیچ سکتا ہوں مونگ پھلی کی جگہ" ٹیڈی نے جھنجلا کے کہا۔ "اس کے لیے گلا ضروری نہیں۔ مونگ پھلی والے ہاتھ میں گھنٹی رکھتے ہیں۔"

"تم گلے میں گھنٹی باندھ لینا۔ بیل کی طرح سر ہلاتے رہنا اور یہ ڈُو ڈُو جیسی آواز نکالتے رہنا" محسن بولا۔ "تماشا دیکھنے والے جمع ہو جائیں گے تو دو چار مونگ پھلی بھی لے لیں گے۔"

ان کی جنگ بڑی مشکل سے ختم ہوئی۔ اصولی طور پر سب نے میری دونوں تجاویز سے اتفاق کر لیا تھا۔ اب تفصیلات طے ہونا باقی تھیں اور ابھی بعد کا لائحہ عمل طے کرنا تھا مگر اس کے لیے بہت وقت تھا۔ شام ہونے لگی تھی جب محسن نے لات مار کے غالب کو اٹھایا۔ پھر محسن ضرورت کا کچھ سامان لینے چلا گیا اور میں نے غالب کے پوری طرح جاگنے کے بعد اسے ابتک تمام گفتگو کا خلاصہ سنایا اور صبح سے اب تک پیش آنے والے تمام واقعات بتا دیے۔ وہ شام کے پانچ بجے تک کرتے ہوئے گھوڑے کی طرح سر ہلاتا رہا اور ہوں ہاں کرتا رہا۔ کئی بار مجھے شک ہوا کہ وہ اب بھی سو رہا ہے اور میری بات تک نہیں سن رہا ہے مگر وہ پورے ہوش و حواس میں تھا۔ بعد میں میرے ساتھ کافی پیتے ہوئے بہت سے مفید مشورے دیے جو سب غیر سنجیدگی سے دیے گئے تھے چنانچہ احمقانہ تھے۔ شام سات بجے وہ اپنے اخبار کے دفتر چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ نازو کے مشن اور استاد ٹیڈی کے رول پر غور کر رہا ہے اور اس کا ذہن خاموشی سے اس منصوبے کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا تجزیہ کر رہا ہے۔ غالب کی یہ خوبی تھی۔ وہ کبھی اندازہ نہیں ہونے دیتا تھا کہ اس کے ذہن میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ وہ کسی کمپیوٹر کی طرح چپ چاپ جمع تفریق ضرب تقسیم کرتا رہتا تھا اور اس وقت بولتا تھا جب وہ کسی ایک نتیجے پر پہنچ جاتا تھا اور پھر سب کو لاجواب کر دیتا تھا۔ وہ بہت سطحی نظر آنے والا شخص بہت گہرائی رکھتا تھا اور اسے سادہ لوح سمجھنے والے اس کی عیاری سے مار کھا جاتے تھے جیسے نازو کو کمزور اور لڑکی سمجھنے والے اس سے مار کھا جاتے تھے۔

مجھے اطمینان اس بات کا تھا کہ غالب نے کسی خیال کو مسترد نہیں کیا اور ہمارے منصوبے سے اتفاق کیا — اب یہ ہو سکتا تھا کہ وہ بہتر تجاویز پیش کر دے اور زیادہ مؤثر لائحہ عمل مرتب کرنے میں مدد دے یا خود بھی عملی طور پر شرکت کا راستہ نکال لے۔ وہ کام کرتے ہوئے بھی سوچتا رہے گا اور غیر شعوری طور پر منصوبے کا ہر پہلو سے جائزہ لیتا رہے گا۔ اس کے ساتھ ایک مشکل تھی کہ وہ شب بیدار لوگوں میں سے تھا۔ رات کو جاگتا

www.paksociety.com

تھا اور دن کو اسے صورت کے تحت سونا پڑتا تھا چنانچہ وہ دن میں ہمارے ساتھ ہر روز جانے سے قاصر تھا۔ اس کا ایک فائدہ بھی تھا کہ رات کے وقت ہم کہیں بھی ہوں اس سے رابطہ قائم کر سکتے تھے۔ اسے پیغام دے سکتے تھے اور اس سے مدد بھی مانگ سکتے تھے۔ یہ اپنا غریب وطن پاکستان تھا جہاں ہر فرد اور ہر گھر کو ٹیلی فون جیسی بنیادی سہولت حاصل کرنے کے لیے بھی دس دس سال انتظار میں گزارنے پڑتے تھے چنانچہ اب تک ہم نے جتنے گھر لیے تھے اور جتنے ٹھکانے بدلے تھے سب ٹیلی فون سے محروم تھے ورنہ رابطہ رکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ پھر یہاں پبلک کال آفس کی آسانی بھی بڑے شہروں میں محدود پیمانے پر حاصل تھی پی سی او کچھ دکانوں میں تھے اور ان سے اسی وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا جب دکان کھلی ہوئی ہو۔ کہاں وہ لندن کا شہر جہاں ٹیکسی میں بھی فون دستیاب تھا اور گھر میں تو اتنا ہی ضروری سمجھا جاتا تھا جتنا پانی کا نل یا بجلی کی لائن۔ ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ ہم اپنے درمیان غیر قانونی مواصلاتی رابطہ قائم کریں یعنی وہی واکی ٹاکی مائکروفون رکھیں جن سے ہماری آواز ریڈیو کے ایف ایم بینڈ پر سنی جا سکے اور ہم تین چار افراد ایک ہی فریکوئنسی پر پیغام دے سکیں یا فریکوئنسی الگ الگ ہو تو ہم سب کے علم میں ہو مگر اور کسی کو معلوم نہ ہو۔

اس طریقے میں بہت سی خرابیاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ رابطے کے لیے دو طرفہ نظام ضروری تھا۔ ہر شخص کے پاس بیٹری کے سیل سے چلنے والا ایف ایم بینڈ کا ریڈیو ہو اور مائکروفون ہو۔ چھوٹے سے چھوٹا ریڈیو بھی سگریٹ کے پیکٹ سے بڑا تھا اور اس میں استعمال ہونے والے وہ پین ٹارچ سیل چار دن سے زیادہ ساتھ نہیں دیتے تھے۔ مسلسل استعمال کی صورت میں شاید دو ہی دن میں جواب دے جاتے اور وقفے وقفے سے مختصر وقت کے لیے استعمال کیا جائے تب بھی ان کی لائف ایک ہفتے سے زائد نہ تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہر ہفتے نئے سیل ڈالنے کا مسئلہ جو ہر جگہ اور ہر وقت نہیں ملتے۔ یہی صورت حال مائکروفون کی تھی۔ ان دونوں چیزوں کو ساتھ رکھنا اس طرح کہ کسی کو پتا نہ چلے عملاً ناممکن تھا۔ یہ چیزیں نظر میں آ سکتی تھیں اور تلاشی میں فوراً برآمد کی جا سکتی تھیں۔ یہاں وہ بٹن کی جگہ استعمال ہونے والے طاقت ور مائکروفون کہیں دستیاب نہ تھے جو انگریزی جاسوسی ناولوں میں مجرم اور پرائیویٹ سراغ رساں سب بے باکانہ استعمال کرتے تھے اور نہ ماچس جیسے ٹرانسمیٹر بھی نایاب تھے جن کی آواز سو ڈیڑھ سو گز کے دائرے میں سنی جاتی ہو اور جو [illegible] سے چارج ہونے والی یا جو بڑی قوت والی بیٹری سے مسلسل آن کال

کے قابل رہتے ہوں۔ اگر ہم مقامی مارکیٹ سے ایف ایم ریڈیو یا واکی ٹاکی حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو ان کی رینج زیادہ سے زیادہ پچاس کلو میٹر ہوتی جو [illegible] کم تھی۔ اس سے شہر کے اندر رہتے ہوئے رابطہ رکھا جا سکتا تھا پچیس میل سے زیادہ دور نکل جانے کے بعد رابطے کی کوئی [illegible] نہ تھی۔

ہمارے لیے حالات کی عدم موافقت ہی کا سبب [illegible] مشکل تھی۔ پرائیویٹ سراغ رسانی کا تصور یہاں جاسوسی [illegible] کی کہانیوں میں بھی غیر حقیقی تھا۔ پولیس کا تصور [illegible] نہ وہ برطانوی پولیس کی طرح عوام کے دوست اور مددگار تھے اور نہ امریکن پولیس کی طرح مستعد اور فرض شناس۔ حقیقت [illegible] ترقی یافتہ ممالک میں پولیس کا کردار ویسا ہی تھا جیسا [illegible] ہونا چاہیے۔ یہاں صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی [illegible] کا امیج بہت خراب تھا۔ پبلک ان کو اپنا دشمن اور [illegible] کا ذمے دار سمجھتی تھی۔ جرائم سے متعلق تھے تو صرف رشوت لے [illegible] اور فرض کی ادائیگی سے اتنا بھی واسطہ نہیں رکھتے تھے جتنا [illegible] کی آمدنی سے۔ ان کے لیے اصل آمدنی کے ذرائع ہی [illegible] بنے ہوئے تھے جن میں شریف لوگوں کو بے وجہ تنگ کرنا [illegible] کرنا اور معاوضے کے عوض چھوڑ دینا، چوروں ڈاکوؤں سے حصہ [illegible] جوئے اور نشے کے اڈوں کی سرپرستی، غنڈوں اور بدمعاشوں کے [illegible] بھتہ وصول کرنا اور ایسے ہی رفاہ عامہ کے کام شامل تھے [illegible] بے شک سب ایسے نہیں تھے مگر اس کا کیا علاج کہ [illegible] ایک سے تھے۔

خود پبلک کی صورت حال مختلف نہ تھی۔ قانون کا [illegible] اگر کوئی کرتا تھا تو سزا کے خوف سے۔ اس لیے نہیں کہ یہ [illegible] فرض ہوتا ہے۔ جہاں دیکھنے والا کوئی نہ ہو وہاں سب [illegible] سے فائدہ اٹھا لیتے تھے اور بیشتر صورتوں میں رشوت [illegible] وہی لیتے تھے جن کو رشوت کہیں سے نہیں ملتی تھی۔ ایسے [illegible] لوگ ختم ہوتے جا رہے تھے جو پایا جاتا ہے گرفتار نہ ہوں [illegible] ملتے ہیں مگر وہ خوف خدا کے باعث نہ لیں۔ لوگ اپنی [illegible] اور قانونی فرض سے داریوں سے بھاگتے تھے۔ پڑوس کے گھر [illegible] پڑ جائے تو اپنے گھر میں تالا ڈال کے بھاگ جاتے تھے کہ [illegible] سکیں کہ وہ تو واردات کے وقت موجود ہی نہیں تھے۔ سڑک [illegible] حادثہ ہو جاتا تو نظر بچا کے فرار ہو جاتے تھے کہ گواہ [illegible] پڑے۔ دشمنی، تھانوں اور عدالت بازی [illegible] کرتے تھے جو درست ہو بلکہ ذاتی مفادات اور مصلحت کے [illegible]

کوشش کرتے تھے۔

ایسے حالات میں ہم چند افراد کا اتحاد اور ایک گروہ کی حیثیت سے ولاور مائیکل اینجلو کے خلاف صف آرا ہونا بہت بڑی بات تھی۔ یہ کوئی پی ایل او یا بلیک ستمبر جیسی تنظیم نہیں تھی جس کے وسائل لامحدود ہوں اور جس کے ساتھ ہمدردی رکھنے والوں کی تعداد لامحدود ہو۔ یا جسے عالمی سطح پر سیاسی حمایت بھی حاصل ہو۔ یہ تو چند سرپھرے، سرفروش اور سر بکف افراد تھے جن کو اعتماد تھا خدا کی ذات پر اور اس کی مدد پر۔ جو توکل کرتے تھے اپنے ناموکل کی قوت اور نیت کے خلوص پر اور کام لیتے تھے اپنے زور بازو سے۔ بقول علامہ اقبال۔ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے۔ ہم تو اپنے وسائل بھی خود پیدا کرتے تھے اور اپنے راستے بھی خود نکالتے تھے اور انجام کی پروا کبھی نہیں کرتے تھے۔ یہی ہماری اب تک کی کامیابیوں کا راز تھا۔

رات کو نازو کے جانے کا معاملہ صبح پر ملتوی کر دیا گیا کیونکہ محسن کو میک اپ کا سامان لے کر واپس آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ پھر یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اگلے دن استاد شیدی پہلے اپنا مورچہ قائم کرے اور نازو بعد میں پہنچے۔ استاد شیدی کو اگلے دن بہت سی شاپنگ کرنا تھی۔ ایک عدد ریڑھی خریدنا تھی۔ اس پر ڈھیر کرنے کے لیے مونگ پھلیاں۔ مونگ پھلیاں بھوننے کا چولھا، کڑھائی، ریت اور متعلقہ سامان۔ ترازو اور باٹ۔ لفافے اور پیکنگ کا سامان۔ سب سامان چیزوں کی خریداری تو مشکل نہ تھی مگر اس میں کم سے کم دو گھنٹے صرف ہونے یقینی تھے چنانچہ نازو کی روانگی صبح بھی مشکل نظر آتی تھی۔ دوپہر کے بعد وہ جا سکتی تھی اور محسن کے پاس اس کا میک اپ کرنے کے لیے بہت وقت تھا۔ میں نے رات کو شیدی کے ساتھ جا کر اس گھر کا اور گلی کا جائزہ لیا جہاں وکٹر فیملی کا قیام تھا۔ وہ عام قسم کے بہت سے گھروں سے ملا ہوا ایک گھر تھا جس کا ایک ہی دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ ادھر ادھر کرائے کا مکان تلاش کرنے کے بہانے ہم بہت پھرے مگر وہاں کوئی مکان خالی نہیں۔ میں نے شیدی کی ریڑھی کے لیے ایک جگہ کا انتخاب کیا اور ہم لوگ رات دس بجے تک لوٹ آئے۔ خلاف توقع ہم نے غالب کو موجود پایا۔ شہلا اسے کسی بات پر چھیڑ رہی تھی لیکن وہ ٹال رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہماری واپسی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اسے ہم سے کچھ کہنا تھا چنانچہ وہ کوئی بہانہ کر کے جلد لوٹ آیا تھا لیکن ہم گھر سے غائب تھے۔ نازو کی موجودگی میں وہ اتنا نروس نہیں ہوتا تھا اور ہم سب کے چھیڑنے پر ڈھیٹ بن جاتا تھا لیکن اس وقت وہ کوفت کا شکار تھا۔

"آج کیا پھر ایڈیٹر سے بلنگ ہو گئی؟" میں نے کہا۔ "اس وقت تمھارا یہاں نظر آنا چہ معنی دارد؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم صحافی ایک امن پسند قوم ہیں۔"

"مگر تم صحافی نہیں وکیل صحافی کی بطخ ہو گئے ہو۔" استاد شیدی نے کہا۔

"ہاں ۔۔۔ اور مجھے جھٹکانے والے تم سب ہو۔" غالب نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ "اب میں صحافی بہت کم رہ گیا ہوں۔ تقریباً تیس فیصد۔ باقی تیس فیصد جیمز بونڈ قسم کی چیز بن گیا ہوں۔"

"اور باقی چالیس فیصد کا کیا حساب ہے؟" میں نے بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔

"وہ دل کا حساب ہے۔" غالب نے کہا۔ "مطلب یہ کہ جو چیز دل میں ہے اور میں خود نہیں سمجھتا تو تمھیں کیا سمجھاؤں۔ یہ بہت اوٹ تشریف آوری کہاں سے ہو رہی ہے؟"

"میں اور استاد اس مشن پر گئے تھے جسے فوجی اصطلاح میں ریکونی سینس کہا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ ہم دشمن کے علاقے کا جائزہ لینے گئے تھے۔" غالب نے کہا۔ "اور وہ دولہا میاں؟"

"وہ نہیں آیا ابھی تک؟" میں نے کہا۔ "بہت وقت ہو گیا ہے شادی کے بعد سے۔ شہلا نے ڈھیل بہت دے رکھی ہے لیکن اس سوال کا جواب تو بیچ میں ہی رہ گیا تم کیسے بھاگ آئے۔"

"بس یار۔ چھٹی کر دی میں نے اخبار کی۔" غالب نے کہا۔

"کیا مطلب؟ استعفا دے دیا؟" شہلا نے کہا۔

"یا انھوں نے لات مار کے نکال دیا؟" استاد شیدی بولا۔

"ایک مہینے کے لیے کچھ بھی سمجھ لو۔" غالب نے کہا۔ "میں نے تو مانگی تھی چھٹی کہ شادی ہے۔"

"شادی؟ کس کی شادی؟" نازو بولی اور ہنسنے لگی۔

"میری۔" غالب نے اسے غور سے دیکھ کر کہا اور نازو کی ہنسی کافور ہو گئی۔ "اور معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوا؟ ایڈیٹر نے بہت شور مچایا کہ اخبار کیا میرا باپ نکالے گا۔ میں نے کہا کہ اخبار گیا بھاڑ میں۔ کیا تمھارے اخبار کی خاطر میں کنوارا مر جاؤں۔ تو اس نے ایک فائل نکالی اور میرے سامنے رکھ دی۔ یہ دیکھو جب ستمبر ۶۵ کی جنگ چل رہی تھی تو تم نے ایک مہینے کی چھٹی کی تھی۔ یہ دوسری شادی کرنے کی دو سال بعد نومبر ۶۸ میں۔ تیسری درخواست میں پھر شادی کے بہانے تم ایک ماہ غیر حاضر رہے۔ جولائی ۷۸ میں اور اب دو سال بھی نہیں ہوئے ۔۔۔ کہ پھر شادی۔ بے وقوف سمجھتے ہو مجھے اور بلاتے ہو۔ میں نے کہا آپ کو خدا نے جو شادو یا سونا دیا میرے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے لیکن آپ کو یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ از روئے شرع مجھے چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے اور

www.paksociety.com

میں اپنا یہ شرعی حق حاصل کرنے کے لیے تمہارے سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا۔ کہنے لگا اچھا میں خود جا کر دیکھوں گا کہ ماسٹر صاحب یہاں ہیں یا نہیں اور جو تم کو اس تباہی سے بچانے کے لیے سامنے آ قدم کروں گا۔ میں نے کہا کہ ضرور آپ ضرور ملیں۔ آپ کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔ بالضرور درست ہو جائے گا۔ چال ٹھیک ہو جائے گی اور عقل و نظر کا فتور بھی دور ہو جائے گا مگر پہلے والی ہی سے آپ نہیں مل سکتے۔ پہلی تو عقد سے پہلے منگیتر بھاگ گئی تھی۔ دوسری کو میں عقد کے بعد ہی دولہا میں چھوڑ کر بھاگ آیا۔ تیسری بارات راستہ بھٹک گئی تھی اور غلط جگہ پہنچی جہاں کوئی عرس شریف ہو رہا تھا۔ جب دلھن کے گھر پہنچے تو اس کا نکاح قاضی سے ہو چکا تھا۔"

سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ نازو پہلے تو شرم سے لال ہو گئی تھی کیونکہ سب اس کی طرف دیکھنے لگے تھے مگر... پھر وہ بھی ہنس گئی اور اس کے لیے ہنسی کو ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ غالب بالکل سنجیدہ رہا۔

"تم لوگ بلا وجہ خبطی مشہور نہیں ہوتے۔" ٹیڈی بولا۔

"ہم جینئس لوگ ہوتے ہیں۔ جن کو آدھا پاگل سمجھنے والے پورے پاگل ہوتے ہیں۔"

"مگر ایک مہینے کی چھٹی کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے کہا۔

"تم وہیں رہو تو اچھا ہے۔ سب کے لیے رابطے کی ایک جگہ ہے۔"

"تم ذرا میرے ساتھ چلو۔" غالب بولا۔ "مجھے تم سے ایک... نہیں دو باتیں کرنا ہیں۔"

"ایسی کون سی بات ہے جو یہاں سب کے سامنے نہیں ہو سکتی؟" میں نے کہا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور محسن اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا جو اس نے پیچھے رکھ دیا اور حیرانی سے غالب کو دیکھنے لگا۔

"ایک بات کی جا سکتی ہے سب کے سامنے۔" غالب کچھ سوچ کے بولا۔ "لیکن دوسری بات... بہتر ہو گا کہ تم سنو۔ اس کا تعلق سب سے نہیں ہے۔"

محسن کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑ کر پھونک ماری اور سب کی صورت دیکھ کر بیٹھ گیا۔ "کوئی گمبھیر مسئلہ ہے؟" وہ بولا۔

"ایک مسئلہ واقعی گمبھیر ہے۔" غالب بولا۔ "جس کی وجہ سے مجھے فوراً آنا پڑا۔ اور یہ فیصلہ بھی کرنا پڑا کہ فی الحال میں کہیں نہ جاؤں۔"

"کوئی خطرے کی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ آج جب میں آفس پہنچا تو مجھے اپنی میز پر ایک لفافہ ملا۔ اس پر صرف میرا نام تھا۔" غالب بولا۔ "کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ لفافہ وہاں کس نے پہنچایا۔ وہ ڈاک سے نہیں آیا تھا۔ پبلک اپنے مراسلے، بیانات، اعلانات اور پریس ریلیز چھوڑ جاتی ہے۔ سب وہاں ڈھیر ہوتے رہتے ہیں اور بعض جو متعلقہ ہوں ہم تک پہنچا دیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے اس میں زیادہ تر فضول ہوتا ہے۔ نام کی تنظیموں کے بیانات اور مذاق قسم کے بے مقصد اعلانات۔ انہی میں یہ لفافہ بھی ہو گا۔ ڈاک لینے والے کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ کون لایا تھا۔ میرے نام اس قسم کے خط بھی آتے ہی رہتے ہیں۔ مثلاً تقریبات کے دعوت نامے ہوتے ہیں جو ایسے ہی سادے لفافوں پر نام لکھ کر بھیجے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس لفافے کو دیکھ کر میں نہ حیران ہوا تھا نہ پریشان لیکن میں نے اسے کھول کر پڑھا تو مجھ پر جو دہشت طاری ہوئی وہ بیان نہیں کر سکتا۔ پندرہ سولہ طبق روشن ہوں۔ مجھے کچھ کہنے کا ہوش نہیں تھا۔"

"اور وہ ہو گیا کیا۔ خط کس کا تھا۔ اور اب کہاں ہے؟" ٹیڈی نے کہا۔

"خط میرے پاس ہے۔" غالب نے کہا۔ "اور چوہدری ولاور کی طرف سے آیا ہے۔"

یکلخت سب کو سانپ سونگھ گیا۔ کچھ دیر تو کسی کی سمجھ نے اس سنگین حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کیا کیونکہ اب بھی غالب کی ظرافت کا نمونہ سمجھا۔ پھر غالب کی صورت دیکھ کر آہستہ آہستہ سب پر عیاں ہونے لگا کہ یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ اس نے جیب میں سے ایک لمبا سا لفافہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ "تم اس تحریر کو پہچان سکتے ہو؟" وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر یہ ولاور کے اپنے ہاتھ کا ہے تو اس نے تحریر کو بدل کے لکھا ہے۔ یہ کوئی خط شناس ہی بتا سکتا ہے۔"

"خط لکھا کیا ہے کہاں ہے؟" محسن نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"لفافے پر تو تمہارے نام کے سوا کوئی خطرناک بات نہیں۔"

"پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ خط لے کر تم سیدھے ادھر آ گئے؟" میں نے کہا۔ "ایڈیٹر کو بتا کے آئے تھے کہ کہاں جا رہے ہو؟"

"ہاں۔ میں نے شادی کی درخواست خط پڑھ لینے کے بعد ہی دی تھی۔" غالب بولا۔ "جھگڑا تو ہوا مگر میں طے کر چکا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ میں جا رہا ہوں اپنے گھر اور خبردار جو تم بارات میں آئے۔ وہ بے وقوفوں کی طرح بیٹھا رہ گیا۔ دراصل اس سے پہلے بھی جب میں نے چھٹی لی تو بات مذاق میں ٹل گئی۔ اخبار کے دفتر میں کام زیادہ ہوتا ہے اور عملہ کم۔ باری باری سب ہفتے کے مختلف دنوں میں ایک چھٹی کر کے کام چلاتے ہیں۔

دو دن بھی نہ آئے تو شیڈول بگڑ جاتا ہے۔ ایک ہفتے کی رخصت بھی مشکل ہوتی ہے کیونکہ کام دوسروں پر پڑ جاتا ہے۔ ایک مہینے کی چھٹی صرف شادی کے لیے ملتی ہے چنانچہ سب ہی لکھ دیتے ہیں اور اخبار کا جو مالک ہے وہ مجبور ہو جاتا ہے۔ ایڈیٹر سب جانتا تھا اور اتفاق سے ایک سب ایڈیٹر پہلے ہی چھٹی پر تھا چنانچہ اس نے گڑبڑ ڈالی اور مجھے جھگڑا کر کے نکلنا پڑا۔ آفس میں تو میرا پتا لکھا ہوا ہے جہاں مدت سے کسی کا آنا نہیں ہوا۔ ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ سب باہر مل لیتے ہیں اور اپنا گھر بار ایسا تھا بھی کہاں کہ کسی کی میزبانی کریں یا کوئی وہاں مہمان ہو۔ اب ہو سکتا ہے کہ کل پرسوں ایڈیٹر خود آ دھمکے یا کسی کو بھیجے مجھے کسی صورت واپس لے جانے کے لیے۔"

"تمہارے پاس تو فلیٹ تھا۔" میں نے کہا۔ "مقبرہ ٹائپ؟"

"ہاں۔ اب وہاں کوئی اور دفن ہو گا۔" غالب بولا۔ "جو بے سروسامانی تھی اس سے لینڈ لارڈ کو کرائے کا عشر عشیر بھی وصول نہیں ہوا ہو گا۔"

"وہی۔ چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط؟" محسن بولا۔

"نہیں۔ ایک میلا پاجامہ۔ ایک پتلون۔ دو قمیصیں، پرانی چپل اور چارپائی مع فقیرانہ بستر کے۔" غالب بولا۔ "کرایہ تو میں نے چھ مہینے پہلے بھی نہیں دیا تھا۔ اس کے بعد سے لاپتا ہوں۔ وہ کمرا تو اس کے قبضے میں جا چکا ہو گا۔"

"میں نے پوچھا تھا کہ آپ نے خط لے کر آفس سے سیدھے ادھر تشریف لانے کی حماقت کیوں کی؟" میں نے کہا۔

"ویسے تو حماقت آدمی شوقیہ کرتا ہے۔" غالب بولا۔ "مگر اس وقت حماقت مجھے بہت مہنگی پڑتی۔ میں نیچے والی منزل پر گیا وہاں ایک سب ایڈیٹر کا کمرہ ہے۔ وہ رازدار قسم کا آدمی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ باہر بہت خطرناک قسم کے سود خور چند پٹھان اور تو ہیں یہ کھڑے ہیں۔ میں نہ سود دے سکتا ہوں نہ اصل۔ چنانچہ وہ مجھے لے جائیں گے اور معلوم نہیں کس طرح سود وصول کریں گے — بہرحال... وہ کوئی اخلاقی طرز عمل اختیار نہیں کریں گے اس لیے میں پچھلی طرف سے نکل کر فرار ہونا چاہتا ہوں۔ اس نے دروازہ بند کر کے میری حالت پر افسوس کیا اور پوچھا کہ آخر میں نے ایسی حماقت کیوں کی۔ سود خوروں سے قرض لینا آسان ہے مگر ان سے جان چھڑانا مشکل۔ میں نے اسے ایک دردناک کہانی سنائی کہ کیا کرتا، بہن کی ڈولی اٹھانا تھی۔ خالص فلمی ڈائلاگ تھے۔ نتیجہ یہ کہ اس نے میری مدد کی۔ دفتر میں رسی تو کوئی نہیں تھی مگر ٹیلی فون کے پرانے تار ایک جگہ ڈھیر تھے۔ وہ سب سے لمبا نکال لایا اور میں نے اس کو کھڑکی کے باہر والے ہینڈل سے باندھ دیا۔ ٹیلی فون کا دوہرا تار بہت سخت اور مضبوط ہوتا ہے۔ خطرہ یہ تھا کہ گانٹھ کھل جائے گی چنانچہ اس مددگار نے بھی ایک سرا تھامے رکھا اور میں پھسلتا ہوا نیچے اتر گیا۔ رات کا وقت تھا اس لیے دیکھا کسی نے نہیں۔ پیچھے جو احاطہ ہے اس میں کاغذ کی کترن کے انبار پڑے رہتے ہیں جو وقتاً فوقتاً روئی کی گانٹھوں کی طرح باندھ کر اور دبا دبا کے ٹرک پر لاد دیے جاتے ہیں۔ ان کترنوں کو خریدنے والا اخبار کے ایڈیٹر سے بہت زیادہ مالدار ہے۔"

"مختصر بات کرو۔ ولاور کے خط میں کیا لکھا ہے؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"اس میں کوئی ایسی بات نہیں۔" غالب نے مجھے تسلی دی۔ "ساری پریشانی کی بات یہ ہے کہ وہ خط میرے پاس کیوں آیا؟ میں تو آج بال بال بچ گیا۔ یقیناً صدر دروازے پر چوہدری ولاور کا کوئی شکاری کتا کھڑا ہوا ہو گا اس وقت بھی۔ اس نے مجھے اندر جاتے دیکھا ہو گا اور یہ اطمینان بھی کر لیا ہو گا کہ عمارت میں داخل ہونے اور باہر آنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ پیچھے سے نکلنے میں بھی ان کاغذ کی کترنوں نے بچا لیا ورنہ میں ولن کی طرح ٹوٹ جاتا۔ ہزار سکڑ کے بھی کودتے کہ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ مگر میں گرا اس انبار پر جو روئی کے پہاڑ کی طرح تھا۔"

"کیا تار چھوٹ گیا تھا؟" نازو نے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹیک کے سوال کیا۔

"اس کا اندازہ تو مجھے لٹک جانے کے بعد ہوا۔" غالب بولا۔ "تار تھا کوئی بیس فٹ لمبا۔ چوتھی منزل تھی اڑتالیس فٹ بلند۔ لیکن اچانک میں نے ہاتھ نیچے بڑھا کے تار کو گرفت میں لینا چاہا تو مٹھی میں رات کا اندھیرا آیا اور میں نے چوبیس فٹ بغیر پیرا شوٹ کے پرواز کی۔ کمزور دل کا ہوتا تو نیچے لینڈ کرتا صرف یہ خالی جسم۔ روح وہیں سے اوپر چلی جاتی۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں ولاور کے گرگوں کا شکار ہوں یا اس فولادی بازوؤں والی مشین کا جو کاغذ کی کترنوں کو پریس کر کے گانٹھوں کی شکل میں باندھتی ہے۔"

"غالب بھائی۔" شہلا نے اچانک کہا۔ "اس وقت جب آپ گر رہے تھے۔ چند سیکنڈ میں آپ کو کس کا خیال آیا تھا؟ سچ بتائیے گا۔"

غالب نے سانس روک کر نازو کی طرف دیکھا جو نظر جھکائے پیر کے ایک ناخن کو کھرچ رہی تھی اور خاموشی کے اس مختصر وقفے میں غالب کا جواب سب نے سنا اور سمجھا۔ دیکھا اور جانا پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور مسکرایا۔ "جیسے عدالت فیصلہ محفوظ رکھتی ہے۔ ایسے ہی میں جواب محفوظ رکھتا ہوں۔" وہ بولا۔ "زندگی میں پہلی بار میں نے موت کو اتنے قریب پایا تھا مگر نیچے گرتے ہی میں نرم کاغذوں کے ڈھیر میں دھنس گیا تو میں بہت دیر تک آنکھیں

www.paksociety.com

چند کیے پڑا رہا۔ اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ جو کچھ ادھر وہاں ہوا تھا کسی نے نہیں دیکھا۔ پھر ویک سے نے کہا تھا کہ ٹھیک ہے، ڈاکٹر۔ پہلی زندگی ہی کا مجھ پر بہت بڑا احسان تھا۔ یہ دوسری زندگی مجھ کو نا ہی گا مر پڑتی ہی خاص عنایت ہے کیونکہ اب مجھے جینے کی فرصت کا احساس پہلے سے زیادہ ہو رہا تھا جب آدمی عمر لیے جیتا ہے مقصد ہو تو اس کے جینے یا نہ جینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

غالب نے وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جو اسے کہنا تھا پھر کچھ بغیر ناز و پرو اشتحکر دیا تھا کہ اپنی پہلی زندگی کے آخری لمحوں میں مجھے تمہارا خیال آیا تھا اور اب دوسری زندگی کی مجھے اس لیے ضرورت تھی کہ میں تمہارے لیے بھی سکول اور تمہیں مقصد بنا سکوں۔ کسی نے کسی سے کچھ بھی نہیں کہا۔ غالب نے دلاور کا خط نکالا اور اونچی آواز میں پڑھنے لگا۔

"اس خط کے ذریعے میں سکندر بخت کو ایک پیشکش کرتا ہوں جس کے ساتھ میرے تمام اختلافات کی بنیاد ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس تھا۔ وہ اس کا قانونی وارث ہے اور میں اس کا یہ حق تسلیم کرتے ہوئے یہ کارخانہ اور اس کے تمام اثاثے اس کی ملکیت میں دینے کو تیار ہوں۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ تمام قانونی کارروائی میں سکندر بخت کا ذاتی طور پر حاضر رہنا ضروری نہیں ہوگا۔ اس کے کسی بھی قانونی نمائندے کو قبضہ دیا جا سکتا ہے۔"

"دلاور نے ایک شخص کو ان قبر بھی دی ہے۔" غالب نے پڑھنا چھوڑ کے کہا۔ "اس خبر پر اس سے مزید بات کی جا سکتی ہے۔"

"کیا خط میں صرف اتنا ہی تھا؟" محسن بولا۔

"نہیں۔ یہ پہلا پوائنٹ تھا۔" غالب بولا۔ "تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"خیال تو سب کا ایک ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔ "یہ چوہدری دلاور کی ایک احمقانہ چال ہے۔ شاید اسے معلوم ہو گیا ہے کہ اب مسئلہ حق وراثت حاصل کرنے یا انتقام لینے کا نہیں رہا۔ یہ ایک طرح کی رشوت ہے۔"

"رائٹ۔ یہ رشوت ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہمیں اپنے اصل مقصد سے ہٹانے کے لیے اور ایم آر ایس کے مشن کو ختم کرنے کی سازش ہے۔"

"دوسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس میں اب اسلحہ سازی ختم کر دی گئی ہو گی۔ خطرے کے پیش نظر اسلحہ ساز مشینیں اور آلات کسی دوسری جگہ منتقل کر دیے گئے ہوں گے۔ دلاور کا خصوصی عملہ بھی نکل گیا ہوگا اور اب شاید پھر وہاں صرف زرعی مشینری کے پرزے بنتے رہیں گے جو [illegible] کے زمانے میں بنتے تھے۔ ان کے منافع کی چوہدری دلاور کو ضرورت نہیں رہی۔ اسے کافی وقت ملا ہے۔ اس عرصے میں اپنے ناجائز کاروبار سے اس کی آمدنی میں بے حساب اضافہ ہوا۔ اس کے مقابلے میں زرعی مشینری کے پرزوں کا منافع کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اس منافع کو برقرار رکھنے اور کاروبار کو پھیلانے کے لیے اس نے محفوظ جگہ منتخب کر لی جہاں مکمل رازداری کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ممکن ہو۔ زیادہ آرڈر پورے کیے جائیں اور اس وقت سے [illegible] اٹھاتے ہوئے تجوریاں بھری جائیں۔ مشرقی پاکستان میں [illegible] کا رجحان بڑھ رہا ہے اور وہاں تخریب کار زیادہ سرگرم عمل ہیں۔ ان کی پشت پناہی کرنے والے انڈین ایجنٹ بھی زیادہ ہیں۔ انھوں نے اپنا جال زیادہ منظم طریقے پر پھیلا دیا ہوگا۔ سیٹھ ورمن اب چوہدری دلاور کے مخبر ہوں جنھوں نے کہا ہو کہ لعنت بھیجو اس جھگڑے پر جو ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کی وجہ سے شروع ہوا۔ اپنی آرڈیننس فیکٹری کا سٹی اور محفوظ جگہ قائم کرو۔ بہتر مشینری لگاؤ اور زیادہ مال فراہم کرو۔ یہ پرانا کارخانہ شرپسند سکندر بخت کے حوالے کرو۔ ان کے نقطۂ نظر سے تو یہ شرپسندی بھی ہوتا ہے تاکہ دنیا دیکھے کہ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ دلاور کی پوزیشن کلیئر ہو جائے اور راستے کا کوئی خطرہ نہ رہے بلکہ اس کی شرافت کی دھاک بیٹھ جائے۔"

"میں اس خیال سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔" محسن بولا۔

"میں بھی۔ کیونکہ آگے جو کچھ ہے وہ اس کی تائید کرتا ہے۔" غالب نے کہا۔ "ملاحظہ ہو پیراگراف نمبر دو۔"

"سکندر کے والد کو کاروبار سے بے دخل کرنے کا ذمے دار میر شرافت علی تھا۔ تمام اس سے جتنی ذہنی اذیت سکندر بخت کو ملی اور جتنا مالی نقصان ہوا میں اس کی تلافی کرنے کے لیے بھی تیار ہوں اور یہ سکندر بخت پر چھوڑتا ہوں کہ وہ کتنا ہرجانہ طلب کرتا ہے۔ کسی عدالتی کارروائی کے بغیر یہ رقم میں اسے اپنے حساب سے دینے کو تیار ہوں۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ میر شرافت علی کو قتل کرنے والا استاد پیڈرو تھا جس نے یہ قتل میرے ایما پر نہیں ڈی سلوا کے کہنے پر کیا تھا۔ ڈی سلوا اب دنیا میں موجود نہیں ورنہ اس کی تصدیق کرتا لیکن استاد پیڈرو کو سکندر بخت کے حوالے کیا جا سکتا ہے اور وہ چاہے تو اس سے وزیر خان کے قتل کا انتقام خود لے سکتا ہے۔

استاد پیڈرو ہی یہ بھی بتا سکتا ہے کہ وزیر خان کو اب کہاں دفن کیا گیا ہے۔ سکندر بخت کو اس کے بعد مجھ سے کوئی گلہ نہیں رہنا چاہیے۔"

"یکلخت اتنی نیکی!" میں نے ہنس کر کہا۔ "ساری غلطیوں کا اعتراف کرنا اور تمام گناہوں کا کفارہ ادا کرنے پر رضامندی۔ کیا واقعی دلاور کی فطرت میں یہ انقلاب آ گیا ہے؟"

"یہ تو کوئی غیر معمولی بات نہیں۔" محسن نے کہا۔ "بہت سے لوگ زندگی کے کسی مرحلے میں یا کسی حادثے کے باعث اچانک گمراہی کے راستے سے ہٹ کر صراط مستقیم پر آ گئے۔ متقی اور پرہیزگار بن گئے اور گناہ کی زندگی چھوڑ دی۔ لیکن چوہدری دلاور شیطان ہے۔ شیطان ڈھونگ تو رچا سکتا ہے مگر تائب نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں۔ یہ بھی ڈراما ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ شروع سے ڈرامائی انداز میں ہر بات کہنے کا عادی رہا ہے۔ اس مرتبہ ڈرامے کی پیشکش کا انداز مختلف ہے۔ ظاہر یہ کیا جا رہا ہے کہ اس کے اور پیڈرو کے درمیان اختلافات پیدا ہو چکے ہیں۔ کاروبار سے علیحدگی یا پیڈرو کی سرکشی کے باعث وہ پیڈرو کا دشمن ہو گیا ہے اور اب اسے ہمارے ہاتھوں ختم کرانا چاہتا ہے۔ دلاور کو یقین ہوگا کہ ہم اس کا یہی مطلب نکالیں گے جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہو گی۔"

"اس کا مقصد بھی وہی ہے۔ ہمیں اصل مقصد سے ہٹانا۔" محسن نے کہا۔ "اور ذاتی انتقام کے چکر میں ڈالنا۔ تو ایم آر ایس کے مشن کو بھول کر استاد پیڈرو کے پیچھے پڑ جاتے اور اس سے پہلے تو وزیر خان کے موجودہ مدفن کے بارے میں معلوم کرتے اور پھر منتقل کرنے کی سوچتے۔ اس چکر میں پیڈرو تو ہاتھ آنے کا نہیں، تو پیڈرو کے ہاتھ پڑ جاتے گا۔"

"وزیر خان کے لیے ایک مدفن گیا اور دوسرا گیا۔" میں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "زمین کی مٹی سب ایک ہے اور ایک ہی طرح آدمی کو کھا لیتی ہے۔ مجھے خدا نے موقع دیا کہ ایک بار اس کی قبر کے سرہانے کھڑا ہو کے اس کی مغفرت کے لیے دعا کر سکوں۔ وہ میں نے کر لی۔ اب پھر خدا نے توفیق دی تو اس کی دوسری ابدی آرام گاہ تک بھی جا پہنچوں گا۔ اس کے قاتل کے حساب اور اس کی سزا کو میں نے خدا پر چھوڑا کہ وہ چاہے تو اسی دنیا کے نظام انصاف کو حرکت میں لائے اور اسے عبرت ناک انجام سے دوچار کرے اور چاہے تو روز حساب پر اس کا فیصلہ کرے۔ میرا مقصد اب اس سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ وہ ایک جذباتی دور تھا جس میں ذاتی انتقام کی خواہش نے مجھے دیوانہ کر رکھا تھا۔ اب میں نے صبر کر لیا ہے اور دنیا کے حالات نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ شاید یہ کہ میرے غم میرے مصائب و مسائل اور میری زندگی کے دکھ ہی سب سے زیادہ نہیں۔ ہم سب کی ایک ہی کہانی ہے۔ واقعات مختلف ہیں لیکن مظلوم ہم سب ہیں۔ آج میں سمجھتا ہوں کہ پہلے میں ایک شخص کے خلاف جنگ لڑ رہا تھا اور وہ تھا وزیر خان کا قاتل۔ اب میں اپنے وطن کی خاطر جہاد میں شریک ہوں۔ دو افراد شرط لگا کے تاش کھیلتے ہیں۔ ایک شخص قومی کرکٹ ٹیم میں کھیلتا ہے۔ دونوں کے معیار کا نہیں مقصد اور جذبے کا فرق بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک کا مقصد ذاتی فتح اور جیت ہے۔ دوسرے کے لیے پورے ملک کی نمائندگی کا اعزاز ہے اور وطن کی عزت کا سوال ہے۔"

"اس بیان سے ہم سب کے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔" محسن نے سر ہلا کے کہا۔ "کیوں استاد؟"

"مجھے اپنے ساتھ مت شامل کرو۔" ٹیڈی نے صاف انکار کر دیا۔ "میں تو اس خبیث استاد پیڈرو کو کبھی معاف نہ کرتا۔ چوہدری دلاور سے کہو کہ پہلے اسے ہمارے حوالے کرے پھر آگے بات کریں گے۔"

"استاد۔ یہ سب دھوکا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک مقصد کے تحت استاد پیڈرو کو قاتل بنا کے پیش کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے اصل قاتل وہ نہ ہو۔ ہم نہیں جانتے کہ دلاور کے ذہن میں کیا ہے۔ مگر وہ کچی گولیاں نہیں کھیلا ہے کہ پیڈرو کو آسانی سے تمہارے حوالے کر دے۔ وہ پیڈرو کو اس کیچوے کی طرح استعمال کر رہا ہے جسے کھانے کے لیے تالاب والی مچھلی کانٹے میں پھنس جاتی ہے۔ تم اس جال کو نہیں دیکھ رہے ہو جو مگر جال ہے۔ تمہیں اس کی طرف لانے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ ورنہ تصدیق کرنا ہو تو یہ خط عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کو بھیج دو۔ وہ دلاور سے ملے اور پوچھے کہ کیا یہ خط اسی نے لکھا ہے اور یہ بات دو گواہوں کی موجودگی میں پوچھے۔ وہ صاف انکار کر دے گا۔ یہ اس کی ہینڈ رائٹنگ تک نہیں ہوگی۔"

"اب آخری پیراگراف۔" غالب نے کہا۔

"اگر تمام معاملات کا تصفیہ ہو جاتا ہے تو اس بات کی کوشش کی جا سکتی ہے کہ سکندر بخت کے خلاف مقدمات ختم ہو جائیں۔ ابھی تک اس کے خلاف شرافت علی کے قتل کا مقدمہ سب سے سنگین تھا مگر شیرے اور عبدل کے مرنے کے بعد اس مقدمے میں جان نہیں رہی۔ بے شک اس کے خلاف پولیس نے قتل کے اور بھی مقدمات بنا رکھے ہیں مگر ان کا بھی گواہ کوئی نہیں اور صفائی کے گواہ فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ سکندر کے خلاف

www.paksociety.com

گاڑیاں چھیننے پر جو ڈکیتی کے مقدمات درج ہیں وہ کمزور ثابت ہوں گے کیونکہ سکندر ایک تعلیم یافتہ اور باحیثیت آدمی ہے اور نفسیاتی مریض بھی نہیں ہے۔ البتہ وارداتوں کے عینی گواہ بھی نہیں اور ہوتے تو منحرف ہو جاتے۔ تاہم قانون کے اس عمل سے گزرنے کے لیے سکندر کو خود عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا اور خود کو قانون کے سپرد کرنا ہوگا کیونکہ اس کی ضمانت غیر حاضری کے باعث منسوخ ہو چکی ہے۔ نئے سرے سے ضمانت ہونے تک یا پھر مقدمات کا فیصلہ ہونے تک اسے جیل میں رہنا ہوگا۔ اسے جیل کے اندر بی کلاس اور اضافی مراعات ملیں گی اور اس بات کی ضمانت میں دے سکتا ہوں کہ وہ بہت جلد باعزت طور پر رہا ہو جائے گا۔"

"الو کا پٹھا!" میں نے کہا۔ "سمجھتا ہے میں مرعوب ہو جاؤں گا کہ وہ مقدمات قائم کرا سکتا ہے تو ختم کرانے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ میں ایک بار جیل گیا تو وہاں سے میری لاش ہی باہر نکلے گی۔"

"کیا واقعی وہ ہمیں اتنا کم عقل سمجھتا ہے؟" محسن نے سوچ کر کہا۔

"اور کیا اسے معلوم نہیں کہ ہمارے پاس ایک وکیل تو ہر وقت ہے۔ دوسرا عبدالودود منظر ہے۔ اگر ہم ذاتی عقل سے محروم ہوتے تب بھی ان سے ضرور مشورہ کرتے۔" میں نے کہا۔

"اور اسے یہ معاملات طے کرنے ہی تھے تو غالب کو خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔" محسن بولا۔ "عبدالودود منظر سے ملتا اور سارے مقدمات ختم کرانے کی بات کر لیتا۔ یہ کوئی اور چکر ہے سکندر جسے ہم ابھی تک سمجھ نہیں سکے۔"

"چکر کچھ بھی ہو۔" غالب بولا۔ "باعث تشویش یہ بات ہے کہ اسے میرے اور تمہارے تعلق کا علم ہے۔ وہ میرے ذریعے تم تک پہنچنا چاہتا تھا۔ آج میں نے اس کی کوشش ناکام بنا دی مگر کل وہ پھر کوشش کر سکتا ہے۔"

"یہ تمہارے لیے خطرناک ہوگا اور ہمارے لیے نقصان دہ۔" میں نے کہا۔ "ابھی ہم تمہارے تعلقات سے اور تمہاری پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تم آزادانہ گھومتے ہو اور کوئی آسانی سے تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ تم ہمیں وہ معلومات فراہم کر سکتے ہو جو ہم خود حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ تم ایک اخبار میں ہو۔ اگر اخبار چھوڑ دو گے تو تمہاری یہ پوزیشن نہیں رہے گی۔"

"اسی لیے میں نے فی الحال ایک مہینے کی چھٹی لی ہے اور چھپ کر بھاگ آیا ہوں تاکہ وہ کسی طرح بھی یہاں نہ پہنچ سکیں۔" غالب نے کہا۔ "یہاں آتے ہوئے میں سوچ رہا تھا۔ جمال کے گھر ٹھہرا تھا۔ وہی میک اپ مین۔"

"مجھے پتا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ خود ناز کا میک اپ کرے گا۔" غالب نے کہا۔ "دس ہزار لے گا۔"

"کیا ضرورت تھی اس کی۔ میں بھی یہ کام کر لیتا ہوں۔"

"کام کرنے اور مہارت سے کام کرنے میں فرق ہے۔" غالب بولا۔ "جہاں ہم ناز کو بھیج رہے ہیں وہاں حفاظتی اقدامات میں ایک فیصد بھی رسک نہیں لیا جا سکتا۔ دس ہزار میں یہ رسک مہنگا ہے؟ اس کے علاوہ وہ میرا بھی میک اپ کرے گا۔"

"تمہارا؟" میں اور محسن ایک ساتھ بولے۔ پھر میں نے کہا۔ "تم کیا بنو گے؟"

"یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ بچپن میں بھی بہت سے لوگ یہ سوال کرتے تھے۔" غالب نے کہا۔ "پہلے میں بعض بچوں کی طرح یہ کہتا تھا کہ پائلٹ۔ جہاز اڑانے کے خیال میں سب بچوں کے لیے سنسنی خیزی کا سب سامان ہے۔ میرا باپ کہتا تھا کہ بیٹا بہت بڑا ڈاکٹر بنے گا۔ ماں کی خواہش تھی کہ میں بڑا آدمی بنوں۔ بڑے آدمی کا اس کے ذہن میں کوئی تصور واضح نہیں تھا۔ تمام نامور مشہور لوگوں کو بڑا آدمی سمجھتی تھی خواہ وہ مولانا محمد علی جوہر ہوں یا لتا۔ میں کیا بنا؟ یہ سب کے سامنے ہے۔"

"تم بے وقوف بنے دنیا کے ہاتھوں۔" ٹیڈی نے کہا۔

"اور دل کے ہاتھوں۔" محسن نے اضافہ کیا۔

"چنانچہ اب میں مونگ پھلی بیچنے والا بنوں گا۔" غالب نے اعلان کیا۔ "جو کام استاد ٹیڈی کے سپرد کیا جا رہا تھا، وہ میں کروں گا۔"

"کیوں؟ تم سمجھتے ہو میں وہ کام نہیں کر سکتا؟" استاد ٹیڈی نے بگڑ کر کہا۔ "یہ فیصلہ تم نے اکیلے کیسے کر لیا؟"

"اس لیے کہ اکیلا میں سمجھتا ہوں کہ تم اس کام کے لیے قطعی نااہل ہو بلکہ کسی بھی کام کے لیے نااہل ترین شخص ہو۔" غالب نے اشتعال انگیزی کی پوری کوشش کی۔ "تم کو ہم نے استاد کہہ کے سر چڑھا دیا ہے ورنہ تم کو ابھی سو سال میری شاگردی میں جوتیاں سیدھی کرنا سیکھنا چاہیے۔"

"اور تم... تم کیا ہو؟" ٹیڈی آپے سے باہر ہو گیا۔ "اولاد بنے پھرتے ہو مرزا غالب کا، نام ہے۔ کام کرتے ہو خبریں بنانے کا۔ نہیں تم کو قبریں بنانے کا پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔" وہ غالب کی طرف لپکا۔

غالب ایک دم ہنس پڑا اور اس نے ٹیڈی کو گلے لگا لیا۔

"پاگل کیوں ہوتے ہو۔ ہم تو مذاق کر کے دل خوش کرتے ہیں اپنا ورنہ ہم کیا اور تمہاری... میرا مطلب ہے ہماری اوقات کیا۔ بات یہ ہے کہ ہمیں تمہاری جان بہت عزیز ہے اس لیے یہ خطرہ میں لینے لگا ہوں۔ مریں گے تو ہم مریں۔"

"ضرور مرو۔" ٹیڈی نے خود کو چھڑا لیا۔ "مگر مجھے بے وقوف مت بناؤ۔"

"اچھا تو آرام سے بیٹھ کے میری بات سنو۔" غالب نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ..."

"اصل بات تو میں سمجھتا ہوں برخوردار۔ تم بچے ہو ابھی ہمارے سامنے۔" محسن نے غیر موجود داڑھی پر ہاتھ پھیر کے بزرگانہ لہجے میں کہا۔ "ہم بھی جوانی میں گزرے ہیں اس دور سے۔ صحرا کی خاک چھاننا، جوئے شیر لانا یا مونگ پھلی بیچنا سب ایک ہی سلسلہ ہے۔ مجھے وہاں بیٹھ کے جوتے بھی گانٹھنے پڑتے تو گانٹھتا۔"

"بھئی ہم تو جا رہے ہیں۔ نیند آ رہی ہے۔" ناز اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم لوگ باتیں زیادہ کرتے ہو فیصلے کم کرتے ہو۔ صبح بتا دینا مجھے۔"

"تم کو جو بتانا تھا وہ بتا دیا۔" محسن بدستور شرارت پر آمادہ رہا۔ "اب تمہیں خواب ناز مبارک۔ جاگتے رہیو۔ تم بھی جاؤ زوجہ۔ لیٹنے اور ٹھٹھے سے کیا فائدہ؟" اس نے شہلا کو بلا کے کہا۔ وہ دونوں احتجاجاً واک آؤٹ کر گئیں۔

"اب ٹھیک ہے۔" غالب بولا۔ "کھل کے بات ہو سکتی ہے۔ یارو! بات یہ ہے کہ میں ایک تیر سے دو بلکہ تین چار شکار کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی مشکل تو یہ تھی ٹیڈی کے لیے کہ وہاں گلی کے دوسرے موڑ پر ایک پرانا مونگ پھلی والا ہے جو شاید کسی ٹھیکیدار کا سالا ہے کہ کسی کو گلی میں مونگ پھلی نہیں بیچنے دیتا۔ اس کی اجارہ داری کئی سال سے قائم ہے۔ میں نے اوپر بات کی اور کہا کہ ایس ایس پی رضوی صاحب کا ایک آدمی دوسری طرف مونگ پھلی کی ریڑھی لگائے گا۔ اس سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرے اور بھتہ نہ مانگے۔ اب رضوی صاحب سے بھلا کون تصدیق کر سکتا ہے کہ آدمی ان کا ہے یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ میں نے دفتر سے ایک دوست کو فون کیا تھا۔ دوست کیا ایک ایسا شخص ہے جسے میں نے جیل جانے سے بچایا تھا۔ ایک ڈی ایس پی اس کا دشمن ہو گیا تھا۔ اس نے ڈی ایس پی کو چھ مہینے کا بل بھیج دیا تھا۔ ان کے گھر ٹیلی وژن، ٹیپ ریکارڈر اور بھی فریج آیا تھا قسطوں کے پیسے۔ اس کی اب بھی ہال روڈ پر دکان ہے۔ اس سے میں نے کہا تھا کہ جاسوسی کے لیے کچھ آلات چاہئیں۔ واکی ٹاکی۔ چھوٹے سے چھوٹے مائیکروفون۔ پاکٹ ریسیور... اس نے کہا سب مل جائے گا۔ یہاں نہ ملا تو کراچی سے لا کر دے گا۔ وہاں اس کے بھائی کی وکٹوریہ روڈ پر دکان ہے۔"

"جب میرا بیان سنتے ہوئے تم سوچ میں گم تھے تو میں سمجھ گیا تھا کہ تمہارا ذہن مصروف عمل ہو چکا ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "دو تین گھنٹے میں کافی کام کر لیا تم نے۔"

"اخبار والے ہیں بھیا۔ بال کی کھال نکال سکتے ہیں اور کھال کے جوتے بنا سکتے ہیں اور جوتے چمکا کے گزارہ کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "ایک بار تم نے مجھے مونگ پھلی والے کے بارے میں بتایا تھا۔ تب تو مجھے خیال تھا کہ گڑبڑ ہوگی۔ پولیس کو بھتہ دیے بغیر اور غنڈہ ٹیکس دیے بغیر کوئی ریڑھی تک نہیں لگا سکتا۔ اسٹیشن پر قلی بھی ٹھیکیدار کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کام میں ہماری ضرورت پیش آ گیا ہو گی چنانچہ میں نے فون پر ہی ہال روڈ والے دوست سے بات کی۔ واپسی میں سوچتے ہی کو پکڑا۔ اس بار وہ اکڑ گیا تھا کہ میں نے نقد سودا کیا۔ میں نے ریڑھی کا بھی صبح کے وقت اخبار فروشی کا بندوبست بھی کیا ہے۔ رات بارہ بجے میں آ جاؤں گا۔ صبح چھ بجے سے ٹیڈی وہاں اخبار بیچے گا شام چھ بجے تک۔ اس میں کسی کو برا نہیں ماننا چاہیے اگر شام چھ سے رات کے بارہ بجے تک ہم بھی اس کے قریب رہیں۔ وہ کوئی بات ہم سے کرے اور ہم اس سے کر لیں۔ یہاں تو ایک چنڈال چوکڑی ہے جو بات کا بتنگڑ بناتی ہے۔ وہ باتیں صیغۂ راز میں رہیں گی اور اس پر کچھ تو اثر ہوگا۔ یہ دیکھ کر کہ اس کے عشق نے ایم اے پاس کامیاب صحافی کو مونگ پھلی بیچنے پر مجبور کر دیا۔"

"میں تو سمجھ گیا تھا بیٹے۔" محسن نے دانت نکال کے کہا۔ "کیا ماڈرن الیکٹرونک عشق ہے جس میں ہیرو زلیل پر حال ہو اور ولن زار زار جائے۔"

"کل ناز کو کامیابی رہی تو امید ہے کہ کامیابی کے تمام راستے کھل جائیں گے مگر ایک ہفتہ انہیں لگ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اس ایک ہفتے میں اور کچھ کام بھی ہو جائیں تو اچھا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہم اپنا سب نقد سرمایہ ایک جگہ کر لیں۔ جن ناموں سے کھولے ہیں ادائیں کر نکلوا لے آئیں۔ استاد ٹیڈی کا سونا بیچ دیں۔ دس ہزار تو صبح ہوتے ہی لگ جائے گا۔ الیکٹرونک مواصلاتی رابطے کا ساز و سامان بھی سستا نہیں ملے گا۔ شاید کبھی کوئی گاڑی بھی لینی پڑے۔ اس کے علاوہ اسلحے کی پوزیشن کا بھی اندازہ کرنا ہے۔"

رات کے ایک بجے ہم بھی سو گئے۔ اس وقت تک ہم نے اتفاق رائے سے چوہدری دلاور کے خط کو نظر انداز کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ اس چال کی ناکامی کے بعد وہ کیا قدم اٹھاتا ہے۔ غالب نے غائب ہو کے بہت عقل مندی کی تھی ورنہ ہمارا یہ ٹھکانا بھی شکاری تاڑ جاتے اور اس مرتبہ وہ

www.paksociety.com

عجلت میں کوئی کام نہ کرتے۔ بس اس وقت پتا چلتا جب ایک دھماکا ان کا امام آرام اپنی کے وجود کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتا۔

صبح میں خلافِ معمول دیر تک سوتا رہ گیا۔ شیدی کو سونے کے معاملے میں تھا بہ بدنام۔ اٹھایا نہ جاتا تو دوپہر تک سوتا رہتا۔ اکیلا محسن بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ گھڑی میں پونے آٹھ بجے تھے۔

"عیش کر لو بھائی۔ جب تک مقدر میں ہے۔" محسن مسکرا کر بولا۔ "ہم بھی کبھی آٹھ بجے سو کر اٹھتے تھے۔"

"اب کون روکتا ہے تجھے۔ نام بتا مجھے اس کا۔" میں نے کہا۔

"نام اس کا کچھ بھی ہو۔ شملہ زالعبد یا نازو۔" محسن بولا۔ "لیکن مسلاتی وہ بیوی ہے۔ عجیب مشکل ہے کہ شادی نہ کرو تو رونا اور شادی کر لو تو مزید رونا۔"

"اس وقت رونے کے اسباب پر روشنی ڈالیے۔" میں نے کہا اور سگریٹ جلائی۔ محسن نے جھک کر ڈبیا کو گھورا اور ایک سگریٹ مانگی۔

"دیکھ نا یار۔ کل سگریٹ کی پوری ڈبیا چرمر کر کے باہر پھینک دی کہ بس بچے خبردار جو آئندہ تم منہ سے دھواں نکالا۔" محسن نے کش لگاتے ہوئے کہا۔ "میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ دھواں کہیں سے تو نکلے گا۔ ناک منہ سے نہ نکلا تو دل سے اٹھے گا۔ رات کو سوتے تھے تہجد کے وقت۔ صبح مجھے پہلے اٹھا دیا کہ نماز پڑھو۔ نماز تو پڑھ لی میں نے مگر اس کے بعد بیڈ ٹی مانگی تو جواب ملا کہ بری عادت ہے بس اب ناشتا کرو گے تو چائے ملے گی۔ اگر خالی پیٹ کچھ پینا ہے تو دودھ یا پھر جوس پی لو۔ ہم صبح دم بلیک کافی پینے والے دودھ پینے لگے۔ ناشتا ملے گا سب کے ساتھ۔ روزوں میں نہیں تو کیا کروں۔"

"غالب اٹھ گیا ہو تو بس منگوا لے ناشتا۔ اور دیکھ آتا ہوں حسن کی دوست بن گئی۔" میں نے کہا۔ "بیوی کو ذرا لو بک کر دے۔ ناشتے پر ڈانٹنا بلا وجہ۔ جتنے مختلف کرتی ہو کیوں ہے۔ اللہ اف فرانی کیول ہے شوہروں کے پاس رعب جھاڑنے کے بہت بہانے ہوتے ہیں۔ اس نے سگریٹ پینے کو منع کیا ہے۔ تو چرس شروع کر دے۔ بیڑی سے منع کرے تو حقہ۔ اپنے ساتھ لے کر پھرتے رہو۔ حقے پر پابندی کا جو تو دھمکی دے کہ اب آخر کیا پیوں۔ شراب، چرس یا گانجا۔ ٹھیک ہو جائے گی۔"

"اچھی صلاح دے رہے ہیں سکندر بھائی۔" شملہ نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ اس نے محسن کے ہاتھ سے سگریٹ چھین لی اور کھڑکی سے باہر پھینک دی۔

"تم فکر مت کرو۔" محسن نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی تو کرے گا شادی۔ میں بھی اسے ایسی صلاح دوں گا۔ خدا کے لیے اب تو ناشتا لا دو۔ ہم دیر سے بھوک اٹھ گئے ہیں۔" شملہ نے ٹیڈی کی طرف دیکھا جو اٹھ بیٹھا تھا۔

"غالب بھائی بھی آ جائیں۔" شملہ مسکرائی۔

"اس کا کچھ بھروسا نہیں۔ وہ دوپہر تک بھی نہ آئے۔" محسن بولا۔ "مجھ سے کہہ گیا تھا۔"

غالب دس بجے آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ بیلا کے مو سے بھائی بھی تھا۔ وہ ٹیکسی میں سو رہا تھا اور غالب نے اسے جھنجھوڑنے کے بعد اسے بیدار کیا تو وہ سخت حیران ہوا۔

"ہم سو گیا تھا؟" وہ سر کھجاتے مشکوک لہجے میں بولا۔

"کیا رات بھر جاگتے رہے تھے؟" غالب نے کہا اور اسے اندر لے آیا۔

"نیند لیے نہیں آتا۔ گولی کھاتا تو سوتا۔" مو سے بھائی نے باری باری ہم سب کی صورتوں کا جائزہ لیا۔ نازو اور شملہ کے چہرے اس نے پہلی بار دیکھے تھے مگر مجھے دیکھ کر وہ پہچان گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے اسے مصافحے پر مجبور کیا۔

"رات کو تم نے بھول سے دو گولیاں کھا لی ہوں گی۔" غالب نے کہا۔

"ہم دو ہی کھاتا ہے بابا... مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے پھر دو گولی کھا لیا ہو۔ بھول ہو جاتا ہے۔" وہ بولا۔ اس کی آواز میں غنودگی تھی اور آنکھیں بوجھل تھیں۔ وہ بھی بھریوں کے ایک ایسے گروہ کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا جو صورت بدل بدل کے حقیقی زندگی میں ڈرامے کرتے رہتے ہیں۔ بلیک کافی کی ایک پیالی پی کر وہ ہشاش ہو گیا۔

"اب تم اپنا کام شروع کر دو۔" غالب نے کہا۔ "کام میں تم کو بتا چکا ہوں۔ کام اچھا ہو گا تو ہزار زیادہ دوں گا۔ فرق ہوا تو ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ بلکہ جو تمہاری جیب میں ہے وہ بھی لے لوں گا۔"

"پیسہ پہلے۔ کام بعد میں۔" مو سے بھائی نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

میں نے اسے دس ہزار نقد دیے جو اس نے حفاظت کے ساتھ اندر کی جیب میں رکھ لیے۔ محسن نے وہ سوٹ کیس اس کے سامنے رکھ دیا جو وہ گزشتہ رات لے کر آیا تھا۔ مو سے بھائی نے اسے کھول کر دیکھا اور تمام اسباب کا بغور جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کے سر ہلایا مگر جب محسن نے تزئین کا ہاتھ پکڑ کے آگے کیا تو وہ حیران ہوا۔

"اس لڑکی کو جرنیل بنا دو۔" محسن نے کہا۔

"اللہ ہم کو معافی دے۔ ہم اچھا صورت کو بگاڑتا ہی نہیں۔ ہم صورت کو خوبصورت بناتا مگر تم ہم سے یہ گناہ کراتا۔"

"زیادہ باتیں مت کرو۔" غالب نے خفگی سے کہا۔ "گناہ ثواب کے فلسفے کو ہم زیادہ سمجھتے ہیں۔ گناہ تم نے جیب میں رکھ لیا ہے۔ ثواب تم کو اپنے کام سے ملے گا۔ کتنا وقت لگے گا اس کام میں؟"

"تین گھنٹا۔" مو سے بھائی نے قطعی لہجے میں کہا۔

"اچھا تم اپنا کام کرو۔" غالب نے کہا۔ "میں آتا ہوں دو گھنٹے میں۔"

محسن کو وہیں چھوڑ کر غالب نے مجھے اور ٹیڈی کو ساتھ لیا اور ہم اسی ٹیکسی میں روانہ ہو گئے۔ بہادر لقمہ سرمایہ اب تیس ہزار سے بھی کم رہ گیا تھا۔ اس میں سے پانچ ہزار دے کر ہم نے ٹیڈی کو راستے میں اتار دیا۔ اسے ایک پرانی خرید نا تھی اور موٹر بیچنے کا سارا ہی سامان لینا تھا پھر اس سامان کو اپنے ٹھکانے تک پہنچانا تھا اور اس کام کے لیے ٹیڈی ہی کے پاس پرواز تھا۔ غالب نے اسے بتا دیا تھا کہ شام تک وہ پہنچ جائے گا۔ ٹیکسی کو ہم نے بیڈن روڈ کے پاس چھوڑ دیا اور بیڈن روڈ سے پیدل گزرے۔ راستے میں وہ آفس بھی آیا جس کے باہر "میرو زمیا ایڈ کمپنی" کا سائن بورڈ اب تک اسی طرح موجود تھا لیکن اوپر جانے والے زینے کی گرل میں تالا پڑا ہوا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ آفس میں اب کوئی نہیں۔ شاید وہ سب رخصت کر دیے گئے تھے جو پہلے کاروبار کے دفتری امور کو سنبھالتے تھے۔ زرعی مشینری کے پرزوں کے آرڈر لیتے تھے۔ چالان کرتے تھے اور امپورٹ ایکسپورٹ کی کاغذی کارروائی کا حساب رکھتے تھے۔ اس فیکٹری میں انسانوں کا پیٹ بھرنے والی مشینوں کو رواں رکھنے والے پرزوں کی بجائے سیول لیٹ گولیاں اتاری نے والا اسلحہ بننے لگا اور زندگی کے بجائے موت کا سامنا ہونے لگا تو کسی دفتر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ آرڈر دینے والے اور لینے والے براہِ راست بات کرتے تھے اور گفتگو تک کا ریکارڈ نہ چھوڑتے تھے اور نہ گواہ۔ ان کا لین دین سب ناجائز اور غیر قانونی تھا۔ اس میں حساب کتاب بھی ان کا اپنا تھا۔ اس کے ڈاکومینٹیشن ٹیک اور سیکیورٹی وہ خود تھے۔ انہیں امپورٹ ایکسپورٹ کے لائسنس کی ضرورت نہیں تھی کہ سرکاری اداروں سے خط و کتابت کریں اور سیلز ٹیکس یا انکم ٹیکس ادا کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ چنانچہ دفتر کا اور عملے کا وجود بے مصرف ہو گیا تھا اور حساب و کتاب اردو کی طرح اب حساب دشمنان ورد لوں کے اصولوں پر عمل ہو رہا تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب پہلی بار میں نے اس دفتر میں قدم رکھا تھا اور میری ملاقات ڈیکی سولنے سے ہوئی تھی۔ اس وقت سے اب تک گردشِ حالات نے کیا رنگ دکھائے تھے۔ ڈیکی سولا مذاق خاک ہو چکا تھا اور میں اس ادارے کا مالک ہونے کے باوجود یہاں سے گزرتے ہوئے بھی خوفزدہ تھا کہ پہچان نہ لیا جاؤں۔ نذیر خان کے پرانے وفادار اور نمک خوار جو اس کے لیے ایک خاندان کی طرح تھے بکھر گئے تھے۔ غالب سمجھتا تھا کہ اس وقت میرے جذبات و احساسات کیا ہوں گے۔ وہ خود بھی وقت کی انھی تبدیلیوں کے بارے میں سوچ رہا ہو گا جن کا شکار سب ہوئے۔ ہم ہوتے تم ہوتے کہ میر ہوتے۔ وقت گھات میں بیٹھا ہوا ایسے ہم اندھا شکاری ہے جیسے خبری میں وار کرتا ہے اور ہمارے خوابوں کے طلسم توڑ دیتا ہے۔ امیدوں کے نقش مٹا دیتا ہے اور منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہے اور شہنشاہ کو گدا اور غلام کو سلطنت کا مالک بنا دیتا ہے۔

ہم اپنے خیالات میں کھوئے بائیں طرف مڑ گئے پھر صوبہ خان شیرزئی کی دکان کے سامنے سے گھوم کر بیڈن روڈ پر داخل ہوئے شروع کے حصے میں وہ دکان بھی نہیں تھی جہاں سے ایک بار میں نے کلاک میکینزم والے ٹرانسسٹر ریڈیو لیے تھے جو درحقیقت ٹائم بم تھے معلوم نہیں وہ شخص کیا ہوا۔ اپنے ہی کسی ٹائم بم کے دھوکا دینے سے مارا گیا۔ دھوکا بم نہیں دیتا۔ ٹائمر دیتا ہے۔ وقت پر گرفت کا دعویٰ غلط ہو جاتا ہے اور تیس منٹ کا وقت انتیس منٹ میں گزر جاتا ہے۔ گھڑی کی سوئیوں کو متحرک رکھنے والی گراریاں تیز چلنے لگتی ہیں۔ انتیس منٹ کا سفر اٹھائیس منٹ میں پورا کر لیتی ہیں اور پانچ منٹ کے وقت کو خطرے کی حدود سے دور پہنچنے کے لیے بہت کافی سمجھنے والے ایک دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ بعض اوقات تیس منٹ پورے ہوتے ہی فرشتۂ اجل وقت کو روک لیتا ہے کیونکہ اس کے حساب سے وقت پورا نہیں ہوتا اور جب ٹائم بم لگانے والوں کو یقین آ جاتا ہے کہ اس کے نظام میں کوئی خرابی واقع ہو گئی ہے تو وہ اسے چیک کرنے آتے ہیں اور یہی ان کے لیے زندگی کا آخری لمحہ ہوتا ہے جب ہاتھ لگاتے ہی ٹائم بم پھٹ جاتا ہے کیونکہ فرشتۂ اجل کے ہاتھوں میں رکا ہوا وقت آزاد ہو جاتا ہے۔

غالب کے ساتھ میں ایک بہت بڑی دکان میں داخل ہوا تو میرے خیالات کی رو ٹوٹ گئی۔ وہ دکان ہر قسم کے بجلی کے سامان سے بھری ہوئی اور بہت سجی ہوئی تھی۔ نئے سیلز مین ہماری طرف بڑھے لیکن غالب ہاتھ ہلا کے سیدھا گزر گیا۔ آخری حصے میں ایک شیشے کا دروازہ تھا جس کے وسط میں سرخ رنگ سے "پرائیویٹ" لکھا ہوا تھا۔ اندر مختصر سے کیبن نما کمرے میں ایک میز کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر ایک نوجوان آدمی بیٹھا تھا جس نے غالب کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور ہم اس کے مقابل کی دیوار کے ساتھ لگے

www.paksociety.com

ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔ خاطر تواضع کے ساتھ باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ باغی ذہن رکھنے والا نوجوان غالب کی مدد کے باعث ایک ڈی ایس پی کے عتاب سے بچ گیا تھا مگر اس کی روش تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ پولیس ہی نہیں دوسرے حرام کھانے والوں سے ترمیم ڈگنی اجرت وصول کرتا ہوں، مفت کام کرتا ہوں گا یا رعایت دیتا ہوں گا تو کسی غریب یا مستحق آدمی کو دوں گا یا کسی دوست کا کام ہو گا تو کروں گا۔ پھر ان بدمعاشوں سے کمی پوری کروں گا۔ غالب نے اسے یقین دلایا کہ اس ملک میں رہ کر بھی اس کے خیالات نہ بدلے تو انشاء اللہ ایک دن اس کا کاروبار بھک سے چوپٹ ہو جائے گا اور وہ خود بھی اپنی اصولی اور نظریاتی جنگ کے باعث عزت نہیں پائے گا بلکہ بیتے پ کے مجرمان میں شامل کیا جائے گا۔ غالب کہاں کہاں اس کی مدد کرے گا۔ اس نقار خانے میں جہاں بدمعاشی کا نقارہ بج رہا ہے، کون سنتا ہے صدائے درویش۔

پھر غالب نے مطلب کی بات کی کیونکہ اس نوجوان کے خیالات کو بدلنا مشکل تھا۔ بالآخر وقت اسے صحیح سبق پڑھائے گا۔ وہ سمجھ جائے گا کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا اور پھر دنیا میں کما کھا رہے گا۔ اس نے ہمارے مطالبات پر غور کیا اور ضرورت کی نوعیت کو سمجھنے کے بعد کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

"بات یہ ہے غالب صاحب کہ میں دنیا کے بازار میں سب کچھ ملتا ہے مگر آپ آ گئے ہیں میری دکان پر۔" وہ بولا۔ "میں کوئی ناجائز چیز نہ رکھتا ہوں نہ بیچتا ہوں۔ لیکن میں آپ کو سوری کہہ کے بھی رخصت نہیں کر سکتا کیونکہ آپ ایک ضرورت لے کر میرے پاس آئے ہیں۔"

"مسئلہ کیا ہے۔ یہ کام ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا؟" غالب بولا۔

"میں نے انکار نہیں کیا۔" وہ بولا۔ "مجھے یہ سب سامان منگوا کے دینا پڑے گا۔ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہاں کون کیا بیچ رہا ہے اور کس دام بیچ رہا ہے۔"

"چلو تم ان کا پتا بتا دو۔" غالب نے کہا۔

"وہ آپ کو اتنی آسانی سے یہ چیزیں نہیں دیں گے۔" وہ بولا۔ "جتنی آسانی سے پرچون کی دکان سے دال مل جاتی ہے۔ کسی کو کیا معلوم کہ آپ کون ہیں۔ پولیس یا سی آئی ڈی کے آدمی یا ملٹری انٹیلی جنس والے۔ یہ چیزیں بہت خطرناک مقاصد میں استعمال ہوتی ہیں۔ کسی کا راز لینے کے لیے۔ اب راز کسی فرد یا خاندان کا ہو تو اسے بلیک میل کیا جا سکتا ہے اور حکومت کا ہو تو اس سے وطن فروش قسم کے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"ایک اور استعمال کے امکانات پر غور کرو۔" غالب نے کہا۔ "کہ اس سے وطن دشمن عناصر کی سرگرمیوں کا پتا چلایا جا سکتا ہے اور ان کی نگرانی کی جا سکتی ہے۔ انھیں ارتکابِ جرم کے وقت یا معقول ثبوت اور شہادت جمع کر لینے کے بعد گرفتار کیا جا سکتا ہے۔"

"آئی سی۔" اس نے مجھے پہلی بار غور سے دیکھا کیونکہ میں خاموش ہی رہا تھا اور عملاً اس موضوع پر صرف غالب سے بات کی تھی۔ "آپ لوگوں کا مقصد یہی ہو گا۔ میں یہ فرق نہیں کر سکتا آپ لوگ کسی طرح بھی غیر اخلاقی یا غیر قانونی کام کر سکتے ہیں۔"

"کیوں فرق نہیں کر سکتے۔ صرف ہماری شریفانہ صورت دیکھ کر۔" غالب بولا۔

"نہیں۔ ہر شخص کی ایک چھٹی حس ایسے ہی موقع پر اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور اس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔" وہ بولا۔

"وہ تمھاری مرضی۔ تم اپنی حس پر بھروسا کر دیا پھر ہم پہ۔ کام ہونا چاہیے۔ کاروبار میں اتنی لیت نہیں رکھنی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "صاف بات کرو۔"

"جی۔ اور صاف بات یہ ہے کہ میں آپ کو سب کچھ [illegible] دوسروں سے لے کر آؤں گا۔" وہ بولا۔ "آپ یہیں تشریف رکھیے۔ اگر آپ گئے تو وہ بہت بھڑک جائیں گے۔ کبھی ایک جگہ ہوں گے کبھی دوسری جگہ۔ آج کل پر سروں پہ ٹال [illegible] اور اس عرصے میں آپ کے بے ضرر ہونے کی تصدیق بھی کر لیں گے اور آپ کی [illegible] کا اندازہ بھی۔ قیمت وہ ضرورت کی وصول کرتے ہیں۔ چیز کی نہیں۔ میں ان کے لیے بے ضرر ہوں۔ ابھی مال لے آؤں گا اور [illegible] پیسے بھی نہیں دوں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر چیز وہ بے قیمت خرید پر یا معمولی منافع پر دے دیں گے۔ جی نہیں۔ [illegible] اتنے خطرات مول لے کر جو چیز لاتا ہے وہ معمولی منافع کے لیے نہیں لاتا۔"

"قیمت کوئی مسئلہ نہیں۔" غالب نے کہا۔ "تم جاؤ۔ ہم یہاں تشریف رکھتے ہیں۔" اس نے مجھ سے لے کر اس کے سامنے بیس ہزار رکھ دیے۔

"اب ایسا بھی نہیں۔" وہ بیس ہزار اٹھاتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی میں احتیاطاً زیادہ لے جا رہا ہوں۔ کچھ لوگ زیادہ خبیث ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بیس بھی لحاظ کے قائل نہیں ہوتے۔ [illegible] چوری کا مارکیٹ میں ایک ہی بیس ہو تو وہ چڑھ جاتا ہے [illegible] جو قیمت مانگے دینا پڑتی ہے۔"

ہم نے اسے ایک سیلز مین کے ساتھ باہر جاتے دیکھا لیکن اندر شیشے کے دروازے کے پیچھے بیٹھ کر ان کے [illegible] ہونے والی گفتگو نہ سن سکے۔

"کیا ہم یہاں بیٹھ کے بات کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے مذبح خانے میں بھینس کسی دوسری بھینس سے پوچھے کہ یہاں چھری کا کوئی ڈر تو نہیں۔" غالب بولا۔

"تمھارا مطلب ہے یہاں دیواروں کے واقعی کان ہوں گے؟" میں نے کہا۔ "جو سب سن کر ریکارڈ کر لیں گے اور تمھارا دوست بعد میں سب جان لے گا؟"

"کیا یہ ناممکن ہے؟" غالب بولا۔ "وہ آدمی تو ایسا نہیں ہے لیکن اسے کوئی ضرورت بھی نہیں ہے اتنا اہتمام کرنے کی۔ تم کو کیا لگتا ہے۔ وہ کم سے کم ہماری باتیں سن کے ہمیں بلیک میل نہیں کرے گا اور ہمارے راز بھی افشا نہیں کرے گا۔"

"تمھارا کیا خیال ہے، وہ خط لکھنے والا احمق تھا؟" میں نے کہا۔

"اس کی جگہ تم ہوتے؟" غالب سر کھجا کر بولا۔ "تو یہ خط لکھنے کے بعد کیا امید رکھتے۔ فرض کر لو کہ تمھاری جگہ وہ ہوتا؟"

"میں کوئی امید نہ رکھتا۔" میں نے کہا۔

"یہ بات کہ اسی مسئلے پر غور فرما رہا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "وہ پورا خط ایک جال ہے۔ مگر اس میں ایک سچائی چھپی ہوئی ہے۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد تم نے کچھ نتائج اخذ کیے تھے جو لکھنے والے کے ذہن میں تھا کہ تمھارا ذہن اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچے گا اور یہی نتائج اخذ کرے گا۔ تم نے بہت کچھ فرض کر لیا اپنے طور پر۔ فیکٹری تمھارے حوالے کرنے کی وجہ کیا ہے۔ تمھارے خیال میں وجہ یہ ہے کہ دلاور نے اسلحہ سازی کی تھی اور شروع کر دی ہے۔ دلاور جانتا تھا کہ اس خط کو پڑھنے کے بعد تم یہی سمجھو گے اور پھر تصدیق کرو گے۔ اگر تصدیق کے لیے خود جاؤ گے تو وہ تمھارے استقبال کے لیے موجود ہو گا اور تمھیں اپنے اندازوں کے غلط ہونے کی قیمت ادا کرنا ہو گی۔ سب کچھ وہاں بالکل ویسا ہی ہو گا جیسا پہلے تھا۔"

"کیا تمھارا خیال غلط نہیں ہو سکتا؟" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"ہر بات، ہر خیال اور نظریہ دونوں پہلو رکھتا ہے۔" غالب بولا۔ "وہ تجربات کی کسوٹی پر اور مشاہدے کے بعد درست ثابت ہو جائے گا یا غلط ہو گا۔ اس حقیقت کو میں نے بھی فراموش نہیں کیا تھا۔ اگر ہم یہ مان لیتے ہیں کہ اسلحہ سازی اب کسی دوسرے محفوظ اور خفیہ مقام پر ہو رہی ہے تو کیا ہو گا؟ ہم ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کی طرف سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ اس بات کا تو کوئی امکان ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تم یا تمھارا کوئی قانونی نمائندہ اس کا قبضہ لینے جائے گا تو جھک مار کے لوٹ آئے گا۔ دلاور کہتا کہ میاں ہوش کے ناخن لو۔ مقدمہ عدالت میں ہے۔ میں ایسا خط لکھنے کی حماقت اور جسارت کر سکتا ہوں؟ اچھا کچھ وہی ہوتا کہ ہم اپنے خیال پر قائم رہتے اور ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس ہماری نظرِ کرم سے محفوظ ہو جاتا۔ ہم بے وقوف اس نئے مقام کی جستجو میں لگ جاتے جہاں دلاور نے اسلحہ سازی کی فیکٹری منتقل کی ہو گی اور اس سراب کے پیچھے اپنا وقت بھی ضائع کرتے اور توانائی بھی۔"

"تم نے مجھے الجھا دیا ہے مرزا غالب کے بھتیجے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ تمھارے دونوں خیال منطقی اور قابلِ غور ہیں۔ سچ یہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی مگر سچ دو نہیں ہو سکتے۔"

"سچ ایک ہے اور اس کو دریافت کرنا پڑے گا۔" غالب نے کہا۔ "دلاور کے خط نے ہمارے سامنے ایک چیلنج رکھ دیا ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو ہم اس چیلنج کو قبول کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم خود جا کے دیکھ لیں گے کہ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس میں اب کیا ہو رہا ہے۔"

اسی وقت دکان کا مالک لوٹ آیا۔ اس کے ہاتھ میں گتے کا ایک ڈبا تھا۔ "کچھ تو مل گیا۔" وہ اندر آ کے بولا۔ "کچھ میرا آدمی لے کر آئے گا۔" اس نے ڈبا میز پر رکھا اور فون گھمانے لگا۔ اس نے چند جگہ فون کیا اور پھر آرام سے بیٹھ کر ڈبا کھولنے لگا۔ پہلی چیز جو اس نے برآمد کی وہ دیکھنے میں مختصر ترین آلۂ سماعت کی طرح تھی۔ ایک دھاگے جیسے باریک تار کے ساتھ ایک سرے پر ننھا سا سفید موتی لگا ہوا تھا۔ دوسری طرف دو انچ چوڑا اور تین انچ لمبا سفید رنگ کا پلاسٹک کیس تھا جس کی موٹائی چار پانچ ملی میٹر سے زیادہ نہیں تھی۔

"یہ وہ چیز ہے جس سے بہرے اور اونچا سننے والے عام لوگوں کی طرح سن سکتے ہیں۔" وہ بولا اور اس نے ہر طرف سے بند ڈبیا پر ایک ننھے سے ابھار کو دبا دیا۔ ابھار کے نیچے سرخ روشنی جھلملانے لگی۔ "اب یہ آن ہو گیا ہے۔ جس کا دل چاہے اسے ٹیسٹ کر لے۔ یہ آلۂ سماعت کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

غالب نے کان میں انگلی ڈال کے کہا۔ "غالباً یہ چیز اس فہرست میں شامل نہیں تھی۔ اس کی ضرورت تو شاید اسی سال کی عمر میں پڑے گی۔"

وہ مسکرایا۔ "یہ آپ کی مطلوبہ چیز ہے مگر بہت محفوظ۔ اب آپ غور سے دیکھیے۔ میں اس ننھے سے بٹن کو پھر دباتا ہوں۔ لائٹ آف ہو گئی نا۔ مگر اب پھر غور فرمائیے۔ میں اسی بٹن کو پھر دباتا ہوں۔ لائٹ آ گئی۔ یہ اب بھی آلۂ سماعت ہے مگر یہ دیکھیے میں نے اسی بٹن کو ایک بار پھر دبا دیا۔ لائٹ آف نہیں ہوئی بلکہ کچھ تیز ہو گئی ہے۔ اب یہ ایک واکی ٹاکی ہے۔ کان میں لگا ہوا مائک بہت زیادہ حساس اور پاورفل ہے اور تین فٹ کے دائرے

www.paksociety.com

کی سرگوشی بھی کیچ کر سکتا ہے۔ یہ باریک تار اس کا انٹینا ہے اور اس کے نیچے کا دوسرا حصہ ٹرانسمیٹر ہے جسے جیب میں ڈالا جا سکتا ہے یہاں تک کہ بالوں میں چھپایا جا سکتا ہے بشرطیکہ بال لمبے اور گھنے ہوں۔ بالوں میں سے نکل کے یہ دھاگے جیسا تار کان تک پہنچ جائے گا۔ اس کی آواز سو میٹر دور دوسرے یونٹ میں سنی جا سکتی ہے دونوں کی فریکوئنسی ایک ہے لیکن "پری سیٹ" ہے یعنی آپ چاہیں تو اسے بدل نہیں سکتے۔" اس نے ڈبے میں سے دوسرا ویسا ہی آلہ اور سماعت نکال کے بھی دکھایا اور اپنی نگاہ شیشے کے دروازے کے باہر رکھی۔

"یہ خاصی کارآمد چیز ہے۔" غالب نے کہا۔

"اب آپ اس کا طریقہ استعمال سمجھ لیں۔" وہ بولا۔ "اس بٹن کو پھر دبانے سے یہ نظام آف ہو گیا۔ لائٹ بجھ گئی ہے۔ اسے دوبارہ آن کرنے کے لیے بٹن کو دہرانا پڑے گا۔ پہلی بار میں آلۂ سماعت آن۔ دوسری بار میں آف۔ تیسری بار میں پھر آلۂ سماعت آن جو چوتھی بار دبانے سے لائٹ زیادہ تیز ہو گی مگر لائٹ ہر جگہ نہیں دیکھی جا سکتی۔ فرض کریں کہ یہ آپ نے بالوں میں چھپا رکھا ہے۔ آپ اپنا سر کھجانے کے بہانے اسے آن یا آف کر سکتے ہیں۔ وائرلیس بنانے کے لیے اس بٹن کو چار مرتبہ دبا دیجئے۔ پانچویں دفعہ میں آف۔ خدانخواستہ یہ کسی کے علم میں آ جائے تو اسے خاک بھی پتا نہیں چلے گا۔ ایک بار کی یہ آن ہو گا تو صرف آلۂ سماعت ہو گا۔ وہ اسے آف کر کے دیکھے گا۔ دوبارہ آن کرے گا تب بھی یہ آلۂ سماعت ہی ہو گا۔ شک کی بات ہی نہیں۔ پچھلی بار میں یہ گر ورنہ پیغام رسانی کا ذریعہ ہے جب یہ چار مرتبہ دبایا جائے گا تو سرگوشی کے دائرے میں دوسرا یونٹ کان میں سگنل دے گا۔ دوسرا شخص اپنے یونٹ کے بٹن کو چار مرتبہ دبا کے بات کر سکے گا اور سن بھی سکے گا۔ کان میں لگا ہوا مرئی کنڈنسر مائک بھی ہے اور ہیڈ فون بھی۔"

میں اس چیز کی افادیت کا قائل ہو گیا۔ جب اس نے بالوں کی بات کی تھی تو قدرتی طور پر میرے ذہن میں نازو کا خیال آیا تھا مگر ابھی یہ محض ایک خیال تھا۔ کوئی فیصلہ نہیں تھا کہ وہ اسے ضرور استعمال کرے گی۔ آغاز ہی سے اس کا ایک الیکٹرونک آلے کے ساتھ جانا شبہات کو جنم دے سکتا تھا۔ ہمارے مقابلے پہ وہ لوگ نہیں تھے جو گرد و پیش سے بے خبر ہوں۔ شاید ہم سے پہلے وہ جانتے ہوں گے کہ بازار میں کیا کچھ دستیاب ہے اور استعمال بھی کر چکے ہوں گے۔ یہ کوئی نادر ایجاد یا دنیا میں اپنی نوعیت کی واحد چیز نہیں تھی۔ اس کی قیمت سن کر غالب بھی متاثر ہوا۔ باہمی رابطے کی یہ جوڑی آٹھ ہزار میں مل رہی تھی اور اس کی افادیت سوچنے تک محدود تھی۔ اس کے بعد مجھے دوسری چیز کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ایک سگریٹ کے پیکٹ سے جڑا ہوا واکی ٹاکی تھا اور اس سے ایک فٹ لمبا انٹینا کھینچ کر باہر نکالا جا سکتا تھا۔ اس قسم کے دو یونٹ چار ہزار میں مل رہے تھے۔ یہ ایف ایم ٹرانسمیٹر ریسیور تھے جو بیٹری سیل سے چلتے تھے اور ان کی رینج ایک کلومیٹر تھی۔ ظاہر ہے یہ چھپا کے استعمال کرنے کی چیز تھی اور ان کا طریقہ استعمال ہم جانتے تھے۔

"اس کی رینج انٹینا بڑھانے سے تین کلومیٹر تک ہو جاتی ہے۔" غالب کے دوست نے کہا۔ "منزلہ گھروں کے اوپر لگے ہوئے ٹی وی کے ایریل سے مدد لی جائے تو تین کلومیٹر تک آواز پہنچ جاتی ہے۔ تین کلومیٹر کے فاصلے سے سگنل ریسیو کرنا ممکن ہے۔ اس کا مسلسل استعمال کیا جائے تو پانچ گھنٹے کام دے گا۔"

"اس پر مجھے یاد آیا۔" میں نے کہا۔ "اس دوسرے یونٹ میں بھی تو سیل ہو گا۔ آلۂ سماعت ٹائپ..."

"ہاں۔ اس میں مائکرو سلیکون سیل ہے۔" وہ بولا۔ "یہ چیز نئی عام تو نہیں ہے مگر مل جاتی ہے تلاش کرنے سے۔ ڈیڑھ سو کا ایک سیل ملے گا جو کافی چلے گا۔ استعمال پر منحصر ہے۔ ایک سو اسی منٹ کی لائف ہے اس کی چنانچہ آپ حساب رکھیں کہ کتنے منٹ استعمال ہوا۔ عام طور پر لائٹ سیل آہستہ آہستہ کمزور ہوتا جاتا ہے سگنل بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ سلیکون سیل ایک دم جواب دے جائے گا۔ دراصل اس یونٹ کو کم سے کم ایک خاص مقدار میں بیٹری چاہیے اس کا لیول گرے گا تو فنکشن ختم ہو جائے گا۔ آپ ان دونوں چیزوں کو ٹیسٹ کر لیں گے؟"

"نہیں۔ آپ کا کہا کافی ہے۔" غالب نے کہا اور اس کے دکان دار دوست نے دو چھوٹے اور دو بڑے واکی ٹاکی بھی ڈبے میں بند کر دیے۔ وہ صابن کی بارہ ٹکیوں والا ڈبا تھا جس کو کھولتے ہی صابن کی خوشبو مہک آئی تھی۔ اس میں سب چیزیں پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر رکھی گئی تھیں۔ جیبیں کھلے ہوئے سراغ رساں ہو گیا تھا۔ غالب نے بے چینی سے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ابھی تک دکان کا وہ سیلز مین بھی نہ آیا جو مالک کے ساتھ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اندر آیا اور اس نے چمڑے کی جیکٹ کے اندر سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکال کے میز پہ رکھ دیا۔ "دو ہزار اور دینے ہیں۔"

"کم نہیں کیے اس یہودی نے؟" دکان کا مالک بولا۔

"کہہ رہا تھا بارہ کے دس لے رہا ہوں اور کیا کم کروں۔"

"غالب صاحب، میرا اندازہ کچھ غلط ہو گیا۔" دکان والے نے کچھ خفت سے کہا۔ "لیکن سادی بات ضرورت کی ہے اور مال ملنے کا اتفاق ہے۔ چنانچہ سب خاموش اتحادی ہیں۔ دو چار منٹ میں آپ سے آدھی قیمت دینا پڑی۔ مل سے دو ہزار اور دے دیں۔" سیلز مین دو ہزار لے کر چلا گیا تو اس نے "تحفے" کا سگریٹ والا پیکٹ کھولا۔ اندر سے ایک کلائی کی گھڑی نکلی اور ایک

عجیب سی چیز جس کی لمبائی دو انچ تھی۔ چوڑائی آدھے انچ سے کچھ زیادہ اور موٹائی دیکھی چار پانچ ملی میٹر۔ اس کے دونوں کنارے گول تھے۔ ایک سطح بالکل صاف اور چکنی تھی۔ دوسری طرف انگلی کے ناخن کے برابر کیسے حصے پر جالی تھی۔ جالی کا اور اس چیز کا رنگ سیاہ تھا۔

"یہ سب نایاب... اور خطرناک چیزیں ہیں۔" دکان دار بولا۔ "یہ کلائی کی گھڑی نہیں ایف ایم مائکرو فون ہے۔ گھڑی کی چابی اپنی جگہ وقت بتانے والی سوئیوں کے لیے ہے۔ اس کو تھوڑا سا باہر کھینچ لیں تو وقت ملایا جا سکتا ہے۔ ہر گھڑی میں ایسے ہی ہوتا ہے لیکن اب دیکھیے۔ میں منٹ کی سوئی کو ایک پورا چکر دیتا ہوں۔ وقت ایک گھنٹا آگے بڑھ گیا۔ اب اسے واپس لاتا ہوں۔ وقت پھر وہی ہو گیا۔ اب چابی کو تھوڑا سا اور باہر کھینچ لیں۔ سیکنڈ کی سوئی رک گئی ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ آپ کی گھڑی کا مائکرو فون کام کرنے لگا ہے۔ سوئی کو گھمائیں گے تو فریکوئنسی بدلے گی۔ جیسے ریڈیو کی سوئی سے بدلتی ہے۔ اس ریموٹ مائکرو فون میں یہ فائدہ ہے کہ آپ کو ایک ہی فریکوئنسی پہ پیغام دینے کی مجبوری نہیں۔ آپ جب چاہیں فریکوئنسی بدل لیں۔ اٹھاسی میگا ہرٹز سے ایک سو آٹھ میگا ہرٹز کے درمیان کہیں بھی رکھ لیں۔ اس کی رینج بہت زیادہ ہے میرا مطلب ہے اس کے سائز کے مقابلے میں۔ کسی گاڑی کے ریڈیو کا انٹینا لمبا اور اونچا کر لیا جائے تو ریڈیو ٹیون کرنے سے اس مائکرو فون کا سگنل کسی جگہ بالکل صاف سنائی دے گا۔ تقریباً ایک میل کے دائرے میں۔ ایک کلومیٹر کچھ کم ہوتا ہے ایک میل سے۔ انٹینا کم سے کم تین فٹ اونچا ہونا چاہیے گاڑی کے ریڈیو کا۔ چھت کے اوپر ہو گا تو آواز زیادہ صاف ہو گی مگر رینج وہی رہے گی۔ اس کلائی کی گھڑی کی سب سے بڑی خوبی اس کا سیل ہے جو تھرمو الیکٹرک سیل ہے۔ جیسے کہ گھڑیاں تیل کو جلا کے بجلی پیدا کرتے ہیں؟ اسی طرح اس سیل میں جسم کی حرارت سے کرنٹ پیدا ہوتا ہے۔ گھڑی ہاتھ پہ بندھی رہے تو اس کی پشت حرارت جذب کرتی ہے اور سیل اس حرارت کو کرنٹ میں تبدیل کرتا ہے۔ سیل کی لائف مقرر نہیں ہے۔ نہ چلے تو دو دن نہ چلے اور ٹھیک کام کرتا رہے تو دو سال گزر جائیں۔ طریقہ استعمال سمجھ لیا ہے آپ نے۔ ایک بار پھر دیکھ لیں۔"

"ہم اتنے کم عقل نہیں ہیں۔" غالب مسکرایا۔ "ایک بار میں بات سمجھ بھی لیتے ہیں اور سمجھا بھی دیتے ہیں۔ یہ واقعی بہت قابل قدر اور کارآمد چیز ہے۔"

"ہے بھی تو آٹھ ہزار کی جناب۔" غالب کا دوست خوش ہو کے بولا۔ "یہ جو کمال کی چیز ہے یہ سیدھا سادا مائکرو فون ہے۔ اس کی فریکوئنسی پری سیٹ ہے۔ یعنی آپ بدل نہیں سکتے۔ اسے آپ ایک الیکٹرونک کان سمجھ لیں۔ یہ مقناطیسی ہے اور کسی بھی لوہے کی سطح پہ چپک جاتا ہے۔ آس پاس کچھ بھی ہو یہ ہر آواز کو نشر کرتا رہتا ہے اور اس کی آواز بھی ایف ایم بینڈ ریڈیو پہ سنی جا سکتی ہے مگر وہی سو میٹر کے دائرے میں۔ اسے ارتھ ہونا چاہیے۔ ارتھ ہوتے ہی یہ خود بخود آن ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ اسے گاڑی کی باڈی سے لگا دیں تو یہ کام شروع کر دے گا۔ الگ کر دیں گے تو آف ہو جائے گا۔ گھر کے اندر پانی کے نلکے سے چپکا دیں۔ کسی کیل سے لگا دیں جو دیوار میں پیوست ہو۔ کھڑکی میں نہ لگی ہو لوہے کی۔"

"زبردست! مان گئے تمہیں دوست۔" غالب نے جذباتی ہو کے کہا۔ "تم نے میری جو مدد کی ہے وہ درحقیقت ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ میں تم کو زیادہ تفصیل نہیں بتا سکتا۔ مگر اس وقت تم نے اپنے وطن اور ملک کے کچھ دشمنوں کے جرائم کا کام بتانے کے مقدس فرض کو پورا کر دیا ہے۔ جس حد تک تم کر سکتے تھے۔"

"میں نے تو آپ کی مدد کی تھی۔ اگر یہ میرے وطن کی خدمت ہے تو غالب صاحب! آپ یہ پیسے لے جائیے۔" وہ بولا۔ "میں اپنا نہیں ہوں لیکن اس وطن کی خاطر لڑنے والوں کے لیے کچھ کر سکوں تو میری خوش قسمتی۔"

"پیسہ غیر اہم ہے۔ قربانی اور ایثار کا جذبہ ہے تو سب ہے۔ تم نے وقت پہ ایک مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مدد کی ہے یہ تمہارا جہاد ہے۔" غالب نے اٹھتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ "ایک دن میں خود تمہیں یہ بتانے آؤں گا کہ تم نے جو کچھ کیا تھا وہ بیس ہزار کیا، بیس لاکھ یا بیس کروڑ سے زیادہ قابل قدر تھا۔"

"مجھے امید ہے اس دن یہ بھی آپ کے ساتھ آئیں گے۔" وہ مجھ سے ہاتھ ملا کے بولا۔ "آج تو یہ بالکل نہیں بولے۔"

"امید ہے تم بھی اس راز کو راز رکھتے ہوئے چپ رہو گے۔ کسی سے ہمارے آنے کی بات نہیں کرو گے۔" غالب بولا۔ "تمہارا وہ سیلز مین قابل اعتبار ہے؟"

"وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔" وہ بولا۔ "اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ آپ بھروسا رکھیں اور پھر ضرورت پڑے تو مجھے کسی بھی وقت یاد کر لیں۔ میں اپنا کارڈ دیتا ہوں۔ گھر یا دکان پہ کسی جگہ فون کر دیں۔"

ہم کارڈ لے کر دکان سے نکل آئے۔ ہم نے دو گھنٹے میں واپس پہنچنے کو کہا تھا اور دو گھنٹے ہو گئے تھے۔

"تیرے دوست نے تو کمال کر دیا یار۔" میں نے کہا۔ "میں واقعی خود کو سکندر اعظم سمجھنے لگا ہوں جس نے دنیا فتح کر لی ہو۔"

"وہ تم کو طارق کا کوئی کرنل جنرل سمجھتا رہا۔" غالب ہنسا۔ "اور...

www.paksociety.com

اس لیے تمہارے بارے میں اس نے زیادہ تجسس کا مظاہرہ نہیں کیا۔ آدمی سمجھ دار ہے۔ یہ جانتا ہے کہ کاؤنٹر کے آپریشن کتنے ٹاپ سیکرٹ ہوتے ہیں۔"

"مجھے اس کی حب الوطنی، دوست داری اور اصول پرستی بھی پسند آئی۔" میں نے کہا۔

ہماری خوش قسمتی تھی کہ اسی جگہ سے ایک رکشا والے نے کسی قسم کی شرائط عائد کیے بغیر ہمیں بٹھالیا اور بیس منٹ بعد ہم گھر میں داخل ہوئے تو ہمارا استقبال چالیس سال سے زائد عمر کی ایک بدصورت بڑھیا نے کیا جس کے چہرے پر عمر رفتہ کی تحریر جھریوں کی شکل میں نظر آتی تھی۔ اس کے سر کے بالوں میں سفیدی غالب آنے لگی تھی اور یہ بال خشک، الجھے ہوئے اور کھردرے تھے۔ اس کے میلے اور بدوضع دانتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پان بہت کھاتی ہے اور پھر نسوار بہت استعمال کرتی ہے۔ اس کا رنگ سیاہی مائل گندمی تھا اور سوتی کے پرانے میلے شلوار قمیص کے ساتھ پھٹے ہوئے دوپٹے سے اس کی غربت عیاں تھی۔ جسمانی طور پر بھی وہ بہت نحیف و لاغر تھی۔ میں اور غالب کچھ دیر سکتے کے عالم میں کھڑے رہے۔ ہمارے لیے نازو کی اس ہیئت کذائی پر ہنسنا بھی مشکل تھا اور رونا بھی۔

"بہت صدمہ پہنچا ہے دل کو؟" شہلا نے غالب کو چھیڑا۔

"صدمہ تو مجھے بھی پہنچا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا صورت تھی جسے کیا کر دیا مگر صدمے سے زیادہ مجھے اس ہمت پر رشک آتا ہے۔ یہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔"

"ابھی تو کچھ نہیں کیا میں نے۔" نازو ہنسی۔ "اتنی تعریف مت کرو کہ مجھے غرور ہو جائے۔ حد سے زیادہ خود اعتمادی بھی نقصان پہنچاتی ہے۔"

"اس میں کوئی مبالغے کی بات نہیں نازو۔" محسن نے کہا۔ "میری بیوی سے پوچھو۔ ایمانداری سے بتائے کہ یہ کام وہ کر سکتی تھی؟"

"میں جھوٹ کیوں بولوں۔" شہلا نے کہا۔ "میں واقعی اتنی ہمت نہیں رکھتی۔ لیکن رابعہ باجی شاید..."

"نہیں... وہ بھی سیدھی دشمن کے قلعے میں داخل نہ ہوتی۔" میں نے کہا۔ "خود میں اسے نہ جانے دیتا۔ نازو کی طرح وہ اچھا دفاع نہیں کر سکتی۔"

"بابا تم لوگ اپنا مسخرہ پن چھوڑو۔" موٹے جی نے کہا جس کی طرف ہم نے ابھی تک توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے تین گھنٹے کہے تھے مگر اپنا کام دو گھنٹے میں ختم کر لیا تھا چنانچہ آدھے گھنٹے سے وہ ہمارے انتظار میں شہلا کے بیان کے مطابق ایک پیکٹ سگریٹ کا، دو گلاس پانی اور تین کپ چائے پی چکا تھا۔

"چھوڑ دی۔ بالکل چھوڑ دی آج سے۔" غالب نے کہا۔ "اپنا ٹوتھا پیش خدمت ہے۔ اس کو بگاڑ کے اپنے جیسا بنا دو۔" بیچارہ موٹے بھائی کے سامنے دھرنا مار کے بیٹھ گیا۔ موٹے جی ایک فنکار تھا مگر اس کے فن کی قدر نہیں تھی یا دنیا کو اتنی ضرورت نہیں تھی جتنی موٹر مکینک کی چنانچہ وہ عمر کے اس حصے میں فرسٹریشن کا شکار تھا۔ اسے ٹی وی سے ملنے والا معاوضہ اتنا تھا جو زندگی کی جائز ضروریات کی کفالت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ناجائز اور بے ضرور خواہشات کی تکمیل کے لیے اس نے ناجائز راستے اختیار کیے تھے لیکن اس سے موٹے جی کے اندر چھپا ہوا فنکار شرمسار رہتا تھا اور خود کو مجرم محسوس کرتا تھا۔ ہم سب اس کے ہاتھوں فن ہنرمندی کو مصروف عمل دیکھتے رہے۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے غالب کا چہرہ بدل دیا۔ غالب پر اسے اتنی محنت نہیں کرنا پڑی جتنی نازو پر ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ آدھے گھنٹے میں فارغ ہو گیا۔

"ابھی تم میرے کو چھوڑ کر آؤ۔" وہ بولا۔

"تم ٹیکسی میں آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "ٹیکسی لو اور چلے جاؤ..."

"نہیں یار۔ ہم اتنے بے مروت نہیں ہیں۔" غالب نے کہا۔ "لاؤ بھئی شہلا موٹے بھائی کے لیے گرما گرم دودھ ملائی والی چائے لاؤ۔ اور ہمارے لیے بھی۔" اس نے موٹے جی سے نظر بچا کے مجھے آنکھ ماری اور یہ اشارہ شہلا نے بھی دیکھ کر مخالفت کا ارادہ ترک کر دیا ورنہ یہ چائے کا کوئی وقت نہیں تھا۔

"استاد تم ذرا جا کے موٹے بھائی کے لیے ایک فرسٹ کلاس ٹیکسی لاؤ۔" غالب نے کہا۔ "جتنی دیر میں ٹیکسی آئے گی یہ چائے پی لیں گے اور اگر وہ فوراً آ جائے تو اس سے دو چار منٹ انتظار کا کہنا۔" ٹیڈی نے میری نظر کا اشارہ نہ دیکھا ہوتا تو وہ غالب کے اس تحکمانہ انداز پر احتجاج ضرور کرتا مگر اس نے دیکھا کہ یہ چکر کچھ اور ہے تو وہ خاموشی سے چلا گیا۔ شہلا نے چائے پانچ منٹ میں حاضر کر دی۔ پانی پہلے سے ابل رہا تھا چنانچہ دیر نہیں لگی۔

"یار یہ کیا حرام خوری ہے؟" غالب نے ایک کپ کو اندر سے ملاحظہ فرما کے کہا۔ "کپ کو ٹھیک طرح صاف تو کرنا تھا۔" پھر وہ اسی طرح کپ کو اندر لے گیا اور گرم پانی سے دھو کے لایا۔ سب سے پہلے اس نے موٹے جی کو چائے بنا کے دی۔ پھر اطمینان سے بلکہ کاہلی سے سلو موشن میں ہم سب کو چائے بنا کے دینے لگا۔

استاد ٹیڈی ہمارے چائے ختم کرنے تک ٹیکسی لے کر نہیں لوٹا تھا۔ شاید اسے ٹیکسی دستیاب نہیں ہو رہی تھی۔ لاہور کیا نہ جانے کیوں رکشا تعداد میں بڑھتے جا رہے تھے اور ٹیکسیاں

کم ہو رہی تھیں۔ موٹے بھائی اب واپس جانے کے لیے بے چین تھا کیونکہ اس کے ٹی وی اسٹیشن جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ بیس منٹ بعد بھلا سے ہو ٹیڈی استاد ٹیکسی لے کے واپس آ گئے اور اعلان کیا کہ شاہی سواری آ گئی ہے مگر موٹے جی اس وقت تک سو چکا تھا۔

"موٹے بھائی! اے موٹے بھائی۔" غالب نے اس کو ہلاتے ہوئے چلا کر کہا۔ "تم ادھر سونے کو آیا تھا کیا! تم کو نہیں معلوم کہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔" مگر اس پر خاک بھی اثر نہیں ہوا۔

"آتے ہوئے بھی تم ٹیکسی میں سو گیا تھا۔"

"اس کو کیوں ڈانٹتے ہو، حرکت تو یہ تمہاری ہے۔" میں نے کہا۔

"توبہ توبہ ———" غالب دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا۔ "میں نے تو بس خواب آور گولیاں ملائی تھیں اس کی چائے میں۔ سو یہ خود ہے۔ اگر نہ سوتا تو مجھے اس کو ناک آؤٹ کرنا پڑتا۔ موت سے مرنے والے کو زہر دینے کا گناہ میں نہیں کرتا۔"

"شک تو مجھے پہلے ہی ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تصدیق اب ہو گئی۔"

"چلو اب یہ مال ڈھونے میں میری مدد کرو۔" غالب بولا۔ "میں اس کو گھر کے دروازے تک تو چھوڑ آؤں۔ پہلے آنکھ کھلی تھی تو موٹے بھائی نے خود کو یہاں پایا تھا۔ اب آنکھ کھلے گی تو واپس وہیں ہو گا جہاں سے چلا تھا۔"

"جیسے کوئی خواب تھا جو بھی ہم نے دیکھا جو بھی سنا افسانہ تھا۔"

"اس کو سمجھانا پڑے گا۔" غالب بولا۔ "ورنہ میں اس کو سمجھا دوں گا۔" یہ ضروری تھا کہ موٹے بھائی کو اس گھر کے راستے کا علم نہ ہو۔ اس سے کچھ بعید نہیں کہ کل شراب کے لیے پیسے نہ ہوں تو پھر آ جائے۔ "اب کہاں جائے گا؟"

"تمہارے دفتر بھی تو پہنچ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہاں میں اس کو پہچاننے سے بھی انکار کر دوں گا۔" غالب بولا۔ "شہر میں یہ مجھے تلاش کر نہیں سکتا اور اتفاق سے مل جانے کا رسک ایک فیصد بھی نہیں۔ استاد، رسک تو ہم شرفیہ بھی لیتے ہیں۔" باہر سے ٹیکسی والے نے ہارن دیا اور ٹیڈی جا کے تو میں اور غالب سوتے ہوئے موٹے جی کو اٹھا کے لے گئے اور ٹیکسی میں پیچھے کی سیٹ پہ لٹا دیا۔

"اتنی دیر کیا اسے قتل کر رہے تھے؟" ٹیڈی نے موٹے بھائی کو غور سے دیکھ کر کہا۔ "یہ زندہ ہے کہ لاش؟"

"زندہ ہے مگر سویا ہوا۔" غالب نے کہا۔ "بیمار تھا اس لیے ڈاکٹر نے نیند کا انجکشن دیا ہے۔" وہ آگے بیٹھ گیا اور ٹیکسی روانہ ہو گئی۔

"ٹھیک کہا تھا غالب نے۔" میں نے کہا۔ "وہ تیس فیصد بھائی تھا اور ستر فیصد ایجنٹ زیرو زیرو سیون اور چالیس فیصد مجنوں ہو گیا ہے۔ صحافی تو برائے نام ہی رہ گیا ہے۔"

اندر آنے کے بعد میں نے الیکٹرونک نوادرات کی نمائش کی جسے خواتین نے بھی دلچسپی سے دیکھا۔ میں نے طریقہ استعمال اچھی طرح سمجھانے کے بعد کلائی کی گھڑی نازو کے ہاتھ پر کہنی سے بھی اوپر باندھ دی۔ وہ بہت ہی نازک سی لڑکی تھی چنانچہ اس کا بازو میری کلائی کے برابر یا کچھ زیادہ تھا۔ جب اس نے آستین اٹھائی تو کہنی تک سیاہی مائل گندمی رنگ کے ختم ہوتے ہی جلد کا اصل رنگ شروع ہو گیا جو یوں لگتا تھا جیسے سائے کے ساتھ ہی دھوپ کی روشن لکیر۔ سایہ محدود تھا اور آگے سب دھوپ تھی۔ اس کے چہرے اور گردن کے نیچے تک اور پیروں پہ ٹخنے سے اوپر تک سائے کی علامت تھی جسے دیکھ کر کوئی اجنبی دھوپ کے اجالے کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔

"ہر بار اس کو استعمال کرنے کے لیے تمہیں آستین چڑھانا ہو گی۔" میں نے کہا۔ "اور شاید گھڑی کھولنا بھی پڑے۔ مگر یہ احتیاط بہتر ہے۔ ان کو تمہارے ہاتھ پر کلائی کی گھڑی نظر آئے۔"

"میں اسے آن کیوں نہ رکھوں؟" نازو بولی۔

"چوبیس گھنٹے آن رکھو گی؟" میں نے کہا۔ "اس کی بیٹری ایک دن بھی ساتھ نہیں دے گی۔ اسے تو ضرورت کے وقت استعمال کرنا ہے۔ کم سے کم الفاظ میں پیغام دینا ہے اور بس۔"

"کس کے لیے پیغام دینا ہے؟" محسن نے کہا۔

"تمہارے لیے اب کسی کا پیغام نہیں آئے گا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے تم چپ رہو۔ لمبی گفتگو کرو گی تو یہ اندیشہ بھی رہے گا کہ کوئی سن نہ لے۔"

"ہائے اللہ۔ کسی نے سن لیا تو؟ کوئی آ گیا تو؟" محسن نے لڑکیوں کی طرح کہا اور ایک دم دور بھاگ گیا۔ "تم اسے کیا سمجھا رہے ہو۔ لمبی گفتگو کرے گا وہ — چھ سے بارہ والا۔ دیوانِ غالب اور کلیاتِ میر سنائے گا اور صبح تک بیٹری خلاص۔"

"تم بولنے دو اسے۔" میں نے نازو سے کہا۔ "تم اپنا کام بھی ہوا اور حالات کے مطابق خود احتیاط برت سکتی ہو۔ یہ دوسرا استعمال یہی مانگ ہے۔ اسے بھی موقع دیکھ کر استعمال کرنا۔ اگر تم نے ان کا اعتماد حاصل کر لیا تو ممکن ہے تمہیں کہیں آنے جانے پر کوئی روک ٹوک نہ ہو۔ باہر کا کام ہم پہ چھوڑ دو۔ ہم تمہاری نگرانی اور حفاظت بھی کریں گے اور تمہارے ہر پیغام کو ریسیو بھی کریں گے۔"

غالب ایک گھنٹے میں لوٹ آیا تو ہم سب نے کھانا کھایا جو ایک رسمی کارروائی تھی۔ کھانے کو کسی کا جی نہ چاہتا تھا۔ سب کے دل پر خوف کا ایک بوجھ سا تھا کہ سوچا تو ہم نے جھانسی کے

www.paksociety.com

مگر ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ نازو میک اپ اور اپنی اداکاری کے باوجود پکڑی جاسکتی ہے۔ وہ اتنے محتاط ہوں کہ کسی اجنبی کو اندر گھسنے ہی نہ دیں۔ یا بعد میں کسی موقع پر نازو کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیں۔ سارے خطرات نازو کے لیے تھے جیسے ہم سب مل کر خطرے کی بھٹی میں جھونک رہے تھے۔ جانتے بوجھتے دشمنوں کے حصار کی طرف دھکیل رہے تھے۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوسکتا تھا اس کا تصور کرتے ہوئے بھی دل کانپتا تھا اور ہم خود کو مجرم محسوس کرتے ہوئے نظریں چار نہیں کر پاتے تھے۔ دو بار میں نے نازو سے کہا کہ ابھی وقت ہے اور وہ چاہے تو قدم آگے بڑھانے سے پہلے رک جائے۔ یہی بات دو بار محسن اور غالب دہرا چکے تھے مگر وہ سب کا مذاق اڑاتی رہی اور سب پر ہنستی رہی کہ گویا مجھے چاہیے مگر خوف سے تم سب کا برا حال ہے۔

شام کے چھ بجے میں نے اور غالب نے نازو کو ساتھ لیا اور ہم نے ایک خطرناک ترین مشن کے لیے روانگی اختیار کی۔ شام ڈھلنے کے قریب تھی مگر محسن نے اسے اندر سے جا کر ڈانٹا ڈپٹا تو وہ چپ کھڑی رہی۔ ہم نے جانتے بوجھتے تانگے میں سفر کیا۔ آدھے راستے میں مجھے خیال آیا کہ ہم نے سب کچھ لے لیا مگر ایف ایم بینڈ کا ریڈیو نہیں لیا۔ اس کے بغیر نازو کے ارسال کردہ پیغامات سنے ہی نہیں جاسکتے تھے۔

"یہ ایسی ہی حماقت ہے جیسے کوئی گھوڑا لینے جائے تو نعلیں لے کر لوٹ آئے اور گھوڑا بھول آئے۔" غالب نے کہا۔ نازو ہنس پڑی۔ زبردستی۔

"گھوڑا اب سے لیتے ہیں۔ خریدتے ہوئے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"بیبی جی! دو میں گھوڑا خریدو گے؟" تانگے والا ایک دم چونکا۔ "خیر سے کیسا گھوڑا چاہیے۔ جنگلی جان والا۔ جیسا یہ گھوڑا ہے۔ ایسا ہی لینا ہے تو آپ پیسے لو۔ میں دوسرا پکڑ لوں گا۔"

"کہاں سے پکڑ لو گے؟ چڑیا گھر میں تو گھوڑا ہے نہیں۔" غالب نے کہا۔

"اس کے علاوہ ہم جس گھوڑے کی بات کر رہے تھے وہ بیٹری سیل سے چلتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا کھلونا لینا ہے۔" تانگے والے نے دانت نکال کے کہا۔

ایف ایم بینڈ والا ریڈیو کہیں نہ تھا۔ سب میں وہی میڈیم ویو یا شارٹ ویو بینڈ تھے جو عام گھروں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مجبوراً مجھے کار ریڈیو لینا پڑا۔ یہ بھی وہی گھوڑے کے بغیر نعلیں لینے والی بات تھی۔ کار نہیں تھی مگر کار ریڈیو تھا۔ اس کے لیے کار بیٹری کی ضرورت تھی۔ وہ بھی ہم نے راستے ہی میں خریدی۔ تانگے والے کو مطلع کیا کہ اسے ڈبل راستے کا ڈبل کرایہ بطور انعام ادا کیا جائے گا۔ سب سے پہلے غالب اتر گیا۔ اس جگہ جہاں سے چند قدم کے فاصلے پر مونگ پھلی کی ریڑھی تھی۔ پھر نازو نے بھی وہیں اترنے کا فیصلہ کیا اور میں نے اسے خدا حافظ کہتے ہوئے اس کے کندھے پر پیار سے تھپکی دی۔ "بیسٹ آف لک۔" میں نے کہا۔ نازو نے مسکرا کے دو انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا اور تانگا آگے چل پڑا۔

یکلخت میرے دل کو اداسی نے اور مایوسی نے جکڑ لیا۔ میں نے تانگے والے کو بیس روپے دیے اور خود اتر کے چند قدم واپس گیا۔ نازو کو اب بھی واپس بلایا جاسکتا تھا۔ ابھی کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ کل جب نقصان ہو جائے گا تو الزام صرف مجھ پر آئے گا جس نے یہ اسکیم پیش کی تھی۔ جس نے اول تا آخر اس کے ہر مرحلے میں نازو کی جان کو داؤ پر لگائے رکھا تھا اور اب وہ بڑی خواہش پر موت کے منہ میں چلی گئی تھی۔ میں نے چاہا کہ اسے چلا کے واپس بلاؤں۔ مگر آواز میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ نازو بہت آگے جا چکی تھی۔ اس کی بحفاظت واپسی کے لیے اب صرف دعا کی جاسکتی تھی۔ غالب کی جیب میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ نازو کو بھی ریوالور فراہم کیا جاسکتا تھا۔ وہ خالی ہاتھ بھی مقابلہ کر سکتی تھی مگر جہاں وہ گئی تھی اور جن لوگوں سے اس کا واسطہ پڑنے والا تھا وہ بہت بے رحم، بے ضمیر اور خطرناک تھے۔ ان سے نازو کو صرف خدا کی ذات ہی محفوظ رکھ سکتی تھی۔

گلی کے موڑ پر غالب نے مونگ پھلی کی ریڑھی پر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ میں نے آلۂ سماعت کو کان میں لگا لیا۔ ایسا ہی دوسرا یونٹ غالب کے پاس تھا جو سو میٹر سے کم فاصلے پر تھا چنانچہ ہم آپس میں گفتگو کر سکتے تھے۔ میں نے غالب سے پہلے رابطہ قائم کیا۔

"ابھی کچھ نہیں ہوا۔" غالب کی آواز میرے کان میں گونجی۔ "وہ دروازے پر کھڑی ہوئی ہے۔"

"میں سخت پشیمانی اور احساس جرم میں مبتلا ہوں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" غالب نے کہا۔ "ہم سب کی کیفیت ایک سی ہے۔ میں نے تو دل کو پہلے ہی قائل کر لیا ہے کہ اب نازو سے اس دنیا میں ملاقات کی فقط امید رکھی جاسکتی ہے۔ اگر وہ اور میں بہت خوش قسمت رہے تو پھر ملیں گے ورنہ اس کی یاد میرے ساتھ ہوگی۔ دم آخر تک۔"

"ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتے ہو؟" میں نے تقریباً رو کر کہا۔

"تم بھی تو رابعہ کو کھو چکے ہو۔ پھر پالو گے تو تمہاری قسمت کی خوبی اور خدا کی مہربانی۔" غالب بولا۔ "میں اور تم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔"

"خدا کے لیے بتاؤ نازو کیا کر رہی ہے؟"

"کسی نے دروازہ کھولا ہے۔ ایک عورت ہے۔" غالب نے کہا۔ "نازو اس سے کچھ کہہ رہی ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہے؟" میں نے بے تابی سے کہا۔

"مونگ پھلی دینا ایک پاؤ۔" کسی کی آواز آئی۔ "خالص۔"

"جی بو سرکار۔" غالب نے اچانک آجانے والے گاہک سے کہا اور اس غلط وقت پر گاہک کا آنا مجھے سخت گراں گزرا۔ اپنے سوال کے جواب میں مجھے بالکل ہنسی نہیں آئی۔ میں غالب کو مونگ پھلی دیتے دیکھتا رہا۔

"اب... نازو ہاتھ جوڑ رہی ہے۔" غالب بولا۔ "عورت نے ایک بار دروازہ بند کر دیا تھا مگر وہ کھڑی رہی تھی... وہ اس عورت کے پاؤں پڑ رہی ہے۔ میرا خیال ہے اداکاری اچھی ہے۔ عورت رک کر نازو کی بات سننے پر مجبور ہو گئی ہے۔ پھر کیا اور ان کی بہن سونیا تو نہیں ہو سکتی۔ اس کی کتنی عمر ہے؟"

"میں نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ مگر ظاہر ہے نرس جوان ہی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"نرس کے بوڑھی ہونے پر کوئی پابندی نہیں۔" غالب بولا۔ "یہ کچھ عمر رسیدہ عورت ہے۔ ہاں۔ اب ایک جوان عورت بھی آگئی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ میں گفتگو نہیں سن سکتا حالانکہ نازو کی گفتگو کا ٹرانسمیشن ہوگا۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ دو منٹ میں ہی ریڈیو اور بیٹری بھی خرید لیتے تو اب تک ریڑھی پر فٹ ہو جاتے... خیر... لو بھائی سکندر۔ دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ نازو اندر پہنچ گئی ہے۔"

آدمی نے چاند پر قدم رکھ دیا ہے۔ یہ خبر ابھی نئی تھی۔ غالب کی بات سن کر مجھے یوں لگا جیسے وہ نازو کے ایک دوسری دنیا میں پہنچ جانے کا اعلان کر رہا ہے۔ چاند کی اجنبی دنیا کے پُراسرار سفر پر روانہ ہونے والوں کو اپنی روانگی کے بعد واپسی کا کتنا یقین تھا؟ سائنس کی تمام تحقیق اور نتائج کی قبل از وقت معلومات پر دسترس کے باوجود وہ اس ایک لمحے پر مکمل اختیار کی ضمانت نہیں رکھتے تھے جو ان کا لمحہ ہوتا ہے۔ کہیں آنکھ سے اوجھل رہ جانے والی ایک مشینی غلطی یا کمپیوٹر کے برق رفتار ذہن سے سرزد ہو جانے والی حساب کی فروگزاشت اس لمحے کے وجود کو تسلیم کراتی تھی۔ کروڑوں چھوٹے بڑے کل پرزوں کے مرکب میں رونما ہو جانے والی خرابی لاکھوں سائنس دانوں اور انجینئروں کی آنکھ نہیں دیکھ پاتی۔ کون جانے نازو کو اس سفر پر روانہ کرنے سے قبل احتیاط اور انتظام کے سارے تقاضے پورے کرنے کے باوجود ہم سے کس مرحلے پر کون سی کوتاہی سرزد ہو گئی ہو جو اب اس کی واپسی کو ناممکن بنادے مگر اب ہم اسے واپس نہیں لا سکتے تھے۔ وہ اس سیارے پر جا چکی تھی جہاں ایک وحشی، درندہ صفت اور انسان دشمن مخلوق کی حکومت قائم تھی اور وہ اپنی حدود مملکت میں کسی کی دخل اندازی کو ناقابل معافی جرم تصور کرتی تھی۔

آدھا گھنٹہ مکمل خاموشی میں گزر گیا جس میں ہر دس سیکنڈ بعد میں غالب سے ایک ہی بات پوچھتا تھا۔ "کوئی خبر؟" اور غالب ایک ہی جواب دیتا تھا۔ "کچھ نہیں۔" انتظار کی کوفت آہستہ آہستہ جھنجلاہٹ میں بدلنے لگی تھی۔ اعصابی کشیدگی کا شکار غالب بھی تھا مگر وہ مجھ سے زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا یا پھر کچھ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے یہی کہتا کہ اگر ہم نازو کی کوئی مدد نہیں کر سکتے پھر پریشان ہونے سے کیا حاصل۔ میں دوہرے عذاب میں مبتلا تھا۔ ایک طرف رابعہ تھی جس کے لیے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جب مجھے موقع ملا تھا تو میں نے گنوا دیا تھا۔ ایک مجبوری نے میرے قدم پکڑ لیے تھے اور اب مجھے یہی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس حال میں ہے۔

جہاں میں کھڑا ہوا تھا وہیں ایک میڈیکل اسٹور تھا اور مالک کسی کو فون کر رہا تھا۔ میں اسے دیکھتا رہا اور جب مالک نے ریسیور رکھا تو میں دکان میں داخل ہو گیا۔ وہ عجیب آدم بیزار شخص تھا لیکن میں نے کہا کہ مجھے ایک ڈاکٹر کو فون کرنا ہے اور ایک مریض کی خیریت دریافت کرنی ہے تو وہ مان گیا۔ ریسیور خود ڈاکٹر لطیف نے اٹھایا۔

"ڈاکٹر لطیف؟" میں نے کہا۔ "میں سکندر بول رہا ہوں۔"

"سکندر... ہاں بھئی؟" انھوں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "کیا حال ہے؟"

"حال تو مجھے رابعہ کا معلوم کرنا تھا۔" میں نے کہا۔

"ٹیلی فون پر؟ کیا تم اس وقت بھی نہیں آسکتے؟"

"میں کیوں نہیں آسکا تھا، اس کی وجہ تو آپ کو معلوم ہو گئی ہوگی۔" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "مجبوری ایسی تھی۔"

"مجبور ہم سب ہیں۔ مختار کوئی نہیں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "مگر کبھی دوسروں کی مجبوری پر اپنی مجبوری کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ خواہ اس سے کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ چھوٹی چھوٹی مجبوریوں کے عوض..."

"وہ چھوٹی مجبوری نہیں تھی انکل۔" میں نے کہا۔

"لیکن اس سے کتنی بڑی خرابی پیدا ہوگی۔" ڈاکٹر لطیف نے برہمی سے کہا۔ "تم کو تو ابھی اس کا اندازہ بھی نہیں ہے؟"

"خدانخواستہ... رابعہ کو... وہ ٹھیک تو ہے نا؟" میں نے

www.paksociety.com

ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔ "کیا میں آ جاؤں...؟"

"بہتر ہوگا کہ تم آ جاؤ۔ فون پر میں کیا بتاؤں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔

"آپ بتا دیں۔ میں سب کچھ سننے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ مجھے دنیا میں اکیلا چھوڑ جائے تب بھی میں یہ صدمہ جھیل کے جی لوں گا۔"

"مرنے والے کے لیے صبر آ جاتا ہے۔ اس دنیا میں بچھڑ جانے والے پر آدمی رو کر نہیں بیٹھ سکتا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "اس کی واپسی کی آس تو باقی رہتی ہے۔"

"واپسی۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ آج تمہارے نہ آنے کا رد عمل بہت شدید ہوا تھا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "اس نے میری ایک نہیں مانی۔ یہی کہتی رہی کہ تم سب جھوٹ بولتے ہو اور مجھے بے وقوف بناتے ہو۔ وہ سارا دن روتی رہی۔ اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوا۔ شام کو وہ اپنے کمرے میں نہیں تھی۔"

"کیا! کمرے میں نہیں تھی؟" میں نے چلا کر کہا۔ "پھر کہاں تھی؟"

"کہیں بھی نہیں تھی۔ تمہاری آنٹی نے مجھے بتایا کہ رابعہ نے ان سے کچھ کہا تھا۔ یہی کہ سکندر ضرور کسی اسپتال میں زخمی پڑا ہوا ہے۔ اس کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا تھا۔ میں خود اسپتالوں میں دیکھوں گی۔ ایمرجنسی میں یا پھر آرتھو پیڈک میں۔ معلوم نہیں، وہ کہاں ہوگا۔ میں یہاں آرام سے نہیں بیٹھ سکتی ہوں اور کوئی مجھے بتا بھی نہیں رہا۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ اسپتال میں جا سکتی ہے؟" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "اوہ مائی گاڈ۔ وہ کہاں کہاں جائے گی۔ کس طرح جائے گی۔ وہ اس پاگل پن میں پیدل پھرے گی۔"

"وہ تو خالی ہاتھ نکل گئی ہے۔ اس کا پرس تک یہیں پڑا ہوا ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔

"ڈاکٹر لطیف! کیا آپ نہیں سمجھتے کہ وہ... وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہے اور کوئی بھی اس کی معذوری کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "وہ غلط افراد کے ہاتھوں میں جا سکتی ہے۔ کوئی بھی اس سے کہہ دے کہ چلو میں تم کو بتاتا ہوں سکندر کہاں ہے تو وہ اس کے ساتھ ہو لے گی۔"

"میں یہ سب تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔ تم اس وقت جذباتی ہو کر یہ بھول رہے ہو کہ میں نے تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے اور میرا تجربہ بھی تم سے زیادہ ہے۔ میں ایک ڈاکٹر بھی ہوں۔ مجھے تم سے زیادہ معلوم ہے کہ رابعہ کی ذہنی کیفیت کیا ہے اور اس کیفیت میں اس کا رد عمل کیا ہو سکتا ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ صرف ٹیلی فون پر چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"آئی ایم سوری۔ مجھے بتائیے میں کیا کروں۔ آپ نے کچھ کیا ہے ابھی تک؟ یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"غالباً دو سے تین گھنٹے ہو گئے ہیں اس کو نکلے ہوئے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "تین گھنٹے پہلے وہ موجود تھی، اب دو گھنٹے سے غائب ہے۔ میں نے فون کیے ہیں۔ اسپتالوں میں ڈاکٹر مجھے جانتے ہیں لیکن میں سب کو یہ بات نہیں بتا سکتا۔ ایمرجنسی اور آرتھو پیڈک وارڈ تو ہر اسپتال میں ہوتے ہیں، کیا معلوم وہ پہلے کہاں پہنچے گی لیکن میں نے میو اسپتال، گنگا رام ہوسپٹل اور گلاب سنگھ جیوٹ دیوی اسپتال کے علاوہ دو چار مشہور اور بڑے پرائیویٹ اسپتالوں میں بھی بات کی ہے۔ یہ کہا ہے کہ کوئی عورت سکندر نام کے کسی شخص کو پوچھتی ہوئی آئے تو اسے روک لیا جائے۔ اگر تم آ سکتے ہو تو آ جاؤ۔ ہم چل کر دیکھ لیتے ہیں۔"

"میں آ رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں۔" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ دکان دار کو... پیسے دیے اور باہر آ گیا۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہ تصور کرنا مشکل تھا کہ رابعہ اس وقت کس سڑک پر اور کس سمت میں رواں ہوگی۔ وہ ہر ایک سے پوچھتی پھرے گی کہ تم نے سکندر کو تو نہیں دیکھا؟ تم نہیں جانتے میرے سکندر کو؟ خدا را! تم تو واقف ہو گے... کے مرنے کی۔ دیوانہ مر گیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزری۔ کہیں رابعہ کو پہچان لیا جائے گا۔ کوئی اس سے پوچھ بیٹھے گا کہ تم وہی رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہو نا؟ وہ اقرار کرے گی۔ اور تم اس سکندر بخت کو تلاش کر رہی ہو نا؟ وہ پھر اقرار کرے گی کہ ہاں میں اسی سکندر بخت کو تلاش کر رہی ہوں جو میرا محبوب ہے۔ میری تمنا ہے اور جستجو ہے لیکن دنیا کسی رابعہ کے محبوب سکندر کو نہیں جانتی۔ ایک مفرور اور مطلوب مجرم سکندر بخت کو جانتی ہے۔ ایمرجنسی وارڈ میں ہر جگہ پولیس ضرور موجود ہوتی ہے۔ وہ اس نام کو بھولے نہیں ہوں گے۔ یہ ایک لاکھ روپے کے نوٹ کا نام ہے۔ یہ سکندر بخت کو گرفتار کرانے والے کا انعام ہے۔ میں ڈاکٹر لطیف کے ساتھ کسی اسپتال میں رابعہ کو تلاش کرتا پھروں گا۔ وہ مجھ سے دوسرے اسپتال میں پھر رہی ہوگی۔ ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال۔ پیدل۔ جسمانی تھکن کے احساس سے بے نیاز۔ بھوک پیاس سے بے پروا۔ راستے کے اندھیرے سے بے خوف۔ اندھیرے میں گھومتے بھوکے بھیڑیوں کے وجود سے بے خبر۔ اس شہر کی سڑکوں پر وہ رات بھر چلتی رہے گی اور میں رات بھر اس کی تلاش میں سرگرداں رہوں گا۔ مگر کہیں کسی راستے پر میرا اس کو پا لینا، یا اس کا مجھے دیکھ لینا مشکل ہوگا۔ ملنا ناممکن۔ اس کا چانس ایک لاکھ کے تناسب میں ایک کا بھی نہیں۔ خصوصاً اندھیری سڑکوں پر۔ اور کون جانے اس شب کی سحر ہونے تک کون کہاں پہنچے۔ وہ اور میں الگ الگ بھٹکتے جائیں اور شکاری ہمیں ایک دوسرے سے بہت

کبھی ملنے کے لیے بس دیوار زنداں تک پہنچا ہوں۔ مگر اب درد... مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ رابعہ کے علاوہ میں سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ انجام کچھ بھی ہو، مجھے اس کو تلاش کرنا ہوگا۔

میں نے اپنی جگہ پہنچ کے وائرلیس پر کہا۔ "میں جا رہا ہوں..."

"یار وہ نازو کا پہلا پیغام ملا ہے ابھی ابھی...!"

"غالب! رابعہ پاگل پن میں ڈاکٹر لطیف کے گھر سے نکل گئی ہے۔ اسپتالوں میں مجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"نازو نے مجھے بتایا ہے کہ..."

"اگر وہ بھٹکتی رہی تو مشکل میں گرفتار ہو جائے گی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں ڈاکٹر لطیف کے ساتھ جا رہا ہوں اسے تلاش کرنے۔"

"تم بھی پاگل ہو گئے ہو کیا؟" غالب نے برہمی سے کہا۔ "رابعہ آج اب سب کچھ نہیں ہے۔ نازو بھی ہے۔"

"میرے لیے رابعہ ہی سب کچھ ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "اس کے بغیر میں خود بھی کچھ نہیں ہوں۔ میں جا رہا ہوں۔"

"یہ تمہارا اس کا یہ مشن تمہارے ذہن کی پیداوار تھا۔" غالب نے مشتعل ہو کے کہا۔ "اب تم پیچھے ہٹنے کے روادار بھی نہیں کہ نازو نے کیا کہا ہے۔ اس کو تم نے ہی بھیجا تھا اس جہنم میں..." وہ بولتا رہا مگر میں نے نہیں سنا۔ سڑک کے دوسرے کنارے پر میں نے ایک ٹیکسی کو سواریاں اتارتے دیکھا۔ میں ادھر ادھر دیکھے بغیر اسے پکڑنے کے لیے سڑک عبور کرنے لگا۔ بائیں طرف سے آنے والی ایک تیز رفتار گاڑی کے ڈرائیور نے پوری قوت سے بریک لگائے۔ گاڑی کے پہیے جام ہو گئے اور پھر سڑک سے رگڑ کھاتے چیختے ہوئے گاڑی کے بھاری وجود کو بڑی قوت سے گھسیٹتے ہوئے اور اپنے پیچھے ایک سیاہ لکیر چھوڑتے ہوئے بڑھتے گئے۔ میں نے گاڑی کی چکا چوند کر دینے والی روشنی کو یوں دیکھا جیسے شکار ہونے والا کمزور جانور شکاری چیتے کی انگارہ آنکھوں کو روبرو دیکھتا ہے اور مفلوج ہو جاتا ہے۔ گاڑی نے ٹکر مارنے کے بعد مجھے اوپر اچھال دیا۔ میں فضا میں تھوڑا سا بلند ہوا۔ درد کی شدید لہر نے میری ٹانگیں بے کار کر دی تھیں جیسا کچھ میں نیچے آیا تو میں پیروں پر نہ اتر سکا۔ میں تار کول کی بچھی سڑک پر پتھر کی طرح گرا۔ مجھے یقین تھا کہ اب اپنی کم ہوتی ہوئی رفتار کے باوجود بھی گاڑی کچھ اور راستہ آگے جا کے میرے جسم پر سے گزرے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے ان گنت روشنیاں دیکھیں۔ ستاروں کی روشنی۔ سڑک پر رواں دواں گاڑیوں کی روشنی۔ بجلی کے کھمبوں کی روشنی۔ پھر روشنی کے دائرے سے ہٹ گئے اور گھومنے لگے، مدھم پڑنے لگے۔ میرے کانوں نے آوازوں کا شور سنا جو رفتہ رفتہ معدوم ہو گیا۔

آنکھیں تھوڑی سی کھلیں تو میرے سامنے روشنی میں سائے سے تیرنے لگے۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آوازیں میرے کان سے ٹکرائیں۔ میں نے پلکیں جھپکا کے دیکھا۔ سائے واضح ہو گئے۔ وہ سب انسانی ہیولے تھے۔ ان کے لب ہل رہے تھے اور الفاظ کہیں سے سنائی دینے لگے تھے۔

"کس طرح... دیکھیے... دماغ پر چوٹ... عارضی اثرات۔"

"خطرے کی بات...؟"

"نہیں۔ دماغ کا اندرونی حصہ... جھٹکا لگتا ہے تو دماغ ہل جاتا ہے... اور اسی سے یہ ہوتی... وقتی اثر... بالکل وقتی۔ آٹھ سے بارہ گھنٹے میں ہوش آنا چاہیے۔"

"اور نہ آیا تو؟" اب میں نے بالکل واضح طور پر ایک عورت کی آواز سنی۔

"خدا پر بھروسا رکھیں۔ آخر ہم ڈاکٹر ہیں۔ کچھ علم اور کچھ تجربہ رکھتے ہیں اور ہمارے لیے یہ پہلا کیس نہیں ہے۔"

"کیا کسی طرح بھی ذہن متاثر ہوگا؟" وہی عورت بولی۔

"ابھی تو آثار نہیں ہیں۔" مرد نے کہا۔ "سب ریسپانس نارمل ہیں۔"

"میرا مطلب تھا یادداشت۔" عورت نے کہا۔

"اس کا پتا تو ہوش میں آنے کے بعد چلے گا۔" وہ یقیناً کوئی ڈاکٹر تھا۔

اتنی دیر میں میری آنکھیں بھی سایوں کو شناخت کرنے لگی تھیں۔ اجالے کے رخ مجھے رابعہ کا چہرہ دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے آہستہ سے سر گھمایا اور دوسری طرف دیکھا۔ ڈاکٹر پلٹ کر جا رہا تھا۔ اس نے ایک دروازہ کھولا اور غائب ہو گیا۔ چند لمحے کی تنہائی میں میرے ساتھ صرف رابعہ رہ گئی۔ میں نے اس کمرے کو، اپنے بستر کو اور لائٹس کو دیکھا۔ میری ناک نے دواؤں کی مخصوص بو کو محسوس کیا اور ایک دم مجھے یاد آ گیا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اب میں کسی اسپتال میں تھا مگر رابعہ! کیا اس کار ایکسیڈنٹ کے بعد رابعہ مجھے یہاں لائی تھی؟

"رابعہ!" میں نے اس کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"سکندر!" رابعہ نے فرط مسرت سے چیخ ماری اور بیڈ پر بیٹھ کر میرے ہاتھ کو مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ "خدا کا شکر ہے۔" وہ میرے ہاتھ کو اپنی آنکھوں سے لگا کے رونے لگی۔ اس کے گرم آنسو میرے ہاتھ کو جلانے لگے۔ "خدا کا احسان ہے مجھ پر... اس نے دعا سن لی میری... تم نے مجھے پہچان لیا؟"

"رو کیوں رہی ہو؟" میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ "میں تو نہیں رو رہا تھا۔ جب تم میرے ساتھ تھیں اور میں تمہیں تلاش کر رہا تھا۔ تم تو مجھے چھوڑ گئی تھیں۔"

www.paksociety.com

"میں خود ہی آگئی۔ انھوں نے مجھے روک رکھا تھا۔ قید کر رکھا تھا اور وہ مجھ سے جھوٹ بولتے تھے۔" رابعہ نے روتے روتے کہا۔ "وہ مجھے آنے دیتے تو میں بہت پہلے تم کو تلاش کر لیتی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم زخمی ہو۔ کسی حادثے کا شکار ہوئے ہو لیکن ڈاکٹر لطیف مجھ سے غلط بیانی کرتے رہے کہ تم کو کچھ بھی نہیں ہوا... میرا دل جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وعدہ کرنے کے باوجود تم کیوں نہیں آئے تھے۔"

"لیکن تم... تم یہاں کیسے آگئیں؟" میں نے کہا۔ "یہاں مجھے کون لے کر آیا تھا؟"

"یہ سب تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن میں تم کو تلاش کرتی پھر رہی تھی ہر اسپتال میں... اور یہاں پہنچی تو میں نے تمھیں پا لیا۔ میری محبت نے مجھے یہ راستہ دکھایا اور یہاں لے آئی۔ اب تم فکر نہ کرو۔ میں یہاں ہوں۔ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"اور تم... تم ٹھیک ہو؟" میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ محبت کی معجزہ نمائی تھی جس نے وقت کے ہر لمحے کا اور سارے راستوں کا تعین کیا تھا۔ اسی محبت نے سب سے پہلے رابعہ کو خبر دی تھی کہ سکندر کی گاڑی ایک حادثے میں تباہ ہوئی ہے۔ اسے رات کے دو بجے جگا کے یہ خبر سنائی تھی۔ اگر اس رات ڈاکٹر لطیف نے رابعہ کا راستہ نہ روکا ہوتا تو شاید وہ ٹھیک اس جگہ پہنچ جاتی جہاں میں تھا۔ محبت کا یہ قطب نما جذبۂ دل کی قوت پر راہنمائی کرتا تھا۔ اس نے بالآخر رابعہ کو رہائی دلائی اور اسے وہاں پہنچا دیا جہاں میں حقیقتاً ایک حادثے کا شکار ہو کے اسپتال کے بستر پہ لیٹا تھا اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ خود غالب کو اس حادثے کی خبر نہیں تھی جو مجھ سے سو میٹر کے فاصلے پر موجود تھا لیکن اس وقت قدرت نے راستوں کو وقت کے لمحوں سے ملانے کا نیا اہتمام کیا۔ اس نے مجھے فون کرنے بھیجا اور یوں مجھے ہر جو ہونی کی کیفیت میں حادثے سے دوچار کیا۔ ٹھیک وقت پر پسِ پردہ رہنے والے تقدیر کے ہاتھ نے مجھے اس اسپتال میں پہنچایا اور عین اسی وقت رابعہ کی تلاش اور اس کی قید تنہائی اور دیوانگی سے تمام ہوئی۔ اس نے مجھے زخمی پایا اور یکلخت اس کے دماغ نے دل کی بات مان لی۔ یہ تسلیم کر لیا کہ سچ وہی تھا جو دل کہتا تھا ــــ وہ حقیقت تھی۔ اس کا تصور نہیں تھا اور فریب خیال نہیں تھا جیسا کہ ڈاکٹر لطیف نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے دل اور دماغ کے درمیان جاری رہنے والی کشمکش باقی نہ رہی۔ اس نے دیکھ لیا کہ میں واقعی زخمی ہوں لیکن میری حالت تشویشناک نہیں ہے۔ میں شدید زخمی نہیں ہوں۔

اسپتال کے کسی ڈاکٹر نے یقیناً اسے میرے ساتھ ہی دیکھا ہوگا۔ اسی لیے وہ رابعہ کو میری حالت کے بارے میں تفصیلات بتا رہا تھا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" میں نے کہا۔

"میں نے بتایا نا۔ مجھے بھلا کیا ہوا تھا جو تمھیں میرے بارے میں اتنی تشویش ہے؟"

"یہ اسپتال کون سا ہے؟" میں نے کہا۔

"البرٹ وکٹر اسپتال۔" وہ بولی۔ "اس سے پہلے میں سینٹ پال میں دیکھ چکی تھی اور گنگا رام اسپتال ہو آئی تھی۔"

"تم میرا نام پوچھتی پھر رہی تھیں؟" میں نے پریشان ہو کے کہا۔ مجھے ڈاکٹر لطیف کی بات یاد آگئی تھی کہ انھوں نے سب اسپتالوں کو میرا نام دے کر کچھ پوچھنے والی عورت کو روکنے کی ہدایت کر دی ہے۔ ان میں البرٹ وکٹر اسپتال بھی شامل تھا۔

"کیا میں اتنی احمق ہوں؟" رابعہ نے مسکرا کے کہا۔ "میں خود تمھیں دیکھتی پھر رہی تھی۔"

"تم واقعی احمق ہو۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "ان دو اسپتالوں میں کتنے وارڈ ہیں۔ کتنا پھرنا پڑا ہوگا تمھیں۔"

"زیادہ نہیں۔ میں اسپتال میں ایمرجنسی اور ہڈیوں کے وارڈ دیکھے کیونکہ میرا خیال تھا کہ ممکن ہے حادثے میں تمھاری ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں۔" وہ بولی۔

"کسی نے روکا نہیں تمھیں؟" میں نے کہا۔

"روکتا کیوں؟" وہ حیران ہو کے بولی۔ "ملاقات کا وقت تھا سب ہی آ جا رہے تھے۔"

"اور یہ سب فاصلہ تم نے پیدل ہی طے کیا؟"

"ہاں... مگر یہ فاصلہ ہی کتنا ہے۔" وہ بولی۔ "میں ڈاکٹر لطیف کے گھر سے نکلتے ہوئے اپنا پرس لینا بھول گئی تھی۔"

یہ فاصلہ کم نہیں تھا۔ رابعہ نے میلوں کی مسافت طے کی تھی لیکن اسے احساس نہیں ہوا تھا۔ خوشی مجھے اس بات کی تھی کہ اس حادثے کو بہانہ بنا کے قدرت نے اسے پھر مجھ سے ملا دیا اور میں بھی وہی کچھ دیکھ رہا تھا جو دنیا کا خیال تھا کہ اب شاید وہ لوٹ کر نہ آ سکے۔

"رابعہ! میں یہاں لیٹا نہیں رہ سکتا۔" میں نے کہا۔ "کیا کسی نے بھی یہاں میرا نام نہیں پوچھا۔ یہ تو پرائیویٹ کمرہ ہے؟"

"ہاں۔ تم کو وہی گاڑی والا لایا تھا۔ جس کی کار سے تمھاری ٹکر ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ تم ویوانڈر والا ٹریک پار کرنے کے لیے بھاگے تھے۔" رابعہ نے کہا۔ "نیک دل آدمی تھا۔ پانچ ہزار یہاں بھی جمع کرا گیا تھا۔ اور تمھارے تکیے کے نیچے بھی دس ہزار چھوڑ گیا۔ اس نے تمھارا نام فرخ لکھوایا تھا۔"

میں نے تکیہ اٹھا کے دیکھا۔ اس کے نیچے واقعی دس ہزار موجود تھے۔ وہ آدمی یقیناً کچھ بھی تھا یا نہیں لیکن پیسے والا ضرور تھا اور پیسے کا صحیح استعمال بھی جانتا تھا۔ اس نے خود کو پولیس کیس سے بچانے کے لیے پیسہ فراخدلی سے استعمال کیا تھا۔ تھا نہ اس نے کہا ہوگا کہ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے جس کو سڑک پر کوئی شخص گاڑی سے ٹکر مار کے بھاگ گیا۔

"آخر وہ تھا کون؟" میں نے کہا۔ "اور پھر گیا کہاں؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں گیا۔ جب میں نے تمھیں دیکھا تو میں رک گئی اور ڈاکٹر مجھ سے ہی بات کرتا رہا۔" رابعہ نے کہا۔ "ڈاکٹر پولیس آفیسر تھا۔ رضوی..."

میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ "رضوی؟ ایس ایس پی رضوی؟ کیا انھوں نے مجھے پہچانا نہیں تھا؟ کیا رابعہ کو یاد نہیں کہ رضوی نام کا پولیس افسر کون ہوگا؟"

"رابعہ ہو سکتا ہے وہ ایس ایس پی تو نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے انکل صاحب رضوی تو نہیں تھے؟" رابعہ مسکرائی۔ "یہ تو تمھارے سوچنے کی بات ہے۔ وہ ہوتے تو کیا تمھیں یوں چھوڑ جاتے۔ اور ان کے پاس تو شاید بینک میں پندرہ ہزار ہوں گے تو اپنی تنخواہ میں سے بچاتے ہوئے ہوں گے۔ وہ پندرہ ہزار جیب میں ڈالے لیے پھرتے۔ ان کے پاس حرام کی کمائی نہیں ہوتی کہ اس طرح پھینک کر چلے جاتے۔"

"کیا تم نے اس پولیس افسر کو دیکھا تھا؟"

"نہیں... وہ اسی وقت گیا تھا جب میں پہنچی تھی۔" وہ بولی۔ "میرے آنے سے چند ہی منٹ پہلے۔ لیکن جو کچھ مجھے ڈاکٹر نے بتایا اس سے میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ انسپکٹر کے عہدے کا کوئی افسر تھا اور اس نے حادثے کی ذمہ داری سے بچنے کے لیے یہ سب کچھ کیا ہوگا۔"

"وہ مجھے ٹکر مار کے بھاگ بھی سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"یقیناً کوئی ایسی بات ہوگی کہ وہ رکنے پر مجبور ہوا۔" رابعہ بولی۔ "وہاں ٹریفک زیادہ ہوگا۔ مجمع لگ گیا ہوگا۔ وہ ہوشیار آدمی تھا اور خود پولیس میں تھا اس لیے پریشان نہیں ہوا۔ فوراً تمھیں اپنی گاڑی میں ڈال کے چل پڑا۔ لوگ اس کی شرافت اور احساس ذمہ داری سے متاثر ہوئے ہوں گے اور مطمئن ہو کے منتشر ہو گئے ہوں گے۔ ممکن ہے اس کے ساتھ بھی دو زیادہ جوشیلے اور ہر معاملے میں آگے رہنے والے ہمدرد قسم کے لوگ بیٹھ گئے ہوں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "وہ اپنی چالاکی اور حاضر دماغی سے بچ گیا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی بدحواسی کی وجہ سے میں بچ گیا۔ یہاں آکے اس نے بڑی مستعدی اور انسان دوستی کا مظاہرہ کیا ہوگا۔ فوراً ایمرجنسی وارڈ میں ایمرجنسی پھیلا دی ہوگی کہ سب کو چھوڑ دو... پہلے اس زخمی کو دیکھو۔ ساتھ آنے والے بھی متاثر ہوئے ہوں گے اور جب وہ پندرہ ہزار جمع کرا کے مجھے داخل کرا کے گیا ہوگا تو یہاں اس پولیس انسپکٹر کی نیت پر شک کرنے والے شرمندہ اور مطمئن ہو کے پہلے ہی جا چکے ہوں گے۔"

"تم جا ہو تو ڈاکٹر سے بات کر لو۔" رابعہ نے ایک نوجوان کو اندر آتے دیکھ کر کہا۔ نوجوان صرف اسٹیتھسکوپ کی وجہ سے ڈاکٹر نظر آتا تھا ورنہ حلیے سے وہ نئی نسل کا نمائندہ تھا۔

"ہیلو!" وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ "یو لک فائن۔"

"خدا کا شکر ہے ڈاکٹر صاحب... آئی فیل فائن۔" میں نے کہا۔ ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ میں تم کو فٹ قرار دے کر ڈسچارج کر دوں تو یہ مشکل ہے۔ تم ٹھیک نہیں... بلکہ بہتر ہو... اس حد تک کہ ہوش میں آ گئے ہو لیکن تم کو کم سے کم مزید دو دن یہیں رہنا ہوگا۔"

"کسی وجہ کے بغیر...؟"

"وجہ کو ہم سمجھتے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہوش کا یہ وقفہ عارضی بھی ہو سکتا ہے۔ تم کو انڈر آبزرویشن رکھنا ضروری ہے۔ میں ذاتی طور پہ پہلے بھی مطمئن تھا کہ بے ہوشی کا اثر عارضی ہے لیکن اونلڈ مین مجھ سے متفق نہیں تھا۔"

"کون اولڈ مین؟" میں نے کہا۔

"ہمارے سینئر ڈاکٹر۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر آف نیورو سرجری۔ جن کے پاس دس ڈگریاں ہیں مگر سب آؤٹ آف ڈیٹ۔"

"کیا ڈگری بھی آؤٹ آف ڈیٹ ہو جاتی ہے میڈیسن کی طرح؟"

"آف کورس... علم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ تحقیق مسلسل جاری ہے اور دنیا بھر کے دوا ساز ادارے ریسرچ پر زیادہ سے زیادہ رقم صرف کر رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اس سے پرانے نظریات بدل گئے ہیں۔ بعض نظریات الٹ گئے ہیں۔ میں اسپرین کی مثال دیتا ہوں۔ پہلے کہا گیا کہ اس سے دل پر برا اثر پڑتا ہے۔ اب ثابت ہوا ہے کہ اسپرین دل کے دورے سے بچاتی ہے۔ یہ سب ریسرچ کا نتیجہ ہے مگر پرانی ڈگریاں رکھنے والے محض نام کے دام وصول کر رہے ہیں۔ بڑی بڑی فیس لے کر اور بڑے بڑے عہدے سنبھال کر مطمئن ہیں۔ یہ طب اور میڈیسن میں نئے رجحانات سے ناواقف ہیں اور نئی معلومات سے استفادہ کرنے کے لیے پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے حالانکہ ایک ڈاکٹر کی معلومات بالکل وقت کے ساتھ رہنی چاہئیں۔ اسے نئی دواؤں کے بارے میں نئے امراض کے بارے میں اور امراض کے نئے اسباب کے بارے میں سب معلوم ہونا چاہیے۔ اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ پڑھنے کے لیے وقت نکالنا پڑتا ہے اور ان لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے۔ یہ چوبیس گھنٹے پیسہ کما رہے ہیں۔ دو گھنٹے ایک پرائیویٹ کلینک میں تو دو گھنٹے دوسرے میں۔ ہر جگہ ڈگریوں سے متاثر ہونے

www.paksociety.com

والے مریض مستفید ہوتے ہیں۔ لوگوں کے یقین کا یہ عالم ہے کہ وہ دس دس دن بعد کی ڈیٹ لینا قبول کرتے ہیں مگر ہم جیسے نوجوان ڈاکٹروں سے مشورہ کرنا پسند نہیں کرتے۔ اُن کے خیال میں ہم ناتجربہ کار، غیر ذمہ دار اور احمق ہیں۔ حالانکہ ہم لوگ آج کے دور کی مکمل معلومات رکھتے ہیں۔ ہم میں زیادہ انرجی ہے اور زیادہ جذبہ ہے۔ ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے محنت کرتے ہیں۔ ہم ان بوڑھے ڈاکٹروں کی بھی عزت کرتے ہیں اور ان کے تجربے کو نظرانداز نہیں کرتے مگر ہم جدید ترین ذخیرۂ معلومات سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جو ان بوڑھوں کے پاس نہیں ہے۔"

"تم ان سینئر ڈاکٹروں سے بہت خفا ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"کیا بتاؤں... یہ ہم سب نئی نسل کے ڈاکٹروں کا المیہ ہے۔" نوجوان ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ سینئر ہمیں اپرنٹس سمجھتے ہیں۔ جیسے ہم ابھی زیرِ تعلیم ہیں اور ہماری ڈگری بھی بوگس ہے۔ انھوں نے اپنے ناموں سے اور ڈگریوں کی قطاروں سے ایک امیج بنا رکھا ہے اور اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب سینئر ڈاکٹر ایک سے ہوتے ہیں۔ کچھ یقیناً اپنی نالج کو اپ ٹو ڈیٹ رکھنے کے لیے وہ سب لٹریچر پڑھتے ہوں گے جو دوا ساز کمپنیوں کی معرفت ان تک پہنچتا رہتا ہے اور جس سے نئے نظریات و رجحانات اور نئی دواؤں کے بارے میں مفصل معلومات مل جاتی ہیں۔ مگر اکثریت اس کی زحمت نہیں کرتی۔ کیا ضرورت ہے انھیں جب عزت، شہرت اور دولت اس کے بغیر بھی حاصل ہے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ ان میں سے کچھ جو عمر میں بڑے ہوں گے وہ پڑھا ہوا بھی بھول گئے ہوں گے اور ان کے پاس تجربہ ہی تجربہ ہے۔ علم نہیں ہے یا ہے تو اس کی افادیت مشتبہ ہے۔ آج ان کا پھر امتحان لیا جائے تو یہ فیل ہو جائیں۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "کیا یہ مبالغہ نہیں ہے؟"

"نہیں... میں ایک مثال دیتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اگر تم مانو... اور آپ بھی تو... تو میں ایک سگریٹ پی لوں؟"

"ضرور پئیں۔" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "بلکہ اجازت ہے تو مجھے بھی دے دیں۔"

"اجازت ہوتی تو نہیں ہسپتالوں میں۔" رابعہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"سب فضول باتیں ہیں... قواعد و ضوابط... ریڈ ٹیپ۔" وہ سگریٹ کیس نکال کے بولا۔ "ٹھیک ہے جیسے آپریشن تھیٹر میں پابندی ہونی چاہیے۔ جنرل وارڈ میں ٹھیک ہے کہ دوسرے بھی ہوتے ہیں وہاں جو اس کی بو سے الرجک ہوں۔ اسٹور میں یا آفس میں بھی پابندی ٹھیک ہے۔ لیکن یہ ایک پرائیوٹ کمرہ ہے یہاں ڈاکٹر اور مریض دونوں سگریٹ پیتے ہیں تو کسی کو نقصان نہیں ہو سکتا۔ دھواں اس کمرے میں رہے گا اور اس کھڑکی سے باہر نکل جائے گا۔ ہاں تمھاری صحت کے لیے سگریٹ یا اس کا دھواں مضر ہوتا تو خود تمھیں یہ حرکت نہ کرنے دیتا۔" اس نے ایک [illegible] جلایا اور ایک کش لگانے کے بعد ایک سگریٹ مجھے تھما دیا۔ مجھے وہ نوجوان اور بے تکلف ڈاکٹر اچھا لگا۔

"دراصل میں بہت تھک گیا تھا۔" وہ بولا۔ "اس [illegible] لگ گیا ہوں اور اولڈمین صرف ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہے۔ [illegible] کا صرف یہ کام ہے کہ وہ دن میں [illegible] اور دیکھے کہ سب ٹھیک ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر ریگولر ایک [illegible] ہیں یا نہیں۔ وارڈ کی صفائی [illegible] ہیں یا نہیں؟ کہیں وہ آپس میں زیادہ [illegible] تو نہیں ہو رہے ہیں۔"

اب رابعہ کو بھی ہنسی آ گئی۔ "کیا اُن کا رومانٹک ہونا جرم ہے؟"

"ان کا رومانٹک ہونا سخت جرم ہے۔ اُن کو ہر وقت [illegible] اور نرس رہنا چاہیے۔ یہ بھول جانا چاہیے کہ وہ مرد و عورت ہیں [illegible] نے اسی لیے کہا [illegible] تو قواعد و ضوابط یہاں بھی [illegible] نہیں [illegible] میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایک ڈاکٹر کسی نرس کو پسند کرتا ہے یا نرس کسی ڈاکٹر کو چاہتی ہے تو وہ ایک اچھی ٹیم بنتے ہیں۔ اس [illegible] کو کسی ایسے ڈاکٹر کے ساتھ لگا دو جس کی صورت سے وہ بیزار ہو اور ڈاکٹر کو اس نرس کے ساتھ جس کو دیکھ کر اسے وحشت ہوتی ہو تو کیا وہ ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں گے؟ نو سر... وہ زبردستی ڈیوٹی تو دیتے رہیں گے مگر انتہائی بددلی کے ساتھ۔ ایک دوسرے کو [illegible] اور ڈاکٹر ایک خوشگوار رشتے کے ساتھ کام کرتے ہیں [illegible] کوشش کریں گے کہ ان کا ساتھ قائم رہے۔ چنانچہ وہ مستعد رہیں گے اور کسی کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ یہاں ایسا ہوا ہے کہ کسی ڈاکٹر نے کسی ایک نرس کے ساتھ شفقت کا اظہار کیا اور دو چار مرتبہ ایسا ہوا تو بن جائے گا افسانہ اور اولڈمین کے کانوں تک بات پہنچی تو وہ فوراً فلمی ہدایت کار کی طرح کہے گا... کٹ... اور رومانٹک سین وہیں ختم۔ اگلے دن ایک [illegible] بنا دی جائے گی۔ ایک دوسرے سے بیزار [illegible] قواعد و ضوابط سے بیزار [illegible] یہ پورا [illegible] ایک انقلاب مانگتا ہے۔ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو، علامہ اقبال کے کہنے کے مطابق۔"

میں ہی نہیں ڈاکٹر کی گفتگو سے رابعہ بھی متاثر ہوئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کیا بات تھی کہ وہ [illegible] کمرے میں دم لینے رکا تھا اور اس نے اتنی بے تکلفی سے اظہارِ خیال کیا تھا جیسے ہم پرانے شناسا ہیں اور ہم خیال بھی ہیں۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ ورنہ عموماً لوگ ڈاکٹر، [illegible] اور [illegible] وغیرہ سے مل کر خوش نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ "میں کوشش کرتا ہوں کہ مریض اور ڈاکٹر کے درمیان قریبی اور دوستانہ تعلق پیدا کر دوں۔ عموماً ان کے درمیان فاصلہ رہتا ہے۔ مریض خود کو بے بس اور ڈاکٹر کے رحم و کرم پر سمجھتا ہے اور ڈاکٹر کے لیے وہ ایک نمبر ہوتا ہے۔ وہ مریض کو نام سے نہیں بیڈ نمبر سے پکارتے ہیں۔ چھ نمبر کی کیا پوزیشن ہے۔ دس نمبر کو ڈرپ لگا دو۔ بارہ نمبر کے ساتھ کون ہے، اس سے کہو خون کا بندوبست کرے۔ بیڈ نمبر وہی رہتے ہیں۔ اس پر مریض بدلتے رہتے ہیں۔ [illegible] دس مریض [illegible] آئیں گے اور چلے جائیں گے۔ اس سے مریض کو بھی [illegible] ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اس کے مقابلے میں ایک بہت بڑی اور عظیم طاقت ہے جس کی خوشنودی میں شفا بھی ہے اور زندگی بھی۔ یہ بات بنیادی عقائد کے خلاف بھی ہے مگر اس سے مریض اور ڈاکٹر میں دوستانہ اعتماد کی فضا پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اور مریض کھل کر بات نہیں کرتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مریض پریشانی میں بہت سی فضول باتیں بھی کرتا ہے مگر بعض اوقات اس کی باتوں سے ہی ڈاکٹر بہت کچھ سمجھ لیتا ہے۔ میں اسی لیے زیادہ بولتا ہوں۔ اولڈمین بہت ریزرو رہتا ہے اور مجھے سنجیدہ رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔"

"آپ نے ابھی تک خود کو متعارف نہیں کرایا۔" رابعہ بولی۔

"اوہ سوری میں اتنی دیر سے بول رہا ہوں۔ کیا یہ تعارف نہیں ہے؟" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کا مطلب غالباً نام سے ہے۔ تو میرا نام ڈاکٹر فرخ ہے۔"

"فرخ؟" میں نے چونک کر رابعہ کی طرف دیکھا۔

"چونکیے نہیں۔" ڈاکٹر مسکرایا۔ "مجھے معلوم ہے کہ آپ کے شوہر کا نام بھی فرخ ہے۔ مگر دنیا فنی اتفاقات سے بھری پڑی ہے۔"

رابعہ کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے گلابی ہوا مگر یہاں ڈاکٹر کی بات سننے والا میرے سوا کوئی نہ تھا چنانچہ وہ چپ رہی۔

"اس پہ مجھے یاد آیا۔" میں نے کہا۔ "کہ ہسپتال والوں کو میرا نام کس نے بتایا تھا؟"

"اس نے جو تمھیں داخل کرانے آیا تھا۔" وہ بولا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ایک پولیس انسپکٹر تھا... رضوی۔" میں نے کہا۔

"تمھیں کس سے معلوم ہوا ہے؟" وہ بولا۔

"ان سے۔" میں نے رابعہ کی طرف اشارہ کیا۔

"ان سے؟" وہ ہنسا۔ "یہ بھی خوب ہے... ہمارے یہاں میاں بیوی کتنے تکلف سے کام لیتے ہیں۔ بیویاں بھی نام لینے کے بجائے کہتی ہیں ان کا یہ خیال ہے، وہ یہ کہہ رہے تھے۔ ایسے ہی آپ کو کہنا چاہیے تھا کہ بیوی سے معلوم ہوا ہے۔ بیوی کو بیوی کہنا کون سا غیر اخلاقی فعل ہے [illegible]... خواہ مخواہ کا ایک کمپلیکس ہے۔"

"آل رائٹ... میری بیوی نے بتایا تھا مجھے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"میں نے بھی سنا تھا۔" رابعہ نے جلدی سے کہا۔

"مگر میں نے اسے دیکھا تھا۔" ڈاکٹر اطمینان سے بولا۔ "وہ ایک عیار اور جھوٹا آدمی تھا... مجھے اس کے انسپکٹر ہونے پر بھی شک تھا۔"

"کیوں؟" میں اس انکشاف پر حیران ہوا۔ "کیا وہ وردی میں نہیں تھا؟"

"نہیں۔ اس نے کہا کہ میں انسپکٹر رضوی ہوں اور یہ میرا بھائی ہے فرخ رضوی۔" ڈاکٹر بولا۔ "کوئی اسے گاڑی سے ٹکر مار کے بھاگ گیا تھا... اسے فوراً دیکھیں۔"

"بالکل ٹھیک اندازہ تھا تمھارا۔" میں نے کہا۔ "اسی بدمعاش نے تو ٹکر ماری تھی مجھے۔ پھر خود ہی یہاں لایا اور چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

ڈاکٹر نے اقرار میں سر ہلایا اور سگریٹ کے آخری ٹکڑے کو کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔ پھر کھڑکی کی طرف لپکا۔ "مائی گڈنس! ابھی باہر سے اولڈمین گزر رہا ہوتا تو دھماکا ہوتا۔ اگر سگریٹ اس کے سامنے بھی جا گرتی۔ وہ بارود کا بنا ہوا ہے۔"

رابعہ اس کی بات پر ہنسی۔ "آپ اسے اولڈمین کہتے ہیں۔ وہ آپ کو کس نام سے پکارتا ہے؟"

"ینگ فول۔" ڈاکٹر فرخ نے پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں بات کر رہا تھا اس انسپکٹر کی جو جعلی تھا۔ جب وہ تم کو لے کر آیا تو میں ڈیوٹی پر تھا۔ ہم مریض کو اٹینڈ کرتے ہیں۔ اسے لے کر آنے والے کے بارے میں تفتیش نہیں کرتے، یہ کام پولیس کرتی ہے۔ غالباً اسی لیے وہ خود انسپکٹر بن گیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بڑا عقلمند آدمی تھا۔ اس نے بغیر مانگے پانچ ہزار جمع کرا دیے۔"

"دس ہزار وہ میرے پاس بھی چھوڑ گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"بالکل [illegible] رشوت دے کر نکل گیا۔" ڈاکٹر فرخ نے کہا۔ "تاہم میں نے اسے دیکھا تھا۔"

"تم اس کا کچھ حلیہ وغیرہ بتا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

"ہاں... وہ ڈارک براؤن سوٹ میں تھا۔ تیس پینتیس سال کی عمر ہوگی۔ قد درمیانہ اور جسم قدرے بھاری۔" ڈاکٹر بولا۔ "یہ بہت عام حلیہ ہے۔ میرا مطلب ہے اس کی شخصیت کا کوئی بہت نمایاں پہلو نہیں تھا۔"

"کیا کسی نے اس کی گاڑی نہیں دیکھی؟"

"مشکل ہے..." اس نے کہا۔ "گاڑیاں تو سب پارکنگ لاٹ میں کھڑی کرتے ہیں۔ یہاں وارڈ کے سامنے وہ ایک منٹ کے لیے رکا ہوگا۔ صرف اتنی دیر جتنی دیر میں تم کو اتارا جا سکے۔"

"اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟" میں نے کہا۔

"تھا تو سامنے نہیں آیا... وہی آگے آگے تھا تمام معاملات میں اور ضرورت سے زیادہ شور کر رہا تھا۔" ڈاکٹر فرخ نے کہا۔ "خود

www.paksociety.com

کو اصلی انسپکٹر ثابت کرنے کے لیے... میرا اس سے تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ کیلیفورنیا میں نے اس کو ڈانٹ کر کہا کہ یہ ہسپتال ہے تھانہ نہیں... اگر تم ڈی ایس پی کیا ڈی آئی جی ہو تب بھی اپنی آواز سے مجھ پر رعب مت جھاڑو اور عملے کو ہراساں مت کرو ورنہ میں ایک منٹ میں تم کو باہر پھینک دوں گا... بقلم خود۔"

"بقلم خود؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "کیا تم ایسا کر سکتے تھے؟"

"میں ایک بار ایسا کر چکا ہوں۔" ڈاکٹر فرخ نے کہا۔ "بعد میں وہ انسپکٹر معطل ہو گیا تھا... یوں بھی... میرے ساتھ جو لوگ کام کرتے ہیں وہ ہمیشہ میرے دوست ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ میرا رویہ اُن کے ساتھ دوستانہ رہتا ہے۔ ڈونٹ مائنڈ اٹ لیڈی۔ نرسوں کے ساتھ یہ رویہ کچھ عاشقانہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بہت سے فائدے ہیں مگر صرف پیشہ ورانہ... ان سب نے میرے حق میں گواہی دی کہ انسپکٹر نے مجھے گالیاں دی تھیں اور تھپڑ مارا تھا۔ جب کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔"

"پھر کیا ہوا تھا؟" رابعہ نے ہنستے ہنستے کہا۔

"وہی... اس نے مجھے دھمکی دی۔ میں نے کہا کہ دھکے دے کر باہر پھینک دوں گا... وہ تھا ڈھائی من کا۔ کہنے لگا کہ ہمت ہے تو پھینک کر دکھاؤ۔ میں نے اس کی خواہش پوری کر دی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر جا کے گرا اور لڑھک کر نیچے جا لیٹا۔ میری ٹیم کے ارکان اسے اسٹریچر پر ڈال کے اٹھا لائے اور وارڈ میں لے گئے۔" وہ بولا۔

"تم دیکھنے میں تو ایسے زور آور نہیں لگتے۔" میں نے کہا اور بے ساختہ ہنسا۔

"دیکھنے میں تو میں ڈاکٹر بھی نہیں لگتا۔" وہ بولا۔ "میں پہلوان بننا چاہتا تھا لیکن اکھاڑوں میں کشتی کم تھی بدمعاشی زیادہ... پھر میں نے باکسر بننے کی کوشش کی اور اس کا ثبوت میری ناک ہے۔" اس نے ربر کی محسوس ہونے والی ناک کو دو انگلیوں سے موڑ کر کہا۔ "مجھے بچپن سے خواہش تھی کہ کسی سے مار نہ کھاؤں لیکن میں بقد اگر مند تھا چنانچہ سب سے پٹتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے جسمانی طاقت کو کارآمد بنانے کے ہر فن میں قسمت آزمائی لیکن بالآخر جوڈو کراٹے کا فن کام آیا جس میں میرا جسمانی طور پر بہت صحت مند ہونا ضروری نہیں تھا۔ بس پھرتی کی ضرورت تھی۔ چار سال تک یعنی ایم بی بی ایس کے آخری چار سالوں میں سخت پڑھائی کے ساتھ میں نے اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے بھی سخت محنت کی حالانکہ اس زمانے میں محنت سے زیادہ وقت نکالنے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ یہاں پریکٹس بیلٹ وغیرہ تو ایسے ہی مل جاتی ہے۔ بس میں خود مطمئن ہو گیا کہ اب مجھ سے زیادہ صحت مند چار آدمی مل کے بھی میری پٹائی نہیں کر سکتے۔ میرے بچپن کا کمپلیکس کام آ گیا احساس کمتری میں مبتلا فرد اکثر کسی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کر کے دنیا کو حیران کر دیتے ہیں۔ یہی میں نے بھی کیا۔"

"یو آر اے ونڈرفل مین۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے جعلی انسپکٹر کا نام بھی رضوی نہیں ہوگا۔"

ڈاکٹر فرخ ہنسا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمھارا نام بھی فرخ نہیں سکندر بخت ہے۔"

ایک لمحے کے لیے میرے دل کی دھڑکن رُک گئی۔ میرا سانس اوپر رہ گیا اور نیچے کا نیچے۔ میں پلکیں جھپکانا بھی بھول گیا اور میں نے ڈاکٹر فرخ کی طرف دیکھا جو اتنا بڑا دھماکا کرنے کے بعد پُر سکون بیٹھا تھا۔ خود رابعہ کا رنگ اُڑ گیا تھا اور وہ ساکت و صامت بیٹھی تھی۔

"یہ... یہ کس نے بتایا تمھیں؟" میں نے بالآخر خود کو سنبھال کر کہا۔

"ڈاکٹر لطیف نے۔ وہ ایک زمانے میں میرے استاد رہے اور میں آج بھی ان کا احترام کرتا ہوں۔" ڈاکٹر فرخ نے کہا۔ "تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟"

"پریشان... نہیں... اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے میں خود تمھیں بتانے والا تھا کہ..."

"غلط۔ تم چاہتے تھے کہ تمھارا اصلی نام کسی کو معلوم نہ ہو۔" ڈاکٹر فرخ نے کہا۔ "تم فرخ بن کے چھپے تھے اور فرخ ہی رہنا چاہتے تھے!"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ ٹھیک ہے ایک واجبی سی کوشش..."

"مائی ڈیئر سر! تم تو بے ہوش تھے۔" وہ بولا۔ "لیکن تمھاری وائف تو ہوش میں تھی۔ اس نے ایک بار بھی تردید نہیں کی کہ میرے شوہر کا نام غلط لکھ دیا گیا ہے۔ اور اتنی دیر سے تم باتیں کر رہے ہو۔ تم نے بھی نہیں کہا کہ تمھارا نام فرخ نہیں ہے۔ میں نے جانتے بوجھتے اپنا نام فرخ بتایا تھا صرف تمھارا ردِعمل دیکھنے کے لیے۔ تم چونکے تھے اور میرے کہنے پر تم نے اسے ایک محض اتفاق مان لیا تھا یعنی تسلیم کر لیا تھا کہ تمھارا نام بھی فرخ ہے۔ اس سے تصدیق ہو گئی تھی کہ تم اپنی شناخت چھپانا چاہتے ہو... آخر کیوں؟"

"تم بہت چالاک آدمی ہو ڈاکٹر۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"اس دنیا میں بے وقوف آدمی کے لیے جگہ نہیں رہی اب۔" وہ بولا۔ "چالاک لوگ کامیاب ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے والے اصول پرست، وضعدار اور ضمیر شناس... آئیڈیل مردانِ حق گو بے بانی پر عمل کرنے والے احمق مانے جاتے ہیں اور ہر جگہ ناکام ہیں۔ امید ہے میری صاف گوئی کا تم برا نہیں مانو گے... میں منافقت کا قائل نہیں... میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو بہت سیدھا سادا... معصوم اور شریف آدمی ہوں۔"

"میں کسی حد تک اس فلسفے کی افادیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے میں انکار نہیں کروں گا کہ میں اپنی شناخت چھپا رہا تھا... کیوں چھپا رہا تھا؟ اس کے اسباب پرائیویٹ ہیں۔"

"پولیس پرائیویٹ اسباب کی دلیل نہیں مانتی۔"

"کیا مطلب! پولیس کا اس معاملے سے کیا تعلق؟" میں نے گھبراہٹ پر قابو پا کے کہا۔

"حادثہ پولیس کیس ہوتا ہے لیکن ابھی تک اس کی رپورٹ پولیس کو نہیں دی گئی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "تمھاری بیوی نے ایک بار بھی نہیں کہا کہ اس جعلی انسپکٹر کے خلاف رپورٹ کرنی چاہیے۔"

"کیا یہ تمھارا فرض نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"تھا۔ مگر مجھے اندازہ ہوا کہ خود ڈاکٹر لطیف یہ نہیں چاہتے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "انھوں نے مجھ سے تمھارے متعلق نہیں پوچھا تھا اور نہ کہا تھا۔ ان کا فون آیا تھا کہ کیا رابعہ قادری نام کی کوئی عورت کسی سکندر بخت کو پوچھتی ہسپتال پہنچی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ رابعہ قادری کون ہے؟ وہی ایڈووکیٹ؟ تو ڈاکٹر لطیف نے کہا کہ ہاں۔ اگر وہ آئے تو اس کو روک لینا۔ شی از ناٹ نارمل۔ لیکن مجھے اس کی طرف سے بہت تشویش ہے۔ میں نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں۔ اس فون کے آنے کے پندرہ منٹ بعد تم کو لایا گیا۔ اور تمھیں لانے والا تمھارا نام فرخ لکھوا کے بھاگ گیا۔ آدھے گھنٹے بعد تمھاری بیوی پہنچی۔ اور صبح تو جب اس نے پوچھا کہ یہاں کوئی سکندر بخت تو نہیں ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہیں؟ انھوں نے تسلیم کیا تو میں ان کو مختلف وارڈز میں لے گیا۔ تعارف کرانے سے پہلے ہی ان کے ردِعمل سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ نارمل نہیں ہیں۔ ان کو شاید یاد بھی نہ ہو۔ انھوں نے میری موجودگی کی پروا کیے بغیر چیخ ماری تھی اور تمھارا نام لیا تھا۔ اور ان کا رویہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک محبت کرنے والی بیوی کا ہونا چاہیے۔ میں نے ڈاکٹر لطیف کو اطلاع دے دی کہ رابعہ یہاں ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔ اور وہ سکندر بخت کے پاس ہے۔ ایک گھنٹے بعد وہ آ پہنچے تھے اور انھوں نے سامنے آئے بغیر رابعہ کا کیس ڈسکس کیا تھا۔"

"صرف رابعہ کا؟" میں نے کہا اور رابعہ کی طرف دیکھا۔

"صرف رابعہ کا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "انھوں نے کہا کہ رابعہ کو یہاں رہنے دو جب تک سکندر یہاں ہے۔ اس سے فائدہ ہوا ہے۔ شی از نارمل ناؤ۔ پھر وہ چلے گئے تھے۔"

"جانے سے پہلے انھوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ رابعہ میری بیوی کب سے ہے؟" میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

"بیوی نہیں ہے؟" ڈاکٹر نے چونک کے کہا۔ "او تو... پھر کون ہے؟ خیر میرا یہ سوال بھی غلط ہے... بیوی نہ سہی... ان کا کچھ جذباتی تعلق ہے آپ سے جو بہت گہرا ہے۔ اور واضح ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک ڈاکٹر جب کسی مریض سے دوستانہ طرزِ عمل اختیار کر لیتا ہے تو اس سے باتوں باتوں میں وہ سب معلوم کر سکتا ہے جو براہِ راست تفتیش سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ مریض ایک دم محتاط ہو جاتا ہے اور کچھوے کی طرح اپنی ذات کے خول میں سمٹ جاتا ہے۔ بہرحال تمھیں مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔"

"خطرہ... خطرہ کیوں محسوس کروں گا میں؟" میں نے کہا لیکن مجھے یہ احساس ہوا کہ اس بہت ذہین ڈاکٹر سے حقیقت نہیں چھپائی جا سکتی اور اگر میں نے دغا کی کھیل نہ کھیلا تو وہ میرا سارا کھیل چوپٹ کر دے گا۔

"وہی آدمی اپنی شناخت چھپاتا ہے جسے اپنی اصلیت ظاہر کرنے میں خطرہ محسوس ہو۔" ڈاکٹر بولا۔ "تم کہتے ہو کہ اس کے پرائیویٹ اسباب ہیں... میں مان لیتا ہوں۔ صرف اس لیے کہ میں ڈاکٹر ہوں سراغرساں نہیں ہوں ورنہ اسباب بھی معلوم کر لیتا... بس رابعہ! آپ ابھی تو ٹھیک ہیں کیونکہ یہ دو دن بعد ہیں۔ ہو سکتا ہے کل صبح ڈاکٹر لطیف آئیں۔ میری باتوں سے پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں مسٹر سکندر بخت۔ میں وہ آدمی ہوں کہ اگر تم مجھ پہ بھروسا کرنا چاہو تو فائدے میں رہو گے۔ تم اگر کسی کو قتل کر آئے ہو یا جیل سے بھاگے ہو تب بھی مجھے بے خوف ہو کے بتا سکتے ہو۔ کم سے کم میری زبان سے ایک لفظ کسی اور تک نہیں پہنچے گا۔ میرے لیے ہر مریض پہلے ایک آدمی ہے۔ پھر مریض، اور اس کے بعد وہ کچھ بھی ہو۔ وِش یو بیسٹ آف لک۔" وہ ایک دم اٹھا۔

"ڈاکٹر..." میں نے کہا۔ "جانے سے پہلے اپنا اصل نام بھی بتاؤ۔"

"اٹ از ڈاکٹر حکیم۔" وہ مسکرایا۔ "ویری فنی نیم فار اے ڈاکٹر۔"

"ڈاکٹر سلاور حکیم۔" میں نے اس کے چلے جانے کے بہت دیر بعد کہا۔ "کیا یہ آدمی بھی اپنے نام کی طرح عجیب نہیں تھا؟"

"مجھے وہ عجیب نہیں خطرناک لگا۔" رابعہ نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ بہت کچھ جانتا ہے۔"

"اس نے کہا ہے کہ وہ قابلِ اعتماد بھی ہے۔" میں نے اُسے تسلی دی۔

"ہم اس طرح ہر ایک کے کہنے پر اعتماد کا خطرہ نہیں کر سکتے۔"

"رابعہ! کیا تمھیں یاد ہے کہ تم ڈاکٹر لطیف کے گھر میں کیوں تھیں؟" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم اور غالب وہاں آئے تھے تم بتاؤ؟"

"اچھا اس سے پہلے کیا ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"کب کیا ہوا تھا؟"

"جب میں تم سے ملا تھا۔ اُس کے بعد جو کچھ ہوا..." میں نے کہا۔ "دلاور نے جو کچھ کیا۔ تم کو محسن اور شعلہ... استاد شیدی یاد ہیں؟"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" رابعہ پریشان ہو کے بولی۔ "کل

www.paksociety.com

"تم پوچھو گے کہ میرا نام بتاؤ... یہ پوچھو گے کہ مجھے اپنا نام یاد ہے۔ اپنے والدین کا نام یاد ہے؟"

میں یہ سوال بہت پہلے کرنا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر حکیم کی موجودگی میں مجھے صرف رابعہ کے رویے پر غور کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس سے میں اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ وہ نارمل ہو گئی ہے۔ اب مجھے کوئی شک نہیں رہا کہ اس کی یادداشت بھی بحال ہو چکی ہے۔ میرے ساتھ پیش آنے والے ایک حادثے کے بعد اس کا مجھ سے ملنا اس کی شفا کا بہانہ بن گیا تھا... یہ سب تقدیر کے کھیل تھے۔ قدرت نے مجھے جس طرح سے ملایا تھا اسی طرح پھر ملا دیا تھا ورنہ وہ مجھے کھو چکی تھی اور میں اس سے مایوس تھا۔ میرا حادثے میں زخمی ہونا بھی اچھا ہی ہوا۔ نہ میں زخمی ہو کے یہاں پہنچتا نہ رابعہ کو نظر آتا۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں مجھے تلاش کرتی پھرتی اور بالآخر نہ جانے کہاں پہنچتی۔

مجھے اس وقت یہ بھی خیال آیا کہ میں رابعہ سے ان واقعات کے بارے میں سوال کروں جن کے نتیجے میں اس کی یادداشت متاثر ہوئی تھی مگر میں نے اس تلخ حقیقت کے حوالے سے گریز کیا۔ پانی سے سگ گزیدہ ڈرتے جس طرح اسد۔ میں ڈرا کہ کہیں اس بات کے ذکر سے رابعہ کے ذہن پر خود فراموشی یا پاگل پن کے اس دورے کا اثر پھر نہ ہو جائے۔

"دیکھو رابعہ! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ابھی تک کسی نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں یہاں دو دن نہیں رک سکتا۔ میں ایک انتہائی اہم کام کو ادھورا چھوڑ آیا تھا... مجھے یہاں سے جانا ہے... ابھی اور اسی وقت۔"

"تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔" وہ سہم کر بولی۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"ضرور چلو لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے؟" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر حکیم بہت چالاک آدمی ہے۔ اسے دھوکا دینا بہت مشکل ہوگا۔"

"تم ہی کچھ سوچو۔" رابعہ نے کہا۔

"ایک طریقہ تو یہ ہے کہ میں اسے رازدار بنا لوں۔ وہ آدمی اچھا ہے اور اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن عقل کہتی ہے کہ اتنی جلدی کسی پر بھروسا کر لینا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے حالات ایسے ہیں کہ اچھی طرح جانے اور پرکھے بغیر ہمیں کسی کو بھی دوست اور مددگار نہیں بنانا چاہیے۔ دوسرا طریقہ مشکل اور خطرناک تو ہے مگر..."

"مگر کیا؟" رابعہ نے مجھے سوچ میں دیکھ کر کہا۔

"سوچتا ہوں کہ وہ بیچ بچاؤ کرانے کا ماہر ہوا اور مجھ پر بھاری پڑا تو کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "دشمن کو کمزور سمجھنے کی غلطی نہیں کرنا چاہیے۔"

"تم اسے زبردستی مغلوب کرنے کا سوچ رہے ہو؟" رابعہ خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "اسپتال میں مار دھاڑ کرو گے؟"

"اگر اور کوئی ترکیب کارگر نہ ہوئی تو پھر یہی ایک راستہ بچے گا۔" میں نے کہا۔ "میرا یہاں رکنا ناممکن ہے۔ اب تک میری عدم موجودگی سے نہ جانے کتنا نقصان ہو چکا ہوگا۔ غالب تو پہلے ہی مشتعل تھا کہ میں نازو کو مصیبت میں پھنسا کے جا رہا ہوں۔"

"نازو مصیبت میں ہے... تمہاری وجہ سے؟" رابعہ بولی۔

"ہاں میری وجہ سے۔ یہ میری ہی تجویز تھی جس پر عمل کیا گیا اس نے۔" میں نے کہا۔ "محسن اور شہلا الگ پریشان ہو رہے ہوں گے کہ مجھ بتائے بغیر اور دشمن کو ایسے نازک مرحلے میں چھوڑ کے کہاں غائب ہو گیا۔"

"یہ تم کس مشن کی بات کر رہے ہو؟" رابعہ پریشان ہو کر بولی۔

"دیکھو رابعہ! بہت سی باتیں ہیں جو میں تم کو یہاں اور اس وقت نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "جب تم گھر چلو گی تو محسن بتا دے گا یا اس کی بیوی سے اپنی غیر حاضری کے زمانے کے واقعات سن لینا۔"

"سکندر تم مجھے پاگل کر دو گے۔" رابعہ نے کہا۔ "میں کب غیر حاضر تھی اور یہ محسن کی بیوی کون ہے؟"

"میری بات غور سے سنو۔" میں نے اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ "تم کو آخری بات کیا یاد ہے؟"

"مجھے؟... مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ مجھے اور شہلا کو کچھ لوگ اغوا کر کے لے گئے تھے..." وہ بولی۔

"ہاں... اور تم کو وہاں سے نازو نے نکالا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی مجھے یاد ہے مگر اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ کیا نازو نے مجھے ڈاکٹر لطیف کے گھر پہنچا دیا تھا؟" رابعہ نے کہا۔

"ابھی تم یہی سمجھ لو کہ تب سے تم ڈاکٹر لطیف کے گھر تھیں۔" میں نے کہا۔ "اور تمہاری یادداشت کھو گئی تھی۔"

"میری یادداشت کھو گئی تھی؟" وہ وحشت زدہ ہو گئی۔

"ہاں اس حد تک کہ تم مجھے بھی پہچاننے سے انکار کرتی تھیں۔" میں نے کہا۔ "تمہاری یہ غیر حاضری ذہنی تھی۔ تم ہمارے ساتھ پیش آنے والے بہت سے واقعات سے بے خبر ہو۔ ان کا خلاصہ بھی پیش کرنا چاہوں تو گھنٹوں لگ جائیں گے۔ اب تم ٹھیک ہو تو تمہیں درمیانی مدت میں اپنے ساتھ ہونے والی کوئی بات یاد نہیں۔ تمہارا علاج ڈاکٹر لطیف کر رہے تھے۔ جب تم وہاں زیر علاج تھیں تو محسن کے والد کا انتقال ہو گیا۔"

"انکل شیرازی کا؟" رابعہ کی صورت پہ افسردگی چھا گئی۔

"ہاں... اور جب محسن گیا تو شہلا سے شادی کر کے اسے اپنے ساتھ لے آیا۔" میں نے کہا۔ "شہلا کو وہاں چھوڑنا مشکل تھا اس کے علاوہ مرحوم انکل شیرازی کی وصیت بھی تھی۔ سوئم کے بعد گھر سے شہلا کی رخصتی ہوئی اور وہ دونوں اچانک میاں بیوی کی حیثیت سے آ پہنچے۔ ہم تو خود بھی دم بخود رہ گئے تھے۔"

"اور مجھے یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ شہلا اب محسن کی بیوی بن گئی ہے۔ کہاں ہیں وہ دونوں؟" رابعہ نے اشتیاق اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔

"ہم انھی کے گھر میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اور استاد [illegible] مرزا غالب۔ ہم سب نے ایک پلان بنایا تھا۔ ملاوا کے خلاف۔ اور نازو کو آگے رکھا تھا۔ غالب اس کے ساتھ تھا اور میں غالب کے ساتھ لیکن اس کے بعد اچانک یہ حادثہ پیش آ گیا اور میں غالب کو بتائے بغیر یہاں آ گیا۔ میری مدد کے بغیر غالب بھی نازو کی مدد نہیں کر سکتا اور ہمارے دشمن کا بیڑا غرق ہو سکتا ہے۔ ابھی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔ لیکن بارہ گھنٹے بھی بہت ہوتے ہیں... خدانخواستہ نازو کو کچھ ہوا تو میں تمام عمر خود اپنی نظروں میں مجرم ہو جاؤں گا۔ میں کبھی خود کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں اس کے احسانات کے بوجھ تلے پہلے ہی اتنا دبا ہوا ہوں کہ ایک بار نہیں تین بار جنم لوں تو اس کا قرض ادا کر سکوں گا۔ اس ایک زندگی میں تو یہ قرض اتر نہیں سکتا۔"

"لوگ سات جنم کی بات تو محاورتاً کرتے ہیں۔ یہ تین جنم کی کیا بات ہوئی؟" رابعہ بولی۔

"اس کا دو بار میری زندگی کو اپنی جان کی بازی لگا کے بچانے کا قرض ہے۔" میں نے کہا۔ "دونوں بار خود وہ زخمی ہوئی اور مر بھی سکتی تھی۔ تیسری بار وہ جان پہ کھیل کر تمہیں بچا لائی۔ تم بھی میری زندگی ہو۔ اس لیے نازو کے احسانات کا قرض اتارنے کے لیے مجھے کم سے کم تین بار مر کے جینا ہوگا۔ پھر بھی شاید سود رہ جائے کیونکہ وہ جذبہ میں کہاں سے لاؤں گا جس نے نازو کو اپنے ہی بھائی کے مقابل کھڑا کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ہم پہلے یہاں سے نکل جائیں۔ میں تم کو شہلا کے پاس چھوڑ دوں گا۔ وہاں تم اطمینان سے سارے واقعات اور ہمارے مشن کی تفصیلات سن لینا... اور شہلا یہ بھی بتا دے گی کہ نازو تم کو کس طرح نکالنے میں کامیاب ہوئی تھی۔"

"یہ ڈاکٹر لطیف کون ہیں؟... میرا مطلب ہے میں وہاں کیوں تھی؟ کیا وہ نازو کو جانتے تھے؟" رابعہ نے کہا۔

"نہیں۔ وہ غالب کے والد کے دوست تھے... بہت زبردست آدمی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے گھر کے سوا کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں تمہیں رکھا جا سکتا۔ خصوصاً اس حال میں کہ تمہیں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ اب انھوں نے ڈاکٹر حکیم سے کہا ہے کہ رابعہ کو کہیں نہ جانے دیا جائے تو یہ ڈاکٹر تمہیں نکلنے نہ دے گا اور نہ مجھے۔" میں نے کہا۔ "مجھے وہ کم سے کم دو دن اور یہاں رکھنے پر مصر ہے ویسے بھی وہ کچھ تجسس میں مبتلا ہو گیا ہے کہ میں نے اپنی شناخت بدلنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ اس نے باہر پہرا بٹھا رکھا ہوگا؟"

"پہرا بٹھانا تو مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے اس نے چوکیدار کو ہدایت کر رکھی ہو۔ تم ذرا باہر کا ایک راؤنڈ لگاؤ... یہ دیکھو کہ فرار کے کتنے راستے ہیں۔ خود باہر جانے کی کوشش کرو۔"

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا اور دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔

اس نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا تو میں اس کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے کھڑکی تک جا کے دیکھا۔ اس میں فولادی جالی لگی تھی۔ میں نے جالی پر ہاتھ پھیر کے دیکھا۔ اسے ایک ہتھوڑی سے بھی کاٹا جا سکتا تھا اور مکا مار کے پھاڑا بھی جا سکتا تھا مگر کھڑکی کے بالکل سامنے ایک گارڈن لائٹ تھی۔ اس کے نیچے بنچ پر دو مریض بیٹھے تھے۔ مختصر سے لان میں ایسی چھ بنچیں تین طرف لگی ہوئی تھیں اور ان سب پر مریض کھلی ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے۔ سردی کا زمانہ گزر چکا تھا اور شام بڑی خوشگوار ہوتی تھی۔ لان کے دوسرے کنارے پر ایک کیمسٹ کی دکان تھی اور اس طرف سے کھڑکی توڑ کے نکلنا رات کے بارہ بجے سے پہلے ناممکن نہ سہی مشکل ضرور تھا۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ میں شور مچانے یا راہ میں حائل ہونے والے ہر شخص کو ناک آؤٹ کرتا جاؤں اور باہر نکلتے ہی کسی رکشا کو پکڑ لوں۔ میں رابعہ کو بھی اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا مگر اس کے بعد رابعہ بڑی مشکل میں پڑ جاتی۔ وہ اپنے محسن ڈاکٹر لطیف کے سامنے بھی نہ جا پاتی۔ ڈاکٹر حکیم ان کو پوری رپورٹ دے دیتا کہ وہ کس طرح سکندر کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔

دروازہ کھلا تو میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ رابعہ لوٹ آئی تھی۔ اس کا چہرہ مایوسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "پکڑ لیا کسی نے؟"

"ہاں... اسے اتفاق کہو یا کچھ اور... کوریڈور میں ہی سامنے سے ڈاکٹر حکیم آ رہا تھا۔ کہنے لگا خیریت؟ کدھر کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا کہ ایسے ہی کمرے میں گھبرا گئی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہو لیا کہ چلیے کچھ دیر باغ میں ٹہلتے ہیں۔ میں بھی فارغ ہوں اس وقت۔ مجھے مجبوراً جانا پڑا۔ دس منٹ تک زبردستی اس کے ساتھ ٹہلتی رہی۔ عجیب آدمی ہے وہ بھی۔ یہاں کتنا بول رہا تھا۔ اب بالکل چپ۔ دو بار بولا تو یہ کہ مس رابعہ کچھ بات کیجیے

www.paksociety.com

تنگ آ گئے ہیں۔ سوچا کہ کسی موضوع پر بات کروں۔ اور بوٹ آئی۔"
"کوئی بات نہیں۔ اتفاق ایک بار ہو سکتا ہے۔ دو بار ہو سکتا ہے مگر بار بار نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔ "پھر جاؤ... اور اگر وہ دوبارہ ملے تو اس کو جھاڑ دینا۔ کہہ دینا کہ میں تنہائی چاہتی ہوں۔ آپ خوامخواہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کریں۔ لڑکیوں کے پاس شمع حسن کے پروانوں کی حوصلہ شکنی کے بہت بہانے ہوتے ہیں۔"
"لمبے مت شمع حسن کرو میرے پروانوں میں۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔
"ایک شمع روشن ہو تو پروانے کھنچے آ جاتے ہیں۔ مرنے والے پتنگوں کو کوئی روک سکتا ہے بھلا؟" میں نے اُسے چھیڑنے کے لیے کہا اور وہ ناراضگی میں باہر نکل گئی۔
آدھے گھنٹے میں مجھے معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر حکیم کا سامنے سے نمودار ہونا کوئی اتفاق نہیں تھا۔ دوسری مرتبہ بھی وہ رابعہ کو بالکل اسی جگہ ملا اور پھر رابعہ کے ساتھ ہو گیا۔ رابعہ نے پہلے شرافت سے کہا کہ وہ کچھ دیر اکیلی رہنا چاہتی ہے مگر اس نے کہا کہ یہ عمر اکیلی رہنے کی نہیں ہوتی اور آپ جیسی خاتون کو کیا ضرورت ہے اکیلی رہنے کی۔ رابعہ نے اُسے بے تکلفی سے باز رہنے کے لیے زیادہ صاف الفاظ میں کہا تو وہ سنجیدہ ہو گیا کہ مس رابعہ... میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تنہائی آپ کی ذہنی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ تنہائی میں ذہن کو خیالات پریشان کرتے ہیں اور آدمی ڈپریشن کا شکار ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں کہ مجھے ڈاکٹر لطیف نے آپ کا خیال رکھنے کو کہا ہے میں کسی صورت آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے مجبور کرنے پر رابعہ تیسری بار نکلی اور چند قدم چل کے لوٹ آئی۔ اس نے ڈاکٹر حکیم کو کسی جن کی طرح نمودار ہوتے دیکھ لیا تھا۔
"یہ معاملہ بے حد مشکوک ہو گیا ہے۔" میں نے رابعہ کی روہانسی صورت دیکھ کر کہا۔ "آخر اُسے کیسے علم ہو جاتا ہے کہ تم کمرے سے نکلی ہو... اور حد یہ ہے کہ وہ ملتا بھی اسی جگہ ہے۔ کیا وہ دروازے پر نظر رکھے کھڑا رہتا ہے کہ اُدھر سے تم چلے اور ہم اِدھر سے... اور ملاقات پھر اسی جگہ۔"
"کیسے دیکھتا رہتا ہے؟" رابعہ نے چڑ کے کہا۔ "کہاں سے دیکھتا رہتا ہے۔ سامنے تو سیدھا کاریڈور ہے اور اس کے دونوں جانب مریضوں کے کمرے ہیں۔ آخر میں وہ لاؤنج سا ہے جہاں رات کی ڈیوٹی پر مامور اسٹاف موجود رہتا ہے۔ ایک ٹیبل نرس کی ہے جس پر دو نرسیں اس وقت بھی بیٹھی ہوں گی۔ ایک صوفہ ہے جس پر دو آیا ٹائپ عورتیں بیٹھی ہیں اور ایک طرف ڈاکٹر کا کمرہ ہے۔"
"کس ڈاکٹر کا؟" میں نے کہا۔
"جس کی بھی ڈیوٹی ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "اس کا دروازہ کھلا ہے اور وہاں دوسرا ڈاکٹر موجود ہے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر بھی تھی۔ اگر دروازے سے باہر نکل کے دیکھو تو تمہیں بائیں جانب سامنے دیکھنے سے نرس کی ٹیبل بھی نظر آئے گی اور لیڈی ڈاکٹر بھی۔ دائیں طرف بھی ایک کمرہ ہے جو غالباً اسٹور ہے۔ دوائیں ہیں اور سامان ضرورت ہے۔ بائیں جانب باہر جانے کا راستہ ہے۔"
"اور ڈاکٹر حکیم کس طرف سے آتا ہے؟"
"دائیں جانب سے۔ جدھر اسٹور ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "کیا اسٹور میں صرف جاری نگرانی کے لیے موجود ہے؟ ایک ڈاکٹر بلاوجہ اسٹور میں بیٹھے گا تو کتنی دیر۔ کیا وہ جاری ہے کیا اس پر پہرہ ہے؟ ہم قیدی کا ہیں؟ فرض کرو میں زبردستی باہر جانا چاہوں تو کیا وہ روک سکتے ہیں مجھے؟"
"میرا خیال ہے ایک ڈاکٹر کے اختیارات کو اسپتال میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "وہ خود بھی آسانی سے تم پر قابو پا لے گا اور پھر کسی ایسی جگہ رکھ دے گا جہاں میں بھی نہ جا سکوں۔ کیا پتا کمرے بہت ہیں اور میں ہر کمرے میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتا ہوں۔"
"سب سے بڑی بات یہ ہے سکندر کہ اس کو معلوم کیسے ہوتا ہے؟"
"یہی ہے غور طلب مسئلہ۔" میں نے کہا۔ "کیا تم جو سوچ رہی ہو..."
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" رابعہ نے برہمی سے کہا۔ "میرا بس چلے تو... ہنگامہ کر دوں گی میں۔"
"نہیں نہیں... ایسے نہیں۔" میں نے اُسے تسلی دی۔ "جوش سے نہیں ہوش سے کام لو... اور مجھے ذرا سوچنے دو۔"
میں نے کمرے کی دیواروں کا جائزہ لیا۔ کسی دیوار کے کان نہیں تھے۔ پلاسٹر اور رنگ و روغن ملا ہوا تھا۔ اگر اس کے نیچے کوئی خفیہ مائکروفون ہوتا تو مجھے بال برابر لکیر دیکھ کے بھی اندازہ ہو جاتا کہ کسی نے عمارت سے کچھ چھپایا ہے۔ مگر دو دن پہلے بھی میرے یہاں آنے کی پیش گوئی کون کر سکتا تھا۔ میرا یہاں آنا ایک حادثے کا نتیجہ تھا چنانچہ اس قسم کے انتظامات دو دن پہلے سے نہیں کیے جا سکتے تھے اور نہ میری موجودگی میں ممکن تھے۔ میں نے لائٹ آن کر کے دیکھا۔ پنکھے پر غور کیا جس کے درمیان میں ایک گول ڈھکن سا ہوتا ہے جسے اُکھاڑ کے ہلایا جا سکتا ہے تاکہ پنکھے میں گریس ڈالی جا سکے۔ میں نے اس کو انگلی سے بجایا اور پھر کھول کر دیکھا۔ اس کے نیچے تانبہ بھری ہوئی گریس تھی۔ میں نے بستر کے نیچے اور سائیڈ ٹیبل کی درازوں میں بھی دیکھا۔ کہیں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں مایوس ہونے لگا تھا کہ مجھے دروازے کا خیال آیا۔ میں نے اس کے ہینڈل

بڑھایا اور رابعہ کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے میرے ہاتھ کے اشارے کو سمجھتے ہوئے باہر جھانکا اور فوراً اندر کر لیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔
"کیا وہ پھر سامنے آ گیا تھا؟" میں نے کہا اور رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور ڈاکٹر کے اندر آنے کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ اندر نہیں آیا۔ وہ دروازے کے قریب ٹھٹھک کے آیا اور پلٹ کے چلا گیا۔ میں نے مکمل خاموشی میں اس کے قدموں کی چاپ سنی اور رابعہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ آخر اس کے یوں آنے اور چلے جانے کا مقصد؟ وہ کون ہے؟ کس کے لیے سب کچھ کر رہا ہے؟ کسی سوال کا یقینی جواب نہیں تھا مگر مجھے اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بے بس و لاچار نہیں بیٹھے رہنا تھا۔
میں نے گھٹنوں پر جھک کر ڈور لاک کا معائنہ کیا اور جلد ہی آسانی سے میں نے وہ باریک سا تار دریافت کر لیا جو دروازے کے گول گھومنے والے ہینڈل کے تعلق سے نکل کر دروازے کی ایک جھری کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا مگر اس پر وہی پینٹ کر دیا گیا تھا جو دروازے پر تھا۔ چنانچہ بہت غور سے دیکھے بغیر اس تار پر کسی کی نظر پڑنے کا بالکل امکان نہیں تھا۔ میں نے تار کے اوپر انگلی پھیری اور میری انگلی پر کریم کلر کی لکیر سی بن گئی۔ باقی دروازے کا رنگ خشک تھا مگر تار پر رنگ چپک رہا تھا۔ میں نے اُسے سونگھا۔ اس میں پینٹ یا تیل کی بو نہیں تھی۔ یہ خشک پاؤڈر کلر تھا جو بڑی صفائی سے تار کے اوپر چپکا دیا گیا تھا۔ میں نے رابعہ کو تار کی طرف متوجہ کیا اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلایا اور واضح کیا کہ وہ سمجھ گئی ہے۔ میں نے انگلی سے زمین پر لکھا۔ باتیں کرو۔
"میں اب نہیں جاؤں گی۔" رابعہ نے تندہی سے کہا۔ "تم سمجھے کیوں نہیں آخر۔ ادھر میں باہر نکلتی ہوں اُدھر وہ آ پہنچتا ہے۔"
"اچھا اس سے کہہ دو کہ مجھے کیا چاہیے۔" میں نے کہا۔
"یہ ٹیش من آؤٹ کس لیے ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "تم سگریٹ جلانے کا سامان منگوا سکتے ہو۔"
"لیکن تم جانتی ہو... وہ چیز تمہارے سوا کوئی نہیں لا سکتا۔"
"پھر اس ڈاکٹر کو بلا کر کہہ دو۔" رابعہ نے کہا۔ "وہ لا دے گا۔"
"ڈاکٹر مجھے اسپتال میں شراب لا کے دے گا؟ تمہارا دماغ خراب ہے۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا... مگر یہ سب ڈرامہ تھا۔
"کل جو منگوائی تھی... سب پی گئے۔ اب میں کیسے باہر جاؤں۔ لیکن کمزوری ہو رہی ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "تم بھی سو جاؤ۔"
"اچھا بھئی تمہاری مرضی۔" میں نے کہا اور لائٹ آف کر دی۔
"دو دن کی قید اور ہے... کاٹ لیں گے۔" میں نے اس تمام عرصے میں جو کچھ میں کرتا رہا وہ سب رابعہ بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ میں نے میز پر سے پھل کاٹنے والی چھری اٹھائی اور اس کی دھار کو آہستہ سے تار پر پھیر دیا۔ پتلا سا تار دو حصوں میں تقسیم ہو گیا مگر اپنی جگہ پر رہا۔ اس کے بعد ہم نے پندرہ منٹ خاموشی میں گزار دیے۔ ایک بار پھر کوئی آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے دروازے تک آیا۔ چند سیکنڈ رکا اور مطمئن ہو کے لوٹ گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی رات کے سوا گیارہ بجے تھے۔
"اب تیار ہو جاؤ۔" میں نے رابعہ سے سرگوشی میں کہا۔ "ہماری آواز اب کوئی نہیں سن رہا ہے۔"
"پھر بھی وہ ہمیں سامنے سے گزرتا دیکھے گا۔"
"اس کا باپ بھی کچھ نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے کہا اور چھری سے کھڑکی کی فلائی پروف جالی کاٹ دی۔ اگر دروازے میں نصب مائکروفون کام کر رہا ہوتا تو یہ آواز بھی یقیناً ڈاکٹر حکیم کے کان سن لیتے۔ اب باہر پارک میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اوائل مارچ کی خنکی کے باعث سب لوگ اپنے کمروں میں جا چکے تھے اور کھڑکیاں بند کر چکے تھے۔ صرف کیمسٹ کی دکان کھلی ہوئی تھی لیکن وہ بھی کہیں اندر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے پہلے رابعہ کو باہر اتارا۔ پھر بستر کی چادر لپیٹ کے جسم پر اس طرح لپیٹ لی کہ میرا اسپتال کا لباس تقریباً چھپ گیا۔
"اب تم اطمینان سے باہر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اور کسی رکشا کو روکو۔ جب رکشا گیٹ پر آ جائے تو اندر آ کے مجھے اپنی صورت دکھا دینا۔ میں گیٹ پر نظر رکھوں گا۔ تم واپس جا کے رکشا میں بیٹھ جانا اور میرا انتظار کرنا۔ رکشا والے سے کہنا کہ مریض تھک جاتا ہے۔"
رابعہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئی۔ میں نے اسے پورے اطمینان کے ساتھ گیٹ سے باہر جاتے دیکھا۔ وہ اسپتال کے کپڑوں میں نہیں تھی چنانچہ چوکیدار نے اسے نہیں روکا۔ وہ محلے کی لڑکی بھی ہو سکتی تھی اور کسی پرائیویٹ وارڈ کے مریض کے ساتھ رہنے والی گھر کی کوئی عورت بھی۔ میں پاس اندھیرے کونے میں کھڑکی بند کیے شیشوں کے پیچھے کھڑا گیٹ کو دیکھتا رہا۔ رابعہ دس منٹ بعد اندر آئی اور اس نے کیمسٹ کی دکان سے کچھ خریدا۔ پھر وہ واپس چلی گئی۔ میں کھڑکی سے باہر اترا اور گیٹ کی سمت بڑھا۔ چوکیدار نے چادر کے نیچے سے اسپتال کے دھاری دار لباس کا پاجامہ پہچان لیا۔
"کون ہو تم... ارے بھائی صاحب... رک جاؤ۔" وہ میری طرف بڑھا اور بیچ راستے رک گیا۔ چوکیدار میرے قریب آ گیا۔ "اپنی صورت تو دکھاؤ۔" وہ اپنی صورت کے ساتھ ہی میں نے اسے ایک معمولی سا داؤ کا تماشا بھی دکھایا۔ اس کی گردن پر اور کنپٹی پر میرے دو ہاتھ لگے۔ وہ لان پر گر گیا۔ میں گیٹ کی طرف بھاگا۔ کیمسٹ جلانے

www.paksociety.com

لگا: "پکڑو... پکڑو..."

اس کی آواز پر اچانک کے اندر شاید کوئی منظر ہوا ہو تو جیالا ہو۔ بار جہاں رکشا میں رابعہ بیری متشکر تھی اس کی آواز انجن کے شور میں دب گئی۔ وہی رکشا کا شور جس سے بیٹھ کر میرے اعصاب متاثر ہونے لگے تھے اس وقت میرے لیے باعث سکون ثابت ہوا۔ میرے پیچھے ہی رکشا چل پڑا اور اس وقت میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے [illegible] ڈاکٹر حکیم کا چہرہ نظر آیا۔ وہ رکشا کے پیچھے بھاگا۔ "اے رکشا!" اس نے چیخ کر کہا مگر رکشا والا اپنی دھن میں چلتا گیا۔ اسے کیسے شک ہو سکتا تھا کہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔ اگر رکشا خالی ہوتا تو اس آواز پر ضرور رک جاتا۔ ڈاکٹر کی یہ حرکت مجھے مضحکہ خیز لگی۔ وہ رکشا کے پیچھے خود کیسے دوڑ سکتا تھا۔ میں نے دوبارہ پلٹ کر دیکھا تو اس کا ہاتھ جیب سے باہر آ چکا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے رابعہ کو گردن سے پکڑ کے جھکا دیا۔ میں خود بھی جھک گیا تھا جب فائر کی آواز آئی۔ اگر اس کا نشانہ صحیح ہوتا تو گولی رکشا والے کو بھی لگ سکتی تھی جس کا سر پیچھے بیٹھنے والی سواریوں کے درمیان نظر آتا ہے۔ اب یا تو اس کا نشانہ حد سے زیادہ درست تھا کہ میں نشانہ بنا اور نہ رابعہ ہی اور گولی سیدھی گزر گئی۔ اگر احمد نے رکشا روکنے کے لیے ڈرائیور کے سر کا نشانہ لیا تھا تو اسے قسمت نے بچایا۔ رکشا متحرک تھا اور اس کی رفتار بھی زیادہ تھی۔ سڑک ناہموار تھی۔ چنانچہ جھٹکوں سے ہم بھی اچھل رہے تھے۔ غالباً یہی سب عوامل تھے جو ہمارے اور رکشا والے کے بچ جانے کا سبب بنے۔ ڈاکٹر نے تین فائر کیے تھے مگر ہر فائر کے بعد دوسرا فائر ہونے تک درمیانی فاصلہ پہلے سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔ جب رکشا نے موڑ کاٹا تو میں نے اپنے محفوظ ہونے کا یقین کیا اور اطمینان کا سانس لے کر سر اٹھایا۔ رکشا والا اس سانحے سے قطعی لاعلمی سے بالکل بے خبر تھا اور اسے بالکل اندازہ نہ تھا کہ گولیاں اس پر چلائی جا رہی ہیں۔ اُسے تو اگر ناک گولی لگ جاتی تو پتا چلتا کہ بغیر کسی وجہ کے موت نے اُسے آلیا ہے۔

"یہ تو ہم مرتے مرتے بچے ہیں۔" میں نے رابعہ سے کہا۔

"مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا ہے کہ وہ ڈاکٹر جو اتنے دوستانہ لہجے میں بات کر رہا تھا اور ہمارا اعتماد حاصل کر چکا تھا، ہمارا دشمن تھا۔" رابعہ بولی۔

"میں بھی اس سے متاثر ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اچھا ہی ہوا کہ تم نے اُسے نازو اور مددگار نہیں بتایا۔" رابعہ بولی۔

دریں اثنا سے بچا لیا۔ میں جلدی میں فیصلہ کر لیتا کہ اس سے مدد لینا چاہیے تو ساری باتیں آگے پیچھے ہو جاتیں۔ وہ بہت چالاک تھا اور بہت خطرناک بھی۔"

"تمہارے خیال میں وہ چوہدری علاؤ الدین کا ایجنٹ تھا؟"

"مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور حفاظتی انتظام نہیں کر سکتا تھا جو اس نے کیا۔ وہ کسی کمرے سے ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ جو آواز اس تک پہنچ رہی تھی [illegible] دروازہ کھولتے تھیں اسے معلوم ہو جاتا تھا۔ اگر میں نازو کا [illegible] کہتا تو یہ آواز بھی اس تک پہنچتی اور وہ فوراً آ جاتا۔ [illegible] میں وہ ہم پر [illegible] ہے۔ مجھے تو اس کے ڈاکٹر ہونے پر بھی شک ہے۔"

"اسے اپنی ناکامی پر جھنجھلاہٹ بھی ہوگی اور پریشانی بھی۔ ہم اس کی ساری چالاکی اور مستعدی کے باوجود صاف نکل آئے۔" رابعہ نے کہا۔ "اسے خبر ہو جاتی تو وہ گاڑی لے کر ہمارے تعاقب میں آتا۔"

"ہاں۔ وہ گیسٹ کے چھتے سے باہر نکلا ہوگا۔" میں نے [illegible] گیسٹ نے بھی اس پر شور مچایا کہ وہ چوکیدار کو [illegible] دیکھ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے باہر نکل کے گیسٹ سے پوچھا ہوگا کہ بات کیا ہے اور حقیقت میں صورت حال اس پر واضح ہوتی ہم دور آ گئے تھے۔ اگر اس وقت وہ گاڑی کی طرف لپکا تو راستے [illegible] تک نہ آتا۔ مگر اس سے زیادہ اطمینان کی بات تو یہ ہے کہ [illegible] بہت سی باتیں کی تھیں جس [illegible] جتایا تھا کہ نازو ہے اور اس کا مشن کیا ہے۔ میں نے شعلہ اور محسن کی شادی کا ذکر [illegible] تھا مگر ان کے گھر کا پتا نہیں بتایا تھا۔ اس تمام گفتگو [illegible] ہوگا تب بھی اس سے کچھ پتا نہیں چلے گا۔"

"چوہدری علاؤ الدین تو بہت برافروختہ ہوگا۔"

"ہاں۔ اس مرتبہ انتظام بہت پکا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب ناکامی کی ساری ذمہ داری ڈاکٹر [illegible] پر ڈالے گی [illegible] نہیں ہے۔ وہ تو پوری طرح مستعد تھا مگر [illegible] رکشا کدھر جا رہا ہے؟"

"مزنگ، کیا سمجھی۔ مزنگ والا [illegible]" رکشا والے نے کہا۔

"مزنگ؟ او نہیں یار!" میں نے کہا۔ "مزنگ [illegible] کی لینا ہے [illegible] اور تھے میں نے جانا [illegible] پہلے داتا صاحب کے حاضری دے کے گھر جاؤں گا۔"

رکشا والے نے مجھے گھور کر دیکھا اور میں نے رابعہ کو [illegible] کے دیکھا جیسے ساری غلطی اس کی ہے۔ داتا صاحب کے نام [illegible] وہ بول سکا ورنہ کہیں اور جانا ہوتا تو وہ احتجاج کرتا۔ میں نے

رکشا داتا صاحب کے دربار والی گلی میں چھوڑا اور مزار پر فاتحہ خوانی کرنے گیا۔ آج میں ایک مرتبہ شکاری کے جال میں پھنس گیا تھا اور بال بال بچا تھا۔ جب ہم پھر سڑک پر آئے تو میں بہت اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ دوسرے رکشے نے ہمیں آدھے گھنٹے میں گھر پہنچا دیا۔ گھر پہنچنے تک میرے بچوں کی بے قراری میرے اعصاب کو شکست دینے لگی تھی۔ ایک معمولی سے حادثے نے مجھے کہاں پہنچا دیا تھا۔ میری عدم موجودگی نے نازو کو کہاں پہنچا دیا ہوگا۔ یہ سوچ کر میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرے کچھ بتائے بغیر غائب ہو جانے سے باقی سب کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ میرے ساتھ پیش آنے والا حادثہ عقل کے ہاتھ سے جذبات کا دامن چھوٹ جانے کا نتیجہ تھا۔ رابعہ کے گھر سے نکل جانے کی خبر نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا اور میں نہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل رہا تھا اور نہ کچھ دیکھنے سننے کے۔ لیکن اسی جذباتی دیوانگی کا نام زندگی تھا۔ اسی دیوانگی کے مختلف انداز تھے۔ رابعہ سے عشق اس کا ایک نام تھا۔ ورنہ ہم سب جو پیار کرتے تھے جس طرح جیتے تھے اور جیسے مرنے کا سامان کرتے تھے اس میں سب کچھ ہی دیوانگی سمجھا جا سکتا تھا۔

رکشا رک گیا تو میرے خیالات کی رو بھی رک گئی اور میں یوں گھر کی طرف بڑھا جیسے گھر سے فرار ہو جانے والا ناخلف بیٹا زمانے کے دھکے کھا کر شرمسار اور خوف زدہ۔ دوبارہ گھر آتا ہے... دروازے پر دستک دیتے ہوئے میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ فرطِ جذبات سے اس کی حالت بھی غیر تھی اور یہی کیفیت اپنی انتہا کو پہنچ کر حد برداشت سے بڑھ جاتی تو ہسٹریا کا دورہ بن جاتی ہے۔ جذباتی دباؤ سے وہ بھی شدید اعصابی تناؤ میں مبتلا تھی۔

دروازہ شعلہ نے کھولا۔ اس نے پہلے مجھے دیکھا پھر [illegible] سے رابعہ اس کے سامنے آئی اور شعلہ نے ایک چیخ ماری۔

"رابعہ باجی!" وہ ایک دم رابعہ سے لپٹ گئی۔ اس کی چیخ نے گھر کے اندر محسن کو بوکھلا دیا۔ وہ نہ جانے کیا کر رہا تھا کہ یا خود کسی چیز پر گر کے دوڑا اور لنگڑاتا ہوا نمودار ہوا۔

"کیا ہوا؟ قیامت آ گئی کیا؟" وہ شعلہ کو ڈانٹ رہا تھا مگر ہمیں دیکھتے ہی وہ لنگڑانا بھی بھول گیا۔

"آ گئے ہو خیر سے گھر کو لوٹ کے بدھو میاں۔" محسن نے [illegible] کے تحت [illegible] کی طرح کہا۔

"اکیلا نہیں آیا... کچھ لے کر بھی آیا ہوں۔" میں نے شعلہ کی طرف اشارہ کیا جو رابعہ سے گلے لگ کر رو رہی تھی اور رابعہ سے بالکل چپکی [illegible] چمکا رہی تھی۔ محسن نے پہلے رابعہ کو اور پھر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے آہستہ سے اقرار میں گردن ہلائی۔ [illegible] اس کی ان نظروں کا سوال میں نے سمجھ لیا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ

کیا رابعہ نارمل ہو گئی ہے؟ اس کی یادداشت بحال ہو گئی ہے؟

"یہ بچھڑے ہوئے اندر جا کے بھی رو دھو سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"یار محسن!" میں نے کہا۔ "میں تو بعد میں بتاؤں گا کہ کہاں گیا تھا اور اس وقت کہاں سے آ رہا ہوں، پہلے تو بتا کہ نازو کا کیا حال ہے؟"

محسن نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ "اللہ اس کی مغفرت کرے، اچھی خاصی لڑکی تھی، مگر تجھے کیا۔ بیوہ تو ہوا غالب۔"

"تو اسے نہیں بتائے گا۔" میں نے کہا اور محسن اندر کی طرف دوڑا۔ رابعہ اور شعلہ روتے روتے ہنس پڑیں۔

"شروع ہو گئی دھما چوکڑی اور غنڈہ گردی۔" شعلہ نے کہا۔

میں نے محسن کو ٹانگ اڑا کے گرایا اور اس کے اوپر چڑھ بیٹھا۔ "میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔"

"کیوں! آگے گنتی نہیں آتی کیا؟" محسن بولا۔ "اتنے کم وقت میں بھلا میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ نازو خیریت سے ہے۔"

میں نے اسے چھوڑ دیا اور سیدھا بیٹھ گیا۔ "اس کی طرف سے کوئی پیغام ملا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ غالب کا رابطہ قائم ہے۔" محسن بولا۔ "آج صبح سے تمام [illegible] تیری ڈیوٹی [illegible] تھی۔ مجھ سے بارہ بجے غالب گیا تھا۔ آتا ہی ہوگا۔ بہت مفید معلومات حاصل ہوئی ہیں نازو سے۔"

"وہ لڑکی بھی کمال ہے۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔"

"تجھے تعریف کرنا ہے تو رابعہ کی کر۔" محسن نے مجھے ڈانٹا۔ "خود میں اب شعلہ کے سوا کسی کی تعریف نہیں کرتا۔ کر ہی نہیں سکتا بیچارہ۔"

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتا ہے بیوی سے کہ کوئی تم سا حسین نہیں زمانے میں۔"

"میں تو ایک سچ بولنے پر مجبور ہوں۔" میں نے کہا۔ "کہ کچھ کھانے کو نہ ملا تو میں فوت ہو جاؤں گا۔ گناہ تیرے سر کیونکہ میں تیرا مہمان ہوں۔"

"کنیز!" محسن نے تالی بجا کے کہا۔ "دو مہمانوں کے لیے شاہی دستر خوان بچھایا جائے۔ پڑوس والے ہوٹل سے [illegible] ایک [illegible] کے اچھی طرح جوش دے کر ایک [illegible] رکھی جائے اور اگر [illegible] تو وہ بھی حضرت مہمانوں کے سامنے حاضر کی جائیں۔" وہ دونوں نہایت زور و شور سے باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔ موضوع تھا شادی سے پہلے اور شادی کے بعد۔ مجبوراً محسن کو چیخنا پڑا۔

"لیڈیز! آپ کچن میں جا کے ایک دوسرے کا دماغ چاٹیں۔ یہاں سب سے اہم مردانہ گفتگو ہو رہی ہے۔"

"سُن لیا سُن لیا۔" شعلہ نے بھی چڑ کے کہا۔ "ابھی فرصت نہیں ہے جی۔ ہم بھی بے حد مصروف ہیں۔"

www.paksociety.com

"تو پھر کیا تمہارا سر کھا لیں جس میں مغز تک نہیں۔" محسن نے چلا کر کہا۔

"جوتے کھالو۔ کچن میں جا کے پکا لو یا بازار سے جا کے لے آؤ۔" شہلا نے سُنی ان سُنی کر کے کہا: "ابھی تنور کھلے ہوں گے۔"

"دیکھا تم نے ان بیسویں صدی کی بیویوں کا رویہ۔" محسن نے خفت سے کہا۔ "اسی سے تو: اچھا ہوتا کہ میں کسی تنور والے کی بیٹی سے شادی کر لیتا۔ اس وقت گرما گرم روٹیاں تنور سے لگا کے دیتی۔"

"چل یار جانے دے۔ تیرے مقدر میں خوب ہی بیوی لکھی تھی۔" میں نے کہا۔ "ان کو باتیں کرنے دے۔ ہم بازار سے لے آتے ہیں۔"

ہم نکلنے ہی والے تھے کہ ہمیں سامنے سے ٹیڈی اور غالب آتے دکھائی دیے۔ جاتے جاتے سامنے آ کے دونوں یوں رک گئے جیسے متحارب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوتی ہیں۔

"آ گئے تم مجنوں کے جانشین۔ ملی وہ لیلیٰ یا محض بھٹک ہی آئے؟" غالب نے طنز سے کہا۔

"دونوں کام کیے۔ بھٹک بھی آئے اور لیلیٰ کو بھی لے آئے۔" میں نے دانت نکال کے کہا۔

"کیا مطلب؟ رابعہ کو لے آئے ہو؟" ٹیڈی نے بے یقینی سے کہا۔

"یقین نہیں تو گھر میں جا کے دیکھ لو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ ہمارے ساتھ چلو۔ ہم ماحضر تناول فرمانے جا رہے ہیں۔"

"مجھے تیری بیوی نے صبح مہمان کے گھر سے نکال دیا ہے۔ دوست میں چاہتا ہوں کہیں سے نان نفقے کا بندوبست کر لیں۔" محسن نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم بھی ساتھ چلو۔ کہیں بیٹھ کے دعوت ولیمہ کھا لو میری۔"

"اور وہ گھر میں انتظار کریں گی بچاری؟" میں نے کہا۔

"بیویوں کا کام انتظار کرنا ہے۔" محسن بولا۔ "خود جب باتیں کرتے کرتے تھک جائیں گی تو پکا پکا کے کھا لیں گی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ہم بھی کہیں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔" ٹیڈی نے کہا اور ہم واپس چل پڑے۔ میں نے مختصر الفاظ میں وہ سب واقعات سنائے جو کسی کے علم میں نہ تھے۔ بیٹ کے حادثے میں زخمی ہونے سے اسپتال پہنچنے اور وہاں سے فرار ہونے تک جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا تھا وہ میں نے سب بتا دیا اور چلتے چلتے ہم ریلوے اسٹیشن جانے والی سڑک پر پہنچ گئے۔ وہاں بہت سے ہوٹل کھلے ہوئے تھے۔ ہم ایک نسبتاً صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ کھانے کا آرڈر میں نے دیا۔ پھر غالب نے مجھے نازو کے بارے میں رپورٹ دی۔

"اس کو ڈاکٹر فیصلی نے مجبور ہو کے گھر میں جگہ دے دی... بھائی بہن تو بالکل تیار نہیں تھے مگر اسی گھر میں ان کی ماں بھی ہے۔ مجھے اپنی اولاد کے اصل کرتوت معلوم نہیں۔" غالب نے کہا۔

"اس روز رات کو... اس کا پہلا پیغام کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"بہت مختصر۔ اس نے مورس کوڈ میں او کے کہا تو..." غالب نے کہا: "اندر پہنچنے کے تقریباً نصف گھنٹے کے بعد نازو کا پیغام ملا جس نے میری ساری تشویش دور کر دی تھی۔ اس وقت مجھے سب سے زیادہ تم پر غصہ تھا کہ سب چھوڑ چھاڑ کے چل دیے۔ نازو کی طرف سے اطمینان ہوا تو میں موٹر سائیکل کی طرف بھاگا جہاں تم کھڑے ہوئے تھے مگر تم غائب تھے۔ میں واپس آیا تمہیں ایک سو ایک گالیاں دے کے۔"

"گالیوں کی کوئی بات نہیں۔ دوست ہی تو دعا کرتے ہیں ورنہ دشمن تو پتھر کی طرح۔" میں نے کہا۔ "موٹر سائیکل کا کیا رہا؟"

"بہت فائدہ مند۔ ایک لاری پر کوئی دو سو بچے... جو اس دن میں ختم ہو گئی۔" غالب بولا۔ "حفاظت سے تو ہے۔"

"اس کے بعد نازو سے رابطہ قائم ہوا؟" میں نے کہا۔ "کام کی بات معلوم ہوئی ڈاکٹر فیصلی کے بارے میں؟"

"ہاں۔ اندر داخل ہونے کے بعد ڈاکٹر... اصل مسئلہ تھا۔" غالب بولا۔ "نازو نے رات کے گیارہ بج کے بیس منٹ پر دوسرا پیغام دیا۔ یہ کہا کہ ابھی جاگ رہی ہے۔ وہ دو کہتی تب بھی میں ٹھیک ساڑھے بارہ بجے دکان سے نکلا۔ میں شرماتے ہوئے اقرار کرتا ہوں کہ میں سخت مضطرب اور بے چین تھا۔"

"ماشاءاللہ سے بہت شرمیلا بچہ ہے۔" محسن نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

"تم ہوتے میری جگہ تو تمہارے لیے بھی بہت مشکل ہو جاتا کہ اس طرح چھوڑ کے جانا۔" غالب نے کہا۔ "پھر وہی... خیر، ایک سوڑ سا تھا کہ کہیں بعد میں کوئی غیر متوقع بات نہ ہو جائے۔ خیر میں ساڑھے بارہ بجے تک انتظار کرتا رہا اور یہ آدھا گھنٹا طویل ہو گیا..."

"طول شب فراق کی طرح۔" محسن نے کہا۔ "مختصر بات کرو۔"

ویٹر نے ہمارے درمیان ڈونگے سجانا شروع کیا۔ میں نے ہر ایک چیز سے آنے کو کہا تھا۔ اس کے نزدیک مرغی سے زیادہ اہم واضح خوراک نہیں تھی جبھی ہر چیز میں مرغی تھی۔ چاولوں میں مرغی، مگر اسے پہچاننا اتنا مشکل تھا قورمے میں مرغی جسے مرغ قورمہ قرار دیا گیا تھا۔

"جی تو نصف شب کے بعد آپ کے اور ان کے درمیان کیا راز و نیاز ہوئے؟" میں نے کہا۔ "آپ مختصر کر کے سنا سکتے ہیں۔"

"اس نے ساڑھے بارہ بجے سگنل دیا گویا یہ کان میں ائیر فون..." غالب بولا۔ "میں نے فوراً اپنے سیٹ کو آن کر لیا۔ اس نے رپورٹ کی کہ پیغام جلد... ڈاکٹر فیصلی کو ایک ملازمہ کی ضرورت تھی۔ وہ سب دن بھر باہر رہتے ہیں اور بعض اوقات رات کو بھی گھر نہیں آتے۔ اماں کی کیفیت ہے۔ اسی مجبوری نے نازو کا گھر کے اندر قیام آسان بنا دیا۔ ڈاکٹر صاحبان اور ان کی بیوی تو مخالف تھے کہ کسی اجنبی کو گھر میں جگہ دی جائے مگر نازو کی آہ و زاری نے ان کی ماں کو متاثر کر دیا تھا۔ نازو کا کہنا ہے کہ اسے خود اپنی اداکاری پر حیرت ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر یوسف کو مطمئن کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ پوچھتے تھے کہاں سے آئی ہو، اب کیا کرو گی، در در سوال کرتی پھر رہی ہو۔ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے۔ نازو نے سارے سوالات کے ایسے جواب دیے کہ وہ مطمئن ہوئے یا نہیں مگر ان کی ماں پر رقت طاری ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس مظلوم عورت کو گھر میں پناہ دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ لڑکے اس بات پر تو راضی ہو گئے کہ ایک خادمہ کی حیثیت سے وہ دن بھر گھر میں سب کے کام کاج اور ان کی ماں کی خدمت کرے لیکن رات کو اپنے گھر جائے۔ نازو نے شور مچایا کہ گھر ہوتا اور ٹھکانا ہوتا تو میں آتی ہی کیوں۔ مختصر ماں کی وجہ سے وہ مجبور ہو گئے اور نازو کو کچن کے ساتھ ایک سٹور خالی کر کے اپنا بستر بچھانے کی اجازت دے دی گئی... اور یار اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب اسی کا حوصلہ تھا۔ اس سٹور میں موش کی پوری فیملی تھی۔"

"کون موش؟ وہ ڈاکٹر لطیف کا خونی خاندان؟"

"ہاں۔ اس کے بھائی بند اسٹور میں آباد تھے۔ جسے دیکھ کر تمہاری گھگھی بندھ جاتی تھی۔" غالب نے کہا۔

"اس سے کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا۔ ... کر دیا گیا؟" محسن نے کہا۔

"میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تم دونوں کی زندگیاں ان کو کمرے میں ایک بھی نظر آ جائے تو وہ چیخ ماریں گی اور بے ہوش ہو جائیں گی۔"

"چوہے اور چھپکلی کو دیکھ کر چیخ مارنا خواتین کا پیدائشی حق ہے،" غالب بولا۔ "احتجاج کا۔ اور بے ہوش ہونا ان کی ایک ادا۔"

"خیر تم اپنی بہادر چوہوں کی داستان شجاعت جاری رکھو۔ ... تو مجھے بھی نہیں ڈرتی۔" محسن نے کہا۔

"آگے یہ اس سے چوہے کی طرح ڈرتا ہے۔" ٹیڈی نے لقمہ دیا۔

"ہاں ہاں... سچ ہی ہوں میں۔" غالب نے چڑ کے کہا۔ "تو پھر تم نہیں ہو... بس بات ہی رکھو۔"

"معاف کرنا یار مجھے تمہاری دل شکنی ہوئی۔" میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"اس نے پہلی رات تو جیسے تیسے کاٹ دی۔" غالب کچھ دیر بعد بولا۔ "دوسرے دن اس نے چوہوں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا اور پھر چوہے تو بیچارے جنگ میں کام آ گئے۔ باقی بھاگ گئے۔ پہلی رات اس نے مفصل رپورٹ دی۔"

محسن پھر ہنس پڑا۔ "کیا ستم ہے۔ ہجر و فراق کے مارے ہوئے ام الصبیان ایسے ہو گئے... محبوب کو چوہے نہیں... ہر شاعر مر گیا ہے۔ کتنا غیر شاعرانہ تصور ہے عشق کا۔"

"اور کتنا غیر فلمی تصور ہے۔" میں نے کہا۔ "کسی کامیڈی فلم میں بھی ایسا آئیڈیا پیش نہیں کیا گیا۔"

"زندگی ایک ٹریجڈی ہے۔" غالب نے متانت سے کہا۔ "اس کا اردو شاعری اور فلموں سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔ خیر تو اس رات مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر فیصلی عیش کر رہا ہے۔ ان کا گھر دیکھنے میں باہر سے جتنا غریبانہ نظر آتا تھا اندر سے اتنا ہی شاندار ہے۔ دولت کی فراوانی کے آثار اندر قدم رکھتے ہی نظر آ جاتے ہیں۔ ہیٹر، ڈرائنگ روم ایئر کنڈیشنڈ ہیں اور ٹیلیویژن کو ڈرائنگ روم ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ وہ بھی ہے لیکن نازو نے بتایا کہ محلے والے تو ان سے ملتے جلتے نہیں۔ ان کو بڑا بھی نہیں سمجھتے۔ وہ خود بھی الگ تھلگ رہتے ہیں۔ کچھ لوگ محلے میں ایسے ہیں جو ان کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتے۔ وہ ڈر کے مارے ان کے پاس نہیں آتے اس لیے کہ وہ جنگلی تھے اور مشہور ہے کہ ان کی ماں اسی شہر لاہور کی گلیوں میں جھاڑو دیتی پھرتی تھی۔"

"میرے خیال میں وہ زیادہ قابل عزت کام تھا۔" میں نے کہا۔ "محنت کیسی بھی ہو اور کسی بھی پیشے میں ہو بُری نہیں سمجھی جا سکتی۔"

"ہاں۔ اس کے مقابلے میں جو اولاد کر رہی ہے وہ انتہائی مذموم اور قابل نفرت ہے۔" محسن بولا۔ "مگر دنیا کی نظر میں قصور ہے۔"

"دنیا کی نظر میں یہی قصور ہے۔ بہت سے جرم کی کمائی سے دولت مند ہو جانے والے معزز ہیں اور ہر طرف انہیں سلام کرنے کے لیے آتے ہیں۔ سائنس دان، مزدور اور ہر محنتی... ویٹر اور چوکیدار سب گھٹیا کام کرنے والے سمجھے جاتے ہیں اور معاشرے میں کوئی مقام نہیں رکھتے۔ پیسہ عزت کا معیار بن گیا ہے۔"

"یہ اس وقت صرف میرے پاس ہے۔ اس لیے تم سب مجھے سر کہہ کے مخاطب کرو۔" میں نے جیب سے دس ہزار کی گڈی نکالی جو میں اسپتال سے فرار ہوتے وقت تکیے کے نیچے سے نکال لیا تھا۔ "تم سب سوالی ہو اس وقت۔" میں نے کھانے کا بل ادا کر دیا جو صرف ساٹھ روپے بنا تھا۔ کسی فرسٹ کلاس ہوٹل میں یہی بل ایک سو ساٹھ سے بھی زیادہ ہوتا۔

"نازو کا خیال ہے کہ وہ ڈرائنگ روم ہی وہ جگہ ہے جہاں ان دونوں مشتبہ لوگوں کی ملاقاتیں یا اجلاس ہوتے ہوں گے جیسا کچھ وہ

www.paksociety.com

مقناطیسی مائکروفون کل یہیں نصب کر دیا جائے گا۔"

"کل کیوں؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ کل ایک اجلاس متوقع ہے۔" غالب نے کہا۔

"اس کے آگے میں سناؤں گا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "کیونکہ باقی باتیں اس نے مجھ سے دن میں کی تھیں۔ آج صبح آٹھ بجے وہ اکیلی بس آئی تھی۔ اس کا نمبر میں نے نوٹ کر لیا تھا۔ سوا آٹھ بجے سونیا البرٹ وکٹوریہ اسپتال چلی گئی۔"

"کیا وہ واقعی وہاں کام کرتی ہے؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔ وہاں وہ نرس ہے اور بہت نیک نام ہے۔ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ فارغ وقت میں وہ کیا کرتی ہے۔" غالب نے کہا۔

"فاکس ویگن کی اس مائکروبس کو سونیا کا ایک بھائی چلاتا ہے اور وہ بھی البرٹ وکٹوریہ ہسپتال میں ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"میرا ایک نظریہ درست ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر میں اس کا ذکر بعد میں کروں گا۔ پہلے تم اپنی بات بتاؤ۔"

"دونوں بہن بھائی چلے گئے۔ معلوم نہیں وہ صبح منہ اندھیرے ہی ویگن لیے نکل گیا تھا یا رات کو ڈیوٹی پر تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "اگر اس نے رات ڈیوٹی دی ہوتی تو صبح اسٹاف کو لیتے ہی جاتا۔ یا تو وہ مائکروبس کسی دوسری جگہ کھڑی رہتی ہے یا سلیم وکٹر ذرا پہلے نکل جاتا ہے۔ سونیا تیسرے پہر واپس آئی تھی۔ اس کا بھائی بھی سیدھا گیا تھا اور تیسرے پہر تک وہ بھی آ گیا تھا۔ ان دونوں کے آنے تک نازو کو بہت کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے ایک اہم بات یہ معلوم کی کہ گھر میں ایک تہ خانہ ہے جس کا راستہ ڈرائنگ روم سے نیچے جاتا ہے۔ بظاہر وہ بند دروازہ باتھ روم کا لگتا ہے جو ڈرائنگ روم سے اٹیچ ہے۔ مگر اس دروازے کو مقفل رکھا جاتا ہے۔"

"نازو نے اتنی جلدی کیسے معلوم کر لیا؟"

"وہ ڈرائنگ روم کی جھاڑ پونچھ میں لگی ہوئی تھی کہ پولیس انسپکٹر آ گیا۔ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ بائیں جانب ایک گوشے میں نازو بھی موجود ہے۔ وہ حصہ کچھ تاریک سا بھی تھا۔ بھاری وال لائٹس جلتی جائیں تو ظاہر ہے بہت روشن ہو جاتا ہے مگر ان میں دروازے کھڑکیاں بند رہتے ہیں اور پردے پڑے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے ادھر کوئی جاتا ہی نہیں۔ نازو نے انسپکٹر کو اندر آتے دیکھا تو وہ ایک صوفے کے پیچھے دبک گئی۔ انسپکٹر سیدھا گیا اور دروازے کو چابی لگا کے کھولا۔ نازو نے چند سیکنڈ بعد قریب جا کے سنا تو اس کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ جو کم ہوتی گئی۔ نازو نے دروازہ کھول کر نہیں دیکھا کہ کوئی الارم وغیرہ نہ ہو۔ مگر اس نے اندازہ کر لیا کہ وہ نیچے اتر گیا ہے۔ حالانکہ دروازہ کھلا تھا تو اسے باتھ روم ہی نظر آیا تھا۔ انسپکٹر صاحب کے واپس آنے سے پہلے ہی وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر کام میں مصروف ہو گئی۔ تاہم اس نے دو بار سونیا کی اور اس کے بھائی کی گفتگو سنی۔ وہ اکیلے تھے اور کسی سے وائرلیس پر بات کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ کل رات کچھ لوگ آئیں گے۔"

"وہ کون لوگ ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"اس کا اندازہ نازو نہیں کر سکی۔" غالب نے کہا۔ "کیونکہ جتنی گفتگو ہوئی۔ یعنی مجھ سے اور اپنے انداز ... وہ کچھ ٹیلی پرنٹر کے پیغامات تھے۔ دو تین ... دس منٹ اسے جب بھی ملے ... رابطہ قائم کیا ... محسن نے اس پولیس انسپکٹر پرویز وکٹر کو فون کیا اور گفتگو میں چند نام واضح طور پر لیے گئے۔ مثلاً جنگ ... سیلوک دام کے اور اس معاملے میں غالباً کوئی اختلاف تھا یا وہ اپنی اور ان کی حکمت عملی کے غلط نتائج ... کر رہے تھے کہ بات بھی ہوئی اور انسپکٹر پرویز کی آواز غیر ارادی طور پر بلند ہو گئی۔ نازو بہت قریب نہیں جا سکتی تھی۔ انسپکٹر آہستہ بول رہا تھا لیکن غصے میں آ کر تو احتیاط کے تقاضے بھول جاتا تھا۔ اس وقت نے آپ سب لوگوں سے زیادہ عقل مند ہونے کا ثبوت ..."

"اگر تم اس کے مجنوں ہو تو تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ایک ناقص العقل عورت کو ہم سب سے افضل قرار دو۔" محسن نے احتجاج کیا۔ "میں سب مردوں کی طرف سے احتجاج کرتا ہوں۔"

"میں اپنی بات پہ قائم ہوں۔" غالب اڑ گیا۔ "نہ مانئے تو مت مانئے۔ میں بھی اس وقت تک کچھ نہیں بتاؤں گا جب تک اپنی بات نہیں منوا لوں گا۔"

"تم کہو کہ وہ آپ سب سے زیادہ خوب صورت ہے تو ہم مان لیں گے۔ یہ بھی مان لیں گے کہ وہ مارلن منرو سے زیادہ ہٹ ہے۔" محسن نے مصالحت کا ایک [illegible]

"او نہوں ... وہ تم سب سے زیادہ عقل مند ہے۔" غالب نے کہا۔

"اچھا بابا ... ہم سے ہی نہیں تم سے بھی۔ سارے جہان سے زیادہ عقل مند ہے وہ افلاطون کی بچی۔" محسن نے جھنجھلا کر کہا۔ "آگے بکو۔"

"اس نے مجھے پیغام دیا کہ میں اپنے ایف ایم بینڈ کے ... کو ٹیون کر کے ان کی گفتگو سن لوں۔" غالب نے فاتحانہ انداز میں دانت نکال کر کہا۔ "وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ وائرلیس سیٹ ہو سکتا ہے جیسا ہمارے پاس واکی ٹاکی ہے۔ ... ایف ایم بینڈ۔ سوئی کو ادھر ادھر گھما کر دیکھتے ... تو وہی ایف ایم بینڈ ... ہے تبھی ان کی آواز پکڑی جا سکتی ہے۔ ... ایک جگہ ان کی آواز صاف سن لی۔ دوسری طرف سے جو معلوم نہیں کون بات کر رہا تھا اور ان کے درمیان جھگڑا یہ تھا کہ ... کو ٹیلیکس کی غلطی نے ختم کیا۔ سائیں بابا کے ... والی کا سراغ کس کی غلطی سے ملا؟ ظاہر ہے وہ ایک دوسرے پر الزام دھر رہے تھے۔"

"ان کی گفتگو میں چوہدری دلاور کا نام نہیں آیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ریس کا، استاد چیندو یا نواب خسرو جمشید کا۔" غالب نے کہا۔ "لیکن سراج کا نام آیا تھا۔ پرویز وکٹر نے کہا کہ سراج کو بہت شرمندگی اٹھانی پڑی۔ وہ بہت خفا تھا کہ ... کے مطابق مال کیوں نہیں پہنچا۔ جب میں نے اسے بتلایا کہ یہاں کیا ہوا ہے تو اس کو پریشانی لاحق ہو گئی۔ اس نے کہا کہ یہ ... کیسے ممکن ہو گیا؟ کیا سراغ رساں اداروں کو خبر ہو گئی؟ پرویز وکٹر نے جواب میں جو کچھ کہا، وہ اہم ہے۔ اس نے کہا کہ ... کوئی نہیں لیکن میں نے جب ایم ڈی سے بات کی تو وہ بھی ... ثابت ہوا کہ یہ سکندر اعظم کی فوج کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے جو سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا فتح کر لیں گے۔ اس گفتگو میں ایم ڈی کا لفظ کس کے لیے استعمال ہوا۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔ ایم ڈی کا مطلب ہوتا ہے منیجنگ ڈائریکٹر۔ یہ چوہدری دلاور کا حوالہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ بہرحال ... کمپنی کا منیجنگ ڈائریکٹر ہے۔ یہ کسی اور کا نام بھی ہو سکتا ہے لیکن سکندر اعظم کی فوج کا حوالہ بالکل واضح ہے۔ اس بارے میں شک کی گنجائش ہی نہیں کہ وہ ہماری بات کر رہے تھے اور انہیں یقین ہے کہ اس تباہ کاری کے ذمے دار ہم ہیں۔ ایم آر ایس والے۔"

"کیا انہیں ہمارے نام معلوم ہیں؟" میں نے کہا۔

"غالباً نہیں۔ ورنہ وہ ایم آر ایس ہی کہتے۔ وہ ہمارا ذکر بڑے تحقیر آمیز انداز میں کر رہے تھے۔" غالب نے کہا۔ "جیسے ہم کوئی نالائق ہوں۔ ناممکن اور بعید از امکان و قیاس کام کر رہے ہیں۔ اور ہمارے عزائم شیخ چلی کے منصوبوں سے زیادہ خیالی اور ناقابل عمل ہیں۔ ان کی گفتگو دس منٹ تک میں نے سنی۔ بات کل پر ختم ہوئی۔ پرویز وکٹر نے کہا کہ اچھا اب جو ... کل رات کر لیں گے۔ تم وقت پر پہنچ جانا۔ ... بادان آر سنج سے کہنا کہ وہ ... اور آرزیب کو سمجھا دینا کہ اس نے الٹی سیدھی بات کی تو میں ... گولی مار دوں گا۔ ایم ڈی وہ نہیں ہے۔"

"آرزیب۔ یہ بھلا کیا نام ہوا؟" میں نے کہا۔

"اور بادان آر سنج؟" غالب مسکرایا۔ "ظاہر ہے یہ نام نہیں ہیں، کوڈ ہیں۔ کل میں ان ناموں پر غور کرتا رہا تھا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ خیر ناموں سے ہمیں کیا۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ کل رات ڈاکٹر نبیلی کے گھر میں ان کی میٹنگ ہے۔"

"ہمارے پاس بارہ گھنٹے ہیں۔" محسن نے کہا۔

غالب نے مدبرانہ انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی ان کے استعمال کا وقت نہیں آیا۔ کل رات کی میٹنگ میں کون آتا ہے ایک تو یہ دیکھنا ہے اور میٹنگ کے بعد اگر الگ الگ ان کا تعاقب کیا جا سکے تو یہ بھی کرنا ہے۔ نازو نے ڈرائنگ روم میں وہ مقناطیسی مائکروفون صحیح جگہ پر لگا دیا تو ٹونک جھیل کی ریڈیو پر ہم پوری میٹنگ کی روداد سن سکیں گے۔ لیکن ساتھ ہی ریکارڈ بھی کر لیں گے تاکہ بعد میں ایم آر ایس کی میٹنگ میں اس پر ڈسکس کیا جا سکے۔"

"دوسری اہم بات ہے تہ خانے کی دریافت۔" غالب بولا۔ "اگر میٹنگ تہ خانے میں ہوئی تو ہمیں کچھ بھی پتا نہیں چلے گا۔ نازو وہاں نہیں پہنچ سکتی کہ اپنا مقناطیسی مائکروفون نصب کر آئے۔"

"ایسے چانس مل بھی سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "فرض کرو کہ وہ جانے سے پہلے کر جاتی ہے۔"

"وہ اتنے غیر محتاط نہیں ہوں گے۔" غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر جانے کی ضرورت محسوس ہوگی تو نازو سے نظر بچا کے اور خود سے جائیں گے۔ وہ اس خفیہ جگہ تک نازو کو کبھی نہیں پہنچنے دیں گے۔ مگر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ تہ خانہ ایک گودام ہے اور وہاں سے وہ مائکروبس بھر کے لے جاتے تھے۔ وہاں شاید میٹنگ کی جگہ نہ ہو۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم کے دروازے بند کرنے کے بعد خود کو محفوظ سمجھیں گے۔ وہ کسی خفیہ مائکروفون کی موجودگی کا شبہ کیسے کر سکتے ہیں اور انہیں شک ہو تب بھی اسے تلاش کرنا آسان نہیں ہوگا۔"

"اور کچھ چاہیے صاحب؟" ویٹر نے ہم سے یوں پوچھا جیسے یہ میز خالی کرنے کا نوٹس ہو۔ یہ کارروائی قطعی غیر ضروری تھی کیونکہ دوسری بیشتر میزیں خالی پڑی تھیں۔

"ہاں دوست۔ چاہیے تو بہت کچھ۔" غالب نے ایک سرد آہ بھر کے اس کی طرف دیکھا۔ "تاج و تخت، حکومت و اقتدار۔ مگر فی الحال تم ہمارے لیے صرف چائے لے آؤ۔ باقی پھر کبھی سہی۔"

www.paksociety.com

ہیرے کی صورت دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ اُس نے فرض کیا ہوگا کہ غالب نشے میں ہے چنانچہ وہ جھینپ کر مسکرایا اور لوٹ گیا۔

"خدا کا شکر ہے کہ نازو کو کسی مشکل آزمائش سے نہیں گزرنا پڑا۔" میں نے کہا۔ "یہ مرحلہ جو بہت مشکل نظر آتا تھا، خلافِ توقع بہت آسان ثابت ہوا۔"

"مجھے تو یقین تھا کہ ہم اتفاقِ رائے سے نازو کو عذاب کے جہنم میں دھکیل رہے ہیں۔ وہ حد سے زیادہ چالاک اور بے رحم لوگ ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے اس پر اعتبار کہاں کریں گے اور گھر میں تو ہرگز نہیں گھسنے دیں گے۔ مگر یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے کہ بعض مجرم بہت احتیاط کرتے ہیں۔ ہر طرح سے مکمل منصوبہ بندی کرتے ہیں اور حفاظتی انتظامات میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے لیکن کوئی بہت چھوٹی سی غلطی کر جاتے ہیں جس کا خود انہیں بھی پتا نہیں چلتا یا احساس نہیں ہوتا اور اس چھوٹی سی غلطی کا بہت بڑا خمیازہ ناکامی کی صورت میں سامنے آتا ہے تو پھر پچھتانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔"

"اس کی ماں کی مدد تائیدِ ایزدی ثابت ہوئی۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی ایک وجہ ہے۔ وہ گٹھیا کی مریض ہے۔ زیادہ چل پھر نہیں سکتی۔ اس نے غنیمت سمجھا ہوگا کہ گھر بیٹھے ایک قابل با صلاحیت خادمہ مل گئی۔ ورنہ آج کل بھروسے کے قابل نوکر کہاں ملتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے تینوں بھائی بھی چپ ہو گئے لیکن سب سے بڑی کامیابی کی وجہ خود نازو کی اداکاری ہے۔ اس نے اپنے مظلوم، بے سہارا اور ضرورت مند ہونے کا یقین دلا دیا۔"

"پھر ڈیوڈ وکٹر پولیس کا بھی ہے۔ اس کی لائن ایس پی سراج سے کنفرم ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن دوسری طرف سونیا اور سلیم وکٹر کا کردار زیادہ اہم ہے۔ غالباً سلیم وکٹر ہی نے ڈاکٹر حکیم بن کے ہمیں ٹریپ کر لیا تھا۔ وہ ڈاکٹر وغیرہ کچھ نہیں ہوگا۔"

"ڈاکٹر حکیم؟" ڈیڈی اور غالب نے کہا۔ میں نے ان کو پھر بتایا کہ میں اور رابعہ کس طرح فرار ہوئے تھے۔

"سوال یہ ہے کہ اس ڈاکٹر حکیم کو یہ سب کچھ کرنے کے لیے کس نے کہا ہوگا؟" غالب بولا۔

"اُس نے تو ظاہر کیا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "سوائے اس کے کہ میرا نام فرخ نہیں سکندر بخت ہے اور میں اپنی شناخت کسی نہ کسی وجہ سے چھپانے پر مجبور ہوں۔"

"لیکن وہ سب کچھ جانتا تھا۔" غالب بولا۔ "تمہیں مجبوراً رکھنے کے لیے کسی اسپتال میں یہ انتظام کر لینا آسان نہیں تھا۔"

"وہ ڈاکٹر نہیں تھا۔ اتنا تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں لیکن وہ کوئی بہت ہوشیار اور ذہین آدمی تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کی باتوں نے مجھے اور رابعہ دونوں کو متاثر کیا تھا لیکن یہ اس شکاری کا جال تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اعتماد میں مارے جائیں۔ اس پر بھروسا کرتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش نہ کریں اور خود کو محفوظ سمجھیں۔ وہ تو خیریت گزری کہ مجھے اس کے ہر وقت باخبر رہنے کا راز معلوم ہو گیا اور وہ دھوکے میں مارا گیا۔ ورنہ خود سوچو کہ ایک ڈاکٹر کیا ہاتھ میں ریوالور لے کر پھرتا ہے؟"

"سوال یہ ہے کہ کسی نے اسے چیک کیوں نہیں کیا؟"

"اسپتال سب کے لیے کھلا رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مریض، اُس کی تیمارداری کرنے والے، اُن کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آنے والے۔ وقت بے وقت پہنچنے والے مریض۔ ان سب کو چیک کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بڑے اسپتالوں میں تو ایک شعبے کا عملہ دوسرے ڈپارٹمنٹ کے عملے سے بے خبر رہتا ہے۔ کتنے ڈاکٹر اور کتنی نرسیں ہیں، یہ سب کسی کو یاد نہیں رہتا۔ اگر عملے میں کوئی ڈاکٹر شامل ہو جائے تو فوراً سب کو معلوم نہیں ہو جاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی وقت میں یا محسن ایک گاؤن پہن لیں اور اطمینان سے گھومتے پھرتے کسی بھی اسپتال میں چلے جائیں تو کوئی ہماری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھے گا۔ سب ایک جیسے حلیے میں اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہوتے ہیں۔ کسی کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا کہ کوئی جعلی ڈاکٹر یا نرس بھی ان کے درمیان موجود ہے۔ ہم آپریشن تھیٹر کے اندر تک چلے جائیں گے اور کوئی سوال نہیں کرے گا کہ تم کون ہو۔ اس کے لیے تھوڑا سا اعتماد چاہیے اور ایک معقول قسم کی شخصیت۔ یہی سلیم وکٹر نے کیا۔ رابعہ بھی سب ڈاکٹروں کو نہیں جانتی تھی۔ وقت پر مختلف ڈاکٹر آتے رہتے ہیں۔ جس نے مان لیا کہ وہ بھی ڈاکٹر ہوگا تو کیس کے بارے میں کیسے جانتا اور کیوں آتا۔ اُس نے ان باتوں کا تذکرہ ایسے کیا کہ میں بھی شک نہ کر سکا۔ شک ایک بیج کی طرح ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک بار پھوٹ جائے تو پھر بڑھتا ہی جاتا ہے مگر دماغ میں بیج ہی نہ ہو تو شک کا پودا کیسے سر اٹھائے گا۔ آخری کام اس نے یہ کیا کہ ڈاکٹر لطیف کا حوالہ دے دیا۔ اور یہی وہ کڑی ہے جس سے دوسری کڑی ملتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے ڈاکٹر لطیف بھی.....؟" غالب بولا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ ایسی احمقانہ بات کر کے تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تم غلطی سے صحافت کے پیشے میں چلے آئے۔ ورنہ تم تھے مونگ پھلی بیچنے کے قابل۔" میں نے کہا۔ "رابعہ جب ڈاکٹر لطیف کے گھر میں تھی تو ولاور وہاں اپنی بیوی کے نفسیاتی کیس کے سلسلے میں مشورہ کرنے گیا تھا۔"

"کیا وہ پاگل ہو گئی ہے؟" ڈیڈی بولا۔

"نفسیاتی کیس صرف پاگل نہیں ہوتے۔ بہت سے ہوتے ہیں۔ ہم بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "جو اعصابی دباؤ یا پریشانی کے باعث ذہنی بریک ڈاؤن کا شکار ہوتے ہیں، وہ دوسرے درجے کے مریض سمجھے جا سکتے ہیں۔ پاگل پن کے تو کئی درجے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ولاور وہاں جاتا تھا اور شاید کسی موقع پر اس کی نظر رابعہ پر پڑ گئی۔ اس نے ڈاکٹر لطیف سے پوچھا ہو تو مجھے معلوم نہیں لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے رابعہ سے بات کی ہو اور میرے متعلق پوچھا ہو مگر اس زمانے میں رابعہ کو خود اپنی خبر نہ تھی۔ وہ میرے بارے میں کیا بتاتی۔ ولاور نے اسے ایکٹنگ سمجھا ہوگا تو شاید ڈاکٹر لطیف سے پوچھا ہوگا اور اُسے پہچان کر پیچھے پڑ گیا ہوگا کہ رابعہ کو تو کچھ بھی یاد نہیں۔ تاہم اس نے رابعہ پر نظر رکھی اور ایک دن اسے اچانک معلوم ہوا کہ رابعہ گھر سے نکل گئی ہے اور ڈاکٹر لطیف نے ہر اسپتال میں فون کیا ہے۔ ولاور نے بھی تمام اسپتالوں سے پوچھا اور بہت جلد رابعہ کا پتا لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ اسے اپنی محنت کا انعام توقع سے زیادہ ملا، یعنی رابعہ کے ساتھ میں بھی مل گیا۔ اس نے فوراً سلیم وکٹر کو میری حفاظت پر مامور کر دیا اور اُس کو حفاظتی انتظامات کی ہر سہولت فراہم کر دی۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی اور خود سامنے کیوں نہیں آیا؟" محسن بولا۔

"تمہیں اُس کا وہ خط یاد نہیں جو غالب کی معرفت ملا تھا۔ اس میں وفا سے ملاقات کی پیشکش کی تھی۔" میں نے کہا۔ "یہ کہنا مشکل ہے کہ اسے مہلت ملتی تو وہ اب کیا کرتا۔ میں بے ہوش تھا اور ایسی حالت میں نہ مجھے پولیس لے جا سکتی تھی اور نہ ولاور مجھ سے بات کر سکتا تھا۔ ہوش میں آتے ہی ایک گھنٹے کے اندر اندر میں فرار ہو گیا۔ اگر اتنی دیر میں اس جعلی ڈاکٹر سلیم وکٹر نے ولاور کو مطلع کیا ہوگا تو ولاور نے کہا ہوگا کہ جلدی کی کوئی بات نہیں، بھاگ نہیں سکے گا، تم اس پر نظر رکھو۔"

"اب وہ ولاور کو کیا جواب دے گا کہ اس نے کیا نظر رکھی تھی۔" محسن ہنس کر بولا۔

"تو کیا جواب دے گا گھر جا کے اپنی جورو کو کہ آدھی رات گزرا کے کہاں نکل گیا تھا؟" میں نے کہا۔ "ہم تو ہیں آزاد لوگ۔"

"آزاد نہیں، آوارہ لوگ۔ یہی کہہ دوں گا۔ یہی لوگ مجھے بہکا کے غلط راہ پر لے گئے تھے۔" محسن بولا۔ "اور ویسے وہ تو خود ہی ناشتہ دان۔ ہم نے کھانا پکانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ خود ہی کہا تھا کہ بازار سے لے آؤ۔"

"پھر بھی اب چلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "کافی دیر ہو چکی ہے۔ وہ دونوں پریشان ہوں گی۔"

"خاک پریشان ہوں گی۔ انہیں باتوں میں ہوش ہی کہاں ہوگا کہ کتنی دیر سے شوہر غائب ہے۔" غالب بولا۔

واپسی پر ہم نے اگلے دن کا پروگرام مرتب کیا۔ اس کارروائی میں ہم سب کو شریک رہنا تھا۔ غالب اپنی موٹر سائیکل پر ڈاکٹر لطیف کے گھر میں ہونے والی کارروائی سنے گا اور آگے نشر کرے گا۔ سو میٹر کے فاصلے پر دونوں جانب میں اور ڈیڈی گاڑی کی سیٹ پر موجود رہیں گے۔ گلی میں جانے والی ہر گاڑی کا رنگ، ماڈل اور نمبر وغیرہ سب ایک دوسرے کو بتائیں گے۔ غالب اپنی ڈیوٹی پر ٹیپ ریکارڈر کا اضافی بندوبست رکھے گا تاکہ ڈاکٹر لطیف کے گھر میں جو گفتگو ہو اس کا ہر لفظ سنا جا سکے۔ ہم سب مسلح ہوں گے اور ہر قسم کی ہنگامی صورتِ حالات کے لیے تیار ہو کے جائیں گے۔ میں اور محسن اپنے پرانے طریق کار کے مطابق گاڑیاں حاصل کریں گے۔ گاڑی کا خریدنا، بیچنا اور بیچنے میں بہت وقت لگتا۔ اتفاق سے ہم نے طے کیا کہ اپنی ضرورت کے لیے ہم گاڑی کسی سے بھی لے لیں گے۔ اور شرافت سے ایک بار استعمال کرنے کے بعد مالک کو پہنچا دیں گے۔ اسے سمجھا دیں گے کہ وہ پولیس کے چکر سے بچے اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اسے گاڑی بالکل اسی حالت میں کہیں مل جائے گی۔ ڈیڈی تو خود پولیس سے چھڑاتا پھرے گا لیکن اب اس طرح میں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ گاڑیوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی اور ہم کسی بھی گاڑی کی وجہ سے پہچانے نہیں جائیں گے۔

رات کا ایک بجنے والا تھا جب ہم نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ آنے پر میں نے دروازے کو زیادہ قوت سے بجانا چاہا تو دروازہ اندر ہو گیا۔ میں نے حیران ہو کے اسے پیچھے دھکیلا۔

"یہ کیا۔ دروازہ اس وقت سے کھلا پڑا تھا۔" محسن بولا۔

"اپنی باتوں میں اتنا بھی ہوش نہیں کہ دروازہ اندر سے بند کر لیں۔" میں نے کہا اور سب سے پہلے داخل ہوا۔ باقی سب مجھ سے صرف ایک قدم پیچھے تھے لیکن گھر کے اندر غیر معمولی خاموشی کا احساس ہم سب کو ایک ساتھ ہوا۔

"کیا سو گئی ہیں دونوں؟" غالب نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم کتنی دیر میں واپس آ گئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے میں۔"

www.paksociety.com

"اور میری بیوی تو ... دائمی قسم کی ہے۔ اس کے صبح تک سونے کا کوئی امکان نہیں۔" محسن بولا۔ "وہ صبح تک تحریریں میں مبتلا رہا کرتی اور پڑھتی رہتی۔"

"میں عموماً بارہ بجے کے بعد ہی چلتا تھا ... اور تقریباً اسی وقت گھر پہنچتا تھا تو ہم سب اسی وقت کھانا کھاتے تھے۔" غالب بولا۔ گڑبڑ کا احساس سب کو ہو رہا تھا لیکن دل کی بات زبان پر لانے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

"بشملا ... " سب سے پہلے محسن نے آواز دی۔

"رالعیہ ... " میں نے بھی اتنی اونچی آواز میں کہا کہ وہ گھر کے کسی بھی کمرے میں ہوتی تو سن لیتی۔ پھر ایک ساتھ ہم نے تینوں کمروں اور باتھ روم میں دیکھا۔ وہ دونوں کہیں بھی نہیں تھیں۔

"میں اوپر دیکھتا ہوں۔" استاد ٹیڈی نے بوکھلاہٹ میں کہا۔

"چھت پر! اس وقت چھت پر کیا کام ان کا؟" غالب بولا لیکن اتنی دیر میں ٹیڈی اوپر پہنچ چکا تھا۔

"اوپر بھی نہیں ہیں وہ۔" ٹیڈی گھبرا کے واپس بھاگا تو زینے سے گرتے گرتے بچا۔ ہم سب خوف اور پریشانی میں اپنی اپنی جگہ منجمد ہو گئے۔ شکوک و شبہات کی گنجائش ہی نہ تھی۔ وہ اپنی مرضی سے اتنی رات گئے کہیں جانے والی نہیں تھیں۔ انھیں کوئی لے گیا تھا۔ غالب بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ٹیڈی دیوار سے ٹیک لگا کر دوسری دیوار کو گھورنے لگا۔ میں نے اس جگہ کو دیکھا جہاں وہ بیٹھی تھیں۔ یوں جیسے برسوں کی بچھڑی ہوئی سگی بہنیں۔ دلوں کی ایک جیسی بے قراری اور محبت کی ایک جیسی تڑپ کے ساتھ جذبوں کی ساری خوبصورتی ان کی حسین مسکراہٹوں پر یوں جھلک رہی تھی جیسے شفاف سطح آب پر چاندنی۔ اب وہ جگہ سنسان پڑی تھی۔

"ان کو اغوا کر لیا گیا سکندر۔" محسن نے بہت دیر بعد کھوکھلے لہجے میں کہا۔ کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ یہ کوئی سوال نہیں تھا اور تھا تو اس کا جواب کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ یہ وہ بے رحم حقیقت تھی جو خود اپنا وجود تسلیم کراتی تھی۔ کسی کو کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ انھیں دھوکا دیا گیا۔ کیا کرنے کے شکاری اٹھا لے گئے تھے۔ ایک بار تو رالعیہ کو نازو اپنی جان پر کھیل کے نکال لائی تھی مگر نازو وہ بجلی تھی جو طوفان سے ٹکرا سکتی تھی۔ وہ چنگاری تھی جو شعلوں سے الجھ سکتی تھی اور وہ موج نسیم تھی جو بادِ سموم کو چاٹ سکتی تھی۔ کیا اب رالعیہ بھی شملا کے لیے کچھ کر سکے گی؟ نازو جیسے دشمنوں کے حصار میں تھی اور کسی شرارت کے بغیر اس نے حصار کو عبور کر لیا تھا۔ مجھے اب اس کی کامیابی بھی

ایک جنگی چال نظر آنے لگی۔ دشمن نے اسے بھی کامیاب ہو جانے دیا تھا۔ وہ ہمیں اس کامیابی پر خوش ہوتا دیکھنے کے لیے تھے۔ آخر ہماری شکست پر خندہ زنی کے لیے۔

"وہ یہاں تک کیسے پہنچ گئے؟ یار۔" غالب نے کہا تو ہم سب چونک پڑے۔ "وہ بہت چالاک شکاری ہیں۔ ہم فتح کی خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے ہم کو داتا دربار سے یہاں تک ہمارا پیچھا کیا ہو گا۔"

"کیا تم نے ... دیکھا تھا؟" غالب بولا۔

"ہاں ... دیکھا تو تھا ... اور ہم براہ راست آئے بھی نہیں تھے۔" میں نے کہا۔ "ہم نے رکشا والے سے مزنگ چلنے کو کہا تھا۔ میں نے پروگرام بدل دیا تھا۔ داتا دربار میں رکے تھے اور وہاں سے دوسرے رکشے میں یہاں تک آئے تھے ... کہیں بھی مجھے پیچھا کرنے والا کوئی نظر نہیں آیا تھا۔"

"معلوم ہے وقت تو نہیں ہیں کہ پیچھے آتے ہوئے کوئی ہمیں نظر نہ آئے اور بیٹھے بیٹھے پتا چل جائے۔" استاد ٹیڈی نے بے رحمی سے کہا۔ "بڑا تجربہ رہا تھا ان کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا۔ وہ سب دیکھ رہے تھے۔ یہ سب جانتے تھے۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور مجرم کی طرح سب کو دیکھا۔ "میں نے وہی کیا تھا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ میری جگہ تم میں سے کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا ... یہ ناممکن تھا کہ میں پیچھا ہوتا اور کچھ نہ کرتا۔"

"تمھیں کوئی الزام نہیں دے رہا ہے۔" غالب نے کہا۔

"ظاہر ہے ان کا کوئی آدمی باہر بھی موجود تھا۔ کسی کار یا موٹر سائیکل پر جس نے رکشا کا نمبر دیکھ لیا ... اور پھر بہت دور سے تعاقب کیا۔ غالباً اس نے داتا دربار پہنچ کر رکشا والے سے پتا لیا ہو گا کہ ہم کدھر گئے اور اس نے بتا دیا ہو گا۔ ہم نے ان کا کام آسان کر دیا۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم ایک رکشا چھوڑ کے فوراً دوسرا رکشا لیتے تو شاید وہ تعاقب جاری نہ رکھ پاتے مگر ہم ایسا کرتے تو رکشا والا شک میں پڑ جاتا۔"

"کیا تجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا تھا؟" محسن بولا۔

"میرا دل تو نہیں مانتا۔ میں امکان کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اصل بات کچھ اور ہو گی ... یا تو ان کو پہلے سے یہاں کا علم ہو چکا تھا لیکن وہ کسی وجہ سے خاموش رہے تھے۔"

"وجہ کچھ بھی ... وہ تینوں کو ایک ساتھ پکڑنے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کر رہے تھے۔" غالب نے کہا۔ "اب تک کا ایک ایک لمحہ انھیں ڈسٹرب ہو گئے اور اس کے سب بیچارے آلات ضبط کر کے چھوڑ گئے۔"

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" استاد ٹیڈی نے کہا اور ہم سب نے ان کو ایسے دیکھا کہ وہ شرمندہ ہو گیا۔ اس کا سوال احمقانہ تھا۔ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"مذاق میں بہت مہنگا پڑا۔" محسن نے کہا۔ "کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم باہر نہ گئے ہوتے تو وہ ہمیں بھی ساتھ ہی لے جاتے؟" میں نے کہا۔

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ ہمیں لے جانا چاہتے تو ہماری واپسی کا انتظار کر سکتے تھے۔ ہم اسی طرح پکڑے جاتے جیسے چوہے دان میں چوہا گرفتار ہوتا ہے۔ وہ ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر لے جاتے۔"

"کہاں لے جاتے؟" میں نے کہا۔

"ہاں ... یہ سوچنے کی بات ہے۔" غالب نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہیں جہاں نازو ہے۔ وہ شملا اور رالعیہ کو بھی وہیں لے گئے ہوں گے۔"

"میرا دل بھی یہی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ ہو سکتا ہے۔" محسن نے کہا اور ٹیڈی نے فقط تائید میں سر ہلایا۔

"اگر سب یہی سمجھتے ہیں ... تو پھر دیر کس بات کی۔" میں نے کہا۔ "ہمارا راستہ یہ ہے ہم اس عقوبت خانے پر حملہ کر دیں اور اپنے یرغمالی چھڑا کے لے آئیں۔" محسن بولا۔ "مر جائیں یا مار آئیں۔" "کیا ہم ایسا نہیں کر سکتے؟" میں نے کہا۔

"یہ سراسر خودکشی ہو گی۔ ہمیں ان کے پیغام کا انتظار کرنا ہو گا۔ وہ ہم سے کوئی سودا کریں گے۔ کوئی بات منوائیں گے۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم سب یوں اچھل پڑے جیسے کوئی بغیر بتائے اندر آ گیا ہے۔ حالانکہ یہ دستک بیرونی دروازے پر ہوئی تھی۔ ٹیڈی قریب تھا چنانچہ وہ سب سے پہلے دروازے تک جا پہنچا۔ ہم سب جو اس کے ساتھ بیٹھے تھے رک گئے۔

"ٹھہر جاؤ استاد۔" میں نے چلا کے کہا اور جیب سے ریوالور نکال کے دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ "تم سب ہٹ جاؤ پیچھے۔" مگر اتنی دیر میں ٹیڈی نیچے جھکا۔ میں نے اسے نیچے سے کچھ اٹھاتے دیکھا۔

"یہ ... یہ کوئی کاغذ ہے۔" ٹیڈی چلایا اور اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں نے ٹیڈی کے ہاتھ سے وہ کاغذ چھین لیا۔

"وہ دروازے کو باہر سے کنڈی لگا گیا ہے۔" ٹیڈی نے مشتعل ہو کے ایک ایسی گالی دی جو وہ بھول چکا تھا۔ غالب اور محسن بھی قریب ہو کے اس کاغذ کی تحریر کو پڑھنے لگے۔ اس پر لکھا تھا۔

"سکندر!

میں نے تمھیں پہلے بھی پیغام بھیجا تھا۔ آخر تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟

دلاور"

"بس صرف ایک سطر۔" محسن نے مایوسی سے کہا۔

"جو کچھ اسے لکھنا تھا وہ پہلے ہی لکھ کر بھیج چکا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب تو اس نے صرف یہ کہا ہے کہ تم بات کرنے پر مجبور ہو۔ اب تم انکار نہیں کرو گے ... اور اس نے ٹھیک کہا ہے میں جاؤں گا۔"

"سکندر بادشاہ ... کہاں جاؤ گے تم؟" ٹیڈی نے خوف زدہ ہو کے کہا۔

"اس نے ایک ٹیلی فون نمبر دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ خود بتا دے گا کہ مجھے کہاں خود کو پیش کرنا ہے۔"

"ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں گے۔" ٹیڈی بولا۔

"اس نے تو مجھے بلایا تھا۔" میں نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ مرضی ہے اس کی کہ وہ میرے ساتھ کسی اور کو آنے کی اجازت دے یا نہ دے۔"

"تم ... تم شاید واپس نہ آ سکو۔" محسن بولا۔

"ہاں ... لیکن وہ تینوں آ جائیں گی۔" میں نے کہا۔ "وہ ہم میں سے کسی کو بھی بلاتے تو وہ جاتا۔ کیا تم انکار کر سکتے تھے محسن؟ اور تم غالب؟ کیا یہ ممکن تھا کہ تم نہ جاتے۔ تم اتنا دیکھو ان میں سے کسی نے مجھ سے نظر نہیں ملائی۔ ان میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ پھر ان کا فیصلہ مختلف کیسے ہو سکتا تھا۔"

"عجلت میں نیصلہ مت کرو۔" غالب نے کہا۔ "اس وقت کسی کا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ہمیں صبح تک سوچ سمجھ کے کوئی لائحہ عمل مرتب کرنا ہو گا۔ ہونے والی بات تو ہو چکی لیکن کیا یہ ہماری شکست ہو گئی؟ جنگ ختم ہو گئی؟ صرف اتنی سی بات پر کہ وہ دو لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔"

"یہ اتنی سی بات ہے غالب کے بچے۔" استاد ٹیڈی چلایا۔

"سنو دوستو! وہ سب ہماری محبت تھیں۔ مگر کیا ہماری محبت ہماری کمزوری ثابت ہو گی؟" غالب نے کہا۔ "وہ ہمارا حوصلہ تھیں مگر کیا ان کے بغیر ہمارا عزم کچھ نہیں۔ ہماری شکست آخر کیا تھا جب کا نقصان سب کا اندیشہ ... اور سب کے خطرات کیا ہیں۔ کیا اس نقصان پر ہم اپنے مشن کو قربان کر دیں گے ... ہمارا مشن ایک عورت کا حصول تھا؟ صرف اس کے ساتھ گزاری جانے والی ازدواجی زندگی کی خوشیاں ہمارا مقصد حیات تھیں؟ تو ہم نے اتنا وقت کیوں ضائع کیا؟ ہم یہاں تک کیوں آئے؟"

اس کی بات نے ہم سب کو پھر احساس دلا دیا کہ وہ ٹھیک

www.paksociety.com

مقصد جس نے ہم سب کو کسی حد تک متاثر کیا تھا۔ اب سونے کا کوئی سوال نہ تھا۔ یہ سوچنے کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا کہ وہ رابعہ، شہلا، یا نازو کے ساتھ کیا کر سکتے تھے اور کیا کریں گے۔ پیغام نے ہماری سوچ کو بھٹکنے نہیں دیا تھا۔ اب یہ توقع تھی کہ وہ میرا یا بیسٹ جواب کا انتظار کریں گے اور اگر میں نے انکار نہ کیا تو ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ بے شک اب وہ اس پوزیشن میں تھے کہ انھیں سامنے سامنے یا ہمیں ان کے سامنے لے جا کر ہم سے بات منوا سکتے تھے یا اگلوا سکتے تھے مگر آج کی رات ہم آزاد تھے۔ وہ ہمیں جان بوجھ کر چھوڑ گئے تھے کہ ہم صبح تک کوئی فیصلہ کر سکیں۔

"تم لوگ ڈرائنگ روم میں چلو۔" محسن نے کہا۔ "میں سب کے لیے کافی بنا کے لاتا ہوں۔"

"میں دروازے کو چیک کرلوں۔" میں نے کہا۔ "کہیں دروازے تک آنے کے پیغام چھوڑنے اور ہمیں قید کر جانے والا وہی آلات یہاں نصب نہ کر گیا ہو جو ہم نے ڈاکٹر فیصلی کے گھر میں پہنچائے تھے۔ ہماری جوڑی اور ہمارا ہی سرد لا کیس نہ ہو۔"

"لیکن...... دروازہ تو باہر سے بند ہے۔" ٹیڈی نے کچھ تاخیر سے کہا، کیونکہ وہ بھی اپنے خیالوں میں گم تھا۔ اس وقت تک وہ دروازہ کھولنے کی کوشش کر چکا تھا۔ میں بھی سمجھ رہا تھا کہ دروازہ نہیں کھولا جا سکتا مگر مجھے اس وقت بڑی حیرانی ہوئی جب دروازہ کھل گیا۔ میں نے کسی کے فرار ہوتے قدموں کی صدا بڑی صفائی سے سن لی اور ریوالور نکالا اور باہر آ گیا۔ فرار ہونے والے کو میں نے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر دیکھا۔ وہ سرتا پا سیاہ لباس میں تھا اور آخری کونے کی اسٹریٹ لائٹ کے قریب پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ تب بھی میں اس کی صورت نہ دیکھ سکا کیونکہ اس کے چہرے پر بھی چادر کا ٹکڑا تھا جس میں سے صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ میں نے ریوالور اٹھایا اور نیچے کر لیا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن وہ حرکت میں تھا اور یہ ہو سکتا تھا کہ نشانہ خطا جائے۔ محلہ تو سارا جاگ اٹھے مگر میرے ہاتھ کچھ نہ آئے۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگانے کا سوچا مگر پھر خود ہی اس ارادے کو ترک کر دیا۔ اسے پچاس گز آگے ہونے کا فائدہ حاصل تھا اور وہ تھا بھی بہت تیز رفتار۔ وہ ذرا سی دیر میں میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ پھر کسی جیپ کا انجن غرایا۔ اور جیپ کی ایک جھلک مجھے اس وقت دکھائی دی جب جیپ گلی کے سامنے سڑک پر سے گزری۔ گلی کے آخری حصے کے بعد سڑک پر کوئی اسے واپس لے جانے کے لیے تیار کھڑا ہوا تھا۔

"کچھ ملا؟" غالب نے میرے قریب آ کے کہا۔ "ٹیڈی تو کہہ رہا تھا کہ دروازہ باہر سے بند ہے؟"

"تو کیا میں جھوٹ بول رہا تھا؟" ٹیڈی نے بھڑک کے کہا۔

"جھوٹ نہیں تھا تو کیا سچ تھا؟" غالب نے گھور کر کہا۔ "سکندر کے پاس جادو تو نہیں ہے کہ اس نے باہر سے لگی ہوئی کنڈی کھول لی۔"

"کوئی باہر موجود تھا۔" میں نے دروازہ بند کرنے کے بعد سب کو مطلع کیا۔ "جس نے کنڈی لگائی تھی وہ دروازے کے پاس کھڑا رہا اور ہماری گفتگو سنتا رہا تھا۔"

"تم قیاس آرائی کر رہے ہو......"

"نہیں ...... جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ بھاگا۔" میں نے کہا۔ "میں نے خود اسے بھاگتے دیکھا ..... ایک جیپ اسے لے گئی ہے۔"

"تم نے دیکھ لیا تھا اسے؟ کون تھا وہ؟" محسن بولا۔

"گولی کیوں نہیں مار دی اسے ..." ٹیڈی نے کہا۔

"یار! اس نے کالی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ بہت دور نکل گیا تھا وہ۔" میں نے کہا۔ "گولی تو مار دیتا مگر اس کے بعد لوگ باہر نکل آتے کہ یہ کیا تھا ..... کسے گولی لگی یا کس کو ..... میں پولیس کا چکر پڑ جاتا۔"

ایک بات پر ہم سب کا اتفاقِ رائے تھا کہ یہ گھر اب چوہدری دلاور کی نظروں سے محفوظ نہیں اور تحفظ کا احساس ہماری خوش فہمی تھی۔ بظاہر یوں لگتا تھا کہ اس شہر کے کسی گوشے میں ہمارے لیے مستقل پناہ نہیں۔ دلاور ہزار آنکھوں والا ہزار پا ہے جو ہر جگہ دیکھ سکتا ہے اور ہر جگہ پہنچ سکتا ہے اور اس سے کہیں مفر نہیں۔ آئندہ ہمارا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟ یہ مسئلہ خارج از بحث تھا اور زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا تھا: جہاں سینگ سمائیں ..... جہاں تقدیر لے جائے۔

یہ غالب تھا جس نے ایک سوال پھر اٹھایا کہ وہ شہلا رابعہ کو کہاں لے گئے ہوں گے۔ غالباً وہیں جہاں نازو ہے؟ سب نے کہا ..... یہ ہم پہلے بھی کہہ چکے تھے۔

"وہ انھیں کسی دوسری جگہ بھی لے جا سکتے ہیں۔" ٹیڈی نے کہا۔

"وہاں ..... انتخاب رابعہ یا شہلا کے ہاتھ میں نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟" غالب بولا۔ "کیا وہ اپنے گھر لے جائیں گے ..... نہیں ..... وہاں ان کی اپنی دلچسپیاں وہ جو کچھ باہر کرتے ہیں، جس کا تعلق ان کی ... سے نہیں ہے اور اس کا اثر ان کے گھر پر نہیں پڑتا۔"

"ان کے پاس جگہ کی کمی نہیں۔ ان کے وسائل محدود نہیں۔"

"اور ان کے سارے خفیہ ٹھکانے ہمارے علم میں نہیں۔" میں نے کہا۔

"میں ایک مختلف زاویے سے دیکھ رہا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "میں نے تمھیں ایک گھر اور خاندان کی بات کی تھی جو ان کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی کاروبار کے اثرات سے محفوظ ہیں۔ لیکن کیا ایسے گھر اور خاندان ان کی بدمعاشی اور جارحیت سے محفوظ ہیں؟ ایسا پہلے بھی ہوا ہے۔ وہ رابعہ اور نازو کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ لیکن اس وقت وہ ہمارے ساتھ ایک محاذ پر آ گئے تھے۔ آج انھوں نے اپنے گھر میں محسن پر کارروائی کی ہے۔ وہ محسن کی بیوی کو اٹھا لے گئے ہیں۔ محسن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دلاور کی بیوی کو اٹھا لائے؟"

میں نے غالب کے استدلال پر محسن کی طرف دیکھا۔ پھر محسن نے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی نظر کا سوال ایک ہی تھا: کیا غالب ٹھیک نہیں کہتا؟ ..... جنگ میں اخلاقی اصولوں کی پاسداری دونوں فریق کرتے ہیں یا پھر کوئی بھی نہیں کرتا۔ پہل کرنے والے ہم نہیں تھے مگر جانے کے لیے ویسی ہی جوابی کارروائی کا جواز یقیناً پیدا ہو گیا تھا۔

"یہ بھی سوچو سکندر اعظم کہ رشتوں کی آبرو کا پیمانہ صرف نکاح نامہ نہیں ہوتا۔ جو محسن کے پاس ہے اور تمھارے پاس یا میرے پاس نہیں ہے۔ رابعہ تمھاری بیوی نہیں۔ نازو میری کچھ نہیں مگر کیا وہ ہماری عزت نہیں ہیں جب ہم ان کی عزت کے اتنے ہی رکھوالے ہیں جتنا محسن اپنی بیوی کی عزت کا رکھوالا ہے۔ یہاں قانون اور اخلاق میں نہ کے دار وہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔" غالب نے کہا۔

"میں تمھارے خیال سے اختلاف نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"اختلاف محسن بھی نہیں کر سکتا۔" غالب نے کہا۔ "اگر ہم اپنے عقیدے کو دیکھیں تو اس میں آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت یا جان کے بدلے جان لینے کا تصور ہے۔ ہمیں یہ حکم نہیں کہ کوئی تمھارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دو۔ جہاں تک ہمارے ساتھ ہونے والی زیادتی کا تعلق ہے تو سوال قانونی رشتے کا نہیں .... ایک دشمن ہم سے جبراً چھین کر لے گیا جو ہمیں بہت عزیز تھی۔ ہماری آنکھ اور ہمارے دانت سے بھی زیادہ اور وہ ہمارا دشمن تھا۔ اس سے ہماری جنگ ہے ..... کھلی جنگ۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں دلاور نے ہی مجبور کیا ہے کہ ہم گذشتہ رسموں میں اس کی ادائیگی کریں۔" محسن بولا۔

"اب یہ ہمارا مفروضہ ہے کہ وہ رابعہ اور شہلا کو بھی نازو کے ساتھ قید کر کے لے گئے ہوں گے۔ اس مفروضے کی بنیاد کوئی نہیں۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر فیصلی کے اسلحہ خانے پر حملہ کر کے سب کو چھڑا لانا بھی ناممکن ہے۔ لیکن ایک کام ہم کر سکتے ہیں یہ صورتِ حال یقین کے ساتھ جس میں ناکامی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہم نے چوہدری دلاور کا گھر دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے دشمنوں میں سے ہم نے ایس پی سراج کا گھر دیکھا ہے۔ سکندر کو چوہدری حشمت کا گھر معلوم ہے جو پولیس میں انسپکٹر یا اسسٹنٹ کمشنر ہے۔ ڈی سی سلوا جس کوٹھی میں تھا وہ اب خالی پڑی ہوگی۔ لیکن وہ بھی ایک ٹارگٹ ہے۔ کیا یہ چار ٹارگٹ کافی نہیں؟"

"چار ٹارگٹ کس مقصد کے لیے؟" میں نے کہا۔

"ہمارے پاس بارہ گھنٹے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "ہم ان میں سے چار استعمال کر سکتے ہیں ..... ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک بم کے پھٹنے سے شاید شکاری خوف زدہ نہ ہوں۔ دوسرا دھماکا ان کے حوصلے پست کرے گا۔ تیسرے دھماکے سے پہلے اگر چوہدری دلاور کو بتا دیا جائے کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھائے ورنہ اس کا گھر بچے گا نہ خاندان۔ تو مجھے یقین ہے ہم اس سے ہر بات منوانے کی پوزیشن میں ہوں گے۔"

غالب کی تجویز نے ہم سب کو دم بخود کر دیا۔ یہ خطرناک جنگ کی ابتدا تھی مگر جنگ تو ہوتی ہی خطرناک ہے۔ اس حکمت عملی سے دلاور کو ایک فیصلہ کن جنگ میں شکست ہو سکتی تھی۔ اس سے مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکتے تھے اور ہم ثابت کر سکتے تھے کہ ایم آر ایس ایک نام ہی نہیں ایک طاقت بھی ہے۔ ایک ایسی طاقت جس سے ٹکرانا آسان نہیں رہا۔ اگر یہ پلان کامیاب رہا تو شکاری پہلی بار ہماری قوت کے مظاہرے سے خوف زدہ ہوں گے۔ انھیں یقین کرنا پڑے گا کہ ہم بھی شکاری ہیں جو ان کو اسی طرح شکار کر سکتے ہیں جیسے اب تک وہ سب کو شکار کرتے رہے ..... ان کو جو بے گناہ مارے گئے جو ان کے مقابلے کے لیے غریب تھے اور جان گنوا بیٹھے۔ سائیں بابا سے سیوک رام اور ڈاکٹر فیصلی تک سب اسی سوچ کے شکار تھے۔ چوہدری دلاور نے اپنے پیسے سے ڈی سی سلوا کو استعمال کیا اور خسرو جمشید کو، ڈی ایس پی سراج کو اور ان سب کو شکار کیا جو ضمیر کو قابل فروخت سمجھتے ہیں۔ اس کی عیاری اور سفاکی نے وزیر خان کو اور میر شرافت علی کو شکار کیا۔ رابعہ اس کی ماں اور دوسرے ان گنت لوگ اس کی بربریت کا شکار ہوئے لیکن خود دلاور بھی عالمی سیاست کے شکاری تھے جو اسی پیسے کی قوت سے سرحدیں بدل لیتے تھے۔ دلوں میں تفرقے

www.paksociety.com

پیدا کر رہے تھے۔ گھر اور بستیاں اجاڑ رہے تھے اور اسلحہ خرید کر ان انسانوں کے ہاتھوں میں تھما رہے تھے جو قاتل نہیں تھے مگر ان کے دلوں میں نفرت کا بیج بو دیا گیا تھا چنانچہ وہ عصبیت کا شکار ہو کے اپنے ہم وطنوں کا شکار کر رہے تھے۔ خون کی ہولی کھیل رہے تھے اور انسانیت کی قدروں کو پامال کر رہے تھے۔ شکاری سب تھے اور شکار بھی سب تھے۔ نیچے سے اوپر تک مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندی کی تحریک چلانے والوں سے لے کر اس تحریک کی نشوونما کرنے والوں تک۔

"اب کیا رہ گیا ہے سوچنے کو؟" غالب نے کہا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

"ابھی صبح ہونے میں دیر ہے۔ کم سے کم چار گھنٹے ہیں جس میں ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "وہ ٹائم بم کبھی کسی نے دیکھے؟ مطلب یہ کہ ان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے؟ اگر انہیں استعمال کرنا ہو تو کیسے کیا جائے گا؟"

"اب تک کوشش تو نہیں کی۔ مگر ٹائم بم کا میکنزم کوئی کمپیوٹر کا سرکٹ نہیں ہوتا۔" محسن بولا۔ "کلاک ورک ہوتا ہے۔ ابھی سمجھ لیتے ہیں۔" وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔ جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹائم بم تھا جو اس نے ٹیڈی کی طرف اچھال دیا۔

"لو استاد پکڑو۔ کیچ۔" محسن نے کہا۔ استاد ٹیڈی کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی اور اس کی حالت خندق میں بیٹھے ہوئے شخص سے بدتر ہو گئی جس کے سر پر بم آ گیا ہو نہ وہ اٹھ کر بھاگ سکتا تھا اور نہ بچ سکتا تھا۔ کیچ وہ خاک کرتا۔ اس نے نہایت مضحکہ خیز انداز میں ادھر ادھر ہاتھ چلائے جیسے ناک پر بیٹھنے والی مکھی کو اڑا کر بھگا رہا ہو اور عین آخری وقت میں لڑھک گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی مضحکہ خیز آوازیں سن کر ہم سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ ہماری ہنسی اس وقت قابو سے باہر ہو گئی جب ٹائم بم اس کے برابر بم اس کی گود میں گرا اور اس نے زور سے کلمہ پڑھا جیسے بم پھٹ گیا تو اسے اس کی مہلت بھی نہ ملے گی۔

جب کچھ بھی نہ ہوا اور اس نے ہمیں ہنستے دیکھا تو وہ ایک دم اٹھا۔ "تیری تو ایسی کی تیسی۔" وہ محسن کے پیچھے دوڑا۔ "ابے استاد۔۔۔ کیا گناہ ہے آخر میرا۔ کیچ خود تم نے نہیں کیا اور مارتے ہو مجھے۔" محسن نے چھلانگ مار کر اپنی جان بچائی۔

"لو۔۔۔ سنبھالو یہ بم پھینک دیا اور کہتا ہے میرا گناہ کیا ہے۔" غالب بولا۔

"بم پھٹ جاتا تو بیچارا دنیا سے کوچ کر جاتا۔" میں نے کہا۔

"یہ ٹیڈی خود غرضی کی بات ہے کہ خود تو شادی کر لی اور ٹیڈی پہ بم گرا دیا۔"

استاد ٹیڈی کا خوف پہلے شدید اشتعال میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ہماری ہنسی نے غصے کو خجالت میں بدل دیا۔ وہ منہ بنا کر بیٹھ گیا۔ "یار ایسا جان لیوا مذاق نہیں کرنا چاہیے۔" وہ بولا۔

"ابے کوڑھ مغز۔۔۔ عقل کے دشمن۔" محسن نے کہا۔ "بم والا ہوتا تو یہ دوسرے آرام سے بیٹھے ہوتے۔۔۔ اور میں پہلے پھینکتا۔ قسم خدا کی میرے لیے تو ڈوب مرنے کا مقام ہے سالا استاد اتنا احمق ہے۔"

"استاد۔۔۔ بم میں ایک تو پہلے فیوز نہیں لگتا۔" غالب نے اسے سمجھانے کے لیے کہا۔ "جب تک فیوز نہ لگایا جائے بم اسی طرح رہتا ہے جیسا کوئی کھلونا۔۔۔ اس کے علاوہ یہ تو ٹائم بم ہے جس میں وقت سیٹ کرنا ضروری ہے۔ جیسے الارم کلاک الارم سیٹ کیے بغیر نہیں بجتا۔ ایسے ہی یہ ٹائم بم بھی سیٹ کیے بغیر نہیں پھٹتا ہے۔" اتنی دیر میں محسن نے ٹائم بم کو الٹ پلٹ کر کے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنی رائے کا اظہار غالب سے کیا اور غالب نے اس سے اتفاق کیا۔ پھر انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں نے کہا کہ میں اپنی ناقص عقل کو اس دردِسر سے دور رکھ کے خوش ہوں۔ اللہ آپ دونوں کی مغفرت کرے۔ اگر سمجھنے میں کوئی غلطی ہو جائے۔۔۔ تجربے کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے بم کو ایک طرف رکھ دیا اور آگے کا پلان بنا لیا۔

اس کا پہلا مرحلہ دو ٹیموں کی تشکیل سے شروع ہوا۔ ٹیم میں میرے ساتھ غالب رہا۔ دوسری ٹیم میں سارے صفوتی کو شامل کیا گیا۔ اس تنبیہ کے ساتھ کہ وہ بم ایک دوسرے کو نہ لگائیں۔ پروگرام کے مطابق انہیں ڈی ایس پی کی خالی کوٹھی میں پہلا بم لگانا تھا اور اس کا وقت اتفاق رائے سے دس بجے رکھا گیا تھا۔ ٹائم بم میں زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے کی گنجائش ہوتی ہے۔ یہ ضروری تھا کہ آخری بم کا وقت دو بجے ہو۔ دوسرا بم بھی ایس پی سراج کے گھر میں لگانا تھا اور اس کا وقت گیارہ بجے کا تھا۔ باقی دو بم میرے اور غالب کے پاس تھے۔ تیسرے کے لیے بارہ بجے کا وقت اور حشمت خان کا گھر منتخب کیا گیا اور آخری بم چوہدری دلاور کے گھر کے لیے تھا۔ دلاور کو دو گھنٹے مہلت دی گئی تھی تاکہ وہ فیصلہ بھی کر سکے اور اس پر عمل درآمد کے انتظامات ہماری مرضی کے مطابق ممکن ہوں۔

اس وقت رات کے یا صبح کے تین بجے تھے۔ اور کو کچھ بھی ہونے کے لیے رات ہی سمجھا جا سکتا تھا مگر

صبح کا آغاز تھا اور اس آغاز کو بھی تین گھنٹے بیت چکے تھے۔ حشمت خان کا گھر ایک سمت میں تھا تو دلاور کا دوسری سمت میں اور ہم انہیں پہنچتے تو ایک تکون کے تین اضلاع کی سی شکل بنتی۔ مجموعی فاصلہ پندرہ میل سے کم نہ ہوتا۔ چنانچہ پہلا مسئلہ ٹرانسپورٹ کا تھا۔ محسن اور ٹیڈی کی ٹیم پر بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ انہیں ذرائع نقل و حمل خود تلاش کرنے ہیں یا پیدا کرنے ہیں۔ ہم دو فرلانگ تک پیدل چلتے رہے لیکن اتنی دیر میں جو قریب سے ایک چوکیدار سائیکل پر گزرا۔ ایک کتا چار ٹانگوں پر دوڑا اور ایک ویسپا پر دو ٹانگوں والے گزرے اور وہ دوڑتے ہوئے جانے والا ایک رکشا گزرا جس میں دو ٹانگوں والا جانور چار ٹانگوں والے کو مارنے کی دعائیں دے رہا تھا۔ ہماری مایوسی اور دل شکستگی کو مرزا غالب نے حسنِ تدبیر سے امید اور تازہ حوصلے کو جذبۂ وجد کے جوش اور ولولے میں بدل دیا تھا۔ ہم محسوس کرنے لگے تھے کہ ہاری ہوئی بازی جیتی جا سکتی ہے۔

اچانک غالب نے مجھے کہنی ماری اور سڑک پر گر گیا۔ میں نے پیچھے سے آنے والی گاڑی کی ہیڈلائٹس دیکھی تھیں۔ میں نے سڑک کے درمیان میں آ کے زور زور سے ہاتھ ہلانا شروع کیا۔ قریب آ کے کار رک گئی۔ ان کے لیے رکنے کے سوا چارہ بھی نہ تھا کیونکہ غالب آدمی سڑک پہ لمبا پڑا ہوا تھا۔ باقی راستہ میں نے روک رکھا تھا۔ عورت اور مرد دونوں جوان تھے لیکن عورت خوف زدہ ہو گئی تھی۔

"میں نے۔۔۔ تم سے کہا تھا۔۔۔" وہ بولی۔ "گاڑی مت روکو۔"

"شٹ اپ۔" مرد نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیا بات ہے؟"

"میرا ساتھی۔۔۔ چلتے چلتے لیٹ گیا۔" میں نے کہا۔ "شاید اس پہ دل کا دورہ پڑا ہے۔ بڑی مہربانی ہو گی۔۔۔ اگر آپ اسے اسپتال۔۔۔"

"اوہ۔۔۔ ہمیں ائیرپورٹ جانا ہے۔" مرد بولا۔ "میرا سالا آ رہا ہے۔ اسپتال گئے تو دیر ہو جائے گی۔ ہم ائیرپورٹ نہیں پہنچیں گے اور وہ گھر پہنچ جائے گا۔"

"وہ گھر پہنچ تو جائے گا صاحب۔۔۔ یہ تو اللہ میاں کے پاس پہنچ جائے گا۔" میں نے کہا۔ مرد مجبور ہو گیا اور اس نے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ پلک جھپکتے میں غالب زندہ ہو گیا اور ہم دونوں تقریباً ایک ساتھ پچھلی سیٹ پر قابض ہو گئے۔ مرد کا ہاتھ ڈیش بورڈ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں نے ریوالور نکال لیا۔ عورت نے ایک چیخ ماری۔

"واٹ از دس۔۔۔ تم ڈاکو ہو؟" مرد بولا۔

"یس۔۔۔ ہم ایسے ڈرامے کرتے رہتے ہیں۔" میں نے انگریزی میں جواب دیا۔ "اور تم اب بھی رکھتے ہیں کہ انجام ٹریجک نہ ہو۔ سب لوگ آخر میں ہنسی خوشی اپنے گھر جائیں اور اس واقعے کو بھول جائیں۔"

"یہ زیادہ سے زیادہ بیس منٹ کا ڈرامہ ہے۔" غالب نے کہا۔ "جہاں ہم جانا چاہتے ہیں وہاں پہنچا دو۔ اس کے بعد گڈ بائی اینڈ گڈ لک۔۔۔ ہمیں صرف لفٹ چاہیے۔"

"جو تم خوشی سے نہیں دیتے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر ہمیں اس وقت ٹرانسپورٹ ملنے کی امید ہوتی تو ہم تمہارا راستہ نہیں روکتے۔"

بیس منٹ سے بھی کم وقت میں اس نے ہمیں مطلوبہ روڈ پر گھاس منڈی کے پاس اتار دیا۔ راستے میں کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ عورت نے ایک بار پھر مرد کو یاد دلانا چاہا تھا کہ وہ احمق ہے اور اگر اس نے گاڑی نہ روکنے کا مشورہ قبول کر لیا ہوتا۔ مرد نے پھر اس کو شٹ اپ کہا تھا اور وہ خفا ہو گئی تھی۔

"تھینک یو۔۔۔ اور بہت معذرت۔" میں نے اترنے کے بعد کہا۔ "آدمی کبھی کبھی مجبوری میں وہ کام کرتا ہے جو اسے نہیں کرنے چاہئیں۔ مثلاً شادی۔"

"اگر تم ڈاکا ڈالنا چاہتے ہو تو خدا کے لیے میری گاڑی کا نمبر بھول جاؤ۔" مرد بولا اور گاڑی نکال لے گیا۔ عورت اس وقت بھی دم بخود بیٹھی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم نے صرف لفٹ لی ہے۔ اس کی جان نہیں لی ہے۔ زیورات نہیں لیے۔ ہینڈ بیگ نہیں لیا۔

آگے کا راستہ ایک تنگ سی سڑک سے گزرتا تھا، جو ایک فرلانگ کے بعد دو حصوں میں بٹ جاتی تھی۔ ایک گلی کا موڑ تھوڑا سا دائیں طرف مڑتی تھی تو دوسری تھوڑا بائیں طرف۔ یادداشت نے میرا ساتھ دیا اور میں نے الٹے ہاتھ کی طرف مڑنے کا فیصلہ کیا۔ بہت جلد میں نے اس جگہ کو شناخت کر لیا جہاں ایک رات میں رابعہ کو سخت ترین عذاب کی قید سے نجات دلا کے پہنچا تھا تو مجھے پولیس نے گرفتار کر لیا تھا کیونکہ میرے جسم پر نام کو بھی لباس نہیں تھا۔ وہ گشت پر سوار پولیس تھی جو مجھے اپنے ساتھ تھانے لے گئی تھی۔ جہاں سے انکل الیاس ایس پی ضمیر کو فون کر کے ہی مجھے وی آئی پی کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ اسی رات میں نے حشمت خان کا گھر دریافت کیا تھا۔ بات بہت پرانی تھی اور میں کچھ بھول رہا تھا۔ اگر ہم چاہتے تو کسی سے بھی پتا پوچھ سکتے تھے مگر ایک تو اس وقت بتانے والا دور دور تک کوئی نہیں تھا

www.paksociety.com

اور ہوتا تو بھی حشمت خان کا پتا پوچھ کے ہم اپنی حیثیت مشتبہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر یہ پروگرام پر عمل کرتے ہوئے ہم بارہ بجے حشمت خان کے گھر کو آگ لگاتے تو ایک چشم دید گواہ سامنے آجاتا اور بتاتا کہ ہاں۔۔۔۔ رات کے نہیں۔۔۔ صبح کے ساڑھے تین چار بجے تھے جب دو اس جسم کے آدمی حشمت خان کا پتا پوچھتے پھر رہے تھے۔ ایک جگہ رک کر میں نے تھوڑا سا غور کیا اور ذہن کے نہاں خانوں میں رکھی ہوئی یادوں کی کتاب پر سے وقت کی گرد جھاڑی۔ آہستہ آہستہ میرے ذہن میں ایک تصویر ابھری کہ غالب نے مجھے ہلایا۔

"یہ کیا گلی کے بیچ میں گیان دھیان شروع کر دیا۔ ابھی آجائے گا کوئی چوکیدار تو گلے پڑ جائے گا۔" غالب نے کہا۔

"گیان یہ حاصل ہوا ہے ہیں مڑ کر، ادھر جہاں ہم پہنچے ہیں وہی ہماری منزل ہے۔" میں نے کہا۔ "اپنے سامنے دیکھو۔۔۔۔ وہ جو سرخ رنگ کی کھڑکیوں کی قطار ہے، وہی حشمت خان کا گھر ہے۔" میں نے کہا۔

غالب نے میری انگلی کے اشارے پر دیکھا۔ "یہ تیسرا گھر؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور ہم نے تصدیق کے لیے قریب جا کے دیکھا۔ دروازے پر لکڑی کی سلیٹی تختی پر "حشمت خان اے ایس آئی" لکھا تھا۔ اس کے دونوں جانب دو منزلہ مکان تھے۔ ایک نظر میں ہی ہمیں یہ اندازہ ہو گیا کہ ہمارا کام کتنا مشکل ہو گیا ہے۔

"دونوں طرف سے چھت پر اترنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔" غالب نے کہا۔

"شاید پیچھے کی طرف کوئی ایسا گھر ہو جس کی چھت بالکل حشمت خان کے گھر کی چھت سے ملتی ہو۔" میں نے کہا۔

"اس کا کیا فائدہ کہ پہلے ہم ایک چھت پر چڑھنے کا خطرہ مول لیں اور پھر دوسری پر اتریں۔" غالب نے کہا۔ "براہ راست اسی پر نہ چڑھ جائیں۔"

"کیسے چڑھ جائیں بندر کے بچے۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو اڑنا بھی نہیں آتا اور خدا نے تمہیں عقل دی ہوتی تو ایک سیڑھی یا رسی لے آتے۔"

"بجلی کا پول ہوتا تو سب سے اچھا رہتا۔" غالب نے جھنجھلا کے کہا۔ "تم ادھر آؤ۔ نیلی دیوار کے ساتھ لگ جاؤ۔ میں تمہارے سر پر قدم رکھ کے اوپر والے چھجے تک پہنچتا ہوں۔ وہاں سے چھت کی منڈیر تک پھر کوئی طریقہ کام آئے گا۔"

مجھے اندازہ تو تھا کہ کھڑکی کے اوپر والا چھجا کافی مضبوط ہے اور زیادہ اونچا بھی نہیں ہے۔ زمین سے اس کی بلندی آٹھ فٹ کے قریب تھی لیکن غالب روشن دان کے چھجے کی بات کر رہا تھا جو بارہ فٹ اوپر تھا۔ میں نے اسے سہارا دیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں ملا کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس میں پیر رکھا اور میرے کندھے پر چڑھ گیا لیکن چھجا اب بھی ایک فٹ دور تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھائے۔

"دونوں ہتھیلیوں پر ایک ایک پیر رکھو۔" میں نے کہا۔ "میں تم کو اور اوپر اٹھاتا ہوں۔"

غالب نے سر ہلایا اور میرے ہاتھوں پر چڑھ گیا۔ اس کا وزن میری توقع سے زیادہ ثابت ہوا۔ لیکن میں نے جسم کی پوری توانائی صرف کر کے ہاتھوں کو اوپر کیا۔ آہستہ آہستہ غالب اوپر اٹھا۔ "شاباش نادر بس تھوڑا سا اور۔۔۔۔ بس یہ ہوں۔۔۔۔" ایک دم میرے ہاتھوں پر سے وزن غائب ہو گیا۔ میں نے لمبی سانس کھینچی اور غالب کو روشن دان کے چھجے پر سے چھت کی منڈیر کو پکڑتے دیکھا۔ روشن دان کا چھجا کمزور تھا اور اس پر زیادہ وزن نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ غالب نے نہ جانے ہاتھ سے کیا اشارہ کیا اور چھت پر اتر کے غائب ہو گیا۔ میں گلی میں اکیلا کھڑا رہ گیا۔ اتنی دیر میں نہ گلی سے کوئی گزرا تھا نہ کوئی دوسرا شخص۔ لیکن کوئی کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور سامنے والے گھر کے دروازے میں کھڑا ہو گیا جو دونوں دیواروں کے درمیان کچھ گہرائی میں تھا۔

غالب شاید یہ چاہتا تھا کہ میں گلی کی نگرانی کروں۔ یہ کام وہ اکیلا کر سکتا تھا۔ ہم دونوں کے اوپر جانے اور اندر جانے میں اترنے سے کوئی فائدہ نہ ہوتا کیونکہ وہ کام ایک ہی آدمی کا تھا۔ میں اس اندھیرے میں جیسے خلا میں دروازے سے چپک کر سانس روکے کھڑا ہوا تھا کہ نہ جانے کدھر سے ایک کتا نمودار ہو گیا۔ اس نے قریب آکے مجھے سونگھنا شروع کر دیا۔ میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑنے لگی۔ کتا میرے ٹخنے چاٹنے لگا۔ دنیا کی آفات میں اگر مجھے کسی چیز سے خوف آتا ہے تو وہ کتا ہے۔ جس پر پطرس نے انتہائی حقیقت پسندانہ مضمون لکھا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں اس خطرناک چیز سے اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگی اور اسے ٹل جانے کو کہا لیکن وہ بے تکلفی پر آمادہ تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جب آدمی خوف زدہ ہوتا ہے تو اس کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑتی ہے اور اس کے بدن کا رواں رواں کھڑا ہونے کا سبب وہ ایڈرینالین ہوتی ہے جو ایسے وقت میں خود بخود خون میں شامل ہو جاتی ہے۔ اور کتے اس کی بو سے فوراً واقف ہو جاتے ہیں۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ کتا اس پر غراتا ہے جو اس کے قریب سے ڈرتا ہوا گزرے یا خوف کے باعث رک کر بھاگنے لگے۔۔۔ لیکن جو بے خوفی سے گزر جائے کتا اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اور اس سے ڈرتا بھی ہے۔ اس بات کے سچ ہونے کا ثبوت مجھے میسر ملا۔ کتے نے غرانا شروع کیا اور اس کے عزائم جارحانہ ہو گئے تو میرے لیے کچھ کرنا ضروری ہو گیا۔ میں بھاگ نہیں سکتا تھا۔ چیخ نہیں مار سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے جانے کو دھتکار نہیں سکتا تھا۔۔۔۔ میں نے وہ کیا جس کی مجھے خود سے بالکل امید نہ تھی۔ میرا ایک پاؤں بجلی کی طرح حرکت میں آیا اور بوٹ کی ٹھوکر کتے کے سر پر لگی۔ وہ چلایا تھا۔۔۔ میں نے اطمینان کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ نئی مصیبت نازل ہو گئی۔ اگر وہ کتے کا بچہ نہ آتا تو میں دبکا کھڑا رہتا اور چوکیدار سیدھا گزر جاتا مگر کتے پر ہونے والے تشدد اور اس کی فریاد و فغاں نے چوکیدار کو ہوشیار کر دیا۔۔۔۔ وہ ایک دم لٹھ لے کر سامنے آ گیا۔

"کون۔۔۔؟" اس نے چلا کر پوچھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا۔ اس کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی اور وہ میری گرفت میں بے بس ہو گیا۔ میری جگہ غالب ہوتا تو اس سے زک اٹھاتا کیونکہ وہ صحت مند اور جوان عمر کا پٹھان تھا۔ اسے خاموش رکھنے کے لیے میں نے اس کے کان کے پیچھے کنپٹی ماری۔ وہ بے سدھ ہو کے میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔ میں نے اسے وہیں لٹا دیا اور بے چینی سے غالب کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ سب سے زیادہ خوف مجھے حشمت خان کے گھر میں کسی کے جاگ اٹھنے کا تھا۔ غالب مسلح تھا اور خدانخواستہ حشمت خان مقابلے پر آ جاتا اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے چور کو خود پکڑنے کی کوشش کرتا یا اس پر گولی چلاتا تو خود مارا جاتا۔ یہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔ ہم نے تو یہ طے کیا تھا کہ مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے حشمت خان کے گھر والوں کو گھر سے نکل جانے کو کہیں گے۔ انہیں صاف بتا دیں گے کہ گھر میں بم رکھا ہے جو ٹھیک آدھے گھنٹے بعد پھٹ جائے گا۔ بم کو تلاش کرنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ بم ایسی جگہ ہے جہاں سے تو بم ڈسپوزل اسکواڈ والے بھی اسے برآمد نہیں کر سکتے۔

غالب بیس منٹ بعد نمودار ہوا اور اس نے اوپر سے ہاتھ ہلایا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب رہا۔ اوپر جانے کی نسبت نیچے اترنے کا عمل بہت آسان تھا۔ غالب منڈیر سے لٹکا تو اس کے پاؤں کھڑکی کے چھجے تک پہنچ گئے۔ وہاں سے وہ لٹک کر گلی میں پہنچ گیا اور ہم کوئی بات کیے بغیر چل دیے۔

"سب ٹھیک ہو گیا نا۔" میں نے گلی سے نکل جانے کے بعد کہا۔

"اوپر کپڑے سکھانے والی الگنی تھی۔" غالب بولا۔ "میں نے رسی کھول لی اور بم کو اس میں باندھ کر آتش دان کی چمنی سے نیچے پہنچا دیا۔"

"یہ تو ہوا کہ بم سیدھا آتش دان میں رکھا ہوا نظر آجاتا۔"

"میں نے اسے آٹھ فٹ نیچے اتارا تھا۔" غالب بولا۔ "اور رسی کو چمنی کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ بم دیوار کے بیچ میں ہے۔"

"چمنی میں سے دھواں نیچے نہ گرا ہو۔"

"یار کچھ نہیں ہوا۔۔۔۔" غالب نے جھلا کے کہا۔ "بے وقوف نظر ضرور آتا ہوں میں لیکن ہوں نہیں۔۔۔۔ آتش دان میں آگ کبھی نہیں جلائی گئی۔ پرانے مکانوں میں بنائے ضرور جاتے تھے اب سجاوٹی رہ گئے ہیں۔۔۔ گھروں میں بجلی اور گیس کے ہیٹر استعمال ہوتے ہیں۔"

"پیچھے ایک کتے کی وجہ سے چوکیدار آ گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اسے مجبوراً ناک آؤٹ کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آجائے گا۔"

"اب وہ سپاہی ہے اصل مسئلہ۔" غالب نے کہا۔ "شیر کے کچھار میں ہی بلکہ شیر کے منہ میں بم رکھ آئے ہیں۔"

"چار بج چکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پانچ یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ بجے تک ہمیں وطن سے نکل جانا ہوگا۔"

سڑک پر پہنچنے کے بعد پھر ٹرانسپورٹ کا مسئلہ پیدا ہوا مگر تقدیر مدد پر آمادہ نظر آتی تھی۔۔۔۔ نہ جانے کیسے ایک رکشا نمودار ہو گیا اور ہمارے اشارے پر رک بھی گیا۔ ہم نے عرض مدعا کیا۔

"دھندا کرنے نہیں نکلا ہوں میاں جی۔" وہ بولا۔ "اپنے پڑوسی کو اسپتال لے گیا تھا۔۔۔۔ اس کی بیوی کو۔"

"چلو کچھ دھندا بھی کر لو۔" میں نے کہا۔ "جو مانگو گے دیں گے۔ آج بڑا مبارک دن ہے تمہارے لیے۔۔۔۔ ثواب تو کما ہی چکے۔ ہماری مدد کرو گے تو ثواب کے ساتھ پچاس روپے بھی کما لو گے۔ سارا خرچہ نکل آئے گا۔"

"واپسی میں اپنی گھر والی کے لیے حلوہ پوری لیتے جانا۔" غالب نے لقمہ دیا۔ پچاس روپے سے انکار کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔ رکشا نکلنے کے بعد بات تو خراب ہو ہی چکی تھی۔۔۔ پھر بھی واقعی کام آئی تھی۔ ہم نے بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ پھر کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کرنا پڑی۔ رکشا والے کو بھی اس کی نیکی کا بدلہ ملا تھا۔ اس نے حقوق ہمسائیگی کا خیال کیا تھا خدا نے چاہیے مطلب سے اس کو انعام پہنچا دیا۔ ورنہ یہی رکشا والا دن میں ملتا تو شاید اتنی آسانی سے نہ مانتا اور ہم زبردستی بازو مروڑتے۔

www.paksociety.com

اس نے راستے میں ہمیں بتایا کہ اس کا پڑوسی ایک کلرک ہے جس کو ہر سالانہ انکریمنٹ کے ساتھ ایک بچے کا فریضہ بڑھانے کا شوق ہے۔ بچے رہیں نہ رہیں ہر سال اس کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ مہنگائی الگ بڑھتی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ کہ کلرک دن بدن زیادہ غریب ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن محسن نے انکشاف کیا کہ وہ خود بھی کلرک تھا تو یہی مسئلہ تھا۔ اب اللہ کا فضل ہے — سب کا خرچ پورا ہوتا ہے۔ زیادہ کی ضرورت ہو تو زیادہ محنت کرنے سے مل جاتا ہے۔ اس لیے بچوں کا مسئلہ نہیں ہے۔

ہم اس فلاسفر رکشا والے کی گفتگو سے متاثر ہوئے جو ابھی کلرکی اور کثرتِ اولاد کے معاشرتی اسباب پر مزید اظہارِ خیال کرتا اگر ہماری منزل نہ آ جاتی — وہ پچاس کا نوٹ لے کر اور ہاتھ ہلا کے رخصت ہوا تو ہم نے دلاور کی کوٹھی کا رخ کیا۔ اس کوٹھی کا نقشہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ عقبی حصے میں ایک دروازہ تھا جس سے داخل ہو کے ہم نے لان میں طاہر کی لاش دفن کی تھی۔ کسی دشواری کے بغیر ہم اسی راستے سے گزر کے اندر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے ایک کونے سے جھانک کر دیکھا تو مجھے چوکیدار دروازے پر مستعد کھڑا نظر آیا۔ محسن کے ہاتھ میں بندوق نہیں تھی لیکن اس کی پتلون کی سائڈ پہ ہولسٹر میں ریوالور صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"تم اپنا کام کرو —" میں نے کہا۔ "میں چوکیدار پر نظر رکھتا ہوں۔"

"یہاں تو سارے کھڑکی دروازے بند ہیں۔" غالب نے کہا۔

"دوسری طرف جاؤ۔ شاید کچن میں کوئی موجود ہو۔" میں نے کہا۔ غالب نے سر ہلایا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا.... چند منٹ میں وہ پھر آ گیا۔

"کچن کے دروازے بھی بند ہیں۔ مجھے شیشہ توڑنا پڑے گا کسی کھڑکی کا۔" غالب نے کہا۔

"پھر تم سامنے سے جاؤ۔ ڈرائنگ روم ہی ایسی جگہ ہے جہاں کوئی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میں چوکیدار کو ادھر بلاتا ہوں۔"

غالب دوسری بار غائب ہو گیا۔ میں نے ایک پتھر اٹھایا اور سامنے والی دیوار پر مارا۔ چوکیدار ایک دم چونکا اور آواز کی سمت میں آیا۔ ریوالور محسن نے فوراً نکال لیا تھا۔ میں دیوار کے موڑ پر دیواروں کے ساتھ سانس روکے کھڑا رہا۔ جیسے ہی وہ میرے سامنے سے گزرا میں نے اس کو پیچھے سے دبوچا اور محسن نے ریوالور کا دستہ مار کے بے ہوش کر دیا۔ وہ دلاور کا چوکیدار تھا اور گلی کے چوکیدار کی طرح نہیں تھا۔ اسے ذرا بھی مہلت ملتی تو وہ مقابلہ کرتا اور میں اسے قابو نہ کر پاتا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ سابق کمانڈو ہو۔ ہم میں سے کوئی اسے اپنی صورت نہیں دیکھنے دیتا تھا۔ چوکیدار کی طرف سے مطمئن ہو کے میں سامنے والے حصے کی جانب گیا۔ غالب مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے باہر ٹھہر کر محسن کا انتظار کرنا مناسب سمجھا تاکہ خدانخواستہ اندر کوئی گڑبڑ ہو جائے۔ دلاور نے اندر تہ خانہ بھی الارم سسٹم لگا رکھا ہو یا کسی آہٹ پر وہ جاگ جائے تو غالب پکڑا نہ جائے اور ہم اس کی کوئی مدد کر سکیں۔

غالب ایک کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوا تھا۔ میں نے ایک کھڑکی کا ٹوٹا ہوا شیشہ دیکھ لیا اور جب اس کے پٹ کو دھکیلا تو کھڑکی بھی کھل گئی — غالب اندر نہ جانے کہاں تھا۔ وہ نڈر اور جری آدمی تھا جو صورت سے چغد نظر آتا تھا۔ مگر یہ اس کی ذہانت کا کمال تھا کہ ہم ایک خطرناک جوابی کارروائی کا منصوبہ بنانے میں کامیاب رہے تھے۔ اب وہ دشمن کے قلعے میں انتہائی بے خوفی سے گھس گیا تھا اور اکیلا ہی ساری کارروائی کر رہا تھا۔ مجھے بالکل خبر نہیں تھا کہ دلاور اپنے تکیے کے نیچے بھرا ہوا ریوالور رکھ کر سوتا ہوگا — اگر وہ جاگ اٹھتا اور کسی کو کمرے کے اندر دیکھ لیتا تو سوال کیے بغیر گولی مار دیتا۔ وہ ایسا آدمی تھا۔ چور یا ڈاکو بھی آتے تو انھیں مار کے گاڑ دیتا۔ اور پولیس کو ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کی خاطر بھی رپورٹ نہ دیتا۔ خود غالب بھی کم نہ تھا۔ وہ دیکھتا کہ دلاور کا ہاتھ ریوالور کی طرف جا رہا ہے تو وہ اس ہاتھ کو ہی اڑا دیتا۔

اسے اندر گئے ہوئے دس منٹ ہو گئے تھے۔ میں کچھ بے چین ہونے لگا تھا۔ اچانک گھر کے اندر سے سائرن کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی غالب دوڑتا ہوا نمودار ہوا — اندر سے کسی نے چلا کر کہا۔ "کون ہے —؟" یہ دلاور کی آواز تھی — "چوکیدار.... چوکیدار...."

غالب نے باہر چھلانگ لگائی۔ ہم ایک ساتھ بھاگے۔ تب باہر کوٹھی کے اوپر ہر طرف رات کو دن کر دینے والی سرچ لائٹس جل اٹھیں۔ اندر سے کسی نے ایک فائر کیا مگر ہم اس وقت تک عقبی دیوار پھاند چکے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھے بغیر اور کوئی سوال کیے بغیر ہم بے تحاشا بھاگے — دلاور کی کوٹھی ترچھے تیا۔ت آ گئی تھی.... سائرن اب بند ہو گیا تھا۔ مگر دلاور کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ چوکیدار کو گالیاں دے رہا تھا اور گھر کے دوسرے نوکروں کو حکم دے رہا تھا کہ ہر طرف دیکھیں اور جو نظر آئے اسے بلا تامل گولی سے اڑا دیں۔

جب ہم رکے تو دلاور کی کوٹھی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

"یہ.... یہ تم نے کیا کیا؟" میں نے پھولی ہوئی سانس کو قابو میں لا کے کہا۔

"کچھ نہیں یار — میں نے سوچا کہ چوری کا کیس بنا دوں۔" غالب نے سر ہلا کے ہنستے ہوئے کہا۔

"گویا تم نے تجوری کو ہاتھ لگایا تھا؟"

"ہاں — یہ تو تمہارے باپ کا مال.... آنکھیں کیوں دکھاتے ہو؟" غالب نے کہا۔ "پھر مال ہاتھ لگ جاتا تو اچھا تھا۔ اور تمہیں چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگ جاتا تو مزہ"

"اچھا ہوتا۔" میں نے کہا۔ "تجوری کیا کھلی پڑی تھی؟"

"نہیں.... میں نمبر ملا رہا تھا۔" غالب بولا۔ "یہ فن میں نے ایک ماہرِ نقب زن سے سیکھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کان تیز ہونے چاہئیں — اندر کی گراریاں صحیح نمبر پر کلک کرتی ہیں — تجربہ کامیاب رہا تھا۔ اس کی تجوری کے قفل کا نمبر کیا ہے؟ مرڈر — تین سو دو — مگر اس کے علاوہ بھی کوئی چکر تھا کہ تجوری کا دروازہ کھلتے ہی سائرن چلانے لگا۔"

"یہ بتاؤ جس کام کے لیے گئے تھے اس کا کیا بنا؟"

"وہ تو میں نے دو منٹ میں کر لیا تھا۔" غالب بولا۔ "اندر ایک بڑا سا گملا ہے۔ اس میں ان ڈور پلانٹ ہے۔ میں نے بم کو گملے کے پیچھے کونے میں رکھ دیا ہے — وہاں کسی کو نظر آنے کا سوال ہی نہیں۔"

صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ آدھا میل چلنے کے بعد ہم ایک رکشا پکڑنے میں کامیاب ہو گئے اور طے شدہ وقت سے دس منٹ پہلے ہی گھر پہنچے تو ہمارا خیال تھا کہ محسن اور ٹیڈی ابھی نہیں لوٹے ہوں گے مگر وہ کافی پہلے آ چکے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی کامیابی کی روداد سنائی اور مبارک باد دی۔ اس میں سات بج گئے۔ محسن نے ناشتا تیار کیا۔ جو میں نے زبردستی کھایا تاکہ کسی کو میری پریشانی کا احساس نہ ہو — حقیقت یہ ہے کہ میں بہت بڑا جوا کھیلنے جا رہا تھا۔ میرے مقابل دلاور جیسا خونخوار تھا جو آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالتا تھا۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ ہماری چال کا کوئی توڑ نکال لے اور ہم خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جائیں۔ ناکامی کی سزا صرف میرے لیے ہی نہیں تھی۔ مجھ سے زیادہ رابعہ اور شہلا کے لیے ہو سکتی تھی — ٹیڈی میرے ساتھ ہی نکلا اور میں نے سب کی گڈ لک کے ساتھ سب کو گڈ بائی کہا۔

ٹیڈی نے اپنی رکشا میں پہ پڑا ہوا اخبارات کا بنڈل پھیلایا

اطمینان سے اپنا مواصلاتی رابطہ بحال کیا — پندرہ منٹ بعد اس نے مجھے دو انگلیوں سے 'وی' کا نشان بنا کے سگنل دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ نازو خیریت سے ہے اور شہلا اور رابعہ کو یہاں نہیں لایا گیا۔ یہ میرے لیے خاصی اطمینان بخش خبر تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے میں خانیوال جانے کے لیے رکشا میں بیٹھ گیا — ساڑھے آٹھ بجے میں اطمینان کے ساتھ ایم ٹو نیو ڈی کمپلیکس کے دروازے پہ اترا۔ فیکٹری میں کام شروع ہو چکا تھا مگر دلاور ابھی نہیں پہنچا تھا۔ اس کے اتنی جلدی آنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ مگر میں اس سے پہلے پہنچ جانا چاہتا تھا۔ گیٹ کیپر نے مجھے نہیں پہچانا — وہ کوئی نیا آدمی تھا۔

"کیا کام ہے آپ کو چوہدری صاحب سے؟" وہ بولا۔

"کام کے بچے!" میں نے غصے سے کہا۔ "جو کام مجھے چوہدری صاحب سے ہوگا، وہ میں تمہیں بتاؤں گا۔ میں ان کے آفس میں بیٹھوں گا اور ان کے گھر فون کروں گا کہ میں پہنچ گیا ہوں۔"

"یس سر.... یس سر۔" وہ گھبرا گیا اور اس نے چوکیدار سے کہا کہ میرے لیے دروازہ کھول دے — وہ مجھے چوہدری دلاور کے کمرے تک لے جانا چاہتا تھا مگر میں نے اسے جھڑک دیا اور کہا کہ مجھے راستہ معلوم ہے۔ میں نے اس کے کمرے میں پی اے کے ساتھ بھی کچھ دیر گپ شپ کی، اور اس کا فون اپنی طرف کر لیا۔ پھر میں نے وہ نمبر ملایا جو مجھے دلاور کی طرف سے ملا تھا — جیسے ہی سیکنڈ بیل کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو.... میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے چوہدری دلاور کا پیغام ملا تھا۔ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے پی اے نے پلک جھپکتے میں دراز سے ریوالور نکال لیا۔

"اسے — توپ کے دہانے کا رخ اپنی طرف کرو۔" میں نے اس سے پہلے اپنا ریوالور نکال لیا۔ پی اے کا ہاتھ رک گیا — موٹاپے کے باعث وہ میری طرح پھرتیلا نہیں تھا۔

"کہاں سے بول رہے ہیں آپ؟" ٹیلی فون پر دوسری جانب سے کسی کی نسوانی آواز میں سوال کیا گیا۔

"اپنے منہ سے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے چوہدری دلاور۔ صرف آواز زنانہ ہوئی ہے یا خصلت...."

"جس ٹیلی فون پر آپ بات کر رہے ہیں وہ کہاں ہے؟" سوال اس بار سوچ سمجھ کے کیا گیا تھا۔

"ایک میز پہ۔" میں نے کہا۔ "مگر دلاور... یہ تمہاری جنس بدلنے کا واقعہ کب پیش آیا؟"

www.paksociety.com

"کہاں کرتے ہیں آپ؟" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میں چوہدری صاحب کی سیکریٹری ہوں۔ آپ کا پیغام پہنچا دوں گی لیکن آپ سے ملنے کے لیے وہ کہاں تشریف لائیں؟"

"کہیں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "بس خود پہنچ جائیں، آ جائیں جہاں میں پہلے سے موجود ہوں اور اگر ان کے پہلے سے آنے میں دیر میں یہ مجھے مقتول نہ بنا پایا تو میں انھیں منتظر ملوں گا۔ ورنہ پھر روز محشر میں ملیں گے۔" فون بند ہو گیا۔ میں نے دانت نکال کے پی اے کی طرف دیکھا: "اب تم شوق سے مجھے گولی مار دو۔" میں نے کہا اور ریوالور واپس جیب میں رکھ لیا۔ پی اے خون آشام نظروں سے مجھے گھور رہا تھا مگر الجھن کے آثار اس کی صورت سے عیاں تھے۔ وہ حیران اور پریشان تھا کہ جو شخص ایک مفرور مجرم، قاتل اور دہشت گرد قسم کی چیز تھا اور چوہدری دلاور کا دشمن نمبر ایک تھا، وہ اتنے سکون و اعتماد کے ساتھ اپنے پیروں سے چل کر یہاں کیسے آ پہنچا اور چوہدری دلاور نے اسے طلب کیا تھا تو ظاہر ہے قتل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا۔ پھر دو متحارب دشمنوں کے درمیان اس ملاقات کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ کیا وہ دونوں مذاکرات کی میز پر آمنے سامنے بیٹھ کر کریں گے؟ اور کیا اس کا یہ مطلب بھی نکالا جا سکتا ہے کہ چوہدری دلاور نے مجھے برابر کا حریف مان لیا ہے؟ یہ تسلیم کر لیا ہے کہ جنگ کے فوائد نہیں اور نقصانات کو دیکھتے ہوئے وہ لینے دینے میں لچک پیدا کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں؟ یہ ایسا ہی تھا جیسے برسر اقتدار حکومت کسی باغی گوریلا لیڈر کے سامنے اتنی بے بس ہو جائے کہ اسے ہر قسم کے تحفظات فراہم کر کے بات چیت کے لیے مدعو کرے۔

"ایسے کب تک گھورتے رہو گے مجھے؟" میں نے کہا۔ "میں واقعی زندہ سکندر بخت ہوں، اس کی روح نہیں ہوں۔ شاید تمھیں حیرت ہے کہ میں کیسے زندہ ہوں؟"

"مجھے افسوس ہے کہ تم اب تک کیوں زندہ ہو۔" پی اے نے کہا۔

"جب چور ڈاکو، اسمگلر اور وطن فروش زندہ ہیں، شیطان صفت انسان زندہ ہیں، خوشامدی چمچے اور الو کے پٹھے زندہ ہیں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "یہاں تک کہ تم جیسے چمچے اور کتے کے پلے زندہ ہیں تو پھر میں کیسے مر سکتا ہوں۔ فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے، وہ شمع کیوں بجھے جسے روشن خدا کرے۔ کیا شعر ہے؟"

وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ ساعتیں اس کے لیے استعمال کیسے ہیں؟ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ پی اے نے ریسیور اٹھایا اور میری طرف بڑھا دیا۔

"ہاں بھئی، اپنے سکندر صاحب! اچھا کیا تم نے کہ ہماری بات مان لی۔" چوہدری دلاور کی آواز آئی۔ "مگر یار یہ تم دفتر کیوں چلے گئے؟"

"جہنم میں شاید میری اور تمھاری ملاقات نہ ہوتی..."

وہ ہنسا۔ "ابھی تک مسخری کی عادت نہیں گئی تمھاری۔ میں تم سے ملنے کے لیے آدھے گھنٹے میں آ رہا ہوں۔ مگر ایک بات تو بتاؤ۔ کیا تمھیں کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ فرض کرو اس سے پہلے ہی پولیس آ پہنچے؟"

"چوہدری صاحب! کیا دشمن کو کمزور سمجھنے والے کو عقل مند مانا جا سکتا ہے؟"

"نہیں، مگر کمزور آدمی بھلا دشمنی کا حوصلہ کہاں رکھتا ہے؟" وہ بولا۔

"پھر کیا آپ نے مجھے کمزور اور احمق سمجھا تھا کہ یہ سوال کیا؟" میں نے کہا۔ "خوف تو ایک احساس کا نام ہے۔ آدمی سڑک پر چلتے ہوئے ڈرے کہ کہیں وہ حادثے کا شکار نہ ہو جائے، یا گھر میں ڈرے کہ کہیں چھت اس پر نہ آ گرے۔ موت سے ڈرے۔ موت کا ایک دن معین ہے اور اس کے بارے میں نہ تم جانتے ہو نہ میں کہ آج کا دن کس کی موت کے لیے ہے۔ خواہ تو تمھارے لیے بھی ہے اور میرے لیے بھی۔ مگر تم اس کے احساس سے دور رہنا چاہتے ہو۔ یقین نہیں کرنا چاہتے کہ میری طرح تم بھی غیر محفوظ ہو۔ مگر کیا حقیقت کو تسلیم نہ کرنے سے حقیقت بدل جاتی ہے یا اس کا وجود باقی نہیں رہتا؟"

"کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ میرا مطلب ہے، ڈرا رہے ہو؟"

"نہیں، میں تمھیں سمجھا رہا ہوں کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم مجھ سے ملنے آ سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"تمھارے لہجے اور تمھاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم اپنی حفاظت کا انتظام پہلے سے کر کے آئے ہو۔"

"کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟" میں نے کہا۔ جواب میں وہ معذرت سے ہنسا اور اس نے فون بند کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے مجھ سے بالواسطہ رابطے کے لیے کسی اور کا فون نمبر استعمال کیا تھا۔ اگر فون خود ہی فرماتا کہ میں سکندر بخت ہوں تو مجھ سے پوچھا جاتا کہ میں کون ہوں اور غلط نام بتاتا تو دوسرا سوال یہ ہوتا کہ مجھے کس سے بات کرنا ہے۔ وہ فون نمبر کسی ایسے شخص کا ہوگا جس کی سماجی حیثیت عام لوگوں کی نظر میں بہت معتبر اور شبہے سے بالاتر ہوگی لیکن وہ درمیان کا آدمی ہوگا۔ اس طویل زنجیر کی ایک کڑی جس کا ایک سرا دلاور تھا تو دوسرا مشرقی پاکستان کا کوئی دہشت پسند لیڈر جو علیحدگی کے جذبات کو ہوا دینے کے لیے صوبے کے طول و عرض میں تخریب کاری میں مصروف تھا۔ مجھ سے کسی عورت نے بات کی تھی جس کا لب و لہجہ مگر سیکریٹری والا نہیں تھا۔ وہ کسی کی بیوی یا گھر کی کوئی عورت تھی۔ اگر وہ بھی صنف ... میں شامل نہیں تھی تو اس کو اتنا ہی بتایا گیا ہوگا کہ سکندر بخت نام کا کوئی شخص کبھی چوہدری دلاور سے بات کرنا چاہے تو دلاور کو فلاں نمبر کے

پیغام دے دیا جائے۔ درمیان میں نمبروں کا سلسلہ دراز بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ احتیاط اتنی زیادہ اہم اور ضروری نہیں تھی۔ نمبر مجھے یاد تھا اور میں کسی بھی وقت معلوم کر سکتا تھا کہ یہ کس کے گھر کا نمبر ہے۔

"چوہدری صاحب تم سے ملنے آ رہے ہیں۔" پی اے نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔ "یا تم مجھے کوئی فلمی ڈائیلاگ سنا کے بے وقوف بنا رہے تھے؟"

"اللہ نے تم کو دلاور کا پی اے بنا دیا۔ تم کو بے وقوف بنا کے وقت ضائع کون کرے گا؟" میں نے کہا اور ریوالور پھر جیب میں رکھ لیا۔

"میں تم کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا۔"

"کتنا؟ اپنے برابر یا اپنے باس کے برابر؟" میں نے کہا۔

"میری بات مت کرو۔ تم سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔" پی اے نے کہا۔ وہ دلاور ہی کا ہم عمر لیکن نسبتاً عیار نظر آنے والا آدمی تھا جس سے میری بارہا ملاقات ہو چکی تھی مگر ہم نے کبھی اس طرح گفتگو نہیں کی تھی۔ مگر اب ظاہر ہوتا تھا کہ اس کو بھی میرے تمام حالات کا علم ہو چکا ہے۔

"تم کو کچھ کہنا ہے تو بلا تکلف کہہ ڈالو۔" میں نے کہا۔

"تم مجھے اچھا آدمی نہیں سمجھتے۔" وہ بولا۔ "ٹھیک ہے، میں اچھا آدمی نہیں ہوں۔ بننا چاہتا تھا مگر بن نہیں سکا۔ اب بننا بھی چاہوں تو بن نہیں سکتا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ میں مطمئن ہوں اور دنیا کی پروا نہیں کرتا کیونکہ مجھے دوسرے کچھ زیادہ مختلف نہیں لگتے۔ مجھے پیسے کی ضرورت تھی اور پیسہ مجھے ضرورت سے زیادہ ہی مل رہا ہے۔"

"تمھارے نامۂ اعمال میں تو اندراج کی جگہ نہیں بچی ہوگی۔ اصل جمع سود تمھارا آخرت میں دلاور کے بینک بیلنس سے زیادہ ہے یا کم؟" میں نے کہا۔

"یہ میرے حساب کا کام نہیں آ رہا ہے۔ اس سے میرے بیوی بچوں کو معاشرے میں عزت ملی ہے۔ آسائش کی زندگی ملی ہے۔ وہ خاصے بڑے گھر میں رہتے ہیں۔ جہاں ہر ایک کے پاس ایک کار ہے اور ہم بیمار ہوں تو بہترین علاج کرا سکتے ہیں۔ ان کو نہیں معلوم کہ یہ پیسہ صرف پی اے کی تنخواہ نہیں ہوتا۔ وہ تو سمجھتے ہیں کہ میرا عہدہ بہت بڑا ہے اور فراخ دل چوہدری میری خدمات کا بہت اچھا صلہ دیتا ہے۔ اتنا کہیں اور مل ہی نہیں سکتا۔ میرے کام کچھ نہیں آتا۔ میں دل کا مریض ہوں۔ ہائی بلڈ پریشر سے دل بڑھ گیا ہے اور یہ مرض قابل علاج نہیں۔ دنیا بعض کے ساتھ یہ مرض جان لیوا ہو جاتا ہے۔ میں کچھ کھا پی نہیں سکتا۔ نمکین نہ میٹھا۔ اس عمر میں ایسا بھی کیا جینا۔ یار دوست بھی تھے نہیں۔ سگریٹ شراب حرام ہی نہیں ممنوع ہیں۔ چنانچہ پیسہ دوسروں کی ضرورت ہے جسے میں پورا کرنے پر مجبور ہوں۔

اس پیسے نے میرے ایک بیٹے کو ڈاکٹر بنا لیا اور بیٹی کو عزت سے رخصت کرنے میں میری مدد کی۔ دوسرے بیٹے کو ویڈیو شاپ قائم کرنے میں مدد دی۔ میں اس پیسے کے بغیر کچھ نہ ہوتا۔ میری اولاد اپنے پیروں پر اس طرح نہ کھڑی ہوتی۔ چنانچہ میں اس پیسے کی خاطر سارے گناہ اپنے کھاتے میں ڈال رہا ہوں اور ساری خوشیاں ان کو بخش رہا ہوں۔ وہ گناہگار نہیں ہیں کیونکہ وہ اس پیسے کو جائز اور حق حلال کی کمائی سمجھ کے خرچ کرتے ہیں۔ اگر ان کو اس بات کا یقین نہیں ہوتا تو وہ میری دل سے کبھی عزت نہ کرتے۔ میں گناہ سمجھ کے پیسہ کماتا ہوں اور جہنمی ہوں لیکن جس سے پیسہ لیتا ہوں اس کا وفادار نہیں ہوں۔ تم اچھے آدمی ہو۔ میں جانتا ہوں لیکن تم میرے مالک کے دشمن ہو۔ اس لیے تم مجھ سے بھی نفرت کرتے ہو۔ یہ نفرت میں نے ہمیشہ محسوس کی ہے۔ مگر تم نے کبھی انسانوں کی مجبوری کو محسوس نہیں کیا۔ تم یہ کبھی نہیں سمجھے کہ نیکی کے راستے سے آدمی جب چاہے بدی کے راستے پر چلنے لگے مگر جس راستے پر میں ہوں اسے چھوڑنا میرے لیے ناممکن ہے۔ آج میں تم کو یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم مجھے اپنا دشمن مت سمجھو۔"

"لیکن تم میرے دوست بھی نہیں ہو سکتے۔" میں نے اس بظاہر کمزور اور مجبور و معتمد شخص کو افسوس سے دیکھا۔

"دوست کیسے ہو سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "اگر ابھی چوہدری صاحب آ کے مجھے حکم دیں کہ تمھیں شوٹ کر دوں تو میں ان کا حکم مانوں گا۔"

"تم نے تو ان کا حکم ملنے سے پہلے ہی ریوالور نکال لیا تھا۔ کوشش ضرور کی تھی۔" میں نے طنز سے کہا۔

"میں اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں رہ سکتا۔ خصوصاً ایسے شخص کے سامنے جو مجھے بھی اپنا دشمن سمجھتا ہو۔ میرا یہ ردعمل فطری تھا۔" وہ بولا۔ "اس کے علاوہ مجھے حکم تھا کہ تم کبھی اندر گھسو تو تمھیں گولی مار دوں۔"

"پھر تم نے ماری کیوں نہیں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "اب مار دو۔"

"تمھاری بات سننے کے بعد یہ ضروری نہیں رہا۔" وہ بولا۔ "تم جوان آدمی ہو، پڑھے لکھے ہو۔ بے شک دلاور نے تم سے تمھارا حق چھینا مگر بازوؤں میں دم ہو تو آدمی نئی دنیا آباد کر لیتا ہے۔ تم یہاں موت کو گلے لگانے کیوں آ گئے ہو؟"

"تم مجھے مشورہ دے رہے ہو کہ میں بھاگ جاؤں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تم ہر طرف سے محصور ہو۔ کیا یہ بات تم نہیں جانتے؟" وہ بولا۔ "آج میں پہلی بار غداری کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ غالباً یہ کمزوری اس بات کا اشارہ ہے کہ میرا وقت قریب ہے اور قدرت مجھے نیکی کمانے کا ایک موقع دینا چاہتی ہے۔ شاید کہ بعض اوقات نامۂ اعمال کی ایک نیکی سارے گناہوں کی سیاہی دھو ڈالتی ہے۔"

www.paksociety.com

تحائف بانٹنے میں سب کو ایک جیسے احکامات ملے ہوئے ہیں، اب تم جانا بھی چاہو تو جا نہیں سکو گے۔"

"پھر تم یہ مشورہ مجھے ہی کیوں دے رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"تم جانا چاہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "مجھے جینے دو اپنے کام کرو۔ میرا ریوالور لے لو۔" اس نے ریوالور نکال کے میرے سامنے رکھ دیا۔ "پھر مجھے دھکیلتے ہوئے ڈھال بنا کے آگے لے جاؤ۔ میں صاحب کو منع کر دوں گا کہ گولی نہ چلائیں۔ ورنہ میں مارا جاؤں گا۔ سڑک تک مجھے ایسے ہی لے جاؤ۔ پھر ناک آؤٹ کرو اور بھاگ جاؤ۔ آگے اللہ بیلی۔"

پاسنگ سن زدہ بیٹیوں کا پشیماں ہونا! مجھے اس بے بس آدمی پر ترس آیا جو اب عمر کی آخری منزل پر پہنچ کے عذاب آخرت کے خوف کا شکار ہوا تھا۔ یہ احساس اس کو بہت دیر سے ہوا تھا لیکن وہ چھوٹی سی بات یہ مان رہا تھا کہ ایک نیکی کمائے گا تو اس کا عذاب شاید کم ہو جائے گا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ اس کو یہ موقع فراہم کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ بہت بدبخت تھا وہ شخص جس نے بہت کمایا اور سب گنوا دیا۔

"میرا دل تمہاری جرأت سے صاف ہوا۔" میں نے کہا۔ "مگر میں یہاں دلاور سے خود ملنے آیا ہوں۔ اپنی مرضی سے اور اپنے پیروں پہ چل کر اور اپنے تمام معاملات اور مسائل کو ذہن میں رکھتے ہوئے۔ تم نے کہا کہ آگے اللہ بیلی۔ آگے پیچھے ہر جگہ اللہ بیلی نہ ہوتا تو میں کہاں ہوتا۔ تم بالکل فکر مت کرو۔ اس نے مجھے عقل کی حفاظت ضرور دی ہے۔ مجھے اس پر پورا بھروسا ہے۔ دلاور چاہے گا بھی تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

اس نے مایوسی اور دکھ سے سر ہلایا۔ "تم نوجوان ٹھوکر کھائے بنا سنبھلتے ہی نہیں۔ دوسروں سے کچھ نہیں سیکھتے جو ٹھوکریں کھا چکے ہیں۔"

"اپنے تجربات کے بغیر اپنی زندگی ایسی ہی ہے جیسے چابی کے کھلونے کی زندگی۔" میں نے کہا۔ "میں دوسروں کی عقل کی چابی سے نہیں اپنی مرضی سے چلنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ مجھ میں اور کھلونے میں کچھ فرق رہے۔"

"تمہاری مرضی۔ مگر یوں نہ بیٹھو میرے سامنے۔" وہ بولا۔ "کم سے کم ریوالور نکال لو۔ دلاور آتا ہی ہوگا۔"

میں نے اس کی یہ خواہش پوری کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ مگر اسی وقت میری نگاہ کو ایک تصویر نے متوجہ کر لیا تھا۔ یہ تصویر ڈاکٹر حکیم کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی خبر تھی کہ البرٹ وکٹر اسپتال کا ایک ملازم کل اس وقت ایک تیز رفتار گاڑی کی ٹکر سے شدید زخمی ہو کے انتقال کر گیا جب وہ ڈیوٹی پر حاضری کے لیے جا رہا تھا۔ متوفی کے بارے میں اسپتال کے ذرائع نے بتایا کہ وہ جعلی اسناد پیش کر کے ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر واسع اس پر پہلے شک کا اظہار کر چکے تھے۔ اس کو ملازم ہوئے ابھی ایک مہینہ ہی ہوا تھا اور اسپتال میں اس کے کوائف کی تحقیق اور اس کی رہائش پتے کا کوئی ریکارڈ بھی نہیں ہے۔ لاش کو پولیس نے ضابطے کے بعد سول اسپتال بھیج دیا تھا لیکن رات گئے تک اس کا کوئی وارث اسپتال نہیں پہنچا تھا۔ پولیس نامعلوم گاڑی کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مزید انکشافات کی توقع ہے۔

خبر پڑھ کر میرا دماغ چکرا گیا۔ تصویر اسی شخص کی تھی جس سے میں البرٹ اسپتال میں ملا تھا جو انتہائی پُراسرار طریقے پر سائے کی طرح ہمارے ساتھ لگا ہوا تھا اور جس نے اپنی ناکامی پر مشتعل ہو کے ہم پر گولی چلانے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا اور اس بات کا خیال بھی نہیں کیا تھا کہ اسپتال کے کسی ڈاکٹر کا مسلح ہو کے آنا اور یوں فائرنگ کرنا ہی اس کی حیثیت کو مشتبہ بنا دیتا ہے۔ بلاشبہ اس کو ناکامی کی سزا دی گئی تھی اور سزا دینے والے بھی وہی شکاری تھے جن کے جال کو ہم نے کاٹ دیا تھا۔

لیکن زیادہ چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ خبر میں حادثے کا وقت دوپہر کے قریب بتایا گیا تھا۔ دوپہر کے بعد تو لاش سرد خانے پہنچ چکی تھی مگر ہم نے اس شخص کو رات کے وقت زندہ دیکھا تھا۔ پھر کیا اس کی روح مردہ خانے سے آ کر وہ فرض پورا کر رہی تھی جو زندگی میں پورا نہ ہوا تھا۔ نہ مجھے اپنی عقل یا بصارت پر شبہ تھا اور نہ رابعہ انکار کر سکتی تھی کہ تصویر اسی شخص کی نہیں ہے۔

دن میں مرنے والا رات کو ہمیں زندہ نظر آیا تو یقیناً اس خبر میں کوئی گھپلا تھا۔

پہلی بات تو میں نے یہ دریافت کی کہ خبر کسی اسٹاف رپورٹر نے نہیں دی تھی بلکہ پریس ریلیز تھی۔ ایک حادثے کے بارے میں اخباری نمائندوں کا ذریعہ اطلاعات تھانہ ہوتا ہے یا اسپتال۔ اگر خبر اسٹاف رپورٹر کے حوالے سے شائع کی جاتی ہے۔ حادثہ بڑا ہو تو پولیس کا یا خبر رساں ایجنسی کا حوالہ ہوتا ہے مگر کوئی اسپتال کسی مرنے والے کے بارے میں پریس ریلیز جاری نہیں کرتا۔ حادثات میں زخمی ہونے والے سول اسپتال ہی جا کے مرتے ہیں مگر ان کی بابت سول اسپتال کی جانب سے کوئی پریس ریلیز نہیں جاری ہوتی کہ فلاں فلاں تھانے سے حادثے کے اتنے زخمی لائے گئے تھے اور ان میں سے اتنے جانبر نہ ہو سکے۔ یہ خبر ان کی طرف سے دی گئی تھی اور دلاور نے اپنے خصوصی ذرائع استعمال کر کے شائع کروا دی تھی۔

"میں ایک اور فون کر لوں؟" میں نے کہا اور اس کی مرضی کے مطابق ریوالور کو انتہائی جارحانہ انداز میں اس کی جانب رکھا۔

"کر لو۔ مگر خیال رکھنا کہ دلاور آتا ہی ہوگا۔" وہ بولا۔

میں نے سر ہلایا اور ڈائریکٹری سے البرٹ وکٹر اسپتال کا نمبر کوشش کر کے ملایا۔

"ہیلو۔" کسی نے سخت بیزار لہجے میں کہا۔

"مجھے اس خبر کے بارے میں..."

"ارے بابا... ہم تو صبح سے دس بار بتا چکے ہیں کہ خبر غلط ہے۔ کوئی ڈاکٹر حکیم وحید ہمارا ملازم نہیں تھا۔" بیزار شخص چلانے لگا۔ "ہم نے پریس ریلیز نہیں دی ہے۔ اب سارا دن سارا شہر ہم سے پوچھتا ہے کہ کیا جواب کریں..."

"آپ اس کی تردید جاری کر دیں۔" میں نے اس کی بیزاری کو جائز تسلیم کرتے ہوئے ہمدردی سے کہا۔

"کر دیا بابا کر دیا۔ مگر وہ تو کل چھپے گی... آج کیا ہوگا۔ فون پر جواب دیتے دیتے ہم تو پاگل ہو جائیں گے۔" وہ بولا۔

"پاگل ہوں آپ کے دشمن... آپ پریشان نہ ہوں، کہہ دیں۔"

"پھر اسپتال فون کرنے والے ضرورت مند پاگل ہو جائیں گے۔" وہ میرے ہمدردانہ لہجے سے متاثر ہوا تھا۔

"پھر آپ صبر و تحمل سے کام لیں۔ کوئی سکون بخش دوا کھا لیں یا پھر چھٹی کر کے گھر چلے جائیں۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ بوڑھا مجھے غور سے دیکھتا رہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" وہ بولا۔

"بات تو ابھی میری سمجھ میں نہیں آئی... تمہیں کیا سمجھاؤں۔ یہ ہے ایک سرواہ خبر کہ مُردہ زندہ ہو گیا۔" میں نے تصویر پر انگلی رکھ کر کہا۔ "یہ شخص دوپہر کو فوت ہوا۔ شام سے پہلے اٹھ کھڑا ہوا اور مردہ خانے سے فرار ہو گیا۔"

"چوہدری دلاور سے میں نے اکثر سنا ہے کہ تم جوکر ہو۔" بوڑھا بولا۔

خبر میں ایک گھپلا اور بھی تھا۔ میرا زخمی ہو کے البرٹ وکٹر اسپتال پہنچنا بھی حادثہ تھا۔ مجھے وہاں پہنچانے والا ایک پولیس افسر تھا۔ حادثے کے کیس تو سول اسپتال جاتے ہیں۔ پھر وہ مجھے البرٹ وکٹر اسپتال کیوں لے گیا تھا؟ بظاہر قانونی الجھن سے بچنے کے لیے۔ میری چوٹیں معمولی نوعیت کی تھیں۔ اس نے اسپتال کے کسی ڈاکٹر سے سازباز کر کے یا پھر کوئی دوسری کہانی بیان کی۔ کوئی ایسی کہانی جس پر یقین کرتے ہوئے البرٹ اسپتال والے مجھے داخل کر لیں۔ پیشہ ورانہ مریض کے لیے یہ سب ہو گیا تھا۔ شاید دس پندرہ کسی کے ہاتھ پر بھی رکھ دیے ہوں۔ البرٹ وکٹر ایک نیم اسپتال تھا مگر ایک گندی مچھلی کسی تالاب میں نہیں ہوتی۔ بے شمار لوگوں کے درمیان کوئی پیسے کا لالچی بھی بیٹھا ہے جو اس نیک نامی پر بٹا لگاتے ہوئے شرمندہ نہیں ہوتا۔

آخری ناقابل فہم بات یہ تھی کہ میرا البرٹ وکٹر اسپتال پہنچنا اگر اتفاق تھا تو جعلی ڈاکٹر حکیم وہاں کیسے پہنچ گیا۔ کیا وہ شخص جس کی گاڑی کو میں نے ٹکر ماری تھی اور جس نے خود کو پولیس انسپکٹر ظاہر کیا تھا، وہ بھی ایک شکاری تھا یا اسی نے دلاور کو مطلع کیا تھا کہ آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔ سکندر بختا کا نام ظاہر ہے میری گاڑی کے سامنے آ کر اور غش کھا کے اس کو فلاں جگہ پہنچا دیا ہے۔ آگے آپ سنبھال لیں۔ دلاور فوراً حرکت میں آ گیا اور اس نے ایک قابل اعتماد آدمی کو حفاظتی انتظامات کے ساتھ اسپتال میں پہنچا دیا مگر یہ آدمی اعتماد کے معیار پر پورا نہیں اترا۔ چنانچہ جلد بازی کو معاف کر دیا گیا اور اس کی وفات تو رات کو ہوئی مگر حادثے کا دوپہر کا وقت بتا دیا گیا۔ دلاور نے جلدی میں یہ غلطی کی کہ پریس ریلیز کو اسپتال سے منسوب کر دیا ورنہ اس جعلی ڈاکٹر حکیم کو ناکامی اور نااہلی کی سزا دینے کے بعد یہ بہتر ہوتا کہ اس کی لاش پولیس کے حوالے کر دی جاتی اور دلاور اپنے ذاتی تعلقات اور پیسے کی طاقت سے پولیس کی خدمات حاصل کرتا۔ وہ حادثے کا بہت اچھا انتظام کر سکتے۔ مثلاً جائے واردات کو بدل دیتے۔ یہ کہتے کہ متوفی رات کو ڈیوٹی پر جا رہا تھا۔ چنانچہ نامعلوم گاڑی والے اس کو ٹکر مار کے فرار ہو گئے۔ پولیس اس کی لاش کو ناقابل شناخت بنا سکتی تھی۔ اور وارث قرار دے کر مردہ خانے میں بھجوا سکتی تھی۔ میڈیکل کے طالب علموں کو تجربات کے لیے مرنے کے بعد والا ڈھانچہ مل جاتا۔ لاوارث کہا جاتا ہے کہ بس ہو جاتے ہیں زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب۔ موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا۔

مگر پلان کے نقائص ہی مرتے تھے۔ یہ سب کچھ دلاور نے تعمیل کیا ہوتا تو کسی نے بہت گھرا کے اس کے بعد پھر اپنی عقل پہ بھروسا کرتے ہوئے خبر چھپنے کی تسلی کی۔ یا دوسری بات باقی۔ دلاور کی طرف سے نفی کرنے والے کوئی جانتے تھے یا خبر نے ایک اور وضاحت بھی کر دی تھی کہ مجھے اسپتال میں نظر بند بھی کیوں رکھا گیا تھا۔ اگر میرے محافظ اور نگران خود شکاری تھے تو انھوں نے مجھے شکار کیوں نہیں کیا۔ صرف اسیر رکھنا کیوں کافی سمجھا۔ دراصل دلاور مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ پہلی بار اس کی دعوت کو ٹھکرانے والی سمجھ کے مسترد کر دیا تھا۔ دوسری بار وہ مجھے اس اسپتال سے لے جانا چاہتا تھا اور میرے گھر ہوٹل میں آنے کا منتظر تھا۔ اس کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔ مجبوراً اس نے وہ چال چلی جس میں کامیابی یقینی تھی۔ شہلا اور رابعہ کو یرغمال بنا کے وہ مجھے بلانے میں کامیاب رہا تھا۔

میں نے سول اسپتال فون کرنے کا سوچا اور پھر ارادے کو ملتوی کر دیا۔ ان کا جواب اس کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ یہاں کسی ڈاکٹر حکیم کی لاش نہیں لائی گئی جو کسی کار کے حادثے میں زخمی ہوا ہو۔ میں پولیس سے پوچھتا تو وہ سب سے زیادہ لاعلم بن جاتے۔ اخبار والوں سے پوچھتا تو پریس ریلیز کا مسودہ ہی نہ ملتا۔ یہ نہ معلوم ہوتا کہ پریس ریلیز کون

تھا گیا تھا خبر کس نے کاتب تک پہنچائی اور اشاعت میں شامل ہو گئی۔ اخبار کے دفتر میں رات کے وقت کاتبوں کی ایک ٹیم سر جھکائے بغیر کام کرتی ہے اور کتابت کے لیے ان میں خبریں برابر تقسیم ہوتی رہتی ہیں، نتیجہ میں کوئی نہیں بتا سکتا کہ کون سی خبر کس نے دی تھی اور کس کاتب کو دی تھی۔

خبر میں میری دلچسپی ایک قدرتی بات تھی لیکن اس کے بعد میں ذہنی طور پر خبر کا تجزیہ کرنے لگا اور پولیس کی طرف سے غافل ہو گیا۔ ریوالور میری گرفت میں موجود تھا مگر اپنی حفاظت کے لیے نہیں پہلے سے جانتا تھا کہ میں اس ریوالور میں مشغول۔ اگر وہ چاہتا تو کسی بھی وقت مجھ سے ہتھیار رکھوا لیتا لیکن اس کی باتیں سننے کے بعد میں نے مان لیا تھا کہ وہ میرا دشمن نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ گھومنے والی کرسی پر اطمینان سے سر پیچھے ٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دوبارہ اس کی طرف توجہ کی تب بھی وہ اسی طرح خاموش تھا اور بے حس و حرکت نگاہیں چھت پر لگائے بیٹھا تھا لیکن اچانک مجھے اس کی حالت پہلے سے مختلف لگی۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت نظر آئیں۔ میں ایک دم اٹھا اور میز کا چکر لگا کے اس کے پاس پہنچا۔

"شفاعت صاحب!" میں نے کہا۔ اور اس کا شانہ ہلایا۔ وہ تھوڑا سا ہلا اور بائیں طرف جھک گیا۔ میرے لیے شک کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ وہ مر چکا تھا۔ پانچ دس منٹ پہلے وہ زندہ تھا میں یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ میں نے سوچ بچار میں کتنا وقت صرف کر دیا تھا لیکن اتنا یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس وقفے میں کوئی بھی کمرے میں داخل ہوا تھا اور نہ کھڑکی میں نظر آیا تھا۔ اس کی موت کے طبعی ہونے میں شبہ نہ ہونے کے باوجود میرے دل میں ایک خلش پیدا ہو گئی۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ابھی چند منٹ پہلے اس نے اپنی گمشدہ زندگی پر میرے سامنے اپنی مجبوری کا اعتراف کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ اس کی طرف سے میرا دل صاف ہو جانا چاہیے۔ کیا یہ سب قدرت کا انتقام تھا؟ فرشتۂ اجل کی روانگی سے پہلے گناہ گار اور خطاکار آدمی پر اپنا غفور الرحیم ہونا ثابت کرنے کے لیے اس نے ایک شخص کو چند منٹ دیے کہ وہ اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر لے۔ مگر اسے یہ ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے جسے ثبوت درکار ہی نہیں۔ پھر کیا یہ اتفاق تھا کہ اعتراف جرم و ندامت کے فوراً بعد دل نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

میں ابھی حیرت اور خوف، دکھ اور بے یقینی کے احساس سے دم بخود کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے فوراً کسی کو آواز دے کر بلانا چاہیے یا دروازہ بند کر کے بھاگ جانا چاہیے کیونکہ یہ حادثہ میرے خلاف ایک جرم بھی بنایا جا سکتا تھا کہ اسی وقت مجھے اپنے سامنے کھلے دروازے میں چوہدری دلاور نظر آیا۔

وہ اطمینان سے چلتا ہوا میری طرف دوستانہ انداز میں مصافحے کے لیے آیا۔

"تو بھئی ایڈیٹر صاحب! ہم نے بلوا ہی لیا آپ کو۔" اس نے خوشدلی سے کہا۔ بلوا لیا کہہ کے اس نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ "تم تو کبھی نہ آتے۔ مگر دیکھو کہ تم کتنے مجبور ہو کر آ گئے۔" یہ مجبوری ویسی ملاقات تھی جیسی دوسری جنگ عظیم کے بعد شہنشاہ ہیرو ہیٹو کی اتحادی فوجوں کے سپریم کمانڈر کے درمیان ہوئی تھی۔ چڑھتے سورج کی سرزمین کا وہ شہنشاہ جس کی طرف رعایا نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی اعتراف شکست کی دستاویز پر دستخط کرنے آیا تھا۔ آنا اس کے اختیار کی بات نہیں تھی۔

"یہ... یہ اسے کیا ہوا؟" چوہدری دلاور نے میری ناخوشی، میری صورت کے تاثرات کو دیکھ کر کہا۔

"اسے اللہ نے بلوا لیا۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی میری طرح مجبور ہو گیا تھا غالباً۔"

"اچھا... گویا یہ مر گیا۔" چوہدری دلاور نے جذبات سے عاری اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کا رد عمل اتنا سرسری تھا کہ میرا چہرہ جلنے لگا۔ وہ یوں پوچھ رہا تھا جیسے ذکر کسی آدمی کا نہیں بلکہ پتنگ کا تھا۔ کتا بلی پالنے والے بھی اس سے اتنے مانوس ہوتے ہیں کہ ان کے مرنے پر رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

"چند منٹ پہلے تک یہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا میری اور تمہاری طرح۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اور یہ تمہارا ملازم تھا۔ تم ایسے بات کر رہے ہو جیسے..."

"ارے بھئی تم کیوں خفا ہوتے ہو؟" دلاور بولا۔ "موت سے کس کو رستگاری ہے۔ یہی تو کہتے ہیں کہ ہم کھلونا ہیں... بندے ہیں۔ فقط شعر پڑھتے ہیں تو آپ اس پر بھی خفا ہو جاؤ گے۔ اب مرنا تو سب کو ہے۔ بندہ بشر کیا اور جانور کیا۔ درخت اور یہ سب دنیا کا دھندا کاٹھ کباڑ سب ختم ہو جانا ہے۔"

"تمہارے نزدیک اس آدمی میں اور کاٹھ کباڑ میں کوئی فرق نہیں؟ اور کیا یہ اب یہاں ایسے ہی پڑا رہے گا؟" میں نے کہا۔

"نہیں، اٹھوا دیتے ہیں اسے۔" دلاور نے بے نیازی سے کہا۔

"چوہدری صاحب! زندہ انسانوں کی تو کوئی اہمیت ہے نہیں آپ کے نزدیک، مرنے والے کا بھی لحاظ نہیں؟ آخر یہ نمک خوار تھا آپ کا۔ اس کے وارثوں کو اطلاع دینا، تجہیز و تکفین میں شریک ہونا، یہ سب آپ کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔"

"ہاں یار ہے، میری اخلاقی ذمہ داری ہے۔ تم کیوں پریشان ہو آخر۔ یہ تمہارا نمک خوار تو نہیں تھا۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "سب کچھ ہو جائے گا۔ میں بھی پہنچ جاؤں گا نماز کے وقت۔ یہ کام دوسرے لوگ کریں گے وہ تم آؤ میرے ساتھ۔ ہم اتنی دیر

میں بات کر لیں۔ آخر تم اس سے ملنے تو نہیں آئے تھے۔"

"کمال ہے چوہدری صاحب!" میں نے بادل ناخواستہ اور حقارت کے ساتھ جاتے ہوئے کہا۔ "تم نے ابھی تک یہ نہیں پوچھا کہ آخر یہ کیسے مر گیا۔ صرف میں تھا اس کے پاس۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ دروازہ کھول کے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "سکندر صاحب! بندے کا دل رہنا چاہیے۔ سب کہا جاتے ہیں کہ اس کا دل حد سے بڑھ گیا تھا مگر شاید یہ تم نہ سمجھو۔"

"کیوں؟ کیا دل نہیں ہے میرے پاس؟" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔

"یہ مطلب نہیں تھا میرا۔" دلاور نے بیٹھتے ہوئے مجھے اپنے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "دل تو ہے تمہارے پاس مگر جوان ہے اور تمہارے کام بھی کمال کے ہیں۔ وہ دماغ سے ہی صاحب کے کام لگتے ہیں۔ مگر کبھی زندگی اور موت کا توازن ایک بال پر قائم ہو جاتا ہے۔ ریت کا ایک ذرہ سے پریشان رکا رہتا ہے۔ ہم نے دسویں جماعت کے جغرافیے میں پڑھا تھا کہ گلیشیئر سو سال میں چند انچ سرکتے ہیں۔ آواز کی لہروں سے۔ اونچا بول لو یا ایک جھٹکا مار دو تو برف میں جلتے ہیں اور پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ یہ بندہ بھی بس ایسے ہی زندگی کے دھاگے سے لٹکا ہوا تھا۔ دھاگا کمزوری کے جانے کی اتنی ہوئی تھی کہ ایک سانس میں ٹوٹ جائے۔"

"تم یہ فلسفہ مجھے کیا سمجھانے کے لیے بول رہے ہو؟" میں نے اسے غور سے دیکھا کیونکہ اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی جو کچھ کشتی محسوس ہوتی تھی۔

"یہی کہ مجھے اس کی اچانک موت کا سبب معلوم ہے۔" چوہدری دلاور نے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا۔ "تم دیکھو گے؟"

"اب دیکھنے کو کیا رہا ہے؟" میں چونکا۔

"وہی اس بندے کی موت کا سبب۔" چوہدری دلاور بولا اور اس کا ایک ہاتھ جیب میں گیا۔ میرا رد عمل فوری اور اضطراری تھا۔ میں اس بات سے اور کیا مطلب نکالتا کہ وہ مجھے موت کا سبب بتانا نہیں دکھانا چاہتا ہے یعنی ریوالور۔ ایک دم میرے ہاتھ میں آ گیا لیکن اس کا دلاور پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا جیسے میرے ہاتھ میں اصلی نہیں نقلی ریوالور ہو۔ اس شخص کی اداکارانہ صلاحیت کا میں ہمیشہ سے معترف تھا۔ وہ اپنے رد عمل کو بھی کنٹرول کر لیتا تھا۔ اپنی صورت سے وہ خوف یا پریشانی اور گھبراہٹ کا کبھی اظہار نہیں ہونے دیتا تھا اور اپنے لہجے سے یا صرف مسکراہٹ سے اپنی بات کہہ جاتا تھا جو زبان نہیں کہتی تھی۔ اس نے جیب میں سے ایک سفید کاغذ نکالا جس کو چار مرتبہ تہ کیا گیا تھا۔ پورا کھل جانے پر وہ فل اسکیپ سائز کی شیٹ بن گیا جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کے میرے سامنے پھیلا دیا۔ میرے دماغ کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اس پر مارکر سے موٹے واضح حروف میں صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا: "غدار کے لیے سزائے موت۔"

وہ سارا فلسفہ جو دلاور نے بگھارا تھا ایک دم میری سمجھ میں آ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا ملازم کس طرح اچانک آواز نکالے بغیر مر گیا تھا۔ اسے کسی نے گولی نہیں ماری تھی، زہر نہیں دیا تھا اور کسی نے اس کا گلا نہیں گھونٹا تھا مگر اس کی موت طبعی نہیں تھی۔ یہ قتل تھا جو دلاور نے کیا تھا۔ اس نے میری اور شفاعت کی تمام گفتگو سن لی تھی یا اس کا کچھ حصہ سن لیا تھا جس سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ نمک حرام ہو گیا ہے۔ اس کا تشدد ذہن عملی زندگی میں کئی مرتبہ ڈرامے کر چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ڈرامائی طریقے سے ذہن کو مرعوب کرنے کا ماہر ہے اور خود میرے ساتھ اس نے کئی ایسے ڈرامے کیے تھے جن کا نقش میرے ذہن پر قائم تھا۔ وہ سیدھی سی صاف بات کو بھرپور انداز میں یوں پیش کرتا تھا جیسے ایک کامیاب ہدایت کار کسی کہانی کے خیال کو ڈرامے کی صورت میں اسٹیج پر پیش کرتا ہے اور اپنی پیش کش کے کمال سے ناظرین کو ہنسانے رلانے اور ان کے جذبات کا رخ اپنی مرضی کے مطابق موڑنے میں کامیاب رہتا ہے۔ جب اس نے کہا تھا کہ ریت کے ایک ذرے سے چٹان رکی رہتی ہے تو وہ اپنے ملازم کی بات کر رہا تھا جس کا ناتواں دل خفیف سا صدمہ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے قتل کا الزام اپنے سر لیے بغیر اسے مار دیا۔ نہ جانے کس وقت وہ اسی دیر کے لیے کھلے دروازے کے سامنے آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں یہی تحریر تھی جسے شفاعت نے پڑھا اور وہ ایک دم سمجھ گیا کہ دلاور نے اس کی تمام گفتگو سن لی ہے۔ دہشت کا صدمہ اس کے دل کو لے بیٹھا۔ وہ سزائے موت کا فیصلہ دیکھ کر مر گیا۔ غالب نے تو ایک شاعرانہ بات کی تھی کہ "مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب" مگر یہاں میرے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی میری نظروں کے سامنے ایک انسان کو ایک سطر سے قتل کیا گیا تھا۔ کیا چند حروف پر مشتمل ایک سطر کو آلۂ قتل سمجھا جا سکتا ہے؟ دنیا کا کوئی قانون اسے قتل قرار دے سکتا تھا! کوئی ہوشمند آدمی میری بات مان سکتا تھا کہ دلاور قاتل ہے۔ وہ غضب کا شکاری تھا۔ اس کی نظر اس کی عقل سے زیادہ تیز تھی۔ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ صرف ریت کا وہ ذرہ ہٹا رہا تھا جس پر چٹان ٹکی ہوئی تھی اور اب وہ مجھے موت کا سبب دکھا رہا تھا کسی خوف یا شرمندگی کے بغیر۔ اسے بالکل ڈر نہیں تھا کہ میں کیا سمجھتا ہوں۔ میں کہتا تو وہ کاغذ کی شیٹ میرے حوالے کر دیتا کہ لو جہاں چاہو لے جاؤ۔ پولیس کے پاس جاؤ یا اخبار والوں کے پاس یا اسے چوک میں چسپاں کر دو اور چاہو تو اس کے نیچے یہ بھی لکھ دو کہ اس جملے سے چوہدری دلاور نے

www.paksociety.com

اپنے باپ کو قتل کر دیا۔ یکلخت میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا مگر ایک بار پھر دلاور نے اپنے ٹھنڈے دماغ سے مجھے شکست دی۔ اس نے میری صورت سے میرے ردِ عمل کا اندازہ کر لیا تھا۔ عین اس وقت جب میں ریوالور نکال چکا تھا اور فیصلہ کر چکا تھا کہ اب اس حرامزادے کو قتل کر کے ہی دم لوں گا، اس نے میرے ہاتھ پر پیپر ویٹ کھینچ مارا۔

اس کا نشانہ بھی خطا نہیں گیا۔ میری کلائی پر سخت چوٹ آئی اور ریوالور چھٹک کر میں نے اپنا ہاتھ جھٹکا جس میں درد کی شدید لہر نکلی تھی۔ دلاور نے ایک قہقہہ لگایا۔

"ریوالور اٹھا کے جیب میں رکھ لو۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "تم پھر فوراً ہی مشتعل ہو جاتے ہو۔ دیکھو بھئی! یہ حماقت ہے جانے کا بہت فیل ہو گیا ہے۔ نہیں ابھی ... نہیں ... اب کیا فائدہ؟ اگر میں ... کا ... ہاں ... وہ تو میں نے باہر نکل کے دیکھ لیا ... مر جانے کے بعد ویسے مر جاتا ہی ... جی ... تم فکر ہی میں ... کر دو۔ سب اس کے جانے میں ... اور دیکھو میت کے ساتھ تم مجھ جانا ... دفنانے کا وقت تم ... رکھنا ناظر ... پہنچ جاؤں۔ میری طرف سے تعزیت کرنا ... بڑی اچھی صحت کی بات ہے ... اس ... باتیں کہتے تھے ... خیر ... پیتے بھی ہوں تو سب ... ایک مذاق کر لو ... ہاں ... باقی میری طرف سے ڈال دینا ... مگر یہ ایک ... کے مقتولان کو آج بھی ... میں خود آؤں گا تو تم سے ... اور ... یہاں ایک مہمان بیٹھے ہیں ... ورنہ میں ابھی ... کام خود کر آتا ... بہت ... کچھ نہیں ہو سکتی۔ تم ذرا کافی ... کسی سے کہہ دو ... ہاں ... شفاعت بیچارہ ... سب کچھ ..." اس نے ریسیور رکھ دیا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے جذبات کی آتش فشانی پر قابو پالیا۔ آدمی اپنے دوستوں سے ہی نہیں دشمنوں سے بھی بہت کچھ سیکھتا ہے۔ دشمن اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا ہے، تم ہی تو ایک طرح سے موقع فراہم کرتے ہیں کہ ان کمزوریوں سے نجات پالے۔ دلاور کی بات ایک حد تک ٹھیک تھی کہ میں دل سے کم اور دماغ سے ہی سامنے کا کام لیتا ہوں۔ کم سے کم ایسا سمجھتا ضرور ہوں مگر کیا واقعی ایسا ہے؟ ابھی میرے دماغ پر دل اس طرح غالب آ گیا تھا کہ میں اندھا ہو گیا تھا۔ اندھا نہ ہوتا تو ضرور دیکھ لیتا کہ دلاور کو قتل کر کے میں خود کس راستے سے زندہ باہر جاتا اور پھر ان سب کے مشن کا کیا بنتا جنھوں نے عقل و ہوش سے کام لینے پر مجھے یہاں بھیجا تھا۔ ماجد اور شعلہ کا کیا ہوتا؟

میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا اور اپنی شمہ کی موت کو بھول گیا۔ دلاور ایک سفاک اور شیطان صفت آدمی ہے اور

جذباتی بے حسی کا یہ مظاہرہ اس کی فطرت میں شامل تھا۔ مجھے مقصد سے کام رکھنا چاہیے۔

"میں تمھارا مہمان نہیں ہوں دلاور۔" میں نے کہا۔ "مجھے سے آنا تو ضرور ایسا سمجھتا لیکن جیسا کہ تم نے کہا تم ... ہے۔"

"یعنی تم کافی کیا پانی تک نہیں پیو گے میرے یار؟" دلاور ہنسا۔ "تمھاری مرضی بھئی ... ہم تو آ گئی ... وضع ... نہیں ہیں۔ تم مجھے اتنا ... لیتے تب بھی تمھارا یہ ... کر کے پینے کا ... مانگتا۔"

"سب سے پہلے بتاؤ کہ ماجد اور شعلہ کہاں ہیں؟ ... کہاں رکھا ہے تم نے انھیں؟"

"وہ جہاں بھی ہیں خیریت سے ہیں ... لیکن تمھاری یقین دہانی کے لیے کہہ سکتا ہوں ..."

"کیا وہ نازو کے ساتھ ہیں؟" میں نے سنا۔

"نازو؟ یہ کون ہے؟ اپنے سکندر صاحب ... نازو وہی لڑکی تو نہیں جو بڑی نامور ... ترقی ... اس سب ... بھی ... کیا نام ہے اس کا ... ہاں ... اکرام شیخ ... وجہ سے استعفیٰ دینا پڑا۔"

"میرا سوال اکرام شیخ کے بارے میں نہیں ..."

"وہ تھا اگر دوست تھا ... اور اپنے سکندر ... میں ایسا ہوتا تو نہیں چاہیے۔" دلاور بولا۔ "دوست کی عزت عزت ..."

"تم جیسے مت شیطان کے منہ سے عزت کا لفظ بھی نہیں لگتا۔" میں نے جھڑک کر کہا۔ "اس کی بیٹی ... کی عزت میری عزت ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔ "مجھے ... اس لیے محسوس کرتا ہے ... میں بھی کہتا ہوں کہ تم ... چھوڑ دو ... جو بھی ہوا اس میں کسی کا ... نہیں ہوا ... اگر ہوا تو میں کچھ نہیں کر سکتا لیکن ماں باپ تو کسی کو منہ دکھانے کے نہیں رہے۔ اب یہ بھی ایسی بات ہے سکندر کہ جو تم ... یہ ... سمجھتے ... بشرطیکہ تمھاری بھی جوان بیٹی ہوتی مگر ... زندگی کے ... تجربات سے گزرنے کی مہلت ..."

"اگر تم سمجھتے ہو کہ اس دھمکی سے میں ..."

"دھمکی کوئی نہیں۔" دلاور نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "یہ سب فضول باتیں ہیں۔ تم کچھ کرو گے تو ... کے ... کرو گے ورنہ میں ... کر رہا ہوں۔ تم نے نازو کے بارے میں سوال ... اس کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم تھا وہ تمھیں بتا دیا۔"

"وہ خود کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

دلاور نے دونوں ہاتھ پھیلا کے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "اگر تم کو نہیں معلوم تو پھر میں کیسے بتاؤں۔ سچائی نہیں جانتا ... ماں باپ نہیں جانتے ... پولیس نہیں جانتی اور تم نہیں جانتے ... تو پھر اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔"

ایک شخص کافی لے کر اندر آیا۔ "وہ ... سر ... پولیس کو اطلاع ہوتی ... آ رہی ہے۔"

"ابھی ضرورت نہیں ... تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔" دلاور نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "لاش کہاں ہے؟"

"یس سر ... چوکیدار کی چارپائی پر لٹا دیا ہے۔" وہ بولا۔

"اچھا ... پھر تم اس کی نگرانی کرو۔" دلاور نے کہا۔ "اور اس بات کا خیال رکھو کہ اندر کوئی نہ آنے پائے ... کوئی فون کال بھی نہیں ..."

"یس سر۔" کافی لانے والے نے کہا۔ ایک لمحے رکا اور لوٹ گیا۔ میں دلاور کی کسی بات کو جھوٹ یا سچ کیسے سمجھتا جب کہ وہ ... عیار شخص اس بات پر قادر تھا کہ سچ کو جھوٹ بنا دے اور جھوٹ کو سچ ... نازو کے متعلق اس کے اظہارِ لاعلمی سے بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنا مشکل تھا اور نازو کے گھر والوں کی حالت کے متعلق اس کے بیان پر اعتبار کرنا بھی۔

"تم بھی خوب جانتے ہو دلاور ..." میں نے اس کی کافی قبول کرتے ہوئے کہا۔ "تمھارے ... دعوت نامے کو میں نے مسترد کر دیا تھا۔ تمھاری پیشکش اگر سنجیدہ اور مخلصانہ ہوتی تب بھی میں تم سے ملنے نہ آتا۔ مجھے تم سے کوئی سودا منظور ہی نہیں خواہ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہو۔ میں اس فائدے سے ... کر سکتا ہوں جو تم سے حاصل ہو۔ اس کے مقابلے میں جان کا زیاں بھی قبول ہوگا مجھے ..."

"واہ اپنے سکندر صاحب!" دلاور مسکرایا۔ "بڑی تیاری سے آئے ہو، اچھا بول رہے ہو ... پڑھے لکھے بندے ہو نا ... ڈائیلاگ بھی بنا لائے۔"

"اب یہ تو بتا دو کہ مجھے کیوں بلایا تھا۔ یہ مجھے جاننے دو۔" میں نے اٹھ کے اپنی کی خواہش کو اور غصے کی شدید لہر کو دبا کے کہا۔

"میں نے تو اپنے خط میں سب لکھ دیا تھا۔" وہ بولا۔ "کوئی نئی بات نہیں ہے۔" اور اطمینان سے کافی پینے لگا۔ اس کا کنٹرول اپنی ... حرکات ... پر ... ذرا پر بھی نہیں ... آخر ... یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ آدمی نہیں مشین ہے ... اس کی ساری شخصیت کو ایک خاص تاثر ... جیسے ... سیٹ بجلی کی استری اور اوون یا فریز ... ٹمپریچر ... ہے اور نہ زیادہ بلکہ وہی

سکتا ہے جہاں اسے سیٹ کر دیا جائے۔ اسی طرح وہ اپنے ردِ عمل کو صورت کے مطابق سیٹ کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ پھر نہ وہ مشتعل ہوگا نہ مایوس، نہ حیران ہوگا نہ پریشان۔ اس کی آواز بھی ایک ہی لیول پر سیٹ رہے گی۔ نہ اوپر جائے گی نہ نیچی ہوگی۔ لہجے میں بھی جذبات کو ... دخل نہ ہوگا اور اس کا چہرہ ... اسکرین کی طرح کوئی عکس پیش نہیں کرے گا۔ بالکل بلینک رہے گا۔ شاید اسمگلر دلاور کی شخصیت اس سے بہت مختلف ہوگی۔ وہ اپنے ردِ عمل کے نظام کو دوسرے لیول پر سیٹ کرتا ہوگا۔ بے رحم، سفاک اور غصہ ور ... طوفانی لہریں والے ... ہیجان رہنے والا۔

"میں چاہتا تھا کہ یہ جھگڑا ختم ہو جائے۔" وہ پھر بولا تو میں چونکا۔

"جھگڑا تو ایسے ختم نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ اب میرے اور تمھارے درمیان ذاتی نہیں ... جنگ غیر ذاتی ہونے کے بعد حق و باطل کی قوتوں کے درمیان ہو رہی ہے ... نیکی بدی ... جائز و ناجائز ... دوست اور دشمن کی شناخت کی جنگ ہے۔ ہم دشمنوں کو پہچان گئے ہیں اور اب ایک طرف وطن پرست ہیں تو دوسری طرف وطن فروش۔ میں ان کا نمائندہ نہیں ہوں کہ تم سے صلح کے مذاکرات کر سکوں۔ جھگڑا تو تمھارے ناپاک وجود کے ساتھ ہی ختم ہوگا اور نہ نہیں ہوگا۔ لیکن یہ سب میں نے مصلحت کے خلاف سمجھتے ہوئے نہیں کہا۔

"پھر کیسے ختم ہو سکتا ہے؟" دلاور نے اسی سپاٹ آواز میں کہا مگر یہی وہ بات تھی جس کا جواب حاصل کرنے کے لیے اس نے مجھے زحمت دی ... لایا تھا۔

"کیا تم نہیں جانتے؟" میں نے بھی گول مول بات کی۔

"جانتا تو ہوں۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "تم کو وزیر خان پر ہونے والے ظلم کی شکایت ہے۔ میں تمھارے جذبات کو سمجھتا ہوں۔ تم کو یقین دلا دیا گیا ہے کہ اصل مجرم میں ہوں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میں نے وزیر خان کی مدد نہیں کی۔ میں حالات سے بے خبر رکھا اور ... مدد کی تو میر شرافت علی کی جس نے سب کچھ کیا۔ پلان اسی کا تھا۔ عمل کرنے کے جرم میں ایک شریک میں بھی تھا۔ لیکن اس وقت تک پلان میں وزیر خان کو یکسر خارج کر دینا شامل نہیں تھا۔ میر شرافت علی نے مجھے قائل کیا کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ وزیر خان کو وہ بہت پہلے سے جانتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ حد درجہ اصول پسند اور ... آدمی ہے میں نے نہ تائید کی اور نہ تردید ... پھر جو کچھ کیا اس نے کیا۔ میں خاموش رہا جو ایک طرح سے حمایت تھی۔ ظاہر ہے کہ میں کھل کر مخالفت کرتا تو وہ ایسا نہ کرتا مگر میں وزیر خان سے ناواقف تھا۔ اور میر شرافت علی نے جو بھی کیا اس کے نتائج کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ غالباً وہ خود بھی اندازوں کی غلطی کا

www.paksociety.com

نکلا دھوا۔ اس کا خیال تھا کہ تم نوجوان ہو۔ ہر نوجوان کی طرح دولت مند بننے کی آرزو رکھتے ہو، چار سال ولایت میں رہنے کے بعد تمھارے خیالات کی پرواز بلند ہوگی، تم اصول پرستی وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑو گے اور عام نوجوانوں کی طرح عیش و آرام کے ... کے اصول پر عمل کرتے ہو گے۔ اگر تم نے تھوڑی بہت مزاحمت کی تو تم کو سمجھانا بہت جلد تمھیں راہ راست پر لے آئے گی۔ خیر... ایسا نہیں ہوا اور میری رضامندی کے بغیر اس نے وزیر خان کو قتل کروا دیا... اگر وہ مجھ سے براہ راست کہتا کہ اس نے یہ فیصلہ کیا ہے اور اس پر فوراً عمل بھی کر رہا ہے تو میں اس کی ضرور مخالفت کرتا۔"

"یہ سب مجھے بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں صرف اس لیے آیا ہوں، اس پر یقین نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "جب مجھے کچھ کرنا ہوگا تو اپنی تفتیش کے نتائج کو سامنے رکھ کے کروں گا۔ میرے نظام انصاف کو تمھارے خیالات اور اس فضول گفتگو سے کوئی تعلق نہیں۔"

"سیدھی صاف بات ہے سکندر کہ تم انتقام صرف مجھ سے لینا چاہو تو یہ ناممکن ہے۔" دلاور نے کہا۔ "میں نے اپنی حد تک اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ میں تمھارے ہاتھ میں دے کر سر جھکا سا ہوں... کہ آؤ اور میری گردن... نہیں... مجھے اپنی گردن پیاری ہے۔ ایک تو خود اپنی نظر میں ساری سزا کا مستحق اکیلا میں ہوں۔ دوسرے یہ کہ ایک نہیں دو دو قتل کر کے بھی کوئی بے وقوف ہی پھانسی کے تختے پر نہیں چڑھتا۔ تمھارے مرنے والے تھے۔ ایک حق وراثت کا اور دوسرا اپنے باپ کے قاتل کو سزائے موت دینے کا۔ میں اس شخص کو تمھارے حوالے کر سکتا ہوں جس کے ہاتھ براہ راست وزیر خان کے خون میں رنگے ہوئے ہیں۔"

"تمھاری مراد استاد میڈرو سے ہے تو جس دن وہ میری گرفت میں آئے گا اس دن حقیقت کا اعتراف خود اس کی زبان کرے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پھر حقیقت وہ نہ ہو جو تم بیان کر رہے ہو بلکہ اس کے برعکس ثابت ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "تم اور استاد میڈرو میری نظر میں ایک ہی جیسے مجرم ہو۔"

"استاد میڈرو تم کو یہ بھی بتا سکتا ہے کہ اس نے تمھارے والد کو کہاں دفن کیا تھا۔" دلاور نے یوں کہا جیسے میری بات اس نے سنی ہی نہیں۔

"وہ بتائے یا نہ بتائے، مجھے کیا فرق پڑتا ہے یا وزیر خان کو کیا فرق پڑتا ہے؟" میں نے کہا۔ "مٹی خود آدمی کو بلاتی ہے۔ جس مٹی کا مرنے والا ہو وہ اپنے موجودہ مدفن سے صور اسرافیل پر اٹھے گا۔ مٹی تو مٹی میں مل گئی۔ اسے اب نہ تو کسی مزار کی ضرورت ہے نہ میرا ارادہ اس کے لیے کوئی عالیشان مقبرہ تعمیر کرنے کا ہے۔ اس کی نشانی میں خود ہوں۔"

اگر اسے کوئی مایوسی ہوئی تھی تو اس کا اظہار دلاور نے صورت سے نہیں ہونے دیا۔ "تم نہیں جانتے اچھا سکندر کہ آج تم صرف میری وجہ سے زندہ ہو۔"

میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ "کیا تم خدائی کے دعوے دار ہو چودھری دلاور؟ زندگی اور موت پر اپنے اختیار کا دعویٰ تو ... اور نمرود نے بھی کیا تھا۔"

"میں کچھ اور بتانا چاہتا تھا تمھیں۔" پہلی بار دلاور کے لہجے میں تھوڑی سی جھنجھلاہٹ آئی۔ "الفاظ کو توڑ مروڑ کے ... فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ استاد میڈرو ... ہاتھ میں ہوتی تو وہ کب کا تمھیں ٹھکانے لگا چکا ہوتا۔ ... قتل پر سب سے زیادہ خوش ہونے والا وہی ہوگا۔ ... ہے مگر اس کو میں نے ہمیشہ روکا۔ اسے روکنے کے لیے ... کافی تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ واضح دھمکی دی ... تمھیں قتل کرنے کی حماقت کی وہ اس کی زندگی کا بھی آخری ... یہی وجہ ہے کہ تم ابھی تک زندہ بھی ہو۔"

"میں اس لیے زندہ ہوں چودھری صاحب کہ خدا کی ... ہے۔" میں نے کہا۔

"تم دیکھنا چاہتے ہو کہ میڈرو کس حد تک تمھارے خون کا پیاسا ہے؟" دلاور نے کہا۔ "میں اسے یہاں بلا کے صرف اشارہ کر دوں ... خیر چھوڑو... میں نے تم کو یہاں دشمنی بڑھانے یا لڑنے جھگڑنے کے لیے نہیں بلایا۔"

"جب تم اتنے طاقتور ہو تو صلح کے مذاکرات کیوں کر رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ نقصان مجھے بھی ہو رہا ہے۔" دلاور نے ...

"یہ میرے اندازوں کی غلطی تھی جس کے باعث ایک سوال اتنا لمبا ستارہ بنا۔ بے شک اس وقت تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے جب یہاں پہنچے تھے لیکن اس کے بعد تم کو حالات ... تم اکیلے تھے اور مرنے سے نہیں ڈرتے تھے۔ میری بیوی بچے ... تمھاری طرح جنون کا شکار نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا گھر ... گھر بھی اس جنگ سے متاثر ہوا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تمھاری بیوی کے اغوا سے ... ہے مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے چودھری دلاور کہ گھر کے ... اپنے شوہر ثابت ہوئے ہو تمھارے رویے کی وجہ سے ... عادت ہوئی ہو یا اس کی اعصابی کمزوری کا یہ ..." میں نے کہا۔ "لیکن جو کچھ رابعہ کے ساتھ ہوا..."

"... تو رابعہ کے پاگل پن کے پیچھے بھی وہی ہو سکتے ہیں۔"

"ہاں صاحب، تمھارے ساتھ صرف رابعہ ہے۔ میرے ساتھ بچے بھی ہیں۔ ان کو ایک ماں کی توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔ تم نے تو زیبا کو رابعہ پر قربان کر دیا، اب رابعہ جو تب بھی تم ہی لو گے۔ باقو پھر کوئی متبادل کوشش کی ہے۔ میں بھی دوسری بیوی تو لا سکتا ہوں لیکن وہ بچوں کی ماں نہیں ہو گی... اور ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے تم سے تمھاری شرائط پر سودا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مرحوم وزیر خان کی تمام جائداد منقولہ اور غیر منقولہ کتنے ہی شاید اسے تمھیں منتقل کرنے کو تیار ہو جاتا۔"

"اس میں ایک چیز اور شامل کر لو۔ وزیر خان کی زندگی۔" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ..." دلاور نے ایک ہاتھ کے اشارے سے میری بات کو فضول سمجھتے ہوئے ٹال دیا۔ "تم حسابات آڈٹ کرا کے وہ سب منافع بھی لے سکتے ہو جو وزیر خان کو نہیں ملا۔"

"لیکن اس کو تو سب منافع مل رہا تھا آخری وقت تک۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اس کے دستخط موجود ہیں۔ تمام حسابات، کیش بک، لیجر اور دوسری سب دستاویزات پر۔"

"ہاں، مگر اس کے باوجود وہ رقم میں تمھارے حوالے کر دوں گا۔ تم اس کے ساتھ ہی ایم ایم ویو ٹی وی کمپلیکس کے ایک قانونی مالک بن جاؤ گے۔ تمام معاملات میں میرا اور تمھارا برابر کا دخل ہو گا مطلب یہ کہ تم بزنس پارٹنر کہلاؤ گے۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے، یہ معاملات میں اپنے قانونی مشیر اور اکاؤنٹنٹ ایڈووکیٹ ... پر چھوڑتا ہوں۔" میں نے کہا۔

دلاور نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر تمھارے لیگل ایڈوائزر سے معاملات طے کرنے ہوتے تو میں تمھیں کیوں بلاتا؟"

"لیکن اس میں کوئی بات غیر قانونی نہیں۔ مشکل کو کُل اختیارات حاصل ہیں کہ وہ میری طرف سے جو چاہے کر سکے۔" میں نے کہا۔

"یہ کوئی اختیارات کی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "میں تحفظ کی ضمانت چاہتا ہوں۔ ورنہ مجھ سے بڑا احمق کوئی نہیں ہوگا کہ تمھیں وراثت تسلیم کرتے ہوئے سب کچھ تو حوالے کر دوں ... صاحب کے بچے کر دوں اور تم بدستور میرے خلاف گوریلا جنگ جاری رکھو۔ تمھیں تو وہ سب مل جائے گا جو تمھارے باپ کا حق تھا، مجھے سکون نہ ملے گا۔"

"یہ تحفظ تمھیں کیسے حاصل ہو سکتا ہے چودھری جی؟" میں نے کہا۔

"اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تم خود کو قانون کے حوالے کر دو۔" دلاور نے کہا۔ "ہر کیس میں تمھاری ضمانت کرانے کی ذمے داری میری۔ مقدمات دستبردار نہ کرنے کی ذمے داری میری۔ گواہوں کو منحرف کرانے کی ذمے داری میری۔ تم کسی سزا کے بغیر چھوٹ جاؤ گے لیکن قانونی کارروائی ضابطے کے مطابق ہوتی ہے۔ تمام مقدمات کا فیصلہ ہونے میں کم سے کم سال لگے گا۔ یہ عرصہ تم جیل میں نہیں گزارو گے مگر پابند ضمانت رہ کر گزارو گے اور چونکہ ضامن میں بنوں گا اس لیے میری حفاظت میں گزارو گے تاکہ تمھارے کسی غلط فیصلے سے میری دی ہوئی ضمانت ضبط نہ ہو۔"

میں نے دل ہی دل میں دلاور کے منصوبے کی خوب صورتی کو سراہا۔ اگر وہ ٹھیک نیتی کے ساتھ ایسا ہی کرتا جیسا وعدہ کر رہا تھا تب بھی ایک سال کے لیے میں اپنے مقصد سے کٹ جاتا۔ دلاور کے محافظ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتے اور ضمانت پر رہائی بھی نظر بندی ہوتی۔ میں کسی کوٹھی میں رہتا تو محافظ باہر پہرا دیتے، گاڑی میں نکلتا تو محافظ ساتھ ہوتے یا پیچھا کرتے۔ ایک سال میں تو میرا مشن چوپٹ ہو جاتا اور اسی ایک سال میں دلاور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لیتا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ سارا پلان اوپر سے دیا گیا ہے۔ ان کی طرف سے جو دلاور کے بھی آقا تھے جو اس سے اسلحہ خریدتے تھے اور اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اسے آگے مشرقی پاکستان کے تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں تک پہنچا رہے تھے۔ نقصان دلاور کو نہیں ان کو ہو رہا تھا اور وہ ہر قیمت پر میری رخنہ اندازی کو ختم کرانا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہی دلاور پر دباؤ ڈالا ہوگا کہ یہ جھگڑا ختم کرو تاکہ ہمارا راستہ صاف ہو۔ جو دینا دلانا ہے سو دو اور اس کو قانونی نہیں سیاسی مسئلہ سمجھ کے بات کرو۔

"بے شک تم ضمانت پر رہائی کے عرصے میں نقل و حرکت کے لیے آزاد ہو گے اور جسے چاہو گے ساتھ رکھ سکو گے۔ تمھاری عزت اتنی ہی ہوگی جتنی میری ہے۔ تم ایک پارٹنر کی حیثیت سے آفس میں بیٹھ کر کام کرو گے اور فیصلے کرو گے۔ رابعہ اگر اپنی لیگل فرم کے معاملات ٹھیک کرنا چاہے تو اپنی گڈول بحال کر سکتی ہے۔ سادہ ظاہر ہے کہ اس نئے شادی شدہ جوڑے کو... محسن اور شہلا کو ازدواجی زندگی کا پہلا سال... جو ہنی مون کہا جا سکتا ہے... سکون کے ساتھ گزارنے کے وہ مواقع ملیں گے جو اب حاصل نہیں۔"

"تمھاری باتیں دل چسپ ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ اور کیا ہوگا؟"

"اور یہ ہوگا... کہ غالب پہلے کی طرح ایک صحافی بن کے کام کرتا رہے گا۔ ایک بار تو وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو گیا تھا مگر وہ کب تک مفرور رہ سکتا ہے۔ نازو اپنے گھر لوٹ جائے گی۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ صحافی اس میں خاصی دلچسپی لے رہا ہے۔ تم سب کے جوڑے اچھے بنتے ہیں۔ پھر اس احمق کو بھی ملک لاوارث کیوں چھوڑ رکھا ہے جو خواہ مخواہ تمھارا چیلا بنا ہوا ہے۔ استاد چیکو... خیر یہ مذاق کی بات تھی، اصل بات تھی میری پیشکش کی۔"

"چودھری صاحب! آپ کی ہوشیاری کے پیچھے آپ کی ..."

www.paksociety.com

کو دخل ہے۔" میں نے کہا۔ "فرض کیا کہ میں خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دوں تو باقی سب آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ میری ضمانت پر رہائی۔ ثبوت، شہادت میں ردوبدل اور گواہوں کا منحرف ہونا۔ اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ تم یہ سب فراموش کر دو گے۔ اگر میں نے خود کو گرفتاری کے لیے قانون کے حوالے کر دیا اور تم اطمینان سے بیٹھ گئے تو میں تمہارا کیا بگاڑ لوں گا۔ کس طرح تم کو مجبور کروں گا کہ تم مجھ سے کیے ہوئے وعدے سے پھرو۔ تم تو کہہ رہے ہو کہ میری زبان پر اعتبار کرتے ہوئے خود پولیس تک پہنچ کر پیش کر دوں۔ یہ سب کر کے ماضی میں تمہارے خیالات کو مستحکم کر دوں۔ ایک طرف تم مجھے یقین کرا رہے ہو کہ تم میرے مفاد میں کہہ رہے ہو اور اب جتنی نقصان ہو رہا ہے وہ سب تمہاری طرف سے، تم مجھ سے اس قسم کی حماقت کی توقع رکھتے ہو؟"

"یہ حماقت نہیں سکندر! تمہاری مجبوری ہے۔" دلاور بولا۔ "تم کو میری زبان پر اعتبار کرنا ہی ہوگا اور کوئی صورت نہیں ہے اس مسئلے کو حل کرنے کی۔ تم کو یہ فیصلہ آج اور ابھی کرنا ہے۔"

"یعنی ایک جانی دشمن سے زندگی کی ضمانت قبول کر لوں۔ مجبوری اگر خطرناک ہو تو حماقت سے بہتر یا اگر میں اس کا یقین دلاؤں تو کیا یہ عقلی طور پر ممکن ہے؟" میں نے کہا۔

"فیصلہ تم کو کرنا ہے اپنے سکندر صاحب، مجھے نہیں۔" دلاور بولا۔

"اور اگر میں سوال کروں کہ اتنا فیصلہ کرنے کے لیے تمہارا مجھ کو بلانا ہی سب سے بڑی حماقت تھی؟"

"تم جو چاہو سمجھو مگر یہ حماقت بھی تم کو ہی بھگتنی پڑے گی، فیصلہ کیے بغیر تم یہاں سے جا نہ سکو گے۔" دلاور مسکرایا اور اس کی صورت کا تاثر تھوڑا معاندانہ تھا۔ "تم جانتے ہو کہ تمہارا چھوٹا اور قیمتی سامان میرے پاس ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟ تم سے تھوڑی توجہ یا تعاون وہ محفوظ ہیں۔ اگر یہ بات نہیں ہوتی تو پھر وہ باتیں کیسے سچ ہوں گی؟" میں نے کہا۔

"وہ محفوظ ہیں۔ تمہارے فیصلے کی ضمانت پر۔" دلاور نے کہا۔

"میں تمہاری ہر پیشکش مسترد کرتا ہوں۔ یہی ہے میرا فیصلہ۔" میں نے کہا۔

"ایک بار پھر سوچ لو۔ تم اس پوزیشن میں نہیں ہو۔" چوہدری دلاور نے کہا اور اس کی صورت پر خشونت، بے رحمی اور سختی کے جذبات کا تھوڑا سا تاریک سایہ پھیل گیا۔

"ایسا تم سمجھتے ہو دلاور۔" میں نے کہا۔ "تمہارے اندازے پہلے بھی غلط ہو چکے ہیں۔ دوبارہ سوچنے کا میں قائل ہی نہیں۔"

"تم اپنے ساتھ ایک ریوالور لائے ہو۔" دلاور آگے جھک کر بولا۔ "ابھی آپ نے مجھے میرا ریوالور استعمال کرنے سے روک دیا تھا اور بہت خوش ہوئے تھے کہ سب سمجھے تھے میں ڈر گیا... ہے نا یہی بات؟"

"میں ایسا نہیں سمجھا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمہارا یہ اندازہ بھی غلط ہوا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم بالکل محفوظ ہو اور میں جیب سے ریوالور نکالنے کی حماقت نہیں کروں گا۔ اس سے پہلے ہی [illegible] نشانہ لیے ہوئے [illegible] بندوقوں کی نالیں [illegible] آگئے ہیں۔ میں نے ایک پیزلی کلاوت کو [illegible] اپنی مرضی سے ہوا ہے مگر [illegible]"

"تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔" دلاور بولا۔ "مگر اس سے قبل مجھ پر واضح کر دیا کہ یہ ناممکن ہے۔"

"میرا کہنا اتنا آسان ہوتا تو میں ضرور چلا جاتا۔ [illegible] کر کے ڈھال بناتا اور پیچھے پیچھے میرا راستہ کوئی نہ روکتا۔ [illegible] اور اپنی جیب سے ریوالور نکال کے [illegible]

خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا جس میں دلاور [illegible] مجھے گھورتی رہیں اور میں ظاہری بے نیازی سے [illegible] کوشش کرتا رہا تاکہ دلاور میرے اطمینان سے میری [illegible] قائل ہو جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خوفزدہ میں بھی تھا۔ [illegible] طرف سے [illegible] اور ایم آر ایس کی کلاشن سے [illegible] میں کوئی منظر نہیں آتا تھا لیکن یہ دھوکہ تو سب کو ہوتا ہے۔ [illegible] قاتل سے لے کر قتل کے منصوبے بنانے والوں تک سب [illegible] انہوں نے ہر طرح خود غور و خوض کرنے کے بعد [illegible] امکان نہیں چھوڑا۔ اگر عمل درآمد کا وقت آتا ہے تو بہت سے [illegible] پیدا ہو جاتے ہیں جو ان کی نظر میں نہ تھے۔ [illegible] چھوٹ کر دیتے ہیں۔ [illegible] سامنے بھی کوئی عام آدمی نہیں [illegible] شخص تھا جو اپنے شیطانی ذہن [illegible] دکھا دیتا تھا۔ [illegible] حالات کی [illegible] کے متعلق اس کا [illegible] اس کی چال بھی ہو سکتا تھا۔ میں اس بات کو خارج از امکان نہیں سمجھتا تھا کہ [illegible] دھماکہ خیز [illegible] گودام کی خبر بھی سن چکی ہو اور وہ اچانک [illegible] چاروں [illegible] تاہم [illegible] سامنے [illegible] اپنے سکندر صاحب [illegible] کیا خیال ہے۔ تاہم میں اسے [illegible] تسلیم کرتے [illegible] اور قبل از وقت [illegible] سمجھتا تھا۔

"آخر تم کیا سوچ کے یہاں آئے تھے؟" دلاور نے [illegible] کہا۔ "یہاں میں تم سے وہی بات کروں گا جو میں نے خط میں لکھی تھی۔ تم نے ملنے کی توجہ [illegible] اور نہ تمہیں کافی [illegible] لگا اور کہوں گا ٹھیک ہے...۔"

"جو تمہیں منظور ہو [illegible] دلاور [illegible] یہ سوچ سکتا ہے۔" [illegible] کہا۔ "تم [illegible] سامنے آگئے ہیں۔ جب آدمی کسی [illegible] پکار [illegible] جاتا ہے تو [illegible] نہیں [illegible]۔ میں نے اپنا فیصلہ تم کو بتا دیا۔ اب ایک [illegible] ہے اور اس فیصلے کے لیے میں تم کو آدھا گھنٹہ دیتا ہوں [illegible]

[illegible] بلکہ پانچ منٹ باقی رہ گئے۔"

[illegible] ساڑھے [illegible] ہوگا... قیامت آجائے گی؟" دلاور نے طنز [illegible] سے کہا۔

"تمہیں اپنے سابق دوست ڈاکٹر سلوا کے گھر کا فون نمبر یاد ہے؟" میں نے کہا۔ "یا تم مرتے ہی دوستوں کو اسی طرح بھلا دیتے ہو جیسے طوائف گزشتہ عاشقوں کو فراموش کر دیتی ہے؟"

"کیا اس کا فون نمبر ڈاکٹر سلوا کی [illegible] مجھے میرے سوال کا جواب مل سکے گا؟" دلاور نے کہا۔

"اس کی کوٹھی میں آج کل کون رہتا ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کا پتا نہیں؟" میں نے کہا۔ "اس سے میری ملاقات تو ہو چکی ہے لیکن اس وقت مجھے نام یاد نہیں آ رہا ہے۔ [illegible] وہ احساس [illegible] جس [illegible] دیکھنے میں [illegible] بے حد شریف اور مہذب آدمی تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر سلوا سے زیادہ خطرناک تھا۔ ڈاکٹر سلوا اپنے [illegible] سے صاف [illegible] بدمعاش [illegible] شرافت اور تہذیب کا [illegible]

"مجھے [illegible] کیوں [illegible] ہے؟" دلاور نے میری بات کاٹ [illegible] وہ اپنی تشویش کو نہ چھپا سکا۔

"[illegible] چوہدری دلاور صاحب۔" میں نے کہا۔ "آپ [illegible] جنرل اسٹور [illegible] گیا تھا اگر صرف پانچ منٹ [illegible] تو اس کے گھر [illegible] ہوگا۔ باہر [illegible] اپنی جان بچا لے گا مگر [illegible] تباہ ہو جائے گا۔"

"[illegible] تمہارا [illegible] ٹھیک [illegible] بجے اس گھر [illegible] اڑانے کے لیے [illegible] آف [illegible] جائے گا؟" دلاور نے [illegible] کہا۔

"[illegible] ڈاکٹر سلوا [illegible]" میں نے کہا۔ "[illegible] کا فیصلہ [illegible] کوٹھی میں ایک [illegible] ٹھیک دس بجے پھٹ جائے گا۔ ویسے تو [illegible] اطلاعات [illegible] سہولت کے لیے خبر فوراً پہنچانے کا معقول انتظام کیا ہے۔ [illegible] دس بجے تمہیں ایک فون کال موصول ہوگی تم کو ایک [illegible] خبر [illegible] کیا تم کو معلوم ہے کہ اس کوٹھی کے آگے [illegible] کون لوگ رہتے ہیں اور ان کا فون نمبر کیا ہے۔"

"میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔"

"[illegible] شریف لوگوں کا اپنے ہمسایوں سے [illegible]" میں نے کہا۔ "ٹیلی فون نمبر تمہیں بتا دیا جائے گا [illegible] تاکہ پانچ منٹ بعد تم فون کر لینا۔ آس پاس رہنے والے تم کو یقیناً یہ خوش خبری سنا سکیں گے کہ اس کوٹھی میں کیا ہوا۔"

دلاور نے ایک دم ٹیلی فون اٹھا لیا۔ اس نے انکوائری کا نمبر ڈائل کیا اور منتظر رہا کہ کوئی جواب دے مگر ٹیلی فون والے کسی [illegible] ہوں کہ فوراً جواب دے دیں۔ [illegible] ایسا ہی اتفاق دلاور کے ساتھ ہوا۔ اسے آدھا منٹ بھی انتظار نہیں کرنا پڑا ہوگا مگر وہ [illegible] "سو رہے ہو تم لوگ... آدھے گھنٹے سے ریسیور [illegible] بیٹھا ہوں کہ کوئی [illegible]" اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔ "مجھے فوراً [illegible] کا نمبر بتاؤ... ایک بم پھٹنے والا ہے... پھٹ گیا تو..." اس نے ایک کاغذ پر نمبر لکھا اور [illegible] کاٹ دی۔ پھر وہ [illegible] والوں کا نمبر ملانے لگا۔

میں نے مایوسی اور افسوس کے ساتھ سر ہلایا۔ "اتنا وقت اب کہاں رہا ہے چوہدری دلاور صاحب! ان کو پہنچنے میں بھی پندرہ منٹ تو لگ جائیں گے اور تم [illegible] انہیں [illegible] کے لیے [illegible] چاہیے۔"

"ہیلو! [illegible] پیلس کا [illegible]"

چوہدری دلاور [illegible] "ایک [illegible] معلوم ہوا ہے کہ کسی نے اس کوٹھی میں [illegible] بم [illegible] کر دیا ہے جو دس بجے پھٹ جائے گا... کیا؟... [illegible] بات ابھی ایک منٹ پہلے معلوم ہوئی ہے۔" اس نے ریسیور کو دھڑ سے [illegible]

"اچھا ہوا کہ آپ نے مختصر بات کی۔" میں نے کہا۔ "جب ٹیلی فون والے عقل مند ہوتے ہیں کہ مقررہ وقت تک [illegible] اپنی جان بچانے کا بندوبست ضرور کر لیتے ہیں مگر تم ان کو [illegible] کر دیتے تو اچھا تھا۔"

"اچھا! اچھا! میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔" وہ غرایا جس سے مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ تھوڑا بہت پریشان ضرور ہے۔ اس نے میری بات کو جھوٹ سمجھ کے نظرانداز نہیں کیا تھا۔

"کاش ایسا ہوتا چوہدری دلاور۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔ "تمہارے اس فون میں اسپیکر سسٹم تو ہے ذرا بٹن دبا دو کہ کال آئے تو گفتگو میں بھی سن سکوں؟" میری بات ختم ہونے سے قبل ہی گھنٹی بجی اور دلاور نے ایک دم ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا پھر اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور ایک بٹن دبا دیا۔

"ہیلو!" چوہدری دلاور نے زور سے ہی ریسیور اٹھائے بغیر کہا۔

"چیف چوہدری دلاور صاحب؟" میں نے غالب کی آواز سنی۔ "ایک فون نمبر لکھ لیں۔ جہنم رسید ہونے سے قبل تمہارا ماتحت شیطان ڈاکٹر سلوا جس کوٹھی میں رہتا تھا، یہ اس کوٹھی کے مقابل سڑک کے پار والے جنرل اسٹور کا نمبر ہے۔"

www.paksociety.com

"تم... کون ہو تم؟" دلاور نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"میں فرشتہ اجل کا نمائندہ خصوصی۔" غالب نے قہقہہ لگایا۔

"ٹھیک دس بج کر پانچ منٹ پر اس اسٹور سے آپ کو فون پر کارآمد معلومات حاصل ہوں گی۔"

دلاور نے کاغذ کے پیڈ پر نمبر لکھا۔ "تم سمجھتے ہو کہ میں اس طرح ہراساں ہو جاؤں گا تو تم غلطی پر ہو۔"

"اللہ اس کی غلطی معاف کرے جو غلطی پر ہو۔" غالب بولا۔

"ایک بات کا خیال رکھنا اپنے چوہدری دلاور صاحب۔ آپ کے پاس ہمارا ایک مہمان بیٹھا ہے۔ اس کو ایک ڈبل چائے، ڈبل علی حوالی پلانا نہ بھولیں اور تقویت قلب کے لیے خمیرہ گاؤ زبان عنبری جواہر والا چھ ماشہ..."

دلاور نے اسے ایک گالی دی جو ناقابل اشاعت ہے اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بجنے میں دس منٹ رہ گئے تھے۔ اس نے ایک اور نمبر ملایا۔

"سنو! میں دلاور بول رہا ہوں۔" اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "وہاں کوئی آیا ہے، مقابل گھر کے سامنے یا سڑک پر گاڑی میں...؟"

"نہیں چوہدری صاحب! ابھی تو میں اور مجھو تو جی ہیں... آپ بالکل فکر مت کریں... ہم کسی کو اندر نہیں گھسنے دیں گے۔"

"فکر کے بچے۔ فوراً باہر نکل جاؤ۔" دلاور نے کہا۔ "اندر کسی نے بم رکھ دیا ہے۔"

"بم... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں چوہدری صاحب؟ ہم نے تو کسی کو بھی آتے جاتے نہیں دیکھا۔" وہ بولا۔

"اس وقت تم سب سے پڑے تھے سالو، وہ ادھر مر جاؤ گے اگر میری بات نہ مانی تو۔" دلاور نے ریسیور کو دوسری بار غصے میں کریڈل پر مارا۔ اسے تڑپتا دیکھ کر مجھے زندگی میں پہلی بار دلی مسرت حاصل ہو رہی تھی۔

"ایک تو چھوٹو ہے وہاں؟" میں نے ہمدردانہ لہجہ بنا کے کہا۔ "دوسرا کون ہے۔ جو دس منٹ بعد نہیں ہوگا۔ موٹو یا مجھو؟"

"اپنی بکواس بند کرو۔" دلاور نے دھاڑ کر کہا۔

"تم بتا دو کہ رابعہ اور شعلہ کہاں ہیں تو میں بتا سکتا ہوں کہ بم کہاں ہے۔" میں نے کہا۔ "چھوٹو موٹو یا مجھو میں سے کوئی بھی اس کا فیوز نکال سکتا ہے۔"

میری بات جھوٹ تھی۔ وہاں بم فٹ کرنے والے تو حمیدی اور محسن تھے۔ میں نے حشمت خان اور دلاور کے گھر میں بم رکھا تھا۔ زیادہ صحیح بات یہ تھی کہ وہاں بم رکھنے کے لیے میں غالب کے ساتھ گیا تھا۔ بم خود غالب نے فٹ کیا تھا اور میں نے کسی سے پوچھا تک نہیں تھا کہ اس نے بم کہاں رکھا ہے۔ غالب نے یہ ضرور بتا دیا تھا کہ ایک جگہ بم کو اس نے چھت میں لٹکا دیا ہے اور دوسری جگہ ایک گملے کے پیچھے رکھا ہے لیکن کون سا گملا اور کس گملے کے پیچھے، یہ اس کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔

دلاور بڑی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا اور اس کے اضطراب میں بیک وقت اضافہ ہو رہا تھا۔ ریوالور اس کے سامنے میز پر میرے ہاتھ کی دسترس میں تھا اور اس سے پہلے کہ دلاور کوئی غلط حرکت کرتا میں ریوالور اٹھا سکتا تھا۔ یہیں ہم کچھ دیر پہلے گفتگو کر رہے تھے ایک سیدھے سادے ماحول میں۔ وہ اپنی بالادستی کے احساس سے مطمئن اور پراعتماد تھا اور میں اپنے انتظامات کے خیال سے۔ میرے سامنے آتے ہی گویا اعلان جنگ ہو گیا تھا اور اب ہم شطرنج کے دو کھلاڑیوں کی طرح آمنے سامنے موجود اپنے حریف کی قوت کا صحیح اندازہ کر کے اس کی جنگی حکمت عملی کا جائزہ لینے اور دونوں طرح کے تجزیے کرنے میں مصروف تھے۔ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو ختم کرنے میں پہل کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اگر ایک طرف سے چلائی گئی تو دوسری جانب سے بھی فوراً جواب ملے گا۔ اتنے کم فاصلے سے کسی کا نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی نہ تھا چنانچہ یہ حرکت صریحاً خودکشی کے مترادف تھی۔

دلاور کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی آدھے گھنٹے کی مہلت کو کھلی دھمکی اور اس کے بعد آنے والی فون کال کو حقیقت سمجھتا مگر یہ بھی سوچتا کہ خدانخواستہ دھمکی ٹھیک آدھے گھنٹے بعد صحیح ہو گئی تو کیا ہوگا؟ وقت اس کی قوت فیصلہ کو کمزور کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بم ڈھونڈنے والوں کے پاس پہنچنے اور بم کو تلاش کر کے ناکارہ بنانے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اب دس بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ مہلت تمام ہو رہی تھی اور وہ میری صورت کو گھورنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن میری صورت سے وہ جھوٹ پکڑنے سے قاصر تھا۔ یہی چیز اس کو جھنجلا رہی تھی اور کوفت زدہ کر رہی تھی۔

دوسری طرف میں بے پناہ اعتماد کے باوجود دل کے ایک گوشے سے اس خوف کو نہیں نکال سکتا تھا کہ جانے انتظامات میں کوئی خامی عین وقت پر ہماری ناکامی نہ بن جائے۔ یہ سارا کھیل ہی وقت کا تھا۔ اگر ٹائم بم کا کلاک ٹھیک نہ ہو یا سیٹ کرتے ہوئے محسن کچھ بھول گیا ہو جس سے ٹائمنگ ہی نہ ہوا ہو تو خرابی تو ہر گھڑی ہو سکتی ہے۔ کلاک کی مشینری کو تیل وغیرہ دینا پڑتا ہے۔ اندر گرد بھی چلی جاتی ہے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو دلاور کے ساتھ میں بھی اچھل پڑا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اعصابی کشیدگی کا شکار دلاور بھی ہے۔ اس شخص کو میں نے کبھی پریشان ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ آج اس کی ساری اداکاری دھری رہ گئی تھی۔ وہ اپنے جذبات کو چھپانے میں ناکام تھا۔ اس نے جھپٹ کر ریسیور اٹھا لیا۔

"بہت افسوس ہے اپنے چوہدری صاحب۔" اس بار آواز محسن کی تھی جو دلاور کے لہجے کی بہترین طور پر نقل اتار رہا تھا۔ "فیصلے میں بہت دیر کی آپ نے... شاید آپ نے فیصلے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔"

"کون ہو تم؟ سور کے بچے..." دلاور کے منہ سے گالیاں ابلیں جیسے پریشر ککر سے بھاپ نکلتی ہے۔

"فرشتہ اجل کا نمائندہ خصوصی۔" محسن ہنسا۔ "اگر تمہاری قوت دید کام کر رہی ہو تو آج دوپہر تک تم بھی دیکھ لو گے... زندگی میں پہلی اور آخری بار لیکن اس سے پہلے گیارہ بجے تمہارا ایک اور خانہ خراب ہوگا۔ جانے محسن کی زندگی کا مالک ویسے تو خدا ہے مگر ہم نے کوشش کی ہے کہ وہ تمہارے شر سے محفوظ رہے۔"

"میں ان دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔" دلاور چلایا۔

"دھمکی آپ بے وقوف سمجھتے ہیں دلاور۔" محسن بولا۔ "تم سکندر بخت کو ہاتھ لگا کے دیکھو، تمہیں اندازہ ہوگا کہ وہ تمہارے دفتر میں بھی اتنا ہی محفوظ ہے جتنا اپنے گھر میں تھا۔ اب تم اس کی حفاظت کرو گے، اس کی بحفاظت واپسی پر بہت کچھ منحصر ہے۔ وقت ہو گیا ہے۔ وقت کا پہلا سبق تم کو یہ ہے کہ جو کچھ سکندر بخت نے کہا وہ غلط نہیں تھا۔ اس کے بعد بھی جو کچھ وہ کہے گا وہی ہوگا۔ وہ بڑا با اصول شخص ہے۔" فون کی لائن کٹ گئی اور دلاور نے بڑی عجلت میں وہ نمبر ملایا جو اسے غالب نے دیا تھا اور اس کے سامنے کاغذ کے پیڈ پر لکھا ہوا تھا۔

"تم تو واقعی نام کے دلاور نکلے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "آج تو تمہارا جمع رکھنا بھی تمہارے لیے مشکل ہو رہا ہے... جو ہونا تھا ہو چکا۔ میں تمہیں مزید آدھے گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔"

"بکواس مت کرو..." دلاور نے چیخ کر کہا۔

دروازہ ایک دم کھلا۔ "آپ... آپ کے آدمی..."

"گیٹ آؤٹ..." دلاور نے اندر آنے والے کو ایک غلیظ گالی دی۔ "میں نے کیا کہا تھا... اندر کیسے آئے تم..."

"سوری... سوری سر..." اندر آنے والا بڑی گھبراہٹ میں پلٹا۔ جاتے جاتے وہ اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے بارے میں بہت کچھ سن گیا۔

"ہاں جی؟" ٹیلی فون کے ریسیور اور اسپیکر میں کسی نے کہا۔ ٹریفک کی آواز کے ساتھ مختلف لوگوں کی باتیں کرنے کا شور بھی سنائی دیا۔ دلاور نے نظر گھڑی پر ڈالی اور نمبر دہرایا۔

"ہاں جی... یہی نمبر ہے۔" جواب ملا۔ "بات کرو فٹافٹ۔"

"بھئی یہ تمہارے سامنے سڑک کے دوسرے کنارے پر کیا ہوا ہے؟" دلاور نے آواز کو سخت جدوجہد کے بعد نارمل رکھا۔ "ایک کوٹھی ہے...؟"

"بس جی مت پوچھو کیا ہوا ہے۔" آواز آئی۔ "اور کوٹھی ہے کہاں جی، یہ تو... اب تو مٹی دھول ہے اور دھواں ہے... آپ کون ہو؟"

"میں... ڈی ایس پی..."

"تو ڈی ایس پی صاحب! آپ مہربانی کرو۔" جواب دینے والا سخت گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ "کسی کو بھیجو ادھر... ایسا بم لگتا ہے جی کسی نے کہ بہت کچھ اڑا کے رکھ دیا ہے... اوپر سے بجا رہے ہیں، دیکھو کون کا بہ دوڑ نہ جانے پیچھے سے بغیر... معاف کرنا جی بڑی افراتفری ہے۔ میں تو خود بھی نیچے گر گیا تھا۔ سامنے شیشے ٹوٹ گئے، گلاس برتن نیچے پڑے ہیں۔ کچھ کا بھی پتہ نہیں ہے مگر نقصان ہوا کچھ نہیں ہے۔ ٹوٹ کی وجہ سے بیروں کے پیچھے گھس گئے ہیں۔ اوپر سے بجا رہے... بند کرا دو گا کا بجانا... ایسے قیامت آگئی ہے جیسے پیا کاٹے گئے ہوں۔"

دلاور نے ریسیور کو نیچے رکھا اور چند سیکنڈ تک اس کی نظریں خلا میں معلق رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے میری طرف دیکھا۔

"تم کو اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی سکندر!" اس نے سوا اور سانپ کے لہجے میں کہا۔

"صرف تیس منٹ اور ہیں تمہارے پاس دلاور۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اس وقت کو دھمکیوں میں ضائع مت کرو... ایسا نہ ہو کہ تمہارے لیے دوسری اطلاع زیادہ اندوہناک ہو۔ میں صرف رابعہ اور شعلہ کا پتا ہی تو پوچھ رہا ہوں۔"

"اب وہ تم کو اگلے جہان میں ملیں گی۔" دلاور نے کہا اور میں نے اس کی صورت کو دیکھا جو غیظ و غضب سے مسخ ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور نتھنے پھول گئے تھے۔ گال اندر ہو جانے سے جبڑے کچھ نمایاں ہو گئے تھے اور اس کی کنپٹی پر ایک رگ پھڑک رہی تھی۔

"تم ان کو قتل کرانے سے زیادہ کیا کر سکتے ہو؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "مجھے تو اس وقت بھی یقین نہیں کہ وہ زندہ ہوں گی۔ یہاں آنے سے قبل ہی میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھا کہ شاید اس دنیا میں ہماری پھر ملاقات نہیں ہوگی۔"

"تم موت کو کھیل سمجھتے ہو نا... اس لیے کہ موت ابھی تم سے کھیلی نہیں۔" دلاور نے زخمی سانپ کی طرح پھنکار کے کہا۔

"یہ تو سارا کھیل ہی موت کا تھا دلاور! مگر ہم جانتے تھے کہ موت صرف ایک بار آتی ہے۔" میں نے کہا۔ "جو بات

تم نہیں جانتے وہ بہت جلد جان لو گے۔ ٹھیک گیارہ بجے تم پھر کسی کو فون کرو گے تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ فرشتۂ اجل کا نمائندہ خصوصی غلط نہیں کہتا تھا۔ شاید آج ہی تم اسے دیکھو۔۔۔"

"اس سے پہلے تم بہت کچھ دیکھو گے سکندر۔" طلاور نے کہا اور فون اٹھا لیا۔ اس نے ایک نمبر ڈائل کیا لیکن فون کے اسپیکر کو بند کر دیا تاکہ میں ان کی گفتگو نہ سن سکوں۔

"گاڑی باہر ہے؟" وہ بولا۔ "ہاں۔۔۔ پانچ منٹ میں۔۔۔ پانچ منٹ ہوتے ہی تو میں تمہاری کھال کے ٹکڑے بنوا کے تمہاری ماں کو بھیج دوں گا۔" وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ "اور سنو۔۔۔ رابعہ اور شہلا۔"

یہ آخری بات اس نے مجھے چونکانے اور میری توجہ اپنی طرف کرنے کے لیے کہی تھی ورنہ اسے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا۔ رابعہ اور شہلا کا نام سنتے ہی میں نے بے اختیار طلاور کی طرف دیکھا اور اس ایک لمحے میں اپنی حفاظت کے تقاضوں سے غافل ہو گیا۔ طلاور نے ریسیور میرے منہ پر کھینچ مارا۔ فون کریڈل کے ایک کونے پر ہوتا تو شاید بل کھائے ہوئے اسپرنگ جیسے تار کی قوت اسے آگے بڑھنے سے روک لیتی مگر فون طلاور کے بالکل سامنے اور میز کے وسط میں تھا۔ میز کا تین فٹ سے کچھ کم چوڑائی ہم دونوں کے درمیان حائل تھی اور کریڈل سے الگ ہونے کے بعد ریسیور دوسری طرف برابر فاصلے پر چار فٹ تک تو جا ہی سکتا تھا۔ یہ طلاور کی زبردست چال تھی کہ اس نے میرے ذہن کی غفلت کے ایک لمحے کو پیدا کیا اور جب وہ لمحہ اسے حاصل ہوا تو اس نے اپنی جگہ سے اٹھے بغیر اور مجھے کوئی موقع دیے بغیر میرے دفاع کی صلاحیت ختم کر دی۔ ریسیور کسی پتھر کی طرح میرے منہ پر لگا اور میں سنبھل نہ سکا۔ میرا سر ایک جھٹکے سے پیچھے ہوا۔ طلاور نے ریسیور جھٹکے سے واپس کھینچا۔ میرا ہاتھ میز کی خالی سطح پر پڑا۔ پستول اس وقت تک طلاور کے قبضے میں پہنچ چکا تھا۔ اس درد کو بھول کر جو میری ناک اور جبڑے کی ہڈی میں یوں اٹھا تھا جیسے ہڈی ٹوٹ گئی ہو، میں کرسی سے لڑھک گیا۔ پستول سے نکلنے والی گولی میرے پیچھے کی دیوار سے ٹکرا کے پیچھے گری یا اس میں پیوست ہو گئی۔۔۔ یہ میں نے نہیں دیکھا۔

"باہر آ جاؤ سکندر اعظم۔" میں نے طلاور کی آواز سنی جو میرا مذاق اڑا رہی تھی۔ "تم اسے چھپ کر نہیں بچ سکو گے، نہ گولی کو روک سکو اور نہ میرا نشانہ اتنا کچا ہے۔ میں نے گولی تم پر چلائی ہی نہیں تھی۔" وہ کھسک کے جھکا اور نیچے جھکا۔ میں نے اس کے پستول کو میز کی سطح کے نیچے اپنے سر سے دو فٹ دور دیکھا۔ "اٹھو!" اس نے پستول والے ہاتھ سے حقارت سے حکم دیا۔ "کوئی تو میں تم کو یہاں بھی مار سکتا ہوں مگر اتنی آسان موت تمہارے مقدر میں نہیں ہے۔"

میں آہستہ آہستہ اٹھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری ناک سے خون قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا اور درد کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ چوٹ میرے لبوں کے کنارے پر لگی تھی، میرا اوپری ہونٹ کٹ گیا تھا اور کسی ہونٹ سے ٹپکتے خون کا نمکین ذائقہ مجھے زبان پر محسوس ہو رہا تھا۔ طلاور نے پستول کو اٹھا کے پھر کریڈل پر اپنے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر یوں مسکرا رہا تھا کہ اس کی مسکراہٹ کسی گالی سے زیادہ اشتعال انگیز لگتی تھی۔

"تم تیس منٹ میں سے پانچ منٹ ضائع کر چکے ہو۔" میں نے ناک سے خون کو آستین سے صاف کیا۔ "جب چاہو مجھے گولی مار سکتے ہو مگر جو تمہارے اور تمہارے خاندان کا تمہارے تباہ ہونے کے باعث۔"

"صرف اپنی فکر کرو۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔

"اس جنگ میں لوگوں کو گھسیٹنے میں تمہیں۔۔۔"

رابعہ اور اس کی ماں کے ساتھ جو کچھ کیا گیا تھا۔۔۔ تھا کہ تم نے مجھے ایک دوست کی بیوی۔۔۔ محسن کی بیوی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تمہاری۔۔۔ جو تمہارے بچوں کی ماں ہے وہ جو تمہاری عزت ہے۔۔۔ کرنا چاہیے تم گیارہ بجے۔۔۔"

"گیارہ بجے کچھ نہیں ہو گا۔" وہ دیوانوں کی طرح۔۔۔ پر تنقید آور ہوا۔ اس کی دیوانگی۔۔۔ رہی تھی جس کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کمزور پڑ گیا تھا۔ اس کا سارا اعتماد، اطمینان اور غرور ایک اعتراف شکست میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اداکاری۔۔۔ کرنے کا زبان سے خود کو ناقابل تسخیر۔۔۔ خود کو شیطان سے زیادہ خطرناک تسلیم کرنے کا۔۔۔ تھا۔ اس کا سیلف کنٹرول ختم ہو رہا تھا۔۔۔ ذہنی ابتری کی دلیل تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔۔۔ کو خالی ہاتھوں سے بھی اٹھا سکتا ہوں۔۔۔ جھٹکے سے لگا مار سکتا تھا اور۔۔۔ لینے کی کوشش بھی نہیں کی تھی مگر۔۔۔ کسی مسند یا مرتبہ کا مستحکم نہ تھی۔

میں نے سر جھکایا اور جیسے اس کے۔۔۔ وہ ادھر جھکا تو میں نے گھٹنا اٹھایا اور پھر دونوں ہاتھ ملا کے ایک زوردار الٹا ہاتھ پوری قوت سے مارا۔ گردن کی ہڈی کسی دیاسلائی کی طرح ٹوٹ جاتی لیکن۔۔۔ دیتا تو خود بھی مارا جاتا اور میرا مشن ادھورا رہ جاتا۔

۔۔۔ کے خواب بھی شامل تھے۔ طلاور۔۔۔ مسلح افراد نمودار ہوئے ان سب کے۔۔۔ پیچھے آمد آیا تھا۔ پیڈرو۔۔۔ بالکل مختلف۔۔۔ تھا۔۔۔ کھڑا تھا۔

"۔۔۔ ہاتھ باندھ دو۔" پیڈرو نے کہا۔ آمد۔۔۔ سے دو نے مشین گن رکھ دی۔ تیسرا۔۔۔ مشین گن کا رخ میری۔۔۔ پیٹھ کی۔۔۔ ایک انگلی ٹریگر پر رکھ کے کھڑا رہا۔ وہ مجھے صورت سے بھی جنونی لگتا تھا۔ ایک ایسا شخص جو۔۔۔ کے بغیر بھی گولی چلا سکتا تھا۔ کسی وجہ کے۔۔۔ کر سکتا تھا اور میرے بدن کے ہر سوراخ سے۔۔۔ نکلتے دیکھ کر خوشی سے قہقہے لگا سکتا تھا۔۔۔۔ کسی فعل کے منطقی جواز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود۔۔۔ جانتا کہ وہ کیا کر رہا ہے کیوں کر رہا ہے۔ سب اس کی۔۔۔ منحصر ہے۔ وہ چاہے تو سر پر۔۔۔ لے کر سے پھاڑ کر آگ۔۔۔ قریب سے گزرنے والے کے گریبان پر ہاتھ۔۔۔ اسے دیکھ۔۔۔ کے ہاتھ میں مشین گن دیکھ کر میرا خوف۔۔۔ اپنی جگہ منجمد ہو گیا اور اس کی طرف۔۔۔ مسکرایا۔

۔۔۔ ہو گئی تھی۔ جیسے شہر کے دوسرے سرے۔۔۔ ہو جانے والی عورت کو موت۔۔۔ ہاتھوں زیر ہونے کے بعد۔۔۔ احساس ہو رہا تھا کہ میرے۔۔۔ کمزوری کا تماشا کر کے اس نے اپنا۔۔۔ کاٹ دیا تھا اور پیڈرو نے طلاور کی شخصیت۔۔۔ کی فکر میں تھا جو میرے ہاتھوں سے ذرا۔۔۔ آ رہی تھی۔

"دونوں ایک رسی سے کر دو۔"۔۔۔ مشین گن پیچھے رکھ۔۔۔ میرے ہاتھ پیچھے کر لیے۔

"تم کو تو بالکل بے وقوف نہیں سمجھتا تھا طلاور۔" میں نے۔۔۔ میری ناک سے بہنے والا خون بند ہو گیا۔۔۔ خون کے باعث میں ناک سے سانس۔۔۔ لانے والے سے بات کرنے۔۔۔ کے گرد رسی لپیٹنے میں مصروف تھے۔ "ایک ثبوت۔۔۔ اس کے باوجود تم سمجھتے ہو کہ گیارہ بجے کچھ نہیں۔۔۔ کی طرف دیکھو۔"

۔۔۔ گھڑی کی طرف نہیں دیکھا۔ پیڈرو نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن وہ شخص جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ ذہنی طور پر پسماندہ ہے میری چال میں آ گیا۔ وال کلاک اس کے پیچھے تھا۔ اس کی گردن بے اختیار گھوم گئی۔ میں نے دایاں پیر ایک دم پیچھے کی جانب اٹھایا۔ میرے ہاتھ باندھنے والوں میں سے ایک پہلو کے ذہن میں۔۔۔ میں نے غوطہ مارا اور مشین گن والے کے پیروں میں جا پڑا۔ اس نے خطرے کا احساس ہوتے ہی ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ مشین گن کا ایک راؤنڈ ختم ہو گیا۔ جیسے ہی میں نے کیا تھا اس کا نشانہ ہوتے وہ سیدھا ہوا ہی تھا کہ گولیاں اس کے جسم سے گزر گئیں۔ دوسرا جو میرے ہاتھوں کے گرد رسی لپیٹ رہا تھا میرے ساتھ کھنچا چلا آیا۔ میں تو فرش پر اوندھا ہو گیا مگر وہ مزاحمت کے باعث سیدھا رہا اور مجھے اپنی جانب کھینچنے کی کوشش میں مارا گیا۔ ان دونوں کے حلق سے ایک جیسی بھیانک چیخ نکلی۔ رسی سے آزاد ہوتے ہی میرے ہاتھوں نے مشین گن والے کی پنڈلیوں کو عین ٹخنے کے اوپر سے گرفت میں لے لیا جہاں ان کی موٹائی کم سے کم تھی۔ ایک جھٹکے سے وہ اس پل کی طرح گرا جس کو سہارا دینے والے ستون کشتی کے دھکے سے غائب ہو جائیں۔ پیڈرو اور طلاور صورت حال کی اس غیر متوقع تبدیلی کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ مشین گن کے فائر کی آواز سے وہ غیر شعوری طور پر پیچھے ہٹے اور مجھ سے چند قدم دور ہو گئے۔ مشین گن والا پیچھے گرا تو اس کا سر سیمنٹ کے فرش پر لگا اور ضرب کی شدت نے اسے بے سدھ کر دیا۔

میرا ہاتھ ایک دم اس مشین گن کی طرف بڑھا جس کے راؤنڈ نے دو افراد کو ایک سیکنڈ میں موت سے ہمکنار کر دیا تھا لیکن اس میں اب کوئی راؤنڈ نہیں تھا۔ اسے دوبارہ لوڈ کرنے کے لیے اضافی راؤنڈ کہاں سے آتے۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اپنے پیچھے رکھی ہوئی دو میں سے ایک مشین گن اٹھانے کا نہیں سوچا۔

اسی وقت میں نے پیڈرو کو جست لگا کے اپنے قریب سے گزرتے دیکھا۔ میں نے خالی مشین گن کو ڈنڈے کی طرح گھمایا۔ اس کا بٹ پیڈرو کی پنڈلی پر بالکل سامنے پڑا۔ ہڈی پر لگنے والی ضرب کی شدت دہرے تصادم کے باعث دگنی ہو گئی۔ ایک طرف سے وہ آگے بڑھ رہا تھا اور یقین نہیں کہہ سکتا کہ اس کی رفتار کیا ہو گی مگر دوسری طرف سے گن کا بٹ کم سے کم دس گنا رفتار سے آیا۔ نتیجے میں وہ چیخ مار کے منہ کے بل گرا اور خالی مشین گن جھٹک کر ایک دم اٹھا۔

طلاور نے دیکھ لیا تھا اور سمجھ لیا تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ مسلح افراد کے دو ارکان خاک و خون میں غلطاں پڑے تھے۔ تیسرے کو دن میں تارے نظر آ گئے تھے یا اسے زمین آسمان الٹے گھومتے محسوس ہو رہے تھے کہ وہ فرش پر پڑا طلاور کو نفرت سے بھٹک

www.paksociety.com

رہا تھا۔ سیکیورٹی افواج کا کمانڈو اگر ہمیں زمین بوس ہوگیا تو چوہدری ملاور کو اپنی حفاظت کے لیے خود کچھ کرنے کا خیال آیا۔ مگر اس خیال کے آنے اور سیکیورٹی گن تک پہنچنے میں سیکنڈ کے سویں یا ہزارویں حصے کا فرق رہ گیا جس کی وجہ سے مشین گن پر پیٹ میں گرا۔ چوہدری ملاور سینے کے بل اوپر گرا اور میں نے ایک کروٹ لے کر اسے دور دھکیل دیا۔ سیدھا کھڑا ہوتے ہی میں نے دوسری مشین گن پر ایک پاؤں رکھ دیا اور اپنے ہاتھ کی مشین گن کا رخ ملاور کی جانب کر دیا تب میں نے دیکھا کہ دروازے کے پیچھے کچھ تماشائی بھی ہیں جو فائرنگ کے شور ہنگامے اور چیخ پکار پر کام چھوڑ کر دوڑے تھے۔ مشین گن کا رخ اپنی جانب دیکھ کر وہ بھاگ جانے لگے۔

"رک جاؤ سب۔" میں نے چیخ کر کہا۔ وہ سب یوں رک گئے جیسے بجلی سے چلنے والے کھلونے لائٹ جاتے ہی ساکت رہ جائیں۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی مگر میری ذہنی و جسمانی صلاحیت آزمائش کے مرحلے سے گزر کر دو چند ہو گئی تھی۔ "دروازہ... گیٹ بند کرا دو... نہ کوئی باہر جائے گا نہ اندر آئے گا اور نہ فون کرے گا۔ یہ کم از کم دو ان آدمیوں کو ورنہ اس مشین گن کا راؤنڈ میں ان پر چلا دوں گا۔ دوسری مشین گن پھر بھی میرے پاس ہوگی۔"

"جاؤ!" ملاور نے زخمی شیر کی طرح دہاڑ کر کہا۔ "سنا نہیں تم نے کیا کرنا ہے... اور کیا نہیں کرنا ہے۔"

"نہیں۔ یہ سب جو کرنے میں آ چکے ہیں یہیں رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم فون پر حکم دو گے۔ یہ سب یرغمالی ہیں۔ تمھاری یا کسی اور کی ملاوری کی قیمت یہ اپنی جان سے ادا کریں گے۔ کوئی ملازم خود کو ضرورت سے زیادہ چالاک اور حد سے زیادہ نمک حلال ثابت نہ کرے ورنہ ان سب کی موت کا ذمہ دار وہی ہوگا۔ اندر کی خبر باہر نہیں جانے گی۔ اشارے کنایے یا کوڈ میں۔ کوئی پرچی لکھ کر یا کسی آنے والے فون کے جواب میں غلط بات کہی گئی تو میں ان سب کو بھون دوں گا۔ ان کی بیویاں یتیم اور بچے بیوہ... میرا مطلب ہے... خیر مطلب تم سب لوگ سمجھ گئے ہو۔"

ملاور آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس نے فون اٹھانے کی کوشش کی۔ ایک مشین گن ہاتھ میں سنبھالے اور دوسری کو پیر سے گھسیٹتا میں میز تک پہنچا۔ ملاور نے وہی نمبر ڈائل کیے تھے کہ میں نے ایک ہاتھ مارا اور فون دیوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔

"میں نے فون استعمال کرنے سے منع کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "انٹرکام استعمال کرو... باہر کی دنیا سے تمھارا کوئی رابطہ نہیں ہونا چاہیے۔"

چوہدری ملاور کی صورت بگڑ گئی۔ اس کی یہ چال بھی ناکام رہی تھی۔ وہ میرے سامنے فون کرتا اور وہی نمبر دہراتا جو میں نے کہا تھا مگر سننے والا شاید ایس پی سراج ہوتا۔ تو سب تصور شیشہ ہوتا یا اس کا کوئی مددگار رہتا جو فوراً سمجھ جاتا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ میں نے نہیں دیکھا تھا کہ وہ کیا نمبر ڈائل کر رہا ہے اور یہ نمبر یا اندر کا۔

"چوکیدار سے کہو باہر تالا ڈال دے۔" میں نے کہا۔ آنے والے سے بھی کہے کہ فیکٹری بند کر دی گئی ہے۔ سب ملازم کے جنازے میں گئے ہیں... ٹیلی فون ایکسچینج سے کہو کہ سب فون یہاں آ جائیں۔" ملاور نے انٹرکام کا بٹن دبا کر کہا۔ زبان سے نکلنے والا ہر لفظ ایک حکم ہوتا ہے... گھڑی کی طرف دیکھو چوہدری ملاور۔" میں نے کہا۔ "اشارہ ہو سے جاتے تو میں کیسے ثابت کرتا کہ گیارہ بجے فون آئے گا کہا تھا۔ اب دس بج کر چالیس منٹ ہوئے ہیں۔ ٹھیک پونے گیارہ بجے تم کو فرشتہ اجل کے نمائندہ خصوصی کی کال آئے گی جو میں ریسیو کروں گا... لیکن سنو گے تم بھی۔"

کمرے میں موجود سات افراد نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ فرشتہ اجل کے روپ میں تو صرف میں ان کے سامنے موجود تھا پھر یہ نمائندہ خصوصی کون ہوگا جو کال کرے گا؟ ایسا کبھی دیکھا نہ سنا کہ حضرت عزرائیل نے کسی کی جان لینے سے پہلے اسے فون پہ مطلع کیا ہو کہ حضرت جی حاضر ہو جاؤ۔

"ایک قدم پیچھے ہو کر دیوار کے ساتھ لگ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" ان سب نے بڑی فرمانبرداری سے تعمیل کی۔ سوائے بیڈ روم کے جو وہیں بیٹھا رہا اور کراہتا رہا۔ کال ٹھیک پونے گیارہ بجے آئی۔ میں نے بٹن دبا کر فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ "ہاں بھئی کس سے بات کرو گے؟" میں نے پنجابی زبان میں کہا۔

"یہاں ملاور کون ہے؟" غالب کی آواز آئی۔

"کوئی بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "سب بزدل ہیں۔ کی طرح ڈرپوک کھڑے ہیں۔ ان میں اپنے چوہدری صاحب بھی ہیں۔ مشین گن کے سامنے بیر بہوٹی کی طرح کانپ رہے ہیں۔" غالب یقیناً سمجھ گیا ہوگا کہ دال میں کچھ کالا تھا مگر اب پوری دال ہی کالی ہے یا سفید ہے ورنہ ملاور مشین گن کی زد میں کیسے آ گیا؟

"اپنے چوہدری صاحب! آپ سب ڈسپوزل ہیں۔ ایک ٹیلی فون اور کریں۔" غالب بولا۔ "ان سے کہیں کہ سراج کے گھر میں کسی نے ٹائم بم رکھ دیا ہے جو ٹھیک گیارہ بجے پھٹ جائے گا..."

"سراج... سراج کے گھر میں...؟" ملاور ہکلایا۔

"یہ تو واقعی بچوں کی طرح کانپ رہا ہے۔" غالب نے قہقہہ مارا۔ "اس سے کہو... یہ بڑا چھوٹا یار کھلاڑی ہے یہاں بھی لق لق... اس گھر میں... اس کی بوڑھی ماں بھی رہتی ہے۔ ...کوئی بھی نہیں بچ سکے گا۔" ملاور نے غضب ناک ہو کر غالب کے خوف سے تمام بات سنی پھر کہا۔

"جب ہم پولیس میں بھرتی ہوئے تھے تو اس نے کسی کی ماں بہن کا خیال نہیں کیا تھا۔ ہم پولیس والوں کو نہیں سمجھتا تھا۔ شریف اور بدمعاش میں فرق نہیں رکھتا۔ ہم سب جنگل میں کام آتے ہیں۔ یہ چوہدری کی ماں کا... یا سکندر کے باپ کا کس نے لحاظ کیا۔ ملاور اور بھی بہت سے نام یاد ہوں گے تم کو جو لٹنے کے بعد بے گناہ تھے۔ ایس پی سراج کی ماں ہے۔" غالب نے کہا۔ "اس بار تو تیلیفون ڈسپوزل اسکواڈ والے تمھاری بات سن لیں گے ہی نہیں۔ تم جانتے ہو وہ کہاں دوڑاؤ گے ان کو اور ہر جگہ وہ دو دو منٹ میں پہنچ نہیں سکتے۔ ایک بم کا سراغ لگانے کے لیے بھی تو وقت چاہیے۔"

"ہیں... میں اس کے... سراج کے گھر فون کر دوں؟"

"تمھارا باپ ہے وہ تصور کا بچہ...؟" میں نے گرج کر کہا۔ "اور جب ایک بار میں نے کہہ دیا ہے کہ کوئی فون کال نہیں جائے گی تو نہیں جائے گی... آنے والی تو میں ریسیو کروں گا۔"

"ایک فون کال کی اجازت مجھے دینا ان کو یار۔" غالب نے کہا۔ "ایس پی سراج کی کوٹھی سے متصل دوسری کوٹھی کا فون نمبر ہے۔ گیارہ بج کر پانچ منٹ پہ... یعنی اب سے دس منٹ بعد... ان کو دوسری خوش خبری ملے گی... نمبر لکھو..."

میں نے منصور کو اشارہ کیا۔ اس نے مجبوراً نمبر لکھا پھر لائن کٹ گئی۔ ملاور کی حالت کا تغیر اب قابل دید تھا۔

"سنو! میں بات کرنا چاہتا ہوں تم سے۔" وہ لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "بیٹھو گی میں..."

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اب کوئی فائدہ نہیں۔ تم نے اس مشتبہ فائدہ اٹھانے کے بجائے پیچھے ملاور بیٹے کی کوشش کی اور بیٹا ایک ساتھی گنوا دیا۔ اس کی ماں کے خون ناحق کے تم ذمہ دار ہو... تم نے پھر فیصلے میں دیر کی تو موت... یاد رکھو کتنے احمق ہو کہ اپنی عزت کو اور بھی سمجھتے ہو۔ میں نے تم کو آتے ہی بتا دیا تھا کہ میں اپنی حفاظت کا پورا بندوبست کر کے آیا ہوں۔ صرف تم اپنے دفاع سے غافل تھے۔"

"میں تم کو... بتا دوں گا... کہ وہ کہاں ہیں۔" وہ بولا۔

"بتاؤ گے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "گیارہ بج کر پانچ منٹ سے پہلے نہیں تو اب آدھے گھنٹے کی مہلت ملے گی۔ بلکہ پچیس منٹ کی۔ ساڑھے گیارہ بجے تک ان کا صحیح پتا ٹھکانا بتا دیا اور اتنا وقت ہوا کہ ہم ان کو بحفاظت نکال سکیں تو ہم تمھیں بھی بتا دیں گے کہ بم کہاں ہے... اگر تمھیں وقت ملا تو تم بھی وہی کر سکو گے جو ہم کریں گے۔ تم اپنے یار ایس پی اور اس کی ماں کے لیے تو کچھ نہیں کر سکے۔ مگر اس کے بعد جس کی باری ہے شاید اسے بچا سکو۔ یہ سب تمھارے تعاون پر منحصر ہے۔ یاد رکھو ہم اس وقت تک کچھ نہیں بتائیں گے جب تک ہمیں یقین نہیں آ جائے گا کہ اب وہ بالکل محفوظ ہیں اور ہم بھی۔ تیسرا نشانہ کون ہے یہ میں ابھی نہیں بتا رہا ہوں مگر یہ جو تھا نشانہ تمھارا اپنا گھر ہوگا۔ تمھارے اپنے بیوی بچے تمھاری وجہ سے مریں گے۔"

ملاور اب میری ہر بات پر یقین کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس کی مضبوط شخصیت موم کے بت کی طرح پگھل چکی تھی اور وہ پٹے ہوئے مہرے کی طرح انہی کی نظروں کے سامنے ذلت و رسوائی برداشت کر رہا تھا جو اس کے نام کی دہشت سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ یہ شکست وقتی بھی مگر مکمل تھی۔ وقتی اس لیے کہ تمام وطن فروشوں کا اور ان کے اڈوں کا پتا چلنے تک ملاور کا زندہ رہنا ضروری تھا۔

"پہلو دوڑا یار، سراج کی خیریت معلوم کرو۔" میں نے گھڑی کی طرف دیکھا جس میں گیارہ بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔

"نمبر تم ملا دو..." ملاور نے کوڑے ہوئے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زمیے لہجے میں کہا۔

"انٹرکام پر کسی سے کہو کہ ایک فون نکال کر یہاں لے آئے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے چپڑاسی کی لائن بھی یہی ہے۔ اسے کہو اپنا فون پلگ سے نکال کر یہاں لگا دے۔"

وہ شخص جو کافی لے کر آیا تھا اور جسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی جگہ جا بیٹھے اس وقت دیوار کے ساتھ دونوں ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ اس نے اجازت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"جاؤ لیکن اپنی زندگی کو وفاداری کے غیر ضروری مظاہرے سے خطرے میں مت ڈالنا۔" میں نے کہا۔ "چوہدری صاحب تمھیں تو پی لے دینا دیں گے مگر یہ جو باقی بے گناہ کھڑے ہیں ان کی جان لے کر ایک عہدہ حاصل کرنا تم کو بہت مہنگا پڑے گا۔"

"یہ سب میرے ساتھی ہیں سر۔" وہ سسکیوں سے بولا۔

"اس کے علاوہ... وہ شارع بھی تو ہے جس پہ آشیانہ تھا۔" میں نے کہا۔ "تو آشیاں بندی سے کیا حاصل۔ ان کے ساتھ چوہدری صاحب بھی گئے تو تم کس کے لیے اے خوشی گے؟"

غالب! یہ دوسرا لمحہ اسے قائل کرنے میں زیادہ اہم کردار ادا کر گیا اور وہ چند منٹ میں فون کو پلگ سے نکال لایا۔ ٹیلیفون کی لائن بجلی کے تاروں کی طرح فٹ کی گئی تھی۔ جیسا کہ عموماً دفاتر اور بڑے اداروں میں ہوتا ہے۔ اور ایک بورڈ میں ٹیلی فون لائن کے تین کنکشن تھے۔ اس نے صحیح ساکٹ میں پلگ لگایا اور

www.paksociety.com

بے حد سعادت مندی سے پھر اسی صف میں جا کھڑا ہوا جہاں دوسرے بچے اقرار زندگی سے بیزار کھڑے تھے۔ وہ تماشا دیکھنے آئے تھے اور خود تماشا بن گئے تھے۔

دلاور نے جس بے دلی کے ساتھ نمبر ڈائل کیا، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ یقیناً وہ اسے پہلے ہی آ چکا ہے اور اب دوسری بری خبر کی تصدیق سے احساس کے عذاب میں اضافہ ہی ہوگا۔ اس دوسرے فون کے ساتھ ایکسٹینشن/ لاؤڈ اسپیکر نہیں تھا مجھے افسوس ہوا کہ میں نے ٹیلی فون کو بلاوجہ جھپٹ لیا تھا۔ میں دلاور کو جھپٹ مار کے فون استعمال کرنے سے روک سکتا تھا۔ اس ٹیلی فون کے ٹوٹ جانے کا نقصان یہ ہوا کہ میں دلاور کی گفتگو مکمل طور پر نہیں سن سکا۔

"کون... دیکھیں جی میں دلاور بول رہا ہوں۔" چوہدری دلاور نے جھکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کے ساتھ والی کوٹھی میں ایک ایس پی صاحب رہتے ہیں جی؟ ہاں جی... جی... پوری کوٹھی تباہ ہو گئی... کوئی نہیں بچا؟ آپ کو معلوم ہے ایس پی صاحب کی والدہ اندر تھیں... اور خود ایس پی صاحب... نہیں معلوم..." اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"اب بھی تم یہ سمجھتے ہو کہ میں بے وقوفوں کی طرح تمہارا گھر کے بھول چکا یا چھپ گیا تو تم سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اب میں اکیلا نہیں ہوں دلاور... اور کمزور بھی نہیں ہوں۔ میں ماسٹر وزیر خان کا بیٹا ہوں جس کو تم نے بے بسی اور ذلت کی موت مار دیا اور اپنے شکاری کتے پیچھے لگا کے مجھے افغانستان سے یہاں بلوا لیا۔ آج میں ایک طاقت ہوں دلاور۔ میرا نام انصاف کی طاقت ہے۔ تم اپنی دولت اور بدمعاشی کی طاقت کے غرور میں انصاف کی بات کرنے والوں کو کیا سمجھتے تھے؟ خیالی دنیا میں رہنے والے احمق۔ مگر یہی احمق آج تم سے تسلیم کرا چکے ہیں کہ انصاف ایک سچائی ہے جسے ختم کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سورج کی دھوپ کو کالا کرنا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ انصاف آج بھی ملتا ہے اور اگر ملتا نہیں تو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت کا تصور کرو جب تمہاری جگہ میں اسی طرح خوف اور وحشت میں مبتلا... ڈرا ہوا اور سہما ہوا کھڑا تھا۔ تمہاری طاقت اور دبدبے کے ڈر سے مرعوب اور خود کو تمہارے رحم و کرم پر سمجھنے والا۔ آج صورت حال اس کے برعکس ہے۔ انگریزی محاورے کے مطابق میزیں الٹ گئی ہیں۔ اب تم میرے جوتوں میں کھڑے ہو۔ یہ بھی انگریزی محاورہ ہے۔ اس کا اندازہ تم کو ہو چکا تھا۔ اسی لیے تم مجھے انصاف کی خیرات دینا چاہتے تھے یعنی قانونی حق دینے کی بات کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات تم نے بہت دیر سے کی۔ اپنے فیصلوں کی طرح۔ اب مجھے تم سے بھیک مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود سب کچھ حاصل کر سکتا ہوں۔"

ایک تقریب میں نے ان سب کو دیکھا جو اپنی … نہیں جھکتے تھے لیکن ہاتھ اوپر رکھنا ان کے لیے شرمناک … سب سے زیادہ بدتر حالت پیڈرو کی تھی جو ٹانگ … سے وہ شدید تکلیف میں تھا اور کھڑا ہو … ساری باتیں اس نے بھی سنی تھیں اور دلاور کی طرح وہ بھی اندر اپنے پیچ و تاب کھا رہا تھا اور اپنی … رہا تھا کہ اس نے تین افراد کی طاقت پر جو شین گن … بہت زیادہ بھروسا کر لیا۔ یہ ان کا قصور نہیں تھا۔ ایک … تین شین گنوں کے سامنے کتنا بے بس ہوتا ہے اس کا … اندازہ تھا۔ وہ کس طرح فرض کر لیتے۔ تقدیر … ورنہ وہ اپنی جیب میں ایک ریوالور تو ضرور رکھتے۔

"استاد پیڈرو!" میں نے تفریح طبع کے لیے … ضروری سمجھا۔ "بہت بے ادب ہو گئے ہو تم۔ تمہارے … ہمت، تمہارے ان داتا اور باس کھڑے ہیں۔ … کھڑے ہو جاؤ۔"

"میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔" وہ بولا … کو سمجھتے ہوئے یا دلاور کے اشارے پر اس نے … اور غرانا بند کر دیا تھا اور شرافت سے بات کر رہا تھا۔ … لہجہ بھی مجھے اچھا لگا۔

"کون سی ٹانگ؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"یہ ٹانگ۔" اس نے خون کے گھونٹ پی کر … کی طرف اشارہ کیا۔

"غلطی تمہاری تھی... تمہیں کیا ضرورت تھی ٹانگ … کی۔" میں نے محاورے کا غلط استعمال کیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اور احترام کرنے والے تو ایک ٹانگ پر کھڑے رہتے ہیں… کھڑے ہو جاؤ۔"

پیڈرو مجھے یوں دیکھتا رہا کہ اس کی آنکھوں سے … ہوئی خون کی پیاس کو میں نے محسوس کیا۔ جیسے راکھ میں دبی … چنگاری کی حرارت محسوس کی جا سکتی ہے۔ مگر وہ اسی طرح بیٹھا … "کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری دوسری ٹانگ بھی توڑ دوں … پھر تمہیں پنکھے سے اسی طرح لٹکا دوں جیسے قصائی ذبح کیے … بکرے کی کھال اتارنے کے لیے اس کی ٹانگیں … میں نے کہا۔ "تم نے دیکھا تو ہوگا یہ منظر... یہ رسی دیکھو … منگوائی تھی... میرے ہاتھوں کے لیے... اب … کمال دیکھنا۔ دس منٹ الٹے لٹکو گے تو تمہارے حلق سے … بھی ذبح ہونے والے بکرے کی طرح نکلیں گی۔"

دیوار کے ساتھ ساتھ قطار میں کھڑے ہوئے سات … میں سے ایک بے اختیار ہنس پڑا۔ اب انھیں اپنی طرف …

… میں نے ان کو کئی بار بے گناہ کہا تھا جیسا کچھ … رہا تھا کہ میں ان کو بھی انتقام کی خاطر مار سکتا … دیکھنا کہ جینے والا وہی تھا جس کی شین گن سے آگ … بھی تو اب بیٹھے تھے اور جس سے میں نے پہلی شین گن … وہ واقعی ذہنی طور پر پسماندہ تھا۔ اسے پاگل نہیں کہا جا سکتا تھا۔ آدمی جب انتہائی احمق ہونے کی حد سے بھی آگے نکل جا … عمر کے مقابلے میں اس کے دماغ کی عمر پیچھے رہ جائے تو … پیڈرو نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"تم سب لوگ بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "مگر ایک شرط ہے جب میں اشارہ کروں تو تم لوگ تالیاں بجاؤ گے۔"

وہ سب بیٹھ گئے اور میں آگے بڑھا۔

"تالیاں!" میں نے پیڈرو کے قریب پہنچ کر شین گن اٹھائی۔ بیٹھے ہوئے لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور تالیاں بجانے لگے۔ دلاور اب بھی میری زد میں تھا۔

"چوہدری! جب میں شین گن سے استاد پیڈرو کی ٹانگ پر ضرب لگاؤں گا تو پھر تالیاں۔" میں نے کہا۔ "پیڈرو چلائے تو پھر تالیاں۔"

پیڈرو نے دیوار کا سہارا لیا اور ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کی ایک ٹانگ زمین پر تھی اور دوسری ہوا میں معلق تھی۔

"تالیاں۔" میں نے کہا۔ "استاد پیڈرو اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے... بلکہ پیر پر کھڑے ہو گئے۔"

دلاور اور پیڈرو کے ماتحت اور ملازم ان کے اشاروں پر ناچنے والے اور ان کے ٹکڑوں پر پلنے والے پھر تالیاں بجانے لگے۔ چشم فلک نے یہ تماشا پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

"ویری گڈ۔ ذرا ایک قدم آگے آ جاؤ استاد۔" میں نے کہا۔ "ہمارا بیٹا انسانوں کا لینا چاہیے۔ جانوروں کا نہیں... شاباش۔ بچپن میں تم نے کبھی ایک ٹانگ پر وہ کھیل تو کھیلا ہوگا... لنگڑی پالا؟"

استاد پیڈرو ایک ٹانگ پر اچھل کر آگے آیا تو اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی اذیت ناقابل برداشت تھی۔ وہ گرا تو اس کی وہ ٹانگ اپنے جسم کے وزن کے نیچے آ گئی۔ وہ ذبح کی طرح بلبلایا۔

"عورتوں کی طرح ڈھکوسلے مت کرو۔" میں نے گرج کر کہا۔ "کھڑے ہو جاؤ فوراً۔"

"میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ سور کے بچے... کتے..." پیڈرو نے بلبلا کر جواب دیا۔ "مار دو مجھے گولی... تیری..." … نے مجھے مزید غلیظ ترین گالیاں دیں۔ عام حالات میں ایسی گالیاں … زندہ ہوتا۔ میں اپنی سمجھ کر گندے منہ سے گندگی نکل ہی … کا نہیں۔ اس گٹر سے پھول کیسے جھڑ سکتے ہیں۔

گٹر میں پھول کیسے مہک سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت میں نے آگے بڑھ کے پیڈرو کے منہ پر کک ماری۔ وہ زمین پر گر گیا۔ میں نے اس کو ٹھوکریں مار مار کے بے حال کر دیا۔ کئی ٹھوکریں اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر لگیں اور اس کی چیخوں نے تماشا دیکھنے والوں کا رنگ فق کر دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پیڈرو کی حالت زار دیکھتے رہے۔ بالآخر پیڈرو کی آواز بند ہو گئی اور وہ بے حس ہو گیا۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ اب اسے ٹھوکریں مارنا کسی پتھر کو ٹھوکر مارنے کی طرح بے مقصد تھا۔

"تالیاں ایک بار پھر..." میں نے کہا اور یہ محسوس کیا کہ پیڈرو کو مارتے وقت میں دشمنی اور انتقام کے بے رحم جذبات سے کس حد تک مغلوب ہو چکا تھا۔ شاید میرے لاشعور میں دبا ہوا ایک خیال میرے شعور پر غالب آ گیا تھا کہ یہی میرے باپ کا قاتل ہے۔ بہت بے دلی سے چند افراد نے تالیاں بجا کے ظاہر کیا کہ وہ حکم عدولی نہیں کر رہے ہیں۔

"چوہدری دلاور..." میں نے کہا۔ "سوا گیارہ بجے ہیں... کیا تم ان دونوں کو ساڑھے گیارہ بجے تک یہاں بلا سکتے ہو؟"

"یہاں؟" دلاور چونکا۔ "میں تم کو وہاں پہنچا دوں..."

"جو میں کہوں گا وہ ہوگا..." میں نے کہا۔ "تمہاری مرضی نہیں چلے گی۔"

"لیکن صرف پندرہ منٹ ہیں۔" وہ بولا۔ "کم سے کم آدھا گھنٹہ تو دو۔" پیڈرو ایک بار کراہا۔ وہ ہوش میں آنے لگا تھا۔

"میں تم کو پون گھنٹہ دے سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر اس کے بعد یہ ممکن نہیں رہے گا کہ تم تیسرے بم کو بھی پھٹنے دو۔"

"تیسرا بم... وہ کہاں ہے...؟" دلاور کے حلق میں آواز گھٹ گئی۔

"یہ تمہیں کیسے فون پر بتایا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "جب رابعہ اور شعلہ یہاں آ جائیں گی اور ہم سب بحفاظت نکل جائیں گے تو تمہیں یہ بتا دیا جائے گا کہ تیسرا بم کہاں ہے۔"

"ٹھیک ہے... لیکن اس کے لیے مجھے ایک فون کرنا ہوگا۔" دلاور بولا۔

"کرو۔ لیکن ذرا سوچ سمجھ کے... یہ تیسرا بم تمہارے گھر کے اندر ہے۔" میں نے کہا۔

دلاور نے ایک نمبر ڈائل کیا جو میں نے ذہن میں نوٹ کر لیا۔

"جمشید! ان دونوں کو یہاں بھجوا دو۔" دلاور نے مختصراً کہا۔ "کم سے کم وقت میں۔" اور ریسیور رکھ دیا۔ دلاور کسی کا نام لیے بغیر بھی یہ حکم دے سکتا تھا مگر وہ حواس باختہ تھا۔ اس نے خود ہی پہلے نواب خسرو جمشید کا ٹیلی فون نمبر بتا دیا مگر اسے احساس نہ ہوا۔ اس نمبر سے خسرو جمشید کا سراغ لگایا جا سکتا تھا۔ اسی وقت پیڈرو کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

www.paksociety.com

"تمھارے کہنے کے مطابق رابعہ اور شملہ کو یہاں پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ ہی صرف ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "اس وقت کو ضائع کرنا ٹھیک نہیں چوہدری جی... اپنے استاد پیڈرو کو ایک کاغذ قلم فراہم کیجیے۔"

دلاور نے میز پر سے پیڈ اور بال پوائنٹ میں اٹھایا اور آہستہ آہستہ پیڈرو کی طرف بڑھا۔ پیڈرو کے قریب جا کر وہ تھوڑا سا جھکا اور اس ایک لمحے میں جب دلاور میرے اور پیڈرو کے درمیان حائل تھا، پیڈرو کا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس نے جیب سے ریوالور نکال کے مجھ پر فائر جھونک دیا۔ میں اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ میرا تو خیال یہ تھا کہ دلاور اور پیڈرو اپنے ساتھ کوئی ریوالور نہیں لائے تھے۔ دلاور تو ریوالور اپنی دراز میں رکھتا تھا مگر پیڈرو کا ریوالور عادت کے مطابق اس کے پاس تھا۔

میرا خیال ہے کہ پیڈرو نے گھبراہٹ اور عجلت میں نشانہ لیا تھا۔ اسی لیے گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ دلاور ایک دم گر گیا۔ اس نے مجھے پیڈرو کے مقابل نہیں کیا تھا۔ پیڈرو کو میرے سامنے چھوڑ دیا تھا اور اپنی جان بچائی تھی۔ یہ اس نے اچھا ہی کیا کیونکہ جواب میں ایک لمحے کا توقف کیے بغیر میں نے اسٹین گن کا برسٹ مارا مگر اس بات کا خاص خیال رکھا کہ کوئی پیڈرو کو نہ لگے۔ کوئی گولی اس کے ہاتھ پر لگی اور ریوالور اس کی گرفت سے نکل کر دور جا گرا۔ پیڈرو تکلیف سے چلایا۔ اس کا ہاتھ لہولہان ہو گیا تھا۔ دلاور نے اور کمرے میں موجود دوسرے لوگوں نے خوف و دہشت سے گولیوں کے ان نشانات کو دیکھا جو پیڈرو کے پیچھے والی دیوار پر نمودار ہو گئے تھے۔ یہ سوراخ اس کے جسم میں بھی ہو سکتے تھے مگر وہ بال بال بچ گیا تھا۔

"اب قلم اٹھاؤ اور لکھو۔" میں نے تیری اسٹین گن اٹھا کے کہا۔

"کیا لکھوں؟ اور کیسے لکھوں؟" پیڈرو نے اپنا خون آلود ہاتھ اٹھایا اور میں نے دیکھا کہ گولی سے اس کی درمیان والی انگلی اڑ گئی تھی۔ زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔

"یہ لو..." میں نے اپنی جیب میں سے رومال نکال کے دلاور کی طرف پھینک دیا۔ "اس کو پٹی باندھ دو۔ اس کے بعد تم منشی کے فرائض سنبھال لو... یعنی جو کچھ پیڈرو بتاتا جائے وہ لکھتے جاؤ۔ تم سمجھ گئے تھے کہ میرے والد کا اصل قاتل پیڈرو ہے اور پیڈرو ہی بتا سکتا ہے کہ وزیر خان کا مدفن اب کہاں ہے؟"

پیڈرو نے چونک کے سر اٹھایا۔ "یہ تم نے کہا تھا؟" اس نے ہر ہیبت بھرے ہوئے لہجے اور خونخوار نظروں کے ساتھ دلاور سے کہا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو بے وقوف۔" دلاور نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں، دلاور کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔ "عرصہ ساتھ رہنے کے باوجود ابھی تک تم اسے نہیں سمجھ سکے۔ اس نے مجھ سے ایک سودا کرنا چاہا اور سوچنے کے لیے مجھے تمھیں میرے حوالے کیا جا رہا تھا کہ میں تم سے وزیر خان کے قتل کا انتقام لے لوں اور تم سے یہ بھی معلوم کر لوں کہ کو اس کی قبر سے نکال کر تم نے کہاں دفن کیا تھا۔"

پیڈرو نے دوسرے ہاتھ سے دلاور کو دھکا دیا۔ "بچتا ہے؟ تم مجھے قربانی کے بکرے کی طرح..." پیڈرو نے ایک گالی دی۔

"ذرا صبر سے کام لو۔ تم دونوں۔" میں نے کہا۔ "تم دونوں مل کر کیا ناٹک کرتے رہے ہو یہ جو کچھ دلاور نے مجھے بتایا، تمھیں معلوم تھا۔ تم دونوں نے ہی مل کر اس دن کے لیے ایک تیار کیے ہوں گے اور خط نامہ لکھا ہوگا۔ اب وہی لکھو سب سے پہلے یہ لکھو کہ تم نے وزیر خان اور تم نے اس کو کیسے قتل کیا تھا؟"

"وزیر خان کو میں نے قتل نہیں کیا تھا۔" پیڈرو چلایا۔

"گویا میرے شیر خان علی کو تم نے قتل کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ یہ قتل تم نے کیسے کیا تھا؟... دلاور لکھتا جائے۔"

"اس سے کیا فائدہ ہوگا تمھیں؟" پیڈرو بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "عدالت میں اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی اور ویسے بھی عدالت میں میرا حاضر ہونا ناممکن سمجھو۔ اس کے بعد یہ لکھو کہ وزیر خان کو تم نے کہاں دفن کیا تھا۔ غلط بیانی سے کام لیے بغیر..."

پیڈرو نے اس ہاتھ کو دیکھا جس پر دلاور نے پٹی باندھ دی تھی۔ مہارت سے بندھی ہوئی پٹی تھی مگر اس کے باوجود خون رس رہا تھا اور وہ سخت تکلیف میں تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے ہوائی مانگ کو پکڑ رکھا تھا۔

"تم مجھے گولی مار سکتے ہو مگر مجھ سے یہ تحریر نہیں لکھوا سکتے۔" وہ بولا۔

"میں تم سے سب کچھ لکھوا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے اور تم کرو گے ایک دن۔ ابھی وقت کم ہے اس لیے میں اصرار نہیں کرتا۔ تم کو جانا تو میرے ساتھ ہی ہے۔" ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو کمرے میں موجود ہر شخص چونک پڑا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور میں نے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو..." میں نے کہا۔

"سکندر..." محسن کی آواز آئی۔ "کچھ بات بنی؟"

"تم تیار رہو۔" میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ یہ سب شدہ کوڈ تھے۔ میری بات کا مطلب یہ تھا کہ وہ فوراً ماڈل ٹاؤن ایم بلاک کی ہاؤسنگ سوسائٹی کے باہر کسی گاڑی میں میرا انتظار کریں۔ ان کے پاس نہیں تھی۔ ان کو حاصل کرنا تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی صورت میں پونے بارہ بجے سے پہلے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ اب حشمت خان کے گھر والوں کو بھی دھماکے سے اڑنے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

ہم نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ غالب اور محسن کس وقت فون کریں گے اور کامیابی یا ناکامی کی صورت میں ان کا لائحہ عمل کیا ہوگا۔ شیدی اس وقت لاؤنج میں چلا گیا اور اخبار پڑھنے کی ڈیوٹی پر مجھے یہ اطمینان ضرور حاصل تھا کہ نازو خیریت سے ہے۔ اس کا اغوا ناممکن نہیں ہوا اور وہاں سب کچھ پروگرام کے مطابق چل رہا تھا۔ یہ بات دلاور نہیں جانتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ دھماکے سے قبل سراج کی ماں کو خود غالب اور محسن نے اس گھر سے نکال لیا ہوگا۔ خواہ انھیں بڑی بی کو زبردستی اٹھا کے لے جانا پڑا ہو۔ جنگ میں عورتوں، بچوں کو نشانہ بنانا اخلاقی بزدلی سمجھا جاتا تھا اور اگر وقت آ جاتا تو دلاور کے بیوی بچوں کو بھی خود دلاور کی زبانی گھر میں بم کی موجودگی کی اطلاع مل جاتی۔ حشمت خان کے بیوی بچوں کو بھی کوئی خطرہ نہیں تھا۔ انھیں دس منٹ پہلے بھی گھر سے نکالا جا سکتا تھا۔

فون کی گھنٹی پھر بجی۔ یہ فون غیر متوقع تھا۔ فیکٹری کے اندر پانچ فونوں کا ایکسچینج تھا جو بند کر دیا گیا تھا مگر دلاور کے پاس ایک پرائیویٹ لائن تھی۔ میں نے سوچنے میں وقت ضائع کیے بغیر ریسیور اٹھا کے کہا۔ "ہیلو!"

"بھئی آج یہ کیا ہو رہا ہے؟ میرے کانوں نے ایک جانی پہچانی آواز بہت عرصے کے بعد سنی تھی۔ "یہ معقول چوکیدار نہیں روک سکتا جب کہ تمھاری فیکٹری میں آگ لگی ہے۔ اور اس کی خود سری دیکھو۔ چلو انھیں ماننا کیا ابھی ابھی چوہدری صاحب نے خود فون کر کے بتایا تھا؟"

"نواب خسرو جمشید۔" میں نے کہا اور ریسیور دلاور کو تھما دیا۔

"ہاں کیا بات ہے جمشید؟" دلاور نے کہا۔ "ہاں ہاں... تم گھبرا گیا مگر تم نہیں سمجھے۔ تم ذرا فون چوکیدار کو دو... چلو دوست۔" پانچ سیکنڈ کا وقفہ آیا جس کے بعد دلاور نے چوکیدار کو حکم دیا کہ نواب خسرو جمشید کو اندر آنے دے۔ دو خواتین کے ساتھ... خواتین کے الفاظ کا مجھ پر الیکٹرک شاک کی طرح اثر ہوا۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا اور میری نظر دروازے پر جم گئی۔

دو منٹ بعد ایک گاڑی اندر آئی۔ اس کے چاروں دروازے کھلے اور میں نے بھیگی آنکھوں سے رابعہ اور شملہ کو دیکھا۔ وہ سب شکر کے ساتھ میں آئی تھیں۔ اندر کا نقشہ دیکھ کر ان کے قدم رک گئے تھے۔ نسبتاً زیادہ خسرو جمشید کو صدمہ پہنچا۔ وہ اپنی جانی وضع میں تھا۔ سیاہ شیروانی، اونچے کلف لگے شملے والی دستار اور گھیر والی سفید شلوار۔ اس کی مونچھیں بھی پہلے کی طرح گھنی اور لمبی تھیں اور صحت مند کلین شیو چہرے کا رنگ بھی سرخ و سفید تھا۔ اس کا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا اور رک گیا۔ رابعہ اور شملہ کی صورت سے پریشانی عیاں تھی جو ایک قدرتی بات تھی اور وہ کچھ تھکی ہوئی بھی لگتی تھیں مگر اس کے علاوہ مجھے ان کی ظاہری حالت میں کوئی بات تشویشناک نہیں لگی۔

"تم دونوں ادھر آ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اور آپ نواب صاحب قبلہ... ادھر تشریف لے آئیے۔ اس صف میں بیٹھ جائیے۔ با ادب با ملاحظہ ہوشیار۔"

نواب خسرو جمشید کے ذہن نے بالآخر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ ان کا تیر چلا ہوا باس دلاور اور استاد کہلانے والا پیڈرو اسٹین گن کے سامنے بے بس ہیں تو وہ کیا کر سکتے ہیں جو محض نواب ہیں۔ وہ وہیں بیٹھ گیا جہاں دیوار کے ساتھ پہلا آدمی ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

"پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم اصلی ہو یا نقلی؟" میں نے کہا۔

"ہم اصلی بھی ہیں اور نقلی بھی۔" خسرو جمشید بولا۔ "جس کی شناخت جو وہ پہچان لے۔"

میں نے رابعہ اور شملہ کی طرف دیکھا۔ "تم ٹھیک ہو نا؟"

انھوں نے ایک ساتھ اقرار میں سر ہلایا۔

"تمھارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی کسی نے؟" میں نے کہا۔

"نہیں بس ہمیں یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا۔" رابعہ نے کہا... وہ یقیناً مجھ سے اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتی ہوگی مگر یہاں اس کا موقع نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے چوہدری دلاور۔" میں نے کہا۔ "اب تم سب انسپکٹر حشمت خان کو فون کرو۔ بم اس کے گھر کے ایک کمرے کی چھت میں معلق ہے۔ اسے نکالنے اور ناکارہ بنانے کا وقت نہیں ہے اس لیے گھر والے فوراً باہر نکل جائیں۔"

"حشمت خان!" چوہدری دلاور کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ "وہ تو خود بھی گھر پر ہوگا۔" وہ فون کی طرف لپکا۔

"گویا تم کو اس کی ڈیوٹی کا شیڈول بھی معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ دلاور نے بڑی گھبراہٹ میں نمبر ملایا۔ "حشمت! میں دلاور بول رہا ہوں۔ سنو اسی وقت گھر سے نکل جاؤ... پاگل کے بچے تمھارے گھر میں ایک ٹائم بم رکھا جا رہا ہے جو سات منٹ بعد پھٹ جائے گا... تمھارے باپ سکندر بخت نے رکھا ہے۔ سراج کے گھر میں پھٹ چکا ہے اور اس سے پہلے گوجرانوالہ والا کوٹھی میں۔ ہاں ہاں میں تصدیق کر چکا ہوں... دیر کرو گے تو مارے جاؤ گے..." اس کے ریسیور رکھ دیا۔ اس وقت تک نواب خسرو جمشید کی صورت

www.paksociety.com

پسپا ہو چکے تھے۔

"اب ہم چلتے ہیں۔" میں نے دلاور سے کہا۔ "تمہارے بیوی بچوں کی سلامتی کا دارومدار تمہارے رویے پر ہے۔ اگر ہمارا راستہ روکا گیا اور کسی نے ہمارا پیچھا کیا تو ہم دس منٹ بعد تم کو بتا دیں گے کہ وہ کہاں ہے۔ تم کو بہت وقت ملے گا ہم کو ناکارہ بنانے کے لیے۔ لیکن مجھے شک ہوا کہ تم نے کوئی چکر چلایا ہے تو ہم فون نہیں کریں گے۔ ایک گھنٹے بعد تم دنیا میں تنہا رہ جاؤ گے... ہم نواب خسرو جمشید کی گاڑی میں جائیں گے... رابعہ تم پیڈرو کا ریوالور اٹھا لو۔" میں نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا "اور شعلہ کے ساتھ جا کے گاڑی میں بیٹھو۔ تم ڈرائیور کے پیچھے ہو گی اس کے سر کا نشانہ لے کر بیٹھو گی۔ شعلہ درمیان میں ہو گی... پیچھے میں اور آگے دوسری سیٹ پر پیڈرو ہو گا۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" پیڈرو چلایا۔ اس کی آواز میں احتجاج تھا۔ شعلہ فریاد تھی کہ مجھے دشمنوں کے حوالے مت کرو... خوف تھا اور بے بسی تھی۔

"تم سے کسی نے پوچھا نہیں ہے کہ چلو گے یا نہیں۔" میں نے کہا۔ اتنی دیر میں رابعہ نے ریوالور اٹھایا اور شعلہ کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

"دلاور! تم چپ کھڑے ہو۔" پیڈرو نے چیخ کر کہا مگر اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ دلاور دوسری طرف دیکھتا رہا۔

"سور کے بچے... حرام زادے... یہی صلہ ہے میری نیکی کا۔ جو میں نے تیرے ساتھ کی..." پیڈرو پھر چلایا۔

"نیکی!" میں نے قہقہہ لگایا۔ "اول تو وہ نیکی نہیں تھی کسی کچے ڈاکو کی مدد نیکی نہیں کہلاتی۔ اس کے علاوہ یہ تو تمہاری بے وقوفی تھی کہ تم نے نیکی کر کے کچھ کیا تو کس کے لیے... سانپ کو دودھ پلاؤ گے تو کیا وہ ڈسنا چھوڑ دے گا اور اسے صلہ دینا ہو تب بھی اس وقت وہ خود مجبور ہے۔ وہ تمہیں جواب نہیں دے سکتا۔"

"نہیں... تم مجھے نہیں لے جا سکتے... دلاور... تم نے بھی مجھے چھوڑ دیا؟ ان سب کی طرح جو... تیرے زر خرید تھے۔" پیڈرو اب پاگل ہونے کے قریب تھا۔ اس صورت حال نے مجھے چونکا دیا۔ کیا واقعی یہ ڈراما نہیں تھا؟... دلاور سچ مچ اپنے دست راست سے محرومی کے فیصلے کو قبول کر چکا تھا۔ کیا دلاور کو ڈر نہیں کہ وہ ہماری تحویل میں ہو گا تو سارے راز کھول دے گا۔

"تم اگر جانا چاہو تو تمہیں کون لے جا سکتا ہے۔" دلاور نے اچانک بے حد پرسکون اور جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"کیا؟... تم... تو چاہتے ہو کہ میں...؟ دلاور! میں ایسا نہیں کر سکتا۔" اس کے ساتھ ہی پیڈرو کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا۔

"بزدل! کیا تم نے سوچا نہیں تھا کہ یہ وقت بھی آ سکتا ہے۔" اس نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ "تم سے پہلے بھی لوگوں کے سامنے سے راستے ختم ہو گئے تھے تو انھوں نے آخری راستہ اختیار کیا۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم ان معمولی حیثیت کے لوگوں کے آگے کم ہمت ہونے کا ثبوت دو گے۔ یہ تمہارا آخری ... تم کو کیسے لے جا سکتے ہیں۔"

"نہیں۔" پیڈرو پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ "میں جینا چاہتا ہوں... میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں ان کے ساتھ جاؤں گا انھیں وہ سب بتا دوں گا جو مجھے معلوم ہے۔ ان کا سودا کر لوں گا۔ میں خود کشی نہیں کروں گا دلاور..." دلاور کا چہرہ تاریک ہو گیا۔

یکلخت ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ دلاور بے بسی سے پیڈرو کو مر جانے دیتا مگر وہ جانتا تھا کہ پیڈرو جو آج عمر بھر ہمت کی آزمائش سے کامیاب گزرا تھا۔ زندگی اور موت کی سرحد سے بے خوف گزر رہا تھا اور وفاداری کے ہر امتحان سے کامیاب ہوا تھا آج بھی اس کی توقعات پر پورا اترے گا اور اتنی ہی آسانی سے جان سے گزر جائے گا مگر عین وقت پر دلاور کے سامنے پیڈرو کی شخصیت کا وہ روپ سامنے آ گیا جو اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ یقیناً اس کے دانتوں کے کسی خلا میں کوئی زہر کا کیپسول تھا جس کو دلاور نے آخری راستہ قرار دیا تھا۔ اس نے پیڈرو کو بتا دیا تھا کہ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا اور اب تمہیں مر جانا ہے۔ اس سے پہلے اگر پیڈرو کے لیے جان کے ضیاع کا مرحلہ آیا تھا تو اس میں زندگی کے بچنے کے پچاس فیصد امکانات تھے یا چالیس فیصد تھے یا تیس فیصد تھے مگر آج یہ امکانات صفر فیصد رہ گئے تھے تو پیڈرو کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میرے ساتھ جانا جلاد کے ساتھ پھانسی کے تختے کی طرف جانے سے بھی بدتر ہے۔

"شکریہ پیڈرو!" میں نے کہا۔ "شاید تم مجھے دلاور سے نجات دلاؤ۔ خدا میں تمہیں معاف کر دوں۔ تمہارے پاس بیچنے کے لیے کوئی ایسی چیز ہو جس کے بدلے تم مجھ سے زندگی خرید سکو۔"

پیڈرو نے دیوار کا سہارا لیا اور کھڑا ہو گیا۔ میں ایک طرف ہٹ گیا اور الٹے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا گیا۔ اس وقت تک رابعہ اور شعلہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں اور نواب خسرو جمشید کا ڈرائیور جو خود دلاور بھی ہو سکتا تھا بالکل منجمد بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ یقیناً اس کے سر کے پیچھے رابعہ کا ریوالور تھا۔

"شاباش... آ جاؤ..." میں نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

اچھلتا کودتا آگے بڑھا۔ وہ اس وقت ایک بالکل نیا آدمی تھا۔ دروازے تک پہنچ کے اس نے دلاور کی طرف دیکھا۔

"لعنت ہو... تم سب پر..." پیڈرو چلایا اور تڑپ کر پیچھے ہٹتے ہٹتے گاڑی کے دروازے تک پہنچ گیا پھر وہ ہوا جس کے لیے میں ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھا۔ پیڈرو ایک دم کر کے اندر کی طرف دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ کسی نے دروازے کو دھڑ سے بند کر دیا اور ساتھ ہی میرے ہاتھ نے شیشن گن کا رخ گھما دیا۔ دروازے میں سوراخ ہی سوراخ ہو گئے لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا۔ اندر رہ جانے والے جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ سب دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔

یکلخت مجھے احساس ہوا کہ میں خالی ہاتھ دشمنوں کے قلعے میں کھڑا رہ گیا ہوں۔ کسی طرف سے آنے والی کوئی بھی گولی میرے جسم میں اتر سکتی تھی۔ یہ بات دشمن بھی جانتے تھے کہ شیشن گن کی گولیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اب جو کچھ تھا وہ ریوالور تھا جو رابعہ کے ہاتھ میں تھا اور دلاور کی دراز میں بھی تھا۔ اس کے بعد کسی کی دراز میں بھی ہو گا جانے کس کس کے پاس ہو گا۔ یہ تو وہ مسحور قلعہ تھا جہاں سب کچھ ممکن تھا اور جہاں دلی دور پھیلنے کے لیے ابھر رہا تھا۔ اس سے بچھڑے ہوئے قلعے میں ایک ریوالور ایسے ہی تھا جیسے ریوالور کے مقابلے میں غلیل۔ میں ایک دم گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں نے دلاور کو چلتے دیکھا تھا۔

"چلو... گاڑی چلاؤ۔" میں نے چلا کر کہا۔

نواب خسرو جمشید کے نقش ثانی نے سر گھمایا اور مسکرا کے مجھے دیکھا۔

"میں صرف تین تک گنوں گی۔" رابعہ نے پیچھے سے ریوالور کی نال اس کی گردن پر رکھ دی۔ "ایک... دو..." مگر میرے ہاتھ اس سے پہلے ہی حرکت میں آ چکے تھے۔ میں نے نواب خسرو جمشید بنے ہوئے ڈرائیور کے سر پر شیشن گن کا دستہ مارا... وہ ... میں نے دروازہ کھول دیا اور وہ باہر لڑھک گیا۔ اندر سے کہیں دلاور، پیڈرو اور دوسرے سات افراد بند تھے ... کا سامنا ہو رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اتنی دیر میں دلاور ٹیلیفون پر فرنٹ گیٹ بند کرا دیا ہو گا کہ دروازہ نہ کھولے۔ مجھے اس کا افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے فون دوبارہ لگوانے سے روکنے کا استعمال نہیں بنایا تھا۔ اب علاوہ فیکٹری کے اندر اور باہر سب کو ہمارا راستہ روکنے کے احکامات جاری کر رہا ہو گا۔ ... معلوم ہو گا کہ مطلوبہ مجرم کہاں ہیں۔ ... بہت جلدی ہو گی۔ پولیس کے پہنچنے کی مجھے توقع نہیں تھی۔ ان ... پولیس اسٹیشن سے سو گز دور بھی جانا ہو تو وہ آدھا گھنٹا ضرور لیتے ہیں مگر اندر کے دشمنوں کا ہوشیار ہو جانا اور ہمارا ان کے نرغے میں آ جانا انتہائی سنگین صورت حال پیدا کر سکتا تھا۔

پہلا فائر کسی نے اس وقت کیا جب میں گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ میں نے گاڑی کو نصف دائرے میں ریورس دیا تو ایک خندق سی آ گئی جس کے بعد پھولوں کی ایک فٹ چوڑی اور آخر تک پھیلی ہوئی کیاری تھی۔ گاڑی اس سے ٹکرا کے پھولوں کو روندتی ہوئی پھولوں پر سے گزر گئی۔ مگر یہ نواب خسرو جمشید کی مرسیڈیز نہ ہوتی تو شاید اس رکاوٹ کو عبور نہ کر پاتی۔ کیاری کی کچی زمین بہت نرم تھی لیکن طاقتور انجن کی قوت نے پہیوں کو دھنسنے نہیں دیا۔ پھر بیک وقت دو فائر ہوئے جن میں سے ایک سامنے والے حصے میں بونٹ پر لگا۔ میں نے اپنے سامنے چھوٹے چھوٹے گنبد دیکھے۔ مرسیڈیز ان کو عبور کرتی گزری تو لان آ گیا۔ جس میں مالی نے پانی چھوڑ رکھا تھا۔ میں نے رفتار ایک دم بڑھائی تو گاڑی گھوم گئی مگر پھر ایک جست میں لان کو عبور کر گئی۔

رابعہ نے پیچھے سے فائر کیا اور میں نے ایک بیرک سے دوڑ کر باہر آنے والے پہلے شخص کو گرتے دیکھا۔ رابعہ کا نشانہ بہت اچھا نہیں تھا مگر اس شخص کی قضا آ چکی تھی کہ گولی خود اس کی طرف چلی گئی۔ دوسرا شخص بائیں جانب سے شیشن گن کے ساتھ نمودار ہوا۔ رابعہ نے پھر فائر کیا مگر اس سے قبل ہی میں نے گاڑی کا رخ سیدھا اس کی جانب کر دیا تھا۔ اس نے دس گز کے فاصلے سے مرسیڈیز کو یوں دیکھا جیسے کھلے میدان میں آدمی سر پر آ جانے والے پہاڑ جیسے ٹرک کو دیکھتا ہے۔ مرسیڈیز کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ وہ شیشن گن پھینک کر بھاگا۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے رہ گئے... پھر کسی خونی آسمانی عذاب کی طرح مرسیڈیز نے اسے روند دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ گاڑی میرے کنٹرول سے باہر ہو چکی ہے۔ پیچھے سے رابعہ اور شعلہ مسلسل چیخ رہی تھیں مگر میں اندھا اور بہرا ہو چکا تھا۔ فیکٹری کے گیٹ کو بھی میں نے اس وقت دیکھا جب درمیانی فاصلہ پچاس گز بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے سر کو جھکا کے اسٹیرنگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ میں نے خود کو اوپر اٹھتے اور پھر ایک جھٹکے سے نیچے آتا محسوس کیا۔ گاڑی دروازہ توڑ کر باہر نکل آئی تھی۔ دونوں فولادی گیٹ اکھڑ گئے تھے۔ ان میں سے ایک مرسیڈیز کے پچھلے حصے پر لگا۔ میرے کانوں نے شیشن گن کے مسلسل فائر سنے لیکن میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ گاڑی میرے قابو میں آ چکی تھی اور ابھی تک رواں تھی۔ آگے بڑھ رہی تھی۔ میں زندہ تھا۔ رابعہ اور شعلہ زندہ تھیں اور ہم ہر لمحہ موت سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

www.paksociety.com

مجھ تک پہنچنے کا راستہ شاید دو سو گز تھا لیکن اس وقت یہ فاصلہ زندگی کی سرحد کا سفر بن گیا جو صرافت سے بھی دور لگتی تھی۔ یہ غنیمت ہے کہ مجھے اپنا ہوش تھا۔ میرا خیال تھا کہ رابعہ اور شہلا کس حال میں ہیں۔ گاڑی کو میں کیا دیکھتا کہ اس کا حشر کیا ہوا۔

"سکندر!" رابعہ نے ایک دم میرا کندھا ہلا کے اور میرے کان میں چیخ کر کہا۔ "گاڑی روکو۔ وہ دیکھو محسن اور غالب دوسری گاڑی لیے کھڑے ہیں۔"

"سکندر بھائی۔" شہلا چلائی۔ "اس گاڑی سے دھواں اٹھ رہا ہے۔"

میں نے جسم کی تمام قوت بریک دبانے میں صرف کر دی۔ گاڑی کے پہیے جام ہو گئے۔ نیم پختہ سڑک پہ ٹائر زبردست رگڑ کے ساتھ بڑھتے گئے پھر جیسے زلزلہ گزر گیا۔ کائنات جو تہ و بالا ہو رہی تھی ساکت ہو گئی۔ سمندروں کا طوفانی مدوجزر ختم ہو گیا اور قیامت تھم گیا۔ میں نے محسن اور غالب کو دوڑ کر آتے دیکھا۔۔۔ میں اپنا اسٹیئرنگ پہ جھکے سوچ رہا تھا کہ میں کتنا تھک گیا ہوں۔ مجھ میں حرکت کی ہمت بھی نہ رہی تھی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور محسن نے مجھے کھینچ لیا۔ وہ مجھے کندھے پہ ڈال کے دوڑنے لگا۔ چند سیکنڈ میں اس نے مجھے کندھے پر سے اتار کے سیدھا دوسری گاڑی کے کھلے دروازے میں پھینکا۔ دروازہ بند ہوا اور گاڑی جب چل پڑی تو میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر رابعہ اور شہلا بھی ہیں۔ وہ دونوں زخمی تھیں اور بے ہوش تھیں۔ میں خود بھی ہوش میں نہیں تھا مگر دھماکا ہوا تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میری سیٹ والی جگہ ایک الاؤ بھڑک رہا تھا۔ اس میں پٹرول ٹینک کے پھٹتے ہی آگ لگ گئی تھی۔ میرے کانوں میں ابھی تک مشین گن کے فائروں کی آواز گونج رہی تھیں۔ اس آدمی کی چیخ گونج رہی تھی جسے میں نے روند ڈالا تھا۔ میری گاڑی اس کے لہو گوشت اور ہڈیوں کو پیستی ہوئی اور سڑک پہ پھیلاتی ہوئی گزر گئی تھی۔ میں وہ دھماکا سن رہا تھا جو بند فولادی گیٹ کے ٹوٹنے سے ہوا تھا۔ وہ سب پیچھے رہ گیا تھا مگر خود میرے تصور کے ساتھ تھا میرے خیال میں زندہ تھا۔ ایک آسیب بن گیا تھا۔ گاڑی سیدھی جا رہی تھی۔ دوسری سمت سی گاڑیوں کو پیچھے چھوڑتی اسے محسن چلا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میں زندگی کی حقیقت کی طرف لوٹنے لگا۔ پھر ہوش میں آنے لگا اور بالآخر سب کچھ دیکھنے سننے اور سمجھنے لگا۔

"یہ۔۔۔ یہ دونوں زخمی ہیں۔" میں نے غالب کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے کہا جو اگلی سیٹ پہ مطمئن بیٹھا تھا۔

"اور خود تم کیا ہو۔ ذرا آئینے میں دیکھو۔" غالب نے بیک ویو مرر کا رخ میرے مقابل کر دیا۔ میں اپنا چہرہ دیکھ کر ڈر گیا۔ اس پہ خون ہی خون تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اب تک کسی زخم کی تکلیف مجھے محسوس کیوں نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی اسلام آباد کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" غالب نے مسکرا کے کہا۔

"ہم وہاں جا رہے ہیں جہاں تقدیر ہمیں لے جا رہی ہے پھر ایک گھر جا رہے ہیں جسے گھر ہونے کو۔" غالب نے کہا۔

"تم بہت وقت پہ پہنچے۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ اور رابعہ اور شہلا کو دیکھا۔ ان کے چہروں پہ خراشیں بالکل ویسی ہی تھیں جیسے میرے چہرے پہ تھیں۔ یہ گاڑی کے ریزہ ریزہ ہو جانے والے شیشے سے آئی تھیں اور اگر میں نے جھکایا ہوتا تو شاید اندھا ہو جاتا۔

"تم نے بہت دیر کی۔" غالب بولا۔ "ہم تو وہیں کچھ کرنے والے تھے تخت یا تختہ۔"

"کم سے کم فون پہ تو بتا دینا تھا کہ تمہیں مدد کی ضرورت ہے۔" محسن بولا۔

"محسن!" میں نے اچانک چونک کے کہا۔ "فون، دلاور کو فون کرنا ہے۔ صرف چند منٹ رہ گئے ہیں۔"

"تو نے اسے بتایا نہیں؟" محسن نے ایک دم پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا اور محسن نے گاڑی کو ایک پٹرول پمپ پہ موڑ لیا۔ جتنی دیر میں اس کا ٹینک فل ہوا محسن کیشئر کے پاس جا کے لوٹ آیا۔ اس نے رقم ادا کی اور ... نکال لے گیا ہو کر پٹرول ڈالنے والا پیچھے کی سیٹ پہ ... اور زخمی پڑی ہوئی دو عورتوں کو اور ایک مرد کو ... نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"بات ہو گئی؟" میں نے کہا اور محسن نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"میں نے دلاور کے گھر اور دفتر دونوں جگہ فون کر دیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "وہ تو ملا نہیں۔ شاید راستے میں ہو۔ اس کی بیوی کو بتا دیا۔"

"اس نے یقین بھی کیا؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

"کیا پتا ہو گا۔ وہ ایک دم چیخنے چلانے لگی تھی۔" محسن۔۔۔

"وہ اعصابی مریض ہے۔ پاگل نہ ہو گئی ہو۔" میں نے کہا۔

"دلاور کے بچے مارے جائیں گے اگر اس نے کچھ نہ کیا۔"

"خطرہ ہو تو جانور بھی بچوں کو محفوظ مقام پہ منتقل کر دیتا ہے۔ وہ پاگل ہے تو کیا۔۔۔ ایک ماں بھی ہے۔" محسن نے کہا۔ اس کے جواب سے میری تشفی نہیں ہوئی۔ خدا کرے دلاور وقت سے پہلے گھر پہنچ جائے اور اس کی بیوی ہی ٹیلی فون پہ ملنے والے پیغام کے بارے میں بتا دے۔

"ایس پی سراج اور حشمت خان کے گھر میں کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"دھماکا۔" غالب بولا۔ "صرف حشمت خان کے مارے جانے کی اطلاع ہے۔ باقی سب بچ گئے۔ گھر تباہ ہو گئے۔"

"اس پٹرول پمپ والے نے گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا ہوگا؟" محسن نے اپنا ایک ... کہا۔ گاڑی جو مال روڈ پہ دوڑ رہی تھی موڑ کاٹ کے ایک کوٹھی میں داخل ہوئی اور پورچ میں رک گئی۔ وہ خاصا پرانی اور ویران کوٹھی تھی۔ "تم سب نکلو۔" محسن نے کہا۔ "تم اور غالب دونوں۔۔۔ لڑکیوں کو اٹھا کے اندر لے جاؤ۔ میں گاڑی کو کہیں چھوڑ کے آتا ہوں۔"

ایک طرف غالب آگے سے اترا اور میں پیچھے سے دوسری طرف۔ ہم نے پیچھے کے دونوں دروازے کھولے۔ رابعہ کو غالب نے کھینچ لیا اور شہلا کو میں نے۔ پھر ہم نے لات مار کے دروازے بند کیے اور محسن گاڑی کو ریورس گیئر میں لے گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ فورڈ کار تھی۔ جیسے سنہ ساٹھ والی ساٹھ کے اول کا ماڈل ... کسی سے چھینی ہوئی۔

"میاں کھڑے کیوں ہو۔۔۔ اندر چلو۔" غالب بولا۔ "اپنا ہی گھر سمجھو اسے۔"

"اپنا گھر۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "ایسے کہہ رہے ہو جیسے تمہارے باپ کا گھر ہو۔ آگے چلو۔"

"ہاں۔۔۔ یہ میرے باپ کا ہی گھر ہے۔" غالب نے کہا۔ "یہاں میں پیدا ہوا تھا۔" اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ "اس کا مالک میرا باپ تھا۔"

اس حالت میں بھی غالب کی بات نے میرے ذہن کو جھنجوڑ دیا۔ مجھے وہ سب یاد آ گیا جو ڈاکٹر لطیف نے بتایا تھا۔ غالب ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ "تم نے تو گھر چھوڑ دیا تھا؟" میں نے کہا اور شہلا کو ایک پرانے بیڈ پہ لٹا دیا جس پہ صاف اجلی چادر تھی۔ غالب نے رابعہ کو اسی بیڈ پہ شہلا کے ساتھ لٹا دیا۔

"ہاں میں نے ہی یہاں سے لیا تھا۔ مہاتما بدھ کی طرح میں اپنے محل سے نکل گیا تھا۔" غالب ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "گھر ہو یا محل۔۔۔ سب دیواروں کے حصار ہوتے ہیں۔ دیواریں تو جیل کی بھی ہوتی ہیں۔ فرق صرف تعلق کا ہے۔ پیار کرنے والے نہ ہوں تو اس کو گھر نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان دیواروں کو مجھ سے اور مجھے ان دیواروں سے کوئی پیار تھا ہی نہیں تو میں ان کے درمیان کیسے رہتا۔"

"پھر اب اس زندان میں کیوں لوٹ آئے ہو۔۔۔؟" میں نے طنز سے کہا۔

"اب یہ گھر ہے پیارا ہے یہاں؟" غالب نے کہا۔ "تم اور رابعہ، محسن اور شہلا۔۔۔ ہم سب پیار ہو۔ پیار تم سے ہے اور تم پیار سے ہو۔"

"اور نازو۔۔۔ وہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ میں ہوں۔" غالب ہنسا۔ "جیسے تم جو چاہو سمجھو۔ محسن آ جائے تو کسی ڈاکٹر کو بلا لیں۔"

"کیا ان کی حالت زیادہ تشویشناک ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ ہوش میں تو یہ آ جائیں گی۔" غالب بولا۔ "مگر ان کو کچھ سکون آور ادویات کی اور کچھ مرہم پٹی کی ضرورت تو ہوگی۔"

"تم وہاں سے سب سامان نکال لائے ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ صرف اپنی جان سلامت لے آئے ہیں۔" غالب بولا۔ "یہ بھی کیا کم غنیمت ہے؟ ہم وہاں کیسے رہ سکتے تھے۔ نقد رقم اب ختم ہو رہی ہے۔"

"ویسے تو میرے پاس دس ہزار ہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر اثاثہ سٹیڈی کا مدفون خزانہ بھی تو محفوظ پڑا ہے۔"

"ہاں صاحب کسی دن نکال کے لانا ہی پڑے گا۔" غالب بولا۔ اسی وقت باہر ایک رکشا آ کے رکا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا تو محسن ایک ڈاکٹر کے ساتھ اتر کے اندر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر بہت عجیب چیز تھا۔ اور اپنے مضحکہ خیز لباس سے کسی سرکس کا جوکر لگتا تھا۔ محسن نے بعد میں بتایا کہ وہ تیس سال تک ایک ملٹری اسپتال میں کمپاؤنڈر رہا اور اب بھی پریکٹس کرتا ہے۔ اس نے ڈریسنگ بڑی مہارت سے کی اور دونوں لڑکیوں کو دو دو انجکشن بھی لگا کے ... ایک سکون آور ہی سوئی وہ میرے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے کہا کہ سکون آور انجکشن وہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھے۔ اس نے محسن سے دو سو روپے لیے اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ اس نے زخموں کی نوعیت اور ان کے اسباب کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ سو روپے محض زبان بند رکھنے کے لیے تھے اور میرے خیال میں رازداری کی یہ فیس بہت کم تھی۔ مستند ڈاکٹر ہوتا تو یہی کام ہزار لے کر بھی نہ کرتا۔

اجڑی ہوئی کوٹھی کے صرف دو کمرے قابل رہائش بنائے گئے تھے۔ اس حد تک کہ بستر جھاڑ کر بچھا دیے گئے تھے۔ ورنہ فرش پہ برسوں کی دھول اسی طرح موجود تھی۔ چھت میں پرندوں کے گھونسلے قائم تھے اور دیواروں کے گوشوں میں مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے۔ دوسرے کمروں میں کیا تھا یہ دیکھنے کی ابھی نہ ضرورت تھی اور نہ فرصت۔ ان دو کمروں کے علاوہ کچن اور باتھ روم کو بھی استعمال کے قابل بنا لیا گیا تھا مگر مردانہ ہاتھوں کے لیے صفائی کا عمل مشکل کام تھا۔ پوری کوٹھی کی جھاڑ پونچھ اور صفائی رابعہ اور شہلا کے لیے بھی چند دن کی مشقت تھی۔ محسن نے اسی کچن میں چائے بنائی اور ثابت کیا کہ چولہا اب بھی جلتا ہے۔ تاہم پانی کی موٹر کے بارے میں اس نے افسوس سے مجھے مطلع کیا

www.paksociety.com

کر جام ہو گئی ہے اور جو پانی اوپر والے ٹینک میں تھا، وہ برسوں میں بخارات بن کے اڑ گیا ہے۔ جو اندر گرا ہوا ٹینک میں ہے، وہ گندہ ہے اور ٹینک کی صفائی کیے بغیر اس کو بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم باہر پارک کے ایک نل سے براہ راست کارپوریشن کا تازہ اور صحت بخش پانی حاصل ہوتا ہے۔ ٹونٹی جام ہو چکی تھی مگر اسے پلاس کی مدد سے کھول لیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ عقبی حصے میں ایک ہینڈ پمپ بھی تھا جس کا واشر سوکھ چکا تھا۔ غالباً تیل دینے کے بعد وہ بھی پانی اگلنے لگتا۔

"ہم ابھی تو سامنے کے حصے سے داخل ہونے پر مجبور تھے مگر آئندہ ہماری آمدورفت عقبی حصے سے ہو گی۔" محسن نے کہا۔ "کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ کئی سال تک غیر آباد رہنے والی کوٹھی میں کوئی آ گیا ہے۔"

"کوئی کا کیا مطلب ہے؟" غالب نے ڈانٹ کر کہا۔ "صاحب خانہ تشریف لے آئے ہیں۔ ہم کوئی ایرے غیرے نتھو خیرے کوٹھی والے ہیں؟"

"ہم نے اندر کے دو کمروں کا انتخاب کیا ہے۔" محسن نے اس کی بات سنے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ "بیرونی کمروں کے کھڑکی دروازے بند ہی رہیں گے۔ آج ہم ایسا انتظام بھی کر لیں گے کہ رات کو لائٹ جلے تو روشنی باہر نہ جائے۔ جب تک ناروے کا مشن مکمل نہیں ہو جاتا، ہم اسی طرح چھپ کر رہیں گے۔ حتی الامکان دن میں باہر نکلنے سے گریز کریں گے اور ناگزیر ہوا تو پیچھے سے جائیں گے۔"

"میری ایک بہت اچھی تجویز کو محسن نے ویٹو کر دیا صرف اس لیے کہ وہ میرے ذہن میں آئی تھی۔" غالب نے شکایت کی۔ "میرا مشورہ تھا کہ ہم خانہ بدوش یا فقیروں کا گیٹ اپ بنا لیں اور یوں رہیں جیسے ویران کوٹھیوں میں ناجائز قابض رہتے ہیں۔"

"اور اس تجویز کو محسن نے مسترد کر دیا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "میں اس کے ویٹو کو ویٹو کرتا ہوں۔ یہ تو چھپ کر بے خطر آنا جانا اور دبتے ہوئے پھرنے کے لیے مناسب ترین طریقہ ہے۔ ہم خانہ بدوشوں کا قبیلہ بن سکتے ہیں کیونکہ ہم واقعی بے گھر لوگ ہیں۔"

کافی پیتے ہوئے میں نے محسن اور غالب کو طلعت سے ملاقات کا احوال سنایا۔ رابعہ اور شعلہ سوتی رہیں۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو غالب نے ناشتے کو دہرایا یعنی سلائس، آملیٹ اور چائے۔ پیٹ بھرنے کے لیے سب غنیمت تھا کیونکہ اس وقت کوئی بھی باہر جانا نہیں چاہتا تھا۔ پھر میں نے بلال کی خیریت معلوم کی۔

"نارمل ڈیوٹی پر ہے۔" محسن بولا۔ "اور وہ کچھ پہلی ملازمت کی ڈیوٹی جیسی دم ہے۔"

"آج رات وہاں جو خفیہ میٹنگ ہونے والی ہے اس سے بہت کچھ معلوم ہو گا۔" غالب نے کہا۔ "ہم سب آ جائیں گے اور اندر ہونے والی گفتگو سنیں گے۔ یہ بھی دیکھیں گے کہ کون کون آتا ہے اور ..."

میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ قدموں کی آہٹ پر ہم نے پلٹ کر دیکھا تو ہمیں تین آدمی نظر آئے۔ ان کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں اور نقابوں نے چہروں پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔

تینوں نے پہلے تو واردوں کو اور پھر ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ان حالات میں سب سے پہلے یہ خیال آنا ایک فطری امر تھا کہ یہ تینوں بھی تنظیم ہی کے آدمی تھے یا کسی طرح جلال اسرار کے لوگ یہاں تک آ پہنچے تھے مگر یہ خیال ایک بے بنیاد اندیشے سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو چاہیے تھا کہ وہ یہاں قدم رنجہ فرماتے ہی اتنی دیر استغفار نہ کرتا۔ لیکن یہ بھی خاصے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ ... سے وہ لندن یا اس کے کسی پالتو کتے کا شکاری ... یہاں تک آنا محال بلکہ ناممکن تھا۔ ہم جس گاڑی میں ... آئے تھے، وہ نواب خسرو جمشید کی تھی مگر وہ گاڑی کو ٹھکانے لگ چکی تھی۔ باقی سفر ہم نے دوسری گاڑی میں ... سے طے کیا تھا اور محسن اس گاڑی کو بھی بہت دور ... آیا تھا۔ چنانچہ اس دعوے میں مبالغہ نہ تھا کہ اب کوئی ... بھی نہیں پا سکتا تھا۔

"وہ ... محسن ... کیا یہ تیرے سسرالی رشتے دار ہیں؟" غالب نے سب سے پہلے محسن کو ٹہوکا دیا۔

"پتا نہیں یار۔" محسن چونکا۔ "ہو بھی سکتے ہیں ... بہرحال ... ابھی سب کو نہیں پہچانتا ہوں۔"

"ایک کی صورت میرے پر نانا کے سالے سے ملتی ہے" میں نے کہا۔ "مرحوم نے ایسی ہی بندوق سے خودکشی کر لی تھی۔"

"بکواس بند کرو اپنی۔" ان میں سے ایک نے گرج کر کہا۔ "ٹھیک ٹھیک بتاؤ تم کون ہو؟"

غالب نے ایک سرد آہ بھری۔ "پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟"

"یہ خود کون ہیں یار؟" محسن بولا۔ "بالکل اصلی ڈاکو لگتے ہیں۔"

"حالانکہ یہ سب میک اپ کا کمال ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "غالباً کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔"

"ہم اصلی ڈاکو ہیں۔" دوسرا نقاب پوش چلایا۔ جیسے اس سے اس کی انا سخت مجروح ہوئی تھی۔

"میرے پر نانا کا سالا بھی اصلی ڈاکو تھا۔" میں نے خوش ہو کے کہا۔ "ایسی ہی بندوق لے کر دندناتا پھرتا تھا ... انیسویں صدی میں بھی رائفل چلتی تھی۔"

"اگر تم لوگ ڈاکو ہو تو یہ توپ کیوں اٹھائے پھرتے ہو؟ ... ریوالور لے لو ... ایسا ..." اس نے بڑی پھرتی سے ریوالور نکال کے سامنے کر دیا۔

غالب نے اور میں نے بھی ایک آواز ہو کر ریوالور نکال کے دکھائے۔ ... جس نے انھیں پریشان کر دیا تھا۔ بلاشبہ وہ حلیے سے ڈاکو ہی لگتے تھے۔ عام آدمی کی انھیں دیکھ کر عقل بند ہو جاتی مگر ہم بہت بڑے ڈاکوؤں سے واقف تھے اور اس لڑائی میں جدید ترین اسلحہ یہاں تک کہ ایٹم بم استعمال کر رہے تھے۔ وہ ڈاکو تھے ملک کی دولت پر ڈاکہ ڈالنے والے۔ عدل و انصاف کے مقدس ایوانوں پر ڈاکہ ڈالنے والے۔ انسانیت اور شرافت کی آبرو پر ڈاکہ ڈالنے والے اور انسانوں کی زندگی کے حق، محبت کے رشتوں اور ماؤں بہنوں کی عزت پر ڈاکہ ڈالنے والے۔ ان کے مقابلے میں یہ ڈاکو طفل مکتب تھے جو صرف مال و زر چھینتے تھے۔ ان کی ... رائفلیں بھی پولیس کے تھانوں یا تھانیداروں سے چھینی ہوئی لگتی تھیں۔

"گولی چلانے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔" محسن نے انھیں سمجھایا۔ "تم بھی تین ہو اور ہم بھی تین۔"

"لیکن ہمارا چوتھا ساتھی آنے والا ہے۔" غالب نے کہا۔

"اور اگر تمہارا کوئی چوتھا ساتھی نہیں ہے تو سمجھو کہ تم گھرے ہوئے ہو کیونکہ ہمارا چوتھا ساتھی تم کو باہر سے ہی ہینڈز اپ کرانے کا بیٹھا ہے۔"

"تم تینوں اس کے نشانے کی زد میں ہو گے مگر وہ خود تمہارے سامنے نہیں ہو گا کہ تم اسے نشانہ بنا سکو۔" محسن نے کہا۔

"اس لیے بہتر ہو گا کہ تم یہ رائفلیں رکھ دو اور آرام سے بیٹھ کر بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟" غالب نے کہا۔

"یہاں کیوں آئے ہو اور زندہ واپس جانا کیوں نہیں چاہتے؟" ملک نے کہا۔

ڈاکوؤں کا حوصلہ جواب دے گیا۔ ہمارے پرسکون انداز اور اعتماد نے ان کے جارحانہ عزائم کو پہلے ہی شکست دے دی تھی جب ہم نے مسلسل بولنا شروع کیا اور ان کو جواب کا موقع دیے بغیر قوالوں کی طرح یکے بعد دیگرے بولے چلے گئے تو ان کو اندازہ ہوا کہ وہ کسی مشکل میں پڑ گئے ہیں اور مقابلہ عام لوگوں سے نہیں ہے۔ ... نے عوام کے دل میں ڈاکوؤں کی وحشت بٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور ہم شریف آدمی ہوتے تو اخلاقاً ہی اصلی ڈاکو دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگتے یا بے ہوش ہو جاتے مگر ہمارا رد عمل اتنا ... تھا کہ ہم نے زیادہ ... سے زیادہ ... ہتھیار نکال لیے تھے۔ ... انھیں بھی اپنے ڈاکو ہونے کی لاج رکھنا تھی۔

"ہم ان کھلونوں سے نہیں ڈرتے۔" ان میں سے ایک نے گرج کر کہا لیکن یہ گرج بھی ان بادلوں کی تھی جو برستے نہیں۔

"اوئے ... سالو ... کیا لے ..." دوسرے نے بالکل فلمی ولن کی طرح دھاڑ کر کہا ... یہ بھی ... گھر کے شیر کی دہاڑ تھی جو ... کام میں مبتلا ہے۔

"ٹھہر جاؤ اوئے! ایسے انہاں وی ... " تیسرے نے نسبتاً پرسکون لہجے میں حکم دیا اور اپنے زیادہ سمجھدار ہونے کا ثبوت دینے کے ساتھ ساتھ اس نے باقی دو جوشیلے ساتھیوں کی آبرو بھی رکھ لی۔ باقی دو نے تھوڑا سا احتجاج کیا مگر پھر اپنے سردار کے فیصلے کو قبول کرتے ہوئے رائفلیں رکھ کر بیٹھ گئے۔ یہ بہادری، مصلحت اندیشی اور سرداری کا مظاہرہ خاصا کامیاب رہا۔ ہم نے بھی اخلاق اور مروت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ریوالور واپس جیب میں ڈال لیے۔

"اب بتاؤ تم کون ہو؟" سرداری کا عہدہ سنبھالنے والے نے کہا۔

"ہم یہاں رہتے ہیں۔" غالب نے بے حد اختصار سے کام لیا۔

"جھوٹ مت بولو۔" سردار نے کہا۔ "یہاں ہم رہتے ہیں۔"

"ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی گھر کی چھت کے نیچے ہم بھی رہیں اور تم بھی رہو۔" میں نے کہا۔

"ہم نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" ایک نے حیرت دکھا کے کہا۔

"ہم نے بھی تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" غالب نے دانت نکال کے کہا۔

"تم یہاں کیسے رہ سکتے ہو؟" دوسرے نائب ڈاکو نے مشتعل ہو کے کہا۔ "تمہارے باپ کا گھر ہے؟"

"اگر میں کہوں کہ ہاں تو؟" غالب نے کہا۔

"پھر یہ ہمارے بھی باپ کا گھر ہے۔" سردار نے تنگ آ کے کہا۔

"کیا ہم تم تینوں ایک ہی شخص کو باپ مان سکتے ہیں؟" غالب نے انھیں مزید مشتعل کرنے کے لیے کہا۔ "میرے باپ نے تو ایک ہی شادی کی تھی لیکن کیا پتا اس کے تعلقات دوسری عورتوں سے بھی تھے۔"

"اوئے ... زبان سنبھال کے ..." اس بار تو سردار کا خون جوش میں آ گیا۔ غالباً ان کی والدہ کے کردار پر حرف آ رہا تھا۔ غالب نے زبان سے نکل جانے والی بات کے مفہوم کو بدل دیا تھا۔

سردار کا اٹھنا ہی اس کے لیٹنے کا سبب بنا۔ جیسے ہی وہ رائفل لے کر سیدھے سامنے کھڑے ہوتے تھے میں نے اپنے جارحانہ عزائم کو خوف کی معصوم اداکاری سے چھپا دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی واردات کا بھی کوئی چلے۔ خصوصاً ہمارے نووارد مہمانوں کی رائفل سے وہ دھماکا ہو جو ہر طرف سنا جاتا اور آس پاس رہنے والے یہ دیکھنے آ جاتے کہ اس ویران اور آسیب زدہ کوٹھی

www.paksociety.com

میں کسی عورت کا قتل ہوا ہے یا کوئی پُراسرار واردات ہوئی ہے۔ اس طرح ہماری یہاں موجودگی کا راز فاش ہو جاتا۔ سوار نے تو محض اداکاری سے یہ ظاہر کرنا چاہا تھا کہ گولی شاید اس کی قوتِ برداشت سے باہر ہے۔ ابھی وہ واصل کی طرف ہاتھ بڑھا کے لگا ابھی نہیں ہوا تھا کہ میں نے اسے جا لیا۔ وہ مجھ سے زیادہ کچھ تیز نہیں تھا لیکن میں تھوڑی سی مہلت چاہتا تھا۔ جب وہ بیٹھ گئے تھے تو مجھے مہلت ملنے کا یقین ہو گیا تھا۔

میری لات پڑتے ہی سوار اچھل کر پیچھے گیا۔ میں نے اسے پیچھے سے اٹھا کے پوری قوت سے دیوار پر مارا۔ وہ لڑکھڑایا اور دیوار کے ساتھ سر ٹکائے ہوا زمین پر بیٹھ کر جھومنے لگا۔ میرے حرکت میں آتے ہی غالب اور محسن نے بھی ریوالور دوبارہ نکال لیے تھے اور باقی دونوں ڈاکو کھڑے ہی پھر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے ان تینوں کی رائفلیں لے کر دیوار کے ساتھ ایک کونے میں کھڑی کر دیں۔

"کب سے قابض ہو تم لوگ اس گھر پر؟" میں نے ان کے سر پر کھڑے ہو کر کہا۔ "تمہیں معلوم ہے یہ کس کا گھر ہے؟"

"یہ مجسٹریٹ صاحب ہیں۔" محسن نے با ادب لہجے میں میری طرف اشارہ کیا۔ "کوٹھی ان کے دوست کی ہے۔" اس نے غالب کی طرف دیکھا۔

"چار سال سے میں لندن میں تھا۔" غالب نے آگے آ کے کہا۔ "تم نے کیا سمجھا تھا کہ یہ لاوارث زمین ہے؟ اور لاوارث ہو تب بھی یہ حق کس نے دیا ہے تم کو کہ اس کے وارث بن بیٹھو۔"

ان تینوں کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ اپنے ڈاکو ہونے کا پہلے ہی اعتراف کر چکے تھے۔ ان کا دوسرا جرم ناجائز قبضہ تھا۔ نہ جانے کب سے وہ اس ویران کوٹھی میں اپنا اڈا جمائے بیٹھے تھے اور کئی سال سے بند پڑی ہوئی کوٹھی کی طرف سے بہت مطمئن تھے کہ اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ یہاں نہ کبھی پولیس آئے گی اور نہ کوئی حقِ ملکیت کا دعوے دار آئے گا۔ اگر کوئی دور کے رشتے سے حقِ وراثت رکھنے والا زندہ ہوتا تو اب تک وہ لاکھوں کی اس جائداد کو حاصل کرنے کی کوشش شروع کر چکا ہوتا۔ بے شک کوٹھی کھنڈر ہو چکی تھی اور اس کا سازو سامان غائب ہو چکا تھا مگر صرف یہ زمین ہی کئی لاکھ مالیت کی تھی جس پر کوئی بھی سرمایہ کاری کرتا تو عالی شان عمارت کھڑی کر سکتا تھا یا پرانی کوٹھی گرا کے اس کی جگہ کوئی کمرشل کمپلیکس یا کوئی شاندار رہائشی اسکیم بنا سکتا تھا۔

"صاحب! غلطی ہو گئی ہم سے۔" سب سے پہلے سوار نے ہاتھ جوڑ کے عاجزی و انکساری کا ڈراما شروع کیا۔

"ہر غلطی کی سزا تو بھگتنا ہی پڑتی ہے۔" میں نے بالکل کسی مجسٹریٹ کی طرح کہا۔ "قانون کسی کو معاف نہیں کرتا۔"

"جناب! ہمیں معلوم نہیں تھا۔" اب دوسرے نے بھی اپنی غلطی

ڈاکو والی اداکاری کو خیر باد کہا اور حسبِ عادت پھر اتر آیا۔

"کیا معلوم نہیں تھا؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ بات تو بچہ بھی جانتا ہے کہ پرائی چیز پرائی ہوتی ہے۔ کیا ایسے کوئی کسی کے گھر میں منہ اٹھا کے گھس سکتا ہے؟ اور اس پر یہ [illegible] رہتے ہیں دھڑلے سے تھے۔ یہ بیٹی زوری کہ اس کو اپنے باپ کا گھر بتاتے تھے۔ حالانکہ یہ ان کے والد کا مکان ہے۔ وہ بہت بڑے ڈاکٹر تھے اور ہوائی حادثے میں میاں بیوی دونوں ہلاک ہو گئے تھے۔ یہ باہر زیرِ تعلیم تھا اس لیے گھر نہیں آ سکا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ گھر اس کا نہیں رہا؟"

"گھر تو مالک کا ہی ہوتا ہے سرکار۔" ڈاکوؤں میں سے ایک نے گڑگڑا کے کہا۔ "ہم سے بڑی بھول ہوئی۔"

"کیوں بھئی! کیا خیال ہے؟" میں نے بڑی متانت سے غالب کی طرف دیکھا۔ "چھوڑ دیں ان کو؟"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" غالب نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "دیکھ تو لیں کہ گھر میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔"

"ہاں۔ یہ تو گھر کا سارا سامان بھی بیچ کر کھا گئے ہوں گے۔" محسن نے تائید کی۔ "فی الحال تو ان کو پولیس کی تحویل میں دے دو۔ وہ خود سب اگلوا لیں گے کہ یہاں سے کیا کچھ نکالا گیا تھا۔"

انھوں نے قسمیں کھانا شروع کر دیں کہ اس ایک کمرے کے سوا انھوں نے کسی دوسرے کمرے میں کبھی قدم نہیں رکھا۔ یہاں بھی وہ ہفتے میں یا دس دن میں ایک بار آتے تھے... سب ایک ساتھ بول رہے تھے اور ہاتھ پیر جوڑ رہے تھے۔ ان کا شور جاری ہی تھا کہ رابعہ خود ادھر چلی آئی اور اس نے ڈرامے کو دیکھا۔ وہ اب بہت پُرسکون تھی۔ سکون بخش دوا کا اثر تقریباً ختم ہو گیا تھا چنانچہ وہ کچھ غنودگی کی کیفیت کا شکار تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی سوئی سوئی تھیں۔

"آپ ہماری سفارش کریں بیگم صاحبہ۔" ڈاکوؤں کے سوار نے بڑی چالاکی سے کام لیتے ہوئے عورت کے دل کی نرمی اور فطری رحم دلی سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ "آئندہ ادھر کا رخ کریں تو..."

"آئندہ کی آئندہ دیکھی جائے گی۔" محسن نے کہا۔ "ابھی تو یہ حساب دو کہ کہاں کہاں ہاتھ مارتے رہے ہو۔ کتنی وارداتیں کی ہیں؟... قتل کتنے کیے ہیں؟" پھر وہ رابعہ کو ان کے بارے میں بتاتا رہا۔

"میرا خیال ہے کہ میں ساتھ والی کوٹھی سے فون کر کے پولیس کو بلا لیتا ہوں۔" غالب نے کہا۔

"ایک منٹ ٹھہرو... مجھے یہ کچھ اچھے لگتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ڈاکو اتنے بزدل نہیں ہوتے۔ بہت سے ڈاکو سامنے

والے جا چکے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی اتنا احمق نہ تھا جتنا یہ ہیں۔ یہ جانتے ہیں پولیس کی مار کیا برداشت کریں گے۔"

"مجھے یہ ڈاکو نظر نہیں آتے۔" رابعہ نے کہا۔ اس کی بات نے مجھے جزبز کیا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ کوئی میرے خیال کی تائید کرے۔ یہ ڈاکو تھے جو تاوان مانگتے ہوئے خود کو معمولی قسم کی وارداتوں تک محدود رکھتے تھے۔ تسلیم کر لیں، میں جانتے ہوئے بھی اپنی کوتاہ بینی اور کم عقلی کا ثبوت دے رہا تھا۔

وہ پیٹ پالنے کے ڈاکو تھے لیکن ہم ان کو پولیس کے حوالے کرنے کے چکر میں نہیں پڑ سکتے تھے۔ ان سے پہلے تو پولیس ہمیں دھر لیتی۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اتنے خوفزدہ ہو کر فرار ہوں کہ دوبارہ ادھر کا رخ کرنے کا نہ سوچیں۔

"صورت پہچانتے جا رہے ہیں۔" میں نے رابعہ سے مخاطب ہو کے کہا۔ "آپ کو دیکھ کر تسکین پا رہے ہیں۔ آپ جا کر دیکھیے۔ اگر سامان آ گیا ہو تو کافی ہوا ہے۔"

"سامان وافر دیر سے آئے گا۔" محسن بولا۔ "میں اپنی والدہ سے کہتا ہوں۔" وہ رابعہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔

ڈاکوؤں کے دل میں اب ذرا بھی شک و شبہ نہ رہا کہ گھر کے اصل مالک اپنی فیملی کے ساتھ لوٹ آئے ہیں اور ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ مالک کا ایک دوست مجسٹریٹ ہے۔ وہ دوستی کا نہ جانے کیا جال چلے۔ پولیس کے نام سے ان کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ گرفتاری کے بعد ان کا پولیس کے ہاتھوں کیا حشر ہو گا اور اگر انھیں سابقہ جرائم کی سزا ملی تو ان کی زندگی کے کتنے سال جیل میں کٹ جائیں گے۔ ان کے بارے میں میرا اندازہ کسی حد تک درست تھا کہ وہ بہت خطرناک قسم کے ڈاکو نہیں تھے۔ ان کا کوئی باقاعدہ گروہ بھی نہیں تھا۔ غالباً انھوں نے حال ہی میں یہ دھندا شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ چوری چکاری کی وارداتیں کرتے رہے ہوں گے۔ آپس میں مل گئے تو رائفلیں لے کر گھومنے لگے اور خود کو ڈاکو کہنے لگے۔ ان میں بڑی واردات کا حوصلہ نہیں تھا تو قتل وہ کیا کرتے۔ تاہم میرا خیال غلط بھی ہو سکتا تھا۔ اصولاً انھیں قانون کے مطابق سزا ملنا چاہیے تھی لیکن ہم قانون کی نظروں میں ان سے بڑے مجرم تھے۔ اپنے حالات کے باعث ہم ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتے تھے جس کے وہ مستحق تھے۔

"وہ ٹیلی فون والا آیا تھا۔" محسن نے دوسرے کمرے سے نمودار ہو کے کہا۔ "اس سے کہا ہے کہ وہ ہزار دے دیں تو کل ہی فون بحال ہو جائے گا۔" اس نے مجھے آنکھ ماری۔ رابعہ اس کے ساتھ ہی آ گئی۔

"اتنے برسوں کے بعد بحالی کا کیا سوال... وہ تو لائن دے گئے۔" میں نے کہا۔ "تم فکر مت کرو... میں کل ایس پی عاصم رضوی سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔ وہ ٹیلی فون کے محکمے کے کسی اعلیٰ افسر سے کہہ کے تمھارا کام ہو جائے گا۔ رشوت مانگنے آئے کوئی تو اسے گردن سے پکڑ

کر میرے پاس لے آؤ۔"

"عاصم رضوی تو اب ایس ایس پی ہیں۔" محسن بولا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح میرے ذہن کی سوچ کو سمجھ لیا تھا اور اب ہماری ساری گفتگو بے مقصد ہونے کے باوجود ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے تھی۔ ڈاکوؤں نے ایس ایس پی کا نام سنا اور سہم کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شامتِ اعمال ان کو کھینچ لائی تھی۔

"یعنی ختم کریں یہ سلسلہ۔" رابعہ نے سچ مچ کی بیگم صاحبہ کے انداز سے کہا۔ "کیا آتے ہی عدالت لگا لی۔ ہمارے لیے تو پہلے ہی کم مسائل نہیں ہیں۔ اتنے عرصے بعد گھر آئے ہیں تو یہ نئی مصیبت۔"

"یہ کوئی مصیبت نہیں۔ میں ان کو پولیس لاک اپ بھجوا دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو اب پولیس بھی آئے گی؟" رابعہ نے تنک کر کہا۔ "میں کہتی ہوں دفع کریں انھیں۔"

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ مجرم ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہوں گے... لیکن کیا سب کو پکڑنے کے ٹھیکے دار آپ ہی رہ گئے ہیں۔ ابھی سارا گھر ٹھیک کرنا ہے، فرنیچر آنے والا ہے۔ ہزار کام چھوڑ کے آپ اس کام میں لگ گئے۔" رابعہ نے کہا۔

"اچھا آپ اندر چلیں۔" میں نے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں کہ ان بدبختوں کا قصور قابلِ معافی ہے یا نہیں۔"

رابعہ اندر چلی گئی تو میں نے ان کے سوار کو اشارہ کیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں اپنے تمام کرتوت اگل دو۔" میں نے کہا۔ "جو کچھ اب تک کیا ہے سب سچ سچ بتا دو۔ پھر میں سوچوں گا کہ کیا تم کو شرافت سے زندگی گزارنے اور اپنی اصلاح کا ایک موقع دیا جائے یا نہیں۔"

"آپ ہمارے مائی باپ ہیں حضور۔" سوار نے ہاتھ جوڑ کے کہنا شروع کیا۔ "بس ایک بار ہمیں معاف کر دیں۔ ہم قسم کھا لیں گے آپ کے سامنے... آئندہ چوری ڈاکا سب چھوڑ دیں گے... محنت مزدوری کریں گے اور پھر کبھی برائی کی طرف نہیں آئیں گے۔"

ڈاکوؤں کے اس خودساختہ سوار نے مجھے دنیا کا سب سے احمق مجسٹریٹ مان لیا تھا۔ اسی یقین کے باعث وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ انھیں راہِ راست پر چلنے کا موقع فراہم کیا گیا تو وہ واقعی شرافت کی زندگی اختیار کر لیں گے۔ یہ عملاً ناممکن تھا... جس راستے پر چل رہے تھے اس میں واپسی ممکن ہوتی تو وہ بہت پہلے لوٹ گئے ہوتے۔ اب تو وہ بہت آگے جا چکے تھے۔ اتنا آگے کہ وہ وقت ان کی نظر سے اوجھل ہو چکا تھا جب ان کے قدم غلط راستے پر اٹھے تھے۔ میں ان کو چھوڑنے پر مجبور تھا مگر میں اپنا بھرم رکھنا چاہتا تھا اور اس ڈرامے کو حقیقی بنانے کے لیے ضروری تھا کہ میں انھیں آسانی سے نہ جانے دوں اور آخر انھیں فرار ہونے دوں۔

www.paksociety.com

اندر ایک اسٹور روم ایسا تھا جس کو باہر سے مقفل کیا جا سکتا تھا مگر اس کی کھڑکی کے عام شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ اس کے باہر کی طرف نہ لوہے کی سلاخیں تھیں اور نہ گرل تھی چنانچہ دونوں پٹوں کو ملا کر ان پر تختے ٹھونک دیے گئے تھے اور کیلیں بڑی موٹی گی تھیں۔ کیلوں کو بھی زنگ لگ گیا تھا اور کوئی بھی معمولی سی کوشش سے اور تھوڑا سا زور لگا کے تختوں کو نکال سکتا تھا اور پٹ کھول سکتا تھا۔

"ان میں سے ایک کو اندر ڈالو۔" میں نے اندر جاتے ہوئے محسن کو حکم دیا۔ "باقی دو کو باندھ کر رکھو۔"

"باندھنے کے لیے تو کچھ نہیں ہے۔" غالب نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں، میں انھیں ہلنے نہیں دوں گا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "کوئی ہلنے کی کوشش بھی کرے تو بلا تامل گولی مار دینا۔" میں نے کہا۔ "اچھا ایسا کرو، ایک کو اندر رہنے دو اور دو کو مرغا بنا دو... اس سردار کی اولاد کو پہلے لاؤ۔"

"چل بھئی۔" غالب نے اس تھانیدار کی طرح کہا جو ملزم کو حوالات سے نکال کر ڈرائنگ روم کی سیر کرانے کے موڈ میں ہو۔ "تو چل مجسٹریٹ صاحب کے سامنے۔ اور تم دونوں کیا دیکھ رہے ہو، کان پکڑو۔"

دونوں ڈاکوؤں نے احساسِ ذلت سے ایک دوسرے کو دیکھا، یوں جیسے کہہ رہے ہوں کہ حضرت پہلے آپ۔

"بن جاؤ مرغا۔" میں نے گرج کر کہا۔ "کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ میں سب کو گولی مار کے یہیں گاڑ دوں گا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا مجھ سے۔"

وہ دونوں بڑی پھرتی سے اٹھے اور مرغا بن گئے۔ میں نے اسٹور کی ایک پرانی گرد سے اٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ کے ریوالور ہاتھ میں رکھا اور سردار صاحب کو طلب کیا۔ محسن نے اسے یوں پیش کیا جیسے وہ ایس ایچ او کا کارندہ ہو۔

"تو تم ہو ڈاکوؤں کے سردار کہتے ہو تم؟" میں نے ریوالور سے اشارہ کیا۔ "اس کونے میں کان پکڑو اور پھر بتاؤ اپنے کارنامے۔"

"مرغے کی اولاد۔" محسن نے اس کے ایک چپت ماری۔ "سنا نہیں مجسٹریٹ صاحب نے کیا حکم دیا ہے۔" ڈاکو کو میرے ہاتھ میں ریوالور صاف نظر آرہا تھا اور وہ میرے خالی ہاتھوں سے بھی غالباً پٹ چکا تھا چنانچہ اس نے بخشش دیے جانے کی امید میں یہ ذلت بھی قبول کی اور مرغا بن گیا۔

"یہ بتاؤ کب سے چوری ڈاکے شروع کیے تھے؟" میں نے کہا۔ "زیادہ لمبی بات مت کرنا اور کوئی دو نمبر اسٹوری مت سنانا کہ تم کو حالات نے ڈاکو بننے پر مجبور کر دیا۔ تم زمانے کے ستائے ہوئے ہو اور یہ جو کر رہے ہو وہ ایک انتقامی ردعمل ہے۔ ایسی بکواس پر میں نے کبھی یقین نہیں کیا۔ ہر آدمی اپنے ہر فعل میں خود مختار ہے۔ وہ نہ چاہے تو کوئی اسے مجرم نہیں بنا سکتا۔ سیدھی طرح یہ بتاؤ کہ پہلی چوری کب کی تھی، کہاں کہاں واردات کر چکے ہو، کس کس کے ساتھ رہے ہو اور اس لائن میں آنے کے بعد کسی بے گناہ کو مارا ہے یا نہیں؟"

اس نے ایک بے سروپا داستان شروع کی جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اب تک اس نے معمولی نوعیت کی چوریاں کی ہیں۔ راہ چلتے لوگوں کو بھی لوٹا ہے۔ گھروں میں گھس کے نقدی اور زیور بھی لوٹے ہیں لیکن کسی کی جان کبھی نہیں لی۔ کسی عورت پر ہاتھ نہیں ڈالا اور کسی غریب آدمی سے کچھ نہیں چھینا۔ اس کا نشانہ جرائم کا ارتکاب کرنے والے ہی رہے ہیں۔ وہ چالاک آدمی تھا، اس طرح وہ اپنی مجرمانہ زندگی کو ایک اخلاقی جواز بھی فراہم کر رہا تھا اور اپنے جرم کی سنگینی کو کم کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے آدھے گھنٹے تک اس کی کتھا سنی پھر اسے باہر نکال دیا۔

"اب اسے لے جاؤ۔ اس کا تذکرہ نہ رکھنا۔" میں نے کہا۔ "اس کے دوسرے ساتھی کو لے آؤ... اس سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔" میں نے دیکھا کہ میری بات پر ڈاکو کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب اس کا جھوٹ پکڑا جائے گا۔ ایک ہی واردات میں ملوث ملزمان سے الگ الگ بیانات لے کر تضاد بیانی یا اختلاف کے فرق کا پتا چلانا آسان ہو جاتا ہے۔ محسن نیولا اس کی کمر سے لگ کے دھکیلتا ہوا لے گیا۔ اس کی جگہ دوسرا آ گیا۔ حسب توقع اس کا بیان مختلف واقعات پر مبنی تھا۔ تیسرے کی باری آئی تو اس نے کچھ اور کہانی سنائی۔

میں نے انھیں ایک ساتھ طلب کیا اور صف بستہ کر دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تم نے رعایت حاصل کرنے کا موقع گنوا دیا۔" میں نے ان کے مقابل کھڑے ہو کے کہا۔ "تم سب نے جھوٹ بولا۔ اگر سچ ہوتا تو سب ایک ہی بات کہتے۔"

وہ خود بھی جانتے تھے کہ انھوں نے غلط بیانی کی تھی مگر الگ الگ بیان دینے سے ان کے بیچ کا راز فاش ہو گیا تھا۔ ایک دوسرے کے سامنے تو جو ایک کہتا تھا دوسرا اس کی تائید کر دیتا تھا۔

"اب میں تمھیں پولیس کے حوالے کرنے پر مجبور ہوں۔ تمھارے بیانات میں نے ٹیپ کر لیے تھے... احتیاطاً۔ پولیس وہ ٹیپ بجا کر سنے گی تو تمھیں بجائے گی اور پھر وہ جانیں اور تم جانو... میرا نام تو اس کیس میں آنے کا نہیں۔ میں پولیس کو ہدایت کر دوں گا کہ وہ سب سے پہلے حفاظت میں تمھارا چالان الگ الگ پیش کرے۔ اگر وہ ضروری سمجھیں گے تو تمھیں سروش یا تھانہ اسٹیشن کے کیس میں بھی لے آئیں گے۔ اسلحہ تمھارے پاس سے برآمد ان کے پاس ہوتی ہے۔"

"پولیس پر بہت اعتماد ہے تمھیں؟" ڈاکوؤں کے سردار نے مایوس ہو جانے کے بعد بہتر یہی سمجھا کہ اب وہ اپنی جرأت دکھائے۔ "ہو سکتا ہے۔ مجسٹریٹ صاحب! وہ تو جانتے ہیں سلیپنگ پارٹنر ہیں۔"

"سلیپنگ پارٹنر؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "ویری گڈ! اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ تم پڑھے لکھے بھی ہو۔ سمجھتے ہو کہ اس اصطلاح کا مطلب کیا ہے؟"

"ہاں۔ جو کچھ نہ کرے مگر حصہ پورا وصول کرے۔" سردار نے اپنے ساتھیوں کی طرف فخر سے دیکھا۔ "یہ دونوں ان پڑھ ہیں مگر میں گریجویٹ ہوں۔ اسی لیے سردار ہوں ان کا۔"

"ماشاء اللہ! تعلیم سے خوب فائدہ اٹھایا تم نے۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم ان دونوں سے زیادہ سخت سزا کے مستحق ہو جس نے زیادہ سمجھ بوجھ رکھنے کے باوجود یہ راہ اختیار کی اور دوسروں کو بھی اس پر چلایا۔ لیکن پولیس سے تمھارے ساتھ امتیازی سلوک کون کرے گا۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ وہ ہمارے ہی ساتھی ہیں۔ سب بکے ہوئے ہیں۔ یہاں نے بھی بات کر کھانے بغیر کچھ نہیں کرتے۔" وہ بولا۔ "تم ہو جا ہو گو۔ مگر وہ بھی حوالات میں بڑے آرام سے رکھیں گے۔ ہماری خاطر مدارات معززوں کی طرح کریں گے۔ اور ہماری ضمانت بھی کرا لیں گے۔"

"ضمانت کے لیے تم کو مجسٹریٹ ہی سامنے لایا جائے گا نا۔" میں نے کہا۔ "میں دیکھوں گا کہ تمھارا ضامن کون بنتا ہے۔ خود ضامن کو ایک ضامن کی ضرورت پڑ جائے گی۔ تم بھول رہے ہو کہ میں عام آدمی نہیں ہوں، ایک مجسٹریٹ ہوں۔ اگر میں تفتیش سے مطمئن نہ ہوا تو تھانے کے پورے عملے کا ٹرانسفر کرا دوں گا۔ اچھا ہوا کہ میں نے رحم کھا کے تم کو چھوڑنے کی غلطی نہیں کی۔ تم راہ راست پر آنے والے نہیں تھے۔ جاؤ بھئی، پولیس کو فون کر دو۔" میں نے محسن کی طرف دیکھ کر کہا جو ریوالور ہاتھ میں لیے کھڑا ہوا تھا۔

وہ جانتا ہی تھا کہ ان تینوں نے ایک ساتھ مجھ پر حملہ کیا...

"سیدھے ہو جاؤ۔" محسن نے چلا کر کہا۔ "ورنہ شوٹ کر دوں گا۔"

"نہیں۔ گولی مت ضائع کرو۔" میں نے اپنا ریوالور جیب میں ڈال کر کہا۔ "پہلے میں ان کو سمجھا دوں کہ مجسٹریٹ کی مار پولیس سے کتنی زیادہ سخت ہوتی ہے۔"

دس منٹ بعد وہ تینوں لمبے پڑے ہوئے تھے اور اس قابل نہیں رہے تھے کہ پیروں پر کھڑے بھی رہ سکیں۔ سردار کا جبڑا اتفاقاً ہی ٹوٹ گیا تھا۔ دوسرے کے دو دانت کم ہو گئے تھے اور وہ قمیص کے دامن سے خون صاف کرتے ہوئے بری طرح کراہ رہا تھا۔ تیسرے کی شاید ایک پسلی ٹوٹ گئی تھی کہ اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی اور ہر سانس کے ساتھ اس کی صورت پر کرب نمایاں ہو جاتا تھا۔ چھوٹی موٹی چوٹوں کا کوئی حساب نہ تھا۔ میں نے تینوں کو ایک ساتھ بہت بری طرح رگیدا تھا۔ انھیں اٹھا اٹھا کے دیوار پر مارا تھا۔ دھوبی پٹکا دیا تھا۔ ٹھوکریں ماری تھیں اور لاتیں مار مار کے ان کے چوکھٹے بگاڑ دیے تھے۔ وہ انتقامی وحشت زدہ ہو گئے تھے اور شاید پچھتا رہے تھے کہ انھوں نے بچ نکلنے کا موقع گنوا دیا۔

"پولیس کے آنے تک اسے ہی اپنی جیل سمجھو۔" میں نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ پھر میں اور محسن دروازے سے کان لگائے کھڑے ہو گئے۔ اندر سے کچھ دیر کراہنے اور ہانپنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ وہ ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگے۔ غالباً بات ایک دوسرے کو الزام دینے سے شروع ہوئی تھی اور بہت جلد تو تو میں میں کی نوبت آ گئی مگر سردار ہی تھا، انھیں ٹھنڈا کیا۔

"احمقو... الو کے پٹھو... خدا نے ایک موقع دیا ہے نکلنے کا تو لگے آپس میں لڑنے۔ گنوا رہے ہو؟" وہ بولا۔ "اس کھڑکی سے راستہ بناؤ اور نکل جاؤ۔"

"اور باہر نکلتے ہی انھوں نے گولی مار دی تو؟" ایک کراہ کے بولا۔

"یہ رسک تو کھیلنا ہی پڑے گا۔ کچھ نہ کیا تو ذرا سی دیر میں پولیس آجائے گی اور سب لوٹے جائیں گے۔" سردار نے کہا۔ "اور اس بار اگلا پچھلا سارا حساب برابر کریں گے، ہائے سب ہی... کوئی تو دی ظالم ہے۔"

"پولیس تو پہلے بھی بے جا تی رہی ہے۔"

"پچھلی بات بھول جاؤ۔" سردار بولا۔ "وہ خرگوش اور ہرن تھے جن کا ہم شکار کرتے تھے۔ اس بار شیر کی کچھار میں پھنس گئے ہیں اور شیر بھی آدم خور۔"

"اسی لیے تو کہتے ہیں... ہائے..." تیسرا بولا۔ "کہ سو دن چور کے تو ایک کوتوال کا... یا سیر کو سوا سیر... لگتا ہے پسلی حلق میں اتر گئی ہے۔"

"وہ کوتوال بھی بڑا خبیث ہے۔" سردار نے کہا۔

"بڑے مردم شناس لوگ ہیں۔" محسن نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "کیسی صحیح رائے دی ہے تیرے بارے میں۔"

"وہ مونچھوں والا گینڈا تو ریوالور لیے کھڑا ہو رہا تھا۔" دوسرا بولا۔

"سچ فرمایا آپ نے۔" میں نے خوش ہو کے محسن کے کان میں کہا۔ "تیری ذات پر بھی بڑا جامع تبصرہ کیا ہے۔"

ہم نے تختے اکھاڑنے اور کیلیں کے ٹوٹنے کی دبی دبی آوازیں سن کر صحن میں سے جھانکا۔ وہ کھڑکی کھولنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ زور آزمائی صرف وہ کر سکتا تھا جس کے دانت ٹوٹے تھے۔ ٹوٹی ہوئی کلائی اور شکستہ پسلی والے صرف اللہ کو یاد کر رہے تھے۔

"جہاں سے تک کا کیا ہوگا استاد... ہائے..." ٹوٹی پسلی والا بولا۔

"بھاڑ میں گیا جنک۔" سردار نے کہا۔ "یہاں سے نکل گئے تو

www.paksociety.com

جا سکے تو بہت جانتے ہیں۔"

"کسے معلوم تھا کہ مال بھر میں جتنا جمع کیا تھا سب یہیں رہ جائے گا۔" دوسرے نقاب پوش نے روہانسے لہجے میں کہا۔

"ایک لاکھ کم تو نہیں ہوتے استاد۔" کھڑکی سے کشتی لڑنے والے نے منہ بنا کے کبوتر کی طرح غٹرغوں کی۔

"اچھا تو جاؤ کھود کے نکال لو۔" استاد نے برہمی سے کہا۔ "اپنے اُسی ملنے مجسٹریٹ سے کہنا کہ جناب دوستگر نے ہمیں ہم نے چوری کا مال گاڑ رکھا ہے اجازت ہو تو لے جائیں۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک لاکھ کی لاٹری نکلنے پر ہاتھ ملا کے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔

"پاگل ہے چرسی۔ وہ مجسٹریٹ تو ہمیں ایسا اندر کرائے گا کہ شاید باہر آنے ہی نہیں دے گا۔" سوار نے کہا۔ "تینوں رائفلیں بھی تو لے چکی ہے اس نے اور وہ سب پولیس کی ہیں۔"

"ہم نے نقصان کا کرایہ دیا تھا۔ ہمیشہ ویسے آئے ہیں۔"

"مگر کیا پولیس والے مانیں گے؟" سوار تھا جو کے بولا۔

"جب بات ان پر آئے گی تو وہ ہم کو پکڑ نہیں گے کہ ہم نے یہ جعلی مال خانے سے چوری کیا تھا۔ میں تو کہتا ہوں خدا کا شکر ادا کرو کہ یہ بے وقوفی ہو گئی ان سے کہ انہوں نے کھڑکی کی طرف دھیان نہیں دیا اور یہ بھی قسمت کی بات ہے کہ کھڑکی میں سلاخیں نہیں ہیں۔ لعنت بھیجو سب پیسہ اور نکلنے کی کرو۔ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ دوبارہ ہماری پرچھائیں بھی دیکھی تو چھوڑیں گے نہیں۔ اس بار مرغا بنایا تھا، اگلی بار مرغی بنائیں گے اور پھر کہیں گے کہ انڈا بھی دو... ورنہ ماریں گے۔"

"مگر استاد وہی ایک لاکھ..."

"ایک لاکھ کے بچے... یہاں سے بچ کر نکل گئے تو ایسے کئی لاکھ بنانے کا موقع ملے گا۔" سوار نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "بھول جا اس نقصان کو... فائدہ دیکھ کہ جیل جانے سے بچ گئے۔ ایک بڑا ہاتھ ماریں گے۔ اگلی بار تو لاکھ پورے کر لیں گے۔"

جب وہ کھڑکی کھول کے اپنی دانست میں کامیابی سے فرار ہو گئے تو میں نے دروازہ کھول کر کھڑکی سے جھانکا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو سہارا دیتے گرتے پڑتے بدحواسی کے عالم میں پیچھے دیکھتے بھاگے جا رہے تھے۔ میرا ڈراما کامیاب رہا تھا۔ اب ان کی واپسی کا کوئی امکان نہ تھا۔ وہ جانتے تھے یہ اسی گھر میں کسی جگہ ایک لاکھ روپے دفن بھی چھوڑ گئے تھے مگر اس کے باوجود مجھے افسوس ہو رہا تھا۔

"کاش ہم ان کو پولیس کے حوالے کر سکتے۔" محسن نے کہا۔

"کاش صرف اتنا ہی کر سکتی ہیں کہ انہیں سامنے کھڑا کر کے گولی مار دیتا اور ان کی لاشیں یہاں گاڑ دیتا۔" میں نے کہا۔ "اس سزا کے مستحق تو تھے یہ لوگ۔"

"ہاں ہم نے ایسے خطرناک مجرموں کو مزید جرائم کرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔" محسن بولا۔ "مجرم ہم بھی ہو گئے۔ قانونی بھی اور اخلاقی بھی۔"

"یہ آئندہ جو کچھ کریں گے اس کا گناہ جانے سر ہی آئے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ ہماری خود غرضی تھی یا مجبوری کہ ہم نے انہیں نکل جانے دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ آئندہ بھی چوریاں کریں گے اور ڈاکے ڈالیں گے۔ ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں تھی۔"

"بس اتنا احساس پشیمانی بہت ہے۔" غالب نے آ کے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "خدا تو جانتا ہے نیتوں کا حال۔ ہم مجبور تھے تو یہ جانتے ہوئے ذاتی مفاد کی مجبوری نہیں تھی۔ ہم ایک عظیم تر مقصد کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ یہ فرد اور معاشرے کی برائی کا مسئلہ ہے کہ کیا اجتماعی فائدے کی خاطر فرد کے حقوق کو قربان کر دینا چاہیے۔ فرد بھی اہم ہے کیونکہ افراد کے ملنے سے ہی معاشرہ وجود میں آتا ہے مگر بعض اوقات انتخاب میں آزمائش کا مرحلہ آ جاتا ہے۔ ایسی ہی وقت میں تم اپنے وقت اور اپنی توانائی کو کہاں کہاں صرف کر سکتے ہو۔"

"یہ فلسفہ مجھے مطمئن نہیں کر سکتا۔" محسن بولا۔ "اور میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کچھ بھی کرے اس کے غلط یا صحیح ہونے کا جواز بھی خود پیدا کر لیتا ہے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔" غالب بولا۔ "فرض کرو تمہارے پاس دس منٹ ہوں اور تمہیں معلوم ہو جائے کہ دشمن نے دو جگہ بم نصب کر رکھے ہیں۔ ایک تمہارے دوست کے گھر میں جو پانچ منٹ کے فاصلے پر ہے اور دوسرا کسی پبلک پلیس، پاور ہاؤس... اسکول یا اسپتال میں۔ اگر تم اپنے دوست کو خبردار کرنے گئے تو دوسرا بم پھٹ جائے گا جس سے اجتماعی نقصان ہو گا۔ وہاں پانچ منٹ کی تاخیر سے پہنچنا ممکن ہی نہیں۔ تم کدھر جاؤ گے؟ کسے بچاؤ گے... اگر یہ بات ہوتے بھی کہ تم اپنے دوست کے گھر کو بچا سکتے تھے تم نے اس کو مر جانے دیا تو یہ صحیح فیصلہ ہو گا۔"

"اس مثال کا موجودہ حالات سے کیا تعلق؟" محسن بولا۔

"تم بڑے دشمن سے ٹکرا رہے ہو۔ جو معاشرے کے نہیں ملک کی تباہی کے درپے ہے۔" غالب بولا۔ "یہ چور ڈاکو ایک محدود دائرے میں غیر قانونی سرگرمیوں سے چند افراد کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ اگر تم ان کو سزا دینے یا دلوانے کے چکر میں پڑ جاتے تو وہ [illegible] پلیتی کا کچھ نہ کر پاتے۔ وہ اس ملک کے عوام کو ان کی آزادی کو اور ان کی حب الوطنی کو بیچ رہے ہیں۔ وہ بڑے ڈاکو ہیں۔ تم نے ایک منطقی طور پر درست فیصلہ کیا۔ چلو اب اندر چلیں۔"

غالب نے بڑے غیر جذباتی انداز میں جاتے اس فعل کو ایک

اخلاقی سند عطا کر دی تھی۔ اس طرح سوچنے پر خود ہماری نظر میں بھلا کوئی جرم نہیں رہا۔ اندر اب شعلہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ان دونوں کی حالت بہتر تھی۔ پرسکون تھیں مگر وہ جاننا چاہتی تھیں کہ ہم لوگ اپنے حال کو توڑ کر یہاں تک بحفاظت پہنچنے میں کیسے کامیاب ہوئے۔ شعلہ نے اپنے تصور [illegible] وہ سب بتا دیا جو میں نے کیا تھا۔ جب وہ کامیاب رہا تھا اور ہم نے جس وقت وہ کارنامے سر انجام دے رہے تھے۔ ایک طرف دشمن نے اپنی بھرپور قوت کا مظاہرہ کر کے ہمیں زبردست نقصان پہنچایا تھا۔ دوسری طرف انہیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ وہ شعلہ اور رابعہ کو گرفتار نہیں رکھ سکتے تھے۔ دلاور کی یہ شکست اتفاقی سبق آموز تھی۔ رابعہ اور شعلہ کو اٹھانے وقت اس کے ذہن میں صرف ہماری کمزوری کا خیال تھا یا اپنی شہ زوری کا۔ اس نے فرض کر لیا تھا کہ رابعہ اور شعلہ کی وجہ سے ہم کو دست و بستہ اس کی خدمت میں حاضر ہونا پڑے گا اور اس کی ہر شرط کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کی وہ کامیابی تھی اسے بہت بڑی ناکامی سے دوچار کر دیا تھا۔ [illegible] جس کوٹھی میں رہتا تھا وہاں اب بھی اس کا کوئی آدمی رہتا تھا اور میرے اندازے کے مطابق وہ جگہ ان کے ایک ٹھکانے کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ وہاں رہنے والے بھی اگر مارے گئے تھے تو مجھے ان کی موت کا ملال نہیں تھا لیکن وہ اڈا بہرحال تباہ ہو گیا تھا جو خود کو فرعون سمجھنے والے ایس پی کی کوٹھی کو بم سے اڑا دینا ہی ایسا کارنامہ تھا جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے تھے۔ جیسا اندازہ تھا کہ حشمت علاوہ اس تباہی و بربادی پر دل شکستہ و مشتعل تھا اتنا ہی سراج بھی غصے سے پاگل ہو رہا ہو گا۔ اصل یا نقلی نواب خسرو خورشید کی ذات بھی ان کے لیے بہت بڑی سزا تھی اور حشمت خان اگر [illegible] گیا تھا تو گویا ایک شیطان کم ہو گیا تھا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ حشمت خان کے گھر سے عورتیں اور بچے نکل گئے تھے اور ایس پی سراج کی ماں کو نکال لیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہو کے ہم دشمن کے قبضے سے یوں نکل آئے تھے کہ وہ ہماری گرد کو بھی نہ پا سکے تھے۔ نہ جانے کتنے عرصے تک مسلسل کوشش کے بعد وہ ہمارا سراغ لگانے میں کامیاب ہوئے تھے کہ ہم پھر روپوش ہو گئے۔ اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ دلاور نے ڈاکٹر حنیف کے گھر میں رابعہ کو دیکھنے کے بعد ہی ہمارے پیچھے اپنے شکاری کتے لگا دیے تھے۔

رابعہ اور شعلہ نے ہمیں بتایا کہ ان کو کس طرح اغوا کیا گیا تھا۔

"تم دونوں تو کھانا لینے نکلے تھے؟" رابعہ نے کہا۔

"ہاں، مگر پھر ہم کھانا کھانے بیٹھ گئے۔" محسن نے اعتراف کیا۔

"اور تمہیں بالکل خیال نہیں آیا کہ گھر پہ بیویاں بھوکی بیٹھی ہیں؟" شعلہ نے خفگی سے کہا۔

"بیویاں؟" محسن نے میری طرف دیکھا۔ "یار کیا یہ جمع کا صیغہ درست ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "چوری چھپے کسی اور سے بھی نکاح کر لیا ہے تو بتا دے۔ شعلہ کو پتا چل گیا ہے۔"

"میری اکلوتی بیوی جانتی ہے کہ میں دوسری بار یہ حماقت کرنے کا اہل نہیں ہوں۔" محسن بولا۔

"پھر کیا میرا حوالہ دیا ہے تیری اکلوتی بیوی نے؟" میں نے سر کھجایا۔

"پتا نہیں۔ یہاں جو دو عورتیں ہیں ان میں ایک تو یقیناً بیوی ہے جس کا شوہر میں ہوں۔" محسن نے غور سے رابعہ کو دیکھا جس کا رنگ لال ہو رہا تھا۔

"دیکھا تم نے باجی۔" شعلہ نے ہنسی کو خفگی میں چھپائے رکھا۔ "کیسی بات بدلتے ہیں اور پھر شروع کر دیتے ہیں اپنی بیت بازی۔"

"ایک گھنٹے تک تم لوگ نہیں آئے تو ہمیں تشویش ہونا ضروری تھی۔" رابعہ نے بہتر سمجھا کہ موضوع بدل دے۔ "دستک ہوئی تو ہم نے یہی سمجھا کہ خیر سے تم دونوں گھر کو آئے۔"

"اس وقت کسی اور کے آنے کی امید بھی نہیں تھی۔"

"مگر بلا اور موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔" محسن نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

"بلا سے کیا مطلب؟" شعلہ نے آنکھیں نکالیں۔

"تمہاری اور ہماری جان کے لیے بلا ایک آئی تھی۔" محسن نے فوراً اپنا دفاع کیا۔ "اور وہی موت کے نامہ بر بھی ہیں۔"

"اتفاق سے میں کمرے میں تھی۔ شعلہ نے دروازہ کھولا اور انھوں نے اندر آتے ہی اسے دبوچ لیا۔" رابعہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں نے اندر سے ہی پوچھا کہ کون ہے اور شعلہ کا جواب نہیں ملا تو خود دیکھنے گئی۔ وہ اندر آ کے زینے کی طرف بھاگ کر کھڑے ہو گئے تھے۔"

"انھوں نے تمہیں بھی دبوچ لیا۔ شاباش ہے تم دونوں کو۔" غالب نے کہا۔ "یعنی وہ شیرنی تھی ورنہ ان کی مونچھوں کو دبوچ لیتی۔ میرا خیال ہے کہ تم دونوں کو زبان کے علاوہ ہاتھ پیر چلانا بھی سیکھ لینا چاہیے۔"

"گویا زبان درازی کے ساتھ دست درازی بھی آنا چاہیے مستورات خواتین کو۔" محسن نے تائید کی۔ "اب نازو آئے تو اس کی شاگردی قبول کر لو۔"

"سوچ لو، سب سے زیادہ خطرہ بھی آپ جیسے ہی لاحق ہو گا جو سب سے قریب ہو گا۔" شعلہ ہنسی۔

"توبہ کرو توبہ۔" محسن کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا۔ "کسی کو ڈرا مرغا ہو نیک بخت... اپنے مجازی خدا کو..."

"سب قرب قیامت کی نشانیاں ہیں برادر عزیز۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔ "بجلی گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پہ۔"

www.paksociety.com

"اب تم لوگ باتیں ہی کرتے رہو گے۔" رابعہ نے کہا۔ "شام ہو رہی ہے۔ تم لوگوں کو نازو اور ڈیڈی کی طرف جانا ہے۔"

"کمرا بند ہے ورنہ چلتے کہ یہاں سب یار بیٹھے ہیں۔" غالب بولا۔ "کیوں یار رو؟"

"بیٹھے کیا ہیں، کھڑے ہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مگر بقول شاعر تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے۔"

"مطلب ہے کہ ٹھکانا تو وہ بھی تھا جہاں سے تم پتا ٹھکانا بتائے بغیر نکل گئی تھیں۔" محسن بولا۔ "مرزا ایک بیوی کے لیے ایک جنگ عظیم نہیں چھیڑی جا سکتی۔"

"اس سے تو آسان ہے کہ آدمی وہ کرے...." میں نے شانہ ہلایا۔

"خود کشی؟" غالب نے کہا۔

"نہیں یار... صبر جمیل۔" محسن بولا۔ "تم دونوں کو تو تجربہ ہی نہیں... رات حوالات میں گزرے یا فٹ پاتھ پر... تم کیا جانو طول شب فرقت کو۔"

"اچھا اچھا... اب جاؤ۔" شہلا نے کچھ شرما کے اور ڈانٹ کے کہا۔ "حساب بعد میں لیں گے۔"

"بیٹو میرا مطلب ہے کہ میری عدم موجودگی میں تب تمھاری محافظ ہوگی۔" محسن نے ریوالور شہلا کو تھما دیا۔ "بس گولا چلاتے وقت دیکھ لینا کہ سامنے کون ہے۔ میں تو پہلے ہی مر چکا ہوں... تم ہو۔"

"تم بھی یہ اضافی اسلحہ رکھ لو۔" میں نے اپنا ریوالور رابعہ کے حوالے کیا۔ "اگر تیر نگاہ اور خنجر ابرو کافی ہوں تو یہ واپس دے دینا مگر یہ خیال تم بھی رکھنا کہ نشانہ کسی کا دل ہے۔ باقی وہی جو محسن نے کہا۔"

وہ دونوں واک آؤٹ کر گئیں۔

ہم نے پچھلے اسلحہ خانے سے دو نسبتاً جدید ریوالور نکالے۔ ان میں سے ایک پر سائلنسر بھی تھا۔ آج کی رات قتل و خونریزی کا امکان تو نہیں تھا لیکن احتیاط کے تقاضے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے تھے۔ وہی بات یہ تھی کہ فرنیچر کے سوا پرانے گھر کا تقریباً سب سامان نیا منتقل کر لیا گیا تھا۔ اسلحہ خانے میں جو کچھ تھا وہ دوسروں سے چھینا ہوا تھا اور آج تک ہر مشکل وقت میں ہمارے کام آیا تھا۔ ریوالور نسبتاً آسان حاصل کیے تھے ورنہ ہمارے ملکی قوانین کے تحت لائسنس بھی بڑی سفارشوں سے حاصل ہوتا تھا اور اس کے بعد اگر ریوالور ملتا تھا تو اس کی ایک ایک گولی کا حساب رکھنا پڑتا تھا۔ اب تک کی معرکہ آرائی میں سب سے اہم کردار وہ چار نامعلوم لوگ تھے جو ہماری خواہش اور منصوبہ بندی کے مطابق ایک ایک گھنٹے کے فرق سے پہنچ گئے تھے جو مقام پہنچنے سے پہلے شکاری کی چوکڑی بھول گئے تھے۔ سب سے بڑے شکاری نے یقین کر لیا تھا کہ جو تھے ہم ہیں۔ اس کے خاندان کی زندگی اور ان کے مستقبل کو داؤ پر لگا کر ہماری زندگی اور ہمارے مستقبل کا سودا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

جب ہم گھر سے روانہ ہوئے تو ہم نے خواتین کو سختی سے تنبیہ کی کہ وہ دروازے بند کر کے قلعہ بند ہو جائیں اور ہمارے سوا کسی کے لیے بھی اس وقت دروازے کھولیں جب ان کو یقین آ جائے کہ ہم ہی ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی نہیں، یہاں تک لانے والا نہیں ہے۔

"ہدایت نمبر ایک۔" محسن نے کہا۔ "اسے تم حکم سمجھو بلکہ کسی دیوانے کو میرے خیال کی طرح دل سے جدا نہ کرنا۔"

"ہدایت نمبر دو...." میں نے کہا۔ "دروازہ کھولنا پڑ جائے تو اس طرح مت کھولنا جیسے پہلے کھولا تھا۔ شہلا دروازہ کھولنے جائے تو تم کسی محفوظ مقام پر چھپ کر دیکھتی رہنا اور ریوالور تیار رکھنا۔ اس میں سات گولیاں ہیں اور تم کو سات خون معاف ہیں۔ بس شہلا کا نشانہ درست لینا۔"

"اگر بھوت اور جنات یا خبیث ارواح تم کو اسی طرح نکالنا چاہیں جیسے ہم نے ان تین الوؤں کو نکالا تھا تو چیخ مار کے بے ہوش ہو جانا۔ یہ کام تو خواتین کے لیے مشکل نہیں ہوتا مگر بھوت اور ارواح خبیثہ کے لیے تمھارا مشکل ہو جائے گا۔" غالب بولا۔

"وہ لکڑ بیٹھے جائیں گے تو ان شاء اللہ لوٹ کر نہیں آئیں گے... ہدایت نمبر تین ہے۔"

"بھوتوں سے پہلے آپ لوگ جو آ جائیں گے۔" رابعہ نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ان کی صورت دیکھتے ہی بھاگ گئے ہوں گے۔" شہلا کی آواز پیچھے سے سنائی دی۔ ہم تینوں اپنے بدلے ہوئے حلیوں کے باعث اصل صورت میں تو نہیں تھے لیکن مقام افسوس یہ تھا کہ جو محنت موسیٰ بھائی نے ہمارا حلیہ بدلنے میں کی تھی وہ رائیگاں گئی تھی کہ کم سے کم میری موجودہ صورت کو شکاری دیکھ چکے تھے۔ رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ شام پر غالب آ رہا تھا۔ ہمیں تھوڑا سا وقت ہوتا تو ہم ایک بار پھر چہرہ بدل لیتے۔ یہ خود وہ جگہ بھی شکارگاہ تھی جہاں نازو انتہائی جرأت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اکیلی پہنچ گئی تھی۔ اس جگہ سے بہت قریب ڈیڈی ایک خطرناک مشن کی نگرانی کر رہا تھا۔

"میاں سکندر اعظم۔" غالب نے کچھ دور آ جانے کے بعد کہا۔ "ہم کوئی بے وقوفی تو نہیں کر رہے ہیں؟"

"بے وقوفی تو ہم اکثر کرتے ہیں۔ وضاحت فرمائیے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ ہمارے ساتھ... اگلے دن پائے تھے ہم ہو رہے... والی بات نہ ہو جائے...۔" غالب بولا۔ "جہاں پہنچیں اور معلوم ہو کہ شکاری پہلے سے استقبال کے لیے موجود ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ایسا ہوتا تو ڈیڈی گرفتار ہو جاتا۔" میں نے کہا۔

"اور نازو کو بھی مہلت نہ ملتی۔"

"یہ مہلت بھی تو ایک جال ہو سکتی ہے۔" غالب نے کہا۔

"لیکن یہ ناممکن ہے کہ انھوں نے نازو کو بھی شناخت کر لیا ہو۔ جانتے بوجھتے اس کو گھر میں گھسنے دیا ہو صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے۔"

"ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا مرزا جی... بہرحال..."

"مگر کیا تم نے فرض کر لیا تھا کہ شکاری ڈاکٹر لطیف کے گھر میں رابعہ کو پکڑنے کے بہانے پیچھے لگ گئے تھے۔" غالب بولا۔ "کیا ثبوت ہے کہ ایسا ہی ہوا تھا؟"

"تمھاری ناقص عقل کیا کہتی ہے آخر؟" محسن نے کہا۔

"کیا یہ بعید از قیاس ہے کہ انھوں نے نازو کو پہچان لیا ہو اس پر نظر رکھی ہو؟" غالب نے کہا۔ "اس طرح کہ خود نازو کو خبر نہ ہو۔ انھوں نے اس کے پھیلائے ہوئے جال کا سرا پکڑ لیا ہو۔ دیکھا مگر خاموش رہے ہیں اور ڈیڈی کی صبح شام ڈیوٹی بدلتے رہے ہیں اور ہم خود ڈیڈی کو پکا سرخ رعایتی کا ڈراما چلا رہے ہیں۔ وہ ہمارا تعاقب کرتے ہوئے ہمارے اڈے تک آ پہنچے۔"

"فرض کرو ایسا ہی ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "مگر اب کیا کریں... یہیں سے واپس لوٹ جائیں؟ نازو اور ڈیڈی کو چھوڑ دیں؟"

"یہ کون الو کا پٹھا کہہ رہا ہے۔" غالب نے چڑ کے کہا۔ "خود کو بہت زیادہ عقلمند سمجھنے والا احمق مانتا ہے۔ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ دلاور کتنا چالاک اور خطرناک آدمی ہے۔"

"ہماری صورتیں بدلی ہوئی ہیں۔" محسن بولا۔

"سکندر تو چوہدری دلاور کے سامنے آیا ہے اور اس کا چہرہ دلاور بھول نہیں سکتا۔" غالب نے کہا۔ "ہماری شکل کا بھی چہرہ رہا نہیں۔ وہ سب کی اصلیت جان چکے ہوں... کرنا وہی ہے جو آج رات تو ساتھ ہی رہیں گے تمام بھی نہیں گے۔ میرا مطلب ہے کہ ہمیں الگ الگ رہنا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ وہ موقع ہاتھ آنے پر... ڈیڈی اور دلاور کو ایک ہی بار سمیٹ کر اندر لے جائیں اور نازو کے سامنے پیش کر دیں کہ لیجیے تماشا... یہی ہیں نا وہ جو خود کو شکاری کا ماسٹر سمجھتے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم ڈیڈی سے دور دور رہیں گے۔" محسن بولا۔

"لیکن ڈیڈی کو اپنی تشریف آوری کی اطلاع دے دیں گے۔" میں نے کہا۔ "تاکہ وہ پریشان نہ ہو۔ جب تک اس کی طرف سے آل کلیئر کا سگنل نہیں ملے گا، ہم قریب نہیں جائیں گے۔"

ڈیڈی اپنی جگہ موجود تھا۔ یہ ہم نے دور سے ہی دیکھ لیا۔ ہم نے تین مختلف سمتوں میں پوزیشن سنبھالی۔ میں گلی کے دوسرے کنارے پر رہا۔ غالب اور محسن میں سے ایک کو میرے ساتھ رہنا تھا۔ محسن نے میرا ساتھ دینا پسند کیا۔ گلی کے اس کنارے پر ایک فٹ پاتھ ہوٹل تھا۔ چائے والے نے چولھا اور دوسرے آلات اور چائے کے سازوسامان اپنے اطراف میں پھیلا رکھے تھے اور فٹ پاتھ کو ہوٹل کے لیے یوں بند کیا تھا کہ چوڑائی کے رخ دونوں جانب دو لکڑی کے تختوں کی بینچیں لگا دی تھیں۔ فٹ پاتھ پر آنے والوں کو سڑک سے نیچے اتر کے جانے کے سوا کسی حد سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ کوئی بھی راہگیر فٹ پاتھ پر چلنے کا قانونی حق ان سب سے طلب نہیں کر سکتا تھا جو بینچوں پر اکڑوں یا آلتی پالتی مار کے بیٹھتے تھے اور چائے نوش کرتے تھے، گپ لگاتے تھے اور کبھی سر پرادوں کی صدا بڑھا دیتے تھے۔ محسن نے بھی اسی چائے خانے سے رجوع کیا اور ہم کو روکتا گیا۔ وہاں ایک کپ چائے پینے والا اگر دو گھنٹے بھی بیٹھا رہے تو کسی کو بالکل اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت صرف دو ہی افراد تشریف فرما تھے۔ وہاں چنانچہ محسن شریف نہ ہو گیا اور نہ جانے کس فضول مشغلے پر بحث میں الجھ گیا۔ اس کی نظر چھو کر...

میں نے ڈیڈی کو وائرلیس پر مخاطب کیا تو فوراً اس کی طرف سے جواب آیا۔ "آ گئے ہو بیٹے سکندر بادشاہ؟" وہ بولا۔ "ایک تو سخت تشویش لاحق ہو رہی تھی۔"

"کیوں استاد، ڈر کس کا تھا تمھیں؟" میں نے کہا۔

"ڈر تو تم ہو... کسی کا نہیں..." وہ بولا۔ "سب سے اکیلا بھی رسک لیتا ہیں۔"

"سب کوئی؟" میں نے کہا۔

"ابھی دن سب چپ چاپ تھے۔ دلاور آخر پہنچا ہے۔" ڈیڈی نے کہا۔ "بہت پہلے ایک گاڑی میں دو آدمی آئے تھے مگر میں انھیں دیکھ نہیں سکا۔ انھوں نے پردے ڈال رکھے تھے۔ پہلی بیٹی..."

"نازو کی طرف سے کوئی اطلاع ملی؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں۔" ڈیڈی بولا۔ "تم بتاؤ شہلا اور رابعہ کی کوئی خبر..."

"ہم انھیں لے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "خیر تفصیل نہیں... آئی دونوں کو۔ تفصیلات اس وقت نہیں بتا سکتا۔"

"شکر ہے میرے رب کا۔" ڈیڈی بولا۔ "تشویش اسی بات کی تھی کہ سارا دن گزر گیا تھا اور تمھاری طرف سے کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ سارے دن میں آدھا خون تو خشک ہو گیا ہوگا میرا۔"

"باقی آدھا خشک مت ہونے دینا استاد۔" میں نے کہا۔ "ہم سب تمھاری حفاظت کر رہے ہیں۔"

"وہ مرزا غالب کا بھتیجا کہاں ہے جو اس نے چارج نہیں لیا مجھ سے۔"

"وہ تمھارے بہت قریب کہیں موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "میں گلی کے دوسرے کنارے پر تمھارے جوتوں کے ساتھ مورچہ بند ہوں۔ ہم سب مسلح ہیں اور اگر ضرورت پڑی تو دونوں طرف سے راستے بند کر دیں گے۔ خدانخواستہ انھوں نے نازو کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی تو پھر کھلی جنگ ہوگی۔"

"نازو کا آخری پیغام مغرب سے ذرا پہلے ملا تھا۔" ڈیڈی بولا۔ "اس نے کہا تھا کہ اب وہ دور رہے گی۔ اس نے دو تشخیص..."

www.paksociety.com

مائکرو فون صحیح جگہ پر فٹ کر دیا ہے جہاں ان سب کے جمع ہونے کی امید ہے۔ ان کی سب گفتگو براہ راست سنائی دے گی۔ تم بھی سنو گے؟"

"تم نے ٹیپ ریکارڈر بھی سیٹ کر لیا ہے نا؟"

"ہاں لیکن ابھی تک تو بالکل خاموشی ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"وہ تینوں بہن بھائی گھر پہ ہیں؟"

"ہاں۔ پرویز وکٹر اور اس کی بہن موجود ہیں۔" ٹیڈی بولا۔ "اب وہ تین نہیں دو رہ گئے ہیں۔"

"میں بھول گیا تھا کہ سلیم وکٹر مارا جا چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم نے تصویر دیکھی ہو گی۔"

"دیکھی تھی... تصویر بھی دیکھی تھی۔ کیا اسپتال میں وہی ڈاکٹر بنا ہوا تھا اور اسی نے تم پہ حملہ کیا تھا؟" ٹیڈی بولا۔

"ہاں استاد۔ دلاور نے اسے ایک بہت اہم فرض سونپا تھا۔ [illegible] تھا کہ رابعہ اور میں اسپتال سے منتقل نہ ہو سکیں۔ اس کے لیے بہت اچھا انتظام کر دیا گیا تھا۔ مگر وہ ناکام رہا۔ اس ناکامی کی سزا یہی ہو سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے... یہ حادثہ نہیں تھا، قتل تھا؟"

"ہمارے ساتھ تو اتنا عرصہ ہو گیا تمھیں استاد مگر تم ابھی تک بہت سیدھے ہو کہ ان لوگوں کو نہیں سمجھے۔" میں نے کہا۔ "یہ انڈر ورلڈ کو استعمال کرنے والے لوگ ہیں۔ صرف اپنے فائدے کے لیے۔ نقصان ہو جائے تو یہ آدمی کی ایک بھی غلطی کو معاف نہیں کرتے۔"

"حالانکہ انسان خطا کا پتلا ہے۔" استاد ٹیڈی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"غلطی مشین سے بھی ہو جاتی ہے۔ روبوٹ اور کمپیوٹر سے بھی ہو سکتی ہے تو آدمی کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا سلیم وکٹر کی لاش گھر آئی تھی؟"

"نہیں... میں نے صبح خبر پڑھی..."

"تم نے ایک بات پر غور نہیں کیا ہو گا۔ خبر کسی نے براہ راست اخبارات کو دی تھی۔" میں نے کہا۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"جرائم اور حادثات کی خبریں عموماً تھانوں سے جمع کی جاتی ہیں یا پھر عدالتوں سے۔" میں نے کہا۔ "حادثات کی خبریں اسپتالوں سے ملتی ہیں یا پھر اتفاق سے کوئی رپورٹر جائے حادثہ پر موجود ہو تو خود دیکھ لیتا ہے۔ ورنہ شہر کے کسی حصے میں حادثہ رات نو بجے بھی پیش آئے تو اخبار والوں کو اگلے دن ہی پتا چلتا ہے اور خبر اس سے اگلے روز آتی ہے۔ نہ کوئی تھانہ کسی اخبار والے کو اطلاع دیتا ہے، نہ اسپتال... مگر یہ خبر اسپتال سے منسوب کی گئی تھی۔ اسپتال والوں نے اسے جھوٹ قرار دیا۔ میں نے معلوم کیا تھا۔"

"اس کی لاش تو گھر بھی نہیں پہنچی۔ میں سارا دن منتظر رہا۔ سونیا کو پرویز وکٹر دن کے ایک بجے گھر لے آیا تھا۔ وہ بہت رو رہی تھی۔ لیکن اس ایمبولینس سے لاش کوئی نہیں اتار رہی تھی۔" ٹیڈی نے کہا۔ "کیا انھوں نے لاش کو غائب کر دیا ہو گا؟"

"ابھی کچھ دیر میں حقیقت سامنے آ جائے گی۔" میں نے کہا۔ "میرے دو نظریات ہیں۔ ایک یہ کہ حادثہ ہوا ہی نہیں۔ سلیم وکٹر کو گولی مار کے کہیں گاڑ دیا گیا۔ لیکن اس کے امکانات کم ہیں کیونکہ پرویز وکٹر اور سونیا کو اپنا دشمن نہیں بنائیں گے۔ انھیں ان کی خدمات کی ضرورت ہے۔ یہ بھائی بہن ملک و قوم [illegible] کے لیے جیسے بھی ہوں، آپس میں کوئی بیر نہیں رکھتے۔ اگر ان کے درمیان محبت نہ ہوتی تو اس عمر کو پہنچنے تک وہ الگ ہو چکے ہوتے۔ [illegible] باہم یوں مل کر رہتے [illegible] مزاج، طبیعت اور عادات میں [illegible] ہوتا تو یہ اتفاق کیسے ہوتا ان میں... یہ تو ایسا کام ہے کہ کسی کی سوچ بھی مختلف ہوتی تو وہ باقی دو کو بھی کچھ نہ کرنے دیتا۔ [illegible] ایک ہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہو گی۔ اگر وہ سلیم وکٹر کو ختم کریں گے تو باقی دو باغی ہو جائیں گے۔ یہ سوچیں گے کہ کل [illegible] ہمارے ساتھ نہ ہو۔ منتقل ہونے کے بعد وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ان کو سب معلوم ہے اور جتنا سب معلوم ہوا اس سے [illegible] پڑتا ہے یعنی ان تین بہن بھائیوں کی طاقت ہے کہ کسی ایک کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اب یا تو دلاور اینڈ کمپنی سب کو ختم کر دے یا سب کو برداشت کرے۔ سب کو ختم کیا تو کام رک جائے گا۔ [illegible] چاہئے جو بھروسے کے قابل اور تجربہ کار لوگ ہیں۔ فوراً ایسے لوگ نہیں مل سکتے جو ان تینوں کی جگہ لے لیں۔"

"تمھاری باتیں اپنے پلے نہیں پڑیں سکندر بادشاہ۔ تم ایک طرف کہتے ہو کہ سلیم وکٹر کو اس کی غلطی کی وجہ سے قتل کر دیا گیا، دوسری طرف اپنے کہے کی تردید کرتے ہو۔" استاد ٹیڈی بولا۔ "سیدھی بات کرو۔"

"بات ٹیڑھی ہے کیونکہ یہ لوگ ٹیڑھے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور دھوکا دینے کے ماہر ہیں۔ انھوں نے خبر دے کر یہی مطلع کیا ہے کہ سلیم وکٹر کو قتل کر دیا گیا۔ وہ اسپتال میں پولیس [illegible] کے بیچ تھا۔ اسپتال والوں کی جان چھٹ گئی اور وہ بھی مطمئن ہو گئے کہ قصہ ختم ہو گیا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ثابت ہو گی۔ سلیم وکٹر سو فیصد زندہ ہو گا۔ بس اسے منظر سے ہٹا دیا گیا ہے کیونکہ وہ بہت نمایاں ہو گیا تھا... یہ آوازیں..."

"ہاں... میں بھی سن رہا ہوں۔" استاد ٹیڈی بولا۔ "شاید وہ لوگ میٹنگ کے لیے آ گئے ہیں... اب چپ رہو کیونکہ میں ٹیپ ریکارڈر کو آن کر رہا ہوں۔"

میرے کانوں میں بیک وقت بہت سے لوگوں کے بولنے کی آواز آنے لگی تھی۔ یوں جیسے کرکٹ میچ کی کمنٹری کے پس منظر میں لوگوں کا شور... آہستہ آہستہ آوازیں بلند اور صاف ہونے لگیں۔ پھر کوئی دروازہ کھلا اور ایک دم مجھے آوازوں نے [illegible] سے نمایاں آواز نازو کی تھی۔

"خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔" وہ بڑی مظلومیت کے ساتھ [illegible] کر رہی تھی۔ اس نے اپنی آواز بدلی تھی مگر میں اسے پہچان سکتا تھا۔ "میں ایک غریب لاوارث عورت ہوں۔"

"چپ کر ... ادھر۔" یہ آواز دلاور کی تھی۔ "کس نے بھیجا تھا تجھے... بول..."

"میں تو خود ہی آ گئی تھی جی۔" نازو نے روتے ہوئے کہا۔ "بابا جی نے رحم کھا کے رکھ لیا مجھے۔"

طمانچے کی آواز بالکل صاف سنائی دی۔ "خود ہی آ گئی تھی۔" دلاور نے اس کے الفاظ دہرا کے کہا۔ "بکواس کرتی ہے تو کتی۔"

نازو نے سخت واویلا کیا۔ "ہائے مر گئی... ارے ظالمو... غریب بڑھیا پہ ہاتھ اٹھاتے ہو، آج کوئی تمھارا [illegible] ہوتا تو میرا تو تم سے نمٹ لیتا... گالیاں دیتے ہو مجھے... [illegible] کے عذاب سے ڈرو۔"

"آوارہ ابھی ہے بڑھیا۔" اس بار خسرو جمشید کی آواز میں نے پہچانی۔

"دیکھ مائی... جھوٹ نہیں چلے گا۔" دلاور نے کچھ نرمی سے کہا۔ "تو نہیں جانتی ہم کون ہیں۔"

"کیا ضرورت ہے مجھے جاننے کی۔" نازو نے دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کیا۔ "میں تو اس گھر کی نوکرانی ہوں۔ گھر بھر کی خدمت کرتی ہوں... تم کہاں سے آ گئے... خدا غارت کرے [illegible] عزت سے ملازمت کی روٹی ملتی تھی... کبھی کسی نے کچھ نہیں کہا مجھ سے۔ بھولی بی بی، [illegible] سب نے اچھا سلوک کیا میرے ساتھ... مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ اس گھر کے مہمان ایسے کیسے ہوں گے... یہ کیسے مہمان ہیں کہ گھر کے نوکروں کو [illegible] اور مالک چپ رہتے ہیں۔"

"ادھر کہاں جا رہی ہے؟" دلاور کے پیچھے پیڈرو نے گرج کر کہا۔

"جا رہی ہوں جہاں مقدر لے جائے۔ یہاں اب نہیں رہ سکتی۔" نازو نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جا میرے [illegible] سامنے بیٹھ۔"

نازو کے ایک اور چانٹا مارا گیا اور یہ پیڈرو نے مارا تھا۔ نازو نے ایک دل دہلا دینے والی چیخ ماری۔ "اسے کوئی بچاؤ... یہ مار ڈالیں گے مجھے... کسی کو رحم نہیں آتا ایک عورت پر... خدا نے بے آسرا کر دیا مجھے... ورنہ میرے بھی دو جوان بیٹے تھے۔"

"کہاں مر گئے وہ؟" پیڈرو طنز سے ہنسا۔ "ماں کو چھوڑ کر بھاگ گئے؟"

"اللہ نہ کرے... نہیں۔" نازو نے روتے ہوئے کہا۔ "چھوٹا [illegible] جنگ سے نہیں لوٹا... بالکل اس کے جیسا تھا، یہی صورت شکل، یہی قد کاٹھ... ایسی ہی آواز بھی تھی اس کی۔ سچ بتا تو وہی تو نہیں ہے؟"

"تیرا دماغ خراب ہے بڑھیا۔" دلاور نے کہا اور میں سمجھ گیا کہ نازو نے اس کو جذباتی کمزوری میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی جرات اور بے باکی کا میں پہلے ہی قائل تھا۔ ذہانت اور اداکاری کی صلاحیت کا معترف تھا جو ڈرامے میں اس کی مہارت کو تسلیم کرتا تھا [illegible] فائدہ اٹھا کے اس نے بڑے بڑے شہ زور مردوں کو چت کیا تھا۔ اس کے حسن بے مثال کا جادو سر چڑھ کے بولتا تھا۔ ان صفات اور بے پناہ حسن و جمال کی شخصیت پر میں پوری ایک کتاب رقم کرتا تو الفاظ کم پڑتے۔ اگر میں مصور ہوتا تو مجھے رنگ ناکافی ہوتے جو اس پیکر جمال کے عکس کو اتار سکیں اور میں شاعر ہوتا تو اس کے وجود کی رعنائی پر بے شمار دیوان لکھ دیتا... محبت ایک الگ جذبہ تھا جس کا مرکز صرف زاہرہ کی ذات تھی اور میرے خیال کی دنیا اسی کے تصور سے آباد رہتی تھی مگر نازو کے بارے میں میرے حقیقی جذبات یہی تھے کہ شاید اس حسین لڑکی کو خدا نے اپنے ہاتھوں سے ایک بار تخلیق کر کے شاہکار کی طرح بنایا اور پھر سانچہ ختم کر دیا۔ شاہکار تو ایک ہی بار تخلیق ہوتے ہیں۔ اگر محبت کرنا اپنے اختیار کی بات ہوتی تو میں ہزار بار اس سے محبت کرتا۔

اس وقت وہ انتہائی ہمت اور حاضر دماغی کے ساتھ بہترین اداکاری کا مظاہرہ کر رہی تھی اور دلاور کو اپنے بیٹے کی طرح بتا کے اس نے زبردست چال چلی تھی۔ دلاور کا لہجہ نرم پڑ گیا تھا۔ مضبوط سے مضبوط اعصاب والے مرد کے گرد بھی ایک جذباتی فصیل موجود رہتی ہے جو کہیں نہ کہیں سے کمزور پڑ جاتی ہے۔ نازو نے اس کمزوری کا پتا چلانے کے لیے اندھیرے میں ایک تیر پھینکا تھا اور جہاں یہ تیر لگا تھا وہاں سے گونج آئی تھی جو ٹھوس حصار کے پیچھے خلا کا پتا دیتی تھی۔

"میں کتنے سالوں سے اس کی واپسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہو گا۔" نازو نے دیوانوں کی طرح کہا۔ "کیا تو میرا بیٹا نہیں ہے... ہے تو مجھے بتاتا کیوں نہیں ہے آخر؟"

"لاحول ولا قوۃ... اے اماں مجھے معاف کر۔" دلاور نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں تیرا بیٹا نہیں ہوں۔"

"ٹھیک کہتا ہے تو... وہ تو بڑا رحم دل تھا، کسی کو تکلیف میں دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔" نازو نے اسی لہجے میں کہا۔ "کسی کا دل نہیں دکھایا تھا اس نے۔ سب کی عزت کرنا جانتا تھا... ہر بوڑھی عورت اس کی ماں تھی۔ جب وہ گیا تھا تو میں نے کہا تھا کہ بہادر بن۔ اس کا نام بہادر تھا۔ بہادر تو نام کا بہادر نہیں ہے۔ بہادری کمزور پہ ہاتھ اٹھانے میں نہیں ہے۔ خبردار جو کسی عورت پر، کسی بچے پر... بوڑھے یا بیمار پہ ہاتھ اٹھایا۔"

"بند کر اپنی بکواس۔" پیڈرو نے پھر اس کے [illegible]

www.paksociety.com

جارہی ہے کتیا کی طرح۔" نازو مار کھا کے بھی مشتعل نہیں ہو رہی تھی۔
"پیڈرو۔" دلاور نے تنبیہ کے انداز میں کہا۔ "یہ ایسے ہی بکتی رہے گی۔ مار مت اسے۔"
"استاد یہ بہت مکار لگتی ہے مجھے۔" پیڈرو نے کہا۔
"پیڈرو... یہ کئی دن سے ہمارے گھر میں ہے۔" یہ آواز سن کے میں چونک پڑا کیونکہ یہ سلیم وکٹر کی آواز تھی۔ وہ سلیم وکٹر جو البرٹ وکٹر اسپتال میں مجھ سے ڈاکٹر حکیم بن کے ملا تھا اور اخباری اطلاع کے مطابق حادثے میں ہلاک ہو چکا تھا۔
"ہم نے اس پر مسلسل نظر رکھی ہے۔" سلیم وکٹر بولا۔ "ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔"
"تم دونوں ہر وقت گھر میں نہیں رہتے۔" پیڈرو نے بے رخی سے کہا۔
"میں نے سارا دن گھر میں رہ کے بھی دیکھا ہے۔" یہ آواز سونیا کی تھی۔
"ہم نے اپنی ماں کو بھی سمجھا دیا تھا کہ یہ کوئی مشتبہ حرکت کرتی نظر آئے تو ہمیں بتانا۔" سلیم وکٹر بولا۔ "اس طرح سے یہ تو کہیں گئی اور نہ کوئی اس سے ملنے کے لیے آیا۔"
"تم سب جلد و جلد اس کی طرف داری کر رہے ہو۔" پیڈرو بولا۔ "مجھے صرف دس منٹ دو۔ میں اسے الٹا لٹکا کے سارا سچ اگلوا لیتا ہوں۔"
"میرا بھی خیال ہے کہ اس کا یہ ظاہری روپ میک اپ کا نتیجہ ہے اور اصل چہرہ مختلف ہوگا۔" نواب خسرو جمشید کی آواز پہلی بار آئی۔
"میک اپ کیا میں کھال اتار کے دیکھ لوں گا۔" پیڈرو نے غالباً نازو پہ ہاتھ ڈالا تھا کہ اس نے چیخ ماری۔
"پیڈرو!" اس مرتبہ دلاور کے لہجے میں برہمی نمایاں تھی۔ "کیا کہا تھا ابھی میں نے... پھر وار جوا سے پھر ہاتھ لگایا؟"
میں یہ سب کچھ ایک ریڈیو ڈرامے کی طرح سن رہا تھا جس میں مرکزی کردار ادا کرنے والوں کے ڈائیلاگ مکمل اور واضح صوتی اثرات کے ساتھ سنائی دیتے تھے۔ میں اس جگہ سے زیادہ دور بھی نہیں تھا جہاں حقیقی زندگی کا یہ پر تجسس ڈراما کھیلا جا رہا تھا لیکن چشم تصور سے میں خود کو اسی جگہ محسوس کر سکتا تھا۔ سامنے کردار نہ دیکھے جاسکتے تھے اور میں ان کی صورت کے پیرائے کو اور ان کی تمام حرکات و سکنات کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ یہ ایک بالکل غیر متوقع صورت حال تھی۔ ہم میں سے کسی نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس وقت جب نازو کی پوزیشن وکٹر فیملی کے گھر میں محفوظ ہو چکی ہے، اس کے خلاف نئے سرے سے انکوائری شروع ہو جائے گی لیکن ایسا ہونا عین ممکن تھا۔ نازو کو اس گھر کے اندر جگہ دلانے میں قبول بھی بھائیوں سے زیادہ ان کی بوڑھی ماں کی خواہش اور ضرورت کا دخل تھا۔ دلاور، پیڈرو اور خسرو جمشید مختلف لوگ تھے۔ زیادہ خطرناک اور شک کرنے والے۔ وہ سفاک اور بے رحم نازو کو یوں گھیرے ہوئے تھے جیسے معصوم ہرنی کو خونی بھیڑیے ہر سمت سے زخمی نہیں کرتے۔
کسی نے دروازے پر دستک دی تو مجھے اندازہ ہوا کہ کسی حد تک اعصابی کشیدگی میں مبتلا ہوں۔
"کون ہے؟" پیڈرو نے کہا۔ اس کے لہجے سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ دلاور کی بات سے کتنا مشتعل ہوا ہے۔
"تمہارا باپ۔" جواب ملا۔ آواز بند دروازے سے کچھ دب کے آئی تھی لیکن میں نے پہچان لی۔ یہ ایس پی سراج تھا۔ دروازہ کسی نے کھولا۔
"میں نے تم سے پہلے بھی کہا ہے کہ میرے باپ کی بات کیا کرو۔" پیڈرو نے سخت برہمی سے کہا۔
"آئندہ تم بھی اس لہجے میں بات کرنے کی جرأت مت کرنا۔" ایس پی سراج نے خطرناک آواز بنا کے کہا۔
"گلا دبوچ لو میرا..." پیڈرو کی گھٹی گھٹی آواز آئی۔
"سراج! یہ کیا کر رہے ہو تم؟" دلاور نے کہا۔ "چھوڑو اسے۔"
"اس دو ٹکے کے بدمعاش کو سمجھا دو کہ یہ اپنی اوقات میں رہے اور یہ نہ بھولے کہ میں ایس پی ہوں۔" سراج نے کہا۔ "اگر کسی نے اس کا باپ کہلانا قبول نہیں کیا تو یہ میرا قصور نہیں ہے۔"
"لیکن تمہیں بھی وہ بات نہیں کرنا چاہیے جو یہ برداشت نہیں کر سکتا۔" پیڈرو نے جھٹکا کھاتے ہوئے کہا۔
"کانے کو کانا کہو تو وہ بھی برداشت نہیں کرتا۔ جس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہوں وہ نوٹس ہی نہیں لیتا۔" سراج بولا۔ "میرا تو ایک آنکھ کا قصور ہے... میرا نہیں..."
"بہت ہو گئی سراج۔" دلاور نے غرا کے کہا۔ "تم نے تو آتے ہی فساد پھیلا دیا۔ یہاں تم ایس پی نہیں ہو... یہ بات بھی کہ تم بھی ہم میں سے ایک ہو۔ ہم تمہیں سیلوٹ نہیں کرتے... وہ جانتے افسر ہو اور یہ تھانہ نہیں ہے۔"
"چلو بات ختم ہوئی۔" نواب خسرو جمشید سب سے کم بولنے والا آدمی تھا۔ اس نے بروقت مداخلت کی۔
"یہ عورت کون ہے؟" سراج نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کہا اور میں نے تصور کیا کہ وہ مظلوم بن کر روتی ہوئی نازو کا جائزہ لیتا ہوا نظر سے گھور رہا ہوگا۔
"یہ اس گھر کی نئی ملازمہ ہے..." پیڈرو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "خود کو لاوارث اور مظلوم کہتی ہے۔ اس سے زیادہ اپنا کچھ نہیں بتا سکتی کہ اس کے دو بیٹے تھے جو مر گئے اور اب اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔"
"اس طرح کسی بھی اجنبی پر اعتبار کر لینا حماقت ہے۔" سراج

"یہی میں نے بھی کہا تھا۔" پیڈرو بولا۔ "مگر سلیم کے گھر میں سب ہی اس کو بھروسے کے قابل سمجھتے ہیں۔ سب مطمئن ہیں کہ یہ بے ضرر ہے۔ ہمارے چوہدری صاحب کو اس مکار عورت نے اپنی اداکاری سے موم کر لیا ہے۔"
"یہ میں کیا سن رہا ہوں دلاور... کیا تم کسی تفتیش کے بغیر ہی مطمئن ہو گئے؟" سراج بولا۔
"تو کیا تفتیش کر رہے تھے تم؟" دلاور نے کہا۔ جھنجھلاہٹ اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسے منظور نہیں مگر وہ سب کو روکنے سے بھی قاصر تھا۔
"ایس پی صاحب! میں کہتا ہوں کیا یہ اداکاری نہیں ہو سکتی؟ اس کا رونا دھونا اور مکر۔" پیڈرو کا حوصلہ بڑھ گیا۔ "کیا اس کی صورت پر میک اپ کا جھوٹا نقاب نہیں ہو سکتا؟ لیکن ہمارے چوہدری صاحب کا دل بہت نرم ہے نا۔ اس بات سے پگھل گیا کہ اس کے ایک بیٹے کو بس نے کچل دیا تھا اور دوسرا نکل جانے والا چوہدری صاحب جیسا تھا۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "اتنی آسانی سے... آواز بھی ایسی ہی تھی اس کی... اور کمال یہ ہے کہ اس کا نام جاوید تھا۔ دلاور اور جاوید میں کیا فرق ہے۔ وہ جنگ میں مارا گیا تھا۔ اس نے پوچھ لیا کہ تم وہی تو نہیں ہو اور چوہدری صاحب جذبات کی رو میں بہہ گئے۔"
ذرا سی دیر میں صورت حال بدل گئی تھی۔ جب سراج آیا تھا تو اس نے پیڈرو کا گلا دبوچ لیا تھا اور اسے دلاور نے چھڑایا تھا۔ دو منٹ بعد وہ سراج کی حمایت میں اور دلاور کی مخالفت میں بول رہا تھا۔ دلاور یقیناً اندر ہی اندر کھول رہا ہوگا کہ پیڈرو اس وقت صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔
"فضول باتیں مت کرو۔" دلاور نے غرا کے کہا۔ "میں جذبات سے نہیں عقل سے سوچنے والا آدمی ہوں۔"
"پھر تم تفتیش کی مخالفت کیوں کرتے ہو؟"
"تفتیش کرو۔ مگر دیکھو کہ یہ ایک بوڑھی اور کمزور عورت ہے۔" دلاور نے گویا صاف جواب دیا۔ "جسمانی تشدد سے کیا فائدہ؟"
سراج نے قہقہہ مارا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ ہم سوال کریں۔ یہ جواب دے اور ہم مان لیں۔ کیا اس طرح کوئی سچ بولتا ہے؟"
"اصل بات وہی ہے سراج۔" نواب خسرو جمشید نے کہا۔ "اس نے دلاور سے پوچھا تھا کہ تم میرے گمشدہ بیٹے تو نہیں ہو؟ اب یہ اتفاق ہے یا اس عورت کی چالاکی کہ اس نے جو نام بتایا وہ دلاور نہیں تھا جاوید تھا۔ اور دلاور کے ایک بھائی کا نام جاوید تھا جو بچپن میں ہی گم ہو گیا تھا۔"
اس بات نے جتنا مجھے حیران کیا تھا اتنا ہی دوسروں کو بھی ہوگا کیونکہ اس کے بعد خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا۔ پھر دلاور کی آواز آئی۔
"کیا یہ ٹھیک ہے اپنے چوہدری دلاور صاحب؟"
"یہ ٹھیک ہے۔" دلاور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
"تم نے پہلے کبھی بتایا نہیں!" سراج بولا۔
"یہ میری پرائیویٹ لائف ہے۔ تم سے میرا صرف کاروباری رشتہ ہے۔" دلاور ایک دم بھڑک گیا۔ "ضروری نہیں کہ میں اپنے خاندانی معاملات اور خاندانی تاریخ پہ بھی تم سے بات کروں۔"
"یہ تم نے ہی خسرو جمشید کو بتایا ہوگا؟"
"میں دلاور کو بہت پہلے سے جانتا ہوں۔" خسرو جمشید نے اطمینان سے کہا۔ "اور میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ اس کی ماں..."
"جمشید!" دلاور نے دہاڑ کر کہا۔ "بند کرو اپنی بکواس۔"
"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ ایک سبب بتا رہا ہوں تمہارے مذہب کا اور تمہاری نفسیاتی کمزوری کا۔" خسرو جمشید نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ "کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اس صدمے سے تمہاری ماں کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو شاید میرا رد عمل بھی مختلف ہوتا۔"
"میں... میں مانتا ہوں کہ اس صدمے نے میری ماں کی جان لے لی تھی اور اس کے بعد میں دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔ ایک سال کے وقفے سے میرا بھائی گیا اور پھر میری ماں گئی۔" دلاور نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور بالآخر باپ بھی گیا۔ کیونکہ اس نے دوسری شادی کر لی تھی... وہ میرا باپ نہیں رہا تھا۔ آخر میں میرا گھر بھی گیا کیونکہ وہ میرا گھر نہیں رہا تھا... بس جمشید... خود میں نے سب بتا دیا ہے کہ تم میری ذات کو بے نقاب کرنے کا اعزاز حاصل نہ کر سکو۔ کوئی دعا کا کرنے کی سنسنی خیز خوشی نہ لے سکیں۔ تم مجھے جذباتی طور پر بلیک میل نہ کر سکو۔ کوئی آئندہ اگرا آج تک مجھے بلیک میل نہیں کر سکا۔ جس نے یہ کوشش کی وہ زندہ نہ رہا۔" اس کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی چلی گئی تھی۔
"آئی ایم سوری دلاور... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"
"میں تمہیں بھی سمجھتا ہوں اور تمہارے مطلب کو بھی..." دلاور نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم نے سمجھا تھا دلاور کمزور پڑ گیا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ ذلیل کرو دلاور کو اس بہانے۔ مگر ایسا نہیں ہوگا جمشید... تم اس عورت کے ساتھ جو چاہو کرو... ایس پی صاحب آ گئے ہیں اب تو... یہ تفتیش کے ماہر ہیں... اگر میری ماں ہوتی... میری اصلی ماں... تب بھی میں یہ اذیت جھیل جاتا لیکن ڈرو اس وقت سے جمشید... تم پیڈرو... اور تم سراج... جب وقت ہماری جگہ بدل دے گا۔ تم خود کو وہاں پاؤ گے جہاں اس وقت یہ ہے اور میں تمہاری جگہ ہوں گا۔ تم بھی آدمی ہو... پتھر کی دیوار یا بجلی کے کھمبے نہیں ہو۔ تمہاری جذباتی کمزوری کبھی نہ کبھی سامنے آئے گی تو ظاہر ہو گی۔" وہ یکلخت چپ ہو گیا۔
میرا خون خشک ہونے لگا۔ اپنے دل کی سرزمین پہ قدم

www.paksociety.com

دیکھتے ہی میں نے ایک رات تھانے میں سراج کے ہاتھوں جو ذہنی اور جسمانی اذیت برداشت کی تھی اس کے تصور سے آج بھی میری روح کانپتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے موت کے بچھو کا ڈنک میرے رگوں میں اتر گیا ہے اور تکلیف سے میرا وجود مفلوج ہونے لگا ہے۔ کیا وہ سب کچھ نازو کے ساتھ ہو گا؟ سراج اپنے اسی غیر انسانی طریقے پر نازو سے تفتیش کرے گا اور... نہیں... اس سے آگے سوچنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میرا ذہن سوچ کے اس خلا سے ایک جست میں آگے نکل جاتا تھا اور قطعی فیصلے پر پہنچ جاتا تھا۔ اگر سراج نے نازو پر تشدد کے شیطانی اور ننگ انسانیت طریقے آزمائے تو میں انتظار نہیں کروں گا۔ میں غالب اور محسن اور ٹیڈی کے ساتھ اندر پہنچ جاؤں گا۔ پھر جو ہو سو ہو۔ غنیمت تھا کہ ساری گفتگو ابھی ٹیڈی سن رہا تھا یا میں۔ غالب اور محسن کو گفتگو کا ٹیپ بعد میں سننا تھا۔

"یار سکندر بادشاہ..." استاد ٹیڈی کی آواز آئی "قسم مولا علی کی اگر ان لوگوں نے..."

"بالکل ٹھیک ہے استاد... میں بھی یہی فیصلہ کر چکا تھا۔" میں نے کہا۔

"کیا فیصلہ کر چکے تھے؟" میری بات نے ٹیڈی کو حیران کیا۔

"جو تم کر چکے ہو۔ ہم کوٹھی کے گھر پر دھاوا بول دیں گے اور نازو کو نکال لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"ہمارے پاس صرف ریوالور ہیں... مگر کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔

"اللہ مسبب الاسباب ہے۔" میں نے کہا۔ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی مجھے مہلت نہ ملی۔

"میرا خیال ہے کہ فضول اختلافات اور بے مقصد باتوں میں ہم نے بہت وقت ضائع کر دیا ہے۔" سراج نے کہا۔ "تم سب کو معلوم ہو گا کہ آج کسی نے میرے گھر کو بم سے اڑا دیا۔ خدا کا شکر ہے میری ماں بچ گئی۔"

"حشمت خان بھی مارا گیا۔" ملاور بولا۔ "اور گلوب سینما والا گھر بھی تباہ ہو گیا۔"

"لیکن تمہارا گھر بچ گیا۔" سراج نے طنزیہ اور تلخ لہجے میں کہا۔

"میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔" ملاور نے احتجاج کیا۔ "میں نے جو تدبیر بھی اٹھایا تھا اس میں تم سب کا مشورہ شامل تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ پیڈرو نے بھی دیکھا خسرو جمشید نے بھی دیکھا۔ کیا میری جگہ یہ لوگ کچھ کر سکتے تھے؟"

"تم ہم سب کو کس کے سامنے کہہ رہے ہو؟" پیڈرو بولا۔ "اس عورت کے سامنے جس کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے کہ یہ دوست ہے یا دشمن۔"

"یہ ابھی معلوم ہو جائے گا۔" ایس پی نے کہا۔ "سلیم تم گھر میں سے

ایک رسی لاؤ۔ تھوڑا سا تیل اور پسی ہوئی لال مرچیں اور پٹرول بھی... اس کے کپڑے اتار دو۔" نازو نے ایک چیخ ماری۔

"میں زخمی ہوں۔" پیڈرو بولا۔

"اچھا بیٹھو، یہ کام تم کر سکتے ہو۔" سراج نے جواب دیا۔ "جب رسی آ جائے تو اس کو الٹا لٹکا دو۔ پیر باندھ کر ... بھی پیچھے کمر کی طرف کر کے باندھ دو اور منہ میں کپڑا ٹھونس دو۔"

"ماں جی... ماں جی! مجھے بچاؤ۔" نازو نے چیختے ہوئے... "مجھے ان شیطانوں سے بچاؤ۔"

"بس... جو مختصر جواب دے گیا ابھی سے۔" سراج غصیلے لہجے ... پر ہنسا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" سراج نے غرا کر کہا۔

"دروازہ کھولو... یہ کیا ہو رہا ہے اندر؟" کسی عورت نے دروازہ پیٹتے ہوئے کہا۔ نازو نے اور زور سے چلانا شروع کیا۔

"سلیم... اپنی ماں سے کہو واپس چلی جائے۔" سراج نے ...

"دروازہ کھولو نہیں تو میں دروازہ توڑ دوں گی۔" سلیم کی ماں کی آواز آئی جو دروازہ بند ہونے کی وجہ سے کچھ دبی دبی ... ہو رہی تھی۔ "کھولو دروازہ، نہیں تو میں سارا محلہ اکٹھا کر لوں گی۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس عورت کی مداخلت نے نازو کو بچا لیا تھا۔ ان میں سے کسی نے مجبوراً کنڈی کھول دی۔

"آخر کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اسی عورت کی آواز ... "دیکھو یہ چیخ رہی تھی کون ہے؟"

"ماں جی...... مجھے بچاؤ... مجھے ..." نازو نے چلانا شروع کیا۔ "یہ ظالم شیطان مجھے بے عزت کر رہے تھے..."

"کیا... کیا تم سب پاگل ہو گئے ہو؟" بوڑھی عورت چیخی۔ "تم بھی سلیم... اور تم پیڈرو... یہ بوڑھی عورت ہے؟"

"تم کو کچھ معلوم نہیں امی۔" سلیم بولا۔ "تم اندر جاؤ۔"

"لیکن تم اس کو یہیں چھوڑ جاؤ۔" سراج نے کہا۔

"اپنا ہاتھ پیچھے کر لیجیے... کون ہے تو میرے گھر میں حکم چلانے والا اور لوگوں پر ہاتھ ڈالنے والا؟" وہ چلا کے بولی۔

"امی... اندر جاؤ ورنہ..." پیڈرو نے زیادہ سخت لہجے میں کہا۔

"ورنہ کیا؟... بول... مجھے بھی بے عزت کرے گا۔" وہ دیوانہ وار چیخنے لگی۔ "بے غیرت... بے حیا... کون ... میں نے کبھی نہیں پوچھا کہ تم لوگ اندر گھس کے دروازہ بند کر کے کیا کرتے ہو مگر آج تم میرے گھر کا ... غریب بے سہارا اور مظلوم عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہو؟ خداوند یسوع مسیح کی قسم... میں اپنی جان دے دوں گی... ایسا اپنے گھر میں نہیں ہونے دوں گی۔ دو مست ...

... ساتھ... میں دیکھتی ہوں میرا راستہ کون روکتا ہے..."

... چند منٹ بعد دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی۔

"... کچھ نہیں ہوا..." ملاور نے بہت دیر بعد کہا۔ "ایک ... جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے۔"

"اس عورت سے بعد میں نمٹ لیں گے۔" سراج نے کہا۔

"... ابھی سے آیا ایس پی صاحب۔" ملاور ... "جب سارا خرابا ہو چکی۔ تم لوگ یہ کبھی نہیں ... کہ ایک پولیس افسر کا منصب ... کے چوبیس گھنٹے ... خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔"

... سے ان کے درمیان ایک گرما گرم بحث کا آغاز ہوا۔

... سب سے زیادہ طاقتور لوگ تھے۔ ثانوی حیثیت ... جمشید کی تھی۔ حیثیت کا یہ تعلق کسی چارٹر یا بائی لاز ... نہیں ہوا تھا بلکہ حقیقتاً وقت کے ساتھ ساتھ کوئی ... گیا تھا اور حکم چلنے لگا تھا تو دوسرے اس کا حکم ماننے لگے ... سب سے زیادہ دولت مند، عیار اور ذہین۔ بالآخر اور ... اس نے سرغنہ کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس کے کاروبار سے ... بڑھ چڑھ تھا اور اس نے ناجائز کاروبار کو ایک جائز ... لکھنے والا نام دے رکھا تھا۔ ایم ڈی نیو ویو انجینئرنگ کمپلیکس ... خوش قسمتی سے سونا بنانے کا یہ کاروبار شروع ہی نہ ہوتا۔ ... اس کاروبار کا محافظ تھا اور اپنے تمام قانونی اختیارات کے ... غیر قانونی دھندے کو چھپانے والوں پر آنچ نہیں آنے دیتا تھا۔ چنانچہ وہ خود کو ملاور سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایک ... کا ڈرائیور تھا تو دوسرا گارڈ... پیڈرو خود کو انجن سمجھتا ... کو کھینچتا تھا اور یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ اس ... نہیں چل سکتی مگر یہ بھی جانتا تھا کہ انجن خود نہیں چلتا۔ ... ڈرائیور کے ہاتھوں کے کنٹرول میں رہتا ہے۔ وہ اسے ... چاہے روک دے اور اگر چاہے تو پٹری سے بھی اتار دے... چنانچہ ... اس کا وجود ناچیز ... ہوتا اسے بہت کھلتا تھا۔ خسرو جمشید ... نے کچھ بچوں کا دیا تھا۔ وہ ملاور کے کاروبار میں برابر کا شریک ... تھا اور ... اس کاروبار میں سرمائے کی برابری کی ... تھی۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ چودھری ملاور اور خسرو جمشید ... کے ساتھی ہیں۔ وہ بچپن کے دوست یا کلاس فیلو وغیرہ ... خسرو جمشید اس کا حوالہ ... دیتا۔ لیکن اس نے ... وہ ملاور کو ہمیشہ بچپن سے جانتا ہے کیا وہ پہلے بھی ... کاروبار میں شریک رہے تھے؟ میں نے سوچا کسی وجہ ... وہ دھندا ختم کرتا چلا گیا لیکن ملاور نے نیا دھندا شروع کیا ... شامل ہو گیا۔ وہ زبردستی بھی شامل ہو سکتا تھا کیونکہ وہ ... سے پرانے معاملات سے واقف تھا۔ "محض پرانا ... ہوا تھا۔ وہ ملاور کو بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں تھا

چنانچہ ملاور نے اسے بھی ایک ورکنگ پارٹنر بنا لیا تھا تاہم کنٹرول بدستور ملاور کے ہاتھ میں تھا اور خسرو جمشید بھی اپنی حیثیت کو ملاور سے کمتر تسلیم کر کے خوش نہیں تھا۔ ڈاکٹر فیضی چار بڑوں کے بعد آتا تھا۔ وہ مجلس کا رکن تھا لیکن عام کارکن نہیں تھا۔ نازی، مٹھو اور گلانی بھی مارے جا چکے تھے، وہ بھی ایسے ہی کارکن تھے جو بہت اہم اور قابل اعتماد سمجھے جاتے تھے۔ اس کے بعد ایسے کارکن تھے جو خریدے جا سکتے تھے، ختم کیے جا سکتے تھے، بدلے جا سکتے تھے اور ضائع ہو جائیں تو بھلائے جا سکتے تھے۔ اہمیت کے اعتبار سے اس شکاری ٹولے میں سب سے اوپر ملاور تھا... پھر سراج... اس کے بعد خسرو جمشید اور آخر میں استاد پیڈرو... ڈاکٹر فیضی کے تین افراد اس کے بعد تھے۔

آج وہ سب بے حد مشتعل تھے۔ رابعہ اور شملہ کو یرغمال بنا کر مجھے بلانے کی اسکیم ان سب نے مل کر بنائی تھی اور اس کا مقصد میرے جرائم کا اندازہ کرنا اور مجھے منہ مانگی قیمت دے کر راہ سے گزارا کرنا تھا مگر یہ کوشش ناکام رہی تھی اور اس کے نقصانات بہت زیادہ ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے سوچا تک نہ ہو گا کہ میں یوں بے خوف و خطر ان کے ناقابل شکست حصار میں داخل ہو جاؤں گا اور پھر اتنی آسانی سے دندناتا ہوا نکل جاؤں گا۔ ان کی ساری طاقت مجھے نہ روک سکے گی اور ان کی فتح ایسی ذلت آمیز شکست میں تبدیل ہو جائے گی۔ وہ سب ایک دوسرے کو الزام دیتے تھے حالانکہ نقصان کے ذمے دار سب ایک جیسے تھے۔ ملاور پر سب کا غصہ یوں تھا کہ اس کا گھر بچ گیا تھا۔ اس نے پانچ منٹ پہلے بم کو ڈھونڈ نکالا تھا اور گھر سے دور ایک کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا۔ اس کے پھٹنے سے ایک ٹیلی فون کا کھمبا گر گیا تھا اور ایک گھر کی بیرونی دیوار کا کچھ حصہ۔ لیکن کسی کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ یہ بم وہاں کس نے رکھا تھا اور کیوں رکھا تھا۔ سراج کی کوٹھی کا نصف حصہ تو کھنڈر بن گیا تھا۔ باقی نصف میں بھی دراڑیں پڑ گئی تھیں اور اس کے کہنے کے مطابق سامان کے ساتھ ہونے والے نقصان کی مالیت چار لاکھ سے اوپر تھی۔ مٹی سلوا کی کوٹھی کسی کی ذاتی ملکیت نہیں رہی تھی۔ مٹی سلوا کا کوئی وارث ہوتا تو اس کا مالک بنتا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں وہ اکیلا تھا۔ اس کوٹھی میں دو ملازم مارے گئے تھے۔ کسی کو ان کی زندگی کے ضائع ہونے کا صدمہ نہیں تھا۔ گفتگو کے دوران میں البتہ سب نے بار بار مال کے ضائع ہونے پر افسوس کا اظہار کیا تاہم یہ واضح نہ ہو سکا کہ وہ مال کیا تھا۔ اگر وہاں بھی اسلحے کا گودام ہوتا تو ایک ٹائم بم سے ... سلسلہ

شروع ہو جاتا یعنی ایک سے دوسرا بم پھٹتا۔ گولہ بارود میں آگ لگتی اور وہ دھماکا ارد گرد کے سارے علاقے کو ہلا دیتا۔ پاس پڑوس کے گھر اور دکانیں تباہ کر دیتا اور وہ صرف ایک دھماکا نہ ہوتا۔ دھماکوں کا سلسلہ ہوتا۔

www.paksociety.com

حشمت خان مجبور بھی نہ تھا کہ اپنے نقصان کو روتا۔ کسی سے اس کا تذکرہ کیا بھی تو سرسری انداز میں۔ اتفاق دارلے سے انھوں نے سراج کے نقصان کو سب سے زیادہ اور دقاقی تسلیم کیا اور اسے تسلی دی کہ چار پانچ لاکھ کا ازالہ بہت جلد کر دیا جائے گا۔ فی الحال وہ کسی کرائے کے مکان میں منتقل ہو جائے یا دوسرا مکان خرید لے۔

"مکان تو میں خرید لوں گا۔" سراج نے کہا۔ "لیکن میرے حلقے میں اور پبلک کے سامنے میری پوزیشن بہت خراب ہوگی۔ کل سارے اخباروں میں آ جائے گا کہ ایس پی کے گھر میں بم کا دھماکا!"

"یہ تو حشمت خان کے بارے میں بھی آئے گا۔"

"حشمت خان گیا جہنم میں۔ اسے اب خدا کے سوا کس کو منہ دکھانا ہے۔" سراج عالم اشتعال میں بولا۔

"خدا کو منہ دکھانے کے قابل وہ پہلے ہی نہیں تھا۔" خسرو جمشید بولا۔

"تم ان اخبار والوں کو نہیں جانتے۔" سراج بولا۔ "یہ بال کی کھال نکالتے ہیں اور کوڑی سے کوڑی ملاتے ہیں۔ صفحۂ قیامت پہ سنسنی خیز سرخیاں لگاتے ہیں اور نام لکھتے ہیں۔ یہ معلوم کر لیں گے کہ میری پوسٹنگ کہاں ہے اور پھر کوئی جیسے ایسا شوشہ چھوڑے گا کہ خود تو گرفت میں آئے گا نہیں مگر پبلک پر واضح کر دے گا کہ یہ بارڈر پر اسمگلنگ کرنے والوں کی کارروائی ہو سکتی ہے اور ممکن ہے یہ سودے بازی میں اختلافات پر رنجش کا نتیجہ ہو۔ وہ اس کو حشمت خان کے گھر کی تباہی سے اور حشمت خان کی ہلاکت سے ملا دیں گے اور پھر کوئی اسٹوری بنا لیں گے کہ وہ انسپکٹر پولیس اور میں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ مل کر کوئی غلط کام کرتے تھے اور غلط کام کا انجام تو غلط ہونا ہی تھا وغیرہ وغیرہ۔"

"جھوٹ لکھنے پر تم ان کے خلاف کارروائی کر سکتے ہو؟" پیڈرو بولا۔

"عدالتی کارروائی کیا آسان کام ہے؟" سراج تلخی سے بولا۔ "اور پھر ان اخبار والوں کے خلاف... یہ تو لکھ دیتے ہیں۔ مبینہ طور پر... یا پھر... کہا جاتا ہے... اب کس نے کہا اور انھوں نے کس سے سنا، معتبر ذرائع کیا تھے... یہ سب گول مول ہوتا ہے... ان کے جھوٹ کو کبھی جھوٹ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ان آدمی دلدل میں اتر جاتا ہے۔ وہ گڑے مردے اکھاڑنے پر آ جاتے ہیں۔ سب مل کر محاذ قائم کر لیں تو افسرانِ بالا تک پریشان ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ یہی بہتر سمجھتے ہیں کہ جھوٹ کو سچ مان کے جان چھڑائی جائے۔ جس کے خلاف طوفان کھڑا کیا گیا ہے اسے ٹرانسفر یا وقتی طور پر معطل کر دیا جائے۔ بیان دے دیا جائے کہ تحقیقات کی جا رہی ہیں۔ اس طرح معاملہ دب جاتا ہے اور چند دن میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن پریشانی تو ہوتی ہے نا۔"

"تم اپنا دوسرا گھر خفیہ رکھنا۔" خسرو جمشید نے مشورہ دیا۔

"مجھے تو اندیشہ ہے کہ اب ہم کچھ بھی تحقیق نہیں کر سکیں گے۔" سراج نے کہا۔ "آخر یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ کرپال والا [illegible] ہم نے کتنا محفوظ سمجھ رکھا تھا۔ وہ کیسے تباہ ہو گیا۔ سیوک رام [illegible] کرنل جگی ناتھ سب کیسے مارے گئے؟"

"میں سمجھتا ہوں وہ بھی ایسی ہی غلطی تھی۔" خسرو جمشید [illegible] "اس وقت رابعہ نام کی اس ایڈووکیٹ کو اور اس لڑکی [illegible] کیا گیا تھا۔"

"کون نازلی... وہ انسپکٹر شیخ کی بہن؟" سراج بولا۔

"ہاں۔ اب تو خیر وہ استعفیٰ دے کر غائب ہو گیا [illegible]" جمشید نے کہا۔ "مگر سکندر بخت کا وہ انتقامی ردِعمل بھی ایسے اقدام کا نتیجہ تھا۔ بہتر ہوگا اگر ہم عورتوں کو بیچ میں نہ لائیں [illegible] کو دیوانگی کی حد تک چاہتا ہے اور اس کی خاطر ساری دنیا [illegible] کر سکتا ہے۔ خواہ دنیا کے ساتھ وہ خود بھی تباہ ہو جائے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" پیڈرو بولا۔ "آج وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر وہاں گھس آیا تھا جہاں سے وہ واپسی کی امید نہیں رکھ سکتا تھا مگر دیکھو وہ کتنی تباہی پھیلا کے دونوں لڑکیوں کو لے گیا۔"

"[illegible] ہم تو جیسے ہی ہیں... بلکہ وہی رہیں..."

"ہاں۔ اس نے سامنے پارٹر والے کے مزار سے لوہا اٹھا لیا ہوگا اور بکس میں بارود بم تھے۔" ولاور نے کہا۔ "اگر ہم بھی اس کے پاس ہونے چاہئیں۔"

"ضرور ہوں گے۔ شاید اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو۔" پیڈرو بولا۔ "جو اس نے کرپال والا کے اڈے سے اٹھایا ہو۔"

"اگر ہم نے رابعہ کو اغوا نہ کیا ہوتا تو وہ سیوک رام تک نہ پہنچتا۔ سیوک رام کے ذریعے ہی اسے کرپال والا کا ٹھکانہ [illegible] اس نے سب تباہ کر دیا۔" پیڈرو نے کہا۔ "[illegible] بھی اسی میں مارا گیا تھا۔"

"سیوک رام اور جگی ناتھ کو اس نے دشمن کا [illegible] کے مار دیا اور ان کے سلسلے کے ذخیرے کو بھی تباہ کر دیا لیکن یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسے ہم پر بھی شبہ ہے؟" سراج نے کہا۔ "اور اس کے ساتھی یہ جانتے ہیں کہ سیوک رام اور جگی ناتھ کو اسلحہ کون فراہم کرتا ہے؟"

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" ولاور بولا۔ "[illegible] ہے سیوک رام نے اسے بتا دیا ہو۔ تشدد سے ہی انھوں نے [illegible] والی کا پتا معلوم کیا ہوگا۔ اب یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے صرف [illegible] کے بارے میں پوچھا ہو کہ وہ کہاں ہے اور سیوک رام اسے لے جانے پر مجبور ہو گیا ہو۔ سیوک رام اپنی بیوی کو ختم [illegible] وہ کچھ نہ بتا سکے۔ ایسے شخص سے یہ امید کم ہی ہے کہ [illegible] بتانے میں کچھ ٹالا ہو۔ اس کو یہ ڈر بھی ہوگا کہ راز نہ بتانے [illegible] وہ زندہ نہ رہ سکے گا۔ مگر سیوک رام کا کوئی [illegible] معلوم ہو جاتا کہ وہ تشدد سے ہلاک ہوا تھا یا [illegible] خود کشی کر لی تھی۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھاگ گیا ہو۔" سراج بولا۔

"ہاں۔ اس کا امکان زیادہ ہے۔" ولاور نے تسلیم کیا۔ "میرا خیال ہے کہ جب وہ سکندر کے ہتھے چڑھا تو سکندر نے اس سے رابعہ کے بارے میں پوچھا۔ وہ رابعہ کے بارے میں بتانے پر مجبور ہو گیا اور [illegible] کے مزار تک لے گیا۔ تاہم وہ جانتا تھا کہ [illegible] پہنچنے کے بعد سکندر کو اور بھی بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔ [illegible] پہنچنے سے پہلے اس نے جان بچا کے نکل جانے کا انتظام کر لیا۔ [illegible] سکندر کو رابعہ مل تو درمیان میں کسی وقت سیوک رام کو [illegible] کا موقع مل گیا۔ وہ سرحد پار چلا گیا ہوگا۔ سکندر بخت اور اس کے ساتھیوں نے تہ خانہ وغیرہ بعد میں دیکھا ہوگا مگر اس وقت تک سیوک رام نکل گیا تھا۔ چھپا کچھ لے جانے [illegible] میں [illegible] کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔"

"میں تمھارے خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا ولاور۔ میرا خیال ہے کہ سیوک رام نے سب بتا دیا ہوگا۔ وہ انہی کے ہاتھوں مارا گیا اور انھوں نے لاش کہیں پھینک دی۔" سراج بولا۔

"اگر اس کو اتنا معلوم ہوتا تو کیا وہ یہاں تک پہنچ جاتا؟" ولاور نے کہا۔ "مجھ سے گفتگو کے دوران میں بھی اس کی باتوں سے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اسے اسلحے کے کاروبار کی نوعیت معلوم ہے [illegible] وہ بہت ذہین اور چالاک انگریز ہے۔ مجھ سے تو وہ منشیات کی بات ہی کرتا رہا۔"

"گویا اب تک اسے علم نہیں کہ ہم منشیات فروش نہیں ہیں۔" اب خسرو جمشید نے کہا۔ "یہ بات عقل تسلیم نہیں کرتی ولاور۔"

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اداکاری کو سمجھ نہ سکوں۔" ولاور نے کہا۔ "اور میں نے اپنی عقل کے مطابق اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ [illegible] اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ تم نے اسپتال میں اس انسپکٹر [illegible] دیکھا تھا؟ وہ صرف رابعہ کے لیے فکرمند تھا اور رابعہ کو لے [illegible] کے بعد سب حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ [illegible] کے ہینڈل میں ائیرو فون چھپایا گیا ہے؟"

"کیا تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو؟" سلیم نے برہمی سے کہا۔

"بچوں کی طرح داڑھی کے تنکے پر ہاتھ مت ڈالو۔" ولاور بولا۔ "میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اس نے اپنی ذہانت سے سب معلوم کیا۔ تمھاری آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گیا... ڈاکٹر [illegible] میں آخر کیا ہوا تھا۔ وہ صرف رابعہ کی خاطر جا رہا تھا۔ [illegible] اس نے پاگل کر رکھا تھا۔ رابعہ کا مسئلہ ہو تو وہ خود کو بھول جاتا ہے۔ [illegible] وہ جہاں بھی ہتھیلی پر سر رکھ کے گیا ہے [illegible] سمجھتا ہے۔ اگر اس کو شبہ ہوتا کہ اس کارخانے میں اسلحہ بن رہا ہے تو وہ چار ٹن بم لگا کے کارخانہ اڑا چکا ہوتا۔ اس نے ابھی تک براہِ راست کارخانے پر حملہ نہیں کیا۔ آخر کیوں؟ اگر وہ جانتا ہے کہ اسلحے کی ترسیل اسی جگہ سے ہوتی ہے تو اس جگہ کو وہ کیوں چھوڑے ہوئے ہے؟ ادھر ادھر کیوں بھٹکتا پھر رہا ہے؟"

"تمھاری اس بات میں وزن ہے۔" سراج نے کہا۔

ان کی بات خاصی اطمینان بخش اور حوصلہ افزا تھی۔ وہ ابھی تک ہمارے عزائم کا صحیح اندازہ نہیں کر پائے تھے اور ہمارے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ جس اپنی تباہی کا ذمہ دار سمجھیں۔ ان کی عقل میں یہ نہ آیا کہ ہم ان کے ملک دشمن ساتھیوں سے اور ان کے ممنوعہ کاروبار کی اصل نوعیت سے واقف ہو چکے ہیں۔ ہم نے ابھی تک انھیں اپنے بارے میں غلط تاثر دینے کی جو کوشش کی تھی وہ کامیاب رہی تھی۔ ولاور اور پیڈرو کا خیال اب بھی یہی تھا کہ میں اپنے باپ کے قاتلوں کا دشمن ہوں۔ اس کو ذلیل حالی اور کسمپرسی کے عالم میں زندہ درگور رکھنے والوں کا دشمن ہوں۔ اس کی تمام عمر کی محنت کی کمائی پر غاصبانہ قبضہ کرنے والوں کا دشمن ہوں اور ان سب کا دشمن ہوں جنھوں نے مجھے مصائب کی دلدل میں گرفتار کر کے بلیک میل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور مجھے میرے حق سے محروم رکھنے کے لیے اپنے اثر و رسوخ کا ہر حربہ آزمایا۔ ان کے یقین کے مطابق میں جو کچھ کر رہا تھا اپنے ذاتی دشمنوں کے علاوہ منشیات کے اسمگلروں کے خلاف تھا۔

ان کی گفتگو سے میں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ وہ اسلحے کے ذخائر کی تباہی اور اپنے ایجنٹوں کی موت پر سخت تشویش میں مبتلا ہیں کہ یہ خفیہ پولیس کی کارروائی تھی یا [illegible] کی۔ ولاور نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ ملک میں [illegible] کوئی ایسا سرفروشوں کا گروہ برسرِ پیکار ہو جسے اپنے ذرائع سے وطن کی سرزمین پر غداروں کی موجودگی کا پتا چل گیا ہو [illegible] خیال کو اکثریت نے مسترد کر دیا۔ سب نے یہی کہا کہ یہاں کسی زیرِ زمین [illegible] تنظیم یا جانبازوں کی تنظیم کے اس حد تک منظم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ابھی تک اس قوم میں اتحاد، یقین محکم اور تنظیم کے اصولوں پر عمل کرنے کی صلاحیت صرف تقریروں تک محدود ہے یا ان زریں اقوال کا تذکرہ صرف کتابوں میں ملتا ہے۔ یہاں یہ ناممکن ہے کہ کوئی تنظیم بنے جو پی ایل او کی طرح قوت رکھتی ہو، مؤثر ہو اور باعمل ہو۔ وہ فرمودۂ اقبال سے بے خبر تھے کہ: ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔ ایم آر ایس کے نام سے سرفروشوں کی ایک بہت چھوٹی سی تنظیم وجود میں آ چکی تھی مگر چھوٹی ہونے کے باوجود اس تنظیم کے پاس یقین محکم اور اتحاد کی وہ طاقت تھی کہ اس کے عزائم بہت بڑے تھے اور ان کے حوصلے ہمالہ کی بلند ترین چوٹی سے بھی بلند تر اور ناقابل

www.paksociety.com

شکست دے۔ انھیں کہاں علم تھا کہ ستاروں پر کمند ڈالنے والے جوانوں کے ساتھ اس سرزمین پر لیلیٰ اور شازیہ جیسی مادرِ وطن کی قابلِ فخر بیٹیاں بھی ہیں جو اپنے جسم کے ہر قطرۂ خون سے اس مٹی کے ہر ذرے کو سرخرو کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔

میں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔ میں نے دور سے محسن کو اشارہ کیا اور وہ چائے کے چنڈو خانے کی محفل سے اٹھ گیا۔ معلوم نہیں اس نے حاضرین و ناظرین پاکستان سے کس اخلاقی مسئلے پہ اشتعال انگیز بحث شروع کر رکھی تھی کہ وہ آیا تو لال پیلا ہو رہا تھا۔

"اچھا ہوا کہ تو نے بلا لیا۔" وہ بولا "ورنہ ایک آدھ میرے ہاتھوں چھٹی ہو جاتا یا وہ سب مل کر میرا آملیٹ بنا دیتے۔"

"جھگڑا کس بات کا تھا؟" میں نے کہا۔

"ابے یار! میں یوگنڈا کا ذکر کر رہا تھا کہ وہاں کے جنگلات سے صورت میں شتر مرغ سے ملتے ہیں کہ ایک شخص کہنے لگا تم کہتے ہو میں سات سال افریقہ میں رہ چکا ہوں۔ میں نے کہا کہ تم کہتے ہو تم نے شتر مرغ تو کیا مرغ تک نہیں دیکھا ہوگا۔ ذرا بتاؤ دنیا میں کتنی قسم کے مرغے ہوتے ہیں۔ وہ ایسا خبیث تھا کہ واقعی قطب شمالی سے قطب جنوبی تک ہر قسم کے مرغوں کی اقسام گنانے لگا۔ میں نے کہا، سب سے اچھا کون سا ہوتا ہے۔ بس یہیں وہ مار کھا گیا۔ اس نے کوئی مشکل سا نام لیا اور میں نے کہا غلط۔ سب سے اچھا ہوتا ہے فلاں ہوٹل کا مرغ مسلّم... بس اسی بات پہ ہاتھا پائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔"

"ہاتھا پائی یا ہاتھا پانی...؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں... صرف ہاتھا... پانی میں پاسے چلانے پڑتے۔" وہ بولا۔

"اچھا اب تم یہاں میری جگہ لو۔" میں نے کہا۔ "میں تھک گیا ہوں اور چائے خانے کی رونق بڑھانے جاتا ہوں۔"

لالہ رانہ کلینی کی گفتگو ہوتی گئی اور بیچ میں ایسے بہت سے مرحلے آئے جب ذرا سی بات پہ اختلاف رائے سے نوبت تیغ زنی تک اور گالی گلوچ تک پہنچی مگر پھر کسی نہ کسی نے جوش کو چھوڑ کر ہوش سے کام لیا اور بات کو اس حد تک نہیں بگڑنے دیا جہاں بات بنائے نہ بنتی۔ وہ سب ایک ایسے کاروبار میں شریک تھے جو غیر قانونی اور غیر اخلاقی تو تھا ہی خود ان کے بے مذاہب اور احساسِ جرم کی خلش کو جگائے رکھتا تھا۔ وہ اس کا اعتراف اپنے آپ سے بھی نہیں کرتے تھے مگر ان کے مادی وجود کے اندر احساس کی ایک کرن زندہ تھی جس پہ تاریکی غالب آ ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ آدمی کا ضمیر تھا جو کبھی کسی قاتل کے ہاتھوں نہیں مرتا۔ جو بے وجود ہونے کے باوجود سخت جان ہوتا ہے اور سسک سسک کر بھی زندہ رہتا ہے۔ یہ لاشعور کی گہرائیوں میں دفن رہنے والا خیال ان کو اندر ہی اندر کچوکے دیتا رہتا ہے کہ وہ دوست نہیں بلکہ شریکِ جرم ہیں اور دنیا کے سامنے ظاہر ہے وہ معزز اور معتبر بھی ہیں لیکن ایک دوسرے کے سامنے سب مجرم ہیں۔ ان کے درمیان نمو اعتماد کی فضا میں پروان چڑھنے والا رشتہ تھا ہی نہیں۔ شکوک اور عدم اعتماد کے ساتھ مجبوری کا تعلق تھا۔ ان کی دوستی کا ظاہر ایک مناسب تحفظ کا ملک تھا۔

چائے خانے کے مالک نے کئی بار مجھ سے مختلف امور پر تبادلۂ خیال کی بے سود کوشش کی۔ وہ [illegible] سے لے کر [illegible] کی تباہ کاریوں تک ہر مسئلے پہ مفید معلومات فراہم کر سکتا تھا اور یہ بھی بتا سکتا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ اس مجلس کے عام لوگ تھے جو ایک کپ چائے پیتے تھے تو دل کھول کر باتیں کرتے تھے۔ یہ تنہائی کے احساس کو مٹانے اور وقت گزارنے کا سستا نسخہ تھا۔ کچھ وہاں آنے والے لوگ تھے جو اسے اپنا اڈا سمجھتے تھے۔ [illegible] تو کلب کہلاتا ہے یا کافی ہاؤس۔ کبھی کبھار کے آنے والوں [illegible] اس روڈ سائڈ کلب میں کبھی کبھی سمجھ کے تو انداز نہیں کیا جاتا [illegible] سب بہت جلد بے تکلف ہو جاتے تھے اور [illegible] چاہیے کہ سب کی سنتے اور اپنی سناتے۔

لیکن میں یہاں گیان دھیان میں مگن سادھو [illegible] طرح چپ بیٹھا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ میرے سر کے پیچھے ایک حقیر ریسیور چھپا ہوا ہے جس میں سے نکلنے والا [illegible] جیسا باریک تار میرے کان میں گھسا ہوا ہے۔ [illegible] گھر کے بند دروازوں کے پیچھے ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ صاف سن رہا ہوں۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ جو آوازیں میں سن رہا ہوں وہ اس ملک اور اس قوم کے محبِ وطن افراد کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر یہ آوازیں سب سن سکتے تو [illegible] جلا کے راکھ کر دیتے اور وطن فروشوں کے اس [illegible] جو کچھ بھی کرنا چاہتے تھے وہ اشتعال انگیزی کی [illegible] انھیں سب سن کر تمام معلومات کی مدد سے ایک [illegible] کرنا تھا تاکہ ہم ہر گوشے میں چھپے ہوئے وطن کے ہر دشمن کا [illegible] کر سکیں۔

"میری سوہنی سرکار۔" چائے خانے کا مالک بالآخر میری پراسرار خاموشی سے تنگ آ گیا۔ "آپ چائے کو پیالی پیٹ میں ڈالتے جا رہے ہو۔"

"اس پیٹ کے دوزخ میں آدمی تمام عمر [illegible] ہے لیکن اس کی آگ کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی۔" میں نے [illegible] طرح فرمایا۔

چائے والا بے حد متاثر ہوا۔ "آپ تو مجھے پہنچے ہوئے ہو جی!"

"مجھے کیا معلوم کون کہاں پہنچا ہوا ہے۔" [illegible]

"[illegible] کوئی شتونگڑا بھی نہیں پہنچا... کوئی ولایت پہنچا۔"

"سبحان اللہ میری سوہنی سرکار۔" فرطِ عقیدت سے اس کا [illegible] جو ولایت کے مرتبے تک پہنچے ولی ہوئے۔ آپ کو ولایت حاصل ہے جی؟"

"ہم ولایت تک پہنچ کے لوٹ آئے۔" میں نے قلندرانہ [illegible] سادہ لوحی اس نقطے کے مطلب کا تھا کہ میں کچھ کہہ رہا [illegible] سمجھ رہا تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ چپ ہو جائے۔

"آپ ہم پر بھی التفات کریں تو ہم خود اس فرش پہ ہاتھ سے اٹھ [illegible]" میرے سامنے ایک اور چائے کا کپ رکھ کے بولا... "[illegible] روز کا پریشان ہونا ایسا اٹھا لیں گے کہ پھر بیٹھنے نہ دیں [illegible] کہ یہاں سے اٹھ کے کسی ہوٹل میں کاروبار جمائیں۔"

"اللہ تجھے اٹھائے بچہ۔" میں نے کہا۔ "تیرے کاروبار کو [illegible]"

"آمین۔" وہ کچھ بڑی عقیدت سے بولا۔ "ایک بات [illegible]"

"چپ۔" میں نے انگلی ہونٹوں پہ رکھ کر سرگوشی میں کہا۔ "ہم [illegible] بیٹھے ہیں۔"

وہ دم بخود رہ گیا۔ "کیا حکم ہے جی میری سوہنی سرکار؟ [illegible] تھوڑی [illegible]"

"ہم جو کچھ سن سکتے ہیں وہ کوئی نہیں سن سکتا بچہ جٹ..."

[illegible] بالکل غلط نہیں تھا۔ چائے والا خاموش ہو گیا [illegible]

لالہ رانہ کلینی والے اب اپنے نئے اقدامات پر بحث کر رہے [illegible] اور وہ سب لوگ بھی مارے جا چکے تھے جو اس [illegible] تعلق رکھتے تھے لیکن اس سے نہ تخریب کاروں [illegible] کو شکست ہوئی تھی اور نہ ان کے غدار دوستوں کا [illegible] ہوا تھا۔ انھوں نے دوسرے افراد اور دوسرے ٹھکانے [illegible] تھے۔ اگر ہم سلوک رام اور جگن ناتھ کے علاوہ ان کے دوسرے [illegible] تک رسید کر دیتے تب بھی یہ ایسا کاروبار نہیں تھا [illegible] ایک ہی جگہ چلتا رہے اور انھی لوگوں کے [illegible] سمجھنے کے لیے بعض لوگ اور ٹھکانے [illegible] رہنا ضروری ہو جاتا ہے۔

[illegible] سن رہا تھا وہ اتاشی کے پاس ریکارڈ بھی [illegible] مقدار میں کیسٹ تھے لیکن میں اس [illegible] نہیں کر سکتا تھا کہ یہ ایک مشینی نظام تھا جو [illegible] سے ختم ہو سکتا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر میں وقتی [illegible] چاہیے تھی چنانچہ میرے لیے گفتگو کے ہر لفظ کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا ضروری تھا۔ میں اس وقت جب ان کی میٹنگ کا اصل مقصد پورا ہو چکا تھا اور وہ چائے پیتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے تھے میں نے ایک کار کو گلی کے آخری حصے سے کچھ فاصلہ پر رکتے دیکھا۔ یہ ایک مرسیڈیز تھی اور تقریباً ویسی ہی تھی جیسی خسرو جمشید کے پاس تھی اور جسے ہم ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپنی سے نکلنے کی کوشش میں تباہ کر چکے تھے۔ اس کا رنگ اور ماڈل سب کچھ وہی تھا مگر جس چیز نے مجھے متوجہ کیا وہ اس کا رجسٹریشن نمبر تھا۔ خسرو جمشید کی جل کر خاک ہو جانے والی مرسیڈیز کا نمبر بھی ایسا تھا کہ آسانی سے ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ اس دوسری کار پر مجھے وہی نمبر نظر آ رہا تھا۔ یہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی مردہ جسے سپردِ خاک کر دیا گیا ہو پھر سرِراہ انھی کپڑوں میں نظر آ جائے جو وہ عموماً اپنی زندگی میں پہنتا تھا۔

ابھی میں اس مرحوم کے زندہ ہونے پہ حیران ہی تھا کہ میں نے سڑک کے کنارے لگے ہوئے بجلی کے کھمبے کی روشنی کو براہ راست ڈرائیور پر پڑتے دیکھا اور چائے کا آٹھواں کپ میرے ہاتھ سے گرتے گرتے رہ گیا۔ میں ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ لو چائے کے پیسے..." میں نے دس کا نوٹ نکال کے کہا۔

"توبہ جی توبہ۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا۔ "آپ تو بس میرے حق میں دعا کریں۔"

"دعا کس چیز کے لیے؟"

"اللہ ایک بیٹا دے اس سال۔" وہ بولا۔ "چھ سال میں گھر والی نے چھ لڑکیاں پیدا کر دی ہیں۔"

"لڑکیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں بچہ۔" میں نے کہا۔

"بیٹے بڑھاپے کا ایک سہارا بھی چاہیے میری سوہنی سرکار۔"

"ہم اولادِ نرینہ کے لیے دعا نہیں دیتے۔" میں نے کہا۔ "اولاد جوان ہو کے نافرمان اور سرکش ہو تو باپ کی سفید داڑھی پکڑتی ہے اور اس کا منہ کالا کرتی ہے۔ ساری بددعائیں پھر ہم پر آتی ہیں۔"

"اچھا تو خوشحالی کی دعا دیں۔" وہ بولا۔

"کتنی خوشحالی چاہیے؟" میں نے کہا۔ "لکھ پتی بننے کی دعا چاہیے تو تیس ہزار روپے۔ کروڑ پتی بننے کی دعا دس ہزار میں۔"

"لیں؟ او بدمعاش... فراڈیے..." اس نے میرے ہاتھ سے دس کا نوٹ چھین لیا اور چھ روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ "چل بھاگ ادھر سے... بڑا پہنچا ہوا بنتا تھا۔ [illegible] ہوتا تو پہنچ جاتے۔"

"ہم وہاں بھی پہنچ چکے ہیں بچہ۔" میں نے چلتے چلتے کہا۔ "اب اللہ تجھے بھی پہنچائے۔ اور تجھے مزید چھ بیٹیاں ملیں۔" پھر میں نے وہاں سے دوڑ لگائی۔ وہ اٹھا اور پھر بیٹھ گیا۔ اس کا ارادہ پھر میرا پیچھا کرنے کا تھا مگر شاید کچھ غلط گھوم گیا اور شاید [illegible] بن گیا۔

www.paksociety.com

پھر وہ آپس میں الجھ گئے۔ چائے والا معافیاں مانگ رہا تھا اور گاہک مجروح کلائی کو ملتے ہوئے بیٹھ چکا تھا۔

کار کے قریب پہنچنے کے بعد میں نے خود کو ایک ساعت پر رکھا تاکہ ڈرائیور مجھے بیک ویو مرر میں نہ دیکھ سکے۔ پیچھے جھک کر میں نے ماچس کی ایک تیلی سے ٹیوب کا والو دبا دیا۔ ہوا بڑی آواز کے ساتھ نکلی اور ڈرائیور ایک دم اچھل پڑا۔ وہ کسی نامعقول کی شرارت اور جرأت و دلیری پر مشتعل تھا جو ڈرائیور کی موجودگی میں ٹائر کو نیست کرنے پر آمادہ تھا۔ وہ ایک دروازے سے باہر آیا اور میں دوسری طرف سے گھوم کر سامنے چلا گیا۔ نواب خسرو جمشید کے ہم شکل نے زیرِ لب ایک گالی دی: "کون تھا؟" وہ پچھلی سائڈ کے بائیں ہاتھ والے ٹائر کو دیکھ کر بولا۔ اس نے لات مار کر ہوا کا پریشر دیکھا جو بالکل ٹھیک تھا۔ دراصل ہوا کم ہونے سے پریشر میں کیا فرق پڑ سکتا تھا مگر ہوا نکلنے کی آواز اس نے خود سنی تھی جو پیچھے سے آئی تھی۔ ادھر ادھر دیکھنے پر اسے کوئی بھی نظر نہ آیا جس پر وہ شک کر سکتا۔ اس نے آواز کو اپنا وہم سمجھا اور پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ میں اتنی دیر میں سر جھکائے پیچھے کی طرف لوٹ آیا۔ بیٹھے بیٹھے میں نے پھر تیلی کی مدد سے ٹیوب کے والو کو دبایا۔ اس مرتبہ آواز پہلے سے بھی زیادہ دیر تک سنائی دی۔

نواب خسرو جمشید کا ہم شکل اب تو دوسری بار پورے یقین کے ساتھ دلاورانہ تقریبیں کر کے باہر آیا۔ میں دوبارہ کار کے پیچھے گھس گیا اور کسی آواز کے بغیر سرکتا ہوا دوسری طرف جا نکلا۔ وہ پیچھے آیا اور کچھ دیر سیدھا کھڑا رہا۔ پھر میں نے پیچھے سے ہی اس کے قدموں کو آگے بڑھتے دیکھا۔ اس نے کار کے گرد ایک چکر لگایا اور کسی کو نہ پا کے حیران ہوا۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے سر جھکایا اور نیچے جھانکنا چاہا۔ میرے ہاتھوں نے صحیح وقت پر اس کی گردن دبوچ لی۔ ابھی اور تیز چلنے والی گھڑی اس نے پہلے ہی ٹانگ کے ایک ہاتھ میں تھام لی تھی ورنہ اتنا جھٹکنے سے وہ زمین پر گر تی۔ اس طرح وہ ایک ہاتھ کو استعمال کرنے کے قابل نہ رہا۔ میں سیدھا ہو کر اس کے پاس آ گیا۔ میں نے اسے ایک ہاتھ سے بال پکڑ کے کھینچا تو وہ پیچھے گرا اور اس کا سر ساتھ سے ٹکرایا۔ پھر میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبا کے اسے کار کے پیچھے کھینچ لیا۔ ریوالور وہ استعمال کر ہی نہیں پایا تھا۔ میں نے اس کا سر اوپر اٹھا کے کار کے فرش پر مارا۔ اس سے ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے کوئی خالی ڈرم پر لات مارے۔ دوسری بار میں نے ایسا ہی کیا اور وہ آواز نکالے بغیر بے سدھ ہو گیا۔

میں نے چند منٹ تک انتظار کیا کہ اگر ادھر ادھر سے کسی نے دیکھا ہو گا تو آ جائے گا اور پھر اس سے بھی نمٹنا ہو گا مگر یہ ساری کارروائی ایک منٹ میں ختم ہو گئی تھی۔ کسی نے ڈرائیور کو کار کے گرد چکر لگاتے دیکھا ہو گا تو اسے کوئی بات غیر معمولی نظر نہ آئی ہو گی۔ اس نے دو منٹ کے وقفے میں ڈرائیور کو غیر موجود پایا ہو گا تو سوچا ہو گا کہ وہ اندر جا بیٹھا ہے۔ کار کے پیچھے میں سیکنڈوں میں ہونے والی جنگ بالکل یک طرفہ رہی۔ اسے مزاحمت کا موقع دیے بغیر میں نے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔

اگلا مرحلہ زیادہ دشوار ثابت ہوا جب میں نے بے ہوش ہوتے ہوئے نواب خسرو جمشید کے نقشِ ثانی کو بے لباس کیا … قدرت میں آ گیا۔ مرسیڈیز جیسی عالی شان کار کے پچھلے … اب بھی آیا جب ایک عام والا محاورہ درست ثابت … پھر میں نے وہ خلعتِ فاخرہ زیبِ تن فرمائی جو دوسرے جسم پر تھی مگر اب نہیں تھی۔ میں نے اپنا لباس … نہیں سمجھا۔

باہر طلوع ہونے کے بعد میں نے اپنی دستار بھی … وہ پگڑی جس پر میں نے ہاتھ ڈالا تھا پیچھے سے اٹھا کر اپنے سر پر جمالی۔ فرق اب صرف مونچھوں کا تھا جس کا علاج … ایسی کا تھا۔ خود میں نے … ہونے کے لیے … پہ کافی وقت صرف کیا تھا مگر اس نقلی نواب کی مونچھیں آدھا انچ کے قریب زیادہ باہر نکلی ہوئی تھیں … تھیں۔ رات کے اندھیرے میں صورت کے فرق کا اندازہ مشکل تھا اور میں اب ایک او کھلی … سے ڈرنا بے کار تھا۔

موقع پاتے ہی میں نے ڈگی کھول کر نقلی نواب کو نکالا اور ڈگی میں ڈال دیا۔ زیادہ ڈر مجھے اصلی نواب خسرو کی طرف سے تھا۔ ان کی میٹنگ ختم ہو رہی تھی اور وہ کسی بھی … ہو سکتا تھا۔ ان دونوں نے ایک جیسی شکل و شباہت … چلا رکھی تھی وہ بالآخر آج ختم ہو گیا۔ صاف … خسرو جمشید اعلیٰ سطحی اجلاس میں بنفسِ نفیس شریک تھا … کی ہدایات کے مطابق شوفر ٹھیک وقت پر … گاڑی لے کر حاضر ہو گیا تھا۔ اگلی سیٹ پر … تھوڑا سا آگے بڑھا کر ریمپ پوسٹ سے دور … پھر پیچھے اتر کے ڈگی میں پڑے ہوئے نقلی نواب کی … میں پڑے ہوئے تھے۔ محسن دور سے سب کچھ دیکھ … وہ آہستہ آہستہ قریب آ گیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟" وہ بولا۔ "یہ جانتے ہو پروگرام میں … نہیں تھا۔"

"پروگرام میں تو جانے بہت کچھ شامل نہیں تھا۔" … کسی عظیم فلسفی کی طرح کہا۔ "… تیرا … فرما۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے … یہی منظور تھا۔ منظورِ نظر … نواب بنوں اور تو … لگ رہا ہوں میں؟"

"ایسا کر، نواب خسرو جمشید تیری نظر اتار رہے گے۔" محسن جل کر بولا۔ "ممکن ہے نظر کے ساتھ کھال بھی اتار لیں۔ اور مجھے پورے کے … انسان کر لیں۔"

"یہ … بہت جھڑتا۔" میں نے وصیت کے انداز میں رقت آمیز کہا۔ "میری کھال کے جلسے خوالینا۔ اور راکھ کو لوٹے دینا اور … عاشق کی روایات پر عمل کرتے ہوئے میرا ساتھ دینے کے بجائے عالمِ بالا کی سمت کوچ کر جانے تو ہر سال شہیدانِ الفت … اور قوالی وغیرہ۔ قوالی میں شرکت کے لیے ہی چلے … قوالی خود گانا۔"

"ملا ور … چودھری قوال اور بھنوا زیادہ بہتر قوالی کریں گے۔" محسن … بجائے گا۔ اس نے ایک رات تھا تھے میں جیسے … کی طرح بہت اچھا بجایا تھا۔"

"مذاق کی بات چھوڑ… وہ آنے والے ہیں۔" میں نے کہا … نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔ باقی ڈگی میں … بالکل اصل حالت میں… جیسا دنیا میں آیا تھا… اور دودھ … کپڑے لے جاؤ۔" میں نے بنڈل اسے تھما دیا۔

"… جا کر تیری نشانی کے طور پر البم کو دے دوں؟" محسن نے … میرا ارادہ بدل نہیں سکے گا۔"

"ہاں… میری آخری نشانی۔"

"اور اسٹوری کیا سناؤں؟" محسن بولا۔ کپڑوں کے اندر کا … ہو گیا۔

"کوئی بھی سی دل پر اثر کرنے والی اسٹوری سنا دینا۔ مثلاً یہ … کے شیر کو دیکھ رہے تھے۔ شیر نے کہا کہ ایسے کیا دیکھتے ہو … مجھے دیکھو۔ مرحوم جذباتی ہو کے اندر چلے گئے۔ اب … ہیں اور ہضم ہو چکے ہیں۔ پھر تو شیر کو نشہ نہیں تھا اس … بہت اچھی ہوگی۔"

"… کپڑے غائب کر کے آتا ہوں۔" محسن بولا۔ … مرحوم گھومنے جا رہے ہیں اور کچھ دیر سے آئیں گے میں … جلنے دوں گا۔"

"بے وقوفی مت کر… بیوی کو بیوہ میں تبدیل مت کرو۔"

"… مت کرو۔" وہ بولا۔ "میں آ رہا ہوں… میرے آنے …"

… جلسے اور آنے میں دس منٹ صرف ہونے یقینی … ان سے اندازہ ہوتا … ایک دوسرے سے رخصت ہونے کی اجازت … باتیں میں نے سن لی تھیں اور مجھے یقین … بھی ہو گئی … سب شرکت کریں … ان کے … جو انتہائی خطرناک تھے۔ اگر ان کے عزائم پورے ہو جاتے تو یہ ملک … ہو جاتا اور ملک میں

ایسی خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو جاتی جس میں لاکھوں جانیں ضائع ہوتیں اور ملک کا بال بال بے آبرو ہو کے مٹی میں مل جاتا۔ ان غداروں کو سزائے موت دینے کے لیے یہی جرم کافی تھا کہ انہوں نے ایسا سوچا مگر ابھی ان کے پورے منصوبے کو شکست دینا اور ان کے ہر شریکِ جرم تک پہنچنا تھا۔ ابھی سے انہیں مار کے ہم راستوں کا سراغ گم نہیں کرنا چاہتے تھے۔

رخصت ہونے والوں میں سب سے پہلے ایس پی سراج گیا۔ اس وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ وہ گلی کے دوسرے حصے سے نکل گیا۔ ورنہ اس طرف سے جاتا تو میں اسے ضرور دیکھتا۔ اس کے جانے کے بعد پیٹرو نے ملاور اور جمشید کے سامنے اسے گالیاں دیں کہ ڈرا ایس پی بنا پھرتا ہے۔ کسی دن یہ کروں گا اور وہ کروں گا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ پیٹرو اور سراج کے درمیان کچھ … بنی اور وہ ساتھ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہیں۔ ساتھ دینے کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ ایک دوسرے کو کتے کی موت مار دیتے۔ ملاور نے پھر اسے سمجھایا کہ وہ بہت کام کا آدمی ہے۔ ایس پی اور ڈی آئی جی کے عہدے کی بات نہیں، پولیس میں ایسے بہت ہی کم ہوتے ہیں جو پیسے کے لالچ میں اندھے ہو جائیں۔ فرائض اور وفاداریوں کو بھول جائیں اور دشمنوں کا آلۂ کار بننا تک قبول کر لیں۔ اسے ناراض کرنا کئی باہر کے راستے بند کرنے کے مترادف ہو گا۔ پھر دوسرا آدمی ملنے سے جو اسی طرح سارے راستے کھلے رکھے۔ خسرو جمشید نے اس کی تائید کی اور پیٹرو کو جذباتی نہ ہونے کی تلقین کی۔

ملاور اور خسرو جمشید ایک ساتھ نکلے اور مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ اس کا اندازہ میں نے ان کے الوداعی کلمات سے کیا۔ پھر پیٹرو نے روانگی اختیار کی اور چلتے چلتے سونیا سے نہ جانے کیا کہا کہ اس نے بے رخی سے کہا: "مجھ سے اس … مت کرو۔" پیٹرو قہقہہ مار کے ہنسا۔ سونیا کی بے رخی مجھے ایک ادائے محبوبانہ لگی۔ معلوم نہیں ان کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا تھی لیکن یہ بات عجیب سی تھی یا مجھے عجیب لگی کہ اس گھر میں سونیا کے دونوں بھائی بھی موجود تھے اور پیٹرو و نعمان کے سامنے کوئی قابلِ اعتراض بات کی تھی۔ ممکن ہے وہ سامنے نہ ہوں، میں نے سوچا۔ میں صرف آوازیں سن رہا ہوں، کچھ دیکھ نہیں رہا ہوں۔ پیٹرو بھی چلا گیا اور میں نے قدرے تشویش میں مبتلا ہو کے محسن کو تلاش کیا جو دس منٹ میں آسانی سے واپس لوٹ کر آ سکتا تھا لیکن اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ نواب خسرو جمشید کسی بھی لمحے گلی کے نکڑ سے نمودار ہو سکتا تھا اور اب محسن کے لیے اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ وہ ڈگی میں چھپ سکے۔

غالباً آخری چند سیکنڈ باقی تھے جب میں نے اپنا پروگرام بدل دیا۔ ذہن میں آنے والا یہ فوری خیال بالکل آوازِ غیب کی طرح تھا جس نے واضح الفاظ میں کہا کہ سکندر! تم نے سوچے سمجھے

www.paksociety.com

بغیر بہت عجلت میں فیصلہ کیا تھا، جس وقت تمھاری گرفت میں ہے... بدل دو اس فیصلے کو... یہ نہ ہو اتنی بڑی کامیابی تمھارے غلط فیصلے سے ناکامی میں بدل جائے اور قصوروار صرف تم ہوگے کیونکہ تم نے کسی کو بتائے بغیر اور کسی سے مشورہ کیے بغیر وہ کیا جو تمھارے دماغ میں آیا۔ یہ شاید وہ آواز تھی جسے کوئی اچھی چھٹی حس سے تعبیر کر سکتا تھا۔ یہ تائید غیبی تھی، وہ قوت تھی جس کا نادیدہ ہاتھ ہمیشہ مجھے تحفظ فراہم کرتا آیا تھا اور جس نے مجھے سوچ کے صحیح راستے پر گامزن رکھا تھا۔

میں نے چابی گھمائی اور گاڑی کو ایک دم گیئر میں ڈال دیا۔ کسی چیتے کی طرح خاموش اور خوب صورت مرسیڈیز نے ایک جست لی اور اس کی رفتار چند سیکنڈ میں ساٹھ میل پر پہنچ گئی۔ میں نے کھڑکی سے سر نکال کے پیچھے دیکھا کیونکہ بیک ویو مرر میں اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ خسرو جمشید ابھی تک سڑک پر نہیں پہنچا تھا۔ اب میں اس سے کافی دور تھا چنانچہ وہ آ بھی جاتا تو اتنے فاصلے پر جانے والی کار کو پہچان نہ پاتا۔ اس کی نظر گلی اور سڑک کے سنگم پر اِدھر اُدھر گئی ہوگی کہ شوفر نے کار کہاں کھڑی کی ہے، یہ خیال اس کے ذہن میں آنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا کہ صرف دس سیکنڈ پہلے وہ کار یہاں موجود تھی مگر اب نہیں ہے۔

خود کو محفوظ پا کے میں نے رفتار کم کی اور اب میرے دماغ کی منفی سوچ نے مجھے اندیشوں اور خطرات کے امکانات کا مناسب سمجھنا شروع کیا۔ اگر محسن آجاتا اور گاڑی میں بیٹھ جاتا تو کیا ہوتا۔ وہ میری کوئی مدد کر پاتا۔ سب سے پہلے تو یہ ہو سکتا تھا کہ خسرو جمشید اصل اور نقل کے فرق کو پہلی نظر میں تاڑ جاتا۔ اس کے شوفر کی اور میری مونچھوں میں تو اتنا فرق نہیں تھا مگر ہمارے چہرے بالکل مختلف تھے۔ اگر خسرو جمشید اندھیرے میں صورت پر غور نہیں کرتا تو جیسے ہی وہ اندر بیٹھنے کے لیے دروازہ کھولتا اور اندر چھت کی لائٹ جلتی وہ میری صورت دیکھ لیتا۔ اس کی نگاہ کے دھوکا کھانے کا امکان بہت کم تھا۔ میں نے اسے کبھی چشمہ لگاتے نہیں دیکھا تھا چنانچہ یہ فرض کرنا غلط تھا کہ اس کی نظر کمزور ہوگی۔ اگر یہ بھی نہ ہوتا تو سب سے خطرناک مرحلہ آتا، وہ مجھ سے کہتا کہ چلو۔ اور میں احمقوں کی طرح سوچتا کہ کہاں چلوں۔

یہ سب سے بڑی غلطی میرا راز فاش کر دیتی۔ اصل شوفر تو جانتا تھا کہ خسرو جمشید کو کہاں لے جانا ہے۔ میں اس سے تو پوچھ نہیں سکتا تھا کہ نواب صاحب کہاں تشریف لے جائیں گے۔ پھر کس سے پوچھتا۔ میں جو یہ سب ناک آؤٹ ہو جانے والے شوفر سے نواب جمشید کے گھر کا پتا معلوم کرنا ہوتا تو کام شاید چل جاتا۔ اس کے بعد بھی مجھے وقت ملا تھا جب میں گاڑی کا رجسٹریشن کا کاغذ دیکھ سکتا تھا۔ رجسٹریشن بک میں کوئی نام اور پتا ضرور مل جاتا۔ لیکن یہ سب کچھ کیے بغیر میں نے شوفر کی جگہ سنبھال لی تھی اور

بال بال بچ گیا تھا ورنہ پیچھے بیٹھنے والا خسرو جمشید مجھے [illegible] پستول رکھ دیتا اور کہتا کہ بہروپیے! کون ہو تم... اور اصلی [illegible] کہاں ہے جو اس گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے گاڑی کو دوسری مرتبہ داخلی طرف موڑا [illegible] شکر ادا کیا کہ جلد بازی میں ایسے ہی وقتی [illegible] ایجنٹ کیتھی کو معلوم ہو جاتا کہ جس وقت ان کا انتہائی خفیہ اجلاس ہو رہا تھا اس وقت ایم آر ایس کے جاسوس [illegible] چھپ کے ان کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کو ریکارڈ [illegible] ان کا یہ شک یقین میں بدل جاتا کہ جیسی ان کے اصل [illegible] ان کے مذموم عزائم کا اچھی طرح علم ہے۔ اب [illegible] ٹھکانے اور ایجنٹ ہمارے ہی ہاتھوں تباہ و برباد ہو [illegible] اپنا سارا پروگرام بدل لیتے۔ سارے آگے تبدیل کر [illegible] سب منسوخ کر دیتے جو انھوں نے دکو فیصل کے [illegible] طے کیا تھا۔ اس کے بعد ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا [illegible] سے ان کے منصوبے دیکھنا آسان ہی ناممکن ہو جاتا [illegible] جانے والے عجوبے کا تعاقب کرنا۔

ظاہر ہے اس کے بعد اگر خسرو جمشید مجھے ختم نہ کرتا [illegible] اصل اور نقلی دونوں نوابوں کو ختم کرنا ضروری ہو جاتا [illegible] قید رکھتا یا ان کی لاشیں تک غائب کر دیتا مگر صورت [illegible] پُراسرار گمشدگی سے شکاری ایک ہی نتیجہ اخذ کرتے [illegible] کے پالیسی ساز اجلاس کے بعد ایک اہم شریک جلسہ [illegible] طرح غائب ہونا خطرے کا سائرن ہے۔ ان کو کسی [illegible] ہوگا اور پھر ان کے جسم سے جان کو قطرہ قطرہ کشید کرنے [illegible] ان کے دماغ سے بھی وہ سب معلومات حاصل کر لی [illegible] اہم تفتیش کے تو ایک سو ایک طریقے ایسے ہیں [illegible] آدمی کو یوں بولنے پر مجبور کر دیتا ہے جیسے چابی والے [illegible] ریکارڈ کو سوئی کی چبھن آواز نکالنے پر مجبور کر دیتی ہے [illegible] اپنے منصوبے کو از سر نو مرتب کرتے اور سب کچھ [illegible]

یہ مسئلہ اب بھی تھا کہ اس شوفر نواب کا کیا جائے [illegible] کی ڈگی میں بند تھا لیکن زیادہ سنگین نہیں۔ اسے [illegible] کہ بہتر طریقے پر حل کیا جا سکتا تھا۔ میں اس عالی شان کار [illegible] نکل کی سے گزار کر گلبرگ کی مونگ پھلی اینڈ نیوز [illegible] طرف لے گیا جہاں اب مرزا غالب مونگ پھلی [illegible] یہ کوئی عام کار نہیں تھی جو کسی کو متوجہ نہ کرتی۔ اس کو چھپانا آسان تھا، رکھنا علانیہ ناممکن تھا۔ آدمی کسی کی مرغی تو چرا [illegible] اور ہضم بھی کر سکتا ہے چند یا گھر کا ہاتھی نہیں [illegible] تو چھپا کے نہیں رکھ سکتا۔ مجھے معلوم تھا کہ [illegible] کو اس کار کی چوری کے بارے میں سب پتا دیا جائے [illegible] وہ آسانی سے کسی بھی سڑک پر اس گاڑی کو دیکھ لیتے [illegible]

[illegible] ایسی کاریں لاہور میں دو درجن سے زائد نہیں ہو [illegible] میں نے کار کو دو گھروں کے درمیان خالی پڑے ہوئے [illegible] کیا یہی تھا کہ سر سے کا بوجھ اُترا اور پھر آوازیں آنے لگیں۔ [illegible] کی ہوا سو میٹر کی ریٹنگ سے دور ہو گیا تھا۔ اب [illegible] جیل کے اسٹیشن سے قریب تھا چنانچہ میرے [illegible] نے کام شروع کر دیا تھا۔

"[illegible] سب تمھارا قصور ہے ممی..." پرویز یا سلیم دکھڑے میں سے [illegible] دونوں بھائیوں کی آوازیں بھی ایک نقلیں جیسے [illegible] تھے۔

"آخر کیا ضرورت تھی تم کو..."

"تو تمھارا خیال ہے کیا؟" ان کی ماں نے چیخ کر کہا۔ "کہ مجھ سے [illegible] سوال کر رہا ہے... اسے بیگم میرا ہے... تیرے ان [illegible] دوستوں کا نہیں۔ آخر کیا سمجھ کے اس نے ایسی حرکت کی [illegible] اس کا منہ نوچ لیتی۔"

"اس نے کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی۔"

"اور کیا حق ہے غلط حرکت؟" وہ اسی لہجے میں بولی۔ "وہ اس مظلوم عورت کو مارتا؟ کپڑوں کے ساتھ عزت اتار لیتا؟ کھال کھینچ لیتا تب یہ غلط حرکت ہوتی؟ بے حیا کہتی ہوں تم کو شرم نہیں آتی اس رات جب وہ ہمارے گھر کا نمک کھانے والی ایک غریب عورت [illegible] تھا تم کہاں تھے... کیوں منع نہیں کیا اس [illegible]"

"تم ان باتوں کو نہیں جانتیں ممی۔" سونیا نے نسبتاً نرم لہجے میں [illegible] اس سے پوچھنا ضروری تھا۔"

"کیا پوچھنا ضروری تھا۔ کیا تم نے دیکھا نہیں تھا کہ وہ بے چاری [illegible] سہمی ہوئی تھی؟" ان کی ماں بولی۔

"ہم نے یہ اسی کے منہ سے سنا تھا۔" سونیا کا بھائی بولا۔

"تو کیا وہ جھوٹ بول رہی تھی؟" ماں نے جھنک کر کہا۔

"ممی! کیا ثبوت ہے کہ سچ ہی بول رہی تھی وہ؟" سلیم بولا۔

"پاگل کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی احمق... کتنے دن [illegible] اس گھر میں۔ صبح سے شام تک جو کچھ کرتی تھی سب [illegible] کرتی تھی۔ سب کی خدمت کی اس نے... میں تو [illegible] میری دوا کا اور خوراک کا خیال رکھتا۔ جو [illegible] نہیں کر سکتے تھے وہ اس نے کیا..."

"[illegible] نہیں تھے۔" پرویز نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہاں! تم میری اپنی اولاد تھے... تم کو کرنی چاہیے تھی میری خدمت مگر تم تو میرا دو دن کا آرام نہ دیکھ سکے۔" ان کی ماں نے [illegible] اسے بے وقوف... میں نے اسے اپنی طرح پہچان کر [illegible] جانتے ہو مجھے میں نے زیور کھلا چھوڑا۔ اُدھر اُدھر [illegible] اس نے ہر چیز اُٹھا کے مجھے لا دی۔ میں نے ہزار روپے [illegible] ہزار کی پوری گڈی دروازے کے پاس گرا دی، جب

جیسے تم سے باہر جاتے ہوئے گر گئی ہو۔ وہ چاہتی تو رکھ لیتی لیکن اس نے کبھی ایک پیسہ اِدھر سے اُدھر نہیں کیا۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ چور تو نہیں ہے۔ وہ زمانے کی ستائی ہوئی عورت تھی، جسے تم نے یہاں بھی نہ ٹکنے دیا۔ خدا معلوم اب کہاں گئی ہوگی۔ اس کی بد دعا نہ لگ جائے ہمارے گھر کو۔"

یہ میرے لیے نئی اور بڑی اچھی اطلاع تھی کہ نازو موقع پاتے ہی اس گھر سے نکلنے میں کامیاب ہوئی۔ اس کا مشن اس کی ہمت اور ذہانت کے باعث بخیر و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس نے وہ سب کچھ کر لیا جس کے لیے ہم نے... میں نے... اسے ایک ایسے جہنم میں دھکیل دیا تھا جہاں زہریلے ناگ اور ڈنک مارنے والے بچھو سے زیادہ ہلاکت آفریں انسان رہتے تھے اور جہاں سے اس کی واپسی قطعی غیر یقینی تھی۔ ایک بار پھر میں نے تسلیم کیا کہ عورت نازو جیسی ہو تو کارنامہ سرانجام دے سکتی ہے۔ وہ جو سب ہی کر لیتے ہیں کر وہ آسان ہے... ہر وقت آتا ہے تو ان سے کان بھی نہیں اٹھائی جاتی۔ میں خود اپنے بارے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہی کام میرے سپرد کیا جاتا تو میں سامنے خطرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اتنی آسانی سے تیار ہو جاتا اور اگر جانا پڑتا تو یہ مرحلہ اتنی خوبی سے سر کرنے کے بعد اتنی صفائی سے نکل بھی آتا۔ یہ نازو کی اداکاری کا کمال تھا کہ ماں اپنی اولاد کو احمق اور بے وقوف کہہ رہی تھی۔ نازو کو ایک ستم رسیدہ اور مظلوم عورت تسلیم کر چکی تھی۔ اس کے دکھ درد کی تھی۔ اس کی خدمت گزاری، وفا شعاری اور ایمانداری کے گن گا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہونے والے سلوک پر برہم تھی۔ نازو نے کمال کیا تھا کہ کسی کو اپنے بارے میں شک میں مبتلا ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک وقت کچھ دیر پہلے ایسا آگیا تھا جب میں سمجھ رہا تھا کہ مار دھاڑ کیے بغیر وہ نکل نہ سکے گی اور میں یہ بھی طے کر چکا تھا کہ ایم آر ایس کی پوری قوت کے ساتھ اس کو نکال لانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا۔ بلاشبہ نازو کسی کے ہاتھ آنے سے پہلے ایک مدد کے باعث پھر ٹوٹنے کی پوری طرح اہل تھی مگر وہاں دو سے زیادہ افراد تھے جو مسلح بھی تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم نازو کی مدد کو پہنچتے کوئی بھی شکاری صرف ایک گولی چلا کے نازو کا اور اس کے مشن کا خاتمہ کر دیتا۔ نازو نے ثابت کر دیا کہ وہ آسانی سے جذبات کی تندی کا شکار ہو جانے والی لڑکی نہیں ہے۔ اس نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے جوابی کارروائی سے گریز کیا اور جب موقع پایا تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یوں نکل گئی جیسے چھلنی سے پانی نکل جاتا ہے۔

میں نے ماتر لیس کا جنم دن جا کے مرزا غالب سے رابطہ قائم کیا۔ وہ لنک اپ کر کے کہہ رہے تھے: کھاؤ جو میری مونگ پھلی... کھل جائے تمھاری عقل کی کلی۔ خوشبو سے مہکے گلی گلی۔ بادام سے اونچی پستے سے جلی۔"

www.paksociety.com

"بس مرزا بس... شاعری کو مبالغے نے کھا لیا..." میں نے کہا۔ "تم کو یہ مونگ پھلی ڈلوا دے گی۔"

"تم کیا شاہ جنات کے ساتھ ڈوب مرے تھے جلوت کے نیچے؟" مرزا غالب نے خفگی سے کہا۔ "محسن اور اس کا سالا دونوں جھک مارتے پھر رہے تھے۔"

"ویری گڈ۔ وہ اسی قابل ہیں کہ جھک ماریں۔" میں نے کہا۔ "اور کیا مار سکتے ہیں وہ... تم نے سنا کرنا تو بھاگ گئی۔"

"پرانی خبر ہے... مگر واضح ہو کہ جیسے کے ساتھ نہیں بھاگی... ٹیڈی کے ساتھ بھاگی ہے۔" غالب نے کہا۔ "غالب کی قدر تو اس کے مرنے کے بعد ہوگی۔"

"تمہارے کیس میں مرنے کے بعد بھی مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ محسن خان کہاں پائے جاتے ہیں؟"

"تمہاری تلاش میں گلی گلی جھک مار رہا ہے... ابھی آ جائے گا پلاسٹ پیتے کہا ابھی تک سکندر کے منتظر ہیں۔ تم منٹ پرنٹ۔" غالب بولا۔

"یار وہ ایک چیز اٹھا لی میں نے سڑک پر سے... بس ایسے ہی دل چاہا تھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے مگر آپ بھول رہے ہیں۔" غالب بولا۔ "آپ تو ایک نہیں دو چیزیں اٹھا لائے ہیں۔ ایک نواب کا حجرہ اور دوسری نواب کی کار۔ آخر اس ایڈونچر کی کیا ضرورت تھی۔ تنگ ہو جاتا اگر شرافت سے لوٹ آتے؟"

"یہ تو میں نے نہیں سوچا تھا۔ بہت سے کام سوچنے سے نہیں ہوتے۔ مثلاً نکاح کے وقت فوراً کہنا پڑتا ہے کہ قبول کیا۔ سوچنے بیٹھ جائے آدمی تو قاضی سے کہے کہ آپ بتا دیجیے پہلے آپ نے قبول کیا؟" میں نے کہا۔ "محسن آ گئے تو اس سے کہو کہ گھر جائے۔ تم بھی خیریت سے سدھارو۔ میں وہ تحفۂ درویش لے کر حاضر ہوتا ہوں... اس کا کیا کرنا ہے۔ یہ سوچ کر کریں گے۔"

"میں ابھی نہیں جا سکتا۔ آج تو سیل ہو رہی۔ ٹیڈی جینچ گیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "میں بابا تمہیں ہی دکان پر بٹھا دوں گا۔"

"یہ بتاؤ وہ سب ٹھیک ریکارڈ ہو گیا؟"

"ہو گیا ہوگا... جب سنیں گے تو پتا چلے گا۔" غالب نے کہا اور پھر سے کاری شروع کی۔ "کہاں ڈو بیری... مونگ پھلی۔" غالباً اس کے گاہک آ رہے تھے۔ میں نے ریسیور آف کرنے سے پہلے قافیہ ملا کے کہا۔ "مچھوں لگے موت ملی۔" اور گاڑی کو واپس لے گیا... میری آخری بات صرف غالب کے کانوں نے سنی ہوگی مگر وہ فی البدیہہ کچھ عرض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ان دنوں مونگ پھلی بیچنے کا مقابلہ زوروں پر تھا اور غالب کے ساتھ ٹیڈی کی ٹھنی ہوئی تھی۔ گزشتہ دنوں ہی ان کی جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔

وہاں سے روانہ ہونے کے بعد میں نے سیدھا گھر کا رخ کیا۔ میں اس کار کو کم سے کم وقت اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ [illegible] کو اپنے پاس رکھنا ضروری تھا۔ وہ میں جیسے بھی [illegible] قائم کر سکتا تھا۔ اس کے انجام کے بارے میں مجھے کوئی شبہ [illegible] ہم اسے واپس کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے [illegible] تھا کہ وہ غائب ہو جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے گدھے کے سینگ غائب ہو گئے۔ گدھا تھا اصل نواب [illegible] کے سینگ تھے یہ جیتی شو [illegible] صاحب جو ڈبل کا رول [illegible] سے ادا کرتے آئے تھے مگر دنیا سے شکل ہی جانے [illegible] کار اتنی شاندار تھی کہ مجھے خسرو جمشید پر [illegible] اس سے حسد محسوس ہونے لگا۔ یہ جائز دولت کی [illegible] کی مگر شاہانہ سفر کے تمام تکلفات سے مزین ایسی کار کی [illegible] آدمی فخر کرے تو جائز۔ شاید کسی دن خدا مجھے بھی اس [illegible] میں نے سوچا۔ اگر وہ سب جو میرا حق تھا مجھے مل جاتا اور [illegible] دشمنوں کے بغیر رابعہ قاری جیسی کامیاب ایڈووکیٹ سے شادی میں کامیاب ہو جاتا تو ہم ایسی دو کاریں رکھ سکتے تھے [illegible] آرزو کہ خاک شدہ!... ابھی تو عشق بھی آشفتہ سر ہے [illegible] ہے سودائے خام... نہ جانے کب تک اسی گردش میں قائم [illegible] درمیان... بے سامان... ہم بھی یوں لگے بے نشان... [illegible] گئے اپنی ہی تنہائیوں کے کارواں... اپنے اپنے تو [illegible]

معلوم نہیں کیسے میرا ذہن ایسے وقت میں بھٹک گیا۔ مجھے انتہائی مستعد رہنے کی ضرورت تھی۔ میں نے اس [illegible] پولیس کے سارجنٹ کو اس وقت دیکھا جب وہ مجھے [illegible] سکے لیے سامنے آ چکا تھا۔ اس کی سائڈ میں [illegible] ٹرانسٹ موٹر سائیکل نہ جانے کہاں سے میرے پیچھے لگی تھی۔ وہ آگے آگے چلتے ہوئے ایک ہاتھ سے مجھے رکنے کا اشارہ [illegible] تھا۔ قدرتی طور پر جو خیال سب سے پہلے میرے ذہن میں [illegible] خسرو جمشید نے چوری ہونے والی مرسڈیز کا ماڈل رنگ اور [illegible] نمبر کرا دیا تھا اور پولیس نے اپنے وائرلیس کے نظام پر سب [illegible] اطلاع بھی دے دی تھی کہ اس قسم کی کار پر نظر رکھی جائے۔ یہ [illegible] میری شامت اعمال ہی کے لیے کھڑا تھا کہ ادھر [illegible] میں اس کے سامنے سے گزرا۔

اب نجات کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی تھی کہ [illegible] کے بجائے رفتار بڑھا دوں اور جھکائی دے جاؤں مگر اس کے پاس خطرناک قسم کی موٹر سائیکل تھی۔ وہ میرا تعاقب کر کے [illegible] پکڑ سکتا تھا۔ یہ کار نہ ہر تنگ گلی سے گزر سکتی تھی اور [illegible] موڑی جا سکتی تھی۔ اس کے برخلاف موٹر سائیکل [illegible] تھی جو برق رفتاری کے ساتھ جست لگاتے۔ ایک [illegible] گھوم کر سامنے آ جاتے اور فرار کے راستے ہی مسدود کر دیتے [illegible] طریقہ یہ تھا کہ میں اسے ٹکر مار کے بھاگ جاؤں۔ [illegible]

[illegible] سارجنٹ سیخ تھا۔ وہ گھورتے گھورتے بھی کار کا ماڈل پر یقین کر سکتا [illegible] نے بہتر یہی سمجھا کہ اپنے اعتماد کا مظاہرہ کروں اور اگر مقابلہ [illegible] خالی ہاتھوں کی طاقت کا ہو۔ [illegible] میں نے کار روک کے سر نکالا۔

"یس؟" [illegible]

"پیچھا تو پولیس کے بچے۔" وہ موٹر سائیکل ایک کنارے [illegible] بولا۔

"میں پولیس کا بچہ ہوں تو تم کون ہو؟" میں نے نیچے اتر کے [illegible] "تو کے بچے؟"

"بکواس بند کرو..." وہ ریوالور نکال کے بولا۔ "یہ تمہارے باپ کی گاڑی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے تسلیم کیا۔ "یہ تمہارے باپ کی گاڑی ہے۔"

اتنی اشتعال انگیزی کو برداشت کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ [illegible] اور وہ سیدھا میرے سر پر مارنا چاہا۔ لیکن اس کا ہاتھ نیچے [illegible] میرا ہاتھ تھا اور ضرب اتنی شدید ہو گئی کہ ریوالور اچھل [illegible] اس کے ہاتھ کی ہڈی کلائی کے اوپر سے ٹوٹ گئی۔ میں نے [illegible] وقت میں وہاں سے نکل جانے کے لیے اس کو سنبھلنے کا [illegible] ہاتھوں نے اس کو اپنی طرف کھینچا تو جب [illegible] آگے آیا تو میں نکل گیا۔ اس کا سر بڑی آواز کے ساتھ [illegible] سے ٹکرایا۔ کوئی دوسری کار ہوتی تو اس کی چادر اندر دب جاتی [illegible] مرسڈیز کی باڈی بہت مضبوط تھی۔ سارجنٹ کے حلق سے [illegible] کی آواز نکلی۔ پھر وہ وہیں گر گیا۔ میں نے اسے اٹھا [illegible] کے اندر ڈال دیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس دو منٹ [illegible] سڑک پر سے ایک گاڑی بھی نہیں گزری اور کسی نے [illegible] نہیں دیکھا ورنہ اس واردات کا چشم دید گواہ بن جاتا۔

میرے ذہن نے تیزی سے سوچنا شروع کیا۔ سارجنٹ یقیناً [illegible] دیکھ کر پیچھے آیا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ یہ چوری کی ہے ورنہ اتنی عظیم الشان کار کے مالک سے تو پولیس والے بھی ایسے ہی بات کرنے کی ہمت نہیں رکھتی۔ میں اپنے تحفظ کے [illegible] دلیل دور تھا۔ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے میں نے ایک بار پھر حلیہ بدلنے کے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ میں خود بھی [illegible] کے اندر گیا اور اندر ہی رہتے ہوئے میں نے نقلی نواب کا [illegible] بدل ڈالا۔ سارجنٹ کی وردی جیسے میرے جسم پر فٹ آ گئی۔ [illegible] کے ساتھ ہی اس کے تمام کاغذات اور اس کی جیب میں [illegible] کی بدولت بھی میری تحویل میں آ گئی۔ سارجنٹ کی [illegible] سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی تھی اور ابھی تک میں نے [illegible] سوچا تھا کہ اس کو وہیں چھوڑ دوں گا یا ساتھ لے جاؤں گا۔ [illegible] سارجنٹ کے بارے میں بھی طے نہیں کیا تھا کہ اسے کہاں [illegible] چھوڑوں گا۔ اس نے تو محض شامت اعمال کے باعث میرا [illegible] کی غلطی کی تھی اور جو کچھ اس نے کیا وہ اس کا فرض تھا۔ نہ وہ مجھے پہچان پایا تھا اور نہ میرا ارادہ اسے اس سے زیادہ سزا دینے کا تھا جتنی وہ پا چکا تھا۔ گڑبڑ اس وقت ہوئی جب میں نے اسے بھی ڈکی میں ڈال کر کچھ دور لے جانے کا فیصلہ کیا۔

میں نے سوچا تھا کہ سارجنٹ کو موٹر سائیکل سے ایک ڈیڑھ میل دور بالکل مختلف سمت میں کسی جگہ سڑک کے کنارے ڈال دوں گا جہاں سے کوئی اسے اٹھا لے گا ورنہ وہ خود ہی ہوش میں آنے کے بعد چل پڑے گا۔ خسرو جمشید کے شوفر کی وردی اسے پہنانے کا خیال مجھے ضرور آیا تھا لیکن اس طرح دو الگ الگ وارداتوں کا مسئلہ آپس میں مل جاتا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ سارجنٹ کو بھی ڈکی میں ڈال دوں پھر ایک جگہ اسے چھوڑ دوں اور گاڑی کو دوسری جگہ۔ کہیں سے ایک اور گاڑی اڑاؤں۔ نقلی نواب کو اس گاڑی میں شفٹ کروں اور گھر پہنچ جانے کے بعد دوسری گاڑی کو بھی دور چھوڑ آؤں۔

ڈکی کھول کر دیکھنے پر مجھے نواب خسرو جمشید کے شوفر کی گردن کچھ عجیب طرح سے مڑی ہوئی اور اکڑی ہوئی دکھائی دی۔ زندگی میں تو خسرو جمشید کی گردن اکڑی ہی رہتی تھی مگر بے ہوشی کی کیفیت میں یہ پوزیشن ذرا مشکل لگتی تھی۔ میں نے اسے ہاتھ لگا کے دیکھا تو اس کا جسم بھی اکڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد تصدیق کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ مر چکا تھا اور اسے مرے ہوئے بھی کافی دیر ہو گئی تھی۔ غالباً وہ اسی وقت مر گیا تھا جب میں نے اسے ناک آؤٹ کیا تھا۔ اس کا اتنی جلدی مر جانا میری سمجھ میں نہ آیا۔ اگر وہ سر کی کسی اندرونی چوٹ سے مرتا تو فوراً نہ مرتا۔ ایک شبہ دور کرنے کے لیے میں نے ڈکی میں سر ڈال کے اس کا منہ سونگھا۔ اس کے منہ سے کڑوے باداموں جیسی بو آ رہی تھی۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا۔ گزشتہ [illegible] بھی ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ [illegible] پیڈرو سے کہا تھا کہ گرفتار ہو کے جانے سے بہتر ہے کہ وہ قید حیات سے نجات پا لے مگر اس کو ہمت نہ پڑی تھی۔ خسرو جمشید کا یہ وفادار شوفر جو اس کے ڈبل کا رول بڑی کامیابی سے کرتا تھا' پیڈرو سے زیادہ بہادر ثابت ہوا۔ اس نے وہی کیا جو ایسے حالات میں کرنا تھا۔ وفادار اینڈ کمپنی کے ہر معتمد خاص کو اس کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا۔ اس نے دانتوں کے کسی خلا میں چھپے ہوئے دنیا کے خطرناک ترین زہر سائنائڈ سے بھرے کیپسول کو توڑ دیا تھا اور چند سیکنڈ کے اندر اندر مر گیا تھا۔ غالباً ڈکی کے اندر پہنچتے ہی اسے ہوش آ گیا تھا مگر ہوش آتے ہی اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ قید میں ہے اور اس قید سے رہائی کی کوئی صورت نہیں۔ وہ پرانا آدمی تھا اور اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس کو قید کرنے والے کون ہیں اور اس کے ساتھ کیا سلوک کر سکتے ہیں۔ اس نے فوراً فیصلہ کیا اور اس پر عملدرآمد میں بھی دیر نہیں لگائی۔

اس صورت حالات نے مجھے اپنا پروگرام بدلنے پر مجبور کر

www.paksociety.com

دیا۔ مجھے اپنی کوشش کے رائیگاں جانے اور وقت کے ضائع ہونے کا احساس ہونے لگا۔ محسن اور غالب تو اب مجھے بخشیں گے نہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ آخر اس ایڈونچر کی کیا ضرورت تھی۔ نقلی نواب کے مرنے سے میرا یہ کارنامہ واقعی بے مصرف ایڈونچر ہو گیا تھا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ خواہ مخواہ گاڑی چوری کی۔ نقلی نواب کو اغوا کرنے کا خطرہ مول لیا اور مزید خرابی کہ ایک ٹریفک سارجنٹ کو مار کے گاڑی میں ڈال لیا۔ یہ سب تو تھا ہی اب دوسرا مسئلہ سارجنٹ کی گاڑی کا بھی پیدا ہو گیا تھا۔

سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں نے سارجنٹ کو کھینچ کر باہر نکالا اور سڑک سے دور لے گیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے، چنانچہ ہر طرف ویرانی کا راج تھا۔ کسی نے مجھے یہ کارروائی کرتے نہیں دیکھا۔ میں واپس آ کے گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی کو بھگا لے گیا۔ تقریباً ایک میل سیدھا جانے میں میرے پانچ منٹ صرف ہوئے۔ میری نظر کسی مناسب مقام کی جستجو میں تھی۔ اچانک مجھے سڑک کے کنارے ایک گیراج سا نظر آیا۔ گیراج لکڑی کا مختصر سا کیبن تھا جس کے سامنے تین چار پرانی اور زنگ خوردہ کاروں کے ڈھانچے کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی کو ان کے درمیان میں فٹ کیا۔ نقلی نواب کے کپڑے ڈکی میں ٹھونسے اور پٹرول ٹینک کھولا۔ ڈکی میں ایک پائپ نہ ہوتا تو پٹرول نکالنا خاصا مشکل ہو جاتا مگر کاروں والے عموماً چھوٹا سا پائپ کا ٹکڑا اسی لیے رکھتے ہیں کہ ضرورت پڑنے پر تھوڑا بہت پٹرول نکالا جا سکے۔ ... کی صنف ان کا مسئلہ ہو یا ریک لاک دھونے کا، تھوڑا بہت پٹرول میکینک بھی کھینچ کر نکال لیتے ہیں۔ میں نے پائپ کا ایک سرا ٹینک میں ڈالا اور دوسرے سرے کو منہ سے لگا کے پٹرول کو سانس کے ساتھ کھینچا۔ تھوڑا سا پٹرول میرے منہ میں گیا۔ میں نے فوراً نلکی کو نیچے کر دیا اور پٹرول خسرو جمشید کے شوفر کے کپڑوں پر گرنے لگا۔ میں نے منہ کے پٹرول کو باہر تھوکا مگر پھر بھی میرا حلق کھولتا رہا اور پٹرول سے میرے ہونٹ کے کنارے جلنے لگے۔ میری زبان سن ہو گئی اور اس کی بو سے مجھے متلی سی ہونے لگی۔ جب کپڑے پٹرول میں اچھی طرح تر ہو گئے تو میں نے ڈکی بند کی اور کپڑے گاڑی کی اگلی اور پچھلی سیٹوں پر پھیلا کے لائٹر سے آگ دکھا دی۔ شعلے بھڑکتے ہی میں وہاں سے بھاگا۔

سڑک پر دس منٹ پیدل چلنے کے بعد مجھے اپنے پیچھے سے ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس کا اجالا محسوس ہوا۔ میں نے گاڑی کے قریب آنے کا انتظار کیا اور پھر سڑک کے بیچ میں آ کے اسے روک لیا۔ گاڑی کو ایک عورت چلا رہی تھی۔ وہ بڑی طرح نروس ہو گئی۔ اگر آخری وقت میں چھلانگ لگا کے میں ایک طرف نہ ہو جاتا تو کار یقیناً مجھے کچل دیتی۔

"کیا... کیا بات ہے؟" عورت نے خوفزدہ لہجے میں سوال کیا۔

"کیا تم نشے میں ڈرائیونگ کر رہی تھیں؟" میں نے ... سارجنٹ کے لہجے میں سوال کیا۔ "لائسنس ہے تمھارے پاس؟"

"سب کچھ ہے" وہ چلائی۔ "لیکن اس وقت مجھے جانے دو... مجھے ہاسپٹل پہنچنا ہے... میری بیٹی کی حالت خراب ہے۔"

"آئی ایم سوری" میں نے کہا۔ "آپ اُدھر ہی جا رہی ہیں، مجھے آگے ڈراپ کر دیں۔"

عورت نے سر ہلایا اور دروازہ کھول دیا۔ "بیٹھو" وہ بولی اور ابھی میں بیٹھا بھی نہ تھا کہ اس نے گاڑی چلا دی۔

"کیا ہوا ہے آپ کی بیٹی کو خاتون؟" میں نے ہمدردانہ لہجہ اختیار کر کے کہا۔

"اس کو... کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔" وہ دکھ سے بولی۔ "آج ایک سال ہونے کو آیا۔ اس کے گردے ناکارہ ہو گئے تھے۔ وہ مشین کے سہارے زندہ تھی۔ ہفتے میں دو تین بار ڈائلیسس ہوتی تھی مگر اب وہ بھی ممکن نہیں... جاتا تو ڈاکٹر کوشش کر سکتے تھے لیکن ابھی تک مجھے ... ہوئی۔ اب اس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ اس سے زیادہ ... تکلیف نہیں دیکھ سکتی۔" وہ چالیس پینتالیس سال کی ... مگر کچھ اس کی جسمانی ساخت ایسی تھی اور کچھ اس نے ... کے رکھا تھا چنانچہ وہ تیس برس کی نظر آتی تھی۔ اس کا لباس فیشن ایبل تھا اور اس کے انداز و اطوار سے بھی اچھے ... کی جھلک ملتی تھی۔ وہ بہت ہمت والی بھی تھی کہ تنہا ... اکیلی گاڑی لے کر چل پڑی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس کے ... کوئی مرد کیوں نہیں۔

"آپ اکیلی جا رہی ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں اکیلی ہی ہوں... ایک بیٹی تھی... جب وہ مر جائے گی تو میں بھی مر جاؤں گی... صرف اسی کے لیے زندہ تھی... ایک امید تھی کہ شاید میری کوشش اور دعائیں ... اپنے بچے ... لیکن نہ تھا... میں خود کو شوٹ کر لوں گی" ... سیٹ کی سائڈ پر لٹکا ہوا ریوالور اٹھا کے مجھے دکھایا ... رہ گیا۔ وہ اگر چاہتی تو ریوالور دکھا کے ڈرائے بغیر نکل جاتی ... نے میرے لیے گاڑی روک لی تھی۔

"آپ... یہ کیا کہہ رہی ہیں؟" میں نے کہا۔ "... ہیں آپ... کہ خودکشی کی سوچ رہی ہیں... یہ جانتے ہوئے بھی کہ ... کرنا غلط ہے... اخلاقی اور قانونی طور پر جرم ہے۔"

"کوئی مجھے زندہ رہنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔" وہ بولی۔

"میں کر سکتا ہوں" میں نے اچانک کہا۔ "آپ کا مسئلہ ایک گردے کا ہے نا... میں یہ مسئلہ حل کر دوں گا۔"

"میں اب تک کچھ نہیں کر سکی۔ تو تم کیا کر لو گے؟"

"میں بھی کوشش کروں گا" میں نے کہا۔ "میں اکیلا نہیں ... بہت سے ساتھی ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے کسی کا ... آپ کی بیٹی کے لیے موزوں ثابت ہو۔ آپ نے خود..."

"میرا ایک گردہ میچ کر گیا تھا" وہ میری بات کا مطلب سمجھ کے بولی۔ "مگر قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں بدل سکتا... جس دن آپریشن ہونا تھا اس دن بجلی فیل ہو گئی۔ ہاسپٹل والوں نے اپنا جنریٹر چلایا وہ خراب ہو گیا... گردہ ضائع ہو گیا۔"

"گاڑی یہاں روک لیں" میں نے موٹر سائیکل کو دیکھ کر کہا۔ "اور مجھے بتائیں کہ آپ سے پھر کہاں اور کیسے رابطہ قائم کروں؟"

"کیا پولیس میں اتنے ہمدرد اور نیک دل لوگ ہوتے ہیں؟" وہ میری وردی کو دیکھ کر بے یقینی سے بولی۔

"اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق کسی محکمے یا کسی شہر سے اور کسی ملک سے نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "بہتر ہو گا اگر آپ ... وقت میرے ساتھ چلیں۔ سب سے پہلے میں ہوں۔ پھر میرے ... لڑکے ... میں کسی نہ کسی کا گردہ ضرور میچ کرے گا... نہیں کرے ... ہم اپنے دوستوں سے رابطہ قائم کریں گے۔ ہمارے دوست ... جگہ ہیں جیسے ہم ہیں۔"

"تم خوش قسمت ہو۔ اگر کوئی میرا بھی دوست ہوتا تو میری مدد ... تھا۔" وہ اب تک نہیں روئی تھی مگر ہمدردی کے دو بول ... رونے لگی۔

"پلیز آپ... خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا" میں نے اسے تسلی دی۔

"بہت مشکل ہے اب" وہ بولی۔ "اگر میرا شوہر زندہ ہوتا... تو کیا ہو سکتا تھا... اس کے مرتے ہی سب ساتھ چھوڑ گئے۔"

"کون تھا آپ کا شوہر" میں نے کہا۔ "کب انتقال ہوا ان کا؟"

"انتقال ہوئے کئی سال ہو گئے" وہ بولی۔ "وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا... کم سے کم اس دنیا کی نظر میں... تم نے بھی شاید اس کا نام سنا ہو گا... بہرام دادا کے نام سے مشہور تھا وہ..."

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ بہرام دادا کا ذکر استاد ... نے کیا تھا مگر میرے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ آدھی رات کو ایک سنسان سڑک پر ملنے والی یہ عورت بہرام دادا کی بیوی ... جب میں پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں نے اطمینان سے اس کا ریوالور اٹھا لیا۔

"میں بہرام دادا کو اچھی طرح جانتا ہوں" میں نے کہا۔ "اگر تم جھوٹ نہیں بول رہی ہو..."

"مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی" وہ بولی۔ "اسے پولیس ... کون جانتا تھا۔ تم ہی تو اس کے قاتل تھے۔ میں پہچانتی ہوں..." اس نے یہ کہتے ہی جھپٹ کر ریوالور میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ ... ایک لمحہ تھا جس نے مجھے اس کی طرف سے غافل کر دیا تھا۔ میں یہ امید بھی نہیں رکھتا تھا کہ اس جیسی دبلی پتلی منحوس اور مضمحل عورت ایک توانا مرد کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش بھی کر سکتی ہے۔ مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکی تھی اور اب ریوالور کی نال کا رخ میری طرف تھا۔ مجھے وہ اپنے شوہر کا قاتل سمجھتی تھی اور اس کی آنکھوں میں انتقام کی پیاس کے ساتھ خون اتر آیا تھا۔

"دماغ خراب ہے تمھارا" میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا مگر مجھے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ گولی میرے بائیں شانے کے گوشت کو ادھیڑتی ہوئی ونڈ اسکرین کا شیشہ توڑتی ہوئی نکل گئی۔ اگر اس وقت جب اس نے ریوالور اٹھایا تھا میں نے دیکھ لیا ہوتا کہ اس کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا ہے تو یہ نوبت نہ آتی۔ سیفٹی کیچ سے گولی کے اتفاقیہ چل جانے کا خطرہ بھی باقی نہ رہتا۔ میں نے سیدھے ہاتھ سے اس کی کلائی تھام کے جھٹکا دیا تو ریوالور نیچے گر گیا۔

"ہاں ہاں میں پاگل ہوں" اس نے ہسٹریائی انداز میں چیخنا شروع کیا۔ "پہلے تم نے میرے شوہر کو قتل کر کے مجھے زندہ درگور کیا..."

"ہوش میں آؤ... میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا" میں نے اسے جھنجوڑا۔

"تم نہ سہی... وہ تم جیسا ہی تھا۔ پولیس کی وردی نے اور اس کے ریوالور نے یہ اختیار دے دیا تھا اسے کہ وہ جسے چاہے قانون کے نام پر اپنی گولی کا نشانہ بنا ڈالے" وہ دیوانہ وار چیخنے لگی۔ "آج تم آ گئے ہو میرے ہمدرد بن کے... جھوٹے... فریبی... دغاباز... کیا بچا ہے اب میرے پاس جو مجھ سے چھینو گے" اس نے ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ مجھ سے لڑنا جاری رکھا۔ اپنی کلائی کو میری گرفت سے چھڑانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا، وہ اپنی جگہ بیٹھی بل کھاتی رہی۔ اس نے میرے ہاتھ پر دانت جمانے کا ارادہ چاہا اور دوسرے ہاتھ سے میرا منہ نوچنے کی کوشش کی۔ مجبوراً مجھے اس کے ایک تھپڑ رسید کرنا پڑا۔ میں نے زیادہ قوت صرف نہیں کی تھی مگر ایک محدود سی جگہ میں ہونے والی کشمکش سے نقصان زیادہ ہوا۔ اس کا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرایا۔ وہ آخری بار چیخی اور بے ہوش ہو گئی۔ میں نے اسے دوسری سیٹ پر کر دیا۔ اسی وقت ایک کار سامنے سے نمودار ہوئی اور عین میرے قریب آ کے ٹھہر گئی۔ "کیا ہو رہا ہے یہ..." کار میں سے اترنے والے باکسر ٹائپ شخص نے بڑے خوفناک ارادے سے ہماری کار کا دروازہ کھولا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے باہر گھسیٹتا میں خود باہر آ گیا۔

"تمھارے خیال میں یہاں کیا ہو رہا تھا؟ کسی فلم کی شوٹنگ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

"کیوں چیخ رہی تھی یہ عورت... بولو" وہ غرایا۔ قد میں وہ مجھ سے چار انچ زیادہ ہی تھا اور اسے یقیناً اپنی قوت بازو پر بڑا

www.paksociety.com

نازتھا۔

"دیکھو مسٹر! میں تمھیں شرافت سے جانے کے لیے دس سیکنڈ دیتا ہوں۔"

"شرافت کی ایسی تیسی۔" وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ "تم جیسے شریفوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں میں... اس وردی سے بھی نہیں ڈرتا میں... تم جیسے دس سارجنٹ میرے باپ کو سیلوٹ کرتے ہیں۔" بولا۔

"مگر ان دس میں تم نے مجھے شامل سمجھ رکھا ہے تو یہ تمھاری بھول ہے۔" میں نے کہا۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں تم کو بھی گرفتار کرلوں گا۔"

"مجھے گرفتار کرو گے؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "کس جرم میں؟"

"فرائض کی ادائیگی سے روکنا جرم ہے۔ میٹر ریڈر سے پولیس انسپکٹر تک سب سرکاری ملازم ہیں تمھارے باپ کے نہیں۔" میں نے کہا۔

"اور وردی پہن کر اکیلی عورت پہ دست درازی کرنا تمھارے سرکاری فرائض میں شامل ہے؟" اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

میں اس سے اُلجھنا نہیں چاہتا تھا تو اس کے متعدد اسباب تھے۔ میں نقلی سارجنٹ تھا اور مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر اصلی سارجنٹ کی موٹر سائیکل کھڑی ہوئی تھی۔ اصلی سارجنٹ کسی بھی لمحے ہوش میں آجاتا تو بہت سنگین مسائل پیدا کر دیتا۔ وردی نہ سہی اس کے جسم پہ بنیان اور انڈرویئر بہر حال تھے چنانچہ وہ سڑک تک پہنچتا تو مجھے فوراً شناخت کر لیتا اور مجھ پر ایک درجن مقدمات قائم ہو جاتے۔ ایک سرکاری ملازم کی وردی... سارجنٹ پہ قاتلانہ حملہ، اس کی وردی پہن کر دھوکا دینا۔ گاڑی کو آگ لگا کے تباہ کرنا اس میں سے جلی ہوئی لاش برآمد ہونے کے بعد ایک قتل... چوری اور قتل کے جرائم کو چھپانے کی کوشش۔ ایک عورت پہ بدنیتی کے ساتھ دست درازی اور ایک شریف شہری "سے مار پیٹ جو عورت کی مدد کرنا چاہتا تھا... وغیرہ وغیرہ... یہ کون دیکھتا کہ میں نے ایک مصیبت سے نجات پانے کے لیے دوسری مصیبت مول لی تھی۔ یہ سلسلہ جانے کہاں تک دراز ہوتا۔

میری وجہ سے اس عورت کو بھی اسپتال پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی جس کی بیٹی کی حالت نازک تھی۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر مدد کا جذبہ اس کے حق میں برائی کا سبب بن رہا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے شک تھا کہ وہ قتل و مقتولات کرنے والا جوان ہوش میں نہیں ہے۔ وہ کچھ پیے ہوئے تھا اور اگر میں اپنی جان چھڑا کے نکل جاتا تو معلوم نہیں وہ بہرام والا کی بیوہ کے ساتھ کیا بدسلوکی کرتا۔ وہ پریشانی کی وجہ سے نروس بریک ڈاؤن کا شکار تھی اب اس کے لیے یہ نہ شد ہونا شدہ والا مسئلہ ہو گیا تھا۔ پہلے میں نے اس سے زبردستی لفٹ لی تھی اور ابھی وہ مجھ سے گلو خلاصی میں ہی کامیاب

نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور بدمعاش نے فساد کھڑا کر دیا۔

ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے بالآخر جوابی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ایک گھونسا اس کے منہ پر مارا۔ وہ اس حد تک ہوش میں تھا کہ اس نے خود کو بچانے کی کوشش کی اور گھونسا اس کے شانے پر لگا۔ شدید نہیں تھی مگر وہ ایک دم پیچھے گرا اور چلانے لگا۔ میں نے ایک پیر سے اس پہ دباؤ ڈالا۔

"بھونکنا بند کرو کتے... اور بھاگ جاؤ۔" میں نے کہا۔ وہ اس طرح چیخنے لگا جیسے بلڈوزر کے نیچے آگیا ہو۔ منہ میں یہ سب نشے کا اثر تھا۔ تشہیر ہوا تھا تو جوہر دکھانے کا جذبہ بھی خلاص ہو گیا تھا اور اس نے سامنے تماشے کو مدد کے لیے اکٹھا کرنے کا پروگرام بنالیا تھا۔

"مرگیا... ارے کوئی مدد کرو... مدد کرو..." اس نے لاؤڈ اسپیکر کی طرح آواز نکالی۔ مجھے یقین تھا کہ ذرا شور سے سونے والے تو کیا مردے تک جاگ جائیں گے۔ ابھی میں فرار ہونے کی سوچ ہی رہا تھا کہ بہرام والا کی بیوہ کار سے نکل گئی۔ نہ جانے کس وقت اُسے ہوش آگیا تھا اور اس نے موقع پاتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پہ آکے چابی گھمائی۔ انجن کے اسٹارٹ ہوتے ہی اس نے گاڑی بڑھا دی۔ چند قدم اس کے پیچھے دوڑا مگر یہ ایک اضطراری حرکت تھی میں اس کار کو پکڑ بھی نہ سکا اور بے بسی سے اس کی ٹیل لائٹس اندھیرے میں ڈوبتے دیکھتا رہا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ رکھنے کے باوجود اس عورت کے کام نہ آسکا۔ وہ ایک بہت بڑے محسن کی بیوہ تھی اور مصیبت میں تھی۔ تھا کہ میرزا غالب محسن یا بیٹی کا بھلا کر دیا۔ ایک کہ اگر وہ اس کی بیٹی کی جان بچ سکے گی۔ کہہ سکتا تھا اور وہ اپنی وکیل برادری تک۔ مرزا غالب کے اپنے روابط تھے۔ وہ صحافی برادری کے ذریعے بات کو عوام و خواص کے ہر حلقے تک پہنچا سکتا تھا۔ بڑے پیمانے پہ کوشش کے نتائج خاطر خواہ برآمد ہوتے تھے۔ غالباً بہرام والا کی بیوہ کو کسی نے مشورہ دیا تھا اسے خیال آیا تھا کہ وہ اخبارات میں اپیل شائع کرائے۔

"اب کیا دیکھ رہے ہو؟" پیچھے سے وہ چیخا۔ جو ایک منٹ پہلے زمین پہ گرا ہوا واویلا کر رہا تھا۔ "گئی... پنچھی... اُڑ گئی۔"

بالکل غیر ارادی طور پر میرے منہ سے گالی نکل گئی۔ "تیری ساری اکڑ..." میں نے اسے دبوچ کر ایک اوپر اٹھا لیا۔ وہ پھر چلانے لگا۔ "مرگیا... بچاؤ..." مگر پرواہ نہیں کی۔ میں نے اسے پنکھے کی طرح گھمایا اور پھینک

دوسری طرف دیکھا ہی نہیں جدھر سے سارجنٹ بنیان کو سڑک کی طرف چلا آرہا تھا۔

"ٹھہرو... کون بدمعاش ہے... تمھاری تو..." وہ کسی کی طرح گالیوں کا ورد کر رہا تھا۔ اس نے وردی دیکھ کر شناخت کر لیا تھا۔ اس کا ریوالور تو میں نے چھین لیا تھا مگر میری پستول گم ہو گئی کہ وہ دوسرا ریوالور لہراتا آرہا تھا۔ میں موجود نہیں تھا۔

میں ایک دم بھاگا اور اس جوان کی گاڑی میں جا بیٹھا۔ وہ ایسے تڑپ رہا تھا جیسے آخری وقت قریب ہو۔ اس کے چکر میں گاڑی کا گیٹ کھلا چھوڑ دیا تھا اور انجن بند نہیں کیا تھا۔ چنانچہ مجھے گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہونے میں دیر نہیں لگی۔ میری نیت کا اندازہ بے وردی سارجنٹ نے بھی کر لیا۔ اس نے نشانہ لیے بغیر فائر کیا۔ گولی کار کی باڈی پہ لگ کے میں نے صرف فائر کی آواز سنی اور پھر ٹین کی چادر سے گولی ٹکرانے کی آواز۔ میرے کانوں نے کار کے مالک کی فریاد سنی۔ وہ عالم نزع کو بھول کر اور تڑپنا چھوڑ کر میرے پیچھے آیا تھا۔ "اوئے... اوئے میری گاڑی... اوئے تیری..."

میں اتنی دیر میں کار کے ایکسیلیریٹر کو فرش سے لگا چکا تھا۔ گاڑی اس نے زیادتی پہ احتجاج کرتے ہوئے ایک چھلانگ لگائی اور ہوا ہو گئی۔ دوسرا فائر مس ہو گیا مگر تیسرا پیچھے والے شیشے پر لگا۔ اس کا شیشہ بکھر گیا اور شیشے کے ذرات اندر تک آئے۔

سارجنٹ اپنی موٹر سائیکل سے دور تھا۔ مجھے فوراً پیچھا کرنے کے لیے دو سیکنڈ لگے تھے تب تک پہنچنے اور موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے میں دو تین منٹ تو لگ جاتے۔ اس کے بعد بھی وہ میرا پیچھا کرتا تو میں منتظر رہتا۔ میں موٹر سائیکل کو کہاں تک دوڑا پاتا... مجھے اس کے غصے اور بے بسی دونوں کا احساس تھا۔ احتیاطاً میں نے سیدھی سڑک پکڑنے کے بجائے دوسری متوازی سڑکوں پہ کئی موڑ کاٹے اور جب یہ محسوس کیا کہ کوئی پیچھا نہیں کر سکتا تو میں نے کار کو ایک کوٹھی کے دروازے پر روک دیا۔ میں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ نقلی نواب جمشید کو ابھی اس سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوا تھا مجھ پہ دوسرے پیدا ہو گئے تھے اور اب مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ حقیقت کتنے پریشان ہوں گے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں نقلی خسرو جمشید بن کے اسی گاڑی میں اصلی خسرو جمشید کے گھر پہنچا تھا۔ صرف قیاس آرائی کر سکتے تھے۔ تاہم میری عدم موجودگی نہیں رہی تھی۔ ایک تو مجھ پہ یہ راز منکشف ہوا کہ نواب خسرو جمشید کون ہے۔ نقلی باقی نہ رہی

تھی چنانچہ آئندہ کسی کشیدگی کا امکان نہ تھا۔ دوسری اہم بات بہرام والا کی بیوہ سے ملاقات تھی۔ میں اس کی گاڑی کا نمبر نہیں نوٹ کر سکا تھا اس کا نام اور پتا نہیں پوچھ سکا تھا لیکن اس سے اسپتال میں دوبارہ ملا جا سکتا تھا۔ وہاں بھی اس لڑکی کو تلاش کرتا تھا جس کے دونوں گردے ناکارہ ہو چکے تھے اور جو مشین کے سہارے زندگی کے آخری ایام ایک موہوم سی امید کے سہارے کاٹ رہی تھی کہ شاید قدرت اُسے زندہ رکھنا چاہے تو کسی درد مند یا ضرورت مند کو بھیج دے جو ایک انسانی زندگی بچانے کا ثواب کمانے کے لیے اپنا ایک گردہ عطیے میں قبول کرلے یا مالی مشکلات سے نجات پانے کے لیے اپنا ایک گردہ فروخت کرکے پچاس ہزار یا ایک لاکھ میں زندگی کا یہ سودا کرلے۔ اس میں بھی کوئی معیوب یا غیر اخلاقی بات نہیں ہو گی۔ جو شخص گردہ بیچتا ہے وہ اپنا ضمیر تو نہیں بیچتا۔ باہمی رضامندی سے دو حاجت مند زندہ رہنے کے مواقع حاصل کرتے ہیں اور یہ معاہدہ دو خاندانوں کی خوشیوں کا ضامن ہوتا ہے۔

ابھی میں نے ایک فرلانگ کا فاصلہ پیدل طے کیا ہو گا کہ پیچھے سے ایک موٹر سائیکل سوار آیا۔ میں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا تو وہ خود ہی رک گیا۔ وہ ایئرپورٹ سیکیورٹی کا آدمی تھا اور نصف شب کے بعد کی ڈیوٹی ختم کرکے لوٹا تھا۔ اس نے وردی کے فرق کے باوجود مجھے بھی اپنا ہم پیشہ سمجھا اور گھر تک لفٹ دینے کے بعد ہاتھ ملا کے رخصت ہوا۔ عمداً میں ایک ایسی کوٹھی کے سامنے رک گیا تھا جہاں صرف پورچ میں روشنی تھی اور گیٹ کھلا پڑا تھا۔ میں چند قدم اندر تک گیا اور پھر لوٹ آیا۔ مرزا غالب کا آبائی گھر تقریباً سو قدم کے فاصلے پر اس سے متصل اور متوازی چلنے والی سڑک پر تھا۔

باہر سے کوٹھی کی ویرانی سالہا سال پرانی لگتی تھی اور ایک نظر ڈال کے گزر جانے والا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ برسوں بعد بالآخر بوسیدہ دیواروں والے اس کھنڈر نے اپنے وارث کو بلالیا ہے۔ میں جھاڑ جھنکاڑ والے میدان سے گزرا جو کبھی لان ہو گا۔ اس کے سرسبز تختوں کے گرد رنگین پھولوں کا حاشیہ ہو گا اور اس کی ہریالی نگاہوں کو تازگی بخشتی ہو گی۔ اب وہاں خشک خودرو گھاس تھی۔ کانٹے دار جھاڑیاں تھیں اور خودرو پودوں کے درمیان گرگٹ کی نسل کے زمین میں رہنے والے جانوروں نے بل بنا رکھے تھے... برآمدے کے عقبی حصے کے ایک دروازے کے سوا باقی سب دروازے اور کھڑکیاں جن کا رُخ سامنے کی طرف تھا حسب سابق بند پڑے تھے۔

میں گھوم کر پیچھے گیا تو مجھے ایک کھڑکی کے پردوں سے چھن کر نکلنے والا اجالا گرد آلود شیشوں پہ نظر آیا۔ اندر وہ سب تھے۔ میں کان دروازے سے لگا کر ان کی گفتگو سننا چاہتا تھا مگر ابھی میں

www.paksociety.com

جھکا ہی تھا کہ کسی نے پشت پر جما کے لات رسید کی اور میں دروازے سے گزر کے سیدھا ان کے درمیان پہنچا۔ محسن باہر میرا منتظر تھا اور اسی نے تو مجھے اندر آتا دیکھ لیا تھا مگر میں اُسے نہ دیکھ پایا تھا چنانچہ وہ دبے پاؤں میرے پیچھے آگیا تھا۔ میرا آنا غیر متوقع تھا کہ سب کے قدم اکھڑ گئے۔ کچھ پھرتی مرزا غالب نے بھی دکھائی اور میں تیر کی طرح اندر گیا تو انھوں نے فوراً ٹانگ اڑا دی۔ نتیجہ یہ کہ میں منہ کے بل وہیں گرا جہاں وہ سب میرے آس پاس حلقہ سا بنائے بیٹھے تھے۔

"السلام علیکم حضرات و خواتین!" میں نے اُٹھنے کے بعد چوٹیں سہلاتے ہوئے خفت سے دانت نکال کے کہا۔ "میں کچھ جلدی تو نہیں آگیا؟"

"بالکل نہیں..." محسن نے اندر آنے کے بعد کہا۔ "یہی وقت دیا تھا آپ نے... جلدی تو ہم آگئے تھے... گویا قصور ہم ہیں۔"

"درست آید، دیر تک۔" میں نے کہا۔ "ابھی جو دولتی آپ نے جھاڑی اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔"

"قسم مولا علی کی سکندر بادشاہ... تم نے ہم سب کو تفتیش میں مبتلا کر دیا تھا۔" استاد ٹیڈی نے سنجیدگی سے کہا۔

"تفتیش نہیں، ابوجہل کے بچے... تشویش..." مرزا غالب نے کہا۔ محسن بھی نہیں ہنسا تھا مگر رابعہ، شمعون اور نازو کے ہنسنے سے ان کے غصے کا اثر زائل سا ہوگیا۔ ٹیڈی نے جواب میں غالب کو مرزا جاہل کہا۔

"کیا مصیبت ہے یار؟" محسن نے جھلا کر کہا۔ "کیا طے کیا تھا ابھی کہ سب سیریس رہیں گے... کچھ سزا دیں گے اسے... میں نے تو لات ماردی... ایک ایک ہاتھ تمھیں بھی مارنا تھا۔"

"مجھے اندازہ ہے آپ سب کے دلی جذبات کا۔" میں نے کہا۔ "کچھ ایسے ہی جذبات میرے بھی ہیں لیکن پہلے آپ لوگ میری دکھ بھری کہانی سن لیں... اگر سب آٹھ آٹھ آنسو نہ رونے لگیں تو جو چاہو سزا دو۔ ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔ میں اتنی دیر تک جھک نہیں مارتا رہا۔"

"اتنی دیر تک پھر آپ کیا مارتے رہے مسٹر تیس مار خاں؟" محسن بولا۔

"بھئی ایک تو ہم نے فقط ثواب مارا۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "پھر ایک عدد شریف سارجنٹ کو تھوڑا سا مارا... اتنا کہ وہ اپنا سر نہ اٹھا سکے۔ ایک نامعلوم شخص کو بلاوجہ مارا۔ اس کا دل چاہتا تھا پٹنے کو۔ یعنی اس کی کار میں چھپنا پڑا۔ اس سے پہلے ہم ایک بہت اعلیٰ قسم کی کار تک جھپٹ چکے تھے۔ پھر ایک نیک دل خاتون سے ہم نے زبردستی لفٹ لی۔ اس پہ یاد آیا کہ ہم نے قانون کے ایک جانثیر بھی مارا تھا۔"

"ایک دل خاتون کی عمر، رنگ روپ، ناک نقشہ؟" محسن

بولا۔ یہ سوال حسن رابعہ کی طرف سے کیا جا رہا تھا۔

"اہم بات یہ ہے کہ نیک دل خاتون ہمارے محسن کی بیوہ تھی۔" میں نے کہا۔ "ہم سب کو اس کا ایک قرض چکانا ہے۔"

"دیر میں گزرے۔ اور جہانگیر گویا... اس قرض کی ادائیگی کا خیال طور پر یاد آگیا تھا آپ کو۔" غالب بولا۔

"مرزا جی! اپنی زرد صحافت مت چلاؤ۔" رابعہ نے میرا پورا بیان سنا نہیں اور ایک سنسنی خیز سرخی لگا دی۔" میں نے کہا۔ "جو کچھ میں نے فرمایا ہے اس کی تفصیلات بہت طویل ہوں گی۔ پہلے میری اچھی طرح خاطر تواضع کی جائے... ویسے جیسے آپ لوگ چاہتے ہیں... بلکہ جیسے حق بنتا ہے... کیسے سنگدل لوگ ہیں یہاں کہ لاتیں مارتے ہیں۔ بٹھاتے نہیں کسی پہ... یہ نہیں پوچھتے کہ کیا چاہیے ہو دوست جانتے ہو۔"

"سیدھی طرح بتا دو کیا چاہیے۔" رابعہ نے مصنوعی خفگی سے ڈانٹا۔ کیونکہ حملہ کی پہل بھی کرنے گئی تھی۔

"ایک روٹی کا سوال ہے مائی۔" میں نے فقیر کی طرح صدا لگائی۔ "دو وقت کا بھوکا ہوں... اللہ تیرے دل کی مراد پوری کرے... تیرا سہاگ سلامت رکھے... میرے بچے یتیم ہیں بھائی ہیں۔" میں نے دردناک لہجے میں کہا اور ایک ہاتھ محسن کے سر پہ رکھا اور دوسرا غالب کے سر پہ۔

"بابا جی!" محسن نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "آپ تینوں میں سے جس کو چاہیں بہن بنا لیں۔ بس مجھے بھائی نہ بنائیں۔ بہنوں کو بھائی کہنا گناہ ہے۔"

"چلو بابا جی! یہ لوگ تو شروع ہو گئے۔" شمعون نے کہا اور اس کے ساتھ کچن کی طرف چلی گئی۔ وہاں صرف نازو رہ گئی جو اب تک اپنے اسی میک اپ میں تھی۔ پچھلے پہر والی بدشکل اور خستہ حال بڑھیا بنی ہوئی۔

"خدا کے لیے اب تو حلیہ بدل لو اپنا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ تو غالب کے دل کا ہی کچھ خیال کر لو۔"

"ہاں۔ کتنے پاپڑ بیلے ہیں اس نے۔" محسن نے تائید کی۔

"نہیں... کتنی مونگ پھلیاں بیچی ہیں اس نے۔"

"مونگ پھلیاں تو میں نے زیادہ بیچی ہیں۔" ٹیڈی بولا۔

"غلط! تم کیا مجھ سے اچھے سیلز مین ہو؟" غالب نے کہا۔

"ہاں... میری آواز میں تاثیر تھی۔ ہم استاد ٹیڈی نے کہا۔ لوگ اس پہ کھنچے چلے آتے تھے۔" "میری اس بات کا تو جواب ہی نہیں کہ مونگ پھلی سو نگل لو۔"

"یہ چوری ہے..." مرزا غالب نے کہا۔ "یہ سکندر کا شعر ہے جو ہر قصبے، دیہات کی دیوار پہ لکھا نظر آتا ہے۔ شعر جانتے ہو تمھیں۔"

"پھر تم بھی ہو... ایک شعر نہیں پورا تھا۔"

ٹیڈی نے مشتعل ہو کے کہا۔ "مرزا غالب کو قیامت کے دن کیسے منہ دکھاؤ گے۔"

"شاعری میری اپنی تھی۔" مرزا غالب نے میز پہ مکا مارا۔ "اور مونگ پھلی کی شان میں ایسا قصیدہ لکھ کر تو دکھائے کوئی... میری مونگ پھلی کا بیچنا ہی کا راز تھا... میری سیل پہلے سے زیادہ رہی۔"

"وہ سیر مونگ پھلیاں تم خود چر جاتے تھے۔ اس کو سیل میں شامل کرتے ہو..." ٹیڈی نے چراغ پا ہو کے کہا۔

"تم بھی اس سے زیادہ اپنی آر بڑھانے کے لیے بانٹ دیتے تھے۔" مرزا غالب نے چلا کر کہا۔ "اور تم بارہ گھنٹے ڈکار لیتے رہتے تھے۔"

"صبح سے دوپہر تک لوگ اخبار خریدتے ہیں۔ مونگ پھلی نہیں۔ تم تو سینما کے دو شو ملتے تھے۔" ٹیڈی نے بھی چلا کے کہا۔ "لوگ رات کو ہی مونگ پھلی کھاتے ہیں... کبھی تشفی والی کے بچھتے۔"

"دیکھ بیٹے! شام کے دونوں شو خالی جاتے۔" مرزا غالب نے مزید اشتعال انگیزی کی۔ "لوگ تمھاری صورت دیکھ کر بھاگ جاتے تھے وہ سینما بھی چھوڑ دیتے۔"

"ہاں! ادریس تمھارا گلا ناحق کے لوٹ جاتے۔" ٹیڈی نے ناک بھوں کے کہا۔ "بالکل زہرہ بائی انبالے والی کی طرح گاتے تھے۔ کھالے جو میری مونگ پھلی۔" اس نے مضحکہ خیز زنانہ آواز بنا کے نقل اتاری۔ میں اور محسن تو اس مونگ پھلی کی بھلی جنگ سے بہت خوش تھے اور لطف اندوز بھی ہو رہے تھے مگر رابعہ اور شمعون کے اندر آتے ہی امن بحال ہوگیا۔ انھوں نے نازو سے خاموش تصفیہ کرا لیا اور نازو اٹھی ہی تھی کہ غالب اور ٹیڈی نے ہاتھ ملا لیا۔

"بھئی! سیلز مین تو آپ ہیں... میں تو آپ کی خاک پا۔" غالب نے کہا۔

"نہیں دوست! یہ مجھے شرمندہ مت کرو... تم نے بہت زیادہ مونگ پھلی بیچی۔" ٹیڈی بولا۔ "تم استاد میں شاگرد۔"

"نہیں تم استاد میں شاگرد۔" غالب بولا۔

"اونہوں... تم..." ٹیڈی نے اصرار کیا اور نازو جو اب تک ایک چارپائی پہ بیٹھی ہوئی تھی اٹھ کر ان کے درمیان آگئی۔

"اب کوئی نام نہ لے مونگ پھلی کا۔" نازو نے کہا۔ "کسی کا لفظ منہ سے نکلا تو نہیں۔" غالب اور ٹیڈی نے ڈھٹائی سے ہنسنا شروع کیا۔

"یہ نازو کس محسن کی بیوہ کا ذکر تھا؟" محسن بولا۔ "ہمارا کون محسن فوت ہوا ہے؟"

"اس کے انتقال کو زمانہ ہوا۔" میں نے کہا اور کھانے پہ ہاتھ

صاف کرنے لگا۔ "احسان امیر میاں استاد ٹیڈی پر کیا تھا لیکن ہم سب دوست ہیں تو اس احسان کا قرض بھی ہم سب پہ ہے۔ خدا نے ہمیں موقع فراہم کیا ہے کہ ہم اب یہ قرض اتار دیں۔"

میں نے نقل خسرو جمشید کے اغوا سے بات شروع کی اور مختصراً اپنی اور بہرام دادا کی بیوہ سے ملاقات تک سب کچھ بتا دیا۔ میری توقع کے مطابق استاد ٹیڈی پہ سب سے زیادہ اثر ہوا۔

"تمھیں یقین ہے کہ وہ عورت جھوٹ نہیں بول رہی تھی؟" وہ بولا۔

"نہیں استاد! جھوٹ بول کے اسے کیا ملتا۔"

"مگر پیارے سکندر بادشاہ... جہاں تک مجھے معلوم ہے۔" ٹیڈی نے بے چینی سے ٹہلتے ہوئے کہا۔ "بہرام دادا کی بیوی یا کوئی نہیں تھی۔ تم بیٹی کی بات کرتے ہو۔"

"بہرام دادا سے تمھاری ملاقات کا زمانہ بہت مختصر تھا۔ اس نے تمھاری مدد کی تھی... تم کو اپنا رازدار نہیں بنایا تھا۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے وہ کسی کو بھی اپنے بیوی بچوں کے بارے میں نہ بتاتا ہو... ان کو محفوظ رکھنے کے لیے کسی کے سامنے ان کا ذکر تک نہ کرتا ہو۔"

"اگر یہ سچ ہے تو ہمیں فوراً اس سے ملنا چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "اس عورت کی مدد کرنا چاہیے۔"

"زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔ نہ جانے خدا نے یہ نیکی کی توفیق کس کے مقدر میں لکھی ہو۔ کس کا ایک گردہ میچ کر جائے تو اس کی بیٹی کی زندگی بچ جائے۔"

"کیا ایک گردے کے ساتھ آدمی بالکل صحت مند رہتا ہے؟" ٹیڈی نے کہا۔ "اور زندہ رہتا ہے؟"

"ہاں استاد... یہ قدرت کا حیرت انگیز نظام ہے۔" میں نے کہا۔ "جیسے ایک آنکھ چلی جائے تو آدمی دنیا کو اسی طرح دیکھ سکتا ہے جیسے دو آنکھوں والے۔ اسی طرح ایک گردے اور ایک پھیپھڑے کے ساتھ آدمی بالکل نارمل رہتا ہے۔"

"پھر تو سب سے پہلے میں اپنا گردہ دوں گا۔" ٹیڈی بولا۔ "یہ میرا حق ہے کہ اپنا قرض سب سے پہلے میں ادا کروں۔"

"تمھارے جذبات قابل قدر ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ مسئلہ جذباتی نہیں ہے میڈیکل سائنس کا ہے۔ کسی بھی شخص کے کوئی بھی گردہ نہیں لگایا جا سکتا۔ پہلے بہت سے ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ عموماً ماں باپ یا بھائی بہن کے گردے موزوں ثابت ہوتے ہیں اور جسم انھیں قبول کر لیتا ہے لیکن غیروں کے گردے بھی میچ کر جاتے ہیں۔"

"تم عجیب آدمی ہو کہ اس کا نام پتا نہیں پوچھا۔"

"میں نے بتایا نا کہ وہ ایک دم بھاگ گئی۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"اب تو ہم صبح ہی سیدھا اسپتال جا کے معلوم کریں گے۔"

"یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔" مرزا غالب نے کہا۔ "میں اپنے اخبار کے دفتر اور دوسرے صحافی دوستوں سے کہوں گا۔ وہ ایک گھنٹے میں پتا چلا لیں گے اور اگر بدقسمتی سے ہم میں سے کوئی بھی اس ثواب کا اہل نہ ہوا تو پھر پاکستان بھر میں اپیل بھی وہی لوگ شائع کرا دیں گے۔"

"ہم مشترکہ طور پر معاوضہ ادا کریں گے۔" ٹیڈی بولا۔ "خدا کا شکر ہے کہ وہ پندرہ سیر سونا ابھی تک محفوظ رہا... شاید اسی دن کے لیے..."

"مجھے ایسا لگتا تھا کہ اس عورت کے مالی حالات بھی ٹھیک نہیں ہیں... ورنہ یہ کام وہ خود بھی کر سکتی تھی۔" میں نے کہا۔ "اخبار میں اشتہار دے کر کسی کو معقول معاوضے کی پیشکش کرتی۔"

"مگر تم نے کہا ہے کہ وہ گاڑی میں تھی۔ خود چلا رہی تھی۔" محسن بولا۔

"ہاں، گاڑی تو چلا رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ گاڑی اسی کی تھی۔ دوسری بات یہ کہ گاڑی کوئی بہت زیادہ قیمت کی نہیں تھی... معمولی سی پرانی گاڑی تھی۔"

"ایک گردہ جسے ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔" غالب نے تلخی سے کہا۔ "وہ ایک گاڑی سے زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔ اہمیت گاڑی کو ملتی ہے۔"

"جب تک زندگی کی گاڑی چلتی ہے ہم یہی رویہ رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پھر ایک دن اچانک ہم پر یہ عیاں ہوتا ہے کہ جسم کی مشینری کا ایک معمولی سا پرزہ بھی کتنا گراں قیمت ہے۔ بعض اوقات کروڑوں اربوں روپے میں زندگی کی چند سانسوں کے لیے یہ سامان مستعار بھی نہیں ملتا۔"

"میرا خیال ہے میں ابھی چلا جاؤں۔" ٹیڈی اچانک بولا۔

"ابھی جا کے کیا کرو گے؟" میں نے کہا۔ "کوئی تمھیں وارڈ میں نہیں جانے دے گا اور تم سارے اسپتال میں بھٹکتے پھرو گے۔ اسی میں صبح ہو جائے گی۔ یہی کام غالب صبح آسانی سے کر لے گا۔"

"لیکن صبح تک... اسے کچھ ہو نہ جائے۔" ٹیڈی بولا۔

"خدا پر بھروسا رکھو۔" میں نے کہا۔ "اسی نے تو یہ اسباب پیدا کیے کہ میں بہرام داوا کی بیوہ سے ملا اور اس کے حالات سے واقفیت ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس میں خدا کی مرضی اور مصلحت شامل تھی۔ وہ ہمیں اتنی مہلت بھی دے گا کہ ہم ایک نیکی کما سکیں۔ میرا دل کہتا ہے اگر خدا کو یہ منظور نہ ہوتا کہ وہ لڑکی زندہ رہے تو یہ اتفاقیہ ملاقات بھی نہ ہوتی۔ یہ کوئی ایسا مرض نہیں جو مہلت ہی نہ دے۔ اس بیماری میں مریض کی ظاہری حالت کئی بار اتنی بگڑ جاتی ہے کہ زندگی کی امید نہیں رہتی مگر وہ پھر سنبھل جاتا ہے۔"

"اس کے علاوہ..." غالب بولا۔ "سارے ٹیسٹ صبح ہی ہوتے ہیں... اس وقت ہم سب جا کے کھڑے ہو جائیں تب بھی ڈاکٹروں کا جواب یہی ہوگا کہ یہ بہت مشکل اور پیچیدہ قسم کے ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ ٹیسٹ ہو جانے کے بعد ہی ڈاکٹر کوئی حتمی فیصلہ کرتے ہیں۔ گردہ دینے والے کو ایک مقررہ تاریخ پر طلب کرتے ہیں۔ پھر آپریشن وغیرہ ہوتے ہیں۔"

ٹیڈی خاموش ہو گیا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس امر نے جذباتی طور پر اسے کتنا مضطرب کر دیا ہے۔

"تم یہ بتاؤ استاد کہ وہ سب ریکارڈ ہو گیا؟" محسن نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

"ہاں، کیا تم سن نہیں رہے تھے؟" غالب بولا۔

"میں نے اور تم نے تو سن لیا تھا۔" میں نے کہا۔ "سب نے تو کچھ نہیں سنا۔"

"نازو کا یہ کارنامہ ہم سب کے لیے باعث فخر ہے۔" محسن بولا۔ "ٹیپ تو میں نے نہیں سنے مگر ٹیڈی نے جو کچھ بتایا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلاور اینڈ کمپنی کے عزائم کتنے خطرناک ہیں..."

"لیکن اب خدا کی مدد شامل حال رہی تو ہم ان کے عزائم خاک میں ملا دیں گے۔" میں نے کہا۔ "نازو کی بے مثال ہمت کے باعث ہی ہمارے لیے یہ معلومات حاصل کرنا ممکن ہوا... ہم سب اندھیرے میں رہتے اور دشمن کھیل کھیلتا رہتا۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ نازو محفوظ رہی... اسے کچھ ہو جاتا تو..."

"مجھے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی یقین نے میری حفاظت کی۔" نازو بولی۔

"ایک وقت ایسا آیا تھا جب تمھارے یقین کو شکست ہو سکتی تھی۔ اس وقت جب ایس پی سراج تمھاری اصلیت جاننے کے لیے پولیس کے مخصوص حربے استعمال کرنے پر تل گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس وقت میں گھبرا جاتی تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جاتا۔"

"تمھاری اداکاری بہت لاجواب تھی۔" میں نے کہا۔

"سراج کسی اداکاری سے متاثر ہونے والا آدمی نہیں تھا۔ تو خدا نے کسی کی سن لی اور وہ گھر کی ماں آ گئی۔" نازو بولی۔

"کس کی سن لی؟" شہلا بولی۔ "میری اور رابعہ کی سنی ہوگی۔"

"ممکن ہے غالب کی سنی ہو۔" میں نے کہا۔ "دل سے دعا بھی اثر رکھتی ہے... مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تم بھی ایک خطرناک فیصلہ کر چکی تھیں۔"

"تم نے کیا فیصلہ کر لیا تھا؟" نازو سے کہا۔

"بس سو جھتی ہی باتیں لگاتے گئے۔" میں نے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ شیطان تمھارے ساتھ کوئی زیادتی کرتے اور ہم سب کچھ بھی نہ کرتے۔"

"قسم مولا علی کی... سوچا میں نے بھی یہی تھا۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "اگر وہ کمینہ چندو اپنے باپ سراج کے حکم پر عمل کرتا تو اس کے پیچھے میں اندر گھس جاتا... اس کے بعد تخت یا تختہ۔"

"تم نے اکیلے ہی چڑھائی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا استاد؟" محسن نے کہا۔

"ہاں، پہلے تو مجھے اتنا تاؤ آ رہا تھا کہ دل چاہتا تھا دروازہ توڑ کے اندر گھس جاؤں اور سالوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں۔" ٹیڈی بولا۔

"کافی زبردستی سے جانی پڑتی تمھیں۔" غالب نے کہا۔ "اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کمینے تم کو انھی اینٹوں سے انار کلی کی طرح دیوار میں زندہ چن دیتے۔"

"اسی لیے میں نے برداشت سے کام لیا۔" استاد ٹیڈی سادگی سے بولا۔ "میں نے سوچا کہ سب کے ساتھ حملہ کرنا چاہیے بس اسی وقت آن کی آن میں حالات کو بگڑنے سے بچا لیا۔"

"اس وقت بڑھیا کا آنا واقعی تائید ایزدی ثابت ہوا۔" نازو نے ٹیڈی کی بات پہ مسکرا کر کہا۔ "ورنہ معلوم نہیں کیا ہوتا... کوئی زیب آنے کی جرأت کرتا تو مارا جاتا۔ اس کے بعد اگر دلاور آ جاتا تو شاید بچ کر نکل آنے کی کوئی صورت پیدا ہو جاتی۔ یہ سب کوشش ترک نہیں کی جا سکتی تھی۔ اگر دلاور یا سراج میں سے کوئی پکڑا جاتا تو اسے ڈھال بنا کے نکلنے کی کوشش کامیاب ہو سکتی تھی۔"

"یہ کامیابی بھی ناکامی ہی ہوتی۔ ہمارا راز فاش ہو جاتا اور تمھاری محنت رائیگاں جاتی۔" میں نے کہا۔ "جو ہوا اچھا ہوا... اب تو آگے کی سوچنا چاہیے۔"

"آگے کی صبح سوچیں گے۔" محسن نے منہ پھاڑ کے جماہی لی۔ "معلوم ہے کہ رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کل ہوٹل بھی نہیں جانا ہے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "نیند تو مجھے بھی آ رہی تھی پہلے... لیکن اب بہرام داوا کی بیوہ کے خیال سے پریشانی ہو رہی ہے۔"

"تمھاری پریشانی سے اس کی پریشانی دور نہیں ہوگی۔" محسن نے سمجھایا۔ "ہم سب کو عملی طور پر جو کچھ بھی کرنا ہے وہ کل ہی ہو سکتا ہے۔ اس وقت کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ہماری عدم موجودگی میں رابعہ اور شہلا نے بہت کام کیا تھا۔ انھوں نے تیسرا کمرہ بھی جھاڑ پونچھ کے رہائش کے قابل بنا لیا تھا۔ اسے گیسٹ بیڈروم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ صفائی کے باوجود اب وقت اس کمرے کی فضا میں موجود تھا۔ کئی سال پرانے بیڈ کو جھاڑنے سے گرد ہٹ گئی تھی لیکن اس کا اڑا ہوا رنگ اور داغ دھبے باقی تھے۔ یہی حال پردوں کا تھا جو جگہ جگہ سے بوسیدہ ہو گئے تھے۔ فرش پر سے تنکے اور دوسرا کوڑا کرکٹ ہٹا دیا گیا تھا لیکن قالین پر اتنی گرد جم گئی تھی کہ اسے اٹھا کر باہر لے جائے بغیر صاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دیواروں پر جہاں تک رابعہ یا شہلا کا ہاتھ پہنچ سکتا تھا وہاں تک جھاڑو سے مکڑی کے جالے وغیرہ ہٹا دیے گئے تھے مگر اوپر کے گوشوں میں اور چھت کے ساتھ ساتھ اب بھی جالے دکھائی دیتے تھے۔ اگر بجلی کی روشنی ہوتی تو شاید اس ماحول کا آسیب کچھ کم محسوس ہوتا لیکن موم بتی کی مدھم روشنی سے ویرانی کا تاثر ختم نہیں ہوتا تھا۔ یہ گیسٹ بیڈروم شہلا اور محسن کے حوالے کر دیا گیا۔ دوسرا کمرہ کھانے کا کمرہ تھا۔ اس کی بہت قدیم وضع کی میز کرسیاں ہٹانے کے بعد اتنی جگہ نکل آئی تھی کہ غالب اور ٹیڈی فرش پر دراز ہو جائیں۔ بستر تکیوں کی جگہ وہ کشن استعمال کیے جو ڈرائنگ روم کے صوفوں پر رکھے ہوئے تھے۔

"بالکل ایسا لگتا ہے جیسے یہاں بھی قالین ہے..." میں نے کہا۔

"یہ قالین ہی ہے اور بہت اعلیٰ قسم کا۔" غالب نے کہا۔ "جس پر آپ لیٹے ہیں۔"

"اچھا؟" میں نے سر کھجایا۔ "اس کا رنگ کیسا تھا؟"

"مجھے یاد نہیں۔" غالب نے حقارت سے کہا۔ "مٹی کئی سال سے پڑ رہی ہے۔"

"ہاں، اب مٹی زیادہ ہے قالین کم۔" میں نے کہا۔ "پہلے مٹی اس قالین پر پڑتی رہی۔ اب ہم مٹی میں پڑے ہیں۔ تم شکر کرو کہ ہم قالین پہ لیٹے ہوئے ہیں... مٹی پر نہیں لیٹے ہیں۔"

"ایک ویکیوم کلینر سے سارے قالین صاف ہو جائیں گے..." غالب نے کہا۔ "جب گرد ہٹے گی تو پھر دیکھنا قالین کا اصل رنگ۔"

"خدا کا شکر ہے چوہے نہیں ہیں۔" ٹیڈی بولا۔ "ورنہ یہاں سونا مشکل ہو جاتا... لے تیری..." وہ ایک دم اچھلا اور اچھل کر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ ٹیڈی کی بات ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک موٹا تازہ چوہا دروازے سے اندر آ گیا۔

"سالا کہیں چھپ کر آسکی کر رہا تھا۔" ٹیڈی نے کہا اور اس پر جوتا پھینکا۔ اس کے بعد بڑی بھگدڑ مچی۔ چوہا ڈرائنگ روم میں چلا گیا جہاں رابعہ اور نازو آمنے سامنے کے بڑے صوفوں پر دراز تھیں۔ انھوں نے چیخ ماری اور صوفے پر کھڑی ہو گئیں۔ میں، غالب اور ٹیڈی چوہے کے پیچھے لگ گئے۔ ہم نے باری باری نشانہ لے کر جوتوں سے حملہ کیا مگر چوہا ہر بار بچ گیا۔ وہ کبھی ایک صوفے کے نیچے چلا جاتا تھا کبھی دوسرے کے پیچھے چھپ جاتا۔ کبھی نازو چیخ مار کے دوسرے صوفے پر رابعہ کے ساتھ

www.paksociety.com

جا کھڑی ہوتی تھی تو کبھی رابعہ اور وہ ایک ساتھ تیسرے صوفے پر چھلانگ مارتی تھیں۔ ہماری ہنسی سے ان کو مزید تقویت کا سامان تھا۔ ان دونوں کی جرأت مندی اور بے خوفی اچھے خاصے مردوں کو شرمندہ کر دیتی تھی۔ رابعہ نے دشمنوں کا مقابلہ بڑی ہمت سے کیا تھا۔ اسے قید میں شدید ترین جسمانی اذیت دی گئی تھی اور ابھی گزشتہ دنوں وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں میرے ساتھ ایم ڈی بلیو ڈی کمپلیکس سے باہر نکلی تھی اور اس گاڑی سے وہ جوابی فائرنگ کرتی رہی تھی۔ دوسری نازو تھی۔ مجسم قیامت... مار دھاڑ سے بھرپور اور قتل و خونریزی کو کھیل سمجھنے والی جو تن تنہا دشمن کے قلعے میں داخل ہو گئی تھی اور بحفاظت لوٹ آئی تھی۔ یہاں ایک چوہا دیکھ کر دونوں حواس باختہ تھیں اور یہی سب سے بڑا لطیفہ تھا۔ ہمارے شور اور قہقہوں نے محسن کو بھی بیڈروم سے کھینچ نکالا۔ اس کی نوعمر بیوی بھی آنکھیں ملتی اندر آ گئی۔ پھر اسے ہنگامے کا سبب نظر آ گیا۔ اس نے بھی ایک دلخراش چیخ ماری اور اس صوفے پر چڑھ گئی جہاں دو بہادر خواتین پہلے ہی لرزہ براندام تھیں۔ محسن ہمارے ساتھ شکار میں لگ گیا اور چوہا جس کے لیے فرار کے سارے راستے مسدود ہو گئے تھے، بالآخر محسن خان کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ چند جوتے کھانے اور مسلسل دوڑنے سے وہ نیم جان پہلے ہی ہو رہا تھا۔ محسن خان نے ایک بانس اٹھا رکھا تھا جس پر جھاڑو اس طرح باندھی گئی تھی جیسے رائفل پر سنگین لگائی جاتی ہے۔ اس سے دن میں جالے صاف کیے گئے تھے۔ اب محسن نے طویل فاصلے سے وار کرنے والے اس ہتھیار سے چوہے پر وار کیے اور اسے مار دیا۔

اس کے بعد مزید ہڑبونگ مچی کیونکہ ابھی خواتین نے سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ محسن نے چوہے کو دم سے پکڑ کے اٹھا لیا۔

"یار سکندر! تو نے غور کیا۔ اس میں اور میرے سالے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دیکھنے میں ویسا ہی ہٹا کٹا اور کالا بھجنگ اسمارٹ اور ڈرپوک۔" وہ بولا۔

"اتفاق دیکھو کہ نمبر بھی شیڈی کو آیا تھا۔" غالب نے لقمہ دیا۔

"آیا ہو گا بڑے بھائی سے ملنے۔" محسن بولا۔ "وہ بھی مارا جائے گا کسی دن اسی طرح میرے ہاتھوں... سالا چوہا۔"

"محسن... یہ کیا بدتمیزی ہے۔" شعلہ چلائی کیونکہ شیڈی کسی پریشر ککر کی طرح پھٹنے والا تھا۔

"یہ بدتمیزی نہیں چوہا ہے... یہ لو..." اس نے چوہے کو شعلہ کی طرف اچھال دیا۔ وہ چیخ مار کے بھاگی۔

"یہ چوہا نہیں چھچھوندر ہے۔" اب اسے غالب نے اٹھا لیا اور اس کو ناک کے قریب لا کے سونگھا۔

"کیا اس کے سر میں چنبیلی کا تیل ہے؟" میں نے کہا۔

"یہی دیکھ رہا تھا... ذرا تم دیکھنا..." اس نے چوہا نازو کی طرف پھینکا۔

نازو ایک صوفے سے دوسرے پر کود گئی۔ "میں بتاؤں گی تم کو..." وہ چلا کے بولی۔ اب چوہا میرے قریب آ پہنچا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا تو رابعہ کی حالت غیر ہو گئی۔ میں آگے بڑھا۔

"دیکھو سکندر... خبردار... باہر لے جاؤ اسے۔" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے چلائی۔ "دفن کرو... دفع کرو اسے۔"

"کیوں... اچھا بھلا آدھا سیر گوشت ہے۔" محسن نے کہا۔ "پلاؤ پکے گا زبردست... یا قورمہ... موش مسلم کھایا ہے؟"

اب پوزیشن یہ تھی کہ جیسے ہی میں آگے بڑھتا تھا وہ تینوں دوسری جانب دوڑ جاتی تھیں۔ ان کا احتجاج اور ان کی فغاں سب کو بے حد محظوظ کر رہی تھی اور ہم سب کے ہنستے ہنستے آنسو نکل آئے تھے۔ جب شیڈی نے جھاڑو مار کے چوہا نیچے گرایا اور اٹھا کے باہر پھینکا تو یہ ڈرامہ ختم ہوا۔ ہم پھر لیٹے تو بہت دیر تک ہماری ہنسی نہیں تھمی۔ کافی دیر بعد جب ہم نے پھر سونے کا موڈ بنایا تو رابعہ اور نازو معصوم صورت بنائے دروازے میں نمودار ہوئیں۔

"اب کیا ہو گیا... کیا وہ میرا سالا آ گیا؟" غالب گرجا۔

"نہیں یار... میرا سالا ہو گا..." میں نے کہا۔

"ہم بات نہیں کرتے تم سے۔" رابعہ نے کہا۔

"دونوں ایک جیسے بدتمیز ہو..." نازو بولی۔ "بھائی شیڈی! ذرا تم ادھر آؤ۔"

"آہا ہا... بھائی شیڈی..." غالب نے نقل اتاری۔ "شرافت اور شائستگی ٹپکتی ہے لہجے میں۔"

"ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے بھی نقل اتاری۔ "بھائی شیڈی آپ ادھر ہمارے کمرے میں سو جائیں... یہی بات ہے نا...؟"

بات یہی تھی چنانچہ ان دونوں کو مزید شرمندگی اٹھانا پڑتی لیکن شیڈی نے انہیں بچا لیا اور خود بھی ان کے ساتھ چلا گیا۔ وہ بھی ہم سے جان چھڑانا چاہتا تھا اور اسے موقع مل گیا تھا کہ ایک شریف اور بہادر بھائی کا رول ادا کرے۔ ہم بہت دیر تک لیٹے ہوئے گپ کرتے رہے۔ دوسرے کمرے میں جا کر وہ ان دونوں کے درمیان خالی جگہ پر لیٹ گیا تھا۔ رابعہ اور نازو اس کے دائیں بائیں صوفے کے اوپر تھیں اور وہ نیچے قالین پر تھا۔ ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ رات کو شیڈی کا شور و غوغا سنائی دیا۔ میں اور غالب فوراً اٹھ بیٹھے۔

"خدا خیر کرے اب کون سی مصیبت آ گئی ہے کیا..." غالب بولا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے... ان کا قیدی آ گیا ہے یہاں..." میں نے کہا۔

"یار ادھر آؤ..." شیڈی نے کہا۔ اس کے بولنے سے پہلے ہم کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ دوسرے کمرے میں عجیب منظر تھا۔ رابعہ اور نازو تو سکون سے سوئی پڑی تھیں جو خاصی حیرت کی بات تھی۔ انتہائی ہنگامے سے اتنی خوفزدہ ہونے کے بعد وہ کتنی جلدی مطمئن ہو گئی تھیں کہ اب ڈر کی کوئی بات نہیں رہی کیونکہ ان کے درمیان ایک محافظ موجود ہے۔ خوف کا احساس بھی نفسیاتی تھا اور تحفظ کا بھی... استاد شیڈی قالین کے اوپر ایسے ہاتھ مار رہا تھا جیسے عینک لگانے والا عینک تلاش کر رہا ہو۔

"مرزا جی! تم کو کچھ یاد ہے؟" شیڈی نے کہا۔ "اس کونے میں کیا تھا؟"

"اس کونے میں...؟" غالب نے ایک صوفے کے آخری سرے کے پیچھے دیکھا۔

"ہاں... ابھی سوتے میں میرا پیر ادھر گیا تو ایسا لگا جیسے فرش کھوکھلا ہو..." شیڈی نے کہا۔ "تم بھی دیکھو، قالین کے نیچے تختہ ہے۔"

"ہوں... ہے تو سہی..." میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر تختے کے ابھرے ہوئے کنارے تلاش کیے۔

"یہاں ایک تجوری رکھی ہوئی تھی۔" غالب نے کہا۔ "لیکن لکڑی کا تختہ کہاں سے آ گیا۔ تجوری تو کس سٹیل کی بنی ہوئی تھی۔ اس پر بم بھی اثر نہ کرتا۔ اس کی سطح فرش کے برابر تھی لیکن بعد میں اسے تین چابیاں لگا کے ہی کھولا جا سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار ڈیڈی نے اسے میری موجودگی میں کھولا تھا۔ انہوں نے قالین ہٹایا تو مجھے اس کونے میں ٹائل والے موزیک کے ڈیزائن کی جگہ ایک سیاہ مربع دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی کیونکہ اس سے پہلے کبھی وہاں سے قالین ہٹایا گیا تھا تو مجھے کچھ نظر نہیں آیا تھا... پورا فرش ایک جیسا ہی تھا۔ میری حیرانی دیکھ کر ڈیڈی نے ہنس کے لیا اور چوکور کینوس کا ٹکڑا اس سیاہ سطح پر پھیلا دیا اور سارا فرش ایک جیسا ہو گیا۔ اس کینوس کے ٹکڑے پر وہی ڈیزائن اسی رنگ میں پینٹ کیا گیا تھا اور اس کے نیچے کوئی چپکنے والی چیز تھی۔ قالین ہٹانے پر بھی ایک نظر میں کوئی بھی محسوس نہیں کر سکتا تھا کہ ایک کونے میں تجوری ہے۔ دوبارہ کینوس ہٹانے کے بعد انہوں نے تالی سے ایک چابی لی اور مجھے دکھائی تو اس سیاہ سطح کا چھوٹا سا سوراخ نظر آیا۔ انہوں نے چابی کو درمیان میں رکھ کے ذرا سا دبایا تو ایک جگہ چابی فٹ ہو گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے کار کے ڈور لاک کی چابی اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ اس چابی نے سوراخ تلاش کر لیا تھا اور اندر گھس گئی تھی۔ اسے ایک بار گھمانے کے بعد ڈیڈی نے دوسری چابی لی۔ اس پر آٹھ نمبر لکھا تھا۔ دوسری چابی کو انہوں نے بالکل دائیں جانب رکھا اور اسی طرح دبایا تو وہ بھی فٹ ہو گئی۔ اسے گھمانے سے پہلے والی چابی نکل آئی۔ ڈیڈی نے مجھے بتایا کہ جب تک دوسری چابی نہیں نکالی جائے گی پہلی چابی اندر پھنسی رہے گی۔ یہی دوسری چابی کے ساتھ ہوا۔ اسے نکالنے کے لیے تیسری چابی بائیں جانب لگانا پڑی اور تیسری چابی پر چھ کا ہندسہ لکھا ہوا تھا۔"

"سات سو چھیاسی۔" میں نے کہا۔ "گویا بسم اللہ۔"

"ہاں... بسم اللہ کے اعداد پورے ہوتے ہی ہموار سطح پر ایک ہینڈل سا ابھر آیا۔ اسے ڈیڈی نے ایک بار سیدھے ہاتھ کی طرف گھمایا اور پھر الٹے ہاتھ کی طرف۔ اس سے تیسری چابی نکل آئی اور تجوری کا دروازہ اندر کی طرف کھل گیا... وہ بہت بھاری دروازہ تھا۔ بعد میں ڈیڈی نے پھر سے کھڑا کر کے اوپر کھینچ کر بند کر دیا تو میں اسے ہلا بھی نہ سکا لیکن اتنا وزنی دروازہ کھلتے ہوئے جھٹکا نہیں تھا بلکہ آہستہ آہستہ نیچے گیا تھا۔ اندر نہ جانے اسپرنگ اور لیور کا کیا مشینی نظام تھا جو اسے سنبھالے رکھتا تھا۔"

"ایسی نادر روزگار تجوری تمہارے ڈیڈی نے کہاں سے بنوائی تھی؟"

"وہ لندن کی کسی سیکورٹی فرم کے مالک کو جانتے تھے۔ اسے برٹش گورنمنٹ نے ریزرو بینک آف انڈیا کے اسٹرانگ روم کے تحفظ کا انتظام بہتر کرنے کے لیے دہلی بلایا تھا۔ معلوم نہیں کون اسے دہلی کی جامع مسجد لے گیا اور وہاں اس نے سیڑھیوں پر بیٹھے بارہ مسالے والی گھسیٹے خاں کی حلیم کھا لی۔ اس بار وہی حلیم نے نازک مزاج انگریز کے پیٹ کا وہی حشر کیا جو نادر شاہ نے دلی کا کیا تھا۔ اس کا علاج میرے ڈیڈی نے کیا جو اس زمانے میں وہاں تھے۔ بعد میں وہ لندن گئے تو انہی کے مہمان ہوئے۔ وہ انہیں ہر ایک سے ملواتا تھا تو یہ واقعہ ضرور سناتا تھا کہ دہلی میں اس نے پاؤنڈ والا حلوا کھایا تھا تو اس ڈاکٹر نے مجھے چھٹی نہیں دی تھی۔ وہ مگر یہی کہتا تھا کہ انڈین پولیس سخت خطرناک ہے۔ انہوں نے وہ آتش گیر حلوا بیچنے والے کو پکڑا تو تھا مگر پھر چھوڑ دیا کہ حلوے میں ذرا نمک کم تھا اور کوئی خطرناک بات نہیں تھی۔"

مجھے اور غالب کو اس بیان پر بڑی ہنسی آئی۔ مرچ بالکل نہ کھانے والے انگریز کے لیے تو وہ تیز سرخ مرچوں والا دھواں دھار حلیم واقعی بارود سے کم آگ لگانے والا نہ تھا۔ پولیس نے انگریز حاکم کا حال پتلا دیکھ کر مجبوراً حلیم فروش کو پکڑا ہو گا اور اس کی حلیم کی دیگ نوش فرمانے کے بعد چھوڑ دیا ہو گا۔ ظاہر ہے اسی سے ان کو نمک کی کمی کا پتا چلا تھا۔

"یہ تجوری کسی جوہری نے بنوائی تھی؟" غالب بولا۔ "اس جوہری کو ڈاکو اٹھا کے لے گئے اور اس کی بیوی سے تاوان کی اتنی قیمت طلب کی کہ آدھی دکان خالی ہو گئی۔ میاں چھوٹ کر آیا تو اطلاع ملی کہ بیٹے کو قبائلی اغوا کر لے گئے ہیں۔ وہ باغیوں کی سرکوبی کی مہم پر گیا تھا اور اسے رزمک کی چھاؤنی میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے رپورٹ کیے دو ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے۔ باقی آدھی دکان اس عورت نے اپنی مامتا پر قربان کی۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ تجوری بیچ دی تھی اور جوہری اسے تجوری میں رکھ کے کیا کرتا۔ وہ تجوری

www.paksociety.com

مد سے جا سکا اور نہ انہیں واپس تھا سے میرے والد کو گفٹ کر دیا۔ ڈیڈی بہت پریشان ہوئے کہ اس تحفے کا کیا کریں؟ انکار کریں تو بد تہذیب کہلائیں اور قبول کریں تو اسے سوٹ کیس میں ڈال کر کیسے لے جائیں۔ وہ ایک سوٹ کیس میں سامان سفر ڈال کے پھرنے کے عادی تھے مگر میرے بابا ان کی پریشانی کو بھانپ گئے اور انھیں تسلی دی کہ یہ تجوری ان کے دروازے تک پہنچانا اور اسے نصب کرانا بھی انہی کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔ بعد میں یہ تجوری واقعی کام آئی۔"

"کیا ڈیڈی تم کو رکھتے تھے اس میں؟" میں نے کہا۔

"نہیں! وہ کچھ بہت قیمتی ہیرے جواہرات اور خاندانی قسم کے زیورات میری والدہ کو مل گئے۔" غالب بولا۔

"کہاں سے مل گئے... سڑک پر پڑے ہوئے؟" ڈیڈی بولا۔

"وہ تم نے تھے اپنے باپ کو۔" غالب نے کہا۔ "واضح ہو کہ میری نانی کسی والیٔ ریاست کی چھٹی یا ساتویں بیگم تھیں... اور روایات شاہد ہیں کہ حسن و جمال میں ثانی نہیں رکھتی تھیں لیکن یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ حضور نواب کی نگاہ انتخاب کی کسوٹی پہ کیسے پوری اترتیں۔ وہ تو عقد ہی اسی سے فرماتے تھے جو چندے آفتاب و چندے ماہتاب ہو۔ نانی مرحومہ میں جو خوبی سب سے بڑھ کر تھی وہ ان کی سیاسی ذہانت تھی۔ انھوں نے محل میں قدم رنجہ فرماتے ہی دو کام کیے۔ ایک تو نواب صاحب کی عقل کو گھاس چرنے کے لیے بھیج دیا اور بقول کسے 'نواب صاحب پہ اُلو کی لکڑی پھیر دی۔' وہ حکم کے غلام ہو گئے کہ نانی نے کہا کہ کان پکڑ لو تو وہ مرغا ہی نہیں بنتے، اٹھیں بیٹھیں بھی کرنے لگے۔ انھوں نے کہا ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر سر سے پیر تک کہو تو انھوں نے پوری مثنوی زہر عشق پڑھ ڈالی۔ اس مرحلے پہ نانی جی نے مدبر کا نامہ سرانجام دیا اور اپنی ہر سوکن کی چھٹی کر دی۔ نواب صاحب نے سب کا اجلاس عام طلب کیا۔ جیسا کہ جیتے داروں کا ہوتا ہے۔ وہ بھی نواب صاحب کی شیر ہو رہی تھیں اور اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے نواب صاحب نے کہا کہ میں آپ ساتوں کو مجموعی طور پر اکیس بار طلاق دیتا ہوں۔ بھلا اب کیوں طلاق دی کسی نے اعلان کی رحلت کے بعد ایک دن خود نانی کو بھی فوت ہونا پڑا۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ بعد مرنے کے جو گھر سے سامان نکلا اس میں ہیرے سوا ہیرے کوئی دو درجن یا تین سے تو جانی ہیرے۔ تو خالی چھنجنا ایک زمرد، الماس اور نیلم اور ساڑھے سات سیر سونے اور چاندی کے ظروف کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ جانے یہ مفلسی کی موت کا سبب کا کچھ کیا؟ میری والدہ کو زبردستی تھما دیا گیا کہ تم ہی ان کی واحد وارث ہو۔ چاندی کے برتن ان کے چہلم سے قبل ہی چوری ہو گئے تھے۔ سونا انھوں نے بیچ کر رقم بینک میں ڈال دی اور پھر اس کے بے کو قرقی تعمیر ہوئی۔ ہیرے جواہرات تھے جو اس تجوری میں بند تھے۔ میرے والد بڑے قلندر تھے۔ دنیاوی مال و زر شہرت اور عزت کی نہ انھیں کبھی تمنا تھی اور نہ پروا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں وہ ان ہیرے جواہرات کو محفوظ کیے بیٹھے تھے اور کبھی کبھی انھیں دیکھ کر خوش ہو لیتے تھے۔ اس کے سوا ان پتھروں کا مصرف کچھ نہ تھا۔"

"ممکن ہے تمھاری والدہ کو اپنی والدہ کی نشانی ہونے کی بنا پر عزیز ہوں۔"

"مشکل ہے۔ ایسا ہوتا تو وہ سونا بھی پڑا رہتا۔" غالب بولا۔ "وہ سب زیور نہیں تھا۔ سونے کا ایک پیالہ تھا جس سے وہ پانی پیتی تھیں... نانی جان۔ ایک وضو کا لوٹا تھا۔ تو سب آرزو کے وضو کا ہی ہوتا ہوگا مگر خوشی زیادہ حلق ہوگی۔ انشا نہیں اس خود اور امریت پہ صاف کرے۔ سونے کی ایک رحل تھی جس پہ قرآن رکھ کر تلاوت کرتی تھیں۔ قرآن بھی ایک نادر نسخہ تھا جس کے حروف طلائی تھے۔ قرآن گھر میں رہ گیا تھا۔ باقی سب سامان بیچ دیا تھا انھیں چاندی کے برتنوں کے چوری ہونے کا بھی صدمہ نہیں تھا۔ فقط مختصر وہ ہیرے جواہرات، زمرد، الماس اور نیلم اسی تجوری میں بند تھے اور میری آخری اطلاعات کے مطابق بیچے نہیں گئے تھے جب کہ والدین پہ ایسا وقت آنے کا کوئی امکان نہ تھا جب وہ ضرورت کے لیے ان کو فروخت کرتے۔ پس میں جیسا کہ تم جانتے ہو کہ وہ ہوائی حادثے میں مارے گئے اور یہ ناخلف لوٹ کر گھر نہیں آیا۔"

"کمال ہے! ان کی مالیت تو کئی لاکھ بنتی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"لاکھ نہیں۔ کروڑ کا لفظ استعمال کرو۔" غالب بولا۔

"اور اس کے باوجود تم نے ان کی خبر نہیں لی؟" ڈیڈی بولا۔

"میرے لیے سب پتھر تھے۔ میں خود پتھر ہو چکا تھا۔ جیولین پتھر کی تھیں اور اس میں سامنے جذبے پتھر تھے۔ میرا احساس پتھر تھا۔ دنیا کے لوگوں کی نظر پتھر ہو گئی تھیں۔ ان چمکیلے لال نیلے، سبز پتھروں میں میرے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے کبھی خیال آیا بھی تو اس گھر کی ویرانی کا... آج تم نے پوچھا تو سب یاد آیا... ورنہ شاید اب بھی میں بھولا ہی رہتا۔" غالب نے کہا۔ "میرا خیال ہے اب یہاں کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"قالین ہٹا کے دیکھتے ہیں۔" ڈیڈی نے کہا۔

قالین بڑی دشواری سے ہٹایا گیا۔ اس کا کونا اسی صوفے کے نیچے دبا ہوا تھا جس پر رابعہ سو رہی تھی۔ میں نے اسے ایک طرف سے اٹھانے کی کوشش کی۔ رابعہ کا اپنا وزن ہوتا تو کیا محسوس بھی نہ کرتا مگر وہ کم بخت دین عزت کا صوفہ نہ جانے کس لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ غالب نے اور میں نے اسے مل کر زمین سے چند انچ اوپر اٹھایا تو ڈیڈی نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر قالین کھینچ لیا۔ ہم نے صوفہ آہستہ سے پھر نیچے رکھ دیا۔ رابعہ کو خبر تک نہ ہوئی۔ صوفے کے نیچے ہی تین فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا لکڑی کا تختہ سا آہستہ فرش کے ہموار ہی رکھ دیا گیا تھا۔ تختہ تجوری کے نکالے جانے کے بعد خالی جگہ چھپانے کے لیے رکھا ہوا تھا۔

"بڑی فراغت سے کام کیا چوروں نے۔" غالب تلخی سے بولا۔ "جب تحفے کو وصول کرنے کے بعد والد ماجد پریشان ہو گئے تھے کہ اسے اٹھا کر کیسے لے جائیں تو ظاہر ہے کہ وہ جانثار اور قانونی طور پر اسے لا سکتے تھے اور اتنی استطاعت بھی رکھتے تھے کہ ہوائی جہاز سے لانا چاہیں تو لے آئیں خواہ کرایہ اتنا بن جائے کہ پھر اصل مالک ہی جوہری والا کیس ہو جائے۔ انھیں پورے اطمینان سے نکال لے گئے۔"

"اور وہ کیا کرتے؟ اسم اللہ کی چابی ان کے پاس تھی نہیں۔ تجوری نہ کھلنا، نہ تیشۂ فرہاد اور نہ کھل جا سم سم کا جادو۔ تجوری کو کھولنا یا توڑنا ناممکن تھا۔ ہم بھی اگر بم ہوتا تو کام کرتا مگر ہیرے جواہرات اور وہ خود بھی مشت غبار رہ جاتے۔ انھوں نے آسان کام کیا کہ تجوری کو فرش سے نکال لیا۔ پھر کہیں ویلڈنگ تار یا اس سے اسے کاٹ دیا ہوگا۔ ممکن ہے تجوری بھی بکی ہو۔ دس ہزار میں بھی سستی تھی۔" غالب بولا۔

"پھر اب یہ دیکھو کہ تختہ رکھنے میں کیا مصلحت تھی؟" میں نے کہا۔

خالی جگہ دو فٹ سے کچھ زیادہ لمبی اور چوڑی تھی۔ گہرائی تین فٹ کے قریب تھی۔ تجوری کے چاروں طرف سے اور نیچے سے سیمنٹ توڑے بغیر تجوری نہیں نکالی جا سکتی تھی لیکن جو گڑھا بنا نظر آیا تھا اس کے کنارے ہموار تھے اور فرش سیدھا تھا۔

"اسے بعد میں دوبارہ بنایا گیا ہے۔" غالب نے جھک کر اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

"اندر کچھ ہے۔" ڈیڈی نے کنارے سے سر لٹکا کے گڑھے کے نیچے تاریک حصے میں دیکھا اور اندر اترنے لگا۔

"دیکھنا استاد! چکر نہ ہو اس میں کوئی۔" میں نے کہا۔

"کیسا چکر؟" ڈیڈی نے اپنا پاؤں باہر کھینچ لیا۔

"کوئی شیطانی چکر۔ تم اترو اور غائب ہو جاؤ... پیچھے دو سفید گھر کنٹرول ہو۔" میں نے کہا۔ "یا کوئی کروڑوں کا خزانہ ہو اور اس پہ سیاہ ناگ پھن پھیلائے بیٹھا ہو۔"

ڈیڈی سمجھ گیا کہ میں اسے ڈرانے کے لیے ایسا کہہ رہا ہوں۔ چڑ کر وہ مخاطب ہوا۔ "یہ تو کوئی صندوق ہے۔" وہ ٹین کی آواز سن کر اور مزید تصدیق کے لیے اس نے سیاہ ٹین کی چادر پہ پاؤں مار کر

"استاد! کیا غضب کرتے ہو۔" میں نے کہا۔ "پرانے مال کی حفاظت کے خیال سے کوئی غافل نہیں ہوتا۔ کوئی بم نہ ہو اس میں جو تمہیں مارنے سے پھٹ جائے اور تمہارے ساتھ ہماری عاقبت بھی خراب ہو۔"

"بلا سکندر بادشاہ! کیسی دل توڑنے والی باتیں کرتے ہو! ہمارے ساتھ تمھاری عاقبت خراب ہو رہی ہے؟" ڈیڈی برا مان کے بولا۔

"حرام کیسے جو یہ خودکشی ہے... یا ہو سکتی ہے۔" میں نے فوراً وضاحت کی۔ "اس کو حرام موت ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس سے کیا عاقبت سنور جائے گی؟ خیر تم اللہ کا نام لے کر نکالو اس پنڈورا کے باکس کو۔"

"کس کا صندوق ہے یہ؟" ڈیڈی نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔

"تم کو کسی کا نام لکھا ہوا نظر آ رہا ہے اس پر؟"

"یہ غالب کی نانی کا نام تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ خود پنڈورا کا باکس تھیں جسے نواب صاحب غفلت سے کھول بیٹھے تھے... اب سمجھے؟"

ڈیڈی کم تعلیم یافتہ ہونے کے باعث ہماری اس قسم کی گفتگو سمجھ نہیں پاتا تھا اور عجیب کر چپ ہو جانے ہی کو بہتری سمجھتا تھا۔ اس نے تھوڑی سی کوشش کی اور ٹین کا وہ صندوق نکال لیا جو زیادہ بڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پہ چمکدار کالا پینٹ تھا جو گرد پڑنے سے کچھ دھندلا گیا تھا اور اسی لیے فوراً نظر نہیں آیا تھا۔ اس میں معمولی سا قفل تھا جسے ڈیڈی نے ہاتھوں کے زور سے توڑنے کی ناکام کوشش کی۔

"اسے دوسرے کمرے میں لے چلو۔" غالب نے کہا۔ "ہاں یہاں شور ہوگا تو ان کے خواب ناز میں خلل پڑے گا۔" غالب ہنسا۔ "اللہ یہ عورت ذات بھی... ایک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا... اب کیسی غافل سو رہی ہیں۔"

"بس یہ احساس ہے کہ جاں باز استاد ڈیڈی جیسے مار دھاڑ کے دوران کے درمیان ان کی حفاظت کے لیے موجود ہیں۔" میں نے کہا۔

"چنانچہ اب پچھتا تو خیر آ بھی نہیں سکتا۔ چور ڈاکو اور بھوت بھی دور رہیں گے۔" غالب بولا۔

"کچھ سوچ کے ہی بھروسا کیا ہوگا انھوں نے مجھ پر!" ڈیڈی بولا۔

"معاملہ جذبات کا ہو تو خواتین سوچنے سے قاصر رہتی ہیں استاد اور ثبوت دیکھنا ہو تو ابھی انھیں جگا کے بتا دو کہ میں جا رہا ہوں... مجال ہے جو یہ پھر سو سکیں۔ ویسے تو تم جا ہی رہے ہو۔" غالب نے کہا۔

ایک پرانے سریے کی مدد سے تالا کھٹ سے ٹوٹ کر کھل گیا۔ میں نے ڈھکنا اٹھایا اور بھونچکا رہ گیا۔ اس میں صرف کتابیں اور کاغذات تھے۔ نہ جانے کیوں میں یہ توقع رکھتا تھا کہ باکس میں سے ہیرے جواہرات نہ سہی مالِ غنیمت ضرور برآمد ہوگا۔ کچھ ایسی ہی مایوسی کی کیفیت غالب اور ڈیڈی کی صورت سے عیاں تھی۔

www.paksociety.com

"وہ بدمعاش جو میاں غاصبانہ طور پر قابض تھے۔" غالب بولا۔ "وہ چور ڈاکو تھے۔ انھوں نے کہا بھی تھا کہ ان کا مال یہاں دفن ہے۔"

"یہ تو وہ مال نہیں ہو سکتا۔" میں نے سر ہلایا۔ "جس کی وہ بات کر رہے تھے... مگر یہ کاغذات کیسے ہیں؟"

غالب نے ایک فائل اُٹھا کے گرد جھاڑی اور اس کے چند صفحے پلٹے۔ پھر اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اس نے باقی صفحات پر سرسری نگاہ ڈالی۔ "یہ تو کوٹھی کی ملکیت وغیرہ کے کاغذات ہیں۔ سیل ڈیڈ... لیز ایگریمنٹ۔"

میں نے دوسری فائل اُٹھائی۔ "اس میں پراپرٹی ٹیکس کے بل ہیں۔ کارپوریشن کے واجبات کی ادائیگی کی رسیدیں ہیں۔ اور یہ کئی سال کے بل ہیں جو ادا نہیں ہوئے۔ کسی نے سب جمع کر کے اکٹھے کر دیے ہیں۔"

غالب نے تیسری فائل اُٹھائی۔ "یہ ڈیڈی کے انکم ٹیکس کا حساب ہے۔" ٹیڈی نے ایک بڑا سا لفافہ اُٹھایا اور الٹ دیا۔ اس میں چیک بکس تھیں۔ سب جزوی طور پر استعمال شدہ... مختلف بینکوں کی مختلف برانچوں کے یہ اکاؤنٹ غالب کے والد یا والدہ کے نام پر تھے۔ پھر دو چیک بکس غالب کے نام کی برآمد ہوئیں۔

"معلوم نہیں کس اکاؤنٹ میں کتنا پیسہ ہے؟" وہ بولا۔

"جتنا بھی ہو... مگر ان کاغذات سے تمھیں اپنا قانونی حق وراثت حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔" میں نے کہا۔

"قانونی حق وراثت!" غالب نے تلخی سے کہا۔ "تمھیں مل گیا؟"

"میری بات چھوڑو... تمھارے حق پر ڈاکا ڈالنے والا کوئی میر شرافت علی یا چوہدری دلاور نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "تمھیں سب ملے گا۔"

"کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک۔" وہ بولا۔

"کیا تصور میں تم نازو سے مخاطب ہو؟" میں نے کہا۔

ٹیڈی نے اُچھل کر کہا۔ "یار سکندر بادشاہ۔" اور میں نے بھی باکس میں دیکھا۔ کاغذات ختم ہو گئے تھے اور نیچے سے اچانک وہ دولت نکل آئی تھی جس کی امید اور جس کا خیال بھی دل سے محو ہو چکا تھا۔ مایوسی خلاف توقع ہوئی تھی لیکن اس کے بعد شگفتہ خیال کے حقیقت میں ڈھل جانے سے جتنی حیرانی ہوئی تھی وہ ناقابل بیان تھی۔ صندوق کے نچلے حصے میں نوٹوں کی گڈیاں تہ در تہ جمی ہوئی تھیں اور یہ سب ملے جلے پرانے نوٹ تھے۔

"کیا یہ ایک لاکھ کی رقم ہے؟" غالب نے نوٹوں کو ایک نظر دیکھ کر کہا۔

"ایسے اندازہ نہیں ہو سکتا، گن لیتے ہیں۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "یہ کون سا قارون کا خزانہ ہے۔"

"تم نے کبھی غور کیا؟" میں نے کہا۔ "ہم سب پیسے کی ضرورت اور اس کی اہمیت کے زیادہ سے زیادہ قائل ہوتے جا رہے ہیں حالانکہ ہم سب پیسے کو اپنا مقصد حیات نہیں سمجھتے تھے۔ ہم میں سے کسی نے پیسے کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا کہ کہاں سے آئے گا اور کہاں سے آئے گا۔ نہ ہم اس کو طاقت کا ذریعہ سمجھتے نہ شرافت کا معیار... میرا باپ ایک صنعت کار تھا۔ اور جب تک لندن میں تھا تو میری سب ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ میرا خیال تک نہ آتا تھا کہ واپس پہنچ کر کیا ہوگا۔ یہ سب تو گویا پہلے سے طے شدہ تھا کہ میں اسی کاروبار کو سنبھالوں گا اور ترقی دوں گا۔ میں نے کبھی حساب نہیں لگایا تھا کہ میرے باپ کے اثاثے کتنے ہیں اور میں کتنا کماؤں گا۔ کما کے کہاں لٹاؤں گا۔ کہاں خرچ کروں گا۔ ایک عجیب سی بے نیازی اور شاہانہ استغنا تھی کہ پیسہ مزید آتا رہے گا۔ سب ضروریات اب تک پوری ہوئی ہیں آئندہ بھی ہوں گی۔ ضروریات کا بھی کوئی محدود تصور نہ تھا۔ نہ ایک سے دو اور دو سے چار کارخانے بنانے کا کوئی منصوبہ تھا۔ نہ یہ احساس کہ کل اگر یہ کارخانہ بھی نہ رہا تو کیا ہوگا۔ بڑائی اور عزت میں بھی نہ تھی۔ چنانچہ عیش و عشرت کے بارے میں تو سوچتے نہ تھے۔ ایسے بھی نہ تھے کہ دنیا میں نام مشہور ہو تو عیش کے اسباب بنا لیں۔ بنا چاہو بنا لو۔ مسجد و تالاب بنا کے مقبولیت کا شوق پورا کرتے ہیں۔ میں سکندر جیسا اپنا کوئی وجود ہی نہ رکھتا تھا۔ بس میں تھا... میری ذات اور اس کی مصروفیات۔ محض کے لیے بھی مستقل مشغولیت۔ وہ بڑے باپ کا بیٹا تھا۔"

"خود میں نے عملاً پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھا۔" غالب بولا۔ "تم دیکھ لو کہ وہ میرے جواہرات نہ جانے کتنے لاکھ کے تھے۔ میرے سگے تھے مگر اب مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ کون لے گیا۔ جواہرات کے خزانوں کی خاطر قتل و خونریزی ہوتی ہے۔ اسمگلنگ کا جال پھیلایا جاتا ہے۔ اس پر فلمیں بنتی ہیں اور شہزادوں کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ وہ میرے جواہرات کسی غریب آدمی کو سڑک پر پڑے مل جاتے تو شاید اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ یا اسے پولیس مار ڈالتی کہ کس کا خزانہ لوٹا تھا مگر وہ نہ بتا پاتا۔ مجھے آج بھی معلوم نہیں کہ میرے باپ کے اور میرے اکاؤنٹ میں کتنا پیسہ ہوگا۔ میں نہیں جانتا کہ اس بنگلے کی قیمت کتنے لاکھ ہے۔ جب ہم فقیروں کی طرح دنیا کو دیکھتے رہے ہیں جیسا ہمارا مشن صحافت تھا۔ پیسہ کمانا مشن نہ تھا۔ مگر اب دیکھو کہ صرف ایک لاکھ..."

"ایک لاکھ چوالیس ہزار۔" استاد ٹیڈی نے تصحیح کی جو گن کر فارغ ہو گئے تھے۔ "ایک لاکھ چوالیس ہزار کی رقم میرے لیے بھی کوئی اہمیت نہ ہوتی اگر میں اپنے باپ کے کاروبار کا مالک ہوتا۔ میں ابھی مشاہدہ رہا مگر ہمت نہ تھی۔ میں اس کے کاروبار کو بہت ترقی دیتا اور مٹی میں ہاتھ ڈالتا تو سونا بنا لیتا۔ مگر دیکھو... میں سونا میں کس حق کے لیے اٹھائے پھر رہا تھا... میرا... یہ تھا؟"

"خود رابعہ کتنی مطمئن اور خوشحال تھی۔ اس کا مشن بھی پیسہ نہیں تھا۔ وہ ترقی کرتی، مزید شہرت پاتی۔ اس کی فرم کی آمدنی دگنی ہو جاتی اور اس کی کوٹھی بہت بڑی ہوتی۔ کسی دن وہ ہائی کورٹ کی جج بن جاتی مگر آج اس کے پاس بھی کچھ نہیں۔" ٹیڈی نے کہا۔

"اور عدالت کی ستم ظریفی دیکھو کہ جانے مقابل وہ ہیں جن کا دھرم ایمان سب پیسہ ہے۔" غالب بولا۔ "جو صرف پیسے کو مقصد حیات جانتے ہیں خواہ وہ جائز ذرائع سے آتا ہو یا ناجائز طریقے سے... جو پیسے کی خاطر خود کو اپنی عزت نفس کو، اپنے ضمیر کو اور اپنے وطن کو سب کو بیچ دیتے ہیں۔ کیا تضاد ہے یہ بھی۔ ایک طرف ہم جیسے ہیں جو بہت دولت مند گھروں میں پیدا ہونے کا جو تحفہ ملا اسے ٹھکرا دیا اور ہم طبعاً بھی قلندر تھے کہ پیسے کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے تھے ورنہ وہ بھی ہیں جو لاکھ سے کروڑ بنا لیں تو کروڑ سے ارب اور ارب سے کھرب بنانے کی فکر کرتے کرتے مر جاتے ہیں۔"

"ہمارا واسطہ پڑ رہا ہے ان چوروں سے... ڈاکوؤں سے۔" میں نے کہا۔ "یہ لوگ غریب اور احساس محرومی کے مارے ہوئے تھے۔ ان کے لیے سب کچھ پیسہ تھا جس کی خاطر انھوں نے سب اخلاقی اور قانونی دائروں سے نکل کر سب کے حقوق غصب کیے... مجرم کہلائے اور معاشرے کا ناسور قرار پائے لیکن ان کو پیسہ ملا تو عزت نہ ملی۔ پیسے کو خرچ کرنے کی آزادی نہ ملی۔ جن کے یہ ایک لاکھ چوالیس ہزار ہیں ان کی حیثیت ہمارے مقابلے میں کیا ہے؟ مگر ہم بھی ان سے مختلف نہیں... چوروں کا مال چراتے ہیں۔ ڈاکوؤں کے مال پر ڈاکا ڈالتے ہیں۔ چھوٹے چوروں سے بڑے چور تک سب کی دشمنی کے سوا کچھ نہیں پاتے۔ یہ کام جو کر رہے ہیں وہ کتنا بڑا ہے مگر کیا ہمیں کوئی قومی ہیرو مانتا ہے؟ ہمیں کوئی بہادری یا حب الوطنی کا میڈل ملے گا؟"

"اتنا حساس اور قنوطی ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" غالب نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کے کہا۔ "کامیابی کی جو لگن... شوق لاحاصل... عزم و ہمت کا کبھی ختم نہ ہونے والا جذبہ اور رفاقت کا جو اعتماد ہمیں حاصل ہے وہ کس کو ملتا ہے۔"

"نیکی کرنے کی توفیق بھی خدا جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "ہر ایک کے نصیب میں یہ خوشی نہیں ہوتی۔"

"بڑا نام کمانے کے لیے تو سب ہی جدوجہد کرتے ہیں... بڑا نام کر کے کمانے اور نیک مقصد میں کامیابی کی خوشی کو ہی اپنا انعام سمجھ کر خدا کا شکر ادا کرنے والے بہت کم ملتے ہیں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ہم سب مل کر ڈاکوؤں کا ایک گروہ بنا لیتے یا اسمگلروں کا۔" غالب نے کہا۔

"اور کچھ بھی نہ کرتے تو دلاور کے ساتھی بن جاتے۔ اس کی دشمنی میں تو سب نے نقصان اُٹھایا۔ فائدہ دیکھتے تو اس کی پیشکش سے دولت حاصل کر سکتے تھے۔" ٹیڈی بولا۔ "یہ کتنی بڑی بات ہے کہ ابھی تک وہ ہم میں سے کسی کو بھی اپنے ارادے سے ایک انچ نہیں ہلا سکے۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "ابھی تک کسی کی استقامت میں سر مو فرق نہیں آیا ہے۔ اتنی سختی جھیلنے اور اتنے مصائب برداشت کرنے کے باوجود سب کا حوصلہ پہلے سے زیادہ ہے۔" میں نے کہا۔ "کتنے لوگ ہیں جو آرام و آسائش... بلکہ عیش و عشرت کی زندگی کو چھوڑ کے اس راہ پر خطر کے عذاب و اذیت کو قبول کر سکتے۔ ہماری جگہ دلاور اینڈ کمپنی کا کوئی بھی آدمی ہوتا تو اس کا ایمان سلامت نہ رہتا۔ وہ سب قابل فروخت ہیں۔ میں شرط لگا کے کہہ سکتا ہوں کہ یہ جس لاکھ ہوتے تو ہم پیڈرو کو خرید سکتے تھے۔ وہ دلاور سے وفاداری پر لعنت بھیج کر خود اپنے ہاتھوں سے اس کو قتل کر دیتا۔ میں لاکھ میں خسرو جمشید بھی الگ ہو جاتا... رہ جاتا سراج... وہ بیس لاکھ میں سب کو بند کرا دیتا یا ختم کرا دیتا اور اپنی ایس پی کی نوکری سے بھی فائدہ اٹھاتا رہتا... ان سب کو احساس ہے کہ وہ ایک جرم میں شریک ہیں... کسی نیک کام میں نہیں۔ یہ بات وہ سب سمجھتے ہوں گے کہ کوئی کسی وقت بھی خود کو بچانے کے لیے دوسروں کی گردن پھنسا سکتا ہے۔ وہاں سب اپنی ذات کا تحفظ اور اپنا فائدہ پہلے دیکھتے ہیں۔"

"اگر ہماری سوچ بھی ایسی ہی ہوتی تو سب سے پہلے تم الگ ہو جاتے کیونکہ سب سے زیادہ فائدہ تمھارا ہی تھا۔" غالب بولا۔ "پچاس لاکھ کی آفر اب کتنی بڑھ چکی ہے۔ وہ تمھارا کاروبار تک تمھارے حوالے کرنے کو تیار ہے۔ تمھارے اور مرحوم وزیر خان کے سارے نقصانات کی تلافی کرنے کی بات کرتا ہے۔ تم اُن کی بات مان کے رابعہ کے ساتھ لندن میں سکونت اختیار کر لیتے اور اپنی کے کاروبار کو چلاتے رہتے۔ محسن کو کیا پڑی تھی۔ ماں باپ اور بھائی بہن کا ساتھ چھوڑ کے تمھارے ساتھ خوار ہونے کی۔"

میں نے کہا۔ "یہی تو فرق ہے جو بالآخر ان کی شکست کا سبب بنے گا۔ ہم سب خود کو نہیں ایک دوسرے کو بچاتے ہیں۔ ان سب کو بچاتے ہیں جو اس سرزمین پر جان اور مال اور عزت آبرو کے تحفظ کے ساتھ رہتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کے درمیان ہی وہ غدار ہیں جو پیسے کے لیے ان کے یقین کو فروخت کر رہے ہیں۔ جنھیں اپنی جان کی پروا نہیں۔ ان کو صرف اپنی جان پیاری ہے۔ ایم آر ایس کے اتحاد کا مقصد ان کے اتحاد کے مقصد سے اتنا ہی دور ہے جتنا آسمان اس زمین سے —— اگر ہم اپنی اپنی دنیا میں والدین کے بنائے ہوئے

www.paksociety.com

پر کامیابی اور خوشحالی کا سفر جاری رکھتے تو پھر ایک دو سکندر سے کیسے ملتے اور ایم آر ایس کا وجود کہاں ہوتا۔"

"آج ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے شیخ چلی کی طرح صرف خیالی پلاؤ نہیں پکائے... ہوا میں تیر نہیں چلائے تھے۔" غالب نے کہا۔ "صرف سرجانی میں نہیں عمل بھی کیا ہے۔ ہمارے کریڈٹ پر بہت سی فتوحات ہیں۔ ہم نے دشمنوں کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اس سے زیادہ نقصان ان کے عزائم کو پہنچایا ہے۔ ان کے مقاصد کو ناکام بنانے کے لیے پیش قدمی کی ہے اور ان کے حوصلوں کو پست کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اب تو انھیں اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ ان کے مقابل بھی ایک قوت ہے جو ان کی راہ میں دیوار بن گئی ہے اور یہ دیوار گرائی نہیں جا سکتی۔ ہر نیا دن اس کی مضبوطی میں اضافہ کر رہا ہے اور ایک دن آئے گا جب یہ دیوار ہمالیہ پہاڑ سے بھی زیادہ بلند اور ناقابل تسخیر ہو جائے گی۔"

"اس سے ٹکرانے والے خود پاش پاش ہو جائیں گے...." غالب بولا۔

"پھر ہم خود ایک دو سکندر کو بہادری کا تمغہ دینے لگے۔" ٹیڈی بولا۔ "کیوں سکندر بادشاہ؟"

"ایک سینڈل تو ابھی لو...." محسن نے دروازہ کھول کے کوئی چیز پھینکتے ہوئے کہا۔ "ایک لنگار رکھی ہے کب سے!"

اس نے جو چیز پھینکی تھی وہ میری کمر پر پڑی۔ "آہ... کیا چھپ کر بیٹھ کے مار لیا ہے!" میں نے واویلا کیا مگر محسن اندر غائب ہو چکا تھا۔

"شرفا کی عزت اب باہر بھی محفوظ نہیں رہی۔" غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔ ٹیڈی نے قہقہہ مارا۔

"شرفا کے پیچھے اس کمبخت نے نیند حرام کی۔" محسن نے پھر دروازہ کھول کے دوسری چپل ماری جو نشانہ چوک جانے سے ٹیڈی کو لگی۔

"یہ سالا ہمت سے دانت نکال رہا ہے۔" محسن کی آواز آئی۔ ٹیڈی کی ہنسی رک گئی۔ اس نے مشتعل ہو کے اپنی چپل کو محسن کی طرف فائر کیا مگر محسن پھر دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

"صبر کرو استاد۔" غالب قہقہہ مار کے بولا۔ "مقدر میں یہی تھا کہ جس کا رشتہ بھی دو اور پھر جوتے بھی کھاؤ۔"

"او بدبخت! فقیر دل کو مت مار... مارنا ہے تو کسی کا حق مار۔" میں نے کہا۔

"نہیں تو باہر آ... پھر دیکھ فقیر کیا کرتے ہیں۔" ٹیڈی نے چلا کے کہا۔

"ایسی کی تیسی فقیروں کی۔" محسن نے اندر ہی سے جواب دیا۔ "ہم کسی بادشاہ سے نہیں ڈرتے... خواہ سکندر اعظم آ جائے...."

وہ اپنے قصور ختم ہونے کا فائدہ اٹھا رہا تھا مگر شامت اعمال اس وقت تصلوایا پڑی تھی کیونکہ صبح ہونے لگی تھی۔ میں اور ٹیڈی ایک ساتھ اٹھ کر دوڑے۔ محسن فوراً چارپائی کے پیچھے چھپ گیا۔ چارپائی کے پیچھے ایک گھس ان کی جگہ تھی۔ محسن اکیلا دونوں کا مقابلہ کیسے کر سکتا تھا اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش میں چارپائی الٹ دی مگر پکڑا گیا۔ ہم باہر نکلے تو نازیہ دروازے میں کھڑی غالب سے پوچھ رہی تھی۔

"کیا کوئی چوہا اندر نکل آیا ہے؟" خوفزدہ نازو اس کے پیچھے تھی۔

"ہاں! یہ چوہا ابھی ابھی پلنگ کے نیچے سے نکلا ہے۔" میں نے کہا اور محسن کو صحن میں پھینک دیا۔

"بہت شکریہ آپ حضرات کا۔" محسن نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے دانت نکال کے کہا۔ "یہاں تک اٹھا کر لانے کی زحمت کی۔" پھر اس کی نظر نوٹوں کے ڈھیر پر گئی۔ "یہ کیا ہے؟"

"ہاتھ کا میل۔" میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ "غالب کے ہاتھ کا... مجھے رشوت میں دے رہا تھا۔"

"تم لوگ کسی بات کا سیدھا جواب نہیں دے سکتے؟" شعلہ بولی۔

"ہم سیدھے سادے لوگ ہمیشہ سیدھی بات کرتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی غلط بیانی نہیں شعلہ بی بی۔" میں نے کہا۔ "یہ سب غالب کا ہے۔"

"تجھے کیوں رشوت میں دے رہا تھا؟" محسن نے دلچسپی سے کہا۔

"کہتا تھا کہ میرا ایک کام کرا دو... سفارش کی کہتا تھا..." میں نے نازو کی طرف دیکھا۔

"اچھا...؟ کام کیا تھا؟" محسن نے بھی نازو کو دیکھا، اس کا رنگ لال ہونے لگا۔

"بہت مشکل کام تھا یار... جان جوکھوں کا۔"

"میں سمجھ گیا... کہتا ہوگا کہ میری طرف سے اظہار محبت کر دو۔" محسن نے سر ہلایا۔ "اسے سمجھاؤ کہ یہ عیاشی چھوڑ دے۔ ابھی میرا ... کا ڈنڈا ہے... ڈنڈا بھی تھا تیدار کا نہیں... بے چارہ مولا بخش۔"

"مولا بخش تمام عمر اس کی جوتیاں سیدھی کرے گا۔" غالب نے دانت نکال کے کہا۔

"اور اسے ہمیشہ پاؤں کی جوتی سمجھے گا۔" محسن نے کہا۔ "اس کے لیے ایک محل بنائے گا سپنوں کا۔"

"اس محل میں اپنی ادنیٰ کنیز بنا کے رکھے گا۔" محسن بولا۔ ... ہم سب نے ہنسنا شروع کیا تو وہ سب وہاں سے ہٹ چکی تھیں۔

بس ایک دفعہ ان کی زبان پھسل پڑے تو رکنے کا نام نہیں لیتی۔" کہیں سے ایک آواز آئی۔ "وہ نام ہم ہیں۔"

"فوراً ہیڈی سے اتر جاتے ہیں۔" شعلہ نے خفگی سے تائید کی۔

جب ناشتا شروع ہوا تو ہم نے اپنی شب بیداری کے اسباب پر روشنی ڈالی۔ غالب کی بات اور جمالیہ کے انکشافات نے خاصی سنسنی پھیلائی۔

"کیا وہ چوری کا مال لینے کے لیے واپس آئیں گے؟" محسن بولا۔

میں نے کہا۔ "اگر تجوری بھی انھوں نے نکالی ہوگی تو انھیں ایک ڈیڑھ لاکھ کی کیا پروا۔"

غالب نے کہا۔ "مجھے وہ ایسے نہیں لگتے تھے کہ تجوری کا پتا چلا ہی اور اٹھا لے جائیں۔ اس کو کھود کر نکالنا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا اسے یہاں سے کہیں منتقل کرنا، اور پھر کسی سے کھلوانا... عام ویلڈنگ کرنے والے اسے نہیں کاٹ سکتے تھے۔ وہ گن میٹل کی بنی ہوئی تھی۔"

"تمھارا مطلب ہے تجوری پہلے ہی کوئی لے گیا تھا! کیا بڑا اور ہنر مند چور؟"

غالب بولا۔ "ہاں! اور ممکن ہے یہ کام کسی گھر کے بھیدی نے کیا ہو۔"

"کیا مطلب؟" ٹیڈی نے کہا۔

غالب نے کہا۔ "میرے والد اپنے دوست احباب پر بہت بھروسا کرتے تھے۔ ان کے سب دوست پرانے اور قابل اعتماد تھے۔ ڈاکٹر لطیف اس کی ایک مثال ہیں۔ وہ سب کو تجوری کے متعلق بتاتے تھے۔"

"مگر ڈاکٹر لطیف جیسے لوگ تو یہ کام کرنے سے رہے۔"

"نہ جانے کس کس کو یہ بات معلوم تھی۔" غالب نے کہا۔ "ان کے انتقال کے بعد میں تو آیا نہیں۔ معلوم نہیں کس نے موقع سے فائدہ اٹھا لیا۔"

"تمھیں کیوں یقین ہے کہ یہ کام اپنوں کا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"یہ کام وہی کر سکتا تھا جو پورے اعتماد کے ساتھ یہاں آ سکتا ہو۔" غالب بولا۔ "جیسے دوست کہ سب لوگ جانتے پہچانتے ہوں اور گھر کا محافظ سمجھتے ہوں۔ کوئی اجنبی تجوری نکالتا تو سب دیکھتے۔ اسے لوڈ کرنے کے لیے کرین منگوانا پڑا ہوگا اور اسے ٹرک میں لے جایا گیا ہوگا۔ ورنہ دس بیس مزدوروں نے یہ کام کیا ہوگا۔ ظاہر ہے یہ رات کی خاموشی میں ہونے والا ایسا کام نہیں تھا کہ آس پاس والوں کو خبر تک نہ ہوتی۔ میں ایک مفروضے کی بنیاد بنا رہا ہوں کہ جب میرے والد کے ساتھ حادثہ پیش آیا تو سب تعزیت کرنے والے یہاں پہنچے۔ جانے کچھ رشتے دار بھی تھے جن کو میرے والد منہ نہیں لگاتے تھے۔ اس لیے کہ وہ غریب تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ میرے والد معمولی ڈاکٹر تھے اور وہ سب دولت مند شمار ہوتے تھے۔ میرے والد نے سخت حالات کا مقابلہ کیا تھا اور اُس وقت سب رشتے دار غیر بنے ہوئے تھے۔ بعد میں میرے والد کی کامیابی کا دور شروع ہوا تو وہ سب دوڑے۔"

"اپنی اپنی نااہل، بدتمیز اور بدصورت لڑکیوں کے رشتے لے کر۔" محسن بولا۔

"بالکل یہی ہوا۔" غالب بولا۔ "مگر میرے والد نے اپنی مرضی سے شادی کر لی۔ ایک متوسط گھرانے میں... اپنے ایک میڈیکل کے زمانے کے کلاس فیلو کی لڑکی سے جو ہیڈ کلرک تھا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ لو میرج تھی۔"

"ایک اچھی روایت قائم کی تھی انھوں نے... اسے قائم رکھو۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد انھوں نے بھی ٹکڑے ہونے دیے... تو جانے خاندان کے خلاف ... میرے والد نے کوئی نوٹس نہیں لیا اور معاشرتی مقاطعہ کر کے دلوں سے الگ ہو کے اپنے مخلص دوستوں سے رشتوں کو استوار کر لیا۔ ان کو کسی کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔" غالب نے کہا۔ "میرا قیاس یہ ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو میری عدم موجودگی میں کوئی خون کے رشتے کا دعویدار آ پہنچا ہوگا۔ ایک دو تو فرسٹ کزن تھے۔ چچا زاد یا ماموں زاد قسم کے۔ اصولاً وہ میرے بھی چچا اور ماموں تھے۔ کسی چالاک آدمی نے فوراً میزبانی کے فرائض سنبھال لیے اور گھر پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ سوگ ختم ہو گیا اور کوئی آنے جانے والا نہ رہا... میرا انتظار بھی نہ رہا۔ تو اس نے صورت حال سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ ممکن ہے وہ سال چھ ماہ یہاں رہا ہو۔"

"تم نے ڈاکٹر لطیف سے پوچھا ہوگا؟"

"میں نے پوچھا تھا۔" غالب نے کہا۔ "اور ان کے جواب پر ہی میرے قیاس کی بنیاد ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہاں! کوئی تھا تو سہی جو سب سے مل کر بڑے ... کو بچا رہا تھا۔ سب اسی کو آ کے ملتے تھے اور اسی سے تعزیت کرتے تھے۔ اندر باہر سب انتظام اسی کے ہاتھ میں تھا۔ سوئم پر بھی وہی منتظم تھا اور چہلم پر بھی... خود ڈاکٹر لطیف کو اس کا نام یاد نہیں تھا۔ جو حلیہ انھوں نے بتایا وہ کسی بھی ادھیڑ عمر کے آدمی کا ہو سکتا تھا لیکن وہ نام بتا دیتے تب بھی میں کیا سمجھتا۔ میں آج بھی کسی کو نہیں پہچان سکتا۔ نہ ان کو میری خبر ہے۔ نہ مجھے ان کی۔ مطلب یہ کہ یوں مرحوم کا نام لیوا بن کے کوئی یہاں مقیم رہا اور جب ادھر ادھر کے لوگوں نے اسی کو وارث تسلیم کر لیا اور اس کی موجودگی کے عادی ہو گئے تو اس نے اپنا کام بے خوف و خطر کیا۔ اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ کوئی مدد کو آئے گا۔ میرے گھر نہ ہونے سے وہ سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ اس نے عقلمندی سے کام لیا کہ سب کچھ ویسے ہی چھوڑ دیا۔ ...

www.paksociety.com

گھر کا ساز و سامان... بس وہی ایک چیز لے گیا جو قیمتاً سب سے زیادہ قیمت کی تھی۔ ممکن ہے کہ اب وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ کسی عالی شان محل میں رہتا ہو اور اس کا شمار معززین کاروں میں ہو۔"

"ایک اور چودھری دلاور!" میں نے کہا۔ "اس کو بھی ڈائری میں لکھ لو۔ ہمیں ایک دن اس تجوری چور کو بھی پکڑنا ہے۔ ہم اسے تلاش کر لیں گے مگر بعد میں..."

"کیا تم نے میری قیاس آرائی کو اتنا درست تسلیم کر لیا ہے؟" غالب ہنسنے لگا۔ "ہو سکتا ہے اس افسانے میں حقیقت کا ایک فیصد بھی نہ ہو۔"

"یہ فیصد کا فرق ہی افسانے کو حقیقت سے جدا کرتا ہے۔" محسن بولا۔ "اور مجھے یہ فرق دکھائی نہیں دیتا... بالکل ایسا ہی ہوا ہو گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تجوری چور تو فی الحال محفوظ ہیں مگر ہم خود کو ان چوروں سے محفوظ تصور نہیں کر سکتے جن کا مال ہمارے قبضے میں آ گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ اپنا مال لینے تو آئیں گے۔"

"اور ایسے وقت میں آئیں گے، جب ہم موجود نہ ہوں گے۔" غالب نے کہا۔ "صرف محترم خواتین ہوں گی۔"

"اور اب وہ تیر و تفنگ اور بم بارود نہیں لائیں گے۔ اپنے ساتھ نصف درجن حسن پرست چوہے لے آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"اوئی اللہ... پھر چوہے..." محسن نے زنانہ آواز بنا کے چیخ ماری۔ رابعہ اور نازو کا خفت سے برا حال ہو گیا کیونکہ ہم سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو رہا تھا۔

"کچھ چوہے اور کچھ چھپکلیاں۔" غالب بولا۔ "یہ اسلحہ خواتین کی ایک فوج کو شکست دینے کے لیے کافی ہے۔" مگر ابھی اس کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ نازو بجلی کی طرح اٹھی۔ دوسرے لمحے میں مرزا غالب لڑھکتے نظر آئے۔ شیڈی نے بچنے کی بڑی کوشش کی مگر غالب اس کے اوپر گرا۔ وہ دونوں جب الجھ گئے میں اور محسن فوراً دور ہو گئے تھے۔ چنانچہ بچے تھی وہیں کی وہیں بیٹھ گئی۔ باری اب خواتین کے ہنسنے کی تھی۔

"کیا ہوا بھئی! بڑے بڑے سورما چت پڑے ہیں۔" رابعہ بولی۔

"اور بڑے بڑے سکندر بھاگ رہے ہیں۔" شعلہ بولی۔ "چھپ رہے ہیں۔"

"بالکل چوہوں کی طرح۔" رابعہ نے کہا۔

"اور ایک چھپکلی جیسی لڑکی کے سامنے تعلیاں بگھار رہے ہیں۔" شعلہ بولی۔

جب امن و امان بحال ہوا تو سنگین مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ رقم کے بارے میں طے کیا گیا کہ اسے فوری ضرورت خرچ کرنا مناسب ہو گا۔ چودھری دلاور رائیڈ کمپنی کا پروگرام ہم کو معلوم ہو چکا تھا مگر اس کا بیلام مرحلہ تین دن بعد آنا تھا۔ شمامہ سے ہم پھر ان کے پیچھے لگ سکتے تھے۔ ٹیپ سننے کے بعد سب کے لیے نئی حکمت عملی کا نقشہ سامنے آ گیا تھا اور سب کا یہ خیال تھا کہ اب ہمارا پروگرام کیا ہو گا۔ ان تین دنوں میں انہیں بھی ہم جیسے سے کام نمٹانے تھے۔

"سب سے پہلے تو بہرام دادا کی بیٹی کے لیے کچھ کرنا ہے۔" شیڈی نے کہا۔ "ہم کو اب تک اسپتال پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

"میں اور تم اسپتال جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس سلسلے میں ذرا احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف مجھے پولیس تلاش کر رہی ہو گی۔"

"تم اس سارجنٹ کی وردی کو تو اتار دو۔" رابعہ نے کہا۔ "خواہ مخواہ ڈر لگتا ہے کہ ابھی کسی کا چالان کر دو گے۔"

"ایک دن چالان تو تمھارا ہو گا بی بی!" میں نے کہا۔ "بغیر وردی کے بھی کر لیں گے ہم... مگر تمھاری خواہش کے احترام میں یہ لباس بدل دیتے ہیں ورنہ تو بہت جچ رہا تھا یہ لباس ہم پر۔"

"تقریباً ایسی ہی وہ شیری وردی تھی۔" رابعہ نے کہا۔

"اس میں آدمی خود کو زیادہ بااختیار محسوس کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر اس لباس میں باہر جانے کا مطلب ہے... کہ ٹریفک پولیس کو پیچھے لگانا... میں اتنا احمق نہیں ہوں آپ لوگوں کی اطلاع کے لیے..."

"ہماری رائے کسی اطلاع سے نہیں بدل سکتی۔" محسن بولا۔ "آپ نے کل جو حماقتوں کا درانی شو پیش کیا..."

"یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم آج بہرام دادا کی بیوہ کے لیے کچھ کرنے کے قابل ہوں گے۔" میں نے احتجاج کیا۔ "اگر اسے حماقت کہا جائے تو اس میں بھی خدا کی مصلحت تھی۔"

"اس کا اثر دلاور رائیڈ کمپنی کے پلان پر بھی پڑ سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "کل ہی نازو وہاں سے غائب ہوئی... کل ہی شمو جیسا ثانی مارا گیا۔"

"ان دونوں واقعات کے درمیان کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔"

"ہو بھی سکتا ہے۔" محسن بضد رہا۔ "وہ کوئی رسک ہرگز نہیں لیں گے۔"

"رسک ہم بھی نہیں لیں گے۔" میں نے کہا۔

"تم اسپتال جا کے رسک لے رہے ہو۔" غالب بولا۔ "تم کو کم از کم چوبیس گھنٹے سڑک پر نظر نہیں آنا چاہیے۔"

"لیکن بہرام دادا کی بیوہ کو صرف میں پہچانتا ہوں۔"

"اسے پہچاننا ضروری نہیں۔" غالب نے کہا۔ "اگر اس کی بیٹی مل جائے گی تو ان کا پتا بھی مل جائے گا۔ اسپتال میں ہمیشہ پولیس موجود رہتی ہے۔ اور تم ایک بار پھر اسپتال میں خاصی ہنگامہ آرائی کر چکے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں نہیں جاتا۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں تو جاؤں گا۔" شیڈی بولا۔

"تم بھی مت جاؤ..." غالب نے کہا۔ "یہ کام صرف شعلہ کو کرنے دو۔"

"اکیلی شعلہ کو؟" رابعہ نے کہا۔

"اکیلی کا کیا مطلب... اسے کیا وہاں توپ چلانی ہے۔" غالب بولا۔ "اور نازو کا مشن تو خیر ایسا تھا کہ یہ بی بی اکیلی اور کر ہی نہیں سکتی تھیں۔"

"یہ تسلیم کرتے شرم آتی ہے کہ تم بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔" رابعہ بولی۔

"ہاں ہاں! میں اور شعلہ کا میاں... ہم دونوں صرف مار کھا سکتے ہیں۔ کسی کو خالی ہاتھوں سے مار نہیں سکتے... تمھارے سکندر اعظم کی طرح۔" غالب نے جھنجلا کر کہا۔ "عقل کی بات کوئی سنتا نہیں... فوراً کاٹ شروع ہو جاتی ہے۔ شعلہ سے میرا مطلب مشہور مطلب ہے۔ اسے رابعہ اور نازو کی طرح کسی سے خطرہ نہیں۔ یہ جائے گی اور دھڑلے کے ساتھ اطمینان سے جنرل وارڈ میں کسی سے بھی بات کرے۔ اسے کوئی نہیں پہچانتا۔ یہ اس لڑکی سے کوئی بھی رشتہ جوڑ سکتی ہے۔ بہرام دادا کی رشتے کی پھوپھی بن جائے اور سیدھی اس لڑکی سے جا کے بات کرے۔ خاموشی سے اس کو یا اس کی ماں کو سمجھائے کہ وہ کس کی طرف سے آئی ہے۔ وہ میرا حوالہ دے یا استاد شیڈی کا۔ مگر انھیں قائل کرے کہ وہ رازداری سے رہیں... ہماری اصلیت جاننے کے چکر میں نہ پڑیں اور خدا نے چاہا تو ہم سب کچھ ٹھیک کر لیں گے۔ ایک بار رابطہ قائم ہو جائے پھر کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔"

غالب کی بات بہت معقول تھی چنانچہ اس سے اتفاق نہ کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ شعلہ نے اسی وقت روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ مسئلہ ایک برقعے کے حصول کا بھی تھا مگر شعلہ نے کہا کہ وہ بازار سے خرید لے گی اور امید ہے کہ وہ دوپہر کے کھانے کے وقت تک لوٹ آئے گی۔ شیڈی کچھ مضطرب اور مایوس نظر آتا تھا کہ اسے بہرام دادا کی فیملی کے لیے کچھ کرنے کا موقع نہیں مل رہا۔ مگر ہم نے اسے تسلی دی کہ پہلا کام تو اس لڑکی کو بچانے کا ہے۔ اس کے بعد ساری زندگی پڑی ہے۔ شیڈی جس طرح چاہے بہرام دادا کا قرض مع سود ادا کر سکے گا۔"

"مع سود تو اب نکال ہی لینا چاہیے۔" شیڈی نے کہا۔

"نکالتے کیوں نہیں۔ جب ضرورت پڑے گی نکال لیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہاں وہ سونا بہت محفوظ ہے۔"

میں اور محسن سڑک تک شعلہ کے ساتھ گئے اور اسے ٹیکسی میں بٹھا کے لوٹ آئے۔ ہم نے اسے دس ہزار روپے دے دیے تھے کہ اگر اسپتال میں بہرام دادا کی بیٹی ضرورت مند ہو تو اسے دے آئے۔ واپسی پر ہم نے اخبارات خرید لیے۔ ان میں گزشتہ دنوں کی دہشت گردی کے خلاف بہت سے بیانات اور اداریے تھے جن میں سارا غم و غصہ انتظامیہ پر اتارا گیا تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ یہ بیانات چھپوائے گئے ہیں کیونکہ ہماری تمام کارروائی کا نشانہ دلاور کے علاوہ پولیس کے دو افسر بنے تھے۔ ان میں سے ایک انسپکٹر حشمت خان تو مارا گیا تھا لیکن ایس پی سراج کا گھر تباہ ہوا تھا۔ تازہ خبر میں ایک نامعلوم شخص کے قتل اور ایک ٹریفک سارجنٹ پر قاتلانہ حملے کی خبریں تھیں۔ نامعلوم شخص کے متعلق بتایا گیا تھا کہ اس کی لاش ایک جلی ہوئی گاڑی سے دریافت ہوئی تھی اور ناقابل شناخت ہو چکی تھی۔ اس بات کا ذکر نہیں تھا کہ گاڑی کس کی تھی اور کہاں سے ملی تھی۔ اس گیراج کا بھی کوئی حوالہ نہیں تھا جہاں میں نے مرسیڈیز کو چھوڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کے ساتھ کھڑی ہوئی دو زیر مرمت کاریں بھی متاثر ہوئی ہوں گی مگر خبر میں اس کا تذکرہ نہیں تھا۔ پولیس شاید اسی گیراج کے مالک کو پکڑ کے لے گئی ہو گی یہ پوچھنے کے لیے کہ وہ مرسیڈیز وہاں کیسے پہنچی... کیسے اس میں آگ لگی؟ اسے وہاں چھوڑ کر جانے والے کون تھے اور اس نے کچھ نہیں دیکھا تو کیوں نہیں دیکھا؟ باقی دو گاڑیوں کے مالکوں نے بھی اپنے نقصان کے لیے اس کو ذمے دار ٹھہرایا ہو گا اور پولیس نے کاروں کے مالکوں کو مطمئن کرنے کے لیے گیراج والے کو اندر کیا ہو گا۔ اس کی واجبی سی مرمت کی ہو گی اور پھر اسے معاف کر دیا ہو گا۔ معاف کرنے کا تاوان لے کر پولیس کو بھی معلوم ہو گا کہ وہ مجرم نہیں ہے اور اگر سچ مچ تفتیش کرنی پڑی تو وہ کبھی کچھ معلوم نہیں کر سکیں گے لیکن خبر میں یہ سب نہیں تھا۔ ٹریفک سارجنٹ نے بھی واقعات کو اپنی مرضی کے مطابق پیش کیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق حملہ آور دو تھے اور ان میں سے ایک گاڑی لے کر بھاگ گیا اور دوسرا پکڑا گیا۔ اس نے دوسری کار کے مالک کو پکڑ لیا تھا جو وہاں موجود ہونے کا قصور وار تھا۔ وہ نشے میں تھا اور اس کا یہ جرم کافی تھا۔ پولیس نے اس سے سارے نقصانات کی تلافی کرالی ہو گی۔ سارجنٹ نے اپنی عزت بچالی تھی ورنہ یہ بالکل نہیں لکھا تھا کہ فرار ہونے والا مجرم اس کی وردی اتروا کے بھاگ گیا تھا۔ وہ دوبارہ اس وردی میں نمودار ہوا تھا اور پھر بھاگ گیا تھا۔ اس قسم کی کارکردگی پر اسے بہت شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ جو پکڑا گیا تھا بہر حال پیسے والا تھا۔ نئی وردی بنوانے کے لیے پیسے دے گیا ہو گا۔

www.paksociety.com

ہم واپس پہنچے تو غالب اور نازو مختلف کروں میں بیٹھے رہتے تھے۔ غالب اپنے بچپن سے فرار ہونے تک کے واقعات بڑی تفصیل سے بیان کر رہا تھا اور نازو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی۔ چنانچہ غالب نے فریدہ کی کتاب کا ہر ورق اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔

"میرا خیال ہے غالب یا آخر نازو کو امپریس کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔" محسن نے ان دونوں کے انہماک کو دیکھ کر کہا۔

"تم سب مرد ایک جیسے شکاری ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "لفظوں کے جال بنتے ہو، سبز باغ اور سنہرے خواب دکھاتے ہو، عورت بچ کر کہاں جا سکتی ہے؟"

"یہ عورت تو اپنے گھر جا سکتی ہے۔" محسن بولا۔ "اس کا اپنا گھر ہے؟"

"کون سا گھر؟ عورت کا اپنا گھر ہوتا ہے؟" رابعہ جذباتی ہو گئی۔

"یہ تمام فلسفہ مت جھاڑو، یہ اداس کرنے کے لیے کافی ہے، تو ایک دن بابل کا انگنا چھوڑ کے آنا پڑتا ہے۔" محسن بولا۔ "ہم سب ہی اسی طرح اپنے اپنے دل میں حسرتِ تعمیر لیے پھرتے ہیں۔ میرا کون سا گھر ہے؟ استاد ٹیڈی کا گھر کہاں ہے؟ بے چارے کا گھر تو اسے ملا نہ سکندر کو۔ لیکن اسے تم نے خرید لیا، اس ویرانے میں اور اس ویرانے میں کیا فرق ہے؟ بقول شاعر، آباد کرتے آخر ویرانے آدمی ہیں۔ جب سکندر رخصت ہو کے تمہارے گھر جائے گا... تو کیا وہ اس کا گھر نہیں کہلائے گا کیونکہ مالک تو تم ہو۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" رابعہ نے شرمندگی سے کہا۔

اندر سے غالب کا ایک نعرہ سنائی دیا۔ نازو ہنستی ہوئی برآمد ہوئی اور رابعہ کو اپنے ساتھ لے گئی۔ "چلو باجی کچھ دوپہر کے کھانے کا کریں۔" وہ بولی۔ جاتے جاتے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ غالب رونی شکل بنائے لنگڑاتا ہوا نمودار ہوا تو وہ پھر ہنسی۔ میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"یار مرزا... خیریت تو ہے نا...؟" میں نے ہمدردی سے کہا۔

"خاک خیریت ہے۔" مرزا فرش پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ "الو کی پٹھی کے ہاتھ پیر ہی قابو میں نہیں ہیں۔"

"تمہاری بھی تو زبان قابو میں نہیں ہے دوست۔"

"او یار تو زبان کا جواب زبان سے دے۔" مرزا غالب نے غصے سے کہا۔ "آخر کون سی بڑی بات کہہ دی تھی میں نے۔ یہی کہا تھا کہ وہ دن کب آئے گا جب تمہارے رخِ روشن کی چاندنی سے میرے گھر میں اجالا ہو گا۔ میرے دل میں پھول کھلیں گے۔"

"ڈائیلاگ تو اچھا تھا۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔

"خاصی رومانٹک اور جذباتی بات تھی۔" محسن نے میری تائید کی۔

"بس اسی پر اٹھا کے پھینک دیا۔" غالب نے نقشِ فریادی

کر کے کہا۔

"تم چھوڑو مرزا... یہ عشق تمہارے بس کا نہیں۔" [illegible] کہا۔ "نخرے اٹھاتے ٹوٹے ہو جاؤ گے شادی ہونے تک... [illegible] پر جانا اچھا نہیں لگتا۔"

"اور ڈھیل چھوڑ کے بیٹھ کر کیسا لگتا ہے؟" محسن بولا۔

"یہی تو مجبوری ہے دوستو۔" غالب نے آہ بھر کے کہا۔ "اپنی خو تم چھوڑو گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔"

"سوچ لو ابھی سے یہ حال ہے۔ بعد میں کیا ہو گا... جب تم اس کے حکم کے غلام ہو گے... [illegible] ہے..."

"سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔" غالب بولا۔ [illegible] نے آج بھی بار بار اظہارِ عشق کیا تھا۔ اعترافِ جرم کیا تھا اور سزا کا طلبگار رہا تھا۔ اس کا مرض لاعلاج ہو چکا تھا۔

"یار یہ نازو کیا اب ایسے ہی بھڑ کے گی؟" غالب بولا۔ "بجھی ہوئی۔"

"یہ پوچھو کہ چاند بدلی سے کب باہر آئے گا۔" میں نے [illegible]

"تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب موسے بھائی آئے گا اور [illegible] کو پھر سے بنائے گا۔"

"اور موسے بھائی کب آئے گا؟" محسن بولا۔ "جب [illegible] دیکھیں گے۔"

"اور تم اسے کب لاؤ گے؟" غالب نے کہا۔

"ہم اسے جب چاہیں گے اٹھا لائیں گے۔" محسن نے [illegible]

"اب تو اٹھا کے ہی لانا پڑے گا... اپنی خوشی سے [illegible] بھی نہیں آیا تھا......" غالب بولا۔ "صورت دیکھی جائے گی۔"

"ہمیں ایک خانہ بدوش قبیلے کے سفر کرنا ہے۔" [illegible] کہا۔ "پھر کیا ضرورت ہے نازو کا میک اپ اتارنے کی، ہم سب کو ایسا ہی بن جانا چاہیے۔"

"ہمیں خانہ بدوشوں کے دیگر اسباب کی ضرورت [illegible] چار گدھے اور کم سے کم دو خیمے۔ سفر میں کھانا پکانے کا سامان، بستر اور زمین پر بچھا کے سونے کے لیے کچھ بستر [illegible] بولا۔ "اس کے علاوہ صورت خانہ بدوشوں جیسی بنا لینے کے بعد ویسا ہی لباس بھی درکار ہو گا۔ یہ سب کہاں سے آئے گا؟"

"بازار میں کیا نہیں ملتا۔ ابھی تو کھانے میں دیر ہے۔" [illegible] نے کہا۔ "ہم چلتے ہیں اور سب خرید لاتے ہیں۔ تم [illegible] بدل جائے تو اچھا ہے۔ پھر یہ طے کریں گے کہ کس کو کیا کرنا ہے، کدھر جانا ہے۔"

"اب ہم سب ایک ہی قافلے کی صورت میں نہیں [illegible] سکتے۔" غالب نے بھی بالآخر اپنے لب کھولے۔ "دو حصوں میں [illegible] بٹ گا۔ ایک ٹیم دوسری ٹیم سے رابطہ ضرور رکھے گی، لیکن دونوں [illegible] رہیں گے۔"

"یہاں کون ٹھہرے گا؟" ٹیڈی سوتے سوتے اٹھ بیٹھا۔

"کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہاں کوئی کام نہیں ہو گا۔"

"کام تو ہے لیکن تم اسے کام نہیں سمجھتے۔" ٹیڈی نے شکایتی [illegible] "بیمار [illegible] والد کی بیٹی کا کیا بنے گا؟"

"اس کے لیے ہمیں جو کچھ کرنا ہو گا جانے سے پہلے ہی کر لیں گے۔ اس کے بعد آپریشن کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ آپریشن کی کامیابی کے لیے ہم دعا کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔ دعا کے لیے ہمارا یہاں موجود ہونا ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔

"ہم ان عورتوں کو بھی ساتھ رکھیں گے؟"

"ظاہر ہے، یہاں کس کا میکہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ان کی ضرورت بھی تو پڑ سکتی ہے۔ ایک ٹیم میں نازو ہو گی تو دوسری میں رابعہ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ میں اور نازو الگ الگ ہوں۔ خالی ہاتھوں لڑنا پڑے تو دونوں ٹیموں میں مقابلے کی صلاحیت برابر ہو۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم اور رابعہ... میں اور نازو..." غالب نے خوش ہو کے کہا۔ "خوب گزرے گی..."

"مجبوری ہے ورنہ تمہاری جان کی بازی نہ لگاتے۔" میں نے کہا۔ "اسے تمہارے بچھڑنے کا موقع ملا تو وہ سارے عشق ستم تمہاری جانِ ناتواں پر کرے گی اور وہاں تمہیں بچانے والا بھی کوئی نہیں ہو گا۔"

"اسے تو موت کا فرشتہ سمجھنا چاہتا ہے۔ مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی۔" غالب چلایا۔

"بس تو پھر کیا غم ہو گا۔" محسن بولا۔ "شوق سے مرو۔"

"ان میاں بیوی کا کیا ہو گا۔ کیا ہم ظالم سماج کی طرح ان کو جدا کر دیں گے؟" غالب بولا۔

"میرا خیال ہے شہلا ہمارے ساتھ نہیں جا سکتی۔" میں نے کہا اور محسن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ نہیں جا سکتی۔"

"مگر کیوں نہیں جا سکتی؟" ٹیڈی نے کہا۔

"تم نہیں سمجھو گے بیٹے، ابھی بچے ہو۔" محسن نے اس کے سر پر [illegible] کہا۔ "وہ امید سے ہے۔" اس نے شرماتے ہوئے اعتراف کیا۔

"اچھا؟" غالب اور ٹیڈی ایک ساتھ اچھلے۔ "تو یہ بات ابھی تک بتائی کیوں نہیں۔" غالب نے محسن کے ایک مکا رسید کیا۔ "مبارک ہو بھئی۔"

"یہ تو اتنی تازہ خبر ہے کہ آج کے اخبار میں بھی نہیں۔" محسن [illegible] "مجھے بھی کل رات کو ہی اطلاع ملی تھی اور میرا خیال تھا کہ کسی [illegible]"

"سکندر کو کیا فرشتے بتا گئے؟" غالب بولا۔

"تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے امید تھی۔"

"تم بھی امید سے تھے؟" غالب بولا۔

"ہاں بھئی! ایک اندازہ تھا کہ جب محسن نے شادی کی ہے تو پھر وہ سب کچھ تو ہو گا جو شادی کے بعد ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "دنیا امید پر قائم ہے۔"

"پھر تو واقعی شہلا نہیں جا سکتی۔ اور ظاہر ہے پھر بچے کا باپ بھی نہیں جا سکتا۔" غالب نے کہا۔

"باپ ضرور جائے گا۔ کسی کا باپ نہیں روک سکتا اسے۔" محسن بولا۔

"لیکن یہاں بھی تو کسی کو شہلا کی خبر گیری کے لیے رہنا چاہیے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"ہم اسے کسی کے پاس چھوڑ سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ "مثلاً منظر کے گھر میں۔ اس کی بیوی بہت تجربہ کار ہے۔"

"فائن! اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہو سکتی تھی۔" میں نے کہا۔ "تو اب دونوں ٹیموں کی تشکیل ہو گئی۔ میرے اور رابعہ کے ساتھ استاد ٹیڈی۔ غالب اور نازو کے ساتھ محسن۔ اس سے بہتر ٹیم نہیں بن سکتی۔ غالب اور نازو کی جوڑی تو اچھی ہے..."

"اتنی ہی اچھی ہے جتنی تمہاری اور رابعہ کی جوڑی۔" محسن بولا۔

"ہاں اتنی ہی اچھی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ضروری ہے کہ دونوں کے ساتھ ظالم سماج کا نمائندہ موجود ہے۔ ویسے تو ماشاء اللہ سب ہوش مند، فرشتے وار اور باضمیر ہیں مگر احتیاط اچھی چیز ہے۔ نازو کے اور میرے الگ الگ ہونے کے اسباب وہ نہ ہوتے جو میں نے بیان کیے تو میں خود تجویز کرتا کہ رابعہ اور غالب ایک ساتھ ہوں۔"

"یہ انتخاب بہتر کارکردگی کا ضامن ہو گا۔" محسن نے کہا۔ "کام میں دل لگے اور دل کی تقویت کا سامان ساتھ ہو تو کام بھی کام نہیں رہتا، ایک رومانٹک ایڈونچر بن جاتا ہے۔"

"لیکن نازو اور غالب کے ساتھ ٹیڈی کو رکھا گیا تو یہ ایڈونچر بھی خانہ جنگی کی صورت اختیار کرے گا۔ نازو اور غالب میں تو تو میں میں تو یہاں سے ہی جاری ہے۔ حالانکہ [illegible] ٹیڈی اور غالب بھی لڑیں گے اور تینوں آپس میں الجھنے والے ہوں گے تو سلجھائے گا کون۔ میں اور رابعہ امن پسند لوگ ہیں۔"

"ٹھنڈے خون والے جانور مثلاً مگرمچھ اور اژدھا؟" غالب نے کہا۔

"تمہارے ساتھ محسن ہی ٹھیک رہے گا۔" میں نے کہا۔ "ہم استاد ٹیڈی کے اچھے باڈی گارڈ ثابت ہوں گے۔"

ہم دونوں ٹیموں کے فرائض اور تقسیمِ کار کی بحث میں ایسے الجھے کہ دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا۔ شہلا نے اس سے پہلے ہی لوٹ آنے کو کہا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں [illegible]

www.paksociety.com

کر وہ جائے اور اسپتال کو واقعتاً لگا کے لوٹ آئے۔ رابعہ اور نازو نے لنچ کا اعلان کیا تو دو بج چکے تھے۔ شعلوں کا انتظار بے سود تھا۔ محسن نے بھی مجھ سے اتفاق کیا کہ وہ چار بجے سے پہلے نہیں آ سکتی چنانچہ ہم سب دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ مینو دیکھ کر ہم سب کو حیرانی ہوئی۔ دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں دو لڑکیوں نے بہت کچھ بنا لیا تھا۔ قورمے کے ساتھ آلو کے کٹلٹ تھے۔ بریانی تھی۔ سلاد تھا، رائتہ اور کھیر دیکھ کر مجھ پر رقت طاری ہونے لگی۔ یہ اتنا ہی گھریلو قسم کا مینو تھا جو دربدری میں نہ جانے کب سے خواب و خیال تھا۔ عام طور پر بازار کا کھانا چلتا تھا۔ تنوری روٹیاں اور روسٹ، آلو قیمہ اور گوشت۔

"بیٹھے کیوں ہو... کیا صرف دیکھ کر پیٹ بھر جائے گا؟" رابعہ ہنسی۔

"کچھ یقین نہیں آ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ سب کیسے کر لیا تم لوگوں نے؟"

"ہم کیا نہیں کر سکتے۔" نازو نے غالب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اب تک تو یا تو پر چلتے اور لوٹتے ہی دیکھا تھا..." غالب بولا۔ "یہ معلوم نہیں تھا کہ ہانڈی میں بھی چمچہ چلا لیتی ہو۔"

"اور یہ خاتون ایڈووکیٹ! انھیں قانونی موشگافیوں کے علاوہ کھانے پکانے میں بھی شد بد ہے۔" میں نے کہا۔ "غالباً قورمہ انھوں نے بنایا ہوگا۔"

"غلط... قورمہ نازو نے تیار کیا ہے۔" رابعہ مسکرائی...

"میں نے بریانی پکائی... خوب اندازہ ہے آپ کا۔"

"پھر کٹلٹ نازو نے بنائے ہوں گے۔" غالب نے کہا۔

"میرے کٹلٹ بنا لی رہتی ہیں نا۔"

"یہ بھی غلط۔" رابعہ پھر ہنسی۔ "نازو نے کھیر بنائی ہے۔"

"کھیر پکائی جتنی تھا اور خرچہ دیا چلا۔" میں نے کہا۔

"آیا کٹ کھا گیا۔" محسن نے غالب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تو میں نے ڈھول بجا۔" میں نے امیر خسرو کا دوہا گنگناتے ہوئے نازو کو مخاطب کیا۔ "ڈھول بجتی ڈھول بجانی، ڈھول سپا جیا۔"

"ڈھول تو یہ ساری عمر بجاتی رہیں گی۔" محسن بولا۔ "کھانا کھا کے پھر چلنے سفر میں ریت پھانکنا پڑے اور گھاس چرنا پڑے۔"

میں نے کھانے پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔ بیڈی اور غالب مجھ سے پہلے ہی ٹوٹ پڑے تھے اور خواتین کی ایک تیں منہ سے تھے جو صبر کی تلقین میں وقت ضائع کر رہی تھیں۔ بالکل گھر گرہستی والی بی بیوں کی طرح انھوں نے [illegible] خود کھانے سے [illegible] شعلوں کا انتظار کر لیا گئے۔

غالب اور بیڈی نے اتنا کھا لیا تھا کہ انھیں کھینچ کر اٹھانا پڑا [illegible] وہ بڑی مشکل سے بستر تک پہنچے اور لیٹ گئے۔

"اب تو سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔" استاد بیڈی [illegible]

"غالباً معدے میں جگہ نہیں رہی تو کھانا [illegible] گیا۔ دل و جگر میں سما گیا۔" غالب نے کہا۔

"یہ تمہارا آخری طعام تو نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"اب لیٹ کر پڑے رہو۔" محسن بولا۔ "ہم جا رہے ہیں۔ ہماری واپسی تک فوت مت ہونا۔"

ان دونوں پر غنودگی طاری تھی۔ میں اور محسن گھر سے نکلے تو وہ خراٹے لے رہے تھے۔ نہایت مختصر [illegible] لگتا تھا کہ غالب ایک مصرع پڑھتا ہے اور بیڈی [illegible] مصرع پڑھ کے جواب دیتا ہے۔ ہم دونوں نے جیب میں [illegible] ہزار روپے رکھ لیے تھے۔ باقی ایک [illegible] نے سیف میں اچھی طرح لپیٹ کر [illegible] رکھ دی تھی جس میں پانی اوپر تک بھرا ہوا تھا لیکن نہ جانے [illegible] پڑتا تھا۔ ہم نے اتفاق رائے سے موسیٰ بھائی کی خدمات [illegible] کرنے کو غیر ضروری قرار دیا۔ خانہ بدوش صحرائی قبیلے کا [illegible] بھیس بدلنا کوئی مشکل کام نہیں تھا جو ہم خود نہ کر سکتے۔

چوک رنگ محل کی ایک دکان تک پہنچنے کے لیے ہم نے راہ چلتے لوگوں سے اور کچھ دکانداروں سے رہنمائی حاصل کی۔ رنگ محل کی اس دکان کے ماتھے پر بڑا جاندار [illegible] تھا۔ "حشر تھیٹریکل سپلائی کمپنی" کا نام اسٹیج ڈرامے کے اس عظیم [illegible] اور فنکار کے نام سے منسوب تھا جسے دنیا آغا حشر کے نام سے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ تاہم سائن بورڈ پر مصوری کے سائنے نمونے ویسے ہی تھے جیسے عموماً ٹرک اور بس کی باڈی پر نظر آتے ہیں۔ [illegible] طرف خوفناک مونچھوں والا پہلوان نما شخص [illegible] وضع قطع بنائے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ نے گرز کو تھام رکھا تھا تو دوسرے ہاتھ سے وہ مغل اعظم [illegible] کا پھول سونگھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں کسی شہنشاہ [illegible] نظر آیا جو اسے جھٹکا ہوا اور بیک وقت گرز اور پھول [illegible] تصویر بنا ہو۔ دوسری طرف نورجہاں یا ملکہ [illegible] خاتون تھیں۔ لباس شاہانہ میں بے لباسی کا [illegible] آنکھ چھوٹی تھی یا [illegible] دوسری پڑی۔ کسی نے شرارت میں [illegible] لبوں پر مارکر سے دو سیاہ لکیریں بنا دی تھیں جو [illegible] ہوئی مونچھیں نظر آتی تھیں۔

مالک دکان آغا حشر کا قدردان ہی نہیں [illegible] کا اتفاقاً [illegible] بات کی۔ سب ڈراما ہی تھا۔ اس نے [illegible] اپنا مشورہ شامل کیا اور بہت تفصیل سے سمجھایا کہ [illegible] نظر آنے کے لیے ہمیں کس قسم کا گیٹ اپ بنانا ہوگا۔ اس کے [illegible] بڑی اہم تھی جس میں مختلف اسٹیج ڈراموں کے فوٹوگراف [illegible] نے متعدد ڈراموں کے بارے میں بتایا کہ وہ کس [illegible]

[illegible] ہیرو کے باپ امیر [illegible] کے باپ اور کامیڈین [illegible] زمانہ رول تک بیچے تھے۔ اور بقول خود [illegible] ادا کاری کی دھاک بٹھا دی تھی۔ نیا [illegible] بائیسکوپ کا جس [illegible] کا بیڑا غرق کیا۔ اس نے جس خانہ بدوش قبیلے کے مرد اور عورت کے بھیس میں بہت سی تصویریں دکھانے کے بعد اپنی [illegible] سے سامان نکالا اور مفصل ہدایات کے ساتھ ہمارے حوالے [illegible] کی فضول گوئی کو اس ہم نے مروت اور اخلاق میں سنی... وہ [illegible] دل شکستہ آرٹسٹ تھا جس کے لاکھوں قدردان ختم ہو چکے [illegible] شہرت سے گمنامی کے اندھیرے میں گم ہو جانے [illegible] کوئی پوچھنے بھی نہیں آتا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ جب وہ کسی کو [illegible] کے متعلق کچھ بتاتا تھا تو کم ظرف اور بے تمیز لونڈے [illegible] ایک کلب بنا کے بیٹھ گئے ہیں [illegible] یہ لونڈے خود کو بڑا آرٹسٹ کہتے تھے [illegible] ٹی وی ڈراموں کے لیے منتخب ہو جاتے تھے۔ فن کہیں نہیں مگر فنکار سب ہیں۔ اس نے زمانے [illegible] پر آخری تبصرہ کیا۔

ہم ایک خاصا بڑا بنڈل لے کر اور اس ماضی کے عظیم [illegible] سے مصافحے کی سعادت حاصل کر کے دکان سے رخصت ہوئے تو کچھ افسردہ تھے۔ زمانے کی ناقدر شناسی کا نظارہ بہت [illegible] ناک تھا۔ وہ بھی زمانہ ہوگا جب ہزاروں افراد اس فنکار کے [illegible] کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اس سے ایک بار ہاتھ ملا [illegible] لیے اور اس سے ملاقات کے لیے دن رات آگے پیچھے پھرتے [illegible] کرسیوں سے [illegible] تماش بینوں تک ہر طبقے کی ایک [illegible] ایک حسین لڑکی اس پر فریفتہ ہوگی اور اس کے قرب کی [illegible] میں بے قرار۔ مگر وقت ساتھ چھوڑ گیا تو سب ساتھ چھوڑ گئے۔ اب ثقافت کے نام لیوا بھی اس سے کترا کے گزر جاتے [illegible] شاید وہ ہر ایک کو اسی طرح اپنے ماضی کی داستان سنا کے [illegible] ہوگا اور [illegible] زمانہ جس ہم لوگ... [illegible] کی روش تو یہ ہے کہ جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو۔ [illegible] فنکاروں کو [illegible] والے بھی اپنی تحویل میں نہیں لیتے۔

"اس آدمی نے مجھے شرمندہ کیا۔" محسن بولا۔ "موسیٰ بھائی تھا [illegible] بدمعاش ہم بھی اس سے جو معاشی [illegible] میں [illegible] تھے اور پیسہ اس کے منہ پر مار رہے تھے۔ یہ فنکار تھا اس [illegible] اس نے سمجھا اور فن کے اسرار و رموز سمجھاتا رہا۔ اگر [illegible] ہو جاتا کہ ہم اس کے پیشے سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتے [illegible] ہیں تو اسے کتنا دکھ ہوتا۔"

"دکھ تو آدمی کا مقدر ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر اسے اتنا ہی [illegible] فن کی بے قدری دیکھ کر تو وہ اس پیشے کو خیرباد کیوں [illegible] اصل بات یہ ہے کہ مجبوری سب کچھ کراتی ہے۔

وہ جانتا ہے کہ سب میک اپ سے بھیس بدلنے والے ڈراما آرٹسٹ نہیں ہوتے۔"

"پھر اس نے ہم سے یہ سب باتیں کر کے کیا پایا؟"

"کچھ نہیں... تم بھول رہے ہو کہ وہ ایک [illegible] ایکٹر رہا ہے۔ خواہ اسے اسٹیج اور اسکرین کی دنیا بھول جائے۔" میں نے کہا۔ "وہ اچھی طرح سمجھتا ہوگا کہ اب میک اپ سے کوئی بھیس بدل سکتا ہے تو دنیا کو دھوکا دینے کے لیے، روپوش ہونے کے لیے چوروں کو اور جرائم پیشہ لوگ زیادہ ہیں۔ اسٹیج آرٹسٹ بہت کم۔ اس نے ہم سے کوئی سوال نہیں کیا کہ ہم کس [illegible] یا کس کالج کے ڈرامیٹک کلب سے تعلق رکھتے ہیں۔ عموماً اپنے کلب اپنا سامان رکھتے ہیں اور [illegible] کا مظاہرہ نہیں کرتے تھا۔ اس نے تو ڈرامے کا نام تک نہیں پوچھا۔ ہم سچ مچ اسٹیج ڈراما کرنے والے ہوتے تو کیا اسے دعوت نہ دیتے؟ مگر وہ پرانے وقتوں کے کچھ نہ جاننے والے اور کچھ نہ سمجھنے والے سادہ لوح بوڑھے کا کردار ادا کرتا رہا اور بلاشبہ اس نے اپنی اداکاری سے مجھے متاثر کر لیا۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ اگر اس کے پاس پولیس والے جائیں اور صاف کہیں کہ وہ کس مقصد کے لیے بھیس بدلنا چاہتے ہیں تو وہ حیران ہو جائے گا۔ یہ ظاہر کرے گا کہ اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ اشاروں میں بات کرے گا اور جو وہ مانگیں گے دے دے گا۔"

"اس کا فائدہ؟"

"وہ محفوظ رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جو لوگ دھوکا دہی کے لیے اس سے بھیس بدلنے کا سامان لے جاتے رہے ہیں وہ ایک مظلوم اور قابل رحم شخص لگتا ہے۔ کبھی کوئی پکڑا جاتا ہوگا تو اس کا نام نہیں لیتا ہوگا کہ خواہ مخواہ پولیس اس بڈھے کو بھی گھسیٹے گی۔ بفرض محال اس کو پولیس اعانت جرم میں دھر لے تو وہ ایک مجبور لاچار اور دل شکستہ بوڑھے کی اداکاری سے اپنی معصومیت کا تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہے گا اور چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ بھی موسیٰ بھائی ہے لیکن بے ضرر۔"

"میں نہیں مانتا کہ یہ اداکاری تھی۔" محسن بولا۔

"دیکھو یار! اس نے پیسہ کتنا لیا ہم سے۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ سامان سات ہزار کا ہے؟ وہ ڈراما آرٹسٹ ہوتے تو یہ ان سے سات سو مانگتا اور اگر سات ہزار مانگتا تو کیا وہ اتنی آسانی سے دے دیتے؟ پھر ہم نقلی وگ، داڑھی مونچھیں اور چھوٹا موٹا دوسرا سامان ہے تین چار سو کا ہوگا۔ سات سو کے بجائے اس نے ہم سے سات ہزار وصول کر لیے۔ ایک پیسہ کم نہ کرنے کا مطلب بالکل صاف تھا کہ میاں یہ سامان کی نہیں ضرورت کی قیمت ہے۔ معلوم نہیں تم کیا کرو گے۔ مجھے اپنا رسک بھی تو کور کرنا ہے۔ ممکن ہے تم ڈاکا ڈالو۔ لاکھوں لوٹ لو۔ پھر سات ہزار مجھے کیوں نہیں دیتے؟"

"ہم چھوڑ کے بھی تو جا سکتے تھے۔"

www.paksociety.com

"مشکل تھا، اسے ہم نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ دکان کتنی مشکل سے تلاش کی تھی ہم نے۔" میں نے کہا۔ "مشکل انھی کو پیش آتی ہے جن کا ڈرامے سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ وہ جانتا تھا کہ ہم سات ہزار دے سکتے ہیں۔ ایسی دکانیں گلی گلی تو ہیں نہیں۔ ہم کہاں جاتے۔ اور جاتے بھی تو وہ ایک شوشہ چھوڑ دیتا کہ میاں ہوشیار رہنا۔ لوگ پہلے پولیس کو بلا کے تصدیق بھی کر لیتے ہیں کہ یہ ڈراما کہاں ہو رہا ہے۔ یہ تم لوگ ڈراما آرٹسٹ تو لگتے نہیں۔"

"میں قائل ہونے لگا ہوں تیری بات سے۔" محسن بولا۔ "اس کا یہ بھی مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ آئندہ کے لیے یہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ بڈھے کو پیسے سے غرض ہے۔ اس کے بعد اسٹیج پر ڈراما کرو یا دنیا کے ساتھ۔ اس کی کوئی ذمے داری نہیں۔"

"ظاہر ہے! سات ہزار کی اس نے کون سی رسید دی ہے۔" میں نے کہا۔

"اور سامان سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہم نے اس سے لیا تھا۔" محسن بولا۔ "چلو ٹھیک ہے۔ ہم بھی ایک مستقل فرزند شناس ہیں۔ پھر لیں گے اگر خدا لایا۔"

"اب وہ سامان چاہیے جو کسی دکان پر نہیں ملتا۔" میں نے کہا۔

"کہیں کچھ گدھے چاہئیں۔"

"ان کی کیا کمی! ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"وہ ایک کہاں ملے گا؟" میں نے کہا۔ "غالباً کسی کمہار یا دھوبی سے پوچھنا پڑے گا۔ معلوم نہیں آج کل کیا بھاؤ چل رہا ہے۔"

محسن قہقہہ مار کے ہنسا۔ "کیا دلچسپ تجربہ ہے۔ یہ بھی کبھی سوچ سکتے تھے ہم کہ ایک دن گدھے خریدنے پڑیں گے... ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو آدمی کبھی نہیں خریدتا۔ مثلاً کشکول ہم فقیروں کے ہاتھ میں دیکھتے ہی رہتے ہیں مگر کوئی پوچھے کہ یہ کہاں بنتے ہیں اور کہاں بکتے ہیں تو جتنے خیرات دینے والے ہیں ان میں سے ایک بھی نہ بتا سکے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ شہر سے باہر چلتے ہیں۔ ملتان روڈ کی طرف۔ میں نے اکثر خانہ بدوشوں کے خیمے دیکھے ہیں وہاں۔" میں نے کہا۔ "گدھے کیا ان سے خانہ بدوشی کا تمام اسباب مل جائے گا۔"

ایک ٹیکسی نے ہمیں ملتان روڈ پہنچا دیا۔ ڈرائیور نے دو بار پلٹ کر پوچھا کہ ہمیں ملتان روڈ پر کہاں جانا ہے اور ہر بار ہم نے وہی جواب دیا کہ سیدھے چلتے جاؤ۔

"او جی! ملتان جانا ہے تو صاف دسّو نا۔" وہ چڑ کر بولا۔ "میں نہیں جا سکدا... کوئی بس پھڑ لو۔"

"بس یہی ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی بس پھر بیٹھے آں۔"

ٹیکسی والے نے اس جواب کا مزید برا منایا اور وہیں ٹیکسی کھڑی کر دی۔ ہم نے بہت شرافت سے کرایہ میٹر کے مطابق ادا کیا اور وہ ہمیں سڑک پر چھوڑ کے واپس ہو گیا۔ وہ طے نہیں کر سکا کہ ہم بے وقوف ہیں یا بہت چالاک۔ جب ٹیکسی نظر سے اوجھل ہو گئی تو … ایک طرف اشارہ کیا۔ سڑک سے کچھ فاصلے پر چند خیمے … تھے۔ ایک اونٹ اپنی بلندی کے باعث صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے دامن میں چرنے والے گدھے بھی ہو سکتے تھے اور گھوڑے بھی۔ باقی جو پائے جاتے تھے بھیڑ بکریاں تھے یا خانہ بدوشوں کے بیوی بچے۔

تقریباً آدھے میل کا فاصلہ ہم نے پیدل چل کر طے کیا۔ … کھیتوں کی منڈیر پر سے گئے۔ گرد اور دھوپ نے ہمارے روپ کو خاصا متاثر کیا اور جب ہم خیموں تک پہنچے تو ہمارا لباس کا رنگ اڑ گیا تھا … وہاں کل سات خیمے تھے اور اتنے ہی گدھے ان کے سامنے … جو نہایت کاہلی سے کھڑے تھے۔ چار جوان … عورتیں میلے کچیلے … پیسا … ایک دوسرے کے سروں سے جوئیں … تھیں۔ یہاں کی بابی بھی جاگتی تھی۔ بچے بھی زمین کی … سے بے نیاز … میں مصروف تھے۔ … تھے اور ان کے ساتھ مل کر زمین کو … نے بھونکنا شروع کیا تو انھیں کسی اجنبی کی موجودگی کا احساس … سب سے پہلے بچے آگے اور انھوں نے انتہائی پیشہ ورانہ انداز میں کورس شروع کیا۔ "ایک چار آنے دے بابو... بھوک لگی ہے۔" وہ ہمارے پیچھے چلنے لگے اور مختلف دردبھری اپیلیں کرنے لگے۔ "میرے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ ماں اندھی ہے، باپ …" ہمارے پاس اگر … چونیاں ہوتیں جتنے بچے تھے تو … کورس کو بند کر سکتے تھے۔ ایک روپے کا نوٹ پھینکتے تو وہ آپس میں چھینا جھپٹی میں پھاڑ دیتے اور لڑتے تو ایک کے نوٹ بھی … نہیں تھے۔ چنانچہ ہم نے ان کو نظر انداز کیا لیکن وہ بالکل متاثر نہ ہوئے۔

پھر کسی خیمے سے ایک لمبا سا بانس نما شخص نکلا جس کی مونچھیں اسٹیل وول کی بنی ہوئی لگتی تھیں۔ اس کے لمبے بال کندھوں تک پہنچتے تھے اور تقریباً سفید تھے۔ وہ صرف ایک پاجامہ پہنے ہوئے تھا اور ننگے پاؤں نکلا تھا لیکن اس کے گلے میں … تھی۔ جیسے لال رنگ کے موتیوں کی مالا … کانوں میں … بالیاں اور ہاتھ میں کونڈی والا سوٹا نما ڈنڈا جو جنگ کے کام آتا ہو گا لیکن اس سے وہ سہارا لیتا تھا … ہم اسے دیکھ کر مسکرائے۔

"کیا یہ قبیلے کا سردار ہو گا؟" محسن نے سوچ کر کہا۔

"سجی دانا کچھ سمجھتا ہے۔" وہ شخص آسمان کی طرف اٹھا کے بولا۔ اس کی آواز کی گھن گرج نے مجھے متاثر کیا۔

"یہ تو یار فقیروں کا ڈیرا ہے۔" محسن بولا۔

"پھر کیا ہوا... یہ خانہ بدوش فقیر ہوں گے۔" میں نے

… گلا صاف کر کے اس بڈھے کو مخاطب کیا۔ "بابا! ہم کچھ خریدنے آئے ہیں اور بیچنے بھی۔"

"فقیر دعا دے گا بچہ! اللہ تجھے زمین پر حاکم بنائے گا۔"

"حاکم کیا مطلب؟ سی ایس ایس؟" محسن بولا۔ "ڈپٹی کمشنر؟"

"یار کام کی بات کرنے دو۔" میں نے کہا۔ "بابا! ہمیں کچھ گدھے چاہئیں... جیسے یہ ہیں۔"

بڈھے کا موڈ آف ہو گیا۔ "مذاق کرتے ہو ہم سے۔" وہ گرجا۔ "شہر میں کم ہیں گدھے؟"

"صحیح کہا آپ نے... بہت گدھے ہیں مگر ہم یہ خریدنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ سب... مطلب یہ کہ آپ کی بستی..."

بڈھے نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ غالباً میں صحیح الفاظ میں مدعا بیان نہیں کر سکا تھا۔ محسن نے بروقت میری مدد کی۔

"بابا جی! آپ کے یہ دو خیمے بہت پرانے ہو گئے ہیں۔ محسن نے کہا۔ "ہم چاہتے تھے کہ ان کی جگہ آپ کو نئے خرید دیں۔"

"اللہ اجر دے گا آپ کو۔" بڈھا ایک دم خوش ہو گیا۔

"اب جانے سے پہلے اتنا وقت تو ہے نہیں کہ ہم نئے خیمے لا دیں اور پھر ان کو جلا دیں۔" محسن بولا۔ "یہ بتاؤ نئے خیمے کتنے میں آتے ہیں؟"

"دو خیمے... چھ سو... سات... نہیں آٹھ سو۔" لالچ نے اس کے لیے فوری فیصلہ کرنا مشکل بنا دیا تھا۔

"ٹھیک ہے... یہ لو آٹھ سو۔" محسن نے جیب میں سے نوٹ نکالے۔ "یہ خیمے اکھاڑ کے ہمارے حوالے کرو۔"

بڈھا پھر پریشان ہو گیا۔ وہ کبھی خیموں کی طرف دیکھتا تھا تو کبھی نوٹوں کی طرف۔ "ابھی؟... دیکھو بابو... ایک تو میں اپنا خیمہ خالی کر دوں اسی وقت... دوسرا... وہ... پیچھے والا... وہ خالی ہی کلب ہے... باقی مرد و عورت سے پر ہو گئے ہوئے ہیں... شام... بچے رات کو آئیں گے... اور پتا نہیں سودا کریں گے بھی..."

میں سمجھ گیا۔ بڈھا اپنا اور اپنی بہن کا فائدہ چاہتا تھا۔ "ابھی اتنا … یہ تھی کہ وہ دونوں خیمے جو بڈھا بیچنے پر آمادہ تھا … خستہ تھے مگر باقی سب کے مقابلے میں نئے ہی لگتے تھے۔ … نے آنکھ ماری اور اس نے نوٹ بڈھے کو تھما دیے جس … نے … سے دھوتی میں اڑس لیا۔ پھر وہ … طرف منہ کر کے گلا پھاڑنے لگا۔ اس کی زبان ہماری سمجھ میں نہیں آئی لیکن اس کی بات کا اثر ہم نے فوراً دیکھا۔ تقریباً ہر … ایک عورت نے نکل کر چلانا شروع کیا۔ بڈھے نے … جواب میں بہت کچھ کہا جو غیر شریفانہ اور خواتین سے گفتگو … انتہائی ناگوار تھا مگر خواتین ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھیں۔ ان کو بڈھے کی گالیوں پر نہیں اس بات پر اعتراض تھا کہ اس نے کمینے پن کا مظاہرہ کیا اور اپنے دونوں خیمے بیچ دیے۔ انھوں نے بڈھے کو تقریباً ہم وزن گالیاں دیں اور پھر پاؤں پٹخ کر اندر چلی گئیں۔ فروخت ہو جانے والے دونوں خیموں کو اکھاڑنے کا کام فوراً شروع ہو گیا۔ ایسا آتش بیاں اور سنسنی خیز واقعہ پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا چنانچہ بچے بھی دم بخود تھے۔

"اب ایک سودا اور کرنا ہے۔" محسن نے کھنکار کے کہا۔

"بولو بولو... اور کیا چاہیے... یہ مٹکے... یہ مالا... چمٹا ہے اور کشکول ہے۔" بڈھا بولا۔

"نہیں! یہ سب آپ کو مبارک ہو... یہ گدھے..."

"یہ گھوڑے ہیں بابو۔" اس نے تصحیح کی۔

"اچھا! اتنے پورٹیبل... میرا مطلب ہے بالکل گھوڑے کا خلاصہ لگتے ہیں۔" محسن نے ایک کامیاب شو روم کے مالک کی طرح کہا جو کسی کی پرانی گاڑی بیچتے وقت اس میں صرف خامیوں کا شمار کرتا ہے اور مالک شرمندہ ہوتا ہے کہ اب تک جس چیز کو وہ فخر سے گاڑی سمجھ کے استعمال کرتا رہا وہ تو گدھا گاڑی سے بھی زیادہ گئی گزری چیز تھی۔

"خیر گھوڑے ہیں تو گھوڑے سہی... چار دو دو؟" محسن بولا۔ نوٹ محسن کے ہاتھ میں تھے۔ چنانچہ بڈھا دانت پیس کے گالی دے سکا اور دولت لٹانے پر مجبور ہو گیا۔ "یہ چار سو کا ایک ہو گا۔"

"چلو اس کا بھی سودا ہوا۔" محسن نے سولہ نوٹ گن کے بڈھے کی طرف بڑھائے اور پھر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "یہ بڈھا بھی تمھارا ہے؟"

"ہاں جی... لینا ہے؟ آٹھ سو ہوں گے۔" بڈھے نے نوٹوں کی طرف پھر ہاتھ بڑھایا۔

"یہ ہو گئے چھ سو بیس... ٹھیک ہے۔" محسن بولا۔ "کچھ کپڑے... جیسے ان عورتوں نے پہن رکھے ہیں۔"

"یہ... یہ کپڑے...؟" بڈھا بھونچکا رہ گیا۔ "پھر یہ کب پہنیں گی؟"

"ان کو تم نئے کپڑے لا کر دے سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "دراصل ہم تھیٹر والے لوگ ہیں۔ ہمیں ایک فلم کے لیے یہ سب سامان درکار ہے۔ ہمارے پاس یہ تین ہزار روپے ہیں۔ ہمیں خانہ بدوشوں کی زندگی دکھانے کے لیے یہ سامان چاہیے۔"

"فلم کے لیے...؟" بڈھا بولا۔ "ایک بار پہلے بھی فلم والے آئے تھے اور ہم سب کو لے گئے تھے۔ سب کو دس دس روپے ملے تھے۔"

"ہم بھی لے جائیں گے اور پچاس پچاس دیں گے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے جی... سب مل جائے گا آپ کو۔" وہ بولا۔

"ہاں! [illegible]" میں نے کہا۔ "آدھا گھنٹا [illegible] ہم انتظار کریں گے۔"

www.paksociety.com

تقریباً ایک گھنٹے میں وہ سب سامان ریڑھے پر لاد دیا گیا جو ہم نے مانگا تھا۔ اگر ہیں بڑھے نے ہماری مدد کی ہوتی تو ہم ریڑھے کو ڈرائیو کر کے نہیں لے جا سکتے تھے خصوصاً اس صورت میں کہ تین فاضل گھوڑے بھی ساتھ ہوں۔ اس نے دو گھوڑوں کو بڑی مہارت سے آگے جوتا اور دو کو پیچھے باندھ دیا۔ ہم سامان کے اوپر بیٹھے اور وہ شہر کی مختلف سڑکوں سے گزار کے شام پانچ بجے تک ہمیں گھر کے قریب پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ خیریت گزری کہ راستے میں کوئی حادثہ نہیں ہوا اور کوئی ٹریفک سارجنٹ ملا بھی تو متوجہ نہیں ہوا۔ ہماری جیب میں اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ اس سے کچھ غلامی کی فیس ادا کر سکتے۔ ابھی ہم اپنے گھر سے آدھا میل کے فاصلے پر تھے کہ مجھے ایک کھلا میدان سا نظر آیا۔ میں نے اس جگہ کو مناسب سمجھتے ہوئے گھوڑا گاڑی رکوا لی۔ ڈرائیور سے کہا کہ ہماری فلم کا سیٹ اسی جگہ لگایا جائے گا۔ وہ اگر چاہے تو ایک ہفتے بعد اپنے تھیلے کو لے کر صبح نو بجے تک یہاں پہنچ جائے۔ اس نے اپنی فقیرانہ بولی اب ترک کر دی تھی اور ہم سے عام فہم زبان میں اور سیدھے صاف لہجے میں بات کر رہا تھا۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے دو گھوڑوں کی باگ ڈور سنبھالنے کی کوشش کی اور اس تجربے میں ناکام رہا۔ وہ اشاروں کی زبان سمجھنے والے جانور تھے اور میرے اشارے ان کو کنفیوز کر رہے تھے چنانچہ ایک چلتا تھا تو دوسرا رک جاتا تھا۔ ایک دائیں طرف جانے کے لیے مڑنے لگتا تو دوسرا بائیں سمت چلنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس طرح گاڑی نہیں چل سکتی تھی چنانچہ میں نے اتر کے ان دونوں کی لگام تھامی اور آگے آگے پیدل چلنا شروع کیا۔ محسن پیچھے رہا اور باقی دو گھوڑوں کو ہنکاتا رہا۔ جب ہم اس خانہ بدوشی کے جملہ اسباب کے ساتھ کوٹھی کے ویران احاطے میں داخل ہوئے تو مجھے بہرام دادا کی بیوی کی گاڑی نظر آئی۔ "یہ کون آ گیا سکندر؟" محسن نے گھبرا کے کہا۔

"فکر کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم ان گھوڑوں کو یہاں باندھ دو۔ ان کے چرنے کو گھاس کافی ہے۔ ریڑھا پیچھے کی طرف لے جانا۔ سامان اسی پر رہے۔"

"یہ سب تو کر لوں گا میں۔۔"

"بہرام دادا کی بیوی آئی ہے۔" میں نے کہا۔ "شاید تمہارا کو چھوڑنے اور ہمارا ٹھکانا دیکھنے آئی ہوگی۔"

اندر پہنچنے کے بعد میں نے بہرام دادا کی بیوہ کو ایک پرانی کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ اس کے سامنے بیڈ پر لیٹا ہوا زار و نزار چپ چپ سا تھا۔ غالب اور شیڈی کچھ فاصلے پر مستقر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ عورت کھڑی ہو گئی۔ اس نے ابھی تک لباس نہیں بدلا تھا مگر میرے جسم پر سارجنٹ کی وردی نہیں تھی۔

میں نے اسے سلام کیا اور اس کی بیٹی کی خیریت پوچھی۔

"وہ ویسی ہی ہے۔" وہ بولی۔ "کل رات بھی ... کے بعد اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔"

"شملہ پولیس کی تحویل میں ہے۔" غالب نے کہا۔

"پولیس کی تحویل میں؟" میں نے ... اور محسن نے ...

"بے چاری لڑکی۔" بہرام دادا کی بیوہ نے افسوس ...

"آئی تو تھی جولی کی جان بچانے کے مشن پر۔۔۔ میری ... جولیٹ مگر ہم جولی کہتے ہیں۔ مجھے بہت دکھ ہے کہ ... کر لیا گیا۔"

"لیکن کس جرم میں؟" میں نے کہا۔ "کیسے گرفتار کر لیا؟"

"جرم اس نے تو کوئی نہیں کیا تھا۔" غالب ... "ہمارے ساتھ تھی۔ مجرموں کی ساتھی تھی۔"

محسن ابھی تک اس غیر متوقع صدمے سے ... "یہ پولیس کو کیسے معلوم ہوا۔۔۔؟"

"غلطی میری بھی تھی۔" جولی کی ماں ... "مجھے معاف کرنے ... لیکن تم نے مجھے رات کو ... نہیں تو شاید یہ سب نہ ہوتا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ تم تو ایک سارجنٹ کی وردی چھین کر میری گاڑی کے ... آ گئے تھے اور تم نے مجھے بتایا ہی نہیں تھا کہ تم۔۔۔"

"تم نے ... موقع کب دیا تھا۔۔۔ کیا ضرورت تھی فرار ہونے کی؟" میں نے بے رخی سے کہا۔

"دیکھو، وہ میری غلطی نہیں تھی۔ میں بہت پریشان تھی۔ وہاں تم نے اس شرابی سے مارپیٹ شروع کر دی تھی۔ ... میں اس جھگڑے میں نہیں پڑ سکتی تھی۔ مجھے پہلے ہی ... تھی۔ میں تو اس نروس بریک ڈاؤن کا بہت جلد شکار ہو جاتی ہوں۔ جولی کی بیماری نے میرا حوصلہ چھین لیا ہے اور میری قوت ... ختم کر دی ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ پولیس والا مجھے تھانے لے جائے گا اور وہاں جو سوال جواب ہوں گے ان کا مجھے اندازہ تھا۔ وہ مجھے بلاوجہ بٹھائے رکھتے۔۔۔ ذلیل کرتے اور پھر ... آج کل ویسے ہی میرے پاس نہیں ہے جو تھا وہ ... بیماری میں لگ گیا اور میرے پاس زیادہ تھا بھی نہیں۔ ... باپ جتنا چھوڑ کر مرا تھا اس میں سے ہم کئی سال سے ... تھے۔ اس میں ... کا قرضہ بھی ... ہوتا ... کمانے والا کوئی ... تھا۔ میں سروس کر سکتی تھی۔ پڑھا سکتی تھی۔ اسٹینو گرافر ... میں نے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھی تھی اور اچھی ... لیکن میں کیا کروں کہ بہرام دادا کا حوالہ میری راہ میں حائل ... تھا۔ مجھے نوکری اس لیے نہیں ملتی تھی کہ میں ایک بدنام ... کی بیوی رہی تھی۔ میں خود بدنام نہیں تھی۔ کوئی بھی مجھ سے ... تھا کہ تم کس کی بیٹی ہو۔ میری شرافت کی بہرام دادا قسم کھاتا تھا۔ ... شادی کر کے گویا میں نے خاندانی شرافت بیچ دی تھی۔ سب ... میرے ... یار دوست ... وہ ... کے ساتھ تھے اور یہ حاقت اب بھی آئے جاتے رہیں ... بڑی خرابی ہوئی کہ ... نہیں سوچا تھا کہ وہ ساتھی اگر ساتھ ... تو ... سو کی نوکری کیوں ڈھونڈتی پھرتی۔۔۔ خیر ... معاف کرنا میں کیا کہنا چاہتی تھی اور کدھر نکل گئی۔"

"تم اب فکر مت کرو۔" استاد ... نے اچانک ... انتہائی ... لہجے میں یوں کہا کہ ہم بھی چونک پڑے۔ "تمہاری مشکلات ... ختم ہو گئیں۔ اب تمہیں کسی بات کی پریشانی نہیں ہوگی۔ ... سب تمہارے ساتھ ہیں۔"

"ہاں! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" میں نے کہا۔ "خدا ... تو جولی ... ٹھیک ہو جائے گی اور دوسرے مسائل بھی حل ... مگر یہ بتاؤ کہ شملہ تک پولیس کیسے پہنچ گئی؟"

"میں وہی بتانے والی تھی۔" جولی کی ماں بولی۔ "تم جیسی ... الجھ پڑے تھے۔۔۔"

"وہ شرابی مجھ سے الجھا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، میرا مطلب تھا میرے۔" وہ معذرت آمیز لہجے میں بولی۔ "اس نے میری گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ اور میں سمجھتی ہوں ... اس نے مجھے کوئی بدقماش عورت سمجھا ہوگا۔ میرا حلیہ بھی تو ... لیکن یہ لباس تو میں شروع سے پہنتی آئی ہوں۔ ... پہنا میں نے۔ ہاں میں ... بہرام دادا نے تو کبھی نہیں ٹوکا مجھے۔ اب تو ... آپ نہیں کرتی ... کرتی تھی۔ اس نے کبھی نہیں کہا ... میرا نام ہے مگر سب ... کہتے ہیں۔ اس نے ... مجبور نہیں کیا۔ مجھے ... والے کرسچن ... فٹ تھا ... کسی نے نہیں سمجھا اور اسی لیے ... راستے سے ہٹ گیا باغی ہو گیا۔ اس نے مجھ سے محبت ... کے باپ کی دولت کو لات مار دی مگر مجھ ... کہا کہ اپنا مذہب بھی چھوڑ دو۔ میں نے اسے بتا دیا تھا ... ہوں۔ اس نے کہا کہ کیا فرق پڑتا ... سال بھی ہیں۔ تمہارا اور ہمارا خدا تو ایک ہی ہے ... ہمارا عقیدہ بھی ہے کہ ان کو آسمان ... گیا۔ پھر میں ہمارا اپنا مذہب ... کے لیے کوئی ... نہیں ... سکتا۔ کوئی مذہب پریشانی پیدا کرنے اور ... پھیلانے ... اتفاق ... کے لیے آیا ہی نہیں۔ ہمارا ... مسائل بھی وہی ہیں جو کسی بھی گھر کے مسائل ہو سکتے ... واقف ہو۔ اپنے فرائض کو سمجھتی ہو تو کافی ہے۔ ... ہونا چاہیے ... کی تعلیم ہے۔ ... چلی جاتا۔ میں بدبخت جسے کوئی ... نہیں جاتا تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ تم میرے ساتھ علیحدہ کر لینا اور میں تمہارے ساتھ کرسمس میں شریک رہوں گی۔ آئی ایم سوری۔ میں پھر بھول گئی کہ تم نے کیا پوچھا تھا۔ میں اس آدمی کی بات کر رہی تھی جو مجھے غلط قسم کی عورت سمجھ کے رکا تھا۔ غلط آدمی وہ خود تھا۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ مجھے پولیس نے آدھا گھڑی میں دھر لیا ہے۔ یا شاید خود بھی پولیس والا۔۔۔ خیر۔۔۔ اسے مایوسی ہوئی اور اس نے مار کھائی۔ پھر اس نے نمبر جانے دیکھ لیا تھا اور جب دوسرا آدمی جو اندر ہی تھا دوڑتا ہوا آیا تھا اور جس کے متعلق مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ اصلی پولیس سارجنٹ تھا۔ تم نے اسے مار کے اس کی وردی کیوں چھینی تھی؟"

"اس سوال کا جواب میں پھر کبھی دوں گا۔" میں نے کہا۔

"خیر وہ اصلی سارجنٹ تو وہیں رہ گیا تھا اور تم اس شرابی کی گاڑی لے کر بھاگ گئے تھے۔" کیتھرین نے کہا۔ "اسی سے ساری گڑبڑ پھیلی۔ وہ ایک اسمگلر کا لڑکا تھا۔ باپ سے زیادہ بگڑا ہوا لیکن بااثر۔ اس وقت تو وہ پولیس کے ساتھ چلا گیا مگر آدھے گھنٹے میں باپ آ پہنچا۔ یہ باتیں مجھے اسپتال میں آج معلوم ہوئیں۔ وہ بیٹے کو لے گیا اور پولیس کو اس کی گاڑی چوری ہونے کی رپورٹ لکھنا پڑی۔ اخبار میں جو خبر ہے وہ فضول اور نامکمل ہے۔ اس میں نہ کسی کا نام ہے اور نہ گاڑی کی چوری کا ذکر۔۔۔ یہ سب پولیس والوں کی چال تھی۔ انہوں نے میری کار کا نمبر ... معلوم کر لیا گاڑی کس کی ہے اور پھر میرے گھر پہنچے۔ ان کا خیال تھا کہ تم میرے ساتھی ہو۔ تم میرے ساتھ کار میں بیٹھے تھے اور میری خاطر تم نے ایک شخص کو مارا بھی تھا چنانچہ میں ان کو تمہارے بارے میں بتا سکوں گی۔ صبح گیارہ بجے وہ اسپتال آ پہنچے۔ میں جانتی تھی کہ انکار کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ میری نہیں مانیں گے کہ میں تمہیں نہیں جانتی اور تم سے چند منٹ پہلے ہی ملی تھی۔ تمہارا نام تک نہیں جانتی اور تم کو پہچانتی بھی نہیں۔ وہ یقیناً مجھے تھانے لے جا کر اقرار کرانے کے وہ سب طریقے آزماتے جن سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ معاملہ بہت سنگین تھا۔ ان کے ایک افسر کی سخت بے عزتی ہوئی تھی۔ تم نے اسے مارا اور اس کے کپڑے اتار کے اسے اندھیری جھاڑیوں میں پھینک گئے۔ پھر آئے اور اس کی نظروں کے سامنے دوسری واردات کر کے بھاگ گئے۔ اس کی ایک گولی نہیں لگی تمہیں۔ وہ اپنی ناکامی پر سخت مشتعل تھا۔ اگر وہ مجھے تفتیش کے لیے لے جاتے تو اپنی ناکامی کا سارا غصہ مجھ پر اتارتے اور خواہ وہ مجھے مار مار کے ختم کر دیتے مگر مجھ سے تمہارا نام پتا معلوم کرنے میں ناکام رہتے۔ جو بات مجھے معلوم ہی نہیں تھی وہ میں ان کو کیسے بتاتی۔ جولی نے ہی میری جان لے لی۔ یہ سب سوچ کے میں نے اسپتال کے ایک ... بات کی۔ وہ بہت نیک دل آدمی ہے۔ نیک دل کوئی ہو سکتا ہے خدا کے کسی سے نہیں ڈرتا اور اپنے ضمیر کو زندہ رکھتا ہے۔

www.paksociety.com

مسلمان ہے اور اگر جنگ نہ ہوتا تو شروع سے میرے ساتھ بے حد ہمدرد اور رقیہ رکھتا۔ وہ ایسا آدمی تھا جس کی مدد نے مجھے بہت سہارا دیا۔ اس نے میری ساری بات سنی اور کبھی یہ میری کچھ تو فی ہے یا کمزوری کہ جب کوئی مجھ سے ہمدردی کرتا ہے تو میں ایسا دکھڑا رونے بیٹھ جاتی ہوں۔ مسلسل صدمات اور آزمائشوں نے مجھے کمزور کر دیا ہے۔ زیادہ تر لوگ تو دکھوں کے زخم دینے والے ملتے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ کبھی کوئی ملے تو میں اپنا ہر دکھ اور ہر زخم اسے دکھانے لگتی ہوں۔ اسی ڈاکٹر کو میں نے بتایا کہ ایک پولیس والا مجھے اپنے ساتھ تھانے لے جانا چاہتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو بتا دیا کہ میرے ساتھ کیا حادثہ ہوا تھا اور اب مجھے کیا ڈر ہے۔ اس نے میری بات سمجھی اور پولیس والے کو وارڈ سے نکال دیا مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ تھوڑی دیر میں وہ سارجنٹ خود آ پہنچا۔ وہ دو پولیس والوں کے ساتھ مجھے وارڈ میں گھس کے اور میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال کے لے جانے کی نیت رکھتا تھا مگر وارڈ میں اس کو میرے بجائے ڈاکٹر سے بات کرنا پڑی۔ ڈاکٹر نے مجھے وارڈ میں ڈیوٹی آفیسر کے کمرے میں بٹھا دیا تھا اور کہا تھا کہ جب تک پولیس چلی نہ جائے میں باہر نہ آؤں ورنہ صورت حال بگڑ جائے گی۔ وہ زبردستی میرا آیا تو تمہیں گھسیٹ کر لے جائے گا۔ مجھ سے مار پیٹ ہوگی اور معاملہ اتنا بڑھ جائے گا کہ ڈاکٹر ہڑتال کر دیں گے۔ اخبارات طوفان کھڑا کر دیں گے لیکن اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ میں اس کمرے میں بیٹھی سنتی رہی۔ تھانیدار بہت گرم ہوا مگر ڈاکٹر نے تحمل سے بات کی اور کہا کہ جولی کی ماں کل دوپہر کے بعد آئی تھی اور پوری رات یہاں رہی کیونکہ اس کی بیٹی جولی کی حالت اچانک بگڑ گئی تھی۔ ہم نے اسے فون کر کے بلوایا تھا۔ وہ یہ بات ماننے پر تیار نہیں تھا اور جانتا تھا کہ ڈاکٹر مجھے بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ جب اس نے شور کیا تو ڈاکٹر نے کہا کہ تھانیدار صاحب یہ وارڈ ہے۔ یہاں آہستہ بات کرو ورنہ یہاں سے نکل جاؤ۔ اس نے ڈاکٹر کو بھی دھمکی دی کہ تم مجرم کو چھپا رہے ہو اور یہ بھی جرم ہے۔ ڈاکٹر نے سینئر ڈاکٹر کو طلب کر لیا اور فوراً ہی علاقہ ایس پی کا فون آ گیا۔ انسپکٹر کو واپس جانا پڑا۔ ایک ڈاکٹر اور ایک سینئر سرجن کو خود ایس پی بھی مجبور نہیں کر سکتا تھا تاہم انسپکٹر اپنے یقین کی وجہ سے ساتھ آنے والوں کو وارڈ کے دونوں جانب باہر کھڑا کر دیا کہ وہ آنے جانے والوں پر نظر رکھیں۔ کیتھرین باہر نکلے تو اس کا تعاقب کریں اور کوئی جولی سے ملنے آئے تو اس سے بھی پوچھ گچھ کریں۔ یہ جاننے کے بعد کہ میں کون ہوں وہ اپنی کامیابی کے بارے میں بہت پرامید تھا۔ اس نے مجھ سے صاف کہا تھا کہ وہ بدمعاش بھی تیرے شوہر کا یار کوئی ڈاکو تھا جو اب تیرا یار ہے۔ تو اسے چھپا رہی ہے اور یہ ڈاکٹر تجھے بچا رہا ہے مگر میں کسی کے روکے رکنے والا نہیں ہوں۔ میں ہی دم لوں گا۔ ابھی وہ وہیں موجود تھا کہ شعلہ آ گئی۔ جولی کو بھیجا تھی اس لیے وہ لوگوں سے چھپتی تھی۔ اس کی اطلاع فوراً انسپکٹر کو مل گئی۔ ایک عورت جولی کی آئی ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ وہ جولی کا تھا اس کا بیٹا نمبرا اور وارڈ۔ وہ عورت وضع لگتی ہے مگر عورت جوان، خوب صورت اور وہ بہت خوش ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ عورت اور تم نے خود آنے کے بجائے اسے بھیجا ہے تاکہ پتا چل جائے۔ وہ وارڈ کے باہر شعلہ نکلی اس نے آگے بڑھ کے راستہ روک لیا۔ اندر بیٹھی رہی تھی اور میں نے بھی اس سے بات نے مجھے تمہارے متعلق بتایا۔ تم سب کے متعلق...

"ہمارے متعلق کیا بتایا اس نے؟" محسن بولا۔

"کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔" کیتھرین بولی۔ کہ رات کو انسپکٹر کی وردی میں میرا بھائی تھا اور اس نے جو کیا تھا مجبوری میں کیا تھا۔ مجبوری کی نوعیت اس نے نے یہ بھی کہا کہ میرے تین بھائی ہیں اور شادی شدہ نے یہ بھی بتایا کہ دو بھائیوں کی بہت جلد شادی ہو جانے ان کی نسبت طے پا چکی ہے لیکن میں نے نام پوچھے تو کسی کا بھی نام بتانے سے انکار کر دیا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہاں رہتی ہے۔ ماں باپ کون ہیں اور شوہر کیا کرتا ہے تنگ کر آ گئی! بس آپ کا کام ہو جائے گا۔ آپ کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ ہم خود آپ سے رابطہ رکھیں گے آپ کا پتا درکار ہے۔ میں نے اسے پتا بتا دیا مگر نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ اس کا رویہ کوئی انسان ایک کام کرتا ہے تو اسے نہیں ہوتی۔ بے شک کچھ لوگ گمنام رہ کے نیکی کرتے دینی تشہیر سے گریز کرتے ہیں لیکن کسی نہ کسی کو تو معلوم کر وہ کون ہیں۔ وہ مجھے تو سب کچھ بتا سکتی تھی اور ہم لوگ پبلسٹی نہیں چاہتے مگر میں نے محسوس کیا اپنی شناخت ظاہر کرانے کا مقصد وہ نہیں ہے وہ اپنے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے ڈرتی ہے۔ بھی عجیب تھا اور تمہارے بارے میں معلوم ہونے مزید شک میں ڈال رہی تھیں۔ تاہم میں نے شعلہ کی۔ خدا نے اسے رحمت کا فرشتہ بنا کے بھیجا کی جان بچ جائے۔ اب وہ کچھ بھی ہوں۔ ڈاکو ہوں تو مجھے کیا۔ اتنی بڑی نیکی کے بعد

ضرور قبول کرے گا۔ دنیا کا قاعدہ مختلف ہے۔ بہت بڑی نیکی سے بھی ایک بہت چھوٹے جرم جب تک کہ قانون اسے بری نہ کرے۔ میں سے ظاہر ہے کہ زیادہ نہیں، رحمت کا چلا جائے گا اور پھر میں تمام عمر جولی کی قبر پر نیکی کے جذبے کا خون اپنے شک سے کی بیوی نے تھا چھپائی ہوئی سب دیکھی تھا کہ سب اچھے نظر آنے والے اچھے نہیں سمجھا جاتا ہے وہ بعض اوقات اچھوں سے عذاب اور ثواب نیکی اور بدی اس وقت کا حساب ہے جیسے صرف وہی جانتا ہے۔ میں اتنی خوش تھی کہ جب شعلہ چلی گئی تو میں سوچتی سے کہا کہ ہم بہت خوش نصیب ہیں بیٹی کہ نے قبول کر لی اور ہماری مایوسی کو امید میں بدل دیر نہیں ہوئی تھی کہ مجھے شعلہ کے گرفتار ہونے کا پولیس کے ہاتھ پڑنے سے بگڑ گئی تھی اور اس سے انسپکٹر کا شک بھی یقین میں شعلہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ میں بہت پریشان ہوئی کہ کیسے اطلاع دوں اور اسے کیسے بچاؤں امید کا چراغ بھی روشن نہیں رہ سکتا تھا۔ میں سے بات کی تو اس نے کہا کہ کیتھرین میں نے ہمیشہ تم مصیبت زدہ ہو لیکن وہ عورت ٹھیک نہیں ہو اور جو پولیس کے خیال میں کسی گروہ سے تعلق رکھتی ہے اسے میں کس طرح بچانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔ کسی گروہ کی عورت نہیں تو وہ بولا کہ خود ہی چھوٹ جائے گی۔ مایوس ہو کے میں نے اپنے دوستوں سے رابطہ قائم کیا جو وکیل تھے اور جب وہ اس کے مقدمات کی پیروی کے لیے وصول کرتے رہے تھے۔ ان سب پر میں اعتماد ان کی فطرت سے واقف تھی۔ بعد خدمات کی ضرورت پڑی تھی نہ ان کو مجھ سے تعلق تھا۔ پھر بھی میں نے کوشش کسی حد تک کامیاب رہی۔ ایک سینئر وکیل نے کہا کہ وہ میرے ساتھ تھانے مجھے ہسپتال سے اپنے ساتھ لے گیا اور اس تھانے والے بھی شرافت سے بات

"... تھانے پہنچی تھیں؟" میں نے کہا۔

"تقریباً ایک گھنٹے بعد۔ وہ لوگ شعلہ کو ڈرا دھمکا رہے تھے کہ وہ اس شخص کا نام بتائے جس نے اسے بھیجا تھا اور جو گزشتہ رات ٹریفک سارجنٹ کی وردی اتار کے خود پہنے پھر رہا تھا۔" کیتھرین نے کہا۔ "لیکن شعلہ کی رٹ وہی تھی کہ نہ اسے کسی نے بھیجا ہے اور نہ وہ کسی ایسے شخص کو جانتی ہے۔ اس کے پاس دو باتوں کا جواب البتہ نہیں تھا۔ ایک یہ کہ جس لڑکی کو وہ نہ جانتی تھی نہ پہچانتی تھی اس سے ملنے کیوں گئی تھی، دوسری یہ کہ اس کا گھر کہاں ہے۔ وہ شعلہ کی یہ بات ماننے پر تیار نہ تھے کہ نہ اس کا کوئی عزیز رشتے دار ہے اور نہ گھر۔ چنانچہ وہ اسے سخت دہشت زدہ کر رہے تھے کہ انہیں سب اگلوانا آتا ہے اور ان کے پاس ایسے طریقے بھی ہیں کہ وہ صرف پانچ منٹ میں سب بک دے گی۔"

"کیا انہوں نے شعلہ کو مارا تھا؟" محسن خلا میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"ایک آدھ تھپڑ تو مارا ہی تھا۔ نشان اس کے گالوں پر نظر آ رہے تھے اور وہ رو بھی رہی تھی۔" کیتھرین بولی۔ "لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ ایس ایچ او کے کمرے میں تھی جہاں وہ ٹریفک سارجنٹ بھی موجود تھا۔ اور بہت گندی گالیاں بک رہا تھا۔ بار بار کہہ رہا تھا کہ اسے میرے حوالے کرو۔ میں اسے بتاؤں گا کہ اس کے خصم نے تو صرف میری وردی اتاری تھی، میں اس کی عزت کیسے اتارتا ہوں اور کھال کیسے اتارتا ہوں۔ اگر ہم نہ ہوتے تو وہ سب کچھ کرتے۔ ان کی اس قسم کی تفتیش آدھی رات کے بعد شروع ہوتی ہے۔ شعلہ کے ساتھ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اس کا کوئی والی وارث بھی تھانے نہیں پہنچا تھا اور وہ ہر قسم کے تشدد کا نشانہ بن سکتی تھی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ پہلی بار تھانے جا سکے تو مرد بھی دہشت زدہ ہو جاتے ہیں اور وہاں ایک ایک سفاک دل والا قانون کا نام لے کر سب کچھ کرنے کا مجاز ہے۔ اس وقت بھی شعلہ کے سامنے ایک کونے میں انہوں نے کسی چور کے کپڑے اتار کے الٹا لٹا رکھا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر دو کانسٹیبل قسم کے قصائی اس کو دبائے بیٹھے تھے اور تیسرا چمڑے کی پٹی سے اس کو تیزی کی طرح مار رہا تھا مگر وہ نہ چیخ سکتا تھا اور نہ ان کے شکنجے سے رہائی پا سکتا تھا۔ وہ ہر ضرب پر کرب سے بل کھاتا تھا...."

"بس اب..." محسن چلایا۔ "مت سناؤ یہ سب مجھے اور یہ بتاؤ کہ تم نے وہاں جا کے کیا کیا؟"

"تم اس کے شوہر ہو نا۔" کیتھرین بولی۔ "آئی ایم سوری لیکن بات یہ ہے کہ جن دنوں پہلے جب میرا شوہر زندہ تھا تھانے جاتی ہی رہتی تھی۔ ان میں بہت کھائی تھی میں نے اس لیے اب میں ڈری نہیں۔ میرے وکیل تھانیدار کے ساتھ۔ اس کو دیکھتے ہی سب سیدھے ہو گئے۔ اس چور کو اندر لے گئے اور تھانیدار نے مجھے

www.paksociety.com

دیکھ کر بڑا سامنہ تو بنایا مگر کچھ بولا نہیں۔ وکیل نے کہا کہ اس لڑکی کو اسپتال سے کس جرم میں گرفتار کر کے لائے ہو۔ تھانیدار نے کہا کہ اس کا ایک خطرناک گروہ سے تعلق ثابت ہوتا ہے اور ہم ابھی کچھ بتانے کے پابند نہیں۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اسے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیں گے اور اس کا ریمانڈ لے لیں گے۔ وکیل نے سمجھداری سے کام لیا اور کہا کہ ٹھیک ہے۔ لیکن اسے چند منٹ شعلہ سے اکیلے میں بات کرنے کی اجازت دی جائے تو ممکن ہے اس سے فائدہ ہو۔ اس وقت تک شعلہ نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ تھانیدار ہنسنے لگا اور بولا کہ اچھا تو یہ بتا دو کہ اس کا نام کیا ہے۔ آپ اس کے شوہر کا نام بھی بتا دیں۔ یہ بھی بتا دیں کہ اس کے بھائی کون ہیں اور گھر کہاں ہے۔ وکیل نے کہا کہ سب بتا دیا جائے گا لیکن پہلے اسے تنہائی میں بات کرنے کا موقع دیا جائے۔ تھانیدار اس چکر میں آ گیا کہ شاید اب وہ اصل مجرم تک یعنی تم تک پہنچ سکے گا۔ میں نے موقع پاتے ہی شعلہ سے تم لوگوں کا پتا پوچھا۔ وہ بہت پریشان تھی کہ کیا کرے۔ بہر حال میں نے اس کو تسلی دی اور اس وکیل نے بھی کہا کہ تم میری بیٹی کی طرح ہو اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہو۔ اس شہر میں تم کسی کو تو جانتی ہو گی۔ مجھے بتاؤ تاکہ میں اس سے مل لوں۔ اس نے پہلے ایک ایس پی کا نام لیا...“

”ایس ایس پی... ضامن رضوی؟“ محسن نے چونک کر کہا۔

”ہاں۔ وکیل ان کو فون کرنے گیا مگر وہ تو آفس میں سے نہ گھر پہ — تاہم اس نے پیغام دے دیا۔“ کیتھرین بولی۔

”اوہ مائی گاڈ۔“ محسن بولا۔ ”کیسی بے وقوف لڑکی ہے۔“

”اس نے ٹھیک کیا۔“ غالب بولا۔ ”وہ اسی طرح محفوظ سمجھے گی۔“

”لیکن ہم تو محفوظ نہیں رہیں گے۔“ محسن بولا۔

”تمہارا کیا خیال ہے شعلہ ان کو ہمارا پتا ٹھکانہ دے گی؟“ وہ کبھی ایسا نہیں کرے گی۔“ میں نے کہا۔ ”فائدہ صرف یہ ہو گا کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر پائے گا۔“

”ایس ایس پی صاحب اس کی رہائی کے احکامات بھی صادر نہیں فرما دیں گے۔“ محسن نے تلخی سے کہا۔

”مجھے معلوم ہے کہ وہ شعلہ کو زیر حراست رکھنے کے احکامات دیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر حراست میں رہ کے بھی شعلہ محفوظ ہو گی۔“

”یہ تمہارا خیال ہے۔ جسمانی تشدد وہ چاہے نہ کریں تفتیش کے نفسیاتی دباؤ والے طریقوں کا استعمال ضرور کریں گے۔“ محسن بولا۔

”نہ تم لوگ میری بات تو سن لو۔ [illegible] کی عدم موجودگی میں مجھے بہتر موقع ملا۔ میں نے اس سے ملنا رو دیکھو! تم میرے گھر تک اسے امید بن کے آئی تھیں۔ کیا اب میں ناامید ہو جاؤں؟

یہاں سے واپس چلی جاؤں اور جولی کو یہ بتا دوں کہ جو کر سکتے تھے وہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ کتنی مایوس ہو گی۔ جولی کو میں صرف آپ کو بتا سکتی ہوں۔ اس وکیل پر بھی کیا کر سکتی۔ یہ لوگ قانون پرستی کے چکر میں پڑ گئے تو ہم رہ گئے ہیں۔ تم نے کہا کہ خدا نہ کرے... پیسے کی قسم... کوئی کاٹ سکتا ہے مگر اس زبان سے وہ بات نہیں کہ میں راز رکھنا چاہوں۔ پھر شعلہ نے مجھے یہ بتایا کہ وقت ضائع کیے بغیر چلی آؤں گی۔“

”وہ وکیل کہاں گیا؟“ میں نے کہا۔

”وہ اپنے آفس چلا گیا۔“ کیتھرین بولی۔ ”میں نے کہا کہ کل اگر ضمانت داخل کرنے کی ضرورت پیش آئی تو میں انتظام کر دوں گی کہ وہ عدالت میں آ جائے۔ لیکن وہ کہتا تھا کہ ٹھیک کہتی ہے۔ اور ایس ایس پی ضامن رضوی واقعی اس کے انکل ہیں تو پولیس کا باپ بھی اس کو باعزت طور پر...“

”تم نے اسے اور کچھ تو نہیں بتایا؟“

”میں بہرام دادا کی بیٹی ہوں۔“ وہ بڑے فخر اور غرور سے بولی۔ ”میں اس کے قابل نہ ہوتی تو وہ مجھ سے شادی کی فکر نہ کرتا۔ میں اپنے قابل نہ سمجھتی تو اس پر تھوک دیتی۔ لیکن میں نے باپ کی دولت پر تھوک دیا۔ وہ مر گیا... مٹی ہو گیا۔ مگر میں اس کی وفادار ہوں۔ میں شادی کر سکتی تھی۔ مجھ سے شادی کے خواہشمند بھی بہت تھے۔ آئی واز وری بیوٹی فل۔“

”آج بھی آپ کسی سے کم نہیں ہیں۔“ محسن بولا۔

”شٹ اپ یو لائر... تم آج مذاق کر سکتے ہو۔“

”اوہ نو! میں مذاق نہیں کر رہا تھا آنٹی۔“ محسن خفگی سے بولا۔

”اس وقت جو لوگ میرے آگے پیچھے پھرتے تھے سب کو میں نے دھتکار دیا تھا۔“ وہ بولی۔ ”پھر وہ میرے لٹ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں زندگی کی آخری سانس تک بہرام دادا کی ہی رہوں گی۔ وہ تو بس اس کی چھوٹی سی اس کی یادیں تو ہیں۔ وہ سب گیدھ تھے۔ لالچی اور مردار خور۔ یقین تھا کہ بہرام دادا کے پاس کروڑوں ہوں گے۔ سونا چاندی، ہیرے جواہرات۔ اس نے عمر بھر میں جتنا کمایا وہ سب ہو گا۔ شاید اس سے زیادہ ہی ہو گا۔ وہ سب تھا۔ کچھ لوگ مردار بننے کے لیے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ہوتے ہوئے وہ مردار ہی نہیں سکتا۔ وہ مردہ خزینہ خزانہ... کے مطابق۔ اور کیوں... وہ قانع میں ان کو فرشتہ ثابت نہیں کر رہی ہوں۔ وہ تہذیب سے وہ ڈاکو تھا مگر وہ خود کو ڈاکو مانتا تھا۔ کہتا تھا دن دہاڑے لوٹتا تھا اور ان کو حقیقت

زیادہ تر سفید پوش تھے۔ اسمگلنگ کے بدعنوان افسر اور رشوت خور... ذخیرہ اندوز اور ٹھیکیدار جو ریت کی دیواریں کھڑی کرتے... ہیرو ہیروئن کے ٹھیکیدار ڈنگے وام پر ہوتے تھے... وزراء اور اعلیٰ عہدوں والے... جو کہیں صدارت... کہیں بھی بہاں خصوصی ہوتے تھے۔ کوئی نہیں پوچھتا تھا... کے پاس یہ دولت کہاں سے آئی۔ کہاں سے وہ عطیات... ان کی چمکتی دمکتی کاروں کا ماڈل ہر سال کیسے بدلتا ہے۔... کوٹھیاں بھی... کتنے ناموں سے کتنے اکاؤنٹ ہیں ان کے... اور کیا ان کی ساری عمر کی تنخواہ کا ٹوٹل ان کی ایک کوٹھی کی قیمت خرید کے برابر بھی ہوتا ہے؟ وہ سب... تھے بزدل، قانون کے ڈر سے تھر تھر کانپنے والے... کے چھاپوں سے خوفزدہ رہنے والے۔ سات پردوں میں... سرکار کے خزانے پر یا پبلک کی جیب پر ڈاکا ڈالنے والے۔ بہرام دادا ان سے زیادہ بڑا آدمی تھا۔ اس کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اس میں منافقت نہیں تھی۔ اس نے لوٹ مال کمایا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے سب... برابر بانٹا۔ اور جو اپنا حصہ رکھا اس میں سے بہت کم بچایا۔ وہ... بھی کہاں ہے۔ وہ رابن ہڈ مشہور نہیں ہوا مگر وہ تھا رابن... تم کیا جانو۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کی مدد سے کتنی... لڑکیوں کو جہیز ملا۔ کتنی بیوہ اور بے سہاروں کو سر چھپانے کے لیے ایک... کا سایہ ملا۔ کتنے بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے ہوتے... آج ہے کہ وہ لوگ بھی اسے نہیں جانتے جن کے لیے اس... سب کچھ کیا۔ وہ کہتا تھا کہ نیکی اچھا لے ہر بب کی بھی تعلیم... دوسروں دو کہ ایک ہاتھ سے مگر دوسرے ہاتھ کو خبر نہ... بہت زیادہ وہ نہیں جیا۔ صرف چوالیس سال اس کی عمر تھی جب وہ مر گیا تھا مگر کچھ لوگ سو سال جی کے بھی کچھ نہیں کرتے... جیتے ہیں تو بس جیتے ہوئے ہی جیسے وہ حشرات الارض کو پیدا ہونے... اور خود ختم ہو جاتے ہیں۔ اپنے پیچھے کوئی داستان... نہیں چھوڑتے۔ کوئی ایسا کام نہیں کرتے کہ انہیں زمانہ یاد کرے... شعلہ کی بات کہتا تھا کہ گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے... ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ اور اس نے یہ ثابت کر دکھایا... کے دشمن اسے نہ مار سکے۔ ایک دوست تھا جس نے... اور اس نے دی۔ خیر یہ تم کو اس کی سوانح حیات... سنانے کا وقت برباد نہیں کروں گی۔“

”ہم اس بہادر انسان کے بارے میں تمام سب باتیں... اور یہ بھی سمجھیں گے کہ ہم نے وقت کا بہترین استعمال کیا۔“ ... بڑے انسانوں کی زندگی کے تجربات چھوٹے انسانوں... کو روشنی دیتے ہیں۔ تم اس روشنی کو جانے کے لیے بھی... ہمیں اس کی ضرورت ہو گی لیکن اس وقت شعلہ

کو بھی ہماری اتنی ہی ضرورت ہے جتنی جولی کو۔“

”یو آر رائٹ بوائے۔ تم اب کیا کرو گے؟“ وہ بولی۔

”ہم اب کیا کریں گے؟“ محسن نے زیر لب کہا۔ یہ کوئی سوال نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا جو الفاظ میں ڈھل گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اور اس کی سوچ یہیں تک آ گئی تھی۔

”ہم پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتے۔“ میں نے کہا۔ یہ بھی جواب نہیں تھا محض اظہار حقیقت تھا۔ ”اب تک انکل ضامن رضوی وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔“

”انکل... وہ تمہارے بھی انکل ہیں؟“ کیتھرین نے حیران ہو کے کہا۔ ”پھر کس کا ڈر ہے ینگ مین؟“ اس نے اپنے بالوں کو انگلیوں سے سنوار کے پیچھے کیا اور ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس کے سیٹ کیے ہوئے بال ہلکے براؤن رنگ کے تھے اور اس کے شانوں تک پہنچتے تھے۔ وہ کسی حد تک دُبلی پتلی اور اسمارٹ عورت تھی۔ اچھا میک اپ ہیں اسے بیس سال کی حسین و جمیل لڑکی بنا سکتا تھا۔ جسم سے زیادہ اس کا حوصلہ جوان تھا۔ تھکن یا اداسی کا اظہار ہوتا تھا تو صرف اس کی آنکھوں سے۔ ان کا رنگ بھی براؤن تھا مگر وہ کچھ خلا میں دیکھتی ہوئی اور کھوئی کھوئی سی لگتی تھیں۔

”وہ ہم سب کے انکل ہیں لیکن... میں ان کو بُرا نہیں کہہ سکتا۔ وہ مثالی قسم کے انسان ہیں۔ اصول پرست اور فرض شناس۔ وہ اداے فرض پر جذبات کے سامنے رشتے قربان کر دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اور ہم سب اسی لیے ان کے سامنے جانے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔“

”کیوں؟ وائٹ ہیو یو ڈن؟“ وہ بولی۔ ”کیوں ڈرتے ہو تم لوگ؟“

”یہ بھی بہت لمبی کہانی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جب فرصت ہو گی تو ہم پہلے تم سے بہرام دادا کی زندگی کی کہانی سنیں گے اور پھر تمہیں اپنی کہانی سنائیں گے۔ ابھی صرف اتنا سمجھ لو کہ ان کی نظر میں اور قانون کی نظر میں ہم مجرم ہیں۔ یہ ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا جانتا ہے کہ مجرم کون ہے۔ حالات کی شہادت اور اتفاقات و حادثات نے ہمیں مجرم بنا دیا ہے۔ شعلہ کو مجرموں کے ایک گروہ کا ساتھی سمجھا جا سکتا ہے مگر وہ خود مجرم نہیں ہے۔ تم یہ بات بہتر طور پر سمجھ سکتی ہو۔ مجرم بہرام دادا تھا مگر سزا تم کو اور جولی کو آج تک مل رہی ہے۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا تھا... پھر ایسا کیوں ہے؟ مگر ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور آج کل بھی ہو رہا ہے۔“

”تو شعلہ کے بھائی نہیں ہو تم؟“

”بھائی ہونے کا مطلب اگر یہ ہو کہ ہم سب نے ایک ہی ماں کے پیٹ سے جنم لیا یا ہمارا باپ ایک ہی تھا تو جواب ہو گا نہیں۔ مطلب اگر رشتے کی جذباتی گہرائی ہے اور اس کا تقدس

www.paksociety.com

ہے تو شعلہ ہم تینوں کی بہن ہے۔" میں نے غالب اور ٹیڈی کے کندھوں پر دونوں ہاتھ پھیلا کے کہا۔ "اور ہم سب بھی آپس میں بھائی ہیں۔ صرف خون کے ساتھی نہیں۔ دکھ بھی برابر بانٹ سکتے ہیں۔ اسی لیے سب مجرم بنے ہوئے ہیں۔ یہ ایک خاندان ہے۔ الزام بھی ہم سب لیتے ہیں۔ انعام بھی ہم سب پاتے ہیں۔ گھر ہوگا تو سب کا گھر ہوگا۔ ورنہ ہم سب بے گھر ہیں۔"

"میں یقین نہیں کر سکتی کہ رشتے اتنے پائیدار اور حقیقی بھی ہو سکتے ہیں۔" وہ رشک سے ہم سب کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں شعلہ کی تعیناتی تبدیل کرانی چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "بہتر ہو کہ انکل کی فوج ہمیں محسوس کرے اور راستے بند ہو جائیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ شعلہ اتنی کمزور ثابت نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

"وہ اتنی کمزور نہیں تھی۔" محسن بولا۔ "جب تک وہ صرف میری بیوی تھی۔ اب وہ ایک ماں بن رہی ہے۔ اس کی سوچ بدل سکتی ہے۔"

"محسن ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اگر انکل رضوی نہ پہنچے اور پولیس نے اس پر تشدد کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنے آپ کو نہیں، اپنے بچے کو بچانے کی۔ ماں کا جذبہ تو عورت کی سب سے بڑی کمزوری بن جاتا ہے۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی۔ شعلہ اچھی طرح جانتی ہے ہم سب کو۔ جانتی ہے مستقبل کو اور جانتی ہے محسن کو قربان نہیں کرے گی۔" میں نے کہا۔ "وہ مر جائے گی۔"

"مگر اسے مرنا نہیں چاہیے۔" رابعہ چلائی۔ "ہم اتنا بڑا گناہ نہیں کر سکتے سکندر۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم خود کو پولیس کے حوالے کر دیں۔"

"کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟" محسن بولا۔ "وہ نہیں مرے گی۔ اور یہ سب ہم پہلے ہی طے کر چکے ہیں کہ ایک فرد ایک شخص نہیں ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی... میں، تم... سکندر یا شعلہ... کسی کی خاطر بھی خودکشی نہیں کی جا سکتی۔"

"تم سب کیا کہہ رہے ہو؟ واٹ شن؟" کیتھرین نے کہا۔

"کیا تم کو یہ بات بتانی ضروری ہے؟" محسن سخت لہجے میں بولا۔ "تم یہاں موجود ہو... یہ کافی ہے۔ ہم تم پر اعتماد کرتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ہم میں سے ہو۔ تم سے چوبیس گھنٹے پہلے صورت آشنائی تک نہیں تھی۔ تمہارے کریڈٹ پر بہرام دادا کا قرض ہے ورنہ...."

"اس نے کبھی کسی پر قرض نہیں چھوڑا تھا۔" کیتھرین نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اور چھوڑا تھا تو میں معاف کرتی ہوں۔ یو آر فری۔"

"ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کا تعلق اسی سے… ہم کر رہے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ہمیں اپنا فیصلہ خود کرنا…"

"تم سب کیا خاک فیصلہ کرو گے۔" غالب بولا۔ "میں… کرتا ہوں پولیس اسٹیشن یا اخبار کے کسی باخبر آدمی سے… کچھ نہیں ہوتے ویسے اور شعلہ آ جائے گی۔"

"اس کے پیچھے پولیس بھی آ جائے گی۔"

"وہ بعد کی بات ہے۔ ہم ایسا بندوبست کر… ہم تک پہنچنے میں کامیاب ہو لیکن پولیس کو کچھ… ان کو ڈراپ کر سکتی ہے ورنہ ہم خود شعلہ کو پولیس سے بچا…" غالب بولا۔ "آپ اب گھر جائیں۔ اپنے ساتھ استاد… جائیں۔ یہ اصل نام نہیں ہے اس کا… ماں باپ نے… رکھا تھا۔ دنیا نے استاد ٹیڈی کر دیا۔ آپ بھی پیار… سکتی ہیں جتنا بہرام دادا پر کر سکتی تھیں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو… یو آر ایڈیٹ…"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں نانو…" غالب… "آپ اپنا بیٹا سمجھیں۔ بیٹے بعض اوقات توقعات پر پورے نہ اترتے۔ اسی لیے میں نے بہرام دادا کی مثال دی تھی… کی بات ہوگی تو آپ دیکھیں گی کہ میں نے غلط نہیں کہا… میں سے کوئی آپ کے آستانے پر جان نہیں دے گا…"

"کیسی عجیب باتیں کرتے ہو تم لوگ… میں کیوں… کی جان لوں گی۔" کیتھرین بولی۔ "بہرحال میں اس کو ساتھ لے جاتی ہوں۔"

"یہ آپ کا گھر دیکھ لے گا۔ اس کے بعد اگر ضرورت ہوئی تو ہم میں سے کوئی بھی آپ کے ساتھ رہنے کو تیار ہوگا… اگر آپ خود کو تنہا یا غیر محفوظ سمجھتی ہوں…"

"غیر محفوظ۔" کیتھرین تلخی سے ہنسی۔ "میرا خدا میرا محافظ ہے جس دن وہ ہاتھ کھینچ لے گا اس دن میں خود بھی اپنی حفاظت نہیں کر سکوں گی۔ میرے شوہر نے مجھے زندہ رہنا سکھایا تھا۔ یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ زندگی فنا و بقا کی ایک مسلسل جنگ ہے جس میں سب جینا چاہتے ہیں۔ مارنے والا بھی مارا جاتا ہے۔ اس لیے کبھی کبھی دوسروں سے جینے کا حق چھین کر بھی زندہ رہنا پڑتا ہے۔ میں نے اس ریوالور سے چھ آدمی مارے ہیں اب تک…" اس نے ایک جھٹکے میں… ایک ریوالور نکال لیا۔ یہ وہ ریوالور نہیں تھا جو… نے کار میں دیکھا تھا۔

اس کے ریوالور نے کسی کو خوفزدہ نہیں کیا تھا… مجھے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی… دکھا لیا۔ "میں اس وقت تک کسی کو نہیں مارتی جب تک میری زندگی یا میری عزت خطرے میں نہ پڑے۔ اتنے شوہر…

…اور ایک بار جوہلی کو بچانے کے لیے میں… دشمنوں کو گولی مار دی جو بہت آگے آ گئے تھے اور یہاں… کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ آج بھی بہت… اور ایک بات بتاؤں… میں نے ایک… گولیاں ضائع نہیں کی ہیں۔ صرف ایک گولی سے… سوراخ کیا تھا۔" اس نے اپنی پیشانی کے وسط… انگلی سے چھو کر کہا۔ "اس سر کے سوراخ سے ان کے… شیطانی ارادے ان کی ناپاک روح کے ساتھ نکل گئے… نکال کے دیکھنا چاہو تو میں بتا سکتی ہوں کہ وہ… ان کے ڈھانچے دیکھنا۔ سب کے سروں میں ایک… ہی سوراخ ملے گا۔"

"… بہت اچھے ہوئے۔" غالب بولا۔ "اب آپ… اس ڈاکٹر کے ساتھ مل کر کوئی ایسا بندوبست… کے سامنے ٹیسٹ ہو جائیں۔ باری باری… اور… کے بارے میں آخری رپورٹ مل جائے کہ وہ جوہلی کے… کر سکتا تو دوسرے گھر کو لے جائیں۔ یا وہ ڈاکٹر اسکیم… میں سب کے ٹیسٹ مختلف ہسپتالوں… شرط صرف ایک ہے۔ مکمل رازداری اور سب… واپسی… خدانخواستہ سب ناکام ہے تو پھر دوسرا… ہم کریں گے۔ اس جلسے کے آخر تک جوہلی کا گروہ بدل… اور ایک کامیاب آپریشن کے بعد وہ صحت مند… کی طرف لوٹ گی۔"

"کاش یہ سب اتنا آسان ہوتا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "تم نے تو ایک جملے میں بات ختم کر دی۔ اس ایک مسئلے کے… نکلتے ہیں۔"

"ہم سب کی طرف سے یقین رکھیے کہ آپ کے لیے کوئی…" میں نے کہا۔ "زمین پر جو کچھ انسان کے اختیار میں ہے… اختیار سے باہر نہیں ہے۔ ایک بار نہیں سو بار بھی… ضرورت پڑے گی تو ہم حاصل کر لیں گے۔ یہاں سے… تو ہم جوہلی کو امریکا تک بھیج دیں گے۔"

"تم کیا سمجھ رہے ہو… میں… کیا ہے میرے پاس…"

"ہمارے پاس کیا ہے۔ صرف اپنا یقین۔" میں نے کہا۔ "… اب کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ بالکل کچھ نہیں… صرف… کیونکہ آپ ہیں اور یہ وہ چیز ہے جو سب سے زیادہ… رکھتی ہے لیکن… پر صرف ایک جگہ ملتی… آپ کے دل میں۔"

"گاڈ بلیس یو… گاڈ بلیس آل آف یو۔" اس نے کانپتی… میں کہا اور اپنے سینے پر ایک انگلی سے صلیب بنائی۔ "… کچھ خدا پر اور تم پر چھوڑتی ہوں… خدا پر اور تم پر چھوڑتی ہوں…" وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ ٹیڈی اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد اس کی گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز آئی۔

"میں باہر کسی پبلک کال آفس سے بات کروں گا۔" غالب بولا۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔" میں نے کہا۔

پبلک کال آفس کی تلاش میں ہمیں ایک میل اور جانا پڑا۔ وہ ایک ریسٹورنٹ تھا جہاں ٹیلی فون کاؤنٹر پر رکھا ہوا تھا۔ میں اتنے قریب بیٹھا تھا کہ جاری گفتگو سن سکتا تھا۔ غالب نے نہ جانے کس کا نمبر ملایا۔

"ہیلو… یار میں غالب ہوں… ہاں… اسے نہیں بھائی! مرتے ہیں غیرت مند لوگ… ہم بہت ڈھیٹ چیز ہیں… یار اسی دنیا سے بول رہا ہوں… دیکھو ایک کام ہے… بالکل سیکرٹ… تمہارے اور میرے درمیان رہنے کی بات۔ ایک نمبر لکھو… ہاں… ایس پی ہے اس سے بات کرو… ایک لڑکی ہے شعلہ… بکواس نہیں کرو، ورنہ فون پر مکا ماروں گا… وہ میرے دوست کی بیوی ہے۔ بہن کی طرح ہے میرے لیے… آج پولیس نے میو ہسپتال سے اٹھا لیا ہے۔ ہاں آج… وجہ کوئی نہیں بس اٹھا لیا… خدا ان کو ایک تو… کہہ دو کہ اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اور اگر اس نے الیکٹرک کا کرنٹ دیا تو معلوم… وہ سالے کچھ بھی لگا سکتے ہیں… یار میں نہیں جا سکتا اسی لیے تو تم سے کہہ رہا ہوں… نہیں میں فون بھی نہیں کر سکتا۔ میں دس منٹ بعد پھر تم سے ہی پوچھوں گا۔ … اور دیکھو… مرزا غالب نے کوئی فون نہیں کیا تھا… یہ بات اچھی طرح بٹھا لو اپنی کھوپڑی میں ورنہ میں آج رات ہی تمہاری کھوپڑی اتارنے کے لیے آؤں گا…" وہ قہقہہ مار کے ہنسا اور فون بند کر دیا۔

ہم نے وہیں بیٹھ کے ایک کپ چائے کا پیا اور اس دوران میں کیتھرین اور اس کے شوہر کے بارے میں بات کرتے رہے۔ وہ شوہر کے بارے میں بات کرتی تھی تو بے حد جذباتی ہو جاتی تھی۔ وہ کسی شریف آدمی کی بیوی نہیں تھی لیکن اس کی محبت سو فیصد وہی تھی جو مشرق کی کوئی بھی شوہر پرست بیوی کرتی ہے۔ شاید اس سے زیادہ ہی تھی۔ اس میں آج بھی کمی نہیں تھی جبکہ بہرام دادا صرف ایک نام رہ گیا تھا۔ اس کی شدت اور وارفتگی کا اندازہ ہی تھا مصائب نے اس کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا لیکن وہ بڑی حوصلہ مندی سے مقابلہ کر رہی تھی۔ اس کے کردار کی مضبوطی اور اس کی بے خوفی قابل تعریف تھی۔ بے شک حالات کے دباؤ نے اس کے اعصاب پر بڑا اثر ڈالا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ بہت بولتی تھی۔ بولتے ہوئے موضوع سے ہٹ جاتی تھی اور گھوم پھر کر اپنے شوہر کے ذکر پر آ جاتی تھی لیکن وہ اکیلی عورت جینے کا ہنر…

www.paksociety.com

انداز رکھتی تھی۔

دس منٹ بعد جیسے ہی غالب نے دوبارہ اپنے دوست کو فون کیا: "ہاں... کیا ہوا... تو وہ ایس ایس پی صاحب موجود ہیں وہاں... نہیں یار... تو کیوں ڈرتا ہے۔ اب صحافی ہے تو گھسیارا نہیں ہے۔ اگر تم نے فون کر کے کسی ڈاکو یا قاتل کے بارے میں بھی پوچھا ہوتا تو یہ کوئی جرم نہ ہوتا... ہاں... ہم سے بات کرنا چاہتے ہیں... اچھا... ہاں... ٹھیک ہے دوست... ہم بات کر لیتے ہیں... تھینکس... یہ نہیں کہوں گا میں... سارے تم ہمارے کام نہیں کرو گے تو اور کون کرے گا۔ تمہاری برادری سے خارج تو نہیں ہو گئے ہم... سمجھو ایک انڈر گراؤنڈ صحافتی مشن پر ہوں میں۔ جب باہر آؤں گا تو ایسی اسٹوری کے ساتھ جو ابھی دھماکا کرے گی جیسے سارے اوپر تک سب کو ہلا دے گی... دیکھ لینا بھائی... تم بھی یہاں ہو اور ہم بھی ہیں... سب سامنے آ جائے گا۔" اس نے فون بند کر دیا۔

"کیا ایس ایس پی صاحب براہِ راست مذاکرات پر بضد ہیں؟" میں نے کہا۔ "کوئی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اس صورتِ حال سے...؟"

"معلوم نہیں وہ کیا چاہتے ہیں۔" غالب بولا۔ "بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ صرف پولیس افسر ہی نہیں، شریف النفس آدمی بھی ہیں۔ اس تھانے کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ مجھے معلوم ہے تم کس کے کہنے پر فون کر رہے ہو۔ تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو اور اس کا نام مجھے کبھی نہیں بتاؤ گے لیکن تم اسے ایک پیغام دے سکتے ہو تو ضرور دو کہ مجھ سے بات کریں۔" ہم یہ گفتگو کافی دور سے ذرا ہٹ کر کر رہے تھے۔

"اس میں کوئی چال تو نہیں ہو سکتی؟" میں نے کہا۔

"چال کیا ہو گی۔" غالب بولا۔ "تمہارا خیال ہے کہ وہ کال کو ٹریس کریں گے تو پولیس کو... ضرورت نہیں ہے۔ ابھی تو ان کو یہ بھی علم نہیں کہ میں نے کہاں سے فون کیا تھا ورنہ وہ ایکس چینج سے کہہ دیتے... یہاں ایک نہیں دس ایکس چینج ہیں... یہ ہو سکتا ہے کہ ہم دوبارہ کال کریں تو وہ کسی انجینئر سے کہیں اور وہ اپنے طور پر کسی طرح اس فون نمبر کا پتا چلائے جہاں سے ہم بات کر رہے تھے۔ پر یہ لمبا عمل ہے۔ انکل رضوی کو تھانے میں ایک فون پر ہی گفتگو جاری رکھنی ہو گی اور اس وقفے میں دوسرے فون سے کال ٹریس کرنے کی کارروائی کی جائے۔ دوسرا فون تھانے میں تو ہو گا نہیں۔ یہاں ابھی تک ایک تھانے کو ایک سے زیادہ فون دینے کا رواج نہیں بلکہ زیادہ تر تھانے بغیر فون کے ہیں۔ دوسرا فون قریب ہوا تو شاید کوئی معلوم کر سکے کہ فلاں نمبر سے بات ہو رہی تھی۔ یہی فون کا عملہ بھی کوئی اتنا مستعد اور فرض شناس تو ہوتا نہیں کہ ایک منٹ میں بتا دے۔ پانچ دس منٹ کسی کو آتے جاتے ہیں تک

جائیں گے۔ پھر اگر پولیس کو فوراً روانہ کیا گیا تو انھیں یہاں تک پہنچنے کے لیے آدھا گھنٹا چاہیے۔ برطانیہ امریکا میں تو قریب کار پیغام ملنے کے چند منٹ میں پہنچ جاتی ہے سمجھا۔ ہم اطمینان سے آدھا گھنٹا گفتگو کر سکتے ہیں۔"

"بہتر ہو گا کہ اب ہم دوسری جگہ سے بات کریں۔"

"نہیں! وقت ضائع ہو گا۔" غالب بولا۔ [illegible] بات ہے۔"

غالب نے دوبارہ کاؤنٹر پر جا کے فون گھمایا تو [illegible] نہیں تھا۔ اس کے کچن میں کوئی خانہ [illegible] جس میں ہاتھ پیر یا سر کم تو تے تھے [illegible] آواز آ رہی تھی کہ [illegible] میں چائے پیش کی جا سکے گی۔

"مجھے ایس ایس پی صاحب سے بات کرنی ہے۔" غالب نے اعتماد سے کہا اور چند سیکنڈ تک انتظار کرنے کے بعد [illegible]

"السلام علیکم سر... میں غالب بول رہا ہوں جی... ایک منٹ" اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور سرگوشی کی [illegible] بات کرتے ہوئے [illegible]

میں نے ریسیور لے لیا۔ "السلام علیکم انکل [illegible]"

"میں تو سمجھا تھا کہ تم بھی سر پر کفن باندھ کے [illegible]" انکل رضوی کی آواز میں طنز تھا اور کچھ دبا دبا غصہ بھی تھا۔ "کیا حال ہے؟"

"آپ کو معلوم ہو گا انکل... میں بھی ٹھیک ہوں... بلکہ [illegible] کی کوشش کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آنٹی ٹھیک ہیں؟"

"ہاں... ٹھیک ہیں سب۔" وہ بولے۔ [illegible]

"اگر میں کہوں کہ آپ کی وہ ملاقات اچھی ہے تو آپ [illegible] میں طعنہ دے رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس لڑکی نے مجھے بتایا کہ اس نے شادی کر لی ہے تم سے۔" انکل رضوی بولے۔ "شیروانی زندہ ہوتا تو میں [illegible] سے پوچھوں گا کہ کیا یقین ہے اب تک انکل [illegible] کہ ادھر باپ مرا ادھر نہ کوئی انکل رہا نہ کوئی رشتہ [illegible] خیر یہ بتاؤ تم نے بھی [illegible] ہے...؟"

"نہیں انکل... محسن اور شہلا کو... بلکہ انکل شیروانی کو وقت نہیں ملا... ورنہ یہ ہو سکتا تھا کہ آپ کی دعائیں شامل ہوتیں [illegible] میں ایسا نہیں ہونے دوں گا... بعد کو آپ رخصت کر لیتے۔"

"لیے پاگل ہوا ہے۔" غالب [illegible] ہیں۔ ایس ایس پی صاحب ایسے نہیں ہیں [illegible] کر مجھ سے اس قسم کی پرائیویٹ گفتگو کریں۔ تیرے جذبات سے [illegible] اٹھا رہے ہیں وہ..."

"یہ تم کہہ رہے ہو اس لیے مان لیتا ہوں۔" انکل رضوی [illegible] میں کہا۔ [illegible] تو ایسے نہیں ہیں کہ سب کچھ [illegible]

"میں معذرت چاہتا ہوں انکل۔" میں نے کہا۔ "میں ابھی پانچ منٹ میں پھر فون کرتا ہوں آپ کو۔" کچھ تلخی سی ہو رہی ہے [illegible] فون کا ریسیور رکھ دیا۔ غالب کی بات نے مجھے قائل کر دیا تھا۔ [illegible] آفیشل ڈیوٹی پہ تھے لیکن ان کی گفتگو سراسر ان آفیشل [illegible] کے کردار کے خلاف امر تھا کیا ان کے لیے میں دکھی ہونے کا احساس بھی ان کی اداکاری تھا؟ میں نے باہر نکل کے سوچا۔ [illegible] دل نے یہ بات نہیں مانی کہ وہ مجھے دکھی [illegible] صرف دھوکا دینے کے لیے جذباتی ہو رہے تھے۔ وہ واقعی [illegible] کوشش کر رہے تھے کہ ان کا دکھ ظاہر نہ ہو۔ خدا نے [illegible] ان کو دو والد جیسے تھے ایک بے حد شریف آدمی کا جو بیمار [illegible] سے پریشان تھا۔ دوسرا ایک فرض شناس پولیس افسر کا جو [illegible] کو قانون سے زیادہ اہم تسلیم نہیں کرتا تھا اور اس وقت [illegible] باہم مصروفِ پیکار تھے۔ یہ شک پولیس افسر کا غالب تھا مگر انکل رضوی کا مظلوم دل بھی چھپے چھپے [illegible] تھا۔

اتفاق سے باہر نکلتے ہی مجھے ایک خالی رکشا گزرتا نظر آیا [illegible] نے چلتے چلتے روک لیا۔ ہم نے مخالف سمت میں [illegible] دس منٹ میں طے کیا۔ پھر مجھے ایک پرائیویٹ [illegible] نظر آیا۔ میں نے رکشا کو روک لیا اور غالب کے ساتھ اندر [illegible] ریسپشن پر ایک اسمارٹ سی لڑکی بیٹھی تھی۔ وہاں [illegible] آئے۔ ایک بورڈ لکھا ہوا تھا: "صرف ڈاکٹرز کے لیے" اور [illegible] کے سامنے "ڈاکٹروں اور مریضوں کے لیے" کی تختی رکھی [illegible] میں نے کسی تذبذب کے بغیر دوسرا فون اٹھا لیا۔ لڑکی نے [illegible] ہم دونوں کو دیکھا مگر پھر کسی کال کو اٹینڈ کرنے لگی۔

"مجھے ایس ایس پی صاحب سے بات کرنی ہے۔" میں نے [illegible] کہا۔

"آپ کا نام؟" اس آفیسر [illegible] نے جو بات کرنے والا ایس ایچ او [illegible] سکتا تھا۔

"ایس ایس پی صاحب کو معلوم ہے۔" میں نے بھی اسے [illegible]

"ہاں جی سکندر! مسٹر شہلا کا ہے؟" انھوں نے تلخی سے [illegible] "تمہاری وجہ سے یہ بے قصور پکڑی گئی۔"

"سب لوگ تو [illegible] بے قصور انسانوں کو پکڑتے رہتے ہیں [illegible] آپ کے محکمے کے تھانیداری رکھنے والے [illegible]"

"تم مجھ سے پولیس کے محکمے کی خرابیوں اور ان کی اصلاح [illegible] پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔" وہ بولے۔ "مختصر بات کرو [illegible] چاہتے ہو؟" "یہ نہیں۔" غالب کا تجزیہ بالکل درست

تھا... اب وہ صرف ایس ایس پی رہ گئے تھے کیونکہ ان کی چال ناکام ہو گئی تھی۔ گفتگو اسی طرح چلتی رہتی تو وہ آدھے گھنٹے سے زیادہ دیر تک "گپ شپ" کرتے رہتے۔ میں ان کے مہربان اور دوستانہ لہجے سے متاثر ہو کے باتوں میں الجھ جاتا۔ پھر مطلب کی بات بھی آتی ہی ہو جاتی کہ کال ٹریس کرنے کی سست رفتار کارروائی بھی مکمل ہو جاتی اور ہم دھر لیے جاتے۔ اب وہ سمجھ گئے تھے کہ میں اس جگہ سے کھسک گیا ہوں جہاں پہلے تھا۔

"شہلا کو آپ کسی جرم کے بغیر قید میں رکھنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو کیسے روک سکتا ہوں سر۔" میں نے طنز سے کہا۔ "آپ کا حکم تو قانون سے بڑھ کر ہے۔"

"میں شہلا کی قانونی کارروائی میں مداخلت نہیں کروں گا"

"وہ تو آپ کر چکے۔" میں نے ان کی بات کاٹ دی... "پولیس نے ایک عورت کو ہسپتال کے وارڈ میں گھس کر پکڑا۔ ہسپتال کا سارا عملہ اور وارڈ کے سب مریض گواہ ہیں کہ اس عورت نے کوئی جرم نہیں کیا تھا... کیا آپ نے اس غیر قانونی عمل کرنے والے سے باز پرس کی؟ اس سے پوچھا کہ اس عورت کو کیوں گرفتار کیا گیا ہے...؟"

"ایسا ہوتا ہے... مجرموں کے گروہ کا ایک آدمی بھی ہاتھ آ جائے تو ہم اس سے گروہ کا سراغ نکالنے میں مدد لیتے ہیں..."

"کیا آپ بھی اس طریقِ تفتیش کے قائل ہیں؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کہ ڈاکو ہاتھ نہ آئیں تو اس کے بیوی بچوں کو اٹھا لو، ماں باپ کو اٹھا لو۔"

"میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا۔"

"کیا شہلا کے خلاف کسی تھانے میں کوئی رپورٹ درج ہے؟" میں نے کہا۔ "کبھی کوئی ایسا ثبوت یا گواہ ملا ہے جس سے پتا چلا ہو کہ وہ کسی واردات میں شریک تھی یا اس نے مجرموں کی مدد کی تھی؟"

"میں سمجھتا ہوں وہ آپ ہی بے قصور ہے جتنی... آپ سمجھ لیں کہ شیروانی صاحب کی بیٹی اور محسن کی بیوی قرنیہ... جو سیالکوٹ میں ہے۔ پکڑنا چاہیں تو آپ اسے بھی پکڑ لیں کہ محسن کی بہن ہے اور اس سے محسن کا پتا پوچھا جا سکتا ہے مگر کسی مجرم سے رشتہ کوئی جرم تو نہیں ہوتا ایس پی صاحب... باقی آپ کی مرضی ہے اس کے خلاف کسی بھی جرم میں ایف آئی آر کاٹ دیں۔ اسے دہشت گردی کے ہزار بہانے ہوں گے آپ کے پاس قاعدے قانون جو ہیں۔"

"شٹ اپ! تم میری بے عزتی کر رہے ہو۔" انکل رضوی نے کہا۔ "میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔"

"مگر آپ کے ماتحت ضرور کریں گے۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ نہیں جانتے کہ شہلا اس تمام عرصے میں کہاں رہی تھی؟ وہ اسلام آباد میں تھی، انکل شیروانی کی بیگم اور خود انکل شیروانی کی زندگی کے آخری لمحات میں اسی نے دن رات ایک کر کے تیمارداری کی تھی... اب

www.paksociety.com

ان کی موت کے بعد وہ فوزیہ کے پاس سیالکوٹ چلی گئی تھی۔ یہاں آئے ہوئے تو اسے بمشکل آٹھ دن بھی نہیں ہوئے اور پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔"

"تم نے اسے اپنا آلۂ کار بنایا تھا۔" انکل رضوی نے کہا۔

"کیا یہ ثابت ہو گیا ہے... شعلہ نے اس کا اعتراف کر لیا ہے؟" میں نے کہا۔ "اور اگر ہم نے آلۂ کار بنایا تھا تو کس جرم کا ارتکاب کرنے کے لیے؟ یقیناً پولیس کی کارکردگی قابلِ تعریف ہے کہ ابھی مجرموں کے ایک گروہ نے جن کا ابھی نام و نشان تک معلوم نہیں، کوئی واردات کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور ایک لڑکی کو کسی خاص مقصد سے ایک بستر مرگ پر لیٹی ہوئی لڑکی کے پاس بھیجا تھا۔ انھوں نے موقعے پر پہنچ کر لڑکی کو پکڑ لیا اور یوں قبل از وقت کارروائی سے مجرموں کے عزائم کو خاک میں ملا دیا... وغیرہ وغیرہ۔"

"مجھے یہ اختیارات حاصل نہیں ہیں کہ میں شعلہ کو رہا کرنے کا حکم دے دوں۔" انھوں نے کہا۔ "ایس ایچ او کا خیال ہے کہ اس لڑکی سے تمہارا پتا معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اخفائے جرم بھی تو جرم ہوتا ہے۔"

"آپ شوق سے اس کو حراست میں رکھیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک تو یہ بات نہ بھولیں کہ وہ خود مجرم نہیں ہے۔ اس کا شوہر آپ کی تعریف میں تو مجرم ہو گا ورنہ وہ بھی مجرم نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ انکل شیروانی کی بیوہ ہے اور مرتے وقت تک ان کی صرف یہی خواہش تھی کہ شعلہ سکھی رہے۔ تیسری بات یہ کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس پر ذہنی یا جسمانی تشدد کیا گیا تو ہو سکتا ہے..."

"ایسا کچھ نہیں ہو گا۔" انکل رضوی نے کہا۔ "میں اس کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ تفتیش جیسے سامنے ہو یا میں خود کروں۔ اس کو ریمانڈ پر تھانے میں یا جوڈیشل ریمانڈ پر جیل نہ بھیجا جائے۔ تم جانتے ہو وہاں کا ماحول کیسا ہوتا ہے۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔ نازو کو واپس کر دو۔ اسے کسی طرح گھر جانے دو۔ اس کے والدین کی حالت بہت خراب ہے اور اس کا بھائی پاگل ہو رہا ہے۔ وہ سیکر گھر میں بھی آزاد نہیں ہو گی۔"

"میں یہ پیغام اسے دے دوں گا۔" میں نے کہا۔ "اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ وہ اس شرط کو قبول بھی کرے گی۔ وہ خود پاگل لڑکی ہے جو ہم پاگلوں کے ساتھ ہے۔ ہم ایسا نہیں چاہتے تھے مگر اس نے ہماری کبھی نہیں مانی۔ اگر وہ لوٹ کر گئی تو..."

"تو میں لوٹ جاؤں گا۔" وہ بولے۔ "میں شعلہ کے معاملے میں بالکل دخل نہیں دوں گا۔ مجھے اپنا دل پتھر کرنا پڑے گا۔ ایک ایس ایس پی شہر کے ہر تھانے کے کیس میں دخل نہیں دیتا۔" میں نے نازو کی خیال سے ایک پیشکش کی تھی۔ اگر اسے شعلہ کا خیال ہو گا تو وہ آنا ضرور کرے گی... یہ کوئی بہت مشکل یا ناممکن بات نہیں۔ لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہتی ہے تو پھر مجھے بھی اپنے باپ

پر جبر کرنا پڑے گا۔ یہ نہ قانون کے خلاف ہو گا نہ ضمیر کے خلاف۔ ایک جذباتی الجھن ہو گی مگر اس کی کوئی بات کھلے گی تو شعلہ۔" انھوں نے ایک دم اپنی بات کاٹ دی۔ کہتے ہوئے وہ بے حد مشتعل تھے اور میں تصور کر سکتا تھا کتنا غصہ تھا۔ میری باتوں نے انھیں مشکل میں ڈال دیا تھا۔ یکطرفہ فیصلہ کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔

"یہ آپ لوگ کس قسم کی باتیں کر رہے تھے؟" کسی نے پیچھے آ کے کہا اور میں چونک کر پلٹا۔

"کیا یہ غیر مہذب اور غیر شائستہ گفتگو تھی؟"

"یہ فون صرف مریضوں کے لیے اور انھیں دیکھنے آنے والوں کی خاطر لگایا گیا ہے۔" وہ بولا۔ صورت اور حلیے سے وہ ڈاکٹر نہیں لگتا تھا۔ شاید وہ وارڈ بوائے یا منیجر تھا۔

"ہم کسی مریض کو دیکھنے آئے ہیں۔" غالب بولا۔ "اس لیے فون کا استعمال ناجائز نہیں سمجھا جائے گا۔ جیسے میں ایک مریض ہوں۔" اس نے اپنا پرس کا کارڈ نکالا۔ "میں نے اگر یہ فون استعمال کر لیا تو کوئی جرم نہیں کیا اور کیا ہے تو مجھے گرفتار کرا دو۔ یہ ایک وکیل ہیں جو ایک ایس ایس پی سے بات کر رہے تھے۔"

"اور ہم اس فون کو زحمت نہ دیتے اگر آس پاس کوئی پبلک کال آفس مل جاتا۔" میں نے دس کا نوٹ کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ "ہم نہیں لوکل کال کے کتنے پیسے جانتے ہوں گے۔"

"ایک لوکل کال اگر آدھا گھنٹہ جاری رہے تو بھی اتنے پیسے نہیں بنتے جتنے تم نے دیے ہیں۔" غالب نے دس کا نوٹ اٹھا لیا اور کاؤنٹر پر ایک اٹھنی رکھ دی۔ اعتراض کرنے والا بے بسی سے ہمیں باہر جاتا دیکھتا رہ گیا۔ اس نے ہم پر رعب جھاڑنے کی جلد بازی کی کوشش کی تھی۔ پولیس کا ذکر اور وکیل کا سن کر وہ خود مرعوب ہو گیا تھا۔ اس نے اٹھنی اٹھا کے ہماری پیچھے پھینکی جو فرش پر بچھی سے گری مگر ہم نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ پھر کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی اسمارٹ لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا جو چاندی کے سکوں کی جھنکار کی طرح تو نہیں تھی مگر یوں لگا جیسے بہت سی اٹھنیاں فرش پر بکھر گئی ہوں۔

"اب کیا ہو گا؟ ایس ایس پی صاحب کی تو شرط معلوم ہے مگر دوسری طرف نازو ہے۔" میں نے کہا۔

"نازو واپس چلی جائے گی۔" غالب نے کہا۔

"وہ کبھی نہیں جائے گی۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں اس کی فطرت کو۔"

"تم اس کی فطرت کو جانتے ہو۔ میں نازو کو جانتا ہوں... شرط لگا لو۔"

"شرط تو ہم نے نہیں لگائی لیکن لگائی ہوتی تو غالب جیت

کے ساتھ ہماری پوری بات بڑے سکون سے سنی۔ اس کی صورت کے تاثرات کو غور سے دیکھتا رہا۔ میں نے وہ سب بتا دیا جو انکل رضوی نے کہا تھا۔ رابعہ پہلے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ نازو مسکرائی اور پھر ہنسنے لگی۔

"پھر میں چلتی ہوں۔" وہ بولی۔ "شعلہ کی آزادی کے لیے مجھے منظور ہے۔"

خاموشی کا ایک احساس اور بوجھل لمحہ آیا۔ نازو کو یوں بھی جانا ہی چاہیے تھا۔ اس کے والدین کی حالت ابتر تھی اور دھڑکا تو پہلے ہی تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں یہ سب انتہائی غیر متوقع تھا۔ ہم نہیں سوچ سکتے تھے کہ وہ یوں ہمارا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گی۔ وہ ہماری قوت تھی۔ آہستہ آہستہ سب کی ضرورت بن چکی تھی۔ سب جیسے لاجواب ہو کے رہ جاتے تھے۔ ہمارے حوصلے اور ہماری امیدیں۔ سب میں وہ برابر کی شریک تھی۔ ہم آرائیں کا مشن اس کی شرکت کے بغیر لاحاصل ہوتا تھا۔ بے شک وہ ایک لڑکی تھی اور ہم سب اکثر دوسروں کو قائل کرنے کے لیے دلیل دیتے تھے کہ مشن کسی ایک فرد کی عدم موجودگی سے بیچ میں نہیں رک سکتی۔ فراق کا وقت آیا تھا تو سب کو مایوسی کے احساس اور ناامیدی نے گھیر لیا تھا۔

"تم مجبور نہیں ہو۔" محسن نے بہت دیر بعد کہا۔ "شعلہ کی بہتری کو پابند مت سمجھو۔ وہ آ جائے گی۔ اس پر کوئی جرم ثابت نہیں ہو گا اور وہ... پولیس والے اسے کیسے رکھ سکتے ہیں۔ منظور اس کی ضمانت کرا دے گا۔"

"تم نے تعاقب میں ایک رات بھی نہیں رہنا چاہیے۔" نازو نے کہا۔ "اچھا ہے اگر اسے انکل رضوی لے جائیں۔ وہاں اس کی دیکھ بھال بھی ہو گی... اور وہ محفوظ بھی رہے گی۔"

"میرا مطلب تھا کہ تم کو اپنے والدین کی وجہ سے جب نا امید..." محسن نے کہا۔ "ہم تو پہلے بھی کہتے تھے کہ تمہارا گھر لوٹ جانا بہتر ہو گا۔ اب اگلا مرحلہ بھی تو ایک ہی جیسا ہے۔ تمہاری وجہ سے کوئی کمی ہوئی اور یقیناً اسے بھی بہت لگا ہے۔"

محسن کی بات بے ربط تھی۔ وہ خواہ مخواہ دلائل دے رہا تھا۔ نازو کے ذہن میں ایک کشمکش تھی جس نے اس کی سوچ کو الجھا دیا تھا۔ وہ شعلہ کی طرف سے بالکل بے فکر نہیں ہو سکتا تھا۔ انکل رضوی صاحب کے گھر میں رہے۔ شعلہ کے لیے وہ بھی اچھا تھا۔ اور ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ پھر کب اس سے ملاقات ہو گی یا نہیں ہو گی۔ وہ تو جانے ساتھ ہی جا رہی تھی۔ سوچا تو تھا کہ اس کا نہ جانا بہتر ہو گا مگر اس بات

کا یقین کسی کو نہیں تھا کہ وہ مانے گی۔ وہ صاف کہہ دیتی کہ اب جو بھی ہو گا وہ سب کے ساتھ ہو گا۔ میں اکیلی پیچھے رہ کے اپنے وسوسوں کے آسیب میں مبتلا ہو جاؤں گی۔ اکیلی انتظار کروں گی کب تک؟ جب تک تم سب واپس نہ آ جاؤ۔ کیا تم لوگ بتا سکتے ہو کہ تم کس دن کس وقت واپس آؤ گے... کون سی گارنٹی ہے؟ کس نے دی ہے؟

"تم سب لوگ اتنے مایوس کیوں ہو... رونی شکل کیوں بنائی ہے تم لوگوں نے؟" نازو ہنسی۔ "کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس سفر کے کسی مرحلے پر ہمارا ساتھ چھوٹ جاتا؟ ابھی تو میں لوٹ کر گھر جا رہی ہوں۔ کیا یہ بالکل بعید از امکان تھا کہ مجھے کسی دشمن کے پستول کی ایک گولی ختم کر دیتی اور تم کو میرا نشان تک نہ ملتا؟ یہ تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا اس سے مشن ختم ہو جائے گا؟ تم تو کہتے تھے کہ آخری آدمی بھی لڑے گا اپنی زندگی کی آخری سانس تک..."

"وہ مختلف بات ہوتی..." میں نے بمشکل تمام کہا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میرا ارادہ کمزور پڑ جاتا۔ میں ویسے ہی ڈر جاتی اور تمہارا ساتھ چھوڑ جاتی؟" نازو بولی۔ "اس وقت واپس چلی جاتی جب تم مجھے واپس جانے کے لیے مجبور کر رہے تھے؟ یہ تو بہت اچھا ہے کہ میں ایک ساتھ دو کام کر رہی ہوں۔ اپنے گھر واپس جا رہی ہوں اور شعلہ کو بھی ایک گھر میں پہنچا رہی ہوں۔ تم لوگ جاؤ... تمھیں اور ہمسفر ملیں گے۔ تمہارا ساتھ دینے والے بہت ہوں گے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ ہم کو تو خوش ہونا چاہیے کہ بالآخر تم گھر جا رہی ہو... اپنے ماں باپ کے پاس۔" میں نے کہا۔ "ہم سب بے گھر لوگ تھے۔ کسی کے بھی ماں باپ نہیں تھے۔ ہم لوٹ کر آئے تو کسی کے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"تم واپس آؤ گے... کامیاب آؤ گے۔ اور اس وقت شعلہ تمہارا انتظار اکیلی نہیں کرے گی..." نازو ہنسی۔ وہ اپنی افسردگی اور جذباتی دباؤ کو کم کرنے کے لیے زبردستی ہنس رہی تھی۔

"معلوم نہیں ایسا ہو گا یا نہیں ہو گا۔ ممکن ہے وہ اس قید تنہائی میں گھٹ گھٹ کر اور ہماری بے بسی پر پریشانی میں روتے روتے حوصلہ ہار جائے اور ہم واپس نہ آ سکیں۔ جانا تو ہمارے اختیار کی بات ہے، واپس آنا تقدیر کی یاوری کے بغیر ممکن نہیں۔" محسن بولا۔ "ہو سکتا ہے وہ بیوہ اور اس کا بچہ یتیم رہ جائیں۔"

"تو پاگل ہو رہا ہے محسن!" میں نے بدمزگی سے کہا۔ "آنا ہی خیال ہے بیوی بچے کا تو جا... تو بھی انکل رضوی کے پاؤں پکڑ لے... تجھے بھی معافی اور بیوی مل جائے گی۔"

محسن نے سر کو جھٹکا۔ "معاف کر یار... پتا نہیں مجھے اچانک کیا ہو گیا تھا۔"

www.paksociety.com

"میں اب جا رہی ہوں... ہو سکے تو جب بھی موقع ملے مجھے فون کر دینا۔" نازو بولی۔

"تمہارے والدین فون کٹوا دیں گے۔" غالب بولا۔

"خط ڈال دینا... بس خیریت کا..." نازو نے براہِ راست غالب سے کہا۔

"صرف خیریت کی اطلاع کو میں خط نہیں سمجھتا۔" غالب بولا۔ "میں سادہ پوسٹ کارڈ پر پتا لکھ کر ارسال کرتا رہوں گا۔ مضمون تم خود لکھ لینا کہ میں یہاں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔"

"اچھا بابا! جو تمہارا دل چاہے لکھ دینا۔" نازو نے کہا۔

غالب کا چہرہ کھل اٹھا۔ "جو دل چاہے... مگر دل کی بات تم تک کوئی پہنچنے دے گا۔ میرا تو خیال ہے کہ جیسے ہی تم واپس پہنچو گی، والدین خدا کا شکر بجا لائیں گے جس نے ان کی عزت آبرو رکھی۔ اب تک تو وہ کسی بہانے تمہاری عدم موجودگی پر جھوٹ کا پردہ ڈالتے رہے ہوں گے۔"

"ہاں! انھوں نے سب سے کہا ہوگا کہ میں خالہ کے پاس کراچی گئی ہوئی ہوں۔"

"مگر اب وہ تمہارے ساتھ جھٹ منگنی پٹ بیاہ کی بات کریں گے اور تمہاری ایک نہیں سنیں گے۔" غالب بولا۔ "شادی کی زنجیر سے باندھ کر کسی کے حوالے کریں گے کہ چاند سی بنو اب تیرے حوالے۔"

"پاگل ہوئے ہو، زبردستی کون کسی کو کسی کے سر منڈھ سکتا ہے۔ میں نہیں بندھتی کسی زنجیر سے اور زنجیر تو میں یوں توڑ سکتی ہوں۔" وہ چٹکی بجا کے بولی۔

"پھر بھی کب تک..."

"جب تک تم واپس نہیں آ جاؤ گے... میرا مطلب ہے تم سب..." وہ بولی۔

"دوسروں کی بات نہیں کرتا۔ میں ضرور آؤں گا... وعدہ۔" غالب نے کہا۔

نازو کے چہرے پر حیا کا رنگ گل کھلانے لگا۔ "وعدہ۔"

اس نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ سب سے ہاتھ ملایا۔ جب اس نے رابعہ سے ہاتھ ملایا تو رابعہ رونے لگی۔ اس نے نازو کو گلے لگا لیا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ نازو مسکراتی رہی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ روئے گی نہیں۔ غالب سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے چند سیکنڈ کے لیے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں رہنے دیا۔ اور میں نے دیکھا کہ غالب نے اس کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا۔ تھوڑا سا دبایا اور پھر چھوڑ دیا۔ ان چند سیکنڈ کے وقفے میں ان کے درمیان سارے قول و قرار ہو گئے۔ غالب نے وہ سب کہہ دیا جو وہ [illegible] خاموشی میں کہہ سکتا تھا اور نازو نے شاید پہلی بار اسے مایوس نہیں کیا۔ جواب نازو کی آنکھوں سے [illegible] غالب کی صورت پر نظر آیا۔ چہرہ وہ [illegible] ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ہم سب [illegible] چپ چاپ اور سوگوار اور دل شکستہ۔ اس گھر کی [illegible] اداسی تمام اتر آئی۔

پھر باہر کوئی کار آ کے رکی۔ ہم سب چونکے۔
میں نے کہا۔ "یہ تو شیخو آنٹی کی کار معلوم ہوتی ہے [illegible] آ گئی ہیں؟"

"[illegible] آئیے اندر۔" میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا [illegible] دروازے کے [illegible] پوزیشن لے کر کھڑا ہو گیا۔ [illegible] ساتھ والے کمرے میں غائب ہو گئے۔ مجھے [illegible] کر رہا تھا [illegible] آنٹی کی عادت ہے [illegible] یہ ہو سکتا تھا کہ باہر پولیس ہو [illegible] خلاف کوئی [illegible] کرنے پر آ جائے۔ وہ کینہ پرور لوگ [illegible] تھے اور اس کی بیوی آنٹی پیرا تھیں۔ [illegible] اکیلی عورت کے خلاف جھوٹے الزامات کا سلسلہ [illegible] تھے۔ اس [illegible] کا الزام عائد کرنے کے لیے [illegible] طرف سے درخواست حاصل کر سکتے تھے۔ یہ کہہ سکتے تھے کہ اس کے گھر میں اب بھی جرائم پیشہ افراد کو [illegible] جاتا ہے۔ وہ [illegible] اڈا ہوتی ہے۔ کسی اسمگلر کا [illegible] وغیرہ وغیرہ [illegible] ثبوت اور جھوٹے گواہوں کی بنیاد پر ان کے لیے [illegible] کا چیلنج کرنا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔ [illegible] سو بار [illegible] کے بعد ایک [illegible] ثابت ہوتی ہے۔ [illegible] مقدمات درج کرنے سے پولیس کو روکنے کے لیے کوئی قانون کام نہیں آتا۔

لیکن استاد ڈیڈی اندر آیا تو ہمارے اندیشے مٹ گئے۔ [illegible] کے ساتھ شیخو آنٹی بھی آئی تھیں۔ اندر آنے کے بعد ڈیڈی نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ [illegible] سامنے آ گیا۔

"میں تو ڈر گیا تھا کہ [illegible] سب کہاں چلے گئے۔"

"ہم بھی ڈر گئے تھے [illegible] چھوڑنے گئے تھے [illegible] اپنے ساتھ واپس کیوں لے آئے۔" [illegible] اندر سے آ گئے تھے۔

"کیا آپ اس کو چھوڑنے آئی ہیں؟" محسن بولا۔ "[illegible] پر چھوڑ دینا تھا۔ یہ سیدھا اپنے ٹھکانے پر آ جاتا۔"

"نہیں... میں آج رات یہاں رہوں گی..." شیخو [illegible] "[illegible] تو [illegible] مانتی... مجھے ڈر تھا کہ کہیں رات کو [illegible] پریشان کرنے نہ آ جائے کوئی..."

"ہم آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔" میں نے کہا۔

[illegible] انھوں نے مجھے پریشان کرنا چھوڑ دیا تھا۔" شیخو [illegible]

[illegible] میں اس وقت سے پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ میں خواہ مخواہ [illegible] جھگڑوں میں نہیں پڑ سکتی۔"

"یہ بھی آپ کا گھر ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن..."

"لیکن کیا؟ فکر مت کرو... میں تم پر زیادہ عرصہ بار نہیں بنوں گی۔" وہ بولی۔

"آپ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔" میں نے وضاحت کی۔ "اس گھر میں ہمارا قیام چند دن سے زیادہ نہیں ہو جانا ہے۔ ہم جہاں کے لیے کچھ کیے بغیر نہیں جا سکتے۔"

"یعنی میں نے ٹھیک ہی بات کی تھی۔" شیخو آنٹی نے کہا۔ "اس نے بتایا ہے کہ کل تم سب کے سب [illegible] ہو سکتے ہیں۔ کیا واقعی تم لوگ [illegible] کے لیے یہ سب کرو گے... ایک اجنبی کے لیے... [illegible] شکر ادا کروں تمہارا۔"

"اس کی ابھی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "الفاظ صرف زندہ کرتے ہیں۔ کبھی وقت پڑا تو ہم بھی ضرورت مند بن کے آ جائیں گے۔ اب تم ہماری مدد کرو... ممکن ہے ایسے ہی تم بھی [illegible] بیٹی کے لیے کچھ کر سکو۔"

"مجھے اس لڑکے نے بتایا ہے کہ [illegible] شوہر کو جانتا تھا اور اس کے پاس اس کی کوئی امانت پڑی ہے۔" وہ بولی۔

"یہ ٹھیک کہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب آپ اسی سے باقی تفصیلات بھی سن لیں۔ اتنی دیر میں ہمیں بھی کچھ کام کرنے ہیں۔"

رابعہ ان کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ میں محسن اور غالب باہر آ گئے۔ ہم نے خانہ بدوشی کے پروگرام پر تفصیل سے بات کی۔ ابھی تک ہمارے پلان میں کہیں خامی نہیں تھی۔ [illegible] کمپنی کے پروگرام کے مطابق اسلحے کی اگلی کھیپ کے [illegible] روانگی طے تھی۔ انھیں یہ اسلحہ بیل گاڑیوں پر بھوسے کے ڈھیر میں چھپا کے لے جانا تھا۔ بھوسے سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں [illegible] دیہات کو سڑکوں پر رواں نظر آتی ہیں جن پر بھوسا [illegible] باندھ کر لادا جاتا ہے کہ بیل گاڑی کے اوپر دس فٹ تک اونچا اور اپنی حدود سے دائیں اور بائیں جانب پانچ پانچ فٹ تک [illegible] کا پھیلاؤ ہو جاتا ہے مگر بھوسے کا وزن نہیں ہوتا چنانچہ بیل آسانی سے کھینچتے رہتے ہیں۔ سڑک پر دور سے [illegible] ہیڈ لائٹ پڑتی ہے تو بھوسے کی سنہری چمک سے [illegible] سڑک پر روشن دیوار سی دکھائی دیتی ہے لیکن اوور ٹیک [illegible] گاڑیاں تھوڑی سی جگہ سے گزر جاتی ہیں۔ بیل گاڑی [illegible] پیچھے [illegible] میں ایک لالٹین جھولتی رہتی ہے اور بھوسے [illegible] سوتا نظر آتا ہے۔ تجربہ کار بیل بالکل [illegible] راستوں پر اپنا سفر کرتے ہیں۔

اس ڈھیر کے اندر یقیناً خاصی مقدار میں اسلحہ چھپانے کی [illegible] اور چھ بیل گاڑیوں کا ایک قافلہ اتنا ہی اسلحہ لے جا سکتا تھا جتنا ایک ٹرک میں لے جانا ممکن ہوتا ہے مگر بھوسے کی گاڑیوں پر کسی کو شک ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ان کو چلانے والے بھی دیہاتی نظر آتے ہوں تو انھیں اسلحے کا اسمگلر، غدار یا دشمن کا ایجنٹ کون سمجھ سکتا ہے۔ ہم ان کے پیچھے پڑاؤ تک ان سے پہلے پہنچ سکتے تھے اور سڑک سے کچھ فاصلے پر اپنے خیمے گاڑ کے انتظار [illegible] ہم پچھلے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رابعہ آئی اور ہمیں بھی چائے کے کپ تھما کے لوٹ گئی۔ "کیا استاد ڈیڈی کی فلم ابھی چل رہی ہے؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ابھی تو انٹرول ہوا ہے۔"

"اس نے ابھی تک نازو کے بارے میں سوال نہیں کیا؟"

"کیا تھا..." رابعہ بولی۔ "میں نے بتا دیا... رونے کے قریب ہو گیا تھا۔"

"اس سے کہنا کہ ہمارے بارے میں کچھ نہ بتائے۔" محسن بولا۔ "ہم خود رات کو ایک ساتھ بیٹھیں گے تو بات ہو جائے گی۔"

"تم لوگ یہاں بیٹھے ہو، جا کے پتا کیوں نہیں کرتے کہ نازو اپنے گھر پہنچی یا نہیں اور انکل رضوی بھی شملا کو لے گئے یا نہیں؟" رابعہ نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ "میں اب رات کے کھانے کی تیاری کرتی ہوں۔"

"ہم بھی جاتے ہیں چائے پی کر۔" میں نے کہا۔ "ویسے انکل رضوی وعدہ کر کے مکرنے والے نہیں ہیں۔ شملا کے حق میں اچھا ہی ہوا۔ آنٹی اس کا خیال رکھ سکتی ہیں۔ اس کی مدد بھی کر سکتی ہیں۔"

"کیسی مدد؟"

"یہی! اگر وہ ہم سے بات کرنا چاہے۔ ہم فون کریں کبھی تو وہ بات کرا دیں۔ اس کو خط یا پیغام ارسال کریں تو انکل رضوی کا سنسر دھرا رہ جائے اور خط کا جواب بھی آ جائے۔" میں نے کہا۔ "وہ عورت ہیں بہرحال۔"

ہم تینوں میں سے غالب اور محسن فون کرنے گئے۔ میں نے گھر پر ٹھہرنا مناسب سمجھا۔ ڈیڈی ابھی تک باتوں میں مصروف تھا۔ میں رابعہ کے پاس کچن میں جا بیٹھا۔ وہ موم بتی کی مدھم روشنی میں گھٹنوں پہ ٹھوڑی رکھے بیٹھی تھی... "کوئی خواب دیکھ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں! خواب دیکھنے چھوڑ دیے ہیں میں نے۔" وہ بولی۔

"ایک [illegible] نازو [illegible] وقت بھوک لگی ہے۔ تم گرما گرم پراٹھے اتارو۔ میں یہیں بیٹھ کے کھاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"ایسا رومانی [illegible] ناولوں میں ہوتا ہے۔" رابعہ مسکرائی۔ "اس وقت تم کہو گے کہ چلو آج جا کر [illegible] چلتے ہیں... یا حکم دو گے کہ ویٹر... خانساماں سے کہو آج ہم ناشتے میں پراٹھے کھائیں گے۔"

www.paksociety.com

ڈائننگ ٹیبل پر اخبار پڑھتے پڑھتے تم دو چار نوالے کھا کے کافی پی لو گے اور اٹھ جاؤ گے۔"

"یہ تو بڑا عبرتناک نقشہ کھینچ کے رکھ دیا تم نے۔" میں نے کہا۔ "بے شک اگر میں سکندر بدبخت نہ ہوتا صرف سکندر بخت ہوتا تو آج صنعت کاروں کی صف میں شامل ہوتا۔ جو دن رات کاروباری مسائل میں الجھے رہتے ہیں اور پراٹھے نہیں کھا سکتے کیونکہ ہضم نہیں کر سکتے اور ان کا کولیسٹرول بڑھ جاتا ہے۔ خیر... کیا یہ ممکن ہے کہ کل جو نہیں ہو سکتا وہ ابھی ہو جائے؟"

"یہ ہو سکتا ہے۔" وہ ہنسی۔

"ابھی وہ سب آ جائیں گے میرے سالے۔" میں نے کہا۔ "کتے کی طرح ان کی ناک خوشبو سونگھ لے گی۔"

"اور آپ بھی میرے پیچھے پڑ جائیں گے کہ پراٹھے پکا پکا کے کھلا رہی ہو۔" رابعہ ہنسی۔

اور ایسا ہی ہوا۔ سب سے پہلے تو ٹیڈی وارد ہوا۔ اس نے آتے ہی نعرہ لگایا۔ "آہا ہا... پراٹھے!" اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ کیتھرین دروازے میں کھڑی مسکرا رہی۔ میں اور ٹیڈی چھینا جھپٹی کرتے رہے اور لقمے گرم پراٹھے کھاتے رہے کہ دونوں کے منہ جل گئے۔ ابھی ہمارا مقابلہ جاری ہی تھا کہ محسن اور غالب آ گئے۔

"ابے یار دیکھو ذرا بدمعاشی۔" محسن چلایا۔ "ہمیں کیسے بہانہ کر کے گھر سے نکال دیا اور یہاں ہو رہی ہے دعوت؟"

"کس کی دعوت؟" غالب بولا۔ "میاں یہ تو عشق ہے۔ کھلا عشق اور عہد بہ بے شرمی کا۔"

"یہ طفیلی تو میاں مجنوں کی وجہ سے کھا رہا ہے۔ ورنہ اسے کون پوچھتا۔" محسن نے کہا۔ "یار اپنی بھی گھر والی تھی... سو فیصد شرعی..."

"صبر کر یار آ جائے گی وہ... سیف ڈیپارٹمنٹ والٹ میں رکھی ہے۔" غالب نے کہا۔ "اپنی بھی کسی دن نکل آئے گی کہ ملا سماج کی دیواریں گرا کے۔"

"مگر یہ تو تمام سماج کے سامنے پراٹھے کھاتے جا رہے ہیں..."

"بک بک بند کرو۔ یہاں بیٹھو اور کھانا شروع کرو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں نے منع کر دیا رابعہ کو تو سوکھی روٹی ملے گی۔"

"یہ خشک روٹی جو آزاد رہ کر... تو وہ ہے غلامی کے حلوے سے بہتر۔" غالب بولا۔ "مگر میں غلام ابن غلام ابن غلام..." وہ محسن کا ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گیا۔

"تم لوگ کیا خبر لینے گئے تھے۔ کیا خبر لائے؟" میں نے کہا۔

"بیٹی وہی ہے خاک جہاں کا خمیر تھا۔" غالب بولا۔ "تازہ اپنے گھر میں ہے۔ اس کے باپ نے کم از کم بیس منٹ سے زیادہ گالیاں دیں۔ مگر میں گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔"

"شعلہ کو انکل رشدی اسی وقت لے گئے تھے؟"

"جب وہ تھانے گئے تھے تو اسی ارادے سے گئے تھے۔ ہوشیار آدمی ہیں۔ تم سے ایک سودا بھی کر لیا۔ اگر نا ہوتا تب بھی وہ شعلہ کو ہر حال لے جاتے۔"

"کیا ان کی بیگم نے بتایا ہے یہ سب کچھ؟"

"اور کیا انکل بتاتے۔" محسن بولا۔ "میں نے شعلہ سے بات کی تھی۔"

"وہ رو رہی تھی؟"

"رو تو میں بھی رہا تھا۔" محسن نے معصومیت سے کہا۔ "مگر..."

"رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے۔" غالب نے لقمہ دیا۔

"ہاں آنٹی نے بہت تسلی دی اور کہا کہ دن میں جب ایس ایس پی صاحب دفتر میں ہوتے ہیں تو تم فون کر لینا۔ میں نے کہا کہ جان ہتھیلی پہ رکھ کے دیواریں پھاند جاؤں گا۔ آ جاؤں تو وہ ہنسنے لگیں اور بولیں کہ دیوار پر اب خاردار ہیں... بہت اونچے۔ اندر دو خونخوار قسم کے کتے بھی پال لیے گئے ہیں۔ تاروں سے کپڑے پھٹ جائیں گے۔ کتوں سے تم خود پھٹ جاؤ گے۔ اس لیے ایسا نہ کرنا۔"

کھانے کے بعد ہم سب بیٹھے تو ایک بار پھر بہادر مردانگی کے بیان کی بات شروع ہوئی۔ میں نے کیتھرین کو الگ بیٹھ کے اسے اپنی سرگزشت کا خلاصہ سنایا۔ وہ دم بخود بیٹھی رہی۔ محسن اور غالب کا تعارف ختم ہوتے ہوتے ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پھر میں نے اسے رابعہ، شعلہ اور نازو کے متعلق بتایا۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ تم سب اتنے باہمت اور اتنے مخلص... اتنے اچھے دوست ہو۔" کیتھرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "آج مجھے اپنا شوہر یاد آ رہا ہے۔ وہ ہوتا تو ہمارے لیے کوئی پرابلم نہ ہوتی۔ کچھ نہ کچھ میں بھی کروں گی۔ میرے بہت وسیع رابطے تھے۔ میں بہرام دادا کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے ہر راز میں شریک تھی۔"

"پ... آپ ہمارے ساتھ چلیں گی؟"

"ساتھ نہ گئی تب بھی ساتھ دوں گی... تم نہیں جانتے میں کیا کر سکتی ہوں۔" وہ بولی۔ "وقت بتائے گا کہ میں اب بھی وہ ہوں جو بہرام دادا کی نصف بہتر تھی..."

ابھی اس کی بات جاری تھی کہ باہر سے آہٹ سنائی دی۔ پھر ایک رائفل کی نال شیشہ توڑ کے اندر آ گئی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ادھر سے بھی دو نالیں ہم سب کا نشانہ لیے ہوئے تھیں۔

سب ایک ہی وقت میں ایک ہی چھت کے نیچے جمع تھے اور کوئی دشمن ایسے وقت میں آ پہنچا تھا جب ہم اپنے دفاع کی طرف سے غافل تھے۔ ہم سب نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے سوال کیا کہ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ مگر جو میری ذہنی کیفیت تھی وہی سب کی تھی۔ لیکن میں ساتھ ہی یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ کون سے شکاری ہیں۔ وہ تو پہنچنے کے شکاری جو صف دشمناں میں سب سے اول تھے۔ پھر یا وہ جو ہم سب سے پہلے اس گھر پہ قابض تھے اور بڑی دیدہ دلیری سے اپنے باپ کا گھر سمجھ کر یہاں مال غنیمت لاتے چھپاتے تھے اور جمع رکھتے تھے۔

ایک قدرتی ردعمل یہ ہوا تھا کہ ہم سب نے ریوالور نکال لیے تھے مگر ہمارے مقابل صرف دو نالیں تھیں اور ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے تھے جو باہر کھڑے تھے اور اپنا نشانہ بنانے کو تیار تھے کہ ہم خود ہی اپنی اس کمزور پوزیشن کو سمجھتے ہوئے ہتھیار ڈال دیں۔ یہ سب لوٹا ہوا اور چھینا ہوا اسلحہ تھا۔

میں نے ایک نظر سب کا جائزہ لیا اور اچانک امید کی ایک کرن نے مجھے مایوسی کے گھپ اندھیرے سے نکال لیا۔ غالب نظر نہ آیا۔ عین اسی وقت جب ان نادیدہ حملہ آوروں نے سر نکالا تھا یا چند لمحے قبل وہ دوسرے کمرے میں غائب ہو چکا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا کہ اب اسے لوٹ کر نہ آنے دیا جائے اور اس خطرے سے خبردار کر دیا جائے جس میں ہم گرفتار ہو چکے تھے۔

"کون ہو تم لوگ؟" محسن نے کچھ اعتماد اور مضبوط لہجے میں کہا۔

"معلوم ہو جائے گا۔" باہر سے جواب آیا۔ آواز اجنبی تھی اور لہجہ تحکمانہ۔ "بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ یہ ہتھیار گرا دو اور سب پلٹ کر دیوار کی طرف منہ کر لو۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو سر سے اونچا اٹھا کے دیوار پر رکھو اور ایسے ہی کھڑے رہو۔"

"تم سمجھتے ہو کہ ہم اتنے بزدل اور کم ہمت ہیں؟" میں نے کہا۔ "ہم موت سے نہیں ڈرتے۔ تم اگر مرد ہو تو سامنے آؤ۔"

میری بات کا کوئی مقصد نہ تھا سوائے غالب کو خبردار کرنے کے۔ ایسے وقت میں کسی کو اپنی جرأت مندی سے متاثر کرنا یا موت سے پیار ثابت کرنا ایک احمقانہ حرکت ہی تھی۔ چنانچہ سب نے مجھے حیرانی سے دیکھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس طرح شور مچانے سے فائدہ ہو سکتا ہے۔

"اپنی بکواس بند کرو۔" اسی آواز نے کہا۔ "ہم یہاں تم سے باتیں کرنے نہیں آئے ہیں۔ اپنی مردانگی اپنے پاس رکھو اور وہی کرو جو کہا جا رہا ہے۔"

"ورنہ تم سب کتے کی موت مارے جاؤ گے۔" یہ دوسری آواز کسی ادھیڑ عمر شخص کی تھی۔ "[illegible]..." اس نے ایک فحش بات کی۔

"تم چپ رہو۔" پہلے شخص نے اپنے ساتھی سے اتنی ہی بے حسی کے ساتھ کہا۔ "کیا تمہیں بتایا نہیں گیا تھا کہ فضول بات کوئی نہیں ہوگی اور تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا۔"

"ٹھیک ہے جی ٹھیک ہے۔" دوسرا شخص کتے کی طرح آہستہ سے غرایا۔

"میں تم کو دس سیکنڈ دوں گا کہ اپنے ہتھیار نیچے پھینک دو... ادھر دروازے کی طرف۔" پہلا شخص جو روبوٹ کی طرح بولتا تھا اور اس گروہ کی قیادت کا دعویدار تھا مجھے زیادہ خوفناک لگا مگر اس کے ساتھ ہی مجھے اس کا مشینی لہجہ بھی مصنوعی لگا۔ وہ آواز بدل کے بات کر رہا تھا۔ اب وہ گنتی شمار کر رہا تھا اور میرے کان ہر سیکنڈ کے گزرنے کی آواز سن رہے تھے۔ جب وہ سات پر پہنچا تو میں نے ریوالور نیچے کر کے دروازے کی طرف اچھال دیا۔ محسن اور استاد ٹیڈی مجھ سے پہلے ہی پھینک کر رسید سے ہو چکے تھے۔

"تمہارا ایک ساتھی کم ہے۔" گروپ لیڈر نے کہا۔

"کون کم ہے؟" میں نے بیک وقت محسن اور ٹیڈی کی طرف دیکھ کر اپنی حیرانی کا اظہار کیا۔

"تم خود جانتے ہو کہ کون کم ہے۔ اسے کہو کہ سامنے آ جائے ورنہ اندر آنے کے بعد ہم سب سے پہلے اس کی ساری چالاکی نکال دیں گے۔"

"اگر کوئی ہے تو تم کو اختیار ہے کہ اس کے ساتھ جو سلوک چاہو کرو۔" میں نے کہا۔

"جیسے بھی تم کو ہم سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" محسن نے سر ہلایا۔

"اچھا اب ان عورتوں سے کہو کہ یہ بھی وہی کریں جو تم نے کیا۔" گروپ لیڈر بولا۔ "ہم جانتے ہیں کہ یہ بھی مسلح ہیں۔"

"یہ... یہ کیا ہو رہا ہے۔" جولی کی ماں نے اچانک بہتر سے مغلوب لہجے میں کہا۔ اس کی آواز میں لکنت تھی اور وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

"ہمت سے کام لو... پلیز..." میں نے کہا۔ مجھے شک ہونے لگا تھا کہ وہ محض خوف کا ڈرامہ کر رہی ہے۔ وہ ایسی عورت نہیں تھی کہ صرف بندوق کی نال کا رخ اپنی طرف دیکھ کر دہشت زدہ ہو جائے۔ اس کی عمر کا بڑا حصہ بہرام دادا کے شانہ بہ شانہ خطرات میں گزرا تھا۔ وہ تسلیم کر چکی تھی کہ کس طرح وہ چھ افراد کو گولی کا نشانہ بنا چکی ہے جو اسے کمزور عورت سمجھنے کی غلطی کر بیٹھے تھے۔ میرا اندازہ درست تھا۔ وہ میری بات ختم ہونے سے قبل ہی تھوڑا سا ہلی اور پھر بے جان لاش کی طرح فرش پہ ڈھیر ہو گئی۔

"یہ عورت دل کی مریض ہے۔" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں... اسے مر جانے دو۔" باہر سے جواب آ...

www.paksociety.com

"ہو سکتا ہے کہ یہ مکر کر رہی ہو... تم یہ بتاؤ کہ چوتھی عورت کہاں ہے؟"

"چوتھی عورت؟" میں نے تعجب سے دہرایا۔ اس کی بات سے پتا چلتا تھا کہ وہ کسی کو پہچان نہیں سکتا ورنہ وہ نام لے کر پوچھتا کہ فلاں کدھر ہے۔

"ہاں! یہاں چار مرد اور چار عورتیں ہوں گی۔" وہ بولا۔ "ہمیں یہی بتایا گیا تھا۔" رابعہ اور شہلا نے بھی ایک ایک ریوالور آگے کھسکا دیا۔

"بھکنے والوں کو غلط فہمی..."

"ایک عورت اور ایک مرد اگر دوسرے کمرے میں ہیں تو ان سے کہو کہ سامنے آ جائیں ورنہ ان کا حشر بُرا ہو گا۔" وہ بولا۔

"تم ان کا کیا حشر بُرا کرو گے۔" محسن نے اچانک قہقہہ مارا۔ "وہ میاں بیوی باہر گئے ہوئے ہیں۔ تم محسن اور شہلا کو پوچھ رہے ہو نا؟"

میں ایک بار پھر محسن کے اور اپنے خیالات کی یکسانیت اور سوچ کی ہم آہنگی کا قائل ہوا۔ کچھ لوگ اسے ذہن کی اس برقی رو کی فریکوئنسی کا ایک ہونا کہتے ہیں جو انسان کی کھوپڑی میں دماغ کے عمل کو متحرک کرتی ہے۔ محسن نے بھی سمجھ لیا تھا کہ ہمیں محصور کرنے والے صرف ہماری تعداد سے واقف ہیں۔ وہ کسی کو صورت سے شناخت نہیں کر سکتے۔

"شہلا امید سے ہے۔ محسن اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"کس ڈاکٹر کے پاس؟" وہ بولا۔

"غالباً ڈاکٹر لطیف کے پاس۔" میں نے روانی سے کہا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محسن نے وہاں جانے کا خطرہ مول لیا ہو۔ شہر میں سیکڑوں ڈاکٹر ہیں جو اس کو نہیں پہچانتے۔"

"وہ کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس گیا ہے۔" رابعہ نے آہستہ سے کہا تاکہ باہر والے بھی سن لیں۔

"تم سب مل کر ایک جھوٹ کو سچ بنا رہے ہو۔" باہر والا بولا۔ "ہم نے صبح سے اپنے آدمی یہاں لگا رکھے تھے۔ انھوں نے کسی کو باہر جاتے نہیں دیکھا۔"

وہ خود کو احمق ثابت کر رہا تھا۔ صبح کے بجائے وہ دوپہر کہتا تب بھی غلط ہوتا لیکن وہ کہہ سکتا تھا کہ ہم بہت دیر سے دیکھ رہے تھے۔ میرا حوصلہ کچھ اور بڑھ گیا۔ ایک احمق آدمی زیادہ خطرناک دشمن ثابت نہیں ہو سکتا اور اپنی حماقت کے باعث اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ خود ہی کوئی ایسی غلطی کرے گا جس سے ہم فائدہ اٹھا لیں گے۔

"اچھا وہ اندر ہیں تو آ کے انھیں بھی پکڑ لو۔" ٹیڈی نے جھنجلا کے کہا۔

"اپنا منہ دیوار کی طرف کرو اور ہاتھ اٹھا کے کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے حکم دیا۔ ہم چند لمحے تذبذب کی کیفیت کا اظہار کرتے رہے۔ جب اس نے پھر دس سیکنڈ کی وارننگ دی اور گننا شروع کیا ہم پلٹے اور مردہ قدموں سے چلتے ہوئے دیوار سے جا لگے۔ میرے چہرے سے بے بسی، مایوسی اور اشتعال کا اظہار ہو رہا تھا۔ صرف ٹیڈی کی ماں فرش پہ بے حس و حرکت پڑی رہ گئی۔ چند لمحوں کا مختصر وقفہ بھی اس حالت میں بہت طویل محسوس ہوا۔ پھر میرے کانوں نے بھاری قدموں کی آہٹ سنی۔

"ان سب کی تلاشی لو۔" گروپ لیڈر بولا۔ "اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ سخت جان لوگ جوڈو کراٹے جانتے ہیں۔ اگر کسی نے تم کو قابو کر لیا... تو میں تمہیں بچا نہیں سکوں گا۔ زیادہ سے زیادہ میں اس کو گولی مار دوں گا۔ گولی تم کو بھی لگ جائے تو میری ذمہ داری نہیں۔"

"بس بس! میں آپ سے وقوف نہیں ہوں۔" دوسرا شخص چڑ کے بولا۔

"پھر کہتے ہیں بے وقوف ہو؟" محسن نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔ جواب میں اس کی گالی کے ساتھ ہی محسن کو تھپڑ مارنے کی آواز سنائی دی۔ محسن کا سر دیوار سے ٹکرایا۔

"اپنا کام کرو۔" گروپ لیڈر نے بھی اس کو ایک گالی دے کر کہا لیکن گالی دیتے وقت بھی اس کی آواز بلند نہیں ہوئی۔ وہ اسی تشفی لہجے میں بولتا رہا۔ "اسی لیے سب نے مجھ سے کہا تھا کہ تم اور کو ساتھ لے جاؤ۔ مجھ میں برداشت نہیں ہے۔"

میں اپنی باری کا منتظر رہا اور تلاشی لینے والے کو شکست دینے کا کوئی موثر طریقہ سوچتا رہا۔ اگر کسی طرح اس کو مجبور کیا جا سکتا کہ وہ غصے میں بے قابو ہو جائے اور اپنا کام کرنے کے بجائے مجھ سے الجھ جائے... اچانک میرے کانوں نے ٹیڈی کے کراہنے کی آواز سنی۔ سر گھما کے دیکھنے پہ مجھے ٹیڈی نیچے گرا ہوا نظر آیا۔ دو افراد اسے گھسیٹ کر لے گئے۔ میں نے شہلا اور رابعہ کا دہشت سے سفید پڑ جانے والا چہرہ دیکھا اور یہ بھی کہ ہمارے پیچھے دو افراد مشین گن لیے بہت مستعد کھڑے ہیں۔ ان سب نے سر سے پیر تک سیاہ لباس پہن رکھے تھے۔ سیاہ پتلونوں کے پائنچے انھوں نے سیاہ بوٹوں کی سیاہ جرابوں کے اندر کر لیے تھے۔ اوپر سب نے ایک جیسی کالی قمیص پہن لی تھی اور اپنی صورت کو چھپانے کے لیے انھوں نے نائلون کی کالی جرابیں الٹی کر کے سر کی طرف سے چڑھائی تھیں۔ بڑے سائز کی جراب میں چہرہ چھپ جانے کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ اس کے باوجود پوری جراب کو سر پہ چڑھانے کے لیے انھیں جراب کے ساتھ زبردستی کرنا پڑی ہوگی۔ جراب گردن تک آ گئی تھی اور بہت زیادہ کھنچ جانے سے جالی کی طرح ہو گئی تھی چنانچہ وہ اس کے اندر سے دیکھ سکتے تھے مگر باہر سے ان سب کے چہرے مضحکہ خیز ہو گئے تھے۔ ان کے

ناک کان اس جالی میں صاف ابھرے ہوئے محسوس ہوتے تھے لیکن ان کے سر اور چہرے ایک جیسے لگتے تھے۔ انڈے کی طرح گول، سپاٹ اور بے شناخت۔ مسجد کے گنبد کی طرح سروں کے وسط میں ایک چھوٹا سا گنبد نما ابھار بھی تھا۔ یہ جراب کا وہ حصہ تھا جو پورا پھیلا نہیں تھا اور سر کی ہموار سطح کے ساتھ برابر نہیں ہوا تھا۔ اس قسم کے نقاب میرے لیے نئے نہیں تھے۔ میں نے لندن میں قیام کے عرصے میں سڑک چھاپ غنڈوں کو اس کم خرچ آسان حاصل نقاب سے صورت چھپا کر ایشیائی دکانوں پہ حملہ کرتے اور فرار ہوتے دیکھا تھا۔ کوئی ان کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ جالی جیسے نقاب میں ان کے بالوں کے انداز، رنگت اور صورت کے خدوخال سب چھپ جاتے تھے۔ یہی طریقہ وہاں ڈکیتی کی چند وارداتوں میں بھی استعمال ہوا تھا۔ وہ اور بات تھی کہ وہاں کی پولیس اس روپوشی کے باوجود اکثر مجرموں کو ڈھونڈ نکالتی تھی۔

ٹیڈی کو تلاشی لینے والے نے ناک آؤٹ کیا تھا۔ اس کو انھوں نے تھوڑا سا پیچھے لے جا کر ڈال دیا اور محسن کی تلاشی لینے لگے۔ اس بار میں انھیں دیکھتا رہا۔ ایک نے اوپر سے نیچے تک محسن کے کپڑوں پہ ہاتھ مارا اور مخنوق کٹ لباس کو یوں ٹٹولا کہ کہیں کوئی سگریٹ لائٹر بھی ہوتا تو اس کے ہاتھ محسوس کر لیتے۔ پھر دوسرے نے محسن کے سر پہ ریوالور کا دستہ مارا اور محسن کوئی آواز نکالے بغیر لڑکھڑا کے نیچے گر گیا۔ مجھے اس کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا کہ وہ سچ مچ بے ہوش ہوا ہے۔ مارنے والے نے بڑی قوت کے ساتھ وار کیا تھا۔ تاہم وہ صرف ضرب کی شدت کو کافی سمجھتا تھا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ صحیح جگہ پہ خفیف سی ضرب کا اثر بھی وہی ہوتا ہے جو غلط جگہ پہ شدید ضرب کا، بلکہ بعض اوقات سخت ترین ضرب سے بھی خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوتے۔

جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے ایک گہری سانس لے کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ مجھے اپنے دفاع میں کامیابی کے لیے جو کچھ کرنا تھا اس کا انحصار میری صحیح ذہنی اور جسمانی مدافعت پر تھا۔ اگر دشمن کا عمل پہلا ہوا تو میں سر پہ چوٹ کھانے کے لیے تیار تھا۔ اگر گردن اکڑا لیتا تو چوٹ زیادہ سخت پڑتی اور میں خود کو بچانے کے لیے سر جھکاتا تو وہ ایک کی جگہ دو مرتبہ وار کرتا اور دوسری بار جھنجلاہٹ میں زیادہ طاقت سے مارتا۔ میں نے ضرب کو سر کی خفیف سی جنبش کے ساتھ جھیلنے کی کوشش کی مگر پھر بھی ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے اور دیوار میرے سامنے اندھیرے کے غائب ہو گئی۔ میں نے گرنے کے انداز میں سنبھلنے کی کوشش کی مگر زمین تو میرے قدموں کے نیچے سے غائب ہو چکی تھی۔ میں گرتے ہوئے دیوار سے ٹکرایا۔

نیم بے ہوشی کا یہ وقفہ تو بہت مختصر تھا لیکن اس نے مجھے کچھ کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں مختلف آوازیں سن کر ان کا مطلب سمجھنے کے قابل تھا۔

"کیا سب کا ڈھیر لگاتے جاؤ گے؟" روبوٹ بولا۔ "جاؤ پہلے ان کو ٹرک میں ڈال دو۔"

"باہر سے ان دونوں کو بھی بلا لو۔"

"نہیں... ایک ٹرک میں ہے۔ ایک کا باہر رہنا بھی ضروری ہے۔ کہیں وہ دونوں میاں بیوی نہ آ جائیں۔"

"ایک کو ایک اٹھا کے ٹرک تک نہیں لے جا سکتا..."

"تو دونوں مل کے لے جاؤ۔"

"پھر تم یہاں اکیلے رہ جاؤ گے۔"

"میری فکر مت کرو۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں دو عورتوں سے نہیں نمٹ سکتا۔" روبوٹ نے کہا۔ "آخر تم بار بار یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ یہاں تم میرے حکم کی تعمیل کے لیے آئے ہو، مجھ سے بحث کے لیے نہیں۔ لیڈر میں ہوں۔"

"لیڈر... اونہہ..." تمسخر اور حقارت آمیز لہجہ اور مجبوری۔

میں نے ایک آنکھ کھول کر دیکھنا چاہا لیکن میں غلط رخ پہ گرا تھا۔ میں دونوں آنکھیں کھول کر دیکھتا تب بھی مجھے اپنے مقابل دیوار ہی نظر آتی۔ پیچھے دیکھنے کے لیے میرا سر کو گھمانا ضروری تھا لیکن میں ذرا بھی حرکت کرتا تو وہ ہوشیار ہو جاتے۔ چنانچہ میں اسی طرح لیٹا رہا۔ ایک وقت ایسا آیا جب میرے اندازے کے مطابق کمرے میں صرف روبوٹ تھا۔ باقی دونوں محسن کو اٹھا کے باہر لے گئے تھے۔ آخر شہلا اس موقع سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتی؟ میں نے سوچا۔ اس کے پاس ریوالور بھی ہے۔ وہ اس ایک آدمی کو شوٹ کر سکتی ہے۔ تعاقب کیوں رکا ہوا ہے؟ اسی وقت وہ بھی روبوٹ سے ہتھیار رکھوا لے تو باقی دو کو بھی اندر بلوا کر آتے ہی ہینڈز اپ کرایا جا سکتا ہے۔ یہ وقت گزر جائے گا تو وہ غائب کو بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ چھلاوا آپ سے نہیں کہ نظر سے اوجھل ہو جائے۔ غالب اندیشہ ہے... پھر بھی نہیں لگا اور وہ میرے دیکھتے دیکھتے ٹیڈی کو لے گئے۔ پانچ منٹ میں وہ پھر آئے۔ ان میں سے ایک نے میرے دونوں ہاتھوں کے نیچے بغل میں ہاتھ دے کر اٹھایا، دوسرے نے ٹانگوں کو پکڑ لیا۔

ٹرک عام قسم کا مال بردار ٹرک نہیں تھا۔ یہ ہیوی ڈیوٹی ٹرک تھا جس کے پیچھے لمبا سا ٹرالر تھا۔ اس کے اوپر فولادی چادروں سے بنا ہوا بیس فٹ لمبا دس فٹ چوڑا اور دس فٹ اونچا باکس کنٹینر رکھا ہوا تھا۔ یہ اسٹینڈرڈ سائز کے کنٹینر ایسے ساز و سامان کی نقل و حرکت میں استعمال ہوتے ہیں جن کے بارش یا دھوپ میں خراب ہونے کا اندیشہ ہو اور جن کو زیادہ حفاظت کے ساتھ پہنچانا مقصود ہو۔ بیرونِ ملک سے اس قسم کے کنٹینر بحری جہاز سے ڈاک یارڈ پہ کرین سے اٹھا کے

www.paksociety.com

جاتے ہیں اور مال بردار جہاز جب بندرگاہ پر پہنچتے ہیں تو انھیں کرین جہاز پر سے اٹھا کے اسی طرح ٹرک کے ٹریلر پر رکھ دیتی ہے جو ان کو سڑک کے راستے اندرونِ ملک پہنچا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ باکس انتہائی مضبوط ہوتے ہیں اور اس طرح مقفل کیے جا سکتے ہیں کہ کسی بھی جگہ کوئی انھیں آسانی سے نہ کھول سکے۔

دیو ہیکل باکس کی سائڈ کا ایک دروازہ نیچے گرا ہوا تھا۔ اس دروازے کو بند کرنا مقصود ہو تو اوپر اٹھا کے برابر کر دیتے ہیں اور ایک پائپ موٹی لوہے کی سلاخ کو کھٹکا کر کئی سوراخوں میں سے گزار دینے کے بعد تین چار جگہ ایسے قفل سے روک دیتے ہیں کہ باکس تقریباً سیل ہو جاتا ہے۔ لیکن ابھی تالے نہیں ہوتے۔ ان سب کو توڑے بغیر سلاخ ایک سوت نہیں ہلتی اور جب تک پوری سلاخ دروازے کے سامنے سے نہ ہٹ جائے، پٹ نیچے نہیں گرتا۔ مجھے بھی اس کھلے دروازے سے اندر پھینک دیا گیا۔ کچھ کرنے کی خواہش کو میں نے بڑی مشکل سے دبا رکھا تھا صرف اس امید میں کہ غالب اور کیتھرین کے ذہن میں جو بھی پروگرام ہے وہ میری جلد بازی کے باعث ڈسٹرب نہ ہو۔

فرش پر گرنے سے مجھے چوٹ تو آئی مگر میں برداشت کر گیا اور جہاں گرا تھا وہیں پڑا رہا۔ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ اس کمرے سے بڑے باکس کے اندر بھی کوئی شکاری ضرور ہوگا۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے تو اتنے کم اندیش اور غیر محتاط کیسے ہو سکتے تھے کہ پہلے سب کو گرفتار کریں اور پھر نکل جانے کا موقع فراہم کر دیں۔ میں سر اٹھا کے محض پانچ ان کا جائزہ لینا چاہتا تھا اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں وہ بھی میری طرح بے ہوش بنے تو نہیں پڑے ہیں مگر میں اس محافظ کے ڈر سے نہیں اٹھا جو بلاشبہ میرے خیال کے مطابق اندر موجود تھا۔ غالباً یہی احتیاط محسن اور ٹیڈی بھی کر رہے تھے۔ اب تک جو صورتِ حال سامنے آئی تھی اس کے مطابق دس تک سات شکاری اس مہم کے لیے بھیجے گئے تھے۔ چار اندر آئے تھے۔ ایک ٹرک ڈرائیور اور ایک وہ جو باہر نظر رکھے ہوئے تھا کنٹینر کے اندر والا ملا کے سات۔ ان کی تعداد زیادہ بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن اتنی بھی نہیں کہ معلوم ہو دشمن کے قلعے کو سر کرنے کے لیے فوج کشی مطلوب تھی۔

پہلا فائر ہوا تو میں اچھل پڑا۔ آواز اندر سے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی بڑے بے ہنگم طریقے پر چلایا اور میں نے آواز پہچان لی یہ وہی اُجڈ اور اکھڑ شخص تھا جسے گروپ لیڈر معتی شیخی لہجے میں بات کرنے والا رعونت بار بار فہمائش کر رہا تھا پھر دوسرا فائر ہوا اور دوسرے شخص نے چیخ کے کہا "میں ان دونوں کو گولی مار دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی رابعہ کے چلانے کی آواز نے مجھے احتیاط کے سبب تمام تقاضے نظر انداز کرنے پر مجبور کر دیا۔

"محسن... ٹیڈی..." میں نے سر اٹھا کے کہا۔ کیسے ہو گے

دو گولیاں میرے سر کے اوپر دائیں بائیں سے گزر گئیں۔ اس بند ہال میں فائرنگ کی آواز نے بڑی گونج پیدا کی۔ گولیاں ایک تاریک گوشے سے چلائی گئی تھیں جہاں میرے اندازے کے مطابق کوئی ریوالور لیے دبکا ہوا تھا۔ میں نے سر کو ایک جھٹکے سے پیچھے کیا اور دوسرے لمحے بجلی کی طرح اٹھتے ہوئے باہر کود گیا۔ اندر جو چھپا محافظ تھا اس ایک لمحے میں تھوڑا سا مطمئن اور غافل ہو گیا تھا کہ اب اتنی جلدی دوبارہ سر اٹھانے کی جرأت نہیں کروں گا۔

میں زمین پر گرا اور ایک دم پلٹ کر ٹرک کے بھاری بھرکم اور بڑے بڑے پہیوں کے درمیان کی جگہ میں گھس گیا۔ میرا محافظ شاید دوڑ کر دروازے تک آیا تھا۔ جتنا وقت مجھے باہر گرنے میں لگا تھا اتنا ہی اسے پھر مجھے نشانہ لینے میں صرف ہوا تھا کیونکہ میں نے پلٹا کھایا کہ یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ ایک سیکنڈ کے سوویں یا ہزارویں حصے کے فرق نے مجھے نشانہ بننے سے بچا لیا اور گولیاں وہاں زمین میں پیوست ہو گئیں جہاں میں گرا تھا۔ میرے کانوں میں رابعہ کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے اپنے خالی ہاتھ ہونے کا افسوس ہوا ورنہ وہ دونوں بدمعاش جو رابعہ کو ڈھال بنائے لا رہے تھے میرے سامنے تھے۔

اس وقت مجھے خیال آیا کہ اس ٹرک کے نیچے جتنی دیر میں ہوں اور جیسے ہی اندر سے فائرنگ کرنے والا بتائے گا کہ "ایک قیدی نکل کر ٹرک کے نیچے چھپ گیا ہے" باقی شکاری مجھے ہر طرف سے فائرنگ کر کے مار ڈالیں گے یا بہ آسانی نکال لیں گے۔ میرے پاس ایک ریوالور ہوتا تو میں اس محفوظ مورچے سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ رابعہ اور شمسو کے زخمی ہونے کا خیال تھا تو ان پر گولی نہ چلاتا مگر اس ٹرک کے اگلے ٹائر برسٹ کر دیتا یا ڈیزل ٹینک میں سوراخ کر دیتا اور ان کے فرار کو ناممکن کر دیتا۔ ٹرک کے ٹائر اتنے بھاری اور موٹے تھے کہ عام کیل سے ان کا کچھ بھی نہ بگڑتا۔ میرے پاس خنجر بھی ہوتا تو بے کار تھا میرے خیال میں ڈبل ٹائر ہونے کے باعث ایک دو ٹائروں کے فلیٹ ہونے سے فرق بھی نہ پڑتا۔ چنانچہ میں نے فوری طور پر نکل بھاگنے کا فیصلہ کیا۔ آزاد رہ کر میں بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اور آزادی کے لیے مقابلے کا امکان نہیں تھا۔ فرار کے راستے ابھی کھلے ہوئے تھے۔

میں ٹرک کے عقبی حصے کے نیچے سے نکلنے کے لیے بڑھا ہی تھا کہ ٹرک کے اندر سے محافظ نے چلا کے کہا: "ایک مچھر نکل کر بھاگ گیا۔"

"کیسے بھاگ گیا...؟" باہر سے کوئی گالی دے کر اور چیخ کر بولا۔ "تو کیا سو گیا تھا۔ بے ہوش آدمی پر نظر نہیں رکھ سکا۔"

"وہ بے ہوش نہیں تھا... تم دونوں الو کے پٹھے اور بیوقوف ہو جو ایسا سمجھے تھے۔" وہ اوپر سے بولا۔ "دیکھو اسے وہ نیچے تھا۔"

"تُو نے پاؤں میں مہندی لگا رکھی تھی۔" پیچھے سے دوسرے شخص نے زیادہ گندی گالی دے کر کہا۔

"میں نیچے آ رہا تو تیرے یہ دونوں باپ بھی بھاگ جاتے۔" پہرے والے نے گالی کا جواب گالی سے دیا۔ "ان دونوں کو اندر ڈالو اور اسے نکالو۔"

رابعہ کی خاموشی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ بھی بے ہوش ہو گئی ہے یا کر دی گئی ہے۔ چند سیکنڈ کے اس وقفے میں جو ٹرک کے فولادی ڈھانچے کی پناہ میں گزرا، مجھے یہ بھی سوجھی تھی کہ میں کسی بھی قریب آنے والے کو ٹانگ پکڑ کے اندر گھسیٹ لوں اور اس سے ریوالور چھین لوں مگر اس میں کامیابی کے امکانات بہت کم اور خطرات بہت زیادہ تھے۔ یہ ضروری تھا کہ آنے والا اتنا قریب آ جائے کہ میرے دونوں ہاتھوں کی دسترس میں ہو۔ پھر یہ بھی ضروری تھا کہ میرے ہاتھ اس کے ٹخنوں سے اوپر کے حصوں کو صحیح طرح گرفت میں لے سکیں اور آخری بات یہ ضروری تھی کہ میں اسے اتنی قوت کے ساتھ جھٹکا دے سکوں کہ وہ سر کے بل گرے اور سیدھا اندر کھنچا چلا آئے۔ ٹرک کے نیچے میری نقل و حرکت کی صلاحیت بہت محدود تھی۔ ہر طرف کیل کانٹے تھے اور میں سیدھا بیٹھ بھی نہ سکتا تھا۔ ایسی حالت میں میری کوشش کا انجام ناکامی ہوتا تو اس کے نتائج زیادہ بھیانک نکلتے چنانچہ میں نے زیادہ سے زیادہ دور جانے کا فیصلہ ٹھیک ہی کیا تھا۔

ابھی غالب اندر تھا اور ایک شکاری بھی باہر نہیں آیا تھا بلاشبہ وہی رعونت گروپ لیڈر تھا۔ ابھی تک انھوں نے ایک دوسرے کو نام سے مخاطب کرنے کی غلطی نہیں کی تھی اور صرف تین لہجے میں بولنے والا ہی آواز بدل کے بات نہیں کر رہا تھا باقی سب بھی اصل آواز میں گفتگو نہیں کر رہے تھے۔ انھیں اپنی شناخت چھپانے کے لیے مفصل اور واضح ہدایات دی گئی تھیں جن پر وہ پوری طرح عمل پیرا تھے مگر ان کے طرزِ عمل نے بہت سے راز کھول دیے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ اجنبی تھے اور ہم میں سے کسی کو پہچانتے نہیں تھے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا تھا کہ وہ نئے شکاری تھے یا انھیں اس مہم پر بھیجنے والوں نے ایسے افراد کا انتخاب کیا تھا جو پیشہ ور بدمعاش نہیں تھے۔ مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ وہ پکڑے جائیں تو پولیس کے پاس ان کا کوئی ریکارڈ نہ ہو اور وہ کسی کا نام نہ بتا سکیں۔ نہ ولا عدا اینڈ کمپنی کے کسی رکن کا نہ عالم آرا کا... انھیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ انھیں کس نے ہائر کیا تھا۔ اس پارٹی کے شکاری محتاط تھے۔ ان میں سے کوئی شہر کے کسی نئے بدمعاش کے پاس پہنچا ہوگا اور اس کے سامنے ایک خطیر رقم رکھ دی ہوگی کہ سوال جواب کوئی نہیں۔ فلاں جگہ آ کے فلاں لوگوں کو... انھیں جیسے چاہو اٹھا لاؤ اور فلاں جگہ پہنچا دو۔ پہنچا دو تو دو لاکھ یا تین لاکھ اور ملیں گے۔ مر جاؤ گے اور پکڑے

گئے تو تمھاری قسمت۔ تم سے ایک لاکھ کوئی واپس نہیں مانگے گا لیکن بچانے کے لیے بھی کوئی سامنے نہیں آئے گا۔ تم خود بتاتے رہنا کہ تم نے جو کچھ کرنے کا سوچا تھا اس کا مقصد کیا تھا۔ پولیس کے سامنے ذمے دار جس کو ٹھہراؤ گے بے کار ہوگا کیونکہ تم ہمارا نام پتا ٹھکانا کچھ جانتے ہی نہیں اور پولیس یہ عذر قبول نہیں کرتی کہ تم کوئی جرم کسی کے کہنے پر کر رہے تھے خصوصاً ایسی صورت میں جب مجرم فرضی نام ہیں۔ اس نئے بدمعاش کے لیے ایک لاکھ بہت تھے اور یہ اس کے لیے خود کو بڑا بدمعاش ثابت کرنے کا چیلنج تھا۔ حقیقی معنوں میں بڑا بدمعاش بننے کے کیریئر کے آغاز کا پہلا سنہرا موقع... ایک لاکھ کا جوا... ہار گئے تو وہی جیل جو اس کیریئر کی ٹریننگ اکیڈمی ہے اور چھوٹے بدمعاش کو بڑا بدمعاش بننے کے لیے وہاں سے پاس آؤٹ کرنا ہی پڑتا ہے۔ نہ پکڑے گئے تو مزید تین لاکھ کیریئر کا پہلا بڑا منافع بخش سودا جس سے گڈول قائم ہو گی اور مستقبل میں شہرت اور کامیابی کے نئے راستے کھل جائیں گے۔ اس نئے بدمعاش نے چانس سے فائدہ اٹھانے کے لیے یارانِ کہن سے مشاورت کی اور چند حوصلہ مند ساتھیوں کو گروپ بنانے اور اسے گروپ لیڈر تسلیم کرنے کی ضرورت اور افادیت کا قائل کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں ابھی ڈسپلن کا فقدان تھا اور پرانے تجربہ کار لوگوں کی طرح منصوبہ بندی کرنے اور سکون کے ساتھ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی صلاحیت کی کمی تھی۔

یہ سب وہ خیالات تھے جو ان حملہ آوروں کے آنے کے بعد سے اب تک ان کے رویے کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں آئے تھے۔ اس تمام عرصے میں جب میں مصروفِ عمل تھا میرا ذہن اپنے طور پر حقائق کو جمع کرنے اور نتائج اخذ کرنے میں مصروف تھا۔ ٹرک کے نیچے سے نکلتے وقت بھی میں نے مجموعی صورتِ حال کو فراموش نہیں کیا تھا اور احتیاط ہر لمحے ملحوظ رہی تھی جیسا کہ آگے سے نکلنے کے بجائے میں نے پیچھے کا راستہ منتخب کیا تھا۔ آگے میری معلومات کے مطابق ایک ڈرائیور موجود تھا اور میں یہ فرض نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مسلح نہیں ہوگا۔ اگر میں سامنے سے نکلتا تو کیتھرین کی گاڑی سامنے تھی اور میں ایک جست میں اس گاڑی کے پیچھے پہنچ جاتا لیکن یہ ناممکن تھا کہ میں اس گاڑی کو اسٹارٹ کر کے نکل جاتا۔ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ گاڑی تباہ ہو جاتی جس کی طرف ابھی ان کا دھیان نہیں گیا تھا۔

میں پیچھے والے دونوں ٹائروں کے بیچ میں سے نکلا تو اندر سے رابعہ کو لانے والے ٹرک کے دونوں طرف پیچھے جھکے ریوالور نکالے ایک ہی بات کو بار بار دہرا رہے تھے: "تم چھپ کر نہیں رہ سکتے۔ بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ خیریت چاہتے ہو تو باہر آ جاؤ۔" ان باتوں کے ساتھ ساتھ وہ گالیاں

www.paksociety.com

پہنے تھے۔ راجو کو غالباً وہ اندر جھانک چکے تھے۔ میں پیچھے بھی زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ بالآخر ان میں سے کوئی چکر لگاتا ہوا پیچھے بھی آ سکتا تھا۔ وہ فائر کرنے سے گریز کر رہے تھے کیونکہ انھیں گولی کے کسی ٹائر میں لگ جانے کا ڈر تھا۔ نقصان زیادہ بھی ہو سکتا تھا اگر گولی سے ڈیزل یا آئل ٹینک میں سوراخ ہو جاتا یا کسی طرح فیول لائن کٹ جاتی۔

اچانک میری نظر نے لوہے کی اس سیڑھی کو دیکھا جو ٹرک کی باڈی کے پچھلے حصے کے ساتھ بنی ہوئی تھی۔ اس ٹریلر میں اوپر سامان نہیں رکھا جاتا کیونکہ اوپر کی سطح بالکل ہموار تھی اور اس کے کناروں پر کسی قسم کی روک بھی نہیں تھی۔ سیڑھی لگانے کا بظاہر کوئی مقصد نہیں تھا سوائے اس کے کہ کبھی کبھار اوپر سے صفائی مقصود ہو تو چڑھا جا سکے۔ میں نے سیڑھی کو اپنی ہنگامی ضرورت کے لیے تائید ایزدی جانا اور اوپر چڑھ گیا۔ کنٹینر کی چھت زمین سے پندرہ فٹ تو یقیناً اونچی تھی۔ اس کے اوپر چھ فٹ کا آدمی کھڑا ہو کے کیسے چھپا رہ سکتا تھا چنانچہ میں بالکل وسط میں لیٹ گیا اور سرکتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

" وہ پیچھے نہیں ہے... " کسی نے چلا کے کہا۔

" اور کہاں جا سکتا ہے۔ پیچھے ہی ہوگا... آنکھیں کھول کے دیکھو۔"

" میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں... جب وہ بھاگا تھا..." دوسرے نے مشتعل ہو کے گالی دیتے ہوئے کہا۔ " وہ کسی اور طرف نکل گیا اور تجھے پتا نہیں چلا... ابھی اپنے باپ کو جواب دینا۔"

" کیا شور ہے یہ؟" شخص لیڈر والا روبوٹ اندر سے برآمد ہوتے ہوئے بولا۔ "کون نکل گیا؟" باقی نے اس کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے ایک دوسرے پر الزام تراشی کا سلسلہ جاری رکھا۔ جس محافظ کی غفلت نے مجھے فرار کا موقع فراہم کیا تھا وہ زیادہ قصوروار سمجھا جا رہا تھا حالانکہ جس طرح میں جان ہتھیلی پہ رکھ کے کودا تھا اس کو میری بیوقوفی یا خوش قسمتی کچھ بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ اس محافظ کی جگہ کوئی دوسرا یا خود گروپ لیڈر بھی ہوتا تو صورت حال مختلف نہ ہوتی۔ اب الزام کے جواب میں الزام لگا کے وہ سب خود کو بچانے میں لگے ہوئے تھے اور مجھے بھولے ہوئے تھے۔ میں نے آہٹ کیے بغیر آگے کھسک کر کنارے سے سر نکالا اور نیچے جھانکا۔ گروپ لیڈر ان سب کو ایک جیسی گالیاں دے رہا تھا۔ ایک معمولی سے حادثے نے ان کو بدحواس اور پریشان کر رکھا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر غالب اور کیتھرین کا کیا بنا۔ وہ ابھی تک باہر نہیں آئے تھے۔

ان کا ایک ساتھی غالباً مارا جا چکا تھا۔ اس کی چیخ سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ گولی کا نشانہ بن گیا تھا اور گولی یا غالب چلا سکتا تھا یا پھر کیتھرین چلا سکتی تھی۔ دوسری گولی کا نشانہ آخر کون بنا تھا؟ جو دل کے وسوسے کہتے تھے کہ انھی دونوں میں سے ایک اپنی جرأت مندی کا خمیازہ بھگت چکا۔ دوسرا فائر بھی انھی نے کیا ہوتا اور دشمن اس کا نشانہ ہوتا تو مجھے ایک آدمی کم نظر آتا یا زخمی ہوتا دکھائی دیتا۔ اگر وہ دونوں اندر تھے تو کیا ان میں سے ایک مر چکا تھا؟ کون مر چکا تھا؟ کیتھرین نے اچانک اٹھ کر ایک کو نشانہ بنایا تھا اور دوسرے کا نشانہ بن گئی تھی۔ یا غالب ایک کو مار کے باہر آنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ پہلی صورت زیادہ امکانی تھی۔ کیونکہ کیتھرین اتنی دیر تک ساکت و صامت نہیں پڑی رہ سکتی تھی۔ اس سے امید بھی بندھتی تھی کہ غالب محفوظ ہے اور زیادہ ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے سامنے آنے سے گریز کر رہا ہے۔ وہ عین وقت پر نمودار ہو کے ان کے پروگرام کا ملیدہ کر دے گا لیکن اس سے مایوسی کا جو احساس پیدا ہوتا تھا وہ زیادہ دل شکن اور تکلیف دہ تھا۔ کیتھرین کو مرنا نہیں چاہیے۔ اگر وہ مر گئی تو میں بھی مر جاؤں گا۔ ایسے وقت میں جب زندگی سے مایوس ہوں کے بجائے جینے کے اسباب پیدا ہو گئے تھے اور دوست رقیب نے اس کے جینے کی ضرورت پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی... بولی کا بے ساختہ ہو جانا بھی اس کی موت تھا... نہیں... قدرت اس کے ساتھ اتنا سنگین مذاق نہیں کر سکتی۔

"تم سب گدھے ہو۔" گروپ لیڈر نے کہا۔ "وہ بھوت یا چھلاوا نہیں تھا آدمی تھا۔ اب اس بحث سے کیا فائدہ کہ وہ کس کی غلطی سے بھاگا۔ وہ نہیں ہوگا۔ تلاش کرو اسے... دوسری گاڑی میں دیکھو۔ اس گاڑی پہ دیکھو۔ یہ گدھے کھوڑے کیسے کھڑے ہیں یہاں... ڈرائیور کیوں موجود ہے؟"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟" آگے سے آواز آئی اور میں نے پہلی بار ڈرائیور کی موجودگی کا یقین کیا ورنہ اب تک وہ ایک مفروضہ تھا۔

"تم بکواس مت کرو... ہاتھ پیر باندھ رکھے تھے تاکہ دیکھتے؟ موچھوں کو تاؤ دیتے رہو۔" گروپ لیڈر نے کہا۔ آہستہ آہستہ وہ نروس ہونے لگا تھا اور اس کا مصنوعی سیلف کنٹرول ختم ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"خود تم نے ہی کہا تھا کہ تمھارا کام بالکل تیار رہنا ہے تاکہ روانگی میں ایک سیکنڈ کی دیر نہ ہو۔" ڈرائیور خوشی سے بولا۔

"اچھا اس ٹرک کو آگے بڑھا دو۔ وہ پیچھے ہوگا تو مرے گا یا نکلے گا۔"

ابھی تک میں طے نہیں کر پایا تھا کہ میں کس طرح ان بدمعاشوں کی بدمعاشی ختم کروں۔ وہ مسلح تھے اور تعداد میں زیادہ ہونے کے علاوہ چھپے ہوئے تھے۔ اگر وہ ایک جگہ جمع ہوتے تو میں اوپر سے چھلانگ لگا دیتا۔ ایک کو گرنے کے گرتے اور باقی کو سنبھلنے سے پہلے بے دست و پا کر دیتا۔ چند سیکنڈ کی جنگ میں کود کر دشمن کی قوت کو ختم کرنے کا خطرہ مول

لینا تھا لیکن اسی صورت میں کامیابی کے امکانات واضح ہوتے ہوں۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا تو میں نے سوچا کہ اب مجھے اپنی پالیسی تسلیم کرنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ آخر یہ ٹرک کہاں جا رہا ہے۔ جو بات ابھی تک میری عقل میں نہ آ سکی تھی وہ یہی تھی کہ آخر کس عقلمند نے ان لوگوں کو یہ ٹرک استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کی رفتار ایک حد سے زیادہ تیز نہیں بڑھائی جا سکتی تھی۔ اسے تنگ راستوں اور تمام سڑکوں پر سے نہیں گزارا جا سکتا تھا۔ چند سڑکیں ہیوی ٹریفک کے لیے ممنوعہ علاقہ تھیں۔ کچھ ایسے پل بھی تھے جن پر سے ایک مخصوص سائز اور وزن سے زیادہ کی گاڑیاں گزارنا منع تھا۔ اس چلتے پھرتے جہاز کو چھپانا مشکل تھا لیکن اس کا سراغ لگانا اور تعاقب کرنا بہت آسان تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی عام تیز رفتار ٹرک یا ویگن ہوتی تو زیادہ کارآمد ثابت ہوتی۔ یہ صرف آٹھ افراد کی منتقلی کا مسئلہ تھا۔ اس میں وہ لاریاں بھی استعمال کی جا سکتی تھیں۔ پھر یہ کنٹینر کس لیے جس میں سینٹرل جیل کے سارے قیدی ایک ہی پھیرے میں منتقل کیے جا سکتے تھے۔

ٹرک آگے بڑھا تو میں نے اپنی پوزیشن بدلی اور میری نگاہ نے ایک ربڑ کی نلکی دیکھی جو کنٹینر کی سپاٹ چھت میں ایک روشندان نما سوراخ میں سے اندر چلی گئی تھی۔ یہ روشندان اس قسم کا تھا کہ چھت پر پڑنے والی بارش یا دھوپ کا اندر گزر نہ تھا لیکن ہوا کی راہ میں رکاوٹ نہیں تھی۔ اس قسم کے روشندان اور بھی تھے اور ان کا مقصد یہی معلوم ہوتا تھا کہ جب اس ہال جیسے کنٹینر میں مویشی لے جائے جائیں تو انھیں تازہ ہوا ملتی رہے۔ یا فرض محال انسان ہوں تو زندہ رہیں۔

میں نے نلکی کو کھینچنا چاہا مگر وہ چھت کی سطح کے نیچے کہیں مضبوطی سے لگی ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا سرا مجھے ٹرک کے آگے ٹرک کو چلانے والے حصے میں ڈرائیور کیبن کے اوپر تک جاتا نظر آیا۔ کیبن کے اوپر مختصر سا جنگلا لگا ہوا تھا۔ اس پر دو سیکنڈ فاضل ٹائر کے علاوہ بھی کچھ سامان پڑا ہوا تھا۔ نلکی وہیں لیٹے ہوئے ایک سلنڈر سے ملتی تھی۔ یہ بات کچھ عجیب سی تھی میں نے کسی بھی ٹرک، بس یا ویگن پر اس قسم کا کوئی نظام پہلے نہیں دیکھا تھا اور اس کی ضرورت بھی مشکوک تھی۔ سر پر فاضل نظر آنے والا ٹائر بھی اگر گاڑی کے لیے ضروری ہو تو وہ ایسی جگہ نصب نہیں کیا جا سکتا۔ یہ آگ بجھانے والا آلہ بھی نہیں تھا جو ہمیشہ ڈرائیور کی دسترس میں رکھا جاتا ہے۔

سلنڈر کا رنگ بھی زرد اور سرخ تھا اور اس پر سفید رنگ سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے قریب سے دیکھا تو اس پر مجھے سفیدی کے نیچے بھی سیاہی کی جھلک نظر آئی۔ اس پر خطرے کا نشان تھا جس کو سفید پینٹ کے نیچے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی مگر ایک کاسہ سر کے ساتھ دو ہڈیاں کراس کی صورت میں نظر آ جاتی تھیں۔ قدرتی طور پر مجھے خیال آیا کہ اس میں پہلے کوئی زہریلی گیس تھی۔ مگر زہریلی گیس کے سلنڈر کو دوسری بے ضرر گیس کے لیے استعمال کرنے کی وجہ کوئی نہیں ہو سکتی اور ایسی کون سی گیس ہے جو کسی گاڑی میں یوں رکھی جائے۔ اس میں اب بھی وہی زہریلی گیس ہوگی۔ اس خیال نے مجھے پریشان کر دیا۔ اس کا مقصد یہی ہوگا کہ کسی بھی وقت زہریلی گیس کے سلنڈر کو کھولا جائے تو گیس فولادی کنٹینر میں داخل ہونے لگے۔ کوئی بھی گیس جو ہوا سے بھاری ہوگی وہ نلکی کے راستے نیچے اتر جائے گی اور سانس لینے والوں کے پھیپھڑوں میں پہنچ جائے گی اور وہ کنٹینر ایک گیس چیمبر بن جائے گا۔ کسی قسم کی مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا اور زہریلی گیس سونگھنے والے بے ہوش ہو جائیں گے یا مر جائیں گے۔

اس تصور نے ہی مجھے لرزا دیا کہ میرا اور میرے ساتھ پوری ایم آر ایس کا کیا انجام ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک بات قبل از وقت دریافت کر لی تھی۔ اب اس موت کے سامان کو غیر موثر بنانا ضروری تھا۔ پہلے میں نے نلکی کو کھینچ کر سلنڈر سے جدا کرنے کا سوچا لیکن اس طرح تو کبھی سلنڈر کا والو کھولتے ہی اسے فوراً معلوم ہو جاتا کہ ٹیوب الگ ہے اور وہ اسے پھر جوڑ دیتا۔ میں نے آہٹ کیے بغیر اوپر کے سامان میں کوئی ایسی چیز تلاش کی جس سے ربڑ کی نلکی کاٹی جا سکے لیکن وہاں ایسی کوئی بھی چیز نہ تھی۔ میں مایوس ہونے لگا تھا کہ مجھے جنگلے کا کنارا دکھائی دیا۔ ربڑ پائپ کو اس کے اوپر رگڑنے سے کام بننے کی امید تھی۔ میں نے پائپ کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کے جنگلے پہ دبایا اور اس طرح رگڑا کہ کیبن میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور کو حرکت کا ارتعاش بھی محسوس نہ ہو۔ کنڈکٹر نظر آنے والا کنارہ خلاف توقع بہت جلد پائپ کو ادھیڑنے میں کامیاب رہا۔ پائپ کا ربڑ نرم تھا۔ دو منٹ میں ربڑ آدھا کٹ گیا تو میں نے دونوں طرف سے انگلیوں میں دبا کے کھینچا اور پائپ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ میں نے ان کو وہیں ساتھ ہی چھوڑ دیا۔ اب اوپر آ کے سلنڈر کی چابی گھمانے والا ایک نظر میں دیکھ ہی نہیں سکتا تھا کہ گیس لائن درمیان میں سے منقطع ہے۔ گیس فضا میں منتشر ہو جائے گی اور انھیں اس وقت پتا چلے گا جب سلنڈر خالی ہو چکا ہوگا۔

دریں اثنا مجھے ہر طرف تلاش کرنے والے ناکامی کا اعتراف کر چکے تھے۔ تاہم روبوٹ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ میں پلک جھپکنے میں غائب ہو گیا۔

"اندر باہر سب جگہ تم لوگ موجود تھے۔" وہ بولا۔ "تم نے صرف اس کو باہر چھلانگ لگاتے اور ٹرک کے نیچے گھستے دیکھا تھا۔ پیچھے سے وہ نکلا نہیں تو پھر کہاں گیا؟"

"اور یہ ایک بے وقوف نظر آنے والے نے اچانک

وہ بات کہہ دی کہ وہ سب چونک گئے۔ میں فوراً پیچھے نہ ہٹ جاتا تو وہ سب مجھے دیکھ لیتے جن کے سر خود بخود اوپر اٹھ گئے تھے۔

"یہ ٹھیک ہے... اوپر دیکھو۔" روبوٹ بولا۔ "باقی سب خواہ مخواہ گھیرا ڈال لو۔"

اس کی بات نے مجھے فوری کر دیا۔ اب میرے لیے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی پوزیشن تھی۔ لیکن ان میں سے دو تو ٹریلر کے ایک جانب کھڑے ہو گئے۔ روبوٹ دوسری طرف رہا اور چوتھے نے نیچے سے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ میں نے ایک کنارے پر ہو کے ادھر دیکھا جہاں سے ایک مسلح شخص نمودار ہونے والا تھا۔ دوسری نظر نیچے ڈالی جہاں روبوٹ ٹریلر سے تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر قدم جمائے کھڑا تھا اور پھر جسم کو قوس کی صورت جست لگا دی۔

گروپ لیڈر کی نگاہ اوپر ہوتی تو شاید وہ ہٹ جاتا مگر وہ اپنے اوپر جانے والے ساتھی کی طرف متوجہ تھا۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو اتنا وقت بھی نہ رہا تھا کہ وہ سنبھل پاتا یا ریوالور کام میں لاتا۔ میں اس کے ساتھ ہی گرا۔ اس نے چلا کر کسی کو آواز دی اور مجھے دھکیلنا چاہا مگر موت کے روبرو میری تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ مجھے اسی شینی لمحے میں ہونے والے کو زمین بوس کرنے اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے میں تیس سیکنڈ بھی نہیں لگے۔ اس کی آواز نے سب سے پہلے ڈرائیور کو متوجہ کیا تھا مگر وہ خاصی بلندی پر کیبن میں قید تھا۔ یہی پوزیشن اس شخص کی تھی جو اب کنٹینر کی چھت پر نظر ڈال رہا تھا اور سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ اوپر ہوتا تو مجھے براہ راست نشانہ بنا لیتا۔ اسے اور ڈرائیور کو نیچے اترنے میں کچھ وقت لگا۔ اسی وقت دوسری طرف کھڑے ہوئے دو افراد کو گھوم کر آنے میں لگا۔ مگر یہی مختصر ترین مہلت میرے لیے زندگی کی ضمانت بن گئی۔ میں پھر ٹرک کے نیچے گھس گیا جہاں سے پہلا فائر میں نے ڈرائیور پر کیا۔

ڈرائیور اپنی جگہ پر گھوم گیا۔ گولی نے اس کے سینے پر زخم کھول دیا تھا۔ وہ منہ پھاڑ کے چلایا اور نیچے گر گیا لیکن اس کے بعد مجھے مہلت نہ ملی۔ باقی تین نے ٹائروں کے پیچھے رہتے ہوئے اپنے ریوالوروں کا رخ میری طرف کر دیا۔

"باہر نکل آؤ۔ اپنا ریوالور وہیں چھوڑ دو۔" روبوٹ نے کہا۔

"مجھے بہت افسوس ہے کہ میں تم کو شوٹ نہیں کر سکتا ورنہ اب تک اس ریوالور کی ہر گولی تمہارے جسم میں اتر گئی ہوتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمہارے ہاتھوں مرنا قبول کروں گا۔ مگر تم کو نہیں ماروں گا۔"

میں نے مقابلہ بے سود سمجھا۔ کھلی جگہ پر میں ان تینوں سے نمٹ سکتا تھا مگر یہاں مقابلہ آتشیں اسلحے کا تھا اور میں تین طرف سے گھرا ہوا تھا۔ میری مایوسی کی دوسری وجہ غالب اور کیتھرین کا خیال تھا۔ ابھی تک مجھے امید تھی کہ غالب کچھ نہ کچھ کرے گا لیکن آہستہ آہستہ میرا یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ قابل ہی نہیں۔ وہ زخمی پڑا ہے اور خشکی جلتے ہیں کہ وہ خود ہی مر جائے گا۔ شاید اب تک مر چکا ہو گا۔ پھر کیتھرین معذور تھی۔ وہ بھی بہت کچھ کر سکتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کی بنیادی ڈرامہ ہے مگر یہ خیال بھی غلط ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی بہادری کی ساری داستانیں، جرأت مندی اور بے خوفی کے سامنے دعوے اور عزم دھرے کے دھرے رہ گئے تھے اور جرائم والوں جیسے مردوں سے کم نہ ہونے کی باتیں وقت آنے پر بھول ہو گئی تھیں۔ تھی وہ عام عورت بلکہ عام عورت کے مقابلے میں زیادہ کمزور۔ رابعہ نے حواس برقرار رکھے تھے لیکن وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ شاید بعد میں اس سے ریوالور لے لیا گیا ہو گا اور اس کی بے ہوشی کو ابدی نیند میں بدل دیا گیا ہو گا۔ اب میرا ذہن قائل ہو رہا تھا کہ پہلا فائر غالب نے کیا اور اس اجنبی آدمی کو ختم کر دیا جو سب سے زیادہ جارحانہ رویہ رکھتا تھا۔ پھر کسی نے جواب میں گولی چلائی اور غالب کو مار دیا۔ تا نزدیک ہو گئے تھے ایسے دشمنوں کے ایک ساتھی کا مارا جانا ثابت ہوتا تھا۔ دوسرے کنٹینر سے غالب اور کیتھرین میں سے ایک بچ گیا تھا تو یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ ایک گولی چلا کے دشمنوں نے بے ہوش پڑی ہوئی کیتھرین کو ختم کیا تھا اور غالب ابھی تک چھپا بیٹھا تھا۔ میرے کنٹینر میں ایک جگہ ایسی تھی جہاں غالب چھپ سکتا تھا۔ دوسرے کمرے میں قالین کے نیچے ایک گوشے کا فرش دیکھنے میں برابر لگتا تھا لیکن وہاں تختے کو ہٹانے سے وہ خلا نمودار ہو جاتا تھا جس میں سے غالب کے باپ کی تجوری نکالی گئی تھی۔ غالب اگر اس خالی جگہ میں بیٹھ کر تختہ برابر کر لیتا تو اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ ایسا آدمی تو تھا نہیں کہ جان بچانے کے لیے وہاں چھپا ہو۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو اب تک ضرور نکل آتا۔ اس کے لیے دشمنوں کو اندر سے ہی نشانہ بنانے کے بہترین مواقع تھے۔

یہ وہ حوصلہ شکن خیالات تھے جن کی وجہ سے میں وقتی طور پر اپنی شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ یہ کرائے کے لوگ ہیں اور انھوں نے مجھے بھی قتل کر دیا تو باقی لوگوں کو یہ بہرحال لے جائیں گے اور اپنے آقاؤں کے سامنے بیان داغ دیں گے کہ ان میں سے دو بڑے سورما بنتے تھے چنانچہ مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔ باقی حاضر ہیں۔ ان کا اپنا بھی ایک آدمی کم ہو گا تو کسی ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی کہ مقابلہ واقعی ہوا تھا۔ میں [illegible] بہشت کے اصول پر بھی یقین رکھتا تھا اور یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ ایسا میں غالب اور ڈیڈی کے ساتھ میرا ہونا ضروری ہے۔ ایک

ایک گیارہ تو مزید ایک ملانے سے ایک سو گیارہ۔

میں اپنی ترازو سے باہر نکلا اور اس فولادی قید خانے میں پہنچ گیا جس میں محسن اور ڈیڈی کے ساتھ صرف رابعہ پڑی ہوئی تھی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ شعلہ کا گرفتار ہو جانا ایک بہت نیک فال ثابت ہوا۔ اس سے وہ خود اصل قاتل رضوی کے گھر میں محفوظ ہو گئی اور اسی وجہ سے نازو بھی بچ گئی۔ شعلہ پکڑی جاتی تو اس وقت قیدیوں میں تین حضرات کے ساتھ تین خواتین بھی ہوتیں۔ شعلہ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ مار دھاڑ اور اٹھا پٹخ برداشت کر سکتی۔ اسے بھی اگر رابعہ کی طرح پھینکا جاتا تو خطرناک ہوتا اور اسے ناقابل تلافی نقصان بھی ہو سکتا تھا۔ وہ دونوں جانے سے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کو یہ بھی معلوم نہیں ہو گا کہ ہم پہ کیا بیتی اور نہ جانے کب تک وہ ہمارا انتظار کریں گی۔ کوئی پیغام ملے۔ کوئی واپسی کی نوید ہو۔ کہیں سے خیریت کی اطلاع آ جائے۔ وہ کب تک اس نانے بیٹھی رہیں گی؟ آس بڑی سخت جان چیز ہے کہ مصائب اور آلام کے بدترین ہجوم میں، ناامیدی کا کوہ گراں آ پڑے اور سخت ترین آزمائش کی چکی پیس ڈالے تو آس کو کچھ نہیں ہوتا... وہ آخر تک امید کی ایک کرن ساتھ رہتی ہے کہ پھر کوئی آیا اور غم دور۔

"اب کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔" روبوٹ نے کہا۔ "جاؤ اس بڑھیا کو بھی لے آؤ۔ دیکھتے نہیں فائرنگ کی آواز دوسروں نے بھی سن لی ہے۔ کسی نے پولیس کو فون کر دیا تو ہم یہیں دھر لیے جائیں گے۔"

"گاڑی اب کون چلائے گا؟" ایک ماتحت نے کہا جو کافی خوف زدہ محسوس ہوتا تھا۔

"گاڑی کوئی بھی چلا سکتا ہے۔ ان لاشوں کا کیا کرنا ہے؟" دوسرے نے زیادہ پریشانی سے کہا۔

"ظاہر ہے ان کو ہم چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔" گروپ لیڈر بولا۔ "دونوں کو نیچے ڈال دو۔"

ان کی گفتگو نے میری رہی سہی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اگر وہ کیتھرین کو لا رہے تھے تو شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی کہ غالب مارا گیا۔ اور اس خیال نے ہی میرے دل میں خنجر اتار دیا۔ وہ مرد قلندر... یاروں کا یار... باضمیر اور اصول پرست انسان، اعلیٰ ظرف... دنیا سے بے پروا اور بے نیاز۔ راہ و رسم عاشقی سے ... اور دولت جہاں کے مقابل اپنا سمجھنے والا، ناقص لوگوں کی وراثت ترک کر کے آزادی کی جلا وطنی اختیار کرنے والا... پھر ... بھول گیا اور جب ... تو بس ... پھر آرام کیا اور عدم کی راہ لی۔ ان کی گفتگو کا سارا درد میری آنکھوں میں اتر آیا۔ اشک بن کے ٹپکا اور پھر بھی ... پچھلے دو گھنٹے سے وہ خون آلود لاشیں اندر آئیں۔ ... ایک کے سینے سے اور دوسرے کے سر سے لہو اب بھی ٹپک

رہا تھا۔ اب میرے سامنے پانچ بے حس و حرکت جسم پڑے تھے۔ ان میں زندہ اور مردہ کی تفریق صرف میں کر سکتا تھا جو کنٹینر کے پیچھے سے سب کچھ دیکھتے رہنے پر مجبور تھا۔ ایک لاش محسن پہ یوں گری تھی کہ اس کا آدھا اوپر کا دھڑ محسن کی ٹانگوں پر تھا چنانچہ اس کے سینے سے نکلنے والا خون محسن کو بھی تر کرنے لگا تھا۔ دوسری لاش رابعہ کے پاس گری تھی اور اس کا خون رابعہ کے دامن تک پہنچ رہا تھا۔ وہ سب آڑھے ترچھے پڑے ہوئے تھے۔ دوست اور دشمن سب ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔

جب کیتھرین کو اندر پھینکا گیا تو وہ بھی محسن کے اوپر والی لاش پہ گری۔ محسن ایک مردہ اور ایک زندہ جسم کے بار سے دب گیا۔ مردہ جسم دشمن کا تھا اور زندہ دوست کا لیکن یہ سب میرے لیے احساس کی تفریق تھی۔ وہ خود ان سب خیالوں سے بیگانہ تھے۔ امید اب بھی میرا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ ایک امید یہ تھی کہ شاید آس پاس پڑوس کے لوگوں میں سے کوئی فون کر چکا ہو اور پولیس آ جائے۔ بے شک پولیس بھی ہماری دوست نہیں تھی اور ہم ایک کی قید سے رہائی پاتے تو دوسرے کی قید میں پہنچ جاتے لیکن ترجیح کے اعتبار سے دیکھا جاتا تو پولیس کی قید آسان اور بہتر تھی۔ پولیس کے جال سے نکلنے کی امید کی جا سکتی تھی مگر ان سے نہیں جو ہمیں لے جا رہے تھے۔ ایک امید یہ بھی تھی کہ شاید اب بھی غالب آ جائے... مگر غالب کہاں کہ آ جاتا۔ یہ لاش بے کفن اسد بن ختر جان کی ہے۔

دروازہ دھڑ سے بند ہوا تو کنٹینر کے اندر اندھیرا چھا گیا جس میں کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ انھوں نے باہر سے لوہے کی سلاخ کو پلٹ کیا اور تالے ڈال دیے۔ میں آوازیں سنتا رہا اور تصور کی مدد سے سب دیکھتا رہا۔ چند منٹ بعد ٹرک کا انجن گرجا اور ٹریلر آہستہ سے آگے بڑھا۔ باہر سے آنے والی دوسری آوازیں معدوم ہو گئیں۔

"سکندر...." میں نے کیتھرین کی آواز سنی۔

میں اچھل پڑا۔ "تم... آہ کیتھرین... تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں بس... مجھے کچھ نہیں ہوا۔" وہ آہستہ سے بولی اور میں نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے پر محسوس کیا۔ "ریوالور ہے؟"

"ہاں۔ مجھے شرم آتی ہے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ میں ٹھیک ہوں مگر میں تمہاری طرف سے بہت متفکر تھا۔" میں نے کہا۔

"میں بے ہوش نہیں تھی۔ میں انتظار کر رہی تھی کہ موقع ملے... مگر کیا کرتی... وہ میرے سر پر کھڑے تھے۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک کو مار سکتی تھی۔ پھر وہ مجھے مار دیتے اور میرا ریوالور چھین لیتے۔" وہ بولی۔

"کیا مطلب؟" ریوالور اب بھی تمہارے پاس ہے؟"

www.paksociety.com

سے کہا۔

"ہاں... انھوں نے تھا سی وجہ سے مجھے نظرانداز کیا... اور اہمیت نہیں دی کہ عورت ہے اور اتنی بزدل عورت کے پاس کیا ہوگا۔" وہ بولی۔

"ان کا ایک آدمی تو مارا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "جس کی لاش یہاں پڑی ہوئی ہے۔ اسے تم نے نہیں مارا تھا تو غالب نے ہوگا۔"

"غالب؟ کیا وہ یہاں نہیں ہے؟" کیتھرین حیران ہو کے بولی۔

"نہیں... وہ اندر ہی تھا۔ دوسرے کمرے میں چھپ گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" کیتھرین نے کہا۔

"تم نے وہ فائر تو سنے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... سنے تھے۔" کیتھرین بولی۔

"کس نے چلائی تھیں وہ گولیاں؟" میں نے کہا۔

"مجھے کیا معلوم... میں نے دیکھا نہیں... صرف سُنا تھا۔ میں نے باہر سے بھی فائرنگ کی آواز سُنی تھی۔" وہ بولی۔ "کیا تم فائرنگ نہیں کر رہے تھے؟"

"میں نے بھی فائرنگ کی تھی... لیکن اندر نہیں... اندر ان کے آدمی کو کسی نے تو مارا ہوگا۔ محسن اور ٹیڈی تو پہلے ہی ناک آؤٹ ہو گئے تھے... اس کے بعد کسی نے جواب میں گولی چلائی تھی۔" میں نے کہا۔

"میں کیا بتاؤں... اصل بات یہی ہے کہ میں نے کچھ دیکھا نہیں تھا۔"

"بہرحال... مجھے یقین ہے کہ غالب مارا جا چکا ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ نو..." اس نے اندھیرے میں اپنے سینے پر انگلی سے صلیب بنائی۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے لگی تھیں۔

"تم وہ ریوالور مجھے دے دو۔" میں نے کہا۔

"نہیں... میرے پاس شاید بچ جائے۔" وہ بولی۔

"میری تلاشی لی جا چکی ہے... تمھاری اب لی جائے گی۔" میں نے کہا۔

"کہاں لی جائے گی؟" وہ ریوالور چھپاتے ہوئے بولی۔

"جہاں بھی ہمیں لے جایا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو ہم سفر میں ہیں۔ دیکھو، ٹرک کب اور کہاں رکتا ہے؟"

"یہ کون لوگ ہیں سکندر؟ دلاور کے شکاری؟" وہ بولی۔

"غالباً یقین کے ساتھ تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔ "مگر اور کون ہو سکتا ہے... خدا کا شکر ہے تارو اور شعلہ بچ گئے... لیکن آنٹی... اب جولی کا کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ وہ مر جائے گی۔" وہ کھوئے لہجے میں بولی۔

"ایسا مت کہو... اسے زندہ رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"بہت کچھ ہونا چاہیے ینگ مین... لیکن وہ سب نہیں ہوتا۔" کیتھرین نے کہا۔ "میں کوئی فلاسفر نہیں ہوں مگر زندگی کے تجربات کا فلسفہ میں نے پڑھا ہے۔ میری زندگی ہوائی جہاز کا آرام دہ شاہانہ سفر نہیں تھی جس میں انسان ہوا پہ تیرتا جاتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے کوئی خواب دیکھتا ہے یا آنکھیں کھول کر اوپر کے آسمان یا نیچے بادلوں کے خوب صورت رنگ دیکھتا ہے اور منزل آجاتی ہے۔ نہیں... یہ سمندروں کا سفر تھا۔ طوفانی لہروں، غضب ناک ہواؤں اور خطرناک چٹانوں کے ساتھ جاری رہنے والی جدوجہد کا سفر۔ میں نے زندگی اور موت کی آنکھ مچولی میں بارہا موت کے اجل کو رگِ جاں سے بھی قریب تر پایا اور پھر میرے خدا کے ہاتھ نے مجھے بچالیا۔ جولی بھی ایسی ہی جدوجہد کر رہی ہے۔ وہ بچانے والا ہاتھ اس کے ساتھ بھی ہے۔ اب میں یہ سوچنے لگی ہوں کہ ایسی حالت میں وہ آج تک کیوں زندہ رہی۔ خدا کو اسے زندہ رکھنا منظور تھا۔ ایک وقت تھا جب میں اس کی موت کے خیال سے بہت ڈرتی تھی۔ سوچتی تھی کہ وہ مر گئی تو میں بھی مر جاؤں گی۔ اس کا غم اور اس کی تکلیف میرے لیے بہت عذاب تھے مگر آہستہ آہستہ میں نے یہ عذاب برداشت کرنا سیکھا۔ میں سمجھتی تھی کہ جولی کو میرے سہارے کی ضرورت ہے۔ میری موجودگی اور میرا قرب اسے حوصلہ دیتا ہے۔ میری باتوں سے اس کو امید ملتی ہے۔ پھر میں نے جینے کی خواہش کو طاقت دی۔ بڑا امید افزا آنے کی جدوجہد شروع کی تاکہ میں جولی کے لیے وہ سب کچھ کرسکوں جو میں کرنا چاہتی تھی اور کر سکتی تھی۔ میں نے ایک حقیقت کو تسلیم کرلیا کہ میری کوشش اور ڈاکٹروں کی جدوجہد جولی کو زندہ رکھنے کی ایک خواہش کا نام ہے۔ ورنہ خدا کو نامنظور ہو تو میرے چاہنے اور ڈاکٹروں کے چاہنے سے کیا ہوگا... کچھ بھی نہیں۔ اور اگر اس کی زندگی باقی ہوگی تو خود بخود سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دوا اثر کرے گی، جسم ساتھ دے گا اور کوئی معجزہ بھی رونما ہو جائے گا۔ معجزہ کیا ہے۔ کوئی بھی ایسی بات جو آدمی کے وہم و گمان میں نہ آسکتی ہو۔ جب تم لوگ ملے تو میں نے فوراً اسے ایک معجزہ تسلیم کرلیا۔ میں ہر امید کو سہارا بنا لیتی ہوں۔ امید غلط ہو جائے تو دل سخت ہوتا جاتا ہے۔ میں بھی بہت پہلے جولی کی طرف سے دل کو پتھر کر چکی ہوں کہ وہ زندہ نہیں رہے گی۔ میں ہر روز کہتی تھی کہ وہ آج مر جائے گی۔ پھر وہ دن گزر جاتا تھا لیکن میرے ہر گزرنے والا دن بڑا امید ہو جاتا تھا۔ میں نے ذہنی طور پر اس حقیقت سے سمجھوتا کرلیا ہے کہ جولی کا مر جانا غیر متوقع نہیں، اس کا زندہ رہنا غیر متوقع ہوگا۔ وہ پھر مجھے مل گئی تو یہ خدا...

"...تو تمھارا بڑا خصوصی عنایت ہوگی۔" وہ یکلخت چُپ ہوگئی۔

"پھر بھی حسن رضوی بہت اچھے آدمی ہیں۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اگر تمھیں جولی کے پاس لے جایا جا سکے گا تو وہ ضرور لے جائیں گے۔ اس کے علاوہ وہ تارو بھی ہے۔ غالب نے بھی اپنے کچھ بیٹے دوستوں سے کہا تھا۔ تمھارے لیے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"کیا تم ٹریس کر رہے ہو کہ ہم کدھر جارہے ہیں؟" وہ بولی۔

"میں نے کوشش کی تھی۔ پہلے دائیں طرف... پھر دائیں طرف... اس کے بعد بائیں جانب... پھر دائیں طرف... اب ذہن میں سب غلط ملط ہو گیا ہے۔ کچھ یاد نہیں۔ اس کے علاوہ صرف موڑ سے کیا پتا چلتا ہے۔ ایک سڑک پہ دائیں جانب دس موڑ آسکتے ہیں۔"

"میں نے ایک ایسی ہی صورت حال کسی فلم میں دیکھی تھی۔ وہ گنتی گئی۔ ہیرو گھڑی دیکھتا رہتا ہے کہ کتنے منٹ بعد موڑ کس طرف آیا تھا۔ اس نے رفتار کا اندازہ کرلیا۔"

"میرے دماغ میں کوئی اسپیڈومیٹر نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "مزید یہ کہ میں ہیرو نہیں ہوں اور یہ فلم نہیں ہے۔"

"تم بہت افسردہ اور دل شکستہ ہو..."

"میں غالب کی موت کے خیال سے افسردہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "جوان آدمی میرے سفر کے چکر میں نہ جانے کس کس نے جان دی۔ سب میرے خیرخواہ تھے اور اسی لیے جان سے بھی گئے لیکن ایسا بے غرض دوست ان میں کوئی نہ تھا۔ وہ شاید کبھی اپنے لیے جیا ہی نہیں۔ اس کی زندگی ایک مشن رہی۔ صحافت کا پیشہ بھی اس نے اپنے مشن کی خاطر اختیار کیا تھا۔ اس نے کس مقصد کے لیے جان دی، کون جان سکے گا۔ اسے کوئی تمغہ، کوئی میڈل اور کوئی ایوارڈ کبھی نہیں دیا جائے گا۔ ان ہزاروں گمنام مجاہدوں کی طرح جو وطن کی آبرو پہ قربان ہوگئے۔ اس کو تو رونے والا بھی کوئی نہیں۔"

کیتھرین خاموش رہی۔ میں بھی چپ رہا۔ ٹرک ایک ہی رفتار سے چلتا رہا۔ اس کی مسلسل گھوں گھوں ایک نوحہ ماتم بن گئی اور چشمِ تصور سے میں نے وہ گھر دیکھا جہاں غالب اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ اس گھر کا وارث تھا مگر پولیس شاید اسے لاوارث قرار دے گی کہ... مرنے والے کی شناخت نہ ہو اور ایک صحافی کی موت کا چرچا ہی نہ ہو۔

ٹرک کی رفتار کم ہونے لگی تو میں نے کیتھرین سے کہا۔ "غالباً ہماری منزل آرہی ہے۔"

"ہیلو اشپ... کیا اس کے بعد بھی سفر جاری رہے گا؟ تم کو کیا معلوم؟" وہ بولی۔

"ہم اس باکس میں تو نہیں رہیں گے نا۔" میں نے کہا۔ "یہاں سے نکلنے کے بعد منتقل کیے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "یا یہ ٹرک بھی آگے جائے گا اور ہم بھی۔ ایسے ٹرک کراچی تک یا بیرون ملک سامان لے جاتے ہیں۔ بحری جہازوں پہ لوڈ کر دیے جاتے ہیں۔"

"سمندر پار... اوہ نو... میں جولی کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی۔"

"تم نے ابھی کہا تھا کہ بہت کچھ ہونا چاہیے مگر وہ سب ہوتا نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم نے سفر کی بات کی تھی تو میں نے سمجھا تھا کہ سفر زندگی کی آخری منزل تک جاری رہتا ہے۔"

ٹرک رک گیا اور کیتھرین فوراً اسی طرح بیٹھ گئی جیسے پہلے لیٹی ہوئی تھی۔ باتوں میں مجھے بھی اس سلنڈر کا خیال نہیں رہا تھا جس کے پائپ کو میں نے کاٹ دیا تھا۔ کیا انھوں نے گیس کھولی ہوگی؟ میرے اندازے کے مطابق ہم نے تیس منٹ سے آدھے گھنٹے کے درمیان سفر کیا تھا۔ اگر انھیں استعمال نہ کرنا ہوتا تو وہ زہریلی گیس کو اندر پہنچانے کا اہتمام ہی کیوں کرتے۔ اس کے بعد کب موقع آنے گا اور ممکن ہے وہ زہریلی گیس صرف اس لیے ہو کہ ہم سب بے ہوش ہو جائیں۔ ٹرک کو بڑی سڑکوں پہ سے گزرنا تھا۔ اگر ہم ہوش میں رہتے تو اندر سے چادر ہٹا کے راہ چلتے لوگوں کو متوجہ کر لیتے۔ یہ بات میرے دل کو لگی کہ وہ صرف ہمیں خاموش رکھنا چاہتے تھے۔ مارنا مقصود ہوتا تو وہیں مار دیتے، زندہ یہاں کیوں لاتے۔ میں نے باہر سے دروازے کے بولٹ کے جانے اور لاک میں سے نکلنے کی آواز سنی۔ اس کا شور کنٹینر کے اندر بہت زیادہ سنائی دیا اور میں نے بھی لیٹ جانے کا فیصلہ کیا۔

میرا فیصلہ کسی یقین کی بنیاد پہ تھا لیکن سوچنے اور کسی منطقی نتیجے پہ پہنچنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ اگر میں نے غلط کیا تھا تو غلطی کا نتیجہ بھی سامنے آجائے گا۔ غلط یہ بھی ہوسکتا تھا کہ بے ہوش نہیں بیٹھا ہوا تھا اور ایک غلطی مجھے بہرحال کرنا تھی۔ ایسے وقت پھر تو انگشت ہی پڑتا ہے۔

دروازہ بڑی آواز کے ساتھ گرا اور میں نے آنکھیں کھول کر پھر بند کرلیں۔ باہر اندھیرا تھا اور... روشنی... میرے کان آوازیں سننے کے لیے منتظر تھے لیکن ابھی تک وہی آوازیں تھیں جو میں نے اس سفر کے آغاز میں سنی تھیں اور ان کے قدموں کی چاپ تھی۔ پھر خاموشی کا مختصر وقفہ آیا۔ یکلخت سب چپ ہوگئے تھے۔ دو منٹ بعد کوئی اندر آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرے لوگ بھی آئے۔ میں نے اپنی پوزیشن ایسی رکھی تھی کہ میں سر یا گردن گھمائے بغیر ایک آنکھ کھول کر بھی آنے جانے والوں کو دیکھ سکوں۔ چنانچہ میں نے چوہدری دلاور کو سب سے پہلے دیکھا۔ اس کے پیچھے دو ہی چار افراد تھے جو میں نے کہا آنے تھے... گروپ لیڈر دلاور کے ساتھ ساتھ ٹارچ لے کر چل رہا تھا۔

"آخر باقی لوگ کہاں ہیں؟" دلاور کی آواز میں ناگواری تھی۔

"یہیں ہیں سب جی۔ مجھے..."

www.paksociety.com

"میں نے کیا بتایا تھا تمہیں؟" دلاور بولا۔
"آپ نے تو سات کہے تھے چوہدری صاحب۔ چار مرد اور تین عورتیں مگر..."
"مگر تم لائے ہو تین مرد اور دو عورتوں کو... یہی میں پوچھ رہا ہوں کہ باقی دو کہاں ہیں؟" دلاور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"وہاں جتنے تھے سب کو میں لے آیا ہوں۔ کسی کو چھوڑ کر آنے میں کیا ملتا مجھے؟" گروپ لیڈر نے کہا۔ "میں نے تو پوری کوشش کی تھی کہ سب کو زندہ لے آؤں۔"
"مگر وہ مارے گئے...؟"
"میرے دو آدمی مارے گئے۔ اس لیے کہ میں ان کو روک نہ پایا۔" وہ اونچے شیخی لہجے سے دوسرا دلاور لگتا تھا اور بعض اوقات گمان گزرتا تھا کہ وہ دلاور کی نقل اتار رہا ہے مگر یہ اس کا اپنا انداز نہ ہوتا تو دلاور کے سامنے وہ اصل لہجے میں بات کرتا۔ یہ بات دلاور بھی جانتا ہوگا چنانچہ وہ لہجے کا برا نہیں منا رہا تھا۔
"مجھے ان کے مرنے کا یقیناً افسوس ہے لیکن تم نے معاہدہ پورا نہیں کیا۔" دلاور بولا۔ "تم کو سات آدمی لانے تھے۔"
"وہاں پانچ ہی آدمی تھے تو میں کیا کرتا چوہدری صاحب؟"
"تمہارا مطلب ہے میں نے تم کو غلط اطلاع دی تھی۔" دلاور کا موڈ خراب ہونے لگا۔ "جھوٹ بولا تھا تم سے؟"
"میں نے ایسا کب کہا ہے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے وہاں سات ہی ہوں گے۔ چار مرد اور تین عورتیں۔" وہ بولا۔ "لیکن ایک مرد اور ایک عورت کہیں چلے گئے تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ ان کا نام محسن اور شعلہ تھا۔ اور ان کے ساتھیوں نے کہا کہ وہ ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر لطیف کے پاس مگر عورت کہتی تھی کہ نہیں وہ کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئے ہوں گے..."

"دیکھو لڑکے... کیا نام ہے تمہارا... پتنگا۔"
"آپ جانتے ہیں کہ میرا نام پروانہ ہے... استاد پروانہ۔" گروپ لیڈر نے مشتعل ہو کے کہا کیونکہ اس کے کسی ساتھی نے ہنسنے کی کوشش کی تھی۔
"ہاں بھئی پروانہ... وہ ایک ہی چیز ہوتی ہے پتنگا اور پروانہ۔" دلاور نے اسی لہجے میں کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تمہارا اصل نام کیا ہے۔ بلکہ یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہاری اصلیت کیا ہے۔ اور کس کے استاد ہو لیکن تم شاید نہیں جانتے کہ میرا نام کیا ہے۔ بعض اوقات نام سے کچھ بھی پتا نہیں چلتا۔ کچھ لوگ نام کی بلندی سے استاد بنتے ہیں اور بلندی وہ خود کرتے ہیں۔ کچھ لوگ گمنام رہتے ہیں مگر وہ استادوں کے استاد ہوتے ہیں۔ یقیناً تمہارے نام کا ڈنکا کہیں بج رہا ہوگا اور میرا نام بہت کم لوگوں نے سنا ہوگا۔ لیکن تم اپنی غلط فہمی دور کر لو تو اچھا ہے کہ تم میرے ساتھ برابر ہو۔"
"میں سمجھا نہیں کہ آپ کیوں بگڑ رہے ہیں؟" پروانہ بولا۔
"جب میں نے تم کو بلایا تھا مسٹر پروانہ۔" دلاور نے اپنے مخصوص کاٹ دار رکھنے والے سرد و سفاک لہجے میں کہا۔ "تو میں نے تمہارے آبا و اجداد کا شجرۂ نسب تک معلوم کر لیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا باپ کون تھا۔ تمہارا گھر کہاں ہے۔ تم کس کس کو رقم بھیجتے ہو۔ گھر میں کتنے بھائی بہن رہتے ہیں۔ کتنی بہنوں کی شادی ہوئی اور کس کے ساتھ ہوئی۔ کتنی شادی کے قابل ہیں۔ پھر یہ کہ باہر تم نے کیا کارنامے سرانجام دیے اور کس کس کے شاگرد رہے۔ استاد کے مرتبے پر فائز ہونے سے پہلے۔"
"آپ کو یہ مجھے مرعوب کر کے کیا فائدہ ہوگا۔" پروانہ نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "یا مجھے میرے ساتھیوں کے سامنے بے عزت کر کے کیا ملے گا جو میں جانتا ہوں کہ آپ کچھ نہیں جانتے۔"
"استاد محترم! آپ کے والد پہلے شاہ عالمی کے ایک تنور پہ کام کرتے تھے۔" دلاور بولا۔ "سات سال روٹیاں لگاتے رہے اور پھر ایک دن خود تنور میں گر گئے۔ کہا گیا کہ ان کو گرمی سے چکر آ گیا تھا مگر یہ دوسرا چکر تھا۔ بعد میں تم پیدا ہوئے۔ جب تنور کے مالک نے تمہاری ماں سے شادی کر لی۔ تمہاری ایک بہن کا سونگھنے منڈی کے ایک ڈرائیور کی بیوی ہے۔ دو گھر میں بیٹھی جوان ہو رہی ہیں۔"
"بکواس بند کرو اپنی..." پروانہ چیخ کر بولا۔
"میاں پروانہ صاحب! جامے سے باہر ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" دلاور نے ہنس کر کہا جس کے سامنے استاد پروانہ واقعی طفل مکتب تھا۔ "تم نے کہا تھا کہ میں کچھ نہیں جانتا تو میں بتا رہا ہوں کہ مجھے کیا کچھ معلوم ہے۔ اگر غلط کہا ہو تو کہو۔ تمہارے بارے میں تمہاری پرائیویٹ لائف کے بارے میں کچھ اور بھی جانتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ تم دماداد جیالہ کی اولاد ہو۔ تو اپنا ریکارڈ درست کر لو۔ اب تمہارا استادی شاگردی کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ تم مختلف لوگوں کے ساتھ رہے۔ چار مرتبہ جیل میں۔ وہاں سے نکلے تو شاہدرہ میں ترقی کی۔ ایک زمانے میں تم استاد پیدو کے لونڈے تھے۔ تم کو یاد ہے؟" جس انداز سے اس نے استاد پروانہ کو پیدو کا لونڈا کہا تھا وہ انتہائی تحقیر و تذلیل کا انداز تھا اور ممکن تھا کہ پروانہ کسی اور جگہ چوہدری دلاور پہ حملہ کر دیتا مگر یہاں وہ خود کو مجبور سمجھتا تھا۔
"استاد پیدو مر گیا..." پروانہ نے اپنے غصے کا رخ پیدو کی طرف موڑ دیا اور اسے ایک بہت بڑی گالی دی۔
"ابھی تم ان سے ملو گے تو یہ بات ان سے خود ہی کہہ دینا۔ میرے سامنے بھی نہیں چلے گی۔" دلاور ہنسا۔ "استاد پیدو نے تمہارا انتخاب کیا تھا اور تمہارا تاریخ جغرافیہ بتایا تھا۔ تم کو پتا ضروری ہے کہ بات ڈبی دو میرا ایک کتا ہے۔ جیکر اشارے سے پر جھپٹنے والا دم ہلانے والا۔ بھونکنے والا اور کاٹنے والا... اور پہ بہت سے کتے پال رکھے ہیں میں نے جن کے سامنے تم اب پلے ہو۔ اس لیے اپنی ہوشیاری اپنے پاس رکھو۔"
دلاور زبردست ڈرامے باز تھا اور مکالموں کی ادائیگی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ میرا اس سے بارہا سابقہ پڑ چکا تھا۔ چنانچہ میں جانتا تھا کہ وہ صرف زبان سے ہی نہیں اپنی شخصیت سے اور بعض اوقات ڈرامائی صورت حال پیدا کر کے کس طرح اپنے حریف پہ چھا جاتا ہے۔ اس کے ذہن کو گمراہ یا مفلوج کر دیتا ہے یا سوچ کے غلط راستے پہ ڈال دیتا ہے اور پھر اپنے مقصد میں کامیابی کے امکانات کو یقینی بنا لیتا ہے۔ استاد پروانہ کیا چیز تھا کہ متاثر نہ ہوتا۔
"میں نے کون سی غلط بات کہی ہے چوہدری صاحب!" پروانہ بولا لیکن اب اس کا لہجہ جارحانہ نہیں معذرت خواہانہ ہو گیا تھا۔
"کون سی بات صحیح کہی ہے تم نے؟" دلاور نے ایک دم گرج کے کہا۔ "پیدو لے کی اولاد میں خاک کر دوں گا تمہیں... کون سے میاں بیوی کی بات کر رہے تھے تم؟"
"میں نے نام بتایا ہے ان کا... محسن اور شعلہ۔"
"الو کے پٹھے... یہ ہے تمہارا والد ثانی محسن۔" دلاور دھاڑا۔ "اس کی بیوی کہاں ہے؟ اور یہ تم کسے اٹھا لائے ہو؟ اپنی نانی کو... کون ہے یہ عورت؟"
"چوہدری صاحب! میں کسی کو پہچانتا نہیں تھا اور آپ نے مجھے کسی کا فوٹو دکھایا تھا اور نہ نام بتایا تھا۔" پروانہ نے احتجاج کیا۔
"میں یہ بات تم کو نہیں بتا سکتا تھا... اس لیے کہ تم احمق ہو... اصل افراد تمہارے سامنے تین کم ہیں۔ دو عورتیں اور ایک مرد۔ ایک تو وہی عورت ہے جو محسن کی بیوی ہے... شعلہ۔" دلاور گرجا۔
"نام تو میں نے ٹھیک ہی بتایا تھا آپ کو... اور یہ مجھے ان کا سے معلوم ہوا تھا۔" پروانہ بولا۔
"کیا ضرورت تھی کسی سے اس کا نام یا کام پوچھنے کی؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ فضول باتیں بالکل نہ کرنا... جتنے آدمی جا رہے ہو سب کی زبان کو لگام دے کے رکھو اور ان سے کہو کہ اپنا کام کریں۔ یہ کام کیا ہے تم نے؟ سات میں سے چار کو لائے ہو... باقی کو چھوڑ آئے ہو یا اپنے پیچھے لگا لائے ہو؟"
"ہمارے پیچھے کوئی نہیں آیا۔"
"تمہیں کیا معلوم کہ تمہارا واسطہ تم جیسے نام کے استادوں سے نہیں تھا۔ یہ آدمی نہیں بھوت ہیں۔ تمہیں کیا پتا مجھے تو نظر نہیں آتے مگر آ جاتے ہیں سر پہ۔ جو رہ گئے ہیں وہ مزید پیچھا چھوڑیں گے اور نہ تمہارا۔ میری تو کوئی بات نہیں۔ مجھے ان سے نمٹنا آتا ہے تم اپنی خیر مناؤ۔" دلاور نے کہا اور اس کی دلاسے سن کر میں خوش ہوا۔ اس نے ہمیں جن بھوت کہا تھا۔ کیڑے مکوڑے نہیں کہا تھا۔ شیخی نہیں بگھاری تھی کہ وہ ہمیں حشرات الارض کی طرح مسل دے گا۔ یہ تسلیم کیا تھا کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ دلاور جیسے شخص سے اتنی عزت و احترام حاصل کرنا ایک دن کا کام نہیں تھا۔ اس کی رائے بدلنے میں بہت وقت لگا تھا۔ جان اور مال کا بڑا زیاں ہوا تھا اور پُر خطر آزمائش کے ہزار جان لیوا مرحلے سر کرنے پڑے تھے۔
"آپ ہماری فکر مت کریں جی۔ ہم بھی دیکھ لیں گے وہ کتنے بڑے جن بھوت ہیں۔ بڑے بڑے عمل سیکھے ہیں ہم نے بھی جن اتارنے کے۔" پروانہ ابھی چھوٹا بدمعاش بلکہ شہدا تھا چنانچہ اس کی اکڑ فوں زیادہ تھی۔ انگریزی محاورے کے مطابق خالی برتن زیادہ شور کرتے ہیں۔ ایسا ہی پروانہ کر رہا تھا ورنہ اس کا مقصود نہیں تھا کہ آپ بھی فارغ کر دیں۔
"تم فارغ ہو گئے... جاؤ۔" دلاور جھنجھلا کے بولا۔
"جا تو... میرا مطلب ہے جانا تو ہے۔" پروانہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔
"تم شاید معاوضے کے انتظار میں ہو برخوردار... مجھے یہ سمجھاؤ کہ میں تم کو کام کا معاوضہ دوں یا کام بگاڑنے پر تم سے جرمانہ وصول کروں۔ سات میں سے تم چار بندے لائے ہو... جو پانچواں میری طرف سے تحفہ رکھ لو... یہ میرے کام کی نہیں۔" دلاور نے یقیناً کیتھرین کی طرف اشارہ کیا ہوگا۔
"چوہدری صاحب! آپ نے پچاس ہزار فی کس کہا تھا۔" پروانہ نے غصے کو قابو میں رکھتے ہوئے ضبط سے کام لیا۔ "چار آدمی تو آ گئے نا... ان کے دو لاکھ نکالیں... اور یہ جو دو مر گئے..."
"اللہ ان کی مغفرت کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔" دلاور نے کہا۔ "تجہیز و تکفین کے لیے کچھ چاہیے تو لے لو۔"
"آپ حد سے بڑھ رہے ہیں چوہدری صاحب... میرے دو آدمی جان سے گئے ہیں۔" پروانہ مشتعل ہونے لگا۔
"یہ تو میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کوئی مارا گیا یا پکڑا گیا تو رسک صرف تمہارا ہے۔" دلاور نے بے رخی سے کہا۔ "تم آٹھ نہیں آٹھ سو کی نفری لے کر جاتے۔ ان میں سے صرف تم بچ کر آتے تب بھی یہی کہتا... جو یہ کام کرتے ہیں وہ مرتے بھی ہیں مرنے سے ڈرتے تو ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھتے باہر نہ نکلتے... بہرحال میں انہی کی وجہ سے دو لاکھ دوں گا... لیکن تمہیں نہیں دوں گا۔ ان کے گھر والوں کو ایک ایک لاکھ پہنچ جائیں گے۔"

www.paksociety.com

بیٹوں کی جوانی کی قیمت۔"

"وہ لاکھ میں لوں گا چوہدری صاحب... بیچارا آدمی میں لایا ہوں۔" یہ معاملہ طے کر لیا۔ "معاہدہ میں نے کیا تھا۔"

"تمہارا معاہدہ ابھی پورا نہیں ہوا استاد... باقی دو آدمی بھی لے آؤ اور یہ مال تو اٹھا لے جاؤ۔" دلاور نے سنجیدگی سے بولا۔ "معاہدے میں جو وقت دیا گیا تھا وہ ایک گھنٹے بعد ختم ہو جائے گا۔"

"مجھے نام پتا بتاؤ وہ کون لوگ ہیں۔" پروانہ اب آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"ہاں یہ نام نوٹ کرو..." دلاور بولا۔ "ایک ہے مرزا غالب وہ صحافی ہے اور اس کا پتا کوئی نہیں، وہ جس اخبار میں تھا وہاں سے اس کو برطرف کیا جا چکا ہے۔ تاہم وہ گھر اسی کا تھا جہاں تم کو بھیجا گیا تھا۔ اس کا باپ بہت مشہور ڈاکٹر تھا جو یہ کوٹھی اس کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ دوسرا نام ہے شہلا کا جو تمہیں ملے گی ایس ایس پی خاص رضوی کے گھر میں۔ میری تازہ ترین اطلاعات یہی ہیں... تمہارے لیے ایس ایس پی کے گھر میں گھس کر اسے اٹھا لانا کیا مشکل ہے۔ آخر ایسے ہی تو استاد پروانہ نہیں کہلاتے۔ تیسرا نام ہے ایک لڑکی نازلی کا جو نانرو کہلاتی ہے... ایک سابق سب انسپکٹر پولیس اکرام شیخ کی بہن ہے اس کا باپ ریٹائرڈ سول جج تھا۔ لڑکی تم سب کو دو منٹ میں لنگڑا لولا اپاہج اور معذور کر سکتی ہے۔ اس کے سامنے بھول کر بھی خالی ہاتھ جانے کی غلطی مت کرنا ورنہ سب کے جسم ہمیشہ کے لیے بیکار ہو جائیں گے تمام عمر کوئی چیز صحیح کام نہیں کرے گی... میرا مشورہ یاد رکھنا۔"

"یہ تم اب بتا رہے ہو مجھے... تمہاری..." پروانہ نے غضبناک لہجے میں ایک گالی دے کر کہا۔ "پیسہ ہضم کرنا چاہتے ہو ہمارا... بے ایمان کتے... میں تم کو چھوڑوں گا نہیں... سور کے بچے..."

"اوئے پروانے..." تب باہر سے استاد پیڈرو کی آواز آئی۔ "چل باہر... بہت دیر ہو رہی ہے... اور تم سب بھی آ جاؤ... میں تم سب کو انعام دیتا ہوں۔ ایسا کہ دو سکے یاد رکھیں گے۔"

"دو سکے... دو سکے کون؟" پروانہ ہکلایا۔

"تمہیں رونے والے... اور کون..." پیڈرو ہنسا۔ "اور وہ جو کل تمہارے جنازے میں شریک ہوں گے۔"

اس کے بعد بہت ہنگامہ ہوا۔ ایک وقت گالی گلوچ کا شور اٹھا اور مار پیٹ بھی ہوئی مگر ایک گولی نے سب ختم کر دیا۔ میں نے بالکل غیر ارادی طور پر آنکھ کھول کے دیکھا تو استاد پروانہ تڑپ رہا تھا۔ وہ جتنا بڑا بدمعاش بن سکتا تھا بن چکا تھا۔ اپنی دانست میں استاد مگر در حقیقت ایک غلط راستے پر چلنے والا نوجوان جس نے بڑے بدمعاش دیکھے ہی نہیں تھے۔

وہ لاوا ہے جس نے پہاڑ دیکھا ہو اور گرد کی مخلوق کو وہ بھی سمجھتا رہتا ہے کہ اس سے بڑا کوئی نہیں۔ دلاور نے اس سے ایک کام لیا تھا معلوم نہیں کتنا پیسہ دکھایا تھا اور پروانہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ یہ اس کی زندگی کی قیمت ہے۔ دلاور نے اس سے پہلے نہ جانے کس کس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اسی طرح استعمال کیا جیسے وہ کاغذ کے نوٹ یا ریوالور کی گولی استعمال کرتا تھا۔ دونوں صرف ہونے والی چیزوں کی طرح پروانے جیسے لوگ بھی اس کے لیے قابل صرف اشیا سے زیادہ اہم نہیں تھے۔

پروانے کے انجام نے باقی سب کو گھٹنے ٹیک کر ہاتھ جوڑنے، زمین پر ناک رگڑ کر رحم کی بھیک مانگنے اور زندگی کی خیرات کے لیے گڑگڑانے پر مجبور کر دیا تھا مگر زندگی کا یہ سبق انھوں نے بہت دیر سے سیکھا تھا۔ شیر کی خون آشامی کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی آدم خور شیر کے سامنے چلا جائے تو یہ تجربہ بہت مہنگا اور بہت بے مصرف محسوس ہوتا ہے مگر اس وقت جب وہ شیر کی جان لیوا گرفت میں آ جاتا ہے اور کسی کو نہیں بتا سکتا کہ یہ تجربہ کیسا رہا۔ چوہدری دلاور نے کچھ سرپھروں کو پیسے کے جال میں گرفتار کر کے موت کے مشن پہ روانہ کیا تھا اور جو مر گئے تھے وہ اچھے رہے تھے کہ رسوا نہ ہوئے۔ مجبور ہو گئے اور انھوں نے صرف موت کا عذاب جھیلا۔ موت ان کا بھی تھا... خود کو کامیاب و کامران جان کر فتح مندانہ تسلی دیتے رہے۔ وہ خود اپنی نظر میں رسوا ہوئے اور ذلت کا عذاب انھوں نے جھیلا، پشیمانی اور بے بسی کے احساس اور اپنی احمقانہ جدوجہد کے رائیگاں جانے کا صدمہ الگ برداشت کیا اور پھر پہنچے وہیں جہاں کا تیر تھا۔ ان جیسے پہلے بھی نہ جانے کتنے مر کر ان کو رونے والے بھی پچھتاتے ہیں کہ کاش وہ ہم سب کی طرح جیتا تو مر کے جی لیتا۔

جب یہ شور و غوغا ختم ہوا۔ جلاد انھیں لے گئے جن کو سزائے موت دی گئی تھی اور وہاں تین زندہ اور تین مردہ مرد اور دو عورتیں پڑی رہ گئیں تو دلاور نے کہا۔ "ان سب لاشوں کا... اور باقی سب کا بھی انتظام تم خود کر لو گے۔"

پیڈرو نے کہا۔ "وہ میں کر لوں گا مگر باقی کا کیا بنے گا؟"

"ان کا بعد میں سوچیں گے۔" دلاور بولا۔ "ان سب کو اندر لے آؤ۔"

مجھے اسی طرح پڑے پڑے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہونے والا تھا۔ مجھے کیتھرین کے بارے میں تو علم تھا کہ وہ میری صدا سب سن رہی ہے اور شاید دیکھ بھی رہی ہو مگر نادرہ کی طرف سے میں پریشان تھا کہ کہیں ہوش میں آ کے کوئی غلط حرکت نہ کر بیٹھے۔ اپنے ذہنی انتشار اور اعصابی بحران سے نکلے۔

ہوا تھا۔ محسن اور شیلا کی کے بارے میں مجھے شک تھا کہ وہ ابھی تک بے ہوش نہیں رہ سکتے۔ غالباً وہ بھی مکر کیے ہوئے تھے۔ پندرہ منٹ بعد مجھے اٹھا لیا گیا۔ مجھے اٹھانے والا وہی شخص تھا جس نے مجھے کندھے پر ڈال لیا۔ میرا سر اور بازو پیچھے تھے اور ٹانگیں آگے تھیں۔ اس وقت بھی میں ایسی پوزیشن میں تھا کہ اس شخص کو ختم کر دوں لیکن میں پروانے کا انجام دیکھ چکا تھا۔ اس کے ساتھی بھی پیڈرو و جلاد کے سپرد کیے گئے تھے اور وہ مسلح ہونے کے باوجود دم نہ مار سکے تھے۔ یہ مطلب بھی تھا کہ وہ سب خود کو دشمن کے قلعے میں بے بس محسوس کرتے تھے جہاں ان کی جنگ باہر ہوتی تو وہ بھی مرنے پر تیار ہو جاتے۔ ان حالات کے پیش نظر میری کوئی بہادری کا مظاہرہ قبل از وقت خودکشی کے مترادف ہوتا۔ اس سے بہتر یہی تھا کہ انتظار کروں اور دیکھوں کہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

میں نے آنکھیں کھول کے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو مجھے کسی گودام قسم کا شیڈ نظر آیا۔ شبہ تو مجھے پہلے بھی تھا کہ یہ جگہ [illegible] واقعی اہم ٹیلیویژن کی کیبلیں ہو سکتی ہے۔ دلاور کی موجودگی [illegible] اس شبہے کو تقویت ملی تھی۔ جو شخص مجھے لے جا رہا تھا وہ بھی اپنی [illegible] سے کوئی [illegible] قد و قامت سے قابل رشک صحت کا مالک نظر آتا تھا۔

اس نے مجھے بیرک کی لمبائی کے رخ والی دیوار سے متصل فرش پہ پھینک دیا۔ اس مختصر مسافت کو طے کرتے ہوئے مجھے بیرک کا ایک سامنے کا تفصیلی جائزہ لینے کا موقع ملا۔ بیرک کی چوڑائی اتنی تھی کہ اس میں آگے پیچھے یا ساتھ ساتھ [illegible] دو بھی ٹریلر کھڑے کیے جا سکتے تھے۔ چھت [illegible] اونچائی سے [illegible] بیرک میں [illegible] چھت سے [illegible] بیرک میں اور [illegible] سوائے چند لکڑی کے بڑے بڑے بکسوں کے جو دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔

جس کمرے میں مجھے پہنچایا گیا وہ کچھ آفس قسم کا تھا۔ مجھے [illegible] پر ڈال دیا گیا۔ میں بے حس و حرکت پڑا رہا اور [illegible] کھولنے کی حماقت بھی نہیں کی۔ یہاں تیز روشنی تھی [illegible] یقین تھا کہ یہاں جلاد ضرور ہوگا۔ اس کی پوری [illegible] سب [illegible] ہوں گے۔ [illegible] ہو گئی۔

"یہ سب لوگ ابھی تک بے ہوش کیوں ہیں؟" دلاور نے کہا۔
"[illegible] کھولی تھی؟" پیڈرو بولا۔
"[illegible] کا اثر ہی ہوگا۔" کسی نے جواب دیا۔
"[illegible] کا اثر بھی اتنی دیر میں ختم ہو جانا چاہیے۔" دلاور نے کہا۔ "تم ڈاکٹر کو بلاؤ۔"

"فون کروں جی؟"

"خود جاؤ گاڑی لے کر۔" دلاور نے بدمزگی سے کہا مگر یہ سب اس خبیث کی اداکاری تھی۔ اچانک اس نے میری گردن پر جلتی ہوئی سگریٹ لگا دی۔ میں اچھل پڑا اور قدرتی طور پر میرا ہاتھ گردن کی طرف گیا۔ یہ جسم کا طبعی رد عمل یا ریفلیکس ایکشن تھا۔ اس نے مجھے تاثر یہ دیا تھا کہ وہ مجھے بے ہوش تسلیم کر چکا ہے اور ڈاکٹر کو بلانے کی بات کرتے کرتے وہ دبے پاؤں میرے پاس آ گیا تھا۔ اس نے میری بے ہوشی کو ٹیسٹ کرنے کے لیے ٹھیک چال چلی تھی۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔

"معاف کرنا ہے سکندر صاحب۔" وہ مسکرایا۔ "ہم بھی تو آپ کے مقابلے میں ان پڑھ اور بے وقوف۔ لیکن تھوڑا سا زندگی کا تجربہ حاصل ہوا ہے۔ وہ بھی آپ کی جوتیوں کے طفیل... آپ کی خدمت کر کے..."

"تمہیں تو اب بولنا بھی آ گیا ہے۔" میں نے حقیقت کو چھپا کے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ابھی کہاں جی... ابھی تو صرف سیکھنے لگے ہیں۔" وہ ذومعنی الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے بولا۔ "ہم بولیں گے تو آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔" اس نے مجھ سے بات کرتے کرتے اچانک جھک کر وہی سگریٹ محسن خان کی گردن پہ چھوا دی۔ نتیجہ میری توقع کے مطابق نکلا۔ اس نے کان پر ہاتھ مارا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" وہ چلا کے بولا اور پھر اٹھ بیٹھا۔ اس نے میری طرف اور دلاور کی طرف دیکھا اور شیلا کو ہلانے لگا۔ "تم بھی اٹھ جاؤ صاحبہ۔"

"ورنہ یوں اٹھائے جاؤ گے جیسے مردے اٹھائے جاتے ہیں۔" دلاور بولا۔

ایک ایک کر کے سب کھڑے ہو گئے جو ابھی تک اپنی بے ہوشی کو ایک ڈھکوسلے میں چھپائے ہوئے تھے۔ ان میں نادرہ بھی تھی۔ وہ خوفزدہ ضرور تھی مگر ہسٹریا کا شکار نہیں تھی۔ ہم سب ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ ہمارے پیچھے سپاٹ دیوار تھی جو تقریباً پندرہ فٹ لمبی تھی۔ اس کمرے کی چوڑائی دس فٹ ہوگی۔ اس کی چھت [illegible] آٹھ فٹ اونچی تھی۔ ائیر کنڈیشنر کی موجودگی [illegible] کے لیے دیواروں پر بھی [illegible] خوب صورتی سے لگائی گئی تھی اور اس پر بہت عمدہ وارنش تھا۔ دیواروں پر چھت سے فرش تک پہنچنے والے پردے تھے چنانچہ کسی دیوار میں کوئی کھڑکی تھی تو نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے مقابل ایک میز تھی جس کے پیچھے ایک گھومنے والی کرسی رکھی ہوئی تھی۔

دلاور ہم سے چند قدم کے فاصلے پر اپنے پیچھے

www.paksociety.com

کھڑا ہوا بڑی عیاری سے مسکرا رہا تھا۔ اس کے پیچھے کمرے کے دونوں کونوں میں دو آدمی اسٹین گن لیے کھڑے تھے۔ تیسرا جانے کے قریب دروازے میں موجود تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ان کے مقابلے میں میرا ریوالور کس حد تک کارآمد ہوگا۔

"ہر بات کی ایک انتہا ہوتی ہے سکندر۔" ولاور نے کہا۔

"ہاں۔ ظلم اور ناانصافی بھی ایک انتہا کو پہنچ کے خود اپنی سزا بن جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے... یا تم کہہ سکتے ہو کہ تقدیر نے۔" وہ میری بات کو ان سنی کر گیا۔ "تم کو متعدد مواقع فراہم کیے۔ جب تم اپنی یہ احمقانہ جنگ ختم کر سکتے تھے۔ تم اسے احمقانہ تسلیم نہیں کرو گے۔ یہ میرا خیال ہے اور تم اس سے اتفاق کرو یا نہ کرو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم اس کو معرکۂ حق و باطل کہو یا اصولوں کی جنگ کہو یا وطن کے لیے جہاد۔ حقیقت وہی رہتی ہے کہ تم نے کچھ پایا نہیں۔ جو کچھ تمہارا تھا وہ بھی تم نے ٹھکرا دیا اور اس کے علاوہ دوسروں کا بھی بہت نقصان کیا۔ اس میں شک نہیں کہ تم لوگوں کو متاثر کرنے کا فن جانتے ہو۔ جیسا کہ تم کو کچھ لوگوں کی اس حد تک حمایت حاصل رہی کہ وہ تمہارے لیے ہر قسم کی قربانی دیتے رہے۔ جوانی میں جذبات ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے سیلاب کے دھارے کی طرح۔ اس کا جدھر رخ موڑ دیا جائے ادھر بہنے لگتا ہے۔ وہ چار لڑکے اور دو چار لڑکیاں... یہ ہے تمہاری کل طاقت جس کو تم نے ایم آر ایس کا مضحکہ خیز نام دے رکھا ہے۔"

"تمہاری انٹیلی جنس سروس کی فراہم کردہ معلومات قابلِ تعریف ہیں۔" میں نے کہا۔

"ڈھول کا پول تو کھل ہی جاتا ہے ایک دن۔" ولاور نے گھوم کر چلتے ہوئے اور کرسی پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم نے کچھ عرصہ مجھے دھوکے میں مبتلا رکھا اور یہ ظاہر کرتے رہے کہ میں کامیاب بھی ہے کہ جیسے کاروبار کی اصل حقیقت کا تمہیں علم نہیں ہے۔ میری حد تک یہ دھوکا چل سکتا تھا لیکن سائیں بابا پارٹی والے کے مزار کو موضع کرماں والی پہنچ کے تم حد سے بڑھ گئے۔ کیا تم اب بھی انکار کرو گے کہ تم نے اس جگہ کو تباہ کیا ہے؟"

"نہیں..." میں نے سوچے سمجھے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "یہ کوئی قابلِ شرم بات نہیں، کوئی اخلاقی یا قانونی جرم نہیں اور کوئی گناہ نہیں کہ میں اس کا اعتراف تم جیسے شیطان کے سامنے کرتے ہوئے ڈروں۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے اس فریب کے اڈے کو میں نے ختم کیا تھا۔ انہی چند سر پھرے ساتھیوں کی مدد سے جو ایم آر ایس کے نام کو مضحکہ خیز تسلیم کرتے ہیں۔ اپنی خیر کا تقدس سمجھتے ہیں۔ اپنی زندگی سے بھی زیادہ۔"

"میری گزارش ہے سکندر اعظم صاحب۔" ولاور نے طنزیہ تمسخر والے انداز میں تین بار تالی بجا کے کہا۔ "افسوس ہے کہ یہ ڈائیلاگ حب الوطنی پہ بنی ہوئی کسی فلم میں ادا کرو تو ... نہیں کیے ورنہ لوگ بہت تالیاں پیٹتے۔ خصوصاً ... لوگ۔ سیوک رام اور اس کی بیوی کو اور کرنل جگجیت ناتھ کو ... قتل کیا تھا؟"

"ہاں۔ اور مجھے اس کارنامے پر فخر ہے۔" ... باقی سب اس لیے چپ کھڑے ہیں کہ ان کے جذبات کی ترجمانی میں کر رہا تھا۔

"کیا تم سمجھتے تھے کہ چند افراد ایک حکومت کی ... تباہ کر سکتے ہیں؟ تم اتنے کم عقل تو نہیں تھے۔ تم سب..." بولا۔ "بس مجھ سے دشمنی میں اپنے ساتھ میرا نقصان کرنے کے ... فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ تم نے سمجھ لیا کہ ایک ملک ... اور فوجی قوت کے اعتبار سے اس ملک سے پانچ گنا ... تم پانچ آدمی اور ڈھائی عورتیں ٹکر لے سکتے ہو... سوچو ذرا ... شیخ چلی کی کہانی ہے۔ انڈین آرمی... کی تعداد اور طاقت ... کے وسائل اور ان کی تنظیم... طاقت اور وسعت کا چند افراد ... کیا مقابلہ جن کے پاس اپنا پستول تک نہ ہو۔ جو راہ چلتے ... سے کاریں چھین کر کام چلاتے ہوں اور ادھر ادھر سے ... کر اسلحہ حاصل کرتے ہوں... یہ چور اچکوں کی چھوٹی فوج کہاں... انڈین آرمی کہاں۔"

"چوہدری ولاور! تاریخ کا سبق کچھ اور بھی ہے..." ... تنگ آکے کہا۔ "یہ دنیا صرف طاقت رکھنے والوں نے ... ہے۔ آج جو کچھ ہے تعلیم اور تہذیب کی ترقی۔ علم کی روشنی ... سائنس کا ارتقا... یہ سب ان کی بدولت ہے جو جسمانی طور پر کمزور لوگ تھے۔ وہ نہ جنرل تھے نہ پہلوان اور نہ ... کراٹے کے ماہر اور نہ شہزور۔ حضرت عیسیٰ کو مصلوب کرنے ... کتنے زیادہ اور کتنے طاقتور تھے۔ امام حسینؓ کے مقابل یزید ... لشکر تھا مگر کیا وہ جیت گئے اور آج فتح مند کون ہے؟ سقراط ... زہر کا پیالہ پینے والے اور گلیلیو پہ کفر کے فتوے صادر کرنے ... کیوں کامران نہ ہوسکے اس لیے کہ عیسیٰ یا محمدؐ، سقراط ... گلیلیو کسی فرد کا نہیں ایک سچائی کا نام تھا اور سچائی ناقابلِ ... رہتی ہے خواہ سچ بولنے والے کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں ... کے ریگزاروں سے اٹھنے والی ایک آواز آج دنیا کے ... میں پھیلے ہوئے ایک ارب انسانوں کی آواز ہے۔ اس آواز ... والے ہزار یا دس ہزار تھے، ایک لاکھ تھے، ان کو بھی بہت گھمنڈ تھا اپنی طاقت کا۔"

"تمہارے ساتھ یہی ایک خرابی ہے۔" ولاور ... گیا۔ "کہ تم سے آج کی بات کی جائے تو تم گزرے ہوئے کل کی ... پڑھانے لگتے ہو یا آنے والے کل سے ڈرانے لگتے ہو ... بات کرتا ہوں تو تم آخرت کی۔ میں تم کو بتانا چاہتا

... ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ سب باتیں ... معلوم ہو گئیں، ورنہ میں خود تم کو تھوڑا تھوڑا کر کے قتل ... آہستہ آہستہ مارتا۔ نہ جانے کیوں پہلے میں تم کو ڈھیل دیتا رہا۔ ... کے ساتھ تھوڑی سی زیادتی ہو گئی تھی جس کی وجہ ... نے تمہاری جوانی پہ رحم کھایا۔ کسی حد تک تمہارا ... کی تلافی کی کوشش بھی کی تو تمہارے جذبات کے ... کو سرد کرنے کی بھی۔ اس کا خمیازہ میرے ساتھ دوسروں ... بھگتنا۔ تم نے کرماں والی کے واقعے سے بارہ نام ہم چوری ... لیے۔"

"چوری نہیں کیے... چھینے..." میں نے کہا۔

"ان میں سے چار کو تم نے مجھ پر اور میرے دوستوں پہ استعمال ..." وہ بولا۔

"تم کو ہماری شرافت کا قائل ہو جانا چاہیے کہ ہم نے اس ... ایس پی سراج کی والدہ کو، حشمت نعمان کی فیملی کو اور ... گھر کو بخش دیا۔ کیونکہ ہم جنگ میں عورتوں، بچوں کو مارنے ... نہیں تھے۔ تم نے جو کچھ راحیلہ اور شہلا کے ساتھ کیا اس ... تمہیں شرم آتی ہے؟"

"ٹھیک ہے... تم فرشتے ہو اور میں شیطان ہوں۔" وہ ... اس ملک کے قانون کے تحت ہی اتنے جرائم کیے ہیں ... دس بار پھانسی ہو سکتی ہے مگر اب تمہاری سزا کا فیصلہ ... نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے جو اس ملک کے قانون کے ... مجھ سے کہا گیا تھا کہ تم سب کو زندہ سلامت ان کے ... کر دوں۔ وہ تم سے سیوک رام اور کرنل جگجیت ناتھ کے علاوہ ... دوسرے ساتھیوں کے خون کا حساب لیں گے اور یہ بھی ... تمہارے ساتھی اور مددگار کون ہیں۔ وہ دیکھیں گے ... ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ تم نے میری انٹیلی جنس سروس ... معلومات کی تعریف کی تھی یہ سب میں نے نہیں ... نے خود معلوم کیا اور مجھے بتایا۔ کیا یہی وہ بڑھیا تھی جو ... کے گھر میں بھیس بدل کے ملازم رہی تھی؟" اس نے ... کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔" میں نے کہا مگر اسی وقت کیتھرین نے اقرار ... ولاور مسکرایا۔ "ایک وقت ہاں اور نہیں؟ خیر ... وہ خود چلا لیں گے۔ میں تو تم کو یہ بتانا چاہتا ... انھوں نے بہت دلچسپی سے دیکھا... ... وہاں ہانگ کانگ بھیجے تھے۔ اس ... جانباز صحافی تھا جو ابھی غائب ہے مگر کب ... لے گا۔"

... غائب ہونے کی بری خبر ملی تھی اس کے ... خوشخبری تھی۔ میرا دل ایک دم خوشی سے لبریز ہو گیا اور میں نے ان آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکا جو میری دلی مسرت کا مظہر بن کے آنکھوں سے رواں ہونے پر بضد تھے۔ اس وقت میرے رونے کو میری خوشی کی انتہا کون مانتا۔ اسے میری بزدلی اور کم ہمتی سے تعبیر کیا جاتا۔

"انھوں نے بعد میں سب کچھ دریافت کر لیا۔" ولاور بتاتا رہا۔ "ان کے پاس ہانگ کانگ ... تھے۔ تمہارے فرانسیسی ... سے انھوں نے تمہارا سراغ لگا لیا۔ پھر وکٹر فیل کے گھر میں سے سب کچھ برآمد کر لیا۔ بس یہ بڑھیا وہاں سے نکل گئی تھی... وہ ایک سسٹم کے مطابق کام کرتے ہیں۔ ان کی تربیت اور ان کا تجربہ اسی فیلڈ میں ہے۔ غالب بھی آ رہا ہوگا۔ شہلا کو انھوں نے چھوڑ دیا ہے کیونکہ عملاً وہ تم لوگوں کی تخریبی سرگرمیوں میں تمہارے ساتھ نہیں رہی تھی اور وہ ہے بھی بالکل بے ضرر لڑکی... راحیلہ بھی ماں باپ کے گھر میں محفوظ رہے گی۔ اس کے بھائی نے یقین دلا دیا ہے کہ اسے گھر میں زنجیروں سے باندھ کے رکھنا پڑا تو رکھا جائے گا... باقی سب لوگوں کو بہت جلد آگے روانہ کر دیا جائے گا۔"

ولاور کی باتوں نے مجھے صورت حال کی سنگینی کا احساس دلایا۔ وہ جھوٹ بولنے اور اسے سچ بنا کے پیش کرنے کا ماہر تھا لیکن اس وقت جو کچھ اس نے کہا غلط نہیں لگتا تھا۔ وہ خود بھی کچھ پریشان سا تھا۔ غالباً اس کو اپنا کارندہ بنانے والوں نے اس کی نااہلی کے باعث ہونے والے نقصانات پر اظہارِ تشویش کیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ فوری طور پر ان کو مطمئن نہ کیا گیا تو اس کا کاروبار ہی نہیں خود اس کا وجود اور اس کے خاندان کا اور ساتھیوں کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ اسے اندازہ تھا کہ ہمیں گرفتار کر کے دشمنوں کے حوالے کرنے سے وہ محفوظ ہو سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ دیکھو آپ کے مجرم، اب آپ ان کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں۔

ولاور کے اشارے پہ ہم سب کو باری باری باہر لے جایا گیا۔ کمرے کے مخالف کونوں میں دونوں مسلح افراد اسٹین گن لیے موجود تھے اور ان کی نظر ایک پل کے لیے بھی ہم پر سے نہیں ہٹی تھی بلکہ میں نے تو ان کو پلک جھپکاتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل مستعد اور بے حد مستعد تھے۔ اسٹین گن کی موت اگلنے والی نال کا رخ ایک ہی جگہ رہا تھا اور ان کی انگلی کو ٹریگر پہ دیکھ کر یہ شدت سے محسوس ہوتی تھی کہ کہیں وہ اس اعصابی کشیدگی کے باعث غیر ارادی طور پہ دباؤ نہ بڑھا دیں اور اس سے پہلے کہ ان کو غلطی کا احساس ہو ہم میں سے کسی کا جسم چھلنی ہو جائے۔ ان کو واضح حکم تھا کہ کوئی بھی خطرے کی بات دیکھیں یا ہم سے کوئی خطرہ محسوس کریں تو فائر کھول دیں۔ ان کے عزائم کا اظہار ان کے چہروں کی بے حسی اور ان کی آنکھوں کی سفاک چمک سے ہوتا تھا... وہ

www.paksociety.com

بھی مجھے انسان سے زیادہ مشینی روبوٹ لگے جو اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی قوتِ فیصلہ اور قوتِ عمل ریموٹ کنٹرول کے ذریعے جلادوں کے اختیار میں تھی۔ جلاد ذرا ایک اشارہ کرتا اور وہ حرکت میں آجاتے۔ مشین گن رکھ دیتے۔ بیٹھ جاتے۔ لیٹ جاتے یا کھڑے ہو کر مشین گن اٹھا لیتے اور یہ دیکھے بغیر کہ سامنے دیوار ہے یا انہی جیسے آدمی قطار میں کھڑے ہیں وہ گولیوں کی بوچھاڑ کر دیتے۔ یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے ہم میں سے کسی نے بھی بھاگ نکلنے کی بالکل بے وقوفی نہیں کی۔

جب میری باری آئی تو میں نے کسی بہادر جنگی قیدی کی طرح مارچ شروع کیا۔ ایک شخص میرے پیچھے تھا اور دو کچھ فاصلے سے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ ویسے تو یہاں ہر آدمی دشمن جانی تھا اور مجھے قاتل ہوڈ میں نظر آتا تھا لیکن اس بار ان قاتلوں کے انداز میں ملٹری ڈسپلن کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ جلاد بننے والے یقیناً احمقوں کا ایک گروہ تھے جو اپنی تعداد اور طاقت کے بل پر ہمیں گرفتار کر لائے تھے لیکن بہت بڑی قیمت دے کر۔ ان میں نظم و ضبط کا فقدان تھا اور وہ کسی منصوبے کی پیش بندی کیے بغیر آ پہنچے تھے۔ خود جلاد ذرا احتیاط پسند اور ہوشیار آدمی تھا مگر وہ بھی کام لیتا تھا پیدا نہیں کرتا تھا۔ یہ تجربہ اس اعتبار سے جدا تھا کہ جلاد ان پر حکم نہیں چلا رہا تھا۔ وہ جلاد کے سامنے اس کے غلاموں کی طرح باادب با ملاحظہ ہوشیار نہیں کھڑے تھے اور بظاہر صرف اپنے فرض میں مصروف تھے۔ انھیں کسی سے سروکار نہیں تھا کہ وہ کون ہے کیا کہہ رہا ہے یا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ ان کو حکم تھا کہ جو لوگ وہاں لائے جائیں انھیں کہیں نہ جانے دیں۔ حتی الامکان زندہ اور اسیر رکھیں۔ یہ ناممکن ہو جائے تو شوٹ کر دیں لیکن فرار نہ ہونے دیں۔ ورنہ یہ ان کا جرم سمجھا جائے گا۔

یہی وجہ تھی کہ جو کمرے میں موجود تھے وہ ایک لفظ نہیں بولے تھے۔ وہ اب بھی خاموش تھے اور ایک تو مشین گن کے ساتھ میرے ہر قدم کو شمار کرتا پیچھے آرہا تھا لیکن دائیں بائیں چلنے والے فرشتے خالی ہاتھ تھے۔ ان کے ساتھ چند قدم چل کے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی جلادوں کے آدمی نہیں تھے۔ وہ پیشہ ور قسم کے کمانڈوز تھے جو خالی ہاتھوں سے لڑنے کا فن جانتے تھے۔ مجھے ان کے ہاتھوں کی ساخت اور مخصوص حرکات سے اندازہ ہو گیا کہ اگر میں نے سیدھا بھاگنے کی کوشش کی تو وہ جوڈو یا کراٹے کا کون سا داؤ آزمائیں گے۔ کسی ایک پر حملہ کیا تو کیا کریں گے۔ تھا باڑی کمائی تو ان کا رد عمل کیا ہوگا اور پیچھے والے محافظ ... کے اس سے مشتعل ہو کر ... کوشش کی تو وہ میری کوشش کو کیسے ناکام بنائیں گے۔ میں خود بھی اس طرح کو......

چنانچہ اپنے ذہن سے سوچنے کے باوجود میرا اندازہ

غلط نکلا کیونکہ انھیں پہلے سے بتا دیا گیا تھا کہ قیدیوں میں ... مرد اور ایک عورت مومن ہیں۔ جو اس سے تو بچے تیغ بھی ... بیٹا بھی۔

دوبارہ میرک سے گزرتے ہوئے میں نے ... یہ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کا حصہ ہے۔ کوئی ... میں نے اس فیکٹری کو پوری طرح نہیں دیکھا تھا جس کو ... والد نے رکھی تھی جس کو میرے والد نے ورکشاپ سے ... بنانے میں دن رات ایک کر دیے تھے اور جو قانونی طور پر ... بھی ملکیت تھی۔ اس کا کچھ حصہ میں نے بہت پہلے دیکھا تھا ... یہ ہو سکتا تھا کہ اندر سے عمارت میں تبدیلی کر دی گئی ہو لیکن میرک کا فور زدہ میں باہر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی ... جی ٹی روڈ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا اور اس سڑک پر چوبیس گھنٹے ٹریفک رواں رہتی تھی جس کا شور صاف سنائی دیتا ... باہر کا سناٹا اب مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔

چلتے چلتے میں نے دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے ... باکس کو غور سے دیکھا۔ یہ سب پانچ فٹ اونچے اور چوڑے ... تھے جو بڑی صفائی سے موٹے تختے جوڑ کر بنائے گئے تھے۔ کہیں تو ڑ آتا تھا اور ان کے کناروں پر اینگل آئرن تھا جس سے کناروں کے ٹوٹنے یا جدا ہونے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا ... طرح رندہ پھیرنے کے بعد لکڑی پالش کی گئی تھی اور چمک ... یہ باکس کس طرف سے کھلتے تھے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔

دائیں جانب چلنے والا اچانک رک گیا۔ دوسرا ... والے نے ہاتھ اٹھا کے میرے سامنے ایک پھوٹا سا دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ رک جاؤ۔ میں رک گیا۔ دائیں طرف چلنے والے نے ایک باکس کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اسے آنکھیں نکال کے دیکھا۔ "کیا مطلب ہے؟"

"آخر تمہارا ..."

اس نے ہاتھ سے زیادہ واضح اشارہ دیا کہ مجھے اندر ہو جانا چاہیے۔

"میں اس... ڈبے میں گھس جاؤں؟" میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "کیا مر گیا ہوں ... اور تم سمجھتے ہو ..." لیکن میری بات کے ختم ہونے سے پہلے ہی وہ دونوں حرکت میں آگئے۔ ان کو اندازہ تھا کہ میں بطور غیرت اور حمیت خوشی کبھی ایسے حکم کی تعمیل نہیں کروں گا۔ ایک سیکنڈ بعد میں اندر تھا ... سر سامنے والے تختے سے ٹکرایا اور اندر گویا کسی ... سنبھل کر اٹھنے سے پہلے وہ تختہ برابر ہو گیا جو ایک طرف پڑا تھا لیکن میں نے اسے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے تختہ برابر کیا۔ اس کے کناروں پر اینگل آئرن رکھے اور ... کسنے لگے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ باکس ... تھا

تھے اور ... آرائیں کے باقی ... امکان انھی تابوتوں میں بند ... سے یہیں گزر کے آیا تھا۔ سب ڈبوں کی ساخت ... اس کی ایک سائیڈ کا کھلا حصہ قبضوں کی مدد سے ... تھا اور جو حصہ کھولنے پر نیچے گر کر فرش سے مل جاتا تھا ... اسے بند کرنے کے لیے پانچ فٹ لمبا اینگل آئرن کام آتا ... باقی تین کناروں پر اینگل آئرن پہلے سے نصب ... بنانے کو ملانے والا اینگل آئرن دوسرے کنارے ... آئرن کے ساتھ ویلڈ کر دیا گیا تھا۔ صرف اوپر کی ایک ... تھی جس کا اینگل آئرن پیچ کھولنے سے جدا ہو جاتا ... دروازے کی طرح کھل جاتی تھی۔

یہ بڑا مضبوط اور کثیف جو انتظام تھا۔ میرے ساتھ ... تو ہوتے ہی سب کٹ گئے تھے۔ ان کو خود بات کرنے ... ہمت ہوئی ... لہجے سے یہ اندازہ بھی نہ کر سکوں کہ وہ کس ... کس خطے کے رہنے والے ہیں۔ وہ پاکستانی بہرحال نہیں ... ان کو مدراس، حیدرآباد دکن یا جنوبی ہندوستان کے ... کا رہنے والا فرض کر سکتا تھا۔ وہ اپنی تربیت اور ... اصولوں پر سختی سے عمل کر رہے تھے۔ ایک منٹ میں انھوں ... اینگل آئرن میں اسکرو ٹائٹ کر دیے اور مجھے سیل بند کر دیا۔ ... اور اسکرو ان کے پاس جیب میں تھے ... کہیں موجود تھے میں خود دیکھ سکتا تھا۔

پانچ فٹ کی چوڑائی اور اونچائی ایسی تھی کہ میں نہ سیدھا ... ہو سکتا تھا اور نہ پیر پھیلا کے لیٹ سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا ... مجھے دس پندرہ دن رکھا گیا تو میری کیا حالت ہو جائے گی۔ قید میں سب سے زیادہ اذیت ناک ... تنہائی کا ہوتا ہے۔ چنانچہ نظر بندی بھی صرف اس لیے ... جاتی ہے کہ آدمی کا مونس دیواروں کے سوا کوئی نہیں رہتا ... چلنے پھرنے اور کھانے پینے کی آزادی ہوتی ہے اور بعض ... لوگوں کو اپنے ہی گھر میں بھی نظر بند کیا جاتا ہے مگر اس ... اپنا گھر بھی پنجرہ لگتا ہے جب گھر کے دروازے خود صاحبِ ... پر بند ہو جاتے ہیں اور اس کو ساری دنیا سے الگ کر دیں ... اپنے آپ سے باتیں کرے تو دیوانہ نظر آتا ہے اور کہلاتا ... مسلسل خاموشی، اعصاب کو شکست دے دیتی ہے اور نظر ... فی الحقیقت زباں بندی بھی بن جاتی ہے۔

یہاں قید تنہائی کے علاوہ بھی بہت سے عذاب تھے۔ ... نقل و حرکت کی جگہ انتہائی محدود تھی اور سب سے ... جانور ہونے کا احساس تھا۔ اشرف المخلوقات کو اس ... دڑبہ نما ... تھا جس میں شاید گدھا بھی نہ سماتا۔ تاہم ... کا تعداد میں منتخب کر سکتے اور وہاں پہ ... کا تقاضا بھی نہیں کر سکتے۔ کسی عالمی انسانی منشور میں ...

کو یہ حق نہیں دیا گیا۔ انگریز تو کہتے ہیں کہ خیرات مانگنے والے بھی اختیار کا حق نہیں رکھتے۔ انھیں وہی قبول کرنا پڑتا ہے جو خیرات دینے والے دیں۔

خود کو اس تکلیف سے قائل کرنے کے بعد میں ایک دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ میری جیب میں سے سگریٹ تک نکال لی گئی تھی لیکن سگریٹ ہوتی تو اس ڈبے کی چھتیس مکعب فٹ ہوا کو دھوئیں سے آلودہ کرنا ممکن نہ ہوتا۔ میں نے اندر کی سطح پر ہاتھ پھیر کر دیکھا اور کونوں میں انگلی پھیر کے دیکھا۔ کہیں کوئی درز یا سوراخ محسوس نہیں ہوا۔ تاہم باکس ایئر ٹائٹ نہیں تھا اور مجھے امید تھی کہ جتنی آکسیجن میں خرچ کروں گا اتنی باہر سے آتی رہے گی اور جو کاربن ڈائی ... وہ اوپر سے باہر نکلتی رہے گی۔ کاربن ڈائی آکسائڈ ہوا سے تو غالباً ہلکی ہوتی ہے۔ میں نے سوچا۔

پرائمری اسکول کے زمانے سے میں یہ پڑھتا چلا آرہا تھا کہ تمام جانداروں کو جن میں پودے بھی شامل ہیں زندہ رہنے کے لیے تازہ ہوا کے علاوہ دھوپ، پانی اور خوراک کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اگر میں سکندر بخت نہیں ... کا پودا ہوتا تب بھی ان چار چیزوں کے بغیر مر جاتا اور ابھی تک میں یہ دریافت کر چکا تھا کہ تازہ ہوا تو حسبِ ضرورت ملتی رہے گی۔ دھوپ کا گزر بعید از قیاس تھا مگر خوراک اور پانی کی فراہمی بھی مشکوک تھی۔ اللہ پتھر کے کیڑے کو بھی رزق پہنچاتا ہے تو باکس میں بند سکندر بخت کے لیے بھی کچھ کرے گا۔ خود سکندر بخت کیا ہے کہ ... اپنے موجودہ ... کو بھی ... کے طور پر استعمال کرنا پڑا۔

میرے پاس کیتھرین کی حاضر دماغی کے باعث ایک ریوالور محفوظ رہ گیا تھا۔ دشمن ... گویا قاتل خود ہی بار ایک ... سے کام لیتے جیسے احتیاط اور حفظ ماتقدم کے سارے تقاضے پورے کر لیے ہوں۔ نہ کہیں غیر ارادی طور پر بھول چوک کر جاتے ہیں۔ حد سے زیادہ مستعد ... فیصد درست چلتا ہے مگر ایک فیصد خطا بھی نہ کرے تو آدمی خطا کا پتلا کیسے کہلائے۔ جانے مقتول شکاری بھی کیتھرین کی بے ہوشی کے دوران کی طرف متوجہ ہو گئے تھے چنانچہ ان کے ذہن میں صرف کیتھرین کی بزدلی کا احساس رہ گیا تھا اور یہ خیال محو ہو گیا تھا کہ ... درجہ کمزور عورت کی تلاشی لینے کی رسمی کارروائی تو کرنا ہی چاہیے۔ اس کے بعد وہ ریوالور میں نے ... کر بہت عقل مندی کا ثبوت دیا تھا مگر اب میں حیران تھا کہ اس عقل مندی کا کیا کروں۔ ریوالور میرے لیے اتنا ہی بے کار تھا جتنا خالی ہاتھوں سے ہونے کا ... میں ان دیواروں کو شوٹ نہیں کر سکتا تھا جو میرے ... پانچ فٹ کے بعد سامنے آجاتی تھیں۔ اس محدود وسعت میں ... سے کام ناممکن تھے۔ میں چہل قدمی نہیں کر سکتا۔

www.paksociety.com

زیادہ سے زیادہ رکوع کی حالت میں وہ قدم جا سکتا تھا، سیدھا کھڑا ہو کے انگڑائی نہیں لے سکتا تھا اور ونڈ نہیں چل سکتا تھا مگر بہت سے ایسے طریقے بھی تھے جن سے میں ہاتھوں پیروں کو حرکت دے کر ان کی کارکردگی کا معیار برقرار رکھ سکتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے گردن اور کمر کی ورزش کرنا بھی ممکن تھا۔

یہ سب خیالات قبل از وقت تھے۔ ابھی میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے اس ڈبے میں کتنا عرصہ رہنا ہوگا۔ رکھنے والے مجھے اسی حالت میں ایک سال بھی رکھتے تو مجھے کوئی معجزہ ہی بچاتا۔ وہ مجھے چند گھنٹوں کے بعد تفتیش کے لیے زیادہ ویری پڑ ناب جگہ طلب کر لیتے یا پھر پوچھے بغیر عالم بالا کو ارسال کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو ان کی مرضی۔ میں نے اطمینان سے بیٹھ کر صورت حال میں امید کا پہلو تلاش کرنا شروع کیا۔ ریوالور میرا بہت بڑا سہارا تھا۔ فرض کرو ایسا ہو جائے کہ کوئی شخص مجھے دانہ پانی ڈالنے آئے اور میں اس کو دبوچ لوں۔ میں نے سوچا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ اگر کوئی آئے گا تو اکیلا نہیں آئے گا۔ باہر دوسرا قاتل موجود ہے گا کہ ادھر میں ڈبے سے گردن نکالوں ادھر وہ میرا قصہ پاک کرے۔ ایک قفل ہوتا یا ایک کنڈی ہوتی تو میں گولی سے اڑا دیتا لیکن پانچ فٹ لمبے اینگل آئرن کا ایک گولی سے کیا بگڑے گا جو کئی جگہ سے اسکریو لگا کے جوڑا گیا ہو۔ اور گولی چلتے ہی سب بھاگے چلے آئیں گے۔ ڈبے سے باہر نکلنے کے بعد کون سی آزادی مل جائے گی۔ آگے کئی بند دروازے ہوں گے اور راستہ روکنے والے محافظ ہوں گے۔ چنانچہ سکندر بادشاہ اعظم کو دوسروں کے مقابلے میں اس ریوالور کے باعث صرف ایک فائدہ ہو سکتا ہے کہ تم قید کی سختی نہ جھیل سکو تو خودکشی کر کے حرام کی موت مر جاؤ۔

لاحول ولا قوۃ! میں نے کہا۔ ایسے مایوس کن خیالات کا آخر کیا مطلب ہے؟ مجھے کچھ تو شرم آنا چاہیے۔ میرے ساتھ محسن بھی بند ہے اور وہ زیادہ ذہنی اذیت میں مبتلا ہوگا کیونکہ اس کو بیوی یاد آ رہی ہوگی اور اس بچے کا خیال ہوگا جس کا باپ شاید اسے کبھی نہ دیکھ سکے۔ میرے ساتھ دلبر ہے اور کیتھرین ہے۔ ڈیڈ فل وومن۔ اس کی بیٹی بستر مرگ پر ہے مگر وہ زندگی سے مایوس نہیں ہے اور اس کا خدا کے اعجاز مسیحائی پر اعتقاد کم نہیں ہوا ہے۔ مزید یہ کہ مردہ بھی زندہ ہو گیا ہے یعنی مرزا غالب جن کو میں مرحوم سمجھ کے رو بھی چکا تھا بفضل خدا ابھی تک دشمن کے ہاتھ نہیں لگے ہیں۔ وہ الو کا پٹھا آخر کہاں گیا اور چھپ کر کیا کرتا رہا۔ ہمارے آنے کے بعد نکلا ہوگا تو اس کا فائدہ؟ پھر بھی اللہ سے دعا ہے کہ اس کو عقل اور ہمت دے کہ وہ ایم اے آئی کے منشور پر عمل کرتے ہوئے جہاد جاری رکھے۔ ہمارا سراغ لگانے کے بعد ہمیں ایسے نکال لے جائے جیسے اسمگلر کسٹم والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ممنوعہ سامان نکال لے جاتے ہیں۔ افسوس یہ کہ مرزا صاحب نے ملکے جانے کے لیے بہت غلط وقت کا انتخاب کیا۔ ان کے انتخاب کیا کہ شطلا کی مجبوری نے ... باہر ہوتی تو اس سے امید کی جا سکتی تھی کہ وہ دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیتے یا توڑ دیتے۔

کسی نے دروازہ کھولنے کا عمل شروع کیا اور میں نے اپنا ریوالور تیار کر لیا مگر جیب سے نکالا نہیں۔ پانچ منٹ میں بولٹ کھل گئے اور دروازہ ہٹا تو مجھے سنگر فیرنکس سے ... آیا۔ ان معرفوں کا ابھی تک مجھے نام تو معلوم تھا نہیں ... اس ڈبے تک لانے اور اندر پہنچانے کے فرشتے ... وہ پھر ساتھ آئے تو مجھے منکر نکیر کا ہی خیال آیا۔ شاید ... بھی کریں ایک تابوت میں تھا۔ دوسرا باہر کھڑا رہا۔ ... تشنہ مضراب سے مات کی عملی تفسیر بنا ہوا ... بے چین نظر آتا تھا اور میری بے عملی سے مایوس تھا۔

"السلام علیکم حضرت!" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "... آئے؟" گیٹ کھولنے والے نے ایک کاغذ میں لپٹا ہوا ... اندر رکھا۔ پھر موٹے کاغذ کا بنا ہوا پانی کا گلاس بھی احتیاط سے ساتھ ایک طرف رکھا۔

"دیکھئے! صبح ناشتے میں دو انڈے ہاف فرائی... ایک کافی... توس دو عدد براؤن سینکے ہوئے..." میں نے کہا مگر گیٹ دوبارہ اٹھا چکا تھا اور اس کے تنگ بولٹ کس رہا تھا۔ "بداخلاقی کا دور ہے" میں نے کہا۔ "ہاں اب یہ ... میں۔ وہاں ایک خاموشی تری سب کے جواب میں" میں نے ... پہ غور فرماتے ہوئے مرزا غالب کی زبان میں شکوہ کیا۔ ابھی بھوک نہیں تھی مگر میں نے سب کچھ پیٹ میں اتار لیا اس خیال سے کہ کہیں مجھے بھوک ہڑتال پہ سمجھ کے وہ من و سلویٰ کو بھی نہ لے جائیں۔ پانی میں نے نہیں پیا کیونکہ پھر پانی کے جسم سے اخراج کا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔

میری عقل ابھی تک کام کر رہی تھی چنانچہ ... سے گریز کیا تھا۔ ایک امید قائم تھی کہ شاید قدرت کوئی ... فراہم کر دے جب ایک ریوالور سے جنگ کا پانسا پلٹنے ... مارنے کو میں منکر نکیر کو ٹھنڈا کر سکتا تھا مگر باہر ... والے بھی تھے جو سب کی طرح قتل و خونریزی کے لیے ... تھے۔ ابھی تک ہم میں سے کسی نے یہ عہد نہیں کیا تھا ... بقید حیات اور اپنے اپنے ڈبوں میں بخیر و عافیت موجود تھے۔

جب کرنے کو کچھ نہیں۔ سوچنا بے کار ہے۔ ... نہ کٹنے والا تو وقت کاٹنے کے لیے سو جانا ہی بہتر ہے۔ ... مجھے کیو سونے سے جسم کی توانائی بحال ہوتی ہے اور ذہن ... کے بعد بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ میں تختے کے ... سے بیٹھ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اپنی درازی قامتی مجھے کبھی باعث پریشانی یا پشیمانی نہ تھی۔ لیکن اس پر ناز کرتا تھا مگر آج مجھے خیال آیا کہ پستہ قد بھی کبھی فائدے میں رہتے ہیں۔ اگر میں پانچ فٹ قد کا ہوتا تو ... کے سوتا اور باکس کے اندر مزے سے ٹہلتا۔

مجھے معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا تھا اور سو چکا تھا یا ... ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایسے کانوں میں وہ کھٹ کھٹ سنی اور ایک دم آنکھ کھل گئی۔ یہ دستک میرے ڈبے کے صدر دروازے پر نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی آواز مجھے اپنے پیچھے سے سنائی دے رہی تھی۔ کھٹ کھٹ... کھٹا کھٹ... کھٹا ... کھٹ... کھٹا کھٹ کٹ... میں وفور خوشی سے بے چین ہو گیا۔ یہ مورس کوڈ کا سگنل تھا۔ ایک پرانی یاد نے پھر دل کا دروازہ کھولا۔ میں نے غور سے سنا۔ از کجا می آید ایں آواز دوست! آواز دوست پڑوس میں سے سنائی دے رہی تھی۔ جیسے ... کے ساتھ ہی محسن خان دوسرے پنجرے میں قیام پذیر ... مجھے معلوم نہیں اس نے کیسے جانا کہ میں اس کا ہمسایہ ہوں۔ ... اس نے قسمت آزمائی کی لیکن قسمت نے ساتھ دیا۔ میں ... غالب کے پیغام کو صاف سمجھ لیا۔ اس نے صرف میرا نام لیا تھا۔ سکندر... میں نے فوراً پیچھے کی دیوار پر انگلی بجا کے جواب ... ہاں... میں...

مورس کوڈ ایک عظیم ایجاد ہے۔ اسے ٹیلیگراف آفس میں بیٹھنے والے نہیں سمجھتے۔ شاید تار ارسال کرنے والے بھی اسے مسلسل استعمال کرنے سے اتنے بیزار ہو جاتے ہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا پسند کرتے ہیں یا یوں ہی شغلاً دو چار ہاتھ ادھر ادھر مار کے ڈیوٹی پوری کرتے ہیں۔ تار پہنچے یا غلط پہنچے کیا ہی ... ہو سکتی ہے۔ دراصل نقطوں اور لکیروں کی یہ زبان ایک عالمی زبان ہے جسے اہل زبان بھی استعمال کر سکتے ہیں اور بے زبان بھی۔ جنگ کی حالات میں اس سے پیغام ارسال کرنے کے ... کسی بھی شخص کو کسی بھی چیز سے بجا کے کام چلایا جا سکتا ہے۔ ... نقطے کے لیے انگلی آہستہ سے ماری تھی اور لکیر کے لیے ... زور سے ... یہی میں نے بھی کیا۔ کسی ... کے بغیر ہمارے درمیان مواصلاتی رابطہ قائم ...

"کیا حال ہے... شیر لوہے کے جال میں ہے؟" محسن بولا۔ ... خواہش کرتا تھا کہ میرا قد چار فٹ گیارہ انچ ہوتا۔

"ہم یہاں کب تک رہیں گے آخر؟"

... تو مجھ کو بھی علم نہ تھا کہ وہ جنت میں کتنا عرصہ ...

"تو نے مزید غور و خوض فرمایا ہوگا۔ کافی فرصت تھی... کہ ... کیا ہوگا؟"

"میں کچھ استراحت فرماتا رہا۔" میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "لیکن آپ کے سوال کا جواب دینے کے لیے غور کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ نے یہ احمقانہ سوال بھی غور فرمائے بغیر کیا ہے۔"

"یار مختصر بات کر... انگلیاں تھک جائیں گی۔" محسن بولا۔

"یار میرے پاس ایک ریوالور ہے۔" میں نے کہا۔

"تو میرے پاس نہیں ہے الو کے پٹھے۔"

"کیا میں ایک گولی چلا کے ثبوت پیش کروں؟" میں نے کہا۔ "اپنا سر سامنے رکھ اس تختے کے درمیان میں۔ ریوالور مجھے آنٹی نے دیا ہے۔"

"کیتھرین نے؟"

"ہاں... وہ تلاشی سے بچ گئی تھی۔"

"معلوم نہیں یہ اچھی بات ہے یا بے کار بات ہے۔" محسن بولا۔ "اس کے استعمال کی نوبت آئے گی یا نہیں۔"

"دلبر اور کیتھرین کا کیا حال ہے؟"

"معلوم نہیں... ان کو جو بنگلا الاٹ کیا گیا ہے وہ دوسری طرف ہے۔ میرے دوسرے پڑوسی خواجہ صاحب ہیں۔"

"وہ زندہ تو ہیں؟"

"ہاں۔ میں نے پہلے ادھر پیغام بھیجا تھا۔ اس نے جواب میں چلا کے کہا کہ کون ہے بھائی... اندر آ جاؤ..." محسن بولا۔ "پھر میں نے دوسری طرف کوشش کی۔"

"تجھ پر کیا وحی نازل ہوئی تھی کہ دوسرے ڈبوں میں کون ہے؟"

"جب مجھے یہاں ٹھہرایا گیا تھا تو ظاہر ہے خاص فائیو اسٹار ہوٹل کے باقی کمرے دوسرے مہمانوں کے لیے بک تھے۔" محسن بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف ہمیں رکھنے کے لیے اتنا تکلف کیوں کیا گیا۔" میں نے کہا۔ "باکس بنوانے ضروری نہیں تھے۔ ہمیں ایک ہی کمرے میں بھی بند کیا جا سکتا تھا۔"

"پہلی بات تو یہ کہ باکس ہمارے لیے نہیں بنے۔ اس میں سامان جاتا ہے۔" محسن نے جواب دیا۔ "ایکسپورٹ کیا جاتا ہے۔ سب کے تختوں پہ ایک ہی پتا لکھا ہوا تھا۔"

"کیا لکھا ہوا تھا؟"

"نام تو میں... یاد نہیں رکھ سکا..." محسن نے جواب دیا۔ "بہت مشکل اور لمبا نام تھا۔ کارین ٹیرا لکور لمیٹڈ قسم کا... پتا بھی کچھ لمبا ہی تھا۔"

"جو تو نے دیکھا اور میں نے نہیں دیکھا... ایک ہی بات ہے۔"

"نہیں یار... ملک کا نام مجھے یاد ہے... بلکہ شہر بھی۔"

www.paksociety.com

محسن بر۔۔ "اس پر تو سٹرک کا نام، ٹیلیکس نمبر، کیبل ایڈریس اور فون وغیرہ سب ہی لکھا گیا تھا۔ اسٹینسل سے حروف پینٹ کیے گئے تھے۔ وہ سب میں کیسے یاد رکھتا۔ شہر کا نام تھا ایڈوبیٹ سٹی۔"

"کیا... ایڈوبیٹ؟" میں نے کہا۔ "تو نے ٹھیک سے دیکھا تھا؟"

"ہاں یار... یہی نام تھا... اسپائیل ڈی او ایم اے ٹی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے...؟"

"مجھے بھی معلوم ہے کہ یہ ایک دوا کا نام ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ اور یہ بلڈ پریشر کی دوا ہے۔ بہت عام۔" میرے منہ سے نکلا۔

"اور اسی لیے مجھے یہ نام یاد رہ گیا۔" محسن نے جواب دیا۔ "کیونکہ میرے والد یہی دوا استعمال کرتے تھے۔"

"ملک کا نام کیا تھا؟"

"یہ مت کہنا کہ میری عقل گھاس کھانے گئی ہے۔ یا میری دور کی نظر خراب ہو گئی ہے۔" محسن بولا۔ "ملک کا نام تھا... وسن بی وانیا..."

"وسن بی وانیا؟" میں بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں وسن بی وانیا۔" محسن بولا۔

"اس کا مطلب تو ہے... تمہارا حافظہ..."

"میں نے اور تو نے فلم پر ایسی ایک ساتھ دیکھی تھی۔" محسن بولا۔ "لندن میں ابھی کچھ وقت یہ لفظ چلا تھا۔"

"یہ روسی زبان کا لفظ ہے۔" میں اب محسن کی بات سمجھنے لگا تھا۔ "فلم میں ایک گانا تھا، فلمیں لگنے جانے والے یار وسن بی وانیا۔"

"ہاں۔ اچھا گانا تھا مگر وہ دوسرا گانا زیادہ اچھا تھا۔ مدہوم تنانا تنے رے نانا۔" محسن بولا۔ "لتا کی آواز میں۔"

"لاحول ولا قوۃ... موسیقی ہمارا موضوع نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تیری بات سے تو میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جو بھی ہوگا ٹیلیکس نمبر، کیبل ایڈریس... فون نمبر سب غلط ہوگا۔"

"اتفاق سے میں آپ سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں۔"

"اور یہ سب مال جاتا کہاں ہوگا؟" میں نے کہا۔

"جہاں اسے نہیں جانا چاہیے۔" محسن بولا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ یہاں سے کراچی جاتا ہوگا۔ وہاں بندرگاہ سے کسی بحری جہاز پر لادا جاتا ہوگا۔ اب جیسا کہ تو جانتا ہے بندرگاہ تو پورا شہر ہوتا ہے جس کا سر پیر نہیں ہوتا۔ ہر روز نہ جانے کتنے مال بردار جہاز آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ نہ جانے کتنی گودیاں ہیں اور کتنے گودام۔ سیکڑوں ایسے اور اس سے بھی بڑے باکس اور کنٹینرز۔"

"ہاں... کنٹینرز۔" محسن بولا۔ "جس میں ہم لائے گئے تھے۔"

"ان کنٹینرز میں کتنے باکس آ سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"سولہ... ایسے ہی باکس..." محسن نے ہونہار طالب علم کی طرح فوراً جواب دیا۔ "وہاں اس قسم کے کنٹینرز بھی روزانہ جہاز پر چڑھائے جاتے ہیں۔ ہزاروں مزدور اور بندرگاہ کے عملے کے ہزاروں افراد دن رات یہ کام کرتے ہیں۔ کون غور کرتا ہے کہ کسی چٹھی، پارسل، باکس یا کنٹینر پر کیا پتا لکھا ہوا ہے۔ مال جا رہا ہے چلا جائے گا۔ چڑھانے والے خود بھی جہاز پر پہنچا کر لوڈ کریں گے۔ کلیئرنگ فارورڈنگ ایجنٹ اور ان کے ایجنٹ، سب کے سب کسی بھی چیز کو جہاز تک پہنچا سکتے ہیں یا بندرگاہ سے نکال سکتے ہیں اور جہاں تک مجھے یقین ہے سب لوگ دنیا کے تمام ممالک اور تمام شہروں کے نام نہیں جانتے۔ کیا تو بتا سکتا ہے کہ آج اقوام متحدہ کے رکن کتنے ممالک ہیں اور ان سب ممالک کے بندرگاہوں کے نام کیا ہیں؟"

"نہیں... یہ جواب تو کمپیوٹر بھی نہیں دے سکتا ہے کیونکہ آئے دن کوئی چھوٹا موٹا خطہ خود مختاری حاصل کر لیتا ہے اور چند جزائر پر مشتمل مملکت بن جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"درست... اسی کم علمی کو دنیا کا زیادہ علم رکھنے والوں نے استعمال کیا۔" محسن بولا۔ "عام مزدور تو پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اگر بندرگاہ کے اندر کوئی ایجنٹ کہے گا کہ یہ فلاں جہاز کا مال ہے۔ ایجنٹ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً دشمن کا ایجنٹ... جہاز بھی انہی کا ہوگا۔"

"یہ تو بہت خطرناک کام ہے۔"

"ہاں۔ مگر کرنے والے کر رہے ہیں۔" محسن بولا۔ "خطرے سے کھیلنے کا ہی معاوضہ پا رہے ہیں۔ اوّل تو وہ اپنے مال کے سوا کسی کے مال پر نظر ڈالتے نہیں۔ سب اپنا مال پہچانتے ہیں اسی کو تلاش کرتے ہیں۔ کوئی دیکھ لے تو سوچتا نہیں کہ یہ شہر، یہ ملک کہاں ہوں گے۔ ٹانگانیکا... ہونولولو... وغیرہ وغیرہ یہ بھی تو شہر ہی ہیں۔"

"تیری نظر... تحقیق اور استدلال سے ہم مرعوب ہو گئے۔"

"صرف خوش ہونے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم فوت بھی تو ہو سکتے ہیں۔"

"اگر فوت نہ ہوئے تو یہ معلومات کارآمد ہوں گی۔"

"فوت تو ہونا پڑے گا۔"

"یار ہو سکتا ہے غالب دعا ہوں مرے۔" میں نے کہا۔

"...ان باتوں کی تصدیق طلب ہیں۔" محسن بولا۔ "ممکن ہے وہ بھی آئے ہوں اور ہماری طرح آرام کر رہے ہوں... اس کے علاوہ غالب صرف یہ بول سکتا ہے، دعا دا نہیں بول سکتا۔"

"اس کو فلمی ہیرو کی طرح چانس ملنا چاہیے۔"

بچوں کے پیچھے لگا ہے۔"

"مجھے کیتھرین کا بہت افسوس ہے۔ اس کے بچے کا بہرا نصیب ہے۔"

"ایک امید یہ بھی ہے کہ شاید اسے چھوڑ دیا جائے۔" میں نے کہا۔

"یہ لوگ بے گناہ کو بخش دینا ضروری نہیں سمجھتے۔"

"کیا تجھے اپنی زوجہ یاد آ رہی ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... اور مجھے ہچکیاں بھی آ رہی ہیں۔ یقیناً وہ مجھے یاد کر رہی ہے۔"

"مجھے بھی رابعہ یاد آ رہی ہے۔ ممکن ہے اب اسے ہچکیاں لگ رہی ہوں۔" میں نے کہا۔

"میری انگلیوں کی پوریں درد کرنے لگی ہیں... اس لیے وقفہ... یا رابعہ یا ہاتھ روم کی ضرورت، تاکہ یہ ہوتی جا رہی ہے۔"

ابھی ہمارے مواصلاتی رابطے کو منقطع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں نے رابعہ کے چیخنے کی آواز سنی۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

"کہاں لے جا رہے ہو تم مجھے... بتاتے کیوں نہیں؟" اس بات کا بھی کسی نے جواب نہیں دیا اور رابعہ کی آواز آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی۔ اس کے چیخنے کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ ہم کہیں آس پاس موجود ہوں تو خبردار ہو جائیں۔ ہمیں یہاں قید کرنے والے ایک ایک کر کے لائے تھے چنانچہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی کہ کہاں ہے۔ صرف محسن نے عقل کے گھوڑے دوڑا کر مجھ سے رابطہ قائم کر لیا تھا اور یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ دوسری طرف استاد بیٹھا ہے۔ میں نے استاد اور ٹیڈی کی آواز بھی سنی۔

"بے غیرت... بزدل انسانو... عورتوں پر ظلم کو بہادری سمجھتے ہو؟" اس کے مشتعل ہونے اور ایسی باتیں کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا مگر اس کے دلی جذبات عقل کے تابع نہیں تھے۔ وہ بہت غصیلے اور بے بسی کا اظہار اسی طرح کر سکتا تھا۔ میں اور محسن چپ بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے سے ہم کیا کہتے... ذہن جانتا تھا کہ محسن کو جانے ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور ان کے ساتھ بھی کیا ہو سکتا ہے۔ ہم جنگی قیدی تھے اور افراد یا تنظیم کے اخلاقی معاہدے یا جنیوا کنونشن کے سوال ہی پیدا نہیں ہوتے۔ ان پر حقیقی عمل درآمد وہ بھی نہیں کرتے جو تحفظِ انسانیت کے عالمی منشور بناتے ہیں۔ ہم جن لوگوں کے رحم و کرم پر تھے وہ جانتے ہیں ایسی بہت سی معلومات حاصل کر چکے تھے جو ہمارے خیال کے مطابق صرف ہم تک محدود تھیں لیکن انہیں کھلواڑ میں بہت کچھ پوچھنا تھا جو پوچھ کے پرانے طریقے ہو چکے تھے اور رابعہ کے لیے بھی نئے نہ تھے۔ پہلے ایک انسانی حیثیت سے اس نے پولیس کے طریقے کا ارتکاب کیا تھا اور بعد میں میرے ساتھ رہ کے وہ تشدد کا عملی مفہوم بھی سمجھ گئی تھی۔ سو اس کو ڈلی تک سے بغیر زبان خاموشی میں محسن مجھ سے ہم کلام ہوا۔

"یار... یہ تو بہت برا ہوا..."

"ہم نے اچھا چاہا تھا، اچھا کب تھا... اچھائی برائی سب بہانے ہیں، ان کے انداز فکر کا فرق ہے۔"

"اب وہ رابعہ پر تشدد کریں گے۔"

"ہم ان کو نہیں روک سکتے... پھر یہ سوچنے سے کیا حاصل... رابعہ کے ساتھ اس کا اور ہمارا خدا ہے۔"

اسی وقت کیتھرین نے شور مچانا شروع کیا۔ "واٹ از دس... چھوڑ دو مجھے... تم اس لڑکی کو کہاں لے گئے تھے... کیوں چلا رہی تھی وہ... دیکھو... اس کی جگہ مجھے مارنا چاہو تو مجھے اعتراض نہیں... مگر اس کو جانے دو... اس پر ظلم مت کرو۔"

بے وقوف عورت... کس سے سودا کرنا چاہتی ہے اور کیا مانگ رہی ہے میں نے سوچا۔ کیتھرین کی واویلا بے اثر ہو سکتا ہے لیکن ان کے کانوں پر نہیں۔ اس کی جگہ رابعہ ہوتی تو وہ بھی شور مچاتی کہ مجھے مار ڈالو مگر اس عورت کو چھوڑ دو... اس کی لڑکی بہت بیمار ہے... وہ مر جائے گی۔

باہر سے کسی نے پھر باکس کو کھولنا شروع کیا۔ چند منٹ کے بعد مجھے شکر نظر آ گئے۔ ایک نے مجھے انگوٹھے سے باہر آنے کا سگنل دیا۔ میں جھک کر رکوع کی حالت میں باہر نکلا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں نے حیرانی سے لوگوں کو دیکھا جو وردی کے ساتھ آتشیں مشین گن لیے کھڑے تھے۔ میں نے محسن اور ٹیڈی کو بھی دیکھا جو اپنے اپنے پنجروں سے جانوروں کی طرح نکل آئے تھے اور اپنے احساسِ خودداری کو بلند رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ آپس میں کوئی بات کیے بغیر ہم ان کے ساتھ چل پڑے۔ جتنی ضروری باتیں تھیں وہ ہم پہلے ہی کر چکے تھے۔ اب ان کے سامنے اپنی بے نیازی کا انداز برقرار رکھا جا سکتا تھا۔ ٹیڈی دڑبے میں شور مچا رہا تھا۔ اب خوفزدہ ہو کے خاموش ہو گیا تھا۔

اس بار میں باہر کے باہر سے چلا گیا اور تب میں نے دیکھا کہ وہ گودام... عمارت کے اندر نہیں تھی۔ وہ تنہا ایک صنعتی علاقے میں کھڑی تھی۔ اس کے گرد و نواح میں دوسری فیکٹریاں تھیں اور دور دور تک ایسی بہت سی عمارتیں اور کارخانوں کی چمنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ کوئی اسٹیٹ کا علاقہ لگتا تھا۔ ہر کارخانے میں رات کی شفٹ میں کام نہیں ہو رہا تھا چنانچہ تاریکی بھی ویرانی کا تاثر ابھر گیا تھا۔ باہر ایک کار کھڑی ہوئی تھی اور دو سٹرلائٹ ویٹ ٹرک تھا۔ ہم تینوں کو ٹرک میں سوار ہونے کا حکم دیا گیا اور آمنے سامنے لگی ہوئی دو بنچوں پہ ہم لوگ بیٹھے کا آخری حصے میں بیٹھے

www.paksociety.com

مقابل محسن تھا۔ محسن کے ساتھ والا استاد دکھائی اور پھر وہ گوریلا جو مشین گن پر سے انگلی نہیں ہٹاتا تھا۔ دوسرا گن مین پیچھے کے ساتھ تھا اور اس کی مشین گن کا رخ مخالف سمت میں محسن اور ٹیڈی کی طرف تھا۔ وہ دونوں شروع میں بہت جن کے بارے میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ جوڈو کراٹے کے ماہر ہیں۔ جانے بیٹھ جانے کے بعد بھی ٹرک نہ چلا۔ پھر ایک وردی والا شخص نمودار ہوا جس کے ہاتھ میں تھرمس تھا۔ اس نے تھرمس میں سے کافی انڈیلی اور کپ میری طرف بڑھایا۔ "پی لو۔"

"یکلخت تم لوگوں اتنے مہربان اور مہمان نواز ہو گئے ہو؟" میں نے کہا۔ "اس میں کیا راز ہے؟"

"پی لو ورنہ پچھتاؤ گے... لمبا سفر ہے۔" وہ بولا اور اس نے دوسرا مگ پہلے محسن کو دیا۔ تیسرا ٹیڈی کو دینے کے بعد اس نے جو تھا اپنے لیے بھرا اور بولا۔ "تم کو شک ہے کہ اس میں زہر ہوگا۔" پھر وہ ہنسا۔ "اگر تمہیں مارنا ہی مقصود ہوتا تو یہاں تک کیوں لاتے۔"

وہ باہر کھڑا رہا اور کافی کی چسکیاں لیتا رہا۔ اس نے کافی کے ساتھ دو گولیاں بھی نگل لیں اور ہم سے بھی پوچھا کہ کسی کو اسپرین کی ضرورت تو نہیں ہے۔ مجھے ضرورت تھی۔ میرے بعد محسن نے بھی مانگ لی۔ ہمارا شک اب دور ہو چکا تھا۔ کافی کی مہک ویسے بھی بہت پرکشش تھی۔ ہم نے مگ خالی کر دیے تو اسی شخص نے ہمیں سگریٹ دیے۔ وہ انہی لوگوں کا ساتھی تھا اور جو کچھ کر رہا تھا اپنی مرضی سے نہیں کر رہا تھا مگر وہ بداخلاق یا بدزبان نہیں تھا۔ سگریٹ کے پیکٹ میں سے میں نے اپنے اور محسن کے لیے دو سگریٹ نکالے اور اس کو پیکٹ واپس کرتے ہوئے ماچس طلب کی۔ اس نے ماچس دیتے ہوئے کہا "پیکٹ رکھ لو۔"

"ٹھیک ہے۔" محسن بولا۔ "تم نے کوئی نیکی تو کی... کون ہو تم؟"

"میں حکم کا غلام ہوں۔" وہ ہنسا اور خالی مگ لے گیا۔

"اب چلنا ہے کہ نہیں؟" آگے سے کسی نے پوچھا اور ٹرک ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، تین دفعہ... میں نے اور محسن نے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں استاد۔" محسن نے اچانک ٹیڈی سے کہا۔ "ابھی تم دیکھنا یہ کیا زبردست مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شاندار دعوت ہوگی... پلاؤ... قورمہ..."

"کیوں۔ سسرال جا رہے ہیں کیا تمہارے؟" ٹیڈی جل کے بولا۔

"او نہوں۔ جب کسی کی سزائے موت کے فیصلے پر عمل ہونے کا وقت آ جاتا ہے تو اسے پسند اور خواہش کے مطابق کھانا دیا جاتا ہے۔" محسن بولا۔

"آخری طعام۔" میں نے تائید میں سر ہلایا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا سر کچھ زیادہ ہلکا ہو گیا تھا۔ میں نے بہت کم حرکت کی لیکن سر ڈھلک کر کافی آگے آ گیا تھا اور پھر اسے واپس لانے کے لیے مجھے تھوڑا سا زور لگانا پڑا تھا۔ یہ بڑی عجیب کیفیت تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میری پرانی گرفت پہ بہت بوجھ رکھ دیا گیا تھا جسے سنبھالنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے محسن کی طرف دیکھا تو وہ سگریٹ کو گھور رہا تھا۔

"اس سگریٹ میں... کچھ تھا سکندر؟" وہ بولا

میں نے نفی میں سر ہلایا تو میرا سر پھر ڈولنے لگا۔ "کافی..."

"کافی تو اس نے بھی پی تھی۔" محسن بولا۔

"اس نے دو گولیاں بھی... کہاں تھیں..." میں نے

"اس پہ اثر نہیں ہوا... وہ اسپرین نہیں ہوگی... اسپرین... ہم نے صرف ہلکی دی..." میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ٹرک ڈرائیور آگے کا انجن کے ساتھ کچھ کر رہا تھا اور ٹرک چلا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جانتے بوجھتے دیر کر رہا تھا۔ وہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ جس راستے سے ہمیں لے جایا جائے وہ ہم پہچانیں۔ ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم شور کرنے کے قابل نہ رہیں۔ چند منٹ کے اندر اندر میں نے اس صورت حال کو قبول کر لیا۔ ٹیڈی سو گیا تھا اور محسن اونگھ رہا تھا۔ جب ٹرک اسٹارٹ ہوا تو میں ایک جھٹکے سے پیچھے گر گیا۔

دوبارہ ہوش آنے پر میں نے خود کو ایک تہ خانے میں پایا۔ اس کی دیواروں کے بالکل اوپر والے حصے میں چھت کے قریب دو روشندان تھے جن میں سے آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہم زمین کی سطح سے کتنا نیچے ہیں۔ جیسے جیسے حواس بحال ہوئے میں گرد و پیش کا جائزہ بہتر طور پہ لینے کے قابل ہو گیا۔ یہ سیمنٹ کے پلاستر کے ڈھنگ والا خاصا بڑا کمرہ تھا۔ (تقریباً) اٹھارہ فٹ لمبا اور پندرہ فٹ چوڑا۔ میں اس کے فرش پہ لیٹا ہوا تھا۔ میرے قریب ہی محسن اور ٹیڈی پڑے تھے۔ کمرے کی چھت سے ایک بلب معلق تھا مگر اس کی روشنی کو دیواریں جذب کر رہی تھیں۔ اس کی طرف ایک ہلکے سے دیوار میں دروازہ تھا اور یہ دیوار ہم سے بہت دور تھی۔ ہم اس دروازے تک پہنچ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ہم سب کا بایاں ہاتھ ایک زنجیر سے منسلک تھا اور زنجیر دیوار میں پیوست تھی۔ میں نے محسن کو آوازیں دیں۔ وہ ہوں... ہاں کر کے اور کروٹ لے کر پھر سو گیا۔ ٹیڈی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

میں ابھی سوچ رہا تھا کہ آخر اس قید خانے میں منتقلی کا مقصد کیا ہے اور یہ لوگ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ شاید یہ تو تین ہوگا کہ جب تک ان کے منصوبے کے مطابق مال

[…] نکل جائے ہمیں نکلنے ہی نہ دیا جائے۔ ولکر فیصلی کے [...] ہونے والی میٹنگ میں جو کچھ طے ہوا تھا ہمیں معلوم تھا اور یہ بات وہ جان گئے تھے۔ اب یا تو وہ اپنا پروگرام [...] جو زیادہ مشکل کام تھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے [...] ان کے سامنے اسمگلنگ مال کو وصول کرنے اور آگے پہنچانے کے مقامات [...] کر چکے ہوں گے۔ یہ سب انتظامات دوبارہ ہم [...] اور سب کچھ نئے سرے سے کرنے میں تاخیر کا پہلو آ جاتا [...] انہوں نے آسان یہی سمجھا کہ ہمیں روک لیا جائے۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر میں چونکا۔ آہستہ آہستہ پولیس کی وردی میں ملبوس دو افراد میرے قریب آ گئے۔ ان میں سے ایک کو میں پہچانتا تھا۔ وہ ایس پی سراج تھا۔ دوسرا کوئی نیا چہرہ تھا۔ مجھے اب کوئی شک نہیں رہا کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ سراج میرے قریب آ کے رک گیا۔ پھر اس نے مجھے بوٹ کی ٹھوکر ماری۔

"دیکھو اپنی حالت کو سکندر اعظم۔" وہ خباثت سے بولا۔ "ایک چوہے سے زیادہ بے بس اور قابل رحم ہو۔ ایک بار ہمارے جال سے نکل گئے تھے اور جتنا عرصہ چھپے رہے یہ سمجھتے رہے کہ تم اپنا کمال [...] ہو۔ تقدیر تم کو ڈھیل دیتی رہی اور تم اسے اپنا کمال سمجھتے رہے۔ یہ سمجھتے رہے کہ تم بہت ذہین [...] ہو۔ بیک وقت افلاطون بھی ہو اور ارسطو بھی۔ تمہاری شکل دیکھ کر میرا خون کھولتا تھا۔ اس خیال سے کہ یہ سب [...] میری وجہ سے ہوا۔ تمہیں میری بے وقوفی نے ہیرو بنا کر دیا... جب تم میری مٹھی میں تھے تو میں نے تم کو نکل جانے دیا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ تم بعد میں اتنا اچھلو گے، اتنا اتراؤ گے، ہماری خرابی کا باعث بنو گے، اتنا نقصان کرو گے... تو اسی دن تمہاری لاش کے ٹکڑے شہر کے دس کوچوں میں پھنکوا دیتا۔ کون... پکڑ سکتا تھا مجھے... بہت ہوتا تو تھوڑی تحقیقات ہوتیں اور بس... اتنی خرابی اس لیے پیدا ہوئی کہ میں نے [...] تم کو قتل نہیں کیا تھا۔"

"مجھے قتل کرنا اس وقت تمہارے اختیار کی بات نہیں تھی... غدار اور بے غیرت شیطان۔" میں نے کہا۔ "اور نہ آج ہے..."

وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے چیخ کر مجھے ایک سے [...] گالی دی اور اس کے ماتحت انسپکٹر نے اس کو نہ روکا ہوتا تو [...] میں وہ مجھے لاتوں سے مار مار کے ختم کر دیتا۔ "میں [...] کاٹ دوں گا کتے کی اولاد... تیرا یہ سر توڑ کے وہ سب [...] دوں گا۔ تیری ہڈیاں کتوں کے سامنے ڈال دوں گا... [...] سے ساری سرکشی... ساری خوش فہمی اور ساری مردانگی [...] گا تیرے..." اس نے منہ سے مغلظات اگلتے ہوئے کہا۔

"سر... پلیز سر۔" ماتحت انسپکٹر نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے ایک طرف کھینچ لیا۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں... ہوش میں آئیں سر..."

"چھوڑ دو مجھے سندر..." وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چلایا۔ "میں اس... کو بتاتا ہوں... اس کی تو..."

"نہیں سر! ہم اور آپ مشکل میں پڑ جائیں گے..." انسپکٹر نے کہا جو اپنے نام سے ہندو ہی لگتا تھا۔ ایک اور وطن فروش اس مٹی سے اگنے والی فصل سے پیٹ بھرنے والا۔ اس زمین کے اوپر کی ہوا سے سانس کھینچنے والا جو اس کے جسم کے ہر خلیے اور خون کے ہر قطرے تک پہنچی تھی۔ اور اسی زمین کے آسمان سے دھوپ لینے والا۔ اسی زمین پہ بسنے والوں سے رشتوں کے سہارے پا کر زندگی کے مشکل مرحلوں سے گزرنے والا۔ میں نے نفرت اور حقارت سے ان دونوں کی طرف دیکھ کر سوچا اور تھوکا۔ میرے تھوک میں میرا لہو تھا جس کا نمکین ذائقہ مجھے اپنی زبان پر محسوس ہوتا تھا۔ اب یہ انسپکٹر سندر۔ احسان فراموش اور کمینہ۔ دشمن کا غلام تھا۔ اندر وطن کے دوستی کا فریب دینے والا اور دشمن کے ساتھ مل کر پیٹھ میں خنجر گھونپنے والا۔ اس ملک نے ان دونوں کو کیا نہیں دیا؟ بچپن سے جوانی تک زندہ رہنے کے لیے سازگار حالات... تعلیم... ترقی کے مواقع۔ ملازمت۔ قانون کے مقدس نام کی حفاظت کے لیے یہ عہدے۔ یہ عہدہ۔ لوگوں کے جان و مال اور عزت آبرو کے تحفظ کی ذمہ داری اور ان دونوں نے ان تمام مراعات کا کیا بدلہ دیا؟ ان احسانات کے بدلے میں اسی ملک کے ساتھ کیا کیا؟ ایک ہندو تھا اور اس کا جرم قانونی طور پر مسلمان کے جرم سے کم سنگین نہ تھا مگر مسلمان میری نظر میں زیادہ بڑا مجرم تھا جس نے اللہ اور رسولؐ کے ماننے والوں کے اعتماد کو دھوکا دیا۔ اس نے وہی کیا جو ایک کافر کر سکتا تھا لیکن مسلمانوں جیسا نام رکھ کر ان کے ہم مذہب کی حیثیت سے وہ دوہرا مجرم تھا۔ اس کو اسلام کے نام پہ حاصل ہونے والے ایک ملک کی حفاظت ایک مسلمان کی حیثیت سے بھی کرنا تھی اور ایک پولیس افسر کی حیثیت سے بھی۔

یہ سب خیالات میرے ذہن میں اس مختصر وقفے میں آئے جو میں نے ایس پی سراج کی وحشیانہ مار پیٹ کے بعد سنبھلنے میں صرف کیا۔ ٹھوکروں سے میری کنپٹی متعدد مقامات پہ سے پھٹ گئی تھی اور میری پسلیوں پر پڑنے والی ہر ضرب اتنی شدید تھی کہ میرے لیے سانس لینا بھی آسان نہ رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری پسلیاں ٹوٹ کر اندر دھنس گئی ہیں۔ میرا سر گھوم رہا تھا اور میرا اوپر والا ہونٹ کٹ گیا تھا۔ محسن اور ٹیڈی بھی میری طرح بے بس تھے۔ چنانچہ وہ بھی مجھے عقل سے کام لینے کی تلقین کرنے کے سوا میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ دوبارہ [...]

www.paksociety.com

سراج کے عتاب کا شکار نہیں بنے تھے چنانچہ محفوظ رہے تھے۔ ٹیڈی نے کہا۔ ”سکندر بادشاہ... چپ رہو... کیا فائدہ بولنے سے...“

محسن بولا۔ ”یار چھوڑو ایسی باتیں... ہم ابھی کچھ نہیں کر سکتے...“

انسپکٹر سندر نے بھی سراج کے غصے کی آگ کو دبا دیا تھا۔ سراج نے مجھے آستین سے خون صاف کرتے دیکھا۔ ”تم آئندہ بھی کچھ نہیں کر سکو گے...“

”اور تو غلام ابن غلام۔“ میں نے حقارت کے زہر سے بجھے لہجے میں کہا۔ ”شیطان کے غلام۔ ہوسِ زر کے غلام۔ وطن دشمنوں کے غلام۔ تو خود کیا کر سکتا ہے؟ تجھ میں ہمت ہے اپنے آقاؤں کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے کی؟ کتا اپنی مرضی سے دُم تو ہلا سکتا ہے۔ تو اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتا۔ بدبخت ہے وہ ماں جس نے تجھے جنا۔ تیری ماں کے پیروں کے نیچے بھی جنت تھی۔ ہر ماں کے پیروں کے نیچے ہی جنت ہوتی ہے۔ یہ وطن جو ہم سب کی جنت ہے۔ اس کی مٹی کو تو نے بیچ دیا تو ماں کے پیروں کے نیچے ملنے والی جنت کو بیچ دیا۔“

معلوم نہیں کیوں سراج کا اشتعال ذرا سی دیر کے لیے ایک کرب بن کے اس کے چہرے پر نمودار ہوا۔ اس کے اندر سے اذیت کی ایک لہر یوں اٹھی جیسے دل کے دورے کی بجلی جان لیوا 'وجود کو کاٹ دینے والی' احساس کے زخموں میں کرچیاں بن کے پھیل جانے والی اور درد کی انتہا تک پہنچ کے ٹوٹ جانے والی تڑپ۔ پل بھر کے لیے ایس پی کے قالب میں وحشی اور پولیس کی وردی کے کفن میں لپٹی ہوئی اس آدمی کی بے جان اور بے حس لاش میں حرکت پیدا ہوئی جو کسی ماں کا بیٹا تھا۔ یکلخت اس نے محسوس کیا کہ وہ خود اپنے لیے نہیں اپنی ماں کے لیے باعث رسوائی ہے اور اس کے چہرے پر انفعال کا سایہ اس طرح آیا اور گزر گیا جیسے چاندنی سوکھے سپاٹ صحرا پر سے ابرِ بہاراں کا سایہ گزر جائے۔

لیکن اس ایک لمحے نے سراج کے آتش فشاں سے اُبلنے والے لاوے کو روک دیا۔ وہ انسپکٹر سندر سے مخاطب ہوا۔

”سندر داس... میں... باہر ہوں...“ وہ پلٹ کے بولا۔ ”تم اس سے جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔“ اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس تماش بین کی طرح جس کو جوان بیٹے نے کسی طوائف کے کوٹھے کی سیڑھیاں اترتے دیکھ لیا ہو۔ دروازے تک جا کے وہ لوٹا اور اندر جھانک کے بولا۔ ”میں ایک سگریٹ پی رہا ہوں۔ اندر میری طبیعت کچھ گھبرا رہی تھی۔“ یہ بات کہتے ہوئے اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔

”آپ فکر نہ کریں سر۔“ سندر داس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلے تو پھر مجھے بتانا۔“ وہ بولا اور دروازے سے غائب ہو گیا۔

میرا وار کارگر رہا تھا۔ میں نے اس کے ضمیر پر نشتر چلایا تھا۔ یہ ضمیر پہلے ایک ناسور ہوگا مگر اب سرطان کا آزار بن چکا تھا۔ ناقابل علاج اور قاتل۔ اس نے سب کو مار دیا تھا۔ اس سراج کو جو ایک ماں کا بیٹا تھا۔ وہ نیک دل ماں اس بیٹے پر فخر کرتی تھی اور اس کی راستی کی قائل تھی۔ اس کی فرض شناسی کی قائل تھی اور اس کی محبت کی قائل تھی۔ وہ آج اس ایس پی سراج کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی جسے بادولادر اور کرنل جنگی نامہ جیسے شکاری جانتے تھے۔ ماں کو اپنے بیٹے کا یہ اصل چہرہ دیکھنا پڑتا تو وہ ایک آواز کے ساتھ اس کا دل ٹوٹ جاتا۔ مگر دل شکستگی کا اگلا لمحہ اس کے لیے دکھ، ندامت اور احساس جرم سے نجات کا لمحہ بن جاتا اور شاید یوم حشر اسے اپنا بیٹا بھی تسلیم نہ کرتی۔ ضمیر کے سرطان نے پولیس کے اس افسر کو مار دیا تھا جس نے ملازمت کا آغاز کرتے ہوئے فرض کی ادائیگی کے لیے جان تک دینے کا حلف اٹھایا ہوگا۔ ضمیر کے سرطان نے ایک آدمی کو مار دیا تھا جو برائی کو برائی سمجھتا ہے تو قبول نہیں کرتا۔ یُوں نے اسے ضمیر کے سرطان میں زہر کا انجکشن گھونپ دیا تھا۔ وہ مجھ سے بھی نظر ملا کے بات کرتا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“ سندر داس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ ”غدار... پہلے تم نے کسی کے لیے کچھ کیا ہے۔ تم کو اس ملک کے رہنے والوں نے فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے عزت سے جینے کا حق دیا تھا۔ یہاں تک کہ تم کو اسی وطن کے قانون کا رکھوالا بنانا منظور کر لیا تھا۔“

”غدار کا ٹھیک ہے! میری بات سنو۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ ٹھیک ہے میں ہندو ہوں۔ کافر ہوں اور ملحد ہوں۔ مگر میں غدار اور وطن فروش نہیں ہوں۔ تم مانو یا نہ مانو اس سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔ سارا زمانہ میری وفاداری پر شک کرتا ہے کیونکہ میں ہندو ہوں۔ رام اور رحیم کا یہ فرق مذہبی عقائد کا فرق ہے۔ تم نماز پڑھتے ہو میں پوجا کرتا ہوں۔ اس کا حب الوطنی سے کیا تعلق۔ یہاں تو کرپٹ بھی ہیں اور تم دیکھ لو تمہارے ہم مذہب سراج جیسے بھی...“

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ پھر میں نے کہا۔ ”یہ بھی اچھی جنس والوں کا حربہ ہے۔ ہمدردی کے جال اور اعتماد حاصل کر کے...“

”تم بیکار وقت ضائع کر رہے ہو۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”وہ آ جائے گا تو میں کوئی بات بھی نہیں کر سکوں گا۔ میں اس بات کو ثابت نہیں کر سکتا۔ دلائل نہیں دے سکتا اور ثبوت نہیں دے سکتا کہ میں بھی اتنا ہی پاکستانی ہوں جتنے تم ہو۔ تم پڑھے لکھے ہو، یہ خیال آ سکتا ہے۔ محض اس لیے مجھ سے نفرت مت کرو کہ میں سندر داس ہوں۔ ایک دن تم قائل ہو جاؤ گے کہ میں نہ غدار تھا اور نہ کسی غدار کا ساتھی۔ میں بڑی مشکل سے اس کے ساتھ یہاں تک پہنچا ہوں۔ اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے مجھے بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔ اب بھی وہ مجھے سو فیصد قابل اعتماد نہیں سمجھتا مگر وہ مجبور ہے کیونکہ اس کے ساتھ مجھے ضامن رضوی صاحب نے رکھا ہے۔“

مجھے اب بھی اس پر یقین نہیں آیا۔ ”تم ضامن رضوی کا نام استعمال کر رہے ہو۔“

”اوکے... میں بتا چکا ہوں کہ یقین کرنا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔“ سندر داس کا موڈ آف ہو گیا۔ ”تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو یا فرض کر سکتے ہو لیکن میری ایک درخواست ہے کہ سراج کے سامنے ان کا حوالہ بالکل مت دینا ورنہ میرا کام خراب ہو جائے گا۔“

”کیا کام... کیا تم اور وہ ایک ہی کام نہیں کرتے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ بظاہر ہمارا ایک ہی کام ہے۔“ سندر داس بولا۔ ”ہم دونوں پولیس میں ہیں اور جانے ہمارے فرائض کی نوعیت مختلف نہیں۔ ایک بات تمہاری معلومات میں اضافے کے لیے۔ ایس پی کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ اس کے خلاف تمام شکایات موصول ہوئی تھیں۔ مگر جاتی قوانین و ضوابط کی تمام شکایتوں پر نوٹس نہیں لیا جاتا۔ لیکن اس کی بھی ایک حد ہے۔ جب کچھ شکایات سچ ثابت ہوئیں تو ایس ایس پی نے مجھے اس کے ساتھ تعینات کر دیا۔“

”کیا وہ جانتا ہے کہ تم کو اس کی نگرانی پر مامور کیا گیا ہے؟“

”غالباً نہیں۔ میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ سندر داس نے کہا۔ ”وہ ہر وقت اور ہر جگہ مجھے ساتھ نہیں رکھتا۔ اس سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اسے شک ہو گیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پولیس میں یہ بات دوسرے لوگ بھی جانتے ہوں۔ لیکن اس کا امکان کم ہے کیونکہ تمام شکایات ذاتی طور پر ضامن رضوی صاحب کے نام ان کے گھر کے پتے پر ارسال کی گئی تھیں۔ انھوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ ان شکایات کا علم کسی کو بھی نہیں۔ مگر اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ شکایت بھیجنے والے نے کسی دوسرے اعلیٰ پولیس افسر کو بھی خطوط لکھے ہوں۔ وہ ایک ہی شخص ہے۔“

”اور اس کی شکایات کی نوعیت کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ سندر داس نے سر ہلایا۔ ”رضوی صاحب نے مجھے تفصیل سے آگاہ نہیں کیا۔ انھوں نے صرف یہ کہا کہ میں ایس پی سراج کے ساتھ ڈیوٹی دوں۔ اس کی کوئی بات مشکوک یا مشتبہ نظر آئے تو اس کی رپورٹ ذاتی طور پر صرف رضوی صاحب کو دوں اور کسی کو بھی معلوم نہ ہونے دوں کہ سراج کے خلاف شکایات ملی ہیں۔“

”پھر تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“ میں نے کہا۔

”انھوں نے تمہارا ذکر کیا تھا۔“ وہ متذبذب لہجے میں بولا۔

”کس حوالے سے؟“ میں نے کہا۔

”میں بتا نہیں سکتا۔“ وہ بولا۔ ”مگر جب میری پوسٹنگ کا پتا میرے ایک پرانے ساتھی کو چلا تو اس نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا کہ میں تمہارا خاص طور پر خیال رکھوں۔“

میں اس چکرا دینے والا انکشاف کرنے والے انسپکٹر سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر مشکل در پیش تھی کہ نہ اس کے لیے وقت تھا اور نہ یہ جگہ ایسی تھی کہ میں مفصل گفتگو کر سکتا۔ میں جرح کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ وہ پولیس کی وردی میں ایک بااختیار افسر تھا اور میں ایک قیدی۔ معلوم نہیں ضامن رضوی صاحب نے اس سے میرے بارے میں کیا کہا تھا۔ صرف میرے بارے میں کہا تھا یا لالہ، محسن اور شسلا کے بارے میں بھی کہا تھا۔ ان کے لیے ہم سب مجرم بھی تھے اور دوسرے رشتے سے ان کے مرحوم دوستوں کی نشانی بھی۔ وہ ایک پولیس افسر کی حیثیت سے ہم سب کو مجرم سمجھنے اور ہماری گرفتاری کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے پر مجبور تھے لیکن یہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ اس میں کوئی خوشی محسوس کرتے ہوں گے یا ان کے دل میں ہمارے لیے نیک اور ہمدردانہ جذبات نہیں رہے ہوں گے۔ ایک انسان کی حیثیت سے وہ یقیناً ہمارے لیے اداس ہوتے ہوں گے کہ ہم سے بھلا سا تعلق نہ رہا اور وقت نے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رکھنے کے بجائے ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا۔ انسپکٹر سندر داس سے انھوں نے میرا ذکر کس طرح کیا تھا؟ کیا وہ جانتے تھے کہ میرا اور سراج کا آمنا سامنا ہو سکتا ہے؟ ہاں! یہ ان کو یقیناً معلوم ہو گا۔ پھر انھوں نے کیا کہا ہو گا؟ یہ کہ سکندر، بخت یا محسن میں سے کوئی نظر آئے تو ان کی حفاظت کرنا؟ یا انھیں گرفتار کر لینا؟ نہیں... مگر وہ گرفتاری کی بات کیسے کہتے؟ سندر داس مجھ سے بات ہی کیوں کرتا۔ بس مجھے گرفتار کر لیتا اور سیدھا رضوی صاحب کے سامنے جا کر پیش کر دیتا۔ پھر جو کچھ پوچھنا ہوتا وہ خود پوچھ لیتے۔ یا ان کو اطلاع کر دیتا کہ سکندر، بخت اور اس کے ساتھی مل گئے ہیں۔ باقی سب ان پہ چھوڑ دیتا کہ وہ گرفتاری کا بندوبست کرتے ہیں یا خود آتے ہیں۔ سندر داس نے دوستانہ رویہ رکھا تھا۔ یہ بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔

www.paksociety.com

لیکن اس نا تجربے کے قریب میں آنے کا انجام غلط بھی ہو سکتا تھا۔

"وہ کون دوست تھا تمہارا؟" میں نے محسن کی آواز سُنی۔

"جس نے ہمارا خاص خیال رکھنے کو کہا تھا۔"

"ہمارا؟" سندرداس نے اُسے گھور کر دیکھا۔ "تم کون ہو؟ میں تم کو نہیں جانتا۔ کیا تم بھی اس کے ساتھ ہو؟"

"نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "تم یہ سوال میری طرف سے بھولو۔"

"مجھ سے اکرام شیخ نے کہا تھا۔" وہ بولا۔ "وہ پہلے پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔ بڑا اچھا اور نیک نام افسر تھا مگر ایسے افسروں کا چلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ بھی استعفیٰ دے گیا۔ اکرام شیخ نے بھی ایک ہی نام لیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ سکندر بخت کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو فوراً مجھے بتانا۔ اس نے اور کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"کیا تم اس کو اطلاع دے چکے ہو؟" میں نے کہا۔

"ابھی تو نہیں۔ لیکن بتا دوں گا۔" سندرداس بولا۔

"کیا تم نے ایس پی سراج کے بارے میں کوئی رپورٹ بھیجی ہے؟"

"ہاں۔ لیکن اس میں کوئی خاص بات نہیں۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "خاص بات مجھے معلوم ہی نہیں ہوئی۔ میں ایک انسپکٹر ہوں اور وہ ایس پی ہے۔ میرے جیسے نہ جانے کتنے انسپکٹر اس کے ماتحت ہیں۔ وہ جیسے چاہتا ہے ساتھ رکھتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ویسے تو ہم سب بارڈر ایریا کی نگرانی کرتے ہیں لیکن بارڈر بہت طویل ہے اور ہم سب ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ دن رات ڈیوٹی بدلتی ہے تو کوئی کسی طرف جاتا ہے کوئی کسی طرف۔ سراج کی مرضی ہوتی ہے کہ جسے چاہے اپنی جیپ میں ساتھ لے جائے۔ مجھے وہ کبھی نہیں لے جاتا بلکہ ہمیشہ اس کا اُلٹ ہوتا ہے۔ یعنی وہ مشرق کی طرف جاتا ہے تو میری ڈیوٹی مغرب میں ہوتی ہے۔ کئی میل دُور۔ وہ رات کو جاتا ہے تو میں دن میں بھیج دیا جاتا ہوں۔ اور وہ دن میں جائے تو میری ڈیوٹی رات کو لگ جاتی ہے۔"

"اچھا سندرداس! دیکھو تم کو ہم سے بہت مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور تم سراج کی نقل و حرکت اور اس کی مشتبہ سرگرمیوں کے بارے میں ایس پی محسن رضوی صاحب کو مستقل رپورٹیں بھیج سکتے ہو۔ ایسی رپورٹیں جو ناقابل یقین مگر درست ہوں گی۔ اور اگر تم اس مشن پر کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دینے میں کامیاب رہے تو تمہارا ڈی ایس پی بن جانا یقینی ہے۔ عین ممکن ہے تم کو خصوصی ترقی دے کر ایس پی بنا دیا جائے۔ بجائے اس کے ... سب جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔"

"مگر کون؟" وہ محسن اور شیدا جی کی طرف دیکھ کے بولا۔

"تم کو بعد میں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "میرے کچھ ساتھی بھی ہیں جو میری وجہ سے مشکل میں گرفتار ہیں۔ ہم سب ... کیوں آئی۔ اس کا جواب بھی تمہاری رپورٹوں سے ملے گا۔ لیکن یہ سب ہم اس وقت بتائیں گے جب مطمئن ہو جائیں گے کہ تم ڈراما نہیں کر رہے ہو۔"

"ڈراما؟ کیسا ڈراما؟" وہ حیران ہو کے بولا۔

"ہمارے ساتھ ہونے کا۔" میں نے کہا۔ "میں یقین نہیں کر سکتا کہ تم سندرداس ہو۔ خدا بخش ہو یا پیر بخش۔ میں آنکھ بند کر کے نہیں مان سکتا کہ تم پولیس انسپکٹر ہو اور یہ وردی اصلی ہے۔ محسن رضوی اور اکرام شیخ کے حوالے تو سراج بھی دے سکتا ہے اور کچھ اس سے بھی بڑے شکاری۔"

"شکاری... تم کیسی عجیب باتیں کرتے ہو۔" سندرداس نے کہا۔

"ناراض ہونے کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "کچھ چھپا نہیں رہتا اور جھوٹ بھی ایک نہ ایک دن کھل جاتا ہے۔ جس دن مجھے یقین آگیا کہ تم نے سب سچ کہا تھا اس دن تم میرے دوست ہو گے۔ ابھی تم بھی شکاری ہو اور یہ بھی کر سکتے ہیں شکاری ہوں۔ ہم ایک ہی شکار گاہ میں ہیں۔ ایک دوسرے سے اوجھل مگر ایک دوسرے کے تعاقب میں۔ ہم ایک دوسرے کو شکار کرنے کے لیے جال بچھاتے ہیں اور دوسروں کے پھیلائے ہوئے جال سے بچنے کی کوشش میں ہیں۔ ابھی فیصلہ ہونا ہے کہ کون شکاری تھا اور کون شکار۔ اس کا فیصلہ وقت کرے گا یا تقدیر کرے گی۔"

"مختصر بات کرو... وہ آنے والا ہو گا۔" سندرداس نے بے چینی سے باہر کی طرف دیکھا اور پھر کلائی کی گھڑی کو۔

"میں تمہارا دوست بن کے تمہارے لیے بہت کچھ کروں گا مگر یہ سب اس وقت ہو گا جب تم ثابت کر دو گے کہ تم دشمن نہیں ہو۔ غداروں میں سے ایک نہیں ہو اور خود بھی شکاری نہیں ہو۔ ابھی تو مجھے تم سے صرف ایک بات کہنا تھی... میرے بارے میں کسی کو اطلاع نہیں دو گے۔ نہ ایس پی کو... نہ اکرام شیخ کو... یہی پہلا ثبوت ہو گا۔"

سندرداس نے تفہیم میں سر ہلایا۔ "میں ایسا نہیں کروں گا۔ جب میں تم سے مل چکا تو یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی... جانتا ہے..."

"سراج کبھی محسن رضوی کو نہیں بتائے گا کہ میں یہاں ہوں اور تم نے محسن رضوی کو رپورٹ دی کہ سکندر بخت مل گیا تو ان کے آنے سے پہلے ہی تمہاری رپورٹ غلط ہو جائے گی۔ تمہیں پتا نہیں ہو گا کہ میں کہاں ہوں تو تم ان کو کیا بتاؤ گے۔ جگہ ... دیکھو گے تب بھی کچھ نہیں ہو گا۔ تمہاری رپورٹ غلط ہوگی اور بالآخر تم ناقابل اعتبار ہو جاؤ گے۔" میں نے کہا۔

"اب جو بھی ہو۔" سندرداس بولا۔ "اکرام شیخ کو میں خط بھیج ہی دیتا ہے۔ ایک آدمی لاہور جا رہا تھا۔ وہ فوراً ... لے گیا۔"

"افسوس سندرداس! تقدیر نے ہم دونوں سے ایک اچھا موقع چھین لیا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "اب تم کچھ نہ کر سکو گے... اکرام شیخ یہ بات ایس ایس پی محسن رضوی کو بتا دے گا..."

دروازے کو دستک مار کے ایس پی سراج اندر آیا۔ "بہت ... تم کو سندر... کچھ معلوم ہوا؟" وہ اب پہلے کی طرح ... تھا۔

"کچھ معلوم نہیں ہوا سر۔" سندرداس نے کہا۔ "اس کی ... ہے کہ مجھے نہیں معلوم۔"

"اور اس کے ساتھیوں سے پوچھا؟" وہ میرے سر پر آ کھڑا ہوا۔ ... تھیں مار کھاں اور علم خاں ہیں۔ رستم خاں کے ... سب۔" اس نے حسب عادت گالیاں دے کے ہر ... بیان شکن بنایا۔

سندرداس نے افسوس زدہ اور شکایتی انداز میں میری طرف ... محسن کو پتا تھی نہ ہم سب کا پہلا جھوٹ بولا تھا۔ اقرار ... پختہ ہونے سے پہلے ہی لانے کا الزام وہ مجھے دے ... نہیں کیونکہ ابھی تک مجھے اس کے کسی جھوٹ ... کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔

کسی سے کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی سر۔" سندرداس ...

"آپ کو صرف ایک بات پوچھنی تھی سندر۔" سراج نے ... کہا اور مجھے معلوم تھا کہ تم نہیں پوچھ سکو گے۔ تم گپ شپ ...

"جی یہ گپ شپ نہیں تھی۔" سندرداس پھر کٹا ہو گیا۔ ... یہ شک پیدا ہوتا ایک قدرتی امر تھا کہ کہیں ... کر تو اس کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔ اس سے اپنی ... نہیں ہوئے دی تھی مگر ایسے معاملات پر کسی تحقیق کو دفن ... کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

"اور اتنی دیر تم کیا جھک مارتے رہے۔ تم ایک نالائق اور ..." سراج نے برہم ہو کے کہا۔ "معلوم نہیں کس آلو ... تمہاری سفارش کی تھی کہ تمہیں..."

"... پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں کسی کی سفارش سے ... نہیں ہوا تھا۔" سندر نے اس کی بات کاٹ دی۔ "... تو یہ آپ کی رائے ہے سر ... نہیں کروں گا لیکن آپ جب بھی مجھے سفارشی ... تردید ضرور کروں گا۔ یہ میرے لیے زیادہ ناقابل ... آپ تصدیق کر سکتے ہیں کہ میں میرٹ پر سلیکٹ ... ہوا ہوں ... تم اپنے آفیسر کو بھی آئینہ دکھانے پر آ گئے ہو۔"

سراج کا چہرہ بگڑ گیا۔ "مجھے تمہاری یہ خود سری اور بحث کی عادت بالکل پسند نہیں ہے اور میں اسے ان ڈسپلن سمجھتا ہوں۔ تم کو مجھ سے ابھی رپورٹ لینا ہے تو خود کو اچھا ثابت کرتا ہو گا انسپکٹر..."

"یس سر! میں خوشامد کر کے آپ کو خوش نہیں کروں گا کہ میرے بارے میں جھوٹی رپورٹ دیں۔" سندرداس نے مؤدبانہ لہجے میں کہا مگر یہ سراج کی بات کے جواب میں ایک اور طنزیہ اور معنی خیز بیان تھا۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ تم کیا پوچھتے رہے ہو؟" سراج نے جھنجلا کے کہا۔ "تم نے ابھی کہا تھا کہ کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی۔ اور کیا کام کی باتیں معلوم کرنا تھیں تم کو؟ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تم کو یہاں اکیلا چھوڑنا میری غلطی تھی اور تم بھروسے کے قابل نہیں ہو۔"

"یہ میری بدقسمتی ہے سر..." سندرداس نے جذبات سے عاری اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ان کے یہ اختلافات اور باہمی کشیدگی کو ظاہر کرنے والا رویہ ثابت کرتا تھا کہ سندرداس نے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی مگر میرا فریب خوردہ ذہن اتنی جلدی اعتبار کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مجھے ایک شک کی خلش اس وقت بھی ہوشیار کر رہی تھی کہ کہیں یہ گفتگو بھی ڈرامے کے پہلے سے طے ہوئے ڈائیلاگ پر مشتمل نہ ہو۔ میں جانتا تھا کہ مولا داد کتنا بڑا ڈراما آرٹسٹ ہے۔ اس کی پوری شخصیت ایک ڈراما تھی۔ وہ خود بہترین اداکار تھا اور کسی بھی صورت حال کو ناقابل یقین حد تک ڈرامائی بنا سکتا تھا۔ پھر اس ڈرامائی صورت حال کو حقیقت میں ڈھال سکتا تھا اور اپنے فائدے کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ سراج اور انسپکٹر سندرداس کو خود اسی نے یہ ڈائیلاگ رٹائے ہوں تاکہ سراج اور انسپکٹر سندرداس کی چپقلش کھل کر سامنے آ جائے اور میں انسپکٹر سندرداس پر یقین کرتے ہوئے اسے رازداری کا اہل سمجھ لوں۔ میرا ذہن شک کی بیماری میں مبتلا تھا تو اس کے اسباب تھے۔ میں بقول مرزا غالب "ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں" اس بیماری سے شفا میں چاہتا بھی نہیں تھا۔ ہر بات پر شک کرنے سے میری احتیاط پسندی کی عادت راسخ ہوتی جا رہی تھی۔ ہر وقت کوشش کر اور ہر چیز کو دیکھ کر اعتبار کر لینے کی عادت مجھے نقصان پہنچا سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے سراج کی اور سندرداس کی رنجش آمیز گفتگو سے کچھ غلط امیدیں وابستہ کرنے سے گریز کیا۔

سراج کی ایک اور لات پڑی تو میں بے اختیار چلایا کیونکہ ضرب میرے پیٹ میں آئی تھی۔ میں وہیں پیٹ پکڑ کے لوٹنے لگا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرا جگر یا گردے اس چوٹ سے متاثر ہوئے ہیں۔ سراج نے میرے ایک اور لات ماری "مر جاؤ"

www.paksociety.com

"…کل کے مرتے آج مر جاؤ۔" وہ گال سہلاتے ہوئے بولا۔ "میری جاب کو بھی پروا نہیں۔"

"سر… پلیز خیال رکھیں…" سنند بولا۔

"شٹ اپ۔" سراج نے دہاڑ کر کہا۔ "تنگ آ چکا ہوں میں تم سے… تم خود کو کیا سمجھتے ہو آخر۔ میرے افسر ہو تم یا میرے باپ ہو؟ جو آئندہ مجھے ٹوکا…"

"میں آپ کی بھلائی کے لیے…"

"نہیں چاہیے مجھے تمہاری بھلائی۔" سراج نے اسی لہجے میں کہا۔ "اپنی بھلائی کو اپنے پاس رکھو… اور یہ کبھی مت بھولو کہ میں تم سے بہت بڑا افسر ہوں۔ میں تم کو خوش رکھنے کا پابند نہیں ہوں… میری نوکری… میرا مستقبل تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے… لیکن میں تمہارا بیڑا غرق کر سکتا ہوں۔ میری رپورٹ تمہارے کیریئر کو تباہ کر دے گی۔ نوکری کے… روٹی کے اور زندگی کے لالے پڑ جائیں گے تم کو۔"

"آپ مجھے نکال کر جکڑ دیں کہ میں سروس کے قابل نہیں تو میں ابھی اپنا استعفا لکھ کر آپ کو دے دوں گا۔" سنند داس نے سرکشی سے کہا۔ "لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ آپ مجھے نوکری سے نکلوا دیں گے تو یہ آپ کی بھول ہے سر… مجھے بھی بچانے والے ہیں… میں آپ کا ذاتی ملازم نہیں ہوں اور یہ وردی وہ نہیں ہے جیسی آپ نے اپنے شوفر کو سلوا کے دی ہوگی۔ یہ سرکاری وردی ہے سر… آپ دیکھیں گے کہ میری نوکری رہے گی۔ مجھے کھانے کو روٹی بھی ملتی رہے گی۔ اور موت سے پہلے میری زندگی کی حفاظت بھگوان کریں گے۔"

سراج غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ شاید اس کے کسی ماتحت نے کبھی یوں کھل کر اس سے بات نہ کی ہوگی۔ عین ممکن تھا کہ وہ پھر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا لیکن نہ جانے اس نے سنند داس کی آنکھوں میں کیا دیکھا کہ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور رک گیا۔ کچھ دیر اپنے ہونٹ کاٹتا رہا اور اسے خوں آشام نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر وہ میری طرف پلٹ گیا۔

"سکندر اعظم کے نطفے… میں صرف ایک بار پوچھوں گا اس کے بعد بھی جواب نہ ملا تو میں دوسرے طریقے اختیار کروں گا جن سے تم اچھی طرح واقف ہو۔" وہ طنزیہ اور تلخ لہجے میں بولا۔ "سیدھی طرح بتا دو کہ نازو کہاں ہے؟"

"میری آخری اطلاعات کے مطابق نازو اپنے گھر پر تھی۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد کہاں گئی [illegible] تم نے مجھے گھما کے بات ماری…"

میں تڑپ گیا۔ ایس ایس پی صاحب رضوی صاحب نے کہا تھا۔ نازو کو گھر بھیج دیا جائے تو شملا کو وہ اپنے گھر لے جائیں گے۔ اور ان کا یہ علم ملنے کے بعد ہم نے ایسا ہی کیا تھا۔ نازو کو پولیس اسٹیشن سے اپنے گھر لے گئے تھے اور ہم نے گھر سے پوچھا تھا تو معلوم ہوا تھا کہ وہ گھر پہنچ چکی ہے۔

"آخر دیر سے تم یہی کہے جا رہے ہو۔" سنند نے اپنا منہ [illegible] دیا۔ "اے بھائی! یہ سب تو ہمیں پہلے سے معلوم ہے کہ بعد میں وہ کہاں گئی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے اس انکشاف پر [illegible] حیرت کو چھپا لیا۔

"پھر وہی! مجھے نہیں معلوم۔" سنند نے آگے بڑھ کر گلا دبوچ لیا اور میرے [illegible] کئی زوردار تھپڑ رسید کیے۔ "سب معلوم ہے۔ تمہاری ہدایت پر وہ واپس گئی تھی۔ اس کو سمجھا دیا تھا کہ جب شملا کو ایس ایس پی صاحب [illegible] تو تم گھر سے باہر بیٹھ کے نکل آنا۔ کہاں بلایا تھا تم نے [illegible]"

سنند داس نے مجھے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ جو [illegible] کسی کے علم میں نہیں تھا۔ نازو کا پھر نکل جانا اس کی توقعات سے ہم آہنگ تھا۔ وہ قید میں رہنے والی لڑکی نہیں تھی۔ ماں باپ اور بھائی اسے زنجیروں سے باندھ کر رکھنے کی بات کر سکتے تھے اور شاید وقتی طور پر اسے باندھ بھی سکتے لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے ہمیشہ چند کمروں میں بند دروازوں کے پیچھے نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ جس لڑکی کو رشتوں کی پروا ہی نہ ہو اس کی راہ میں کون حائل ہو سکتا ہے۔ یہ بات مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھی کہ وہ جتنی آسانی سے جانے کو تیار ہو گئی تھی، اتنی ہی آسانی سے وہ واپس آنے کا فیصلہ کر چکی ہوگی۔ اس کا مقصد شملا کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔ اس نے ایس ایس پی صاحب کی عائد کردہ شرط قبول کر لی تھی اور ایک شرط پوری بھی کر دی تھی۔ اس نے یہ شرط قبول نہیں کی تھی کہ اس کے بعد وہ تمام عمر گھر سے نہیں نکلے گی۔ رضوی صاحب نے یہ ضمانت طلب کی تھی کہ بعد میں بھی نازو کو گھر میں [illegible] ورنہ جس وقت وہ دوبارہ نکلی اسی وقت شملا کو پھر پولیس کی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ شملا کو پولیس کے پاس کبھی نہ چھوڑتے۔ خواہ نازو واپس [illegible] نہ جاتی۔ سوال یہ تھا کہ نازو دوبارہ گھر سے کب نکلی اور کدھر گئی؟

"بولو… تم نے اس سے کہاں آنے کو کہا تھا؟" سنند نے [illegible] گردن کو جھنجھوڑا۔

"میں نے اسے کہیں بھی آنے کو نہیں کہا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ اتفاق تھا کہ وہ قریب آئی جہاں سے مجھے پکڑا گیا تھا۔"

"تمہارا ایک اور ساتھی بھی تھا۔ مرزا غالب۔" سنند نے میری گردن چھوڑ دی۔ "وہ کہاں ہے؟"

"وہ اپنے گھر میں مر گیا تھا۔" میں نے [illegible]

"یہ جھوٹ ہے۔" سراج نے میرے سر پر مکا مارا۔ "وہ اندر نہیں تھا۔ وہ اندر ہوتا تو جل کے مر جاتا اور ہمیں اس کی جلی ہوئی لاش ملتی۔ یا وہ جان بچانے کے لیے باہر نکلتا تو ہمارے ہاتھ لگتا…"

"پھر وہ غائب ہو گیا ہوگا… بھوت بن کے۔" میں نے شدت تکلیف کے باوجود کہا۔ میرے لیے یہ بہت بڑی خوش خبری تھی کہ غالب نہ صرف یہ کہ بچ گیا تھا بلکہ وہ کسی کے ہاتھ بھی نہیں آیا تھا۔ ہم سب کے لیے یہ بھی ایک خبر تھی کہ جنہوں نے اس کوٹھی کو آگ لگا دی گئی تھی۔ وہ غالب کے باپ کا گھر تھا جو غالب کی وجہ سے جل کے خاک ہوا۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

"مجھے معلوم تھا کہ یہ حرامزادہ آسانی سے نہیں بتائے گا…" سراج اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم کو بتانا تو پڑے گا۔" سنند نے کہا۔ "اچھا ہوتا اگر تم پہلے بتا دیتے اور زیادہ سختی سے بچ جاتے۔"

"کیا تم کو معلوم ہے سکندر کہ اس وقت رابعہ اور وہ عورت جو اپنا نام کشور بتاتی ہے…" سراج بولا۔ "کہاں ہیں؟"

"وہ ایسے ہی خصوصی رہائشی [illegible] اور تم لوگوں کی مہمان نوازی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"نہیں… اس وقت وہ آرام سے ہیں۔" سراج نے کہا۔ "ان دونوں کو ایک بیڈ روم دے دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ باتھ بھی ہے۔ انھیں کھانا بھی اچھا دیا گیا تھا لیکن انھوں نے کھایا نہیں… خیر… سب تک نہیں کھائیں گی۔ جب ہم ان کو تمہارے متعلق بتائیں گے کہ تم بہت آرام سے ہو۔ تو وہ کھا لیں گی۔ مگر اس کے بعد وہ آرام سے نہیں رہ پائیں گی۔" وہ کمینگی سے ہنسا۔ "یہ سب کچھ باری باری ہوگا۔ ابھی تم آرام سے نہیں ہو۔ اور آج یا کل رات وہ اپنی آنکھوں سے تفتیش ہوتے دیکھیں گی — جیسے آپریشن تھیٹر کے باہر سے کوئی اپنے کسی عزیز کا [illegible] جان لیوا اور تکلیف دہ آپریشن ہوتا دیکھے۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ کوئی ماں اپنے بیٹے یا بہن اپنے بھائی کے جسم پر نشتر چلتے… اس کا خون بہتے اور اس کے کٹے پھٹے جسم یا سر کو نہیں دیکھ سکتی اور جہاں معاملہ محبوب کا ہو…" اس نے ایک شیطانی قہقہہ مارا۔ "تو بھلا کون لڑکی اپنے محبوب کی اذیت برداشت کر سکتی۔ فرض کرو کہ تم الٹے لٹکے ہوئے ہو۔ لہولہان ہو اور [illegible] ہو… بالکل بے لباس؟"

[illegible] نے غضب ناک لہجے میں [illegible] "میں [illegible] ایسی باتوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں مگر تم دیکھ لو گے کہ رابعہ تمہاری توقع سے زیادہ قوت برداشت رکھتی ہے… تمہیں مایوسی ہوگی۔"

"چلو یہ بھی کیا جواب ہے۔" سراج بولا۔ "یہ تو معلوم ہو جائے گا مگر اس کے بعد بساط الٹ جائے گی… نہیں… شاید میں غلط محاورہ استعمال کر گیا۔"

"محاورہ غلط نہیں تھا۔ تمہارے منہ سے سچ نکل گیا۔" میں نے کہا۔ "خدا نے چاہا تو واقعی بساط الٹ جائے گی۔"

"یہ لفظوں کا ہیر پھیر ہے۔" سراج بولا۔ "اصل بات یہ ہے کہ اس کے بعد نقشہ بدل جائے گا۔ جو تماشا تھے وہ تماشائی ہوں گے۔ اور جو تماشائی تھے وہ تماشا ہوں گے۔ تمہاری قوت برداشت کتنی ہے؟"

"تم کو اندازہ ہو جائے گا۔" میں مسکرایا۔

"مجھے تو ہے… تم کو پہلی بار ہوگا۔" وہ بولا۔ "میں نے تمہاری پاکستان تشریف آوری پر تمہارا خیر مقدم کیا تھا۔ اس رات تمہاری قوت برداشت دیکھ لی تھی پھر یہ مسئلہ ذرا زیادہ ہی سنگین ہے۔ کیا تم اپنی جگہ رابعہ کو تصور کر سکتے ہو۔ اسی حالت میں جیسا کہ میں نے بیان کیا تھا۔ سر کے بل معلق۔ اس طرح تم نے پہلے کبھی اسے نہ دیکھا ہوگا۔ جیسے وہاں ہم سب دیکھیں گے اور یہ تو کہنے کی بات ہی نہیں کہ جتنا ایک مرد کے ساتھ ہو سکتا ہے اس کا دس گنا ایک عورت کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ مرد کے مقابلے میں عورت کا جسم… ایک خوب صورت جوان عورت کا نازک جسم اذیت میں کس طرح رقص کرتا ہے۔ کیسے بل کھا کے تڑپتا ہے اور کتنے دلچسپ تجربات کی آماجگاہ بنتا ہے۔ اس پر تم غور کرو تو تمہیں نازو اور مرزا غالب کے بارے میں بتا دینا بہت آسان لگے گا۔"

وہ حرامزادہ میرے جذبات پر گندے الفاظ کے [illegible] نشتر چلا رہا تھا۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ ذہنی اذیت دے کر میرے اعصاب کو شکست دینا چاہتا تھا لیکن میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس دباؤ کو برداشت کروں گا۔ وہ بولتا رہا۔ اس نے بے شرمی اور بے حیائی کی انتہا کر دی۔ وہ صد درجہ فحش زبان میں بتاتا رہا کہ رابعہ کے ساتھ کیا ہوگا۔ محسن کی حالت بھی غیر تھی اور ان باتوں پر اس نے بھی کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تو یہ اس کی ہوشمندی تھی۔ اس شیطان کو جواب میں گالیاں دینا یا اس پر چیخنا چلانا بے سود تھا۔ شیدی نسبتاً کم ہمت آدمی تھا۔ اس نے سراج کو بڑا بھلا، گالیاں دیں۔ اس کی ماں اور بہن کو بیچ میں گھسیٹ لایا اور جاتے منع کرنے کے باوجود چلاتا رہا کہ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہوا تو یہ کر دوں گا اور وہ کر دوں گا۔ سراج کے لیے اس کا یہ ردعمل بھی تسکین کا باعث بنا کیونکہ ہم نے اسے مایوس کیا تھا وہ زیادہ مزے سے کرخت لہجے میں شیطانی باتیں کرتا رہا۔

www.paksociety.com

رہا کر شہلا اس کے ہاتھ نہ لگی ورنہ زیادہ مزہ آتا۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ ایک ہی جگہ ڈبل پروگرام چلتا۔ جس کا جدھر دل چاہے دیکھے۔

بالآخر وہ دفع ہوا اور ہم سب کچھ دیر زمین پر سر رکھے پڑے رہے۔ اگر ہمیں سو سو درے مارے جاتے تو وہ ہماری حالت نہ ہوتی جو اس کی باتوں سے ہوئی تھی۔ بے حیائی کی یہ باتیں ہم نے سن تو لی تھیں مگر اب ہم میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ایک دوسرے سے نظر ملا سکیں۔ ہم سب شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے۔ سب ایک ہی بات سوچ رہے تھے اور ڈر رہے تھے۔ اگر سچ مچ ایسا ہوا تو کیا ہوگا۔ اور خود کو سمجھا رہے تھے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ ٹیڈی رو رہا تھا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو چکا تھا۔ گالیاں دینے اور چیخنے چلانے کے بعد وہ اپنی بے بسی کے احساس سے ہار گیا تھا۔ حقیقت نے اپنا وجود تسلیم کرا لیا تھا کہ جو سب کچھ کر سکتے ہیں وہ آج آزاد ہیں اور طاقتور ہیں اور ہم صرف امید کا سہارا لے سکتے ہیں۔ خود کو فریب دینے کے لیے اور ناقابل تصور حالات کا حقیقی روپ دیکھنے کا حوصلہ پیدا کرنے کے لیے۔۔۔ دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں۔ وہ بھی ہو سکتا ہے جو سراج نے کہا تھا۔

"استاد۔۔۔" بالآخر میں نے سر اٹھا کے کہا۔ "تم تو بہت بزدل نکلے یار۔"

"قسم مولا علی کی سکندر بادشاہ۔" وہ روتے روتے بولا۔ "اس گھٹیا کی زبان کاٹ دیتا پر ہاتھ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ورنہ میں اس کا حلق تک سے چیر کے رکھ دیتا۔ میں تو اتنا مجبور تھا کہ خود اپنے کان تک بند نہیں کر سکتا تھا۔ جن میں وہ حرام زادہ اتنی گندگی ڈال گیا۔"

"گندے الفاظ جس منہ سے نکلتے ہیں وہ منہ گندا ہوتا ہے یہ بات تو مجھے بچپن میں بتائی گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "سننے والے پر گندگی نہیں آتی۔"

"کیا واقعی نازو پھر اپنے گھر سے نکل گئی؟" محسن اچانک بولا۔

"وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور جب وہ گئی تھی تو۔۔۔ مجھے یاد ہے وہ فوراً چل پڑی تھی۔۔۔ اس نے کسی قسم کے تذبذب کا اظہار نہیں کیا تھا۔۔۔ بالکل سوچا نہیں تھا۔"

"ہاں۔۔۔ غالباً وہ طے کر چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔" محسن بولا۔ "اسے جانا تھا اور جانے کی شرط پوری کرتے ہی پھر آ جانا تھا۔"

"لیکن وہ آئی بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ سب سے بڑی پریشانی کی بات ہے۔" محسن بولا۔ "اسے تو معلوم تھا کہ ہم یہاں ہیں۔ وہ کسی اور جگہ نہیں جا سکتی تھی۔"

"پھر کیا ہوا آخر؟"

میں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ "ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔۔۔ حادثہ۔۔۔"

"اونہوں۔ حادثہ پیش آتا تو بالآخر اس کے والدین کو خبر ہوتی اور انکل رضوی کو خبر مل جاتی۔ ان کو بھی معلوم ہو جاتا کہ کیا ہوا؟ ان لوگوں نے پہلے سارے اسپتال چھان مارے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے نازو کو تلاش کرنے والوں نے۔"

"کیا یہ سندر داس۔۔۔ واقعی اکرام شیخ کا دوست ہوگا؟"

"ہو بھی سکتا ہے۔ ابھی تک میں طے نہیں کر سکا کہ وہ کس حد تک سچ بول رہا تھا۔" محسن نے کہا۔ "میرا دماغ نوے فیصد ووٹ اس کے حق میں دیتا ہے تو دل تیس فیصد خلاف بھی ہے۔"

"غالباً یہی مناسب ہے۔" میں نے کہا۔ "سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انکل رضوی نے اسے صرف ہیڈ کوارٹر سے ملی بتایا؟ تیرے اور شہلا کے بارے میں کچھ نہیں کہا؟"

"یہ ہے ذرا عجیب سی بات۔" محسن بولا۔ "کہ وہ مجھے اور ٹیڈی کو نہیں پہچان سکا۔"

"حالانکہ اس نے غالب اور نازو کی بات کی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس کو یہ نام معلوم تھے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ باقی سب کے نام وہ نہ جانتا ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ صرف نام جانتا ہے پہچانتا کسی کو نہیں۔" محسن بولا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ سراج تو اسے دور دور رکھتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کی راہ میں کہیں حائل نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"پھر وہ اس کو تفتیش کے لیے اپنے ساتھ کیوں لایا؟" محسن نے ایک منطقی سوال کیا۔ "وہ اپنے کسی قابل اعتماد انسپکٹر کو بھی تو لا سکتا تھا جس سے افشائے راز کا بالکل ڈر نہ ہوتا۔"

"اس کی باتوں نے مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "آخر انکل رضوی نے سکندر کے بارے میں اس سے کیا بات کی تھی؟ میری باتیں بتائی ہوں گی کہ یہ سکندر ایک مفرور مجرم ہے اور بہت خطرناک ہے۔ اگر تم کو نظر آئے تو فوراً گرفتار کر لینا یا گولی مار دینا۔ اور اگر کچھ نہ کر سکو تو مجھے اطلاع دے دینا۔ میں سارا انتظام کروں گا۔۔۔ نہیں محسن! انھوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ انھوں نے کہا ہے کہ تم سکندر بخت کی حفاظت کرو گے کیونکہ وہ سراج کے ہاتھ پڑ سکتا ہے۔ سندر داس کو سراج کے خلاف شکایات کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ حقیقت کیا ہے یہ تو انکل رضوی بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ سندر داس کو ثبوت حاصل کرنے ہیں تاکہ وہ سراج پر ہاتھ ڈال سکے۔ غالباً انہی شکایات کے باعث انکل رضوی کو معلوم ہوا ہوگا کہ ہم کس چکر میں ہیں اور کس کے خلاف لڑ رہے ہیں جو بات ہم نے ان کو نہیں بتائی تھی وہ کسی نے انھیں خطوط میں بتا دی۔ کچھ باتیں پہلے سے معلوم تھیں یا انکل رضوی نے دو اور دو کو جوڑ کر جواب

نکال لیا۔ غالباً اب وہ ہمارے دشمن کو سمجھتے ہیں اور اس کو راز رکھنا چاہتے ہیں۔ خود کو ملوث کیے بغیر بالواسطہ طور پر ہماری حفاظت کے انتظامات بھی کر رہے ہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ ہمارے دشمن نہیں ہیں۔" محسن بولا۔ "جب وہ شہلا کو لے گئے تھے تو مجھے شک ہوا تھا کہ یہ مہربانی بے سبب نہیں۔"

"وہ بے حد ذہین آدمی ہیں۔ انھوں نے تسلیم کر لیا ہوگا کہ قانون کے دائرے میں رہ کے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم مجبور تھے بالواسطہ اختیار کرنے پر۔ قانون کی تمام قوت ان کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے دلاور اینڈ کمپنی کا کیا بگاڑ لیا؟ آج تک ایم ایچ ٹیوڈی انجینئرنگ کمپلیکس پر چھاپا تو مار نہیں سکے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دلاور اینڈ کمپنی سے تصادم کا کوئی فائدہ نہیں۔ الٹا ہوگا یہ کہ یہ سب لوگ جن کے ہاتھ بہت لمبے اور خوف سے بہت بھرے ہوئے ہیں، ان کو اپنے راستے سے ہٹوا دیں گے۔ ان کی پوسٹنگ کسی دور دراز جگہ کرا دیں گے، اتنی دور جہاں بیٹھ کے وہ کچھ نہ کر سکیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں ترقی دے کر ہیڈ آفس میں بٹھا دیا جائے انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے۔ جو اختیارات ایک شہر کا ایس ایس پی رکھتا ہے وہ ہیڈ کوارٹر کا ڈپٹی آئی جی بھی نہیں رکھتا۔ پھر وہ ہمیں تحفظ فراہم کر سکتے تھے اور نہ ہماری مدد کے لیے کسی سندر داس کو بھیج سکتے تھے۔"

"تیرا خیال دل کو لگتا ہے۔" محسن بولا۔ "انکل رضوی کو اب حقیقی صورت حال کا پتا چل گیا ہے۔ انھوں نے ہمارے سامنے بکھرے ہوئے جرائم کو اسی لیے نظر انداز کر دیا ہوگا کہ یہ سب کچھ ہم نے شوقیہ نہیں کیا تھا بلکہ ایک مقصد کے حصول کی خاطر کیا تھا۔ مقصد بہت بڑا ہے اور دشمن سے جنگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ میدان جنگ میں سپاہی اپنی بندوق کا بے دریغ استعمال کرتا ہے۔ دشمنوں کا قتل عام کرتا ہے مگر اسے پھر بھی بہادر کہا جاتا ہے۔ وہ ایک پوری بٹالین کا صفایا کر دے، ایمونیشن ڈپو اڑا دے یا پھر کسی بستی کو تباہ کر دے جہاں دشمن کا ٹھکانا ہو، تو اس سے باز پرس نہیں ہوتی۔ اسے تمغہ ملتا ہے۔ بہادری اور جرأت کے کارنامے گنوائے جاتے ہیں۔ انکل رضوی نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہم ایک بہت خطرناک دشمن کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ اور یہ ایسا دشمن ہے جس سے وہ نہیں لڑ سکتے۔ فوج نہیں لڑ سکتی۔ پولیس نہیں لڑ سکتی اور عوام نہیں لڑ سکتے۔ منتشر لوگوں سے نہیں یہ وہ لڑی جانے والی جنگ ہے۔ اگر انھوں نے ہمارے بارے میں ملنے والی ساری خبروں پر غور کیا ہوگا تو اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ ہم جس جنگ میں ہیں زیادہ عقل کی ایسی بات ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ انھوں نے اخبارات کی خبروں کو دیکھا ہوگا۔ گو کہ ماضی کے

تباہ ہو جانے والے اڈے کے بارے میں تفتیشی رپورٹ دیکھی ہوگی۔ پھر انھیں کرماں والی اور صالحیں یا پڑوالے کے اسلحہ خانے، وہاں سے حاصل ہونے والے ہیروئن کے ٹکڑوں، اسلحے کے نمونے اور ماہرین کی رپورٹ ملی ہوگی۔ انھیں حشمت خان، سراج اور ڈی سلوا کی پرانی کوٹھیوں میں بیٹھنے والے نام نہادوں کی تفصیلی رپورٹ مل گئی ہوگی۔ ممکن ہے کہ حشمت خان کو وہ نہ جانتے ہوں مگر سراج کے خلاف تو پہلے ہی ان کو شکایات مل رہی تھیں۔ وہ ڈی سلوا کے نام سے بھی واقف تھے اور اس کی کوٹھی میں بھی اسلحہ تھا۔۔۔"

"خیر یہ سراج کے خلاف شکایات کون ارسال کرتا رہا؟"

"اسی کا کوئی دشمن۔" میں نے کہا۔

"ساتھی بھی ہو سکتا ہے۔" محسن بولا۔ "ایسا ساتھی جو مال حرام کی غلط تقسیم یا کسی کے غلط رویے کے باعث ان کے خلاف ہو گیا ہو۔"

"یا جس کو بالآخر ضمیر کی خلش نے مجبور کر دیا ہو۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ یہ بھی ایک امکان ہے۔" محسن بولا۔

"سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے اچانک کہا۔ "مجھے معاف کر دو۔"

میں چونک کے رہ گیا۔ "کس بات پر۔۔۔ یہ کیا ہے خواجہ صاحب؟"

"وہ خط میں نے ڈالے تھے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تم سے پوچھے بغیر۔۔۔"

اگر اس تہ خانے میں بم پھٹ جاتا تو ہم اتنے حیران نہ ہوتے جتنے ٹیڈی کے لبوں سے نکلنے والے ایک جملے سے ہوئے۔ کچھ دیر ہم دم بخود بیٹھے ٹیڈی کو دیکھتے رہے۔

"تم نے۔۔۔ تم نے ایس ایس پی ضامن رضوی کو خطوط ارسال کیے تھے؟" میں نے بہت دیر بعد کہا۔

"ہاں سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی سر جھکا کے بولا۔ "میں بہت بے وقوف ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن پتا نہیں کیوں جس دن مجھے یہ خیال آیا اس دن کے بعد پھر آسیب ہو گیا۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے یہی خیال ستانے لگا کہ مجھے تمہارے انکل رضوی کو سارے حالات سے باخبر رکھنا چاہیے۔ وہ کب تک یقین نہ کریں گے بالآخر ان کو سوچنا پڑے گا۔ وہ بڑے افسر ہیں۔ تفتیش کریں گے تو سچ سامنے آ جائے گا۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بے وقوف اور جاہل نظر آنے والے استاد ٹیڈی نے ایک ایسا کام کیا تھا جو ہم افلاطون نہ کر سکے تھے۔ اس کی بے وقوفی یہ تھی کہ وہ اب بھی شرمندہ تھا جبکہ اس کی وجہ سے ہماری پوزیشن صاف ہو گئی تھی یا انکل رضوی کا ہم پہ اعتماد بحال ہو گیا تھا اور ان کی نظر سچ کو دیکھنے لگی تھی۔

www.paksociety.com

"میں نے تم سے اس لیے تذکرہ نہیں کیا تھا۔" وہ اب بھی اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ "کہ تم مجھے روک دو گے۔ اور نہ جانے میرے اندر کون سی آواز تھی جو کہتی تھی کہ ٹھیک ہے... یہ نیکی ہے۔ یہ نیکی ہے۔ ایسا ضرور کر... پھر میں نے تم سب سے چھپ چھپ کے خط لکھنے شروع کیے... میں وہ سب لکھتا گیا جو میرے نزدیک سچ تھا۔ جو کچھ ہم نے کیا تھا، جو مجھے معلوم تھا۔ میں نے کسی کا نام نہیں لکھا مگر واقعات سب لکھ دیے وہ سب لکھ دیا جو ہم جانتے تھے۔ اور پھر یہ خطوط مختلف مقامات سے پوسٹ کرتا رہا۔ میں پولیس کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ یہ میں نے خطوں میں بھی لکھ دیا تھا۔ اور اسی لیے میں نے سارے خط ان کے گھر کے پتے پر بھیجے تھے۔"

میرے کان ہیڈی کی آواز سن رہے تھے۔ یہ آواز عجیب تھی جس نے ہیڈی سے کہا تھا کہ اپنی تلاش اور دیکھ... اس بچی آواز کی طرح جس نے ایک اُمّی رسولؐ سے کہا تھا کہ پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا۔ اور اب وہ آواز مجھ سے مخاطب تھی۔ "دیکھو! تم صراط مستقیم پر تھے۔ اس لیے ہم نے تمہاری حفاظت کی اور تم کو ہدایت دی، عقل دی اور بصیرت دی کہ تم اپنے نفع نقصان کو سمجھ لو۔ اور تم کو روشنی دی اور زبانت دی۔ حوصلہ دیا اور وہ سب کچھ دیا جو تم نے چاہا۔ تمہارے مانگنے سے پہلے تم کو دیا۔ تم کو دنیا سے متعارف کرایا۔ تمہارے نام پر ہر تقصیر بخشی اور تم کو سارے رشتوں سے محروم کیا مگر کیا ہم نے تمہارے بیٹے دلوں میں محبت کم کی؟ ہم نے تم کو زیادہ مخلص اور سچے رشتے دیے اور وہ محبت دی جو ہم اپنے خاص بندوں کو دیا کرتے ہیں۔ پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔"

میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میری ساری طاقت تو سب سے مجبور ہے۔ میں نے عاجزی سے اعتراف کیا۔ یہ سب سچ تھا۔ ا تھا .... سب پر اکتفا کر رہا تھا۔ انکل رضوی کو قتل کر لیا تھا اور ان کو پھر ہمارا معاون و مددگار بنا دیا تھا۔ سندر داس کی باتوں کا ثبوت مل گیا تھا کہ اسے خاص رضوی نے بھیجا تھا اور اکرام شیخ نے اسے بطور خاص میرا خیال رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ یہ سب تائید ایزدی تھی کہ اس نے ایک غیر مسلم کو ذریعہ بنایا اور اپنی قدرت کاملہ کا ایک اور ثبوت فراہم کیا حالانکہ اس قادر مطلق کے اختیار میں سب کچھ ہونے کا یقین، ایمان ہے اور اس پر کوئی شک کرنے والا نہیں۔

"... اور میں نے یہ اس لیے کیا کہ میرا ہینڈ رائٹنگ رضوی صاحب بالکل نہیں پہچان سکتے۔ میں وہ خط لیا ہی اور کا خط بدل کے لکھتا تھا۔ اور کبھی ایک جگہ سے ڈالتا تھا تو کبھی دوسری جگہ سے۔" ہیڈی کا اعتراف جرم بھاری تھا۔

"تو اب تم کس بات پر شرمندہ ہو؟" میں نے کہا۔ "شرمندہ تو میں ہوں کہ کچھ کر نہیں سکتا ورنہ اس وقت اُٹھ کر تمہارا چہرہ چوم لیتا اور تمہارے ہاتھوں کو بوسہ دیتا۔ تم نے تو وہ کام کیا جو سکندر سے نہ ہوا۔ یہ سب تمہاری کوشش کا نتیجہ ہے کہ ہمیں ایک بہت بڑی اور خوشگوار تبدیلی آئی ہے۔ ایس ایس پی خاص رضوی اب ہمارے ساتھ ہیں اور ہمیں ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ سب کچھ سنبھال لیں گے۔ تم نے چاہا تو ان کی تائید بھی حاصل ہو گی۔ وہ پولیس کو ہمارے تعاقب سے ہٹا سکتے ہیں۔ ہمارے کیس داخل دفتر کرا سکتے ہیں۔ عدالتی کیس تو وہی ایک ہے۔ میر شرافت علی کے قتل کا۔ اور اس میں اب جان کہاں رہی ہے۔ قاتل نے مرتے وقت اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا۔ جس دن بھی ہم عدالت میں پیش ہوں گے عدالت کی رسمی کارروائی کے بعد باعزت طور پر بری ہو جائیں گے۔"

"تم نے بہت بڑا کام کیا ہے استاد... تم واقعی استاد ہو گئے ہو۔" ہیڈی نے کہا۔ "مجھے تسلی کی طرف سے اطمینان حاصل ہو گیا ہے۔ اور اب تو مجھے لگتا ہے کہ اکرام شیخ بھی سندر داس کے پیچھے پیچھے ہوگا۔ انکل رضوی نے اسے ضرور سمجھا دیا ہوگا کہ حقیقت کیا ہے۔ وہ مستعفی ہو چکا ہے۔ وہ ہمارا ساتھ دے سکتا ہے۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔" میں نے مسرت سے کہا۔ "یہ بھی ممکن ہے کہ نازو نے اپنی پوزیشن کلیئر کر دی ہو۔ اکرام شیخ بہت ذہین آدمی ہے۔ اس نے اور انکل رضوی نے مل کر نازو کے غائب کو قابل کر لیا ہوگا کہ وہ نازو کی طرف سے بے فکر رہیں۔ وہ نہ غلط قسم کی لڑکی ہے اور نہ غلط راستے پر چل رہی ہے۔ جو کچھ وہ کر رہی ہے وہی اس کو کرنا چاہیے۔"

"تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ نازو اس بار سب کی رضامندی سے فرار ہوئی ہے اور یہ فرار نہیں ہے۔" محسن بولا۔

"اگر میرے مفروضات غلط نہ ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نازو اس بار اپنے بھائی کے ساتھ نکلی ہو۔ ایسی صورت میں کسی کو کیا اعتراض ہوگا۔"

"مگر وہ نکل کر جائے گی کہاں؟" محسن نے بڑا سوال اٹھایا۔ "وہ گھر جہاں ہم تھے جل کے خاک ہو چکا۔ غالب نہ جانے کدھر گیا۔ انھیں معلوم نہیں کہ ہم کدھر گئے۔ دلاور لینڈ کیپٹن نے تو اپنا سارا پلان بدل دیا۔ وہ ہم تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیں جانے کہاں لے جائیں گے۔ تلاش کرنے والے بھٹکتے رہ جائیں گے مگر کبھی ہمارا سراغ نہ پائیں گے۔"

"انسپکٹر سندر داس ان کو بتا چکا ہے۔"

"صرف یہ کہ ہم کہاں ہیں۔ کل کے بارے میں وہ خود بھی نہیں جانتا کیونکہ سراج اسے ہمارے ساتھ نہیں رکھے گا۔" محسن نے کہا۔

"سندر داس نے بتایا تو ہے کہ اکرام شیخ کو مطلع کر دیا گیا ہے۔ بس کسی کو خط لانے کے لیے بھیجا تھا۔ کسی کے ہاتھ بھیجا جانے والا لیٹر اب تک پہنچ چکا ہوگا۔ خط ڈاک سے جاتا تو دیر ہو سکتی تھی۔ خط گم بھی ہو سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے... مگر سکندر... اگر ایسا ہوا کہ نازو اور اکرام شیخ ایک ساتھ نکل کھڑے ہوتے ہوں... جیسا کہ تیرا خیال ہے۔ تو وہ خط لے جانے والا خط کسے دے گا؟" محسن بولا۔ "یہ بڑی عجیب اور افسوسناک صورت حال ہوگی کہ ادھر جانے والا وہ پتے کی اطلاع لے جانے والا نامہ بر وہاں جائے اور ادھر پانے والے مکتوب الیہ تو گھر سے نکل کے نہ جانے کدھر گئے۔ گھر والے کیا بتائیں گے کہ اکرام شیخ کہاں گیا۔ اکرام شیخ اپنی بہن نازو کے ساتھ جتنے گا اس گھر میں جہاں نازو پہلے بخیر و عافیت چھوڑ گئی تھی۔ وہاں اسے ایک پرانی حویلی کا جلا ہوا ڈھانچہ ملے گا... لوگ شاید بتائیں کہ آگ لگی تھی تو دو لاشیں شاید ملی تھیں مگر اور کوئی زندہ نکلا نہ مردہ۔ شاید اندر ہی جل کے راکھ ہو گئے بچے ملبے میں دب کر کوئلہ ہو گئے۔ پھر نازو اور اس کا سابق سب انسپکٹر بھائی کیا کریں گے۔ وہ کس سے پوچھیں گے غالب کا پتا... میرا اور تیرا پتا۔"

"لیکن... جب انھیں کسی کا پتا نہ ملا تو وہ کہاں جائیں گے؟ ظاہر ہے واپس گھر..." میں نے کہا۔ "اور گھر پہنچتے ہی انھیں سندر داس کا مکتوب مل جائے گا۔"

"ہاں۔ بشرطیکہ وہ لوٹ کر گھر گئے۔" محسن بولا۔ "وہ دونوں قدم آگے بڑھا کے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ اکرام شیخ کو جانتا ہی ہے تو... اگر اب اس کو احساس ہوگا کہ اس نے غلطی کی تھی تو تلافی کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگا دے گا اور ہمارا سراغ لگانے چل پڑے گا۔ اس کی رہنمائی کرے گی نازو... وہ بھی ضدی اور جنونی۔ اللہ بچائے فلمی اتفاقات اور حادثات سے بھری پڑی کہانی ہے۔" محسن نے ایک سرد آہ بھری۔ "بس دعا کر وہ خط انھیں مل جائے۔"

"صرف خط کا ملنا ہی کافی نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ خط پڑھ کے فوراً روانہ ہو جائیں۔ اور ہمارے یہاں سے ہٹائے جانے سے پہلے آ جائیں۔ اگر وہ دیر سے آئے تو یہاں کون ملے گا۔ ممکن ہے سندر داس ملے مگر وہ بھی کیا بتائے گا کہ اسیران خستہ جاں کو مشقت کدھر لے گئے۔"

"سندر داس ہمارے انکل رضوی کو بھی تو مطلع کرے گا..." محسن نے کہا۔ "اور ان کو یہ بھی بتائے گا کہ اس نے سکندر کو کہاں اور کس حال میں دیکھا تھا۔ پھر وہ سراج سے پوچھیں گے۔ سراج کو بتانا پڑے گا۔"

"ایسا ہو سکتا تھا لیکن ہاری شی نے تو خود ہی سندر داس کو تیرے سامنے منع کر دیا تھا کہ انکل رضوی کو کچھ نہ بتائے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"یہ تو نے بہت غلط کیا۔"

"مجھے کیا معلوم تھا اس وقت کہ سندر داس واقعی سچ بول رہا ہے۔ میں اس پر کیسے اعتبار کر لیتا ایک دم۔" میں نے کہا۔ "اب کہہ دیں گے اس سے کہ ایس ایس پی صاحب کو سب بتا دے۔ وہ سب باتیں جو ہم سے ہوئیں۔ ہمارے بارے میں۔ سراج کے بارے میں۔" محسن بولا۔

"اگر موقع ملا تو کہہ دیں گے مگر اس کے بعد بھی کون سی ضمانت ہے کہ انکل رضوی فوراً ایکشن لیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ سراج سے پوچھ ضرور سکتے ہیں لیکن سراج انکار کر دے تو اس طرح نہیں پوچھ سکتے جیسے سراج ہم سے پوچھے گا۔ ایس ایس پی صاحب سراج کو الٹا لٹکا کے تھرڈ ڈگری کے طریقے سے اعتراف نہیں کرا سکتے کہ اس نے ہمیں کہاں چھپایا ہے۔ کہاں بھیجا ہے یا کس کے ہاتھ بیچا ہے۔ قتل کیا ہے تو لاش کہاں گاڑی ہے۔ وغیرہ وغیرہ... زیادہ سے زیادہ کسی ایس پی کو معطل کیا جا سکتا ہے۔ وہ بھی کسی سنگین جرم کا ثبوت ملنے پر۔ صرف ایک انسپکٹر کا کہہ دینا کافی نہیں ہوگا۔ سراج صاف مکر جائے گا کہ یہ وہ دوبارہ سکندر محمد سے ملا ہے۔ وہ انسپکٹر پر دشمنی کی نیت سے جھوٹ بولنے کا الزام عائد کر سکتا ہے۔ نہ ثبوت نہ گواہ۔ ایک الزام ماتحت نے افسر پر لگایا دوسرا افسر نے ماتحت پر۔ وزن کس کے الزام میں ہوگا۔ ظاہر ہے افسر کی ... مارا جائے گا سندر داس۔"

"تو بہت حوصلہ شکن باتیں کر رہا ہے۔" محسن بولا۔ "تو بھی سچ رہا ہے۔"

"میں حقیقت کو خواب کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتا۔" میں نے کہا۔ "خواہش اگر جنون بن جائے تو آدمی پاگل کہلاتا ہے۔ سراب کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے۔"

دروازہ کھلا تو ہم خاموش ہو گئے۔ ایک ساتھ چار افراد اندر آ گئے۔ ان میں دو وہی اسٹین گن والے تھے جو ہمیں اسی بیرک کے آفس میں دلاور کے ساتھ ملے تھے۔ باقی دو وہی خاموش رہ کر خالی ہاتھوں سے لڑنے والے تھے جو ہمارے ساتھ آئے تھے اور جنھوں نے ہمیں پنجروں میں بند کیا تھا۔ ان کے پیچھے ایس پی سراج آیا۔

"تم لوگوں نے کوئی فیصلہ کیا؟" وہ میرے سامنے کمر پہ ہاتھ رکھ کر اور سینہ پھیلا کے کھڑا ہو گیا۔ بالکل فلمی ولن کی طرح۔

"فیصلہ تم کو کرنا ہے۔ تم نے بہت بڑے وعدے کیے تھے۔" میں نے کہا۔

"میں آخری بار پوچھ رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "نازو اور غالب کہاں ہیں؟"

"ہمارا جواب اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم نہیں جانتے۔" میں ...

کہا۔ "اگر تمہیں معلوم ہوتا تب بھی نہ بتاتے۔"

"ٹھیک ہے۔" سراج بولا۔ "ان سب کو اوپر لے آؤ۔"

دو قریں قال ہاتھ آنے والوں نے اپنی اپنی جیب سے رومال سے بڑے کپڑے نکالے۔ ایک نے میرے پیچھے آ کے میری آنکھوں پہ پٹی باندھ دی۔ دوسرے نے محسن کے پیچھے یہی عمل شروع کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ چند منٹ کے بعد میری ہتھکڑی کھول دی گئی۔ ساتھی ہیں سے کسی نے مجھے جھٹکا دے کر پیروں پہ کھڑا کیا اور پھر آگے دھکیلا۔ میں لڑکھڑا کے گرتے گرتے بچا۔ مجھے ہانکنے والے اسی طرح دھکے دے کر مجھے آگے بڑھنے پہ مجبور کرتے گئے۔ تہ خانے کی سیڑھیوں پہ میں دو مرتبہ ٹھوکر کھا کے گرا۔ میں نے ٹیڈی کی آواز سنی۔ وہ ان سب کو گالیاں دے رہا تھا۔

"خدا تم سب کو اندھا کرے۔ تمہاری آنکھوں میں کیڑے پڑیں۔" مجھے بے ساختہ ہنسی آنے لگی تھی مگر میں نے روک لی۔ بات مذاق کی نہیں تھی لیکن مجھے ایک پرانی بات یاد آ گئی۔ جنگ آزادی سن ستاون یا اس کے بعد ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا جب انگریز افواج غالب آ چکی تھیں اور ہندو مسلمان چونکہ متحد نہ تھے اس لیے شکست کھا گئے تھے۔ بطور لطیفے کے یہی بات مشہور ہو جاتی تھی کہ اس زمانے میں بڑی بوڑھیاں انگریزوں کو بد دعائیں اور کوسنے دیتی تھیں تو کہتی تھیں کہ اللہ کرے موئے فرنگیوں کی ٹوپیوں میں کیڑے پڑیں۔ ٹیڈی بھی کچھ کرنے سے قاصر تھا تو بد دعا پر اکتفا کر رہا تھا۔

میں سراج کے حکم کی تعمیل میں واپس بالائی منزل پر لایا گیا۔ ظاہر ہے یہ حکم صرف میرے لیے نہیں تھا۔ محسن اور ٹیڈی بھی اس کا حکم ماننے جا رہے تھے اور ہم سب ایک ساتھ کسی نامعلوم مقام کی جانب رواں تھے۔ مجھے اپنے اندیشے درست ہوتے نظر آ رہے تھے۔ اب کوئی آیا بھی تو یہاں کون ملے گا۔ نہ نازو اور نہ غالب، نہ ایس آئی اکرام شیخ اور نہ ایس ایس پی صاحب رضوی۔ وہ وہاں پہنچ سکیں گے جہاں ہمیں اب لے جایا جا رہا تھا۔ اس کے بعد بھی ہماری منزل کہاں تھی۔ یہ خود ہم نہیں جانتے تھے۔ شاید سراج اور مسندداس بھی نہیں جانتے تھے کہ ہمیں کس کے حوالے کرنا ہے اور کہاں پہنچانا ہے۔ سفر کے کتنے مرحلے ہیں اور کتنے ہمسفر ہیں۔ ہم شکاری تھے۔ یہ دعویٰ باطل ہوا۔ دلاور اور سراج بھی شکاری تھے۔ وہ کسی حد تک کامیاب ہوئے۔ انہوں نے ہمیں جن کے حوالے کیا وہ سب سے بڑے شکاری تھے۔ یہ ثابت ہو گیا۔

دو ہاتھوں نے مجھے ایک دم اٹھایا اور اچھال دیا۔ میں کسی ٹرک یا بس کے فرش پہ گرا۔ میرے ساتھ ہی محسن اور ٹیڈی بھی اندر آ لیے۔ میں نے مسندداس کی آواز سنی۔ "اب کیا حکم ہے سر؟"

"تم اب ڈیوٹی پہ جاؤ۔" سراج نے کہا۔

"لیکن کل رات کی شفٹ میں ڈیوٹی دے چکا ہوں۔" اس نے احتجاج کیا۔

"ہم یہاں روٹین اور شیڈول کو قانون نہیں کر سکتے۔ بارڈر کو کھلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔" سراج نے گرج کر کہا۔ "ایک آدمی بیمار ہے تو اس کی جگہ بھی ڈیوٹی دو۔ بس ان کے آرڈر ہیں۔ تم کو ڈبل ڈیوٹی دینا ہے۔ یہ کوئی ناانصافی یا ظلم نہیں ہے۔ تمہاری جگہ بھی لوگ ڈیوٹی دے چکے ہیں۔"

"یس سر!" مسندداس نے مردہ لہجے میں کہا۔

"اوکے... تم جا سکتے ہو۔ اور یاد رکھو آج رات پھر تم کو اپنے معمول کے مطابق شفٹ کرنا ہے۔" سراج بولا۔

"آئی نو سر!" مسندداس نے کہا۔ "ڈیوٹی از ڈیوٹی... آرڈر از آرڈر..."

ٹرک دس منٹ بعد روانہ ہوا اور تقریباً ایک گھنٹا چلتا رہا۔ میں ادھر ادھر کی آوازوں سے بالکل اندازہ نہ کر سکا کہ ہم کہاں سے گزر رہے ہیں۔ ہر طرف خاموشی تھی اور ہچکولے یہ ظاہر کرتے تھے کہ ہم پکی سڑک پر نہیں تھے۔ وہ کچی سڑک بھی نہیں تھی، ناہموار زمین تھی۔ ایک گھنٹے کے بعد ٹرک رکا تو ہمیں اتار لیا گیا۔ ہم مختلف راستوں سے گزارے گئے۔ پھر ہمیں رکنے کا حکم دیا گیا اور کسی نے میری آنکھوں پہ سے پٹی اتار دی۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ محسن اور ٹیڈی میرے ساتھ نہیں ہیں۔ جہاں میں کھڑا ہوا تھا وہ پندرہ فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا کمرہ تھا جس میں کراس بار اور چھت سے آویزاں لوہے کے حلقے تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ورزش کرنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ یہ کوئی چھوٹا سا جمنازیم لگتا تھا۔ لیکن میں سمجھ گیا کہ یہ عقوبت خانہ ہے جہاں مجھ سے پوچھا جائے گا کہ نازو کہاں ہے اور غالب کہاں ہے۔ لیکن اس بار پوچھنے کا انداز مختلف ہوگا۔

اس بات کا یقین مجھے رابعہ کو دیکھ کر بھی آیا جو شیشے کے ایک بند دروازے کے پیچھے کرسی پر بندھی بیٹھی تھی۔ وہ کچھ کہنے کے لیے چلا رہی تھی مگر اس کی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ پھر دروازے کے پیچھے بالکل اندھیرا ہو گیا اور اس مختصر سے کمرے میں سرچ لائٹ روشن ہو گئی۔ اب رابعہ وہ سب کچھ دیکھ سکتی تھی جو میرے ساتھ ہونے والا تھا۔ لیکن میں اس کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اچانک ایک اسپیکر آن ہو گیا اور میں نے رابعہ کے چیخنے کی آواز سنی۔ "رابعہ!" میں چلایا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں سکندر!" اس نے چلا کے کہا۔ "دیکھو ان کو بتا دو کہ نازو کہاں ہے۔"

یہ بڑا بے رحم انتظام تھا۔ ہم ایک دوسرے کی فریاد و فغاں سب سن بھی سکتے تھے۔

رابعہ کی آواز نے میری ذہنی اذیت میں اضافہ کیا۔ ایک طرف جسمانی عذاب کا خیال باعث اذیت تھا دوسری طرف رابعہ کی موجودگی کا احساس۔ ایسے میں رابعہ کو یہ کہنا کہ نازو کے بارے میں کچھ نہ چھپاؤں اور سب بتا دوں میرے لیے حیرانی اور دکھ کی بات تھی۔ حیرانی مجھے یوں تھی کہ مجھے نازو کے متعلق معلوم تھا جو رابعہ جانتی تھی اور سب جانتے تھے۔ میرے پاس اب کہنے کو تھا ہی کیا جو میں کچھ چھپاتا اور ان حالات میں کچھ چھپانا ممکن بھی نہیں تھا۔ اگر میں سچ بولتا تو صرف یہی کہتا کہ نازو کو گھر کی زمین نگل گئی یا وہاں سے نکل کے کہاں گئی یہ کسی کو نہیں معلوم اور غالب یا قندھاری آگ میں جل کر بھی نہیں مرا اور وہاں ملا بھی نہیں تو اللہ کے سوا کون جانتا ہے کہ وہ کہاں ہوگا۔ تو یہ جواب انہیں ہرگز مطمئن نہ کرتا۔ چنانچہ یہ تو طے تھا اور میں نے ذہنی طور پر خود کو اس کے لیے تیار بھی کر لیا تھا کہ وہ جسمانی تشدد کا کوئی بھی طریقہ جس حد تک آزمانا چاہیں گے ضرور آزمائیں گے۔ وہ مجھ سے ایک واضح جواب کی امید رکھتے تھے کہ فلاں فلاں جگہ جا کے دیکھو یا فلاں دن فلاں وقت پر نازو اور غالب فلاں جگہ آئیں گے۔ میرا یہ جھوٹ بھی آسانی سے پکڑا جاتا۔ وقتی طور پر میری جان عذاب سے بچ جاتی مگر پھر یہی سب کچھ رابعہ کے یا محسن کے ساتھ ہوتا اور اگر وہ بھی جھوٹ بولتے کہ غالب اور نازو کہاں کس وقت مل سکتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کے اور میرے جھوٹ میں فرق ہوتا اور سب سے پہلے سچ کی قلعی کھل جاتی۔ دشمنوں کو معلوم ہو جاتا کہ ہم نے تشدد کی اذیت سے بچنے اور مہلت حاصل کرنے کے لیے فضول سی کوشش کی تھی۔

دکھ مجھے رابعہ کی اس بات پہ ہوا کہ اس نے ایک غلط بات کی تھی۔ اگر مجھے نازو کے بارے میں علم ہوتا کہ وہ کہاں ہوگی تب بھی کیا میں اسے پکڑوا دیتا؟ میں پوری کوشش کرتا کہ آخری حد تک مجھ پر جو گزرتی ہے گزر جائے لیکن میری زبان میرے اعمال کی شکست کا اعتراف نہ کرے۔ غالب اور نازو میرے لیے کسی اعتبار سے کوئی غیر نہ تھے کہ دونوں میرے ساتھی تھے اور اس جنگ میں میرے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ انہیں بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنا اور دشمنوں کے ہاتھوں تک نہ پہنچنے دینا میرا ہی نہیں ہم سب کا مشترکہ مقصد تھا جو اس وقت قید میں تھے۔ پھر رابعہ نے یہ کیوں کہا کہ نازو کے بارے میں بتا دو؟ کیا وہ ایک تشدد سے مغلوب ہو جانے والی عورت ہو گئی تھی یا جذبات کی ایک طرح لپیٹ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جانے والی۔ جواب ایک ہی تھا۔ نازو کی پکار اس کی تھی کہ جا ہے دیتا ہے مرنے نہیں دیتا۔ وہ ہے محبت کی زندگی ہے۔ کیا محبت اسی خود غرضی کو کہتے ہیں؟

سرچ لائٹ چھت کے ایک گوشے میں نصب تھی اور اس کی روشنی تاریخ کی روشنی کی طرح ایک لکیر کی صورت میں اندھیرے سے گزر کر فرش تک محدود سے دائرے میں پڑ رہی تھی اور جہاں وہ دائرہ ختم ہوتا تھا فرش پر ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ یہ کوئی عام استعمال کی کرسی نہیں تھی۔ یہ فولادی کرسی سیاہ رنگ کی تھی اور اس ماحول میں بالکل الیکٹرک چیئر کی طرح لگ رہی تھی جو امریکا اور یورپ میں سزائے موت پہنچانے کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ وہ چمڑے کے تسمے تھے جو کرسی کے بازوؤں پہ اور پشت پہ نظر آ رہے تھے اور جن سے کرسی پہ بیٹھنے والے کو یوں کسا جا سکتا تھا کہ وہ جنبش تک نہ کر پائے۔ الیکٹرک چیئر پر بٹھائے جانے والوں کو بھی برقی رو چھوڑنے سے پہلے اسی طرح باندھا جاتا تھا۔ کرسی کے فولادی پائے سیمنٹ کے فرش میں نصب تھے۔ چنانچہ کرسی کو ہلانے کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔

مجھے سزائے موت نہیں ہونی تھی۔ یہ میرے لیے موت سے بدتر عقوبت کا اہتمام تھا اور ایذا رسانی کے ذریعے اعتراف جرم کرانے یا زبان کھلوانے کے اس طریقے کو ساری دنیا میں سب سے آسان اور مؤثر سمجھ کے استعمال کیا جاتا تھا۔ جو اس مرحلے کو جھیل جاتا تھا وہ گویا جہنم کے دوسرے زیادہ اذیت ناک طبقے کے لیے کوالیفائی کر لیتا تھا۔ جہنم کے اگر سات طبقے ہیں اور ہر طبقے کا عذاب شدید تر ہے تو دنیا میں انسانوں نے بھی عقوبت کے درجے بنا رکھے ہیں اور جو قوت برداشت کے ایک مرحلے سے گزر جاتا ہے وہ اذیت اور تشدد کے سخت ترین مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ کسی نہ کسی مرحلے میں ہر شخص شکست قبول کر لیتا ہے۔ اگر کوئی فتح مند گزرتا ہے تو وہی جو بالآخر جہاں سے گزر جاتا ہے۔ سراغ رسانی اور تفتیشی اداروں کے ماہرین نے آدمی کے ذہن کے ہر نہاں خانے سے سچ کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کے فن کو ایک ناقابل تصور حد تک جدید تر اور لرزہ خیز مسلسل بنا دیا ہے۔ اب تشدد کرنے والی مشینوں کے استعمال کو وہ بھی جائز سمجھتے ہیں جو آزادیٔ ضمیر اور اخلاقی اقدار اور مہذب معاشرے کی بات کرتے ہیں۔ جو انجمن انسداد بے رحمی حیوانات بناتے ہیں مگر حیوان ناطق اور اشرف المخلوقات کے ساتھ انسانیت سوز مظالم کو اپنی سیاست میں روا رکھتے ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ سب سے پہلے مجھے ہی اس کرسی پہ باندھ کر یوں بٹھا دیا جائے گا کہ وہ سرچ لائٹ براہ راست میری آنکھوں پہ پڑتی رہے اور جب اس روشنی کا عذاب میری آنکھوں کے لیے اور میرے اعصاب کے لیے ناقابل برداشت ہو جانے لگے گا تو سوالات کا سلسلہ شروع ہوگا۔ جن لوگوں نے روشنی کو صرف چاندنی، ٹیوب لائٹ اور مرکری لیمپ، فانوسوں اور دلکش ڈیزائن والی وال لائٹس، نیون سائن، جلتے بجھتے آرائشی بلبوں، نگین

www.paksociety.com

روشنی کے فواروں، اکینڈل لائٹ ڈنر اور خواب گاہوں میں رکھا ہے ان کے لیے روشنی صرف خوب صورتی ہے۔ اندھیروں کو مٹا دینے والی قوت ہے اور نائٹ لائف کے ہنگامہ ناؤ نوش اور جشن طرب کو جاری رکھنے کی ضمانت ہے۔ مگر جو پولیس کے تھرڈ ڈگری طریقہ تفتیش سے گزرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہی روشنی کتنی سفاک اور بے رحم حقیقت ہے۔ عام آدمی کو اگر براہ راست آنکھوں پر پڑنے والی دس ہزار واٹ لائٹ کی بیم میں بٹھا دیا جائے تو پہلے اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگا۔ پھر وہ پاگل ہونے لگے گا۔ چیختا چلاتا اس اذیت کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہو جائے گا یا ہمیشہ کے لیے اندھا ہو جائے گا۔ یہ کہنا بہت آسان ہے کہ آنکھیں بند کرنے کے بعد روشنی نہیں رہتی مگر ایسا نہیں ہوتا، اتنی کمزور روشنی نہیں ہوتی۔ یہ بند آنکھوں کے پپوٹوں کو چیرتی ہوئی اندر اتر جاتی ہے اور اس کی چبھن آنکھوں میں پیوست ہونے والی سوئیوں کی طرح محسوس ہوتی ہے۔

جس دروازے سے مجھے اندر لایا گیا تھا وہ ایک بار پھر کھلا اور وہ دونوں پھر نمودار ہوئے جو زبان رکھتے تھے مگر گونگے تھے۔ ان کے تیور ہر وقت جارحانہ رہتے تھے اور وہ مشتعل ہو کر نظر آتے تھے جیسے ان کے مقابل آدمی نہیں آدم خور شیر ہو۔ ان کی صورت کے نقوش میں بھی عجیب آدم بیزار بے حسی اور ملازار سختی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں ان کو ایک ہاتھ رسید کرنے کا ارادہ بھی کرتا تو وہ دونوں مجھے دو ہاتھ مار کے لٹا دیتے۔ قد میں وہ مجھ سے کم تھے لیکن ان کے جسم فولادی اور تباہ کن قوت سے بھرے ہوئے لگتے تھے۔

ان میں سے ایک نے انگلی سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ کوئی مشکل اور ناقابل فہم اشارہ نہیں تھا مگر میں کھڑا رہا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اب وہ زبان سے کیا حکم دیتا ہے مگر ان کے منہ میں تو جیسے زبان تھی ہی نہیں۔ انھیں اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ ان کا واسطہ لاتوں کے بھوت سے ہے جنھیں باتوں کی ضرورت نہیں۔ دوسرے نے مجھے بڑی پھرتی سے گھوم کر لات ماری اور میں ایک دم آگے گیا تو دوسرے نے سنبھال لیا اور کرسی پر گرا دیا۔ مشینی انداز میں انھوں نے میرے ہاتھوں کو کرسی کے بازوؤں پر کس دیا۔ پیروں کو نیچے کرسی کے پایوں سے باندھ دیا اور ایک بیلٹ درمیان سے میرے پیٹ پر سے گزار کے پیچھے کھینچ کر باندھ دیا اور اب میں بالکل بے بس تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں مناسب موقع کے انتظار میں، میں نے کچھ کرنے کے سارے مواقع ضائع تو نہیں کر دیے ہیں۔

جب میرے سر کو پیچھے ہیڈ ریسٹ پر رکھ کے ایک بیلٹ میری پیشانی پر کسی گئی تو میں تقریباً منجمد ہو گیا۔ سرچ لائٹ ابھی میری آنکھوں پر نہیں پڑ رہی تھی۔ مجھے باندھ کر بے بس کر دینے والے اپنا کام کر کے رخصت ہوئے تو سرچ لائٹ کا زاویہ بدلا اور اچانک میرے سامنے سورج آگیا۔ اس چوکی روشنی کے سوا میری نگاہ سے ہر چیز اوجھل ہو گئی۔ مجھے اس کی چندھیا دینے والی روشنی کے ساتھ ہی تپش بھی محسوس ہوئی جو میرے چہرے اور جسم کے راستے اندر اتر رہی تھی لیکن میں اپنے سر کو ایک سمت ادھر سے ادھر نہیں کر سکتا تھا کہ اس روشنی کی یلغار سے پناہ لے سکوں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے دیکھا مگر اس سے روشنی کی شدت میں برائے نام کمی آئی۔ میری پلکوں پر اس روشنی کا سیلاب امڈ آیا اور اس کا دباؤ آنکھوں میں درد بن کے پھیلنے لگا۔ وقت گزرنے لگا۔

رابعہ کی آواز اب میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی اور میں ایک کمرے کی تنہائی میں اس روشنی میں یوں قید تھا جیسے وہ روشنی اپنا ایک مادی وجود رکھتی ہے۔ وہ روشنی میرے گرد ایک چپکیلے اور ٹھوس مادے کی طرح جمع ہو کے جم گئی تھی۔ اس میں میرا جسم اس طرح نظر آتا تھا جیسے شفاف شیشے کے پیپر ویٹ میں رنگین پھول مقید دکھائی دیتے ہیں۔

"رابعہ!" میں نے چلا کے آواز دی۔ میرا مقصد اپنی تنہائی کے احساس کو شکست دینا تھا۔ "رابعہ... حوصلہ مت ہارنا... میں ان کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

میری بات کا جواب دیواروں کی خاموشی نے بھی نہیں دیا۔ مجھ پر واضح کر دیا گیا تھا کہ میرے اور رابعہ کے درمیان رابطہ ہے لیکن کنٹرول ان کا ہے۔ ان کی مرضی ہے کہ وہ جو چاہیں دکھائیں اور جو چاہیں سنائیں۔ رابعہ کو میری حالت دکھائیں اور مجھے اس کی آہ و بکا سنائیں۔ وقت ایک بار گراں بن گیا تھا۔

"رابعہ...!" میں پھر چلایا۔ "مجھے اور تم کو ایک دن ہی مرنا ہے لیکن مرنے سے پہلے یہ شرمندگی نہ ہو کہ ہم ہار گئے۔ ہم دوستی کے نام کو رسوا کر گئے۔"

خاموشی... سناٹا... ایک بے حسی کا آسیب اور اذیت! "سن رہی ہو نا... جب انھیں کچھ معلوم ہی نہیں تو یہ مجھ سے کیا پوچھیں گے۔" میں نے زیادہ اونچی آواز میں کہا۔ وقت مجھے شکست دینے لگا۔

"جواب دو مجھے رابعہ۔" سکوت کا ایک وقفہ۔

"رابعہ... میں تم سے محبت کرتا ہوں... تم جانتی ہو... ہمارا زمانہ جانتا ہے اور ساری خدائی جانتی ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "زندگی کی آخری سانس تک... دل کی آخری دھڑکن تک میں یہ اقرار کرتا رہوں گا۔"

نہ جانے کون میرے تصور میں قہقہے مار کے ہنس رہا تھا۔ بے آواز ہنسی میرا تمسخر اڑا رہی تھی۔ یہ وقت تھا یا میری تقدیر تھی جو مجھ پر خندہ زن تھی۔ تھکے اعصاب جواب دے چکے تھے۔

"سکندر بخت... تم پاگل ہو رہے ہو۔"

"یہ روشنی بجھا دو... ہٹا دو اس روشنی کو میرے سامنے سے۔" میں نے چیخ کر کہا اور خود کو آزاد کرنے کی بے سود کوشش کرنے لگا۔ "سنو... تم جو بھی ہو... ولدیو... سور کے بچے... کمینے... یہ لائٹ آف کر دو نہیں تو میں تجھے قتل کر دوں گا... بے غیرت... استاد کی اولاد... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا... خنزیر... خبیث... قواب کے نطفے... تیری تو..."

روشنی پسے ہوئے شیشے کی طرح میری آنکھوں کو کاٹ رہی تھی۔ درد بن کے میرے دماغ کو مفلوج کر رہی تھی اور میرے جسم میں آگ بھر رہی تھی۔ میں پاگلوں کی طرح زور لگا رہا تھا اور دیوانہ وار جدوجہد کر رہا تھا لیکن اس روشنی سے مفر نہ تھا۔ میں اس روشنی میں ایسے پھنس گیا تھا جیسے گاڑھے سیمنٹ میں تنکا پھنس جائے اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ سیمنٹ سخت ہوتا جائے تو تنکے کے پر بھی ٹوٹ کر منجمد ہونے لگیں۔ میں چیخ رہا تھا اور چوہدری ولدیو سمیت ان سب کو گالیاں دے رہا تھا جو میری اس حالت کا تماشا کہیں چھپ کر دیکھ رہے تھے یا میرے قریب ہی خاموش کھڑے تھے۔ بالآخر بے ہوشی مجھ پر سکون کا وقفہ بن کے نازل ہوئی۔

دوبارہ ہوش آیا تو میں پسینے میں تر تھا۔ وقت کا احساس تو پہلے ہی فنا ہو گیا تھا۔ اب مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ باہر کی دنیا میں دن ہے یا رات اور میں بے ہوشی سے پھر ہوش کی دنیا میں کتنی دیر کے بعد لوٹا ہوں۔ مجھے سخت نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ میری سانس بھی تیز تھی۔ تاہم وہ روشنی غائب تھی جس نے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔

"تم کچھ سوچ رہے ہو سکندر بخت۔" ایک اجنبی آواز نے اس اندھی خاموشی کو چیر دیا۔ میں اچھل پڑا... صرف محاورتاً ورنہ اچھلنا تو درکنار میں اپنی جگہ پر ہل بھی نہیں سکتا تھا۔

"کیا تم سوچ رہے ہو کہ تعاون کرنا تمہارے حق میں بہتر ہوگا؟" آواز نے کہا۔ وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا مگر اس کا لہجہ بالکل صاف نہیں تھا۔ عام طور سے انگریزی کا یہ لہجہ بگڑ جاتا ہے۔ بنگالی اور پنجابی یا مدراسی لہجے کو شناخت کر سکتا ہوں۔ مجھے مخاطب کرنے والا جنوبی ہندوستان سے تعلق رکھتا تھا۔ تامل، تیلگو یا ملیالم بولنے والوں کے لہجے کا تلفظ مرتب ہے۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"تم کو صرف جواب دینے ہیں۔ سوال ہم کریں گے۔" وہ بولا۔ "تم جواب میں کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ اس کے غلط یا صحیح ہونے کا پتا ہم خود چلا لیں گے۔"

"تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"ہم ترتیب وار سوالات کریں گے۔" یہ دوسری آواز تھی۔ غالباً کوئی بنگالی۔

"سکندر بخت تمھارا دوسرا نام کیا ہے؟"

"مجھے بچپن میں کبیر خان بھی کہتے تھے۔ میرے والدین اور دوست۔"

"تم اپنا والد کسے سمجھتے ہو؟"

"صرف وزیر خان کو۔"

"مگر تمھیں معلوم ہے کہ وزیر خان نے صرف تمھاری پرورش کی تھی، ورنہ تم جنوبی ہندوستان کی ایک ریاست کے ولی عہد ہو۔"

"میں اس فضول بات کو نہیں مانتا... پیدائش کے وقت میں نے جس ماں کی گود میں آنکھ کھولی وہ وزیر خان کی بیوی تھی۔ اور جس شخص نے میرے کان میں اذان دی وہ وزیر خان تھا۔" میں نے کہا۔

"اس سے حقیقت تو نہیں بدلتی۔" مدراسی بولا۔

"اگر تم چاہو تو آج بھی اپنی ریاست میں لوٹ کر جا سکتے ہو۔" بنگالی نے کہا۔

"ہندوستان میں اب کون سی ریاست رہ گئی ہے؟"

"مگر ریاستوں کے انضمام کے وقت جو کچھ حکمرانوں کو ملا وہ تمھیں مل سکتا ہے۔" بنگالی نے کہا۔

"مجھے اس کی قطعی آرزو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ویری ڈیل... کیا تم وزیر خان کے وارث کی حیثیت سے اس کے کاروبار اور اثاثوں کو اپنی تحویل میں لینا پسند کرو گے؟" مدراسی بولا۔

"میں اس رشوت کو پہلے ہی ٹھکرا چکا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"مگر اسی حق وراثت کے لیے تم نے اپنے والد کے پارٹنر میر شرافت علی کو قتل کر دیا تھا۔"

"وہ ایک جھوٹا الزام تھا۔ مجھے اس قتل میں ملوث کیا گیا تھا۔"

"لیکن ابھی تک کسی عدالت نے تمھیں بے گناہ قرار نہیں دیا۔" بنگالی بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔"

"صرف تمھارا جاننا کافی نہیں سکندر بخت... یہ قانونی معاملہ ہے۔" مدراسی نے کہا۔

"تم اپنے والد کا قاتل کسے سمجھتے ہو؟" بنگالی بولا۔

"کئی افراد کو... بہت سے لوگوں نے مل کر ان کے خلاف سازش کی تھی۔"

"میر شرافت علی کو تم نے قتل نہیں کیا تو پھر کس نے کیا تھا؟" مدراسی بولا۔

www.paksociety.com

"اس کے دل میں خنجر اتارنے والا ہاتھ استاد ویڈو کا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں خنجر تھمانے والا چوہدری دلاور تھا۔" میں نے کہا۔

"تم نے ان دونوں سے قتل کا انتقام لینے کا ارادہ کیوں چھوڑ دیا؟"

"میرا انصاف خدا کرے گا۔" میں نے کہا جو ایک گول مول جواب تھا۔

"تم پر پرویز خان کے قتل کے اسباب کب واضح ہوئے تھے اور تمہارے خیال میں وہ اسباب کیا تھے؟" بنگالی نے پوچھا۔

"چوہدری دلاور کے ٹولے کا ناجائز کاروبار۔" میں نے کہا۔

"تم اس ناجائز کاروبار کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"وہ اسلحہ بناتا اور اسمگل کرتا ہے۔" میں نے بے توقفی سے کہا۔

"اور یہ اسلحہ کہاں جاتا ہے؟"

"مشرقی بنگال کے تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں کو۔" یہ سب ایسے حقائق تھے جن کا اعتراف نہ کرنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔

"گویا تم ہی سائیں بابا پڑوالے کی خانقاہ کو تباہ کرنے کے ذمے دار ہو؟"

"وہ خانقاہ نہیں... تمہارا اسلحہ خانہ تھا۔" میں نے کہا۔

"تم سیوک رام... کرپال والی اور کرنل جگجیت ناتھ مقرر کے قتل کا اعتراف کرتے ہو؟" مدراسی نے کہا۔

"ہاں! وہ جاسوس اور غدار تھے اور اپنی زمین پر مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں ایسے لوگوں کے ناپاک وجود کو ختم کر دوں۔ مجھے موقع ملے تو میں تم کو بھی زندہ نہ چھوڑوں۔" میں نے کہا۔

"تم نے بہت سے اسلحے پر قبضہ بھی کر لیا تھا۔" بنگالی نے کہا۔

"ہاں... ہمیں اس کی ضرورت تھی۔"

"ہم کون؟ تمہارے ساتھی؟" بنگالی نے کہا۔

"کیا تم ان ساتھیوں کے نام گنوا سکتے ہو؟" مدراسی نے کہا۔

"تم سب کے نام جانتے ہو۔ پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"میں سوال کر رہا ہوں۔ کیا تم ان کے نام گنوا سکتے ہو؟"

"میں اپنی زبان سے کسی کا نام نہیں لوں گا۔"

مدراسی نے ایک ایک کر کے سب نام لیے۔ "تم سب نے تنظیم آزادیٔ فلسطین آرمی یا بلیک آرمی کی طرز پر ایک دہشت گرد تنظیم ایم آر ایس کے نام سے بنائی تھی۔ یہ ایک مضحکہ خیز حرکت تھی۔"

"تم ایسا کہہ سکتے ہو۔"

"اگر تم کو آزاد کر دیا جائے تو کیا تم کوئی سمجھوتا قبول کرو گے؟"

"اور اگر قبول کر لو گے تو اس کی شرائط کیا ہوں گی؟"

"تم نے ابھی ہماری تنظیم کو مضحکہ خیز قرار دیا تھا۔ اب اسی کے ایک نمائندے سے مصالحت کی پیش کش میں تم اتنے سنجیدہ ہو؟" میں نے کہا۔

"یہ ہو سکتا ہے کہ تم اور رابعہ لندن چلے جاؤ۔ محسن اور شمن بھی تمہارے ساتھ رہیں تو کوئی حرج نہیں۔ تم کو رہائش اور معقول ملازمت کے علاوہ بڑی شہرت مل جائے گی۔" بنگالی نے کہا۔ "پھر باقی سب لوگ اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ استاد ویڈو، غالب اور نازو۔"

"میں ان شرائط کو مسترد کرتا ہوں۔"

"تمہیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔" مدراسی بولا۔

"ہم سب کو باری باری رضامند کر لیں گے۔" بنگالی نے کہا۔

"پرویز خان کے گھر سے تمہیں کیا معلومات حاصل ہوئی تھیں؟ تم نے ایک بڑھیا کو وہاں جاسوسی کے لیے بھیجا تھا... وہ بڑھیا کون تھی؟" مدراسی نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا وہ رابعہ تھی؟" مدراسی نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"وہ شہلا تھی۔" میں نے یہ سوچ کر کہا کہ وہ سب سے زیادہ محفوظ رہی تھی۔ میں نے وہ سب کچھ بتا دیا جو ہمیں نازو کو کرنل تھمی کے گھر میں بھیج کر معلوم ہوا تھا۔ ان معلومات کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ وہ لوگ اپنا پلان بدل چکے تھے اور میرے سچ بولنے سے وہ یقین کر سکتے تھے کہ جاسوس بن کے اندر پہنچنے والی عورت شہلا ہی تھی، نازو نہیں تھی۔

"نہیں، وہ رابعہ بھی نہیں تھی اور شہلا بھی نہیں تھی... تم جھوٹ بول رہے ہو۔" مدراسی بولا۔

"یہ تمہاری مرضی ہے کہ جسے چاہو جھوٹ مانو اور جسے چاہو سچ۔"

"تمہاری اس نام نہاد دہشت گرد تنظیم کے اغراض و مقاصد کیا تھے؟ یہ تنظیم کب سے قائم ہے؟" مدراسی بولا۔

"مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے اس کا نام کب ایم آر ایس رکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "اغراض و مقاصد تمہیں معلوم ہیں۔"

"ایم آر ایس سے پہلے یہ تنظیم کیا تھی؟"

"وطن کے ناموس کی خاطر اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگانے والے چند دوست جو سرزمین پاکستان سے غداروں اور وطن فروشوں کا خاتمہ کرنے کا عہد کر چکے تھے۔" میں نے کہا۔

"اور اب اس کی قوت کیا ہے؟"

"وہی اتحاد، یقین محکم اور تنظیم کے اصول۔ خلوص نیت، خدا پر بھروسا اور سرفروشی کا جذبہ ہے۔" میں نے کہا۔

"اس جملے میں صرف خوب صورت الفاظ ہیں... میں مادی قوت کی بات کر رہا تھا۔" مدراسی نے کہا۔ "تمہاری اس تنظیم کے حروف ایم آر ایس سے کیا مراد ہے؟"

اگر میں سچ بولتا تو یہ جواب نہایت مضحکہ خیز ہوتا کیونکہ ایم

آر ایس سے کوئی تنظیم ہی نہ تھی۔ یہ تو در حقیقت ہمارے ایک جذبے کا نام تھا۔ ایک عہد اور ایک مشن کا نام تھا جس میں سب برابر کے شریک تھے مگر بنانے میں ہم نے محسن، رابعہ اور سکندر کے ناموں کے ابتدائی حروف سے ایک نام گھڑ لیا تھا جو پی ایل او کی طرح بہت بھاری بھرکم اور حتیٰ تاثر دینے والا لگتا تھا۔ اس کے بنیادی ارکان ہم تھے۔ سب سے پہلے شکاری مجھے گھیر لائے تھے۔ محسن بیت کے ساتھ تھا اور پہلی مدد رابعہ نے کی تھی۔ اس کے بعد جلال، نقرہ، شمو نے استاد ویڈو، شمن... نازو اور غالب کسی طرح بھی ہم سے کم اہم نہ تھے مگر وہ نام زبان پر ایسا چڑھا تھا کہ ہم اپنی اجتماعی قوت کو ایم آر ایس کہنے لگے تھے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات تھی جیسے غیر موجود سائنس داں انجمن کو جب اپنی دریافت کردہ پُر اسرار شعاعوں کا کوئی نام نہ سوجھا تو اس نے انھیں ایکس ریز کہنا شروع کر دیا جو آج تک ایسے ہی چل رہا ہے۔ اب ایک سنگین صورت حال میں اس سوال کا جواب دینا مشکل ہو گیا۔

مدراسی نے کہا "کیا تم نے سوال نہیں سنا؟"

میں نے کہا "ایم آر ایس کا مطلب ہوتا ہے۔ مدر لینڈ ریفارم سوسائٹی۔"

مدراسی نے کہا "ریفارم؟ گویا تم جو کچھ کر رہے ہو، یہ اصلاح ہے؟"

"ہاں، مادر وطن! تم اسے تنظیم اصلاح وطن کہہ سکتے ہو۔"

مدراسی بولا "تم نے اصلاح کا کون سا کام کیا ہے؟"

میں نے کہا "اصلاح کے لیے ہی سب کچھ ہے۔ سب سے پہلے دشمنوں کی اصلاح، ان کے دماغ کی اصلاح، نیت کی اصلاح پھر وطن پرستوں کی نگاہ کی اصلاح جو دشمنوں کو نہیں پہچانتی، ان کے جذبۂ ایمان و اتحاد کی اصلاح۔"

"ایم آر ایس کا صدر دفتر کہاں ہے؟" مدراسی نے میری دلیل سے قائل ہو کے کہا۔

میں نے کہا "جہاں ہم سب ہوں وہی صدر دفتر ہے۔"

"ہم سب سے تمہاری مراد اعلیٰ کمان سے ہے؟" مدراسی بولا۔

میں نے کہا "اعلیٰ کمان؟"

مدراسی بولا "ہاں... تم اور محسن... غالب اور ... رابعہ، شہلا اور نازو۔ یہ سات افراد ایم آر ایس کو کنٹرول کرتے تھے؟"

"تمہارا کیا مطلب ہے؟"

مدراسی بولا "مطلب یہ کہ اب تم سات نہیں رہے اور تم خود اب کچھ بھی نہیں ہو۔ تم ایم آر ایس کو کیسے کنٹرول کرو گے جبکہ تم خود ہمارے کنٹرول میں ہو۔"

میں نے کہا "ایم آر ایس افراد کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک قوت کا... ایک جذبے کا اور ایک تحریک کا نام ہے۔ اس میں ہم سات کیا ہیں۔ تم دیکھو گے کہ اس میں ملک کے سات کروڑ عوام شامل ہیں۔"

"سوائے ہم غداروں کے۔" بنگالی بہت دیر بعد غصے سے بولا۔ "تم یہی کہو گے۔"

"تم سچ کو خود قبول نہیں کر رہے ہو۔ سچ تم پر غالب ہے اور تم اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو۔" میں نے کہا۔

"سات کروڑ عوام میں سے تمہارے ساتھ کتنے لوگ شامل تھے؟" مدراسی نے کہا۔ "جو تمہاری تخریبی کارروائیوں میں تمہارا ساتھ دیتے تھے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"ایم آر ایس کے ارکان کی مجموعی تعداد کیا ہے؟"

"سات کروڑ۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"ایم آر ایس کی باقاعدہ رکنیت حاصل کرنے والے کتنے ہیں؟ ان کے صوبائی، ڈویژنل اور ڈسٹرکٹ... اور شہری سطح پر کون سربراہ ہیں؟ کس کس شہر میں تمہارے دفاتر ہیں اور کہاں واقع ہیں۔ ان کے اجلاس کب ہوتے ہیں۔ انھیں کون ہدایت کرتا ہے، تربیت کون دیتا ہے؟"

"یہ کیا فضول بکواس ہے۔" میں نے کہا۔

"تم کو ابھی ایک سوالنامہ دیا جائے گا۔" مدراسی متأثر ہوئے بغیر بولا۔ "اور اس میں یہی سوالات ہوں گے... اس میں اور بھی بہت کچھ پوچھا جائے گا... نام، پتے... سب کی کارگزاری... یہ کہ کس کے پاس کتنا اسلحہ ہے اور یہ اسلحہ کس طرح حاصل کیا گیا۔ کس کس نے ایم آر ایس کو سرمایہ فراہم کیا... کیا تمہاری تنظیم کو غیر سرکاری طور پر حکومت کی فوجی یا نیم فوجی تنظیموں کا تعاون حاصل ہے اور یہ کہ مشرقی بنگال اور بھارت میں تمہارے کتنے تربیت یافتہ ایجنٹ کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں، ان سب کے نام اور ٹھکانے..."

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔" میں نے بوکھلا کے کہا۔ "تنظیم میں یہی سات آٹھ افراد شامل ہیں جن کو تم نے خود بالائی کمان سمجھ لیا ہے۔ بے شک ہمیں بہت سے دوسرے لوگوں کا تعاون بھی حاصل رہا اور اکثر غیر متعلق افراد نے ہماری مدد کی ہے۔ مگر وہ ایم آر ایس کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔"

"تم سمجھتے ہو کہ ہم اس بے سرو پا بات پر یقین کر لیں گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔" مدراسی نے کہا۔ "ایم آر ایس ایک تنظیم ہے اور تمہارے اپنے کہنے کے مطابق یہ صوبائی یا مقامی تنظیم نہیں ہے۔ ایک قومی تنظیم ہے جسے ملک کی سات کروڑ آبادی کا تعاون حاصل ہے۔ غالباً تمہاری مراد مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں اپنے حامیوں سے ہو گی۔"

www.paksociety.com

بنگالی ہنسنے لگا۔ "تم سمجھتے ہو کہ اُدھر سب تمہارا ساتھی لوگ ہے؟ تم سب پاکستان کی آبادی میں سات کروڑ کو اپنے ساتھ مانتے... تم بے وقوف ہے۔ اُدھر سب ایسا بات بولتا۔ ادارا بنگلہ دیش ہی سب تمہارا دشمن ہے۔" بنگالی نے نہ جانے کیوں انگریزی بولتے بولتے اردو کی ٹانگ توڑنا شروع کر دی۔ اس غدار کی زبان سے یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں تھی۔ علیحدگی پسندی کے رجحانات رکھنے والے ایسی ہی باتیں کر رہے تھے اور ان کے سستے جذباتی نعرے مشرقی پاکستان کے سیدھے سادے مسلمانوں کو گمراہ کر رہے تھے۔ یہ وہی مسلمان تھے جنھوں نے تقسیم کے وقت مسلمانوں کے علیحدہ وطن کی خاطر خون کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ آج یہ کیسے ممکن تھا کہ وہی مسلمان اپنے مغربی حصے کے بھائیوں سے الگ وطن کا مطالبہ کرنے لگتے۔ انھیں غلط اعداد و شمار سے... سیاسی چالبازیوں سے اور بے بنیاد پروپیگنڈے سے یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ ان کا استحصال ہو رہا ہے۔ سنہرے ریشے کی سرزمین کی تمام آمدنی کو مغربی حصے کی خوشحالی پر صرف کیا جا رہا ہے اور ان کے حصے میں بھوک اور سیلاب کی تباہ کاری، فاقہ کشی اور بے روزگاری کے سوا کچھ نہیں آ رہا ہے۔ چھ نکاتی پروگرام کو ایک منظم سازش کے تحت بنگال کے عوام کا نعرہ بنایا جا رہا تھا حالانکہ ان بیچارے پاکستانیوں کے دل سے وہی پاکستان زندہ باد کی صدا نکلتی تھی۔ مگر یہ عالمی سیاست کے شعبدہ گروں کا کمال تھا کہ وہ اسی آواز کو دل سے نکال رہے تھے۔

"بیٹھا مسکرایا... آئی مین یہ جو پوچھا تم نے کہا۔" مداسی نے غیر ارادی طور پر منہ سے نکل جانے والے تمام پر حقارت سے کہا۔ "سوال یہ نہیں کہ پاکستان کے دونوں حصوں کی مجموعی آبادی میں سے سات کروڑ تمہارے ساتھ ہیں یا آٹھ کروڑ۔ میرا مقصد تھا کہ تم پہلے مغربی پاکستان کے بارے میں بتاؤ۔ یہاں تمہاری تنظیم کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ پشاور سے کراچی تک تمہارے کتنے ایجنٹ ہیں؟"

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟" میں نے کہا۔ "اس تنظیم میں جو کچھ ہیں ہم ہی ہیں اور کوئی نہیں۔"

"جیسا کہ میں نے پہلے کہا، میں ایسی مضحکہ خیز بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ ایم آر ایس صرف سات ارکان پر مشتمل ہے۔" مداسی بولا، جو اپنے لہجے اور اعتماد کے باعث تفتیشی ٹیم کا سربراہ لگتا تھا۔ "چار مرد اور تین عورتیں مل کر کوئی دہشت گرد تنظیم نہیں بناتے۔ تمہاری پشت پناہی یقیناً کسی کا سرمایہ کر رہا ہوگا۔ کوئی سیاسی جماعت تمہارے پیچھے ہوگی جو تم کو اسلحہ اور وسائل فراہم کرتی ہوگی۔ تمہاری عملی مدد کرنے والے ہر جگہ پھیلے ہوں گے جو سامنے آئے بغیر تمہارے لیے بہت کچھ کرتے ہوں گے۔ ہم نے دنیا بھر کی دہشت پسند تنظیموں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے... طریق کار اور کارکردگی۔ نیچے سے اوپر تک کے تنظیمی ڈھانچے کی ساخت... عوامی سطح پر اس کے عملی نمونے کا اسلوب اور عالمی سطح پر ان کے روابط کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ مجھے یہاں تمہاری تنظیم کے بارے میں مکمل معلومات جمع کر کے ایک تفصیلی رپورٹ مرتب کرنا ہے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ بھارت میں اور مشرقی بنگال میں تمہاری پوزیشن کیا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ مداسی کی سوچ غلط نہیں لیکن جب وہ معاشرے میں وہ ایم آر ایس کا موازنہ پی ایل او کے تنظیمی ڈھانچے، روابط اور وسائل سے کر رہا تھا تو اس کے اسباب تھے۔ یہاں ہم نے انھیں بہت نقصان پہنچایا تھا جو غداروں سے مل کر ملک کے دو ٹکڑے کرنے کی سازش میں شریک ہو گئے تھے اور پیسے کی خاطر بک گئے تھے۔ مشرقی بنگال میں بھی حب الوطن محب عمر کے باقاعدہ علیحدگی پسندوں کو اور ان کے حامیوں کو برابر نقصان پہنچا رہا تھا چنانچہ مداسی نے فرض کر لیا تھا کہ ہمارا ان سے رابطہ ہے اور ہم ملک گیر سطح پر منظم ہو کے مزاحمت کی تحریک چلا رہے ہیں۔

"ابھی میں تم کو ایک سوالنامہ دوں گا۔" مداسی نے کہا۔ "تمہارے پاس پوری رات ہوگی۔ ایسا ہی سوالنامہ تمہارے تمام ساتھیوں کو الگ دیا جائے گا۔ اس سوالنامے کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ساٹھ سوال ہیں جن کے جواب بہت مختصر ہیں۔ ہاں یا نہیں۔ دوسرے حصے میں تمھیں سوچ کر وہ سب لکھنا ہوگا جو تم جانتے ہو۔"

"دیکھو... تم شدید غلط فہمی کا شکار ہو..."

"آج کی رات سوچو اور آرام کرو۔" وہ میری بات کاٹ کے بولا۔ "کل صبح دس بجے تک تم جوابات تحریر کر دو گے۔"

"میرے پاس تم کو کچھ بتانے کو ہے اور نہ لکھنے کو۔" میں نے چلا کر کہا مگر وہ اسپیکر بند ہو گیا تھا جس کے ذریعے میں ان کی آواز سن رہا تھا۔ کمرے میں ایک مدھم سی روشنی کچھ تیز ہوئی اور پھر وہی دونوں اندر آ گئے جنھوں نے مجھے کرسی کے ساتھ باندھا تھا۔ انھوں نے مجھے کھولا اور کھڑا کر دیا۔ میں تھوڑا سا لڑکھڑایا کیونکہ اتنی دیر تک بندھے رہنے کے بعد میرے ہاتھوں اور پیروں کے مسلز جیسے اکڑ گئے تھے۔ انھوں نے مجھے دھکیلا تو میں چل پڑا۔ بے اختیار میری نگاہ اس شیشے کے دروازے کے پیچھے گئی جہاں میں نے رابعہ کو دیکھا تھا۔ تھوڑی سی روشنی وہاں پہنچ رہی تھی لیکن وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ میرے محافظ مجھے اس عذاب گاہ سے نکال کے ایک خواب گاہ میں لے گئے۔

خواب گاہ سات فٹ لمبے چوڑے اور اونچے کمرے یا کوٹھڑی کا نام تھا جس کی چاروں دیواریں ایک جیسی سپاٹ اور مضبوط تھیں۔ دیواروں پر سیاہ رنگ کی کوچی پھیر دی گئی تھی تاکہ کمرے کا سیاہ رنگ بے روشن ہو جائے۔ اوپر چھت بھی ایک دیوار ہی محسوس ہوتی تھی جو میرے اور آزادی کے درمیان حائل تھی۔ جو میری زمین کو آسمان سے جدا کرتی تھی اور مجھے محبوس ہونے کا احساس دلاتی تھی۔ فریب نظر، اسے چھت نہیں مانتا تھا۔ گھروں کی چھت بہت خدا اور بہت مہربان ہوتی ہے۔ آدمی گھر کی دیواروں کو پھلانگ سکتا ہے تو چھت کو آسمان کے نیچے ایک اور سائبان کی پناہ کے طور پر دیکھ سکتا ہے یا محسوس کر سکتا ہے۔ اس چھت کو میں اپنے ہاتھوں سے چھو سکتا تھا اور اس کی سختی کو اور بے حسی کو محسوس کر سکتا تھا۔ دیواروں کے اوپر والے ایک جوڑ پر ٹیوب لائٹ کی روشنی تھی جس کے پیچھے والے روشندان سے گزر کے باہر جاتے تھے۔ روشندان کی لمبائی دو فٹ اور چوڑائی آٹھ انچ کے قریب تھی۔ ٹیوب لائٹ اس کی چوڑائی کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرتی تھی اور لمبائی کے رخ پورے روشندان پر پھیلی ہوئی تھی۔ لائٹ کی ٹیوب لائٹ کا اجالا اس کمرے کے لیے کافی تھا۔

روشندان میں کوئی سلاخ یا جالی نہیں تھی۔ اس کے سامنے ٹیوب لائٹ کی رکاوٹ ضرور تھی (اگر میں) اسے توڑ دیتا تب بھی آٹھ انچ کی چوڑائی سے نہیں گزر سکتا تھا۔ روشندان سے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ دیواریں ڈیڑھ فٹ چوڑی ہیں۔ میرے پاس ایک کیل بھی ہوتی تو میں جڑ سے ایک ایک اینٹ الگ کر دیتا اور رات بھر میں دیوار کے شگاف سے نکل جاتا لیکن میرا سارا اثاثہ ایک ریوالور تھا جسے میں باہر لانے سے گریز کر آیا تھا اور منتظر تھا کہ اس کے استعمال کا مناسب وقت آئے۔ شاید وہ وقت کبھی نہیں آئے گا اور جب آئے گا تو ریوالور مجھ سے چھینا جا چکا ہوگا۔ میں نے مایوسی کی کیفیت میں سوچا۔ فرش پر ایک بستر بچھا ہوا تھا۔ بستر صاف اور آرام دہ تھا۔ اس کے تکیے پر ایک قلم اور ایک کاپی رکھی ہوئی تھی۔ سو صفحات والی تھی جو شاید چار آنے میں ملتی تھی۔ اسے کھول کر مجھے غصے نے جان لیا کہ یہی وہ سوالنامہ ہے جس کے جواب مجھے صبح دس بجے تک تحریر کرنے ہوں گے۔ اگر میں نے جوابات نہیں دیے تو کیا ہوگا؟ غلط جوابات دیے تو کیا ہوگا؟ اور بالفرض محال سب ٹھیک ٹھیک جوابات لکھ دیے تو کیا ہوگا؟ یہ اضافی سوالات میرے ذہن میں تھے مگر ان کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔

بستر پر بیٹھ کے میں نے چشم تصور سے رابعہ کو اور پھر محسن کو دیکھا۔ شاید ایسے ہی ڈربوں میں بستر پر بیٹھے سوالنامے کو پڑھ رہے ہوں گے اور ان کا خون کھول رہا ہوگا لیکن بے بسی کا خون گھونٹنا ہے تو جینا ہے۔ وہ بھی اسی مشکل کا شکار ہوں گے۔ خدا کیا کریں۔ قلم توڑ دیں۔ سوالنامے کو پھاڑ دیں یا جوابات پر غور کریں۔ جو سوالات میرے ذہن میں تھے وہی ان کے ذہنوں میں انتشار پیدا کر رہے ہوں گے۔ آزمائش کے مرحلے سب کے لیے ایک جیسے تھے۔

اچانک دروازے کے قفل نے باہر سے کسی کے آنے کی خبر دی۔ پھر دروازہ کھلا اور ایک بی سراج اندر آ گیا۔ اس کے لبوں پر وہی کمینی سی مسکراہٹ تھی جو اس کی فطرت کی خباثت کو ظاہر کرتی تھی۔ پیچھے ایک ملازم ٹائپ آدمی تھا جس نے ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ ٹرے میں میرے لیے کھانا لایا گیا تھا۔ اس کے اشارے پر ملازم نے ٹرے نیچے رکھ دی۔

"لے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں کبھی کسی دشمن کا نمک نہیں کھا سکتا۔"

سراج نے قہقہہ لگایا۔ "کیا فرما گئے ہیں اپنے علامہ صاحب کہ اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔ [illegible] جو پیٹ خالی ہے تو دماغ بھی خالی رہتا ہے اور تم کو دماغ کا بہت استعمال کرنا ہے۔"

میں نے ٹرے پر نظر ڈالی۔ اس میں روٹی کے ساتھ چاول تھے۔ بھنا ہوا گوشت تھا اور تھوڑا سا حلوا تھا۔ میں نے سراج کے سامنے ایک ڈینگ تو ماری تھی مگر حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ بھوک آدمی کی سب سے بڑی دشمن ہے یا اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ بھوک نے آدم کو جنت سے نکلوایا۔ بھوک نے معاشی جدوجہد کو جنم دیا۔ غلامی بھی معاشی جدوجہد ہے۔ عصمت فروشی بھی اور چوری ڈکیتی بھی۔ بھوک نے ہی انسان کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ اس میں اور ایک حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ آخر میں کب تک نہیں کھاؤں گا۔ میں نے سوچا۔ فاقہ کشی کا مجھے کوئی تجربہ نہ تھا۔ میں نے کبھی شوقیہ بھی بھوک ہڑتال نہیں کی تھی۔ تو میں اب میرے جذبات پر عقل کا دباؤ ڈال رہا تھا اور وہ دلائل دے رہا تھا جن کی نفی نہیں کی جا سکتی تھی۔ نہ جانے اس قید میں کب تک رہنا پڑے۔ جسم بھی اذیت اسی وقت برداشت کر سکتا ہے جب اس میں قوت ہو۔ سختی جھیلنے اور مظالم برداشت کرنے کے لیے مجھے توانائی چاہیے۔ ناتوانی میں تو حوصلہ بھی جواب دے جاتا ہے۔ پھر دشمن کے نمک کا کیا سوال۔ نمک حرام تو یہ شیطانی ٹولہ تھا۔ میں اپنے وطن کی مٹی سے اگنے والی گندم کی روٹی پر حق رکھتا ہوں۔ ملتے میں خود کیوں اپنے پیٹ پر ممنوعہ بناؤں۔ یہ سب کچھ حرام ہونا چاہیے ان کے لیے جو وطن فروش ہیں۔ ان کو واقعی حق نہیں پہنچتا کہ اس وطن کی کسی بھی نعمت کو اپنا کہیں۔

"زبردست۔" سراج طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اس میں زہر نہیں ہے۔"

"اگر تمھارے بس کی بات ہوتی تو تم مجھے صرف زہر ہی کھانے کو دیتے۔" میں نے کہا۔ "میں بے بس ہوں، تم بھی بے بس ہو کہ مجھے مار نہیں سکتے۔"

www.paksociety.com

"مار دینا تو بہت آسان کام ہے۔ مارنا اور مرنے نہ دینا، یہ ذرا مشکل پڑتا ہے۔" وہ بولا۔ "میں تمھیں مار دیتا تو تمھاری جان دنیا کے سامنے بھیڑیوں سے چھپٹ جاتی۔ یہ مختلف لوگ ہیں۔ یہ اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑیں گے۔ تم لے یہ سوالنامہ تمھاری مشکل میں تم نے نقل میں سر لیا۔" اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو ایک کام کر دو۔"

"کیسا کام؟" وہ حیران ہو کے بولا۔

"میں تو رات کے بعد سو جاتا ہوں۔ تم یہ سوالنامہ پڑھ کے مناسب جوابات لکھ دو۔" میں نے کہا۔ "سوالات مرتب کرنے میں تم نے ضرور مدد کی ہوگی۔ زیادہ تر معلومات ایسی ہوں گی کہ تم میری جگہ جواب دے سکتے ہو۔"

"ماشاء اللہ طبیعت کی ظرافت ابھی باقی ہے۔" وہ بولا۔ "ابھی کچھ ہوا نہیں ہے۔ کل رات مزاج پوچھیں گے اور دیکھیں گے زبان سے پھول جھڑتے ہیں یا کانٹے۔ ٹرے میں یہ تھرماس کافی کا ہے۔ سگریٹ میں ابھی بھجواتا ہوں۔ جو شخص برتن اٹھانے آئے گا وہی سگریٹ بھی لائے گا۔ اور کسی چیز کی ضرورت پڑے تو دروازہ بجا دینا۔ باہر دو مسلح محافظ تمھاری خدمت کے لیے بھی کھڑے کیے گئے ہیں۔"

"کیا میں انھیں قتل کر کے فرار ہو جاؤں؟" میں نے کہا۔

"کوشش کر کے دیکھ لو۔" مسکراتے جاتے بولا۔ "تمھاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی کوشش ضرور کرتا۔ دوسرا راستہ خودکشی کا بھی ہے۔ تم سمٹ کر بی کے برابر ہو جاؤ تو دروازے سے نکل سکتے ہو۔"

جب وہ چلا گیا تو مجھے یہ خیال کر کے بہت افسوس ہوا اور بہت شرم آئی کہ میں کھانے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ کوئی بات نہیں۔ میں نے ٹرے کو اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ جیسے نیند سولی پر بھی آجاتی ہے ایسے ہی بھوک شاید قبر میں بھی لگتی ہوگی۔ آدمی بہت کمزور ہے بے بس اور مجبور ہے۔ خطا کا پتلا ہے اور وہ ہے "پانی کا بلبلا" وغیرہ۔ اس قسم کے دلائل ختم ہونے سے پہلے کھانا ختم ہو گیا اور میں نے کافی کا تھرماس خالی کرتے ہوئے ریوالور استعمال کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جب وہ ملازم برتن اٹھانے کے لیے اندر آئے تو میں اسے زد پر رکھ لوں اور کہوں کہ راستہ چھوڑ دو ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا... نہیں... وہ کہے گا کہ مار دو۔ ایک ملازم کی جان بے قیمت ہوتی ہے اور ایک آقا کی مرضی پر دس غلام قربان کرنے کی روایت پرانی ہے۔ تجویز نمبر دو... کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں اس ملازم کی ٹھکائی لگاؤں اور جب وہ واویلا کرے تو خود بھی اس کے ساتھ شور مچاؤں۔ فوراً کوئی مسلح محافظ مشین گن کے ساتھ اندر آجائے اور میں اسے گولی مار کے اس کی مشین گن پر قبضہ کر لوں... تو... وہ اکیلا نہیں آئے گا۔ ایک اندر آئے گا تو دوسرا پیچھے موجود رہے گا اور وہ دونوں بہرحال اتنے احمق نہیں ہوں گے کہ مجھے مشین گن پر اتنی آسانی سے قبضہ کرنے دیں۔ انھیں یہ بتا دیا گیا ہوگا کہ میں کیا کر سکتا ہوں اور انھیں ہر مشکل صورت حال سے نمٹنے کے لیے واضح ہدایات دے دی گئی ہوں گی۔

ملازم اندر آیا اور ٹرے اٹھانے لگا تو میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "کیا تم سگریٹ لانا بھول گئے ہو؟"

اس نے معذرت خواہانہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس نکال کے مجھے پکڑا دی۔

"یہ کیا ہے؟ گولڈ لیف؟" میں نے کہا۔ "میں تھوڑی کا سل پیتا ہوں۔" ملازم نے میری فضول بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"سنو! کیا تم مجھے یہاں سے فرار ہونے میں مدد دے سکتے ہو؟" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "میں تم کو پانچ روپے انعام دوں گا۔"

ملازم نے بدحواسی میں ادھر ادھر دیکھا۔

"چلو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ تم باہر کھڑے ہوئے دونوں محافظوں کو گولی مار سکتے ہو؟" میں نے کہا۔ "ریوالور میں فراہم کر دوں گا۔"

ملازم نے پھر ٹرے کو اٹھانا چاہا جس کو میں نے پکڑ رکھا تھا۔

"اچھا میرے ماموں کو پیغام تو پہنچا سکتے ہو کہ میں یہاں قید ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ دلی روڈ سے جنگیوں کی توپ لے کر آجائے گا اور ایک گولا چلائے گا تو سب کو پتا چل جائے گا۔ وہ بہت بہادر ہے... والد سے بھی زیادہ..."

باہر سے ایک محافظ نے میری توقع کے مطابق جھانک کر دیکھا کہ برتن اٹھانے والا اتنی دیر سے کیا کر رہا ہے۔

میں نے ملازم کے ایک جھانپڑ مارا۔ "اتنی دیر سے بکواس بھی بولتا جا رہا ہوں... تمھارے منہ میں زبان نہیں ہے یا ماں نے بولنا نہیں سکھایا؟"

ملازم چلانے لگا۔ "ہائے مر گیا جی... اللہ میری توبہ..."

میں نے اسے گردن سے دبوچ لیا۔ ایک بار پھر وہی ہوا جس کی مجھے امید تھی۔ مشین گن والا محافظ اندر آگیا۔ اس کے پیچھے دو قدم سے دوسرے محافظ نے بھی اپنی مشین گن کا رخ میری طرف کر دیا۔ ملازم ٹرے اٹھا کے بھاگا۔

"سب مارے گئے ہیں یہاں۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور سگریٹ جلالی۔ دونوں محافظ لوٹ گئے اور دروازہ باہر سے مقفل ہو گیا۔

تو گویا فرار ہونے کے امکانات صفر فیصد۔ میں نے اس تجربے سے حاصل ہونے والے نتائج کی روشنی میں سوچا۔ کہیں سے غیبی امداد پہنچنے کے امکانات صفر فیصد... ہمارا ان سے مقابلہ کر کے نکل جانے کے امکانات صفر فیصد... مجموعہ صفر فیصد... ان حالات میں سوالنامے کا مطالعہ کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس کے پہلے ... صفحات پر چھپے ہوئے تھے۔ ... سوالات چند صفحات پر چھپے ہوئے تھے ... دوسرے حصے کے سوالات ساتویں صفحے پر درج تھے اور باقی تیس صفحات ... چھوڑ دیے گئے تھے کہ میں جتنا اندراج کرنا چاہوں کر لوں۔ ... نہایت ذہین طالب علم تھا اور سالانہ امتحانات میں ہر پرچہ حل کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ صفحات کالے کرنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ جہاں دوسرے ایک امتحانی کاپی سے کام چلا لیتے تھے ... میں دو یا تین کاپیاں بھرتا تھا اور بہت خوش ہوتا تھا کہ ... دو گنا یا تین گنا قابل ہوں مگر مجھ سے زیادہ لائق لڑکے ایک ہی کاپی میں کے زیادہ نمبر لے جاتے تھے۔

آج پھر ایک امتحان در پیش تھا۔ کاش! مجھے معلوم ہو سکتا کہ دوسرے کیا سوچ رہے ہیں۔ ان کا ذہنی ردعمل کیا ہے۔ اگر میں ان سے مشورہ کر سکتا تو ہم مشترکہ لائحہ عمل اختیار کر سکتے تھے لیکن دشمن نے یہی تو چال چلی تھی۔ ہمارے جوابات سے جھوٹ پتا چل جائے گا۔ ... امید تھی کہ ... اور ... بھی ... کر دوں گا... میں کیا کروں گا۔ یہ میں نے ابھی طے نہیں کیا تھا۔ کمتری بیچاری کی معلومات تو نہ ہونے کے برابر تھیں اور اس کے لیے سوالنامہ شاید عبرانی زبان میں ہوتا تب بھی ناقابل فہم ہوتا۔ وہ اردو بول لیتی تھی مگر لکھ پڑھ نہیں سکتی تھی۔

حصہ اوّل کے سوالات تاریخ کا حصہ تھے اور میرے لندن میں قیام کے زمانے سے شروع ہوتے تھے۔ لندن میں مجھے ... خان کے خطوط ملتے تھے؟ کیا خطوط میں اس نے ... کا اعتراف کیا تھا؟ کبھی بتایا تھا کہ ... کون ہے؟ ... اور ... کون ہے؟ اس نے کاروبار سے اپنی علیحدگی ... کیا تھا؟ کبھی یہ بتایا تھا کہ اس کے کاروبار پر غاصبانہ قبضہ ... ہے؟ کبھی یہ لکھا تھا کہ اب وہاں ناجائز کاروبار ہو رہا ہے ... سوالات پاکستان میں قیام کے بعد کے حالات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں وہ سب کچھ پوچھا گیا تھا جو ہم کر چکے تھے ... یا نہیں کر پائے تھے۔

دوسرے حصے کے سوالات زیادہ مشکل تھے اور کچھ یوں تھے۔

۱۔ ایم آر ایس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟

۲۔ ایم آر ایس کے ارکان کی مجموعی تعداد کیا ہے؟ وہ ان میں کتنے ... ان کے فرائض کیا ہیں؟ ... کس عہدے میں ... شعبوں میں ... ان کے ... کہاں ہیں اور ان کو ہدایات کون جاری کرتا ہے؟

۳۔ ایم آر ایس کی عسکری قوت کیا ہے؟ اسے کتنے سابق فوجیوں کا اور کن کن کا تعاون حاصل ہے؟ انھیں خدمات کا کیا معاوضہ دیا جاتا ہے اور یہ لوگ کیا خدمت سرانجام دیتے ہیں؟

۴۔ ایم آر ایس کے مالی وسائل کیا ہیں؟ مجموعی اثاثے کتنے ہیں اور کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں؟

۵۔ ایم آر ایس کے پاس اسلحہ کتنا ہے اور کہاں سے آتا ہے؟

۶۔ ایم آر ایس کا رابطہ ملک کی کس سیاسی جماعت سے ہے اور کس کس جماعت نے ایم آر ایس کو حمایت کی پیشکش کی ہے؟

۷۔ بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر ایم آر ایس کو کس شخصیت کی پشت پناہی حاصل ہے؟

۸۔ ایم آر ایس نے اب تک تخریب کاری کی کتنی وارداتیں کی ہیں اور ان میں کتنا مالی یا جانی نقصان کیا ہے یا اٹھایا ہے؟

۹۔ بھارت اور مشرقی بنگال کے کن افراد... تنظیموں... سیاسی جماعتوں یا اداروں سے ایم آر ایس کو سیاسی اور نظریاتی بنیادوں پر تعاون حاصل ہے؟

۱۰۔ کیا ایم آر ایس اپنی تخریبی کارروائیوں کا سلسلہ روک کے ملکی معاملات سے خود کو علیحدہ رکھنے کے سوال پر مذاکرات کے حق میں ہے یا مصالحت کا کوئی فارمولا پیش کر سکتی ہے؟

یہ سوالات پڑھ کے میری عجیب حالت ہوئی۔ ایک طرف میرے اندر غصے کا آتش فشاں پھٹنے کے قریب ہو گیا۔ یہ حرامزادے ہمیں تخریب کار کہتے تھے۔ ہماری مجاہدانہ سرگرمیوں کو اپنی وطن دشمن حرکتوں کی طرح بے حس ہوس کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں ملک میں انتشار پھیلانے والے پیسہ اور اسلحہ دیتے ہیں۔ ہم امریکا یا روس کے ایجنٹ ہیں۔ آخری سوال کا مفہوم بھی واضح تھا کہ بتاؤ کتنا پیسہ چاہیے۔ کس ملک کی شہریت اور عیش و عشرت کے کیا لوازمات درکار ہیں۔ مذاکرات... مصالحت کا فارمولا... الو کے پٹھے... شیطان کے چیلے۔ خود تو بک چکے اب ہمیں خریدنا چاہتے ہیں۔ غصے کے ساتھ مجھے ہنسی بھی آئی کہ وہ خوف اور دہشت کے باعث رائی کو پہاڑ کی شکل میں دیکھ رہے تھے۔ ہم گنتی کے چند افراد... خالی ہاتھ... بے آسرا اور پریشان حال... ہمارا موازنہ وہ بہت بڑے پیمانے پر ملکی اور بین الاقوامی سطح کی تنظیموں سے کر رہے تھے۔ کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ گنگو تیلی ہم تھے مگر ان کی تو عقل بھی راجا بھوج سمجھ رہی تھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے محاذ جنگ پر کوئی کسی کے ہاتھ میں لوٹا بھی دیکھے تو بم سمجھ کے دور بھاگ جائے۔ ہمارا اثر ایک نفسیاتی فضا کا ہوتا ہے۔ کتے سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد... ان کو ہماری سرگرمیوں نے ایم آر ایس فوبیا میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ سب سوالات ان کے ذہنی

www.paksociety.com

تنہا بیٹھے ہوئے اندیشوں کی پیداوار تھے اور ان کے تصور کا فریب تھے لیکن میرے لیے تشویش کی بات یہ تھی کہ جواب کیا ہوں گے۔ جہاں سوال ہی غلط ہوں وہاں جوابات کے درست ہونے کا کیا سوال۔ ہم کیسے بتائیں گے کہ ہمارا کس سیاسی جماعت سے رابطہ ہے۔ ہم کس سیاست داں کے آلۂ کار ہیں اور کس کے اشارے پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ روس اور امریکا میں سے کون ہمیں شہ دے رہا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ تو ایک خالص ذاتی سطح کی جدوجہد ہے جس سے نہ کسی کا مفاد وابستہ ہے اور نہ غرض۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ کہاں کی مدد اور کیسی مدد۔ ابھی تک تو کوئی ایم آر ایس کا نام تک نہیں جانتا۔ کیا دے گا کوئی ہمیں اور کیوں دے گا۔ ابھی تک نہ اثاثے ہیں نہ وسائل۔ ملا خاک بھی نہیں۔ جو اپنا تھا وہ بھی گنوا دیا ہے اور ایک جان بچی سو وہ بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔

مگر کیا یہ سب کچھ وہ مانیں گے جنھوں نے سوال نامہ مرتب کیا ہے۔ وہ تو کہیں گے کہ جواب دو۔ مفصل جواب دو۔ اعداد و شمار دو۔ نام پتے دو۔ ... اور جواب سے انکار سے کام نہیں چلے گا۔ میں نے سوال نامہ رکھ دیا اور ایک سگریٹ سے دوسری سگریٹ جلانے لگا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم کس مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل ... وہ ہر صورت میں تشدد کریں گے اور تشدد کی ہر صورت میرے تصور میں تھی خصوصاً وہ سب جو رابعہ کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ اس کو غیر شریفانہ، غیر اخلاقی یا غیر انسانی کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ دشمن سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کے لیے دشمنی کا جواز رکھتے ہیں۔

کونے میں ایک سرسراہٹ کی آواز نے مجھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس کونے میں فرش کے ساتھ ایک انچ سے کچھ زیادہ قطر کا سوراخ تھا جس میں لوہے کا پائپ فٹ تھا۔ آثار سے وقت میں دروازہ بجا کے سنتری کے سامنے اسکول کے بچوں کی طرح ایک انگلی کھڑی کرتا تو وہ ... مجھے اس سوراخ سے رجوع کرنے کو کہتا۔ سرسراہٹ سے یوں لگتا تھا جیسے کوئی چوہا اندر آنے کی کوشش میں مصروف ہے لیکن اسی وقت ایک تنکا اندر آیا۔ تنکے کے آخر میں کاغذ کی ایک گولی چپکی ہوئی تھی۔ میں لپک کے گیا اور تنکے کو اندر کھینچ لیا۔ یہ تنکا نہیں لوہے کا تار تھا۔ کسی سائیکل کی پرانی اسپوک۔ اس پر جو کاغذ کی گولی تھی اسے میں نے احتیاط سے کھولا۔ اس پر پنسل سے لکھا ہوا تھا۔ ”مجھے بتاؤ میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ سندر“

”سندر!“ میں نے زمین پر لیٹ کر نالی کے سوراخ میں سرگوشی کی۔ ”تم میری آواز سن سکتے ہو؟“

”ہاں ...“ سندر کی آواز لوہے کے پائپ میں سے براہ راست

میرے کانوں میں پہنچی۔ ”ذرا آہستہ بات کرنا۔“

”کیا تم ہمیں یہاں سے نکال نہیں سکتے؟“ میں نے کہا۔

”نہیں ... پہرا بہت سخت ہے۔ میں اکیلا سب سے نمٹ نہیں سکتا۔ میں تو ڈیوٹی سے بھاگ کر آیا ہوں۔ مستقلاً اس کمرے کا سراج نے مجھے دو میل دور مخالف سمت میں بھیج دیا تھا۔“

”کیا ہم بارڈر پر ہیں؟“ میں نے کہا۔

”تم بارڈر کے قریب ہو۔“ وہ بولا۔ ”کلیم گرین کا قصبہ یہاں سے نزدیک ہے۔ تقریباً سات میل کے فاصلے پر۔“

”تو کیا اب ہمیں بارڈر کے پار اسمگل کیا جائے گا؟“

”ہاں ... تم کو انڈین انٹیلی جنس کے حوالے کر دیا جائے گا لیکن وہ تم کو زمینی راستے سے نہیں لے جائیں گے۔“ سندر وارا بولا۔

”پھر کیا ہوائی جہاز سے لے جائیں گے؟“

”مجھے اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ تم کو سمندر کے راستے بحری جہاز میں لے جایا جائے گا۔“ سندر نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ پہلے ہمیں کراچی لے جایا جائے گا؟“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ اور غالباً انھی دنوں میں ...“ سندر نے کہا۔

”آئی سی۔“ میں نے کہا۔ مجھے محسن کی بات یاد آئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ ستمبر دونوں پر ”ایلفریڈ ونیٹ سٹی“ اور ملک کا نام ”وسیع دنیا“ لکھا ہوا تھا جو ایک جعل اور گمراہ کن بات تھی۔ ”سندر کیا تم یہ بات کسی ایسے شخص کو بتا سکتے ہو جو ہماری مدد کر سکے۔ مثلاً اکرام شیخ کو یا ایس پی رضا حسن رضوی کو ... یا غالب کو یا نازو کو ... اگر وہ جیپ سے کراچی میں موجود رہیں تو شاید کچھ کر سکیں۔“

”میں کوشش کروں گا۔“

”اگر تمھیں اس جگہ کی بابت صحیح معلوم ہو جائے اور تم اس کا لوکیشن بتا سکو کہ ہم کہاں ہیں تو بتا دینا۔“ میں نے کہا۔

”میں ... کوشش کروں گا۔“ وہ بولا۔ ”دراصل یہاں سے میرا جانا تو ناممکن ہے۔ ٹرک کا انتظام بھی نہیں ہے۔ لاہور یہاں سے بائیس میل دور ہے لیکن جہاں ہم پڑے ہیں وہ غیر آباد علاقہ ہے۔ کوئی ٹرانسپورٹ نہیں ملتی۔ میں خود موٹر سائیکل لے کر جاؤں تو چار گھنٹے سے پہلے نہیں آ سکتا اور میری غیر حاضری کا سراغ فوراً ہی لگ جائے گا۔ ادھر سے کوئی بس گزرتی بھی نہیں۔ کوئی دیہات ... لاہور سے ہمارا رابطہ وائرلیس پر ہے لیکن وائرلیس بھی سراج کے پاس ہے۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا۔“

”اچھا۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”اگر تم اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤ تو ہمارے دوستوں کو صرف یہ بتانا کہ ہم خیریت سے ہیں۔ ورنہ وہ پریشان رہیں گے۔ اگر معلوم ہو سکے تو یہ بھی کہنا کہ ہمیں تلاش کریں۔ خصوصاً غالب اور نازو کے بارے میں اور ہاں ... اگر ایس پی رضا حسن رضوی صاحب سے بات ہو تو

ان سے پوچھنا کہ حیدری کی رہائی جیل کا کیا ہوا۔ اس کے گرگے بدلے رہے تھے۔ اگر یہ پوزیشن اب تک نہ ہوا ہو تو ایس پی صاحب سے کہنا اپنا سارا اثر و رسوخ استعمال کر کے یہ کام ضرور کرا دیں۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ تمھیں یاد ولانی ہے گی ... اور غالب نے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کیا ہو گا۔ اس نے اپنے اخبار نویس ساتھیوں کے ذہن کا یقین دلایا تھا۔ بس جولی کی خیریت معلوم ہو جائے۔“

”میں ... کوشش کروں گا۔“ سندر نے اسی لہجے میں کہا۔ ظاہر تھا کہ وہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا مگر وہ انکار سے گریز کر رہا تھا اور وعدے سے بھی۔ پھر بھی اس کے الفاظ مجھے بہت دلچسپ لگ رہے تھے اور اس سے رابطہ قائم ہو جانے کے بعد یہی محسوس کرنے لگا تھا کہ میرا رابطہ ساری دنیا سے بحال ہو گیا ہے اور ابھی تک دنیا کو خبر نہیں تھی کہ رابعہ اور محسن، حیدری اور سیٹھ جی کہاں ہیں لیکن اب انھیں پتا چل جائے گا کہ ہم یہاں ہیں۔ کوئی نہ کوئی کچھ کرے گا۔

”مجھے اب ڈیوٹی پر واپس پہنچنا ہے۔“

”اچھا سندر۔“ میں نے کہا۔ ”تم پھر کب آؤ گے؟“

”میں کیا بتاؤں ... جب بھی موقع ملے ... یہ بہت خطرناک ہے اور میرے لیے بہت زیادہ پرسکی ہے۔“ وہ بولا۔

”تم ایس پی صاحب کو اپنی رپورٹ کیسے بھیجتے ہو آخر؟“

”ایسے ہی ... جب بھی موقع مل جائے یا کوئی وسیلہ ہاتھ آ جائے۔“ وہ بولا۔

”کیا تمھیں معلوم ہے کہ رابعہ اور محسن کدھر ہیں؟“

”ہاں ... لیکن میں ادھر نہیں جا سکتا۔ ادھر روشنی ہے اور ان محافظوں کی نظر میں آ جاؤں گا۔“ وہ بولا۔ ”آخری کمرہ کے پیچھے تب تو وہاں جا سکتا ہوں۔“

”تم مجھے کوئی ایسی چیز لا کر نہیں دے سکتے جس سے میں دیوار توڑ سکوں؟“ میں نے کہا۔ ”کوئی چھینی یا ہتھوڑی ... چاقو ...“

”اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“ وہ بولا۔ ”اگر تم رات بھر کوشش کر کے دیوار کی چند اینٹیں نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو محافظوں کو بھی پتا چل جائے گا ... تو باہر آ کے کہاں جاؤ گے ... دیکھے جاؤ گے۔“

”آخر تم بھی تو یہاں پہنچے ہو۔“

”مجھے کہا گیا تھا۔ پہنچنا ہے۔ اس نے کوئی سوال کیے بغیر یہ پیچھے وزنی کھول دیا تھا اور میں پیچھے اتر آیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”اگر محافظ کوئی شک ہو گیا تو کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ میں اندر تھا ... کوئی بلا وجہ کسی سے میرا ذکر نہیں کرے گا۔ مگر تم کیسے باہر جاؤ گے۔“

”اور تم کب تک یہ سب پتا لگاؤ گے؟“ میں نے کہا۔

”کل ... جیسے ہی میری ڈیوٹی سراج کے سامنے ہوگی اور مجھے

اس جرم کی سزا ملے گی۔ ممکن ہے میری بیٹی اتر جائے۔ یا مجھے معطل کر دیا جائے ... لائن حاضر کر دیا جائے۔ یا میرے خلاف انضباطی کارروائی ہو تو میری تنزلی ہو جائے۔ میرے کندھے پر وہ یہی اسٹار رہ جائیں۔“ سندر داس بولا۔

”گیٹ کتنی دور ہے؟“

”سو گز کے فاصلے پر۔“ وہ بولا۔ ”یہ جگہ زیر زمین ہے۔ سو گز لمبی سرنگ ایک کمرے میں کھلتی ہے۔ باہر سے صرف یہی ایک کمرہ نظر آتا ہے اور اس پر لکھا ہوا ہے ’سب اسٹیشن واپڈا‘ اس کے چاروں طرف خاردار تاروں کی باڑھ ہے جس میں کرنٹ رہتا ہے۔ تاروں کی بلندی دس فٹ ہے۔ ان کو عبور کرنا بہت مشکل ہے۔ دروازے پر مسلح محافظ کھڑا رہتا ہے جو واپڈا کا ملازم نظر آتا ہے اور اس پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ وہ تم کو دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔ اس کے علاوہ تم اکیلے نکل بھی گئے تو تمھارے دوسرے ساتھیوں کا کیا ہو گا۔ ان کی تو شامت آ جائے گی۔ تم سب ایک ساتھ تو فرار ہو نہیں سکتے ... میرا مشورہ ہے کہ ایسی کوشش بھی نہ کرنا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے زیادہ مایوس ہو کے کہا۔ ”چلو تم ایک کام تو کرو ... میں ایک ریوالور باہر پھینک رہا ہوں۔“

”ریوالور ... تمھارے پاس ...؟“

”ہاں ... تفصیل ابھی نہیں بتا سکتا کہ ریوالور میرے پاس کہاں سے آیا۔ میرا خیال ہے کہ ریوالور کیتھرین کے پاس رہا ہے تو اچھا ہے۔ میں نے اس سے لیا تھا کہ کام آئے گا ... مگر اب مجھے ڈر ہے کہ میرے پاس سے برآمد ہو جائے گا۔ اس کے پاس محفوظ رہنے کا چانس زیادہ ہے۔“

”ٹھیک ہے ... لیکن ریوالور کیسے پھینکو گے؟“

”روشن دان میں سے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ جس ٹیوب لائٹ ہے لیکن میرا ہاتھ پیچھے کے نالے تک پہنچ جاتا ہے۔“

”پھینک دو ... میں کیچ کر لوں گا۔“ وہ بولا۔

میں فرش سے اٹھا ہی تھا کہ دروازہ ایک دم کھلا۔

”لاؤ ... پستول مجھے دے دو۔“ سراج نے اندر آتے ہی ہاتھ پھیلا دیا اور آہستہ آہستہ میرے قریب آنے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کے ٹریگر پر رکھی ہوئی انگلی ذرا سے دباؤ کی منتظر تھی۔ میں بے وقوفوں کی طرح کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ ابھی تو میں نے اپنا ریوالور باہر پھینکنے کے لیے نکالا بھی نہ تھا کہ وہ آ پہنچا۔ وہ یقیناً کہیں دور بیٹھا ہماری ساری گفتگو سن رہا تھا۔ ہم اور سندر بہت اونچی آواز میں نہیں بول رہے تھے مگر کہیں چھپا ہوا کوئی مائیکرو فون اتنا حساس تھا کہ ہماری سرگوشی بھی ریکارڈ کر رہا تھا۔ دیواریں بالکل سپاٹ تھیں۔ ان کے کان کہیں نہ کہیں ضرور تھے۔

”کم آن ...“ سراج نے کہا۔ ”معلوم نہیں اب تک

www.paksociety.com

بے وقوفی سے یہ ریوالور تمھارے پاس رہا... میں معلوم کر لوں گا... لیکن تم کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو تو اچھا ہے۔ یہ ریوالور کیا تمھارے پاس توپ بھی ہوتی تو بے کار تھی۔"

میں نے اندر اڑسا ہوا ریوالور نکالا اور سراج کے ہاتھ پر رکھ دیا کیونکہ اس کے بالکل پیچھے آنے والا گن مین انتہائی جارحانہ انداز میں آگے بڑھنے لگا تھا۔ "یہ لو... خودکشی میں کام آئے گا۔"

"اس حوالے سے تو میں نمٹ لوں گا۔" سراج نے ریوالور کو جیب میں ڈال لیا۔ "دھوبی کا کتا... نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔"

"تم اچھی بات کر رہے ہو تو میں اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"مسٹر جوکر... بہتر ہوگا اگر تم آرام سے سو جاؤ یا ان سوالات پر غور کرو جن کا تمھیں جواب دینا ہے۔ کتنا وقت ضائع کر دیا ہے تم نے۔" سراج ناگواری سے بولا اور پلٹ گیا۔ اس کے ساتھ آنے والوں میں ایک لڑکا... وہ چند منٹ کے لیے باہر گیا اور پھر لوٹ آیا۔

"تم سندر سے ملنا پسند کرو گے؟" وہ خباثت سے مسکرایا۔ اس کے اشارے پر گن مین نے مجھے ہاتھ پکڑ کے اٹھا دیا اور دروازے کی جانب روانہ کر دیا۔ دروازے کے باہر اس کا دوسرا ساتھی موجود تھا۔ بالکل مشینی انداز میں وہ میرے دائیں بائیں ہو گئے لیکن اس وقت مجھے ان کا نہیں سندر کا خیال تھا۔ کیا سراج کے کتوں نے اسے پکڑ لیا ہوگا۔ بے چارہ نیکی کرنے آیا تھا، بدی گلے پڑ گئی۔ اپنی وفاداری اور حب الوطنی ثابت کرنے کے لیے اس نے بڑی محنت کی تھی اور بالآخر ہندو ہونے کے باوجود یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ کسی بھی مسلمان سے کم پاکستانی نہیں۔ اس نے ضامن رضوی جیسے شخص کا اعتماد حاصل کر لیا تھا تو یہ اس کی کامیابی کی سند تھی۔ سراج اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ یہ بات تو یقینی تھی کہ وہ معطل ہوگا۔ وہ ڈیوٹی چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔ رضوی صاحب بعد میں اسے بچا لیں گے۔ وہ بتائے گا کہ اس نے یہ رسک کیوں لیا تھا مگر اسے دوبارہ سراج کے ساتھ پوسٹ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ سراج پہلے ہی اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اور سندر نے اس کو یہ سنہری موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ اسے انتہائی خراب رپورٹ کے ساتھ واپس کر دے۔ سندر انکار نہیں کر سکے گا کہ وہ ڈیوٹی چھوڑ کے مجرمانہ غفلت کا مرتکب ہوا تھا۔ اس نے دو گھنٹے ایک بارڈر کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا اس نے کسی اسمگلر سے بھتا لے کر وعدہ کیا تھا کہ جب اس کا مال گزرے گا تو روکنے والا کوئی نہیں ہوگا؟ سندر پر سارے الزامات عائد کیے جا سکیں گے اور وہ کسی کا جواب نہ دے سکے گا۔

میں ایک سرنگ نما راہداری میں چل رہا تھا جس کی چھت سر سے اتنی ہی اونچائی پر تھی جتنی کمرے کی چھت۔ یہ زیرِ زمین عمارت تھی۔ اس کی دیواروں اور چھتوں کو اونچا رکھنے کے لیے زیادہ گہرائی تک کھدائی کرنا مشکل کام تھا چنانچہ سات فٹ کی بلندی کافی سمجھی گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں حبس نہیں تھا اور گرمی نہیں تھی۔ کہیں نہ کہیں سے ایگزاسٹ فین کے ذریعے ہوا باہر کھینچی جا رہی تھی اور دوسری طرف سے تازہ ہوا اندر پہنچ رہی تھی۔ راہداری کے دونوں طرف دروازے تھے۔ سراج نے ایک دروازے کو دھکیلا اور اس کے پیچھے میں بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔ رابعہ کو دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ وہ فرش پر بچھے ہوئے بستر پر گھٹنے سمیٹے اور ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھے بیٹھی تھی۔ یہ بالکل ویسا ہی کمرہ تھا جیسا مجھے دیا گیا تھا۔ محسن اور شیڈی دائیں جانب کی دیوار سے چپکے کھڑے تھے۔ مجھے بھی اس صف میں شامل کر دیا گیا۔

"کیا بات ہے؟ کہاں ہے وہ...؟" اس نے ایک گالی دے کر کہا۔

"وہ... دوسرے کمرے میں..." اندر آنے والا ایک شخص بولا۔

"کیا تم نے اسے مار دیا ہے؟" سراج نے کہا۔

"نہیں... زندہ ہے... مگر مرنے والا ہے..."

"تو میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو... اسے مرنے سے پہلے لاؤ۔" سراج نے گرج کر کہا۔ دو آدمی باہر نکل گئے۔ میں نے رابعہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑ گیا تھا اور نظریں دیوار پر منجمد ہو گئی تھیں۔

سراج کے حکم پر باہر جانے والے چند منٹ میں لوٹ کر آئے تو انھوں نے دونوں ہاتھ اور دونوں ٹانگیں پکڑ کے سندر کو اٹھا رکھا تھا۔ وہ بے ہوش تھا۔ اس کا سر نیچے لٹکا ہوا پیچھے جھول رہا تھا اور اس کے کپڑے خون سے تر تھے۔ خون اس کے جسم سے مسلسل بہہ رہا تھا اور فرش پر گرتا جا رہا تھا۔ انھوں نے سندر کو کمرے کے فرش پر ایسے پھینک دیا جیسے وہ مردہ ہو اور اس کے لیے درد کے احساس کا کوئی مفہوم نہ ہو۔ بے ہوشی سے بیگانگی نے اسے جسمانی اذیت کے احساس سے [illegible] کر دیا تھا لیکن ہم بہرحال احساس رکھتے تھے۔ ہم مُردوں کو بھی اتنے احترام اور شائستگی کے ساتھ اٹھاتے ہیں کہ ان کو خفیف جھٹکا بھی نہ لگے۔ زخمی اور قریبِ مرگ کے ساتھ اس قسم کا سلوک دشمن سپاہی کے ساتھ میدانِ جنگ میں بھی کوئی روا نہیں رکھتا۔ سندر کی تکلیف کا آزار میں نے اپنے دل میں محسوس کیا۔ سندر داس کو تین گولیاں لگی تھیں۔ ایک زخم سینے پر تھا، دوسرا پیٹ سے ذرا نیچے اور تیسرا بائیں ران پر۔ خون تیزی سے

بہہ کر فرش کو داغدار کرتا جا رہا تھا اور میں اس شخص کو دیکھ کر احساسِ جرم و ندامت کا شکار تھا جس نے ہماری خاطر چوری چھپے دو میل کا فاصلہ طے کیا تھا اور دشمنوں کے سامنے گزرنے کا خطرہ مول لے کر خود کو اس اعتماد کا اہل ثابت کرتا جا رہا تھا جو رضوی صاحب نے اس پر کیا تھا۔

"تم لوگ جذبات میں اندھے ہو جاتے ہو۔" سراج نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ "فائر کھول دیا سوچے سمجھے بغیر۔ ایک گولی کافی تھی... میں اس کو زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا کہ اس نے کیا کہا تھا اور کیا سنا تھا۔ میں اس سے سب [illegible] اس کا یہ جرم ہی کافی تھا کہ یہ بارڈر پر اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر آیا تھا۔ اب کس سے معلوم کروں کہ یہ کیوں آیا تھا۔ یہ لوگ [illegible] گئے؟" اس نے ہم سب کی طرف اشارہ کیا۔

"جب تم نے سب کچھ اپنے کانوں سے سن لیا ہے تو پھر کس بات کا؟" میں نے کہا۔ "سندر تمھیں وہی بتاتا... جو بتا چکے ہو۔"

"تم اپنی بکواس بند رکھو۔" سراج دہاڑا۔ "مجھے معلوم ہے کیا تھا۔ یہ تمھارے آنکل ایس ایس پی کا ایجنٹ تھا۔ میری نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ تمھارا ہمدرد تھا اور تمھاری مدد کرنا چاہتا تھا۔"

"شیطانوں کے درمیان بھی انسان ہوتے ہیں جن کا مذہب انسانیت ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور تم جیسے لوگ جو بے خدا ہوتے ہیں ان سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے ہیں۔ تم کو اب [illegible] جو تم پر آئے گا۔ رضوی صاحب بھی سمجھیں گے کہ ظالم نے جان بوجھ کے اسے مروا دیا۔ تم اس سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔"

"لیکن اسے میں نے تو نہیں مارا۔" سراج نفرت اور حقارت سے غرایا۔ "یہ بارڈر پر ڈیوٹی دیتے ہوئے اسمگلروں کی گولیوں کا نشانہ بنا۔ یہ کوئی غیر معمولی واردات نہیں۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے... جب کہ سندر داس کی موت بہادر اور فرض شناس آدمی کی موت کہلائے گی۔ میں اسے زندہ گرفتار کرتا تو اسمگلروں سے ساز باز، رشوت سے [illegible] اور جرم میں برابر کا شریک ہونے کے الزامات ثابت کرتا اور اسے جیل پہنچا دیتا۔"

سندر داس کے بے حس و حرکت جسم میں اچانک حرکت ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھول کے ادھر ادھر دیکھا اور اس کی نظریں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ میں دوسروں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا سر ہاتھوں میں لے لیا۔

"پا... پا... پانی..." اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مرنے والے کو ایک گھونٹ پانی بھی نہیں دو گے؟"

میں نے پلٹ کر سراج کی طرف دیکھا۔

"کاش میرے اختیار میں ہوتا کہ میں اس کے لیے موت کے عذاب کو زیادہ سخت اور لمبا کر سکتا۔" سراج نے قہقہہ لگایا۔ ایک سفاک شیطانی قہقہہ... جو انسانیت کا نوحہ تھا اور ضمیر کی بے حسی کا آئینہ دار تھا۔

رابعہ ایک دم اٹھی۔ اس کے کھانے کے برتن ابھی تک اٹھائے نہیں گئے تھے کیونکہ اس نے کھانے کو چھوا بھی نہیں تھا۔ اس نے ٹرے میں رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھایا اور سندر کے پاس گھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھ گئی۔ ایک طرف سے میں نے سندر کو سہارا دے کر اوپر اٹھایا اور دوسری جانب سے رابعہ نے گلاس کو اس کے لبوں سے لگانے کی کوشش کی۔ میں ذرا سی دیر کے لیے سراج کی طرف سے غافل ہو گیا کیونکہ سندر مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ "میں... میں نے کہا... کہا نا... کوشش..."

اسی وقت سراج نے آگے بڑھ کر گلاس کو کک ماری۔ گلاس رابعہ کے ہاتھ سے نکل کر اڑتا ہوا گیا اور چھت سے ٹکرا کے پاش پاش ہو گیا۔ رابعہ نے ایک چیخ ماری کیونکہ چوٹ اس کی کلائی پر بھی آئی تھی۔ پھر وہ وحشیانہ دیوانگی کے ساتھ اٹھی اور سراج پر حملہ آور ہوئی۔

"ذلیل... شیطان... کتے..." اس نے پاگل پن کی بھری ہوئی قوت کے ساتھ سراج کا منہ نوچ لیا۔ سراج کے لیے اتنا شدید ردعمل بالکل غیر متوقع ثابت ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا رابعہ کے ناخنوں نے جو کسی خونخوار شیرنی کے پنجوں سے زیادہ بے رحم ہو گئے تھے سراج کے چہرے پر خراشیں ڈال دیں۔ اس نے خود کو بچانے کے لیے ہاتھوں سے چہرہ چھپانا چاہا اور ایک بار رابعہ کو دھکیلا مگر وہ پھر اس سے یوں ٹکرائی جیسے کسی اسپرنگ کی طاقت نے اسے کھینچ لیا ہو۔ سراج کی گردن کا گوشت ادھڑ گیا۔ میں نے اس کی جلد پر خون کی سرخ لکیروں کو نمایاں ہوتے دیکھا۔

"چھوڑ... مجھے پاگل کتیا..." اس نے چیخ کر گالی دی اور اپنا گھٹنا اٹھا کے رابعہ کے پیٹ میں مارا۔ رابعہ جیسے ہی دوہری ہوئی تو اس نے دوسرا گھٹنا اس کے منہ پر مارا اور وہ دور جا گری۔ محسن اور شیڈی مجھ سے پہلے آگے بڑھے تھے لیکن ان کی راہ میں وہ دونوں گن مین دیوار بن گئے تھے جو ہر وقت مستعد رہتے تھے۔ انھوں نے بڑی پھرتی سے دونوں کو پھر دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا اور وہیں دبوچ کر انھیں بے بس کر دیا تھا کہ وہ سانس بھی بڑی مشکل سے لے رہے تھے۔ میری آنکھوں نے ایک سیکنڈ میں دونوں طرف دیکھ لیا تھا۔ رابعہ کو گرتے بھی اور محسن کے ساتھ شیڈی کو بے بس ہوتے بھی۔ دو سیکنڈ میں میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ میرے وجود میں جیسے بارود بھر گیا جیسے پریشر ککر میں بھاپ اتنی بھر جائے کہ سارے حفاظتی نظام کی موجودگی بھی اسے پھٹنے سے

www.paksociety.com

نہ بچا سکے۔ میں نے ایک جست میں سراج کو جا لیا۔ اس نے
رابعہ کو دور پھینکا ہی تھا کہ میں نے اسے اٹھا کے دیوار پر دے مارا۔
وہ نیچے گرا تو میں اس کے اوپر گرا۔ میں نے مشین گن کے برسٹ
کی آواز سنی اور رابعہ کی چیخ بھی۔ لیکن اس وقت میں جنون کی اس
منزل سے آگے تھا جہاں عقل کی رسائی ممکن ہی نہ تھی۔ میں سراج
کو اسی شیشے کے گلاس کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا تھا جس
کو سراج نے ٹھوکر مار کے گرا دیا تھا۔ میں اس کو قتل کر دیتا اور خود
سراج نے بھی میری آنکھوں میں اپنی موت دیکھ لی تھی۔ مقابلہ کرنا
اس کے بس کی بات نہ تھی۔ میرے ناخنوں نے اس کا
حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ میں نے اسے آٹے کی طرح گوندھ ڈالا تھا اور
یوں رگڑ ڈالا تھا جیسے سل پر مسالے کو بٹتے دیکھا جاتا ہے۔ مجھے
ایک منٹ اور ملتا تو میں اس کا ریشہ ریشہ بوٹی بوٹی الگ کر دیتا
اور ان سب کے سامنے سراج ایس پی کے بجائے ٹوٹی پھوٹی
ہڈیوں، خون اور گوشت کا کراہیت انگیز قابل نفرت اور بے شکل
ڈھیر پڑا رہ جاتا۔

اچانک دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے کھینچ لیا۔ میں نے
مزاحمت کرنے والوں سے بھی لڑنے کی کوشش کی اور ان میں سے
ایک قلابازی کھا کے دور جا گرا لیکن دوسرے نے مجھے مفلوج
کر دیا۔ اس کے بجلی کی طرح چلنے والے ہاتھ میرے بازوؤں پر
یوں پڑے کہ ہڈی ٹوٹنے سے رہ گئی مگر میرے بازو بے جان ہو
گئے۔ اس نے گھوم کر لات ماری جو میری ران پر پڑی اور میں
کٹے ہوئے درخت کی طرح گرا۔ دوسرا اتنی دیر میں پھر سنبھلنے
آ گیا اور اس نے میرے دونوں ہاتھ ... گن کے پیچھے دے
مارا... میں پھر اٹھا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا اجالا ہو
رہا تھا اور میرے پیروں کے نیچے زمین جھولا بن گئی تھی۔ ان
دونوں نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

میں نے سر کو جھٹکا کر دیکھا اور منظر میری نظروں کے
سامنے صاف ہونے لگا۔ تیڈی اور محسن کو ایک مشین گن نے
روک رکھا تھا۔ دوسرا مشین گن والا دروازے میں جما کھڑا تھا
اور اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا۔ اگر اندر والے ایک ایک
کر کے ختم ہو جاتے تو آخر میں وہ ایک برسٹ مار کے ہمیں
بھی ختم کر دیتا لیکن اس سے پہلے وہ جانے بے فرار کا راستہ
کھلا نہ چھوڑتا۔ اس ملازم نے جو میرے لیے کھانا لایا تھا سراج
کو سہارا دے کر اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ سراج زخمی تھا اور بری طرح
کراہ رہا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اتنی مہلت ملنے کے
باوجود اس کی ناپاک زندگی کا خاتمہ نہیں کیا۔ میں اس کو مکے
تھپڑ مارتا رہا اور جھنجھوڑتا رہا۔ وجہ وہی تھی کہ میں غصے سے
دماغ کے ساتھ نہیں لڑ رہا تھا ورنہ میں صرف ایک ہاتھ مارتا
اور اس کی گردن توڑ دیتا۔ وہ میری توقع سے زیادہ سخت جان

ثابت ہوا تھا اور اگرچہ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی مگر وہ زندہ
تھا۔ شاید اس کی ہڈیاں بھی ڈھیٹ تھیں کہ کوئی بھی نہ ٹوٹی
اور وہ سیدھا کھڑا ہونے کے قابل تھا۔ سندر مر گیا تھا لیکن کوئی
اس کا طالب انصاف لاش کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب کی
نگاہ سراج پر تھی جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی
آنکھوں میں قاتلانہ چمک تھی اور وہ ریوالور نکالی کر اس کی تمام
گولیاں میرے جسم میں اتار دینے کی نیت کے ساتھ آ گیا تھا۔ آج
اس کی بہت بے عزتی ہوئی تھی۔ اس کی حاکمیت کا غرور ایک
عورت نے توڑ دیا تھا۔ پھر اس کی افسری کی ذہنیت کو توہین
آمیز شکست ہوئی تھی اور اس جرم کی وجہ مجھے زیادہ سخت
سزا دینا چاہتا تھا۔ مجھے دونوں گوشے کا ایسے جکڑے ہوئے یوں
تھا کہ میں جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ مجھ سے دو قدم دور تھا جب دروازے پر کھڑے
ہوئے محافظ نے اسے مخاطب کیا۔ "ریوالور جیب میں رکھو
ایس پی صاحب!" میں نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آواز
میں نے پہلے بھی سنی تھی۔ یہ وہی مدراسی تھا جو مجھ سے
تفتیش کرتا رہا تھا۔ اس کی سپاٹ آواز میں حتمی تنبیہ تھی۔ یہ
تحکمانہ بے حسی کا ایسا انداز تھا جس نے سراج کو اس کی طرف
دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

"میں اس کو قتل کیے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔" سراج نے
زخم خوردہ سانپ کی طرح پھنکار کے کہا۔ "اس کا خون پی جاؤں گا۔"

"یو ول ڈو نو سچ تھنگ۔" مدراسی نے اسی جذبات سے
عاری لہجے میں کہا۔ "ریوالور کا استعمال کرنے کی تمہیں اجازت نہیں۔"

"اجازت؟" سراج پھٹ پڑا۔ "تم اجازت کی بات
کرتے ہو مجھ سے۔ کون ہو آخر تم... میرے افسر یا میرے باپ
... تم بھول رہے ہو کہ تم کہاں کھڑے ہو۔"

"میرا کام تم کو خبردار کرنا تھا۔" مدراسی نے بھی انگریزی میں
کہا۔ "میں وہ نہیں ہونے دوں گا جو تم چاہتے ہو۔ ایک بار
... میں پھر دہرا رہا ہوں... ریوالور جیب میں رکھ لو۔"

سراج کے پندار پر یہ ایک اور تازیانہ تھا۔ اس نے ریوالور
جیب میں رکھتے ہوئے مدراسی کو زیر لب گالی دی مگر وہ
پتھر کا آدمی تھا جو کسی طرح بھی جذبات سے متاثر نہیں ہو سکتا
نہ وہ مشتعل ہو سکتا تھا۔ ادائے فرض کے معاملے میں اس کا
سے ایک مشین ادھر ادھر ہوتا تھا۔ جو اوپر والوں نے
کے مشن کا راستہ قرار دی تھی۔

"تم... کتے کے پلے ہو۔" سراج نے شعلہ فشاں نظروں
سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا تھپڑ میرے منہ پر
کے ساتھ پڑا۔

میں اب ہوش میں تھا۔ میرا گال تھپڑ کی ...

بے رنگ تھا مگر میں مسکراتا رہا۔

"میں تم کو ایسی سزا دوں گا... تم کو بھی اور تمہاری اس
... بھی... کہ تمہاری ساری بہادری اور شباب بین کے نکل جائے
گی۔" میرے منہ پر دوسرا تھپڑ مارا۔ اس نے ایک بار
... کی کہ وہ میرے سامنے رابعہ کا لباس تار تار کرے
... نظروں کے سامنے میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اس کے
ساتھ وہ میرے پیٹ میں گھونسے مارتا گیا۔ میں ان کو ...
کے شکنجے میں تھا اور ان کی گرفت اتنی سخت تھی کہ
... میری ساری طاقت دھری رہ گئی تھی۔ ہر ضرب
پیٹ کے اندر ایک بگولا سا اٹھتا تھا اور میں کرب سے
... کرتا تھا۔ اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی...
ظاہر تھا کہ سراج کے لیے گولی چلانے کے سوا کچھ ...
... اجازت لینا ضروری نہیں تھا۔ وہ مجھے ہر طرح
... میرے ساتھ ہر غیر انسانی سلوک کرنے، میری
... اور مجھے زیادہ سے زیادہ ذہنی و جسمانی اذیت
... کے لیے آزاد تھا۔ شرط صرف ایک تھی کہ میری جان
... سب سے سخت شرط تھی۔ میرے لیے بھی اور
... مجھے ذہنی اذیت دینے کے لیے میری
... کمزوری رابعہ اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ...
... کا زہر قبول کر لیا تھا کہ ہم سب کچھ نہیں
... ہماری آنکھوں کو وہ سب دیکھنا ہوگا جس کا تصور ...
... ہمارے کانوں کو گندے الفاظ
... کی آبرو لٹے جانے کا مکروہ شور سننا ہوگا اور ہمارے
... کو وہ سب برداشت کرنا ہوگا جو پتھر کا سینہ شق کر دے۔

"تم مجھ سے معافی مانگ لو گے تو بڑی اذیت اور
... سے بچ جاؤ گے سکندر۔" سراج نے میرے بال پکڑ
کر جھٹکا دیا۔

اس وقت میں نے وہی کیا جو میرا بہترین جواب ہو سکتا
تھا... اس کے منہ پر تھوک دیا اور مسکرانے لگا لیکن
... حرکت نے سراج کو پاگل کر دیا۔ وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔
... کے کپڑے پھاڑ دیے اور ان کا تار تار میرے جسم
... رابعہ نے ایک چیخ ماری لیکن اس کا کسی پر اثر
... موجود ہر شخص جیسے اندھا گونگا اور بہرا ہو گیا
... سراج کے جن کی زبانیں ان کے وجود کی ساری
... ان کے ساتھ ہی تھی۔ تیڈی اور محسن نے نظر
... اور رابعہ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔
سراج نے میری بیلٹ کھینچ لی تھی۔ شڑاپ کی آواز کے
ساتھ ... بیلٹ میرے جسم پر پڑی۔ شدید تکلیف کے
... مسکراتا جا رہا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جب

تک ہوش ہے گا میں مسکراتا رہوں گا۔ یہ مسکراہٹ اس کی
گالیوں سے زیادہ تذلیل کرنے والی تھی۔ میں اگر اسے برابر کا جواب
دیتا تب بھی وہ اتنا مشتعل نہ ہوتا جتنا میری اس مسکراہٹ نے
کیا۔ یہ مسکراہٹ اسی روشنی کی طرح بے صدم تھی جس کو بجھانا تیرے
اختیار میں نہ تھا اور جس کا عذاب میری برداشت سے باہر تھا۔
وہ مجھے قتل نہیں کر سکتا تھا لیکن اب وہ میری اس طعنہ دیتی
ہوئی، تمسخر اڑاتی ہوئی، چیلنج دیتی ہوئی، تحقیر کرتی ہوئی۔ اس کی
بزدلی اور میری جرأت۔ اس کی بے بسی اور میری ہمت۔ اس
کی کامیابی میں ناکامی اور میری سرفرازی کا اعلان کرتی ہوئی مسکراہٹ
کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھ وحشیانہ انداز میں بیلٹ کو بھر
کر پوری قوت سے میرے جسم پر مار رہے تھے۔ مجھے کسی خدشے نہیں
روکا۔ ہر بار جب بیلٹ کسی کوڑے کی طرح میرے بدن پر
لگتی تھی تو میری کھال پر ایک بے رنگ سی سیاہ لکیر سی بنا جاتی تھی۔
آہستہ آہستہ یہ لکیریں گہری اور جنگل کی الجھی ہوئی پگڈنڈیوں کی طرح
ہوتی جا رہی تھیں۔ کہیں کہیں کھال کے پھٹنے سے خون رسنے لگا
تھا لیکن ابھی تک میں ہوش و حواس کے ساتھ اپنے لبوں کی
مسکراہٹ کو برقرار رکھنے میں کامیاب تھا۔ اس ہیرے کی طرح
جیسے کوئی ناخدا گرداب و طوفان سے بچائے رکھنے کے لیے جسم و جان
کی ساری توانائی صرف کر دے۔ رابعہ تو اسی وقت بے ہوش ہو گئی تھی
جب میرے جسم پر چمڑے کی بیلٹ کا پہلا نقش ابھرا تھا۔ پھٹی
پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا اور بری طرح
کانپ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر آیت الکرسی تھی جو وہ بلند آواز
میں پڑھ رہا تھا۔ میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے یا اپنے دل کی
تقویت کے لیے۔ اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا تھا۔
محسن خلا میں دیکھ رہا تھا اور بالکل بت بنا کھڑا تھا۔ اس کی
پلکیں تک نہیں جھپکتی محسوس ہوتی تھیں۔

بالآخر میں کامران ہوا۔ خدا نے مجھے اتنا حوصلہ دیا۔ اتنی
استقامت دی اور اتنی قوت برداشت دی کہ میں شدید ترین
اذیت کو جھیل گیا۔ میرے جسم کو انگاروں کی زبان چاٹ رہی تھی
اور ہر آتشیں زخم میں کانٹے اگ آئے تھے لیکن میں نے دانتوں کو
مضبوطی سے ایک دوسرے پر جما رکھا تھا اور میرے لبوں پر
سراج کے لیے ایک ناقابل برداشت گالی بن جانے والی مسکراہٹ
زندہ تھی۔ یہ مسکراہٹ اس وقت تک رہی جب تک میں
ہوش میں رہا۔ پھر اچانک احساس فنا ہو گیا اور میرا وجود
گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ درد حد سے گزرا تو دوا ہو گیا۔

میں نے دوبارہ آنکھ کھولی تو اپنے کمرے میں تھا۔ ایک
شخص جو ڈاکٹر کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا میرے اوپر جھکا
ہوا تھا۔

"زخم مندمل ہونے میں دو ہفتے تو لگیں گے۔" وہ بولا۔

www.paksociety.com

"دو ہفتے... نہیں ڈاکٹر... زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ۔"
یہ آواز سراج کی تھی۔ وہ کچھ پریشان تھا... اور خوف زدہ تھا۔
میں نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔
"میں علاج کر سکتا ہوں... جادو نہیں کر سکتا...!" ڈاکٹر نے کہا۔ "تاہم خطرے کی اس وقت بھی کوئی بات نہیں۔ میں نے اینٹی بائیوٹک انجکشن دیے ہیں اس لیے کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوگی۔ مرہم اور پاؤڈر لگاتے رہو۔"
"لیکن اس کو جاگنا تھا۔"
"جاگ جائے... پہلے پھرنے سے کس نے روکا ہے۔" ڈاکٹر بولا۔ "تھوڑی سی جسمانی توانائی بحال ہو جائے تو یہ خود ہی اٹھ کھڑا ہوگا۔"
"کل سے چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں۔" سراج بولا۔
"چوبیس گھنٹے میں یہی ہو سکتا تھا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "گلوکوز کی دو بوتلیں اور چڑھا دی جائیں گی۔"
"کیا تم کسی کو زبردستی ڈرپ لگا سکتے ہو ڈاکٹر؟" میں نے اچانک کہا۔
ڈاکٹر چونک پڑا۔ "تم... تم ٹھیک ہو... ویری فائن...!"
"تم زبردستی مرہم تھوپ سکتے ہو، پاؤڈر چھڑک سکتے ہو؟" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "میں تمھارے علاج معالجے پر لعنت بھیجتا ہوں... کوئی میرے قریب تو آ کے دیکھے۔"
"کیا تم اچھا ہونا نہیں چاہتے؟" ڈاکٹر نے نرمی سے کہا۔
"اچھا ہو جاؤں آخر کس لیے... دوبارہ کھال اُدھڑوانے کے لیے؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "نہیں... میں چاہتا ہوں کہ سراج مجھے اسی حالت میں پیش کرنے پر مجبور ہو... اسے جواب دہی کرنا پڑے کہ یہ سب کیوں ہوا۔ ایک ایس پی کو بھی اندازہ ہو کہ با اختیار ہونے کے باوجود وہ اپنے آقاؤں کا زرخرید غلام ہے اور کتنا بے اختیار ہے۔"
"ہم تمھیں انجکشن دے کر سیڈیشن میں رکھ سکتے ہیں... مطلب یہ کہ سلا کے رکھ سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "تم کوئی پرابلم نہیں بنو گے اور ہم گلوکوز دیتے رہیں گے۔"
"تم اگر واقعی ڈاکٹر ہو تو مجھے دکھ ہے کہ تم نے بھی اپنے پیشے کے تقدس کو ان بے ضمیر شیطانوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔" میں نے کہا۔
"میں کون سا غلط کام کر رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے عیاری سے کہا۔ "اگر میں کسی کی جان لوں تو یہ غلط ہوگا۔ میں تمھاری صحت کی بحالی کے لیے کوشش کر رہا ہوں تو یہی میرا اور ہر ڈاکٹر کا پیشہ ہے... اور فرض ہے۔ اگر کسی مریض کا رویہ عدم تعاون کا ہو، کوئی ہسٹریا، جنون یا پاگل پن میں اپنا اور ہمارا دشمن ہو جائے تو ہم اور کیا کر سکتے ہیں۔ ہم اسے زنجیروں سے نہیں جکڑتے، بس
بتلا دیتے ہیں۔ اس قابل نہیں چھوڑتے کہ وہ حرکت...
"تم فکر مت کرو ڈاکٹر..." سراج نے ڈاکٹر کو تسلی دی... پر تھپکی دی تھی۔ "میں مسٹر سکندر بخت کی طرف سے ضمانت دیتا ہوں کہ یہ وہی کریں گے جو ہم چاہیں گے۔ اگر یہ تیر کی طرح سیدھے نہیں ہوں گے تو ہم انھیں سیدھا کرنے کے لیے ایک چیز استعمال کریں گے جس کا نام ہے رابعہ۔"
میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ سراج... کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ کاش اس مشکل وقت... رابعہ کی یاد ہوتی۔ خود رابعہ نہ ہوتی۔ میں نے سوچا... تو اس کے تصور کے ساتھ زندگی کی ہر سختی جھیل جاتا... کے طلب گار ہر مرحلے سے گزر جاتا... لیکن اب... گیا۔
تقریباً دو گھنٹے بعد جب میں اپنی ہی سوچوں میں... تھا ایک شخص کمرے میں آ گیا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ میرا ہی ہم عمر تھا یا مجھ سے پانچ سات سال بڑا تو... اچھی صحت کے باعث کم عمر لگتا تھا۔ وہ صورت سے... اور مہذب نظر آتا تھا اور اسے ہینڈسم کہا جا سکتا تھا۔ اس... چہرے کے نقوش میں وہ سختی نہیں تھی جو یہاں سب... یہ محسوس ہوتی تھی اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے سب... پتھر بیچ ہوں۔ اس نوارد کی شخصیت میں ایسا... والی دلکشی تھی۔ اس کے گھنے چمکیلے سیاہ بال، نازک... فریم کی عینک، تازہ کلین شیو چہرہ اور اس کی دوستانہ مسکراہٹ اس تاثر میں خوشگوار اضافہ کرتے تھے۔ وہ... کے بہترین سلے ہوئے سفاری سوٹ کے ساتھ اعلیٰ... جوتے پہنے ہوئے تھا۔
اس نے قریب آ کے مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
"ہیلو مسٹر سکندر بخت... کیا حال ہے؟"
میں نے ہاتھ نہ بڑھانے کا سوچا اور پھر یہی... یہ اظہار تعلق کی ابتدا کو درست نہ سمجھتے ہوئے ہاتھ ملا لیا۔ "میری حالت کے بارے میں مجھ سے بہتر دوسرے جانتے ہیں... اس کے ذمے دار ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کون ہو؟"
وہ ابھی کھڑا ہوا تھا۔ فرش پر بیٹھے ہوئے بستر... کے لیے مشکل بھی تھا اور شاید اس نے مناسب بھی نہیں...
"ویل... اگر تم چاہو تو مجھے اپنا دوست سمجھ سکتے ہو۔"... نے ہاتھ پیچھے باندھ کر کہا۔
"دوست! ایک ایسے شخص کو جسے میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہو اور وہ بھی اپنے بدترین دشمنوں کے درمیان؟"
اس نے سر ہلایا۔ "میں نے غلط لفظ استعمال کر لیا تھا۔ مجھے یہ کہنا تھا کہ میں ایک ایسا شخص ہوں جو تمھارے کام آ سکتا ہے، تمھاری بہتری کے لیے کچھ کر سکتا ہے۔"
"شاید یہ کہ تم مجھے اور میرے ساتھیوں کو باعزت طور پر یہاں سے نکال کے نہیں بھیج سکتے ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔
پہرے دار جو کھڑا ہوا تھا فوراً اس کے لیے ایک اسٹول رکھنے آیا... چلا گیا۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ لبوں میں دو سگریٹ دبا کے... دوران میں سے ایک میرے لبوں سے لگا دی۔ یہ اعتماد... کرنے کی اور دوستانہ فضا پیدا کرنے کا ایک اچھا طریقہ... میں نے اندازہ کیا کہ وہ ماہر نفسیات ہوگا۔ تفتیشی اداروں... ایسے افراد مؤثر کردار ادا کرتے ہیں جہاں پولیس کے حربے... ناکام ہوں جو زیر تفتیش افراد بہت ذہین یا ہوشیار... قوت ارادی کے مالک ہوں تو جسمانی تشدد سے کچھ... نہیں ہوتا۔ پھر ان کے ذہن تک رسائی حاصل کرنا اور... ذہنی طور پر شکست دینا ضروری ہو جاتا ہے اور یہ کام وہی کر سکتے ہیں جو انسانوں کو اس طرح سمجھتے ہوں جیسے تیس سال کا عملی تجربہ... ملک... ہو کہ ہر کل پرزے کو سمجھتا ہے۔
"مسٹر سکندر بخت!" وہ خاموشی کے طویل وقفے کے بعد... "...پاکستان آئے ہو...؟"
"میں خود نہیں لایا گیا تھا۔" میں نے کہا۔
اس نے سر ہلایا۔ "تب سے تم اپنی مشکلات میں مسلسل اضافہ کر رہے ہو اور تمھارا یہ طرز عمل مزید زیادہ سے زیادہ انتقامی... ہے۔ انتقام لینا انسان اور حیوان کی قدر مشترک ہے... اپنے آپ کو انتقام کا نشانہ بنا رہے ہو اور خود کو اذیت... دے رہے ہو..."
"...اس اعتراف کو اس سے تمھاری قابلیت کا تعین تھوڑی... اندازہ کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "سیدھی طرح بات... کرنے کے بجائے کیا چاہتے ہو۔"
اس کی مسکراہٹ کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے پھیکا پڑا۔ "...کل تمھیں ایک سوال نامہ دیا گیا تھا... کیا تم نے... جوابات...؟"
"...نے اسے پڑھ لیا۔" میں نے کہا۔
"پھر جواب کیا تھا؟" وہ بولا۔
"...پوچھ سکتا ہوں کہ میرے ساتھیوں نے کیا فیصلہ... کیا تھا؟"
"یہ اندازہ تو تم کر سکتے ہو کہ انھوں نے کیا کیا ہوگا؟" وہ نرمی... بولا۔
"میرا اندازہ ہے کہ انھوں نے سوال نامے کو پھاڑ کے پھینک دیا ہوگا۔"
...مسکرایا۔ "آئی ایم سوری... میں سمجھتا تھا... سوال نامہ... ایک ٹیسٹ نہیں ہے۔ وہ ذہنی... نہیں ہوتی ہے کہ تم ایک دوست کی مانند... انڈرسٹینڈنگ
کر سکے۔ دراصل یہ انڈر اسٹینڈنگ پرانے دوستوں میں طویل رفاقت کے بعد یا گہری جذباتی وابستگی سے پیدا ہوتی ہے۔ بشرطیکہ دوستی اور وابستگی بے غرض ہو۔ نفع نہ چاہی گئی ہو اور اس کا مقصد مسرت کا حصول ہو۔ تمھاری ان ساتھیوں کے ساتھ وابستگی ایک مشن کے لیے ہے۔ گویا کاروباری ہے۔"
میں نے دلچسپی سے اسے دیکھا... الّو کا پٹھا... ماہر نفسیات کی دُم۔ حالات کا پتا نہیں اور آ گیا تحلیل نفسی کے لیے۔ کتابی علم بگھارنے۔ قصور اس کا نہیں تھا۔ اس کے نظریات کی بنیاد وہی معلومات تھیں جو اسے فراہم کی گئی تھیں۔ اسے صرف یہ بتایا گیا تھا کہ ہم پر الزام کیا ہے۔ اس کے نزدیک یہ دہشت گردوں کا ایک ٹولہ تھا اور جیسے جماعت دشمن صرف پیسے کی خاطر سب کچھ کرتے تھے جیسے ہی شاید ہم نے بھی پیسے کے عوض اپنی جان کو گروی رکھ دیا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم کرائے کے قاتل ہیں۔
تاہم میں نے اس کی تھیوری کو مسترد نہیں کیا اور یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ کتنا سطحی علم اور کتنی نامکمل معلومات رکھتا ہے۔ میرے حق میں یہی بہتر تھا کہ میرے ذہن میں جھانکنے کی خواہش رکھنے والے کی آنکھوں پہ غلط نمبر کی عینک ہی لگی رہے تاکہ وہ غلط دیکھے اور غلط سمجھے۔ میں اس کو صحیح معلومات فراہم کر دیتا اور اس کا زاویۂ نگاہ درست کر دیتا تو گویا اس کی مدد کرتا۔
"تمھارے اندازے کے برعکس انھوں نے سوال نامے کے جوابات تحریر کر دیے ہیں۔" وہ میری مایوسی سے مطمئن ہو کے بولا۔
"اچھا۔" میں نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔ "پھر تو مجھے بھی ان کی توقعات کو غلط ثابت کرنا چاہیے۔ انھوں نے سمجھا ہوگا کہ میں جواب لکھ دوں گا چنانچہ انھوں نے بھی لکھ دیے۔ ایسی کی تیسی ان سب کی۔" میں نے سرہانے رکھی ہوئی کاپی اٹھا کے پرزہ پرزہ کر دی۔
وہ میری اس حرکت پر بالکل حیران یا مشتعل نہیں ہوا بلکہ ایسے بیٹھا رہا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ "کوئی کام دو طرح سے کیا جا سکتا ہے۔ خوش اسلوبی سے اور کسی خرابی یا دشواری کے بغیر... وہی کام اپنے لیے مشکلات پیدا کر کے اور بڑی خرابی کے بعد کرنے والے کو عقل مند نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ لوگ جو تم کو یہاں لائے ہیں تمھارے دشمن ہیں۔ ان سے رحم یا رعایت کی توقع خود فریبی ہوگی لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ تم اپنی اس پوزیشن کو تسلیم کرتے ہوئے مزاحمت چھوڑ دو اور وہ سب بتا دو جو تم سے پوچھا جانا ہے تو تم بہت سے عذابوں سے محفوظ رہ سکتے ہو۔ مجھے تم کو یقین دلانے کے لیے بھیجا گیا ہے کہ تم ان سے تعاون کرو گے تو وہ دوبارہ نہیں ہوگا... جو گزشتہ شب ہوا۔"
"یقین دہانی کرانے والا کون ہے؟" میں نے کہا۔
"وہ ذمے دار لوگ ہیں۔ انھوں نے سراج کو بھی...

www.paksociety.com

کی ہے۔ وہ ذرا اکھڑ اور بادوی مزاج رکھنے والا آدمی ہے۔ اس کے خلاف پہلے بھی بے رخی کی شکایات تھیں۔ میں سمجھتا ہوں وہ نارمل نہیں ہے تو اس کی وجہ ہے یہ اس کے بچپن کے حالات کی سختی... احساس محرومی اور کمتری کا رد عمل ہے۔ یوسفی اس کا باپ نہیں تھا میرا مطلب ہے اس کے باپ کا نام نہیں تھا۔"

"لیکن ظاہر ہے کہ کوئی شخص بغیر باپ کے نہیں ہوتا... یہ کیوں کہ اس کے اصل باپ کا نام اس کی دستاویزات میں کہیں ولدیت کو ظاہر نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔" اس نے انگلی اٹھا کے تعریفی انداز میں کہا۔ "اس کی ماں کے ساتھ بہت ظلم ہوا جس شخص نے اس سے شادی کی وہ اس کو بد چلن سمجھتا تھا جبکہ وہ خود بد چلن تھا۔ اس نے شادی کے بعد اپنی بیوی کو گناہ کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ عورت اپنے بچے کے ساتھ اس کے گھر سے فرار ہو گئی بعد میں بھی وہ درندے کے ہاتھوں میں بہت خوار ہوئی۔ یہ سب سراج کے ذہن میں اس کے لاشعور میں ہے۔ وہ سارا زہر جو اس کی ماں نے پیا نفرت کا زہر تھا یہ اس کے خون میں بھی شامل ہوا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ دنیا کو ان سارے مظالم کی سزا دے کر ایک تسکین حاصل کرتا ہے جو دنیا نے اس پر کیے تھے۔ ایک میجر اور ذمے دار افسر میں زیادہ تحمل، بردباری اور قوت برداشت ہونا چاہیے۔ مثلاً کل اسے اتنا مشتعل ہونے اور ایسی دیوانگی کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی جگہ دوسرا ایس پی ہوتا تو مستعد کو گرفتار کر لیتا مگر تم سے کچھ نہ کہتا۔ ظاہر ہے کہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ یہ مار پیٹ بے مقصد تھی اسے معلوم تھا کہ تم کو تھوڑی سی مہلت آرام سے سوچنے کے لیے دی گئی ہے۔ اس نے اشتعال میں کام خراب کر دیا۔ اس پر تو لازم تھا کہ تم نے اس پر تھوکا تھا تب بھی برداشت سے کام لیتا اور رومال سے منہ صاف کر لیتا... خیر... یہ سب میں نے اس لیے بتایا کہ تم سراج کی مجبوری کو سمجھ سکو اور یہ بھی سمجھ لو کہ آئندہ وہ تمہارے سامنے نہیں آئے گا۔"

میں حیران تھا کہ وہ سراج کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے۔ اس نے وہ سب دیکھا یا سنا ہے جو گزشتہ شب ہوا لیکن وہ ہمارے بارے میں معلومات نہیں رکھتا کہ میں اور محسن بچپن سے یک جان دو قالب ہیں اور رابعہ کا مجھ سے وہی رشتہ ہے جو روح کا جسم سے ہوتا ہے۔ کیا وہ تجاہل عارفانہ سے کام لے رہا تھا اور جانتے بوجھتے ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتا؟

"میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تمہیں آزادی دلا سکوں لیکن میں اتنا ضرور کر سکتا ہوں کہ تمہارے لیے آسانیاں پیدا کر دوں۔ یہاں تمہارا قیام عارضی ہے۔ میں اور چند دوسرے افسر ذمے داری کو قبول کر چکے ہیں کہ تمہارے بارے میں اور [illegible] کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کر لیں۔ سب سچ [illegible] غلط ہیں یا صحیح۔ اس کی تصدیق ہم نہیں کریں گے [illegible] گے ہم درست تسلیم کرتے ہوئے ریکارڈ میں شامل کر لیں [illegible] آگے وہ جانیں جن کا یہ کام ہے۔ ہم تمہارے مکمل [illegible] یہ سب انفارمیشن آگے پاس کر دیں گے اور تمہیں بھی ان کے حوالے کر دیں گے۔ ہم صرف عارضی طور پر تمہارے کسٹوڈین [illegible] ذاتی سطح پر ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی دشمنی نہیں [illegible] وہ کر رہے ہو جو تم صحیح سمجھتے ہو۔ ہم وہ کر رہے ہیں جو ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ فرق صرف پوزیشن کا ہے۔ اس وقت تم [illegible] ہو اور قید کرنے والے ہم ہیں۔ کل پوزیشن الٹ بھی سکتی ہے لیکن میری خواہش ہے کہ تم ہمارے لیے مشکل پیدا نہ کرو۔ سوالنامے کے جواب میں کچھ بھی لکھ دو۔ جھوٹ سچ [illegible] سے کیا۔ ہم تو لکھیں گے کہ جناب یہ ہیں آپ کے قیدی [illegible] انفارمیشن جو ان سے ملی ہے۔ اس کے بعد ہمارا کام ختم۔"

اس وقت تک مجھے یقین آ چکا تھا کہ جسے میں [illegible] سمجھا تھا وہ ایک بہت عیار اور خطرناک آدمی ہے۔ وہ خود کو کچھ ظاہر کر رہا تھا اور حقیقت اس سے بالکل مختلف تھا۔ [illegible] اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ دوسرا اندازہ میں نے یہ لگایا کہ وہ [illegible] انٹیلی جنس کی ٹیم کا سربراہ ہوگا جو ہماری گرفتاری اور ہمارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے خصوصی طور پر تشکیل دی گئی ہوگی۔ اس ٹیم میں جاسوس اور سراغرساں، تفتیش کے ماہرین اور پیشہ ور قاتل سب شامل تھے لیکن اس کی نگرانی [illegible] انٹیلی جنس کا بہت اچھی شہرت اور بہترین ریکارڈ رکھنے والا بہت اعلیٰ افسر ہوگا۔ کرنل یجنگن یا تھوڑے سے بڑے رینک کا کوئی بریگیڈیئر یا میجر جنرل۔ اعزازی عہدے والا یا سول [illegible] آنے والا۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ اس کا کام صرف معلومات [illegible] ساتھ دوسروں کے حوالے کرنے کا ہے۔ یہ دو [illegible] مشرقی بنگال میں بغاوت کی منظم سازش کرنے والے [illegible] کا مددگار بھارتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ خود کو ایک پاکستانی [illegible] کر رہا تھا۔ سراج اور دلاور کا ساتھی بتا رہا تھا جبکہ وہ خود [illegible] ٹائپ کا آدمی تھا جو [illegible] جاننے کے لیے آیا تھا جو [illegible] اور دلاور کا بھی باس تھا۔ ان سے کام لیتا تھا اور ان کو وطن فروشی کے راستے دکھاتا تھا۔ طریقے بتاتا تھا اور [illegible] معاوضے ادا کرتا تھا۔ وہ مشرقی بنگال میں ہونے والے [illegible] ڈرامے میں برابر کا شریک تھا مگر اس نے مغربی پاکستان کے [illegible] کی وفاداری کا بہروپ بنا رکھا تھا۔ اس جیسے نہ جانے کتنے [illegible] محاذ پر مختلف جگہ اپنی اپنی وفاداریاں پوری کر رہے تھے

[illegible] خود مختار تھے۔

"میری بات کو سمجھو اور مانو۔" اس نے اندر کی جیب میں [illegible] اور ویسی ہی دوسری ڈبیا نکالی جیسی میں [illegible] چکا تھا۔

"[illegible] کرتا ہوں کہ تم آرام سے رہو گے بشرطیکہ [illegible] دو محسن جیسے ساتھیوں کو بھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ [illegible] کر دیا جائے کیونکہ باقی سب تو جوابات دے ہی [illegible] تم بھی جوابات لکھ دو تو تمہاری یہ قید تنہائی ختم ہو جائے [illegible] سب کو ایک کوٹھی میں شفٹ کر دیا جائے گا جہاں تم [illegible] ملنے کے لیے آزاد ہو گے۔ اندر ہی تمام [illegible] باہر کی دنیا سے تمہارا رابطہ ممکن نہ ہو گا کہ ان حالات میں [illegible] اجازت کیسے دی جا سکتی ہے۔ ایک میڈیکل اسپیشلسٹ [illegible] دیکھتا ہے۔ اس نے امید ظاہر کی ہے کہ ایک ہفتے [illegible] ٹھیک ہو جاؤ گے۔ اس وقت بھی تم چل پھر سکتے ہو [illegible] بیٹھ سکتے ہو۔ تم کچھ بھی منگوا سکتے ہو۔"

"[illegible] دوستی ہے... دو [illegible] قریب... اچھا ہے..."

وہ [illegible] میں نے سنا تھا کہ تمہارا اسپیشل ٹف [illegible] حالات میں بھی ختم نہیں ہوتا... خیر... کیا اب [illegible] امید [illegible] کہ تم سوالنامے پر دستخط کر دو گے؟ یہ سمجھ لو کہ جتنی جلدی یہ [illegible] گے اتنی ہی جلدی یہاں سے نکل سکے [illegible] منتقل ہو جاؤ گے اور اپنے ساتھیوں سے مل سکو گے۔ کوشش [illegible] انھوں نے جوابات درست دیے ہوں کیونکہ باقی سب کے جوابات [illegible] ہوگا اور بہت زیادہ فرق ہوا تو..." وہ بات ادھوری [illegible] مسکرا دیا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ میرے باقی ساتھی کیسے ہیں؟" میں نے بے اختیار ہو کے پوچھ لیا حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ اس کا جو بھی جواب دے گا وہ غلط ہوگا۔

"ٹھیک ہیں... رابعہ اور کیتھرین کو ہم نے ایک جگہ [illegible] ہیں۔ انھیں [illegible] سہولتیں حاصل ہیں... عورت ہونے کی وجہ [illegible] زیادہ [illegible] جا سو گے؟"

یہ سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ میں اچھل پڑا۔ کیا یہ ممکن ہے [illegible] کوشش کر سکتا ہوں کہ تم چند منٹ کے لیے مل [illegible] کوئی تمہارے قریب موجود ہوگا۔ کسی پرائیویسی کی [illegible] رکھنا۔" وہ بولا۔ "اس کے علاوہ... تمہاری گفتگو [illegible] ذاتی باتیں... یہ بہت غلط ہوگا اگر تم نے [illegible] تم نے کیا لکھا اور کیوں لکھا... اور [illegible] تم کوئی پلان نہیں بناؤ گے اور ایک [illegible] کسی قسم کی ہدایات نہیں دو گے۔ کیا ان شرائط کو [illegible] ملاقات تمہیں قبول ہوگی؟"

میں نے اقرار میں گردن ہلائی۔ "میں صرف اسے دیکھوں گا... صرف تسلی دوں گا۔ اس کے آنسو پونچھوں گا۔ [illegible] بلکہ تم کہو گے تو میں خدا حافظ بھی نہیں کروں گا۔ بالکل نہیں بولوں گا... تم ایک بار اسے لانے کا وعدہ کرو تو میں سب وعدے کر سکتا ہوں۔"

اس نے سر ہلایا اور باہر چلا گیا... اندر ہی اندر میں اس شخص کے وجود پر... اس کی اداکاری... اس کی پُرفریب باتوں اور اس کے شاطر ذہن کی بدمعاشی پر کھول رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ظاہر کیا تھا کہ وہ میرے اور رابعہ کے جذباتی تعلق سے بے خبر ہے۔ اس نے ہماری وابستگی کو کاروباری قرار دیا تھا۔ اب وہ رابعہ کو میری جذباتی کمزوری بنا کے استعمال کر رہا تھا۔ وہ پہلے مبہم اور غیر واضح الفاظ میں دوسروں کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔ اب وہ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔

دروازہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ میں اٹھ کر دروازے تک گیا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میری جسمانی اذیت بہت کم ہو چکی تھی۔ درد کے احساس کو ختم کرنے والی کسی دوا کا اثر تھا جیسے زخموں پر بھی کوئی ایسا ہی مرہم لگایا گیا تھا۔ زخم بالکل سطحی تھے چنانچہ کسی علاج کے بغیر بھی ٹھیک ہو جاتے۔ [illegible] انجکشن کے بعد انفیکشن کا خطرہ بھی نہیں رہا تھا۔

دروازے کے باہر کسی محافظ کو نہ پا کے مجھے تعجب ہوا لیکن بہت جلد میں نے سمجھ لیا کہ یہ دوسری چال ہے۔ شکاری وہی ہیں مگر جال وہ نہیں ہے۔ اب انھوں نے وہم کا جال زمین پر بچھایا ہے جو نظر نہیں آتا لیکن جیسے ہی میں نے غلط قدم اٹھایا میں نئی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ میں واپس آ گیا۔ دل کو رابعہ کے آنے کی آس نے ضبط و سکون کا یارا ہی نہ دیا تھا اور صبر و قرار ساتھ چھوڑ گئے تھے... وہ آئے گی... کیا وہ آئے گی... پتہ نہیں... وہ مجھے امید کا فریب دے گیا ہے۔ [illegible] خیال میں الجھا گیا ہے۔ وہ ابھی کچھ دیر میں آ کے کہے گا کہ سوری [illegible] کی مجبوری ہے... وہ کہتے ہیں کہ پہلے تم سوالنامے کے جوابات دے دو تو انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا اگر تم ایک ساتھ اس کمرے میں بھی رہو۔

میں نے اسٹول کو روشندان کے قریب کیا اور باہر جھانکا۔ میرے سامنے مشکل سے پانچ فٹ کے فاصلے پر دوسری دیوار تھی اور ایک ایسا ہی روشندان تھا اس میں بھی ٹیوب لائٹ لمبائی کے رخ فٹ تھی لیکن میں ٹیوب لائٹ کو پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی عجیب بات مجھے ہوئی کہ اس میں چوک کی طرف سے وہ تین تار نکلے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو تو واقعی طور پر بجلی کے تار تھے لیکن تیسرا [illegible] تھا۔ تقریباً ویسا ہی جیسا کہ ہینڈ سیٹ اور ٹیلی فون کے درمیان ہوتا ہے۔ یا جو ڈیک اور اسپیکر کے درمیان نظر آتا ہے۔ آواز کی لہروں کو برقی

www.paksociety.com

مقناطیسی لہروں کی صورت میں اِدھر سے اُدھر آنے جانے کی راہ فراہم کرنے والا ہے۔ میں نے فوراً اپنے روشندان کی ٹیوب لائٹ کے پیچھے ہاتھ مار کے دیکھا۔ اس میں بھی تین تار تھے... دو آپس میں بل کھا کے لپٹے ہوئے تار بجلی کے تھے۔ تیسرا پتلا اور چکنی سطح والا نرم تار تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس چکنی سطح کے نیچے دو الگ الگ تار ہیں اور ٹیوب لائٹ کے اندر ہی کسی جگہ ایک مائکروفون فٹ ہے۔

ٹیوب لائٹ کوئی پیچیدہ چیز نہیں ہوتی۔ چوک۔ اسٹارٹر اور ٹیوب... اس کے یہی تین اجزاء ہیں۔ چوتھی چیز وہ ٹین کا فریم ہوتی ہے جس میں ٹیوب فٹ کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ہے تو اس کا تعلق ٹیوب لائٹ سے نہیں۔ میں نے ہاتھ گھماتے ہوئے سوچا اور بہت جلد اس چیز کو دریافت کر لیا۔ یہ بھی ایک اسٹارٹر تھا۔ ایک ٹیوب لائٹ میں دو اسٹارٹر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ دوسرا اسٹارٹر دیکھنے میں اسٹارٹر لگتا ہے لیکن اس کے اندر مائکروفون ہے۔ یہ بات سمجھ لینے کے بعد میں نے دونوں کی ساخت پر غور کیا۔ فرق بہت نمایاں تھا۔ ایک اسٹارٹر کے اوپر والے حصے میں بہت باریک جالی سی تھی۔ اسٹارٹر نکال لینے سے جلتی ہوئی ٹیوب لائٹ روشن رہتی ہے۔ فرق اس وقت پڑتا ہے جب اسے بجھایا جائے۔ بغیر اسٹارٹر کے ٹیوب پھر روشن نہیں ہوگی۔

میں نے اطمینان سے دونوں کی جگہ بدل دی۔ اسٹارٹر کی جگہ مائکروفون لگاتے وقت معمولی سا اسپارک ہوا اور تار جلنے کی مخصوص بو آئی۔ دو سو بیس وولٹ پر مائکروفون کا جل جانا قدرتی بات تھی لیکن میں نے مائکروفون کی جگہ اسٹارٹر لگایا تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ گزشتہ روز اسی مائکروفون کے ذریعے وہ سب گفتگو سراج نے سن لی تھی جو میرے اور رشید کے درمیان ہوئی تھی۔ وقتی طور پر میں نے اس نظام کو ناکارہ کر دیا تھا۔ مجھے یہ خوش فہمی نہیں تھی کہ انہیں پتا نہیں چلے گا۔ وہ دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ یہ حرکت میں نے کی ہوگی مگر اب مجھے رابعہ سے بات کرنے کا موقع ملا تو ہماری گفتگو کوئی نہ سن پائے گا۔ ایک نظر دیکھنے سے وہ فرق محسوس نہ کر پائیں گے اور جتنی دیر میں وہ چیکنگ کر کے دیکھیں گے کہ خرابی کہاں ہے اتنی دیر میں رابعہ سے بہت سی باتیں ہو جائیں گی۔

یہ کارروائی دو منٹ سے بھی کم وقت میں مکمل ہو گئی تھی۔ باہر کوئی نہ تھا لیکن یہ خطرہ بہرحال تھا کہ کوئی اچانک آ جائے۔ میں اترنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے رابعہ کی آواز سنی... اور گرتے گرتے بچا۔

"سکندر... یہ کیا کر رہے ہو؟" وہ خوفزدہ سرگوشی میں بولی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے نیچے اترتے ہی اسٹول کھینچ کر اسے دور کر دیا۔ "بیٹھو اور سناؤ کیا حال ہے۔ بہت پریشان دکھائی دے رہی ہو اس وقت۔ معلوم ہوتا ہے تمہیں خواب میں ڈر لگا ہے۔"

"سکندر! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" وہ میرے قریب آ گئی۔ اتنا قریب کہ میں اس کے بالوں کی خوشبو کو محسوس کر سکتا تھا اور اس کی آنکھوں میں اتر آنے والے موتیوں کو گن سکتا تھا۔

"رونے سے کیا یہ سب نہیں ہوگا؟" میں نے کہا۔ "اور امید رکھو، خدا نے مقدر ہو اس کو ایک وسیلہ بنا کے بھیجا ہے وہ بہتری کی کوئی اور صورت بھی پیدا کرے گا۔ لیکن ذہن میں تیار رہو کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ کہیں بھی جنیوا کنونشن کے مطابق عمل نہیں ہوتا۔ نازیوں نے جو کچھ جرمنی کے کیمپ میں کیا تھا وہ روسیوں نے بھی اپنے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں کیا ہے اور یہی ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے سکندر... یہ بہت بے رحم اور شیطان لوگ ہیں... میں کیا بتاؤں کیسی ذلیل... ہیں۔" وہ نظر جھکا کے بولی۔

"وقت کم ہے اس لیے جو میں کہہ رہا ہوں وہ سن لو۔ انعام ضامن رضوی اب جماعت ساتھ ہیں۔ انسپکٹر سندھو اس کا... نے ہی سراج کے پیچھے لگایا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ بے چارہ تو مارا گیا۔" رابعہ کا چہرہ پھر آنسوؤں میں ڈوب گیا۔

"ہاں، لیکن اس نے مرنے سے پہلے اکرام شیخ کو کوئی خط بھیج دیا تھا کسی کے ہاتھ..." میں نے کہا۔

رابعہ کا چہرہ پھر امید سے روشن ہو گیا۔ "سچ؟"

"ہاں... اور خبر یہ بھی ہے کہ اکرام شیخ اور نازو ایک ساتھ مکمل طور پر شریک ہو گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے غالب ان کے ساتھ ہو۔"

"کیا یہ بات سب کو معلوم ہے؟"

"نہیں... لیکن موقع ملے تو بتا دینا... کہ ناامید نہ ہوں۔ بے شک ان کو خط ملنے اور ہمارا پتا معلوم کرنے... پہنچنے اور کچھ کرنے میں وقت لگے گا اور یہ ہو سکتا ہے کہ... ویرے میں ہم یہاں سے... پہنچ جائیں... پھر بھی یہ ناممکن تو نہیں کہ... ہمارا سراغ لگا لیں۔ وہ تینوں ماشاءاللہ بہت ہوشیار ہیں۔ اب مجھے باہر گزارا مشکل ہے۔ جلدی سے یہ بتاؤ کہ تم نے... جوابات لکھے ہیں یا نہیں۔ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ سب نے لکھ دیے ہیں۔"

"یہ جھوٹ انھوں نے مجھ سے بھی بولا تھا۔" رابعہ...

"یہ... یہ کمینہ کیا ہو رہا ہے۔" کسی نے باہر کی طرف سے روشندان میں نمودار ہو کے کہا۔ مجھے اس کی... نظر نکل گیا۔

"کیا ہوا بھائی... خدا کی لعنت تمہاری تمیز..."

"شٹ اپ... ایک لفظ آگے کہا تو..." اس مائکروفون اور اسٹارٹر کی بدلی ہوئی جگہ دیکھ چکا تھا اب اپنی جیب میں سے دوسرا مائکروفون نکال کے صحیح جگہ لگا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ ارشاد فرماتا دروازے... سے ایک محافظ نمودار ہوا اور تقریباً ہم سے...

"اس طرح کیوں گھور رہے ہو سالے صاحب؟" میں... "غلط حرکت تم کرنے پر آمادہ ہو کہ میاں بیوی کے درمیان... ہے۔ چلو دیکھا ہے مجھے پتا ہے..."

محافظ مجھے اسی طرح گھورتا رہا لیکن رابعہ میری بات... بگڑ گئی۔

"ہاں تو دیکھو بھئی..." میں نے کہا۔ "عرض یہ کر رہا تھا بیوی کو اپنے رسم کے مطابق تو مولوی..."

"دیکھیے جی... آپ مولانا کی بات کر رہے تھے؟" بھتیجے نے مجھے تو... "اعمال نامے کی تھیں۔"

"ہاں... یاد آیا... تو طے ہم نے یہ کیا ہے کہ اس سوالنامے کا مفصل جواب دیں اور سب کچھ لکھ دیں۔ صاف بتا دیں کہ ہم نے کیا نہیں مطلب کیا تھا اور ایک کروڑ کا لالچ دیا تھا... خیر یہ سب تو آپ نے بھی لکھا ہی ہوگا۔"

"تم نے رعایت کا غلط استعمال کیا مسٹر سکندر بخت۔" ... "مجھے... روشندان میں نظر آیا تھا جو رابعہ کو لانے کا وعدہ کر کے گیا تھا۔"

"میں بالکل سچی باتیں کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر اس پر بھی اعتراض ہے تو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ وقت ملاقات ختم ہونے تک میں رابعہ کو دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کروں گا۔ وہ بھی... تو شاید نہیں۔"

"اس لڑکی کو لے جاؤ۔" وہ مجھ پر دھیان دیے بغیر بولا۔ محافظ فوراً حرکت میں آیا اور اس نے رابعہ کو بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا۔

"خدا حافظ۔" میں نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ "اب میدان حشر میں ملاقات ہوگی... پریشان مت ہونا... میں خود تلاش کر لوں گا تمہیں..."

دروازے میں کھڑا ہوا شخص اندر آ گیا۔ "یہ حیرت کی بات ہے... ان حالات میں بھی ہنسنے ہنسانے کی صلاحیت... معلوم..."

"سب کی طرح میں بھی روتا ہوا دنیا میں آیا تھا۔" میں نے... کہا۔ "ہنسنے کی یہ مہلت بہت غنیمت ہے... رونا... ہے۔"

اس نے پھر سر ہلایا اور اسٹول اٹھا کے نکل گیا۔ وہ مسلسل... ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ اندازہ بھی نہیں ہوتا تھا اور اقرار بھی نہیں۔ اس کا مطلب کچھ نہیں ہوتا تھا اور کچھ بھی نکالا جا سکتا تھا۔ وہ حد درجہ ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ بالکل برف کا بنا ہوا۔ جذبات سے عاری اور ظاہر سے باطن کی خبر نہ دینے والا۔ انٹیلی جنس سروس میں وہ اسی لیے کامیاب تھا کہ وہ گرگٹ تھا۔ اس کی شخصیت کے رنگ بدلتے رہتے تھے اور وہ ہر جگہ وقت کی ضرورت کے سانچے میں ڈھل سکتا تھا۔ اس کا اصل روپ کبھی فلاش ہو جاتا تھا اور کبھی نظر نہیں آتا تھا۔

میں تھک گیا تھا اور میرے زخموں کی ٹیس پھر بیدار ہو رہی تھی۔ مسکن اور درد کش دوا کا عارضی اثر کم ہو چلا تھا۔ میں بستر پر بیٹھ گیا اور سوالنامے کو... پڑھنے لگا۔ پھر میں بہت دیر لیٹا رہا اور جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا رہا۔ انسپکٹر سندھو مر گیا تھا اور مجھے اس بہادر شریف اور محب وطن انسان کی موت کا بہت دکھ تھا مگر مرتے مرتے وہ ہمارے لیے ناامیدی کے اندھیرے میں امید کا ایک چراغ روشن کر گیا تھا۔ شاید اس کا پیغام اکرام شیخ تک پہنچ جائے۔ پھر شاید اکرام شیخ یہاں تک پہنچ جائے۔ ایس ایس پی ضامن رضوی کی سپاہ یہاں تک پہنچ جائے اور دشمن کے اس زیرزمین قلعے کو فتح کر لے۔ ہم پیچھے بیٹھے گولیاں اور گولے چلنے کی آوازیں سن سن کے خوش ہوتے رہیں۔ یہاں تک کہ انکل رضوی کے ساتھ نازو... غالب اور اکرام شیخ نمودار ہوں اور انکل کہیں...

"تم پہلے سے بہت بہتر ہو۔" ڈاکٹر نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ "میں تم کو کچھ گولیاں دیتا جاتا ہوں۔"

"تھوڑی نائٹ تھری کی؟" میں نے کہا۔ "اس کے لیے انکل جی کو چاہیے۔"

"گڈ جوک... ویری گڈ جوک۔" ڈاکٹر نے ایسی بری شکل بنا کے کہا کہ مجھے اپنا بچپن یاد آیا جب ملیریا کے علاج کے لیے کونین مکسچر پلایا جاتا تھا۔

"یہ گولیاں درد اور تکلیف میں کچھ گھنٹے آرام دیتی ہیں۔" وہ... لہجے میں بولا۔ "کھانا کھا کے یہ دو گولیاں کھا لینا۔ اس سے نیند آ جائے گی۔"

"میں ان کا عادی ہوں... چار سے کم نہیں کھاتا۔" میں نے کہا۔ ڈاکٹر نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور میری سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے اس نے آٹھ گولیاں میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔

"ان میں سے چار رات کے کھانے کے بعد۔" وہ بولا۔ "سب اکٹھی کھا کے مرنے کی کوشش مت کرنا۔ تم مرو گے نہیں... ذرا لمبے سو جاؤ گے۔" پھر اس نے مجھے ایک انجکشن لگایا اور رخصت ہو گیا۔ اس کو حیرت کے ساتھ خوشی بھی تھی کہ میری صحت یابی کی رفتار اتنی تیز ہے۔ میں نے ساری

www.paksociety.com

خواب آور گولیاں اپنے بستر کے نیچے رکھ دیں اور سوالوں کے جواب لکھنے لگا۔ درمیان میں وہی ملازم بیئر لے کر آیا اور میں نے اس سے انتہائی اوٹ پٹانگ اور پریشان کن سوالات کیے۔ وہ بیئر سرو کرنے کے بعد چلا گیا تو میں نے پھر کاپی کے صفحے بھرنے شروع کیے۔ حصہ اول کے جوابات میں نے یوں دیے کہ جہاں مجھے ہاں لکھنا تھا وہاں نہیں لکھا اور جہاں جواب نہیں تھا وہاں میں نے ہاں لکھا۔

حصہ دوم کے جوابات زیادہ دلچسپ تھے۔ میں نے ایک کہانی کے لیے ایک مضمون لکھنا شروع کیا۔ رات تک میں نے دس صفحات پُر کر دیے تھے۔ رات کا کھانا کھاتے ہی لیٹ گیا اور دیر تک سگریٹ پھونکتا رہا۔ میزبان بہت مہربان تھے اور میری ہر فرمائش پوری ہو رہی تھی۔ سگریٹ کے علاوہ مجھے ہر مطلوب چیز مہیا کی گئی تھی۔ رات کو میں وقفے وقفے سے سوتا جاگتا رہا۔ جب نیند آتی تھی تو میرے لاشعور کا خوف مجھے خواب میں طرح طرح کے مناظر دکھاتا تھا۔ سراج کی بیوی کا نقش زندہ ہو جاتا تھا اور میں اٹھ بیٹھتا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ کمرہ بھی ایک قبر ہے اور صورِ اسرافیل کی صدا سے پہلے میں اس قبر سے نہ نکل سکوں گا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور میں نے کاپی کے باقی صفحے بھی پُر کر دیے۔ یہ سب بالکل بے معنی باتیں تھیں۔ مثلاً میں نے لکھا تھا کہ ایم آر ایس کی تنظیم کے اغراض و مقاصد بہت وسیع ہیں۔ دنیا کی تمام بدصورت لڑکیوں کے لیے عاشقانِ صادق فراہم کرنا اور ان کی شادی ایسے لڑکوں سے کروانا جو مہتاب قسم کی گوری چٹی لڑکیاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ شالیمار باغ کو اسی طرح کے لوگوں پر منتقل کرنا، یہ معلوم کرنا کہ پہلے انڈا پیدا ہوا تھا یا مرغی۔۔۔ باقی سوالوں کے جواب میں کچھ یوں لکھا تھا کہ ایم آر ایس ملک گیر بلکہ بین الاقوامی تنظیم ہے۔ ہر صوبے میں اس کی شاخ کا سربراہ گورنر ہوتا ہے اور ڈویژن کا کمشنر۔ ان کا اجلاس ہر چودھویں رات کو چاند نکلنے کے بعد ریگستان میں ہوتا ہے۔ ممبران کی کل تعداد اتنی ہے جتنی پولیس کی نفری۔ بیرونی امداد کا یہ عالم ہے کہ ایک بار امریکی سفیر نے طلب کیا تھا اور ایک کروڑ ڈالر دیے تھے کہ جاؤ کشمیر خرید لو مگر واپسی میں جیب کٹ گئی۔ روسی سفیر کو میں نے دو درجن بم، تین درجن میزائل، چار درجن سپر سانک طیارے اور پانچ درجن جدید ترین ٹینک کے علاوہ بھی بہت کچھ فراہم کرنے کا حکم دیا تھا اور امید ہے کہ وہ سارا سامان بہت جلد ڈلیور کر دے گا۔ سیاسی پارٹی جس نے ایم آر ایس سے رابطہ قائم کیا اتفاق پارٹی کہلاتی ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ ہر سوال کے جواب میں ایک کہانی تھی جس کا کوئی سر پیر نہ تھا۔

صبح دس بجے وہ پھر آیا جو خود کو میرا خیرخواہ کہتا تھا۔ میری حالت بہت بہتر تھی۔ معلوم نہیں وہ کون سا مرہم تھا جو میرے جسم پر ملا گیا تھا تو بدن کا درد غائب ہو گیا۔ جسم پر صرف داغ رہ گئے تھے۔ دراصل وہ زخم جلد کی خراشوں جیسے نہ تھے اور اگرچہ نیل بہت نمایاں نظر آتے تھے لیکن تکلیف نہیں دے رہے تھے۔ درد مٹانے والی دوائیں کھانے اور صرف آرام کرنے سے میری جسمانی حالت تقریباً نارمل ہو گئی تھی۔

"افسوس یہ ہے کہ میں تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں لایا۔" وہ ٹہلتے ہوئے بولا۔

"اگر وہ خبر سنانا بے حد ضروری ہے اور تم سنائے بغیر نہیں رہ سکتے تو میری فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "میں نے اتنی زندگی دیکھی ہے اور اتنی بری بری خبریں سنی ہیں کہ میرا دل پتھر ہو گیا ہے۔"

"تمہارے ساتھ جو عورت پکڑی گئی تھی اس کے بیان سے معلوم ہوا کہ وہ ایک مصیبت زدہ عورت ہے۔ اتفاقیہ تم سے ملی تھی۔"

"تم کیتھرین کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں۔ اس نے بتایا کہ تم لوگوں نے اس کی مدد کا وعدہ کیا تھا۔" وہ بولا۔ "اس کی ایک بچی میو ہسپتال میں داخل تھی۔ اسے ایک گردے کی ضرورت تھی۔ تم سب نے مل کر کوشش کی اور اس کا انتظام ہو گیا۔"

"یہ تو اچھی خبر ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہارا صحافی دوست... کیا نام ہے اس کا؟"

"مرزا صاحب۔"

"کہاں ہے وہ آج کل؟" وہ بولا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔

"تم مجھے بتا سکتے ہو۔ ورنہ یہ بہت سفاک اور بے رحم لوگ ہیں۔ تم سے نہیں پوچھ سکے مگر کسی اور سے معلوم کر لیں گے۔" وہ بولا۔ "ضروری نہیں کہ سب کی قوتِ برداشت اتنی ہی ہو۔"

"تم خود کو بہت شریف اور ہمدرد ثابت کر رہے ہو۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "اور یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو کہ تم جانتے ہی کچھ نہیں ہو۔ تم یہی سمجھتے ہو کہ جو بات کسی کو معلوم نہ ہو وہ بدترین عذاب دے کر بھی نہیں پوچھی جا سکتی۔ میں مانتا ہوں کہ تشدد کے جدید طریقوں کے مقابلے میں انسان کی قوتِ برداشت واقعی کچھ نہیں لیکن ایسی صورت میں اکثر تشدد کرنے والوں کی محنت رائیگاں جاتی ہے۔ اپنا وقت ضائع ہوتا ہے تو نادانی کسی کو ذہنی و جسمانی اذیت دینے میں صرف ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات جان سے گزر جانے کے بعد بھی کچھ بتا نہ سکنے کے بعد لوگ سچ کو تسلیم کر لیتے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے... مگر یہ میرے اور تمہارے جیسے نہیں ہوتے کہ ان کو کسی احساسِ پشیمانی سے پریشانی ہو۔ انھیں ضمیر نہیں ہے۔" وہ ٹہلتے ہوئے بولا۔ "آدمی مر جائے تو ان کو اتنا بھی غم نہیں ہوتا جتنا کارپوریشن کے اس ملازم کو ہوتا ہے جو لاوارث آوارہ کتے مارتا ہے۔ یہ آدمی کو بھی کتے کی طرح جھٹکا دیتے ہیں اور دفنا دیتے ہیں۔"

"میں ایسی باتوں سے دہشت زدہ نہیں ہوتا۔" میں نے صاف کہا۔ "تم مجھے وہ بری خبر سنانا نہیں چاہتے تو نہ سناؤ... یہ مت سمجھو کہ میں کسی سخت سسپنس کا شکار ہوں۔"

"سوری۔ میں دوسری باتوں میں الجھ گیا۔" وہ بولا۔ "تمہارے صحافی دوست کی بیوی ... ہسپتال میں کام کرنے والوں ... بہت سے لوگ آئے لیکن اتفاق ... تھی کہ جولی کے لیے کسی اور ... لیا جائے۔ ڈاکٹروں نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ اس ... وہ ماں بننے والی ہے لیکن وہ ... "

میرا دل ڈوبنے لگا۔ "کیا... کیا شعلہ کو کچھ ہو گیا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "شعلہ کو نہیں..."

"تو کیا... اس کے بچے کو..." میں نے اٹھ کے اس کا گریبان تھام لیا۔ "بتاتے کیوں نہیں ہو؟"

اس نے خود کو چھڑانے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھتا رہا۔ "ابھی ابھی تم نے دعویٰ کیا تھا کہ تم بری خبر سن سکتے ہو۔ گویا تم خود کو فریب دے رہے تھے۔" میں نے اسے چھوڑ دیا۔ ایک گہری سانس لی اور بستر پر گر پڑا۔

"شعلہ کے بچے کو بھی کچھ نہیں ہوا۔" اس نے اپنے کپڑوں کی شکنوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔ "بس شعلہ کی قربانی... یا حماقت بے سود رہی۔ جولی کو فائدہ نہیں ہوا... وہ مر گئی۔"

"اوہ مائی گاڈ..." میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"جولی کی کنڈیشن ایسی نہیں رہی تھی کہ اتنا بڑا آپریشن کیا جاتا۔" اس نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔ "لیکن ڈاکٹرز کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ رسک نہ لیتے تب بھی جولی مر جاتی۔ اس کا ففٹی ففٹی چانس پر عمل تھا اور انھوں نے گردہ بدلنے کا فیصلہ کیا تھا... ففٹی پرسنٹ چانس پر۔ لیکن قضا و قدر کا فیصلہ ہنڈرڈ پرسنٹ چانس کے لیے ہو چکا تھا۔ اسے کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔"

"کیا یہ بات اس کی ماں کو بتا دی گئی ہے... تم سب سنگدل ہو... اسے تو تم سب سے پہلے بتانے گئے ہو گے۔" میں نے کہا۔

"دشمن سے رعایت کی امید مت رکھو۔" وہ بولا۔ "میں نے تم کو کل سمجھایا تھا۔ میں خود شاید یہ کرتا مگر جانے دو۔ اب وہ تمہارے سامنے ایک شرط رکھیں گے۔ تم سب کے سامنے۔"

"کیسی شرط؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"یہی کہ... اگر تم غالب اور نانو کے بارے میں بتا دو اور ان کے حلیے سوالات کے صحیح جوابات دو تو کیتھرین کو ہسپتال بھیجا جا سکتا ہے۔"

"کیا؟" میں نے چلا کے کہا۔ "کیتھرین..."

"ہاں۔ اس خبر کا اس پر غیر متوقع اثر ہوا۔ وہ بے ہوش ہو گئی اور ابھی تک بے ہوش ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن اس کو ہسپتال پہنچا دیا جائے تو وہ بچ جائے گی۔"

"ان لوگوں کے نامۂ اعمال میں ایسی ہزاروں نیکیاں موجود ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "بہتر ہوتا اگر کیتھرین کے قتل کی نیکی بھی کما لیں۔"

"اس کی موت ایک صدمے کا نتیجہ..."

"نہیں... اس کی موت جانتے بوجھتے طبی امداد کی فراہمی کو روکنے کا نتیجہ ہوگی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کسی کی خوراک روک دی جائے تو وہ بھی مر جائے گا۔ ہوا روک دی جائے تو وہ بھی مر جائے گا۔ قانون اسے طبعی موت نہیں سمجھتا۔ پھر مریض کی دوا روک دی جائے اور اس کا علاج روک دیا جائے تو کیا یہ قتل نہیں ہے؟ مجھے الفاظ کے چکر میں مت ڈالو۔ نیت کا حال خدا بہتر جانتا ہے لیکن تمہارے بھی ارادے نیک نہیں ہیں۔"

وہ خاموشی سے ٹہلتا رہا۔ "تم کو شعلہ کا زیادہ فکر کرنا چاہیے کیونکہ جولی کے مرنے کے بعد کیتھرین کا زندہ رہنا بے مقصد تھا۔"

"اس کا فیصلہ تم کیسے کر سکتے ہو۔ وہ کسی عظیم تر مقصد کے لیے بھی زندہ رہ سکتی تھی۔" میں نے کہا۔ "موت تو زندگی کی ایسی حقیقت ہے جس کو ماں باپ بھی تسلیم کرتے ہیں خواہ ان کا سب سے بڑا، جوان اور کماؤ بیٹا مر جائے۔ انھیں دوسرے بچوں کے لیے زندہ رہنا پڑتا ہے۔ ماں باپ مر جائیں تو آدمی بہن بھائی اور بیوی بچوں کی خاطر زندہ رہتا ہے۔"

"لیکن کیتھرین کا تو کسی سے کوئی رشتہ نہیں۔"

"رشتے جذبات سے ہوتے ہیں اور جذباتی وابستگی کے لیے خونی رشتے ہی نہیں ہوتے۔ خلوص اور محبت کے رشتے بھی ہوتے ہیں۔ خیر یہ بات تم نہیں سمجھو گے۔ یہ بتاؤ شعلہ کا کیا ذکر تھا؟" میں نے کہا۔

وہ ٹھٹک گیا۔ "میں نے بتایا تھا کہ اس نے ڈاکٹروں کی مرضی کی پروا نہ کرتے ہوئے خود کو پیش کیا... ایک جذباتی حماقت۔"

"تم اسے حماقت کہنا چاہتے تھے نا؟" میں نے تلخی سے کہا۔

www.paksociety.com

"ایک دل ربا کار یست تھے۔ ان کی پیشکش بھی ان ہی کی اعلیٰ ترین مثال تھی۔ شعلا کے پاس تو تعلق کی ایک وجہ تھی۔ یہ اجنبی لوگ جن کا جولی سے دور کا تعلق بھی نہ تھا انہی کے لیے تو سبھی کچھ کرتے ہیں۔ کمال ان کا ہے جو غیروں کے لیے کرتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ جو کچھ ہوا دیر سے ہوا۔ یہ کچھ مہینے پہلے ہوتا تو جولی بھی بچ جاتی اور شعلا کے لیے یہ ایثار کوئی خطرہ پیدا نہ کرتا... اب اس کی اپنی زندگی خطرے میں ہے۔"

"خطرہ کس حد تک ہے؟" میں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ بولا۔ "اطلاع صرف آئی تھی کہ شعلا کی حالت بھی ٹھیک نہیں اور اس کو کسی پرائیویٹ اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں رکھا گیا ہے۔ ایس ایس پی صاحب کا بیٹا اور اس کا سورس ہی اسے بچا لے گا۔"

اس نے آخری جملے میں جو طنز کیا تھا اسے میں نے نظر انداز کر دیا کیونکہ یہ وقت خاص رضوی صاحب کے کردار کے دفاع کا نہیں تھا۔ "یقیناً تم نے محسن کو اذیت دینے کے لیے یہ خبر ضرور سنائی ہوگی اور بہت مبالغہ آرائی کے ساتھ... میں ملاؤ کو جانتا ہوں... اس نے ایسا نقشہ کھینچا ہوگا کہ شعلا تو بستر مرگ پر ہے اور ہر سانس کے ساتھ تمھارا نام لے رہی ہے۔ ڈاکٹروں نے صاف کہا ہے کہ اس کی زندگی کی امید صرف ایک صورت میں ہے کہ محسن کو فوراً بلا لیا جائے۔ تم جا سکتے ہو اگر غالب اور ہارون کا پتا بتا دو۔ ان سے ملتے ہی تم کو اسپتال پہنچا دیا جائے گا۔ تمھاری بیوی اور تمھارا بچہ دونوں بچ سکتے ہیں۔"

"کم سے کم میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"تم اور وہ کیا الگ الگ ہو؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ ملاؤ کے ڈرامے بھی میں نے دیکھے ہیں اور یہ ڈراما بھی دیکھ رہا ہوں جو تم کر رہے ہو۔ لیکن میں ایسی باتوں سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں اور یہاں محسن کے بارے میں بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تم اس کے سامنے فرض اور محبت کی آزمائش کے لیے یہ دردناک جذباتی سچویشن رکھو گے تو وہ بھی متاثر نہیں ہوگا۔ وہ کہے گا کہ شعلا کو اگر خدا بچانا چاہے گا تو بچا لے گا۔ اسے منظور نہیں ہوگا تو میرے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ موت ہمارے لیے کوئی حوصلہ آزما یا حوصلہ شکن چیز نہیں جس کا خوف ہمارے ارادے بدل دے۔ ہماری عقل کو منجمد کر دے یا ہمیں اطاعت پر مجبور کر دے۔ جس کو جب مرنا ہے وہ اپنے وقت پر مرے گا اور ویسے ہی مرے گا جیسے دستِ قدرت نے اس کے لیے مرنا لکھا ہے۔ اس تحریر کو نہ ہم بدل سکتے ہیں نہ کوئی اور بدل سکتا ہے۔ ہم کسی سے کوئی بھی مر سکتا ہے لیکن تمھاری کوشش سے نہیں... خدا کے حکم سے... اور خدا کے حکم کے سامنے ہم ہر وقت سر جھکاتے ہیں۔"

"اچھا بول لیتے ہو تم۔" مجھ سے ملاؤ نے کہا تھا۔ "اور میں نے کہا تھا کہ وہ سب بولنے والے ہی نہیں زبان سے نکلنے والے ہر لفظ پر عمل کرنے والے بھی ہیں... تم سب اسی کردار میں متحد بھی ہے اور یکساں بھی... جیسے کسی زنجیر میں ہوتی ہے۔ وہ مڑتی جاتی ہے اور ایک جگہ سمٹ آتی جاتی ہے اسے جوڑنے والا دوسرا نہیں کر سکتا... خیر... تم ابھی میری پوزیشن کو نہیں سمجھے۔ اس کمرے میں وقت میں بھی تمھاری طرح مجبور ہوں۔ کچھ مجبوریاں ہیں لیکن میرے کچھ اختیارات بھی ہیں۔"

"محدود اور مشروط اختیارات۔" میں نے کہا۔ "تم ہم سے مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی وعدہ کر سکتے ہو۔ یہ کہ محسن کو شعلا کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ کینیڈا یا امریکا منتقل کر دیا جائے گا۔ یا یہ کہ سب کو چھوڑ دیا جائے گا... ایسے وعدوں کی ضمانت کوئی نہیں۔ تم دس جھوٹ بول سکتے ہو اور زیادہ مہارت سے بول سکتے ہو۔"

"تم نے وہ سوالنامہ پڑھا؟" اس نے اچانک میری بات کاٹ دی۔

"ہاں... باقی سب نے مجبوری کے سامنے سر جھکایا تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا اور کاپی اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے کاپی کو کھول کر ایک نظر دیکھا اور اس کے چہرے پر کامیابی کی طمانیت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کاپی بند کر کے اس نے سر ہلایا۔ جو اور بہت کچھ کہنے کے مترادف تھا... "ٹھیک ہے... ختم ہو گئی ساری الجھنیں۔ یہ تو ہونا ہی تھا" وغیرہ وغیرہ۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔ میں اس کے جانے کے بعد یہ خیال سے نہیں بچ سکا کہ جوابات پڑھنے کے بعد اس کی حالت کیا ہوگی جب اس پر واضح ہوگا کہ وہ صرف بے وقوف بنایا گیا اور سب کے ساتھ غداری کی ہے تو اس نے جھک مارا ہے۔

مجھے جولی کی موت کا سخت صدمہ تھا۔ کتنی امید دل میں لے کر ہم نے اس کار خیر کے لیے مل کر جدوجہد کی تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہم سب کی مشترکہ کوشش جولی کو موت کے منہ سے کھینچ کر واپس زندگی کی طرف لے آئے گی۔ یہ کوئی ناممکن کام نہ تھا۔ بس اس کے لیے وقت نہیں رہا تھا۔ ہم اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ قدرت نے جولی کو جتنی فرصت عمر دی تھی وہ ختم ہو رہی ہے جس کے بعد ساری دنیا کے ماہر ترین معالج بھی کوئی مسیحائی نہیں دکھا سکتے۔

مجھے شعلا کی طرف سے زیادہ تشویش تھی۔ اس نے جولی کی موت سے صدمہ ضرور اٹھایا تھا مگر اس سے وقتی بیزاری اس کو شرمندہ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بھی وہی عشق تھا جو بے خطر آتش نمرود میں کود پڑا...

کسی سود و زیاں کا خیال کیے بغیر اپنی ذات سے بے نیاز ہو... کوئی منفی نہیں تھا اور دین کا بہت کم علم رکھتا تھا۔ میری نظر میں شہید کا کوئی مقام تھا تو بہت بلند تھا۔ شہید وہ جو کسی نیک مقصد کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے جان قربان کر دے۔ مرنے کے بعد شہادت کا مقصد حاصل کر لیتی۔ لیکن میں زندہ رہنے کا قائل ہوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر جولی بھی زندہ رہتی۔ شعلا ایک طویل عمر تک اس خوشی کی دولت سے سرفراز رہتی جو اسے ایک زندگی بچا کے حاصل ہوئی تھی۔ ایسا نہ ہو سکا تھا۔ اب ہم سب کی خوشی کے لیے شعلا کا زندہ رہنا اور اس کے لیے دعا کرنا ضروری تھا... مجھے وہ وقت یاد ہے جب میرے اور شیڈی کے درمیان جنگ ہوئی تھی کہ بحیثیت سپاہی حق میرا ہوگا یا ماموں کی حیثیت سے اس کا۔ وہ کسی کو کچھ دیتے گا؟ سوائے رنج و احساس زیاں کے اور پریشانی کے۔ بیا... ہم سب کی دعائیں مسترد کر دے گا۔ ایسے نکلنے والی دعائیں اگر مسترد ہو سکتی ہیں تو پھر یہ دعائیں کیسے قبول نہ ہوں گی جو دل کی گہرائی سے خلوص اور صدق کے ساتھ... میرا حوصلہ آہستہ آہستہ پست ہو گیا تھا۔ یہ بہت بڑی شکست تھی۔ بے بسی کی انتہا اور کیا ہوگی کہ ہم دشمن کی قید میں ہیں۔ ایسی جگہ جہاں امید بھی کسی کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ جولی مر چکی... شعلا انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں ہے۔ غالب زندہ ہے یا نہیں۔ کیتھرین کو جیمی کی موت نے ہوش سے بیگانگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہمارا ایک مددگار سکندر تھا جو مارا گیا ہے اور ہم اب غیر ملکی ایجنٹوں کی تحویل میں ہیں جو ہمیں اٹھوا لینا چاہتے ہیں۔ ہر طرف سے نا امیدی کی یلغار ہے۔ امید کی ایک کرن کا اس سیلاب یاس میں کیسے سہارا مل سکے گا۔

میرے جوابات کا ردعمل بہت جلد ظاہر ہوا... آدھے گھنٹے سے کم وقت میں وہ پھر آ گیا۔

"تمھارے جوابات بہت پرلطف تھے۔" وہ بولا۔ "ہم سب اتنے جلتے ہوئے خیال ہو گیا۔" لیکن یہ بات کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ناگوار اثرات اور جھنجھلاہٹ کو چھپانا مشکل ہو گیا۔

"اور اب شاید میرا برا حال ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" وہ فکرمندی سے بولا۔ "میں نہیں سمجھتا تھا کہ... تم اتنے... عاقبت نا اندیش ہو... تم سوچ سکتے ہو کہ اب... ہوا اور حالات سامنے ہیں... خیر... مجھے افسوس ہے کہ میں تمھاری مدد نہ کر سکا۔"

اس کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ دونوں اندر آ گئے جن کا ... ہونے کے باعث میں نے نظر... بڑے منشی نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں مجھے چلنے کا اشارہ دیا۔ میں چل پڑا۔ وہ میرے دائیں بائیں

اس طرح چلنے لگے کہ ان کی آنکھیں ان کے ہاتھ اور ان کا ذہن پوری طرح چوکس تھے۔ یہ نا ممکن تھا کہ میں اس زیر زمین قید خانے سے نکل کے فرار ہو سکوں مگر وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ تیار رہیں اور اگر میرا ایک قدم بھی غلط پڑے تو دماغ درست کر دیں۔ ایک بار پھر مجھے اسی جہنم میں لایا گیا جہاں میں نے ایک رات کا عذاب مسکراتے ہوئے جھیل لیا تھا مگر اب مجھ میں مسکرانے کا حوصلہ نہ تھا۔

اس بار مجھے فولادی کرسی میں جکڑا نہیں بٹھایا گیا۔ کمرے میں تین کرسیاں پڑی تھیں جن میں سے مجھے بیچ والی کرسی ملی۔ تقریباً میرے ساتھ ہی سراج اندر آیا۔ اس کی ذہنی زہر آلود شیطانی مسکراہٹ اس کے چہرے پر چپکی تھی جو اس کا ٹریڈ مارک بن گئی تھی لیکن وہ مجھ سے کچھ دور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دوسری جانب وہ آ گیا جو بیچ کر ہمدرد اور بہی خواہ کا رول ادا کرنے میں ناکام رہا تھا۔

"تم نے تو ہماری تفریح کا بڑا اچھا انتظام کیا تھا۔" سراج نے کچھ دیر بعد کہا۔ "سوالوں کے جواب میں لطائف و ظرائف لکھ مارے۔ اب کچھ تفریح کا بندوبست ہماری طرف سے ہو جائے۔"

"ہم تم کو ایک فلم دکھاتے ہیں۔" دوسرا شخص بولا۔ "یہ فلم ہم رابعہ کو بھی دکھا چکے ہیں۔"

سراج ہنسا۔ "اور یقین کرو اس نے بڑا انجوائے کیا۔ تم بھی کرو گے۔"

میں خاموشی سے ایک شخص کو فلم کی نمائش کا انتظام کرتے دیکھتا رہا۔ اس نے مجھ سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر ایک آہنی بار سے پردہ لٹکایا اور اسے کھول دیا۔ یہ چار فٹ چھ فٹ کا پردہ سفید کپڑوں یا زین کے کپڑے کا بنا ہوا تھا اور ایک ڈنڈے پر لپیٹا ہوا تھا۔ پھر وہ پیچھے گیا اور اس نے پردے کو چھت سے تھوڑا سا اوپر رکھنے کے لیے پہلے ایک میز رکھی اور اس کے اوپر ویسی ہی کرسی رکھ دی جیسی میرے بیٹھنے کے کام آ رہی تھی۔ اس کرسی پر اپنا پروجیکٹر رکھنے کے بعد اس نے پلگ کو پچھلی دیوار میں لگایا اور لائٹ کو پیچھے پر فوکس کرنے کے لیے میز کو آگے پیچھے گھسیٹتا رہا۔ بالآخر ایک سلائیڈ پردے پر نمودار ہوئی جسے آپریٹر نے بالکل ٹھیک فاصلے پر فوکس کیا تھا جیسا کہ عکس بہت واضح تھا جیسے کسی ذہن کو ایک اچانک شاک لگا کیونکہ سلائیڈ میں ایک عورت کو دکھایا گیا تھا۔

اور یہ عورت رابعہ تھی! اسے لباس کے بغیر دیکھ کر مجھے اتنا صدمہ ہوا جتنا اسے انتہائی بے شرمی سے مسکراتا دیکھ کے ہوا۔ وہ نہایت بے باکی سے کیمرے کی طرف دیکھ رہی تھی چنانچہ مجھے اپنی طرف دیکھتی محسوس ہوتی تھی اور میرے لیے اس سے آنکھیں چار کرنا مشکل تھا۔ یہ عکس غائب ہو گیا اور اس کی جگہ دی

www.paksociety.com

عورت دوست کے ساتھ نہایت شرمناک پوز میں نمودار ہوئی۔ میرے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ رابعہ ہو سکتی ہے مگر اس میں شک کی کوئی بات نہیں تھی۔۔۔۔ رابعہ دشمن کے قبضے میں تھی اور اس کے جسم کو تو اس نے پامال کیا ہی تھا اس سے محروم رکھ کر اور اسے بھی کسی بھی شکل اور قیمت پر فعل پر مجبور کرنا ان لوگوں کے لیے مشکل نہیں تھا۔ ناقابل یقین وہ جذبات تھے جو رابعہ کی صورت پر عیاں تھے۔ میں تصور نہیں کر سکتا تھا کہ رابعہ اس طرح مسکراتے ہوئے اتنی بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور اتنی خوشی سے ایسی تصاویر اتروا سکتی ہے۔ اس کے چہرے سے جبر کا بالکل پتا نہیں چلتا تھا اور اگر یہ ساکت تصاویر تھیں لیکن میں فرض کر سکتا تھا کہ آنے والی فلم میں بھی مرکزی کردار رابعہ کا ہی ہو گا۔ میرا دماغ خالی ہو رہا تھا اور میں گم صم بیٹھا تھا۔ آخر یہ سب کیسے ہوا۔ اگر وہ تو امیدہ ہوتی تو میں سمجھتا کہ وہ بے ہوش ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہوتیں تو میں سمجھتا کہ اسے … لیکن وہ تو پوری طرح ہوش و حواس میں تھی۔ میرا ذہن اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا کہ آخر یہ کیسے ممکن ہوا۔

میں نے ابتدائی دو تین تصاویر کے بعد کچھ نہیں دیکھا۔ میری نظر اسکرین پر جمی اور اس پر عکس بدلتے رہے مگر میں کچھ اور ہی سوچتا رہا۔

جواب تلاش کیے بغیر میرے دماغ کا پرسکون ہونا مشکل تھا۔ یہ جواب بہت جلد مل گیا تھا۔ یا رابعہ کو شراب پلا دی گئی تھی یا اسی قسم کی کوئی نشہ آور چیز دے دی گئی تھی جس سے وہ بہک گئی تھی یا اسے ہپناٹائز کیا گیا تھا اور اس کے ذہن کو ناکارہ بنانے کے بعد اس طرح اپنے قابو میں کر لیا گیا تھا کہ وہ ہر حکم کی تعمیل کرتی رہی تھی۔ اٹھو جاؤ۔۔۔ بیٹھ جاؤ۔۔۔ مسکراؤ۔۔۔ ادھر دیکھو۔۔۔ کتنی گھٹیا باتوں کی تو ہم سکندر کے ساتھ مجھ سے بھی سلوک کر رہے تھے۔ اس کے لاشعور میں ایک خوف تھا جس نے اسے مجبور کیا ہو گا۔۔۔ یہ وضاحت منطقی ضرور تھی مگر میرے لیے تشفی بخش نہیں تھی۔ میرے دل میں ایک نوکیلا خار تھا جو مسلسل باعث آزار تھا اور مجھے احساس ہوا کہ یہ توجیہ غلط ہے۔ اصل بات نہیں ہے۔ میں نے ایک جواز بنا لیا ہے۔ ایک سبب ایجاد کر لیا ہے۔ صرف خود کو مطمئن کرنے کے لیے رابعہ کے رویے کو قابل فہم بنا لیا ہے۔

"تم کو تصویریں پسند آئیں؟" سراج نے میری حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"ان تصویروں سے تم کس کو بلیک میل کرو گے؟" میں نے کہا۔ "مجھے یا رابعہ کو اور جاننے والے دوست احباب کو کوئی فرق نہیں پڑے گا اگر تم اس البم کو شائع کرا کے سارے شہر میں مفت بانٹ دو۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں۔" سراج نے قہقہہ لگا کے کہا۔ "یہ فلم سے پہلے سینما ہال میں سلائیڈ دکھائے جاتے ہیں نا۔۔۔ اس کے بعد فلم شروع ہوتی ہے۔"

میں نے پہلے دائیں بائیں دیکھا۔ دو خبیث گونگے اپنے ہاتھوں کو مڑے جارحانہ انداز میں بازوؤں پر رکھے کسی بھی کارروائی کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے دیوار کے ساتھ تین قاتل موجود تھے جن کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ تھا۔ وہ پاس ریوالور تھے اور میرے پاس بیٹھی گن تھی۔

"پریشان ہونے کی بات نہیں۔" میرے برابر بیٹھا ہوا شخص آہستہ سے بولا۔ "اس قدر کا رابعہ سے کوئی تعلق نہیں۔"

"اس بیہودگی اطلاع کا شکریہ۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "اب اپنا یہ کھیل بند کرو کہ تم بہت سے نہیں چاہو اور ... ہو یا ہیروں کے مقابلے میں کوئی تعریف ... مہذب آدمی ہو۔ میرا خیال ہے زیادہ ... حرام ہو۔"

اسی وقت فلم شروع ہو گئی۔ معلوم نہیں وہ کون لڑکی تھی۔ منظر اسی جگہ کا تھا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ لڑکی فرش پر گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ سراج نے کمنٹری کرتے ہوئے بتایا کہ یہ لڑکی ایک کاروباری بیوپاری ہے اور اس نے جانے سے پہلے کام کیا تھا لیکن بعد میں جب اس کے پاس کافی پیسہ جمع ہو گیا تو وہ غائب ہو گئی۔ ہم نے اسے تلاش کر لیا اور دوبارہ کام پر لگا دیا گیا اور پھر جیسے ایک بار ٹھیک رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں پچھتاوا ... لگی اور اس پر حب الوطنی کا دورہ پڑا۔ اس کے ضمیر میں فرض شناسی کے جراثیم داخل ہو گئے اور اس نے اپنے یار سے مل کر ایسا چکر چلایا کہ ہمارے بہت سے آدمی پکڑے گئے۔ کئی جگہ کامیاب چھاپے پڑنے سے لاکھوں کا نقصان ہوا اور وہ راستے بند ہو گئے جن پر ہمارا مال جاتا تھا۔ نئے راستے اور نئے آدمی تلاش کرنے میں بہت پریشانی اٹھانا پڑی۔ اس نے سامنے جرائم کا اعتراف کر لیا۔

یہ فلم اس لڑکی سے اعتراف جرم حاصل کرنے کی لرزہ خیز کہانی تھی۔ اس پر بدترین طریقے کے مطابق تشدد کیا گیا تھا۔ اس کے نازک جسم پر کوڑے برسائے گئے تھے اور جلتے ہوئے سگریٹ لگائے گئے تھے۔ اس کی لرزہ خیز چیخوں کی آواز پروجیکٹر سے منسلک اسپیکرز پر مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ ان کو کسی ماہر کیمرہ مین کی خدمات بھی حاصل ہوں گی۔ ... اتنی بے رحم تفصیلات کے ساتھ دکھایا جا سکتا۔ میری آنکھیں اجنبی لڑکی پر ہونے والے ظلم کو دیکھ رہی تھیں مگر میرے تصور میں رابعہ تھی۔ وہ چند ساکت عکس تھے جو میں نے فلم سے پہلے دیکھے تھے۔ گرفتار ہی یہ چاہتے تھے کہ اس فلم کو دیکھتے ہوئے میں چشم تصور سے اس بدبخت اور مظلوم لڑکی کی جگہ رابعہ کو دیکھوں تو وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے تھے۔

میں نے دل کو کسی طرح سے قائل کیا۔ میں نے اعتراض کیا کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ یہ لڑکی کوئی پیشہ ور ایکٹریس یا کوئی ... ہو گی جسے بھاری معاوضہ دے کر اس قسم کی فلم کے لیے رضامند کر لیا گیا ہو گا۔ اگر کوئی لڑکی آرٹ کی خاطر عریانی پر راضی ہو تو باقی کام ہدایت کار اور کیمرہ مین کر لیتے ہیں کہ ... کس زاویے سے دکھایا جائے کس طرح پیش کیا جائے کہ ... زیادہ دل گداز ہو اور کس طرح کیمرے کی آنکھ ... کو یوں دکھایا جائے کہ دیکھنے والے کو سب اپنے سامنے ہوتا محسوس ہو ... ہیں اور وہاں ایکٹر بھی پیسے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں کہ اب مغرب کی مہذب بے راہ روی ہمارے معاشرے میں بھی سرایت کرنے لگی ہے اور پیسہ تو سب کچھ بنا ہی آیا ہے۔ کیا عورت کی شرم و حیا اور کیا اس کی آبرو۔

اس خیال نے مجھے قائل کر لیا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اداکاری ہے یہ اداکارہ یا فاحشہ آج بھی کہیں موجود ہو گی اور اس کے بعد نہ جانے کتنی فلموں میں بے حیائی کے مظاہرے کر چکی ہو گی۔ یہ اداکاری ہرگز نہیں تھی۔ اداکاری کا شمار فنون لطیفہ میں ہوتا ہے۔ اس لڑکی پر جو تشدد کیا جا رہا تھا وہ حقیقی تھا اور وہ اس طرح چیخ چلا رہی تھی اور یوں تڑپ رہی تھی جیسے پچھ اس کے لیے یہ اذیت ناقابل برداشت ہے۔ ... کے مطابق یہ چیخ و پکار بھی مصنوعی تاثرات ... والوں کا کام رہا ہو گا جن کے پاس ہر قسم کی آوازیں محفوظ ہوتی ہیں۔

ان سب دلائل کے باوجود میرے ذہن سے وہ نقش نہ مٹا تھا جو رابعہ کی ناقابل بیان حد تک شرمناک تصاویر دیکھ کر ابھرا تھا اور میرے لیے یہ اذیت انتہائی باعث ملال بھی تھی۔ ... اس قسم کی تصویر کشی کے لیے ان بے رحموں نے رابعہ ... شاید جو وہ سے بھی یہ تصاویر دکھائی گئی ہوں ... وقت وہ ہوش میں ہوگی تو اس کے دل پر کیا بیتی ہو گی۔ ... اور میری نے بھی رابعہ کو اس حال میں دیکھا ہو گا۔ اف میرے خدا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وقت اور رسوائی کے احساس سے نجات پانے کے لیے رابعہ خودکشی کر لے۔ ہر لڑکی اگر حساس ہو گی ... نمائش دیکھنے کے لیے اور دیکھنے والوں کی نظروں کا سامنا کرنے کے لیے زندہ رہنا پسند نہیں کرے گی۔ محسن ... سمجھتا ہو گا کہ رابعہ کو مجبور کیا گیا ہو گا اور مجبور کر کے بہت ... کے لیے خدا کے لیے جو علامت بنا رہا ہے۔ تم سب ... فرشتوں کی طرح معصوم ہو گی۔ یہ سب تو جنگ ... ہے۔ دشمن کوئی رعایت نہیں کرتا اور کسی حربے کو غیر ... غیر انسانی یا ناجائز نہیں سمجھتا۔

اچانک فلم کا منظر بدل گیا۔ آخری سین وہ تھا جب بے ہوش ہو جانے والی لڑکی کو دو آدمی اٹھا کر لے گئے تھے۔ یہ دونوں اس وقت میرے دائیں بائیں تیار کھڑے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں میرا یقین متزلزل ہونے لگا کہ یہ فلم تھی جس کے سارے مناظر غیر حقیقی تھے۔ جس طرح وہ لڑکی لے جائی گئی تھی وہ منظر حقیقی تھا۔ اتنی اچھی اداکاری اس لڑکی نے کیسے کی؟ اگر وہ واقعی ایسی اداکاری کر سکتی تو یقیناً فلمی دنیا میں صف اول کی اداکارہ شمار ہوتی کیونکہ جہاں تک ظاہری حسن و شباب کا تعلق تھا وہ بہت سی نامور اداکاراؤں کے مقابلے میں ہزار درجہ بہتر تھی پھر اس کے جسم کو پیشہ ورانہ خصوصاً اس قسم کے رسوائی کردار کرنے والی اداکارہ والی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر وہ پیسے کی خاطر اس قسم کی فلمیں بنوانے والی ہوتی تو اس کی صورت پر پھیکا پن اور اس کے انداز و اطوار میں اس کے سارے گناہ اور ذلتیں کی جھلک ہوتی لیکن وہ تو عام سی لڑکی تھی۔

ایک اور بات یہ تھی کہ اس لڑکی سے جتنے سوال جواب کیے جا رہے تھے وہ بھی میں نے سنے تھے۔ سوال کرنے والے سامنے نہیں تھے مگر ان کی آواز کو میں نے شناخت کر لیا تھا۔ ایک آواز استاد جیدا کی تھی اور دوسری ایس پی سراج کی۔ جیدا اور سراج دونوں اور کا بیٹے ننگا کرنے کے مناظر میں وہ لڑکی اس کمرے میں تھی جس میں مجھے رکھا گیا تھا اور شاید وہ سب کمرے ایک جیسے تھے جن میں ہم سب اسیر تھے۔ اس کے ساتھ بھی دو لوگ تھے کی ... تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس فلم میں بھی ان کا کردار خاموش تھا۔ وہ ایک لفظ نہیں بولے تھے۔ وہ تعمیل حکم کرتے تھے لاتے تھے۔ کمرے میں لڑکی کے ساتھ وہی دونوں موجود تھے اور معلوم نہیں کیا کیے جاتے تھے کہ لڑکی کی حد درجہ بے بسی ہوتی تھی۔ اب مجھے یقین آ رہا تھا کہ یہ اداکاری نہیں۔ وہ لڑکی کوئی ایکٹریس نہیں تھی۔ جو کچھ اس پر بیتی تھی حقیقت تھی اور میں اس ظلم کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے پر مجبور تھا۔

سراج کے کہنے میں آتے ہی لڑکی نے چیخ ماری۔ سراج کے ہاتھ میں ایک ڈبا تھا۔ جب کیمرے نے سامنے سے فوکس کیا تو مجھے پتا چلا کہ یہ ڈبا ایک چوہے دان تھا۔ اس کا سامنے کا حصہ جالی دار تھا۔ دوں کی جالی کا بنا ہوا تھا۔ کیمرے نے اسے اور بہت قریب سے ... تو مجھے اس میں چھوٹے چھوٹے چوہے اچھلتے اور انتہائی اضطراب کے عالم میں جالی سے سر ٹکراتے دکھائی دیے۔ میں سمجھ گیا کہ اب کیا ہو گا۔ اس کا مجھے تجربہ نہیں تھا لیکن میں نے سنا تھا کہ پولیس کے پاس یہ بھی تشدد کا ایک مؤثر اور کامیاب ذریعہ ہے اور اس طریقے کو استعمال کرنے کے بعد عام طور پر مجرم کو چھپانے کا حوصلہ نہیں رہتا۔ یہ سب چوہے ... بھوکے رکھے گئے تھے اور گوشت خور تھے۔ عورت تو ... چوہا

www.paksociety.com

یا کاکروچ دیکھ کر ہی دہشت زدہ ہو جاتی ہے مرد بھی ان چوہوں کی آدم خوری اور خون آشامی سے پناہ مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب غالب کے آبائی گھر میں ایک چوہے کے آجانے سے نازو جیسی بہادر لڑکی اور رابعہ جیسی باہمت لڑکی کا کیا حال ہوا تھا۔

ان دونوں گونگے کمانڈوز نے لڑکی کو بے لباس کر دیا اور سراج نے اپنے شیطانی قہقہوں کے ساتھ اسے چوہوں سے ڈرانا شروع کیا۔

گونگے کمانڈوز نے لڑکی کے ہاتھ پیچھے باندھے اور اسے چھوڑ دیا۔ وہ بری طرح اچھلنے لگی۔ چوہے اس کے سامنے جسم پر دوڑ رہے تھے مگر ان کے لیے باہر نکلنے کے سارے راستے بند کر دیے گئے تھے۔ وہ جسم سے چپکے ہوئے کپڑوں کے اندر قید تھے......... لڑکی کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے چنانچہ

وہ پاگلوں کی طرح دانتوں سے رسی کی گرہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے دانت صرف آستینوں کی گرہ تک پہنچے لیکن وہ انھیں بھی نہ کھول سکی قمیص کے نچلے حصے اور شلوار کے پائنچوں تک اس کے دانتوں کی رسائی ہی نہ تھی۔ اس نے فرش پر جھک کر وحشیانہ ادھر سے ادھر تڑپ تڑپ کر گرتے ہوئے قلابازی کھا کے لوٹتے ہوئے ان موذی اور وحشی چوہوں سے نجات پانے کی بے سود کوشش جاری رکھی۔ سراج مسلسل ایک ہی سوال دہرا رہا تھا اور لڑکی کچھ نہیں سن رہی تھی۔ وہ پوری قوت سے چیخ رہی تھی۔ اس کے حلق سے "خدا کے لیے... رسول کے لیے... مجھے نہیں معلوم... میں نے کچھ نہیں کیا... مجھے چھوڑ دو..." کے جملے نکلتے تھے۔ پھر وہ ایسے چیخ مارتی تھی جیسے اسے ذبح کر دیا گیا ہو۔ وہ اپنی ماں کو آوازیں دے رہی تھی۔ خدا کو پکار رہی تھی۔ ان سب کی منت سماجت کر رہی تھی لیکن اس کی آواز بہری دیواروں سے ٹکرا کے لوٹ رہی تھی۔

"بند کرو... بند کرو یہ سب۔" میں نے اچانک چیخ کر کہا اور کسی دیوانے کی طرح میرے ذہن میں یہ سب کچھ تباہ و برباد کر بیٹھنے کا خیال آیا۔ یہ جگہ سینما کا پردہ۔ میرے ارد گرد موجود درندے... جلاد صفت شکاری یہ عقوبت گاہ۔

میں ان سب کو نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا لیکن وہ پہلے سے ہوشیار تھے ان کو معلوم تھا کہ فلم کا اثر کیا ہوگا۔ مضبوط سے مضبوط اعصاب والے کے لیے بھی یہ سب دیکھنا ناممکن تھا۔ میرے اٹھنے سے پہلے دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے پھر بٹھا دیا۔ سراج میرے دائیں جانب تھا اس نے اپنی کرسی کو کچھ دور کر لیا بائیں طرف بیٹھا ہوا شخص بھی آگے کھسک گیا۔ اور وہ دونوں گونگے کمانڈوز میرے دائیں بائیں آ گئے۔ انھوں نے مجھے ایک دم اٹھایا اور گھسیٹ کر اس کرسی تک لے گئے

جو اسی جگہ ٹھکی ہوئی تھی اور سیمنٹ کے فرش میں نصب تھی۔ میں نے بہت ہاتھ پیر چلائے اور ان کو لاتیں ماریں مگر کامیاب نہیں ہوا مگر وہ پروفیشنل لوگ تھے۔ مجھ سے بہت زیادہ تنومند تھے اور مار کھانا بھی جانتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو صرف ایک گھونسا مار کے مجھے ناک آؤٹ کر دیتے۔ خود گونگے کمانڈوز کے لیے میری مزاحمت کو ختم کرنا مشکل نہ تھا مگر وہ مجھے فلم دیکھنے کے لیے ہوش میں رکھنا چاہتے تھے۔

مجھے اس فولادی کرسی پر چمڑے کی پیٹیوں سے باندھ دیا گیا تو سراج اور اس کا دوسرا ساتھی اپنی کرسی پر پیچھے ہٹ گئے۔ سامنے سینما کا اسکرین نئے زاویے پر لٹکایا گیا اور اسی مناسبت سے پروجیکٹر کو شفٹ کیا گیا۔ میں نے ان کو بہت گالیاں دیں اور قتل کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو ڈالنے کی دھمکیاں دیں۔ وہ صرف مسکراتے رہے۔ وہ یہی چاہتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ بالآخر میری قوت برداشت ختم ہو جائے گی اور میرے اعصاب جواب دے جائیں گے۔ ابتدا میں رابعہ کی تصاویر دکھانے کا مقصد یہی تھا کہ جب میں فلم دیکھوں تو مجھے اس اجنبی لڑکی کی جگہ رابعہ دکھائی دے۔

"ابھی تم نے کچھ نہیں دیکھا۔" سراج بولا۔ "ابھی تو آدھی فلم ہوئی ہے... باقی آدھی بھی دیکھو۔"

"میں کچھ نہیں دیکھوں گا۔" میں نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں لیکن اسی وقت میرے جسم کو جھٹکا لگا۔ میں تڑپ کر اچھلا مگر اپنے بندھنوں میں کسمسا کے رہ گیا۔ میرے لب خشک ہو گئے اور سارے جسم پر پسینہ آ گیا۔ میرا دل چلتے چلتے رکا اور پھر چلنے لگا لیکن اب اس کی دھڑکن بہت تیز تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دل میرے سینے کے زندان کی دیوار توڑ دے گا۔ یہ کرسی واقعی الیکٹرک چیئر تھی۔ انھوں نے اس میں ذرا سی دیر کے لیے کرنٹ چھوڑا تھا اور بند کر دیا تھا۔

"پانی... پانی..." میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

سراج نے قہقہہ لگایا۔ "فلم کے بعد پانی ملے گا... فلم نہیں دیکھو گے تو صرف الیکٹرک شاک ملیں گے۔"

"میں... میں یہ سب نہیں دیکھ سکتا..." میں نے کہا۔

بجلی ایک بار پھر چمکی اور اس بار یہ جھٹکا مجھے اندھیرے میں چمکنے والی آسمانی بجلی کی طرح لگی میرے دماغ میں جھکڑ چلنے لگے اور اندھیرے سے آ جانے کی آگ کھجلی شروع ہو گئی میرا سارا جسم ہو گیا اور اس میں سے آگ نکلنے لگی۔ پسینہ اب پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور میرے حلق میں کانٹے چبھ گئے تھے۔ اب میں چیخ بھی نہیں سکتا تھا اور پانی بھی نہیں مانگ سکتا تھا۔

"فلم دیکھو۔" سراج نے مجھے حکم دیا۔

"اگر تم پوری فلم خاموشی سے نہیں دیکھو گے تو [illegible]

بتا دیں گے اور باقی فلم وہ بھی تمہارے ساتھ بیٹھ کر دیکھیں گی۔" شخص بولا جس کا مجھے ابھی تک نام معلوم نہیں تھا لیکن وہ میرے خیال میں اس مشن کا سربراہ تھا جس کا مقصد مجھے گرفتار کر کے لانا اور مجھ سے تمام معلومات حاصل کرنا تھا۔

"ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ تمہارے پپوٹے کاٹ دیں... تم پلک بھی نہ جھپکا سکو گے تو آنکھیں کیسے بند کرو گے۔ تمہاری آنکھیں ساری زندگی کھلی رہیں گی۔ مرنے کے بعد بھی کھلی رہیں گی...... تم جانتے ہو اگر پلک ایک منٹ بھی نہ جھپکے تو آنکھ پر کیا گزرتی ہے۔"

میں لمبے لمبے سانس لینے لگا اور فلم دیکھنے لگا۔ فلم کے باقی مناظر شرافت اور انسانیت کی لاش کی بے حرمتی کے مناظر تھے۔

عمومی طور پر اس فلم کی لمبائی کیا تھی، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ میرے لیے وہ وقت صدیوں کے عذاب پر محیط تھا۔ اس الیکٹرک کرسی پر وہ تیسرا معمولی جھٹکا کھانے سے میری جو حالت ہوئی تھی اس کے بعد مجھ میں آنکھیں بند کرنے کا حوصلہ نہ رہا تھا۔ وہ سب کچھ کر سکتے تھے۔ میں نے تشدد کے واقعات کا تذکرہ کتابوں اور رسالوں میں پڑھا تھا مجرموں کے ناخن کھینچے، دانت توڑنے اور جوتے کاٹنے کے واقعات نازیوں سے بھی منسوب تھے۔ دہشت پسندوں اور تفتیش کرنے والوں سے بھی۔ یہ سب میرے ساتھ بھی ہو سکتا تھا اور رابعہ کے ساتھ بھی۔

فلم کے آخری منظر میں لڑکی مر گئی تو میں نے یوں محسوس کیا جیسے میرے سینے سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ خدا نے بالآخر اس کو اذیت سے نجات دی۔ اس کے ساتھ جو ہوا وہ سب بیان کرنا بھی ناممکن ہے اور اس کا ذکر سننا بھی۔ مگر میں نے تو یہ سب دیکھا تھا اور خوف میری روح کے اندر تک سما گیا تھا کہ یہی سب کچھ رابعہ کے ساتھ ہوگا اور میں دیکھوں گا۔ دیکھنے پر مجبور کر دیا جاؤں گا۔ میری عقل اور میرے جذبات، میرا دل اور دماغ سب یہی بات کہنے لگے تھے۔ چھوڑ دو سکندر محبت ایمان سب بلکہ یہ جو تم کر رہے ہو صرف رابعہ کو بچا لو۔ بھول جاؤ آزادی کو... اپنے مشن کو... والد کو... اپنے باپ کے ساتھ گزرے دنوں کو... اس وطن کو بیچنے والے بہت طاقت ور ہیں۔ تم نے دیکھا کہ انھوں نے رابعہ کے ساتھ کیا کیا۔ رابعہ کے ساتھ تو نہیں... ابھی رابعہ کے ساتھ کچھ نہیں ہوا۔ بھلا کیسے معلوم کیا تم نے اس کی تصاویر نہیں دیکھیں... وہ دیکھو... اس لڑکی کی لاش کو ایک ٹرک میں ڈالا جا رہا ہے... ٹرک اب روانہ ہو گیا ہے۔ اس جگہ کو تم پہچانتے ہو نا... یہ لاہور کی ایک مشہور سڑک ہے سامنے مال کا حصہ... دیکھو انھوں نے لڑکی کی برہنہ، مسخ شدہ اور زخم خوردہ لاش کو سڑک پر پھینک دیا ہے... اور اب دیکھو... وہ ٹرک واپس آ رہا

ہے۔ ٹرک اس لاش کے اوپر سے گزر گیا ہے... ہاہاہا... ٹرک دوبارہ ریورس گیئر میں آیا... ہاہاہا... پھر ٹرک کے اوپر سے گزر جانے سے کون پہچانے گا یہ کس کی بیٹی تھی، کس کی بہن تھی، کس سے پیار کرتی تھی، کون تھا جس نے اسے خوابوں میں بسا رکھا تھا۔ یہ کس گھر کے آنگن کو اپنے وجود کی مہکار دینا چاہتی تھی۔ کس گلشن میں پھول کھلا سکتی تھی۔ اب یہ ایک لاوارث ناقابل شناخت لاش ہے۔ حشرات الارض کا رزق... اس کے لیے کوئی دفن نہیں... کوئی لوح مزار نہیں... کوئی اشکبار آنکھ نہیں۔ اس کی روح تا ابد زمین اور آسمان کے درمیان چلاتی پھرے گی۔ ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دیر گیر!! ہاہاہا... روز مکافات... ہاہاہا..."

قہقہے سراج کے تھے مگر ایک وقت آیا جب میں نے محسوس کیا کہ میں بھی اس کے ساتھ ہنس رہا ہوں، اسی طرح قہقہے لگا رہا ہوں۔

"لے جاؤ اسے... اندر میں ڈال دو۔" سراج بولا۔

"ڈاکٹر کو بلاؤ۔" دوسرا شخص بولا۔ "اس کے دماغ پر یہ اثر عارضی ہوگا... آدمی مستقل مزاج ہے۔"

وہ دونوں مجھے گھسیٹ کر لے گئے۔ میں راستے میں ان کو ماں بہن کی گالیاں دیتا رہا۔ ہنستا رہا اور روتا رہا۔ انھوں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر پھینک دیا۔ میں فرش پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ ان سب کی مکروہ آوازوں کا شور... اس لڑکی کی جگر خراش چیخیں، سراج کی بھیانک ہنسی... سب ختم ہو گئے۔ ذہن سے سارے بے آبرو نقش محو ہو گئے۔ مجھے احساس سے پناہ مل گئی۔ جب میں پھر ہوش میں آیا تو میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ میں اسی زندان کے اندھیرے میں تھا اور تنہا تھا۔ میرے قریب اسٹول پر وہی شخص بیٹھا تھا جس کو میں نے سوالات کے جوابات پیش کیے تھے۔ کاپی اس کے ہاتھ میں تھی۔ "ہیلو۔" وہ خوش دلی سے بولا۔ "میں تمہارے جوابات دیکھ رہا تھا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کاپی کے صفحات پلٹتا رہا۔

"دیکھو... مجھے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟" میں نے نقاہت سے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے میرا نام..." وہ بے نیازی سے بولا۔ "نام سے کیا فرق پڑے گا تم کو... فرض کرو میرا نام ایکس ہے۔ یہ نام جاسوسی ناولوں اور کہانیوں میں بہت مقبول ہے۔ تم مجھے مسٹر ایکس کہہ سکتے ہو۔"

"مسٹر ایکس... کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔

"اگر میں کچھ بتا سکتا تو ضرور بتا دیتا۔ ایم آر ایس ویسی تنظیم نہیں ہے جیسی پی ایل او... یا پھر آئی آر اے۔ اس میں صرف ہم لوگ

www.paksociety.com

ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ تم سوالات کے میں نے عمداً غلط جواب دیئے تھے۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "یہ تو دوسری کاپی ہے۔ تم اس میں صحیح جوابات لکھ دو... جیسی ملاوٹ لکھ سکتے ہو، ورنہ کل ایسے اور تم کی شوٹنگ ہوگی۔ فلم ویسی ہی ہوگی جیسی تم نے کل دیکھی تھی مگر اس کی ہیروئن رابعہ ہوگی۔"

"تم نے یہ دھمکی کل بھی دی تھی۔" میں نے سوالنامہ لیتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "کاش وہ دھمکیاں میری ایک ہی ہوتیں..."

"جو کسی طرح بھی مجبور نہیں وہ ایک خدا کی ذات ہے۔" وہ بولا۔

"تم خدا کی بات کیوں کرتے ہو۔ تم اس کے وجود کے قائل ہوتے تو تمہارے دل میں اس کا خوف بھی ہوتا... جو کچھ تم کرتے ہو یا کر سکتے ہو اس پر تو شاید خود شیطان بھی شرمسار ہو۔"

"ہر شخص اپنے اعمال کی سزا اگر خود کاٹتا ہے تو کوئی انوکھی یا غلط بات نہیں۔" وہ بولا۔ "مگر جو کچھ رابعہ کے ساتھ ہوا... یا ہو سکتا ہے اس میں رابعہ کی کوئی خطا نہیں۔ اس کے ذمہ دار تم ہو... تم اسے بچا بھی سکتے ہو۔ اگر بچانا چاہو تو ایک بار پھر اس سوالنامے کو غور سے دیکھو۔"

"میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ یقین کرو سچ اتنا ہی ہے جتنا تم پہلے سے جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم تو میرے جوابات سے مطمئن نہیں ہو گے۔ تم یہ سمجھتے رہو گے کہ میں حقائق کو چھپا رہا ہوں۔ کسی دوسرے شہر میں یا ملک میں ہماری کوئی شاخ نہیں۔ ہمارا کوئی حامی تک نہیں۔ تم تصدیق کر سکتے ہو کہ کسی بھی سیاسی جماعت سے ہم نے رابطہ قائم نہیں کیا۔ کوئی ہمیں جانتا ہی نہیں تو رابطہ کیسے قائم کرے گا۔"

"میرا خیال ہے ان جوابات سے بات نہیں بنے گی۔" وہ بولا۔

"تو پھر یہ لے جاؤ۔" میں نے سوالنامہ اسے واپس کر دیا۔ "ویسے بھی میں تم کو کسی وعدے کا پابند نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو ایسی بات ہے کہ میرے پاس اپنے سچ کو ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ سچ اگر کہیں سے ظاہر ہو سکتا یا کسی لیبارٹری ٹیسٹ سے معلوم کیا جا سکتا تو ہم سب کے لیے کوئی پریشانی کی بات ہی نہ ہوتی۔ مگر اب بات یقین کی ہے۔ ہم سے تم لاکھ بار پوچھو، کسی بھی طرح پوچھو... جواب وہی رہے گا۔"

"یہ مسئلہ تو ہے۔" وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ "اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کی جا سکتی۔"

"دشمن کی کون مدد کرتا ہے۔ آخر تم میرے دشمن ہو اور میں تمہارا دشمن ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تو تم پر اعتبار بھی نہیں کر سکتا کہ تمہاری کسی بھی ضمانت کی کوئی حیثیت ہے۔ تم نے ... کہ سکندر رحمت یہ لو خنجر اور اپنا گلا کاٹ لو۔ اس کے بدلے سب کو چھوڑ دیا جائے گا... تو یہ حرام موت ہوگی۔ میرے مرنے کے بعد بھی تم باقی سب کے ساتھ وہی کرو گے جو تمہارا دل چاہے گا۔ مجھ سے کیے ہوئے وعدے اور میری قربانی کا خیال تک نہیں آئے گا۔ تم کہو گے کہ وہ تو بے وقوف تھا کہ ہم نے کہا اور اس نے مان لیا۔ ... اور یہ صرف میری نہیں، تم کسی کے سامنے بھی یہ شرط رکھو گے تو وہ سب کے لیے اپنی جان دینے کو تیار ہو جائے گا۔ جسے تم بے وقوفی سمجھتے ہو وہ ہم سب کے لیے خلوص اور وفاداری کا نام ہے۔"

"میں ایسی کوئی شرط عائد نہیں کر رہا ہوں۔"

"ہاں... تمہاری شرط اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "تم سچ جاننا چاہتے ہو اور ہمارے سچ کو سچ نہیں مانتے۔ پھر ٹھیک ہے جو تمہارا دل چاہے کرو۔"

"گویا تم نے آخری فیصلہ کر لیا ہے کہ کسی بھی سوال کا جواب نہیں دو گے۔" وہ ذرا جھنجلا کر بولا۔

"میرے فیصلے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جواب دوں یا نہ دوں، تمہارے لیے ایک ہی بات ہے۔ تم جیسے جی چاہے مار ڈالو۔ تھوڑا تھوڑا کر کے قتل کرو... بے آبرو کر کے مارو... ہمارے جسم سے قطرہ قطرہ خون کشید کرو یا ٹکڑے ٹکڑے کرو... جو ہم نہیں جانتے وہ کیسے بتا سکتے ہیں۔ تم تو ہماری لاشیں پھنکواتے ہوئے بھی پشیمان نہیں ہو گے۔ دعا کا سوال نہیں، گالی ہی دو گے کہ حرام زادے ضدی تھے۔ جان دے دی مگر بتایا کچھ نہیں۔ ہمارا وقت بھی برباد کیا اور توانائی بھی ضائع کی۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ متاثر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے پھر سر ہلایا مگر اس سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ قائل ہو گیا ہے یا کچھ اور فیصلہ کر چکا ہے۔ جب وہ دروازے کے قریب تھا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ میں نے کہا۔ "تم یہ تو بتا سکتے ہو کہ کیپٹن کی حالت اب کیسی ہے؟"

"کوئی خاص فرق نہیں۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ... کی یہ کیفیت عارضی ہوگی تو چوبیس گھنٹے میں معلوم ہو جائے گا۔ چوبیس گھنٹے تو گزر گئے۔ اب یہ ہے کہ اسے کسی جنرل وارڈ میں کسی ماہر کی زیر نگرانی رکھا جائے تو وہ ہوش میں آ سکتی ہے مگر وقت کا تعین مشکل ہے۔ ہفتہ دس دن بھی لگ سکتے ہیں... مہینہ بھر بھی۔"

"اور اگر وہ اسی طرح پڑی رہی تو...؟"

اس نے کندھے جھٹک کے لاعلمی کا اور مایوسی کا اظہار کیا۔ "یہ تو پھر جو خدا کی مرضی۔ جب تک زندگی ہوگی جیتی رہے گی اسی طرح..." وہ پھر جانے کو تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔

"شہلا کی کوئی خبر ہے...؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ سوال ... تھا۔ بھلا انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ شہلا کی خیریت معلوم کرتے پھریں۔ ان کی بلا سے کل کی مرتی آج مر جاتی۔ اس کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا رہا۔ میری عقل مجھ سے مدد اور رہنمائی مانگتی ہے۔ میرے پروردگار ... کی آواز میں کہا۔ میں کیا کروں۔ اگر اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت ممکن نہیں تو ہمارے لیے موت کو آسان کر دے۔ شہلا اور محسن کے لیے، کیپٹن کے لیے، میرے اور رابعہ کے لیے۔ ہمیں موت سے پہلے کے عذاب سے محفوظ کر۔

میں نے وہ سارا دن یوں گزارا جیسے سزائے موت پانے والا قیدی زندگی کا آخری دن بسر کرتا ہے۔ میں پاگلوں کی طرح نفرت و دہشت سے ٹہلتا رہا یہاں تک کہ میری ٹانگیں جواب دے گئیں۔ ڈاکٹر دو بار آیا اور مجھے چیک کر کے چلا گیا۔ اس نے مجھے فٹ قرار دیا۔ میں نے اس کو بہت گالیاں دیں... اسے قصاب، جلاد اور شیطان کہا۔ میرا ذہنی توازن بگڑنے لگا تھا۔ میں دروازہ کوٹتا رہا اور رابعہ اور محسن کو آوازیں دیتا رہا۔ پھر جلاد اور سرخ کو گالیاں دیتا رہا۔ ان کی منت سماجت کرتا رہا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی ہے۔ سب بھی بے اثر ہے۔

میں نے سارا دن کھانا نہیں کھایا اور جو کھانا آیا تھا وہ ملازم کے منہ پر پھینک دیا۔ رات آئی تو مجھے ان گولیوں کا خیال آیا جو میں نے ذخیرہ کر رکھی تھیں۔ وہ آٹھ گولیاں میرے بستر کے نیچے موجود تھیں۔ میں نے آٹھوں گولیاں ہتھیلی پر رکھیں اور چبا کے نگل گیا۔ ان کا ذائقہ بہت خراب تھا مگر میں نے ... حلق سے اتار لیا اور بے ہوشی یا موت کا انتظار کرنے لگا۔

میری آنکھیں غنودگی سے بوجھل ہو رہی تھیں جب میں نے کسی عورت کے چیخنے کی آواز سنی۔ وہ یوں چلا رہی تھی جیسے بھیڑیے ہر طرف سے اس کی بوٹیاں نوچنے کے لیے ... "چھوڑ دو مجھے... مجھے جانے دو... سکندر... مجھے بچاؤ... سکندر... سکندر..." وہ اسی طرح چیخ رہی تھی جیسے وہ لڑکی جسے میں نے ایک فلم میں بڑی بے بسی اور درد سے عذاب کے ساتھ مرتے دیکھا تھا۔ مجھے وہ بات بھی یاد تھی کہ یہ سب کچھ رابعہ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ آواز رابعہ کی ہے۔ میں نے غنودگی کے ذہن کو بیدار کیا اور غور سے سننے کی کوشش کی۔ شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ رابعہ تھی... رابعہ نہ ہوتی تو مجھے کیوں پکارتی۔ لیکن اس وقت تک میرے حواس پر غنودگی غالب آنے لگی تھی۔

دوسری بار میں نے پھر وہی درد و کرب میں ڈوبی ہوئی فریاد سنی۔ یہ رابعہ کے سوا کسی کی آواز نہیں ہو سکتی تھی۔

"یا اللہ... اللہ میری توبہ..." وہ شدید تکلیف میں دہشت سے چیخ رہی تھی۔ "چھوڑ دو... مجھے چھوڑ دو... خدا کے لیے..."

"رابعہ..." میں نے دیوانہ وار چلا کے کہا اور بند دروازے پر مکے مارنے لگا۔ پوری قوت کے ساتھ، جیسے اپنے خالی ہاتھوں کی قوت سے میں دروازے کو توڑ ڈالوں گا۔

"اللہ... اف اللہ... آہ... قسم خدا کی... قسم رسول کی... مجھے نہیں معلوم..." اس کی مسلسل چیخوں سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ "اسے نکالو... مجھے مار ڈالو... میرا گلا کاٹ دو... گولی مار دو مجھے... لیکن مجھے ایسا عذاب مت دو... یا خدا... میں کیا کروں... کدھر جاؤں... سکندر... مجھے بچاؤ سکندر... سکندر... سکندر..."

"رابعہ..." میں نے دروازے پر پاگلوں کی طرح یلغار کی۔ "رابعہ... میں آ رہا ہوں... میں ان سب کا خون پی جاؤں گا... ذلیلو... سرخ... رابعہ کو چھوڑ دو... اسے کچھ نہیں معلوم... اسے عذاب مت دو..." میں نے دروازے پر لاتیں اور مکے برسانا جاری رکھا۔ میرے ہاتھ زخمی ہو گئے۔ میرا دماغ رابعہ کی پکار سے مفلوج ہو رہا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ان پتھر کی دیواروں سے گزر کے رابعہ تک پہنچ سکوں لیکن میں چلا چلا کے کہہ رہا تھا کہ میں آ رہا ہوں اور مسلسل اس بند دروازے سے ٹکرا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی پتا نہ تھا کہ رابعہ اس قید خانے میں کدھر ہے۔ کتنے بند دروازے اور کتنی سنگ و خشت کی دیواریں میرے اور اس کے درمیان حائل ہیں۔ میں تو اس کے جسم پر گزرنے والا سارا عذاب جھیل رہا تھا۔ اس کی ہر صدا پر میرے دل میں درد کا آتشیں نشتر پیوست ہو جاتا تھا اور ایک ناقابل برداشت کرب میرے وجود کو چھیلنے لگتا تھا۔ میرے احساس کو شل کرنے لگتا تھا۔ وہ مسلسل چیخ رہی تھی اور اس کی ہر چیخ ایک تڑپ تھی۔ میری آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں کہ وہ بھیڑیوں کے نرغے میں ہے جو اس کے بدن پر اپنے سفاک پنجوں اور اپنے خونی دانتوں کی درندگی آزما رہے تھے۔ اس کے زخمی لہولہان جسم پر اپنے شیطانی ہاتھوں کے لمبے لمبے ناخنوں سے حیوانیت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اسے ہوس پرست سفاک اور خون آشام جانور جھنجھوڑ رہے تھے۔ ہر طرف سے نوچ رہے تھے۔ کاٹ رہے تھے۔ اس کے گرد جمع ہو کے وحشت اور بربریت کا ننگا رقص کر رہے تھے۔ موت کا کھیل ... اس کی عصمت اور عزت ...

www.paksociety.com

اور معصومیت کی دھجیاں اُڑا رہے تھے۔ اور وہ چلا رہی تھی۔ خدا کو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ مجھے پکار رہی تھی۔ موت مانگ رہی تھی۔

میں نے چیخ چیخ کر ولاور کو اور سراج کو ایک سے ایک گندی گالی دی اور اپنا سر دروازے سے ٹکرانے لگا۔ رابعہ کی آواز میرے دل کو یوں پارہ پارہ کر رہی تھی کہ ہر قطرہ خون درد و کرب کا سمندر بن کے اُبلنے لگا تھا لیکن پھر بھی وہ ڈوبتی ہوئی بے بس پکارتی ہوئی آواز کُند ہتھیار کی طرح میرے جگر کو کاٹتی جارہی تھی۔

بالآخر دروازہ کسی نے باہر سے کھولا۔ میں ایک وحشی قوت کے ساتھ باہر نکلا اور اس جال میں اُلجھ گیا جو شکاری پہلے سے پھیلائے کھڑے تھے۔ یہ نائلون کی مضبوط ڈوریوں سے بنا ہوا جال تھا جو جیل وزنداں کے مقابل رکھا گیا تھا کہ میں اپنے پاگل پن میں نکلوں تو مجھے قابو کرنے کے لیے کسی کو ایک انگلی بھی نہ ہلانا پڑے۔ وہ میری ذہنی کیفیت کا اندازہ کر سکتے تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ جو بھی میرے سامنے آئے گا مارا جائے گا خواہ اس کے ہاتھ میں سٹین گن ہی کیوں نہ ہو۔

جال ایک دم میرے گرد لپٹ گیا۔ میں نے ہر طرف ہاتھ پیر چلائے اور اس جال کی ڈوریوں کو ہاتھوں سے توڑنے کی اور دانتوں سے کاٹنے کی دیوانہ وار کوشش کی مگر میری ساری جدوجہد تلوار سے ہوا کو کاٹنے یا سمندر کے ٹکڑے کرنے کی احمقانہ کوشش کے سوا کچھ نہ تھی۔ جال سمٹتا گیا اور میں چیختے چیختے پاگل ہوگیا۔ میں اس وقت اپنی حالت دیکھنے سے قاصر تھا۔ لیکن میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ میرے حلق سے بے ربط اور بے معنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں کبھی رابعہ کو پکارتا تھا کبھی ولاور اور سراج کو "پیٹرو" کو اور خورشید کو گالیاں دینے لگتا تھا۔ میں نے ان سب کی ماں بہن کو ایک کردیا تھا۔ میں اُنھیں جھوٹی دھمکیاں دے رہا تھا اور جال میں یوں تڑپ رہا تھا جیسے جنگل میں پکڑا جانے والا خونخوار چیتا۔ مجھے بے بس کرنے والے وہی دونوں خاموش ہٹے کٹے تھے جو صرف حکم کے غلام تھے اور اسی طرح کام کرتے تھے جیسے مشینی نظام والا روبوٹ کسی آپریٹر کے اشارے پر چلتا ہے۔ ان کے ذاتی جذبات و احساسات کا سرے سے وجود نہ تھا۔ وہ بے پناہ قوت کے مالک تھے اور جسمانی اعتبار سے دیوزاد تھے۔ ان کو خصوصی تربیت کے ذریعے ہر صورت حال سے نمٹنا سکھا دیا گیا تھا چنانچہ وہ خالی ہاتھوں مسلح تھے یا اسلحہ رکھتے تھے مگر انھوں نے اسلحہ استعمال نہیں کیا تھا مگر میرا بہت پہلے سے خیال تھا کہ وہ ریڈیو اور سائنسی گن کے سب کچھ چلاتے ہوں گے اور ممکن ہے ہر قسم کی گاڑی ڈرائیو کرسکتے ہوں اور جہاز اُڑا سکتے ہوں۔ وہ محض اعلیٰ تربیت یافتہ اور ہر کام کی صلاحیت رکھنے والے ملازم تھے جن کو ملامت گزاری اور فرماں برداری کے سوا کچھ نہ آتا تھا۔

وہ مجھے جال میں گرفتار کرکے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ میں نے خود کو پھر اسی عمارت میں جیسے عقوبت خانے میں پایا۔ میرا خیال تھا کہ رابعہ اسی عذاب گاہ میں ہوگی مگر وہاں صرف دلاور تھا جو بڑے مطمئن اور فتح مندانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میں ابھی تک جدوجہد میں مصروف تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو زخمی کرلیا تھا۔ اپنے کپڑے پھاڑ لیے تھے اور اپنے بال نوچ ڈالے تھے۔ پھر بازوؤں نے میرے ہاتھ سے اور چہرے سے رستے ہوئے خون کی لکیریں میری حالت کو مزید مضحکہ خیز بنا رہی تھیں۔ مجھے اب رابعہ کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید وہ بے ہوش پڑی ہوگی۔ شاید وہ مرگئی ہوگی۔ میں نے سہم کر سوچا۔

سراج اندر آیا اور دلاور کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ اب وہ دونوں میری دیوانگی اور میری بے چارگی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ میری ساری رائیگاں پر خندہ زن تھے۔ وہ اپنی فاتح قوت کے غرور کا مقابلہ میری شکست کی ذلت سے اور میری مجبوری سے کر رہے تھے۔

"بھئی سراج صاحب! یہ اپنے سکندر اعظم ہیں۔ ایم آر ایس کے چیئرمین۔" دلاور نے اپنے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔

سراج نے قہقہہ لگایا۔ "یہ ہے وان کے اندر یونا۔"

"ایسا تو مت کہو یار۔ یہ ماشاءاللہ سے بڑے جیالے اور شہ زور ہیں۔" دلاور بولا۔ "جو ڈو کراٹے جانتے ہیں۔ میرے تمھارے جیسے دس کو چت کرسکتے ہیں۔ دیوار کو یوں گرا سکتے ہیں۔" وہ چٹکی بجا کے بولا۔

سراج نے آگے بڑھ کر میرے بال پکڑ لیے۔ "یہ تو بہت پتلی ڈوریاں ہیں۔ دیواریں گرا سکتے ہو تو ان کو کیوں نہیں توڑ سکتے... تم تو شیر ہو اور یہ جال تو خرگوش پکڑنے کے کام آتا ہے۔"

"سراج... ایس پی صاحب... خدا کے لیے۔" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

"اب خدا یاد آیا۔" سراج نے میرے سر کے بالوں کو مٹھی میں لے کر اتنی قوت سے جھٹکے دیے کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "کیا خدا کا حکم تھا کہ ایم آر ایس بناؤ۔"

"اور اپنے سکندر صاحب! یہ تو بڑی جذباتی دکھائی دیتے ہیں آپ بے غیرت والے کبھی ہم جیسے کمینوں کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں۔" دلاور نے طنز سے کہا اور پیچھے ہاتھ باندھ کے ٹہلنے لگا۔ "آپ تو شیر سے بہادر ہو۔ جان و مال اور عزت و آبرو سب قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہو... وہ کیا فرمایا ہے اپنے علامہ صاحب نے کہ مر گئے تو شہید اور زندہ رہے تو غازی یہ شعر و شاعری کی بات ہے اس لیے مجھے یاد نہیں مگر کچھ ایسا ہی ہے اس میں آپ سمجھ گئے ہوں گے۔"

"سراج! تمھیں اپنی ماں کی قسم۔" میں نے کہا۔ "رابعہ کو چھوڑ دو۔"

سراج نے میرے سر پر لات ماری۔ "اچھا سلوک کیا تھا تم نے میری ماں کے ساتھ۔ اس نے ایک رات تم کو مہمان رکھا اور پھر تم نے اسی کے گھر کو بم سے اُڑا دیا۔"

"لیکن اس کو تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہم نے اُسے نکال لیا تھا۔"

"کیا اس سے تھارے جرم کی سنگینی کم ہوجاتی ہے؟" سراج نے دوسری لات میرے بازو پر ماری۔ "تم کسی عورت کو گھر سے نکال کے گھر کو آگ لگا دو۔ بم سے تباہ کردو... اور پھر کہو کہ عورت کی زندگی تو بچالی۔ یہ پوچھو اس عورت سے کہ اس کے دل پر کیا گزری۔ اس کے دل میں تمھارے لیے شکر گزاری کے جذبات ہیں یا نفرت کے؟ وہ گھر میرے باپ کا تھا۔ میری ماں کے شوہر کا۔ اس گھر میں جو کچھ تھا اس سے میری ماں کی تمام زندگی منسوب تھی۔ اس کی یادوں کا سارا خزانہ لوٹ لیا تھا تم نے... اس کو بے گھر کردیا تھا۔"

"جانے دو سراج۔" دلاور بولا۔ "ان سے نا تجربہ کاری اور جوانی کے جوش میں بہت غلطیاں ہوئی ہیں۔ ہمارا تو نقصان کیا سو کیا، دنیا بھی خوب بیڑا غرق کیا انھوں نے... واہ بھئی واہ اپنے سکندر صاحب... پڑھ لکھ کے بھی آپ ہم سے زیادہ بے وقوف ہے۔ کیا ہوا جو ہے کہ دشمن کے سر پہ ڈنڈا مارا تو اپنے پاؤں پہ کلہاڑی ماری۔"

"میں تم کو آخری موقع دے رہا ہوں۔" سراج نے سو فیصد ایس پی کے لہجے میں کہا۔ "بہت لحاظ کرلیا میں نے۔ اس... لیفٹے سلارے نے تم کو بہت گمراہ کیا۔ تم یہ سمجھنے لگے کہ بس اب تمھارے خالق اور مددگار یہی جنّے والے ہیں۔" اس نے حقارت سے ایک گندی گالی دی۔ "یہاں اُن کے فرشتے بھی پر نہیں مار سکتے۔ تمھارے وہ انکل رضوی ایس ایس پی بہادر... نہ وہ ایس آئی اکرام... بے غیرت شخص۔ اس کی بہن تو ساری ساری راتوں کو گھر سے باہر رہتی ہے جوان مردوں کے ساتھ جہاں جاتی ہے راتیں گزارتی ہے۔ کیا میں نہیں جانتا۔ دنیا نہیں جانتی کہ تم لوگ کچھ بھی نہیں ہو۔ صرف آوارہ مزاج مغرب زدہ اخلاقی اقدار کے ماننے والے... مادر پدر آزاد لڑکے اور لڑکیاں وہاں بھی مشترکہ فلیٹ میں رہتے ہیں۔ شادی کو غیر اہم سمجھتے ہیں۔ معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی زنجیروں کو توڑ کے سمجھتے ہیں کہ انھوں نے مکمل آزادی حاصل کرلی۔ ان کے لیے خاندان کچھ نہیں اور خاندانی رشتے داریاں بھی کچھ نہیں۔"

"تم کہتے ہو تو میرا خون کھینچ کر سر پر آگیا۔"

"نہیں... میں جانتا ہوں تم نے چار سال لندن میں گزار کے یہی سیکھا اور اب وہی سب کچھ یہاں کر رہے ہو۔" سراج نے کہا۔ "تم سب جوائنٹ فیملی سسٹم پر ہنستے ہو... کیسا نکاح اور کیسی شرعی قیود۔ تم حیوانی سطح پر رشتے قائم کرتے ہو... میں جانتا ہوں کہ یورپ میں بھی یہ انتہائی گرے ہوئے معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے بے ضمیر اور بدکردار افراد کا شیوہ ہے۔ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ وہاں ننگوں کے کلب بھی ہیں اور ان کے ممبر لباس کو انسان کے لیے غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ لباس فطرت تو برہنگی ہے۔ خدا آدمی کو دنیا میں جس طرح بھیجتا ہے اسے ویسے ہی رہنا چاہیے۔ تمام ذی روح رہتے ہیں۔ انسان بھی جانور سے اگر تعلق رکھتا ہے تو کیا ہوا۔ تم نے بھی شاید یہاں خود ایم آر ایس کے نام پر وہی کلب بنا رکھا ہے اور یہ جو ڈھونگ رچایا ہے تم نے کہ تم محب وطن ہو یہ سب اپنے کرتوتوں کا پردہ ہے۔ رابعہ تمھاری جانِ من ہے، غلام اور کنیز کی بیٹی...."

"شعور کے بچے... خبیث... کتے۔" میں نے غصے میں پاگل ہوکے چیخنا شروع کیا۔ "ایک بار مجھے چھوڑ کے دیکھ... پھر میں تجھے بتاؤں کہ ماں اور بہن میں کیا فرق ہوتا ہے، بیوی، محبوبہ اور داشتہ میں کیا فرق ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہے، مگر تم نے سب کو ایک کردیا ہے۔" سراج نے کھینچ کے کہا۔ "تم سب کے سامنے خُشر بیٹی کسی کو بہن کہتے ہو کسی کو بھابی، مگر ہیں وہ سب تمھارے لیے صرف عورتیں...."

میں اسے چیخ چیخ کر گندی گالیاں دینے لگا۔ دلاور مسکراتا رہا۔ میں جال میں پھنسا ہوا تھا اور وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھے مگر بالکل محفوظ تھے۔ پھر میری آواز بیٹھ گئی۔ میرے سینے سانس لینا مشکل ہوگیا اور سراج پھر بولنے لگا۔ اس نے تازہ شعلہ اور رابعہ کے بارے میں اور زیادہ غلیظ باتیں شروع کردیں۔ میں تھک گیا تھا۔ اگر میرے اعصاب پہلے کی طرح مضبوط ہوتے تو میرا ردعمل یہ ہوتا۔ میں ساری بکواس پی کر بھی پرسکون رہتا اور سمجھتا کہ جو بک رہا ہے تو اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے۔ بہ مکنا کتّے کی فطرت بھی ہے اور عادت بھی۔ کبھی کبھی وہ کاٹ لے تب بھی کوئی ایسی بات نہیں مگر اس وقت میں اپنے آپ پر قابو رکھنے میں ناکام تھا۔ ذرا سی بات سے میرے اعصاب کے تار جھنجھنا اُٹھتے تھے۔ جب یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ سراج کی ہرزہ سرائی کا مقصد صرف مجھے ذہنی اذیت پہنچانا اور میرے اعصاب کو زیادہ کمزور کرنا ہے تاکہ میری مزاحمت کی قوت کم ہوجائے تو میں خاموش پڑا سب سنتا رہا۔ کیا یہ لوگ دو مرتبان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کر رہے ہوں گے؟ رابعہ پر ہونے والے

www.paksociety.com

تشدد کو توڑ میں نے دل کی آنکھ سے دیکھا تھا اور خود بھی جھیل رہا تھا مگر مجھے محسن اور میڈی یا کیتھرین کی کوئی خبر نہ تھی۔ کیا ان پر بھی ایسے ہی جسم اور ذہن کو شکست دینے والے حربے آزمائے گئے ہوں گے؟ جواب اثبات میں آیا۔ یہ لوگ کسی کو بھی رعایت دینے والے نہیں تھے۔ مایوسی کی انتہا کو پہنچنے کے بعد میں بے حد قنوطی ہو گیا تھا۔ مجھے اب کوئی امید نہیں رہی تھی کہ اس مصیبت سے کبھی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ میں سب کچھ بتانے کو تیار تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ جو کچھ میں بتا سکتا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ پوچھ رہے تھے۔ میرے پاس اگر سونے کا ایک سکہ تھا جسے میں چھپا سکتا تھا تو وہ مجھ سے سونے کی کان کا پتا معلوم کرنا چاہتے تھے جو میرے فرشتے بھی نہیں بتا سکتے تھے۔ میں ان کی ہر شرط قبول کرنے کو تیار تھا۔ میں ایم آر ایس سے دستبرداری قبول کر سکتا تھا۔ اپنے مشن سے تائب ہونے پر تیار ہو سکتا تھا۔ انھوں نے ذہنی اور جسمانی حملے سے مجھے ہی نہیں میرے حوصلے کو بھی ختم کر دیا تھا۔ مجھے احساس دلا دیا تھا کہ میری ساری جدوجہد بے مقصد اور احمقانہ تھی۔ میں گوشت پوست کا بنا ہوا انسان تھا۔ کوئی پتھر یا فولاد کا مجسمہ نہیں تھا کہ مجھ پر کسی چیز کا اثر نہ ہوتا اور میں سپرمین نہیں تھا کہ ساری عمر ہر قسم کا تشدد جھیلتا رہتا اور پھر بھی اپنی بات پر اڑا رہتا۔ یہ کسی کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ لیکن انتخاب ہمارے ہاتھ میں نہیں تھا کہ ہم کچھ کر سکتے اور پہلے جو ہوا اس کو بھول کر ندامت کا اظہار کرتے اور آئندہ کے لیے وہ راستہ اختیار کر لیتے جو ہمیں دکھایا جاتا۔ دشمنوں سے نجات مشروط تھی اور اس کی شرائط کو ناممکنات میں شامل سمجھا جا سکتا تھا۔ ٹریجڈی یہ ہے کہ فلموں، قصے کہانیوں اور تصورات کی دنیا میں ہیرو ناقابلِ شکست ہوتا ہے۔ وہ تنہا سامنے دشمنوں کو زیر کرتے سماجی اور معاشرتی اقتدار کو یہاں تک کہ قانون کو شکست دے سکتا ہے۔ فوجوں سے لڑ جاتا ہے اور سب پر غالب آتا ہے۔ عملی زندگی میں ایک آدمی کا بدمعاشوں، اسمگلروں، پولیس یا مسلح افواج کی طاقت سے مقابلے کا سوال ہی نہیں۔ وہ مارا جاتا ہے اور کبھی ہیرو نہیں بن سکتا۔ چنانچہ معاشرے میں برائی بڑھتی جا رہی ہے۔ زبردست کی حکومت قائم ہو رہی ہے۔ لہٰذا تو بیت کار جہاں پھیل رہا ہے اور اصول پرستی، فرض شناسی اور قانون یا حق کی باتیں کرنے والے احمقوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

میں نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا تھا۔ اس جال کے اندر میں واقعی خود کو مچھلی سے زیادہ حقیر، کمزور اور بے بس محسوس کر رہا تھا۔ جب میں نے خاموشی پر غور کیا تو سر اٹھا کے دیکھا۔ کمرے میں اب کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے جال میں باندھ کر لانے والے شکاری کب کے رخصت ہو چکے تھے۔ میں جال سمیت ادھر سے ادھر کھسکنے کے لیے آزاد تھا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس ہال کے سامنے دروازے بند تھے۔ اوپر ایک لائٹ جل رہی تھی اور یہ وہی بے رحم لائٹ تھی جو تیز ہو جاتی تھی تو آنکھوں میں زبردستی گھستی تھی۔ ایسے کسی ریگولیٹر سے تیز یا مدھم کیا جاتا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز پر میں نے سر گھما کے دیکھا۔ شکاری اب محسن کو دوسرے جال میں گرفتار کر لائے تھے۔ انھوں نے محسن کو گھسیٹ کر میرے قریب ڈال دیا اور لوٹ گئے۔ محسن کے گرد بھی جال یوں لپٹا ہوا تھا کہ وہ ایک گٹھڑی بن گیا تھا۔

"محسن!" میں نے بمشکل تمام کہا۔ "تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں..." وہ کراہ کے بولا۔ "انھوں نے مجھے مرنے نہیں دیا۔"

"ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔ ہم حالات کی موافقت یا اتفاق سے بچتے رہے تھے اور جو کچھ میں نے کہا تھا اس سے خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم ان کو ختم کر ڈالیں گے۔"

"حالانکہ ایسا سوچنا بھی بے وقوفی تھا۔ یہ ایک طاقت ور مافیا ہے۔ ان کے پیچھے غیر ملکی ہاتھ ہیں۔ ان کے پاس اسلحہ ہے، وسائل ہیں اور قوتِ بازو ہے۔" محسن بولا۔

"اب پچھتانے سے کیا فائدہ۔" میں نے کہا۔ "یہ بتا کہ ہم ان کی غلط فہمی کیسے رفع کریں یا کیسے یقین دلائیں ان کو کہ ہم بس ایم آر ایس ہیں۔ ہم کوئی قومی یا عالمی دہشت گرد یا حریت پسند تنظیم نہیں بنا لیا۔ ہمیں کسی قسم کی سیاسی حمایت حاصل نہیں ہے۔ ہماری پشت پر کوئی سپر پاور نہیں ہے۔"

"اس کا یقین تو انہیں ہمارے مر جانے کے بعد بھی نہیں آئے گا۔" محسن بولا۔ "لیکن موت ابھی کہاں۔"

"کیا انھوں نے تجھے... بہت تشدد کیا تجھ پر؟"

"تجھ پر تشدد نہیں ہوا کیا؟" محسن نے کہا۔ "میں اور تو اور ہم سب ان کے لیے برابر ہیں۔ سب کے ساتھ ایک سا سلوک ہو رہا ہے۔ اس میں شک کی کون سی بات ہے۔"

میں محسن کی حالت دیکھ سکتا تھا۔ جال کے اندر سے بھی اس کے پھٹے کپڑے... چوٹوں کے نشانات... بدن کے نیل اور لہو کے داغ دکھائی دیتے تھے۔

"محسن... انھوں نے رابعہ کو..." میں نے کہا۔

"دل کو پتھر کر لے سکندر... رابعہ سب سے زیادہ عذاب جھیلے گی کیونکہ وہ عورت ہے اور ہم سب کی کمزوری ہے۔ جذبات کے رشتے سب سے بڑی کمزوری ہوتے ہیں... انہی سے آدمی کا استحصال ہوتا ہے۔" محسن بولا۔

"کیا تجھ کو معلوم ہے کہ... کہ شعلہ...؟"

"ہاں، شعلہ مر گئی۔" محسن نے سکون سے کہا۔

"مر گئی...؟"

"ہاں... کیا تجھے نہیں معلوم؟" محسن تعجب سے بولا۔

"مجھے صرف اتنا بتایا تھا... کہ اس نے ایک گروہ جولی کے لیے دینے کی غلطی کی تھی۔" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"غلطی؟ غلطی کیسی... اس نے تو بہت اچھا کیا کہ اپنے بے مقصد... آسان اور ثواب کی موت قبول کی۔" محسن ہنسنے لگا۔ میری طرح اس کا ذہنی توازن بھی خاصا متاثر ہوا تھا۔

"اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا..."

"اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ ورنہ ایک دن وہ بھی یہاں پہنچتی... آج نہ کل... ایک ہفتے یا ایک مہینے بعد..." محسن بولا۔ "اس وقت جب اس کے وجود سے جنم لینے والے بچے کے دنیا میں وارد ہونے کے دن قریب ہوتے۔ ابھی تو وہ وقت بہت دور تھا... وہ یہ سب عذاب کیسے برداشت کرتی سکندر... اور وہ بچہ... اس نے تو کوئی قصور نہیں کیا تھا مگر اس کو بھی سزا ملتی... اب وہ ماں کے ساتھ مر گیا... اچھا ہوا... میں نے اس کی صورت صرف تصور میں دیکھی... وہ میری گود میں نہیں کھیلا... اسے بھول جانا آسان ہوگا... شعلہ نے بھی صرف خواب دیکھے تھے... ابھی اس کی ممتا کے سوتے نہیں پھوٹے تھے۔ وہ اسے اپنی کوکھ میں چھپا کے ان بے رحم درندوں کی دسترس سے دور چلی گئی... زمین میں چھپ گئی... اس نے بہت اچھا کیا سکندر... بے شک وہ جولی کی جان نہ بچا سکی... لیکن اس نے نیت کا ثواب تو حاصل کر لیا... نیکی کما لی... اس کی بخشش ہو گئی۔ وہ تو اس معصوم کے طفیل بھی بخشی جاتی جس کو اس نے اپنے وجود میں سنبھال کر رکھا تھا کہ وہ زندگی خدا کی امانت تھی اور شعلہ نے باعزت طور پر اسی کو لوٹا دی... یہاں بے عزت ہو کے مرنے سے اچھا کیا نا۔" وہ اب نارمل ہو رہا تھا... میں رحم کھانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اطلاع کہ شعلہ بھی مر گئی، میرے دل کے زخم پر تازہ دہکتے انگارے کی طرح تھی جس کی اذیت کو الفاظ کا بیان نہیں کیا جا سکتا۔

"میری شعلہ مجھے چھوڑ گئی سکندر۔ وہ میرے بچے کی ماں نہ بن سکی۔" محسن نے روتے ہوئے کہا۔ "اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ کچھ بھی کرنا نہیں چاہتا۔ نہ اپنے لیے نہ تیرے لیے نہ ایم آر ایس کے لیے۔"

مایوسی... مایوسی... مایوسی... ہر سمت ناامیدی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا... زندگی کی مجبوریاں... زندہ رہنے کا عذاب۔ نجات کا امکان۔

"کیا جولی بھی مر گئی ہے محسن؟"

"ہاں۔ مجھے کیتھرین نے بتایا تھا۔" محسن بولا۔

"اور کیتھرین یا میڈی بھی زندہ ہے۔"

"میں اور تو بھی زندہ ہیں۔" محسن نے کہا۔ "زندہ نہ رہنا بھی ہمارے بس میں نہیں تو پھر کیا کریں... کیسے مریں؟"

"کیا ہم ایک دوسرے کے جال کی ڈوریاں نہیں کھول سکتے؟"

"معلوم نہیں۔ مگر اس سے کیا فائدہ؟" محسن بولا۔ "وہ ہمیں پھر باندھ جائیں گے۔"

"ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کوشش کی ضرورت کیا ہے۔ جال کاٹ دیا تب بھی یہاں سے نکل تو نہیں سکتے۔" محسن نے کہا۔

میں نے محسن کی بات نہ مانتے ہوئے لڑھکنا شروع کیا اور اس کے قریب چلا گیا۔ میرے جھکنے پر محسن نے ہر طرف سے جکڑے جال کو دیکھا اور مایوسی سے سر ہلایا۔ پھر میں نے اسے چاروں طرف سے دیکھا تب مجھے یقین آیا کہ اس جال کے کسی پھندے کو کاٹنا یا کھولنا ممکن نہیں۔ اس کا کوئی کنارا نہیں تھا۔ کسی جگہ ڈور کا کونا نہیں تھا اور سب پھندے ایک دوسرے سے جوڑے گئے تھے۔ ڈوری کو دانت سے کاٹنے کی کوشش میں میرے دانت درد کرنے لگے مگر ڈوری پہ اثر نہ ہوا۔

"آخر ایسے کب تک چلے گا محسن؟" میں نے کہا۔ "کب تک یہاں رکھیں گے یہ لوگ ہمیں؟"

"یہی سوال میں تجھ سے کرتا ہوں۔ مجھے تو جواب نہیں معلوم۔ تجھے معلوم ہے تو بتا دے۔" محسن بولا۔

سراج اور دلاور ایک بار پھر اندر آ گئے۔

"ہاں بھئی! اپنے سکندر بخت صاحب! خوب گپ شپ رہی پھر یا بولے نہیں ہیں؟" دلاور نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں کہا۔

"آج شعلہ کی تدفین ہے... اور جولی کی بھی۔" سراج نے حقارت سے مسکرا کے کہا۔ "ہم نے ایک آدمی بھیجا تو ہے کہ فلم بنا لے یا کم سے کم تصویریں لے آئے۔"

"ایسی فلم آپ نے ضرور دیکھی ہوگی یہاں... اپنے سکندر صاحب! ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے۔" دلاور نے لبوں پر زبان پھیر کے کہا۔ "ہماری ولایت میں آپ نے میموں کی بہت فلمیں دیکھی ہوں گی مگر کیا وہ ایسی تھیں؟"

"اور وہ فلم تجربہ حاصل کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔" سراج نے کہا۔ "تجربہ ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ اب جو فلم ہم آج بنائیں گے ابھی تھوڑی دیر میں... وہ بہت بہتر ہوگی... ہر لحاظ سے۔"

"اور آپ یہ سمجھ لیں جنابِ عالی۔" دلاور نے کہا۔ "کہ یہاں اس وقت ہم ایک کیمرا اسٹوڈیو ہے... اپنے سراج صاحب بڑے اچھے ڈائریکٹر ہیں۔ انھوں نے سارا انتظام کیا ہے۔ لائٹ، ایکشن، کیمرا... ایکٹر، ہیرو، ہیروئن میں الگ ہوں گے۔"

"ایک ہی ہیروئن کے ساتھ۔" سراج نے قہقہہ لگایا۔

"ہم کوشش کریں گے کہ انجام ویسا نہ ہو۔" دلاور مسکرایا۔

www.paksociety.com

"وہ جو لڑکی تھی، وہ ہماری ناتجربہ کاری کے باعث مر گئی تھی۔ انشاء اللہ اب ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ اور سیدھی خود اپنی فلم کا پریمیئر شو دیکھے گی۔ اس کی کاپیاں سلطنت پاکستان میں نمائش کے لیے بھیجی جائیں گی۔ خاص طور پر تمہارے ایس ایس پی صاحب کو۔"

"تازہ کے گھر والوں کو۔" سراج بولا۔ "اور وہ جو محسن کی بہن ہے نا... تمہاری پہلی داشتہ... اس کے شوہر کو۔"

ایک بار پھر میرے ضبط کا جام چھلک گیا۔ میں چلانے لگا اور گالیاں بکنے لگا۔ "تم سب کتے ہو... شیطان ہو... رابعہ کے ساتھ تم کچھ بھی کر کے دیکھ لو... وہ تم کو کچھ نہیں بتا سکے گی... اس کو کچھ معلوم ہی نہیں۔"

"تم تو جانتے ہو... شوٹنگ کے دوران میں جب مناسب سمجھو بتا دینا... ورنہ فلم تو پوری بنے گی۔" سراج بولا۔ ابھی وہ بات کر ہی رہا تھا کہ دو افراد بڑے بڑے کیمروں کو دھکیلتے ہوئے اندر لے آئے۔ یہ فلموں کی شوٹنگ میں استعمال ہونے والے کیمرے تھے جو تختوں پر نصب اسٹینڈ کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ تختوں کے نیچے بال بیئرنگ لگے تھے۔ چنانچہ انھیں کسی بھی سمت میں گھمایا اور چلایا جا سکتا تھا۔ پھر دو آدمی بھاری بھرکم سرچ لائٹس اٹھا کے لائے۔ انھوں نے لوہے کے اسٹینڈ والی لائٹس کو تختے کے سامنے رکھ دیا اور ان کے پلگ لگا کے روشنی کے سیلاب کا رخ متعین کرنے لگے۔ پھر انھوں نے بھی ایک پلیٹ فارم کو فوکس کیا جو مرکزی کا جا بجا تھا اور [illegible] ساری لمبائی چوڑائی دس فٹ سے زیادہ تھی۔ پلیٹ فارم کمرے کے درمیان ہی تھا اور چھت چند فٹ دور تھا۔ مجھے خیال آیا کہ جس تہہ خانے جیسا کمرہ پہلے اتنا بڑا نہیں تھا۔ غور سے دیکھنے پر مجھے معلوم ہو گیا کہ درمیان کی دیوار ہٹائی گئی ہے۔ یہ دیوار لوہے کی سرکنے والی گرل تھی جس کے سامنے جیسے پردے پڑے ہوئے تھے۔ دو حصوں کے ایک ہو جانے سے کمرے کی مجموعی لمبائی چالیس پچیس فٹ ہو گئی تھی مگر چوڑائی اتنی ہی رہی تھی۔ جو کچھ وہاں ہونے والا تھا اس کا تصور کرنے سے ہی میرا جسم سرد پڑنے لگتا تھا اور میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔

"محسن!" میں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"کیا بات ہے۔ تو ڈر رہا ہے؟"

"ہاں یار... یہ لوگ... نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں کر سکتے... یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔" محسن بولا۔

"ان سے کہو ایسا نہ کریں... جتنا ظلم کرنا ہے مجھ پر کر لیں... یہ میرا کہنا ماننے والے لوگ نہیں ہیں... ورنہ رابعہ کی جگہ میں تیری جگہ بھی میں خود کو پیش کر دیتا۔" محسن دکھی لہجے میں بولا۔ "تیری جگہ بھی میں خود ہی سارا ظلم برداشت کر لیتا... ان لوگوں سے سودا کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ سو وہ کر سکتے ہیں جو کچھ بھی ہو سکتے ہوں... ہمارے بس میں کیا ہے کہ ہم؟"

"ہاں جو کچھ یہ مانگ رہے ہیں... وہ تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

اچانک رابعہ کی آواز پھر سنائی دی۔ "چھوڑ دو... خدا کے لیے... مجھے معاف کر دو... اللہ... یا اللہ... اللہ... ہائے ماں... میں مر گئی... سکندر..."

"میرے کانوں میں سیسہ ڈال دے محسن..." میں نے اپنے ہاتھوں کی دونوں انگلیاں کانوں میں ٹھونس کر کہا۔ مگر رابعہ کی چیخ کی آواز اسی طرح سنائی دیتی رہی۔ "میں پاگل ہو جاؤں گا محسن۔"

"کاش میں بھی ہو جاؤں۔" محسن بولا۔ "دیوانگی میں احساس کا یہ عذاب تو نہیں ہوگا۔ میں خود بھی پاگل ہو جانا چاہتا ہوں تاکہ زندگی کے دکھوں، دوسروں کے رنج و غم سے نجات مل جائے۔ کوئی فکر نہ ہو، کوئی خیال پریشان نہ کرے۔ آج کی پرواہ ہو نہ کل کی... زندگی کا انحصار ہو نہ موت کی تمنا لاحاصل۔"

"میں بہت بے غیرت ہوں محسن۔" میں نے کہا۔ "مجھے موت بھی نہیں آتی۔ کاش مرنا میرے اختیار کی بات ہوتی۔ میں سانس روک لیتا اور پھر نہ لیتا۔ میں اپنے دل کی دھڑکن کو روک لیتا۔"

"میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ ابھی تک میرا ہارٹ فیل کیوں نہیں ہوا جب میں نے سنا کہ تسنیم مر گئی ہے... میرا بچہ مر گیا ہے... میرا گھر اور اس کے سارے خواب مٹی میں مل گئے ہیں تو مجھے سے میری حرکت قلب بند کیوں نہیں ہوئی۔ آخر وہ بھی تو ہوتے ہیں جو بہت معمولی سے جذباتی دباؤ پر ہارٹ فیل ہونے سے مر جاتے ہیں۔" محسن بڑبڑانے لگا۔ اس کے اعصاب بھی جواب دے چکے تھے۔ وقت ہمیں کہاں لے آیا تھا کہ ہماری ساری شوخی اور ظرافت کافور ہو گئی تھی۔ عزم و حوصلہ ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ امید کے آسرے باقی نہ رہے تھے۔ خود پر، آنے والے دن پر اور دنیا کی ہر چیز پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ ہم اب زندگی کی نہیں موت کی بات کرتے تھے۔ تقدیر ہمیں دیارِ غیر سے... ساتھ دولت سے اپنے وطن لائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی آزمائش اور ابتلا کا دور شروع ہوا تھا۔ عارضی اور وقتی کامیابیوں کے فریب نے ہمیں خوش فہمی میں مبتلا کر دیا تھا اور انجام یہ ہوا تھا کہ اپنا سب کچھ گنوا بیٹھنے کے بعد ہم موت سے بدتر عذاب جھیل رہے تھے اور ایک بہت پُراذیت دنیاوی جہنم میں جھونک دیے گئے تھے۔

وہ دونوں گونگے کمانڈو پھر نمودار ہوئے اور انھوں نے مجھے اور محسن کو گھسیٹ کر کمرے کی دوسری دیوار سے لگا دیا۔ دیوار کے نچلے حصے میں وہ دو کنڈے پہلے ہی لگا چکے تھے۔ انھوں نے ہمیں ان کنڈوں سے یوں باندھ دیا کہ ہمارے لیے نہ کھڑا رہنا ممکن رہا نہ بیٹھنا۔ ہم نیچے ہوتے تو ہمارے سرین زمین پر ٹک جاتے تھے لیکن باقی دھڑ اوپر رہتا تھا۔ کھڑے ہونے کی حالت میں گنجائش نہ تھی۔ ایک حد سے اوپر ہو جانے کے بعد ہاتھ نیچے والے اپنی جگہ سے ہلنا بھی ممکن نہ رہا۔ معلوم نہیں اب ان کے شیطانی دماغ میں کیا تھا۔ وہ صرف ہمیں وحشت زدہ کر رہے تھے یا ہمیں کوئی بھیانک کھیل دکھانا چاہتے تھے۔

جب وہ رابعہ کو گھسیٹتے ہوئے اندر لائے تو میرے جسم کا رواں رواں کانپنے لگا۔ وہ چوبیس فٹ دور مخالف دیوار کے ایک در سے آئے تھے۔ رابعہ ان کے ہاتھوں کی گرفت میں مچل رہی تھی اور ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔ اس کے جسم پر وہی لباس تھا جو اس نے اسیری کے وقت پہن رکھا تھا۔ اس کو اندر لانے والے بھی وہی دونوں گونگے کمانڈو تھے اور ان کی فولادی گرفت میں رابعہ اسی طرح تھی جیسے باز کے پنجوں میں ایک ناتواں فاختہ۔ رابعہ اب چلا نہیں رہی تھی کیونکہ اس کے منہ پر ٹیپ لگا دیا گیا تھا۔ غالباً بہت زور سے ایک چوڑے ٹیپ نے اس کے ہونٹوں کو ملا کے بند کر دیا تھا۔

"ٹھہرو!" میں نے چیخ کر کہا۔ "خدا کے غضب سے ڈرو۔ اس عورت کو مار ڈالو مگر اس پر یہ ظلم مت کرو۔"

"آنکھیں بند کر لے سکندر۔" محسن نے مشورہ دیا جو اس حالت میں سب سے اچھا مشورہ تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن [illegible] جو زیادہ وحشت خیز تھی۔ میں نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ رابعہ اب اسٹیج کے درمیان پڑی ہوئی تھی۔ سراج احمد اور اس پلیٹ فارم کے دائیں اور بائیں جانب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ سراج کے اشارے پر باری باری دونوں سرچ لائٹس آن ہوئیں... دو کیمرا مین اور دو لائٹ مین اسی وقت آ گئے تھے جب میں کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے فرض کیے بیٹھا تھا کہ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں رہی۔

سب سے آخر میں پیڈرو آیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پلیٹ فارم پر چڑھ گیا۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے لیکن میں ان کی زبان کے الفاظ کا صحیح مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔ پھر پیڈرو نے ایک قہقہہ لگایا اور نیچے جھکا۔ اس نے ایک انتہائی شرمناک حرکت کی اور پھر میری طرف دیکھنے لگا۔ رابعہ تڑپ رہی تھی۔ تب مجھے پتا چلا کہ اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر رسیوں سے باندھ دیے گئے ہیں۔ چاروں رسیوں کے سرے پلیٹ فارم کے چاروں کونوں پر بندھے ہوئے تھے چنانچہ وہ حرکت تو کر سکتی تھی مگر اس شکنجے سے نکل نہیں سکتی تھی۔ پیڈرو کے ہاتھ میں سلگتی ہوئی سگریٹ تھی۔ وہ نیچے جھکا اور اس نے وہ سگریٹ رابعہ کے جسم پر رکھ دی۔ وہ بُری طرح تڑپی۔ پھر میں چلایا۔ میں پیڈرو کو گالیاں دینے لگا۔ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ میری طرف بالکل متوجہ نہیں ہوا۔

سراج آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آیا۔ اس نے کہا۔ "ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ تم مجھے وہ سب بتا سکتے ہو۔"

"میں کچھ نہیں بتا سکتا... معلوم ہوتا تو اب تک بتا دیتا۔" میں نے دہاڑیں مار مار کے روتے ہوئے کہا۔ "تم کو اللہ رسول کا واسطہ... رابعہ کو چھوڑ دو... اس کے ساتھ ایسا مت کرو۔"

"یہ سب تو تمہاری ضد کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ہمیں بہرحال معلوم کرنا ہے کہ پاکستان بھر میں تمہارے ایجنٹ کہاں ہیں۔ کون ہیں اور کیا پلان رکھتے ہیں۔" سراج بولا۔ اس پر میرے رونے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی لوٹ گیا۔

ایک گھنٹے بعد جو تماشا ایک پورے دن سے بھی زیادہ طویل عذاب رکھتا تھا قدرت نے میری مدد کی۔ میں پاگل ہو گیا۔ لیکن پاگل ہونے سے پہلے میں نے رابعہ کے ساتھ وہ سب کچھ ہوتے دیکھا جو اس سے پہلے ایک فلم میں کسی نامعلوم لڑکی کے ساتھ ہوتے دیکھا تھا۔ وہ فلم نقلی یا حقیقت... وہ لڑکی مظلوم ضرور تھی مگر اس کے ساتھ میری کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی۔ میں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ وہ کوئی پیشہ ور لڑکی ہوگی۔ یہاں میرے سامنے رابعہ تھی۔ ایک کلی سے زیادہ معصوم اور پھول سے زیادہ نازک۔ اس کے آس پاس وہ انسان تھے جن سے شیطان پناہ مانگے۔ ان کی سفاکی سے درندے پناہ مانگتے اور حیوان توبہ کرتے۔ ان میں سب سے نمایاں کردار پیڈرو کا تھا لیکن اس کا ساتھ دونوں گونگے کمانڈو نے بھی دیا۔ انھوں نے مجھ پر ایک ظلم یہ بھی کیا تھا کہ رابعہ کے ہونٹوں کو آزاد کر دیا تھا۔ اس کی دل کو خون کر دینے والی چیخوں سے میرے سینے میں محشر بپا تھا۔ جو کچھ رابعہ کے ساتھ ہوا وہ... پولیس بدترین اخلاقی مجرموں کے ساتھ بھی نہیں کرتی۔ سراج نے ہدایات دیں اور باقی لوگوں نے جس طرح رابعہ کے جسم کو نوچا کھسوٹا... جلایا کاٹا اور بربریت کا نشانہ بنایا اس کا الفاظ میں بیان ممکن ہی نہیں...

سراج کئی بار میرے پاس یہ پوچھنے کے لیے آیا کہ اب میرا کیا خیال ہے۔ میں اس وقت تک پاگل ہو چکا تھا۔ میں جس حال میں اچھل رہا تھا اور چیختے چیختے میرا گلا بیٹھ گیا تھا۔ میرے ہونٹوں سے کف جاری تھا اور میرے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں میں نے اس سے کیا کہا۔ میں رو رہا تھا۔ میں نے اس کی منت سماجت کی۔ اسے رب کے واسطے دیے۔ دھمکیاں اور گالیاں دیں مگر وہ سب پتھر کے آدمی تھے۔ رابعہ ان کے جبر و ستم کی انتہا سے گزر کے بار بار بے ہوش ہوئی۔ ہاتھوں نے اس کے خوب صورت بال نوچ ڈالے اور میں نے بالوں کے جلنے سے اٹھنے والی بو کو اپنے حواس پر یلغار کرتے محسوس کیا۔ [illegible] میں ہنسنے لگا۔

www.paksociety.com

"محسن! یہ سب تو نہیں دیکھ رہا ہوگا؟" میں نے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ پتا نہیں مجھے کیا نظر آرہا تھا۔ عجیب آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں رابعہ کو دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ وہ یہاں ہے ہی نہیں... وہ تو آنکل بضوی کے گھر میں ہے۔"

"یہ رابعہ نہیں ہے سکندر۔" محسن نے کہا۔ وہ بھی پاگل ہو چکا تھا۔ میں نے پھر چیخنا شروع کیا۔ رابعہ پھر چلانے لگی مگر اب وہ مر رہی تھی۔ اس کی آواز میں نزع کا کرب آگیا تھا۔

اس وقت مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ محسن نے مجھے بعد میں بتایا کہ میں نے اپنے کپڑے پھاڑ لیے تھے اور چیختے چیختے ایک وقت ایسا آیا تھا جب میرے حلق سے آواز نکلنا بھی بند ہوگئی تھی۔ یہ بات طے تھی کہ میں آزاد ہوتا تو کچھ نہ کچھ توڑ کر بیٹھتا۔ میں انھیں قتل نہ کر پاتا تو خود کو نقصان پہنچاتا۔ میرے ہاتھ میں کوئی چیز آجاتی میں اپنی جان لینے کے لیے استعمال کرتا اور کچھ بھی نہ ملتا تو دیوار سے سر ٹکرا کے مر جاتا۔ جب مجھے ایک دہشت انگیز اور انسانیت سوز مظالم کی فلم دکھائی گئی تھی تو میں نے سوچا بھی تھا کہ یہ سب رابعہ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ ایک خیال تھا۔ خیال سے حقیقت تک یقین کے ہزاروں مرحلے تھے اور میں نے پہلے ہی مرحلے میں اپنے خیال کو مسترد کر دیا تھا۔ یہ دلیل میرے کام آئی تھی کہ فلم کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ سب کیمرا ٹرک تھا اور کسی پیشہ ور اداکارہ یا فاحشہ کی خدمات منہ مانگی قیمت دے کر حاصل کرنے کے بعد یہ شوٹنگ کی گئی تھی چنانچہ رابعہ کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ اسے جینے کے لیے مادی سہاروں کے ساتھ ذہنی اور روحانی اطمینان اور اعتماد کے سہاروں کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ ہر روز سڑکوں پر پیش آنے والے بدترین حادثات کی دردناک تفصیلات پڑھ کے اور تصویریں دیکھ کے بھی وہ خوف زدہ نہیں ہوتا اور یقین نہیں رکھتا کہ وہ خود بھی ایسی ہی خبر بن سکتا ہے... اگر یہ خوف غالب آجائے تو وہ پاگل ہو جائے۔ گھر سے نکلنا چھوڑ دے۔ زینہ اترنا چڑھنا چھوڑ دے کہ اس سے بھی پیر پھسل جائے تو گردن ٹوٹ جاتی ہے۔ بجلی کی چیزوں کو ہاتھ نہ لگائے کہ بجلی کے جھٹکے سے بہت لوگ مر گئے ہیں لیکن جینے کی خواہش آدمی کو اس خوف سے دور رکھتی ہے اور اس کے یقین کو متزلزل نہیں ہونے دیتی کہ وہ کسی حادثے کا شکار نہیں ہوگا۔ یہی کیفیت میری بھی تھی۔ میں نے مان لیا تھا کہ رابعہ کے ساتھ کچھ نہیں ہوگا اور یہ لوگ صرف مجھے ڈرا رہے ہیں لیکن وہ خیال جس پر میں یقین کرتے ہوئے ڈرتا تھا سچ بن کے سامنے آیا تو خوف اور صدمے کی شدت نے میرے ذہن کو پھر تحفظ فراہم کیا۔ میں ہوش سے بیگانہ ہوگیا اور احساس کے عذاب سے بچنے کے لیے میں اس خیال کی پناہ میں چلا گیا کہ وہ رابعہ نہیں تھی۔

جب وہ رابعہ کی لاش اٹھا کے لے جا رہے تھے تو میں زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔ سراج اور دلاور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آکے رک گئے۔

"کیا یہ سچ مچ پاگل ہوگیا ہے؟" سراج نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" دلاور بولا۔

"میں پاگل ہوں؟" میں نے قہقہہ مارا۔ "پاگل تم دونوں ہو۔ مجھے بے وقوف بنا رہے تھے۔ کیا میں سمجھتا نہیں کہ یہ سب ڈراما تھا۔"

"یہ ڈراما نہیں تھا۔" سراج نے کہا۔ "تمھاری ضد کی وجہ سے رابعہ کو..."

"وہ رابعہ نہیں تھی..." میں نے ایک گالی دے کر کہا۔ "میں اندھا نہیں ہوں کہ رابعہ کو بھی نہ پہچان سکوں۔"

"پھر وہ کون تھی... اپنے سکندر صاحب؟" دلاور مسکرایا۔

"وہ تیری ماں تھی الّو کے پٹھے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "یہ پوچھو محسن سے... کیوں محسن... وہ سراج کی ماں تھی نا؟"

"تو ٹھیک کہتا ہے سکندر... وہ رابعہ نہیں تھی... [illegible] تیری نانی تھی۔"

"وہ بے وقوف لڑکی مر گئی بالآخر۔" سراج نے کہا۔ "کیا ملا اس کو ضد سے؟"

"کیا تم اس کی لاش دیکھو گے؟" دلاور بولا۔

"لاش...؟" میں نے زور زور سے ہنسنا شروع کیا۔ میرے قہقہے بلند سے بلند تر ہوتے گئے۔ "میں تمھاری لاش دیکھنا پسند کروں گا... میں اپنی لاش دیکھنا پسند کروں گا... اپنے چوہدری صاحب... میں مر گیا ہوں... رابعہ کو بتا دینا... اس سے کہنا کہ میری لاش کو نیلا کفن دے۔ گہرا نیلا جس پہ زرد پھول بنے ہوں۔ اس کا ایک ساڑھی ہے ایسی ہی... اسی میں لپیٹ دینا مجھے۔ رابعہ کو غسل اور حویلی سے کہنا کہ میرے لیے تاج محل بنوا دیں جس کے چپے کا نام سکندر رحمت رکھنا۔"

میں نے محسن کو دو بار چیخ مار مار کے روتے ہوئے سنا اور ایسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ "تجھے کیا ہوا شیطان کے بچے... اچکی کی اولاد... تیرے کون سے سگے مر گئے ہیں جو تو رو رہا ہے؟"

میں اسی طرح شور کرتا رہا اور جال کے اندر پاگل جانور کی طرح اچھلتا رہا۔ قہقہے لگاتا رہا۔ دلاور اور سراج چلے گئے۔ محسن چلا چلا کے مجھ سے کچھ کہتا رہا لیکن میں نے اس کی ایک نہیں سنی۔ پھر وہی دونوں گوشت کے پہاڑ نمودار ہوئے اور مجھے لے گئے۔ جیسے ہی انھوں نے مجھے اپنے کمرے میں لے جا کر آزاد کیا میں پاگل کتے کی طرح ان دونوں سے چمٹ گیا۔ وہ اس کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ ایک نے مجھے آگے سے ہاتھوں پہ لیا اور پیچھے کی طرف پھینک دیا۔ میں پھر اٹھا اور ان سے یوں لڑنے لگا

جیسے وہ میرے جانی دشمن ہیں اور میں نے ان کو نہ مارا تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میرے ہاتھ پیر بجلی کی طرح چل رہے تھے اور دیوانگی نے مجھے غیر معمولی قوت عطا کر دی تھی۔ میں نے ایک کو آتی چپڑی مہارت سے فلائنگ کک ماری کہ وہ دیوار سے ٹکرایا اور وہیں ڈھیر ہو کے بیٹھ گیا مگر اتنی دیر میں دوسرا مجھ پہ ٹوٹ پڑا۔ اس نے مجھے اٹھتے ہی گردن دبا لیا اور بال پکڑ کے میرا سر فرش پہ مارنے لگا۔ میں نے چیختے چلاتے ہوئے اپنی مزاحمت جاری رکھی اور اس وقت تک لڑتا رہا جب تک کہ میرا وجود مکمل تاریکی میں نہیں ڈوب گیا۔

مجھے معلوم نہیں بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا۔ درمیان میں ہوش کے مختصر وقفے بھی آتے رہے جیسے صحرا میں کنارے کے مسافر کو نخلستان۔ میرے کانوں نے کچھ آوازیں سنیں جو [illegible] نہیں تھیں اور اندھیرے میں سایوں کی طرح لرزتے ہوئے [illegible] میرا ان سے رابطہ [illegible] میں نے رابعہ کو دیکھا۔ وہ سر تا پا سفید لباس میں تھی جو بالکل کفن کی طرح تھا۔ میرے پاس بیٹھ کر اس نے اپنا ہاتھ میرے ماتھے پہ رکھ دیا جو برف کی طرح سرد تھا۔

"یہ تمھیں کیا ہوگیا ہے سکندر؟" وہ بولی۔

"مجھے کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "مجھے تو قبر کی تنگی کا ڈر بھی نہیں ہے۔ مجھے اپنی قبر بہت کشادہ محسوس ہوتی ہے۔"

"یہ تمھاری قبر نہیں ہے۔"

"اچھا! تو کیا یہ تمھاری قبر ہے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "انھوں نے مجھے بھی تمھارے ساتھ ہی دفن کر دیا ہوگا۔ عاشقی کی روایت کچھ ایسی ہی ہے۔ غالباً لیلیٰ مجنوں کا مدفن بھی ایک تھا اور رومیو جولیٹ کا بھی۔"

"پاگل... سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ تمھارا کمرہ ہے۔" وہ بولی۔

"قبر بھی ایک کمرہ ہی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"سکندر تم زندہ ہو۔ میں بھی زندہ ہوں۔" رابعہ نے مجھ پہ جھک کر کہا۔

"یہ حیات بعد از موت ہے۔ ہماری دوسری ابدی زندگی۔" میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

"نہیں سکندر! یہ وہی دنیا ہے۔" رابعہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکا اور میری پیشانی پہ گرا۔

"کون سی دنیا... وہ جس میں میرے باپ کے قاتل تھے۔ دلاور اور سراج تھے۔ وطن دشمن اور انسانیت فروش شیطان۔ تمھاری خوشیوں کے دشمن۔" میں نے کہا۔

"ہاں... وہی دنیا..."

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "وہاں ہم نہیں مل سکتے۔ تم اس دنیا میں کیسے رہ سکتی تھیں۔ اب کوئی ڈر نہیں..."

"سکندر! میں زندہ ہوں... تم نے جو فلم دیکھا تھا، وہ سب تمھاری نظر کا دھوکا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"دھوکے میں نے بہت کھائے ہیں رابعہ۔ لیکن اب ہم وہاں ہیں جہاں کوئی ہمیں دھوکا نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔

"تم سمجھ رہے ہو کہ میں مر چکی ہوں؟" رابعہ نے کہا۔ "دیکھو... اچھی طرح دیکھو میں زندہ ہوں... وہ میں نہیں تھی... جسے تم نے مرتے دیکھا تھا... وہ سب ڈراما تھا... شوٹنگ تھی... جیسے فلموں کے مناظر کی شوٹنگ ہوتی ہے... دیکھنے والوں کو سب بالکل حقیقی لگتا ہے... محسن نے تم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی... وہ سب سمجھ گیا تھا کہ جس لڑکی پہ ظلم کیا گیا تھا... وہ میں نہیں تھی... وہ ایک ایکٹریس تھی... میری اور اس کی صورت میں تھوڑی سی مشابہت ہے... باقی مشابہت میک اپ سے پیدا کی گئی تھی۔ اسے میرے کپڑے پہنا دیے گئے تھے... تم بہت دور سے دیکھ رہے تھے اور تمھارا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ تم نے سمجھ لیا کہ وہ میں ہی ہوں... یہ سب تم کو دہشت زدہ کرنے کے لیے تھا... وہ ایکٹریس بھی زندہ ہے۔ اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوا تھا... وہ سب کیمرا ٹرک تھی... وہ چیخوں کی آواز بھی اس کی نہیں تھی... میری بھی نہیں تھی۔ وہ ریکارڈ تھا۔ ٹیپ کی ہوئی آوازیں تم کو سنائی دی گئی تھیں۔ اس کے ساتھ نہ کسی قسم کی زیادتی ہوئی نہ اس پر تشدد ہوا۔ [illegible] یہ کون سی غیر معمولی یا مشکل بات ہے۔ اس شوٹنگ کا بندوبست دلاور نے کیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ وہ ایسے ڈرامے پہلے بھی کرتا رہا ہے... یہ اسی کے شیطانی ذہن کی سازش تھی۔ اس ایکٹریس کو خراش تک نہیں آئی۔ وہ کوئی ایکٹریس بھی نہیں۔ شاہی محلے کی ایک طوائف کی بیٹی ہے جو ایسی ہی گندی فلموں میں کام کرتی ہے اور اس کو ذرا شرم نہیں آتی۔ میں نے بعد میں اس کی اور دلاور کی ساری گفتگو سنی تھی۔ اسے پچاس ہزار روپے دیے گئے تھے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا... جہاں میرا کمرہ ہے اس کے پیچھے ہی وہ لوگ باتیں کر رہے تھے اور مجھے ان کی گفتگو روشندان سے سنائی دے رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ فلم بنانے والوں کا مقصد کیا ہے۔ اس کے خیال میں مقصد مختلف کیسے ہو سکتا تھا۔ پہلے بھی اس نے ایسی ہی فلموں کے لیے کام کیا تھا۔ دلاور اس کی اداکاری کی تعریف کر رہا تھا۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ وہ کون تھا جو درمیان میں چلا رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا... دلاور نے اسے بتایا کہ فلم کی سچویشن ہی ایسی ہے۔ ایسی فلموں میں کہانی تو برائے نام ہوتی ہے۔ دلاور نے کہا کہ فلم میں یہ سب کچھ ایک ایسے شخص کی نظروں سے [illegible] ہوا تھا جو لڑکی کو چاہتا تھا اور اس سے شادی کرنے

www.paksociety.com

تھا۔ چنانچہ اس کا یہ رد عمل بالکل حسب حال تھا۔ اس کی چیخ پکار، گالی گلوچ اور احتجاج ایک فطری امر تھا... وہ مطمئن ہو گئی تھی دراصل وہ تم کو نہیں دیکھ سکتی تھی کیونکہ اس کے سامنے وہ سب لاشیں تھیں اور تم روشنی کے پیچھے بہت دور تھے۔ وہ سمجھتی رہی کہ جیسے اس کی آوازیں اصلی نہیں بلکہ پہلے سے ٹیپ کی ہوئی تھیں اور وہ ان آوازوں کے مطابق تاثرات دے رہی تھی، یہ سب ہنگامہ بھی صوتی اثرات کا نتیجہ تھا۔ اب آیا تمھاری سمجھ میں؟ مجھے چھو کر ہاتھ لگا کے دیکھ لو... میں زندہ ہوں اور حقیقی زندہ ہوں... مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ہے... تم بھی بالکل ٹھیک ہو اور میں تمھارے پاس ہوں۔"

بے تکلف اس کی باتوں کو میرے ذہن نے قبول کیا تھا اور میں کچھ پرسکون ہو کے سنتا رہا تھا لیکن بے یقینی کے اثرات باقی تھے۔ میں یوں محسوس کرتا تھا جیسے میرے دماغ کے اندر مکمل تاریکی تھی مگر اب نامعلوم سمت سے روشنی اندر آرہی ہے۔ یہ روشنی بہت کم تھی میں واضح طور پر کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں خود کو اندھے خلا کی قید میں محسوس نہیں کرتا تھا۔ میں تھوڑا کچھ دیکھ سکتا تھا اور ہر طرف تجسس کی نظر ڈال سکتا تھا اور اب وقت اور مقام کا تعین کرنا چاہتا تھا... میں کون ہوں؟ زندہ یا مردہ... اور کہاں ہوں؟ عالم خاک و باد میں یا عالم ارواح میں... رابعہ کی کچھ باتیں میری سمجھ میں آرہی تھیں اور کچھ نہیں۔ جیسے دسویں جماعت تک سائنس پڑھنے والے طالب علم کو زمین کی کشش... اس کے دائرے سے نکلنے والے راکٹ کی رفتار کا اصول تو سمجھ میں آجائے مگر خلا میں اس کے مدار اور حرکت کے سائنسی فارمولے اور ایروناٹکس کی فنی اصطلاحات محض کنفیوژن پیدا کریں۔ میں اسے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہتی رہی جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔

پھر وہی دونوں نمودار ہوئے۔ مجھے سکتے ہوئے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ "آگئے... ملک الموت..." میں نے انگلی اٹھا کے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں پھر آؤں گی۔" رابعہ کھڑی ہو گئی۔

"یہ جہنم کے فرشتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ تم کو نہیں آنے دیں گے۔"

"نہیں منکر نکیر ہیں اور تمھارے جیسے انسان ہیں..." رابعہ نے کہا۔

یہ بڑی عجیب صورت حال تھی۔ ایک وقت تھا جب رابعہ کا ذہنی توازن برقرار نہیں رہا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ میں مر چکا ہوں اور میں نے سخت کوشش کر کے اسے قائل کیا تھا کہ یہ غلط ہے۔ فریب خیال ہے اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں... اب معاملہ اس کے برعکس تھا۔ رابعہ مجھے یقین دلا رہی تھی کہ میں زندہ ہوں اور وہ بھی زندہ ہے مگر میرا ذہن ان خیالوں سے نجات پانے میں ناکام تھا کہ ہم [illegible] چکے ہیں۔ اس کے جانے کے بعد بھی میرا ذہن بے ربط خیالات کی یلغار میں رہا۔ یہ سب بے ربط خیالات تھے۔ بے سمت بھٹکنے والے اور کسی وجہ کے بغیر آنے جانے والے۔ جیسے دماغ میں ساری عمر گزشتہ کی یادیں وقت اور مقام کی ترتیب سے محفوظ تھیں۔ بالکل کسی ماڈرن سپر اسٹور میں قاعدے اور سلیقے سے رکھے ہوئے سامان کی طرح... ایک زلزلے نے سب کچھ تہ و بالا کر دیا تھا۔ سب خلط ملط ہو گیا تھا۔ ترتیب بگڑ گئی اور اب ایک ڈھیر تھا جس میں ہاتھ مارنے سے کبھی کچھ مل جاتا تھا کبھی کچھ لیکن یہ مشکل تھا کہ ضرورت کی کوئی چیز تلاش کی جائے تو آسانی سے ہاتھ آجائے۔ سیدھا وہیں جائے جہاں وہ چیز موجود ہو۔ مجھے تمام واقعات، نیٹ ورک اور مقام اس طرح یاد آتے تھے جیسے مووی اسکرین پر ایک سلائیڈ آئے اور دوسری جائے لیکن ایک سلائیڈ کا دوسری سے کوئی تعلق نہ ہو۔ مجھے بہت سے لوگ یاد آئے جو مر چکے تھے اور انہی کے ساتھ جولی یاد آئی۔ جھلملاتی اور آواز دیتی رابعہ... مگر رابعہ کہتی تھی کہ وہ زندہ ہے۔ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ شعلا بھی زندہ ہو؟ جولی بھی زندہ ہو؟ میں سوچنے لگا۔ میرے ذہن کا خلا کبھی کباڑی کی دکان بن کے بھر جاتا تھا تو کبھی ایسے خالی ہو جاتا تھا جیسے لوٹی ہوئی دکان... مجھے اتنا ہوش ضرور تھا کہ جو لوگ میرے سامنے بار بار آتے ہیں ان میں سے دو میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ ایک ڈاکٹر تھا جو صبح شام آتا تھا۔ دو بار میں نے اس پر حملہ کیا مگر اس کے ساتھ آنے والوں نے مجھے بے بس کر دیا اور وہ مجھے انجکشن لگا کے چلا گیا۔

پھر ایک بار آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجھے محسن دکھائی دیا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ "محسن! یار یہ کیا چکر ہے؟"

محسن کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ "کیا چکر ہے؟"

"یہ خواب ہے یا حقیقت؟" میں نے کہا۔

"تو مجھے خواب میں نہیں دیکھ رہا ہے۔" محسن بولا۔

"عجیب بات ہے... رابعہ کو بھی میں نے خواب میں دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور وہ مجھے یقین دلا رہی تھی کہ اسے کچھ نہیں ہوا۔"

"وہ بھی خواب نہیں تھا۔ وہ خود تیرے پاس آئی تھی اور یہ ٹھیک ہے کہ اسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔" محسن بولا۔ "اور کیا کہتی تھی وہ؟"

میں نے سوچ سوچ کر یادداشت کی مدد سے وہ سب بتایا جو مجھ سے رابعہ نے کہا تھا۔ محسن مسکراتا رہا۔ پھر اس نے بھی وہی کہا جو رابعہ نے بتایا تھا۔

"تو سچ کہہ رہا ہے؟" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "وہ سب ڈھونگ تھا... ولاور کا ڈراما تھا... شعلہ کی شوٹنگ تھی؟"

"ہاں یار... وہ شاید تجھے فلم بھی دکھاتے۔" محسن نے خوش ہو کے کہا۔ "مگر وہ شوٹنگ بھی لمبی پڑتی... تیرا دماغ الٹ جاتا۔ خدا کا شکر ہے اس کا اثر زیادہ دیر نہیں رہا۔ انھوں نے ولاور کو بھی اسی لیے بھیجا تھا اور مجھے بھی اسی لیے بلایا گیا ہے کہ ہم لوگ تجھے یقین دلا سکتے ہیں اور سمجھا سکتے ہیں کہ رابعہ پر تشدد نہیں ہوا اور اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کی گئی۔ یہ سب وہ لینے پر مجبور تھے۔ یہ ولاور اور سراج کا آئیڈیا تھا۔ بینک والا جو سب کا چیف ہے یا مشن کا نگراں ہے، اس خیال سے متفق نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ایک قدم دکھانا ہی ہے۔ اس نے بادل ناخواستہ ایک ایسی جعلی شوٹنگ کی اجازت دی تھی جس میں کسی کو رابعہ بنا کے پیش کیا جائے جیسے ایک عورت کو لے آئے جو رابعہ کی ہم شکل تھی اور یہ شکل اس کی میک اپ سے تیار کی تھی تو اس نے بھی یہ تجربہ کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی لیکن بعد میں وہ ولاور اور سراج پر بہت بگڑا کہ انھوں نے انتہا پسندی سے کام لیا اور اگر سکندر کا ذہنی توازن ٹھیک نہ ہوا تو ان کے حق میں بھی ٹھیک نہ ہوگا... وہ کہتے تھے کہ ایک شخص کے نہ ہونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ تفتیش دوسروں سے بھی کی جاسکتی ہے... مگر وہ کہتا تھا کہ مجھے آگے بھی جواب دینا ہے۔"

"یہ سب باتیں تو نے کیسے سنی ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں نے کچھ نہیں سنا۔" محسن بولا۔ "رابعہ کو جس کمرے میں رکھا گیا تھا اس کا روشندان باہر کی طرف دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔ وہاں ان کا آفس ہے یا وہ کمرہ اس بینک والے کا ہے۔ ان کا نام کسی کو بھی نہیں معلوم لیکن میرا خیال ہے کہ وہ انڈین انٹیلی جنس کا کوئی اعلیٰ افسر ہے۔"

"میں نے اس سے نام پوچھا تھا تو اس نے کہا تھا کہ اسے مسٹر ایکس سمجھا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جیسا کہ جیمز بانڈ کے چیف کا نام ایم ہے۔"

"وہی مسٹر ایکس اس بات کا ذمہ دار ہے کہ ہمیں حفاظت سے جانے اور اعلیٰ حکام کے سپرد کرنے سے پہلے کچھ معلومات حاصل کرنا ضروری تھیں۔" محسن نے کہا۔ "تاکہ وہ تصدیق کر لیں کہ ہم میں سے کوئی ان کے حربوں سے زیر نہیں ہوا۔"

"اب ان کا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس سے زیادہ کچھ معلوم ہی نہیں یا ہم کچھ بتا نہیں رہے ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ اب ہمارے متعلق ان کا ارادہ کیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "یہ سب کچھ مجھے رابعہ سے معلوم ہوا ہے۔ وہ روشندان سے کان لگا کے باتیں سنتی رہتی تھی۔ اگر دوسری طرف [illegible] تو پھر مسٹر ایکس کا کمرہ ہے۔"

جیسے شیطان کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا نام لیا اور وہ حاضر۔ ایسے ہی مسٹر ایکس اندر آگیا۔ وہ سوٹ میں تھا۔ کریم کلر کے سوٹ کے نیچے اس نے ڈارک چاکلیٹ شرٹ پہن رکھی تھی اور کریم کلر کی ٹائی بڑی نفاست سے باندھ رکھی تھی۔

"ہیلو۔" اس نے بیک وقت مجھے اور محسن کو مخاطب کیا اور مسکرایا۔ میں اپنے اسی بستر پر تھا جو فرش پر بچھا رہتا تھا اور محسن اسی پر بیٹھ کر قریب بیٹھا ہوا تھا۔ مسٹر ایکس کے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی اور وہ نیچے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اول تو یہ اس کی شان کے خلاف تھا کہ ایک دشمن یا مجرم کے ساتھ فرش نشین ہو۔ دوسرے اس کو اپنے سوٹ کی استری کے خراب ہونے کا ڈر تھا۔

"میں... افسوس کا اظہار کرنے آیا تھا۔" اس نے عادت کے مطابق کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔

"کس بات پر؟" میں نے کہا۔

"جو کچھ بھی ہوا۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "اس میں میری مرضی بہرحال شامل نہیں تھی۔"

"تمھاری مرضی کیا تھی؟" محسن نے طنز سے کہا۔

"کچھ نہیں... کورس... میں صرف حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔" وہ بولا۔ "اور اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔ اس کے پیچھے سائے کی طرح ایک محافظ نمودار ہو گیا تھا جو اب دروازے سے ذرا آگے گن سنبھالے کھڑا تھا اور اپنے جارحانہ انداز سے سرد لہجہ وحشی دکھائی دیتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جو اس نے مجھے غافل سمجھتے ہوئے کوئی غلط حرکت کی تو خود مسٹر ایکس بھی اپنی حفاظت کے خیال سے کبھی غافل نہیں رہتا تھا۔ اس وقت بھی میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی پتلون کی ایک جیب میں ریوالور ہے جو جسم میں پڑا ہونے کی وجہ سے کوٹ کے اوپر بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

میں نے محسن کے یوں انگلی چبھوئی کہ وہ نہ دیکھ سکے۔ "میں کچھ کہنے والا ہوں۔" میں نے آہستہ سے فرانسیسی میں کہا۔

مسٹر ایکس چونکا۔ "تم نے کچھ کہا مجھ سے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "تم تھکے ہوئے ہو۔"

وہ مطمئن نہیں ہوا اور مجھے شک کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "تم نے کچھ اور کہا تھا، فرانسیسی میں۔"

"تم فرنچ جانتے ہو؟" میں نے مجرمانہ اعتراف [illegible] کر لیا۔

"فرنچ تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔" وہ بولا۔ "تم کوئی اور زبان بول کے دیکھو مثلاً روسی، بنگالی، عربی، پشتو، جرمن یا ترکی۔"

"گویا سات زبانیں جانتے ہو تم... انگریزی سمیت۔" محسن نے تعریفی انداز میں کہا۔ "مادری زبان الگ۔"

www.paksociety.com

"تم نے کہا تھا... میں... چاہتا ہوں..." وہ بدستور مجھے گھورتا رہا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

"میں مرنا چاہتا ہوں... یہی کہا تھا میں نے۔" میں نے کہا۔

خلاف توقع وہ مطمئن ہوگیا اور اس کے اطمینان سے مجھے اطمینان حاصل ہوا کیونکہ جو میں نے کہا تھا، وہ محسن نے مِن و عن سمجھ لیا تھا۔

"... تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ سب میری مرضی کے خلاف ہوا۔" وہ پھر ٹہلنے لگا۔ محسن میرے سرہانے بائیں جانب بیٹھا تھا... وہ دائیں طرف مختصر سی جگہ میں ہاتھ پیچھے باندھے ایک دیوار تک جاتا تھا، پھر پلٹ کر دوسری دیوار تک۔ اس طرح ایک راؤنڈ میں دو موقع ایسے آتے تھے جب وہ میرے اور شیئن گن کے درمیان آجاتا تھا۔

"تمہارا دل رکھنے کے لیے ہم مان لیتے ہیں کہ ایسا ہی ہے۔" محسن نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ اگر ہم اعتبار نہ کریں تو تمہاری مرضی اور بچوں کو سچ منوانا چاہو تو تمہیں اختیار ہے۔"

"میں پولیس کا طریقہ کار اختیار کرنے کو اپنی ہی سمجھتا ہوں۔ جیسے گدھے گھوڑے کو ایک لاٹھی سے ہانکنا..." وہ بولا۔ "ہر آدمی ایک الگ یونٹ ہے... اپنی ذات کے خول میں بند۔ اس کی شخصیت اور مزاج یا طبیعت... ذہنی ردعمل کا نام ہے اور... ذہنی ردعمل میں بہت کچھ آجاتا ہے۔ فرق کے ہزاروں اسباب نکلتے ہیں۔ سب کو ڈنڈے سے تسخیر نہیں کیا جاسکتا۔ اور کچھ بہرحال ناقابل تسخیر ہوتے ہیں۔ میں ان کے اصرار سے مجبور ہو گیا تھا... میں یہ بتانے آیا تھا کہ شاید تم سے یہ میری آخری ملاقات ہو... آرڈر آگئے ہیں کہ تمہیں بھیج دیا جائے۔ میں نے اعتراف کر لیا ہے کہ میں تم سے کچھ معلوم کرنے میں ناکام رہا۔"

"تمہاری اس ناکامی کو تمہاری نااہلی نہیں سمجھا جائے گا؟" محسن بولا۔ وہ مسٹر ایکس کو باتوں میں لگائے رکھنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے میری نیت کو سمجھ لیا تھا اور وہ دیکھ بھی رہا تھا کہ میں موقع تلاش کر رہا ہوں۔

"اوہ نو... میرے وسائل بہت محدود تھے۔" وہ بولا... "اگلے مرحلے میں جو لوگ تم سے پوچھ گچھ کریں گے، وہ ایکسپرٹ لوگ ہوں گے۔ تفتیش کا فن ایک سائنس ہے اور وہ سائنسداں ہیں... بہت سائنٹیفک طریقے پر کام کرنے والے لوگ...؟ یقیناً نتائج حاصل کرتے ہیں۔ ان کی ایک لیبارٹری ہوتی ہے اور وہاں آدمی کو اسی طرح ٹیسٹ کیا جاتا ہے جیسے... تم نے غور کیا ہوگا کہ میڈیکل سائنس کی ریسرچ میں سفید چوہے بہت استعمال ہوتے ہیں... گنی پگ... وہاں تمہارے دماغ کے ایک ایک ریشے اور ہر خیال کا تجزیہ کرنے والی جدید ترین مشینیں ہیں، تم کچھ نہ بھی کہو تو وہ تمہارے ذہن کو پڑھ لیں گے۔ بہت سی دوائیں ہیں جو آدمی کے دماغ پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس کو پاگل یا بہادر بنا سکتی ہیں۔ اس کی مزاحمت یا سرکشی کو ختم کر سکتی ہیں، اسے مکمل طور پر مطیع و فرمانبردار کر سکتی ہیں... اس کے ہر تغیر پذیر ذہنی کیفیت کا تجزیہ..."

میرا خیال ہے کہ وہ ایک عام انسانی کمزوری کا شکار ہو... ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ہم کسی کے سامنے کوئی انوکھی یا حیرت انگیز بات کرتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ سننے والا ہماری اطلاعات سے حیران بھی ہے اور دلچسپی بھی رکھتا ہے تو ہم زیادہ گہرائی میں جا کے اور زیادہ تفصیل کے ساتھ اسے اپنی معلومات سے امپریس کرتے ہیں۔ یہی مسٹر ایکس کے ساتھ ہوا۔ وہ جیلر یہ باتیں بتانے میں ضرورت سے زیادہ ہی بہک گیا۔

میں اپنی جسمانی استعداد کا اندازہ کر رہا تھا۔ مسٹر ایکس کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ کمانڈو کے ایک مشن کا لیڈر تھا تو ظاہر ہے اپنی صلاحیت کے اعتبار سے وہ بہت پہلے اس کا اہل ثابت کر چکا تھا۔ اس کا اپنی ذات پر اعتماد اسی اہمیت کی بنیاد پر تھا۔ چنانچہ میرے لیے ناکامی اور کامیابی کے امکانات کو برابر سمجھنا بھی مشکل تھا، زیادہ امکان میری ناکامی کا تھا مگر جس شخص کے پاس ہارنے کو کچھ نہ ہو، وہ جوا کھیل سکتا ہے۔ جیسے موت یقینی اور در حقیقت نجات محسوس ہوتی ہو اس کے لیے مرنے سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ ان لوگوں کے لیے میری زندگی زیادہ اہم ہے۔ مارنا چاہتے تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں تھا لیکن یہ حکم کی تعمیل کرنے والے لوگ مجھے زندہ رکھنے پر مجبور تھے۔ ابھی تک تفتیش کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا اور گنی پگ یعنی ہم کو اب لیبارٹری والے سائنسدانوں کے حوالے کرنا ضروری تھا۔ ابھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ مسٹر ایکس نے روایتی طریقے پر تفتیش کی تھی چنانچہ مشن ناکام نہیں سمجھا جا سکتا مگر ہم مارے جاتے تو مشن کہاں ہوتا، مسٹر ایکس کے لیے جواب دہی مشکل ہو جاتی کہ وہ ہماری حفاظت کیوں نہیں کر سکا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ صرف ہم ہی سے بنیادی نوعیت کی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں، ہمارے سوا کوئی ذریعہ نہیں۔ کیا وہ ہماری اہمیت کو نہیں سمجھتا تھا؟

مسٹر ایکس ہماری جسمانی اور ذہنی صحت کا خواہاں تھا اور اس نے ابھی تک اپنی فرض داری پوری کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ ایک مرحلے پر دباؤ اور سرزنش کے اظہار کے سامنے جھک جانا اس کی غلطی تھی۔ میری حالت یقیناً ایسی ہوگئی تھی کہ میں جسمانی طور پر زندہ رہتا لیکن میری ذہنی موت واقع ہو جاتی۔ میرا دماغ ان سائنسدانوں کے لیے بیکار ہو جاتا جو اپنے سائنٹیفک طریقوں سے ہر خلیے کے ہر خیال کو پڑھنا چاہتے تھے اور مسٹر ایکس کو اس کوتاہی اور غیر ذمہ دارانہ رویے کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑتی۔ اس کے شاندار سروس ریکارڈ پر سیاہی پھر جاتی۔

ان سب عوامل کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تھا۔ مجھے ایک فائدہ یہ حاصل تھا کہ مسٹر ایکس کے نزدیک میں سو فیصد فٹ نہیں تھا۔ اس کو جلنے والی رپورٹس کے مطابق میں ذہنی اذیت سے بریک ڈاؤن کا شکار تھا، سادہ الفاظ میں یہ کہ میں عارضی طور پر پاگل ہو چکا تھا۔ اصل صورت اب اس کے برعکس تھی۔ پہلے رابعہ کا نشہ مجھے دیوانگی سے ہوش کی دنیا میں لانے کا سبب بنا تھا اور وہ جذباتی وجوہ کی بنا پر پچاس فیصد سے زیادہ کامیاب رہی تھی۔ اس سے ملاقات کے بعد میں کچھ بے یقینی کا شکار ضرور رہا تھا مگر میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال ہوگئی تھی۔ محسن نے اس بے یقینی کی کیفیت کو بھی ختم کر دیا تو میرا ذہن پھر جدوجہد کے لیے مستعد ہوگیا۔ عام حالات میں میری ذہنی اور جسمانی صحت کی بحالی کا یہ عمل اتنا تیز نہ ہوتا۔ اگر میں کسی اسپتال میں لیٹا ہوا مریض اس وقت تک نہیں اٹھتا جب تک معالج اور تیماردار منع کرتے ہیں اور وہ خود عزم و ہمت محسوس نہ کرے۔ لیکن جدوجہد کے سفر میں کسی آبلہ پا کے لیے بھوک پیاس یا تھکن کے علاوہ بخار میں بھی ریت پر لیٹ جانا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ گر پڑے تب بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کی ہمت کا فاضل ذخیرہ جو قدرت نے ہر ذی روح کے جسم میں ہنگامی صورت حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے رکھا ہے اسے جدوجہد جاری رکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

مسٹر ایکس ابھی اپنے تفتیش کرنے والے سائنسدانوں کی مہارت اور ان کی استعداد کے متعلق معلومات بہم پہنچا رہا تھا کہ میں نے فیصلہ کر لیا۔ زندگی نام ہے حرکت کا۔ بے حرکت پڑے رہ کر سب کچھ جھیلنے سے بہتر ہے کہ جان کی بازی لگا دوں، مر گیا تو سمجھوں گا کہ موت اپنے وقت پر تھی اور فرشتہ اجل کو بھی حکم تھا کہ مقدر ہجرت کی روح اسی وقت قبض کرے۔ بچ گیا اور ناکام رہا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مجھے زنجیروں میں جکڑ دیا جائے گا یا کسی فولادی پنجرے میں بند کر دیا جائے گا۔

میں نے بہت ناپ تول کر کے جست لگائی۔ میں نے ہر لمحے کو شمار کیا۔ مسٹر ایکس کی نقل و حرکت پر نظر رکھی۔ اس کا ایک ایک قدم گنا اور بالآخر میرے دماغ کے کمپیوٹر نے اس لمحے کا اعلان کر دیا جب مجھے کچھ کرنا تھا۔ یہ فیصلہ پہلے ہی سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ مسٹر ایکس بات کرتے کرتے ایک سیکنڈ سے بھی بہت کم وقت کے لیے رکا۔

وہی لمحہ تھا جب مسٹر ایکس نے مجھے شیئن گن سے تحفظ فراہم کیا۔ میں بگولے کی طرح اٹھا۔ ایک لات مار کے میں نے محسن کو فرش پر گرا دیا اور اپنی قوت میں آدھا ہو گیا۔ مسٹر ایکس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس کی نظر اپنی طرف ہونے سے پہلے میں اس سے ٹکرا چکا تھا۔ اس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف گیا تھا لیکن ریوالور نکالنے کے لیے نہیں۔ وہ غالباً سگریٹ نکالنا چاہتا تھا۔ میرے چھ فٹ قد اور ایک سو ساٹھ پونڈ وزن نے مسٹر ایکس کے قدم اکھاڑ دیے۔ میں نے محسن کی طرف نہیں دیکھا اور شیئن گن کے بارے میں نہیں سوچا۔ میں نے صرف ایک شکاری کو زیر کرنے پر ساری توجہ مرکوز کر دی تھی۔

گرنے کے بعد مسٹر ایکس نے صورت حال کو سمجھ لیا اور وہ فوراً پوری طرح متحرک اور فعال ہوگیا۔ اس نے دونوں پیروں کو فرش پر جما کے مجھے ایک جھٹکے سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن میں عملی تجربہ رکھنے کے باعث اس جھٹکے کے لیے تیار تھا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ میں نے جسم کی لچک سے فائدہ اٹھایا اور اسے اپنے اوپر سے گزار کے دوبارہ پیچھے نیچے مارا۔ پھر میں نے اس کے شانے پر کڑی ہتھیلی سے ضرب لگائی اور وہ ذرا سی دیر کے لیے مفلوج ہوگیا۔

اسی وقت میں نے شیئن گن کے برسٹ کی آواز سنی مگر میں نے اپنی توجہ میں کمی نہیں آنے دی۔ کوئی گولی مجھے لگتی تو خود پتا چل جاتا۔ اگر محسن اس کا شکار ہوا تو یہ اس کا مقدر۔ میں اسے بچا نہیں سکتا تھا۔ بس میرے ذہن میں یہ خیال ضرور آیا کہ محسن ابھی محفوظ ہے ورنہ میں اس کی آواز ضرور سنتا۔

مسٹر ایکس کے لیے سوٹ ایک جال بن گیا۔ وہ جوڈو کراٹے کا ایکسپرٹ ہوگا مگر اس لباس میں مسٹر ایکس کی حرکت بڑی محدود ہو کے رہ گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں میرا لباس ڈھیلا ڈھالا تھا۔ مجھے قید رکھنے والوں نے علاج کی غرض سے مجھے ایک دھاری دار سوتی پاجامہ اور ویسی ہی شرٹ نما ٹاپ قمیض دے رکھی تھی، جو عموماً اسپتالوں کے مریض اسی لباس میں نظر آتے ہیں۔ یہ لباس مجھے نقل و حرکت کی پوری آزادی عطا کرتا تھا۔

www.paksociety.com

ایکس کا دایاں بازو مفلوج ہوتے ہی اس نے بڑی پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس کا ریوالور نکالنے میں کامیاب ہو گیا مگر میں اسے قبضے میں نہ رکھ سکا۔ مسٹر ایکس نے وہ حرکت ہاتھ کی کرتے ہوئے میرے پہلو پر ماری۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ تاہم میں نے اس لمحے میں اپنی گرفت برقرار رکھی جو بیچ کی گولی تھی۔ اس کے بعد کوئی دوسرا موقع عمل کرنے والا لمحہ نہیں تھا جس کے بعد میں اس بات کو سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔

مشین گن والا ایک برسٹ مار کے الگ ہو گیا تھا۔ میں نے اوپر نیچے ہوتے ہوئے دیکھا تھا کہ محسن بھی اس سے ٹکرا گیا ہے۔ بعد میں غالباً اس نے مشین گن کا بٹ مار کے محسن کو ناک آؤٹ کر دیا تھا جو اب فرش پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ مشین گن کا برسٹ بھی اس نے بڑی احتیاط سے مجھے اور مسٹر ایکس کو بچاتے ہوئے مارا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ تمام گولیاں دیواروں میں پیوست ہوئی ہیں۔ اب وہ میری اور مسٹر ایکس کی جدوجہد دیکھ رہا تھا لیکن کچھ کرنے سے قاصر تھا۔

مسٹر ایکس نے مجھے اپنے سے جدا کر کے اٹھتے ہوئے اپنے گھٹنے سے وار کیا اور مجھے دیوار کی طرف اچھال دیا۔ وہ ابھی اٹھا ہی تھا کہ میں نے پیروں پر بوجھ ڈالا اور اسپرنگ کی طرح اس کی طرف آیا۔ سر کے بل گیا اور جیٹ کر دونوں پیروں کی پوری قوت سے اس کے منہ پر جما دیے۔ وہ پیچھے گرا تو اس کا سر بڑی آواز کے ساتھ فرش پر لگا۔ اسی وقت مشین گن نے پھر گولیاں اگلیں۔ اور میں نے اپنے کانوں میں سائیں سائیں ہوتی محسوس کی۔ گولیاں یقیناً میرے اوپر سے میرے کانوں کو چھوتی ہوئی گزری تھیں۔ سنتری نے چلا کے بچہ سے کچھ کہا اور یہی غلطی کی۔ وہ مجھے فائرنگ سے دہشت زدہ نہیں کر سکا تھا۔ اب اس نے خود آگے بڑھ کے مجھے بھی محسن کی طرح ناک آؤٹ کرنا چاہا۔ وہ مسٹر ایکس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ میری اور اس کی جنگ میں کوئی فریق حاوی نہیں ہے لیکن یہ کسی بھی لمحے ہو سکتا تھا کہ میں مسٹر ایکس پر غالب آ جاتا یا میرے ہاتھ میں ریوالور آ جاتا۔ اس نے ٹھیک ہی سوچا تھا کہ قریب آ کے موقع دیکھے اور پھر میرے سر پر مشین گن کا بٹ مار دے۔

لیکن اسے خبر نہ تھی کہ محسن جو وقتی طور پر بے ہوش ہوا تھا، ہوش میں آ چکا ہے۔ اسے بھی غیبی قوت نے جھنجھوڑا ہوگا کہ اٹھو، گھڑی دو گھڑی ہے، تو عرصۂ محشر میں ہے۔ بے ہوش پڑے رہنے کا وقت نہیں ہے۔ اور لاشعور کی وساطت نے محسن کو بہت جلد بیدار کر دیا تھا۔ جیسے ہی سنتری آگے بڑھا وہ اس کے پیروں سے لپٹ گیا اور سنتری منہ کے بل گرا تو مشین گن چھوٹ کے دور مسٹر ایکس کے قریب آئی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اپنے ہاتھ بڑھائے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق مشین گن میرے مقابلے میں مسٹر ایکس کے زیادہ قریب تھی لیکن ہوا یہ کہ فرش پر ہاتھ رگڑنے والے محافظ نے بھی اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے کھینچنا چاہا مگر محسن نے کھینچ لیا اور یوں مشین گن مسٹر ایکس کی دسترس سے چند انچ دور چلی گئی اور میرے ہاتھ میں آ گئی۔

پوری طرح اپنی مضبوط گرفت میں لیے بغیر میں نے مشین گن کو گھمایا۔ اس کا بٹ مسٹر ایکس کے منہ پر لگا اور اس نے پلٹ کے مجھے گالی دی۔ میں نے اس کے سامنے والے دانتوں کو غائب پایا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ نکلا تھا لیکن وہ اسی بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ اس نے اچانک ریوالور اٹھا لیا جو اس کے نیچے آ گیا تھا۔ اتنے قریب سے وہ فائر نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ریوالور محافظ کی طرف پھینک دیا۔

"پکڑو اسے... شوٹ ہم... یو ایڈیٹ...!" وہ چلایا۔

اسی وقت میں نے مشین گن کا بٹ مسٹر ایکس کے سر پر مارا۔ جب ریوالور کے فائر کی آواز آئی تو میں بے اختیار فرش پر گرا۔ میرے کانوں نے ایک چیخ بھی سنی لیکن یہ محسن کی چیخ نہیں تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ریوالور محسن کے ہاتھ میں تھا اور محافظ، جو کچھ دیر پہلے مشین گن لیے کھڑا تھا، خود کو بے حد محفوظ اور دوسروں کو اپنی انگلی کے اشارے کا تماشا سمجھے ہوئے تھا، فرش پر عجیب طرح سے لوٹ رہا تھا۔ وہ ٹانگیں چلا رہا تھا اور تقریباً ایک دائرے میں گھوم رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ گردن پر تھے اور خون اس کی انگلیوں سے پھوٹ رہا تھا۔ محسن کی چلائی ہوئی گولی اس کے نرخرے میں سے گزر گئی تھی۔ وہ اب بہت بھیانک آوازیں بھی نکال رہا تھا اور چند لمحوں کا مہمان تھا۔

اس جنگ کی خبر مشین گن کے چلتے ہی اوروں نے سب کو پہنچا دی تھی لیکن نہ جانے کس وقت محسن نے دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔ اب باہر جمع ہونے والے دروازے کو توڑنے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ میں سراج کے دہاڑنے اور اس کی آواز میں گالیاں بکنے کا شور بھی سن رہا تھا۔ مسٹر ایکس نیم بے ہوش تھا اور اس کے سانس لینے کی رفتار بہت کم تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ وقتی بے ہوش ہے۔

مشین گن اٹھاتے ہی میں نے محسن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے مجھے فتح کے جشن میں ہاتھ ملایا اور منہ میری طرف اچھالا۔

"دروازے کے ساتھ... ادھر سے۔" میں نے محسن کو اشارہ کیا اور محسن میری راہ سے ہٹ گیا۔ باہر سے ٹکریں مارنے والے دروازے کی مضبوطی پر برہم تھے۔ انھوں نے خود ہی اسے مقفل بنایا تھا لیکن ان کا مقصد یہ تھا کہ جو اسیر ہو وہ نکل نہ سکے۔ اب خود دیا ہے تو ان کے لیے اسیر بنانے والے دروازے کی شکل ہو گئی تھی۔ یقیناً ان لوگوں کو اس کا احساس ابھی ہوا ہوگا جو انھوں نے دروازے کے اندر کنڈی لگانے کی بھی جگہ رکھی تھی لیکن یہ ہماری عادت ہے کہ ہم دروازے کو اندر اور باہر سے ایک جیسا محفوظ بناتے ہیں۔ لوہے کی موٹی سی سلاخ کو محسن نے ایک ہاتھ مار کے کھسکا دیا تھا اور سلاخ دو آہنی کنڈوں سے گزر گئی تھی۔

باہر سراج مسلسل چیخ رہا تھا۔ "مارا گیا نا آخر افلاطون کی اولاد... ہم کو الو کا پٹھا سمجھتا تھا۔" اس نے مسٹر ایکس کے لیے ایک زبردست گالی کے ساتھ کہا۔ "ہم بھی چھوٹے بچے کے ابا نہیں بنے... بہت عرصہ..." اس نے خود اپنی ذات کے لیے نہایت نامناسب الفاظ استعمال کیے۔ "اور اندر وہ کتے کا بچہ... مشین گن لیے کھڑا کیا کر رہا تھا... اب لایا ہے تمھارے..." اس نے کسی کو گالی دی۔

میں نے مشین گن سے نشانہ لے کر ایک برسٹ مارا... دروازے میں کئی سوراخ ہو گئے اور باہر دو تین افراد ایک ساتھ چیخے تھے۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا کہ کنڈی کھول دے۔ اس کا ناگہانی ردعمل تھا۔ جیسے ہی دروازہ کھلا میں باہر کی طرف لپکا۔ پہلے برسٹ نے تین آدمی گرا دیے تھے جو دروازہ توڑنے کے لیے اپنے جسم سے دھکا لگا رہے تھے۔ ان میں وہ دونوں گونگے بہرے بھی شامل تھے جو آج تک فرشتۂ اجل کی طرح مسلط تھے۔ ان کو مرتا دیکھ کے مجھے ایک وحشیانہ سی خوشی ہوئی۔ ان سب کی موت کے پیچھے بیٹھے تھے تو سراج بھاگ رہا تھا۔ میں نے مشین گن کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں فائر کے بغیر ہی منجمد ہو گیا۔

"تم اسی طرح اسی جگہ کھڑے رہو گے۔" میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "محسن باہر جائے گا... صرف محسن..."

"مگر وہ کیسے... کیسے باہر جائے گا۔" سراج نے کہا۔ "راستے بند ہیں۔"

"وہ اپنے ساتھ مسٹر ایکس کو لے جائے گا۔" میں نے کہا۔ "راستے خود مسٹر ایکس بتائیں گے۔ ان کے حکم سے سامنے کے محافظ راستہ بنا دیں گے... اور سارے بند دروازے کھلیں گے... باقی سب کے سب غائب ہو جائیں گے۔ تم اکیلے اس زندان میں کھڑے رہو گے۔ کوئی تمھاری مدد کے لیے آئے گا تو خود بھی جان سے جائے گا اور تمھیں بھی مروائے گا۔"

"تم اپنی زندگی سے کھیل رہے ہو۔" سراج نے کہا۔

"بکواس بند کرو۔" میں نے کہا۔ "یا تم چاہتے ہو کہ میں وہی گنتی دوہرانا شروع کروں... دس تک گنوں اور اس کے بعد بھی تم..."

"آل رائٹ... سب لوگ اندر جاؤ۔" اس نے بادلِ ناخواستہ حکم دیا اور وہ چاروں اِدھر اُدھر کے کمروں میں گم ہو گئے جو راہداری میں سراج کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے مشین گن سے سراج کو اشارہ کیا۔

"اب تم اندر آ جاؤ... آگے آؤ... اور آگے..." میں نے ایک ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ میں اسے نظر میں رکھنا چاہتا تھا لیکن یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ دروازے سے گزرنے تک میرے بہت نزدیک ہو۔ سراج تعمیل پر مجبور تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے تک آیا۔ اس وقت تک میں چند قدم پیچھے ہٹ چکا تھا اور اس کے گزرنے کے لیے دروازہ خالی تھا۔

"یہ تو مر گیا ہے۔" سراج نے نیچے پڑے ہوئے مسٹر ایکس کی طرف دیکھ کے کہا۔

"اس کے مرنے سے تم یتیم نہیں ہو گے۔" میں نے کہا۔ "دوسرا باپ مل جائے گا تمھیں... تم اپنی فکر کرو۔"

اگر سراج کا مقصد میری توجہ بٹانا تھا تو وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ یہ ایک سوچی سمجھی حرکت تھی۔ کوئی معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا بھی اس طرح دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ میں نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنا منہ دیوار کی طرف کرے اور ہاتھوں کو سر کے اوپر رکھ کے کھڑا ہو جائے۔ تھانے میں ایک معمولی سپاہی کسی بھی چور، اچکے یا جیب کترے کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے اور صف بھر ان میں ان شرفا کو بھی شامل کر دیا جاتا ہے جو آوارہ گردی یا مشتبہ انداز میں پھرنے کے الزام میں پکڑ لائے جاتے ہیں۔ پولیس کی کچھ وقعت کا معاشی خوشحالی سے براہ راست تعلق ہے۔ انڈین تعزیرات کی دفعہ کسی بھی دو افراد یا دو گروہوں پر لگائی جا سکتی ہے جو بد آواز بلند بدتمیزی کر رہے ہوں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہاں خون خرابہ ہونے ہی والا تھا۔ کوئی نقص امن کی غرض سے گھوم رہا ہے یا کسی کا پتا تلاش کر رہا ہے تو اس پر آوارہ گردی کا لیبل آسانی سے لگ جاتا ہے... اور شبہ نظر آتا تو دیکھنے والے کی نظر پر ہے جیسے حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے ایسے ہی کسی سو فیصد شریف اور امن پسند معزز شہری کو پولیس کی نظر مشتبہ یا آوارہ گرد کی حیثیت سے دیکھتی ہے تو صرف اس لیے کہ یہی لوگ رہائی کا معاوضہ ادا کر کے جاتے ہیں۔ جانے سے پہلے ان کو تھانے کے رعب اور دبدبے کا احساس دلانے کے لیے چند چھتر لگائے جاتے ہیں یا لاتیں مکے تو اس کی ضرورت اور اہمیت کبھی تھانے والے ہی جانتے ہیں۔

www.paksociety.com

مگر آج معمولی کانسٹیبل نہیں، ایک ایس پی کے ساتھ وہ سلوک ہو رہا تھا جو عام حالات میں ہمارے ساتھ ہوتا۔ مجھے وہ سب یاد تھا جو سراج نے روزِ اوّل میرے ساتھ روا رکھا تھا اور اب کیا تھا میری دلی آرزو تھی کہ میں انگریزی محاورے کے مطابق... اس کو اسی کے سکوں میں ادائیگی کروں یا ایک بار اسے بھی بتاؤں کہ بات صرف وقت کی ہے جو بدلتا رہتا ہے۔ کل وہ اوپر تھا، آج نیچے آ کے دیکھے اور سمجھے کہ ظلم کیا ہوتا ہے۔ زبان سے میں کیسے بتا سکتا تھا کہ مجھ پر کیا بیتی تھی۔ جو جسمانی اور ذہنی اذیت میں جھیل چکا تھا اس کو بیان کرنے کے لیے دنیا کی تمام زبانوں کے الفاظ ناکافی تھے اور اسے ضابطۂ تحریر میں لانے کے لیے عمرِ خضر بھی ناکافی تھی لیکن صرف ایک رات کا عملی سبق اس بے ضمیر شیطان کی آنکھیں کھول سکتا تھا۔

"مجھے افسوس ہے گا سراج کہ تم میرے ہاتھ آئے تو ایسے وقت میں جب میں تم سے اپنا حساب برابر نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "تم نے اور ولاور نے بڑے زبردست شیطانی ڈرامے کیے۔ تم خود کو بہت اچھا ڈائریکٹر پروڈیوسر سمجھتے ہو گے۔ میں تمھاری خوش فہمی دور کر دیتا کہ تم سے بڑے ہدایت کار اور والے بڑے ہم ہیں... میں تو سر عذاب اور سر اذیت جھیل گیا۔ اور کیا تم دعویٰ کر سکتے ہو کہ قوتِ برداشت میں سکندر بخت تم سے زیادہ نہیں؟ اس کا پتا چل جاتا اور کسی دن مزہ چکھے گا جب معاملہ اُلٹا ہوگا۔ اب تک تم تماشا دیکھتے اور تماشا کرنے والے بھی اور تماشائی بھی... کسی دن تم تماشا ہو گے... تمھارے لیے وہ ایک دلچسپ تجربہ ہوگا اور سبق بھی، جو تم کبھی نہ بھول سکو گے۔"

"آج تمھیں روکنے والا کون ہے؟" سراج نے زہرخند کے ساتھ کہا۔

"وقت۔" میں نے کہا۔ "ابھی اتنی ہی مہلت ہے کہ میں دوسرا زیادہ اہم کام ختم کروں۔ تاہم میرا وعدہ ہے کہ ایک رات تم بھی ایم آر ایس کے تھانے میں گزارو گے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک رات میں نے تمھارے تھانے میں گزاری تھی اور سراج، ایک قلم کی نوک سے میں بھی کروں گا جسے تم میری طرح دیکھو گے۔ مجھے تو پہلے سے معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوگا... مگر میں نے تم کو بتا دیا ہے۔ اب تم انتظار کا عذاب بھی جھیلو۔ خوف کے آسیب کے بھی قیدی رہو۔ عادی تھے میں مر جانا آسان ہوتا ہے۔ سزائے موت پانے والے قیدی کے لیے پھانسی کے دن تک جینا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ سارا ذہنی اور جسمانی عذاب اور اذیت جو مجھے ملی تم بھی پاؤ گے مگر خوف اور انتظار کا کرب تمھیں اضافی ملے گا۔ اسے تم اپنے اعمال کا سود سمجھو جو حرام ہوتا ہے لیکن حرام کھانے والوں کو، حرام کاری کرنے والوں کو اور تم جیسے حرام زادوں کے لیے جائز ہے... محسن... ایس پی صاحب کو ننگا کر دو اور ان کے کپڑے اتار دو۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔" سراج چیخ پڑا۔

"اس وقت ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس سے زیادہ بھی کر سکتے ہیں۔ تم اتنے کم عقل تو نہیں ہو کہ صورتِ حال کو سمجھ نہ سکو۔"

"میں... اس کا بدلہ لوں گا۔" سراج نے دانت پیس کر کہا۔

محسن نے اس کے ایک تھپڑ دیا۔ سراج کا منہ دیوار سے لگا اور اس نے ہاتھ سے ناک کو چھو کر دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی ناک سے خون بہنے لگا ہے۔

"بدلہ تم کو نہیں ہم کو لینا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تم تو سب کچھ کر چکے۔ جوابی کارروائی جہاں کرتا ہے یہ باری کا کھیل ہے اور تمھاری باری گزر گئی۔" اس نے سراج کی جامہ تلاشی جاری رکھی اور اس کی جیب میں سے ریوالور کے علاوہ شناختی کارڈ، نقد رقم جو بعد میں نو ہزار سات سو نکلی تھی اور کچھ کاغذات بھی نکال لیے۔

"اب تم اپنے کپڑے شرافت سے میرے حوالے کرو گے یا میں زبردستی کروں؟" محسن نے کہا۔

سخت اشتعال کے عالم میں سراج نے اپنی بشرٹ اور پتلون اتار کے زمین پر دے ماری۔ "تم نے اسے اتروا کے بہت بڑا جرم کیا ہے۔"

محسن نے اس کے ایک لات ماری۔ "کیا یہ جرم اس وردی کو پہن کر اسمگلنگ کرنے سے بھی بڑا ہے جو غداری اور وطن فروشی سے بھی زیادہ سنگین ہے۔"

"سچ تو یہ ہے کہ تم اس لباس کے کبھی اہل نہ تھے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے جسم پر تو وہ چار خانے والی وردی ہونا چاہیے جو کلاس سی کے قیدیوں کو ملتی ہے... یہ لباس تو وطن کے قانون کی بالادستی رکھنے والوں اور ملک کو اندر اور باہر کے دشمنوں سے بچانے والوں کو دیا جاتا ہے۔"

"اب اُلٹے لیٹ جاؤ۔" محسن نے حکم دیا۔

احساسِ ذلت سے سراج کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا لیکن وہ تعمیل نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اس کی نظر بار بار دروازے کی طرف جاتی تھی، شاید اسے امید تھی کہ کوئی سے باہر دروازے کے لوگ کچھ نہ کچھ کریں گے مگر ابھی تک ہر طرف خاموشی تھی۔ وہ کہنیاں ٹکا کر اُلٹا لیٹ گیا۔ میری نظر دروازے سے باہر بھی دیکھ رہی تھی اور میں بے ہوش پڑے ہوئے مسٹر ایکس کی طرف سے بھی غافل نہیں تھا۔

ممکن تھا کہ وہ چالاک اور عیار آدمی مکر کر رہا ہو اور آنکھیں بند کیے ہماری ساری باتیں سن رہا ہو اور موقع کی تاک میں ہو کہ وہ پھر صورتِ حال کو قابو میں کر سکے۔ میں نے اس کو دو بار ٹھوکر مار کے دیکھا اور اس کی جیب میں سے سگریٹ لائٹر سے جلائی اور پھر اس کے جسم سے لگا کے دیکھی مگر وہ غیر متحرک رہا۔ اس وقت جیب میں یہ کارروائی کر رہا تھا تب مجھے احساس ہوا تھا کہ اس کا سانس رکا ہوا ہے... مجھے ڈر ہوا کہ سراج کی بات درست ہی نہ ثابت ہو جائے۔ وہیں میں نے پھر دیکھا تو مجھے پھر سانس رکی ہوئی تھی اور میرا یقین ہی ہو چلا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ دو منٹ تک سانس روکے رکھنا کوئی مشکل کام نہیں لیکن منٹ بہت ہوتے ہیں۔ اگر میں نبض دیکھتا تو مجھے شک نہ رہتا۔ میں تم اگر ایک ہاتھ میں ہو تو بے کار، اس کے لیے دونوں ہاتھوں سے تھامنا پڑتا ہے۔ میں نے نبض دیکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا کہ کہیں جھٹکوں اور مردہ زندہ ہو جائے۔ جب محسن اپنی کارروائی میں مصروف تھا تب بھی میری نظر مسلسل مسٹر ایکس کا جائزہ لے رہی تھی اور میں یہ ماننے پر مجبور ہو گیا تھا کہ مسٹر ایکس خودکشی کر چکا ہے یا وہ کسی حرب کاری سے ہلاک ہو گیا ہے۔ جاسوس اپنے دانتوں کے خلا میں پوٹاشیم سائنائڈ جیسا کوئی زہر رکھتے ہیں اور جہاں فرار کے سب راستے بند ہوں وہاں اس کی مدد سے اپنا خاتمہ کر لیتے ہیں یوں وہ دشمن کی قید میں جا کے تشدد کا عذاب جھیلنے سے بچ جاتے ہیں اور اس امکان سے بھی کہ وہ تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے سارے راز افشا کر دیں۔ دانتوں کے خلا میں چھپے ہوئے اس زہر کے کیپسول کو ایک زبان سے دانتوں کے بیچ میں لا کر چبانا کافی ہوتا ہے۔ چند سیکنڈ میں زہر اپنا کام کر جاتا ہے اور ہر حکومت کے جاسوس جو دشمن کے علاقے میں بھیجے جاتے ہیں ان پر واضح ہے کہ گرفتاری کی صورت میں انھیں اپنی مدد آپ کرنا ہوگی۔ بہت مشہور ہے کہ جاسوس کا دوست کوئی نہیں ہوتا، اپنے نہ پرائے۔ پرائے تو خیر دشمن ہوتے ہیں مگر اپنے بھی پہچاننے سے صاف انکار کر دیتے ہیں چنانچہ وہ جان آسانی سے دینا پسند کرتے ہیں۔

سراج کی آواز آئی تو میں چونکا اور یہ دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی اور ہنسی بھی آئی کہ محسن نے سراج کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا ہے۔ اس نے اپنا جوتا اتار کے سراج کی مرمت شروع کر دی تھی لیکن سراج اب خاموش تھا۔

"افسوس کہ میرے پاس وہ تیرہ نمبر کا روایتی جوتا نہیں جو تھانوں میں شرفا کی عزت افزائی کے لیے رکھا جاتا ہے۔ میرے جوتے کا نمبر دس ہے۔" محسن نے کہا۔

"محسن! وقت ضائع مت کرو۔" میں نے کہا۔ "یار زندہ، صحبت باقی۔ ہم یہ کام تسلی سے اور دل جمعی سے کریں گے۔"

"میں نے تو افتتاح کیا ہے۔" محسن بولا۔ "دس جوتے صرف آغاز کے طور پر لگائے ہیں... باقی انشاءاللہ آئندہ۔"

"ادھر آ کے دیکھو یہ دشمن کیا مر گیا ہے... مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

محسن نے سراج کو چھوڑ کے جوتا پہنا اور میرے پاس بیٹھے ہوئے مسٹر ایکس کا معائنہ کرنے لگا۔

"یہ تو واقعی مر چکا ہے۔" محسن نے بھی سانس پر غور کیا۔

میں نے اشارے سے نبض اور دل کی دھڑکن دیکھنے کو کہا۔ محسن نے اس کی کلائی تھامی اور جانتے بوجھتے غلط جگہ پر انگلی رکھ کے نبض دیکھنے لگا۔ یہ ضروری نہیں کہ نبض کے چلنے کا پتا صرف انگوٹھے کے نیچے کلائی پر انگلی رکھ کر ہو۔ غور سے دیکھا جائے تو نبض کی جگہ متحرک نظر آتی ہے۔ بے شک یہ حرکت بہت خفیف ہوتی ہے مگر مجھے ایک جگہ پھڑکتی دکھائی دیتی ہے۔ اور محسن نے اسی کو دیکھ کر مجھے آنکھ ماری جس کا مطلب واضح طور پر یہ تھا کہ مسٹر ایکس فوت نہیں ہوئے ہیں۔ یقیناً وہ وقفے وقفے سے سانس لیتا رہا تھا اور میں نوٹ نہیں کر سکا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ یوگا کا ماہر ہو جن کے بارے میں ناقابلِ یقین باتیں مشہور ہیں کہ وہ سانس کو مسلسل گھنٹوں روکے رکھتے ہیں۔ یوگی ایسے بھی ہیں جو قبروں میں دفن رہ کے اگلے دن زندہ برآمد ہوتے ہیں۔ کم عقل اور اندھی عقیدت رکھنے والے تو ہفتوں اور مہینوں کا ذکر کرتے ہیں کہ فلاں یوگی بابا چھ مہینے بعد قبر سے نکلے... مگر وہ سب مبالغہ اور بکواس ہوتی ہے۔ تاہم طویل وقفے کے لیے سانس روکنے کی مشق یوگا میں شامل ہے۔

"نبض بھی رکی ہوئی ہے۔" محسن نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔" میں نے بھی افسوس سے کہا۔ "یہ آدمی کام کا تھا۔ ہمیں بہت کچھ بتا سکتا تھا۔"

"اچھا ہوتا اگر یہ زندہ رہتا۔" محسن اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ ساری گفتگو مسٹر ایکس کو سنانے کے لیے تھی تاکہ اسے ہمارے بے وقوف بننے کا یقین آ جائے۔ "خیر اب آگے کی سوچو... یہاں سے نکلنے کے لیے کیا کرنا ہے؟"

"ابھی تو باہر نکلنے کے راستے بھی معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"راستے تو کھل جائیں گے لیکن پہلے رابرٹ ہیڈلی اور کیتھرین کو ساتھ لینا ہے۔ یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں قید ہیں۔ جیلی ہیڈکوارٹر میں جا کے دیکھنا ہوگا۔ باہر والے کوریڈور میں دونوں طرف آٹھ دروازے ہیں۔ چار ایک طرف اور چار دوسری طرف۔ نواں دروازہ بالکل سامنے ہے جو شاید باہر جانے کے لیے ہوگا۔ باہر جیپ ہے؟ ہم باہر جا کے دیکھیں گے۔ پہلے تو ہر کمرے کے سامنے سے گزرنے کا مرحلہ ہے۔ نہ معلوم کس کمرے میں سے کوئی توپ چلا دے۔ پھر رابرٹ کیتھرین اور ہیڈلی کو نکال کر ساتھ لے جانا بھی آسان نہیں ہوگا۔ سراج جانتے تھے میں ہے تو ہو سکتا ہے کہ ابھی تین آدمی ان کے پاس ہیں۔ ان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔"

"معلوم نہیں یہاں کل کتنے آدمی تھے۔" محسن بولا۔

"تین مارے گئے... وہ یہاں ہیں۔" میں نے کہا۔ "دلاور اور پیڈرو بھی یہاں تھے۔ اب کسی کی آواز نہیں آ رہی ہے۔ باہر نکل کے دیکھتے ہیں۔"

"ہر کمرے کے سامنے سے گزرنے کا اور ہر کمرے کے اندر جانے کا خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔" محسن بولا۔

"تو ایس پی صاحب کی وردی پہن لے۔" میں نے آہستہ سے محسن کے کان میں کہا۔

محسن نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"یہ لوگ پہچانتے ہیں اور دھوکا نہیں کھائیں گے کر لو۔ سراج سے۔" میں نے اس کے کان میں کہا۔ "مگر ہم باہر نکل گئے تو اس وردی سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور اٹھائیں گے۔"

محسن نے میری بات مان لی اور اپنے کپڑے اتار کر ایس پی سراج کی پوری وردی پہن لی۔ سراج خونی نظروں سے ہمیں گھورتا رہا۔ میں نے محسن کو دروازے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ محسن نے مسٹر ایکس اور سراج کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا۔ اس کی نظر کا سوال واضح تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا ہم ان دونوں خطرناک دشمنوں کو اسی جگہ ایسے ہی چھوڑ جائیں گے۔ میں نے سر ہلا کر اسے پھر دروازے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ میں اور وہ ایک ساتھ دروازے سے نکلے اور پلٹے۔ پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے وہیں کھڑے رہ کر باری باری دونوں پیروں پر اچھلنا شروع کیا۔ محسن نے میری تقلید کی۔ زمین پر جانے پیروں کے پڑنے سے ایسی آواز پیدا ہوتی تھی جیسے ہم دونوں بھاگ رہے ہوں۔ رفتہ رفتہ میں نے اس آواز کو کم کیا۔ یہ تاثر دینے کے لیے کہ ہم دور چلے گئے ہیں۔ پھر ہم دروازے کے دونوں جانب پوزیشن لے کر کھڑے ہو گئے۔

ہماری اس حرکت کے نتائج خاطر خواہ نکلے۔ منٹ سے پہلے تو کمرے کے اندر سے سراج کے کراہنے کی اور چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی۔ پھر ہم نے مسٹر ایکس کی آواز سنی۔ وہ سراج کو ڈانٹ رہا تھا کہ اس طرح شور نہ کرے۔ ہم ان کے منتظر تھے۔ کوریڈور کے تین دروازے کھلے اور ان میں سے تین آدمی نکلے۔ دو کے ہاتھ میں ریوالور تھے اور تیسرے نے اسٹین گن اٹھا رکھی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے، میں نے اسٹین گن کا راؤنڈ چلا دیا اور وہ تینوں وہیں گر گئے۔ مارے جانے والے بھی یہی سمجھے تھے کہ ہم راہداری میں دوڑتے ہوئے دروازے کی طرف گئے ہیں اور وہ ہمیں پیچھے سے شوٹ کر دینے کا ارادہ رکھتے تھے مگر اندازے کی غلطی ان کی موت کا سبب بن گئی۔

میں نے محسن کو واپس کمرے کے اندر کھینچ لیا کیونکہ اب مزید مسلح افراد کا باہر نکل آنا یقینی تھا۔ اندر سراج اور مسٹر ایکس ایک ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر بری طرح چونکے۔ فائرنگ کی آواز سے انھوں نے بھی فرض کر لیا تھا کہ ہم فرار ہوتے ہوئے مارے گئے۔

"مردہ زندہ ہو گیا۔" میں نے مسٹر ایکس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا تم بھی اسی شان سے باہر جانا پسند کرو گے؟" محسن بولا۔

"مجھے کوئی کمپلیکس نہیں ہے۔" مسٹر ایکس نے متانت سے کہا۔ "تم میرے کپڑے پہننا چاہتے ہو تو لے لو۔ کپڑوں کا میری شخصیت سے یا میری عزت اور ذلت سے کوئی تعلق نہیں۔ کپڑے بدل جانے سے میں وہی رہوں گا... جو میں ہوں۔ شان کی پروا بھی نہیں کرتا جو میرا تماشا دیکھیں گے اور مجھ پر ہنسیں گے کیونکہ وہ دشمن ہیں۔"

اس کی باتوں نے سراج کے دل کو یقیناً تسلی دی ہوگی۔ وہ بولا۔ "یہ ایسی ہی بات ہے جیسے تم میری وردی پہن کے ایس پی نہیں ہو گئے۔ اور چوہدری نے میری وردی اتار لی تو میرا عہدہ ختم نہیں ہوا۔ میں اب بھی ایس پی ہوں اور ایسی وردیاں مجھے بہت ملیں گی۔"

اسٹین گن کے راؤنڈ ختم ہو گئے تھے لیکن اب ہمارے پاس دو ریوالور آ گئے تھے۔ ایک سراج کا اور دوسرا مسٹر ایکس کا۔ میں نے اسٹین گن کو ناکارہ بنا کے پھینک دیا۔

"چلیے جناب ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "اور مسٹر ایکس۔"

اس نے مسکراتے ہوئے انکار میں سر ہلایا۔ "تم مجھے شوٹ کر سکتے ہو مگر مجھے تعمیل حکم پر مجبور نہیں کر سکتے۔"

میں نے اس کی پُراعتماد مسکراہٹ اور اس کے لہجے... کیا تو مجھے یقین آنے لگا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں اسے شوٹ کر دوں یا ایسی صورت میں اسے اٹھا کے باہر پڑتا۔ میں اسے دھکے دے کر باہر لے جانے کی کوشش کرتا یا برداشت کرتا اور اگر باہر چلا بھی جاتا تو وہ مدد نہ کرتا جو ہم چاہتے۔ وہ کسی کو حکم نہ دیتا کہ ہماری مدد کریں۔ اپنی جان بچانے کے لیے بھی حکم پر عمل نہ کرتا۔ وہ بالکل مختلف آدمی تھا سراج اور دوسرے لوگوں سے الگ۔ وہ جان کی بازی لگانے آیا تھا۔ ... یہ ہو سکتا تھا کہ وہ الٹا سب سے ... بات نہ مانیں اور مقابلہ کریں۔ ایسے آدمی سے کچھ بھی اگلوانا ناممکن تھا اور یہاں ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ... سے زبردستی کچھ اگلواتے۔

اگر میں تہذیب سے کام لیتا تو اس سے میری کمزوری ظاہر ہوتی۔ میں نے فوراً فیصلہ کر لیا۔ "مسٹر ایکس دس سیکنڈ میں تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکتے ہو۔ ہمیں باہر نکالنے میں مدد کرو گے یا ... قبول کرو گے۔"

"فیصلہ میں کر چکا ہوں اور میں کبھی دو فیصلے نہیں کرتا۔" وہ ... "اگر میں زندگی کو اتنا اہم سمجھتا تو اس مشن کی کمان سنبھالنے ... فیصلہ کرتا اور ... ان کی تقریب بھی تھا جنھوں نے ... ہم فرقہ وارانہ سوچ رکھتے ہیں۔ تمھارے نقطۂ نظر سے میں دشمن ... فرعون یا جھوٹا ہوں۔ غدار اور شیطان ہوں لیکن ... بھارت کا پالا ہوا سپوت ہوں۔ میں محب وطن ... ہوں اور مر جانے کے بعد سورگ باشی کہلاؤں گا۔ اعلیٰ ... اعزاز کا مستحق سمجھا جاؤں گا۔ شکست قبول کر لینے اور زندہ بچ نکلنے کے لیے دشمن سے زندگی کی بھیک مانگنے یا اس سے سمجھوتا ... کی صورت میں میرے لیے کچھ نہیں۔ میں ادھر دشمن تو ... ادھر کا فرعون تو ادھر بھی۔ ادھر جہنم تو ادھر نرگ کا ... ذلت اور رسوائی دونوں طرف... میں کھلے ہاتھوں ... ترجیح دوں گا۔"

"آل رائٹ۔ میں تمھیں وعدے کے مطابق دس سیکنڈ ... جس میں تم سوچ سکتے ہو کہ یہ ڈراما ہے یا حقیقت۔" ... نے کہا اور ایک ایک سیکنڈ کو گن کر شمار کرتے ... دس سیکنڈ گزر گئے اور اس شخص کے اطمینان اور اعتماد ... آئی۔ جب میں نے اس کے سر کا نشانہ لیا تو گولی ماری تب بھی ... تھا لیکن اس کی اچانک موت نے سراج پر ... طاری کر دی۔

"اب تمھاری باری ہے۔" میں نے ریوالور کا رخ بدلا۔ "تم کیا ... ہو؟"

"نہیں... میں... تم کیا چاہتے ہو؟" سراج نے ہکلا کے کہا۔

"تم اپنا ... سے سامنے فیصلے کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "میں ایک شخص تھا جو تم پر حکم چلاتا تھا۔ تمھارے لیے ہم سب کو زندہ سلامت یہاں سے نکالنا کوئی مشکل کام نہیں۔"

"اتنا آسان بھی نہیں... لیکن میں کوشش کر سکتا ہوں۔" سراج نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"تمھارا مطلب ہے چوہدری دلاور یا پیڈرو تمھاری راہ میں حائل ہو سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کیا تم وعدہ کر سکتے ہو کہ اس کے بعد مجھے مارو گے نہیں؟" اس نے مسٹر ایکس کی لاش پر نظر ڈالی۔

"اگر تم میرے وعدے پر اعتبار کر سکتے ہو تو وعدہ کرنے میں کیا ہرج ہے۔" میں نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں۔"

سراج کی پوزیشن بہت عجیب ہو گئی تھی۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ ہم نے مسٹر ایکس کے ساتھ کیا کیا۔ لیکن وہ مسٹر ایکس کی طرح بہادر نہیں تھا۔ مسٹر ایکس اپنے لوگوں کے لیے غدار نہیں رہا تھا لیکن سراج بدستور غدار تھا اور مرنے کے بعد بھی رہتا۔ وہ مرتے دم تک ... تھا۔ ہم سے زندگی کی ضمانت مانگنا ایک ایسی ہی احمقانہ حرکت تھی جو اس سے موت کے خوف میں سرزد ہوئی۔ جب جنگ جاری ہو تو دشمن سے وعدہ لینا اور پھر وعدے پر قائم رہنے کی امید رکھنا دونوں بے وقوفی کی دلیل ہیں۔

"میں تمھارے ساتھ تعاون کروں گا... لیکن اس طرح نہیں۔" وہ بولا۔

"تم محسن کے کپڑے پہن سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

انتہائی مجبوری کے عالم میں اس نے محسن کے اتارے ہوئے کپڑے پہنے۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو خود اپنی نظر سے گر گیا تھا۔ اس کی بہادری کے دعوے موت کو سامنے پا کے نقش بر آب ثابت ہو گئے تھے۔ وہ بہت ... تھا۔ گالیاں دیتا تھا اور ظلم کرتا تھا مگر اس وقت جب فریق مخالف بے بس اور قطعی مجبور ہوتا تھا۔ اس وقت جب وہ خود کو محفوظ سمجھتا تھا اور با اختیار سمجھتا تھا۔ صورت حال کے پلٹتے ہی اس کی اصلیت ظاہر ہو گئی تھی۔

باہر آتے ہی اس کی نگاہ نے دروازے پر پڑی ہوئی تینوں لاشوں کو دیکھا۔ پھر آگے تین مختلف دروازوں پر اسے تین اور آدمی پڑے نظر آئے اور اس کی صورت پر مایوسی اور ناامیدی کا تاریک سایہ اور گہرا ہو گیا۔

"میں تمھارے ساتھ ایک قدم پیچھے ہوں۔" میں نے کہا۔ "پہلے ایک دروازے پر دستک دو۔ جو اندر ہو اسے باہر آنے کا حکم دو اور پھر خود ایک قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔"

"اندر اب کوئی نہیں ہوگا۔" وہ تلخی سے بولا اور آگے چلا گیا۔ میں نے پہلے دروازے پر گرے ہوئے محافظ کی اسٹین گن اٹھا لی۔

www.paksociety.com

اسے اٹھانے کا خیال سراج کے دل میں بھی آیا تھا مگر اس نے مجھے ایک قدم پیچھے پایا تو اپنا ارادہ بدل دیا۔ اسٹین گن لوڈ تھی چنانچہ میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔ محسن ہمارے ساتھ نہیں نکلا تھا۔ وہ اسی کمرے کے دروازے میں ریوالور لیے کھڑا رہا تھا جس میں مسٹر ایکس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ یہ ایک دوسرا حفاظتی اقدام تھا۔ میں سراج کے پیچھے لگا ہوا تھا اور محسن یقیناً محفوظ مقام سے میری حفاظت کر رہا تھا۔ سراج نے دروازے پر دستک دی۔ لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔

"اندر کوئی نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"تم پیچھے ہٹ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں دیکھوں گا... اور یہ مت بھولنا کہ تم دو ریوالوروں کی زد میں ہو۔" میں نے محسن کی جانب اشارہ کیا۔

کمرے میں باقی کوئی نہیں تھا۔ یہ ویسا ہی کمرہ تھا جیسے کمرے میں مجھے رکھا گیا تھا۔ تاہم یہ رابعہ کا کمرہ نہیں تھا... وہ دائیں جانب تھا۔ چنانچہ یہ محسن یا ڈیڈی میں سے کسی ایک کا کمرہ ہو سکتا تھا۔ اندر کی فضا خود بتاتی تھی کہ یہاں بھی کوئی اسیر تھا۔ کھانے کے برتن جن میں تھوڑا بہت کھایا ہوا کھانا موجود تھا۔ چائے کا کپ، ایک خالی گلاس اور فرش پہ بچھے ہوئے بستر کی شکن آلود چادر۔

"تم آگے چلو۔" میں نے باہر آ کے کہا۔ دوسری جانب وہ کمرہ تھا جس میں رابعہ کو رکھا گیا تھا مگر وہ بھی خالی تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے سراج کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نظر آئی جو میرا مذاق اڑا رہی تھی۔ میں نے اس مسکراہٹ سے مشتعل ہو کے اس پہ حملہ کر دیا۔

"کہاں گئے یہ لوگ؟" میں نے چیخ کر کہا اور اسٹین گن کے بٹ سے سراج کے شانوں پہ اور اس کی پسلیوں پہ وار کیے۔

"میں... میں تو تمہارے ساتھ تھا..." وہ نیچے گر گیا اور بری طرح کراہنے لگا۔

"کیا انہیں ڈلاور اور چیمہ لے گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ نیم مرا ہو کے بولا۔

"معلوم ہے... تم کو سب معلوم ہے۔" میں نے کہا اور اس کو پے در پے ٹھوکریں ماریں۔ وہ ہر ٹھوکر پر دوہرا ہوتا گیا اور ہائے ہائے کرتا گیا۔

"خدا کی قسم... میں... مجھے معلوم نہیں..."

"اب خدا کی قسم کھاتے ہو۔" میں نے اسے اور لاتیں ماریں۔ "جب میں خدا کا نام لیتا تھا تو کیا کہتا تھا... میری کسی قسم پہ اعتبار کیا تھا؟ اپنے الفاظ یاد کرو..." میں نے اسے ایک گالی دی۔

محسن نے یہ سب سنا تھا۔ وہ میرے قریب آ کے بولا۔ "اس کو مارنے سے کیا ملے گا سکندر... اندر سامنے کمرے دیکھ لیجیے۔ ممکن ہے وہ باقی سب کو لے کر نکل گئے ہوں۔"

میں نے محسن کے ساتھ مل کر دوسرے کمروں کا جائزہ لیا۔ سامنے کمرے خالی تھے۔ راجہ، کیتھرین اور استاد ڈیڈی کا کہیں پتا نہ تھا۔ غالباً حالات کا رخ بدلتا دیکھ کے ڈلاور اور چیمہ نے یہاں رکنے کا خطرہ مول نہیں لیا اور فوراً وہاں سے نکل گئے۔ انھوں نے محسوس کیا ہو گا کہ تمام حفاظتی انتظامات کے باوجود نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے تو اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی جزوی شکست مکمل شکست بن جائے۔ ہم سب کو چھڑا لیں اور ان کو قید کر لیں۔ ہماری دسترس سے باہر کسی نامعلوم مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اپنا دباؤ برقرار رکھ سکتے تھے کیونکہ رابعہ، کیتھرین اور ڈیڈی ان کے قبضے میں تھے۔ اپنے ساتھیوں کی سلامتی کو داؤ پر لگا کے ہم کچھ نہیں کر سکتے... یہ بات وہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب یہاں کچھ بھی نہیں تھا تو یہ گارڈز کس کی حفاظت کے لیے موجود تھے۔" میں نے کہا۔

"یہ غالباً سراج اور مسٹر ایکس کو نکال کر لانے کے لیے پیچھے چھوڑ دیے گئے ہوں گے۔" محسن نے کہا۔

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "تم یہاں ٹھہرو... میں دیکھتا ہوں کہ اس آخری دروازے کے پیچھے کیا ہے۔"

"ایسے مت جاؤ سکندر..." محسن نے کہا۔ "کیا معلوم وہاں کے پیچھے وہ کیا جال بچھائے بیٹھے ہوں اور تم سیدھا ان کے ہاتھوں میں پہنچ جاؤ... یا موت کے منہ میں پہنچ جاؤ۔"

"مجھے ایک وہم ہو گیا۔" "تو ٹھیک کہتا ہے... ہو سکتا ہے کہ وہ دروازے کو ٹریپ کر گئے ہوں... اس کے ساتھ کوئی بم وغیرہ لگا گئے ہوں... کہ ادھر ہم دروازہ کھولیں ادھر دھماکا ہو اور سب ختم..." میں نے کہا۔

"ایس پی صاحب کو ضرور معلوم ہو گا۔" محسن نے سراج کی طرف دیکھا جو اب اٹھ بیٹھا تھا مگر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"مجھے... مجھے نہیں معلوم..." وہ چلانے لگا۔

"چلو اٹھو..." محسن نے اس کے سر پر لات ماری۔ "اب دروازہ تم کھولو گے۔ اگر ہم کھولتے تو ہلاک ہو جاتے۔ ایسا انتظام ممکن بھی تھا مگر کیا ایسا انتظام کرنے والوں کو تمہارا خیال نہیں ہو گا؟ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اس میں سے ہم گزرتے۔ تم اور مسٹر ایکس بھی۔ میں قتل کرنے کے بعد یا پھر قیدی بنانے کے بعد۔ کیا بتاتے جاتے انھیں ایس پی صاحب... شکاری جانتے ہیں کہ ایس پی صاحب کو بچ کر نکلنا آتا ہے۔"

"دروازے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف قفل ہے۔" سراج اپنی چوٹوں کو سہلاتے ہوئے کراہ کر کہا۔

پہلے مجھے صرف شبہ تھا اور میرے ذہن میں یہ خیال احتیاط پسندی کے باعث آیا تھا لیکن سراج کے رویے نے خیال کو یقین بنانے میں مدد دی۔ میں نے کہا۔ "اچھا یہ قفل ہے اسے کھولو۔"

"میں... میں کیسے کھولوں..." سراج بولا۔ "میرے پاس اس کی چابی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔ ایس پی صاحب کہتے ہیں کہ میں تالا کیسے کھولوں... ساری عمر ڈاکوؤں کے ساتھ رہے ہیں۔ ان سے تالے کھلوانے کے گر سیکھے ہیں اور ان کی منہ زبانیں کھلواتے رہے ہیں۔ وہ کوئی بچہ تھا کہ ہمارے سامنے جھوٹ بولتے ہیں اور جو کچھ انھوں نے کیا وہ ہماری آنکھ میچ کے ہوتے تالے کھولنے کے لیے کیا۔ اب کہتے ہیں دروازے کا قفل بغیر چابی کے کیسے کھولوں؟" میں نے بڑی بے دردی سے آگے بڑھ کے اسے لات ماری۔ وہ دروازے سے ٹکرایا اور بے حس ہو کر لیٹا رہا۔

"چابیاں اس کے ہاتھ میں تھیں محسن۔" میں نے وہ دو گروہ پڑے ہوئے تختوں میں سے ایک کا ریوالور سراج کی طرف پھینکا... "اگر وہ اس تالے کو ایس پی بہادر... لیکن اپنا ریوالور کا رخ اس کی طرف رکھنا... مجھے ذرا بھی شک ہوا کہ تم پلٹ کر دیکھنا چاہتے ہو تو میں تمہیں چھلنی کر دوں گا۔"

سراج اٹھا تو اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ "تم خود... خود بھی تو یہ کھول سکتے ہو..."

"وقت مت ضائع کرو... ہم یہ کام تمہیں سونپ رہے ہیں۔" محسن بولا۔

سراج نے ریوالور اٹھایا۔ میری ہدایت کے مطابق اس نے ریوالور تھامتے وقت بھی اپنا چہرہ دروازے کی طرف رکھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ وہ چند سیکنڈ تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے جھک کے ریوالور فرش پر رکھ دیا۔

"میں... میرا خیال ہے... کہ تم ٹھیک کہتے ہو..." وہ ہکلایا۔

"ہم کبھی غلط نہیں کہتے تھے۔ اس کا اعتراف ایک دن تم بھی کرو گے۔" میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ یہ وقت ذہن میں آ جانے والے ایک خیال نے ہمیں بچا لیا تھا تو اسے ہماری ذہانت اور عقلمندی بھی کہہ سکتے تھے اور خوش قسمتی بھی لیکن یہ آواز غیب تھی اور تائید ایزدی کے سوا اسے کچھ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

"گویا تم مان رہے ہو کہ دروازے کے قفل میں موت کا جال ہے جو تم پہلے بھول گئے تھے مگر خاموش رہے۔ تم کو یقیناً بہت مایوسی ہوئی ہو گی۔ تمہاری ساری امیدیں اس ٹریپ سے وابستہ ہوں گی۔" محسن بولا۔

ایس پی آگے بڑھا۔ اس نے ڈور لاک کو گھمایا اور چند سیکنڈ خاموش رہا۔ "ڈلاور... میں سراج ہوں... تم سن رہے ہو نا؟"

"کیا بات ہے بتا چکا ایس پی صاحب؟" مخصوص لہجے میں ڈلاور کی آواز سنائی دی۔ کسی بہت چھوٹے سے اسپیکر میں سے نکلنے والی آواز اصل آواز سے بہت مختلف تھی مگر انداز اور لہجہ ڈلاور کا تھا... جیسے کسی طرح کا سکوت... جذبات سے عاری ظاہر ہوا... جیسے طنز اور تمسخر کا انداز لیے ہوئے۔

"میں باہر آنا چاہتا ہوں۔" سراج نے کہا۔

"اچھا؟ اندر بہت گرمی ہے کیا؟" ڈلاور بولا۔

"فضول باتیں مت کرو..."

"لو بھی آپ ہم پہ ناراض ہو... ہم تو آپ کے بھلے کی کہتے ہیں۔ کیا کرو گے آخر باہر آ کے... باہر بڑی کمینی دنیا ہے جس نے آج تک تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اب دوسری دنیا میں ملیں گے اپنے سراج صاحب کیونکہ یہاں سے تو ہم جا چکے ہیں۔" ڈلاور بولا۔

"کہاں جا چکے ہو مجھے چھوڑ کے؟" سراج نروس ہو گیا۔

"اب تمہاری اور ہماری منزل جدا ہے۔ پھر تم کو بتانے سے کیا فائدہ کہ ہم کس راستے پہ جا رہے ہیں۔" ڈلاور ہنسا۔

"میرے احسانات کا اور میری دوستی کا یہ بدلہ دے رہے ہو مجھے۔ تم ایسا نہیں کر سکتے ڈلاور..." سراج نے بے بسی سے کہا۔

"کیوں نہیں کر سکتے بھئی؟" ڈلاور بولا۔ "کیا تم ہمیں روک سکتے ہو؟ اور یہ دوستی اور احسان کی بات تم پہلے بھی کرتے تھے۔ میں نے کتنی بار سمجھایا تھا تم کو کہ ہم سب ایک کاروبار کر رہے ہیں... وہ کاروبار بھی شرافت کا نہیں۔ نقد سودا تھا جس میں نہ کوئی دوستی کا سوال تھا نہ کسی کے احسان کا۔ نہ نیکی کا نہ مروت کا... تمہارے بعد بھی کام کوئی اور کرے گا۔ مروت منہ دیکھے کی بات ہے بازار میں بہت ہیں جو تمہاری طرح بکنے کو تیار ہیں۔ اپنی عزت، شرافت، فرض اور انسانیت کے ساتھ... جیسے مکان بکنے کو تیار ہو تو تمام آسائشوں کے ساتھ زیادہ قیمت ملتی ہے۔ ایسے ہی آدمی کی خدمات کا معاوضہ ادا کیا جاتا ہے تو یہ دیکھ کر کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور کتنا اچھا کر سکتا ہے۔ کون زیادہ سہولتیں اور آسانیاں فراہم کر سکتا ہے۔ تم بھی مجھ سے

www.paksociety.com

نہیں تھے مگر اب جیں ایک ڈی آئی جی مل رہا ہے... اسی مسند پر..."

"دو دو... کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔" سراج نے اچانک خود کو سنبھال لیا۔ "وہ لوگ تہ خانے میں اتر گئے ہیں۔"

"تہ خانے میں اتر گئے ہیں! کیسے؟" دلاور کے لہجے میں تشویش آگئی۔ "ضرور تم نے انھیں راستہ بتایا ہوگا نمک حرام!"

"گالی مت دو... میری جگہ تم ہوتے... تو تم بھی بتا دیتے۔" سراج نے کہا۔

"اتنی سی دیر میں بھول گئے ایس پی بہادر؟" دلاور نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ "شاید انھوں نے صرف گولی مارنے کی دھمکی دی ہوگی اور تمہارا دم نکل گیا ہوگا۔ آخر وہ بھی تو تھا جس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ جان دے سکتا ہے مگر مجرم کے آگے سر نہیں جھکا سکتا۔ اور اس نے ایسا ہی کر کے دکھایا۔"

"ٹھیک ہے... میں اتنا بہادر نہیں ہوں۔" سراج نے جھنجھلا کر کہا۔ "کیا تم اس کی جگہ ہوتے تو اتنی آسانی سے موت قبول کر لیتے؟ کہنا بہت آسان ہے چوہدری دلاور، مگر کرنا بہت مشکل کام ہے... یہ جو تم نے کروڑوں کمائے ہیں کس کے لیے ہیں؟ اتنا خطرہ اور اتنی بدنامی مول لے کر آدمی دولت جمع کرتا ہے زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے... اس لیے نہیں کہ ایک گولی کھائے اور مر جائے۔ عیش کریں وہ جنھوں نے اگلی نسل تک بچائی ہو... جن کو گھر بیٹھے قارون کا خزانہ مل جائے۔ نہیں دلاور ... میں ابھی مرنا پسند نہیں کروں گا۔ جب دولت ہاتھ میں ہو تو دنیا زیادہ... بہت زیادہ خوب صورت لگتی ہے۔"

"اپنے ایس پی صاحب!" دلاور جھنجلایا۔ "کیا موت کو قبول کرنا یا نہ کرنا اپنے اختیار کی بات ہے؟ فرض کرو تم اس وقت جینا تو چاہتے ہو لیکن کیا اپنی مرضی سے جی سکتے ہو؟ وہ راستے تو سب بند ہیں جو زندگی کی طرف جاتے ہیں۔"

"ایسا مت سوچو دلاور... جب کوئی راستہ نہ ہو تب بھی بچنے والے راستہ بنا لیتے ہیں۔" سراج نے خوفناک لہجے میں کہا۔ "میں ابھی زندہ ہوں... میرے جیتے جی یہ دغا بازی نہیں چلے گی۔ ایسی کی تیسی تمہارے اس ڈی آئی جی کی اور تمہاری... تمہارے سارے راستے تو میری نظر میں ہیں۔ کیا وہ ڈی آئی جی تمہیں میری نظر سے چھپا سکتا ہے؟ خود چھپ سکتا ہے؟ یہ میں ہی تھا جس کے ساتھ تم نے ہر راستے پر خود کو محفوظ سمجھا اور دونوں ہاتھوں سے مال سمیٹا۔" سراج نے مشتعل ہو کے کہا۔

"کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" دلاور بولا۔

"ہاں ہاں... کھلی دھمکی دے رہا ہوں... مجھے یہاں پہنچ کے جاؤ اور پھر دیکھو کہ میں کیا کرتا ہوں... تمہاری ساخت ... حاصل ہوئی... تم نے کیا [redacted] سمجھ لیا ہے... سراج ... میں تو موت کا فرشتہ ہوں... جب [redacted] آخری سانس قبض نہیں کر لوں گا چھوڑوں گا نہیں... [redacted]"

سراج نے اسے ایک زبردست گالی دی۔

"ٹھیک ہے اچھے ایس پی صاحب... پھر ہم بھی دیکھ لیں کہ کون کس کی جان قبض کرتا ہے۔" دلاور نے کہا۔

ان کی یہ لڑائی ایک نیا تجربہ تھی۔ اگرچہ پہلے ان کے درمیان کاروباری رقابت کی خلیج آگئی تھی اور دلاور اینڈ کمپنی نے سراج کو سرطان زدہ عضو کی طرح کاٹ کے الگ کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا تو اس صورت حالات سے ہم فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ معلوم نہیں انھوں نے یہ فیصلہ کیوں کیا تھا۔ ممکن ہے سراج سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہوں یا وہ ان کی توقعات پر پورا نہ اترا ہو۔ دلاور جیسے لوگ اپنی مرضی سے راستوں کے کچھ مزدور خریدتے ہیں اور پھر بے خوف ہو کے سفر کرتے ہیں۔ وہ ہر محافظ کی جیب میں مال ڈالتے جاتے ہیں لیکن اسی طرح جیسے کوئی کتے کو ہڈی ڈالتا ہے۔ ہڈی ڈالنے والا کتے سے وفاداری کی توقع تو رکھتا ہی ہے لیکن اسے اپنی اوقات بھی یاد دلاتا رہتا ہے۔ یہ جتاتا رہتا ہے کہ وہ ہڈی پر پلنے والا کتا ہے اور کتے کو کتا ہی رہنا چاہیے۔ ایس پی سراج شاید کتا بن کے رہنا پسند نہیں کرتا ہوگا۔ وہ ایک خود سر، بدمزاج اور مغرور آدمی تھا۔ وہ خود کو دلاور اینڈ کمپنی میں اور بیرونوں کے برابر سمجھتا ہوگا۔ شاید اسی لیے انھوں نے سراج کو چلتا کر کے دوسرے آدمی کو لانے کا بندوبست کر لیا تھا۔ انھیں سراج سے پیچھا چھڑانے کا بہترین موقع ہاتھ آیا تھا۔ وہ اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتے۔

لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سراج پر مسند اللہ کی نگرانی کا علم دوسروں کو بھی ہو گیا ہو۔ سراج اب خفیہ ... میں شامل تھا اور اس کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ ایسے پولیس افسر کا تعاون حاصل کرنے والے بھی خود کو سو فیصد محفوظ نہیں سمجھ سکتے تھے جب کہ وہ اب مشکوک سمجھے جانے لگے تھے۔ سراج کی پوزیشن وہ نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔ اس سے پہلے کہ سراج کی وجہ سے ان پر کوئی مصیبت آتی انھوں نے سراج کا متبادل تلاش کر لیا۔ ایک ایسا آدمی ڈھونڈ نکالا جو ... خوب ... تھا اور زیادہ کارآمد تھا۔ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور انھیں پیسے کی طاقت بھی حاصل تھی۔ معلوم نہیں وہ کون ڈی آئی جی تھا جس نے پوری زندگی ان لوگوں کا ساتھ ... منظور کر لیا تھا۔ دولت کی خاطر اپنے عہدے کی آبرو اور وطن کی عزت کا سودا کر لیا تھا۔ افسوس کی بات ضرور تھی مگر اچنبھے کی نہیں۔ میر جعفر اور میر صادق ہماری تاریخ کے ہر دور میں ... ان کے نام بدل گئے مگر ان سب کا کردار ایک ہی رہا۔ کچھ لوگ آج بے نقاب ہو چکے تھے لیکن بہت سے چہرے ابھی سامنے نہیں آئے تھے۔

سراج اب گالیاں بک رہا تھا کیونکہ دلاور نے سلسلہ گفتگو منقطع کر دیا تھا۔ وہ مائکروفون لفٹ ڈور لاک میں تھا اور وہ اسپیکر میں ... دلاور اور سراج کی دو طرفہ گفتگو جاری تھی۔ ہم یہ تو سمجھ گئے تھے کہ دلاور اور سراج کے درمیان ٹھن گئی ہے مگر ابھی تک ... نہیں کر پائے تھے کہ دلاور کہاں سے بات کر رہا تھا۔ وہ اسی ... کے کسی حصے میں تھا یا کسی دوسری جگہ سے بول رہا تھا۔ ... کتنی دور تھی۔ بظاہر وہ سراج کو جانتے ہوئے زیر زمین تہ خانوں میں مرنے کے لیے چھوڑ گئے تھے اور اگر ان تہ خانوں سے باہر جانے کا راستہ ہوتا تو دلاور یہ ضرور پوچھتا کہ کیا اپنی مرضی سے ... یہ جواب ... دیکھیں اب کون کس کی جان قبض ... ان کی گفتگو سے ہی ہم پر تہ خانوں کی موجودگی کا راز فاش ... ان تہ خانوں میں کیا تھا؟ یہ ابھی ہم نہیں جانتے تھے۔

"اب تم کیا کرو گے سراج؟" میں نے کہا۔ جس پر تحیر تھا ... ہوا سے لگے۔

"میں سب کی ہوا نکال دوں گا۔" سراج نے پلٹ کر کہا۔ "تمہارا دشمن ان کو بہت مہنگی پڑے گی... بہت مہنگی..."

"ہاں... لیکن ٹھیک ہے... تم بھی مرنے کے لیے ان کی دنیا میں پہنچ گئے ہو۔" محسن نے ہنس کر کہا۔ "ابھی تو تم ہمارے ساتھ ہو۔"

"اور تمہاری پوزیشن دھوبی کے کتے جیسی ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "نہ دوست تمہارے ہیں نہ دشمن... تمہارے لیے اندر اور باہر موت ہے اور وہ بھی بے موت کی موت نہیں۔"

"دیکھو... یہ ٹھیک ہے کہ تم میرے دشمن ہو... میں نے تم سے رعایت نہیں کی... تم کو جس حد تک ذلیل کر سکتا تھا ... تمہارے باپ کو سخت نے مخت بنایا اور... مجھے اختیار ... تم کو کتے کی موت مارتا۔" سراج نے کہا۔ "اگر تم کو موقع ملے ... تم بھی ... نہیں کرو گے۔"

"یہ وعدہ تو ہم کر چکے ہیں۔"

"ہاں، مگر تمہاری اور میری مجبوری ایک ہی ہے۔" سراج بولا۔ "اور وہ ہے جینے کی مجبوری... دوستی اور دشمنی کے رشتے سب ... زندہ رہو گے تو اپنا وعدہ پورا کر دو گے۔ باہر ... کوئی تیر مارو گے۔ نہ نکلے تو یہیں مر جاؤ گے۔ میں تم کو باہر ... لے جا سکتا ہوں۔"

"کس شرط پر؟" میں نے کہا۔

"شرط یہی ہے کہ باہر نکلنے کے بعد تم مجھے ایک موقع دو گے۔" سراج بولا۔ "میں تم کو جینے کا ایک موقع دوں گا۔ اس کے بدلے میں تم مجھے جینے کا ایک موقع دو گے۔ ہم اپنے اپنے راستوں پر چلے جائیں گے۔ ہم دوست نہیں ہوں گے... دشمن ہی رہیں گے مگر دشمنی اس کے بعد شروع ہوگی۔ ہمارے راستے دو ہیں اور منزل وہی ہے۔ منزل تک پہنچنے کا مقصد الگ ہے۔ ہم ابھی راستوں پر چل نہیں سکتے۔ تب تک کے لیے تم کو میری اور مجھ کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں تم کو باہر پہنچا دوں گا۔ بس تم وعدہ کرو کہ تم میری پیٹھ میں گولی نہیں مارو گے... مجھے جانے دو گے... یہ وعدہ میں کسی دشمن سے نہیں، وزیر خان کے بیٹے سکندر بخت سے چاہتا ہوں۔"

"جب میں نے تمہاری ماں کا نام لے کر تمہاری منت کی تھی تو تم نے کیا جواب دیا تھا؟" میں نے کہا۔

"جو کچھ ہو چکا میں اس سے انکار نہیں کر رہا ہوں... اور نہ تم سے رحم کی درخواست کر رہا ہوں۔ نہ تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔ وقت ضائع مت کرو... مرنا ہے تو آسان راستہ اختیار کرو... پہلے مجھے گولی مارو اور پھر خود کو مار لو... یہاں بھوکے پیاسے تڑپ تڑپ کر مرنے سے کیا فائدہ... یہاں کوئی نہیں آئے گا... کم سے کم ایک ہفتے تک... تم ان ویران کمروں میں پیچھے پھرو... دیواروں سے سر ٹکراؤ یا دروازے سے باہر نکلنا تمہارے لیے ناممکن ہے۔ اگر زندہ رہنا ہے تو مجھ سے اپنے باپ کے خون کی قسم کھا کے وعدہ کرو کہ میں نے تمہیں باہر نکال لیا تو تم یہ تمیز کئے بغیر چلے جاؤ گے اور مجھے قید کر کے بھی نہیں لے جاؤ گے... تم مجھے اتنی مہلت دو گے کہ میں تمہاری نظروں سے اوجھل ہو جاؤں... کم سے کم ایک گھنٹے تک تم میرے پیچھے نہیں آؤ گے۔ تم اگر مخالف سمت میں جانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ اب زیادہ بے خوفی سے اور زیادہ اعتماد سے بات کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے ایس پی صاحب!" میں نے کہا۔ "مجھے یہ شرط منظور ہے۔ میں اپنے والد مرحوم وزیر خان کے خون ناحق کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اس تہ خانے سے نکلنے پر تم کو زندہ رہنے کا ایک موقع دوں گا۔ ایک مجبوری کے تحت میں تم سے اشتراک کر رہا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ ہم دشمن نہیں رہے... میرے باپ کو قتل کرنے والوں میں تم بھی ہو... یہ میری اور تمہاری ذاتی دشمنی ہے۔ میں اپنا انتقام خدا پہ بھی چھوڑ سکتا ہوں لیکن تم کو وطن دشمنی کے جرم پر معاف نہیں کر سکتا۔"

"اچھا...؟" وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ "تم ذاتی عداوت کے جذبات کو بھول سکتے ہو؟ کیسے...؟"

www.paksociety.com

"میں اس کے جواب میں تم کو ایک مشہور واقعہ سناؤں گا۔" میں نے کہا۔ "جو شاید تم نے سنا ہو۔ ایک یہودی کو حضرت علیؓ نے میدانِ جنگ میں زیر کر لیا جب آپ خنجر سے اس کے سر کو تن سے جدا کرنے والے تھے تو اس نے آپؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ آپؓ نے خنجر کے وار کو روک لیا اور اسے بخش دیا۔ یہ فرماتے ہوئے کہ پہلے میرے اور تیرے درمیان راہِ خدا میں جنگ تھی۔ اب میں نے تجھے قتل کیا تو سمجھا جائے گا کہ میں نے ذاتی توہین کا بدلہ لیا... تو ایس پی سراج صاحب... خدا اور اس کے رسولؐ نے عفو و درگزر کو سب سے بہتر مقام قرار دیا ہے۔ وہ وقت گزر گیا جب... میں جذبات کی رو میں بہہ کر ان سب کا خون پی جانا چاہتا تھا جو میرے باپ کے قاتل تھے یا ان کے قتل میں شریک تھے یا اس کے ذمے دار تھے۔ اب یہ جنگ وہی ہے جو حق و باطل کی جنگ سمجھی جا سکتی ہے۔ تم میرے وطن... میرے عقیدے... میرے کردار اور ہم وطن مسلمانوں کی نظریاتی اساس کے دشمن ہو تو میں تمہارا دشمن ہوں اور تم میرے نزدیک واجب القتل ہو۔"

"اور اگر... اگر میں تائب ہونا چاہوں... تو؟" وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔

"تم... تم تائب ہو کے کیا کرو گے اب؟" میں نے چونک کر کہا۔

"کیوں... کیا توبہ کے دروازے بند بھی ہوتے ہیں؟" وہ بولا۔

"نہیں... مجھے... مجھے نہیں معلوم... کہ تمہاری نیت کیا ہے... اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو... یا کہنا چاہتے ہو اس کے پس منظر میں کیا ہے۔ یاد رکھو مرتے وقت کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ مگر خوف اور مجبوری میں توبہ کی سوچ بھی توبہ ہے... لیکن فیصلہ کرنے والا میں نہیں ہوں۔ وقت ہے... یہاں اس موضوع پر بات کرنے کا کیا فائدہ... ہم تمہاری کسی بات پر اعتبار کرنے والے نہیں۔ آئندہ جو کچھ ہوگا وہ دوسری بات ہے۔ ابھی تو ہمارے درمیان ایک وقتی معاہدہ ہوا ہے۔ تم ہمیں باہر لے چلو... ہم تم کو جانے دیں گے آئندہ کبھی سامنا ہوا تو دوست ہوں گے یا دشمن اس کی بات کرنا ابھی بے کار ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے سر ہلایا اور واپس چل پڑا۔ میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر بھی ایک خفیف مسکراہٹ تھی۔ کیا ایسا ہوگا کہ سراج تائب ہو جائے گا؟ آدمی ٹھوکر کھا کے ہی سنبھلتا ہے۔ اور صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ ویسے بھی ممکن ہے سراج کو اب بھی یہ احساس ہو جائے کہ جس راستے پر وہ چل رہا تھا وہ غلط تھا تو بلاشبہ وہ آئندہ زندگی کے لیے صراطِ مستقیم کا انتخاب کر سکتا ہے۔ وہ سابقہ غلطیوں کی تلافی کر سکتا ہے۔ معافی مانگ سکتا ہے۔ باقی عمر نیکیاں کما کے وہ گناہ اور ثواب کے حساب برابر کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اب تک وہ فرض سے بیگانہ تھا وہ اپنے فرض کو پہچان لے تو ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے چور اگر پہرے دار ہو جائے اور کوتوال بن جائے تو سب چوروں کو پکڑ سکتا ہے کیونکہ وہ سب کو پہچانتا ہے اور سب کے ٹھکانے جانتا ہے۔ ایک ایس پی اگر راتوں رات انتقامی کارروائی کا شکار ہو جائے تو ہمیں وہ سب معلومات فراہم کر سکتا ہے جو ہمارے لیے مشکل ہوں۔ جو وہ اندر کے سب لوگوں کو پہچانتا تھا۔ سب خفیہ ... سے واقف تھا۔ اسے ان سے دغا کی امید نہ تھی جن کا وہ سب سے بڑا معاون تھا۔ اب وہ ان کی دشمنی مول لینے کی پوزیشن میں تھا۔ اس نے بہت دولت کمالی تھی مگر آج دولت کمانے کے جنون سے پیدا شدہ ... واضح ہوا تھا کہ وہ دھوبی کا کتا ہے نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ اسے مزید دولت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ایماندار افسر بن کر اپنی ذات پر آنے والے شک کے سائے سے بھی بچ سکتا تھا۔ افسرانِ بالا کی نظر میں نیک نام ہو سکتا تھا۔ یہ ثابت کر سکتا تھا کہ اس کے خلاف الزامات بے بنیاد تھے۔ وہ اپنے ضمیر کی تسکین کا سامان بھی حاصل کر سکتا تھا۔ میرے خیال میں سراج کے لیے گھاٹے کا سودا نہیں تھا اور اگر وہ سچ مچ ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہو جاتا تو میں اس کے سارے قصور معاف کر سکتا تھا۔ وہ سب کڑیاں جوڑ سکتا تھا جو اس نے میرے ساتھ کی تھیں۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے جو کچھ میں سوچ رہا تھا شاید وہی محسن بھی سوچ رہا تھا۔ یہ خوب صورت بھی ایک بہت بڑے انقلاب کی علامت تھی۔ ... نے سراج کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا اور اس کی موت سے پہلے کسی اور کو سراج کی جگہ مقصود تھی تو یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ مگر دشمن اگر ایسی غلطیاں نہ کرے تو ثابت کیسے ہو کہ اس کا مالک "مولا" راہبر اور رہنما شیطان تھا۔

سراج آخری کمرے کے دروازے سے گزر گیا۔ اس کمرے میں مجھے رکھا گیا تھا۔ آگے راہداری بند تھی اور مجھے اپنے سامنے ایک سپاٹ دیوار نظر آ رہی تھی۔

"کیا تم اس دیوار کو توڑ سکتے ہو؟" سراج نے کہا۔ "یہ کوئی بہت مضبوط دیوار نہیں ہے۔ ایک اینٹ کی کھڑی چنائی ہے۔"

"اس دیوار کے پیچھے کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کے پیچھے ایک کچی پہاڑی ہے۔ مٹی کنکر پتھر کی دیوار ہے۔" وہ بولا۔ "اس سے یہ دیوار ملی ہوئی ہے مگر بیچ میں تھوڑا بہت خلا ضرور ہوگا۔ یہ عمارت کا آخری حصہ ہے۔ باقی عمارت آدھی تک چھت کے نیچے ہے اور اس کے اوپر مٹی ہے اور جھاڑیاں ہیں۔ باہر سے یہ عمارت نظر نہیں آتی لیکن میں نے نقشہ دیکھا تھا۔ تو اس دیوار سے ملی ہوئی پہاڑی تھی۔ اگر تم دیوار کے اوپر والے حصے میں شگاف ڈالو تو اینٹوں کے ساتھ ہی ریت اور کنکر اندر گریں گے۔ ایک شگاف ہو جائے تو مزید اینٹیں نکالنا مشکل نہیں ہوگا۔ تین اینٹوں کا راستہ بنانے کے بعد اوپر کی جانب سے زمین کھودنا پڑے گی۔ بھربھری مٹی ہے۔ خود ہی شگاف سے اندر گرتی جائے گی۔ میرا خیال ہے تین چار فٹ کھدائی کے بعد ہم باہر ہوں گے۔"

"اور اگر اوپر بیس پچیس یا تیس چالیس فٹ تک پہاڑی ہوئی۔ بھربھری کنکر پتھر والی مٹی نہ ہوئی۔ کوئی چٹان آ گئی تو؟" میں نے کہا۔

"بلندی کے بارے میں تو مجھے معلوم ہے کہ اس کنارے پہاڑی کی اونچائی زیادہ نہیں ہے کیونکہ یہ پہاڑی کا کنارا ہے۔ درمیان میں سے اس کی اونچائی چالیس پچاس فٹ ہوگی مگر یہاں نہیں۔ تاہم میرا اندازہ ہے کہ پانچ فٹ سے زیادہ مٹی نہیں ہوگی۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ بیچ میں چٹان ہوگی یا نہیں کیونکہ میں نے پہاڑی کو صرف اوپر سے دیکھا تھا۔" سراج نے کہا۔

"کیوں دیکھا تھا؟" محسن نے کہا۔ "تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمہیں بھی کسی دن اسی طرح قید ہو جانے کا ڈر تھا۔"

"میں نے اور ... نے اس زیرِ زمین عمارت کا ہر طرف سے جائزہ لیا تھا۔ یہ دیکھا تھا کہ کوئی اندر پہنچ سکتا ہے تو کس طرف سے اور اندر سے باہر نکلنا چاہے تو کیسے نکلے گا۔ اس وقت ... نے تھوڑی سی تشویش کا اظہار کیا تھا کہ ادھر سے دیوار کا اوپر کا کنارا پہاڑی کے نیچے آ گیا ہے اور پہاڑی کچی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ادھر تھوڑا سا سیمنٹ اور کنکریٹ بچھا دینا چاہیے۔ مگر بعد میں اس موضوع پر بات نہیں ہوئی اور وہ خود بھی بھول گیا۔" سراج نے کہا۔

"ٹھیک ہے... ہم کوشش ضرور کریں گے۔" میں نے کہا۔ "مگر ہمارے پاس کھودنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"اس عمارت میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔" محسن بولا۔ "وہ بند ہیں... ہم سب نے وہ جگہ بھی دیکھی ہے۔"

"وہ... اس کا راستہ ادھر سے نہیں ہے۔" سراج نے وضاحت شروع کر دی۔ "باہر والا دروازہ کھل سکتا تو ہم آگے ... تک پہنچ سکتے تھے۔ وہاں سب مل سکتا تھا مگر دروازے کو کھولا نہیں جا سکتا اور یہ سب کرنے کا فائدہ نہیں۔"

"چلو ہم اسٹین گن کا استعمال کریں گے۔" میں نے کہا۔ "کام کی بنیاد ... تم میرے کندھوں پر چڑھ کے اوپر والے حصے کی اینٹیں نکالو گے۔ تمہارے پاس خالی اسٹین گن ہوگی۔ بھری ہوئی اسٹین گن سے محسن کھڑا رہے گا۔ پھر میری جگہ تم ہو گے اور محسن تمہارے کندھوں پر چڑھ کے باقی کام کرے گا۔ بھری ہوئی اسٹین گن میرے ہاتھ میں رہے گی۔"

"اپنے اطمینان کے لیے تم کچھ بھی کرو... مجھے اعتراض نہیں لیکن وقت ضائع مت کرو۔" سراج بولا۔ "ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ نکل جائیں۔"

"کہاں؟ وہ نکل کے کہاں جائیں گے؟" میں نے کہا۔

"ایسے کیا بتاؤں۔ ان کے کئی ٹھکانے ہیں۔" وہ بولا۔

"تم نے تہ خانوں کا ذکر بھی کیا تھا۔" محسن بولا۔

"تہ خانوں کے چکر میں پڑو گے تو وہ تمہارے ساتھیوں سمیت غائب ہو جائیں گے اور پھر تم کو نہ جانے کب تک بھٹکنا پڑے گا۔" وہ بولا۔

"تم یہ تو بتا سکتے ہو کہ ان تہ خانوں میں کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... اسلحہ ہے۔" وہ بولا۔ "فیصلہ کر لو کہ تہ خانے دیکھو گے یا باہر نکل کے ... کا راستہ روکو گے۔"

"کیا ہم ان کا راستہ روک سکتے ہیں؟" محسن بولا۔ "میرا خیال ہے کہ براہِ راست مقابلہ مشکل ہوگا۔ اور شاید سود مند بھی نہ ہو۔ ہم ان کے تعاقب میں بھی جا سکتے ہیں... تمہیں تو ان کے سارے ٹھکانے معلوم ہیں۔"

"لیکن... میں تم کو مرشد کے ٹھکانے تک کیسے لے جا سکتا ہوں۔ باہر نکلنے کے بعد میرے اور تمہارے راستے الگ ہوں گے۔" سراج نے کہا۔

"میرا اور تمہارا راستہ ایک ہی ہوگا ایس پی صاحب... تم خود مجھے اپنے ساتھ لے کر جاؤ گے... تم جانتے ہو وہ کہاں جائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"تم... تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" سراج نے خوف اور مایوسی کے ساتھ کہا۔ "کیا تمہاری کوئی بھی قسم اعتبار کے قابل نہیں؟"

"قسم میں نے نہیں کھائی تھی سراج... سکندر اپنے وعدے پر قائم رہے گا۔" محسن بولا۔ "وہ تمہارے پیچھے نہیں جائے گا لیکن میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ میں نے تم سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا کوئی قسم نہیں کھائی۔"

سراج کو احساس ہوا کہ وہ خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گیا ہے۔ سراج سے غیر ارادی طور پر ایک چوک ہو گئی تھی۔ اس نے میرے وعدے کو ایک اجتماعی وعدہ سمجھ لیا تھا اور یہ فرض کر لیا تھا کہ میں نے قسم کھائی ہے تو اس کا پابند محسن بھی ہوگا۔ اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا کہ محسن سے بھی حلف اٹھوائے۔ باہر نکلنے کا راستہ معلوم ہو چکا تھا اور وہ ہمیں روک نہیں سکتا تھا لیکن باہر جانے کے بعد قسم کا پابند صرف میں تھا۔ میں نے اپنے باپ کے خونِ ناحق کی قسم کھائی تھی

www.paksociety.com

اور یہ ہرگز نہیں کہہ رہا تھا کہ محسن یا میرا کوئی ساتھی بھی سراج کے تعاقب میں نہیں جائے گا۔

"محسن ٹھیک کہہ رہا ہے سراج! یاد کرو تمہارے الفاظ کیا تھے؟ میں نے کہا تھا" تم نے کہا تھا کہ میں وزیر خان کے بیٹے سکندر بخت سے جو وعدہ چاہتا ہوں اور وعدہ صرف میں نے کیا تھا۔ میں نے ایک بار بھی ہم کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ میری قسم کا پابند محسن نہیں ہے؟"

"تم دھوکے سے ایسا کر رہے ہو۔" سراج بگڑ گیا۔

"اول تو یہ دھوکا ہے نہیں، یہ تمہاری غلط فہمی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد یہ مان لیا جائے کہ یہ دھوکا ہوا تو اس میں بھی کوئی بری بات نہیں کیونکہ جنگ میں سب جائز ہے۔ تم خود بھی دھوکا دیتے آئے ہو۔ تم حکومت کو دھوکا دیتے رہے ہو۔ اس ملک کے رہنے والوں کو دھوکا دیتے رہے ہو اور ان کے اعتماد کو دھوکا دے رہے ہو۔ جو سب کو دھوکا دے رہا ہو اس کے ساتھ دھوکا کیوں نہ کیا جائے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا...!"

"میں... میں نے سوچا تھا کہ تمہاری مدد کروں گا... تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"مجھے اس پر اعتبار نہیں تھا۔ تمہارا ایسا کہنا بھی دھوکا ہو سکتا تھا۔" محسن نے کہا۔ "اور اسی لیے میں طے کر چکا تھا کہ اگر تم نے مجھ سے قسم کھانے کو کہا تو میں انکار کر دوں گا۔ یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ تم ہمارا ساتھ محض کیوں سوچ رہے تھے؟ اس لیے کہ اب تک تم جن کا ساتھ دیتے آ رہے تھے انھوں نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اب تم ان کے پاس جاؤ گے تو وہ تم کو دھتکار دیں گے۔ ان سے دشمنی کرو گے تو کس برتے پر... تم ان کی طاقت کو جانتے ہو... وہ تمہیں عہدے سے ہٹوا سکتے ہیں، گرفتار کروا سکتے ہیں، پھانسی تک کروا سکتے ہیں۔ تم ہمارا ساتھ دینے پر اس لیے تیار ہوئے تھے کہ اب تم نے انھیں اپنا دشمن مان لیا ہے اور ان کے خلاف تم کو ہماری مدد کی ضرورت تھی۔ تم ذاتی انتقام کے لیے ہمیں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ہم تو پہلے ہی ان کو نیست و نابود کرنے پر کمر بستہ ہیں۔ یہی تمہاری خواہش بھی ہے۔ چنانچہ تم ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ ایک طرف نیکی کما کے افسرانِ بالا کا یہ شبہ دور کر دو کہ تم ملک دشمن عناصر سے ملے ہوئے تھے اور دوسری طرف دغا دینے والوں کو عبرت ناک سبق دو... یہ ثابت ہو جائے کہ تم تو بہت ہی ایماندار اور فرض شناس افسر ہو، تمہاری نشاندہی پر ملک دشمن افراد کی طاقت کا شیرازہ بکھر گیا۔ یوں مال حرام تم نے اب تک کمایا ہے وہ کوئی نہ دیکھے اور تم نیک نامی بھی کما لو۔"

میں حیرت سے محسن کو دیکھ رہا۔ اس نے سراج کی نیت کا بالکل صحیح تجزیہ کیا تھا اور اس نے وہی سمجھا تھا جو میں نے سمجھا تھا۔ اس نے سراج کو آئینہ دکھا دیا تھا اور سراج میں ہمت نہ تھی کہ نظر اٹھا سکے۔ اس نے پھر مزید بحث نہیں کی اور خاموشی سے ہمارے ساتھ تعاون کرنے لگا۔ اس کے بیان کے مطابق ہمیں دیوار کے اوپر والے حصے کی اینٹیں نکال کر راستہ بنانے میں کچھ زیادہ دشواری نہ ہوئی۔ اندر کی طرف گرنے والی بھربھری مٹی ایک ڈھیر کی شکل میں نیچے جمع ہو گئی تھی۔

"ہم پہلے تہ خانے دیکھیں گے... بلکہ... پہلے میں ہی تہ خانہ دیکھوں گا۔" محسن کچھ دیر بعد بولا۔ "سکندر باہر جائے گا اور باہر ہی جا کر انتظار کرے گا۔"

"نہیں، میں بھی تہ خانے میں ساتھ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اپنی قسم کے مطابق میں نے باہر نکلنے کے بعد سراج کے پیچھے نہ جانے کا عہد کیا تھا۔ یہ وعدہ اندر کے لیے نہیں تھا۔ پہلے ہم تہ خانے دیکھ آئیں پھر باہر جا کے کیا کرنا ہے یہ سوچیں گے۔"

سراج کو اگر اپنی زندگی سے اتنا پیار نہ ہوتا تو وہ اتنا بزدل نہ ہوتا اور اتنی آسانی سے ہماری بات نہ مانتا۔ مگر اس کی کمائی ختم ہو چکی تھی مگر زندہ رہنے کی مجبوری اب بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ واپس چل پڑا۔

"میں کچھ بھول گیا۔" سراج نے اچانک ایک ہاتھ ماتھے پر رکھ لیا۔

"کیا بھول گئے ہو؟" میں نے کہا۔

"وہی... تہ خانے کا راستہ..." سراج نے کہا۔ "دراصل میں ایک ہی بار نیچے گیا تھا... اور اس وقت دلاور آگے تھا، میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔"

"کیا دلاور نے دھیان دینے سے منع کر دیا تھا؟" میں نے طنز سے کہا۔ "تم جو اب تک تو مطیع و فرمانبردار حکم کے غلام تھے... کمال کیا تھا، آپ مائی باپ اگر آپ نہیں چاہتے تو ہم دھیان نہیں دیں گے۔"

"نہیں... میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔" سراج نے باری باری مجھے اور محسن کو دیکھا... وہ اپنی بات کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔

"خوب، آپ کسی اور کے بارے میں سوچ رہے تھے۔" محسن نے کہا۔ "غالباً اپنی محبوبہ یا منگیتر کے بارے میں کہ آپ کی وفات حسرت آیات کے بعد وہ کس کے پاس جائے گی بہتر ہو گا آپ یہ بعد میں سوچیں۔"

"تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں۔" سراج نے کہا۔ "تہ خانے میں بہت دیر لگ جائے گی۔ اس کا راستہ تلاش کرنا پڑے گا اور پھر نیچے جاتے آتے میں مزید وقت لگے گا... ایسا نہ ہو کہ اتنی دیر میں کوئی اوپر آ کے وہ راستہ دیکھ لے... جو ہم نے بنا لیا ہے۔"

صاف ظاہر تھا کہ سراج ہمیں تہ خانے میں لے جانے سے

گریز کر رہا ہے۔ اس نے پہلے راستہ معلوم نہ ہونے کا بہانہ کیا پھر تاخیر کے نتائج سے ڈرایا۔ سراج کو اس تجویز کی بالکل توقع نہ تھی جو میں نے ایک دم اس کے منہ پر الٹے ہاتھ سے رسید کیا۔

"یہ حقیقت رہنے دو یہیں سراج!" میں نے کہا۔ "آفتاب اس وقت تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ تہ خانے کا راستہ ہم تم سے ہی پوچھیں گے اور جس وقت تک تم انکار پر قائم رہو گے تو خود دریافت کر لیں گے۔"

"نہیں اب کوئی جلدی نہیں ہے۔" محسن نے تائید میں سر ہلایا۔ سراج کا ایک ہونٹ کٹ گیا تھا۔ اس نے آستین سے لب صاف کیے۔ "تم یہ بھی نہیں سوچتے کہ اتنی دیر میں وہ بہت دور نکل جائیں گے... رابعہ کے ساتھ..."

"یہ ہم بعد میں پوچھیں گے کہ وہ رابعہ کو کہاں لے گئے ہیں اور تم ہی ہماری رہنمائی اس ٹھکانے تک بھی کرو گے۔ فی الحال خیریت چاہتے ہو تو تہ خانے کی طرف چلو۔" میں نے کہا۔ "رابعہ خدانخواستہ... ہے؟"

"میں... میں ایسا نہیں کر سکتا..." سراج نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "تم اس ذخیرے کو تباہ کر دو گے... اور وہ اس کا ذمے دار مجھے سمجھیں گے... اور اس کی سزا بہت سخت دیں گے۔"

"کیا تم پاگل ہو؟" میں نے کہا۔ "وہ تم کو بھاگتے ساتھیوں کی طرح چھوڑ گئے... وہ تم کو مردہ سمجھ کے بھول چکے ہیں۔ تم اب ان کے ساتھ نہیں ہو... تمہاری جگہ کسی اور کو تعینات کر دیا گیا ہے۔ اس سے بڑی سزا اور کیا ہو گی؟"

"کیا تم نہیں جانتے دوسری موت بہت کم سزا ہوتی ہے۔ یہ سزا صرف ایک آدمی کو ملتی ہے اور موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے جب اسے سخت ترین سزا دینی ہو تو موت نہیں دیا جاتا۔ تجھے یاد ہوگا ایسا وقت نہیں آیا تھا جب تم نے موت کی آرزو کی تھی۔ اس لیے کہ موت اس عذاب کے مقابلے میں بہت کم تر تھی جو تم جھیل رہے تھے۔ موت تمہاری نجات کا ذریعہ بن سکتی تھی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دلاور اینڈ کمپنی نے اگر سراج کو الگ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو یہ واقعی ان کی مہربانی تھی کہ وہ سراج کے لیے عذابِ موت کا انتظام کر کے چلے گئے تھے۔ سراج کا وجود ان کے لیے غیر ضروری ہو گیا تھا مگر ابھی تک اس کی وجہ سے نقصان نہیں ہوا تھا مگر اس نقصان سے بچنے کے لیے انھوں نے پہلے ہی بندوبست کر لیا تھا۔ اگر اس کی بے وقوفی یا غداری کا ثبوت مل جاتا یا پتا چل جاتا کہ سراج نے جانتے بوجھتے ان کو نقصان پہنچانے والوں کا ساتھ دیا تھا تو یقیناً اس کی سزا زیادہ سخت ہوتی۔ اس

کی موت زیادہ سخت ہوتی۔ مرتا تو آدمی ایک ہی بار ہے مگر اس کے لیے ذہنی اور جسمانی اذیت کو طول دیا جا سکتا ہے۔ اسے تھوڑا تھوڑا کر کے قتل کیا جا سکتا ہے، ایک ہفتہ یا ایک مہینے یا ایک سال تک موت کے کرب میں معلق رکھا جا سکتا ہے۔ اور اس عرصے میں وہ دیکھ سکتا ہے کہ اس کی غلطی کی سزا وہ بھی پا رہے ہیں جن سے وہ محبت کرتا تھا، جن کے لیے وہ ایک خراش بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"میں سمجھ گیا سراج..." میں نے کہا۔ "لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب آدمی چوروں کا ساتھ دیتا ہے تو اسے ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وہ پکڑا گیا تو خواہ اس نے پہلی واردات کے مالِ غنیمت میں سے پھوٹی کوڑی نہ لی ہو اسے ان سب کے برابر سزا ملے گی جو پہلے سے وارداتیں کرتے رہے تھے۔ مگر ان کی خوش قسمتی تھی کہ پکڑے نہیں گئے تھے۔ پہلی بار ساتھ دینے والا بدقسمت بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھ تمام سابقہ جرائم کی سزا پائے اور ہاتھ کچھ نہ آئے... قتل کرنے والا اگر خنجر نکالنے سے پہلے یا گولی چلانے سے پہلے اس شخص کے بارے میں سوچ لے جو موت کے اندھے کنویں میں پھانسی کے پھندے سے لٹکا ہوا ایڑیاں رگڑ رہا ہو اور فرشتۂ اجل کے سوا اس کی مدد کوئی نہ کر سکتا ہو... تو شاید وہ ہاتھ روک لے... مگر ایسا نہیں ہوتا اور اسی کے پیچھے آنے والے ورثا: بیوی بچے اور بوڑھے ماں باپ... آخری ملاقات کے لیے لائے جاتے ہیں اور پھر صبح دم طلوعِ آفتاب سے قبل اس کی لاش لینے جیل کے دروازے پر جمع ہوتے ہیں... تم نے وہ سب کچھ دیکھا جو تمہارے اور محسن کے ساتھ ہوا۔ مگر اس وقت تم کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہی سب کچھ تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تمہیں یہ ڈر ہوتا تو کیا تم وہ سب کرتے جو تم نے کیا تھا؟"

"اب تم بھی ان کے لیے دشمن ہو... تمہاری پوزیشن ابھی تک وہ نہیں جو ہماری ہے... لیکن ہو جائے گی... تم اس سے بچ نہیں سکتے۔" محسن نے کہا۔ "ہم نے تو اپنا عذاب کاٹ لیا۔ یہ عذاب ہمارے لیے غیر متوقع تھا اس لیے ہم ڈرے نہیں۔ تمہارے لیے یہی عذاب تم کو ڈرا رہا ہے اور تم اس لیے خوفزدہ ہو کہ تم نے ہمیں عذاب میں دیکھا ہے۔"

"یوں سمجھو کہ تم نے ایک شخص کو پھانسی پاتے دیکھا تھا اور اس وقت تم جیلر تھے یا پولیس والے تھے۔" میں نے کہا۔ "اب اس نادیدہ ہستی کی قدرت نے جو انسانوں کی تقدیر کے فیصلے لکھتی ہے خود تم کو تختۂ دار پر لٹکا دیا ہے۔ مگر کیا تم نوشتۂ تقدیر کو مٹا سکتے ہو؟"

www.paksociety.com

"ہم لوگ... تم لوگ مجھے بچا سکتے ہو۔" وہ لجاجت سے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ "مجھے تھانے نہ لے جاؤ۔ میں مجبور تھا۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا، میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "صرف ہاتھ جوڑ دینے سے کسی غلطی کی تلافی نہیں ہوتی... تم تو قانون کو سمجھتے ہو... اس پر عمل کراتے ہو۔ اگر تم کسی چور کو یا ڈاکو اور قاتل کو ارتکاب جرم کے وقت گرفتار کر لو تو کیا اس کو ہاتھ جوڑنے پر معاف کر دو گے؟ جسے تم اپنی غلطی کہہ رہے ہو وہ غلطی نہیں تھی سنگین ترین جرم تھا۔ غداری سے بڑا جرم ملک کے قانون کے تحت اور کیا ہو گا ایس پی صاحب؟"

"تاہم تمہاری مدد کی جا سکتی ہے۔" محسن بولا۔ "قانون میں ایک شق وعدہ معاف گواہ کے لیے خصوصی رعایت کی ہوتی ہے۔ وہ باقی مجرموں کے خلاف ٹھوس شہادت دے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچانے میں قانون کا معاون ہو تو اس کی سزا بہت کم یا بالکل ختم بھی ہو جاتی ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ ملک کا قانون اندھا ہے، ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا کیونکہ اس قانون کے ہاتھ مضبوط کرنے والے تم جیسے تھے مگر تم نے قانون کے ہاتھ کاٹ دیے تھے۔ اب قانون ہم ہیں۔ قانون وہ ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم خود مدعی ہیں، خود منصف اور خود ہی سزا پر عمل درآمد کرنے والے۔ اب یہ پی پی سی یا ضابطہ فوجداری پاکستان کی کسی دفعہ کے تحت چلایا جانے والا مقدمہ نہیں ہو گا۔ یہ ایم آر ایس کے وضع کردہ قانون انصاف کے مطابق چلے گا اور تم یہ کر سکتے ہو کہ وعدہ معاف گواہ کی طرح اصل مجرموں کے خلاف ایم آر ایس کی عدالت میں بیان دو، گواہی دو اور ثبوت پیش کرو۔"

میں نے تعریفی نظروں سے محسن کی طرف دیکھا۔ اس نے بہت واضح الفاظ میں سراج کے سامنے ایک متبادل راستہ رکھ دیا تھا۔ سراج خلا میں گھور رہا تھا۔ اس کا ذہن کسی فیصلے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ محفوظ وہ کسی طرح بھی نہیں۔ اگر اس نے ہماری بات نہ مانی تو ہم اسے بخشنے والے نہیں۔ اگر اس نے ہمارا ساتھ دیا تو دلاور بیگ بھی اسے بخشنے والا نہیں۔ آگے کنواں پیچھے کھائی۔ وہ نہ آگے جا سکتا تھا نہ پیچھے۔

"تم جانتے ہو ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر تم نے فوراً فیصلہ نہ کیا تو پھر ہم کوئی فیصلہ کریں گے۔" محسن بولا۔

سراج نے آہستہ سے سر ہلایا اور آگے بڑھا۔ بظاہر وہاں ایسی کوئی علامت نہیں تھی جس سے ہم کچھ اندازہ کر سکتے۔ محسن نے بتایا تھا کہ دلاور کے کمرے میں جو روشن دان ہے اس کے ساتھ ہی مسٹر ایکس کا کمرہ ہے یا کوئی آفس ہے جہاں ہونے والی گفتگو دلاور کو سنائی دیتی تھی۔ اب سراج اسی کمرے میں کھڑا ہوا تھا اور روشن دان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے دیوار کو کھرچنا شروع کیا۔ دیوار کا رنگ اکھڑنے لگا۔ سراج نے عین روشن دان کے نیچے سے رنگ اتارنا شروع کیا اور رنگ کے بڑے بڑے چھلکے اور پپڑیاں نیچے گرنے لگے۔ اس رنگ کے نیچے بھی مختلف رنگ نہیں تھا مگر رنگ کی اوپر والی تہ کچھ میلی پڑ گئی تھی چنانچہ نیچے سے نمایاں ہونے والا رنگ نیا اور گہرا محسوس ہو رہا تھا۔

سراج نے تین فٹ کی چوڑائی اور چھ فٹ کی لمبائی کا رنگ اتار دیا۔ اب یہ مستطیل ٹکڑا باقی دیواروں سے الگ نظر آنے لگا۔ اگر ہم خوردبین یا محدب عدسے سے کر اس عمارت کی ایک ایک دیوار کو دیکھتے پھرتے تب بھی ہم اس جگہ کا پتا نہ چلا سکتے۔ اس کمرے میں رہ کر بھی ہم کبھی اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ ایک دیوار کسی بھی طرح دوسری دیوار سے مختلف ہے۔ اوپر کا رنگ بالکل ہموار اور ایک جیسا تھا۔ دلاور اینڈ کمپنی کی چالاکی پر میری عقل دنگ رہ گئی۔ اگر وہ اپنا ایک مہرہ نہ گنواتے تو شاید اس محاذ پر ان کو بازی مات نہ ہوتی۔

"یہ ہے نیچے جانے کا راستہ۔" سراج نے کہا۔ اس کی آواز اور لہجے میں شکست اور مایوسی کا عنصر بہت نمایاں تھا۔ "میں نے تمہارے لیے یہ راستہ کھول دیا ہے مگر اپنے لیے کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑا۔"

"اس کا احساس تمہیں آج ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "واپسی کے راستے تو تم نے بہت پہلے بند کر دیے تھے۔ آج تو اچانک تمہارے سامنے دیوار آ گئی ہے۔"

"اس دیوار کے پیچھے ایک کمرہ ہے۔" وہ بولا۔ "پہلے یہاں ایک دروازہ تھا۔ پھر اس کی جگہ دو انچ موٹی دیوار اٹھا دی گئی اور اس پر رنگ کر دیا گیا... اسے تم لات مار کر گرا سکتے ہو۔ چنائی کچی ہے۔"

لات کے بجائے میں نے اس پر اسٹین گن کا دستہ مارا۔ اس کی بہت سی پتلی پتلی اینٹوں کے دوسری جانب گرتے ہی دیوار میں خاصا بڑا شگاف پیدا ہو گیا۔ پھر محسن نے اوپر والا حصہ بھی گرا دیا۔ مجھے اب اپنے مقابل وہ کمرہ نظر آ رہا تھا جس میں وہ سب جمع ہوتے تھے۔ اس میں دو میز لگے ہوئے تھے۔ ایک میز تھی جس کے گرد چھ کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ یہ میز کھانے کے لیے بھی استعمال ہو سکتی تھی اور گول میز کانفرنس کے لیے بھی۔ الغرض دونوں مقاصد کے لیے استعمال بھی ہوتی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کی الماری رکھی ہوئی تھی اور اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ الماری میں کچھ کراکری تھی اور چائے وغیرہ بنانے کا سامان تھا۔ اسی الماری کے قریب کونے میں مٹی کے تیل کا چولہا تھا جس پر شاید جلدی جلنے والی الومینیم کی پتیلی رکھی ہوئی تھی۔ کمرے کے ایک گوشے میں چھوٹا سا فریج تھا۔

میں دیوار کے ملبے پر سے گزرا اور دوسری جانب کھڑا ہو گیا۔ پھر سراج اندر آیا اور آخر میں محسن۔ میں نے زیادہ تفصیل سے کمرے کا جائزہ لیا لیکن وہاں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی سوائے اس بات کے کہ ایک میز کے سرے پر مختلف رنگ کے چند تار لٹک رہے تھے۔ یہاں ان کا مواصلاتی نظام تھا جس سے وہ ہماری گفتگو سنتے تھے شاید ریکارڈ بھی کرتے تھے۔ ہم سے بات کرتے تھے اور باہر والوں سے رابطہ رکھتے تھے۔ جاتے وقت وہ سارے آلات وغیرہ لے گئے تھے لیکن منقطع تار چھوڑ گئے تھے۔ کمرے کی اونچائی اتنی ہی تھی جتنی ہمارے کمروں کی تھی۔ لیکن یہ کمرہ تہہ خانے میں لگتا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ ہمیں یہاں ہونے والی گفتگو کیوں سنائی دیتی تھی۔ وہ اینٹ کی کچی دیوار آوازوں کو مؤثر طور پر نہیں روک سکتی تھی۔ یہ خامی دلاور اینڈ کمپنی کے علم میں نہیں تھی۔

"اس کمرے میں مجھے کوئی دوسرا دروازہ تو نظر نہیں آ رہا ہے۔" محسن نے کہا۔

"دروازہ اس الماری کے پیچھے ہے۔" سراج نے کہا۔

"محسن کے ساتھ مل کے اسے ہٹاؤ۔" میں نے کہا۔ "بلکہ بہتر ہو گا اگر تم اکیلے ہی کوشش کرو۔"

"ہاں الماری زیادہ بھاری تو نہیں لگتی۔" محسن نے کہا۔ "پہلے برتن نکال کے نیچے رکھ دو گے تو کام زیادہ آسان ہو جائے گا۔"

سراج نے بڑی مجروح نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "تم اب بھی شک کرتے ہو کہ میں دھوکا کر سکتا ہوں۔"

"میں سانپ اور بچھو پر بھروسا کرنے کا رسک لینے کو عقلمندی نہیں سمجھتا۔" میں نے کہا۔ "خواہ وہ میری قید میں ہی کیوں نہ ہو۔"

سراج نے غصے میں برتن نکال کے باہر پھینک دیے۔ کپ پرچ، پیالے اور پلیٹیں فرش پر گر کے ٹوٹ گئے۔ چمچے بکھر گئے۔ جانے کتنی ہی دوسری چیزوں کی کرچیاں پاش پاش ہو گئیں۔ پھر سراج نے خالی الماری کو دھکا دیا اور لکڑی کی الماری بڑی آواز کے ساتھ فرش پر گری۔ مجھے اس آواز سے فرش کے نیچے خلا کی موجودگی کا احساس ہوا۔ الماری کی جگہ اب ایک دروازہ نمودار ہو گیا تھا۔

"اب اگر تم کہو گے کہ اس کا تالا بھی کھولوں۔ وہ تو میں نہیں کھول سکوں گا۔" سراج نے اپنی ذلت کے احساس کو دبانے کے لیے تھوڑی سی خفگی کا سہارا لیا تھا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے ایک دم ریوالور اٹھا کے فائر کیا۔ آواز زیادہ نہیں تھی مگر اس کمرے کی محدود جگہ میں زیادہ سنائی دی۔ سراج بری طرح چونکا اور بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ گولی اس کے سامنے سے گزری تھی۔ میں نے تالے کا نشانہ لیا تھا لیکن گولی سراج کے پیٹ سے چند انچ دور رہ گئی تھی۔

میں نے دوسرا فائر کیا تو تالے کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔

"اب دروازہ کھل جائے گا... آگے چلو...!" محسن نے کہا۔

سراج جھکا اور اس نے دروازے کو لات ماری۔ دونوں پٹ اندر کی طرف کھلے اور میں نے اپنے سامنے ایک تاریک خلا دیکھا۔

"نیچے روشنی کا کیا بندوبست ہے؟" میں نے کہا۔

"اور اسی سوال سے دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس عمارت میں بجلی کہاں سے آتی ہے؟" محسن نے کہا۔

"بجلی واپڈا والے فراہم کرتے ہیں۔" وہ بولا۔ "لیکن ان کا اپنا انتظام بھی ہے۔ نیچے جنریٹر ہے جو بجلی کے جاتے ہی ٹرپ ہو جاتا ہے۔ یعنی خود چل پڑتا ہے۔"

"وضاحت کا شکریہ... ویسے میں ٹرپ کا مطلب سمجھ گیا تھا۔" میں نے کہا اور محسن سے مخاطب ہوا۔ "انسپکٹر استاد نے مجھے بتایا تھا کہ اوپر صرف ایک کمرہ ہے جس میں واپڈا سب اسٹیشن کا بورڈ لگا ہوا ہے اور آس پاس خاردار تاریں ہیں۔ خود واپڈا والوں کو بھی اس سب اسٹیشن کا پتا نہیں ہو گا۔"

سراج نے دروازے سے نیچے قدم رکھا اور کوئی سوئچ دبایا۔ اس سے اندر روشنی پھیل گئی۔ سراج کے پیچھے چلتے ہوئے ہم نیچے اترنے لگے۔ کل بیس زینے تھے اور ہر زینہ شاید آٹھ انچ بلند تھا چنانچہ ہم ساڑھے آٹھ فٹ کی گہرائی میں تھے۔ زینہ ختم ہوتے ہی مجھے ایک نیم تاریک ہال نظر آیا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ہال پوری اوپر والی عمارت کے نیچے پھیلا ہوا تھا۔ اس کی لمبائی بھی پچاس فٹ تھی اور چوڑائی بھی پچاس فٹ... یہ صحیح پیمائش نہیں تھی۔ مجھے چھت کے نیچے تو سیمنٹ اور کنکریٹ کے ستون دکھائی دے رہے تھے۔ انہی ستونوں نے اوپر کے سارے اسٹرکچر کا وزن سنبھال رکھا تھا۔ ہر قطار میں تین ستون تھے اور ایسی تین قطاروں کے ہر ستون کے درمیان کا فاصلہ دونوں جانب سے بارہ فٹ کے قریب لگتا تھا چنانچہ ہال اتنا ہی لمبا اور چوڑا ہو سکتا تھا۔

جنریٹر نیچے والے دروازے کے قریب ہی نصب تھا۔ وہیں اوپر مجھے ایک سوئچ بورڈ نظر آیا۔ میں نے اس کے بٹن دبائے تو ہال کے ہر ستون پر نصب بلب روشن ہو گیا۔ ہال کی دیواروں پر سیمنٹ کے پلاسٹر کا رنگ تھا مگر ہر ستون پر جو سو واٹ کا بلب سرچ لائٹ کی صورت میں یوں لگایا گیا تھا کہ سب کی

www.paksociety.com

روشنی مختلف سمت میں جاتی تھی اور وہاں کے ہر گوشے کو روشن کر دیتی تھی۔ اس روشنی میں مجھے نیچے سے اوپر تک ویسے ہی باکس نظر آئے جیسے ہم نے گلے باچھی کے اڈے پر اور پھر بس میں پانچ سو والے کے مزار کے نیچے دیکھے تھے۔ انہیں کھول کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب تک ہم نے جو اسلحہ پکڑا تھا اور تباہ کیا تھا وہ ایک ہی جیسا تھا۔ کچھ غیر ملکی ساخت کا مگر بیشتر ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کا تیار کیا ہوا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ وہ اور اینڈ کیمی اور اس جیسے وطن کے غداروں کی فیکٹریوں کا بنا ہوا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اب ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس میں پھر زندگی شہزادی کے پورے عروج پہ نہ ہوں کیونکہ اس کا نام پریس، پبلک اور پولیس سب کے لیے نا آشنا نہیں رہا تھا۔ وہ اسلحہ ساز شہزادی کسی دوسری جگہ سے لگے ہوں گے۔ اس خیال کا اظہار محسن پہلے بھی کر چکا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ صرف ایک مشین تخریب کاری کی کئی فیکٹریاں چلا رہی ہوں۔

محسن کی نظر بھی لکڑی کے تابوت نما صندوقوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ شاید وہ بھی سوچ رہا تھا کہ ان میں کتنے وحشی بم ہوں گے۔ کتنے ٹائم بم اور کتنی مشین گنیں، کتنے پستول اور کتنے کارتوس، ڈائنامائیٹ اور بارودی سرنگیں۔ یہ سب تباہ کن اسباب کتنے لوگوں کی جان لیتا۔ کتنے بے گناہوں کا خون بہاتا۔ کتنے بچوں کو یتیم کرتا۔ کتنی عورتوں کو بیوہ کرتا۔ اس سے کتنے پل اڑائے جاتے، کتنے بجلی گھر تباہ کیے جاتے اور کتنی سرکاری تنصیبات کو نقصان پہنچایا جاتا۔

سب سے پہلے وہ آواز میں نے سنی۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت کے فرق سے محسن نے چونک کر اوپر دیکھا اور میں نے سراج کے لبوں پہ ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیلتی محسوس کی۔

"کیا یہ ہیلی کاپٹر یہاں آ رہا ہے؟" میں نے اسٹین گن کا رخ سراج کی طرف کر لیا۔

سراج نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح مسکراتا رہا اور اس کی یہ مسکراہٹ مجھے اپنا تمسخر اڑاتی محسوس ہوئی۔

"کون آیا ہے اس ہیلی کاپٹر میں؟" میں نے چیخ کر کہا اور اسٹین گن کا دستہ گھما کے سراج کے سر پہ مارا۔ وہ اچھل کے ایک طرف ہو گیا مگر اپنے کندھے کو ضرب سے نہ بچا سکا۔

"اس میں تمہارا باپ آیا ہے۔۔۔ وزیر خان۔۔۔ سیدھا جہنم سے۔" سراج نے تکلیف کے باوجود مسکرانا جاری رکھا۔ "اور وہ تم کو ساتھ ہی لے کر جائے گا اپنے پہلو میں سیوت کو۔"

"وہ صرف مجھے نہیں، تمہیں بھی لے جائے گا سراج۔" میں نے کہا۔ اس کی استہزائیہ گفتگو اور باتوں پہ یہ جواب بہت ناکافی تھا مگر

میرا ذہن فوری طور پہ دوسری طرف چلا گیا تھا۔ اب میں نے بھی سمجھ لیا تھا کہ سراج کے اس رویے کا مطلب کیا ہے اور محسن نے بھی ہیلی کاپٹر میں یقیناً وہ آ رہے تھے جو جانتے تھے، دشمن تھے، سراج کے ساتھی تھے۔ اس اسلحے کے خریدار آئے تھے یا اس ذخیرے کو منتقل کرنے والے۔

"اب ہمیں کچھ کرنا ہو گا محسن!" میں نے کہا۔

"وقت بہت کم ہے۔۔۔ ہم یہ سارا ذخیرہ تباہ نہیں کر سکیں گے۔" محسن بولا۔

"کیوں محسن! ان صندوقوں میں دیکھو۔۔۔ ان میں ٹائم بم بھی ہوں گے۔۔۔ ابھی پندرہ منٹ تو لگیں گے۔" میں نے کہا۔

"پندرہ منٹ میں ایک یا دو ٹائم بم فٹ کیے جا سکتے ہیں۔" محسن نے مایوسی سے کہا۔ "ان میں تیز ترین کام... ٹائم سیٹ کرنا اور انہیں صحیح جگہ پہ رکھنا۔"

"چلو وہی سہی۔۔۔ کچھ تو ہو گا۔۔۔" میں نے کہا۔

"دو ٹائم بم سارے اسلحے کے ذخیرے کو نہیں اڑا سکتے۔۔۔ یہ اسلحہ کی بھی آدمی ہی کا ہے۔ ایک دو جگہ گر جائیں گے۔۔۔ یا چھت کا کونا ٹوٹ جائے گا۔" محسن بولا۔

"تم اب کچھ نہیں کر سکتے۔۔۔ صرف مر سکتے ہو۔۔۔ مجھے بھی مار سکتے ہو مگر خود کو کسی طرح نہیں بچا سکتے۔" سراج نے شوخی، شیطانی قہقہہ مارا۔ میں ایک دم اس پہ ٹوٹ پڑا۔ محسن نے جلدی جلدی باکس کھول کر دیکھنے شروع کیے۔

"کمینے۔۔۔ تیرا منہ پہلے بند کر دوں۔۔۔" میں نے اس پہ پے در پے وار کیے۔ وہ سر پہ پڑنے والی پہلی چوٹ پہ ہی چکرا کے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

"ویری گڈ محسن! میں اس کمینے کو گھسیٹ کر اوپر لے جاتا ہوں اور اس راستے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ ہیلی کاپٹر کی آواز اب بہت صاف سنائی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جائے سر پہ پہنچ چکا ہے۔

"نہیں سکندر۔۔۔ باہر مت جانا۔" محسن چلایا۔ "ہو سکے تو ان کا راستہ روکنے کی کوشش کرنا۔ وہ سامنے والے دروازے سے اندر آئیں گے۔۔۔ جسے کور ٹیپ کیا گیا تھا۔"

"نہیں محسن! ادھر سے اندر آنے کے بعد پیچھے پہنچنے کا واحد راستہ یہ دیوار تھی۔" میں نے سراج کو اٹھایا اور کندھے پہ ڈال لیا۔ "اس تہ خانے تک آنے کا دوسرا راستہ بھی ہو گا تو اس دروازے پہ ایک ٹائم بم لگا دو۔ جو بھی وہاں پہ ان کا پیش رفت تک جائے گی۔ مجھے وقت مل جائے گا۔ اگر مجھے موقع ملا تو میں ہیلی کاپٹر کو تمہیں اترنے دوں گا۔"

میں سراج کے وزن کے ساتھ اوپر چڑھنے لگا۔۔۔ یہ کام

www.paksociety.com

آسمان نہیں تھا چنانچہ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سیڑھیاں صرف بارہ تھیں۔ کمرے سے گزر کے میں راہداری میں دوڑتا ہوا پہنچا۔ ہیلی کاپٹر کا شور اب بہت بلند ہو گیا تھا۔ میں نے سراج کو مٹی اور پتھر کے اس ڈھیر پر پھینک دیا جو دیوار سے ملی ہوئی کچی پہاڑی کھود کر راستہ بناتے ہوئے اندر گرنے سے جمع ہو گیا تھا۔ پھر میں اس ڈھیر پر چڑھا۔ بھربھری مٹی پر قدم جما کے اوپر جاتے ہوئے کئی بار میرا پیر پھسلا اور میرے کپڑے پھٹنے کے علاوہ میرے بازوؤں پر خراشیں آئیں مگر چند فٹ کی وہ بلندی میں نے ایک جنونی کیفیت میں طے کر لی۔ پیچھے محسن کیا کر سکتا ہے اور کیا کرے گا؟ یہ میں نے اس پر چھوڑ دیا تھا۔ میرے سامنے وہ تھا جو مجھے کرنا تھا۔

ایک بات میرے ذہن نے قبول کر لی تھی کہ اس صورت حال میں ہمارا بچ نکلنا ممکن نہیں تو محال ہوگا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم سراج کو وہیں چھوڑتے تو اپنی جان بچا کے اس راستے سے فرار ہو جاتے جس کا ابھی دشمن کو علم نہیں تھا لیکن ہم یوں نکل جاتے تو یہ جرم محاذ جنگ پر مورچا چھوڑ کر فرار ہو جانے کے جرم سے بھی زیادہ سنگین ہوتا۔ دشمن وہ سب اسلحہ لے جاتا جو وہاں موجود تھا اور اس اسلحے سے جتنی تباہی ہوتی، جتنی انسانی جانوں کا نقصان ہوتا اور وطن فروشوں کے مذموم مقاصد کی تکمیل کا جتنا سامان ہوتا اس کے ذمے دار صرف ہم ہوتے۔ ہم اتنا بڑا جرم کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ایسا سوچنے سے پہلے جان دینا ... کے لیے بہت آسان ہوتا۔

میں نے اوپر ایک پتھر کی اوٹ سے سر نکال کے دیکھا تو مجھے ہیلی کاپٹر مشکل سے پچاس گز دور اور فضا میں چالیس پچاس فٹ کی بلندی پر نظر آیا۔ اس کی بلندی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی اور ہیلی کاپٹر تقریباً اسی جگہ اتر رہا تھا جہاں اسلحہ خانے کی چھت تھی۔ کچھ دیکھنے یا سوچنے سمجھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ میں نے ایکدم سامنے آ کے پوزیشن لی اور اسٹین گن کا رخ اوپر ہیلی کاپٹر کی طرف رکھتے ہوئے پورا راؤنڈ خالی کر دیا۔ یہ چند سیکنڈ کا کام تھا۔ پھر میں نے غوطہ مارا اور اس کچی مٹی کی ڈھلوان پر گر گیا جو کسی سرنگ کی طرح اندر آتی تھی۔ میں پھسلتا لڑھکتا سراج کے اوپر گرا۔

باہر ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ میں اُٹھ کے پھر باہر کی جانب لپکا۔ میرا دل کامیابی کی خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر یقیناً گر گیا تھا۔ لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی تباہی کس حد تک مکمل رہی۔ جو نظارہ میں نے باہر نکل کے دیکھا اس نے میرے جسم کے ریشے ریشے میں مسرت کی سنسنی بھر دی۔ ہیلی کاپٹر ایک آگ کا الاؤ بن گیا تھا۔ اس کے بہت سے چھوٹے ٹکڑے دور تک

پھیلے ہوئے جل رہے تھے۔

ایک بڑے الاؤ کے گرد چھوٹے چھوٹے الاؤ میرے لیے خوشی کا چراغاں تھے۔ ابھی تک مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہیلی کاپٹر کے عملے اور دوسرے افراد کی تعداد کیا تھی اور ان میں سے کتنے زندہ بچ گئے۔ پہلے میری فائرنگ اور پھر ہیلی کاپٹر کے گرنے سے کسی کا زندہ بچ جانا مشکل ہی نظر آتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آگ اب خشک گھاس اور جھاڑیوں تک پھیل گئی ہے۔ میں نے غور سے ہر طرف دیکھا لیکن نہ مجھے کسی کے چیخنے چلانے یا کراہنے کی آواز سنائی دی اور نہ کوئی حرکت کرتا دکھائی دیا۔ پھر اچانک وہ بو میری ناک تک پہنچی جو دنیا کی سب سے زیادہ قابل نفرت اور کراہیت انگیز بو کہی جا سکتی ہے۔ اس بو میں اور سیخ پر کبابوں کے بھونے جانے کی خوشبو میں کوئی فرق نہیں ہوتا مگر جہاں آدمی خود جانتا ہو کہ بو انسانی گوشت کے جلنے کی ہے وہاں احساس کا ردعمل قطعی مختلف اور شدید ہوتا ہے۔ معلوم نہیں وہ اس بو کو کیسے گوارا کر لیتے ہیں جو اپنے عقیدے کے مطابق مرنے والے کو خود جلاتے ہیں اور اس کے عمل کو دیکھتے ہوئے ... کھڑے رہتے ہیں۔ شاید وہ اس کے عادی ہوتے ہیں یا انسان کے ذہن کی تربیت جس نہج پر ہو وہی اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ آدم خور قبائل کے درمیان پرورش پانے والے بچے کے لیے مرنے کے گوشت کو بھون کر کھا جانا کوئی جذباتی مسئلہ نہیں ہوگا خواہ مرنے والا اس کا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔

میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا اور میں نے قلق سا محسوس کیا کہ میں نے غلطی سے اسٹین گن کو وہیں پھینکا اور پھر نیچے بھاگا۔ سراج ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ میں اس کے اوپر سے ... گیا۔ دوڑتا ہوا دالان سے اور پھر کمرے سے گزرا۔ نیچے پہنچا تو محسن نے ہال کے آخری حصے سے چلا کے مجھے مبارکباد دی۔

"تو اب ماہر شکاری ہو گیا ہے کہ ایک وار میں ہیلی کاپٹر گرا ... لگا ہے۔" وہ بولا اور ناخنوں سے کسی چیز کو کھولنے کی کوشش میں مصروف رہا۔

"تجھے کیسے معلوم ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"دھماکے سے" محسن نے دو تاروں کو دانت سے کاٹ کے چھیلا۔

"وہ تو بم گرنے سے بھی ہو سکتا تھا" میں نے کہا۔

"اب ایک دھماکا میں کروں گا۔ دیکھتے ہیں کس کا دھماکا بڑا رہا۔" محسن نے کہا۔ "میں تو گھبرا گیا تھا پہلے۔" پھر میں نے دو باکس درمیان میں رکھے اور ان دونوں میں ایک ایک ٹائم بم فکس کر دیا۔ وہ اچانک تار جوڑتے جوڑتے چونکا۔

"کیا دونوں بم پھٹنے والے ہیں؟" میں نے اس کی بوکھلاہٹ کو سمجھ کے کہا۔

"خیال نہ آتا تو دو منٹ میں ہم دونوں اللہ کو پیارے ہو جاتے۔" محسن نے ایک باکس کھول کے کچھ کیا اور پھر دوسرے باکس کی طرف لپکا جو دوسرے ستون کے قریب تھا۔

"یہ تو مرنے کے بعد معلوم ہوتا کہ اللہ کو پیارے ہوتے یا اللہ کے نزدیک معتوب ہوتے" میں نے کہا۔ "اصولاً یہ ہماری اجتماعی خودکشی کا کیس بن جاتا اور خودکشی حرام موت ہوتی ہے۔"

"اللہ نے ہی حرام موت سے بچا لیا" محسن بولا۔

"بڑی عجیب چیز ہے۔ دو منٹ باقی رہ گئے تھے اور آپ کتنے اطمینان سے تار جوڑنے میں اور مبارک باد دینے میں مصروف تھے۔"

"وہ... دراصل یار... تیرے آنے سے پہلے میں نے سمجھ لیا تھا کہ اب بچ کے باہر نکلنے کا کوئی امکان نہیں رہا۔" محسن بولا۔ "ذہن میں وہی خیال تھا۔"

"یہ تار کہاں سے ملے تجھے؟" میں نے کہا۔

"یہیں سے" اس نے ادھر ادھر ہاتھ گھما کے کہا۔ "دیکھتا نہیں اب تو یہاں صرف دو لائٹیں جل رہی ہیں۔"

"تو نے ان کے تار کاٹ لیے؟"

"کاٹنے کو کیا تھا۔ بس کھینچ کر توڑ لیے۔" محسن بولا اور چھیلے ہوئے تار کو ایک ڈائنامائیٹ سے جوڑنے لگا۔

"تجھے کرنٹ نہیں لگا؟ تو تو شاک پروف مخلوق ہے کیا؟" میں نے کہا۔

"حاضری میں سب سے الٹی مخلوق" محسن بولا۔ "تو نے سائنس پڑھی ہوتی تو ایسا سوال نہ کرتا۔ اگر ایک وقت میں ایک ننگے تار کو ہی پکڑ لیا جائے اور آدمی کہیں سے ارتھ نہ ہو تو کرنٹ کیوں لگے گا۔ میں لکڑی کے صندوق پر چڑھ کے تار کھینچتا رہا۔ ایک وقت میں ایک تار کھینچا تاکہ شارٹ سرکٹ ہونے سے فیوز نہ اڑ جائے۔"

"اور اب کیا سائنس کا نیا سرانجام دے رہا ہے تو؟"

"میں نے کچھ ایسا بندوبست کیا ہے" محسن نے ایک اور تار کے ٹکڑے کو دانت سے کاٹا۔ "کہ جب ہم باہر جائیں تو وہ تار جو میں نے چار صندوقوں کو جوڑنے کے لیے استعمال کیے ہیں... یہ دیکھ... پہلا باکس پہلے ستون کے پاس ہے۔ اس میں ڈائنامائیٹ بھی ہیں، ٹائم بم والی سرنگیں بھی ہیں جو زمین کے نیچے دبائی جاتی ہیں اور کوئی الٹا سیدھا پیر ... سیدھا اوپر پہنچتا ہے... اللہ میاں کے پاس۔ اس تیسرے باکس میں دستی بم ہیں۔ ان تینوں کے درمیان برقی تاروں کا سلسلہ ہے۔ اور ... میں نے اس چوتھے صندوق پر ... ہیں۔"

"گویا ایسے اڑان ہو تو پہلے جنریٹر چلانا پڑے گا" میں نے کہا۔ "اور جنریٹر چلا تو کچھ نہیں ہوگا۔ پلاؤ کھا لیں گے ... قائم ہو گا۔"

"دیکھ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر پلاؤ زردے کی توہین کی بات نہیں سن سکتا۔" محسن بولا۔ "تجھے معلوم ہے کب سے فاقہ چل رہا ہے۔ سوائے چوہوں، بلاؤں اور کوؤں کے کچھ نہیں کھایا۔ سوئیٹ ڈش میں گالیاں ملی ہیں۔ تیری باتوں سے میرے پیٹ میں وہ چوہے پھر دوڑنے لگے ہیں جو دوڑتے دوڑتے تھک کر بے ہوش ہو گئے تھے۔"

"تیرا کتنا کام باقی ہے اب؟" میں نے کہا۔ "ممکن ہے فریج میں کچھ کھانے کو مل جائے۔ چلتے چلتے تو اس سالے ایس پی نے سب حصوں میں توڑ پھوڑ کی ہے ورنہ میں اس سے خانساماں کا کام بھی لیتا۔"

"وہ ہے کہاں؟" محسن نے جھک کر تاروں کو تیسرے باکس میں کسی چیز سے ملایا۔

"باہر گر کے ڈھیر پر وہ کتے کی طرح پڑا ہے۔"

"بہت بڑا شیطان ہے یہ بھی۔ کیسے کیسے رنگ بدلے اس گرگٹ کی اولاد نے۔ پہلے تائب ہونے کی بات کی، پھر توقف کرتا چلا گیا۔ اور آخر میں ہیلی کاپٹر کی آواز سنتے ہی آ گیا اپنی اصلیت پہ۔" محسن بولا۔

"یار محسن! کیا اسے معلوم تھا کہ ہیلی کاپٹر آنے والا ہے؟" میں نے کہا۔

"یقیناً معلوم تھا... وہ وقت پورا کر رہا تھا۔" محسن بولا۔

"پھر تو یار وہ بھی ڈرامہ تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ سب گفتگو جو وطن دشمن کے اور سراج کے درمیان ہوئی تھی۔ خیال یہ ہو کہ معلوم ہو گیا تھا کہ ہم غالب آ گئے ہیں۔ انھیں ... جوابات کی اس کا اصل مطلب کچھ اور نکلتا ہوگا؟"

"اصل مطلب ہم سرنگ میں سے ... بلکہ کچھ لیں گے۔" محسن بولا۔

"تاحکم میں اب کتنا وقت رکھا ہے؟" میں نے کہا۔

"پندرہ منٹ آگے بڑھا دیا ہے" محسن بولا۔ "تو بہت باتوں میں مست کر رہا ہے... دیکھ اگر فریج میں کچھ ملے تو لے آ۔"

میں پھر اوپر گیا۔ فریج میں ٹھنڈا پانی تھا اور ڈبل روٹی کے کچھ سلائس تھے، کچھ انڈے تھے۔ ... اسباب جھولی میں ڈال کے اور پانی کی بوتل لے کر واپس گیا۔ ہم چار چار سلائس یوں کھا گئے کہ دانتوں سے ... اور پھر سلائس... اس کے بعد ایک گھونٹ پانی پیتے تھے۔

"کھانا بہت اچھا ہے" محسن نے پانی کا گھونٹ پی کر کہا۔

"جی... اسپوٹنڈ تھی، اور میں نے بڑی محنت سے بنائی تھی" میں نے کہا۔

"آملیٹ بھی تو وانی کے تھے آپ کے۔" محسن بولا۔

"جی... وہ ویانا فرائی... وہ ہاف بوائل۔" میں نے اس کی خدمت میں چار سالم انڈے پیش کیے۔ "نوش فرمائیے۔"

"ایسا نہ ہو کہ میں انڈا توڑ کے منہ میں ڈالوں اور کوئی چوزہ نکل کے آجائے۔ لیکن شاید خالص اور پکی حالت میں یہ چوزہ بھی پروٹین فراہم کرے گا۔ ویسے ہر انڈا مستقبل کا چوزہ ہے۔ ہر انڈے سے مرغ اور مرغیوں کے ایک خاندان کا شجرۂ نسب شروع ہوتا ہے۔ مگر ہم یہ شجرۂ نسب کھا جاتے ہیں۔" محسن بولا۔

"بلکہ پی جاتے ہیں۔" میں نے کچا انڈا توڑ کے حلق میں انڈیل لیا۔ اس وقت مسلز والوں کا نہیں توانائی کا تقاضا تھا۔ یہ محسن اور انڈے جانے جسم کی گاڑی کے لیے آئندہ بارہ گھنٹے کا ایندھن تھے۔

"تم نے ایس پی صاحب کی سگریٹیں بھی چرائی تھیں۔" محسن بولا۔ "وہ ہوش میں آتے ہی تمہیں گرفتار کر لیں گے۔"

"یہ سب مالِ غنیمت ہے جو مسلمانوں پر حلال ہے اور مجاہدین میں برابر تقسیم ہوتا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "مگر یار بارود خانے میں سگریٹ جلا لوں؟"

"جلا لے یار... کیا ہوگا... زیادہ سے زیادہ مرنا۔" محسن بولا۔

میں نے نیچے بیٹھ کے اور جھک کر زمین سے لگتے ہوئے دو سگریٹ منہ میں دبائے اور ماچس کی ایک تیلی سے جلائے۔ ان میں سے ایک میں نے محسن کو دیا۔ "کش لیتے وقت خیال رکھیے گا کہ یہ آپ کی آخری سانس ثابت نہ ہو۔ آپ بارود کے ڈھیر پر تشریف فرما ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرا کام ختم ہو گیا۔" محسن پیچھے آ گیا۔ "اب اپنی سائنسی مہارت اور اعلیٰ کارکردگی پہ ایک تعریباً اپنی تعریف میں کرتا ہوں۔" وہ کش لے کر بولا اور دروازے کی جانب چلنے لگا۔ "جیسا کہ تمہیں معلوم ہے یہ انکشاف ایس پی صاحب نے فرمایا تھا کہ جیسے ہی بجلی جائے گی جنریٹر ٹرپ ہو جاتا ہے یعنی خود بخود بیٹھ جاتا ہے۔"

"وضاحت کا شکریہ۔ جیسے میں ٹرپ ہونے کا مطلب سمجھ گیا تھا۔" یہ وہی الفاظ تھے جو محسن نے سراج سے کہے تھے۔

"جب ہم باہر جائیں گے تو بجلی چلی جائے گی۔" محسن اور آگے بولا۔ "اور جنریٹر ٹرپ ہو جائے گا۔"

"بجلی کو آپ کیسے بھیجیں گے؟" میں نے کہا۔

"اف... ابو جہل۔" محسن نے سر پہ ہاتھ مارا۔ "بچپن سے دیکھتا آیا ہے کہ کوئی شارٹ سرکٹ ہو تو فوراً اڑ جاتا ہے۔ پھر فیوز کا اڑنا اور بجلی کا بند ہونا ایک ہی بات ہے۔"

"آدمی کا اڑنا اور آدمی کا بند ہونا ایک ہی بات نہیں ہے۔"

سنی ہی نہیں تھی۔ سنی تھی تو اس کا جواب دینا فضول سمجھا تھا۔ وہ زیادہ اہم کام میں مصروف تھا۔ اس نے سب سے آخری بلب کو نکالا اس پہ ایک چونی رکھی اور بلب کو پھر فٹ کر دیا۔ یہی حرکت اس نے باہر آ کے کی۔ وہ بلب اس راہداری کا آخری بلب تھا اور تقریباً لیٹے پڑے ہوئے سراج کے سر پہ تھا چونکہ چھت ہر جگہ ہی آٹھ فٹ اونچی تھی اس لیے ہاتھ اٹھا کے بلب نکالنا اور فٹ کرنا مشکل کام نہیں تھا۔

میں نے بلاوجہ اس کو چڑانے کے لیے کہا مگر محسن نے میری بات

"یہ چونیاں کہاں سے ملیں تمہیں؟" میں نے کہا۔

"ان کی جیبوں سے کچھ ریزگاری نکالی تھی میں نے۔" اس نے وحشیوں کی طرف اشارہ کیا جو بے ہوش پڑے تھے۔ ان کا جو خون فرش پہ بہا تھا وہ بھی جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔ "اللہ مجھے غریبوں کی جیب کاٹنے پہ معاف کرے۔ ویسے میں نے ایک روپیہ ان کی جیب میں رکھ دیا تھا۔ ایک کا نوٹ۔"

"پھر تو کوئی گناہ نہیں ہوا غالباً۔ مردے سے ریزگاری لینا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم اگر چاہیں تو ان کی جیب سے سب کچھ نکال سکتے ہیں لیکن یہ جانتے ہیں یہ دشمن نہیں ہیں۔ یہ تو شاید جاہل تک نہ جانتے ہوں۔ یہ فقط دشمن کے آلۂ کار تھے۔ ان کا حکم ماننے پہ مجبور تھے۔" میں نے کہا۔

"سراج کی جیب سے نکلی ہوئی رقم کافی ہے۔" محسن بولا۔ "مگر اس کی جیب سے جو دستاویزات برآمد ہوئی ہیں وہ زیادہ دلچسپ اور اہم ہیں۔ مجھے سرسری طور پہ دیکھنے کا موقع ملا تھا۔"

"کیا تھا اس میں؟" میں نے کہا۔

"ایک تصویر، کمال ایک حسینوں کے خطوط۔" محسن بولا۔

"اُف بدبخت بدذوق۔ سالے میٹھے جیسے استعمال کر ڈالے... تمہاری روح کو سخت تکلیف ہوئی۔" میں نے کہا۔

"تکلیف تمہیں ہو رہی ہے... کیا تو شاعر کی روح ہے؟" محسن بولا۔ "اس میں سب کچھ موجود تھا۔ ایک تصویر۔ ایک خط... ایک چیک... وہ لڑکی سراج کی منگیتر ہے۔ جتنی خوب صورت لڑکی ہے اتنا ہی خوب صورت نام ہے عنبرالنسیم... مگر یہ اس سے زیادہ خوب صورت ہے... معلوم نہیں ایسی لڑکی ایسے کمینے آدمی کے پلے کیوں باندھی جا رہی ہے۔"

"کمینہ اور شیطان وہ بن جائے لفظ غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "لڑکی کے والدین تو اس کے چلانے ہوں گے کہ ہونے والا داماد ایسا ہی ہے... بات بات پہ سب کو بند کرا دینے کی دھمکی دیتے

www.paksociety.com

رہوں گے۔"

"تو غلط سمت میں غور کر رہا ہے۔" محسن بولا۔ "یہ لڑکی ہمارے کام آسکتی ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"جیسے دلبر جان کے کام آئی۔" محسن نے کسی تذبذب کے بغیر کہا۔

میں کچھ دیر کے لیے جیسے ہکا بکا رہ گیا: "غزالہ فہیم... کیا ہم اسے اٹھا کے لائیں گے؟ وہ اس پر تشدد کریں گے؟"

"اگر سراج نے ہمیں مجبور کیا... تو یہ بھی ہوگا۔ جنگ تو جنگ ہے۔ اس کی لپیٹ میں سب آجاتے ہیں۔ جوبلی اور جھلا کا قصور کیا تھا کہ وہ اس جنگ کی بھینٹ چڑھا دی گئیں۔" محسن یکلخت اداس ہو گیا اور اس کے لہجے میں نفرت کا اور انتقام کی آرزو کا زہر آگیا۔ مجھے اپنی بات یاد آئی۔ میں نے بھی سراج سے کہا تھا کہ تم کو تمہارے ہی سکوں میں ادائیگی کی جائے گی۔ میں نے عہد کیا تھا کہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا... لیکن کیا ایسا ضروری ہوگا جو کہ تم کر رہے ہو... شاید ہم غزالہ فہیم نامی اس معصوم اور بے گناہ لڑکی کے ساتھ وہ سب کچھ نہ کر سکیں جو سراج اور دلاور کرنے کے اہل ہیں۔ ہم کتنے بھی گر جائیں انسان سے شیطان نہیں بن سکتے اور دلاور یا سراج جیسے کتنے بھی اعلیٰ مقام پہ کیوں نہ ہوں ان کے لیے انسانیت کے معیار کو چھونا مشکل ہے۔

ہم اب سراج کو اٹھا کے باہر لے جانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ ایک آواز نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔

"یہ پھر دوسرا بجلی کا میٹر۔" محسن بولا۔

میں نے ایک دم سراج کو اٹھا لیا: "اسے بھی تو بہت تھا۔ ایک ہی بجلی کا میٹر میں لیے جا سکتا تھا۔"

"تو باہر نکل۔" محسن نے کہا۔ "میں آتا ہوں... جتنا دور جا سکے چلے جانا... اور میری فکر مت کرنا۔"

"تو کیا کرنا چاہتا ہے؟ میرے ساتھ کیوں نہیں نکلتا؟" میں نے چلا کر کہا۔

"پاگل مت بن۔" محسن بولا۔ "مجھے یہ سوئچ آن کرنا ہے جس سے سارا یہ والا بلب روشن ہوگا۔ اس کے اوپر جیلی دیکھنے کا مقصد بھی یہ ہے کہ تار شارٹ ہو جائیں۔ اندر والے بلب پہ تو بیٹ سے اس لیے کیا تھا کہ یہاں سوئچ خراب ہو یا کسی وجہ سے شارٹ نہ ہوں تو میں اندر جا کے تار جلا سکوں۔ سپارک ہوتے ہی مین فوراً گر جائے گا اور بجلی بند ہوتے ہی نیچے جنریٹر اسٹارٹ ہوگا۔ میں نے جنریٹر کی لائن کے کنکشن کو تینوں صندوقوں میں ڈائنامائٹ سے جوڑ دیا ہے۔ جنریٹر کے اسٹارٹ ہوتے ہی ہر باکس سے بجلی کا شعلہ نکلے گا جو ڈائنامائٹ کو اڑا دے گا۔ باقی سب چین ری ایکشن ہوگا یعنی ایک ڈائنامائٹ کے پھٹنے سے دوسرے ٹکڑے پھٹتے جائیں گے۔ بارودی سرنگ اور روشنی بموں میں بھی ایسا ہی ہوگا صرف ٹائم بم والے باکس میں دھماکا ایک وقت پہ ہوگا۔ تقریباً اب سے پندرہ منٹ بعد۔ باہر میں نے دو ٹائم بم اس گیٹ پہ لگا دیے ہیں جو ہال کے آخر میں ہے۔ تو نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ سیدھا تہ خانے میں پہنچنے کا راستہ ہے لوہے کے گیٹ کی لمبائی چوڑائی دیکھنے کے بعد میں سمجھ گیا تھا کہ اس راستے سے بھی گاڑیاں سیدھی اندر لائی جاتی ہوں گی۔ شاید یہ کوئی سلوپ ہوگا۔ کوئی آہستہ آہستہ نشیب میں اترنے والا راستہ جو ایک فرلانگ یا سو گز دور سے شروع ہو کے تہ خانے پہ ختم ہوتا ہوگا۔ ٹائم بم گیٹ کو اتنا نقصان ضرور پہنچا دیں گے کہ فولادی گیٹ ٹوٹ کر راستہ روک دے یا بہرحال جام ہو جائے تو کھلنے کے قابل نہ رہے۔"

"ویری گڈ... مگر اب تیرا رکنا کیوں ضروری ہے۔ چل یہاں سے نکلنے کی فکر کر۔" میں نے کہا۔

"ابھی نہیں۔" محسن بولا۔ "تو سراج کے ساتھ بھاگ جا۔ میں اس وقت بٹن دباؤں گا جب بجلی کا میٹر آ جائے گا۔ پوری عمارت گر جائے گی اور ملبے کے ڈھیر میں بجلی کا میٹر کے پرزے بھی دفن ہو جائیں گے۔"

"تو خود بھی تو غیر محفوظ ہوگا محسن۔" میں نے کہا۔

"اللہ مالک ہے۔ میں بٹن دبانے ہی اسی راستے سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔" محسن نے کہا۔ "دھماکا تو بٹن دباتے ہی ہو جائے گا اس لیے ممکن ہے یہ چھت بھی بیٹھ جائے اور... یہ راستہ بند ہو جائے مگر تو جا۔ خدا نے چاہا تو ہم پھر ملیں گے وہ سب... اس دنیا میں نہیں تو اس دنیا میں... ویسے بھی اب جینے کی تمنا مر چکی ہے جھلا کے ساتھ ہی..."

"یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے..."

"جا سکندر... نکل جا... بجلی کا میٹر آ رہا ہے۔" محسن نے کہا اور بلب روشن کرنے والے سوئچ کے قریب جا کھڑا ہوا۔

میں سراج کو لے کر سیڑھیاں چڑھا تو قدم ہی نہ اٹھ رہے تھے کہ دھماکا ہو رہا ہے۔ جیسے قدم اٹھا رہے اور دل ڈوب رہا ہو۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

پسندیدہ رسائل و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کیلئے تشریف لائیں
عمران لائبریری
[illegible]

[illegible]

مصنف ... کے آن ناموروں کی روداد جو گوشت پوست سے گزر کر افسانوی شخصیتوں میں ڈھل گئے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی تیرگی میں گزر رہے تھے۔ جنہوں نے ... [illegible]

[illegible]

احمد اقبال کے شہ پار و شبنم فشاں قلم سے

وہ ایک دھماکا نہیں تھا بلکہ ایک کے بعد ایک ہونے والے کئی دھماکے تھے جو زمانی وقفہ انتہائی مختصر ہونے کے باعث ایک طویل گڑگڑاہٹ دار دھماکے کی طرح سنائی دیے تھے۔ اس کی وجہ مجھ پر واضح تھی۔ پہلا دھماکہ بیس سیکنڈ کی اسپارک سے ہوا ہوگا جب محسن نے بٹن دبا کے باہر کی لائٹ جلائی ہوگی لیکن وہ بلب نہیں جلا ہوگا۔ اس بلب کی ہولڈر نے فیوز اڑا دیا ہوگا۔ فیوز کے اڑتے ہی جنریٹر اسٹارٹ ہوا ہوگا اور اس سے ملے ہوئے تاروں سے ان تین تالوں میں بجلی کا شعلہ نکلا ہوگا جن میں ڈائنا مائیٹ، بارودی سرنگیں اور ٹائم بم بھرے ہوئے تھے۔ اس تمام بارود کے ڈھیر کے اڑنے ہی سے عمارت کا ڈھانچہ بھی ایک دھماکے سے گرا ہوگا۔ اس وقت تک ہیلی کاپٹر بھی اتر چکا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی محاورے کے مطابق.... اس کے قدموں کے نیچے سے زمین نکلی، ہیلی کاپٹر بھی ملبے میں دفن ہوا اور اسی دھماکے میں اس کی موت کا دھماکا بھی شامل ہو گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ دونوں ٹائم بم جو محسن نے نیچے والے فولادی گیٹ میں نصب کیے تھے، صحیح وقت پر پھٹے تھے یا نہیں بند ہو گئے تھے۔ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اس دھماکے میں شریک ہوں لیکن ان کے دیر سے پھٹنے سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کنکریٹ کے اس زیر زمین اسٹرکچر کے گرتے ہی وہ فولادی گیٹ بھی گر گیا ہوگا اور شاید گڑا ہوگا تو اس کے پیچھے ... کی لاش ملبے میں دفن ہو گئی۔ کبھی اس ملبے کو کھودا گیا تو اس میں سے ایک ہیلی کاپٹر کا ڈھانچہ بھی برآمد ہوگا اور دیکھنے والے حیران ہوں گے یا برہم ہوں گے کہ صرف ایک دشمن ملک کی کارروائی ہے۔ ان کی یہ جسارت ہے کہ انہوں نے یہاں ہیلی کاپٹر بھیج دیا۔ یہ خلاف عین سرحد کے ... مگر پھر بھی یہ سرحدی حدود کی خلاف ورزی تھی۔ دیکھنے والے اسلحے کے اس ذخیرے پر حیرت ... کریں گے جو ملبے سے نکلے گا اور پھر ایک رپورٹ مرتب کی جائے گی جو حکومت کی منسٹری کے اعلیٰ ماہرین کے جانب سے مرتب ہوگی۔

اس رپورٹ میں یقیناً بڑی باریک بینی سے کام لیا جائے گا اور ہیلی کاپٹر کے اجزا کے مطالعے سے حاصل کردہ معلومات کو یکجا کر کے بتایا جائے گا کہ ہیلی کاپٹر کتنا بڑا تھا، کس ساخت اور ماڈل کا تھا اور اس میں کتنے افراد تھے۔ اس کے گر کر تباہ ہو جانے کے بعد کیا ہوا۔ ملبے پر کیا بیتی اور باقی افراد کس طرح ہلاک ہوئے۔

یہ بھی اندازہ لگایا جائے گا کہ کتنے ڈائنا مائیٹ تھے، کتنے ٹائم بم اور کتنی بارودی سرنگیں تھیں۔ ان سب کی مجموعی تباہ کن قوت کیا تھی اور اس نے اسٹرکچر کو کتنا نقصان پہنچایا۔ یہ بھی بتایا جائے گا کہ اسٹرکچر کی مضبوطی کا کیا معیار تھا۔ بی ایس ایس کے مطابق اس کی

سینٹ اور ملٹری کی قوت۔ کتنے ہزار یا ڈیڑھ ہزار لوگ پہنچتی پھر بالقلوں، مشین گنوں اور ریوالوروں کی تعداد بتائی جائے گی تباہ شدہ ٹینک اور صحیح حالت میں ملنے والے ٹینک۔ پھر ساخت بغیرہ کا ذکر ہوگا۔ ان کے لاؤ لشکر شمار کیے جائیں گے۔ لاشیں بھی جائیں گی اور ہر لاش کی پوسٹ۔ مارٹم رپورٹ ہوگی۔

لیکن اس مفصل رپورٹ میں کہیں ایک سطر بھی ان کے بارے میں نہیں ہوگی جو اس چھت کے نیچے اپنی ذات سے ہم میں ہر روز، ہر شب کے ہر لمحے کا عذاب جھیلتے ہیں۔ جو تھوڑے بہت انسے بے آسرا اور بے نوا تھے اور ان کی ساری طاقت ان کا علم تھا۔ ان کا خلوص تھا اور ان کا ناقابل تسخیر جذبہ تھا۔ وطن کی پاسبانی کا جذبہ، وفا کی راہ میں نذرانۂ جان کو عبادت کہ سمجھنے کا جذبہ۔ غداروں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا جذبہ۔ پوچھنے والے ان سے پوچھتے تھے کہ تمہارے ساتھ کون کون سی تنظیم اور ہے؟ کون سی سیاسی جماعت ہے جو تمہاری عسکری قوت کیلئے ہے؟ اور وہ مردانِ حق... ہر فرد حق اور مجنونی لوگوں کا فلسفہ ایسی باتوں کا جواب نہیں دے سکتا تھا چنانچہ ان کے جسم پر ستم کا ہر تیر آزمایا گیا اور تشدد کا ہر سامان استعمال کیا گیا۔ ان کو ذہنی اذیت کے ناقابل تصور عذاب میں زندہ رہنے پہ مجبور کیا گیا۔ اس رپورٹ میں کہیں نہیں لکھا جائے گا کہ وہاں ایک عقوبت خانہ بھی تھا۔ کوئی ان لاشوں کو شمار کرتے وقت یہ نہیں لکھے گا کہ ان پر کس نے کیا ظلم کیا تھا۔ ان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ درج نہیں ہوگا کہ درد کو کتنے کا ٹمدد ذہن جسم کے ننگِ انسانیت اور ظالمانہ احکامات کی تعمیل کرتے تھے اور کرواتے تھے۔ مجھ پر اور محسن اور رابعہ پر جو بیتی، اس کی کسی کو خبر نہیں ہوگی۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ وہ ماہرین اس ظلم کو دیکھ سکتے اور اس فلمی سین کی خوفناک دیکھ سکتے جو میں نے دیکھی تھی اور وہ بھی اصلی حالات میں دیکھتے جن سے میں گزرا تھا۔ پھر ان کی رپورٹ مکمل ہوتی۔ اس میں صرف اعداد و شمار نہ ہوتے۔ حقائق کی وہ تصویریں ہوتیں جنہیں دیکھنے والی ہر آنکھ سے خون کے آنسو ٹپکتے۔

ستم تو یہ تھا کہ اگر ان رپورٹ مرتب کرنے والوں کو ہماری حب الوطنی کا ثبوت مل جائے گا تو وہ دیکھیں گے کہ یہاں کچھ مفرور مجرم بھی روپوش تھے۔ ان میں سے چند مخت بھی تھا جو متعدد عدالتوں میں پولیس کو مطلوب تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جان بچا کے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ ہم جیسے وطن کی خاطر جان کی بازی لگانے ہوئے تھے اسی وطن کے قانون نے ہمیں مجرم بنا رکھا تھا۔ ہماری قربانی۔ ہماری مشکلات اور ہماری جدوجہد کی کوئی قدر کرنے والا نہ تھا۔ کوئی یہ بھی نہیں سوچتا تھا کہ ہم کتنا بڑا کام کر رہے تھے اور کتنی مشکل تجربہ بے سروسامانی کے ساتھ۔ خیر۔ کبھی تاریخ لکھی گئی تو شاید اس کا ایک سنہرا باب ہمارے نام سے منسوب ہو۔ ہر چند کہ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ تاریخ سب سے زیادہ مظلوم ہے کہ اسے لکھنے والوں نے اپنے مفادات کے تحت مرتب کیا یا اپنے جذباتی نقطۂ نظر سے سمجھ کے لکھا۔

یہ سب خیالات ان چند منٹوں میں میرے ذہن سے گزرے جو ایک نے رُت کے کنارے میں پڑے ہوئے گزارے۔ اتنا سمجھنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے کوئی متعدد بار کی پڑھی ہوئی کتاب دیکھے تو صرف ایک خیال کی طرح کتاب کا موضوع ذہن میں آ جائے یا کسی مشہور فلم کا نام سنتے تو اس پوری فلم کی کہانی یاد آ جائے اور اس فلم کی ہر نمایاں بات یاد آ جائے۔ خیالات بڑے تھے اور یہ میری سوچ میں جمع ہو جانے والی گرد تھی۔ جو بیٹھ گئی تھی مگر ایک جھٹکا پڑنے سے یہ گرد اڑی تو یہ ایک بگولا بن گیا۔ بالآخر ہم اس جہنم سے نکل آئے تھے اور ہم نے اس جہنم کو نیست و نابود بھی کر دیا تھا مگر ابھی نہ جانے ایسے کتنے جہنم ہمارے انتظار میں تھے اور ہماری راہ میں تھے۔

صبح ہونے والی تھی۔ میں اٹھا تو میں نے آنکھوں سے اور چہرے سے گرد صاف کی اور پھر گرد اور دھوئیں کے اس بادل کو دیکھا جو بہت بلند ہو چکا تھا۔ میرے کانوں میں ابھی تک سیٹیاں سی بج رہی تھیں اور مجھے زمین اپنے قدموں کے نیچے ابھی تک لرزتی محسوس ہو رہی تھی۔ محسن دھماکے سے دور ہونے کے باوجود مجھے اچھال دیا تھا۔ اس نے محسن کا کیا حال کیا ہوگا؟ یہ سوچتے ہوئے بھی میں ڈرتا تھا۔ ابھی تک اس کا کوئی پتا نہ تھا مگر میں خود کو قائل کر رہا تھا کہ وہ نکل آئے گا۔ اسے آنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ میری نظر اسے تلاش کر رہی تھیں اور میرے کانوں میں محسن کے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے بات مذاق میں کی تھی۔ اس دنیا میں نہ سہی اگلے جہاں میں ملیں گے۔ مگر بعض اوقات زبان سے مذاق میں نکلنے والی بات تقدیر کا بے رحم مذاق بن جاتی ہے۔ اور وہ تو زندہ رہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ نہیں۔ وہ اتنا کم ہمت نہیں ہے۔ اس نے یہ ضرور کہا تھا کہ شہلا کے مر جانے کے بعد جینے کی لگن ختم ہوگئی ہے مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ مرنا چاہتا تھا۔

محسن... میں نے آواز میں اپنے حلق کی ساری فریاد کو شامل کر کے پکارا۔ اتنی قوت سے کہ وہ زیر زمین بھی ہوتا تو میری آواز سن لیتا۔ میں نے گلے کی ساری طاقت کے ساتھ اسے آواز دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس دیوانگی کا جواب

کون دے گا۔ ویرانے میں میری صدائیں گم ہو جائیں گی جیسے صحرا کی پیاسی ریت میں بارش کا ایک قطرہ۔ چنانچہ جواب میرے بہت قریب سے آیا تو میں یوں اچھل پڑا جیسے دوسرا دھماکا میرے پیچھے ہو گیا ہو۔

"اتنا کیوں چلا رہے ہو بھائی...؟" محسن نے کہا اور میں ایک دم پلٹا۔

"یہ... یہ تم... تو ٹھیک ہے نا...؟" میں اس کی طرف دوڑا اور اس سے لپٹ گیا۔

"ابے بھوت... کیوں چمٹ گیا مجھ سے...؟" محسن ہنسنے لگا۔ "کیا تو سمجھا تھا نہیں کہ میں... میں نہیں ہوں... میں محسن کا بھوت ہوں... محسن تو مارا گیا۔"

"میں سخت پریشان ہو گیا تھا یار..." میں نے محسن کو چھوڑتے ہوئے کہا۔ "میں بہت ڈر گیا تھا۔"

محسن نے میرے کندھے پہ ہاتھ مارا۔ "اپنے ایسے مرنے والے ہوتے تو بہت پہلے مر جاتے... بہت ڈھیٹ چیز ہیں ہم..."

"یہ سب اللہ کا فضل و کرم ہے محسن..." میں نے کہا۔ "ذرا تو خود سوچ کہ کس حال میں ہم یہاں تھے۔ ابھی دو دن کیا دو گھنٹے پہلے بھی ہم اس پوزیشن میں تھے کہ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینے کا خیال بھی دل میں لاتے؟"

"مصیبت پہلے بھی آئی تھی۔" محسن بولا۔ "اور مصیبت سے ہم نکلے بھی تھے لیکن اب کے نظر آتے تھے کچھ آثار جدا۔ امید کہ ساتھ چھوڑ گئی تھی۔"

"چل اب یہاں سے نکلنے کی فکر کر" میں نے کہا۔ "تو زخمی ہے۔"

"تھی ہلکا سا زخمی تو تو بھی ہے۔ یہ تو خراشیں آئی ہیں جب میں بم دبا کے بھاگا تو پتا نہیں کیا ہوا۔ مجھے لگا جیسے بم کے ساتھ ہی میں بھی اڑ گیا ہوں۔ کسی جن کے نظر نہ آنے والے بہت طاقتور ہاتھ نے مجھے اٹھا کے باہر پھینک دیا۔"

"میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا لیکن میں دور تھا۔" میں نے کہا۔

"لیکن تو بس قدرتی بچ گیا" محسن بولا۔ "اگر میرا رخ اس دیوار کے شگاف کی طرف نہ ہوتا تو میں چھت سے ٹکراتا یا دیوار سے اور میرا سر پھٹ جاتا۔ میرا رخ باہر کی جانب تھا۔ چنانچہ میں اس شگاف سے باہر جا پڑا۔ اسی سے یہ خراشیں آئی ہیں۔ کنکر پتھر لگے تھے۔ سخت چٹان ہوتی تو شاید زیادہ چوٹ آتی۔ جیسے ہی میں باہر گرا، وہ دیوار منہدم ہوگئی اور شگاف بند ہوگیا۔ میں وہیں رک گیا ورنہ پھسلتا ہوا وہیں جاتا اور اندر ہی دفن ہو جاتا۔ مجھے تو اٹھنے کا ہوش بھی نہیں تھا اور کافی دیر تک مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ اتنی مٹی تھی کہ میری ناک، حلق اور آنکھوں میں بھر گئی اور مجھے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ بارود کی بو تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ دھواں نہیں تھا۔ دھواں بعد میں اٹھا۔ جب میں خود اٹھ چکا تھا۔ ہوش آنے سے پہلے تو مجھے خیال آیا تھا کہ دُنیا سے اٹھ چکا مگر جب زندہ ہونے کا یقین آیا تو میں اٹھ کے بھاگا۔ دل پر ایک دہشت سوار تھی کہ ابھی تو دوسرا دھماکا ہوا تو نہ جانے کدھر جا کے گروں گا۔ اپنی حالت کا جائزہ بھی میں نے بعد میں لیا۔ ایس پی صاحب خیریت سے ہیں نا؟"

"ہاں۔ ابھی سو کے نہیں اٹھے۔" میں نے پلٹ کر کہا اور اس طرف اشارہ کیا جہاں سراج بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ "ادھر لیٹے ہوئے ہیں۔"

محسن کی صورت پہ بارہ بج گئے۔ "کہاں؟"

نظر میری بھی اس خالی جگہ پہ ٹھہر گئی تھی جہاں ابھی چند منٹ پہلے سراج بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ "مردود... وہ بھاگ گیا محسن۔" میں نے کہا۔ "مگر کیسے پڑا تھا۔ اسے ہوش آ گیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" محسن نے میرے کندھے پہ تھپکی دی۔ "بھاگ کے جائے گا کہاں۔ ہمارے سامنے سے تو گزرا نہیں۔ گیا ہوگا تو ادھر ہی گیا ہوگا۔ تو تھوڑا سا دائیں طرف جا۔ میں ادھر بائیں طرف رہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اتنی سی دیر میں وہ بہت دور نہیں جا سکتا۔ اس کی حالت بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ چیتے کی طرح دوڑ سکے۔ ایک میل کے اندر ہی ہوگا ابھی۔"

"زیادہ دور مت جانا۔" محسن نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ ہم ہی بچھڑ جائیں اور باقی وقت ایک دوسرے کو ہی تلاش کرتے رہیں۔"

ہم دونوں ساتھ ساتھ روانہ ہوئے۔ ہم دونوں کے پاس اب دو دو ریوالور تھے۔ جو ہم نے سراج سے، منیر احمد سے اور دو محافظوں سے حاصل کیے تھے۔ ایک ایک ہم نے ہاتھ میں رکھا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے چلتے گئے۔ میری نظر زمین پہ بھی تھی کہ کہیں کوئی نقش قدم یا سراج کے گزرنے کی کوئی نشانی دکھائی دے تو ہم اس کی سمت کا تعین کر سکیں مگر وہاں چٹانیں تھیں اور پھر پتھریلی زمین تھی جس میں نصف سے زیادہ کنکروں کی آمیزش تھی۔ اس پہ نقش پا کا ثبت ہونا مشکل تھا۔ سورج

www.paksociety.com

نکل آنے کے بعد راستہ صاف نظر آنے لگا تھا۔

"شیطان سے زیادہ مکار آدمی ہے یہ سراج بھی۔" محسن بولا۔

"ہاں — خبیث نے کس طرح مجھے قسم دے کر پابند کیا تھا" میں نے کہا۔ "یہ تو اچھا ہوا کہ خود اس نے اپنی طرف سے بدعہدی کی اور اب میں قسم نباہنے کا پابند نہیں رہا۔"

"ورنہ کیا تو سچ مچ اس کو جانے دیتا؟"

"ہاں — قسم تو قسم ہی ہوتی ہے یار — آدمی دنیا کو دھوکا دے سکتا ہے لیکن اپنے ضمیر کو دھوکا نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے تجھے — ابے یہ جنگ ہے کوئی اس کا زمانہ نہیں ہے... کم سے کم جانے لیے — جنگ چل رہی ہو تو یہ سالے بے ادب آداب — اصول اور شرافت کے قاعدے ضابطے نہیں چلتے۔"

"میں مانتا ہوں —" میں نے کہا۔ "مگر اس وقت میرا یہی خیال تھا کہ سراج کو اپنی طرف سے ایک موقع ضرور دوں گا — ممکن ہے باہر آ کے میرا بھی خیال بدل جاتا — لیکن سب سے بڑی عقل مندی کا ثبوت تو نے دیا تھا — تو قسم سے بچ گیا تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا۔"

"یہ بھی اچھا ہوا کہ ہم نے جو ملا، پیٹ میں ڈال لیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "ورنہ اس وقت چلنے کی طاقت بھی نہ ہوتی۔"

"سراج کا ملنا بہت ضروری ہے۔" میں نے تشویش سے کہا۔ "ورنہ ہم لاکھ رہ جائیں گے — ان سب کا سراغ سراج ہی سے مل سکتا ہے۔"

میری مراد رابعہ، کیتھرین اور شیلی سے تھی اور محسن نے یہ بات سمجھ لی — اس نے سر ہلایا اور اچانک اس کی صورت پہ دکھ کا تاریک سایہ پھیل گیا۔ میں نے اس کے وجود کو ڈسنے والے خیال کے کرب کو دیکھا — ایک لمحے کی کسک محسن کی آنکھوں تک آئی مگر اس نے درد کو اشک نہیں بننے دیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شہلا کی یاد تھی — جو اس کی محبوبہ تھی — اس کی بیوی تھی اور اس کے ہونے والے بچے کی ماں تھی اس بچے کی جس نے محسن کے خیالوں میں ہی زندگی پائی اور حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔ میں محسن سے تسلی اور ہمدردی کے الفاظ کہنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے الفاظ ہی نہیں سوجھے — میں سوچتا رہا کہ محسن سے کیا کہوں۔ کہنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں — الفاظ ہیں تو وہ بس الفاظ ہیں — الفاظ کیا کر سکتے ہیں — کون سا دکھ دور کر سکتے ہیں، کس نقصان کی تلافی کر سکتے ہیں۔ کسی درد کا درماں بن سکتے ہیں — کیسے زخم بھر سکتے ہیں — یہ سب تو خدا کرے گا اور وقت کرے گا جو سب سے بڑا مسیحا ہے۔ چنانچہ میں چپ رہا — کچھ بھی نہ بول سکا — پھر میں نے دیکھا تو محسن مسکرا رہا تھا۔

"اب یہاں سے میں تھوڑا سا دائیں طرف جا رہا ہوں۔" محسن نے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن ہر طرف وہی قد آدم جھاڑیاں تھیں اور جنگل تھا جو اب گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ اس زرخیز مٹی والے علاقے میں ہمیں ریگستانی علاقے کا وجود میرے لیے باعث حیرت تھا۔ لیکن وہ بہت چھوٹا سا قطعۂ زمین تھا۔ اب جہاں سے ہم گزر رہے تھے، وہاں سونا اگلنے والی مٹی تھی۔ ہر طرف سبزہ اگ رہا تھا اور بقول غالب سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب — بیکاؤ، شیشم، دھریک اور ببول کے درخت زیادہ نظر آنے لگے تھے۔ جس سے فضا میں صبح بہار کی لطافت اور خوشبو آگئی تھی — درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے اب تلاش رزق کے لیے پر تول رہے تھے اور ان کی چہکار ہر سمت سے سنائی دیتی تھی — آبادی کے نشان ہنوز مفقود تھے ورنہ مجھے زمین پر پگڈنڈیاں نظر آ جاتیں — پگڈنڈی قرب و جوار میں انسانی آبادی کی علامت ہوتی ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ یہیں اسی جگہ سے لوگ گزرتے ہیں۔ اکا دکا آدمی یا ہل چلانے والے — بازار جانے والے — کھیتوں میں محنت کرنے والوں کے لیے کھانا لے جانے والی جفاکش بیویاں — کنوؤں سے پانی بھر کر لانے والی مٹیاریں — نہ جانے کتنی صدیوں تک آدمی کے قدم زمین کو ایک ہی جگہ سے روندتے جاتے ہیں اور تب آہستہ آہستہ اس پہ زمین پہ ایک راستے کے نقوش ابھرنے لگتے ہیں۔ شہر میں محکمۂ تعمیرات والے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ نقشے بنواتے ہیں۔ سروے ہوتا ہے۔ ٹینڈر طلب کیے جاتے ہیں اور مجموعی اخراجات کا حساب لگایا جاتا ہے کہ اس میں سے کتنا سڑک کی تعمیر پہ صرف ہو گا اور کتنا کس کس کی جیب میں جائے گا — اسے منافع، مزدوری، کمیشن یا رشوت، کچھ بھی سمجھا جا سکتا ہے جو سڑک بنانے والے بائیں ہاتھ کے کھاتے ہیں — گاؤں میں ایسا کچھ نہیں ہوتا — بس آدمی چلتے جاتے ہیں۔ ان کے پیر مضبوط قدموں کے نشان دیکھ کر اگلی راہ پہ اٹھتے رہتے ہیں — باپ کے بعد بیٹا — پھر اس کی اولاد — سب اس پر چلتے ہیں اور یہ انسانی قدم خود بخود ایک سڑک بنا دیتے ہیں۔ کسی سروے — بلیو پرنٹ اور ٹینڈر کے بغیر — اور پھر یہ راستے شاہراہوں کی طرح گاؤں کو گاؤں سے اور گھر کو گھر سے ملاتے ہیں اور کبھی مسافروں کو بھٹکنے نہیں دیتے مگر یہاں مجھے ایسے آثار بالکل بھی نہیں مل رہے تھے۔

"حیرت کی بات ہے محسن کہ اتنا بڑا دھماکا کسی نے نہیں سنا۔" میں نے کہا۔

"سنا ہو گا تو آنے والوں کو وقت لگے گا۔" محسن بولا۔ "کون جانے یہاں سے آبادی کتنے کوس پر ہے — میرا خیال ہے ادھر ہو گی — مخالف سمت — جدھر سے ہم آئے ہیں — دھماکا یقیناً میلوں تک ضرور سنا گیا ہو گا۔"

"صبح کا وقت تھا — آٹھ دس میل تک آواز پہنچی ہو گی۔" میں نے کہا۔

"میں اس طرف پینتالیس ڈگری پہ جا رہا ہوں — تو دوسری طرف پینتالیس ڈگری کے زاویے پہ تلاش کر۔" محسن نے کہا۔ "لیکن منہ اٹھا کے چلتے نہیں جانا ہے — ایک میل کے بعد پھر پینتالیس درجے مڑ کر چلنا شروع کریں گے۔ تو ایک جگہ مل جائیں گے — تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر۔"

"یہ حساب کا فارمولا ہے بھئی — غلط نہ ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "میں نکل جاؤں کالا شاہ کاکو کی طرف اور تو جا پہنچے دیچھ کی ملکیاں...؟"

آہستہ آہستہ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا۔ میں نے محسن کے غائب ہونے سے پہلے اس کی طرف ہاتھ اٹھا کے انگلیوں سے وی کا نشان بنایا — وی فار وکٹری — اس نے جواب میں مجھے مٹھی بند کر کے مکا دکھایا جو اتحاد کی علامت تھا اور طاقت کا مظہر تھا — یہ مکا پاکستان کے پہلے وزیراعظم مرحوم لیاقت علی خان نے ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے دکھایا تھا اور تب سے بہت شہرت حاصل کر گیا تھا — مجھے اس وقت محسن کا یہ اشارہ بہت حوصلہ افزا لگا۔ یہ اتفاق میں برکت ہے کا سمبل تھا۔ مل کر رہو اور متحد رہو تو یہی سب سے بڑی قوت ہے۔

محسن درختوں میں غائب ہو گیا تو میں نے زیادہ انہماک کے ساتھ زمین کے آثار پر غور کرنا شروع کیا۔ ہمارے ملک کے ریگستانی اور پہاڑی علاقوں میں جہاں عام طور پہ جغرافیائی حالات کسی سراغ کو باقی نہیں رہنے دیتے۔ تجربہ کار کھوجی قدموں کے نشان دیکھ لیتے ہیں یا وہ نشانات تلاش کر لیتے ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص کدھر گیا ہے — ان کی آنکھیں انتہائی باریک بین اور تیز ہوتی ہیں کہ گھاس کی ایک پتی بھی مڑی ہوئی یا ٹوٹی ہوئی دکھائی دے تو وہ چونک کے رہ جاتے ہیں اور بیشتر صورتوں میں ان کی تلاش کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر بار وہ کسی مجرم کو ہی تلاش کریں۔ بعض اوقات کوئی مفرور لڑکی یا منحرف ہو جانے والا اونٹ بھی ڈھونڈنا پڑتا ہے تو وہ ڈھونڈ نکالتے ہیں — ان کی نظر صرف قدموں کے نشان پہ نہیں رکھتی — جانور نے جہاں گھاس پر منہ مارا ہو یا درختوں سے پتے توڑے ہوں، یہ کھوجی اسے بھی نوٹ کر لیتے ہیں۔ اس وقت میرے ساتھ ایسا ہی کوئی کھوجی ہوتا تو مجھے سیدھا سراج کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیتا۔

تاہم میں سراغ رسانی کے فن میں اپنی ناواقفی کے خیال سے مایوس نہیں ہوا۔ میں نے زمین کا مشاہدہ جاری رکھا۔ ایک جگہ مجھے پگڈنڈی دکھائی دی جو دائیں سے بائیں جا رہی تھی مگر میں نے اس پر چلنے کا خیال چھوڑ دیا۔ ایک تو اس لیے کہ مجھے محسن کی ہدایات کے مطابق ناک کی سیدھ میں اور پینتالیس ڈگری پہ چلنا تھا اور میں پگڈنڈی پہ مڑ لیتا تو محسن سے نہ مل پاتا۔ دوسری وجہ میرا ذاتی خیال تھی کہ سراج چالاک آدمی ہے — وہ عام اور آسان راستے سے دور رہے گا۔ وہ دشوار گزار راستہ اختیار کرے گا، جہاں کسی سے ملنے کا امکان کم سے کم ہو۔

ایک جگہ میرے قدم خود بخود رک گئے اور میں ارشمیدس کی طرح — "پا لیا... پا لیا..." چلاتے چلاتے رک گیا — گھاس پہ خون تھا — میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس داغ کو غور سے دیکھا تو مجھے مایوسی ہوئی — یہ بہت پرانا خون تھا جو خشک ہو چکا تھا۔ کچھ آگے جا کے مجھے یہی خون پھر نظر آیا۔ چوتھی جگہ یہ خون گھاس پہ پپڑی بن کے منجمد ہو گیا تھا اور میں نے اس پپڑی کو اٹھایا تو یہ سرخ رنگ کا پاپڑ ٹوٹ گیا — میرے لیے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ خون آدمی کا ہے یا جانور کا مگر اتنا میں وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ خون بہت پرانا تھا — وہیں میری ناک نے تعفن بھی محسوس کیا اور کچھ آگے جانے پر میں نے ایک لاش دیکھی — مگر وہ لاش کتے کے سائز کے کسی جانور کی تھی۔ وہ لومڑی بھی ہو سکتی تھی اور گیدڑ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ اسی کا خون تھا۔ جانور اب ہڈیوں کا پنجر رہ گیا تھا۔ اس کا سارا گوشت حشرات الارض اور مردار خور چٹ کر چکے تھے۔

"لاحول ولاقوۃ —" میں نے زور سے کہا اور ناک پہ رومال رکھ لیا۔

"باہر کس پہ لاحول بھیجتا ہے —" میرے پیچھے سے کسی نے خوفناک آواز میں کہا۔ "شیطان تو تیرے اندر ہے — بھوت کے بچے...!"

میں اچھل پڑا — بے اختیار میرا ہاتھ ریوالور پہ گیا — لیکن وہ کوئی ملنگ تھا... پچاس ساٹھ سال کا یا اس سے بھی

www.paksociety.com

زیادہ عمر کا ــــ اس کی صحت اب بھی اچھی تھی۔ اس نے عجیب مضحکہ خیز حلیہ بنا رکھا تھا ــــ ملنگ سے زیادہ وہ جوکر لگتا تھا ــــ اس کی دھوتی پہلے ضرور نارنجی رہی ہوگی مگر اب اس پہ داغ ہی داغ تھے ــــ گرد و غبار اور میل نے دھوتی کو سبز اور رنگ دے دیے تھے۔ مزید یہ کہ کثرتِ استعمال سے دھوتی ایئر کنڈیشنڈ ہو گئی تھی اور اس میں ہر طرف تازہ ہوا کے آنے اور جانے کے لیے سوراخ تھے متعدد سوراخ ہو چکے تھے ــــ دھوتی پہ اس نے بے حد میلا کچیلا پھٹا ہوا اور لال رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ بقول مشیر تفریحی یہ لنڈا کا کوٹ تھا تو ــــ کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار ہے ــــ گورے کے بعد اس کو جانے کتنے کسی غریب کالے نے پہنا تھا اور جب اس کے لیے بھی بے مصرف ہو گیا تو شاید اس نے کسی کو خیرات کر دیا تھا ــــ اب یہ ملنگ نے بڑی شان سے پہنے کھڑا تھا۔ اس کے سر پہ جو فلیٹ ہیٹ تھا، اسے ملنگ نے کھینچ کھینچ کر کانوں تک بڑھا دیا تھا اور اس کے زیریں حصے میں ملنگ کا سر کسی گیند کی طرح نظر آتا تھا۔ باقی چیزوں کی طرح یہ فلیٹ ہیٹ بھی تاریخی حیثیت رکھتا تھا جس کے نیچے سے ملنگ کے بھیجے اُلجھے ہوئے سفید بال نکلے ہوئے تھے ــــ سر کے بال اس کی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں یوں مل گئے تھے ... کہ من تو شدم تو من شدی کا منظر تھا ــــ پتا نہیں چلتا تھا کہ داڑھی کہاں ختم ہوئی اور جٹائیں کہاں سے شروع ہوئیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک بہت موٹا ڈنڈا تھا جسے اصطلاحاً "سونٹا" کہا جاتا ہے اور جو کُونڈی کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے ..... اکیلی .... کُونڈی بھنگ نہیں گھوٹ سکتی جو جانے ملنگوں کا فیورٹ ڈرنک ہے۔ ملنگ نے گلے میں بھی چھوٹے بڑے رنگین منکوں کی جو مالائیں پہن رکھی تھیں، اُن کا وزن دو سیر تو ضرور ہو گا ــــ یہ فریبی ملنگ ــــ مجذوب اور بہروپیا نیم پاگل ہوتے ہیں اور کمزور عقیدے کے لوگ ان کی بے سروپا باتوں سے اپنی اپنی عقل اور ضرورت کے مطابق مفہوم اخذ کر کے انھیں معرفت کی باتیں سمجھ لیتے ہیں ــــ یا یہ بہت چالاک لوگ ہوتے ہیں اور جانتے بوجھتے ہوئے بھی ایسا حلیہ بنا لیتے ہیں کہ عام آدمی دیکھ کر مرعوب ــــ تو نہیں ہوتا کچھ خوف زدہ ہو جاتا ہے ــــ یہی خوف اُن کے دل میں عقیدت پیدا کر لیتا ہے۔ اگر یہ ملنگ بیٹھے گلے میں ایک بے ضرر سا سانپ ڈال لیتا تو نہ جانے کتنے لوگ اس کے مرید ہو جاتے۔

"کیا کہا ــــ؟" میں نے ریوالور کا رُخ اس کی طرف کر دیا۔ "میں بھوت کا بچہ ہوں ــــ کالر ڈرن کی اولاد؟"

ملنگ کی گھگھی بندھ گئی "ارے ــــ ارے بابا۔ غلطی ہو گئی فقیروں سے ــــ جانے دے ہمیں نامراد ــــ اور تو بھی نامراد جا ــــ میں دُنیا سے جا یا یہاں سے ہی...؟"

"میں جاؤں ــــ؟" میں نے گرج کے کہا۔ "پہلے میں تجھے تو بھیج دوں نامرادی کے بچے ــــ بیٹھ ــــ چل بیٹھ نیچے۔"

"ہم تو ہیں مٹی کے پُتلے ــــ مٹی ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے ہم مٹی میں مل جائیں گے ــــ" وہ دھپ سے نیچے بیٹھ گیا۔ "مگر تو مٹی میں سونا کھوج رہا ہے ــــ تیرے من میں لڑو مانا ہے ــــ تیری نظر خزانے تلاش کر رہی ہے۔"

"اپنا ریکارڈ بند کر دو ملنگ مہاراج ورنہ مار مار کے ماسے پتنگ بنا دوں گا...."

"کیا بنا دے گا ــــ پتنگ... یعنی جا ہوائی ــــ نادان ہم پہلے ہی پتنگ بنے ہیں ــــ" وہ بولا۔

"میں پتنگ بنانے کی بات کر رہا تھا ــــ" میں نے کہا۔ "یا ہی ہوا چھکا کر کے اڑا دوں گا ــــ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہم اپنے سوہنے محبوب کو تلاش کر رہے ہیں بھوت کے بچے۔"

"پھر ... مجھے بھوت کا بچہ کہا۔" میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کرنا چاہا مگر وہ بڑی پھرتی سے لیٹ گیا۔ "سیدھی طرح جواب دے .... بدمعاش ــــ کون ہے تو؟"

"فقیر پہ ہاتھ اٹھائے گا تو اللہ تجھے اٹھائے گا بھوت کے بچے" ملنگ نے اکڑ کر کہا ــــ "ابھی موقع ہے۔ جو مانگنا ہے مانگ لے۔"

"میں ایک سوال کا جواب مانگ رہا ہوں" میں نے ملنگ آخر اسے بھوت کا بچہ کہنے پہ معاف کر دیا۔ "تم نے کسی آدمی کو ادھر سے گزرتے دیکھا ہے؟"

"کیا تو آدمی نہیں ہے ــــ مجھے پتا تھا تو مان جائے گا کہ تو بھوت کا بچہ ہے۔" اس نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔

اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا ــــ میں نے اس کے ایک لات رسید کی ــــ وہ گرا اور پھر اٹھ کے بیٹھ گیا ــــ لات اس کے صحیح نہیں پڑی تھی۔

"میرے علاوہ تم نے اور کو دیکھا ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے اپنا فلیٹ ہیٹ جھاڑ کر سر پہ رکھا اور دبا کر کھوپڑی پہ فٹ کر لیا۔ "ہم نے تو بہت کچھ گزرتے دیکھا ہے وقت کو ــــ بادشاہوں کے جاہ و جلال کو ــــ فرنگی کے دورِ استبداد کو ــــ دل پہ قیامت کو ــــ شاہِ جنات کو" میں بس کے منہ سے یہ الفاظ سُن کے چونکا۔ اچانک اس نے عالمانہ قسم کی گفتگو شروع کر دی تھی ــــ کسی جاہل آدمی کے لیے یہ مجذوب کی بڑ ہو سکتی تھی مگر میرے لیے یہ بہت بامعنی اور کسی حد تک شاعرانہ گفتگو تھی۔

"ہم تو تجھے بھی گزرتا دیکھیں گے بھوت کے بچے" وہ بولتا گیا۔

میں نے اس کی داڑھی پکڑ لی۔ "سچ سچ بتاؤ، تم کون ہو؟ مجھے تو تم دشمن کے ایجنٹ لگتے ہو۔"

"ارے بابا ــــ کیوں ہماری اکلوتی داڑھی کا دشمن ہوا ہے چھوڑ اسے ــــ بچہ ناسمجھ ہے تو کچھ اور پکڑ لے ــــ یہ عصا پکڑ لے ہمارا ہاتھ پکڑ لے" وہ خود ہی چلانے لگا۔

"میں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک حقیقت معلوم نہیں کر لوں گا" میں نے کہا۔ تو اس اَڑیل کے اس بیچ کُھو مم رہا تھا ــــ تیرا تو بھیس فقیروں والا ہے مگر تو فقیر نہیں ہے۔"

"دنیا کو فقیروں کا بھیس غالب .... تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں ــــ سچا بھوت کے بچے" اس نے اپنی اصل آواز میں کہا اور میں نے غالب کی آواز پہچانی تو انتہائے حیرت سے منجمد ہو گیا۔

"ارے بھائی! اب تو داڑھی چھوڑ دو ہماری ــــ پوری داڑھی کا ناس کر دیا جھٹکوں سے ــــ" غالب بولا۔

"غالب ــــ مرزا غالب" میں نے چیخ کر کہا ــــ پھر میں اس سے لپٹ گیا ــــ اس نے مجھے دعائیں دی تھیں سکتے ماتے اور میں نے اسے محبت اور خوشی میں ہم ایک دوسرے کو جتنی گالیاں دے سکتے تھے دے چکے تو میں نے آنکھوں میں خود بخود آ جانے والے آنسو صاف کیے۔

"تو زندہ ہے ــــ مجھے پتا تھا، تو نہیں مر سکتا بھوت کے بچے!" میں نے مرزا غالب سے کہا۔ "تو غائب ہو گیا تھا بھوت کے بچے ــــ مگر تو یہاں کیسے پہنچا؟"

"جیسے تو پہنچا" غالب نے اپنے لمبے کوٹ کی جیب میں سے سگریٹ نکالی اور وہیں بیٹھ گیا۔ "آدمی کو اس کی تقدیر کہیں بھی لے جا سکتی ہے ــــ کوئے یار سے سوئے دار تک۔"

"وہ تو ہے ــــ مگر یہ جگہ کیسے معلوم ہوئی تجھے ــــ تو اکیلا آیا ہے ــــ باقی سب کہاں ہیں؟ نازو کیسی ہے؟" میں نے ایک سانس میں کہا۔

"پھر نہ کہتے دم لے" غالب نے دو سگریٹیں جلائیں اور ایک مجھے دے دی۔ "یہاں تو میں اکیلا ہی پہنچا ہوں ــــ ایک حضرت ہیں انسپکٹر شنڈ داس ...."

"میں نہیں یار ... مجھے" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کیا اُن کا پیغام مل گیا تھا؟"

"اس پیغام کے بغیر تمھارا پتا ٹھکانا کیسے ملتا" غالب نے کہا۔

"پھر تم نے اتنی دیر کیوں کی؟" میں نے کہا۔

"دیر کہاں کی، میرے عزیز ــــ تمھارے بارے میں اطلاع ملی تھی نازو کو ــــ بلکہ اس کے برادرِ کلاں حضرت اکرام شیخ کو ــــ وہ پہنچے سیدھے ایس ایس پی صاحب کے پاس ــــ واضح ہو کہ خدا نے ان کے دل میں سب کی ڈانٹ اور ان کو صراطِ مستقیم پہ چلنے کی توفیق عطا کی۔ انھوں نے حقائق کو سمجھا اور اکرام شیخ کو ذرا جانے کا مشورہ دیا کہ وہ اپنی ہمشیرہ صاحبہ ... محترمہ نازلی بیگم صاحبہ..."

"نازو کافی ہے ــــ تو اپنی محبوبہ کا نام لیتے ہوئے تکلف کر رہا ہے" میں نے کہا۔

"بجا ارشاد ــــ اکرام شیخ نے نازو سے مشورہ کیا اور ظاہر ہے وہ تو ہے شاہِ جنات کی بیٹی ــــ" غالب بولا۔

"مگر تُو کہاں مل گیا اسے؟" میں نے کہا۔ "میرے بارے میں تو عام اطلاع یہ تھی کہ اپنے آبائی گھر میں مدفون ہے ــــ"

"یہ اطلاع خود میں نے دی تھی" غالب بولا۔ "اور سب سے پہلے نازو کو دی تھی ــــ تمھارے نکلتے ہی میں بھی رفو چکر ہو گیا تھا۔ بال بال بچا ورنہ وہیں جل مرتا ــــ میں نے اندازہ لگایا کہ ان حالات میں میرا مرحوم نہ ہونا ایک معجزہ ہی تھا ــــ میں اندر دبکا ہوا تھا کہ مناسب وقت پہ دخل در معقولات کروں گا اور دشمنوں کو تہس نہس کر دوں گا مگر اسی میں وقت نکل گیا۔ مجھے سخت ملال تھا کہ تم لوگ کیا سمجھے ہو گے ــــ باہر نکل کے دیکھا تو تم میں سے کسی کا پتا نہ تھا ــــ پھر میں کیا کرتا ــــ میں عبدالغفور منظر کے گھر چلا گیا۔ اس کے ایک درجن بچے ہو گئے۔"

"ایک درجن کیا بچے ہو گئے؟" میں نے کہا۔

"سمجھے اور کیا ..." غالب نے کش لے کر جواب دیا۔ "وہ تو پہلے ہی تھے ــــ اس بار ــــ بقول منظر کے ــــ بیوی نے ایڈوانس بکنگ کر رکھی تھی۔ آئندہ سال کی بھی مانگی ہے اس نے خیر اس کے یتیم خانے میں میرے لیے بھی جگہ نکل آئی ــــ وہاں سے میں نے پہلے تو ان کو فون کیا ــــ" اس نے شرمانے کی بھونڈی اداکاری کی۔

"اچھا ــــ اور انھوں نے کیا کہا؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"انھوں نے کہا... مگر تجھے کیوں بتاؤں کہ میں نے کیا نہیں کہا اور اس نے کیا نہیں کہا ــــ یہ ہماری پیار محبت کی باتیں ہیں۔"

www.paksociety.com

غالب بولا: "آخر میں اُس نے کہا کہ جہاں ہو، وہیں رہو۔"

"مطلب یہ کہ اپنی اوقات میں رہو۔۔۔ خیر! اس سے آگے بڑھے یا بے تکلف ہونے کی کوشش کی؟" میں نے کہا۔

"ایسی غلطی میں کر سکتا ہوں؟ مجھے اپنی ہڈیاں عزیز ہیں۔" غالب نے کہا۔ "اس کا مطلب تھا کہ منظر کے گھر میں رہو۔ ہم لوگ یعنی اغوا شدہ حضرات و خواتین کو موقع ملا تو تم کسی نہ کسی جگہ سے رابطہ ضرور قائم کرو گے اور ایسی جگہ انکل رضوی کا گھر تھا، نازو کا گھر یا پھر عبدالودود منظر کا گھر۔۔۔ اُسے یقین تھا کہ تم خود فون نہ کر سکے تو کسی کو نمبر دے دو گے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم پیغام موصول کرنے کے لیے موجود ہوں۔ فون تو نہیں ملا لیکن انسپکٹر سدرواس کا ایک خط ضرور مل گیا جس میں خاصی مفید معلومات تھیں اور اس خط نے ہماری بڑی رہنمائی کی۔۔۔ وہ کیسے مارا گیا یار۔۔۔؟"

"یہ بڑی لمبی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "مختصر میں بتا دیتا ہوں کہ سمجھ لو کہ اسے سراج نے گولی مار دی۔ وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔"

غالب کچھ دیر چپ رہا۔ "تو وہ کافر۔۔۔ مگر اس کے لیے مغفرت کی دعا ضرور ہو گی آگے جو اُس غفور الرحیم کی مرضی۔"

"تو نے بتایا نہیں کہ نازو اور اکرام شیخ کہاں ہیں؟"

"وہ بھی میرے ساتھ ہی تھے۔ اب کراچی میں ہیں۔" غالب نے کہا۔

"کراچی میں؟ کراچی کیا لینے گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"تمہیں لینے۔" غالب نے کہا۔ "پتا یہ چلا تھا کہ تم کو کسی کارگو شپ پر مال کے ساتھ کہیں بھیجا جائے گا، تم ایکسپورٹ آئٹم ہو۔"

"وہاں ہزاروں جہاز لاکھوں ٹن مال آتا ہے، چڑھاتے ہیں۔ وہ کیا سارے جہازوں کی جامہ تلاشی لیں گے؟" میں نے کہا۔

"نہیں، سدرواس نے لکھا تھا کہ جو کریٹ وہاں پہنچیں گے اُن پر نام پتا غلط ہے۔" غالب بولا۔ "بڑی احمقانہ حرکت تھی یہ ولا اور لائنڈ کمپنی کی۔ ہر کریٹ پر شہر کا نام تھا: ایڈیلیڈ سٹی۔"

"اور ملک کا نام تھا ڈی بی و اسٹیا۔ رائٹ؟" میں نے کہا۔

"رائٹ۔ وہ دونوں یہی دیکھیں گے۔" غالب نے کہا۔ "میں نے تو اس بیچ ٹھاکر کے بھائی سے کہا تھا کہ میری نظر بہت تیز ہے، میں اور نازو چلے جاتے ہیں کراچی اور قسم بھی کھائی تھی کہ ہم صرف کریٹ دیکھیں گے لیکن وہ اڑ گیا کہ نظر نہیں تم خود بھی بہت تیز ہو اور میری بہن تم سے بھی تیز ہے۔ میں تمہاری سلامتی اسی میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں الگ ارسال کر دوں تاکہ تم سالم رہو۔۔۔ بس اسے پار جانی۔" غالب نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "یہ فقیر وہ آ گیا صحرا کی خاک چھانتے۔"

"تو نے کمال کا میک اپ کیا اور خوب آواز بنائی یار۔۔۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ "تو کب سے موجود ہے یہاں۔۔۔؟"

"میں رات کو یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ گرد و نواح کے کچھ دیہاتیوں نے مجھے بتایا تھا کہ ادھر ایک پہاڑی سی ہے، وہاں کبھی کبھی جہاز اُترتے ہیں۔ بس میں سمجھ گیا کہ یہی ہے میری منزلِ مقصود، ورنہ یہاں کوئی ائیرپورٹ تو ہے نہیں۔ رات بھر میں اِدھر اُدھر سے جائزہ لیتا رہا مگر مجھے سوائے ایک کمرے کے کچھ نظر نہیں آیا۔ اس کے باہر ایک نیلے رنگ کا چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا ہوا تھا 'واپڈا'۔ اور کچھ بھی نہیں۔ یہ کوئی گرڈ اسٹیشن تو تھا نہیں، بس ایک کمرا تھا۔ میں نے غور کیا کہ کیا یہ سب اسٹیشن ہو سکتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا دوست؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"نادان دوست! سب اسٹیشن وہاں بنائے جاتے ہیں جہاں لوڈ زیادہ ہو۔" غالب بولا۔ "ڈسٹری بیوشن ڈپو سمجھ لے بجلی کا۔ وہاں سے ہائی وولٹیج کے تار نکلتے ہیں اور صاف نظر آتے ہیں۔ ان کے باہر عموماً لال رنگ کی ایک چیٹ لگا دی جاتی ہے اس پر ہمیشہ مجھے وہی ایک تصویر نظر آتی ہے، تیرے جیسا ایک کھوپڑی کی۔ نیچے لکھا ہوتا ہے خطرہ گیارہ ہزار وولٹ یا تینتیس ہزار وولٹ۔ لیکن اس کمرے میں پول سے بجلی کے دو معمولی تار جا رہے تھے۔ مزید یہ کہ سب اسٹیشن اتنا چھوٹا بھی نہیں ہوتا۔"

"مرزا غالب! کاش واپڈا والے اپنا محکمہ تجھے بخش دیں۔ آخر اتنی موٹی باتیں ان کی عقل میں کیوں نہیں آئیں؟" میں نے کہا۔

"آ گئی ہوں گی تو بھی گم ہو گئی ہوں گی۔" غالب بولا۔ "جب ہاتھ میں نوٹ آ جاتے ہیں تو آدمی صرف نوٹ دیکھتا ہے، ملک اور قوم کا مفاد نہیں دیکھتا۔ یہ نہیں دیکھتا کہ وہاں ہو کیا رہا ہے اور کیوں کالا ہے۔ جب میں نے تصدیق کر لی کہ یہ سب اسٹیشن نہیں اور جو سنتری باہر کھڑا ہوا ہے، وہ بھی واپڈا کا ملازم نہیں۔۔۔"

"یہ تصدیق کیسے ہوئی؟"

"میں نے سنتری کے پاس جا کر پوچھا تھا کہ بابا! کیا واپڈا میں نوکری مل جائے گی؟" غالب بولا۔ "وہ کہنے لگا، دفع ہو جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔ اس سے تصدیق ہو گئی۔ یہ واپڈا کا ملازم ہوتا تو اتنا بُرا نہ مانتا، رشوت مانگتا یا دعا دیتا۔ میں نے کہا: 'چچا! تم میری نوکری تو نہیں لے رہے ہیں، اگر گولی مارنا ہے تو واپڈا کو مارو اور خلقِ خدا کی دعا لے۔' وہ ذرا مشتعل ہوا اور آگے بڑھا تو میں نے اسے لٹا دیا اور ٹھنڈا کر دیا۔"

"کیسے؟ عالی! ہاتھوں سے۔۔۔ نازو کی شاگردی کر لی ہے کیا؟"

"آہ! ایسی دل دکھانے والی باتیں مت کر۔ وہ جفا کار حسینہ مجھے اپنی شاگردی میں قبول کرے تو میں تین بار ایجاب و قبول کو بہتری کہوں۔ سنتری کو میں نے بھینچنے سے ٹھنڈا کیا۔" غالب نے کوٹ میں ہاتھ ڈالا اور بیلٹ میں سے سائلنسر والا پستول برآمد کیا۔ "یہ وہ دھوکے میں مار گیا، اُسے کیسے خیال آ سکتا تھا کہ آج کل کے ملنگ بھی گودڑی میں پستول رکھتے ہیں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اندر جاؤں کہ فائرنگ کی آواز آئی اور میں دور چلا گیا۔ وہ شیشی لگنے کے فائر تھے۔ دور سے ہی میں نے تین گاڑیاں روانہ ہوتے دیکھیں۔"

"تم نے کسی کو دیکھا؟"

"نہیں، میں قریب ہوتا تب بھی نہ دیکھ سکتا اور دیکھ لیتا تو کیا فرق پڑتا۔ وہ اصلی خبر تو تیتر ہوں گے نا۔ تینوں گاڑیاں ایک ہی سمت گئی تھیں۔ میں پیچھے دوڑتا تو کیسے دوڑتا۔ رات کا وقت تھا، اندھیرے میں ویسے بھی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تاہم میں اسی طرف گیا تھا اور اب واپس آ رہا تھا کہ یہ دھماکا سنا۔" غالب بولا۔

"وہ راجہ بخت سرین اور ٹیڈی کو لے گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "سراج کو ہم نے تالا میں کر لیا تھا۔"

"وہ دھماکا تم نے کیا تھا؟ کیا تم یہاں۔۔۔؟"

"وہی جو سامنے پہاڑ والے کے اڈے پر تھا۔" میں نے کہا۔ "افسوس یہ ہے کہ خبیث سراج بھاگ گیا۔ بس چند سیکنڈ کے لیے نظر چوکی تھی کہ وہ نکل گیا۔ شوکر کا بچہ نکل کے بے ہوش پڑا تھا۔ میں اور محسن اسے ہی تلاش کرنے نکلے تھے۔"

"محسن؟ کہاں ہے محسن؟" غالب ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔

"وہ مجھے کوس دار پر ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اس نے مجھے ہدایت دی تھیں کہ میں پینتالیس ڈگری پر ایک میل چلوں پھر بائیں جانب اسی زاویے پر آتا رہوں تو جہاں سے ہم چلے تھے، دو اِن سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر پہنچ جائیں گے۔ وہ تو پہنچ چکا ہو گا۔"

"شکر ہے، تم دونوں کی فطرت ایک ہے۔ جب تم مرزا مستقیم سے بلک کے لوکپ لگانے بیٹھ گئے تو وہ بھی کہیں بھٹک گیا ہو گا۔" غالب نے کہا۔ "چلو اب ہم دونوں اُسے تلاش کرتے ہیں۔ اندازاً سمت بتاؤ۔"

میں نے اندازے سے سمت کا تعین کیا اور ہم دونوں روانہ ہو گئے۔ شور اب کافی بلند ہو گیا تھا۔ میں نے اور غالب نے پہلے اُسے بلند آواز سے پکارنے کا سوچا اور پھر یہ ارادہ ترک کر دیا۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں محسن سے پہلے ہماری پکار سراج کے کانوں تک نہ پہنچ جائے اور وہ جواب گولی سے نہ دے۔ جو بے شک اُسے غیر مسلح کر دیا تھا مگر اس کا کوئی بھروسا نہیں تھا کہ باہر بھی کہیں قریب چھپا رکھا ہو۔ وہاں سے گولا داغنے سے گولا نہ سہی سیر بھر کا پتھر کھینچ مارے۔ اس کے جنگلی پن پائے جانے کے خاصے امکانات تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ہماری نظر سے چھپنے کے لیے درخت پر چڑھ جائے اور پتوں میں چھپ کر بیٹھ جائے۔ زور سے سیر بھر کا پتھر وہ پھینکتا ہمارے سر پہ مار سکتا تھا اور ہمارے دل کی طرح ہمارے سر بھی بہت نازک تھے۔

تقریباً پون گھنٹے تک ہم اندازے غلط کرتے رہے اور اِدھر سے اُدھر بھٹکتے رہے لیکن محسن کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اب بھی میرے ذہن میں سمت کا تھوڑا سا حساب تھا کیونکہ سورج ابھی تک مشرق میں ہی تھا۔ کنفیوژن سے بچنے کے لیے میں نے ایک کھجور کے درخت کو نشانی بنا لیا تھا جو ٹھیک اسی سمت میں تھا جدھر سے سورج طلوع ہوا تھا اور یہ درخت اپنی قسم کا ایک ہی درخت تھا۔

"یہاں سکندرِ اعظم! مجھے تو یہ وحشت طلسمات لگتا ہے۔" بھورا غالب نے بالآخر کہا۔ "آخر محسن ابھی تک نظر کیوں نہیں آیا۔ ذرا میری طرف دیکھنا، کیا میں نظر آ رہا ہوں؟"

"بالکل صاف، پوری داڑھی کی جھاڑی سمیت۔۔۔"

"خدا کا شکر ہے تم بھی نظر آ رہے ہو ورنہ مجھے یہ وہم ہوا تھا کہ ہم ابھی تک گم نہیں ہوئے ہیں۔" غالب بولا۔ "غالباً اس لیے کہ کولہو کے بیل کی طرح ایک دائرے میں پھر رہے ہیں مگر یہ سمجھ رہے ہیں کہ بہت سفر کیا ہے۔"

"ناک کی سیدھ میں چلنے والا سیدھے راستے سے نہیں بھٹک سکتا۔"

"تیری ناک ٹیڑھی ہے، پیارے ہمسفر۔ میری ناک بھی۔۔۔" غالب نے کہا۔ "معلوم نہیں کس کی ضرب سے ہوئی مگر اسی کی وجہ سے ہم بھٹک رہے ہیں اور ہنوز وہیں ہیں جہاں سے چلے تھے۔"

"غلط۔ وہ جگہ کم سے کم دس قدم دور ہے۔" میں نے اشارہ کر کے بتایا مگر اس کے ساتھ ہی میری آواز بند ہو گئی اور میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے غالب کو روک لیا۔

"غور سے سنو مرزا جی!" میں نے جیسے بہت مشکل سے سرگوشی کی۔

غالب بھی سر ہلا کر: "سنا، میں نے بھی سنا۔"

"کیا سنا؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"جو تو نے نہیں سنا، میرے دل نے اُسے پکارا تھا۔" غالب بولا۔

"کاش میں آپ کے جیسا سیدھا کر سکتا۔ جناب! شرک کی آواز آپ صاف سنتے۔" میں نے کہا اور غالب کو ہاتھ سے پکڑ کے پیچھے کھینچ لیا۔ ہم دونوں ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئے۔ پھر میں نے درخت پر غور کیا اور مجھے درخت کے تنے سے ملی ہوئی شاخوں تک پہنچنا آسان نظر آیا۔ میں نے غالب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اوپر چڑھ گیا۔ زمین سے تقریباً بارہ چودہ فٹ اوپر جا کے دیکھنے پر مجھے کچھ نظر نہیں آیا تو مجھے فریبِ سماعت کا یقین آنے لگا۔ غالب نیچے کھڑا مجھے گھور رہا تھا کیونکہ اُس کے کانوں نے واقعی کچھ نہیں سنا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ کیا ہے اور میں نے اشارے ہی سے کہا

www.paksociety.com

میں اُسے صبر کرنے کو کہا۔ اس وقت مجھے ایک لطیفہ یاد آرہا تھا اور اگر میں نیچے اُترتا تو شاید وہی لطیفہ غالب مجھے شرمندہ کرنے کے لیے سُناتا۔ "کسی پاگل خانے میں ایک پاگل بستر سے زمین پر پڑا دیوار سے کان لگائے کچھ سن رہا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے آتے جاتے کئی بار دیکھا اور بالآخر پاگل کے قریب جا کر خود بھی کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا مگر اسے کچھ بھی سنائی نہیں دیا تو اس نے پاگل سے کہا کہ کیا بات ہے میاں، مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیتا۔ پاگل نے ڈاکٹر کو افسوس ناک اور قابلِ رحم نظروں سے دیکھ کر کہا کہ پاگل کے بچے! جب پانچ گھنٹے سے مجھے کچھ سنائی نہیں دیا تو تجھے پانچ منٹ میں کیا سنائی دے گا۔ چل بھاگ یہاں سے۔"

ابھی مجھے یہ لطیفہ یاد آیا ہی تھا کہ قریب سماعت کا شبہ دور ہو گیا۔ میں نے دائیں جانب سے کسی کے قدموں کی آہٹ سُنی۔ وہ بہت احتیاط کے ساتھ دبے پاؤں آرہا تھا۔ میں نے نظر جھکا کے دیکھا اور ایک دم سراج میرے سامنے آگیا۔ بے ہوش محسن اس کے کندھے پر لٹک رہا تھا اور سراج ہاتھ میں محسن کا ریوالور لیے ادھر ہی آرہا تھا۔

"غالب!" میں نے شاخ سے بندر کی طرح نیچے لٹک کر کہا۔ "شکار آگیا۔ اس کمینے نے محسن کو شکار کیا ہے۔ اسے ادھر متوجہ کرو ورنہ پیڑ کے نیچے سے... مگر آواز مت نکالنا اس کے ہاتھ میں ریوالور ہے۔"

غالب نے سر ہلایا اور میں پھر اوپر پہنچ گیا۔ میں اوپر سے غالب کو خاموش سگنل دے رہا تھا۔ سراج بہت محتاط تھا لیکن وہ بہت تھکا ہوا بھی تھا۔ وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہا تھا، رک رک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا۔ غالباً اُسے بھی راستے کی جستجو تھی یا کسی آبادی کی تلاش تھی۔ ٹھیک وقت پر غالب نے اپنے ہوئے منکوں کی مالا کو ہاتھ میں لے کر ہلانا شروع کیا۔ منکے کڑکڑانے لگے اور سراج ٹھٹک گیا۔

"کون ہے؟" سراج نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا مگر غالب درخت کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ سراج چند لمحے بہت چوکنا کھڑا رہا پھر اس کی صورت پر حیرانی کے آثار نمودار ہوئے کیونکہ اس جنگل میں یہ آواز اسے عجیب لگی تھی۔ تجسس اُسے درخت کے پیچھے لے آیا۔ اُس نے محسن کو نیچے ڈال دیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"ریٹل اسنیک؟" اس نے پہلے آپ سے سوال کیا۔ یہ سوال بالکل ٹھیک تھا۔ اس قسم کی آواز جنگل میں ایک سانپ کے چلنے سے پیدا ہوتی ہے جس کی دُم کی ہڈیاں کھڑکھڑاتی ہیں لیکن وہ سانپ ہمارے جنگلوں میں نہیں پایا جاتا۔

ریوالور اس کے ہاتھ میں ہی تھا جب میں اس پر بم کی طرح گرا۔ قدرتی طور پر میں نے گرتے ہوئے ریوالور کا خیال رکھا اور میرا ایک ہاتھ اس کی کلائی پر یوں لگا کہ ریوالور دور جا گرا۔ سراج میرے وزن کے نیچے دب گیا۔ میں نے اُس کی گردن دبا رکھی تھی۔

"دل تو چاہتا ہے کہ تجھے کتے کی موت مار دوں۔" میں نے اس کے منہ پر طمانچے مارتے ہوئے کہا۔ ہر طمانچے پر اس کا منہ کبھی دائیں طرف پھر جاتا تھا کبھی بائیں طرف اور میری انگلیوں کے نشان اس کے گالوں پر بنتے جاتے تھے۔ وہ ہر طمانچے پر کراہتا تھا۔

"دل کی بات مان لے بچے!" غالب نے سامنے آکے اپنے موتی منکوں والی مالا بجانا شروع کی۔ "مگر یہ کتا تو نہیں ہے۔ یہ تو کتے کا بچہ ہے۔" محسن نے سراج کا ریوالور اُٹھا لیا۔

میں نے سراج کو چھوڑ دیا۔ "تو سمجھا ہو گا کہ بچ کے نکل گیا لیکن تقدیر ساتھ چھوڑ دے تو سارے راستے ایک ہی طرف لے جاتے ہیں۔"

"اور ہاتھ میں توپ بھی ہو تو اس کا گولا پلٹ کے لگتا ہے بچے۔" غالب نے ریوالور کو گھما کے کہا۔ "یہ دیکھو، اب اس کا رُخ کدھر ہو گیا ہے۔"

اب سراج سمجھ گیا تھا کہ وہ ریٹل اسنیک کون تھا۔ وہ غالب کو گھور رہا تھا اور اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا مگر جسے پہلی نگاہ نہ پہچان سکی تھی اُسے سراج کیسے پہچان سکتا تھا۔ میں محسن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ غالباً سراج نے اُسے بے خبری میں وار کر کے ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ میں نے اُسے آوازیں دیں اور اس کے گال تھپکے لیکن محسن کی آنکھیں بند رہیں۔ اس وقت اندر ہی اندر میں غصے کی بھڑکی ہوئی آگ میں جل رہا تھا لیکن بہت مجبور تھا۔ میں سراج کو مارتا تو وہ مر جاتا۔ جو معلومات ہمیں اس سے حاصل ہو سکتی تھیں کسی اور سے نہیں ہو سکتی تھیں۔ اسی کی مدد سے ہم رابعہ، کیتھرین اور لیلیٰ تک پہنچ سکتے تھے چنانچہ سراج کا زندہ رہنا بے حد ضروری تھا۔

"یار کچھ سمت کا اندازہ ہے؟" میں نے غالب سے کہا۔ "تم نے تو اس علاقے کا سروے کیا تھا کوئی آبادی ہے قریب میں؟"

"قریب تو نہیں، چار پانچ میل چلنا پڑے گا۔" غالب بولا۔ "پہلے ہم آبادی تک جانے والے راستے تک پہنچ جائیں، وہاں سے ٹیکسی مل جائے تو اس بار برداری کو اُٹھا کے چلنے سے بچ جائیں گے۔" اس نے سراج کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹیکسی؟ کیا اس کو کہا گیا ہے کیا؟"

"مقامی آبادی آمد و رفت اور نقل و حمل کے لیے بیل گاڑی سے استفادہ کرتی ہے۔ شہر میں یہی کام ٹیکسی سے لیا جاتا ہے پس بیل گاڑی لوکل ٹیکسی ہے۔" غالب بولا۔ "ممکن ہے پیرز ڈیلکس سروس یعنی ڈھاپا تانگا بھی مل جائے۔ تو کیا ہم پبلک میں جا سکتے ہیں؟"

"محسن کی حالت ٹھیک نہیں ہے، چلیں جانا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "تو تم اسے اُٹھاؤ اور آگے چلو، میں ایس پی صاحب کو مارچ کراتا ہوں۔" اور نیچے جھک کر سراج کو پیروں پر کھڑا کر دیا۔

"ایس پی صاحب کا منہ بند کر دے۔" میں نے کہا۔ "اور ہاتھ پیر باندھ دے، جو قمیص انھوں نے پہن رکھی ہے وہ محسن کی ہے اُسی کو پھاڑ کے استعمال کرو۔"

سراج اب تقدیر سے بھی مایوس ہو چکا تھا جس نے اُسے دوبارہ ہم جیسے دشمنوں کی قید میں پہنچا دیا۔ اس نے بالکل مزاحمت نہیں کی۔ غالب نے قمیص کو پھاڑ کے اس کے منہ میں ٹھونس دیا اور بازو سے اس کے ہاتھ کمر کے پیچھے کس کر باندھ دیے پھر غالب نے محسن کو کندھے پر ڈالا اور میں نے سراج کو دھکیل کر روانہ کر دیا۔ میرے ہاتھ میں اُس کی پتلون سے نکالی ہوئی بیلٹ تھی۔

تجربہ بیلٹ کا یہ بات بہت کھلی ثابت ہوا۔ غالب نے اور میں نے باری باری محسن کو اُٹھایا۔ یہ کام فاصلہ ہی نہیں مشکل کام تھا کیونکہ محسن کا وزن بھی میرے برابر یعنی ایک سو ساٹھ پونڈ تھا۔ اب تو مدت سے ہم نے وزن نہیں کرایا تھا۔ جب تک ہم لندن میں تھے تو ایک دوسرے کو موٹو اور گول مٹول کہتے تھے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے ہمارا وزن بڑھنے لگتا تھا اور وزن کو حد میں رکھنے کے لیے ہم اکٹھے دوڑ لگاتے تھے اور ورزش کرتے تھے پھر کبھی ایسا زمانہ آتا تھا کہ ورزش چھٹ جاتی تھی اور خوب پارٹیاں ہوتی تھیں۔ آئس کریم اور کیک کھانے کے مقابلے شروع ہو جاتے تھے تو وزن پھر بڑھنے لگتا تھا۔ یہاں آئس کریم اور کیک کے مقابلے تو تھے نہیں، دال اور ابلے چاول سے مقابلہ تھا اور ورزش سے زیادہ دوڑ دھوپ تھی چنانچہ پہلے کے مقابلے میں دونوں کا وزن کم ہوا تھا پھر بھی یہ وزن اتنا کم نہیں تھا کہ ہمیں نقش فریادی سمجھا جاتا۔

جنگل کے ناہموار راستے پر محسن کو اُٹھا کے ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرتے کرتے ہم ہانپنے لگتے تھے۔ غالب اور میں ڈیوٹی بدل رہے تھے۔ ایک محسن کو لے کر چلتا تھا تو دوسرا سراج کو جنگی قیدی کی طرح دھکیلتا۔ اُسے حسبِ توفیق ذلیل کرتا اور وہ خاموش احتجاج کرتا یا پلٹ کر دیکھتا تو بیلٹ سے اس کی کھال اُدھیڑتا۔ اس کام میں ہمارے لیے ایک انتقامی تسکین کا سامان تھا۔ راستے میں ہم ایک جگہ دس پندرہ منٹ کے لیے رُکے اور ایک سگریٹ پی۔ اس کے سوا پینے کو کچھ تھا بھی نہیں۔

"آہا! کتنا لطف ہے اس تصور میں کہ جب یہ سفر ختم ہو گا تو ہمیں گرما گرم کھانا ملے گا۔ اسٹیم باتھ لیں گے، کلب سینڈوچ ہوں گے۔" غالب نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ "اور تھری کاسل کے سگریٹ ہوں گے۔"

"اور ہمارے لیے ایک چمکتی دمکتی مرسیڈیز تیار کھڑی ہو گی۔"

میں نے بھی اس کے تصور میں ساتھ دیا۔ "ایئر کنڈیشنڈ اور ہوا سے تیرنے والی۔"

"مرسیڈیز کی پچھلی نشست پر رابعہ اور ناز و بیٹھی ہوں گی۔" غالب بولا۔

"رابعہ نے گہرے آسمانی رنگ کی ساڑی باندھ رکھی ہو گی جس پر زرد پھول یوں کھلے ہوں گے جیسے آسمان پر ستارے۔" میں نے کہا۔

"اور ناز و نے سر سے پاؤں تک سفید ریشم کی شلوار قمیص پہن رکھی ہو گی اور اس کے گلابی چہرے کے گرد سفید شیفون کے دوپٹے کا ہالہ ہو گا اور اس نے بالوں میں موتیے کے پھول لگا رکھے ہوں گے اور اس کے لبوں پر دھوپ سے اُجلی مسکراہٹ ہو گی اور وہ حیا سے نظریں جھکا کے اور مسکرا کے کہے گی..."

"اُلّو کے پٹھے! اُٹھ اور آگے چل۔" میں نے کہا۔

"بس اتنی سی تصوراتی خوشی بھی نہیں دیکھی گئی، اچھے دوست ہو۔" غالب نے آنکھیں کھول کے سرد آہ بھری۔ "بڑا مزہ آرہا تھا۔"

"مزہ تو آئے گا ابھی۔" میں اُٹھ کر اُٹھا ہوا۔ سراج ہم دونوں کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کاش تم بھی تصور میں کوئی ایسا ہی حسین خواب دیکھ سکتے۔" میں نے سراج کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ "مگر تمھارے تصور میں تو وہی بھوک کے چہرے آتے ہوں گے۔ دلال اور داور چند... تمھارے غیر ملکی آقا۔ تم نے ان چندوں میں اور ہم نے دیکھے ہوں گے یا پھانسی کا پھندا، ذلت کی موت بے وفائی اور رسوائی۔"

"قیامت کم یار، یہ بھی خوابِ نسیم کو یاد کر رہا ہو گا۔" غالب بولا۔

سراج ایک دم تڑپ کر پلٹا۔ اس کی نظروں میں دکھ کے ساتھ خوف تھا۔

"پریشان کیوں ہو ایس پی صاحب؟" میں نے اس کے ایک بیلٹ رسید کی۔ "تم سے بھی تو ہم بہت جلد ملانے کے لیے لا رہے ہیں۔"

سراج نے پھر پلٹ کر دیکھا اور میں نے ایک اور بیلٹ ماری۔ اس کی پیٹھ پر کئی نیلے نشان نظر آنے لگے تھے۔

"تم کو یاد ہو گا کہ میں نے ایک وعدہ کیا تھا تم کو تمھارے ہی سکے میں ادائیگی کا۔" میں نے کہا۔ "اب وقت آگیا ہے۔ بہت جلد تم وہ سب دیکھو گے جو ہم نے دیکھا کیونکہ تم نے دکھایا تھا اور ہم وہی کریں گے جو ہم نے تم سے سیکھا۔ سنو! ایک فلم تم نے دکھائی تھی اور پھر ایک فلم کی شوٹنگ کا اہتمام کیا تھا۔ بعد میں تو معلوم ہو گیا کہ وہ لڑکی رابعہ نہیں تھی مگر ہم تم کو مرا کے سے پریشان نہیں کریں گے۔ ہماری فلم میں اصل ہیروئن ہو گی۔ مس نسیم۔ تم بہت قریب سے سب دیکھو گے جو میں نے دیکھا تھا۔"

سراج نے پھر سر جھکایا اور پھر بیلٹ کی ضرب سے اس کی کمر پر... "وقت بڑا بے رحم اُستاد ہے سراج۔" میں نے کہا۔ "یہ طوطے کی طرح بھی نہیں بدلتا ہے، ہم سے زیادہ رفتار ہے۔ دیکھو! اس نے کس طرح تمھارا ساتھ چھوڑ دیا۔ آج وقت ہمارے ساتھ ہے۔ اب تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی۔ واقعات وہی ہوں گے بس تمھاری جگہ ہم ہوں گے اور ہماری جگہ تم کو لینا پڑے گی۔ جب وقت ہمارا نہیں تھا تو انتخاب ہمارے ہاتھ میں نہیں تھا۔ آج انتخاب تمھارے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

"اپنے سکندر بخت صاحب!" غالب نے دلدار لہجہ بنا کے کہا۔ "یہ تو ہم شاید کسی آبادی کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ میرے کانوں

www.paksociety.com

ہیں گھنٹیاں سی بج رہی ہیں اور یہ ساز کی آواز نہیں، بیلوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹی تھی ہے۔"

غالب کے بعد میں نے بھی یہ موسیقی سنی اور اس کے ساتھ ہی مجھے بیل گاڑی کی چرچراہٹ سنائی دی پھر بیل گاڑی کے بانکے نے اپنے بیلوں سے خطاب کیا، جو چند بے معنی الفاظ پر اور کچھ پیار بھری گالیوں پر مشتمل تھا۔

"آ آ ہا... آ وو... ٹچ ٹچ... اوئے شور دے پتر تے پھیتوں دے جان بوجڑا... چل چل... او تیری تے..."

"مرزا غالب!" میں نے محسن کو پیچھے رکھ کے کہا "میں جاتا ہوں اس بیل گاڑی میں اور گاؤں سے کچھ کھانے پینے کو لاتا ہوں۔"

"او ہم... ہم یہاں سوکھتے رہیں!" غالب نے کہا۔

"مجبوری ہے مرزا!" میں نے کہا "تم اس حالت میں گئے تو گاؤں میں مجمع لگ جائے گا، مرد و زن تم سے تعویذ کے اور دعاؤں کے طالب ہوں گے... بعض تو تمہاری زیارت کے خواہش مند تمہارا جلوس نکال دیں گے، بہت زیادہ عقیدت کا مظاہرہ کیا تو ممکن ہے تمہارا مزار شریف بنا دیں، تاکہ تمہاری ذات بابرکات کے فیوض اس آبادی تک محدود رہیں اور سراج کو بھی تم ... سکتے ہو۔"

"آخر محسن کو لے جانے میں کیا ہرج ہے؟"

"اس کی وردی تو دیکھو دوست، یہ ایس پی ہے۔ آدمی تو ایس پی بے ہوش نہیں ہوتا اور ہو تب بھی بیل گاڑی میں بہرحال سفر نہیں کر سکتا" میں نے کہا "میرے ذہن میں ایک بہت شاندار پلان ہے۔ بس تم ایک گھنٹہ انتظار کر لو، اس کے بعد دیکھنا۔"

"اگر آنکھیں اس وقت تک دیکھنے کے قابل رہیں۔" غالب بولا۔

میں درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا اور بیل گاڑی کے پیچھے دوڑا جو اتنی دیر میں سو گز آگے جا چکی تھی، یہ کچا راستہ اسی قسم کی سواریوں کے لیے تھا۔ مجھے زمین پر ٹائروں کے جو نشانات نظر آئے، وہ سائیکلوں کے ٹائر تھے، اس سے بڑے ٹائروں والی گاڑی شاید ادھر سے کبھی نہیں گزری تھی، جو کیچڑ کے خشک ہو جانے کے بعد جو نقش قائم رہ گئے تھے، ان میں موٹر سائیکل کے ٹائروں کے پرنٹ تو نظر آتے۔ راستہ جنگل سے چھ فٹ چوڑا تھا اور اس کے دوسری طرف کھیت تھے۔

"بھیا... اے بھیا...!" میں نے دوڑتے ہوئے ہانک لگائی۔

گاڑی والا پھر ٹھٹک گیا۔ وہ جس راستے سے گزر کے آیا تھا اس پر ابھی چند منٹ پہلے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اچانک نمودار ہوا تھا بالکل اس طرح جیسے آسمان سے ٹپکا ہوں یا زمین سے اگا ہوں، سر سے پیر تک میں پتلون والا شہری بابو تھا۔ گاڑی بان بیس بائیس سال کا لڑکا تھا۔

"قبلہ محترم! اگر بار خاطر نہ ہو تو اس بندہ حقیر فقیر پر تقصیر کو قریب ترین آبادی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ..." میں نے کہا۔

وہ خوفزدہ ہو کے میری صورت دیکھنے لگا۔

"اردو نہیں سمجھتے؟" میں نے انگریزی میں کہا "مجھے گاؤں تک پہنچا دو، جہاں تم جا رہے ہو۔"

گاڑی والے نے سر ہلایا، بیلوں نے بھی گردن ہلائی۔

"اچھا اچھا، چلاں، دسناں اس یار کو پنجابی وچ ... آ جاؤ" میں اچھل کے چھلانگ مار کے بیل گاڑی میں بیٹھ گیا "تو جتن چلی، بیلوں دکھا کے چل نال وے، یار سو ہتھی گنڈی والیا۔"

وہ ہنس پڑا "تم فلموں میں کام کرتے ہو؟"

"اب کروں گا" میں نے کہا "تم مجھے اپنے گاؤں کے ... چھوڑ دو، راستہ بھول گیا تھا، رات بھر بھٹکتا رہا ہوں، اس جنگل میں شیر کم ہیں بھوت زیادہ ہیں۔"

"شیر؟" گاڑی والا ہنسنے لگا "شیر کہاں سے آ گیا؟"

"پتا نہیں، غیر ملکی ہوگا" میں نے کہا "تو رست شیر یا کلکتے سے نکلا ہو۔ ایک ہی بات ہے دونوں کی، خیر یہ بتاؤ گاؤں کتنی دور ہے اور اس کا نام کیا ہے؟"

"گاؤں تو وہ سامنے ہے ..." اس نے ... کہا "نظر نہیں آ رہا ہے؟ نام ہے چوہدری والا۔"

"کیا یہ چوہدری والا کا بھائی ہے؟" میں نے مسخرے پن سے کہا۔ وہ پھر ہنسنے لگا۔

سیدھا سادہ اور اچھا آدمی تھا، اس نے مجھے بہت مفید معلومات فراہم کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ گاؤں میں ڈھائی تین سو گھر تھے۔ ایک ڈاک خانہ بھی تھا اور پولیس چوکی بھی۔ پٹواری اور نمبردار کے بارے میں اس کی رائے اتنی ہی خراب تھی جتنی پولیس چوکی کے تھانیدار کے بارے میں۔ گاؤں میں بجلی بھی تھی اور ایک تصویروں والا ڈبا جسے چوپال میں لگا دیا گیا تھا پھر نمبردار اپنے گھر لے گیا اور اب اس کی بیٹھک میں صرف خاص خاص لوگ ہی جا سکتے ہیں۔ ان میں اسکول ماسٹر بھی شامل ہے جو دس سال سے بچوں کو پڑھانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ بچوں کے والدین تعلیم کے مقابلے میں دوسرے مسائل کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں، مثلاً بھیڑ بکریاں چرانا، ڈنگر بھینسوں کی دیکھ بھال، کھیتوں میں چھوٹے موٹے کام کرنا وغیرہ وغیرہ۔ وہ خود بہرحال چوتھی پاس تھا۔

مجھے اس نے گاؤں کی ماں بولی میں بتا دیا۔ وہ مصر تھا کہ میں اس کے ساتھ چلوں اور اس کے چاچے کو سمجھاؤں کہ وہ اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے قصور بھیج دے جہاں وہ پانچویں کلاس سے شروع کرے گا اور پانچ سال میں میٹرک کر لے گا۔

"تمہارے گھر تو میں بعد میں آؤں گا" میں نے کہا "تم یہ بتاؤ کہ تمہارے چاچے سے کیوں بات کرنا ضروری ہے، باپ سے کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ باپ تو ہے ہی نہیں" وہ بولا "اس کے مرنے کے بعد چھوٹے بھائی نے رواج کے مطابق گھر کی عزت پر چادر ڈال دی تھی۔"

"معاف کرنا دوست، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی" میں نے کہا۔

"بھولے کو ہم گھر کی عزت کہتے ہیں نا جی۔ گھر والا مر جائے تو اسی گھر کا دوسرا مرد اسے بیوی بنا لیتا ہے، عزت باہر نہیں جاتی" وہ بولا "میرے باپ کے چھوٹے بھائی نے بھابی سے شادی کر لی تھی، یعنی میری ماں سے۔ اب ماں تو تیار ہے کہ مجھے قصور بھیج دیا جائے، ماسٹر کے پاس..."

"تو تمہارے چاچے کو کیا اعتراض ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ میری شادی کرنا چاہتا ہے" وہ بولا "اس کی پہلی بیوی بڑی ہے..." وہ اس نے اپنی چھوٹی سوتیلی سالی کے لیے ایک ایسا لفظ استعمال کیا جو اس نے کسی بار ایک بیل کے لیے استعمال کیا تھا "وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ باندھنا چاہتی ہے۔"

"کیا وہ تم کو پسند نہیں؟" میں نے کہا۔

"آپ دیکھنا اس کو ... گاؤں میں سب اس کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں" وہ بولا "اور عجب سی بات تو یہ ہے کہ وہ سارے گاؤں کی ... میں تو اس سے بیاہ کر لوں تو قتل کر کے پھانسی نہ چڑھ جاؤں۔"

"اچھا اچھا، میں تمہارے چاچے کو سمجھا دوں گا، پر وہ نہ سمجھا تو اس کا دماغ درست کروں گا" میں نے کہا "ایک دو دن میں ایس پی صاحب ادھر آنے والے ہیں۔"

"ایس پی؟ وہ کیا ہوتا ہے؟"

"پولیس کا سب سے بڑا افسر" میں نے کہا۔

"تھانیدار سے بھی بڑا؟" وہ بولا۔

"ہاں، تھانیدار تو اس کے گھر میں جھاڑو دیتے ہیں اور برتن دھوتے ہیں" میں نے کہا "وہ سارے تھانیداروں کا تھانیدار ہوتا ہے۔"

"ایس پی کو کہہ کر آپ چاچے کو ذرا چھتر لگوا دیں" وہ خوش ہو کے بولا "وہ افسر آپ کی مانتا ہے؟"

"دوست ہے میرا، مانے گا کیوں نہیں" میں نے کہا "لیکن یار تم بھی میرا ایک کام کرو۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ تھانے میں کون کون ہے؟"

"تھانے میں؟" وہ بولا "ایک تو وہ کانا حوالدار ہے فتح خان، اس کے ساتھ دو سپاہی ہیں، ایک تو کوڑا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے قیوم؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی، کمہار کا لڑکا، اور دوسرا شہر سے آیا ہے سوہنا خان، اس کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا۔ دو دو گز لمبی ... پانچ سیر دودھ ہر روز ... جاتا ہے، ان کے لیے بھیجے جاتے ہیں ... پکڑ کے لے جاتے ہیں اور کھا کے واپس بھیج دیتے ہیں" وہ بولا۔

"گھر کے لیے ... کوئی آتی ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی، وہ سوہنا خان، نائی کا بیٹا ہے ... پھرتا ہے، گلی بازار ... کو پکڑ کے لے گئے تھے، اس نے نمبردار کی بیٹھک کے لیے

جو بھینس بنائی تھی اس کی ٹکڑی سے برباد ہو کر لگنے لگا تھا۔ آج وہ آئے گا، سو چھتر کھا کے اور سر منڈوا کے... نمبردار نے سو چھتر مارنے کے لیے کہا تھا۔"

"اچھا! یہ سب تو ہوتا آیا ہے، ظلم ہے اور ہوتا رہے گا۔ اکیلا ... کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ہر گاؤں اور شہر کے تھانے میں پولیس کے ہاتھوں غریب اور لاوارث مگر بے گناہ لوگوں کی پٹائی ہوتی رہے گی اور ظالم نمبردار قسم کے لوگ ان کو سو چھتر بھی پڑواتے رہیں گے اور سو پیاز بھی کھلاتے رہیں گے، مگر تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا، میں پولیس کی اصلاح کے لیے نہیں آیا۔ ان سب کا اللہ ہی حافظ ہے۔ تم میرا ایک کام کرو، سیدھے تھانے جاؤ۔"

"تھانے جاؤں؟" لڑکے نے خوفزدہ ہو کے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے سر پر تازہ کٹی ہوئی لان کی گھاس جیسے بال اُگ رہے تھے۔ غالباً اسے تھانے سے آئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔

"فکر مت کرو، دوبارہ تمہاری ٹنڈ کوئی نہیں کرے گا" میں نے کہا "تم اس کانے حوالدار سے کہنا کہ مجھے ایس پی صاحب کا پی اے لایا تھا، کیا کہو گے؟"

"ایس پی صاحب کا پی اے لایا تھا" وہ بولا۔

"شاباش... اور کہنا کہ وہ کسی ملزم کی تلاش میں ادھر آئے ہیں اور ہو سکتا ہے تھانے میں بھی پہنچ جائیں" میں نے کہا "یہ مت بتانا کہ پی اے صاحب بیل گاڑی میں آئے تھے میرے ساتھ، کہنا کہ سڑک پر ملے تھے۔"

"اچھا جی۔ میں کہہ دوں گا کہ سڑک پر ملے تھے" وہ بولا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے کہا "اگر تم سے ملنا ہو تو...؟"

"فضلو... میرے چاچا کا نام ہے رحمتو... وہ خود کو رحمت اللہ کہنے لگا ہے اب..." وہ خوش ہو کے بولا۔

میں نے اسے دس کا ایک نوٹ دیا "یہ پیشگی انعام رکھو اور دیکھو جو کام میں نے کہا ہے وہ ویسے ہی ہونا چاہیے ... میں ایس پی کا پی اے ہوں۔"

"ایس پی کا پی اے!" اس نے دس کا نوٹ دھوتی میں اڑس کر کہا۔

گاؤں کی ماں روڈ پر چار پانچ دکانیں بالکل اسی معیار کی تھیں جیسی کہ ہونی چاہئیں۔ وہ سب جنرل اسٹور اور ڈیپارٹمنٹل اسٹور تھے یعنی وہاں ہر چیز ملتی تھی مثلاً انسانوں کی خوراک بھی اور مویشیوں کی بھی، بھینس باندھنے کی زنجیر بھی اور سگریٹ بھی۔ تاہم گاؤں اس سے بڑا تھا جتنا مجھے مسٹر فضلو نے بتایا تھا۔ اس میں گھروں کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ ضرور ہوگی۔ میں نے ایک چائے خانہ بھی دریافت کیا۔ وہاں وہی بنا ہوا گاڑھا شیرہ تھا جس میں دودھ وافر تھا اور چائے کی پتی برائے نام ڈالی گئی تھی تاہم اسے پی کر بھی میں اتنا ہی خوش ہوا جتنا لاہور میں شیزان کی چائے پی کر ہوتا پھر میں سوچنے لگا کہ اس مشروب کو غالب اور محسن

www.paksociety.com

تک کیسے لے جاؤں کہ یہ ٹھنڈا نہ ہو مگر اللہ بڑا کارساز ہے۔ ابھی میں چائے پی کر فارغ ہی ہوا تھا کہ میں نے پولیس فورس کو دیکھا۔ ان میں گاؤں کا حوالدار بھی شامل تھا۔ دونوں ماتحت ایک نوجوان کی گردن میں رسی ڈالے اسے بیل کی طرح کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ نوجوان کے گھنگھریالے بال دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ بہت جلد وہ ان بالوں سے محروم ہونے والا تھا۔ جو اندازہ مقامی تھانیدار کے معقول اختیارات حاصل تھے اور جو تھانیدار کہلاتا بھی تھا، ایک ڈنڈا لیے پیچھے چل رہا تھا وقتاً فوقتاً وہ مجرم کے ایک ڈنڈا رسید کرتا تھا اور ایک ایسی گالی دیتا تھا جو میں نے پہلے نہیں سنی تھی۔ سب سے پیچھے ایک شخص داڑھی دکھتا آ رہا تھا داڑھی پر لکھو کے ایک کا سامان لو یہ جاتے کہ کچھ تھا مگر اس میں مجھے ایک الائم کلاک ایک جوڑی نئے جوتے، ایک تھرماس اور ایک سلائی مشین بھی نظر آئے۔ یہ ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ باقی لوگوں میں کوئی تحریک نہیں تھی۔

"یہ کیا چکر ہے؟" میں نے اس شخص سے کہا جو داڑھی سے جا رہا تھا۔ "کون ہے یہ؟" میں نے مجرم کی طرف اشارہ کیا۔

"مجرم ہے جی" داڑھی والے نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھ کر کہا۔ اگر میں اس گاؤں کا رہنے والا ہوتا اور چیتوں میں نہ ہوتا تو وہ مجھے جھڑک دیتا۔ "یہ سب چوری کا مال ہے۔"

"یہ تھرماس بھی؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی پتا نہیں کس کس کے گھر سے۔ تھانیدار جی کی بڑی گلی میں پھر کے کھوج نے پتا چلا اور جہاں واردات تھا وہاں سے کچھ غائب کر لیتا تھا۔"

کہتا تھا تھانیدار اور اس کے ماتحت شاید میں قدم آگے تھے انہوں نے یہ گفتگو نہیں سنی ورنہ وہ مجھ سے دخل در معقولات کا سبب ضرور پوچھتے۔

"تم کون ہو، چور کے ساتھی؟" میں نے کہا۔

"حضرت جیسی کی ایسے کام پر تھے" وہ بولا۔ "میں تھانے کا چوکیدار ہوں اور تھانیدار صاحب کا خاص آدمی ہوں۔"

"وہیں گئے" میں نے کہا۔ "پھر تو تم میرا ایک کام کر سکتے ہو۔ یہ لو سو روپے تم تھرماس سے جیب میں رکھ لو۔"

تھانیدار کے آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی نے سو کا نوٹ لیتے ہی غائب کیا جیسے شعبدہ باز لوہے کا گولا غائب کرتے ہیں "ہو کیا کام ہے؟"

"یہ تھرماس تمہارے بیٹے کا ہے" میں نے کہا "تم چوری کے مال میں اسے مت شامل کرو۔"

اس نے داڑھی سے تھرماس اٹھایا اور مجھے پکڑا دیا۔ "یہ لو جی مگر اب کھسک لو۔ تھانیدار صاحب نے دیکھ لیا تو سو جھنجھٹ پڑیں گے۔" میں فوراً واپس ہو گیا۔ بیس روپے کا تھرماس اس وقت سو میں بھی مہنگا نہیں تھا۔ میں نے اس میں چائے بھروائی اور بسکٹ لیے اور گاؤں کا ایک چکر کاٹ کے واپس ہوا۔ میں نے گاؤں کا ڈاک خانہ دیکھا جہاں فرد واحد ایک کرسی پر حقہ پیتے پیتے سو گیا تھا۔ میں نے ایک دھوپ میں خریدی لیکن ایک کرتا مجھے نہ مل سکا جب میں اس ساری طرف سے واپس آ رہا تھا تو مجھے پھر تھانیدار نظر آیا۔ وہ تھانے جا رہا تھا۔ محسن نے میری فرمائش پر پھر دہرایا کہ آگے کیا ہونا ہے۔ اس کے باوجود مجھے ڈر رہا کہ کہیں وہ الٹا نہ کہہ دے کہ یہ جاپانی صاحب کے مہمان ہیں۔ گاؤں کے دوسری طرف مجھے ایک جلا ہوا گھر بھی نظر آیا جو [illegible] پڑا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ چوہدری کی شکایت پر تھانیدار کے حکم سے اسے آگ لگا دی گئی تھی۔

جب میں پھر غالب اور محسن کے پاس پہنچا تو دو گھنٹے کے انتظار نے ان کی حالت خراب کر دی تھی۔

"معاف کرنا یار! کچھ دیر ہو گئی مجھے" میں نے کہا۔

غالب ایک درخت کے نیچے سبزہ تھا اس پر محسن کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ اس نے میری طرف ایک آنکھ کھول کے دیکھا "اب معافی مت مانگ، دعائے مغفرت مانگ۔ ہم سب فوت ہو چکے ہیں۔"

محسن نے آنکھیں کھول کے مسکرایا تو میری آدھی کوفت دور ہو گئی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا "کیا حال ہے اب تیرا؟"

"ٹھیک ہے" محسن نے کہا "سوجن بہت، سخت درد ہے۔"

"فکر مت کر، میں گرما گرم چائے لایا ہوں۔ اسپرین کی گولیاں مل گئیں لیکن یہ تھرماس نہ ملتا تو کچھ نہ ہوتا" میں نے کہا۔

غالب اٹھ کے بیٹھ گیا "گاؤں والے بھی اب ماڈرن ہو گئے ہیں۔ چائے، تھرماس اور اسپرین... نصف صدی قبل کسی گاؤں کے رہنے والے ان الفاظ کا مطلب نہیں جانتے تھے۔ کیا نام ہے اس گاؤں کا...؟"

"چوہدری والا" میں نے کہا "یا روزن پور والا... وہ کہیں ہے سابق ایس پی؟"

"ادھر حوالات میں" غالب نے بڑے اشتیاق سے تھرماس کھولا۔ بسکٹ کے ڈبے کھولے اور پہلے محسن کو چائے دی۔ میں نے دوسری طرف جا کے دیکھا تو غالب نے سراج کو درخت کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ اس نے اپنی تمام رنگین ریشموں والی مالائیں اس کے گرد لپیٹ رکھی تھیں۔

"میں فارغ تھا، سوچا تھوڑی سی ایڈ کر لی جائے" غالب نے کہا "جو گوڑ رہتا کہ ایس پی صاحب چوری نہ ہو جائیں۔ جب محسن ہوش میں آ گیا تو میں نے سراج کو باندھ دیا تاکہ خوبصورتی سے باندھا جائے۔"

"معافی مانگ... ہوں تیری" محسن نے کہا "بہت اچھا سجایا ہے قربانی کے اس بکرے کو۔ اوپر نیچے لال نیلے پیلے ریشمی لڑیاں نظر کو بہت بھلی لگتی ہیں۔ تم ڈرٹ کھاؤ تو اسے بھی کچھ دو۔"

ورنہ مر جائے گا۔"

"کیا سوچ رہے ہو؟ بہت دور ہے" غالب بولا۔

"نہیں میں تو خواہ مخواہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا" محسن نے کہا "واپسی پر پیدل آئے بند ہی نہیں [illegible] ہو جائیں گے۔"

"لیکن ہم سب پیدل نہیں جا سکتے" غالب بولا۔

"مجبوری ہے" میں نے کہا "میرے پلان کے مطابق ہمارے لیے اس وقت گاؤں میں داخل ہونا مناسب نہیں۔ ہم رات کو اندھیرا چھانے کے بعد جائیں گے۔ میں سارے راستے اور ٹھکانے دیکھ آیا ہوں۔"

"مگر رات تک یہاں کیا کریں گے؟" غالب نے احتجاج کیا۔

"آرام" میں نے کہا "یہ جگہ راستے سے بہت ہٹ کر ہے۔ اوپر پیڑوں کا سایہ ہے، نیچے سبزہ۔ رات تک ہم سب کی حالت بہت بہتر ہو جائے گی۔"

"مگر اس وقت چلنے میں کیا قباحت ہے؟" غالب نے میری ہر دلیل کو مسترد کر دیا۔

"بے وقوف آدمی، ذرا غور کر۔ سراج کی وردی محسن نے پہن رکھی ہے۔ کوئی ایس پی گاؤں میں اس طرح پہنچتا ہے؟ پھر سراج کو ہم ایسے نہیں لے جا سکتے۔ اسے چھپا کے لے جانا پڑے گا" میں نے خفگی سے کہا "اور تم نے تو ابھی میرا پلان بھی نہیں سنا۔"

"اچھا سن لیتے ہیں" غالب نے محسن سے کپ لے لیا۔ وہ بڑی بے تابی سے اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کیونکہ تھرماس کا ایک ہی کپ تھا۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی اس کی زبان جل گئی اور صورت ایسی ہو گئی جیسے غلطی سے وہ مگرمچھ کا لوڈ پی گیا ہو۔ "یہ چائے ہے؟"

"ہاں یہ چائے ہے" میں نے آستین چڑھا کے کہا "دیہاتوں میں تیرا باپ بھی چائے کا عادی ہے... اگر یہ چائے نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟"

محسن نے آنکھیں بند کر لیں اور ایک ہاتھ سر پر رکھ کے لیٹا رہا اور میری بات سنتا رہا۔ میں نے ان کو فون سے ملاقات سے لے کر تھانیدار کے افسر بکار خاص سے چوری کا مال خریدنے تک کا احوال تفصیل سے سنایا لیکن اپنی آواز اتنی کم رکھی کہ سراج کے کانوں تک نہ پہنچے پھر بھی [illegible] غالب نے [illegible] آہستہ آہستہ محسن کی حالت بھی بہتر ہونے لگی اور وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سراج کو چائے اور بسکٹ دینے کے بعد پھر اسی طرح باندھ دیا گیا اور ہم نے سر جوڑ کر اپنے پلان کو ڈسکس کیا۔ انہوں نے اتفاق کیا کہ مجھے ایسا شاندار پلان بنانے پر [illegible] اعتراف کیا کہ میں ایم آئی [illegible] پولیس کی سربراہی کے لیے موزوں ترین شخص ہوں۔ غالب نے یہ بھی اعتراف کیا کہ یہ بات وہ اوپری دل سے کہہ رہے ہیں اور [illegible] جھوٹ بول رہے ہیں۔

رات کا اندھیرا پھیلنے میں ابھی کم سے کم چھ گھنٹے باقی تھے۔ ہم نے اتفاق رائے سے دو دو گھنٹے سراج کی نگرانی کرنے کی ڈیوٹی دینے کا فیصلہ کیا اور اس طرح ہر ایک نے چار چار گھنٹے سونے کی مہلت نکال لی۔

سورج تقریباً سات بجے غروب ہوا۔ ہم سب کئی دن کے تھکے ہوئے تھے اور ذہنی طور پر بھی اتنے ہی خستہ حال تھے جتنے جسمانی طور پر شکستہ حال تھے چنانچہ مجھے اور محسن کو نیند تو آئی مگر ٹوٹ ٹوٹ کر۔ وہ پرسکون اور بے خواب نیند ان حالات میں بھلا کیسے آ سکتی تھی جبکہ ہر طرف خطرے کا آسیب مسلط تھا۔ ذہن میں ہر لحظہ رابعہ کی یاد تھی اور ان سب کا خیال تھا جن کی سلامتی ہمیں تو اپنی زندگی سے زیادہ عزیز تھی۔ دو بار میری پلک جھپکی تو یادونا کے بھوت عفریت جو ماضی کا قصہ بن گئے تھے اپنی قبروں سے نکل آئے اور ان کے مکروہ ڈھانچے مجھے خواب میں ڈرانے لگے۔ "ہم پھر آئیں گے سکندر بخت... ہم تمہارے تعاقب میں ہیں" وہ شیطانی قہقہے لگانے لگے۔ "یہ لو نظم دیکھو بڑی اچھی نظم ہے اس میں رابعہ بھی ہے" دونوں بار میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا اور محسن میرے ساتھ تھا۔ نیند میں وہ بھی پریشان ہو رہا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو تسلی دے کر پھر لیٹ گئے۔ نیند نہ سہی جسم کے لیے آرام ضروری تھا۔ ہم نے سراج کو بھی باندھ کر پیڑ کے ساتھ کھڑا رکھنے کے بجائے زمین پر لٹا دیا تھا اور اس کے جسم سے لپٹی ہوئی ایک مالا کو درخت سے باندھ رکھا تھا کہ وہ دور نہ جا سکے۔ وہ بھی تھکن اور بیماری سے بے حال تھا مگر ہمارے مقابلے میں وہ واقعی گھوڑے بیچ کر سویا۔ اس کے خراٹے سن کر مجھے تعجب ہوا تھا۔ محسن نے تو خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ ایکٹنگ کر رہا ہوگا مگر جب اس نے اس کے کان میں تنکا پھیر کے دیکھا تو اس نے حرکت بھی نہیں کی جس سے اندازہ ہوا کہ وہ بے ہوشی کی نیند سو رہا تھا۔ کھانے کے لیے وہی بسکٹ کے ڈبے تھے جو ہم چیک کر آئے تھے اور چائے تھی جو دوپہر کو ہی ختم ہو گئی تھی تاہم اس آرام کے وقفے نے ہماری جسمانی توانائی کو بحال کر دیا۔

سات بجے میں نے سراج کو لات مار کے جگایا "اٹھ مردے، یہ تیرے باپ کی جاگیر نہیں ہے جس پر ٹانگیں پھیلا کے سو رہا ہے" محسن نے کہا۔

"تیرے لیے تو قبر کی دو گز جگہ بھی مشکل سے نکلے گی تیری لاش کو کتے بھنبھوڑ کریں گے" محسن بولا "ذرا سوچ کہ صور اسرافیل پر شرفاء اپنی قبروں سے اٹھیں گے، تو کہاں سے نکلے گا؟"

"بے حد غور طلب نکتہ ہے" غالب نے آخری سگریٹ جلاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ "ممکن ہے ایسے مقتولوں کو عرصہ محشر میں بھی قدم نہ رکھنے دیا جائے، سیدھا جہنم کے سب سے غلیظ طبقے میں پہنچا دیا جائے۔"

"چلو یار، ذرا تیاری کرو" میں نے کہا "گاؤں تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا گہرا ہو جائے گا۔ بھوک بھی لگ رہی ہے اب تو..."

ہم سب ایک ساتھ روانہ نہیں ہوئے۔ سراج کو ہم نے سب سے پیچھے رکھا اور اس کے ساتھ غالب رہا۔ میں اور محسن آگے تھے۔ ہم راستہ صاف دیکھتے تھے تو انہیں اشارہ کرتے تھے اور وہ

www.paksociety.com

ہمارا ساتھ دینے لگتے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمیں کوئی بھی گاؤں میں داخل ہوتا دیکھے۔ پورے بیس منٹ کا راستہ چالیس منٹ میں طے ہوا اور ہم تقریباً آٹھ بجے اس جلے ہوئے مکان میں داخل ہوئے جس کے بام و در ابھی تک سیاہ تھے اور دہوی کے ہاتھوں ہوئی تباہی پر نوحہ خوانی کر رہے تھے۔ اس کا ایک کمرا جلنے سے صاف تھا کیونکہ اس کی چھت نہیں گری تھی مگر وہاں بھی فرش پر مٹی اور گھاس کے علاوہ چھت میں بسیرا کرنے والے پرندوں کی غلاظت کا بستر بچھا ہوا تھا۔ کچھ حضرات و خواتین نے اسے خلوت کی جگہ پا کے بطور بیت الخلا بھی استعمال کیا تھا اگر محبت کرنے والوں نے اسے ملنے کی جگہ بھی بنایا ہو تو تعجب نہیں کیونکہ یہ گھر گاؤں سے باہر تھا۔

"آخر چوہدری نے اس گھر کو کیوں آگ لگائی؟ کون بدقسمت تھا وہ؟ جسے یہ سزا ملی اور وہ اپنے گھر کی آگ میں جل مرا یا کہیں بے گھر پھر رہا ہے؟" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔

"ان سوالات کا یہ کوئی وقت نہیں۔" میں نے اسے ڈانٹا۔ "پوسٹ مارٹم کے حساب سے جب انگلش کا پرچہ ہو تو حساب کے سوال پوچھنے کا مقصد؟ بہرحال ہم کل جواب دیں گے۔"

"کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔" غالب نے ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد کہا۔ "دشت کو دیکھ کے گھر یاد آ گیا۔ دیکھا گھر بھی ایسا ہی ویران ہے، اسے ولادو نام کے ایک چوہدری نے کے حکم پر جلایا گیا تھا۔"

"گھر تو دیا کا بھی جلایا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ گلے شکوے اپنی جگہ، اپنی غم گشتہ جنتوں کو یاد کر کے کیوں دل آزردہ ہوتے ہو؟ ہم ایک دن پھر لوٹ کر انہی جنتوں کو آباد کرنے جائیں گے جہاں سے ہمیں شیطان نے نکلوایا۔ ابھی تو میں گاؤں جا رہا ہوں۔ موم بتی، سگریٹ، ماچس، کھانے پینے کا سامان لانا ہوں اور چائے بنانے کا سامان بھی لانا ہوگا۔ مرزا غالب تم یہ گلفند راز لمبا کیا آمار دو اور یہ دھوتی باندھو اور جس طرح ملتان میں لایا تھا اور میرے ساتھ بیٹھو۔ محسن تو ذرا ایس پی صاحب سے کمرے کی صفائی کروالے۔"

غالب نے وہ لنگی باندھی اور اوپر صرف بنیان پہنے دیا یہ وضع قطع مقامی لوگوں کے لیے زیادہ قابل قبول تھی۔ ہم نے گاؤں کی مال روڈ کی طرف جاتے ہوئے ایک کنواں دریافت کیا جو ہماری جائے قیام سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ ہم اس کے رہٹ کو بیل کی طرح چلا سکتے تھے اور تازہ پانی سے غسل فرما کے تازہ دم ہو سکتے تھے۔ اس خیال نے مجھے بہت خوش کیا۔ یہ بھی طور کرتا گیا کہ موضع چوہدری والہ میں ٹیلی فون کی لائن تو نہیں ہے۔ ٹیلی فون کا کھمبا تک مجھے دکھائی نہ دیا۔ رات کے وقت بیشتر گھروں میں چراغ جل رہے تھے مگر گاؤں میں بجلی تھی چنانچہ کچھ گھروں میں بلب بھی روشن تھے۔ مال روڈ پر ایک قطار میں چھ سات بلب فلک ہو رہے تھے۔ سر شام گزر چکی تھیں چنانچہ دکانیں ابھی کھلی ہوئی تھیں اور چائے خانے کے باہر تو خاصی رونق تھی۔ چارپائیوں پر لوگ دھوتیاں سمیٹ کر اور حقے کی فراغت سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ادھر جانے سے گریز کیا۔ پہلی ہی دکان سے میں نے چار جانے کے ایک ایک آنے والے پیکٹ لیے۔ وہاں تبر علی جس کو دکاندار نے بہترین کھانڈ قرار دیا۔ ہم نے وہیں سے سگریٹ خریدے اور چوہدری کا سل کے نام پر دکاندار نے کنگ رکھا۔ اس کے خیال میں یہ ولایتی سگریٹ تھے یا انگریزوں کے زمانے میں بنتے تھے۔ مقامی آبادی کا برانڈ تھا بنگلا مارکہ سگریٹ یعنی کنگ اسٹائک۔ اعلیٰ ترین سگریٹ وہ سمجھے جاتے تھے جس کا صرف ایک پیکٹ دستیاب تھا۔ باقی ہم کو دیسی بنگلا مارکہ لینے پڑے جسے غالب نے 'کھنگ اسٹروک' قرار دیا۔ کھنگ چونکہ پنجابی میں کھانسی کو کہتے ہیں اس لیے یہ نام بہت مناسب تھا۔ اس سگریٹ کا دھواں سینے میں جا کے گھونسے کی طرح لگتا تو بے اختیار کھانسی آتی تھی۔ وہاں صابن بھی تھا مگر مسئلہ ایک برتن نے پیدا کیا۔ گاؤں میں صرف مٹی کے برتنوں کی دکان تھی۔ چونکہ ہم نے کافی شاپنگ کی تھی اس لیے نیک دل دکاندار نے ہمیں کمہار کا گھر بھی انگلی کے اشارے سے دکھا دیا۔ پھر اس نے ہم سے وہ سوال کیا جس کے انتظار میں ہم بہت دیر سے تھے۔

"تم اس گاؤں کے تو نہیں لگتے۔" وہ بولا۔ "کہاں سے آئے ہو؟"

"شہر سے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"شہر سے؟ قصور سے کہ لاہور سے؟" وہ بولا۔

"دونوں جگہ سے۔" میں نے کہا۔ "لاہور سے چلے تھے اب قصور سے آئے ہیں۔ دراصل ایس پی صاحب کے ساتھ ٹور پہ گئے تھے۔"

"کس کے ساتھ؟" وہ چونکا۔

"پولیس کے بادشاہ کے ساتھ۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے ایک دھوکے باز کو پکڑنا تھا... وہ کبھی ادھر بھاگ جاتا تھا کبھی اُدھر... آج پھنس گیا۔"

"اچھا اچھا... وہ اپنا فضلو بھی کتنا پھر رہا تھا۔" دکاندار بولا۔ "کوئی بہت بڑے پولیس کے افسر آنے والے ہیں۔ تھانیدار اسے پکڑ کے نمبردار کے پاس لے گیا تھا۔ وہاں اس نے سب کے سامنے کہا کہ اسے کوئی ملا تھا۔ پتا نہیں کون۔ اس نے بتایا کہ آنے والے ہوشیار رہیں... کاتا... میرا مطلب ہے تھانیدار صاحب کی تو جیسے ڈھیلی ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ چوہدری کی... تا... ان کی حالت زیادہ خراب ہے۔ آج رات پھر تھانے کی صفائی ہوگی۔"

"اس اطلاع سے مجھے دلی مسرت ہوئی۔" میں اتنی کے ساتھ بولی اور وہ گاؤں کے باہر موجود ہیں۔"

"گاؤں کے باہر؟" دکاندار چونکا۔ "اتنے بڑے افسر اور گاؤں کے باہر... نمبردار کی حویلی کے ہوتے ہوئے..."

"بابا... بس یہیں رک جاؤ۔" میں نے کہا۔ "افسر کا حکم ہے کسی کو خبر نہیں ہونا چاہیے۔ بہت سخت اور ایماندار افسر ہے... کسی بھی نمبردار، تحصیلدار، تھانیدار کے گھر کی روٹی بھی نہیں کھاتا... مگر غریب آدمی کے گھر چلا جاتا ہے۔ تمھاری زبان سے ایک لفظ نہیں نکلنا چاہیے کل تک ورنہ سمجھو کہ سب سے پہلے تم ہی پکڑے جاؤ گے... ابھی تک تمھارے سوا یہ بات کوئی نہیں جانتا۔"

"میں... میری توبہ... میرے باپ کی توبہ..." وہ بولا۔ "آپ یہ پیسے بھی رکھیں... میں غریب اور چھوٹا آدمی ہوں۔"

"بابا... میں نے کہا نا کہ افسر سخت ہے۔ ایک پیسے کی رشوت نہیں لیتا۔ اس لیے قیمت تو تم کو لینا پڑے گی۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ تم ایک رات کے لیے کچھ سامان دے دو۔"

"حکم کرو مائی باپ... کیا سامان چاہیے... گھر خالی کر دوں؟ آپ لوگ آ جائیں۔ میں اپنے سسر کے گھر..."

"فضول باتیں مت کرو۔" میں نے کہا۔ "افسر اپنی آمد کو خفیہ رکھنا چاہتا ہے اور تم کہتے ہو یہاں آ جاؤ... کر سکتے ہو تو اتنا کرو کہ ایک پتیلی لا دو... دو تین چائے کے پیالے۔"

بڈھے دکاندار کے لیے یہ بڑی خوش قسمتی کی بات تھی کہ اتنے بڑے افسر کی خدمت اور رازداری کا موقع مل رہا تھا۔ اس نے سب چیزیں پتیلی میں ڈال دیں اور سارا سامان ایک پوٹلی میں باندھ دیا۔ [illegible] کے لیے سو کا نوٹ بطور زرِ ضمانت رکھوانا چاہا تو وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ میں نے نوٹ رکھ لیا۔ "بس اب آج رات کسی سے بات مت کرنا۔" میں نے کہا۔ "کوئی جاننے والا بھی پوچھے تو کہہ دینا کہ مسافر تھے۔"

"کسی سے کوئی شکایت ہو تو بتاؤ۔" غالب نے کہا۔ "ہم صاحب سے سفارش کر سکتے ہیں۔"

"شکایت... شکایت تو ہے جی... پر کسی اور سے کیا کہیں، جب اپنی ہی اولاد کمینی ہو۔" وہ بولا۔ "میرا جوان لڑکا ہے جی... تین بچوں کا باپ۔ ایک رنڈی کے پیچھے لگ کر برباد ہو رہا ہے۔"

"کون ہے وہ رنڈی؟" میں نے رعب سے کہا۔

"وہ جی... ماشو کی سالی... کیا کہیں جناب کہ ماں کتنی تھی اور اس کی نیت کیسی بدمعاش... تیس سال کی ہو گئی اور ابھی تک کسی نے قبول نہیں کیا اسے... کرے گا بھی کون؟" وہ بولا۔

مجھے یاد آیا کہ اسی عورت کا ذکر فضلو نے کیا تھا کہ اس کا چاچا ماشو زبردستی اسے اپنی سالی کے ساتھ باندھنا چاہتا ہے جو بقول فضلو کے سارے گاؤں کی جورو بن چکی ہے۔ اور فضلو اس سے شادی پر خودکشی کو ترجیح دیتا تھا۔ یہ مسئلہ ایک نہیں تھا مگر اس کا حل ایک ہی ہو سکتا تھا۔

"تم فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "صبح سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمھارا بیٹا اس رنڈی سے اس طرح الگ ہو جائے گا جیسے جوتی پاؤں سے الگ ہوتی ہے۔"

"یہ... یہ بھی تو ناانصافی جناب عالی... سارا کمال ہی جوتی کا ہے... بس اس کو چار چھتر پڑ جائیں کرائے سے۔" وہ بولا۔

"کیسے... اس رنڈی کو...؟" میں نے کہا۔

"نہیں جی... میرے پتر کو۔" وہ بولا۔ "اور چھتر پڑیں سب کے سامنے... اس کی بیوی بچی ہو... میری بہو کے سامنے... دل خوش ہو جائے سب کا۔"

"سب کا دل خوش کر دیں گے چاچا... السلام علیکم۔" میں نے کہا۔

جب ہم واپس آ رہے تھے تو مرزا غالب نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ یہاں ہر مرض کی دوا چھتر ہے۔ جمہوریت اور شخصی آزادی، انصاف اور قانون... انسانی نفسیات پر چھتر کاری کے منفی اثرات یہ سب یہاں کوئی نہیں جانتا... چور کا علاج چھتر، آوارہ پنے کا علاج چھتر، عشق کا علاج چھتر... جن بھوت کا علاج چھتر، جو بیماری... مولوی صاحب یا حکیم ڈاکٹر کی نہ مانے اس کا علاج چھتر۔

ہماری عدم موجودگی میں محسن نے ایس پی سے جھاڑو دلوائی تھی۔ جھاڑو بھی سراج نے خود ہی درختوں سے تیلی تیلی شاخیں توڑ کے بنائی تھی اور پھر پتوں سے ہی رگڑ رگڑ کے فرش کو صاف کیا تھا۔ وہ دو بار محسن سے پٹا بھی تھا۔ ہم نے موم بتی روشن کی تو چھت پر چمگادڑوں نے احتجاجاً اڑنا اور چیخنا شروع کیا۔ وہ کچھ دیر کمرے میں چکر لگا کے باہر نکل گئیں تو محسن نے سارا سامان دیکھا اور ہماری ساری روداد سنی۔ اس عرصے میں غالب نے پتھروں کا چولہا بنوایا اور سراج کو باہر سے خشک لکڑیاں جمع کرنے لگا دیا۔ اب ہم اپنی مرضی کے مطابق چائے تیار کرنے کی پوزیشن میں تھے لیکن میں نے تجویز پیش کی کہ پہلے ہمیں نہا لینا چاہیے۔ کنوئیں پر سراج کو بیل کی جگہ باندھ دیا گیا اس کے مقدر میں خدا نے جتنی ذلت لکھی تھی وہ اس کو ہر حال اٹھانا تھی یا پھر...

www.paksociety.com

باری ہم نے بھی اس کے ساتھ زور لگایا اور ایک ایک کر کے نہاتے گئے۔ پانی بہت صاف اور ٹھنڈا تھا۔ لاشعوری طور پر گاؤں میں نہانا کوئی عجیب سی بات نہیں تھی۔ یہ یونیورسل قسم کا باتھ روم تھا جو شاید ماؤنٹ ایورسٹ پر بھی مل جاتا۔ اس سے نہا دھو کے پاک ہوتے ہی ہم نے خود کو ایک نئی دنیا کا نیا انسان محسوس کیا جس کے جسم میں نئی طاقت تھی اور جس کا عزم و حوصلہ نیا تھا۔ سراج کو ہم نے منہ بھی نہیں دھونے دیا کیونکہ صبح اس کو مقدور بھر کی طرح پیش کرنے کے لیے اس کا حلیہ بھی خراب ہونا ضروری تھا۔ ہم نے چوہدری جلال کے بیٹے شاہ جی کے لائے ہوئے بسکٹ کھاتے ہوئے مسلسل چائے پیتے رہے۔ ولز کے سگریٹ برابر تقسیم کیے گئے۔ دسویں سگریٹ کو پہلے سلگایا گیا اور اس کے کش سب نے لیے۔ سراج کو بھی بسکٹ اور چائے دی گئی اور پھر باندھ کر دوسرے کمرے میں ڈال دیا گیا جس کی چھت نہیں تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا نہیں ٹھونسا گیا تھا۔ یہاں اس کو شور مچانے کی اجازت تھی مگر وہ بالکل گم سم پڑا رہا۔ اس سے بندھی ہوئی ایک ڈوری جالے سے باہر ہی رہی تھی پھر بھی ہم نے اس پر نظر رکھی۔ وہ ایسا آدمی تھا کہ ملائی ڈوری کسی پتھر سے باندھ کے نکل جاتا اور ہم ساری رات قہر تھامے اس یقین کے ساتھ بیٹھے رہتے کہ وہ موجود ہے۔

دس گیارہ بجے چاند نکلا تو ہم زمین پر ایک دوسرے کے متوازی لیٹے سگریٹ پیتے رہے تھے کہ اتنی بہت بھی لگتے تھے اور سب ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ سب کے ذہن میں بالعموم اور استاد شیدی کا خیال تھا۔

اچانک محسن نے پوچھا۔ "یار غالب! تو نے بھی شملا کو روکا تھا؟"

غالب نے اسے سر گھما کے دیکھا۔ "کس بات سے؟ میں نے اسے شادی کے وقت روکا تھا کہ کس کو قبول کر رہی ہے... میرا مطلب ہے روکتا اگر..."

"بکواس مت کر۔" محسن گرم ہو گیا۔ "سیدھی طرح بتا..."

"کیا بات ہے یار... تو بہت سیریس ہو رہا ہے۔" غالب بولا۔

"میں نے جو پوچھا ہے وہ بتا... تو نے بھی منع کیا تھا اسے؟"

"کس بات سے یار... تو جانتا ہے وہ انکل رضوی کے گھر میں تھی۔" غالب بولا۔

"انھوں نے بھی اسے روکا تھا... کہ جولی کے بچے گردے کا عطیہ نہ دے۔"

"تو پاگل ہو گیا ہے کیا؟" غالب اٹھ بیٹھا۔ "شملا نے کب عطیہ دیا تھا جولی کے لیے؟"

"پھر کس نے دیا تھا؟" میں نے اسے غور سے دیکھا۔

"ایک حافظ جی تھے۔ اخبار میں اپیل چھپی تھی تو ان کی بیٹی آگئی تھی اور لوگ بھی بہت آئے تھے مگر گردہ اسی حافظ جی کی بیٹی کا لگا۔ انھوں نے کسی طرح بھی ایک پیسہ نہیں لیا... خدا مغفرت کرے..." غالب بولا۔

"غالب... کیا کہہ رہا ہے تو...؟" میں نے اس قدر ہیجان سے کہا کہ غالب پریشان ہو کے بیٹھ گیا۔ اس نے میری اور محسن کی صورت پر پھیلتی ہوئی وحشت کو دیکھا۔

"اس میں... ایسی کون سی انوکھی بات ہے یار؟" وہ بولا۔

"پھر کیا ہوا تھا شملا کو...؟" محسن نے چلا کے کہا۔ "اس کی طبیعت اچانک اتنی خراب کیسے ہو گئی تھی۔ کون جھوٹ بول رہا ہے مجھ سے... زمانہ کہ تو..."

"یار میں کیوں جھوٹ بولوں گا... اس کی طبیعت خراب تو خیر ہوئی تھی مگر اس میں بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں... انکل رضوی سے بہتر اس کا خیال رکھنے والا کون تھا... اور پھر آنٹی تجربے کار ہیں۔ باقاعدہ میڈیکل چیک اپ کے لیے وہ ایک گائناکالوجسٹ کے پاس جاتی تھی... آنٹی کی کوئی کزن وغیرہ ہے۔"

"پھر وہ مر کیسے گئی... کیسے مر گئی وہ...؟" محسن نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور اسے دیوانہ وار جھنجھوڑنے لگا۔

غالب نے محسن کو دھکا دیا۔ "سکندر... یہ پاگل ہو رہا ہے۔ پچ پچ... کہتا ہے شملا مر گئی... کیوں کہتا ہے یہ ایسی باتیں...؟"

"تو... تو کیا... وہ زندہ ہے؟" میرے حلق سے آواز بڑی مشکل سے نکلی اور جو آواز نکلی وہ مجھے اپنی نہیں لگی۔

"تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو... تمھاری صورت بتاتی ہے کہ تم سیریس ہو... کیا کسی نے تم سے کہا تھا کہ وہ مر گئی ہے؟" غالب نے باری باری مجھے اور محسن کو دیکھا جو اب بت کی طرح ساکت بیٹھے تھے۔ "میں سمجھ گیا... یہ ان خبیث لوگوں نے کہا ہوگا تم کو اذیت پہنچانے کے لیے... بے تکی بات ہے۔"

میں نے احمقانہ اور بے بسانہ ندامت سے سر ہلا دیا۔

"الو کے پٹھے... مجھ سے اب تک پوچھا بھی نہیں...؟" غالب چلانے لگا۔ "انھوں نے کہا اور تم نے مان لیا... تو میں قابل اعتبار نہیں تھا تمھارے لیے؟"

"یار... وہ دراصل..." میں نے کہا۔

"کیا دراصل... اصل بات یہ ہے کہ دونوں کے دماغ میں بھوسا بھرا ہے اور کچھ نہیں... سامنے زمانے کی باتیں کر لیں۔ صبح سے رات ہو گئی... کہاں کہاں جھک مار آئے۔ شملا کا نام تک نہیں آیا کسی کی زبان پر۔" غالب ہم پر بری طرح برسنے لگا۔

"ہم اس منحوس خبر پر اعتبار کر چکے تھے۔" میں نے کہا۔ "ہم میں سے کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس موضوع کو چھیڑتا... میں محسن کے خیال سے چپ تھا۔ محسن ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کتنا صبر کرنے والا دل رکھتا ہے۔"

"کیا وہ... وہ زندہ ہے غالب... دیکھ جھوٹ مت بولنا مجھ سے... میں نے دل کو پتھر کر لیا تھا۔ سینے پر صبر کی چٹان رکھ لی تھی۔ مجھے ایسے جھوٹ کی ضرورت نہیں ہے جو کوئی مجھے تسلی دینے کے لیے بولے۔" محسن نے غالب کا بازو تھام لیا۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔

"محسن! وہ بالکل ٹھیک ہے میرے یار... شملا بالکل ٹھیک ہے... تو بتا میں کس کی قسم کھاؤں۔" غالب نے اس کے چہرے پر پیار سے تھپکی دی۔

"تو نے... تو نے خود دیکھا تھا؟ کب دیکھا تھا؟" محسن بولا۔

"یہاں آنے سے دو دن پہلے۔" غالب بولا۔ "دیکھا تو نہیں تھا... فون پر بات ہوئی تھی... اس وقت نازو بھی تھی وہاں... بوڑھی نے جب نمبر ملایا تھا تو ریسیور آنٹی نے اٹھایا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ کھانے کی چوری ہے... تم ہی سمجھاؤ اسے۔ کل رات دودھ کا آدھا گلاس پیا اور آدھا واش بیسن میں ڈال دیا۔ صبح مجھے پتا چل گیا... یہ کیا احمقانہ حرکت ہے... بیٹیاں تو ہمارے بھی گھر سے رو رہے تھے، چوہوں بلکہ لڑکوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے تھے مگر ہم اپنا خیال رکھتے تھے۔ اس طرح کھانا پینا چھوڑ دے گی تو اپنی صحت تو خراب ہوگی پھر بچے کی صحت کیسے اچھی ہوگی۔ میں نے کہا تھا کہ آنٹی آپ مجھے کیا کہہ رہی ہیں۔ ایس ایس پی صاحب سے کہیں۔ دو ہاتھ لگائیں... تیرا کیا ہے... سیدھی ہو جائے گی۔ میں نے بھی اسے ڈانٹا تھا کہ کھاؤ... آنتا کھاؤ کہ چیتے ہو جائے۔ بھوکے مرنے سے کھا کے مرنا بہتر ہے۔"

محسن ایک دم ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونے لگا۔ میں نے اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ "مت رو محسن... وہ سب جھوٹ تھا... ڈراؤنا خواب تھا..."

"میری شملا زندہ ہے سکندر... میرا بچہ بھی زندہ ہے۔" محسن اب پھوٹ پھوٹ کے رو رہا تھا لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ جنھیں اس نے اپنے ذہن سے فراموش کر دیا تھا اور تصور میں ایک بھولی بسری یاد بنا لیا تھا، وہ پھر حقیقت بن کے اس کی دنیا میں آگئی تھی۔ یہ اتنی بڑی خوشی تھی کہ اس کا پاگل ہو جانا بھی ممکن تھا۔ میں نے اسے رونے دیا۔ یہ جانے بغیر کہ میں خود بھی رو رہا ہوں۔ صرف غالب تھا جو بے وقوفوں کی طرح ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور بڑبڑا رہا تھا۔ "لاحول ولا قوۃ... اچھا عشق ہے یہ... تو بہ محبت ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ مر گئی اور دل نے مان لیا... سب ڈراما ہے... سچا عشق ایسا نہیں ہوتا... کوئی لاکھ کہتا مگر دل نہ مانتا... یہ تو محبت کا دعویٰ کرنے والے کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے... کل کوئی کہہ دے گا کہ وہ بھاگ گئی کسی کے ساتھ... یا اس نے نکاح ختم کرانے کا کیس کر دیا ہے... مان لو گے؟"

"بس یار... اب اور شرمندہ مت کر..." میں نے کہا۔ "اسے مبارک باد دے کہ اس کی محبت اسے پھر مل گئی۔"

"ہونہہ... محبت..." غالب بولا۔ "یہ کہہ کر یقین پھر مل گیا۔ بہت کچا اور بودا... ناقابل اعتبار یقین ہے یہ بھی... پھر تو چاچا کو کسی کی بات پر..."

"مرزا جی! انھوں نے بات ہی اس طرح کی تھی۔" میں نے کہا۔ "تم ہوتے تو تم بھی مان جاتے۔ انھوں نے کہا کہ جولی کا آپریشن کامیاب نہیں ہو سکا۔"

"ایسی کی تیسی ایسا کہنے والوں کی... جولی بالکل ٹھیک ہے... بالکل صحت مند ہے اور اس کا آپریشن ایک سو ایک فیصد کامیاب تھا۔" غالب نے کہا۔ "ڈاکٹر بھی اس کی صحت یابی کی رفتار پر حیران تھے۔ اس نے بڑی تیزی سے ریکور کیا۔ ایک دو ہفتے میں وہ چلنے پھرنے لگی۔ یہ سب انکل رضوی نے خود اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ صبح شام اسے دیکھنے جاتے تھے۔ سامنے ڈاکٹر یمین شش رہتے تھے۔ نرس ہر وقت موجود... اسپیشل وارڈ میں تو پہلے ہی منتقل کر دیا گیا تھا۔ اور وہ تو ایسا کیس تھا کہ نہ جانے کتنے رضاکار تھے۔ سب بضد تھے کہ ہم سے گردہ لے لو۔ اسے دیکھنے کے لیے تو نہ جانے کتنے لوگ ہر روز آتے تھے۔ اسکولوں کے بچے اپنی ماؤں کو لاتے تھے۔ چرچ کی طرف سے الگ گلدستے پہنچتے تھے۔ ٹی وی والے تو سارا دن آتے تھے۔ اخبارات میں اس کی تصاویر بھی چھپتی رہی تھیں۔ سب اپنے یار تھے جو برابر کام کر رہے تھے۔"

"آج مجھے بہت عرصے بعد... نہ جانے کتنی صدیوں کے بعد... اتنی بڑی خوشی ملی ہے۔" میں نے کہا۔ "اتنی بڑی کہ میرے دل میں اس کے لیے جگہ تنگ لگتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے سرکاری کوارٹر میں رہنے والے چپراسی کو قارون کا خزانہ مل جائے جس کی کنجیاں ہی سات اونٹوں پر لادی جاتی تھیں۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا سکندر..." محسن نے بالآخر خود کو سنبھال کے اپنے آنسو خشک کیے۔ "کہ جولی بھی ٹھیک ہوگی۔ ہم سے تو انھوں نے کہا تھا کہ اسے شملا کے مرنے کی خبر دی گئی تھی تو وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور اس کی حالت بہت تشویشناک بتائی تھی۔"

"کیسی عجیب بات ہے اور بیٹی کی موت کی خبر سے اسے

www.paksociety.com

کچھ بھی ہو سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"میرا دل اب بھی نہیں مانتا۔" محسن نے کہا۔

"آپ کا دل انتہائی فضول... مکروہ اور جاہل ہے۔" غالب نے کہا۔ "اب اس پر اعتبار کیوں کرتے ہو۔"

"وہ محنت والی عورت تھی یار۔" محسن بولا۔ "صدمہ تو ہوا ہوگا اُسے مگر اتنا نہیں۔ جب تمسلائی اور چولی کی بات غلط ہوگی تو یہ بات بھی غلط ہوگی کہ وہ بے ہوش پڑی تھی... اگر وہ بے ہوش تھی اور اس کی حالت اتنی ہی خراب تھی تو وہ جاتے وقت اُسے کیوں لے گئے؟"

"ماشاءاللہ" بیٹے سے متعلق دلائل سوجھ رہے ہیں اب۔" غالب نے طنز کیا۔

"ظاہر ہے یار... جب دماغ کو غلط لائن پر ڈال دیا گیا تھا تو سوچ کیسے صحیح رہتی۔" محسن نے کہا۔ "تو بہت بول رہا ہے بیٹے... وہاں ہماری جگہ ہوتا تو ہم پوچھتے... سارا ردیف قافیہ تنگ ہو جاتا۔"

"ہاں یار... اب ذرا فرصت ہے... بتاؤ تمھارے ساتھ انھوں نے کیا سلوک کیا۔" غالب بولا۔ "ویسا ہی جیسا بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں... یا ویسا جو اکثر بادشاہوں کے ساتھ نہیں کرتے؟"

"انھوں نے ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا جو ہم ان کے ساتھ کرتے۔ اگر وہ ہمارے قبضے میں ہوتے۔" میں نے کہا اور پھر غالب کو مختصراً وہ سب بتانے لگا جو ہم پر بیتی تھی۔ غالب نے مذمت میں کئی بار ان کو گالیاں دیں اور اعتبار دلایا کہ قسم فلاں کی۔ فلاں کے ساتھ یہ نہ کیا تو غالب نام نہیں۔

رات کے آخری پہر میں جب ہمارے سگریٹ بھی ختم ہو گئے اور ہماری باتیں بھی ختم ہو گئیں تو ہم نے سونے کی ناکام کوشش کی صرف غالب اپنی کوشش میں کامیاب ہوا۔ میں اور محسن صبح کا اجالا پھیلنے تک فضول لایعنی اور جولی کی باتیں کرتے رہے۔ محسن اب بہت خوش تھا۔ خود میں محسوس کرتا تھا کہ میری دنیا میں امید کا نیا آفتاب طلوع ہوا ہے جس نے مایوسی کے اندھیرے کو یوں دھو ڈالا ہے جیسے بارش گرد آلود آسمان کو دھو ڈالتی ہے۔ صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تو مجھے خیال آیا کہ کچھ کرنا چاہیے۔ میں نے محسن سے کہا اور محسن نے اتفاق کیا۔ ہم دونوں کنوئیں تک گئے۔ محسن نے اپنی ایس پی کی میلی وردی اتاری اور قمیص سے رہنٹ چلایا۔ اسی وقت بولتے ہوئے صابن سے محسن نے وردی کو اچھی طرح دھو کے صاف کیا۔ اتنی دیر میں اجالا کافی پھیل گیا تھا چنانچہ ہم نے باری باری غسل کیا اور لوٹ آئے۔ جب ہم چائے بنانے کی تیاری کر رہے تھے تو غالب اُٹھا۔ مجھے چولہا جلاتے اور محسن کو دُھلے ہوئے کپڑے پھیلاتے دیکھ کر وہ بہت ہنسا۔

"کیا وقت آگیا ہے۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ "جو سکندرِ اعظم بنے پھرتے تھے وہ چولہا پھونک رہے ہیں۔ تقدیر نے ان کے کپڑے تک اتروا لیے ہیں۔"

"یہ نہیں دیکھتا شاعر کہ تقدیر نے ایس پی کی وردی بھی پہنا دی ہے۔" محسن نے شرما کے کہا۔

"مت سن اس کی شاعری۔" میں نے محسن سے کہا۔ "یہاں سب اپنے ہیں اور اپنوں میں شرم کیسی۔"

غالب اس کے بعد کوئیں پر گیا اور میں نے غسل میں اس کی مدد کی۔ جب ہم واپس آئے تو محسن چائے بنا چکا تھا۔ ہم نے دہکتے ہوئے کوئلے استری چھلی میں ڈالے جس میں چائے بنائی گئی تھی اور ایس پی کی وردی کو فرش پر بچھا کے اور ہاتھ سے برابر کرتے ہوئے تیلی جس کا استری کی چپٹی کا پیندا اتنا گرم ہو گیا تھا کہ سو فیصد نہیں تو ستر فیصد ہماری توقع کے مطابق نکلے۔ دھلنے اور استری ہونے کے بعد وردی بالکل ایسی ہو گئی تھی کہ دور سے پہچانے والے ایس پی کے شایانِ شان ہو۔ ایک میلی کچیلی اور شکن آلود وردی کا امپریشن اتنا اچھا نہ پڑتا جتنا اس ایجاد شدہ استری سے وردی خشک بھی ہو گئی تھی ورنہ ہمیں دھوپ کے نکلنے کا انتظار کرنا پڑتا اور اُسے دو تین گھنٹے تک پھیلائے رکھنا پڑتا۔ سراج کی جیب میں سے ایک کنگھی بھی نکل آئی تھی جو اس وقت کام آئی۔ میرے اور غالب کے کپڑے اتنے صاف نہیں تھے لیکن ہمارا کردار بھی اتنا اہم نہیں تھا۔ میں ایس پی صاحب کا پی اے تھا اور غالب ان کا چپراسی۔

نو بجنے کے قریب ہم اس جلے ہوئے گھر سے اپنے قیدی کو لے کر روانہ ہوئے۔ سراج اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں مگر وہ ہمیں روک نہیں سکتا تھا۔ ہم نے اس کا منہ پھر بند کر دیا تھا تاکہ وہ بول ہی نہ سکے۔ گاؤں کی حدود شروع ہوتے ہی پہلے چند افراد نے دیکھا جو ہل لے کر کھیتوں کی طرف جا رہے تھے اور جھک کے ادب سے سلام کیا۔ فضلو کی کارکردگی کا اندازہ میں نے گزشتہ شب ہی کر لیا تھا۔ اس نے ایس پی کی آمد کی خبر متعلقہ افراد تک پہنچا دی تھی اور اب تک غیر متعلقہ افراد کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ پولیس کا کتنا بڑا افسر گاؤں میں آنے والا ہے۔

پولیس چوکی تلاش کرنے میں ہمیں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ دو کمروں پر مشتمل پکی عمارت تھی جو انسپکشن کے لیے تیار تھی۔ کالے حوالدار نے غالباً رات اس پر سفیدی پھیری تھی۔ ظاہر ہے اس نے مقامی آبادی کو بیگار میں پکڑا ہوگا۔ باہر بنے ہوئے

کی سفید لکیریں بڑی جلی تھیں اور اندر بھی ہر چیز چمک رہی تھی۔ پولیس تھانے تک ہی محدود نہیں، سرکاری دفاتر اور اداروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب کوئی بڑا افسر دورے پر معائنے کے لیے تشریف لاتا ہے تو تمام معاملات درست ملتے ہیں اور حالات مثالی ہو جاتے ہیں۔ عملہ مستعد، با اخلاق اور فرض شناس نظر آتا ہے۔ ہر کام قاعدے ضابطے کے مطابق، صفائی کا معیار بہترین۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ عام دنوں میں کیا ہوتا ہے۔ اگر سارا سال کارکردگی کا ایسا ہی معیار رہے تو پبلک کو کسی سے شکایت نہ رہے اور خوشامد کرنے کو کچھ نہ رہے۔ مگر یہ ایک رسم ہے جو اسی طرح سب لوگ نباہتے ہیں۔

ہماری تشریف آوری کی خبر ہم سے بہت پہلے پہنچ گئی تھی۔ غالباً کالے تھانیدار نے گاؤں کے چاروں طرف اپنے مخبر کھڑے کر دیے تھے کہ ایس پی صاحب جدھر سے بھی نمودار ہوں اُسے دوڑ کر اطلاع دی جائے۔ وہ بنفسِ نفیس ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس کی وردی سے جوتے تک سب بے داغ تھے اور اپنی ایک آنکھ پر اس نے سیاہ چشمے کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ اس نے چلا کر ہمیں سلیوٹ کیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں سپاہی اٹینشن ہوئے اور انھوں نے بھی ایڑیاں بجا کے سلیوٹ جھاڑا۔ یہ گویا گارڈ آف آنر تھا۔ کالا حوالدار بظاہر بہت پُراعتماد نظر آرہا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ در حقیقت اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہوں گی۔ کسی ایس پی کا ایک چھوٹے سے گاؤں کی پولیس چوکی پر اچانک چھاپا مارنا قیامت کے آنے سے کم نہیں ہوتا۔

محسن نے ایک شانِ استغنا کے ساتھ سر ہلا کے سلیوٹ کا جواب دیا اور کہا۔ "دیکھو بھئی... ہم نے یہ خطرناک مجرم پکڑا ہے... یہ بہت بڑا دھوکے باز ہے... اور جعلساز ہے..."

"شکل سے ہی ایک نمبر فراڈ لگ رہا ہے جنابِ عالی۔" کالے حوالدار نے کہا اور اس کے ماتحت عملے نے تائید میں سر ہلایا۔

محسن اس کرسی پر بیٹھ گیا جو واحد میز کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ "اس کو حوالات میں ڈالو۔" اس نے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو باقاعدہ حوالات تھا۔ اس میں لوہے کی سلاخوں والا دروازہ تھا جس میں قفل بھی پڑا ہوا تھا۔

کالے حوالدار نے گرج کے اپنے ایک ماتحت کو حکم دیا۔ "اوئے مرنے... اس بدمعاش کو ڈال دے... تفتیش کرنا ہے جنابِ عالی؟"

اس کا مطلب واضح تھا۔ تفتیش کے نام پر پولیس صرف تشدد کرتی ہے۔ کالا حوالدار افسر کو خوش کرنے اور اپنی فرض شناسی ثابت کرنے کے لیے فوراً تیسرے نمبر کا استعمال شروع کرنا چاہتا تھا۔

"ابھی نہیں..." محسن نے ہاتھ اٹھا کے کہا اور اپنی کیپ اتار کے میز پر ڈال دی۔ "بس اس کا منہ بند رکھنا... مجھے شور اچھا نہیں لگتا۔"

سراج کا منہ تو پہلے ہی بند تھا۔ جب اسے نہایت ذلت کے ساتھ دھکے دے کر حوالات میں پہنچایا گیا تو مجھے دلی مسرت حاصل ہوئی۔ وہ اس تھانے کا حاکم تھا مگر اس کے ماتحت اسی کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کر رہے تھے۔ اندر ہی اندر اس کا خون کھول رہا ہوگا لیکن وہ بے بس تھا۔

"بہت کمینہ ہے یہ..." محسن نے کہا۔ "نہ جانے کتنے لوگوں کو لوٹ چکا ہے۔ کہیں تحصیلدار بن کے جاتا ہے۔ کہیں نہر کے محکمے کا افسر بن جاتا ہے۔ ایک گاؤں کے لوگوں سے دس ہزار وصول کر لیے تھے کہ نہر کا پانی بند نہیں ہوگا... آج کل ایس پی بنا پھر رہا تھا۔"

"ایس پی ہو؟" کالا حوالدار چیخا۔ "اس کی یہ مجال..." وہ کسی مجبوری کے باعث تیم کی آواز نکالنے سے قاصر تھا۔ "زندہ مار مار کے..."

"بھئی دیکھو..." محسن نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ ہمارے ماتحت ہیں... ہمارے ساتھ تو آرہے تھے... ارے بھئی تم کھڑے کیوں ہو۔" محسن نے مجھے مخاطب کیا۔ "بیٹھ جاؤ نا... تم بھی دروازے کے باہر بیٹھو... میری اجازت کے بغیر کسی کو اندر مت آنے دینا... اور چیخ مت لگانا..."

"جی سرکار..." غالب بولا اور باہر چلا گیا جہاں اس کو بھی تشریف رکھنے کے لیے ایک کرسی دی گئی۔ میں ایک دوسری کرسی پر بیٹھ گیا جو میز کے دائیں جانب پڑی تھی۔ تیسری کرسی بائیں طرف تھی۔ سامنے کوئی کرسی نہیں رکھی گئی تھی۔ یہ سب کرسیاں کسی کے گھر سے منگوائی گئی تھیں کیونکہ اس قسم کا فرنیچر تو شہر کے تھانوں میں بھی نظر نہیں آتا... ایک بنچ کمرے کی دیوار کے ساتھ ڈال دی گئی تھی جو ملاقاتیوں کے لیے تھی۔ ان کو افسرِ اعلیٰ کے بہت قریب آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ حاکم اور محکوم کے درمیان یہ فرق بھی نہ رہے تو خطرناک قسم کی اسلامی مساوات آجاتی ہے اور جمہوریت آجاتی ہے جو حاکموں کو حاکم نہیں رہنے دیتی۔ چنانچہ جو نظام گوری چمڑی والے انگریز نے کالی رعایا کو قابو میں رکھنے کے لیے قائم کیا تھا، وہ اپنی تمام قابلِ مذمت روایات کے ساتھ آزاد لوگوں نے اپنا لیا تھا۔

"ہاں بھئی... کیسا چل رہا ہے یہاں کا نظام؟" محسن نے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا، آنکھیں ملیں اور کچھ اطمینان سے بیٹھ

www.paksociety.com

گیا۔ مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ بہت تھکا ہوا ہے۔

"نظام بہتر چل رہا ہے جناب... بہترین۔" کانپتے حوالدار نے کہا اور اپنے ایک نائب کو کچھ اشارہ کیا جو میں نے دیکھا۔ ماتحت فوراً جیسے پاؤں نکل گیا۔

"وارداتوں کا کیا حال ہے؟" محسن نے کہا۔

"اللہ کی مہربانی سے سب ٹھیک ہے۔ چوری ڈکیتی کچھ نہیں... بس کبھی کبھی آپس کے جھوٹے موٹے جھگڑے ہوتے ہیں... تو جناب عالی وہ میں نوٹ کرتے... میرا مطلب ہے صلح صفائی کرا دیتا ہوں۔" حوالدار نے مفصل رپورٹ دینا شروع کی۔ "جھگڑے بھی دبے ہوتے ہیں۔ کسی کے ڈھور ڈنگر کسی کے کھیت میں چلے گئے... آخر زمیندار ہیں جناب عالی... گھروں میں لڑائی ہو جاتی ہے... جہاں دو برتن ہوتے ہیں وہ ٹکراتے ہیں تو بجتے ہیں... پر پرچے کاٹنے سے کیا فائدہ۔"

"یہاں مجھے بہت لوگ نظر آئے تھے۔" محسن نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

حوالدار پر بجلی گر پڑی۔ "جی... جی..." اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔

"کچھ... بہت سے لوگوں کی بھیڑ نظر آئی تھی۔" محسن نے کہا۔

"وہ... دراصل... گرمی بہت پڑتی ہے تو جناب یہاں کے لوگ سرشام آ بیٹھتے ہیں تاکہ سر کو ٹھنڈی ہوا لگے۔ مغرب تک اٹھ جاتے ہیں۔"

"مجھے رپورٹ ملی تھی کہ تم بڑا کام کراتے ہو۔" محسن نے اسی لہجے میں حوالدار کی طرف دیکھے بغیر کہا اور اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا۔

حوالدار پر اب آسمان ٹوٹ پڑا۔ "میں... یہ آپ کیا فرماتے ہیں جناب عالی... میری کیا مجال... کسی نے جھوٹی رپورٹ دی ہے... بہت سے کمینے لوگ میرے خلاف ہیں... میں انصاف سے کام لیتا ہوں اس لیے... میرا تو یہی فرض ہے... کسی میں فرق نہ رکھوں... یہاں چوہدری اور نمبردار... زمیندار... یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کا ساتھ دوں... وہ دوسروں کو نہیں دیتے مار دوں غریب مزارعوں..."

"یہ تم سے نمبردار اور چوہدری کہتے ہیں؟" محسن نے کہا۔ "یعنی مطالبہ کرتے ہیں کہ کسی بے گناہ کو ان کے کہنے پر تھانے لا کے جوتے مارے جائیں؟ میں ملنا چاہتا ہوں ان سے... اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ پولیس کے کام میں دخل دیتے ہیں میرے ایک ماتحت کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"یہ بات... یہ بات نہیں جناب عالی۔" حوالدار کی حالت اس وقت کے خیال سے غیر ہونے لگی جب ایس پی یہ بات نمبردار اور چوہدری کے سامنے کہے گا کہ تم میرے ماتحت سے غلط کام کراتے ہو۔ "آپ تو افسر ہیں... کبھی کبھی آتے ہیں... یہاں ہم دن رات ان کے ساتھ ہیں... ان کی نظر رکھتے ہیں... وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے۔"

"ہاں... یہ تو ہے... دریا میں رہ کے مگرمچھ سے بیر نہیں رکھا جا سکتا... لیکن میرے پاس کچھ درخواستیں آئی تھیں۔" محسن بولا۔

"کس کی جناب۔" حوالدار کا رنگ پھر اڑ گیا۔

"میں بلاؤں گا ان سب کو آج۔" محسن نے کہا۔

"ایک تو سردار فضل الرحمٰن عرف فضلو کا کیس ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں بھئی... مجھے یاد ہے... ایک عورت کے بارے میں بہت سی شکایات ملی تھیں۔ کوئی حشمت اللہ ہے یہاں۔ اس کی بیوی کی بس ہے۔" محسن نے انتہائی بے نیازی سے کہا۔

"وہ... ٹھیک ہو..." حوالدار بولا۔ "بڑی حرافہ ہے... جی... مگر آپ کچھ کھا پی لیں پہلے۔"

"ہاں بھئی... چائے اگر مل جائے تو..." محسن نے دونوں ٹانگیں میز پر پھیلا کے کہا اور جیب میں سے دس کا نوٹ نکالا۔ "یہ ایک پیکٹ تقوی کا مل کا۔"

"کس چیز کا جناب عالی؟" حوالدار دم بخود رہ گیا۔ یہ نام اس نے پہلی بار سنا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ افسر بسکٹوں کا پیکٹ مانگ رہا ہے یا بندوق کی گولیوں کا۔

"سگریٹ چاہئیں... میرے سگریٹ رات کو ختم ہو گئے تھے۔" محسن بولا۔

"تو حکم کریں جناب..." وہ ایک الماری کی طرف لپکا اور اس میں سے کیپسٹن کے سگریٹوں کا پورا کارٹن نکال لایا جو اس نے یقیناً شہر سے بطور خاص منگوایا ہوگا یا کسی نمبردار قسم کی چیز نے تحفے میں بھیجا ہوگا۔

"تھانے میں سگریٹ؟" محسن نے ناگواری سے کہا۔

"وہ سر... آپ کے لیے نمبردار صاحب نے خاص طور پر بھیجے تھے... اور انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ آج رات کا کھانا..."

"شٹ اپ..." محسن نے کہا۔ "یہ لو دس روپے... اس میں سے دس پیکٹ مجھے دو... بلکہ یہ دس روپے اور رکھو... کارٹن میرے حوالے کرو۔"

"جناب عالی... وہ پیسے نہیں لیں گے۔" حوالدار نے مری مری آواز میں کہا۔

"مگر تم دو گے... ابھی اپنے پاس رکھو... جب میں انھیں بلاؤں تو میرے سامنے دینا۔ میں دیکھتا ہوں وہ کیسے انکار کرتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اور ہاں شام کے کھانے کے لیے ملک سے

شیخ کریم دین کسی کے گھر دعوت پر نہیں جاتا۔ کوئی تحفہ قبول نہیں کرتا اور ہر چیز کی قیمت ادا کرتا ہوں۔ جو افسر پہلے آئے ہوں گے ان کی بات اور تھی۔ مجھے ان جیسا نہ سمجھا جائے۔ یہ بات ان سب کو معلوم ہو جانا چاہیے جو مجھ سے ملنے آئیں۔ اگر کسی نے مجھے کسی بھی بہانے کچھ پیش کیا... تو تم معطل..."

"جی... جی... جناب عالی..." حوالدار کا خون خشک ہونے لگا مگر خیریت گزری کہ اسی وقت چائے آ گئی حسب توقع چائے کے ساتھ لوازمات بھی کچھ تھا۔ میں نے حوالدار کو آنکھ سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

"جب افسر لوگ چائے پیتے ہیں تو کسی کی موجودگی پسند نہیں کرتے۔ تم جا سکتے ہو جب تک ناشتہ نہیں لے آؤ۔" میں نے کہا۔

"بہت اچھا جناب... غلطی ہو گئی تھی مجھ سے۔" وہ اندر جانے لگا۔

"بے وقوف... ابھی نہیں... پہلے صاحب کو فارغ ہونے دو۔" میں نے کہا۔

میری اس کوشش کا فائدہ یہ ہوا کہ محسن نے اطمینان سے پیٹ بھر کے کھایا۔ دیہات کے خالص مکھن کا بھرا ہوا ڈونگا تھا۔ پراٹھے تھے حلوا تھا۔ آپ ہوتے ہوئے آہستہ سے کھا رہے تھے۔ ڈراما صحیح پیش کرنے کے لیے ہمیں آدھا گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ مگر اس کے بعد کھانے کا سامان باہر آیا تو میں نے اور وہ سب نے ساتھ بانٹ کر کھایا۔ ہم ماتحت اور چیلے لوگ تھے چنانچہ ہمارا اپنے افسر کی طرح ہونا ضروری نہیں تھا۔ جب افسر اعلیٰ کی طرف سے ایک ایک پیکٹ سگریٹ کا بھی مرحمت فرمایا گیا۔ ہم نے سگریٹ بھی باہر پیے۔ افسر کے سامنے یہ حرکت بھی گستاخی سمجھی جاتی۔

اصل ڈراما ایک گھنٹے کے بعد شروع ہوا۔ اس وقت تک گاؤں میں پولیس کے افسر اعلیٰ کی آمد کی خبر پھیل چکی تھی اور کچھ لوگ تھانے کے آس پاس بھی پہنچے تھے مگر ان کو تھانے حوالدار نے ڈانٹ کے بھگا دیا۔ اسے اندیشہ تھا کہ یہ شر پسند اس کا کیریئر خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان میں بیشتر گنجے تھے اور سر پیٹنے کے انداز میں ہاتھ پھیر رہے تھے۔ گاؤں کے جو آئی پی بھی شرف نیاز حاصل کرنے کا پیغام بدرسانی کر چکے تھے محسن ان کو انتظار کرنے کا کہہ دیا گیا تھا۔

"حوالدار..." محسن نے ناشتے کے بعد ایک دم اپنا رویہ بدلا اور ایس پی بن گیا۔ "اس لڑکے فضل الرحمٰن کو حاضر کرو۔"

حوالدار نے کہا۔ "جی جناب۔" اور صوبا خان کو محسن نے روانہ کر دیا۔

"کل یہاں کوئی چور پکڑا گیا تھا؟" محسن نے کہا۔

"چور... نہیں... کوئی چور نہیں پکڑا گیا یہاں تو۔"

"بکواس۔" محسن نے گرج کر کہا۔ "کوئی پلاسٹک کے کھلونے بیچنے والا تھا... گلیوں میں پھرتا تھا اور چوریاں کرتا تھا۔"

"وہ... جی ہاں... مگر وہ بے قصور تھا۔"

"چنانچہ تم نے چھوڑ دیا۔ تفتیش بھی ایک دن میں مکمل ہو گئی۔ حسب الاٹ بھی نہیں کاٹا اور تم نے فیصلہ بھی کر دیا۔ کیا تم نے یہاں عدالت کے اختیارات بھی سنبھال رکھے ہیں... بولو... جواب دو۔"

"جناب... جناب عالی... اس کے پاس..." حوالدار کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

"اس کے بارے میں چشم دید گواہوں کا بیان کچھ اور ہے۔" محسن نے کہا۔

"کون... چشم دید گواہ... کیا بیان ہے سر...؟"

"یہ کہ تم نے اس کے گلے میں رسی باندھ رکھی تھی اور اسے بیل کی طرح گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔" محسن نے کہا۔ "اس کی ریڑھی پر مال مسروقہ تھا جس میں ایک طلائی انگوٹھی... ایک گھڑی اور ایک عطر دان تھے۔"

"یہ... یہ غلط ہے جناب عالی۔" حوالدار نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

محسن نے میز پر ہاتھ مارا۔ "پی اے۔" اس نے مجھے آواز دی۔ "اندر آؤ۔"

میں اندر جا کے اٹینشن ہو گیا۔

"تم نے کل ایک چور کو حوالدار کی تحویل میں دیکھا تھا؟ حوالدار کو بتاؤ کہ اس کے پاس کیا تھا۔" محسن نے کہا۔

میں نے وہی بتایا جو حقیقت پر مبنی تھا۔ سو روپے میں عطر دان کی خرید و فروخت کا معاملہ حوالدار کے علم میں بھی نہیں تھا تاہم وہ کسی الزام کی نفی کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی۔

"حوالدار... تمہاری خاموشی اقرار جرم کے مترادف ہے۔" محسن نے سخت لہجے میں کہا۔ "یا تو تم نے کسی بے گناہ کو پکڑا اٹھایا پھر وہ چور تھا تو تم نے رشوت لے کر اسے چھوڑ دیا۔ مال مسروقہ کو ضبط کر کے بیچا۔ دونوں جرم بہت سنگین ہیں... تم کو مال ضبط کرنے کا اختیار تھا اور نہ بیچنے کا۔ تم کو سیدھا بتانا چاہیے تھا وہ چور کہاں ہے۔ اگر وہ بھاگ گیا ہے تو میں تم کو معطل کر سکتا ہوں۔ ابھی... اسی وقت..."

"جناب عالی۔" حوالدار نے ہاتھ جوڑ کے گڑگڑانا شروع کیا۔ "غلطی ہو گئی... پہلی بار سمجھ کے معاف کر دیں... وہ لڑکا ایک

www.paksociety.com

غریب مزارع کا ہے... باپ بہت شریف اور فرماں بردار تھا۔ اسے بھی گمراہ کیا ہے۔"

گویا اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے باپ کو مزارع کی حیثیت سے کام نہیں کرنے دیا بڑھاپے میں وقت اٹھانے سے روک دیا اور خود بھی غلامی قبول نہیں کی... آزادی سے روزی کمانے کا سوچا... "کس کا مزارع تھا وہ؟" محسن بولا۔

"نمبردار صاحب کا۔" حوالدار بولا۔

"ٹھیک ہے... جب نمبردار آئے تو اس لڑکے کو بھی میرے سامنے پیش کرنا۔ اس کی بیڑی ہی کے ساتھ۔" محسن بولا۔

"وہ... وہ تو زناب... انہی کے احاطے میں کھڑی ہوئی تھی... کل ہی اسے آگ لگا دی گئی تھی۔" حوالدار بولا۔

"او مائی گاڈ... یہاں تو لاقانونیت کا راج ہے۔ غنڈہ گردی ہے اور تم کہتے ہو سب ٹھیک ہے۔" محسن نے برہمی سے کہا۔

"سر... وہ فضلو آگیا ہے۔" ایک سپاہی نے سیلوٹ مار کے کہا۔

"ٹھیک ہے... اسے اندر بھیج دو... باقی سب باہر جاؤ۔" محسن نے کہا۔ "تم ٹھہرو۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

فضلو ڈرتا ہوا اندر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کا حوصلہ بحال ہوا۔ وہ سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"بہیں صنب مظلوم ہو گیا فضلو۔" محسن نے کہا۔ "تمہارا وہ چاچا... کیا نام ہے اس کا؟"

"حشمت اللہ عرف باشو سر۔" میں نے مستعد پی اے کی طرح کہا۔

"ہاں... وہ بھی آیا ہے؟" محسن نے پوچھا۔

فضلو نے اقرار میں سر ہلایا۔ "آیا ہے سر... مگر اس نے راستے میں مجھے دو تھپڑ مارے اور کہا کہ ایس پی تو چلا جائے گا۔ دیکھو بعد میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں میں... اور ٹھینگا کرانے کی دھمکی دی ہے۔"

"اسے بلاؤ اندر۔" محسن نے کہا۔ "حوالدار کو بھی بلاؤ۔"

حشمت اللہ عرف باشو صورت سے کمینہ نظر آنے والا ٹھگنا آدمی تھا۔ غالباً اسے حوالدار نے مرعوب کر دیا تھا کہ وہ ہاتھ جوڑ کر اندر آیا اور ایک دم شروع ہو گیا۔ "مائی باپ... یہ لڑکا فضلو تو سارے گاؤں کے لیے مصیبت ہے... ہم سب پریشان ہیں اس سے... ایک نمبر کا جھوٹا ہے..."

محسن اٹھ کر تمتماتا ہوا اس کے قریب گیا تو وہ کانپنے لگا اور اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ محسن کا زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا تو وہ تیورا کر گیا۔ میں نے فضلو کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ میں نے اسے آنکھ بھی ماری کہ آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ باشو نے اب محسن کے پیر پکڑ لیے تھے مگر اس کا اشارہ بھی حوالدار نے کیا تھا۔

"سیدھا کھڑا کرو اسے حوالدار۔" محسن نے گرج کر کہا۔

حوالدار نے اسے سر کے بال پکڑ کے کھینچا اور اٹینشن کر دیا۔

"باشو! میں تم کو اسی جگہ پھانسی دے دوں تو مجھے پوچھنے والا کوئی نہیں... گولی مار سکتا ہوں میں تم کو۔" محسن نے اپنا ریوالور نکالا اور میز پر رکھ دیا۔ "تم ایک نمبر کے جھوٹے اور ناقابل اعتبار آدمی ہو۔ میں لمبی بات نہیں کرتا... میرا حکم سن لو... اور حوالدار... میں ایک ہفتے بعد کسی کو بھیجوں گا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ میرے احکامات پر عمل ہوا یا نہیں۔"

"بالکل... بالکل ہوگا زناب عالی... کیسے نہیں ہوگا۔" حوالدار پر کپکپی طاری تھی لیکن وہ اپنی خودی کو رعایا کے سامنے بلند رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"فضلو کو کل ہی پڑھنے کے لیے اسکول بھیج دو۔" محسن نے کہا۔

"شک کیوں نہیں۔" حوالدار نے باشو کی گدی پر ایک زبردست جھانپڑ مارا۔

"کل کیوں مائی باپ... آج ہی بھیج دوں گا۔" باشو چلانے لگا۔

"اپنی آواز بند رکھو۔" محسن نے گرج کر کہا۔ "تم اس کی شادی کی بالکل فکر نہیں کرو گے۔ وہ جہاں چاہے گا اور جب چاہے گا اپنی مرضی کے مطابق شادی کرے گا۔ کوئی زبردستی نہیں چلے گی۔ میں نے اس کو اپنا پتا اور اپنا ٹیلی فون نمبر بھی دیا ہے کہ کوئی اسے پریشان کرے تو مجھ سے شکایت کرے پھر میں ایک ایک کی کھال میں بھس بھروا دوں گا۔"

"جیسا حکم مائی باپ..." باشو لرزتے ہوئے بولا۔

"تم نے یہاں آتے ہوئے اسے مارا تھا۔" محسن نے کہا۔ "معافی مانگو اس سے۔"

باشو کی سانس رک گئی اور آنکھیں پتھرانے لگیں۔ تھپڑ کھانا اتنی بڑی ذلت نہیں تھی جتنی کہ چھوٹے سے معافی مانگنا۔ محسن نے اس کے تذبذب کو دیکھتے ہوئے دوسرا تھپڑ رسید کیا... اور اپنا حکم دہرایا۔

"مجھے... مجھے معاف... کر دے... فضلو..." باشو نے زارو قطار روتے ہوئے کہا۔

"فضلو نہیں... بیٹا کہو... آئندہ ہمیشہ اسے بیٹا کہو گے پھر کبھی تمہارے غلط رویے کی شکایت ملی تو سر منڈوا لوں گا۔" محسن نے کہا۔

"معاف کر دے مجھے بیٹا۔" باشو بولا۔

"اب دفع ہو جاؤ۔" محسن نے کہا۔ اس کے جانے کے بعد محسن نے فضلو سے ہاتھ ملایا اور اسے پانچ سو روپے دیے۔

"یہ تمہاری تعلیمی ضروریات کے لیے... جاؤ..." محسن نے کہا۔ فضلو کی آنکھوں میں جذبۂ احسان مندی سے آنسو آنے لگے تھے۔

"اللہ آپ کو ترقی دے... عزت دے سر..." وہ بولا اور باہر نکل گیا۔

اگلا کیس بھی خاصا دلچسپ تماشا رہا۔ پہلے اس بڑے ہی کلاؤدار کے بیٹے کو طلب کیا گیا جو گلابو کے چکر میں پڑ کر بیوی بچوں کو بھول رہا تھا۔ وہ تیس سال کا کلین شیو اور لمبی لمبی مونچھوں والا جوان تھا اور گاؤں میں یقیناً بدمعاشی سے سر اٹھا کے چلتا ہو گا مگر یہاں بھی وہ گھبرایا نہیں تھا کیونکہ ابھی تک اس کو اپنے خلاف الزامات کی نوعیت کا علم نہیں تھا۔

"کیسے یاد فرمایا ہمیں حضور نے؟" وہ بولا۔ اور ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔

محسن نے اسے کرسی پر بیٹھے بیٹھے نظر بھر کے دیکھا۔ "حوالدار... اسے سیدھا کھڑا ہونا سکھاؤ۔" اس نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

حوالدار اب اپنی عزت و نوکری بچانے کے لیے ایس پی صاحب کو زیادہ سے زیادہ خوش کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک گھونسا مارا۔ "ہاتھ پیچھے کر سور کے تخم... ایسے کھڑا ہے جیسے تو بڑا افسر ہے... ابھی ساری بدمعاشی بھی نکل جائے گی... [illegible] ذاتی ہے یہاں..."

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا... اس نے ظاہر کیا کہ گھونسے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ ایسے گھونسوں کی پروا بھی نہیں کرتا۔

"اچھا تو یہ بدمعاش ہے؟" محسن نے کہا۔ "حوالدار... یہاں کوئی باربر ہے... میرا مطلب ہے حجام... نائی..."

"ہے زناب عالی... آپ نے شیو بنوانا ہے؟"

"نہیں... اس بدمعاش کی ٹنڈ کرا دو پہلے۔" محسن بولا۔ حوالدار کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس کے دل کی مراد بر آئی تھی۔ افسر نے وہی کیا تھا جو وہ خود کرنا چاہتا تھا۔ اسے یقین آنے لگا تھا کہ اب اس کا لوگوں کی ٹنڈ کرانے کا جرم سنگین شمار نہیں ہوگا۔ ملزم نے کچھ شور مچایا کہ اس کا جرم بتایا جائے مگر اس کی کسی نے نہیں سنی... حوالدار نے اسے بزور بازو مرغا بنایا... خود تھپڑ مار کر اس کے سر پہ کھڑا رہا اور اس کے ماتحت سونا خان نے بقلم خود ملزم کو مونڈ دیا۔ اس کام میں وہ خاصا تجربہ رکھتا تھا اور حوالدار صاحب کے حکم پر شاید گاؤں کی نصف باقی آبادی کے سر صاف کر چکا تھا۔ گھنے لمبے بالوں کے نیچے سے کدو جیسا سر نکالنے کے بعد سونا خان نے صفائی کے خیال سے ایک ایک بال چنا اور فرش پر پھینک مارا۔

"اس کی مونچھیں کیوں چھوڑ دیں؟" محسن نے کہا۔

ملزم کی ساری اکڑفوں ختم ہو گئی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانا شروع کیا لیکن اس کی ایک نہ سنی گئی۔ سونا خان نے اس کی پلی ہوئی مونچھیں ایک منٹ میں غائب کر دیں۔ سر منڈوانے کے مقابلے میں کسی جوان کے لیے مونچھیں منڈوانا بہت زیادہ بے عزتی اور بے غیرتی کے مترادف کی بات تھی۔ شاید اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا منہ کالا کیا جائے گا اور پھر اسے شاہی سواری پر یعنی کمہار کے گدھے پہ دم کی جانب منہ کر کے بٹھایا جائے گا اور گاؤں کی گلیوں میں پھرایا جائے گا۔

"ہاں بھئی... اب بتاؤ تم کیا کرتے ہو... بدمعاشی کے علاوہ؟" محسن نے ایک اور سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔

"حضور ہم شریف آدمی ہیں... غلط کہا ہے کسی نے..."

"تمہاری بیوی ہے... بچے ہیں۔" محسن نے اس کی بات کاٹ دی۔

"جی حضور والا... چار بچے ہیں..."

"اور اس کے باوجود بدمعاشی کرتے ہو؟" محسن نے کڑک کر کہا۔ "کیا لگتی ہے گلابو تمہاری... کیوں ملتے ہو اس سے..."

"میں... خدا کی قسم حضور... میں کسی گلابو کو نہیں جانتا... یہ جھوٹا الزام ہے مجھ پہ..." وہ چلانے لگا۔

"چلاؤ مت۔" محسن نے میز پہ مکا مارا۔ "حوالدار... گلابو کو بلاؤ... باشو کی سالی کو۔"

اس دو حرفی جملے سے حوالدار پہ اور گلابو کے عاشق پہ واضح ہوا کہ ایس پی صاحب سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔ ایک آدمی اسی وقت گلابو کو لانے کے لیے بھیج دیا گیا۔

"گلابو کے آنے تک تم اُدھر کان پکڑو۔" محسن نے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ ایک شادی شدہ شخص کو راہِ راست پر لانے اور ایک فاحشہ کے چنگل سے چھڑانے کے لیے مؤثر کارروائی ضروری تھی۔ حوالدار نے اسے گردن سے دبوچا اور کونے میں پھینک دیا جہاں وہ رضاکارانہ طور پر مرغا بن گیا۔

"حوالدار... اس گاؤں کی شرقی سمت میں آخری مکان کس کا ہے؟" محسن نے کہا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں آگ لگ گئی تھی۔"

"آگ... جی ہاں زناب... صحیح فرمایا آپ نے... اس میں آگ ہی لگی تھی۔" حوالدار نے سنبھل کے کہا۔

"کیسے لگی تھی؟ کس کے حکم سے...؟"

"بس زناب عالی... بجلی گری آسمان سے۔" حوالدار نے کہا۔

www.paksociety.com

"اللہ کے حکم سے۔"

"اور وہ جو اس میں رہتے تھے... وہ کون تھے... اب کہاں ہیں؟"

"وہ... ایک بڈھا تھا جناب... تب بخار کی گرمی تو... وہ گھر میں نہیں تھا۔" حوالدار نے کہا۔ "اس لیے بچ گیا... بڑا مغرور ہو گیا تھا کیونکہ اس کا ایک بیٹا ڈپٹی ہو گیا تھا۔ وہاں سے وہ باپ کو بہت پیسہ بھیج رہا تھا... اس نے پکا مکان بنوا لیا تھا۔"

"جو ایک گستاخی تھی۔ پٹواری کا مزارع اور پکا مکان بنا کے رہنے لگے۔ یہ تو صاف بغاوت کرنے والی بات ہے۔ کل تک جوتیاں اٹھانے والے اور جوتیاں سیدھی کرنے والے برابری کا دعویٰ کرتے ہیں... سر اٹھا کے چلتے ہیں اور دوسروں کو بھی کہتے ہیں کہ خدا کے آگے سر جھکاؤ... کسی اور کے آگے نہیں۔ رزق دینے والا خدا ہے... زمیندار نہیں... یہی جرم تھا نا اس کا جس کی سزا اسے یہ دی گئی کہ اس کا گھر جلوا دیا گیا؟" محسن کی آواز آہستہ آہستہ تیز ہوتی گئی۔ "تم نے کیا کیا؟"

"میں... میں... میں..." حوالدار ہکلانے لگا۔

"کیا کیسے کی عزت نفس کر رہے ہو... میں پوچھتا ہوں تم نے پرچہ کاٹا پٹواری کے خلاف؟" محسن نے میز پر ہاتھ مارا۔

حوالدار اچھل پڑا۔ "خود ہی کاٹ دیتا... جناب مدعی کوئی تو مدعی ہونا چاہیے... وہ سامنے ہی نہیں آیا... شکایت لکھوانے آتا تو میں ضرور لکھتا۔"

"اب کہاں ہے وہ...؟" محسن نے کہا۔

"اپنے بیٹے کے پاس..." حوالدار بولا۔

"گویا ان ظالموں کے ڈر سے جلا وطن ہو گیا؟ اپنا گھر اور گاؤں چھوڑ گیا... اور تم انصاف کے ٹھیکیدار بیٹھے دیکھتے رہے؟" محسن نے گرجتے ہوئے کہا۔ "مجھے حیرت ہے پولیس کی وردی میں دیکھتا حوالدار کہ وہ پٹواری اس مکان کو نئے سرے سے تعمیر کراتا۔ اپنے خرچ سے بنواتا اور تم کو میں اس مکان کا چوکیدار بنا دیتا کہ اس کی ایک اینٹ بھی نکلی تو تم پولیس سے نکالے جاؤ گے... مگر اب خدا کا شکر ادا کرو کہ تم بچ گئے ہو۔ مدعی ہی کوئی نہیں اس کیس میں تو انصاف کیسے دلایا جائے۔"

تھانے پر ایسی افتاد کبھی نہ پڑی ہوگی۔ افسر پہلے بھی گزرے چلے گئے تو مرغیاں کھا کے یا زمینداروں کی میزبانی کا لطف اٹھا کے نذرانے لے کر اور شکار کھیل کر رخصت ہوتے ہوں گے۔ یہاں تو آج تھانے میں بھونچال آیا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سارے کیس آج ہی نمٹائے جائیں گے۔ جس پر بھی ظلم ہوا ہے اس کی داد رسی ہوگی اور ظالم کا وہیں فیصلہ ہوگا... اتنا بڑا افسر تھا، اس کے سامنے کس کو دم مارنے کی مجال تھی۔ ایک حوالدار اگر سیاہ سفید کا اختیار رکھتا تھا تو اس افسر کے اختیارات کی انتہا کوئی نہیں ہو سکتی۔ دو قلی سپاہی بار بار گاؤں دوڑتے تھے اور کسی فریادی کو لے آتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک سارے گاؤں میں تہلکہ مچ گیا ہوگا کہ ایک زبردست فرض شناس انصاف پرور حاکم آیا ہے جو کسی کی نہیں سنتا اور ایک پیسہ نہیں لیتا۔ نمبردار کے گھر کی مرغی تک کھانے سے انکار کر دیا۔ بہشتی کو ایک دن کی بادشاہت ملی تھی تو اس نے چمڑے کے سکے چلا دیے تھے۔ ہم بھی چمڑے کے سکے چلا رہے تھے۔ جو بہت عرصہ چلیں گے۔ کچھ دن چرچا رہے گا کہ ایک سچا پولیس افسر آیا تھا۔ لوگ اس کے انعام و اکرام اور اس کے انصاف اور اس کے فیصلوں کو یاد رکھیں گے اور دعائیں دیں گے۔ پھر سب بھول جائیں گے کیونکہ صدیوں کے ظلم اور ناجائز اختیارات سے تجاوز اور قانون کے غلط استعمال کی روایات کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ انھیں ایک دن میں نہیں بدلا جا سکتا تھا۔ مگر مجھے بہت لطف آ رہا تھا کہ ایک دن کے لیے ہی سہی ہم نے نمونہ تو پیش کیا کہ پولیس کو کیا ہونا چاہیے۔ قانون تو کمزور کی حفاظت کے لیے بنا تھا لیکن پیسے نے قانون کو بھی خرید لیا اور جو طاقتور تھے وہ زیادہ طاقتور ہو گئے۔ غریب کا دشمن قانون بھی ہو گیا۔ اب سوائے یوم حشر کے انصاف پر اعتقاد رکھنے کے سوا وہ کرے بھی تو کیا کرے۔

ایک سپاہی نے گلابو کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے اسے دیکھا تو مجھے یقین آیا کہ عورت کو صرف مجبوری طوائف نہیں بناتی۔ اس الزام میں بھی سو فیصد صداقت نہیں ہے کہ اسے مرد طوائف بناتا ہے۔ کبھی کبھی وہ شوقیہ بھی طوائف بنتی ہے۔ شہر کی طوائف کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا تھا۔ دیہات کی طوائف کو دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ واقعی اٹھائیس تیس سال کی عورت تھی۔ قدرے فربہی کی طرف مائل۔ اس کے رخساروں پر صحت مندی کی چمک تھی اور اس نے کپڑے بھی ریشمی پہن رکھے تھے۔ اس کی آنکھوں کا سرمہ پلکوں کے سامنے سے باہر تک پھیلا ہوا تھا اور اس نے چہرے کے داغوں کو چھپانے کے لیے پاؤڈر کریم میں ملا کے یوں لیپ رکھا تھا جیسے دیہاتی دیوار کو کچے سے لیپ پوت کے برابر کرتے ہیں۔ جب وہ میرے پاس آئی تو اس کے وجود سے بہت تیز اور گھٹیا سینٹ کی مہک آئی۔ یہ سب فحش نہیں تھا۔ فحش اس کی مسکراہٹ تھی۔ یہی مسکراہٹ خود اشتہار دیتی تھی کہ وہ عورت نہیں طوائف ہے۔ برائے فروخت ہے۔

"بڑے صاحب نے بلایا ہے مجھے؟" وہ پازیب چھنکا کے بولی۔

"ہاں... مگر تیرے نخرے دیکھنے کے لیے نہیں۔" میں نے اس کے لہجے پر برہمی سے کہا۔ "یہاں ٹھہر ابھی... پہلے اطلاع کر دوں۔"

لیکن وہ بڑی بے باک عورت تھی۔ وہ ہنسی اور میرے پیچھے پیچھے اندر چلی آئی۔ وہ مجھے بالکل لفٹ دینے پر تیار نہیں تھی اور اسے یقیناً یہ خوش فہمی تھی کہ اسے بڑے افسر کی دل بستگی کا سامان فراہم کرنا ہے۔ اندر قدم رکھتے ہی اس نے اپنے ایک پرستار کو صاف ستھرے سر کے ساتھ کونے میں مرغا بنا دیکھا تو وہ ٹھٹکی۔

"سلام صاحب جی۔" گلابو نے ایک ادا سے مسکرا کے کہا اور کرسی پر بیٹھنے کی نیت سے آگے بڑھی۔ "کیا حکم ہے جناب عالی؟"

"الو کی پٹھی۔" میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ "کھڑی ہو جا یہاں۔" گلابو کا رنگ اڑ گیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ "یہ گلابو ہے سر۔" میں نے کہا۔ "اسے روکا تھا میں نے مگر یہ پیچھے چلی آئی... بہت بدتمیز عورت ہے۔"

محسن نے سر ہلایا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ افسری کی اداکاری میں واقعی کمال دکھا رہا تھا۔ اس کی نظر گلابو پر ہی تھی۔

"گھر والا کہاں ہے تیرا؟ وہ ساتھ کیوں نہیں آیا؟" محسن نے کہا۔

"جی... گھر والا؟" گلابو نے گھبرا کے کہا۔ "شادی نہیں ہوئی۔"

"تو باپ کو ساتھ لانا تھا۔ بھائی کو ساتھ لانا تھا۔" محسن نے کہا۔

"میرا کوئی نہیں سرکار۔"

"رہتی کہاں ہے؟ کس کے ساتھ رہتی ہے؟"

"اپنا گھر ہے سرکار۔ باپ کا چھوڑا ہوا... اکیلی رہتی ہوں۔" وہ بولی۔

"گزارہ کیا ہے؟ کھاتی کہاں سے ہے؟"

"بس سرکار... دال دلیہ مل جاتا ہے... آپ کی دعا ہے۔" وہ مسکرائی۔

"میری دعا سے یا ان الو کے پٹھوں سے؟" محسن نے گرج کر کہا اور کونے میں مرغا بنے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا لگتا ہے یہ تیرا؟"

"کچھ... کچھ نہیں... کچھ نہیں سرکار۔" وہ کانپنے لگی۔

"پھر کیوں بلاتی ہے اسے؟ کیوں ملتی ہے اس سے؟" محسن نے کہا۔ "تجھے معلوم نہیں کہ اس کی بیوی ہے... بچے ہیں... ان کا حق تو مار رہی ہے ناحق... گاؤں تیری وجہ سے بدنام ہے۔"

"قسم آپ کی سرکار... میں نہیں بلاتی اسے... یہ تو خود میرے پیچھے پڑا ہوا ہے... جان نہیں چھوڑتا میری۔" وہ رونے لگی۔ "اس کے بیوی بچوں کا تو مجھے بھی خیال ہے۔"

"اچھا... یہ کہہ رہی ہے؟" محسن نے نرمی سے کہا۔ "حوالدار... اس کے باپ کو اور اس کی بیوی کو حاضر کرو۔"

انھیں بھی شاید گلابو کے ساتھ ہی بلایا گیا تھا مگر وہ بعد میں پہنچے تھے اور باہر کھڑے ہوئے تھے۔ اس کا باپ نے اندر آ کے مجھے پہچانا اور پیر سے اوپر مجھے بھی سلام کیا۔ پھر اس کی نظر اپنے فرزند ارجمند پر گئی جو ایک کونے میں مرغا بنے ہوئے تھے۔ ان کا گھٹا ہوا سر دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"بیٹھو چاچا۔" میں نے بینچ کی طرف اشارہ کیا۔ "اپنی بہو کو بھی بٹھاؤ... اور صاحب کو بتاؤ کیا شکایت ہے تمھیں گلابو سے؟"

بڈھا تو خاموش رہا۔ مرغے کی بیوی نے رونا پیٹنا اور دہائی دینا شروع کیا۔ اس نے گلابو کو اپنی زنانہ لغت میں گالیاں دیں اور کہا۔ اپنے اکلوتے شوہر نامدار کو برا بھلا کہا اور درخواست کی کہ اس کا دماغ درست فرمایا جائے۔ محسن سب کچھ افسرانہ التفات کے ساتھ سنتا رہا۔

"دماغ درست ہو جائے گا حکومت کرے... آج کے بعد یہ گلابو کا نام بھی لے تو حوالدار کو بتانا۔" محسن نے کہا۔ "حوالدار..."

"یس جناب عالی۔"

"چھتر ہے تمہارے پاس؟" محسن نے کہا۔

"کیا چیز سر... کون سا چھتر..." حوالدار ایک دم انجان بن گیا۔

"تیرہ نمبر کا چھتر... دماغ کیسے درست کرتے ہو آخر تم..." حوالدار سوچ رہا ابھی تک چھتر کو مذاق سمجھتے ہوئے محسن نے کہا۔ اس کے بعد حوالدار کے لیے گنجائش نہیں رہی کہ وہ اصلی تیرہ نمبر چھتر پیش کرے۔

"اس مرغے کو اتار لو۔" محسن نے حکم دیا۔ حوالدار نے تعمیل کی۔ مرغے نے بہت واویلا مچایا اور بہت ہاتھ جوڑے۔ ابھی تک اس کا خیال تھا کہ چھتر سروس خود حوالدار کرے گا۔

"اس عورت... کیا نام ہے اس کا... گلابو۔" محسن نے چٹکی بجا کے کہا۔ "یہ چھتر اسی کو دو... اور اس سے کہو یہ واقعی اسے نہیں بلاتی بلکہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔ تو اس کے گن کر چالیس چھتر لگائے۔"

مرغا ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا... عورت ذات جیسوں جوتی مارے... نہیں سرکار... تمھی چالیس نہیں سو چھتر مار لو..."

"بکواس بند کرو اس کی حوالدار۔" محسن نے آواز بلند کیے بغیر کہا۔

"چل او نے تیری..." حوالدار نے چھتر اٹھا لیا مگر اس نے حوالدار کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اس کے لیے یہ انتہائی ذلت کی بات تھی کہ ایک عورت جو طوائف تھی... بدنام تھی اور کوئی عزت نہ رکھتی تھی، وہ اسے جوتی سے مارے اور وہ بھی سب کے سامنے۔ اس کے باپ کے سامنے اور اس کی بیوی کے سامنے۔ عورت تو مرد کے سامنے نظر نہیں اٹھا سکتی۔ مرد زیادہ سے زیادہ یہ حق بڑی

www.paksociety.com

یعنی گلو اور ماں کو جیتا ہے کہ وہ اس کو ڈانٹ ڈپٹ رہے تھے اور ایک آدھ تھپڑ بھی غصے میں مار دیتے۔ لیکن بیوی تو خود پاؤں کی جوتی ہے۔ گاؤں میں تو مرد حاکم ہے اور عورت کا درجہ کنیز کا بھی نہیں۔

"میں اسے نہیں چھوڑوں گا جو مجھ سے ہو سکا وہ کیا تھا میں نے۔" مرتے تے مین فلمی ولن کی طرح بڑھک مارتی... وہ مقابلے پر آمادہ تھا اور بلاشبہ اتنا تنومند تھا کہ سب کے سامنے جملہ حاضرین کو فوراً بیٹھا سکتا تھا۔ خود حوالدار اس کے جارحانہ عزائم کو دیکھتے ہوئے ڈر گیا تھا اور جب اس نے وقت سے پہلے اصل تھانیدار کو طلب کر دیا تو حوالدار کی ہستی گم ہو گئی۔ وہ شخص مرنے مارنے پر آمادہ تھا اور حوالدار کو اندازہ نہیں تھا کہ اس صورت حال سے ایس ایچ او کیسے نمٹے گا۔ اگر وہ حوالدار کو حکم دیتا کہ اس بدمعاش کو پکڑ لو تو حوالدار یقیناً مار کھاتا۔ اس کا اندازہ محسن نے بھی کر لیا تھا چنانچہ اس نے ریلیا اور نکال کر میری طرف دیکھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ آرام سے لیٹ جاؤ۔" محسن نے کہا۔

"او تجھے تو میں گولی مار دوں گا میں۔" وہ سینے پر ہاتھ مار کے بولا۔ اس کے باپ اور بیوی نے چلانا شروع کیا کہ اس بے وقوف کا قصور معاف کر دیا جائے۔ گلابو رونے لگی۔

"سب پیچھے ہٹ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "بیچ میں کوئی نہ آئے۔" پھر میں آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، میں نے اسے اٹھایا اور ٹخنے کے نیچے سے مارا۔ وہ تڑپ کر گرا۔ میں نے اسے مسلسل ٹھوکریں ماریں اور وہ کئی بار دیوار سے لگا۔ ذرا سی دیر میں اسے اپنی طاقت کے بے مصرف ہونے کا اندازہ ہو گیا۔ میں نے اسے دو منٹ میں الٹا لٹا دیا اور ایسے دبا لیا کہ وہ حرکت تک نہیں کر سکتا تھا۔

"چلو... اپنا کام کرو...!" محسن نے گلابو کو یوں اشارہ کیا جیسے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ گلابو ہاتھ جوڑنے لگی۔

"ایسا مت کریں سرکار... کسی اور کو حکم دیں..."

"اگر تو نے حکم نہ مانا تو اس کی جگہ لینا پڑے گی۔" محسن نے سگریٹ جلاتے ہوئے دھواں اوپر چھوڑا۔ "بول تیار ہے بھا؟"

گلابو کے لیے حوالدار سے چھتر لینے کے سوا چارہ نہ رہا۔ گلابو کے اس یرستار کو بالکل اندازہ نہ ہوا کہ یہ سب اس کے باپ کی فرمائش پر ہو رہا ہے مگر افسوسناک بات یہ بھی تھی کہ خود بڑھے دکاندار نے یہ بات سنجیدگی سے نہیں کی تھی۔ اسے یہ بات کرتے وقت بالکل امید نہیں تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے اور اب وہ پشیمان بھی تھا اور پریشان بھی۔ خود اس کی بہو جو کچھ دیر پہلے رو رو کر گلابو کو کوس رہی تھی اور اپنے مجازی خدا کے دماغ کی اصلاح کا مطالبہ کر رہی تھی اب دم بخود بیٹھی تھی۔ تھانے کا وہی ماحول تھا جو

شاید عدالتی کٹہرے میں مجرم کو زبردستی تختہ دار تک پہنچاتے وقت نظر آتا ہوگا۔ گلابو ابھی تک کشمکش و پیچ میں تھی۔ حوالدار نے اسے دھکا دیا۔

"اب بھول زرا سارا نخرہ... کنجری... تیرے سامنے یار آئیں گے ابھی تو سہی"

مجھے یہ دھمکی پسند آئی۔ اس میں گلابو کے لیے معاشی اور سماجی بحران اور مستقبل کے بارے میں شدید خطرات کی دھمکی تھی۔ بلاشبہ اگر وہ اپنے سامنے پرستاروں کی تاجپوشی کرتی تو پھر گاؤں میں کیسے رہتی۔ گلابو کا دم خشک ہو گیا اس نے نیچے پڑے ہوئے شخص کے ایک چھتر مارا۔

"ایسے نہیں... زنان لگا ذرا... زنانہ مال کھایا ہے اس کا اتنا بھی زور لگا کے مار۔" حوالدار نے کہا۔ نتیجہ یہ کہ باقی اٹھائیس چھتر گلابو نے ایمانداری سے پوری قوت صرف کر کے مارے اور اس کے پرستار نے ہر چھتر پر اسے غلیظ گالیاں دیں۔ جب یہ سزا پوری ہو گئی تو میں نے اسے پیروں پر کھڑا کر دیا۔

"ابھی تمہارا دماغ درست نہیں ہوا۔" محسن نے کہا۔ "حوالدار اسے بند کر دو حوالات میں۔ رات کو سارے گاؤں کو جمع کرو۔ بیٹا تماشا پھر ہوگا۔ اب چھتر اس کی بیوی مارے گی۔"

وہ ایک دم زمین پر گر گیا۔ "خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں... میری توبہ ہمیشہ کے لیے توبہ۔ میں اس کنجری کا نام بھی لوں تو میری کھال کھینچ لینا۔ مجھے اور ذلیل مت کرو۔ ابھی کسی نے نہیں دیکھا۔ میں خودکشی کر لوں گا۔ اگر سب کو معلوم ہوا..."

"اچھا... نہیں معلوم ہوگا۔" محسن نے نرمی اور ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔ "اٹھو اور سیدھے کھڑے ہو کے اپنے باپ کو وعدہ تمہاری تحویل میں ہے۔ یہ کہ تم آئندہ کوئی غلط حرکت نہیں کرو گے۔ بیوی بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرو گے اور یہ بدمعاشی بھی چھوڑ دو گے۔ چھوٹے سے گاؤں میں بدمعاشی بہت آسان ہوتی ہے مگر تم نے انجام دیکھ لیا... یہ میرا آخری دورہ نہیں ہے۔ میں پھر آؤں گا۔ کسی بھی دن آ جاؤں گا۔ ایک ہفتے یا ایک مہینے بعد... اور مجھے معلوم ہوا کہ تمہارا رنگ نہیں بدلا۔ تو پھر دیکھنا میں تم کو کیسے چکی پر چڑھاتا ہوں۔ رنگ پکا ہو تو اسے کاٹنے کے لیے دوسرے طریقے اختیار کرنا پڑتے ہیں۔"

جب اس نے باپ کے سر پر ہاتھ رکھ کے وعدہ کر لیا اور باپ بھی اس کی نیک چلنی کا ضامن بن گیا تو اسے جانے کی اجازت دے دی گئی اور ان سب کو جو وہاں موجود تھے سمجھا دیا گیا کہ اس کمرے میں پیش آنے والے واقعات کا ذکر وہ باہر کسی سے نہیں کریں گے۔ اب دوپہر ہو چکی تھی اور سارے گاؤں کو اطلاع مل

چکی تھی کہ تھانے میں کتنا انصاف ہو رہا ہے۔ باہر مجمع لگ رہا تھا اور علاقے کے کچھ معزز لوگ بھی باہر غالب کے پاس کھڑے تھے۔ ان میں چوہدری بھی تھا اور نمبردار بھی مگر غالب نے ان کو روک رکھا تھا اور بڑے صاحب ایک کیس سے نمٹ لیں تو وہ جا سکتے ہیں۔ جب گلابو کا پرستار اپنے باپ اور بیوی کے ساتھ نکل گیا تو گلابو بھی جانے لگی۔ محسن نے اسے روک لیا۔

"تم وہاں بینچ پر بیٹھو۔" محسن نے کہا۔ "نمبردار صاحب اور چوہدری کو اندر آنے دو۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور میں تیزی سے جا کر باہر گیا اور ان دونوں کو لے آیا۔ ان کے پیچھے ایک اور شخص آیا... وہ اسکول ماسٹر تھا۔ پھر ڈاک بابو نے بھی اجازت چاہی۔ میں نے سب کو آنے دیا۔ محسن نے ان سب سے اٹھ کر ہاتھ ملایا اور سب کو تشریف رکھنے کے لیے کہا۔ ڈاک بابو اور ماسٹر کو جگہ نہ ہونے کے باعث مجبوراً گلابو کے ساتھ بینچ پر بیٹھنا پڑا۔ کچھ ادھر ادھر کی رسمی باتوں کے بعد خوشامد اور چاپلوسی کے بعد اور افسر کا موڈ دیکھنے کے بعد نمبردار نے محسن کو دعوت دی۔

"آپ کے پہلے بھی دو بار افسر آئے۔ جنہوں نے غریب خانے کو عزت بخشی۔" وہ بولا۔ "آپ کیا تشریف لائیں۔ اس قابل بھی نہیں سمجھتے؟"

"نمبردار صاحب... یہ میرا اصول ہے کہ ڈیوٹی پر نہ میں کسی کے گھر میں قیام کرتا ہوں اور نہ کسی کی دعوت قبول کرتا ہوں۔" محسن بولا۔ "پھر کبھی حاضر ہو جاؤں گا۔"

"جناب! صاف سمجھ کے نہیں... مہمان سمجھ کے درخواست کر رہے ہیں۔ یہ شہر نہیں ہے کہ کوئی آئے کوئی جائے کسی کو غرض نہیں۔ یہاں ہر آنے والا گاؤں کا مہمان ہے۔" نمبردار نے اپنی پچھلے دار باتیں جاری رکھیں۔ میرا دل چاہا اس سے پوچھوں کہ گزشتہ ایک سال میں کتنے اجنبی گاؤں سے گزرے تھے اور ان میں سے کتنوں کی دعوت اس کی حویلی میں ہوئی۔ مہمان نوازی کی وہ قدیم روایات اب داستان پارینہ ہو گئی ہیں۔ اب تو مسجدیں بھی مقفل رہتی ہیں جہاں پہلے مسافر بلا امتیاز ٹھہر جاتے تھے اور ہر گھر سے ان کے لیے کھانا بھی آتا تھا۔

"جب میں مہمان بن کے آؤں گا تو یہ دعا آپ کے کہ دانے پر دستک دوں گا کیونکہ سب سے پہلا حق آپ کا ہے۔ آپ نے بجا طور پر ٹھیک کہا ہے۔" محسن بولا۔ "فی الحال میں آپ لوگوں سے ایک مسئلے کو حل کرنے میں مدد چاہتا ہوں۔ آپ لوگ اس علاقے کے با اثر اور معزز لوگ ہیں۔ آپ سب چاہیں تو یہ مسئلہ ختم ہو سکتا ہے۔"

"آپ حکم دیں جناب۔" چوہدری بولا۔ "مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے۔" محسن نے بینچ پر بیٹھی ہوئی گلابو کی طرف اشارہ کیا۔

سب کی نظر ایک ساتھ گلابو پر گئی۔ پھر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ایک ایس پی ان سب کو آزمائش میں ڈال دے گا۔ وہ سب تو اپنی چوپالوں میں تھے۔

"جہاں تک مجھے موصول ہونے والی شکایات سے پتا چلا ہے۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہنا شروع کیا۔ "یہ عورت آپ لوگوں کے گاؤں کو بدنام کر رہی ہے؟"

"یہ تو ہے جناب... اسے گاؤں سے نکال دیتے ہیں۔" نمبردار کھنکارا۔

"نہیں نمبردار صاحب۔ پھر یہ دوسرے گاؤں میں چلی جائے گی اور اسے بدنام کرے گی۔ ہر گاؤں کی اپنی عزت ہوتی ہے۔ کیا کبھی آپ ایسا کرتے ہیں کہ اپنے دروازے کی غلاظت اٹھا کے اپنے پڑوسی کے دروازے پر ڈال دیں۔ کیا حکم ہے جانے دین کا ہمسائے کے حقوق کے بارے میں؟ پڑوسی کا گاؤں بھی تو ہمسایہ گاؤں ہے۔ اس کے علاوہ یہ سوال ایک عورت کے مستقبل کا بھی ہے۔ مجھے اس فلسفے پر تقریر نہیں کرنا ہے کہ عورت کو طوائف کون بناتا ہے۔ میں صرف ایک سوال کروں گا کہ کیا آدمی کو موقع ملے تو اسے نیکی نہیں کرنا چاہیے۔ بھٹکے ہوئے کو راستہ دکھانا ہو تو کیا اس کا ہاتھ نہیں تھامنا چاہیے... گرے ہوئے کو اٹھانا نہیں چاہیے۔ آپ لوگوں کے گاؤں میں کوئی ہے جو اس عورت کو اپنی ذمہ داری سمجھ کے قبول کر سکے؟"

طویل خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ محسن اپنے سوال کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ گلابو پلک جھپکائے بغیر محسن کو دیکھتی رہی۔ اس نے بھی شگفتہ تھا نہ دیکھا تھا۔ شاید ان میں سے کسی نے بھی سنا اور دیکھا نہیں تھا کہ پولیس ایسی بھی ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے۔ پولیس معاشرے کی اخلاقی ذمہ داریاں بھی سمجھ سکتی ہے اور سمجھا سکتی ہے۔ مسائل کو حل بھی کر سکتی ہے۔ اب تک تو پولیس صرف مسائل پیدا کرتی آئی تھی۔ دن بدن پولیس کی وجہ سے لوگوں کے مسائل میں اضافہ ہو رہا تھا مگر یہ عجیب افسر تھا کہ حقوق ہمسائیگی کی بات کرتا تھا۔ سماجی ذمہ داریوں کی بات کرتا تھا۔ طوائف کے مستقبل کی بات کرتا تھا۔

"ایک شخص ہے تو سہی۔" بالآخر اس خاموشی کو ماسٹر کی آواز نے توڑا۔

"کون ماسٹر صاحب؟" ڈاک بابو نے کہا۔

"وہی میراثی... جو اس سے کئی بار شادی کو کہہ چکا ہے۔" ماسٹر نے کہا۔

"ہے تو سہی... وہ شادی کر لے گا۔" نمبردار نے تائید کی۔

"شادی تو کر لے گا... نبھائے گا بھی؟" محسن نے کہا۔ "زندگی کی ذمہ داریاں سنبھال لے گا؟ اخلاق و کردار کیسا ہے اس کا؟"

"اب اس کے اخلاق و کردار کو کیا دیکھنا جناب۔" چوہدری بولا۔

www.paksociety.com

"یہ کون سی شریف زادی ہے؟"

"یہی تو اصل بات ہے پٹواری صاحب۔" محسن نے اُسے ٹوک دیا۔ "ہر شخص اس عورت کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتا۔ اس کا دل بڑا ہونا چاہیے۔ اس کی نظروں میں وسعت ہونا چاہیے۔ کہ وہ اس عورت کے ماضی کو فراموش کر سکے۔ کبھی اس کا طعنہ نہ دے۔ اُسے شریف زادی سمجھتے ہوئے قبول کرے۔ غلطی سب کرتے ہیں۔ مگر کیا غلطی کو معاف بھی سب کر سکتے ہیں؟ سچے دل سے۔ دنیا کو دکھانے کے لیے نہیں... نیک نیتی کے ساتھ۔"

"وہ... اچھا آدمی ہے جناب۔" ماسٹر بولا۔ "اس سے محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے... مگر وہ میراثی ہے... اور اس کا رنگ کالا ہے۔ اس لیے یہ عورت اُسے ٹھکراتی رہی۔ وہ اب گانے بجانے کا کام نہیں کرتا۔ اس کے باپ دادا میراثی تھے اس لیے وہ بھی میراثی کہلاتا ہے۔"

"باپ دادا کے میراثی ہونے سے کسی کی میراث ذلت نہیں ہو سکتی اور شرافت کسی کو ورثے میں نہیں ملتی۔ اسلام نے تو گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر برابر رکھا تھا۔ حضور کا آخری خطبہ کیا تھا۔ انھوں نے رنگ، نسل اور ذات کی بنیاد پر فضیلت کے دعوے کو مسترد کر دیا تھا۔" محسن بولا۔ "یہ ایک جاہل عورت ہے۔ آپ لوگ اس کو سمجھا سکتے ہیں کہ سب سے بڑی دولت تو محبت ہے۔ یہ جو وقت گزر جائے تو وہ جہالت، نفرت کی نظر سے دیکھنے لگے گی۔ جو آدمی دل میں محبت رکھتا ہے۔ اس سے کہو کہ اس میراثی سے شادی کر لے۔"

"میں... میں کروں گی سرکار... ضرور کروں گی۔" ... پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کا بستر آنسوؤں کا سیلاب بن گیا۔ "میں جاہل ہی نہیں اندھی بھی تھی۔ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس کی ... بن کے دکھا دوں گی۔ ... سب ... کسی کو مجھ سے شکایت نہیں ہوگی۔ یہ سب لوگ دیکھیں گے کہ میں بھی عورت ہوں۔"

"ویری گڈ!" محسن نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ "آپ سب نے سنا؟ یہ تائب ہو رہی ہے۔"

"جزاک اللہ... آپ تو جنتی ہیں ایس پی صاحب۔" نمبردار بولا۔

"میں بہت گنہگار ہوں نمبردار صاحب... توبہ کرتا ہوں ہر وقت خدا سے۔" محسن نے کہا۔ "اب آپ لوگ آج رات اس کی شادی کا بندوبست کریں۔ دعوت ولیمہ ہوگی اور ہم سب شریک ہوں گے۔ میری طرف سے یہ رکھیے۔" اس نے جیب میں سے ایک ہزار روپے نکالے اور میز پر ڈال دیے۔ "شادی کے انتظام کے لیے۔"

"انتظام ہو جائے گا سرکار۔" نمبردار نے احتجاج کیا۔

"پھر بھی... یہ میری طرف سے... دولہا دلہن کے لیے۔" محسن نے کہا۔ "رکھیں ورنہ میں نہیں آؤں گا۔" نمبردار نے بادل ناخواستہ رقم اٹھالی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کتنے شرمسار تھے۔ ان کی نظروں میں اس پولیس افسر کے لیے حقیقی عزت اور عقیدت کے جذبات تھے... یہ انتہائی جذباتی منظر تھا۔

اچانک کلثوم اٹھی اور دوڑتی ہوئی محسن کی طرف بڑھی۔ اس نے جھک کر محسن کے قدم پکڑنا چاہے۔ محسن نے اُسے اٹھایا۔ "چلو میری بہن... خدا تمھیں صحیح راستے پر چلنے کی توفیق دے اور تمھارا گھر آباد رکھے۔"

"آپ فرشتہ ہیں... فرشتہ ہیں سرکار...۔" وہ بولی اور ہچکیاں لینے لگی۔ معززین ہم سب تو ... کھڑے تھے۔ ایک ایس پی ایک طوائف کو بہن کہہ رہا تھا۔ اس کا گھر آباد کر رہا تھا۔ ... نہیں... وہ رشوت بھی نہیں لے رہا تھا اپنی جیب سے شادی کا خرچ دے رہا تھا۔ اس نے نمبردار کی ذاتی دعوت مسترد کر دی تھی مگر ایک میراثی اور ایک طوائف کی تقریب خانہ آبادی کی دعوت میں آنے پر تیار تھا۔ ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا کیا آئندہ کبھی ایسا ہوگا؟ ہوگا تو کب ہوگا؟ جس دن ہوگیا اس دن یہی دنیا جنت نہیں کہلائے گی؟

جب سارے لوگ نکل گئے تو محسن نے پٹواری کو روک لیا۔ "آپ سے کچھ مشورہ کرنا مطلوب ہے۔" محسن نے اخلاق کے ساتھ کہا۔

"ہم تو خادم ہیں سرکار کے۔" پٹواری پھر بیٹھ گیا۔

"پٹواری صاحب!" محسن نے کہا۔ "اس گاؤں کے باہر ایک جلا ہوا گھر ہے۔"

پٹواری کا رنگ فق ہوگیا۔ "ہاں جی ہے... بالکل ہے۔"

"کس کا گھر تھا وہ؟" محسن نے میز پر انگلیوں سے طبلہ بجاتے ہوئے بہت شرافت سے کہا۔

"تھا جی ایک بدبخت کا۔" پٹواری سرد آہ بھر کے بولا۔ "اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہوا۔ آسمان سے بجلی گری۔"

"وہ بجلی آپ تو نہیں تھے؟" محسن بولا۔ "اللہ نے خدانخواستہ آپ کو قہر بنا کے تو نازل نہیں کر رکھا ہے یہاں؟"

"میں... نہیں سرکار... میں تو سب کا خادم ہوں... سب کی بھلائی کے لیے دن رات کوشش کرتا ہوں۔" پٹواری نے جھینپ کو نباہنے کی کوشش کی۔

"پھر کہاں گیا وہ شخص جس کے گھر کو بجلی نے جلا کے خاک کر دیا؟"

"اس نے کہاں جانا تھا جی۔" پٹواری بولا۔ "کہیں نہیں گیا گھر میں۔"

"پٹواری صاحب!" محسن نے یکلخت لہجہ بدل دیا۔ "اس کے لڑکے نے مجھے بالواسطہ باہر سے خط بھیجا تھا۔ باپ تو ان پڑھ تھا اس لیے کچھ نہ لکھ سکا مگر لڑکے نے سب واقعات لکھے تھے۔

شروع ہو جانا چاہیے آپ کو پٹواری صاحب۔ اگلی بار میرے آنے سے پہلے اس گھر کو بالکل ویسا ہی ہونا چاہیے جیسا پہلے تھا۔ بہت مال کھینچا ہے آپ نے۔ مجھے سب معلوم ہے... اس میں سے تھوڑا سا نکالیے۔"

"لیکن... حضور... میرا کیا قصور... میرے خلاف کوئی شکایت کسی نے نہیں لکھوائی... کبھی پرچہ نہیں کٹوایا گیا...۔"

"اچھا... تو آپ قانون پڑھتے رہتے ہیں... اپنے ہوشیار ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔" محسن کھڑا ہو گیا۔ "بہت بہتر۔ انکوائری آج سے شروع ہو جائے گی... حوالدار..."

"جی... جی... جناب عالی۔" حوالدار جوش سے چلایا۔

"مجھے شکایت ملی ہے کہ گاؤں سے کچھ لوگ ناجائز اسلحہ سرحد پار بھیجتے ہیں اور ان کی مدد گاؤں کا پٹواری کرتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "بعد میں خانہ تلاشی کے وارنٹ آئیں گے تو اسلحہ بھی برآمد ہو جائے گا۔ فی الحال میں پٹواری صاحب کو ساتھ لے جاؤں گا۔ ان کا کیس سی آئی اے کے سپرد کیا جائے گا۔"

پٹواری چلانے لگا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں... سرکار یہ تو سراسر ظلم ہے۔"

"اور جو کچھ تم نے کیا تھا وہ کیا تھا؟ وہ ظلم نہیں تھا؟" محسن نے گرج کے کہا۔ "بکواس کرنے کی ضرورت نہیں میرے سامنے۔ کل گاؤں میں کھلی کچہری ہوگی۔ اس میں بھی تمھارے خلاف سب کی شکایات سنی جائیں گی۔"

"سرکار... مجھے معاف کر دیں... میری توبہ... میں نیا مکان کھڑا کر دوں گا۔" پٹواری گڑگڑانے لگا۔

"ایک مہینے میں۔" محسن نے کہا۔ "میں درمیان میں بھی چکر لگا کے دیکھ سکتا ہوں کہ کتنا کام ہوا۔ میں نہ آ سکا تو کوئی تمھاری خبر لینے ضرور آئے گا۔ جاؤ دیکھو... نمبردار صاحب چلے گئے؟"

"ابھی باہر موجود ہیں جناب عالی... پٹواری صاحب کا انتظار فرما رہے ہیں۔" حوالدار نے کہا۔

"اچھا تو انھیں ایک منٹ کے لیے اندر بھیج دو۔" محسن بولا۔

"حکم بندہ پرور۔" نمبردار نے اندر آ کے کہا۔

"نمبردار صاحب! کل ایک غریب آدمی کو غلطی سے پکڑ لیا گیا کہ وہ چور ہے۔" محسن بولا۔ "ساری غلطی اس حوالدار کی ہے۔ اسے میں نے سرزنش کر دی ہے۔ وہ شخص بڑھئی ہے پٹواری صاحب کے گھر پر کام کر رہا تھا۔ معلوم نہیں کس نے اس پر یہ جھوٹا الزام عائد کیا۔ اور پھر رات کو اس کی ریڑھی کو آگ لگا دی۔ آپ کی حویلی کے احاطے میں ہے جا کے۔"

"میری حویلی کے احاطے میں؟" نمبردار نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"جی ہاں... ظاہر ہے آپ کو بدنام کرنے کے لیے۔" محسن نے کہا اور جیب میں سے پانچ سو روپے نکالے۔ "یہ میری طرف سے اس کو دے دیں۔ ممکن ہے وہ مجھ سے قبول نہ کرے... اور اُسے ریڑھی بنوا دیں۔ اُسے آپ کی حفاظت میں چھوڑتا ہوں۔ حوالدار اگر تم نے پھر ایسی زیادتی کی تو جیل میں سڑا دوں گا۔"

"جیسا آپ کا حکم بندہ پرور۔" نمبردار پھر کھنکارا۔ "لیکن یہ رقم تو اپنے پاس رکھیے... زیادہ شرمندہ نہ کریں... تھوڑی سی نیکی ہم بھی کما لیں۔"

محسن نے ہاتھ ہلایا اور ان کو رخصت کر دیا۔ اس نے کسی ماہر سیاست دان کی طرح ہر چال چلی تھی۔ ہر شخص کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا تھا جس کا وہ مستحق تھا۔ اسی لیے ہر بات کل تھی جیسے ضروری تھی اور تمام معاملات کو انتہائی خوش اسلوبی سے نمٹا دیا تھا۔ ایس پی تو نہیں تھا مگر اس سے بہتر ایس پی کی مثال نہیں دی جا سکتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ غیر شعوری طور پر وہ ایس ایس پی آکل حسن رضوی کے انداز میں سارے معاملات طے کر رہا تھا۔ اس کا لب و لہجہ کسی حد تک آکل رضوی کے جیسا تھا۔ اور یہ ایک غیر شعوری حرکت تھی۔ ذہنی طور پر وہ رضوی صاحب سے متاثر تھا اور خود میں بھی جانتا ہوں وہ ایک مثالی انسان اور مثالی قسم کے پولیس افسر تھے۔ یہ علاقہ ہوتے تو شاید ان کا رویہ بھی ایسا ہی ہوتا۔ کسی کو شک نہیں ہوا تھا کہ وہ جعلی ایس پی ہے۔ گاؤں کے رہنے والے کیا جانیں کہ ان کے علاقے کا ایس پی کون ہے۔ ایس پی بدلتے رہتے ہیں اور نمبردار کے کہنے کے مطابق صرف دو بار ایس پی یہاں آئے تھے۔ اگلی بار کون کس وقت آئے گا یہ کہنا غیر یقینی تھا۔

ایس پی کی آمد کا شور شرابہ نہ چھوٹنے کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ تھانیدار کے اختیارات رکھنے والا کانا حوالدار اپنے عملے سمیت جانے شاید استقبال کے لیے تیار تھا۔ اس کے لیے ناممکن تھا کہ وہ تصدیق کر سکتا۔ تھانے میں کیا گاؤں میں بھی ٹیلی فون نہیں تھا۔ اگر وہ دس میل جاتا اور کہیں سے ٹیلی فون کر کے معلوم کرتا تو اُسے کچھ معلوم نہ ہوتا۔ اوّل تو شہر کی لائن ہی نہ ملتی، پھر پولیس ہیڈ کوارٹر میں وہ کس سے پوچھتا کہ کون سا ایس پی اچانک آ رہا ہے۔ ایس پی اچانک کہیں بھی چھاپا مارنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اتنی جرأت تو کسی ایک یا دو پھول والے باقاعدہ تھانیدار کو نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ایس پی کا نام پوچھ سکے اور اس سے شناختی کارڈ طلب کر سکے۔ پھر جتنے کیس محسن نے نمٹائے ان سے بھی ثابت ہوا کہ وہ ایس پی ہے جسے ہر بات کا علم ہے جتنی شکایات اسے ملی تھیں ان سب پر اس نے ایکشن لیا۔ کہیں بہت سخت تو کہیں معمولی۔ مگر اس نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ ایک حاکم کو رعایا کے حال سے کتنا باخبر ہونا چاہیے۔ کتنا عادل ہونا چاہیے اور کتنا مہربان ہونا چاہیے۔

www.paksociety.com

"یہاں جتنی حوالدار... اور کوئی کیس ہے؟" محسن بولا۔

حوالدار کی آنکھوں سے سمجھ ہو رہا تھا کہ اور آتی شہرت دیکھی شاید اس نے کسی افسر کے ساتھ نہیں کی تھی۔ وہ اور اس کے ماتحت مسلسل گاؤں میں مورچہ لگائے بیٹھے تھے اور لٹھ شن کھڑے تھے۔ کھانے کا وقت گزر چکا تھا لیکن ابھی تک افسر نے کھانے کا نام ہی نہیں لیا تھا تو... بیٹے بولتا۔ ہماری پوزیشن یہ تھی کہ ہم خود دس بجے کے قریب ہوا علی شفیق اور دس گلی کے پیا تھے کہا نے تھے وہ ابھی تک ہضم نہ ہو سکے تھے۔ ہم شہری لوگ تھے۔ چیزوں کو دیکھ بھال کے کھانا چاہتے تھے مقررہ مقدار میں اور ایک وقت پر کھانے والے۔ یہ خالص تھا محنت کرنے والوں کو اس آتی تھی جو ہاں چیلا کے فرسے آسانی سے ہضم بھی کر لیتے تھے۔

"اور تو کوئی کیس نہیں سر جی۔" حوالدار بولا۔

"تم نے کھانا کھا لیا ہے؟" محسن نے بے نیازی سے کہا۔

"نہیں تو صاحب جی... میرا خیال ہے کہ آپ بھی کھا لیں۔"

"نہیں... تم کھا لو۔" محسن بولا۔ "اور یہ بتاؤ یہاں کوئی تنور ہے جہاں سے روٹی سالن مل سکے؟"

حوالدار نے افسوس کے ساتھ نفی میں گردن ہلائی۔ "سب کے اپنے اپنے گھروں میں تنور ہیں۔"

"اچھا چلو... ایک چکر گاؤں کا لگاتے ہیں۔" محسن اٹھ کھڑا ہوا۔ "کہیں چائے مل جائے گی... چائے تو ملتی ہے نا۔"

حوالدار کا منہ لٹک گیا۔ پہلے وہ بھی افسروں کے ساتھ عیش کرتا ہوگا۔ ان کے لیے پلاؤ زردہ اور بھنے ہوئے مرغ آتے ہوں گے تو حوالدار بھی دعوت میں شریک رہتا ہوگا اس افسر نے جیسے بھوکا کھڑا کر رکھا تھا اور اب خالی پیٹ گاؤں میں گھومنے پر مصر تھا۔ لیکن حوالدار انکار کیسے کرتا اس نے اپنی سیاہ کوٹ چست کیا اور ہمارے پیچھے چلنے لگا۔ تھانے کے باہر اب بھی پندرہ بیس افراد جمع تھے۔ ان سب نے محسن کو دیکھتے ہی سلام کیا۔ محسن ان کے پاس چند منٹ کے لیے رکا اور پوچھا کہ کسی کو پولیس سے کوئی شکایت تو نہیں ہے۔ ان میں مجھے چار چہرے نظر آئے تھے۔ وہ تازہ اور وہ پرانے لیکن وہ بولے نہیں۔ غالباً پیچھے سے حوالدار نے انہیں آنکھیں دکھا کے خاموش کر دیا تھا۔

گاؤں میں واقعی اس پولیس افسر کے انصاف اور رعایا پروری کے قصے پھیل چکے تھے اور لوگ ہر جگہ ہمیں انتہائی عقیدت اور احترام کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ مجھے اس احترام میں خوف بالکل نظر نہ آیا۔ کچھ بزرگ قسم کے لوگوں نے آگے بڑھ کے محسن سے ہاتھ بھی ملایا اور اسے طویل عمر کی ترقی کی اور صحت کی دعائیں دیں۔ یہ سچے دل سے نکلنے والی دعائیں تھیں۔ دعائیں دینے والے نہیں جانتے تھے کہ وہ ایس پی اصل ہے یا نقلی۔ انھوں نے تو انصاف اور سچائی کا ایک روپ دیکھا تھا۔ مظلوموں کے حق میں اٹھنے والی ایک آواز سنی تھی۔ حق بات کو تسلیم کرنے والے کو دیکھا تھا۔ اور یہ سب انھوں نے پہلے نہیں دیکھا تھا چنانچہ وہ اپنے جذبات کے اظہار میں بہہ رہے تھے۔

پھر یہ تھے جیسے واقعی ہم اس علاقے کے بادشاہ ہیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاش ایسا ہوتا۔ یہ پانچ سو گھروں کی چھوٹی سی آبادی ہماری حکومت ہوتی۔ ہم اسی کو ایک یوٹوپیا بنا سکتے۔ وہ مثالی فلاحی ریاست جس کا تصور اسلام نے پیش کیا تھا اور جس کی ایک مثال حضرت عمرؓ کے دورِ حکومت میں نظر آتی تھی۔ جب گلی میں ایک کتا بھی بھوکا سوتا تو خلیفہ خود کو مجرم سمجھتا تھا۔ جب خلیفہ اور غلام باری باری اونٹ پر سواری کرتے تھے تو جنت ہوں کے سفیر وقت اور وہ جب یہیں عمرؓ کے حضور خلیفہ کو اپنی عبا میں ٹانکے لگاتے ہوئے پاتے تھے۔ جو رعایا کے سامنے پیرہن کے لیے جوابدہ تھا مگر جس کی سخت گیری اور گرفت سے وہ سب تھر تھر کانپتے تھے جن کے دل پاک نہ تھے یا جن کی نیت میں فتور تھا۔ ہماری یہ ایک دن کی بادشاہت خود ہمیں یاد رہے گی اور لوگ بھی یاد رکھیں گے۔

اچانک ایک ضعیف اور کمزور تنہا شخص نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اس کی عمر ستر سال سے زائد ضرور ہو گی۔ "السلام علیکم بیٹا۔" اس نے محسن سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "میں گاؤں کی مسجد کا پیش امام ہوں۔"

محسن کے بعد ہم سب نے اس سے مصافحہ کیا۔ "تم ہی ایس پی ہو نا... جس کو سدا گاؤں دعائیں دے رہا ہے... میرا لڑکا بھی پولیس میں تھا۔"

"اچھا مولانا صاحب۔" محسن نے کہا۔ "اب کہاں ہے؟"

"سوچتے رب کے پاس۔" وہ انگلی اوپر اٹھا کے بولا۔ "اس کی رضا یہی تھی۔ ورنہ وہ بھی آج ایس پی ہوتا... بالکل تمہارے جیسا بہادر جوان تھا۔"

"کیا نام تھا اس کا مولانا صاحب؟" محسن نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"کریم علی... اے ایس آئی کریم علی۔" پیش امام نے کہا۔ "دس سال ہو گئے اب تو... اللہ نے صبر دیا۔ ایک ہی اولاد تھی میری۔"

"مجھے بہت افسوس ہے... کیسے انتقال ہوا تھا اس کا؟" محسن نے کہا۔

"ڈاکو آ گئے تھے گاؤں میں۔" پیش امام نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ اکیلا نکل گیا... میں نے روکا کہ بیٹا اکیلا مت جا... وہ بولا کہ بابا... اکیلا کہاں۔ میرا رب میرے ساتھ ہے... اس کی ڈیوٹی نہیں تھی وہ تو چھٹی آیا ہوا تھا۔ ڈیڑھ سال ہوا تھا شادی کو... پتر ایس پی... ادھر اس کا جنازہ اٹھا۔ ادھر اس کے بیٹا ہوا... اب دس سال کا ہے میرا پوتا... اس کو پولیس میں بھرتی کرانا ہے۔"

"ضرور کرائیے... لیکن ابھی تو وہ چھوٹا ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں پتر... جب جوان ہو جائے گا تب۔" وہ بولا۔ "میں نے تو اسی دن اپنی بہو سے کہا تھا کہ نیک بخت... صبر... اللہ نے امتحان لیا ہے ہمارے صبر کا... بیٹا لیا ہے تو پوتا دیا ہے۔ وہ سب انسپکٹر تھا تو یہ اس سے بھی بڑا افسر بنے گا۔ باپ سے آگے جائے گا۔"

"ضرور جائے گا مولانا صاحب... اگر آپ کی دعائیں شامل حال رہیں اور خدا نے چاہا تو وہ ایس پی کیا آئی جی بنے گا۔" محسن نے اس جذباتی بوڑھے کو تسلی دی۔ اس کی بات نے ہم سب کو افسردہ کر دیا تھا جب ہم نے اجازت مانگی تو وہ اڑ گیا۔

"میں اتنی دیر سے آخر کس لیے کھڑا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "میں تو خود آتا مگر میں ایک سب انسپکٹر کا باپ ہوں... جو شہید ہو چکا ہے۔ میں نے سوچا کہ تم کو خود میرے پاس آنا چاہیے... اور دیکھو تم آ گئے۔ اب بیٹے گھر سے کچھ کھائے بغیر نہیں جا سکتے۔ چاہے لسی پی کے چلے جاؤ۔" اس نے یوں حکم دیتے ہوئے کہا۔ پیش امام کچھ عمر کے باعث اور کچھ اپنی زندگی کے اس المناک حادثے کی وجہ سے تھوڑا سا خبطی ہو گیا تھا۔

"چائے لسی تو ہم نہیں پئیں گے مولانا صاحب۔" محسن نے کہا۔

"پیو گے کیسے نہیں..." وہ گرم ہونے لگا۔

"میرا مطلب تھا کہ ہمیں بھوک لگی ہے۔ روٹی مل جائے گی...؟" محسن نے کہا۔

"او نئے پتر ایس پی... روٹی کیوں نہیں ملے گی۔ گھر میں روٹی نہیں ملے گی تو پھر کہاں ملے گی۔" وہ محسن کو بازو پکڑ کے کھینچنے لگا۔ میں نے حوالدار کی طرف دیکھا۔ اس کی صورت پر بارہ بج گئے تھے۔

"یہ بڈھا تو پاگل ہے جناب۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "جب سے اس کا بیٹا مرا ہے..."

"تم کو شرم نہیں آتی۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "جس کے پیچھے نماز پڑھتے ہو اسے پاگل کہتے ہو... ساری زندگی جھک مارتے تم حوالدار رہے اس کا بیٹا دس سال پہلے اے ایس آئی تھا... اور وہ شہید ہوا تھا۔"

"غلطی ہو گئی سر جی۔" حوالدار نے حلق کی تلخی کو تھوک سے نگل لیا کیونکہ محسن نے بھی اسے خون آشام نظروں سے گھورا تھا۔

پیش امام کا کچا گھر مسجد سے متصل دو تین تاریک کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک میں ہم کو بٹھا دیا گیا۔ فرش پر بچھی ہوئی دری چٹائی، پڑی ہوئی تھی ہم نے ہاتھ دھو کر بسم اللہ پڑھی اور کھانے لگے۔ اندر سے پیش امام کی بہو گرم گرم روٹیاں ارسال کرتی رہی۔ اس کے ساتھ گڑ تھا۔ دیسی گھی تھا اور پیاز تھی۔ حوالدار کے حلق میں نوالہ پھنس رہا تھا اور اس کو دن بھر کے فاقے کے بعد سوکھی روٹی اور پیاز کھانا پڑ رہی تھی۔ اس کی مجبوری قابل دید تھی۔ افسر کو وہ دل ہی دل میں ہزار گالیاں دے رہا ہوگا کہ کیسے کیسے لوگ ایس پی ہو گئے ہیں جن میں کوئی بات افسروں والی ہے ہی نہیں۔ مگر وہ سب کا ساتھ بھی دے رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ ماحول کی جذباتی فضا کا اثر تھا۔ یا پہلے سے بھوک لگی تھی کہ ہم نے اس کھانے میں جتنا مزہ پایا وہ آج بھی یاد ہے۔

ہمارے واپس ہوتے ہوتے پورے گاؤں کے ہر فرد کی زبان پر یہ بات تھی کہ ایس پی نے پیش امام کے گھر میں زمین پہ بیٹھ کے سوکھی روٹی گڑ اور پیاز کے ساتھ کھائی۔ اسی شہرت کا نتیجہ تھا کہ بات کو ہم گلو اور میراثن کے نکاح کی تقریب میں پہنچے تو وہاں گاؤں کا بچہ بچہ موجود تھا۔ عورتیں محسن کو ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے وہ آدمی نہیں فرشتہ ہے جو ابھی پر لگا کے اڑ جائے گا۔ ہر شخص اس سے ہاتھ ملانے کا مشتاق تھا۔ کیونکہ ان کے دلوں سے ڈر نکل گیا تھا اور اس کی جگہ عزت و احترام کے جذبات نے لے لی تھی۔ وہ محسن سے ہاتھ ملا کے یوں خوشی محسوس کرتے تھے جتنی دعائیں محسن نے اس ایک دن میں لیں شاید ہم سب نے ساری عمر میں اکٹھی نہیں لی ہوں گی۔ شادی کی تقریب کا سارا اہتمام نمبردار نے کیا تھا۔

چودھری اور دوسرے معززین بھی اب اپنے تکبر بھلانے میں پیش پیش تھے اور غالباً یہ گاؤں کی تاریخی شادی تھی۔ عام حالات میں یہ معززین کسی میراثی اور ایک یتیم عورت کی شادی کی دعوت قبول کرنے والے کو بھی بے عزت کرنے کے جھگڑتے مگر شادی میں ایک بار بھی حاکم و محکوم کی تفریق نظر نہیں آئی تھی۔ ایس پی کے لیے اور معززین کے لیے الگ بیٹھنے کا انتظام ہو رہا تھا مگر میں نے خاموشی سے نمبردار کو سمجھا دیا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ ایس پی عام لوگوں میں بیٹھ جائے گا تو انہیں مایوسی ہو گی۔

ہم رات آٹھ بجے لوٹ آئے۔ مجھے کوئی شک نہیں تھا کہ یہ شادی کامیاب رہے گی۔ اس کی ذمہ داری گاؤں کے بڑوں نے لی تھی اور خود گلو نے جو وعدہ کیا تھا وہ جھوٹا نہیں تھا۔ اس کے دل کا سچ خود الفاظ میں ڈھل کے زبان تک آ گیا تھا اور گلو کا لہجہ اس کی نیت کی صداقت کا گواہ ہو گیا تھا۔ میراثن بہت خوش تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسے خدا ایک وقت اتنی بہت سی خوشیاں عطا کر دے گا۔ اسے اپنی محبت مل جائے گی۔ شادی کے انتظامات خود بخود ہو جائیں گے۔ اس کی شادی میں نمبردار چودھری اور گاؤں والے رہیں گے۔ نہیں ایک ایس پی بنفس نفیس شریک ہو گا جو سارے علاقے میں پانچ سو روپے دیئے جائے گا۔

"آج تو نے کمال کر دیا محسن۔" میں نے واپسی میں تو آپس میں بولنا شروع کی۔ "تیری جگہ میں اس منصب کو اتنی خوش اسلوبی سے نہیں

www.paksociety.com

تبدیلہ سکتا تھا۔"

"معلوم نہیں کیوں اس دھوکا دہی اور جعل سازی میں بھی مجھے عجیب خوشی مل رہی ہے۔" محسن نے بھی فراخدلی میں جواب دیا۔ "اس وردی کے بغیر میں ایک دن میں اتنی ترقی نہیں کما سکتا تھا۔"

"لیکن ہمارا مقصد تو پورا ہوا۔ جب ہم چلے جائیں گے تو سب بیدار ہو جائیں گے... کیونکہ وہاں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"ہم کسی طرح اصل روشنی سے کہیں گے کہ وہ بعد میں اپنے کسی ماتحت کو ایک دن کے لیے بھیج دیں۔" محسن بولا۔ "جو تصدیق کر جائے کہ فضلو کو تعلیم کے لیے بھیجا گیا یا نہیں۔ بگلا بو کا چلن کیسا ہے۔ اس کا سابقہ ریکارڈ درست ہے یا نہیں۔ پٹواری نے اس لڑکو پھر بتایا ہے یا نہیں جسے اس نے آگ لگوائی تھی اور تھانیدار نے اس نوجوان کو رہنے بھی لگا دی ہے یا نہیں۔"

"میرا بھی خیال ہے کہ یہ بندوبست مشکل نہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ لوگ بعد میں تصدیق تو نہیں کریں گے... ہمارے متعلق؟" محسن بولا۔

"اگر ہم سب کو لوٹ کر چلے جاتے، ڈاکہ کرتے، زبردستی نذرانے لیتے اور رشوت سے جیبیں بھرتے تو شاید یہ لوگ معلوم کرتے کہ وہ ڈاکو تو نہیں تھے۔" میں نے کہا۔ "اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم کچھ دے کر ہی جا رہے ہیں... لے کر جا رہے ہیں تو صرف دعائیں۔"

"اب اصل کام رات کا ہے جس کے لیے ہم نے تھانہ حاصل کیا تھا اور تھانیداری قائم کی تھی۔" محسن نے کہا۔

"ہاں... اب سراج سے تفتیش کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے اس سے ایک وعدہ کیا تھا، اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے حالات خود بخود سازگار ہو گئے ہیں۔"

حوالدار ہماری گفتگو سے بوکھلایا ہوا تھا۔ اگر انگریزی ہوتی تو وہ ایک آدھ لفظ یا جملہ سمجھ لیتا۔ مگر یہ زبان تو اس کے لیے فرانسیسی زبان تھی۔ وہ پریشان بھی تھا کہ کہیں یہ گفتگو اس کے خلاف تو نہیں ہے۔ ایس پی نے سنگھ گاؤں کے کیس نمٹا دیے تھے مگر اس کا کیس باقی تھا۔ وہ خود جانتا تھا کہ اس نے کتنے غلط کام کیے ہیں جنہیں اس کے دل کا چور اُسے ڈرا رہا تھا کہ یہ افسر بہت باخبر ہے۔ اسے لوگوں کے ذاتی معاملات تک کا علم ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ اسے اپنے علاقے کے لوگوں کی خبر ہو۔

تھانے پہنچنے کے بعد محسن نے کہا۔ "بھئی حوالدار... تم بہت تھک گئے ہو گے۔ اس لیے اب تم آرام کرو۔"

"اور... آپ... جناب عالی؟" حوالدار نے سکھ کا سانس لیا۔

"مجھے تو ابھی اس بدمعاش سے تفتیش کرنا ہے۔" محسن نے کرسی پر گرتے ہوئے کہا۔ "تم ایسا کرو کہ تھانے کے باہر چارپائیاں ڈال لو۔"

"ہماری مدد کی ضرورت نہیں پڑے گی سرکار؟" حوالدار بولا۔

"میرا خیال ہے کہ نہیں پڑے گی۔" محسن بولا۔ "پڑے گی تو بلا لیں گے۔ تم آج اندر سے چارپائیاں نکال کے باہر لے جاؤ۔"

"چارپائی کی کوئی بات نہیں جناب عالی۔" وہ بولا۔ "آپ کو بھی آرام کرنا ہو گا، اس لیے میں نے بستر کھلوا دیے ہیں۔"

"پھر... تم لوگ کیا کرو گے؟" محسن بولا۔

"ہم بھی منگوا لیں گے کچھ گاؤں سے۔" حوالدار بولا۔ پھر اس نے اپنے ماتحتوں کے ساتھ گارڈ آف آنر پیش کیا اور رخصت ہو گیا۔ تخلیہ ہوتے ہی سپاہیوں کی اداکاری کی آنکھیں آرام کرنے کے لیے ہم نے آدھا گھنٹہ لیٹ کر سگریٹیں پئیں اور سارے دن کے واقعات پر ہنستے گزارا۔ پھر ہم حوالات میں پہنچے جہاں سراج گٹھڑی بنا پڑا ہوا تھا۔ محسن نے اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا۔

"اب تم گلا پھاڑ کے چلا سکتے ہو اور مدد کے لیے پکار سکتے ہو۔ باہر تھانے اپنے قبیلے کے لوگ ہیں۔ ان پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔ وہ تفتیش کے شور میں زیادہ سکون سے سوتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"اگر ان کو معلوم ہو جاتا... کہ تم دھوکے باز ہو۔" سراج نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہم تم سے بڑے دھوکے باز تو نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم نے دھوکا دیا تو ایک چھوٹے سے گاؤں کو۔ تم تو پورے ملک کو اور ملک کے عوام کو دھوکا دیتے رہے ہو۔"

"اور تمہیں معلوم بھی کیسے ہو سکتا تھا۔" محسن بولا۔ "سراج جتنا معلوم ہو سکتا تھا میں ان کو بتا سکتا تھا۔"

"افسوس یہ کہ تمہیں کوئی موقع نہیں ملا۔" غالب نے کہا۔

"تم لوگوں کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اور پھر میرا۔" سراج نے اسی لہجے میں کہا۔ "کہ اس وقت تم میری جگہ حوالات میں بندھے ہوئے نہیں پڑے ہو۔ تم سادہ لوح بادشاہت کرتے رہے اور نشہ اقتدار میں بھول گئے کہ شامت اعمال تمہارے کتنے قریب آ گئی تھی۔ مجھے موقع ملا تھا جب میں یہ راز فاش کر سکتا تھا۔"

"کب موقع ملا تھا؟" میں نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"جب ایک احمق سپاہی کھانا لایا تھا۔" سراج بولا۔ "اس نے تو میرے ہاتھ بھی کھول دیے تھے اور جب میں کھانا کھا رہا تھا تو وہ بندوق تانے کھڑا ہوا تھا۔ لیکن میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ حالانکہ میں چاہتا تو اسے سب بتا سکتا تھا۔ صرف اتنا ہی کہہ دیتا کہ فوراً ایس پی صاحب سے ان کا شناختی کارڈ تو مانگ لو۔ وہ نہ سہی... تمہیں پر تو تمہارا ماتحت نہیں تھا۔ وہ شک میں پڑ جاتا تو تم سے یہ مطالبہ ضرور کر بیٹھتا۔ جب میں کھانا کھا رہا تھا تو تھانے کے دربار میں ہی عزت سے بیٹھے ہوئے تھے۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی ہم سے اتنی بڑی بھول ہوئی تھی۔

"تم کو کھانا کس نے دیا تھا۔ میرا مطلب ہے کس کی اجازت سے دیا گیا تھا؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم... تم لوگ بھول گئے تھے لیکن وہ نہیں بھولے تھے کہ ان کی تحویل میں ایک حوالاتی بھی ہے۔" سراج بولا۔

"پھر تم نے ان سے وہ کیوں نہیں کہا جو تم کہہ سکتے تھے۔" محسن بولا۔

"میں نے اس میں کوئی فائدہ نہیں دیکھا۔" سراج نے کہا۔ "تم جو کچھ کر رہے تھے اچھا ہی کر رہے تھے۔ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں تھا، وہ سب مجھے اچھا لگا اور میں نے دخل در معقولات نہیں کیا۔"

"لیکن تم جانتے تھے کہ... تمہیں نقصان ہو گا۔" میں نے کہا۔

"کیا نقصان ہو گا؟" وہ نخوت سے کہنے لگا۔ "جتنا نقصان ہونا تھا ہو چکا۔ میں نوکری سے غیر حاضر ہوں۔ اور میرے دوبارہ حاضر ہونے کا امکان بھی نہیں۔ مجھے معطل کیا جا چکا ہو گا۔ یہ عہدہ تمہیں مبارک ہو۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اب تم صرف میری جان لے سکتے ہو۔"

"تم جانتے ہو کہ تمہارے لیے جان دینا اتنا آسان بھی نہیں ہو گا جتنا تم سمجھ رہے ہو۔" محسن بولا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھے بڑی اذیت دینے کے لیے کتنے بے تاب ہو۔" سراج بولا۔ "تمہیں پہلی بار موقع ملا ہے۔"

"ہاں... جب تم کو پہلی بار موقع ملا تھا تو تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا۔ آج تم میرے مہمان ہو۔ ایک بالٹی میں نے رکھی ہوئی دیکھ لی تھی وہ میں خاص طور پر منگوا رہا ہوں۔"

"تم اپنا شوق پورا کر سکتے ہو۔" وہ بولا۔ "اگر صرف معلومات حاصل کرنے کی بات ہے تو میں ویسے بھی سب کچھ بتانے کو تیار ہوں۔ میں تم کو وہاں لے جا سکتا ہوں جہاں زلیخا، کیتھرین اور تمہارے دوست ٹیڈی مل سکتے ہیں۔"

"تمہاری باتوں پر اتنی آسانی سے اعتبار نہیں کریں گے سراج۔ ایک موقع تم کو پہلے بھی دیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ موقع تقدیر نے دیا تھا۔ لیکن میں اس سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ تقدیر بار بار موقعے فراہم نہیں کرتی۔ اور اب تو میرا اعتقاد نہ تقدیر پر ہے نہ تدبیر پر... وقت ہی ساتھ چھوڑ گیا ہے ورنہ مجھ سا آدمی بار بار گرفت میں کیسے ہوتا۔" سراج بولا۔

"یہ سب ہم نہیں جانتے۔ تمہاری ریاکاری بھی ہو سکتی ہے۔"

"میں تمہارے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا ہوں۔" سراج بولا۔

"نہیں، ہم اپنی مدد آپ کر سکتے ہیں۔ ہم نہ تمہاری رہنمائی پر بھروسا کر سکتے ہیں اور نہ تمہاری نیک نیتی پر۔" میں نے کہا۔ "ہم تمہیں ساتھ رکھیں گے۔"

"تمہارے علاوہ مجھے کوئی ساتھ رکھنے کے لیے تیار بھی نہیں ہو گا۔" وہ بولا۔ "تم جانتے ہو کہ دلاور بھی مجھے چھوڑ چکا ہے۔ مجھے ایک موقع اور دو۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ پھر تم جی چاہے تو جو سزا چاہے دینا۔"

"پہلے یہ بتاؤ کہ زلیخا، کیتھرین اور ٹیڈی کو کہاں لے جایا گیا ہے؟" میں نے کہا۔

"انہیں کراچی لے جانے کا پروگرام تھا۔" وہ بولا۔

"کیسے؟ یہ تو میں بھی معلوم ہے کہ ان کو کریٹ میں بند کر کے کراچی پہنچایا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ کریٹ کراچی تک کیسے جائیں گے؟"

"سڑک کے ذریعے سامان لے جانے والے ٹرکوں میں سے۔" وہ بولا۔

"اور یہ ٹرک کہاں سے روانہ ہوں گے؟" محسن بولا۔

"یہ مجھے نہیں معلوم۔" وہ بولا۔ "دلاور... یہ باتیں مجھے نہیں بتاتا تھا۔"

"مگر تم ہمیں بتاؤ گے۔" غالب نے کہا۔

تھانے میں تفتیش کا سب اسباب مہیا تھا۔ پہلے ایک گھنٹے میں غالب نے اور میں نے تفتیش کی۔ ہمارا سوال ایک ہی تھا کہ ٹرک کہاں سے روانہ ہوں گے اور کب روانہ ہوں گے۔ میں نے اس کے جسم سے لباس الگ کر دیا اور غالب کی مدد سے اس کو کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر میں نے چمڑے کی بیلٹ اٹھائی۔ اس کی آواز بند رکھنے کے لیے ہم نے اس کے منہ میں پھر کپڑا ٹھونس دیا۔ بیلٹ کے ہر وار پر وہ بل کھاتا رہا اور تڑپتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کے سارے جسم پر نیل کے سانپ سے نمودار ہو گئے۔ جب میں تھک گیا تو میں نے اسے ایک موقع دیا۔ لیکن وہ ایک ہی بات پر اڑا رہا۔ مجھے نہیں معلوم... محسن نے اور غالب نے مزید ایک گھنٹا محنت کی مگر اس سے کچھ نہ اگلوا سکے۔ وہ نیم بیہوش تھا اور اس کے جسم کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔

بالآخر میں نے محسن سے کہا کہ وہ بالٹی اٹھا لائے۔ میں نے اسے کرسی پر بٹھا کے مضبوطی سے باندھ دیا اور بالٹی اس کے سر پر الٹی کر کے رکھ دی۔ اس کا منہ گردن تک بالٹی میں غائب ہو گیا۔ محسن دوسرے کمرے سے باہر گیا اور رحمت کی دو شاخیں توڑ لایا۔ ان کے پتے صاف کرنے کے بعد وہ ایک اینچ سے زیادہ

www.paksociety.com

سوٹے اور تقریباً تین فٹ جیسے فولادی ڈنڈے سے جا لگے ہاتھ میں رہ گئے۔ سراج کی آنکھیں بالٹی اوڑھانے سے پہلے وحشت سے باہر آ رہی تھیں۔ جب بالٹی پہ میں نے پہلا ڈنڈا مارا تو سراج کرب سے تلملانے لگا۔ دوسری طرف سے محسن نے بالٹی پہ وار کیا۔ اس کی اذیت میں نے محسوس کی کیونکہ میں اس جیسے تجربے سے گزر چکا تھا۔ رفتہ رفتہ میرا جنون بڑھنے لگا۔ میں نے پوری قوت سے بالٹی پہ ڈنڈے مارنا شروع کیے۔

"سراج..." میں نے قہقہہ لگا کے کہا۔ "کیسا لگتا ہے اندر؟ میں نے اپنا ایک وعدہ پورا کیا۔ یہ طریقۂ تفتیش میں نے تم سے ہی سیکھا تھا۔"

"سکندر!" محسن نے اچانک میرا ہاتھ روک لیا۔ "یہ آواز کیسی ہے؟"

میں نے کان لگا کے سنا۔ یہ کوئی گاڑی تھی... غالباً جیپ... جو قریب آ رہی تھی۔ ابھی تک تو میں نے اس گاؤں کے راستے پر موٹر کے ٹائر کا ایک بھی نشان نہیں دیکھا تھا۔ پھر یہ فورٹ کے قیمتی جیپ کہاں سے آ گئی؟

گھپ اندھیرا تھا لیکن دور سے آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی کی دو متحرک اور متوازی لکیروں کی طرح آگے بڑھتا دیکھ سکتا تھا۔ ناہموار زمین کے جھکولوں سے روشنی اوپر نیچے ہو رہی تھی تو اس کی زد میں آنے والے جنگل کے درختوں کا ساکت وجود کبھی تنے کی حد تک نظر آتا تھا تو کبھی سرسبز شاخوں میں اچانک اندھیرے پیوست ہو جاتا تھا۔ پرندوں کے درمیان آشیانوں کی افراتفری خواب گاہوں میں پرندے یوں خوفزدہ ہو کے چلاتے تھے جیسے صبح کے بعد شفق کے نرم اجالے سے نکلنے والا سورج آج ایک لعنت آدمی نما کو سوا نیزے پہ آ گیا ہے۔

"حوالدار۔" میں نے چلا کے کہا۔ وہ مجھ سے پچاس گز کے فاصلے پر منجمد کھڑا ہوا تھا۔

"جناب عالی۔" وہ اچھلا اور چیخ کر دوڑا۔

"کون آیا ہے اس وقت؟" میں نے کہا۔

"کوئی جیپ میں آیا ہے جناب۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "کوئی جیپ میں آیا ہے مگر یہ کون ہے؟ یہاں کس کے پاس ہے جیپ؟"

"جیپ تو کسی کے پاس نہیں ہے۔ مگر آپ تو جانتے ہیں کہ آج کل چور ڈاکو بھی گھوڑوں پہ نہیں آتے۔" وہ بولا۔ "پچھلے سال جب ڈاکا پڑا تھا تو جناب اپنے نمبردار صاحب کی بیٹی کی شادی تھی... جو مہمان تھے وہ ادھر ادھر کے پنڈ سے دو سو بندے اور زنانیاں حویلی میں اور باہر حویلیوں میں ٹھہرے ہوئے تھے اور زنانیاں زیور تھیں۔ اللہ ان کو عقل دے۔ خوب سجے... تقریب میں شو مارنے کے لیے۔ ڈاکوؤں کو سب معلوم تھا۔ چوڑیاں اور کڑے... زیور اتروا لیے... ناک کی لونگ تک نہیں چھوڑی۔ کئی سہیرے سونا لے گئے۔" جیپ اب گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔

"اچھا... اور کسی نے... میرا مطلب ہے اتنے لوگ تھے پھر بھی ڈاکو نکل گئے؟"

"مقابلہ تو کیا تھا جناب... گاؤں کے نوجوانوں نے۔ ایک ڈاکو زخمی ہوا تو اسے اس کے ہی ساتھی ٹھنڈا کر گئے۔ گاؤں کے دو نوجوان مر گئے۔ شادی کیا ہونی تھی... سب کی بربادی ہو گئی۔"

"تمہارا مطلب ہے رخصتی نہیں ہو سکی؟" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"ہو گئی... وہ سب کچھ تو ہوا۔ پر جناب اپنا نمبردار تو برباد ہو گیا نا۔" حوالدار بولا۔ "سب اس کے مہمان تھے۔ اس نے سب کا نقصان پورا کیا۔ ایک مربع زمین بیچی۔ پورا سال سب نے نمبردار کا نقصان پورا کیا تب اس غریب کو زمین واپس ملی۔"

"سب نے مل کر۔ تمہارا مطلب ہے گاؤں کے لوگوں نے؟" میں نے کہا۔ "ان کا کیا قصور تھا۔ اور کیا زمیندار کے پاس ایک ہی مربع زمین تھی؟"

"نہیں جناب عالی۔ تھی تو زیادہ مربعے... مگر نقصان تو اکیلے کا ہوا تھا۔" حوالدار نے کہا۔ "اور مہمان تھے وہ پنڈ کے... سب نے مل کر یہ نقصان تو پورا کرنا ہی تھا۔"

"ہمت خوب ہے... مہمان پنڈ کے اور نقصان نمبردار کا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم کس مرتبے والے کو غریب کہتے ہو... باقی تھے اس کے۔ کیا وہ کم تھے اس کو کہ گاؤں والوں کو سال بھر محصولی کا ٹیکس دے کر نقصان پورا کرنا پڑا۔ امیر کے خزانے سے چار اشرفیاں نکل جائیں تو رعیت اپنا پیٹ کاٹ کر دے... اور غریب کا گھر لٹ جائے تو...؟"

"غریب کا گھر... اس میں کیا ہوتا ہے جناب عالی... زیور کپڑے؟" حوالدار میری جذباتی گفتگو پہ کچھ مجبور رہ گیا۔

"کیا آج بھی کوئی شادی ہے؟" میں نے لاجواب ہو کے کہا۔

"ابھی تو نہیں... ابھی وہ چلتے ہیں۔" وہ سوچ کر بولا۔ "ڈاکو نہیں ہوں گے سرجی۔ کسی کے مہمان آئے ہوں گے۔ یا کوئی بیمار ہو گا تو شہر سے ڈاکٹر کو لایا ہو گا۔ آپ فکر مت کریں۔ ادھر ڈیوٹی پہ ہم موجود ہیں۔"

"اور دوسری طرف؟" میں نے کہا۔

"ادھر بھی گارڈ ہے۔" اس نے مجھے مطلع کیا۔ "تھانے کے تینوں جانب اس کے ماتحت [illegible]"

میں نے عدم... کے اطمینان کا اظہار کیا اور اندر لوٹ گیا۔ جتنی دیر میں باہر رہا تھا میں نے محسوس کیا تھا کہ اندر ہونے والی تفتیش کا شور جتنا باہر سے بھی سنائی دیتا تھا۔ اتنا باہر نہیں پہنچا تھا۔

غالب نے غالباً اس تفتیش کے دوران اپنی موجودگی کو مزید ضروری نہیں سمجھا تھا اور وہ عمارت کے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک کمی بہتر پردہ راز چھوڑ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔ محسن اکیلا ہی سراج کی فولادی ٹوپی کو بجا رہا تھا اور اس کام میں بڑے ذوق و شوق کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اندر سراج کی حالت کیا ہو گی۔ بات پرانی تھی مگر اس کی اذیت کا احساس تازہ لگتا تھا۔ سراج کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ اب چیخ رہا تھا اور اچھل رہا تھا۔ کرب سے چلا رہا تھا۔ خدا اور رسول کے واسطے دے رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دو... میں... مر جاؤں گا... مجھے بخش دو... مجھے کچھ معلوم نہیں۔ خدا کی قسم..." الفاظ اس کے حلق سے کراہ بن کے نکل رہے تھے۔

میں نے اس کے سر سے بالٹی ہٹا دی۔ "کیوں بھئی اسپیشل صاحب!" میں نے سراج کے لہجے اور آواز میں کہا۔ "کیسے مزاج عالی ہیں؟"

"سکندر... میں... میں نے بہت ظلم کیا تھا۔" وہ لڑکھڑا کر بیٹھ گیا۔ مگر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ خود ایسے لرز رہا تھا جیسے اسے سخت جاڑا لگ رہا ہو... وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔

"ظلم نہیں بھئی... تفتیش ہے... تمہارا ہی طریقہ ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھ پہ تمہارا بہت قرض ہے۔ سب ایک رات میں تو ادا نہیں ہو گا۔ پھر بھی جتنا ممکن ہوا ضرور لوٹائیں گے۔ ابھی بہت رات باقی ہے۔"

تفتیش کا یہ عمل یقیناً صبح تک جاری رہتا لیکن اچانک گاؤں کی طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ پہلے ایک فائر ہوا اور کسی عورت نے ہذیانی انداز میں چلانا شروع کیا۔ رات کی خاموشی کے باعث اس کے چیخنے چلانے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں اور محسن ایک ساتھ اٹھے اور باہر آ گئے۔

"غالباً یہ ڈاکو ہیں۔" میں نے تشویش سے کہا۔ "مجھے ابھی حوالدار نے بتایا تھا کہ کبھی کبھار وہ ادھر بھی چکر لگانے آ جاتے ہیں۔ کسی خاص موقع پر مثلاً کسی شادی پر جب انھیں عورتوں کے زیورات اتارنے ہیں۔"

"اگر یہ ڈاکو ہیں تو میں کیا کروں۔" محسن نے کہا۔ "ہم ان کو روک نہیں سکتے اور نہ انھیں مار کے بھگا سکتے ہیں۔"

"ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "آپ سرپرستی میں... ایک نے کارنامے نمایاں سر انجام دے کر اس گاؤں میں جو عزت کمائی تھی وہ خاک میں مل جائے گی۔"

"عزت کا خاک میں مل جانا بہتر ہے۔" محسن نے فرمایا۔ "خود جانے خاک میں ملنے سے۔"

"مگر یار... یہ گاؤں والوں پر بڑا ظلم ہے۔ ہم اتنے بے حس ہو جائیں کہ جانتے بوجھتے کچھ نہ کریں۔" میں نے کہا۔ "ظلم ہم پہ ہو یا جائے کسی ہم وطن پہ... ہم اسے ایم آر ڈی کے مقصد میں شامل سمجھتے ہیں کہ اس کے خلاف ڈٹ جائیں۔"

"آپ ایم آر ڈی کو یکا تحریک بنا رہے ہیں سکندر اعظم صاحب!" محسن نے کہا۔ "ہمارا ایک مقصد اور ایک مشن ہے۔ اس سے ہٹ کر ہم نے ہر جگہ پنگا لینا شروع کیا تو حاصل کچھ بھی نہیں ہو گا۔ سوائے دفعات بمعہ حسرت آیات کے۔ بے شک سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے مگر اس کی دوا ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"ہمارے پاس تو خود اپنے درد کی دوا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ کان اور آنکھیں بند کر لو۔" محسن بولا۔ "ظالم ہر جگہ ہیں اور شیطان بھی ہر جگہ ہیں... لیکن ہم خدائی فوجدار نہیں ہیں۔"

لیکن فائر اور ہوا۔ "حوالدار..." میں نے چلا کے کہا مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ ابھی چند منٹ پہلے وہ پوری طرح جاگ رہا تھا۔ چنانچہ اس کا فوراً مدہوشی کی اتنی گہری نیند میں گم ہو جانا میرے لیے ناقابل فہم تھا۔

"حوالدار مکر کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "اتنی چیخ و پکار ہو رہی ہے مگر یہ مردہ بنا پڑا ہے۔ سالے کو ڈر ہے کہ کہیں اسے گاؤں کی طرف [illegible]"

"یہ بہترین پالیسی ہے۔" محسن بولا۔ "ہر جگہ یہ لوگ ڈاکوؤں کا سامنا کرنے سے گریز کرتے ہیں اور ہر مرتبہ ان کے پاس کوئی نہ کوئی عذر لنگ ہوتا ہے۔ ناکافی اسلحے کا... بہت کم نفری کا... ٹرانسپورٹ کی سہولت نہ ہونے کا یا پھر قطعی لاعلمی کا۔ یہ جانتے بوجھتے انجان ہو جاتے ہیں۔"

"ڈاکوؤں سے ان کی ملی بھگت ہوتی ہے۔ سب طے شدہ پروگرام کے مطابق اور اتفاقی لگنے سے ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کب آئیں گے، کدھر سے آئیں گے، کس کے گھر جائیں گے اور کیا لے جائیں گے؟ یہ سب معلومات پولیس کے پاس پہلے سے ہوتی ہیں۔ صرف اس لیے کہ ڈاکو ان کا حصہ پہنچاتے وقت ڈنڈی نہ ماریں... میں ذرا حوالدار کو خواب خرگوش سے جگا دوں۔"

حوالدار بھی تان کے سو رہا تھا مگر اس کی آنکھوں کی خفیف سی حرکت چغلی کھاتی تھی کہ وہ جاگ بھی رہا ہے۔ ہماری باتیں بھی سن رہا ہے اور غالباً نیم وا آنکھوں سے دیکھ بھی رہا ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔

www.paksociety.com

"حوالدار!" محسن نے قریب پہنچ کر اونچی آواز میں کہا۔ پھر اس سے قبل کہ حوالدار ہڑبڑا کے اٹھنے کی اداکاری کرتا، محسن نے اس کی چارپائی الٹ دی۔

"وہ..... آہ..... بس ذرا....." حوالدار بدحواسی کے عالم میں کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا۔

"گھوڑے بیچ کے سوتے ہو، گدھے کے بچے!" محسن نے گرج کر کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" محسن نے گاؤں کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا ہو رہا ہے جناب عالی؟" حوالدار نے معصومیت سے مظلوم لہجے میں کہا۔ اس کی بدقسمتی کہ اسی وقت مسلسل تین فائر ہوئے۔

"تمہارے باپ آئے ہیں غالباً" محسن نے کہا۔ "تمہاری آنکھیں تو کھل گئی ہیں لیکن کان شاید ابھی تک بند ہیں۔" اس کا ایک زناٹے دار تھپڑ حوالدار کے گال پر پڑا۔ اس کے کانوں میں یقیناً سیٹیاں بجنے لگی ہوں گی۔ وہ لڑکھڑا کے گرا اور پھر فوراً کھڑا ہو گیا۔ کہاں تو اس نے افسران اعلیٰ اور عوام و خواص سب سے ہی بہت کھائی ہوں گی مگر ایسا تھپڑ کھانے کا شاید یہ پہلا اتفاق تھا۔ مشکل یہ تھی کہ افسر بہت بڑا تھا اور جسمانی طور پر بھی بہت زیادہ طاقت ور تھا، جس کے برعکس حوالدار کمزور بھی تھا، بے ضمیر اور بزدل بھی تھا۔ چنانچہ اس میں خودی ایک فیصد بھی نہیں تھی۔ سرِ عام تھپڑ کھانے کا یہ ذلت آمیز واقعہ ایک پرائیویٹ واقعہ تھا یعنی کسی کے سامنے پیش نہیں آیا تھا۔ وہ فوراً ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ گاؤں میں اب پھر خاموشی چھا گئی تھی یہ بھی عجیب بات تھی۔

"معاف کر دیں جناب..... بندہ بے قصور ہوں..... نیند آ گئی تھی۔"

"بے غیرت..... تم مکر کر رہے تھے تاکہ تم کو جانا نہ پڑے۔" محسن نے ڈانٹ کر کہا۔ "جاؤ اور دوڑتے ہوئے آؤ..... دیکھو گاؤں میں کیا ہو رہا ہے؟"

"جناب..... میرے بیوی بچے ہیں..... مجھے تو یتیم خانے چلے جائیں گے..... بیوی کو ان سے خانے میں ڈالنے کی..... ڈاکو شریف آدمی نہیں ہوتے ورنہ اتنا ظلم نہیں کرتے جناب عالی..... میں بالکل مر جاؤں گا..... مجھے کسی پہ معاف رحم کریں۔" وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

ڈاکو غالباً اپنا کام کر کے جا چکے تھے جیسے لگتا تھا وہ لوٹ چکا تھا اور اب باقی لوگ اسے تسلی دے رہے تھے یا صبر کی تلقین کر رہے تھے۔ یعنی بے چارے بے وقوف لوگ پولیس سے رجوع کرنے اور رپورٹ لکھوانے کا مشورہ بھی دے رہے ہوں۔

"تم کو کس الّو کے پٹھے نے پولیس میں بھرتی ہونے کا مشورہ دیا تھا؟" محسن نے افسرانہ غصے میں دھاڑ کر کہا۔ "میری ایک نظر گاؤں کی طرف تھی تو دوسری تھانے کی طرف۔"

"میری نوکری نے جناب!" وہ منمنانے لگا۔ "وہ چاہتی تھی کہ میں شان سے مر جاؤں..... کسی پولیس مقابلے میں ہلاک ہو جاؤں۔"

ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا جاؤں..... کہتی ہے بہادر بنو..... کہیں کوئی سپاہی ٹریفک پولیس میں چلے جاؤ..... ہر طرف گاڑیاں ہی گاڑیاں ہوں اور خوب پیسے ملے گا..... کیسی ذات عورت کی..... ذاتی سیٹ کرائے کوئی گاؤں پھر پر چڑھا دے گی..... رشوت مانگتی ہے جیالی میری وفات..... "

"آخر کیوں؟" مجھے اس کی بات اور حالت پر ہنسی آ گئی۔

"بس زری..... اس نے شادی سے پہلے ایک یار بنا لیا تھا، وہ لوہار ہے، ایک لونڈا تھا..... ناکام کا نکا..... وشمن مار کر شہر کے فلمیں دیکھتا تھا..... گاؤں میں آ کے عاشقی کی پکچر گیا تھا۔ اس کے چکر میں پڑ گئی تھی..... باپ نے مجھ سے شادی کر دی مگر وہ اسے بھولی نہیں ہے..... چاہتی ہے کہ میں مر جاؤں تو اسے دوسرے یار کے ساتھ رہنے کا..... ابھی تو ڈرتی ہے کہ میں اسے قتل کر دوں گا۔"

"ایسی عورت کو تم چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟" میں نے کہا۔

"چھوڑ دوں؟ خود اپنی مرضی سے..... نہیں تو زری لے جائے وہاں اپنے یار کے پاس؟" حوالدار دم بخود ہو گیا۔ اس موضوع پر مزید گفتگو اس لیے جاری نہ رہ سکی کہ پیچھے گاؤں کی جانب سے دو سائے سے لپکتے دکھائی دیے۔

"ایس پی صاحب..... ڈاکے پڑے سرکار!" ایک نے چلا کر ہانپتے ہوئے کہا۔

"ہماری مدد کریں مائی باپ!" دوسرا بولا۔ قریب آ کر وہ دونوں پیچھے گر گئے..... یہ بالکل قدموں میں سر رکھنے کا انداز تھا۔

"لاحول ولا قوۃ!" محسن نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ "یہ کیا بے ہودگی ہے..... سیدھے کھڑے ہو کے بات کرو۔"

وہ دونوں کھڑے ہو گئے..... ان میں سے ایک جوان آدمی تھا اور دوسرا بوڑھا۔

"شرم نہیں آتی تم لوگوں کو..... مسلمان ہو اور جانتے ہو کہ خدا کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں۔" محسن نے انہیں ڈانٹنا شروع کیا۔ "مجھ کو کیا بے انسانوں کی طرح کھڑے ہو..... پیر پکڑنے یا ہاتھ جوڑنے کی ضرورت نہیں ہے..... مصیبت میں پولیس سے مدد مانگنا تمہارا حق ہے اور تمہاری مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔"

"وہ..... سر جی....." نوجوان نے خود کو سنبھال کے کہنا شروع کیا۔ "ڈاکو آ گئے تھے گاؤں میں....."

"ڈاکو کہاں ہیں؟ ڈاکو؟" میں نے کہا۔

"وہ ڈاکو نہیں تھے مائی باپ....." بڈھے نے کہا۔ "وہ کچھ لے کر نہیں گئے..... کسی گھر کو نہیں لوٹا انہوں نے..... پانچ جوانوں کو پکڑ کر لاری میں ڈال لیا اور بھاگ گئے..... ان کی مائیں تو پاگل ہو گئی ہیں، وہ بے ہوش پڑی ہیں..... دو کو باندھ کے ڈال دیا ہے۔"

اپنے کپڑے پھاڑ رہی تھیں۔"

"لیکن تمہیں کیسے معلوم کہ وہ فنکار تھے؟" محسن نے کہا۔

"اور کوئی پانچ جوان لڑکوں کا کیا کرے گا مائی باپ؟" بڈھے نے کہا۔ "بس اب وہ ان کو اپنے کسی بیگار کیمپ میں لے جائیں گے..... کھانے کو کچھ نہیں دیں گے..... مار پیٹ کے اور جانوروں کی طرح کام لیں گے..... وہ ایک دم مر جائیں، اس طرح کے رہنے لگا..... ان میں میرا بیٹا بھی ہے..... اس کا چھوٹا بھائی....."

اب نوجوان نے بھی بھائی کو یاد کر کے رونا شروع کر دیا۔ اب تک وہ جو حوصلے کا ثبوت دے رہے تھے یا پولیس افسر کے سامنے ضبط سے کام لینے پر مجبور تھے کہ کہیں وہ خود سیشر ابے پھٹکار نہ ہو جائیں۔

"دیکھو..... عقل سے کام لو..... حوصلہ رکھو!" محسن نے کہا۔ "مجھے اطمینان سے ساری بات بتاؤ..... فنکار اس طرح نہیں آتے..... وہ ڈاکے مار کر جوان آدمی اپنے ساتھ نہیں لے جاتے..... تم نے دیکھا تھا ان کو.....؟"

"دیکھا تھا مائی باپ!" بڈھا سسکیاں لیتے ہوئے بولا۔

"کتنے آدمی تھے وہ؟"

"بہت دور..... مگر ان کے ہاتھوں میں پستول تھے مائی باپ۔ اور انہوں نے گولی سے ایک لڑکے کو زخمی بھی کر دیا تھا..... وہ ان کے قبضے سے نکل بھاگا تھا..... گولی اس کی ٹانگ میں لگی تھی لیکن وہ پھر بھی بھاگ گیا..... رات کا وقت تھا اس لیے نشانہ چوک گیا..... اللہ نے زندگی بچائی..... باقی پانچ کو انہوں نے لاری میں ڈال لیا..... ان ہی میں سے ایک لاری کا ڈرائیور تھا..... دوسرا پیچھے بیٹھا تھا۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ خبردار جو کوئی ہلا..... سب لیٹے پڑے رہو..... کسی نے سر بھی اٹھایا تو گولی مار دوں گا۔" بڈھے نے بتایا۔

"اور تم سب دیکھتے رہے؟" محسن نے بے بسی سے کہا۔ "خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ انہوں نے کس کس کو پکڑا..... اور کہاں سے؟"

"وہ جو ایک کو انہوں نے کھیتوں سے پکڑا..... وہ پانی لگا رہا تھا۔" بڈھے نے بتانا شروع کیا۔ "وہ لٹیرے ساتھ لے کر وہ گاؤں میں گھسے اور لڑکے سے خود انہوں نے پوچھا کہ کس گھر میں کون جوان لڑکا ہے..... اس کا نام کیا ہے..... پھر انہوں نے ہر دروازے پر دستک دے کر لڑکے کو نام لے کر بلایا اور باہر کھینچ لیا..... دیکھتے ہی دیکھتے سامنے کھڑی لاری میں ڈال لیا۔"

"انہوں نے کچھ کہا نہیں..... کہ آخر وہ کیا چاہتے ہیں؟" محسن نے گھبرا کے پوچھا۔ "گھر والوں سے کوئی بات نہیں کی؟"

"انہوں نے یہ کہا تھا مائی باپ کہ فکر کی بات نہیں..... ہمیں جلد ہی جوان اور محنتی لڑکے چاہئیں۔" بڈھا بولا۔ "شور مچانے اور رپورٹ کرنے کی ضرورت نہیں..... لڑکے صبح تک آ جائیں گے..... لیکن

مائی باپ..... وہ جھوٹ بول رہے تھے۔ ماں باپ سو کر کیسے رہ جاتے؟ انھوں نے دوبارہ دوڑ دوڑ کی..... ڈرانے کے لیے..... ایک لڑکا بھاگا تھا۔ سب جانتے ہیں اسے کہ وہ ہاتھ سے سانپ کو پکڑ لیتا ہے اور بھنچ کر مار دیتا ہے..... ایک بار اس نے کلہاڑی سے بھیڑیے کی گردن الگ کر دی تھی جو اس پر حملہ کرنے والا تھا..... وہ چلتی لاری سے کود گیا اور بھاگ کر آ گیا..... گولی اس کی پنڈلی میں لگی تھی لیکن اللہ نے بچایا اور اسی لیے وہ ڈر کے مارے جنگل میں تھا۔ اس لیے درختوں کی آڑ میں وہ دوڑ رہا..... وہ اور گولیاں چلاتے..... فنکاروں کو نکل جانے کی جلدی بھی تھی۔"

"بابا جی..... میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ فنکار نہیں تھے۔" میں نے کہا۔ "اگر انھوں نے یہ کہا تھا کہ لڑکے صبح تک واپس آ جائیں گے تو مجھے پوری امید ہے کہ وہ آ جائیں گے..... اصل بات یہ ہے کہ تم ذرا ان کا حلیہ بتاؤ۔"

بڈھے نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں تو کچھ نہیں دیکھ سکا۔ انھوں نے دروازہ بجایا تو میرا بیٹا گیا تھا، کنڈی کھولنے..... وہ اسے گھسیٹ کر لے گئے..... وہ چلایا تو میں دوڑا..... مگر لاری نکل گئی تھی..... میں نے اسے جگایا اور باہر گیا۔ اس وقت تک گاؤں کے سب لوگ اٹھ چکے تھے۔"

"وہ پولیس والے تو نہیں تھے.....؟" محسن نے پوچھا۔

بڈھے نے نفی میں سر ہلایا۔ "وردی تو کسی نے بھی نہیں پہن رکھی تھی۔"

"کسی دوسرے گاؤں کے دشمن بھی نہیں تھے؟"

"دشمن ہر ایک کا ہوتا ہے..... مگر گاؤں کا دشمن گاؤں نہیں ہوتا۔" بڈھا بولا۔ "وہ چھ لڑکے ایک ہی خاندان کے بھی نہیں تھے..... آپس میں سب ایک دوسرے کو جانتے تھے مگر ان کا کوئی دشمن نہیں..... سب اچھے شریف لڑکے تھے۔"

"گویا حلیہ کسی نے نہیں دیکھا؟"

"نہیں مائی باپ..... انھوں نے چہروں پر رومال باندھے ہوئے تھے۔ ڈاکو ہوتے تو ڈھاٹے باندھ کر آتے۔" بڈھا بولا۔ "اور ڈاکو پتلون نہیں پہنتے۔"

"پتلون.....؟" محسن چونک کر بولا۔

"ہاں مائی باپ..... اتنا میں نے ضرور دیکھ لیا تھا کہ وہ پتلونیں پہنے ہوئے تھے۔"

"اور اوپر..... قمیص..... ٹی شرٹ یا کوٹ.....؟" محسن نے پوچھا۔

"کوٹ جیسی قمیص تھی جناب....." بڈھے نے کہا۔

"ایک کی ٹی شرٹ تھی سرخی....." لڑکے نے کہا۔

"اچھا..... رنگ دیکھا تھا.....؟"

"چاندنی تو کافی تھی۔" لڑکے نے کہا۔ "ٹی شرٹ تھی سفید

www.paksociety.com

اور قمیض دھاریوں والی۔۔۔ سفید کالر یا سفید شیلڈ"

"اچھا۔ بھاگنے والوں کے لئے سامنے لوگوں میں سے کسی نے لاری کا نمبر وغیرہ دیکھا؟" محسن نے پوچھا۔ "خیر چھوڑو۔۔۔ تم واپس جاؤ اور ان سب کو بلا لو جن کے گھروں سے لڑکے اٹھائے گئے ہیں۔ ماؤں کو مت بلانا۔ صرف ان کے باپ آجائیں یا بھائی۔۔۔ اور وہ سب مجبور۔۔۔ نے پھر دیکھا تھا۔۔۔ اور حسن بہادر لڑکے کو تو ضرور بلانا جو اپنی جان بچا کے بھاگ آیا تھا۔"

"جیسا حکم مائی باپ" بڈھا پھر رونے لگا۔ "بس میرا بیٹا مجھے واپس دلوا دو۔۔۔ اس کی ماں مر جائے گی۔۔۔ سب کے بیٹے دلوا دو۔۔۔ اللہ تم کو عزت دے گا۔۔۔ غریبوں کی دعائیں لو گے تو حکم پاؤ گے۔"

"چلو بابا چلو۔۔۔ ہم آتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ وہ دونوں پلٹ کر چل پڑے۔۔۔ ہم انہیں اندھیرے میں غائب ہوتا دیکھتے رہے۔

"یہ کیا چکر ہے آخر؟" محسن نے بے تعلقی سے کہا۔

"وہ۔۔۔ صرف۔۔۔" میں نے … کر کے حوالدار کی موجودگی کا احساس دلایا۔ "ہم چل کے دیکھ لیتے ہیں۔۔۔ حوالدار کو آگے بھیج بیٹھے رہیں؟"

"ہاں۔۔۔ یہ ٹھیک ہے۔" محسن جیسے … سہم گیا۔ "جاؤ حوالدار۔ تم نے میرے احکامات سن لئے۔۔۔ اس بڈھے کے ساتھ گاؤں پہنچ کر ہمارے آنے سے پہلے۔۔۔"

"زی نزاب عالی" حوالدار پوری بات سنے بغیر مڑ گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ دونوں کانسٹیبل بھی ہمارے پیچھے ہی موجود ہیں۔ اس نئی واردات میں ان کا دلچسپی لینا ایک فطری امر تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ خود میں پولیس چوکی کے دروازے سے کافی دور آ گیا تھا۔۔۔ اور حقیقی دیر تک تفتیش رہا تھا اپنے قیدی کی طرف سے غافل رہا تھا۔۔۔ سراج کا خیال آتے ہی میں اندر لپکا۔۔۔

دروازے سے داخل ہوتے ہی میں نے کمرۂ حوالات پہ نظر ڈالی تو ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہوا۔ جہاں پہلے خستہ حال اور نیم جان سراج لیٹا ہوا تھا، وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔ سراج اس موقع سے فائدہ اٹھا کے فرار ہو گیا تھا۔ میں نے اندر جا کے دیکھا۔۔۔ وہ جاتے وقت محسن کے کپڑے بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔ اس کے پاس کپڑے پہننے کے لیے وقت نہیں تھا۔۔۔ یہ ہماری بے وقوفی تھی کہ تفتیش کرتے کرتے جیپ کی آواز سن کر باہر چلے گئے اور پھر دوسرے معاملات میں الجھ کر اپنے قیدی کو بھول گئے میں پلٹا کہ باہر جا کے محسن کو یہ افسوسناک اطلاع دوں مگر وہ میرے پیچھے موجود تھا۔

"نکل گیا وہ کمینہ؟" محسن نے مایوسی اور غصے کے ساتھ کہا۔

"ہاں یار۔۔۔ میری بے وقوفی ہے۔" میں نے کہا۔ "بس … کے لیے میں اس کی طرف سے غافل ہوا تھا۔ اس سے پہلے میری نظر دروازے پر تھی۔۔۔ مگر جب وہ بڈھا چلاتا ہوا آیا تو۔۔۔" میں نے پھر افسوس سے سر ہلایا۔

"غلطی ہم سب کی ہے۔" محسن دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا۔ "یہ کسی ایک کی ذمے داری نہیں تھی۔۔۔ میں تو اس کی حالت کی وجہ سے تھوڑا سا مطمئن تھا کہ اب بھاگ کر کہاں جائے گا۔"

"ہم نے دروازے کو مقفل نہیں کیا اور باہر آ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ مایوسی کی کیفیت میں کہاں وہ خبیث مکر کرنے میں ماہر تھا کیا مرا ہوا تھا۔۔۔ مگر پھر ایک دم کھڑا ہو گیا ہوگا۔۔۔ اس نے جائزہ لیا ہوگا کہ ہم کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ وہ کپڑے اٹھا کے دبے پاؤں نکل گیا۔۔۔ بڈھا اور اس کا ارد گرد کا شور کر رہے تھے۔ ہماری توجہ ان کی طرف تھی۔۔۔ پیچھے اندھیرا تھا۔۔۔ اسے کسی نے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔"

"ہم دونوں کی توجہ تھی۔۔۔ مگر حوالدار نے بھی نہیں دیکھا!" محسن نے اچانک کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے یار۔۔۔ دروازہ اس کے بالکل سامنے تھا اور کھلی آنکھوں کے ساتھ یہ نا ممکن ہے کہ کوئی اس دروازے سے نکلنے والے کو نہ دیکھ پائے۔"

"اور پھر ایک ایسے شخص کو جو برہنہ ہو؟"

"تو نے کیوں … کر لیا ہے کہ وہ ننگا ہی نکل بھاگا ہوگا؟" محسن بولا۔

"کپڑے اس کے لیے غیر اہم تھے محسن۔۔۔ کپڑے نہ ہوتے تب بھی وہ بھاگ نکلتا۔۔۔ یہاں سے نکل جانے کے بعد سب کچھ اس کے اختیار میں تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ کپڑوں کا بندوبست بھی کر لیتا۔۔۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی ایک سیکنڈ ضائع نہ کرتا۔ اس نے بھی یہی کیا ہو گا۔۔۔ وہ کپڑے ہاتھ میں پکڑ کر اندھیرے میں غائب ہو گیا ہوگا یہاں سے نکل کے بھی اس نے کپڑے نہیں پہنے ہوں گے۔۔۔ جب تک اسے یقین نہیں آ گیا ہوگا کہ وہ ہماری دسترس سے دور اور محفوظ ہو چکا ہے۔۔۔ تاریکی اس کی بہترین پناہ گاہ تھی۔"

محسن نے قائل ہو کے سر ہلایا "لیکن یار کیا وہ جسمانی طور پر اس قابل ہے کہ زیادہ دیر تک اور زیادہ دور تک بھاگ کے جا سکے؟"

"جب آدمی موت سے بھاگتا ہے تو اس کے جسم کی توانائی کا آخری تنکا بھی ایک شہتیر جیسے سہارا دیتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اب اس کی تلاش میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" محسن بولا۔

"میں نے یہ نہیں کہا کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جائیں۔۔۔ ہم تو جنگل کے راستوں پر … کے اندھیرے میں کوئی سراغ تلاش نہیں کر پائیں

رات کے اندھیرے میں کیا دیکھیں گے۔۔۔ وہ ایک آدمی ہے لیکن چار سمتوں میں تین سو ساٹھ راستے ایک ڈگری کے فرق سے ملتے ہیں ایک ڈگری کا فاصلہ صرف ایک میل کے بعد کتنا پھیل جائے گا۔ اس کا تجھے بھی اندازہ ہوگا۔۔۔ اس کے علاوہ ہم گاؤں کی طرف جا رہے ہیں۔۔۔ یس پی صاحب۔۔۔" میں نے کہا۔

"یار یہ غالب ہی جاگتا رہتا تو کیا تھا۔۔۔ مردہ … کے لیٹ گیا ہے" محسن نے بستر پہ لیٹے لیٹے ہوئے غالب کی طرف دیکھا۔

"اسے تو اٹھا دو۔ صور اسرافیل پھونک کے" میں نے کہا اور زور سے بستر کو ہلا کے غالب کے کان میں چیخ ماری "اٹھو مرنے والے قیامت آ گئی"

غالب جھنجھلا کے اٹھا "یار قیامت آئے گی تو آسمان زمین ہو جائے گا؟۔۔۔ یہ آخر تم لوگوں کے چین آرام کے دشمن کیوں ہو گئے ہو؟"

"ہم جا رہے ہیں۔۔۔ گاؤں میں ایک واردات ہو گئی ہے" میں نے کہا۔

"مگر اس سے بڑی واردات یہاں ہو گئی ہے۔۔۔ سراج بھاگ گیا ہے" محسن نے اسے اطلاع دی۔۔۔ غالب نے بے یقینی کی طرح ہم دونوں کو دیکھا۔ اس کو ہماری باتوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ ہم مذاق کے موڈ میں ہیں۔ ہم نے اسے مختصراً ساری بات بتائی۔۔۔ پھر ہم گاؤں کی طرف چل پڑے۔

"میرا بھی شک حوالدار پہ ہے" محسن بولا۔

"ہاں۔۔۔ میرا خیال ہے کہ سراج نے کسی طرح اسے پیغام دیا ہو گا کہ مجھے یہاں سے نکال سکو یا نکلنے میں میری مدد کر سکو تو منہ مانگا انعام دوں گا" میں نے کہا۔

"ممکن ہے لالچی حوالدار نے پانچ دس ہزار میں سودا کر لیا ہو … کوشش کروں گا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا یار۔۔۔" محسن بولا۔ "کیا خبر سراج نے اسے اپنی اور ہماری اصلیت سے بھی آگاہ کر دیا ہو۔۔۔ اور ساتھ ہی کہہ دیا ہو کہ خاموش رہے ورنہ اسے ہاتھوں ہاتھ مارا جائے گا۔۔۔ اگر سراج نکل گیا تو حوالدار کو انسپکٹر بنوا دو۔ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا؟"

"شاید ایسا نہ ہو" میں نے کہا۔ "وہ ڈیوٹی سے بغیر اطلاع کے غائب ہونے کے جرم میں معطل کیا جا چکا ہوگا۔۔۔ مخبر کی موت کے بعد اس کے خلاف شکوک بڑھ گئے ہوں گے اور ایس ایس پی فاروق رضوی پوری کوشش کریں گے کہ وہ معطل ہی نہیں گرفتار بھی ہو جائے۔"

"یہ مشکل ہوگا۔۔۔ اپنے سکندر صاحب" محسن چلتے چلتے … "وہ اپنی صفائی پیش کرے گا کہ اسے ہم اٹھا کر لے گئے تھے۔"

"اور یہ ثابت کیسے کرے گا؟"

"کچھ اور ثابت کرے نہ کرے یہ کہ" محسن بولا۔ "کہ اسے ڈاکو لے گئے تھے۔۔۔ یا وہ مجرموں کے تعاقب میں نکل گیا تھا اور وہاں پھنس گیا تھا۔ اسے موقع ہی نہیں ملا کہ کسی کو اطلاع دے سکتا۔۔۔ اس کے پاس ہزار بہانے ہوں گے اور خود اس کے ماتحت بھی اس کی جھوٹی کہانی کو سچ بتائیں گے تو وہ فوراً بحال بھی ہو جائے گا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہے کہ حوالدار سے محتاط رہنا ہوگا۔"

"صرف محتاط رہنے سے کیا ہوگا؟" محسن بولا۔ "اس سے پوچھنا پڑے گا کہ اس نے سراج کو فرار ہونے میں کس طرح مدد دی۔۔۔ اور کیوں مدد دی؟"

گاؤں کا مجمع نمبردار کی حویلی کے دالان میں تھا۔ متاثرہ خاندانوں کے علاوہ گاؤں کے ہر گھر کا تقریباً ہر فرد وہاں موجود تھا۔۔۔ بیک وقت سب بول رہے تھے … آتے تھے۔۔۔ گریہ و زاری … کر رہے تھے جن کے بھائی یا بیٹے اٹھائے گئے تھے۔ گاؤں کی مقامی قیادت اس غم زدہ اور بپھرے ہوئے ہجوم کو خاموش کرنے میں ناکام رہی تھی۔۔۔ زیادہ جوشیلے جوان کلہاڑیاں، ڈانگیں، سوٹے اور ڈنڈے لے کر ڈاکوؤں کے تعاقب میں جانا چاہتے تھے مگر ذی ہوش لوگ ان کو روک رہے تھے۔۔۔ ابھی یہ غنیمت تھی کہ خواتین کو اندر نہیں آنے دیا گیا تھا۔ ان کی فریاد و فغاں پس منظر میں مسلسل جاری رہی لیکن براہ راست اس اجتماع کے سامنے اپنے بیٹے یا کسی دوسرے کا مظاہرہ کرنے سے قاصر رہیں مگر حاضرین کی قوت فیصلہ بھی بری طرح متاثر ہوئی۔

"آئیے آئیے۔۔۔ ایس پی صاحب" نمبردار نے پریشانی سے سر پہ ہاتھ پھیر کے کہا۔ "آپ بھی موجود ہیں۔۔۔ اچھا ہوا جو یہ واقعہ آپ کے سامنے پیش آیا۔"

"یہ بہت اچھا ہوا؟" کسی نے چلا کے کہا۔

"ارے پاگل یہ تو … میرا مطلب تھا کہ کوئی معتبر گواہ تو ہے۔" نمبردار نے دخل در معقولات کرنے والے کو جھاڑا۔

"دیکھیے میں چشم دید گواہ نہیں ہوں۔" محسن نے فوراً وضاحت ضروری سمجھی۔ "یہ واقعہ میرے سامنے پیش آیا ہو اور میری بھی … یہاں ہیں۔۔۔"

"اس کا مطلب ہے تم بھی کچھ نہیں کرو گے؟" کسی نے کہا۔

"آخر ہوتا پولیس والے۔۔۔" دوسری آواز آئی۔

"میں نے یہ نہیں کہا کہ میں کچھ نہیں کروں گا۔" محسن نے گرج کر کہا۔ "جو کچھ میں نے ایمان میں کیا وہ آپ لوگوں نے دیکھا تھا۔ اس کے باوجود تم مجھے پولیس والا ہونے کی گالی دیتے ہو۔۔۔ جب تک مجھے ساری بات معلوم نہیں ہو جاتی، میں کچھ نہیں کر سکتا اور ایسے تو مجھے کچھ پتا نہیں چلے گا۔۔۔ کوئی لڑ رہا ہے۔۔۔ کوئی گالیاں دے رہا ہے کوئی رو رہا ہے تو کوئی صرف ہنگامہ کر رہا ہے۔۔۔ …

www.paksociety.com

ہوں کہ یہاں صرف وہ لوگ ہیں جن کا اغوا ہونے والوں سے قریبی تعلق ہے — پانچ جوان اغوا ہوئے ہیں — ان پانچ گھروں کے مردوں کے سوا سب باہر نکل جائیں — اپنے اپنے گھر جائیں اور مجھے کام کرنے دیں — اور ہاں... وہ لڑکا جو ان بدمعاشوں کی قید سے فرار ہو کے آ گیا تھا... پہلے وہ سامنے آ جائے۔"

مجمع خاموش تو پہلے ہی ہو گیا تھا... اب لوگوں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن نہ کسی نے جواب دیا اور نہ کوئی اپنی جگہ سے ہلا۔

"تم لوگوں نے سُنا نہیں میں نے کیا کہا ہے؟" محسن نے دہاڑ کر کہا اور ایک دم ریوالور نکال کر ہوائی فائر کر دیا... مجمع یوں منتشر ہوا جیسے جلتے تالاب میں بم پھٹ جائے — دو منٹ میں وہ سب حویلی کے دالان سے نکل گئے۔ اندر کوئی دس بارہ افراد رہ گئے۔

"جاہل لوگ... میری ایک نہیں سنتے تھے۔" نمبردار نے اطمینان کا سانس لیا اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ خود کو تعلیم یافتہ سمجھتا ہے۔

"وہ لڑکا کدھر ہے؟" محسن نے ایک کرسی پر تشریف فرما ہو کے کہا جو ملازم اندر سے اٹھا کے لایا تھا... دوسری پر میں بیٹھ گیا... نمبردار صاحب بیوی کی طرح آستانے تک کھڑے رہے۔

"وہ تو... شہر ہے۔" کسی نے کہا۔ "حکیم صاحب اس کی پٹی کر رہے تھے۔"

"اچھا... اسے بعد میں لے آنا۔" محسن بولا۔ "پہلے تم آؤ... تم بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا اور کیا سُنا؟"

"اور جی... سب نے دیکھا ہے کہ لوگ جو میں نے دیکھا۔" ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے پگڑی کے کونے سے آنکھیں صاف کر کے کہا۔ "ایسی طرح وہ لڑکی جو ہے — اتنی زندگی لگ گئی ہے... کبھی نہیں سُنا کہ بندیالی نون کوئی اس طرح بھیڑ بکریوں والا گلہ لے جائے... ظلم..."

"دیکھو — تقریر مت کرو۔" محسن بولا۔ "یہ بتاؤ کہ تم نے دو والے پہ وہ ٹنک سینے والے کو دیکھا تھا؟"

"ایسی طرح سر... جیسے میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔" وہ اپنی اردو پنجابی کی ملی جلی زبان بولتا رہا۔

"ایسے تو نہیں دیکھا ہوگا... گاؤں کی گلیوں میں اندھیرا ہوتا ہے اور میں روشنی میں بیٹھا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "لیکن تم کو اپنی نظر پر اتنا بھروسا ہے تو مجھے اس کا حلیہ ذرا تفصیل سے بتاؤ۔"

مقرر کو محسن کے جوش بھرے لہجے نے کچھا دیا کہ وہ بھی... "بندہ تھا میری طرح گبرو جوان... واہ واہ قد... چوڑی چھاتی..."

"بے وقوف... اس کا قد کتنا تھا... موٹا تھا یا پتلا... سر پر بال تھے یا گنجا تھا... بال تھے تو سیاہ تھے یا سفید؟" محسن نے ترچھے سے کہا۔

"وہ سر... قد میں کیسے ناپتا..." وہ سر کھجانے لگا۔

"اچھا — اس کا اپنا رنگ کیسا تھا — مونچھیں تھیں... ہاتھ کیسے لگتے تھے؟" محسن نے اس پر جرح جاری رکھی — وہ جرح کے بے تکی بات کرنے یا کہانیاں اڑانے کا عادی تھا... وہ بھی اندھیرے اور افراتفری کے باعث زیادہ کچھ نہیں دیکھ سکا تھا — محسن نے اسے جھاڑ کے ایک طرف کر دیا اور وہ خاصا افسردہ سا زمین پہ اکڑوں بیٹھ گیا — دوسرے گواہوں کے بیانات سے جو نتائج اخذ کیے ان سے ظاہر ہوا کہ اغوا کرنے والے ایک اسٹیشن ویگن میں تھے۔ اسے دیہاتیوں نے بہت بڑی جیپ قرار دیا تھا۔ ان میں سے ایک نے سفید شرٹ اور سیاہ پتلون پہن رکھی تھی اور دوسرے نے نیلی سفید دھاریوں والی قمیص اور نیلی پتلون... دونوں نے منہ پر عام قسم کے رُومال اس طرح باندھے تھے کہ صرف ان کا آدھا چہرہ چھپ سکا تھا۔ ان کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں جن کی ہیئت کے لحاظ سے اجنبی تھے — ان دونوں کی عمر پہ اتفاق رائے تھا کہ تیس پینتیس سال ہوگی۔ قد اور وزن کے تعین کے لیے حاضرین میں سے میرا انتخاب کیا گیا جس سے ثابت ہوا کہ وہ پانچ فٹ دس گیارہ انچ اور ایک ہو بچا سا تھا... پہنچے کہ جوان آدمی تھے — انھوں نے گاڑی کو گاؤں کے کنارے آبادی کے قریب لاکے کھڑا کیا اور قریب ترین گھروں سے پانچ جوانوں کو اٹھانے کا فیصلہ کیا — جو نوجوان کھیتوں میں پانی لگا کے لوٹ رہا تھا وہ سب سے پہلے اٹھا لیا گیا تھا اور اسی سے پوچھا گیا تھا کہ وہ اپنے جیسے پانچ جوانوں کے نام اور گھر بتائے — اس نوجوان کی خاص کہانی بھی تھی کیونکہ وہ چلانے لگا تھا اور تعاون پہ آمادہ نہ تھا۔

اس بیان بازی میں تقریباً ایک گھنٹا صرف ہو گیا۔ پھر وہ بہادر جوان آ پہنچا جو دشمنوں کے نرغے سے نکل بھاگا تھا اور گولی کھانے کا اعزاز بھی حاصل کر چکا تھا — دو افراد اسے یوں اٹھا کے لائے کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ کلائی سے پکڑ لیے تھے... اس طرح ایک جھولا سا بن گیا تھا اور بیٹھا ماسا ٹھیک آرام دہ تھا... جوان کے آتے ہی واہ واہ کی آوازیں بلند ہوئیں اور کسی نے اسے شیر دا پتر... بھی کہا۔ اسے محسن کے سامنے زمین پہ رکھ کے بٹھایا گیا بلکہ تخت دیا گیا۔ محسن نے اسے تھپکی دی۔

"تم واقعی بہادر آدمی ہو۔" محسن بولا۔

"جناب مجھے پولیس میں رکھ لیں۔" اس نے فوراً انعام کا مطالبہ کر دیا۔

"بہادر لوگ پولیس میں نہیں جاتے۔" محسن نے ہنس کر کہا۔

"پھر کہاں جاتے ہیں...؟" وہ بولا۔

"تم فوج میں جاؤ جوان۔" محسن نے کسی قسم کے وعدے سے گریز کرتے ہوئے مشورہ دیا۔ "اب ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ وہ کون لوگ تھے... ان کا ناک نقشہ... لباس، حلیہ سب تم نے اچھی طرح —

دیکھا ہوگا۔"

اس جوان نے بھی جو کچھ بتایا وہ مختلف نہیں تھا۔

"تم نے ان کی گفتگو بھی سنی ہوگی۔" محسن نے کہا۔

"ہاں جی — وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ بیٹھے بٹھائے مصیبت پڑ گئی ہے۔" وہ بولا۔

"کیسی مصیبت...؟" محسن بولا۔

"یہ تو پتا نہیں —" لڑکا بولا۔ "بس وہ ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے... ایک نے کہا کہ تم اندھے ہو کے گاڑی چلا رہے ہو... دوسرے نے کہا کہ تم خود ڈرائیور بن جاؤ — دونوں بہت غصے میں تھے لیکن انھوں نے لڑکوں سے کہا کہ پریشان ہونے کی بات نہیں — دو چار گھنٹے کا سارا کام ہے... تم کو پیسے بھی ملیں گے... صبح ہونے سے پہلے تم سب واپس گھر پہنچ جاؤ گے۔ کام کے بارے میں انھوں نے کچھ نہیں بتایا — کہ کیا کام ہوگا..."

"نہیں سر جی... لڑکے بہت ڈرے ہوئے تھے۔" وہ بولا — "انھوں نے سب کو اٹھا کر زبردستی گاڑی میں ڈال لیا تھا۔"

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی —" محسن بولا۔ "تم سب جوان اور صحت مند لوگ ہو — وہ کیا طاقت ور تھے کہ تم کو اٹھا کے پھینکتے رہے اور جب گاڑی میں بیٹھ کر ... ہو گئے تھے تو کیا آدمی کو بھی قابو نہیں کر سکتے تھے... جو پیچھے بیٹھا ہوا تھا؟"

"یہ دیکھیں جناب —" لڑکے نے اپنی زخمی ٹانگ محسن کے قریب کی۔

"اسے کھولیے... لت پچھے کہ —" کسی نے اس کو بدتمیزی کہا اس بات پہ ڈانٹا کہ وہ ایک پولیس افسر کی طرف ٹانگ پھیلا رہا ہے۔

"تمہارا مطلب ہے کہ دیا اور تھا کہ ان کے پاس... اس لیے تم سب کچھ نہ کر سکے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں جی... اس نے کہا تھا کہ پستول میں چھ گولیاں ہیں — کسی نے ہلنے کی کوشش کی تو وہ سب کے سر میں سوراخ کر دے گا... یہاں۔" جوان نے پیشانی کے وسط میں انگلی رکھ کے بتایا۔

"اللہ توبہ —" کسی نے خوف سے جھرجھری لے کر کہا۔

"تم مجھے سمجھ دار لگتے ہو... پھر تم نے جان کا خطرہ مول کیوں لیا؟" محسن بولا۔ "کیا تم کو ڈر نہیں تھا کہ وہ پیچھے سے تم کو گولی مار دے گا؟"

"ڈر تو تھا جناب... پھر میں نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے" وہ اپنے فرار ہونے کے کارنامے کی تفصیلات بتانے لگا۔ "وہ دروازے کے قریب تھا اور میں اس کے پیچھے ... اس نے ... ہاتھ میری کمر پہ رکھا ہوا تھا — ایک جگہ کھڈا تھا... جھٹکا لگا تو وہ کچھ آگے جھکا... میں نے اس کی گردن پہ مُکا مار کے اسے نیچے گرا دیا اور خود دروازے کے باہر کود گیا — اسے بھی اٹھنے میں دیر لگی اور مجھے بھی... اللہ کا شکر ہے گرنے سے میری ٹانگ نہیں ٹوٹی تھی ورنہ میں وہیں پڑا رہتا — اس وقت تو میں نے کچھ نہیں دیکھا... گرا اور اٹھ کے بھاگا — گاڑی کی رفتار زیادہ نہیں تھی ورنہ ہڈیاں تو ضرور ٹوٹ جاتیں اور وہ آدمی وہیں آ کے میرے سر میں یہاں سوراخ کر دیتا۔" اس نے دوبارہ پیشانی کے بیچ میں انگلی رکھی۔

"تم نے بہت حاضر دماغی سے کام لیا۔" محسن نے کہا۔ "کیا تم پڑھنا لکھنا جانتے ہو؟"

"ہاں جی — ساتویں جماعت تک سرگودھا میں چاچے کے پاس رہ کے پڑھا تھا — معاشرے ..." وہاں سے وہ بولا۔

"گڈ... پھر تو تم نے گاڑی کا نمبر بھی نوٹ کیا ہوگا؟" محسن بولا۔ لڑکے نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس پہ نمبر تھا ہی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ سر جی کہ جہاں نمبر لکھا ہوتا ہے وہاں کچھ بھی نہیں تھا — آگے تو میں نے دیکھا نہیں... لیکن جب وہ مجھے اندر دھکیل رہا تھا... وہ مندری والا... تو میں نے..."

"مندری والا...؟" میں نے اور محسن نے بیک وقت کہا۔ یہ ایک غیر متعلق سی تفصیل تھی... بالکل ایسا ہی جیسے بجلی کا جھٹکا لگے... یہ ہو سکتا ہے۔

"ان میں سے ایک جو کالا ہٹا کٹا تھا جناب... اس کے دونوں کانوں میں پیتل کی مندریاں تھیں... چھوٹی چھوٹی اور گول..." لڑکے نے وثوق سے کہا۔

"اور اس کے بال چھوٹے، سخت اور گھونگریالے تھے؟" محسن نے کہا۔

"سخت کا تو مجھے پتا نہیں سر جی... میں نے ہاتھ لگا کے نہیں دیکھے تھے لیکن چھوٹے ضرور تھے... اور گھونگریالے بھی تھے۔" لڑکا سر ہلا کے بولا۔

"پیچھے کی طرف سے ہوئے؟" میں نے کہا۔

"ماتھا تنگ... موٹے ہونٹ... چوڑی ناک۔" محسن بولا۔

"صرف ماتھا نظر آتا تھا اس کا جناب۔" لڑکے نے ہکلا کے مجھے اور محسن کو دیکھا۔ "ہونٹ اور ناک تو رومال کے نیچے تھے۔"

"کیا آپ نے اس کو شناخت کر لیا ہے؟" نمبردار نے پُر امید لہجے میں کہا۔ "یہ تو کمال ہو گیا۔"

"ابھی کوئی کمال نہیں ہوا..." محسن اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہو سکتا ہے کہ میرا خیال غلط ہو... لیکن اس حلیے کا ایک ہی شخص میرے ذہن

www.paksociety.com

میں آتا ہے؟"

"استاد پیڈرو۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔۔۔ ذرا سی بات نے جواب تک معمہ بنی ہوئی تھی۔۔۔ میرے خیالات میں طوفان برپا کر دیا تھا۔۔۔ اگر وہ پیڈرو ہی تھا تو اس کے ساتھ دوسرا کون تھا؟ وہ اس گاؤں تک کیسے آ پہنچے تھے۔ ان کو چھ جوان آدمی پکڑ کر لے جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟ [illegible] ہو کے گاڑی چلانے [illegible] ہوا ہوگا؟ کیا ان کی گاڑی الٹ گئی تھی؟ یا گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا تھا؟ وہ کون سی گاڑی تھی؟ جس گاڑی میں کیا تھا جو گرا تھا...؟ یکے بعد دیگرے ہزاروں سوالات میرے ذہن میں کلبلانے لگے جیسے بند گٹر کا ڈھکنا کھلنے سے کیڑے فرش پر رینگنے کے لیے نکل آئیں۔

"سڑک یہاں سے کتنی دور ہے؟" محسن نے پوچھا۔ لہجے سے وہ خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اندرونی طور پر وہ بھی بہت مضطرب تھا۔

"پکی سڑک ہوگی جناب کوئی تین چار میل...!" نمبردار نے کہا۔

"اچھا۔۔۔ میں فوراً وہاں پہنچنا چاہتا ہوں۔۔۔ گاؤں میں کسی کے پاس کچھ ہے۔۔۔ گاڑی یا موٹر سائیکل؟" محسن بولا۔

نمبردار نے نفی میں سر ہلایا۔ "میری گاڑی ہے لیکن وہ میرے لڑکے کے پاس رہتی ہے اور وہ شہر میں نوکری کرتا ہے۔۔۔ کل ہی شہر گیا ہے اور اب آنے کا کل پرسوں تک۔۔۔ باقی گاؤں میں دو سائیکلیں ہیں اور دو تانگے۔۔۔"

"جناب عالی...!" حوالدار نے بھی لب کھولے۔ "آپ بغیر گاڑی کے کیسے پہنچے تھے یہاں...؟"

اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔۔۔ اس سے شک کا اظہار بھی ہوتا تھا اور اس میں طنز کی جھلک بھی تھی۔۔۔ یہ ایک جملہ سب کے دلوں میں شکوک پیدا کر سکتا تھا۔۔۔ ایس پی اور دوسرے اعلیٰ سرکاری افسر جب پہلے بھی گاؤں میں آئے تھے۔۔۔ وہ سب شاندار گاڑیوں میں ٹھاٹ باٹ اور جاہ و جلال سے آتے ہوں گے۔۔۔ کم از کم سرکاری جیپ میں ضرور پہنچے ہوں گے۔۔۔ یہ کیسا ایس پی تھا جو پیدل آیا تھا؟ وہ ایک مجرم کو گرفتار کر کے لایا تھا مگر اس کے پاس سواری نہیں تھی۔

"نمبر بناتے ہو حوالدار..." محسن نے سنجیدہ مگر بارعب لہجے میں کہا۔ "کیا میں ایک خطرناک مجرم کے تعاقب میں تھا۔۔۔ اسے جنگل سے پکڑ کے لایا تھا۔۔۔ دن رات مجھے اس کا تعاقب کرنا پڑا تھا۔۔۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ گاڑی میں نے کہاں چھوڑی تھی۔" جب

محسن نے اس خطرناک مجرم کے فرار ہو جانے کا ذکر نہیں کیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔۔۔ فی الحال میں بھی حوالدار سے اس موضوع پر بات کرنے کے حق میں نہیں تھا۔۔۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے کیا معلوم ہے اور کتنا معلوم ہے۔۔۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں وہ سب کے سامنے نہ چلانے لگے کہ یہ دونوں فراڈ ہیں۔۔۔ یہ جعلی ایس پی ہے۔۔۔ وہ اصلی ایس پی تھا جو ان کی قید سے نکل کے بھاگ گیا۔ غالباً حوالدار خود یہ بات نہیں جانتا تھا۔۔۔ یا پھر تذبذب کا شکار تھا کہ کس کو اصلی سمجھے اور کس کو نقلی۔۔۔ ثبوت سراج کے پاس بھی نہیں تھا کہ وہ اصلی ایس پی ہے ورنہ وہ گاؤں کے اسی مجمع میں ہمیں بے نقاب کر دیتا۔۔۔ حوالدار شاید اسی لیے چپ تھا کہ کہیں نقلی ہی اصلی ثابت ہو گیا تو خود اس کا کیا بنے گا۔۔۔ اصلی تو سرے سے غائب ہو گیا تھا اور جب تک وہ دوبارہ منظر عام پر آتا اور ثبوت کے ساتھ ہماری جعل سازی کا بھانڈا پھوڑنے کے لیے پھر آتا، حوالدار کے لیے محسن کو ہی اصلی ایس پی سمجھنے میں عافیت تھی۔۔۔ اسے اندازہ ہوگا کہ ذرا سے اظہار سے نقصان ہو سکتا ہے۔۔۔ جو لوگ ایس پی کو پکڑ کے لا سکتے ہیں اور چوکی میں [illegible] ہیں، وہ ایک حوالدار کو بڑی آسانی سے گولی مار سکتے ہیں۔

تاہم یہ سب میرے ذہن کے اندیشے تھے جو بے بنیاد بھی نکلتے تھے اور درست بھی۔۔۔ میں اب جلد از جلد اس گاؤں سے نکل جانا چاہتا تھا جہاں خطرہ بڑھنے لگا تھا۔۔۔ یہاں سے بہت قریب پیڈرو اور اس کا کوئی ساتھی موجود تھے اور ابھی [illegible] ہماری قید سے نکل کر فرار ہو گیا تھا۔۔۔ اس کا کسی قریبی تھانے میں اپنی شناخت کرانا اور پھر پولیس کی مسلح نفری کے ساتھ دوبارہ لوٹ آنا بعید از امکان نہ تھا۔۔۔ میرا اور محسن کا فوراً اس جگہ پہنچنا ضروری تھا جہاں پیڈرو اور اس کا کوئی ساتھی گاؤں کے پانچ جوانوں کو اپنی مدد کے لیے لے گئے تھے۔۔۔ میرے ذہن میں دو امکانات روشن ہو رہے تھے۔۔۔ یا تو وہ لوگ اسٹوڈیو لے جانے کے بعد کسی حادثے سے دوچار ہو گئے تھے۔۔۔ یا وہ ہمارے تینوں ساتھیوں رالیمہ، ٹیڈی اور کیتھرین کو منتقل کرتے ہوئے کسی مصیبت میں پڑ گئے تھے۔۔۔ اس مصیبت کی نوعیت ابھی غیر یقینی تھی مگر اس خیال سے میرا دل دھڑک رہا تھا کہ رالیمہ مجھ سے تین چار میل دور ہے۔۔۔ ممکن ہے وہ زخمی ہو۔۔۔ ممکن ہے وہ زندہ ہی نہ ہو۔۔۔ لیکن ممکن یہ بھی ہے کہ وہ میرے تصور سے اپنی تنہائی کو آباد کیے ہوئے ساتھ مجھے پکار رہی ہو۔

اگر پیڈرو کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا تعلق بھی کسی کیمپ سے تھا تب بھی جائے وقوع پہنچ کے دشمن کے ذخیرے [illegible] کرنا یا اسے تباہ کر دینا ضروری تھا۔۔۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ سائیکل پر کسی مقامی گائیڈ کی مدد سے پندرہ بیس منٹ میں ہم

کچھ پہنچ سکتے تھے۔ یکلخت مجھے حوالدار کا خیال آیا۔۔۔ اسے یہاں سے اپنے ساتھ گائیڈ بنا کر لے جانے میں دو فائدے تھے۔ ایک تو یہ کہ میں دیکھتا کہ ہمارے منظر سے غائب ہوتے ہی وہ عوام دشمنوں کے جانے میں تقریر کر کے انہیں قائل کرے گا کہ ہم دھوکے باز تھے اور محسن ایک نقلی خود ساختہ ایس پی تھا۔۔۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ہم راستے میں اس سے پوچھ سکتے تھے کہ وہ سراج کے فرار کی سازش میں کب سے شریک ہے۔

"پھر جناب نمبردار صاحب۔۔۔ آپ وہی سائیکلیں منگوا لیں۔" محسن نے کہا۔

"بالکل ٹھیک فرماتے ہیں ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "ایک سائیکل پر میں اس بہادر جوان کو لے جاؤں گا۔۔۔ جوان کو پہچانتا ہے۔۔۔ کیوں جوان؟"

"بالکل بے سر جی۔" جوان کھڑا ہو گیا اور تھوڑا سا لنگڑا کر چلنے کے بعد مسکرانے لگا۔۔۔ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ پیدل بھی چل سکتا ہے۔

"دوسری سائیکل پر حوالدار میرے ساتھ جائے گا۔" محسن نے اچانک اعلان کر دیا۔۔۔ میں دم بخود رہ گیا۔۔۔ ایک بار پھر میری اور اس کی سوچ کے دھارے مل گئے تھے اور اس نے وہی فیصلہ کیا تھا جو میری خواہش سے مطابقت رکھتا تھا۔

"میں۔۔۔ لیکن جناب۔۔۔ میں کیسے جاؤں۔۔۔ اور کیوں جاؤں آپ کے ساتھ؟" حوالدار نے واضح طور پر باغیانہ لہجہ اختیار کر لیا جس سے میرے شکوک کو زیادہ تقویت ملی کہ وہ اصلیت سے واقف ہو چکا ہے۔

"کیوں۔۔۔؟ تم نے پوچھا ہے کیوں؟" محسن نے اونچی آواز میں کہا کہ حوالدار سمیت بہت سے لوگ اچھل پڑے۔ "تم مجھ سے سوال کرتے ہو۔۔۔ میرے حکم کو کافی نہیں سمجھتے۔" محسن نے یکلخت ریوالور نکال لیا۔ "تم نافرمانی اور بغاوت کا مطلب سمجھتے ہو حوالدار۔۔۔ پولیس میں نافرمانی کو ہی بغاوت سمجھا جاتا ہے اور اس کی سزا میں تم کو یہاں سب کے سامنے دے سکتا ہوں۔"

حوالدار کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ "جناب" اور "جناب عالی" سے آگے کچھ نہ کہہ سکا لیکن اس کی نظریں بتاتی تھیں کہ وہ مجبور نہ ہوتا اور بزدل نہ ہوتا تو ابھی بتا دیتا کہ محسن کون ہے۔۔۔ نمبردار نے اور چند دوسرے لوگوں نے اس کو ڈانٹا اور محسن سے درخواست کی کہ وہ اس نادان کی غلطی معاف کر دیں۔۔۔ پھر سائیکلیں آ گئیں اور محسن نے حوالدار کو ریوالور سے اشارہ کیا۔۔۔ گاؤں کے لوگ [illegible] عالم میں دیکھ کر حیران پریشان کھڑے تھے۔۔۔ شاید سوچ رہے تھے کہ کیا پتا ایس پی حوالدار کو گولی مار کے ٹھنڈا کر دے گا۔۔۔ ہم

تو افسری جیتا ہے۔۔۔ اس کا ہاتھ کون پکڑے گا اور گولی کو کون روکے گا۔

پھر چشم فلک نے ایک دلچسپ کامیڈی سین دیکھا۔۔۔ جو گاؤں کے لوگوں نے کبھی تصور میں بھی نہ دیکھا ہوگا کہ ایک حوالدار جسے گولی مار دینے کی دھمکی دے کر تعمیل حکم پر مجبور کیا گیا تھا، ایک ایس پی کو سائیکل کے آگے ڈنڈے پر بٹھا کے جنگل کی سمت روانہ ہو رہا ہے۔ دوسری سائیکل پر میں نے بہادر مگر زخمی گائیڈ کو بٹھایا اور یوں چار افراد پر مشتمل یہ مضحکہ خیز پولیس پارٹی ایسے خطرناک مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے روانہ ہوئی جو چھ جوان آدمی اٹھا کے لے گئے تھے۔۔۔ اُن کے پاس بہت بڑی جیپ تھی۔۔۔ وہ سب تعداد میں زیادہ تھے اور مسلح تھے چنانچہ گاؤں والوں کا ہماری کامیابی کے بارے میں شکوک میں مبتلا ہونا جائز تھا۔۔۔ ہم کیسے اُن کا تعاقب کریں گے اور کیسے اُن کو پکڑ لیں گے؟ یہ سوالات۔۔۔ ہمارے وسائل کے پیش نظر ہماری پوزیشن کو افسوسناک حد تک ناقابل اعتبار بنا رہے تھے۔

لیکن ہم بنیادی طور پر ایم آر ایس کے ارکان تھے اور اب تک عملاً ثابت کر چکے تھے کہ "موت سے تو پہلے تیغ بھی لڑتا ہے" سپاہی، اسے ایم آر ایس کا "موٹو" یا نعرہ بھی سمجھا جا سکتا تھا۔۔۔ وسائل کے بغیر صرف خدا پر اور خود پر بھروسا کرتے ہوئے آتش نمرود میں کسی حسینہ کے ساتھ کود جانا کہ وہ گلزار بن جائے گی ہمارا ایمان بالغیب تھا۔۔۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہم فوراً حوالدار کو اغوا کر کے اس جگہ سے نکال لے جانا چاہتے تھے جہاں ہماری پوزیشن خطرے میں تھی۔۔۔ اور تیسری وجہ یہ تھی کہ ہم پیڈرو تک پہنچنے میں تاخیر کے بالکل متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

گاؤں کے لوگ منہ کھولے ہمیں اندھیرے جنگل میں غائب ہوتا دیکھتے رہے۔۔۔ میرے ساتھ زخمی جوان تھا جو ہمارا گائیڈ بھی تھا۔ چنانچہ ہم آگے تھے۔۔۔ عام حالات میں سائیکل پر ڈبل سواری جرم تھا اور چالان خود پولیس کرتی تھی مگر اب پولیس خود ہی ڈبل سواری کر رہی تھی۔ ضرورت اس کا سب سے بڑا جواز بن گئی تھی۔۔۔ راستہ بہت پُرپیچ تھا اور اندھیرے میں مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے پگڈنڈی پر چلنے کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔۔۔ ناہموار راستے پر سائیکل چلانے کی مشقت الگ تھی۔ یہ ڈر الگ تھا کہ میں کسی جھاڑی میں نہ گھس جاؤں۔۔۔ کسی پتھر سے نہ ٹکرا جاؤں یا کسی سانپ پر سے نہ گزر جاؤں۔ کھڈے میں سائیکل سمیت گرنے یا سائیکل کی ہوا نکل جانے کے امکانات بھی خاصے روشن تھے۔۔۔ اُدھر جنگل میں سے عجیب و غریب جانوروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔۔۔ جنگل زیادہ

www.paksociety.com

گھنا نہیں تھا لیکن ہوا تیز تھی اور سائیں سائیں کرتی درختوں سے گزر رہی تھی تو درخت جھومتے تھے اور پورا جنگل سنسنانے لگتا تھا۔ یہ ماحول بھی بھوت اور چڑیل قسم کی ارواح خبیثہ سے ملنے کے لیے بھی نہایت سازگار تھا اور میرے ذہن میں ایسے متعدد واقعات تھے کہ (دروغ برگردن راوی) اچانک کوئی سامنے آ گیا جس کے ہاتھوں میں اپنا ہی کٹا ہوا سر تھا جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ مزید غضب یہ ہوا کہ گائیڈ نے دہشت ناکی کے ساتھ ساتھ میری حیرانی بڑھانے کے لیے گاؤں کی سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی تاریخ کے اوراق میں سے بھوتوں کے تذکرے نکال لیے۔ پیپل کے کسی پیڑ کے نیچے کوئی کسی چڑیل کا شکار ہوا... اس کی لاش بعد میں بغیر جلد کے پائی گئی۔ نیم کا بھوت کون ہے اور کیا کرتا ہے... آم کے پیڑ میں کس بھوت کا بسیرا ہے... منڈیر کے کھنڈر سے جو ڈھانچہ اکثر برآمد ہو کر ڈانس کرتا ہے... وہ کس کا ہے... یہ سب اسی بہادر جوان نے مجھے راستے میں بتایا۔ وہ گولی سے نہیں ڈرتا تھا تو بھوتوں سے کیوں ڈرتا... وہ یہی ثابت کرنا چاہتا تھا مگر میں اس کی باتیں کم سُن رہا تھا... پیچھے ہونے والی گفتگو پر میرے کان زیادہ لگے ہوئے تھے جو نقلی ایس پی اور اصلی حوالدار کے درمیان جاری تھی۔

حوالدار نے دو مرتبہ آواز بلند کی مگر نہ جانے محسن نے کس طرح دبائی... ان کے درمیان اب بات چیت شرافت کے دائرے سے باہر ہو چکی تھی اور مجھے بالکل شک نہیں رہا تھا کہ موضوع بحث کیا ہے... محسن اس سے سراج کے فرار کی سازش کا اقرار کرانا چاہتا تھا... حوالدار شاید محسن سے اس کے نقلی ایس پی ہونے کا اقرار کرانا چاہتا ہو گا مگر... دنیا میں زبردست اپنی منوا لیتا ہے... کمزور مجبور ہوتا ہے کہ اصل کو نقل اور نقل کو اصل مانے... حوالدار کمزور فریق تھا کیونکہ وہ بزدل تھا... کمزور تھا اور خالی ہاتھ تھا۔

بالآخر ایک دھماکا ہوا... میں نے فوراً سائیکل سے پیر نیچے ٹکا کے بریک لگائے کیونکہ سائیکل کے اپنے بریک تھے ہی نہیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے حاکم و محکوم دونوں جنگل کی زمین پر سائیکل کے قریب پڑے ہوئے نظر آئے... پھر حاکم یعنی ایس پی اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا؟ سائیکل پنکچر ہو گئی سر...؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں... حوالدار پنکچر ہو گیا ہے شاید۔" ایس پی نے کہا۔ "میں آگے بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا کہ اس نے اچانک حلق سے عجیب سی آواز نکالی اور بس لڑھک گیا۔"

"وہ کریلا بابا کا بھوت..." گائیڈ بولا۔ "وہ یہی کرتا ہے... جی... اس پگڈنڈی کے اوپر رہتا ہے۔" اس نے بیری کے درخت کو نظر اٹھا کے دیکھا۔

"کریلا بابا... اس کا بھوت کیا کرتا ہے؟" محسن بولا۔

"جمعرات کو یہاں سے گزرتا ہے جس کسی کے حلق میں کریلے کا ست ڈال دیتا ہے اور جناب وہ اتنا کڑوا ہوتا ہے کہ وہ اُوق کرتا ہے اور بس..." وہ بولا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ حوالدار کس طرح فلیٹ ہوا ہوگا مگر میں نے کہا۔ "آخر یہ کریلا بابا کا بھوت ایسا کیوں کرتا ہے؟ میرا مطلب ہے زبردستی لوگوں کو کریلے کا ست کیوں پلاتا ہے؟"

"تعجب کرو گے آپ کو رات کے وقت سوتے سے جگا کے اگر آپ کے اوپر سے سائیکل چلاتا ہوا گزر جائے تو کیا آپ اسے شہد پلائیں گے؟" زخمی مجاہد بولا۔

"اوہ... تمہارا یہ کریلا بابا یعنی اس کا بھوت بیری کے نیچے سو رہا تھا اور حوالدار گستاخ اس کے اوپر سے گزرا تو اسے سزا دی گئی۔" میں نے سر ہلایا۔ "چلو ہم بال بال بچے۔ شاید بھوت کے پیٹ سے دُور تھے..."

"تم لوگ چلو۔" محسن بولا۔ "میں آتا ہوں... اسے لے کر آتا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "سڑک اب کتنی دور ہے؟"

"سڑک تو وہ رہی... سامنے۔" زخمی نوجوان نے کہا۔

"اچھا اچھا۔" محسن نے سر ہلایا۔ "بھئی لڑکے... تم بڑے بہادر ہو کر بھوت سے بھی نہیں ڈرتے... کیا تم واقعی پولیس میں بھرتی ہونا چاہتے ہو؟"

"یس سر جی، آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔" وہ بولا۔

"اچھا تو پھر ایسا کرو کل پرسوں یا کسی بھی دن لاہور شہر چلے جاؤ اور ایس ایس پی خامس رضوی صاحب سے مل لو۔" محسن بولا۔ "نام یاد رہے گا؟"

"ایس ایس پی... خامس رضوی۔" وہ حفظ کرنے کے انداز میں بولا۔

"ہاں، نام بھول گئے تو سب گڑبڑ ہو جائے گی۔" محسن بولا۔ "ان سے مل کر کہنا کہ مجھے کبیر خان نے بھیجا ہے۔ وہ تم کو بھرتی کر لیں گے۔"

"میرا نام کبیر خان ہے۔" میں نے کہا۔ "بتا دینا کہ وہ ایس پی کے ساتھ گاؤں آئے تھے تو بات ہوئی تھی۔ اب تم جاؤ۔"

"جاؤں؟" وہ حیران ہو کے بولا۔ "واپس جاؤں؟..."

"سر یہ کیسے جا سکتا ہے... زخمی ہے؟" میں نے کہا۔

"اوہ... پھر تو ایسا کرو اسے اپنی سائیکل دے دو۔" محسن نے سوچ کر کہا۔ "یہ زخمی ہے اس لیے ہمارے ساتھ اس کو آگے نہیں جانا چاہیے۔ کیوں جوان سائیکل چلا لو گے؟"

"میں تو پیدل بھی جا سکتا ہوں سر جی۔" جوان بھول گیا۔

"نہیں نہیں... سائیکل لے جاؤ۔" محسن بولا۔ "ہمارا کوئی بھروسا نہیں کہ مجرموں کے تعاقب میں کہاں تک جانا پڑے... جب تک ہم واپس آئیں تو دوسری سائیکل بھی یہیں مل جائے گی۔"

نوجوان نے بڑی عقیدت سے ہاتھ ملا کے چوما۔ ایک بار پھر پوچھا کہ اسے پولیس میں نوکری مل جائے گی اور ہمارے یقین دلانے پر خوشی میں تیز تیز پیڈل مارتا ہوا واپس ہو گیا۔

"اب یہاں سے ذرا جھک کے دوست۔" محسن بولا۔ "اس خبیث حوالدار نے سراج سے بات کی تھی۔ اس سے پوچھا تھا کہ میں تم کو فرار ہونے میں مدد دوں تو کتنے پیسے دو گے۔ اس نے دس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا یعنی حوالدار کو بتا دیا کہ اصل ایس پی وہ خود ہے مگر اسے ان بدمعاشوں نے پکڑ رکھا ہے۔ اس کا شناختی کارڈ اور وردی سب چھین لی ہے اس لیے وہ خود کو اصلی ایس پی ثابت نہیں کر سکتا اور بول بھی نہیں سکتا ورنہ یہ لوگ قتل کر دیں گے لیکن حوالدار نے اسے نکلنے کا موقع دیا تو وہ چند گھنٹوں میں واپس آئے گا اور ان دونوں کی ایسی تیسی کر دے گا۔ اس نے حوالدار کو اپنی طرف سے دس ہزار نقد انعام دینے کا وعدہ کیا تھا اور سرکار کی طرف سے پکا تھانیدار بنانے کا یقین دلایا تھا لیکن یہ بھی کہا تھا کہ وہ خاموش رہے ورنہ مارا جائے گا۔"

"حوالدار نے خود ہی سب قبول کیا؟" میں نے کہا۔

"ہاں... بے وقوف آدمی ہے۔" محسن بولا۔ "خود ہی مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا تم نقلی ایس پی ہو۔ میں نے کہا کہ یہ شک تمہیں کیوں ہوا؟ کہنے لگا کہ کیا تمہارا نام سراج ہے؟ میں نے کہا کہ ہاں... تو بولا کہ عجیب بات ہے، وہ بھی خود کو ایس پی سراج کہتا ہے جو حوالات میں بند ہے۔ تم بھی خود کو ایس پی سراج کہتے ہو۔ وہ تم کو بدمعاش کہتا ہے تم اسے بدمعاش کہتے ہو۔ آخر میں کس پر اعتبار کروں۔ میں نے پوچھا کہ کیا تم نے سراج سے بات کی تھی... اور کی تھی تو کیوں کی تھی؟ وہ اس پہ تو ذرا باتیں بنانے لگا تھا۔ میں نے پلٹ کر ریوالور اس کے پیٹ پہ رکھ دیا اور اس سے کہا کہ سائیکل چلاتے رہو اور بولتے رہو جیسے ہی مجھے شک ہوا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو میں گولی چلا دوں گا۔ سچ تمہاری جان بچا سکتا ہے۔ میں تم کو سڑک پہ پہنچ کے چھوڑ دوں گا اور تم دونوں واپس جا سکو گے ورنہ یہ سمجھ لو کہ اکیلا وہ لڑکا واپس جائے گا تمہارے بارے میں یہ اطلاع لے کر کہ تم بدمعاشوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔"

"مگر بدمعاش ہیں کہاں؟" میں نے کہا۔

"یہی حوالدار نے بھی پوچھا تھا۔" محسن ہنسا۔ "میں نے اس سے کہا کہ جب ہم تمہیں گولی مار سکتے ہیں تو کیا گولی مارنے کی معقول وجہ ایجاد نہیں کر سکتے۔ تمہارا گاؤں میں کوئی رشتے دار ہے۔ ہم اس لڑکے کو سو روپے دیں گے تو وہ گاؤں جا کے یہی بیان دے گا اور سب کہیں گے شکر ہے جان چھوٹی... تم نے آدھے گاؤں کو تنگ کر دیا ہے۔ تمہاری موت سے وہ سب خوش ہوں گے جن کے سر پہ بال نہیں۔ پھر حوالدار نے سب بتا دیا اور میں نے اسے گولی تو خیر نہیں ماری، اس کی بات ختم ہوتے ہی ریوالور سے مارا اور اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ یہی اوق کی آواز تھی جسے ہمارے گائیڈ نے کریلا بابا کے بھوت سے منسوب کر دیا تھا کہ اس نے حوالدار کو کریلے کا ست پلا دیا تھا۔"

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی..." میں نے کہا۔ "مجھے پہلے ہی شک تھا کیونکہ حوالدار کی نظریں بدلی ہوئی تھیں... ہو سکتا ہے گاؤں والوں کو بھی شک ہو کہ یہ کیسا ایس پی تھا... ادھر سراج کی خبر نہیں ہو کب دوسرے گاؤں سے پولیس کی نفری لے کر پہنچ جائے... گاؤں والے سب بتا دیں گے... ہمارا گائیڈ اسے بھی ادھر لے آئے گا۔"

"چل تو سائیکل اٹھا۔" محسن بولا۔ "میں حوالدار کو اٹھاتا ہوں۔"

"یار... اس مصیبت کو کہاں لے جائیں گے؟" میں نے کہا۔ "اور اس سے چھٹکارا کیسے پائیں گے؟ غالب کا کیا بنے گا؟ جو وہیں پھنسا ہوا ہے۔"

"یہ بعد میں سوچیں گے..." محسن بولا۔ "ابھی تو سڑک تک چل کے دیکھتے ہیں کہ بندوبست کیا کر رہا ہے... اس کے ساتھ کون ہے اور وہ گاؤں سے ہمیں باہر کیوں لے گئے تھے۔"

محسن نے حوالدار کو سائیکل کے ہینڈل پہ ڈالا اور میں نے سائیکل سنبھالی... یہ بہت مشکل کام تھا مگر ہم کسی نہ کسی طرح سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے... یہ مین روڈ نہیں تھی بلکہ کوئی ذیلی سڑک تھی جو قصور کو آنے والی سڑک سے کسی قصبے کو ملاتی ہو گی... سڑک پہ ہُو کا عالم تھا اور دور تک سناٹا تھا جو جنگل میں تھا... دائیں بائیں تا حد نظر کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

"ہمارے گائیڈ کا اندازہ غلط ہو گیا؟" میں نے مایوسی سے کہا۔ "وہ بھی شارٹ کٹ سے لایا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ گاڑی ادھر ہی آئی تھی۔"

"یار سکندر... شارٹ کٹ کو گولی مارو۔" محسن بولا۔ "یہ دیکھو کہ وہ اسٹیشن ویگن کس راستے سے گاؤں پہنچی تھی۔ ظاہر ہے اس راستے سے گاڑی نہیں جا سکتی جس پہ ہم سائیکل چلا کے آئے ہیں۔"

"ہاں... ادھر تو کریلا بابا کا بھوت بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"... تو اس کو سنبھال کے بیٹھ... میں ذرا دیکھ کے آتا ہوں۔"

"صرف دیکھ کے مت آنا۔" محسن بولا۔ "اس سڑک کے راستے گاؤں جا اور غالب کو لے آ... تجھے کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں پڑے گی اور تم دونوں آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچ جاؤ گے۔"

www.paksociety.com

وہ ہمارا انتظار کر رہا ہوگا اور ایسا نہ ہو کسی بڑی مصیبت میں اکیلا گرفتار ہو جائے۔"

"تو آخر وہ کیا کرے گا؟" میں نے سائیکل سے حوالدار کو نیچے گرا کر کہا۔

"میں اس کے ساتھ ایک طرف چھپا رہوں گا۔" مجھی بولا۔ "اسی جگہ سڑک کے کنارے دائیں طرف یا بائیں طرف... جب تو آئے گا تو میں خود باہر نکل آؤں گا — جگہ مت چھوڑنا۔"

میں نے سر ہلایا اور سائیکل بھگا کر سڑک پر ایک فرلانگ گیا۔ پھر واپس آ کے دوسری طرف ایک فرلانگ جانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر گاؤں کی طرف جانے والی کچی سڑک مجھے سو گز پہلے کے نظر آ گئی۔ اس پر جیپ کے ٹائروں کے نشان تازہ تھے اور میں نے غور سے کے پل میں جھک کے دیکھا تو مجھے نشانات سڑک پر بھی دکھائی دیے۔ جیپ سڑک پر آ کے ادھر ہی مڑ گئی تھی جدھر میں جا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ محسن پیچھے بالکل ٹھیک تھا اور یہیں جانا تھا تو بہت کچھ جانا تھا۔ اپنی سراغ رسانی سے مجھے تھوڑی سی خوشی ہوئی۔ اب ہماری سمت کا تعین خود ہو گیا تھا اور دیکھنا صرف یہ رہ گیا تھا کہ راستے پر پیڈرو کتنا آگے ہے۔

واپسی پر سڑک پر میں نے سائیکل کو جیٹ طیارے کی طرح دوڑایا۔ میری طبیعت جولانی پر تھی۔ بہت عرصے بعد مجھے سائیکل پر سواری کا موقع ملا تھا اور آدھی رات کو جنگل میں کوئی دیکھنے والا بھی نہیں تھا۔ میں نے سائیکل کو ہینڈل پر بغیر ہاتھ رکھے چلایا۔ پھر ہاتھ چھوڑنے کے نتیجے میں ایک بار سائیکل بہت بھدے طریقے سے سڑک پر گرا اور باقی راستہ شرافت سے طے کرنے پر مجبور ہوا۔ سیٹی بجانے یا گلا پھاڑ کے گانے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ اس کے باوجود یہ پرلطف ایڈونچر رہا اور جب اچانک پولیس چوکی آ گئی تو میں سمجھ گیا کہ اسٹیشن ویگن جب یہاں سے گزری تھی تو میں نے اس کی آواز سنی تھی لیکن میرے باہر آنے تک اس کی ہیڈ لائٹیں دور نظر آنے لگی تھیں۔

دونوں کانسٹیبل فراغت سے لمبی تان کر سو رہے تھے۔ لیکن اب انہیں اپنے فرض میں کوتاہی پر سزا ملنے کا کوئی موقع نہیں تھا کیونکہ ان کا سونا میرے حق میں نیک فال تھا۔ اور غالب خستہ حال یوں پریشان حال بیٹھا تھا جیسے جنگل کا بچھڑا پہلا دن چرا یا گھر کے پچھواڑے گزار آیا ہے۔

"لیجئے آ گئے تم سکندر اعظم کے خالو۔" وہ مجھے دیکھتے ہی پھٹ پڑا۔

"مشورہ غالب غلط بات مت کرو۔ میری کولٹ باہر سڑک پر کھڑی ہے جو بطور خاص تیرے لیے بھیجی گئی ہے۔"

"بس پانچ منٹ سے وقت آیا تو میں بھاگ جاتا۔" غالب ہانپ کے بولا اور سیٹ پر سوار ہو گیا یعنی سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھ گیا۔

"بھاگ کے آپ کہاں جاتے... میرا مطلب ہے چاروں سمتوں میں سے کدھر کا انتخاب کرتے؟" میں نے کہا۔ "از راہ عنایت آپ ڈرائیور کی سیٹ پر آ جائیے۔"

"یار مجھے ڈبل سواری چلانا نہیں آتی۔" غالب نے احتجاج کیا۔

"مجھے بھی نہیں آتی تھی... لیکن میں نے ابھی کچھ دیر پہلے کارنامہ انجام دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ بھی کوشش کریں... آپ انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔"

"ابھی زبردستی ہے...؟" غالب نے بادل ناخواستہ پچھلی جگہ دی اور پھر سائیکل پر چڑھ گیا۔ "چالان ہو گیا سالا پھر؟"

"چالان کون کرے گا — پولیس سو رہی ہے۔" میں بولا۔

"انہیں میں نے سونے کی اجازت دی تھی۔" غالب نے دانت نکال کے کہا۔ "ورنہ وہ میرے اعصاب پر سوار رہتے... اور مجھے فرار نہ ہونے دیتے۔ میرا ارادہ تھا کہ سراج کا سراغ لگانے نکل جاؤں۔"

"ویری گڈ — آپ مجھ سے مل سکتے ہیں مسٹر شرلاک ہومز آف پاکستان کہ سراغ کدھر ملتا؟" میں نے کہا۔

"شرلاک ہومز کا طریقہ کار یاد کرو... وہ کہتا تھا آپ خود کو مجرم تصور کریں۔" غالب نے کہا۔ "ایک بار اس نے خود کو گھوڑا فرض کر لیا تھا اور پھر وہاں جا پہنچا تھا جہاں گھوڑا گھاس کھا رہا تھا۔ میں بھی یہی تصور کرتا کہ میں ہی سراج ہوں — اگر مجھے فرار ہونا مقصود ہو تو مجھے کدھر جانا چاہیے۔"

"اور آپ کدھر تشریف لے جاتے؟"

"ہم اب بھی ادھر ہی تشریف لے جا رہے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "سراج کو جنگل میں بھٹکنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ الٹا خطرہ تھا کہ ہم اسے پکڑ لیں گے۔ وہ ادھر گیا ہوگا جدھر کچھ ملنے کا امکان تھا — جہاں سے وہ مدد لے سکے۔ اگر وہ گاؤں کی طرف جاتا تو اس کو پھر تم لوگ مل جاتے چنانچہ وہ آیا ہوگا سڑک کی طرف... کہ شاید کوئی آتا جاتا مل جائے جو اسے یہاں سے دور لے جائے۔"

"آپ کو کیا معلوم تھا کہ سڑک کدھر ہے؟"

"وہ اتنا احمق بھی نہیں ہے۔" غالب بولا۔ "اس نے بھی جیپ کی آواز سنی ہوگی اور اندازہ کر لیا ہوگا کہ جیپ کس طرف سے آئی تھی۔"

میرے جسم میں خوف کی ایک سنسنی دوڑ گئی۔ "یار غالب! تو واقعی عقل مند ہو گیا ہے ہماری صحبت میں — میں تیرا مذاق اڑا رہا تھا — سراج ادھر ہی آیا ہوگا اور یا پھر... بس قسمت اچھی تھی کہ میں تجھے لینے پہنچ گیا ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ راستے میں چھپا کھڑا ہوتا اور میرے سر پر پتھر یا کسی شاخ کا بنا ہوا ڈنڈا کھینچ مارتا... میں بڑی بے فکری سے سرکس کا تماشا دیکھتا آ رہا تھا — مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔"

"یہ تو اب بھی ہو سکتا ہے۔ وہ پھر تیرے ساتھ ہیں۔" مرزا غالب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں مرزا — اب وہ نکل گیا۔" میں نے کہا۔ "اور غالباً پیڈرو سے جا ملا۔"

سائیکل کا ہینڈل ڈگمگایا اور دوسرے ہی لمحے ہم دونوں سڑک پر گرے۔ میرے لبوں سے پیڈرو کا نام سن کر مرزا غالب اتنے حیران ہوئے تھے کہ ہینڈل چھوٹ گیا تھا... اور انہوں نے ہینڈل تک چھوڑ دیا تھا — جب ہم پھر روانہ ہوئے تو میں نے ڈرامائی انداز میں مرزا غالب کو مختصراً پیڈرو کے بارے میں بتایا کہ یہ کرنا یاد ہے ہم گاؤں سے چپ چاپ فرار ہونے گیا تھا... اور اب دیکھنا یہ ہے کہ کیوں لے گیا تھا — اور کہاں لے گیا تھا؟

"عجیب چکر ہے یہ تو۔" مرزا غالب نے کہا۔ "وہ خبیث اس گاؤں میں کیسے پہنچا؟"

"گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس محاورے کے استعمال کی یہاں کیا تک تھی؟" غالب نے کہا۔

"تمہارے سوال کی بھی کوئی تک نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں بھائی... معلوم نہیں تقدیر کو آگے کیا منظور ہے... جیسے وقت پر سراج ہاتھ سے نکل گیا... اور اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ادھر ہی جانا ہے ہمیں — جدھر سراج کے ساتھ پیڈرو بھی گیا... اور ان کا تیسرا ساتھی بھی جس کا نام میں ابھی نہیں جانتا مگر وہ حوالدار بھی ہو سکتا ہے اور نواب خسرو جمشید بھی — میں نے دیکھا ہے کہ وہ گاؤں سے پانچ جوانوں کو لے کر ادھر گئے تھے... ممکن ہے آگے وہ ہمارے استقبال کے لیے موجود ہوں۔"

"اب تو دو گھنٹے ہونے کو ہیں..."

"ہاں... لیکن مجھے امید ہے کہ وہ ملیں گے — ان کا کام لمبا اور محنت طلب تھا ورنہ وہ گاؤں تک آتے اور مردوں کے جلنے کا انتظار نہ کرتے۔ وہ خود ہی کر لیتے۔" میں نے کہا۔ "مجھے یاد آتا ہے کہ ان کی کوئی اسٹیشن ویگن جیپ سڑک پر کھڑی ہے

ٹرک کا ٹائر راستے میں کھل گیا یا انجن ٹوٹ گیا اور ٹرک اُلٹ گیا... یا مال بردار ٹرک بے قابو ہو کے سڑک سے نیچے اتر گیا... نشیب میں چلا گیا یا کسی ایکسیڈنٹ میں ان کا مال سڑک پر گر گیا — وہ دو آدمی... ٹرک ڈرائیو کر رہے تھے۔

ان کے لیے اکیلے ٹرک کا لوٹ سمیٹنا پھر اٹھا کے ٹرک پہ لادنا بہت مشکل تھا... وہ تھوڑے کا کوئی تو پیچ ہو جاتی۔ وہ راتوں رات کام ختم کر کے راستہ صاف کر دینا چاہتے ہوں گے... اور اسی لیے وہ تیسری گاڑی سے لیبر فورس لے گئے۔"

"تیری بات دل کو لگتی ہے عزیز من!" مرزا غالب نے کہا۔ "پھر لگتی کوئی ایسی ہی بات... جو ابھی بچ جاتی ہو — ابھی ٹریک کر کے ان کا سراغ مل جائے جس کو ہم تلاش کر رہے تھے — اور بڑی بات کہ جب ہم ان سے ملیں گے تو وہ مل کر ہمارا سراغ مٹا دیں گے۔ پیڈرو اور سراج جیسے دشمن اور ان کے دو ساتھی مل کر چار افراد ہوئے... ایک ٹرک اسلحے کا بھی ہے ان کے پاس اور ہم اس طرح پیچ تیچ کرتے ہوں گے تو وہ اتنے خوش ہوں گے کہ ایک آدمی پیدا ہو کے ہم پھینک کر سلامی دیں گے — اب کیا خیال ہے وہ گیدڑ اور شہر والا محاورہ ہم پر صادق نہیں آتا؟"

"آتا ہے — مگر ہم مجبور ہیں۔" میں نے کہا۔ "جو راہ ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کے جاتی ہے... یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم مخالف سمت میں بھاگ جائیں — ایک تو... سوری... مرسڈیز کے علاوہ ہمارے پاس تین ریوالور ہیں — ہم اتنے بے وقوف بہرحال نہیں ہیں کہ سڑک پر سیدھے چلتے جائیں گے۔ ہم چھپ چھپا کے سفر کریں گے مجھے امید ہے کہ ایک میل سے پہلے وہ ضرور ملیں گے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جا چکے ہوں۔" غالب نے کہا۔

"تب بھی ان کا سراغ تو ملے گا۔"

"سراغ کا ہم کیا کریں گے؟ چاٹیں گے؟" غالب بولا۔ "لیلیٰ نہ ملی تو اب لکیر پیٹا کرے۔"

"ہم لکیر کے فقیر ہیں... سانپ کی لکیر پہ چل پڑیں گے۔" میں نے کہا۔ "تیری باتیں تو حوصلہ شکن ہیں مگر اس سے زیادہ حوصلہ افزا بالجر کا خیال ہے۔"

"میں سوچ رہا تھا کہ تو نے اتنی دیر سے اس کی بات نہیں کی — تجھے تو صرف اسی کا خیال ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "جیسے قیس پھرتا تھا محمل لیلیٰ کے اونٹ کے پیچھے... تو ذرا انجر جا اپنی لیلیٰ کے پیچھے جو باڑے کے ڈھیر میں یا ملبے کے ساتھ کسی تابوت میں ٹرک پہ رواں ہے — ہم مارے جائیں گے تیرے اس عشق میں — بھلا مجھے کیا پڑی ہے کہ میں سائیکل لے کر ٹرک کے پیچھے دوڑوں... آرام سے گاڑی پکڑ کے کراچی نہ چلا جاؤں۔"

www.paksociety.com

جہاں وہ بندھا تھا، یہ سنسنی خیز انداز ہے ۔۔۔ یہ ایم ایس نا ہو
دیکھا جائے۔ اس کی یہ بات اس گھٹی رہی ہماری دوستی بکھرا گئی وہیں ہم سڑک
پر اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں میں نے محسن کو چھوڑا تھا ۔۔۔ وہ ایک دم ہمارے سامنے آ گیا۔
"آ گئے تم لوگ ۔۔۔ میں سخت پریشان تھا۔" محسن نے گھبراہٹ میں کہا۔ "بہت گڑبڑ ہو گئی ہے۔"
"کیسی گڑبڑ ۔۔۔؟" میں نے محسن کی بدحواسی دیکھ کر کہا اور سائیکل کو ایک طرف پھینک دیا۔ "آرام اور حوصلے سے بات کرو۔"
"ادھر آ جاؤ یار۔" محسن نے سڑک کے دوسری جانب اشارہ کیا۔
"کیا وہ حوالدار بھی بھاگ گیا؟" میں نے قیاس آرائی کی۔
"وہ ۔۔۔ وہ تو مر گیا یار۔" محسن نے کہا۔ "سڑک کے اس طرف وہیں پڑا ہوا ہے ۔۔۔ جہاں پہلے تھا۔" وہ ایک سڑک سے نیچے اتر گیا تھا۔
"کیسے مر گیا؟ تو نے مار دیا ۔۔۔؟" میں اس کے پیچھے چلتا گیا۔
محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اسے باندھ کے اُدھر گیا تھا۔" اس کے ہاتھ کا اشارہ اسی سمت کو ظاہر کرتا تھا جدھر سے ہم آئے تھے۔
"باندھا کیسے تھا؟" میں نے کہا۔
"اسی کے کپڑے پھاڑ کر ۔۔۔" محسن بولا۔ "میں نے سوچا کہ آدھے گھنٹے سے پہلے تم آؤ گے نہیں ۔۔۔ کیوں نہ میں ذرا دریا تک جا کے دیکھ لوں ۔۔۔ اور میں اُدھر ہی چل پڑا۔ ادھر تو گیا تھا ۔۔۔ کچی سڑک مجھے سوکھا تو گز بجل کے نظر آ گئی تھی ۔۔۔ میں نے غور سے دیکھا تو جیپ کے ٹائروں کے نشانات بھی مل گئے۔ وہ ابھی تک دیکھی اسی سمت میں گئی تھی ۔۔۔ میں چلتا رہا۔ پھر اچانک میرے کانوں نے ایک آواز سنی ۔۔۔ میں فوراً چھپ گیا۔ آواز دوبارہ سنائی دی تو میں آگے بڑھا ۔۔۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی کراہ رہا ہو ۔۔۔ اور معلوم ہے میں نے کیا دیکھا ۔۔۔ کون تھا وہ؟"
"یار، مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟" میں نے چڑ کر کہا۔ "خواہ مخواہ سسپنس مت پیدا کرو۔"
"یار ۔۔۔ وہ کیتھرین تھی۔" محسن ایک دم رک گیا۔ "وہ سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔"
میں بھی ایک دم رک گیا ۔۔۔ غالب بھی ایک دم رک گیا۔ ہمارا سانس بھی رک گیا۔ میرے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ غالب کی آواز بھی بند ہو گئی۔
"وہ ۔۔۔ وہ زندہ ہے۔" محسن نے ہانپتے ہوئے کی حالت میں دیکھ کر کہا۔
"تو وہ کہاں ہے؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی کی۔
"اُدھر ۔۔۔ جھاڑیوں کے پیچھے۔" محسن بولا۔ "میں بہت ڈر گیا تھا ۔۔۔ اسے اٹھا کے واپس دوڑا اور یہاں لے آیا ۔۔۔ وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔"
"چل ۔۔۔ چل آگے چل۔" میں نے کہا۔
"اس حوالدار کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔" محسن آگے چلتے بولا۔
میں سمجھ گیا، غالب مجھ سے ٹکرا گیا۔ "سانپ؟"
"ہاں یار ۔۔۔ میں کیتھرین کو لے کے ادھر ہی آ گیا تھا۔ وہاں جا کے دیکھا تو وہ الٹا لیٹا ہوا تھا۔" محسن بولا۔ "مجھے کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی ۔۔۔ دیکھا تو ایک کالا سا گھاس میں غائب ہو رہا تھا۔ چند منٹ میں وہ مر گیا ۔۔۔ معلوم نہیں وہ کون سا زہریلا سانپ تھا ۔۔۔ پھر میں ادھر نہیں رکا ۔۔۔ اس ڈر سے کہ گاؤں کی طرف سے کوئی نہ آ جائے ۔۔۔ وہ سب اس کی لاش کے لیے جائیں گے۔"
"قریب ستراری لیے قدرت نے۔" میں نے کہا اور جھک کر کیتھرین کو دیکھنے لگا۔ وہ بے ہوش تھی اور اس کے سانس کی رفتار میں بھی بے قاعدگی تھی۔ اس کی نبض بھی سست تھی۔ اس کی بے ہوشی کی نوعیت کا اندازہ کرنا مشکل تھا لیکن ایسا لگتا آ رہا تھا کہ وہ زخمی نہیں ہے۔
"اب تو شک کی کوئی بات نہیں رہی۔" میں نے کہا۔ "وہ یہاں اِدھر سے گزرے تھے اور شاید اب بھی کہیں قریب ہی ہوں گے۔"
محسن نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس کے جسم پر تشدد کے نشانات ہیں۔ میں نے غور سے دیکھی تھی ۔۔۔ پرانے نیل گہرے زخم بھی تھے لیکن اب وہ مندمل ہو چکے ہیں۔"
"کیتھرین کے مرنے کا اندیشہ تو نہیں ہے؟" غالب نے کہا۔
"اگر اسی جگہ اسی طرح پڑی رہی تو یقیناً مر جائے گی۔" محسن بولا۔ "اسے فوری طبی امداد ملنی چاہیے۔"
"یہاں تو کچھ بھی نہیں ملے گا ۔۔۔ اور جہاں سے آئے ہیں وہاں اب ہم لوٹ کر نہیں جا سکتے۔" میں نے کہا۔
"صبح تک انتظار کرنے کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے کہ صبح کوئی ٹرانسپورٹ مل جائے۔" محسن نے کہا۔ "اسے لاہور پہنچا سکیں۔"
"میں اسے سائیکل پہ ڈال کے لے جاؤں ۔۔۔؟"

ہے کہا۔
"کیا فائدہ ۔۔۔ یہاں آ رہے لیتی ہوتی ہے ۔۔۔ ایسا تو کچھ بھی بات ہی ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "بظاہر مجھے کوئی تشویش کی بات نظر نہیں آتی۔"
"مجھے تشویش اس بات پر ہے کہ اسے یہاں کیوں پھینک دیا گیا تھا۔" محسن بولا۔ "وہ خبیث اسے ساتھ لائے تھے تو ساتھ لے جا سکتے تھے۔"
"میدانِ جنگ کی تاریخ میں ایسے واقعے ملتے ہیں کہ کہیں بہت زیادہ قیدی ہاتھ آ گئے اور ان کو اسیر رکھنا مسئلہ بن گیا کیونکہ جتنا راشن فوج کے لیے ضروری تھا، وہ قیدی کھا جاتے تھے چنانچہ ایک حکم کے ذریعے بوڑھوں، کمزوروں یا بیماروں کو قتل کرا دیا گیا ۔۔۔ پھر بچے وہ اور صحیح سال کے لڑکوں کو ۔۔۔ صرف جوان اور تندرست باقی بچے جو قلعوں کی مشقت جھیل سکتے تھے اور جن کو ہر قسم پانی سے کام لیا جا سکتا تھا۔" میں نے کہا۔
"تیرا مطلب ہے، اس کمزور اور بیمار بڑھیا کو وہ بے مصرف سمجھ کر پھینک گئے ہوں گے؟" محسن نے کہا۔
"ہاں ۔۔۔ بے کار بوجھ اٹھائے پھرنے سے کیا حاصل ۔۔۔؟"
"مگر کیتھرین کے ذریعے وہ اچار بازار پر قرار رکھ سکتے تھے۔" غالب نے مجھ سے اختلاف کیا۔ "ان کے ہاتھ میں تین قیدی تھے، رابعہ، نینڈی اور کیتھرین ۔۔۔ اور یہ جانتے ہیں کہ ہمارے لیے سب کی زندگی اور آزادی یکساں اہمیت رکھتی ہے ۔۔۔ وہ ایک پتا ضائع کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔"
محسن نے بھی اس کی تائید میں سر ہلایا۔ "غالباً کیتھرین موقع پا کے خود کسی گاڑی یا ٹرک میں سے کود گئی ۔۔۔ یہ بے ہوشی اسی کا نتیجہ ہے۔"
"کیا انھیں یہ معلوم نہیں ہوا کہ ایک قیدی فرار ہو گیا ہے؟" میں نے کہا۔
"ممکن ہے معلوم ہوا ہو ۔۔۔ اور انھوں نے گاؤں سے پانچ آدمی اسی لیے حاصل کیے ہوں کہ مفرور قیدی کو تلاش کریں۔" غالب نے کہا۔
"پھر کیتھرین انھیں ملی کیوں نہیں؟" میں نے کہا۔ "جب کہ وہ محسن کے بیان کے مطابق سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔"
"ممکن ہے تب تو خود کیتھرین ہوش میں رہی ہو اور بعد میں ہی بے ہوش ہو گئی ہو۔" غالب نے کہا۔ "لیکن میرے نزدیک محسن کی بات زیادہ صحیح ہے۔ کیتھرین نے اگر کسی تیز رفتار ٹرک میں سے چھلانگ ماری ہو گی تو وہ سڑک پر گرتے ہی جنگل میں غائب ہو گئی ہو گی۔ اس ڈر سے کہ شکاری اسے تلاش کرتے ہوئے ضرور آ جائیں گے ۔۔۔ کیتھرین آسانی سے ان کے ہاتھ نہیں آنا چاہتی تھی ۔۔۔ یہ بھی کیتھرین ہوش میں آ کے بتلائے گی کہ اس کے ساتھ رابعہ اور نینڈی بھی تھیں یا نہیں اگر تھے تو انھیں لے جانے والے کون تھے اور کہاں لے جا رہے تھے۔ ہم صرف قیاس کر سکتے ہیں کہ کسی طرح کیتھرین اپنے مقصد میں تو پہنچنے میں کامیاب ہو گئی اور موقع پاتے ہی ٹرک یا گاڑی سے باہر کود گئی کچھ دیر جنگل میں روپوش رہی لیکن جب اس کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو وہ پھر سڑک پہ آ گئی۔ وہ جنگل میں پڑی رہتی تو کون دیکھتا ۔۔۔ مرنے کے بعد اس کی لاش کو بھی چیل کوے اور جنگلی جانور کھا جاتے ۔۔۔ سڑک پہ ایک امکان تو تھا کہ اسے کوئی اٹھائے گا۔ اٹھانے والے خود شکاری ہوں گے تو اس کی بدقسمتی ۔۔۔ کسی اجنبی نے اٹھا لیا تو کہیں نہ کہیں ضرور لے جائے گا ۔۔۔ جہاں وہ محفوظ ہو گی۔"
مجھے غالب کی دلیل نے قائل کر لیا۔ شاید اسی لیے وہ گاؤں کے پانچ چھ جوانوں کو لے گئے ہوں گے ۔۔۔ وہ خود جنگل میں کہاں کہاں جاتے ۔۔۔ اور جاتے تو یہ ڈر بھی ہوتا کہ راستہ بھول جائیں گے ۔۔۔ چنانچہ انھوں نے مقامی افراد کی خدمات حاصل کرنا بہتر سمجھا جو اس جنگل کے راستوں سے واقف ہوں ۔۔۔ کم سے کم چار وہ خود تھے ۔۔۔ چھ کے بجائے ان کو پانچ آدمی ملے مگر اس طرح وہ نو افراد ہو گئے۔ جن کے لیے جنگل کو چھاننا نسبتاً آسان تھا۔
"یار، ان قیاس آرائیوں میں وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل؟" محسن نے کہا۔ "یا تو کیتھرین کے لیے کچھ کرو یا آگے چلنے کا فیصلہ کرو۔"
"تم کیتھرین کو کندھے پہ ڈال کے لے جا سکتے ہو؟" غالب بولا۔
"کہاں؟ لاہور؟"
"نہیں ۔۔۔ ادھر چلے جاؤ ۔۔۔ آبادی سڑک کے ایک طرف تھی تو دوسری طرف بھی ہو گی ۔۔۔ صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ یہاں کھیت بھی ہیں ۔۔۔ کسان نظر آنا شروع ہو جائیں گے۔" غالب نے کہا۔
"میں اسی جگہ صبح کا انتظار کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔" محسن نے کہا۔
"اچھا تو تم ذرا چھپ کر رہو ۔۔۔ میں اور سکندر آگے چلتے ہیں۔" غالب نے کہا۔
"یار ۔۔۔ ایسے اکیلے اکیلے مت جاؤ ۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بھی بچھڑ جائیں جیسے دوست بچھڑے ۔۔۔" محسن بولا۔ "جیسے ماں باپ بچھڑے ۔۔۔ پھر دوست مہربان بچھڑے، جیسے انکل رضوی اور انکل شیخ ۔۔۔ اس کے بعد نازو اور شہلا نے ساتھ چھوڑا ۔۔۔ رابعہ اور نینڈی بچھڑے۔"
"کیا ہو گیا ہے تجھے ۔۔۔ تو طبیعت کا مریض یا شاعر کب سے ہو گیا؟" میں نے کہا۔ "ملنا بچھڑنا تو زندگی کے کھیل ہیں ۔۔۔ خدا نے چاہا تو سب بچھڑے ہوئے ملیں گے ۔۔۔ انتظار کیجیے

www.paksociety.com

صبر کی ضرورت ہے ــــ وقت پہلے ایک سا نہیں رہا تو آگے کیوں رہے گا ـــ دن رات ہمیشہ ایسے نہیں ہوں گے ... جہاں تک ماں باپ کا تعلق ہے تو انھیں خدا نے بلا لیا ـــ اس کی مرضی۔ شہلا تو خیر سے اپنے ہی گھر میں ہے ـــ نازو بھی بھائی کے ساتھ جانے کے انتظار میں ہے ـــ کیتھرین واپس آ گئی ہے ـــ رابعہ اور ٹیڈی کو بھی ہم لے آئیں گے ـــ ایسی مایوسی کی باتیں مت کرو جو حوصلے بھی کم کریں۔"

"حفاظت ہو یارــــ بس میں ڈرنے لگا ہوں وقت سے۔"

محسن بولا "ہم چاروں کوشش تو کر سکتے ہیں ساتھ رہنے کی۔"

میں اسے کوئی جواب ضرور دیتا لیکن روشنی کا ایک کوندا سا لپکا اور ... ہم سب اچھل پڑے۔

"یہ کیا تھا ...؟" میں نے اٹھتے ہوئے آسمان کو دیکھا۔

"... میں تو سمجھا تھا ... بجلی چمکی ہو گی ـــ مگر بادل دور دور تک نہیں ہے" محسن بولا۔

غالب نے مشرق کی جانب اشارہ کیا ـــ درختوں کے اوپر روشنی کبھی کم اور کبھی زیادہ ہو رہی تھی ـــ ہم سب ایک ساتھ سڑک کی جانب لپکے ـــ اتفاق رائے سے ہم سب کے ذہن نے ایک ہی بات سمجھ لی تھی ـــ روشنی کسی گاڑی کی تھی ـــ پہلی بار وہ کوندا سا اس لیے نظر آیا تھا کہ گاڑی نے کوئی موڑ کاٹا تھا اور اس وقت سڑک بلندی پر تھی ـــ اب وہ گاڑی ہماری طرف آ رہی تھی اور اس کی ہیڈ لائٹس نے درختوں کے اوپر اجالا کر دیا تھا ـــ جھٹکوں سے گاڑی اوپر نیچے ہوتی تھی تو روشنی کم زیادہ ہوتی نظر آتی تھی۔

"ایسے بے وقوفوں کی طرح سڑک پہ دوڑنا مت شروع کر دینا" غالب نے کہا۔

"تم ادھر سڑک سے بس گز دو گز دور رہو" محسن بولا "میں دوسری طرف اتنے ہی فاصلے پہ رہتا ہوں ـــ آگے بڑھتے جاؤ ... گاڑی یہیں اس جگہ سے جتنا آگے ملے اچھا ہے۔"

"سکندر تم ہم دونوں کے پیچھے آؤ ـــ دونوں کو نظر میں رکھتے ہوئے کوئی سگنل ہم کر دیں" غالب نے کہا "کیا معلوم کس کی گاڑی ہے۔"

"اگر ... اگر یہ وہی ہوئے ـــ شکاری ـــ" میں نے ڈرتے ہوئے کہا "تو ہم کیا کریں گے؟"

"ماریں گے یا مر جائیں گے" غالب نے جھنجلا کے کہا ... "تیسری صورت صرف یہ ہے کہ دم سادھ کے لیٹے جائیں اور گاڑی کو گزر جانے دیں۔"

محسن سڑک پار کر گیا تھا اور میں اس کے سامنے کو درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں آگے بڑھتا دیکھتا رہا ـــ غالب کا اور میرے درمیان بھی اب دس گز سے زیادہ فاصلہ ہو گیا تھا ـــ وہ دونوں بڑی احتیاط کے ساتھ قدم بڑھا رہے تھے لیکن راستہ دشوار تھا ـــ گاڑی اب بہت قریب آ چکی تھی ـــ اس کی ہیڈ لائٹس صاف نظر نہیں آتی تھیں لیکن انجن کی آواز سنائی دینے لگی تھی یہ آواز رفتہ رفتہ قریب آتی محسوس ہوتی تھی۔ غالباً آگے کوئی موڑ تھا ... اچانک غالب کسی چیز سے ٹھوکر کھا کے گرا ـــ اسی وقت میں نے گاڑی کی روشنی دیکھی۔

صرف ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر ایک خاصا بڑا پتھر اٹھا لیا ـــ امکانات ہر صورت میں برابر تھے۔ یہ گاڑی وہی ہو سکتی تھی جس میں بیٹھ کے اپنے ساتھ کیتھرین کو لے کر کہیں جا رہا تھا اور اسے جھٹکنے پہ مجبور ہو گیا تھا یا وہ خود جان کی پرواہ کرتے ہوئے گاڑی میں سے چھلانگ لگانے پہ مجبور ہو گئی تھی ـــ اگر ٹیڈی اور رابعہ بھی اس گاڑی میں تھے تو غالباً یہ گاڑی انھیں کسی محفوظ قید خانے میں چھوڑ کے واپس آ رہی تھی ... ایسی صورت میں میرا سڑک کے کنارے کھڑا ہو کے گاڑی کو رکنے کا اشارہ کرنا خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے کے مترادف تھا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ گاڑی میں شکاری نہ ہوں مگر شدا یجود جنگل میں گاڑی رکنے کا خطرہ مول نہ لے ... گاڑی کے قریب آنے تک میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے ـــ اگر اس میں شکاری ہوں گے تو میں پلٹ کر جنگل میں مسلسل بھاگتے ہوئے اپنے دوسرے ساتھیوں سے دور لے جانے کی کوشش کروں گا ... شاید میں درختوں کی بھیڑ میں گم ہو جاؤں یا کسی درخت پہ چڑھ کے بچ جاؤں ـــ وہ گاڑی چھوڑ کر زیادہ دیر تک اور بہت اندر آ کے میری تلاش نہیں کریں گے ـــ اگر یہ کسی عام آدمی کی گاڑی ہوئی تو خود ہی رک جائے گی۔

گاڑی بالکل میرے سامنے تھی جب میں نے وہ لاش دیکھی جس سے ٹھوکر کھا کے غالب گرا تھا لیکن اب اس کے بارے میں غالب سے بات کرنے کا وقت ہی نہیں تھا ـــ میں نے ہاتھ گھما کے پتھر کو جو گاڑی کے ونڈ شیلڈ پر پڑے زور سے لگا ـــ چند انچ کے فرق سے ونڈ اسکرین بچ گیا مگر شیشہ بالکل ریزہ ریزہ ہو کے بکھر جاتا۔ کچھ پتھر کی رفتار تھی جو ایک سمت میں جا رہا تھا ـــ گاڑی مخالف سمت سے آئی۔ چنانچہ جتنی بھی قوت کی رفتار سے لگا اور ونڈ شیلڈ پر ایک دھماکا ہوا ـــ یہ صبح کاذب سے پہلے کا وقت تھا ـــ اب ہوا بھی تھم چکی تھی اور جنگل آخر شب کے سکوت میں ڈوبا ہوا تھا اس خاموشی میں یہ آواز مجھے کچھ زیادہ ہی اونچی لگی ـــ ایک جھٹکے میں گاڑی میرے سامنے آ گئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا ـــ دودھ لانے لے جانے والا ٹرک تھا ـــ نئے ماڈل کا بیڈ فورڈ ٹرک جس کے پچھلے حصے پہ دودھ کے ڈرم تین منزلوں میں ایک کے اوپر ایک لگے ہوئے تھے ـــ لوہے کے فریم پہ تختے لگا کے ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ ڈرم اٹھائے بغیر کھسکا کے آگے پیچھے کیے جا سکتے تھے اور بھرا یا خالی ڈرم نیچے گرنے کا خطرہ نہ ہو ... ٹرک پہ دودھ لے جانے کی گنجائش میں کچھ ہو گئی تھی۔

پتھر لگتے ہی گاڑی لہرائی اور کچھ بے قابو ہوئی مگر ڈرائیور نے اسے سنبھال لیا۔ اس ٹرک پہ سے وہ بہر طور گزرتا ہو گا ... اور چونکہ خالی راستے پر اسے کوئی بھی نہیں ملتا ہو گا ـــ بم کی طرح پھٹنے والے پتھر کے دھماکے سے اس کا چونک اٹھنا اور بوکھلا جانا ہوتی تھا ـــ ٹرک کو رکتے ہی وہ ایک زبردست گالی دے کر نیچے اترا ـــ اسی وقت میں سڑک پہ آ گیا۔

"تو ماریا سی ڈنڈا ـــ؟" وہ مشتعل ہو کے میری طرف بڑھا۔

"ہاں ... پتھر میں نے سڑک پہ پھینکا تھا" میں نے بھی پنجابی میں ہی جواب دیا "تم کو کیا ضرورت تھی رات میں ٹرک لے کر آنے کی؟"

وہ پھر بھڑکا "پاگل ہوئے ... تو پاگل تے نہیں؟"

"نہیں" میں نے کہا "جھوٹا ناحق کی جھڑپ ـــ ایک پاؤ تازہ دودھ تو دو۔"

اس نے مجھے ایک گالی اور دی اور آگے بڑھا "بیڑا غرق کر دیا گاڑی کا اور اوپر سے مذاق کرتا ہے۔"

میں نے اطمینان سے ریوالور نکال لیا "یہ مذاق نہیں ہے پہلوان۔"

اس کا منہ کھلا رہ گیا اور وہ دہیں منجمد ہو گیا "کیا چاہیے تم کو ... میرے پاس ... یہ سو سوا سو روپے ہیں۔"

غالب میرے ساتھ ہی نکل آیا تھا ... دوسری طرف سے محسن پولیس کی وردی میں نمودار ہوا تو پہلوان کی حالت غیر ہو گئی۔

"معاف کرنا پہلوان" میں نے کہا "تم کو روکنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کرنے پہ مجبور رہے ... ہم گولی مار کے ٹائر پھاڑتے تو شاید ٹرک الٹ جاتا۔"

"لیکن ... میری غلطی جناب" وہ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔

"گھبراؤ نہیں" محسن نے اس کے کندھے پہ تھپکی دی۔ "یہاں کچھ قاتل لاش ڈال کر گئے ہیں ... اور چند وارداتیں بھی ہوئی ہیں ـــ ہم صرف تفتیش کے لیے رکے ہوئے ہیں۔"

"کیسی وارداتیں؟ اور میرا کیا تعلق جناب ...؟" وہ ہکلانے لگا۔

"تم سے جو پوچھا جائے اس کا جواب دو" محسن نے ڈانٹ کر کہا "یہ بتاؤ تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

"ادھر سات میل دور موضع ڈالیاں خورد سے" وہ بولا "میں روز اسی وقت دودھ لے جاتا ہوں۔"

"اس سات میل کے راستے پہ تم نے کوئی گاڑی دیکھی؟" میں نے کہا۔

"گاڑی ... کیسی گاڑی جناب؟"

"کوئی ٹرک یا بس ویگن ... کار یا جیپ ...؟" میں نے کہا۔

"دیکھی تو ہے" وہ بولا "جب میں پکی سڑک سے کچھ دور تھا تو ایک گاڑی دوسری طرف جا رہی تھی" وہ بولا "اس کی بتیاں نظر آئی تھیں۔"

"اس سے تمھیں کچھ اندازہ نہیں ہوا؟" میں نے کہا "کہ گاڑی چھوٹی ہے یا بڑی ... کار اور ٹرک میں تو بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"ہاں جی ـــ کار تو خیر وہ نہیں تھی" وہ بولا "اس کی بتیاں اونچی ہی تھیں ... میرا خیال ہے کہ وہ لاری تھی ـــ یہ ادھر تو اس وقت کوئی مسافروں والی لاری نہیں جاتی ـــ ہو سکتا ہے کسی کی جنج ہو ... سب خیر کرے ... کسی کی میت آئی ہو ... آگے بھی پہنچ گئی۔"

"تمہارا گاؤں ڈالیاں خورد سڑک سے کس طرف ہے؟"

"ادھر سے جاتے ہوئے کھبے ہتھ ہے" وہ بولا "دو میل کا کچا راستہ ہے۔"

"تمھیں یقین ہے کہ وہ لاری تمہارے گاؤں میں نہیں گئی ہو گی؟"

"نہیں جناب ... ڈالیاں خورد جانے کا تو وہی ایک راستہ ہے جس پہ میں آ رہا تھا" وہ بولا "وہ لاری یا تو سیدھی گئی ہو گی یا پھر ... اس سے آگے فضل پور چک ہے ... یا جوگی نگر۔"

"اچھا ... ادھر آؤ میرے ساتھ ..." میں نے کہا اور سڑک سے کوئی بیس گز اندر جنگل لے گیا جہاں ایک لاش پڑی ہوئی تھی "یہ کون ہے؟"

گوالے کا رنگ لاش دیکھتے ہی فق ہو گیا تھا "یا رب ... خیر ... آج تو مجھے ہوا ہے وحشت پڑ گیا ہے ـــ بادشاہو میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ یہ کون ہے ...؟"

"تم اس علاقے کے رہنے والے ہو ... لوگوں کو پہچانتے نہیں ہو ...؟"

"قسم ہے سچے رب کی تھانیدار صاحب ... میں نے اسے

www.paksociety.com

"پہلے نہیں دیکھا — میں تو اپنے سامنے پنڈ کے ہر بندے کو نہیں پہچانتا... جب یہ کس پنڈ کا تھا...؟"

"تم دیکھتے ہو کہ اسے قتل کیا گیا ہے — یہ دیکھو گولی کا نشان — یہ کوئی دیہاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا سڑک پر آگے تم نے کسی کو گزرتے ہوئے دیکھا تھا...؟ جھوٹ مت بولنا..."

وہ قسمیں کھانے لگا کہ اس نے سڑک پر کسی کو بھی نہیں دیکھا۔

"اچھا — کہیں ایسی ہی کوئی لاش دیکھی؟"

"لاش!" وہ اچھل پڑا۔ "توبہ توبہ... یہ بھی آپ نے دکھائی ہے ورنہ میں تو گاڑی چلاتے ہوئے سڑک پر نظر رکھتا ہوں... اور بھی کوئی مارا گیا ہے کہیں...؟"

"ہاں بھئی... اندازہ ہے کہ اس واردات میں پانچ افراد کو قتل کیا گیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "ایک پولیس کا حوالدار بھی غائب ہے۔"

"بچے... بچہ بندے... کوئی زمین کا جھگڑا تھا... یا دشمنی کا...؟"

"وہ ڈاکو ہیں — جیل سے فرار ہوئے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اطلاع ملی تھی کہ ادھر آگئے ہیں — ہم نے ناکہ بندی کی مگر وہ کم بخت ہماری گاڑی لے کر فرار ہوگئے — خیر اب تم برے وقت پر آئے... وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے — چلو بھئی۔" محسن نے مجھے بڑے رعب سے اشارہ کیا۔

"کیا... کیا میری گاڑی...؟" گوالا پریشان ہو کے بولا۔ "مجھے یہ دودھ پہنچانا تھا جناب...؟"

"دودھ کا بچہ۔" محسن نے گرج کر کہا۔ "تیرے نزدیک اس دودھ کی قیمت انسانوں کے خون سے زیادہ ہے؟ آگے وہ نہ جانے کتنے انسانوں کی جان لیں گے — ان کو روکنا بہت ضروری ہے — یہی لے جاؤ۔"

"دیکھو پہلوان!" غالب نے دودھ والے کو ایک طرف لے جا کے سمجھانا شروع کیا۔ "یہ تو ایس پی صاحب بہت نیک دل اور شریف آدمی ہیں... ورنہ اتنے بڑے افسر کے سامنے زبان چلانے والوں کی زبان کاٹ دی جاتی ہے — یہ گاڑی اب سرکاری ڈیوٹی کے لیے استعمال ہوگی۔ دوسرے افسر تو جسے چاہیں بیگار میں پکڑ لیتے ہیں مگر ایس پی صاحب کسی کا نقصان نہیں کرتے اور کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے — تمہارا دودھ ضائع ہوگا تو — تم کو اس دودھ کی پوری قیمت مل جائے گی۔"

"پوری قیمت ملے گی — پھر تو کوئی بات نہیں۔" گوالے نے کہا۔ "گاڑی حاضر ہے سرکار... مگر آپ کو اس طرح مانگنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

میں نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکالا... "یہ اس کا مال تھا۔ یہ سو روپے اس نقصان کے جو پتھر پھینکنے سے ہوا۔ دودھ کی مالیت بتاؤ۔"

"دودھ...؟" وہ دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے بولا۔ "ساڑھے تین... نہیں... چار سو — کچھ اوپر۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اصل لاگت تین سو ہوگی تو اس نے ساڑھے تین کہے... وہ اسے کم لگے تو اس نے چار سو کہے — پھر سوچا کہ کچھ اور بھی مانگے میں ہرج کیا ہے۔ لوڈ ٹرک میں استعمال ہونے والے ٹرک پیٹرول ڈیزل ٹوٹے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر اس نے ایک پتھر لانے کا جرمانہ سو روپے تو خوشی خوشی رکھ لیا۔ اسے مزید خوش کرنے کے لیے میں نے دودھ کی قیمت کے بھی پانچ سو دے دیئے تو اس کا سارا گلہ شکوہ جاتا رہا۔

"اب ذرا دھیان سے میری بات سنو۔" غالب بولا۔ "تم ایک خطرناک سرکاری مہم میں شریک ہو... خطرہ سب کے لیے برابر ہے لیکن زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے — اللہ نے چاہا تو ہم ان بدمعاشوں کو پکڑ لیں گے — تم کو کچھ نہیں کرنا ہے سوائے اپنا منہ بند رکھنے کے — جو کچھ تم دیکھو گے اس کے متعلق نہ تم ہم سے کوئی سوال کرو گے اور نہ آج کے بعد کسی سے کچھ کہو گے... اگر تمہاری زبان بند نہ رہی تو معلوم ہے کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا جی...؟" گوالا ڈر گیا۔

"وہ قاتل تمہارے پیچھے لگ جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "بات ایک زبان سے نکلتی ہے تو دس کانوں تک پہنچتی ہے اور دس زبانوں سے نکلتی ہے تو سو کان سنتے ہیں — ان خطرناک لوگوں کو معلوم ہوجائے گا کہ تم بھی پولیس کے ساتھ تھے اور وہ کسی رات کو تمہارے گھر آجائیں گے۔"

"تمہاری بھیڑ بکریاں — مرغیاں — گائے بھینس اور بیوی بچے سب کاٹ کر رکھ جائیں گے۔" غالب نے اسے ڈرانے کے لیے کہا۔ "اور اگر وہ نہ پہنچے تو پولیس پہنچ جائے گی — تم گرفتار کرلیے جاؤ گے کہ تم نے سرکاری راز کو راز نہیں رکھا۔"

"میری توبہ... میرے باپ کی توبہ۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

"اچھا اب تم پیچھے بیٹھو گے۔" میں نے کہا۔ "جگہ ہے نا...؟"

"جگہ بہت جناب — ایک پورا تختہ درمیان میں خالی ہے۔ مجھے آگے سے بھی دودھ اٹھانا تھا۔" وہ بولا۔

اس کے بعد معاملات آسان ہو گئے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی کو پیچھے لے گیا۔ سو گز پیچھے سڑک کے کنارے گاڑی روک کر میں جنگل میں گیا اور کیریئر کو اٹھا لایا — محسن اور غالب نے اس کو اٹھا کر تختے پر لٹا دیا۔

گوالا جو ایک لاش دیکھ کر ہی دہشت زدہ ہو گیا تھا، اب دوسری لاش دیکھ کر تو... مگر غالب نے اسے بتا دیا کہ اس عورت کو ڈاکو اغوا کر کے لے جا رہے تھے لیکن پولیس کی مداخلت سے مجبور ہو گئے اور سڑک پر گولی مار کر بھاگ گئے۔

"اس بڈھی عورت کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے؟" گوالا حیران ہوا تو ٹھیک ہوا کیونکہ دیہاتوں اور شہروں سے عام طور پر جوان لڑکیاں ہی اٹھائی جاتی ہیں۔

"بھئی یہ مالدار عورت ہے۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "ڈاکو اس کے وارثوں سے پانچ دس لاکھ روپے مانگتے۔"

"اور وہ نہ دیتے تو...؟"

"تو اسے قتل کر کے پھینک دیتے۔" میں نے کہا۔

اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "یا رب جی توبہ! ایسی بڈھی عورت نوں قتل کر دیتے... کیسا زمانہ آگیا ہے۔"

"اچھا اب تم پیچھے آؤ۔" میں نے کہا۔ "مجھے تم سے ایک بات کرنا ہے۔"

جنگل میں ایک جھاڑی کے پیچھے لے جا کر میں نے اس سے کہا۔ "اپنے کپڑے مجھے دے دو۔"

"اور میں... میں خود کیا پہنوں؟" وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"تم میرے کپڑے پہن لو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اصل میں اب ہم جیل کے فراریوں کا تعاقب کرنا چاہتے ہیں... وہ ہمیں پہچان گئے ہیں — ہمیں دیکھتے ہی گولیاں چلانے لگیں گے۔ میں آگے بیٹھوں گا اس لیے سب سے پہلے نظر آؤں گا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان کو شک نہ ہو — وہ یہ سمجھیں کہ دودھ لے جانے والی گاڑی جا رہی ہے — گوالا اسے چلا رہا ہے — تم پیچھے ہو گے۔ خود ایس پی صاحب اور دوسرے تھانیدار صاحب بھی پیچھے بیٹھیں گے، چھپ کر۔"

"وہ... وہ بھی تھانیدار ہیں... اور آپ بھی؟"

"ہاں بھولے — اتنے بڑے افسر کے ساتھ تو تھانیدار ہی ڈیوٹی دیتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے کپڑے تم کو ڈھیلے ہوں گے لیکن کوئی بات نہیں... گزارا کرو — سب کام ختم ہو جائے گا تو تم کو یہ کپڑے مل جائیں گے۔"

"اوجی نہیں... کون سا لٹھا شیشی کا اور دو گھوڑا بوسکی کا کرتا ہے۔" وہ اپنی گاڑھے کی دھوتی اور قمیص اتارتے ہوئے بولا۔ چند منٹ کے بعد ہم جھاڑیوں میں سے برآمد ہوئے تو دونوں کا ماڈرن لگ رہے تھے — تاہم محسن نے انگوٹھا دکھا کے اشارے سے "فرسٹ کلاس" کہا... وہ اور غالب دودھ کا فراخدلانہ استعمال کر رہے تھے — انھوں نے کیریئر کے منہ پر دودھ کے چھینٹے مارے اور اب ٹھنڈا دودھ پلانے کی کوشش کر رہے تھے — زندگی میں پہلی بار ہم نے دودھ کا پورا ٹرک خرید لیا تھا — جس میں شاید دس من دودھ ہوگا — دودھ کے اسٹاک کو وہ اپنا پیٹ بھرنے کے علاوہ غسل کرنے کے لیے بھی استعمال کرنا چاہتے تو کافی ہوتا... میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ملکہ قلوپطرہ کی کوئی اداکارہ اپنے حسن کی حفاظت کے لیے دودھ سے منہ دھوتی تھی اور غسل کرتی تھی — مگر ہمارے پاس اس عیاشی کا وقت نہیں تھا۔

غالب حفاظت کے لیے سامنے آگے بیٹھا۔ سیٹ کافی چوڑی تھی جس پر تین بیٹھ سکتے تھے مگر اسے مشورہ دیا کہ وہ لیٹ جائے تاکہ سامنے والے شیشے سے صرف میری شکل مبارک دکھائی دے۔ اس حلیے میں مجھے کوئی آسانی سے نہیں پہچان سکتا تھا — میرے سر پر ایک بہت میلے اور بدبودار کپڑے کی پگڑی سی تھی — اسے پگڑی کہنا بھی غلط ہوگا — یہ ایک گز لمبا چوڑا چارخانہ دار رومال تھا جسے میں نے رسی کی طرح بل دے کر دونوں کونے لا کے سر کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ اس سے میری پیشانی جزوی طور پر چھپ گئی تھی — گاڑھے کا کرتا نہ صرف میلا اور بدبودار تھا۔ اس میں سے دودھ، لسی، مکھن کے علاوہ مویشی، گوبر اور بھینس کے پسینے اور ان کے دوسرے خارج کردہ مواد کی خالص دیہاتی مہک آ رہی تھی — گوالے کے اپنے بدن کی بو کا اس میں کیا پتا چلتا — یہی حال دھوتی کا تھا لیکن یہ لباس اس ٹرک سے میچ کرتا تھا بالکل اسی طرح جیسے پائلٹ کی وردی ہوائی جہاز سے میچ کرتی ہے۔

میں نے ٹرک کو اسٹارٹ کیا اور اس کے ڈیش بورڈ پر نظر ڈالی تو فیول میٹر کی سوئی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ٹینک دو تہائی کے قریب بھرا ہوا ہے۔

"آج بریک فاسٹ میں تو ہمیں دودھ ملے گا؟" غالب لیٹے لیٹے بولا اور ہاتھ بڑھا کے گلو کمپارٹمنٹ کی تلاشی لینے لگا۔

"ابھی کچھ نہیں ملے گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے اس علاقے سے نکل جائیں، پھر کہیں رک کر دیکھیں گے... لوگوں سے پوچھیں گے کہ وہ سب کدھر گئے ہیں... آگے بھی آبادی ہے۔"

"ہاں — اپنے پہلوان کا گاؤں ہے... ڈانیاں خورد..."

www.paksociety.com

اور کسی کے لیے بھی قتل ایک مشغلہ ہی ہے... ؟ غالب نے کہا۔
"حالانکہ اس خاکسار صحافی نے یہ نام پہلے نہیں سنے تھے۔"
"اس لیے نہیں سنے کہ یہاں کسی اخبار کا کوئی نمائندہ نہیں ہوتا اور جو کچھ یہاں ہوتا ہے اسے خبر نہیں سمجھا جاتا... خواہ وہ قتل ہو یا ڈاکا ہو۔" میں نے کہا۔
"ایک لاش سے کیا اندازہ ہوتا ہے؟" غالب بولا۔ "انھوں نے سب کو مار دیا ہو گا؟"
"اس سے کچھ بعید نہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ شخص پانچ میں سے ایک تھا؟"
"اور کون ہو سکتا ہے؟" غالب بولا۔ "گولی کا نشانہ دیکھا تھا تم نے... عین پیشانی کے وسط میں تھا... اور حیرت کی بات یہ تھی... ویسے بھی گاؤں دیہات میں قتل کے لیے ریوالور استعمال نہیں ہوتے... کلہاڑی، ڈانگ اور برچھے وغیرہ زیادہ مستعمل ہیں... وہ اعشاریہ بائیس نمبر کی گولی کا سوراخ تھا۔"
میں نے حیرانی سے غالب کو دیکھا۔ "تم ماہر آتشیں اسلحہ ہونے کا بھی دعویٰ رکھتے ہو؟"
"ہاں... کرائم رپورٹر... عام اخبار نویسوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ جانتے ہیں۔" غالب بولا۔ "سوراخ بہت چھوٹا تھا اور اسی لیے خون بھی کم نکلا تھا۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ریوالور ٹھیک اسی جگہ رکھ کر گولی چلائی گئی تھی اور اس سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مقتول کو سزائے موت دی گئی تھی۔ اس کو فرار ہوتے ہوئے گولی نہیں ماری گئی تھی... یا تو اسے ناک آؤٹ کیا گیا اور پھر شوٹ کیا گیا... یا وہ خود بے ہوش ہو گیا تھا... تھوڑا سا امکان اس بات کا بھی ہے کہ اسے سر پر ریوالور رکھ کے دہشت زدہ کیا جانا مقصود تھا مگر غلطی سے گولی چل گئی... ممکن ہے اس نے کسی حکم کی تعمیل سے انکار کیا ہو۔ اس کی موت کے بعد باقی چاروں پر دہشت طاری ہو گئی اور اپنی جان بچانے کے لیے ان سے پورا تعاون کیا ہو گا۔"
"کیا اس بات کا امکان ہے کہ باقی چاروں کو زندہ واپس جانے کا موقع مل گیا ہو؟" میں نے ٹرک چلاتے ہوئے نظر سڑک پر رکھی۔
"ہاں... امکان تو ہے۔" غالب نے کہا۔ "یہ سب قتل سے گریز کرتے ہیں۔"
"مگر وہ چاروں ایک قتل کے چشم دید گواہ ہو گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "اور ان سے یہ ڈر ہے کہ وہ بعد میں سب کو شناخت نہ کر لیں... یہ بتا دیں کہ انھیں کہاں لے جایا گیا تھا اور کس کام کے لیے...؟"
"وہ کیسے بتائیں گے؟" غالب بولا۔ "گاؤں والوں کو؟"

پولیس چوکی کے انچارج صاحب کو تو سانپ نے ڈس لیا ہے۔
"سانپ نے سانپ کو ڈس لیا ہے۔" میں نے کہا۔
"گاؤں والے لاشیں لے کر چلے جائیں گے۔"
قسمت سے آگلی تنخواہ اٹھانے زندہ رہے گا تو... یہاں تعینات ہو جانے والا تفتیش کرنے کی بجائے کہ مجرموں کو ڈھونڈے... کا فقری کا دروازہ ہوتی ہے... چلا ہو اور بیٹھ رہے جیسے ان گاؤں کے منڈوں کی گواہی سے ڈھونڈنے والے نے اہمیت ہی نہیں دی ہو گی کسی سے کچھ پتا نہ ہو تو کیسے...
غالب نے کہا۔ "البتہ سراغ پہنچا تو گاؤں کی شامت آ جائے گی۔ ایک دن کی بادشاہت میں جو اچھے کام ہم نے کیے تھے سب پھر جائیں گے... پیٹرو اور اس کے ساتھیوں کے خلاف کیسے ہو سکتے تھے؟ وہ تو حوالدار کی موت کو بھی قتل کا کیس بنائے گا اور اس نوجوان کی لاش کو بھی... ساری گواہیاں ہمارے خلاف لے گا اور تلاش کرے گا... پیٹرو اور اس کے ساتھ آنے والوں کے لیے کوئی خطرہ..."
بانٹ اور پیچھے والے حصے کے درمیان کیبن کی دیوار میں ایک شیشہ تھا جس میں سے ہم پیچھے والوں کو دیکھ سکتے تھے لیکن درمیان میں اندھیرے کے باعث... صبح کے چار بج گئے تھے اور آسمان پر ستارہ سحری پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہو چکا تھا... کچھ دیر میں صبح کاذب کے آثار نمودار ہونے لگتے... ہم جائے واردات سے بہت دور آ گئے تھے... احتیاطاً میں نے روشنی بجھا رکھی تھی چنانچہ ٹرک کی رفتار بہت کم تھی... اس کے انجن کی آواز بھی کم تھی مگر مجھے اتنا شور بھی بہت محسوس ہو رہا تھا... اچانک پیچھے کسی نے شیشے کو انگلی سے بجایا... میں نے ٹرک کو ایک کنارے پر روک لیا اور اتر کر پیچھے گیا۔
"کیتھرین کو ہوش آ گیا ہے۔" محسن بولا۔
"ہیلو کیتھرین۔" میں نے ٹرک پر چڑھ کے خوش دلی سے کہا اور مسکرایا۔ "کیسی ہو؟"
"خائف..." وہ آہستہ سے بولی۔ "تم سب کو دیکھ کر میں پھر زندہ رہنے کی آرزو کرنے لگی ہوں... لیکن... صرف آرزو سے کیا ہوتا ہے؟"
"تم زندہ رہو گی کیتھرین... ابھی سے مرنے کی باتیں کر کے ہمیں نہ ڈراؤ۔" میں نے کہا۔ "ہم سب کو تمہاری فکر ہے... جونی کو بھی۔"
"جونی..." اس نے ہنسنے کی کوشش کی مگر آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ "اب تک اور کس کے لیے زندہ تھی میں... ڈیڈ... ڈیڈ...؟"

"ہیں تو میں بھی کچھ جانتا ہوں... آئندہ..."
"واٹ آ... نونسنس..." اس نے میری بات کاٹ دی۔ "مجھے معلوم ہے کہ وہ مر چکی ہے... تم لوگ اپنے جھوٹ کیوں بولتے ہو... جھوٹ سہارا بن سکتے ہیں؟ زندگی دے سکتے ہیں...؟ جھوٹ تو خود مر جاتے ہیں..."
"کیتھرین میری ماں... تم کو تیار رہنا ہو گا کہ جونی زندہ ہے؟"
محسن نے کہا۔ "کیتھرین... پلیز تم یقین کرو۔"
"مجھے بہلانے والے جھوٹے دلاسوں کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "میں سچ کا سامنا کر سکتی ہوں... تمام عمر میں نے سچ کا زہر پیا ہے... امرت مجھے نہیں... زہر پچتا ہے... حقیقت پر ملمع کے پردے مت ڈالو... کب تک ڈالو گے پردے آخر...؟ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ... تم جھوٹ سے مجھے زندہ رکھو اور سچ کو ٹالتے رہو... جب تک میں اس قابل نہ ہو جاؤں کہ تم جھوٹ کے پردے ہٹا کے پورا جھوٹ کا اعتراف کرنے سے... اور شرمندہ ہو کے دیکھنے پر مجبور ہو جاؤ... کیتھرین وہ ضرورت تھی... اصل حقیقت یہ ہے... تم مجھے شرمندہ دیکھنے کا کوئی شوق نہیں... آئی ڈونٹ مائنڈ... جسٹ لیٹ می ڈائی... پلیز"
محسن نے مجھے اشارہ کیا اور میرے ساتھ نیچے اتر گیا۔ گلا بچکا بیٹھا ہوا سارا ڈراما دیکھ رہا تھا مگر اس کا ایک لفظ بھی سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ اس کے دماغ میں کچھ نہیں اس کے سوا کچھ نہیں تھا... میں نے اسے قانونی ڈاکوؤں کے بارے میں ایک کہانی سنائی تھی... بطور ثبوت اس نے ایک لاش بھی دیکھی تھی۔ کیتھرین کے بارے میں اس کو یقین تھا کہ ڈاکو اغوا کر کے لے جا رہے تھے لیکن جو ڈائیلاگ اس نے سنے تھے وہ اغوا کی واردات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے... نہیں وہ پولیس کے معاملات میں دخل در معقولات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے پولیس کا ساتھ دینے میں کوئی فائدہ ہی نظر آتا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اس نے قانون کی پاسداری کی... پولیس کیا نہیں کر سکتی... اسے حوالات میں... اس کا ٹرک ضبط کر سکتی ہے... اسے چوری کے شبہے میں جب تک چاہے زیر تفتیش رکھ سکتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے قبضے سے چوری کا مال بھی برآمد کر سکتی ہے... اس کو ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ ہم جعلی پولیس والے تھے... چنانچہ وہ جو سوچ رہا تھا اس پر قناعت کیے چپ بیٹھا تھا اور بھلا لینے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔
"کیتھرین کو لاہور لے جانا بہت ضروری ہے۔" محسن نے ٹرک سے ذرا فاصلے پر جا کے کہا اور مجھے ایک سگریٹ پیش کی... پھر ماچس نکالی۔

"یہ سگریٹ کہاں سے آئی ہے؟" میں نے سگریٹ کو جھپٹ لیا۔
"ذرا احتیاط سے۔" محسن بولا۔ "پہلوان کا تحفہ ہے... ہاں یہ سونگھ کے لگا دیں گے۔" اس نے اچھی سی سگریٹ جلائی جو امپورٹڈ عام کنگ سائز برانڈ تھی...
"... اس کا تمباکو سب سے بہترین ہے، دھواں پیٹ میں کھولتا طرح لگا مگر صرف نشے کی لت ہو ڈرین طلب کی اذیت کو جاتا ہے اور نشہ ٹوٹنے کے عالم میں وہ کچھ بھی کر سکتا ہے پھر نشے کے لیے جو بھی... سب حرام... ہے"
"کیتھرین کو لاہور لے جانے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر ہم تو غالباً حالت میں جا رہے ہیں تو..." میں نے ایک طویل کش لینے کے بعد بہت پرسکون ہو کے کہا۔
"جب تک وہ جونی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے گی اسے کسی کی بات کا یقین نہیں آئے گا۔" محسن بولا۔ "میں نے اسے ساری صورت حال سمجھانے کے لیے بہت سر کھپایا مگر وہ اسے بھی جھوٹ سمجھتی ہے کہ... زندہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ہمارے ساتھ رہنا خطرناک ہے۔ اس کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے بلکہ کسی حد تک تشویش ناک ہے... وہ جسمانی طور پر بہت کمزور ہو گئی ہے اور اس کی قوت مدافعت بالکل ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے بھی کہ وہ زندہ رہنا ہی نہیں چاہتی اور اگر وہ ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو شاید خودکشی کر کے مر چکی ہوتی... ہوش میں آنے کے بعد وہ ہیجانی انداز میں بہت چیخی چلائی اور اس نے ٹرک سے چھلانگ لگانے کی کوشش بھی کی... ہم نے اسے دبوچ لیا۔"
"اچھا! مجھے کچھ معلوم نہیں تھا شیشے کے ادھر آواز نہیں جاتی۔" میں نے سگریٹ محسن کی طرف بڑھا دیا۔
"پہلے تو وہ سمجھتی رہی کہ اب بھی وہ اسی ٹرک میں ہے۔" محسن نے دھواں چھوڑ کے کہا۔ "جس میں سے وہ کود گئی تھی۔"
"وہ کس ٹرک میں تھی؟" میں نے کہا۔
"ہاں اس نے ہمیں پہچاننے کے بعد بتایا تھا۔" محسن بولا۔ "وہ ٹرک میں لکڑی کے باکس تھے جو پیچھے کے حصے میں بہت اوپر تک لادے گئے تھے۔ اس کے اندازے کے مطابق کم سے کم سو..."
"ویسے ہی تابوت...؟"
"نہیں، کیتھرین کا کہنا ہے کہ باکس ڈھائی فٹ لمبے دو فٹ چوڑے اور دو فٹ اونچے تھے۔" محسن بولا۔ "میں نے کہا اگر موقع ملے تو ہم تلاشی کر لینا، ایک آدمی کا بھی فرق نہیں ہو گا۔ بظاہر عام قسم کے ٹھوس تھے جن میں پھل سیب، آم اور انار وغیرہ پیک کیے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں پھل نہیں آ رہے تھے یا آ رہے ہوں...؟"
"یہ کیتھرین نے کیسے جانا؟"
"اس کی نظر آتش شناس ہے اور بڑے بڑے کی صلاحیت حیرت انگیز

www.paksociety.com

"ہے۔" محسن نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ کہ پل ہوتے تو خوشبو سے آتی ہوا باہر کی طرف آتی کہ یا انہوں کے کریٹ ان پہ رکھے گئے ہوں گے کہ راستے میں کوئی سر پھرا مل جائے یا ضرورت مند تو اسے مطمئن کیا جا سکے۔"

"ان راستوں میں یا تو فرض شناس اور سر پھرے پولیس افسر آتے ہیں یا پھر رشوت مانگنے والے جن کو حقیقت پتا ہو۔" میں نے اتفاق کیا۔

"میں کل ہی یہ پلاننگ لیں اور اتنی ہی جوڑی بگرتی تھیں جن میں ان کیفیلا کو بے ہوش کر کے ڈال دیا گیا تھا۔ رابعہ کو، ٹیڈی کو اور کیتھرین کو۔" محسن بولا۔ "اس ڈھیر کے اوپر خود جمشید ریوالور لیے بیٹھا ہوا تھا اور ... نیچے جھانک کر ... جو کوئی کوشش کی وہ دیکھ سکتا تھا۔"

"کیتھرین کو پہلے ہوش آ گیا... ؟"

"نہیں، وہ اطلاع آخر ہوش میں آئی تھی۔" محسن بولا۔ "جب ٹرک روانہ کیا جا رہا تھا تو پروگرام کے مطابق کچھ دیر ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر ایک گھنٹے تاخیر سے پہنچا تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا یا کوئی عطائی، یہ اسے نہیں معلوم۔ وہ سب اس کو ڈاکٹر ہی کہتے تھے ... ان کی کارکردگی لیٹ ہو گیا تھا چنانچہ وہ چار بجے شام کے بجائے پانچ بجے پہنچا۔"

"کہاں پہنچا؟" میں نے کہا۔ "کیتھرین کو اندازہ ہے؟"

"نہیں، وہ جنگل کے آخری حصے میں واقع کسی کوٹھی کا تہ خانہ تھا، جہاں ان کو رکھا گیا تھا۔" محسن بولا۔ "ڈاکٹر نے پہلے رابعہ کو انجکشن لگایا پھر ٹیڈی کو۔ انھوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ اس قابل ہی نہیں رہے تھے۔" وہ ذرا سی دیر کے لیے خاموش ہوا۔

"میں سمجھ گیا محسن۔" میں نے کہا۔ "وضاحت کی ضرورت نہیں کہ وہ کیوں مزاحمت کے قابل نہیں رہے تھے۔"

"جب کیتھرین کی باری آئی تو جانے کیسے ڈاکٹر کے ہاتھ سے گر کے دوا کی شیشی ٹوٹ گئی۔" محسن نے کہا اور سگریٹ کا آخری ٹکڑا پھینک دیا۔ "دیر پہلے ہی ہو چکی تھی اور ڈاکٹر کے پاس دوسری شیشی نہیں تھی۔ انھوں نے کیتھرین کو ڈرایا دھمکایا کہ خبردار، راستے میں آواز بھی نکلی ... ان دونوں کو بے ہوش رکھنا ضروری تھا مگر تمہارا زندہ رہنا بھی غیر ضروری ہے۔ گردن کاٹ کے لاش باہر پھینک دیں گے۔ کیتھرین نے اداکاری سے ان کو یقین دلا دیا کہ وہ صدمے سے ... ہے اور ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں بن سکتی۔ ... انھوں نے رابعہ، ٹیڈی اور کیتھرین کو ٹرک سے ایک جیپ اسٹیشن ویگن میں منتقل کر دیا تھا۔"

"اسٹیشن ویگن میں؟" میں نے بے ساختہ کہا۔

"ہاں، وہ اسی گاؤں میں، ہمارے بہت قریب سے گزرے تھے۔ ہم نے پولیس چوکی سے باہر آ کے دیکھا تھا تو ہمیں ہیڈ لائٹس دکھائی دی تھیں ... پیچھے پڑے ہوئے تھے ...... لیکن ..."

ٹیڈی تو واقعی بے ہوش تھے مگر کیتھرین دم سادھے پڑی ... محسوس کر رہی تھی اور ہوش میں رہنے کا فائدہ بھی اٹھا سکے۔"

"کاش کسی طرح مجھے معلوم ہو جاتا۔" میں نے حسرت سے کہا۔ "کہ وہ کتنے قریب آ گئی اور پھر ... تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"معلوم ہو جاتا تو آپ کیا کرتے؟" محسن نے کہا۔ "آپ خود بھی چوہے کی طرح پکڑے جاتے ... جب قیدیوں کو ٹرک سے اسٹیشن ویگن میں منتقل کر دیا گیا تھا تو ڈرائیور کی غلطی سے تھوڑا سا نشیب کی جانب ... اٹھنے سے بال بال بچا تھا۔ کیتھرین نے اسٹیشن ویگن کے پچھلے شیشے سے جو دیکھا ... اسٹیشن ویگن سڑک ... کے واپس جانے لگی تھی۔ اسی وقت ڈرائیور نے پھر ٹرک ... کے باوجود ... سالم سڑک پہ لے آیا لیکن ... اگلا ٹائر پوسٹ ہو گیا۔ ٹرک نشیب کی جانب جھکا ... تو ٹرک پہ آگرا تھا لیکن ڈرائیور ہلاک ہو گیا۔ یہ سب کیتھرین نے ... گفتگو سے اندازہ کیا۔ اسٹیشن ویگن کو ... پیڈرو کو اٹھایا اور ... کھڑے سر ہلاتے رہے ... الٹ جانے والے ٹرک کو دیکھتے رہے ... دیر بعد وہ اکیلا واپس آیا اور گولی کی طرح لاہور کی طرف چل پڑا ... دوسرے ٹرک کا اور ڈرائیور کا بندوبست کیا اور دو گھنٹے بعد ... پہنچا جہاں حادثہ پیش آیا تھا۔ اس وقت وہ بہت ... پریشان تھا۔ وہ اتر کے پیڈرو کے پاس گیا ... آ بیٹھا ... دونوں ... انھوں نے ... کیتھرین کو سیٹ پر ڈال دیا ... کی جگہ بہت ناکافی تھی چنانچہ پیچھے والا پانچواں دروازہ ... کو وہاں ٹھونسا گیا مگر پھر وہ دروازہ بند نہ ہو سکا۔ پیڈرو ... پیچھے کو سر کے ... ریوالور ... دیکھا کہ اگر کسی نے ذرا سی بھی حرکت کی ... سوراخ کر دیا جائے گا ... وہ سب سے آگے والی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ جا بیٹھے ... بے ہوشی کا ... برقرار رکھا۔ آگے وہ آرام سے بیٹھے ... کے سامنے لگے ہوئے شیشے میں پیچھے کا منظر دیکھتی رہی ... تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک ... اور ... کیتھرین نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو پیڈرو اس کا نشانہ لے ... غالباً وہ کیتھرین کی دعا قبول ہونے کے باعث ہوئی ... اور پھر ... کے بھاگ گیا۔ جنگل اور اندھیرے میں گم ہو گیا ...

"اس کے پیچھے جانے کا کیا فائدہ ہے؟" شخص نے کہا کہ وقت ضائع ہوگا۔ "وہ اس جنگل کے راستوں سے واقف ہے۔ اب ہاتھ نہیں آئے گا ... پچھلے گاؤں میں ہی سب کو ... لے گئے تھے کہ پیچھے بکھرا ہوا مال ... ٹرک میں ... کریٹ ... ٹرک میں رکھنے پڑے ہوں گے لیکن ... پیڈرو کریٹ ... یہ معاملہ ہے۔ یہ سب کیتھرین کو نہیں معلوم، صرف اس کا اندازہ ہے۔"

"میرے اندازے کا کمال بھی تو دیکھو۔" محسن نے کہا۔ "بالکل وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔"

"بس اب ... " محسن بولا۔ "بہت سیدھی بات ... پیڈرو نے جب اسٹیشن ویگن کو ٹرک کے پاس لا کے روکا تو وہ اور ڈرائیور فوراً پیچھے ... اور وہ لوگ ... لگے۔ اس وقت کیتھرین کو فرار کا موقع ملا۔ ڈرائیور کی سائیڈ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ٹرک سڑک کے بائیں جانب کھڑا ہوا تھا۔ اسٹیشن ویگن بھی بائیں جانب روک دی گئی تھی اور وہ لیفٹ ہینڈ ڈرائیو گاڑی تھی چنانچہ کیتھرین اتری اور خاموشی سے جنگل تک ... گئی۔ پہلے چند قدم بہت مشکل ثابت ہوئے جبکہ اسے یقین تھا کہ ابھی کوئی گولی ... سے نکلے گی ... اس وقت سنائی دے گی جب کیتھرین ... ہوگی مگر قسمت اس کی مدد کر رہی تھی ... پیڈرو اور ... جلدی میں تھے اور پریشان تھے کہ ان کا دھیان کیتھرین کی طرف نہیں گیا۔ وہ ... بے ہوش ہو کے گر پڑی۔ اسے نہیں معلوم کہ بعد میں پیڈرو اور ... نے پانچوں مدد کرنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اگر انھوں نے ایک کو مار دیا تھا تو شاید باقی کو بھی مار دیا ہوگا ... ان کے لیے زیادہ اہم تھا ... گاؤں کے پانچ لونڈوں کا زندہ رہنا اتنا ضروری نہیں تھا۔"

"پھر کیتھرین سڑک تک کیسے پہنچی؟" میں نے کہا۔

"بہت دیر بعد اسے ہوش آیا تو اس نے سوچا کہ ... " محسن بولا۔ "وہ ... سڑک تک ... اس جگہ سے کافی دور جہاں حادثہ پیش آیا تھا۔ اس نے اسٹیشن ویگن کو ... دیکھا ... کیتھرین نے ... ٹرک بھی ... ہونے کے بعد روانہ ہو چکا تھا اور وہ شاید دو تین گھنٹے کے وقفے سے دوبارہ سڑک پر آئی تھی۔ وہاں کسی ... انتظار کرتی رہی تھی اور بالآخر بے ہوش ہو گئی تھی۔"

"اب ... بتا دے کہ وہ ٹرک کہاں گیا اور اسٹیشن ویگن کدھر گئی؟"

"کیتھرین نے جو کچھ سنا اس کے مطابق ... " محسن نے کہا۔ "... کے بارے میں ایک اشارہ ملا تھا کہ وہ کسی پہاڑی کے

قریب ہے یا اس کے دامن میں ہے۔ اسٹیشن ویگن میں رابعہ اور ٹیڈی کو ... پہنچایا گیا ہے۔ کیتھرین کے فرار کا ان کو فوراً پتا چل گیا ہوگا اور ... ٹھہرایا ہوگا تو پیڈرو نے ڈرائیور کو۔ ان کے پاس وقت نہیں تھا ورنہ وہ اسے مزید تلاش کرتے۔ اپنی حماقت پر بہت پچھتائے ہوں گے کہ بڑھیا کو کمزور، بے وقوف اور بزدل سمجھ کے بے فکر ہو گئے اور اس کی طرف سے غافل ہو گئے۔"

"سب لوگ ... " میں نے کہا۔ "خصوصاً مولانا غالب بہت خوش ... نظر آتے تھے۔ اب بتاؤ کیا ہے؟"

"میں نے کہا۔ "کیتھرین کو لاہور بھیج دیا جائے۔"

"اس کے ساتھ کون جائے گا؟" میں نے کہا۔ "غالب؟"

"جی، غالب۔ اس کے لیے ضروری ... امداد کا انتظام کر کے اسے ... کے حوالے کر کے ... " محسن بولا۔ "اور ہم دونوں آگے جائیں گے۔"

"نہیں، میں اور غالب آگے جائیں گے۔" میں نے یک لخت اپنا فیصلہ بدلتے ہوئے کہا۔ "کیتھرین کو تم لے جاؤ ... کیتھرین اور ٹیڈی کو وہاں چھوڑ دینا اور پھر شمالی سے مل کے آنا۔"

"نہیں یار۔" محسن نے تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ کہا ... ان کی صورت کے تاثرات کس طرح بدلے تھے۔

"دیکھو اس بحث کو خواہ مخواہ ... تمہارا دل نہیں چاہتا ... کرو۔"

"وہ تو چاہتا ہے۔" محسن ... بولا۔

"تو پھر جاؤ۔ شمالی سے مل کے سب بتا دو ... رضوی صاحب ... احتیاط ضروری ہے۔ ان کی فرض شناسی بہت خطرناک چیز ہے۔ وہ پہلے تمہیں بند کر دیں گے اور پھر کہیں گے کہ اب سناؤ بیٹے، خیر سے تو ہو، کہاں رہے اتنے دن! بہت یاد آ رہی تھی تمہاری۔"

محسن ہنس پڑا۔ "میں ان سے نمٹ لوں گا ... واپس نہیں آ سکتا ... ضرور ملوں گا ... فون کر لوں۔ نازو اور اکرام شیخ کے گھر بھی جاؤں گا ... ٹیلی فون ضرور کروں گا اور سب کو تسلی دے کے لوٹ آؤں گا۔ تم لوگ کہاں ملو گے؟"

"کراچی میں۔" میں نے کہا۔ "نازو اور اکرام شیخ وہاں پہلے ہی موجود ہیں ... ان کو تلاش کرنا آسان نہیں ہوگا مگر وہ خود بھی ہماری جستجو اور ہمارے انتظار میں ہوں گے ... دوسرے کو دیکھ لے گا ... کامیابی کا امکان ہے ... ابھی تو آگے جا رہے ہیں ... کوشش کریں گے ... کراچی میں ... لاہور کال کی جا سکتی ہے ... کہ تم لوگ کہاں ہو۔ ہم بھی کراچی پہنچنے کے بعد ... فون کر دیا کریں گے ..."

www.paksociety.com

تمہارا تماشا کا نا بنا رہے گی۔"

"ایسا ہو تو فون رضوی صاحب سن لیں۔"

"میرے خیال میں تو لینا ہی پڑے گا،" میں نے کہا۔ "احتیاطاً یہ ہو سکتی ہے کہ پہلے رضوی صاحب کے دفتر فون کیا جائے، وہ موجود ہوں تو گھر کال کی جائے۔"

"صاحب آپ دونوں میں رضا و رغبت حاضر ہوتے ہیں، یہیں یا پولیس خاص کے ساتھ تشریف لاؤں۔" غالب نے چلا کے کہا۔ اس کے صبر کا پیمانہ بالآخر لبریز ہو گیا تھا۔

ہم واپس گئے اور ٹرک میں بیٹھ گئے۔ اب صبح کا اجالا نمودار ہونے لگا تھا۔ جب ہم اس مقام تک پہنچے جہاں ہم نے سائیکل چھوڑی تھی تو ٹرک پھر رکا۔ ہم نے تازہ دودھ پیٹ بھر کے پیا پھر حسن کو الوداع کہا۔ مرزا غالب ہمارے مذاکرات کی تفصیل جاننے کے لیے بہت بے چین تھے مگر میں نے انھیں صبر جمیل کی تلقین کی۔ غالب سمجھ گیا تھا کہ ٹرک کی واپسی اور حسن کا بہترین کے ساتھ جانا کوئی مقصد رکھتا ہے اور ہم جو اتنی دیر تک الگ کھڑے باتیں کرتے رہے تھے تو ایک دوسرے کو لطیفے نہیں سنا رہے تھے۔ دودھ والا بالکل خاموش تھا۔ وہ عقل مند آدمی تھا۔ اسے لاہور جانے کے قصے سے یقیناً خوشی ہوئی ہوگی۔ اس کے چھ سو روپے کا منافع تو پہلے بھی محفوظ تھا۔ اب وہ خود کو بھی محفوظ سمجھنے لگا ہوگا اور اپنے ٹرک کو بھی، اور اس کا یہ اندیشہ مٹ گیا ہوگا کہ یہ پراسرار لوگ اسے کسی جگہ قتل کر کے پھینک دیں گے اور ٹرک لے جائیں گے۔

"جی مرزا صاحب، وہ تو رہ گئے" میں نے اپنے سر پر ہاتھ چلایا۔

"کون رہ گئے؟" غالب بولا۔

"میرے کپڑے اور گولڈن۔" میں نے کہا۔ "[illegible] پتلون لے گیا۔ اب مجھے [illegible] باقی زندگی گزارنا پڑے گی۔"

"اس میں سے بہت [illegible] جانوروں کی خوشبو آ رہی ہے۔" مرزا نے سائیکل اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اور چشم بد دور تم کیا کسی جیل سے کم ہو۔"

"ذرا مجھ سے کہ دیکھو کہ آج کل مجھے [illegible]" میں نے کہا۔

"آ جاؤ سائیکل پر بیٹھو۔" غالب نے کہا۔

ہم اس حیرت ناک بطرس کی مشہور زمانہ سائیکل کی کوان پر سفر شروع کرنے ہی والے تھے کہ مخالف سمت سے ایک کار نمودار ہوئی۔ غالب نے سائیکل پھر پھینک دی۔ سورج نکل آیا تھا اور درختوں کے سائے لمبے تھے اور اندھیرے اجالے کی کیفیت تھی لیکن سڑک پہ دھوپ بھی اور چمکتی دمکتی کار پہ کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

"لو مرزا، تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ گیا" میں نے کہا۔ "اب سے پہلے تو اونٹ مانگتے تھے..."

"اور اس کے بعد ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے تھے جو عرب کے ساتھ اونٹ نے کیا تھا۔" غالب بولا۔ "اونٹ خیمے کے اندر مالک باہر۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس میں تمہارے ساحل جیسی [illegible]"

غالب سڑک کے کنارے دو ہاتھ کرنے لگا۔ پیٹ پیچھا کے [illegible] لگا اور ہاتھ ہلانے لگا۔ اس نے اپنے مٹکے اور سادھوؤں والے جھبے کے لوازمات تو کب کے پھینک دیے تھے مگر اس کا لباس وہی جوگیا تھا کہ [illegible] نے بھی تو ایسے پجاریوں کا شوشہ چڑھا رکھا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں خاص دیہاتی نظر آ رہے تھے اور یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی مہذب شہری ہم جیسے کسی دیہاتی کو بھی اپنی صاف ستھری کار میں بٹھانا پسند نہ کرے۔ چنانچہ ہم نے سڑک کے درمیان آ کے ہاتھ اٹھائے اور دہائی دینے لگا۔ گاڑی ہم سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ ایک معمولی توند والے مغرور اور بدمزاج شخص نے باہر سر نکالا اور مجھے ایک گالی سے نوازا۔

"مرنے کی صلاح ہے؟ میاں جی، مجھے کیوں مصیبت میں ڈالتے ہو۔ مرو کسی ٹرک کے نیچے آ کے۔" وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

"ٹرک تو ابھی تک کوئی نہیں آیا۔" میں نے معصومیت سے کہا۔ "بہت دیر سے کھڑے ہیں اور مرنے کی صلاح تو یہ میرا ارادہ ہے۔"

"تو پھر مجھے کیوں روکا ہے؟ قبرستان لے جانا ہے کیا تمہارے سارے کا؟"

"نہیں جی، وہ تو آپ کو کیجیے اور ہم سب کو چار بندے مونڈھوں پر اٹھا کے لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "آپ ہم کو آگے تک چھوڑ دو۔"

"آگے کہاں؟ آگے تو سارا جنگل ہے؟" وہ بولا۔

"بس جی ڈولیاں سے آگے۔" میں نے گالی کی فراہم کردہ معلومات [illegible] کا نام ابھی ہے سنگرالی..."

"چلو بیٹھو۔" اس نے بڑا سا منہ بنا کے پیچھے کا لاک کھول دیا۔ "میں بھی اتفاق سے سنگرالی ہی جا رہا ہوں۔ قسمت اچھی ہے تمہاری۔ لیکن میری سیٹ مت خراب کر دینا۔"

میں اور غالب پیچھے بیٹھ گئے۔ اس نامعقول شخص کے رویے پر مجھے بہت تاؤ آ رہا تھا اور میں اب اسے تھوڑا سا شرمندہ کرنے کے موڈ میں تھا۔

"کیا آپ مسلمان نہیں ہو جی؟" میں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

اس شخص نے مشتعل ہو کے میری طرف گردن گھمائی۔ "کیا مطلب ہے اس بات کا؟ کیا تم کو [illegible] نظر آتا ہوں؟"

"وہ... دراصل ہم نے پہلے [illegible] دیکھا تھی۔" میں نے کہا۔ "مسلمان تو ملتے ہی پہلے السلام علیکم کہتے ہیں۔ یہ گالی کس مذہب کا سلام ہے؟"

وہ یک بیک [illegible] بار وہی گالی ہیں، وہ شرمندہ ہونے کے باوجود ڈھیٹ بن کے بولا۔

"اب تو شکل ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہم بیٹھ گئے تو بیٹھ گئے۔"

"بلکہ اب اٹھنے تو [illegible] اٹھائے۔" میں نے سر ہلایا۔

"اور دعا ہے کہ آپ کو پہلے اٹھائے۔" غالب بولا۔

"ہم... منکر... فرشتے..." اس نے گاڑی روک دی۔ "تم [illegible]

کا ڈھونگ رچا رہے تھے پچھے اترو۔"

"چلو پہلے تم اترو۔" غالب نے شرارت نکال کے کہا۔

"نہیں، تو پہلے آپ۔" میں نے کہا۔

"پہلے آپ۔" غالب بولا۔

"پہلے آپ۔"

"انھوں نے تم سے کہا ہے۔" غالب بولا۔

"نہیں، تم سے کہا ہے، پوچھ لو ان سے۔"

"وہ جی [illegible] تم دونوں اترو [illegible] دفع ہو جاؤ۔" وہ چلا کے بولا۔

"دونوں؟ اچھا پہلے تم اترو اور پھر ہمیں اتار دو۔" میں نے کہا۔ "ایسے تو ہم اترنے والے نہیں ہیں۔"

"یا پھر جس کو اتارنا ہے۔" غالب نے سر ہلایا۔

"تم دو ہو اس لیے بدمعاشی دکھا رہے ہو؟"

"نہیں ایک کا مقابلہ ایک سے۔" غالب نے کہا۔ "پہلے مجھ کو اتار دو ورنہ میں تم کو اتار دوں گا۔"

"یا میرے ساتھ مقابلہ کر لو۔" میں نے کہا۔

"مقابلہ؟ کیا مقابلہ... تمہارے باپ کی گاڑی ہے کیا؟" اس نے چیخ کر کہا۔

"بھائی جی! اس نے آپ کے باپ کا نام لیا ہے۔" غالب بولا۔ "اسے مارو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس نے تمہارے باپ کو کہا ہے کا کا، تم مارو۔"

"مگر میرا باپ تو تمہارا بھی چاچا تھا۔"

"اور میرا باپ تمہارا تایا تھا۔"

"چلو پھر دونوں مل کے مارتے ہیں۔ پہلا مکا تم مارو۔"

اس نے ایک نظر ہم دونوں کی غیر سنجیدہ صورت کو دیکھا۔ ہم اسے مارنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھے لیکن وہ اشتعال میں آپے سے باہر ہو کے ہم پر ہاتھ اٹھانے کی غلطی کر بیٹھتا تو [illegible] اس نے ہم دونوں کا جائزہ لیا اور راستہ [illegible] کر دیا۔

"کہاں تک تم [illegible]" اس نے غصے میں گاڑی آگے بڑھائی۔

"آپ تو مجھے بہت بڑے سرکاری افسر معلوم ہوتے ہو۔" میں نے پھر چھیڑا۔

"میں نہر کے محکمے کا اوورسیئر ہوں۔" وہ [illegible] خوشامدانہ لہجے سے متاثر ہو کے بولا۔

"اچھا جی... اوورسیئر۔" غالب نے کہا۔ "تنخواہ کتنی ہے تمہاری؟"

اوورسیئر نے پھر غصے سے پیچھے کو دیکھا [illegible]

"گاڑی کتنے کی ہوگی اوورسیئر صاحب؟" میں نے کہا۔ "بالکل نئی [illegible] بہت بڑی ہے۔"

"بھائی جی، افسر ہیں تو بڑی ہوگی۔" غالب بولا۔ "اوپر سے آمدنی بھی بڑی ہوگی۔ تنخواہ چھوٹی ہے تو کیا ہوا؟"

"سچ ہے کا کا، تنخواہ تو یہ ریٹائر ہونے تک جوڑتے رہتے۔ تب بھی اتنی کار نہ خرید پاتے یا عمر بھر کی کار خریدتے۔" میں نے کہا۔

"اور اسے [illegible]" غالب بولا۔ "[illegible] گھوڑی کار کہلاوے گی۔ جیسے گھوڑا گاڑی ہوتی ہے یہ موٹر کار ہوتی ہے۔"

اب اس کی صورت پر بے چینی یا خوف کے آثار عیاں ہو چلے تھے۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا لیکن وہ [illegible] جائزہ لے رہا تھا۔ "تم دونوں بہروپیے ہو؟" وہ بولا۔ "کون ہو تم لوگ؟"

"بھائی جی۔" غالب نے ایک دم چیخ ماری۔ "وہ دیکھو ایک [illegible] بیٹھا ہے۔ اس کے [illegible] پر لگے ہوئے ہیں۔"

"غالب رات کو حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔" اوورسیئر نے [illegible] لہجے میں اظہار خیال کیا۔ "یہ تو بتاؤ کہ ادھر ٹرک کیوں آیا تھا؟"

"بے زبان جانور ہے، [illegible] ہوگا۔" غالب بولا۔

اوورسیئر [illegible] تبدیلی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ پریشان ہے۔ حرام کی دولت سے ایسی چمکتی دمکتی گاڑیاں خریدنے والے ہمیشہ دو قسم کے لوگوں سے ڈرتے ہیں۔ [illegible] خود بھی رشوت نہ لیتے ہوں، اور ڈاکوؤں سے جو [illegible] پھرتے ہیں کہ مال حرام بود بجائے حرام رفت کے مقولے کو سچ ثابت کریں۔ [illegible] لوٹنے والے۔ "تم لوگ بڑی عجیب باتیں کرتے ہو۔"

"جناب جی، ہم اور بھی بہت کچھ کرتے ہیں جو ہم نے ابھی تک آپ کے ساتھ نہیں کیا۔" میں نے کہا۔

"اس کار [illegible] ہو گیا [illegible] میں معذرت چاہتا ہوں۔ میں نے آپ لوگوں کے ساتھ غلط رویہ اختیار کیا۔ میں کچھ پریشان تھا۔"

"مقدر میں پریشانی [illegible] ہو تو پھر خوشی اور اطمینان نہیں دیتا۔" میں نے کسی [illegible] کی طرح کہا۔ "تم نے نہر کے پانی کو بیچ کر خوب مال کمایا۔ کسان خون پسینہ ایک کرتے رہے۔ تم نے ہمیشہ اس وقت نہر کا پانی روکا ہوگا جب انھیں فصل کے لیے پانی کی ضرورت ہوگی۔ نہر کی صفائی کے بجائے اور فصلوں کی تباہی کے ڈر سے جب ان غریب محنت کشوں نے [illegible] اور تمہارے [illegible] کا پیٹ بھرا ہے۔ تم کو [illegible] پیش کر دیا ہوگا تو نہر میں پانی آ گیا ہوگا۔ تم نے [illegible] جاگیرداروں کے لیے نہر کاٹ دی ہوگی۔ ان سے بھی انعام و اکرام وصول کیا ہوگا۔ مگر آتی دولت [illegible] پکڑے جانے کا خوف، اولاد کے سامنے شرمندگی، بیوی کے سامنے شرمندگی، جن کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ تمہاری تنخواہ کتنی ہے جو تم [illegible] لاتے ہو۔ تم نے ان کے خون میں حرام رزق ملا دیا۔ انھیں بے غیرتی کے ساتھ عیاشی کرنا سکھایا۔ [illegible]

www.paksociety.com

فیل ہونے کے خیال سے تمھارا دل لرزتا ہو گا مگر تمھاری اولاد منتظر ہو گی کہ تم مرو تو تمھاری لاکھوں کی جائیداد ہتھیا سکے۔“

اُس کا نروس بریک ڈاؤن ہونے لگا۔ ”خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم سی آئی اے ڈی کے آدمی ہو۔“

”ہم صرف آدمی ہیں اس لیے [illegible] نہیں ہیں۔“ غالب بولا۔

”آپ لوگ یہاں کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟“ وہ بولا۔ ”یقیناً کوئی سنگین کیس ہو گا؟“

”سنگین کیس تو تم بھی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ تم کو اپنے اعمال کی سزا مل رہی ہے اور ملتی رہے گی۔ دُنیا میں الگ اور آخرت میں الگ۔ اس لیے ہم تمھارا نام بھی نہیں پوچھیں گے۔“

”ویسے نام پوچھے بغیر بھی تمھارا پتا معلوم کرنا ہمارے لیے مشکل نہیں کیونکہ کار کا نمبر ہم نے دیکھ لیا ہے۔“ غالب بولا۔ ”ممکن ہے یہ تمھاری بیوی کے نام پر ہو یا بیٹی کے نام پر لیکن پتا شاید تمھاری ہی کسی کوٹھی کا ہو گا۔ اس کوٹھی کا جس میں تم رہتے ہو یا اس کا جو تم نے کرائے پر اٹھا رکھی ہے۔“

”کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم سے مت ڈرو۔“ میں نے کہا۔ ”تم اللہ سے معافی مانگو اور اپنے انجام سے ڈرو۔ ہمیں تو چند سوالوں کے جوابات سے غرض ہے۔“

”کیسے سوالات؟“ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا اور اس نے [illegible] ڈیش بورڈ میں سے [illegible] کی ایک گولی نکال کر زبان کے نیچے رکھی۔ یہ صاف انجائنا کی علامت تھی۔ ہماری باتوں کی دہشت نے اس کے دل پر جرم کے احساس کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔

”اس علاقے کے جغرافیے سے تم اچھی طرح واقف ہو؟“

اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”یہاں میرا آبائی گاؤں ہے۔“

”گڈ۔ پھر تو تم گاؤں دیہات کے لوگوں سے بھی واقف ہو گے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ اس سڑک کے دونوں جانب کتنے گاؤں ہیں جہاں گاڑی جا سکتی ہے؟“

”ایسے دو ہی گاؤں ہیں۔“ وہ بولا۔ ”چک گوجراں اور سنگراں۔ [illegible] آخری گاؤں ہے۔ [illegible] ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔“

”اچھا یہ سڑک کہاں تک جاتی ہے؟“

”سرحد پار تک۔“ وہ بولا۔ ”یہاں [illegible] سڑک ختم ہو گی اس کے بعد [illegible] پاکستان کا ہے پھر درمیان میں وہ جگہ ہے جو کسی کی نہیں۔“

”نو مینز لینڈ۔“ میں نے کہا۔

”یس... یس۔“ وہ میری انگریزی سے ریلیکس ہوا۔ ”اس کے بعد انڈین ٹیریٹری شروع ہو جاتی ہے۔“

”بارڈر پر پوزیشن کیا ہے؟“ غالب نے کہا۔ ”دونوں طرف فوج رہتی ہے یا دستے گشت کرتے ہیں؟“

”بھارت کی طرف انڈین بارڈر فورس کے دستے کبھی کبھار آ جاتے ہیں ورنہ سرحد کھلی ہی رہتی ہے۔“ وہ بولا۔ ”میرا مطلب ہے کہ ایسی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ یہی حال اِدھر کا ہے۔ [illegible] دونوں طرف کے گاؤں کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ کبھی اُدھر کے مویشی اِدھر چلے گئے تو وہ چارہ کھاتے کھاتے پہنچ گئے کبھی ان کو [illegible] خوبصورت چراگاہ [illegible] گئے۔“

”اور ان کو روکنے والا کوئی نہیں؟“

”وہ [illegible] مگر [illegible] بارڈر سیکیورٹی فورس والے بھی یہ بات سمجھتے ہیں [illegible] کبھی کبھی [illegible] بہت سے [illegible] آتے ہیں جب سرحد کے آر پار [illegible] کوئی خطرہ ہے؟“

”بارڈر پر ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

”آپ لوگ کس جگہ سے آئے ہیں آخر؟“ وہ بولا۔

”مسٹر [illegible]“ میں نے سخت لہجے میں اچانک انگریزی شروع کر دی۔ ”آپ نے آفیشل سیکرٹس ایکٹ پڑھا ہے۔ سال میں دو بار سرکاری [illegible] سے [illegible] لیے جاتے ہیں کہ وہ اس ایکٹ کی دفعات سے واقف ہیں مگر صرف کاغذی کارروائی ہوتی ہے۔ شاذ و نادر ہی کسی نے اس ایکٹ کا مطالعہ کیا ہو گا مگر قانون میں ناواقفیت کا عذر قبول نہیں ہوتا۔ [illegible] ان پڑھ دیہاتی بھی قتل کرے تو ضابطہ فوجداری کی دفعہ [illegible] سے ناواقفیت کا عذر پیش کر کے بچ نہیں سکتا۔ ہم انٹیلی جنس کے لوگ ہیں چنانچہ ہم تو کسی پر اپنی شناخت ظاہر نہیں کر سکتے۔ آپ چونکہ ایک [illegible] سرکاری ملازم ہیں اس لیے آپ کو اتنا بتایا جا سکتا ہے کہ ہم ایک [illegible] مشن پر ہیں مگر آپ سے توقع کی جاتی ہے کہ آپ کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ یہ بھی نہیں کہ آپ ہم سے ملے تھے۔ انڈر اسٹینڈ؟“

”یس... یس سر۔“ [illegible] اب [illegible] پڑ گیا تھا۔

”یہ کبھی نہ بھولیں کہ ہم کسی بھی وقت آپ کو اٹھا سکتے ہیں۔“ غالب نے بھی انگریزی میں کہا۔ ”راستے سے یا گھر سے اور اغوا کے [illegible] آپ سے شاہی قلعے کے [illegible] سیل میں [illegible] پوچھا جا سکتا ہے [illegible] جانتے ہیں آپ ہمیشہ کے لیے گم بھی ہو سکتے ہیں۔“

خوف سے اس [illegible] کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ ”[illegible] یقین دلاتا ہوں کہ میری زبان سے ایک لفظ نہیں نکلے گا۔ میرے لائق اور کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائیں۔“

”آپ کی خاموشی ہی [illegible] خدمت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”[illegible] واپسی پر دیکھ لیجیے ممکن ہے ہم پھر آپ سے [illegible] مانگیں۔“

”[illegible] شام کو [illegible] واپس جاتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”[illegible] لکھوں گا؟“

”کیا اس طرف کوئی پہاڑ ہے؟“ میں نے کہا۔

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایک پہاڑی ہے [illegible] دور [illegible] تو بھی اگر آپ نہر کے کنارے پر چلتے جائیں تو سات میل کے فاصلے پر نظر آ جاتی ہے۔ پہاڑی اتنی مختصر ہے۔ وہاں جنگل بھی خاصا گھنا ہے۔ رات کو بھیڑیے بھی پھرتے ہیں۔“

”مگر وہاں بھی کوئی آبادی نہیں؟“

”نہیں پہلے یہاں ایک چھوٹا سا ڈیرہ تھا [illegible] کیا وہ ڈیرہ [illegible] جنگ میں وہاں [illegible] سے زیادہ [illegible] پھر وہاں ایک چھوٹا سا آرڈیننس ڈپو [illegible] تو پولیس نے وہ علاقہ خالی کرا لیا۔ آس پاس ایک میل کے فاصلے پر بورڈ لگے ہوئے ہیں جن پر لکھا ہے ”ممنوعہ علاقہ“ چنانچہ اُدھر کوئی نہیں جاتا۔“

”[illegible] آرڈیننس ڈپو؟“ میں نے حیرانی سے کہا۔

”آپ تو خیر انٹیلی جنس کے لوگ ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔“

”معلوم ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہے ہیں۔“ میں نے جلدی سے بات بنائی۔ ”مگر میری معلومات کے مطابق یہاں ایسا کوئی [illegible] ڈپو بھی نہیں۔“

”ہمارے علم میں بھی نہیں۔“ غالب نے میری تائید کی۔

”کیا آپ نے کبھی یہاں فوج کی موومنٹ دیکھی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”اگر کہیں آرڈیننس یا ایمونیشن سب ڈپو ہوتا تو وہاں فوج کے لوگ ڈیوٹی دے رہے ہوتے، گاڑیاں آتی جاتی دکھائی دیتیں۔“

وہ [illegible] سر ہلاتا رہا۔ ”[illegible] کبھی نوٹ نہیں کیا۔“ [illegible] جواب [illegible] بائیں طرف [illegible] سنگراں [illegible] میل [illegible] ہے۔“

”آپ کا آفس سنگراں میں ہے؟“

”ہاں آفس کیا ہے، ایک ریسٹ ہاؤس کا کمرہ ہے۔“ وہ بولا۔

”ریسٹ ہاؤس محکمہ انہار کا ہے؟“

”نہیں محکمہ جنگلات کا۔“ وہ بولا۔

”وہاں ٹیلی فون ہے؟“ غالب نے کہا۔

”ہے مگر [illegible] ہے۔“ وہ بولا۔ ”خراب ہو جائے تو مہینہ لگ جاتا ہے ٹھیک ہونے میں مگر ہم اپنا کام دوسری طرح چلاتے ہیں۔“

”دوسری طرح کیسے؟“

”[illegible]“ وہ بولا۔ ”ہمارے پاس [illegible] ٹیلی فون [illegible] جو [illegible] کے لائن مین لیے پھرتے ہیں۔ ایک میل [illegible] باکس ہے، وہاں سے [illegible] بات کر لیتے ہیں۔ اب کیا کریں [illegible] خلافِ قانون تو ہے لیکن آپ لوگوں کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ [illegible] کے لیے حاضر ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ [illegible]“

”آپ نے گاڑی روک دی [illegible] اور خود [illegible] آپ لوگوں نے میری گستاخی کو معاف کر دیا ہو گا۔“

”فارگیٹ اِٹ۔“ میں نے کہا۔

”[illegible]“ غالب نے کہا اور [illegible] نکال کر [illegible] سے صاف کیا۔ اور [illegible] مجھ سے

[illegible] اس کے ہاتھ میں واضح لرزش محسوس کی جس کو اس نے [illegible] خوفناک قسم کے [illegible] تھے۔ یہ تجربہ شاید پہلی بار ہوا تھا [illegible] دھوکا کرنے والے [illegible] نظر آتے تھے [illegible] لگے تھے اور ان کے پاس سروس ریوالور بھی تھے۔ غالب کے پاس [illegible] تھا جو فوج یا پولیس کو ہی ملتا ہے۔ [illegible] کوئی غلط فہمی تھی تو وہ پوری طرح رفع ہو چکی تھی۔

اس کی گاڑی نہر کے کنارے [illegible] سڑک پر [illegible] نظروں سے غائب ہو گئی تو ہم نہر سے ذرا ہٹ کر درختوں کے پیچھے مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔

”وہ [illegible] کیس کا ہی ہو گا۔“ غالب بولا۔

”[illegible] ہو گئے۔“

”اور کیا کرتے اس کے لیے کریں [illegible] ایا کوئی کام ورنہ [illegible]“

”[illegible]“ غالب بولا۔ ”ممکن ہے آج رات [illegible]“

”[illegible] کے لیے اتنا اہم تو نہیں ہو گا۔ اگر وہ چاہتے تو اسے [illegible] جا سکتے تھے۔“ میں نے کہا۔

”[illegible] جنگل کو [illegible] غالب نے [illegible] افسوس کے لیے سر ہلایا۔

”[illegible] کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ [illegible] کمپنی کا [illegible] ڈپو ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جہاں [illegible] پھر سرحد پار بھیجا جاتا ہے۔“

”اور یہ ایک [illegible] پوسٹ ہے۔“ غالب نے کہا۔ ”[illegible] ہوں گے۔“

”یقیناً ہوں گے اور ایسے ہی مقامات پر ہوں گے جو [illegible] ہوں گے اور جہاں [illegible] میں آبادی نہیں ہو گی... یا ہو گی تو اسی طرح خالی کرائی گئی ہو گی۔“

”کل رات جس ٹرک میں مال آیا تھا وہ [illegible] رات [illegible] پہنچا دیا گیا ہو گا اور غالباً ابھی وہیں ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”رات کو [illegible] ہو گئے تھے پھر بھی وہ ساڑھے تین چار بجے تک [illegible] پہنچ گئے ہوں گے۔ اگر ان کو [illegible] کرنے میں دو تین گھنٹے لگے ہوں تو چھ سات بجے تک وہ تمام مال اپنے ڈپو میں پہنچانے کے فارغ ہو گئے ہوں گے۔ اب بجے ہیں ساڑھے سات اور میرا حساب کہتا ہے کہ آٹھ بجے تک ٹرک کو اِدھر سے واپس جانا چاہیے۔“

”[illegible]“ غالب نے [illegible] بھائی کیا ہم کوئی ایسی پوزیشن لے کر بیٹھ سکتے ہیں جہاں سے ہم ٹرک کو چیک کر سکیں اور اس کا نمبر بھی نوٹ کر سکیں؟“

”اس کے لیے بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے؟“ غالب نے کہا۔ ”نہر کے کنارے چلتے ہیں۔ اس جگہ میں [illegible] کون قابلِ غور سمجھے گا؟“

”[illegible] سات [illegible] دیکھا جا سکتا ہے۔“

”[illegible] سات [illegible] جانے کا [illegible] ہو۔“

[illegible] اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا کہ اس جگہ ہم گھومتے

www.paksociety.com

"ہو سکتا ہے مل جائیں گے" میں نے تو درافتادہ جگہ پر کوئی آسانی سے نہیں پہنچ سکتا۔ یہ پٹھان کو کیا معلوم کہ ہم کتنے مرحلوں سے گزر کے کس طرح ان کے سوچ کے علاقے تک آ گئے ہیں۔ آتے جاتے وہ راستے پر ضرور نظر رکھتے ہوں گے۔ کل رات غروب سے پہلے ایک ٹرک کے سوا شاید ہی کبھی دیکھا ہوگا۔"

ہم دونوں نہر کے پیچھے والی سڑک پر چلنے لگے۔ نہر میں پانی بڑے سکون سے بہہ رہا تھا جو دیکھنے میں تھوڑا سا گدلا تھا۔ ایک جگہ ہم نے گاؤں کی عورتوں کو کپڑے دھوتے دیکھا۔ دوسری جگہ نہر میں چار بھینسیں اور ایک بچہ نہا رہا تھا۔ بچہ چودہ پندرہ سال کا تھا اور جیسے بھینسوں کو اپنی عریانی کا احساس نہیں تھا ایسے ہی اس کو بھی نہیں تھا۔

"ماما کا بچہ!" میں نے اسے مخاطب کیا "یہیں سے پنڈ دادن خان والا کتنا دور ہے؟"
اس نے ہاتھ سے پیچھے اشارہ کیا۔ "اوہ پرلی طرف۔"
"پیچھے دیکھئے: پیچھے درختوں اور جھاڑیوں سے چند کچے گھر جھانکتے دکھائی دیتے ہیں۔"

"کیا ہمیں اس آبادی سے رجوع کرنا چاہیے؟" میں نے کہا "کچھ نہ کچھ کھانے کو مل جائے گا۔"

"اس ڈرائیور نے تو کہا تھا کہ آس پاس آبادی کوئی نہیں ہے" میں نے کہا۔ "اس نے کہا تھا کہ پہاڑی کے آس پاس ایک میل کا علاقہ ممنوعہ ہے اور ہم ابھی اس پہاڑی سے پانچ میل دور ہیں" غالب بولا۔

"میں بھی اردو بول سکتا ہوں" لڑکے نے پہلے سے بلند آواز کے ساتھ نیکر پہنتے ہوئے کہا "تم اس پہاڑی کی طرف جا رہے ہو، مرنے کے لیے؟"

"مرنے کے لیے کیوں؟" میں نے کہا۔

"جو بھی ادھر گیا، وہ زندہ نہیں آیا" لڑکے نے انکشاف کیا اور ان سب کے نام گنوانے لگا جو اپنی جان گنوا چکے تھے۔ اس میں لڑکے کا چاچا بھی شامل تھا۔

"کیا اس پہاڑی پر جن ہیں؟" میں نے کہا۔

"اوہ جنس پتا، جن پہاڑ وچ نئیں رہتے، قبرستان میں یا پیپل کے درخت پر رہتے ہیں۔ تم کو اتنا بھی نہیں معلوم؟"

"پھر تم ہی بتاؤ" میں نے کہا "تم بتاؤ کہ تمہارے چاچے کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"اسے شیر نے کھا لیا ہوگا" لڑکا بولا۔

"شیر نے؟" میں اور غالب یک وقت بولے۔

"ہاں جی، شیر نے۔ اب آدمی تو شیر کو کھا نہیں سکتا" وہ بولا "اور وہ تو ہے ہی آدم خور شیر۔"

"مگر دوست شیر اس علاقے میں کہاں سے آ گیا؟" میں نے کہا۔

"تم اس علاقے میں کہاں سے آ گئے ہو؟" لڑکا بولا اور اس کی تیز طراری نے مجھے تھوڑا سا حیران کیا۔ عقل سے بڑی چیز کے ساتھ حل کرنے والا اشتعال ... ہوگا میرے پیچھے لگنے کی بات تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ شیر پاکستان میں کہیں بھی نہیں ہیں۔ چھانگا مانگا میں بھی نہیں ہیں" میں نے اسے سمجھایا۔

"اچھا تو پھر شیر سے کہا جو پوچھنا کہ وہ کہاں سے آیا ہے" لڑکے نے بحث ختم کر دی اور اپنی بھینسوں کو پانی سے نکالنے کے عمل میں مصروف ہو گیا۔

"یہ تو بتاتے جاؤ کہ تمہارے پنڈ میں کوئی ڈھابا ہے؟" میں نے کہا "ہمیں کچھ سگریٹ چاہئیں۔ روٹی شوٹی مل جائے گی؟"

"ماسے وی آ جاؤ" وہ بھینسوں کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ "سگریٹ مل جائے گی، روٹی سب کے گھر پکتی ہے۔"

"مثلاً آپ تو روٹی مانگ کر کھائیں گے، یہ شہر نہیں ہے قبلہ" غالب نے کہا "آپ کسی کے بھی مہمان ہو سکتے ہیں۔ جائیے، گاؤں ابھی ایسے نہیں بنے ... لسی پیا کہاں جاتا ہے؟"

"صبح جو ناشتہ ہم نے کیا تھا وہ تو ہضم ہو گیا" میں نے کہا "آگے جا کر ... ایک کھانے کو صرف ڈھول ہوگی اور پیچھے نہر کا کنارہ جس میں ... اور خواہش ... کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے ... بیٹھ کر تک سکتے ہیں۔" ٹرک بہت دور ایک گرد باد کی طرح نمودار ہوا اور ہم ... چھپ گئے۔

"اب کیا کریں، کسی درخت پر چڑھ جائیں؟" غالب نے کہا۔

"نہیں، پانی بہتر رہے گا، سب سے نہر میں ہی چھپ جائیں گے۔"

"ایک عالم میں سب..." غالب نے کہا اور دو منٹ میں ہم کپڑے کنارے پر رکھ کر نہر میں اتر گئے۔ ٹرک کے آنے تک ہم نے اچھی طرح غسل کیا اور اس ٹھنڈے پانی نے جسم کو بڑی فرحت دی۔ میں اور غالب سر کو پانی کے نیچے غائب رکھنے کے تماشے میں مصروف رہے۔ ٹرک ہمارے پاس سے گزر رہا تھا جب ہم نے ڈبکی لگائی اور نیچے ہی نیچے تیر کر دس گز پیچھے گئے۔ ہم نے اس وقت سر نکالا جب ٹرک ہمارے سامنے سے گزر چکا تھا۔ میں نے اس کے پیچھے لگی ہوئی کمرشل نمبر پلیٹ کو دیکھا۔ یہ نمبر بوگس بھی ہو سکتا تھا لیکن میں نے حفظ کر لیا۔ ٹرک کسی پرائیویٹ کمپنی کا تھا اور اس پر بہت اعلیٰ مصوری کے نمونے تھے۔ ایک حورت بڑے ہیجان انگیز انداز میں ایک شیر کے مقابل کھڑی مسکرا رہی تھی۔ شیر کی آنکھیں تھیں اور وہ حورت پر جست لگا رہا تھا۔ ... رنگ بھر گیا تھا۔ درمیان میں ایک خوفناک مونچھوں اور مختصر تہہ لنگوٹی والا پہلوان بہت بڑا گرز اٹھائے کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیسے شیر کو حورت کو ... پہلوان کے سر پر تاج تھا اور تاج پر لکھا ہوا تھا "مرحوم والد صاحب حاجی قمر دین آنے والے عرف بوٹا پہلوان رستم انبالہ گولڈ میڈلسٹ۔"

یہ سب کچھ مرزا غالب نے بھی دیکھا اور نہر سے باہر نکلنے کے بعد بولا۔ "شیر اس نے مجھ سے چند سیکنڈ پہلے سر نکالا تھا اور میں نے دیکھ لیا تھا کہ ٹرک گولڈن اینڈ گولڈن ... کمپنی گوجرانوالہ کا ہے ... نمبر وغیرہ سب اصلی ہوگا۔ شاید وہ اس طرح خود کو شک اور شبہات سے محفوظ رکھتے تھے اگر ٹرک پکڑا جائے تو وہ صاف بچ جائیں لیکن اس طرح ہو..."

اتنا اہم سراغ مل گیا تھا۔ یہ فرض کرنا تو محال تھا کہ اس ٹرک کمپنی کے مالک یا ڈرائیور کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ مالک کی بے خبری تو تسلیم کی جا سکتی تھی مگر ڈرائیور سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہوگی کہ وہ کیا مال لے کر جاتا ہے۔ اسے اندھیرے میں رکھ کے کوئی غلط کام نہیں ہو سکتا۔ جب کوئی پیاز کا ٹرک ... بتایا جاتا ہے تو یہ ناممکن ہے کہ ٹرک میں چرس بھر کے لے جائے۔ اس طرح تو ہمیشہ ڈرائیور ہی پکڑے جاتے ہیں، اصل مجرم یہ کہہ کے الگ ہو جاتے ہیں کہ ہم کیا جانیں اس نے راستے میں کیا کیا، یہاں سے تو پیاز بھیجی گئی تھی ...

لیکن ڈرائیور کو بتا دیا جائے کہ پیاز کے بہانے چرس لے جانا ہے تو وہ خود بھی حصہ دار ہو جاتا ہے اور چونکہ راستوں پر سے اس کا روز گزر ہوتا ہے اس لیے جو ڈرائیور غلط کام کرتے ہیں وہ غلط قسم کے راستے روکنے والوں کو بھی جانتے ہیں اور ان کی فیس بھی جانتے ہیں۔ سو وہ اپنے کام کا معاوضہ الگ لیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ چرس لے جانے کا معاوضہ وہ نہیں ہوگا جو پیاز لے جانے کا ہوتا ہے۔ پیاز میں تو ... ڈرائیور سے بچ جاتا ہے ... چرس لے جانے والے خاص لوگ ہوتے ہیں، اپنی فیلڈ کے سپیشلسٹ اور ٹرک تو ایک ہی چلاتے ہیں لیکن وقت ... کی مناسبت سے ... طلب کر سکتے ہیں پھر راستے کی رکاوٹیں دور کرنے کا جو ... ذمہ داری ہو گی وہ خریدار کے کھاتے میں ہے۔ ایسی صورت میں مالک بیچارہ تو یہی سمجھتا رہتا ہے کہ ٹرک میں پیاز کراچی گئی ہے مگر ٹرک جا رہا ہو کسی دوسری سمت میں کچھ لوڈ کر کے۔

چنانچہ طے شدہ طور پر ڈرائیور ہیر پھیری کے ہر کاروبار میں ایک فریق ہوتا ہے۔ ٹرک کا نمبر اور کمپنی کا نام ہمارے پاس تھا۔ یہ معلوم کرنا بہت آسان تھا کہ فلاں دن اس ٹرک کو کس نے کرائے پر لیا تھا۔ وہ ڈرائیور بہت کچھ بتا سکتا تھا مگر گزشتہ رات اس نے جو کچھ دیکھا اور مناسب ہے اس سے معلوم ہو سکتا تھا۔ وہ اس سے زیادہ بھی بتانے کی پوزیشن میں تھا کیونکہ وہ ... کے نزدیک ایک خاص آدمی تھا جس پر وہ بھروسا کرتا تھا اور یہ پہلی بار نہیں ہوگا ...

اپنا لائحہ عمل مرتب کرنے کے بعد ہم اس گاؤں میں گئے جو نہر کے بائیں کنارے پر ایک ڈیڑھ فرلانگ دور نظر آ رہا تھا۔ اسے پنڈ کہنا کسی بچے کو شہر کا درجہ دینے کے مترادف تھا ... آبادی ہی شاید پچاس گھر ہوں گے یا اس سے بھی کم اور ان سب کی ضروریات ... سے پوری ہو جاتی تھیں۔ ہر گاؤں کی طرح یہ بھی کوئی ... چیز تھی جہاں انسان اور مویشیوں کی ضروریات کا سامان ایک ہی جگہ مل جاتا تھا۔ انسانوں کے لیے دال چاول تو مویشیوں کے لیے کھل ... انسانوں کے لیے ... اور مویشیوں کے لیے ... وہاں ہمیں پھر کنگ اسٹارک سگریٹ ملے۔ ایک ... نام کی مقبولیت کا ... کم آگاہ ہونے کی تھی کہ سارے براینڈ سگریٹ عوام

کے نچلے طبقے میں ہر جگہ پیے جاتے تھے۔ اس سے اوپر ... پانچ ... کے سگریٹ تھے، جو نسبتاً خوشحال لوگ پیتے تھے۔ سب سے اوپر ... کا مشہور پیکٹ تھا یا مصری کا ... خوبصورت ... پیکٹ اور ... زمانے میں وہی ایک سگریٹ تھا جو ... پیکنگ میں دستیاب تھا۔ گاؤں کے لوگ ... کنگ اسٹارک یا ... کے آگے کچھ نہیں جانتے تھے۔ ... ایک آنے والی ... کی پڑیا جانے کی قسم ... تھوک سے خریدتے تھے، جو دکانوں پر ... کی طرح سجی دکھائی دیتی تھی۔

گاؤں والے ملنے میں سادہ دل اور مہمان نواز تھے جیسے عموماً ہوتے ہیں۔ ... زمیندار نے مسافروں کے ... روٹی کھلوائی ... ہم ... آ گئے ... ہم آپس میں ... بولنے لگے ... ہو جاتے ... ہم بالکل ... نہیں ... جانتے تھے ... گاؤں ... ہو گیا ... راستہ ... مٹھائی ... ہو گئے ... پیٹ بھر گیا تھا اور اب ہم دونوں ... کے رہ گئے تھے ... سگریٹ ... کا کچھ سامان ہو گیا تھا ... طلب پوری نہیں ہوئی تھی ... کسی کو ... سب کچھ نہیں ملتا۔

ہمارا راستہ بالکل سیدھا تھا۔ نہانے اور کھانے سے ہم تازہ دم ہو گئے تھے، ڈیڑھ گھنٹے میں ہم نے چار میل کا فاصلہ طے کیا۔ تمام راستے ہمیں کوئی بھی نہیں ملا۔ پھر وہ موڑ آیا جہاں سے نہر بائیں طرف جاتی تھی اور پہاڑی جو ابھی تک درختوں کے پیچھے اوجھل تھی اچانک ہماری نظروں کے سامنے آ گئی۔ وہیں ہم نے 'علاقہ ممنوعہ' کا پہلا سائن بورڈ دیکھا۔ راستہ اب بھی نہر کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا اور ہم چلتے جاتے تو پہاڑی تک پہنچ جاتے لیکن یہ احتیاط کے تقاضوں کے خلاف ہوتا۔ اگر یہ ایک اہم ڈپو تھا تو یقیناً یہاں حفاظتی انتظامات بھی خاصے سخت ہوں گے۔ محافظ ہر وقت راستے کی نگرانی کرتے ہوں گے اور دور ہی سے آس پاس کے سارے علاقے کو جانچتے رہتے ہوں گے۔

"اس وقت آگے جانا خطرے سے خالی نہیں" غالب بولا "تاریکی چھا جانے کے بعد ... خودکشی کر جانے ..."

"شہید ہونے" میں نے فوراً اس کی تصحیح کی۔

"بات وہی ہے" غالب ہنسا "ویسے ہمارا انداز بیان ہے، دوسرا ذہن کا۔"

"یہاں کھڑے رہنا بھی تو کوئی دلچسپ اور مفید کام نہیں" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"ابھی دوپہر ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہم وہاں رات کو جائیں گے۔ رات ہونے تک ہم قیلولہ فرما سکتے ہیں۔ آپ اپنی پسند کے خواب دیکھیں، میں اپنی پسند کے دیکھتا ہوں۔"

"بیڈروم ایئرکنڈیشنڈ ہے نا؟" میں نے کہا۔

"بالکل ہے، آؤ ہم دیکھ آتے ہیں۔ شنیل کے پلنگ پوش اور ایرانی قالین اور قلمیں پردے۔" غالب نے کہا۔ "ملکی تھا اور پھر وہ خواب جو سنائے بھی نہیں جا سکتے۔ تشریف لائیے۔"

جنگل میں چھوٹے بڑے ہر قسم کے درخت تھے۔ چھوٹے درخت بیری کے تھے اور بڑے شیشم کے لیکن بہت گھنے نہیں تھے۔ زمین کی جلد کے ساتھ خودرو گھاس تھی اور جنگلی پھولوں والے پودے تھے۔ تھوڑی جستجو کے بعد ہمیں ایک ہموار قطعہ زمین مل گیا جہاں لمبے نوکیلے پتوں والی گھاس نہیں تھی بلکہ پھیلاؤ دار سبز گھاس تھی جو زمین پر اور پتھروں پر پھیلتی جاتی ہے اور جڑیں پکڑتی جاتی ہے۔ آس پاس بیس پچیس گز کے فاصلے پر جھاڑیوں کی قدرتی فصیل تھی اور اوپر صرف کھلا آسمان تھا چنانچہ یہ خطرہ نہیں تھا کہ کوئی درندہ ہم پر چھلانگ لگا دے۔ غالب نے جھک کر زمین کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد فیصلہ دیا کہ بیڈروم میں کیڑے مکوڑے نہیں ہیں۔

"اگر رات میں شیر کہا جائے یا ہاتھی اوپر سے گزر جائے تو بُرا مت ماننا۔" غالب نے لیٹتے ہوئے کہا۔ "روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں ایک آدم خور شیر ہے۔"

"نام اس کا دلاور ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر وہ نام کا دلاور ہے۔"

"ممکن تو یہ ہوگا اپنی زوجہ کے پاس۔" غالب آسمان کو تکتے ہوئے بولا۔ "میں ان کے بچھڑ کر ملنے کے منظر کو چشم تصور سے دیکھ سکتا ہوں۔ شملا سے دوبارہ ملے گی۔"

"مجھے اس کی وہ کیفیت یاد ہے جب اسے پتا چلا تھا کہ شملا زندہ ہے۔" میں نے کہا۔ "شملا سے ملنے کے بعد اس کا کیا حال ہوگا۔ شملا نہیں سمجھ سکے گی کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔"

"ممکن ہے لاہور گیا ہو۔" غالب نے [illegible] کہا۔ "میں جانتا ہوں کراچی کی بندرگاہ، تو کہاں جائے گا چیف!"

"کہیں بھی واپس پہنچ ہی جاؤں گا جہاں روشن خیال پیارے سے ابھی تمام۔" میں نے کہا۔ "خیال خود میرے خوابوں کی رہگزر ہوگا۔"

ہمیں ان پرندوں کے شور نے بیدار کیا جو شام ہوتے ہی درختوں پر شب بسری کے لیے آ گئے تھے اور آشیانوں کے گرد منڈلاتے ہوئے خوشی سے چہچہا رہے تھے۔ میں نے دیکھا تو غالب آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ پرندے سارا دن فکر معاش میں رہتے ہیں۔" غالب بولا۔ "اور اب گھر آئے ہیں تو معلوم ہے بیوی بچوں سے کیا کہہ رہے ہیں؟"

"کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہ جو آدمی شام کو دور دراز کا رخ کرنے سے گھبراتے ہی کہتا ہے، ہیلو ڈارلنگ، ابھی کہاں ہو؟ ہم آ گئے۔" غالب بولا۔

"کسی وقت ہم بھی ہوتے تھے۔" میں نے غالب کے کندھے پر تھپکی دی۔ "وہ دن مزیدار ہوگا۔"

"اونہہ... کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔" غالب بولا۔ "کنگ اسٹار سگریٹ جو اس فضا کا شکر بجا لا کر زندہ اٹھ گئے۔"

"تجربہ تخلیقیت کا اندر غالب۔" میں نے کہا۔ "کیا خواب میں مائدہ نے اچھا سلوک نہیں کیا؟"

"ڈر گیا اور بڑا کیا۔ وہ آدھی رات کے بعد آتی ہے۔ وہ ہمیشہ ایک ہی جیسا سلوک کرتی ہے۔ نظر سے نہیں گراتی، اشعروں سے گراتی ہے۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ سادہ عاشق تھا ہوا اول بال ہو گیا۔ میلا کچیلا ہو گیا، کوئے سے دھوبی پچھاڑ... دھوبی پٹخا، نیل کیا، جان تک نکل جائے۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ غالب کے بیان کا انداز جدا ہوتا ہے دوست...

ہم نے ایک بار پھر نہر میں ڈبکی لگائی اور سفر کے اگلے مرحلے کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ سفر اندھیرے جنگل کا سفر تھا مگر راستہ گم ہونے کا احتمال کم تھا کیونکہ ہمیں نہر کے متوازی چلنا تھا۔ کسی دشواری کے بغیر ہم نے دو ایک میل کا فاصلہ ایک گھنٹے میں طے کر لیا۔ ہم بہت محتاط تھے اور ہمارے کان ہر آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ ہم بات بھی کرتے تھے تو ایک دوسرے کے کان میں سرگوشی کے انداز میں۔

"یہ ایک پہاڑی ہے۔" غالب نے رک کر کہا۔

"یہ صرف ایک پہاڑی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور کچھ نہیں۔"

"لیکن یہاں ایک آدم خور شیر ہونا چاہیے۔" غالب بولا۔ "یہ علاقہ [illegible] ہے تو کیوں ہے؟"

"شیر کی افواہ بھی بے مقصد نہیں پھیلائی گئی۔" میں نے کہا۔ "گاؤں کے ان پڑھ لوگ علاقہ ممنوعہ کی اصطلاح نہیں سمجھتے۔ انھیں اس علاقے سے دور رکھنے کے لیے شیر ایجاد کیا گیا۔ ایجاد اس لیے کہ ویسے تو مغربی پاکستان میں شیر سوائے چڑیا گھر کے کہیں دستیاب نہیں۔ مگر گاؤں والے یہ باتیں کیا جانیں۔"

"اور اس فرضی آدم خور شیر نے کئی زندہ انسانوں کو نگل لیا۔"

"ہاں، وہ لوگ جو نادانستہ یا غیر ضروری طور پر تجسس پسند اور مہم جو ہو گئے ہوں گے۔ شیر کی حقیقت دریافت کرنے یا کسی غلطی کے باعث بھٹک کر ادھر نکل آئے ہوں گے، جہاں سے واپسی ان کے اختیار کی بات نہ رہی تھی۔ ان کی ہڈیاں اور جسم کے بچے ہوئے ٹکڑے جو بعد میں ملے ہوں گے، افواہ پھیلانے میں کام آئے ہوں گے کہ انھیں شیر نے کھا لیا۔"

"مگر مجھے ابھی تک کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دی۔" غالب بولا۔

"اس کے لیے زیادہ قریب جانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"ایسا تو نہیں کہ وہ پہاڑی کے پیچھے ہو؟"

"آؤ پتا کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم گھوم کے جاتے ہیں۔"

غالب کے منہ سے نکلی ہوئی بات ایک گھنٹے کے بعد سچ ہوئی۔ پہاڑی کے عقبی حصے میں ہم نے روشنی دیکھی۔ روشنی بہت مدھم تھی اور غالباً الیکٹرک روشنی تھی۔ گھپ اندھیرے میں چمکنے والی یہ دھندلی روشنی پہاڑی کے دامن میں کبھی نظر سے اوجھل ہو جاتی تھی اور کبھی پھر نظر آنے لگتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہوا سے شاخیں ہلتی تھیں تو ہماری آنکھوں کے اور روشنی کے بیچ میں آ جاتی تھیں۔ میں نے اور غالب نے آہستہ آہستہ کوئی آہٹ کیے بغیر بڑھنا شروع کیا۔ ریوالور اب ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ ہم ایک پلان کے مطابق پیش قدمی کر رہے تھے۔ پہلے میں چند قدم چلتا تھا اور غالب کسی درخت کی اوٹ میں ریوالور لیے کھڑا رہتا تھا کہ اچانک کوئی سامنے آ جائے تو وہ میری مدد کرے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ سامنے آنے والے کو شوٹ کر دے اور ہم واپس بھاگ کھڑے ہوں۔ جنگل میں فائرنگ کے بعد اس غیر قانونی اڈے کے [illegible] دشمن کی پسپائی کا عدم امکان اسلحے کے ساتھ نکلتا اور ہماری تلاش میں ہمارے پیچھے دوڑ پڑتا۔

باری باری ایک دوسرے کو تحفظ دیتے اور کور فراہم کرتے ہم نے مزید سو گز طے کیے۔ اب ہمیں ایک ہی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ بتی اس دروازے کے اوپر جل رہی تھی۔ اس کے بالکل نیچے کوئی شخص بیٹھا تھا۔

بیٹھا ہوا شخص اس کے پاس ایک دوربین بھی تھی جس سے وہ مسلسل [illegible] کے ذریعے سامنے کا سارا علاقہ دیکھتا تھا۔ یہ اندھیرے میں بھی صاف دکھانے والی دوربین تھی۔ انفراریڈ شعاعوں کی مدد سے تصویریں اتارنے والے کیمرے بھی اب کوئی جادوئی چیز نہیں رہے تھے لیکن اس قسم کے کیمرے علاوہ ایسی دوربینیں بازار میں دستیاب نہیں تھیں۔ یہ سراغ رسانی کے محکموں اور اداروں کو بطور خاص فراہم کی جاتی تھیں۔ ہم نے دوربین کے سامنے آنے سے گریز کیا اور درختوں کی اوٹ سے دروازے کو دیکھتے رہے۔

کچھ دیر بعد اندر سے ایک شخص نمودار ہوا اور اس نے پہلے سے بیٹھے ہوئے شخص کی جگہ سنبھال لی۔ ہم پھونک پھونک کر قدم بڑھاتے اور آگے گئے۔ ابھی بات کرنے کی بالکل گنجائش نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہاں درختوں پر خفیہ کیمرے اور مائیکروفون نصب ہوں گے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ زمین میں سنسنی خیز آلات نصب ہوں۔ اس علاقے کی حفاظت کرنے والوں کے نزدیک ایک طریقہ یہ تھا کہ بیک وقت بارودی سرنگیں بچھائی جائیں۔ بجلی کا ایسا نظام ہوتا کہ جب بھی کوئی اس پر قدم رکھتا تو دھماکا ہوتا اور آس پاس کی دور دور تک سنائی دیتا۔ دوسرے شخص بھی بارودی سرنگ کے ساتھ ہی اڑ جاتا۔ یہ دو طرفہ خطرہ تھا۔

چنانچہ یہ بالکل ممکن تھی کہ ہم قدم قدم پر شکاری پھندے سے جو جال ہو سکتے ہیں اور شکنجے ہو سکتے ہیں۔ ایسا کوئی سرے ہو اقسام

رہی ہو جیسے ان کی طرف بڑھائے جانے والے بڑے بھٹکے آدمی کے پیر کو اس طرح جکڑ سکتے ہیں کہ ہڈی ٹوٹ جائے۔ ایسے جال ہو سکتے ہیں جو اچانک اوپر سے آ گریں اور آدمی اندر ہی بند ہو جائے۔ ایسے گڑھے بھی ہو سکتے تھے جن پر سرکنڈے رکھ کے گھاس پھوس پھیلا دی جائے اور ان پر کوئی قدم رکھے تو اندر گرے اور گرنے والے کے لیے باہر نکلنا ناممکن ہو۔ گڑھے میں نوکیلے بانس گاڑے جا سکتے تھے جو آدمی کے بدن میں گھس جائیں۔ شکاری ہر علاقے کے جانور کے لیے الگ پھندا یا شکنجہ رکھتے ہیں۔ جنگل کے اندھیرے میں رات کے وقت یہ پھندے دیکھے تو نظر آ ہی نہیں سکتے تھے لیکن ہمارا قدم ایک بار غلط پڑ جاتا تو ہم گرفتار ہو جاتے اور شکاری فوراً آ پہنچتے۔

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ایک حفاظتی بندوبست کیا تھا۔ میں نے ایک خشک ٹہنی اٹھا لی تھی جو ایسی ہی میری ضرورت تھی یعنی چار فٹ لمبی اور عام سی مضبوط لاٹھی۔ ہر قدم آگے بڑھانے سے پہلے میں زمین پر ٹہنی پھیر کر اطمینان کر لیتا تھا کہ کوئی شکنجہ یا تار تو نہیں ہے۔ یہ ہیر پھیر کو نہیں اور سرکنڈوں کی کھوکھلی چھت پر گھاس بھی ہوتی ہو تو میں قدم رکھنے سے بچ جاؤں گا۔ میری اس احتیاط کو غالب نے بھی پسند کیا۔ مگر اسے پتا تھا کہ آس پاس کوئی ایسی شاخ نہیں ملی۔ اگر وہ کسی درخت سے چار فٹ لمبی اور ایک اچھی شاخ توڑتا تو اس کی آواز ہوتی کہ اب یہاں گو دور نظر آنے والے کانوں نے بجلی کی کڑک کی طرح سنا ہوگا۔

مجھے اس حفاظتی انتظام نے پہلی بار اس وقت بچایا، جب میں نے ایک گڑھا دریافت کیا جسے بہت ہوشیاری سے کیموفلاج کیا گیا تھا اور اس کی سطح جنگل کی عام سطح نظر آتی تھی۔ میں نے ٹہنی ماری تو مجھے سرکنڈوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے غالب کو روک لیا۔ وہ درخت کی اوٹ میں دبکتے ہوئے بیٹھ گیا۔ میں نے مزید ٹٹولا تو ٹہنی کی پھینٹ پر گھاس اور بے شمار بانس۔

وہ ایک گڑھا کافی دیر تلاش کرتا رہا۔ دس منٹ کی خاموش کوشش کے بعد پتا چلا کہ وہ کوئی گڑھا نہیں ایک خندق ہے جو تین فٹ چوڑی ہے اور ہمارے دائیں بائیں پھیلی ہوئی ہے۔ غالباً پہاڑی کے سامنے والے حصے کے آس پاس جہاں وہ دروازہ نظر آ رہا تھا کوئی کسی سمت سے بھی آتا اس خندق میں ضرور گرتا۔ اس سے بچ کے نکلنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ تین فٹ چوڑائی میں چلتے ہوئے آدمی کا ایک قدم پڑنا یقینی تھا۔

غالب نے شاباش کے انداز میں میرے کندھے پر تھپکی دی اور میں کو رخش بچا لیا۔ خندق کو عبور کرنے سے پہلے ہم نے پھر دروازے کو دیکھا جس دروازے کے سامنے شعاعوں کو دوربین کی مدد سے دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک شخص اوپر دیکھا گیا تھا اور مجھے یہ کسی غار کا دروازہ لگ رہا تھا اس دروازے کے پیچھے بالکل اندھیرا تھا۔ میں نے خندق پر سے گزرنے کے بعد جب بیٹھنے کا ارادہ کیا تھا کہ جیسے دن نکل آیا ہو۔ پہاڑی پر ایک ایسی سرچ لائٹ روشن ہوئی جس کی طرف دیکھنا ناممکن تھا۔ میں اور غالب فوراً لیٹ گئے۔ سرچ لائٹ آہستہ آہستہ گھوم رہی تھی۔ ہمارے اوپر سے گزری۔ میرا دل زمین اور سینے کے درمیان اچھلنے لگا۔ اس روشنی

www.paksociety.com

کے منتقل ہونے والے نُجانے میں آ گئے تھے۔ سے خندق کی گہرائی نظر آتی تھی اگر ہم یا غالب اس میں اُتر جاتے تو چھ فٹ نیچے جاتے۔ بالکل نیچے سیمنٹ کا فرش تھا جس میں کانچ کے ٹکڑے اس طرح جڑے ہوئے تھے جیسے بعض گھروں کی بیرونی دیواروں اور گملوں کی منڈیروں پہ لگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سب اس کا استعمال نہیں رہا تھا لیکن کچھ روز کو بست و بیکار ہو گئے تھے مگر ایک زمانے میں یہ حفاظتی انتظام خاصا معقول تھا۔ خندق میں گرتے ہی ہمارا سارا جسم نوکیلے تیز دھار والے شیشوں کی جراحت سے کٹ جاتا اور ہم اس قابل نہ رہتے کہ اپنے زخموں سے بہنے والے لہو کو روک سکیں اور خندق سے نکل کے فرار ہو سکیں۔

سرچ لائٹ ایک راؤنڈ مکمل کرنے کے بعد آف ہو گئی تو میں نے رُکی ہوئی سانس کو خارج کیا اور غالب کے ساتھ خندق کے پار کود گیا۔ تین فٹ کا فاصلہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم نے آہستہ سے جست لی اور کسی آہٹ کے بغیر دوسری طرف پہنچ گئے لیکن اس وقت غالب کے حلق سے ایک ایسی آواز نکلی جسے سُن کر میرے دل کی دھڑکن رُک گئی۔ میں نے پہلے دروازے کی طرف دیکھا جو سنتری نے یہ آواز نہیں سُنی تھی پھر میں غالب کی طرف متوجہ ہوا۔

یہ دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا کہ غالب کا ایک پاؤں شکنجے میں پھنس گیا ہے۔ شکنجے سے مراد اوپر یہ فولادی شکنجہ اس کے پیر سے یوں چمٹ گیا تھا جیسے جونک کھال سے چمٹ جاتی ہے۔ غالب سخت تکلیف میں تھا اور یہ اسی کا حوصلہ تھا کہ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کو دبا لیا تھا۔ اس میں غالب نے اپنے ہی دانت اپنی ہتھیلی میں گاڑ دیے تھے لیکن اپنی آواز نہیں نکلنے دی تھی۔ میں نے جھک کر شکنجے کو دیکھا۔ یہ مضبوط لوہے کے اسپرنگ لاک والا شکنجہ تھا جسے صرف مخصوص چابی سے کھولا جا سکتا تھا۔ اس کا وزن بھی ڈیڑھ دو سیر سے کم نہیں تھا۔ غالب کا پیر سیدھا اس پر پڑا تھا اور شکنجے نے مگرمچھ کے دانتوں کی طرح غالب کی ٹانگ پکڑ لی تھی۔

میں نے ہاتھ سے شکنجے کو ہلایا تو خوف اور صدمے سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ شکنجے کے اوپر سے غالب کی پنڈلی ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر تھپک کر دبایا اور اُسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ اب یہاں ایک لمحہ ضائع کرنا بھی بے سود تھا۔ میں نے غالب کو اٹھایا تو شکنجہ بھی ساتھ اٹھ آیا اور ٹوٹے ہوئے جوڑ کے ساتھ لٹکنے لگا۔ غالب درد کی شدت سے تڑپا اور میرے ہاتھوں سے نکل کے خندق میں گرتے گرتے بچا۔

"بس غالب... بس ایک منٹ... صرف ایک جھٹکا اور پھر..." میں نے کہا اور خندق عبور کر گیا۔ غالب بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے کمال ضبط سے کام لیا اور منہ میں ہاتھ دبا کر ... میں نے اُسے چند قدم دور لے جا کر جھاڑیوں کے پیچھے لٹا دیا۔ شکنجے کو الگ کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اب مجھے غالب کو اٹھا کر پانچ میل واپس جانا تھا اور کوئی ایسا انتظام کرنا تھا کہ شکنجہ اُسے تکلیف نہ دے اور اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو نہ ہلائے۔

پھر یہ سوچ کے کہ میں نے اپنے لباس سے [illegible] کھدر کو نیچے سے پھاڑا اور ایک لمبی پٹی تیار کی۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ مجھے کوئی ایسی مضبوط لکڑی نہیں مل رہی تھی جس کو استعمال کر سکتا۔ [illegible] اُسی لکڑی کو توڑا جس میں ابھی کچھ پتے ... اور شکنجے کو دریافت کر کے بے استعمال کرنا تھا۔ یہ موٹی لکڑی ایک انچ کے قریب موٹی تھی اور تھا ایک ایک فٹ کے دو ٹکڑے توڑنا کوئی مشکل کام نہیں تھا مگر مجھے اس طرح پیدا ہونے والی آواز سے ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے [illegible] کے نیچے دبا کے موڑا۔ لکڑی چٹ سے ٹوٹ گئی اور میرا دل ایک بار پھر سے دھڑک کے رُک گیا ... آواز کے ساتھ ہی سرچ لائٹ پھر روشن ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ بے رحم روشنی ہم تک پہنچتی، میں بھی غالب کے ساتھ ساکت ہو کے لیٹ گیا۔ روشنی جھاڑی کے پتوں کی جالی سے چھن کر گزر گئی۔

میں نے دونوں لکڑی کے ٹکڑوں کو پنڈلی کے متوازی رکھا [illegible] انداز سے سیدھا رکھتے ہوئے پٹی کس کر باندھنا شروع کی۔ یہ ابتدائی امداد کا اصول تھا۔ طبی امداد نہیں تھی تاہم اس سے غالب کی مشکل [illegible] کام آسانی سے ہونے کی توقع تھی۔ میں نے دانت سے [illegible] پھاڑی اور اس سے بھی دونوں کھپچیوں سے کھینچ کر لپیٹ دیا۔ [illegible] سوا انچ چوڑائی کی پٹی [illegible] کر لیا اور لکڑیوں کی گرفت سخت سے سخت ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ میں نے ہاتھ سے ہلا کے دیکھا تو وہ مضبوطی سے جم گئی تھی۔ ٹانگ کا جوڑ جس جگہ ہے میں نے کپڑا اتار دیا [illegible] کو نیچے سے پھاڑنا شروع کیا۔ میں نے ایک کے بعد ایک چار پانچ چوڑی پٹیاں پھاڑیں اور پھر مضبوط دھجیوں کو بل دے کر ایک رسّی سی بنا لی۔

میرے پاس ایک خاصی مضبوط رسّی تیار ہو گئی تھی جو دو سیر کا وزن اٹھا سکتی تھی۔ میں نے اس رسّی کو شکنجے کے ایک حلقے سے گزارا اور اپنی گردن میں ڈال لیا۔

پھر میں نے غالب کو یوں اُٹھایا کہ شکنجہ بھی ساتھ رہا [illegible] اس کا سارا وزن میری گردن نے اٹھایا۔ غالب کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ شکنجے کی گرفت برقرار تھی لیکن اس کا وزن کسی طرح بھی ٹانگ پر نہیں پڑ رہا تھا۔ میں نے غالب کو اٹھا کے چند قدم کا فاصلہ طے کیا تو اندازہ ہوا کہ رات بھر میں پانچ میل کی مسافت طے کرنا کتنا مشکل ہو گا۔ مجھے خود کو اس محافظ کی دوربین نظروں سے بھی محفوظ رکھنا تھا جو اندھیرے میں بھی ہر نقل و حرکت کو دیکھ سکتی تھیں۔ میں ایک درخت سے درخت کی اوٹ میں جاتے ہوئے پیچھے مُڑ کر دیکھتا تھا پھر ایک آگے کی زمین کو بغور دیکھ کر اور ٹٹول کر اگلا قدم بڑھاتا تھا۔ غالب کا وزن پر تھا اور شکنجے کا وزن میرے گلے میں یوں جھول رہا تھا کہ جب حرکت کرتا تھا تو فولادی شکنجہ میرے سینے پر دھم دھم لگتا تھا۔

پچاس گز کا فاصلہ میں نے کتنی دیر میں طے کیا، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ ہر قدم پر میرا لوک مسافت کا ایک حصہ تھا جس میں خاک کا خوف لگ رہا تھا۔ میں پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ یہ جسمانی مشقت سے زیادہ ایک انجانے خوف کا احساس تھا جو میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی سرد لہر دوڑا دیتا تھا کہیں اگلے قدم پہ کوئی شکنجہ مجھے شکار نہ کرلے۔ میں کسی جال کے بچھے ہوئے [illegible] جنگل میں بھیڑیے اور گیدڑ چلا رہے تھے، جس سے رات کا سناٹا زیادہ دہشت ناک محسوس ہوتا تھا۔ غالب کا کراہنا اب کم ہو گیا تھا۔ میری ترکیب نے اس کے پاؤں کو وقتی طور پر جوڑ کے بندھے کی تکلیف سے نجات دلا دی تھی۔ جہاں شکنجے نے اپنے آہنی دانت گاڑ رکھے تھے، وہ جگہ شاید سُن ہو گئی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس قسم کی چوٹ کچھ دیر بعد زیادہ تکلیف دیتی ہے، جب پٹھے اکڑنے لگتے ہیں اور سوجن بڑھتی ہے۔

دو گھنٹے بعد بھی میں ممنوعہ علاقے ہی میں تھا اور میرا اپنا یہ حال تھا کہ پانچ میل کا فاصلہ پانچ سو میل کے سفر سے زیادہ کٹھن نظر آ رہا تھا۔ میں نے میری مایوسی کا اظہار غالب پر نہیں ہونے دیا۔ میں اُسے برابر ہنسا اور ہمت سے کام لینے کی تلقین کرتا رہا اور اُس کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔

"یار یہ سب مصیبت میری وجہ سے پڑی تجھ پر" وہ بولا۔

"کیا چوٹ کا اثر تیرے دماغ پر بھی ہو گیا ہے؟" میں نے بڑی سے کہا "تیری جگہ اس شکنجے میں میرا پاؤں بھی پھنس سکتا تھا۔"

"پھر بھی یار، مجھے شرم آ رہی ہے کہ تیرے لیے..."

"دیکھ اس بات کو مرزا غالب کے [illegible]" میں نے کہا "ایسی خیریت کی باتیں ابھی نہیں نکلیں تیرے منہ سے۔ کیا میں اس طرح ٹانگ تڑا بیٹھتا تو مجھے کوئی ڈراتا؟ ... یا استاد ٹیڈی... تو اللہ میں... ہم میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں ہوتا تو دوسرا کیا کرتا؟ باقی باتیں اللہ حافظ کہہ کے چلا جاتا؟ لعنت ہے تیری اس سوچ پر..."

"لعنت ہے میری اس ٹانگ پر۔"

"یہ لعنت کرنا میرے نزدیک کفر کا کلمہ ہے" میں نے کہا۔ "تمام عمر اس ٹانگ نے کہاں کہاں تیرا ساتھ دیا۔ تجھے کہاں کہاں لے گئی، تیرے وجود کے بوجھ کو اٹھائے پھرتی رہی۔ یہ جسم خدا کی تخلیق کا وہ شاہکار ہے جس کا ایک پرزہ بھی بے مقصد اور فالتو نہیں۔ تو اس میں نقص نکال کے کفرانِ نعمت کا مرتکب ہو گا۔ تیری [illegible] بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی تیری ایک آنکھ، ہاتھ یا پیر کی ایک انگلی۔ یہ بھی نعمت [illegible] جا سکتی تو [illegible] لعنت میری اس ٹانگ پر [illegible] پھینک دے تو"

"یار تو اس پھر دماغ خراب ہو گیا ہے" غالب شرمندہ ہو کے بولا "تو اب زیادہ مت بول، تیری سانس پھول رہی ہے۔ ہم کتنی دور آ گئے ہیں؟"

"تقریباً آدھا راستہ [illegible]" میں نے کہا۔

"ان اونچے درختوں کے پیچھے [illegible] سے ایک بار مُڑ کے دیکھا تھا" غالب نے کہا۔

"اچھا میں نے نہیں دیکھا۔"

"تو اپنے سامنے دیکھ، یہ جو میری نظر پیچھے سے دونوں جانب دیکھ سکتی ہے" غالب نے کہا "تو تھوڑی دیر رک کر دم لے لے۔ ابھی بہت دور جانا ہے۔"

ہم نے وہاں آدھا گھنٹہ آرام کیا۔ میں ایک درخت کے نیچے دراز ہو گیا۔ مجھے اپنی سانس کی رفتار بحال کرنے میں دس منٹ لگے۔ زمین پر چیونٹے رینگ رہے تھے اور درخت کی چھال نے میرے پسینے بھرے جسم پر [illegible] لگے تھے۔ دو بڑے خونی قسم کے چیونٹے تھے۔ ایک نے میری گردن پر کاٹا تو میں اچھل پڑا۔ میں نے اسے نوچ کے الگ کیا تو میری انگلیوں نے خون کی معمولی سی نمی کو محسوس کیا۔ پھر دوسرے نے میرے پیٹ پر کاٹا۔ میں نے اُٹھ کر اپنا کرتہ اُتارا اور جھاڑ کر پہنا۔ کرتہ اب آگے پیچھے سے ڈیڑھ دو فٹ کم ہو گیا تھا اور اس کی لمبائی کوٹ کے برابر رہ گئی تھی۔ [illegible] یہ ہیئت مضحکہ خیز ہو گئی تھی لیکن مجھے اپنی ہیئت کذائی کا احساس ہی نہ تھا۔

درخت سے ذرا ہٹ کے چیونٹے نہیں تھے وہ ایک ٹیلے سے نکل کر سیدھے درخت پر جا رہے تھے یا درخت سے اُتر کے بل میں داخل ہو رہے تھے۔ میں اس جگہ سے دو گز دور لیٹ گیا۔ میری نظر اوپر تاروں بھرے آسمان پر گئی اور بے اختیار میرے ہونٹوں سے ایک دعا نکلی۔ خدایا مجھے آج کی رات دوستی کی لاج رکھنے کا حوصلہ دے اور نہ جانے کیسے مجھے ایک سرگوشی سی سنائی دی۔ میں نے اپنی [illegible] یہ دو پہاڑوں کے درمیان سنائی دینے والی صدائے بازگشت محسوس ہوتی تھی۔ یقیناً غالب نے کچھ نہیں سنا تھا۔ [illegible] یہ میرے دل کا واہمہ تھا یا میری دعا کا سفر تھا جو عرش تک پہنچ کر لوٹ آئی تھی۔ یہ ایک مخلص دعا تھی جو مدد کی التجا تھی یا فریاد تھی۔ [illegible] میری تسلی ملی ہے۔

ایک سگریٹ جلا کر میں نے غالب کو دی اور دوسری خود پھونکا۔ دھواں [illegible] کو میں نے بڑی حسرت سے دیکھا۔ یہ خوشبو بھی کیسی ایک نفسیاتی سہارا فراہم کرتی ہے۔ غالب بھی خاموش پڑا رہا۔ اسے پیچھے رکھتے ہوئے میں نے پوری احتیاط سے کام لیا تھا۔ پھر بھی فولادی شکنجہ اس کے منہ پر لگ گیا تھا۔ دوبارہ سفر کا آغاز کرنے سے پہلے میں نے اپنے کُرتے کو دونوں طرف سے پھاڑ دیا اور ایک رسّی سی بٹ کے ایسا بندوبست کر لیا کہ شکنجہ میری گردن میں طوق کی طرح پڑا رہے لیکن حرکت نہ کرے اور میرے سینے پہ وار نہ کرے۔ میں نے اسے اپنی کمر کے ساتھ بھی کس لیا اور پھر نئے عزم کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

رات کا وہ سفر جن حالات میں ہوا، اس کی وہ داستان ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ صبح مرغے اذانیں دے چکے تھے، جب میں گاؤں

www.paksociety.com

گاؤں نظر آیا جہاں سے ہم گزشتہ روز جیپ میں گزرے تھے۔ ہم
گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے تو مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی — گھر
سے نکلنے والے پہلے نمازی نے ہمیں دیکھا اور ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ
ایک ادھیڑ عمر سفید ریش والا دبلا پتلا بوڑھا تھا۔

"ارے یہ کیا ہوا؟" وہ بڑبڑایا اور پھر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے مجھے دیکھنے
لگا۔ "تم لوگ تو کل والے آئے تھے... کیا ہوا؟"

"ہم جنگل جا رہے تھے، یہ میرا دوست ہے اس کی ٹانگ ٹوٹی
لیکن جان بچ گئی، باقی چوٹ لگی ہے۔"

ذرا سی دیر میں ہمارے گرد کئی نمازی اکٹھے ہو گئے۔ انھوں نے ہمیں
وہیں بیٹھنے کو کہا اور مسجد کی طرف جاتے جاتے کہا "انشاء اللہ نفل پڑھ کے آتا ہوں"
پندرہ بیس منٹ بعد وہ پھر آئے اور گاؤں میں ایک ہلچل پیدا ہو
گئی۔ سب لوگ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے کہا کہ اگر ہمیں جانے کے لیے
کوئی سواری مل جائے...

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "کہاں جانا ہے؟"

دوسرے نے سر ہلایا "اسپتال؟" مگر تیسرے نے کہا کہ زمیندار
ابھی آنے والا آدمی تو نہیں ہے کہ کسی کی مصیبت میں بھی مدد نہ کرے۔ اسے
جگانے میں کوئی حرج نہیں۔ انھوں نے مجھے میرے فرض سے سبکدوش
کر دیا اور غالب کو خود اٹھا کے چل پڑے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ انھوں
نے جس احتیاط کا مظاہرہ کیا اس سے غالب کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی۔
زمیندار وہی شخص تھا جس کا اس گاؤں میں واحد پکا مکان تھا اور
جس نے گزشتہ روز ہمیں مسافر جان کر کھانا بھی کھلایا تھا۔ اس نے
شور مچانے والوں کو اندر ہی سے کچھ کہا لیکن دروازہ کھول
کر دیکھنے پر اسے حقیقت حال کا علم ہوا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ اس کی گاڑی
کا واحد ڈرائیور تھا جہاں جانے کی ضرورت تھی، نکالا گیا۔ ہم
کا پورا خرچ وہی برداشت کرے گا، اس کا کہنا تھا۔ فضول و لایعنی

وہ خود ایک ڈاکٹر تھا جو ایک قصبے میں جاتا تھا۔ اس نے
ساتھ کر ولایتی دوا کا ڈبہ بھی دے دیا۔ اور دوائی قریب علاج ہمارے
مزاج کے موافق ہی نہیں... اس نے میٹھی دوا بھی دی تھی جو بیمار
کے لیے لایا تھا، مگر وہ استعمال نہیں ہوئے تھے کیونکہ غالب
کا ارشاد تھا کہ اس کا پیٹ گرم ہے... وہ ٹیکہ لگوا کر ہی غالب
سو گیا۔ اندر سے دوا کو جلا دیتی ہے، اگر کو چھوٹا دینی ہے تو ٹھیک
ٹھاک کر لیں۔

اس سب کی ناپسندیدگی کے باوجود میں نے غالب کو ٹیرامائی سین کا انجکشن
دیا۔ اس کے ساتھ ہی پینسلین دی اور پھر اسپرو کی چار گولیاں اس کے حلق سے
اُتار دیں۔

میرے سادہ دل میزبانوں کو تعجب کمال تھا کہ اتنی گرم دوائیں پیٹ
کھانے کے بعد غالب جھلس نہ جائے گا اور اس کے اندر جو آگ لگے گی وہ

غالب اس معجزے کے مطابق ہو گیا کہ وہ کچھ جلا دیا تھا دہشت کر سو گیا۔
لیکن انھوں نے ہمیں ہماری تقدیر پر چھوڑ دیا اور خود کشی... بلکہ میرا مطلب
اقدام قتل کی اس کوشش پر احتجاج نہیں کیا۔ صرف کرشمہ جانے کب ہو۔
میرے سامنے مختصر اور ہماری ساری تحریریں... چلیں گی ہوئی
میزبانوں کی خواہش کے عین مطابق بستر کا ہمیں خیال تھا کہ ہم دونوں
جوانوں کو اسے سو میں گنا تو کھا نا ہی چاہیے پھر ہمیں پہنچا کر اسی گھر
سے اور مجھے اتنا آرام ملا کہ بدلے صاحب خانہ کے لباس میں ملبوس کر
کیا۔ جو شلوار قمیص پر مشتمل تھا اور بہت بڑا تھا عزت کے تمغوں اور
نیکی کے جذبے نے اس کی قدر و منزلت کسی بیش قیمت سوٹ سے
بھی ہزار گنا زیادہ کر دی تھی۔

ساڑھے سات بجے ہمیں گاؤں کا واحد تانگا... منگوا لیا گیا کہ جلد
سے جلد ہم شہر جائیں۔ میں نے انھیں بتایا تھا کہ وہاں ایک شہر کے اور ڈاکٹر
عزیز ہیں اور وہ اپنی گاڑی میں ہمیں شہر لے جائیں گے۔ تانگے کا سفر
کوئی آرام دہ سفر نہیں تھا پکی سڑک پر ہچکولے بہت زیادہ لگتے تھے
اسپرین نہ ملتی تو غالب کے لیے درد کی اذیت یقیناً ناقابل برداشت
ہوتی۔ اب وقتی طور پر درد کچھ دب گیا تھا۔ اسپرین میں نے بھی کھائی تھی
کیونکہ رات بھر جنگل میں سفر کیا تھا اور ذہنی تو تقویت کے اعتبار سے
سخت ترین حالات میں کیا جانے والا سفر تھا۔ تانگے میں بیٹھ کے مجھے
بڑی راحت ملی اور مجھے پھر اپنی دعا کا خیال آیا کہ دعا قبول نہ ہوتی تو یہ
سب کیسے ہوتا۔ چاہے یہ معمولی چیز تھی کہ گیا اس گاؤں میں اسپرین اور
انجکشن بائیو کیمک دواؤں کا سوچا بھی جا سکتا تھا۔ اب کسی بڑی نعمت
سے بڑھ کر سگریٹ پیا اور مجھے جسم کو بہت آرام ملا۔ ...
موت کے منہ میں جا کے زندہ لوٹ آئے تھے۔

ساڑھے نو بجے تانگا اور ویٹر کے آفس کے سامنے رکا تو وہ
مجھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا پھر اس نے غالب کو دیکھا اور وہ بے دھڑک بولا۔
"یہ... یہ سب کیا ہے سر؟" وہ بولا۔
"تمہارے ... کا اطمینان ہے تو میں نے کہا "آپ کی گاڑی کہاں ہے؟"
"وہ ادھر پیچھے کھڑی ہوئی ہے" وہ بولا۔
"تو اسے یہاں لے آئیے۔ اپنے دوست کو اس میں منتقل کر کے
پھر ہم ایک ٹیلی فون کریں گے پھر آپ ہمیں شہر لے جائیں گے" میں نے کہا۔
"میں... یس سر" وہ بولا۔ اس کے لیے حیرت کے سوا
کچھ تھا۔ وہ ہر طرح جانتا تھا کہ ہم اس کے پاس دلیل لائے جب سے جب
ہم سے ہاتھ ملا کے اور پیچھے کی بات کا صحت پوچھنا بھول گیا۔ اس نے
غالب کو اور مجھے اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر منتقل کر دیا تو ٹیلی فون استعمال
کرنے کا مرحلہ آیا۔ اور ویٹر مجھے اپنے ساتھ آفس میں لے گیا۔
"سر... یہ سب بہت عجیب اور ناقابل یقین طریقہ ہے۔"
"کیوں؟ آپ کا فون پھر خراب ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ ہفتے سے خراب ہے" وہ بولا اور اس نے ایک میز کی دراز
سے ٹیلی فون نکالا جس سے مجھے پڑھ کے لائن ملتی تھی
متعلق تھی، میں مصیبت میں تھا۔ "شکریہ جناب یہ سرکاری معاملہ ہے؟"
"یہاں سب سے بڑھ کر کسی کی جان ہے۔ جو تم سے ہو سکے"
پیچھے ہٹتے ہوئے کہا، "یہ اتنا اہم معاملہ ہے کہ اس میں جائز اور ناجائز
کا کوئی سوال نہیں۔"
ہم ایک میل دور پیدل گئے کیونکہ جہاں کنکشن ٹھیک تھا وہاں
گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔
اور ویٹر نے مجھے ٹرک کے کنارے کھڑا کیا ... ٹیلی فون
... کے متعلق بتایا اور اب آپ کہیں بھی بات کر لیں" وہ بولا اور چلا گیا۔
میں نے پھر لائن کو دیکھا جس میں سے چار پانچ مختلف سمتوں میں جا
رہے تھے۔ اور ویٹر نے مجھے بتایا کہ کون سی لائن کس کی ہے اور انتخاب مجھ پر
چھوڑ دیا کہ میں کس کے پاس سے استفادہ کرتا ہوں۔
"آپ خود اس سہولت سے کیسے فائدہ اٹھاتے ہیں؟" میں نے اور ویٹر
کے کھڑے ہو کر ہچکولے کھاتے جسم پر نظر ڈالی۔
"وہ میں خود نہیں کرتا" وہ جھینپ کر بولا "میرا کوئی ہیلپر یہ بات کر
لیتا ہے۔"
"آپ کی جگہ وہ کیسے بات کرتا ہے؟" میں نے کہا۔
"کیونکہ میں جب سے کہتا ہوں" وہ ادھر بولا، "وہ ناپ ہے" اور ویٹر نے کہا "جو
جواب ملتا ہے وہ مجھے سنا دیتا ہے۔"
"لیکن افسران بالا سے...؟"
"وہ کچھ نہیں کرتا، مجھ سے اور میرے جیسے دوسروں کو کچھ مدد... اور اب یہ
تو ایسے بڑے ساتھ بنایا ہے، میرا ایک ہیلپر ہے اور مجھے کندھوں پر
اٹھا لیتا ہے، پھر دوسرا ہم دونوں کو اٹھاتا ہے اور پول تک لے جاتا ہے۔"
مذہب اور اور ویٹر کو مزید شرمندہ کرنے کے بجائے بندر کی طرح
کھمبے پر چڑھ گیا۔ یہ غیر قانونی کام جو ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کے لائن مین صرف
نیٹ ورک کی سہولت کے لیے کرتے تھے، کیا میں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ پہلے میں نے
بائیں سے اور... دائیں سے کنکشن کو کھولا پھر دو مختلف مقامات پر تار چھیل کر اس کے
دونوں سروں کو منہ سے دبا کے کان پر لگائے رکھا۔ ایک جگہ ٹون آ گئی۔
اور ویٹر صاحب نے نیچے سے ایک پیچ کس پھینکا جو میں نے کیچ کر لیا مگر
اس کوشش میں اور ویٹر صاحب بھی گرتے گرتے بچے۔ پیچ کس کی نوک سے
تار چھیل کر منہ کے بجائے میں نے اپنے آلے کے کنکشن ملائے اور نمبر ملانا
شروع کیا۔

انکل رضوی کا نمبر مجھے یاد تھا۔ آرام سے شیخ صاحب کے علاوہ شبانہ کا
نمبر بھی یاد تھا لیکن سوچ میں پڑ گیا کہ پہلے کس سے بات کروں۔ شبانہ کے
گھر فون کرتے ہوئے مجھے ڈر لگتا تھا کہ اس کے ماں باپ پہنچ جائیں گے اور مجھے
پہچان لیں گے اور پھر ان کی بے نقط کے جواب میں ہکلانے کے سوا
کچھ نہ کر پاؤں گا۔ سنتے کے تذبذب نے شبانہ کو راضی کرنے اور گھر سے بے گھر کرنے

والا ہی تھا، میری وجہ سے وہ نافرمان اور گستاخ ہوئی۔ گھر والوں سے بے تعلق
ہوئی اور نوبت اب یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ بھائی کو بھی ساتھ لے گئی۔
مسئلہ گھر پر ہونا ہی یقینی تھا کیونکہ اب وہ دن نکلنے والے تھے اور وہ کھو تا
سلامتی کے کورٹ چلا جاتا تھا۔ ان حالات میں مناسب یہی تھا کہ سب سے پہلے
انکل رضوی کے گھر کا نمبر ہی رہ جاتا تھا۔

میں نے اللہ کا نام لے کر نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی تین بار بجی پھر کسی نے کہا۔
"ہیلو... " یہ شبانہ کی آواز تھی کہ میرا دل چاہا کہ میں اس کے ساتھ کوئی
شرارت کروں مگر پیچھے اور ویٹر صاحب منہ اٹھائے گوش بر آواز کھڑے تھے۔
"یہ ایس ایس پی رضا صاحب کا گھر ہے؟" میں نے کہا۔
"جی... آپ... آپ کون ہیں؟" شبانہ کی آواز میں عجیب سی بے چینی
اور بے یقینی تھی۔ ممکن ہے کہ میری آواز پہچان لی تھی پھر وہ کسی سے پکار رہی تھی۔
"سکندر بھائی!"
"تم لوگ پہنچے" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ جذبات کے ہر لحاظ سے فوراً
قبول ہو جاتے ہیں۔
"السلام علیکم جناب!" میں نے یوں کہا جیسے ایس ایس پی
لائن پر ہو۔ "یہ کیا حال ہے آپ کے بجائے کرنل سکندر بخت بول رہا ہوں
قرام ایم آر ایس کیا ہمارے محسن صاحب پہنچ گئے ہیں؟"

"ہاں وہ پہنچ گیا" شبانہ نے حیرت صورت حال کی نزاکت
کو سمجھ لیا اور اپنی آواز دبا کر بولی "تم کہاں سے بول رہے ہو؟"
"ایک کھمبے پر سے" میں نے کہا "میری ذہنی سطح ابھی تو وقت عام
لوگوں سے چند منٹ بلند ہے، تم ٹھیک ہو؟"
"ہاں! بالکل ٹھیک ہوں... بالکل ٹھیک ہوں" وہ پاگل ہونے
دو گئی تھی "مجھے محسن نے سب بتا دیا ہے۔"
"اور محسن کے ساتھ وہ کیا تھا؟"
"کیتھرین؟ وہ بھی ٹھیک ہے" شبانہ بولی "انکل تو پٹی کروا کر
آئے بہوش ہو گئی تھی، ہوش میں آئی تو روتی رہی۔ انکل کی بہت احسان مند
تھی۔ دونوں یہیں ہیں، آج شاید اپنے گھر جائیں گی۔"
"اچھا وہ کیا ہے؟"
"وہ کون؟" شبانہ نے کچھ سوچ کے کہا۔
"وہ جو آنے والا ہے" میں نے کہا "ٹیڈی کا بچہ!"
"بھائی جان!" شبانہ نے مصنوعی خفگی سے کہا اور اس کی آواز میں
ہنسی پھنس گئی۔
"کس کا فون ہے؟" مجھے منظر میں انکل کی آواز سنائی دی۔
"کسی کا نہیں... میری ایک سہیلی ہے" شبانہ ہکلائی۔
"شبانہ! فون ایس ایس پی صاحب کو دو" میں نے جلدی سے کہا۔ اور نیچے کھڑا
ہوا اور ویٹر ایک پل کا نام سن کر بھونچکا رہ گیا۔ وہ بھونچکا رہ جانے کا ماہر

www.paksociety.com

تھا۔ میں نے منصور شاہ کو کہا کہ وہ دور چلا جائے۔ وہ افسردہ قدموں سے دور چلا گیا۔ پر اس کی بے عزتی مجھے بھی برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

"ہیلو!" انکل رضوی کی آواز ہمیشہ کی طرح پُرسکون تھی۔

"السلام علیکم انکل! میں سکندر بخت بول رہا ہوں" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے" انھوں نے کہا۔

"کیا میں نے آپ کو کچھ بتانا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، مجھے سوچنا تھا کہ تم کیا صرف فون پر" وہ بولے۔

"وہ آپ کے سامنے آنے سے ڈرتے ہیں" میں نے کہا "آپ نے بند کر دیے گئے؟"

"یہ تو ہے" انکل رضوی نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا۔

"آپ اس کی باتوں کو اتنا غلط کیوں سمجھتے ہیں؟" میں نے کہا

"اوہ کیا کہوں" وہ بولے "یہ چیک ہے کہ دیکھ کے بولے میں صرف اس بات کا ثبوت بھی چاہیے کہ وہاں غیر ملکی اسلحہ تھا مگر اس کا والدہ وغیرہ سے تعلق ثابت نہیں ہوا۔"

"کیا آپ کو فوج یا ایجنسیوں نے نہیں بتایا کہ جو پشاور تک تباہ ہو چکے ہیں وہ کس ملک کے تھے وغیرہ..."

"اس معاملے پر میں فون پر کوئی بات نہیں کر سکتا یہ ملکی سلامتی کا مسئلہ ہے اور نیا سیکرٹ قانون پر دبا ہوا ہے" وہ بولے "تم بھی اتنے کم عمر کیوں ہو گئے ہو کہ فون پر اس قسم کی گفتگو کر رہے ہو؟"

"آئی ایم سوری انکل" میں نے کہا "میں مجبور ہوں، ایک شخص نے ایک ہیرالڈ کے تیل فون پول پر چڑھا ہوا ہے مگر آس پاس کوئی فون نہیں ہے تمہیں میری بات یہاں کوئی نہیں سن رہا ہے۔"

"مگر وہ ان دنوں سے پہلے بہت تھے مجھے ملی ہوئی ہے جو توقع رکھتے ہیں کوئی بھی ٹیپ کر سکتا ہے" انکل نے بڑی سے کہا۔

"پلیز آپ یہ بتا دیں کہ مجھے کیوں نہیں بتایا کہ میں جنسی ہوں مگر وقت گزر گیا تو بہت نقصان ہو جانے کا" میں نے کہا۔

"ایسی کون سی ایمرجنسی ہے؟" انھوں نے کہا۔

"میں آپ کو ایک بات سمجھا رہا ہوں وہ میں نے کہا ہے کہ اسی طرح آپ مجھے کچھ تو شاید جلد آپ سے رابطہ قائم ہو سکے وہاں ایک ایمرجنسی پڑ رہی ہے۔ اگر آپ نے آج ہی فوراً ایکشن نہ لیا تو وہ اسلحہ سرحد پار پہنچ جائے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہاں کس قسم کا اسلحہ ہے اور کتنا اسلحہ ہے لیکن اس بات کا یقین ہے کہ وہاں ایک ٹرک آئل ٹینکر کا پایا تھا اور اس ٹرک کو خود ہی والد نے تباہ کرایا تھا جب ٹرک میں وہ اسلحہ جا رہا تھا وہ ٹوٹ گیا مجبوراً دوسرا ٹرک منگوایا گیا اور وہ لوگ اس کی موجودگی میں سارا اسلحہ دوسرے ٹرک میں منتقل کیا گیا آپ سن رہے ہیں نا؟"

"ہاں میں سب سن رہا ہوں" انکل رضوی نے کہا۔

"ضرور سمجھو" میں نے کہا "اس ٹرک کے ساتھ اسکارٹ بھی گیا تھا، پولیس والوں کا دوست واسطے سے انھوں نے ٹرک کو دیکھ کر ختم کرنے کے لیے راستے کے ایک گاؤں سے پانچ لڑکے پکڑے تھے... بلکہ ... ایک جان بچا کے اور زخمی ہو کے نکل گیا اور آپ کے پاس آئے گا۔ اسے پولیس میں بھرتی ہونے کا بہت شوق ہے، باقی پانچ کو غالباً قتل کر دیا گیا جس نے ایک کی لاش بھی دیکھ لی تھی وہ ٹرک بھی راستے میں الٹا پڑا ہوا ہے

آپ کو نظر آ جائے گا۔ دوسرے ٹرک کا نمبر نوٹ کر لیں۔ ٹرک گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی ایجنسی کے ساتھ الوالی کی ملکیت ہے معلوم کریں کہ کل رات شہر سے کون کون ڈرائیور لے گیا تھا"

"میں معلوم کر لوں گا"

"اور انکل، وہ جگہ بہت خطرناک ہے" میں نے کہا "اس کے آس پاس ایک بہت فٹ چوڑی خندق ہے۔ ان دشمنوں نے اپنے تحفظ کے لیے اسے ممنوعہ علاقہ بنا رکھا ہے مگر جگہ جگہ سے اور شکنجے لگا رکھے ہیں۔ غالب کی ٹانگ ایک شکنجے میں پھنس کر ٹوٹ گئی ہے

وہ شکنجے آس پاس اندھوں شکنجوں بھی ہوں۔ آپ کو اپنے ساتھ خاص مسلح فورس لانا پڑے گی۔ آپ مناسب سمجھیں تو یہ معاملہ اعلیٰ فوجی حکام کے سپرد کر دیں۔ میں آپ کو دوبارہ فون نہیں کروں گا۔ آپ کی کامیابی کی خبر اخبار میں دیکھ لوں گا"

"ممکن ہے یہ خبر دبا دی جائے، ملکی سلامتی اور مفادِ عامہ کے پیشِ نظر"

"اگر آپ یہ آپریشن رات کے وقت کریں تو بہتر ہوگا"

"میں اپنا کام بہتر سمجھتا ہوں تمہارے مشوروں کے بغیر بھی کر لوں گا"

"سوری انکل! تو میں نے شروع ہی کہا تھا کیا غیر ملکی نے آپ کو پہلے نہیں بتایا؟"

"بتایا تھا"

"اس کے باوجود آپ کو شک ہے؟"

"مگر مجھے یہ بھی کسی نے کہا ہے کہ جھوٹ ہے" انکل رضوی بولے "میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اس سب سے والد کا تعلق ثابت نہیں ہوتا۔"

"وہ بھی ہو جائے گا ابھی اتنا ہی غنیمت ہے کہ آپ کو ہم پر اعتبار آیا

کہ ہم کوئی غلط کام نہیں کر رہے" میں نے کہا۔

"لیکن مجھے اس طریقہ کار سے اختلاف ہے جو تم لوگوں نے اختیار کیا ہے"

"مجھے افسوس ہے انکل کہ آپ کا قانون اور ضابطوں والا طریقہ کار ہمارے کام نہیں آ سکتا" میں نے کہا "آپ شاید اس غداری کا اور ثبوت تلاش کرتے رہ جاتے اور ملک دشمن فائدہ اٹھا لے جاتے، ہم نے ثبوت پیش کر دیا ہے"

"مجھے معلوم ہے زیادہ منہ بولی بات کی ضرورت نہیں" وہ بولے "میں جانتا ہوں کہ آپ کے لیے ہی ماحول پر سختی آ گئی تھی۔ وہ مجبور نہ ہوتے تو شاید گھل کر اسی طرح ہمارا ساتھ دیتے جیسے اکرام شیخ نے دیا تھا کیونکہ ان کے نوکری بھی چھوڑ دی تھی۔ کیا بھاشی سراج واپس پہنچ گیا انکل؟"

"نہیں، اس کا کچھ پتا نہیں" وہ بولے "مجھے ڈر ہے کہ غائب ہونے کے جرم میں معطل کر دیا گیا ہے"

"کیا اس کا چارج کسی نئے آئی جی نے سنبھالا ہے؟"

"نہیں، ابھی تو اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ چوہدری صاحب نے کہا لیکن کسی نئے آئی جی کے بھیجے جانے کا کیا سوال ہے ابھی تو شاید کوئی نہیں ہے ابھی تو... کوئی نئی ایس پی جائے گا، ایس پی کی جگہ کام کرے گا"

"اس نے خفیہ طور پر قتل کر دیا تھا" میں نے کہا۔

"اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا" انکل رضوی نے کہا۔

"یہی تو خرابی ہے ساری کہ آپ ثبوت ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں

سچ کو کسی کی زبان سے سچ نہیں مانتے۔ کیا ایک سرکاری ملازم جس نے جھوٹ بولا وہ سچ بول سکتا ہے؟"

"میں جس نظام انصاف کا حصہ ہوں وہ ثبوت کے بغیر کسی کو مجرم تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اب بتاؤ کہ تم نے کیا کہا... ان کے سوال سے میرا ماتھا ٹھنکا" میں غالب کی طرف دیکھ رہا تھا

غالب پیچھے سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے"

"نہیں بیٹا، اسلام علیکم" میں نے کہا "وہ آپ سے خفا تو نہیں ہیں؟"

"نہیں، تمہارے لیے دعا کرتی رہتی ہیں"

"مجھے آپ کی دعاؤں کی بھی ضرورت ہے انکل" میں نے کہا۔

"میری دعائیں..." انھوں نے جذباتی لہجے میں کہا "میں چاہتا ہوں کہ تمہارے کام آ سکوں" پھر انھوں نے فون بند کر دیا۔ انھوں نے اعتراف کر لیا تھا کہ یہاں کس سے ان کا تعلق ہے۔ وہ ہمارے بیٹے کو جاننا چاہتے تھے مگر کسی سطح پر ہماری مدد کر سکنا ان کے اختیار کی بات نہیں ہے۔ میرے لیے یہی اطمینان کی بات تھی کہ ان کے دل میں بھی میری خیر خواہی کے لیے گنجائش تھی۔

پیر پول چاہتا تھا کہ میں پھر منصور سے بات کروں لیکن اس کی بات کرانا مشکل تھا۔ میں نے اسے بھی بات کرنے کو کہا لیکن میں نے اسے مجبور کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ شاید رضوی صاحب بھی اپنی گفتگو کو خفیہ رکھنا چاہتے تھے۔ میں اس وقت جب میں ان کے گھر پہنچا تو ان کا بیٹا جواب دینے والا باہر آیا تھا۔

کے بہانے جیسا ہوا مجھے آرام آیا اور اس سے بیر صاحب کو دیکھ کر مسکرایا۔

"جناب ایس ایس پی شہباز کوئی خاص تو نہیں ہوا" وہ بولا۔

"شکرانہ کوئی چیز ہے" میں نے کہا "ہو جیسا کہ ہماری کلاس فیلو تھی"

"وہ سخت مرعوب نظر آنے لگا" "کرنل صاحب ہیں بہت غریب سا آدمی ہوں"

"اگر آپ غریب ہیں تو اللہ ہم سب کو غریب کرے" میں نے کہا "پاکستان کے بچے بچے کو غریب کرے"

"میرا مطلب تھا یہ نوکری کا معاملہ ہے"

"آپ پر اتنی سہنی آئے گی۔ آپ ترقی کے قریب جائیں گے تو ضرور آئے گی اور مجھے لگتا ہے کہ آپ آگ سے کھیل رہے ہیں" میں نے کہا۔

"جی، میں کچھ نہیں" وہ گھبرا کے بولا۔

"سمجھا کریں" میں نے کہا "اور جیب میں شہزادہ گاڑی میں چڑھا ہے تو اس کا مطلب دیکھنے والے کیا سمجھتے ہیں؟ یہی کہ آپ اس کی جیب میں ہیں اپنے ہاتھ اعمال میں زہر کی قیمت میں اولاد کے خون ہیں"

"نہیں... جناب یہ سب چھوڑ دو ان کا خوف لے کر ہوتے بولا۔

"چھوڑ دوں گا" میں نے قہقہہ مارا "وہ بھی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ جلدی کیجیے جب تک مقدر ہے، ہم کسی سے بھی نہیں لیں گے، جب برا وقت آئے گا تو آپ خود محسوس کریں گے کہ آخری وقت کی توبہ کیوں قبول نہیں ہوتی۔ چلیں، اب ہمیں رخصت کیجیے"

غالب گاڑی میں بیٹھا ہوا سخت بے چین تھا مگر اور بیر کے سامنے اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔

"یار معاف کرنا... وہ لمبے ایس۔ ایس پی صاحب زیادہ ہی بات کرنے لگے"

"ایس ایس پی... خاص رضوی صاحب سے بات کر رہے تھے آپ؟"

وہ چونکا۔

"ہاں میں نے ان کو سب بتا دیا ہے، اب باقی کارروائی وہ خود کریں گے" میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا اور بیر نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ ایک بار پھر ہم ٹوٹے پھوٹے راستے سے گزرے۔ وہ ٹرک اب بھی الٹا پڑا تھا شاید وہ لاش بھی وہیں پڑی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا اس نوجوان کی یاد میں آنسو بہانے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا جو ایک راہ میں مارے گئے کسی کو معلوم بھی نہیں ہوا کہ کیوں مارے گئے۔ ایک حوالدار کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ کتنی سچی بات ہے کہ سانپ نے سانپ کو ڈس لیا تھا۔ میں ہونٹ بھینچے رہا۔ گاڑی رکنے کی آواز نے آنکھیں کھولیں اور اچانک میری نظر نے پولیس کو دیکھا جو ٹرک کے درمیان چار ڈرائیور کے گھڑی تھی۔

www.paksociety.com

اگر میرے ساتھ ممکن ہوتا تو میں اطمینان سے فرانسیسی میں کچھ کہہ سکتا تھا لیکن مرزا غالب مادری زبان کے علاوہ کوئی زبان جانتے تھے تو وہ حاکموں کی زبان تھی اور حاکموں کی بولی کا ایک ناقابلِ اعتبار نمونہ ہمارے ساتھ اوورسیئر کی شکل میں موجود تھا۔

"یہ تو معاملہ کچھ گڑبڑ سا لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے کہ یہ خیر جانی صاحب کے قائم مقام حسنِ خلیفہ خسرو تھے ہیں۔" غالب نے شوق آرزو میں کہا۔ اس کی مراد ان لوگوں سے تھی جو آج کل شعلہ کے والد بنے ہوئے تھے۔

"اس مصیبت سے کوئی توڑ کر نکلنا ہے اوورسیئر صاحب؟" میں نے کہا۔

"کیا چیز توڑ کر نکلنا ہے؟" اوورسیئر نے کار کی رفتار اب بہت کم کر دی تھی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کرنل صاحب؟"

"آپ دیکھتے رہیے کیسے ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم سب کر لیں گے۔"

"لیکن... وہ پیچھے سے گولی ماریں گے... یہ لوگ ہیں۔" اوورسیئر نے کہا۔

"پھر کیا ہوا۔" مرزا غالب نے کہا۔ "موت کا ایک دن معین ہے۔"

"آپ... آپ کا مطلب ہے کہ... خواہ مخواہ میں فوت ہو جاؤں... مگر گاڑی کو بھگا کر لے جاؤں... ان کے بیچ میں سے یوں گزار کے لے جاؤں جیسے ان کی گولی میرے جسم میں سے گزر جائے گی۔" اوورسیئر نے تقریباً روتے کہا۔

"نہیں نہیں... آپ گاڑی روک لیں۔" میں نے کہا۔ "موت ہو آپ کے دشمن۔"

"یعنی وہ سب جو آپ کو رشوت دینے پر مجبور ہیں۔" غالب نے کہا۔ گاڑی رک گئی کیونکہ اب ہمارے بالکل سامنے سڑک کے وسط میں ایک پکا تین پھولوں والا تھانیدار اور ایک سب انسپکٹر اس طرح کھڑے ہوئے تھے جیسے وہ ہلاک کرنے کے لیے موذن ہو کر دیے گئے ہوں۔ وہ مجھے بھی بالکل تو ہم...

"اب آپ ان سے کہیں گے کہ ہم ملک و انصار کے جیالے ہیں۔" میں نے... اور اوورسیئر کی گدی پر ہاتھ رکھا اور ہٹا لیا۔

"یعنی آپ کے ماتحت... آپ ہمارا کچھ بھی نام بتائیں لیکن موت کو مت بھولیں۔" غالب نے اوورسیئر کو دو سکے ریالوں کی جھلک دکھا کے کہا۔

اوورسیئر نے صرف ایک بار تھوڑا سا سر گھمایا تھا۔ پھر شاید اس نے سمجھ لیا تھا کہ گاڑی میں موجودگی کا تقاضا صرف ریالوں کی تعمیل کا ہی ہو سکتا ہے۔ وہ اقرار میں سر ہلاتا ہوا کیا کرتا۔

"پکا تھانیدار گاڑی کے دائیں طرف آ گیا۔ دو پھول والا بائیں طرف سے غالب کے قریب پہنچا۔ ان دونوں کی نخوت اور فرعونیت کے تیور سے بگڑی ہوئی کریہہ صورت دیکھ کر اور ان کے جسم پر غور کرنے سے یہ خیال آتا تھا کہ وہ بھائی نہیں تو کزن ہیں۔

"پیچھے آ جاؤ۔" انسپکٹر نے بڑی نخوت سے اوورسیئر کو حکم دیا۔

"پیچھے کہاں... گاڑی کے پیچھے؟" میں نے پیچھے سے کہا تو اوورسیئر کا کندھا دبا کے کہ پیچھا آپ نے سے روک دیا۔ "تم خود کیوں نہیں آ جاتے گاڑی کے پیچھے؟"

"یہ کار کے پیچھے کیسے آ سکتے ہیں۔" غالب نے مزید اشتعال انگیزی کی۔ "یہ ٹرک کے پیچھے شاید آ جائیں۔"

اپنی افسری کی بے عزتی دیکھ کر تھانیدار اس غبارے کی طرح اُچھلا اور پھٹ گیا جسے آگ پر رکھ دیا گیا ہو۔ اس نے عادت کے مطابق مجھے کچھ معزز قسم کی گالیاں دیں جو آدمی پولیس میں رہ کے سیکھتا ہے۔ "پہلے تو گالیاں ہی تو نیچے آ نا۔" اس نے غضبناک لہجے میں عزم کیے نیچے والا دروازہ کھولا۔ "تجھے ہم اتارتے ہیں قبر میں۔"

تقریباً اسی وقت سب انسپکٹر نے اپنے افسرِ اعلیٰ کی تقلید کرتے ہوئے غالب کی عزت افزائی کی اور دوسری طرف کا دروازہ کھول لیا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ خود غالب کے ذہن میں بھی ایسی ہی اسکیم آئی ہوگی کہ وہ دونوں جانے جال میں پھنس گئے۔ انسپکٹر کا خوفناک مونچھوں والا بھاری بھرکم چہرہ جیسے ہی اندر آیا اور اس کا ہاتھ مجھے گرفت میں لینے کے لیے آگے بڑھا تو میں جان بوجھ کے پیچھے ہوا اور سیٹ سے چپک گیا۔ میری پشت غالب کی پشت سے لگ گئی۔ میں نے پیچھے کی طرف زور لگانا شروع کیا جیسے میں تھانیدار کے خلاف جسمانی مزاحمت کر رہا ہوں۔ اس سے تھانیدار اور اس کے ماتحت کے غصے میں مزید اضافہ ہوا۔

"اوئے... تمہاری تو... اوئے باہر نکل کنجر کے... میں کہتا ہوں گولی مار دوں گا۔" تھانیدار نے سر اندر ڈال کے ہانپتے اور چیختے ہوئے کہا۔ اس وقت میں اوورسیئر کی حالت نہیں دیکھ سکا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی کار کی عقبی سیٹ پر ہونے والی اس دھینگا مشتی اور پُرجوش حملے سے سخت بدحواس ہوگا۔ ایک طرف تھانیدار حق آگاہ دوسری طرف انسٹری ایجنسی جنس کا ایک کرنل۔ دونوں مسلح تھے اور دونوں اس کو مقتول کر سکتے تھے۔ یہ ہاتھیوں کی لڑائی تھی جس میں وہ ایک حقیر کیڑے کی طرح پس جانے کے اندیشے سے دوچار تھا۔

مشکل یہ تھی کہ دونوں طرف سے کار کے دروازے پورے کھلے تھے بھی تھانیدار کا سیدھا اندر آنا ناممکن تھا۔ ان کی چوڑائی زیادہ تھی اور وہ کار میں اس طرح گھس سکتے تھے کہ ایک سانس استعمال کیا یعنی اپنے پورے سر کو لے کے جیسے پیٹ کو سامنے رکھیں۔ پیر کر کے جتنی کہ تو تھوڑا سا خم دیں اور سیٹ پر گر جائیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تب بھی سیٹ پر کیسے گرتے جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے لیے بیک سائیڈ کی جگہ بھی نہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ وہ کار کے دروازے میں پھنسے رہے۔ چیختے چلاتے ہوئے، جھپٹ سے پیچھے کا حصہ کار سے باہر تھا اور سے کار تھا۔ اندر کا حصہ ان کے ہاتھ پہنچے ہوئے تھے اور انھوں نے ہمیں دبوچ بھی لیا تھا لیکن ہمیں کھینچ کے باہر نکالنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا تھا۔

"تو کیا ہمیں گولی مار دے گا۔ تو پپ کے گھر کی اولاد۔" میں نے تھانیدار کی گردن میں بانہیں حمائل کر دیں۔ وہ اور پھنس گیا۔

"ہم تیرے مقابلے میں آتے تو انگور ہیں تم لومڑ کے بچے۔" غالب نے کہا۔ "لیکن یہ انگور کھٹے ہیں۔"

"اوئے چھوڑ مجھے۔" تھانیدار نے سانپ جیسی گردن کو ادھر ادھر ہلا کے میری بانہوں کے پاس سے نکالنا چاہا۔

سب سے بُرا حال اوورسیئر کا تھا۔ "جناب... ابھی لیجیے... کرنل صاحب... تھانیدار صاحب... یا میرے مولا... کس مصیبت میں ڈال دیا تو نے مجھ غریب کو..." وہ مسلسل بول رہا تھا مگر اس کی سننے والا کوئی نہ تھا۔

بالآخر میں نے محسوس کیا کہ اب تماشا کافی ہو چکا۔ میں نے تھانیدار کے سر کو بالوں سے پکڑ کے... کیونکہ اس کی ٹوپی اس دھینگا مشتی میں پہلے ہی گر چکی تھی۔ کار کے دروازے اور کھڑکی کے درمیان کی جگہ پہ مارا۔ اسی وقت غالب نے سب انسپکٹر کے سر پہ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو اس کا دستہ مجھے پکڑ کے سر سے ٹکرایا۔

"لے دیکھ لے... دیکھ لے کیا چاہتا ہے۔" میں نے کہا اور تھانیدار کے سر کو زوری باؤنڈ میں دوبارہ اسی جگہ مارا۔ تھانیدار نے پہلے درد کا ایک مچلا ایک جیسی آواز نکالی۔ پھر سب انسپکٹر بھی جیسے مل گیا۔ ڈکرایا اور وہ دونوں تقریباً ہم پہ گر گئے۔ غالب کی ٹانگ میں شاید درد کم تھا۔ اس نے پھر سا تھ پورا دیا۔ افسران کے کمتر ماتحت ابھی تک جیب میں اتر پیسے تو جانتے تھے کیونکہ انھیں اپنے افسران کے اختیارات اور خوف اور ان سے نمٹنے کی اہمیت پر پورا اعتماد تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر نکالنا چاہ کر دیکھ سکے کیونکہ افسروں کے ہیولے اب میرے ہاتھ میں تھے۔ ان کا کام ختم ہو گیا۔ انھوں نے ایک نظر افسرانِ اعلیٰ کی طرف دیکھا جن کا پچھلا دھڑ کار کے دروازے سے باہر لٹکا تھا اور باقی اندر اوندھا ہو چکا تھا۔ پھر سب نے ٹوٹی ہوئی گردن دیکھا اور اوپر نخوت پرستی سے پیچھے ہٹ گئے۔ بدحال کیا بہتر سمجھا۔ جان ہے تو جہان ہے۔

"بچا تو دو۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

"پہلے انھیں شعلہ نے مجھے بہنایا ہو۔" غالب نے ان کی ٹیڑھی کمر اور گردن کی طرف اشارہ کیا جہاں خنجر کے ضرب کی نشانیاں تھیں۔ پھر وہ ہر وقت پیچھے سے لگ کے رکھتے تھے کہ کوئی پر جنگ کے لیے جلتوں سے زیادہ کار کر نہیں تھیں جلتوں کے بجائے تو جا سکتے ہی ہیں وہ لگیں تو چلانے کے قابل تھیں اور دیکھا جانے کے غالب گاڑی میں سے ریوالور نکالا اور ان کو دیکھتا رہا۔

"ہو... ہو ہو ہو... ہو حکم... عالی جاہ... "ایک کانسٹیبل نے کہا جو غالباً پیدائشی ہکلا تھا۔

"مذاق... آ... آ... کلا... ما... ما... تے... ہو... ہو... میرا۔" غالب نے کہا اور اس کے سر کا نشانہ لے کر ہوائی فائر کر دیا۔

"میں... میں... میں... میری... کیا مجال... عالی... جاہ جاہ جاہ..." وہ جیسے گر کر ہوش میں ہو گیا۔ اس نے اپنی رائفل اپنے قدموں میں ڈال دی تھی۔ دوسرے کسی کی خود ہی کچھ بلند تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اطمینان سے پیچھے اترا، اپنی رائفل کو اس نے جیب میں ہی چھوڑ دیا... اوورسیئر بھی ہمت کر کے کار سے نکل آیا۔

"یہ آپ نے کیا غضب کیا... کرنل صاحب..." وہ بولا۔ "میں غریب آدمی..."

"چپ کرو... غریب کے بچے۔" میں نے ڈانٹا۔ "کیا ضرورت تھی خود کو غریب کہنے کی؟ تم ختم ہو جاؤ گے۔"

"ہمارا راستہ کیوں روکا تھا؟" میں نے اوندھے منہ کانسٹیبل سے کہا تھا۔

"اس لیے کہ تم جیل سے بھاگے ہو۔" وہ بولا۔

"ہم جیل سے بھاگے ہیں؟" میں نے اور غالب نے ایک ساتھ کہا۔

"اور نہیں تو کیا ہم جیل سے بھاگے ہیں؟" کانسٹیبل نے ایک معقول سوال کیا۔

"مگر... کیا ہم جیل سے بھاگے ہوئے لگتے ہیں؟" غالب نے کہا۔ "پہلے سے یا شکل سے... یا لباس سے..."

کانسٹیبل نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے حلیہ صورت اور لباس سب بدل لیا ہے۔"

"جیل سے کون فرار ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

"اور کس جیل سے؟" غالب نے پوچھا۔

"ایک تو ڈاکو ہے... دوسرا... حوالاتی..." کانسٹیبل نے کہا۔ "دوسرا اس کا ساتھی اور دشمن ہے زبردست شاہ عرف گورا۔"

"اور کیا پتے، قاتل کالا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں... مگر زبردست خان سور نہ... ہے۔" کانسٹیبل بولا۔ "اس کے بال بھی سفید ہیں اور سارا جسم سفید ہے... بچوں کے سریق کی طرح... اس لیے وہ گورا ڈاکو مشہور ہو گیا... بالکل انگریزوں کی طرح لگتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے انگریزوں کی طرح۔" غالب نے کہا۔ "کیا ہم دونوں میں سے کوئی ایسا لگتا ہے؟"

www.paksociety.com

"تم دونوں نے ٹھیک ہی کہا ہے۔" کانسٹیبل نے قطعی لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کا ثابت کرنا مشکل تھا کہ ہم وہ مفرور ڈاکو نہیں ہیں۔"

"ابھی تم نے کہا کہ ساتھی اور دشمن... یہ کیا بات ہوئی؟"

"پھر وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے۔" کانسٹیبل بولا۔ "سب ہی جانتے ہیں کہ دو جیل سے فرار ہوئے تھے مگر اتفاق سے ایک دوسرے کی مدد کی۔"

"تم مجھے کچھ پڑھے لکھے لگتے ہو۔" میں نے کہا۔

"میں گریجویٹ ہوں۔" وہ بولا۔ "کوئی اعتراض ہے تمھیں؟"

"بالکل ہے... بی اے پاس کیا تھا تم نے پولیس میں بھرتی ہونے کے لیے جہاں زیادہ تر لوگ انگوٹھا ٹیک ہیں۔" غالب نے کہا۔ "پچھتر ان پڑھ ہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ بولا۔ "کماتے کھاتے تو اچھا ہیں... عیش تو کرتے ہیں۔ بی اے ایم اے کو کون پوچھتا ہے۔"

"افسوس نوجوان..." میں نے کہا۔ "کیا تم حرام اور حلال..."

"چلو چلو... یہ فضول مت دو۔" کانسٹیبل حقارت سے بولا۔ "بہت دھکے کھائے ہیں میں نے... بچپن سے جوانی تک سب کی بات سنی۔ سب منافق اور ریاکار تھے جو زیادہ نصیحت کرتے تھے وہی زیادہ بدمعاش نکلے۔ خود تم کون سا حرام حلال کے فرق کو سمجھتے ہو۔ باقی سب بھی تمھاری طرح ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تم ڈاکو کہلاتے تھے، ہم اور وہ ڈاکو نہیں کہلاتے۔"

"بات یہ ہے عزیزم..." میں نے متاثر ہو کے کہا۔ "ہم اس وقت تم سے معاشرتی یا معاشی مسائل پر بحث نہیں کر سکتے۔ تمھارے پاس بھی یقیناً ایک دردناک کہانی ہوگی کہ تم نے کس طرح ڈگری لے کر ملازمت کی کوشش میں دھکے کھائے اور کس طرح تمھارے وہ منصوبے خواب خاک میں مل گئے جو اس ڈگری سے وابستہ تھے۔ اس لیے کہ تمھارے پاس سفارش کا انجن نہیں تھا جو تمھاری زندگی کی گاڑی کو دھکیل کر منزل مراد تک پہنچا سکتا۔ چنانچہ مایوس ہو کے تم نے کوئے ملامت کا رخ کیا اور کانسٹیبل بن کے حرام کھانے پر کمربستہ ہو۔ دنیا لے لی اور عاقبت کو چھوڑ دیا۔"

"یہ... یہ سب تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" کانسٹیبل نے آنکھیں جھپکا کے کہا۔

"تم ابھی بچے ہو... اپنے بزرگوار ہو۔" میں نے خوش ہو کے کہا۔ "یہ کہانیاں تو ایسی ہیں کہ ان پر کوئی افسانہ نگار قلم نہیں اٹھاتا... کوئی ادیب قلم نہیں اٹھاتا اور کوئی غور نہیں کرتا کہ کسی کو اس مسئلے اور اس سے جنم لینے والے دوسرے مسائل سے اس لیے دلچسپی نہیں رہی کہ مسئلے کا حل کوئی نہیں۔ سوچتا تھا اس پر پیشہ ورانہ کے اجلاس میں بحث ہوتا ہے مثلاً اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پسماندہ معاشرے کے تین حصے تھے

زیادہ کرنے والے سے زیادہ سننے والے... اور وہ جن کے خلاف زیادہ جاتی تھی اب وہ ہو گئے ہیں کیونکہ زیادہ سننے والے کم ہی ہوتے ہیں۔ جن کے خلاف فریاد کی جاتی ہے یہی حق فریادی کو حاصل نہیں کہ ملزم کو منصف ماننے سے انکار کر دے یا منصف کو ملزم قرار دے۔

"معاف کرنا دوست!" غالب بولا۔ "ہم یہاں وہ بدبخت کالا ڈاکو ہیں۔ یا ہمارے خیال میں ہے اور گویا ڈاکو ہی ہوں۔"

"ہم نے کسی پولیس والے کو آج تک دوست نہیں کہا۔" میں نے اس کانسٹیبل کو گلے لگایا۔ "تم پہلے شخص ہو جس نے پولیس والے کے بھی سچ بولنا نہیں چھوڑا... اور تمھارے حالات بھی ہمارے حالات تھے۔ فرق صرف کل اور آج کا ہے۔ ہم کل ڈاکو تھے تم آج یہ ہو لیکن جو تم جانتے ہو ہم بیٹھے... اچھی بات یہ ہے کہ تم قانون کا محافظ نہیں کہتے بلکہ ڈاکو تسلیم کرتے ہو۔"

"میں ذرا بزدل تھا اس لیے ڈاکو نہیں بن سکا۔" نوجوان کانسٹیبل ذرا شرمندہ ہو کے بولا۔ "یہ تو وہ جنت کا کام ہے۔"

"ہاں، ہم پکڑے بھی جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم پکڑے نہیں جاتے بلکہ پکڑتے ہو۔ ڈاکوؤں کو بھی لوٹتے ہو۔ اب یہاں اور ریٹر صاحب جیسے خود کو شریف آدمی کہتے ہیں یہ حالات کی ہے۔"

"قسم خدا کی خرچہ ہے۔" میں نے... اور ریٹر نے شور مچایا۔ میں نے اس کے ایک تھپڑ مارا۔ "کیسے خرچہ؟ ڈاکو، یا پولیس کا گلا دبا ہوا تو تم مل گیا۔ مقدمہ قتل کرنے والوں کے حق پر کمال کھیل تھی یہ کام کی۔"

"دیکھو بھائی۔" اور ریٹر نے ہاتھ جوڑ کے کانپنا شروع کیا۔ "کوئی مقصود ہے تو بتاؤ... میں نے تو تمھاری مدد کی تھی۔"

"بالکل... تو تم تسلیم کرتے ہو کہ تم نے ڈاکوؤں کی مدد کی تھی؟" کانسٹیبل نے اسے ایک اور تھپڑ مارا۔ "تم تو بڑے درست ہو۔"

"اور ہم... ہمیں اجازت ہے۔" میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"اگر چاہو تو ہمارے ساتھ چلو۔" غالب نے کہا۔ "اس کا لالچ کو اتار پھینکو۔" وہ تمام گفتگو کار کی کھڑکی سے سر نکال کے سن رہا تھا۔

"نہیں سیٹھ! میں اتنا بھی دار نہیں ہوں۔" وہ ہاتھ ملا کے بولا۔ "میں یہی وردی پہن کے زیادہ آسانی سے اپنا کام کر سکتا ہوں۔ ابھی تو نقاب پہنتے ہو، اسے بڑا نقاب سمجھو... جاؤ، بھاگ جاؤ۔ اس سے پہلے کہ دوسرے افسر ہوش میں آئیں... مگر دیکھو... ایسے مت بھاگو کہ ہم معطل ہو جائیں... جاؤ تاکہ میرے اوپر الزام آئے... اور اس وقت یہ جیپ لے جانا۔"

"دل تو نہیں چاہتا تم پر ہاتھ اٹھانے کو۔" میں نے کہا۔ "مگر

مجبوری ہے۔"

"یہ تو بتاؤ کہ تم اور ریٹر صاحب کا کیا کرو گے۔" غالب نے کہا۔

"یہ تو تم ہی پوچھو۔" میں نے کہا۔ "ہمارا سب سے پہلے اب ان کا کوئی مصرف نہیں رہا... کیوں نہ قتل کر دیں۔ کیوں تو پولیس کے حوالے کر دیں؟"

"اور ریٹر صاحب سے پوچھو ان کی کیا مرضی ہے۔" غالب نے کہا۔ "کیا بیان دے گئے ہیں؟"

"یہی جو بیان دوں گا جو تم کہو گے۔" اور ریٹر اب ہکلانے لگا تھا۔ اس کا جسم خوف سے اتنا پھیل گیا تھا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہو سکتا تھا۔

"اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ بعد میں تم اور کچھ نہیں کہو گے؟"

"تم کیسی ضمانت چاہتے ہو؟" اور ریٹر بولا۔ اسے اب ذرا بھی شک نہیں رہا تھا کہ ہم کیا ہیں۔ ڈاکو جو بھیس بدل کر آئے ہیں۔ ایک کانسٹیبل کے سامنے ہم نے تسلیم کیا تھا کہ ہم بھی تعلیم یافتہ ہیں اور گردش حالات نے ہمیں ڈاکو بنا دیا ہے۔ عموماً لوگ چھوٹے ڈاکو ایسے ہی بنتے ہیں۔ شوقیہ کوئی اس پیشے میں قدم نہیں رکھتا۔ ماں باپ جو ہمیشہ اولاد کو ڈاکٹر یا انجینئر بنانے کی سوچتے ہیں، کبھی بیٹے کو ڈاکو بنانے کی پلاننگ نہیں کرتے۔

"ضمانت کی فکر چھوڑو۔" میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "تمھارے وعدے کی ضمانت تمھاری جان ہے۔ اس جان کو تم کسی سیف ڈیپازٹ والٹ میں رکھوا دو تب بھی ہم نکال کے ضائع کر دیں گے۔ اس کے علاوہ تمھاری بیوی بچے بھی تمھارے وعدے کے ضامن بن جائیں گے۔"

"بیوی بچے... ان کا میرے معاملات سے کیا تعلق؟"

"ابھی تو نہیں ہے لیکن تم نے وعدے کی خلاف ورزی کی تو کوئی نہ کوئی تعلق ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "تم اس دنیا میں نہ رہے یا وہ اس دنیا کو چھوڑ گئے۔ بات تو ایک ہی ہے۔ لواحقین اور وارث صرف املاک کے، کوٹھی کار اور بینک بیلنس کے حقدار نہیں ہوتے۔ انھیں مرحوم کے قرضے بھی چکانا پڑتے ہیں۔ ان کے کیے کی سزا بھی بھگتنا پڑتی ہے۔"

میرا مقصد صرف اپنی دھمکی میں اثر پیدا کرنا تھا ورنہ ایسا تو ہو سکتا تھا کہ میں اپنے دشمنوں کے ظلم... ان کی ... اور رشتوں کی لین دین سے ناراض ہو کر ان کی بیویوں کو سزا دوں یا معصوم بچوں کو۔

"اپنے بچوں کی زندگی کی قسم کھاؤ۔" غالب نے کہا۔

"بچوں... تم کو کہ تمھارے بچے بھی ہیں یا نہیں؟" میں نے کہا۔ "مجھے یقین ہے تم تو ہر بار قسم کھانے سے بھی کیا نقصان ہو سکتا ہے۔"

"میرے بچے نہیں ہیں۔" وہ بولا۔ "تین لڑکے تین لڑکیاں ہیں۔ میں ان کی زندگی کی قسم کھاتا ہوں کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"یہ ٹھیک ہے... کیونکہ وہی بتاؤں گا جو تمھیں بتایا جائے گا۔" غالب

لے گئے تھا تھا۔

"ہاں ہاں... وہی کہوں گا، ہمیشہ وہی کہوں گا جو تم کہو گے۔"

"اچھا تو سنو۔" میں نے کہا۔ "تم سے ہماری ملاقات ابھی کچھ دیر پہلے اچانک ہوئی تھی جب ہم نے جنگل سے نکل کر سڑک پر تمھارا راستہ روک لیا تھا۔ ہم نے ریوالور دکھا کے تم کو مجبور کیا کہ تم ہمیں گاڑی میں بٹھا کے وہاں سے لے چلو جہاں ہم کہیں۔ تم انکار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ تم کو خطرہ تھا کہ یہ دونوں شخص جرائم پیشہ نظر آتے ہیں۔ یہ تمھارا خون کر کے بھی گاڑی لے جائیں گے۔ ابھی تم جنگل سے ایک میل دور آئے تھے کہ تمھارا راستہ پولیس نے روک لیا۔ تب تمھیں معلوم ہوا کہ ہم تو جیل سے فرار ہونے والے ڈاکو تھے۔ اس کے بعد تمھاری اور کانسٹیبل کی ایک سی کہانی ہوگی کہ ڈاکوؤں نے پہلے افسروں کو تباہ کیا، پھر تمھیں مارا اور جیپ لے کر فرار ہو گئے۔ چونکہ تم بے ہوش پڑے تھے اس لیے تم نے نہیں دیکھا کہ وہ دونوں ڈاکو کس طرف گئے... بس یہی۔ سمجھ میں آ گیا؟"

"بالکل آ گیا۔ میری طرف سے بالکل مطمئن رہیے۔" اور ریٹر کانپتے ہوئے بولا۔ "اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دیں، غالب صاحب... میں ایک غریب..."

اس مرتبہ میں نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ مارا۔ اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا، ہونٹ کٹ گیا اور خون قطرہ قطرہ اس کی سفید قمیص پر گرنے لگا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور پھر بچوں کی طرح بلک بلک کر بےتحاشا رونے لگا۔

"چپ... کیا منحوس ہچکی کی آواز میں رو رہا ہے۔" غالب نے اسے ڈانٹا تو وہ ایسے چپ ہو گیا جیسے گراموفون ریکارڈ پر سے سوئی اٹھا لی جائے۔

"تم پھر بھول گئے تھے کہ تم غریب آدمی نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

"جلدی کرو بھئی!" کانسٹیبل بولا۔ "اس موٹے کی فکر مت کرو۔ اگر اس نے بک بک کی تو ہم اسے اندر کر دیں گے کہ یہ بھی ڈاکوؤں کا ساتھی ہے اور اس نے ڈاکوؤں کی مدد کی تھی۔ تم اب نکل جاؤ۔ ایک افسر کچھ ہل رہا ہے۔"

میں نے دیکھا تو سب انسپکٹر کی ٹانگیں ہل رہی تھیں۔ غالب نے پلٹ کے اس کے سر پر ایک وار کیا تو وہ پھر ساکت ہو گیا۔ میں نے اور ریٹر کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ وہ پہلے ہی نیم جان تھا۔ وہ ایک بار گلا پھاڑ کے چلایا اور گھوم کے نیچے گر گیا۔

"تم نے سمجھ لیا ہے؟" میں نے کانسٹیبل سے مخاطب ہو کے کہا۔ "تم پر وار کرنا اچھا تو نہیں لگتا لیکن مجبوری ہے۔"

"اس طرح میں الزام سے بچ جاؤں گا۔" وہ بولا۔ "تمھارا اللہ بیلی۔"

میں نے اس کی پیشانی پر ریوالور کی نال ماری جس سے ایک ملازم گم آیا۔ کھال ادھڑ دو انچ تک پھٹ گئی اور اس کی پیشانی خون

www.paksociety.com

سے تو چونکہ زخم کی گہرائی زیادہ نہیں تھی مگر دیکھنے میں وہ اور بیشتر اپنے افسران سے زیادہ زخمی لگتا تھا۔ میں نے اس کے کپڑے بھی یوں پھاڑ دیے کہ معلوم ہوا اس نے سخت مقابلہ کیا تھا۔ اس عمل میں کچھ خراشیں بھی اس کے جسم پر آ گئیں۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "اب مجھے ترقی ضرور ملے گی کیونکہ میں نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا۔" اور اطمینان سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ پھر میں نے باقی کارروائی مکمل کی۔ میں نے اور صنیر کی جیب خالی کی اور کاغذات کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے مٹی میں پھینک دیا۔ بکلا کے جیب سے گرنے والا کانسٹیبل ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اسے گولی نہیں لگی تھی چنانچہ مجھے یہ کچھ عجیب سا لگا کہ وہ گولی کی آواز سن کے بے ہوش ہو گیا تھا۔

"تمہارا یہ ساتھی، کیا یہ واقعی بے ہوش ہے؟" میں نے کانسٹیبل سے کہا۔

کانسٹیبل نے مجھے ایک آنکھ کھول کے دیکھا۔ "ہو گا۔۔۔ اسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ اس وقت بھی شاید مرگی نے ہی اچانک آ لیا تھا۔"

مرگی بھی ہسٹریا کی طرح ایک دماغی عارضہ ہے۔ میں نے اس کا علاج لوگوں کو جوتی سے کرتے دیکھا تھا۔ معلوم نہیں جوتی سنگھانے کا نسخہ سب سے پہلے کس حکیم افلاطون نے ایجاد کیا ہوگا مگر میں نے اس سے بچ بچ مرگی کا دورہ ختم ہوتے اور مریض کو ہوش میں آتے دیکھا تھا۔ جیسے کہ یہ لوگ ساتھی جو لندن میں میرے کلاس فیلو تھے ہندوستانیوں کی جہالت اور اوہام پرستی کا بہت مذاق اڑاتے تھے جوتی سنگھانے والی بات بھی ایک بار سخت نزاع کا سبب بن گئی تھی جب ہم نے ایک جرمن لڑکی کو مرگی کا دورہ پڑتے ہی جوتی سنگھا دی تھی۔ میں اور محسن چلتے چلتے اس کے پیچھے گئے تھے کہ لڑکی ہوش میں آ گئی تھی۔ تاہم یہ معاملہ اور بگڑ گیا تھا کیونکہ عام تاثر جاہلانہ حق میں نہیں تھا۔ کہا یہی گیا کہ لڑکی کو خود ہوش آ گیا تھا ہم نے جوتی سنگھا کے گویا سخت بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ اس مرتبہ تو معذرت اور وارننگ پر بات ٹل گئی لیکن دوسری بار اسی لڑکی کو دوبارہ دورہ پڑا تو ہم نے چیلنج کیا کہ اب یہ لڑکی خود ہوش میں نہیں آئے گی۔ انڈین طلبا جو پہلے سے اس معاملے میں ہماری مخالفت کرتے تھے ہمارے ساتھ ہو گئے۔ ہم نے پھر جوتی سنگھائی اور لڑکی نے آنکھیں کھول دیں۔ دوسری بار ایک ڈاکٹر نے ہمارا اثر تو لیا اور سخت حیرانی کا اظہار کیا۔ اس کے خیال میں یہ برین ٹیومر کی ایک بیماری تھی جس کا واحد علاج آپریشن تھا بشرطیکہ ٹیومر ایسی جگہ ہو جہاں سے اس کو کاٹ کے نکالا جا سکے اور جان کو خطرہ نہ ہو۔ ورنہ آپریشن کے کٹ جانے سے ناقابل علاج دماغی اندھے پن کا اندیشہ تھا۔ ہم نے بعض پاکستانی ہندوستانی طلبا نے متعدد غلط سلط تاریخی نام ہونے کے ثابت کیا کہ یہ طریقہ علاج مسلمان

سے کام لیے جاتا ہوا اب تو جوتا ہر مرض کا علاج بن گیا ہے۔ آج پھر یہ بات یاد آئی تو مجھے ہنسی آ گئی۔

میں نے ایک تیلی ماچس کی جلائی پھر تک مارے کے گھبرا کر خود اس کی جیب بے ہوش ہو جانے والے کانسٹیبل کے کان کی لو پر لگا دی جل کر سسکیں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس کی بے ہوشی دور نہیں ہوئی تھی اور یہ جتنی بار چاہے جاری رکھتا۔ انسپکٹر کی جیب میں سے نقد رقم سوا سو روپے نکلی اور ایک پیکٹ سگریٹ کا برآمد ہوا۔ میں نے فوراً ایک سگریٹ کار سے جلا کے سلگانے کی کوشش کی اور ایک اپنے لیے نکال لی۔ سگریٹ جلانے کی کوشش کرتے ہوئے غالب نے سب انسپکٹر کی جامہ تلاشی لی اور میں نے … ملا کہ ان کے قبضے سے باقی … روپے کی خطیر رقم ملی جو ہم نے غنیمت اور حلال سمجھتے ہوئے رکھ لی۔ کاغذات وغیرہ جانے کیا بے مصرف تھے چنانچہ ہم نے وہیں پھینک دیے۔

غالب اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو بھلائے بیٹھا تھا مگر پریشان تھا لیکن اب اس کی صورت دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ وہ تکلیف میں ہے۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور جیپ میں ڈال دیا۔ جیپ میں مجھے تھرماس اور ناشتے دان نظر آئے۔ یہ کھانا کسی والے پولیس پارٹی کا لنچ تھا اور چونکہ پارٹی میں وہ افسر موجود تھا اس لیے لنچ کی … میں تبدیل نا یقینی تھا۔ کھانے کو غیر ضروری سمجھ کے میں نے تھرماس کو کھولا تو اس میں سے گرم چائے کا دھواں نکلا یہ ڈبل کپ والا تھرماس تھا جس میں دودھ الگ تھا اور … میں صرف پتی ڈالی گئی تھی۔ میں نے دودھ کو پھینک دیا اور گرم کپ غالب کو پیش کیا۔ میری جیب میں اسپرین بھی تھی اور وہ بھی بھی۔ انجکشن … کی پہلی خوراک کو چار گھنٹے گزر چکے تھے چنانچہ میں نے غالب کو دونوں دوائیں دے دیں۔

جلدی جلدی چائے کا ایک کپ حلق سے اتار کے میں نے کپ غالب کو … گرم چائے نے انتہائی قوت بخش اور جادو اثر تھا جس نے مجھے آدمی سے شیر بنا دیا۔ میں نے دوسری … کے لیے آس کو گاڑی کے ساتھ کیا پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر اسے باہر نکال لیا۔ اس کی وردی اتار کے پانچ منٹ بھی صرف نہیں ہوئے یہ وردی مجھے کافی ڈھیلی تھی لیکن میں نے بیلٹ کو ٹائٹ کر لیا اور پھر اپنے اوپر کا جیکٹ پہن لیا … سب انسپکٹر کو اسی حالت میں کار کے اندر ڈال دیا جس وقت وہ پیدا ہوا تھا۔ قتل انسپکٹر کے ساتھ بھی میں نے یہی سلوک کیا اور ان کے ہاتھ پیر ڈال کے کار کو لاک کیا اور چابیاں اپنی جیب میں ڈال لیں۔ وردی میں نے غالب کو تھما دی۔

"میں اسے نہیں پہن سکتا۔" غالب نے اپنی ٹانگ کی طرف

اشارہ کیا۔

"بعد میں دیکھیں گے۔" میں نے کہا اور پیچھے سے وہ رائفل اٹھا لی جو جیپ میں ڈال دی جو مرگی زدہ کانسٹیبل کی ملکیت تھی۔

"میری رائفل مت لے جانا مجبو۔ ورنہ میں گرفتار ہو جاؤں گا اور مجھ پر کیس بن جائے گا۔"

"تم اسے اپنا احسان فراموش نہیں پاؤ گے دوست۔" میں نے کہا اور اس کی رائفل جیپ میں سے نکال کے اس کے قریب ڈال دی۔

"میرا خیال ہے کہ تم نکل جاؤ گے۔" وہ بولا۔ "تم بہت ہوشیار اور دلیر لوگ ہو۔ مجھے ایک بات بتاؤ۔"

"پوچھو۔" میں نے کہا۔

"تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن کیوں ہو؟" وہ بولا۔ "مل کے کام کیوں نہیں کرتے۔ اتنی طاقت ایک دوسرے کے خلاف کیوں ضائع کرتے ہو۔ جیسے مل کر جیل سے نکلے ہو ایسے مل کے باہر رہو۔ فائدہ تمہارا اپنا ہے۔"

"یہ سبق ہم نے سیکھ لیا ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی تمہاری بات یاد رکھیں گے۔ نام کیا ہے تمہارا دوست؟"

"چھوڑو نام کو۔۔۔ جس کو تم پہچانتا ہے۔" وہ بولا۔ "اب جاؤ۔"

"آج تم نے ہماری مدد کی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ کل ہم تمہاری مدد کر سکیں۔"

"تم میری کیا مدد کرو گے؟" وہ ہنسا۔ "خیر۔۔۔ میرا نام ہے خدا بخش ولد اللہ بخش۔"

"جب ہم کچھ کریں گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور جیپ میں بیٹھ گیا۔ چابیاں ابھی تک اگنیشن سے لگی ہوئی تھیں۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور چند منٹ میں ہم سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رواں تھے۔ خدا بخش کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ کچھ دیر میں اس کا کوئی افسر ہوش میں آئے گا تو اسے بھی سنبھال لے گا۔ افسروں کے مقابلے میں اس کی پوزیشن بہت بہتر ہوگی۔

"کیا عجیب آدمی تھا یہ کانسٹیبل بھی۔ تم نے نام پوچھا؟" غالب نے کہا۔

"ہاں، خدا بخش۔" میں نے کہا۔ "ہمارے حق میں تو فرشتہ رحمت بن گیا ورنہ وہ ایسا شخص تھا کہ آسانی سے بازو مار سکتا تھا مرتے مرتے بھی ہم کو پریشانی میں مبتلا کر دیتا۔"

"غالباً ذہنی طور پر یہ اکثر پولیس والوں اور گورنمنٹ کا ستایا ہوا جیالا ہے۔" غالب بولا۔ "یا وہ ان سے متاثر ہے۔ ممکن ہے ان کے کوئی ملامت جیسی کہانی جیسے ہمارے ہو گئے ہیں۔"

"ہاں بات صرف زاویے کی ہے کہ کون کسے کس زاویے سے دیکھتا ہے۔" میں نے کہا۔ "قانون کی نظر میں ہم مجرم، قاتل اور ڈاکو ہیں لیکن ہماری نظر میں حلال اور نواب شمو جیسے معزز، تیرا اور معزز لوگ … سے کم نہیں۔"

"صرف پولیس میں کیا۔۔۔ تحصیلدار بھی ڈاکو ہیں اور ٹھیکے دینے والے افسر بھی ڈاکو ہیں۔ بیشتر ملکوں میں بیشتر لوگ اپنے سرکاری فرائض کے سلسلے میں حاصل ہونے والے اختیارات کو ڈاکے ڈالنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ زمیندار اور وڈیرے اپنے مزارعین اور ہاریوں کے حقوق پر یہاں تک کہ ان کی عزت پر ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ شریف آدمی کہیں ہے تو روپوش ہے۔ اپنی جان، مال اور آبرو بچانے کے لیے خاموش ہے اور پناہ کے سوا کچھ نہیں مانگتا۔"

"ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب کوئی کسی کے حق پر ڈاکہ نہیں جان یا عزت پر، انصاف پر اور طاقت پر ڈاکا نہیں ڈال سکے گا۔" غالب بولا۔ "ہم مایوس نہیں ہو سکتے۔ ہمارا مایوس ہونا شکست کی پہلی علامت ہوگا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر وہ دن کب آئے گا۔" میں نے کہا۔ "میں اور تو۔۔۔ محسن اور امجد آرائیں کے سب قبائلی فوجدار۔۔۔ ہم سب احمقوں کی جنت میں تو نہیں رہتے؟"

"نور چشم! امجد آرائیں ہی احمق ہم ہی نہیں۔ دنیا کے لاکھوں کروڑوں لوگ ہیں۔ وہ سب جو ایک نئی دنیا کے خواب دیکھتے ہیں۔ کرۂ ارض پر انسانیت کی سربلندی مانگتے ہیں اور اس کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں یا کچھ غلط کچھ خاموشی سے۔ جو دعائیں مانگتے ہیں وہ بھی تو کچھ کرتے ہی ہیں۔۔۔ ہمارے جیسے لوگ بس سپورٹ تو فراہم کرتے ہیں۔"

"اچھا مولانا صاحب۔۔۔ یہ فلسفہ چھوڑو۔۔۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کیا ہم اسی طرح سیدھے چلتے جائیں، آگے کہیں دوسری پولیس پارٹی بھی مل سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "آگے ایک سڑک سیدھے ہاتھ کی طرف جاتی نظر آتی ہے، گاڑی ادھر موڑ لوں؟"

مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ اس وقت ہم کہاں ہیں۔ لاہور ہمارے مشرق میں ہے یا مغرب میں اور شمال یا جنوب میں ہے تو کتنے فاصلے پر ہے۔ وہ سب سرحد کے قریب کا علاقہ تھا اور مجھے کوئی شبہ نہ تھا کہ وہ مشہور بی آر بی کینال ہوگی جہاں ۶۵ کی جنگ میں ملک کے ایک جیالے سپوت نے بے مثل جرأت اور شجاعت کا ایک تاریخی کارنامہ سرانجام دیا تھا جس کی یادگار بھی وہاں موجود ہے مگر مجھے ابھی تک نشانِ حیدر پانے والے اس شہید کو خراج تحسین پیش کرنے اور دعائے مغفرت مانگنے کے لیے اس یادگار پر حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ محسن کی بھی ایک بے حد عزیز دوست کا علم تھا اور وہ … کا نقل بھی ایسے تھے کہ لاہور میں رہ کے میں نے کسی سے ان کے نام سنے تک نہ تھے چنانچہ مجھے اپنی صحیح جغرافیائی پوزیشن کا تعین کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی اگر ہم سیدھے چلتے جاتے تو کسی نہ کسی شاہراہ پر پہنچ جاتے لیکن سیدھا جانے میں یہ امکان بھی تھا کہ ہم تعاقب میں آنے والی ہر پولیس پارٹی میں تو کوئی گریجویٹ کانسٹیبل خدا بخش نہیں تھا۔

www.paksociety.com

جیپ کچے راستوں، جنگلوں اور تھوڑے ناہموار میدانوں یا پہاڑوں کے سفر میں آتی ہی تو اس کا اعتبار اور مفید کبھی جاتی ہے جتنا صحرائی مسافتوں کے لیے وہ جانور جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ دائیں طرف مڑتے ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ سڑک ایک جنگلی سڑک تک آتی تھی وہ ایک کچے راستے سے زیادہ کچھ نہیں اور آگے جا کے یہ راستہ بھی آثار دشوار گزار ہو گیا کہ جانے سے پاس کا راستہ ہوتی تو اس کا وہی حشر ہوتا جو قالین پر نزاکت سے چلنے والی شہری دوشیزہ کا ہو اگر اسے ننگے پاؤں دھوپ میں چٹیل پہاڑوں پر چلنا پڑ جائے۔

"یار یہ ہم کس طرف جا رہے ہیں؟" غالب نے کہا۔ "بیٹھ ہو کر ہم آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والی بات کو سچ کر دکھائیں۔ پولیس سے بچ رہے ہیں تو اس سے بھی بڑی مصیبت گلے پڑ جائے۔"

"اب تو میرے خیالات بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "معلوم نہیں یہ راستہ کہاں تک ایسا ہی ہوگا۔"

"میں نے ٹائروں کے نشانات تو دیکھے ہیں۔" غالب بولا۔ "شاید جنگل سے لکڑی کاٹنے کا ٹھیکا لینے والوں کی گاڑیاں آتی جاتی ہوں گی۔ آگے کسی آبادی کا وجود تو مشکل نظر آتا ہے۔"

"مجھے تو ڈر ہے کہ ہم گھوم پھر کے دوبارہ اسی نہر کے کنارے پہنچ جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "یا پھر اچانک سڑک ختم اور نہر ہی ہمارا بیڑا غرق۔"

"جیپ میں نہر اور نہر میں جیپ۔" غالب نے کہا۔ "بہتر ہے کہ آپ واپس چلیں۔"

میں نے گاڑی کو تھوڑا سا موڑا۔ جیپ کے پہیے ایک جھاڑی کو کچلتے ہوئے گھسے اور جیپ کا رخ کچھ بدلا۔ میں نے جیپ کو ریورس میں ڈالا تو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ "شاید پچھلا پہیہ گڑھے میں آ گیا۔" میں نے کہا۔

"گڑھا یا کنواں؟" غالب نے کہا۔

"موت کا کنواں۔" میں نے کہا۔ "اس میں بھی گاڑی چلا سکتا ہوں میں۔"

لیکن یہ دعویٰ فوراً غلط ہو گیا۔ میں نے گاڑی کو دوبارہ آگے بڑھانا چاہا تو انجن غرایا۔ گاڑی نے تھوڑا سا جھٹکا لیا اور آگے بڑھ کے پھر پیچھے آ گئی۔ میں نے دوبارہ کوشش کی اور زیادہ ریس دی۔ انجن گرجنے لگا اور پہیے تیزی سے گھومتے ہوئے شور کرنے لگے۔ پچھلے گڑھے کے ساتھ خشک پتے اڑے تو میں نے سمجھ لیا کہ پہیہ گڑھے میں زیادہ دھنس گیا ہے اب اس کے آگے پیچھے کی سطح زیادہ بلند اور پکی ہو گئی ہے۔ میں جتنی کوشش کرتا پہیہ اتنی ہی مٹی کھودتا اور دھنستا چلا جاتا۔ یہ قطعی پریشان کن صورت حال تھی۔ اس کا ایک علاج تو یہ تھا کہ چار آدمی پیچھے سے جیپ کو آگے دھکیلیں تو انجن کے ساتھ یہ اضافی قوت کام کر جاتی لیکن یہاں وہ چار آدمی کہاں سے تھے۔ میں اور غالب مل کر ڈیڑھ آدمی۔ غالب اگر زور لگانے کی ہمت کر لیتا تب بھی میں اکیلا جیپ کو نہیں دھکیل سکتا تھا۔ یہ کام صرف جنگلوں کا باسی ٹارزن ہی کر سکتا تھا۔ چنانچہ دوسرا معقول طریقہ یہ تھا کہ میں جیپ کو جیک پر اٹھاؤں اور پھر گڑھے میں خشک ٹہنیاں اور پتھر بھر دوں۔ گڑھے کے دونوں کناروں کو تھوڑا سا کھود کے برابر کر دوں اور گھاس پھوس ڈال دوں تاکہ ٹائر کی گرفت مضبوط ہو تو جیپ ایک جھٹکے میں آگے بڑھ جائے۔

"اب اسے زحمت سے نکالیں گے۔" میں نے کہا۔ "قبلہ! وقت بولئے آرام، قیام و طعام۔"

"پکنک کے لیے اچھی جگہ ہے۔" غالب نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا۔

"ہاں، لیکن شاید ہم دونوں کے سوا آج تک کسی کو یہاں پکنک پر آنے کی توفیق اللہ نے نہیں دی۔" میں نے کہا۔

"آج کل سب سے اچھے کام ہی سب سے بے مزہ ہوتے ہیں۔" غالب بولا۔ یہ مذاق کی بات تھی ورنہ وہ جگہ انتہائی بے ہودہ تھی۔ ہر طرف جھاڑیاں تھیں جن پر خوفناک قسم کے لال بھبوکوں کی افواج بے مقصد گشت کر رہی تھیں۔ آس پاس کی جھاڑیوں میں عجیب سے لٹکتے پھل لگے ہوئے تھے جو شکل سے [illegible] بیرونی سطح پر کانٹے ہی کانٹے تھے اور یہ کانٹے [illegible] میں پیوست ہو جاتے تھے۔ گھنے درخت کم تھے اور بہت [illegible] جہاں جیپ رکی تھی وہاں کسی اژدہے کی نسل کا جانور فوت ہوا تھا یا شکار ہوا تھا اس کا بچا کھچا پنجر کچھ دور پڑا سخت تعفن پھیلا رہا تھا۔

"یہاں تشریف رکھنا تو بہت مشکل ہے۔" غالب نے ناک پہ رومال رکھ کے کہا۔ "آپ ذرا سیر و سیاحت کر کے کوئی مناسب جگہ تلاش کریں جہاں خیمہ تنہائی نصب کیا جا سکے۔"

"مطلب یہ کہ کوئی پر فضا مقام تلاش کروں جہاں رنگ رنگ کے مہکتے پھول ہوں اور چہکتے پنچھی سروں میں گاتے نغمے پڑھ رہے ہوں [illegible] ہو۔"

"مختصر وار جو سر بزم ہو آگے بیٹھے تمنا ہی تو!" غالب نے ہنس کے کہا۔ "اس جنگل میں آ کے آپ کو بھی شاعری کا دورہ لگتا تھا۔"

میں تسلیم بجا لا کے ہر سمت میں چند قدم گیا اور درست جگہ ایسی تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جو قدرے آرام دہ تھی۔ [illegible] کانٹے بھی وہاں نہیں تھے اور اس ہموار قطعہ زمین پر گھاس بھی تھی۔ میں غالب کو گود میں اٹھا کے لے آیا۔ پھر جیپ سے پانی اور کھانے کا سامان نکال لیا۔ [illegible] وزنی تھا۔ پانی ایک [illegible] گیلن میں تھا جو ہمیشہ جیپ کے پیچھے رکھنے کے کام آتا ہے۔ پہلے میرا بھی خیال یہی تھا [illegible]

[illegible]

جنگل میں ہم نے باقاعدہ دسترخوان بچھا کے کھانا شروع کیا۔ "بسم اللہ کیجیے مرزا نوشہ۔" میں نے کہا۔ "ماحضر تناول فرمائیے۔"

"بڑا اہتمام کر لیا آپ نے۔" غالب نے کہا۔ "واللہ آپ نے بڑا تکلف کیا۔"

"بس خیر! شرمندہ نہ کیجیے۔ غریب کے پاس یہی تھا۔" میں [illegible] ایک طرف پڑی تھی جن میں بھنا ہوا مرغ۔ تیسرے میں پراٹھے اور چوتھے میں حلوہ۔

"واہ یار! آج پھر ثابت ہوا کہ کھانا وہی ہے جس کے مقدر کی مہر لگ چکی ہو۔" میں نے کہا۔

"ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دوپہر کے لنچ کا مینو ایسا شاندار ہوگا۔" غالب نے کہا۔

"اور تھانیدار کے ساتھ پولیس کو دیکھ کر تو صرف شامت اعمال کا خیال آیا تھا اس وقت بے مثال کا نہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ بڑے اہتمام سے کھانا کھانے چلے ہوں گے۔"

"ہاں، منگوایا ہوگا کسی حوالاتی کے گھر سے۔" میں نے کہا۔ "تھانوں میں یہی ہوتا ہے۔ سرکار کی تنخواہ جو حوالاتی کی خوراک کا انتظام کرنے کے لیے ملتی ہے وہ الگ بعض گھر والے حوالات میں بند عزیزوں کے لیے جو بھیجتے ہیں وہ بھی بعض دفعہ مفت کا تر مال ملتا ہے۔ اسی لیے تو وہ لوگ بڑے مزے سے ہوتے تھے۔"

"کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے۔" غالب بولا۔ "زمینی کو فون اور مصیبت کی بھگڑ ہوتے کھاتے اور گالیاں کھاتے ہیں۔"

"تو نے مجھے ان کی یاد دلا دی مرزا۔" میں نے کہا۔ "بیچارے اپنی ساتھی۔"

غالب کا ہاتھ رک گیا۔ "رابعہ اور لیڈی؟"

"معلوم نہیں انہیں آج کھانے کو کیا ملا ہوگا۔" میں نے کہا۔ اس خیال سے نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا تھا۔ مجھ سے اور نہیں کھایا گیا۔ غالب نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ ہم نے تو جا کے [illegible] لیٹے رہے بہت دیر تک ہم اپنے اپنے خیالوں سے ہم کلام رہے۔ پھر غالب نے کہا۔ "اب چلنا چاہیے۔"

"فوراً پہرے بدل لے۔" میں نے چونک کے کہا۔ "اگر تو مجھے وردی پہنا دے تو ہم کچھ محفوظ ہو جائیں گے۔"

"تمہاری شرٹ تو بن جائے گی۔" غالب نے کہا۔ "پتلون کیسے پہنوں گا۔"

"مولوی ڈھیلے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں پہننے میں تمہاری مدد کروں گا۔ تو ذرا ہمت سے کام لینا۔"

غالب نے سر ہلایا اور میں نے پہلے اسے سب انسپکٹر کی بش شرٹ پہنائی پھر پتلون۔ پتلون کا ایک حصہ آسانی سے پہنا دیا۔ دوسری ٹانگ کو موڑنا بہت مشکل تھا۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ پتلون کا پائنچہ ادھیڑ دیا اور اسے ٹانگ کے گرد رکھ کے لپیٹ دیا۔ اب یوں لگتا تھا کہ پتلون کے ایک پائنچے کو جراب کے اندر کر دیا گیا ہے۔ شرط صرف بیلٹ پر سے ڈھیلی تھی۔ اسے پتلون کے اندر کرنے سے وردی نیلو کچھ خطرناک نہیں رہی۔ اب ہمارے پاس پولیس کی جیپ بھی تھی اور وردی بھی۔ نیز تھانیدار کی ٹوپی۔ ہم کسی چیک پوسٹ سے رکے بغیر گزر جاتے تو اس بات کا امکان تھا کہ کوئی ہمارا پیچھا کرنے کی بجائے یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم کو فوراً کسی جائے واردات پر یا کسی مجرم کو پکڑنے کے لیے پہنچنے کی جلدی تھی۔

اگر اس وقت ہم روانہ ہو جاتے تو وہ سب نہ ہوتا جو بعد میں ہوا لیکن مجھے پر مرغن غذاؤں کا اثر ہو رہا تھا اور تھوڑی دیر سے آرام کی مہلت ملی تھی تو مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ قیلولہ فرمانے کی تجویز میں نے ہی پیش کی اور غالب نے منظور کر لی۔ اس شرط پر کہ ہم گھوڑے بیچ کر نہیں سوئیں گے۔ اور صرف ایک گھنٹہ آرام کریں گے لیکن وہاں ہمارے پاس کوئی الارم تو تھا نہیں کہ ہمیں ایک گھنٹے بعد بیدار کر دیتا۔ تھکن آتی زیادہ تھی کہ میں نے تو آنکھیں بند کرتے ہی سو گیا۔ یہ ایک پرسکون نیند تھی چنانچہ بے خواب تھی۔

پھر اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے لات ماری ہو۔ میں نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔ "کون ہے بے!"

"تمہارا باپ۔" اوپر سے کسی نے خوفناک لہجے میں کہا۔

میں چونکا اور ایک دم اٹھ بیٹھا۔ صحیح صورت حال کا اندازہ کرنے میں مجھے کچھ دیر لگی۔ غالب کو مجھ سے پہلے اٹھا دیا گیا تھا اور وہ ایک ٹانگ سیدھی کیے بیٹھا ہوا تھا۔ جنہیں اٹھانے والے دو افراد تھے جس نے مجھے لات ماری تھی وہ میرے سر پر سوار تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے ملیشیا کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور سر پر پگڑی کے انداز میں بہت بڑا صافہ باندھ رکھا تھا جس کے ایک کونے سے اس نے اپنا منہ چھپا لیا تھا۔ یہ ڈاکوؤں کا روایتی حلیہ تھا۔ دوسرا شخص بھی اسی حلیے میں تھا مگر اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور پیشانی دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ دونوں کون ہو سکتے ہیں۔ غالب کا کہا درست ہوا تھا۔ ہم آسمان سے گر کر سیدھے کھجور میں اٹک گئے تھے۔ یہ وہی مفرور ڈاکو تھے۔

"اٹھ او نے تھانیدارا!" اس ڈاکو نے مجھے دوسری لات رسید

www.paksociety.com

کی جسے پلٹے خاں سمجھا جا سکتا تھا کیونکہ وہ صورت سے ہی ٹھگ نہیں لگتا تھا۔ دوست کے ساتھ بالکل سفید ہاتھ اور سفید پیشانی ظاہر کرتے تھے کہ وہ گورا ڈاکو ہے۔ پلٹے خاں بالکل فلمی ولن کے انداز میں مجھ سے مخاطب تھا اور لہجے کو خوفناک دہشت ناک بنا کے بات کر رہا تھا۔ یہ اس کا قدرتی انداز نہیں تھا۔

میں اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ "تم پلٹے خاں ہو...؟"

"آہو... پلٹے خاں میرا نام اے۔" وہ گرج کے بولا۔ "تینوں چنگی طرح معلوم اے فیر وی سوال کرنا ایں؟"

"مجھے حکم ہے کہ تم جہاں نظر آؤ تم کو گرفتار کروں۔" میں نے تفریحی لہجے میں کہا۔

پلٹے خاں نے پھر ایک فلک شگاف فلمی قہقہہ لگایا۔ "اوئے کون اے تینوں حکم دین والا۔ میرے کول لیا اونوں، میں اونوں دو سال لئی گرفتاری دے دیاں گا۔" اس کے قہقہے کا ساتھ گورے ڈاکو نے دیا۔

"گویا تم گرفتار ہونے سے انکار کر رہے ہو؟" میں نے سوچ کر کہا۔ "یہ تو بڑی غلط بات ہے۔ پہلے تم جیل سے فرار ہوئے...!"

وہ دونوں پھر ڈرامائی انداز میں ہنسے۔ "اوئے ساڈی جیل دیاں دیواراں نہیں روک سکدیاں۔"

وہ دونوں میرے اور محسن کے ریوالور پہلے ہی اٹھا چکے تھے چنانچہ ان کو اطمینان اور اعتماد حاصل تھا کہ ہم نہتے ان کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ ویسے بھی ڈاکوؤں کی رائے پولیس والوں کے بارے میں اچھی نہیں ہوتی اور وہ سب کو ایک جیسا حرام خور اور بزدل سمجھتے ہیں۔ وہ میرے اتنا قریب تھا کہ میں جب چاہتا اسے ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچتا، اس کا ریوالور گراتا اور ایک ہی بار میں اٹھ کے گورے ڈاکو پر ٹوٹ پڑتا اس طرح کہ وہ دونوں پھر اٹھ نہ پاتے لیکن میں نے جلدی نہیں کی۔

"اچھا چلو میں تم کو گرفتار نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کے بدلے تم مجھے کیا دو گے؟" میں نے اب تھانیداروں کا انداز اختیار کر لیا اور ہماری باقی گفتگو ٹھیٹ پنجابی میں ایک دوسرے سے تعلق کی بنیاد پر ہوئی۔

"ابھی کیا ہے میرے پاس دینے کو۔" وہ مونچھوں پہ تاؤ دے کر بولا۔ "جو بھی تھا وہ اندر والوں کو دے دیا۔"

"اب جیل سے نکلے ہیں تو کچھ کریں گے۔" گورا ڈاکو بولا۔ "تمہارے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔"

"بس ہماری نوکری کا خیال کرنا۔" میں نے لجاجت سے کہا۔ "اور کچھ ہمارا...!"

"تمہارا خیال ہم نے کب نہیں رکھا۔" پلٹے خاں نے ... کے لہجے میں کہا۔ "تم کو بھی اتنا ہی ملے گا جتنا دوسرے تھانیدار کو ملتا ہے... مگر دیکھو... پلٹے خاں سے دغا کی تو تمہارا حشر وہی ہو گا جو پہلے والے تھانیدار کا ہوا تھا۔"

"پہلے والا تھانیدار کون تھا؟" میں نے سہم کر کہا۔

"وہی بدبخت افضل شاہ۔" پلٹے خاں بولا۔ "اس سالے کا خیال تھا کہ مال بھی ہضم کر لے گا اور پلٹے خاں کو پھانسی بھی لگوا دے گا۔"

"اس نے میرے ساتھ بھی غداری کی۔ اسی کی مخبری سے میں گرفتار ہوا میرے سب ساتھی پولیس مقابلے میں مارے گئے۔" گورا ڈاکو غصے سے بولا۔

"آج اس کی اور اس کے سارے خاندان کی قبر ایک جگہ بنی ہوئی ہے۔" پلٹے خاں فخر سے بولا۔ "لیکن پلٹے خاں سزا پا کے بھی آزاد ہے اور آزاد رہے گا۔" اس نے چیلنج بھرے انداز میں کہا۔

میں اچھل پڑا۔ "میں اس علاقے میں بالکل نیا ہوں مجھے معلوم نہیں۔ بس آتے ہی بتایا گیا تھا کہ کوٹ لکھپت جیل سے دو ڈاکو پلٹے خاں اور گورا ڈاکو فرار ہو گئے ہیں اور اسی جنگل میں چھپے ہوئے ہیں۔ دو دن پہلے میں نے سنگ جانی اسٹیشن پر چارج لیا تھا...

"کیا نام ہے تیرا تھانیدار؟" پلٹے خاں نے میرے قریب بیٹھے اور تعاون کرنے کے انداز سے متاثر ہو کے کہا۔

اگر وہ جاہل نہ ہوتا تو وردی پہ لکھا ہوا نام پڑھ لیتا اور یہ سوال ہی نہ کرتا۔ میں نے اپنے سینے پر نظر ڈالی اور کہا۔ "نصیب... یہ میرا ماتحت آغا مبارک ہے۔ یہ فورٹ عباس سے میرے ساتھ آیا ہے۔ ہمیں چارج لیتے ہی ادھر بھیج دیا گیا اس لیے تمہارے بارے میں ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اب ملاقات ہوئی تو انشاءاللہ ہم بھی بتا دیں گے کہ ہم جنگلوں کے مجاہد ہیں اور ... کے دوست ہیں۔"

"یہی ہمارا بھی اصول ہے نصیب علی۔" پلٹے خاں نے کہا۔ "ہم سے بنا کے رکھو گے تو عیش کرو گے۔"

"تم بھی عیش کرو مگر اتنا خیال رکھو کہ میں سرکاری ملازم ہوں۔ میری یہ وردی نہ اتر جائے۔" میں نے کہا۔

پلٹے خاں نے پھر قہقہہ مارا۔ "اوئے تیری وردی کون اتار سکتا ہے ہمارے ہوتے۔ افضل شاہ بھی ہمارا ساتھ دیتا تو ہم اس کا ساتھ دیتے۔"

"اب اس طرح کتنی دیر کھڑے رہو گے؟" میں نے کہا۔

"جاؤ اور جیب اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"یہ کوئی چال تو نہیں ہے؟" وہ شکوک لہجے میں بولا۔

"پلٹے خاں! بیٹھنے اور گپ لگانے کے لیے وقت نہیں ہے۔" گورے ڈاکو نے اسے تنبیہہ کی۔ "تم ان کو نہیں جانتے ان پہ بھروسہ کر لیا ہے۔"

"بھروسہ کر رہا ہوں میں اپنی ہمت اور طاقت پہ۔" پلٹے خاں نے مونچھوں کو بل دیا۔ "رب دی سوں۔ چال ہوگی تو یہ خود دیکھ لے گا پوری چھ گولیاں ابھی میرے پستول میں۔"

"چھ گولیاں تو میرے پاس بھی ہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ دس لاشیں پچھلا تک کے جا سکتے ہیں ہم لوگ ان میں دو لاشیں ان کی بھی ہوں گی۔" پلٹے خاں بولا۔

"دس کیوں؟" میں نے کہا۔ "بارہ کیوں نہیں؟"

پلٹے خاں گلا پھاڑ کے ہنسا۔ "ایک ایک گولی ہم اپنے لیے رکھیں گے۔ اب ہم زندہ ہاتھ نہیں آئیں گے کہ وہ ہمیں پھانسی پر چڑھا دیں۔"

"کیا تم... تم دونوں کو سزائے موت ہو چکی ہے؟" میں نے کہا۔

"اب تک چودہ قتل کیے ہیں۔ ایک بار صرف حکم ہوا ہے پھانسی کا۔ پھانسی کی تاریخ بھی طے ہو چکی تھی مگر ہے کوئی ماں کا لال جو پلٹے خاں کو لٹکا سکے۔" وہ سینے پر ہاتھ مار کے بولا۔ "یہ بتا آگے پیچھے کوئی اور پولیس پارٹی ہے؟"

"نہیں... سڑک پر بہت آگے ایک پارٹی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ یہاں نہیں آسکتے۔ تم کو مجھ سے کوئی خطرہ نہیں۔ اطمینان سے کچھ دیر آرام کرو۔ ہم بھی تو بے فکر سو رہے تھے حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ تم اسی جنگل میں ہو۔"

"تجھے ڈر نہیں تھا ہمارا؟" وہ کچھ قائل ہو کے بولا۔

"ڈر ہوتا تو نہیں سو سکتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ تم سوتے میں گولی نہیں مارو گے کیونکہ تم بہادر آدمی ہو۔" میں نے کہا۔ "میں تم سے ملنا بھی چاہتا تھا۔"

گورا ڈاکو زیادہ ذہین تھا۔ "پلٹے خاں! باتوں میں مت آ۔"

"اوئے نہیں یار! میرا دل کہتا ہے یہ تھانیدار دل کا کھرا ہے۔" پلٹے خاں بولا۔

"میرے ساتھی کی تو ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم دیکھ سکتے ہو یہ بالکل بے ضرر ہے۔ میرا ریوالور تمہارے پاس ہے۔ آخر میں کس طرح یقین دلاؤں تمہیں کہ میں تمہارا دشمن نہیں بلکہ سمجھا کہ اپنی جان بھی پیاری ہے اور بیوی بچوں کی زندگی بھی۔"

"لاؤ جیپ کی چابیاں ہمارے حوالے کرو۔" گورے ڈاکو نے ہاتھ پھیلایا۔

میں نے چابیاں اس کی طرف اچھال دیں۔ "اور کوئی خدمت کہو تو یہ وردی بھی اتار کے دے دوں۔"

"اوئے نہیں یار۔" پلٹے خاں نے ریوالور ہٹا کے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ "مجھے اعتبار ہے تجھ پہ۔"

"تو پھر بیٹھو، کھانا کھاؤ۔" میں نے کہا۔ "پراٹھے، گوشت، حلوہ۔"

"اچھا...؟ واہ بھئی واہ۔" وہ بولا اور فوراً بیٹھ گیا۔ غالباً وہ دونوں بھوکے تھے اور جیل سے فرار ہونے کے بعد اب تک انہوں نے کچھ نہیں کھایا تھا کہ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ وہ چار افراد کا کھانا تھا اور ہم نے اس کا ایک تہائی بھی نہیں کھایا تھا مگر انھوں نے ذرا سی دیر میں سب صاف کر دیا۔ میں غالب کو آنکھ مار کے اس ڈرامے میں شریک کر چکا تھا۔ ان دونوں کو ناک آؤٹ کر کے جیپ میں ڈالنا کوئی مشکل کام نہ تھا لیکن میں پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کس قماش کے ڈاکو ہیں اور ان کے جرائم کی تعداد کیا ہے۔

کھانے کے بعد انھوں نے ہم سے سگریٹ لے کر پیے اور بیٹھے بیٹھے خراٹے لگانے لگے۔ ریوالور انھوں نے اندر رکھ لیے تھے اور اب بہت مطمئن بیٹھے تھے۔ پلٹے خاں کی کیس ہسٹری زیادہ پرانی تھی۔ وہ شریف والدین کی خبیث اولاد تھا۔ آوارگی کے شوق میں گھر سے نکلا۔ جیب کتروں کی صحبت سے مستفید ہوا۔ پھر جیل گیا تو چوروں کے گروہ میں شامل ہوا۔ دوسری بار اور تیسری بار جیل جانے سے تجربہ حاصل ہوا تو چھوٹے چھوٹے ڈاکے ڈالنے لگا۔ کچھ دن قسمت نے ساتھ دیا۔ چند وارداتیں کامیاب رہیں اور اسے ایک بڑے ڈاکو نے اپنے گروہ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اس وقت تک وہ تین قتل کر چکا تھا۔ دو فرار ہوتے ہوئے اور ایک دشمنی میں مگر پکڑا نہیں گیا تھا۔ گروہ میں شامل ہو کے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ بڑے ڈاکے ڈالتے تھے اور ان کا مقابلہ کرنے کی حماقت کرنے والے مارے جاتے تھے۔ جب وہ آخری بار پکڑا گیا تو اپنے حساب سے قتل کی دس وارداتیں کر چکا تھا مگر پولیس کو وہ صرف ڈکیتی میں مطلوب تھا۔ اسے سات سال کی جیل ہوئی۔ وہ باہر نکلا تو پرانے ساتھی مارے جا چکے تھے۔ تین کو پھانسی ہو گئی تھی۔ چار پولیس مقابلوں میں ہلاک ہوئے تھے اور باقی ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ اس نے اپنا گروہ بنایا اور دو سال تک اسی علاقے میں دہشت پھیلاتا رہا۔ بالآخر ایک فرض شناس اور ایماندار پولیس افسر اس کے پیچھے لگ گیا۔ ایک سب انسپکٹر

www.paksociety.com

افضل شاہ نے اس کی ہر پیشکش مسترد کر دی۔ لاکھوں پہ تھوک دیا اور جان کی بازی لگا کے اُسے گرفتار کر دیا۔ پاسے خان کے ساتھیوں نے افضل شاہ کو قتل کر دیا اور اس کے گھر کو آگ لگا دی۔ افضل شاہ کے بیوی بچے اندر ہی جل کے مر گئے۔ ڈاکوؤں نے باہر سے کنڈیاں لگا دی تھیں اور جب وہ اندر سے مدد کے لیے چیخ رہے تھے تو وہ باہر ہوائی فائر کر رہے تھے تاکہ لوگ قریب نہ آئیں۔ افضل شاہ مر گیا مگر وہ

پاسے خان کی ساری کبریائی کا طلسم توڑ گیا۔ جو پاسے خان کے خلاف چار افراد کے قتل کا پکا کیس بنا چکا تھا جس میں ثبوت گواہ سب پکے تھے۔ جب افضل شاہ قتل کر دیا گیا اور اس کے خاندان کو آگ سے جلا دیا گیا تو پولیس کا پورا محکمہ پاسے خان کو پھانسی لگوانے پہ تُل گیا۔ اس کے خلاف قتل کے مقدمات بنانے کے علاوہ متعدد ڈکیتی کی وارداتوں میں ملوث کر لیا گیا جو اس نے نہیں کی تھیں۔ کسی

ڈاکو سے تھانیداروں کی یہی جنگ "جیو اور جینے دو" بلکہ عیش کرو اور عیش کرنے دو کے اصول پر ہوتی ہے۔ مگر پاسے خان نے افضل شاہ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس نے ہر تھانیدار کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ یہی اُن کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکو بہر حال ڈاکو ہیں، اُن کو یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ تھانیدار اُن سے ڈرتے ہیں یا ان کے زر خرید غلام ہیں۔ ان کے درمیان کوئی بھائی چارہ کا سمجھوتا ہوتا ہے تو یہ تھانیداروں کی دی ہوئی رعایت ہے۔ کوئی تھانیدار

یہ رعایت نہیں دیتا تو اسے قتل کرنا تمام تھانیدار برادری کی توہین ہے۔ کسی تھانیدار کی شرافت، اصول پرستی اور ایمانداری اس کا عیب سہی مگر جرم بہر حال نہیں ہے اور اگر جرم ہے تو کسی ڈاکو کو یہ اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اس کو سزا دے۔ ایک غلط حرکت نے پاسے خان کو تختہ دار تک پہنچا دیا۔ پولیس نے اس کے خلاف وہ جنوں بیتی شہادت عدالت میں لا کھڑی کی کہ جب پاسے خان کو سزائے موت

سنائی گئی تو اسے احساس ہوا کہ معاملہ کتنا سنگین ہو گیا ہے۔ اس نے جیل سے تھانیداروں کو پیغامات بھیجے کہ وہ تلافی کے لیے تیار ہے مگر بات نہ بنی۔ اس نے گورے ڈاکو سے مدد مانگی کہ میں اور تم حریف سہی مگر ایک مقتول تھانیدار کے لیے سب تھانیدار اس کی جان

کے دشمن ہو گئے ہیں تو کیا ایک ڈاکو ساتھی کے لیے دو ڈاکو مل کر کچھ نہیں کر سکتے۔ گورے ڈاکو نے اس اپیل پر لبیک کہا۔ اپیل کی سماعت کی تاریخ پہ پاسے خان کو جیل سے عدالت لایا گیا تو

گورے ڈاکو کی پلٹن نے حملہ کر دیا۔

گورے ڈاکو کو علم نہ تھا کہ مخبری ہو چکی ہے۔ اس لئے پوری

قوت کے ساتھ حملہ کیا تھا اور اُسے یقین تھا کہ وہ پاسے خان کو چھڑا لے جائے گا۔ مگر اس روز پاسے خان کے لیے خصوصی حفاظتی انتظامات کیے گئے تھے۔ سخت مقابلے میں چند پولیس والے مارے گئے اور دو عام آدمی۔ گورے ڈاکو کے چار ساتھی ہلاک ہو گئے اور پاسے خان

کو چھڑانے کے لیے آنے والا گورا ڈاکو خود گرفتار ہو گیا۔ پاسے خان

کی اپیل بھی مسترد ہو گئی۔ گورے ڈاکو کو سیشن کورٹ سے سزائے موت سنا دی گئی۔ تھانیدار برادری اس کے خلاف بھی متحد ہو گئی تھی۔ گورے ڈاکو نے کوٹ لکھپت جیل سے اپیل ارسال کی جو بار بار ہر سطح سے گزر کر وہاں تک پہنچے۔ انھوں نے طاقت کے استعمال سے گریز کیا کیونکہ کوٹ لکھپت جیل کو توڑ کے کسی سزائے موت پانے والے قیدی کو نکالنا تقریباً ناممکن تھا۔ انھوں نے مذموم کا علم پھر جاری رکھا اور نیچے

سے اوپر تک لاکھوں کی تھیلیاں پہنچا دیں اور بالآخر پاسے خان اور گورا ڈاکو کال کوٹھری سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ باقی یک ان کا اپنا تھا۔ وہ اب سندھ کے جنگلات میں روپوش ہو جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ سبک دوش ہو کر دور جانا ان کے لیے بے حد ضروری تھا کیونکہ یہاں پھانسی کا پھندا تقریباً ان کے گلے میں پڑ چکا تھا۔

پاسے خان یقیناً بے وقوف تھا کہ اس نے باہر نکلنے کی بجائے پولیس سے گٹھ جوڑ کا سوچا۔ یہ نہیں سوچا کہ اسی پولیس نے اسے

کہاں پہنچا دیا تھا۔ معلوم نہیں کیوں اس نے دل میں انتقامی نہیں پالا تھا۔ وہ باہر نکل کے ان سب کو قتل کرتا جو اس کے خلاف استعمال ہوئے یا اس کی جان کے دشمن بنے۔ غالباً دو سال کال کوٹھری میں گزارنے کے بعد اس کا حوصلہ ختم ہو چکا تھا۔ ایک تھانیدار کو قتل کرنے کی سزا بہت سخت ملی تھی۔ اس نے موت کو روبرو دیکھ لیا تھا۔ ایک ابھی

تاریخ کے روپ میں جس کی صبح پھانسی کے پھندے کو کھینچ میں ہوتی وہ ٹل گیا تھا اور اب صرف فرار ہونا چاہتا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ان دونوں ڈاکوؤں کا سارا کس بل نکل چکا تھا ورنہ وہ ہمیں جنگل کے بجائے گولی مار کے ہمیشہ کے لیے سُلا دیتے۔ ان کی بادشاہی کی وجہ

یہی میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ وہ اب کسی کے لیے دہشت نہیں بنے تھے چنانچہ وہ خوفناک پیچھے سے ہی لڑا سکتے تھے مگر اس شہر کی رہا ڈر تھا کہ کون ڈرتا ہے جو پنجرا پکڑ کے پنجرے سے ہے۔ اس لیے زندہ رکھا ہو کر اسے دوسرے پنجرے میں منتقل کر دیا جائے۔ وہ جنگل کے

بادشاہ کی اداکاری کرتے تب بھی لوگ مرعوب نہیں ہوں گے۔

پاسے خان نے ہم پر اعتبار کر کے رسک لیا تھا۔ شاید اس رسک میں یہ خیال بھی شامل تھا کہ ہر تھانیدار افضل شاہ نہیں ہوتا

بلکہ ہزاروں میں ایک ہوتا تھا تو اب شاید لاکھوں میں ایک ہوگا۔ پھر میری تھانیداری کی پیشکش اور دستبرداری دیکھنے نے اس کو مزید اطمینان دلایا اور وہ خود کو محفوظ سمجھتے ہوئے رُک گیا۔ میں دیکھ رہا تھا گورا ڈاکو اس کے مقابلے میں بہت زیادہ محتاط ہے اور اس کا ایک ہاتھ مستقل اپنے ریوالور پہ ہے۔ تاہم اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اچھا بھئی جمن خوب بلی... ابھی تو ہم چلتے ہیں۔" وہ بولا۔

"تم میری جیپ لے جا رہے ہو۔" میں نے مردہ آواز میں کہا۔ "میں کیا جواب دوں گا؟"

پاسے خان نے قہقہہ مارا۔ "اسے جو دل کرے کہہ دینا۔ کہہ دینا کہ ڈاکو پاسے خان کے ساتھ تیرے ساتھی تھے انھوں نے بے بس کر دیا تھا۔"

"مگر ہم بے بس کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"کہہ دو ہم نے ہاتھ باندھ کے ڈال جاؤ۔" غالب نے کہا۔

"مگر یہاں نہیں۔" میں نے کہا۔ "سڑک پہ ڈال دینا اگر کوئی اٹھا لے۔ میرے ماتحت تو چل بھی نہیں سکتے۔"

"چل بھئی جیسے تو راضی۔" پاسے خان بولا۔ "اسے جیپ میں ڈال لے۔"

میں نے اطمینان سے غالب کو پیچھے والی سیٹ پہ بٹھایا جہاں گورا ڈاکو پہلے سے براجمان تھا۔ اس نے اب اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔ "تم جیپ چلاؤ۔" گورے ڈاکو نے مجھے حکم دیا۔ "اور خیال رکھو کہ پیچھے سے بھی میں دل میں گولی اتار سکتا ہوں۔"

میں نے خفت سے شکریہ ادا کیا۔ "کیوں ڈراتے ہو گورے بادشاہ...!"

مگر اسی وقت میرا پورا جسم بجلی کی طرح حرکت میں آگیا۔ میں نے دایاں ہاتھ گورے ڈاکو پہ ڈال دیا۔ بائیں ہاتھ سے میں نے اس کے بازو پہ وار کیا اور میں نے بازو کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز صاف سنی مگر اس سے قبل ہی وہ پاسے خان پہ فائر کر چکا تھا جو جیپ میں سوار ہونے والا تھا۔ میں نے ان کو اٹھنے کی بالکل مہلت نہ دی۔ میری ایک لات پاسے خان کے سر پہ لگی اور اس کا سر جیپ کی سائڈ سے ٹکرایا۔ گورے ڈاکو کا ہاتھ لٹک کے جھولنے لگا تھا مگر اس نے فوراً ریوالور کو دوسرے ہاتھ میں پکڑنے کی کوشش کی۔ میں نے دوسرے پیر کی ایک اس ہاتھ کی کلائی پہ جڑ دی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ بڑی طرح چلانے لگا۔ پاسے خان گولیاں چلانے لگا۔ اس کا دوسرا ہاتھ بھی کلائی کے ٹوٹ جانے سے ناکارہ ہو گیا تھا۔ پاسے خان مجھے گالیاں دیتا اٹھا تو میں نے اسے منہ پر ایک ٹھوکر ماری۔ وہ دوبارہ جیپ سے ٹکرایا اور نیچے گر گیا۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچا اور سر سے

اوپر اٹھا کے نیچے دے مارا۔ وہ ہلکے ہلکے سانس لینے لگا اور وہیں پڑا رہا۔ گورا ڈاکو اچانک بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے پیچھے دوڑنے سے پہلے میں نے پاسے خان پہ آخری وار کیا تاکہ وہ اٹھے تو غالب کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں چڑھ گئیں اور اس کا کراہنا بند ہو گیا۔

میں جب گورے ڈاکو کے پیچھے لپکا تو وہ تقریباً پچاس قدم آگے تھا۔ میں نے پاسے خان کا ریوالور اٹھا لیا تھا چنانچہ میں نے اسے پیچھے سے چلا کے وارننگ دی۔ "گورے کی اولاد... رک جاؤ ورنہ میں شوٹ کر دوں گا۔"

جواب میں ایک گولی آئی جو شاید میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے ایک دم غوطہ مارا اور ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس حالت میں گورے ڈاکو کے نشانے کا خطا ہو جانا ہی ممکن تھا۔ شاید اس نے اپنے فریکچر والے ہاتھ سے کام لیا تھا ورنہ جس ہاتھ کی کلائی ٹوٹی تھی اس سے وہ ریوالور نہیں تھام سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گورے ڈاکو سے مقابلہ کرنا بھی آسان نہ تھا مگر مجھے زیادہ افسوس اپنی بے وقوفی پہ ہوا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ گورے ڈاکو کے پاس بھی دو ریوالور ہیں۔ ایک اس کا اپنا، دوسرا وہ جو اس نے غالب سے چھینا تھا۔

میرا جوابی فائر ایک فطری ردعمل تھا لیکن اس نے گورے ڈاکو کو محتاط کر دیا۔ اس نے بے تحاشا اور اندھا دھند دوڑنا چھوڑ کے درختوں کی آڑ میں بھاگنا شروع کیا۔ میں نے اُسے نظر میں رکھتے ہوئے پیش قدمی جاری رکھی اور جانتے بوجھتے اسے موقع فراہم کیا کہ وہ پھر یہ گولی چلائے۔ اس کی چلائی ہوئی تیسری گولی میری ران سے رگڑ کھاتی ہوئی گزری اور مجھے آگ کی ایک کیپی جلن محسوس ہوئی۔ میں نے اس پہ جوابی فائر صرف اسے جواب دینے کے لیے کیا۔ گورے ڈاکو نے پلٹ کر یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلائیں۔ اب میرے حساب سے اس کے ریوالور میں ایک ہی گولی رہ گئی تھی اور مجھے ان کی دہائی یاد تھی کہ ایک گولی وہ اپنے لیے بچا کے رکھیں گے کیونکہ وہ زندہ ہاتھ آ کر پھانسی چڑھائے جانے کا رسک نہیں لے سکتے۔

تیسرا فائر میں نے نشانہ لے کر کیا۔ اس وقت تک میرے اور گورے ڈاکو کے درمیان فاصلہ کم ہو کے آدھا رہ گیا تھا۔ گولی گورے ڈاکو کی ٹانگ پہ گھٹنے کے قریب لگی۔ وہ ایک دم منہ کے بل گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ ریوالور کی آخری گولی خود پہ چلاتا، میں نے دوڑ کر ایک جست لگائی اور اس کے اوپر جا پڑا۔ اس نے جلا کے چیخ ماری۔ ریوالور نیچے گر گیا۔

"خدا کے لیے مجھے مر نے دو... اسی جگہ مر جانے دو۔" وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ "کل بھی تو مجھے پھانسی ہی ہونا ہے۔"

www.paksociety.com

"ہاں۔ مگر وہ انصاف کے عمل کی تکمیل ہوگی۔" میں نے کہا۔

"میں تم کو خودکشی کرنے نہیں دوں گا۔"

"اچھا تو خود گولی مار دو مجھے۔" وہ چلایا۔

"نہیں گوہر بادشاہ! میں تمہارا قاتل کیوں بنوں؟" میں نے کہا۔ "تم کو قاعدے قانون کے مطابق پھانسی ہونا چاہیے... اور ضرور ہوگی۔"

میں اُسے گھسیٹتا ہوا لایا اور اٹھا کے جیپ میں پھینک دیا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے ہاتھوں کے لیے یہ اذیت ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ آخری بار چیخا اور بے ہوش ہوگیا۔ غالب نے مسکرا کے مجھے انگوٹھے سے وی کا نشان دکھایا۔ وہی مارو کری۔ میں نے دو دستی ... خالی کو بھی گوہر کے اوپر ڈال دیا۔ اب گاڑی کا پہیہ گڑھے سے نکالنے کا مرحلہ میرے سامنے تھا۔ میں نے پہلے سے سوچی ہوئی ترکیب پر عمل کیا اور اس میں کامیاب رہا۔

"ان دونوں پر نظر رکھنا۔" میں نے دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی ہوش میں آئے نہ بھاگنے پائے۔"

کھانے پینے کا سارا سامان وہیں پڑا رہ گیا اور میں نے جیپ کو واپسی کے راستے پر دوڑانا شروع کیا۔ دوبارہ سڑک تک پہنچنے میں ہمیں آدھا گھنٹہ لگا۔ اب شام کا سورج ڈھل رہا تھا۔ سڑک بھی سنسان تھی اور ہمارا راستہ صاف تھا۔

"خدا اس وقت قارون کا خزانہ بھی عطا کرتا تو اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی دو ڈاکوؤں کو پا کے ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں! اب ہم بارگین کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"ہم کس سے بارگین کریں گے؟" میں نے کہا۔ "رضوی صاحب سے؟"

"اور کس سے کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ اس میں ہم دوسری بار قانون کی مدد کریں گے۔ انکل رضوی نے اب تک یقیناً اس ایمونیشن ڈپو پر قبضہ کر لیا ہوگا۔ یہ مفرور ڈاکو ان کے حوالے کر کے ہم ثابت کر دیں گے...."

"ہم کچھ ثابت نہیں کر سکیں گے کم سے کم انکل رضوی پر۔" میں نے کہا۔ "وہ بارگین کرنے والے آدمی ہی نہیں ہیں۔ اور بارگین ہم کیا کریں گے؟ کیا ان سے کہیں گے کہ ہم پر تمام مقدمات ختم کر دیے جائیں تو ہم دونوں ڈاکو ان کے سپرد کریں گے؟ یہ ان کے اختیار کی بات ہی نہیں اور ہوتی تب بھی وہ نہ کرتے۔ وہ صاف کہیں گے کہ ٹھیک ہے قانون تمہاری خدمات کے اعتراف میں سزا کم کر سکتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تم خود کو قانون کے حوالے کرو۔"

"ہمارا اتنا بڑا کارنامہ بلکہ اتنے بڑے کارنامے ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔"

"قانون نہ ہمارے احسان کو تسلیم کرے گا اور نہ ہمارے قرض کو مانے گا۔" میں نے کہا۔ "ہم نے ملک و قوم کے دشمنوں کے ایک اڈے کی نشاندہی کی جہاں سے کثیر مقدار میں اسلحہ برآمد ہوا۔ جو یہ وطن دشمن عناصر کسی وقت وطن پرستوں کے خلاف استعمال کرتے۔ ہمارا کارنامہ یہ ہے کہ ہم نے دو خطرناک ڈاکو جیل سے فرار ہونے کے چوبیس گھنٹے کے اندر پکڑ لیے جن کو پولیس گرفتار نہ کر سکی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ جو کچھ ہم نے اس سے پہلے کیا... اس پر پھانسی۔ یقینی ہی ہے۔"

"پھر ان ڈاکوؤں کا کیا کرنا ہے۔ اگر ان کے بدلے کوئی سودا بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہم ایک پوائنٹ اور اسکور کریں گے۔" میں نے کہا۔ "نیکی کر دریا میں ڈال اور ڈالتا جا۔ ایک دن آئے گا کہ دریا نیکیوں سے بھر جائے گا۔ اتنا بھر جائے گا کہ اسے اپنا رُخ بدلنا پڑے گا۔ وقت کا دریا ہمارے خلاف بہہ رہا ہے مگر ایک دن ہم اس کا رُخ موڑ لیں گے۔ کیسے موڑ لیں گے؟ یہ تم بھی جانتے ہو مرزا۔ ہم کو مجرم کہنے والے خود قاتل اور مجرم ٹھہریں گے اور اگر ہم ملک کو وطن فروشوں کے وجود سے پاک کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اس کا سارا اعزاز بھی ہمیں جائے گا۔"

"دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔" غالب نے کہا۔

"نہیں۔ یہ صرف خیال نہیں۔ ہم اسے حقیقت کا روپ دینے کی کوششوں کا آغاز تو کر ہی چکے ہیں۔ ہماری اب تک کی کامیابیاں کم نہیں اور امید کا سفر تو ہر حال میں جاری رہتا ہے۔ ہمارے عزم اور حوصلے کے کارواں کا ہر قدم منزل کی طرف ہے۔ اور جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے ہیں راستے خود صاف ہوتے جاتے ہیں۔ انکل رضوی ہی ایک قابلِ اعتماد گواہ ہیں جو تسلیم کریں گے اور کر بھی چکے کہ ہم نے ان دشمنوں کے ایک خفیہ اسلحہ خانے کا پتا دیا تھا۔"

"اور وہ جو اس سے پہلے ہم کئی دفاتر تباہ کر چکے ہیں؟"

"ان کا کریڈٹ وہ نہیں دیتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "مشکل یہ ہے کہ ان کا ریکارڈ کچھ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ پولیس نے ان واقعات کی تہ کو ہمیشہ کی طرح نامعلوم تخریب کاروں کی تخریبی کارروائی قرار دیا ہوگا۔ اگر ان کو قبل از وقت معلوم ہو جاتا تو وہ کریڈٹ خود کو دیتے اور خوب ڈھول پیٹتے کہ پولیس نے بہت اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تخریبی عناصر کے مذموم عزائم کو بروقت ناکام کر دیا۔ اور پروانے کامیابی کا سہرا کسی منظورِ نظر کے سر باندھتے اور اسے ترقی دلوا دیتے۔ صرف انکل رضوی ہی ایسا کر سکتے ہیں کہ کھل کر ہمارا نام لیں اور یہ کہیں کہ اس اڈے کا پتا سکندر بخت نے دیا تھا جو مفرور مجرم ہے۔ وہ کسی کو بھی اس کامیابی کا سہرا خود اپنے سر نہیں باندھنے دیں گے اور یہ بات ریکارڈ پر رکھیں گے کہ ہم نے اور صرف ہم نے اس اڈے کا پتا دیا تھا۔

ہم ان ڈاکوؤں کو بھی انکل رضوی کے حوالے کریں گے اور صرف وہ ہی یہ کامیابی ہم سے منسوب کریں گے۔ ان کی جگہ کوئی اور پولیس افسر ہوتا تو پہلے بات طے کر لی جاتی کہ اس کامیابی کا اعزاز کسے دیا جائے۔ یہ ناممکن تھا کہ اس کا اعزاز دو مفرور مجرموں کو دیا جاتا۔ بھلا جانے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ مطلوب مجرموں نے دو مفرور ڈاکو پکڑ کے پولیس کے حوالے کر دیے ہوں۔ یہی توقع ہوتا ہے پولیس کے سپاہی اپنی کارکردگی کا ڈھنڈورا پیٹنے کا۔ مجرم پکڑے جاتے ہیں، اتفاق سے یا مخبری سے یا اپنی بدقسمتی کے باعث۔ پولیس فوراً نام کما لیتی ہے۔"

"رضوی صاحب کے محکمے والے اس سے ناخوش ہوں گے۔" غالب بولا۔

"وہ تو پہلے ہی ناخوش ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "تاہم یہ بات سب کو خود اپنے منہ پر طمانچہ مارنے کے مترادف لگے گی۔ یہ پولیس کے محکمے والے پولیس کے نام کو بٹا لگانے سے کم تو نہیں ہے کہ جیل سے بھاگ جانے والے ڈاکوؤں کو پولیس کی چھاپہ مار پارٹیاں اور ناکہ بندی کرنے والے نہ پکڑ سکیں اور خبر آجائے کہ ان کو سکندر بخت اور اس کے ساتھیوں نے پکڑا اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ ابھی تم دیکھو گے کیا ڈراما کرتا ہوں۔"

"لیکن اس سے فائدہ ہونے کی امید نہیں تو پھر اتنی محنت کس لیے؟"

"فائدہ ہوگا مرزا۔" میں نے کہا۔ "مگر وہ فائدہ نہیں جو تم چاہتے ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مفرور مجرم اچانک تائب ہو کے نیکی کے کام شروع کر دیں تو ان کے سابقہ جرائم ختم ہو جائیں۔ مثلاً یہی ڈاکو جیل سے نکل کر شریف اور نیکوکار ہو جاتے۔ رفاہِ عامہ کے اور ثواب کے کام کرتے پھرتے۔ اصلاحِ معاشرہ کے لیے بدمعاشوں اوباشوں کو پکڑوانے لگتے۔ جرائم کو روکنے میں مدد کرتے تو اس سے ان کی سزائے موت کے فیصلے پر کوئی اثر پڑتا؟ یہ ثابت ہو جاتا کہ اب یہ فرشتے ہو گئے ہیں اور بدی سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں رہا۔ تب بھی کچھ نہ ہوتا۔ یہی پوزیشن ہماری بھی ہے۔... لیکن..."

"لیکن کیا؟" غالب نے بےچینی سے استفسار کیا۔

"لیکن دوست ایک بات ایسی ہے جو صرف ہم سمجھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم سے مراد ہے ہم سب جو خود کو ایم آر ایس کہتے ہیں۔ اگر آپ کے حالات کا تجزیہ کرو تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ رضوی صاحب دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ اور جیسے جیسے وقت گزرے گا انکل رضوی اور ایس ایس پی رضوی کے درمیان فاصلہ بڑھتا جائے گا۔ انکل رضوی ہمارے ساتھ ہیں۔ ان کی نیک خواہشات اور دعائیں ہمارے ساتھ ہیں مگر ایس ایس پی رضوی کے لیے قانون کی بالادستی اہم ہے۔ ایس ایس پی کا انکل کے جذبات سے کوئی تعلق نہیں۔ انکل کو یقین ہے کہ ہم بے گناہ ہیں جیسے ہمیں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھنسایا گیا تھا۔ وہ جانتے ہیں کہ وزیر خان کو کس نے قتل کیا تھا۔ میر شرافت علی کو کس نے مارا تھا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے پیچھے کس شکاری کا ہاتھ تھا۔ مگر ان کے جاننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے ماننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایس ایس پی کہتا ہے کہ ثبوت لاؤ۔ قانونی تقاضے پورے کرو۔ عدالتی کارروائی ہونے دو۔ پھر جو مجرم ہوگا اسے سزا مل جائے گی۔ جو بے گناہ ہوگا وہ رہا ہو جائے گا۔ وہ نظامِ "انصاف" کو بُرا نہیں سمجھتے مگر یہ جانتے ہیں کہ اس کو مفاد پرست کس طرح استعمال کرتے ہیں اور اب اس نظام میں جتنی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں وہ کیا ہیں۔ لیکن وہ اکیلے اس پورے نظام کو نہیں بدل سکتے۔ وہ اس کے خلاف بغاوت بھی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ خود اسی نظام کا حصہ ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ احتجاج کرتے ہوئے پولیس کی نوکری چھوڑ سکتے ہیں۔ اس سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔ پولیس کے بدعنوان اہلکار جو ان کی وجہ سے مجبور تھے آزاد ہو جائیں گے۔ ان کی موجودگی سے اگر بدعنوانی کی غلاظت کے ڈھیر میں ایک فیصد کا اضافہ رکا ہوا ہے تو یہ بھی بہت ہے۔ ان جیسے سو افسر ہوتے تو یہ کوڑے کا ڈھیر نظر ہی نہ آتا جس پر بیٹھ کے عزت دار لوگ خیر اس طرح پڑے ہوئے ہیں جیسے اکثر نوزائیدہ معصوم بچوں کی لاشیں پڑی ملتی ہیں۔"

"کچھ لوگوں کو اب بھی یہ کوڑے کا ڈھیر نظر نہیں آتا۔" غالب بولا۔ "انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔"

"ایک دن وہ آنکھیں کھولنے پر مجبور ہوں گے مرزا۔" میں نے کہا۔ "اس وقت جب انھیں احساس ہوگا کہ ان کے چاروں طرف غلاظت اور کوڑے کے ڈھیر اتنے اونچے ہو گئے ہیں کہ وہ خود اس گندگی میں ڈوب چکے ہیں اور کوڑے کے متعفن ڈھیر کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔"

"اس طرح کیا ہم انکل رضوی کی مشکلات میں اضافہ نہیں کر رہے ہیں؟"

"یہ خیال تو مجھے بھی آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جیسے جیسے ہم اپنی بے گناہی اور مظلومیت ثابت کرتے جائیں گے اتنا ہی انکل رضوی اور ایس ایس پی رضوی کی دو شخصیتوں کے درمیان تفاوت بڑھے گا۔ ان کے دل اور دماغ کی جنگ میں شدت آتی جائے گی۔ ان کے لیے اپنے وجود کے دونوں برسرِپیکار حصوں کو یکجا اور متحد رکھنا دشوار ہوتا جائے گا۔ پولیس والا بھی گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہوتا ہے جو احساس رکھتا ہے۔ ایس ایس پی کب تک ثبوت کو ڈھال بنائے گا۔ سچائی بالآخر ان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرے گی۔ ایک وقت آ جاتا ہے جب سچ کسی ثبوت کا محتاج نہیں رہتا اور اسے تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"یار یہ سامنے کوئی بڑی سڑک آرہی ہے۔" غالب نے اچانک کہا۔

"ہاں، میں بھی مخالف طرف کی ٹریفک کو دیکھ رہا ہوں۔"

www.paksociety.com

"اب جانتے ہیں تھوڑی بہت ملاقات تو ضرور ہوگی۔" غالب نے کہا۔ "اس جیب میں ہاتھ ڈالنے والے کے پکڑے جانے کا خطرہ زیادہ ہے۔"

"اس میں جانتے بوجھتے نکل جانے کے امکانات بھی زیادہ ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر یہی رہ گئی تو صرف پولیس پبلک سے ہم کو خطرہ نہیں ہے۔"

"پولیس نے خطاب تک چوری ہو جانے والی جیب کے نمبر وغیرہ کی تشہیر کر دی ہوگی۔" غالب بولا۔ "کیا خیال ہے ان پولیس والوں نے پیچھا کیا ہوگا؟"

"اقبالی بیان کے سامنے تو سچ ہی ہوگا۔ لیکن اقبالی بیان کی بنا پر کسے سے متعلق کو جیل کی مشق کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "خبر بھی آئے گی کہ دونوں مفرور ڈاکوؤں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے پولیس پارٹی پر حملہ کیا اور ان کا اسلحہ اور جیپ بھی لے گئے۔"

"اور ڈاکوؤں کا حلیہ وہ کیا بتائیں گے؟ ظاہر ہے ہمارا حلیہ تھا۔" غالب ہنس کر بولا۔ "انھیں ابھی اس طرح معلوم ہے کہ ہم جیسے ابھی تک یہ نہیں تھے اور ہم کو پٹھان خان یا گوجر ڈاکو نہیں سمجھا جا سکتا لیکن ان کو اپنی عزت تو بچانا ہے۔ گرجو بیٹ کا نشیبل خدا بخش کہے گا ... بیان سے ان کا بیان مختلف نہیں ہو سکتا۔ خود اور مبشر وہی کہے گا جو پولیس کہے گی حالانکہ وہ ہم سے ایک دن پہلے بھی مل چکا تھا اور وہ جانتا ہے کہ ہم ڈاکو نہیں ہیں۔ اس نے مجھے کسی میک اپ کے بغیر دیکھا تھا لیکن وہ اپنا حقیقت پر مبنی بیان دے کر مصیبت میں نہیں پھنس سکتا۔ وہ بھی کہے گا کہ پٹھان خان اور گوجر ڈاکو زبردستی اس کی کار میں بیٹھے۔ آگے پولیس نے راستہ روکا تو ان کے ساتھی آ گئے اور وہ سب کچھ چھین کر لے گئے۔ اسلحہ، گاڑی اور وردیاں۔ پولیس نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا مگر وہ تعداد میں زیادہ تھے اور ان کے پاس خطرناک قسم کا جدید اسلحہ تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بے چارہ اور مبشر خواہ مخواہ پھنس گیا!"

"سب ... کی سزا ہے۔" میں نے کہا۔ "سالا چھوٹو غریب آدمی کیسے سے باز نہیں آتا تھا۔ اب ساری عمر آئینہ دیکھے گا تو ... حماقت کی جگہ نقلی ... رکھے گا کیا نے یہ سزا کیوں ملی تھی۔ میرا بس چلتا تو میں اس کی گاڑی کو بھی آگ لگا دیتا۔ اس نے کھیتوں کا پانی روک کر کتنے غریب کاشت کاروں کے دل جلائے ہوں گے۔ اس نے محنت کشوں کے خون پسینے پر قبضہ کر کے ... کیا اور زبردستی وصول کیا ہوگا۔ ایسے ... آگ لگا دیتے ... سب جتنا ... کو سنگسار کرتے ہیں۔"

غالب ہنسنے لگا۔ "ایسے تو ... ایجاد کر ... مذہب کے ... بھی تیرے خلاف ہو جائیں گے۔"

"اس میں غلط کیا ہے۔ ... حرام کھاتا ہے ... حرام کرتا ہے۔ حرام کھانے والا تو اپنی نسلوں کے خون میں رزق حرام شامل کرتا ہے وہ زیادہ بڑا مجرم ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ چوری کا مال تھا، یہ سب

جانتے ہیں لیکن ایسے چور محفوظ رہتے ہیں۔ ہاں ... اس کی ایک اور چیز بھی میرے پاس رہ گئی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" غالب نے کہا۔

میں نے اندر ہاتھ ڈالا اور وردی کے نیچے اپنے ... سے وہ ٹیلی فون کا آرٹیکل ... جو تاروں سے جوڑ کے ... حساب کی تھی اور مبشر کو میں نے فوراً بھیج دیا تھا ... آخر کے بعد میں نے اس آلے کو ہاتھ میں رکھا تھا۔ ... خیال تھا کہ اسے رکھ دوں گا۔"

"مگر پھر دل میں بے ایمانی آ گئی۔" غالب بولا۔

"سچ فرمایا آپ نے۔" میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے ... میں پھسل گیا اور میں نے اسے قمیص کے اندر چھپا لیا ... کام ..."

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے ... یہ ایجاد ہمارے بہت کام آئے گی۔" غالب نے کہا۔ "اسے سنبھال کے رکھو۔"

"سنبھال کے ہی رکھا ہوا ہے ..." میں نے کہا۔

"میرا ایک مشورہ ہے، بالکل مفت۔" غالب ... "ہونے سے پہلے ہم شہر میں داخل نہ ہوں۔ ابھی دو گھنٹے میں ... پھیل جائے گا۔ دن کے اجالے میں پولیس کی جیب بھی ... نظر آتی ہے اور خصوصی چھیڑا جاتا ہے۔ رات کو ..."

"میرا خیال ہے کہ زیادہ ہوتی ہے۔" ... نے کہا۔

"ٹریفک پولیس نہیں رہتی۔" غالب نے کہا۔ "گشت کرنے والے آ جاتے ہیں مگر وہ ... کرتے ہیں۔ سیر تفریح ... آوارہ گردی کی ... وصول کرنا ... جیسے ... سے آنے والے مسافروں کو لوٹنا ... گھڑیاں اور نقدی ... تلاشی میں ضبط کرنا۔ ان کی نظر میں تو سب ہی مشتبہ ہوتے ہیں۔ جو پکڑا جائے اور خالی ہو تو وہ چار ہاتھ ... دس بیس گالیاں ... آئے تو ایک سو ... ارسال کیا جاتا ہے۔ جو شرافت سے جیب خالی کر دے وہ گھر چلا جاتا ہے اور کسی ... شکایت نہیں کرتا سوائے اپنی تقدیر کے۔"

"میں قائل ہوا۔" میں نے کہا۔ "رات تک کیا کریں؟"

"صبر۔" غالب نے کہا۔ "صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور اللہ ... صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

ہم نے جیب کو شاہراہ سے ایک ... وہاں ایک ... تھی اور اس کے ساتھ ہی ... تھا جو خالی پڑا ہوا تھا یا باہر سے ایسا ہی لگتا تھا۔ میں نے جیب اس کے پیچھے کھڑا کیا اور اندر داخل ہو گیا۔ چار افراد جو فرش پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے ایک دم اٹھ کے بھاگے اور دیوار پھاند گئے۔

... ہی ... کا ایک کیگ مین پکڑا گیا۔ میں نے اپنا ریوالور نکال لیا۔

"یہ سب ہو رہا ہے جوا یہاں؟" میں نے گرج کے کہا اور تاش کے ان بے ترتیب پتوں کی طرف دیکھا جو بھاگتے وقت بکھر گئے تھے۔ ... ان کی جیتی ہوئی اور ہاری ہوئی رقم ... کیگ مین کا رنگ ... کی طرح سفید ہو گیا۔

"جی ... نہیں حضور والا..." وہ ہکلانے لگا۔ "یار دوست تھے۔"

میں نے اس کے ایک چھانپڑ مارا۔ وہ دیوار سے جا لگا۔ "سرکار غلطی ہو گئی، مجھے معاف کریں۔" اس نے ایک دم ... پاؤں پکڑ لیے۔

میں نے اسے کالر پکڑ کے ایک جھٹکے سے اٹھا لیا۔ "اس پیسے کا تم کو ... نے کہا ... یہاں جوئے کا اڈا قائم کر لو۔"

... لگا۔ "اڈا کیسا جناب۔ آپس میں تھوڑا بہت کھیل لیتے ہیں۔ دس بیس روپے سے زیادہ نہیں لگاتے۔ غریب لوگ ہیں سب۔"

"غریب جوا کھیل سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "دس بیس پیسے کی بازی کو جوا کہتے ہوئے تم کو شرم نہیں آتی۔ جوا ہوتا ہے ... میں ... ہے اور وہاں جہاں لاکھوں لگانے والے آتے ہیں۔ جوتی کہاں ہیں۔"

"کہاں جی؟" کیگ مین بولا۔

"کہیں نہیں۔" میں نے کہا اور اسے چھوڑ دیا کیونکہ وہ واقعی جواری نہیں تھے صرف وقت گزارنے اور کھیل میں تھوڑی سی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے شرط لگا کے کھیلتے تھے۔

"میری جگہ کوئی اور پولیس افسر ہوتا تو تم کو پکا جواری قرار دے کے بند کر دیتا اور اس جگہ کو جوئے کا اڈا سمجھ لیتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے تم شکل سے ... نظر آتے ہو۔ تم کو ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ کیا بیوی بچے نہیں ہیں تمہارے...؟"

"جی جناب۔ مگر وہ یہاں نہیں، وطن میں رہتے ہیں۔" وہ بولا۔ "آپ کی بڑی مہربانی آپ نے میری عزت اور نوکری بچا لی۔"

"ایک بار تو تم بچ گئے۔" میں نے کہا۔ "دوبارہ شاید تقدیر تمہارا ساتھ نہ دے۔ غریب جب جوا کھیلتا ہے تو صرف اپنی تقدیر کو داؤ پر لگا سکتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کا مستقبل یا تھوڑی بہت عزت داؤ پر لگا سکتا ہے اور ہارنے کو تمہارے پاس کیا ہے۔ تمہاری تقدیر اچھی ہوتی تو تم کیگ مین نہ ہوتے بے وقوف ... اور ایسی تقدیر سے کرپٹ ہونے کے بعد تم جوا کھیلتے ہو؟"

"آئندہ ... کی ... قریب۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا۔

"باپ ... ہے تمہارا؟" میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔

"نہیں جناب۔" وہ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔

"تو اس کی روح کو کیوں دکھ دیتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ وعدہ اور یہ ہاتھ جوڑ کے توبہ کرنا سب دکھاوا ہے، جان بچانے کے لیے۔ کل تم پھر جمع ہو جاؤ گے اور یہیں پر کھیلو گے اور شاید سمجھو گے کہ جیب تھانیدار تھا۔ وہ چھاپہ مار کے چھوڑ گیا مگر شاید ... سادہ آدمی ... سادہ کپڑوں میں یہاں آ کے تاش کھیلیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تمہاری ڈیوٹی کیا ہے؟"

"میں جناب یہاں پھاٹک بند کرتا ہوں۔" وہ بولا۔ "جب گاڑی آنے کا ٹائم ہو۔"

"ابھی کسی گاڑی کے آنے کا وقت ہے؟"

"نہیں جناب! دو گھنٹے بعد ایک گاڑی گزرے گی۔" وہ بولا۔

"اچھا تو دیکھو، ہم یہاں دو گھنٹے ٹھہریں گے۔" میں نے کہا۔ "ہماری گاڑی میں وہ دو ڈاکو ہیں جو آج ہی پکڑے گئے ہیں۔"

"کون... وہ پٹھان خان اور گوجر ڈاکو؟" وہ بولا۔

"ہاں... تم کیسے جانتے ہو؟"

"یہ تو سب ہی جانتے ہیں حضور۔" وہ بولا۔ "اخبار میں تھا کہ یہ جیل سے فرار ہو گئے ہیں۔ آس پاس کے علاقے والے بہت ڈرے ہوئے تھے۔"

"اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم نے ان کو جنگل سے گرفتار کر لیا ہے۔"

"واہ واہ جناب! یہ تو کمال کر دیا آپ نے۔" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "ان دونوں کی علاقے میں بڑی دہشت ہے۔ سب یہی کہتے تھے اب پھر پہلے کی طرح کسی کی جان و مال محفوظ نہیں رہیں گے۔ سب نے خدا کا شکر ادا کیا تھا جب وہ پکڑے گئے تھے۔ پٹھان خان کو تو چار دن بعد پھانسی ہونے والی تھی۔"

"اب چار دن میں تو شاید نہ ہو مگر خدا نے چاہا تو چار ہفتے بھی نہیں لگیں گے۔" میں نے کہا۔

"اللہ کرے جی۔ بڑے گھر ... انھوں نے۔" وہ ایک دم اداس ہو گیا۔ "میرا گھر بھی تباہ کیا اس خنزیر کے تخم پٹھان خان نے۔"

"تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟" میں نے ہمدردی سے کہا۔

"میری بیٹی کا سارا جہیز لوٹ کر لے گئے تھے۔" وہ رونے لگا۔ "اس کا رشتہ ختم ہو گیا، پھر وہ مر گئی... اس نے خودکشی کر لی۔ اسٹیشن کی پٹڑی پر لیٹ گئی ... اور میری سوہنی دھی... کیسا نصیب لائی تھی تو۔" وہ یکلخت دھاڑیں مارنے لگا۔

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "صبر کرو بھائی... اس کو موت کی سزا تو ... ڈاکو کو بھی سنائی جا چکی ہے اور اسے پھانسی ضرور ہوگی۔ مگر ان کو کبھی کوئی نہیں پکڑے گا جو تمہاری بیٹی کے اصل قاتل ہیں۔ وہ شریف ڈاکو جو جہیز کے نام پر لڑکی والوں کو لوٹتے ہیں۔"

www.paksociety.com

"کیا وہ جہیز کے بغیر تمھاری بیٹی کو نہیں لے جا سکتے تھے؟ وہ رشتہ ختم نہ کرتے تو تمھاری بیٹی خودکشی کیوں کرتی؟"

"وہ لے جاتے تو کون سا خوش رکھتے۔" وہ آنسو پونچھ کے بولا۔ "وہ ساری عمر طعنے سہتی... عذاب جھیلتی... جل جل کے مرنے سے پہلے بہت سے دکھ اٹھاتی اور وہ سارے دکھ ہم بھی اٹھاتے... اچھا ہوا ایک ہی بار مر گئی، ہم نے بھی صبر کر لیا مگر صفدر... مجھے اس ڈاکو کی صورت تو دکھا دو۔"

"میں اس کو اندر لاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر شرط یہ ہے کہ تم خود پر قابو رکھو گے۔"

میں پہلے غالب کو اٹھا کے اندر لایا۔ پھر باری باری ان دونوں ڈاکوؤں کو۔ اب وہ دونوں ہوش میں تھے۔ پاشے خان کی حالت کچھ بہتر تھی مگر کوڑا ڈاکو اپنی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کی تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ کمرے میں ایک ہی چارپائی تھی جس پر میں نے غالب کو لٹا دیا تھا۔ خود میرے بیٹھنے کے لیے گینگ مین نے ایک اسٹول فراہم کر دیا۔

"دیکھ لیا تماشا۔" پاشے خان نے فرش سے سر اٹھا کے کہا۔ "ہم سے سودا کر لے..."

میرے کچھ جواب دینے سے پہلے ہی گینگ مین اس پر پل پڑا۔ اپنی بیٹی کے خون کا بدلہ لینے کی آرزو اس پر ایک جنون بن کے سوار ہو گئی اور وہ مجھ سے کیے ہوئے وعدے کو بھول گیا۔ "تو سودا کرے گا... کس کس سے سودا کرے گا... پہلے میری بیٹی کی زندگی کی قیمت دے... تیری تو..." اس نے ایک کے بعد ایک گندی گالی دیتے ہوئے پاشے خان کو دیوانہ وار تھپڑ مارے۔ پاشے خان نے اسے ایک بار دھکیل دیا مگر وہ پھر اس پر ٹوٹ پڑا۔ میں نے مداخلت نہیں کی۔ میں چاہتا تھا کہ میری موجودگی میں گینگ مین اپنے دل میں جلنے والی آگ کو کچھ ٹھنڈا کر لے۔ اس نے تو خواب و خیال میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ وہ شخص جس کے خلاف اس کے وجود میں نفرت کا زہر بھرا ہوا تھا، بے بس اور لاچار اس کے سامنے لایا جائے گا۔ عام حالات میں پاشے خان پھر اس گینگ مین کے سامنے آتا تو وہ ہاتھ جوڑ کے اس کے سامنے گریہ وزاری کرتا اور پوچھتا کہ سب کچھ تو لے گئے ہو، اب کیا لینے آئے ہو مگر صورت حال قدرت کے نظامِ انصاف نے بدل دی تھی کہ وقت کی بساط الٹ گئی تھی۔ ظالم اب مظلوم تھا اور جو کل مظلوم تھا اس کو ظلم کا حساب برابر کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے غالب کو مختصراً گینگ مین کے ساتھ ہونے والے ظلم کی کہانی سنا دی۔ اس عرصے میں گینگ مین نے پاشے خان کو دھکا دے کے گرا دیا۔ اس نے پاشے خان کی دو پسلیاں ٹھوکریں مار مار کے توڑ دیں اور اس کے سامنے والے دانت توڑ دیے۔ اس کے چہرے کا نقشہ بگاڑ کر ... اور کسی وحشی درندے کی طرح اس کے ... زمین کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ جوان آدمی نہیں تھا۔ خود پاشے خان بھی ابھی

تھوڑی بہت مزاحمت کی قوت باقی تھی۔ پاشے خان ... اور مار کھاتا رہا۔ گینگ مین ہانپنے لگا۔ چلاتے چلاتے ... دیتے اس کا گلا بیٹھ گیا۔ وہ اپنی بیٹی کا نام لے لے کر ... خان پر مسلسل حملے کرتا رہا۔ اگر وہ خالی ہاتھ نہ ہوتا تو یقیناً ... کو قتل کر دیتا۔ میں بھی یہ جانتا تھا کہ وہ اس جنونی کیفیت ... خان کو چیر پھاڑ سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے بہت ... دوسری بار گینگ مین نے پاشے خان کا گلا گھونٹنا چاہا لیکن ... نے اسے دھکیل دیا۔ پھر اچانک گینگ مین ... ایک کونے کی طرف لپکا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ کیا کرنے ... کے واپس آنے سے پہلے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سبزی کاٹنے کی چھری لے کر آیا تو اس نے مجھے اپنی راہ میں مزاحم پایا۔

"ہٹ جاؤ... ہٹ جاؤ تھانیدار صاحب... مجھے ... کا خون پینے دو۔" گینگ مین چلایا اور ... خون سے ہی میرے دل کی آگ ٹھنڈی ہوگی... میں ... جاؤں گا آپ مجھے گرفتار کر لیں پھر مجھے اس کی ... میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو ڈالوں گا۔"

میں نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی اور ... چھڑانے کے لیے بل کھا رہا تھا۔ "بس بھائی... ... مت بڑھو، تم پھانسی چڑھ جاؤ گے تو باقی سب کا کیا بنے گا ... بیوی کا... اور وہ دوسرے بچوں کا... خدا کی لاٹھی بے آواز ہے ... دیکھا کس طرح تمھارا گھر برباد کرنے والا تمھاری ٹھوکروں میں ... اپنا بدلہ خدا پر چھوڑ دو۔ اس نے سب کا حساب بے باق کر ... بہت جلد یہ اپنی ٹوٹی ہوئی گردن کے ساتھ پھانسی گھاٹ ... کنوئیں میں لٹکا ہوگا۔ اسے میں بھی گولی مار سکتا تھا مگر میں نے ... دنیا میں بھیجا ہے جہاں اجل اس کی انتظار میں ہے۔ یہ موت ... سے بھاگنا چاہتا تھا۔ جلاد موت سے بھاگ کے کوئی کہاں جائے ..."

گینگ مین نے چھری گرا دی اور فرش پر دھپ سے بیٹھ ... رونے لگا اور میں نے چھری اٹھا کے دور پھینک دی۔

"اس ڈاکو سے بھی تم نے کچھ کہا تھا جو جہیز کے نام پر ... گھر میں ڈاکا ڈالنے آیا تھا؟" میں نے کہا۔ "اس سے تم نے کچھ ... کہا ہوگا" اگر تم نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے ہوں گے ... قدموں پر سر رکھ دیا ہوگا" یا اپنی پگڑی ڈال دی ہوگی، کہا ہوگا ... عزت اب تمھارے ہاتھ میں ہے۔ یہی کیا تھا نا سب ... ان کو کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ وہ شخص تو خود بے غیرت ہے جو ... آدمی کی بساط سے بڑھ کر جہیز کا مطالبہ کرتا ہے اور ... کی بیٹی کو ... ہے ... دونوں کا قتل ایک ہی ہے مگر طوائف صرف عورت ... تم پر لازم تھا کہ اس ڈاکو کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتے۔ ...

نامرد کے ساتھ ٹھوکریں مارتے۔ اُسے بھی آدھا ہی بے عزت کرتے جتنا اس نے تمہیں کیا۔ جس دن تمھاری بیٹی کا جنازہ اٹھا اسی دن اگر اس کے بیٹے کا جنازہ بھی اٹھتا تو فرق پڑتا۔ ان سب کو فرق پڑتا جن کی بیٹیوں کی براتیں لوٹ گئیں یا رشتے ٹوٹ گئے۔ مگر تم اس کے ہاتھوں ذلیل ہوئے اور تم نے خود کو بھی ذلیل کیا۔ اس نے تو اپنے بیٹے کی بارات اتنی ہی دھوم دھام سے کہیں اور بیاہنی ہوگی۔ تم نے اس ڈاکو کو مارا؟ یہ تو ڈاکو ہے اس کی کوئی عزت نہیں مگر اس عزت دار ڈاکو کا تم کچھ نہ بگاڑ سکے۔"

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" غالب نے مجھے اونچی آواز میں ٹوکا۔ "تم اسے قتل پر اکسا رہے ہو۔ اگر اس نے اب پھر مشتعل ہو کے اس لڑکے کا، اس کے باپ کا یا اس لڑکے کی بیوی کا خون کر دیا تو سوچو کیا ہوگا۔ کتنے گھر تباہ ہوں گے۔ اس کا اپنا، اس لڑکے کا اور اس دوسری لڑکی کا جو بے قصور ہے۔"

مجھے ہوش آ گیا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ انصاف تو اسی وقت ہونا چاہیے تھا جب ظلم ہوا تھا۔ اب بہت دیر ہو گئی۔"

"ہاں جی اب تو بہت دیر ہو گئی۔" گینگ مین نے کہا۔ "آخر وہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے جس کا گھر بعد میں آباد ہوا۔ سارا قصور اس لڑکے کے باپ کا تھا۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ میری بیٹی کا چالیسواں جس دن تھا جس دن اس کا سوئم تھا کہتے ہیں اسی بیٹے نے جلاد کے بیٹے باپ کو زہر دیا تھا مگر مشہور یہ ہوا کہ اسے سانپ نے کاٹ لیا۔ سانپ تو وہ خود تھا، پھر سنپولیا کیسے ... ہوتا ہے۔"

"تمھارا نام کیا ہے؟" غالب نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔ "یہ تو ابھی تک بتایا ہی نہیں تم نے۔"

"غازی خان۔" وہ بولا۔ "خدا آپ کو ترقی دے۔ آپ نے میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا۔ جس دن اس کمینے کو پھانسی ہوگی، میں مٹھائی تقسیم کروں گا اور آپ کے نام پر بھی بانٹوں گا۔"

"نہ بھئی، ہمارا تو یہ فرض ہے۔ ہم یہ کام مٹھائی بانٹنے کے لیے نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "ہماری کسی سے بھی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔"

"میں اپنی بیوی کو آپ کے متعلق ضرور بتاؤں گا۔ یہ بھی بتاؤں گا کہ میں نے اسے کتنا مارا۔ اس کے منہ پر پیشاب کر دیا۔ میں نے مگر ... کر سکا اب ... کے دل کو بہت قرار آ گیا ہے۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔ اگر جناب ملے تو کبھی غریب خانے پر آ جائیں۔" وہ بولا۔ "میری بیوی کی دعائیں بھی لیں۔ وہ غریب تو رو رو کے اندھی ہو چکی ہے مگر دعا دے سکتی ہے۔"

"ہم... ہم ضرور آتے... مگر تمھارا گھر بھی تو معلوم نہیں ہمیں۔" میں نے کہا۔

"آپ جانتے ہیں؟ وہاں ریلوے کے کوارٹر ہیں۔" وہ بولا۔ "چھوٹے کوارٹر دیکھے ہوں گے آپ نے۔ وہاں کسی سے بھی پوچھ لیں کہ ڈیرہ غازی خان کہاں ہے۔"

"ڈیرہ غازی خان؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی... میرا نام غازی خان ہے نا، تو سب میرے گھر کو ڈیرہ غازی خان کہتے ہیں جناب۔" وہ بولا۔ "میں آپ کا خادم ہوں۔ آپ کا احسان ہے مجھ پر کہ مجھے جوا کھیلنے کے جرم میں نہیں پکڑا اور مجھے موقع دیا کہ میں کچھ تو بدلہ لے سکوں اپنی بیٹی کا۔"

"غازی خان... تمھاری بیوی کیا بالکل اندھی ہو چکی ہے؟" غالب نے پھر بات کا رخ بدلا کیونکہ غازی خان گھوم پھر کے اپنے انتقام پر آ جاتا تھا۔

"ہاں جی، ابھی تو بالکل اندھی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں بڑا آپریشن ہوگا۔" وہ بولا۔ "ڈھائی ہزار روپے لگیں گے، غریب کے پاس ڈھائی ہزار کہاں جناب۔ کافی ہے جتنی دنیا دیکھ لی۔"

"لیکن سرکاری اسپتال بھی تو ہے۔" میں نے کہا۔

"وہاں بھلا ہمیں کون پوچھتا ہے۔ کہتے ہیں ریلوے اسپتال جاؤ۔ اور ریلوے اسپتال آپ خود جا کر دیکھ لیں۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "کیا فائدہ دھکے کھانے سے۔"

میں نے غالب سے مشورہ کیا۔ بات صرف ڈھائی ہزار کی تھی جس سے ایک بدنصیب عورت کی بینائی واپس آ سکتی تھی۔ پاشے خان کی پھانسی سے اس کی بیٹی واپس نہیں مل سکتی تھی لیکن بیٹی کے ساتھ چلی جانے والی بیوی کی آنکھوں کی روشنی اس سے صرف ڈھائی ہزار روپے کی مسافت پر تھی مگر اس کی دسترس میں نہ تھی۔ اسے ڈھائی ہزار میل پیدل چل کے اس روشنی کو واپس لانا پڑتا تو وہ اپنی شریکِ حیات کے لیے سفر کی ہر صعوبت برداشت کر لیتا اور اسے آنکھوں کا نور لا دیتا مگر ڈھائی ہزار روپے لانا اس کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ ایسے کئی ڈھائی ہزار ہماری جیب میں پڑے ہوئے تھے اور یہ ڈاکوؤں کا مال تھا جیسے ہی ڈاکوؤں کا یہ ایک غریب گینگ مین کے گھر کی ساری خوشی، ساری روشنی اور ساری زندگی کی کمائی لوٹ کے لے گئے تھے۔

"غازی خان۔" میں نے جیب میں سے گن کر تین ہزار نکالے۔ "یہ لو۔"

"یہ کیا ہے جناب؟" وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔

"تمھاری بیوی کے لیے آنکھوں کی روشنی۔" میں نے کہا۔

"نہیں جناب! ایسے کسی سے لیتے ہوتے تو میں بھیک مانگ لیتا۔" غازی خان نے کہا۔ "بہت سے ساتھیوں نے کہا تھا کہ چندہ کر لیتے ہیں۔ سب کو مجھ سے ہمدردی تھی کہ پہلے جہیز گیا، پھر رشتہ گیا۔ پھر بیٹی گئی۔ جب بیوی کی آنکھوں کی روشنی گئی تو ان کے سینے میں دل باقی ہو گئے مگر میں نے کہا کہ سب اس کی رضا ہے۔ تو میں راضی ہوں۔ میں نے کسی کی خیرات نہیں قبول کی۔"

www.paksociety.com

"مگر وہ خیرات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "ان ڈاکوؤں کے پاس سے برآمد ہونے والی رقم ہے، اس پر تمھارا بھی حق ہے۔ تمھاری بچی کی زندگی انمول تھی مگر جیز کی مالیت کا تو اندازہ ہوگا تم کو۔"

"ہاں جی... تھا کوئی پانچ ہزار کا۔" وہ بولا۔

"کیا وہ پانچ ہزار تمھیں واپس ملے ہیں؟"

"نہیں جناب... جو گیا سو گیا۔ برآمد ہو جائے تب بھی کہاں ملتا ہے سب کا سب۔ جیسے آپ نہیں ہیں پولیس میں۔" وہ بولا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ یہ تمھارا حق ہے۔" میں نے مزید دو ہزار شامل کر کے رقم اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ "اگر یہ رقم پولیس کے حساب میں چلی گئی تو تمھیں کیا ملے گا؟ وقت سے فائدہ اٹھاؤ، ابھی معاملہ میرے اختیار میں ہے۔"

میری دلیل نے اسے کچھ قائل کیا تھا مگر وہ متذبذب کا شکار تھا۔ "آپ... آپ کیوں اتنے مہربان ہیں مجھ پر جناب... کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟"

"بس دعائیں چاہئیں۔" میں نے کہا۔ "وہ دعائیں جو سچی ہوں اور دل سے نکلیں۔ ہم دکھی دلوں کا دود مشکے ہی ایسی دعائیں پا سکتے ہیں جو قبول بھی ہوتی ہیں۔ ہم قرض مند ہیں غازی خاں، سیکھ لو۔"

"ایسے نہیں جناب... مجھے معلوم ہے کوئی پولیس افسر اپنی مرضی سے برآمد ہونے والا مال نہیں بانٹ سکتا۔" وہ بولا۔ "اگر یہ ڈاکو کا مال ہے تو آپ کا بھی مال ہے۔"

"کیا تم مجھے ڈاکو سمجھتے ہو؟" میں نے ہنس کے کہا۔

"نہیں سرکار... میری کیا مجال... میرا مطلب تھا کہ آپ بھی تو اس مال کو رکھ سکتے ہیں۔ آپ سے پوچھنے والا کون ہوگا۔" وہ بولا۔ "میں بھی سامان کا حقدار ہوں؟ اس کے پیسے مال کا نہیں۔"

"ایک ہی بات ہے غازی خاں۔" میں نے کہا۔ "اگر مجھے یقین ہوتا کہ یہ مال حکومت کے خزانے میں جائے گا تو میں تم کو ایک پیسہ نہ دیتا لیکن میں جانتا ہوں کہ اسے سب لوگ تقسیم کر لیں گے جن کے خزانے پہلے ہی مال سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ حق کسی ضرورت مند کے کام کیوں نہ آئے کسی حرام خور کے پیٹ میں ڈھائی ہزار کچھ نہیں۔ وہ ایک دن میں اس سے زیادہ پیدا کر لیتا ہے۔ مگر تم ساری عمر کوشش کرتے رہو گے تب بھی ڈھائی ہزار نہیں بچا سکو گے اور اگر تم پانچ دس سال میں ڈھائی ہزار جمع کرنے کے قابل ہو گئے تو اس وقت تک آپریشن چار چھ یا پانچ ہزار ہو جائے گا۔ کون جانے آپریشن ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، میں خوش ہو رہا ہوں تم کو۔"

"جناب آپ بڑے آدمی ہیں۔ آپ کا دیا دنیا اور آخرت دونوں میں آپ کے لیے عزت کا باعث ہو سکتا ہے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "ہم غریب اور چھوٹے لوگ ہیں، ایسا نہ ہو کہ دنیا میں رسوا ہوں... آخرت میں بھی... اور اپنی نظر میں بھی۔ کبھی پولیس کو دیکھا نہیں کہ اس نے کسی کو

نیک نیتی سے کچھ دیا ہو۔ لیکن ضرور دیکھا ہے اور اسی لیے یقین نہیں آتا کہ اس میں کوئی دھوکا نہیں ہے۔ ہم تو ویسے ہی پریشان لگے ہوئے ہیں بعد میں آپ ہی مجھے گرفتار کر لیں کہ... یہ جو سنگی رقم تھی، ابھی تو بچا لیے وا سے داس میں رکھے چھوڑ کے بھاگ گئے ہیں۔ اس سے کبھی آپ مجھ کو بنا سکتے ہیں مگر میرے پاس سے تین ہزار برآمد ہوئے تو میں کیسے ثابت کروں گا کہ میں نے ڈاکہ نہیں ڈالا تھا۔ آپ ہی مجھ سے سوال کریں گے کہ تمھارے پاس تو آدھی بیوی کی آنکھوں کے آپریشن کے لیے ڈھائی ہزار نہیں تھے پھر یہ تین ہزار کہاں سے آ گئے؟ ابھی تک پہلے میرے ان ساتھیوں کے بارے میں نہیں پوچھا جو بچا یا پڑے تھے مگر فرار ہو گئے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ تین ہزار برآمد کرنے کے بعد آپ رات کو مجھے تھانے لے جا کر پوچھیں، ان چاروں کے نام بتاؤ ورنہ تو کہیں باقی چار کے بھی بتاؤ۔"

میرے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی اور ٹوٹ گئی۔ میرا اٹھا ہوا ہاتھ پیچھے ہو گیا۔ مدد کرنے کا جذبہ سرد ہو گیا اور میرے لیے احساس جرم بن گیا۔ یہ ایسا المیہ تھا کہ انسانوں کو نیکی، شرافت اور امیدیت کے خلوص پر اعتبار نہ رہا تھا۔ کوئی مدد یا دستگیری کے لیے ہاتھ بڑھائے تب بھی نظر آستین میں چھپے ہوئے خنجر تلاش کرتی ہے۔ شک اور خوف نے دلوں میں بیگانگی کا زہر بھر دیا ہے۔ ہر شخص، آزادی سے ڈرتا ہے کہ اس کو کسی خوف کا شکار ہونا ہے۔ جو قانون کی بالادستی کی علامت تھی کتنی بدنام ہو کے رہ گئی ہے۔ اب کسی کو یقین نہیں آتا کہ اس وردی میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے دل درد سے خالی نہیں... جو انسانیت کی قدروں کو اتنا ہی محترم سمجھتے ہیں جتنا کہ وہ آدمی جسے انسان ہونا میسر ہے۔ آدمی کے تجربات کا عکس اس کی زندگی کے آئینے میں نظر آتا ہے اور پولیس کے معاملے میں پچھلے عقیدے کے غریب اور لاچار لوگوں کی اب ایک دن میں خراب نہیں ہوئی۔ یہ برسوں، شاید صدیوں کا المیہ ہے۔ اس وقت سے جب انگریز بہادر نے پولیس کو اپنی حاکمیت تسلیم کرانے کے لیے ڈنڈے اور اختیار دیا تھا اور کہا تھا کہ جاؤ اپنے ہم وطنوں کو ذلیل اور شرافت کی زبان میں نہیں جو تا کاری، لاٹھی چارج، آنسو گیس اور فائرنگ کی زبان میں بتاؤ کہ اقتدار کیا ہوتا ہے۔ آج تک جب کہ ہمیں آزادی کا سورج طلوع ہوئے پچاس برس ہو گئے، پولیس کے اور عوام کے درمیان فاصلہ رہا ہے۔ لندن کی پولیس کی طرح عام آدمی کے دوست بننے کے لیے دونوں طرف سے کوشش کی اشد ضرورت محسوس کی جب زمانہ ہی اٹھ سے جینس چھنے جانے والا ہو تو پولیس والوں سے بات کیوں نہ کرے۔ پہلے لاتی ہے کہ اتنی کوئی ذکر نہیں چلے گی۔

"آپ ناراض تو نہیں ہو گئے سرکار؟" غازی خاں نے کہا۔ "آپ مالک ہیں۔ اقرار کو بھی ہمارا جرم بنا سکتے ہیں اور انکار کو بھی۔"

"ہمارے پاس وقت نہیں ہے غازی خاں کہ ہم بحث کر سکیں

اور تم کو قائل کر سکیں کہ کہیں بھی سارے شیطان اور سارے فرشتے نہیں ہوتے، ہر محکمے میں، ہر شہر اور ہر ملک میں اچھے بُرے لوگ ہوتے ہیں۔" میں نے کہا اور رقم جیب میں رکھ لی۔

"تم کچھ جانتے ہو کہ ویڈیو چلا سکتے ہو؟" غالب نے کہا۔ "یہاں کوئی بند روست ہے؟"

"ہے سرکار... ابھی خود بھی بنا سکتا ہوں۔ اور آپ کہیں تو آگے سے بھی منگا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "سڑک کے دوسری طرف ہوٹل ہے۔"

"نہیں... تم خود بنا دو۔" میں نے کہا۔ پھر میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے تندور کے اطراف پر اسٹوو جلا کر پانی اُبلنے کے لیے رکھا۔

"جتنی دیر میں یہ پانی اُبلتا ہے۔" میں نے دس کا ایک نوٹ نکال کے کہا۔ "تم دوڑ کے سگریٹ لاؤ۔ اس ہوٹل پر ملتے ہیں نا؟"

"میں لاتا ہوں جناب... آپ پیسے رکھیں اپنے پاس۔" وہ ایک دم اٹھا۔

"ٹھہرو! یہ پیسے کیوں نہیں لے رہے ہو تم؟ کیا اس ہوٹل سے تم کو روز مفت سگریٹ ملتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"روز... نہیں... مگر آپ تو مہمان ہیں۔" وہ گھبرا کے بولا۔

"مہمان؟" میں نے طنز سے کہا۔ "اچھی عزت کی ہے تم نے مہمان کی، ان کے خلوص کو گالی دے کر۔"

"میں... میں نے... میں نے تو..." وہ ہکلانے لگا۔

"اگر ہماری نیک نیتی پر شک کر سکتے ہو کہ ہم وہ رقم تم کو پھنسانے کے لیے دے رہے تھے تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہ مہمان نوازی نہیں ہے، تم رشوت دے رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "اور کس کس کو روز دس روپے کے سگریٹ لا کے پلاتے ہو۔ ہم تو چلے جائیں گے پیسے دیں گے۔"

وہ شرمندہ نظر آنے لگا۔ "میری کیا مجال کہ رشوت دوں۔"

"اچھا چھوڑو۔ مہمان نوازی کا شوق ہے تو اپنے سگریٹ نکالو۔" غالب نے کہا۔ وہ تین پیالی کے برتنوں کو ٹوٹی پھوٹی اور سکوں کے درمیان خاکی والی سگریٹ کی ڈبیا بڑی ہوئی تھی جو بہت سستے قسم کے سگریٹ تھے جیرت زدہ ایک سگریٹ اٹھا کے غالب کو ملا۔ پھر خاموشی کا ایک وقفہ آیا جس میں وہ خاموشی سے چائے بنا کے لایا اور ہم نے پی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ معاملہ ناکام ہے۔

"اب ہم چلتے ہیں۔" میں نے چائے کا خالی کپ رکھتے ہی کہا اور غالب کو اٹھنے کے لیے اشارہ کیا۔ باہر رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ شام کے دھندلکے پر غالب آنے لگا تھا۔ دونوں ڈاکوؤں کی حالت خراب تھی لیکن میں نے شہر کے علاقے میں اسے ریکارڈ ضروری تھا۔ میں نے گاڑی میں غازی خاں کے بیٹے ہوئے نام کے ٹکڑوں کو سنبھالا اور پھر لاش کو ان کے منہ بند کر دیے۔

"کسی سے اس بارے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں..." میں نے جیب تک پہنچتے ہوئے کہا۔ "اپنے ساتھیوں کو بتا دینا کہ ہم ایسے اچانک آ گئے تھے۔"

"جی سرکار..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"اچھا غازی خاں۔" میں نے کہا۔ "خدا حافظ... تمھاری مہمان نوازی کا شکریہ۔"

غازی خاں کو بالآخر اس کے دل نے قائل کر لیا تھا کہ ہم ویسے لوگ نہیں ہیں جیسے وہ سمجھا تھا اور اپنے شک کا اظہار کر کے اس نے ہمیں صدمہ پہنچایا ہے۔

"ایک... ایک عرض ہے سرکار۔" غازی خاں نے اس وقت کہا جب میں جیپ کو اسٹارٹ کر چکا تھا۔

"کہو کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ... میں رقم آپ سے ضرور لے لیتا۔ مجھے ضرورت بھی ہے۔" وہ بولا۔ "مگر..."

"مگر کیا...؟"

"آپ نیکی کرنا چاہتے ہیں آپ... تو یہ رقم خود اسے دے دیں... جو ضرورت مند ہے۔" وہ بولا۔ "اس کے ہاتھ میں... اپنے ہاتھ سے وہ آپ کو دعا دے گی۔"

"تمھارا مطلب ہے تمھاری بیوی کو... تمھارے گھر آ کے...؟" میں نے کہا۔

اس نے شدت سے سر ہلایا۔ "غریب تو میں ہوں جی۔ میں بڑا گنہگار ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ میں نے جو کبھی دکھ سہنا اس پر صبر اختیار کروں۔ اب میرا دل تو کہتا ہے کہ آپ فرشتے ہیں یا انسان کے بھیس میں۔ مجھے یقین آ جائے گا اگر آپ نے اس اندھی کے ہاتھوں میں روشنی دینے کے لیے جیسے قریب خانے کی دہلیز بھی پار کر لی۔"

"اچھا... اگر تم امتحان لینا چاہتے ہو ہماری نیت کا تو ہم آئیں گے۔" میں نے گاڑی آگے بڑھاتے کہا۔ "ضرور آئیں گے۔"

"کب... کس وقت جناب؟" وہ جیپ کے پیچھے دوڑا۔

"کسی بھی دن... کسی بھی وقت۔" میں نے چلا کے کہا۔ "خدا حافظ غازی خاں۔"

"خدا حافظ سرکار۔" وہ رک گیا اور پیچھے رہ گیا۔

ہم نے غازی خاں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی کیونکہ یہ میں بھی جانتا تھا اور غالب بھی کہ جیسے وہ امتحان سمجھا تھا وہ ہمارے لیے کوئی امتحان نہیں۔ ہم کسی بھی وقت جا کے اس کی بیوی کو ایک نیکی کا نذرانہ دے آئیں گے۔ ان ہاتھوں کی دعا بھی آنے والے دنوں میں کہیں نہ کہیں امید کی روشنی دے گی جب ہم مایوسی کے اندھیرے میں راہ ڈھونڈنے کی طرح بھٹک رہے ہوں گے۔

"کیوں نہ میں پہلے انکل رضوی کو فون کر لوں...؟" میں نے کہا۔ "شہر میں یہ کام مشکل ہوگا۔"

"یہ تو ٹھیک سوچا تو نے۔" غالب نے کہا۔ "مجھے وہاں بھی

www.paksociety.com

تحلیل آیا تھا۔ غازی خاں کے کالا رخ کے پیچھے سے ٹیلی فون کی تاریں گزر رہی تھیں۔ اور وہاں لکھا بھی تھا مگر پھر سب سمجھتے۔"

میں نے جیپ کو سڑک کے قریب سے موڑا اور کچے راستے پر اتار دیا۔ اندھیرے میں ہیڈ لائٹس جلائے بغیر اس ناہموار راستے پر گاڑی چلانے کے لیے مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنا پڑا۔ بڑے بڑے درخت تو صاف نظر آتے تھے اور چھوٹی موٹی جھاڑیاں جیپ کے نیچے آ کے پسی جاتی تھیں لیکن گڑھے اور پتھر دکھائی نہ دیتے تھے۔ جھٹکوں سے میرا برا حال ہو گیا اور میں نے بڑی مشکل سے گاڑی کو قابو میں رکھا۔ اس کے ٹائر نئے اور بہت جاندار تھے ورنہ ایک بھی ٹائر برسٹ ہو جاتا تو جیپ الٹ جاتی۔ ابھی تک جیپ میں پچھتر فیصد لوگ ٹوٹے ہوئے تھے۔ پھر سو فیصد ہو جاتے۔

گاڑی کو میں نے ایک ٹیلی فون پول کے قریب روک لیا جو ہر لحاظ سے محفوظ تھا۔ مین روڈ کو کیا چھوٹی سڑک پر سے گزرنے والا بھی نہ مجھے دیکھ سکتا تھا اور نہ جیپ کو۔ مجھ سے جیپ آتی دور تھی کسی بھی گفتگو ہوتی تو کوئی نہیں سن سکتے تھے۔ کسی دشواری کے بغیر میں کھمبے پر چڑھا اور اس اینگل آئرن پر بیٹھ گیا جو تاروں سے دو فٹ نیچے شاید اسی مقصد کے لیے لگایا گیا تھا۔ ایک ڈیڑھ فٹ لمبے اینگل آئرن پر میری ایک ٹانگ کھمبے کی ایک طرف لٹکی رہی اور دوسری ٹانگ دوسری طرف۔ دونوں ہاتھوں سے کام کرتے وقت میں نے ٹانگوں کو کھمبے کے گرد قینچی مار کے لپیٹ لیا۔

اس پول پر وہ کالا سا باکس نہیں تھا جس میں سے کنکشن لینا آسان ہوتا اور یہی سوچ کے میں نے جیپ کے ٹول باکس سے پلاس ساتھ لے لیا تھا۔ تاروں کی پیوند تو بہت سخت تھی میں نے ماچس کی تیلی جلا کے اسے گرم کیا اور جب سیاہ پلاسٹک سے جلنے لگا تو پیچ کس مار کے پگھلتے ہی پلاس سے کاٹ دیا۔ دو تاروں کی انسولیشن ہٹا کے میں نے اپنے پاؤچ کے اندر سے ٹرانزسٹر ٹیلی فون انسٹرومنٹ نکالا اور اس کے دونوں تاروں کے کنکٹر کلپ ان سے ملا دیے جب ریسیور میں ٹون آئی تو مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے سر پر سے گزرنے والے چار تاروں میں سے درست صحیح تاروں کو منتخب کیا تھا۔

ریسیور آنٹی نے اٹھا کے ہیلو کہا تو میں ان کی آواز پہچان گیا۔

"آنٹی! میں آپ کا نالائق ناسمجھ بھتیجا سکندر بول رہا ہوں مگر میرا نام مت لیجیے گا۔" میں نے کہا۔

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد انھوں نے کہا۔ "اچھا۔"

میں نے کہا۔ "میں نے آج صبح بھی فون کیا تھا۔ شعلہ سے بات ہوئی تھی، ان سے بھی۔"

"ان سے کن سے؟"

"بھئی وہی جو آپ کے شوہر ہیں۔ ایس ایس پی صاحب۔" میں نے طنز کیا۔ "انھوں نے آپ کو بتایا نہیں؟"

"شعلہ نے بتایا تھا۔" وہ بولیں۔ "کہاں سے بول رہے ہو تم؟"

"بہت بلندی پر سے۔" میں نے کہا۔ "زمین پر نہیں ہوں۔" [illegible]

"کیسی باتیں کرتے ہو؟" انھوں نے پکارا اور مطلب نکال کر خفگی سے کہا۔ "یہ کس مصیبت میں ڈال رکھا ہے تم نے سب کو۔ بیچاری مجھے اور اپنے انکل کو۔ وہ لاکھ ایس ایس پی سہی تم کو کیا معلوم کہ وہ تمھاری وجہ سے کتنے پریشان رہتے ہیں... راتوں کو سو نہیں سکتے... اور شعلہ کے لیے کیا یہ پریشانی اٹھانے کے دن ہیں... کیا ضرورت تھی اس لڑکے کو شادی کرنے کی اگر وہ بیوی کو سنبھال نہیں سکتا تھا۔"

"آنٹی... آنٹی... بہتر...،" میں نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے آپ کتنی ناراض ہوں گی۔ بے شک میں نے آپ کو بہت دکھ دیے ہیں لیکن کیا کروں خود کو... سوائے اس کے کہ مقدر بہت بدبخت تھا۔ بدبخت ہی تو ہوتے ہیں وہ بیٹے جو ماؤں کا سکھ بھی چھین لیتے ہیں۔ ماں تو یاد نہیں، ایک آپ کی ذات میں ہی بے غرض محبت کا ایک روپ دیکھا تھا۔ زمانے کی طرح آپ بھی خفا ہیں مجھ سے... مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

"اب تک کس کام آئی ہیں میری دعائیں۔" انھوں نے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

میں دم بخود رہ گیا۔ یہی بات مجھ سے انکل رضوی نے کہی تھی۔ بے چارے مجبور لوگ کیا کریں اور کدھر جائیں۔ ایک طرف تو بیٹا اور اس کی بے شک کی محبت یا پیار۔ دوسری طرف ہم اور جاتے دکھ۔

"آنٹی... آپ رو تو نہیں رہیں؟ میں کھمبے سے نیچے گر گیا تو میری بھی ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ غالب تو ٹوٹی ٹانگ لیے بیٹھا ہی ہے۔ ساتھ لنگڑا تو پھر رہا ہے۔ پھر کیا رہ جائے گا مجھ پر سوار ہے یا جیپ پر۔" میں نے انھیں ہنسانا چاہا۔

"بکواس مت کرو۔ مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں ہے... وہ جیپ... محسن بھی مجھے کچھ نہیں بتاتا۔" انھوں نے کہا۔ "اچھا ہے تمھارے انکل گھر میں نہیں ہیں... میں تم سے بات کر سکتی ہوں۔"

"آنٹی... فون ٹیپ ہو رہا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"نہیں، فون ٹیپ نہیں ہو رہا ہے۔" وہ بولیں۔

"آپ کو نہیں معلوم۔ انکل نے صبح مجھے بتایا تھا کہ۔"

"تم کو نہیں معلوم۔ انھوں نے تمھیں غلط بتایا تھا۔" وہ میری بات کاٹ کے بولیں۔ "انھوں نے مجھ سے بہت پہلے کہا تھا کہ میں نے سب ختم کروا دیا ہے۔ جب سے شعلہ آئی ہے یہاں۔ انھوں نے تمام انتظامات ختم کرا دیے ہیں۔ وہ اب تمھارے پیچھے نہیں ہیں۔ شوہر بھی تمھیں بچانا چاہتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ انکل کیا یہ سب اور شعلہ سے کیا تعلق؟ انتظامات کا؟"

"تم واقعی احمق ہو۔ یعنی ان کا مقصد اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم کبھی شعلہ سے بات کر سکو... مجھ سے کہا تھا انھوں نے کہ کسی کا فون آئے تو شعلہ بے شک اطمینان سے بات کرے۔ اب کوئی نہیں سنے گا۔ انھوں نے کسی کا نام تو نہیں لیا تھا مگر ظاہر ہے کسی سے مراد تم ہی ہو۔ محسن کہ... مجھے بیٹا... اب شعلہ کا شوہر بھی ہے اور شعلہ یہاں ہو... محسن بھی آ گئی ہے۔ اس کو زیادہ سخت قید تنہائی کی سزا سے کتنی مجبور ہو کے آئی ہے۔ اور ابھی لیے انھوں نے گارڈ بھی ہٹا دیے۔"

"یعنی... اس لیے کہ محسن گھر کے لیے آ رہا ہے تو آ سکے نہیں آنٹی... میں نہیں مانتا۔" میں نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے یہ بھی ان کی چال ہے؟" آنٹی نے خفگی سے کہا۔ "تم اس پولیس افسر کو آنٹی اچھی طرح نہیں جانتے جتنا میں جانتی ہوں... اپنے شوہر کو جانتی ہوں۔ محسن ٹیپ بالا آ چکا ہے جب سے شعلہ وہاں کی ہو گئی ہیں اور ان کے سامنے نہیں آیا۔ آ سکتا بھی نہیں۔ جانتا ہے کہ انھیں معلوم ہے۔"

"کیسے معلوم ہے؟" اطمینان کا احساس میرے وجود میں خوشی کی لہر بن گیا۔

"تم نے شعلہ کو دیکھا ہوتا اس وقت تو تم بھی جان جاتے کہ محسن آیا تھا۔" انھوں نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "مگر تم مت آنا ابھی۔"

"کیتھرین اور جولیا کہاں ہیں؟" میں نے اپنی دلی مسرت کو دبا کے کہا۔ "مجھے بات کرنا تھی ان سے۔"

"وہ گھر جانا چاہتی تھیں لیکن تمھارے انکل نے اجازت نہیں دی۔ ان کو ہی سوچ کے گارڈ رکھ دیا ہے۔"

خیالوں کی ایک فلم میرے ذہن میں چلنے لگی جس کا پہلا منظر ابھی تک نیا تھا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب گول کر دیا۔ وہ کہاں ہے؟"

ان کی آواز نے مجھے تصورات کی دنیا سے واپس بلا لیا۔ "میں بھولی نہیں... آپ ہی کچھ بتایئے کہ وہ کہاں ہے؟"

"سکندر! خدا کے لیے ختم کرو اس خطرناک کھیل کو... واپس آ جاؤ۔"

"یعنی پہلے خود کو پولیس کے حوالے کر دوں؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں ہوگا تمھیں! تمھارے انکل سب ٹھیک کر لیں گے... وہ تو بس اس پر کہ ایک بار تم قانون کے دائرے میں آ جاؤ تو وہ سب سنبھال لیں گے۔ وہ بھی جو انھوں نے آج تک نہیں کیا۔ انھوں نے شعلہ سے کہا تھا کہ میں یہ آنچ نہیں آنے دوں گا... اپنے سارے وسائل اور اثر و رسوخ استعمال کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کو بچا لوں گا خواہ اس کے بعد میرے لیے ملازمت بچانا مشکل ہو جائے۔ خواہ مجھے استعفا دینا پڑے۔"

"مجھے... بہت افسوس ہے آنٹی کہ اکیلا میں واپس نہیں آ سکتا۔ آئیں گے تو ہم سب آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"تمھیں معلوم ہے نازو کی ماں کا کیا حال ہے؟" وہ بولیں۔

"نہیں... اور میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔ اس سے تو اور میرا دکھ بڑھے گا۔"

"اپنے دکھ کو تو تم نے خود بڑھا لیا ہے... اور بڑھاتے چلے جا رہے ہو۔ جیسے محسن کی ماں مر گئی، پھر باپ مر گیا اور وہ آخری وقت میں بھی ان سے دور رہا۔ ایسے ہی نازو کی ماں بھی مر جائے گی۔" آنٹی نے کہا۔

"میرا باپ بھی ایسے ہی مر گیا تھا آنٹی۔" میں نے انھیں یاد دلایا۔

"اگر یہ تو قسمت، تقدیر ہے..."

"تقدیر کو الزام مت دو... نازو تو غیر لڑکی تھی، اس نے اپنے ماں باپ کو رسوا کیا۔ وہ تمھاری ہیروئن آپ ہی کی خیالی دنیا میں رہتی تھی لیکن ماں باپ اس دنیا میں سب کو منہ دکھانے پر مجبور تھے کب تک چھپا سکتے تھے کہ جوان لڑکی گھر سے نکل گئی اور دہشت پسندوں سے مل گئی۔ یہ میں نہیں کہہ رہی ہوں... یہاں ایسا ہی مشہور کیا گیا تھا۔"

"کس نے مشہور کیا تھا؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"تم جانتے ہو پھر بھی مجھ سے پوچھتے ہو؟" آنٹی نے کہا۔ "باپ کی جان تو دنیا کے دکھوں سے چھوٹ گئی۔"

"کیا؟" میں نے چونک کے کہا۔ "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"تمھیں نہیں معلوم... نازو کے باپ کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔" آنٹی نے کہا۔ "نازو نے نہیں بتایا تم کو؟ اسے تو معلوم تھا۔"

"نہیں آنٹی!" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "اس نے جانتے ہوئے بھی یہ بات ہم سب سے چھپائی ہوگی۔"

"اب اس کی ماں اپنے بھائی کے گھر پڑی ہوئی ہے کیونکہ بیٹی اب تو بیٹے کا بھی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ نوکری چھوڑ کر گھر چھوڑ دیا اور بہن کے نقش قدم پر چل پڑا۔ اب بتاؤ کون کرے گا اس لڑکی سے شادی؟" انھوں نے بالکل ناصحانہ انداز فکر اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"غالب۔" میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔ "غالب کرے گا اس سے شادی۔"

"ہونہہ... جیسے تم نے اب تک کر لی۔" آنٹی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اور شعلہ سے کی تو نے کیا... پہلے بھی اکیلی تھی... اب بھی بے گھر ہے۔"

"کیا آپ کا گھر اس کا گھر نہیں ہے؟"

"فضول باتیں مت کرو۔ لڑکیوں کا گھر ان کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔" آنٹی نے کہا۔ "کتنا اچھا ہوتا اگر تم واپس آ کے شادی کر کے اپنا گھر بسا لیتے۔ غالب بھی صحافی تھا اور اچھا لڑکا تھا۔ نازو کے والدین ہنسی خوشی اسے قبول کر لیتے... تم سب کے گھر ہوتے... فلاں فلاں ہوتا... ہم بھی آتے۔"

"ہوگا آنٹی... سب ہوگا... ضرور ہوگا۔" میں نے انھیں تسلی دی۔ "ذرا صبر کیجیے۔ دن تھوڑے سے ہیں۔"

www.paksociety.com

"میں شعر و شاعری نہیں سمجھتی۔" انھوں نے چڑ کر کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ... اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ اور شادی کے سوا۔ پیسہ ان سے منسلک ہیں... اس کے بعد کریں گے اہل تفکر تازہ بستیاں آباد؟" میں نے بیزار شعر پڑھ کے انھیں چڑایا۔ "اب یہ بتائیں کہ صاحب بہادر کہاں ہیں؟ آپ کے داور کب آئیں گے؟"

"وہ تو آ گئے ہیں۔ کمرے میں بیٹھے کر پڑھنے گئے تھے۔" انھوں نے اطمینان سے کہا۔

"یا میرے مولا!" میں نے گھبرا کے کہا۔ "آتے ہی وہ سب مشن پہ چلے گئے۔ یہ آپ نے کیا غضب کیا؟ مجھے بھی نہیں بتایا۔"

"وہ کہہ رہے تھے مشن پہ ہیں، یا تم بدم میں ہیں۔" انھوں نے کہا۔

"مجھے ان سے ہی بات کرنا تھی آپ تو خواہ مخواہ بیچ میں آ گئیں..."

"سکندر میں ابھی تھوڑے مار دوں گی..."

"کب ماریں گی؟" مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "بہت دن ہو گئے کسی کے پیار بھرے ہاتھ سے کھانے، تھپڑ بھرے کر کے کھائے... آج پھر سے پیار بھرے کھائے..."

"بک بک کرنے کی عادت نہیں گئی تمھاری... لو آ گئے تمھارے انکل۔"

"آپ فون وہیں آ گئے؟" میں نے کہا۔

"ہاں بیٹی سکندر۔" انکل نے کہا۔

"کیا ہوا آپ کے مشن کا؟" میں نے کہا۔ "السلام علیکم۔"

"کون سا مشن؟" وہ بولے۔ "وعلیکم السلام۔"

"وہی آرڈیننس ڈپو کا۔" میں نے کہا۔ "جس کی میں نے اطلاع دی تھی۔"

"وہ... وہ میں نے آج ہی انٹیلی جنس کے سپرد کر دیا تھا، ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔" انھوں نے کہا۔

"آپ نے بتایا نہیں کس کی اطلاع پہ آپ کو معلوم ہوا تھا...؟"

"میں نے تحریری رپورٹ بعد میں بھیجی ہائی آفس سے ہی آ کے آ رہا ہوں۔ اس میں تمھاری ساری گفتگو لفظ بہ لفظ لکھ دی تھی۔" وہ بولے۔ "تاکہ میری اطلاع پہ کچھ ہو۔ فون پہ میری بات اسی وقت ہو گئی تھی، تم سے بات ہونے کے بعد... اور شام کو مجھے اُڑتی اُڑتی خبر ملی تھی کہ خاصا اسلحہ ملا ہے، پکڑے صرف چار آدمی گئے تھے لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ کون تھے۔"

"یہ بات آن ریکارڈ ہے کہ ان کا پتا میں نے بتایا تھا۔"

"ظاہر ہے آن ریکارڈ ہی ہوگا۔" وہ بولے۔ "میری ساری رپورٹ میں تمھارا ہی حوالہ ہے۔ تمھارا کیا خیال تھا کہ کریڈٹ میں لوں گا۔"

"نہیں انکل! آپ ہی پہ تو بھروسا تھا مجھے... ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک بات تو بتائیے انکل۔"

"پوچھو۔"

"ہم نے اسلحے کے جس ذخیرے کی نشاندہی کی اس کا سراغ لگانے کے لیے ہمیں اپنی زندگی کو داؤ پہ لگانا پڑا تھا۔ اس جگہ تک پہنچنے کے تمام راستے مشکل تھے اور ایک شکنجے میں پھنس کر ... نکلنا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم نے اپنی قانونی ذمے داری تو پوری کی لیکن ہم نے ایک بہت بڑی قومی خدمت بھی کی۔ جہاں یہ کارنامہ جنگ کے دوران دشمن کی کسی چوکی پہ قبضے یا کسی مورچے کی تباہی سے کم نہیں۔ اگر ہم فوج میں ہوتے تو میدان کارزار میں ہمت و شجاعت کا یہ مظاہرہ کیا ہوتا تو ہمیں ستارۂ جرأت ضرور ملتا۔ اب بھی کیا ملے گا؟"

"تم کیا توقع رکھتے ہو؟" رضوی صاحب نے تلخی سے کہا۔ "تم کو بہادری کا میڈل مل جائے گا؟ میڈل کیا میں دیتا ہوں! احساس کے علاوہ بہادری کے کسی بھی کارنامے کے چشم دید گواہ ہوتے ہیں۔ وہ سب ایک قاعدے ضابطے کے مطابق ہوتا ہے۔ ستارۂ جرأت لینے والے قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہوتے۔"

"کیا ایک مجرم... قاتل یا ڈاکو محب وطن نہیں ہو سکتا؟" میں نے بھی تلخی سے کہا۔ "اس کا پیشہ غلط ہے یا اس کو عدالت نے مجرم قرار دیا ہے تو کیا وہ وطن کے لیے کچھ کرنے کے جذبے سے بھی محروم ہو گیا ہے؟ چشم دید گواہ نہ سہی کیا یہ غلط ہے کہ ہم نے اور صرف ہم نے ایمونیشن ڈپو کا پتا چلایا اور آپ کو مطلع کیا..."

"یہ ٹھیک ہے۔ اس کا اعتراف میں نے اپنی رپورٹ میں کر دیا ہے۔ تم لو سنو: میرے خیال اور یقین کے مطابق سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم نامی ایک شخص نے مجھے گمنام ٹیلی فون کیا اور یہ اطلاع دی۔ چونکہ میں مذکورہ شخص کی آواز پہچان سکتا ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا اس لیے میں نے فوری کارروائی کی سفارش کی۔ حال ہی میں ہونے والے چند دھماکوں سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ملک دشمن عناصر تخریبی مقاصد کے لیے اسلحہ جمع کر رہے ہیں اور بیرون ملک سے بھی حاصل کر رہے ہیں۔ ملک کے متعدد بازاروں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے ثابت ہو چکا ہے کہ خفیہ ہاتھ اس ملک کے سیاسی حالات کو انتشار اور بد امنی پھیلانے اور علیحدگی پسند جماعتوں کو ہوا دینے کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور بعض غیر ملکی طاقتیں ملک دشمن عناصر کے گٹھ جوڑ سے تخریب کاروں کو اسلحے کی ترسیل کر رہی ہیں۔ آج ملک دشمن کے ہاتھوں ... اور ملی مفاد پر ذاتی مفاد کو قربان کرنے والے ... گرفتار کیے گئے ہیں لیکن ... ہے کہ ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچانے والے نفرت کا گھناؤنا کھیل کھیلنے والے دشمنوں کو اور ان کے آلۂ کاروں کو بے نقاب کر کے ... ختم کرنا ناگزیر ہے۔ عوام میں شامل ان لوگوں کا پتا وہی دے سکتے ہیں جن کے درمیان یہ غدار موجود ہوں۔ ... ایک گمنام ٹیلی فون کال کو نظر انداز کر دینے سے نقصان کا اندیشہ تھا۔

اور میں اپنی ذمے داری اور ملک پہ فوری کارروائی کی پُرزور حمایت کرتا ہوں، میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم چونکہ قانون کو مطلوب اور ایک مفرور مجرم ہے لیکن صرف اس بنا پہ اس کی اطلاع پہ کارروائی نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے اور اگر اس کے معاملے کو قابل غور اور توجہ طلب نہیں سمجھا جاتا تو بعد میں ہونے والے نقصانات سے مجھے بری الذمہ سمجھا جائے گا اور سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم مجاز ہو گا کہ جانتے بوجھتے مجرمانہ غفلت اور نااہلی کے مرتکب افسروں کے طرز عمل سے ہونے والے قومی نقصانات کے خلاف پریس یا عدالت میں آواز اٹھا سکے یا ان پر بالواسطہ طور پر دشمنوں کی امداد کرنے یا دشمنوں کی پشت پناہی کرنے کی فرد جرم عائد کر سکے۔"

"تم نے سنا یہ میری رپورٹ کا ایک حصہ ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں لکھ سکتا تھا۔ اور اگر میں یہ دھمکی نہ دیتا تو شاید تمھارا نام بھی کہیں نہ آتا... بلکہ کچھ بھی نہ ہوتا کیونکہ گمنام کال پہ ایکشن نہیں ہوتا۔ کارروائی کے بجائے وہ پہلے اپنے طور پر تصدیق کرتے اور پھر ایک رپورٹ مانگ لیتے۔"

"ٹھیک ہے انکل۔" میں نے شرمندہ ہو کے کہا۔ "آپ نے تو مجھے کریڈٹ دے دیا لیکن کیا اوپر والے بھی دیں گے؟"

"میں ان کے بارے میں کیا کہوں؟ اور کیسے کہوں؟" وہ بولے۔

"کیا... یہ بات اخبارات کو نہیں بتائی جا سکتی...؟"

"نو..." انھوں نے صاف کہا۔ "ابھی تو یہ ٹاپ سیکرٹ ہے۔ ویسے بھی لیکن عام حالات میں بھی ہیڈ کی اجازت کے بغیر پریس کانفرنس بلانے کی اجازت نہیں۔ سرکاری ملازمین کسی صورت بھی پریس سے رابطہ قائم کریں تو یہ ان کے ڈسپلن میں شمار ہوتا ہے۔"

"میرے خلاف ہر بات تو اخبارات میں خوب بڑھا چڑھا کے پیش کیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ سب میں نے نہیں کیا تھا۔" انھوں نے میری بات کاٹی۔ "وہ تمھارے دشمنوں نے کیا تھا۔"

"آپ مانتے ہیں کہ میرے کچھ دشمن ہیں اور ان ہی کی وجہ سے میں سازش کا شکار رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہی جو میرے دشمن ہیں، ملک کے بھی دشمن ہیں۔"

"سکندر! عقل سے کام لو۔ میرے ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ میں کوئی سیاسی لیڈر یا کسی اخبار کا ایڈیٹر نہیں ہوں۔ ایک سرکاری پوزیشن رکھنے والا سینئر پولیس آفیسر ہوں۔ میں اس لیے تمھارا ساتھ نہیں دے سکتا کہ تم میرے سب سے عزیز دوست وزیر خان کے بیٹے ہو اور اس یقین پہ کچھ نہیں کر سکتا کہ تم مظلوم ہو۔ قانون کا معاملہ دوسرا ہے۔ میں قانون کے معاملے میں کیوں یا کیسے نہیں کر سکتا۔ مجھے احکامات کی تعمیل کرنا پڑتی ہے۔ میں تم کو سپورٹ نہیں کر سکتا۔ میری پوزیشن تو اس لیے اور بھی خراب ہے کہ تمھارے اور میرے ذاتی تعلق سے سب واقف ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک سب میری غیر جانبداری کو تسلیم کرتے ہیں لیکن مجھ سے حسد کرنے والے بھی ہیں اور میرے بدخواہ بھی۔ اگر کسی بھی وجہ سے میں نے ان کو موقع فراہم کر دیا تو وہ ضرور فائدہ اٹھائیں گے کہ ایس ایس پی رضوی اب غیر جانبدار نہیں رہا۔ اس نے مجرموں کو رعایت دی۔ خدا ہی دیکھ رہا کہ سازش میرے گھر میں موجود ہے۔ میرے خلاف چلتا ہے لیکن میں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں مگر یہ میرے اختیار میں نہیں کہ تمھارے کارناموں کی تشہیر کروں۔ میں تو تمھاری حمایت میں بول بھی نہیں سکتا۔"

"آپ سچ بھی نہیں بول سکتے؟"

"سچ بولنا اچھی بات ہے مگر سچ کو تسلیم کون کرے گا؟" وہ بولے۔ "مثلاً میری رپورٹ کا معاملہ ہو، اس میں تمھارا نام آنے سے پہلے میں نے ایک افسر اعلیٰ سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ ایک مجرم کا نام لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ وہ کہ ہمارے مخبروں کی مصدقہ اطلاع ہے۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ انھوں نے کہا کہ سچ کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے جو آپ کہتے ہیں کہ وہ سکندر بخت کی آواز تھی۔ ٹیلی فون پہ آواز دھوکا بھی دے جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی سکندر بخت کی... آواز بنا کے دھوکا دے رہا ہو، یا اس کی آواز ملتی جلتی ہو۔ میں نے کہا کہ آپ کہیں تو میں حلف نامہ داخل کر دوں۔ اس پہ وہ فرمانے لگے کہ اتنا سیریس ہونے کی ضرورت نہیں۔ سکندر بخت کا نام ضرور لکھو مگر اس کو فائدہ کیا ہوگا، بہت سے ماتحت مستحق ہیں کہ انھیں ترقی دے۔ یہ ان کے لیے ایک اچھا موقع ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ جناب عالی! اپنی رپورٹ نہیں بدلوں گا اور اس کے بعد جو آپ کا دل چاہے وہ کیجیے۔ آج میری رپورٹ پہ سخت ناگوار ردعمل ہوا کہ یہ آپ نے کیا دھمکی دے دی ہے آخر میں۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک یہی بحث چل رہی تھی۔ آئی جی صاحب نے کہا ہے کہ میں رپورٹ پہ نظرثانی کروں اور صحیح جوابات ہوں گی۔ صاف بات یہ ہے کہ وہ میری اور تمھاری ٹیلی فون کی گفتگو کو سند ماننے کے لیے تیار نہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ایمونیشن ڈپو کی اطلاع کا کریڈٹ جاری ایجنسی کو دیا جائے یا پھر آئی جی صاحب کے کسی منظور نظر کو۔"

"فرض کیجیے وہ اس بات پہ اڑ گئے...؟"

"تم ہی بتاؤ۔ اگر کسی ثبوت کی عدم موجودگی میں میرے پاس کیا دلیل ہے؟ میں کیسے ثابت کر سکتا ہوں کہ مجھے سکندر بخت نے اطلاع دی تھی۔ اگر کل یہ کہا گیا کہ رضوی اپنے بھتیجے کے جرائم کی شدت کم کرنے کے لیے ایک سازگار ماحول بنا رہا ہے۔ اسے رعایت دلانے کے لیے بیک گراؤنڈ بنا رہا ہے تو میں کیسے تردید کروں گا... کیا استعفیٰ دوں گا۔"

"گویا آپ نے ابھی رپورٹ دی نہیں ہے؟" میں نے کہا۔ "اور آپ کو ثبوت چاہیے... او کے انکل... رپورٹ کو صبح تک اپنے پاس رکھیے صبح تک آپ کو دستاویزی ثبوت بھی مل جائے گا آپ

www.paksociety.com

کی پوزیشن خراب نہیں ہوگی۔ آپ میرے اگلے ٹیلی فون کا انتظار کریں۔"

"دیکھو کوئی حماقت مت کرنا۔ میری اس گفتگو کا حوالہ بھی مت دینا کسی کے سامنے۔" انھوں نے کہا۔

"میں بے وقوف ضرور ہوں انکل لیکن اتنا بھی نہیں۔ آپ کی نیک نامی اور پوزیشن دونوں پر میری وجہ سے کبھی حرف نہیں آئے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ بتائیے ایس پی سراج کہاں ہے؟"

"اپنی ڈیوٹی پر۔" انکل رضوی نے کہا۔

"لیکن اسے تو معطل کر دیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس نے براہِ راست ڈی آئی جی صاحب کو رپورٹ دی کہ میں کچھ اسمگلروں کے تعاقب میں تھا اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے قریب ہو گیا تھا۔" انکل رضوی نے کہا۔ "پھر کسی کو اطلاع دے سکا نہ واپس آ سکا۔ ڈی آئی جی صاحب کے سامنے اس نے اپنا ہمدردی کی کہانی بہت نمک مرچ لگا کے بیان کی ہوگی کہ وہ متاثر ہو گئے۔ اسی وقت معطلی کے احکامات واپس لے کر اسے ڈیوٹی پر جانے کے لیے کہہ دیا گیا۔"

"مجھے یہی امید تھی۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "اچھا انکل فی الحال تو خدا حافظ۔ میں پھر رابطہ قائم کروں گا۔"

"سکندر! مجھے امید تو نہیں کہ تم میرا مشورہ مانو گے۔" وہ بولے۔ "مگر پھر بھی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس چکر سے نکل جاؤ۔ تم دلدل میں پھنستے ہو اور گہرے دھنستے جا رہے ہو۔ تم ان سب سے نہیں نمٹ سکتے جن کو تم شکاری کتے سمجھتے تھے۔ تمہارے پاس ان سے مقابلے کے لیے بہت کم وقت ہے۔ ہاں تم اب تک حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں قانون کی مدد کر سکتے ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تم خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ میں ہر طرح سے تمہاری مدد کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ تم کو زیادہ سے زیادہ رعایت حاصل ہوگی۔ تمہارے خلاف کیس بہت کمزور ہیں لیکن تمہاری غیر حاضری نے ان کو سنگین بنا دیا ہے۔ تمہارے ساتھ رابو، محسن اور پیٹر، غالب اور دوسرے سب بھی شریکِ جرم بن گئے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم ایسے ہی صحرا نوردی کرتے کرتے مارے جاؤ گے۔"

"اکیلے ہی ہم اکیلے کہاں ہیں انکل۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اتنے بہت سے نام لیے ہیں ابھی آپ نے۔ ان کے علاوہ کیا ہمارے جانے ساتھ نہیں ہیں؟ آپ کی اور ان گنت دوسرے لوگوں کی دعائیں ساتھ نہیں ہیں؟ خدا بھی تو حق و باطل میں ہمیشہ حق کے ساتھ ہے۔ مرنے سے کوئی بھی نہیں ڈرتا۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں، خدا حافظ۔"

میں نیچے اترا اور جیپ کو واپس چلا کے سڑک تک لاتے ہوئے میں نے غالب کو وہ سب بتا دیا جو انکل رضوی نے کہا تھا اور جو کچھ تھانے سے کہا تھا۔ وہ حیرانی اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ ضرورت سے زیادہ لمبی گفتگو کی تھی اور غالب صرف تجزیہ کر رہا تھا لیکن تفصیل سے میری بات سننے کے بعد وہ مطمئن اور خوش نظر آنے لگا۔

"چل یار! اگر تو شمار کرے۔" غالب بولا۔ "ایس ایس پی صاحب کی بدگمانی تو دور ہو گئی۔"

"بدگمانی الگ چیز ہے مرزا۔" میں نے کہا۔ "قانون شکنی جس کا تم کو پہلے بھی بتا چکا ہوں، وہ بدگمان نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انھوں نے ہمارے جرائم معاف کر دیے۔ ان کی تو بس وہی ایک بات ہے کہ خود کو قانون کے حوالے کر دو، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ان کا قانون سب ٹھیک کرنے والا ہوتا تو اب تک ٹھیک کر چکا ہوتا اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہی کیوں؟" غالب بولا۔ "مگر یار تو نے اتنی دیر میں بھی ادھوری بات کی۔ جو کہنا تھا وہ تو تو نے کہا ہی نہیں۔"

"ان کی بات نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اپنا پلان بدل دوں۔ بدلنے سے پہلے تم سے مشورہ ضروری تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم سیدھے اپنے دوست کے گھر چل رہے ہیں۔"

"کس دوست کے گھر؟" غالب نے کہا۔

"عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں کہیں تو بیٹھنا ہے اور بہت سے معاملات طے کرنا ہیں۔ مجھے وہی ایک جگہ محفوظ نظر آتی ہے۔"

دونوں ڈاکو ہوش میں تھے اور ہماری ساری گفتگو سن رہے تھے لیکن مجھے ان کی پروا نہیں تھی۔ انکل رضوی کی باتوں نے مجھے ایک مختلف لائحہ عمل اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے جیپ لاہور کے مضافات سے گزر رہی تھی۔ ایک بار پھر ہم جانی پہچانی سڑکوں پر تھے اور رات کا اندھیرا ہمیں بچا رہا تھا ورنہ اب تک پولیس کی جیپ کہیں نہ کہیں روک لی گئی ہوتی۔ ہم کئی پولیس چوکیوں کے پاس سے گزرے۔ بہت سے پولیس والے چوکیوں پر ڈیوٹی دیتے اور موٹر سائیکلوں پر آتے جاتے ملے مگر کسی نے جیپ پر توجہ نہیں دی۔ ایسی درجنوں جیپوں کو وہ ہر وقت دیکھتے رہتے تھے اور ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ سب کے نمبر چیک کریں۔ کوئی ہی جیپ کو دیکھتے ہی شناخت کر لیتا۔ جیپ ان کے پاس سے گولی کی طرح گزر جاتی تھی اور اس کی نمبر پلیٹ کو اندھیرے میں پڑھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ عبدالودود منظر کے گھر سے ایک فرلانگ دور میں نے جیپ روک لی اور غالب کو جیپ میں چھوڑ کر منظر کے گھر تک پیدل گیا۔

میں نے گھنٹی بجانے کے بجائے دروازے کو پیٹنا شروع کیا۔ منظر جب سوتے سے ہڑبڑا کے باہر نکلا تو وردی والے پولیس مین کو دیکھ کر وہ چراغ پا ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟ دروازہ توڑنا ہے کیا؟" وہ خونخوار لہجے میں بولا۔ "عقل نہیں ہے اس قدر، سوتے سے اٹھا دیا۔ یہ گھنٹی سالی کس لیے لگائی گئی ہے یہاں؟"

"گھنٹی... کدھر ہے گھنٹی؟" میں نے آواز کو تھوڑا سا بدل کے کہا۔ "یہ تو ایک بٹن ہے۔"

"اف... ابے یار تم کس چڑیا گھر سے آئے ہو۔ اسی بٹن کو دبانے سے اندر گھنٹی بجتی ہے۔" منظر نے جھلا کے کہا۔

"اچھا اچھا۔" میں نے گڑبڑا سا سر ہلایا۔ "تو یہ لکھ کر لگا دو نا ادھر کہ دبانے سے اندر گھنٹی بجے گی۔ ایسے کیا پتا چلتا ہے بندہ بٹن دبائے اور لائٹ چلی جائے یا کرنٹ لگ جائے۔"

"اچھا دفع کرو گھنٹی کو بھی اور بٹن کو بھی... کام کیا ہے؟" منظر نے سر پکڑ کے کہا۔

"بس... کام تو اندر جا کے بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے تم بتاؤ کہ تم نے کیا کہا تھا ابھی؟ میں کس چڑیا گھر سے آیا ہوں؟ جو تھانے کو چڑیا گھر کہتے ہو۔ ابھی گھر سے تھانے جا کے تم کو پتا چلے گا چڑیا گھر کے پنجرے کا۔"

منظر چونکا کیونکہ پولیس کا کوئی تھانیدار اس سے یوں بات کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ پھر میں نے اپنی آواز بھی رفتہ رفتہ بدل لی تھی اور آخری جملہ میری اصل آواز میں تھا۔

"ابے... ابے تو... مجنوں کے۔" اس نے حسب عادت گویا ڈکار کے کہا اور جھپٹ کے جونک کی طرح چمٹ گیا۔ اس عرصے میں وہ پھول کر اور بھی پھیل گیا تھا۔ خصوصاً اس کا پیٹ تو اس کی ہیئت کی وسعت میں افقی طور پر بڑھ گیا اور بڑی مشکل سے اسے دھکیل کر اندر پہنچایا۔

"ابے زندہ ہے... قسم اللہ کی میں تو سب کر چکا تھا۔ سوئم چہلم وغیرہ۔" اس نے مجھے گلے سے لگا کے زور زور سے ہلانا شروع کیا۔ "اچھا ہوا بری مصیبت سے پہلے تو لوٹ آیا۔ اکیلا ہے؟"

"نہیں یار۔" میں نے کہا۔ "اور بھی تین عدد ہیں۔"

"تین عدد؟ ہا ہا۔" وہ پھر گو نج کے ہنسا اور اس کی توند ہنسنے سے تھرتھرانے لگی۔ "ایسے کیا ڈھکی چھپی رکھی ہیں؟ میری گھر والی کی طرح۔ تمہاری شادی کب ہو گئی؟"

"دیکھ ایک لنگڑا رکھا ہے۔" میں نے اس کے پیٹ میں ٹہوکا دیا۔ "ایک ٹانگ والا غالب ہے جو میرے ساتھ ہے اور دو ڈاکو ہیں جو کوٹ لکھپت جیل سے فرار ہوئے تھے۔ انھیں پکڑ لیا ہے اور تیرے گھر کی بیٹھک میں بتا نہیں چلے گا۔"

منظر کی ہنسی ایک دم بند ہو گئی۔ اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ "کیا کہا؟ دوبارہ کہنا، جو پتا نہیں میرے کان خراب ہیں یا تیرا دماغ آؤٹ ہے؟"

"دونوں ٹھیک ہیں۔" میں نے کہا۔ "ذرا اپنی گاڑی لے کر میرے ساتھ چل، ان تینوں کو یہاں لانا ہے۔ آج رات ہم یہاں رہیں گے۔"

"او یار سکندر... ایمان سے گھر والی مجھے طلاق دے دے گی... گھر سے کھڑے نکال دے گی۔" منظر نے واویلا کیا۔ "میں بال بچوں کو لے کر کہاں جاؤں گا آدھی رات کے وقت۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

میں اسے زبردستی گھسیٹ کر لے گیا۔ وہ ہانپتے کانپتے پاجامے میں گاڑی لے کر گیا اور جیپ کے پاس پہنچ کے جب اس نے غالب کو، اس کی لٹکی ہوئی ٹانگ کو اور اس سے منسلک شکنجے کو دیکھا تو اس کی عقل خبط ہو گئی۔ جب میں نے دونوں ڈاکو اس کی گاڑی میں ڈالے تو منظر کی حالت دیکھنے والی تھی لیکن وہاں شور مچانے کی گنجائش ہی نہ تھی۔

"اب آپ جائیں۔" میں نے کہا۔ "میں آتا ہوں۔"

"کہاں جاؤں... جہنم میں؟" منظر نے فریاد کرتے ہوئے کہا لیکن گاڑی لے کر چل پڑا۔ میں نے جیپ کو اچھی طرح صاف کیا۔ اس پر جہاں جہاں ہمارے ہاتھوں یا انگلیوں کے پرنٹ ہو سکتے تھے وہ جگہ میں نے کپڑے سے رگڑ کر صاف کر دی۔ پھر جیپ کو چلا کے دو میل دور لے گیا اور اسے ایک خالی کوٹھی کے احاطے میں چھوڑ کے پچھلی طرف سے باہر نکل آیا۔ کوٹھی کے باہر سے میں نے ٹیکسی پکڑی اور آدھے گھنٹے بعد پھر منظر کے دروازے پر دستک دی۔ اس بار وہ سمجھ گیا کہ گھنٹی نہ بجانے والا کون ہوگا۔

غالب نے اسے مختصراً بتا دیا تھا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور جانے دونوں قیدی کس طرح ہمارے ہاتھ لگے تھے۔ اس نے ایس ایس پی رضوی صاحب سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ چنانچہ منظر کچھ مطمئن تھا۔ اس نے غالب کو باہر والی بیٹھک میں لٹا دیا تھا اور دونوں ڈاکوؤں کو بھی باندھ کر وہیں ڈال رکھا تھا۔ جب میں پہنچا تو وہ بدحواسی میں کمرے کے اندر چکر لگا رہا تھا۔

"یار یہ مصیبت یہاں کیوں لے آئے۔ خود کیا کم مصیبت ہو تم لوگ۔" وہ بولا۔ "کسی تھانے کے باہر پھینک آتے۔ کرنا کیا چاہتے ہو تم؟"

"پیارے دوست! ابھی سب پتا چل جائے گا کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صبح ہونے سے پہلے ہی ڈاکو تو پولیس کی تحویل میں دے دیے جائیں گے لیکن یہ کام ایسے نہیں ہوگا۔"

"پھر کیسے ہوگا؟ کیا پولیس خود آئے گی یہاں؟" وہ بولا۔

"نہیں۔ ہم پولیس کو بلوائیں گے کسی اور جگہ۔" میں نے کہا۔ "پہلے تم ہمارا پروگرام سن لو۔ ہم چلے تو یہ وردی اتاریں گے۔ اس کے نیچے ہمارے اپنے کپڑے ہیں۔ وہ بھی اتار دیں گے۔"

www.paksociety.com

"وہ بھی آمادہ ہو گئے؟" اسے یار کچھ خیال کرو۔ میرا نہ سہی میری پگڑی کا... کہیں وہ ادھر آگئی۔ یا میرے کمرے [illegible] بچوں میں سے کوئی آگیا تو..." وہ بولا۔ "بات تو کیجیے۔ آنے سے پہلے خبر بھی کی جا سکتی ہے۔"

"اس کے بعد تم چلے [illegible] سفر اہم کرو گے۔" میں نے کہا۔ "جانے سے پہلے کھانے پینے کا بندوبست کر دو گے۔ چلو تم ہم چلیں گے۔ ہمیں کافی چاہیے اور غالب کو ایک [illegible]۔"

"ڈاکٹر تو آجائے گا لیکن اس شکنجے کا کیا ہوگا جو وہ پوچھے گا کہ یہ [illegible] کیوں یہیں رکھی ہے؟" منظر بولا۔

"اپنے کسی یار دوست کو بلاؤ تاکہ وہ سوال نہ کرے اور کرے تو پھر تمہارے جواب پر اعتراض نہ کرے۔" میں نے کہا۔

"بڑی مصیبت ہے۔ کبھی تو خیریت کا پیغام لے کر آیا کرو یار۔ یہ کیسی دوستی ہے کہ جب آتے ہو کوئی [illegible] میں ڈال دیتے ہو۔" وہ بولا۔ "آخر شرفا کی طرح کیوں نہیں آسکتے تم لوگ؟"

"اس لیے کہ ہم شرفا نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمارے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ ہم زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ٹھہر سکتے ہیں۔ اس لیے جلد بندوبست کرو۔"

"اچھا، میں ابھی کہتا ہوں اپنی گھر والی کو۔" وہ بے بسی سے بولا اور اندر چلا گیا۔ منظر کی عادت تھی [illegible] میں مروت کو ترجیح دے کر [illegible] کی تھی۔ [illegible] اس کی بیوی بہت سعادت مند اور بالکل اللہ میاں کی گائے تھی۔ اپنے کام سے کام رکھنے والی اور اس کا ایک کام تو یہی تھا کہ وہ منظر کو زیادہ سے زیادہ صاحب اطلاع کرے۔ وہ منظر کے معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتی تھی اور اس سے قطعی سروکار نہیں رکھتی تھی کہ باہر وہ کیا کرتا ہے اور کس سے ملتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ شوہر کے سارے کلائنٹ ہم جیسے ہی ہوتے ہیں۔

"مرزا جی!" میں نے منظر کے جانے کے بعد کہا۔ "اس وقت تو [illegible] والے ہیں۔ تمہارے اخبارات کی پوزیشن کیا ہوگی اس وقت؟"

"کیا مطلب... اشاعت کے اعتبار سے؟"

"مطلب یہ کہ ہم ایک پریس کانفرنس بلانا چاہیں... ملا جب سیکرٹ قسم کی اور ایک دھماکا کرنے والی اسٹوری دینی ہو۔" میں نے کہا۔ "تو اس کا بندوبست کیسے ہو سکتا ہے؟"

"وقت کم ہے۔" غالب نے سوچ کے کہا۔ "کیا یہ اسلحے کے ذخیرے سے متعلق خبر دینا ہے؟"

"ہاں۔ اس کے سوا اب چارہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اخبار والوں کو جانتے ہو۔ ان میں سے قابل اعتماد کون ہے؟ زیادہ نہیں تو چار چھ بڑے اخباروں کے خاص نمائندے بلا لو۔ ہم ان کو تفصیلات دیں گے۔ اپنی تصاویر فراہم کریں گے اور میں ایک تحریری بیان دوں گا۔ [illegible] شکنجے کے ساتھ [illegible]

پیش ہوگا۔ وہ اپنے ساتھ فوٹو گرافر لائیں تاکہ ہم صحیح دھماکا کر سکیں۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے۔" غالب نے کہا۔ "مگر خطرناک [illegible] کہیں ایسا نہ ہو کوئی پولیس والا آجائے یا اپنے چوہدری صاحب [illegible]"

"ہیڈ کوارٹر جا رہا ہوں خود ہوں۔ مگر [illegible] جانشین ادھر پہنچ جائیں۔" میں نے کہا۔ "پولیس کانفرنس میں ایس پی صاحب بھی ہوں گے۔"

"انکل رضوی؟" غالب نے کہا۔ "نہیں یار۔ ان کی پوزیشن [illegible] ہو جائے گی۔ سمجھا جائے گا کہ انھوں نے شہرت کے لیے سب ڈراما کیا ہے۔"

"ہم انھیں بالکل [illegible] کر لیں گے۔" میں نے کہا۔

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ بھی [illegible] سمجھا جائے گا [illegible] بلکہ کہیں گے کہ انھوں نے اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لیے [illegible] کے ساتھ مل کر سارا ڈراما کیا۔"

"چلو وہ نہ سہی۔ لیکن پولیس کا ایک افسر موجود ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اسے میں لاؤں گا۔ تم اپنے رپورٹر دوستوں کو بلا سکتے ہو [illegible] یہ ضروری ہے ورنہ کل [illegible] اسلحے کے ذخیرے پر چھاپا مار کر سارا کریڈٹ خود لے لیں گے۔ ہمارا نام تک نہیں آئے گا۔"

"اور ان ڈاکوؤں کا معاملہ...؟"

"وہ اتنا اہم نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے کل پر اٹھا رکھو۔ [illegible] دوسری پریس کانفرنس میں ان کو پولیس کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ پہلے ایک کام [illegible] زیادہ ضروری ہے۔"

فون اس میز پر رکھا ہوا تھا جس پر منظر کسی کیس کی فائل لیے بیٹھا ہوا تھا [illegible] سب کچھ پھیلا ہوا چھوڑ کر اٹھ گیا تھا۔ قانون کی موٹی موٹی کتابیں ایک طرف ڈھیر تھیں اور ٹیبل لیمپ دوسری طرف لگا ہوا تھا۔ ٹیبل فون کے ساتھ بہت لمبا تار تھا چنانچہ میں نے اسے اٹھایا اور غالب کی گود میں رکھ دیا۔ غالب کی ٹانگ اب متورم رہی تھی لیکن اسپرین کے اثر سے اس کے درد کی شدت کچھ کم ہو گئی تھی جیسے جیسے [illegible] رہا تھا اسپرین بھی غیر مؤثر ہو رہی تھی اور اب غالب کو [illegible] علاج، پلاسٹر اور دافع درد انجکشن کی ضرورت تھی لیکن [illegible] کے تحت ہم صورت حالات کو جوں کا توں رکھنے پر مجبور تھے۔

غالب نے ایک نمبر ملایا۔ اس کے اپنے اخبار کے [illegible] سے غالب کی خاصی بے تکلفی تھی۔ جب غالب نے بتایا کہ [illegible] بول رہا ہے تو شاید اس نے [illegible] شروع کیا۔ غالب نے [illegible]

"شروعات کرو نور چشم! گالیاں پھر بھی دے لینا۔ ابھی [illegible] کہہ رہا ہوں وہ غور سے سنو۔" غالب نے کہا۔ "اخبار کے لیے بہت بڑی اور بہت سنسنی خیز خبر ہے۔ تم کسی فوٹو گرافر [illegible]

[illegible] نہیں یار... رک سکتی ہے جگہ۔ ہو اسی وقت اخبار میں [illegible] غیر اہم خبریں نکال دو۔ یہ دھماکا خیز ہوگا۔ یار میں کوئی گپ شپ نہیں [illegible] جب میں کہہ رہا ہوں کہ خبر دھماکا خیز ہے تو [illegible] ہوں۔ نہیں ایڈیٹر سے کوئی بات مت کرو۔ پہلے تم آجاؤ [illegible] لینا چاہیے۔"

"اس سے کہو قزاقی اسٹیڈیم۔" میں نے کہا۔ "گیٹ نمبر ون۔"

"قزاقی اسٹیڈیم آجاؤ۔" غالب نے ریسیور میں کہہ دیا۔ "[illegible] ہے۔"

"اچھا، ابھی ان کے پیچھے۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر آگیا ہے۔"

"ذرا فیروز گارڈن کی عمارت کے احاطے میں آسکتے ہو؟" غالب بولا۔ "اس سے قریب کوئی سی جگہ ہوگی... اور دیکھو... اپنے ساتھ کسی دوسرے اخبار والے کو بھی لا سکتے ہو۔ کسی دوسرے کا نام [illegible] نہیں یار تمھاری ہی اسٹوری ہوگی۔ شیئر کر لینا... نہیں؟... اچھا چھوڑو۔ تم آجاؤ... ابھی نہیں بس کوئی ایک گھنٹے میں... اچھا آدھے گھنٹے میں۔" اس نے فون بند کر دیا۔

"مجھے معلوم تھا کہ ایک رپورٹر کبھی دوسرے کو ساتھ نہیں لائے گا۔ سب کسی بڑی اسٹوری کا کریڈٹ خود لینا چاہتے ہیں۔" غالب نے دوسرا نمبر ملایا اور پھر وہی بات کی۔ چند منٹ کی بحث کے بعد وہ دوسرے کرائم رپورٹر کو بھی آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تین جگہ بات کر کے اس نے فون رکھ دیا۔

منظر ہمارے لیے کھانے پینے کا سامان لے آیا تھا۔ اس نے بھی غالب کی ساری گفتگو سن لی تھی۔ "یہ تو کوئی لمبا ڈراما ہے۔" وہ بولا۔

"ڈاکٹر کو کیا بتا کر بلوایا ہے؟" میں نے کھانے پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔ غالب مجھ سے پہلے کھانا شروع کر چکا تھا۔ کھانے سے زیادہ اس وقت کافی کی طلب تھی جو بہت مدت سے نہیں پی تھی۔

"ڈاکٹر آتا ہوگا۔" منظر بولا۔ "مگر ایک ڈاکٹر سے کیا بنے گا... یہ تو اچھا خاصا ہڈیوں کا وارڈ بنے گا۔ تین مریض ٹوٹے پڑے ہیں۔"

"تم نے کسی کو فون تو کیا نہیں؟" میں نے کہا۔

"ڈاکٹر سے یہ بات کی تھی۔" منظر بولا۔ "وہ دراصل میرے پڑوس میں رہنے لگے ہیں نا... ان میں ایک لڑکا ڈاکٹر ہے۔ ابھی میں نے چھت پر سے آواز دی تھی۔ وہ ابھی ابھی اسپتال سے پہنچا تھا۔"

"نیچے لوگ رہیں گے۔" میں نے تصور کرتے ہوئے کہا۔ "اسے اندر [illegible] کر دینا۔"

"کر دوں گا... مگر بعد میں اور خود کراؤں گا۔" منظر نے کہا۔ "یہ [illegible] وقت [illegible] تیار ہونے کا جھگڑا ہے۔ پھر میں خود [illegible] آجاؤں گا تم لوگوں سے ملنے [illegible]"

[illegible] منظر چند منٹ میں ایک ہم جیسے نوجوان کو لے کر آگیا۔ میڈیکل بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اندر آتے ہی وہ چونکا۔

"آؤ... آؤ... ڈاکٹر یہ تمھیں سہی [illegible] میرے مہمان [illegible]" منظر نے کہا۔ "تقریباً میرے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ اسکول کالج میں میرے پیچھے لگے رہے۔ ایک کلاس پیچھے۔ کبھی میں تو کبھی یہ۔ یہ ہیں سکندر بخت عرف سکندر اعظم ثانی۔ بلکہ لاثانی۔"

اس نے اصل نام بتایا تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ اس تعارف کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اگر تھی تو وہ ہمارے کچھ بھی نام بتا سکتا تھا۔ میں نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔

"یہ ڈاکٹر شہریار ہیں۔ ملنسار [illegible] ایک خصوصیت تو تم دونوں میں مشترک ہے۔" منظر نے کہا۔ ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے ہاتھ ملایا۔

"یہ بھی مرزا غالب ثانی بلکہ لاثانی۔ یہاں جو بھی ہے ثانی [illegible] ثانی ہے۔" منظر بولا۔ "اصل ان کے آگے ماند ہے۔ یہ اپنے کارناموں کے آگے سکندر اعظم کی فتوحات کو خاطر میں نہیں لاتے۔ یہ موجودہ اسد اللہ خاں غالب کو اپنا چربہ قرار دیتے ہیں۔"

غالب نے میری طرف خفگی سے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور ڈاکٹر سے ہاتھ ملایا۔ "آپ دونوں سے مل کر خوشی ہوئی۔" ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بیٹھ کر کہا۔ "آپ نے تو یہ کہا تھا منظر بھائی کہ یہ مہمان ٹوٹے پھوٹے گئے ہیں۔"

"ہاں... دو وہ ادھر پڑے ہیں۔" منظر نے کہا اور تب ڈاکٹر نے دوسری جانب بیٹھے ہوئے [illegible] دیکھا۔ "یہ دونوں ڈاکو ہیں۔ کوٹ لکھپت جیل سے فرار ہوئے تھے کہ ہمارے ان دوستوں نے گھیر لیا اور یہاں لے آئے۔ بس ثابت نہ لا سکے۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ منظر ایسا کیوں کر رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کو سب سچ بتاتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر [illegible] صحت مند، توانا شخص تھا۔ دلکش اور وجیہ شخصیت کا مالک، وہ خوش لباس اور خوش اخلاق تھا مگر ہم اسے نہیں جانتے تھے اور منظر نے بھی صرف اتنا ہی کہا تھا کہ وہ [illegible] پڑوسی ہیں [illegible] پر منظر کا یہ اعتماد ہمارے نقطۂ نظر سے خطرناک ہو سکتا تھا۔ وکیلوں کی طرح [illegible] بھی [illegible] پیشے کی اخلاقیات پر [illegible] سختی سے کاربند رہتے ہیں اور [illegible] غیر قانونی کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

"یہ... کیسے ہوا... میرا مطلب ہے کیا آپ شکاری ہیں؟" ڈاکٹر نے غالب کے شکنجے کو [illegible] کر دیکھا۔

"جی... یہی سمجھ لیں۔" غالب بولا۔ "اتفاق سے وہاں چلے گئے تھے جہاں ہم سے بڑے شکاری موجود تھے۔"

"یہ فرسٹ ایڈ کس نے فراہم کی ہے؟" وہ بولا۔

"میں نے... اس کے علاوہ میں اسپرین دیتا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور ہر چار چار گھنٹے سے یہ [illegible]" میں نے باقی [illegible] اس کے ہاتھ پر [illegible] کر دی۔

www.paksociety.com

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے میرا کام آدھا کر دیا۔" شہریار نے کہا۔ "اب مجھے صرف ہڈی جوڑنا ہے۔ یہ کھپچیاں نہ باندھی گئی ہوتیں تو ٹوٹی ہوئی ہڈی سے جوڑ خراب ہو جاتا اور۔۔ تکلیف بھی بہت زیادہ ہوتی۔ یہ ٹھیک ہونے کا بھی ذکر نہیں رہا۔ لیکن۔۔۔ منظور بھائی! جب تک یہ ٹھیک نہیں بیٹھے گا، پلاسٹر کیسے۔۔۔"

"ابھی آپ میری ٹانگ کو اسی طرح رہنے دیں۔" غالب نے کہا۔ "ڈاکٹر وہ کم کرنے کے لیے کوئی زیادہ موثر دوا دے سکتے ہوں تو دے دیں۔۔۔"

ڈاکٹر نے سوالیہ نظروں سے غالب کو دیکھا۔ "ایسا کیا کام آ لگا ہے آپ کو؟"

غالب مسکرایا۔ "مجھے اپنی یہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کہیں پیش کرنا ہے اس شکنجے سمیت۔ دو تین گھنٹے کے بعد میں آپ کو زحمت دوں گا، فی الحال آپ ان دونوں کو دیکھ لیں۔"

"ان کو کیا ہوا ہے؟" شہریار نے آگے بڑھ کے کہا۔

"ایک کا دایاں بازو اور بائیں کلائی ٹوٹی ہے۔" میں نے کہا۔ "دوسرے کی غالباً دو پسلیاں۔ ہاں یہ اگر پلاسٹر چڑھانا ممکن ہو تو یہ کام کر لیں اور ہاں۔۔ انھیں کسی قسم کی دوا وغیرہ بھی نہیں دی گئی ہے۔"

"یہ تو بے ہوش ہیں۔ غالباً سخت تکلیف ہوگی ان کو۔" شہریار بولا۔

"آپ اب جیسا مناسب سمجھیں کریں۔" میں نے کہا۔ "ہم ان کو کل پولیس کے حوالے کریں گے۔ کل تک ان کو زندہ رکھیں۔"

"یہ زندہ رہیں گے۔" شہریار نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے ان کے ہاتھ پیر کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ مجرم دونوں ہیں نا؟ پھر تو خطرناک گروہ ہوگا؟"

"جی! لیکن آپ کسی سے تذکرہ نہیں کریں گے۔۔"

"منظور بھائی نے مجھے بتا دیا ہے کہ میں جو کچھ دیکھوں گا، سنوں گا اسے اپنی ذات تک محدود رکھوں گا۔" شہریار مسکرایا۔ "آپ لوگ بالکل مطمئن رہیں۔ اگر میں اعتماد کے قابل نہ ہوتا تو منظور بھائی مجھے نہ بلاتے اور میں بھی یہاں نہ آتا۔ کہہ دیتا کہ میڈیکو لیگل کیس ہیں۔۔۔ ہسپتال لے جاؤ۔" وہ جھک کر زخمیوں کے ہاتھوں پیروں کو احتیاط سے ہلا کے دیکھنے لگا۔

"ویسے تو ایکسرے کے بغیر مجھے پلاسٹر نہیں چڑھانا چاہیے اور بعد میں بھی ایکسرے لینا چاہیے۔" وہ بولا۔ "لیکن یہ سمپل فریکچر ہیں۔ امید ہے جوڑ ٹھیک بیٹھ جائے گا۔ پہلے میں ان کو مارفین دے دیتا ہوں۔"

"آپ ان کو کل تک سیڈیشن میں رکھیں۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ شعور نہ کھو بیٹھیں اور آؤٹ آف کنٹرول نہ ہوں۔"

"کل تک تو لازماً انھیں بے ہوش رکھنا ہوگا۔" وہ بولا۔ "اچھا پہلے میں آپ کو ایک انجکشن لگا دوں۔ اس سے درد کا احساس ختم

ہو جائے گا۔ کم سے کم چھ گھنٹے کے لیے۔۔ مگر اس کے بعد۔۔۔"

"چھ گھنٹے بعد میں خود کو آپ کے حوالے کر دوں گا۔" غالب نے منظور کو اشارہ کیا۔ "مجھے تمھاری گاڑی کی چابی چاہیے۔" ہم منظور کے ڈرائنگ روم میں آئے تو اس نے کہا۔ "اور چند کیسے اپنے ساتھ لیے ہوئے ہو کیا؟"

"گاڑی تو تم لے جاؤ۔ مگر تو دیکھنا یہ کیسا چکر ہے۔ اپنے ساتھ مجھے بھی اندر مت کرا دینا۔" ...

ایک بار پھر میں نے غالب کو شکنجے سمیت اٹھایا اور گاڑی میں منتقل کیا۔ کار کو وہاں تک لے گیا جہاں خالی کوٹھی کے ویران احاطے میں جیپ ابھی تک موجود تھی۔ غالب کو جیپ میں منتقل کرنے کے بعد کار کو سڑک کے کنارے ہی چھوڑا اور جیپ دوڑاتا ہوا اس سڑک تک لے گیا جو شہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ بنی تھی۔ بانسوں والی سڑک کے موڑ پر میں نے جیپ کا انجن بند کر دیا۔ ... سے کچھ دور رکا۔ پیچھے اتر کے میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ مجھے وہ کھمبا نظر آگیا جس میں سے ایک تار انکل رضوی کی کوٹھی تک جا رہا تھا۔ سڑک ویران تھی اور ٹیلی فون کا کھمبا ایک گھنے پیڑ کے پیچھے آگیا تھا چنانچہ میں کسی حد تک محفوظ تھا۔ مجھے صرف ایک طرف سے آنے والے ٹریفک کی روشنی میں دیکھا جا سکتا تھا لیکن یہ وقت ٹریفک کے دوسری طرف سے آنے کا تھا اور ویسے بھی اس سڑک پر سے گزرنے والی اکا دکا گاڑی کے کسی ڈرائیور کو اتنی فرصت تھی کہ وہ کسی کو ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھا دیکھ کر رکتا۔ رک کر وجہ پوچھتا۔ بحفاظت اتر کر میں نے اپنے سامنے سڑک پر پھیلی ہوئی روشنی تک محدود رہتی ہے جہاں جیپ کھڑی ہوئی تھی وہاں انکل رضوی کی کوٹھی کا گیٹ چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ کسی آنے والے سے ہمیں کوئی ڈر نہیں تھا کہ وہ پولیس کی جیپ کو کھڑا دیکھ کر رکے لیکن اتفاق سے کوئی پولیس میں ہی گزرتا تو یہی سمجھتا کہ انھی کی اپنی جیپ ہے۔ خطرہ صرف اس صورت میں تھا کہ خود انکل کہیں باہر سے آتے یا باہر جانے کے لیے نکلیں تو گاڑی کو دیکھ لیں لیکن یہ خطرہ مول لیے بنا چارہ نہ تھا۔ میں نے غالب کو وہیں کام ختم کرنے کی تلقین کی اور ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھ گیا اور اوپر پہنچ کے مجھے اندازہ ہوا کہ میرا کھمبے پر چڑھنا ضروری نہیں۔ تار درخت کے بیچ سے گزر رہے تھے چنانچہ میں نے ایک شاخ پر بیٹھ کر ... سے کنکشن ملایا۔ ریسیور انکل کے کسی ملازم نے اٹھایا اور کچھ دیر بعد انکل کی آواز آئی۔ "رضوی۔۔۔"

"انکل میں نے کہا تھا نا کہ میں پھر رابطہ قائم کروں گا۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ اسی وقت قذافی اسٹیڈیم آ سکتے ہیں؟"

"قذافی اسٹیڈیم۔۔۔ وہاں کیا ہے؟" وہ حیران ہو کے بولے۔

"آپ اکیلے آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"میرا دماغ خراب نہیں ہے۔" انھوں نے خفگی سے کہا۔

"میں خود کو آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں نے بہت سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا ہے۔ لیکن میں نے چند اخباری نمائندوں کو بھی بلا لیا ہے۔ آپ سمجھ لیں کہ یہ ایک طرح کی پریس کانفرنس ہوگی۔ میں اپنا بیان دوں گا۔ ظاہر ہے جو کچھ میں کہوں گا اس کا ... آپ پر نہیں۔ میں ایک تحریری بیان بھی پولیس کے حوالے کروں گا جس میں اس ایموشن ٹریو کے بارے میں وہ سب ہوگا جو میں جانتا ہوں یا غالب جانتا ہے اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جو آپ بھی نہیں جانتے۔ میرا تحریری بیان میری اور غالب کی تصویر کے ساتھ صبح کے اخبارات میں شائع ہوگا۔ اس کا سو فیصد کریڈٹ ہمیں ہوگا اور میری گرفتاری کا سو فیصد کریڈٹ آپ کو۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔" انکل رضوی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے یہ پریس کانفرنس وغیرہ۔۔۔"

"جو کام آپ نہیں کر سکتے تھے وہ ہم آپ کی طرف سے کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور جو کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا وہ آپ کریں گے۔۔ اگر آپ کو مجھ پر اعتماد ہے تو آپ اکیلے آئیں گے۔"

"آل رائٹ۔۔۔ میں آؤں گا۔" انھوں نے کہا۔ "مگر قذافی اسٹیڈیم بہت بڑا ہے۔۔ تم کہاں ملو گے؟"

"گیٹ نمبر ون پر۔" میں نے کہا اور لائن کاٹ دی۔

حسب توقع انکل رضوی نے فوراً کوئی نمبر ملانا شروع کیا۔ نمبر پولیس اسٹیشن کا تھا اور دوسری طرف سے ایس ایچ او نے بات کی۔

"ایس ایچ او صاحب، حکم جناب عالی۔" میں نے ایس ایچ او کی آواز سنی۔

"دیکھو بھئی۔۔۔ ایک گرفتاری کرنا ہے۔" انکل رضوی نے کہا۔ "ایک مجرم ہے سکندر بخت۔ وہ وزیر تعلیم کا قاتل، مرحوم۔"

"یس سر۔۔۔ میں جانتا ہوں۔"

"اس نے مجھے فون کیا تھا کہ وہ خود کو قانون کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔" انکل رضوی نے کہا۔ "تمھارے پاس کتنی نفری ہے اس وقت؟"

"یس سر۔۔ آپ حکم کریں۔۔۔ سب ملا کے تین افسر ہیں۔۔ اور پانچ بندے۔۔۔" ایس ایچ او بولا۔

"اچھا تو ایسا کرو کہ تم ایک افسر کو تھانے میں چھوڑ دو۔۔ اور اس کے ساتھ دو ماتحت رہنے دو۔" انکل نے کہا۔ "تم باقی لوگوں کے ساتھ فوراً قذافی اسٹیڈیم پہنچو۔۔۔ گیٹ نمبر ایک پر پوزیشن لو لیکن خود کو چھپا کے اور میرا انتظار کرو۔ میں بھی پہنچتا ہوں۔ سب کے پاس اسلحہ ہونا چاہیے۔"

"کیا میں آپ کو لینے آ جاؤں سر؟" ایس ایچ او نے کہا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔۔ تم فوراً گیٹ پر پہنچو۔" انکل رضوی

نے کہا۔ "اور دیکھو کسی کو معلوم نہ ہو کہ تم کس کام سے جا رہے ہو۔"

"آپ بالکل فکر ہی نہ کریں سر۔" ایس ایچ او نے کہا اور لائن کٹ گئی۔

مجھے انکل رضوی کی وعدہ خلافی پر افسوس ہوا۔ غالباً ان کے حوصلہ افزا رویے نے مجھے ان سے غلط امیدیں وابستہ کرنے پر مجبور کیا تھا ورنہ وہ ایس ایس پی پہلے تھے کسی کے انکل بعد میں۔۔۔ خصوصاً ایک مجرم کے۔۔۔ میرے اندازے کے مطابق انکل رضوی تیار ہو کے پانچ منٹ میں بھی باہر آ سکتے تھے چنانچہ میں نے ایک منٹ کے وقفے سے ان کا نمبر ملایا۔ حسن اتفاق سے ریسیور خود شہلا نے اٹھایا۔ میری آواز پہچانتے ہی وہ ... ہو گئی۔

"تم نے انکل سے بات کی تھی؟" وہ بولی۔

"ہاں۔ ایک بار نہیں دو بار۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس وقت تم کو ایک ضروری پیغام دینا تھا۔ کیا محسن تم سے ملنے آئے گا؟"

"معلوم نہیں۔"

"تم کو معلوم ہے کہ وہ آئے گا۔" میں نے ... "جب وہ آئے تو اسے بتا دینا کہ ہم منظور کے گھر میں ہیں۔۔۔ خدا حافظ۔"

نیچے اترتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا اور جیپ کو بالکل گیٹ تک لے گیا۔ رضوی صاحب کی وردی ... دروازے پر ... گارڈ بٹھا دی تھی اور اندر ان کی جیپ کے پاس بھی کوئی نہیں تھا۔ ڈرائیور ... کے پیچھے کوارٹر کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے کیپٹن اور ... کا تصور کیا اور سوچا کہ آخر وہ یہاں کیوں رکی ہوئی ہیں؟ ان کا اپنا گھر ہے لیکن وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ یہاں بھی پولیس ان کی کب تک حفاظت کر سکتی ہے اور حفاظت سے پہلے پولیس نے کیپٹن سے تفتیش کی ہوگی۔ پوچھا ہوگا کہ وہ کہاں تھی اور کس کے ساتھ تھی؟ اس نے کچھ تو بتایا ہی ہوگا۔ غالباً انکل رضوی نے انھیں مزید تفتیش کے لیے روک رکھا ہے۔

میں دیوار کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گیٹ تک گیا۔ پھر میں نے جیب سے ماچس نکالی اور اس میں ایک کیل یوں گھسیڑ دی کہ وہ دوسری طرف نکل آئی۔ اسے میں نے جیپ کے اگلے ٹائر کے نیچے پہیے کے نیچے یوں رکھا کہ کیل کا نوکیلا سرا اوپر کی جانب رہا۔ دوسری ماچس میں نے غالب سے لی تھی۔ اس میں دوسری کیل اسی طرح کھڑی کر کے میں نے وہ دوسرے اگلے پہیے کے بالکل نیچے فٹ کی اور دوڑ کر باہر آ گیا۔ اب ایک ماچس کے سلپ ہونے کے باوجود دوسری کیل سے ٹائر کا فلیٹ ہو جانا یقینی تھا۔ ویسے دونوں ٹائر بھی پنکچر ہو سکتے تھے مگر روانہ ہوتے وقت جیپ کی کم رفتار کے باعث یہ اندیشہ نہیں تھا کہ ٹائر برسٹ ہونے پر جیپ الٹ جائے گی۔ میرے اندازے کے مطابق انکل رضوی کو جیپ کوٹھی سے باہر آ کے سو گز دور جانے سے پہلے معلوم ہو جائے گا کہ ٹائر فلیٹ ہو گئے ہیں۔

www.paksociety.com

دونوں ماچسوں کا پتا بھی نہیں چلنے لگے۔ ان کا پورا منتشر ہو جائے گا مگر پولیس فائلوں میں الجھی رہ جائیں گی۔ فوری طور پر انکل رضوی کو خیال بھی نہیں آئے گا کہ وہ کسی سازش کا شکار ہو سکتے ہیں۔
تقریباً سات منٹ بعد انکل رضوی کی آواز آئی۔ "کھانا ہے لگا"
"ابھی تو آئے تھے آپ!" بیٹی کی آواز تھی۔
"ارے بابا یہ بڑی مشکل نوکری ہے۔ تم کیا جانو بیوی کو شوہر کا غلام بے چارے شوہروں کو دیکھو کس کس کے غلام ہیں پبلک کے، افسران کے اور یہاں تک کہ ماتحتوں کے۔" وہ ہنسنے لگے۔ "کتنا اچھا ہوتا اگر عاملہ جیسا بس ایک شوہر ہوتا اور اسے خوش رکھ کے فرض ادا ہوتا۔ ایک گھر ہوتا اسے سنبھالنے کے کام ختم۔"
"بہت آسان سمجھتے ہیں نا... کسی دن کر کے دیکھیں۔"
"ایک دن اس شہر کو سنبھال کے دیکھو۔" وہ بولے اور جیپ اسٹارٹ کی۔ "ایک تھانے کو سنبھال کے دیکھو۔ چھوٹا چلے گا۔ نیچے اوپر سب چور اچکے بیٹھے ہیں۔"
"اچھا کب تک آئیں گے...؟" آنٹی نے کہا۔
"کتنی بار کہا ہے کہ یہ سوال مت پوچھا کرو۔ کوئی قلم کا شو تو دیکھنے جا نہیں رہا ہوں کہ بتا دوں... کہ قلم اتنے بجے ختم ہو گی اور اتنے بجے تک میں آ جاؤں گا... آ جاؤں گا کام ختم ہوتے ہی لیکن تم یہ یاد رکھا کرو کہ کسی بھی سپاہی یا پولیس مین کا گھر سے نکلنے کے بعد واپس آنا قطعی یقینی نہیں ہوتا۔"
"مت کریں ایسی باتیں۔ میں عاجز آ گئی ہوں...؟"
"تم کو عادی ہو جانا چاہیے۔ اسی لیے میں ایسی باتیں کرتا ہوں۔ چلو جاؤ سو جاؤ، خدا حافظ۔" انکل نے کہا۔
ان کی جیپ باہر نکلی اور ہیڈ لائٹس روشن ہوتے ہی سڑک پر آ کے چل دی۔ جیپ کا رخ ادھر ہی تھا جدھر ہماری جیپ کا ناک تھا۔ انھوں نے ہمیں نہیں دیکھا۔ جب تک ان کی جیپ مشکل سے یہاں سے گزر جائے رک گئی۔ اسی وقت میں نے اپنی جیپ اسٹارٹ کی اور ایک دم آگے بڑھا دی۔ انکل رضوی ابھی ٹائروں کو دیکھنے کے لیے اترے ہی تھے کہ میں نے بریک لگائے اور جمپ مار کے جیپ سے اتر گیا۔ انھوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔
"السلام علیکم انکل! کیا ہوا... دونوں ٹائر فلیٹ ہو گئے؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "جیسے کوئی بات نہیں، گاڑی حاضر ہے۔"
"تم...؟" انکل رضوی نے سیدھا کھڑا ہو کے کہا۔ "تو یہ تمھاری حرکت ہے؟"
"میں معذرت خواہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "تاہم آپ کو زحمت نہیں ہوگی۔"
"مقصد کیا ہے اس حرکت کا؟" انھوں نے متانت سے کہا اور ان کا ہاتھ ریوالور کی طرف بڑھانے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ ریوالور غالباً جیب میں تھا۔
میں نے سوچا کہ آپ کہاں تلاش کرتے پھریں گے مجھے، کیوں

"ہم خود آپ کو لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔
"اور اگر میں جانے سے انکار کر دوں؟" انھوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بے خوفی سے کہا۔
"مجھے امید ہے آپ ایسا نہیں کریں گے۔ میری درخواست ہے کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔" میں نے کہا۔ "اپنے ایس ایچ او کو فون کر دیں کہ آپ اسٹیشن جا رہے ہیں... لوٹ آئے گا جھک مار کے۔"
"ٹی سی! گویا تم نے میرا فون ٹیپ کیا تھا؟" وہ بولے۔ "مجھ گئو... پھر یہ اب پولیس افسروں کے فون ٹیپ کرتے ہیں کیا دیدہ دلیری ہے"
"وقت کم ہے انکل۔" میں نے کہا۔ "اخباری نمائندے پہنچ گئے ہوں گے۔"
"شٹ اپ۔ میں تمھارے ساتھ جانے سے انکار کرتا ہوں۔" رضوی صاحب نے کہا۔
"آپ مجھے زبردستی پر مجبور کر رہے ہیں۔" میں نے کہا اور ریوالور نکال لیا۔
"مجھے تمھاری سعادت مندی سے یہی امید تھی۔" انکل نے طنز سے کہا۔ "انکل بھی کہتے ہو مجھے اور..."
"میں تو کہتا ہوں۔" میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "آپ کب خود کو انکل سمجھتے ہیں؟ آپ تو صرف ایس ایس پی ہیں۔ آپ نے مجھے کبھی اپنا بھتیجا نہیں سمجھا جیسے مرحوم سکندر بخت واللہ وزیر خان مرحوم کہا۔ میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ اپنے کام میں آپ نے وعدہ کیا اور سکندر اعظم کو دھوکا دیا۔ میں مانتا ہوں کہ آپ بہت ہوشیار شکاری ہیں لیکن اناڑی ہم بھی نہیں ہیں۔ جب ایس ایس پی صاحب کر آپ کے قریب میں آ جاتے ہیں میں آپ کو ہر قیمت پہ لے جاؤں گا۔"
"تم پر اغوا کا ایک اور کیس بن جائے گا۔" انکل رضوی نے کہا۔ "اور ایک سینئر پولیس افسر کا اغوا کوئی معمولی واردات نہیں سمجھا جاتا۔"
"مجھے پروا نہیں... جہاں سیر وہاں سوا سیر۔" میں نے کہا۔ "مجھے اپنا کام تو کرنا ہی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میں پولیس کے نمائندوں کے سامنے گرفتاری دوں گا۔"
"اور کیا تم واقعی گرفتاری دینا چاہتے تھے؟" انھوں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم جھوٹ بول رہے تھے۔"
"آپ کا خیال درست ہے۔ مجھے آپ کی موجودگی میں پریس کے سامنے ایک بیان دینا تھا۔" میں نے کہا۔ "آپ کی گواہی کی ضرورت تھی مجھے لیکن آپ نے مجھ سے رابطہ قائم کرنے سے پہلے ہی سیٹھ نوری کی مدد سے گرفتار کرنا چاہا۔"
"میں نے وہی کیا جو میرے نزدیک جائز اور درست تھا۔"
"میں بھی وہی کر رہا ہوں جو میرے نزدیک جائز اور درست ہے۔ جائز اور درست کا مطلب آپ کے نزدیک کچھ اور ہے میرے نزدیک کچھ اور... اور شاید ہر شخص الفاظ کا مفہوم اپنے حالات سے

اندازہ ہے۔" میں نے کہا۔ "آج میرے پیچھے چودھری دلاور بھی آنا ہی خطرناک شکاری ہے جیسے آپ ہیں۔ قانون کے محافظ اور قانون شکن دونوں شکاری ہیں جو ہمارے تعاقب میں ہیں۔ لیکن ہم نے اس شکار گاہ میں جینا سیکھ لیا ہے اور اب ہم آسان شکار نہیں ہیں۔ کیا آپ زحمت کریں گے؟ وقت کم ہے۔" میں نے ریوالور سے اشارہ کیا۔
انکل رضوی اپنی جگہ پہ متذبذب کھڑے کچھ سوچتے رہے۔
"انکل! میں آپ پہ ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "فرض اور محبت کی جنگ میں کوئی مشکل مقام آیا تو آپ نے فرض کو ترجیح دی اور کبھی نہیں پچھتائے۔ مجھے آزمائش میں مت ڈالیں کہ میں نے آپ کی عمر کا رشتے کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔"
انکل رضوی نے سر ہلایا اور جیپ کی طرف بڑھے۔ اس جنرل کی طرح جو بڑے باوقار انداز میں اپنے حریف جنرل کے سامنے جنگی قیدی بن کے جا رہا ہو۔ جنگ میں ہار جیت تو ہوتی ہے پھر بھی ایک جنرل ہار کے بھی جنرل رہتا ہے۔ وہ جیپ میں بیٹھنے سے پہلے ذرا سی دیر کے لیے رکے اور انھوں نے جیپ کا نمبر غور سے دیکھا۔
"السلام علیکم انکل رضوی۔" غالب نے پچھلی سیٹ پر سے کہا۔
وہ چونکے۔ "وعلیکم السلام... گویا آپ بھی ہیں۔" وہ بولے اور جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ "یہ جیپ کہاں سے ملی؟"
"یہ دوسری اسٹوری ہے۔" میں نے ان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا اور جیپ کو اسٹارٹ کیا۔ میری گھڑی کے مطابق ہم کچھ لیٹ ہو گئے تھے۔ اخباری نمائندوں سے پہلے ہمارا پہنچنا ضروری تھا لیکن آدھے گھنٹے کا وقت بہت کم تھا۔ میں نے جیپ کو ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑایا۔ سڑکیں اس وقت خالی تھیں اور مجھے بانسوں والی سڑک چھوڑ کے مال تک جانے اور پھر ٹنگ کراس سے گھوم کر سیدھے باغ پر آنکلی بلڈنگ تک پہنچنے میں دس منٹ بھی نہیں لگے۔ [illegible] کی پرانی عمارت بالکل سنسان پڑی تھی۔ برآمدے میں صرف ایک بلب جل رہا تھا اور ایک شخص سگریٹ کا دھواں نکالتے ہوئے ٹہلائی کے رنگ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ یہ بھی ایک روایتی صحافی کا بچہ ہے۔ جیپ کو گیٹ سے اندر آتے دیکھ کے وہ رکا اور آگے آیا۔ جیپ کے قریب آ کے اس نے پہلے رضوی صاحب سے اور پھر غالب سے ہاتھ ملایا۔
"کتنی دیر ہوئی تم کو پہنچے ہوئے؟" غالب نے کہا۔
"میں ٹھیک وقت پر آ گیا تھا۔ تم دس منٹ لیٹ ہو۔" اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ "اتنا کام کا رش تھا۔ مگر سب ایسے ہی چھوڑ کر آیا ہوں۔"
"یہاں کوئی اور تو نہیں ہے؟" میں نے جیپ سے اتر کے کہا۔
"ایک چوکیدار تھا۔ میں نے بہت کہا لیکن وہ [illegible]

پر راضی نہیں ہوا۔" وہ بولا۔ "حالانکہ وہ مجھے جانتا ہے۔ تیرا میں نے پچھلی طرف چار پانچ کرسیاں ڈلوا دی ہیں۔"
"اور چوکیدار کہاں ہے؟" غالب نے کہا۔
"اسے میں نے کہا تھا کہ چائے کا بندوبست رکھنے پریس کانفرنس ہے۔"
میں غالب کو اٹھا کے پیچھے کی طرف والے برآمدے میں لے گیا اور ایک کرسی پر یوں بٹھا دیا کہ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ دوسری کرسی پہ تکیے کے ساتھ رکھی رہی۔ غالب کے دوست نے اس کا تعارف کیا اور اپنے فوٹوگرافر کو کوسنے لگا۔ وہ اسی اخبار کا کرائم رپورٹر تھا جس میں غالب تھا چنانچہ دوست کرائم رپورٹر کہلاتے تھے۔ وہ دوستانہ فضا میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ ایک کرسی پر انکل رضوی بیٹھے رہے اور ایک پہ میں بیٹھا رہا۔ اس طرح پانچ کرسیاں بھر گئیں۔ اگلے دس منٹ میں پانچ افراد پہنچے۔ ہر اخبار کا ایک رپورٹر اور ایک فوٹوگرافر۔ وہ سب پیچھے بیٹھے۔ ان سب نے غالب سے شکوہ کیا کہ باقی لوگوں کو کیوں بلایا گیا ہے اور غالب نے عدم تعلق کا اظہار کیا لیکن غالب ہوشیار آدمی تھا، اس نے سب کو خاموش کر دیا اور مطمئن بھی کیونکہ حالات کا تقاضا تھا۔
"اپنے مرنے کے معاملات کب تک چھپاؤ گے؟" مرزا غالب کے اخبار سے آنے والے صحافی دوست نے سب سے زیادہ بے چینی کا مظاہرہ کیا۔ "ہم تو جانتے ہیں تیرے ضمیر کو۔ میں تو چاہتا تھا کہ یہ میری ایکسکلوسیو اسٹوری ہوتی۔"
"چاہتا تو میں بھی یہی تھا۔" دوسرے رپورٹر نے کہا۔
"کون نہیں چاہتا تھا۔" تیسرے نے تائید کی۔
"مگر حق میرا زیادہ تھا...؟"
"چپ بے حق کے بچے۔" غالب نے کہا۔ "یہ کیا اس سے بڑی بڑی خبریں جب ایجنسی سے ملتی ہیں تو سب کو ملتی ہیں۔ پولیس ریلیز سب کے لیے ہوتی ہے۔ یہ بھی ایسی ہی خبر ہے۔"
غالب کا وہ دوست منہ پھلا کے بیٹھ گیا۔ میں نے پریس کانفرنس کے آغاز میں کہا۔ "مجھے ایک بیان دینا ہے۔"
ان سب نے اپنے ٹیپ ریکارڈر آن کر لیے جو وہ ہر پریس کانفرنس میں ساتھ لیے پھرتے تھے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کے ہر لفظ کہا۔ یہ بتایا کہ بہت عرصے سے کچھ لوگ یہاں سے مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسند عناصر کو اسلحہ فراہم کر رہے ہیں۔ ان میں وہ کاروباری افراد بھی شامل ہیں جن کا ضمیر صرف پیسہ ہے اور غیر ملکی ایجنٹ بھی۔ کسی کا نام لیے بغیر میں نے کہا کہ ہمیں کچھ اسلحے کا پتا چلا ہے لیکن ہمارے پاس ان کے خلاف کوئی ایسا ثبوت نہیں جس کی بنیاد پر ہم انھیں قوم کے سامنے بطور مجرم پیش کر سکیں لیکن ہم بہت جلد ثبوت شہادت اور

www.paksociety.com

www.paksociety.com

گواہ سب حاصل کریں گے۔ اس کے بعد میں نے شمالی علاقے کے متعدد غداروں کی تباہی کا حوالہ دیا اور کہا کہ وہ میں نے اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے تباہ کیے تھے۔ ان میں سے چند نے مخبری کا ثبوت دیتے ہوئے درمیان میں سوال کیے مگر انہیں میں نے خاموش کر دیا کیونکہ ابھی میرا بیان مکمل نہیں ہوا تھا۔ میں نے کارگزاری کی مفصل روداد پیش کرنے کے بعد میں نے تازہ ترین صورت حال سے انہیں آگاہ کیا اور بتایا کہ کس طرح میں نے گیلی توت پیٹر ایس ایس پی صاحب کو ایک اسلحے کے ذخیرے کی نشاندہی کی تھی مگر انہوں نے ایک گمنام کال پر ایکشن سے انکار کر دیا۔ مجبوراً مجھے اخباری نمائندوں کا سہارا لینا پڑا کیونکہ میں خود پولیس کے سامنے پیش نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے بتایا کہ ہم کس طرح سمگلروں کے ٹھکانوں تک پہنچے اور وہاں ملک دشمنوں۔ کس اس اڈے کو تباہ کرنا کتنا دشوار ثابت ہوا۔ اس مہم میں غالب کی ٹانگ ایک شکنجے میں پھنسی اور ٹوٹ گئی۔ وہاں بارودی سرنگیں بھی تھیں لیکن خدا نے ہمیں محفوظ رکھا۔ میں نے خندق کا اور آس پاس کی دوسری رکاوٹوں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ کوئی تفصیل باقی نہ رہی۔

میرا بیان ختم ہوتے ہی وہ سب پھٹ پڑے۔ لیکن میں نے ان سے کہا کہ وہ باری باری سوال کریں۔ چونکہ میں ان سب کے نام نہیں جانتا تھا اس لیے یہ ساری گفتگو نام کے حوالے کے بغیر ہے جو رضوی صاحب سے ہوئی۔

سوال: ایس ایس پی صاحب، کیا آپ نے ملزم سکندر بخت کے ٹیلی فون کرنے کے بعد کوئی قدم اٹھایا تھا؟

جواب: میں اس کا پابند نہیں تھا تاہم قومی سلامتی کے پیش نظر میں نے اعلیٰ حکام کو اطلاع ضرور دی تھی۔

سوال: اور کیا اعلیٰ حکام نے اس پر کوئی کارروائی کی ہے؟

جواب: ضرور کی ہوگی۔ اگر نہیں کی تو یہ میری ذمہ داری نہیں۔

سوال: کیا وہاں سے اسلحہ دستیاب ہوا ہے؟

جواب: مجھے نہیں معلوم۔

سوال: کیا کچھ گرفتاریاں بھی ہوئی ہیں۔ یا متوقع ہیں؟

جواب: میں قبل از وقت کچھ نہیں بتا سکتا۔

سوال: کیا سکندر بخت کی فراہم کردہ معلومات آپ کے نزدیک معتبر ہیں؟

جواب: میں نہیں سمجھتا کہ سکندر بخت کو ایسا جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ ہوگا۔

سوال: گویا آپ انہیں سچ مانتے ہیں؟

جواب: سچ نہ مانتا تو اعلیٰ حکام کو کیوں خبردار کرتا۔

سوال: کیا آپ کے اور ملزم سکندر بخت کے درمیان کوئی رشتہ ہے؟

جواب: نہیں۔

سوال: کیا آپ ملزم سکندر بخت کو گرفتار کر چکے ہیں؟

جواب: نہیں! ملزم سکندر بخت مجھے گرفتار کر کے لایا ہے۔

سوال: کیا مطلب؟

جواب: مطلب یہ کہ مجھے میری مرضی کے خلاف گھر سے اغوا کر کے لایا گیا ہے۔

سوال: کیا اس پر آپ سکندر بخت کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے؟

جواب: یقیناً۔ میں موقع ملتے ہی اغوا کی رپورٹ درج کراؤں گا۔۔۔ ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے میں پریس کانفرنس سے خطاب کر سکتا ہوں اور نہ کوئی جواب دینے کا پابند ہوں لیکن میں اپنی پوزیشن کلیئر کرنا پسند کرتا ہوں۔ آپ سب لوگ ملزم سے پوچھ سکتے ہیں کہ کیا وہ مجھے یہاں دھوکے سے اور گن پوائنٹ پر لے کر نہیں آیا۔ اس جرم میں آپ کا دوست اور ہم پیشہ صحافی مرزا غالب بھی برابر کا شریک ہے۔

سوال: سکندر بخت نے شمالی علاقے کے چند غداروں کا حوالہ دیا ہے جن میں نگٹے ماچھی کا اڈا۔ سامنے پاپڑ والے کی جعلی خانقاہ جو موضع کراں والا میں تھی اور ایک ذخیرہ جہاں وہ ہیلی کاپٹر تباہ ہوئے تھے۔ ایک ہیلی کاپٹر موضع کرہاں والی میں بھی تباہ ہوا تھا۔ وہاں کسی اخباری نمائندے کو نہیں جانے دیا گیا تھا؟

جواب: ہیلی کاپٹر کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ قومی مفاد میں نہ ہر بات اخبار والوں کو نہیں بتائی جا سکتی۔

سوال: کیا آپ سکندر بخت کے دعووں کی تائید کرتے ہیں کہ ان اڈوں کو انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے تباہ کیا تھا؟

جواب: میں کیسے تائید یا تردید کر سکتا ہوں۔ میں چشم دید گواہ تو نہیں تھا۔

سوال: کیا یہ درست ہے کہ وہاں سے غیر ملکی اسلحہ برآمد ہوا تھا؟

جواب: مجھے نہیں معلوم۔

سوال: کیا وہ ہیلی کاپٹر انڈین تھے جو تباہ ہوئے؟

جواب: میں نہیں جانتا۔

سوال: آپ جانتے نہیں یا بتانا مناسب نہیں سمجھتے؟

جواب: مجھے علم ہوتا تب بھی میں نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ ان معاملات کا تعلق حکومت کی خارجہ پالیسی سے اور سیاست سے بھی ہو سکتا ہے جب کہ میں ایک سرکاری ملازم ہوں۔ اس کے علاوہ اس قسم کے کیس پولیس ہینڈل نہیں کرتی۔ اس کے لیے اعلیٰ سطح پر کوئی ایجنسی کام کرتی ہے۔

سوال: کیا آپ نے کوئی انڈین ایجنٹ پکڑا ہے یا اس کا سراغ لگایا ہے؟

جواب: میں نے۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ میرا کام ہی نہیں ہے۔

سوال: کیا آپ کے پاس ایسے افراد کا ریکارڈ ہے جو ملک کی

سالمیت کے خلاف کام کر رہے ہوں، غیر ملکی طاقتوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہوں اور تخریبی عناصر سے ملے ہوئے ہوں۔

جواب: ایسے لوگ کہاں اور کس ملک میں نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس بھی ایسے افراد کا ریکارڈ ہے۔

سوال: پھر آپ نے ابھی تک ان کو گرفتار کیوں نہیں کیا؟

جواب: ہم قاعدے قانون کے مطابق چلتے ہیں۔ جب ہمارے پاس کسی غدار یا وطن فروش کے خلاف اتنا مواد جمع ہو جائے کہ ہم عدالت میں پیش کر کے اسے مجرم ثابت کر سکیں تو ہم ایک لمحہ بھی تاخیر نہیں کریں گے۔

سوال: سکندر بخت نے چند افراد کا ذکر کیا ہے لیکن کسی کا نام نہیں لیا۔ کیا آپ ان افراد سے واقف ہیں؟

جواب: مجھے نہیں معلوم کہ سکندر بخت نے کن افراد کا ذکر کیا ہے۔

سوال: اگر وہ آپ کو نام بتا دے تو آپ کیا کریں گے؟

جواب: تفتیش۔ صرف نام سن کے ہر شخص کو نہ گرفتار کیا جا سکتا ہے اور نہ مجرم سمجھا جا سکتا ہے۔

سوال: اب تک پولیس اور دوسرے کسی ادارے نے شمالی علاقے کے کتنے غداروں کا پتا چلایا ہے اور کتنے ملک دشمن افراد کے خلاف کارروائی کی ہے؟

جواب: یہ بات بتانا عقل مندی نہیں ہوگی۔ اگر ہم تفصیلات ظاہر کر دیں گے تو ان کے ساتھی روپوش ہو جائیں گے، اپنے ٹھکانے بدل دیں گے یا طریقۂ کار بدل دیں گے۔ یہ کام رازداری سے چلتے رہتے ہیں اور ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے بھی نہیں کیے جا سکتے۔ اس کے علاوہ میرا کام ملکی قانون کے مطابق لاہور تک محدود ہے۔ مجھے ملکی اور قومی سطح پر ہونے والے کام میں دخل کا اختیار نہیں ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں سکندر بخت کے خلاف مقدمات کی تعداد کیا ہے؟

جواب: مجھے کوئی اندازہ نہیں۔

سوال: کیا وہ سب مقدمات بہت سنگین ہیں؟

جواب: اس کا فیصلہ تو عدالت کرتی ہے۔ میرے نزدیک کسی کو گالی دینا بھی ایک سنگین جرم ہے، گولی مارنا تو دور کی بات ہے۔

سوال: کیا سکندر بخت نے کسی کو گولی ماری ہے؟

جواب: میں نے تو ایسا نہیں کہا۔ ایک مثال دی تھی۔

سوال: کیا اس مرحلے پر سکندر بخت کی ضمانت ممکن ہے؟

جواب: یہ بھی عدالت کے اختیار کی بات ہے۔

سوال: اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سکندر بخت اور اس کے ساتھیوں نے ملک دشمن عناصر کے خلاف قابل قدر جرأت کا ثبوت دیا ہے جیسا انھوں نے شمالی علاقے کے غدار تباہ کیے، دشمن کے ٹھکانے کو ٹھکانے لگایا اور جان پر کھیل کے وطن دشمنوں کے عزائم کو ناکام کیا تو کیا انھیں ملکی و قومی خدمات کے عوض قانون سے کوئی رعایت ملے گی؟

جواب: آپ پڑھے لکھے ہو کے ایسا سوال کرتے ہیں۔ قانون میں رعایت یا ترمیم کیسے ممکن ہے اور اگر کسی کو مقدمات واپس لینے کا اختیار ہے تو وہ حکومت کو حاصل ہے۔ میں حکومت نہیں ہوں کہ ابھی سے کچھ بتا سکوں، نہ میں عدالتی معاملات پر تبصرہ کرنے کا مجاز ہوں۔

سوال: آپ کا ذاتی خیال کیا ہے۔ سکندر بخت کے ساتھیوں کے دعوے درست ہیں؟

جواب: میری ذاتی رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

سوال: لیکن ابھی تک کسی نے بھی ایسا دعویٰ نہیں کیا۔۔۔ اور حکومت کی طرف سے کوئی بیان بھی جاری نہیں ہوا کہ اسلحے کے وہ ذخائر کس نے تباہ کیے تھے؟

جواب: حکومت کو تردید یا تائید کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی کیونکہ یہ دعوے کبھی حکومت کے سامنے نہیں آئے۔

سوال: سمگلروں کے ایمونیشن ڈپو کے متعلق سکندر بخت کے انکشافات پر حکومت یہ نہیں کہہ سکتی کہ اسے پہلے سے علم تھا۔ کیا اس طرح تصدیق نہیں ہو جاتی کہ درحقیقت سکندر بخت اور ان کے ساتھیوں نے ہی اب تک تمام پیش رفت کی ہے۔ اور غالب مرزا کے دعوے درست ہیں؟

جواب: نو کمنٹ۔

سوال: کیا ان حالات میں یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ سکندر بخت کے خلاف سارے مقدمات ایک سازش کا نتیجہ تھے جس کا مقصد ان کو جیل میں بند کر کے اصل مقصد میں کامیابی حاصل کرنے سے روکنا تھا اور کیا یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ ملک دشمن عناصر کی سکندر سے دشمنی میں پولیس بھی شامل تھی جس نے مقدمات بنائے؟

جواب: فرض کرنے کو آپ کچھ بھی فرض کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد میری باری آئی اور ان چاروں نے مجھ سے یہ سوالات کیے۔

سوال: مسٹر سکندر بخت آپ کے خلاف سب سے پہلے ایک قتل کا مقدمہ درج کیا گیا تھا۔ آپ پر الزام تھا کہ آپ نے اپنے والد کے ایک بزنس پارٹنر کو قتل کیا تھا؟

جواب: میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سوالات میرے مقدمات کے بارے میں نہ ہوں۔

سوال: پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے خلاف مقدمات قائم کرنے والے بھی لوگ تھے جو آپ کے خیال میں وطن دشمن عناصر

ہیں یا ان کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں شو جن کے خلاف وراثت کا مقدمہ تھا؟

جواب: میں ایسا نہیں سمجھتا۔

سوال: کیا یہ عرض کرنا غلط ہوگا کہ آپ کو جان بوجھ کر ایک سے زائد مقدمات میں الجھایا گیا تھا تاکہ آپ ان عناصر کو بے نقاب نہ کر سکیں؟

جواب: جیسے ایس ایس پی صاحب نے کہا آپ کچھ بھی فرض کر سکتے ہیں۔

سوال: آخر آپ کھل کر ان کے خلاف بات کیوں نہیں کرتے۔ کیا آپ ان سے ڈرتے ہیں؟

جواب: جی ہاں، میں ان سے ڈرتا ہوں۔ میری جگہ آپ ہوتے تو آپ بھی ڈرتے۔ میں صحافی ہوں نہ تاجر ... مجھے جوڈو کراٹے میں بلیک بیلٹ ملی ہے اور یہ ہی کنگ فو وغیرہ جانتا ہوں۔ یہ مسئلہ ہے یہاں کا نظام انصاف جو قدم قدم پر رشوت اور سفارش طلب کرتا ہے اور رشوت کے بغیر تو شاید یہاں ولدیت کے خانے میں باپ کا نام بھی غلط درج کر دیا جاتا ہے۔ جو پولیس ہے جو انصاف کرنے والوں اور انصاف مانگنے والوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

سوال: کیا آپ اس بوسیدہ نظام کو بدل سکتے ہیں جس کی ساری خرابیاں ہم سب جانتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر آپ کیا کریں گے؟

جواب: وہی جو آپ ہم کرتے ہیں۔ صرف خدا پر اور خدا پر بھروسا رکھتے ہوئے۔

سوال: آپ نے متعدد بار جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے اور کہا ہے ہم ... آپ کے ساتھی کون ہیں؟

جواب: میں کسی کا نام بتا کے اسے کسی شکاری کے سامنے نہیں ڈالوں گا۔

سوال: شکاری آپ کسے کہتے ہیں؟

جواب: ان سب کو جو انصاف کے نام پر استحصال کرتے ہیں۔ کمزور سے حق چھینتے ہیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے فلسفے کو آج کے حالات کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ قانون کو کمزور کا سہارا سمجھتے ہیں لیکن کمزور کے لیے جینے کے حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ لامذہب بلکہ لا ... پر یقین رکھنے والے سب لوگ ہیں جو "سوالوں ... " کے قائل ہیں جو اصول ایمان اقدار و عقائد کی خرید و فروخت کو جواز عطا کرتے ہیں۔ اس تعریف کی روشنی میں آپ معاشرے کے ہر شکاری کی شناخت کر سکتے ہیں۔

سوال: کیا آپ خود شکاری نہیں ہیں؟

جواب: ہم بھی شکاری ہیں۔ ہم معاشرے کے ہر شکاری کی شکار ...

سوال: آپ کب تک اس طرح روپوش رہیں گے اور اپنے ... میں اضافہ کرتے رہیں گے؟

جواب: جب تک ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔ جب ہم کامیاب ہوں گے تو یہ معاشرہ ... خوش آمدید ...

سوال: کیا مرزا غالب بھی آپ کے ساتھی ہیں؟

جواب: نہیں وہ صحافی ہیں۔ بعض اوقات خبروں کی جستجو میں جیسے وہ اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ بھی شکاری ہیں۔

سوال: کیا آپ نے ان کو مجبور کیا تھا کہ ہنگامی ... ؟

جواب: جی۔ اور اس کے بعد ہی انھوں نے آج کی پریس کانفرنس کا انتظام کیا۔ یہ سب میں نہیں کر سکتا تھا۔

سوال: آپ کو ایس ایس پی کو اغوا کر کے لانے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب: میں نے انھیں اغوا کر کے نہیں بلایا۔ انھی کی جیپ میں ... ہوں اور جیپ باہر کھڑی ہے۔ آپ لوگ دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے ان کو راستے میں دیکھا اور روک لیا۔ میں نے کہا میں اپنی گرفتاری دے سکتا ہوں بشرطیکہ مجھے پریس کے سامنے اپنا مقصد و بیان کرنے دیا جائے۔ میں نے ان ... جھوٹ ... وہ مجھے گرفتاری دینے کا ... میں ان کو صرف گواہ رکھنا چاہتا تھا۔

سوال: لیکن انھوں نے کہا ہے کہ وہ آپ کے خلاف اغوا کی رپورٹ لکھوائیں گے؟

جواب: ایس ایس پی میرے خلاف ڈاکے اور قتل کی رپورٹ بھی لکھوا سکتے ہیں۔ مگر یہ خود جانتے ہیں کہ جرم وہ ہوتا ہے جس کے چشم دید گواہ ہوں۔ جس کا ثبوت ہو۔ کوئی ... مقصد بھی نہیں ہوتا اغوا زبردستی ہوتا ہے جب کہ جیپ خود چلا کے لائے ہیں اور آپ نے دیکھا بھی تھا ... اندر آئے تھے تو نہ ان کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اور نہ یہ بے ہوش تھے۔

سوال: آپ کے ... ساتھی تھے مسٹر محسن خیبرانی؟

جواب: مجھے ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ ان کی بیوی ... بی صاحب کے گھر میں مقیم ہیں۔ میری ان سے ... ہوئی تھی۔ وہ بھی نہیں جانتے ... ممکن ہے ... محسن کے والد اور ایس ایس پی صاحب کے تعلقات برادرانہ تھے ... مرحوم کی ...

سوال: آپ کے ساتھ ایک خاتون ایڈووکیٹ مس زاہدہ کا نام ...

جواب: میں نے سنا ہے کہ وہ کراچی میں ہیں ...

سوال: آپ کے بارے میں یہ بھی مشہور ہوا تھا کہ آپ نے ایک دہشت گرد تنظیم ایم آر ایس کے نام سے بنائی تھی؟

جواب: یہ سوال کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔

سوال: ... آخر آپ کے ساتھی کون ہیں؟

جواب: آپ سب، تمام محب وطن پاکستانی، تمام انسانیت دوست لوگ، باضمیر صحافی ... پاکستان کے عوام، انصاف اور حق کے علمبردار، کیا اتنے ساتھی کم ہیں؟ اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ میں اور کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔

انھوں نے بہت شور کیا کہ وہ غالب سے بھی کچھ پوچھنا چاہتے ہیں مگر غالب نے کہا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ سوالات کس ترتیب سے ... گئے تھے، درمیان میں کبھی کوئی بولتا تھا کبھی کوئی۔ ایک دو جگہ انکل رضوی نے احتجاج کیا مگر میں نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ البتہ انھوں نے جیپ والی بات کی تردید کی تھی لیکن میں اپنے جھوٹ پر ڈٹا رہا اور ان کا ... تاریخ اور قیاس آرائیاں ... تبصرے اور تجزیے کا سارا کام میں نے اخبار نویسوں پر چھوڑ دیا تھا۔ میں ایم آر ایس کا نام ... اپنے ساتھیوں کی مدد اور پبلک کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا اور میں اس میں کامیاب رہا تھا۔ یہ دلاور اینڈ کمپنی کے خلاف باضابطہ اعلان جنگ تھا لیکن میں نے ان کا نام لینے سے گریز کیا تھا ... بہت پہلے ہی ... کی جگہ بن چکی تھی مگر اب تک پبلک کے سامنے صرف ... مشہور ہوئے تھے ... تھا۔ اپنی ... تصویر کا دوسرا رخ پیش کر دیا تھا۔ یہ پروپیگنڈا بڑی خوش ... عوام کو بہت جلد متاثر کرتا ہے اور اس میں ذرائع ابلاغ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ حالات ... سب کے سامنے آئیں ... ایک تفصیلی ... نہیں ہوتی۔

اخباری نمائندے بڑی عجلت میں رخصت ہوئے۔ ان کو ... جانے سے پہلے بنانا تھی اور وہ سب تصاویر ... مختلف زاویے سے بنائی تھیں ... بہت پہلے جا چکے تھے کیوں کہ انھیں فلموں کی پراسیسنگ کرانا تھی اور ... اخباری ... کا سامنا ہوا آیا۔

"او جی ... " وہ بولا۔

"کس چیز کے ... ؟" میں نے کہا۔

"او جی ... میرا مطلب ہے ... جناب ... "

اپنا مافی الضمیر بیان کرنے سے قاصر تھا اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں نے ... کے معاملے میں اپنی صوابدیدی استعمال کرتے ہوئے پریس کانفرنس کرنے کی اجازت دی ... کی تو اس کا حق خدمت تو ملنا ہی چاہیے۔ صحافی برادری ہمیشہ کی کنگال۔ دوسروں کی دعوت اڑانے والے ... کھایا پیا اور روانہ ہوگئے کہ اب ایس ایس پی جیسے کوتوال شہر کی موجودگی میں غریب چوکیدار کیا بولے گا اور بولے گا تو کوئی نہ کوئی ... ادا کر ہی دے گا ...

ہر قسم کی پریس کانفرنس بلانے والوں کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ پریس کانفرنس کسی بہترین ہوٹل میں بلائیں جہاں کھانے پینے کا بہترین انتظام ہو اور اس بہانے ہی کچھ لوگ آجائیں ورنہ ان کو تحفے تحائف پیش کیے جائیں تاکہ وہ آپ کا نقطۂ نظر لوگوں کے سامنے پیش کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ مگر یہ تو خود صحافی لوگ تھے ... قسمت میں ... پاکستان جیسے ملک میں اسمگلر اور رشوت ... کے پاؤں دبانے والے اور ان کے جوتے اٹھانے والے بھی صحت مند بینک بیلنس کے ساتھ چل سکتے ہیں لیکن صحافی ... ساری عمر قلم گھسیٹتا ہے، دماغ کھپاتا ہے اور خون جلاتا ہے مگر اس سے ... فرق نہیں پڑتا ... شہرت ہی ذریعہ ... اپنی عزت ... جاتے ہیں۔

میں نے چوکیدار کو دو سو روپے پیش کیے تو وہ خوش ہو گیا۔ غالباً اس نے ... ایس ایس پی صاحب کا ... وغیرہ سمجھا ہوگا۔ ابھی تو خود ایس ایس پی صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ یہ بھی پولیس کی ہی جیپ تھی جو ہم نے اٹھا لیا۔

صحافیوں کے جانے کے بعد میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب کیا ہوگا۔ انکل رضوی بہت ... کھڑے ہوئے تھے۔ "ہاں بھئی اب کیا حکم ہے ... " انھوں نے کہا۔

"انکل میں دل سے شرمندہ ہوں۔ ایک مجبوری تھی جس کے تحت میں نے ایسا کیا۔" میں نے کہا۔

"اور وہ مجبوری کیا تھی جس کے تحت تم نے پولیس سے یہ جیپ چھینی تھی؟" انھوں نے طنزاً کہا۔ "تمھارے پاس تو ہر غلط کام کا عذر ایک ہی ہے ضرورت، حالات کا تقاضا یا مجبوری۔ اس کے تمام تم خود ... ہو۔"

"کیا آپ یقین کریں گے کہ یہ جیپ دو ڈاکوؤں سے چھینی تھی جو آپ کی پولیس کے سورماؤں کی وردیاں تک اتار چکے تھے اور ان کا اسلحہ بھی لے آئے تھے۔" میں نے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" انکل نے کہا۔

"میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں انکل۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ سچ نہیں ہے کہ لاہور کی کوٹ لکھپت جیل سے دو ڈاکو نکل بھاگے تھے۔ پائندہ خان اور ... ان میں سے ایک کے لیے سزائے موت پر عمل درآمد ..."

www.paksociety.com

کی تاریخ تک مقرر ہو چکی تھی اور دوسرے کو سزائے موت سنائی جا چکی تھی۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ابھی راستے میں ابھی آیا تھا۔ پولیس نے ان کی گرفتاری کے لیے ناکا بندی کر رکھی ہے۔" وہ بولے۔ "اور متعدد مقامات پر چھاپے مارے ہیں۔"

"آپ بالکل پولیس کے سرکاری ترجمان کی زبان بول رہے ہیں ورنہ کیا آج تک ناکا بندی سے کوئی فائدہ ہوا ہے۔ کہیں چھاپے مارنے سے کوئی مجرم ہاتھ آیا ہے۔ انھیں تو چھاپا پڑنے سے پہلے علم ہو جاتا ہے مگر وہ مطمئن بیٹھے رہتے ہیں۔ پولیس صرف کاغذی رپورٹ دیتی ہے کہ چھاپا ناکام رہا۔ یا سرے سے چھاپا مارنے ہی نہیں جاتی۔ آپ کی ایک ناکا بندی کرنے والی پارٹی کی ان ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔ وہ غالباً کہیں کھانا کھانے کے تیاری کر رہے تھے کہ ڈاکو آ پہنچے۔ ڈاکوؤں نے ان کے ساتھ مل کر کھانا بھی کھایا۔ میں آپ کو مینو بھی بتاتا ہوں۔ مرغی کی قورمہ۔ بھنا ہوا مرغ، پراٹھے اور حلوا۔ ظاہر ہے ایسی مرغن خوراک کھا کے تو نیند ہی آئے گی۔ پھر جنگل کی پرسکون تازہ ہوا۔ جب وہ جاگے تو ڈاکو ان سے سب کچھ چھین چکے تھے۔ چلتے چلتے ڈاکو ان کو ایک اوورسیئر کی گاڑی میں ڈال گئے۔"

"کون اوورسیئر...؟" انکل نے حیرانی سے کہا۔

"مگر انتظار کرو۔ منگورا سے چند میل کے فاصلے پر اس کا آفس ہے اور وہ ہر روز اسی سڑک پر سے آتا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم منگورا سے واپس آ رہے تھے کہ ہمیں وہ گاڑی نظر آئی جس میں اوورسیئر بھی پھنسا ہوا تھا اور آپ کے وہ تھانیدار بھی۔ ایک انسپکٹر اور دوسرا سب انسپکٹر۔"

"تمھیں ان کے عہدے کیسے معلوم ہوئے؟"

"ان کے کاغذات سے۔ ہم نے جامہ تلاشی لی تھی۔" میں نے کہا۔ "یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کون ہیں۔ ڈاکو جیپ لے گئے تھے۔ وہ پولیس کی جیپ میں فرار ہو گئے تھے۔ ہم خود جنگل میں چھپتے چھپاتے آ رہے تھے کہ ہم نے جیپ کو گھنی جھاڑیوں میں چھپا ہوا دیکھ لیا۔ پولیس کی جیپ کو سڑک سے اتنا دور جنگل میں پا کے ہمیں تعجب ہوا۔ ڈاکو شاید کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ شاید اپنے ساتھیوں کا۔ ہم پہنچ گئے۔ انھوں نے پیا اور نکال لیے اور شاید وہ ہمیں شوٹ بھی کر دیتے مگر ہم خود نیچے گر گئے اور سب نے دھوکے لگ کہ ہم تو بہاتی ہیں جو غلطی سے ادھر آ گئے۔ انھوں نے ہماری جان بخشی کی تسلی کی اور ہا لے گئے۔"

"کیا مطلب؟ تم نے قتل کر دیا انھیں؟"

"نہیں انکل۔ ہم نے انھیں آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے زندہ گرفتار کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ان میں اور ہم میں یہی ایک فرق تھا کہ وہ اسلحے کی طاقت پر اتراتے تھے۔ جب تک اسلحہ ان کے ہاتھ میں تھا، ہمارے لیے اپنی جان بچانا ضروری تھا۔ اس لیے ہم نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا۔ ایک کی کلائی توڑی اور بازو کی دو پسلیاں۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے پوچھا تھا کہ یہ جیپ کس سے ملی تو میں نے کہا تھا کہ یہ دوسری اسٹوری ہے۔ ابھی یہ اسٹوری صرف آپ کو معلوم ہے۔ صبح شاید اخبارات میں بھی آ جائے۔ آپ کی پولیس پارٹی کے بیانات کیا فرماتے ہیں۔ ان کو کچھ نہ کچھ بھی پتا چلے گا۔ اور ظاہر ہے وہ اوورسیئر سے بھی اپنے بیانات حاصل کریں گے۔"

"پھر وہ ڈاکو کہاں گئے؟" انکل رضوی نے بے یقینی سے کہا۔

"وہ کہاں جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایم آر ایس کے تھانے میں ہیں۔ جہاں سے کوئی ان کو نکال سکتا ہے۔"

"کیا مطلب! ایم آر ایس کے تھانے سے؟"

"مطلب یہ کہ ہماری تحویل میں ہیں۔ کل پھر ایک ایسا ہی چھوٹا سا پریس کانفرنس ہوگی جس میں ہم خود ڈاکوؤں کو پولیس کے حوالے کریں گے۔" میں نے کہا۔ "اب تو اخبارات میں جانے کیا کیا ہی شائع ہوں گے۔ ہم ہیرو بن کے دکھائیں گے۔ یہ تو آپ جانتے کہ پریس تک ہماری رسائی ہے۔ ہم تین کہانیوں کے ساتھ تصویریں بھی اٹھائیں گے جو پبلک کی نظر میں ہمارا امیج بحال کرنے کے لیے ہیں۔ ہم پبلک کو باور کرائیں گے کہ ہم مجرم نہیں ہیں۔ شکوتی جیسا پاور فل نے ایک سازش کے تحت ہمیں مجرم بنایا ہے۔ اس سازش میں پولیس ان کے ساتھ تھی۔ چنانچہ وہ کسی حد تک کامیاب رہا۔ اب ہم حقائق کو بے نقاب کر رہے ہیں۔ پریس کانفرنس بھی اس لیے ضروری ہے کہ ڈاکو خود حقیقت بیان کر سکیں اور بتا سکیں کہ جب ان کی پولیس سے ملاقات ہوئی تھی تو پولیس ناکا بندی کر رہی تھی۔"

"تم نے انھیں کہاں رکھا ہے؟" انکل رضوی نے کہا۔

"بہت محفوظ مقام پر۔ ان کا علاج بھی ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب تک ان کی ہڈیاں جوڑ کے پلاسٹر چڑھا دیا گیا ہوگا۔ انھوں نے ہمیں بہت بڑی رشوت بھی پیش کی تھی۔ یہ بھی کہا تھا کہ ہمیں شوٹ کر دو یا خود کشی کرنے دو لیکن ہم نے صاف انکار کر دیا اور انھیں بتا دیا کہ وہ قانون کے سزا یافتہ مجرم ہیں۔ انھیں عدالت کے فیصلے کے مطابق سزا ملے گی۔"

"یہ سب تو تم نے اچھا کیا۔" انکل رضوی نے تشویش سے کہا۔ "لیکن ان کو اپنے پاس رکھ کے تم بہت بڑی حماقت کے مرتکب ہو رہے ہو۔ وہ بہت خطرناک ڈاکو ہیں۔"

"میں نے عرض کیا کہ ان کے فرار ہونے کا سوال ہی نہیں۔"

"اوہو... یعنی وہ خود نہیں فرار ہوں گے۔ ان کے ساتھی جو انھیں چھڑا لے جائیں گے، تم سمجھتے کیوں نہیں؟" انکل رضوی نے کہا۔ "ان کے گروہ کا ہر رکن ڈاکو ہے اور ہر ایک نہیں ہوگا۔ ان کے گروہ کا پتا نہیں۔"

"انھیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم اور لوگ کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہ خوش فہمی تم کو لے ڈوبے گی۔" انکل رضوی کی برہمی بڑھ گئی۔ "ابھی وقت ہے کہ انھیں پولیس کے حوالے کر دو۔ پولیس انھیں ہاتھوں ہاتھ واپس جیل پہنچا دے گی۔ کسی دوسری جیل میں منتقل کر دے گی۔ پولیس ان کے گروہوں کا مقابلہ کر سکتی ہے اور ان میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ حملہ کرکے انھیں چھڑا لے جائیں۔"

"آخر وہ کوٹ لکھپت جیل سے بھی نکلے ہی تھے۔"

"وہ کبھی نہ نکل پاتے۔ اگر ان کی مدد اندر سے نہ کی جاتی..."

انکل رضوی نے کہا۔ "جیل کے عملے کو مجبور کر دیا گیا تھا۔"

"رشوت لے کر؟" میں نے طنز سے کہا۔

"نہیں۔ باہر ان کے گروہوں نے جیل کے تین ملازمین کو اغوا کیا اور ان کے خاندانوں سمیت کسی نامعلوم مقام پر لے گئے۔" انکل رضوی نے کہا۔ "کچھ اور لوگوں کو بھی ایسی ہی دھمکی دی گئی تھی کہ ان کو پھانسی ہو گئی تو ان سب کے بیوی بچوں کی خیر نہیں۔ دھمکی کے علاوہ رشوت بھی تھی۔ کچھ لوگ مجبور ہو گئے۔"

"ایسا تو ہر ڈاکو گروہ کر سکتا ہے۔ کیا آپ ان کی دھمکی میں آ کے ڈاکوؤں کو چھوڑتے جائیں گے؟"

"نہیں... ہم عدالت کے فیصلے پر عمل درآمد کرائیں گے۔ ان ڈاکوؤں کے بھی خاندان ہیں۔ ہم ان کے تعاقب میں ہیں اور شاید کل تک سب کو برآمد کر لیں گے۔" انھوں نے کہا۔ "میں تم کو وہ بات بتا رہا ہوں جو صرف پولیس کے اعلیٰ حکام کو معلوم ہے۔ جلد از جلد ڈاکوؤں کو ان کے حوالے کر دو تاکہ ہم اعلان کر سکیں۔"

"اپنی کوششوں کی کامیابی کا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ یہ اعلان کہ ڈاکو پکڑے جا چکے ہیں۔ اگر ان کے ساتھی جیل کے عملے کو اور ان کے متعلقین کو چھوڑ دیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ پانچ میں کی سزائے موت ملتوی کر دی جائے اور اسے خصوصی رعایت کے تحت عمر قید میں تبدیل کی سفارش کی جائے۔"

"کیا قانون میں اس کی گنجائش ہے؟"

"بالکل نہیں۔ جب صدر نے رحم کی اپیل مسترد کر دی تو پھانسی برحق ہے۔" انکل نے کہا۔ "شوکت اتنے بڑے قانون داں نہیں ہو تم۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب کچھ حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ بے شک حکومت قانون بدل سکتی ہے لیکن اس کا ایک طریقہ کار ہے۔ کسی سرکاری افسر یا وزیر کے حکم سے قانون نہیں تبدیل ہوتا اور حکومت بھی قانون کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتی۔ عائلی معاملات میں دخل اندازی کا کیا سوال ہے۔ سپریم کورٹ نے سزائے موت کا فیصلہ بحال رکھا ہو تو صدر بھی خصوصی حالات میں ہی رحم کی درخواست قبول کر سکتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ موت کے فیصلے کو عمر قید میں بدل دے۔ مگر جانے کا اعلان ہے وہ جعل سازی میں آ جائیں گے۔ ہم خود ان ڈاکوؤں سے اپنے ساتھیوں کے نام اپیل کرائیں گے۔"

"یہ آپ کل بھی کر سکتے ہیں۔ ہمیں ٹیک نامی کا ایک امپورٹنٹ اسٹوری کرنے دیں۔" میں نے کہا۔ "ہم پریس کے ذریعے ایک اور دھماکا کریں۔"

"اور اگر رات کو ان کے ساتھی حملہ کر کے تمھیں بھی مار گئے اور ان کو بھی چھڑا کے لے گئے پھر کیا ہوگا؟" انکل رضوی نے کہا۔ "یا انھوں نے دھماکے سے تم کو ہی اڑا دیا پھر...؟"

"انکل! ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہو سکتی..."

"ان کو خبر مل چکی ہوگی۔ ان کے مخبر اور ساتھی ہر جگہ ہیں۔ خود پولیس میں ایسے لوگ ہیں جو ڈاکوؤں سے بھتا لیتے ہیں۔ صرف اس بات کا کہ وہ ڈاکوؤں کو پولیس کی سرگرمیوں سے باخبر رکھیں۔ پولیس کے کسی آپریشن کا ان کو قبل از وقت کیسے علم ہو جاتا ہے۔ پولیس مشرق میں کوئی کارروائی کرنے جاتی ہے تو انھیں خبر مل جاتی ہے کہ مغرب میں میدان صاف ہے۔" وہ بولے۔

"لیکن انکل! ابھی تو نہ پولیس کو معلوم ہے نہ کسی تیسرے شخص کو، میرا مطلب ہے آپ کے سوا؟" میں نے کہا۔

"اور جہاں تم نے ان کو رکھا ہے، آس پاس کے لوگوں نے تو دیکھا ہوگا؟"

پہلے میں نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر مجھے ایک دم اس ڈاکٹر کا خیال آ گیا جسے ہم نہیں جانتے تھے مگر اس نے ڈاکوؤں کو پہچان لیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو۔ اگر وہ نکل گئے تو تم دہرے مجرم ہو گے۔ تم پر گٹھ جوڑ کا الزام آ جائے گا کہ تم نے انھیں پناہ دی اور فرار ہونے کا موقع فراہم کیا۔ ابھی اور اسی وقت ان کو پولیس کے حوالے کر دو۔ اگر تم کو پریس پبلسٹی کا اتنا ہی شوق تھا تو ابھی کیوں نہیں اعلان کر دیا۔ تم ان کو ساتھ لا سکتے تھے۔" انکل نے کہا۔

"یہ بہت مشکل ہو جاتا۔" میں نے کہا۔ "ہمیں بہت چھپ چھپا کے آنا تھا اور آپ کو بھی لانا تھا۔ ہم ڈاکوؤں کو کیسے لاتے۔ وہ اس قابل بھی نہیں تھے کہ آ سکتے اور اگر ہم یہاں لے آتے تو بات وہی ہوتی۔ آپ اکیلے تھے۔"

"میں پولیس کی پوری کی پوری بٹالین لا سکتا تھا۔"

"ایسی صورت میں ہم کہاں جاتے۔ ہماری پریس کانفرنس کیسے ہوتی؟" میں نے کہا۔ "اب آپ صبح تک انتظار کر لیں۔ چند گھنٹوں کی بات ہی تو ہے۔ ہم آپ کو گھر پہ ڈراپ کر دیتے ہیں۔"

انکل نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں صبح تک انتظار نہیں کر سکتا۔ کیا تم کو معلوم ہے کہ مجھے ان ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے خصوصی ٹیم کا

www.paksociety.com

سر پر داغ کر کیا گیا ہے؟ میں ان کو ابھی گرفتار کر لوں گا۔"

"یہ تو آپ کی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "کہ آپ نے چھتیس گھنٹے میں انھیں پھر جیل کے اندر پہنچا دیا۔ تاہم اس کامیابی کو ہم آپ کے ساتھ شیئر کریں گے۔ ہم بھی آپ کو بتائیں گے کہ آپ کو کہاں آنا ہے۔"

"تم مجھے ابھی بتاؤ گے کہ مجھے کہاں جانا ہے۔" انکل رضوی نے ایک دم ریوالور نکال لیا جو انھوں نے قمیص کے اندر چھپا رکھا تھا۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ "میرا خیال تھا کہ آپ کا ریوالور جیپ میں رہ گیا۔"

"یہ عہدہ اس عہدے تک میں کسی کی سفارش سے یا رشوت دے کر نہیں پہنچا۔" انکل رضوی نے کہا۔ "زندگی میں تم سے کہیں زیادہ چالاک اور عیار لوگ ملے ہیں۔ ایسے جو تم کو جیب میں ڈال سکتے تھے، جانیں اور پیچ کھائیں۔ مگر وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔"

"اگر... اگر یہ آپ کے پاس تھا تو... تو آپ نے مزاحمت کیوں نہیں کی؟" میں نے کہا۔ "ہمارے ساتھ کیوں آ گئے؟"

"تمھاری خواہش پوری کرنے کے لیے۔" وہ بولے۔ "میں خود اغوا ہو گیا اور اپنی مرضی سے میں نے اغوا ہونا قبول کیا۔ تمھیں اجازت دی کہ تم اغوا کا ڈراما کرو اور مجھے پولیس کے سامنے پیش کر سکو۔ تم کو سارا معاملہ پولیس کے حوالے کر دینا ہے بلکہ یہ پہنچانا تھا۔ میں خود پولیس کا افسر ہوں سے خطاب کر نہیں سکتا تھا۔ یہ موقع تمھاری وجہ سے مجھے ملا۔ میں نے خود کو مجبور ظاہر کیا اور پولیس سے وہ سب کہہ دیا جو میں کہنا چاہتا تھا اس سے تمھیں بھی فائدہ ہوا اور مجھے بھی۔"

"مجھے... مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کے بیان کی تردید میں جھوٹ بولا۔" میں نے کہا۔ "یہ کہا کہ آپ اپنی جیپ میں ہمیں ڈھونڈنے نکلے تھے اور اپنی مرضی سے آئے تھے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ بولے۔ "اس لیے کہ جیپ میری نہیں تھی۔ میری جیپ تو تمھاری حویلی سے گھر کے قریب ہی کھڑی ہوئی ہے اور اخبار والوں کو کیا پتا کہ یہ جیپ کس کی تھی۔ محکمے کے لوگ تو جانتے ہیں کہ اس جیپ میں کون کہاں گیا تھا۔ میں نے اس جیپ کا نمبر دیکھتے ہی پہچان لیا تھا اور تم سے پوچھا بھی تھا کہ یہ جیپ تمھیں کہاں سے ملی؟ مگر تم نے جواب گول کر دیا۔ میرا اس وقت تک یہ خیال تھا کہ ان ڈاکوؤں نے پولیس پارٹی پر حملہ کر کے انھیں ہلاک کر دیا ہوگا اور تمھیں جیپ لاوارث کھڑی ہوئی ملی ہوگی۔ چونکہ تم منزل کے قریب اسلحے کے ایک ذخیرے کی اطلاع پہلے ہی دے چکے تھے اور یہ پولیس پارٹی اسی طرف گئی ہوئی تھی اس لیے مجھے یہ بات قرین قیاس لگی تھی۔"

"اب آپ دیکھیے گا کہ وہ پولیس پارٹی کیا کہتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور ڈاکو کیا کہتے ہیں۔ وہ ہمارے بیان کی تصدیق کریں گے۔"

"میں ان سب کو معطل کر دوں گا۔ بلکہ ان کے خلاف محکمانہ غفلت کے تحت مقدمات درج ہوں گے۔" انکل رضوی مضطر... "پولیس پارٹی کے ساتھ دو جوان بھی تھے۔"

"جی ہاں... وہ بھی وہیں پڑے ہوئے تھے۔"

"ان کا اسلحہ... وردیاں... سب تمھارے پاس ہے؟" رضوی نے کہا۔

"جی۔ سامان کے ریوالور اور رائفلیں تو ہیں... کارتوس نہیں... جو وہیں بکھرے پڑے تھے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے... وہ بھی میرے حوالے کر دو۔"

"آئی ایم سوری انکل... اس وقت یہ ناممکن ہے۔" میں نے...

"تم اخباری نمائندوں کو بیوقوف بنا سکتے ہو۔" انکل رضوی مضطر...

"میں تم کو اتنی رعایت دے سکتا ہوں۔ وہ جہاں بھی ہیں ان کو ... والے آ سکتے ہیں اور تمھارا بیان وغیرہ سب لے سکتے ہیں۔"

"میں آپ کو مشورہ دے جاتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ اپنی وردی اور اپنے خصوصی اختیارات کے باوجود وہاں داخل نہیں ہو سکتے۔"

"کیا وہ کسی کے گھر میں ہیں؟ تم وضاحت کرو۔"

"وہ ایک ایسی جگہ ہیں جہاں آپ زبردستی داخل ہوئے تو ہو سکتا ہے کہ آپ خود معطل ہو جائیں۔ آپ کے خلاف قانون میں مجرم بھی بری ہو جائے اور کامیابی کا کریڈٹ ناکامی کا ذریعہ شمار ہو۔" میں نے کہا۔

"کیا وہ کسی وکیل کے گھر میں ہیں؟" انکل رضوی نے پوچھا۔

میں ان کی ذہانت پر حیران رہ گیا اور اپنی بے وقوفی پر پچھتایا کہ میں نے ان کو ایسا اشارہ دے دیا جو انھوں نے سمجھ لیا۔

"وہ عبدالودود منظر کے گھر میں ہیں؟" انھوں نے پھر کہا۔ "تم نے میرا کام آسان کر دیا۔ اب میں اس پورے علاقے کا محاصرہ کر لوں گا۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ گرفتار ہو جائیں گے۔"

"اور ہم بھی؟" میں نے اطمینان سے کہا۔

"کیا تم توقع رکھتے ہو کہ میں تم کو یہاں سے کہیں اور جانے دوں گا؟" انکل نے کہا۔ "اس وقت جب ریوالور میری جیب میں تھا۔ میں نے تمھارے اصرار پر تم سے تعاون کیا تھا۔ اب ریوالور تمھاری جیب میں ہے اور تم مجھ سے تعاون پر مجبور ہو۔"

میرا ذہن بہت دیر سے مصروف عمل تھا اور میں صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا۔ میری مایوسی صرف اداکاری تھی۔ انکل رضوی کی بات ختم ہوئی تھی کہ میں نے جھپٹ کر ان کے ریوالور پر ہاتھ مارا۔ میں پہلے سے تیار تھا۔ انھیں جتنا میں سمجھتا تھا اس سے زیادہ وہ مجھے سمجھتے تھے۔ میں اچھل کر جیپ کے بونٹ پر گرا اور رضوی نے ریوالور کا دستہ میرے سر پر مارا۔ میں بری طرح جھکا...

مناظر ... آنکھوں کے سامنے پھیل جاتے اور کچھ دیر جیب کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ غالب محمود اور ... نہ جانے کچھ فرار کرتا۔ اس وقت ہم اس زاویے سے ... ہو چکا تھا ورنہ وہ پھر ... انکل رضوی سے ہم دونوں کو ایک ہی ریوالور سے بے بس کر دیا تھا۔

"چلو... جیب میں۔" میں نے انکل کی آواز سنی۔ "یاد رکھو کہ میں نے زندگی میں کبھی کسی مجرم کو رعایت نہیں دی۔ یہ تو مجھے تم پر گولی چلانا پڑے۔"

میں لڑکھڑاتا ہوا جیپ میں بیٹھ گیا۔ غالب نے میرا سر تھامے رکھا۔ "بس اب زیادہ ہوشیاری نہ دکھانا ورنہ تم چلاؤ گے۔" انکل رضوی نے کہا۔ "میں پیچھے بیٹھوں گا۔ چند منٹ میں تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

میں نے سر کو جھٹکا اور اقرار میں سر ہلایا۔ چند منٹ کا وقفہ پانچ منٹ کا وقفہ بن گیا۔ اس کے بعد میں نے جیپ میں لگی ہوئی چابیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"اپنا رخ میرے گھر کی طرف رکھنا۔" انکل رضوی نے کہا۔ "وہاں سے میں پولیس کی نفری طلب کر لوں گا۔ مجسٹریٹ کو بلاؤں گا تاکہ چھاپا مارنے میں قانونی دشواری کوئی نہ ہو... اور تم سب کے لیے کوئی مشکل پیدا نہ کرو۔"

اپنے پیچھے میں نے ایک قہقہے کی آواز سنی۔ "چلو جی، اپنے ایس ایس پی صاحب، ہم آپ کی مشکل آسان کر دیتے ہیں... کئی بار ڈاکوؤں کو... اب آپ سب اپنے مہمان ہو... کیسی رہی یہ ملاقات اپنے سکندر صاحب... اچھی ہے؟"

مجھے یقین تھا کہ اس آواز کو انکل رضوی نے بھی پہچان لیا ہوگا۔ لہجہ اور انداز ... بالکل ... آواز محسن کی تھی۔ اس وقت میں اپنی وقتی کامیابی کی خوشی کے خاک میں مل جانے کے خیال سے بہت ملول، گرفتہ اور ملول تھا۔ بہت عظیم الشان اور بہت خود غرض ایڈونچر... اور احتیاط کے ساتھ بنائے جانے والے منصوبے کا ایک بہت معمولی، ناقابل فہم اور قطعی ناقابل حفاظت غلطی سے کس طرح چوپٹ ہوتے ہیں، میں نے دیکھ لیا تھا۔ اس وقت میرے لیے امید کی اور ... تو صرف تائید ... مجھ سے ملنے والی کوئی رعایت یا سہولت تھی جس سے فائدہ اٹھا کے ... ایک بار پھر پانسا پلٹ دیں۔ اگر ایسا کوئی موقع آتا تو محسن اور انکل رضوی کے درمیان فنا و بقا کی آخری جنگ ہوتی۔ وہ مجھے کسی رشتے سے کوئی رعایت نہ دیتے اور گولی مار دیتے۔ جو وہ دل پھر کرکے مفرور مجرم سکندر بخت کو شوٹ کر دیتے تو قتل نہ کرتے، بالکل ایسا ہی میں بھی کرتا۔ میرے لیے ان کی شخصیت قابل احترام تھی اور ان کی اصول پرستی ان کے کردار کی بہترین صفت تھی لیکن موجودہ حالات میں

سوال یہ تھا کہ کیا اہم ہے۔ سب سے اہم میری آزادی اور زندگی تھی جو بھی مجھ سے میری آزادی چھیننے کی کوشش کرتا یا میری زندگی کی راہ میں مزاحم ہوتا وہ میرے نقطہ نظر سے صرف دشمن تھا اور یہ حساب کا سیدھا سادہ سوال تھا کہ مرتا ہو تو کسے مرنا چاہیے۔ مجھے یا انکل رضوی کو؟ اور میرے فارمولے سے اس کا صرف ایک ہی جواب آتا تھا کہ مجھے ہر جذباتی رشتے کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ایس ایس پی کو قتل کر دینا چاہیے۔ کسی بھی ایس ایس پی کی پوسٹ خالی نہیں رہتی۔ رضوی نام کا ایک شخص قتل ہوتا ہے تو اس سے ایک عورت بیوہ ہوتی ہے یا دو بچے یتیم ہوتے ہیں اور ایک خاندان بدبختی کے اندھے غار میں گرتا ہے۔ میری موت سے ایم آئی کی قوت کمزور پڑتی تھی اور ہمارا مشن ناکامی سے دوچار ہو سکتا تھا کیونکہ میری جگہ فوری طور پر دوسرا کوئی لینے والا نہیں تھا۔ یہ مشن ناکام ہو جاتا تو ہزاروں لاکھوں عورتیں اور بچے بیوہ اور یتیم ہوتے اور وہ دشمن کامیاب ہوتے جن کو رضوی صاحب کا تعاون ابھی تک پہنچا تھا بھی نہیں تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ بغیر لڑے قانون کے سامنے ہتھیار ڈالنا بھی موت ہے۔ پھر میں آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرکے کیوں نہ مروں... جہاں جینا یا جان لینا جنگ میں کوئی جذباتی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔ مگر فیصلے کا لمحہ آجاتا تو صرف ایک زندہ گھر پہنچ سکتا تھا، رضوی صاحب یا میں۔

لیکن وہ فیصلہ کن اور آزمائش کا لمحہ آنے سے پہلے محسن آ گیا۔ اس وقت میں نے یہ بالکل نہیں سوچا کہ آخر محسن کو یہاں کس نے بھیجا۔ اس کا آنا کچھ غیبی تائید سے مربوط تھا یا یہ محض اتفاق تھا اور اس سے قادر مطلق کے کسی فعل کو جواز کی ضرورت نہیں کہ اس نے یہ کیوں کیا اور کیسے کیا۔ اس کی ذات کے مددگار ہونے پر میرا یقین ہمیشہ غیر متزلزل رہا تھا۔ آج بھی زندہ تھا اور میرا ساتھ دینے والے دوست وفادار تھے تو اس میں میرا کوئی کمال نہ تھا۔ وہ ایسا ہی چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوا تھا۔ خوشی سے میرا دل بھر گیا اور میرا حوصلہ پہلے سے دوچند ہو گیا۔

انکل رضوی بیخود ہو گئے۔ "کیا تم مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہو محسن؟"

"نہیں انکل! آپ کو دھوکا دینا آسان نہیں اور مجھے بہت ڈر لگتا ہے آپ سے۔" محسن بولا۔

"تم لوگ اب بڑی روانی سے جھوٹ بولنے لگے ہو۔" رضوی صاحب نے طنز سے کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ تم کو اب کسی کا بھی خوف نہیں رہا۔"

"باقی باتیں ہم راستے میں بھی کر سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "کیا آپ یہ ریوالور..."

"نہیں... اسے نہیں دوں گا۔" رضوی صاحب نے کہا۔

www.paksociety.com

"تم چھین سکتے ہو تو چھین لو مگر اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ میرا نشانہ سکندر پر ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ تم ریوالور چھین لو اور میں سکندر کی جان لے لوں۔"

انکل رضوی کا لہجہ پُر یقین تھا اور وہ ذرا بھی توقف زدہ نہیں تھے۔

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں انکل!" محسن نے بے بسی اور عاجزی سے کہا۔

"نہیں... نہ میں تمھاری بات سمجھ سکتا ہوں، نہ تم میری بات سمجھتے ہو۔ یہ اس لیے ناممکن ہے کہ تمھاری اور میری سوچ کی سمت بالکل مختلف ہے۔" انکل رضوی نے کہا۔ "اس لیے یہ کوشش بھی فضول ہوگی کہ ہم ایک دوسرے پر اپنے نظریات اور اپنے مقاصد مسلط کرنے کے لیے بحث کریں یا توقع کریں کہ ہم میں سے کوئی ایک صرف باتوں سے دوسرے کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ نہیں، مان لو ایسا ہوگا اس وقت یا تو میں اپنی نوکری اور وردی چھوڑ کے تمھارے ساتھ چل پڑوں گا یا تم خود کو پولیس کی تحویل میں دے دو گے۔"

"آپ اس وقت وردی کی اور فرض کی مجبوری کی بات نہ کریں انکل کیونکہ ہم آپ کے لیے صرف مطلوب و مفرور مجرم ہی نہیں..."

"تم میرے لیے اور کچھ نہیں..."

"کیا آپ جذباتی رشتوں کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتے؟"

محسن نے برہمی سے کہا۔ "میں نہیں مان سکتا، ہر زندہ شخص احساس رکھتا ہے۔"

"میرے لیے پہلے اپنی ذمے داریوں کا احساس ہے، پھر جذباتی رشتوں کا اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔" انکل رضوی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں اس تمام عرصے میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ مجھے ذرا بھی خوش فہمی نہ تھی کہ میری پھرتی اور چالاکی میرے کام آ سکتی ہے اور میں انکل رضوی کو دھوکا دے کر ان سے ریوالور چھین سکتا ہوں یا اس ریوالور سے نکلنے والی گولی کا نشانہ بننے سے بچ سکتا ہوں لیکن محسن کی بحث نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ بحث بے مقصد تھی مگر وہ اسے بلاوجہ طول نہیں دے رہا تھا۔ اگر وہ وقت ضائع کر رہا تھا تو اس کا بھی کوئی مقصد ضرور تھا جو ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ غالب خستہ حال اپنی شکستہ ٹانگ اور قیودی سکنے کے باعث بے عمل اور غیر فعال ہو چکا تھا چنانچہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر لاتعلق پڑا ہوا تھا اور اس کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا کہ خود کو تقدیر کے فیصلے پر چھوڑ دے۔

"انکل آخر ہم آپ کے کزن ہیں!" محسن نے لجاجت سے کہا۔ "ہم سکندر کے والد آپ کے کتنے عزیز..."

"وہ سب مجھے ہمیشہ عزیز رہیں گے، ان کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہو سکتا۔" انکل رضوی نے کہا۔

"پھر ہم آپ کو عزیز کیوں نہیں ہیں؟"

"اصل بات تو یہ کہ تم بھی مجھے اتنے ہی عزیز ہو، عزیز ہو، اس سے مجھے کچھ امیدیں ہوتی ہیں۔" انکل رضوی نے کہا۔ "بیٹا اگر تمھاری ہی عمر کو پہنچ کر وہ سب کرنے لگے جو میرے کے مطابق غلط اور غیر قانونی ہو تو میں اس کو یہ رعایت نہ سکتا کہ وہ قانون کو تماشا بنائے اور رو جائے کہ پھر سے خون کا رشتہ تسلیم کروں گا مگر وہ قتل کرے گا تو اسے بھی لے جاؤں گا۔ اس کے بعد اگر صدمے سے مر جاؤں تو اور بات ہے۔"

"ٹھیک ہے انکل!" محسن نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ اتنے ہی مجبور ہیں تو ہم آپ کی مجبوری سے فائدہ نہیں..."

محسن نے پیچھے سے اپنا ریوالور آگے بڑھایا اور رضوی صاحب کے سامنے کر دیا۔ رضوی صاحب نے بہت محتاط بائیں ہاتھ سے ریوالور وصول کیا مگر دائیں ہاتھ کے ریوالور کا زاویہ وہی رکھا اور اپنی نظر کو وہیں مرکوز رکھا۔ وہ بھی سمجھتے تھے کہ ہم چالاک لوگ ہیں اور پلک جھپکنے سے پہلے بازی الٹ دینے کے ماہر ہیں۔ وہ کسی قسم کا رسک لینے پر تیار نہ تھے اور مجھے یقین تھا کہ انھیں سکندر بخت کی لاش بھی لے جانا پڑی تو وہ کر گزریں گے۔ ان کا عزم مجھے ان کی آنکھوں کی بے حسی سے اور ان کے لہجے کی یکسوئی میں نظر آ رہا تھا۔ خود محسن نے یہ بات سمجھ لی تھی اس نے جو کچھ کیا وہ انتہائی ذہانت کا مظاہرہ تھا۔

ابھی انکل رضوی نے محسن کا ریوالور ضبط کر لینے کی کامیابی پر اطمینان کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ ایک گولی آئی اور ہاتھ سے ریوالور اڑا کے لے گئی۔ میں نے اس وقت بالکل نہیں سوچا کہ یہ گولی کس نے چلائی تھی اور کہاں سے چلائی تھی جیسے ہم کو قائل کر دینا چاہا... پھر گولی کی آواز نے مجھے متحرک کر دیا۔ جو ریوالور انکل رضوی کے ہاتھ سے نکلا میں نے وہ اٹھا لیا لیکن ریوالور دوسرے ہاتھ میں پکڑا تھا، انکل رضوی کے ہاتھ کی گرفت ابھی ریوالور پر بہت مضبوط تھی۔ محسن نے کچھ کہا جو میں نے نہیں سنا۔ اب میرے اور رضوی صاحب کے درمیان دست بدست لڑائی چل رہی تھی۔ میں نے ان کے ریوالور والے ہاتھ کو نیچے دبا رکھا تھا تاکہ گولی چلے تو نیچے جائے۔ ان کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ میں نے ریوالور سے دیکھا تو وہ

جھکے جا رہے تھے۔

یہ کام غالب نے کیا تھا۔ اس نے چپکے چپکے پیچھے سے انکل کے سر پر کوئی چیز ماری تھی۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو اتنی دیر میں وہاں بھیڑ لگ جاتی اور فائر کی آواز پر بھگدڑ مچ جاتی لیکن رات کے سناٹے میں اس سڑک پر سے گزرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں سے کسی نے چلا کے پوچھا "کون ہے؟" پھر پولیس کی سیٹی سنائی دی اور محسن ایک دم جیپ میں بیٹھ گیا۔

"چلو۔ فوراً نکل چلو یہاں سے۔" محسن نے کہا۔

"تم انکل رضوی کو سنبھالو۔" میں نے کہا۔ "میں بیک وقت دو کام نہیں کر سکتا۔"

"غالباً گشت کرنے والی پولیس آ رہی ہے۔" غالب نے تشویش سے کہا۔

"انھیں میں روک لوں گا۔" محسن بولا اور نیچے اتر گیا۔

"کیسے روک لو گے؟" غالب نے کہا۔ "اور کیا عقل مندی ہے؟ آدھی رات کو پولیس تعاقب میں ہے؟"

پولیس آ جاتی تو مقابلہ ناگزیر ہو جاتا مگر دو منٹ میں ہم نے سب ٹھیک کر لیا۔ غالب کے ساتھ انکل رضوی کو ڈال دیا گیا اور محسن نے ڈرائیونگ سنبھالی۔ میں نے غالب کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا سا دیکھا جو لوہے کا پائپ ثابت ہوا۔ جیپ کا ٹول باکس پیچھے تھا اور جس وقت محسن اور انکل رضوی کے درمیان گفتگو چل رہی تھی، غالب اس ٹول باکس کو آواز پیدا کیے بغیر کھول کر اس میں کوئی ایسی چیز تلاش کر رہا تھا جو ہتھیار کے طور پر استعمال ہو سکے۔ غالب نے بعد میں بتایا کہ ویسے تو ٹول باکس میں ایک ہتھوڑی بھی تھی لیکن اسے ڈر تھا کہ اس کی ضرب مہلک ثابت نہ ہو جائے۔ اس نے پائپ مارتے وقت بھی ایک بار خدا سے اس گناہ کی معافی مانگی تھی اور دعا کی تھی کہ اس کا وار ضرورت کے مطابق ہو، ایسا بھی نہ ہو کہ انکل رضوی کا سر پھٹ جائے اور ان کی جان چلی جائے اور ایسا بھی نہ ہو کہ بے ہوش کرنے کی کوشش رائیگاں چلی جائے۔ وہ کامیاب رہا۔ اگر وہ کامیاب نہ ہوتا تو محسن بھی طے کر چکا تھا کہ اپنے ریوالور کا دستہ مار کے انکل رضوی کو ناک آؤٹ کر دے گا۔ اس نے بڑی عقل مندی سے ایک ایسا منصوبہ بنایا تھا کہ پوری طرح ہوشیار رہنے والے انکل رضوی بھی اس سے دھوکا کھا گئے۔ محسن کا نشانہ کبھی خطا نہ ہوتا تھا۔ غالب اس فن میں سر فہرست تھا اور بلاشبہ اڑتی چڑیا کے پَر گن کر کسی بھی پرندے کا بے خطا نشانہ لے سکتا تھا۔ دوسرا بھی ایسا ہی ہو سکتا تھا یا پھر ہیڈ ہنٹر ہی کر محسن کے اندازے کے مطابق ریوالور کے جدید پانچویں فائر پر تھا لیکن ابھی اس نے گولی سے ہاتھ کے ریوالور کو اڑا دیا تھا مگر وہ تو بے خوابی کی نذر آ گئی تھی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے مشکل سے چار فٹ کے فاصلے سے نشانہ لیا

تھا۔ اس کی سب سے بڑی کامیابی رضوی صاحب کے ذہن کو ذرا سی دیر کے لیے غیر حاضر کرنا تھی جیسے میں ان سے ایک ریوالور لے کر مطمئن ہو گیا تھا کہ انھیں غیر مسلح کر دیا ہے۔ ایسے ہی ان کے ذہن نے بھی تسلیم کر لیا تھا کہ محسن سارے ہتھیار ان کے حوالے کر چکا ہے۔ یقین حاصل ہونے میں محسن کی باتوں کو بھی دخل تھا۔ انکل بھول بیٹھے تھے کہ وہ جذباتی ہو کے شکست قبول کر رہا ہے۔ درحقیقت ایسا نہ تھا۔ محسن نے دوسرا ریوالور ہاتھ میں رکھتے ہوئے یہ تاثر دیا تھا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی اور رضوی صاحب بھی اُسی چال سے مات کھا گئے تھے جو انھوں نے میرے خلاف چلی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ انکل رضوی نے اپنی طاقت کو ظاہر کرنے میں عمداً تاخیر سے کام لیا تھا اور دوسرا ریوالور فوراً نہیں نکالا تھا۔ شاید اسی کوتاہی نے ان کی کامیابی کا تختہ مسمار کر دیا۔

جب ہم جائے واردات سے دور نکل آئے تو میں نے کہا۔ "کیا آپ بتائیں گے۔ اس راز سے پردہ اٹھانا پسند کریں گے کہ غیب سے آپ کا ظہور اچانک کیسے ہوا؟" میں نے کہا۔

"ہم ہر جگہ الیسم کا پہنچتے ہیں، کیونکہ ہم بہت پہنچے ہوئے صاحب کشف و کرامات ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اللہ کا حکم ہوا کہ اپنے مصیبت میں گرفتار دوستوں کو دشمن کے پنجے سے چھڑا لیں، ہم آ گئے۔"

"مجھے شعلہ نے بتایا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"کیا تم نے شعلہ کو بتایا تھا کہ تمھارا پروگرام کیا ہے؟" محسن بولا۔

"میں نے اسے بتایا تھا کہ ہم منظور کے گھر میں ہیں۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں تو منظور کے گھر گیا ہی نہیں۔" محسن بولا۔ "اور تم لوگوں نے منظور کو بھی اس جگہ کا پتا نہیں دیا تھا۔"

"اچھا بھائی! آپ کو ہم نے صاحب کشف و کرامات مانا۔" غالب نے کہا۔ "اب آپ بتا دیں کہ آپ فلمی ہیرو کی طرح کیسے صحیح وقت پر نازل ہو گئے؟"

"یہ محض اتفاق نہیں تھا دوستو۔" محسن نے ہنس کر کہا۔ "مجھے شعلہ سے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ تم منظور کے گھر پہنچے ہو۔ میں نے منظور کو فون کیا تو وہ چلانے لگا کہ کیا تم اور کیا تمھارے ہم زاد اور ہم زاد، سب میرے گھر آ کے مصائب کی مثال بن کے نازل ہوتے ہو۔ اکیلے آتے تب بھی کم نہ تھا۔ اپنے ساتھ راہ میں ملنے والی ہر مصیبت بھی اٹھا لاتے ہیں اور مزید مصیبتوں سے شوق فرمانے میں لگے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کہاں اور کس طرف، تو منظور نے کہا کہ اب یہ تو خود اُن کے فرشتے بھی نہیں جانتے کہ ان کی نیت کیا ہے اور وہ کس مشن کا رُخ کر کے نکلے ہیں تو مغرب کی سمت نہیں جائیں گے مگر میں نے غالب کو چلا چلا کر اخبار والوں سے باتیں کرتے سنا تھا۔ اس نے پہلے تعلقات اسٹیڈیم کی بات کی تھی مگر بعد میں کہا تھا کہ راشد

www.paksociety.com

آجاؤ۔ مستقل کی بات سن کر میں نے سیدھا یہاں آجانا مناسب سمجھا۔ تم لوگ یہاں سے نکلتے تو میں قذافی اسٹیڈیم جاتا۔ یہاں بھی مجھے گھوم پھر کے دیکھنا پڑا تو تم لوگ پچھلے حصے میں نظر آئے اور تمہارے ساتھ رضوی صاحب کو دیکھ کر میں چکر میں پڑ گیا۔ بالآخر میں نے طے کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر رضوی صاحب اپنی مرضی سے آئے ہیں تو مجھے کچھ نہیں کرنا ہے۔ صرف تم سے معلوم کرنا ہے کہ کیا ڈراما تھا۔ اور اگر تم ان کو اغوا کر لائے ہو تو پھر مجھے کسی بھی ناپسندیدہ صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"یہ شک تمہیں کیوں ہوا کہ ہم رضوی صاحب کو زبردستی لائے ہوں گے؟"

"اس لیے کہ میں نے شہلا سے پوچھا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ انکل رضوی کو سکندر بھائی نے فون پر کچھ کہا تھا اور وہ چھاپا مارنے کی نیت سے قذافی اسٹیڈیم گئے ہیں۔ یہ بات انھوں نے اپنی بیوی کو بتائی تھی تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔ آنٹی نے ہمیشہ اپنے شوہر کی فرض شناسی کو نبھایا ہے یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ کس قسم کے شوہر ہیں اور کس قسم کے افسر ہیں۔ لیکن انکل چلے گئے تو وہ کچھ پریشان نظر آرہی تھیں۔ شہلا کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ کیوں پریشان ہیں۔ انکل رضوی جیسے افسر اور مجرموں کو گرفتار کرنے کے لیے پہلے بھی وقت بے وقت چھاپے مارنے جاتے رہے تھے اور یہ آنٹی کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ پریشانی ان کو یہ اندیشہ کر رہا تھا کہ انکل محسن اور سکندر کو گرفتار کرنے گئے ہیں اور وہ بار بار کہہ رہی تھیں کہ سکندر اور محسن بے قصور ہیں۔ آخر کیا ضرورت تھی ان کو ایس پی صاحب سے بات کرنے کی۔ اس بات سے شہلا کو بھی پریشانی لاحق ہو گئی۔ تاہم اس نے آنٹی کو تسلی دی اور بتایا کہ محسن اور سکندر اتنے بے وقوف بہرحال نہیں ہیں کہ خود پولیس کو کسی جگہ بلائیں اور گرفتار ہو جائیں۔ وہ گرفتار ہونا چاہتے تو کیا گھر نہیں آسکتے تھے۔ میرے ذہن میں شہلا کی بات رہی کہ تم نے کسی خاص مقصد کے تحت انکل رضوی کو قذافی اسٹیڈیم بلایا ہے۔ جب مستقل سے بات ہوئی تو صورت حال کھل کر سامنے آگئی۔ تم پہلے قذافی اسٹیڈیم جانا چاہتے تھے مگر کسی وجہ سے تم نے اپنا پروگرام بدل دیا۔ ایس ایس پی صاحب تم کو گرفتار کرنے کی غرض سے چھاپا مارنے کے لیے قذافی اسٹیڈیم جانا چاہتے تھے مگر بیچ میں گئے۔ راستہ تو گلا میں ماس سے اور کیا نتیجہ اخذ کر سکتا تھا میں؟ اس بات کا امکان کم تھا کہ وہ جتنی خوشی تمہارے ساتھ آگئے ہوں۔ چنانچہ میں نے جیب میں سے دوسرا پستول بھی نکال لیا جو اس گنگو نے کیپٹن کے ... میں پڑا ہوا تھا۔ میں قریب آکے کچھ نہیں سن سکتا تھا لیکن دور سے ایسا لگتا تھا کہ کچھ سوال جواب ہو رہے ہیں۔ تم کوئی پروگرام چلا رہے ہو اور جو کچھ بھی ہوا اخباری نمائندے سے ہیں۔ یہ عجیب سا لگا۔ میں سمجھ رہا تھا تم کس نے پریس کے سامنے جانے پر مجبور کیا؟ رضوی صاحب نے یا کسی جنگلی کی موت نے پہلی بات شکل کی تھی چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ تمہیں پریس کانفرنس بلانا پڑی۔ اور یہ کام ہمارے محکمہ کی مدد سے ہوا۔ میں جیپ کے قریب موجود رہا اور جب تم اسٹیج تو جیپ کے پیچھے چھپ گیا۔ اگر سب ٹھیک ہوتا تو میں جیپ کے سوار ہونے سے پہلے نمودار ہو کے کوشش بجھاتا لیکن میرے اس خیال کی تائید بہت جلد ہو گئی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس کے بعد میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا اور جو تم نے دیکھا۔"

"تیری حاضر دماغی اور جرأت پہ ہم تجھے اگر آج انسپکٹر سے ترقی پا کر دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ میں بعد میں وصول کروں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ کیا کرنا ہے؟" محسن نے کہا۔ "انکل کو کہاں پہنچانا ہے؟"

"ان کے گھر، اور کہاں۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے ہمیں انکل کے گھر پہنچنا ہے۔" میں نے کہا۔ "غالب کی حالت خراب ہو رہی ہے۔"

"یہ شیر آخر ہے، دوران میں کیسے جا گھسا؟" محسن بولا۔

"سب اس کی تقدیر کا قصور ہے۔" میں نے کہا۔ "دل لگا اس سراپا ناز سے جس کا شیوہ ہی دھول دھپا ہے۔ ٹانگ پھنسا بیٹھا اس جنجال میں۔"

غالب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔ اگر اسے وقت پر صحیح طبی امداد مل جاتی تو اب تک وہ خاصا سنبھل چکا ہوتا لیکن پہلے تو سپاہی کے فرائض میں نے سر انجام دیے اور اپنی دواؤں کے سہارے یہ وقت گزار دیا جو دستیاب تھیں۔ جب ڈاکٹر ملا تو غالب نے پریس کانفرنس کے جواب میں [illegible] کی تجویز کہ اب وہ درد کی شدت کے ساتھ وہ بخار میں تپ رہا تھا لیکن اپنی تکلیف کو خاموشی سے برداشت کر رہا تھا۔ اس کے لیے شکیے بہت [illegible] تھے کیے چھوٹے اور بار بار ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے میں کتنی اذیت تھی۔ اس کا میں صرف اندازہ کر سکتا تھا مگر وہ تو ساری اذیت خود جھیل رہا تھا۔

مستقل کے دروازے پر جیپ رکی تو میں نے کہا۔ "انکل کو [illegible] یہ اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ تم غالب کے ساتھ مستقل کے گھر جاؤ۔ میرا انتظار کرو۔ صبح ہونے میں ابھی چار گھنٹے ہیں۔ میں انکل کو چھوڑ کر ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔"

"یار غالب بے ہوش ہو گیا ہے۔" محسن نے کہا۔

"کوئی بات نہیں، یہاں ایک ڈاکٹر ہے۔" میں نے کہا۔ "اس سے کہنا کہ فوراً مرہم پٹی اور علاج شروع کر دے۔ [illegible] میں بہت نکل جاتا ہو گا۔ [illegible] یہاں چلنے سے دو سماں بھی ہیں۔ ان کی طرف سے بھی خطرہ [illegible]"

ہم آہستہ آہستہ تقریباً سرگوشی میں بات کر رہے تھے [illegible] چاہتا تھا کہ مستقل کا دوست ڈاکٹر ٹھہر جائے [illegible] مجھے پولیس کی [illegible]

بیٹا لیکے اور یہ دیکھ کر اس جیپ میں کوئی اور بھی بے ہوش پڑا تھا۔ پہلے میں نے غالب کے ساتھ نہیں اتارا بلکہ اپنے ساتھ سے [illegible] وہ انکل رضوی کی صورت دیکھ لیتا تو بعید نہیں یہ ہو سکتا تھا کہ وہ ان کی تصویر دیکھے اور شناخت کرے۔ وہ مجھ سے وابستی احتیاط۔ یہ سوال بھی کر سکتا تھا کہ پولیس کی اس جیپ میں جس کے ساتھ وہ ان تھا اور اسے ہی کہاں چھوڑ آیا۔ وہ جیپ کہاں گئی؟ وہ مستقل کے تعلق سے پہلے ہی ایک غیر قانونی کام میں ہماری مدد کر رہا تھا۔ پولیس کی جیپ اور ایس پی پولیس سے مشتبہ قسم کا تعلق دیکھتے ہی وہ گھبرا جاتا تو ہمارے لیے مسائل کھڑے کر دیتا۔

میں نے غالب کو آہستہ آہستہ جیپ سے اتارا اور مستقل کے گھر کے دروازے پر لٹا دیا۔ پھر میں جیپ لے کر روانہ ہو گیا جس کی پچھلی سیٹ پر اب صرف انکل رضوی لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے پتا تھا کہ وہ ہوش میں آنے ہی والے ہوں گے اور جب وہ مجھے اکیلا پائیں گے تو کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ پیچھے سے مجھ پر حملہ کریں یا چلتی جیپ سے کود جائیں۔ میں ان کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

قریب ترین جگہ غالب کا آبائی گھر تھا جس کا جلا ہوا کھنڈر مجھے رات کی تاریکی اور ویرانی میں زیادہ ہی ڈراؤنا آسیب لگا۔ میں نے جیپ کو اس کے پچھلے حصے میں روکا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں مجھے جلے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کے فریم نظر آئے۔ میں نے گاڑی اور ہیڈ لائٹس بند کرنے کے بعد انکل رضوی کو کندھے پہ ڈالا اور ایک کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں ایک رات دلہا اور تازہ دلہن سوئی تھیں۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر بیٹنے سے بچا ہوا تو لوگ اٹھا لے گئے ہوں گے۔ دھماکے سے وہ کمرا مسمار ہو گیا تھا جس میں محسن اور شہلا نے رات گزاری تھی۔ میں نے یادوں کو اپنے تصور میں جاگتے اور تصویر کی صورت میں متحرک ہوتے دیکھا۔ یہاں کیا کچھ نہ ہوا تھا۔ ناقابل فراموش وہ کیفیت مجھے یاد آئی جب ان کو ایک بچے نے دہشت زدہ کر دیا تھا تو میرے لبوں پہ بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسی جگہ سے ہمارے مصائب کا آغاز ہوا تھا۔ [illegible] ہو گیا تھا۔ غالب کے اعزہ نے اسے بڑے ارمانوں سے بنایا تھا۔ بڑے فخر سے سجایا تھا اور بڑی امیدوں کے ساتھ یہ بوڑھے غالب کے چھوڑ گئے کا سوچا تھا۔ غالب یوں اس کا وارث ہوا کہ لاوارث ہوا۔ گھر بھی اور گھر کا رکھوالا بھی۔

انکل رضوی کے کراہنے کی آواز پر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ہوش میں آچکے تھے اور میں نے انھیں مجبوراً فرش خاک پہ لٹا دیا تھا۔ [illegible] احتیاط لازمی تھی جس نے مجھے محفوظ رکھا ورنہ میں [illegible] تھا کیسا سر چھپٹ جاتا اور جب ہوش [illegible] سے بندھا ہوا کسی پولیس والے کی [illegible] انکل رضوی نا امیدی میں اسی طرح لیٹے ہوئے تھے مگر میں نے نوٹ کیا کہ ان کی پوزیشن کچھ بدل گئی ہے۔ میں نے ان کو فرش پہ سیدھا رکھا تھا مگر اس وقت وہ کروٹ لیے پڑے تھے اور غالباً اسی دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے جدھر سے میرے آنے کی امید تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ان کا ایک ہاتھ کچھ پھیلا ہوا ہے اور اس ہاتھ میں آدھی اینٹ ہے۔ بغیر پٹ کے دروازوں اور کھڑکیوں سے آنے والی روشنی کافی تھی ورنہ میں یہ سب نہ دیکھ پاتا۔

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں ایک قدم دروازے میں نمودار ہوتے ہی فوراً سائڈ میں ہو گیا اور پھر جست لگا کے نکل گیا۔ وہ اینٹ بعد میں اس دروازے کے فریم سے گزری جو رضوی صاحب نے بڑی قوت کے ساتھ ہاتھ گھما کر پھینکی تھی۔ انھیں دوبارہ یہ موقع نہیں ملا میں ان کے سر پہ جا کھڑا ہوا۔

"مجھے بہت افسوس ہے انکل۔"

"شٹ اپ۔ افسوس تو اب مجھے ہو رہا ہے کہ میں تمہارا انکل ہونے سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔ بیٹا ہوتا تو عاق کر دیتا۔" انھوں نے برہمی سے کہا۔

"ایک دن آئے گا جب آپ اس تعلق پہ بھی فخر کریں گے۔"

"وہ دن آنے سے پہلے ہی میں تم کو مار دوں گا یا تم مجھے مار دو گے۔" ان کا غصہ قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ "میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا کسی مجرم سے۔ مجھے اتنی پریشانی نہیں کہ میری پوزیشن کو اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا تم پہنچا چکے ہو صرف اس لیے کہ تم سیدھی راہ پہ چلنے کو [illegible] سمجھتے ہو۔ تم اچھا کرتے ہو اگر [illegible] لیتے۔"

"میں اچھائی برائی کی [illegible] بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ صاف طور پر آپ کی اور میری پوزیشن کا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کے رویے نے بالآخر مجھے بھی اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ میں بھی رشتوں کو نظر انداز کروں اسی طرح جیسے آپ کرتے ہیں۔ آپ میرے ساتھ وہ سلوک کرتے آئے ہیں جو کسی بھی مجرم کے ساتھ ہونا چاہیے۔ کیا اس کے بعد مجھے یہ حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ میں بھی آپ کے ساتھ عام مجرموں کی طرح پیش آؤں۔ آپ کے ساتھ وہی کروں جو کوئی بھی مجرم کسی بھی ایس ایس پی کے ساتھ کر سکتا ہے؟"

"تو کرو۔ کس نے روکا ہے تمہیں۔" وہ دہاڑ کر بولے۔

"کاش یہ میرے اختیار میں ہوتا کہ میں آپ کی شفقت اور محبت اور آپ کے احسانات کو فراموش کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "مشکل تو یہ ہے کہ آپ بھی ثابت قدم نہیں۔ آپ کے وجود کے دونوں حصوں میں سے کوئی ایک مکمل طور پر غالب نہیں۔ آپ ہر وقت ایس ایس پی رہتے ہیں مگر تمام وقت نہیں۔ جب انکل رضوی بنتے ہیں تو شہلا کو گھر میں رکھتے ہیں۔ بیوی اور کمتر کے لیے انسانی ہمدردی"

www.paksociety.com

اور شرافت کے معیار بنائے ہیں اور انھیں بھی صرف ہم سے تعلق کی بنا پر گھر میں معطل بنا لیتے ہیں۔ جانتے ہو پھر تحقیق کی سہولت فراہم کرتے ہیں کہ وہ حملات سے نکل سکے اور اسے قبول کر سکے لیکن گھر سے کارروائی آپ نے کیوں ٹال دی تھی آخر۔ اپنے تو [illegible] آئندہ ورثہ پر کیوں نہیں رکھا آپ نے؟ ایس ایس پی تو کسی کو بھی رعایت نہیں دیتا۔"

وہ شکست خوردہ اور مضمحل سے بیٹھے رہے۔ "شاید اب مجھے مستعفی ہو جانا چاہیے۔ میں کمزور پڑنے لگا ہوں۔ اپنے فرض کے ساتھ وفاداری میں پہلے کی طرح مستقل مزاج نہیں رہا۔ میں مفاہمت کرنے لگا ہوں اور میرے رویے میں لچک پیدا ہونے لگی ہے۔"

"آپ اس احساس کو ختم نہیں کر سکتے انکل کہ آپ صرف ایس ایس پی ہی نہیں ایک اچھے انسان بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ روبوٹ نہیں ہیں۔ آپ کے سینے میں ایک دل ہے جو حساس ہے اور محبت کرنے والا ہے۔ اس کو آپ نکال کر نہیں پھینک سکتے۔ اس سے آپ کی نیت کی خرابی ظاہر نہیں ہوتی۔ آپ جہاں تک ممکن ہوتا ہے اصول پرستی اور فرض شناسی کے صبر آزما راستے پر گامزن رہتے ہیں مگر انسانی فطرت کی کمزوریاں اور خامیاں آپ کے ساتھ بھی ہیں۔ بے عیب تو بے شک صرف خدا کی ذات ہے۔ آپ جو کچھ کرتے ہیں وہ آپ کی عقلی نفسیاتی مجبوری ہے۔"

"معلوم نہیں۔" وہ بے خیالی میں بولے۔ "مجھے بتاؤ اب میرے بیٹے تم نے کیا سزا تجویز کی ہے؟"

"کچھ نہیں۔ یہاں سے آپ گھر جائیں گے۔ اس کے بعد جو آپ مناسب سمجھیں وہ کریں۔" میں نے کہا۔ "میں آپ سے کوئی درخواست نہیں کروں گا۔ منزل کے گھر چھاپہ نہ مارنا خود آپ کے حق میں بہتر ہے ہم آپ کو وہاں نہیں ملیں گے۔"

"میرے لیے اتنی مشکلات مت پیدا کرو بیٹے کہ میں حوصلہ ہار جاؤں۔ تم آخر کب تک مفرور ہوتے رہو گے؟" انکل رضوی نے کہا۔

"مفرور نہیں بنے جا رہے۔" میں نے کہا۔ "ہم صرف بے بس اور لاچار ہونا نہیں چاہتے۔ آپ کا قانون ہمیں تحفظ فراہم کر سکتا ہے اور نہ ان دشمنوں کو روک سکتا ہے جو ہماری تلاش میں ہیں۔ اس لیے ہم چھپ کر رہنے پر مجبور ہیں۔ مفرور ہوتے ہیں مجرم، بزدل اور کسی سے ڈر کر بھاگنے والے۔"

"کیا تم اور کیا تمہارا جہاد؟ اکیلا چنا بھاڑ پھوڑنے کا دعویٰ کرنے لگا ہے؟" انھوں نے تلخی سے کہا۔ "خود کو بچا نہیں سکتے۔ ملک کو دشمنوں سے بچانے نکلے ہیں۔ چند لڑکیاں اور چند لڑکے۔"

میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "کیا آپ اب تک ہماری تمام جد و جہد کو اور کامیابیوں کو خیالی سمجھتے ہیں؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "آپ کے خیال میں یہ سب جھوٹ ہے۔ قلمی کہانی ہے۔ [illegible] کا اڈا۔ سائیں [illegible] کی خانقاہ کا ٹھکانا [illegible] وغیرہ یہ سب کیا آپ کے محکمے کی کارکردگی کے باعث تباہ ہوئے؟ [illegible]

جو کچھ [illegible] ثبوت ہے۔ آپ کو تو وہاں سے [illegible] اور غیر ملکی ایجنٹوں کی لاشیں تک ملی ہوں گی۔ کس کی کارروائی تھی [illegible] اور اب کل تک آپ کو منگوال کے [illegible] تفتیش [illegible] کے بارے میں علم ہو جائے گا۔" میں اتنا مشتعل تھا کہ چیخنے لگا تھا۔ [illegible] کرنے کا رویہ ہی اتنا اشتعال انگیز تھا کہ میں جذبات پر قابو [illegible] یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی [illegible] کی چاہت صرف ہوس ہے [illegible] کوئی الزام لگا [illegible] کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے [illegible] رضوی ایسا نہیں کر سکتے تھے۔

یکلخت مجھے ہوش آ گیا۔ میں ان کی چال کو سمجھ گیا [illegible] مشتعل کر کے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کرنا چاہتے تھے۔ غصے کی حالت میں آدمی کا ذہن معطل ہو جاتا ہے [illegible] بھی آسانی سے ہوتا ہے۔ اس وقت انکل رضوی مجھ سے [illegible] پر مقابلہ کر کے نہیں جیت سکتے تھے لیکن کوئی نفسیاتی [illegible] ہار کا سبب بن سکتی تھی۔ یہ بات سمجھنے کے بعد میں مسکرانے لگا۔

"آئی ایم سوری انکل! [illegible] آپ کو اسی جگہ چھوڑ کے جا رہا [illegible]"

"تمہیں [illegible] ہونے کے لیے مہلت چاہیے؟" رضوی نے کہا۔

"جی ہاں! کم سے کم چار گھنٹے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔" وہ بولے۔ "میں چار گھنٹے سے پہلے کچھ نہیں کروں گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ کو چاہنے والا آپ کے لیے [illegible] یہ کبھی اعتبار نہیں کر سکتا [illegible]"

"تم افلاطون ہو [illegible] تم کیا کرو گے؟ مجھے یہاں باندھ کر [illegible] لو گے؟" انھوں نے [illegible] لہجے میں کہا۔

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا مطلب واضح تھا کہ میں یہی کر سکتا ہوں۔ سب ایسا ہی کرتے ہیں [illegible] میرے لیے [illegible] دیکھنے کے [illegible] یا خواب آور گولیاں دے کر سلا دیتا لیکن یہ طریقے میرے [illegible] نہ تھے۔

"میں [illegible] نہیں چاہتا [illegible] کہ تم ایسا کرو۔" انکل رضوی نے [illegible] کہا۔

"چاہتا تو میں بھی نہیں انکل [illegible] مگر [illegible]"

"مگر [illegible] محبت اور جنگ میں سب جائز ہے [illegible]"

"اور دشمن پر بھروسا کرنا تم نے نہیں سیکھا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا [illegible] لیکن اچھا ہے اگر تم اعتبار کی کوئی صورت نکال لو۔ [illegible] تم نہیں چاہتے [illegible] اس ذلت آمیز سلوک سے بچ جاؤں جو تم کر سکتے ہو [illegible] مگر میں نہیں چاہتا کہ تم ایسا کرو۔" انھوں نے [illegible] بات کہی۔

"اگر آپ کوئی ایسی صورت پیدا کر دیں تو یہ مجھ پر احسان ہو گا۔" میں نے [illegible] سے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ میں قسم نہیں کھاتا۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

"ویسے کے حالات میں خدا کی قسم کھانا بھی میرے مسلک کے خلاف ہے۔" انکل رضوی نے کہا۔

"آپ... آپ اپنے ضمیر کی قسم کھا سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں وہ کچھ سوچتے رہے۔ [illegible] قسم کا پابند بھی کر سکتا [illegible] جیسے قسم توڑنے کے لیے وہ کوئی اخلاقی جواز فراہم نہیں کر سکتے۔ قسم توڑنے کی [illegible] میں کوئی سزا نہیں۔ عادتاً قسم کھانے والے [illegible] خدا اور رسول کی قسم کھا کے بھی شرمسار نہیں ہوتے۔ مذہب نے قسم توڑنے کا کفارہ رکھا ہے اور انسانی مجبوری [illegible] حالات میں قسم توڑنے کی اجازت دی ہے مثلاً اس وقت جب جھوٹی قسم کھانے سے کسی بے گناہ کی زندگی بچائی جا سکتی ہے۔ موجودہ صورت حال میں اس کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ شرعاً یہ غلط ہوتا کہ وہ خدا کی قسم کھا کے کچھ نہ کرنے کا وعدہ کرتے اور میرے جاتے ہی ایس ایس پی بن کے احکامات جاری کرنے لگتے۔ بلاشبہ [illegible] کبھی مشکل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے [illegible] یہ [illegible] کہ قسم انھوں نے حالت جبر میں ایک قیدی کی حیثیت سے کھائی تھی [illegible] قانون کے پابند [illegible] با اختیار ایس ایس پی [illegible] میرے خیال میں صرف ضمیر کو گواہ بنا کے [illegible] قسم کھا سکتے تھے [illegible] وہ مجرم [illegible] اور نہ [illegible] ان کا اپنا ضمیر انھیں معاف نہ کرے [illegible] حالت کا تھا۔

"مجھے منظور ہے۔ میں اپنے ضمیر کی قسم کھا کے وعدہ کرتا ہوں کہ [illegible] بجے تک اسی جگہ خاموش بیٹھا رہوں گا۔" انکل رضوی نے [illegible] کہا۔

"ٹھیک ہے انکل! اب میں یہ جوا کھیلوں گا صرف یہ دیکھنے کے [illegible] انسان کا ضمیر زندہ ہے یا نہیں؟" میں نے [illegible] بات [illegible] انسان کی ہے اور ابھی تک آپ کے انسان ہونے [illegible] آپ ایس ایس پی بھی ہیں۔"

"جس دن انسانیت کا ضمیر جلنے لگا اس دن دنیا ایک ایسی خوفناک جہنم ہو گی جس پر شیطان حکمران ہو گا اور اس کی رعایا میں بھی صرف شیاطین ہوں گے۔" انکل رضوی نے کہا۔

"میں آپ کے الفاظ یاد رکھوں گا۔" میں نے ان سے مصافحہ کیا اور باہر نکل آیا۔ اس وقت میرے دل کی کیفیت اس جواری کی طرح تھی جس نے آخری داؤ پر اپنا سب کچھ لگا دیا ہو اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہو کہ ایسا کر کے اس نے اچھا کیا یا برا۔ باہر آنے کے بعد بھی میں تذبذب اور بے یقینی کا شکار رہا۔ عقل نے کہا کہ رضوی صاحب بھی شکاری ہیں۔ وہ بھی اپنا ایک جال رکھتے ہیں۔ دھوکے فریب کے پھندے لگاتے ہیں۔ اس کے بغیر وہ قانون کی محافظت کے فرائض کی انجام دہی میں ناکامی سے بھی دوچار ہو سکتے ہیں۔ ان کا واسطہ شریف لوگوں سے نہیں، اخلاقی مجرموں سے پڑتا ہے جو ضمیر کا مفہوم بھی نہیں سمجھتے۔ دل کہتا تھا کہ کسی انسان کا ضمیر دھوکے باز نہیں ہوتا جب وہ مجرموں سے بات کرتے ہیں تو قانون کی زبان بولتے ہیں۔ ضمیر کو درمیان میں نہیں لاتے۔ انھوں نے آج ضمیر کی ضمانت دی ہے۔ اس ضمانت کو ضبط کرا کے وہ ضمیر کے قیدی ہو جائیں گے اور بے ضمیر ہو کے جینا ان کو منظور نہ ہو گا۔

یہی کشمکش تھی جس نے دو بار میرے قدم روک لیے۔ میں نے سوچا کہ پلٹ کر جاؤں اور دیکھوں کہ کیا وہ اپنے وعدے پر قائم رہ کر [illegible] ہمت رکھتے ہیں اور اسی طرح وہاں خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک جلتے ہوئے [illegible] میں۔ لیکن میرا ضمیر آڑے آ گیا۔ اس نے مجھے شرمندہ [illegible] اعتماد کی بات کر کے [illegible] خود پر اعتبار نہیں کر [illegible] تو اپنا اعتبار بھی کھو دو گے۔ میں چلتا گیا۔ جیپ کے انجن کی آواز [illegible] گونجتی رہی جیسے وسوسوں اور اندیشوں کے جنگل میں بھٹکنے والے [illegible] آسیب پاگل ہو۔

ایک بار پھر میں نے جیپ کو منزل کے گھر سے [illegible] چوٹ پر کھڑا کیا جو دو گھروں کی دیواروں کے حصار میں تھا۔ وہاں سے چند منٹ کا فاصلہ پیدل طے کر کے میں نے منزل کے دروازے کو بجایا۔ اس مرتبہ دروازہ کھولنے کے لیے آنے والا [illegible] تھا۔

"کہاں چھوڑا انکل رضوی کو؟" وہ میرے پیچھے دروازہ بند کر کے بولا۔

"غالب کے خانۂ ویراں میں۔" میں نے کہا۔

"انھیں ہوش تو نہیں آیا تھا؟"

"نہیں..." میں نے مختصر ترین وقفے میں جھوٹ بولنے کا تہیہ کر لیا۔

"ان کو باندھ کر ڈال آئے تھے کہیں ایسا نہ ہو..."

"یار! عقل سے اتنا بھی پیدل نہیں ہوں۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"غالب کیسا ہے؟"

www.paksociety.com

"جیسا پہلے تھا... بے ہوش..." محسن نے میرے ساتھ ڈرائنگ روم کا فاصلہ طے کیا۔ "خطرے کی بات نہیں ہے۔"

ڈاکٹر شہریار مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ وہ غالب کو قالین پر لٹائے اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بڑی مہارت اور مستعدی کے ساتھ غالب کی ٹانگ پر پٹی لپیٹ رہے تھے۔

"سمپل فریکچر تھا۔" وہ میری سوالیہ نظریں دیکھ کر بولا۔ "ایکسرے وغیرہ کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں نے پلاسٹر چڑھا دیا ہے۔ دو ہفتے تک احتیاط ضروری ہوگی۔"

"آپ کا مطلب ہے... دو ہفتے تک چلنا پھرنا بند۔" میں نے کہا۔

"مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ اس ٹانگ پر زور نہیں پڑنا چاہیے۔ ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔" وہ بولا۔ "لوگ یہی غلطی کرتے ہیں کہ بیساکھی کے سہارے گھومنے پھرنے لگتے ہیں۔ پریکٹس ہوتی نہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ کبھی تو خود گر پڑتے ہیں اور زیادہ نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ سمپل فریکچر کو کمپاؤنڈ بنا لیتے ہیں یا شفا یابی کے عمل کو سست کر لیتے ہیں۔ کبھی حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں کسی آدمی یا کھمبے سے، موٹر سائیکل یا دیوار سے ٹکرانا بھی حادثہ ہے اور فٹ پاتھ سے ٹھوکر کھانا بھی۔"

میں نے سر ہلایا۔ "اور یہ بے ہوشی..."

"یہ ابھی دو تین گھنٹے میں ختم ہو جائے گی... جب درد کم ہوگا۔" وہ پٹی لپیٹتے ہوئے بولا۔ "تاہم آرام ضروری ہے۔"

"آپ دوائیں وغیرہ لکھ دیں۔" میں نے کہا۔ "تاکہ یہ جہاں بھی ہے علاج جاری رہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ غالب یہاں نہیں رہے گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "خود ان کے الفاظ ہیں۔ ایک چھوٹے سے [illegible]"

"آپ تو خوش ذوق آدمی ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "پھر آپ کے سامنے بھی ہے۔ اس فولادی شکنجے سے نجات دلانے کی صورت بھی نکالیے۔"

"میں تو سرجن ہوں۔" وہ بولا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ ٹانگ کاٹ کے شکنجے سے الگ کر دوں۔ شکنجے کو کاٹنے کا کام لوہار کر سکتا ہے۔ [illegible] ٹانگ کاٹ دے [illegible] اور دونوں کو الگ کر دے۔"

"آپ دلچسپ آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہنستے کھیلتے اتنے مشکل کام کر سکتے ہیں۔"

"کیا؟ میرا پیشہ کسی ٹوٹی پھوٹی کار کو دیکھ کر پریشان ہو سکتا ہے یا جذباتی ہو سکتا ہے کہ کیسی نئے ماڈل کی کتنی خوب صورت کار تھی جو تباہ ہو گئی۔ پریشان صرف کار کا مالک ہوتا ہے۔" ڈاکٹر شہریار نے کہا۔ "میکینک تو اسے اپنی مہارت کے لیے ایک چیلنج سمجھتا ہے اور اسے پھر اصل حالت میں لا کے ویسی ہی دوسری کاروں میں شامل کر چکا ہے۔ ہم بھی ڈرائیونگ میکینک ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس ٹوٹے پھوٹے آدمی لائے جاتے ہیں۔"

"اب کتنا وقت اور لگے گا؟" میں نے کہا۔

"تقریباً ایک گھنٹہ۔" وہ بولا۔

میں نے دونوں ڈاکوؤں کو دیکھا۔ وہ سکون سے سو رہے تھے لیکن کبھی کبھی خواب میں تڑپ کے کراہنے لگتے تھے۔ خواب آور دوائیں بھی ان کے لاشعور سے پھانسی کے پھندے کا خوف دور کرنے میں ناکام رہی ہوں گی کہ وہ سہمے ہوئے تھے۔ موت کے ناگزیر ہاتھوں کی بے رحم گرفت سے نجات تقدیر کا ایک مذاق بن گیا تھا اور وہ گھڑی کی سوئیوں کو [illegible] پہنچنے سے قبل ہی پھر وہاں تھے جہاں سے چلے تھے۔ [illegible] ایک فریب خیال سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ موت اٹل تھی اور [illegible] کا راستہ روک چکی تھی۔ جینے کی امید ایسی ہی تھی جیسے [illegible] جھلک صبح کی جو درحقیقت صبح نہیں ہوتی۔ اس کے بعد پھر اندھیرا چھا جاتا ہے اور صبح صادق کے ساتھ ہی جلاد آ پہنچتا ہے جو [illegible] اشارے سے سانس کی ڈوری توڑ دیتا ہے اور دائمی اندھیروں میں مستغرق کر دیتا ہے۔

میں، محسن اور منظور ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ غالب نے محسن کو بتایا تھا کہ ہم اپنے ساتھ کیا انسانی مصیبت اٹھا لائے [illegible] مگر ابھی تک اسے تفصیلات کا علم نہ تھا۔ میں نے [illegible] اختصار سے کام لیتے ہوئے اپنی قید سے رہائی، منظور الہی [illegible] غالب کے ایک شکنجے میں پھنسنے، پھر پولیس سے [illegible] اور ڈاکوؤں کے ہاتھ آنے تک کے واقعات سنا دیے [illegible] اور منظور کو اپنی پریس کانفرنس کی روداد سنانے میں [illegible] پون گھنٹا گزر گیا تھا۔

"معلوم نہیں تم لوگ کیا کر رہے ہو اور کیوں کر رہے ہو؟" [illegible] فریاد کناں لہجے میں کہا۔ "اے بابا چھوڑو یہ سارے چکر [illegible] ہر سال بچے بناؤ، پیسہ بناؤ، گھر بناؤ... نام بناؤ۔"

"نام منظور ہے، توفیق کے اسباب بنا۔" میں نے کہا۔

"بگل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا۔" محسن نے [illegible] میں کہا۔

"وہ سب چیزیں بنانے سے کچھ نہیں ہوتا، جو تم بنانا اور جس بنانے کا مشورہ مجھے دے رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"وہ سالا پاگل ہے جو تم کو مشورہ دے کہ تم خود پاگل ہو۔" [illegible] نے جھلا کے کہا۔ "قسم خدا کی کسی دن تنگ آ گیا تو [illegible] کر دوں گا۔"

"یار، بچوں کا باپ کچھ نہیں کر سکتا۔" محسن نے کہا۔

"سوائے تیرھواں بچہ پیدا کرنے کے۔" میں نے [illegible]

[illegible] کا عدد منحوس ہوتا ہے دوست۔ انگریز تک اسے تسلیم کرتے ہیں۔ [illegible] بہت مشہور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں تیرھویں منزل نہیں ہوتی۔"

"بھائی [illegible] نہیں، وہ بتاتے ہی نہیں۔" محسن بولا۔ "تم بھی تیرھویں [illegible] اگلا بچہ چودھواں ہونا چاہیے... بیوی کو سمجھا دو۔"

وہ ہنسا۔ "[illegible] مجھے ہی والا تھا کہ میں نے اس کو روک لیا اور [illegible] ہم اب دو گھڑی کے مہمان ہیں۔ اب جائیں [illegible] تو پھر نہ جانے کب آئیں گے۔"

"[illegible] گولیوں [illegible] تھا۔" منظور بولا۔

"رات کے وقت [illegible] سے پہلے ساتھ رقیب کو لے سکے۔" میں نے کہا۔ "آپ سے یہاں خدا کرے سے پہلے خدا کرے کر لوں۔"

"تم لوگ واقعی خبطی ہو۔ ادھر بم بارود، مار دھاڑ، قتل و غارت گری کو کشتی سمجھتے ہو۔ ادھر شادی کی جان نہیں چھوڑتے۔ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ سب چور، ڈاکو، قاتل اور تخریب کار، دہشت گرد اور شرپسند کوئی بھی واردات کرنے سے پہلے دیوان غالب سے فال نکالتے ہیں۔" منظور بولا۔

"ہم صبح کا تارا ہیں۔" میں نے کہا۔ "روشنی ہونے سے پہلے ہی غائب ہو جائیں گے۔ مرزا غالب کو ہم نے ایک جگہ [illegible] تاہم ویسے کے لیے منتخب کر لی ہے اور وہ تمہارا [illegible] نہیں ہے۔ ان ڈاکوؤں کو ہم بقلم خود پولیس کی تحویل میں دے دیں گے۔ پہلے صبح کے اخبار میں پولیس کا بیان دیکھ لینا۔"

"قسمت کو کون جانتا ہے۔" منظور آہ بھر کے بولا۔ "ہو سکتا ہے صبح بیان سے پہلے تمہیں پولیس حوالات میں دیکھے۔"

"ہماری وصیت سن لو۔" میں نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ [illegible] یہاں ایس ایس پی رضوی صاحب کی آمد متوقع ہے۔ عرف عام میں اسے بھایا کہا جاتا ہے۔ ان کے سامنے یہ ظاہر کرنا کہ [illegible] باحسن نامی کسی شخص کو تم نے خواب میں بھی نہیں دیکھا اور غالب... غالب کون؟ ان کا ذکر تم بھی کرتے ہو تو اسی لیے کہ ایک شوہر اور وکیل ہو۔ ممکن ہے وہ سرچ وارنٹ وغیرہ کے ساتھ دھاوا بولیں۔ اپنے سامنے بیوی بچوں کو دکھا دینا اگر [illegible] ہو دکھانا اور [illegible] ہم برآمد نہیں ہوں گے اور تم ایس ایس پی صاحب سے وہ سب کہہ دو گے جو تمہیں کہنا چاہیے [illegible] حرام ہے۔ پولیس راج ہے اور [illegible] دوسری بات یہ کہ [illegible] نہیں ہے۔ وہ تم سے وقتاً فوقتاً [illegible] ہم اس سے براہ راست بات نہیں کر سکتے۔ [illegible] کا کام کرو گے۔ اس کے پیغامات [illegible] اور ہمارے پیغامات اسے اسی طرح [illegible] اور اس کا [illegible] آج کل کراچی میں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی تمہیں فون کریں۔ ان سے پتا لینا اور جب ہماری کال آئے تو ہمیں بتا دینا۔"

"بہت بہتر۔" منظور بولا۔ "آج سے وکالت کا پیشہ ترک کرتا ہوں اور ٹیلی فون آپریٹر کے فرائض سنبھالتا ہوں۔ سارے مقدمات تو شوق سے بھاڑ میں جائیں۔ ان کے لیے پھر وقت ہی کہاں ہوگا۔"

"یار اتنی بڑی بات پہ چڑ گئے ہو اور حوصلہ ذرا نہیں۔ ہم جیسے [illegible] کے برابر ہو۔" محسن بولا۔

"اور وہ محاورہ درست مان لیا جائے کہ ایک اکیلا دو گیارہ تو پھر تم گیارہ کے برابر ہوئے۔" میں نے کہا۔ "گویا تم منظور الیون ہو۔ ایک ٹیم ہو۔"

"میں کچھ نہیں، الو کا پٹھا ہوں، پاگل کا بچہ ہوں۔"

"یہ تو تمہارے بارے میں حقیقت بھی کہہ سکتے ہیں۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "تم کو اس انکسار کی کیا ضرورت ہے۔ صبح کا اخبار ضرور پڑھنا۔ آج بھی اور کل بھی۔ اور تم کو یہ دیکھ کر خوشی ہوگی کہ تمہارے دوستوں نے ایک قابل فخر کارنامہ سر انجام دیا ہے اور [illegible] جیل سے فرار ہونے والے دونوں مجرموں کو زندہ گرفتار کر کے ہم پولیس کے [illegible] کے۔ اس کے بعد ہم چلے جائیں گے کراچی۔ یہاں کے معاملات تمہارے سپرد کر کے۔"

"کچھ تمہارے سپرد [illegible] رضوی صاحب کے [illegible]" محسن بولا۔ "[illegible] کی ماں تم نہیں بن سکتے۔ [illegible] وکیل تم بیکار ہو گئے۔"

"کیسا وکیل اور کہاں کا مقدمہ۔ بس تاریخوں پہ تاریخ لینا ہی میرا کام رہ گیا ہے۔" منظور نے کہا۔ "عدالتیں بھی کب تک ڈھیل دیں گی۔"

"تمہارا یہ دوست ڈاکٹر شہریار کس حد تک بھروسے کے قابل ہے؟ تم نے اسے بہت کچھ بتا دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم اس پر اتنا ہی بھروسا کر سکتے ہو جتنا مجھ پہ۔" منظور نے کہا۔ "جذباتی اور سرپھرا جوان ہے۔ میری بیوی کے لیے جان دے سکتا ہے۔"

میں اور محسن ہنس پڑے۔ "[illegible] رقیب کو ابھی تک مقتول نہیں کیا تو نے؟"

"رقیب نہیں... وہ سالا ہے۔" منظور بولا۔ "یہ کچھ جذباتی اسٹوری ہے۔ اس کی ایک بڑی بہن تھی جسے شوہر نے قتل کر دیا تھا۔ شادی کی رات۔ بعد میں قاتل کو پھانسی ہو گئی۔ اس صدمے نے ماں کو تقریباً پاگل کر دیا تھا۔ بیٹا بڑا ہوا تو عجیب نفسیاتی مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اس کی ماں نے میری بیوی کو دیکھا تو اسے دورہ پڑ گیا۔ شہریار نے بعد میں مجھے بتایا کہ میری گھر والی کی صورت ایک سو ایک فیصد اس کی بیٹی یعنی اس کی بہن کی صورت ہے۔ اس نے کچھ مدد مانگی کہ میری بیوی تھوڑی سی توجہ دے

www.paksociety.com

تو اس کی ملی نارمل ہو جائے گی۔ عورتیں اس معاملے میں بڑی جذباتی اور رقیق القلب ہوتی ہیں۔ تین مہینے میں بڑی بی نے مجھے رنگ روپ لا کر دیا ہے اور اب ذہنی طور پر مطمئن ہیں کہ پانچ بچوں کی ماں اسی کی بیٹی ہے۔ اتنے سارے نواسے نواسیاں مفت میں مل گئے اور بیوی کا شوہر بھی کہتا تو خود کو نارمل ہے مگر وہ بھی بالٹی کے چکر میں ایسا پڑا کہ اب دونوں بہن بھائی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں اور بات وہی ہے کہ چوہدری کا بھائی اک طرف۔ بیوی اپنی محبت کو پہلے پانچ بچوں میں تقسیم کرتی تھی اور بچی کچھی محبت مجھے مل جاتی تھی۔ اب یہ ایک خلائی ٹوجا اور مزید شامل ہو گیا ہے تو میرا نمبر واقعی بہت پیچھے ہو گیا ہے۔ تاہم مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں خود کام میں اتنا الجھا رہتا ہوں کہ بیوی سے محبت [illegible] کروں اور بیوی تھی عجیب تھی۔ اب تو گھر کی ہری بھری کھیتی ہے۔ اچھا ہے اس کا بھائی ہی کچھ محبت کر لے۔"

سوالی میں اتنا خوب ہوتا تھا۔ اس کی بات نے ہمیں تھر پارکر کی طرف سے بے فکر کر دیا۔ اسی وقت وہ ہمارے پاس آ گیا۔

"میرا کام تو ختم ہوا۔" وہ بولا۔ "اب کچھ دیر سوتا ہوں۔ صبح پھر آ کے دیکھوں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" محسن نے کہا۔ "ہم جا چکے ہوں گے۔"

ڈاکٹر شمسہ پیارے نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ "اچھا، تو پھر میں دوائیں لکھ دیتا ہوں۔" اس نے ہمارے قریب میز کے ایک کاغذ پر چند سطریں گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"ہمیں منظر نے آپ سے متعارف کرا دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وقت ہوتا تو..."

"سارا مسئلہ ہی وقت کا ہے۔" وہ مسکرایا۔ "وقت ہوتے ہوئے بھی اپنا نہیں ہوتا۔ خیر کبھی وقت ملے گا تو بیٹھ کے گپ شپ کریں گے۔ یار زندہ صحبت باقی۔" وہ اٹھا اور اپنے بیگ کے ساتھ باہر نکل گیا۔ کلاک نے ساڑھے تین بجے کا ایک گھنٹا بجایا۔ مجھے انکل رضوی کا خیال آیا۔ کیا وہ اب بھی اسی اندھیرے میں اپنے ضمیر سے کیے ہوئے وعدے کی آبرو نباہنے کے لیے کھڑے ہوں گے۔ [illegible] بے اختیار ہو گیا۔ صرف اپنے آپ کو مقام انسانیت پر رکھنے کے لیے۔ انہوں نے رضاکارانہ طور پر چار گھنٹے ایک ایسی جیل میں گزار دیے تھے جس کی نہ دیواریں تھیں نہ سلاخوں والے مقفل دروازے نہ پہرہ دار تھے اور نہ تالے۔ اگر انہوں نے ضمیر کی زنجیر توڑ دی ہوتی تو اب تک یقیناً اپنی سپاہ کے ساتھ حملہ کر چکے ہوتے۔ ان سے بنیادی نظریاتی اختلاف رکھنے کے باوجود میرے دل میں ان کے لیے احترام کا جذبہ پہلے سے زیادہ روشن ہو گیا۔

"ہمارے پاس تقریباً ستائیس ہزار روپے نقد ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک گھر میں ہم نے پندرہ سو [illegible] امانت ہے لیکن جس کی وہ امانت ہے [illegible] ابھی اس وقت خدا نخواستہ ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ [illegible] میں نقد رقم کتنی ہے؟"

"اب تو شاید... ایک لاکھ یا کچھ کم ہو گی۔" [illegible]

"وہ رقم کہیں مل سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... رابعہ کے دستخط کیے ہوئے دو چیک میرے پاس پڑے ہیں۔"

"کل یہ رقم نکلوا لو۔" میں نے کہا۔ "اس سے [illegible] شمسہ جمشید کو بھی حق تھا۔"

"وہ رقم دو [illegible] ایک لاکھ ہے۔ اس کا [illegible] کوئی چیک نہیں اور اچھا ہے کہ وہ چار لاکھ [illegible] بولو۔ کبھی تم لوٹ کر آ گئے اور اپنا گھر بسایا تو [illegible]"

"ایک لاکھ میں تم سے کل لے لوں گا۔" [illegible] ہم پہنچے ہیں۔"

ڈاکٹر باہر گئے تھے اور [illegible] میں نے اور محسن نے جیب میں ڈالا۔ [illegible] تھی کہ وہ افراد کو کوئی [illegible] سنبھالا اور جی سے [illegible] سے مسائل حل کر دیتے تھے۔ وہ شور [illegible] کسی کام سے نہیں کرتا تھا [illegible] دوستوں کی مدد کرتے [illegible] تھا کہ اس طرح خود اس کی پوزیشن [illegible] قلادی پھنسنے سے نجات پانے کا مسئلہ ابھی باقی تھا۔ ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے مسائل کے لیے ایک [illegible] مہلت کافی تھی۔

"دن کے کہاں جانے میں اس جیپ کو لے کر [illegible] ہو گا۔" میں نے کہا۔ "تو مجھے ڈر ہے غازی خان پہنچا سکتا ہے [illegible] سمیت روپوش ہو جاؤ۔"

"جیپ کو کہاں لے جاؤں؟" محسن بولا۔

"یہ سوچنے کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "رضوی صاحب تو صبح ہنگامی حالت کا اعلان کریں گے۔ [illegible] لگے [illegible] جانے ملنے کا ذرا بھی امکان ہو گا۔"

"ہم اس پر گرد ڈال کے راستے کہیں بھی کھڑا کر سکتے ہیں۔" میں نے اس تجویز کو پسند کیا۔ "مگر کہاں ہے؟"

"بہت سی گاڑیوں میں کھڑی ہو گی [illegible] گی۔ ہر گھر میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی۔" محسن بولا۔ [illegible] گیراج استعمال کرنے والے سب کار [illegible]

"مطلب یہ کہ ہم ایک کو چرا لیں گے؟"

"ہم [illegible] کے پیچھے سے کار بھی چرانے کا مشورہ رکھتے ہیں یا نہیں [illegible] بار پہنچے ہیں؟" محسن نے کہا۔ "ایک گھر جو [illegible] سے کار والا [illegible] جائے گا۔ وہ دوسرا گھر خرید لے گا۔ ایک گھر اس کی طرف [illegible] محفوظ آزادی؟"

[illegible] آسانی سے حل گیا اور آسانی سے آثار بھی لیا گیا۔ مسئلہ اب یہ تھا کہ جیپ کو کہاں کھڑا کیا جائے اور محسن اپنے دونوں [illegible] کے ساتھ کہاں چھپ کر رہے۔ خود مجھے اس وقت [illegible] کے گھر پہنچنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ سب سے پہلے [illegible] کی خواہش کے مطابق اکیلا جاؤں اور اپنے بیوی کی آنکھوں کے [illegible] کے لیے تین ہزار روپے دوں۔ میرا غالب کو ساتھ لے [illegible] اور اس کی [illegible] بیوی کی تیمار داری میں دینا ایک طرح کا سودا ہو جاتا۔ غازی خان مشکل میں پڑ جاتا۔ وہ تین ہزار لینے سے انکار [illegible] اور غالب کی ذمے داری بھی بڑی خوشی سے قبول کرتا۔ تین [illegible] جب اس کی دیکھ بھال کرنے کے بعد وہ محسوس کرتا کہ اس نے کسی حد تک [illegible] احسان کا بدلہ چکا دیا ہے مگر [illegible] یہ خیال بھی آ سکتا تھا کہ [illegible] تین ہزار دینے کا مقصد ہی اس کے [illegible] شامل کرنا تھا۔ غالب کے پاؤں میں اٹکے ہوئے شکنجے کو دیکھ کر اس کے دل میں شک پیدا ہو سکتا تھا اور اگر اسے وفاداری سے شکنجے کو کاٹنے کا انتظام بھی کرنا پڑتا تو وہ سمجھ جاتا کہ وہ کام غلط تھا۔ اتنا ہی غلط جتنا جیل سے فرار ہونے والے [illegible] کی ہتھکڑی بیڑی کا کاٹنا۔ [illegible] تین ہزار روپے رشوت بن جاتے۔ میں ایک نیکی کو رشوت بنا کے خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اس کا حل مجھے فوراً مل گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو چار بجنے کے پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی پینتالیس منٹ تک ہم ایس ایس پی [illegible] رضوی صاحب کے منتظر تھے۔ ابھی وہ گھر نہیں پہنچے ہوں گے تو ان کی بیگم بھی رات آنکھوں میں کاٹ رہی ہوں گی۔ شمسہ بھی تشویش کے باعث جاگ رہی ہو گی۔ ان سے بات کرنے کا یہ بہترین وقت تھا۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں نے جیپ کو روک لیا۔ سڑک تاحد نظر سنسان پڑی تھی اور ہم اسپتال کے علاقے میں تھے۔ گشت کرنے والی پولیس کی نظر [illegible] کے لیے میں اندر [illegible] گلیوں کے راستے [illegible] کی طرف جا رہا تھا۔ ادھر ادھر نگاہ [illegible] مجھے ٹیلی فون کے کئی کھمبے دکھائی دیے۔ سب سے [illegible] وہ تھا جو ایک کوٹھی کی پشت [illegible] درخت کے [illegible] آ گیا تھا۔ میں نے جیپ میں سے اپنا پورٹیبل فون اٹھایا جو ایک [illegible] اور وہ [illegible] کی طرف سے ملنے والا بہترین تحفہ تھا۔ اس کی افادیت اب تک متعدد بار ثابت ہو چکی تھی۔

انکل رضوی کے گھر کا نمبر ملتے ہی پہلی گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا گیا۔ "ہیلو۔" میں نے شمسہ آنٹی کی آواز سنی۔

"آنٹی! صبح بخیر۔" میں نے کہا۔ "معذرت چاہتا ہوں کہ [illegible] سے [illegible] وقت کی پابندی سے۔"

"تم آدمی ہو کہ بھوت؟" انہوں نے کہا۔ "خواہ مخواہ پریشان کرتے ہو اور وقت بھی نہیں دیکھتے۔"

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے پتا ہے کہ آپ کو دو فکریں لاحق ہیں۔ پہلی اپنے شوہر نامدار کی۔ وہ بالکل خیریت کے ساتھ صبح ساڑھے پانچ اور چھ بجے کے درمیان گھر پہنچ جائیں گے۔"

"یہ تم کیسے جانتے ہو؟"

"آنٹی... میں دنیا کو ذرا بلندی سے دیکھ رہا ہوں۔ میری نظر میں وہ ہے جسے آپ کی نظر نہیں دیکھ سکتی۔" میں نے کہا۔ "دوسری فکر آپ کو میری طرف سے ہے تو آپ اطمینان رکھیں۔ میں ابھی آپ سے بات کرنے کے بعد زمین پر خیریت کے ساتھ ایسے ہی اتر آؤں گا جیسے چاند پر قدم رکھنے کے بعد نیل آرمسٹرانگ واپس زمین پر اترا تھا۔ دونوں فکریں ختم۔ اب آپ بیگم سعادت شملہ زوجہ محسن حسن خان شیروانی کے حوالے کیجیے۔"

وہ ہنسنے لگیں۔ "جب تم ایسی بک بک کرتے ہو تو مجھے ہنسی بھی آتی ہے اور میں اداس بھی ہو جاتی ہوں۔ تم پہلے سے ساتھ ہوتے تو... خیر... بات کرو شملہ سے۔"

"بی بی شملہ! کیا حال ہے؟"

"اچھی ہوں بھائی جان!" وہ بولی۔

"ابھی؟ ارے تم بہت اچھی ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کیا کر رہی ہو؟"

"نہیں۔ آنٹی ہیں میرے ساتھ۔"

"اچھا تو میری بات دھیان سے خاموش رہ کے سنو۔" میں نے کہا۔ "تم میری بات سننے کے بعد جولی اور کیتھرین کے پاس جاؤ گی۔ ان سے کہنا کہ وہ اسی وقت گھر سے نکل آئیں۔ اس طرح کہ کسی کو معلوم نہ ہو۔ ابھی ان کی اشد ضرورت ہے۔ ہم باہر نہر کے کنارے کھڑے ملیں گے۔ وہ نہر کی طرف روانہ ہو جائیں۔ اپنے ساتھ کچھ بھی لانے کی ضرورت نہیں۔ جولی کی صحت ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں۔" شملہ نے کہا۔

"پھر تو وہ پیدل چل سکتی ہے۔ وہ پندرہ بیس منٹ میں نہر تک پہنچ جائیں گی۔ اتنی دیر میں ہم بھی پہنچ جائیں گے۔"

"ہم کون؟"

"اپنے بھائی میں اور تمہارا میاں۔ معاف [illegible] پوچھو نا [illegible]

www.paksociety.com

نکلا، اس نے بھی ایک پیغام دیا تھا مگر وہ اتنا رومانٹک ہے کہ مجھے شرم آتی ہے، وہ ساری باتیں دہراتے...."

"آپ بہت تنگ کرتے ہیں مجھے...."

"اچھے سنو بابا... فون مت رکھ دینا۔" میں نے کہا۔ "جولی اور کیتھرین سے کہنا کہ ہوشیاری سے کام لیں۔ کل سے راستے بند ہو جائیں گے۔ شاید گھر پر دوبارہ گارڈ آ جائے گی اور فون بھی ٹیپ ہوگا۔ لیکن ہم تم سے بات کرتے رہیں گے۔ ممکن ہے کل ہم کراچی چلے جائیں نانو اور اکرم چچا کے پاس۔"

"بھائی جان! رابعہ باجی اور ڈیڈی بھائی کی کوئی خبر؟"

"نہیں، ہم جا کے ان کی خبریں لیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور تم کو اطلاع دیں گے۔ یہاں تم منظر سے رابطہ رکھنا۔ تم کو جانے سے پہلے میں معلوم ہو جائے گا۔ اچھا اب خدا حافظ۔"

میں نیچے اتر آیا اور پھر جیپ میں جا بیٹھا۔ میں نے محسن کو اپنی گفتگو کے متعلق بتایا۔ "میں نے پروگرام بدل دیا ہے۔"

"اب کیا پروگرام ہے؟" محسن بولا۔

"جولی اور کیتھرین کے ساتھ اب ہم ایک گھر کرائے پر حاصل کریں گے۔" میں نے کہا۔ "مکمل صحت یابی تک غالب اسی گھر میں ان کے ساتھ رہے گا۔ اگر ان تین ہفتوں یا ایک ماہ کے عرصے میں کسی کو واپس آنا پڑا تو یہ گھر اس کے لیے ایک ٹھکانا ہوگا۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ اس عرصے میں رابعہ اور ڈیڈی کا سراغ مل جائے گا۔ پھر ہم سب اکٹھے ہو جائیں گے۔"

تقریباً پونے بارہ بجے جب ہم نہر کے بائیں کنارے پر ایک درخت کے پیچھے رکے ہوئے کھڑے تھے، میں نے پہلے کیتھرین کو اور پھر جولی کو نمودار ہوتے دیکھا۔ کیتھرین اور اس کی بیٹی کی عمر میں دو اور ایک کی نسبت ضرور ہوگی۔ یعنی ماں کی عمر بیٹی کے مقابلے میں دوگنی تھی لیکن یہ فرق زیادہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ جسمانی ساخت کے اعتبار سے کیتھرین دبلی پتلی تھی۔ اس کے آفتاب حسن کی تمازت کی کرنوں میں وہی دلکشی کا رنگ تھا جو بیٹی کی جوانی کے طلوع ہوتے سورج کی شفق میں۔ دونوں کے نقوش میں حیرت انگیز مماثلت تھی چنانچہ انہیں پانچ سات سال کے فرق سے چھوٹی بڑی بہن سمجھا جا سکتا تھا۔ جولی کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ لیمپ پوسٹ کی روشنی میں تھی اور اپنی ماں سے چند قدم پیچھے چلتی ہماری طرف آ رہی تھی۔ کیتھرین کی نگاہیں مجسس انداز میں دائیں بائیں دیکھ رہی تھیں۔

میں جا کر ان کے سامنے آ گیا۔ "ہیلو آنٹی کیتھرین... ہیلو جولی..."

وہ چونک کر بولی۔ "اوہ مین... تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔"

میں ہنس پڑا۔ "آپ کسی سے ڈرنے والی نہیں ہیں...."

"ظاہر تم تمام کی بات ہے ڈیئر۔" وہ بولی۔ "جب میں گئی تو مجھے یقین تھا کہ میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ آج ... تھا کہ مجھے جانی کے لیے بھی زندہ رہنا پڑے گا۔ تب میں نے ہمت نہیں توڑی تھی۔"

"اور اب جولی نے آپ کو ڈرنا سکھا دیا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ تو ہوتا ہے سکندر... کوئی رشتوں کے ٹوٹنے سے ... محبت سے ڈرتا ہے جو وہ دوسروں سے کرتا ہے۔ یا دوسرے ... سے کرتے ہیں۔ خیر چھوڑو یہ بات۔ جولی سے ملو۔" کیتھرین نے کہا۔

جولی نے بے تکلفی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ "میں تمہارے بارے میں سب جانتی ہوں۔ ممی جب سے واپس آئی ہیں ہر وقت تم لوگوں کی باتیں کرتی ہیں۔ میں تم سب سے اتنی اچھی طرح متعارف ہو چکی ہوں جیسے تمہارے ساتھ رہ چکی ہوں اور تم میں سے ایک ہوں۔" وہ بڑی روانی سے بات کر رہی تھی۔ اس کے لہجے میں بھی ... معصومیت تھی جو اس کے چہرے پر ... کر پھیلی ہوئی تھی۔ اسے اپنے حسن کے اعتبار سے کوہ قاف ... نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ غیر جانب داری سے ... تو نانو ... محسن ... اوپر تھی۔ پھر ... تھی جولی ان سب سے کم حسین تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بدصورت تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش بہت تیکھے تھے اس کی ملاحت ... سے زیادہ دلکش تھی اور ایک نوخیز جاذبیت تھی جسے الفاظ میں ... نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے ایک طویل عرصہ بیماری میں ... گزارا تھا۔ شفایابی کے باوجود اس کا جسم بیماری کے ... سے پوری طرح سنبھلا نہیں تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ... اس عمر میں جو صحت مندی شباب کے ساتھ آتی ہے وہ ... تھی۔ اس کا رنگ بھی اسی لیے کچھ بجھا بجھا سا لگتا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ جیسے جیسے وقت گزرے گا اس کی صحت میں بہتری آئے گی۔ اس کے رنگ شباب میں شوخی اور چمک آنے لگی۔ اس کے رخسار بھر جائیں گے تو گلابی ہوں گے اور مجموعی طور پر وہ نسوانی ... میں کسی سے کم نہ رہے گی۔ ابھی صرف اس کا لہجہ شوخ ... اس نے اسکرٹ پہن رکھا تھا اور بال شانوں پر ... نظر آ رہے تھے۔ اس سے وہ بالکل اسکول گرل لگتی تھی۔

"بہت دیکھ لیا میری بیٹی کو۔" کیتھرین نے کہا۔ "نظر مت لگا دینا۔"

میں جھینپ گیا۔ "کبھی بھائیوں کی نظر بھی لگتی ہے بہنوں کو؟ دراصل اب تک نام ہی نام سنا تھا۔ آج دیکھا تو عجیب سا لگا۔ یہی وہ لڑکی ہے جس نے موت کو شکست دی۔ دیکھنے میں تو چھوٹی سی اور کمزور سی اسکول گرل لگتی ہے مجھے۔"

جولی ہنسنے لگی۔ "موت کو میں کیسے شکست دے سکتی تھی..."

... کے ساتھ تم جیسے بھائی تھے۔ ان کی محبت تھی، ان کا خلوص تھا، ان کی دعائیں تھیں۔"

"کیا تم اکیلے ہو؟" کیتھرین نے کہا۔

"نہیں، محسن آپ کا منتظر ہے۔" میں نے پیچھے اشارہ کیا۔

"کیسے بے وقوف آدمی ہو۔ یہاں کھڑے باتیں کیے جا رہے ہو۔ چلو یہاں سے اور مجھے بتاؤ کہ اس طرح رات کے وقت میں گھر سے ..."

"چھوڑیں کیا۔" کیتھرین نے چلتے ہوئے کہا۔

"وہ آپ کا گھر تو نہیں تھا آنٹی۔" میں نے کہا۔

"میرا گھر تو اب کہیں بھی نہیں ہے۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"کیوں؟ آپ کا ایک گھر تھا تو...."

"تھا... جب گھر والا تھا تو واقعی گھر تھا۔ اس کے بعد بھی میں نے اسے گھر سمجھا کیونکہ اس کی یادیں ہر طرف میرے ساتھ تھیں۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں ہے۔ جو بچا تھا وہ ڈاکو لے گئے صرف دیواریں چھوڑ گئے۔"

"کون ڈاکو...؟"

"وہی ڈاکو جو دن دہاڑے لوٹتے ہیں۔ کبھی قانون کے محافظ بن کے اور کبھی دوستی کا لبادہ اوڑھ کر۔" کیتھرین نے کہا۔ "شرافت کے ٹھیکیدار بن کر یا فدائی تو بھی دار بن کر۔ کچھ لوگوں نے درخواست دے رکھی تھی کہ یہاں ایک قحبہ خانہ چلتا ہے جو خود بھی یہ پیشہ کرتی ہے اور اپنی بیٹی سے بھی پیشہ کراتی ہے۔ ... سب کا پیشہ بھی یہی ہے.... دونوں کو ... سے کھینچا۔ معلوم نہیں پہلے کون اندر گھسا۔ کس نے چادر اور چار دیواری کا تقدس پامال کیا۔ پولیس نے ... یا ان خودساختہ ٹھیکیداروں نے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون پہلے گھسا اور کون بعد میں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ سب گھس گئے۔ وہاں تھا بھی کیا۔ وہ امیر تو نہیں ہو سکے۔ لیکن ان کو بہت مایوسی ہوئی ہوگی، جو اس یقین کے ساتھ آئے تھے کہ حرام والا جیسے شخص نے گھر میں تاروں کے خزانے چھپا رکھے ہوں گے۔ سارا مال غنیمت زر و جواہر کی شکل میں گاڑ رکھا ہوگا۔ اسے دنیا کیا دکھا سکتی تھی۔" کیتھرین ہنسی۔ "زمانے کا اب یہی چلن ہے۔ ڈاکو کو ڈاکو کہنے کی ہمت کسی میں نہیں ... ڈاکو کہیں ... ڈاکو ہو جاتا ہے۔ بنا دیا جاتا ہے ... مشہور ہو جاتا ہے۔ ان ... چوروں نے میری ... موجودگی میں گھر کا ... رکھ دیا۔ شاید وہ رات کو وہاں مدفون خزانہ تلاش کرتے رہے۔ انہوں نے دیواروں کو توڑ پھوڑ دیا۔ سارا سامان تو وہ پہلے لے گئے تھے۔ انہوں نے ... تک بھی توڑ پھوڑ کے دیکھا ... انہوں نے ... کی تصویر دیکھنا ہو تو ... گھر کی دیواروں پر دیکھو۔"

وہ یکلخت چپ ہو گئی کیونکہ محسن ایک زیر تعمیر کوٹھی کے احاطے سے جیپ لے کر نکل آیا تھا۔

ایک بار پھر تعارف کی رسم ادا ہوئی اور جولی نے اسی بے تکلفی سے محسن سے ہاتھ ملایا اور محسن سے ایسے ملی جیسے بھائیوں سے برسوں کی بچھڑی ہوئی بہن ملے۔ مجھے کیتھرین سے اظہار افسوس کا موقع بھی نہ ملا تھا مگر شاید اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ الفاظ کھوکھلے ہی ہوتے ہیں جو ٹوٹے ہوئے دل ... اس کے گھر کی تباہی کا عمل کن کے ہاتھوں ہوا تھا، وہ کوئی ... نہیں تھا۔ آخر قدرت کیا چاہتی ہے۔ وہ سب بے گھر اور جلا وطن لاوارث اور بے آسرا لوگوں کو ملا رہی ہے۔ سب کے گھر اسی طرح تباہ کیے گئے۔ جلا دیے گئے۔ لوٹے گئے یا برباد ہوئے۔ ہر کہانی الگ تھی مگر انجام ایک تھا۔ میرا گھر جو وزیر خان نے چھینا۔ چوہدری دلاور ... جیسے لٹیروں نے چھینا۔ رابعہ کا گھر ... نے ہم سے اڑا دیا۔ ڈیڈی ملا تو اس نے بتایا کہ کس طرح اس کا ہنستا بستا گھر متعصب ... نذر آتش ہو گیا.... شیطان صفت انسانوں کے ہاتھوں تاخت و تاراج ہوا۔ غالب کے گھر کی بربادی کا قصہ پرانا بھی تھا اور دردناک بھی۔ تازہ ترین واقعہ کیتھرین پر گزری تھی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ ... ہم سب بے گھروں کو اکٹھا کر کے کیا کرے گا۔ ... کے بعد ... کیا انجام؟ سب کے لیے ایک نیا گھر نئی توقعات کی ضمانت کے ساتھ۔ نئی امیدوں کی روشنی کے ساتھ۔

"خدا را جی... گیان دھیان بس کرو۔" محسن نے میری آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی۔ میں پھر چونک پڑا۔ یکلخت مجھے احساس ہوا کہ میں بہت زیادہ سوچنے لگا ہوں۔ مجھے ذہنی طور پر غیر حاضر ہونے کی بیماری سی ہو گئی ہے۔ گزشتہ چند دنوں میں بارہا ایسا ہوا تھا۔

"اب جیپ میں جگہ نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور پانچ بجنے والے ہیں۔"

"گویا خطرے کی گھنٹی بج گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"خطرہ کیسا؟" جولی نے کہا۔

میں ہنسنے لگا۔ "خطرہ تو بس خطرہ ہوتا ہے جولی... ایسا ویسا کچھ نہیں۔ اور ہم تو خطرات کے سمندر میں جینے والی وہ مخلوق ہیں جس نے تحفظ کی زمین چھوڑ دی ہے۔ ہمارے ساتھ رہو گی تو سمجھو گی کہ خطرہ اب ہماری سرشت میں شامل ہو چکا ہے اور جیسے مچھلی بغیر پانی کے نہیں رہ سکتی ایسے ہی شاید ہم خطرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

"پھر کیا یہیں ... ہونے کا ارادہ ہے؟" محسن جھنجلا کے بولا۔

"خان صاحب! آپ اب وہی کریں جو ہم اس قسم کے حالات میں کرتے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اپنے وسائل پیدا کرو۔ میں جانتا...

www.paksociety.com

یہاں ایمبولینس لے کر آؤ۔"

"ایمبولینس! کہاں ہے ایمبولینس؟" جولی نے کہا۔

"اس جیپ میں تین زخمی لڑکے بے ہوش پڑے ہیں۔ اسے ایمبولینس ہی سمجھو۔" میں نے کہا۔ میں پھر محسن سے مخاطب ہو گیا۔ "جولی اور کیتھرین کے ساتھ تم فاصلے پر نظر آؤ گے۔ کسی سے لفٹ لے لو۔ کچھ ہی دیر میں گاڑیاں چلنے لگیں گی۔ میں دونوں جنگی قیدیوں کے ساتھ اپنے آبائی گھر میں پہنچتا ہوں۔"

"اب تو وہ آبائی گھر ہے، میری آپا کا۔" محسن بولا۔ "مگر عزیزم کیا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں؟"

"ہمیشہ کی طرح تم نے احمقانہ سوال کیا عزیزم۔" میں نے کہا۔ "خطرے سے کون سا گھر خالی ہے۔ کون سا راستہ محفوظ ہے اور کس سمت میں خطرہ نہیں ہے؟ وہ گھر میرا دیکھا بھالا ہے۔ میں پچھلی طرف سے اندر جا کے جیپ کو پرانے گیراج میں بند کرنے کی کوشش کروں گا اور تمہارا انتظار کروں گا۔ ڈائریکٹ مت آنا۔"

"سیدھی راہ چلنا ہم بہت پہلے چھوڑ چکے۔ اب چال ہی ٹیڑھی ہو چکی ہے؟" محسن نے کہا۔ "آپ فوراً تشریف لے جائیں اب۔"

میں ویران پڑے ہوئے تاریک گھر میں گیا اور جیپ اسٹارٹ کر کے نکل آیا۔ محسن اب کیتھرین اور جولی کے ساتھ نہر کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ میں ہاتھ ہلا کے گزر گیا۔ اپنے سامنے میں نے ایک گاڑی کی ہیڈلائٹس کو بہت دور سے اپ ہوتے دیکھا... جواباً میں نے بھی ڈیپر دبایا۔ چند منٹ کے بعد جب میں دور تک آ چکا تھا، وہ گاڑی میرے قریب سے گزری۔ یہ ایئرپورٹ کی جانب سے آنے والی ٹیکسی تھی۔ تیز رفتاری کے باعث میں دیکھ نہ سکا کہ ٹیکسی میں مسافر بھی تھے یا نہیں۔ اگلے کئی میل کی مسافت طے کرتے ہوئے مجھے کوئی گاڑی نہیں ملی۔ میں نے آسمان کو دیکھا جس پر ستاروں کے کارواں کا سفر آخر شب کی منزل پر تھا۔ ستارۂ سحری کی تابندگی نے مجھے رابعہ کی یاد دلائی۔ دل میں بجھی ہوئی امیدوں کی کسک جاگ اٹھی۔ ایسی کتنی صبحوں کا درد میرے دامن خیال میں تھا جب اس کی اور میری نظر نے ایک ساتھ صبح کے تارے سے امید کی روشنی لے کر اپنے خوابوں میں بھر لی تھی اور اس کی ہمراہی کے ساتھ افق تک سفر کیا تھا جہاں سے امید کی یہ مشعل نئے دن کی نقیب بن کر ابھرنے والے سورج کی پہلی کرن سے مل جاتی تھی۔ اب وہ کہاں ہو گی؟ مایوسی اور نا امیدی میں اس کے لیے ہر لمحہ کتنا پر عذاب گزرا ہو گا۔ تنہائیوں اور خوابوں کی بے وفائی نے اس کے ہر زخم تمنا پر کتنے انگارے رکھے ہوں گے۔

میں نے سر کو جھٹکا اور رابعہ کے خیال کو دل سے جدا کر دیا۔ اپنے اختیار میں کچھ نہیں تو پھر سوچ کے کانٹے چن کر اپنی ہی راہ چلنا پر ٹالنے سے کیا حاصل ہے۔ یہ سفر جاری رہنا چاہیے خواہ اس کی کبھی ختم نہ ہونے والی وصل کی شب ہو یا جانگداز فراق کی شب۔ جذبۂ عشق سلامت رہنا چاہیے پھر غم لیے اس دنیا میں تو دوسری دنیا میں کون جو پہرے دار ہو گا جو جدا کرے۔ افق پر صبح کاذب کے آثار ہویدا تھے کہ میں اپنے ماضی اور مستقبل کے گھر میں داخل ہوا۔ یہ احساس بہت عجیب تھا کہ یہ پہلے میرا گھر تھا پھر یہ میرا نہ رہا اور آج بھی ایک جا بجا ... سوا اس گھر کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہ تھا سب نے شکستہ حق ملکیت کا خیال امید دیتا تھا کہ ایک دن پھر یہ میرا گھر ہو گا اور رابعہ کا گھر ہو گا۔ وزیر خان مرحوم نے اسے اپنے بیٹے اور بہو کے لیے چاہا تھا مگر اس کے خواب بھی کالا کر لے گئے اور اب وقت دامنی کے ٹکڑے کے ساتھ دنیا سے گیا۔ کاش کوئی اسے بتاتا کہ خواب جو آج تم نے دیکھا تھا اس میں بہو کی تعبیر ہو گی اور یہاں بالآخر تمہارا بیٹا اور بہو اسی طرح آباد ہوں گے جیسے سوچا تھا۔ وہ جلاوطن خوشیوں کے ساتھ لوٹ کر آئیں گے مگر اسے کون بتاتا کہ آدمی کا احساس ماضی سے گزر کر حال کی دہلیز پر رک جاتا ہے۔ مستقبل ایک دیوار کے دوسری طرف ہے جس سے نظر کوئی نہیں آتا۔

پچھلی طرف سے میں نے ایک ٹوٹے ہوئے شیشے میں ہاتھ ڈالا اور انگلیوں کی مدد سے مقفل کر کے چٹخنی تلاش کی جو مدتوں زنگ لگنے کے باعث جام ہو گئی تھی۔ میں نے دروازے کو زور سے ہلایا اور چٹخنی کو پیچھے کھینچنے میں کامیاب ہوا۔ دروازہ کھلا تو عجیب سی مہک نے میرا استقبال کیا۔ یہ برسہا برس تک بند تنہائی میں رہنے والی یادوں کی مہک تھی اور گھٹن ہوا کی خوشبو تھی۔ خانہ ویرانی کی اداس کر دینے والی خوشبو تھی اور درد کی خوشبو جسے صرف میرا دل پہچانتا تھا۔ میں چند منٹ ساکت و صامت کھڑا ویران حویلی میں مقید اندھیرے کو دیکھتا رہا جس پر پرچھائیاں سی متحرک محسوس ہوتی تھیں۔ جیسے والد کے بستر روپ سامنے آ گئے اور اسی اندھیرے میں کھو گئے۔ میں نے بوڑھے دنیا نورد ... کا ایک زخمی سایہ بھی دیکھا جس نے اپنی عمر کے آخری دور میں یہاں وقت کی قید اسی طرح کاٹی تھی ... اور جلاوطن شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر نے رنگون میں ... کی آواز آج بھی گھر کے سناٹے میں گونج رہی تھی۔ "دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں۔" مقدر وزیر خان کو شاید اس پر ترس نہ آیا۔

ایک بار پھر میں نے جھٹک کر آواز و پیکر سے رشتہ توڑا ... پہلے گیا اور آگے بڑھ کے دوسرے اور تیسرے کمرے سے ہو کر باہر آ گیا۔ ایک ایک کر کے میں نے تینوں زخمی اور بے ہوش کو اٹھایا اور اندر لے گیا۔ غالب کا بخار ٹوٹ چکا تھا اور جب سے اٹھایا تو ایک ہاتھ سے مجھے وہ شکریہ بھی تھا مانا پڑا جو ... ڈاکٹر شیرازی نے بہت اوپر ایک پٹی کے ساتھ باندھ دیا تھا تاکہ اس کی حرکت سے نیچے کا حصہ زیادہ متاثر نہ ہو۔ پھر بھی احتیاط لازم تھی۔ میں نے غالب کو باقی دو افراد سے الگ ایک کمرے میں لٹا دیا۔

"کہاں ہیں ہم؟" اس نے آہستہ سے مجھے پکارا۔

"میری جان غالب۔" میں نے اس کے گالوں پر تھپکی دی۔ "میں ابھی آتا ہوں۔"

"کیوں... کہاں جا رہے ہو تم... مجھے چھوڑ کر مت۔"

"کہیں نہیں... تم کو چھوڑ کے میں کہاں جا سکتا ہوں۔ تم بالکل محفوظ ہو اسی طرح لیٹے رہنا میں دو منٹ میں آیا۔" میں نے کہا اور باہر آ گیا۔

پرانا گیراج عمارت کے دائیں جانب تھا اور اس کا گیٹ لکڑی کا تھا۔ پرانی وضع کے بھاری کواڑوں والا۔ اس زمانے میں یہ اسٹیل شٹر نہیں تھے جو اوپر سے نیچے کھینچ لیے جاتے ہیں۔ اس دروازے کو توڑنے یا دھکا دے کر کھول لینے کی کوشش کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اسے تالے کے بغیر دیکھ کر مجھے بہت اطمینان حاصل ہوا۔ اس میں تالا کون لگاتا اور کیوں لگاتا۔ زنگ خوردہ کنڈی سے کواڑ بند کر دینا کافی سمجھا گیا تھا کیونکہ اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے باری باری دونوں کواڑ کھول لیے۔ قبضوں میں تیل نہ ہونے کے باعث صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ میں لوٹ کر جیپ تک آیا اور اسے ڈرائیو کر کے سیدھا گیراج میں لے گیا۔ اس کے ایک گوشے میں کچھ کاٹھ کباڑ پڑا رہ گیا تھا جس میں ایک پرانا ناکارہ ٹائر بھی شامل تھا۔ جیپ کو میں نے کور سے ڈھانپ دیا تاکہ اس کی شناخت کا ایک فیصد امکان بھی ختم ہو۔ ویسے تو یہ بات بھی بعید از امکان لگتی تھی کہ کوئی اس خانہ ویران میں آکے جھانکے گا۔

میں فارغ ہوا ہی تھا کہ سفید رنگ کی ایک سوزوکی مہران کار اندر آئی جسے محسن چلا رہا تھا۔ میں نے اسے اشارہ دیا کہ پیچھے کی طرف جائے۔ جولی اور کیتھرین کچھ پریشان اور خوفزدہ تھیں کیونکہ انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا کہ ہم راہ چلتے لوگوں سے کار کس طرح چھینتے ہیں۔ محسن نے انہیں تسلی دی تھی کہ ہم ایسا ضرورت سے مجبور ہو کے کرتے ہیں اور بعد میں کار اس کے مالک کو واپس مل جاتی ہے۔

"یہ وہ گھر ہے جہاں سے میں نے ہوش کا سفر شروع کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میرے والد کو اس گھر تک پہنچنے کے لیے اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا۔ اپنا پورا خاندان قربان کرنا پڑا تھا اور نئے ملک کی سرحد عبور کرنے کے بعد بھی اٹھارہ سال تک جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ یہ میرے بچپن کا گھر ہے۔ میری جوانی اس گھر سے باہر گزری مگر اب اسے پھر رابعہ نے خرید لیا ہے۔"

"ہاؤ ونڈرفل..." کیتھرین نے مسرت سے کہا اور جولی کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔ جولی نے عجائبات کی ایک نئی دنیا میں پہلا قدم رکھا تھا۔ ہر قدم پر اس کے لیے ایک سنسنی خیز کہانی تھی۔ ایک حیرانی کا سامان تھا اور نیا تجربہ تھا۔

"غالب کو ہوش آ گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے میں یہیں چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ دونوں ڈاکو دوسرے کمرے میں ہیں۔ سات ہزار روپے میں لے جا رہا ہوں، چالیس ہزار چھوڑ رہا ہوں۔"

"یہ چارج رپورٹ کیسی دے رہا ہے تو مجھے..." محسن نے کہا۔

"میں تقریباً دو گھنٹے میں واپس آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "گاڑی کو کہاں چھوڑ دوں؟"

محسن نے مجھے ایک سیل فون نمبر دیا۔ "جہاں بھی چھوڑنا پڑے اس نمبر پر اطلاع کر دینا۔ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی ہے۔ بہت شریف مگر تھوڑا سا کریک تھا۔ کہتا تھا کہ یہ سب بھیڑ چال آخر کیوں ہے؟ کیسے شروع ہوئی۔ پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دینے لگا کہ قصور وار میں ہوں جس نے کار خریدی اور عام لوگوں سے الگ ہوا۔ جو پیدل چلنے والے لوگ تھے ظاہر ہے وہ مجھ سے حسد کرنے لگے اور میرے خلاف ان کے جذبات کو احساس کمتری نے ہوا دی۔ پھر وہ میری تحلیل نفسی کرتا رہا کہ میرا منفی رد عمل میری شخصیت پر کیوں غالب آ گیا اور مسلسل بولتا رہا۔ میں کیا بولتا۔ اسے میں نے اسی کی درخواست پر یونیورسٹی کے سامنے کیمپس پہنچا دیا۔ کہہ رہا تھا کہ گاڑی سے جا ذرا مگر مجھے ایک ٹیکسی پہلے ملے ... کیونکہ میں آج ... پیدل نہیں جا سکتا۔ میں نے کہا کہ چلیے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔" محسن قہقہہ مار کے ہنسا۔ "کار اس کی اور ڈراپ میں کر دیتا ہوں۔ مضحکہ خیز۔ اس نے بھی جواب میں کچھ نہیں کہا اور شکریہ جناب، مجھے موقع دیجیے کہ میں آپ کو ڈراپ کروں اور گھر جاؤں۔ اتر کے اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا کہ گاڑی نو دس بجے تک پہنچا دینا۔ اور بڑے مہذب طریقے سے خواتین کو وش کر کے چلا گیا۔ کلفٹن ہی کی لائبریری میں۔"

"خود باہر مت جانا۔" میں نے کہا۔ "کیتھرین کو بھیج دینا کسی پاس پڑوس کے گھر میں۔ عورتوں کے لیے مشکل نہیں ہوتا وہ کہہ سکتی ہیں کہ ہم نئے آئے ہیں۔ چائے ناشتا وغیرہ مل سکتی ہے۔"

"اگر پڑوسی اتنے با اخلاق ہوئے تب ورنہ ہم بازار سے منگوا لیں گے۔"

"میں دس بجے تک ضرور آ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "امید ہے دوپہر کے بعد ہمیں کہیں نہ کہیں کوئی مکان مل جائے گا۔ ایک اور عارضی ٹھکانا جس کو ہم ضرورت کا تھوڑا بہت سامان خرید کر استعمال کر لیں گے۔ جولی اور کیتھرین وہاں گمنام رہ سکتی ہیں۔ انکل رضوی کے پاس ان کے خلاف کچھ نہیں کہ وہ انہیں تلاش کریں۔ وہ مجھ ہی کے

www.paksociety.com

کہ وہ نوں جناب کے ساتھ نکل گئی ہیں۔ غالب کے بالکل ٹھیک ہونے تک اس کا لاہور میں ہی رہنا ضروری ہے۔ میں اور نو لاکھی چلیں گے؟"

"ضرور چلیں گے۔ ابھی تو آپ جائیں جہاں جانا ہے۔" محسن بولا۔ "صبح ہو گئی ہے۔ دن بہت مصروف گزرے گا۔ رات کو پھر پریس کانفرنس بلانا ہے۔"

"رات کو ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "مکان مل گیا تو ہم اُس گھر میں پریس کانفرنس منعقد کریں گے … تو پولیس کے کسی سینئر آفیسر کی موجودگی میں پیش کریں گے اور … مجھے یقین ہے کہ انکل ہنوز نہیں آئیں گے۔"

والٹن تک پہنچنے میں چالیس منٹ صرف ہوئے۔ پروفیسر کی گاڑی بھی اس کی … آئینہ دار تھی۔ یہ گاڑی پرانی تھی اور کچھ عرصے سے تو جی کا شکار رہتی تھی چنانچہ اس کی رفتار تیس میل سے اوپر جاتی تو گاڑی کا سارا ڈھانچہ کپکپانے لگتا تھا۔ … یا ماڈل کی تھی جو معمولی خرابی تھی لیکن ہم تو کہتے ہیں کہ چلتی کا نام گاڑی۔ جب تک چلتی ہے چلاؤ اور اچانک بیٹھ جائے یا بٹھا دے تو الزام بھی گاڑی کو دو۔ اس ملک کا پروفیسر اور دانشور غریب شمار ہوتا ہے اور ایسی کار رکھ لے تو بہت غنیمت ہے۔ مگر دقت ہے تو روز روز کی مرمت کے خرچے پورے کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نئی کار سے … نئے ماڈل کو وہ صرف اشتہار میں دیکھ سکتا ہے۔

کسی سے کچھ پوچھنے کی نوبت نہ آئی۔ چھوٹے لوگوں کے چھوٹے کوارٹرز مجھے دور سے ہی نظر آ گئے۔ یہ گلبرگ کا علاقہ تھا جہاں آدمی ایک ہی بلاک میں کسی کوٹھی کے نمبر کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے اور کسی نئی … کو ڈھونڈنا کوئی … ہے۔ کوارٹروں کے درمیان دیواریں مشترک تھیں اور فاصلے اتنے کم تھے کہ دل ملتے تھے چنانچہ سب پرانے لوگ ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے تھے اور اجنبی کو ایک نظر میں تاڑ لیتے تھے۔ ایک جگہ میں نے حلوائی کی دکان پر پوری کے حصول کے لیے گھمسان کا رن پڑتے دیکھا۔ یہ لاہور کی صبح کا ایک دلچسپ نظارہ ہے۔ بچے بوڑھے ہر قسم کے لوگ بلا تمیز اس جنگ میں شریک ہوتے ہیں … سے زیادہ … تک جاری رہتی ہے پھر یہ ختم ہو جاتا ہے … برتن بجاتے … لوٹتے ہیں اور حلوائی کڑاہ سے … کے سوکھنے کے لیے قطار میں رکھ دیتے ہیں۔

میں نے گاڑی روکی ہی تھی کہ ایک خشخشی داڑھی والا … طور پر قریب آ گیا … "لو صاحب!" وہ … سے ناک صاف کر کے بولا۔

"مجھے ثریا غازی خان جانا ہے۔" میں نے کہا۔

رضا کار خوشدلی سے ہنسا۔ "اوہ … تیسرا کوارٹر۔" اس نے اشارے سے بتایا۔ "پیچھے او کھوری کھولی ہے۔ اُس نے … ثریا غازی خان۔"

"مہربانی چاچا جی۔" میں نے کہا اور گاڑی کو کوارٹروں کی قطار والی سڑک پر غازی خان کے دروازے تک لے گیا۔ اس وقت وہ اپنی نیلی وردی پہن کے ڈیوٹی پر جانے کے لیے نکلا تھا۔ کار کو اور پھر مجھے دیکھ کر خوشی سے اس کا چہرہ … ہوا میری طرف لپکا۔

"تھانیدار صاحب! آپ نے غریب کو یاد رکھا۔" اس نے … طریقے سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "بڑی مہربانی جناب کی۔ بڑی عزت … مولا نے مجھے دی … خود غریب خانے تک آ گئے۔"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو غازی خان۔" میں نے کہا۔ "مجھے شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔"

اردگرد کے بہت سے لوگ غازی خان کے معزز مہمان کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ تھانیدار کا لفظ سن کے وہ چونکے۔ … قریب رہنے والے ایک دوسرے کا شجرہ نسب تک جانتے ہیں اور … آج تک سنا تھا کہ غازی خان کے عزیز رشتہ دار سب … میں کوئی کار والا تھانیدار بھی ہے۔ میں فوراً غازی خان کے کوارٹر میں داخل ہو گیا۔ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے مختصر ترین صحن تھا جس میں ایک بکری بندھی ہوئی تھی اور ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ صحن کے ایک طرف باورچی خانہ تھا اور دوسری طرف … جن کے بغیر غریب خانہ مکمل نہیں ہوتا۔ … آگے ایک برآمدہ تھا جس میں دونوں کوٹھڑی نما کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ ہر کوٹھڑی آٹھ فٹ بائی دس فٹ سے زیادہ نہ تھی۔

"کون ہے غازی؟ تو گیا نہیں؟" اندر سے کسی نے پوچھا۔

"گیا تھا بیگم … مگر راہ میں ایک فرشتہ مل گیا۔" غازی خان بولا۔

"کون فرشتہ؟"

"بتایا تھا نا میں نے کل … ایک تھانیدار آیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔" وہ فرطِ جذبات میں کھڑی ہو گئی۔ وہ پچاس سال کی عورت تھی مگر اس کے مقدر میں خوشحالی کا سورج ہوتا تو اس عمر میں بھی شباب کی دھوپ نظر آتی مگر مفلسی اور سخت حالات نے اس سے جوانی کو قبل از وقت چھین لیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ڈاکوؤں نے اس کی بیٹی کو چھین لیا تھا … سال کی ہو گئی تھی۔ اس کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور جسم لاغر ہو گیا تھا۔ تاہم صورت سے … عہدِ رفتہ کی دلکشی کے آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ "کیا وہ … آ گیا ہے … واقعی آ گیا ہے؟" وہ بولی۔

"ہاں … یہ دیکھ … میرے ساتھ کھڑے ہیں تھانیدار صاحب۔"

"سلام تھانیدار صاحب۔" وہ سفید دوپٹے کا پلو سر پر …

… پیشانی تک لے جا کر بولی۔ "غازی نے مجھ سے کہا … اللہ جانتا … نہیں مانتا تھا … میں نے کہا تو جھوٹ بول رہا ہے … ایسا کہاں ہوتا ہے۔"

"… غازی خان کدھر چلا گیا؟" میں نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا۔

غازی خان … جا کے نمودار ہوا۔ وہ کہیں سے ایک کرسی لے آیا تھا جو اس نے کپڑے سے صاف کر کے میرے قریب رکھ دی۔ "تشریف رکھیں جناب۔"

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟ میں بھی تمہاری طرح ایک معمولی آدمی ہوں۔ چارپائی کافی تھی میرے لیے بھی۔" میں نے اس کی تسلی کے لیے کہا لیکن پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اُٹھ بیٹھی ہو گئے … مہمان کے لیے کچھ لسی پانی کا کر۔"

"غازی خان! تکلف میں مت پڑو۔" میں نے کہا۔

"تکلف تو بڑے لوگ کرتے ہیں جناب۔" وہ بولا۔ "ہم غریبوں کے پاس تکلف کے لیے کیا ہے۔"

"تو اُٹھو … اب باتیں ہی کرتا جائے گا … جا کے کوئی مٹھائی لا … صاحب جی … آپ تو چائے ہی پیتے ہوں گے۔" وہ آگے بڑھی …

"دیکھیے … میں چائے ضرور پی لوں گا … مگر یہ مٹھائی وغیرہ بالکل نہیں کھا سکتا۔" میں نے کہا۔ "تم بیٹھ جاؤ غازی خان۔"

غازی خان کا چہرہ اتر گیا۔ … ضرورت سے زیادہ سخت ہو گیا تھا۔ "ہاں جناب! اس علاقے میں تو مٹھائی بھی گندی ملتی ہے آپ کے لائق نہیں ہوتی۔"

"اوہ تم سمجھے کیوں نہیں! … صبح صبح مٹھائی کون کھاتا ہے۔ تم بہت اصرار ہے تو میں ناشتا کروں گا۔" میں نے کہا۔ "صبح سے ابھی تک فرصت ہی نہیں ملی تھی۔"

"ناشتا کریں گے آپ!" غازی خان نے مسرت کے جوش میں کہا۔ "ابھی حلوہ پوری لے کر آتا ہوں۔" وہ اٹھا اور ایک دم باہر دوڑ گیا۔ اس نے میری آواز پر دھیان ہی نہیں دیا۔

"میں چائے بناتی ہوں۔" غازی خان کی بیوی نے کہا اور ہاتھ آگے رکھتے ہوئے دروازے کی طرف چلنے لگی۔ "آپ … بھی ہوں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے سب نظر آتا ہے۔ میرے ہاتھ دھوکا نہیں دیتے۔ مجھے معلوم ہے کون سی چیز کہاں ہے۔" وہ چولہا جلا کے … برتن میں پانی اُبلنے کے لیے رکھنے اور چائے کا سامان اٹھا کر … ٹٹولتی رہی۔ "ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے چائے غلط … یہ ہے … اس کی جگہ مرچ مسالے کا ڈبا اٹھاتے ہی مجھے پتا چل جاتا ہے حالانکہ ڈبے سب ایک جیسے ہیں مگر … بھاری … جتنا ہلکا ہوتا ہے چائے کی پتی سب سے ہلکی۔"

غالباً وہ خود کلامی کی عادی تھی۔ غازی خان نے بتایا بھی تھا کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ اس کا کچھ اثر اب تک باقی تھا کہ وہ اپنی تنہائی سے بچنے کے لیے خود کو مصروف رکھتی تھی اور خیالوں کو منتشر رکھنے کے لیے بولتی رہتی تھی۔ میں اُسے باورچی خانے میں نقل و حرکت کرتے دیکھتا رہا۔ اس کے … اندازے سے ایک ناواقف حال شخص … نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بینائی سے محروم ہے مگر … گھر … اور اس کی ہر چیز کے ساتھ وہاں کی شناسائی کا پرانا رشتہ … تھی۔ صرف اس گھر کے اندر وہ اندھی نہیں تھی۔ تصور کی مدد سے اور … کر کے وہ بصارت کی کمی کے احساس پر قابو پا لیتی تھی۔ باقی دنیا اس کے لیے بے وجود ہو گئی تھی۔

حیرت کی بات ہے کہ … چوکی … نصف درجن کی سفید چائے پیتے ہوئے مجھے وہ لطف آیا جو شیزان کی چائے میں کبھی محسوس نہ ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ یہاں چائے میں … کی خوشبو شامل تھی اور خلوص کی سادگی کا رنگ شامل تھا اور … جذبات کی مٹھاس شامل تھی۔ میں نے غازی خان کے اصرار کے بغیر پیٹ بھر کے کھایا اور ایک کے بعد چائے کا دوسرا کپ پیا۔ اس دوران میں غازی خان دست بستہ کھڑا رہا … بہت مجبور کرنے کے …

وہ چارپائی پر نہیں بیٹھا۔ اس کی بیوی بھی پلنگ … پنکھا جھلتی رہی اور دعائیں دیتی رہی۔ مجھے انتظار تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے والے ظلم کا افسانہ چھیڑے اور اس کی المناک موت کا ذکر کرے لیکن ایسا لگتا تھا کہ غازی خان نے اسے منع کر دیا تھا۔

ناشتے کے بعد میں بہت تازہ دم ہو گیا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ "غازی خان!" میں نے جیب سے سگریٹ نکال کے سلگائی۔ "میں اس لیے آیا تھا کہ اپنا وعدہ پورا کروں۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے صاحب جی۔" اس کی بیوی نے کہا۔ "مگر ہم پہ اتنا بڑا بوجھ مت ڈالو۔ ہم غریب اتنی بڑی نیکی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔"

"یہ آپ مجھے شرمندہ کیوں کر رہی ہیں؟" میں نے کہا۔ "آپ پر کوئی بوجھ نہیں۔ میں قرض نہیں دے رہا ہوں۔ خدا کے لیے انکار مت کیجیے۔ میں یہاں انکار سننے کے لیے نہیں آیا ہوں۔" میں نے جیب سے … نکال کے الگ کیے۔ "اگر ان سے آپ کی آنکھوں کی روشنی واپس مل گئی تو میں سمجھوں گا کہ یہ خدا نے مجھ پر احسان کیا ہے کہ مجھے ایک نیکی کا ثواب کمانے کا موقع دیا … موقع وہ کسی اور کو بھی دے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ ایک ہزار میری بیوی نے بھیجے ہیں۔ آپریشن کے بعد دوائیں وغیرہ آئیں گی۔"

www.paksociety.com

"خدا تم دونوں کو وہ ساری خوشیاں دے جو اس کے اختیار میں ہیں اور تمہیں کوئی غم نہ دے۔ تم وہ سب پالو جو تمہارے دل کی تمنا ہے۔ تمہارے نصیب میں کامیابیاں ہوں۔" غازی خان کی بیوی نے گلوگیر لہجے میں دعائیں دینا شروع کیں۔ اس نے اپنی سپید چادر کو دونوں ہاتھوں پر پھیلا لیا تھا اور اپنی بے نور آنکھوں سے اوپر دیکھ رہی تھی۔ چھت کے اوپر... آسمان سے پرے عرش کی بلندیوں پر وہ براہ راست خدا کے سامنے جھولی پھیلائے کھڑی تھی۔ خاموش آنسو اس کے چہرے پر لکیریں بناتے گزر رہے تھے۔ میں ایک دم اٹھا اور کچھ کہے بغیر باہر آگیا۔ غازی خان میرے پیچھے لپکا۔

"غازی خان، اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا۔" میں نے کار کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اللہ آپ کو ترقی دے۔ آپ کا اقبال بلند کرے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔

"میں پھر آؤں گا۔" میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ "یہ دیکھنے کے لیے کہ تم نے آپریشن کرالیا ہے یا نہیں۔ دیر مت کرنا۔ خدا نے چاہا تو تمہاری بیوی دوبارہ دیکھنے لگے گی۔ جلد از جلد۔" میں نے گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور وہاں سے بھاگ آیا۔ ان کی دعاؤں اور ممنونیت کے جذبات کے نیچے دب کر میری نیکی کے جذبے کا دم گھٹ رہا تھا۔ جانے کیسے چار ہزار روپے کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ اس سے دس گنا رقم جانے کب پاس موجود تھی۔ ایسے سیکڑوں چار ہزار ہم نہ جانے کہاں کہاں پھینکتے رہتے تھے۔ ہمارے پاس لاکھوں آتے تھے اور نکل جاتے تھے۔ ہم نے کروڑوں کے سودے ہوتے دیکھے تھے جن میں انسان اپنی شرافت، اپنا ضمیر اور اپنی نیکی سب بیچ دیتے تھے۔ دنیا بھر میں لاکھوں ڈالر کے تحفے اور ہیروں کے دھوکے کی صورت میں اشارہ ہی تھا۔ عورتیں کروڑوں ڈالر کے بیش قیمت جواہرات کی خریداری کر رہی تھیں۔ لاکھوں ڈالر کی پراپرٹی کے تحائف وصول کر رہی تھیں۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں، خوشی کا رول کے ہوتے تحائف میں، پیرس کے عشرت کدوں میں، ٹوکیو کے نائٹ کلبوں میں سہولت لاکھوں کروڑوں ڈالر عیش اور عشرت کے اسباب پیدا کرنے میں صرف ہوتے تھے۔ یہاں صرف چار ہزار روپے میں ایک اندھی عورت بینائی اور قبول ہونے کی ضمانت رکھنے والی دعائیں دے رہی تھی۔ تین ہزار روپے میں آنکھوں کی روشنی پا لینا اس کے لیے دولت مندوں کی دنیا کی سب سے مہنگی خوشی سے زیادہ انمول تھا۔ کیا وہ تین ہزار روپے میں اپنی آنکھوں کی روشنی دے سکتا ہے؟ جو تین ہزار ڈالر کے کمرے میں ایک رات بسر کرنے والی فاحشہ کی ایک مسکراہٹ پر تین ہزار ڈالر قربان کر دیتا ہے۔ جانے کیا سمجھا جاتا ہے

نقطہ نظر کے پہلے نے، اخلاقی اقدار کے حوالے، لیتی امر بلند تر... آخر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔

میں بے حد قنوطی اور جذباتی ہو رہا تھا۔ واپس آتے ہوئے میں نے شکلنگ تھوڑی کا راستہ اختیار کیا۔ سرکاری دفاتر کے اوقات اب شفٹ ہو چکے... پر حاضر ہونے کے لیے نکل رہے تھے اور کاروباری لوگ بھی۔ چنانچہ اس رہائشی علاقے میں بھی مجھے بہت سی کاریں جاتی دکھائی دیں۔ کچھ دیر بعد ان سڑکوں کو ... ہو جاتا تھا۔ گزرتے گزرتے میں نے ایک گیٹ پر "ٹولیٹ" کا سائن دیکھا۔ گتے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا گیٹ پر لٹکا ہوا تھا اور اس پر کسی بدخط شخص نے ٹیڑھے میڑھے حروف بنائے تھے۔ جہاں کال بیل کا بٹن تھا، وہیں ایک نیم پلیٹ پر "ڈیوڈ براؤن" لکھا ہوا تھا۔

گھنٹی بجنے کے ساتھ ہی ایک شخص گاؤن پہنے ہوئے نمودار ہوا۔ گاؤن کے نیچے اس نے دھاری دار پاجامہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ ایک دم سیاہ صاحب تھا... لمبا اور سوکھا چہرہ۔ اس کا سر گنجا اور ... بے نیاز تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ پچپن اور ساٹھ سال کے درمیان لگایا۔

"یس؟" اس نے ... کیا بات ہے؟

"کیا میں مسٹر ڈیوڈ براؤن سے بات کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"تم اسی سے بات کر رہے ہو۔" وہ انگریزی میں بولا۔

"گڈ... کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"اگر کوئی کام ہے تو آسکتے ہو ورنہ جا سکتے ہو۔" وہ بولا۔

اس کی بدتمیزی اور بدتہذیبی پہ مجھے تاؤ آ گیا ... اور ... سمجھتے ہوئے میں نے درگزر کیا۔ "اگر اس سائن کا وہی مطلب ہے جو میں سمجھا ہوں..."

"اس کے دو مطلب نہیں ہو سکتے۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "تم کو مکان کرائے پر چاہیے... یس اور تو؟"

"یس..." میں نے کہا۔ وہ اندر لوٹ گیا اور میں سوچنے لگا کہ کہیں وہ پاگل تو نہیں تھا۔ یا اس نے پولیس کو فون تو نہیں کرنا تھا مگر وہ دروازے کا لاک کھولنے کے لیے ہی اندر گیا تھا۔ اس کا الیکٹرک لاک اندر کا کوئی بٹن دبانے سے کھلتا تھا۔ یورپ میں تو عام تھے مگر ابھی یہاں میں نے کہیں نہیں دیکھے تھے۔ عموماً یہ بھی دولت کے متعلقین تالے ہوتے تھے۔ چنانچہ ان سے کسی کو کیا ... شک نہیں لگ سکتا تھا۔ ایسا حفاظتی انتظام یہ ظاہر کرتا تھا کہ صاحب خانہ خوف کے نفسیاتی مرض کا شکار ہے یا پھر واقعی اپنے دشمنوں کے خلاف موثر دفاعی انتظام کو اہم سمجھتا ہے۔

اندر وہ اکیلا تھا اور ڈرائنگ روم کے صوفوں پر ... تھا۔ جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا۔ "تم نے مکان دیکھا ہے؟"

"جی... کیا یہی مکان کرائے پہ دینا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہاں تم کو اس کے علاوہ بھی کوئی مکان نظر آرہا ہے؟" وہ بولا۔

"میرا مطلب تھا کہ یہاں آپ رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جب کرائے دار آجائے گا تو میں اس کے ساتھ تو نہیں رہوں گا۔ میں چلا جاؤں گا۔" وہ بولا۔

"کیا میں اندر جا کے ایک نظر ڈال سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"تم کو سب کچھ دیکھنے کا حق حاصل ہے۔" وہ بولا۔ "کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔"

میں نے مکان کا جائزہ لیا۔ اس میں ہر چیز پرانی اور فرسودہ تھی جو مکان کی عمر نظر آتی تھی اور اس قابل تھی کہ باہر پھینک دیا جائے۔ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر، گندے ... قالین، پھٹے ہوئے پردے، اکھڑا ہوا رنگ ... سب مل کر کسی کباڑخانے کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ کباڑی وہ تھا جو ہر بات ... لہجے میں کرتا تھا اور لہجے کی شائستگی کو بھی غیر ضروری سمجھتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ مکان ہماری ضرورت کے لیے مناسب ہو گا۔

"مسٹر براؤن... اس کا ماہانہ کرایہ بتاؤ۔" میں نے ... کا اندازہ لگا لیا۔

"اس کا کرایہ ماہانہ نہیں، سالانہ ہو گا۔" وہ بولا۔ "دس ہزار روپے۔"

"ٹھیک ہے۔ کیا میں دس ہزار ادا کر دوں؟" میں نے کہا۔

"پہلے تم کرایہ نامہ وغیرہ بھرو گے اور میرے بارے میں تفتیش کرو گے۔ میں خود دیکھ سکتا ہوں کہ تم غلط قسم کے آدمی نہیں ہو۔" وہ بولا۔ "میرا اطمینان کافی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کب تک مکان خالی کرو گے؟"

"میں کسی کرائے دار کا انتظار کر رہا تھا۔" وہ بولا۔ "ورنہ میں بہت پہلے چلا جاتا۔ اب مجھے دیکھنا ہو گا کہ مجھے کون سی فلائٹ پر سیٹ ملتی ہے۔ مجھے کینیڈا جانا ہے۔"

"یہاں کون ہو گا۔ کوئی ایجنٹ ہے؟"

"کوئی نہیں..." وہ بولا۔ "میرا ایک ہی بیٹا ہے جو کینیڈا میں مقیم ہے... وہ ڈاکٹر ہے۔ اس نے مجھے بلایا ہے تاکہ میرا علاج ... میرا دل کمزور ... مانگتا ہے ... کہ ایک سال بعد تندرست ہو کے واپس آجاؤں اور اسی صورت میں تم کو مکان خالی کرنا ہو گا... فوراً... میں مر بھی سکتا ہوں۔ آپریشن کے ... یا کسی اور عارضے میں مبتلا ہو کے کسی حادثے کا شکار ہو سکتا ہوں۔ ایسی صورت میں میرا بیٹا آئے گا۔ مجھے نہیں معلوم کب... اسے ضرورت محسوس ہو گی یا فرصت ملے گی۔ وہ مکان بیچ کے واپس چلا جائے گا۔ ابھی میں نے اس کی بات نہیں مانی ... چلا جاؤں۔ اگر میں زندہ رہوں گا تو اسی کالے

لوگوں کے ملک میں جہاں کوئی مجھے سیاہ رنگ کے باعث نفرت سے نہیں دیکھتا۔ وہ گوری چمڑی پہ احمقانہ غرور رکھنے والے میری نظر میں سفید کتے ہیں۔ جیسے ان کی نظر میں ہم سب کالے کتے ہیں۔ زندگی کے آخری دور میں کسی کو نفرت اور حقارت کے ماحول میں رہنے سے کیا ملتا ہے؟ صرف پچھتاوا... میں نے زندگی میں بہت عزت کمائی ہے۔ میں بے عزت ہو کے مرنے کے لیے تیار نہیں۔ تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"آپ جو بھی ہیں۔ ایک قابل تعریف اور قابل تعظیم انسان ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں کرایہ کم نہیں کروں گا۔" وہ بولا۔ "خوشامد کے الفاظ ضائع مت کرو۔"

"میں آپ کو دو ہزار ایڈوانس اسی وقت دے سکتا ہوں۔ باقی شام تک۔ میں اپنی فیملی کو لانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ابھی کچھ دیر میں۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ایڈوانس کی ضرورت نہیں مسٹر...؟"

"جارج عیک!" میں نے کہا۔ "انشورنس بروکر... میں کراچی سے صرف اسی لیے آیا تھا کہ اپنی فیملی کے لیے کوئی مستقل انتظام کر جاؤں۔ میں ہر وقت سفر میں رہنے والا آدمی ہوں۔"

اس کی صورت کے تاثرات میں میرا نام سن کے کوئی فرق نہیں پڑا۔ "اب تم مستقل بھی کہہ سکتے ہو لیکن ایک وعدہ تم کو ابھی کرنا ہو گا کہ ایک سال گزر جانے کے بعد تم ہر سال کا کرایہ خود ہی جمع کرا دو گے۔ میں تم کو بینک کا اکاؤنٹ نمبر دے جاؤں گا اور اس کے بعد کسی بھی وقت میرا بیٹا آئے تو تم اس کو پریشان نہیں کرو گے، جیسا کہ کرائے دار کرتے ہیں۔ اس کے پاس کم وقت ہو گا۔ وہ مکان کو بیچ کر جانا چاہے گا... مقدمے بازی..."

"میں دشمنی میں بھی کمینگی سے نفرت کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "جہاں تک کرائے کا سوال ہے تو میں دو سال کا بھی جمع کرانے کو تیار ہوں۔"

"نو... ابھی صرف ایک سال..."

"اس سامان کا کیا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سب تمہیں بہت عزیز ہے؟" وہ بولا۔ "اور اسے تم احتیاط سے ایک کمرے میں رکھ کے کمرا لاک کر سکتے ہو... اسٹور کافی بڑا ہے۔ میری موت کی خبر سنتے ہی سب پھینک دینا۔ لیکن واپس آنے کی صورت میں مجھے سب اسی طرح ... کرنا ہو گا جیسا تم اس وقت دیکھ رہے ہو۔"

"آپ کی عدم موجودگی میں کوئی آسکتا ہے؟ جو خواہ مخواہ آپ کا نام لے کر ہمیں پریشان کرے؟"

"کوئی نہیں۔ پچھلے ایک سال سے کوئی نہیں آیا تو اب کون

www.paksociety.com

کہنے لگا۔ رشتے دار کوئی نہیں، دوست کوئی تھیں، ایک خادمہ آتی ہے اُسے میں نے نوٹس دے دیا ہے۔" وہ بولا۔

"آپ نوٹس واپس لے لیں۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمارے ساتھ رہے گی۔"

پہلی بار اس کی صورت پر سختی کے آثار کچھ کم ہوئے۔ "ٹھیک ہے مسٹر جانسن... تم نے میری ایک غلطی بتا دی۔"

میں اس سے معافی لے کے روانہ ہوا تو میرا دل غم کے تئے احساس سے بوجھل تھا۔ زندگی کتنے اُتنے دکھاتی ہے۔ ہر آدمی کتنے زخم لیے پھرتا ہے۔ عمر کے طویل سفر میں سب کے ساتھ چلنے والا سب سے الگ ہو جاتا ہے۔ جب کسی کو راہ میں خوشی کے پھول ملتے ہیں اور وہ کانٹوں کی زبان سے... تتا دیکھتا ہے۔ ہر صرف کانٹوں پہ چلتا ہے اور پھولوں کے رنگ یا مہکار سے کوئی رشتہ نہیں رکھتا۔ میں... میرے گھر ساتھی... غازی خان اور اس کی اندھی بیوی۔ وہ بزدل جس سے میں نے جھوٹ بولنے کا گناہ کیا تھا۔ سب کے پاس اپنا اپنے غموں کا الگ حساب ہے۔ سب کو اپنا حساب خود چکانا ہے۔

کار اچانک لڑکھڑانے لگی۔ میں نے اسے سڑک کے ایک کنارے پر روک دیا اور نیچے اتر کے دیکھا۔ اس کا ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا۔ میں نے ڈکی کھول کے دیکھا تو اس میں امتحانی کاپیاں بھری ہوئی تھیں۔ کم سے کم ایک ہزار کاپیاں جو سب انٹرآرٹس فائنل ایر کا امتحان دینے والے بیالوجی کے طلبا کی تھیں۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ کار کو چلیں، مگر اس میں ایک ہزار طلبا کے ایک ہزار سال برباد ہو جائیں گے۔ یا ضائع ہو جائیں تو سب کے ہزار سال ضائع ہوں گے۔ ہر سال کا ہر دن قیمتی ہے۔ وقت کا ایک ایک لمحہ اور اس لمحے کی محنت کا کوئی مول نہیں۔ پروفیسر صاحب نے بھی کمال کیا۔ کار کے ساتھ ایک ہزار بچوں کا مستقبل بھی محسن کے حوالے کر دیا۔ جب محسن نے انھیں گھر پہ ڈراپ کیا تھا تو ان پہ لازم تھا کہ امتحانی کاپیاں تو اتروا لیتے۔ خدانخواستہ محسن نے گاڑی کسی جگہ ڈاکا ڈالنے کے لیے چھینی ہوتی تو یہ پرچے بھی پولیس کی تحویل میں جلتے یا محسن اسے آگ لگا دیتا تو اسے خبر بھی نہ ہوتی کہ اس نے ایک ہزار علم کے طالب بچوں کی محنت اور امیدوں کو جلا کے خاک کر دیا ہے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ٹائر فلیٹ ہوا تو میں نے ڈکی کھولی، ورنہ ہم اس سے بے خبر رہتے۔ میرا مقصد پورا نہیں ہوا، گاڑی میں ٹائر ٹھیک تھا اور ہم ویل بدل کے گاڑی کو لاک کیا اور پیدل چل پڑا۔ میں مسٹر ڈیوڈ کے مکان سے دو میل دور آ چکا تھا۔ مزید ایک میل چلنے کے بعد مجھے پبلک ٹیلیفون آفس نظر آیا اور میں نے پروفیسر کو رنگ کیا۔

"جناب، وہ آپ کی گاڑی..."

"ہاں بھئی... وہ تم ابھی تک لائے نہیں۔" انھوں نے

میری بات سنے بغیر خفا ہونا شروع کیا۔ "آدمی کو وعدے کا پابند [illegible]"

"سر، وہ گاڑی رک گئی ہے، ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔"

"تو پھر کیا میں آ کے پنکچر لگاؤں؟" وہ حسبِ عادت [illegible] "تم جوان آدمی ہو۔"

"جناب، اس کی ڈکی میں امتحانی کاپیاں ہیں۔"

"ہاں ہیں... یہ تو تمہاری سخت غلط حرکت تھی [illegible] گئے اور وہ کاپیاں بھی لے گئے... آخر یہ کیا تھا؟ تمہارے [illegible] یا خود تم نے تو امتحان نہیں دے رکھا ہے؟ میں [illegible] معلوم نمبر بتا دوں اپنا..."

مجھے اچانک ہنسی آ گئی۔ "جناب پروفیسر صاحب... [illegible] کا کام تھا کہ کاپیوں کو یاد رکھتے۔ میں پڑھا لکھا ہوں [illegible] میرے سب عزیز بھی... پنکچر لگانا مجھے نہیں آتا۔ جوان آدمی [illegible] فرق نہیں پڑتا۔ آپ کی گاڑی کی چابیاں گاڑی کے اندر [illegible] سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ہے۔ آ جائیے اور لے جائیے۔" [illegible] ان کو پتا بتایا اور ان کے شور احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

میں ٹھیک دس بجے واپس پہنچا۔ اس وقت تک غالب پوری طرح ہوش میں آ گیا تھا۔ دونوں ڈاکو بھی ہوش میں تھے اور بری طرح کراہ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بتاتا، ٹیری نیوز پیپر لے آئی اور میں نے اُسے جھپٹ کر اٹھا لیا۔ اس میں جائے واردات کا پورا احوال تھا اور ہماری تصاویر بھی شائع ہوئی تھیں۔ وہ بمبری اور شیر سنگاں ڈپو سے پکڑے جانے والے وہ تخریب کار جن کی اطلاع سے برآمد ہونے والے اسلحے کی تھی۔ حالات کی تجزیہ کے ساتھ اشاعت شدہ واقعات کے تمام بیانات ایک کہانی کی طرح جانے والے پیش کر دیے تھے۔ میں نے برآمد ہونے والے اسلحے کی تصاویر دیکھنے کے بعد دونوں گرفتار ہونے والوں کو دیکھا۔ غالباً صرف محفوظ تھے۔ تاہم ان کو سی آئی اے کی تحویل میں دے دیا گیا۔ ابھی جائے واردات پر کسی نے تبصرہ نہیں کیا تھا کیونکہ یہ آخری وقت میں لگایا گیا تھا لیکن اسلحے کی برآمدگی اور اس کے ممکنہ نتائج پر بہت سے بیانات تھے جن میں علیحدگی پسندوں اور غداروں کی مذمت کی گئی تھی۔ ان کے عزائم پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا اور حکومت سے سخت اقدام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

"ہماری تصاویر دیکھ کر چودھری ملک اور اینڈ کمپنی کو دلی مسرت حاصل ہوگی۔" محسن نے کہا۔

"اب تو ہم اعلانِ جنگ کر چکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم [illegible] نے تمام دھمکیوں کی مخالفت ذہنی قبول کر لی ہے۔"

"کیا ہم نے ایسا کر کے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے؟" [illegible]

"وہ جھوٹ اب نہیں چل سکتا تھا کہ ہم چودھری [illegible]

بغاوت کی جنگ چل رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "یا اس کے کاروبار کو نقصان پہنچانے کے بارے میں سب بے خبر ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ حقیقت کا ہمیں پتا نہیں۔ یہ طاہر اور اس کے تمام ساتھی شکاری جان چکے ہیں کہ ہم سب حقیقت پوشیدہ نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے خلاف ہم نے مخبری کی ہے اور ہم اب خبری... لیکن ہمارا ساتھ کس نے دیا؟"

"لیکن اس کو تجربہ ایسا ہے اور شکاری کے حق میں بڑا ہو سکتا ہے۔ وہ پہلے کب اپنے حالات کے راز میں۔" میں نے کہا۔ "ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے اعلانِ جنگ کو وہ ہماری طاقت کا مظاہرہ سمجھیں اور محتاط ہو جائیں۔ دشمن کی قوت برابر تسلیم کر لینے والے صلح پر بھی مجبور ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے مذاکرات کی پیش کش کر سکتے ہیں۔ ابھی ہمیں ردِعمل کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"تم نے پولیس کا بیان دیکھا؟" محسن بولا۔ "ڈاکوؤں کے بارے میں۔"

"نہیں۔" میں نے اخبار لیا اور صفحے پر نظر دوڑائی۔

غالب مسکرایا۔ "آخری صفحے پہ دیکھو... خبر کو بہت غیر نمایاں رکھا گیا ہے۔"

میں نے صفحہ پلٹ کے دیکھا۔ اس میں تصویر صرف اس ایک کی تھی لیکن بیانات سب کے تھے اور ظاہر ہے اتفاق رائے کے بعد جاری کیے گئے تھے۔ انسپکٹر اور سب انسپکٹر نے بتایا تھا کہ وہ دونوں مفرور ڈاکوؤں کو پکڑنے کی غرض سے گشت پر تھے کہ اچانک جنگل میں مسلح دونوں ڈاکو ایک کار میں بیٹھے ہوئے جانے کے ساتھ فرار ہوئے۔ انھوں نے مکمل اطمینان کے ساتھ وہ دیر کو دبا اور دکھا کے چوری کیا تھا۔ پولیس پارٹی نے ان کا مقابلہ کیا اور مقابلے میں ایک کانسٹیبل خدا بخش نے مجرمان کی گرفتاری کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال اور شدید زخمی ہوا۔ ڈاکو جدید ترین اسلحے سے لیس تھے اور جنگل میں ان کے دیگر ساتھی بھی روپوش تھے جو مقابلے کے وقت سامنے آ گئے اور پولیس کا اسلحہ اور جیپ وغیرہ چھین کر فرار ہو گئے۔ اور دیسر نے بھی یہی کہا تھا مگر اس نے زیادہ تفصیل سے بتایا تھا کہ اسے دونوں فراران نے سنگاں سے واپسی کے راستے پر کس طرح بیچ سڑک میں آ کے روکا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ جیل سے فرار ہونے والے ڈاکو ہیں۔ چنانچہ اس نے دونوں کو کار میں بٹھا لیا۔ مگر آگے جا کے انھوں نے اسلحہ دکھا دیا اور اسے مجبور کیا کہ وہ گاڑی سے اتر جائے۔ وہیں اچانک پولیس پارٹی نمودار ہوئی اور ڈاکوؤں سے مقابلہ ہوا۔ ڈاکوؤں کے کچھ ساتھی بھی آ گئے جو سٹین گن لیے ہوئے تھے۔ پولیس پارٹی نے بہت جرأت سے مقابلہ کرتے ہوئے انھیں گرفتار کرنے کی کوشش کی مگر وہ زیادہ طاقت کے بل پر پولیس کا اسلحہ اور وہاں اور جیپ وغیرہ چھین کر فرار ہو گئے۔ وہ خود بھی ایک ڈاکو کی ضرب سے بے ہوش ہو گیا تھا، اس لیے اسے نہیں معلوم کہ ڈاکو فرار ہو کے کس طرف گئے تھے۔

مجھے اس بیان پر بہت ہنسی آئی۔ پولیس نے اپنی عزت بچا

لی تھی۔ اور دیسر نے وہی کہا تھا جو ہم چاہتے تھے۔ وہ پولیس کے مقابلے میں ہم سے زیادہ خائف تھا اور خود پولیس کے لیے بھی ایسا ہی بیان دینا ضروری تھا۔ میں نے اس وقت کا تصور کیا جب خوشدل کو اس بیان کی تفتیش کی گئے اور پولیس کے ساتھی گرفتاری کے متعلق بیان دیں گے۔ اس کے بعد پولیس کی پوزیشن کیا ہوگی۔ پولیس کس طرح ان کے تحفظ سے گا اور محکمہ خود ان کے خلاف کیا کارروائی کرے گا۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

ڈاکو دوسرے کمرے میں تھے، چنانچہ ہماری گفتگو نہیں سن سکتے تھے۔ میں نے محسن اور غالب کو بتایا کہ میں نے رہائش کا پورا انتظام کر لیا ہے اور ان کو مسٹر ڈیوڈ براؤن کے متعلق بتایا۔ پروفیسر کی کار کی بات نے سب کو محظوظ کیا۔ وہ سب لوگ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ محسن نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ ٹیری کو کسی کے گھر بھیجے۔ اس میں اندیشہ تھا کہ کوئی بہت زیادہ ہمدردی کے ساتھ مدد کا جائے۔ وہ بیلی اور غالب کو لے کر بازار گیا تھا اور چونکہ بیلی کا بازار اس کا دیکھا بھالا تھا اس لیے وہ پہلے چھوڑ اس خریف سے گیا۔ اصل میں ہماری بھروانے کے بعد واپسی میں ڈبل روٹیاں اور مکھن کے پیکٹ لے آیا۔

"اب یہاں ٹھہرنے کا فائدہ کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ "چلیں کسی گھر آباد کرتے ہیں۔"

"ابھی تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ تم نے جیل وہاں سے... میرا مطلب ہے ایس ایس پی رضوی صاحب سے خوشدل کو نکالا تھا۔" کیتھرین نے کہا۔

"مجھے اندیشہ تھا کہ بعد میں تمہارا نکلنا مشکل ہوگا۔" میں نے کہا۔ "تمہارے وہاں رہنے سے ہماری مشکلات میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ ملک اور اینڈ کمپنی تم کو پھر سے پا جاتی۔ اس بار تمہارے ساتھ تمہاری بیٹی بھی بازی جیت ہوتی۔ اور جتنی ہمت یا مستقل مزاجی کا مظاہرہ تم نے اکیلے کیا تھا، شاید بیلی کی موجودگی میں ممکن ہی نہ رہتا۔ بیلی تمہاری کمزوری بن جاتی اور تم دونوں کو بچانے کے لیے ہمیں کہیں نہ کہیں جھکنا پڑتا... یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پولیس تم کو جال بنا کے رکھے اور ہم کبھی نہ کبھی اس جال میں پھنس جائیں۔"

"کیا وہاں یہ سب نہیں ہوگا؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ خاصی محفوظ جگہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر تم احتیاط سے کام لو۔ میرا مطلب ہے ایسے علاقوں میں بہت زیادہ نہ گھومو پھرو جہاں کسی بھی شکاری کے ملنے کا امکان ہو..."

"شکاری کون؟" بیلی کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ کیتھرین نے اُسے گھورا۔

"وہ سب ہو جاتے ہیں تو آپ بھی شکاری ہیں۔" میں نے وضاحت کے لیے کہا کیونکہ بیلی نے ہماری زبان سے یقیناً بیچ

www.paksociety.com

www.paksociety.com

نہیں لٹتا تھا۔ وہ شکاری ہیں جو تمہاری ماں کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ پولیس بھی شکاری ہے۔ بہرام دادا کے پورے خاندان بھی شکاری ہیں۔ ممکن ہے کچھ دوست بھی شکاری ہوں۔ جو تم سے بہرام دادا کی دولت کا پتا لگانے کے پاس پہنچا بعض ہونے کی فکر میں ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ بین الاقوامی۔ سیاسی نوعیت کے شکاری ہیں۔"

"کیا تم شکاری نہیں ہو؟" جولی نے کہا۔

"ہاں، ہم ان کے شکاری ہیں جو ہمارے شکاری ہیں۔ اس طرح جو یہاں شکار ہے وہ شکاری بھی ہے۔ بس وقت، حالات اور موقع کا تقاضا فرق کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے تمہاری اعلیٰ سوجھ بوجھ میں خاصی بریفنگ کی ہے۔" غالب بولا۔

"تم نے اپنی ٹریڈ مارک کے حوالے سے کی ہو گی۔" میں نے کہا۔

"میں نے جولی کو کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔" کیتھرین نے کہا۔

"جتنا مجھ میں تھا سب بتا دیا ہے۔ ہم آپس کے وجود میں آنے کے اسباب اور اس کے اغراض و مقاصد، کامیابیاں اور ناکامیاں، عزائم اور ارادے۔" محسن بولا۔ "جولی تقریباً سب سے متعارف ہے اور میرا خیال ہے کہ کچھ عرصے بعد جب یہ بالکل صحت مند ہو جائے گی اور اس کی تھوڑی سی ذہنی تربیت بھی مکمل ہو گی تو یہ بھی ہم سے پیچھے نہیں رہے گی۔"

"ابھی ہم اپنے جلوس میں مزید افراد کو شامل کریں گے تو زیادہ غیر محفوظ ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "ابھی ہم ایک ٹیم ہیں۔ شعلہ اور جولی اس ٹیم کے لیے باہر رہ کے بھی بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ ویسے تو جیلا ہو، دوست، ایجوکیٹ اور ڈاکٹر شہریار، غالب کے علاقائی دوست علاوہ بہت سے دوسرے لوگ جنھوں نے اب تک ہماری مدد کی سب ہی ہم آہنگی کے حامی ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ آئندہ ہمیں زیادہ منظم ہو کے الگ الگ ٹیم کی صورت میں کام کرنا ہو گا۔ ابھی تک ہم اپنے ہی ملک میں تھے اور ہمیں آمد و رفت کے بار بار پابندیوں کے مسائل در پیش نہیں تھے۔ راستہ آسان تھا اور جیسا اسلحہ بھی مل ہی جاتا تھا۔ ہم کو ان مجرموں کے پیچھے بھارت یا مشرقی پاکستان جانا پڑا تو حالات مختلف ہوں گے۔ غور کرو تنظیم کس طرح ہوتی ہے۔ ایک حصہ پیش قدمی کرتا ہے اور پچھلا برقرار رکھتا ہے۔ دوسرا حصہ علاقائی رابطہ قائم کرتا ہے۔ جسے تم انٹیلی جنس اور سگنل کور کہہ سکتے ہو۔ تیسرا حصہ ٹرانسپورٹ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ای ایم ای، چوتھا راشن، کپڑے اور دیگر ضروریات کی فراہمی کرتا ہے۔ جیسا کہ یہ سب ضروریات تو ہم بھی ہیں مگر ہم نے ذمہ داریوں کو تقسیم نہیں کیا ہے۔ آگے چل کر ہر فرد کو ایک ٹیم کی ذمہ داری سنبھالنا ہو گی۔ اپنے کام اور منصب کرنے ہوں گے اور ضروری ہو گا کہ وہ کام کار... مقامی آبادی کی مدد کے بغیر کسی ملک میں رہ کے اپنی کارروائی جاری رکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے۔ مگر ہر جگہ ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جن کو پیسے یا جذباتی ہمدردی کے نام پر اپنے ساتھ شامل کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ ابھی دور کے مسائل ہیں۔"

"تاہم غور طلب ہیں۔" غالب نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"یہ خیال تو میرے ذہن میں بھی تھا کہ آگے چل کر ہم شدت اختیار کریں گے تو ہمیں زیادہ منظم ہونے کی ضرورت ہو گی۔ اور مدد بھی درکار ہو گی۔ اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے آج کے مسائل سے نمٹ لیں۔"

ہم نے ایک ٹیکسی میں اپنا سامان رکھا اور [illegible] گیا۔

میں نے کیتھرین کا تعارف کرایا۔ "یہ میری آنٹی ہیں۔ ان کی بیٹی جولیا عرف جولی... میری کزن۔"

ڈیوڈ نے ان سے ہاتھ ملایا۔ "میں بھی سمجھا تھا کہ یہ تمہاری بہن ہو گی اور یہ تمہاری ساس ہیں۔ اور یہ تمہارا سالا۔"

چونکہ میں سب کو ڈیوڈ براؤن کے مشکل ہونے کے بارے میں بتا چکا تھا اس لیے برا کسی نے نہیں مانا... کیتھرین سوالیہ، جولی کے شفق رخسار حیا سے لال ہو گئے۔

"یہ جولی کا بھائی ہے... ایڈورڈ... مگر یہ میرا سالا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ اور اچھی بات پر محبت بھرے دل نے مجھے وقت آ کے دکھا کے شرمسار کیا۔ وہ وقت کتنی جلدی خواب و خیال ہو گیا تھا جب فوزیہ سے میرا عشق ایک جنون تھا۔ اور اس وقت محمد واقعی میرا سالا تھا۔ اس کی بہن فوزیہ سے میری منگنی کئی سال پہلے ہو گئی تھی اور والد کے مرنے تک فوزیہ کے لیے میرے جذبات مضبوط تھے۔ میں محسن کو بالکل وہ سالا اعظم اور جوہر کے بھائی جیسا خیال سے قریب تھا اور ساز و راز فوزیہ سے میری ذہنی رفاقت کے رشتے کو تسلیم کرتا تھا۔ پھر وقت بدلا اور آغاز شباب کے ناپختہ شعور کی اندھی آندھی نے سب کچھ اڑا دیا۔ حالات کے ساتھ دل و دماغ بدل گئے۔ یہ سب کیوں ہوا اور کیسے ہوا۔ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب صرف کاتب تقدیر کے پاس ہو گا۔ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ ایسا ہونا ناگزیر تھا اور آج فوزیہ کا خیال مجھے نہ پریشان کرتا تھا نہ پشیمان... وہ اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ خوش تھی۔ ہم دونوں جو چاہتے تھے اس احساس سے وفا کے آزار سے

اداس تھی۔ یہ جرم و دولت سے دل لگا رہے تھے۔ اب یہ کوئی ایسا... شاید وہ عشق نہیں تھا۔ نادانی کی پسند تھی یا پرانی وابستگی کے جذبات تھے یا ایک خیال کی گرفت تھی کہ ہم ایک دوسرے کے لیے ہیں۔ عملی زندگی کی حقیقت برعکس تھی۔ آج ہم ایک نئی... تسلیم کرتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے تھے۔ ... ہو جاتے تو تباہ ہو جاتے۔ مگر اس حقیقت کو تسلیم کرتے کہ وہ محبت نہیں تھا ... زندگی کے لیے موزوں ... رفاقت قبول کی۔ ... محبت کا مطلب سمجھایا۔ جب مجھے صرف محبت کی ... تھا کہ محبت کا کوئی دوسرا روپ نہیں ہو سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے سچ ایک ہی ہوتا ہے۔

"جانے..." محسن نے چٹکی بجا کے کہا۔ "واپس آ جاؤ۔"

میں چونکا۔ "سوری... میں تھوڑا اداس ہوں۔ تصور پرست، تخیل کی دنیا میں رہنے والا کبھی کبھی حقائق کی دنیا سے پیچھے اپنی دنیا میں لوٹ جاتا ہوں۔"

"بے سبب کچھ نہیں ہوتا۔" ڈیوڈ براؤن نے کہا۔ "ہم سب فرار چاہتے ہیں۔ اس دنیا کے سخت حالات سے لڑتے لڑتے اور مخالف قوتوں کا مقابلہ کرتے کرتے ہمارے اعصاب، ہمارا ذہن اور جسم سب تھک جاتے ہیں۔ اس تھکن کا علاج خواب ہی تو ہیں۔ جاگتے ہوئے دیکھیں یا سوتے ہوئے۔"

"میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بیماری ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ نو... منفی حالات اور مخالف قوت سے تم غلط مطلب نکال رہے ہو نوجوان..." ڈیوڈ براؤن نے کہا۔ "ایک فنکار کے لیے سازگار ماحول کا فقدان، ایک موسیقار کے لیے ایک کمپوزیشن کا ... ایک مصور کے لیے اس کے شاہکار کے لیے ... اتنا ہی وہ صرف دولت مند ہوں مگر تصویر کا ... ادیب پر لکھنے پڑھنے کی پابندی۔ مملکت کی سوچ پر حریت پسند کے لیے آزادی کی منزل کے حصول کی دشواریاں یہ سب مخالف قوتیں ہیں۔ جو اعصابی و ذہنی شکست دیتی ہیں اور وہ فرسٹریشن کا شکار ہوتا ہے تو خواب دیکھتا ہے۔ ایک سپاہی کی مثال لو جس نے گولیوں کی بوچھاڑ میں برستے بم کے دھماکوں میں موت کے تماشے کو دیکھتے پورا ہفتہ گزارا ہو اسے خندق میں سکون کے چند لمحے میسر آتے ہیں تو وہ کس کے بارے میں سوچتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے خواب میں یا تصور میں؟ اپنا گھر، بیوی بچے... یہ خواب اس کو سکون دیتے ہیں۔ ریلیکس کرتے ہیں۔"

"کیا آپ ماہر نفسیات تھے... ہیں مسٹر ڈیوڈ براؤن؟" میں نے کہا۔

"ماہر نفسیات؟ وہ کیا ہوتا ہے؟" وہ فخر سے مسکرایا۔ "یہ فنکار کا علم ہے جو زندہ انسانوں کو دیکھنے سمجھنے اور پرکھنے سے آتا ہے۔ تجربے اور مشاہدے سے آتا ہے اور کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ کوئی آدمی کسی بھی علم میں خود کو ماہر کہے تو وہ احمق ہے کیونکہ علم ایک افق ہے۔ تم جتنا اوپر جاؤ گے اتنا ہی وسیع نظر آئے گا۔ کیا یہ غلط نہیں ہو گا اگر زمین سے اوپر اٹھنے والا خود کو ماہر افلاک کہنے لگے۔ خیر چھوڑو یہ بحث... یہ کیا بات ہے کہ تم لوگ خالی ہاتھ ہو! میں نے کسی خانہ بدوش قبیلے کو بھی اس حد تک بے سر و سامان نہیں دیکھا۔"

میں نے فوراً ایک غلطی کو چھپا لیا۔ "سامان بعد میں آ جائے گا۔ ہم لوگ فوری طور پر نئی رہائش میں منتقل ہونا چاہتے تھے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "تم چاہتے ہو میں ابھی واپس آرٹ گیلری چلا جاؤں؟"

"اوہ نو... آپ رہیں جب تک آپ کا دل چاہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کے ساتھ رہنے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"ٹھیک ہے، میرا خیال ہے کل میں کراچی چلا جاؤں گا۔ وہ بزنس کے لیے مناسب پوزیشن میں رہتے ہیں۔"

میں نے بیس ہزار روپے نکالے۔ "یہ دو سال کا ایڈوانس رینٹ قبول کر لیں۔"

"میں نے کہا تھا کہ میں ایک سال سے زیادہ کا کرایہ نہیں لوں گا۔" وہ جھنجھلایا۔ "مگر تم مصر ہو تو... ٹھیک ہے۔"

میں اور محسن لوٹ کر گئے تو ہمارے سامنے بہت سے کام تھے۔ سب سے پہلے تو ہمیں غالب کی ٹانگ کو شکنجے سے آزاد کرانے کا بندوبست کرنا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر شہریار کی مسیحائی سے اس کی حالت سنبھل گئی تھی مگر وہ شکنجہ بلاشبہ جان بن کے چمٹا ہوا تھا۔ اور یہ غالب ہی کا حوصلہ تھا کہ اس فولادی کیکڑے کو برداشت کر رہا تھا۔

"یہ کام کون کرے گا؟" محسن نے پوچھا۔ "کوئی لوہار؟"

"ہاں، لوہا کاٹنا تو لوہار ہی کا پیشہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ویلڈر بھی کر سکتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہو گا کہ ہم غالب کو ویلڈنگ پلانٹ پر لے جائیں۔"

"ویلڈنگ پلانٹ موبائل بھی ہوتے ہیں، جو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے جا سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"ہاں... مگر بہت بھاری ہوتے ہیں۔ اس کے لیے گاڑی چاہیے۔ ظاہر ہے رازداری کا معاوضہ الگ ہو گا۔ ہر شخص پر اعتبار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہم جسے بھی لے آئیں گے وہ دس قسم کے سوال کرے گا۔ اس بات پر تو کبھی راضی نہ ہو گا کہ اسے آنکھ پر پٹی باندھ کے لے جائیں۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ محاورہ غلط ہو چکا ہے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے؟" محسن بولا۔

میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ یہ بات مجھے کیوں نہیں سوجھی؟"

"مرعوب مندی کی بات کرنے کا ٹھیکا میرے پاس ہے۔"
محسن بولا: "ہوا کاٹنے کی مخصوص آری ہر جگہ ملتی ہے۔ اس کے بلیڈ سخت ترین اسٹیل کے بنے ہوتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"خاک معلوم ہے، کیا فائدہ اس معلومات کا جو وقت پر کام نہ آئے۔" محسن بولا۔

"تم نے کون سا وقت پر بتا دیا۔" میں نے کہا۔ "تم اور غالب بھی یہ بات جانتے تھے پھر کل کیوں نہیں خیال آیا۔ بہرحال وہ ایک مصیبت میں گرفتار ہے۔"

"ہاں یار۔ اس شکنجے کو کل ہی کاٹ کے الگ کیا جاسکتا تھا۔ وہ نرم لوہے کا بنا ہوا ہے۔" محسن بولا۔ "ہتھکڑی کاٹنا پھر بھی مشکل ہوتا ہے۔"

"اس آری سے ہتھکڑی بھی کاٹی جاسکتی ہے۔" میں نے کہا۔

ہارڈ ویئر کی ایک دکان سے ہم نے دو اسٹیل کے بلیڈ خریدے اور واپس پہنچتے ہی اس کام میں لگ گئے جو بہت پہلے ہو سکتا تھا۔ غالب نے [illegible] پر شرمندہ ہونے کی ناکام کوشش کی اور خود شرمندہ ہوا۔ ہم آدھے گھنٹے تک آری کو ایک ہی جگہ رگڑتے رہے۔ اسی میں ایک آری ٹوٹی کیونکہ محسن نے زیادہ جوش و خروش دکھایا تھا۔ ایسی ہر آری ذرا سا موڑنے سے خشک لکڑی کی طرح چٹخ سے دو ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ بالآخر ہماری محنت رنگ لائی۔ محسن نے ایک کالی شے کی طرح اس شکنجے کو باہر پھینکا اور پھر اس انڈر گراؤنڈ ٹینک میں ڈال آیا جس میں برسوں کا پانی کالے رنگ کا ہو گیا تھا۔

دوسرے کمرے میں ڈاکو اب چلانے لگے تھے۔ بھوک اور تکلیف سے ان کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ وہ ہمیں گالیاں دے رہے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ ان کو کہاں لا کے ڈال دیا گیا ہے۔ مگر ہم میں سے کسی نے ان کو جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کی حالت اتنی ابتر تھی کہ وہ شام تک مر جاتے۔ پولیس سے چھینی ہوئی وردیاں اب بھی جیپ میں موجود تھیں۔ ہم نے [illegible] کیے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے اور ڈاکوؤں نے ہوش آنے سے پہلے ہمیں وردی میں دیکھا تھا۔ اب یہ ضروری تھا کہ ہم اپنی تھانیداری کا بھرم قائم رکھیں اور ان کو شک نہ ہونے دیں کہ ہم پولیس والے نہیں ہیں۔ میں نے باہر جا کے گیراج کا دروازہ کھولا اور جیپ میں سے دونوں وردیاں نکال لایا۔ ایک انسپکٹر کی وردی تھی اور دوسری سب انسپکٹر کی۔ محسن نے خیال ظاہر کیا کہ اب غالب کو بھی [illegible] جولیا کے پاس پہنچا دینا چاہیے۔ میں نے اتفاق کیا اور یہ بھی کہا کہ وہ وہاں کے ضروری کام بھی نمٹا آئے۔ مثلاً کچھ فرنیچر اور گھر میں استعمال ہونے والے برتن خرید لے۔ کیتھرین اور جولی اپنے لیے کپڑے بعد میں اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق خرید سکتی تھیں لیکن ابھی وہ چادر اپنے لیے

جو اپنے مددگار تھے جو ہماری [illegible] کو بدلنے [illegible] ہوں ملا پتے ساتھ اس مقصد کے لیے پچیس ہزار [illegible] میں نے اسے یہ بھی تاکید کی کہ وہ فون سے رابطہ قائم رکھے [illegible] ایک لاکھ روپے بھی [illegible] دے آئے جو اس [illegible] کٹوا لیے ہوں گے۔

جب وہ ٹیکسی کی تلاش میں نکل گیا تو میں نے [illegible]
"آج پھر تم کو اپنے اخبار نویس ساتھیوں کو بلانا ہے۔"

"ہاں" میں سوچ رہا تھا کہ کیا پھر انہی کو بلاؤں۔" [illegible]

"کسی اور کو بلانا مناسب نہ ہوگا۔" میں نے کہا۔ [illegible] اشارہ دے چکے ہیں کہ ہمارے پاس جیل سے فرار ہونے [illegible] کی اسٹوری بھی ہے۔ یہ اسٹوری بھی ان کو ملے گی تو وہ ہم سے تعاون کریں گے۔ ظاہر ہے ان کی تو دھاک بیٹھ جائے گی۔"

"ہاں... لیکن دوسرے رپورٹر [illegible] تو ہمارے پیچھے لگ جائیں گے۔" غالب نے کہا۔ [illegible] وہ [illegible] بھی ہیں مگر سب سے خطرناک شکاری یہ صحافی ہوتے ہیں۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ تمہارے [illegible] تم جیسا مناسب سمجھو کرو۔ ایک بات اہم ہے کہ [illegible] کے قابل ہو۔"

"کل میں نے صحافی کا انتخاب کیا تھا جو میرے نزدیک [illegible] اعتماد تھے۔" وہ بولا۔ "آج کس پولیس افسر کی موجودگی [illegible] مناسب [illegible] اچھا تو یہی ہو تاکہ خود رضوی صاحب آ [illegible] کیس کی تفتیش بھی کر رہے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"ہمارے بلانے سے وہ ہرگز نہیں آئیں گے۔ [illegible] تو یہ بات یقینی سمجھو کہ وہ [illegible] سے ساتھ [illegible] جائیں گے [illegible]" کہا۔ "وہ کوئی ایسا بندوبست کریں گے کہ ہمیں خاک بھی [illegible] گا اور ہم محصور ہو جائیں گے۔"

"[illegible] یہ کام کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "[illegible] سے بات کر لیں کہ [illegible] ڈاکوؤں کو جو ہمیں [illegible] کا مقصد [illegible] فائدہ ان کو ضرور ہوگا۔ [illegible] تو پھر اس سے [illegible] ہونا چاہیے [illegible] گئے اور کس کے ذریعے پکڑے گئے۔ بقیہ جرائم کا سراغ [illegible] ہیں۔"

"مگر یہاں تو کوئی ان کی طرف سے پکڑنے والے [illegible] جو سیدھی سی بات نہیں سمجھیں گے۔" میں نے کہا۔ "سوال [illegible] گے کہ ڈاکوؤں کو اخبار والوں کے سامنے لانے والے خود [illegible] وہ کیسے نکل گئے اور ایس ایس پی صاحب [illegible] خود نہیں پکڑے [illegible] خود اس کوتاہی کے مرتکب ہوئے کہ وہ [illegible] ملزم اتنی دیدہ دلیری سے فرار ہو گئے۔"

"اس کا یہی ایک علاج ہے۔" غالب نے کہا۔ "فرض کرو کہ ہم [illegible] ان کے سامنے ڈاکو اپنا بیان دیں اور [illegible] جواب [illegible] ہو جائیں، وہ تصویریں وغیرہ لیں [illegible] کو فون کریں اور بتائیں کہ وہ اپنی تفتیش [illegible] سے ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیں۔ اس طرح گرفتاری [illegible] نہ لگے گا مگر پھر بھی گرفتار نہ کرنے کی کوتاہی کا الزام [illegible] نہیں آئے گا۔"

"[illegible]" میں نے کہا۔ "مجھے یہ بتا دو کہ تمہارے وہ یار اس [illegible] کہاں ہوں گے۔ میرا خیال ہے گھروں پہ بھی تمام کے [illegible] ہو گئے۔"

"ہاں رات کی مصروفیت [illegible]"

"[illegible] ان کے ٹھکانے تو معلوم ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں... اب بھی وہیں ہوں گے جہاں پہلے رہتے تھے۔"

"تو وقت مت کرو۔ جاتے ہوئے ہر ایک کو گھر پہ پیغام دے [illegible] اور جب محسن آئے تو اس کے ساتھ وہ بھی آ جائیں۔"

باہر ایک گاڑی کے رکنے کی آواز پر میں سمجھ گیا کہ محسن ٹیکسی [illegible] میں نے اور محسن نے غالب کو ٹیکسی میں منتقل کیا اور [illegible] مجھے امید تھی کہ راستے میں غالب خود محسن کو سارا [illegible] بتا دے گا۔

اب میں نے تھانیداری کی وردی پھر پہنی اور ریوالور ہاتھ میں [illegible] ڈاکوؤں کے سامنے گیا۔ وہ واقعی سخت تکلیف میں تھے اور مجھے دیکھتے ہی گڑگڑانے چلانے لگے۔

"[illegible] خان... اور [illegible] خان۔" میں نے کہا۔ "تم کو کچھ کہنا ہے؟"

"ہاں... تھانیدار... [illegible]" آخر ہمیں یہاں کیوں [illegible] رکھا گیا ہے؟"

"تمہاری گرفتاری کی خبر ابھی پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ آج ایک [illegible] ہم تم سے تفتیش کریں گے۔" میں نے کہا۔

"ہم کچھ نہیں بتائیں گے... بس جو پھانسی چڑھا دیں [illegible]"

"[illegible] نے ایک موقع فراہم کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اس [illegible] اٹھا سکتے ہو... سچ بول کر..."

"بکنا بند کرو۔" [illegible] نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تو پاگل ہے [illegible] سچ بول کر آدمی کو پھانسی لگتا ہے۔"

"یہ ذرا مختلف صورت حال ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہارے فرار [illegible] اور لوگ معطل ہو گئے ہیں۔ اب اگر تم سچ بتاؤ [illegible] ہونے میں کامیاب ہوئے۔ کس طرح دوبارہ پکڑے گئے [illegible] سماعت پھر شروع ہوگی اور اس میں نئے معاملات

اٹھائے جاسکتے ہیں۔"

"مشکل ہے۔ اب کوئی ہمیں نہیں بچا سکتا۔"

"تمہارا کیس اخبارات میں دیا جا رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "عدالت کے نوٹس میں بہت سی باتیں آسکتی ہیں جو آج تک نہیں آئیں۔ [illegible] تم نے اپنا سارا [illegible] جھوٹ پر [illegible] اب سچ بول کے تم عدالت کی وہ ساری تصویر پیش کر سکتے ہو۔ مثلاً تم تفصیل سے بتاؤ کہ تم ڈاکو کیسے بنے۔ کس نے تمہاری سرپرستی کی۔ کون کون پولیس افسر تم سے مال لیتا رہا۔ یہاں تک کہ جانتے بوجھتے خلاف جانے والی بات بھی کر دو... صاف بتا دو کہ پولیس والے کمائی کے کمال ہوتے تھے [illegible] ان کی جیب کہاں کہاں جاتی تھی اور... تم نے ان کے ساتھ بیٹھ کے کیا کھایا۔"

وہ دونوں تعجب سے میری صورت دیکھنے لگے۔ "یہ بھی بتا دیں؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "ہماری فکر مت کرو... یہ کوئی بڑا الزام نہیں ہے۔"

"تم کہتے ہو گرفتاری کے بعد پھر مقدمہ چلے گا؟" پائے خان بولا۔

"ظاہر ہے نئے بیان کی روشنی میں سماعت دوبارہ ہوگی۔" میں نے کہا۔ وہ میرے جھانسے میں آگئے تھے کیونکہ وہ قانون سے ناواقف تھے۔ انہیں امید کی ایک کرن دکھائی تھی جو میں نے انہیں فراہم کر دی۔

"ایک صورت اور بھی ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

وہ میری صورت دیکھنے لگے۔

"تم سلطانی گواہ بن جاؤ۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ اپنے گروہ کے تمام جرائم کا اعتراف کر لو۔ سب کے پتے ٹھکانے بتا دو اور سب کو گرفتار کرا دو۔"

"یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" [illegible] نے کہا

"ہم... ہم اپنے ہی ساتھیوں کے ساتھ دغا کریں؟" [illegible] بولا۔

"زندہ رہنا ہے تو یہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔ "یہ تو دنیا کا دستور ہے۔ کوئی بھی دوسروں کی خاطر جان نہیں دیتا۔ وہ کون سے تمہارے سگے دوست تھے۔ ہم پیشہ تھے اور بس... ایک غلط کام کے لیے تم سب اکٹھے ہو گئے تھے۔ تم عدالت کے سامنے تائب ہو سکتے ہو کہ ہم آئندہ شرافت کی زندگی گزارنے کا عہد کرتے ہیں... تمہارے سب ساتھی اندر ہو جائیں گے اور تم کو قانون کی مدد کرنے کی رعایت مل جائے گی۔"

"لیکن... وہ ہم کو زندہ نہیں چھوڑیں گے... ہمارے ساتھی۔"

"وہ جیل میں ہوں گے۔ پھانسی لگ جائیں گے۔ کچھ عمر قید کاٹیں گے باقی کو لمبی سزائیں ہوں گی۔ ان کے باہر آنے سے پہلے ہی تم روپوش ہو سکتے ہو۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ جہاں جی چاہے چلے جانا۔ لیکن پہلے سوچ لو کہ زندہ رہنا چاہتے ہو یا نہیں۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

یہ سوال آہستہ آہستہ ضروری ہو گیا تھا۔ ان کی آنکھیں بجھتی امید کی روشنی دیکھنے لگی تھیں۔ جو شخص تختۂ دار کے اتنا قریب ہو اس سے کیا پوچھنا کہ زندہ رہنے کی خواہش رکھتے ہو تو بتاؤ۔ اس وقت وہ زندگی کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ پلٹے خاں اور ڈاکو بھی سوچنے لگے تھے کہ اس طرح زندگی مل سکتی ہے تو کیا ہے... یہ غداری ہو یا بے وفائی۔ بزدلی ہو یا نامردی، یہی الزام لے کر بھی زندگی کا سودا کرنا مہنگا نہیں ہوگا۔ میں نے محسوس کیا کہ تیر نشانے پر بیٹھ گیا ہے۔ اب وہ میری مرضی کے مطابق بیان دیں گے اور ادھر اخبار والوں کے ہاتھ ایک دلچسپ سنسنی خیز کہانی لگ گئی۔ ادھر ایل رضوی کو موقع مل گیا کہ وہ دونوں ڈاکوؤں کے باقی گینگ کو بھی گھیر لیں... سارا میدان کی بہت بڑی کامیابی شمار ہوگی۔ میں نے انھیں تنہا چھوڑ دیا کہ وہ اچھی طرح سوچ لیں اور آپس میں مشورہ بھی کر لیں۔

اس کمرے کے باقی دروازے باہر سے مقفل تھے۔ کھڑکیاں قدرے غیر محفوظ تھیں مگر مجھے ان دونوں کی حالت ایسی نظر نہیں آتی تھی کہ وہ کھڑکی کے راستے کود جائیں اور نکل جائیں۔ مجھ پر کچھ تھکن غالب آ چکی تھی۔ وردی اتار کے اور اپنے کپڑے پہن کے میں دروازے کے قریب لیٹ گیا۔ سگریٹ ابھی آدھا ہی ختم ہوا تھا کہ مجھے نیند نے آ لیا۔ پھر میں کسی گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز سے جاگا۔ میں ایک دم اٹھا اور ریوالور لے کر باہر آیا مگر آنے والے محسن کے ساتھ آئے تھے اور وہی اخباری رپورٹر تھے جنھوں نے گزشتہ رات ڈائجسٹ کے آفس میں ہم سے ملاقات کی تھی۔ وہ بہت خوش تھے کیونکہ ان کی خبر نے بہت بڑا دھماکا کیا تھا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے حیران اور پریشان تھے کہ یہ سب تفصیلات ان کو کیسے ملیں مگر قانوناً وہ کسی بھی اخبار نویس کو ذریعۂ اطلاع بتلانے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ دونوں خبروں نے تہلکہ مچا دیا ہے اور آنے والے اخبارات میں مزید طوفان کھڑا ہوگا۔ عمومی طور پر یہ خیالات کا اظہار کیا جائے گا جو ہمارے حق میں بھی ہموار ہوگا۔ کوشش یہ کی جائے گی کہ ہمیں آہستہ آہستہ ہیرو بنا دیا جائے۔ یہ ثابت کیا جائے کہ ہم سازش کا شکار ہوئے۔ سازش کرنے والے غدار اور ملک دشمن عناصر تھے جن کی مدد پولیس نے کی۔ اس کے بعد تحریک چلائی جائے گی کہ ہمارے خلاف مقدمات واپس لیے جائیں۔

یہ بڑی خوش آئند خبر تھی۔ میں نے ان کو بتایا کہ دونوں ڈاکو آمادہ ہیں اور مصلحت کا تقاضا ہے کہ میں ان کے سامنے نہ جاؤں۔ محسن بھی پولیس کی وردی میں رہے گا اور اخبار والے ان کا مفصل بیان لینے کے بعد جتنے سوالات کرنا چاہیں کر سکیں گے۔ غالب اپنا بیان دے چکا تھا۔ میں نے بھی وہی کہا جو غالب نے کہا تھا کہ یہ ڈاکو پولیس پارٹی سے ان کی جیپ، رائفلیں، ریوالور اور وردیاں لے کر فرار ہو رہے تھے کہ ہم سے مڈبھیڑ ہو گئی اور ہم نے انھیں پکڑ لیا۔

ان کا خیال تھا کہ ہم خالی ہاتھ ہیں اور ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ [illegible] خود کو اس قسم کے دہشتوں کے روپ میں [illegible] ان کو قابو کر لیا۔ اس موقع پر میں نے بتایا کہ میں مارشل آرٹس سے واقف ہوں اور خالی ہاتھ بھی مقابلہ کر سکتا ہوں۔ غالب کے دوستوں نے وعدہ کیا کہ ان کا یہ قصہ خوب بڑھا چڑھا کے لکھیں گے۔ [illegible] اور مفرور مجرم کا نہیں، ایک جیالے نوجوان کا بن جائے گا جو استبداد کے خلاف نبرد آزما ہے اور اپنے [illegible] ملک دشمن عناصر کو نیست و نابود کرنے کا عزم رکھتا ہے [illegible] کے حامی بیوروکریٹ اور بے ضمیر انتظامیہ کے [illegible] مشکلات پیدا کر رہے ہیں، کیونکہ وہ محب وطن نہیں [illegible] بکے ہوئے ہیں۔

ڈاکوؤں نے میری توقع کے مطابق بیان دیا۔ محسن [illegible] وردی پہن کے اندر گیا اور اس نے کہا کہ وہ خصوصی تفتیشی [illegible] ہے۔ اگر ڈاکو سچ بولیں گے تو وہ ملیٹری [illegible] ان کے لیے [illegible] کی سفارش بھی کرے گا اور اگر وہ چاہیں گے تو ان کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا جائے گا اور یہ ممکن ہے کہ ان کی سزا معاف کر دی [illegible] یہ سب جھوٹ [illegible] محسن نے ٹیپ ریکارڈر [illegible] بریف کر دیا تھا۔

گورے ڈاکو نے ایک گھنٹے میں بتایا کہ وہ کس جیل سے کیسے جیل سے فرار ہوا۔ اس نے کہاں کہاں وارداتیں کیں [illegible] ان کو شریک کیا۔ وہ کس کس کو حصہ دیتا رہا تھا۔ [illegible] اس نے اپنی گرفتاری کا احوال سنانا شروع کیا کہ انھوں نے [illegible] پولیس کو دیکھا۔ وہ تھانیدار تھے جو جیپ کے پاس [illegible] انھوں نے دعوت اڑائی تھی اور کھانے میں مرغ، نرگسی کوفتے اور حلوہ کھایا تھا۔ یہی سب کچھ انھوں نے بھی کھایا اور [illegible] والوں کا اسلحہ چھین کر انھیں بے بس کر دیا۔

محسن کے اشارے پر اس نے اپنا بیان ختم کر دیا [illegible] تھا کہ اس سے آگے وہ کچھ نہ کہیں۔ گورے ڈاکو نے تسلیم کیا کہ اب وہ بھی پولیس والوں کی تحویل میں ہیں [illegible] ہے کیونکہ وہی ان کو بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ پولیس [illegible] پہلے بھی ان کے مددگار رہے تھے۔ چنانچہ یہ کوئی انوکھی اور حیران کن [illegible] والی بات نہ تھی۔ ڈاکو سمجھتے تھے کہ اس مدد کی قیمت [illegible] کتنی ہی ہوگی۔ پلٹے خاں کی سوانح حیات [illegible] اور اس میں پولیس کے دو بدعنوان افسران کے نام آ گئے [illegible] جو اس کے دوست اور دشمن رہے تھے لیکن وہ [illegible] دونوں کے بیان میں مشترک تھی۔ پولیس کا وہ [illegible] پولیس افسر بھی موجود تھے اور ترقی بھی پا چکے تھے۔ جن کے [illegible]

[illegible] تھا کہ اس بیان کی اشاعت کے بعد وہ [illegible] صاف ظاہر [illegible] کو جھوٹ کہا گیا۔ بہتان تراشی اور اخبار والوں کی [illegible] انھیں سچا تسلیم کیا جائے گا کیونکہ وہ ظالم اور [illegible] مجرم اور [illegible] ہیں۔ وہ کوئی ثبوت [illegible] نظام میں سچائی صرف وہ ہے جو حکومت [illegible] پلٹے خاں کو بھی اسی جگہ روک دیا گیا جہاں اس کے [illegible] ڈاکوؤں کو لایا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ وہ پولیس کے دو تھانیداروں [illegible] جیپ اور سرکاری اسلحہ چھین کر انھیں بے بس کرنے کے بعد [illegible] فرار ہو گئے تھے۔

اس کے آگے ہمارا بیان تھا کہ ہم نے ان ڈاکوؤں کو پولیس کی جیپ چلاتے دیکھا اور شناخت کر لیا۔ ان کو [illegible] آؤٹ کر کے یہاں لے آئے۔ ہمارے اس بیان کا ڈاکوؤں [illegible] ناممکن تھا کہ وہ بعد میں بیان بدل سکتے۔ اخبار [illegible] عجیب تھے مگر ان کی دوستی غالب سے تھی۔ پولیس [illegible] دشمن تھے جتنی عام پبلک تھی۔ شاید اس سے [illegible] بہت سے ایسے معاملات کی خبر بھی رکھتے تھے جو [illegible] باہر سے کچھ اور دکھائے جاتے تھے۔ انھوں نے [illegible] محسن کے مشورے سے ڈاکوؤں کے اور ہمارے بیانات [illegible] ڈاکوؤں کی تصاویر اتاریں۔ پھر جیپ کی تصویریں لیں۔ [illegible] کے تصاویر بنائیں۔ اس طرح کہ [illegible] اور رائفل کا سیریل نمبر نمایاں ہو۔ [illegible] شناختی کارڈ وغیرہ کی تصویریں بھی اتاریں اور پھر ہم [illegible] انھیں شام تک بہت [illegible] ہمارا وہاں ٹھہرنا فضول تھا۔

میں نے اور محسن نے اس نمائش کو اسی طرح چھوڑا جیسے [illegible] پولیس کی وردیاں، ان کا اسلحہ اور شناختی کارڈ وغیرہ کر کے [illegible] جیپ کو گیراج سے نکال کے باہر [illegible] اپنی موجودگی کے سارے آثار [illegible] قریب ترین ٹیلی فون بوتھ پر پہنچ کے میں نے [illegible] کے آفس کا نمبر ملایا مگر آواز بدل کے بات کی۔ انھیں [illegible] سے فرار ہونے والے دونوں ڈاکو کہاں گرفتار کیے جا [illegible]

"تم کون ہو... بکتہ..." انھوں نے گھبرا کر آواز بدل کے پوچھا۔

"سکندر و سکندر... ہم پولیس ہیں۔" میں نے کہا اور فون [illegible] آیا۔

"[illegible]" میں نے محسن کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ محسن بولا: "غالب نے راہ میں دو گھنٹے لگا دیے۔"

محسن بولا: "اس کے یہ صحافی دوست عجیب و غریب لگ رہے تھے [illegible] سوچتے ہیں۔"

"اور کیا صحافی [illegible] میں رہے گے۔ وہ بھی پاکستان کے صحافی؟"

"ہرگز نہیں [illegible] نہیں جا سکتی تھی۔ مجھے آ کے پیدل جانا پڑتا تھا اور ہم سے دوسرے [illegible] کے لانا پڑتا تھا۔" محسن نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اسباب خانہ داری بھی نہیں پہنچا؟"

"کچھ پہنچ گیا... کام کے صاحب کی تسلی کے لیے۔" محسن بولا: "راستے میں ایک پرانے فرنیچر کی دکان اتفاق سے آ گئی۔ میں نے جو تو آیا وہ خرید لیا۔ چار پرانے بیڈ [illegible] دو سنگل... میز کرسیاں... ایک الماری۔ [illegible] سودا [illegible] بیڈ [illegible] استعمال شدہ نہ ہوتا تو وہ مزید [illegible] ایک [illegible] سے [illegible] چادروں سے [illegible] ہو گئے ہیں۔"

"اور وہ فرنیچر... کیا وہ بھی ٹیکسی میں ڈال دیا تھا؟"

"اسے پتا سمجھا دیا تھا۔" محسن بولا: "دکاندار نے کہا کہ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ہمارے آدمی سارے شہر میں پھرتے ہیں۔ [illegible] نکالتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب تک پہنچ گیا ہوگا۔"

"کیوں نہ ہم باقی شاپنگ کر لیں؟" میں نے کہا: "ضروری برتن اور کچھ [illegible] خریدتے ہوئے چلیں... منگوا لیا تھا؟"

"نہیں... وہ تو [illegible] تھا اور نہ گھر میں۔" محسن بولا: "غالباً کورٹ سے روانہ ہونے میں دیر ہوئی تھی۔ اس وقت [illegible] ہوگا اور وہاں اس سے ملنا ٹھیک نہیں۔ رات کو گھر پہنچ جائیں گے۔"

میرا اور محسن کا یوں گھومنا پھرنا خطرناک تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ آج ہی اخبارات میں ہماری تصویریں شائع ہوئی تھیں۔ ایسے ہی چلتے چلتے میں نے محسن کو تجویز پیش کی کہ اب ہمیں حلیہ بدل لینا چاہیے۔ آدھے شہر نے ہماری تصویر آج دیکھی ہوگی۔ باقی آدھا شہر کل دیکھ لے گا۔ یہ سب پبلک کے لیے بہت سنسنی خیز خبر ہے اور ڈاکوؤں کی گرفتاری تو ایک موضوع ہوگا جس پر گھر کی خواتین بھی اظہار خیال فرمائیں گی۔ محسن کو مجھ سے اتفاق تھا۔ اچانک ہم ایک ہیئر ڈریسر کی دکان کے سامنے سے گزرے۔ اس نے شو کیس میں ہر طرح کی وگ سجا رکھی تھی۔ میں نے محسن کو متوجہ کیا۔ اور بہت کم لوگ تھے۔ جو رش صبح شام کے اوقات میں نظر آتا ہے وہ نہیں تھا۔ "[illegible] ہیئر آرٹسٹ [illegible] پہچان بھی سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہیئر ڈریسر کی دکان بہت خطرناک جگہ ہوتی ہے۔" محسن بولا۔ "سب شیو کروانے والے مفت کے اخبارات پڑھتے ہیں اور پھر تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ یہ ہر ایک باخبر اور باشعور شخص ہوتا ہے جو سب کی سنتا ہے۔"

www.paksociety.com

"تیرا مطلب ہے وہ ہمیں شناخت کر لے گا؟"

"اس کا امکان ہے۔"

"ہم رسک لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

محسن نے غلط نہیں کہا تھا۔ چیف باربر نے کاؤنٹر پہ ہی ہمیں شناخت کر لیا تھا۔ اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ ہم دونوں نے جھٹک کر پستول نکال لیے۔ اس کا منہ فوراً بند ہو گیا۔

"آج کے اخبارات پڑھنے کے بعد تم کو اتنا اندازہ تو کر لینا چاہیے کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "ہم نے سیکڑوں بے قصور لوگوں کا صفایا کر دیا۔ ان کے اطلاعات یہ یاد کر لیے۔ جیل کا پھاٹک گرائے اور دو پولیس کانسٹیبل قتل کیے۔ تم کیا چیز ہو؟"

"ہم نہ چھوٹا کو ہی ہیں، نہ قاتل ہیں، نہ مفرور مجرم۔" محسن نے کہا۔ "ہم اس ملک کے محب وطن شہری ہیں۔"

"بے... بے شک جناب عالی..." باربر نے بمشکل تمام کہا۔ "آج تو سارے لوگ یہی کہتے ہیں... آپ... آپ لوگوں نے تو بڑا کام کیا ہے جی... وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے... کہ لوگ فخر کر رہے ہیں۔"

"اچھا؟" میں نے اس حوصلہ افزا اطلاع پر خوش ہو کے کہا۔ "کیا تم سچ بول رہے ہو؟ یا اپنی جان بچانے کے لیے...؟"

"لو جی... آپ کوئی دشمن تھوڑی ہیں ہمارے۔ الٹا آپ کو حوصلہ ہے اور پولیس کو عقل نہیں۔" چیف باربر نے کہا۔ "ہم تو جی دل سے تعریف کرتے ہیں کہ آپ نے کمال کر دیا۔"

"کل تم کو ایک اور خبر ملے گی۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا جی؟" چیف باربر سرگوشی میں بولا۔

"یہاں نہیں... اندر کوئی جگہ ہے تو ہمیں لے چلو۔ ہمیں تمہاری مدد کی بھی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "بس ایک بات مت بھولنا۔ دھوکا دینے یا چالاکی کرنے والے کو ہم جیون دیتے ہیں۔ ہمارے لیے ہمارا مشن اہم ہے۔ ہم صرف تم کو ہی نہیں ان سب کو ختم کر کے بھی نکل جائیں گے۔ اگر ضروری ہوا... کوئی ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔"

"خدانخواستہ... خدانخواستہ جی..." چیف باربر نے خشک حلق کو تھوک نگل کے تر کیا۔ "آپ حکم کریں عالی جاہ... اندر میرا گھر ہے... پچھلی طرف سے اندر چلیں۔ مجھ سے جو خدمت ہو گی بجا لاؤں گا۔"

سیلون کے آخری حصے میں ایک دروازہ تھا جو گھوم گیا اور اس کی جگہ دروازہ نمودار ہوا۔ ہم اس کے پیچھے ایک اور دروازے سے گزرے تو خود کو ایک کمرے میں پایا۔ ایک عورت جو تخت پر لیٹی کوئی فلمی رسالہ دیکھ رہی تھی، وہ ہڑبڑا کے جاگی اور اندر غائب ہو گئی۔ ایک بچہ جو کرسی سے فرش پر کود رہا تھا آرام سے بیٹھ گیا۔

"ادھر بیٹھو شمشاد بھائی!" چیف باربر [illegible] "کہ آپ نے مجھے خدمت کا موقع دیا... میرا دل کرتا ہے [illegible] بنا دوں..."

"ایسی بے وقوفی ہرگز مت کرنا۔" میں نے [illegible] سب کچھ کرتے ہیں۔ ہم تو پیچھے [illegible] میں پھنس جاؤ گے۔ تم ہی نہیں تمہارے گھر والے بھی۔"

"سمجھ گیا... بالکل سمجھ گیا جی..." وہ بولا۔ [illegible] کل اخبار میں آ جائے گا۔"

میں نے اسے بتایا کہ کس طرح گورا [illegible] جیل سے فرار ہوئے تھے۔ یہ خبر اس نے بھی پڑھی [illegible] انھوں نے پولیس کے ساتھ کیا سلوک کیا اور [illegible] کیفر کردار کو پہنچے۔ چیف باربر [illegible] تھا جیسے ہم کسی اور قسم کی چیز ہیں یا مریخ کی مخلوق [illegible] گھر میں اتر آئی ہے۔ یہ آنکھوں دیکھی باخبری [illegible] تھام لینا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ سامعین نے [illegible] تھا کہ اسے کسی کی ہیرو جی کا شرف حاصل ہوا [illegible] تھا کہ خبر جب سارے شہر سے پہلے معلوم ہو چکی ہے [illegible] چپ رہنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن مجھے لگتا تھا [illegible] بعد وہ پھٹ جائے گا۔ وہ [illegible] اور صبح کا اخبار آنے تک اس محلے کے کافی [illegible] آشنا ہو جائیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک زبان سے [illegible] کان تک پہنچتے ہوئے خبر بدل جائے۔ ہر شخص [illegible] کے لیے کچھ اضافہ کرے گا اور صبح اخبار میں حقیقت آنے تک [illegible] جتنی چیف باربر جانتا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے استاد جی؟" میں نے کہا۔

"امام دین ہیئر آرٹسٹ۔" وہ بولا۔ "لوگ پنڈت کہتے ہیں۔"

"پنڈت؟ یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے کہا۔

"وہ جی... میں کچھ ستاروں کی چال وغیرہ کے حساب سے باتیں بتا دیتا تھا جو درست ہو جاتی تھیں۔ وہ [illegible] شوق تھا۔"

"اور باتیں اتفاق سے درست ہو جاتی تھیں۔"

"وہ تو ہے جی... ہم شغل کرتے تھے۔ [illegible] کو منظور ہو اور بندہ باخبر کیا جائے غیب کا حال [illegible] لگ جاتا تھا اور سچ ہو تو لوگ دوڑے آتے تھے [illegible] بتایا تھا۔ غلط ہو تو کسی کو میرا خیال بھی [illegible] کہ میں نے کیا کہا تھا۔ کچھ لوگ مذاق اڑاتے تھے کہ [illegible] پھرتے ہے۔ بس وہ پنڈت ایسا چلا کہ اب زیادہ لوگ [illegible]

"پھر تو ہم بھی پنڈت ہی کہیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تمہارا ستاروں کا علم کیا کہتا ہے؟"

[illegible] "آپ شمشاد ہو۔ اللہ نے آپ کو اتنی شہرت [illegible] بڑے بڑے کام کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔ آپ تو اس [illegible] کی حمایت حاصل ہے آپ کو۔" وہ بولا۔ [illegible] تیر لگ گیا تو واہ واہ۔"

"اچھا پنڈت! اب ہمارا مشورہ سنو۔" میں نے کہا۔ "تمہاری طرح [illegible] لوگ اس شہر میں ہمیں پہچان سکتے ہیں۔ ابھی تک ہمیں [illegible] تو مزے سے گھوم رہے تھے۔ شاید کسی نے غور [illegible] لیکن ہم ایسے نہیں پھر سکتے۔ کل کے بعد تو بہت مشکل ہو گا۔ ہم [illegible] کہ تم ہمارا حلیہ بدل دو۔ ہم اندر آئے تھے وگ لینے۔ تم ہمارے [illegible] ایسی وگ لاؤ جو فٹ بیٹھے۔"

"بس تو جناب، میں خود کروں گا۔" وہ دکان کی طرف لپکا۔

"مجھے اس صورت حال سے خوشی ہوئی۔" میں نے کہا۔

"میں بھی نہیں بتا سکتا کہ میرا حوصلہ کتنا بڑھ گیا ہے۔" محسن بولا۔ [illegible] ہمارے حمایتی اور مددگار بہت ہیں۔ ان کے مقابلے میں تمہارے [illegible] بہت ہی کم ہیں۔"

"کل کے بعد اخبارات میں جو مہم شروع ہو گی اس کا بہت [illegible] ہم کو پبلک کی چیدہ چیدہ مل جائے گی۔ جلسے ہوں گے [illegible] اس ملک کے سب [illegible] ان میں بڑے بڑے دل والے ہیں جو ہر [illegible] ذرا سے قدم سے کھٹے۔"

"یہ کام بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔"

"ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم صحیح وقت [illegible] پبلک کے سامنے آئے ہیں۔ آئندہ دو چار دن [illegible] وہ ہماری سب سے بڑی فتح ہو گا۔ ہم جہاں [illegible] اس ملک کے عوام ہمارے ساتھ ہوں گے۔ ہم خود [illegible] بہت سے کام نکال سکیں گے۔"

"غالب سے کہتا ہے کہ وہ اپنے سب صحافی دوستوں کو [illegible]" میں نے کہا۔ "پولیس نے اور [illegible] کروا رکھی ہے۔ اب رائے عامہ کو ہمارے حق [illegible] ہمارے کارناموں کو خوب اچھالا جائے۔"

اسی وقت پنڈت آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چار ڈبے تھے۔

[illegible] وگ کا سیٹ ہے بادشاہو۔" اس نے ایک ڈبا [illegible] یہاں تو شوقین مزاج استعمال کرتے ہیں۔ بڑے بڑے [illegible] کے پاس ہیں۔ [illegible] ان کے بیچ [illegible] کرتے ہیں گاہک [illegible]

کون سا معلوم کہ یہ سب شوشا ہے۔ ادھر تو نقلی بالوں کی اسٹائل ہے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "بوڑھے شخص اس سے جوان اور خوب صورت نظر آتے ہیں۔ آپ تو خیر سے خدا بھی ہیرو ہو۔" اس نے ایک ایک ڈبا کھول کے دکھانا شروع کیا۔

"چیز تو لاجواب ہے استاد۔" میں نے کہا۔

"لاجواب کیوں نہ ہو گی جناب، اصل فرانس کا مال ہے۔ ساٹھ ستر میں پڑتی ہے اور ڈیڑھ دو ہزار میں آسانی سے نکل جاتی ہے۔ وہ بھی مل جاتے ہیں۔"

"ہم سے کیا لو گے؟" میں نے کہا۔

"آپ سے؟ لو جی... میں نے قیمت اس لیے تو نہیں بتائی تھی۔" وہ بڑے دکھی لہجے میں بولا۔ "بے وقوف آدمی ہوں جی... اس لیے ملاقات میں بات منہ سے نکل گئی۔"

"ہم مفت نہیں لیں گے۔" محسن نے کہا۔

"ایسا مت کہو سرکار! آپ کو نہیں یہ نذرانہ میں اپنے وطن کو دے رہا ہوں۔ اگر آپ دشمنوں کے خلاف جنگ لڑ رہے ہو تو میری طرف سے عطیہ، تحفہ، چندہ کچھ بھی سمجھ لو۔ غلط جھوٹ نہ جانے پینسٹھ کی جنگ میں اپنی ساری آمدنی میں نے دفاعی فنڈ میں دی۔" میں نے کہا۔ "پنڈت اس ملک میں شکر چینی سے بیٹھ کے ستر سال کھاتا رہا۔ صرف اپنے لیے کماتا رہا۔ اب ملک اپنا حق مانگتا ہے۔ اپنی کمائی میں سے اس کو بھی دے... دیکھو نا جی... ماں اپنے بچے کے لیے کیا نہیں کرتی۔ باپ کتنی محنت سے کماتا ہے اور اسے کھلا پلا کے بڑا کرتا ہے۔ پھر جوان بیٹا صرف اپنے لیے کمائے اور سب خود کھا جائے۔ ادھر ماں باپ نے کبھی نہ مانگا ہو مگر ان پر مصیبت آ جائے تو کیا بیٹا ان کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ حلالی ہو تو ضرور کرتا ہے جی۔ بس جی میں نے کہا کہ آج تک اس ملک نے مجھے پالا ہے۔ سال کے تین سو پینسٹھ دن میں نے کمایا اور خرچ کیا اور اٹھائیس سال سے ملک نے کچھ نہیں مانگا تھا۔ اب اٹھارہ دن کی کمائی بھی اس کو [illegible] سال میں صرف ایک دن کی آمدنی بھی اس وطن کو پیش کروں جس میں مجھے عزت سے روزگار کے مواقع صرف اس لیے حاصل ہیں کہ میں اس ملک کا شہری ہوں۔ پھر جناب میں نے ستر دن کی جنگ میں ایک دن کی کمائی اپنے پاس نہیں رکھی۔ اللہ کے فضل سے بھوکا نہیں مرا۔ آج پھر وطن کچھ مانگتا ہے۔ اس وطن کا مجھ پر ہم سب پر بڑا قرض ہے۔ اس کا سود بھی میں ادا نہیں کر سکتا۔"

"سچ تو تم ہو، پنڈت۔" میں نے کہا۔ "مگر تمہارے جذبات بے حد قابل قدر ہیں۔ جب وقت آئے گا تو وطن کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینا مگر ابھی نہیں۔ ہم اس وقت چندہ نہیں لیں گے۔ نذرانے اور عطیات مستحق لوگوں کو دینا۔"

"پتا نہیں جی، مستحق کون ہوں گے۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "در وہ

www.paksociety.com

وقت کب آئے گا۔"

اس نے ایک وگ کو جائے سر پر سیٹ کیا۔ یہ وگ ایسے بالوں کی تھی جیسے افریقی اقوام کے سروں پر نظر آتے ہیں۔ سخت کڑے ہوئے اور خوب گھنگھریالے۔ اتفاق سے … اور پنڈت کے گھونگھریالے بال نظر آنے والے۔ اس وگ کے ساتھ اگر ہم وقت پر سیاہی مل لیتے تو بالکل حبشی نظر آتے۔ یہ وگ یقیناً بہت کارآمد تھی اور ہماری اصل صورت کو آنا بدل سکتی تھی کہ ہم خود ایک دوسرے کو شناخت نہ کر پاتے۔ اس وقت میرے ذہن میں پہلی بار خیال آیا کہ نام تو میں بدل ہی رہا ہوں اور کسی کو اپنا نام کچھ بھی بتایا جا سکتا ہے۔ صورت بھی میک اپ سے اجنبی ہو سکتی ہے کہ آئندہ کسی شکل میں رہ سکیں مجھے نام کے ساتھ صورت، قومیت اور شہریت بھی بدلنا پڑے گی۔ اس وگ کے ساتھ میں سوڈانی مسلمان بن سکتا تھا۔ ویسٹ انڈیز میں … سے تعلق رکھنے والا امریکی سیاہ فام باشندہ بن سکتا تھا اور ان مخصوص حلقوں سے … والے الگ شناخت رکھنے کے علاوہ ہندوستان پاکستان … سے تعلق کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔

دوسری وگ سفید بالوں کی تھی اور … داڑھی مونچھوں کے ساتھ ہم بالکل بوڑھے نظر آتے۔ شخصیت میں ظاہری تبدیلی کے دیگر اسباب یعنی لباس، چشمہ، چھڑی یا … علامت آسانی سے دستیاب تھے۔ اصل چیز بال ہیں جو نقلی ہوں تو پہچانے جا سکتے ہیں مگر یہ وگ اسی قسم کی تھی۔ … پنڈت نے دونوں وگیں ہمارے سروں پر فٹ کرنے میں ایک گھنٹا صرف کیا اور ہمیں یہ سمجھایا کہ ضرورت پڑنے پر ہم اسے کس طرح ہٹا کے دوبارہ اسی طرح لگا سکتے ہیں۔ اسی دوران میں اندر سے پنڈت کی گھر والی نے چائے کے ساتھ گرم کچھ … مٹھائی اور سموسے ارسال کیے۔ رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔ اور ہم نے ابھی تک ٹیکسی کو روک رکھا تھا۔ اس میں ہمارا سامان بھی بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ ٹیکسی والے سے سودا ہو گیا تھا کہ ہم اسے سو روپے گھنٹا دیں گے۔ یہ اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ اب تک اس حساب سے اس کے ڈھائی سو بن گئے تھے اور میرا اندازہ تھا کہ منظر کے گھر سے ہوتے ہوئے ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچتے پہنچتے اس کو چار سو روپے دیں گے۔ عام حالات میں ٹیکسی والے کے لیے یہ دوران کی کمائی تھی چنانچہ وہ مطمئن ہی نہیں خوش بھی تھا۔

میں نے چائے کا گرم گھونٹ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ باہر دکان میں سے کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز سنائی دی۔

"کہاں ہیں وہ دونوں …؟" کسی نے چیخ کر کہا۔ یہ آواز اور لہجہ دونوں اجنبی تھے۔

"کون دونوں …؟" کسی ملازم نے جواب کے کہا۔

پھر ایسا لگا جیسے کسی نے گالی کے ساتھ ایک تھپڑ مارا ہو۔ کرسی یا میز کے گرنے اور شیشہ ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی شور بلند ہوا۔ دکان کے کاریگر … وقت چلا رہے … رہے تھے۔

"ایسا لگتا ہے کسی گاہک سے جھگڑا ہو گیا ہے۔" پنڈت … اٹھا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "ٹھہرو … معاملہ اور لگتا ہے۔"

باہر ایک فائر ہوا اور کوئی چیخ مار کے بلبلایا۔

"دروازے پر نظر رکھو اور مت آنے دو کسی کو۔"

"اندر پردہ ہے … تم اندر نہیں جا سکتے۔" کوئی ملازم …

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔" پہلا شخص … "میرے اور محسن کے بیچ آئے تو …" … تھا۔

ساتھ ہی ایک فائر ہوا اور … پنڈت … "اندر جاؤ … سامنے سے دھکیلا۔ "پیچھے گلی میں نکل جاؤ۔"

"کہاں سے … کہاں سے … یہ کیا ہے …؟" پنڈت … پڑ گیا۔

"بند نہیں جا سکتے … تم کس طرف سے نکلو گے؟" محسن بولا۔

"ادھر … ادھر تو کوئی راستہ نہیں۔" پنڈت …

"چھت کا راستہ ہے … باہر کو جاؤ … کسی کے گھر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یہاں مت رکو ورنہ مارے جاؤ گے ہم کے ساتھ۔"

باہر ایک شور قیامت برپا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی آگیا ہو۔ سامان اٹھا اٹھا کے پھینکنے کی آوازوں کے ساتھ ہی دکان کے چاروں طرف لگے ہوئے شیشے ایک ایک کرکے ٹوٹ رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی میں لڑنے والوں کی آواز سن رہا تھا۔ معلوم نہیں پہلی گولی انھیں ڈرانے کے لیے چلائی گئی تھی یا کسی کو نشانہ بنایا گیا تھا لیکن شور سے اندازہ ہوتا تھا … کرنے والوں کا حوصلہ اس سے کم نہیں ہوا اور حملہ آور ابھی تک پوری طرح غالب نہیں آئے ہیں۔ وہ یقیناً … آئے تھے۔ انھوں نے پتہ چلا لیا کہاں سے ہمارا تعاقب شروع … تھا اور جب ہم اس … کے سیلون میں داخل ہوئے تھے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ہم محصور ہو چکے ہیں اور ہمیں … شوٹ کیا جا سکتا ہے۔ … دشمن … تھے یا پولیس والے تھے۔ ہم ان کے سامنے آئے بغیر نہیں … سکتے تھے۔

پنڈت بھاگ گیا تھا۔ اندر سے … اس کی بیوی اور … چیخ … تھی جو دکان میں … گالی گلوچ کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔ …

… دکان سے اندر آنے والا راستہ اگر واضح اور نمایاں … تو سب کو … جاتا … لیکن انھیں اس آئینہ خانے کے … آرہا تھا جو دکان کی تین دیواروں پر پھیلا ہوا تھا۔ ہم … اس طرح غائب ہو گئے تھے … کے پیچھے چھپ گئے ہوں۔ انھوں نے کاریگروں کو … لیکن … ہمارا … نہیں … راستہ نہیں بتایا۔ … کے شیشوں کے پیچھے کوئی خفیہ راستہ … گھر میں کھلتا ہے۔ اب وہ راستہ تلاش کرنے کے لیے … شیشوں کو پاش پاش کر رہے تھے۔

ہم … تھے اور … بچاؤ کی مہلت بھی مل گئی تھی۔ پنڈت … پہنچ گیا تھا اور روتی … بیوی کو گھسیٹ کر … کسی ساتھ والے گھر کی چھت پر … ایسا ہی … تھا جس کی گلیوں کے سائے … اونچے مکانوں کی دیواریں ملتی تھیں اور یہ ہو سکتا تھا کہ پنڈت … کسی بھی ہمسائے کی چھت سے ایک منزل اونچی … اونچی چھت پر چڑھنا مشکل تھا مگر ایک منزل نیچی چھت پر … دس بارہ فٹ کی بلندی سے کودنا ممکن نہیں … تھا کہ کودنے والے کی ٹانگ ٹوٹ جائے … جا سکتی تھی۔ یہاں ان کے ٹھہرنے میں جان سے جانے کا خطرہ تھا۔

میں اور محسن بہت محفوظ پوزیشن لے چکے تھے۔ … اگر کوئی آجاتا تو اس سے پہلے کہ وہ ہمیں دیکھتا ہم اسے شوٹ کر دیتے۔ ہم نے کمرے کی لائٹ بجھا دی تھی۔ … ہم روشنی سے آنے والے کو دکھائی ہی نہ دیتے لیکن … جو کچھ دروازے میں نمودار ہوتا وہ پیچھے سے آنے والی دکان کی روشنی میں … نمایاں ہوتا اور ہم اسے پہچان جاتے کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔

لیکن باہر کا ہنگامہ اب بہت بڑھ گیا تھا۔ مار پیٹ اور … کا شور ختم ہونے کے بعد لوگوں کے ہجوم کا شور بلند ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا دکان کے ہنگامے نے … اور کاریگروں کی چیخ پکار نے … لوگوں کو روک لیا تھا جو دکان کے سامنے جمع تھے یا اندر آ چکے تھے۔

"یہ کون ہو سکتے ہیں محسن؟" میں نے کہا۔ "کیا ہم نکل سکتے ہیں؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ اندر چھپ کر بیٹھے رہنے میں خطرہ … وہ … آ جائیں گے۔" محسن بولا۔ "اور راستہ … تو … کو مار ڈالیں گے۔ مجھے یہ خطرناک شکاری لگتے ہیں۔"

"… پولیس والے ہوں۔"

"پولیس اس طرح مقابلہ نہیں کرتی۔ طاقت اور نفری کے اعتبار سے زیادہ ہو تو کمزور کو مارتی ہے ورنہ دم دبا کے بھاگ جاتی ہے۔" محسن بولا۔

"خبردار جو کوئی آگے آیا۔" کوئی چیخ کر بولا۔ یہ اسی شخص کی آواز تھی جس نے سب سے پہلے … بارے میں پوچھا تھا۔

"… میں کہتا ہوں … پیچھے ہٹ جاؤ۔"

جواب میں ایک شور بلند ہوا۔ بہت سے لوگوں نے انھیں ماں بہن کی گالیاں دے کر کہا کہ وہ ایسی تیسی کر دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی مسلسل فائر ہوئے اور لوگ بھاگ گئے۔ بھاگتے قدموں کی آوازیں یوں سنائی دیں جیسے … فرار ہو گئے ہوں۔ دروازے میں ایک … تلاش کی اور باہر جھانکنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے بالکل سامنے … کا وہ دروازہ تھا جس سے ہم اندر آئے تھے۔ اس کے باہر ایک ہجوم تھا جو منتشر ہو رہا تھا۔ … اِدھر اُدھر دوڑتے دکھائی دیے۔ ظاہر ہے ان میں بیشتر فارغ قسم کے تماشبین تھے جو فضول معاملات کا بالکل اندازہ نہیں رکھتے تھے اور اب جان بچا کے بھاگ رہے تھے۔

میں نے محسن کو اشارہ کیا کہ آگے آئے اور دروازے کو آہستہ سے اپنی طرف کھینچ … سامنے ایک مختصر سا خلا تھا جس کی لمبائی اور چوڑائی دو دو فٹ تھی۔ اس کے بعد وہ گھومنے والا شیشہ تھا جو دکان میں سب شیشوں کی طرح نظر آتا تھا۔ اس کا پچھلا حصہ اب سیاہ نہیں تھا۔ اس میں روشنی کی … افقی سمت میں متوازی نظر آرہی تھیں۔ اس کا مطلب صاف یہی تھا کہ دوسری طرف کا شیشہ بھی شہید ہو گیا ہے اور ہم اس تختے کو دیکھ رہے ہیں جو آئینے کا فریم تھا۔ شاید حملہ آوروں نے سامنے آئینے چکنا چور کر دیے تھے مگر ابھی نہ جان سکے تھے کون سا فریم اندر جانے والے راستے کو چھپائے ہوئے ہے۔

… دروازے میں دو افراد نمودار ہو گئے۔ میں صرف ان کی پشت دیکھ سکا لیکن میری نظر ایک شخص کے ہاتھ پر گئی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی سیاہ رنگ کا گولا سا تھا۔ … کو ایک جھٹکے سے کھول کے باہر آ گیا۔

"ہاتھ اوپر …!" میں نے چیخ کے کہا۔

اس شخص نے ایک دم پلٹ کے دیکھا۔ اس کا دوسرا ساتھی جیب سے ریوالور نکال رہا تھا کہ ایک فائر ہوا اور وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے گھوما۔ جھکا اور دہرا ہو کے گرنے لگا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اسے محسن نے شوٹ کیا ہے۔ محسن میرے پیچھے باہر آ گیا تھا۔ ایک کو میں پہلے ہی نشانے پر لیے کھڑا تھا۔ اس نے دوسرے کو … اور اسے بالکل مہلت نہ دی۔ اگر محسن ذرا بھی تذبذب کا

www.paksociety.com

مظاہرہ کرتا یا اُسے خبردار کرتا تو میں مارا جاتا۔

پہلے شخص نے ایک موہوم حرکت کی۔ اس نے خود کو مارا اور ایسی ہی حرکت سے دستی بم کی پن کو منہ سے نکال کے پیچھے اچھال دیا۔ وہ خود باہر گرا اور میں نے محسن کے ساتھ زمین پر گرنے میں دیر نہیں لگائی۔ یہ دستی بم پن نکل جانے کے پانچ سیکنڈ بعد پھٹتا ہے۔ اس شخص نے پانچ سیکنڈ گزرنے کا انتظار نہیں کیا تھا اور پن نکالتے ہوئے دستی بم اچھال دیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مجھے اور محسن کو گرنے کے بعد حفاظتی پوزیشن میں آنے کے لیے بھی دو تین سیکنڈ مل گئے۔ ہم نے ہتھیلیوں سے دونوں کان بند کیے، چہرہ دونوں بازوؤں میں یوں چھپایا کہ سر محفوظ رہے اور گردن دونوں ہاتھوں کے درمیان میں آ جائے۔

دھماکا ہوا تو ذرا سی دیر کے لیے میرے کان سُن ہو گئے۔ میں نے دو سیکنڈ میں جان لیا کہ میں بدستور درست حالت میں ہوں اور ملبے کا ڈھیر بکھر گیا ہے۔ تیسرے سیکنڈ میں میری نظر محسن پر گئی۔ وہ سر اٹھا کے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ ہم ایک ساتھ اٹھے تو ہمیں اپنے مقابل سیدھے ہاتھ کے کونے میں دھواں نظر آیا۔ گرد و غبار اور شعلوں کے الاؤ کے درمیان سے گزرنے کا راستہ نظر آیا۔ دستی بم ایک کونے میں گرا تھا کیونکہ اسے نشانہ لیے بغیر بدحواسی میں پھینکا گیا تھا۔ اس لیے وہ کونا اور چھت کا ایک حصہ مسمار ہو گیا تھا۔ باہر جانے والا دروازہ تو بند ہو گیا تھا مگر کونے میں ایک نیا راستہ بن گیا تھا۔

اس وقت میں نہیں دیکھ سکا کہ دستی بم سے دکان میں کتنے لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے یا ملبے میں دب گئے۔ دکان کے اندر کسی چیز کے سلامت بچنے کا سوال ہی نہ تھا چنانچہ ساری لائٹس ٹوٹ گئی تھیں اور اب صرف شعلوں کی روشنی تھی جو ایک کونے سے پھیل رہے تھے اور اس دیوار کے ساتھ لمبائی کے رُخ رکھے ہوئے کپڑوں کے کاؤنٹر کو جلا رہے تھے۔ میزوں کے اور کرسیوں کے ٹکڑے ایندھن کے ملبے میں بھی آگ پکڑ چکے تھے لیکن ابھی یہ آگ پوری دکان میں نہیں پھیلی تھی اور اسے کنٹرول کیا جا سکتا تھا بشرطیکہ باہر والے نظم و ضبط اور حوصلے کا مظاہرہ کرتے۔

مگر میں نے اس وقت کچھ نہیں سوچا اور ملبے کے ڈھیر کو پھلانگتا ہوا سیدھا اس شگاف کی طرف گیا جو کونے کی دیوار کے گرنے سے نمودار ہوا تھا۔ اس دھماکے نے ساتھ والی دکان کا وہ حصہ بھی گرا دیا تھا جو بینڈٹ کی دکان سے ملا ہوا تھا۔ دھوئیں اور گرد و غبار میں راستہ صاف دکھائی نہ دیتا تھا اور مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں اوپر سے مزید ملبہ نہ آ گرے یا آگ میرے کپڑوں تک نہ پہنچ جائے لیکن میں نتائج سے بے پروا باہر نکلنے کی جدوجہد کرتا رہا۔ اینٹوں کے ڈھیر پر دو بار ٹھوکر کھانے کے بعد فٹ پاتھ پر

گرنے میں کامیاب ہوا۔ دکان کے سامنے موجود افراد بھاگنے بھاگنے کے قریب تھے اور سڑک پر ایک افراتفری [illegible]

"کدھر گیا وہ؟" میں نے چیخ کر ایک دوسرے شخص سے پوچھا۔

"ادھر... وہ سامنے۔" دوسرا شخص ایک کار کی طرف اشارہ کر کے چلایا۔

میں ادھر ہی بھاگا لیکن میری راہ میں ایک کار آ گئی۔ صرف ایک بار میری نظر کار کے شیشے پر پڑی۔ صورت سے پڑھا لکھا آدمی تھا جو اس منظر سے خود دور بھاگنا چاہتا تھا۔ راستہ ملتا تو وہ فوراً بھاگ جاتا مگر میں نے اس کو دروازے کے آگے ہونے کو کہا تاکہ میں اس کی جگہ لے سکوں۔

"ادھر... دوسری سیٹ پر... آگے۔" میں نے اشارہ کیا۔

"کیا؟" وہ چلایا۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"تمھاری..." میں نے ایک گندی گالی دی اور اسے جھٹکے سے باہر کھینچ کر سڑک پر گرا دیا۔ میں نے دروازہ بند کرتے ہی محسن کو دیکھا۔ وہ شاید میرے ساتھ ساتھ تھا اور میں نے آگے جھک کر اس کی جانب کا دروازہ کھولا تو وہ دوسرا دروازہ کھول کے میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ کھلے دروازے سے ایک شخص نے جھپٹنا چاہا مگر جھٹکے سے دور جا پڑا۔ پھر محسن نے دروازہ بند کر دیا۔ مالک سڑک پر گرتے ہی اٹھا اور میرے پیچھے دوڑا۔

"بدمعاش... میری کار... اسے چھوڑو..." وہ چلانے لگا۔ اس نے کھڑکی کے قریب آ کے اسٹیئرنگ کو پکڑنے کی کوشش کی کیونکہ ابھی کار کی رفتار زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ مارا اور اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ گر کے پیچھے رہ گیا۔ میری نظر اس کار پر تھی جس کی طرف ایک شخص نے اشارہ کیا تھا۔ وہ تیر کی طرح نکلی اور ایک آدمی اچھل کر الگ ہٹنے کی پوری کوشش کے باوجود خود کو نہ بچا سکا۔ وہ کار کے ایک پہیے کے نیچے آ گیا۔ میں نے اس کے آدھے دھڑ کو کچلے جاتے ہوئے دیکھا۔ ایک دم وہ اٹھا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کے ایک چیخ ماری اور پھر اسی قدر شدت سے سڑک پر گرا کہ شاید اس کا سر پھٹ گیا ہو۔ اس کے اوپر سے گزری اور مجھے یوں لگا جیسے اسپیڈ بریکر سے گزر رہی ہو۔ سامنے ایک ریڑھا آ گیا۔ گاڑی نے گھوڑے کو ٹکر ماری۔ گھوڑا ہوا میں اچھل کے پیچھے گرا اور لاتیں چلانے لگا۔ غالباً گاڑی نے اس کی گردن توڑ دی تھی۔

لوگ ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے جیسا کہ مجھے خود بچو [illegible]

"وہ بدمعاش اس کار میں فرار ہو رہے ہیں۔" میں نے محسن سے کہا۔ "تو وہیں ہو گیا مگر اس میں بھی کم سے کم دو افراد ہیں۔ ایک ڈرائیور [illegible]"

"بہرحال دستی بم پھینکنے والا تو دکان میں ہی گر گیا تھا۔" محسن بولا۔ "اس کا ریوالور بھی اٹھا لایا ہوں۔"

میری نظر اس گاڑی پر تھی جو اب رفتار پکڑ چکی تھی۔ "اس کی جیب سے اور کچھ ملا؟"

"نہیں... پستول میں ریوالور اور ایمونیشن ہے۔ فوجی ساخت کا۔" محسن بولا۔

"اس کا مطلب ہے یہ آج کل کی تعمیر کا روسی ماڈل ہے۔" میں نے کہا۔ "دشمن کے کمانڈو بھیجوں نے اپنا پستول تیار رکھنا۔ جیسے ہی وہ پیچھے آئیں..."

"فائر مت کرنا... میں تیار ہوں۔" محسن نے سر باہر نکال کے کہا۔

اگلی گاڑی کا فاصلہ کچھ بڑھ گیا تھا۔ میں نے ٹریفک سگنلز کے تقاضے نظرانداز کرتے ہوئے پیڈل دبا دیا۔ سیکنڈوں میں ایسی رفتار حاصل کر لینے والی فاکس ویگن کا انجن غرّایا اور وہ چیتے کی طرح اپنے شکار کی طرف لپکی۔ گاڑی تیکو روڈ سے سیدھی جا رہی تھی اور ادھر سے آنے والی ٹریفک درہم برہم ہو گئی تھی۔ غنیمت تھا کہ پاکستان میں تھے ورنہ اب تک نہ جانے کتنی ٹریفک پولیس کی گاڑیاں پیچھے لگ چکی ہوتیں اور ٹیلی وژن والے بھی آ پہنچتے۔ افراد تعجب کرتے مگر یہاں عام لوگ جان بچا رہے تھے اور بھاگ رہے تھے۔ جو کوئی ٹریفک پولیس کا نمائندہ چوک کے درمیان بیزاری کے عالم میں ہاتھ ہلا رہا تھا یا سڑک کے کنارے ہاتھ باندھے رونق میلہ دیکھ رہا تھا تو اس نے فقط سیٹی بجانے پر اکتفا کیا۔ ممکن ہے انھوں نے دونوں کار والوں کو خصوصی گالیوں سے بھی نوازا ہو لیکن ان کی ملازمتی کاہلی اور عدم دلچسپی کے باعث مجھے یقین کامل ہے کہ انھوں نے کسی کار کا نمبر نوٹ کرنے کی زحمت بھی فضول سمجھی ہو گی۔

تمام مزاحمت سے بچتا بچاتا بالآخر میں درمیانی فاصلے کو اتنا کم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ محسن فائر کر سکے مگر اس سے پہلے کہ وہ نشانہ لیتا اگلی کار سے ایک ہاتھ نکلا اور اس نے ہمارا نشانہ لیا۔ ہم ایک دم نیچے ہو گئے۔ گولی نہ جانے کدھر گئی۔ پھر محسن نے فائر کیا اور اگلی کار کا پچھلا شیشہ پاش پاش کر دیا۔ گاڑی تھوڑا سا لہرائی۔ پھر دوسرا فائر ہوا جو کار کے بونٹ پر لگا۔ میرا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ میں بال بال بچا تھا کیونکہ گولی ونڈ اسکرین کے قریب لگی تھی، ورنہ یہ گولی میرے سینے میں گھس جاتی۔ محسن نے دوسرا فائر کیا۔ گاڑی بری طرح لہرائی اور ایک جانب فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ ایک کھمبے سے ٹکرائی اور رک گئی۔

میں اور محسن ایک ساتھ چھلانگ لگا کے اترے۔ ہم نے فاکس ویگن کو سڑک پر ہی روک دیا تھا۔ لوگ ہر طرف سے دوڑ کر ادھر آ رہے تھے۔ سڑک پر سے گزرنے والی ٹریفک بھی رک رہی تھی۔ امکانات یقینی تھے کہ چند منٹ میں یہاں ایک ہجوم لگ جائے گا۔

میں نے کار میں دو افراد کو دیکھا جو آگے بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ڈیش بورڈ پر جھکے ہوئے بے حس و حرکت پڑے تھے۔ گاڑی کا انجن بند تھا مگر ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔

"محسن... ڈکی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"گاڑی اسٹارٹ کر کے دیکھو۔" محسن نے کہا۔ ایک جھٹکے میں ڈرائیونگ کرنے والے کو پیچھے کی سیٹ پر الٹ دیا۔ میں نے اگنیشن کی چابی گھمائی اور کار نے ایک جھٹکا لیا۔ محسن اب پیچھے بیٹھ چکا تھا۔ میں نے کار کو ریورس گیئر میں ڈالا اور ایک بار پھر چابی گھمائی۔ انجن اسٹارٹ ہوا تو محسن نے آس پاس جمع ہونے والوں کو چلا کر ہٹنے کو کہا مگر لوگ راستہ روکنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔

مجبوراً میں نے کار کو تھوڑا سا پیچھے لے کر موڑا اور آگے بڑھا کے فٹ پاتھ پر دوڑا دیا۔ بہت سے لوگوں نے شور مچاتے ہوئے پیچھے دوڑنے کی کوشش کی مگر میں نے خاصی رفتار سے گاڑی کو فٹ پاتھ سے سڑک پر اتارا۔ گاڑی اچھلی اگر اس کے شاک ابزاربر درست نہ ہوتے تو اس جھٹکے سے یقینی ٹوٹ سکتی تھی۔ ایکسل بھی ٹوٹ سکتا تھا۔ دھماکا ہونے سے قبل ہی میں نے اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھام لیا چنانچہ کار کے سڑک پر گرتے ہی میں اپنی سیٹ پر اچھلا اور میرا سر چھت سے لگا لیکن میں نے اسٹیئرنگ کو نہیں چھوڑا اور سیدھا رکھا۔ گاڑی میرے قابو میں رہی اور جیسے بدک جانے والے گھوڑے کو بالآخر شہسوار ہی راہ پر لاتا ہے ایسے ہی میں اس طاقتور بی ایم ڈبلیو کو جانے والوں سے نکال لانے میں کامیاب رہا۔ بی ایم ڈبلیو کوئی عام گاڑی نہیں تھی۔ شاید لاہور میں گنتی کی چار پانچ کاریں ایسی ہو سکتی تھیں۔ جرمنی کی یہ بیوٹی فل کار صرف ڈپلومیٹ یا غیر ملکی رکھتے ہیں جو اس کے اخراجات کا بار اٹھا سکیں کیونکہ عام نہ ہونے کے باعث اس کے پرزے آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔

گاڑی کا تعاقب کرنے کی کوشش اگر کسی نے کی تھی تو مجھے اس کا علم نہیں ہوا۔ رات کے وقت میرے پیچھے روشنیوں کی ایک قطار تھی اور اپنی تیز رفتاری کے باعث میں آگے جانے والی سب کاروں کو پیچھے چھوڑتا جا رہا تھا مگر ابھی تک ایک بھی کار مجھ سے آگے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اس میں زیادہ کمال گاڑی کا تھا جس کی کارکردگی کو شاید مرسیڈیز بھی شکست دے سکتی تھی۔ باقی میری ڈرائیونگ تھی۔ چار سال باہر رہنے کے بعد مجھے امریکا اور ویسٹ یورپ کی رفتار سے گاڑی چلانے کی بہت مشق تھی۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ فاکس ویگن کی چابیاں نکال لایا تھا ورنہ اس پھیلی سی گاڑی میں بھی کوئی بڑے دل والا بیٹھ کر ہمارے پیچھے چل پڑتا تو ہمیں آسانی سے نشانہ بنا دیتا۔ طے شدہ طور پر وہ دونوں جو اب بے ہوش پڑے تھے ایسے فوراً ہوش میں نہیں تھے اور غالباً بدحواس ہو گئے تھے کہ ہم نے انھیں آ لیا۔

www.paksociety.com

محسن نے ان دونوں کی اچھی طرح تلاشی لی تھی۔ ان کے پاس سے صرف ریوالور برآمد ہوئے تھے۔ یہ سب اسموس ریوالور تھے جن کا سیریل نمبر مٹا دیا گیا تھا۔ ہر غیر ملکی جاسوس ایجنٹ کی طرح ان کی شناخت ناممکن تھی۔ اب وہ پکڑے گئے تھے تو ان سے کچھ اگلوانا بھی آسان نہ تھا۔ ہم جانتے تھے کہ ان کو کس ملک نے کس مقصد کے تحت بھیجا تھا مگر سرکاری سطح پر اس ملک کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ہم اگر ان ایجنٹوں کو کسی دشمن ملک سے منسوب کیا جاتا تو وہ ملک صاف تردید کر دیتا۔ جاسوس کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ یہ بات ہمیشہ سچ تھی اور رہے گی۔ منہ پر پٹے جائیں اور ملک کے لیے جان دیں اور ذہانت اور حوصلے کا قابل رشک کارنامہ سر انجام دے آئیں تو حکومت کی طرف سے انعام بھی ملتا ہے مگر پکڑے جائیں تو اپنے بھی بیگانے ہو جاتے ہیں۔ کوئی بھی ان کو پہچانتا تک نہیں اور دشمن تو خیر دشمن ہوتا ہی ہے۔

"یار... اب ان کا کیا کریں؟" محسن نے کہا۔ "ہم ان کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔"

"پھر کیا کریں... گولی مار دیں؟" میں نے کہا۔

"کیوں نہ انھیں بھی سرکاری حکام کے حوالے کر دیں؟" محسن بولا۔

"سوال یہ ہے کہ سول حکام یا فوجی حکام؟"

"معاملہ تو فوجی نوعیت کا ہے اور صحیح تفتیش بھی فوجی ہی کر سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "مگر سوال یہی ہوگا۔ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے گا... ہم حوالے کرنے جائیں گے تو اپنا کیا حوالہ دیں گے؟"

میں نے گاڑی کو ایک طرف روک دیا۔ "اس کا بھی کوئی حل سوچتے ہیں پہلے گاڑی کی تلاشی لے لیں۔"

اب ہم پارکنگ کے فوراً بعد ہی اسٹیڈیم کے پاس پہنچ چکے تھے۔ آگے کینٹ کا علاقہ تھا۔ تنگ ... جیسے سے بچنے کے لیے میں نے کار کا بونٹ اٹھا دیا تاکہ معلوم ہو کہ ہم انجن میں کسی خرابی کے باعث رکے ہیں۔ ایکسیڈنٹ نے گاڑی کی حالت خاصی خوفناک کر دی تھی اور ہیڈ لائٹ کو چکنا چور کر دیا تھا۔ اگر کار قدرے بائیں طرف سے ٹکراتی اور براہ راست کھمبے کو ٹکر مارتی تو کھمبا گر جاتا اور گاڑی کو بھی زیادہ نقصان پہنچتا۔ فٹ پاتھ کی بلندی نے گاڑی کی فورس ختم کر دی تھی اور غالباً اسی کے جھٹکے سے ان دونوں کا سر ڈیش بورڈ پر لگا تھا۔ ڈرائیور کے بارے میں مجھے شبہ تھا اس کی پسلیاں بھی ٹوٹ گئی ہیں۔ سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ دوسرا بھی مردے کی طرح پڑا تھا مگر میں ایک لمحے کے لیے بھی اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔ یہ ہو سکتا تھا وہ مکر کر رہا ہو۔

محسن نے کار کی ڈگی کھولی اور ایک دم چونک گیا۔ اس کی سیٹی جو اظہار حیرت کا شغل تھی میں نے بھی سنی۔

"مرزا سکندر اعظم..." وہ بولا "ادھر تشریف لائیے۔"

میں نے ریوالور کا رخ اندر کی طرف رکھا ہوا تھا۔ چونکہ پیچھے والا شخص ہماری فائرنگ سے غائب ہو گیا تھا [illegible] بدستور سیٹ کی نشست میں ہے۔ محسن نے ایک [illegible] پارٹی نے بھی اسٹریٹ لائٹ کی تیز روشنی میں [illegible] میں بھرا ہوا تھا۔ اس کے پاس تو غیر ملکی ساخت کی [illegible] ایک باکس میں جیسے ہی [illegible] ریڈ [illegible] میں پھینکا گیا تھا بالکل ویسے ہی [illegible] سٹین گن کے علاوہ تھے۔

"میرا خیال ہے کہ یہ سامان آ رہے ہیں۔" محسن نے [illegible] اس کے ساتھ ہی پکڑے جائیں تو..."

"کوئی پوچھے کہ کیا ہے تو بتانے کو ہے شے [illegible]" پھر ڈرائیونگ سیٹ کے لیے بیٹھ گیا۔ گاڑی کو اس نے [illegible] پیچھے اترنے والی چھوٹی سی سڑک پر موڑا [illegible] کے سامنے سے گزری۔ تھوڑا آگے جا کے بائیں [illegible] تھی۔ اسے عبور کرتے ہی ہم گلبرگ میں داخل ہو گئے [illegible] کا اشتہار لگا ہوا تھا اور وہاں چار نمبر بس کا ٹرمینل تھا۔

"کیا اس کی تمیز چیک پوسٹ ہوگی؟" محسن بولا۔ [illegible] معلوم ہوتی ہے۔"

"دوسری صورت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ [illegible]" میں نے کہا۔

"وہ لیجا چکے ہیں یہ سامان اندر سے جاتے [illegible] کیسے لگا کر لیا ہی ہے وہ سامان جو آنے والا تھا۔"

"فرنیچر تو پہنچ چکا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "کمرہ [illegible] کے علاوہ خانہ داری کی چیزیں ہیں یہ سب تمام فرنیچر [illegible]..."

"مذاق مت کرو یار... آدھا فرنیچر [illegible] چھپا ہوا ہے۔ مجبوری ہے اور وہ تو شور مچا لیتے [illegible] اپنی حالت ماشاء اللہ ہو رہی ہے۔ وہ [illegible] سب ہم پر گرا تھا اور پھر ہم جلے پر گرے تھے۔ بالوں اور [illegible] لگتا ہے کہ سیدھے میدان جنگ سے آ رہے ہیں۔ [illegible] اور اس کی یہ حالت۔" میں نے کہا۔

"گاڑی فوراً روک لیں گے۔" محسن بولا۔ "سامان [illegible] لے جائیں گے اور خواتین سے کہیں گے [illegible] انھوں نے بڑے ہی سارا کا سارا کباڑا سٹور میں رکھ دیا ہوگا اور فرنیچر سیٹ کر دیا ہوگا جو میں نے خرید کر بھیجا تھا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" میں نے کہا۔ "جو سامان ہم نے [illegible] ٹیکسی میں ہی رہ گیا۔"

"اور ٹیکسی والا نہ جانے کدھر گیا۔ مجھے تو نظر آیا نہیں۔"

"وہ سب سے پہلے فرار ہوا ہوگا کہ کسی مصیبت میں نہ پھنس [illegible]

"[illegible] تین سو روپے گئے۔"

"[illegible] ہزار سے زیادہ کا مال ہے گیا۔ مجھے تو اس کا بھی [illegible]"

"[illegible] نے بھی نہیں دیکھا تھا خیر جانے دو۔" میں نے کہا۔ "خیر تو اس کا [illegible] سی ہے۔ اس کا [illegible]"

"اس کا ایک کارندہ بھی مارا گیا۔" محسن نے کہا۔

"اب پولیس کے چکر میں آ جائے گی۔ تفتیش ہوگی اور [illegible] ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "ہم سے پہلے وہ [illegible]"

"کیا یہ ہمارا نام لے گا؟" محسن بولا۔

"مجھے تو امید نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ محب وطن اور سچا پاکستانی ہے۔ اسے معلوم ہوگا کہ اپنے ایک کارندے کی موت کا ماتم [illegible] ہماری مدد نہ کر سکا۔ اگر اس نے عقل مندی سے کام لیا تو [illegible] کو معلوم نہیں کون تھے جو اندھا دھند فائرنگ کر کے [illegible] گئے ورنہ معاملہ تو ہر گیا۔ اب کہا جا سکتا ہے کہ شاید اسی کے دشمن تھے۔ اگر وہ بڑی مصیبت سے بچنا چاہتا ہے تو ہمارے آنے [illegible] کی بات خود بھی نہیں کرے گا اور کسی کارندے کو بھی زبان کرنے دے گا۔"

"ہم اپنا تعلق پورا کر رہے گئے۔ وہ کام کا آدمی تھا۔"

"وہ کام کا آدمی ہے۔" میں نے جے پہ [illegible] کہ آئندہ بھی انکار نہیں کرے گا۔ بس ہم احتیاط کریں گے کہ اس سے ملتے ہوئے زیبوں کی طرح جائیں۔"

میں نے گاڑی کو ایک موڑ پر روک لیا۔ آیلوڈ کا مکان موڑ کے بعد دو [illegible] میں اتر کے اکیلا گیا اور کال بیل بجائی تو بجلی نے گیٹ کھولا۔ گیٹ لائٹ کی روشنی میں اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

"بھاگ کر آ رہے ہو؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا اور اندر چلا گیا۔

"وہ گھر آ رہا ہے۔" بجلی ہنسی۔ "عجیب کارٹون ہے۔"

مگر میں اس وقت کارٹون دیکھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اندر گیا تو پہلے کمرے میں فرنیچر دیکھ کر اطمینان ہوا۔ بجلی اور بیگم نے واقعی گھر کا نقشہ بدل رکھا تھا۔ فی الحال وہ کمرے ٹھیک [illegible] بیڈ روم اور [illegible] کمرے میں ٹیوز موجود تھا۔ غالب ایک بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔

"غالب آ گئے۔" میں نے قریب جا کے کہا۔ "میں کچھ خطرناک سامان لایا ہوں اسے چھپا کے رکھنا ہے۔"

"کیسا خطرناک سامان؟" غالب اٹھ بیٹھا۔

"الٹا دیکھ لینا۔ وہ سامان ہی ہے۔ انھیں کہیں چھپا دو۔ سب بتا [illegible] ۔" وضاحت پر سب بتا دوں گا۔" میں نے ادھر ادھر

سے چادریں کھینچ کے باہر کا رخ کیا۔ پچھلی چادر میں ایک کریٹ لپیٹا گیا تھے ہوئے میرا سانس پھول گیا۔ یہ آٹومیٹک بندوق کا ایک کریٹ تھا جیسے پچھلے کریک کرنے میں استعمال ہوتے ہیں لیکن ہر کریٹ کا وزن بہت زیادہ تھا۔ دوسرے پچھلے میں دوسرا کریٹ دیکھنے کے بعد میں واپس گیا تو میں نے محسن کو غائب پایا۔ پھر وہ کار کے دوسری جانب سے نکلا۔

"سالا ہوش میں آ گیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "ایک دم اچھل کے بھاگا تھا۔"

"پھر؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

"پھر کیا... میں نے گولی چلانے سے گریز کیا۔ سر پہ مارا اس نے بے ہوش ہو گیا۔ اور پھر اندر ڈال دیا۔"

"کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"پتا نہیں... جیسے کوئی دکھائی نہیں دیا۔" محسن بولا۔ "تم جلدی کرو..."

میں نے چاروں مشین گنوں کو چادر میں لپیٹ کر اٹھایا تو ایک کراہی ہوئی لاش کی طرح اندر لے گیا۔ ساتوں کریٹ بھی اور گیلری نے بیڈ کے نیچے کر دیے تھے۔ کیتھرین بیگم کو کوئی اثر نہ تھا مگر بجلی کا رنگ تو دو ہو رہا تھا کہ اس نے یہ سب پہلے کہاں دیکھا تھا۔ اسپتال کے بستر پر زندگی سے مایوس پیٹنے والی بجلی نے یکلخت ہمارے ہنگامہ خیز، خطرناک اور خونی پیغامبر زندگی میں قدم رکھ دیا تھا لیکن جیسے کوئی کسی مقبرے کی سوگوار خاموشی سے اچانک پاپ میوزک کے شور سے گونجتے ہوئے ڈانس ہال میں قدم رکھ دے۔ میں نے مشین گنوں کو بھی ایک بیڈ کے نیچے کھسکایا ہی تھا کہ ٹیوڈی گیا۔

"کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟" وہ کسی تمہید کے بغیر بولا۔ "کہ تم سب آ گئے ہو مگر تمہارا سامان ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ عموماً لوگ سامان پہلے روانہ کرتے ہیں اور خود بعد میں آتے ہیں۔"

"ہمارے پاس بہت زیادہ ساز و سامان پہلے بھی نہیں تھا۔" بجلی نے کہا۔ "اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے کچھ بھی رکھنے نہیں دیا تھا۔"

"یہ بات بھی میں نے نہیں پوچھی تھی کہ تم لوگ پہلے کہاں رہتے تھے اور وہ جگہ تم نے کیوں چھوڑ دی؟" وہ بولا۔ "تم کچھ پُراسرار قسم کا تمیز ہو۔"

"تمھاری یہ تفتیش میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ "لوگ جو کرائے پر رہتے ہیں وہ دربدر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مالک مکان سے وہ جھگڑے رہنا میں اچھا نہیں لگتا اور جب کرائے کے مکان مل جاتے ہوں تو پھر..."

"میں تمھیں اصل بات بتاتی ہوں مسٹر ٹیوڈ۔" کیتھرین نے میری بات کاٹ کے انگریزی میں کہنا شروع کیا۔ "میں ایک بیوہ ہوں۔ میرے شوہر کے کچھ دشمنوں نے میرا گھر جلا دیا۔ اس میں جو سامان تھا وہ سب..."

www.paksociety.com

جھلس گیا۔ میری لڑکی جولی چھ ماہ سے اسپتال میں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس کے گردے ناکارہ ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے میری مدد کی اور میری بیٹی کو گردے کا عطیہ ملا۔ یہ جولی کی دوسری زندگی ہے۔ سات اسپتال سے واپس اس گھر لے جانا مشکل تھا جہاں اب ایک کھنڈر کی راکھ کے سوا کچھ نہیں رہا۔ اس موقع پر ان دو نوجوانوں نے پھر میری مدد کی اور مجھے کرائے کا یہ گھر تلاش کیا جہاں میں سکون سے اپنی بیٹی کے ساتھ رہ سکوں اور مجھے کسی سے کوئی اندیشہ نہ ہو۔ تم تصدیق کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ میں تم کو اپنا پتا دیتی ہوں اس مکان کا جو جلا دیا گیا، تم اسے دیکھ بھی سکتے ہو، تم اسپتال جا کے ڈاکٹروں سے مل کر جولی کے سامنے کیس کی تفصیلات بھی حاصل کر سکتے ہو۔ اگر اس سچ میں ایک فیصد بھی جھوٹ ہو تو ہمارا سامان اٹھا کے باہر پھینک دینا۔ ہم بڑے مصیبت زدہ لوگ ہیں۔ ہمارے آپس کے تعلقات پر تم ہمیں شک کرنا چاہیے اور نہ تشویش میں مبتلا ہونا چاہیے۔“

”میں اس سچ کو تسلیم کرتا ہوں۔“ وہ متانت سے بولا۔ ”بہت بہتر ہوتا اگر مجھے ابتدا ہی میں یہ سب بتا دیا جاتا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔“

”ٹھیک ہے مسٹر ڈیوڈ۔“ کیتھرین نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہارے یہ دونوں مددگار نوجوان تمہارے رشتے دار نہیں ہیں۔ اور غالباً تم انہیں جانتی بھی نہیں ہو۔“ ڈیوڈ اسی طرح اپنے پرانے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا رہا جس پر اس نے مشکوک نظر ڈالی تھی۔

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ کیتھرین نے کہا۔ ”مگر کیا اس میں کوئی معیوب بات ہے اگر میں ان پر رشتے داروں سے زیادہ بھروسا کروں... ؟“

”میں اعتماد کو بہت بڑی طاقت اور صفت تسلیم کرتا ہوں۔ انسان کے جذبات اور اس کی قوت کا تعلق اس کے مذہبی اعتقاد سے ہوتا بھی نہیں چاہیے ورنہ وہ خطرناک ہو جاتا ہے۔“ وہ بولا۔

”یہ مکان حاصل کرنے کے لیے میں نے ایک بے ضرر سا جھوٹ بولا تھا۔“ میں نے شرمندگی کے احساس کو مٹانے کے لیے کہا۔

”آئی ڈونٹ مائنڈ۔ میرے نزدیک بے ضرر یعنی فائدہ پہنچانے والا جھوٹ تھا۔“ وہ پہلی بار مسکرایا۔ ”اور تم جو کو فائدہ پہنچانے کے لیے تو سب ہی جھوٹ بولتے ہیں... جو گناہ ہے۔ مگر دوسروں کے فائدے کی خاطر جھوٹ کو بھی نیکی شمار کرنا چاہیے۔ میں نے دخل اندازی کی اس کے لیے معذرت۔ دراصل یہ جھوٹ مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میری بچی جس کو اب میں مطمئن ہوں۔ تم لوگ اس کو اپنا گھر سمجھ کے رہو۔“

وہ واپس چلا گیا تو میں نے کیتھرین کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ”تم نے سب کی عزت بچا لی۔“

”مجھے اس کا شک... تو لگا تھا۔“ کیتھرین نے کہا۔
”ایک بات اب بھی قابلِ غور ہے۔“ ...
... اصل نام ابھی تک نہیں پوچھے۔“
”میں پوچھ لوں گا جب اسے احساس ہوگا...“
... میں واپس نکل گیا۔ محسن میرے ساتھ آیا، میں پریشان ہو گیا۔
”آتنی دیر کر دی۔“ وہ بولا۔ ”میں نے ...“
”کہاں سے ؟“ میں نے کہا۔
”سیٹوں کے نیچے سے۔“ محسن بولا۔ ... کہاں میں ان سیٹوں کے نیچے بھی چھپایا جا سکتا ہے ... کے نیچے سے ڈاکٹر اٹھا لو ... اسٹاف اور ... چار نام ہم نکلے ہیں۔ ان کو بھی جلدی سے رکھوا ... پندرہ منٹ بعد ہم اس علاقے سے نکل گئے ... قیدیوں سے نمٹنے کا تھا کینٹ ایریا سے گزرتے ہوئے ... کے تار پر لگا دو ... پاس سامنے ... کی آواز ... گاڑی کو ایک جگہ روک کے میں چند قدم واپس گیا اور ایک ... داخل ہو گیا۔ یہ ... کا ہیڈ کوارٹر تھا جس کے ... میجر سلطان کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی ... میجر سلطان بھی ہو سکتا تھا۔

”میں معذرت چاہتا ہوں۔“ میں نے شائستگی سے ... کہا۔ ”مجھے ایک بہت ارجنٹ کال کرنا تھی۔ کیا میں آپ کا ... استعمال کر سکتا ہوں ؟“

”شیور۔“ وہ ہاتھ بڑھا کے بولا اور مجھے اس کی ... بستر ... نمبر ملا کے کہا کہ ایمبولینس فوراً بھیج دی جائے ... ملا جلا۔ اس نے کہا۔ سوری رانگ نمبر اور فون رکھ دیا ... میں میجر سلطان کے فون پر لکھا ہوا نمبر ... اب میں اسے باہر کسی بھی جگہ سے فون کر سکتا تھا۔

میجر سلطان مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

”تھینک یو میجر۔“ میں نے ہاتھ ملا کے کہا۔

”ڈاکٹر شاہ۔“ میجر سلطان نے مصافحے کے بعد میز پر ہاتھ رکھا۔ ”تم نے کس اسپتال سے ایمبولینس طلب کی تھی ؟“

سوال قطعی غیر متوقع تھا لیکن میں نے اپنے رد عمل پر قابو ...
”میرا اپنا پرائیویٹ کلینک ہے۔“
”اور اب ایمبولینس کہاں آئے گی ؟“ میجر سلطان نے ...
چھوڑ دیا لیکن بہت ہوشیاری سے میری راہ میں حائل ہو گیا ...
جس تم نے جس سے بھی بات کی تھی اسے کوئی ایڈریس نہیں بتایا ...
”بات یہ ہے کہ میں نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا تھا ...
”اور وہ جانتا ہے کہ اسے ایمبولینس کہاں بھیجنی ہے۔“ ...

... ضرورت پڑی تو میں فون کر دوں گا۔“
... آپ جس مریض کو دیکھنے آئے تھے وہ کہیں آس پاس ہی ہوگا ... میجر سلطان بولا۔ ”اور اس کے گھر میں یا تو فون نہیں ہوگا یا ... آئی مائٹ ؟“
... میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے لہجے میں شکوک کا رنگ ... یہ اندازہ کرنا مشکل کام نہیں۔
”کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ مریض یا اس کے گھر والوں میں ... خود فون کرنے کی زحمت گوارا کیوں نہیں کی اور ایک ... کے مالک ڈاکٹر سے کیوں کہا کہ وہ کسی بھی جگہ سے ... پولیس مشکوک ہے۔ وہ یقیناً بہت بااخلاق اور مہذب ... لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اس ... تعلیم یافتہ اور مہذب قسم کے لوگ ہی رہتے ہیں۔“ میجر سلطان نے کہا۔

”میں اس بحث اور جرح کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔“ میں نے ... ناگواری سے کہا۔

”مطلب تو میں بھی تمہارے آنے کا نہیں سمجھ سکا۔“ میجر سلطان نے ... ”بلاشبہ تم پڑھے لکھے آدمی ہو، بہت اچھی انگریزی بول لیتے ہو ... تمہاری شخصیت بھی متاثر کن ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تم ڈاکٹر نہیں ... ہو۔“ اس کا لہجہ حسب سابق سپاٹ رہا۔

”یہ خیال تمہیں کیوں آیا میجر سلطان ؟“ میں نے محتاط ہو کے کہا۔

”یہاں ایسی وارداتیں ہوئی ہیں کہ کوئی شخص جعلی پولیس افسر یا ... کے گھر میں داخل ہوا اور گھر کے اندر کا نقشہ دیکھ گیا ... میجر سلطان نے کہا۔

”کیا میں صورت سے ایسا نظر آتا ہوں ؟“ میں نے غصے سے کہا۔

”نہیں... صورت سے تم ایسے نہیں لگتے۔“ میجر سلطان نے ... ”ہو سکتا ہے کہ تم اپنی شخصیت کے فریب سے لوٹتے ہو۔ ضروری ... کہ تم جو رول ادا کرو، ہو بہو ویسے ہی ہو سکتے ہو۔ جو باتوں سے بے وقوف ... یا کبھی تم وکیل بن کر... زیورات کو ٹھگ لیتے ہو ... کی شکل میں آ جاتے ہیں۔ پلاٹ دلانے والے، گاڑی دلوانے ... میں چانس دلوانے والے، ہزار دھندے ہیں... تم جیسے ... مجھے یقین ہو چلا ہے کہ فون کرنے کے بہانے تم اندر ... مجھ سے تعلق پیدا کرنے آئے تھے۔ ایم آئی رائٹ ؟“

”نو... یو آر اے سلیوٹلی رانگ... میرے پاس وقت ہوتا ... تمہارے شکوک دور کر دیتا۔“ میں نے کہا۔

”تمہارے پاس اتنا وقت ہے... اور نہیں ہے تو تم نکلنے سے پہلے مجھے مطمئن کر جاؤ... ورنہ تم جا نہیں سکو گے۔“ اس ... پتلون کی جیب میں سے ریوالور نکال لیا۔

”تم کیا کر رہے ہو ؟“ میں نے بوکھلانے کی اداکاری کی ...

سخت وحشت زدہ نظر آنے لگا۔

”اگر تم نے سچ نہ بولا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا اور پھر خود پولیس کو بلاؤں گا کہ تمہاری لاش اٹھا کے لے جائے۔“ میجر سلطان نے کہا۔ ”میں تم کو نہیں جانتا۔ میرے سارے خاندان یا کسی دوست واقف کار نے آج تک تمہاری صورت نہیں دیکھی مگر تم میرے گھر میں موجود ہو۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم چوری کی نیت سے اندر گھسے تھے اور میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میرا تعلق فوج کے کس شعبے سے ہے ؟“

”میں نے باہر صرف نام دیکھا تھا۔“

”تو پھر میں بتاتا ہوں تمہیں۔ میں لے ایم سی میں ہوں۔ اے ایم سی کور۔ اور اس کا مطلب تم سمجھ گئے ہو گے۔ میں خود ڈاکٹر ہوں۔ اس لیے اب تک تم خود کو ڈاکٹر ثابت کر رہے تھے تو اب یہ احمقانہ کوشش چھوڑ کے مجھے سچ سچ بتا دو کہ آخر تم کون ہو ؟“

میرے لیے بہت مشکل اور پریشان کن صورت حال پیدا ہو گئی تھی اور جھوٹ، چالاکی یا ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے جان بچا کے نکلنے کی شکل ہی نہیں ناممکن نظر آنے لگا تھا۔ میرے لیے اب ایک راستہ ہی رہ گیا تھا کہ میں میجر سلطان کے ریوالور کو ایک غیر مؤثر قوت بنا دوں۔ اس سے پہلے کہ وہ ریوالور سے نشانہ بھی لیتا، میں اسے ناک آؤٹ کر سکتا تھا اور اس کے ریوالور پر بھی قبضہ کر سکتا تھا مگر مجھے میجر سلطان کی مدد کی ضرورت تھی اور میں نے اسے ایک کام کے لیے ہی منتخب کیا تھا مگر انتخاب کے طریقۂ کار میں خامی کے باعث معاملہ الٹا ہو گیا تھا۔

”کیا تم چاہتے ہو کہ میں ملٹری پولیس کو طلب کر لوں ؟“ میجر سلطان نے میری خاموشی پر مسکرا کے کہا۔ ”وہ خود تم سے پوچھ لیں گے کہ تم ڈاکٹر ہو یا ذہنی مریض یا مجرم... حقیقت ذہنی مریض ہی ہوتے ہیں۔“

میں نے ایک طویل سانس لی۔ ہاتھوں اور کندھوں کی حرکت اور شکل و صورت کے تاثرات سے یہ ظاہر کیا کہ میں نے شکست تسلیم کر لی ہے اور میں مقابلے کا بالکل ارادہ نہیں رکھتا۔

”کیا میں بیٹھ سکتا ہوں ؟“ میں نے شکست زدہ لہجے میں کہا۔

”تو...“ میجر سلطان نے کہا۔ ”تم میرے مخالف نہیں ہو۔“

”ایک سگریٹ تو...“

”تو... یہ سب وقت ضائع کرنے اور بچ نکلنے کے حربے ہیں۔“ وہ بولا۔

”آل رائٹ... تم سوال کرو... میں جواب دوں گا۔“

”تم ڈاکٹر نہیں ہو ؟“ وہ بولا۔

”ظاہر ہے۔“ میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”صرف ہاں یا نا میں جواب دو۔“ وہ مشتعل ہو گیا۔

”میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"تم نے کہاں فون کیا تھا؟" میجر سلطان نے کہا۔

"اس نمبر سے تم کو کچھ معلوم نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔

"یہ فکر تم کو نہیں کرنی چاہیے... نمبر بتاؤ۔" وہ بولا۔

میں نے اُسے نمبر بتا دیا جو اس نے نوٹ کر لیا۔

"یہ بھی تمہارا کوئی لنک ہے... میں معلوم کر لوں گا۔" میجر سلطان نے کہا۔ "اور وہ تم کو شناخت کرے گا... جسے تم نے فون کیا تھا۔"

"تم اس سے بحث کیوں نہیں کر لیتے؟"

"یہاں بیٹھ جاؤ۔" اس نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ "میں فون پر بات کروں گا... تم بھی سنو گے... اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا اور یہ مت سمجھنا کہ فوج کا ڈاکٹر گولی نہیں چلا سکتا... میں تو بہت اچھی چلا سکتا ہوں۔"

میں اس کی بتائی ہوئی جگہ پر بیٹھ گیا۔

اس نے نمبر ملایا اور ایک بٹن دبا کے ہینڈ سیٹ رکھ دیا۔ آواز اب براہ راست فون کے چھوٹے سے اسپیکر سے آ رہی تھی۔ الاعین دوسری طرف کی گھنٹی سن سکتا تھا۔ چوتھی گھنٹی پر کسی نے ہیلو کہا۔

"کون بول رہا ہے؟" میجر سلطان نے کہا۔

"آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟" جواب دینے والی عورت نے کہا۔

"ابھی آپ کو ڈاکٹر رشنا نے فون کیا تھا؟"

"میں کسی ڈاکٹر رشنا کو نہیں جانتی۔" وہ تند لہجے میں بولی۔

"پھر اس نے تمہارا نمبر کیوں ملایا تھا؟"

"اگر تم ڈاکٹر رشنا کو جانتے ہو تو اسی سے پوچھو۔"

"اگر آپ کے لیے وہ اجنبی تھا تو آپ نے اسے کیا جواب دیا تھا؟"

"جو مجھے دینا چاہیے تھا۔ میں نے کہا تھا کہ رانگ نمبر... مگر تم یہ سب پوچھنے والے کون ہو؟"

"پولیس۔"

"یہ ڈاکٹر ابراہیم مرود کا گھر ہے۔ دوبارہ سوچ سمجھ کے بات کرنا۔" فون بند ہو گیا اور میں نے میجر سلطان کے ماتھے پر بل دیکھے جو پہلے سے زیادہ خوفناک نظر آتا تھا۔

"کیا یہ عجیب اتفاق نہیں ہے کہ میں بھی ڈاکٹر... تم بھی ڈاکٹر اور میں نے سوچے سمجھے بغیر جو نمبر دیا تھا وہ اتنے بڑے ڈاکٹر کا گھر..." میں نے کہا۔

"آئی سی... تم نے سوچے سمجھے بغیر نمبر ڈائل کیا تھا۔ گویا تمہارا مقصد صرف اندر آنا تھا۔" میجر سلطان بولا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے تفتیش کے چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں ایم پی کو بلاتا ہوں۔"

"انگریزی میں کہتے ہیں کہ کوئی کام کرنے سے پہلے سوچ لو... کہیں تم بعد میں [illegible] ہو؟" میں نے کہا۔ "یا آسمان سے گر کے کھجور میں اٹکنے کے امکانات تو پیدا نہیں کر رہے ہو۔"

"شٹ اپ... میں جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم صرف میرے پیشہ ور کرسٹے کی سوچ رہے ہو۔ تمہارا ذہن اس شے کی طرف [illegible] ان خصوصیت کو بھول رہے ہو جو تم خود اپنے لیے پیدا کر رہے ہو۔"

"کیا مطلب ہے اس بکواس کا...؟"

"فرض کرو ملٹری پولیس یا پولیس کے سامنے میں یہ بکواس شروع کر دوں؟" میں نے کہا۔

"وہ تمہارا دماغ درست کر دیں گے۔"

"مگر تمہارا معاملہ تو ہر حال بگڑ جائے گا۔ میرے [illegible] بیان سے۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ تمہاری مسز کی تصویر ہے؟" میں نے ایک فریم کو اٹھا کے غور سے دیکھا۔

"میری بیوی کی تصویر وہیں رکھ دو..." [illegible] چلا کے بولا۔

"تمہاری وائف بہت ینگ ہے اور بہت خوبصورت [illegible] اور اگر میں نے بیان دے دیا کہ یہاں میں اسی کے لیے آیا تھا... میں اس کا یار ہوں... شادی سے پہلے کا... وہ ایک آوارہ..."

جس کی توقع تھی میجر سلطان نے مجھے انگریزی میں ایک گالی دی اور ریوالور اٹھا کے [illegible] کیا۔ اس کی حرکت [illegible] حملہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ میں اس کے ہاتھ [illegible] جانتے بیٹھا تھا اور میرے آخری لفظ کے ساتھ ہی اس کا [illegible] دیکھتے ہی میں خود [illegible] کے صوفے سے فرش پر گر گیا لیکن گرتے [illegible] میں نے تصویر کا فریم میجر سلطان پر پھینک مارا۔ فریم [illegible] بھاری تھا۔ [illegible] نشانہ بھی خطا ہوا۔ فریم ریوالور والے ہاتھ پر [illegible] میجر سلطان کے [illegible] سے ٹکرایا تاہم اس سے میرا مقصد پورا ہو گیا۔ سلطان ایک کشن والے اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جھکا تو اس کا توازن بگڑ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا میں نے اسے دبوچ لیا۔

"تم نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا۔" میں نے میجر سلطان کو جھٹکے سے فرش پر مارا اور ریوالور لے لیا۔

"گیٹ آؤٹ..." میجر نے زور لگا کے مجھے [illegible] چلانے لگا۔ "نو... نو..." مگر گولی کی آواز [illegible] اس کا بیٹ [illegible] اندر آ چکا تھا۔ دوسری طرف سے اس کی بیوی آئی تھی۔ بلاشبہ بے حد حسین تھی مگر اتنی معصوم صورت تھی کہ مجھے اپنے الفاظ پر شرم آئی۔

"سب تنگ جاؤ... اپنی اپنی جگہ..." میں نے ریوالور [illegible] کے کہا۔ "ورنہ میجر صاحب کی جان جائے گی۔ میرا ارادہ ابھی [illegible] کسی کو بھی نقصان پہنچانے کا نہیں ہے... بس [illegible] میری بات کوئی نہ روکے۔"

"[illegible] تم جاؤ۔" میجر سلطان کی بیوی نے کانپتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لیے [illegible] وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارا راستہ کوئی نہیں روکے گا۔" وہ آگے بڑھ کے اپنے شوہر کے سامنے آ گئی۔

"میں تم کو چھوڑوں گا نہیں۔" میجر سلطان نے غرا کے کہا۔

"پلیز... تم چپ رہو۔" میجر سلطان کی بیوی نے پلٹ کر کہا۔ "میری خاطر۔"

"مجھے بہت افسوس... اور شرمندگی ہے خاتون۔" میں نے کہا۔ "میں نے آپ کے شوہر کے سامنے انتہائی نامناسب الفاظ استعمال کیے... آپ کے لیے... میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔" میں نے ریوالور کا میگزین خالی کر کے گولیاں جیب میں ڈال لیں۔ میجر سلطان نے مجھے پھر ایک گالی دی۔ "میں اکیلا ہوتا تو..."

"تم چپ رہو۔" میجر سلطان کی بیوی نے چلا کے کہا۔

"یہ آپ کا سروس ریوالور ہے۔" میں نے ریوالور نیچے ڈال دیا۔ "[illegible] اس کی گمشدگی سے آپ کے لیے مسائل پیدا ہو جاتے۔ گولیاں ابھی میں باہر ڈال جاؤں گا۔ [illegible] آپ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ رہیں... میرے پاس ذاتی اسلحہ بھی ہے۔" [illegible] نے جیب کے اندر سے اپنا ریوالور نکال کے دکھایا۔ "اگر آپ کو نقصان پہنچانا ہوتا تو میں فون کرنے کا احمقانہ ڈراما نہ کرتا۔ میجر سلطان بے شک میں ڈاکٹر نہیں ہوں لیکن [illegible] میں اتنا ہی شریف آدمی ہوں جتنے آپ ہیں [illegible] آپ سے ضرورت کے تحت ایک تعلق پیدا کرنے کے لیے [illegible] وضاحت نہیں کر سکتا مگر میجر... ایک دن آئے گا [illegible] سے تعلق پیدا کرنا چاہو گے اور اس تعلق کو اہم سمجھو گے [illegible] تمہاری غلط فہمی رفع ہو جائے تو تم یہ سب بھول جانا اور ہم بہتر طور پر دوست ہوں۔"

"معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔" میجر سلطان نے کہا۔ وہ کنفیوژ ہو گیا تھا اور اب اس کے لہجے میں نفرت یا اشتعال کا جذبہ [illegible]

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "فی الحال شب بخیر... خدا حافظ میجر سلطان... پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں... اطمینان سے سو جائیے اور اس واقعے کو بھول جائیے۔"

میں اطمینان سے باہر نکلا تھا مگر مجھے میجر سلطان کی طرف سے اندیشہ نہیں تھا۔ [illegible] ایک دیوار کی اوٹ میں چھپ کر [illegible] کے بعد میجر باہر آیا۔ بیوی نے اس کی قمیص کی آستین پکڑ رکھی تھی۔

"[illegible] کیا کر رہے ہو...؟"

"کہیں نہیں گیا... تم چلو اندر..." میجر کی بیوی نے کہا۔

"آپ [illegible] اس بدمعاش کو پیچھے سے پکڑ لوں؟" اس کے [illegible] سے کہا۔

"چلو تم بھی اندر... اب صورتحال یہ ہے۔" میجر سلطان نے اسے بچھاڑا۔ "جب وقت تھا تو چوہے کی طرح دبک گئے تھے۔ کوئی ضرورت نہیں کسی کو اس کے پیچھے جانے کی۔ اس نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ نقصان پہنچانے والا آدمی تھا بھی نہیں۔"

"مجھے تو حیرانی ہے... کہ وہ آیا کیوں تھا۔" میجر سلطان نے کہا۔ "[illegible] خواہ مخواہ ایک بوگس کال کی... بہت پراسرار آدمی تھا۔"

"شکر کرو کوئی مسئلہ نہیں کھڑا ہوا۔ تم نے تو گولی چلا دی تھی۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے... معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا؟" میجر سلطان بگڑ کے بولا۔

"کچھ بھی کہا ہو... جاتے جاتے معافی تو مانگ گیا..."

"مارا جاتا میرے ہاتھوں تو یہ مذاق مہنگا پڑتا۔" میجر نے کہا اور بیوی کے ساتھ اندر لوٹ گیا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اس کے بنگلے سے باہر نکل آیا۔ [illegible] وہیں کھڑی ہوئی تھی جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا۔ میں نے مخالف سمت میں سفر کیا اور تقریباً پچاس قدم چلنے کے بعد گھوم کر پیچھے والی اسٹریٹ پر ہو لیا۔ وہیں کونے پر مجھے ایک [illegible] کا کھمبا دکھائی دیا اور میں اللہ کا نام لے کر اس پر چڑھ گیا۔ بنگلے کے [illegible] چند منٹ بعد میں نے میجر سلطان کا نمبر ملا لیا تھا۔

"ہیلو..." میجر سلطان کی آواز آئی۔

"میجر سلطان..." میں نے کہا۔ "اب میں بتاؤں گا کہ میں کیوں آیا تھا۔"

"تم...!" انتہائی حیرت سے میجر سلطان صرف ایک لفظ بول سکا۔

"یس... یس..." میں نے کہا۔ "فون بند مت کرنا... مجھے تم سے ایک انتہائی اہم بات کرنی ہے... میں صرف تمہارا فون نمبر لینے آیا تھا۔"

"مائی گاڈ... اور اب کس کے بنگلے میں گھسے ہو؟ فون کہاں سے...؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "میں ہر جگہ رسائی رکھتا ہوں۔"

"تم نے ریوالور کی گولیاں کہاں ڈالی ہیں؟"

"گیٹ پوسٹ کے اوپر..." میں نے کہا۔ "اب میری بات سنو... جو تم کو عجیب لگے گی مگر یہ قومی سلامتی سے تعلق رکھنے والا انتہائی اہم معاملہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تم ملک کا دفاع کرنے والوں میں ہو۔ اس لیے تم اس معاملے سے بے خبر نہیں رہ سکتے۔"

"کیا تم پاگل ہو... یا مجھے پاگل سمجھتے ہو...؟"

"تمہارے گھر کے باہر ایک کار کھڑی ہوئی ہے۔" میں نے اس کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "جس کی [illegible] ہے۔ اس کے اندر دو افراد ہیں۔ ان کو ملٹری انٹیلی جنس کے حوالے کر دو... یہ ہمارے ملک کے دشمن ہیں۔ کیا تم نے گزشتہ دن کے اخبارات میں [illegible]

www.paksociety.com

معاملے کا بہت بڑا ذخیرہ دریافت ہونے کی تفصیل پڑھی تھی۔"

"آں... ہاں..." وہ چونکا۔ "پڑھی تھی۔"

"اس میں صاف ظاہر ہوا ہے اور پچھواڑے کے ذخائر کا تذکرہ بھی تھا۔"

"تم... تم سکندر بخت... اوہ مائی گاڈ..."

"ٹھیک ہے میجر... کہ تم نے مجھے دیر سے کیوں گرفتار کر لیا... امید ہے اب تمھیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "تم براہِ راست بھی بات کر سکتے تھے... اپنا نام بتا کے۔"

"میں اعتماد کا تجزیہ معمول نہیں لیتا۔ مگر اعتماد کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اب تم باہر جا کے ان دونوں کو قابو کرو اور دیکھو کہ وہ تفتیش میں کیا بتاتے ہیں۔ وہ خطرناک لوگ ہیں اور ان کے پیچھے بھی خطرناک لوگ ہیں اس لیے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ تم کو بھی مار سکتے ہیں... اور تم کو بھی... میں نہیں چاہتا کہ تمھاری خوب صورت بیوی اس عمر میں بیوہ ہو۔"

"ایک آوارہ اور بدکردار عورت۔" وہ ہنسا۔

"میں معافی مانگ چکا ہوں میجر۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "وہ سب تم کو مشتعل کرنے کے لیے ضروری تھا۔ تم مشتعل نہ ہوتے تو میں خود کو یا تمھیں نقصان پہنچائے بغیر وہاں سے کیسے نکلتا۔"

"اچھا سبق دیا ہے تم نے مجھے۔" وہ بولا۔ "آئندہ میں اپنے جذبات کو قابو میں رکھوں گا۔"

"بہت مشکل ہے میجر سلطان... بلکہ ناممکن۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "کوئی بھی غیرت مند شوہر ایسی بے ہودہ بات پر وہی کرے گا جو تم نے کیا۔"

"تم بھی یہی کرتے؟"

"بالکل... بشرطیکہ میری بیوی ہوتی اور تم اسی طرح میرے گھر میں گھس کے اس کے بارے میں یہی کہتے۔" میں نے کہا۔ "خیر اب میں کوئی بات نہیں کر سکتا کیونکہ میں... سولی پر ٹنگا ہوا ہوں۔ یار زندہ صحبت باقی۔ میجر کبھی ملیں گے تو دوست بن کر ملیں گے۔ ابھی تو مجھے صرف ایک بات اور کہنی ہے۔ کل صبح کا اخبار دیکھو گے تو اس میں میکلوڈ روڈ پر ایک ہیئر ڈریسر کی دکان میں بم کے دھماکے اور کچھ تخریب کاروں کی دہشت انگیزی کا ذکر ملے گا۔ اس قتل عام ہنگامہ آرائی کے ذمے دار یہی دونوں ہیں جو کار میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی پسند عناصر کے مددگار ہیں اور بھارتی ایجنٹ بھی ہو سکتے ہیں۔ تمھاری سرسری انٹیلی جنس ان سے بہت کچھ معلوم کر سکتی ہے۔"

"یا مائی گاڈ... ہم ان کا سر توڑ کے اندر سے تمام ضروری اور اہم معلومات کا ذرہ ذرہ نکال سکتے ہیں۔" میجر سلطان نے کہا۔ "لیکن مجھے یہ تو بتاؤ..."

"فی الحال اس سے زیادہ نہیں۔"

"کیا تم راستے میں کہیں کال ٹریس کرا لوں گا؟"

میں ہنسا۔ "ابھی ہم ترقی کے اس دور سے بہت دور ہیں۔ شاید ایک گھنٹے تک وہاں کوئی نہ پہنچے جہاں سے میں بات کر رہا ہوں۔ میرے پاس وقت کم ہے اور مجھے وہ سرے کام نکالنے ہیں۔"

"بہرحال سکندر بخت۔"

"شکریہ میجر سلطان۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اب تم مجھے اچھا سمجھنے لگے ہیں اور میرے اچھے کام کے لیے اپنی رائے رکھتے ہیں۔ یہ سوال پیچیدہ ہے تو ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"

"صرف سوال پیچیدہ ہی تو کافی نہیں ہوتی۔"

"مگر جب کوئی کسی سے اصولی طور پر اتفاق کرتا ہے اور طریقے سے اس کی مدد بھی کرتا ہے۔ جتنی جس کی استطاعت ہو اور کسی میں ہمت ہو۔ یہ احساس ہی بہت بڑی طاقت ہے۔ اور میرے دشمن بھی صف دوستاں میں شامل ہو گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "خدا حافظ۔"

"تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔"

"میں کل تم کو پھر فون کروں گا۔ اگر موقع ملا۔" میں نے لائن کاٹ کے کھمبے سے نیچے اترا۔ نیچے میں نے ایک شخص کو دیکھا جو مجھے گھور رہا تھا۔ وہ چھ فٹ سے زیادہ کا بہت لمبا آدمی تھا۔

"کون ہو تم... اوپر کیا کر رہے تھے؟" وہ بولا۔

"اوپر؟" میں نے سر اٹھا کے کھمبے کو دیکھا۔ "اوپر کہاں؟"

"اوپر کھمبے پر؟" وہ چڑ کے بولا۔

"لیکن میں تو اب نیچے آ چکا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں کہتا ہوں تم چڑھے کیوں تھے؟"

"میں... بس ایسے ہی... ٹھنڈی ہوا کھانے..." میں نے کہا اور سوچنے لگا کہ آخر وہ کون ہو سکتا ہے۔ کوئی پولیس کا آدمی۔

"بکواس کرتے ہو میرے سامنے میں نے دیکھا تھا تم ٹیلی فون لائن ملا کے فون کر رہے تھے... یہ جرم ہے۔" وہ مشتعل ہو کے بولا۔

"یہ کون سا جرم ہے! میں ہر روز دیکھتا ہوں کہ لوگ کھمبے پر چڑھ کے فون کرتے ہیں۔ میرے گھر میں فون ہوتا تو میں ایسا نہ کرتا۔ مگر مجبوری سب کراتی ہے جناب۔" میں نے کہا۔

"مجبوری کے بچے... میں ٹیلی فون کے محکمے کا ایس ڈی او ہوں۔ تم جیسے کے لائن مین نہیں ہو۔ میں تمھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔" ایس ڈی او نے کہا۔

"او ایس ڈی او صاحب۔" میں نے کہا۔ "میں ابھی آپ کے..."

"بھائی ہوں اگر میری ٹیلی فون کی اسپیشل نمبر..."

"میں ایس ڈی او ہوں... او ایس ڈی نہیں..."

"چلیے یوں ہی سہی... میرا ایک بھائی بھی ڈی ایس او ہے۔"

ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ آفیسر۔" میں نے کہا۔

اس نے اپنے سر پہ ہاتھ مارا۔ "میں ایس ڈی او ہوں۔ سب ڈویژنل آفیسر ٹیلی فون کا... تم خود کو زیادہ چالاک سمجھو۔"

"اگر میں بھاگ جاؤں تو آپ کیا کر لیں گے؟" میں نے کہا۔

"میں... میں شور مچاؤں گا۔" وہ پریشان ہو کے بولا۔

"اس سے کیا ہوگا؟" میں نے تفریح لیتے ہوئے کہا۔ "یہاں آپ کی سننے والا کون ہے... گھروں میں لوگ آرام سے بیٹھے ہیں۔ وہ آپ کی مدد کے لیے نہیں آئیں گے... آپ کا گلا بیٹھ جائے گا۔"

اس نے مجھے دبوچنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے دھکا دیا اور پیچھے گر چلا لیکن فوراً اٹھا اور میرے پیچھے دوڑا۔ میں نے تھوڑا سا اور خود بھی دوڑا۔ وہ مشکل سے پچاس گز دوڑ کے ہانپ گیا۔ میں نے ہاتھ ہلا کر اسے گڈ بائی کہا اور پھر ایک طرف چل دیا۔ مجھے بہت افسوس ہوا اس لیے کہ میں ہنسی ضبط کر رہا تھا۔ اس کے سامنے کوئی قتل کر کے بھاگ جاتا یا ان کی دولت اٹھا لے جاتا تو وہ شور مچانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے اور پھر ایک مسئلہ نئے کیس کا پیچھے تک جاتے ہیں۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ایک ایجنسی کے لطف اٹھانے نے میری ساری کوفت دور کر دی جو مجھے کچھ دیر پہلے کے جھگڑے سے اتفاقی پڑی تھی۔

میجر سلطان نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے تقریباً ڈرا دیا تھا چنانچہ مجھے امید تھی کہ اسی ذہانت سے کام لیتے ہوئے وہ دونوں قیدیوں کو پولیس یا ملٹری کے حوالے کرے گا اور کرنے والے تفتیش بھی کر لیں گے۔ مسٹر اس کی گاڑی کا تھا۔ اگر وہ سفارتی عملے کے کسی رکن کی ہوتی تو سفارت خانہ احتجاج کرے گا اور بات بگاڑ کے ہو جائے گی۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے عملے کے دو معزز اراکین شاپنگ کے لیے باہر نکلے تھے اور چائے پی کر ایک ریسٹورنٹ سے نکل رہے تھے جب انھیں مسلح افراد اغوا کر کے لے گئے۔ حتیٰ کہ سیاسی گروہ یا دہشت گرد تعلقات دہشت گردی والے ممالک ایک دوسرے پر کچھ بھی الزام لگا سکتے ہیں۔ ممکن ہے ان دونوں افراد کی بازیابی کا مطالبہ کیا جائے مگر یہ سیاسی مسئلہ خود حکومت سیاسی طور پر حل کرے گی۔ میرے لیے یہی اطمینان کافی تھا کہ میں ان کے عزائم ملیامیٹ کر کے نکل آیا اور اس مقابلے میں ہمارا فائدہ یہ ہوا کہ بلا تامل لیا جو وقت ضرورت کام آئے گا۔ مجھے صرف اس ہیئر ڈریسر کی دکان کی تباہی کا افسوس تھا جس نے بڑے ذوق بہت بلند ہمت کے ساتھ ہماری مدد کی تھی۔

خوشی کی بات یہ بھی تھی کہ سارا ہنگامہ اس وقت شروع ہوا جب ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس ہیئر ڈریسر کے نقصانات کی تلافی بعد میں کی جا سکتی تھی۔ اس نے میرے اور محسن کے میک اپ کی تبدیلی تو کی تھیں وہ ہمارے پاس ہی کار میں رکھی تھیں۔ ایک تو

اس نے فٹ کر کے بھی بتا دی تھی اور دوسری ہم دیکھ بھال کے کرشنکاری آ گئے تھے۔ محسن نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے وگ وہاں نہیں چھوڑی تھی اور مجھے یقین تھا کہ آگے چل کے جب ایسی صورت بدلنے کی ضرورت پیش آئے گی تو یہ وگیں بہت کارآمد ثابت ہوں گی۔

اس رات ہم نے وہیں کر سو جانے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ ہمارا لینڈ لارڈ بہت کام کا آدمی تھا اور ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ہم نے غالب کو چپکے چپکے وہ سب بتا دیا جو ہمارے ساتھ پیش آیا تھا لیکن جلال اور کیتھرین کو تب تک کوئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ صبح ہم سو کے بھی نہیں اٹھے تھے کہ ہمارے لینڈ لارڈ نے دستک دی۔ "تم لوگ ابھی تک سو رہے ہو؟" وہ خفگی سے بولا۔

"یہی تو دن میں سونے کے۔" محسن بولا۔ "بڑھاپے میں نیند کہاں آتی ہے۔"

"فلک شیر۔" وہ بولا۔ "جوانی ہوتی ہے کام کرنے کے لیے۔ یہ وقت سو کر گنوا دو گے تو کیا بڑھاپے میں کام کرو گے۔ اور کون کہتا ہے کہ بڑھاپے میں نیند نہیں آتی... ٹھیک آٹھ بجے... میں اپنے آٹھ گھنٹے سوتا ہوں۔ نہ ایک منٹ کم نہ ایک منٹ زیادہ... آدمی کا جسم گھڑی کی طرح کام کر سکتا ہے بشرطیکہ آدمی اس کو ایک ڈسپلن کا پابند بنائے۔ خیر میں یہ بتانے آیا تھا کہ میں جا رہا ہوں۔"

"کب؟" میں نے کہا۔

"آج ہی... میری سیٹ کنفرم ہو گئی ہے۔" وہ بولا۔ "مجھے امید ہے کہ تم بعد میں شریفوں کی طرح رہو گے اور وہ سب نہیں کرو گے جو کرتے رہے ہو۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ "ہم کیا کرتے رہے ہیں جناب؟"

"وہ جو تم کو نہیں کرنا چاہیے۔" اس نے کہا۔ "لیکن میں تمھارا باپ بھی نہیں ہوں اور دوست بھی نہیں ہوں۔ میں نہ حکم دے سکتا ہوں اور نہ مشورہ... تم جو چاہو کرو مگر میری پراپرٹی محفوظ رہنی چاہیے۔"

اس نے ہم سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا۔ اس کی باتوں نے مجھے چکرا دیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہہ گیا تھا۔

"تم اس کی بات کا مطلب سمجھے؟" محسن بولا۔

"ہاں اور نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم میرے جواب کا مطلب سمجھے؟"

"نہیں اور ہاں۔" محسن نے کہا۔ "غالباً بڈھا سب جان گیا تھا۔"

"کیا جان گیا تھا؟"

"یہی کہ ہم کون ہیں۔" محسن نے کہا۔

"اور کیا کرتے رہے ہیں۔" غالب نے اتفاق میں سر ہلایا۔

"اس نے ہمیں پہچان بھی لیا تھا۔" محسن بولا۔

"پھر اس نے کلام کیوں نہیں کیا؟"

www.paksociety.com

"وہ بار بار تقاضا کر رہا تھا کہ میں ان کے حالات میں پڑنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔" غالب نے کہا۔ "بقول شاعر، بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا۔ اس کی بلا سے بوم بسے یا ہما بسے۔"

"میرا تو خیال ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے گیا۔" محسن بولا۔ "اور وہ جانتا تھا کہ اس کی واپسی نہیں ہو گی۔"

"یہ ایک پرانی کہاوت کا خیال رکھنے والی بات مجھے اسے ہی تھی۔ نہ وہ خود واپس آنے کا، نہ اس کا بیٹا۔ مگر اس منڈی کی خبر چھپنے کا کوئی نشان میں صرف اس لیے تو اسے کہ تعلق طور پر ہم کرائے دار ہیں اور خود کو مالک نہ سمجھیں۔" غالب نے کہا۔

"تم نے کیسے فرض کر لیا کہ وہ لوٹ کر نہیں آئے گا؟"

"بس اس کا رویہ، اس کی عمر اور اس کے حالات دیکھ کر۔ اب کتنی عمر رہ گئی ہے اس کی۔ اور جیسا جو لیفٹ اس نے سکونت اختیار کر چکا ہے، وہاں سے واپس آ کے کیا کرے گا؟ یہ پرانی فرسودہ حال کوٹھی کون سا بڑا اثاثہ ہے جس کے لیے وہ لوٹ کر آنا ضروری سمجھے۔ یہاں ایسے بہت سے پرانے گھر ہیں جن کے مکین ہجرت یا ترکِ وطن کر گئے اور جلاوطن ہو گئے۔ ان کے سب رشتے ٹوٹ گئے اور جذبات بدل گئے، گھر کھنڈر ہو گئے۔ یہ گھر ایک مثال ہے۔" غالب نے بتایا۔

"میرا گھر … ہے۔" میں نے کہا۔

"بڈھا چند منٹ کے بعد جو بہت کچھ کہہ گیا، ایک امانت جانتے ہیں، پر گیا اور یہ بھی سمجھ گیا کہ اب اس کی حفاظت بھی ہمیں اچھا زندگی کی طرح کرنی چاہیے۔" محسن بولا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ بھی ہمارا طرف دار اور حامی تھا۔ ہم سے اور ہمارے مشن سے اصولی اتفاق رکھتا تھا لیکن کھل کر یہ بات نہیں کہنا چاہتا تھا کہ کہیں ہم پریشان اور خوفزدہ نہ ہوں۔" غالب نے کہا۔

"اس نے اپنے شک کا اظہار بھی نہیں کیا۔"

"یہ بڑی حوصلہ افزا بات ہے۔" میں نے کہا۔ "کہ آہستہ آہستہ لوگ ہمارے کام اور ہمارے نام سے آشنا ہو رہے ہیں۔ یہ ماننے لگے ہیں کہ ہم مجرم نہیں ہیں، مجاہد ہیں۔ ہم واقعی کسی ایکشن لینے میں تو غلط نہیں کرتے۔ لوگ اس بوسیدہ سماجی، معاشی اور اخلاقی نظام کی ہیرا پھیری سے عاجز ہیں جس میں کوئی قانون، اصول یا ضابطہ کام نہیں آتا۔"

"یہ کام آتا ہے تو غلط کام کرنے کرانے میں۔" محسن نے کہا۔ "اگر کوئی صحیح کام کرنا چاہے… صحیح لیتے ہیں۔ تو بدعنوان لوگ انہی قواعد و ضوابط کی رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں اور اچھا کام کرنے والے کو ہی پھنسا دیتے ہیں۔"

"اخبارات نے ہمارا امیج درست کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "لوگ اصل چہرے پہچان رہے ہیں۔"

"ہاں۔ اس ہیرا پھیری کے بعد ہم مطلقاً سے وابستہ ہمارے لیڈروں نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم سے اور ہمارے مشن سے ہمدردی رکھنے والے ہر جگہ پیدا ہو گئے ہیں۔" محسن بولا۔ "ایسا نہ ہوتا تو یہ سب لوگ پولیس کے حوالے کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔"

"وہ کیا کہتے ہیں شاعر کہ ظلم کی ٹہنی سدا پھلتی نہیں، ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں۔" غالب بولا۔ "بات قریب سے سمجھ میں آنے لگا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ سچ کے ساتھ ہو رہے ہیں۔"

"یہ بڑی خوش آئند تبدیلی ہے اور بہت حوصلہ افزا بھی۔" میں نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اب بہت محفوظ ہیں۔ کیونکہ ہمیں پناہ دینے والے، ہمارے مددگار اور ہمدرد بن گئے ہیں۔ یہ صورت حال صرف یہاں تک محدود نہیں ہو گی۔ جب اخبارات میں ہمارے متعلق مزید تفصیلات آئیں گی تو ہم کہیں بھی غیر محفوظ نہیں رہیں گے۔ پناہ گاہیں زیادہ ہوں گی تو شکاری آسانی سے ہم تک نہیں پہنچ پائیں گے۔"

"یہ جگہ بھی بہت محفوظ ہے۔" محسن نے کہا۔

"اور اسے محفوظ ہی رہنا چاہیے۔"

"ہاں، جب تک غالب بالکل صحت یاب نہیں ہو جاتا۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد بھی کیتھرین اور جولی کو یہاں رہنا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ ان کا اپنا کوئی گھر نہیں رہا۔ ہم فی الحال ان کو ساتھ نہیں رکھ سکتے۔"

محسن نے اتفاق کیا۔ "کیتھرین پر شک کا اثر ہے اور جولی پر بھی طویل بیماری کا اثر ہے۔"

"وہ ناتجربہ کار بھی ہے۔" غالب نے کہا۔

"ناتجربہ کار تو صلاح اور رابعہ بھی تھیں۔" محسن نے کہا۔

"نازو کا نام بھی لو یارو… اس کے نام سے اس کا تصور ابھرتا ہے۔" غالب نے کہا۔

"ہاں دوست، رابعہ کے نام سے اس کا تصور وابستہ ہے۔ مگر میں جانتا ہوں جتنا اس کی بات کرتا ہوں اور جتنا اس کا نام لیتا ہوں، اس سے سوچ کے راستے کھل جاتے ہیں اور خیال ڈوبنے لگتے ہیں۔ میں نے رابعہ کے لیے اپنے جذبات کو دل کے ایک کونے میں ڈال دیا ہے تاکہ احساس کی اذیت میرے دماغ کو ماؤف نہ کرے اور میں وہ سب کچھ کر سکوں جو میں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ایسا نہ کرتا تو شاید زندہ بھی نہ رہ پاتا۔ اب رابعہ بچھڑ گئی تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کے مر جانے کا یقین آ جائے اور وہ اپنا کام بن جائے۔ فی الحال اسی یقین کی ضرورت ہے کہ رابعہ مر چکی ہے اور میں اسے بھلا چکا ہوں۔"

"اگر تیرے یہی جذبات ہیں تو بہت جلد تو پاگل ہو جائے گا۔ یہ جنون کے آثار ہیں۔" محسن بولا۔

"پاگل تو میں ہوں… تم بھی ہو… وہ ہم جانتے ہی تھے۔ جلد پولیس بھی پہنچا ہو گی… ہم یہاں نہ ہوتے۔ بہت پیچھے رہ جاتے۔ بلکہ آگے چلے جاتے کہ خود اپنا سراغ مٹا دیتے۔ جنون کی ایک منزل یہ بھی ہے کہ طلب سے بے نیازی ہے۔" میں نے کہا۔

غالب نے سر کھجایا۔ "یہ تو طبیعت کا فلسفہ ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اخبارات کی رپورٹ دیکھنی چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "اور اس کے بعد شمولات سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔"

"شمولات کس سے؟" میں نے کہا۔

"ہر شوہر کو حق حاصل ہے کہ وہ بیوی سے جس قسم کا رابطہ قائم کرنا چاہے کرے۔" غالب نے فرمایا۔

"وہاں انکل رضوی نے ہر آدمی جنسی ناظر کر دی ہو گی۔ ان کی پوزیشن بہت خراب ہوئی ہے۔"

"صرف ہماری وجہ سے۔" میں نے کہا۔

"اب بہتر ہے کہ اپنے جمالی مشغلے کے ذریعے ہم مطلق رابطہ قائم کیا جائے۔ اور اسی سے تازہ ترین صورت حال دریافت کی جائے۔" محسن بولا۔

"میں نے غور سے کہا تھا کہ وہ رابعہ کے اکاؤنٹ میں پڑے ہوئے… بھاگ جائے پاس ہی اور یہاں ہمارا کام بھی ختم ہو چکا ہے۔ ہمیں آج ہی یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"نازو اور اس کے بھائی اکرام نے بھی کراچی پہنچ کر کیا ہو گا۔"

"مگر حیرت ہے کہ انہوں نے یہاں کسی سے رابطہ قائم نہیں کیا۔" میں نے کہا۔

"کہیں وہ بھی کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو گئے ہوں۔" محسن نے کہا۔ "رابعہ اور جنیدی کی خبر پڑھتے ہی خطرے کو سونگھ گئے۔"

"ان کی طرف سے کوئی پیغام مل جاتا تو ہمارے لیے آسانی ہو جاتی۔ خیر، ہم اتنی ہمت ہارنے والے نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ جو چاہتے ہیں… مجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔" غالب نے کہا۔

"اپنی… ہر جگہ اڑانے کا نتیجہ دیکھ لیا۔" محسن بولا۔ "صحافی بھی… آدھے عاشق اور آدھے شہر پابند ہیں۔"

جولی اور کیتھرین گھر کی صفائی اور سامان کو اپنی اپنی جگہ رکھنے میں مصروف تھیں۔ مالک مکان نے رخصت ہوتے ہی چابیاں… کے ساتھ ڈال دیا تھا اور اب خود وہ مکان کی مالک تھیں۔ دوپہر تک وہ کچن کو اس قابل بنا چکی تھیں کہ وہاں کھانا پکایا جا سکے۔ محسن اخبارات لینے گیا ہوا تھا۔ اس کے واپس آنے تک میں نے اپنے حلیے کو تبدیل کر لیا… سب خطرناک قسم کا… تھا اور اسے ہم پستول کی طرح جیب میں ڈال کے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے لیکن یہ ضروری تھا کہ ہم جہاں بھی ہوں اپنا اسلحہ ہماری دسترس میں رہے۔

محسن آیا تو اس کے پاس اردو انگریزی کے چار اخبارات تھے۔ ان میں ایک وہ بھی تھا جس نے ڈاکوؤں… ڈاکوؤں کی گرفتاری، ان کے بیانات اور تصاویر کے علاوہ ہمارے کارنامے کی پوری خبر دی تھی۔ لیکن اس خبر کے ساتھ جو پہلے صفحے پر شہ سرخی کے علاوہ تین سرخیوں میں کئی جگہ مختلف حوالوں سے لگائی گئی تھی، ہماری کوئی تصویر نہیں تھی۔ خبروں کے درمیان باکس میں کچھ… باتیں بھی چھپی تھیں۔ ایک باکس میں لکھا ہوا تھا: "جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔" کھوتا خود ہی اصل میں آ گیا تھا کیونکہ آگے ذکر تھا کہ پولیس اپنی علاقے پر بیٹھے مرغ اور نرگس کو… سوتی تو جاگتے پر انھوں نے خود کو ڈاکوؤں کی تحویل میں پایا۔ ان کی وردی، ان کا اسلحہ، جیپ اور ان کی آزادی سب چھن چکی تھی اور ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے کے لیے جانے والے ڈاکوؤں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے۔ اس طرح "کھوتا" یعنی گدھا بھی سمجھا جا سکتا تھا اور آسانی سے کچھ کھو دینے والوں کے لیے عام مطلب میں بھی آتا تھا۔

یہ صحافتی حلقوں میں ہلچل مچانے والی خبر تھی اور دوسرے اخبارات کے لیے اتنی بڑی خصوصی خبر ہونے سے ندامت، پریشانی اور خفت کی بات تھی۔ غالب کا دوست راتوں رات ملک کے سب سے باخبر اور ہوشیار رپورٹر کی حیثیت سے مشہور ہو گیا تھا۔ مگر یہ سب جھوٹ ہوتا تو معاملہ الٹا ہو جاتا۔ مگر ایس ایس پی رضوی صاحب نے ڈاکوؤں کو عین اسی مقام سے اٹھا لیا تھا جہاں انھیں رپورٹر نے… گیا تھا۔

پولیس کے ایک ڈی آئی جی نے مشتعل ہو کے رات کو کچھ رپورٹر بلوائے تھے جو ایک دن پہلے کی پریس کانفرنس میں شریک تھے اور ان سے پوچھنا چاہا تھا کہ ہم سے ان کا کیا رابطہ ہے لیکن ایک گھنٹے بعد انھیں اپنے احکامات واپس لینے پڑے۔ صحافیوں نے یہ جانتے ہوئے صاف انکار کر دیا تھا کہ ان کو ہمارے متعلق کیا معلوم ہے۔ سب نے صاف کہا تھا کہ جو کچھ معلوم ہوا تھا وہ اخبارات میں آ گیا ہے۔ مسئلہ رپورٹ اور اس کے… تحفظ… کے جاتے ہیں اور راز داری کا وعدہ کرنے کے بعد وہ خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ وہ پولیس کو مطلع کر کے نہیں جا سکتے اور بدعہدی کر کے اپنا اعتبار کھونا نہیں چاہتے۔

ڈی آئی جی صاحب کی اس حرکت کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ تمام صحافی جو غالب کو جانتے تھے اور ہمارے مشن کی نوعیت کو سمجھ چکے تھے، ہاتھ دھو کے پولیس کے بدعنوان اہلکاروں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اب مجرم پولیس بن گئی تھی جس نے مجرموں کی پشت پناہی کی اور زر خرید غلاموں کی طرح ان… اور ان پر ہمارے خلاف… جرائم کی فہرست کو طول سے طویل تر کرنے میں لگے ہوئے تھے…

www.paksociety.com

نے ہماری بے گناہی کے حق میں ایک مہم شروع کر دی تھی۔

جس اخبار میں ڈاکٹروں کی گرفتاری کی خبر اور ان کے بیانات شائع ہوئے تھے اس نے تو پولیس کی نااہلی پر پورا اداریہ لکھ مارا تھا اور صاف مطالبہ کیا تھا کہ اصل مجرم پولیس ہے اور اس پورے معاملے کی تحقیقات کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیشن تشکیل دیا جائے جو ابتدا سے تمام معاملات کا جائزہ لے یہ دیکھے کہ اصل مجرم کس طرح قانون کے ہاتھوں سے محفوظ ہے۔ وہ کون پولیس افسر تھے جو ملک دشمنی کے کاروبار میں مددگار رہے اور دشمن کے ایجنٹ کا کردار ادا کرتے رہے۔ جانبدارانہ، تمام قانونی معاملات کی از سر نو تفتیش کی جائے اور ان کو سزا دی جائے جنھوں نے ہمارے خلاف سازش کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔

یہ تمام صورت حالات بہت خوش آئند تھی۔ اس سے علاوہ ایجنسی کے لیے مشکلات پیدا ہوئی تھیں۔ ہمارا راستہ صاف ہونے لگا تھا اور اب یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایم آر ایس کی تحریک کو اخبارات کی حمایت مل گئی ہے۔ اس طرح رائے عامہ کی تائید حاصل ہونا یقینی تھا اور ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ محب وطن عوام کی اکثریت نے ایم آر ایس کو اسی طرح تسلیم کر لیا ہے جس طرح تنظیم آزادی فلسطین کو دنیا کے حریت پسندوں نے تسلیم کر لیا تھا۔ اب ہم زیادہ بے خوفی کے ساتھ کہیں بھی جا سکتے تھے اور امید رکھ سکتے تھے کہ ملک دشمنوں کے خلاف مدد کرنے والے ہر جگہ ہمارا ساتھ دیں گے۔

پھر آخری صفحے کی ایک خبر نے مجھے متوجہ کیا۔ اپنے بارے میں اتنی بہت سی خبریں تھیں اور اداریے پڑھتے ہوئے ہم سب بہت خوش تھے اور اتنے منہمک تھے کہ دوسری خبروں پر کسی نے توجہ ہی نہیں دی تھی۔ ہم سب کے جذبات ایک جیسے تھے۔ سب یہ محسوس کرتے تھے کہ ہماری طاقت کئی ہزار گنا بڑھ گئی ہے۔ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ ہمارے وسائل لامحدود ہو گئے ہیں۔ وہ سب جو اس ملک سے محبت کرتے ہیں، اس کی مٹی سے عہد وفا رکھتے ہیں اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کو ایمان جانتے ہیں نظریاتی طور پر مانتے ہیں یا عملی طور پر بچاتے ہیں، وہ سب ایم آر ایس میں شامل ہو چکے ہیں۔

یہ بہت بڑی تبدیلی تھی اور سخت ترین دور ابتلا کے بعد ہمارے صبر و استقامت کے عوض ملنے والا منزل کا نشان دیکھنے والا اور یقین عطا کرنے والا وہ انعام تھا جس نے ہمارے حوصلوں کو بھی کئی ہزار گنا بڑھا دیا تھا۔ ہم تین گھنٹے تک مختلف اخبار دیکھتے رہے تھے۔ بار بار ایک دوسرے کو کسی خبر کا متن سناتے تھے اور ہوتا یہ تھا کہ بیک وقت سب بولنے لگتے تھے۔ ایسے میں کچھ اس طرح ہوتا تھا... یار یہ سن... اور یہ خبر... کوئی انگریزی کا اقتباس پڑھ رہا ہوتا تو کوئی اردو کا۔ سب کا تبصرہ اور شور الگ تھا۔

"یہ خبریں بالکل رضوی نے پڑھ لی ہوں گی نا" محسن بولا۔

"انھوں نے کیا، مشتعلہ اور متعلقہ نے بھی دیکھ لیا ہو گا۔"

"کیا بے وقوفی کی بات ہے۔ سارے شہر نے پڑھ لیا ہو گا اور شہر میں ولاور بھی ہے اور اس کے ملازم بھی۔"

"تم شہر کی بات کرتے ہو۔ ملک کے دوسرے شہروں سے چھپنے والے اخبارات میں بھی کچھ آیا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ہے خبر ایسی ہی ہے... میرا مطلب ہے کوئی اپنی … کی خبر ہے" غالب بولا۔

"اس کا مطلب ہے کراچی کے اخباروں میں بھی یہ خبر …"

"یقیناً ہو گا... یہ اخبار بیک وقت کراچی اور … ہوتا ہے" میں نے کہا۔

"اور پنڈی اور لاہور اور ملتان سے بھی شائع ہوتے ہیں۔"

"اکرام اور … سے بھی یہ اخبار دیکھا ہو گا۔ … اخبار کے رپورٹر سے رابطہ قائم کریں۔ یا منتظر کو فون کریں۔"

"وری گڈ۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا "اب کام آسان ہو گیا۔"

"آسان؟" غالب نے کہا "کام مشکل ہو گیا ہے … پتا چل گیا ہے کہ ولاور اینڈ کمپنی بہت محتاط ہو جائے گی۔ وہ … رابطے بدل دیں گے … زیر زمین … گمراہی میں چلے جائیں گے۔ پہلے کچھ ہے توقع تھی کہ پولیس … اور پکڑے گی کون۔ اب پولیس والے بھی ناک اونچی رکھنے کے لیے کچھ کارروائی تو کریں گے ہی۔ رائے عامہ کے احتساب سے بچنے کے لیے... اعلیٰ سطح پر حکام بھی ان باتوں کا نوٹس لیں گے۔"

"تم بہت امید پرست ہو بے ہودہ دوست" میں نے کہا۔ "صرف کاغذی کارروائی ہوتی ہے۔ کچھ بیانات آئیں گے اس قسم کے کہ ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی کر دی جائے گی۔ غداروں کو سخت سزا دی جائے گی۔ حکومت تخریب کاری اور انتشار پھیلانے کی اجازت نہیں دے گی۔ ملک کی سالمیت کے خلاف کام کرنے والوں سے سختی سے نمٹا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب … اسی قسم کے بیانات ہمیشہ آتے ہیں اور … ایجنسی کے ساتھ صرف حشمت خان ہے ایس آئی … سوار ہی نہیں، اس سے بہت اوپر کی سطح کے لوگ بھی … گئے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اوپر والے … کو آسانی سے پکڑ سکتے ہیں یا اوپر والوں کا خوف ہو تو نیچے والے کیسے غلط کام کر سکتے ہیں مگر اوپر والے براہ راست شریک … ہوتے ہیں۔ وہ بالواسطہ طور پر شامل ہوتے ہیں … ان کی آشیرباد نیچے والوں کو حاصل ہوتی ہے اور نیچے والوں سے … ان کا حصہ … ہوتا رہتا ہے۔ اگر اعلیٰ سطح پر کرپشن نہ ہو تو سب درست ہو جائے … اب تم دیکھ لینا کہ چند روز میں اخباروں کو نوٹس مل جائیں گے … کے خلاف عدالتی کارروائی ہو گی یا ضابطے کے مطابق انھیں معطل … خبریں چھاپنے پر پابندی … کر دیا جائے گا۔ کچھ دن میں ہنگامہ ختم ہو جائے گا پھر سب کچھ پہلے کی طرح ہو گا۔"

"تم نے ٹھیک کہا دوست۔ یہاں تک کچھ ہو رہا ہے … ہر نئی آواز … دبانے والی آوازوں کا شور غالب آ جاتا ہے اور خرابی بڑھ جاتی ہے کیونکہ خرابی کی نشاندہی کرنے والوں کا انجام خراب ہوتا ہے۔" مرزا غالب نے مایوسی سے کہا۔ "مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ اس خراب نظام میں کوئی مجاہد باقی نہیں رہا۔ کچھ صحافی اب بھی اپنے قلم کی آبرو بچا بھی رہے ہیں … یہ معاوضے کی بات نہیں … ایسا کر سکتے ہیں … اور پروا … کتنا بھی … یہ بات پھیل گئی ہے اور کچھ دن آئندہ بھی چھپے گی۔"

"چوہدری ولاور اینڈ کمپنی … خطرناک ہو جائیں گے" میں نے کہا۔ "ہم نے ان کو حالات کی دلدل میں دھکیلنے کی پوری کوشش کی ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ بدلتی ہوئی صورت حال اور … کی طاقت سے ہر خوف کا رخ پھر ہماری طرف کر دیں گے جیسے ماہر کھلاڑی اسکواش … خطرناک ترین شاٹ کو اپنے حریف کی طرف لوٹا کر پوائنٹ حاصل کرتا ہے۔"

اسی گفتگو کے دوران میں آخری صفحے پر میری نظر سے ایک چھوٹی سی خبر گزری۔ اس کی سرخی بہت زیادہ نمایاں نہیں تھی لیکن میری نظر کو گرفتار کرنے والا صرف ایک لفظ تھا... ولاور...

"مشہور صنعت کار چوہدری ولاور نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔" میں نے بہ آواز بلند کہا۔

ایک لمحے کے لیے سب خاموش ہو گئے۔ محسن اور غالب نے غیر یقینی اور بے یقینی کے ساتھ میری صورت کو دیکھا۔

"کیا وہ پاکستان کا وزیر اعظم اور صدر بننے کا فیصلہ بھی خود ہی کر چکا ہے؟" غالب نے کہا۔

"تم لوگ اسے مذاق سمجھ رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں... میں اسے … سمجھ رہا ہوں" محسن نے کہا۔

"یہ خبر بھی کسی اخبار میں موجود ہے جس کی دوسری خبروں پر آپ اور ہم سب ابھی خوش ہو رہے تھے؟" میں نے کہا اور اخبار اٹھا کے پڑھنے لگا۔ "معلوم ہوا ہے کہ مشہور صنعت کار چوہدری ولاور عملی سیاست میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے گزشتہ شام … کے علاقے میں ولاور بلڈنگ کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے کیا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ ابھی تک انھوں نے کسی سیاسی جماعت میں شمولیت کے امکانات پر غور نہیں کیا ہے لیکن وہ ایک نئی سیاسی جماعت کی تشکیل پر اپنے ہم خیال احباب سے مشورہ کر رہے ہیں۔ چوہدری ولاور نے کہا کہ موجودہ حالات میں تعمیر وطن، خدمت انسانیت اور اصول اخلاق کی اہمیت کو تسلیم کرنے والے ایسے افراد کی اشد ضرورت ہے جو آگے آئیں اور ملک و قوم کی بے غرض خدمت کے جذبے سے سرشار ہوں۔"

"الو کا پٹھا... حرام زادہ..." محسن کے منہ سے … اور اس نے ایک سانس میں تقریباً درجن گالیاں دے ڈالیں۔ ان میں سے نصف کو اخلاقی طور پر فحش قرار دیا جا سکتا تھا۔

"صبر... آگے سنو" میں نے محسن کو ہاتھ کے اشارے سے ٹھنڈا کیا۔ "تمہاری … سے چوہدری ولاور … اور اس قوم کی … کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ وہ محب وطن، انسان دوست اور اخلاق پرست ہونے کی سند حاصل کرے گا۔"

"یار تم آگے کی فکر میں پڑ گئے۔ اگلا جملہ پڑھو" غالب نے جھنجلا کے کہا۔

"آگے لکھا ہے... چوہدری ولاور نے جاتے جاتے یہ بھی بتایا کہ ولاور بلڈنگ کئی منزلہ عمارت ہو گی لیکن اس کے فرسٹ فلور پر ایک جدید طرز کا اسپتال ہو گا۔ اپنے والد مرحوم کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اس اسپتال کے بستر غریب اور مستحق مریضوں کو مفت فراہم کیے جائیں گے۔ سرکاری اسپتالوں کی زبوں حالی کے پیش نظر وہ محسوس کرتے ہیں کہ آج عوام کو علاج معالجے کی بہتر سہولت فراہم کرنا بے حد ضروری ہے لیکن یہ کام تنہا حکومت کے وسائل پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اگر صاحب ثروت لوگ اسی طرح فلاحی کاموں کے لیے آگے آئیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسائل … اسپتال … ولاور بلڈنگ اسی جگہ تعمیر کی جائے گی جہاں … کمپلیکس کے نام سے زندگی … کے کچرے سے بننے کا کاروبار ہوتا تھا۔"

"یہ اس کے باپ کی ملکیت تھا؟" محسن نے غصے میں … مکا مارا۔ "یہ کیس تو عدالت میں ہے... وہ کون ہوتا ہے..."

"کون کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا، یہ سب فضول باتیں اخبار میں نہیں ہیں۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اس خبر میں صرف وہ ہے جو ہو رہا ہے... اور ضرور ہو گا... تیرے میرے یا عدالت کے کہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ سمجھ میں آئی بات؟"

"یار تم چپ نہیں رہ سکتے۔" غالب نے محسن سے مخاطب ہو کے کہا۔ "… پھر چلے جانا … اور دارو …"

"… سے پہلے میں پھٹ جاؤں گا۔ میرے اندر تو ابھی دھواں بھر رہا ہے" محسن نے کہا۔

"بس چند سطریں اور ہیں... پھر پھٹ جانا" میں نے کہا۔ "آخر میں لکھا ہے کہ ہمارے نمائندے کی رپورٹ کے مطابق عمارت کے نچلے حصے میں ایک شاپنگ سینٹر ہو گا جو … کی رونق میں بھی اضافہ کرے گا اور علاقے کی ضروریات بھی پوری کرے گا۔ اسپتال

www.paksociety.com

لیں وہ دوسرے بیٹے بن گئے۔ بعد میں یہ تعمیر اور ترقی کردی جائے گی۔ دوسری منزل ڈاکٹروں کے بیٹھنے کے کمروں اور لیبارٹری وغیرہ پر مشتمل ہوگی۔ اس نے دو بڑے ہال نما کمرے بیمار بچوں اور عورتوں کے لیے مخصوص کیے ہیں۔ تقریب میں شہر کے معززین، روساء اور اعلیٰ حکام، تاجر اور صنعت کار شریک تھے جنھوں نے چوہدری دلاور کے جذبات کو خراج تحسین پیش کیا اور انھیں نادار لوگوں کو جدید طبی سہولتوں کی فراہمی کے نیک ارادے پر مبارک باد دی۔ جائے تقریب کے مطابق چوہدری دلاور اس اسپتال کو اپنے مرحوم دوست کی یاد میں "وزیر اسپتال" کا نام دینے کا فیصلہ بھی کر چکے ہیں۔"

میرے وجود کے اندر غصے کا آتش فشاں کھولنے لگا۔ میں نے اخبار جھٹک دیا اور کھڑا ہوگیا۔ میرا خون میرے جسم میں تیزاب بن گیا اور انتقام کی آگ مجھے یوں جھلسانے لگی کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ ہم آرام سے کو بھی اور اس کے مشن کو بھی، اپنے سب عظیم مقاصد کو، ان سب نقصانات کو جو ہم نے اٹھائے تھے اور میری تو لا برابر... دوستوں نے برداشت کیے تھے، اپنی کامیابی کو، وقت اور حالات کے تقاضوں کو، یہاں تک کہ رشتوں کی حرمت کو اور ابد کی محبت کو۔ ایک آرزو تھی جس نے مجھے پوری طرح مغلوب کرلیا۔ یہ عقل و ہوش کی بات ہی نہ تھی۔ یہ سودا لئے سر تھا جس نے مجھے پاگل کر دیا۔

"میں اس کتے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے یکلخت چیخ کر کہا۔ "وہ جہاں بھی ملے گا میں اسے مار ڈالوں گا۔"

اس سے پہلے کہ کوئی مجھے روک سکتا، میں بیڈ کے نیچے گھس گیا جہاں اسٹین گن سمیت ہر قسم کا اسلحہ موجود تھا۔

"سکندر... پاگل مت بنو..." محسن نے مجھے پکڑ لیا۔

"بس اب مجھے مت روکو محسن۔ مجھے اسی پاگل پن کی ضرورت ہے۔" میں نے محسن کو ایک طرف جھٹک دیا۔ "یہ عقل سے کام لینے کا ہی نتیجہ ہے کہ آج تک وہ زندہ ہے۔"

"یہ سب کرنا تھا تو..." محسن پھر اٹھ کے آگے آگیا۔

"ہاں... مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔" میں نے چلا کے کہا اور کپڑوں میں لپٹی ہوئی اسٹین گن نکال لی۔ "اب میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ مجھے کہیں نہ کہیں تو ملے گا۔ میں اس کو چھلنی کردوں گا۔ بنائے وہ مخیر، محب وطن اور انسان دوست اور اخلاق پرست سیاسی جماعت... اس سے پہلے میں..."

محسن نے مجھے پھر پکڑ لیا... وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ "ایسا مت کرو سکن..."

"نہیں محسن... اب ایسا ہی ہوگا... یہ کھیل ختم... زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اور ایک ہی بار جا سکتی ہے۔ وہ خنزیر کتوں کی طرح میرے باپ کو مار چکے ہیں۔ اب وہ میرے پیچھے ہیں، جان لینا چاہتے ہیں... ہم سب بھاگتے پھر رہے ہیں..." میں نے خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔

"یہ غلط ہے... یہ غلط ہے سکندر... ہم اس سے نفرت کرتے ہیں۔" محسن نے مجھے جھنجوڑ کر کہا۔ "ہمارا مقصد محض یہ ہوتا کہ ہم کو اس کی جان لینی ہوتی تو ہم بہت پہلے ایسا کرسکتے تھے۔"

"مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا محسن..." میں نے محسن کو جھٹک کر ایک طرف دھکیل دیا۔ "جو کچھ ہم نے کیا غلط تھا۔ اس سے وہ رکا نہیں صرف ہمارا نقصان ہوا۔ آئندہ بھی صرف ہمارا نقصان ہوگا۔ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے... کبھی اس کا راستہ نہیں روک سکیں گے۔ وہ ترقی کرتا جائے گا۔ اس کا کاروبار بڑھتا جائے گا۔ وہ زیادہ دولت مند ہوتا جائے گا اور زیادہ عزت دار بھی... تم نے دیکھا... اس شہر کے معززین، روساء اور اعلیٰ حکام اس کے ساتھ ہیں... تاجر اور صنعت کار اس کے ساتھ ہیں۔ اُسے خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔ ایک نیک کام پہ وہ خیراتی ادارے بنا رہا ہے... اسپتال بنا رہا ہے، اسی زمین پہ جو میری ہے اور کبھی دلاور کی نہیں ہوسکتی۔ مگر کیا قانون مجھے میرا حق دلا سکا۔ مجھے تو وہاں قبر کے لیے دو گز زمین تک نہیں ملے گی۔ وہاں اس وزیر خان کے نام پہ ایک خیراتی اسپتال قائم ہو رہا ہے جو خود بھی خیراتی اسپتالوں کے چکر لگاتے مر گیا تھا۔ اور یہ اسپتال کون قائم کر رہا ہے؟ وہ اس کا قاتل جو سب کے سامنے کہتا ہے کہ وہ وزیر خان کا دوست تھا اور کوئی اُسے جھٹلا نہیں سکتا... اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اب وہ سیاست کا ہتھیار اٹھا رہا ہے۔"

"سکندر... یہ سب ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "مگر جو تم کرنا چاہتے ہو وہ ٹھیک نہیں ہے... تم اسے قتل کرو گے۔ پھر کیا ہوگا؟ ہم سب کا کیا بنے گا؟ جو کیا ہم نے صرف اسی لیے ترک کر دیا تھا کہ بالآخر پھانسی گھر سے بری الذمہ ہو جائیں... دلاور کہاں جا کر... کیا تو اُسے دلاور کے کتوں کے پاس چھوڑ دے گا جو کہ وہ اس کی بوٹیاں نوچ کھائیں۔ اس کی ہڈیاں تک چبا لیں؟ ہم سب کی طرف دیکھو سکندر..."

میرا کانپتا ہوا جسم پرسکون ہونے لگا۔ میں نے اسٹین گن کو ڈھیلا کر لیا تھا جب محسن کی آواز میرے کانوں کے راستے میرے دل میں یوں اترنے لگی جیسے جلتے ہوئے انگاروں پہ بارش کی پھوار اترتی ہے۔

"خود کشی ہی ہوگی یہ..." کیتھرین یکلخت میرے سامنے آگئی۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"میری طرف دیکھو۔" کیتھرین نے روتے ہوئے کہا۔ "میں سب کچھ کھو چکی ہوں۔ میرا شوہر تم سے زیادہ بہادر تھا... وہ ایک شیر تھا جسے بازاری کتوں نے مار دیا۔ مگر تم نے دیکھا کہ میں زندہ رہی اور میں نے دیکھا کہ اس کی موت بھی مجھ سے نہیں چھین سکی۔ اس لیے کہ جب میں مایوس تھی اور ہمت ہار چکی تھی تو خدا نے مجھے ایک بیٹا دے دیا۔ سرام و اولاد کو ایک بیٹے کی بہت آرزو تھی۔ وہ کہتا تھا کہ بیٹا پیدا ہوگا تو میں اسے پروفیسر بناؤں گا۔ میں خود نہیں پڑھ سکا مگر بیٹا پڑھے گا۔ اس کے پڑھائے ہوئے پروفیسر ہوں گے، ڈاکٹر اور ادیب ہوں گے۔ ایک ظالم کا بیٹا علم کی روشنی پھیلائے گا۔ اس سب کو جو کوئی نہ سمجھتے تھے مگر نہیں رہے... کاش وہ آج زندہ ہوتا تو دیکھتا کہ خدا نے اسے کیسا بیٹا دیا ہے... پڑھا لکھا جوان بیٹا... وہ اتنا ہی فخر کرتا جتنا میں تم پر کرتی ہوں... تم حق و صداقت کے علمبردار تھے، انصاف کی آواز تھے اور ظلم کے خلاف دیوار تھے۔ پھر تم نے قتل کرنے کا فیصلہ کیوں کر لیا ہے مائی سن؟"

اسٹین گن میرے ہاتھ سے گر گئی۔ میں نے زار و قطار روتی ہوئی کیتھرین کو عین اس وقت سنبھال لیا جب وہ گرنے ہی والی تھی۔ میں نے اسے آہستہ سے اٹھا کے بستر پہ لٹا دیا۔ "تم ہم سب کو چھوڑ کے مرنے جا رہے ہو؟"

"اس کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں آنٹی۔" محسن نے تلخی سے کہا۔ "یہ صرف اپنے باپ کے بارے میں سوچ رہا ہے۔"

"کیا یہ ٹھیک ہے سکندر؟" کیتھرین نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم محسن کو اپنا بھائی نہیں سمجھتے؟ جولی اور شعلہ کو بہن نہیں؟... صرف اس لیے کہ تمہارے اور ان سب کے درمیان خون کا رشتہ نہیں ہے؟"

"ایسا نہیں ہے آنٹی۔" میں نے ندامت سے کہا۔ "یہ رشتے تو خون کے رشتوں سے زیادہ پائیدار ہیں... مگر..."

"مگر میں وہی کروں گا جو میرا دل چاہے گا... کسی کی پروا کیے بغیر۔" غالب نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ اب تک چپ بیٹھا تھا۔

میں نیچے بیٹھ گیا اور میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ میں کیا کروں آخر... میرے اعصاب بھی فولاد کے بنے ہوئے نہیں ہیں۔ کوئی ایسی بات سنتا ہوں تو مجھ پہ پاگل پن سوار ہو جاتا ہے۔

میں نے جولی کو دیکھا جو دروازے میں ساکت و صامت کھڑی ہوئی تھی اور اس کی خاموش آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ آگے آئی اور اس نے فرش پہ پڑی ہوئی اسٹین گن اٹھا کے دوبارہ کپڑے میں لپیٹ دیا اور بیڈ کے نیچے ڈال دیا۔

"آئی... ایم سوری آنٹی۔" میں نے کیتھرین سے کہا۔ "میں سب کے ساتھ ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔"

"سکندر... مائی سن... یہ تمہاری اپنی فیملی ہے۔" کیتھرین نے کہا۔ "اگر تمہاری اپنی ماں ہوتی تو کیا تم اس کی بات نہ مانتے؟ تمہارے بہن بھائی زندہ ہوتے تو تم ان کا خیال نہ کرتے... دیکھو خدا نے تمہیں نعمتیں بھی... سب رشتے دے دیے ہیں اور تم کو ان کی قدر نہیں... اگر ہم ساتھ ہیں تو ایک خاندان ہیں ورنہ لاوارث... کیا تم ان رشتوں کو مٹتے ہو مگر بچاتے نہیں؟..."

"میں... شرمندہ ہوں..." میں نے کہا۔ "آئندہ میں سب کے ساتھ وہی کروں گا جو سب چاہیں گے... یہ بات ہی ایسی تھی کہ میں اشتعال میں آگیا۔ تم تو جانتی ہو آنٹی کہ میرے والد کے ساتھ کیا ظلم ہوا تھا۔ اس کے پاس لاکھوں کی دولت تھی مگر وہ زندگی کے آخری دنوں میں کس طرح عذاب جھیلتا ہوا دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کو سرکاری اسپتال کی دوا تک نصیب نہ ہوئی۔"

"وہ سب میں جانتی ہوں۔ خدا پہ بھروسا رکھو... ایک دن انصاف کا ظہور آئے گا۔" کیتھرین نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم چلتے ہیں۔" محسن نے اچانک کہا۔ "جا کے دیکھتے ہیں کہ یہ معاملہ کیا ہے۔"

"کون سا معاملہ؟" غالب نے کہا۔ "دلاور کے سیاست میں حصہ لینے کا؟"

"نہیں... ذرا ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس تک جاتے ہیں یہ دیکھنے کے لیے کہ کارخانے کی جگہ عمارت کھڑی کرنے کا سلسلہ کیسے شروع ہوگیا اچانک۔" محسن نے کہا اور مجھے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔

"میرا خیال ہے تم دونوں کچھ بھول کے باہر جا رہے ہو۔" کیتھرین تاکید سے بولی۔ "تم کچھ کرنا چاہتے ہو؟"

"آپ کی قسم آنٹی... میں کچھ نہیں کروں گا... اور سکندر کو بھی نہیں کرنے دوں گا۔" محسن نے کہا۔ "بس وہاں تک جا کے لوٹ آئیں گے۔"

"آخر کیوں... کیا دیکھنا ہے وہاں جا کے...؟"

"یہی کہ کارخانہ قائم ہے یا عمارت کی بنیادیں کھودی جا رہی ہیں۔" محسن بولا اور مجھے گھسیٹ کر باہر لے گیا۔

"دیکھو احتیاط سے جانا۔" کیتھرین نے چلا کے کہا۔ "کسی مصیبت میں مت پڑ جانا۔"

باہر آنے کے بعد محسن نے کہا۔ "یہ خبر تو شکور نے بھی دیکھی ہوگی۔"

"ہاں... وہ تو اخبار کا کیڑا ہے۔"

"اس سے پوچھتے ہیں کہ یہ سب کیسے ہوگیا۔" محسن نے کہا۔

"میں پہلے جائے واردات کا معائنہ کروں گا۔" میں نے کہا۔

"یار کہیں یہ خبر جعلی نہ ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ صرف ہمیں متوجہ کرنے کے لیے لگوائی گئی ہو۔" محسن نے کہا۔ "کوئی نیا جال نہ ہو کہ ہم وہاں جائیں اور گرفتار ہو جائیں۔"

"کیا اخبار نویس اتنے غیر ذمہ دار لوگ ہوتے ہیں؟"

"بیشتر نہیں ہوتے۔ چھاپنے سے پہلے خبر کی تصدیق کرتے ہیں لیکن بعض نام نہاد صحافی سب کچھ کرسکتے ہیں۔" محسن بولا۔

www.paksociety.com

"کیونکہ نہ ان کا کوئی ضمیر ہوتا ہے نہ اصول۔ ان کا مشن صحافت نہیں تجارت ہوتا ہے۔ اگر ان کا سودا ہو جائے تو وہ اپنا قلم بیچ دیتے ہیں۔"

"پھر بھی… اس خبر میں معززین، اُدبا، شعرا اور تاجر و صنعت کار سب کی شرکت کا ذکر ہے۔" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن نام کسی کا نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔ "کہ فلاں فلاں حضرات اور خواتین شریک تھے… یہ ایک بے معنی سا جملہ ہے۔ چار لوفر لپاڑیے اور چار بدمعاش خود کو معززین شمار کر سکتے ہیں، چار ریڑھی پر سبزی بیچنے والے ہوں اور چار ریڑھیاں چلانے والے تو تاجر اور صنعت کار ہو گئے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "یہاں سب ہی خود کو معزز قرار دیتے ہیں… دکاندار اپنے آپ کو تاجر کہتا ہے اور جس کی ایک کھڈی ہو وہ صنعت کا مالک کہلانا چاہتا ہے۔"

"اسی سے تو مجھے شک ہوتا ہے۔" محسن نے کہا۔

"ایک چال اور بھی ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"کل اس کی تردید آ جائے گی۔" میں نے کہا۔

"ایسا ہوتا رہتا ہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔ "آج میں کسی ذریعے سے بیان چھپوا دوں کہ میں نے صرف لنگوٹ باندھ کے ننگے پاؤں اور خالی ہاتھ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو بڑی سنسنی پھیلے گی۔ وقتی اور سستی شہرت حاصل ہو گی اور بے وقوف جو کہ ہمیشہ اکثریت میں ہوتے ہیں وہ کہیں گے کہ بھئی واہ… بے تا شیر وا پتر… تردید تو بعد میں کسی بھی وقت کی جا سکتی ہے۔"

"بیان چھپوانے میں کیا ہے۔ تو میری طرف سے چھپوا دے کہ میں درحقیقت قلم اسٹار زیبا کا بھی شوہر ہوں۔ تو پریشانی ہو گی زیبا کے لیے… وہ خود تردید کرتی پھرے گی اور اس کے پرستار خنجر کف مجھے قتل کرنے کے لیے تلاش کرتے رہیں گے۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے مجھے یہ خبر جھوٹ لگتی ہے۔ آخر ایک ہی اخبار نے یہ خبر کیوں دی؟" محسن بولا۔

"ہاں… اس قسم کی تقریب میں تو سب اخباری نمائندے ہوتے۔"

"ہمارے دوست بھی ہمیں بتاتے کہ چوہدری ولدار کیا کر رہا ہے یا کیا کرنے والا ہے… انھیں تو پہلے ہی معلوم ہو جاتا۔" محسن نے کہا۔

"سچ کہا تو نے… ہماری پریس کانفرنس میں آنے والے سب ہی مشہور صحافی ہیں۔ وہ ہمارے اور ولدار کے تعلق کو بھی جانتے ہیں اور اس تعلق کے پس منظر کو بھی سمجھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ ضرور اس بات کا ذکر کرتے۔"

"پھر کیا خیال ہے… نہ جائیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں… چال چلا کے ہمیں دھوکا کیا ہے تو ہمیں ایسی بے مروتی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔" محسن مسکرایا۔

"ہاں ورنہ ولدار کو مایوسی ہو گی۔" میں نے جواب دیا۔

"ہم اسے مایوس نہیں کریں گے۔ ہم اسے یہ بتانے ضرور جائیں گے کہ ہم آ گئے ہیں لیکن گرفتار ہونے کے لیے نہیں۔" محسن بولا۔ "اس کے لیے ضروری ہے کہ چوہدری صاحب کو پتا نہ چلے کہ ہم آ گئے اور کب آ گئے ہیں۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "میرا بھی ان سے ملاقات کو جی چاہتا ہے۔"

"گزشتہ چند دنوں میں ہم بہت مصروف رہے ہیں۔" محسن کہتا رہا۔ "اور انھی مصروفیات کے باعث مشہور بھی ہو گئے ہیں۔ یہ خطرہ ہو چکا ہے کہ اب ہمیں پہچاننے والے آسانی سے پہچان جاتے ہیں۔"

"اور پہچاننے والے جتنے زیادہ ہوں تو یہ کوئی اچھی بات نہیں۔"

"ہمارے مشن کی راہ میں رکاوٹ ہے۔" محسن بولا۔

"پہچاننے والوں میں سب دوست نہیں ہوں گے۔ زیادہ دوست ہوں گے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سو میں ایک دشمن ہو یا ہزار میں ایک۔ جتنا فائدہ ننانوے یا نو سو ننانوے دوستوں کی حمایت سے ہو گا، وہ ایک دشمن کے ہاتھوں نقصان بن جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے پھر گمنام ہو جانا چاہیے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ہم چہرے بدل جائیں۔" محسن نے کہا۔ "یہ بات یقینی ہے کہ شکاری ہمیں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ دشمنی اور نفرت کے سخت شدید اور خطرناک جذبے کے ساتھ۔"

"ویسے بھی ہمارے مشن کا اگلا مرحلہ شروع ہونے والا ہے جس میں ہمارے لیے خاموشی اور رازداری سے ہر قدم اٹھانا ضروری ہو گا۔ جب طبیعت ہم نے اب تک حاصل کی ہے وہ ہمارے کام آئے گی۔ جب ضرورت پڑے گی اور ہم محسوس کریں گے کہ ہمارے لیے اپنی شناخت ظاہر کر دینے میں کوئی خطرے کی بات نہیں تو ہم خود بتا دیں گے کہ ہم کون ہیں۔ ورنہ کسی کو شک بھی نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔

اس مسئلے پر ہمارے درمیان مکمل اتفاق رائے تھا چنانچہ ہم نے گھر سے نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ہم نے کیتھرین کو سامان کی فہرست کی ایک فہرست دے کر بازار بھیجا۔ اس کے واپس آنے تک ہم نے ایک دوسرے کی صورت بدل ڈالی۔ ہم لوگ جنگلات پر آرٹسٹ ہی نہیں وہ تمام لوازمات پیش کیے تھے جن کی افادیت مسلم تھی۔ ایک وگ میں نے دوسری محسن نے اپنے سر پر فٹ کی۔ یہ بہت اعلیٰ قسم کی وگ تھی جس کو پہچاننا بھی مشکل کام تھا۔ وگ لگانے کے بعد ہمارے بالوں کی جگہ سر پر جو بال نظر آنے لگے وہ سخت گھنگریالے ہوتے تھے۔ جیسے کہ افریقہ کے حبشی نسل سے تعلق رکھنے والی اقوام کے ہوتے ہیں یا ہمارے ملک میں مکران کے علاقے میں نظر آتے ہیں۔

ہم نے سیاہی مائل کر کے چہرہ، گردن اور ہاتھوں کی جلد کو بڑھیا کی پشت سے کالا کیا تاکہ ہمارا سیاہ رنگ بالکل قدرتی لگے۔ جو ہی مضحکہ خیز صورت دیکھ کر بہت ہنسی مگر اس نے ہماری ذہنی حالت کی غائب ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے تبدیلی کے اس عمل کو دیکھا اور ہمیں اپنے مشوروں سے بھی نوازتا رہا۔

کیتھرین تقریباً دو گھنٹے بعد واپس آئی۔ اس نے بہت ہوشیاری سے تمام اسباب کا انتخاب کیا تھا۔ میرے لیے ایک تنگ موری والی پرانی پتلون تھی جس کا نیلا رنگ جگہ جگہ سے اُڑا ہوا تھا اور اس کے گھٹنوں پر چمڑے کے گول ٹکڑوں کے پیوند تھے۔ یہ نیلی پتلون تھی مگر اتنی موٹی تھی کہ کینوس کا گمان ہوتا تھا۔ محسن کی پتلون ٹوئیڈ کی قسم کے کپڑے کی تھی جس پر بڑے بڑے سرخ لال رنگ کے چارخانے بنے ہوئے تھے۔ میری قمیص زرد تھی اور اس پر سامنے کسی فٹ بال ٹیم یا کسی ایشین کا بہت بڑا مونوگرام چھپا ہوا تھا۔ محسن کے لیے وہ سرخ رنگ کی نیلی نما جرسی لائی تھی جس پر ایک نیم عریاں عورت کے رقص کا پوز سفید رنگ میں ابھرا ہوا لگتا تھا۔ اس کے اوپر پہننے کے لیے ہم دونوں کی جیکٹ تھی۔ میری سرخ رنگ کی اور محسن کی سیاہ رنگ کی۔ عام حالات میں ہم انھیں پہننے سے کچھ نہ پہننے کو ترجیح دیتے مگر اس وقت یہی لباس ہمیں سب کی نظر میں نمایاں بھی کر سکتا تھا اور سب کی نظروں سے چھپا کے بھی رکھ سکتا تھا۔ کوئی بھی ہمیں دیکھتا تو حیران ہو کے مسکراتا یا ہنستا۔ ہمیں کارٹون سمجھتا یا فیرٹ سمجھتا لیکن کسی کا ذہن سکندر بخت اور محسن کی طرف نہ جاتا۔ ظاہر ہے یہ تبدیلی اتنی بڑی تھی کہ ولدار جیسے چالاک آدمی کے ذہن کو بھی گمراہ کر سکتی تھی۔ اس لباس اور سیاہ رنگ کے ساتھ ہم نے سنہری فریم اور گہرے رنگ کے شیشوں والی عینک لگائی اور وہ کیپ بھی لگا لی جو کیتھرین خرید کے لائی تھی۔

"تم اب خود کو کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔" کیتھرین نے ہمیں تعریفی نظروں سے دیکھا۔ "کسی کا باپ بھی تم کو نہیں پہچان سکتا۔"

"خود ان کا باپ ہوتا تو نہ پہچانتا۔" غالب نے کہا۔

"اب یہ طے کر لینا چاہیے کہ ہم کیا ہیں۔" میں نے کہا۔

"تاکہ کسی موقع پر کنفیوژن نہ ہو۔" محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔

"تم دونوں یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ تم یورپ کے کسی سرکس میں جوکر تھے۔" غالب نے کہا۔ "کرتب بھی دکھا سکتے ہو۔"

"کرتب تو ہم ہر وقت ہر جگہ دکھا سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہم جوکر ہی کہلائیں۔ ہم کسی افریقی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر کہلا سکتے ہیں۔ یہ پروفیسر انگیٹ تھا۔ سطح سمندر کے نیچے آثار قدیمہ کی

علمِ ہپناٹزم پر ایک نئی کتاب

جسے
ایک ماہر ہپناٹزم نے تحریر کیا ہے

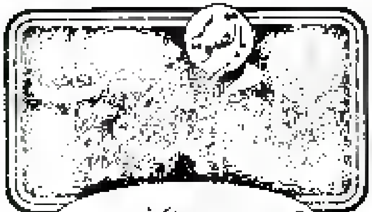

قیمت ۴۰ روپے۔ ڈاک خرچ ۱۶ روپے

اردو زبان کی پہلی کتاب جس میں اس عمل کی حقیقی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔

- ہپناٹزم کے بارے میں آج تک کی تمام تحقیقات کا نچوڑ
- جدید طریقے اور مشقیں
- ہپناٹزم کی مشقوں کے لیے مکمل لائحہ عمل اور پورا پروگرام
- بے شمار سوالات کے جواب
- ہپناٹزم کے موضوع پر ایک مکمل اور مستند کتاب جس میں مصنف کے ذاتی تجربے بھی شامل ہیں۔

ارتکاز توجہ کے لیے سیاہ دائرہ اور مشقوں کو سمجھنے کے لیے حقیقی تصاویر۔

ملنے کا پتہ

مجلس نفسیات پوسٹ بکس ۱۹۱۳۴ کراچی

www.paksociety.com

تلاش کے ماہر، اور ڈاکٹر واٹسن جیسا تک سالانی اخلاق پہ جا کے دباؤ اور جرائم کش ادویات کے اثرات کا مطالعہ کرنے والے یہاں سے اس قسم کے لوگ آتے رہتے ہیں۔"

"کیوں ایسے مشکل مضمون تلاش کرتے ہو؟" غالب نے کہا۔ "سیدھے سیدھے غیر ملکی صحافی بن جاؤ۔ فرنچ تم دونوں کو آتی ہے، اس طرح تم ہر جگہ پہنچ سکو گے۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "یہ ڈیڑھ ماہ تک کا غالب باتستیہ کی کتاب ہے۔" میں نے کہا۔

"غیر ملکی صحافیوں کے پاس ایکریڈیشن کارڈ ہوتے ہیں، یا ان کے اداروں کے جاری کردہ پاس۔" محسن بولا۔

"اگر ہم اپنا اعتماد بحال رکھیں تو مجھے یقین ہے بیشتر لوگ چکر میں آ جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "بعد میں ہم کوشش کریں گے کہ جعلی شناختی دستاویزات بھی بنالیں۔"

"مشاہدے کا چی میں یہ کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔"

"ہاں۔ غیر ملکی پاسپورٹ مل جاتے ہیں مگر آسانی سے نہیں۔ ان کو زیادہ تفصیل سے کوئی چیک بھی نہیں کرتا۔" محسن بولا۔ "شناختی کارڈ وغیرہ کا مسئلہ آنا مشکل نہیں۔ فی الحال تو ہمیں صرف اپنے چوہدری صاحب کے پاس ہی جانا ہے۔ وہ کچھ نہیں پوچھے گا۔ اگر یہ خبر سچ ہوئی تو بہت خوش ہو کے انٹرویو دے گا۔"

"لیکن جھوٹ ہوئی تو فوراً غصے میں مبتلا ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"ہم اس کے غصے کا علاج ساتھ رکھیں گے۔" محسن نے کہا۔

ہم تیسرے پہر کے قریب نکلے۔ حلیے سے ہم کتنے عجیب لگتے ہیں اس کا اندازہ ہمیں سڑک پہ آتے ہی ہو گیا۔ لوگ ہمیں مڑ مڑ کر دیکھتے تھے اور زیر لب مسکراتے تھے۔ ایک جگہ دو ریڑھی والوں نے بہ آواز بلند اظہار خیال بھی کیا۔

"اوئے... ایہہ مخلوق کتھوں لبھی اے؟"

دوسرا قہقہہ مار کے بولا۔ "پچھے کے ویکھ... کیمرے چک کے توں لگدے ہوئے نے باندر دے پتر..."

"اک تے تیرا ماما لگدا اے..."

"وہ جا تیرا پیو لگے..." دوسرے نے فوراً جواب دیا۔

ان کو یقین تھا کہ ہم غیر ملکی ہیں جو پنجابی کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے اور ہم نے بھی تو شدید ہی سے دانت نکال کے یوں ہاتھ ہلائے جیسے ہم ان تعریفی کلمات سے بے حد خوش ہوئے ہوں۔ پھر ہم نے ایک شخص سے جو کار میں بیٹھا تھا فرانسیسی میں پوچھا کہ اس کے اصل والد کون تھے یا نہیں... اور وہ خود آدمی سے زیادہ شرم کیوں نظر آتا ہے۔

محسن نے مسکرا کے ہم سے ہاتھ ملایا۔ "میں صرف انگریزی جانتا ہوں۔"

"انگلش؟" میں نے مسرت سے کہا اور اس کو گلے لگایا۔ "ہم بھی انگلش جانتے ہیں۔"

"میری ٹوٹی پھوٹی انگریزی پہ مت جانا۔ میں آپ لوگوں کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ آپ لوگ میرے خیال میں صحافی ہیں؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہم... صحافی..."

"صحافی... آپ لوگ صحافی ہیں؟" وہ دم بخود رہ گیا۔ "یہاں کس سلسلے میں آئے ہیں؟"

میں نے اپنا سر کھجایا اور فرنچ میں کہا۔ "ہم جھک مارنے آئے ہیں۔"

اس نے نامعلوم حالت بنا کے محسن کو دیکھا۔ "میں نہیں سمجھا۔"

پھر ہم نے بہت الجھی ہوئی اور بہت بری انگریزی میں اسے واضح کیا کہ ہمیں کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ بالآخر وہ سمجھ گیا۔ ہم ایک اخبار کی خبر کا حوالہ دے رہے تھے۔ ہم نے وہ اخبار اس کے سامنے رکھ دیا جس میں دلاور کے متعلق خبر تھی۔ خبر کے گرد ہم نے حاشیہ سا بنا دیا۔

اس نے ہمیں اپنی کار میں شاہدرہ پہنچا دیا اور ہمیں اس چوک پر اتار دیا جہاں ایم ڈبلیو آئی انجینئرنگ کمپلیکس تھا۔ وہ اچھے پاکستانی کی حیثیت سے ہماری مدد کر کے بہت مطمئن تھا۔ جانے سے پہلے اس نے ہمیں اپنا کارڈ بھی دیا جس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ انجینئر تھا۔ ہم جھک کر ہاتھ ملاتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کر رہے تھے جب ہمارے قریب سے چوہدری دلاور کی گاڑی گزری۔ پیچھے کی سیٹ پہ بیٹھے ہوئے دلاور نے غور سے ہم تینوں کو دیکھا۔ پھر اس کی گاڑی سڑک سے بائیں جانب فیکٹری کے گیٹ تک جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔

ہم دونوں نے گیٹ تک واک شروع کی۔ دلاور نے شاید ہم دونوں کو ریئر ویو مرر میں دیکھ لیا تھا یا اسے ڈرائیور نے بتا دیا کہ دونوں کالے غیر ملکی ادھر آ رہے ہیں۔ اس کی گاڑی گیٹ سے گزر کے اندر نہیں گئی۔ وہ باہر ہی اتر گیا اور پلٹ کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔

"ہائے... دلاور؟" میں نے قریب جا کے ہاتھ بڑھایا اور آواز بدل کے کہا۔ چوہدری دلاور نے اقرار میں سر ہلایا۔

"ہو آر یو؟" دلاور نے محسن سے بھی ہاتھ ملایا۔ اس کی صورت پہ حیرانی کے ساتھ تجسس، تصور، دلچسپی اور شک کے جذبات کا ملا جلا عکس نظر آ رہا تھا۔

"می... پیئر استوف۔" میں نے کہا۔ "کار میں یو فرنٹ واقف ہو؟ مارسیلز... ایفل ٹاور... پیرس... قاہرہ... کراچی۔"

"می... جان گارنٹ... لیور پول... لاہور... لندن... آئی... بابا... بنکاک... فار ایسٹ انویسٹیگیشن۔"

"آپ لوگ جرنلسٹ ہیں؟" دلاور نے سنجیدہ اور محتاط لہجے میں کہا۔ جواب میں میں اور محسن نے فرفر بولنا شروع کیا۔ پھر شائستگی سے چند جملے بولے جو سب فرنچ تھے۔ دلاور پریشان ہو گیا۔ اس نے کبھی ان زبانوں کا نام نہیں سنا ہوگا جن کے ہم نمائندے بن گئے تھے۔ دنیا کے کس حصے کے کس شہر سے کس زبان کے کتنے اخبارات اور رسائل نکلتے ہیں اور ان کے نمائندے کہاں کہاں ملتے ہیں یہ خود پاکستان کے اپنے صحافی بھی بعض اوقات نہیں جانتے۔

"میں یہ فرنچ نہیں سمجھتا۔" دلاور نے کہا۔ "کیا آپ لوگ بالکل انگریزی نہیں جانتے؟"

"یس... لٹل انگلش۔" میں نے کہا۔ عمداً میں نے ٹوٹی اور غلط انگریزی بولی تھی تاکہ کوئی فرانسیسی یا اطالوی بھی نہ سمجھ سکتا۔

"می ایسیک انگلش۔" محسن نے کہا۔

"اچھا تو آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" وہ بولا۔

"انٹرویو۔" میں نے کہا۔

"یس... انٹرویو... تھینکس..." محسن نے سر ہلا کے کہا۔ "فوٹو گراف۔"

"مگر کیوں؟" وہ بولا۔ "خیر آپ لوگ اندر آئیں۔ یہاں بات کرنے کی کوئی جگہ نہیں... سادہ انٹرویو وغیرہ کی تو میں سوچوں گا لیکن میں اتنا بد اخلاق بہرحال نہیں ہوں کہ آپ لوگوں کو کھڑا رکھوں۔ یہاں تک آئے ہیں تو میرے ساتھ بیٹھ کے ایک کپ چائے یا کافی ضرور پئیں۔"

"یہ کتے کا بچہ بڑی روانی سے انگریزی بولتا ہے۔" میں نے محسن سے فرنچ میں کہا اور یوں ظاہر کرنے لگا جیسے میں نے دلاور کی تعریف کی ہے۔

"غالباً ہو گا کسی ہیرو کا والد۔" محسن نے کہا اور سر کو خم کر کے مسکرایا۔ دلاور نے اسے شکریہ سمجھ کے قبول کیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔

گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا اور میرا اثر بہت شدید تھا مگر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آگے ہونے کی وجہ سے دلاور نے کچھ نہیں دیکھا۔

لہٰذا جہاں پہلے ایم ڈبلیو آئی انجینئرنگ کمپلیکس کے گودام اور شیڈ اور پولٹری یونٹ تھے وہاں اب کچھ نہیں تھا۔ میں نے ایک بالکل بدلا ہوا منظر دیکھا اور ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے یہ سراب کے سوا کچھ نہیں یا پھر میں غلط جگہ آ گیا ہوں۔ جب یہاں عمارات تھیں وہاں اب بہت چوڑی ہوئی اور پھیلی ہوئی گھاس تھی۔ اب خالی پلاٹ میں کہیں کہیں پرانے آثار ملبے کی صورت میں نظر آتے تھے۔ سامنے والے حصے کو کھودا جا رہا تھا اور بنیادوں کا پورا نقشہ دیکھ کر زیر تعمیر ہونے والی عمارت کا تصور کیا جا سکتا تھا۔

اخبار میں جو کچھ ہم نے پڑھا تھا وہ غلط نہیں تھا اور اس سے اندازہ ہوتا تھا شاید یہ تھا کہ میرے اور محسن کے یقین کی بنیادیں تک مسمار ہو گئیں۔ وہاں دلاور بلڈنگ کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا تھا اور یہ بات درست تھی تو پھر وزیر اسپتال کے قیام کی بات بھی درست تھی اور شاید یہ بھی غلط نہ تھا کہ اس تقریب میں معززین، رؤسا، تاجر اور صنعت کار واقعی شریک ہوئے تھے۔ ہم نے اسے جھوٹ یعنی فلق، ڈھونگ اور فریب سمجھ کے تھوڑے افسانوں سے گھڑ کے پیش کو ثابت کر دیا تھا۔ دلاور نے جانے یہ کوئی چال نہیں چلی تھی۔ اس نے ہمیں ہتھوڑا کرنے اور زیر دام لانے کے لیے یہ خبر کسی صحافی کو خرید کے نہیں لگوائی تھی۔ وہ بہت بڑا کھلاڑی تھا اور اس نے سیاست میں جو حصہ لینے کا فیصلہ کیا تھا تو یہ اس کی بہت بڑی چال تھی۔ وہ ہمارے خلاف سیاست کا جال بچھا رہا تھا۔ وہ اسلحے کی طاقت آزما چکا تھا۔ اب وہ سیاسی قوت حاصل کر کے ہمیں دوسری طرف سے محصور کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم دلاور کو سیاسی غدار یا ملک دشمن قرار دینے کے مشن میں کامیاب ہوں وہ سیاست کے پلیٹ فارم سے اپنے لیے محب الوطنی کی سند حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ وہ انسانیت کا خادم اور اخلاقیات کا علمبردار بن کے مشہور ہونے کی ٹھان چکا تھا تاکہ اس کے خلاف ہر سچ بھی مخالفانہ جھوٹ بن جائے اور وہ کہہ سکے کہ اس کے سیاسی مخالفین اس کی کردار کشی کے لیے جھوٹا پروپیگنڈا کر رہے ہیں اور اس کی شرافت کو بے بنیاد الزامات کا ہدف بنا کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ ہر ملک کی سیاست میں اپنے حریف کے خلاف جائز و ناجائز، اخلاقی و غیر اخلاقی ہر حربہ آزمانا بھی کھیل کا ایک حصہ ہے۔ اور کامیاب سیاستدان وہ ہے جو اپنے سیاسی مخالف کی کمزوری کو اپنی طاقت بنا لے اور عیب ثابت ہو جائے تو اس کا سر پاؤں سے کچل دے۔ دلاور نے اگر ہمارے خلاف سیاسی داؤ پیچ آزمانے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنی ساکھ کو مضبوط کرنے کے لیے سیاست کی بیساکھی استعمال کرنے کا سوچا تھا تو یہ اس کی فہم و فراست اور دور اندیشی کا ثبوت تھا۔

محسن کے خیالات بھی مجھ سے مختلف نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک سے حالات میں ہم دونوں کی سوچ کے دھارے اور جذبات کے ردعمل ایک سے ہو جاتے تھے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے اس کی صورت پہ اپنے جذبات کا عکس نظر آیا۔ میں نے پھر فرانسیسی میں کہا۔ "اب کیا خیال ہے؟"

"لعنت فریب کی کوئی حد بھی ہے یار۔" محسن نے کہا۔

دلاور نے پلٹ کے کہا۔ "دس وے پلیز۔"

میں اور محسن اسی آفس میں داخل ہو گئے جس میں پہلے بھی بارہا آ چکے تھے۔ کبھی سرکٹ کبھی جال کیف۔ کبھی چوہدری چیف اور کبھی جل جنگل بجاتے ہوئے۔ اور جیسے آتے تھے ویسے ہی گئے بھی تھے مگر آج سارا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ دلاور کے آفس کا فرنیچر

www.paksociety.com

وہی تھا مگر وہ بیانیے لوگ بھی بدل چکے تھے جن کو ہم پہچانتے تھے۔ فیکٹری نہیں رہی تھی تو کاریگر کیسے رہتے۔ باہر مزدور اور راج بھر کر بیٹھے تھے۔ اندر ملاور کے پلانے سیکرٹری کی جگہ ایک ہوشربا قسم کی سیکرٹری براجمان تھی۔

ملاور نے ہمیں اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

ہم نے فرنچ میں شکریہ ادا کیا پھر گویا شاہی اردو میں شکریہ ادا کیا اور ملاور کو مسکراتے دیکھا۔

"مس عاشی... پلیز اندر آجائیں۔" ملاور نے کہا۔

میں نے اور محسن نے سر ہلا کے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ لڑکی اور اس کا نام دونوں اچھے تھے۔ اس کا اندر آنا بھی اچھا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بھی اچھی تھی۔

"عاشی... یہ دونوں آلو کے پٹھے کہتے ہیں کہ یہ فرانسیسی اور اطالوی اخباری نمائندے ہیں۔" ملاور نے اردو میں کہا۔

"کافی۔" میں نے احمقوں کی طرح مسکرا کے کہا۔ محسن نے میری تائید کی۔

"ان کے لیے کافی منگوانے کے بعد یہاں بیٹھو۔" ملاور نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "ان سے تم کو ہی بات کرنی ہوگی۔ انگریزی تو یہ ایسے بولتے ہیں جیسے انگریز شوقیہ اردو بولتے ہیں۔"

میں خواہ مخواہ مسکراتا رہا لیکن میرے دل میں تشویش پیدا ہو چکی تھی کہ کیا یہ نازک اندام اور خوش خرام عاشی بھی فرنچ سمجھتی ہے۔ چند منٹ میں میرے اندیشے درست ہوگئے۔

"مس عاشی نے پنجاب یونیورسٹی سے فرانسیسی میں ڈگری لی ہے اور یہ فرنچ اسی طرح بولتی ہیں جیسے مادری زبان ہو۔" ملاور نے مس عاشی کے بیٹھنے کے بعد کہا۔

"ویری گڈ... ویری گڈ..." میں نے سر ہلایا اور محسن سے مخاطب ہو کے کہا۔ "لے بیٹا، سیر کو سوا سیر مل گئی۔ ترکی تمام شد۔"

"یار ابھی سے کیوں ڈر رہا ہے۔ تو دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔" محسن نے فرنچ میں جواب دیا۔ "اس خبیث کی باتوں پر مت جا۔ جیسے بھی انگریزی جاننی ہو... جیسے تیسے تو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ بلکہ دنیا بھر کے بچوں کا پتا نہیں ہوگا۔ ابھی عمر ہی کیا ہے اس کی۔"

"میں قطعاً نہیں ڈر رہا، اس سے اس خیال سے فکرمند ہوں کہ اس نے ملاور کے سوالات کا ترجمہ شروع کر دیا تو ہم کیا جواب دیں گے۔ ملاور کا خیال آدمی ہے جو سوال اس بھولی بھالی لڑکی کے دماغ میں نہیں آسکے گا وہ ملاور کے ذہن میں آسکتا ہے... وہ جرح کر سکتی ہے... وہ ملاور کی طرف سے۔"

"دیکھی جائے گی... ابھی تک تو ملاور کو شک نہیں ہے۔ اسے ہم مطمئن کر دیں گے۔" محسن نے کہا۔ ہم نے گفتگو میں ملاور کا نام نہیں لیا تھا بلکہ اس لفظ کا فرانسیسی متبادل استعمال کیا تھا جو معنی بہادر کے ہوتے ہیں۔

مس عاشی پانچ منٹ کے لیے باہر گئی اور پھر لوٹ کر ملاور کے داہنے ہاتھ کی جانب کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہم ملاور کے مقابل تھے لیکن میز اتنی پھیلی ہوئی تھی کہ ہمارے درمیان بڑا فاصلہ تھا اور شاید اسی لیے فاصلے پر عاشی بھی تھی ذہنی طور پر کہ اس کا نام عائشہ ہوگا۔

"عاشی... ان سے پوچھو کہ یہ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟ میرا انٹرویو کیوں لینا چاہتے ہیں؟" ملاور نے کہا۔

عاشی نے اس کا ترجمہ کیا تو اپنی فرنچ میں معذرت کا پول کھول دیا۔ اس نے فرنچ میں ڈگری ضرور لی ہوگی مگر جانے کو نہیں۔ ڈگری لینے والے دس سال انگلش کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھتے ہیں مگر اس کے باوجود انگریزی کا ایک جملہ بھی صحیح نہیں بولتے۔ مسلسل بات کرنی پڑے تو ان کا ذخیرہ الفاظ ڈکشنری ہی ختم ہو جاتی ہے۔ یہی حال مس عاشی کا بھی تھا۔ وہ درسی کتب والی فرنچ کے جملے بنا بنا کے ادا کر رہی تھی۔ درسی کتب کی زبان اور بولی جانے والی زبان میں اتنا فرق ہوتا ہے... شاعری کرنے والے ملتان جا کے وہاں کی بولی نہیں سمجھتے۔

"مسٹر ملاور آپ کے جواب کے منتظر ہیں..." عاشی نے...

"پیرا استفوف... " ترجمہ ... اور پھر ... کہا کہ تم سوال ... میں کچھ سمجھ نہیں...

میری بات نے عاشی کو نروس کر دیا کیونکہ ... وہ فرنچ بولی تھی جو بے حد عوامی تھی اور اس کی کتابی فرنچ سے بے حد مختلف تھی تاہم اس نے زیادہ محتاط الفاظ میں سوال دہرایا۔ دوسری بار اس کی فرنچ زیادہ فصیح ہوگئی۔

میں نے سر ہلایا اور محسن کی طرف دیکھا۔ "موسیو ... اس سوال کا بہتر جواب دے سکتے ہیں۔"

محسن نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔ جیب میں سے ایک سگریٹ نکالی جو خاصی ٹیڑھی اور کمر خمیدہ ہو گئی تھی اسے میز پر رکھ کے اور گھما پھرا کے سیدھا کیا اور ماچس نکالی۔ یہ انداز بالکل نشے ... سگریٹ استعمال کرنے والوں کا تھا۔ ملاور نے ناگواری سے یہ سب کچھ برداشت کیا۔

"دراصل... ہم بین الاقوامی ادارہ صحت کے مشرق وسطیٰ ... شعبہ ... کے پراجیکٹ پر ایک سروے کر رہے ہیں اور ... عوام کے لیے طبی سہولتوں کا فقدان ہے، وہاں حکومت کے ... سمجھنے والے ہر جیتے پراجیکٹ کی کامیابی کے تناسب کا ... کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم ان سب کی رائے بھی جاننا...

کہ ہم صحت کے مسائل میں دلچسپی رکھتے ہیں یا عملاً کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کل یہاں تھے اور ہمیں اپنے ایک ہم پیشہ ساتھی سے پریس اطلاع ملی تھی کہ آج کسی رفاہی اسپتال کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب ہے۔ ملاور یہ اسپتال ایک ایسا شخص تعمیر کر رہا ہے جو ذاتی حیثیت سے وابستہ تھا۔ زندگی شہرت کے عروج سے ہٹا تھا۔ ... سمجھتے تھے کہ اسے دیہی آبادی کی بہتری یا عوام سے زیادہ دلچسپی ہونی چاہیے۔ مگر اس نے خیراتی اسپتال بنانے کے لیے ایک ایسے شہر کو منتخب کیا جہاں پہلے ہی سرکاری اور نجی اسپتال بہت ہیں اور..."

مس عاشی کی زبان گم ہو گئی کیونکہ محسن نے رک رک کر انتہائی دقیق اور ناقابل فہم فرنچ میں بڑی ثقیل گفتگو کی تھی۔ شاید وہ خود بھی اس کے نصف کا صحیح مطلب سمجھی ہوگی۔ تاہم اس نے اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ایک دیہاتی بھی اگر شہر کے کسی عالم کے پیچھے پڑ جائے جو غالب کے لب و لہجے میں فارسی آمیز اردو بولتا ہو تب بھی دونوں ایک دوسرے کی بات تو سمجھ ہی لیتے ہیں۔ خواہ دیہاتی وزن یا بنگال کے کسی علاقے کی اردو بولے۔ عاشی نے محسن کی طویل تقریر ختم ہونے پر اطمینان کا سانس لیا اور پھر جتنا اسے یاد رہا تھا اتنا ملاور کو بتا دیا۔

"یہ لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ نے غریبی پر ہوسپٹل لاہور جیسے شہر میں قائم کرنے کا فیصلہ کیوں کیا جبکہ دیہات کو اس کی ضرورت زیادہ تھی۔" عاشی نے کہا۔

"دیہاتی ہو یہ بکواس کر رہا تھا۔ صرف اتنی سی بات تھی؟" ملاور حیران ہو کے بولا۔

"وہ... نہیں سر..." عاشی نے کہا۔ "یہ بتا رہا تھا کہ انہیں پریس کلب میں کسی نے کل شام کی تقریب کے متعلق بتایا تھا مگر یہ مصروفیت کے باعث آ نہیں سکے تھے اور یہ کہ ان کا مقصد اقوام متحدہ کے لیے ایک رپورٹ بنانا ہے۔"

ملاور نے سر ہلایا۔ "ان سے کہو کہ بہت جلد ہی دیہات کے لیے بھی موبائل میڈیکل یونٹس قائم کروں گا اور میرا ارادہ ہے کہ کئی ایمبولینس گاڑیاں ... کے ساتھ سامان، اسٹاف اور ادویات کے ساتھ گاؤں گاؤں جائیں گی۔ ہر گاڑی روزانہ کم سے کم سو مریض دیکھے گی اور ان گاڑیوں میں ہنگامی نوعیت کے معمولی آپریشن بھی ہو سکیں گے۔ اوسطاً ایک گاڑی دن بھر میں دس دیہات کا دورہ کرے گی۔"

میں نے اس جواب پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اصل اطمینان کی بات یہ تھی کہ محسن کی بات نے ملاور کو قائل کر لیا تھا اور اس کے ذہن میں شک کے بیج کو پھوٹنے نہیں دیا تھا ورنہ جواب سے پہلے وہ ہم سے شناخت مانگتا۔ اب اس کو یقین آچکا تھا کہ ہم وہی ہیں جو خود کو بتا رہے ہیں۔ ہم نے تقریباً ایک گھنٹے تک انٹرویو کا ڈرامہ کیا۔ میں نے ملاور کی کچھ تصاویر بنائیں۔ ہم نے سو فیصد غیر ملکی صحافیوں والی اداکاری کی اور ملاور کو مسکراتا ہوا دیکھتے رہے۔ وہ اس خیال سے خوش تھا کہ مقامی اخبار کی بات تو کم وقت میں ایک بین الاقوامی خبر کی بنیاد بن گئی۔ اس نے شہر میں ہماری موجودگی کو اپنی خوش قسمتی کی علامت سمجھا ہوگا کہ ہم نے جیسے ہی اسپتال کی تقریب کا ذکر سنا ویسے ہی انٹرویو لینے پہنچ گئے ورنہ کسی غیر ملکی اور بین الاقوامی سطح کے اخبار کو متوجہ کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا اور ان کے نمائندوں کو انٹرویو کے لیے بلانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"ہم کل شام تک اس انٹرویو کو ٹائپ کر لیں گے۔" میں نے عاشی کو مخاطب کیا۔ "اور قابل اشاعت مسودہ بنا کے مسٹر ملاور کے دستخط لینے کے لیے پھر آئیں گے۔"

عاشی نے ہماری بات اسے سمجھا دی۔

"ان سے کہو کہ اگر مصروف نہ ہوں تو ڈنر میرے ساتھ کریں۔" ملاور بولا۔

میں نے محسن کی طرف اور محسن نے میری طرف دیکھا۔ ہم کچھ دیر آپس میں مشورہ کرتے رہے پھر میں نے سر ہلا دیا۔

"یہ جانتے ہیں کہ یہ مشکل ہوگا لیکن ہم مسٹر ملاور کے لیے مشکل بھی برداشت کر لیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہم ہر مشکل کا سامنا کر سکتے ہیں۔"

"جیسے آج تک کرتے آئے ہیں۔" محسن بولا۔

"اور ان کو شکار کرتے تک یہ مشکوک کا سلسلہ جاری رہے گا۔" میں نے کہا۔ "اللہ ہماری مشکل آسان کرے گا۔"

"وہ رضا ہم نہیں اچھے یہ نہیں..."

"جی؟" عاشی نے گھبرا کے پوچھا۔ یہ سب گفتگو ہم نے بہت تیز تیز لہجے میں آواز کو دبا کے اور بگاڑ کے اس طرح کی تھی کہ عاشی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا لیکن ہم ایسے ہنستے رہے تھے جیسے کوئی بے تکلف دوستانہ مذاق کی بات ہے۔ "میں بھی نہیں۔"

"ہم ایک شرط پر آنے کا وعدہ کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کس شرط پر؟" ملاور نے عاشی سے ترجمہ سن کے کہا۔

"ہماری حسین میزبان بھی کھانے کی میز پر اسی طرح موجود ہوگی۔"

"بلکہ جانے دل کے زیادہ قریب رہے گی۔" محسن بولا۔

"اور طعام کے بعد جب تشنگی شراب سے اثر ثابت ہوگا..."

"تو اس کا نشہ شباب جانے سے ساتھ جائے گا۔" محسن بولا۔

"اور صبح ہونے تک..."

عاشی کا چہرہ شرم اور غصے سے لال ہوگیا۔ اس نے پنسل میز پر پٹخ دی۔

www.paksociety.com

"کیا بات ہے عاشی؟" دلاور نے کہا۔
"یہ صحافی..." اس نے بڑی مشکل سے کہا۔
"کیا کہہ رہے ہیں... کچھ پتا تو چلے؟" دلاور بولا۔
"یہ... یہ کہہ رہے ہیں... کہ ڈنر میں..."
"میں سمجھ گیا... تم کو بھی بلا رہے ہوں گے۔" دلاور ہنسنے لگا۔
"نہیں سر... یہ بہت ذلیل... شیطان قسم کے لوگ ہیں۔ مجھ سے کہہ رہے ہیں... کہ اس کے بعد... اس کے بعد ان کے ساتھ جاؤں۔" وہ بڑی مشکل سے بتا پا کے بولی۔
"ان کی تو عادت ہوتی ہے۔ لاہور کو بھی پیرس سمجھ لیا ہے تو ان کا قصور نہیں۔" دلاور نے کہا۔ "یہ اپنے ماحول کے عادی ہیں۔"
"میں بالکل نہیں آؤں گی سر۔" عاشی نے خفگی سے کہا۔
"اچھا اچھا... مت آنا... میں ان کو ٹال دوں گا۔" دلاور نے کہا۔ "ابھی تو کھسکو کر آؤں گی... بعد میں کوئی بہانہ کر دینا... میرا مطلب ہے تمھاری طرف سے میں کر دوں گا۔"
میں اور محسن ایک دوسرے کو احمقوں کی طرح دیکھتے رہے اور سر ہلا کے اظہارِ حیرت کرتے کہ ہمارے نزدیک تو کوئی معیوب بات نہیں تھی پھر یہ خوب صورت لڑکی اتنی خفا کیوں ہو رہی ہے۔ عاشی نے بادلِ ناخواستہ کہا کہ وہ آسکے گی لیکن اسے پہلے گھر جانا ہوگا تاکہ وہ لباس بدل سکے۔
"چلو میں تم کو راستے میں ڈراپ کر دوں گا۔" دلاور بولا۔
"تو کیا آپ یہاں سے سیدھے ہوٹل جائیں گے؟" عاشی نے کہا۔
"نہیں... سیدھا تو نہیں۔" دلاور بولا۔ "راستے میں ایک دو کام ہیں پہلے وہ نمٹاؤں گا۔ انھیں ساتھ لے کر چلوں گا۔ اس وقت تک کھانے کا تو ٹائم نہیں ہوگا۔ میں چاہتا ہوں دو چار مقامی صحافیوں کو بھی بلا لوں۔ صرف کافی کے لیے... تاکہ انھیں بھی انٹرویو کے بارے میں معلوم ہو جائے کل کچھ اور خبریں آ جائیں... اور مجھے بھی معلوم ہو جائے گا ان کو میرے پاس کس نے بھیجا تھا پریس کلب میں ان کی کس سے بات ہوئی تھی۔ ظاہر ہے صحافیوں کے جانے کے بعد ہی کھانا کھائیں گے... سوچ رہا ہوں نواب صاحب کو بھی بلا لوں... نواب خسرو..."
"میرا تو خیال ہے کہ آپ ان صحافیوں کو بھی ڈنر میں شامل کر لیں۔" عاشی نے کہا۔ "ورنہ ان کو بعد میں پتا چلے گا کہ آپ نے انھیں کافی پر ٹال دیا تھا اور ان کو ڈنر دیا تھا تو وہ اپنی توہین محسوس کریں گے۔"
"تم ٹھیک کہتی ہو۔" دلاور نے کہا۔ "جو اخباری نمائندے کل رات کی تقریب میں شریک تھے ان سب کو فون کر کے میری طرف سے دعوت دے دو۔"

"یس سر... میں انھیں نو بجے کا وقت دے دوں؟"
"نو بجے ٹھیک ہے۔" دلاور نے کہا اور ٹیلی فون اٹھا لیا۔ سب سے پہلے اپنے گھر کا نمبر ملایا۔ میں نے اس کی انگلی کی حرکت کو بغور دیکھا اور نوٹ کیا۔ ایٹ... سیون... فور... تھری... نائن... زیرو... ٹو... اس نمبر کو میں نے ذہن نشین کر لیا۔
"دیکھو مجھے دیر ہو جائے گی۔" دلاور شاید اپنی بیوی سے بات کر رہا تھا۔ "تم شوفر کے ساتھ چلی جانا... اسے پتا ہے... معلوم ہے تمھاری بہن کو دیکھنے کے لیے لوگ آ رہے ہیں۔ مگر وہاں میرے رہنے سے کیا فرق پڑے گا۔ تمھارے ماں باپ دیکھ لیں گے ان کو... میں تو... چلو تم ہو... لڑکے والوں کو... بتا دینا کہ غیر ملکی مہمان تھے میرے ساتھ... ڈنر ہے رات کو... ہاں اچانک پروگرام بن گیا وہ بھی اچانک آ گئے تھے... میں عاشی کو تمھارے گھر ڈراپ کر دوں گا... ابھی کچھ دیر میں... وہ بھی اپنی بڑی بہن کے رشتے کو اٹینڈ کرے گی۔"
یکلخت وہاں عاشی کی موجودگی کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ دلاور کی بیوی کی چھوٹی بہن تھی۔ غالباً چھوٹی سے چھوٹی یا سب سے چھوٹی... ورنہ اس جیسی لڑکی کا دلاور کے ساتھ ہونا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔
دلاور نے دوسرا فون نواب خسرو جمشید کو کیا۔ لیکن یہ نمبر اس نے نمبر ڈائل نہیں کیا۔ اس کے ٹیلی فون کی میموری میں پہلے سے موجود تھا چنانچہ اس نے صرف ایک نمبر کو پش دبایا اور کال ملنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے نواب خسرو جمشید کو تفصیل سے ہمارے متعلق بتایا یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم اردو نہیں سمجھتے اس نے بڑے اطمینان سے گفتگو کی اور ملاوٹ میں ہمیں ہماری گالیوں سے نوازتا رہا۔
"یہ نواب صاحب... یہ ٹھیک ہے کہ کسی پر بھی آنکھ بند کر کے بھروسا نہیں کرنا چاہیے... مگر یار ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ اور پھر ان کے بارے میں دوسروں سے معلوم ہو ہی جائے گا۔ مجھے بہرحال اطمینان ہے کہ معروف اخباری نمائندے ہیں۔" دلاور نے کہا۔ "بس تم آ جاؤ وہاں... میں کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ہاں ٹیبل ... ریزرو کرا دوں گا۔"
صاف ظاہر تھا کہ نواب خسرو جمشید نے اپنے عدم اطمینان اور شکوک کا اظہار کر دیا تھا۔ دلاور نے اپنی طرف سے انھیں دلاسا دیا تھا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے مگر اب یہ ممکن تھا کہ ... کو بھی عدم تحفظ کا احساس پریشان کرنے لگے تو وہ بہت سی باتیں کرانے لگے۔ دستاویزی ثبوت مانگے، مجھے اپنے حوالے ... کرنا چاہیے۔
ٹیلی فون رکھنے کے بعد دلاور کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ مسکرایا اور اس نے ہم سے چلنے کو کہا۔ غالباً اس نے اپنے شکوک کو کچھ مؤخر کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کو چند مقامی صحافیوں کے ساتھ ڈنر تھا اور وہاں ہمارا تعارف بھی ہونا تھا۔ اگر ہم جعلی صحافی ہوتے تو پول کھل جائے گا۔ یہی سوچ کے اس نے خود کو تسلی دی کر بولنے تک تشویش کا اظہار بھی بے سود ہوگا۔ اصل بات یہ تھی کہ عشق کا بھوت اس کے دماغ پر چڑھا ہوا تھا۔ لب و لہجہ، فرانسیسی زبان میں بات چیت اور ہماری پُراعتماد اداکاری کا اثر بہت خوشگوار تھا۔ ورنہ دلاور ایسا آدمی تھا کہ اپنی ولدیت کے بارے میں بھی شک کا شکار ہو جائے تو ماں کو نہ بخشے۔
میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ یہ صورتِ حال بالکل مختلف تھی بالکل غیر متوقع تھی جس کے لیے ہم تیار ہو کے نہیں آئے تھے۔ غیر متوقع حالات کی مطابقت سے میرے ذہن میں ایک نیا منصوبہ جنم لے رہا تھا۔ اس کے بارے میں محسن سے رائے لینے یا مشورہ کرنے کی راہ میں عاشی حائل تھی۔ ہم فرنچ بولتے تب بھی وہ دشمنِ جاں سمجھ لیتی۔
اس کا موقع جیسے باہر آنے کے بعد ملا۔ ہم دلاور کی گاڑی کے قریب کھڑے ہو کے زیرِ تعمیر عمارت کا نقشہ دیکھنے لگے۔ دلاور ہمیں انگلش میں کچھ سمجھاتا رہا جو ہم نے نہیں سنا۔ بظاہر ہم اس کی طرف متوجہ تھے اور اسی کی بات پر تبصرہ کرتے جا رہے تھے لیکن درحقیقت ہم آپس میں کچھ اور ہی بات کر رہے تھے۔ دلاور کو عاشی کا انتظار تھا جو ٹیلی فون کر رہی تھی اور صحافیوں کو ڈنر پر مدعو کر کے ... پہنچا رہی تھی۔
"یہ ویسٹ طور پورا اسپتال ہے... بلکہ سیکنڈ فلور بھی اسی ... ہے۔" دلاور نے کہا۔
"ویری گڈ..." میں نے کہا۔ "یار محسن... میں نے ایک بہت بڑا اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" پھر میں نے ... سے ...
"اور اوپر والی منزل میں..." دلاور بولتا رہا۔
"میرا بھی ارادہ بدل گیا ہے۔" محسن نے دلاور کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ "یہ بہت خطرناک اقدام ہوگا۔"
"مگر بہترین موقع ہے..." میں نے دلاور کی طرف دیکھ کے ... کہا۔
"تم نے کچھ نہیں؟" دلاور بولا۔
"سوری... بات یہ ہے..." میں نے سر کھجایا اور پھر محسن ... "بس یہ بتا دو... اب ... ہمیشہ کی طرح"
"چلو..." محسن نے سر ہلایا۔ "اللہ مدد گار ہے۔"
اسی وقت عاشی نمودار ہوئی۔ وہ جس ماحول کی لڑکی تھی اس کی صورت میں حیرت انگیز طور پر اداکارہ رانی کی شباہت تھی معلوم نہیں وہ کیا چیز تھی جس کی وجہ سے وہ دلاور کی سیکریٹری بنی تھی میرے ذہن میں اس کے دو اسباب آ رہے تھے۔ ایک یہ کہ وہ پروفیشنل ٹریننگ حاصل کر رہی تھی۔ کسی اچھی فرم میں جو ملازمت حاصل کرنے میں یہ تجربہ اس کا معاون ہو سکتا تھا جو وہ پیشہ ور ... کے ساتھ کام کر کے کسی حیثیت کے بغیر حاصل کر سکتی تھی۔ دوسری وجہ اس کی بڑی بہن یعنی دلاور کی بیوی ہوتی تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ بیشتر بیویاں اپنے شوہروں کی آؤٹ ڈور مصروفیات کے بارے میں تمام قسم کا حسد اور شک رکھتی ہیں۔ خصوصاً ان شوہروں کے بارے میں جن کے آنے جانے کا کوئی وقت نہ ہو اور کام کی نوعیت کا پتا نہ چلتا ہو۔
عاشی آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئی۔ دلاور اور ہم دونوں پچھلی سیٹ پر تھے۔ باہر اتنی دیر میں غروبِ آفتاب کے بعد کا اندھیرا گہرا ہو کے رات میں ڈھل رہا تھا۔ کچھ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بھی روشن تھیں لیکن زیادہ تر گاڑیاں چھوٹی پارکنگ لائٹ جلا کے چل رہی تھیں۔
"کہاں جانا ہے سر؟" شوفر نے سڑک پر آ کے کہا۔
"پہلے بیگم صاحب کے گھر۔" دلاور نے مختصراً کہا۔
شوفر ایک خطرناک قسم کا شخص دکھائی دیتا تھا اور دلاور جیسے آدمی کے لیے ایسے ہی شخص کا شوفر ہونا ضروری تھا جو وقتِ ضرورت اس کے باڈی گارڈ کے فرائض بھی پورے کر سکے۔ میں یہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ کوئی پیشہ ور ... ہوگا جو تجربے سے ... گن سے ہر قسم کا اسلحہ استعمال کرنے کا اہل ہوگا۔ خالی ہاتھ بھی لڑ سکتا ہوگا۔ جان لینے یا جان دینے میں شاید ہی کبھی دریغ کرتا ہوگا اور دلاور کے اعتماد پر ہر طرح سے پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا ہوگا... یہ بھی یقینی تھا کہ وہ مسلح ہوگا۔
"پاکستان... بیوٹی فل کنٹری۔" میں نے ... کے کہا۔
"ویری بیوٹی فل۔" محسن نے سر ہلایا۔ "وی گریٹ۔"
عاشی نے ناگواری سے پیچھے پلٹ کے دیکھا۔ "تم لوگ ... کے علاوہ بھی کچھ سوچتے ہو۔ تمھاری ساری فرانسیسی قوم تو شراب اور خوشبو کے پیچھے دیوانی ہے معلوم نہیں تم لوگوں نے اتنی ترقی کیسے کر لی۔"
میں دم بخود رہ گیا اس لڑکی نے یہ بات بڑی بے ساختگی میں کہی تھی اور روانی میں وہ بالکل صحیح فرنچ بول گئی تھی۔
"تمھارا خیال ایک سو ایک فیصد درست ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر ہم فرنچ نہیں ہیں فرنچ قوم کے بارے میں تمھاری رائے سے ہمیں اتفاق ہے وہ ایک حسن پرست اور خوش ذوق خوش مزاج اور مہذب قوم ہے انفرادی آزادی اور جمہوریت پر یقین رکھنے والی

www.paksociety.com

غلط یقین رکھنے والی، محض نظریاتی یقین نہیں۔"

"ہم سمجھتے ہیں کہ اگر سب لوگ دنیا میں صرف خوب صورتی کے پرستار بن جائیں تو بد صورتی کا وجود مٹ جائے۔" محسن نے کہا۔

"وہ ساری بد صورتی جو سماجی تفریق، معاشی عدم توازن... ہوس اقتدار، جنگ و جدل، تعصب اور تنگ نظری سے پیدا ہوتی ہے جو آدمی کو نفرت سکھاتی ہے اور محبت کو مشروط کر دیتی ہے، حالانکہ محبت مشروط ہو ہی نہیں سکتی مگر کچھ لوگ محبت کو اور احساس کو، جذبات اور خیالات کو، نظریات کو اور انسانی رشتوں کی ہر حد کو تقسیم کرتے ہیں اور آدمی کو رنگ و نسل، ملک و قوم اور مذہب و ملت، خاندان برادری کے خانوں کا اسیر بنا دیتے ہیں۔ یہ ساری تقسیم صرف نفرتوں کے رشتے اور حوالے دیتی ہے۔ اور سب کچھ لے لیتی ہے۔"

"تم... تم فلاسفر ہو۔" عاشی نے مرعوب ہو کے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہیں یہ لوگ؟" ولاور نے تجسس سے مجھ سے پوچھا۔

"تعریف کر رہے ہیں اس ملک کی۔ اور لوگوں کی..." عاشی نے کہا۔

دلاور طنزیہ ہنسا۔ "یہ بھی فیشن ہے۔ سیاسی اخلاق کا تقاضا ہے کہ روم میں وہی کہو جو رومن سننا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں سے کہو کہ یہ سچ ہے تو یہاں رہ جائیں، چھوڑ دیں اپنا گھر، شہر اور ملک۔"

عاشی نے یہ بات ہم تک پہنچا دی اور ہنسنے لگی۔

"اگر تم کہو تو میں اس سے بھی زیادہ بہت کچھ کر سکتا ہوں۔" میں نے دل پر پتھر رکھ کے اداسی سے عاشی سے کہا۔ "سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔"

"تم...؟" عاشی کی ہنسی ایک شرارت آمیز مسکراہٹ بن گئی۔

"تم... تم یہ دنیا چھوڑ سکتے ہو لیکن تم مسٹر دلاور کو جا کر کہو کہ ایک دن وہ خود بھی اسی ملک کے ایک معزز شہری کی حیثیت سے جائیں گے اور رہ جائیں گے۔"

"اور وہ وقت مری جان بہت دور نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔ "جب ہم سبھی یہاں آباد ہوں گے۔ سارے رشتوں کے تقدس کے ساتھ، خوشی اور عافیت کے ساتھ اور ہمارے بعد آنے والی نسلوں کو ہم یہ سب کچھ وراثت میں دیں گے۔ ثقافتی تبدیلی اور..."

"کیا تمہارا یہ دوست ہر وقت ایسا ہی فلسفہ بولتا رہتا ہے؟" عاشی نے کہا۔

"ہمیشہ اور ہر وقت تو نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن کسی خوب صورت لڑکی کو دیکھتے ہی یہ اسے متاثر کرنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے۔ دراصل یہ اس کا احساس کمتری ہے۔ آج تک تم جیسی لڑکی نے اسے گھاس نہیں ڈالی۔ کیا تم یہ نیک کام کر سکتی ہو؟ گھاس میں اندھا گھ..."

بہت اچھا ہوا کہ اسی وقت عاشی کا گھر آ گیا ... ابھی تقاضا جیسے ہم اپنی ہار دیکھ رہے تھے۔ عاشی اتر کے اندر چلی گئی ... آگے بڑھ گئی۔ اب ہم کھل کے بات کر سکتے تھے۔

"ہماری پوزیشن خاصی مضبوط ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم مسٹر بہادر کی بیکری، شی اور سالی، نواب صاحب اور ... یہ سب جانتے ہیں کہ ہم کہاں آخر کس لیے مر رہے تھے۔"

"غالباً وہ پولیس افسر بھی جانتا ہے۔" محسن نے ... بے فکر کہا۔

"بہت سے لوگوں نے ہمیں مسٹر بہادر کے ساتھ ... میں سوا آٹھ بجے بھی دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمارے پاس بہت وقت ہے۔"

"ہاں... رات کے دس بجے تک مسٹر بہادر کا ... گھر" محسن بولا۔ "اور دس بجنے میں تین گھنٹے باقی ہیں۔"

تین گھنٹے میں ہم دور سے ... دلاور نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "آپ لوگ ... ہے کہیں؟"

میں اور محسن ایک ساتھ ہنسنے لگے۔ جیسے ... شرمندہ ہیں۔ اس کے بعد ہم نے تسلی بھری انگریزی ... ساتھ گفتگو شروع کی۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم کس کس ملک ... مطالعاتی دورہ مکمل کر کے آئے ہیں اور اب کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم نے اس کی تعریف کی اور کہا کہ ہم واپسی میں اگر موقع ملا تو اس کے زیر تعمیر اسپتال کو بھی دیکھنے آئیں گے اور اگر ... تو اس کی تقریب افتتاح میں بھی شریک ہوں گے۔

دلاور نے وہ جگہ کار رکوائی تھی۔ ایک جگہ تو اس کے سسرال کے قریب ہی ہم منزلہ عمارت تھی۔ وہ چند منٹ کے لیے معذرت کر کے گیا اور ہمیں موقع فراہم کر گیا کہ ہم کھل کے بات کریں۔ دس منٹ بعد وہ لوٹا تو کچھ پریشان سا تھا۔

"وہ لڑکی... کیا تھا اگر وہ ساتھ آ جاتی۔" وہ بولا۔

"کون لڑکی؟" میں نے کہا۔ "تمہاری کوئی گرل فرینڈ؟"

"نہیں... میں عاشی کی بات کر رہا تھا۔" دلاور بولا۔

"اوہ یس... بڑی ویری جولی گرل۔" میں نے کہا۔

"وہ آ جاتی تو ہم زیادہ خوش ہوتے... وہ کیوں نہیں آئی؟" محسن نے سادگی سے کہا۔

دلاور نے ہمیں گالی دے کر کہا۔ "تم دونوں... کی وجہ ... مگر یہ جملہ اس نے اردو میں کہا تھا چنانچہ ہم انجان بنے رہے ... ہیں۔ آج اتفاق سے اس کی چھوٹی بہن کی شادی کا مسئلہ طے ہونا ... کیا اس میں آپ کے لیے کوئی پریشانی اور افسوس کی بات ہے؟"

... بولا سکا... "مجھے صرف یہ پریشانی ہے کہ تمہارے اور ہم سر ... کے درمیان مسٹر ہم کے قتل کا الزام دینے والا کوئی نہیں۔ یہاں ایک شخص تھا جو کئی سال فرانس میں رہ چکا تھا۔ اب کئی سال سے کراچی ... نہیں پھول سیلر ہے لیکن وہی انسپکٹر ہے۔ مگر وہ ملا نہیں۔" ... کراچی میں ہے... الائنس فرانسس... فریڈ ہال کے سامنے۔" میں...

... "ہاں... وہ اتفاق سے لاہور آیا ہوا تھا۔" دلاور بولا۔ "مگر اس ... وہ تو کسی فنکشن میں مدعو ہے... شیرو میں نے پیغام چھوڑ ... کر وہ آئے تو سیدھا ہوٹل آ جائے۔"

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمارے ... بوریہ تو فوراً پاک نہیں ہوئے دیا کوئی بھی شخص جو فرانس ... رہا ہو اور اب فرانسیسی پڑھاتا ہو... وہ بھی سفارتی کشش کے ... پہلے والے اولاد ہے ہیں۔ وہ فوراً ہماری فریب اور ہماری ... دونوں کا پول کھول دیتا اور چند سوالوں میں ہماری اصلیت ... عاشی اگر ہمارے ساتھ طلبی جملے مکتب تھی تو ہم اس ماہر زبان کے سامنے ساری فریب بھول جاتے۔

دوسری مرتبہ گاڑی پلازا سینما سے کچھ آگے کھل جانے کے ... دلاور نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اپنے خیالات میں گم تھا چنانچہ ... کہنا بھول گیا تھا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" وہ اترتے ہوئے بولا۔ "آپ لوگ بور ... لگے... دس پندرہ منٹ میں...۔"

"ہم وقت گزار لیں گے۔" میں نے کہا اور دلاور کو واپس ... دیکھتا رہا۔ وہ ایک باہر سے تاریک نظر آنے والی عمارت ... میں داخل ہو گیا۔

"کیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم اس عمارت کو دیکھیں یہ اس کا قیمر ... ابھر رہا ہوئی عمر کی تھی۔" محسن نے کہا۔

"اگر ہم دیکھ لیتے تو کیا فرق پڑتا... مطلب یہ کہ اسے ہم سے ... کوئی ضرورت نہیں... ہم تو اجنبی ہیں۔" میں نے کہا۔

"اسے احتیاط پسندی بھی کہا جا سکتا ہے۔ عادت سے بڑھ کر بولی۔"

"یہ کیوں نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ ہمارے بارے میں تھوڑے سے شک کا شکار ہے۔" میں نے کہا۔

"تو معلوم ہو جائے گا۔" محسن بولا۔ "میں نے اس خیال کو بالکل ... کہ وہ بہت قوت ... کے کہ ہم بیوقوف بنا رہا ... یہ اس کی عادت ہے... اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی ... ہمارے خلاف ایک مضبوط جال بُن رہا ہے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں ... مگر..."

پھر وہاں پہلے ہو جائے گا تو کیا۔ ہم نمٹ لیں گے۔"

"تم نے غور کیا۔ وہ کس عمارت میں داخل ہوا ہے؟"

"نہیں یہاں سے کیا پتا چلتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں دیکھ رہا تھا۔ بیک ویو مرر میں۔" محسن بولا۔ "بھوت بنگلے سے تیسرا یا چوتھا گیٹ ہے۔"

"بھوت بنگلا؟"

"ہاں... جسے کچھ لوگ جادو گھر بھی کہتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"تیرا مطلب ہے فری میسن ہال؟" میں نے کہا۔

"ہاں... فری میسن ہال ایک پُر اسرار عمارت سمجھی جاتی ہے۔ اس سے تیسرا یا چوتھا گیٹ دیکھا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"دیکھنے کی ضرورت نہیں... مجھے معلوم ہے۔"

"کیا معلوم ہے؟"

"یہاں ایک مشہور انٹیریئر ڈیکوریٹر رہتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "جس کی ملی پیلس کے قریب دکان ہے۔"

"آفرین ہے جوان... کیا دماغ اور کیا حافظہ پایا ہے۔" میں نے چلا کے کہا اور محسن کی کمر پر مکا مارا۔ ہم دونوں ایک سنجیدہ موضوع پر بات کرتے ہوئے بے وجہ چلانے لگے تھے اور ہنس رہے تھے تاکہ ڈرائیور یہ سمجھے کہ ہم محض دوستانہ گپ شپ یا کچھ اس کے سوا کچھ نہیں کر رہے ہیں۔

آدھے گھنٹے کے بعد دلاور اندھیرے میں سے نمودار ہوا۔

"مجھے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟" اس نے گھڑی دیکھ کر کہا اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن اس طرح وہ ذہنی حالت میں رونما ہونے والے تغیر کو نہ چھپا سکا۔ وہ پہلے سے پریشان تھا اور یہ پریشانی پہلے سے زیادہ تشویش ناک تھی۔ اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور رنگ اُڑا ہوا تھا۔ ہم نے ظاہری اخلاق سے کہا کہ دیر کی کوئی بات نہیں۔

"اب ہم سیدھے ہوٹل جائیں گے۔" وہ بولا۔ "اور کافی پئیں گے۔ میں نے کافی وقت لے لیا آپ لوگوں کا۔ لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کے ساتھ ہی رہوں۔"

چور دروازوں میں چھپا ہوا پکڑے جانے کے خوف میں مبتلا تھا چنانچہ دلاور کی بات پر میں چونکا۔ کہیں وہ اس لیے تو ہمارے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا کہ ہم ابھی تک مشتبہ تھے۔ دلاور ایسا شخص تھا جو دل کے جذبات کا ہلکا سا عکس بھی صورت پر نہیں آنے دیتا تھا اور ملاقات کے دوران صورت حال پیدا کر کے تماشا دیکھتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ وہ اچانک ہمیں سب کے درمیان کھڑا کر دے گا۔ خسرو، جمشید... ایس پی سراج... مقامی صحافی اور پولیس والوں کے سامنے۔ وہ ایک قہقہہ لگائے گا اور کہے گا کہ پوچھیے سکندر صاحب اور محسن صاحب! اتنا ڈراما کافی ہے۔ بس اب چھوڑیے یہ فراڈ۔ بڑی

www.paksociety.com

شکل نہیں ہے یا اپنی مادری زبان میں بتاؤ کیسی رہی؟

لیکن گاڑی خاموشی سے بڑھتی گئی اور جب ہوٹل کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو مستعد دربان نے دلاور کو پہچان کے سلامی دی۔ اس کے انداز چاپلوسی سے میں نے جان لیا کہ وہ دلاور کو ایک وی آئی پی کی حیثیت سے جانتا ہے اور شاید اس کی گاڑی کو بھی پہچانتا ہے۔ یہ ایک اچھی بات تھی۔ گاڑی گھوم کر پیچھے کی طرف والی قطار میں جا کھڑی ہوئی کیونکہ سامنے والے حصے میں بالکل جگہ نہیں رہی تھی۔ یہ میری توقع کے عین مطابق تھا۔ ہوٹل میں تمام سے گاڑیاں بھرنے لگی تھیں اور بعد میں آنے والوں کو پیچھے ہی جانا پڑتا تھا۔ کچھ دیر بعد مزید گاڑیوں کا دلاور کی گاڑی کے پیچھے آنا یقینی تھا۔ تاہم تب تک دلاور کی کار تقریباً درمیان میں آچکی ہوگی۔

گاڑی کے رکتے ہی میں اور محسن یوں حرکت میں آئے جیسے ہم دونوں کو متحرک کرنے والا بجلی کا ایک ہی سوئچ ہو۔ محسن عین ڈرائیور کے پیچھے تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے ریوالور نکال کے وار کیا۔ ریوالور کا دستہ ڈرائیور کے سر کے پچھلے حصے پر اتنی قوت سے لگا کہ اس کے لیے ہوش بحال رکھنا ناممکن ہوگیا۔ محسن نے دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبایا تھا چنانچہ وہ آواز نکالے بغیر بے حس ہوگیا۔

تقریباً یہی دلاور کے ساتھ ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ شوفر نیچے اترے گا اور اس کے لیے دروازہ کھولے گا۔ میرے لیے ریوالور نکالنا ممکن نہیں تھا کیونکہ میں وسط میں بیٹھا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں دلاور اگلی سیٹ پر نہیں بیٹھا تھا جو عاشی کے اتر جانے کے بعد خالی ہوگئی تھی۔ محسن میری اوٹ میں تھا۔ اپنا چھوٹا سا ریوالور پہلے سے نکال کے سامنے میں رکھ لیا تھا لیکن میں جیب میں ہاتھ ڈالتا تو دلاور کو شک ہوجاتا۔ میں نے محسن کے اٹھتے ہی دلاور کو کھینچ کے گرایا اور پھر اس کی کنپٹی پر کھڑی ہتھیلی ماری۔ وہ مچلا اور میں نے دوسرا وار نشانے سے ذرا اوپر گردن کے قریب کیا۔ دلاور کی مزاحمت ختم ہوگئی۔

یہ سب کچھ ایک منٹ میں ہوگیا۔ باہر رنگا رنگ روشنیوں کا جھلمل اجالا تھا مگر ایئرکنڈیشنڈ کار کے بند شیشوں کے پیچھے اندھیرا تھا چنانچہ باہر سے کوئی بھی اندر کا منظر اس وقت تک نہیں دیکھ سکتا تھا جب تک کہ وہ بہت قریب نہ ہو۔

ان دونوں کو بے ہوش چھوڑ کے ہم دونوں بڑی مستعدی کے ساتھ مسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ اگنیشن کی چابی اب محسن کے ہاتھ میں جھول رہی تھی۔ دور کھڑے ہوئے کچھ شوفروں نے ہمیں واجبی سی دلچسپی کے ساتھ دیکھا اور پھر گپ لگانے لگے۔ ہم دونوں نے جلدی سے ایک قہقہہ لگا کے ہاتھ ملایا۔ ایک اور گاڑی دلاور کی گاڑی کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔ میں آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک اور کار آگئی۔ میں رک گیا۔ پہلی کار میں سے ایک جوڑا اترا اور [illegible] بڑے نخرے کے ساتھ ساڑی سنبھالتی ہوئی [illegible] اندر چلی گئی۔ دوسری کار میں سے ایک نوجوان [illegible]

اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ میں نے [illegible] دیا۔ میرے ریوالور کی ضرب عجلت میں زیادہ سخت پڑ گئی [illegible] پیچھے گرا تو میں نے اس کے سر سے خون پھوٹتے دیکھا [illegible] پچھتانے یا افسوس کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ [illegible] کار کے آجانے سے ہمارا کام کچھ مشکل ہوگیا تھا لیکن [illegible] جاتے تو بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا اور جیسی وہ چار منٹ کی [illegible] تھی اس میں کوئی اور گاڑی آجاتی تب بھی کام خراب ہوتا۔

دو منٹ میں محسن نے دلاور کو دوسری گاڑی میں [illegible] اور میں نے دلاور کے شوفر کو۔ ان دونوں کو ہم نے پچھلی سیٹ [illegible] ڈھیر کردیا۔ تیسرے منٹ میں محسن بھی پیچھے بیٹھ گیا اور [illegible] کے ڈرائیور کی جگہ سنبھال لی۔ اس کے سر سے بہنے والا خون [illegible] بہہ گیا تھا لیکن بہت زیادہ نہیں تھا جو [illegible] ہوگئی۔ اسی وقت ایک اور کار گھوم کے پارکنگ [illegible] آرہی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس ہم پر پڑیں۔ میں نے گاڑی [illegible] گیئر میں ڈالا اور پیچھے سے آنے والی کار رک گئی [illegible] جانے کا موقع فراہم کیا۔ تیز روشنی براہ راست میری آنکھوں [illegible] تھی چنانچہ میں صرف یہ دیکھ سکا کہ وہ ایک سیاہ رنگ [illegible] مرسیڈیز تھی۔ جب میں گھوم کے باہر جانے والے [illegible] میں نے بلاارادہ مرسیڈیز کی طرف دیکھا۔ یہ نواب خسرو جمشید [illegible] تھی۔ وہ اپنے مخصوص سفید طرّے والی دستار اور سیاہ شیروانی [illegible] تھا اور پہلے سے ذرا بھی مختلف نظر نہیں آتا تھا [illegible] بہت عرصے کے بعد دیکھا تھا۔ پھر اس کار میں سے دوسرا [illegible] خسرو جمشید نکلا۔ میں بھونچکا رہ گیا کیونکہ خسرو جمشید کی ایک [illegible] کو ہم ٹھکانے لگا چکے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ بالکل [illegible] رکھتا تھا اور اکثر ہمیں دھوکا دیتا تھا۔ کبھی ہم اصل نواب [illegible] کو اس کا شوفر سمجھ بیٹھتے تھے تو کبھی شوفر کو نواب خسرو جمشید [illegible] اس وقت ختم ہوا تھا جب بالآخر شوفر جانے سے ہاتھوں [illegible] گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔

"اس خبیث نے ایک اور کاربن کاپی بنالی۔" محسن [illegible]

"ہاں یار... بہت چالاک اور خطرناک آدمی ہے یہ۔" [illegible] کہا۔ "لیکن اسے دوسرا ہمشکل کہاں سے ملا؟"

"میک اپ ہوگا۔" محسن بولا۔ [illegible] گا۔ "آخر یہ ایسا کیوں کرتا ہے؟"

"اسی سے معلوم کریں گے کسی دن۔" میں نے کہا۔

"اس نے ہمیں ضرور دیکھا ہوگا۔" محسن بولا۔

"ہاں... مگر دلاور نہ پہچان سکا تو وہ کیسے پہچانتا۔" میں نے کہا۔ "وہ دلاور کی گاڑی بھی دیکھ لے گا۔"

"نہ... مگر اس سے کیا پتا چلے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں بچ گئے۔" محسن بولا۔ "اگر وہ ایک منٹ پہلے وارد ہوتا تو دیکھ لیتا کہ ہم دلاور کی گاڑی کا مال دوسری گاڑی میں ڈال رہے ہیں اور جاتے ہی پیچھے لگ جاتا۔"

"پھر بھی میں جلد مرسیڈیز کا کیا مقابلہ کرتی۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس نوجوان کے زخمی ہونے کا افسوس ہے میں اسے زخمی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خدا کرے زخم معمولی ہو۔"

"نواب خسرو جمشید اندر جا کے زیادہ دیر انتظار نہیں کرے گا۔"

"آدھا گھنٹہ تو دیکھے گا۔ پھر معلوم کرے گا۔" میں نے کہا۔ "چوکیدار سے پوچھے گا۔ وہ کہے گا کہ میں نے خود انہیں باہر جاتے دیکھا۔ گاڑی ان کا شوفر چلا رہا تھا لیکن میں نے کسی کو باہر جاتے نہیں دیکھا۔"

"کیا جاری کارروائی کو آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے دیکھا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔ "کچھ ڈرائیور تھے مگر وہ دور کھڑے ہوئے تھے۔"

"ابھی تفتیش اور حقائق کو سامنے آنے تک گھنٹہ بھر تو لگے گا۔ پھر پولیس کو رپورٹ ہوگی اور تلاش کا آغاز ہوگا۔ دو تین گھنٹے یا پھر صبح کے بعد۔" محسن بولا۔ "اس وقت تک ہمیں لاہور سے نکل جانا چاہیے... دلاور کو ساتھ لے کر..."

"یہ خطرناک ہوگا محسن۔" میں نے کہا۔ "جب تک معلوم [illegible] ہم دلاور کو قید میں رکھ سکتے ہیں اور [illegible] کے ساتھ نکل سکتے ہیں۔ جب حقیقی خطرے کا [illegible] ہوجائے گا اور تلاش کرنے والے زیادہ مستعد نہ رہیں۔"

"وہ مستعد رہیں گے۔ ایک تو معاملہ صنعت کار چوہدری دلاور کا ہے، دوسرے خود ایک بہت مشہور ہوٹل کے اندر سے [illegible] پیچھے یہ سراغ کا سارا ریلا پیچھے ہوگا۔ کوئی اور [illegible] کچھ وہ سمجھ جائے گا کہ دلاور سے ملنے والے فیروز صحافی [illegible] نواب خسرو جمشید یہ بھی بتائے گا کہ اس نے دلاور پر [illegible] اٹھایا تھا اور اسے کھلا پیغام دیا تھا۔" محسن نے کہا۔

"تو شاید یہ بھی جانتے ہوں گے کہ انہیں ہم کب اغوا کر کے لے گئے [illegible] اس کے متعلق بھی جانتے ہوں گے کیونکہ اس نے ہیڈ لائٹس کی [illegible] دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کار میں ہم [illegible] سمجھتا اور اس حلیے کو جب تک نہیں جانتے بہتر ہے کہ ہم اس گاڑی کو جلا ڈالیں یا چھوڑ دیں۔"

میں نے بحث کرکے محسن کو قائل کرلیا کہ موجودہ حالات میں چند دن روپوش رہنا ہمارے حق میں بہتر تھا۔ ہمارا جانا [illegible] گا اور ہم نے عجلت میں فرار اختیار کیا تو [illegible] نہ پائے تھے کہ گرفتار ہو جانے والی کیفیت ہوجائے۔

پل میں کار کو ہم نے راستے میں روک دیا۔ کار سے اترتے وقت میں نے نوجوان کے زخم کا معائنہ کیا اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ چوٹ سے اس کا سر نہیں پھٹا تھا صرف کھال چھلی تھی۔ اور یہ معمولی زخم کسی صورت میں مہلک یا خطرناک ثابت نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ کراہنے لگا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہوش میں آرہا تھا۔ جب میں نے دلاور کو گاڑی میں سے اتارا تو محسن نے اس کے شوفر کو زمین پر لٹا رکھا تھا اور کسی ڈاکٹر کی طرح اس کا معائنہ کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"یار مکند... یہ... یہ تو مر گیا۔" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔

"مر گیا؟ یہ تو بہت برا ہوا۔"

"ہاں... زیادہ سخت ہاتھ پڑ گیا تھا۔" محسن نے کہا۔

"ہاتھ تو تم نے بھی سخت ہی مارا تھا لیکن اس کی جگہ تک چوٹ نازک اور خطرناک جگہ پر پڑی تھی... کوئی مرتا نہیں۔" میں نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ لمبی بے ہوشی طاری ہوجاتی ہے۔ یہ تو بہت جلدی مر گیا۔"

"میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا یار۔"

"میرے سامنے کیوں صفائی پیش کر رہے ہو...؟" میں نے کہا۔ "کیا یہ بات میں نہیں سمجھتا؟ ان تینوں میں سے کوئی بھی مر سکتا تھا لیکن مارا وہی گیا جس کی قضا آگئی تھی۔ یہ دنیا کا قانون نہیں ہے جس کے تحت تم پر قتل کی فردِ جرم عائد کی جاسکے۔ خدا نیت کو دیکھتا ہے اور اس کے انصاف میں غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔ ویسے بھی مرنے والا کون سا نیک آدمی تھا۔ خس کم جہاں پاک۔"

"آدمی تو تھا... نیکی بدی کا فیصلہ کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں۔" محسن بولا۔ "اگر وہ برا تھا تب بھی یہ اختیار کسی اچھے آدمی کو نہ اخلاقاً حاصل ہے اور نہ قانوناً کہ وہ جسے برا سمجھے اسے قتل کردے... بس اللہ ہی ہے جو [illegible] اس ناوانستہ قتل پر [illegible] کیونکہ میری اور اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"مگر وہ دشمن کا آدمی تھا اور اگر اسے موقع ملتا یا حکم ملتا تو وہ تمہیں قتل کرنے میں ایک لمحے کا توقف نہ کرتا۔" میں نے کہا۔

محسن کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ اداس ہوگیا تھا اور وہ میرے دلائل سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک فطری بات تھی۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی مطمئن نہ ہوتا۔

"اب اس کا کیا کریں؟"

www.paksociety.com

"اسے ساتھ لے جاتے ہیں کوئی عقل مندی نہیں۔"
"پھر کیا یہیں چھوڑ دیں؟" محسن بولا۔
"گاڑی میں چھوڑا تو یہ نوجوان خواہ مخواہ چکر میں پڑ جائے گا۔"
"یہ خود تو اب کچھ بتانے سے رہا۔" محسن بولا۔ "اسے سیٹ پہ بٹھا دیتے ہیں۔ گاڑی میں گھر پہنچتے ہیں۔ وہاں تو اپنے ساتھ دلاور کو اتار لینا اور میں اس گاڑی کو..." وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔
"کیوں نہ میں اسے گھر چھوڑ آؤں۔"
"لیکن اس کا پتا..."
"میں دیکھ لیتا ہوں۔" محسن نے گلو کمپارٹمنٹ کھول کے دیکھا۔ اس میں سے کاغذات نکالے اور گاڑی کی مدھم سی روشنی میں غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ جیب میں ڈرائیونگ لائسنس پہ بھی وہی پتا تھا جو گاڑی کی رجسٹریشن بک پہ تھا۔
ایک بار پھر میں نے دلاور کو گاڑی میں ڈالا۔ محسن نے ڈرائیور کی لاش کو سڑک سے ذرا فاصلے پہ رکھا اور واپس آ کے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ چند منٹ بعد اس نے گاڑی کو اس گھر کے سامنے روکا جہاں اب ہمارا بسیرا تھا۔ میں دلاور کو اندر لے گیا اور محسن گاڑی لے کر چلا گیا۔
غالب نے دلاور کو دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ "یہ کیا؟"
"یہ ہیں چوہدری صاحب۔" میں نے ہاتھ مل کے کہا۔
"زندہ یا مردہ؟" غالب نے فرش پہ پڑے ہوئے دلاور کو دیکھا۔
"ابھی تک تو زندہ ہیں۔" میں نے کہا۔ کیتھرین نے قریب آ کے دیکھا۔
"یہ... یہ تو وہی شیطان ہے؟" وہ نفرت سے بولی اور اس کا چہرہ ایک خوفناک سی یاد سے دکھ کی تصویر بن گیا۔
"ہاں... یہ وہی شیطان ہے جس نے حضرت آدم و حوا کو جنت سے محروم کیا... سر جھکے... ہم جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔
"تم اسے کیوں اٹھا لائے؟" غالب نے پریشانی سے کہا۔
"ایک موقع ملا تھا جس سے فائدہ اٹھا لیا۔ اور آئندہ بھی اس کے فوائد حاصل ہوتے رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "میں نے اور محسن نے اتفاق رائے سے چوہدری صاحب کو یرغمال بنانے کا فیصلہ کیا۔ فی الحال ہم ان کے بدلے رابعہ اور زینی کی رہائی کا مطالبہ کریں گے۔"
"کس سے؟" غالب نے طنز سے کہا۔ "لواحقین سے؟"
"لواحقین کیا دے سکتے ہیں سوائے جان کی قیمت کے۔" میں نے کہا۔ "نواب خسرو جمشید کا فون نمبر میں نے نوٹ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ایس پی سراج ہے۔"
غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "ان کے نزدیک دلاور صرف ایک آدمی ہے۔ اس کی جگہ دوسرا آدمی لے سکتا ہے۔ شاید تم نے دونوں کی دلی خواہش پوری کر دی۔"
"کیسی خواہش؟"
"نمبر ون پوزیشن حاصل کرنے کی۔" غالب نے کہا۔ "چاہیں گے کہ تم دلاور کو ختم کر دو... ان کے لیے دلاور کو چھوڑنا ویسے بھی مشکل ہو گا۔"
"کیوں مشکل ہو گا؟"
"اگر انھیں معلوم ہو گا کہ وہ کہاں ہیں تب ہی چھوڑیں گے... ہو سکتا ہے یہ صرف دلاور جانتا ہو۔" غالب نے کہا۔
"ہم نے ایک چانس لینا ہے... اور اگر جمشید یا سراج نے انکار کیا تو ان پہ... دلاور کو اٹھا لانے ہیں تو کل ان کو بھی اغوا کر سکتے ہیں... ایک آدمی کو ہم... الوقت کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب تم اسے سنبھالو... فون پہ بات کروں۔"
گھر کے عقبی حصے کی دیوار سے... فون کے... اور اپنے... موبائل فون کے... اس ہوٹل کا نمبر لیا جہاں... ٹھہرے ہوئے تھے۔
"میں... ہوٹل کے... آپریٹر نے کہا۔
"پلیز... ہوٹل میں... نمبر... پہ..."
"سوری سر۔ مسٹر دلاور ابھی پہنچے نہیں ہیں۔" وہ بولی۔
"پوری بات سننے سے پہلے بولنا بدتمیزی ہے۔" میں نے کہا۔
"سوری سر۔" وہ معذرت کر کے بولی۔
"تیس نمبر... پہ نواب خسرو جمشید ہوں گے... یا ایس پی سراج صاحب ہوں گے... کسی کو ملا دو۔" میں نے کہا۔
"کیا نام بتاؤں سر؟"
"نام... وزیر خان... لاہور آیا ہوں..." میں نے کہا۔
"پلیز ہولڈ کیجیے۔" وہ... بولی۔
تین چار منٹ میں... تاروں... آواز...
... اور یہ سوچ کر مسکرایا... پیغام... گی۔ وہ دونوں فوراً... جائیں گے کہ پیغام... نہیں ہو سکتا۔
"سکندر..." ریسیور میں سے سراج کی آواز آئی۔
"کون سکندر، اور کون دلاور... کو کس سے بات کرنی تھی؟" میں نے کہا۔
"دلاور کہاں ہے؟" سراج نے دھاڑ کر کہا۔
"میری جیب میں۔" میں نے قہقہہ مار کے کہا۔ ...

تمہارا باپ بھی وہاں نہیں پہنچ سکتا۔"
"بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں تمہاری زندگی کے سکندر۔"
"یہ دوست... یہ بتاؤ کہ دلاور کی موت میں کتنے دن باقی ہیں... یہ بتا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "جہاں تک... سوال ہے تو ہم اسے قتل نہیں کریں گے۔ یہ تو ہم بہت پہلے... بھی کر سکتے تھے۔ ہمارا ارادہ ایک بار... مال کے بدلے مال کی بات کرنی ہے تو میری بات... سے ٹھیک ہے... ہم کراچی میں ہوں گے۔ تم بھی... ہو؟"
"کیوں پوچھ رہے ہو؟"
"اس لیے کہ مجھے معلوم ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "کہ تم کہاں... ہو گے جہاں میں تم سے بات کر سکوں۔"
"کیا بات؟"
"... آج تک مقابلہ کیا ہے... سودا نہیں کیا۔" میں نے... اب میں ایک آفر دے رہا ہوں۔ تم رابعہ اور خواجہ... زینب کو... اور ہم چوہدری دلاور کو چھوڑ دیں گے۔"
سراج ہنسا۔ "تم بارگین کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"
"... والوں کے لیے بھی ایک انگریزی مقولہ ہے۔" میں... دیکھو آخر کار کون کس پہ ہنستا ہے۔ تم شاید کہنا چاہتے ہو... دلاور کی کوئی قیمت نہیں۔ مگر ایسا کہنے سے پہلے اپنی قیمت... اس ڈبل رول والے نواب سے بھی پوچھ لو کہ اس کی کیا... اگر دلاور کے بدلے سودا نہ ہوا تو پھر تم دونوں میں سے... زینب کے بدلے میں ہو گا۔ اور تمہارے بدلے رہا تو تمہارے... کے بدلے ہو گا۔ مت بھولو کہ کچھ جذباتی رشتے تمہارے... اتنے ہی اہم ہوں گے، جتنا میرے لیے رابعہ سے رشتہ ہے۔"
... سراج کچھ دیر کے بعد بولا۔ "تم ہوٹل میں فون... کر رہے ہو؟"
"کس سے؟"
"نواب خسرو جمشید سے۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔
"یہ بات اپنی پولیس افسری میں مت بھولنا... تم فون کو... ٹیپ... کال کبھی ٹریس نہیں... کہاں سے کی گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "تو ٹھیک ہے سراج صاحب... مجھے کوئی اعتراض نہیں... ایک بات اور... دلاور... تسلی دے دینا کہ وہ خیریت سے ہے اور کام سے... دو چار دن میں لوٹ آئے گا۔"
"... کی پریشانی کی بہت فکر ہے۔"
"مجھے تمہاری ضعیف ماں کی بھی فکر ہے۔" میں نے کہا۔
"آج اگر دلاور کی بیوی پریشان ہو گی تو سوچو کل تمہاری ماں کا کیا حال ہو گا۔ کوئی احمقانہ کارنامہ سرانجام دینے سے پہلے سوچ لینا۔"
وہ کچھ اور بھی کہتا مگر میں نے فون بند کر دیا اور عبدالودود منتظر کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔ ریسیور اس کی بیوی نے اٹھایا۔
"منتظر کہاں ہے بھابی؟ میں سکندر بول رہا ہوں۔"
"ابھی ابھی تھانے سے چھوٹ کر آئے ہیں۔" وہ بولی۔ "باتھ روم میں ہیں۔"
"تھانے سے؟" میں نے کہا۔
"ہاں... تمہارے انکل رضوی نے چھاپا مارا تھا۔" منتظر کی بیوی نے تلخ طنز آمیز شکایتی لہجے میں کہا۔
"کیوں؟ برآمد کرنے کے لیے؟"
"ہاں... اور اس جرم میں ان کے خلاف مقدمہ درج کر لیا ہے کہ انھوں نے جیل سے فرار ہونے والے مفروروں کو پناہ دی۔"
"یہ ان کو کس نے بتایا؟"
"ڈاکٹر شہریار نے۔" منتظر کی بیوی بولی۔ "وہ بیان نہ دیتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔"
"اس نے جائے متعلق بھی بتا دیا ہو گا؟"
"ہاں۔"
"منتظر کو بہت بھروسا تھا اس پہ۔" میں نے تلخی سے کہا۔
"بعد میں وضاحت کرنے آیا تھا۔ میں نے تب بے عزت کر کے نکال دیا اور صاف کہہ دیا کہ آئندہ ادھر کا رخ نہ کرے۔" وہ بولی۔
"تو ان سے بات کرو۔"
"میاں منتظر۔" میں نے کہا۔ "ذلت ملنے تھانے کا منظر دیکھ آئے ہو؟"
"تمہاری صورت دیکھنے کے بعد یہی سب دیکھنا ہے۔" وہ بولا۔ "دمنگی یار... میں نے تمہارے اس فرض شناس انکل کی ایسی تیسی نہ کر دی تو میرا نام بھی عبدالودود نہیں۔"
"مگر جو کیس درج کیا گیا ہے؟"
"کیس کی بھی ایسی تیسی۔" وہ بولا۔ "میں خود وکیل ہوں، اپنی ضمانت پر رہا ہو کے آیا ہوں۔ اب دیکھنا اس سالے ڈاکٹر کی..." اس نے ایک بہت گندی گالی دی۔ "تم کہاں سے بول رہے ہو؟"
"زمین اور آسمان کے بیچ میں معلق ہوں۔" میں نے کہا۔
"فون صرف اس لیے کیا ہے کہ تم سے دلاور کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ تم نے اس کے متعلق شائع ہونے والی خبر دیکھی؟"
"ہاں... مجھے پتا چلا ہے کہ وہ تمہارے باپ کی جاگیر پہ اپنے دوست کی یاد میں اسپتال بنا رہا ہے۔"
"لیکن یار... یہ سب کیسے ممکن ہوا؟" میں نے کہا۔ "وہ جائداد تو متنازعہ تھی۔ ابھی اس کی ملکیت کا تصفیہ بھی نہیں ہوا تھا۔"

"اس میں کوئی گھپلا ہوا ہے۔" منظور نے کہا۔ "میں معلوم کروں گا اور بلالی کورٹ سے ابھی آرڈر لے لوں گا۔"

"گھپلا کیا ہو سکتا ہے؟"

"جعلی یا تو یک طرفہ فیصلہ ہوا تیرے نہ آنے کی وجہ سے۔" منظور نے کہا۔ "یا تیری طرف سے کوئی حلف نامہ وغیرہ داخل کر دیا گیا... کہ تو اپنے دعوے سے دستبردار ہوتا ہے۔"

"میری طرف سے؟ بغیر میری مرضی کے؟"

"تیرے جعلی دستخط کیے جا سکتے ہیں۔" منظور نے کہا۔ "آخر وہ اسپتال بھی تو تیرے باپ کے نام پر تعمیر ہو رہا ہے۔"

"مگر کیا عدالت میں کوئی وکیل شناخت نہیں کرتا؟"

"وکیل ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ جعلی حلف نامہ داخل کرنے کے لیے جعلی شناخت حاضر ہوا اور ایک جعلی وکیل نے اسے شناخت کیا۔ عدالت نے کاغذات قبول کر لیے۔ اب اس جعلسازی کو چیلنج کرنا بہت بڑا اور لمبا کام ہے۔ تجھے جعلسازی، دھوکا دہی اور عدالت میں غلط بیانی کے جانے کتنے مقدمات درج کرنے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ میری باقی زندگی صرف تم لوگوں کے مقدمات کی پیروی کرتے گزرے گی۔ ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ باقی لوگوں کے لیے وقت ہی نہیں بچے گا۔"

"ہم فیس دیں گے تجھے۔" میں نے کہا۔ "آخر تو ہمارا وکیل ہے۔"

"خدا کے لیے مجھے بخش دو... جتنی فیس اب تک ملی ہے وہ سب میری جان کا عذاب ہے۔" منظور بولا۔ "مجھ سے فیس لے لو واپس، بیزار آ گئے ہیں۔"

"یار میں زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "اتنا تھک گیا ہوں کہ کسی بھی لمحے عرش سے فرش پر ٹپک سکتا ہوں۔ یہ بتا کہ وہ رقم نکلوا لی؟"

"کون سی رقم... جو تیری زوجہ کے حساب میں تھی؟" وہ بولا۔

"ہاں یار... اپنے حساب میں تو صرف دولت عشق ہے۔"

"نہیں... آج سارا دن تھانے میں گزرا۔ بار ایسوسی ایشن نے زبردست حمایت کی ورنہ ہتھکڑی پڑ جاتی۔" وہ بولا۔

"اچھا اب ہم جا رہے ہیں کراچی۔" میں نے کہا۔ "رقم پرسوں تک مل جائے تو اچھا ہے کیونکہ ہم اپنے ساتھ ایک بہت اہم چیز بھی لے جا رہے ہیں۔"

"کیا چیز لے جا رہے ہو... دل کی توپ؟"

"نہیں... اپنے چوہدری صاحب کو۔" میں نے کہا اور فون کی لائن کاٹ کے پیچھے آ گیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو یہ پیچھے سے پکڑ لیتا۔ منظور سے دوبارہ کسی وقت بھی بات کی جا سکتی تھی۔

میں نے محسن کو بھی واپس آتا دیکھ لیا تھا۔

"چھوڑ دیا اُسے اپنے گھر؟" میں نے کہا۔

"ہاں..." محسن بولا۔ "گاڑی کی آواز پر اس کی ... تھی۔ میں نے اُسے سمجھا دیا کہ اس کا شوہر ... سمجھا اس کی کسی سے لڑائی ہو گئی تھی۔ جب وہ ہوش ... اس کو بھی سمجھا دیا کہ چپ رہے اور اس کے سوا کوئی ... کسی سے کوئی بات نہ کرے اور یہ سمجھے کہ وہ آج گھر ... تھی۔ کوئی پوچھے تو تمہارا بیان یہی ہونا چاہیے کہ وہ ... میں ہی تھا۔ اس کی بیوی بہت پریشان ہوئی مگر ... کہ وہ تفصیل میں نہ جائے اور وہی کرے جو میں ... ذکر بھی کسی سے نہ کرے اور وہ بہت بڑی مشکل میں ..."

"چل یہ تو نے اچھا کیا۔"

"میں نے شعلا کو بھی فون کیا تھا۔" محسن بولا۔

"بے وقوف... انکل رضوی کا فون ٹیپ ہو رہا ہو گا۔"

"بس یار... میرا دل چاہ رہا تھا مگر سعد ... کیا بتایا؟ کراچی سے رابعہ کے متعلق ایک اطلاع ملی ہے؟ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ میں نے غور سے ... طرف دیکھا۔

سسپنس

کیوں پیدا کر رہا ہے؟ کہا سیدھا ... کیوں نہیں ...

خیریت ہے؟"

"خیر ابھی ہے۔" محسن نے کہا۔ "مگر میں سنا کے ... ڈرتا ہوں۔"

"ابھی خبر سنانے میں ڈر کس بات کا؟"

"سنا ہے وضعدار قسم کے لوگ خوشی سے بھی ... پیارے ہو جاتے ہیں۔" محسن بولا۔

"جا، میں کسی وضعداری وغیرہ سے بچتا کے کہا۔ ... تجھ سے سچ اگلوانے کے لیے مجھے تھرڈ ڈگری کا فریضہ ... کرنا پڑے گا۔ سو جوتے اور سو پیاز کھا کے بتائے گا؟"

"بیچارہ شاہ، دونوں چیزیں حاضر کی جائیں۔" محسن ... گیا مگر میں نے جوتا اٹھایا ہی تھا کہ وہ ... بھی کیا بے صبری دکھاتا ہوں۔ ... دم توڑے لوں ... نہیں ہوتی۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ عجلت کا ... شیطان ... میں نے اسے جوتا کھینچ کے مارا تو بزرگوں نے ... کہا ہے کہ جوتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے ... ہے۔ پچھلا تک ماری تھی مگر جوتا اس کی کمر ...

کے دوران ... ہے اس کے دونوں کان پکڑ کے مروڑتا ... کان کا دم جانے لگا تو ... چلانے لگا۔ رابعہ یار اس نے ایک فون نمبر دیا تھا۔

صرف فون نمبر پر میں نے اس کے کان چھوڑ دیے۔ ... فون نمبر؟ محسن نے دونوں کان سہلا دیا کہ کہا۔ ... نمبر پر رات بارہ بجے سے صبح چار پانچ بجے تک کوئی ... جائے گا۔

... کیا مطلب ہوا؟" میں نے کہا۔ "وہ صرف فون نمبر ہو ... تو تھا ہی ہے۔"

... افسوس نوجوان کہ عشق کے فاصلے کی کمی کے باعث ... اور دماغ کی کارکردگی متاثر ہوئی ہے۔" محسن بولا۔ ... کا مطلب صاف ظاہر ہے۔ رابعہ نہیں ملے گی تو ... فون پر بات ہو سکے گی... یا اگر ہم اور تازہ میں سے ... ہو گا۔"

"کیا یہ وضاحت رابعہ نے کی تھی؟"

"نہیں اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر اسے موقع ملتا تو ضرور ... مگر نہ جانے کیسے لائن کٹ گئی۔"

"لائن کیوں کٹ گئی؟"

"لائن آخر ہوتی کس لیے ہے؟" محسن نے کہا۔ "یہ کوئی ... نیٹ کیوں ہو گئی تو بتیا شروع ہوتی کس لیے ... فاصلے کی کال کا بہت نازک رشتہ ہوتا ہے۔ ... سے لاہور تک کسی ٹیلی فون کے کھمبے پر کاکروچ چڑھ ... بھی پر بیٹھ جائے تو لائن کٹ جاتی ہے۔ چھوٹی ... سکتا ہے بہرے کا جگر... تو لائن..."

"پھر بھی ٹھیک... میرا مطلب تھا کہیں لائن کسی نے ... اندازی ہو؟" محسن نے کہا۔ "رابعہ کو موقع ملا ہو فون کرنے کا ... بات پوری نہ ہوئی ہو کہ کسی نے دیکھ لیا ہو۔"

"نہیں، میں اتنی قنوطیت سے سوچتا ہوں تو صحیح نتائج ... نہیں ہوتے۔" محسن نے کہا۔ "اگر یہ فرض کیا جائے کہ وہ کہیں ... جہاں اسے یہ موقع مل گیا تو متعدد سوالات پیدا ہوتے ... ہیں کہ اسے قید میں رکھنے والے احمق کیوں ہیں... اور ... اندیشے تھے کہ انھوں نے وہیں ایک فون بھی رکھا ... اس ... تصدیق کیا اور رابعہ کو اس فون تک رسائی حاصل کرنے ... بھی فراہم کیا۔ مزید یہ کہ رابعہ نے وہ فون نمبر بھی پہنچایا ... بھی کے ساتھ کہ جب بھی انہیں موقع ملے گا تو اس ...

نمبر پر بات کرنے سے فائدہ ہو گا۔ نقصان کا اندیشہ ہوتا تو وہ نمبر بتاتی ہی کیوں۔ ظاہر ہے کوئی نہ کوئی اس نمبر تک پہنچنے کے لیے آزاد ہے۔ کم سے کم رابعہ ضرور آزاد ہے جس نے یہ کال کی۔"

"وہ آزاد ہے تو اس نے اپنے بارے میں تفصیل سے کیوں نہیں بتایا، اپنا نیا ٹھکانا...؟"

"میں نے کہا نا کہ لائن کٹ گئی تھی، اس کے بعد شعلا نے بہت دیر تک انتظار کیا... یا تو رابعہ کو دوبارہ لائن نہیں ملی، کسی بھی خرابی کے باعث... یا پھر وہی ہوا کہ کوئی آ گیا جس کے سامنے وہ بات نہیں کر سکتی تھی یا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پھل تھا اس آزادی کا زیادہ امکان ہے۔ کیونکہ پندرہ بیس منٹ کے بعد شعلا نے اس نمبر کو ملانے کے لیے بہت کوشش کی۔ ایک بار لائن ملی تو انگیج کی ٹون آنے لگی۔ اس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا ہے کہ دوسری طرف سے رابعہ نے ریسیور اٹھا رکھا تھا اور وہ شعلا یعنی انکل رضوی کے گھر کا نمبر ملانے میں مصروف تھی۔ شعلا نے عقلمندی تو کی تھی کہ لائن کٹتے ہی فوراً خود نمبر گھمانا شروع نہیں کیا۔ اس نے ریسیور رکھ کے انتظار کیا اور رابعہ کو موقع دیا کہ وہ دوبارہ رنگ کرے مگر کبھی کبھی لائن ملنا خوب کے ملنے سے بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ کہتا یہ ہے میری زوجہ ... نے بتایا کہ وہ دس پندرہ منٹ تک ڈائل گھماتی رہی اور نمبر نہیں ملا تو انکل رضوی وارد ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ کسے فون کر رہی ہو، کوئی ٹرنک کال ہے؟"

"ان کا ایسا سمجھنا برحق تھا۔"

"ہاں، لوکل کال میں اتنی دیر نہیں لگتی۔ وہ پھر شعلا کچھ جذباتی ہو گئی تھی چنانچہ نمبر ڈائل کرنے میں اس نے غیر ضروری جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔ لوکل نمبر نہ ملے تو آدمی دو چار منٹ کے وقفے سے دوبارہ کوشش کرتا ہے۔ ٹرنک کال کے لیے مسلسل نمبر ملانا پڑتا ہے۔ چنانچہ انکل نے کہا کہ مجھے بتاؤ کون سا نمبر ہے، ابھی مل جائے گا۔ ان کو تو شعلا نے ٹال دیا کہ کوئی ایسی اہم اور ضروری بات نہیں مگر مجھے شک پڑتا ہے کہ انکل رضوی نے نمبر نوٹ کر لیا ہو گا۔" محسن نے کہا۔

"وہ کیسے؟ کیا شعلا نے نمبر کہیں لکھا تھا؟"

"نہیں، اب میری گھر والی اتنی بے وقوف بھی نہیں ہو سکتی۔" محسن نے بڑا ماننے کے انداز میں کہا۔ "ایس ایس پی صاحب بہت ہوشیار ہیں۔ اسی فون لائن سے منسلک دوسرا ٹیلی فون ان کے کمرے میں بھی لگا ہوا ہے۔ ہر مرتبہ جب شعلا ڈائل گھماتی ہوگی تو گھنٹی رضوی صاحب کے کمرے میں بھی بجتی ہو گی۔ شعلا اس نے نمبر جو ڈائل کیا تو انکل کے کمرے میں پھر بار گھنٹی بجے گی پھر آ کر

www.paksociety.com

کا حد سے ہو گا تو آٹھ بار اور مسلسل ٹن ٹن ٹن کرتے۔ انھیں خیال آیا ہو گا کہ آخر یہ کون فون کر رہا ہے اور کسے کر رہا ہے کہ نمبر نہیں ملتا۔ ذرا سا غور کرنے سے جانبر ہو سکتے ہیں یہ تھوڑی سی پریکٹس کی بات ہے جیسے کوئی موسیقی کو ذہن میں رکھتا ہے ایسے ہی جہاں فون ہو وہاں سے ڈائل رنگ شمار کر کے صحیح نمبر نوٹ کیا جا سکتا ہے یا تقریباً صحیح نمبر بھی پایا جا سکتا ہے۔ ایک نمبر ادھر اُدھر ہو جائے تو یہ غلطی نمبر ملانے سے درست ہو جاتی ہے۔"

"اور اس کے باوجود تو دعویٰ رکھتا ہے کہ تیری گھر والی اتنی احمق نہیں ہے، وہ تجھ سے زیادہ احمق ہے اور تو اس سے زیادہ۔ بھلا کیا ضرورت تھی اسے پیرو مرشد بننے کی، نمبر آؤٹ ہو گیا تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔ خاموشی سے نمبر نوٹ کرتی اور ہمیں بتا دیتی۔" میں نے کہا۔

"یار! آخر عورت ذات ہے۔ اخلاقاً یا سکندر بخت نہیں ہے اور خود سکندر بخت ہوتے تو میں شرط لگا سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ جذباتی حماقت فرماتے۔ سر کے بل کھڑے ہو کر رابطہ کرنے لگتے یا فون میں گھس جاتے۔" محسن نے خفگی سے کہا۔ "اور میں صرف ایک امکان کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ یہ نہیں کہہ رہا کہ نمبر رضوی صاحب کے پاس پہنچ چکا ہے۔"

"چل برداشت مان۔ جو ہوا اچھا ہوا یا برا ہوا۔ اب بھی اس میں برائی نہیں" میں نے کہا۔ "اب ہم آج رات کوشش کریں گے۔"

"یہ آدھی رات کے بعد والا مشورہ عجیب ہے۔" محسن نے کہا۔ "وہ تھی چار بجے تو شاید رات کے گیارہ بجے کے بعد ہی کم ہو جاتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "لائن چار بجے کی بات نہیں۔ غالباً یہ فون رات کے بعد دستیاب ہوتا ہے۔ کسی ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں رات بارہ بجے سے صبح پانچ بجے تک کسی کی موجودگی کا امکان نہیں اور وہاں سے چوری چھپے بات ہو سکتی ہے۔"

"گویا ناجائز طور پر" محسن بولا۔

"غالباً یہ کسی آفس کا فون ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمام دفاتر رات کے وقت بند پڑے رہتے ہیں، اگر ان میں سے کوئی عقل اور پیسا استعمال کرے تو کسی کمپنی یا سرکاری دفتر کے چوکیدار کو رشوت دے سکتا ہے اور چوکیدار کوئی بھی گھر والوں کے فون اُن کے سامنے رکھ سکتا ہے ایسا ہوتا بھی ہے۔ سرکاری دفتروں اور منتی اداروں کے بے تحاشا بل ہوتے ہیں، انھیں کبھی کالوں کا پتا ہی نہیں چلتا۔ یار لوگ سرکار کے خرچے پر نصف شب کو بیویوں اور محبوباؤں سے کئی گھنٹے ڈائیلاگ بھی بول سکتے ہیں اور دشمنوں کو دل کی طرح گالیاں بھی دے سکتے ہیں۔"

"کیا آئیڈیا ہے" محسن بولا۔ "افسوس کہ ہم نے اس کو نہیں سوچا ورنہ سرکاری دفاتر اور وہاں کے چوکیدار کہاں نہیں، خیر آئندہ کے لیے یہ بھی ایک وسیلہ ہے۔"

"جو ہم آج رات ہی استعمال کر سکتے ہیں۔" [illegible]

"اور کر رہا ہے گے" محسن جوش سے بولا۔ [illegible] "تو نکلو۔"

"ہاں، ورنہ کراچی تو انسانوں کا سمندر ہے اور جانے بغیر کسی کو تلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔" [illegible] میں نے کہا۔ اس [illegible] میں رابعہ کی آواز سن کر سکون ملا تھا میرے دل میں بے قراری [illegible] جب تک رابعہ کے اور میرے درمیان فاصلہ [illegible] احساس کا فاصلہ تھا۔ ایسے جذبات پر میں جیسے [illegible] سی بھی رہی تھی۔ میں دیدہ و دانستہ اس کے خیال سے [illegible] اور اس کے تصور کی اذیت سے بچتا تھا اب وہ [illegible] میں سو جگانے آ رہی تھی تو اس طرح کہ اس کا عکس [illegible] خیالوں میں بس گیا تھا اور اس کا نام ہر دھڑکن کی [illegible] تھا۔ برف پگھلتے ہی جوش کا آتش فشاں [illegible] راستوں کے تاریک سفر میں یک لخت اس کے آفتاب [illegible] اُجلی دھوپ آ گئی تھی چنانچہ میرے جذبات کی شدت [illegible] صورت سے بھی عیاں ہونے لگی تھی۔

محسن آہستہ آہستہ [illegible] شروع ہو گئی [illegible] اس کے لہجے میں گئے عشق کے عذاب۔

"تمہاری گوٹی ہی ایسی ہے" میں نے کہا۔ "خواہ مخواہ وہ نام ہی ایسا ہے جو میں بھولنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔"

"پھر کیا کرتا، تمہیں یہ بات آتی ہے؟"

"نازو کے حوالے سے بتا دیتا" میں نے کہا۔

"پھر اپنے مرزا غالب کا یہی حال ہوتا" محسن [illegible]

"اب چلتے ہیں تو اپنے مہمان کی خبر لیں کہ وہ کس حال میں ہے۔"

"سرکس کا شیر لوہے کے پنجرے میں ہے" میں نے [illegible]

دلاور ہوش میں آ چکا تھا اور کیتھرین کی [illegible]

میں نے کمرے میں قدم رکھا تو مجھے عجیب منظر دکھائی دیا۔ [illegible] کرسی پر دیوار کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا ہوا تھا۔ دلاور کے ہاتھ پشت کی طرف کر کے باندھے گئے تھے اور [illegible] ننگی ہو گئی تھی۔ وہ دلاور کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے [illegible] بدن پر جگہ جگہ زخموں کی خون [illegible] نظر آ رہی تھی [illegible] ہاتھ میں ہنٹر کی ڈوری [illegible] رسی تھی جسے [illegible] یوں کے طور پر استعمال کیا تھا۔

کیتھرین کے بال بکھر گئے تھے اور اس کی آنکھوں میں سے [illegible] دلاور سے اپنی تذلیل کا انتقام لے [illegible] اس کے جسم پر تشدد کر کے لے چکی تھی پھر شاید وہ [illegible] سے خیال آ گیا تھا کہ دلاور کا زخم بہت [illegible] اب وہ ایک ہاتھ میں نمک اور دوسرے ہاتھ [illegible] کا چمچہ لیے کھڑی تھی۔ میرے سامنے اس نے نمک [illegible] پانی یا [illegible] دلاور کے زخم پر ڈال دیا۔ دلاور کا جسم [illegible] سے اچھلا مگر اس کی صورت پر ایک حقیر آمیز مسکراہٹ [illegible] رہی۔

"اب بولو... یو ڈرٹی سوائن... کیسا ہے؟" کیتھرین نے [illegible] "کر میرے پاس تیزاب ہوتا۔"

دلاور نے مجھے اور محسن کو دیکھا "تو تمہارے مددگار آ گئے۔" [illegible] تمہارے دل میں حسرت نہ رہے کوئی۔"

کیتھرین نے پورا نمک اس پر پھینک دیا۔ وہ نمک [illegible] جو اس کے ہر زخم پر پھیل گیا۔ وہ آہستہ آہستہ کراہنے [illegible] کیتھرین کی کوششوں کا مذاق اڑانے کے لیے مسکرانے لگا۔ "تم ایسا کرو ایک مشین منگوا لو قیمہ بنانے کی یا [illegible]" دلاور نے کہا "اس میں مجھے ڈالو اور مشین چلا دو پھر [illegible] گوشت کھا لو اور خون پی لو۔ اپنی بیٹی کو بھی پلا دو۔"

کیتھرین نے ایک جنونی ردعمل کے ساتھ دلاور پر حملہ [illegible] اس کے ناخن لمبے تھے مگر اس سے پہلے کہ وہ دلاور کا [illegible] دلاور نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ "پاگل کتیا!" [illegible] دلاور نفرت کے زہر میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا "کیا [illegible] تم سب بھلا سکتی ہے جو تیرے ساتھ ہوا تھا، جو میں [illegible] نے کیا تھا؟"

کیتھرین ایک دم رک گئی۔ اس کا چہرہ احساس ذلت سے [illegible] اس نے مجرم نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ [illegible] کہانی تھی جو کیتھرین نے آج تک ہم سے چھپائی تھی [illegible] کسی عورت سے بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ منہ چھپا کے [illegible] دروازے کی طرف لپکی۔

"تم ایک کتے [illegible]" میں نے آگے جا کے دلاور کے منہ پر [illegible] تھپڑ مارا۔ "تم نے اور تمہارے شکاری کتوں نے [illegible] ایک بے بس عورت کے ساتھ جو کچھ بھی کیا تھا اس پر [illegible] مردانگی کا اعلیٰ اعزاز ملنا چاہیے۔ تم جسم کے زخموں [illegible] مسکرا کے جھیل گئے مگر اصل اذیت روح کے [illegible] جو تم نے نہیں کھائے اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم وہ تکلیف برداشت نہیں کر سکو گے جو احساس کے ناسور دیتے ہیں۔"

"آپ ڈائیلاگ اچھے بولتے ہو، اپنے سکندر صاحب ایک نے ہمیشہ تعریف کی ہے" دلاور بولا۔

"ہم نے اب تک اچھا ہی کیا ہے، ہم برائی سے گریز کرتے رہے مگر اب ایسا لگتا ہے کہ ہمیں اپنی طبیعت پر جبر کر کے تمہاری سطح پر آنا پڑے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارے ساتھ بھی آج کچھ ایسی بات ہو جائے جسے تم کبھی نہ بھلا سکو۔"

"اور تمہیں افسوس ہو گا کہ تم نے وہ سب کیتھرین کے ساتھ کیوں کیا تھا جس پر انسان نہیں شیطان بھی شرما جائے، تم اس کا حوالہ فخر کے ساتھ دیتے ہو" محسن نے کہا "ویسا ہی تمہارے ساتھ ہو گا۔"

"میرا تم کیا بگاڑ سکتے ہو" دلاور نے اطمینان کی اداکاری کے ساتھ کہا "اپنے سکندر اعظم صاحب [illegible] اپنی جوان بیٹی ہے نہ بیوی [illegible] ورنہ کوئی معشوقہ، جیسی کہ تم لوگوں کے لیے مجبوری اور کمزوری بن جاتی ہے۔ ایک پرانی بیوی ہے تو تم سے جب [illegible] اٹھا لاؤ، جیسے چاہو مار دو۔ نقصان ہو گا تو بچوں کا، انھیں دوسری ماں نہیں ملے گی، ہمارا کیا ہے، نہیں دوسری، تیسری یا چوتھی بیوی بھی مل سکتی ہے اگر زندہ رہے تو۔"

"کیا تم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کو اتنے ہی سکون کے ساتھ برداشت کر سکو گے؟" میں نے پوچھا۔

"کر ہی لیں گے جی، آدمی کا دل پتھر ہونا چاہیے" وہ بولا "یہ جو آپ لوگ موم کا دل لیے پھرتے ہو، یہی عذاب دیتا ہے۔ یہی آدمی کا راستہ روکتا ہے اور اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کرتا ہے۔"

"تم جانتے ہو کہ ہم وہ نہیں کر سکتے جو تم کر سکتے ہو" میں نے غصے سے کہا "مگر یہ سوچ کر..."

"نہیں، یہ تو کبھی سوچنا ہی نہیں چاہیے کہ دشمن ہمارے ساتھ وہ سب نہیں کر سکتا جو ہم دشمن کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ ہر آدمی کے اندر ایک حیوان ہے، ایک درندہ ہے، جب وہ باہر آ جاتا ہے تو شرافت اور تہذیب کے سارے لباس تار تار کر دیتا ہے۔ میری اپنی زندگی ہر وقت تمہارے نشانے پر تھی، بالکل اسی طرح جیسے تمہیں قتل کر دینا یا کرا دینا ہر وقت اور ہر جگہ ہمارے اختیار میں تھا۔ تم وہ فلسفہ بگھار سکتے ہو کہ موت کا ایک وقت معین ہے اور اس سے پہلے کوئی کسی کو نہیں مار سکتا پھر بھی ہم حقائق کو تسلیم کرتے ہیں، اپنی حفاظت بھی کرتے ہیں اور احتیاط بھی کرتے ہیں لیکن کبھی اس خیال سے غافل نہیں رہا کہ تم میرے بیوی بچوں کو میری کمزوری بنا سکتے ہو۔ ایک [illegible]

www.paksociety.com

گھر کے اندر تک پہنچ گئے تھے مگر ایسا تم انتقاماً نہیں کرو گے یہ میرا اندازہ تھا۔ تم مجھ سے پچھلا حساب چکانے کے لیے، کچھ لوٹنے کے لیے یا مجھ سے کوئی سودا کرنے کے لیے ایسا کرو گے۔“ دلاور نے کہا۔ ”میرے اندازے کم ہی غلط ہوتے ہیں اپنے سکندر صاحب۔“

میں اس کی ذہانت کا پھر قائل ہوا۔ ”ہم نے تمھاری زندگی کا سودا کرنے کی بات کی تھی۔“

”کس سے؟ میرے بیوی بچوں سے؟“ دلاور مسکرانے لگا۔

”نہیں، تمھارے یاروں سے۔“ میں نے کہا۔

”یار کون ہے کسی کا؟ آدمی خود اپنا یار نہیں۔“ وہ بولا۔

”آج بڑا فلسفہ بول رہے ہو۔“ محسن نے کہا۔ ”یار نہیں تو وہ لوگ کیا ہیں؟ سراج اور جمشید؟“

”بس بزنس پارٹنر۔ بزنس نہیں تو پارٹنر بھی نہیں اور پارٹنر نہیں تو بزنس کی بات نہیں۔“ وہ بولا۔ ”وہ تم سے کوئی سودا نہیں کریں گے۔ نیا پارٹنر تلاش کر لیں گے۔“

”کیا تمھاری بیوی بھی دوسرا شوہر تلاش کرے گی؟“ محسن نے مشتعل ہو کے کہا۔

”میرے جیتے جی تو نہیں کرے گی، میرے بعد کرے تو پتا نہیں کسی اور کا دل آجائے اس پر یا اس کا دل کسی پر آجائے۔“

دلاور ہنسنے لگا۔

”اور تمھارے بچے؟“ میں نے کہا۔

”وہ یتیم ہو جائیں گے، اور نہ رو۔ دنیا میں ہزاروں بچے ہر روز یتیم ہوتے ہیں۔ ان کے لیے بہت کچھ ہوگا جس سے ان کی زندگی آرام اور آسائش میں گزر جائے گی جیسے اب گزر رہی ہے۔ باپ اہم ضرور ہوتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ اس کا پیسہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔“

”صرف تم جیسا شخص ہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

دلاور ہنسا۔ ”میرے کہنے کی بات نہیں اپنے سکندر صاحب۔ حقیقت تو ایسی ہی ہے۔ کیا اہمیت اور ضرورت ہو سکتی ہے اس باپ کی جو مفلس اور محتاج ہو، معذور ہو اور ایک ایسا بوجھ ہو جسے اٹھا کے چلنا بھی بدنامی کے سوا کچھ نہ ہو۔ ایک بدکردار عیاش باپ بھی قابلِ برداشت ہوتا ہے اگر وہ دولت مند ہو۔ اس امید پر کہ وہ کبھی تو مرے گا مگر دیوالیہ باپ سب کچھ ختم کر کے مرنا چاہے تو کیا اولاد برداشت کرے گی؟ بے شک بچے بین کریں گے لیکن کتنے دن؟ ان کی ساری زندگی پڑی ہے۔ ان کے لیے جو بندوبست میں نے کیا ہے وہ میری محبت کا بہترین نعم البدل ہوگا۔ ایک موازنہ کر لیں جن کا باپ ہو اور پیسہ نہ ہو… یا پیسہ ہو مگر باپ نہ ہو۔ اولاد کے حق میں کون سی صورتِ حال بہتر ہوتی ہے؟“

”تم رشتوں کے بیوپاری لوگ ایسے ہی [illegible] سمجھتے ہو مگر ایسے آدمی کو انسان نہیں سمجھا جا سکتا جو [illegible] بلکہ اچھائی برائی، خیالات اور احساسات سب کو مال [illegible] سے دیکھتا ہو۔ اپنی بیوی سے ہی پوچھ کے دیکھو، کیا وہ [illegible] بیچ سکتی ہے کتنے لاکھ یا کتنے کروڑ میں وہ ایک بیٹے کو [illegible] گی کہ اسے آدم خور قبائل کے حوالے کر دیا جائے یا اپنے [illegible] کا کیا قیمت لے گی؟“

دلاور ہنسنے لگا۔ ”اپنے سکندر صاحب! جب بنگال میں قحط پڑا تھا تو عورتوں نے اپنی مامتا کے اور اپنی عصمت کے سودے ایک مٹھی چاول اور ایک روٹی کے بدلے کیے۔ میری بیوی کے پاس جذباتی عیاشی کے وسائل ہیں اور وہ تمھاری توقعات پر پورا اترے گی۔ قحطِ بنگال جیسے حالات میں اس کا ردِعمل کیا ہوتا؟ یہ تم تصور کر لو تو تمھاری نظر میں [illegible] نہیں رہے گا۔ وہ اپنے شیخ سعدی نے بھی تو کہا ہے کہ [illegible] میں ایسا قحط پڑا کہ لوگ عشق تک بھول گئے۔ وہ فراز کہتے ہیں کیا؟“

دلاور کو قائل کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ [illegible] مزاج، ہماری سوچ اور فطرت کا فرق تھا۔ شیطان کو [illegible] ہے نیکی کے وجود کا قائل کون کر سکتا ہے۔ ”یہ بحث چھوڑ دو۔ تمھیں ایک موقع دیں گے زندہ رہنے کا۔“ محسن بولا۔

”کہ تم اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ۔ سیاسی پارٹی بناؤ، الیکشن لڑو اور اپنی ساری طاقت ہمارے خلاف استعمال کرو [illegible] کے نام پر اسپتال بناؤ جسے خود تم نے قتل کیا تھا۔ اس سب کا نام پر نیکی کمانے کا ڈراما کرو۔ جن کو تم نے اپنی بربریت سے [illegible] کیا اور اپنے شیطانی عزائم کی قربانی کا [illegible] بچوں کے لیے یتیم خانے کھولو جن کو تم نے یتیم کیا اور ان عورتوں کے لیے فلاحی ادارے بناؤ جو تمھاری وجہ سے [illegible] قبول کرنے پر مجبور ہوئیں۔“ میں نے کہا۔

”اتنی رحم دلی اور دریا دلی کس لیے؟“ دلاور طنز سے [illegible]

”ہم تمھیں قتل نہیں کریں گے تو صرف ایک آدمی [illegible] نے کہا۔ ”تمھیں مار کے ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ تم جیسے سیکڑوں [illegible] جو ملک فروشی کے کاروبار میں تمھارے ساتھ ہو گئے [illegible] اور ان سب کو سزا دے گا اس ملک کا قانون، قدرت کا نظامِ انصاف، اس ملک کے عوام کا اتحاد۔ ہم نے تم سے

[illegible] خون کا بدلہ بھی تھا یہ سمجھ لو یا ہے اب تم اور تمھارے وارثوں کی باری ہے نہیں۔ اس قوم کے مجرم ہو تم سب کی سزا ہوگی جو تمھیں ضرور ملے گی ابھی تو ہم تمھیں اس [illegible] دیتے ہیں کہ تم سے ایک سودا کریں۔ تم واپس جا [illegible]

”سودا کیا ہے؟“ دلاور بولا۔ ”اور فائدہ کس کا ہے؟“

”فائدہ دلاور کا ہو تو سودا نہیں ہوتا۔“ محسن نے کہا۔ ”تمھاری [illegible] تمھارے بیوی بچوں کو لوٹائی جا سکتی ہے۔“

”بشرطیکہ رابعہ اور تمھارے استاد محترم شیدی کو تمھارے [illegible] کر دیا جائے۔“ دلاور سمجھ گیا۔ وہ بہت کائیاں شخص تھا اور [illegible] کی طرح سوچتا تھا۔ ”یہی بات ہے نا؟“

”نہیں، تمھارا اندازہ غلط ہو گیا۔“ میں نے [illegible] بدل دیا۔ شاید یہ میری بھی حس کا کرشمہ تھا کہ میں نے [illegible] بدل دیے۔ مجھے یک لخت خیال آیا تھا کہ اب [illegible] سے براہِ راست سودا ممکن نہیں رہا۔ اب تک جتنی گفتگو [illegible] اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی وہ خود کو مجبور [illegible] میرا خیال ہے کہ رابعہ اور شیدی کی رہائی صرف تمھارے [illegible] کی بات بھی نہیں۔“ میں نے سوچ کے کہا۔

”پھر کیا چاہتے ہو؟“ دلاور بولا۔

”ہمارے مطالبات معمولی ہیں جو خود تم پورے کر سکتے ہو۔ [illegible] ایک تو تم کو اہم آر ایس کے مالی وسائل کا کھوج لگانا [illegible] میرے والد کا اور میرا بہت سا مال ہضم کیا ہے۔ ایک [illegible] کئی کروڑ کی رشوت بھی دیتے رہتے تھے۔ اب [illegible] اپنے دشمنوں کو، دوستوں کو جو تمھیں [illegible] تمھارے کاروبار میں شریک غداروں کو [illegible] دے رہے ہیں۔ تمھاری سزا یہی ہے کہ تم ان کے [illegible] جو تمھاری جڑیں کاٹ رہے ہیں۔“

دلاور نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ ”کتنا پیسہ چاہیے تمھیں؟“

”فی الحال دس لاکھ۔“ میں نے کہا۔

”صرف دس لاکھ؟“ دلاور نے بے یقینی سے کہا۔

”آگے ضرورت پڑے گی تو پھر وصول کر لیں گے۔“ [illegible] اس کے علاوہ ہمیں ایک پتا بھی چاہیے۔“

”کس کا پتا؟“

”[illegible] سراج کی منگیتر کا۔“ محسن نے کہا۔

”کون سی منگیتر؟“

[illegible] کا ایک شخص تو ہے مگر چار پانچ جگہ منگنی تو ہو سکتی ہے۔“ محسن بولا۔

”ہم اس کی منگیتر کا نام جانتے ہیں اور اس کی تصویر بھی دیکھ چکے ہیں۔“

”اچھا وہ… تو تم اس سے ملنا چاہتے ہو۔“ دلاور مسکرانے لگا۔

”تمھیں کوئی اعتراض ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، شوق سے ملو مگر اس کے لیے تمھیں سات سمندر پار جانا پڑے گا۔ وہ امریکا میں ہے۔ کس شہر اور کس سمت میں، یہ شاید سراج کو بھی معلوم نہیں۔“ دلاور بولا۔

”اس قسم کے جھوٹ سے معاملات بگڑ جائیں گے دلاور۔“

”نہیں، یہ سچ ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”اس لڑکی کے گھر والوں نے یک طرفہ طور پر نسبت ختم کر دی تھی۔ ان کے خیالات سراج کے بارے میں اچھے نہیں رہے تھے۔“

”کیا وہ شریف لوگ تھے؟“ محسن نے طنز سے کہا۔

”ہاں، تمھارے معیارِ شرافت پر پورے اترنے والے لوگ تھے چنانچہ وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کی بیٹی کا مستقبل سراج کے ساتھ غیر محفوظ ہوگا۔ انھوں نے منگنی توڑ دی اور لڑکی کا نکاح کسی کزن سے کر دیا جو امریکا سے چند دن کے لیے آیا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ سراج کو معلوم ہوتا، وہ واپس بھی چلا گیا اور جاتے ہوئے بیوی کو بھی لے گیا۔“

”اس بے عزتی کا بدلہ نہیں لیا سراج نے؟“ میں نے کہا۔

”سراج تو اس کی تصویر سینے سے لگائے پھرتا تھا۔“ محسن بولا۔

”وہ سب کرنا پڑتا ہے۔“ دلاور بولا۔ ”وہ لڑکی اکلوتی تھی اور والدین لکھ پتی تھے۔ ان کا بی فی روڈ پر ہی کوٹھی کا [illegible] تھا، انارکلی میں ایک کمرشل بلڈنگ تھی۔“

”گویا سونے کی چڑیا تھی، ہاتھ سے نکل گئی۔“ میں نے کہا۔

”ہاں اور چڑیاں تو بہت۔“ دلاور بولا۔ ”بعد میں بہت افسوسناک واقعات پیش آئے۔ پہلے انارکلی کی اس کمرشل بلڈنگ میں آگ لگ گئی پھر ایک رات ان کے گھر میں ڈاکو گھس گئے، وہ صرف مال لے جاتے لیکن گھر والوں نے مزاحمت کی۔“

”اور مارے گئے۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”شاید کسی دن وہ لڑکی اور اس کا شوہر امریکا میں کسی کار کے حادثے میں ہلاک ہو جائیں گے۔ افسوسناک واقعات کیسے پیش آتے ہیں؟ ان کے حرکت میں افسوسناک تھی یا ایک ایس پی کو کیا کہا تھا انھوں نے؟“

”تم سراج کی منگیتر سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اغوا کرنے کے لیے…؟“ دلاور بولا۔ ”تاکہ اس کے بدلے میں رابعہ کو

www.paksociety.com

مانگ سکو۔"

"تم نے بالکل ٹھیک سمجھا۔"

"میں تمھیں نہیں سمجھوں گا تو کون سمجھے گا۔" دلاور بولا "لیکن اس طرح تمھیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ سراج کو کیا معلوم کہ وہ ابھی کہاں ہے۔"

"وہ ہم معلوم کر لیں گے۔" میں نے کہا۔

"اور کوئی مطالبہ؟"

"تم ایک بیان تحریر کرو گے اور اس پر دستخط کر کے ہمارے حوالے کرو گے۔ یہ بیان اخبارات میں شائع ہوگا۔" میں نے کہا "تمھاری طرف سے اعلان ہوگا کہ مجوزہ ذیرا اسپتال کا نام اب دلاور اسپتال ہوگا۔ تم چاہو تو اپنے باپ کا نام بھی لکھ سکتے ہو۔"

محسن کی آنکھوں میں اُلجھن تھی اور حیرانی بھی۔ وہ میرے مطالبات کو یقیناً احمقانہ سمجھ رہا ہوگا۔ دلاور کے اغوا کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا مگر میں بہت سوچ سمجھ کے بے وقوف بن رہا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ دلاور کے لیے اپنی زندگی کوئی مجبوری نہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی کسی کے لیے بھی اتنی اہم نہیں ہوگی کہ ہم اسے جان سے مارنے کی دھمکی دیں تو ہمارا ہر مطالبہ تسلیم کر لیا جائے۔ وہ خود اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ رابعہ اور شیڈی کو اپنی رہائی کے بدلے میں رہا کر سکے۔ یہ فیصلہ دوسروں کے ہاتھ میں تھا چنانچہ میں ایسے حالات پیدا کرنے کی پلاننگ کر رہا تھا جس میں دوسرے مجبور ہوں۔ خود دلاور مجھے بے وقوف سمجھ رہا ہوگا کہ میں نے اتنے معمولی مطالبات پیش کیے۔ دس لاکھ وہ دس پیسے کی خیرات سمجھ کے پھینک سکتا تھا۔

ذیرا اسپتال کا نام بدلنے کا اعلان تو اس نے سمجھا ہوگا کہ میں جذباتی اشتعال سے مغلوب ہوں۔ حالانکہ ایسے کسی بھی اعلان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ بعد میں جب چاہتا ایسے بیان کی تردید کر سکتا تھا۔

"بس یا کچھ اور؟"

"ہم چیک قبول نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔

"تمھیں نقد مل جائے گا۔" دلاور نے کہا۔

"دس لاکھ بہت معمولی رقم ہے۔ اس رقم کو بچانے یا ہمیں پکڑوانے کے لیے کوئی جال پھیلاؤ گے تو جان سے جاؤ گے۔ دو چالاکی اپنے نقشے کے مطابق نقصان صرف تمھارا اپنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تم کس قسم کی ضمانت چاہتے ہو؟"

"پہلے تم ادائیگی کا طریق کار بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"طریق کار کچھ بھی نہیں۔ تم جاؤ اور میری بیوی سے رقم لے لو۔ ابھی اور اسی وقت۔" دلاور بولا۔

"اتنی نقد رقم وہ اپنے ساتھ رکھتی ہے، اور اگر رکھتی ہو تو اس وقت کسی کو بھی دے سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ میری بیوی ہے۔" دلاور نے غرور سے کہا "اور آزما چکے اب اُسے بھی آزما کے دیکھو۔ میری تحریر تمھارے لیے دس لاکھ کا بیئرر چیک ثابت ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم چیک لکھو۔" میں نے کہا "اور رقم نواب خسرو جمشید وصول کر لیں گے۔ ان کو تمھاری بیوی ضرور پہچانتی ہوگی۔ مجھے اس کا فون نمبر تو بتاؤ۔"

دلاور نے اقرار میں سر ہلایا اور خسرو جمشید کا فون نمبر ..."

"اب یہ رقم نواب صاحب خود ایسی صورت میں لیں گے کہ پھر اس کی والدہ کو پہنچائیں گے۔" میں نے کہا "ہم یہ رقم ان سے لیں گے اور اگر درمیان میں کسی نے کوئی چکر چلایا تو ہم ... کی ماں کو ساتھ لانے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"تم واقعی بہت چالاک ہو۔ تم نے ایک زنجیر میں سب کو باندھا ہے۔" دلاور نے کہا "مجھے تمھاری نیت پر شک ہے ... کر دو۔ یہ تم کوئی دوسرا کھیل کھیلنا چاہتے ہو مگر ... اپنے جوتے میں بھر جانے کے لیے تیار ہوں جس میں میری ... کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ لاؤ کاغذ اور قلم۔"

میں نے اسے کاغذ اور قلم دیا اور جب وہ لکھ رہا تھا تو میں نے محسن سے فرانسیسی میں بات کی اور اسے اپنا پلان بتا دیا۔ دلاور نے ایک تحریر نواب خسرو جمشید کے نام لکھی ... خاصی عقل مندی سے کام لیا اور صرف یہ لکھا کہ ایک ... کی وجہ سے وہ ہوٹل نہ پہنچ سکا اور باہر سے ہی ایک ... ساتھ چلا گیا۔ یقیناً ان کو کوفت اور تشویش ہوئی ہوگی لیکن ... ہے کہ وہ زیادہ نہیں لکھ سکتا اور وضاحت نہیں کر سکتا۔ ... دس لاکھ روپے نقد درکار ہیں جو اس کی بیوی کے پاس ... وہ صرف اسی کو دے گی جس کو وہ اعتماد کے قابل سمجھتی ہے۔

چنانچہ وہ جائے اور رقم لے آئے اور پھر یہ رقم سراج کو ... کو پہنچا دے۔ ایک پارٹی یہ رقم سراج کی ماں سے لے جائے گی۔

دوسری تحریر اس نے بیوی کے نام دی۔ اس میں ... تقریباً وہی بات دہرائی گئی تھی جو جمشید کے خط میں تھی ... گیا تھا کہ وہ دس لاکھ ادا کر دے مگر اس بات کا تذکرہ کسی سے نہ کرے اور فکر بھی نہ کرے۔ وہ بہت جلد واپس پہنچ جائے گا۔

"یہ لو۔" دلاور نے کہا "اب آگے تمھارا کام۔ تم مجھے جہاں لے جانا چاہو ...."

"ہم تمھیں تکلیف نہیں دیں گے۔" میں نے کہا "تم ہماری ... میں رہو گے۔"

"مجھے معلوم تھا۔" دلاور نے زندگی سے مایوس ہو کر ... "تم صرف دس لاکھ میں میری جان بخشی کرنے والے ... بہت بڑی چالاکی سے تم نے مجھے لوٹ لیا۔ اپنے ... صاحب اینکر کا ایک چیک کا میل بھی دس لاکھ سے زیادہ کا ... تم نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی ایک فضول چال ... ہے کیونکہ میں ایک سیکنڈ چانس بھی ضرور دینا چاہوں گا۔ بہت جلد تم کو اندازہ ہو جائے گا۔" دلاور کہ ہم نے تھوڑے ... تھا اور تم نے دس لاکھ میں اپنی وہ زندگی بچالی ہے جو ... کے لیے بے مصرف تھی۔ ہم تمھیں آزاد کر دیں گے۔" ... نے کہا۔

دلاور کی صورت کے تاثرات بدل گئے۔ "مجھے یقین ... آتا۔"

"تمھارے لیے ..." میں نے کہا "اب ہم چلتے ہیں۔ تمھاری نگرانی ... کی صورت کرے گی جسے تمھاری جان لینے میں کوئی عار نہیں۔ ہم ... چھوڑ جائیں گے کہ تمھیں جسم اور روح ایک ساتھ رکھ کر نکلنے ... اس کا شاید کتنا ایسا خطرہ ہے اس کا اندازہ تمھیں خود ہی ہو جائے گا۔"

"تم اپنے کہاں جاؤ گے؟"

"تمھارا مطلب ہے کہ ہم نواب خسرو جمشید تک کیسے رسائی حاصل کریں گے اور سراج کے گھر کیسے جائیں گے؟" محسن بولا "اپنے ... صاحب! ہم اپنا کام خود کر سکتے ہیں۔"

غالب نے دوسرے کمرے میں سوتے ہوئے ہماری تمام گفتگو سنی تھی ... اندازہ لگا کر پڑ گیا تھا۔ جب محسن پھر دلاور ... کا پیرا مقصد رہا تھا تو میں نے غالب کے بیڈ کے نیچے سے ... نکال اور اُسے لوڈ کرنے لگا۔ اس وقت میری غالب سے مختصر سی بات ہوئی اور میں نے مناسب سمجھا کہ آئندہ ... پروگرام سے آگاہ کر دوں۔

"دلاور کو کیفرِ حق کی تحویل میں دے کر جانے کی ضرورت ... غالب نے کہا "اس کے ہاتھ میں ریوالور ہوگا یہ نہ ہو کہ ... میں بھری ہوئی نفرت کا سارا زہر گولیوں کی صورت ... کے جسم میں اتر جائے۔"

"غالب غالب نے ٹھیک کہا۔" محسن بولا "یہ کام اسے ... رہو۔"

"مگر کیا یہ لنگڑا اس کا اہل ہے؟"

"وہ کوئی لنگڑا نہیں ہوگی جو اس کا راستہ روک لے جائے گی۔" غالب بولا۔

میں اور محسن باہر آئے تو رات کے گیارہ بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ میں نے ایک چادر میں اشٹین گن لپیٹ لی تھی۔ اور ریوالور محسن کی جیب میں تھا۔ ہم ابھی کسی خبر کی صحافیوں والے محلے میں تھے۔ پروگرام کے مطابق میں نے ایک پول پہ چڑھ کے اپنا فون لگایا اور پھر دلاور کے گھر کا نمبر ملایا۔ میرا خیال تھا کہ موجودہ حالات میں دلاور اور خسرو جمشید مستقل طور پر کسی ایک گھر میں نہیں رہ سکتے۔ دو چار ہفتے میں وہ ٹھکانا بدلتے ہوں گے تو ان کا سیل فون نمبر بھی بدل جاتا ہوگا۔ یہ خیال مجھے دلاور کا نیا فون نمبر نوٹ کر کے آیا تھا جو اس نے میرے سامنے ڈائل کیا تھا۔

"ہیلو۔" کسی بچے نے ریسیور اٹھا کے کہا۔

"یہ چوہدری دلاور صاحب کا گھر ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ تو گھر پر نہیں ہیں انکل۔" بچے نے کہا۔

"امی تو ہوں گی؟" میں نے سوچ کر کہا۔

"وہ نانی کے گھر گئی ہیں۔ آپ کون ہیں؟"

"میں ... تم نہیں جانتے۔ یہ بتاؤ کہ تمھارے گھر ایک انکل آتے ہیں جن کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ کالی شیروانی اور سفید پگڑی باندھتے ہیں۔ کالے رنگ کی مرسڈیز میں آتے ہیں۔ بالکل اپنے جیسے ایک ڈرائیور کے ساتھ۔ ان کا ڈرائیور بالکل انھی کی شکل کا ہے اور انھی کے جیسے کپڑے بھی پہنتا ہے۔"

"جی! وہ آتے تو ہیں ... انکل جمشید ... مگر وہ تو اکیلے آتے ہیں اور اپنی مرسڈیز خود چلاتے ہیں۔" بچے نے کہا۔

"اچھا! خیر یہ بتاؤ کہ ان کے گھر کا فون نمبر کیا ہے؟"

"جی وہ میں نہیں بتا سکتا۔ بابا نے منع کیا ہے کہ ..."

"ہاں بیٹا! غیروں کو کبھی کچھ نہیں بتانا چاہیے لیکن تمھارے انکل جمشید کا باپ ہوں۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو پھر آپ ٹھہریں میں دیکھ کے بتاتا ہوں۔" بچہ میری بات سے قائل ہو گیا۔ چند منٹ کے بعد اس نے نمبر بتا دیا۔ یہ نمبر دلاور کے دیے ہوئے نمبر سے مختلف نہیں تھا۔ میں نے بچے کا شکریہ ادا کیا اور ٹیلی فون انکوائری کا نمبر ملایا۔ رات کی ڈیوٹی دینے والی ایک آدم بیزار آپریٹر نے کہا "ہیلو۔"

"دیکھیے مس! میں ایئرپورٹ سے بول رہا ہوں۔"

"ہاں جی بولیں۔"

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"ہم یہاں مدد کس لیے بیٹھے ہیں سر!" آپریٹر نے کہا۔

www.paksociety.com

"میں ایک پتا معلوم کر رہا ہوں، میرے پاس صرف فون نمبر ہی ہے۔"
"کس کا فون ہے؟"
"وہاں رہنے تو خسرو جمشید ہیں، نواب خسرو جمشید لیکن وہ کرائے دار ہیں۔ فون شاید لینڈ لارڈ کے نام پر ہوگا۔ آپ مجھے پتا بتا دیں تو میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"
"دیکھیں جی، ایسے نہیں بتاتے ہم۔"
"کیوں؟ آپ کے پاس ترتیب وار نمبروں کی ڈائریکٹری ہو گی؟" میں نے کہا۔
"کون سے نمبروں کی؟"
"نیومیریکل ڈائریکٹری۔" میں نے کہا۔ "یہاں ہوتی تو میں دیکھ لیتا۔ اب میں کراچی سے لاہور پہنچا ہوں۔ انھوں نے لندن میں فون نمبر دیا تھا۔"
آپریٹر نے مجھے پتا بتا دیا۔ وہ زیادہ لمبی کہانی سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ میں نے نمبر سے خسرو جمشید کا نمبر ملایا۔ کسی لڑکی نے فون اٹھایا۔
"یہ نواب خسرو جمشید کا گھر ہے؟" میں نے کہا۔
"سوری، رانگ نمبر۔" اس نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ دوسری بار پھر ایسا ہی ہوا۔ میں نیچے اتر آیا۔
"معلوم نہیں کیا چکر ہے۔" میں نے کہا۔ "نمبر تو غلط نہیں لگتا لیکن وہاں کوئی لڑکی ہے جو یہ ماننے کو تیار نہیں ہے کہ وہاں کوئی نواب خسرو جمشید رہتے ہیں۔"
"کہیں اس کی سیکرٹری نہ ہو۔" محسن بولا۔
"کیا وہ ہر کال پر انکار کر دیتی ہے کہ رانگ نمبر؟ پھر بات کرنے والے کیسے بات کرتے ہیں؟" میں نے کہا۔
"بات کرنے والے پوچھتے نہیں ہوں گے... یا ان کے درمیان کوئی کوڈ ورڈ چلتا ہوگا۔ مثلاً یہ کہ کیا یہ لوکس شیخ کا گھر ہے اور وہ پوچھتی ہوگی کہ آپ کون؟ تو جواب دیا جاتا ہوگا کہ میں آلو ہوں... یا دوسرا آلو کا چھا ہوں وغیرہ وغیرہ۔" محسن نے کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے عزیزم کہ نواب خسرو جمشید ایک فرضی نام ہو، اصل نام کچھ اور ہو اور مجھ سے بات کی ہو گھر کی کسی ضرورت سے۔"
"نہیں، یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ ولاور کے گھر کے ایک مخبر نے بھی ایک انکشاف کیا ہے کہ خسرو جمشید جب وہاں جاتا ہے یعنی ولاور کے گھر تو گاڑی خود چلاتا ہے، اپنے ڈرائیور کو ساتھ نہیں رکھتا۔ کیا مطلب ہے آخر اس کا؟ وہ دوسرا شخص ہر جگہ نہیں جاتا، صرف خصوصی مواقع پر حسبِ ضرورت"
کرتا ہے۔"
ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والے ایک ٹیکسی ڈرائیور نے ہم پر بڑا احسان کیا کہ میٹر سے دس روپے زیادہ پر ماڈل کالونی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس عالیشان کوٹھی تک ویران علاقے میں آدھی رات کے وقت ہم پہنچے تو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے ہمیں ایک چوکیدار ملا جو کوٹھی کے دروازے پر کرسی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔
"نواب... کدھر کا نواب ہے؟" اس نے حیرت سے کہا۔
"ریاست جگرپور کا۔" محسن بولا۔
"تم نام کو چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "کالے رنگ کی بڑی گاڑی، کالی شیروانی، لمبی مونچھیں کلف لگی ہوئی اور ... پگڑی کا۔"
"اچھا اچھا... وہ ادھر سے گزرتا ہے۔ تم ادھر سے جاؤ پھر پیچھے والا لین ہے، بیس سے اوپر چوتھا کوٹھی۔ اکبر ایک چھڑوال جاٹ کا ہے۔" چوکیدار بولا۔
"بالکل ٹھیک۔" میں نے کہا۔ "یہ سب سے بڑی تصدیق ہے۔" ہم فوراً چل پڑے اور دس منٹ بعد کوٹھی کے گیٹ کے سامنے پہنچ گئے۔
"کیا سیدھا اندر جانا مناسب ہوگا؟" میں نے پورچ میں کھڑی ہوئی بالکل نئی مرسیڈیز کو دیکھ کر کہا۔ "خسرو جمشید واپس گھر آ چکا تھا۔"
"مجھے یہاں کوئی حفاظتی انتظام نظر نہیں آتا۔" محسن بولا۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خیال کی حد تک خیال والے نے اپنا دروازہ ہم جیسے لوگوں کے لیے کھلا چھوڑ دیا ہو؟ کیا وہ کوئی چوکیدار شامل نہیں۔"
"ممکن ہے کہ وہ ہر آنے والے کو اندر ہی دیکھ لیتا ہو۔ اسے فوراً خبر مل جاتی ہو کہ کوئی دروازے سے گزر رہا ہے۔"
"تو ہم دروازے سے نہیں گزرتے۔" میں نے کہا۔ "دیوار پھاند جاتے ہیں۔"
"دیواریں پھاندنا شرفا کا قاعدہ نہیں عزیزم۔" محسن بولا۔
"شرفا اب بے قاعدہ ہو گئے ہیں شیروانی صاحب۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ بقول شاعر، خط کبوتر کس طرح لے جائے بام یار پہ پر کترتے کوٹھی ہیں تیغیاں دیوار پہ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دیوار پر بھی نظر نہ آنے والی شعاعوں کا پہرا ہو۔"
"تیرا مطلب ہے انفرا ریڈ الارم؟"
"ہاں ایسے بر لگر الارم تو عام استعمال ہونے لگے ہیں۔" میں نے کہا۔ "دروازے سے بھی نہیں گزرنا اور دیوار بھی نہیں پھاندنا۔"

اس صورت میں ایک راستہ تو یہ ہے کہ ہم راکٹ کی طرح سیدھے اوپر پرواز کر جائیں اور پھر اندر گریں۔" محسن بولا۔ "دوسرا راستہ زمین میں سرنگ بنا کے نکالا جا سکتا ہے مگر کیا ہمارے پاس اتنا وقت ہے؟"
"وقت نہیں تو کیا عقل تو ہے۔" میں نے کہا۔
"اور ایجاد ضرورت کی بیٹی ہے۔" محسن بولا۔ "چلیے قبلہ پہلے آپ۔"
اس نے ایک درخت کی جانب اشارہ کیا تھا جسے میں غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ درختوں پر چڑھنا بچپن میں میرا محبوب مشغلہ تھا مگر اس کے بعد بیس سال تک درختوں کے نیچے سے گزرتا رہا اور بلندی پر پہنچنے کے لیے لفٹ استعمال کی لیکن کچھ عرصہ قبل فون کے کھمبوں پر چڑھنے کی جو مشق کی تھی، وہ کام آئی۔ میں درخت پر چڑھا اور اس آخری شاخ تک گیا جو دیوار کے اوپر سے گزر کر کوٹھی کے لان تک پہنچی تھی۔ جب آخر میں پہنچا اور میرے وزن سے شاخ کے ٹوٹنے کا امکان پیدا ہونے لگا تو میں جھول کر نیچے لٹک گیا اور پھر ہاتھ چھوڑ دیے۔
محسن میرے پیچھے تھا مگر وہ مجھ سے زیادہ ماہر درخت باز ثابت ہوا۔ جب میں نے محفوظ علاقے میں لینڈ کیا تو وہ استقبالیہ انداز میں مسکراتا ہوا ملا۔ اس نے مجھے خوش آمدید کہا اور مجھ سے مصافحہ بھی کیا۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ میں نے دائیں جانب سے اور محسن نے بائیں طرف سے کوٹھی کا ایک راؤنڈ لگایا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کوٹھی کے نقشے کا کون سا دروازہ اندر پہنچنے کے لیے سب سے موزوں رہے گا۔ ہم عقبی دیوار کے وسط میں ملے۔
"ایک روشن دان ہے ادھر۔" محسن نے سرگوشی میں کہا۔ "غالباً باتھ روم کا حصہ ہے۔ اس میں پٹ نہیں ہے۔"
"تو جالی یا سلاخیں ہوں گی؟" میں نے کہا۔
"نہیں، غالباً پٹ نکل گیا ہے۔ وہ گھومنے والا پٹ تھا۔ ڈوری کھینچ کے بند کرتے اور کھولتے ہیں۔" محسن بولا۔
میں نے محسن کے کندھوں پر سوار ہو کے روشن دان میں جھانکا۔ یہ باتھ روم ہی تھا جس میں لائٹ جل رہی تھی۔ اس روشن دان کے نیچے انگلش اسٹائل کا ڈبلیو سی لگا ہوا تھا۔ میں نے بازوؤں کے زور پر خود کو اٹھایا اور اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے اندر کی جانب جھکا۔ سر تکلنے کے لیے کر کیا سامنے کی طرف اتر سکتا ہوں۔ اگر میری جگہ سرکس میں کام کرنے والا کوئی بازی گر ہوتا جو فضا میں معلق جھولوں سے پیروں کے سہارے لٹک جاتے ہیں تو کہیں بھی روشن دان کی چوکھٹ سے پکڑ سکتا تھا۔
لیکن میں نے سر کے بل ڈبلیو سی میں گرنے سے گریز کیا۔ میں واپس آیا اور دوبارہ یوں کیا کہ محسن نے چادر کا ایک کونا میری ایک ٹانگ میں ٹخنے سے ذرا اوپر گرہ دے کر مضبوطی سے باندھ دیا تھا۔ یہ وہی چادر تھی جس میں ابھی تک مشین گن لپٹی ہوئی تھی۔ روشن دان سے آدھا گزر جانے کے بعد محسن ہی باہر سے چادر کا دوسرا کونا تھام کے سنبھال سکتا تھا۔
"گانٹھ ذرا مضبوط رکھنا دوست، کہیں چادر سے ہی ترمیم نہ ہو جائے۔"
"ہم بہت سے محاورے بدل چکے ہیں۔" محسن بولا۔ "یہ کس کا حوالہ ہے؟"
"ایسا نہ ہو کہ پانچوں روشن دان میں اور سر ڈبلیو سی میں ہو۔" میں نے کہا۔ "یا روشن دان سے گر کر فلش میں اٹکا۔"
"آؤں گا تو میں بھی ساتھ ہی۔" محسن بولا۔ "چڑھ جا بیٹا سولی پہ، رام بھلی کریں گے۔"
میں سانپ کی طرح اندر لٹکا اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ نیچے رکھے۔ میرا سارا وزن ایک بندھی ہوئی ٹانگ پر آ گیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ میرا پیر ٹخنے کے پاس سے نکل کر الگ ہو جائے

www.paksociety.com

گا پھر وہی ہوگا یعنی میں سر کے بل فرش میں گڑ جاؤں گا اور محسن باہر رہ جائے گا مگر محسن آہستہ آہستہ ڈھیل چھوڑتا گیا اور میں نیچے پہنچ گیا۔ ڈیلیوری فرش سے ڈیڑھ دو فٹ اوپر تھا، اس کے کنارے پر ہاتھ رکھتے ہی میں محفوظ ہو گیا۔

اندر اترنے کے بعد میں نے چادر کا کونا کھول کر ایک جھٹکا دیا اور محسن نے دوسرے کونے پر مشین گن باندھ کے اوپر کی۔ میں نے اسے اندر کھینچ لیا اور چادر کا کونا پھر باہر پھینک دیا۔ دوسری بار محسن نے اسے ہاتھوں سے پکڑا اور پیر دیوار پر رکھ کے اوپر چڑھا تھا۔ جب وہ روشن دان کی منڈیر تک پہنچ گیا تو اس نے پہلے ایک ہاتھ سے روشن دان کا کنارا تھاما اور پھر چادر کو چھوڑ دیا۔ میں نے چادر اندر کھینچ لی اور محسن کو سنبھال لیا جو روشن دان سے اندر لٹک آیا تھا۔

سب سے خطرناک مرحلہ کامیابی سے طے ہو گیا تھا۔ اس میں چند پر تشویش لمحے ضرور آئے تھے مثلاً اس وقت جب مشین گن دیوار سے رگڑ کھاتی اوپر آئی تھی تو معمولی سی آواز پیدا ہوئی تھی اور اس وقت جب میں نے ڈیلیوری پر ہاتھوں سے اپنا وزن ڈالا تھا تو میرے پیر دیوار پر لگے تھے یا اس وقت جب محسن کا سر روشن دان کی چوکھٹ پر لگا تھا مگر ان خفیف سی آوازوں سے اندر کسی کو متوجہ نہیں کیا تھا۔

چونکہ ریڈیو اور ٹی وی کی نشریات ختم ہو چکی تھیں، اس لیے اندر مکمل خاموشی تھی۔ میں نے دروازے کے ہینڈل کو آہستہ سے گھمایا اور دروازہ کھولا جو منظر یک لخت میری نظروں کے سامنے آیا اس نے مجھے مبہوت کر دیا۔ یہ ایک بیڈروم تھا۔ تقریباً اٹھارہ فٹ لمبا اور چوڑا۔ اس کے ایک حصے میں جو دائیں جانب تھا کوئی لڑکی بڑے انہماک کے ساتھ ایزل پر چڑھے ہوئے کینوس پر روغنی رنگوں سے ایک تصویر بنا رہی تھی، اگر وہ اپنے کام میں مگن نہ ہوتی تو وہ کھٹکا ضرور سنتی یعنی جو باتھ روم کا دروازہ کھلنے سے ہوا تھا۔

میری طرف اس کی پشت تھی۔ پشت کی جانب سے اس کا نظارہ بہت نظر نواز تھا۔ اس کی لمبی اور موٹی چوٹی کمر سے نیچے تک لٹکی ہوئی تھی۔ اس کی کرچست قمیص میں مشکل سے دو بالشت لگتی تھی۔ وہ ساٹن کے سفید غرارے میں تھی چنانچہ قمیص مختصر تھی اور اس کے وجود کی ساری نزاکت اپنے تمام ہوشربا نشیب و فراز کے ساتھ عیاں تھی۔ دوپٹے کو اس نے پلنگ کے کنارے پر ڈال دیا تھا کیونکہ اسے یہاں اپنے سوا کسی کی نظر نہیں دیکھ رہی تھی۔

غرارہ ایک مشکل مگر خوبصورت لباس ہے۔ دوشیزگی کے حسن کی علامت، نسوانیت کے تحفظ سے منسوب، مشرقی کی تاریخ کے ایک جاودان دور کی علامت، ایک تہذیب کا ورثہ جس میں ادب آداب، تکلفات اور رکھ رکھاؤ کو بہت دخل تھا۔ اب لڑکیاں کہیں تنگ اور کھلے پائنچوں کی شلواریں پہنتی ہیں۔ بیل باٹم پاجامے پہنتی ہیں یا پتلون پہنتی ہیں یا ساریاں باندھتی ہیں۔ لباس میں غرارہ دلہن صرف تقریبات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

مصورہ کے بعد میں نے تصویر کو دیکھا جو میرے سامنے تھی۔ یہ کسی عورت کی تصویر تھی، ایک عمر رسیدہ عورت جو لباس اور زیورات سے، جس کے پُر تمکنت چہرے اور آنکھوں کے پُر تحکم، پُر غرور اور پُر اعتماد انداز سے کسی ریاست کی والی یا ملکہ لگتی تھی۔ اس کی صورت کے نقوش کو اجاگر کرنے میں مصورہ نے کمال فن کا ثبوت دیا تھا۔ وہ لڑکی بلاشبہ ایک خداداد صلاحیت سے بھرپور فائدہ اٹھانے پر تلی ہوئی تھی مگر جس چیز نے مجھے حیران کیا وہ تصویر کے چہرے سے شناسائی کا احساس تھا۔ میرے ذہن میں بہت سی صورتیں آئیں۔ ملکہ نور جہاں، ممتاز محل، چاند بی بی، رضیہ سلطانہ، جھانسی کی رانی، زیب النساء مگر یہ تاریخ کے کسی حوالے سے ذہن میں آنے والی شخصیت نہیں تھی۔ فوری طور پر میرے ذہن میں کسی کا نام نہیں آیا، بس ایک شناسائی کا تاثر قائم رہا۔ تھوڑے سے فاصلے سے میں اس پیکر حسن کے جمال آفریں ہاتھوں کو اپنی تخلیق سے زبان خاموشی میں ہم کلام دیکھتا رہا۔ وہ اس تصویر سے کچھ کہہ رہی تھی یا پھر سن رہی تھی۔ خالق اور مخلوق کے درمیان جو رابطہ باہمی رہتا ہے، وہ احساس اور خیال کا منفرد تجربہ ہوتا ہے جسے کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔ میرے پیچھے محسن تھا جو تھوڑا سا پنجوں کے بل اٹھ کے یہی دیکھ رہا تھا اور شاید یہی سوچ رہا تھا۔

ہمارے جذبات وقتی طور پر ہمارے فرض کی راہ میں حائل ہو گئے تھے کیسی دلاویز کے گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوتے یا کسی شکاری کی پناہ گاہ پر شب خون مارتے وقت ہم کسی احساس جرم و ندامت سے نہیں اپنی فتح مندی اور قوت کے احساس سے سرشار ہوتے تھے مگر یہ ایک لڑکی، ایک خوبصورت نازک اندام لڑکی کی خواب گاہ تھی اور وہ لڑکی ہم بادہ سے قتل و خونریزی، تخریب کاری اور دہشت گردی سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی تھی اور وہ فنکار تھی۔ رنگ آمیزی سے فطرت کو کینوس پر دوام عطا کرنے والی۔ اس کی خلوت میں مشین گن کے ساتھ قدم رکھنا مجھے جرم سے کم نہ لگا۔

میں دبے پاؤں اس کے پیچھے پہنچا اور عین اس وقت جب اس کا ہاتھ تصویر کو برش سے چھونے کے لیے آگے بڑھا میرے ہاتھ نے پیچھے سے اس کو دبوچ لیا۔ وہ بری طرح

سنبھالا لیکن میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر اتنی سختی سے جم گیا تھا کہ اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ میرے دوسرے ہاتھ نے اس کی کمر میں پیچھے سے ہاتھ ڈال کے اسے بے بس کر دیا پھر محسن ریوالور لے کر اس کے سامنے آ گیا۔

"ہم چور ڈاکو نہیں ہیں" محسن نے نرم شائستہ لہجے میں آہستہ سے کہا۔ "اور تمہیں نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے لیکن تمہیں ہم سے تعاون کرنا ہوگا۔ فی الحال صرف اس حد تک کہ تم خاموش رہو گی۔" میں نے کہا، لڑکی نے آہستہ سے سر کو اقرار میں جنبش دی۔

"تم بہت اچھی مصورہ ہو۔" محسن نے کہا۔ "لیکن ہم بڑے اچھے شکاری ہیں۔ کسی تم جیسی خوبصورت اور معصوم ہرنی کو مارنا ہمارا شیوہ نہیں۔ ہم سفاک بھیڑیوں اور خونی درندوں کے شکاری ہیں۔ لیکن مجبوری بن جائے تو غزال کا گوشت حرام نہیں ہو جاتا۔" پھر محسن نے کہا۔ "تم ایک فنکارہ ہو۔ یقین کرو ہمیں بہت رنج ہوگا اگر تم نے ہماری بات نہ مانی اور ہمیں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرنا پڑی۔" میں نے مزید کہا۔ اس نے پھر رضامندی کا اظہار کیا اور میں نے اس پر اپنی گرفت کو کچھ کم کیا۔ آہستہ آہستہ اس کے منہ پر سے اپنا ہاتھ ہٹایا لیکن پوری طرح چوکس رہتے ہوئے کہ وہ چیخ مارنے کا ارادہ بھی کرے تو اس کی آواز حلق میں ہی روک دوں۔ وہ میرے ہاتھوں میں اسی طرح لرز رہی تھی جیسے بچپن میں چڑیا کو پکڑ لیتا تھا تو اس کا نرم گرم وجود میری ہتھیلی میں کانپتا رہتا تھا۔

جب میں نے اس کا رخ اپنی طرف کیا تو یک لخت مجھ پر تصویر کی اور اس کی صورت میں مشابہت کا انکشاف ہوا۔ دونوں میں فرق صرف ماضی و حال کا تھا اور ماہ و سال کا تھا۔ غالباً وہ اپنی ماں کی تصویر بنا رہی تھی۔ ماں پیکر جمال تھی تو بیٹی پیکر جمال۔ مگر اندازہ ہوتا تھا کہ جب وہ اپنے دور شباب سے گزری ہوگی تو اس کا حسن بے مثال کا نقش ثانی رہی ہوگی جو اب ہمارے روبرو تھا۔

"ہم... اپنا دوپٹہ اٹھا لیں؟" اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا اور میں چونک پڑا۔ میرے دل میں کوئی برا خیال نہیں تھا اور ذہنی کیفیت بری تھی۔ حسن تصویر کا ہو، مناظر فطرت کا یا عورت کا، دل پہ اثر تو کرتا ہی ہے مگر وہ ایک جوان لڑکی تھی جس کی خواب گاہ میں نصف شب کو دو مسلح اور جوان مرد گھس آئے تھے اور وہ دونوں ہی مسلسل گھور بھی رہے تھے۔ اس کا وحشت زدہ ہونا فطری امر تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ سینے پر سمیٹے کھڑی تھی۔

"آپ تشریف رکھیں۔" میں نے کہا۔ "میں معافی چاہتا ہوں بد نظری کے مظاہرے پر۔"

اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا اور بڑی بڑی کالی آنکھوں میں خوف اترا ہوا تھا۔ ابھی تک اسے یقین نہیں آیا تھا کہ اتنی مہذب گفتگو کرنے کے باوجود ہم مہذب ثابت بھی ہوں گے اور بالآخر اپنی مردانگی اور درندگی کا مظاہرہ نہیں کریں گے جس کے سامنے ایک تنہا اور کمزور عورت اتنی ہی بے بس اور مجبور ہوتی ہے جتنا کسی سیلاب کے سامنے ایک حقیر تنکا، وہ ڈرتے ڈرتے بیڈ کی طرف بڑھی لیکن اس کی نظر ایک لمحے کے لیے بھی ہم پر سے نہیں ہٹی۔ اس کے ہاتھ نے شیفون کے دوپٹے کو کھینچ لیا تو اسے تھوڑا سا اعتماد اور اطمینان حاصل ہوا، وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی پھر اس نے بیڈ سائڈ ٹیبل کی طرف دیکھا۔

"ہم... پانی پی لیں تھوڑا سا...؟" وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کے بولی۔

میں نے آگے بڑھ کے وہ شیشے کا گلاس اٹھایا جس پر موتیوں کے کام والا سفید دھاگے سے بنا ہوا کور پڑا تھا۔ میں نے وہ گلاس اٹھا کے اسے مؤدبانہ انداز میں پیش کیا اور مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کا تاثر مزید کم ہوا اور تھوڑی سی حیرانی کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے ایک نظر میری مشین گن کو دیکھا جو میرے ایک ہاتھ میں تھی اور پھر اس گلاس کو جو میں اسے پیش کر رہا تھا۔ اس لڑکی نے اپنی معصومیت سے اور اپنی گفتگو کے معصوم انداز سے مجھے واقعی شرمسار کر دیا تھا۔ پانی کے دو گھونٹ لے کر اس نے گلاس مجھے تھما دیا۔ جیسے میں اس کا خادم خاص ہوں۔

"شکریہ۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں ہم سے؟"

"آپ سے صرف تعاون۔" میں نے گلاس رکھ کے کہا۔

"ہم سمجھے نہیں۔" وہ بولی۔

"دیکھیے، ہم نواب خسرو جمشید سے ملنے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ انہی کا گھر ہے نا؟"

اس نے چند سیکنڈ مجھے نظر جما کے دیکھا اور آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ... کیا کہہ رہے ہیں، وہ تو نانا تھے ہمارے اور ان کے انتقال کو بہت عرصہ ہوا۔ وہ اپنے آبائی محل میں مدفون ہیں۔ ہم سچ کہہ رہے ہیں۔"

"یہ... آپ کی والدہ ہیں؟" میں نے تصویر کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ ہماری نانی ہیں۔" وہ بولی۔ "نواب بیگم خلد آشیانی۔"

"اچھا، یہاں ایک صاحب ہیں، ... جو بڑے قد کے جو بالکل نوابی ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم ان کی گاڑی کو پہچانتے ہیں، یہ جو باہر کھڑی ہے۔" "یہ غالباً نانی کی ہے،" انہوں نے۔ "اس سے قبل جو گاڑی ان کے

www.paksociety.com

پاس تھی اور وہ بھی مایوس ہی تھی۔

"اُن کی بھی لمبی مونچھیں ہیں؟" محسن نے غیر موجود مونچھوں کو بل دے کر کہا۔ "سر پر پگڑی باندھتے ہیں جس کا طرہ ایک ہاتھ اُوپر رہتا ہے۔ سیاہ شیروانی۔۔۔"

"ہم سمجھ گئے۔ آپ بھائی جان کی بات کر رہے ہیں۔" وہ بولی۔

"آپ کے بھائی؟" میں نے کہا۔

"جی۔ ہمارے سب سے بڑے بھائی۔" وہ بولی۔

"کیا نام ہے اُن کا؟"

"مرشد رضا خاں۔ کیا آپ نہیں جانتے؟" وہ بولی۔

"جانتے تو آپ سے کیوں پوچھتے؟" محسن نے کہا۔

"عجیب بات ہے۔ آپ اُن کا نام نہیں جانتے لیکن نانا مرحوم کا نام جانتے ہیں۔ ان کا حلیہ بھی آپ نے درست بتایا۔ گویا آپ انھیں دیکھ بھی چکے ہیں۔ آپ نے ان کے گھر کا بھی سراغ لگا لیا اور۔۔۔ آخر ان سے کیا چاہتے ہیں آپ لوگ۔۔۔ ہمیں پریشانی اور وحشت ہونے لگی ہے۔ کون ہیں آپ۔۔۔ نصیبِ دُشمناں۔۔۔"

"آپ بلاوجہ پریشان نہ ہوں، ہم بھی انھیں قتل کرنے نہیں آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صرف ملاقات مقصود تھی۔"

"لیکن ان سے ملنے کوئی اس طرح نہیں آتا۔ آپ لوگوں کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔" وہ بولی۔ "آپ کو ہماری قسم۔۔۔"

"خواہ مخواہ کی قسموں سے ہم پابند نہیں ہوتے۔" میں نے جھلا کے کہا۔ "یہ بتا دیجیے کہ وہ کہاں ہیں؟"

"وہ۔۔۔ اپنی خواب گاہ میں ہوں گے۔" وہ پھر سہم گئی۔

"آپ ہمیں اُن کی خواب گاہ تک لے چلیں۔" میں نے کہا۔

"ہم؟ آپ کے ساتھ۔۔۔؟" اُس نے گھبرا کے کہا اور غالباً خشک حلق کو تر کرنے کے لیے تھوک نگلا۔ "ہم نہیں جا سکتے۔ بالکل نہیں جا سکتے۔"

"آخر کیوں؟" میں نے اُس کی حیا سے لال ہوتی صورت دیکھ کر کہا۔

"ہم۔۔۔ یہ بھی نہیں بتا سکتے۔" وہ بڑی مشکل سے بولی۔ "ہم آپ کو بھی روک سکتے تو ضرور روکتے کہ اس وقت وہاں نہ جائیے۔ بس مل بیٹھیے گا مگر آپ لوگ ماننے والے کہاں ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے خاتون۔ ہم کو ابھی اور اسی وقت ملنا ہے۔ آپ اگر ڈرتی ہیں تو اسی کمرے میں ٹھہریے۔ ہمیں بتا دیجیے کہ اُن کا بیڈ روم کون سا ہے۔" میں نے کہا۔

"ویسے ہم خود بھی تلاش کر سکتے ہیں۔" محسن بولا۔

"آپ باہر جا کے دیکھیں گے تو راہداری ہے۔ اس پار بائیں طرف آخر میں ٹی وی لاؤنج ہے۔" تو وہ بولی۔ "لاؤنج کے دائیں طرف ان کی خواب گاہ ہے۔ آپ ہماری مانیں تو ابھی نہ جائیں۔"

میں نے مشین گن محسن کو دی۔ "تم جا کے نواب صاحب کو اُٹھا لاؤ۔"

لڑکی نے ایک مرتبہ پھر کچھ کہنا چاہا، مگر محسن کو دروازے کی سمت بڑھتا دیکھ کے خاموش ہو گئی۔ اُس کی معصومیت بے بسی کے ساتھ پریشانی عیاں تھی۔

"آپ لوگ ویسے تو شریفانہ گفتگو کرتے ہیں۔ بظاہر تعلیم یافتہ بھی لگتے ہیں۔" وہ بولی۔ "لیکن ہم کسی طرح بھی آپ کے طرزِ عمل کو شریفانہ نہیں سمجھ سکتے۔ اس طرح اسلحے لے کر کسی کے گھر میں داخل ہونا جرم ہی تو ہے۔ کیا چاہتے ہیں آخر آپ لوگ۔۔۔؟"

"آپ بڑی اچھی مصورہ ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا آپ نانا جانی کے دشمن تھے؟ اور اب اُن کا کوئی بدلہ بھائی جان سے لینے آئے ہیں؟" وہ بولی۔

"آپ نے کہا تھا کہ یہ آپ کے سب سے بڑے بھائی ہیں، گویا ان سے چھوٹے بھی ہیں؟" ہم دونوں ایک دوسرے کے سوالات کو نظر انداز کر رہے تھے۔

"جی ان سے چھوٹے ارشد رضا ہیں۔۔۔ لندن میں۔۔۔ انھوں نے وہاں کسی انگریز لڑکی سے شادی کی ہے اور وہیں کے ہو گئے ہیں۔ ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔" وہ بولی۔

"کیا آپ جانتی ہیں، میرا مطلب ہے کہ کیا آپ کے نانا واقعی نواب تھے؟"

"واقعی کا کیا مطلب؟" اس کے لہجے میں خفگی اور رنج کا احساس نمایاں ہو گیا۔ "وہ صحیح نواب تھے۔ ریاست جب ضم ہو گئی تو یہاں چلے آئے۔"

"اور اب آپ کے یہ بھائی مرشد رضا خاں، یہ خود کو نواب سمجھتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "کیا کرتے ہیں؟"

اس کا چہرہ میرے اندازِ گفتگو سے تاریک ہو گیا۔ "آپ کو ہم کیا بتائیں۔ آپ کے نزدیک تو نواب بس ایسے ہی ہیں جیسے نانبائی یا قوال اور حکیم۔ خاندانی نجابت اور عظمت کیا ایک برابر ہو گئی ہیں۔ نانا حکومت کرتے تھے، اپنی رعایا کے دلوں پر بھی۔ ان کے بعد حکومت نہیں رہی لیکن عزت تو ہے۔ کیا مرشد رضا خاں یہاں پھل فروخت کریں گے۔۔۔ مویشی پالیں گے؟"

میں اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ معلوم نہیں وہ کس قسم کی دُنیا کی مخلوق تھی۔ "میرا مطلب تھا آمدنی کے ذرائع سے۔"

"یہ ہم کیا جانیں۔ ہمارا کام ہی نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "ہمیں منوالا کہ کا سمجھا جاتا ہے۔ یہ حویلی آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس کی شان و شوکت نہیں کہہ سکتے لیکن اس طرح زندگی کے واسطے آمدنی کا معمولی وسیلہ کافی نہیں ہو سکتا۔ کوئی ملازمت نہ کرتے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں۔ تجارت میں ہوتے تو ہم بتا دیتے۔"

"پھر آپ کے خیال میں یہ آمدنی کیسے ہوتی ہے؟ عقل یا اٹکل ہے آپ کی؟" میں نے اُس ناداں لڑکی کو افسوس سے دیکھا۔

"سب کو جاگیر کے بدلے جاگیر ملی تھی جن کے چھوٹے چھوٹے مکانات تھے۔ انھوں نے بھی کلیم داخل کیے تھے پھر کیا نواب خسرو جمشید کے وارثوں کو حکومت نے کچھ نہ دیا ہوگا۔ وہ جاتے رہتے ہیں اپنی زمینوں کے انتظام و انصرام کے لیے۔"

"انتظام و انصرام۔۔۔ بہت خوب۔" میں نے کہا۔ "تو آپ نے کبھی دلچسپی نہیں لی، کبھی نہیں پوچھا ان سے؟"

"ہمیں کیا ضرورت ہے؟ جب ہماری ہر ضرورت پوری ہوتی ہے۔ گھر میں خادم ہیں۔ آرام و آسائش کے اسباب ہیں۔ فرمائش کرتے ہی ہر چیز حاضر ہو جاتی ہے۔ ہم جو چاہتے ہیں خود ہی لے آتے ہیں۔ ہماری گاڑی الگ ہے۔ ہمارا ڈرائیور الگ ہے اور ہماری دلچسپی کے اسباب الگ ہیں۔ ہم کو شوق ہے تصویریں بنانے کا، ریکارڈ جمع کرنے کا اور گانے کا۔" وہ بولی۔ "ہم باقاعدہ ریاض کرتے ہیں اور ہمیں موسیقی کی تعلیم دینے کے لیے۔۔۔" اس کی بات فائرنگ کی آواز میں ادھوری رہ گئی۔ یہ آواز اندر کی طرف سے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی بڑی پُراذیت آواز میں چلّایا جیسے وہ ذبح کے کرب کا شکار ہو۔ پھر کوئی عورت چلائی۔

"یا اللہ۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے چلائی۔ وہ دروازے کی طرف دیوانہ وار دوڑی۔ "بھائی جان!" میں نے اُسے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ بازو چھڑا کے نکل گئی۔ "آپ چھوڑیے ہمیں! آپ لوگ قاتل ہیں، خونی ہیں۔" وہ چیختی ہوئی راہداری میں آگے آگے بھاگنے لگی۔

"زیب النسا۔" نواب خسرو جمشید کی بارعب آواز سنائی دی۔ "ادھر کمرے میں آ جائیے۔ ہم ٹھیک ہیں۔"

"آپ۔۔۔ آپ ٹھیک ہیں؟" زیب النسا ایک دم اس سے لپٹ گئی۔ "ہم سمجھے ان لوگوں نے۔۔۔"

"ہم نے کہا نا کہ ہم ٹھیک ہیں۔ آپ کا یہ رویہ بالکل نامناسب ہے۔ نامحرموں کے سامنے۔" وہ شخص جسے ہم نواب خسرو جمشید کے نام سے جانتے تھے اور جو درحقیقت مرشد رضا خاں تھا، اس وقت بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ اس کا لب و لہجہ بدل گیا تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تو وہ ٹی وی لاؤنج میں کھڑا ہوا تھا اور صرف انڈرویئر میں تھا۔

"بیٹھے۔ آپ اندر جائیے۔" جمشید نے چھوٹی بہن کو حکم دیا۔ شاید ایسا پہلے کبھی نہ ہوا ہوگا کہ وہ صرف انڈرویئر میں ہو اور بہن اس سے لپٹ جائے۔ زیب النسا نے اُسے چھوڑ دیا۔ پلٹی اور ڈرتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ٹی وی لاؤنج ایک وسیع برآمدہ سا تھا جس کی ایک دیوار کے برابر کھڑکی کے سارے پٹ شیشے کے تھے۔ اس شیشے کی دیوار کا نصف سے زیادہ حصہ مخمل کے سُرخ بھاری پردوں کے پیچھے تھا۔ باقی نصف میں سے باہر کی رات نظر آتی تھی۔ اندھیری، سنسان، تاروں بھرے آسمان والی۔ لاؤنج کے وسط میں چھت سے فانوس معلق تھا جس کی روشنی نیچے بچھے ہوئے سُرخ اور نیلے حاشیوں والے کاشانی قالینوں پر پڑ رہی تھی۔ چند قدم پیچھے قالین پر ایک عورت بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ عورت کے جسم پر لباس برائے نام تھا اور وہ ایک گداز بدن والی جوان عورت تھی۔ اس کے جسمانی خدوخال اور رنگ و رُوپ سب اس کی تروتازہ جوانی کا اشتہار دے رہے تھے۔ عورت کے پیچھے دروازہ کھلا ہوا تھا اور میں نواب خسرو جمشید کے عشرت کدے کی مدھم روشنیوں میں ایک چھپر کھٹ دیکھ سکتا تھا جس کے گرد نفیس پردے تھے۔ یہ بالکل الف لیلوی انداز کی خوابگاہ کا منظر تھا اور اب میں زیب النسا کے انکار کا سبب سمجھ سکتا تھا کہ وہ کیوں اس وقت اپنے بھائی کے بیڈ روم کی جانب جانے سے گریزاں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہوگا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس ماحول میں بھی وہ اپنی مصوری کے ذوق اور اپنی نجابت پر معصوم غرور کے احساس کو زندہ رکھے ہوئے تھی اور تمام شرانگیز خیالوں اور پریشان کرنے والے سوالوں سے محفوظ اپنے کمرے میں اپنی تصوراتی دُنیا آباد کیے زندہ تھی۔

نواب خسرو جمشید کے کسی جاں نثار محافظ نے محسن کا راستہ روکنے کی غلطی کی تھی اور مارا گیا تھا۔ اس کی لاش خون میں لتھڑی ہوئی دوسری طرف اُلٹی پڑی تھی۔ فائرنگ کی آواز پر بیدار ہو کر نکل آنے والے دو ملازم اپنے مالک و آقا کے ساتھ ہی ہاتھ اُٹھائے کھڑے ہو گئے تھے اور ان کی خوفزدہ نظریں ہم دونوں سے رحم کی بھیک مانگتی محسوس ہوتی تھیں۔ نواب اس مضحکہ خیز پوز میں اُن کے سامنے کبھی نہ آیا تھا۔

"چلو تم لوگ بھی جاؤ۔" خسرو جمشید نے اپنے نمک خواروں کو حکم دیا۔

"کوئی کہیں نہیں جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "اس وقت وہی ہوگا جو ہم کہیں گے۔ جمشید! تم کو مناسب کپڑے پہننے کے لیے پانچ منٹ ملیں گے پھر تم کو ہمارے ساتھ جانا ہے۔"

"تم دونوں اُدھر چلو۔ زیب النسا کے کمرے میں۔" میں

www.paksociety.com

سے دونوں تھر تھر کانپتے ہوئے نوکروں کو ریوالور سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا خیال رکھنا وہ کہیں فون نہ کر دے کسی کو۔" محسن بولا۔

"فون نہیں ہے اس کے کمرے میں۔" میں نے کہا۔

"وہ باہر نہ نکل جائے۔" محسن بولا۔

"تم فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "میں ان کو کہیں بند کر کے آتا ہوں۔ اتنی دیر میں نواب صاحب تیار ہو جائیں گے۔"

جب میں دونوں نوکروں کے پیچھے چلتا ہوا دوبارہ زیب النساء کے کمرے میں پہنچا تو وہ فرش پر دو زانو بیٹھی چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے زار و قطار رو رہی تھی مگر اس کے رونے کی آواز بھی اتنی کم تھی کہ باہر نہیں سنی جا سکتی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے اور اشکبار آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ "آپ جو چاہیں لے جائیں۔ ہم کچھ نہیں کہیں گے۔" اس نے اپنے گلے سے نیکلس اتارا اور پھر کانوں سے ٹاپس اتارنے لگی جو سب ہیرے کے تھے۔ "ہم کسی کو کچھ بتائیں گے بھی نہیں۔ ہم قسم کھاتے ہیں مگر آپ بھائی جان کو چھوڑ دیجیے۔ انہیں مت ماریے۔ آپ کو ہمارے سر کی قسم۔"

سخت سنگین صورت حال کے باوجود میں اس قسم پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ "مس زیب النساء! اپنے آنسو مت گنوائیے اور انہیں ضائع مت کیجیے۔ مجھے آپ سے کیا اور آپ کے سر عزیز سے کیا لینا۔ نہ ہی یہ سب چھیننے آیا ہوں جو آپ مجھے پیش کر رہی ہیں۔ گو آپ کا حسن اس کا محتاج نہیں مگر یہ پھر پہن لیجیے۔ اپنے سب زیورات آپ کو مبارک ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا ارادہ آپ کے بھائی کی جان لینے کا بالکل نہیں ہے۔ نہ مجھے ان کا مال چاہیے۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے بڑی نزاکت سے پلو کے کونے سے اپنی آنکھیں صاف کر کے مجھے دیکھا۔ اس کا نازک جسم اب بھی سسکیوں کی زد میں ہچکولے لے رہا تھا۔ "پھر کیا چاہیے آپ کو؟ کس لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں آپ؟"

"ہم آپ کے بھائی جان کو ساتھ لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"یا اللہ!" اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کے کہا۔ "کہاں؟"

"یہ ہم نہیں بتا سکتے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کیونکہ آپ بھی ساتھ ہی ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"خدارا ایسا مت کیجیے، ہم مر جائیں گے، آپ کو قسم...."

"پھر وہی قسم۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "بس اب خاموشی سے وہی کیجیے جو ہم کہتے ہیں۔ یہ ہمارا وعدہ کہ نہ آپ کو کچھ ہو گا نہ آپ کے بھائی جان کو مگر ان کو ذرا سمجھا دیجیے گا کہ ہم گولی مارنے میں دیر نہیں لگاتے اور وہ بہادر نہ بنیں ورنہ آپ دنیا میں اکیلی رہ جائیں گی۔"

اتنی دیر میں خسرو جمشید پاجامہ کرتہ اور شیروانی والے لباس میں تیار ہو کے پہنچا۔ میں نے اس کے دونوں نوکروں کو باندھ کے باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔ وہ بے حد فرماں بردار ثابت ہوئے تھے اور ان میں سے ایک نے دوسرے کو باندھا تھا۔ وہی چادر پھاڑ کے جو ہم ساتھ لائے تھے پھر دوسرے نے رضاکارانہ طور پر خود کو میرے حوالے کر دیا تھا۔ انھوں نے منہ بھی خود ہی کھول دیے تھے کہ ان میں کپڑا ٹھونس دوں اور پھر خاموشی سے باتھ روم تک چلے گئے تھے۔ زیب النساء نے یہ سب پتھرائی ہوئی دہشت زدہ نظروں سے دیکھا تھا۔ مجھے تعجب تھا کہ وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔

"گھر میں کوئی اور تو نہیں ہے جو بعد میں ہنگامہ کرے؟" میں نے کہا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے سارے کمروں میں جھانک لیا تھا۔"

"ہماری آپا اماں ہیں۔" زیب النساء نے سوچ کے کہا۔

خسرو جمشید نے اسے گھور کے دیکھا۔ "وہ ایک مجبور بوڑھی عورت ہے جو دنیا میں زیب النساء کے سوا کسی کو جانتی ہے اور نہ پہچانتی ہے۔"

"وہ اگر زیب النساء کو خطرہ لاحق دیکھے گی تو ضرور خطرے کا الارم بجائے گی۔" میں نے کہا۔

"اور زیب النساء کو غائب پائے گی تب بھی شور مچائے گی۔" محسن بولا۔ "کیوں نہ اسے بھی...."

"نہیں، ایسا مت کیجیے۔ ہم انہیں بتا دیتے ہیں۔ ہم خود سمجھا دیتے ہیں کہ ہم جا رہے ہیں۔" وہ منت کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن یہ کہ اس وقت ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"مگر وہ ہیں کہاں؟" میں نے کہا۔

"بس اب تہجد اور وظیفے میں مصروف ہوں گی۔" زیب النساء نے کہا۔ "ہم وہیں جا کے ان سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھائی جان کے ساتھ جا رہے ہیں۔"

"کیا وہ دیکھنے کے لیے نہیں آئیں گی کہ یہ غلط تو نہیں؟"

"کیوں؟ جب ہم بتائیں گے تو وہ مانیں گی کیوں نہیں۔ اماں جانتی ہیں کہ ہم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔" زیب النساء نے کہا۔ "ہم انہیں بتا کے ابھی آتے ہیں۔"

محسن اس کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن میں نے روک دیا۔ اس لڑکی نے مجھے اپنی سادگی اور معصومیت سے قائل کر لیا تھا کہ وہ جھوٹ بولنے کی اہل ہی نہیں اور یہ ایک ناقابل یقین تضاد تھا جو اس کوٹھی کے اندر حیرت کی انتہا تھا۔

اگر اس کوٹھی کے اندر زمین میں سے کوئی شخص درخت کی طرح نکل آتا جس کے ہاتھ میں ایٹم بم ہوتا تب بھی میں اتنا حیران نہ ہوتا۔ دھوپ میں جھلستی ریت کے صحراؤں میں میلوں تک جھیل ویرانے میں چلنے والے کو کسی پیاس سے مر جانے والے مسافر کو اچانک نظر آ جائے تو وہ اتنا حیران نہیں ہو گا جتنا ایک تازہ کھلے ہوئے گلاب کے پھول کو دیکھ کر ہو گا۔

"کون کہہ سکتا ہے کہ زیب النساء تمھاری بہن ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور تم نے بھی اسی ماں کا دودھ پیا ہے جس کا زیب النساء نے۔"

"مجھے امید تو نہیں کہ تم میری بات مانو گے لیکن ہو سکے تو اسے چھوڑ جاؤ۔ اس نے وہ دنیا نہیں دیکھی جس میں ہم شکاری ہیں" قرار دیا۔

"اسے وہ دنیا دیکھ لینی چاہیے مرشد رضا خان۔" میں نے کہا۔ "کب تک وہ تمھاری دوہری شخصیت سے بے خبر رہے گی۔ حالانکہ تم اور وہ ایک ہی چھت کے نیچے تھے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بہتر ہے کہ اب ہم یہ نقاب اٹھا دیں۔ حقائق کتنے بھی بے رحم کیوں نہ ہوں ان کے وجود سے بے خبری کا مطلب یہ نہیں ہوتا...."

"مگر درخت! وہ ہماری جنگ میں شریک نہیں...."

"یہی تو میں کہتا ہوں نواب صاحب! بہت سے لوگ تھے جو اس جنگ میں فریق نہیں تھے۔ وزیر خان کے نام سے شروع کروں تو ناموں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ بالعموم کی ماں کب اس جنگ میں شریک تھی۔ مگر جب تمھاری بہن کی باری آئی ہے تو تم ابھی سے پریشان ہو۔"

"وہ.... وہ مر جائے گی۔"

"پھر کیا ہوا۔ اپنے چوہدری دلاور صاحب کا تو فلسفہ یہ ہے کہ جب ہم گرتے ہیں تو کسی بے گناہ کو اور معصوم کو نہیں بخشتے۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں یا معذوروں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرنا۔" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ کیا تم نے جونی کی ماں، مسٹر ابن یار الیعر کے ساتھ کوئی رعایت کی تھی؟" محسن نے اس کے منہ پر مکا مارا۔ "تم نے جانے ساتھ ہمارے رشتوں کو بھی رسوا کیا۔ جسم کے ساتھ ہماری روح کو بھی زخم دیے۔ ہم سے جذباتی تعلق رکھنے والوں کو بھی کچل دیا اور پھر ہماری اذیت کا تماشا دیکھا بھی اور دکھایا بھی۔ کس نے کی تھی ایسے غیر انسانی کھیل کی ابتدا؟ تم نے دیکھا نواب زادے! آج تمھاری شہ رگ کس طرح دبی ہے۔ اب کوئی منت سماجت کوئی التجا اور واسطہ کام نہیں آئے گا۔ قسم خدا کی اگر میری ماں قبر سے اٹھ کر آئے اور تمھاری سفارش کرے تب بھی میں تم کو نہ بخشوں۔"

میں نے محسن کے کندھے پر تھپکی دی۔ "جذبات کو قابو میں رکھو۔ ان کے اور ہمارے درمیان ایک فرق تھا اور رہے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم ایک سطح پر نہیں آ سکتے نہ یہ ہماری سطح تک پہنچ سکتے ہیں اور

جاسوسی ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ

انسان کی ترقی و تہذیب کے حیات افروز واقعات سے بھرپور ایک پُراسرار شخص کی آپ بیتی۔ وہ جس کی دوست تھی سمندر جس کے لیے آغوش مادر تھا۔ آگ اس کے بدن کو نمو دیتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ کہانی جس نے اپنے وقت میں مقبولیت کے کے ریکارڈ توڑ دیے

صدیوں کا بیٹا

پانچ حصوں میں مکمل

قیمت فی حصہ ۵۰ روپے ● ڈاک خرچ فی حصہ ۱۰ روپے

www.paksociety.com

نہ ہم اسے گھر کتے رہیں۔"

زیب النساء کے آجانے سے میری بات پوری نہ ہو سکی۔ وہ بے حد خوفزدہ تھی لیکن اسے اپنے اعصاب پر قابو پانے کا ہنر بھی آتا تھا۔

"گاڑی کی چابیاں کہاں رکھی ہیں؟" میں نے خسرو جمشید سے کہا۔

خسرو جمشید نے خاموشی سے چابیاں ہمارے حوالے کر دیں۔

"باہر کے دروازے پر کوئی حفاظتی الارم وغیرہ ہے تو بند کر دو۔ ہم خاموشی سے نکل جانا چاہتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"جب تم لوگ اندر آئے تھے تو کیا...؟"

"ہم دروازے سے گزر کے نہیں آئے تھے۔" میں نے خسرو جمشید کی بات کاٹ دی۔ "ہم نے دیوار بھی نہیں پھلانگی تھی۔"

"ہم آسمان سے ٹپکے تھے۔" محسن نے کہا۔

"اللہ! اب تو بتا دیجیے ہم کہاں جا رہے ہیں؟" زیب النساء نے کہا۔

"ہم آپ کے بھائی جان کے ایک دوست کے گھر جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "شاید آپ نے کبھی ان کا نام سنا ہو گا۔ پولیس کے ایک بہت بڑے افسر ہیں — ایس پی سراج۔"

ان الفاظ کا شدید رد عمل ہوا۔ زیب النساء بری طرح چونکی اور اس کا رنگ جو خوف سے زرد تھا یکلخت لال ہو گیا۔ "وہاں — ہم وہاں نہیں جا سکتے۔ بالکل نہیں جا سکتے۔ بھائی جان...!"

"آپ کے بھائی جان بھی ساتھ ہی جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہم آپ کو اپنی مرضی سے لے جا رہے ہیں۔ آپ کے بھائی جان کی اجازت سے نہیں۔"

"اللہ۔ اب ہم کیسے بتائیں۔" اس کا رنگ گلابی ہو گیا۔ "آپ ہی بتائیے ان کو بھائی جان۔ ہم مر جائیں گے مگر وہاں نہیں جائیں گے۔"

"زیب النساء! ان سے ضد مت کیجیے۔ یہ ماننے والے لوگ نہیں ہیں اور یہ مجبوری ہے۔" جمشید نے کہا۔

"ہمیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔" وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا۔ "کیا آپ چاہتی ہیں کہ ہم آپ کو باندھ کر لے جائیں۔ آخر کیا ہے وہاں؟ کوئی کھا تو نہیں جائے گا آپ کو۔ ہم وہاں تک کرائے دار رہیں گے۔ آپ کے بھائی جان ذرا سی دیر کے لیے جائیں گے اور واپس آ جائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ صبح ہونے سے پہلے ہم آپ کو واپس لے آئیں گے۔"

"دیکھیے۔ یہ بہت مشکل ہے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولی۔ "ہمارا وہاں جانا کسی صورت بھی مناسب نہیں۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟"

"یہ نامناسب والی کیا بات ہے۔ خیر نواب صاحب؟" میں نے زیب النساء کے رد عمل پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"وہ... دراصل میں نے اس کی نسبت سراج سے طے کر دی تھی اور ظاہر ہے کہ رخصتی سے قبل اس کا اپنے سسرال جانا نامناسب

ہو گا سمجھا جائے گا۔" خسرو جمشید بولا۔

"دیکھا یہ اطلاع تو مل گئی تھی کہ سراج کے ساتھ اس کی نسبت کیوں ختم ہوئی۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ علم نہ تھا کہ اس سازش میں تم برابر کے شریک تھے۔ خیر تم اپنی بہن کو بھی اپنے کاروبار کی مصلحت کی بھینٹ چڑھانے کا فیصلہ کر چکے ہو تو تم کون ہوتے ہو منع کرنے والے؟"

"بھائی جان! یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں ہم؟" زیب النساء مجروح لہجے میں کہا۔

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔ آپ برداشت کیجیے۔" خسرو جمشید نے بہن کو تسلی دینے کے لیے کہا۔ "یہ ہمارے دوست نہیں ہیں۔"

"چلو باہر نکلو۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔" میں نے کہا۔ "جھوٹ سچ خود ہی زیب النساء کے سامنے آ جائے گا۔ آپ آگے چلیے زیب النساء، ہم مجبور ہیں کہ آپ کو ساتھ رکھیں۔ شاید اس طرح آپ کو بہت کچھ معلوم ہو جائے جو آج تک آپ کی نظروں نے نہ دیکھا اور عقل نے نہیں جانا۔"

"معلوم نہیں یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم تو کچھ بھی نہیں سمجھ پائے۔" وہ بولی اور بوجھل قدموں سے ہمارے ساتھ چل پڑی۔ محسن نہ جانے کدھر غائب ہو گیا تھا۔ ہمارے پورچ میں آتے ہی وہ واپس آ گیا۔ اس نے کچھ کہا نہیں میں ڈوب گئی تو میں سمجھ گیا کہ وہ مین سوئچ آف کرنے گیا ہو گا۔ وہ جب حسنات میں نمودار ہوا تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے ٹیلی فون کے دونوں تار بھی کاٹ دیے تھے۔ گیٹ پر کوئی الارم تھا تو اب بے کار ہو چکا تھا۔

خسرو جمشید کا غصے اور بے بسی سے برا حال تھا۔ "یہ تو کیا ہو رہا ہے... ہم۔"

"ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم آگے گاڑی میں چلاؤ گے۔ تم صرف راستہ بتاؤ گے سراج کا گھر۔ میں نے نہیں دیکھا۔"

"اور آپ کے پیچھے میں رہوں گا۔ آپ کی ہمشیرہ کے ساتھ اور منجی گن کے ساتھ۔" محسن بولا۔

"تم نکل نہیں سکتے۔" جمشید نے کہا۔ "ولاور کے اغوا کی خبر پھیل چکی ہے۔ ہم سب کی حفاظت کے خصوصی انتظامات کیے جا چکے ہیں۔"

"ابھی تک تو مجھے یہ انتظامات نظر نہیں آئے۔" میں نے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن نواب صاحب! جب آپ ہمارے ساتھ ہیں تو کوئی ہمارا راستہ کیوں روکے گا۔ آپ کی حفاظت کرنے والے آپ کی جان کے دشمن تو نہیں ہو سکتے۔" میں نے کار کو اسٹارٹ کیا اور گیٹ سے باہر نکالتے ہی دیکھا کہ ایک پولیس جیپ نے میرا راستہ کاٹ دیا۔ اس میں سے ایک تھانیدار قسم کا افسر اترا۔

"اللہ سے کیجیے کہ راستہ چھوڑ دیں۔" میں نے کہا۔ جمشید نے تعمیل کی۔ اس نے سر نکال کر تھانیدار کو بلایا۔ "جیپ کو سامنے سے ہٹاؤ۔"

"ہمیں علم تھا سر جی کہ آپ جاتے جاتے آپ کا خیال رکھیں۔" وہ بولا۔

"اچھا اچھا۔" جمشید نے کہا۔ "تم لوگ یہاں ٹھہرو اور خیال رکھو اب کوئی داخل نہ ہونے پائے۔"

"مطلب یہ سر جی کہ آپ کے ساتھ نہ چلیں؟"

"نہیں۔" جمشید نے مجبوراً کہا۔ "میں اپنی فیملی کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

جیپ سامنے سے ہٹ گئی۔ جمشید کی گردن پر سے وہ دباؤ ہٹ گیا جو محسن نے ریوالور سے ڈال رکھا تھا۔ اعصاب شکن خوف کا وقفہ ٹل گیا جس میں بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ ہم رکنے والے نہیں تھے۔ جمشید عقل سے کام نہ لیتا تو ہمیں پولیس کو راہ سے ہٹانے کے لیے طاقت استعمال کرنی پڑتی۔ زیب النساء چپکے چپکے پچھلی سیٹ پر رو رہی تھی۔ محسن نے اسے تسلی دے کے چپ کرانے کی ناکام کوشش کی اور پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

حالات بتاتے ہیں کہ سراج کے گھر پر ہمارا استقبال کرنے والے بھی ہوں گے۔ میں نے کہا۔ "امید ہے وہاں بھی تم اسی سمجھ بوجھ کا مظاہرہ کرو گے۔ بصورت دیگر یہ سمجھ لو کہ ان سب کا خون تمہاری گردن پر ہو گا جو ہمارا راستہ روکنے آئیں گے۔ ہم ہر حال اندر پہنچ جائیں گے خواہ اس کے لیے ہمیں قتل عام کرنا پڑے۔"

"تم اپنی بہن کے سسرال میں کسی خونریز معرکے سے گریز کرنا چاہتے ہو تو خاموشی سے رہنمائی کرتے جاؤ جدھر ہم کہیں۔" محسن بولا۔ "اور یہی لینے کی ہونے والے بہنوئی سے بھی کہنا۔ اس کی ماں کا بھی خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔ تمہارے یا سراج کے غلط رویے کے باعث ہم جوابی قدم اٹھانے پر مجبور ہوئے اور اس کے نتائج غلط نکلے تو تمہیں اور تم کو بہت پچھتانا پڑے گا۔"

خسرو جمشید نے پا مردی رضا خان نے نسبت کی خاطر ہم اسے بڑے نام سے ہی مخاطب کرتے تھے۔ ہماری کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اسے امید تو ہو گی کہ ولاور کے بعد ہم اس کی طرف بھی آ سکتے ہیں لیکن ایک تو کبھی ہمارا اس سے براہ راست تصادم نہیں ہوا تھا۔ اس نے ہمارے خلاف کسی کارروائی میں براہ راست شرکت نہیں کی تھی اور ولاور کے ایک پارٹنر کی حیثیت سے اس کا کردار بہت کم نمایاں تھا۔ دوسرے اس نے اپنے لیے حفاظتی انتظامات بھی بہتر کر لیے تھے۔

اس کی نئی مرسڈیز جیسی شاندار گاڑی میں نے کبھی نہیں چلائی تھی۔ وہ ایک زبردست قوت رکھنے والی مگر خاموش اور سبک خرام گاڑی تھی جس میں سوئی کی حرکت کا بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ اس کے رستوں اور آسائشوں کی بھی کمی نہ تھی۔ مثلاً اس کے گھر کیہاں اور

دروازے میں وہ ہلانے سے کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ خودکار ٹرانسمیشن اور پاور اسٹیئرنگ کے ساتھ شاید وہ کار ملک کی گنی چنی کاروں میں ہو گی۔

ایس پی سراج کے گھر تک میں نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ یہ راستہ رات کو خالی ملنے والی سڑکوں پر دس منٹ میں طے ہو گیا۔

آخری موڑ کاٹنے سے پہلے میں نے گاڑی روک کے جمشید کی اور چابی لے کر اتر گیا۔

"اب آپ ذرا ڈرائیونگ کر لیں گے نواب صاحب۔" میں نے کہا اور گھوم کے دوسرے دروازے پر پہنچا جب خسرو جمشید میری جگہ بیٹھ گیا اور میں اس کی جگہ تو میں نے چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔

"یہاں حفاظتی انتظامات بہت سخت ہوں گے۔" محسن نے کہا۔

"تمہارا خیال ہے تو سراج نے چاروں طرف سپاہی اور ایک آدھ تھانیدار بھیج کے حفاظتی انتظامات کیے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "مگر خود اپنے لیے اس نے گھر کے چاروں طرف مسلح حصار قائم کر رکھا ہو گا کیونکہ ایک تو وہ خود پولیس چیف ہے۔ دوسرے وہی سب سے بڑا مجرم ہے چنانچہ وہ سب سے زیادہ خائف بھی ہو گا۔ ولاور ایک عام آدمی ہے اور اس کا جرم صرف اتنا ہے۔ سراج ایک سرکاری افسر ہے جس کا کام قانون کی حفاظت کرنا ہی ہے چنانچہ وہ دہرا مجرم ہے۔"

"اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ولاور جیسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اگر سراج جیسے چور افسر ان کی پشت پناہی نہ کریں۔ آج اسے ڈر ہو گا تو اس نے قانون کے محافظ منع کر دیے ہوں گے۔" محسن نے کہا۔ "تم خود ہی ان محافظوں سے بات کرو گے اور بات نہ بنی تو سراج کو تمام صورت حال سمجھا دو گے کہ تعاون میں خیریت ہے اور عدم تعاون کا نتیجہ تم سب کی توقع سے زیادہ برا نکل سکتا ہے۔"

گاڑی آگے بڑھی تو مجھے پولیس کی پہلی گاڑی نظر آئی جو ہماری طرف آ رہی تھی۔ اس میں مسلح پولیس مین دکھائی دیے۔ انہیں لیے بیٹھے تھے اور آگے کوئی سب انسپکٹر یا انسپکٹر تھا جو وائرلیس پر کچھ بول رہا تھا۔ جیپ کے اوپر لہرانے والا انٹینا ظاہر کرتا تھا کہ اس گاڑی کا وائرلیس کے ذریعے ہیڈ کوارٹر یا تھانے سے رابطہ قائم ہے۔ انہوں نے ہمیں دیکھا مگر ایک تنی عظیم الشان مرسڈیز کو روکنے کی ہمت ان میں نہ تھی جس کا مالک کوئی وزیر، اسمگلر یا صنعت کار بھی ہو سکتا تھا اور ڈپٹی کمشنر یا آئی جی قسم کا افسر بھی۔

دوسری گاڑی عین کوٹھی کے دروازے پر موجود تھی جس کے سامنے جمشید نے کار کو روکا۔ گیٹ بند تھا اور گیٹ لائٹس جل رہی تھیں۔ ایک سنتری وائرلیس دروازے پر نصب جدید قسم کا اسلحہ لیے کھڑا تھا۔ دوسرے کو میں ان... جانے والے راستے پر پورچ کے قریب دیکھ سکتا تھا۔ باقی دو کوٹھی کے باہر دیوار کے آخری کناروں پہ

www.paksociety.com

لگے ہوئے تھے۔ ریلوے والوں پر ہنگامی ضرورت کے تحت سرچ لائٹس لگائی گئی تھیں جو اندر کے اور باہر کے علاقے کو روشن کررہی تھیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس روشنی میں کسی کا ان کی نظروں سے بغیر داخل ہونا ناممکن تھا۔

"سراج ہے؟" خسرو جمشید نے کار کی کھڑکی سے سر نکال کے سنتری سے سوال کیا۔

"ایس پی صاحب... لیکن آپ نیچے اتریں۔" سنتری نے کہا۔

"مجھے نیچے اترنا ہے؟"

"آپ... اور باقی سب لوگ بھی۔" سنتری نے کہا۔

"جانتے ہو میں کون ہوں؟" خسرو جمشید نے رعونت سے کہا۔

"تلاشی کے لیے۔" سنتری نے کہا۔ "گاڑی کی تلاشی بھی لی جائے گی۔ آرڈر ہے۔"

"تم جا کے سراج سے کہو...؟"

"میں کہیں نہیں جا سکتا۔ میری یہاں ڈیوٹی ہے۔" سنتری نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"بکواس بند کرو۔ میں سراج کا دوست ہوں۔" جمشید کا پارہ چڑھ گیا۔

"صاحب کا آرڈر ہے کہ میرا باپ بھی آئے تو اسے اندر مت آنے دو۔ آپ نیچے آجائیں۔"

"اگر سراج آکے نہ کہے گا تو میں اتروں گا۔ ورنہ یہیں بیٹھا ہوں گاڑی میں اور ساری رات اسی جگہ دروازے کے سامنے بیٹھا رہوں گا۔ تم سے جو ہوتا ہے کرلو۔" خسرو جمشید نے کہا اور بٹن دبا کے سب شیشے اور دروازے لاک کردیے۔

یہ صورت حال سنتری کے لیے غیر متوقع تھی۔ اس نے کچھ احتجاجی شور کیا۔ شیشے بجائے اور دروازے کھینچنے کی بے سود کوشش کی پھر آواز دے کر کسی کو بلایا۔ دور کھڑی ہوئی گاڑی میں سے پولیس ایس پی کے عہدے کا ایک افسر نہایت خونخوار موڈ میں برآمد ہوا۔ سنتری نے اسے صورت حال بتائی لیکن بند شیشوں کے پیچھے صرف ان کے ہاتھوں اور ہونٹوں کی حرکت دیکھ سکتے تھے۔ ان کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ڈی ایس پی نے سر ہلایا، چیلنج قبول کرلینے کے انداز میں وہ آگے آیا۔ اس نے جیب میں سے ریوالور نکالا اور شیشے کو آہستہ سے بجایا۔ وہ اپنے عہدے کے رعب اور ارادے سے ہی کام چلانا چاہتا تھا۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ کسی شاندار مرسیڈیز کا شیشہ توڑے اور اپنی بیس برس کی تنخواہ سے نقصان پورا کرنے میں لگوائے۔

جمشید نے شیشہ تھوڑا سا نیچے کیا۔ "میں تمہارے ماتحت کو بتا چکا ہوں کہ سراج کے آنے تک گاڑی اسی جگہ موجود رہے گی اور میں باہر نہیں آؤں گا۔"

"آپ اپنے خلاف شکوک بڑھا رہے ہیں۔ ابھی کسی کو شکوک کی تم وجہ نہیں ..."

"میں بتا بھی چکا ہوں کہ سراج میرا دوست ہے اور بزنس پارٹنر ... اگر میرا نام سننے کے بعد بھی اس نے گیٹ تک آنے سے انکار کیا تو میں اتر آؤں گا۔ ورنہ وہ خود آکے مجھے اندر لے جائے گا۔" خسرو جمشید نے...

"کیا نام بتایا آپ نے؟"

"میں نے ابھی تک کسی کو نام نہیں بتایا! اس لیے کہ کسی نے پوچھا ہی نہیں۔"

"اچھا اب میں پوچھ رہا ہوں۔"

"نواب خسرو جمشید اور سراج سے کہنا کہ ان کی بیٹی بھی آئی ہیں۔" جمشید بولا۔ "اور یہ ریوالور سوچ سمجھ کے نکالو۔ میرے محافظوں کے پاس اس سے بہتر اسلحہ ہے۔"

غالباً محسن نے اسے مشین گن اٹھا کے دکھائی کیونکہ ڈی ایس پی کی صورت پر بارہ بج گئے تھے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پیچھے ہٹ گیا۔ وہاں دیوار پر ایک فون اس طرح نصب تھا کہ ... تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کے چند منٹ تک بات کی۔ پھر لپک کے واپس آیا۔

"اب آپ بتائیں میں کیا کروں؟" ڈی ایس پی بولا۔ "وہ مانتے نہیں کہ نواب خسرو جمشید اپنی بیٹی کے ساتھ آئے ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی شخص مشین گن لے کر آسکتا ہے۔"

"اگر وہ نہیں مانتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" خسرو جمشید نے کہا۔

"نواب صاحب! وہ سمجھتے ہیں کہ تم بے وقوف اور گدھے ہو کہ کوئی کچھ بھی کہے مان لیتے ہو۔ وہ خسرو جمشید نہیں کوئی خطرناک آدمی ہے۔ اگر تم نے اسے نہ روکا تو میں تم کو گولی مار دوں گا۔" ڈی ایس پی کا لہجہ انتہائی بے بسی کا تھا۔ "دیکھئے ضد نہ کیجیے۔ اچھا الٹا کیجیے، یہ گاڑی گیٹ سے اندر لے جائیے۔ اس طرح کہ آدھی اندر ہو اور آدھی باہر۔ دونوں کا کام ہو جائے گا۔"

"اس کا فائدہ؟"

"میں پھر بات کرتا ہوں۔" ڈی ایس پی بولا۔ "کہ وہ خود آپ کو دیکھ لیں... کمرے سے..."

"یہ ہو سکتا ہے۔" خسرو جمشید نے مصالحانہ انداز میں کہا۔

"لیکن یہ سمجھ لیں کہ گاڑی کے سامنے خود میں ہوں گا۔" ڈی ایس پی نے کہا۔ "گیٹ کھلنے کے بعد آپ کو اگر آگے جانا ہو تو گاڑی میرے اوپر سے گزار کے لے جانی ہوگی۔"

"مجھے گاڑی گندی کرنا منظور نہیں۔" جمشید نے کہا۔ گیٹ کھولا گیا۔ ڈی ایس پی کا چہرہ اتر گیا تھا۔ ان کے سامنے ایک نواب تھا جو شاید جانتا نہیں کہ ... وہ ایس پی کا ...

ایک ڈی ایس پی کو گیٹ کے قریب جانے سے روکا۔ وہ تو خود سرتاپا ایک ... اگر اسے اپنی قیمتی گاڑی پر خون کے چھینٹوں کے داغ پڑنے کا ڈر نہ ہوتا تو ... ایک عام آدمی کو بہت اچھی طرح سمجھا دیتا جو اس کے خون کا ایک قطرہ بھی ضائع کرتا۔ اب وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا اور گیٹ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

گاڑی تھوڑا سا کھسکی اور گیٹ کے درمیان میں جا کے رک گئی۔ ڈی ایس پی نے پھر فون کا ریسیور اٹھا لیا تھا۔ اس کے چند منٹ کا انتظار ضرور تھا ... ابھی نہیں تھا کہ دروازے میں وہ گھس جانے والی مرسیڈیز کے سامنے کھڑا رہے کہ وہ سراج سے بات کرسکتا چنانچہ وہ ہونٹ پر کنپٹیاں لٹکائے بہت آگے تک آ چکا تھا۔

"سراج خود دیکھ لیں۔"

"بکواس... تمہاری آنکھیں نہیں ہیں کیا؟" سراج کی آواز لپک کے آئی ہوئے انٹرکام کا مائیکروفون اسپیکر سے سنائی دی۔

"وہ میری نہیں مانتے۔ سراج اللہ سے کہیں کہ وہ ماسٹر بیڈروم کے سامنے آجائیں۔" ڈی ایس پی بولا۔

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد سراج کی آواز آئی۔ "جمشید!"

"ہاں" جمشید نے اس ریسیور کے ساتھ کہا جو ڈی ایس پی ان کے سامنے کر رہا تھا۔ "کیا اب مجھے بھی تلاشی دینی ہوگی؟"

"بکواس۔ برا ماننے کی بات نہیں۔ میں نہیں مان سکتا کہ تمہارے ساتھ زیب النسا بھی ہے؟"

"بیٹی ہے نا۔ میں جو کہہ رہا ہوں۔" خسرو جمشید نے جھنجلا کے کہا۔

"اچھا میری بات کراؤ اس سے۔"

"وہ کمرے میں تم سے بات؟" جمشید نے کہا۔

"یا زیب آسکتی ہے تو بات کیوں نہیں کرسکتی؟" سراج نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے نا، جب میں ساتھ ہوں تو تم کو اور کس بات کا ... تم میری آواز نہیں پہچانتے ایس پی صاحب؟"

"آواز... تو ٹھیک ہے لیکن یار... زیب النسا کی جگہ کوئی اور ہو؟" سراج بولا۔ "میں ان دونوں بدمعاشوں کے چکر سے ڈرتا ہوں۔ وہ بھیس بدلنے کے ماہر تھے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میرے بھیس میں سکندر نہ ہو اور زیب النسا کے بھیس میں محسن؟" جمشید نے ہنس کے کہا۔

"محسن تو نہیں لیکن ایک شخص اور بھی ہے تمہارے ساتھ جس کے پاس مشین گن ہے۔ یہ کون ہے؟"

"میرا باڈی گارڈ۔"

"تمہارے پاس کوئی ایسا باڈی گارڈ پہلے تو نہیں تھا۔"

"پہلے تو تمہارے گیٹ پر بھی یہ ڈراما نہیں ہوتا تھا۔ تم نے تو سرکاری خرچ پر اپنی حفاظت کا بندوبست کیا ہے۔ میں اپنے خرچ پر بھی نہیں کرسکتا؟" جمشید نے کہا۔

"کر سکتے ہو لیکن ... جمشید کے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"باڈی گارڈ ہر جگہ ساتھ رہتا ہے۔" جمشید نے جواب دیا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے تم ہمارے ساتھ تھے۔ اس وقت تک تم نے ایسا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ گھر جاتے ہی تم کو نیا باڈی گارڈ بھی مل گیا؟"

"سراج! میں ساری رات بک بک نہیں کرسکتا۔ تم کو گیٹ تک آنا ہی پڑے گا۔ آکے دیکھ لو ایس پی صاحب..."

"نہیں میں تک نہیں آؤں گا۔ لیکن دیکھنے کی بات ہے تو پلیز! ایسا کرو کہ گاڑی سے نکل کر گیٹ پوسٹ پر کھڑے ہو جاؤ اور یہاں میں کسی بھی جگہ اور ہاں زیب النسا کو بھی آنے کی زحمت دو۔ یہ بدتہذیبی نہیں ایک ضرورت ہے۔ میں بعد میں تم سے معافی مانگ سکتا ہوں۔" سراج بولا۔

سپاہی کے اشارے پر جمشید نے دروازہ کھولا اور باہر اتر گیا۔ کہیں سے کسی کلوز سرکٹ ٹی وی نے گیٹ کو فوکس کر رکھا تھا تو سراج نے اندر اپنے ٹی وی پر اسے ضرور دیکھا ہوگا۔ پھر جمشید نے پیچھے والا دروازہ کھولا اور زیب النسا کو تقریباً باہر گھسیٹ لیا کیونکہ وہ باہر نکلنے پر آمادہ نہ تھی۔

"بس بس... سوری یار جمشید! میں آرہا ہوں۔" سراج کی آواز آئی۔ "سب گاڑی کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔" یہ آخری جملہ اس نے اپنے ڈی ایس پی سے مخاطب ہو کے کہا تھا۔

"یس سر۔" ڈی ایس پی نے کہا اور راستہ چھوڑ دیا۔ گاڑی میں زیب النسا پھر بیٹھ چکی تھی۔

"آئی ایم ویری سوری سر۔" ڈی ایس پی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" جمشید نے تلخی سے کہا۔

"آپ کے دوست اب ایس پی نہیں سر۔ ایس ایس پی ہیں۔ آپ کو بھی مبارک ہو۔" ڈی ایس پی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"ایس ایس پی؟" خسرو جمشید نے کہا۔

"یس سر۔ ان کو شاہد رضوی کی جگہ مقرر کیا گیا ہے۔" ڈی ایس پی نے کہا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے آئی جی صاحب نے فون پر احکامات دیے ہیں۔"

ان الفاظ کا صدمہ کتنا شدید تھا، اس کا اندازہ میں نے محسن کی صورت اور محسن نے میری شکل دیکھ کر کیا۔ پھر خسرو جمشید نے ایک تمسخر اڑانے والی اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ ہم دونوں کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں سوال کیا کہ "کہو، اب کیا خیال ہے۔ میاں بیٹے کوتوال... اور تمہارے انکل تو

www.paksociety.com

دُکان اپنی بڑھا گئے۔ گاڑی آگے بڑھی تو میرے ذہن پر ایک ہی سوال کی بازگشت کے ہتھوڑے برس رہے تھے۔ کیا انھیں معطل کر دیا گیا ہوگا؟ ہماری وجہ سے۔ ہماری پریس کانفرنس ہم سے تعلق، شہلا کو پناہ دینا، چوری اور تھیوڑن کا فرار اور مفرور ڈاکوؤں کے معاملے میں ان کی بھونڈی کارکردگی، سراج اور اس کی پشت پناہی کرنے والے رشوت خور ناپختہ ہاتھوں کی زیرکشی انکل رضوی کی ناپسندیدہ فرض شناسی اور ایمانداری۔ ان سب عوامل نے بالآخر ان کو رسوا کیا، بے اختیار کیا اور شرمسار کیا۔

سراج نے پورچ میں آکے ہمارا استقبال کیا۔ اس کے لیے یقیناً زیب النساء کا آنا حیرت کن تھا۔ وہاں آنا ایک ناقابلِ یقین بات تھی۔ چنانچہ اس کے ساتھ اس کی بوڑھی ماں بھی باہر آگئی تھی۔ جیسے ہی خسرو جمشید ایک دروازے سے نکلا، دوسرے دروازے سے میں باہر آگیا پھر محسن آیا اور سراج کا رنگ اُڑ گیا۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر جیب کی طرف جاتے جاتے رُک گیا۔

"تو ۔۔ یہ تم ہو؟" سراج نے کہا۔

"ہاں، یہ ہم ہیں تمھارے سامنے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے گھر میں۔"

"مجھے ایک لمحے کے لیے خیال آیا تھا۔" سراج بولا۔

"تمھارے خیال کی۔۔۔ ایسے خیال کی کیا اہمیت ہے جس سے وقت گزر جانے کے بعد صرف پچھتاوا ملے۔" میں نے کہا۔

"یہ کیا ہے سب؟" سراج کی ماں نے بیٹے کے کہا۔

"ثریا! اندر چلی جاؤ۔ ان لوگوں سے مجھے اپنے کام ہے۔"

"چاچیے آپ۔" جمشید نے اپنی بہن سے کہا۔

آنسو زیب النساء کی آنکھوں سے رستے تھے اور اس کے لیے قدم اٹھانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ سراج کی ماں آگے بڑھی۔

"آپ ادھر سے آئیں ماں جی۔" محسن نے کہا۔ "پیچھے سے۔"

سراج ابھی تک بے حس و حرکت کھڑا ہونٹ کاٹ رہا تھا اور غصے سے اس کا چہرہ سُرخ پڑ گیا تھا۔ محسن نے اسے زد پر لیا ہوا تھا اور اگر وہ اس لمحے سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ جب ماں اور زیب النساء درمیان میں حائل ہوں گی تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ سراج کی ماں پیچھے سے دوڑتی ہوئی آئی۔

"کیا ہے بیٹے، دروازہ کیوں ہے بیٹی ان لوگوں نے کچھ کہا ہے تجھ سے تو بتا۔" اس نے زیب النساء کو تھام لیا اور اپنے ساتھ لے جانے لگی۔ زیب النساء نے نفی میں گردن ہلا کے اس خیال کی تردید کر دی تھی کہ ہم نے اس کے ساتھ بدسلوکی یا کسی قسم کی زیادتی کی ہوگی۔ یہ صورتِ حال بڑی عجیب تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب زیب النساء نے کمرے کی خلوت میں اپنے خیالوں کے ساتھ تنہا تھی اور صرف اپنی محرومی کے شوق میں کھوئی ہوئی تھی تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ ابھی اچانک وہ سب کچھ اس کے کمرے میں وارد ہو جائیں گے اور پھر اسے رخصتی کے بغیر اس سسرال جانا ہوگا کہ جس کے سر پہ سہرا ہوگا اور نہ وہ دُلہن بنے گی۔ اسے بارات کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا اور اغوا کے ساتھ خود چل کے دُلہا کے گھر میں آنا پڑے گا۔ اغوا ہونے والی کی طرح بے عزتی کے ساتھ۔

"ہم نے تمھاری ماں کو اور اس کی بہو کو کچھ نہیں کہا مسٹر ایس ایس پی صاحب۔ صرف اس امید میں کہ وہ بھی کسی سے کچھ نہیں کہیں گی۔" میں نے کہا۔ "ویسے میں ٹیلی فون کی لائن کاٹ دوں؟"

"میری ماں تمھارے عزائم کی راہ میں حارج نہیں ہوگی نہ تم کو بچانے کے لیے بھی نہیں آئے گی۔" سراج بولا۔

"اس کے ہم کیا لگتے ہیں! ہمیں اسے سمجھا دینا کہ وہ ہم کو بچانے بھی نہ آئے۔" محسن نے کہا۔ "ہم یہاں جان ہتھیلی پر رکھ کے پہنچے ہیں اور اس بارے میں کوئی شبہ تمھارے دل میں ہے تو نکال دو کہ تم اپنی چالاکی سے یا اپنے اختیارات اور وسائل سے کام لیتے ہوئے ہمیں گرفتار کرا دو گے یا ہمارا راستہ روک لو گے۔ ہم محاورے کے مطابق ہی نہیں، عملاً کشتیوں کے پیچھے لگا دیں گے۔"

"ان کو کیوں اغوا کر کے لائے ہو؟" سراج نے کہا۔

"ہم یہاں کھڑے کھڑے مذاکرات جاری نہیں رکھیں گے۔" میں نے کہا۔ "اندر چلو۔ وہیں جہاں تمھاری ماں اور تمھاری ہونے والی بیوی گئی ہیں۔"

"اور اگر میں انکار کروں۔۔۔؟" سراج نے مشتعل ہو کے کہا۔

"تو تم یہاں سب کے سامنے مار کھاؤ گے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے نچلے درجے کے ماتحت بھی دیکھیں گے کہ اس ایس پی جیسے ہی تم کو مرغا بنا پڑا ہو۔"

"یہ بہو کوشش تمھارے حق میں سخت نامبارک ثابت ہوگی۔" محسن بولا۔

"اور کے اندر چلو۔ اگر آنا ہی ضروری ہے۔" سراج نے اپنی شکست کو قبول کر لیا۔ "مگر ایک وضاحت میری بھی سن لو۔ مجھے تم اس طرح اغوا کر کے نہیں لے جا سکو گے جیسے تم دلاور کو لے گئے تھے یا اب جمشید کی بہن کو اٹھا لائے ہو۔"

"ہم تمھارے سامنے ہی جمشید کو بھی چھوڑ دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہم جس مقصد کے تحت آئے ہیں وہ مختلف ہے۔"

ایک بڑے کمرے میں سراج کی ماں، زیب النساء کو چپ کرانے کی اور یہ پوچھنے کی کوشش میں مصروف تھی کہ ہم کون ہیں کیوں لائے ہیں۔ مگر زیب النساء نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" سراج کی ماں نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔ "بیٹا کیوں چلے آئے ہو؟ کیا مقصد ہے تمھارا؟"

"ہمارے یہاں آنے کا مقصد جان کے آپ کیا کریں گی؟ بیٹے کے کاروباری معاملات ہیں۔" میں نے کہا۔

"بیٹے کے کاروباری معاملات یوں طے ہوتے ہیں! ہم بندوق کے زور پر اگر ہوتے ہیں تو جاؤ دوسرے کمرے میں۔" وہ گرم ہو کے بولا۔

"مجبوریاں ہیں ایسی کہ ہم یہاں رہیں گے۔" میں نے "آپ کے سامنے۔۔۔"

"ایسی بدمعاشی پر تم کو شرم آنا چاہیے۔"

"ماں جی! آپ کے بیٹے کا تو سارا دھندا ہی ایسا ہے۔ بدقسمتی سے اس کا واسطہ اور تعلق بدمعاشوں سے ہی رہتا ہے۔ ہم نے کہا۔ "شریف آدمی تو پولیس کے سامنے سے بھی بھاگتا ہے اور پولیس خود بھی کسی شریف بیٹے سے تعلق نہیں رکھتی۔ آپ کو شرم کی تو بات ہی نہیں۔"

"ہم زیادہ دیر یہیں نہیں رُک سکتے۔" محسن نے کہا۔ "خسرو جمشید! اب تمھارا دلاور کے گھر سے دس لاکھ روپے لے آؤ۔"

میں نے خط نکال کے جمشید کو دیا۔ سراج نے اس کو اس نے دیکھا تو خط میں نے اس کی طرف بڑھا دیا۔ "تم بھی پڑھ لو۔ ویسے اگر کسی کی بیوی کے نام خط ہو تو اسے پڑھنا نہیں چاہیے لیکن یہ پرائیویٹ بات نہیں ہے۔"

سراج نے خط لے لیا اور کھول کر پڑھا۔ محسن مشین گن لیے ایک کونے میں کھڑا رہا۔ وہیں ایک ٹیلی فون بھی رکھا ہوا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ مار کے اس کا کنکشن توڑ دیا۔ سراج کی ماں نے اب سمجھ لیا تھا کہ صورتِ حال سنگین ہے۔ چنانچہ وہ ہونے والی بہو کو سمیٹ کر بیٹھ گئی تھی اور خاموش تھی۔

"اس بات کی کیا ضمانت ہے۔۔۔؟"

"کوئی ضمانت نہیں۔" میں نے سراج کی بات کاٹ دی۔ "تم ضمانت طلب کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"

"جاؤ جمشید!" سراج نے کچھ دیر سوچ کے کہا۔

"تمھارے پاس صرف ایک گھنٹہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر دلاور کی بیوی تمھارے پاس ہوگی تو دیر لگنی بھی نہیں چاہیے۔ کوئی غلطی دہرانے کی اور اپنے ساتھ پولیس یا فوج کی پوری بٹالین لے آئے تب بھی تم آسانی سے ہمیں گرفتار نہیں کرا سکو گے۔ ہم مر جائیں گے اور مرنے سے پہلے سب کو مار جائیں گے۔ مرنے والوں میں زیب النساء بھی شامل ہوگی۔"

"تم میں سے کون میرے ساتھ جائے گا؟" جمشید نے کہا۔

"کوئی بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن واپسی میں تم کو ایک کام اور بھی کرنا ہوگا۔ تم دلاور کی بیوی کو یا اس کی بہن کو ساتھ لاؤ گے۔"

"یہ اس خط میں نہیں لکھا ہے۔" جمشید نے کہا۔

"یہ ہم کہہ رہے ہیں۔ ہمیں ضامن بھی تو چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "اگر دلاور کو لانا ہے تو خود اس کی بیوی جا کے لا سکتی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ نہیں ہوگی تو ہم غیر محفوظ رہیں گے۔"

"میں کوشش کروں گا، مگر وہ راضی نہ ہوئی تو۔۔۔"

"تم اسے راضی کر سکتے ہو۔ عورت ذات کو پکڑ دینا تمھارے لیے کیا مشکل ہے۔"

"وہ دلاور کی بیوی ہے۔" خسرو جمشید نے کہا۔

"تم زبردستی بھی تو کر سکتے ہو۔۔۔ یا دھمکی دینے سے آگے کچھ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے؟" میں نے کہا۔ "میں نہیں مان سکتا کہ تم اتنے نااہل ہو کیونکہ جن کے تم ساتھی ہو وہ تو اس ملک کے قانون کو، حکومت کو اور عوام کو چکر دے رہے ہیں اور ان کے دشمنوں سے آزادی اور حب الوطنی کا سودا کر رہے ہیں۔ ملک کے اندر قتل و خونریزی اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں مصروف ہیں لیکن معتبر و معتبر بھی بنے ہوئے ہیں۔ تم سب کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے والوں کے ساتھی ہو۔ ان چوروں کے ساتھ جو کوتوال بنے پھرتے ہیں اور اب تو خیر سے اپنے چوہدری دلاور صاحب عوام کے محبوب رہنما بننے کا فیصلہ کر چکے ہیں بلکہ۔۔۔ پبلک کا فخر ہیں اپنی خیرخواہی اور خدمتِ خلق کے جذبات کا اظہار بھی فرما چکے ہیں اور تم یہ ظاہر کر رہے ہو کہ بہت معصوم ہو۔ جاؤ خسرو جمشید! عرف مرشد، تھا وقت ضائع مت کرو! جیسے بھی ہو، دس لاکھ کی رقم ایک ضامن کے ہمراہ لے آؤ۔ ہم صبح ہونے تک انتظار نہیں کریں گے۔ اس بات کا خیال رکھنا، تمھارے پاس ایک گھنٹا ہے۔ پانچ دس منٹ کی رعایت مل جائے گی، اس سے زیادہ نہیں۔" میں نے دیکھا کہ زیب النساء میری بات پر دم بخود بیٹھی ہے۔

"دیر سے آؤ گے تو یہاں کوئی بھی نہیں ملے گا۔" محسن نے کہا۔

"لیکن بیٹے چند لاشیں ملیں۔" میں نے کہا۔ زیب النساء کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑ گیا۔

"مگر وہ ہماری لاشیں نہیں ہوں گی۔" محسن نے کہا۔

ہمارے بیچ اور ٹھہرے خسرو جمشید کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے چابی لی اور باہر نکل گیا۔ سراج اس کے ساتھ جانے لگا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے آگے دروازے پر ہی

www.paksociety.com

روک لیا۔

"میری اجازت اور میرے حکم کے بغیر محافظ اسے نہیں نکلنے دیں گے۔" وہ بولا۔

"تم ان کو آمد و رفت کے بھی تو احکامات دے سکتے ہو یا تم یہ بات بھول گئے ہو؟" میں نے کہا۔

"وہ۔۔۔ انتظام دوسرے کمرے میں ہے۔" سراج بولا۔

"میں اس نظام کی کارکردگی کا بذاتِ خود مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "چلو۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ میرے گھر میں مجھ پر حکم چلا رہے ہو۔" سراج نے چراغ پا ہو کے کہا۔

"میں تمہارے گھر میں تم پر ڈنڈا بھی چلا سکتا ہوں۔ آؤ آگے پیچھے تو۔" میں نے ڈانٹ کر کہا اور سراج کے سر پر مکا مارا۔ وہ جھٹکا کھا کے آگے جھکا اور پیچھے گر گیا۔ اس کی ماں نے اور زیب النساء نے ایک ساتھ چیخ ماری۔

"خدا کے لیے رحم کرو۔" سراج کی ماں چلائی۔ "تم کو جو کچھ چاہیے لے جاؤ، جو بھی اس گھر میں ہے۔"

سراج کھڑا ہو گیا۔ اپنی ماں اور منگیتر کے سامنے اس کی سخت تذلیل ہوئی تھی۔ وہ پرانا ایس پی تھا جو کریلے سے کم نہیں ہوتا۔ اب وہ ایس ایس پی ہو کے گویا نیم چڑھا ہو گیا تھا مگر یہاں وہ صرف دو افراد کے سامنے اپنی ساری کڑواہٹ کو خود ہی پینے پر مجبور تھا۔

"آپ دور رہیں ماں جی۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم ڈاکو نہیں ہیں۔"

"ڈاکو نہیں ہو تو پھر کون ہو نامرادو؟" سراج کی ماں نے رو کے کہا۔

"ہم علی بابا ہیں اور ہمارا واسطہ چالیس چوروں سے ہے۔ تمہارا یہ ایس پی بیٹا ایک چور ہے۔ دوسرا چور اس کا سالا ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ... آپ کو شرم آنا چاہیے ہمارے بھائی کو چور کہتے ہوئے۔ کیا خاندانی شریف زادی کی یہی عزت رہ گئی ہے؟" زیب النساء نے روتے ہوئے کہا۔

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "تم ایک بے وقوف اور کم عقل لڑکی ہو جس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ شرافت کسے کہتے ہیں۔ تمہاری آنکھیں بند ہیں جیسے تم اپنی خیالی دنیا میں رہتی ہو۔ ایسے ہی تم اپنی تصویروں کے ساتھ زندگی گزار رہی ہو۔ تصویریں گونگی بہری ہوتی ہیں۔ سب کچھ دیکھتی ہیں، تب بھی خاموش رہتی ہیں اور اتنی مجبور ہوتی ہیں کہ کوئی بھی انھیں بنا یا بگاڑ سکتا ہے۔ ان کے خدوخال مسخ کر سکتا ہے اور انھیں تباہ کر سکتا ہے۔ اس اعتبار سے

دیکھا جائے تو تم بھی ایک تصویر ہو۔ خوبصورت مگر نقشِ خیال جو کینوس کے رنگ میں قید ہو جائے۔ تم کو دنیا دیکھنے کی فرصت نہیں ملی یا اجازت نہیں ملی۔ گیا ہے زیب النساء کہ تم دنیا کو اپنی آنکھوں سے بھی تمھیں کیا معلوم کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے اور کون ڈاکو۔"

"تم یہاں تقریر کرنے تو آئے ہو گے۔" سراج نے کہا۔ "باہر گاڑی کو روک رکھا ہو گا۔"

"محسن باقی تقریر کرنے لگا لیڈر۔" میں نے کہا۔ "جانفشانی میری زیادہ ہے مگر حقائق سے وہ بھی آپ کو آگاہ کر سکتا ہے۔"

"جی تو میں... میرا مطلب ہے میرے دوست رہے تھے۔" محسن نے فوراً بات یوں شروع کی جیسے میں ایک کمنٹری کرنے والے سے دوسرا لیتا ہے۔ "بات محض علی بابا اور چالیس چوروں کی..."

میں اور سراج کمرے سے نکل گئے۔ سراج نے ایک کمرے کا دروازہ بڑی چالاکی سے کھولا۔ اس کے دروازے کے سامنے سے میں ہٹ گیا۔ اچانک اس نے دروازے کو ٹھوکر ماری اور ایک دم اندر دروازہ بند کرنا چاہا۔ میں نے دروازے کو کندھے سے دھکیلا لیکن خود ایک دہلیز اور پیٹ کے درمیان سراج نے کوشش کو ناکام ہوتا دیکھ کے ایک وحشیانہ زور کے ساتھ دروازے کو دبایا جیسے وہ مجھے بیچ میں ہی سینڈوچ کر دے گا مگر میں نے ریوالور والا ہاتھ اندر ڈال کے اس کی کلائی پر وار کیا۔ میرا ایک پیر دروازے میں بری طرح دبا ہوا تھا۔ ریوالور کا یوں استعمال کرنا ایک غلطی ہی تھی۔ سراج کے ہاتھ پر چوٹ ضرور آئی تھی مگر اس نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازے کو چھوڑ کے میرے ریوالور والے ہاتھ کو قابو میں کر لیا۔ اس نے اب میری کلائی کو دروازے کے کونے پر مارا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں ایک دم اندر گیا۔ میرے جسم کا سارا بوجھ دروازے پر تھا۔ اس کے ہٹتے ہی دروازہ پیچھے ہوا تو میں خود کو نہ سنبھال سکا۔ اس غلطی نے میری جان بچائی۔ کمرے میں ایک اسپیکر بولنے لگا۔

"ہیلو، ہیلو سر۔"

سراج نے ریوالور ہاتھ میں لیتے ہی گولی چلائی تھی میں جھک کر گرنے کے بل فرش کی سمت جا رہا تھا۔ نہیں لگی اور شاید میرے سر کے اوپر نکل گئی۔ پھر میں نے خود کو سنبھال لیا اور ابھی سراج کی طرف پلٹا ہی تھا

آواز اور پھر دوسرا فائر ہونے کی آواز سنی۔ یہ پہلے سے مختلف آواز تھی۔ "یہ کیا ہے سر؟" اسپیکر نے

"ہیلو..."

"بس جی اب یہیں کھڑے ہو جاؤ۔" آپ کسی نے کہا۔ میں نے دیکھا تو مجھے پولیس کی وردی میں ایک اسمارٹ آدمی اپنے ریوالور کا رخ میری جانب کیے سکون سے کھڑا نظر آیا۔ خود سراج نے اپنے اشتعال کے جذبات پر قابو پا لیا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا تھا ورنہ وہ چاہتا تو اتنی دیر میں گولی میرے سر میں اتار سکتا تھا۔ اسپیکر اب بھی پکار رہا تھا۔

"ہیلو... ہیلو۔"

"کیوں بے، یہ پکار لگا کر رہا تھا؟" اے ایس آئی میری جانب بڑھا۔ میں نے ہاتھ اوپر اٹھا لیے اور احمقوں کی طرح مسکرانے لگا۔ "بس ایسے ہی جی۔"

"اتنی ہمت ہے تیری ہمارے سامنے مسکرا رہا ہے۔" اے ایس آئی نے کہا۔ "ابا نے مجھے خود تیس مار خاں بنایا ہے" میں مسکراتے ہوئے "لگتا ہے آپ بھی مسکرا رہے ہوں گے۔"

"واہ واہ... پھر تو آپ تیس مار خاں ہیں۔" میں نے کہا۔ بالکل آخری وقت میں اے ایس آئی کو خبردار کرتا کہ وہ میرے قریب نہ جائے مگر اسے پھر بھی دیر ہو گئی۔ ایک سیکنڈ میں تیس مار خاں فضا میں کبوتر کی طرح اچھلے اور فرش پر نظر آئے۔ سراج نے فائر کیا۔ گولی اس جگہ گری جس پر اترتے ہوئے تیس مار خاں نیچے آ رہے تھے۔ ان کی ایک ٹانگ کی گولی سے ملاقات ہوئی۔ تیس مار خاں بری طرح چلائے پھر گرے تو دوسری بار چلانے کا موقع نہ ملا۔

محسن اپنی مشین گن کے ساتھ اندر آ گیا۔ "بند کرو یہ آتش بازی!" اس نے ایک نظر میں صورتِ حال کا جائزہ لے کر کہا۔ "سراج!" گولی چلانے کی نوبت نہیں آئی۔ سراج نے خود ہی ریوالور نیچے گرا دیا۔ میں ریوالور اٹھانے کے لیے جھکا اور اچانک میں نے اسے ٹانگوں سے پکڑ کے اٹھایا اور تیس مار خاں پر پھینک دیا۔ وہ بری طرح پھر باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ سراج کے چہرے پر مردنی کی جگہ بشاشت نظر آنے لگی۔

محسن ایک دم بائیں جانب دوڑ کر اس پردے کے پیچھے چلا گیا جو کھڑکی یا دروازے پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے سراج کے پیچھے پوزیشن سنبھال لی۔

"ان کو بتا دو کہ رکھوالے گئے ہیں۔" میں نے ریوالور کی نال کو اس سے چھو کر کہا۔ "اور انھیں واپس کر دو۔ اچھی طرح سمجھا کے۔"

ڈی ایس پی دروازے میں نمودار ہوا تو ہانپ رہا تھا۔

"خیریت تو ہے سر؟"

"تم سے کس نے کہا کہ خیریت نہیں ہے؟" سراج نے کہا۔ میں اس کے پیچھے لاتعلقی سے کھڑا مسکرا رہا۔

"میں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی۔" ڈی ایس پی نے مجھ پر نظر ڈال کے کہا۔ "اور کوئی ریسیور پر جواب بھی نہیں دے رہا تھا۔"

"پھر بھی تم کو ڈیوٹی چھوڑ کے اندر نہیں آنا چاہیے تھا۔" سراج نے کہا۔

"سر یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! میری ڈیوٹی ہے آپ کی حفاظت کرنا اور میں کوئی غیر معمولی بات دیکھوں یا سنوں تو یہ میرا فرض ہے کہ میں معلوم کروں۔" ڈی ایس پی نے کہا۔ وہ کوئی احمق نہیں تھا کہ صورتِ حالات کا صورتوں سے اندازہ نہ کر سکے۔ اس عہدے تک پہنچنے میں اس نے پندرہ بیس سال تک پولیس میں پاپڑ بیلے تھے۔ اس نے تاڑ لیا تھا کہ انہونی ہو چکی ہے اور اس کا افسرِ اعلیٰ غریب ہو گیا ہے۔ یعنی وہ جو کچھ کہہ رہا ہے مجبوری میں کہہ رہا ہے لیکن وہ اپنے شک کا اظہار کرتا تو خود بھی پھنس جاتا۔

"تم یہاں کیوں کھڑے ہوئے ہو؟" ڈی ایس پی نے سب انسپکٹر تیس مار خاں کو ڈانٹا۔ "سیٹ پر تمہارا باپ بیٹھے گا؟"

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر خاموشی سے اس میز پر جا بیٹھا جس پر ایک ٹی وی اور ایک ٹرانسمیٹر قسم کی چیز رکھی ہوئی تھی۔ اس کے بہت سے ڈائل تھے اور سوئچ تھے اور اس کی ایک سرخ روشنی ظاہر کرتی تھی کہ یہ مواصلاتی رابطہ کام کر رہا ہے۔ اس ٹرانسمیٹر سے نکلنے والے مختلف تاروں میں سے ایک ٹیلی فون کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ دوسرا ایک ٹیپ ریکارڈر سے اور تیسرا باہر جا رہا تھا جو شاید ایریل تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں جو کچھ کہا اور سنا جاتا تھا ٹیلی فون پر یا براہِ راست، وہ سب ریکارڈ ہوتا تھا اور شاید نشر ہونے کے بعد کسی دوسری جگہ بھی پہنچتا تھا۔ ٹیلی ویژن پر کوٹھی کا صدر دروازہ نظر آ رہا تھا اور نواب خسرو جمشید کی گاڑی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ سراج نے اسے آف کر دیا۔

"سر وہ آپ کے دوست؟" ڈی ایس پی نے ٹی وی کی جانب اشارہ کیا۔ "ان کو جانے دیں؟"

"ہاں، جانے دو انھیں۔" سراج نے کہا۔ "اور کچھ دیر بعد وہ آئیں گے تو انھیں روکنا نہیں ہے۔ ممکن ہے ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہو۔"

"اور کون سر؟"

"خواتین ہو سکتی ہیں۔" سراج نے کہا۔ "تم وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ نہ اس سے زیادہ نہ کم۔ اپنی عقل سے کام لے کر کچھ

www.paksociety.com

کرنے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔"

"نہیں سر۔" ڈی ایس پی نے بجھتے ہوئے کہا۔

"تم میرے ماتحت ہو، میں حکم عدولی بالکل برداشت نہیں کرتا، اگر تم نے مجھ سے پوچھے بغیر کچھ کیا تو میں تم کو معطل کرا دوں گا۔" سراج بولا۔

"میں کچھ نہیں کروں گا سر۔" ڈی ایس پی بولا۔

"کچھ نہیں کا مطلب سمجھتے ہو؟ کسی سے فون پر یا ڈائریکٹ بھی بات نہیں کرنا ہے، ایک لفظ بات کرو گے، اگر کہیں سے پیغام آئے تو مجھے بتانا، کوئی کچھ بھی پوچھے تو تم جواب دینے سے پہلے مجھ سے پوچھو، رائٹ؟"

"رائٹ سر۔" ڈی ایس پی اندر تک کانپ رہا تھا۔

"اگر تمہاری وجہ سے نقصان ہوا یہ سمجھ لو کہ نقصان بہت سنگین ہو سکتا ہے اور ناقابل تلافی بھی۔" سراج بولا۔ "تو تم کچھ نہیں کر سکو گے۔"

"سیدھی صاف بات سنو۔" محسن اچانک پردے کے پیچھے سے نکل آیا۔ "تمہارے ایس ایس پی اور اس گھر کے تمام افراد کی زندگی اور موت کا انحصار تمہارے رویے پر بھی ہے، یہ بے چارے قید میں ہیں، باہر کی صورت حال کو ہوشیاری سے کنٹرول کرو تاکہ ان کی جان بچی رہے ورنہ ان کے ساتھ ہم بھی نہیں، شاید تم بھی مارے جاؤ گے، باہر ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں آ جائیں تب بھی ان سب کی جان بچانے کوئی اندر نہیں آ سکتا۔ آنے کا کوئی [illegible] لا نہیں پائے گا۔"

"ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم چلے جائیں گے۔" میں نے ریوالور نکال کے کہا۔ "تم ہمیں خیریت کے ساتھ نکل جانے دو گے تو یہاں بھی سب خیریت رہے گی ورنہ..."

"یس... آپ بالکل فکر نہ کریں۔" ڈی ایس پی نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔ "کیا اب میں جا سکتا ہوں؟"

"جاؤ۔" میں نے کہا۔ "موبائل کا رابطہ ٹوٹنا نہیں چاہیے ورنہ شکوک پیدا ہوں گے، سب کو بتاتے رہو کہ سب ٹھیک ہے، بعد میں تم اپنی مجبوری کی وضاحت کر سکتے ہو، ایس ایس پی صاحب تمہیں بچائیں گے اور اگر تم نے ان کو مزید مشکلات میں مبتلا کیا تو تمہارے بارے میں اچھی رپورٹ نہیں دیں گے۔"

ڈی ایس پی واپس جانے لگا تو محسن نے کہا۔ "ڈی ایس پی، جو کچھ تم نے دیکھا یا سنا اور تم سے کہا گیا، وہ صرف تمہارے لیے تھا، باہر جو تمہارے ماتحت ہیں انہیں بتانا ضروری نہیں ہے۔"

"آپ مجھ پر بھروسا کریں، میں ایسی کوئی بات نہیں ہونے دوں گا۔" وہ بولا۔

"تمہارا یہ ماتحت واقعی کچھ [illegible] بے وقوف

بنا کے نکل جانا چاہتا تھا۔" محسن نے کہا۔ "تو وہ باہر جا کے انہیں خود تمہاری طرف سے ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھائے گا؟"

"تم اگر مطمئن نہیں ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" سراج بولا۔

"اب آپ بھی جائیں۔" میں نے محسن سے کہا۔ "آپ کو ڈسٹرب ہوا، خواتین باقی پکچر دیکھنے کے لیے بے چینی سے منتظر ہوں گی، انہیں سب بتا دیا۔"

"خاک بتاؤں، عجیب کوڑھ مغز خواتین ہیں۔" محسن بولا۔

"جب آپ نے خواتین کہہ دیا تو وہ کوڑھ مغز کیسے ہو گئیں۔" میں نے کہا۔

"مناسب وقت پر یہ بات خواتین تک پہنچا دی جائے گی۔ ان خواتین تک جو آپ کی رائے بدل سکتی ہیں۔" محسن بولا۔ "میرے لیکچر سے مستفید ہونے والی تو کچھ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں، وہ دراصل ایک ماں ہے، ایک منکسر، ایک بیوی، ایک بہو، ایک ساس ہے اور ایک بہو، ایک سیدھی سادی عورت ہے تو ایک معتوب ہے۔"

"اُف، بائیں ہاتھ کو چھوڑ کے آیا تھا، [illegible]" میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا۔ محسن ہنسا اور واپس چلا گیا۔

"ہاں جیتی۔" میں نے اسماعیل آفندی کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"آہ! قسم اللہ کی بڑا دکھ رہا ہے۔" وہ کراہ کے بولا۔

"تمہیں مسکراتے ہوئے مردے کا ڈر ہے، میرا خیال ہے اس وقت بھی وہ مسکرا رہے ہوں گے، تمہاری حالت پر۔" میں نے کہا۔

"وہ تو میں ایسے ہی کہہ رہا تھا۔" وہ پان چباتے ہوئے بولا۔

"ہمت سے کام لو، خود تم کو آنسوؤں میں مسکرانا ہے، مردہ بنا ہے، منکر نکیر کے سامنے بھی مسکراتے رہنا، سودا اسرائیلی کے مسکراتے ہوئے اٹھنا۔" میں نے کہا۔ "اور یہ جو تم شیطان بھاڑ جھنکار لیے بیٹھے ہو، اس تک بھی کسی سے بات کرو تو مسکراتے ہوئے بات کرنا۔ کیسے بھلا؟ ذرا مسکرا کے دکھاؤ۔"

"ہیں جی؟" وہ بوکھلا گیا۔

میں نے اس کے ایک ہاتھ مارا، وہ کرسی سمیت لڑھک گیا اور بڑی مشکل سے اٹھا۔

"مسکراؤ۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔ اس نے زبردستی ہنسنے کی کوشش کی۔

"ہم اب یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ وہ کھانے کا کمرہ تھا اور کھانے کی میز پر ریڈیو، ٹیلی فون اور انٹرنیٹ اور کلوز سرکٹ ٹی وی کا تمام اسباب پھیلا ہوا تھا۔ وہ کرسیاں لے کر ہم ایک طرف بیٹھ گئے۔ سراج نے ہی نہیں اس کے ماتحت نے اب تسلیم کر لیا تھا کہ دشمن ان کے

اعصاب پر غالب آ چکا ہے اور اس کی طاقت کا مقابلہ کرنا پاگل پن کے مترادف ہے۔ سراج یہ بھی سمجھتا تھا کہ اسے حقیقت سے فرق پڑتا ہے؟ مجھے نہیں، وہ ایک بزدل اور کم ہمت آدمی تھا، بے ایمانی اور خود غرض آدمی کے لیے جرأت اور بہادری، غیرت و حمیت اور اعلیٰ انسانی صفات کی پاسداری کا انعام نہیں ہوتی جتنی اپنی زندگی، کیونکہ زندگی اس کے لیے ہوس زر اور بے لگام خواہشوں کا سرچشمہ رہتی ہے اور وہ کسی مقصد کے لیے جان دے کر گھاٹے کا سودا کبھی نہیں کرتا، اپنی نظر میں کبھی نہیں کرتا۔

"کیا تم واقعی دس لاکھ لے کر چلے جاؤ گے؟" سراج نے کہا۔

"تمہارا اندازہ کیا کہتا ہے؟" میں نے کہا۔

"میرے خیال میں تمہارے لیے دس لاکھ کی رقم کچھ نہیں، جب تم اس سے دس گنا یا سو گنا لے سکتے تھے تو تم نے نہیں لیے تھے۔" سراج بولا۔

"تمہارا دماغ ابھی تک صحیح خطوط پر سوچ رہا ہے، اس لیے تم بخشش کے بھی حقدار ہو سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے بخشش کے لیے نہیں، تمہارے پاس حرام کا مال جمع کرنے کے ذرائع پہلے بھی کم تھے، اب اور زیادہ ہو جائیں گے، تم ایس ایس پی جو بن گئے ہو، مانتا ہوں کہ تمہارے پیچھے بہت لمبے ہاتھ ہیں۔"

"مجھے اندیشہ ہے کہ تم ولادر کی بیوی کو لے جاؤ گے۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اسے ہی نہیں، تمہاری منکوحہ کو بھی..."

"وہ ایسی لڑکی نہیں ہے، وہ مر جائے گی۔" سراج بولا۔

"مر جانے دو، تم سے شادی کر کے وہ موت سے بدتر عذاب تو نہیں جھیلے گی اور جیتے جی در گور تو نہیں ہو گی۔" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے تم میری ماں کو بھی لے جاؤ گے؟"

"ہاں، یہ ماں، بہن یا بیوی کے سب رشتے جذبات کے رشتے ہیں اور تمہارا جذبات سے کیا رشتہ؟" میں نے کہا۔ "ورنہ پولیس والے ہو، رشتوں کی قدر و قیمت اور آبرو کو سمجھتے، تم ان کی عزت کا لحاظ کرتے، تم کو اب ہم سے کسی رعایت کی توقع کیوں ہے؟" میں نے کہا۔ "بہت مجبور ہو کے ہم نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ وقت نے ہمیں سکھا دیا ہے کہ جنگ اور جذبات بھی آدمی کی کمزوری بن جاتے ہیں۔ میں بہت پہلے خود کو ذمہ دار سمجھتا ہوں کہ میری محبت رابعہ کو تحفظ فراہم نہیں کر سکی تھی۔ ولادر اور رابعہ کے حق میں نقصان دہ ہو گئی تھی، تم نے اسے بھی بدلے کے لیے استعمال کیا، اس کے ساتھ وہ سب کیا جو شاید تم نے اپنے کیمپوں میں عورتوں کے ساتھ کیا ہو گا۔ اس کو

میں نے دیکھا، تم نے مجھے دیکھنے پر مجبور کیا، اس وقت تم نے نہیں سوچا تھا کہ تم مجھے بھی بے حس اور سفاک بنا رہے ہو، جو میرے ذہن کو بدل رہے ہو خود اپنے خلاف... آج میں اتنا پتھر دل ہو گیا ہوں کہ وہ سب کر سکتا ہوں جو تم نے کیا تھا۔ تمہاری ماں یا زیب النساء اور ولادر کی بیوی یہ سب وسیلے ہو گئے ہیں تم پر غلبہ پانے کے، میں احترام آدمیت کے احساس سے بیگانہ ہو گیا ہوں۔ تمہاری کوششوں کے طفیل اور آگے چل کے شاید شیطان بھی بن جاؤں، جو اذیت میں جھیل چکا تم وہ اب جھیلو گے۔"

"رابعہ بیچاری کا قصور نہیں ہے۔" وہ اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔

"پھر کیا ہوا، حسن رضوی صاحب کے گھر پر چڑھائی کر دی، وہاں سے محسن کی بیوی کو اٹھا لو۔" میں نے کہا۔ "کیمرہ مین اور جو بھی کر سکتے ہو تلاش کر لو، رابعہ کو پھر پکڑ لو۔"

"تم آج بھی یہ سب تو کر سکتے ہو۔"

میں ایک دم اٹھا اور میں نے اس کے چہرے پر تھپڑ مارا۔ اسے کئی بار پیچھے سے اٹھایا اور پھر گرا کے ٹھوکریں ماریں، بخت وحشت زدہ لے ایس آئی یہ سب دیکھتا رہا، اس کا بہت بڑا افسر بڑی بے بسی کے ساتھ پٹ رہا تھا۔

"آج اب بات کرتے ہو کھوتے کی۔ جب خدا تمہارے پلڑے میں آ گیا ہے تو کہتے ہو اس کا کیا فائدہ۔ جنگ میں عورتوں کو لانے کی کیا ضرورت ہے، اب ضرورت کا احساس تمہیں دیر سے ہوا۔" میں نے پھر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم جب بازی ہار گئے تو صلح کی بات بھی کرو گے، وہ وقت بھی آئے گا مگر اس سے پہلے تم کو وقت کچھ سبق پڑھا جائے گا، یہ ہو سکتا تھا کہ ہم تمہیں کوئی مار کے نکل جاتے، سابق ایس ایس پی تمہیں چارج دینے کے بجائے تمہارے جنازے کو کندھا دینے آتے مگر میں تم کو جیتے جی سزا دینا چاہتا ہوں، یہ میں ولادر کو سمجھا چکا ہوں کہ اسے جمشید کو اور تمہارے سب حواریوں کو ہم جب چاہتے کتے کی موت مار دیتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ صرف اس لیے کہ ہم پر تمہارے قتل کا الزام نہ آئے، کوئی یہ نہ کہے کہ تم ہمارے انتقام کا نشانہ بنے اور وہ بڑے خطرناک مجرم تھے جنہوں نے تمہیں مار دیا۔ نہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ایک دن تمہارا مقدمہ ایک وطن فروش اور غدار قاتل کی حیثیت سے قانون کی عدالت میں اور عوام کے سامنے جائے، تمہارے خلاف ہر ثبوت ہو، ہر شہادت ہو، ان سب کے خون کی بو کے داغ تمہارے دامن پر ہوں، ان سب کی جو تمہاری [illegible] پر قربان ہوئے، پھر ایک دن فیصلے کا آئے اور ایک دن فیصلے پر عمل در آمد ہو۔"

"تم کتنی لا حاصل خواہشوں کے اسیر ہو۔" سراج نے تلخی

www.paksociety.com

نے کہا۔ "تم کو آج تک کسی خواب کی تعبیر ملی ہے جو تم اس دن کے لیے زندہ ہو اور مر ہو گے۔"

"یہی دلاور نے پوچھا تھا اور میں نے کہا تھا کہ ہاں میں وہ دن دیکھنے کے لیے زندہ رہوں گا، جب خدا نے مجھے ایک مشن سونپا ہے تو وہ مجھے اپنی جدوجہد کا انعام ضرور دے گا کہ میں کامیابی کی خبر سنوں اور تمہارے انجام کو دیکھ سکوں۔" میں نے کہا۔ "تمہاری وہ سزا میرے ساتھ سارا زمانہ دیکھے جو تم کو اس دنیا میں ملنی ہے، باقی رہ جائے گی عاقبت کی سزا تو اس کا حساب ہم بھی دیں گے، ہم بڑے گناہ گار ہیں لیکن مجرم نہیں ہیں۔"

"آج اس وقت تم بڑا بول بول سکتے ہو، بہروپ ہی کر سکتے ہو، یہ بھی کہ زندگی اور موت پر تمہارا اختیار ہے... مگر یہ وقت گزر جائے گا اور بالآخر تم دیکھو گے کہ تمہارے لیے زمین کتنی تنگ ہو چکی ہے، تم خود کو ایک دلدل میں محصور پاؤ گے سراج!"

"کل کی بات کل کریں گے۔" میں نے کہا۔ "وقت بتلائے گا کہ کون دلدل میں ہے اور کس نے کیسے محسوس کیا ہے۔"

یکلخت وائرلیس کا اسپیکر سیٹی سی بجانے لگا اور انسپکٹر تیس مار خان نے کسی سے کہا۔

"یس سر، بول رہا ہوں۔"

"ایس ایس پی صاحب کے بارے میں کیا رپورٹ ہے، کہاں گئے ہیں؟"

"کچھ نہیں معلوم سر، بتا کے نہیں گئے۔"

"گھر میں بھی کسی کو نہیں بتایا؟"

"نہیں سر۔"

"تم سب چوکس رہنا، وہ دونوں بدمعاش ابھی تک روپوش ہیں، سب تھانوں کو خبردار کر دیا گیا ہے، ان کی اصل تصویریں بھی دے دی گئی ہیں، شہر کی ناکہ بندی ہے، تم کوئی ایسی ویسی بات دیکھو تو فوراً رپورٹ کرو۔ ابھی کچھ دیر پہلے شور کیسا تھا؟"

"کچھ دیر پہلے؟ نہیں سر۔"

"ہاں، میں نے خود سنا تھا جیسے فائر کیا گیا ہو مگر اس کے بعد لائن کٹ گئی تھی۔"

"فائرنگ کون کرے گا سر، باہر ڈی ایس پی صاحب مسلح گارڈ کے ساتھ موجود ہیں۔" ایس آئی بولا۔ "لائن آپ کی طرف سے خراب تھی سر، میں کوشش کر رہا تھا مگر جواب نہیں مل رہا تھا۔"

"چلو اب ٹھیک ہے، ڈی ایس پی صاحب کو سلام بولنا۔"

"یس سر۔" ایس آئی نے کہا۔

"کس کی کال تھی؟" میں نے کہا۔

"تھانے سے ایس ایچ او صاحب کی۔" وہ بولا۔

"تم کو سب ہی تیس مار خاں کہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ شاید اس کو یہ بات بری لگی۔ موقع محل دیکھے بغیر کہنے کی عادت ہوگی کہ وہ مسکراتے ہوئے تیس مار سے دفن کر چکا ہے۔

اس کال کے علاوہ بھی درمیان میں متعدد فون آئے تھے۔ خیر خواہی کے جذبات کا اظہار کرنے میں پہل کی کوشش کرنے والوں کو اس جواب سے مایوسی ہوتی تھی کہ ایس ایس پی صاحب گھر پر موجود نہیں ہیں۔ سب خوشامدی پیچھے سراج کو مبارک باد دینا چاہتے تھے۔ کچھ زیادہ چاپلوس تھے کہ خود حاضر ہوئے تھے اور دروازے سے لوٹا دیے گئے تھے۔ اندر اور باہر سراج کے محافظ بڑی ہوشیاری سے تمام صورت حال کو ہینڈل کر رہے تھے۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ دس منٹ اوپر ہو گئے تو مجھے تشویش لاحق ہوئی مگر اسی وقت ٹی وی اسکرین روشن ہو گیا۔ میں نے جمشید کی مرسیڈیز دیکھی جو گیٹ سے اندر آ رہی تھی۔

"تیس مار خاں، جاؤ انہیں یہاں لے آؤ۔" میں نے کہا۔ "آگے جانے کی ضرورت نہیں، اسی جگہ دروازے میں کھڑے رہو، وہ ادھر ہی آئیں گے۔"

تیس مار خاں نے تعمیل کی۔ جمشید پہلے اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا، پھر عاشی اس سے چند قدم پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو گیا۔

"تم... تم ہو یہاں؟" اس نے پلٹ کر جمشید کی طرف دیکھا۔ "آپ نے کیوں جھوٹ بولا تھا؟"

"وہ ضروری تھا۔" جمشید نے مختصراً کہا۔

"خوش آمدید لیڈی عاشی گلبدن۔" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے سر کو بڑی عاشقانہ نیاز مندی سے جھکایا اور فرانسیسی میں کہا۔

"ہم نے کہا تھا کہ پھر ملیں گے۔"

"شٹ اپ۔" وہ اردو میں بولی۔ "تم ایک دھوکے باز ہو، جعلساز ہو، صحافی نہیں مجرم ہو۔"

"ان کو آتا ہے پیار پہ غصہ۔" میں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے، جو چاہو کہو، ہم گالیاں کھا کے بے مزہ نہیں ہوتے۔"

"عاشی، ان کے منہ مت لگو۔" جمشید نے کہا۔ "بیٹھو ادھر۔"

"پہلے میں اس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ جیجا جی کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟"

"جیجا جی؟ کس کے جیجا جی، کیسے جیجا جی؟" میں نے کہا۔ "ہم کیا کسی کے جیجا جی سے کم ہیں؟ ہم سے بھی پوچھ لو کہ ہم کیسے ہیں!"

"بکواس مت کرو، میں تم کو کچھ بتانا چاہتی ہوں کہ تمہارا کھیل

غلط فہمی دور ہو جائے گی۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "چوہدری صاحب کوئی ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں ہیں۔ ان کے اغوا سے تہلکہ مچ گیا ہے۔ میرے پاس اخباری نمائندے بھی آئے تھے، میں نے انہیں سب بتا دیا کہ وہ کون تھے جو انہیں لے گئے تھے۔ کل اخبار میں قد آدم بھی شائع ہوگا۔ چوہدری صاحب کی بازیابی کے لیے پولیس کی خصوصی ٹیم تشکیل دی گئی ہے کیونکہ وزارت داخلہ کے حکام تک دباؤ میں ہیں۔"

"تت تت تت۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "بے چارے چوہدری صاحب ابھی گو سیاست میں نو وارد تھے لیکن یقیناً ان کو کسی سیاسی حریف نے اغوا کیا ہوگا، جس کو اندیشہ ہوگا کہ آئندہ انتخابات میں چوہدری صاحب اس سے صوبائی اسمبلی کی نشست چھین لیں گے۔"

"ان کا کوئی سیاسی حریف نہیں، سب نے مذمت کی ہے۔"

"ہاں ہاں، مذمت کیوں نہیں کی ہوگی، ایک ایسا فرشتہ سیرت آدمی دن دہاڑے اغوا کر لیا گیا اور قانون کے یہ محافظ کچھ نہ کر سکے۔" میں نے سراج کی طرف اشارہ کیا۔ "مذمت کرنے والے بھی سیاستدان ہی ہوں گے، خود ساختہ عوامی لیڈر، دلاور سے زیادہ قوم کا درد دل میں رکھنے والے، جو کسی رفاہی ادارے چلانے کے نام کماتے والے، فلاحی تنظیموں کی آڑ میں بدمعاشی کرنے والے، چندے کھانے والے، دین کے نام پر تجارت کرنے میں مصروف، جن کے چہروں پر منافقت اور جھوٹ کی نقاب ہو، ان کے فرشتہ بننے والے شیطان، سب دلاور کے لیے بیان دیں گے کہ وہ بھی فرشتہ تھا، ملک و ملت کے لیے تن من دھن سب لٹانے کا عزم رکھتا تھا۔ غریبوں کے مفت علاج کے لیے اسپتال قائم کرنے کا اعلان کر چکا تھا۔ ہائے! حسرت ان غنچوں پہ ہے..."

"سراج صاحب، یہ شخص اتنا بول رہا ہے اور آپ چپ ہیں۔ یہ آپ کے گھر میں موجود ہے، آپ کے پاس اتنی پولیس کی نفری ہے اور پھر بھی آپ کچھ نہیں کر رہے ہیں؟" عاشی نے چلا کے کہا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" سراج نے سخت لہجے میں کہا۔ "جاؤ ادھر دوسرے کمرے میں اماں کے پاس... وہاں نرجس انصاری بھی ہے۔"

"لیکن جیجا جی کہاں ہیں؟" وہ ضدی لڑکی اڑی ہوئی تھی۔ "باجی کی طبیعت بہت خراب ہے، انہیں دورہ پڑ گیا تھا..."

"عاشی! پاگل مت بنو۔" سراج نے اسے پکڑ لیا ورنہ وہ شاید مجھ پر حملہ کر دیتی۔ "بہ مشکل دلاور کی جان بچانے کا ہے اور کی وجہ سے مجبور ہو گئے ہیں۔"

"آپ چھوڑیں مجھے، میں خود نمٹ لوں گی۔" عاشی نے زور لگاتے ہوئے کہا۔ "ان کمینوں سے..."

سراج نے اسے جھنجوڑا۔ "تم مجھ سے زیادہ عقل مند نہیں ہو، یہ دس لاکھ روپے آفرکس لیے دے رہے ہیں ہم؟ دلاور کو خیریت سے واپس لانے کے، تم جاؤ ادھر..."

"میں نہیں جاؤں گی۔" اس نے چیخ کر کہا۔

سراج کا تھپڑ اس کے گال پر ایسا پڑا کہ وہ دور جا گری۔ تھپڑ کی ضرب سے زیادہ اس تذلیل کا صدمہ تھا کہ وہ فوراً اٹھ بھی نہ سکی۔ وہیں ایک ہاتھ مضروب گال پر رکھے سراج کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی، پھر اچانک اس کا بستر یا آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ گیا۔

"چلو اٹھو۔" جمشید نے کہا اور اس کا بازو پکڑ کے کھینچا۔ "کئی بار تم کو سمجھایا تھا کہ یہ معاملات ہم پہ چھوڑ دو۔"

"کیا تم رقم گنو گے؟" سراج نے کہا۔

"نہیں، اتنا وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔" میں نے کہا۔

جمشید نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" وہ بولا اور عاشی کو دروازے کی طرف کھینچ کے لے گیا۔ سراج نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

"کیا خیال تھا؟" میں نے کہا اور جمشید کو روک دیا۔

"یہی کہ دس لاکھ کا گننا آسان نہیں ہوتا۔" جمشید بولا اور پھر عاشی سے مخاطب ہوا۔ "تم دفع کیوں نہیں ہوتیں!"

سراج اور جمشید دونوں ہی عاشی کو جلد از جلد کمرے سے دور بھیج دینا چاہتے تھے۔ یہ بات میرے دل میں شک پیدا کرنے کے لیے کافی تھی۔

"مس عاشی! آپ ذرا ادھر آئیں۔" میں نے کہا۔ "یہ سوٹ کیس تو آپ کی باجی کا ہے نا؟"

عاشی نے اقرار میں سر ہلایا۔ اس نے اب اپنے آنسو خشک کر لیے تھے۔

"اس میں رقم آپ کے سامنے رکھی گئی تھی؟" میں نے کہا۔

"اس سے کیا پوچھتے ہو، کھول کے دیکھ لو۔" جمشید نے کہا اور عاشی کو دروازے سے باہر دھکیل دیا۔ جمشید نے ایک جست لگائی اور عاشی کو پھر دروازے سے اندر کھینچ لیا۔ میرے پالو کا رخ اس عرصے میں سراج اور جمشید کی جانب تنا رہا تھا۔

"میرے سوال کا جواب دو۔" میں نے عاشی کو کلائی سے پکڑ کے اندر میز کی جانب پھینکا۔ وہ اگر میز کے کنارے کا سہارا نہ لیتی تو یقیناً گر جاتی۔

"مجھ سے یہی کہا تھا۔" عاشی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

www.paksociety.com

"کس نے کہا تھا؟"

"باجی... ہاں باجی نے کہا تھا۔" وہ ہکلا کے بولی۔

"گویا تم نے نہیں دیکھا تھا کہ اس میں دس لاکھ روپے ڈالے گئے ہیں یا نہیں؟" میں نے کہا۔

"باجی جھوٹ کیوں بولیں گی۔"

"کیا وہ دس دس لاکھ کے نوٹوں سے بھرے ہوئے بریف کیس تیار رکھتی ہیں کہ ادھر مجازی خدا کا حکم ہو ادھر وہ رقم حاضر کر دیں؟" میں نے کہا۔

عاشی نے بے بسی سے سراج اور جمشید کی طرف سوالیہ نظریں اُٹھائیں۔ شاید یہ پوچھنے کے لیے کہ بتاؤ اب میں کیا کہوں؟

"چلو تم مجھے کھول کے دکھا دو۔" میں نے کہا۔ "مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ یہ رقم کتنی ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اوپر نوٹ ہوں اور نیچے برابر کیے ہوئے سادہ کاغذ۔ یہ عام ٹرک ہے۔"

"میں... میں اسے نہیں کھول سکتی۔" عاشی نے کہا۔

"کیوں؟ سیدھا سادہ بریف کیس جیسا سوٹ کیس ہے۔ قفل بھی نمبر والے نہیں ہیں کہ تم نمبر بھول جاؤ یا کہو کہ مجھے نمبر معلوم ہی نہیں۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس چابی نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"نواب صاحب! کیا چابی آپ کے پاس ہے؟" میں نے کہا۔ "ہے تو عاشی کو دے دیں۔"

"چابی... وہ تو تمہارے پاس ہونا چاہیے۔" جمشید نے کہا مگر وہ اتنا اچھا ایکٹر نہیں تھا جتنا دلاور تھا۔ یہ بات کہتے ہوئے وہ مجرم لگ گیا۔

"چلو چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "میں اعتبار کر لیتا ہوں کہ رقم پوری ہو گی مگر اب اس سوٹ کیس کو اٹھاؤ اور دوسرے کمرے میں چلو۔" میں نے کہا۔ "وہاں سب خواتین محسن کی جنرل نالج کے لیکچر سے مستفید ہو رہی ہیں۔"

عاشی نے سوٹ کیس اُٹھا لیا۔ سراج اور جمشید کچھ دیر اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ میں نے انہیں ریوالور سے اشارہ کیا تو وہ پھر بھی کھڑے رہے۔

"کیا بات ہے؟ تم جام کیوں ہو گئے ہو؟ تمہیں اسپیڈ لگاؤں؟" میں نے ان کے پیچھے جا کے کہا تو وہ بادل ناخواستہ آگے بڑھے۔

محسن دوسرے کمرے میں کسی کالج کے پروفیسر کی طرح بیٹھا بول رہا تھا اور غالباً سراج کی ماں اور ہونے والی بیوی کو وہ سب کچھ بتا چکا تھا جو انہیں معلوم نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے تمام حقائق کے سمندر کو ایک کوزے میں بند کر کے پیش کیا ہوگا۔ زیب النساء اور سراج کی ماں یوں بیٹھی تھیں جیسے ان پر فالج گر گیا ہو۔ اگر انہوں نے محسن کی باتوں پر یقین نہ کیا ہوتا تو ان کے چہروں کا ردِ عمل مختلف ہوتا۔

"عاشی! یہ سوٹ کیس ایس ایس پی صاحب کی والدہ کو دے دو۔" میں نے کہا۔ "سراج اور جمشید تم دونوں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ تاکہ تم کچھ نہ دیکھ سکو۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" سراج نے کہا۔

"میں کچھ نہیں کروں گا۔ تمہاری والدہ یہ سوٹ کیس کھول کے دکھائیں گی کہ اس میں نوٹ ہی ہیں۔" میں نے کہا۔ عاشی نے سوٹ کیس رکھ دیا۔

"نہیں۔" سراج چلایا کیونکہ اس کی ماں نے سوٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ ان کی انگلیوں کے ذرا سے دباؤ سے سوٹ کیس کے کھٹکے الگ ہو جاتے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے جھک کے پوچھا۔ "تم کیوں چلانے لگے؟"

"سوٹ کیس مت کھولنا۔" سراج نے اپنی ماں سے کہا۔

"سوٹ کیس کیسے کھلے گا جبکہ" میں نے کہا۔ "عاشی اور نواب صاحب دونوں میں سے کسی کے پاس چابی نہیں ہے؟"

"لیکن اسے کھول کے دیکھنا تو پڑے گا۔" محسن بولا۔ وہ بھی معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ "ماں جی! آپ ایسا کریں کہ تالا توڑ دیں۔"

"نہیں... ماں... سوٹ کیس ان کے حوالے کر دو۔ یہ خود ہی کھول لیں گے۔" سراج نے سخت لہجے میں کہا۔

"افسوس ایس ایس پی صاحب! آپ نے کوئی عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔" میں نے کہا۔ "آپ کے پاس ایک موقع تھا وہ آپ نے گنوا دیا۔ ہم نے بہت کچھ آپ سے ہی سیکھا تھا۔ اب بھی سیکھ رہے ہیں۔ ہم یہ حماقت کیسے کر سکتے تھے کہ دس لاکھ کی رقم کے بدلے خود کشی کر لیتے۔ یہ تو مجھے اسی وقت سمجھ لینا چاہیے تھا کہ دلاور نے فوراً دس لاکھ دینا کیوں منظور کر لیا تھا۔ اپنی بیوی کو خط کیوں لکھ کر دے دیا تھا۔ وہ بھی آخر دلاور کی بیوی ہے۔ اُسے پہلے سے معلوم ہوگا کہ اس سوٹ کیس میں کیا ہے۔ دلاور نے اُسے خط میں کوئی اشارہ دے دیا جو وہ جانتی تھی۔ تم نے فرض کر لیا کہ ہم خود ہی سوٹ کیس کھول کے رقم دیکھنے کی بے وقوفی کریں گے۔ تم عاشی کو وہاں سے جلد از جلد نکالنا چاہتے تھے۔ تم تو جانتے تھے کہ سوٹ کیس میں بم ہے۔ اس کو کھولتے ہی دھماکا ہوگا۔ ہم فوراً خود مار کے فرش پر لیٹ جاتے۔ مارے جاتے تو صرف ہم۔"

"دیکھو مجھے... میری باجی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔" عاشی نے ایک دم چلانا شروع کر دیا۔ "انہوں نے تو خط دیکھ کر رونا دھونا شروع کر دیا تھا کہ کون سے دس لاکھ؟ اس وقت دس لاکھ کہاں سے لاؤں۔ دلاور نے میرے پاس کوئی دس لاکھ نہیں رکھوائے۔ ایک منٹ میں تو بینک والے بھی دس لاکھ نہیں دیتے۔ نوٹس مانگتے ہیں۔"

"عاشی! فضول مت بولو۔" جمشید نے غرا کے کہا۔

"جمشید تم نے دوبارہ عاشی کو ٹوکا تو میں تمہیں خاموش رکھنے کے لیے کسی طریقے پر عمل کروں گا۔" میں نے کہا۔ "جو تمہارے لیے زیادہ ناپسندیدہ ہوگا۔ آگے کہو مس عاشی۔"

"ابھی یہ جمشید صاحب نے کہا کہ دس لاکھ ایک تجوری میں پڑے ہیں۔" عاشی نے مجبوراً بات جاری رکھی۔ "انہوں نے باجی کو ایک چابی دی اور کہا کہ یہ تجوری کی چابی ہے۔ اس میں ایک سوٹ کیس ہے اسے نکال دو مگر... خبردار اسے کھولنا نہیں۔ احتیاط سے جیسا رکھا ہے دے دینا۔ اٹھا لاؤ۔ پھر باجی نے سوٹ کیس نکالا اور پھر ہم یہاں آ گئے۔"

"تمہیں یہاں لانے کے لیے جمشید نے کیا جھوٹ بولا تھا؟"

"انہوں نے کہا تھا کہ چوہدری صاحب نے سراج کے گھر بلایا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کیوں مگر وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ باجی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، چنانچہ میں آ گئی۔ مجھے نہیں معلوم یہ سب کیا ہے؟"

"معلوم ہو جائے گا۔ آئندہ چند دنوں میں تمہیں بہت کچھ معلوم ہوگا مس عاشی۔" میں نے کہا۔ "یہ سوٹ کیس اُٹھاؤ۔ محسن! ان خواتین کا خیال رکھنا، میں ان خواتین کو لے کے جا رہا ہوں۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔" سراج نے چیخ کر کہا۔

"میں ایسا ہی کرنے کی نیت سے آیا تھا ایس ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "اور ایسا ہی ہوگا۔ خواتین ہمارے ساتھ جائیں گی۔ پیچھے کل آخر میں تم اور جمشید یہاں رہو گے۔ صبح تک دلاور بھی آ جائے گا۔"

"تم... تم مجھے بھی لے جاؤ گے؟" سراج کی ماں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "خیر میں چلتی ہوں مگر اسے چھوڑ دو..." زیب النساء کے منہ سے نکلا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایس ایس پی صاحب کی والدہ، نواب خسرو جمشید کی بہن اور دلاور کی سالی، ہم نے انہی کا انتخاب کیا تھا۔"

"تم آخر کیوں کیا چاہتے ہو تم؟" سراج کی ماں رو دی۔

"ماں جی! آپ فکر مت کریں۔" میں نے کہا۔ "ہم کسی کی جان لینے کے خواہش مند نہیں ہیں۔ ہم ایک سودا کریں گے۔ اپنے بیٹے کو سمجھائیں کہ وہ جلد از جلد ہم سے معاملات طے کر لے تاکہ آپ سب واپس آ جائیں۔ اس کا ذمہ دار ہم نہیں۔ یہ لوگ ہوں گے۔ آپ کا فرزند بھی شامل ہے۔"

زیب النساء اچانک پیچھے لڑھک گئی۔ جمشید آگے بڑھا ہی تھا کہ محسن نے اُسے مشین گن کا بٹ مار کے پیچھے کر دیا۔ جمشید کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا مگر وہ بے بس تھا۔ "زیبا بے ہوش ہو گئی ہے۔" وہ بولا۔

"ہوتے رہو۔ ہم اسی حالت میں لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور اپنے جذبات پر قابو رکھو۔ تم ہمیں روک نہیں سکتے۔ اگر روکو گے تو اچھا نہیں کرو گے۔ نہ اپنے لیے اور نہ ان کے لیے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارا راستہ روکا نہیں جا سکتا۔"

"یہ... جو یہاں موجود ہیں، اپنی جان پر بھی کھیل جائیں گے۔ تم مجھے مجبور مت کرو۔" سراج نے کہا۔

"جتنے لوگ یہاں اس وقت موجود ہیں، اس سے زیادہ گولیاں ہمارے پاس ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر تم خون خرابا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ چھوڑ دو اپنے کتوں کو اور پھر دیکھو کہ ہم کیسے شکاری ہیں اور ہمارا نشانہ کیسا ہے۔"

"دیکھو سکندر! اگر تمہارا کوئی مطالبہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ ان عورتوں سے تم کچھ نہیں مانگ سکتے۔" سراج نے کہا۔

"ہم ان کو اس وقت تک اپنے پاس رکھیں گے جب تک ہمارے ساتھی تمہارے پاس رہیں گے۔" میں نے کہا۔

"اور اگر رابعہ کو پہنچا دیا جائے...؟"

"صرف رابعہ ہی نہیں، ایک اور دوست بھی ہے ہمارا۔" نیلما نے کہا۔ "وہ دونوں بخیر و عافیت پہنچ جائیں گے تو پھر دیکھیں گے۔"

"دیکھیں گے کا مطلب؟" جمشید نے غصے سے کہا۔

"دیکھنا یہ ہوگا کہ تمہاری اگلی چال کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "اُمید ہے اس کے بعد تم ایک بات ضرور سمجھ جاؤ گے۔ اب تک تم نے کچھ فائدہ ضرور اُٹھا لیا۔ آئندہ ہم اخلاق اور شرافت کو اپنی کمزوری نہیں بننے دیں گے۔ اس لیے تم کو بھی تیار رہنا ہوگا۔ ہمارا راستہ کھلا چھوڑ دو اور ہمیں نکل جانے دو۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم تمہیں فون کریں گے۔"

"صرف اپنے خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دیں گے اور اگر تم نے راستے بند کیے..." محسن بولا۔ "تو ہم بریف کیس کھول دیں گے۔"

گاڑی کے اندر ہی شاہین نے سر ہلایا۔ "جس میں ہمارے ساتھ دوسرے بھی ہوں گے۔ تم انہیں بھی ہمارے ساتھ دوسری دنیا میں بھیجنا چاہو تو تمہاری مرضی اور وہاں سے واپسی نہیں ہوتی۔"

"نواب صاحب کا بڑا نقصان ہوگا۔" محسن جتنا اچھا گاڑی سے زیادہ حسین بہن اور بہن سے زیادہ قیمتی ان کی گاڑی نہیں

www.paksociety.com

رہے گی۔ سراج کی ماں نہیں رہے گی اور اسے تیسری جگہ منگنی کرنا پڑے گی اور دوسری منگیتر کو قبول کرے... سب سے کم نقصان میں وہ رہے گا جس کی صرف سالی جائے گی۔"

"سالی بھی آدھی گھروالی ہوتی ہے۔ چوہدری صاحب بڑے مہربان ہیں آج کل، ممکن ہے پوری گھروالی بنانے کا سوچ رہے ہوں۔ منگوانی تو تھی پرانی بیوی کے فارغ ہو جانے تو نئی کریں۔ چہکتی، دلکش، انگلش اور فرنچ بولنے والی جو سیاست کے کاروبار میں اچھی پی آر کے لیے ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

میری بات پر عاشی کا رنگ فق ہو گیا۔ اگر یہ جھوٹ ہوتا تو وہ مشتعل ہوتی مگر میں نے اس سچ کو پکڑ لیا تھا جو دل میں چور بن کے چھپا ہوا تھا۔ "تم گندے ذہن کے مالک ہو۔" وہ بڑی مشکل سے بولی۔

"ملا، چوہدری صاحب ہیں بس صاف ستھرے ذہن کے مالک۔ ایک بہن کو دل میں رکھتے ہیں تو دوسری کو نظر میں۔" محسن نے کہا۔ "دوستی سے عقل مند کہتے ہیں داشتہ۔ بدکار، فرنچ اور فارسی میں فرق ہے۔ تم نے یقیناً داشتہ کا مطلب غلط لیا ہو گا۔"

"ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ وہ دو دو امیدوار تھیں..." محسن بولا۔

"ایک بیچارہ عورت سے ہی تو منگنی ہے۔ رشتہ اعلیٰ، ویسے بھی چوہدری صاحب کے دیرینہ دوست ہیں۔ ان کے اشارے کا منتظر رہتا ہے۔ کم سے کم وہ خود ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ گھر کی مرغی دال برابر، بچوں کی خالہ مال برابر۔"

میں نے اندازے اور قیاس کی بنیاد پر ایک بات کی تھی جو اتنی سچ تھی کہ عاشی کے چہرے پر قرارِ جرم کی تحریر بن گئی۔ اُسے جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ اس کی تردید کر سکتی تھی مگر سب کے سامنے یہ انکشاف ایسا ہی تھا جیسے کوئی سرِ بازار اس کے کپڑے اتار دیتا۔ مجھے یقین آ گیا کہ وہ دونوں اپنی بیوی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو گا اور بہت جلد ہم اس کی موت کی خبر بھی سنتے لگے۔ یہ موت بھی بالکل طبعی ہو گی جیسے اس کی بیماری کو طبعی سمجھا جا رہا ہو گا اور کسی کو شک نہ ہو گا کہ وہ سیما نہیں قاتل ہے جو اس کو دوا دیتا ہے۔ ایسا ہو گیا تھا اور اب ہو رہا تھا۔ ہم نے قبل از وقت سب پر ایک راز افشا کر دیا تھا لیکن ہم یہ بھی جانتے تھے کہ اس سے کچھ نہیں ہو گا۔

"چلو یار! ہمیں کیا ان کے گھریلو معاملات سے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اپنے مسائل بہت ہیں تم عاشی کو اور سراج کی ماں کو لے کر گاڑی تک چلو۔ ایس ایس پی صاحب! آپ آگے چلیں، محسن آپ کے نقشِ قدم دیکھتا آئے گا اور موت بن کے پیچھے پیچھے گا۔ تمہارے محافظ بھی تردد ہوں گے، تمہاری آواز اُن تک پہنچے

سے پہنچے گی کہ گولی قریب سے آئے گی اور تیز رفتار ہو گی۔ سب کنٹرول کو پتا ڈال کے رکھنا۔"

سراج نے تعمیل کے سوا چارہ نہ دیکھا۔ ہمارا پلان واضح ہو چکا تھا اور ان دونوں نے حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ سراج کی ماں اب بالکل چپ تھی۔ شاید محسن کی باتیں سن کے وہ بھی سمجھ گئی تھی کہ اُسے جو سزا مل رہی ہے اپنے ہی بیٹے کے کیے کا نتیجہ ہے۔ عاشی اس کے مقابلے میں زیادہ باخبر تھی، چناچہ سر جھکائے سراج کی ماں کے ساتھ رہی۔ محسن ان کے پیچھے یوں کہ اس نے پھر ایک بستر کی چادر کندھوں پر ڈال لی اور سٹین گن کو اس کے پیچھے کر لیا تھا تاکہ باہر والے اسے نہ دیکھیں۔

صورتِ حال مکمل طور پر ہمارے کنٹرول میں تھی۔ باہر سارے فرشتے دار لوگ سمجھ چکے تھے کہ اندر کیا ہوا ہے۔ ان سے کوتاہی ضرور ہوئی تھی مگر وہ کسی طرح بھی نہیں سمجھے جا سکتے تھے۔ خود ایس ایس پی صاحب نے حکم دیا تھا کہ ان کو اندر آنے دیا جائے جن کو انھوں نے گیٹ پر روکا تھا، اس کے بعد بھی وہ صرف تعمیل حکم کر رہے تھے۔ اگر وہ اپنی ذہانت پر کچھ کرتے تو ایس ایس پی صاحب یا ان کی فیملی کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ تماشائی بن کر رہ گئے تھے۔ ابھی تک کوٹھی کے باہر کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوا تھا۔ پیچھے سے کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تھی۔

"چلیے نواب صاحب! اُٹھائیے اپنی ہمشیرہ کو۔" میں نے کہا۔ وہ کچھ دیر زیب النساء کو دیکھتا رہا جو بیڈ پر بے ہوش پڑی تھی۔ "کیا یہ مناسب ہو گا اگر خود سراج اسے اُٹھا کے لے جائے۔"

میں نے کہا۔ "معلوم نہیں تم ایسا کیوں کر رہے ہو جمشید! اپنی بہن کو کس کے حوالے کر رہے ہو۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔" وہ زیب النساء کو اُٹھانے لگا۔

"ملا، سب ہی معاملات تمہارے ذاتی معاملات ہیں۔ تم بھتوں کو بھی کاروبار میں سرمایہ سمجھ کے لگا دیتے ہو، خواہ بہن کا سرمایہ ڈوب جائے۔ تمہارے لیے سب مالِ تجارت ہے۔" میں نے کہا اور جمشید کے پیچھے چلنے لگا۔ "لیکن میری مانو تو اسے زہر دے دو، کم گناہ ہو گا۔"

"تم اس لڑکی کے دماغ میں زہر بھر دو گے۔ اسے سراج کے خلاف کرو گے۔" وہ آگے چلتے ہوئے بولا۔ "مگر اس سے کچھ نہیں ملے گا۔ میں اپنا فیصلہ نہیں بدلوں گا۔ تم اس لڑکی کے لیے مشکلات پیدا کرو گے اور کچھ نہیں۔ شادی تو اسے کرنا پڑے گی۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ لڑکی تمہارا فیصلہ قبول نہیں کرے گی۔" میں نے کہا۔ "یہ خودکشی کرے گی یا گھر سے بھاگ

جمشید نے مجھے پلٹ کے دیکھا۔ "تو اپنی بہن کو کب جانتا ہوں۔" "یہ نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "کہ تم اسے بہن بھی سمجھتے ہو۔"

اس وقت تک ہم باہر گاڑی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ محسن نے عاشی کو آگے بٹھایا تھا اور خود بھی اس کے پیچھے بیٹھا۔ درمیان میں سراج کی ماں تھی اور دوسری طرف کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جمشید نے بہن کو اس دروازے سے سراج کی ماں کی گود میں ڈال دیا۔

"یہ آپ کی ہی امانت تھی۔" جمشید نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"امانت ہی رہے گی جب تک زندگی ہے۔" سراج کی ماں نے کہا۔

"آپ دونوں پیچھے ہٹ جائیں۔" میں نے کہا۔ "یہ رخصتی کے منظر کو زیادہ دردناک نہ بنائیں اور خیال رکھیں کہ یہ وحشت ناک نہ بنے۔"

"مسکندر!" جمشید نے کچھ کہنا چاہا اور پھر چپ ہو گیا۔ زلزلہ مرنے الفاظ کے بے اثر رہنے کا اندازہ کر لیا تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے چابی محسن سے لی۔

"وہ سوٹ کیس کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"ڈکی میں ہے۔" محسن نے کہا۔

"اس میں پورے دس لاکھ ہیں۔" جمشید بولا۔ "تم کھولو گے تو معلوم ہو جائے گا۔"

"ہم... ہم کیوں کھولیں گے۔" میں نے کہا۔ "شاید کبھی ان کو تم ہی اسے کھولو گے۔"

"واشی اسے کھول سکتی ہے۔" جمشید نے آخری وقت کہا۔ "مجھے اس راز سے باخبر کر دینا۔" جمشید کو معلوم تھا وہ اپنی بہن کی طرف سے پریشان اور خوفزدہ تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ لاعلمی میں ہم زیب النساء سے یہ کام کرنے کو کہیں کہ وہ بلڈ ہی جائے۔

"اس اطلاع نے تمہاری بہن کو بچا لیا۔" میں نے کہا۔ "اور سراج کی ماں کو بھی۔"

گاڑی آگے بڑھی تو دروازہ سراج کے اشارے پر کھول دیا گیا۔ محسن پوری طرح چوکس تھا۔ اگر کوئی حرکت بھی کرتا تو اس کی جنبش گن کی آگ اگلنے لگتی۔

چند منٹ میں ہم خطرے کی حدود سے نکل آئے۔ مجھے اطمینان ضرور تھا کہ جب تک ہمارے پاس یرغمالی ہیں سراج بھی طاقت کے استعمال سے گریز کرے گا مگر پھر بھی میں متاسف تھا کہ ہر لمحہ میری نظر ویران سڑک پر رہتی۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ درخت کا سایہ بھی زمین پر حرکت کرتا تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے اچانک ہر طرف اندھیرے سے کیا

چھپ کر بیٹھے ہوئے مسلح افراد کو حملہ کرنے کا اشارہ مل گیا ہے اور وہ ہمارے سامنے صف درصف کھڑے ہو کے ایک ناقابلِ تسخیر دیوار بنا دیں گے۔ خاموشی میں مجھے سرگوشیاں سی محسوس ہوتی تھیں اور میرے کان کسی دھماکے کے منتظر تھے جو سکوتِ شب کو پارہ پارہ کر دے اور ہماری پیش قدمی روک دے۔

ذہنی طور پر میں تیار تھا کہ میرے راستے میں سنگ و خشت کی دیوار بھی ہو گی تو میں گاڑی کو اس سے ٹکرا دوں گا یا دیوار سے گزر جاؤں گا یا اسی دیوار کے ملبے میں سب دفن ہو جائیں گے۔ ہمارے خلاف شہر کی انتظامی مشینری حرکت میں آ چکی تھی اور پولیس ماس بار زیادہ پیشہ ورانہ تن دہی سے ہماری تلاش میں سرگرم عمل تھی کیونکہ معاملہ ان کے اپنے محکمے کے ایک انتظامی سربراہ کا تھا۔ ایس ایس پی قسم کا ہر بڑا افسر جب چارج لیتا ہے تو پبلک کے سامنے پریس کے ذریعے بڑے امید افزا بیانات کا تاثر قائم کرتا ہے اور قانون کی سخت گیری، مساوات اور مستعدی کو شانی بنانے کے دعوے کرتا ہے۔ اخبارات میں اس قسم کے بیانات آنے لگتے ہیں کہ قانون شکنی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ معاشرے کے ناسوروں کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ شرپسندوں سے سختی سے نمٹا جائے گا۔ جرائم پیشہ افراد اور بدعنوانی کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں گے۔ نقلوں کے ہیرپھیر سے ہی بیانات بار بار پڑھنے والے عوام پھر بھی اُمیدیں باندھ لیتے ہیں کہ شاید کچھ ہو مگر ہوتا کچھ نہیں۔ صرف نئے! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟ اور جہاں سراج جیسے حاکم ہوں اور رضوی صاحب جیسے منسوب، میرے خیالات کی رو محسن نے توڑ دی۔ "کس خیال میں گم ہے سکندرِ اعظم؟"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"میں نے کچھ کہا تھا۔" محسن بولا۔

"وہ دراصل یار میں انکل رضوی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کیا ظلم ہے ان کے ساتھ اور ہمارے ساتھ۔ اس شہر کے لوگوں کے ساتھ کہ ایک ایمانداری اور فرض شناسی میں مثالی کردار رکھنے والے کی جگہ آیا بھی تو کون... سراج، جسے ان صفات سے دور کی بھی نسبت نہیں۔"

"گو وہاں نہیں یہ والی سے نکلے ہوئے تو ہیں سے کہیں سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی۔" محسن بولا۔ "یہیں آ تو بولنا پولیس والے ایک زمین ہے اور ایک آسمان تو یہ تضاد ہمارے قومی مزاج کا ہے۔ اچھا تو ذرا گاڑی روک لے۔"

میں نے بریک لگا کے گاڑی روک دی۔ "کیا بات ہے؟"

"میں عاشی کو اندھا کر دینا چاہتا ہوں۔" محسن بولا۔

www.paksociety.com

"کیا؟" عاشی نے سہم کر چیخ ماری۔ "اتنا دھا کرو گے مجھے؟"
"وقتی طور پر۔" محسن بولا۔ "جو آپ کی آنکھیں بند کر دیں گے۔ آپ ہی کے دو بیٹے سے۔ زیب النساء تو ہوش میں ہی نہیں تھی۔"
"میں تو واقعی بے خبر تھا۔ طاہر گیا تھا۔" میں نے کہا۔

عاشی کی آنکھوں پر میں نے پٹی باندھی۔ اس نے احتجاجی انداز میں اس کی اجازت دی۔ سراج کی ماں نے چپ سادھ لی تھی اور خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس بوڑھی عورت کی حالت پر مجھے افسوس ہوتا تھا جس نے ایک بیٹے کو سب ماؤں کی طرح بڑی نیک خواہشات اور تمناؤں کے ساتھ پال پوس کے بڑا کیا تھا اور کبھی نہیں چاہا تھا کہ وہ ایک وطن فروش اور غدار بنے مگر اب وہ دیکھ رہی تھی تمام عمر کی محنت کے رائیگاں جانے کا دکھ اٹھا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس سے کیا غلطی ہوئی تھی جس کی قدرت نے یہ سزا دی۔ وہ ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں تھی۔ خطرہ عاشی ثابت ہو سکتی تھی جو شاید دلاور کے مستقبل کی ہمسفر بننے کے لیے نکلی بڑی کی تیز کھو بیٹھی تھی۔ اس نے دلاور کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا تو یہ ساتھ ہر قدم کا تھا خواہ وہ غلط سمت میں اٹھے۔ اس کا آغاز ہی غلط تھا۔ عاشی نے اپنی خوشی پر اپنی بہن کو قربان کرنا منظور کر لیا تھا۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہوا تھا۔ کیا عاشی اور اس کی باجی کے درمیان پہلے سے جذباتی دوری تھی یا محض اس کی حرص نے دلاور کی طرف کھینچا تھا۔ دلاور کی شخصیت اتنی پرکشش ہرگز نہ تھی کہ عاشی جیسی لڑکی اس پر مرمٹتی مگر لڑکیوں کا کیا بھروسا، یہ میں کیسے جان سکتا ہوں کہ عورت کی نظر کیا ہے۔ پہلے زمانے میں چشم مجنوں باید دید۔ تو پھر مجنوں کو بھی لیلیٰ کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔ دوسری قابل قبول وجہ دلاور کی موت ہو سکتی تھی۔ دلاور کی بیوی بن کے ملنے والی شہرت اور عزت ہو سکتی تھی جس کی طرف عاشی کو خود دلاور نے کھینچا ہو گا۔ فاریج دے کر بلایا ہو گا اور نا پختہ شعور رکھنے والی اور بے مہار خواہشات رکھنے والی عاشی نے اسے اپنا کامیابی جانا ہو گا کہ اس نے ایک ہوشیار صنعت کار، کاروباری اور سیاسی طور پر سمجھ دار، با اختیار اور صاحب اقتدار شخص پر اتنی آسانی سے اقتدار حاصل کر لیا۔

گاڑی ایک بار پھر روانہ ہوئی تو میرے دل میں عاشی سے نفرت کے جذبات میں شدت آ چکی تھی۔ عورت کو عورت کا گھر اجاڑتے۔ اسے شوہر کی محبت اور گرہستی کا مالک ہونے کی خوشی سے محروم کرتے اور احساس رسوائی و ذلت دے کر زندگی سے متنفر کرتے دیکھا اور سنا تھا مگر یا عورت صرف عورت ہوتی ہے، یہ میں نہیں ہوتی۔ بات یہ ہے کہ ہر عورت عاشی نہیں ہوتی جیسے ہر مرد دلاور نہیں ہوتا۔ میں نے اپنی منفی سوچ کو کنٹرول کیا۔

تاہم عاشی سے تعاون رہنے کی ضرورت تھی۔ دو بے ہوش لڑکی نہیں تھی اور محسن نے اس کی آنکھیں کھلی چھوڑنے میں خطرہ محسوس کیا تھا تو یہ احتیاط پسندی کا تقاضا تھا۔ وہ راستہ نوٹ کر سکتی تھی۔ دلاور نے زیب النساء کو بھی بے ہوش کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ دیکھا تھا۔ صرف اس کا نوخیز گلاب جیسا تازہ شباب اور حسن غارت خراب۔۔۔ بس اس کے ساتھ شمع محفل بن جانے کی وہ اضافی صلاحیت جو چراغ خانہ قسم کی پہلی بیوی میں نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ اس سے پوچھوں اور پھر اسے جذباتی مسئلہ سمجھ کے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

صبح کے ڈھائی بجے تھے جب میں نے گاڑی کو اپنے گھر یا موجودہ ٹھکانے کے سامنے روکا۔ اندر کے ہر کمرے میں جلتی ہوئی لائٹ باہر سے شرفی کے شیشوں پر منعکس تھی مگر فرق نکل ہی تھی۔ میں نے ایک بار کار کا ہارن بجانے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ پھر بیچ اتر کے گیٹ تک گیا اور کال بیل دبائی اور اس کے کھلنے کا منتظر رہا۔ جو اندر سے بجتی رہنے کی کیفیت کا کھٹکا بجتا تھا۔ انتظار کے آدھے منٹ کا ہر سیکنڈ طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ خطرے کی سرگوشی ایک پکار بننے لگی۔ میں نے اضطراب میں بار بار کال بیل بجائی۔
"کیا بات ہے؟" محسن نے کہا۔ "کال بیل تو بج رہی ہے۔"
"تو کیا سب سو گئے ہیں؟" میں نے کہا۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" محسن نے کہا۔

میں گیٹ پر چڑھ کے اندر کود گیا۔ کیتھرین اور جولی بھی اگر سو جاتیں تو مسلسل کال بیل سن کے اب تک جاگ جاتیں۔ غالب یا چوہدری دلاور کے سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اندر یقیناً کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ میں نے ریوالور ہاتھ میں نکالا اور دروازے پر لات ماری۔ دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے اس کمرے کو خالی پایا جس میں غالب اپنی چارپائی میں لیٹی ہوئی تھی۔ ٹوکسمیک کے ساتھ موجود تھا۔ ہم نے اسے ریوالور کے ساتھ بیڈ پر بیٹھا ہوا چھوڑا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ خود دلاور کی نگرانی کرے گا۔ وہاں صرف ایک ہی دروازے سے باہر جا سکتا تھا اور غالب کے ریوالور کا رخ اسی دروازے کی سمت ہی تھا۔

میرا دل کسی بہت منحوس خبر سے ڈرنے اور لرزنے لگا۔ "غالب!" میں نے چلا کے کہا اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔
"ادھر آ جا یار۔" غالب کی آواز آئی۔
میں دروازے کے وسط میں رک گیا۔ پھر میں

نے دیکھا کہ ہونا کی پیر شہر گئی جو میرے سامنے آ گیا تھا۔ کمرے کے وسط میں کیتھرین بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ بالکل چت اور ہاتھ پیر پھیلائے۔ اس کے پیچھے دیوار کے ساتھ دلاور بیٹھا ہوا تھا لیکن وہ کرسی سے نہیں بندھا ہوا تھا۔ کرسی کمرے میں ایک طرف گری ہوئی تھی اور وہ رسی بھی فرش پر پڑی تھی۔ دلاور کے دائیں بازو کی آستین کہنی سے کچھ اوپر خون سے تر تھی اور وہ دوسرے ہاتھ سے زخم کو دبائے لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ غالب اس کے بالکل سامنے والی دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر یوں بیٹھا تھا کہ اس کی پلاستر والی ٹانگ سیدھی تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔
"کیتھرین؟" میں نے چلا کے کہا اور گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ اٹھایا پھر اس کے سینے پر سر رکھ کے دل کی دھڑکن کو سننا میرے لیے غیر ضروری تھا۔ اسے پہلی نظر میں دیکھتے ہی مجھے یقین آ چکا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ میں پھر بھی چاہتا تھا کہ اپنے یقین کو خود ہی جھٹلا دوں۔ اس سچ کو جھوٹ کرنے کی خواہش نے مجھے مجبور کیا تھا کہ میں نبض اور دل کی دھڑکن دیکھوں۔ میں نے دلاور کی طرف دیکھا تو وہ مجھے گھور رہا تھا۔
"ہاں، اس نے مارا ہے اسے۔" دلاور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
میں نے غالب کی طرف دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔ شاید اس نے مجھے آواز دی تھی۔
"سکندر! پہلے میری بات سن لے۔" غالب نے چلا کے کہا۔ میرے دلاور کی جانب بڑھتے قدم اور اس کی گردن کو دبوچ کے سانس کا رشتہ توڑ دینے کی آرزو نے مجھے مغلوب ہو کے رک گئے۔
"وہ جولی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔
"مجھے نہیں معلوم، وہ بھاگ گئی تھی۔" غالب نے کہا۔ "تو اکیلا ہے کیا؟ باقی لوگ کدھر ہیں؟"
"باہر گاڑی میں ہیں۔" میں نے کہا اور باہر کا گیٹ کھولنے والا بٹن دبایا۔
"کون کون ہے؟" غالب نے پوچھا۔
"ابھی سب سامنے آ جاتے ہیں۔" میں نے پھر باہر کا رخ کیا۔ محسن میری واپسی میں دیر سے پریشان ہونے لگا تھا۔
"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "بس جو ہونا تھا ہو گیا۔" میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "یہاں کیا بتاؤں۔"
محسن میرے لہجے سے سمجھ گیا کہ کوئی سنگین صورت حال در پیش ہے لیکن اس نے صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا اور خود بھی باہر آ گیا۔
"اندر چلو۔" میں نے عاشی سے کہا۔ "آپ بھی ماں جی۔"
"مجھے کیا معلوم کہ اندر کیا ہے اور باہر کیا۔" عاشی نے کہا

اور مجھے خیال آیا کہ اس کی تو آنکھوں پر پٹی ہے۔ میں ذہنی طور پر اتنا اپ سیٹ تھا کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو رہا تھا۔ جب میں، عائشہ اور سراج کی ماں کو ہاتھ تھام کے اندر لے جا رہا تھا تو محسن تیزی سے آگے نکل گیا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی زیب النساء سے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہ فرار ہو جائے گی۔ غالب اندر جاتے ہی محسن پر اس اندوہناک خبر کی بجلی گری کہ کیتھرین مر گئی ہے اور جولی پاگل پن میں گھر سے نکل گئی ہے۔ میں نے اس کے چیخنے چلانے اور دیوانہ وار گالیاں بکنے کی آواز سنی۔ گالیاں وہ دلاور کو دے رہا تھا اور شاید اس پر ٹوٹ پڑا تھا کیونکہ غالب اسے چلا چلا کے ہوش میں رہنے کو کہہ رہا تھا۔ "یہ گالیاں محسن نے دیں۔" وہ صدمہ زدہ تھیں اور اس کے تاثرات بھی برداشت صدمے کا اور ناشائستہ کی کیفیت کا نتیجہ تھیں۔ میں نے عائشہ کے اور سراج کی ماں کے چہرے پر کسی ناخوشگوار صورت حال سے دوچار ہونے کا خوف دیکھا۔

انھیں ایک طرف بٹھا کے میں محسن کی طرف گیا۔ اس نے دلاور کو دھنک کر رکھ دیا تھا۔ دلاور پھر اسی طرح بیٹھا ہوا تھا لیکن اس کے چہرے پر چوٹوں کے آثار تھے۔ اس کے لبوں سے اور ناک سے خون بہہ رہا تھا اور وہ ایک ہاتھ سے گولی کے زخم کو دبائے کسی طرح کراہ رہا تھا۔ اس کے زخم سے زیادہ خون بہہ کر پورے ہاتھ کو تر کر چکا تھا۔ محسن نے اس کے کپڑے بھی پھاڑ دیے تھے اور اس کے سر کے بال پکڑ کے کھینچے تھے یا سر دیوار سے ٹکرایا تھا کہ وہ پوری طرح ہوش میں نہیں تھا اور اپنی جگہ بیٹھا ہوا جھول رہا تھا۔
"محسن، بس کر یار! اس کو مارنے سے کیتھرین تو واپس آنے سے رہی۔" میں نے کہا۔ "ہمیں جولی کی فکر کرنا ہے۔ ماں کو تو واپس کرنا ہی ہے تاکہ رابعہ اور خیتڈی کی واپسی کی صورت پیدا ہو۔ ہمیں بہت کچھ کرنا ہے دوست۔ ہم دونوں کو۔۔۔"
"ہاں یار! بس صدمہ اتنا شدید تھا کہ میں پاگل ہو جاتا۔" محسن نے کہا۔ "اب تو ہم ہی ہیں۔ کیتھرین اور جولی کے بغیر ہم یہ سب کیسے کریں گے۔"
"ہاں، سوچا تھا کہ تینوں عورتوں کو ان کی تحویل میں دے کر نکل جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اب ایک کام بڑھ گیا۔ کیتھرین کو سپرد خاک کرنے کا۔"
غالب نے رنج سے کہا۔ "خدا اس کے گناہ معاف کرے۔ ایک زندگی میں اس عورت نے بہت دکھ اٹھائے جو کئی زندگیوں کا بوجھ تھے۔"
"ہیں۔۔۔ میں اسے دفن نے آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اور پھر گاڑی کو ٹھکانے لگا دوں۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔۔۔"

میرا جملہ

www.paksociety.com

ناممکن ہو گیا کیونکہ باہر کسی نے گاڑی کا دروازہ بند کیا تھا۔ پچھلی سیٹ کا ایک دروازہ میں کھلا چھوڑ آیا تھا۔ میں تیزی سے باہر نکلا۔ گیٹ کے باہر کھڑی ہوئی گاڑی کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یہ خیال ضرور آیا تھا کہ رات کو گشت کرنے والے چوکیداروں یا پولیس والوں نے ایک گاڑی کا کھلا دروازہ دیکھ کر بند کر دیا ہوگا اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شکوک رفع کرنے کے لیے رک گئے ہوں۔

پھر سارے بند دروازے دیکھ کر مجھے یہ خیال آنا لازمی تھا کہ پچھلے والا دروازہ کیسے بند ہو گیا۔ ہوا بھی نہیں اور یہ ہو گیا۔ آندھی سے بھی ایک مرسیڈیز کا بھاری بھرکم دروازہ بند ہونا مشکل تھا۔ میں نے مڑ کر اور ہاتھ جیب میں رکھتے ہوئے دروازے کو پھر کھولا تو مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہوا۔ پچھلی سیٹ اب خالی پڑی تھی جس پر میں زیب النساء کو بے ہوش چھوڑ گیا تھا۔

یہ ایک نئی پریشانی تھی۔ میں اس بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح اور معصوم نظر آنے والی لڑکی سے ایسی چالاکی اور مکاری کی کیسے توقع رکھ سکتا تھا اور وہ مجھے اعتماد سے دھوکا دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ بے ہوشی کا مکر کیے پڑی تھی اور موقع کی منتظر تھی جو ہم نے اپنی بے وقوفی سے خود ہی فراہم کر دیا تھا۔ اب تک ہمیں کسی پر اعتبار نہ کرنا آ جانا چاہیے تھا مگر ہم تھے کہ کہیں نہ کہیں فریبِ اعتبار میں مار کھا جاتے تھے۔

میں نے سڑک پر دور دور تک دیکھا لیکن ہر سو سناٹا تھا اور سڑک سنسان تھی۔ اتنے کم وقت میں وہ بہت دور نہیں جا سکتی تھی۔ اگر وہ سڑک پر سیدھا بھی گئی تو نظر میں آ جاتی۔ یقیناً وہ چالاک لڑکی کہیں چھپی ہوئی تھی۔ میں اب تک بے تعجب میں مبتلا تھا۔ وہ سب اس کی اداکاری تھی۔ دیکھو کیسے فنکار پڑے ہیں دنیا میں۔ اب تک اداکاری میں پہلا نمبر والا رکھا تھا جو صورت سے تاثرات، آواز اور لب و لہجے پر حیرت انگیز قدرت رکھتا تھا اور کبھی معلوم نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس لڑکی نے تو کمال ہی کر دیا۔ مجھے بار بار اس کا سہما ہوا انداز، خود کو مجرم کہنا، استغفراللہ اور واللہ کہنے کی معصوم ادا، آنسو کا رکنا، خاموش اظہارِ بے بسی کے لیے سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ ابھی نام تو جمشید کا ہی ہے جو غالباً بھولا جانتا ہے کہ اپنی اصل شخصیت کو دوسرے چہروں میں چھپا کے رکھتا ہے۔

میں دونوں جانب دیکھتا ہوا اور پھر آواز پر کان لگاتا ہوا پیچھے گیا۔ اگر وہ کسی درخت کی اوٹ میں یا کسی دیوار کے سائے میں ... تو مجھے دکھائی دے جاتی۔ [illegible] منٹ سے کم وقت تک وہ کتنی دور جا سکتی تھی۔ میں نے سوچا۔ وہ کون سی سڑک [illegible] چھپتی تھی اور پھر عورت کے ساتھ وہ بھاگ بھی نہیں سکتی۔ دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی تو میں پہنچ گیا تھا۔

میں پچاس قدم کے فاصلے سے واپس ہوا اور گاڑی سے آگے نکل گیا۔ وہ تو کوئی بچی تھی۔ غصے اور جھنجھلاہٹ میں میرے لیے اس کے لیے گالی ہی نکل سکتی تھی۔ ہاتھ آ جاتی تو [illegible] مگر وہ ہاتھ آنے والی تو نہ تھی۔ ایسی چالاک لڑکی سب کچھ کر سکتی ہے۔ اس کے ذہین ہونے میں کوئی شک نہیں۔ وہ فوراً کسی کوٹھی میں گھس جائے گی۔ ایک خوبصورت ذات، پھر جوان لڑکی، صورت سے نجیب اور معصوم نظر آنے والی۔ اس کی جگہ کوئی مرد تنہا کسی کے گھر میں گھس جاتے تو مار کھاتے مگر اسے کسی کا ڈر نہیں۔

میں نے ٹہلتے ٹہلتے ادھر ادھر کی کوٹھیوں کو دیکھا۔ سب میں اندھیرا اور سکوت مکمل تھا جیسے کہ خواب میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کسی بنگلے میں ہوگی اور شاید وہ مجھے دیکھ رہی ہوگی اور منتظر ہوگی کہ میں لوٹ جاؤں تو وہ نکل سکے اور گھر والے کھٹکھٹا کر دروازہ کھولیں تو انہیں بتا دے کہ کس طرح بدمعاش ایک ایس پی کے گھر سے تین عورتوں کو اٹھا لائے تھے اور اب وہ کہاں موجود ہیں اور وہ فون کرے گی اور آدھے گھنٹے میں یا اس سے بھی پہلے پولیس پہنچ جائے گی۔ وہ جس گھر سے فون کرے گی وہاں رہنے والا خود پولیس کو صحیح پتا سمجھا دے گا۔

میں نے محسوس کیا کہ ان حالات میں ہمارا یہاں رکنا خطرات کی دلدل میں آخر تک ڈوبنے کے مترادف ہوگا۔ عین اس وقت جب ہم اپنی کامیابی کے یقین سے سرشار تھے، ایک احمق اور نادان نظر آنے والی لڑکی نے ہماری غفلت سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے اپنے رویے سے خود کو بے ضرر ثابت کرنے کی بھرپور اداکاری کی اور ہمیں اپنی طرف سے مطمئن کر دیا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اپنا سر پیٹ لوں۔ وہ معذور تھی۔ اس کی نظر تو بہت تیز ہوگی۔ چیزوں کے ظاہر اور باطن تک اتر جانے والی اور احساس کے ہر رنگ سے آشنا۔ ہمیں یہ سمجھنے ہی نہیں دے رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ [illegible] نہیں بچ سکتی تھی۔ [illegible] کمزور بھولے اور شکست خوردہ نظر آنے کا کھیل رچایا اور [illegible] ہار کو بالآخر جیت میں بدل لیا۔

میں [illegible] پر واپس ہوا۔ اب یہ انتہائی ضروری ہو گیا تھا کہ ہم اس جگہ سے نکل جائیں۔ میں نے سب سے پہلے محسن کو خبردار کیا۔

"یار، وہ تو نکل گئی زیب النساء" میں نے محسن کو باہر بلا کے کہا۔

"نکل گئی، کیا مطلب!" محسن بھونچکا رہ گیا۔ "بھاگ گئی؟"

www.paksociety.com

"ہاں بھاگ گئی، وہ بے ہوش نہیں تھی، مکر کیے پڑی تھی۔"
"اور وہ بال کاؤنٹ بھی بھاگ کے کہاں جا سکتی ہے وہ؟" محسن بولا۔
"میں نے ادھر ادھر دیکھ لیا... یا تو وہ کہیں چھپی ہوئی ہے یا کسی گھر میں گھس گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اسے ساری رات تلاش نہیں کر سکتے۔"
"ساری رات کیا، ہم ایک گھنٹا بھی یہاں محفوظ نہیں۔" محسن بولا۔ "وہ کہیں سے فون کر کے ہمیں پھنسا دے گی اور ہم ایسے پھنس جائیں گے جیسے چوہے دان میں چوہے پھنس جاتے ہیں۔ مشکل ہو گیا یار۔ وہ سب اس کی اداکاری تھی۔"
"لیکن یار، دھری کی دھری رہ گئی ہماری سب افلاطونیت۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "لعنت ہماری مردانگی پر اور بہادری پر، بہت چالاک بنتے تھے، ریوالور اور مشین گن لے کر گئے تھے، کیسا جوتا مار کے گئی ہے منہ پر۔"
"ہم کتنے بڑے گدھے ثابت ہوئے۔" محسن بولا۔ "کہ اس ناگن کو بے ضرر سمجھ لیا۔ اب تو واقعی نکلو یہاں سے ورنہ محصور ہو جائیں گے سب۔ میرا تو دل نہیں مانتا کہ وہ ایکٹنگ کر رہی تھی۔ نہ سراج نے کسی قسم کی حیرت کا اظہار کیا، نہ خسرو جیسے نے۔ میرا مطلب ہے اس کا رویہ دیکھ کر۔ وہ ایسی تو نہیں تھی جیسی بن گئی تھی۔"

"وہ کنفیوژ تو ہوئے ہوں گے کہ وہ ایسے کیوں بول رہی ہے اور اس طرح کیوں بلی بنی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس خیال سے خاموش رہے ہوں گے کہ اس کا کوئی مقصد ہے اور شاید وہ کچھ کر جائے جو وہ خود نہیں کر سکیں گے۔ ان کو کیا ضرورت تھی زینب النساء کا راز فاش کرنے کی اور دیکھو تو وہ اس لحاظ سے بڑی طاقت ثابت ہوئی جو ایس ایس پی کے قلعے کی حفاظت پر مامور تھا۔ کم سے کم اس نے خود کو بچا لیا۔"
غالب کو یہ صورت حال جان کے سخت تشویش لاحق ہونا لازمی تھی۔ "اب کیا کریں؟ نکل جائیں؟"
"بالکل نکل جائیں، اس جگہ سے جتنی دور جا سکتے ہوں اور جتنی جلدی جا سکتے ہوں۔" میں نے کہا۔
"مگر یار، جولی؟" غالب نے رکتے ہوئے اور سہمے ہوئے کہا۔ "وہ کہاں جائے گی؟ میرا مطلب ہے آئے گی تو؟"
"کیا معلوم آئے گی یا نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اس وقت ہم خود کو بچائیں یا جولی کی فکر کریں؟ تم نے اسے کدھر جاتے دیکھا تھا؟"
"میں نے تو بس کمرے سے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ جب دلاور نے اس کی ماں کو مارا تو وہ چلائی تھی۔ اس کی چیخ [illegible] میں پکار، دوسری طرف سے جولی آئی مگر اتنی دیر میں سب ہو گیا تھا۔"

"لیکن آخر دلاور آزاد کیسے ہوا؟" میں نے کہا۔
"مجھے نہیں معلوم، اس نے کسی طرح رسیاں کھول لی تھیں، اسی طرح بیٹھا رہا تھا۔" غالب بولا۔ "کیتھرین نے اسے پانی دیا تھا... میں نے بھی سنا تھا، جولی سو گئی تھی۔ کیتھرین نے مجھ سے پوچھا کہ پانی دے دوں؟ اور میں نے کہا کہ دے دو۔ مجھے خیال آ سکتا تھا، قصور وار تو میں بھی ہوں۔ میں نے فرض کر لیا کہ وہ بندھا ہوا ہے اور بھاگ کے جانے کی تو دلاور سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ میرے سامنے سے گزرتا، میں اسے فوراً [illegible] کر دیتا۔"
"کیا کیتھرین نے اسے مشتعل کیا تھا؟"
"نہیں، اس نے تو بس [illegible] کہا تھا کہ [illegible] میں پانی [illegible] پھر اور پلا آئی لیکن کیا کروں۔" غالب بولا۔ "ابھی اس نے ختم بھی نہیں کیا تھا کہ دلاور نے اسے پکڑ لیا۔ وہ چلائی اور میں اٹھا۔ میرا اٹھنا بھی تم جانتے ہو، ایک ٹانگ کے پلاستر کا بوجھ بھی تھا، پھر بھی میں نے دیر نہیں لگائی لیکن اتنی دیر میں دلاور اس کو مار چکا تھا۔ اس نے کیتھرین پر کرسی ماری تھی۔ کیتھرین کی گردن ٹوٹ گئی۔ دلاور کا ارادہ بھی اس کی جان لینے کا نہیں ہوگا، وہ تو شاید کیتھرین سے کوئی اسلحہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ یہاں سب مسلح ہیں اور ان کے اتنے قریب آنے کا خطرہ مول لینے والی عورت خالی ہاتھ نہیں ہو سکتی۔ وہ کیتھرین کے مزاج شناس سے ضرور واقف ہوگا اور یہ بھی جانتا ہوگا کہ وہ [illegible] کی شریک حیات تھی۔ کرسی کا ایک پایہ کیتھرین کی گردن پر پڑا۔ دلاور کے [illegible] خیر تو کچھ نہیں لگا۔ اس نے اپنی جان گنوا دی۔ اپنے بدترین دشمن کو بچاتے ہوئے مار گئی۔ کیا اسے شہادت کہیں گے یار؟ وہ مسلمان نہیں تھی مگر یہ موت کچھ کم محترم نہیں تھی۔"

"موت کے بعد اسے محترم کہو یا نہ کہو، وہ ایک بڑے مجرم کے قتل ہونے کا احساس دلانے ضرور آئی ہے۔" [illegible] نے کہا۔
"اس وقت اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ کیتھرین مر گئی ہے تو شاید میں خود بھی دلاور کو مار دیتا۔ میں اس کے بازو کا [illegible] اس کے خبیث دل کا اور شیطانی دماغ کا تماشا دیکھتا [illegible] کہ وہ بھاگ جانا چاہتا ہے اور کیتھرین کو مار ڈالا ہے۔ میں نے کیتھرین کو گرتے بھی دیکھا تھا مگر یہ نہیں سمجھا تھا کہ اس کی گردن ٹوٹ گئی ہے۔ میں نے تو بس ایک گولی چلا کے دلاور کو بے بس کیا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ کیتھرین تو کب سے بے جان پڑی تھی۔ میں اسے بے ہوش سمجھ رہا تھا۔" یا انکل نامعلوم طریقے [illegible] کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور جب وہ خاموش

ہوش کے ایک [illegible] لمحے نے ہمیں احساس دلایا کہ خود ہمارے دل کا درد آنکھوں سے اشک بن کے ٹپک رہا ہے۔
"جب جولی آئی تو میں کیتھرین کو پکار رہا تھا۔ وہ ماں کے پاس بیٹھ کر اسے ہلانے لگی اور اس کا سر یوں لڑھکنے لگا جیسے... جیسے دھڑ سے الگ ہو۔ جولی نے ایک چیخ ماری، پھر وہ دہشت زدہ ہو کے اٹھی اور پیچھے ہٹی۔ اس نے دلاور کی طرف بھی نہیں دیکھا، میری طرف بھی نہیں دیکھا۔ میری آواز بھی نہیں سنی۔ میں نے اس کے دوڑنے کی آواز سنی تھی، پھر وہ چلا رہی تھی اور روتے ہوئے۔"
"نہیں، میں نے اس دروازے سے دیکھا، وہ گیٹ کھول کے نکلی اور اندھیرے میں کھو گئی تھی۔ اس کے پیچھے دوڑ سکتا تو ضرور روکتا لیکن ایک تو مجھے دلاور کا خیال تھا، دوسرے میری ایک ٹانگ دوسری کا بوجھ بنی ہوئی تھی۔ میں چلاتا رہ گیا اور اس کے دور جاتے قدموں کی آواز سنتا رہ گیا۔ میں کیا بتاؤں وہ کہاں گئی۔ میرا خیال ہے اس کا دماغی توازن قائم نہیں رہا تھا۔ صدمے نے اسے وقتی طور پر پاگل کر دیا تھا۔" غالب نے کہا۔
"غالب، میں نے [illegible] کہا تو میں... میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہ کہاں گئی ہوگی۔"
"کہاں گئی ہوگی، انکل رضوی کے گھر؟"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، ایسی حالت میں وہ یا تو پولیس کے پاس پہنچ سکتی ہے یا ایک جگہ اور بھی ہے۔"
"کس کا؟ کیا گھر؟" غالب نے کہا۔ "ہاں، وہ جولی کے لیے ایک قدرتی پناہ گاہ ہے، ماں کی گود کی طرح۔ اس کا بچپن وہیں گزرا تھا اور اس گھر کے باہر وہ جہاں بھی رہی، غیر محفوظ رہی۔ تو شاید ٹھیک کہتا ہے، ہم دیکھ سکتے ہیں، آؤ چلتے وہاں..."
"سالار، یاد رکھو اس وقت خود ہمارے لیے اس سے بہتر پناہ کی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم دس منٹ میں نکل چلیں۔"
"اور ان کو؟ قیدیوں کو؟" محسن نے کہا۔
"ظاہر ہے جہاں ہم وہیں ہمارے قیدی۔" میں نے کہا۔
سارا اسلحہ اور [illegible] کی ڈش اٹھا لینے کے سوا ہم نے اس گھر سے کچھ نہیں لیا۔ دس منٹ پورے ہونے سے پہلے ہم نے عائشہ اور سراج کی ماں کو جیپ گاڑی میں بٹھا دیا۔ ان کی آنکھوں پر سے ابھی تک پٹی اتاری ہی نہیں گئی تھی کہ سفر پھر شروع ہو گیا۔
"اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟" عائشہ نے کہا۔
"جنت میں۔" میں نے [illegible] کہا۔ "تمہارے جیسے خصم کے پاس [illegible] سال وہ [illegible] زینب النساء گئی ہے۔"

"زیبا، کیا وہ کہیں چلی گئی ہے؟" سراج کی ماں نے کہا۔
"ہاں، وہ دغاباز اور مکار لڑکی، وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل گئی ہے۔" محسن بولا۔
سراج کی ماں مسکرانے لگی، پھر ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی بلا تمسخرانہ رہی تھی اور میرے خون کی حدت بڑھا رہی تھی مگر میں نے یک بیک اس عورت کے منہ پر ہاتھ مارنے سے گریز کیا۔ آخر بے نامی کے سراج کی ماں میں تو سمجھ گئی تھی کہ وہ شرارت کر رہی ہے تو ایسے ہی نہیں کر رہی ہے۔"
میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ "ہمارا اندازہ درست تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمیں بے وقوف بنا رہی تھی۔"
"اور وہ سب جانتے تھے کہ ہم بے وقوف بن رہے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اب دیر کیسی، سب تو آ گئے۔"
"یار، وہ ابھی بھی کیسے بے مروتی؟" غالب بولا۔ "ہم اسے بھول گئے؟"
"نہیں یار۔" میں نے سر جھکا کے افسردگی سے کہا۔ "بھول تو ہم کبھی نہیں سکتے مگر اس کی صرف یاد کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ اس کے بے جان وجود کے لیے اپنا کفن نہیں رہتی۔"
"کیتھرین جانتی تھی اور خدا بھی جانتا ہے کہ ہم خود غرض اور کمینے نہیں۔" محسن بولا۔ "وہ سب بھی سمجھ جانے والوں کے ساتھ جذبات کے اظہار میں اتنے مخلص نہیں ہوتے جو بڑی دھوم دھام سے سوئم اور چہلم پر پلاؤ زردے کی دیگیں پکواتے ہیں۔ کیتھرین کے لیے احترام اور عزت کے جذبات جو ہم رکھتے ہیں، ناقابل [illegible] نہیں ہیں۔ ہم اس کے ساتھ رہتے تو اسے اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کرتے۔"
"لیکن رسم دنیا کے مطابق اسے آخری تعظیم دینے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ اس سے فرق بھی نہیں پڑتا۔ کیتھرین [illegible] میں ہم شریک نہ ہوئے، وہ ہمیں معاف کر دے گی۔" [illegible] آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے میں نے کہا۔
"ہاں، یہ مجبوریاں نہ ہوں تو ہم خود کو خدا سمجھنے لگیں۔" غالب بولا۔ اور جب میں کار میں بیٹھا تو اس نے ایک آہ سرد بھری۔
"یار، موقع ملے تو اسے بھی [illegible]" غالب بولا۔ میں نے اسے پچھلی سیٹ پر ریوالور تھما کے [illegible] جہاں وہ پلاستر والی ٹانگ کو پھیلا کے بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ محسن مجھے راستہ بتانے کے بجائے خود ہی ڈرائیونگ کرے کیونکہ کیتھرین کا گھر صرف اسی نے دیکھا تھا۔ میں نے جیپ یہاں [illegible] اور خود اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اسی وقت اپنا [illegible] سے سائرن سنائی دینے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر طرف سے پولیس ادھر آنے والے تمام راستوں پر یلغار کر دی ہو۔ [illegible] یہ آواز رات کی خاموشی میں بھر گئی تھی۔

www.paksociety.com

"پولیس آ ہی گئی" تو محسن نے کہا "زیب النساء نے کام دکھا دیا۔"

"تو ڈکی کھول دو" میں نے کہا "اس میں سے ایک دستی بم تو نکال لیں۔ اگر وہ بہت نزدیک آ پہنچے تو ہم ان کی پیش قدمی روک دیں گے۔"

محسن نے سر ہلایا اور پیچھے جا کے ڈکی کھولنے لگا۔

"اب تو کیتھرین کی لاش بھی پولیس کے ہاتھ لگ جائے گی" غالب نے کہا۔

"جلدی کرو محسن" میں نے کہا کیونکہ سائرن زیادہ قریب سے سنائی دینے لگے تھے۔

"اندھیرے میں پتا نہیں چل رہا ہے یار" محسن نے کہا "سب سامان ڈھیر ہوا پڑا ہے۔"

"عمر بھر [illegible] پڑھائی [illegible]۔ مرتے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے" غالب نے کہا۔ وہ کیتھرین کی موت پر ہم سب سے زیادہ دکھی اور جذباتی ہو رہا تھا۔ سائرن کی آواز بہرطور قریب ہوتی جا رہی تھی اور اب آگے پیچھے سے سنائی دے رہی تھی۔ صرف کیتھرین اس آواز کو نہیں سن رہی تھی۔ اس کی لاوارث لاش اس جلتے ہوئے سرائے فانی میں جسے ہم نے اپنا ٹھکانا سمجھا تھا اجنبی مردوں کی طرح پیچھے رہ گئی تھی۔

محسن نے بڑی عجلت میں ڈکی بند کی۔ اسی وقت سامنے سے دو ہیڈلیمپس کی روشنی نمودار ہوئی۔

"گاڑی کو ریورس میں لے" میں نے کہا۔

"اور اگر کوئی پیچھے سے بھی آ گیا" محسن بولا۔ لیکن اس نے گاڑی کو ریورس کر لیا۔ یہ کوئی عام قسم کی کار نہیں تھی چنانچہ محسن کا اندازہ کچھ غلط ہو گیا۔ طاقتور گاڑی ایک دم بے قابو ہو کے پیچھے گئی اور اس سے پہلے کہ محسن رخ بدلتا یا بریک لگاتا، گاڑی ایک ٹیلیفون کے کھمبے سے ٹکرا گئی۔ مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا اور عاشی نے خوفزدہ ہو کے چیخ ماری۔ گاڑی کو تھوڑا بہت نقصان ضرور پہنچا ہوگا۔ اس کی ٹیل لائٹس تو ٹوٹ ہی گئی تھیں مگر ٹیلی فون کا کھمبا بھی اس ٹکر کی تاب نہ لا سکا اور پیچھے کی طرف جھک کر جھولنے لگا۔ اسے تاروں نے مل کے سنبھال لیا تھا جو دونوں طرف سے کھمبے کی گرفت میں تھے۔

پلٹ کر دیکھتے ہی مجھے ایک گلی سی دکھائی دی جو دراصل ایک خالی پلاٹ تھا۔ دو کوٹھیوں کے بیرونی احاطے کی دیواروں کے درمیان یہ پلاٹ جو شاید ایک کنال کا ہوگا بہت چھوٹا لگتا تھا۔ یہاں سب کوٹھیاں اس طرح بنائی گئی تھیں کہ ایک کے پیچھے دوسری تھی اور دونوں کی عقبی دیوار مشترک اور متصل رہتی تھی چنانچہ ایک قطار کی ساری کوٹھیوں کا رخ مشرق کی جانب ہو تو اس کے پیچھے والی کوٹھیاں مغرب کو فیس کرتی تھیں۔ ہر سڑک ایسی دو کوٹھیوں کی قطار کے درمیان سے گزرتی تھی۔ میں نے پہلے جو خالی پلاٹ دیکھا تھا اس کے پیچھے والا پلاٹ بھی خالی تھا۔ شاید اس کا مالک ایک ہی شخص تھا جو آگے پیچھے کے پلاٹوں پر تعمیر کرتا تو اسے دونوں جانب سڑک ملتی یا شاید وہ ایک خاندان کی ملکیت تھے جو الگ رہتے ہوئے بھی مشترک عقبی دیواروں کا دروازہ نکال کے دو گھروں کو ایک سمجھ سکتے تھے۔ وجہ کچھ بھی ہو، اس وقت انہی دو خالی پلاٹوں نے ہمیں ایک سڑک سے دوسری سڑک تک پہنچنے کا راستہ فراہم کیا۔ سائرن کی آواز اور ہیڈ لائٹس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس چند سیکنڈ میں ہم تک پہنچ جائے گی۔

"یہ راستہ بند کر دو" محسن نے کہا۔

میں خود اسی امکان پر غور کر رہا تھا۔ جھٹکے کے بعد زمین سے لگ جانے والے کھمبے نے جزوی طور پر ایک رکاوٹ [illegible] دی تھی مگر جیسے ہم نکل آئے تھے ایسے ہی ہمارا تعاقب کرنے والے بھی آ سکتے تھے۔ میری نظر نے صورت حال کے عملی پہلو کو سمجھ لیا۔ میں نے دستی بم کی پن منہ سے کھینچ کے نکالی اور کھڑکی سے باہر ہاتھ نکال کے اسے پیچھے پھینک دیا۔

دھماکا عین اسی وقت ہوا جب پولیس کی گاڑی سامنے آ چکی تھی۔ پلاٹ کی چوڑائی شاید چالیس گز یا کچھ کم ہوگی۔ دستی بم اس کے تقریباً وسط میں گرا۔ اس وقت تک ہم نصف فاصلہ طے کر چکے تھے یعنی ایک پلاٹ کی لمبائی سے آگے نکل کر دوسرے پلاٹ پر پہنچ گئے تھے۔ دھماکے نے زمین میں ایک گڑھا بنا دیا اور دونوں جانب کی دیواروں کو مسمار کر دیا۔ میں نے اندازہ کیا کہ جیپ میں سوار افراد براہ راست اس دھماکے سے متاثر نہیں ہوئے ہوں گے لیکن ان کا معمولی طور پر زخمی ہو جانا ممکن تھا۔ دھماکا ہوتے ہی ایک مرسیڈیز کچھ اور آگے چلی گئی تھی لیکن جیپ کا رخ اسی طرف تھا جہاں دستی بم گرا تھا۔

اب میں گرد چھٹتے راستے کے درمیان میں اتنا گہرا گڑھا تھا کہ جیپ اس میں سے نہیں گزر سکتی تھی اور گڑھے کے دونوں جانب دیواروں کے ملبے کا ڈھیر تھا۔ جیپ ان اینٹوں کے ڈھیر پر بھی نہیں چڑھ سکتی تھی۔ وہ اب واپس جا کے اور پھر کسی موڑ سے گھوم کر ہی آ سکتے تھے۔ دھماکے سے دھواں پھیلا ہوا تھا اور گرد و غبار کا بگولہ سا اٹھا تھا جس نے ہمیں اسکرین فراہم کر دیا اور ہم پولیس کی نظر سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی مگر وہ اندھا دھند چلائی جانے والی گولیاں ضائع ہو گئیں۔

ہنگامی صورت حال میں یہ تقسیم کار [illegible] قائم رکھنے سے افراتفری نہیں پھیلتی۔ محسن نے اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر رکھی تھی اور مقابلے کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ اگر میں اسے ڈرائیونگ کے بارے میں ہدایت بھی دیتا یا وہ ڈرائیونگ کے ساتھ مجھے بھی مشورہ دیتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تو ہم ایک دوسرے کو ڈسٹرب کرتے اور خود بھی مضطرب ہوتے۔ ہمیں ایک دوسرے کی صلاحیت پر [illegible] اعتماد تھا جتنا خود اپنی ذات پر اور اس دہرے اعتماد کی قوت ہمیشہ مؤثر ثابت ہوتی تھی۔

جب میں نے محسن کو اطلاع دی کہ اب پولیس پیچھے نہیں ہے تو ہم جائے واردات سے بہت دور تھے۔ گاڑی اسی نوے میل کی رفتار سے موڑ کاٹتی جا رہی تھی۔ کبھی دائیں تو کبھی بائیں۔ منزل مقصود کا علم تو محسن کو تھا مگر وہ سیدھا جانے سے گریز کر رہا تھا۔ اس نے فقط سر ہلایا اور اپنی نگاہ سامنے رکھی۔

"تم... تم لوگوں نے پولیس پر بم پھینک دیا" عاشی نے کہا۔

"ہاں... مجبوری تھی" میں نے کہا۔ "ہمارے پاس ایٹم بم نہیں تھا۔"

"خدا تم سے سمجھے" سراج کی ماں نے کہا۔ "تم واقعی دہشت گرد اور تخریب کار ہو۔ بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلنے والے شیطان ہو۔"

"آپ نے سنا ایس پی کی والدہ نے کیا کہا" محسن بولا۔

"ایس پی نہیں گستاخ... ایس ایس پی صاحب" میں نے کہا۔

"ان کی رائے ہمارے بارے میں اچھی نہیں ہے۔"

"اچھی ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ بیٹے نے ماں کو بریف کر رکھا ہے اور ہم اس بیٹے کے دشمن" میں نے کہا "ہم تباہی لگے کہ وہ دن کو رات اور رات کو دن کہہ رہی ہیں تو ہم بھی جھوٹے ہوں گے۔"

"رہنے دو یہ باتیں" سراج کی ماں نے کہا "میں نے سچ کو دیکھا بھی ہے اور بھگت بھی رہی ہوں۔"

"فرض کریں صرف ایک لمحے کے لیے" میں نے کہا "جو کسی دن وقت نے آپ کی آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ ہٹا دیا۔ آپ پر اچانک انکشاف ہوا کہ آپ کا یقین تو ایک سراب تھا۔ آپ کے ساتھ سب سے بڑا جھوٹ تو خود آپ کا اپنا بیٹا بول رہا تھا اور سب سے زیادہ دھوکہ دینے والا وہی کا بیٹا تھا تو آپ کیا کریں گی؟"

"میں مر جاؤں گی۔ خدا نہ کرے کہ میں اس دن کے لیے زندہ رہوں۔"

"آمین" میں نے کہا "ویسے تو ہر ماں کا وجود ایک شجر سایہ دار ہوتا ہے اور کوئی بھی کسی کی ماں کے لیے موت نہیں مانگ سکتا" میں نے کہا "مگر یہ بہت اچھا ہوگا اگر آپ اسی وقت سے ایک طرح پہلے تک ہی شکر چلیں، خوشی اور صحت کے ساتھ جیئیں جو انکشاف کا لمحہ ہو، زندگی کے ایک لمحے سے دستبردار ہو کے آپ بہت سے ناقابل برداشت عذاب سہنے والے لمحوں کی چیرہ دستی سے بچ جائیں گی۔"

"اب تک پولیس نے کیتھرین کی لاش قبضے میں کر لی ہو گی" غالب نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"اب وہ اس سے کیا معلوم کریں گے" جب اس کے جیتے جی نہ معلوم کر سکے" محسن نے کہا "مجھے زیادہ فکر بخولی کی ہے کیا یہ نئی زندگی بخولی کو اس لیے ملی تھی۔ ہم نے کتنی جدوجہد کی تھی اسے موت کے منہ سے واپس کھینچ لانے کی خاطر مگر اس کے بعد ہم نے اسے کیا دیا؟"

گاڑی نے ایک موڑ کاٹا اور گھنے درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے ویرانے میں ٹھہر گئی۔ ہیڈ لائٹس نے پل بھر کے لیے ایک پرانی طرز کے [illegible] روشن کیا جس کے برآمدے میں محرابی دروازے تھے [illegible] صرف دیواروں کے خلا تھے جو بغیر حرکت [illegible] اور دروازوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ میں نے پیچھے مڑ کے چاروں طرف دیکھا۔ آس پاس آباد گھر تھے جن کے درمیان بہرام دادا کا لاوارث رہ جانے والا گھر زمانے کی بے حسی پر نوحہ خواں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ قطعۂ زمین پر اگے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ سے گزرا جو کسی زمانے میں باغیچہ ہوگا۔

دروازوں اور کھڑکیوں کی جگہ باقی رہ جانے والے دیوار کے خالی ٹکڑے ان قبروں کی طرح لگے تھے جن میں سے کفن چوروں نے مردے نکال پھینکے ہوں۔ بہرام دادا کی بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ اس خدا پرست [illegible] نے اپنا سب کچھ بانٹ دیا تھا۔ ساتھیوں میں اور ضرورت مندوں میں مگر پھر بھی اس کی موت کے بعد مدفون خزانے ڈھونڈنے والوں نے بچی ہوئی امیدوں کی خاطر اس کی بنیادیں تک کھود ڈالی تھیں اور جب کچھ نہیں ملا تھا تو جاتے جاتے چور کی لنگوٹی کے مصداق دروازے کھڑکیاں اکھاڑ کے لے گئے تھے۔ میں نے اندر جا کے ایک دیا سلائی روشن کی۔ ایک سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے میں نے تیلیاں جلائیں اور اچھی طرح دیکھ لیا کہ گرد آلود فرش اور پلاسٹر اکھڑی دیواروں کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

دونوں عورتوں کو اندر کے ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ قریب ہی کے کسی اسٹریٹ لیمپ کی روشنی اس کمرے میں براہ راست ایک کھڑکی کے خلا سے پہنچ رہی تھی۔ غالب ان کے مقابل دوسری دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا تو میں نے اور محسن نے وہ سب سامان دوسرے کمرے میں لا کے رکھا جو ہم ساتھ لے آئے تھے۔ سامان میں وہ سوٹ کیس بھی تھا

www.paksociety.com

جس کی ہلاکت خیزی میں کوئی شبہ نہ تھا مگر اُسے عائشہ کھول سکتی تھی، اگر اس میں واقعی دس لاکھ روپے تھے تو یہی ہمارا سب سے بڑا اثاثہ بھی تھا۔

ڈِکی میں گاڑی کا کور بھی تھا جسے میں نے چادر کی جگہ استعمال کرنے کے لیے اُٹھایا۔ محسن کو گلوز کمپارٹمنٹ میں سے ایک ٹارچ مل گئی۔

"پہلے تو اس گاڑی سے چھٹکارا پانا ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، اس کھنڈر میں اس کا وجود ہی شکوک پیدا کرتا ہے۔ کسی رات کے پہرے دار نے اگر دیکھ لی تو... مالک پوچھنے آجائے گا۔" محسن بولا۔ "میں اسے کیا کروں! کہیں چھوڑ آؤں یا...؟"

"کیا تمہیں اب بھی جمشید کے نقصان کا درد اُٹھ رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں! بس ایسے ہی کسی خوبصورت چیز کو تباہ کرتے ہوئے خیال تو آتا ہے۔" محسن بولا۔

"یہ خوبصورتی فریبِ نظر ہے ورنہ یہ مالِ حرام کا ڈھیر ہے۔ سوچ لے ذرا کہ کس کس نے اپنے خون سے اس کی قیمت چکائی ہوگی۔ ان سب نے جو تخریب کاروں کے ہاتھوں میں جانے والے اسلحے سے اپنے بھرے گھروں میں ہی زندہ دفن ہو گئے۔ خون اور گوشت کے لوتھڑے بن کے بکھر گئے اور بچے بھی تو بالکل ادھورے رہ گئے۔ بے گھر یا چھوڑ گئے آنکھوں یا ٹانگوں کے بغیر، یتیمی یا بیوگی کے ساتھ۔ یہ بھی تو ہماری متعفن لاشوں کی تجارت کا مال ہے۔"

"میں نے تو ایسے ہی بات کی تھی۔" محسن بولا۔ "پولیس بھی کیا ہوگا؟"

"آتش دان سے جا کر چارجی طرف کی ہوا بھی، وہاں سے پہنچے تو۔" میں نے کہا۔ "اور خیال رکھنا اپنا بھی!" صبح ہونے والی تھی۔ محسن نکل گیا تو میں نے ادھر اُدھر گھوم پھر کے محفوظ ترین سیل فون کا کھمبا تلاش کیا۔ اتفاق سے سیل فون کی ایک لائن کھنڈر کی چھت کے پیچھے سے گزر رہی تھی۔ لائن کا دوسرا کنارہ پیچھے والے گھر تک گیا تھا۔ میں نے چھت پر چڑھ کے سیل فون کے تار کو دانتوں سے چھیلنے کی کوشش کی مگر انسولیشن بہت سخت تھی۔ مجبوراً میں نے دیا سلائی سے پلاسٹک کو گرم کیا اور پھر دانتوں سے توڑا۔ دو سب تار کو میں نے دو انچ کے فاصلے سے ننگا کیا اور پھر اپنے پورٹیبل فون کے دونوں کنارے جوڑ دیے۔ سراج کا نمبر ملانے میں خطرہ تھا۔ اس وقت کنکشن ایک فون نمبر سے ملا ہوا تھا اور سراج کے گھر میں ہر فون کال کو ٹیپ کرنے اور ٹریس کرنے کا پورا انتظام تھا۔ وہ آدھے گھنٹے میں اس گھر تک آ پہنچتے جس کی یہ لائن تھی۔ چنانچہ میں نے دلاور کی بیوی سے بات کرنا مناسب سمجھا۔

"ہیلو!" کسی مرد نے گھنٹی بجتے ہی ریسیور اُٹھا لیا۔

"کیا میں مسز دلاور سے بات کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"آپ کون ہیں؟" اس نے کہا۔

"پہلے مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے صحیح نمبر ملایا ہے یا نہیں۔"

"میں اس کا والد بول رہا ہوں، دلاور کا خاندان لاپتہ ہو گیا۔"

"کیا آپ کو والد صاحب کی خیر و عافیت سے کوئی دلچسپی ہے؟" میں نے کہا۔

"تم... تم وہی بدمعاش ہو!" اس کا غصہ کسی آتش فشاں کے لاوے کی طرح اُبل پڑا۔ "میں پوچھتا ہوں عائشہ کہاں ہے؟"

"عائشہ خیریت سے ہے اور بالکل محفوظ ہے لیکن آپ کو اس قسم کا اشتعال انگیز اور غیر ذمے دارانہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"کیا اشتعال انگیزی میں نے کی ہے اور جو تم نے کیا... کیا وہ ذمے دارانہ فعل تھا؟" بڈھے نے چلانا شروع کیا۔

"دیکھیے، نہ میں آپ کو جانتا ہوں نہ آپ کو میرے بارے میں کچھ معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "سوائے اس کے کہ آپ کی ایک بیٹی میری تحویل میں ہے۔ دلاور کو ہم نے چھوڑ دیا ہے۔"

"خدا کے لیے اسے بھی چھوڑ دو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تمہاری اور دلاور کی کیا دشمنی ہے مگر عائشہ نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ اس کی بہن کی کیا حالت ہے۔ اس کی بڑی بہن بہت بیمار ہے اور اس کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ وہ صدمے سے مر جائے گی۔ اس پر نہیں تو مجھ پر رحم کرو، میں بوڑھا ہوں اور دل کا مریض ہوں۔ کہاں تک صدمے اُٹھاؤں۔ ایک جوان بیٹا تھا، اس کے بعد جینا تو نہیں چاہتا تھا مگر بیٹیوں نے مجبور کر دیا تھا۔ اب صرف عائشہ رہ گئی ہے۔ کسی کو معلوم ہو گیا تو اس کی بدنامی میرا بڑھاپا اجیرن کر جائے گی۔" وہ منت سماجت کرنے لگا۔

"مجھے آپ سے یقیناً ہمدردی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک اجنبی کو بھی کسی کے حالات سے ہمدردی ہو سکتی ہے۔"

"جھوٹ بکتے ہو تم... تم جیسے لوگ کسی کے ہمدرد نہیں ہوتے۔ تم کو کیا! کسی کی زندگی تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے، کوئی مرتا ہے تو مر جائے۔" وہ پھر برہم ہو گیا۔

"جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ آپ کے مفاد میں ہے۔ مجھے بتائیں کہ آپ سنیں گے یا میں فون بند کر دوں؟" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں، بتاؤ کیا بات ہے؟" وہ جلدی سے بولا۔

"پہلی اطلاع تو میں دے چکا، دلاور کے بارے میں۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے ہی اُس کے کسی دوست نے فون کر کے بتایا تھا کہ وہ بہت بُری حالت میں ملا ہے۔" وہ بولا۔

"خدا کا شکر ادا کریں کہ وہ زندہ مل گیا۔" میں نے کہا۔ "دوسری بات مجھے اُن کی بیوی کے بارے میں کہنا تھی، صرف آپ سے۔ آپ کے سوا کسی اور کو کچھ معلوم ہوا تو آپ کی بڑی بیٹی مر جائے گی۔"

"وہ... اُسے تو مرنا ہی ہے۔" اس نے کہا۔

"وہ ابھی سے آپ کیا کہہ سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "کیا یہ ٹھیک ہے کہ اس کی بیماری کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا یہ بھی ٹھیک ہے کہ اب تک ایک ہی ڈاکٹر نے اس کا علاج کیا ہے جو دلاور کے لیے قابلِ اعتماد ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ ان کا فیملی ڈاکٹر ہے۔"

"کیا یہ بھی درست ہے کہ آپ کی بیٹی کو صرف ایک اسپیشلسٹ نے دیکھا ہے اور اس کے پاس بھی دلاور خود لے کر گیا تھا؟"

"اور کون لے جاتا! آخر وہ شوہر ہے اس کا۔" بڈھے نے بگڑ کر کہا۔

"کیا اس نے آپ سب کو اور اپنی بیوی کو سختی سے منع کر دیا ہے کہ اس سے پوچھے بغیر کسی بھی ڈاکٹر سے بیماری کے بارے میں بات تک نہ کی جائے؟"

"ہاں، مگر تم... تم کیسے جانتے ہو یہ سب؟" وہ بولا۔ "اس نے میری بیٹی سے یہ بات کہی تھی اور مجھ سے..."

"تو پھر آپ دونوں ہی ایسا کر سکتے تھے۔ کیا اس نے کوئی دھمکی بھی دی تھی؟ یہ کہ کسی اور ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو بُرا ہوگا، وہ طلاق دے دے گا؟"

"یہ... یہ تو نہیں۔ آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"پہلے میری بات کا جواب دیں۔" میں نے کہا۔ "دلاور نے دھمکی دی تھی کسی قسم کے نتائج کی؟" میں نے کہا۔

"دھمکی تو نہیں... بس ایک بار ایسا ہوا تھا کہ وہ اپنی کسی سہیلی کے پاس چلی گئی تھی، اس کا میاں اسپیشلسٹ ہے۔ تو دلاور نے اسے مارا تھا اور میرے پاس بھیج دیا تھا کہ... کہ یہ بہت خودسر ہو گئی ہے اور اپنے شوہر پر اعتماد نہ رکھنے والی بیوی کو اس کے گھر میں بھی نہیں رہنا چاہیے۔ پھر کبھی ایسا نہیں کیا کسی نے۔" وہ بولا۔

"گویا اب علاج وہیں ہو رہا ہے جہاں دلاور چاہتا ہے؟"

"ہاں وہیں، اچھا ڈاکٹر ہے، بہت بڑا اسپیشلسٹ ہے۔" وہ بولا۔

"پھر فائدہ کیوں نہیں ہو رہا ہے اس کے علاج سے؟" میں نے کہا۔ "چچا میاں، ایک بات کہتا ہوں، ماننا نہ ماننا تمہارے اختیار میں ہے۔ یہ تمہارا اپنا انتخاب ہے کہ تم بیٹی کی زندگی اور اس کے سہاگ میں سے کس کا انتخاب کرتے ہو۔"

"میں... میں کون ہوتا ہوں اور یہ کیا فضول بات ہے؟" وہ سخت پریشان ہو گیا۔ "تم مجھے دہشت سے مار ڈالو گے۔"

"غور سے سنیے میری بات۔ دلاور اپنی بیوی سے چھٹکارا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ بیماری کو بہانہ بنا رہا ہے۔ چونکہ وہ اسے زندہ رکھنا نہیں چاہتا اس لیے یہ بیماری اس کی جان لیے بغیر نہیں ٹلے گی۔"

"تم... تم اس پر... الزام... لگا رہے ہو کہ وہ قتل کرنا چاہتا ہے اپنی بیوی کو... خبیث... مردود... لعنت ہو تم پر۔"

"میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ جھوٹ ہو تو ابھی جو کچھ آپ نے کہا اس پر مجھ سے غائبانہ اظہارِ شرمندگی ضرور کریں۔ کل اپنی بیٹی کو خاموشی سے کسی دوسرے اسپیشلسٹ کو دکھائیں۔ دلاور کو کچھ معلوم نہ ہو۔ اس کے سارے ٹیسٹ کرا کے دیکھیں، نتیجہ تمہارے سامنے آ جائے گا۔ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اسے کوئی مہلک مرض نہیں ہے اور علاج کے نام پر اس کے ساتھ دھوکا ہو رہا ہے۔ اسے دوا کے نام پر زہر دیا جا رہا ہے۔"

"بکواس کرتے ہو تم، بھونکتے ہو تم کتے...!"

"حقیقت کو تسلیم نہیں کرو گے تو بیٹی کو خود مٹی دو گے۔ یہ کوئی عمر نہیں ہے اس کے مرنے کی۔ اس کے بچوں کو اس کی ضرورت ہے۔ تم دلاور کو صرف داماد کی حیثیت سے جانتے ہو۔ تمہارے سامنے وہ انتہائی شریف اور فرماں بردار بن کے آتا ہوگا مگر یہ ناممکن ہے کہ بیوی سے اس کی اصلیت پوشیدہ ہو۔ کوئی شوہر اپنی بیوی کے سامنے ظاہر اور باطن کے فرق کو نہیں چھپا سکتا اور اگر چھپانے میں کامیاب ہوتا ہے تو یہ اس بیوی کی کم عقلی ہے یا بدنصیبی ہے کہ وہ آنکھیں بند رکھنا پسند کرتی ہے۔ اپنی بیٹی سے کہو کہ آنکھیں کھول کر دیکھے۔ اسے موت کو سامنے دیکھ کر ڈرنا نہیں چاہیے۔ موت برحق ہے اور سب کو آنا ہے مگر اپنی زندگی کی حفاظت بھی ایک فرض ہے۔ اس وقت پھر نہیں ہوگا جب دلاور اپنی کوشش میں کامیاب ہو جائے گا۔"

"لیکن ایسا... وہ ایسا کیوں کرے گا؟" بڈھا اب ہانپ رہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کا دل کمزور ہے۔" میں نے کہا۔ "اور آپ کی یہ عمر بھی نہیں صدمے سہنے کی، مگر میں کسی اور کو یہ سب نہیں بتا سکتا۔ آپ کا بیٹا زندہ ہوتا تو اس سے کہتا لیکن اب تو آپ کو ہی سننا پڑے گا اور حوصلہ رکھنا ہوگا۔ داماد...

www.paksociety.com

یہ سب عائشہ کے لیے کر رہا ہے۔"

وہ ایک دم پھٹ پڑا۔ اس نے مجھے ایک سے ایک گندی گالی دی۔ میں سب سنتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ تھک کے خاموش ہو گیا۔

"خدا کے لیے، الیاس صاحب ہوش... کیوں کر یہ بیہودہ مذاق کیا تھا آپ نے... میری جان لینے کے لیے مگر میں بے غیرت بن کر سن کے بھی زندہ رہا۔"

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ سچ کا بوجھ آپ کو ہی اٹھانا ہے اور برداشت بھی کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "دلاور نے عائشہ سے شادی کرنے کا سوچا ہے، جب اس کی بیوی زندہ ہے۔"

"یہ ناممکن ہے، ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔" وہ چلانے لگا۔

"آپ کی مرضی کا اس سارے کھیل میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "عائشہ خود اس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس چکی ہے، وہ اس کے ساتھ سازش میں شریک ہے۔ تم کہو گے کہ کوئی بہن کے قتل کی سازش میں کس طرح ساتھ دے سکتی ہے مگر پیسہ، زر اور زمین کے تو کھیل کو آج تک کس نے سمجھا ہے؟ ایسا ہو رہا ہے۔ ایسا پہلے بھی ہوا ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ دولت اور ہوس کا جال لے کر پھرنے والے شکاری آپ نے دیکھے کہاں ہیں۔ آپ سن رہے ہیں نا میری بات؟ آپ اس سازش کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ آپ اپنی بیٹی کی زندگی بچا سکتے ہیں۔ اس کی زندگی آپ کے لیے نہیں تو اس کے بچوں کے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ آپ کو اور کتنے دن جینا ہے۔ بچے تمام قربان کر کے بغیر کیسے رہ لیں گے۔ کل ہی کسی ہسپتال میں داخل ہو جائیے۔ ایک نہیں دو بلکہ تین ڈاکٹروں سے الگ الگ ٹیسٹ کروائیے۔ دلاور کو معلوم ہوگا تو وہ بہت برہم ہوگا۔ کوئی سخت قدم اٹھائے گا۔ دھمکی دے گا طلاق دینے کی اور ممکن ہے طلاق بھی دے دے لیکن یہ تو آپ کو سوچنا ہے۔ میں نے بتا دیا تھا کہ فیصلہ اور انتخاب آپ کا ہے۔ دلاور کو اب بیوی کی ضرورت نہیں رہی، عائشہ کو بہن کی ضرورت نہیں رہی۔ اسے دلاور کی دولت کی خواہش نے سارے رشتوں کی تقدیس کا خون کرنے پر آمادہ کیا ہے مگر اس کے بچوں کو اپنی ماں کی ضرورت ہے۔ انھیں دولت سے زیادہ ماں کا پیار چاہیے۔ ایسے دلاور سے مت ڈریں۔ طلاق دیتا ہے تو اسے ایسا کرنے دیں۔ وہ بالآخر یہی کرے گا اور ایسا نہ کر سکا تو پھر وہ کرے گا جو میں بتا چکا ہوں۔ وہ کسی نہ کسی طرح بیوی کو قتل کر دے گا۔ آپ کچھ ثابت نہیں کر سکیں گے۔ سنا آپ نے؟ میری بات کو گرہ سے باندھ لیں۔ وہ مر جائے گی اگر آپ نے میری بات کو اہمیت نہ دی... ہیلو؟

آپ خاموش کیوں ہیں... ہیلو... ہیلو؟"

مجھے احساس ہوا کہ نہ جانے کتنی دیر سے میں اکیلا بول رہا تھا۔ چند لمحات اور بولنے کے گزر جانے کے بعد میری آواز کو دوسری طرف کوئی بھی سننے والا نہیں ہے۔ اس نے ریسیور رکھ دیا تھا یا بے ہوش ہو گیا تھا۔ شاید مر گیا تھا۔ اس کا بوڑھا اور بیمار دل اس صدمے کو نہ جھیل سکا تھا۔ میرے دل پر صدمے اور ندامت کے احساس کا بوجھ سا پڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ افسوس بھی ہوا کہ میں نے غیر ضروری طور پر لمبی بات کی۔ اسے قائل کرنے کے لیے یہ ضروری بھی نہیں تھا ورنہ میں دو جملوں میں بات ختم کر دیتا کہ عائشہ سے شادی کے لیے تمہارا داماد اپنی بیوی کو قتل کر رہا ہے۔ کوئی بات نہ تھی۔ اس وقت یہی بات میرے ذہن میں آئی جو میں نے پہلے کی اور دوسری بات کہنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ میں دلاور کی بیوی کے ذریعے جو پیغام سراج تک پہنچانا چاہتا تھا وہ نہ دیا جا سکا۔

جب میں نے دوبارہ نمبر ڈائل کیا تو میرے کانوں میں [illegible] کی ٹون بجتی اور اس کے بعد نہ جانے میں نے بہت کچھ دیکھا۔ شاید یہ کہ عائشہ کا باپ وہیں گر کے مر گیا ہے، جہاں کھڑا وہ مجھ سے فون پر بات کر رہا تھا اور ریسیور نیچے جھول رہا ہے یا فون بھی نیچے جا پڑا ہے۔ میں انہی افسوسناک خیالوں کے جال میں الجھا ہوا تھا کہ آیا خیال کہ اب کے گھر فون کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہاں جو لوگ تھے ان کے ہاتھ بندھے تھے۔ ایک بھائی مارا گیا تھا اور ایک بہن اپنے حسن و شباب کے ساتھ جان کا نذرانہ دے کر دنیا سے جا چکی تھی۔ خود عائشہ کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ ابھی تک سراج کے گھر میں اور اسی کے ساتھ ہوگی۔

ایسی صورت میں سراج سے رابطے کے سوا چارہ نہ تھا اور اس کے لیے میں کسی کی پرائیویٹ لائن استعمال کرنا چاہتا تھا۔ مجھے کچھ نہ سوجھا اور بالآخر مجھے ایک جنکشن باکس مل گیا۔ مجھے اس پر چڑھ کے چھپکلی کی طرح چپکے رہنے، اسکرو ڈرائیور سے جوائنٹ کھولنے اور تار لگانے کی اب اتنی مشق ہو گئی تھی کہ اب میں اندھیرے میں بھی یہ کام دو یا تین منٹ میں کر لیتا تھا۔ بیل بجتے ہی سراج کے گھر میں آپریٹر کی ڈیوٹی کرنے والے کسی تیس مار خان نے کہا۔ "ہیلو۔"

"کون بول رہا ہے؟" میں نے اسی کے لہجے میں پوچھا۔

"کون ہے تو میاں؟ جو ہم سے مذاق کر رہا ہے۔" وہ بولا۔

"میں ایک مسکراتا ہوا مردہ ہوں جسے تم دفن نہ کر سکے تھے اور میں اس وقت بھی مسکرا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے ایس ایس پی سے بات کرنی ہے مجھے۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد سراج کی آواز آئی۔ "بولو۔"

"جان کی امان پاؤں تو آپ سے کچھ عرض کروں ایس ایس پی صاحب!" میں نے کہا۔ "اب تو آپ خیر سے عالم شہرت میں ہیں۔"

"کیا محض فضول مسخرے پن کے لیے فون کیا تھا؟" وہ بولا۔

"مسخرہ پن اور آپ کے ساتھ؟ آپ تو خود سب سے بڑے مسخرے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کم سے کم اس وقت ضرور لگ رہے ہیں جب میں آپ کی والدہ ماجدہ اور والد کے کیس نہ ہونے کے باوجود آپ کی والدہ ماجدہ کے ساتھ روانہ ہوا تھا، آپ کی سنگت تو بہت مہنگا ہے۔"

"اگر ان دونوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچا..."

"تو آپ کیا کریں گے؟" میں نے کہا۔ "تو آپ جیل میں گے تو سال کریں گے؟ آپ کے تو فرشتے بھی نہیں جانتے کہ ہم بدمعاشوں میں سے کس سمت میں ہیں یا ہوں گے۔"

"فرشتے تو پہنچ گئے تھے مگر قسمت نے تمہارا ساتھ دیا۔"

"تو آپ قسمت کو کوستے؟ اکثر آپ کا ہی ساتھ دیتی آئی ہے مگر قسمت آپ کی زرخرید بہرحال نہیں ہے اور نہ آپ کی باندی ہے۔ میں نے تم کو یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ ناکام ہو اور مجھے تلاش کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔ ہم تک صرف فرشتۂ اجل کے ساتھ ہی پہنچ سکتے ہو۔ وہ آدمی کو ڈھونڈ نکالنے کا ماہر ہے مگر وہ آئے گا تو اس کے ساتھ ہم اکیلے نہیں جائیں گے، ہمارے مہمان بھی ساتھ ہی رہیں گے۔ تم چاہتے ہو کہ ان کو گزند نہ پہنچے تو سب سے پہلے اپنے شکاری کتوں کو روک لو۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور ہم ان کی حفاظت کریں گے۔ عائشہ اور تمہاری والدہ کو ہم خود واپس پہنچا دیں گے مگر اس وقت جب دلاور اور خواجہ نیک محمد کو ہم تک پہنچا دیا جائے گا۔"

"تم زیب النساء کی بات نہیں کر رہے ہو؟"

"اس کی کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "باتوں ہی باتوں میں اس نے ہمیں بھی چکر بنا دیا۔ جیسی روح ویسے فرشتے... تمہاری اور اس کی جوڑی اچھی رہے گی حالانکہ پہلے میرا خیال بالکل مختلف تھا۔ وہ تو خود ایس ایس پی بننے کے لائق ہے کہ تم ہمیں نہ پکڑ سکے تھے، تمھیں زیب النساء نے تقریباً پکڑوا دیا تھا۔ ہم اس کے حسن، اس کی ذہانت اور بے مثل اداکاری کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔"

"مگر وہ اب ہے کہاں؟" سراج نے کہا۔

"کیا اس نے تمھیں فون نہیں کیا تھا؟"

"کیا تھا۔ خود اس نے نہیں، بات کرنے والا کوئی اور تھا۔"

"کرتی اور کون؟" میں نے کہا۔

"یہ تم مجھ سے پوچھتے ہو؟" وہ دھاڑ کر بولا۔ "تم ہی آواز بدل کے بول رہے تھے۔ تم نے اس سے زبردستی جو کہلوایا اس نے کہا۔ پھر تم نے ریسیور لے کے پتا سمجھایا۔ تم ہمارا مذاق اڑانا چاہتے تھے۔ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تم کتنے بہادر اور کتنے چالاک ہو۔ پولیس کو اپنا پتا ٹھکانا بتا سکتے ہو اور پھر ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل سکتے ہو۔"

"سراج! تم نے ایک غلطی کی ہے۔ اچھا ہوا کہ ورکشاپ [illegible] تم کہاں سمجھے۔ یوں سمجھو کہ اس نے ہمیں چکر دیا تھا۔ اب شاید وہ خود کسی چکر میں پڑ گئی ہے۔ کیا وہ وہاں موجود نہیں تھی جہاں سے فون ملا؟"

"نہیں... کیا تم نے اسے وہیں چھوڑ دیا تھا؟" وہ بے یقینی سے بولا۔

"سراج! میں تم کو ایس ایس پی سمجھ کے نہیں، زیب النساء کا منگیتر ہونے کی وجہ سے ایک بات بتا رہا ہوں۔ سچ تو یہ ہے وہ تمہاری مرضی، وہ ہمیں بے وقوف بنا کے نکل گئی تھی اور اسی کے فون پر تم نے پولیس بھیج دی ہوگی۔ فون اسے کسی مہربان کی تھی تو وہ ہم نہیں تھے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ..."

"کیا خیال ہے؟" سراج نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"مجھے بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ تم سے نہیں، اس خیال سے کہ شاید کسی نے اس سے فون کال کے چارجز وصول کیے..." میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ بھاگی تو شاید کسی بھیڑیے کے گھر میں گھس گئی۔ وہ کوئی آس پاس کا بنگلا ہی ہوگا کیونکہ اُسے غائب ہوئے چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے۔" میں نے کہا۔ "کسی شریف اور مہذب نظر آنے والے مرد نے اس کی مدد کی۔ تم نظر آنے کا مطلب سمجھتے ہو نا؟ یہی کہ اب کچھ منظر آتے ہیں۔ پھر زیب النساء نے اسے یا جیسے کیا کہا، اس کا مجھے اندازہ ہے مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اس شریف اور مہذب نظر آنے والے شخص نے کہا کہ لاؤ میں پتا سمجھا دوں اور پتا سمجھانے کے بعد..."

"اوہ نو!" سراج نے پریشان ہو کے کہا۔

"یس سر! تمہاری وہ منگیتر بہت حسین اور انداز و اطوار میں صد درجہ سنسنی خیز ہے۔ ایسی لڑکی اگر آدھی رات کے بعد اکیلی کسی مرد کی خلوت میں وارد ہو جائے تو تہذیب اور شرافت کا لبادہ اتر سکتا ہے۔ اگر وہ آزاد ہوتی تو یقیناً واپس وہیں پہنچ جاتی جہاں پولیس پہنچی تھی۔ پولیس کے آنے تک وہ چھپی رہ سکتی تھی مگر پولیس کو دیکھ کر تو اس کا سامنے آ جانا ضروری تھا۔"

"ہیں... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ فون کرنے کے بعد اکیلی ہی گھر کی طرف چل پڑی ہو؟" سراج نے کہا۔

www.paksociety.com

"تم کیوں خود کو دھوکا دینا چاہتے ہو، وہ اتنی بے وقوف لڑکی ہوتی تو میں مان لیتا مگر کیا وہ نہیں جانتی کہ اس کا گھر کتنی دور ہے اور رات کتنی سنسان ہے اور وہ خودکشی پر کشش ہے اور راستوں پر قبضے کے جھڑپے بھی گھومتے ہیں۔ ہمیں ایسا رسک لینے کی کیا ضرورت تھی جب کہ تمہیں معلوم تھا کہ پولیس آ جائے گی تو اسے بہ حفاظت اور آرام کے ساتھ گھر پہنچا دے گی اور پولیس اس کی غلام ہے کیونکہ یہاں بھیجنے کو تو ان"
"شاید تم ٹھیک کہتے ہو، ٹھیک ہے۔"
"تمہارے منہ سے یہ فقرہ عجیب لگتا ہے۔" میں نے کہا۔
"اگر ایسا ہوا تو میں اس علاقے . . ." وہ چپ ہو گیا۔
"ہاں ہاں کہو . . . تم اس علاقے پر بلڈوزر چلوا دو گے۔ یہاں ایس ایس پی بہادر، جو ان بنگلوں میں سب بلڈوزر ہیں، اپنی طاقت کے زعم میں ہی کسی نے زیب النساء کو بلڈوز کر دیا۔ وہ جانتا ہوگا کہ بعد میں اس کے نام پتے کی تلاش ہی ہو جائے گی مگر اسے ڈر نہیں ہوگا۔ وہ ان لوگوں میں سے ہوگا جن کا نام کوئی لے تو اس کی زبان کاٹ دی جاتی ہے یا اس پر کیس ڈال دیے جاتے ہیں اور ان کا پتا، جواز ہونا ہی حق ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود تم بھی اس کے بنگلے پر سلام کرنے گئے ہو اور یہ بھی کہ وہ تمہارے ہی گروہ کا شکاری ہو اگر تم سے بڑا شکاری . . . خدانخواستہ تمہارے محکمے کے کوئی ڈی آئی جی وغیرہ تو اوپر نہیں بیٹھے؟ ہر فرعون کے راستے میں کبھی موسیٰ کو ہمیشہ ہی نگر جانا ہے، شکر جانا تم سمجھے ہو نا؟"
"شٹ اپ۔ یہ ضروری نہیں۔" وہ یکلخت ایس ایس پی بن گیا۔
"شٹ اپ کرنے سے پہلے میں تم سے دو باتیں کہوں گا۔" میں نے کہا۔ "ایک یہ کہ جو قدم اٹھاؤ سوچ سمجھ کے اٹھانا، کہیں تمہاری غلطی کا خمیازہ تمہارے اپنے رشتوں پر اثر انداز نہ ہو۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے اگلے پیغام کا انتظار کرنا جس میں ہم بتائیں گے کہ جنگی قیدیوں کا تبادلہ کیسے ممکن ہے۔ تم اس وقت تک یہ معلومات حاصل کر لینا کہ رابعہ اور خواجہ نیک محمد عرف استاد تیغی کہاں ہیں اور تم انہیں لا سکتے ہو یا نہیں۔ دوسری اور نوٹ کر لو، ایک تعلق سے اپنے محکمے کا سابق ڈی ایس پی بھی ہے"
"ڈی ایس آئی؟"
"ایس آئی سید اکرم شیخ اور اس کی ایک بہن سے ... اگر وہ نہ ملے تو تم کو ہماری عدالت میں حلف اٹھانا ہوگا کہ وہ تمہاری تحویل میں نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میری یہ گفتگو تمہارے علاوہ کتنے لوگ سن رہے ہیں، اسے کہاں کہاں ٹیپ کیا جا رہا ہے اور اب تک کتنے لوگ میری کال کو ٹریس کرنے کے لیے ادھر ادھر دوڑ رہے ہوں گے مگر ایسا ان کے لیے امپاسیبل۔ اس لیے انرجی ضائع مت کرو، وہ کام کرو جس سے تمہارا اور ہمارا مسئلہ جلد حل ہونے کے امکانات پیدا ہوں۔" میں نے کال ختم کر دی۔

جب میں واپس اس کھنڈر میں پہنچا تو غالب نے عائشہ اور سراج کی ماں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ کمرے کے کونے میں لیٹ کر سو جائیں۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور اب وہ بظاہر بالکل ساکت تھیں مگر یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ واقعی سو گئی ہوں گی۔ اس حالت میں نیند آنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔
"کہاں غائب ہو گئے تھے دونوں؟" غالب نے پوچھا۔
"کون دونوں؟" میں نے بے وقوف بنتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں تو یہاں موجود ہیں، غائب کہاں ہو گئے؟"
"یہ منکر نکیر کی طرح تم دونوں نے ہر جگہ ایک ساتھ جانے کا عہد کر لیا ہے کیا؟" غالب بولا۔
"منکر نکیر ..." میں نے کہا۔ "... سے زیادہ بلندی پر تھا۔ یہ بڑا ملی تو بچنے والا الزام ہے کہ ہم ایک ساتھ تھے، ویسے آپ کیوں چاہتے ہیں کہ ہم میں سے ایک مشرق کو جائے تو دوسرا مغرب کو؟"
"یار تم کن چکروں میں پڑ گئے۔" غالب کا موڈ سخت خراب تھا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ ہم یہاں کیوں آئے تھے۔ کس نے ... کا ایک سیٹ اپ کیا؟"
میں سخت شرمندہ ہوا اور . . . اسے بھولا نہیں ہوں گا۔
"بھولے ہوتے ہو تم۔" غالب نے میری بات کاٹ دی۔ "تم نے کیتھرین کو بھی چھوڑ دیا۔"

"ہم بہت مجبور تھے۔ گاڑی میں بھی نہیں ڈال سکتے تھے اسے اور میں نے تو کہا تھا کہ اسے بھی لے آؤں لیکن ... نے کہا، وقت ملتا تو لے بھی آتا۔"
"چلو اسے چھوڑو، انجولی کو پہلے تلاش کرنا چاہیے تھا۔" غالب نے کہا۔
"میں دیکھتا ہوں، کمروں میں تو نہیں ہے۔" میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "اور ہاں اور زیب النساء گم ہو گئی ہے؟"
"گم ہو گئی کیا مطلب؟"
"مطلب ... ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "کہیں سے اس نے فون کیا مگر اب پتا نہیں کہ کہاں سے کیا تھا اور پھر وہیں کیوں ہو رہی ہے؟"

میں نے ایک مرتبہ پھر کمروں سے گزرتے ہوئے کونوں کھدروں ... بنگلا ویران ہو تا ہو ایک حصے پرانے دنوں کے کچن اور باتھ روم کے آثار دریافت کیے۔ پھر باہر نکلا اور عقبی حصے کا جائزہ لیا۔ پیچھے ایک آنگن سا تھا جو تین طرف کی کوٹھیوں کے احاطوں کی دیواروں سے بنا تھا۔ اس میں ایک پرانا برگد کا درخت تھا جس نے کم و بیش نصف حصے کو گھیر لیا تھا۔ اس کے نیچے ایک چبوترے کا ڈھانچہ کھڑا ہوا تھا۔ ایک گز سے زیادہ پھیلے ہوئے تنے کے علاوہ برگد کی داڑھی دور دور تک زمین میں پیوست تھی چنانچہ کئی شاخوں کے نیچے بھی چلتے چلتے ... جنگل سا بن گیا تھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو مجھے دوسری طرف ایک بینچ نظر آئی۔ انجولی اس سیمنٹ کی بینچ پر سکڑی سمٹی پڑی تھی۔
میں نے اسے قریب جانے سے پہلے ہی پہچان لیا تھا۔ اس بینچ کے قریب ہی ایک بہت موٹی شاخ، تنے سے نیچے کو آ رہی تھی ... ایک موٹی شاخ کے مضبوط بازو سے زنگ خوردہ زنجیریں لٹکی ہوئی تھیں اور زنجیروں نے ایک فولادی جھولے کو تھام رکھا تھا۔ جھولے کا فریم لوہے کا تھا لیکن درمیان کا حصہ لکڑی سے بنایا گیا تھا۔ سالوں پرانا ہو کر گل سڑ گئی تھی اور اس کے ٹکڑے نیچے بکھرے ہوئے تھے۔ درمیانی حصہ خالی ہو گیا تھا۔ جھولا ہر طرف سے شاخوں اور لٹکتی داڑھی کے ریشوں میں گھر گیا تھا لیکن میں اس وقت کا تصور کر سکتا تھا جب رنگین نواروں میں لیٹ کر انجولی فرحت بخش ہوا کی اٹکھیلیاں محسوس کرتی ہوگی، آنکھیں کھول کر نیلے آسمان کی گہرائی پر غور کرتی ہوگی اور اڑتے ہوئے پرندوں کی دلنشیں پرواز کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوگی اور اس کا باپ جسے جرائم کی دنیا ایک خطرناک ڈاکو مانتی تھی ایک باپ کی محبت اور شفقت اور خوشی کی نظر سے یہ سب دیکھ دیکھ کے خوش ہوتا ہوگا اور انجولی اپنے ماں باپ کے قرب میں اس جھولے کو ایک مہربان آغوش یا راحت سمجھتی ہوگی۔
میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ میرا خیال ایک جذباتی پرواز کے سوا کچھ نہ تھا۔ ... کے سائے سے پہلے یہ ایک ... کاشانہ کے تصور ہوتے ہیں اور مجھے یہ تخیل انجولی کے ساتھ اسی محبت کا ... دیکھ لیا تھا جیسے دو معصوم بچوں کا تصور ... ایک ساتھ تھا ... میں مصروف دیکھتا ہے۔ میں نے اسے آہستہ سے آواز دی۔ پھر اس کے شانے کو ذرا سا تھپکا لیکن وہ نیند میں نہیں تھی کہ جاگ جاتی۔ وہ بے ہوش تھی ... پیار کی دیوانگی نے اسے وہاں تک پہنچا دیا تھا جہاں اس کے لیے پیار بھری یادوں کے بسیرے میں ایک محفوظ جذباتی حصار اب تک موجود تھا مگر پھر اس کی ساری توانائی ختم ہو گئی تھی۔
ایسے میں بے ہوشی ہی احساس کے عذاب سے نجات دلاتی ہے اور جسم کی بیٹری کو اس حد تک چارج کر دیتی ہے کہ آنکھیں کھولنے کے بعد گزراں یا رنجی ایام کے ساتھ تنے غم کا بوجھ سنبھالا جا سکے اگر صدمہ بڑا اور دل چھوٹا ہو تو یہ بے ہوشی کا بدل موت یا خود فراموشی بھی بن جاتی ہے۔
میں نے انجولی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ وہ اس قدر کم وزن تھی کہ مجھے تعجب ہوا۔ میں اسے اٹھائے ہوئے اندر گیا تو محسن بھی واپس پہنچ چکا تھا۔
"یہ مل گئی؟" غالب اور محسن نے ایک ساتھ پرمسرت لہجے میں کہا۔ حالانکہ یہ مسرت کے اظہار کا کوئی موقع نہ تھا مگر کبھی کبھی ایک چھوٹا نقصان اٹھا کے بڑے نقصان سے بچ جانے والے کا یہ رد عمل بھی ہوتا ہے۔
"ہاں۔ اسے محسن کی آنکھ سے دیکھ لیا تھا جو تم عقل کے اندھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔" میں نے کہا۔
"خدا کا شکر ہے۔" غالب نے کہا۔ "میرے دل کو ملامت کے قریب سے جھٹکا لگا تھا ورنہ تمام عمر کیتھرین کی لاش اپنی کھلی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے فریاد کناں رہتی۔"
میں نے انجولی کو کمرے کے فرش پر لٹا دیا۔ عائشہ اور سراج کی ماں ہماری گفتگو سن کے اٹھ بیٹھی تھیں۔ عائشہ کی آنکھوں میں تجسس اور حیرت تھی تو سراج کی ماں کی نظروں میں صرف ملامت۔
"اسے کچھ دیر میں ہوش آ جائے گا۔" میں نے کہا۔
"پھر یہ ہنگامہ کرے گی۔" محسن بولا۔
"کچھ دیر میں صبح ہو جائے گی۔" غالب نے کہا۔ "تم نے کچھ سوچا ہے کہ سارا دن کیسے گزرے گا؟"
"یہ تو میں نہیں جانتا کہ کیسے گزرے گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن گزرے گا اسی جگہ۔ ہمارے لیے کسی بھی جگہ جانا بلاوجہ خطرے سے کھیلنے کے مترادف ہوگا۔ آج کہاں کوئی سڑک محفوظ نہیں ہوگی۔ سب سے بہتر یہی ہوگا کہ ہم یہاں دبکے پڑے رہیں کل تک۔"
"کل کیا ہوگا؟" غالب نے کہا۔
"سفر۔" میں نے جواب دیا۔ "جو وسیلۂ ظفر ہوتا ہے مگر اب یہ نہ پوچھنا کہ منزل ہے کہاں۔ تیری منزل لاہور نہیں کیونکہ آدمی اور اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس نے سوچا اسلام آباد جا سکتے ہیں اور پہنچ گیا عظیم آباد یا مشرق کا کہہ کے نکلا اور مغرب کی جانب چل پڑا۔"
غالب سمجھ گیا کہ میں عائشہ کے سامنے اپنے پروگرام کی بات کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ اس نے کہا۔ "چلو لاہور کے لالے تیری ان ... آج اسی ہوٹل خانہ خراب میں ..."

www.paksociety.com

ہیں، پورا فلور بک کرا کے مگر مجھے اس ہوٹل میں صرف قیام
کے امکانات نظر آتے ہیں، طعام کے نہیں۔"
"روزہ رکھو مرزا غالب اور ایک دن فقر و فاقے میں
گزار کے تو دیکھو۔" محسن نے مشورہ دیا۔
"یا اللہ پر بھروسا کرو۔" میں نے کہا۔ "اس نے ہمیں رزق
فراہم کرنے کے لیے گرد و نواح کے کسی کونے کھدرے میں
کوئی نہ کوئی حلوائی ضرور بٹھا رکھا ہوگا جو ہمارا منہ حلوا پوری تلنے
کا ٹھیک کام شروع کرے گا۔"
"اسے اپنا ماموں، سسر یا والد حقیقی بنا لوگے تب بھی وہ
پیسے ضرور مانگے گا۔" غالب بولا۔
"پیسے... کتنے پیسے؟ لاکھ دو لاکھ روپے؟ پانچ چھ لاکھ
روپے... غالباً اتنی رقم میں حلوا پوری کیا پورا حلوائی آجاتا ہے
اور تم یہ جانتے ہو کہ ہمارے پاس فوری لاکھوں ہیں۔"
"ہم جانتے نہیں، ہم نے صرف سنا ہے۔" غالب بولا۔
"اور وہ بھی ان سے جو سچ اور جھوٹ کے درمیان تفریق
کو جانتے ہی نہیں۔" محسن نے اس کی تائید کی۔
"مگر انھوں نے سچ جاننے کا طریقہ بتا دیا تھا۔" میں نے
کہا۔ "یا یوں سمجھ لو کر خزانے کی چابی ہمارے حوالے کر دی تھی۔"
محسن نے عائشہ کی طرف دیکھا۔ "تم سمجھدار ہو۔"
"میں... میں... کیا کر سکتی ہوں؟" عائشہ نے چونک کر کہا۔
"ہمیں بتایا گیا تھا کہ تم اس سوٹ کیس کو کھول سکتی ہو۔" میں
نے کہا۔ "اور یہ کہ اس میں واقعی دس لاکھ روپے ہیں۔"
"انھوں نے غلط بیانی کی تھی۔" عائشہ نے خشک لبوں پر
زبان پھیر کے کہا۔ "مجھے کچھ نہیں معلوم۔"
"اچھی طرح سوچ لو کہیں تم تو غلط بیانی سے کام نہیں
لے رہی۔ جو ہم ہر قفل کھولنا جانتے ہیں مثلاً جھوٹ کا قفل اور
سچ کا قفل۔ اگر تمہارے لبوں کا قفل کھولنے کے بعد ہمیں یقین
آگیا کہ تم کو واقعی کچھ نہیں معلوم تو پھر ہم خود اس سوٹ کیس کو
بھی کھول لیں گے۔" میں نے کہا۔
"کیا تم مجھ پر تشدد کرو گے؟" عائشہ سہم کر بولی۔
"میں نے کہا تھا نا کہ تم سمجھدار ہو۔" محسن بولا اور اس نے
عائشہ کو بازو سے پکڑ کے کھڑا کر دیا۔
"چھوڑ دو... مجھے چھوڑ دو۔" وہ چلانے لگی۔ محسن نے
اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا۔ وہ نیچے گر گئی۔
"آواز کم رکھو۔" محسن نے آہستہ سے کہا اور اسے پھر
کھڑا کر دیا۔
"تم پولیس والوں کے طریقۂ تفتیش سے تو واقف ہو۔" میں
نے نرمی سے کہا۔ "ہم پولیس والوں کے باپ ہیں، وہ ہم سے پناہ
مانگتے ہیں۔ تم صرف چند منٹ میں سوٹ کیس کھولنے کو تیار ہو جاؤ
گی خواہ اس کے نتیجے میں تم کو مرنا ہی کیوں نہ پڑے۔"
عائشہ خاموش کھڑی مجھے گھورتی رہی۔ اس کی آنکھوں
میں نفرت اور غصے کی ایسی آگ تھی جس کے شعلوں کو وہ دبائے
رکھنے پر مجبور تھی چنانچہ یہ آگ اس کے وجود کے اندر ہی اندر جل
رہی تھی۔
"ٹھیک ہے محسن! اس کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔" میں
نے کہا۔ "یہ بہادر لڑکی ہے بس اتنا خیال رکھنا کہ جان نکل جائے
مگر آواز نہ نکلے۔"
محسن نے اسے ایک دم دبوچ لیا۔ اس کا ہاتھ یوں موڑا کہ
وہ خود ہی گھوم گئی مگر چیخ نہ سکی کیونکہ محسن نے اس کے منہ کو
اپنے دوسرے ہاتھ سے دبا لیا تھا۔ محسن اس کی کلائی کو تھوڑا سا
بل دیتا تھا تو وہ کرب سے بری طرح بل کھاتی تھی مگر اس کا
جسم محسن کے اور دیوار کے درمیان دبا ہوا تھا۔
"ضد چھوڑ دو لڑکی۔" سراج کی ماں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
محسن نے اسے ذرا سی دیر کے لیے آزاد کیا۔ وہ لمبے لمبے
سانس لینے لگی اور پھر کانپتی آواز میں بول پڑی۔ "... میں مرنا
نہیں چاہتی۔"
"مرنا کوئی بھی نہیں چاہتا۔" محسن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
"مگر موت کا وقت ٹالا تو نہیں جاسکتا۔ اگر یہ سوٹ کیس ایک
ڈیتھ ٹریپ ہے جو تمہارے آقا بھائی نے ہمارے لیے بنایا تھا
تو اسے وقت کی ستم ظریفی کہو کہ اس طرح تمہارے لیے
موت کا سامان کیا۔ میرا مطلب ہے آسان اور فوری موت کا۔
تم تھوڑا تھوڑا مرنا یقیناً پسند نہیں کرو گی۔ ہم رحم اور رعایت
کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ دشمن ہمارے لیے بھی دشمن ہے۔
یہ جاننے کے لیے کہ سچ کہاں چھپا ہوا ہے، ہمیں تمہارے دماغ
کو خالی کرنا پڑے گا۔ اس کا ریزہ ریزہ چھاننا ہوگا۔ تمہارے خون
کے آخری قطرے سے بھی سچ کشید کرنا پڑا تو ہم کریں گے۔ اگر
اس کے بعد ثابت ہوگیا کہ تم کو واقعی کچھ معلوم نہیں تھا تو ہم
سوری کہہ کے تم کو یہیں چھوڑ جائیں گے۔ جنگ میں تو ایسا
ہی ہوتا ہے۔ بم پھینکنے والا جانتا ہے کہ اس سے بے گناہ
عورتیں، معصوم بچے اور معذور بوڑھے بھی ہلاک ہوں گے مگر
جنگ کی صورتِ حال یہی ہے... مس عائشہ۔"
"بصورت دیگر، شاید ہمیں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے کے
لیے مہلت مل جائے۔" میں نے کہا۔ "یہ قید عارضی ہے، تم کو
واپس جانا ہی ہے۔"
"کیونکہ اب چوہدری دلاور اور ایس ایس پی صاحب ہماری
شرائط پر سودا کرنے پر مجبور ہیں۔" غالب نے کہا۔

"تمہاری بہن بھی تھوڑے دن کی مہمان ہے۔" میں نے کہا۔
"وہ بہت جلد مر جائے گی پھر تم مسز دلاور بن کے عیش کرو گی۔ دلاور
کے پروگرام کے عین مطابق... تم پر کسی کے قتل کا الزام نہیں
آئے گا۔"
"نہیں... میں بتاتی ہوں۔" عائشہ نے لرزتے ہوئے کہا۔
"میں وہ سوٹ کیس کھول دوں گی۔"
ہمارے ڈائیلاگ جو صرف عائشہ کو دہشت زدہ کرنے
کے لیے تھے موثر ثابت ہوئے تھے۔ "چلو پھر سوٹ کیس اٹھاؤ۔"
محسن بولا۔
عائشہ نے سوٹ کیس اٹھا لیا۔ "باہر چلو۔" اس نے محسن
کو اشارہ کیا۔
"باہر کیوں؟" محسن بولا۔ "یہاں کیا حرج ہے؟"
"حرج یہ ہے کہ سب کے ساتھ مجھے بھی
مرنا پڑے گا۔" عائشہ نے تلخی سے کہا۔
"کیا اس سے کوئی دھماکا ہوگا؟" میں نے کہا۔
"نہیں، دھماکا وغیرہ کچھ نہیں ہوگا۔" عائشہ نے کہا۔ "اس کو
کھولنے کا کوئی پیچیدہ عمل ہے۔ یہ لاک دبا کر ذرا سے دباؤ
کے ساتھ دائیں اور بائیں کھینچو، لاک کھٹ سے کھل جائیں گے
مگر ایسا کرنے سے پہلے مجھے باہر جانے دو یا پھر تم بھی میرے
ساتھ باہر چلو۔"
اس نے مجھے کنفیوز کر دیا تھا۔ میں نے محسن سے کہا۔
"ٹھیک ہے، اسے باہر لے جاؤ۔"
"اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہاری کوئی چالاکی نہیں چلے گی۔"
محسن نے کہا۔ "تمہاری بدقسمتی کہ میں شادی شدہ ہوں، تم جیسی
خوبصورت لڑکی کو ٹھائیں سے گولی مارتے ہوئے میرے دل
پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔"
عائشہ نے برا سا منہ بنایا اور بڑی تمکنت سے چلتی ہوئی
باہر نکل گئی۔ میں بھی صرف دلچسپی کے باعث محسن کے ساتھ رہا
کہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس سوٹ کیس میں موت کو کس طرح
محفوظ کیا گیا تھا۔ عائشہ کی طرف سے مجھے فکر نہیں تھی کہ محسن
کیونکہ اس سے وہ نمٹ سکے گا۔ عائشہ نے باہر نکل کے ادھر
ادھر دیکھا پھر نیچے جھک کر ایک پرانے کاغذ کے ٹکڑے
کو اٹھا لیا۔ اسے سب سے اوپر لے جا کے چھوڑ دیا۔ وہ ہوا کا رخ
دیکھنا چاہتی تھی جو بظاہر ساکت لگتی تھی مگر کاغذ تھوڑا سا دائیں
طرف گیا۔ عائشہ نے اپنا رخ ادھر ہی رکھا۔ نیچے جھکی اور اگرچہ
وہ ہم سے پانچ چھ فٹ دور تھی مگر اندھیرے میں اس کی انگلیوں
کی حرکت نہیں دیکھی جاسکتی تھی۔ ہم نے تو بس ایک کھٹکا سنا۔
پھر وہ جھک رہی کہ رہی تھی کہ یہ عام قسم کا لاک تھا جسے
کھولنے کی کوئی خاص تکنیک نہیں تھی۔
میں اور محسن قوطہ مار چکے تھے تب عائشہ ایک دم
پیچھے ہٹی۔ اتنی تیزی سے کہ وہ دم سے ٹکرائی۔
"پیچھے چلو اور دور ہو جاؤ۔" اس نے چلا کے کہا۔
"کیا مصیبت ہے۔" محسن نے غرا کے کہا اور ہم چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔
"کیا اس میں سے جن نکلنے والا ہے یا کوئی آدم خور جن؟" میں
نے کہا۔
"جو دلاور کا تربیت یافتہ غلام ہوگا اور ہم دونوں کا مرید
بنا دے گا۔" محسن نے کہا۔ "تب دلاور تمہاری آنکھوں میں لگا رہے
گا تو ہمیشہ خوش رہے گا، مسکراتا رہے گا اور ستم کرے گا۔"
"ہمت ہے تو ذرا قریب جا کے سانس لو۔" عائشہ نے
طنز سے کہا۔ "پھر دیکھو گی کہ تم کس طرح مسکراتے ہوئے مرتے
ہو۔ اس میں سے وہ قاتل گیس خارج ہو رہی ہے جسے تم ایک
بار سانس کے ساتھ اندر لے جاؤ تو دوسرا سانس نہ لے پاؤ۔"
"مائی گاڈ، گویا اس میں سے سائنائیڈ گیس نکل رہی ہے
جو امریکا میں سزائے موت دینے کے لیے گیس چیمبر میں استعمال
ہوتی تھی؟"
عائشہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور سوٹ کیس کو برابر
دیکھتی رہی۔
"آنا جانا دیا ہے تو اب یہ بھی بتا دو کہ گیس کتنی دیر تک
نکلتی رہے گی اور یہ سب انتظام کس طرح کیا گیا تھا؟" محسن بولا۔
"مجھے نہیں معلوم۔" عائشہ نے مختصراً کہا۔
"تمہیں بہت کچھ معلوم ہے۔" میں نے کہا۔
"مجھے وہی معلوم تھا جو مجھے راستے میں جمشید نے بتایا تھا
کہ تم اس سوٹ کیس کو ہرگز ہرگز مت کھولنا اور جب وہ
لوگ کھولیں تو فوراً اپنا سانس روک کے دور نکل جانا۔"
عائشہ نے کہا۔ "کمرے سے باہر۔"
"گویا اس کے ذہن میں یہ اندیشہ تھا کہ ہم تمہیں مجبور کر
سکتے ہیں؟"
"ہاں اور اس نے مجھے احتیاطاً بھی بھیجا تھی۔" عائشہ نے کہا۔
اسی وقت ایک عجیب بات ہوئی۔ کوئی چیز دھپ سے
نیچے گری۔ یہ کالی سی چیز برگد کے درخت کی شاخوں میں سے
ٹپکی تھی۔ اس کے چند سیکنڈ بعد دوسری آواز آئی۔ یہ درخت کی
شاخوں میں آشیانہ رکھنے والے پرندوں کے بے جان جسم تھے۔
اس قاتل گیس نے حفاظت کے تمام بندشوں کو گیس چیمبر بنا دیا تھا
اور جو گیس ہوا کے ساتھ مل کر اوپر اٹھی تھی اس سے چڑیاں اور
کوے مرے پڑے جا رہے تھے۔ دس منٹ میں اس سوٹ کیس
کے آس پاس مردہ پرندوں کا بستر سا بچھ گیا۔ میں اپنے آپ سے

www.paksociety.com

شرمندہ سا کر دیا تھا۔ یہ ہم تھے جنھوں نے شجر سایہ دار کی ٹھنڈی آغوش میں رہنے والوں کی پوری بستی کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ پرندے کسی جنگ میں شریک نہیں تھے اور کسی کے دشمن نہیں تھے۔ وہ کائنات کا حسن تھے۔ نغمہ تھے اور رنگ تھے۔ یہ درخت ایک ہیروشیما تھا جس پر ہم نے بےتکلفی سے ایٹم بم گرا دیا تھا۔ یوں کہ پلک جھپکنے میں زندگی کی جگہ موت لے لی تھی۔ وہ سب طائرانِ بےنوا ہماری جگہ اپنی جان دیتے جا رہے تھے۔

میرا اندازہ تھا کہ شاید دس منٹ میں پچاس ساٹھ پرندے مر کے گر سکتے تھے۔ ان میں زیادہ تر چڑیاں تھیں اور چڑے تھے۔ پانی کو ترسے تھے۔ چڑیا چڑے کی کہانی بھی میں نے بچپن میں پڑھی تھی۔ ان میں سے ایک دال کا دانہ لایا تھا اور دوسرا چاول کا۔ پھر انھوں نے مل کر کھچڑی پکائی تھی۔ پیاسے کوے سے بھی میری شناسائی تھی۔ اس نے کم پانی میں کنکریاں ڈال کے کیسے پیاس بجھائی تھی۔ یہ بھی ایک کہانی تھی اور شاید نصف صدی میں تیسری نسل کے بچے بھی انھی کہانیوں سے عملی زندگی کا سبق حاصل کر رہے تھے۔ یہ تیسری کہانی سب سے الگ تھی کہ جب وہ بچے بڑے ہوتے ہیں تو اشتراکِ عمل اور جدوجہد سکھانے والے انھی پرندوں کے آشیانوں میں سائنائیڈ گیس چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر آج کے بچے یہ تیسری کہانی پڑھیں تو انھیں کتنا دکھ ہو اور کتنی مایوسی ہو۔

”اب کیا رات بھر یہاں بیٹھ کے ماتم کریں گے [illegible]۔۔“ محسن نے کہا۔

میں چونکا۔ ”کیا سارے پرندے مر گئے؟ سب آشیاں اجڑ گئے؟“

”اچھا تو آپ فلسفۂ حیات و موت پر جذباتی خطابت میں مشغول تھے۔“ محسن نے کہا۔

”دیکھو نا یار! وہ تو مرتے ہی ہیں جو دشمن بن کے لڑتے ہیں مگر اصل المیہ ان کا ہے جو بےسبب مارے جاتے ہیں۔“

”دیکھو بھائی، فنا اور بقا کی یہ جنگ تو دشمنی کے جذبات کے بغیر بھی ہمیشہ سے جاری ہے۔ انسان نے درندوں کو ہلاک کیا اور درندوں نے جنگل کے کمزور جانوروں کو مارا۔ یہ تو ہوا جنگل کا قانون مگر شہر میں جہاں قانون ہے اور آدمی مہذب کہلاتا ہے وہاں کیا ہوتا ہے۔ کیا کمزور زندہ رہ سکتا ہے؟ بیشتر انسان زمین پر حشرات الارض کی طرح جیتے اور مرتے ہیں اور وہ دیوہیکل طاقت، اقتدار اور دولت کے نشے میں چور بدمست ہاتھیوں کے پیروں تلے کچلے جاتے ہیں کیونکہ وہ ان کے لیے راستہ چھوڑ کے نہیں چلتے یا ان کی طاقت کے میدان ہی میں رہتے ہیں۔ سیاست میں بڑی طاقت، شہر میں بڑا بدمعاش، ملک میں ظالم حکمران۔ یہ سب ایسے ہی ہاتھی ہیں جیسے دلاور، جمشید، ایس ایس پی بن جانے والا سراج ہیں۔ ان کے راستے میں آنے والے اور ان کی ہوسِ اقتدار اور ہوسِ زر کا شکار کون ہوتے ہیں۔ وہی جو اپنے چھوٹے چھوٹے گھروں میں سکون سے بیٹھے تھے۔ ان پرندوں کی طرح... سیں عائشہ تم ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ یہ تمھاری سمجھ میں آنے والی باتیں نہیں ہیں۔“

”ہاں، میں نے محسوس کیا ہے تم جو کچھ کر رہے ہو سوچ سمجھ کے کر رہے ہو۔“ وہ بولی۔ ”اور میں سوچے سمجھے بغیر کر رہی ہوں۔ تم بڑے عجیب لوگ ہو۔ شیشوں سے ٹکرا کے جان ہتھیلی پر رکھ کے مرنے مارنے کے لیے تیار پھرتے ہو مگر چڑیاں کوے مریں تو اداس ہو جاتے ہو۔“

”ہم عجیب و غریب نہ ہوتے تو آج اس ویران کھنڈر میں ہم الو کی طرح نہ بیٹھے ہوتے۔“ میں نے کہا۔ ”پیرس یا نیویارک کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں دادِ عیش دے رہے ہوتے۔ مونٹی کارلو کے کیسینو میں جوا کھیل رہے ہوتے یا لاکھ کے کروڑ اور کروڑ کے ارب بنانے کی فکر کر رہے ہوتے۔ یہ سب ہمارے لیے ناجائز نہیں تھا مگر ہم نے چھوڑ دیا۔ چنانچہ ہم عجیب بھی ہیں... اور غریب بھی۔“

”کیا اب تم اس سوٹ کیس کو اٹھا کے لا سکتی ہو؟“ محسن بولا۔

”اب تو تم بھی لا سکتے ہو۔“ عائشہ نے کہا۔

”مگر ہم تمھیں ہی زحمت دیں گے۔“ محسن نے کہا۔

عائشہ تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی۔ وہ بےیقینی کے خوف کا شکار تھی۔ ”انھوں نے کہا تھا کہ پانچ منٹ بعد خطرے کی [illegible] نہیں ہوگی۔“

”اب تو دس منٹ گزر چکے ہیں۔“ میں نے کہا۔

عائشہ آگے بڑھی۔ پرندوں کی موت نے اسے دہشت زدہ کر دیا تھا اور اسے سائنائیڈ گیس کی بےپناہ ہلاکت خیزی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ گیس ہوا میں شامل ہو کے اوپر اڑ چکی تھی مگر یہ اندیشہ بڑا جان لیوا تھا کہ کہیں ہوا میں اس کا تناسب ہزار ایک حصہ بھی ہوگا تو وہ انھی پرندوں پر گرے گی جن کے مردہ جسم اب ٹھنڈے اور سخت ہو رہے تھے۔ وہ ایک قدم چل کے رک گئی تھی۔ محسن نے آہستہ سے پیچھے سے یوں دھکیلا کہ وہ منہ کے بل سوٹ کیس پر جا گری۔ اسے محسن سے ایسی بےرحم اور سفاکانہ کارروائی کی بالکل توقع نہ تھی۔ اس کے حلق سے بےاختیار ایک چیخ نکلی اور وہ چند سیکنڈ تو اٹھ ہی نہ سکی۔ ہمارے لیے اتنا یقین کافی تھا کہ اگر سوٹ کیس میں یا اس کے قریب ذرہ برابر بھی زہریلی گیس ہوتی تو عائشہ اٹھ نہ سکتی۔ وہ جیسے ہی اٹھی، اس نے اسے پکڑ لیا۔ محسن نے سوٹ کیس کو احتیاط کے ساتھ اٹھایا اور ہم اندر چلے گئے۔ مجھے تھوڑی سی تشویش عائشہ کی چیخ سے لاحق ہو گئی تھی۔ کچھ دیر ہم دم سادھے منتظر رہے کہ آس پاس کے کسی گھر سے کوئی باہر نکلے اور یہ جاننے کی کوشش کرے کہ چیخ کس نے ماری تھی مگر رات کے آخری حصے میں نیند بہت گہری ہوتی ہے۔ کسی نے کچھ نہیں سنا تھا۔ سنا تھا تو خواب یا وہم کہہ کے نظرانداز کر دیا تھا یا باہر نکل کے دیکھا تھا۔ تب بھی یہ نہیں سمجھا تھا کہ چیخ اس کھنڈر سے سنائی دی تھی جو مدت سے ویران پڑا تھا۔

”یہ... یہ بہت ذلیل حرکت تھی۔“ عائشہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ خوف سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

محسن ہنسا۔ ”کیا اس سے بھی زیادہ جو تم کر رہی ہو؟ ہمارا تم سے کوئی رشتہ نہیں... یا ہے تو نفرت کا اور دشمنی کا مگر تم اپنی بڑی بہن کے ساتھ کیا کر رہی ہو؟ تم مر جاتیں تو مجھے بالکل افسوس نہ ہوتا کیونکہ میں سمجھتا کہ یہ قدرت کی سزا تھی جو تم کو ملی اور وہ بھی دلاور کے ہاتھوں۔“

”خیر! خدا کے انصاف میں دیر ہے اندھیر نہیں۔“ میں نے کہا اور ایک امکان پر غور کرنے لگا کہ ہم نے دس لاکھ مانگے تو کیا دلاور نے یہ بندوبست پہلے سے کر لیا تھا؟ نہیں۔ پھر اسی خیال نے مجھے مجبور کیا کہ میں محسن کو دوسرے کمرے میں لے جاؤں کیونکہ میں عائشہ کے سامنے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے غالب کو بھی درمیانی دروازے کے قریب بلا لیا جہاں سے وہ عائشہ پر نظر رکھ سکتا تھا۔ سراج کی ماں کی طرف سے کسی کو خطرہ نہیں تھا مگر اس کے کانوں میں پڑنے والی بات خطرہ بن سکتی تھی۔

”مرزا غالب! کیا یہ انتظام صرف ہمارے لیے تھا؟ جب دلاور عالم الغیب نہیں ہے کہ پہلے ہی اس نے صحیح اندازہ کر لیا تھا کہ ہم دس لاکھ طلب کریں گے؟“ میں نے کہا۔

”یہ واقعی غور طلب نکتہ ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”ظاہر ہے جمشید نے ایک گھنٹے میں یہ بندوبست نہیں کیا۔ سوٹ کیس پہلے سے تیار تھا اور اس کی چابی جمشید کے پاس تھی مگر سوال یہ ہے کہ کس کے لیے؟“

”اور پورے دس لاکھ؟“ غالب نے حیرانی سے کہا۔ ”اگر ہم پچیس یا پچاس لاکھ مانگ لیتے پھر... نہیں دوست... یہ ڈرامہ شاید ہمارے لیے تیار کر کے نہیں رکھا گیا تھا۔“

”پھر کس کے لیے تھا؟“ میں نے کہا۔

”جو کسی کے لیے ہوتا ہے!“ غالب بولا۔ ”مشین گن کی گولی پر کسی کا نام ہوتا ہے اور بم پر کہاں لکھا ہوتا ہے کہ اسے کس وقت اور کہاں استعمال کیا جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا باپ بھی عزت دار ہے۔ ان میں یہ ہتھیار کسی دشمن کے خلاف بھی کام آ سکتا ہے اور کسی دوست کے بھی۔ اس میں کوئی اپنا کوئی پرایا۔ دس لاکھ ہو یا کروڑ، اس کی جان بھی لی جا سکتی ہے جو ادائے قرض میں کوتاہی کا مرتکب ہو اور اس کی بھی جس کا ضمیر اسے پریشان کرنے لگے یا جسے شرافت کا دورہ پڑ جائے۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ایسے ہی مہلک کھلونے دوسرے لوگوں کے پاس بھی ہوں گے۔“ میں نے قائل ہو کے کہا۔

”بالکل ہوں گے۔ دلاور کے پاس جو مہلک گیس والا بم تھا، اس کا فیوز جمشید کے پاس تھا یعنی چابی کسی اور کے پاس تھی تاکہ اس بات کا ایک فیصد امکان بھی نہ رہے کہ دلاور کے گھر میں کوئی تجوری کھولنے آ کر کبھی بھی احتیاط کرے۔ کبھی نہ کبھی چابی کو ادھر ادھر بھول جاتا ہے۔ بچوں کو نہ سہی بڑوں کو خصوصاً عورتوں کو تجسس مجبور کرتا ہے کہ جو چیز چھپا کے رکھی جائے یا جس پر ممنوعہ ہو، اس کا راز ضرور جان لیں۔“ غالب نے کہا۔

”لیکن پنڈورا کا باکس بھی کھولنے کے منتظر رہتے ہیں خواہ اس کے بعد کتنی ہی بڑی مصیبت کیوں نہ نازل ہو جائے۔“ محسن بولا۔

”ایسے ہی ہتھیار انھوں نے گردش میں رکھے ہوں گے تو اس کی چابی کسی دوسرے کے پاس رکھوائی ہوگی... نہیں سنا؟ کیا یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر دس لاکھ کی رقم کا اتفاق سے مانگ لی تھی ہم نے... اور حسنِ اتفاق سے سوٹ کیس میں بھی دس لاکھ ہی رکھے گئے تھے، پانچ لاکھ کیوں نہیں تھے؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ رقم بعد میں ڈالی گئی تھی۔“

”اس راز سے تو وہی پردہ اٹھا سکتے ہیں جنھوں نے پردہ ڈالا تھا مگر دوستو! کیا تم خوش اعتقادی میں یقین کرنے سے پرہیز نہیں کر سکتے؟ کم سے کم دشمنوں کے معاملے میں۔“ غالب نے کہا۔ ”تم کو شک سے آغاز کرنا چاہیے اور تصدیق کی علامت ڈالنی چاہیے۔“

”ذرا اس نکتے کی وضاحت فرمائیے۔ ہم کند ذہن لوگ بات کی تہہ تک نہیں پہنچتے۔“ محسن نے کہا۔

”میں پہنچ گیا۔“ میں نے چٹکی بجائی۔ ”مرزا نے پتے کی بات کی ہے۔ یہاں شیروانی! تم نے یقین نہیں کیا کہ یہ دس لاکھ ہیں۔“

”یہ تو جانا۔“ محسن سر کھجا کے بولا۔ ”بس یہی بات ہی مان لیا۔“

”ہاں، یہی آپ کی کم عقلی ہے۔“ جمشید نے کہا اور ہم نے مان لیا۔ اب ذرا گن کے دیکھیں اگر واقعی دس لاکھ ہوئے تو پھر یہ اتفاق ہوگا کہ ہماری زبان سے بھی دس لاکھ ہی نکلے۔ تو نہیں

www.paksociety.com

اتفاقات سے خالی نہیں۔" غالب بولا۔
"میں سوٹ کیس اٹھا لاتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"دس لاکھ کی گڈیاں ہیں۔ نوٹ پرانے ہیں۔" محسن بولا۔ "ہم خود گن کر دیکھ لیتے ہیں نا۔"
"ٹھہرو یار۔ تم پھر غلطی کر رہے ہو۔" غالب نے کہا۔
"اب کیا ہوا؟" محسن نے نوٹوں کے ڈھیر کی طرف دیکھ کر کہا۔
"تم شکاری نہیں اناڑی ہو۔" غالب نے کہا۔ "ہر شکاری جب دام لگاتا ہے تو ناکامی کے امکانات کا سدِباب بھی رکھتا ہے۔ شکار اگر ایک جگہ سے بچ کر نکل جائے تو دوسری جگہ پکڑا جائے۔ متبادل بندوبست رکھنا دور اندیشی کی بات ہے اور تم سب اچھی طرح جانتے ہو کہ خدا دین کس حد تک دور اندیش ہے۔ کیا اس کے ذہن میں نہیں ہوگا کہ ترکیب نمبر ایک ناکام بھی ہو سکتی ہے۔ کسی کی خوش قسمتی کے امکانات کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی کسی دامِ اجل سے بچ جائے۔ فرض کرو ہم سوٹ کیس ایسی جگہ کھول لیتے جہاں ہوا کا رخ موافق ہوتا۔ مثلاً ہمارے پیچھے سے ہوا آ رہی ہوتی۔ کوئی تبدیلی بھی یا یہ مشکل نہیں ہوتا جو زہریلی گیس کو باہر پھینک دیتا۔ کسی بھی قریبی دروازے یا کھڑکی سے۔"
"ہم نہیں جانتے اور یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سب ہمیں ہلاک کرنے کے لیے تھا۔"
"میں بھی صرف اپنی بات نہیں کر رہا ہوں، وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ مگر وہ ایک چال سے بچ جائے تو دلاور ایسا نہیں کہ اس کے لیے دوسری چال بعد میں سوچے نہیں۔ وہ دوسری چال کو زیادہ اہم سمجھتا ہوگا جس کا شکار ہونے سے کسی کو تقدیر بھی نہیں بچا سکتی۔ تم ایسا کرو۔ عائشہ سے کہو کہ رقم شمار کرے۔"
"تم بہت دور کی کوڑی لاتے ہو لیکن مرزا غالب! اسے تم اپنی غیر معمولی عقل و دانش کا کرشمہ مت سمجھنا۔ یہ صرف فیضانِ صحبت ہے کہ تم ہمارے ساتھ رہ کے کچھ سوچنے لگے ہو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ تم تو ناچیز ہیچ مدان وغیرہ تھے۔"
"میں سمجھتا ہوں کہ اتنی احتیاط پسندی سے کام لیں گے تو ہم ایک قدم اٹھانے کے بعد دوسرا قدم اٹھانے تک بہت وقت ضائع کریں گے۔" محسن نے کہا۔
"وقت اور زندگی دونوں میں سے ایک کو ضائع ہونے سے بچانے کی کوشش تو کرنا چاہیے۔" غالب نے کہا۔
اس کی بات دس منٹ کے بعد ایک دل دہلا دینے والی حقیقت بن کے سامنے آئی۔ محسن نے عائشہ سے کہا کہ وہ رقم شمار کرے۔ غالب وہیں بیٹھا رہا۔ میں تقریباً درمیان میں تھا اور کھڑکی سے باہر افق پر صبحِ کاذب کا اجالا دیکھ رہا تھا اور دلاور کا تصور کر رہا تھا۔
"ایک ایک نوٹ کو شمار کروں؟" عائشہ نے کہا۔
محسن نے جواب دینے سے پہلے میری طرف دیکھا۔ "نہیں، بس اندازہ ہو جائے کہ یہ دس لاکھ ہیں۔"
"ایک دو پیسے بھی کم ہوا تو تمہیں لانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔
"اور زیادہ ہوا تو ہم واپس کر دیں گے۔ تم سے جا کے چوہدری صاحب کو دے دینا۔ ان میں اور تم میں ایک ہی قدر مشترک ہے، پیسہ... اس کی خاطر وہ اپنے ہم وطنوں کی جان لے رہے ہیں اور تم اپنی بہن کی جان لے رہی ہو۔" غالب بولا۔
عائشہ نے زخمی ناگن کی طرح بل کھا کے غالب کی طرف دیکھا۔ یہ اس کی دکھتی رگ تھی جو ہم نے چور کی داڑھی والے تنکے کی طرح پکڑ لی تھی اور اب اس پر جانتے بوجھتے وار کر رہے تھے۔ سراج کی ماں اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی جمولی بدستور ہوش سے بیگانہ پڑی تھی۔ عائشہ نے ایک ایک گڈی کو سوٹ کیس سے نکال کے باہر رکھنا شروع کیا۔ یہ سب سو سو کے نوٹ تھے چنانچہ سوٹ کیس میں سو گڈیاں ہونی لازمی تھیں۔
"فرداً فرداً بھی دیکھتی جاؤ اور دکھاتی جاؤ کہ سب نوٹ ہی ہیں۔ اوپر نوٹ اور اندر سادہ کاغذ نہیں ہیں۔" محسن نے کہا۔
"یہ کام تم خود کیوں نہیں کر لیتے؟" عائشہ نے تنک کے کہا۔
"میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ خوب صورت لڑکی لاکھوں میں کھیلتی ہوئی کتنی حسین لگتی ہے۔" میں نے کہا۔
عائشہ نے ایک گڈی کو ایک کونے سے پکڑ کے نوٹوں کو ایسے پھیلایا جیسے کوئی کتاب کے ورق پھیلاتا ہے۔ ہر ورق ایک مسلسل حرکت میں انگلیوں کے لمس سے پھسلتا ہوا نکلتا جاتا ہے۔ ابھی اس نے تین گڈیاں ہی دیکھ کے رکھی تھیں کہ اس کا ہاتھ رک گیا۔
"کیا بات ہے؟" میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔
"کچھ نہیں، مجھے ذرا چکر سے آ رہے تھے۔" وہ بولی اور پھر گڈیاں نکالنے لگی۔ ادھر رقم نکلتے نکلتے اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس کی صورت پر نمایاں ہونے والے تغیر کو محسن نے بھی نوٹ کیا اور وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اس کے دماغ میں یہ آیا ہو یا نہ آیا ہو مگر میرے دماغ میں یہ خیال ضرور آیا تھا کہ کہیں ان نوٹوں کی ہوا میں تو زہریلے اثرات شامل نہیں۔ عائشہ نے دو گڈیاں اور اٹھائیں پھر اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اچانک وہ بیٹھے بیٹھے فرش پر گر گئی۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" سراج کی ماں نے خوف زدہ ہو کے کہا۔
"معلوم نہیں۔" غالب بولا۔ اس کا لہجہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ میں اور محسن دیکھ رہے تھے کہ غالب کے دماغ نے بہت دور کی سوچی تھی جس کو ہمارے ذہن نے خیال و محال سمجھا تھا مگر عائشہ کی ہر لحظہ بگڑتی حالت اس امر کی تصدیق کر رہی تھی کہ وہ دور کی کوڑی نہیں۔ غالب کی چھٹی حس کا کارنامہ تھا یا بچانے والے کا ہاتھ تھا جو مارنے والے ہاتھ سے بہت زبردست ہے کہ ہم محفوظ رہے۔
"پانی... تھوڑا سا..." عائشہ نے کہا اور اس کا جسم کرب سے زمین پر پھیل گیا۔
"دیکھو۔ آپ سنگدل نہ بنو۔" سراج کی ماں نے کہا۔ "اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اسے تھوڑا سا پانی لا دو۔"
"پانی کہاں سے لاؤں؟" میں نے کہا۔ "اچھا میں دیکھتا ہوں، باہر ایک نل یا ہینڈ پمپ ہے تو سہی۔"
"لیکن پانی لائیں گے کس میں؟" محسن بولا۔ عائشہ اب اپنے دونوں ہاتھ گلے پر لے جا رہی تھی جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔
"کوئی پیالہ برتن... لاؤ۔" سراج کی ماں نے چلا کے کہا۔ "یا باہر کوئی ٹھیکرا مٹی کا ڈبا کچھ بھی ہے پھر لاؤ۔"
میں اور محسن ایک ساتھ باہر نکلے۔ محسن نے نلکے کے ہینڈل کو ہلانا چاہا مگر وہ جام ہو رہا تھا۔ اس کے نٹ بولٹ، ہینڈل اور پائپ سب پر زنگ سی جمی تھی۔ زنگ سالہا سال سے لوہے کو کھا رہا تھا اور کاٹ رہا تھا۔ دھوپ اور بارش، اوس اور پالے میں اوپن پڑا رہا تھا۔ محسن نے زور لگایا تو ہینڈل ٹوٹ کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ محسن نے آدھے ہینڈل کو دور پھینک دیا۔
"کیا کوئی مٹکا نہیں ہوگا اندر؟" محسن بولا۔
"ہوا تو بدتر حالت میں ہوگا۔" غالب نے مایوسی سے کہا۔ ہم سر جھکائے لوٹ آئے۔ عائشہ کے لبوں سے جھاگ سا نکل رہا تھا اور اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو مجھے خوف آیا۔ کچھ دیر پہلے میں نے کہا تھا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ خوب صورت لڑکی لاکھوں میں کھیلتی ہوئی کتنی خوب صورت لگتی ہے۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ خوب صورت لڑکی لاکھوں کے ڈھیر میں مرتی ہوئی کیسی تصویرِ عبرت لگتی ہے۔ اس کے ہاتھوں نے نوٹوں کو پھیلا دیا تھا۔ سوٹ کیس کو الٹ دیا تھا۔ اس کا چہرہ اندر کی اذیت سے مسخ ہو رہا تھا۔ موت اس ذہن پر خندہ زن تھی جس نے دستِ قضا کا اختیار اپنے ہاتھوں میں لینے کا سوچا تھا۔ اس عورت پر خندہ زن تھی جس نے دوسری عورت کی لاش پر اپنے لیے کیسی خوشیوں کا سامان رکھنے والی زندگی مانگی تھی۔
اس عورت پر خندہ زن تھی جس نے طوائف سے زیادہ قیمت میں اپنے جسم کا سودا کیا تھا۔ طوائف تو صرف جسم بیچ کے عورت نہیں رہتی لیکن عائشہ نے جسم کے ساتھ رشتوں کی تقدیس بھی بیچ دی تھی اور اس کے بدلے کیا پایا تھا؟ یہ موت جس میں وہ اپنے سارے سفر کو ندامت کے عذاب، پچھتاوؤں کی بے بسی اور بے کسی کی اذیت کے ساتھ تنہا تھی۔
سراج کی ماں اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے رونے لگی۔ عائشہ مر چکی تھی۔ اتنی قاتل نوٹوں کے درمیان جو کاغذ کے بوسیدہ ٹکڑوں سے زیادہ کچھ نہ تھے اور عائشہ کو اب اس کاغذی کفن کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔
"میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے چلا دینا چاہیے۔" میں نے کہا۔
محسن نے سر ہلایا اور عائشہ کو اٹھانے کے لیے جھکا۔ اس نے احتیاط کے ساتھ نوٹوں کو چھوئے بغیر عائشہ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کے کھینچا مگر ہاتھ تھامتے ہوئے بھی اس نے عائشہ کی کلائیاں پکڑیں۔ اس نے ان انگلیوں کو مس کرنے سے گریز کیا جو نوٹ نکالتی اور شمار کرتی رہی تھیں۔ ان نوٹوں میں ایسے زہر کی موجودگی ممکن تھی جو براہِ راست جلد میں سرایت کر جائے اور خون میں شامل ہو جائے۔ یہ زہر عائشہ کی انگلیوں سے محسن کی انگلیوں تک بھی پہنچ سکتا تھا۔
اچانک سراج کی ماں ہنسنے لگی۔ "لو یہ بھی سمیٹ لے جاؤ۔" اس نے ایک ایک نوٹ کی گڈی اٹھا کے ہماری طرف پھینکنی شروع کی۔ "گنتی کرو... یہ لو دس لاکھ پورے گن لو۔ اس کی خاطر ہی سب کچھ کیا تھا نا تم نے... قتل اور اغوا... یہ لو... اور یہ بھی لو۔" وہ دیوانہ وار نوٹ اٹھانے لگی اور قہقہے لگانے لگی۔ "میری جان بھی لے لو۔ خود بھی مر جاؤ۔" اس نے نوٹوں کے ایک ڈھیر کو ٹھوکر سے اچھال دیا۔
"محسن! اس کا دماغ صدمے سے الٹ گیا ہے۔" میں نے چلا کے اور خود کو بچاتے ہوئے کہا۔
"یہ... یہ خود بھی مر جائے گی۔" محسن نے عائشہ کی لاش کو دوسرے کمرے میں ڈال کے غالب کو کھینچ لیا۔
"اسے روکو یار... یہ نوٹ... پھول..." غالب ایک دم جاگا۔ نتائج کی پروا کیے بغیر میں نے سراج کی ماں کو پکڑ لیا۔ وہ اب سوٹ کیس الٹ چکی تھی اور اس کے نوٹوں کو نوچ رہی تھی، پھاڑ رہی تھی، دانتوں سے اور ہاتھوں سے۔ میں نے اسے ایک جھٹکے سے اٹھایا اور دور پھینک دیا۔ پھر میں نے پیر کے جوتوں سے نوٹوں کو ایک طرف کیا جو اب جمولی پر اور اس کے آس پاس بھی پھیل گئے تھے۔ عائشہ کے انجام کے بعد مجھے کوئی شک نہیں رہا تھا کہ سراج کی ماں بھی زندہ نہیں رہے گی۔ بہن جمولی کے انجام کے

www.paksociety.com

بالکل ہی متفکر ہو گیا تھا۔ شاید محسن اور غالب اپنی شکست
کے احساس سے دوچار تھے۔ ہم رابعہ اور ٹیڈی کو چھڑانے کی
کوشش میں ولادو کے چیارڈ بن سے ادھر آ گئے تھے۔ اُس نے
بڑی آسانی سے عائشہ کو اور سراج کی ماں کو اپنی فتح پر قربان
کر دیا تھا۔ اتنی آسانی سے میں رابعہ کی یا ٹیڈی کی زندگی کو داؤ پر
نہیں لگا سکتا تھا۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن جو کچھ میں
نے سوچا تھا وہ غلط ہو گیا تھا اور بازی ایسے اُلٹ گئی تھی جیسے
بعض لوگوں کے نزدیک مسلمان کا عمل اُلٹ جاتا ہے۔ پہلے اگر رابعہ
یا ٹیڈی کے بچنے کی کوئی صورت تھی تو اب نہیں رہی تھی۔ ولادو
کی ہنسی اور اُس کی آواز رات کے آخری پہر میں بازگشت کی
طرح میرے تصور میں گونجنے لگی۔ "واہ بھئی اپنے سکندر صاحب یا
آپ نے تو افلاطون کو بھی مات دے دی۔ ایسی چال چل جانے کے
ساتھ... یعنی... ہم ٹھہرے اَن پڑھ بندے... خیر جی پوچھنا
آپ سے یہ تھا کہ وہ جو آپ کی ہمشیرہ... معاف کرنا، اپنے
محسن صاحب کی... کیا نام ہے اُن کا... رابعہ... ہاں... اُن
کی لاش کا کیا کریں؟ بھون تو آپ کہتے... اُس بیچاری کو ... کیا
سکتے ہیں اُسے... بڑا مشکل سا لفظ ہے... کا... جھیل میں ڈبو دیں
ہیں؟ ہا ہا ہا... آپ تو بڑے جوکر ہو... کیسا لطیفہ مذاق؟ ہم
بھی کر لیتے ہیں تھوڑا بہت تحول..."

"سکندر! کیا ہو گیا ہے تجھے؟" محسن نے مجھے بُری طرح جھنجوڑا۔
"میں چونکا تو یہ مجھے... کیا ہوا... کیا وہ دونوں مر گئیں؟"
"کون دونوں؟"
"وہی بڑھیا... سراج کی ماں... اور جولی؟" میں نے کہا۔
"اب رابعہ کو بھی مار ڈالیں گے وہ اور ٹیڈی کو بھی۔"
"پاگل ہوا ہے کیا؟ مری صرف عائشہ ہے۔" محسن بولا۔ "جولی
تو اب ہوش میں آنے لگی ہے اور سراج کی ماں... وہ بھی آ جائے
گی ہوش میں۔"
میں نے بے یقینی سے پیچھے دیکھا، واقعی جولی آنکھیں کھول
رہی تھی اور بند کر رہی تھی۔ "یہ... یہ کیا محسن؟" میں نے کہا۔
"کچھ نہیں، ان نوٹوں میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔" محسن بولا۔
"پھر... وہ کیسے مر گئی تھی؟" میں نے اُس کمرے کی طرف
دیکھا جس میں عائشہ کی لاش پڑی تھی۔
"وہ غالب نے دریافت کر لیا ہے۔" محسن بولا۔ "نوٹوں
کی ایک گڈی پر عائشہ کے خون کا ایک قطرہ لگا ہوا ہے، اُس
کی انگلی میں ایک پن کی نوک گھس گئی تھی۔"
میں نے غالب کے قریب بیٹھ کر اُس خون کے منجمد داغ
کو دیکھا۔ اُس کا رنگ کچھ زردی مائل ہو گیا تھا حالانکہ جمنے کے بعد
اُس کو سیاہ پڑ جانا چاہیے تھا۔ میں نے اس پن کو بھی دیکھا۔ ہر گڈی کو

ایسی ہی پنوں سے اسٹیپل کیا گیا تھا۔ بینک والے سو سو کے نوٹ
اکٹھے کر کے بڑی مشینوں سے اسٹیپل کرتے ہیں اور اس مقصد کے
لیے وہ جو مشینیں استعمال کرتے ہیں وہ بہت بڑی ہوتی ہے لیکن
اس سے لگائی ہوئی پن کے دونوں کنارے جب دوسری طرف
نکلتے ہیں تو مڑ کر برابر ہو جاتے ہیں۔ خود میں نے بارہا بینکوں سے
ملنے والی نوٹوں کی گڈیوں سے ان پنوں کو چھڑایا تو کئی زخم
اُٹھایا تھا اور پھر پن کو دوسری جانب سے کھینچ کر نکالا تھا
اگر پن کے دونوں کنارے مڑے ہوئے نہ ہوں تو ایک ایک
کر کے نوٹ نکل جائیں اور گڈی اصل صورت میں باقی نہ رہے۔
یہ ساری گڈیاں ایسی ہی تھیں یعنی ان میں سے اسٹیپل پن
کے دونوں نوکیلے کنارے سیدھے کھڑے ہوئے تھے اگر یہ
خرابی مشین کی ہوتی تو بینک والے فوراً اسے درست کرتے یا پھر
دوسری مشین استعمال کرتے۔ وہ ہر گڈی کو دو تین جگہ سے
اسٹیپل کرتے ہیں اور یہ کبھی نہیں کر سکتے کہ انہیں کھلا چھوڑ دیں۔ یہ
ایسا عمداً کیا گیا تھا۔ ہر اٹھی ہوئی نوک پر کوئی بہت مہلک زہر تھا
یہ بات خاصے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی تھی کہ سو گڈیوں کی دو
تین سو پنوں کے چار چھ سو کنارے زہر میں بجھے ہوئے ہوں
گے تو ایک نہ ایک گڈی کھولتے ہوئے ضرور ہاتھ میں چبھ جائے
گا۔ سراج کی ماں نے نوٹوں کو اچھالا تھا اور گڈیاں پھینکی تھیں مگر
اُسے کسی نوک سے گزند نہیں پہنچا تھا۔ عائشہ کی قضا آ گئی تھی کہ
کوئی قاتل نوک اُس کی جلد میں پیوست ہو گئی۔ غالباً اس وقت
جب تم نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ ہر گڈی کو کھول کے دکھائے۔
"آپ کی نظر رنگ کے فرق کو دیکھ سکتی ہے؟" غالب
نے کہا۔

"ہاں، غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ پن کی سطح
چمکیلی اور صاف ہے اور اس کا رنگ ویسا ہی ہے جیسا کہ
المونیم کی پن کا ہوتا ہے مگر ہر نوک پر زردی سی کوئی چیز لگی ہے۔"
میں نے کہا۔

"یہی زردی موت ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہم کسی پلاس کی
مدد سے ہر پن کو الگ کر دیں تو باقی نوٹ صرف نوٹ ہیں۔ صرف
اتنی احتیاط ضروری ہے کہ کوئی پن کسی کے ہاتھ پر یا جلد پر ہلکی
خراش تک نہ ڈال دے۔"
"ہم مزید احتیاط کے لیے دستانے پہن کے یہ کام کر سکتے ہیں۔"
"کیا یہ دوسری بات جمشید کو معلوم نہیں تھی؟" محسن بولا۔
"یا تو معلوم نہیں تھی یا وہ عائشہ سے کہنا بھول گیا۔" غالب
نے کہا۔

"اُس نے سوچا ہوگا کہ عائشہ کو ہم نوٹ کی گڈیاں کھولنے پر
تو مجبور کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "لیکن اس کے بعد ہمارے
ایسی کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔ نوٹ تو ہم خود ہی نکالیں گے۔"
"سوچو یار کہ ہم میں سے کوئی بھی ہلاک ہو جاتا۔" میں نے
جھرجھری لے کر کہا۔
"اس سے آگے سوچو تو خیال آتا ہے کہ ہم جن کو بھی یہ نوٹ
دیتے وہ اسی انجام سے دوچار ہو سکتا تھا۔" غالب نے کہا۔ "مگر
اور کو اس سے کیا کہ کتنے لوگ اس زہر سے ہلاک ہوں گے۔
قدرت نے ہمیں بچا لیا۔"
محسن ایک دم پیچھے گیا تو میں نے بھی پلٹ کے دیکھا۔ جولی
اٹھ بیٹھی تھی اور بڑی وحشت کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔
"محسن بھائی... سکندر بھائی... میری ماں مر گئی ہے نا؟"
اُس نے بہت کھوکھلے اور سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں
یہ بات کہتے ہوئے آنسوؤں کی نمی تک نہیں آئی تھی۔
"ہاں جولی۔" میں نے کہا۔ اس اعتراف کے سوا میں کیا
کر سکتا تھا۔
"اُسے ولادو نے قتل کر دیا تھا؟" وہ بولی۔ "کرسی مار کے
اُس کا سر پھاڑ دیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا وہ ماں کو مار رہا تھا۔"
"ہم سب کو بہت رنج ہے۔"
"کیا ولادو کو مار دیا تم نے؟ اُسے پولیس کے حوالے تو نہیں
کیا؟ پولیس تو اُس کو چھوڑ دے گی۔ وہ بہت پیسے والا ہے۔
بہت طاقت ور ہے... اور شیطان ہے۔" وہ بولتی گئی۔ "مجھے
بتاؤ تم نے...؟"
"ہم نے اُسے وہیں مار دیا تھا جولی۔" میں نے بڑے اعتماد
کے ساتھ اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ وہ جھوٹ بولا جو سچ سے زیادہ
اثر رکھتا تھا۔ "میں نے ہی اُس کا سر پھاڑ دیا تھا۔" محسن نے سر ہلا
کے میری تائید کی۔
جولی نے ایک گہرا سانس لیا اور اُس کی صورت پر طمانیت
کا احساس جھلکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ہسٹریا کا زور ٹوٹنے لگا۔
احساس ہونے لگا اور میں نے جولی کے جسم میں لرزش سی محسوس
کی جو کسی ہیجان کا نتیجہ تھی۔
"تم وہاں سے کیوں بھاگ آئی تھیں جولی؟" محسن نے کہا۔
"میں... مجھے ڈر لگا کہ وہ مجھے بھی مار ڈالے گا۔ وہ ایک
قوی مضبوط تھا۔ میں اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اپنے
والد کی وارننگ، وہ... مجھے پکار رہے تھے، جولی یہاں آ جاؤ، میرے
پاس یہاں میں تمہاری حفاظت کروں گا اور میں بھاگ نکلی۔" اس
نے یکلخت پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا اور اب اُس
کا سارا جسم ہچکیوں کی زد میں جھٹکے لے رہا تھا۔ ہمارے تسلی کے
الفاظ اُس کے لیے بے معنی اور بے اثر تھے۔
"وہ... وہ کہاں ہے؟" جولی نے روتے روتے کہا۔ "میں اُسے دیکھوں
گی اُسے۔"
"ہم نے اُس کی تدفین کر دی ہے۔" میں نے پورے یقین اور
اطمینانِ قلب کے ساتھ دوسرا جھوٹ بولا۔ "تم تو کل سارا دن بے ہوش
پڑی رہیں۔ ہم نے تم کو پرسوں رات یہاں آتے دیکھ لیا تھا۔"
"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" جولی نے ایک دم سر اٹھا کے کہا۔
"اس وقت تم گھر پہ کہاں تھے؟"
"ہم اُس وقت باہر سے آ رہے تھے، جب تم گیٹ کھول
کے نکلی تھیں اور میں نے تمہارا تعاقب کیا تھا۔" میں نے کہا اور
محسن کی طرف دیکھا۔ اُس نے پھر سر ہلایا اور میرے جھوٹ کے
سچ ہونے کی تائید کی۔
جولی تو ان کے آنسو رو رہی تھی۔ اُس کے دل پر صدمے
کا اثر بہت شدید تھا مگر بے ہوشی کے وقفے میں اُس کی
وہ شدت کم ہو گئی تھی جو اُس کے ذہن کو متاثر کر سکتی تھی۔ میں
نے آہستہ آہستہ بڑی تفصیل سے بتایا کہ ہم نے کس طرح اُس کی ماں
کی آخری رسوم ادا کی تھیں اپنے عقیدے کے مطابق۔ میں نے بتایا
کہ عیسائی عقیدے کے مطابق تدفین ممکن نہ تھی کیونکہ ہمیں بہت
سی باتوں کا علم نہیں تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ عیسائیت کے کس فرقے
کی پیروکار تھی۔
"اس سے میری ماں کو کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کی تدفین
کیسے ہوئی۔ اُس کا شوہر مسلمان تھا۔ اُس کے عقائد میں کوئی بات
ایسی نہیں تھی کہ کوئی اُسے مسلمان نہ مانے۔ خود میں بھی تو مسلمان
ہی ہوں، نام کے سوا اور تم سب جو سگے بھائی ہو، مجھے
تمہاری زندگی کی جدوجہد میں کامیابی کی منزل تک لانے والے،
تم بھی تو مسلمان ہو۔" وہ روتی رہی۔ "میری ماں کو تم سب پر فخر
تھا۔ وہ کہتی تھی کہ جولی! تجھے بھائی ملے ہیں، جیسے فرشتے کے
روپ میں انسان یا انسان کے روپ میں فرشتے۔"
"ہم ایسا نہیں سمجھتے جولی۔ ہم بڑے گناہ گار ہیں۔" میں نے کہا۔
"بھائی! مجھے میری ماں کی قبر پہ لے چلو۔" وہ بولی۔
"ابھی نہیں... آگے کے خطرے ابھی ٹلے نہیں۔" میں نے کہا۔ "تو شام کو چلیں گے۔
دن میں ہم کہیں نہیں جا سکتے۔ ہم تمہارے ساتھ اسی لیے یہاں
چھپے ہوئے ہیں کہ ہمیں پولیس تلاش کر رہی ہے۔"
"کیونکہ تمہیں ولادو کی لاش مل گئی ہے۔" محسن نے کہا۔
میں نے اُسے جولی کے پاس چھوڑا، وہ جولی سے اُس کی ماں کی
باتیں کرتا رہا اور اُس کے غم کے زہر کو اُس کے وجود سے نکالتا رہا۔
کسی ماہر جراح کی طرح جو نشتر سے زہریلا مواد کھینچ لیتا ہے، یہ
زہر جولی کے آنسوؤں میں ڈھلتا گیا۔
میں نے غالب سے کہا کہ میں باہر جاتا ہوں کیونکہ صبح کا
اُجالا اندھیرے پر غالب آنے لگا تھا۔ پہلے تو مجھے کھانے پینے

www.paksociety.com

سکے لیے کچھ لانا تھا۔ اس کے بعد کیا کرنا تھا، یہ طے کرنے کے لیے پورا دن پڑا تھا۔ دس لاکھ کی رقم کو میں نے چھوا تک نہیں۔ ہمارے پاس اب بھی تقریباً چوبیس ہزار روپے تھے جو ہماری فوری ضروریات پوری کرنے میں کام آ سکتے تھے۔

تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر مجھے چند دکانیں نظر آئیں۔ ان میں ایک سبزی فروش کی تھی۔ وہ منڈی سے سبزی لا کے دھو رہا تھا اور دکان میں سجا رہا تھا۔ دوسری دکان پر قصاب بکروں کی سری کاٹ رہا تھا اور کھال اُتری ہوئی لاشوں کو لوہے کے ہُک سے ایک قطار میں لٹکا رہا تھا۔ تیسری دکان چائے کی تھی اور چوکی پر کچھ لوگ ناشتا کر رہے تھے۔ لکڑی کی بنچوں پر بیٹھے وہ حلوہ پوری کھا رہے تھے اور لسی کے گلاس پی رہے تھے۔ صرف ایک شخص تھا جو چائے پی رہا تھا اور عینک لگا کے بڑے انہماک سے تازہ اخبار کی تازہ خبریں ریڈیو کی طرح سنا رہا تھا۔ اس کے پیچھے سے گزرتے ہوئے میں نے صفحۂ اوّل کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔

"لو بھئی، اب صنعت کار بھی اغوا ہونے لگے۔" وہ بولا۔

"صنعت کار اغوا نہیں ہوں گے تو کیا مزدور ہوں گے بے چارے جیسے ہم؟" کسی نے کھاتے کھاتے لسی کا ایک گھونٹ لیا اور طنز سے کہا۔

"اغوا تو روز کا معمول بن گئے ہیں جی۔" ہوٹل والا بولا۔

"مگر یار، یہ تو پوچھو کہ کون اغوا ہوا؟" اخبار پڑھنے والے نے کہا۔

"تم پڑھو نا بادشاہو، آگے وہیں تو آپ سے ہی معلوم ہوگا۔"

"وہ اپنے چوہدری دلاور صاحب نہیں ہیں؟" اخبار پڑھنے والے نے کہا اور اس کا لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ میں دلاور کی خبر اُسی کی زبان میں سننے کے لیے رُک گیا اور مسکرانے لگا۔ "انھوں نے ابھی کل پرسوں ہی تو اعلان کیا تھا کہ غریبوں کے لیے ایک مفت ہسپتال بنے گا۔"

"مفت ہسپتال!" مزدور نے پھر تلخی سے کہا۔ "ارے چاچا، سب چکر ہے یہ سیاست کا۔ بے وقوف بناتے ہیں ہمیں۔"

"یار، تم ہو ہی بے وقوف۔" اخبار پڑھنے والا برہم ہو گیا۔ "تم سے کس نے کہا ہے تبصرہ کرنے کو؟"

باقی خبر کا خلاصہ تقریباً حقیقت پر مبنی تھا کہ دو افراد نے چوہدری دلاور سے غیر ملکی صحافی بن کے رابطہ قائم کیا تھا اور چوہدری دلاور نے ان کے اعزاز میں ایک ڈنر کا بندوبست کیا مگر وہاں نہ وہ صحافی پہنچے اور نہ چوہدری دلاور۔ دوسرے مہمان انتظار کرتے رہے۔ پولیس کے ایک اعلیٰ افسر نے جو چوہدری دلاور کے قریبی دوست بتائے جاتے ہیں اور جو خود بھی دعوت میں شریک تھے، رات دو بجے ان کے لاپتا ہو جانے کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ ان کی گاڑی کو ہوٹل میں آتا دیکھا گیا تھا۔ ہوٹل کے گیٹ پر موجود دربان کے کہنے کے مطابق گاڑی کو خود چوہدری دلاور ہی چلا رہے تھے لیکن بعد میں ان کی گاڑی ہوٹل کے اندر ہی کھڑی ہوئی پائی گئی۔ خیال ہے کہ انھیں دو مسلح افراد کار میں ڈال کے لے جایا گیا جو ہوٹل کے اندر ہی چھپے ہوئے تھے۔ چھینی جانے والی کار کے مالک نے دو افراد پر شبہ ظاہر کیا ہے اور ان کا حلیہ وہی بتایا ہے جو تقریباً صحافی بن کر ملاقات کے لیے پاس پہنچنے والوں کا تھا۔ مذکورہ دونوں افراد کے بارے میں خبر رساں اداروں اور پریس کلب کے باخبر حلقوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ کوئی پیشہ ور قسم کے بدمعاش تھے۔ آخری خبریں ملنے تک چوہدری دلاور کا پتا نہیں چل سکا تھا اور ان کے گھر سے رابطہ قائم نہیں ہوا تھا۔

یہ ساری خبر میں نے پوریاں خریدتے ہوئے سُنی۔ پوریاں بنانے والا ایک تھا اور وہ قدرے سست رفتار تھا، جبکہ پوریاں وہ تل رہا تھا۔ اس میں سے ایک آدھ ہی میرے حصے میں آتی تھی۔ باقی چائے والوں کو پیش کر دی جاتی تھیں کیونکہ ان کے نشستیں ... انتظار فرمایئے کا ورد آیا تو وہ شور کرتے۔ میں مکمل پوریاں جمع کرتا گیا اور خبریں بھی سنتا رہا۔ ابھی تک اس میں شہر کے بیچ ... ایس پی کے آخری کی خبر نہیں تھی اور نہ ایس ایس پی کی معزولی کا ذکر بھی نہیں تھا۔ ایس پی سراج کے گھر میں ہونے والے دھماکے، خسرو جمشید کے گھر میں پائی جانے والی لاش اور عائشہ کے بارے میں کوئی خبر آنے کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ یہ نصف شب یا اس کے بعد پیش آنے والے واقعات تھے جب اخبارات کی آخری کاپی پریس میں جا چکی تھی۔ ظاہر ہے چوہدری دلاور کی بازیابی اور زیب النساء کے بارے میں کوئی اطلاع کیسے ہوتی۔ یہ ایک اچھی بات تھی کہ لوگوں کو یہ سب چوبیس گھنٹے کے بعد اخبار والوں کے ذریعے معلوم ہوگا جب ان واقعات کو پیش آئے تیس چالیس گھنٹے گزر چکے ہوں گے۔ اس سے زیادہ خوشی مجھے اس بات سے ہوئی کہ اس خبر کو ہم سے منسوب نہیں کیا گیا تھا۔ غالباً یہ لفظی پیش بندی سراج نے کی تھی۔ اخبار میں ان جعلی صحافیوں کا حلیہ ضرور تھا مگر حلیے سے کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ خصوصاً عام لوگ جو خبر پڑھ کے بھول جاتے ہیں، حلیے کیسے یاد رکھ سکتے ہیں لیکن تصویر ضرور کچھ دن ذہن میں نقش ہو جاتی ہے اور ہمارے موجودہ حلیے کی کوئی تصویر تھی ہی نہیں کہ کوئی اخبارات کو اشاعت کے لیے دیتا۔

"جی چوہدری جی، چاہیئے پوریاں؟" پوریاں بنانے والے نے کہا۔

"ہوں، چائے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "چائے ... لے جانی ہے۔"

"پیالیوں نہیں ملے گی۔" بڈھا ٹھوٹھو دکان دار بولا۔

"نہیں ... مجھے دس بیس کپ چائے کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"دس پیالیاں؟ پہلے سوچ لو۔" دکان دار نے کہا۔

"نہیں ... میں کپ میں ..." میں نے بے وقوفوں کی طرح مسکرا کر کہا۔ "لیکن میرے پاس برتن کوئی نہیں۔"

دکان دار ہنسنے لگا۔ "فیر کی کراں؟ پھولوں وچ پا دیاں ... یا جیب وچ پا کے لے جا؟" اس کی بات سے چند ناشتا خور بھی محظوظ ہوئے۔

"تم یہ کیتلی مجھے دے دو۔" میں نے المونیم کی ایک کیتلی کی طرف اشارہ کیا جو استعمال نہیں ہو رہی تھی۔

"ایہہ ... یا وعدہ ہو گئی۔ فیر توں آکھیں گا کہ میتوں ایہہ پتیلی وی دے دا۔ پائیدی ہے ... چار پیالی۔" دکان دار نے پبلک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ سمجھے نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم ابھی اس علاقے میں نئے نئے پہنچے ہیں۔ سارا سامان سنبھالنا پڑا ہے۔ آپ یہ کیتلی دے دیں اور ضمانت کی جتنی رقم چاہیں رکھ لیں۔" پھر میں نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کے بڑھایا۔ "میں کیتلی واپس کر جاؤں گا اور دو چار کپ بھی عنایت کر دیں۔"

"عنایت کو شیرینی کر دیاں گا لیکن جانا کتھے ہے؟" دکان دار بات سے مطمئن ہو گیا۔ اس نے سو کا نوٹ تقریباً جھپٹ لیا۔ اب اس کے لیے تشویش کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ کیتلی قفل سے بیس روپے کی تھی۔ چار کپ آٹھ دس روپے کے، پوری کے دس روپے۔ میں نہ بھی واپس آتا تو وہ فائدے میں تھا۔ وہ ایک ہی جگہ دو دو کیتلیاں خرید لیتا۔ پرانی کیتلی اپنی قسمت آزما چکی تھی اور پھر بھی پوری قیمت میں بک رہی تھی۔ اسے یقیناً تو چاہیے ہوگا کہ میں لوٹ کر نہ آؤں اور خدا نے اس کی سن لی۔

کیتلی کی چائے میرے لوٹ کر جانے تک ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ... کچن میں ... بان جلا کے گرم کیا گیا۔ لکڑیاں خشک تھیں لیکن دھواں پھر بھی اُٹھا۔ ہم آس پاس کے لوگ ... جس نے بھی دیکھا ہوگا تو سوچا ضرور ہوگا کہ آج یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھا ہے مگر دیکھا کسی نے نہیں کیونکہ تفتیش کرنے کوئی نہیں آیا۔

"کیا آج کا سارا دن اسی جگہ الجھے ہم رہیں گے؟" غالب نے کہا۔

"نہیں ... کچھ کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہاں سے نکلنے کی ضرورت ..."

"اور اس بدبخت کا کیا کریں گے؟" محسن نے کہا اور دوسری طرف اشارہ کیا جہاں عائشہ کی لاش پڑی تھی۔

"اس کا ہم کیا کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "جب یہاں سے چلے جائیں گے تو دلاور کو مطلع کر دیں گے کہ اپنے ارمانوں کا جنازہ اُٹھا لو۔"

"سراج کی ماں نے اور جولی نے کچھ کھایا پیا ہے؟"

"جولی نے چائے پی ہے صرف۔ سراج کی ماں گم صم بیٹھی ہے۔" محسن نے کہا۔ "اس کھنڈر میں پورا دن کاٹنا مشکل ہوگا۔"

"مجبوری کا یہ جیل سمجھ کے رہیں گے سب۔" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آج رات اس فون نمبر پر پھر رابطہ قائم کریں جو کراچی کا نمبر تھا اور رابعہ نے دیا تھا۔ اس کے علاوہ سراج سے بھی ایک آخری بات ہو جائے۔"

"کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "اب تک اس نے صورتِ حال کو صحیح پس منظر کے ساتھ سمجھ لیا ہوگا۔ اس کا رویہ اب کیا ہے۔ دلاور کیا کہتا ہے۔ زیب النساء کے بھائی کا ردِعمل کیا ہے؟"

"اس وقت جب ہم پہنچے تھے۔" محسن بولا۔ "تو وہ واپسی کے لیے بے چین تھا۔ زیب النساء جا چکی تھی ..."

"ہاں مگر اس کرائے کی عورت نے بعد میں کیا کیا؟" میں نے کہا۔

"اپنے گھر کے معاملات خسرو جمشید دبا دے گا۔" غالب بولا۔ "عورت خود ڈر سے خاموش ہو جائے گی۔ نوکروں کو خسرو جمشید ڈرا کے خاموش کر دے گا اور مرنے والے کی لاش غائب ہو جائے گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آج یہاں کی صورتِ حال واضح ہو جائے اور اس نمبر سے رابطہ ہو جائے کراچی کے نمبر سے تو ہم رات کو کسی وقت یا کل صبح نکل جائیں۔"

"کہاں نکل جائیں اور کیسے نکل جائیں؟" محسن بولا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ایک ٹرک ہو تو سفر آسان اور محفوظ رہے گا۔" میں نے کہا۔ "ہم خود بھی جا سکتے ہیں اور ان سب کو بھی لے جا سکتے ہیں۔ یہاں سے کراچی تک قومی شاہراہ پر ہزاروں ٹرک چلتے ہیں اور ہر قسم کا سامان لاتے لے جاتے ہیں۔ انڈے، پھل، سبزیاں، سے کر لوہے، سیمنٹ اور مشینری تک ... ہم سبزی لے جا سکتے ہیں۔"

"آئیڈیا قابلِ عمل ہے۔" غالب نے کہا۔ "مگر ٹرک کہاں سے آئے گا؟"

"ٹرک اس رقم سے آئے گا۔" میں نے فرش پر پڑے ہوئے نوٹوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میرے ذہن میں تو یہ تھا کہ کوئی لمبا ٹریلر مل جاتا۔ کاروان ٹائپ یا جیسے کارگو کنٹینر ہوتے ہیں۔ لوہے کے بیس فٹ یا چالیس فٹ لمبے اور بارہ فٹ اونچے ہر طرف سے بند فولادی ڈبے۔"

www.paksociety.com

"اس میں کیا گھر بنا کے سفر کرنا تھا؟" محسن بولا۔
"نہیں یار! میرے دماغ میں ایک زبردست پلان تھا۔"
میں نے کہا "شرط یہی ہے کہ ہمیں ایک ایسا ٹریلر ... کے، عام ٹرک لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا ملتا ہے تو ٹریلر مل جائے گا جو بڑ ... کا اس میں ایک سرکس قائم کیا جائے۔"
"سرکس؟" غالب بے اختیار ہنس پڑا۔ "اچھا خیال ہے۔ کم سے کم مسخرے بھرتی نہیں کرنے پڑیں گے۔"
"تم مذاق اڑا رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "میری پوری اسکیم بہت شاندار ہے اور اس کے فوائد کا تم ابھی اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم مسخرے ہیں مگر پیشہ ور نہیں۔ اگر ہمیں بدلنا پڑے تو کیا مسخرے سے بہتر کوئی بھیس ہو سکتا ہے؟ جو چاہو اپنی صورت کو جیسے چاہو بگاڑ لو، رنگ پہ سیاہی ملو یا سفیدی۔ آج ایک شکل تو کل دوسری۔ کارٹون دیکھنے والا صرف جانتا ہے، اصل چہرہ کیسے پہچان سکتا ہے۔"
"عجیب بے وقوفی کا نظریہ ہے۔ بھائی! سرکس میں صرف جوکر ہی تو نہیں ہوتے۔" محسن نے کہا۔ "بازیگر بھی ہوتے ہیں۔"
"بازیگر یہ ہے۔" میں نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔ "کرتب دکھاتے ہوئے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اس کے علاوہ ہم سرکس کا شو کریں گے ہی نہیں۔ سرکس تو بس سفر کرے گا یہاں سے کراچی تک۔ راستے میں کسی بھی جگہ پڑاؤ ڈال دو۔ کوئی شک نہیں کرے گا۔ سرکس ایک موبائل ہیڈ کوارٹر بن سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم سرکس کو کہیں چھوڑ کر جائیں یا ... پیچھے سو دو سو میل کے علاقے میں کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ راتوں رات شب خون مار کے واپس بھی آ سکتے ہیں۔"
"جوکر کے بھیس میں؟"
"نہیں یار! جوکر کا لباس تو ایک پردہ ہو گا۔ جب ضرورت ہو گی تو ہم کسی گاڑی یا موٹر سائیکل پر نکل جائیں گے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو کچھ آج مشرقی حصے میں ہو رہا ہے اسے خانہ جنگی یا بغاوت کہنا غلط ہو گا۔ یہ ایک سیاسی سازش ہے اور حکومت اپنے طور پر اس سے نمٹ رہی ہے۔ ہم حکومت کے برابر طاقت اور وسائل نہیں رکھتے کہ سب سے لڑ سکیں اور سب کا مقابلہ کر سکیں۔ سارے تخریب کار، شرپسند، ففتھ کالمسٹ، غدار اور وطن فروش، علیحدگی کے رجحانات کو ہوا دینے والے سیاست دان اور اس کے اسباب پیدا کرنے والے بیوروکریٹس۔ سب کو ختم کرنے کی سوچنا ایسا ہی ہے جیسے کہ تیشہ فرہاد سے ہمالیہ کو کاٹ کے برابر کرنے کی سوچ۔ چنانچہ ہمارا مقابلہ صرف ایک گروہ سے ہے۔ ہم اس گروہ کو اور اس کی ملک دشمن سرگرمیوں اور کارروائیوں کو ختم کر سکے تو ہم سمجھیں گے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ ہم جیسے اور بھی ہیں جو اپنے اپنے محاذ پر ایسے ہی ملک دشمنوں سے لڑ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، وہ ماں بھی اور ... بھی جنگ کر رہی ہے جو صبح شام خالق کائنات کے حضور ہاتھ اٹھا کے حق کی فتح کے لیے صدق دل سے دعا مانگتی ہے۔ وہ بوڑھے بھی شامل ہیں جو ہر نماز میں وطن کی سلامتی کے لیے سجدہ ریز ہو کر دعا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر، انجینئر، مزدور، کسان، طالب علم سب اس جنگ میں کسی نہ کسی طور شریک ہیں۔ میدان جنگ میں فوج ہے۔ اس کے پیچھے ایک قوم کا عزم ہے۔ ان کی تمنائیں اور نیک خواہشات ہیں۔ دلاور اور اس کے ساتھی دوسری طرف ہیں۔ ان جیسے بھی سیکڑوں یا ہزاروں ہوں گے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایم آر ایس جیسی قوت رکھنے والے بھی سیکڑوں یا ہزاروں نہیں۔ خواہ ان کی کوئی باقاعدہ تنظیم ہو یا نہ ہو اور اس تنظیم کا کوئی نام ہو یا نہ ہو۔ ہم خود کون سی تنظیم ہیں۔ بس دوست ہیں جو خلوص اور اتفاق کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں۔ نام تو محض مذاق ہے مگر اس مذاق نے دلاور اینڈ کمپنی کو چیلنج کر دیا ہے۔ یہ چیلنج باقی ہے۔ ہم باقی سب کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس شیطانی قوت کو ہم نیست و نابود کر دیں گے جس کے نام ہیں۔ دلاور، جمشید، سراج، پیڈرو اور نہ جانے ایسے کتنے دوسرے نام ہمارے سامنے آئیں گے۔ تم نے دیکھا دلاور نے اپنا کاروبار یہاں سیٹ کیا ہے۔ میرے والد نے جو فیکٹری زرعی مشینری کے آلات بنانے کے لیے قائم کی تھی ... سمجھتے تھے مگر اب دلاور نے ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کا راز افشا ہونے سے پہلے وہاں سے سب کچھ ختم کر لیا ہے اور وہاں وہ ایک اسپتال بنا رہا ہے۔ غریبوں کے لیے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بردہ فروش اپنے اڈے کو لاوارث عورتوں کے لیے پناہ گاہ بنانے کا اعلان کر دے۔ اس کے سیاسی مقاصد اس کی ملک دشمن سرگرمیوں پر شرافت کا، شہرت کا اور عزت کا جھوٹا پردہ ڈالنے کے سوا کچھ نہیں۔ کرپٹ اور بے ضمیر تاجر وزیر کے علاوہ وہ گروہ ... کی حمایت حاصل کرے گا جو اسے محب الوطن قرار دیں گے مگر ہم حقیقت کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔ خوبصورت الفاظ اور لفظوں کے پیچھے ایک بدبودار ... خلافت اللہ ... جیسے ناسوروں والا جسم ہے۔ زہر یا ابلیس ہے۔ ہم ان سب کے چہرے بے نقاب کریں گے جو دلاور کے ساتھ ہیں۔ ایسے لوگ کم نہیں ہوں گے۔ ان سے نمٹنا آسان بھی نہیں ہو گا مگر ہم نمٹنا جانتے ہیں۔ جب ہم اس راستے پر چلیں گے جو اپنی ...

... زیادتی ہے تو یہ چہرے خود بخود سامنے نہیں آئیں گے۔ ہمیں ان کو تلاش کرنا ہو گا یہاں سے کراچی تک ... کراچی سے اس ... سیاسی سازش کی آگ بھڑک رہی ہے۔ تم ... جانتے ہو ... اس جنگ کو ہم ایک گروہ کے ... محدود رکھیں گے۔ اس سے ہم جنگ جیتنے کی امید نہیں کر سکتے۔ جنگ بہت بڑی بلا ہے مگر ہم اس کو تھوڑا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس کی طاقت کو تھوڑا سا کم کر سکتے ہیں۔ اگر ایک خون پینے والا آدم خور جن ہے تو ہم اس کا ایک ہاتھ ... اس کی ایک ٹانگ توڑ دیں یا ایک انگلی بھی کاٹ دیں ... یہ ہم کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ دلاور اینڈ کمپنی ... کو ختم کر دینا سیکڑوں نہیں ہزاروں گھروں کی سلامتی کا ضامن ہو گا۔ شاید لاکھوں افراد کی زندگی کو بچائے گا۔ موت ... تباہی اور بربادی سے، یتیمی اور بیوگی سے ... کتنی عمارات، کتنے پل، کتنی ریلوے لائن، کتنے ... اور سرکاری ادارے، کتنے ہزار مربع میلوں میں پھیلی ہوئی فصلیں، مویشی اور پالتو جانور، اسپتال اور اسکول، یہ سب تباہی سے بچ جائیں گے۔ اگر ہم نے وہ سب اسلحہ روک لیا یا تباہ کر دیا جو دلاور اینڈ کمپنی آگے بھیج رہی ہے تو کیا اتنا کم ہو گا؟ مگر اس کے لیے ہمیں جستجو اور جدوجہد کرنا ہو گی۔ ہم نکلیں گے تو ... راستے پر ہر طرف آنکھیں کھلی رکھ کے دوستوں اور دشمنوں کی شناخت کرنی ہو گی اور آگے بڑھتے ہوئے ان ... کو ختم کرنا ہو گا۔ یہ سب ہم اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب ہم پہچانے نہ جائیں اور ہمارے دشمن ہمیں نہ جان سکیں ... ان کی تباہی و بربادی کی ... دار ایم آر ایس ہے تو ہم اس ... ہے کہ ان سے آج میں نے سرکس کے بارے میں غور کیا ... مجھے یہی نظر آیا کہ ہم اسی پلان پر عمل کر سکتے ہیں۔ ہم سرکس کے ساتھ ہی ڈراما کمپنی بنا سکتے ہیں۔ لوگوں کو بھرتی کر سکتے ہیں۔ گاؤں گاؤں پھر سکتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں کہ کون کہاں کیا کر رہا ہے۔ ... پھرتے تھیٹر اور سرکس دیہات میں انوکھی چیز ... تماشا اور تفریح بھی بہت ہوتے ہیں۔ اگر ہم اسی طرح ہر جگہ پہنچ ... لوگوں میں اپنے دوست تلاش کر سکے تو یہ بہت بڑی کامیابی ... اور ... کی بات یہ ہے کہ خود دشمن ہمارا تماشا دیکھنے ... جان پائیں گے کہ یہ تماشا دکھانے والے شکاری ... ان کے شکار کو نکلے ہیں۔"

وہ دونوں خاموش بیٹھے میری بات سن رہے تھے ... سب ... بولا جا رہا تھا۔ وہ سب جو رات سے ... الفاظ کی صورت میں سب کے سامنے آ گیا ... تھا کہ میرے منصوبے کے خیال نے ان کو کس حد تک متاثر اور مسحور کیا ہے۔ بالآخر میں بولتے بولتے تھک گیا۔ باقی سب میں نے ان کی قوت پرواز تخیل پر چھوڑ دیا۔ وہ بھی بہت ذہین لوگ تھے اور خاکے سے تصویر کو مکمل کر کے دیکھنے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے۔ خاکہ ان کے سامنے آ گیا تھا اور وہ اپنے تصور سے اس مکمل تصویر کو دیکھ رہے تھے جس میں کامیابی کے رنگ تھے اور کوئی نقش ادھورا یا خیال نہیں تھا ایسا ہو سکتا تھا۔

"یار کاش! میں ڈیڑھ ٹانگ والا غالب نہ ہوتا، شہنشاہ اکبر ہوتا تو تیرا منہ موتیوں سے بھر دیتا اور تجھے خلعت فاخرہ عطا کر کے اپنے نورتنوں میں شامل کرتا۔" غالب نے بالآخر کہا۔ "تو دسواں رتن ہوتا، چیف رتن۔"

"اور کاش میں اس کمپنی کا سربراہ ہوتا جو نوبل پرائز دیتی ہے تو اس سال کے پانچوں انعامات تجھے دے دیتا۔" محسن بولا۔ "خواہ بعد میں اس معاملے پر میرا انجام وہی ہوتا جو ہونا چاہیے۔"

"ابھی تم لوگوں کے اعتراضات باقی ہیں۔" میں نے کہا۔ "سرکس میں ہم دو تو ہوئے مسخرے... مرزا غالب کیا حرج ہے اگر تم اس کے پروپرائٹر بن جاؤ۔ میں دو چار دن میں کچھ لوگ بھرتی کر لوں گا۔ یہ دیکھا گیا ہوں کہ ان میں سے کتنے سکندرا اور محسن کو جانتے ہیں اور ان سب کا رہنماؤں کے مزاج ہیں۔ ان سب سے تیرہ ... دکھانے والے رکھے جا سکتے ہیں اور کچھ ڈراما آرٹسٹ۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں گاؤں گاؤں جو تھیٹر پھرتے ہیں وہ کس تماش کے ڈرامے دکھاتے ہیں۔ زیادہ تر لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا قسم کے یا آغا حشر ٹائپ۔ اس کے لیے بھی چوڑے ساز و سامان کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ناظرین بہت کچھ فرض کر لیتے ہیں اور تھیٹر بھی اور اپنی ادیب جیتے ہیں۔"

"یہ بہت زیادہ لوگ ہو جائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"اچھا تو ہم فی الحال ڈراما آرٹسٹ ڈراپ کر دیتے ہیں۔" میں نے کہا "تو کچھ ہاتھ کی صفائی دکھانے والے جادوگر ساتھ، بندر اور ریچھ کا تماشا دکھانے والے، آتش کے پتلوں کا کھیل دکھانے والے اور دو چار بھانڈ... بھانڈوں کا تماشا دیہات اور شہروں میں یکساں مقبول ہے۔ ایک اچھی جوڑی جو تو پورے مجمع کو محظوظ کر سکتی ہے۔ ان سب کو ... کی کوئی ضرورت نہیں، وہ اپنے اپنے فن میں طاق ہوتے ہیں۔ ان کا تو بس ایک ہی مسئلہ ہے۔ ریڈیو، ٹی وی اور فلم نے اور تعلیم نے ان کے لیے ذرائع معاش کو بہت کم کر دیا ہے۔ ان کی آمدنی اتنی کم ہو گئی ہے کہ وہ بڑی مشکل میں گزر اوقات کرتے ہیں۔ ہم ان کو اگر معقول تنخواہ دے سکتے ہیں، ان کی موجودہ آمدنی سے دگنی، پھر وہ ہمارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔"

www.paksociety.com

"کیا یہ ممکن ہے یار سکندر؟" محسن نے جوش سے کہا۔

"ممکن کیوں نہیں، ہمارے علاوہ بمشکل سے آٹھ دس آدمی ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "اور کچھ جانور۔۔۔"

"میں بتا سکتا ہوں کہ جانور کہاں ملیں گے۔" غالب بولا۔

"کہاں ملیں گے؟" محسن بولا۔

"چڑیا گھر سے۔" غالب نے کہا۔ "ہر جانور مل سکتا ہے۔"

"کیا وہ جانور بیچ دیتے ہیں؟"

"ان کا بس چلے تو وہ شیر اور ہاتھی تک بیچ دیں مگر اس کے علاوہ ہرن اور ریچھ، رنگین طوطے اور بندر، لومڑی اور بھیڑیے، یہ سب تو مل جائیں گے، شاید چیتے کے بچے بھی مل جائیں۔" غالب نے کہا۔ "جیسے چاہیے اتنے۔"

"ہم اپنی سرکس کمپنی کو رجسٹر کرائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"نہیں خود کوشش نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔ "متعلقہ لوگ خود ہی آئیں گے۔ پیسہ لیں گے اور ضابطے کی کارروائی خود ہی مکمل کریں گے۔ مثلاً تفریحی ٹیکس کا معاملہ اٹھے گا تو وہ بھی جائے گی۔ کمپنی بھی بالآخر رجسٹر ہو جائے گی۔ اس میں کوئی زیادہ خرچ نہیں ہوگا۔ چار یا پانچ لاکھ کا ٹرک جس میں ہم سارے جانور رکھ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک لاکھ کے اندر اندر تمام جانور مل جائیں گے۔ یہی عام قسم کے جانور جو ضرور دستیاب نہ ہوں اور تماشا دکھانے ہی کے کام آئیں۔ ان کے پنجرے وغیرہ بھی مہنگے نہیں ہوں گے۔ کباڑ کے پنجرے بنے بنائے ملتے ہیں۔ اسی میں ہمارا کاسٹیوم ڈیپارٹمنٹ بن جائے گا۔ سب کے ملبوسات۔"

"کس کس کے ملبوسات؟ افراد تو شمار کرو۔" غالب جوش سے بولا۔

"بھئی دو جوکر، آپ کے یہ دونوں خادم۔" میں نے سر جھکا کے کہا۔ "ان کے چار چھ رنگ برنگے لباس، ٹوپیاں وغیرہ، ایک مداری، ایک ریچھ، بندر کا تماشا دکھانے والا، ایک ماہر قسم کا سپیرا۔ ان لوگوں کو میں گلیوں میں سے تلاش کر لوں گا۔ ہمیں بھوکے ننگے تو یہ ہوئے چار آدمی اور چند ہنرمند جو بہت اعلیٰ لطافت کا مظاہرہ کرنے والے۔ ایک گھوڑے کی سواری کا ماہر جو سولہ کرتب دکھا سکے یعنی کھڑا ہو کے، سر کے بل، ایک ٹانگ پہ۔ ایک ایسا ہی سائیکل سوار۔ یہ ہو گئے چار اور چار آٹھ آدمی۔ میرا خیال ہے اتنے لوگ کافی ہیں۔ سب اپنا اسباب لائیں گے اور خود ہی اس کی دیکھ بھال بھی کریں گے۔ مثلاً سپیرا اپنے سانپوں کو سنبھالے گا تو ریچھ والا ریچھ کو۔ کھلانا پلانا سب انہی کے ذمے مگر خرچ ہمارا۔۔۔ ان لوگوں کی محدود ضروریات ہوتی ہیں اور محدود سامان کے ساتھ یہ ہمارے ساتھ کہیں بھی رہ سکتے ہیں۔ جہاں رات ہو وہاں کھلے آسمان کے نیچے بھی سو سکتے ہیں اور بند ٹرک ہے ہم خیمے بھی نصب کر سکتے ہیں لیکن ہمارا شو جہاں بھی ہوگا اوپن ہوگا۔ صرف قناتیں لگا کے رسی کی مدد سے اسٹیج بنا کے۔"

"میرا ایک مشورہ ہے۔" غالب نے کہا۔ "ایک ڈھول بجانے والا بھی ہونا چاہیے بینڈ باجے اور گھنگروں والا۔ ذرا بولچے قسم کا۔"

"اسامی منظور کی جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "باقی ایک ایک دو تم دیکھنا کہ لوگ خود ہی آئیں گے۔ مثلاً جہاں ہم تھے آلو چھولے اور گول گپے، پاپڑ بیچنے والے تو آئیں گے ہی، کوئی موت کے کنویں یا موت کے گولے کا خواستگار ہو کے ہمیں قریب ہی رہنے کی اجازت دی جائے، کوئی ہنڈولے والا آ جائے۔ ان کو ہم ہر جگہ عارضی طور پر رکھیں گے، مطلب یہ کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ مستقل عملہ ہوگا جو یہاں سے جائے گا۔ نو آدمی۔"

"ہمارے تو دس ہیں۔" غالب نے ہنس کر کہا۔

"وہ بھی گڈ۔ نور تن سرکس کمپنی۔" میں نے کہا۔ "نام طے ہو گیا۔"

"اب باقی کام کی بات۔" میں نے کہا۔ "یہ نور تن اور ان کے امکان۔ اس وقت ہم چار ہیں، چار گرا چکے ہیں لیکن ابھی جو یہاں سے جائیں گے وہ تیرہ امکان ہوں گے۔"

"اور دو قیدی؟" غالب نے کہا۔ "ان کا کیا ہوگا؟"

"یہ ہمارے ساتھ زیادہ دن نہیں رہیں گی۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ایک ٹرک تو جانوروں کے لیے اور ایک کے لیے ایک ویگن جس میں ہم سب سفر کریں۔ آگے ویگن پیچھے ٹرک۔"

"ایک ٹریلر ٹرک ڈرائیور بھی چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "ہیوی لائسنس رکھنے والا۔"

"یہ تو دس ہو گئے۔" غالب نے مایوسی سے کہا۔

"یہ دسواں صرف ڈرائیور ہے، رتن نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "نور تن سرکس کمپنی کے نام پر اس سے کوئی حرف نہیں آئے گا۔ ٹریلر میں ہم سفری سامان بھی بھر سکتے ہیں۔ مثلاً ٹیپ ریکارڈ، کیسٹ، موبائل فون۔ ممکن ہو تو ایک پورٹیبل جنریٹر۔ اس سب ساز و سامان میں ہم وہ سب چھپا کے لے جا سکتے ہیں جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ مثلاً جتنا اسلحہ ہمارے پاس ہے اور جو مزید چاہیے گا۔ ٹرانسمیٹر، ریڈیو اور مواصلاتی رابطے کا نظام جس میں ہمارا یہ ہر جگہ کام آنے والا فون بھی شامل ہے۔"

"ایسے ہی ایک دو آ سکے اور مل جائیں تو اچھا ہے۔"

"مل جائیں گے۔ سیل فون ڈیپارٹمنٹ کے لاتعداد بیچے پھرتے ہیں۔ ان سے خریدے یا چھینے جا سکتے ہیں۔"

نے کہا۔

"ہمارے نور تن پوچھ سکتے ہیں کہ یہ گولا بارود کس شو کے لیے ہے؟" غالب نے کہا۔

"ہاں، ہم یہ سامان مقفل رکھیں گے، چابی ہم میں سے کسی کے پاس ہوگی اور ہم اس قسم کی مہم جوئی میں رازداری تو برتیں گے۔ یہ بھی کوشش کریں گے کہ ہمیں کوئی پکڑ نہ سکے اور ایک شو سے دوسرے کے درمیان کا وقفہ ایک ہفتہ بھی ہو سکتا ہے اور ایک مہینہ بھی۔ جب سرکس نہیں دکھا رہے ہوں گے ہم راتوں رات بھی لوٹ سکتے ہیں اور دو چار دن ٹک جائیں گے تو کوئی بات نہیں۔ ہماری عدم موجودگی میں ایک شخص معاملات کو سنبھال سکتا ہے۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ناممکن ہے کہ ہمارے زیرِ سے معاملات چھپے رہیں۔"

"بالکل ٹھیک، یہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا۔" میں نے کہا۔ "لوگوں کو بھرا اور بے وقوف فرض کرنا بے وقوفی ہوگی۔ شک پیدا ہوں گے اور شک سے ہی تجسس جنم لیتا ہے۔ جاہل یا کوئی شخص بھی تجسس میں مبتلا ہو جائے تو حقیقت تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرتا ہے اور ہمارے نور تن جاہل ہو سکتے ہیں مگر انہیں کم عقل سمجھنا غلط ہوگا۔ اس قسم کے سب لوگ ذہین ہوتے ہیں اور ان کی قوت مشاہدہ بہت تیز ہوتی ہے۔ پھر یہ بات یقینی ہے کہ ہمارا کوئی راز ہمیشہ راز نہیں رہ سکتا۔ مگر ہم کچھ عرصہ ضرور گزار سکتے ہیں اور یہی وہ عرصہ ہوگا جس میں ہم صحیح اور غلط آدمی کا انتخاب کر لیں۔ یعنی ان کے خیالات سے یا پھر رد عمل سے اندازہ کر لیں کہ اگر ان کو ہمارے بارے میں حقیقت کا پتا چل جاتا ہے تو وہ ہمارا ساتھ دیں گے یا ہمارے خلاف ہوں گے؟ خلاف ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دلاور اینڈ کمپنی سے جا ملیں، مطلب یہ کہ وہ پولیس کے پاس چلے جائیں اور سارا بھانڈا پھوڑ دیں۔ ہمارا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ سارا مشن چوپٹ ہو کے رہ جائے گا۔ اس لیے ہم آدمی کو جانچ کریں گے۔ اگر وہ بھروسے کے قابل ہوگا تو ہم آدمی ابلیس کی قوت میں اضافہ کرے گا۔ بصورتِ دیگر کسی بھی بہانے اس کی چھٹی کی جا سکتی ہے کہ ہم ایک ماہ کی تنخواہ دے کر رخصت کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ ہم بہ معنی مرزا غالب پروپرائٹر نور تن سرکس کمپنی۔"

"مرزا غالب پروپرائٹر نور تن سرکس کمپنی۔" غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کیا ستم ظریفی ہے۔ اسد اللہ خاں قیامت ہے۔ نام ایک سرکس کمپنی کے ساتھ استعمال ہو رہا ہے۔ خدا انہیں معاف کرے جو نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔"

"تمہارا نام مرزا غالب ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟" محسن نے کہا۔ "اصولاً تو تمہارے والدین کو تمہارا نام حاجی بغلول یا مرزا پھویا رکھنا چاہیے تھا۔"

"مجھ میں اور مرزا غالب میں بہت سی صفات مشترک ہیں۔ مثلاً معاشقی و قلندری، فقر و فاقہ اور خود داری و آتا پرستی۔۔۔!" غالب نے اپنا دفاع کیا۔ "مگر تم میں اور شیروانی میں کون سی بات مشترک ہے؟ تم کیوں شیروانی کہتے ہو خود کو؟ کیا تم کوئی لباس ہو؟"

"بس مجاہدو! آپس میں شطرنج بازی۔" میں نے کہا۔ "دن چڑھ گیا۔ اب سوچو کہ کس کو کیا کرنا ہے؟"

"سب سے پہلا مسئلہ اس لاش بیچنے کو دفن کا ہے۔" محسن نے کہا۔

"اسے ہم ورثا کے حوالے کرنے کی کوئی صورت کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم سب چلتے ہیں باہر۔"

"یہ سارا بندوبست آج ہی کر لو گے؟" غالب نے پوچھا۔

"خدا کے لیے مریخ کے بولا کرو۔" میں نے کہا۔ "اگر بہت جلدی کی تب بھی ایک ہفتہ تو لگے گا۔ ٹریلر نہ ملا تو سب شپ ملے گی تو اس کی رجسٹریشن پھر نورتنوں کی تلاش، اسباب کا حصول، جانوروں کی خریداری۔"

"یار! تو پورا ایک ہفتہ یہیں گزرے گا اس کھنڈر میں؟" غالب بولا۔

"یہاں سے نکل جائیں گے آج ہی۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "شام تک کچھ کر لیں گے۔ ٹریلر نہ سہی، ویگن تو آج ہی مل جائے گی، ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"ہمارے واپس آنے تک تم کو کچھ نہیں کرنا ہے۔ ان کے لیے بھی لنچ اسی حلوے پوری کا ہوگا۔ اسی چائے کو گرم کرو اور پیو۔" میں نے کہا۔

"یار سگریٹ تو لا دو۔" غالب نے کہا۔

"ہاں سگریٹ اور اچار ہم لائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور مرزا جی! ماں کو سنبھال کے رکھنا۔"

"میری فکر مت کرو۔" وہ گھٹنوں پر سے سر اٹھا کے بولی۔ "میں نہ بھاگوں گی اور نہ مروں گی۔"

"کیا ہم یہ سارا زہریلا سرمایہ ساتھ لے جائیں گے؟" محسن بولا۔

"ابھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ عائشہ کی لاش واپس کرنا چاہیے یا نہیں؟"

"ہم اسے یہاں بھی چھوڑ کے جا سکتے ہیں جیسے ہم کیتھرین کی لاش کو چھوڑ آئے تھے۔" محسن بولا۔ "بلکہ خود بخود اس کی زبان

www.paksociety.com

آ گیا تھا۔
میں نے گھبرا کے کھوٹی کی طرف دیکھا لیکن وہ دیوار سے ٹیک لگائے ... نہ کسی سوچ میں گم تھی۔ اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔

"کیوں نہ ہم اس کی تدفین کر دیں یا کرا دیں؟" میں نے کہا۔ "اور اس کی موت کی خبر کو اس وقت تک راز رکھیں، جب تک ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتے، وہ مقصد جس کے لیے ہم عائشہ کو لائے تھے۔"

غالب نے میری بات کو سمجھ کے سر ہلایا۔ "کارڈ ہاتھ میں رکھیں۔"

"ہاں یہ کیوں تسلیم کریں کہ ہمارے پاس صرف ایک کارڈ رہ گیا ہے۔" میں نے سراج کی ماں کی طرف دیکھا جو زیب النساء بیگم بن نکل گئی۔ عائشہ کی موت کا نشان کے بعد صرف سراج پردہ بن جائے گا، جو ابھی ولادر ہی ہے۔ جب حمد والیا ور ڈنڈی کی ... ضمانت حاصل کر لیں گے تو دشاور کو بتا دیں گے کہ عائشہ کو خود اسی کے زہر نے مارا تھا، ہم نے نہیں۔ وہ غلط چال نہ چلتی تو عائشہ زندہ رہتی۔"

"یہ مشکل کام ہو گا۔" محسن نے کہا۔ "کفن دفن، میت کا غسل اور پھر کسی قبرستان میں نماز جنازہ وغیرہ۔ گورکن بھی مشکوک حالات میں قبر دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔"

"ہاں مگر بات پھر پیسہ پر آ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "جو سارے کام نکالتا ہے۔ تجہیز و تکفین کا سارا بندوبست رفاہی ادارے کرتے ہیں۔ ان سے سامان مل جائے گا، آدمی بھی مل جائیں گے۔ تدفین آسان ہے اور مغرب کے وقت ہو گی۔"

"دیکھ لو، ایک تو عورت کا معاملہ ہے، گناہ ثواب تمہارے سر۔" غالب نے کہا۔

"یار یہ بھی تو تم کر سکتے تھے کہ لاش کو یہاں لاوارث چھوڑ جاتے۔" محسن بولا۔ "دس گھنٹے میں کون آتا۔ بعد میں خود بو پتا دیتی۔ وہ بھی دو چار دن گزر جانے کے بعد۔ اگر مناسب طریقے پر تجہیز و تکفین ہو جاتی ہے تو... تو ٹھیک ہے۔"

"اچھا اب اٹھو، میرے ساتھ چلو۔" میں نے کہا۔ "بہت سے کام کرنے ہیں۔"

"تم لوگ کس جھگڑے میں پھنس گئے۔" غالب تشویش سے بولا۔ "آج کے دن تو بہت خطرہ ہے۔"

"مجبوری ہے۔" میں نے کہا۔ "کوشش کریں گے کہ دوپہر ... حلیہ جس حد تک بدل سکتے ہوں بدل لیں اور کم سے کم نظر آئیں۔"

ہمارے باہر آنے کے بعد پہلا اچھا کام تو یہ ہوا کہ ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ اس نے سارا دن ساتھ رہنے کے تین سو روپے مانگے تھے۔ ہم نے کہا کہ پانچ سو دیں گے مگر شرط یہ ہوگی کہ تم سوال نہیں کرو گے۔ وہ تھوڑا سا حیران ہوا پھر کچھ سوچ کے تیار ہو گیا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ ہم کوئی ایسا کام نہیں کر رہے ہیں جس سے اس کو پریشانی ہو۔ "ہمارے کچھ دشمن پیچھے لگے ہوئے ہیں اور ہم ان سے بچنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تو اور بھی بُرا ہے جی۔" وہ پریشان ہو کے بولا۔ "وہ ماریں گے گولی آپ کو، لگے گی مجھے۔"

"ارے نہیں بھائی، وہ گولی مارنے والے لوگ نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمیں گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔"

"کون؟ پولیس والے؟ کیا کیا ہے تم لوگ نے؟" وہ بولا۔

"ہم جیل سے بھاگے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمیں سال کی سزا ہو گئی تھی مگر ایک ہفتے میں نکل آئے۔ قتل کیا تھا۔"

"بس جی بس، آپ مجھے جانے دو۔" وہ بولا۔ "پانچ سو روپے کے لیے میں بھی پکڑا جاؤں۔ پھر یہ الزام آئے گا کہ تم نے مدد کی تھی۔ اندر میں تمہارا ساتھی بنوں، میرے بیوی بچے رُل جائیں گے۔"

"وہ تو اب بھی رُل جائیں گے اگر تم نے انکار کیا۔" محسن نے زبردستی بیٹھنے کے بعد کہا۔ میرے ساتھ ہی محسن نے پچھلی سیٹ پر قبضہ کر لیا۔

"ہم دوسرا قتل بھی کر دیں گے مگر واپس نہیں جائیں گے۔" محسن نے ریوالور نکال کے کہا۔ ہم دونوں کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ ہکلانے لگا۔ وہ صرف دو بچوں کا آدمی تھا۔

"نہیں... دیکھو جی... ٹھیک ہے... بالکل ٹھیک ہے۔ میں لے چلتا ہوں... جہاں آپ کہو... بے شک آپ ایسے بھی مت ڈرنا اور میں... بالکل... بالکل خاموش رہوں گا۔ بعد میں بھی بولوں تو میرے باپ کی بھی توبہ... لیکن تمہارا بیٹا ہو... گولی چل جائے گی... میرے بیوی بچے رُل جائیں گے۔ ان کا کوئی نہیں۔"

"ان کے تم ہو اور تم سے پہلے خدا ہے۔" میں نے کہا۔ "خدا کا نام لو اور چل پڑو۔"

پروگرام کے مطابق ہم نے سب سے پہلے لباس بدلا۔ ہمارے لیے غیر ملکی صحافیوں کا تاثر دینے والا یہ لباس کیمرہ لائی تھی جو لندن کی سوغات تھا۔ اب ہم نے سو فیصد مشرقی لباس اختیار کیا۔ شلوار قمیص، پشاوری چپل اور قراقلی ٹوپی۔ یہ لباس ہم نے ریڈی میڈ خریدا اور ٹیکسی میں تبدیل کیا۔ اس وقت ٹیکسی ایک گودام کے پیچھے کھڑی تھی ...

... بھی جانتے دیکھتا رہا۔ اس نے اب یقین کر لیا تھا کہ ہم ... کو بتا رہے ہیں اور وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جو ... کہہ دیتے ہیں۔

پرانے لباس کو ہم نے مختلف مقامات پر پھینکا اور حلیے بگڑ گئے کیونکہ ہماری ظاہری وضع قطع نے ہمیں بہت ... محسن نے ایک عینک ساز سے جو فٹ پاتھ پر ... دوکان کھولے بیٹھا تھا، اپنے اور میرے لیے زیرو نمبر کے شیشوں والی عینک بھی لی۔ اس کے پاس پرانی اور نئی عینکوں کا ملا جلا اسٹاک تھا۔ دیہاتی اور ان پڑھ قسم کے لوگ ... آتے تھے۔ مختلف چشمے لگا کے دیکھتے تھے، جس سے بصارت میں زیادہ اضافہ محسوس ہوتا تھا، اُسی کا سودا کر بیٹھتے تھے اور یہ ریڈی میڈ چشمہ لگا کے خوشی خوشی چلے جاتے تھے۔ نہ کسی ... سے جانچ کرانے کا جھگڑا، نہ قیمتی نسخہ اور شیشے بنوانے کا جھنجٹ۔ پلاسٹک کے فریم والی عینکوں کے شیشے میلے تھے اور ... میرے حصے میں جو عینک آئی اس کے شیشے بھی بالکل گول تھے۔ محسن کی عینک اس کے چہرے ... سے بہت چھوٹی تھی مگر اس عینک سے ہمارا ... بدل گیا ... ایک دوسرے کو ... اس کم خرچ بالا نشین نسخے نے ایک گھنٹے میں کسی ... بغیر ہم دونوں کو ناقابلِ شناخت بنا دیا۔ ٹیکسی ... سب دیکھا مگر اس نے صرف دو چیزوں کو عزیز ... جان کو اور پانچ سو کی رقم کو۔ اسے مزید دہشت زدہ ... ہم خطرناک قسم کی گفتگو بھی کرتے رہے تھے ... ناگ کو چھوڑنا نہیں ہے ... اس کی تو ... سے انعام لینا ہے کہ ... کو بخشا کر آئے ہیں۔ کیسا کالا ناگ اور کہاں ... ٹیکسی ڈرائیور کا پتا دیا ہے ... سوچ سوچ کر ہمارا ... کتنا خطرناک ہو گا۔ ہم نے جیل کے اندر کی بہت سی ... ڈرایا۔ وارداتوں کے تذکرے کیے جو ہم ... تھے اور آئندہ کے منصوبوں کی بات کی ... کہ وہ کچھ تو سمجھے اور ... کہ زبان ... ورنہ ہم بعد میں کاٹنے آ جائیں گے۔

ایک گھنٹے بعد جب ہماری نظریں ... صبح کے دس بجے ... ٹیکسی کو کار ڈیلر کے ایک شوروم سے کچھ فاصلے پر ... واپس گیا۔ محسن ٹیکسی میں ہی بیٹھا رہا۔ شوروم ... اور میں اس کے مالک کو ... بالکل نہیں لگتا تھا۔ "کیا بات ہے؟" اس نے کام کرتے کرتے ہاتھ روک کر پوچھا۔

"خو کیسا بات کرتا اے؟" میں نے پٹھانوں کا سا لہجہ بنا کے کہا۔ "تو ام کو گاہک سمجھتا ہے یا... سلام نہیں کرتا اے ام کو... خیر کوئی بات نہیں ماڑا۔"

وہ ذرا محتاط ہو گیا۔ "آپ گاڑی خریدیں گے؟"

میں مسکرایا۔ "تو ادھار اور کیا لے گا؟ مونگ پھلی؟ تمہارا دکان میں اور کیا ہے؟ یہ فرنیچر بیچے گا، بولو؟"

"یہ... یہ تو ہمارے ذاتی استعمال کا ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "خیر آپ فرمائیے کتنے تک کی گاڑی چاہیے؟"

"کتنا تک؟" میں نے سوچ کے کہا۔ "تو یارا! ام کو ایک نہیں، دو گاڑی چاہیے... بوت بڑا۔"

"بہت بڑی گاڑی؟ شیورلیٹ یا بیوک وغیرہ؟" اس نے یوں کہا کہ طنز اور تمسخر محسوس تو ہو مگر اس کا مقصد یہ تھا۔

"نہیں، ام جانتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک تو ام یہ لے گا۔" میں نے نرگسی رنگ کی مازدا کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ... یہ تو نئی ہے، صرف سال بھر پہلے کا ماڈل ہے۔" وہ بولا۔

"ایک دم نیا چیز لے گا۔" میں نے کہا۔

"وہ بھی مل جائے گی۔" شوروم کے مالک نے پہلی بار سنجیدہ ہو کے مجھے غور سے دیکھا۔ "لیکن یہ بھی نئی سمجھ لیں آپ، مالک نے مشکل سے تین ماہ استعمال کی تھی، اس کی رننگ پوری ہو گئی ہے لیکن..."

"کیا پورا ہو گیا اے؟" میں نے چونک کر کہا۔

"کچھ نہیں خان صاحب۔" وہ بولا۔ "اسے آپ یہاں سے لندن لے جائیں۔"

"لندن؟ نہیں یارا... ام کو لندن نہیں جانا ہے۔ ام یہ نہیں لے سکتا۔ تم کراچی جانے والا گاڑی دکھاؤ۔" میں نے کہا۔

وہ مجھے اول درجے کا احمق سمجھ چکا تھا اور اسے یہ بھی یقین آ گیا تھا کہ میرے پاس دولت ضرور ہے۔ شاید میں کسی قبیلے کا سردار یا زمیندار وغیرہ ہوں جس نے علاقہ غیر سے لاہور میں پہلی بار قدم نکالا ہے۔

"یہ بھی جائے گی کراچی۔" وہ بولا۔ "لیکن اس کی قیمت ذرا زیادہ ہے۔ مالک نے اس پر بہت کچھ لگوایا تھا۔ آپ دیکھ لیں، قالین ہے اور ریڈیو ہے، ایئر کنڈیشنر ہے۔ گدی زیادہ کی بیٹھک یہ آپ کو..."

"ماڑا تم بولو کتنا مانگتا ہے؟" میں نے بُرا مان کے کہا۔

"آپ چالیس ہزار دے دیں۔" وہ سوچ کر بولا۔

میں نے جیب سے رقم نکالی اور دس ہزار اس کے

www.paksociety.com

سامنے والوں کے کہنے پر بیانہ لکھوا، رسید بناؤ اور ہمارا نام پر گاڑی کرو۔ ہم ابھی آئے گا ایک گھنٹا میں، باقی پیسہ دے گا، گاڑی لے جائے گا۔"

"بالکل... بالکل تشریف لائیے۔" شوروم کے مالک نے بے یقینی سے نوٹ اٹھا کے دیکھے۔ شاید اتنے کم وقت میں اتنی آسانی سے اسے منہ مانگی قیمت کسی نے نہ دی ہو گی۔ "ٹرانسفر وغیرہ سب کرا دوں گا میں شام تک۔"

"شام تک نہیں، ہم گاڑی ابھی لے جائے گا۔"

"گاڑی آپ شوق سے لے جائیں۔" وہ بولا۔ "میرا مطلب کاغذات سے تھا، وہ ذرا وقت لگتا ہے نا، تین چار بجے تک..."

"ٹھیک ہے، ہم جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ رسید کس نام سے؟" ڈرائیور بولا۔ "خیر ابھی آپ آ رہے ہیں نا، باقی رقم لے کر، اس وقت لکھ دیجیے گا اپنا نام پتا۔ یہ فرمائیے کہ دوسری گاڑی کا آپ نے کیا سوچا؟ آپ نے دو گاڑیوں کی بات کی تھی۔"

"دوسرا گاڑی... خریدنا اگر ہمارے پاس بڑا گاڑی یہ بڑا تھا، ہم نے لیا۔" میں نے کہا۔

"اس سے بھی بڑی؟" وہ چکرا گیا۔ "کوئی بس وغیرہ یا ٹرک...؟"

"نہیں، بس سے بھی بڑا گاڑی۔" میں نے کہا۔

"بس سے بڑی گاڑی کون سی ہوتی ہے خان صاحب؟" وہ بولا۔

"ہوتا ہے، ہم دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "ادھر ہم کراچی میں دیکھا بہت لمبا گاڑی، آگے ٹرک ہوتا اور اس کا پیچھے بہت لمبا گاڑی جیسا کہ مال گاڑی کا ڈبا ہوتا، ایک دم ویسا، تمہارا دکان سے بھی لمبا۔"

"آپ کو سامان لے جانے والا ٹرالر چاہیے، کنٹینر یا ٹرک چاہیے؟" دکاندار نے متعجب لہجے میں کہا۔ اس نے کاغذ پر شکل بنا کے واضح کیا۔

"ہاں ہاں، یہی چاہیے۔ بہت مشکل نام تھا، ہم بھول گیا۔ ہم کو بولا تھا کسی نے۔" میں نے سر ہلا دیا۔

"مگر جناب! وہ ایسے کہاں ملے گا؟" شوروم کا مالک بولا۔ "اس کا تو آپ کو آرڈر کرنا پڑے گا، شاید کوئی پارٹی بیچ رہی ہو، اگر ملا تو بہت مہنگا ہو گا۔"

"اچھا، دس لاکھ سے زیادہ مہنگا ہو گا؟" میں نے سادگی سے کہا۔

"دس لاکھ... ارے دس... نہیں اتنا تو نہیں، ابھی سات آٹھ، تین چار لاکھ کے درمیان... کنڈیشن پر ہے۔ میرا مطلب ہے حالت اچھی ہوئی تو مہنگا بھی ملے گا، پانچ لاکھ ہو سکتے ہیں۔"

"پروا نہیں یارا۔" میں نے سینے پر زور سے ہاتھ مار کے کہا۔ "ہم لے گا، تم پتا کرو۔ ہم تم کو ابھی اس کا بھی بیانہ دے کر جائے گا۔"

"جی بہت اچھا۔" شوروم کے مالک نے شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا۔ "آپ کریں گے کیا اس کا؟"

"تم کیسا بات کرتا ہے، ہم اس کو آگ لگائے گا۔" میں نے خفگی کا اظہار کیا۔ "ہمارا چیز ہے، ہم اس کو آگ لگائے، تم اپنا پوچھے گا کہ گاڑی کا کیا کرے گا، کس لیے خریدتا ہے، ہمارا پیسہ۔"

"وہ... میں معافی چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا جناب، آپ جو چاہیں کریں، میں تو مدد کرنا چاہتا تھا کہ جناب کی مالکی صحیح چیز مل جائے۔"

"اچھا... ہم جاتا ہے، ابھی آئے گا۔" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے اپنے سینے پر رکھا اور چل پڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کھڑا مجھے دیکھ رہا ہو گا۔ کاروبار میں عجیب و غریب لوگ آتے ہیں اور کیسے کیسے تجربے ہوتے ہیں۔ وہ بہت خوش ہو گا کہ آج کسی اچھے آدمی کا منہ دیکھا تھا کہ صبح صبح ایک دولت مند آ گیا۔ وہ ابھی تو خاموش رہے گا کہ کہیں دوسرے شوروم والے اس کا گاہک نہ توڑ لیں مگر بعد میں ضرور دوستوں سے تذکرہ کرے گا۔

میں گھوم کر ٹیکسی تک پہنچا اور ٹیکسی پھر چل پڑی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب اگر مجھے ایک گھنٹے میں مائکرو وین مل جائے تو اس ٹیکسی سے بھی نجات حاصل کر لیں گے اور اس کے ڈرائیور سے بھی۔ چنانچہ میں نے یہ بات محسن کو فرنچ میں سمجھا دی۔ ٹیکسی ڈرائیور ہماری حرکات اور بولی سے یہ سمجھ رہا تھا کہ ہم جیل سے فرار ہوئے تھے یا کسی دوسرے سیارے کی مخلوق تھے۔ ان کے لیے یہ ایک دلچسپ اور زندگی کا سب سے دہشت ناک تجربہ تھا۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے ٹیکسی کو سڑک پر وہیں رکوا لیا جہاں ہم ٹیکسی والے کو ملے تھے۔ وہاں سے ہمارا ٹھکانا تھوڑے سے فاصلے پر تھا اور میں یہ فاصلہ پیدل طے کر کے جا سکتا تھا۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ ہم نے ناشتا بھی نہیں کیا۔ یہ ضرورت ٹیکسی ڈرائیور نے پوری کی۔ اس کے پاس کھانے کے سارے ڈول تھے، وہ سمجھ نہ سکا کہ آخر ہمارا صرف پلا ٹرنے کر اترنے اور ایک طرف چل دینے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے لیکن مقصد کو سمجھنا اس کے لیے اتنا ضروری نہیں تھا جتنا زندہ رہنا اور ہم سے خیر و خوبی کے ساتھ نجات پانا۔

محسن مجھے دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے اسے مختصراً بتا دیا جو میں کر آیا تھا اور اب جا کے کرنے والا تھا۔ مجھے احتیاط کی تاکید کی۔ میں نے نوٹوں کی گڈیوں کو یوں علیحدہ کیا جیسے میرے ہاتھوں میں بجلی کا ننگا تار ہے۔ بہت زیادہ دولت کا کرنٹ میرے وجود میں دوڑ رہا تھا۔ ایک ایک کر کے میں نے سرخ ہیرے میں جتنی ہو سکیں گڈیاں اور دس گڈیاں محفوظ کر لیں۔ یہ مجموعی طور پر ایک لاکھ تھیں اور فوری ضرورت کے لیے کافی تھیں۔ باقی سب سامان اور فہرست کے ساتھ ایک بن سے بند تھا۔ مجموعی طور پر جس ٹرے کے نشتر جیسی پتوں کو احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا۔ یہ بھی اسلحہ تھا جو مخصوص حالات میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔

ایک گھنٹے بعد میں نے اور محسن نے ٹیکسی کو ریلوے شوروم کے سامنے روک لیا۔ میں نے اسے پانچ سو روپے ادا کیے۔

"بھاگ نہیں جانا۔" میں نے کہا۔ "ہم ابھی آتے ہیں، شکریہ۔"

"اور کہیں جانا بھی نہیں۔" محسن نے کہا۔

"میری کیا مجال جناب۔" ڈرائیور نے بڑی مشکل سے کہا۔ بال بال بچ جانے اور دو گھنٹے کی محنت کے بدلے پانچ سو روپے ملنے کی خوشی اتنی بڑی تھی کہ وہ چھپا نہ سکا۔ جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے تھے کہ وہ بھاگ گیا۔ دس منٹ بعد لوٹ کر آئے تو اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ تب ہم نے ہاتھ ملا کے مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔

"اب آج کا دن تو یہ گھر سے نکلنے کا نہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں، ٹیکسی کی سواری کر کے سارا دن شکرانے کے نفل پڑھے گا۔ اس بے چارے کے خیال میں یہ کرامت تھی کہ نوبت نہیں آئی ورنہ بڑے خونخوار قسم کے مجرم اس کی گاڑی میں گھس گئے تھے جو آدمی کو قتل کرتے ہوئے اتنا بھی محسوس نہیں کرتے جتنا کہ بکرے پر چھری پھیرتے ہوئے۔ ایسے ملنا اچھا ہے۔" محسن نے کہا۔

"اس طرح ہم بھی محفوظ ہو گئے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ ایک امکان تو تھا کہ سارا دن گھومتے پھرتے اس کا بھی پتا ہو جاتا۔"

کار کے شوروم کا مالک ایک اور کار ٹون کو دیکھ کر مزید خوش ہوا۔ اس کے نزدیک وہی کپڑے اور وہی انداز اس قسم کی گفتگو کا حصہ تھا۔ ہم سوٹ پہن کے آتے تو وہ ایک ایک چیز پر جانے کتنے سوال کرتا اور ٹال مٹول میں بچ جاتا۔

"یہ ہمارا بھائی... بڑا بھائی عجیب خان ہے۔" میں نے محسن کا تعارف کرایا۔ "اس کو سلام کرو۔"

"السلام علیکم جناب عالی!" شوروم کے مالک نے مؤدبانہ انداز میں محسن سے ہاتھ ملایا۔ "فرمائیے کیا حاضر کروں؟ چائے کافی؟"

"ہم سبز چائے پیے گا۔" محسن خان نے میرے ہی لہجے میں کہا۔ "سبز چائے اگر یا قہوہ..."

"وہ تو ذرا مشکل ہی سے ملے گا۔" ڈیلر کا رنگ فق ہو گیا۔ شوروم میں اب تین دوسرے سیلزمین آ گئے تھے اور ایک چوکیدار یا چپراسی بھی نظر آ رہا تھا۔

"پھر ہم کچھ نہیں پیے گا۔" محسن نے دو ٹوک بات کی۔ "گاڑی دے گا اور جائے گا، اس کو بہت دور۔"

میں نے جیب میں سے دس کی دس گڈیاں نکالیں اور میز پر رکھ دیں۔ شوروم کے مالک کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "آپ... آپ ایسا کریں، اندر آ جائیں میرے آفس میں، میں وہیں بیٹھ کے رسید بنا دیتا ہوں۔"

اس نے اتنی دیر میں فون کر کے ادھر ادھر سے بہت سی مفید معلومات حاصل کر لی تھیں اور اسے پتا چلا تھا کہ ایک غیر ملکی کنسٹرکشن کمپنی اپنا کوئی ٹرالر بیچنا چاہتی ہے جس میں غالباً منگلا ڈیم کے لیے مشینری آئی تھی۔ اس کے بیان سے ظاہر ہوا کہ وہ خود بھی زیادہ نہیں جانتا مگر وہ مجھے اپنے مطلب کی چیز لگی۔ میں نے اسے مائکرو وین کی پوری قیمت ادا کی۔ ٹیکس، رجسٹریشن اور ٹرانسفر کی فیس دی اور پچاس ہزار اس کے علاوہ دیے۔

"یہ بیانہ بڑا گاڑی کا ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن جناب! ابھی تو میں اسے دیکھوں گا، پھر آپ دیکھیں گے، کمپنی سے سودا ہو گا۔" وہ بولا۔

"سودا ہم کرے گا یارا، ہم تم کو اختیار دیا۔" میں نے کہا۔ "تم کو اچھا لگے تو ہم کو بولو، ہم بھی دیکھے گا، کل پھر آئے گا۔ فی امان اللہ۔"

"فی امان اللہ۔" محسن نے بھی اس سے مصافحہ کیا اور ہم دونوں نے ہاتھ سینے پر رکھ کے انداز میں ہماری تقلید کی۔ سیلزمین یہ تماشا حیرت سے دیکھتے رہے۔ ان کو زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب میں نے اگنیشن سوئچ میں چابی لگائی اور پورے اعتماد کے ساتھ گاڑی کو اسٹارٹ کر کے چلاتا ہوا لے گیا۔ معلوم نہیں انہوں نے بعد میں کیا تبصرے کیے ہوں گے، تاہم ایک بات یقینی تھی، اب وہ ہمارے لیے ہماری ضرورت کے مطابق ایک ٹرالر حاصل کرنے میں دو دن لگائے گا۔ مائکرو وین، عجیب خان ولد حبیب خان، ساکن محلہ ڈوگری، پشاور شہر کے نام پر ٹرانسفر ہوئی تھی۔

اس مائکرو وین کا رنگ سیٹی مائل نیلا تھا۔ محسن نے تجویز

www.paksociety.com

چلتی کی کہ "نورتن سرکس" کی اسکیم کا دوسرا سب سے اہم مرحلہ طے ہو جانے یعنی ہمیں اپنی ضرورت کے مطابق ٹریلر مل جانے تو دونوں کا ایک ہی رنگ کر دیا جائے، دونوں پر کمپنی کا نام شوخ حروف میں لکھا جائے تاکہ یہ چلتی پھرتی پبلسٹی سب کو متوجہ کرے۔ محسن کا خیال تھا کہ دونوں گاڑیوں پر چمک دار زرد رنگ ہو اور اس پر نیلے حروف سے سیدھی پٹی کی صورت میں نورتن سرکس دونوں جانب اور پیچھے لکھا جائے۔ میں اس کی اسکیم کو ڈراپ کرنا چاہتا تھا یعنی گاڑیوں پر شوخ جامنی رنگ ہو اور اس پر ... زرد حروف سے نورتن سرکس لکھا ... طے ہوا کہ ... کرے گا ... سرکس ... خصوصی ... جہاں اپنا ساز و سامان سمیٹنا تھا۔ غالب اور بتول کے ساتھ سراج کی ماں کو لانا تھا اور عائشہ کو اٹھانا تھا۔

عائشہ دنیا سے اٹھ گئی تھی اور اس کے جسد خاکی کو ایک کمرے سے اٹھا کے کفن پہننے کے لیے تہ خاک رکھنے کا خوشگوار فریضہ باقی رہ گیا تھا۔ اب وہ پھر ہو رہی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ رابعہ اور ڈیڈی کی بازیافت کے مسئلے پر ایک آخری بات سراج یا دلاور سے کر لی جائے۔ اگر صورت حال امید افزا ہو تو عائشہ کے سفر آخرت کی ذمے داری دلاور ہی کو سونپ دی جائے۔ میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے یہ دیکھ رہا تھا کہ کوئی مناسب جگہ نظر آئے تو فون کی لائن ملاؤں۔

مناسب جگہ مل تو میں نے انگریزی کی ایک سائیڈ اسٹریٹ کے موڑ پر روک دیا اور خود چند قدم واپس گیا۔ مجھے وہاں پہنچنے میں شاید پانچ منٹ ہی لگے تھے مگر اتنی دیر میں ٹیلی فون کے محکمے کا ایک کارکن نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا تھا اور اب اپنی سائیکل کھمبے کے ساتھ ٹکا کے اوپر روانہ ہونے والا تھا۔ میں مایوس ہو کے پلٹنے ہی والا تھا کہ مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں آگے بڑھ کے انتظار کرنے لگا۔ لائن مین کھمبے پر پہنچ کے کنکشن ملانے لگا۔ اسے میری موجودگی کا بالکل علم نہیں تھا۔ اس نے کراچی کا کوئی نمبر ملایا اور اپنی کسی آپا جی سے گپ شپ کرنے لگا۔ اس نے آپا جی کے یہاں کی خیریت، بچوں کی طبیعت، موسم کا حال اور بازار کے بھاؤ تفصیل سے دریافت کیے اور ان کا ... لاہور کے حالات سے ... میں نے اپنی ٹوپی اور اپنا چشمہ اس کی سائیکل پر رکھ دیا۔

جس وقت میں نے کھمبے پر چڑھنا شروع کیا تو اس نے میری طرف دیکھا تو ... "ارے کیا بات ہے ... کچھ نہیں آپا جی ... یہ بات آپ سے نہیں کہہ رہا تھا ... ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"کیا ہو رہا ہے بھئی، اوپر آ رہا ہوں" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"آپا جی ... معاف کرنا ... یہ کوئی بندہ آ گیا ہے زبردستی ... میرے سفر میں ..." اس نے اپنی آپا کے سامنے اپنی کمزوری رکھی اور یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ خود کتنی بلندی سے مخاطب ہے۔ اس کا آفس ایک کھمبے پر واقع ہے۔ میں اتنی دیر میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ اب ہم دونوں ایک ہی کھمبے سے چھپکلی کی طرح چمٹے تھے اور ہم دونوں کے بیچ ایک ہی ...

"تم ... تم کھمبے پر آخر کیوں چڑھ آئے ہو؟" لائن مین ...

"تم بھی تو چڑھے ہوئے ہو یار" میں نے کہا۔

"یہ تو کام ہے یار، ڈیوٹی ہے میری" وہ ... بولا۔

"... مجھے بھی تو ... کی طرح مجھے بھی مفت کے ٹیلی فون کرنے کا بہت شوق ہے۔ میری بھی ایک آپا ہے ..."

"یہ کیا بکواس ہے، نیچے اترو ورنہ ..."

"ورنہ کیا، تم مجھے دھکا دے کر نیچے گرا دو گے؟" میں نے کہا۔ "میں بھی تم کو گرا دوں گا۔ پھر تمہاری بھی ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ تم لنگڑے ہو جاؤ گے تو اس نوکری سے بھی جاؤ گے۔ ہم کسی کے فون پر بھی اپنی آپا سے گپ شپ ہو جائے۔"

"تم کو فون کرنا ہے کہیں؟" وہ کچھ دیر غور کرنے کے بعد بولا۔ اس نے اپنا آلہ میری طرف بڑھا دیا۔

"یہ بڑی اچھی چیز ہے" میں نے تعریفی نظروں سے اس پورٹیبل فون کو دیکھا جیسا ایک میرے پاس بھی تھا۔ یہ کچھ نیا اور جدید وضع کا تھا۔

"بات کرو اور جاؤ" لائن مین نے کہا۔

"یہ ٹیلی فون بیچو گے؟" میں نے کہا۔

"تم تو پاگل ہو بلیڈ" اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر میں نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ "یہ سرکاری چیز ہے۔"

"سرکاری چیز تو یہ زمین بھی ہے جس پر کھمبا گڑا ہے۔ یہ کھمبا بھی سرکاری ہے جس پر تم چڑھے ہوئے ہو اور ... بھی سرکاری ہے جو تم کر رہے ہو۔ سرکار کی ہر چیز ... تمہاری بھی ہے جتنی میری ہے۔ بولو یہ ٹیلی فون بیچو گے یا نہیں؟"

اس نے سر پیٹ لیا ... "کس پاگل کے پیچھے لگ گیا۔ او بھائی، یہ چیز بیچی نہیں جا سکتی۔ اس کو چرانا ..."

"اچھا اگر یہ چوری ہو جائے، فرض کرو میں اسے چرا لوں ... جرم تو پھر میرا ہوگا" میں نے کہا۔

لائن مین نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "او یار! خدا کا واسطہ ہے۔"

"اچھا فرض کرو میں یہ لے کر بھاگ جاؤں ... تم شور مچاؤ گے بھی میرے ساتھ نہیں دوڑ سکتے ... یہ بے وقوف جائے تو تم کیا کرو گے؟"

"... میں ... نہیں کروں گا" وہ فریاد کناں لہجے میں بولا۔ "اچھا ... کے سوا ... مجھے بتاؤ تم چاہتے کیا ہو؟"

"... تو ... نے پہلے ہی بتا دیا تھا" میں نے کہا۔ "لیکن یہ ... خریدنا چاہتا ہوں۔"

"... لیکن کیوں؟"

"اس لیے کہ مجھے فون کرنے کا بہت شوق ہے" میں نے ... "... نے جو درخواست دے رکھی ہے اس پر تو فون ... سال بعد ملے گا۔ یہ دس سال میں کیسے گزاروں گا۔ میرا تو ... چاہتا ہے کہ ہر وقت فون کرتا رہوں۔"

"... تم کسے فون کرتے ہو؟"

"اپنی ہر گرل فرینڈ کو۔ ہر شہر میں اور ہر شہر کے ہر محلے میں ... کوئی نہ کوئی گرل فرینڈ رہتی ہے۔"

"تم جوان لڑکیوں کو تنگ کرتے ہو اور اس کے لیے فون ... چاہیے؟"

"میں لڑکیوں کو تنگ کرتا ہوں؟ یہ کس نے کہہ دیا تم سے؟ ... اور یہ کون کہتا ہے کہ وہ جوان ہیں۔ کسی کی عمر ... سے زیادہ نہیں ... پانچ سے دس سال کے درمیان ... باتیں کرتی ہیں۔ تم کو اندازہ نہیں کہ ان کی باتیں کتنی مزیدار اور دلچسپ ہوتی ہیں۔"

"خدا کی ... چھوڑو مجھے جانا ہے" وہ ضبط کرتے ہوئے ... بولا۔

"اچھا خدا حافظ" میں نے کہا۔

"یہ فون مجھے دو" وہ ... کے بولا۔

"یہ تو میں نہیں دوں گا" میں نے کہا۔ "اس کے ..." میں نے جیب میں سے ایک ہزار روپے نکالے "... رکھ لو۔"

وہ ہکا بکا نوٹوں کو گھورتا رہا۔ اس وقت روئے زمین پر ... سودے ہو رہے تھے۔ ہر بڑے شہر کی اسٹاک ایکسچینج ... کارن ایکسچینج میں، سڑکوں بازاروں، ... اور عجائب خانوں میں، بازار کی جنس سے آدمی کی جنس تک سب ... فروخت ہو رہا تھا مگر یہاں روئے زمین سے پندرہ فٹ ... بلند ... دنیا کا انوکھا سودا ہو رہا تھا۔

"مگر ... تو ..." میں نے کہا "تم کیا کرو گے؟"

"... مگر یہ ... میں کیا کروں گا، کیا کہوں گا؟" وہ پریشان ہو گیا۔

"تم ایک جھوٹ بول دینا" میں نے کہا "کہ یہ چوری ہو گیا۔ ... ایسا کہنا کہ تم خود ... جو تمہارے افسروں کو مطمئن کر سکے۔ ڈر تو افسروں سے چاہیے۔ افسر والوں کی کیا فکر، وہ خود اس سے بڑے جھوٹ بولتے ہیں۔ سچ کی کمائی میں تو تنخواہ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے تم سے، تم بہت چالاک اور خطرناک آدمی ہو۔ بعد میں مجھے مروا دو گے" وہ بولا۔

"نہیں، روئے زمین پر بہت جھوٹ بولا جاتا ہے" میں نے کہا۔ "لیکن میں اور تم عام انسانوں کی سطح سے بلند ہو کے بات کر رہے ہیں، یہ لو دو ہزار اور اپنی سائیکل اٹھا کے رفوچکر ہو جاؤ۔ پلٹ کے مت دیکھنا۔ دس منٹ بعد میں بھی غائب ہو جاؤں گا۔ اس کھمبے کی نوک پر ہونے والی یہ ملاقات ہم دونوں کے لیے فائدہ مند ہی ... کے سامنے اس کا ذکر مت کرنا ورنہ دنیا والے ... میں اس کا بھلا نہیں دیکھ سکتے۔"

وہ نوٹ لے کر بڑی عجلت میں نیچے اتر گیا۔ اس کی زندگی کا یہ ناقابل فراموش تجربہ تھا۔ غالباً وہ ضرورت مند بھی تھا۔ ضرورت مندی آدمی کے چہرے پر لکھی ہوتی ہے اور یہ تحریر ہمیشہ یکساں مفہوم رکھتی ہے جو آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ غربت اور مفلسی کی مجبوریاں ایسی بہت سی شریف آدمیوں کو جنم دیتی ہیں جن کا مداوا صرف پیسہ کرتا ہے۔ سب لوگ نوٹ نہیں چھاپ سکتے چنانچہ وہ چوریاں کرتے ہیں۔ کبھی مال چراتے ہیں تو کبھی ٹیلی فون کا مال۔

جب وہ میری نظر سے اوجھل ہو گیا تو میں نے سیلولر فون کے انسٹرومنٹ کو آزمایا جو بدستور لائن سے ملا ہوا تھا۔ میں نے سراج کا نمبر ملایا۔

"ہیلو، سب انسپکٹر تیس مار خان" نے فوراً جواب دیا۔

"تیس مار خان! میں مسکراتے ہوئے مردوں کی ایسوسی ایشن کا اعزازی صدر بول رہا ہوں، یعنی تمہارا باپ" میں نے کہا۔

"ایس ایس پی صاحب سے بات کرو گے؟" تیس مار خان نے میری آواز یقیناً پہچان لی تھی مگر وہ ضبط کرنے پر مجبور تھا۔ "میں انہی سے بول رہا ہوں۔"

"سکندر! میری ماں کیسی ہے؟" سراج کی آواز آئی۔

"ماں، میری ماں کی طرح وہ بھی بہت اچھی ماں ہے مگر میرے بیٹے کی طرح تم اچھے بیٹے نہیں ہو" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا وہ ٹھیک ہے نا، کیا میں بات کر سکتا ہوں اس سے؟"

"نہیں، وہ خود تم سے بات نہیں کرے گی" میں نے کہا۔ "اس لیے کہ وہ یہاں موجود ہی نہیں ہے۔ تم فکر مت کرو، ہم اسے کوئی تکلیف نہیں دیں گے۔"

"تم اسے جتنی اذیت دے سکتے تھے دے چکے" وہ بولا۔ "جو کچھ تم نے زیب النساء کے ساتھ کیا ..."

www.paksociety.com

"ہم نے صرف اتنا کیا تھا کہ اُسے ایک ایئر کنڈیشنڈ سمر لیجنڈ میں ڈال کے لے گئے تھے، باقی جو کچھ کیا تھا وہ اس نے کیا۔ وہ ہمارے ساتھ رہتی تو اس کے ساتھ کچھ نہ ہوتا۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟" وہ بولا۔

"نہیں۔ اگر بُرا نہیں ہوا تو اچھا ہے اور اچھا نہیں ہوا تو... سوری۔"

"وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئی ہے۔ اُسے ہم نے سڑک پہ پڑا ہوا پایا تھا اسی علاقے میں۔" وہ بولا۔ "پولیس پارٹی نے اس سارے علاقے کو چھان مارا تھا۔ وہ صبح ساڑھے تین بجے ملی۔ اس حالت میں کہ میں بیان بھی نہیں کر سکتا۔"

"مگر میں تصور کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیا تم نے اس درندے کا پتا چلا لیا جس نے اس کے ساتھ یہ انسانیت سوز سلوک کیا؟"

"نہیں لیکن میں پتا چلا لوں گا جیسے ہی وہ ہوش میں آ جائے۔ اس کے ذہن پر صدمے کا شدید اثر ہے۔"

"میڈیکل رپورٹ کیا کہتی ہے؟"

"وہ کم سے کم تین افراد تھے جنھوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی۔ انھوں نے اسے زبردستی شراب بھی پلائی۔ اگر وہ بچ گئی تب بھی اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ وہ ذہنی صدمے سے ریکور نہ کر سکے۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن لمبا ہو جائے یا کبھی ختم نہ ہو۔ کیا تم کو احساس ہے کہ اس سب کے ذمے دار تم ہو؟" وہ بے حد مشتعل تھا۔ جھنجلاہٹ اور بے بسی کے احساس سے خود اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو رہا تھا۔

"ایس ایس پی صاحب!" میں نے سکون سے کہا۔ "ہم نے ایسا نہیں چاہا تھا مگر کیا تم کو یاد ہے کہ رابعہ کے ساتھ تم نے جو کچھ کیا تھا وہ جانتے بوجھتے کیا تھا۔ اس وقت تمہیں احساس تھا کہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"چھوڑو... چھوڑو یہ بات... زندگی بہت بڑی ہے۔ میں اور تم پھر ملیں گے۔" وہ بولا۔ "اور اس وقت تم آج کے دن کی یہ بات یاد کر کے پچھتاؤ گے۔ میں تم کو ایک موقع دے سکتا ہوں سکندر، تو انفرادی سطح پہ عداوت کا یہ سلسلہ ختم کر دو۔"

"یہ تو آفر ہے ایس ایس پی صاحب ہماری طرف سے۔ تم نے بھی یہ فصل بوئی تھی۔ اس کا پھل کاٹتے ہوئے رو رہے کیوں ہو؟" میں نے کہا۔

"دیکھو رابعہ کے بارے میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ہماری تحویل میں نہیں ہے۔ ہمارے کسی آدمی کے پاس نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"پھر کہاں ہے؟ تمہارے آدمی یہ تو بتا سکتے ہیں کہ انھوں نے رابعہ کو مار کے سمندر میں پھینکا تھا... یا گاڑا تھا تو کہاں گاڑا تھا؟"

"وہ فرار ہو گئی تھی، قید سے نکل گئی تھی۔" وہ بولا۔

"یہ کب کی بات ہے؟" میرا دل ایک دم بیٹھنے لگا۔ میں نے اُسے جھڑک کر خاموش کر دیا۔ [illegible] میں اپنے زعم میں اک بازیافت پہ خوش ہوں، [illegible] کر سکا۔ وہ اب بھی نہیں۔

"تقریباً ایک ہفتے پہلے۔" میں نے سراج کی آواز سنی۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اس نے ہم سے رابطہ کیا ہوتا۔"

"جھوٹ شاید تم بول رہے ہو۔ اس نے تم سے رابطہ کیا ہو گا۔" سراج نے تلخی سے کہا۔

میں حیران رہ گیا کہ وہ کتنا باخبر ہے۔ "وہ خود بھی تو آ سکتی تھی اگر وہ آزاد تھی۔" میں نے کہا۔

"یہ اس سے تم تو پوچھ لینا کہ وہ کیوں نہیں آئی اور وہیں رہی تو کس کے لیے؟" سراج نے کہا۔

"ممکن ہے وہ اکیلی آنا نہ چاہتی ہو۔ اس کے ساتھ [illegible] اور دوست بھی تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں تھا... اُسے ہم چھوڑ دیں گے۔ مجھے معلوم کرنا ہے اُس کے بارے میں کہ وہ کہاں ہے؟" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے، ابھی تم سے میں رابطہ قائم کر لوں گا [illegible] کہاں ہو اور تم کو بتا دوں گا کہ کب، کہاں اور کیسے رہا ہے۔ تمہارے قیدیوں کا تبادلہ ممکن ہے۔"

"شہروا پہ مت کرنا۔"

"کیوں؟ کیا کال کو ٹریس کرنے کا خیال ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں، تمہاری یہ گفتگو صرف میں سن رہا ہوں۔" سراج نے کہا۔ "میں نے اس کا رابطہ آپریشن سے الگ کر دیا تھا۔"

"کیا عائشہ کے بارے میں کچھ کہنا ہے؟"

"ہاں! اُسے چھوڑ دو۔" سراج نے کہا۔ "وہاں بڑی قیامت آ گئی ہے۔ تم نے اس کے باپ سے فون پر کیا کہا تھا؟"

"میں نے صرف سچ بولا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس سچ کے ذریعے تم نے ایک قتل کر دیا۔" [illegible] بے اختیار مجھے ایک گالی دی۔

"اچھا تو یہ اقدام قتل میرے قبضے سے برآمد کرو۔" [illegible]

"تمہارا وہ سچ ایک ٹیپ پہ محفوظ ہے۔ دلاور کا فون آبزرویشن پہ تھا۔ یہ تم کو سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اس کے خلاف کارروائی ضروری ہو گی۔ پولیس وہ سب [illegible]"

"مگر جو عام آدمی کے لیے یہ نہیں ہوتا۔" [illegible]

"دلاور عام آدمی نہیں تھا۔" سراج نے کہا۔ [illegible] انتظامی مشینری کو حرکت میں آنا لازمی تھا۔ تمہاری گفتگو کا ایک ایک لفظ ٹیپ ہوا اور میں نے بھی سنا لیکن اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔"

"کیونکہ وہ ٹیپ تم نے غائب کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس عورت کا باپ، جو دلاور کی بیوی ہے۔"

"وہ دلاور کی بیوی تھی۔" سراج بولا۔

"کیا... کیا وہ مر گئی؟" میں نے چونک کر کہا۔ "جو مار دیا دلاور نے راتوں رات۔ وہ واقعی دلاور ہے۔"

"اسے تم نے مارا ہے سکندر اعظم، دلاور نے نہیں۔"

"میں نے اس کے باپ کو سب بتا دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس عورت کی موت کا مقدر ہو چکی تھی۔ دلاور اسے بہت پہلے سے قتل کر رہا تھا۔ مجھے الزام کیوں دیتے ہو؟ یوں لیے بھی زندگی کی آخری رات تھی۔ اُسے صبح ہونے سے پہلے مرنا تھا۔ شاید دلاور یہ فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ اب دلاور اس کے باپ کو بھی مار دے گا۔"

"دلاور کا یہ کام تم نے کر دیا صرف ایک فون کر کے، سچ کہ تم نے ہمیشہ سچ بولا ہے اور نیکی کا ثواب کمایا ہے۔ اپنے کہنے میں سوال ہو کہ تم نے اس بڈھے کی جان لی۔ وہ سچ کا زہر برداشت نہ کر سکا کیونکہ وہ پہلے ہی دل کا مریض تھا۔ وہ سچ بھی اس کے ساتھ ہی مر گیا اور اس کے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا جو تم نے بولا تھا۔"

"اب تم کہو گے کہ دلاور کی بیوی باپ کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ وہ پہلے ہی سخت بیمار تھی۔" میں نے نفرت سے کہا۔ "دوری گئی آپ! اچھا موقع ملا تمہیں۔ تم کہو گے کہ قدرت مدد کر رہی ہے مگر یہ شیطان کی مدد ہے سراج۔"

"شیطان کی؟" سراج نے کہا۔ "فون تو تم نے کیا تھا۔ ہمارے کہنے سے ہی تو نہیں ہوا اور اب تمہارا سچ دلاور کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟"

"دلاور کو آج ہی معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "کہ سزا نا ممکن ہے اور یہ اس کی آخری سزا نہیں ہوگی۔ عاقبت کی بات میں نہیں کرتا کیونکہ خوف نہ قبرت نہ اس کو ہے نہ تمہیں۔ میں دنیا کی بات کر رہا ہوں۔ اگر وہ مر سکتا تو اچھا تھا مگر وہ زندہ رہے گا کیونکہ خدا اس کی زندگی کو ایک تکلیف دہ عذاب اور عبرت آموز سزا بنانے گا۔" میں نے فون کے تار کھینچ کر الگ کر لیے اور چیخ کر آپ [illegible] اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید کرچھا نہیں [illegible] کے علاوہ [illegible] کا شکار تھا۔

محسن نیچے میرا منتظر تھا اور دو بار چکر لگا کے کھڑکی سے جھانک کر دیکھ گیا تھا کہ میں ابھی تک کیسے چلتا ہوا مجھے اس سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ چند گاڑیاں اور تانگے بہت دور سے گزر رہے تھے اور میں ایسی جگہ تھا جہاں کسی کی نگاہ براہ راست مجھ پہ نہیں پڑ سکتی تھی۔

"یہ کیا مصیبت ہے یار؟" محسن نے بگڑنا شروع کیا۔ "بات مختصر کرنا چاہیے۔ آدھا گھنٹہ لگا دیا۔"

میں نے جواب دیے بغیر دوسرا فون گاڑی میں پھینکا اور آگے محسن کی جگہ بیٹھ گیا۔ "گاڑی چلاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں مار دوں گا کسی دیوار میں یا چڑھا دوں گا کسی پر۔"

"کیا ہوا تجھے؟" محسن نے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ کے مجھے غور سے دیکھا۔ میرا خون ابل رہا تھا اور غصے میں میرا چہرہ گرم ہو کے تپنے لگا تھا۔ جب گاڑی چلی تو میں نے محسن کو بتایا کہ دلاور نے اپنی بیوی کو رات ہی قتل کر دیا اور اسے بہانہ مل گیا کہ وہ باپ کی موت کی تاب نہ لا سکی۔

"یہ تو بہت غلط ہو گیا۔" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔

"وہ خبیث صاف بچ گیا۔ اب اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جس بڈھے نے سچ سنا تھا وہ جی لیتا تو بیٹی کو بھی بچا لیتا مگر سب قدرت کے کھیل ہیں۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ کیا واقعی میں نے غلطی کی تھی مگر میں اسے نہ بتاتا تو کیسے بتاتا اور کوئی صورت بھی تو نہیں تھی۔ میں نے نیک نیتی سے کوشش کی تھی کہ دلاور کی بیوی کو قتل نہ ہونے دوں۔ معلوم نہیں کیوں میری کوشش ناکام گئی۔ شاید قدرت کو میری وقتی انداز کی پسند نہیں آئی۔ اس نے تو موت کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔ میں کیا اور میری بساط کیا کہ اس کی موت کو ٹالنے کی کوشش کروں۔ اس عورت کو ایسے ہی مرنا تھا اور اس کے باپ کو بھی۔ وہ سوئر کا بچہ سراج کہتا ہے کہ تم نے اسے مارا۔ میں کیوں ماروں گا ایک بڈھے کو... مگر وہ زبردستی مجھ پر تھوپ رہا ہے دونوں کی موت کا الزام...۔"

"سکندر یار ہوش میں رہو۔" محسن نے میرے کندھے پر تھپکی دے کر کہا۔ "کسی کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ خدا تو نیت کا حال جانتا ہے نا... پھر تو کیوں پروا کرتا ہے کتوں کے بھونکنے کی؟ اپنے ضمیر پر بوجھ مت رکھو۔"

"معلوم نہیں قدرت کی سزا کس کے لیے ہے، میرے لیے، دلاور کے بچوں کے لیے یا دلاور کے لیے؟" میں نے کہا۔

"سراج نے اور کیا بتایا؟" محسن نے کہا۔

"اس نے... اُس نے زینب... رابعہ کے بارے میں بتایا۔" میں نے کہا۔

گھر پہنچنے تک میں نارمل ہو گیا تھا مگر میرا دل غم کے بارے بوجھل تھا۔ اس احساس کو رابعہ کا تصور بھی پناہ نہیں دیتا

www.paksociety.com

تھا کہ میں نے عائشہ کے باپ کو فون نہ کیا ہوتا تو وہ زندہ رہتا۔ وہ زندہ رہتا تو دلاور کی بیوی کچھ دن اور جی لیتی مگر کتنے دن... اور اسے پھر کوئی کیسے بچاتا؟ میں اگر یہ بات یوں نہ کہتا تو پھر کیسے کہتا۔ کس [illegible] سب کہتا۔ گھر پہنچ کے میں نے [illegible] کو دیکھا تو پتا [illegible] میں کی شدت بڑھ گئی۔ [illegible] بھی دلاور نے قتل [illegible] کے قتل کا اہتمام کیا تھا مگر نشانہ بن گئی وہ [illegible] جسم بڑا پُرکشش، بڑا سفاک اور بڑا سستا تھا۔

"ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔" محسن نے کہا۔ "جلد از جلد سب کچھ سمیٹو اور نکل چلو۔ اسی میں خیریت ہے ورنہ یہاں پولیس آگئی تو گواہ بھی مل جائیں گے کہ اس قسم کی ایک گاڑی آئی تھی۔ کسی نے نمبر نوٹ کر لیا تو مصیبت گلے پڑ جائے گی۔"

گاڑی کو ہم نے کنڈر سے کچھ فاصلے پر کھڑا کیا تھا جہاں ایک بند گیراج تھا۔ یہ پیچھے سے گزرنے والی چھوٹی سڑک تھی جس کے دونوں جانب احاطوں کی دیواریں تھیں۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ مائکروبس کو دیوار سے جتنا قریب لگا سکتا ہو لگا لے اور اس کا سلائیڈنگ ڈور کھلا چھوڑ دے۔

اسلحہ میں نے اور محسن نے دس منٹ میں منتقل کر دیا۔ اس کے لیے مائکروبس کے پیچھے انجن کے اوپر بنا ہوا مختصر سا خانہ کافی رہا اور زیادہ محفوظ بھی رہا۔ غالب کوئی [illegible] نے ہمارا [illegible] کر پہنچایا اور [illegible] دیوار کے اوپر سے آ بادا۔ غالب نے ہماری غیر موجودگی میں فارغ بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور سارے نوٹوں کی گڈیاں [illegible] سے [illegible] رقم واپس سوٹ کیس میں ڈال دی تھی۔

"تجولی! تم ماں جی کو لے جاؤ۔" میں نے کہا۔

"میں خود چل کے جا سکتی ہوں۔" سراج کی ماں کھڑی ہو گئی۔

"ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "کہ آپ ہمارے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہ کریں۔ آپ سمجھتی ہیں نا کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ آپ کو صرف خاموش رہنا ہے۔"

"یہ نہ ہو کہ ہم آپ کو خاموش کرنے پر مجبور ہو جائیں۔" محسن بولا۔

"معلوم نہیں میں مر کے [illegible] نہیں جاتی۔" وہ دکھی لہجے میں بولی۔ "اور کیا دیکھنے کو رہ گیا ہے۔ تم نے تو مجھ سے ماں کا وہ غرور بھی چھین لیا ہے جو اُسے اپنے بیٹے پر ہوتا ہے۔ میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ اسے جھوٹ سمجھوں، وہ سب کچھ جو تم نے کہا مگر سچ کا گھاؤ بہت گہرا ہے۔ میرے دل کو یہ زخم دے کر کیا ملا تمہیں؟ کیوں بولا تم نے وہ سچ جو میری ممتا کا آزار بن گیا ہے؟"

"دکھ کی بات تو یہی ہے ماں جی کہ ہم سب منافقت کے پردوں میں رہنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم وہی دیکھنا چاہتے ہیں جو ہمیں اچھا لگے۔ برائی اور بدصورتی کو ہم جذبات کے رنگ و روغن سے چھپا لیتے ہیں اور پھر دل کو فریب دے کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پورا معاشرہ [illegible] ناسور [illegible] والا [illegible] جسم بن گیا ہے مگر ہم [illegible] لگے [illegible] سے اور [illegible] نظروں کی چمک [illegible] پھسلا کے اس کی خوبصورتی کو سراہتے ہیں [illegible] کے خوش ہو لیتے ہیں۔"

"[illegible] نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"[illegible] صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جب تک آپ جیسی مائیں [illegible] بیٹوں کو نفرت نہیں دیں گی انہیں احساس نہیں ہوگا کہ [illegible] دنیا میں کچھ پانے کے لیے بہت کچھ کھو دیا ہے۔ اسے یہ احساسِ زیاں تو ہونا ہی چاہیے کہ اس نے اپنی ماں کا خزانہ کھو دیا۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ بھی اور کچھ نہیں بھی۔ اس نے تجولی کے ساتھ [illegible] آہستہ دروازے کی طرف قدم بڑھائے اور پھر رک گئی۔ "اس کو تم ایسے ہی چھوڑ جاؤ گے؟" وہ ادھر اشارہ کر کے بولی جدھر عائشہ کی لاش پڑی تھی۔

"ہم اسے ساتھ رکھ کے [illegible] رہ سکتے۔" میں نے کہا۔

"ہم تو کل..." محسن کہتے کہتے رک گیا۔ [illegible] بھی ایسے ہی چھوڑ آئے تھے مگر میں نے اسے بازوؤں کی [illegible] تجولی کا چہرہ دوسری طرف تھا چنانچہ اس نے یہ حرکت نہیں دیکھی۔

"کل نہ جانے کہاں ہوں گے ہم۔" محسن نے اپنی بات بدل دی۔

"اور اس کی لاش یہاں سڑتی رہے گی۔" سراج کی ماں نے خوفزدہ ہو کے کہا۔

"نہیں، ہم اس کے وارثوں کو اطلاع کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ اسے یہاں سے اٹھا کے لے جائیں گے اور دفنا دیں گے۔"

سراج کی ماں مطمئن ہو گئی۔ اس نے [illegible] سر جھکا کے خاموشی سے طے کیا اور تجولی کے سہارے دیوار کے اوپر سے دوسری جانب اتر گئی۔ میں نے دروازے کو کھینچ کر بند کیا اور محسن نے گاڑی چلانے میں دیر نہیں کی۔ میں نے عائشہ کی خود تدفین کا ارادہ بدل دیا تھا کیونکہ اس میں بھی کچھ مشکل اور خطرناک [illegible] تھا اور پھر دلاور کو سزا دینے کے لیے مجھے امید تھی کہ وہ بھی عائشہ کی موت کی اطلاع اس کے گھر والوں کو نہیں دے گا جس میں ایک رات [illegible] لے لیا تھا۔ سب سے مظلوم عائشہ کی ماں تھی۔ ابھی ایک دن پہلے ہی اس نے ایک بیٹی کا رشتہ طے کیا تھا اور [illegible] بیٹی نے زندگی سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ اسی رات [illegible] سے معلوم ہوا کہ فرشتۂ اجل کا شکار [illegible] تو شاید یہ صدمہ اس کی جان لینے کے لیے [illegible] دلاور خاموشی سے عائشہ کی تدفین کرا دے گا۔ [illegible] ماں تو وہ [illegible] رہے گا کہ عائشہ زندہ ہے اور خیریت سے ہے۔ اس وقت تک جب حقیقت خود آشکار ہو۔ [illegible] حالات کا [illegible] توڑ دے، جھوٹ کے پردوں سے سچ نکل [illegible] جیسے ایک لمبی کالی رات کے سمندر کو عبور [illegible] سورج کی پہلی کرن نکلتی ہے۔

"میں سمجھتا ہوں ابھی شہر سے باہر نکلنے کی کوشش کرنا خطرناک ہے۔" محسن بولا۔

"ہاں، ابھی ناکہ بندی ختم نہیں ہوئی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "لیکن بڑے شہروں کے راستوں پر ہی نظر رکھی جاتی ہے۔ پشاور، [illegible] کے راستے کا تو سوال ہی نہیں۔ لائل پور، سیالکوٹ یا سرگودھا کی طرف بھی نہیں جانا۔"

"پھر راستہ کون سا رہا؟" محسن نے کہا۔

"مضافات کی جانب بہت سی کچی سڑکیں ہیں۔ [illegible] گاؤں میں جو لاہور [illegible] کا حصہ بن گئے ہیں۔"

"اس گاڑی میں ہم بہت نمایاں ہوں گے۔" محسن بولا۔ "ہم [illegible] میں کوئی پکا مکان لے کر نہیں رہ سکتے۔"

"ہم اب شہر کی طرف بھی نہیں جا سکتے۔" میں نے کہا۔ "[illegible] کی مدد کرنے کے الزام میں گرفتار [illegible] تھا۔ وہ ضمانت پر رہا تو ہو گیا مگر دوسری بار اس پر [illegible] سارے ٹھکانے پولیس چھانتی پھر [illegible] جہاں جہاں بھی ہم رہے ہیں۔ آدھے سے زیادہ لاہور [illegible] محسن کے نام سے واقف ہے اور کوئی ہوشیار [illegible] تو اسے حلیے میں بھی پہچان لے گا۔ ہم ہوٹل میں [illegible] نہیں جا سکتے کیونکہ ہمارے ساتھ خواتین [illegible] بھی کام چلا لیں مگر ہمارے پاس سامان [illegible] ایک چیز نہیں ملنے دے گا۔"

"اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ اب ہمارا ٹھکانا زمین اور آسمان کے درمیان کہیں بھی نہیں رہا۔" محسن بولا۔

"[illegible] غازی خان۔" میں نے اچانک چونک کے کہا۔ "[illegible] انکار نہیں کر سکتا۔"

"[illegible] اسے ایک نیکی کا معاوضہ طلب کرنے [illegible]" [illegible] بولا۔

"[illegible] کس سے مانگ سکتا ہے؟ [illegible] میں نے [illegible] وعدہ کیا تھا کہ پھر آؤں گا۔"

"ہماری وجہ سے وہ غریب آدمی مشکل میں نہ پڑ جائے۔"

"ہم اس کے گھر میں نہیں رہیں گے۔ اس سے کہیں گے کہ ہماری رہائش کا کوئی انتظام کر دے۔ صرف ایک ہفتے کے لیے۔" میں نے کہا۔ "یہ لوگ نہیں انکار کر سکتے ہیں مگر وہ ضامن ہوگا تو بات بن جائے گی۔"

آدھے گھنٹے بعد میں نے مائکروبس کو غازی خان کے گھر کے قریب روکا۔ ایک بار میں صبح سویرے کار میں آیا تھا تو میری گاڑی [illegible] کے دروازے تک پہنچ گئی تھی مگر یہ بڑی گاڑی تھی جو چھوٹے کوارٹروں کے درمیان پھنس جاتی۔ میں نے محسن کو وہیں چھوڑا اور خود غازی خان کے گھر کے دروازے تک گیا۔

غازی خان کے دروازے پر لگا ہوا قفل دیکھ کے مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے پڑوس میں رہنے والے کا دروازہ بجایا۔ ایک شخص ملیشیا کی نیلی وردی میں باہر آیا۔ وہ سفید مونچھوں اور بالوں والا ضرورت سے زیادہ ہی صحت مند شخص تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ غازی خان اور اس کی بیوی تو ٹیکسلا گئے ہوئے ہیں۔

"ٹیکسلا؟ آنکھوں کے ہسپتال؟" میں نے کہا۔ "اپنی بیوی کی آنکھوں کا آپریشن کرانے گئے ہیں؟"

"ہاں جی اب تو خیر سے واپس آنے والا ہے۔" وہ بولا۔ "اس کی چٹھی آئی تھی کہ آپریشن کامیاب رہا۔ ڈاکٹروں نے صرف تین دن رکھا اور چھٹی کر دی تھی۔"

"کب تک پہنچے گا وہ؟"

"یہ تو نہیں کہا تھا۔" وہ بولا۔ "آپ کو کیا کام تھا جی اس سے؟"

"میں اس کا دوست ہوں۔" میں نے بڑے تہذیب کے ساتھ کہا تو میں نے ہی اُسے مجبور کیا تھا۔ مجھے بہت شرم آئی کہ میں ایک ذاتی مقصد کے حصول کی خاطر اپنی نیکی کا احسان جتلوا رہا ہوں۔

"ہاں جی! مجھے معلوم ہے۔" وہ بولا۔ "کسی نیک دل تھانیدار نے اسے پیسہ دیا تھا۔ پیسہ تو اس کے پاس سارا حرام کا ہی ہوگا مگر اللہ اس کی نیکی قبول کرے۔ آپ کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟"

"میں... مجھے اس علاقے میں ایک مکان کی ضرورت تھی۔ غازی خان ہوتا تو اس کے پاس ٹھہر جاتا۔" میں نے کہا۔

"آپ اکیلے ہو؟" وہ بولا۔

"نہیں فیملی ہے میرے ساتھ۔ بہن ہے اور خالہ ہے۔ ایک زخمی [illegible] ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی [illegible] نے کہا تو پتا [illegible] آئے تھے اور یہاں..."

"[illegible]" وہ بولا۔

"لیکن صرف اسی لیے کہ میں صفائی کر دوں اور دھیان [illegible]

www.paksociety.com

میری گھر والی خیر سے روز جھاڑو دے آتی ہے مگر میں کسی
کو اس کے گھر ٹھہرا دوں، یہ مشکل ہے۔ جبھی میں چاہتا ہوں کہ اُسے
چابی دے دوں۔ ہاں آپ نے جو بات کی ہے کہیں ٹھہرنے
کی تو پیچھے والی لائن میں کونے کا کوارٹر کرائے کے لیے ہے،
ابھی دو دن ہوئے اپنے ایک یار کو الاٹ ہوا تھا۔"

"وہ خود نہیں رہتا وہاں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کوارٹر میں رہے گا؟" وہ ہنسنے لگا۔ "اُس کے چار چار مکان ہیں شہر میں، وہ بیوپاری ہے، اندھی کمائی کر رہا ہے، اُسے تو بس الاٹ ہو گیا کوارٹر بارگاہ پر۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ کوئی بھروسے کا آدمی ہو تو کرائے دار رکھ لوں، ٹھہرتا بھی ہے"
اُس نے ایک گالی پر جملہ ختم کیا۔

"کرکو کی رپورٹ کر دے گا؟" میں نے کہا۔ "میں سمجھ گیا، مگر بھائی میں کرایہ تو پورے مہینے کا دے دوں گا مگر صاف بات ہے کہ رہوں گا دس دن بھی نہیں، بس ایک ہفتہ۔"

"اچھا جی!" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "ایک بات ہے آپ اُس سے مت کہنا۔"

"کیا نہ کہوں؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ آپ ایک ہفتہ رہو گے، کسی سے بھی مت کہنا۔" وہ بولا۔ "ایک ہفتہ تو ایسے ہی گزر جائے گا، کوئی پوچھے تو یہ مت بتانا کہ کرائے پر لیا ہے۔ کہہ دینا کہ... مگر تم سے کوئی کیوں پوچھے گا، ابھی کسی کو معلوم نہیں کہ کوارٹر کیسے الاٹ ہوا ہے، تم آؤ جی میرے ساتھ۔"

"لیکن وہ خود آ گیا تو؟"

"وہ... اس کا کیا کام ادھر، بس جیسے حاضری لگاتا ہے اور ایک افسر کا اسٹال چلاتا ہے ریلوے اسٹیشن پر۔" وہ بولا۔ "افسر نے بھی اپنی سالی کے نام سے اسٹال کا ٹھیکا لیا ہوا ہے، چائے کا اسٹال ہے، اُس کی تو حاضری بھی خود بخود لگ جاتی ہے، کوارٹر اس نے میرے سپرد کر دیا ہے۔ اب میں اس کو کرایہ پہنچا دوں گا تو وہ خوش، اس کا خدا خوش۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چکر چلا رہا ہے۔ وہ مجھ سے ایک ماہ کا کرایہ لے کر جیب میں ڈال لے گا، جس کو کوارٹر الاٹ ہوا ہے اُسے معلوم ہی نہ ہو گا کہ کوارٹر میں کوئی رہا اور چلا گیا۔ حقیقت … جب کوئی پکا کرائے دار ملے گا تو اُسے بتا دے گا … ہو گیا۔ وہ اپنی پاور آف اٹارنی سے فائدہ اٹھا رہا تھا … امانت میں خیانت کا مرتکب ہو رہا تھا۔ ایک ڈاکو کی جیب کاٹ رہا تھا جو فرق ڈاکو اور جیب کترے کے پیشے میں ہوتا ہے وہی کوارٹر کے الاٹی اور اس شخص میں تھا۔ ایک بڑا ہاتھ مارتا تھا۔

یہ اس کے مال سے تھوڑا سا لے رہا تھا جیسے کوئی کنویں سے ایک ڈول پانی نکال لے تو اس سے کنویں میں پانی کم نہیں ہوتا۔ اس حمام میں سب ایک سے تھے۔ وہ افسر جس نے سالی کے نام کا ٹھیکا فرضی نام سے لے رکھا تھا، فرضی نام اس کی سالی کا تھا۔ ایک شخص ریلوے سے مفت کی تنخواہ لے رہا تھا اور افسر اور ماتحت مل کے ریلوے سے کمائی کر رہے تھے۔

"یہ ہے جی کوارٹر۔" وہ اچانک رک گیا۔ یہ بالکل ویسا ہی کوارٹر تھا جیسا غازی خان کا تھا مگر یہ ان کوارٹروں کی قطار کا آخری کوارٹر تھا اور اس اعتبار سے بہتر تھا کہ یہاں آنے جانے کے لیے پچھواڑا اس آبادی سے گزرنا ضروری نہیں تھا۔ ایک طرف تو کوئی گھر تھا ہی نہیں تھا۔ دوسری طرف والے کوارٹر میں تالا پڑا ہوا تھا۔

"ادھر کوئی رہتا ہے؟" میں نے جیب سے نوٹ نکالے اور اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی حریص چمک دیکھی۔

"ادھر کوئی نہیں، ایک پٹھان سگنل مین تھا۔" وہ بولا۔ "بیچارا اپنے فرض کی ادائیگی کے چکر میں جان سے گیا، بڑی بے دردی کی۔ مرنے والے کو برا کہنا تو نہیں چاہیے مگر دیکھو نا جی اس تنخواہ کی خاطر جان دے دی۔"

"کیا بے وقوفی سرزد ہوئی تھی اس سے؟" میں نے کہا۔

"بس کانٹا غلط بدل دیا تھا، عین وقت پر احساس ہو گیا وہ دوڑا کانٹا بدلنے، جب واپس آ رہا تھا تو دوسری طرف سے گاڑی آ گئی۔"

"اور اگر وہ کانٹا نہ بدلتا، اپنی غلطی کو نہ دیکھتا...؟"

"تو ایک ڈاؤن ایک کھڑی ہوئی مال گاڑی میں گھس جاتی" وہ بولا۔ "وہ لنگڑا تھا، پہلے بھی ٹانگ کٹ چکی تھی، جانتا تھا دوڑ نہیں سکتا مگر دوڑ گیا اور کیا ملا جی اسے؟ کسی نے انعام دیا؟ کس نے پوچھا؟ بیوی بچے لاش لے کر چلے گئے ساتھ میں اُن کا سامان پڑا ہے یا پڑا ہو گا۔ اگر یہ مولا نے چھوڑا ہو گا تو انکوائری ہو رہی ہے کہ غلطی کس کی تھی، غلطی اس کی اپنی تھی کچھ بھی نہیں ملے گا اُسے۔ الٹا بیوی بچے چکروں کے بعد … کے بعد اس کے کھاتوں کو … سرٹیفکیٹ لینا پڑے گا … آفس کے چکر لگانا پڑیں گے، پتا نہیں کتنی درخواستیں دینا ہوں گی، کتنے حلف نامے داخل کرنا پڑیں گے۔"

"پھر تو واقعی مرحوم نے بے وقوفی کی۔ دنیا کے نقطۂ نظر سے۔ اللہ شاید اس کی قربانی کو شہادت کا درجہ دے … اس نے کتنی زندگیوں کو بچایا ہے اب کون بتا سکتا ہے …

… میں بھی نہیں آئے گا کہ حادثہ نہ ہونے سے کتنے بچے … ہو جاتا تو مرنے والوں کے اور زخمی ہونے والوں کے … آ جاتے، خیر چھوڑو، یہ تو اس دنیا کے دھندے ہیں اور اسی طرح چلتے رہیں گے، تم بتاؤ کرایہ کیا دو گے؟"

"کرایہ... آپ کو کیا بتاؤں؟" وہ بولا۔

"دو سو کافی ہیں؟" میں نے کہا اور پھر اس کی آنکھوں میں لپ چمک دیکھی۔

"ہاں جی، آپ تو جانتے ہیں کہ خیر سے کرائے کتنے چڑھ گئے ہیں۔" وہ دونوں نوٹ جھپٹ کے بولا۔ "ویسے آپ کو تکلیف کوئی نہیں ہو گی یہاں ہر چیز موجود ہے، بجلی پانی اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے حکم کریں، آپ غازی خان کے دوست تو میرے بھی دوست، اسماعیل کو بھیج دیں…"

"وہ گاڑی میں ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا ایک دوست ہے، … چھوڑنے آیا تھا۔"

اُس نے پلٹ کر … کی طرف دیکھا اور چابی مجھے … تو آپ خیر سے مجھے اجازت دیں، … کے لیے تیار ہوا تھا … کو آؤں گا لوٹ کے تو پھر ملاقات ہو … السلام علیکم۔" وہ ہاتھ ملا کے چل پڑا۔

میں نے واپس جا کے محسن کو چابی دکھائی۔ "اللہ کارساز ہے۔ غازی خان نہیں ملا مگر اس کا نام بھی کام آ گیا۔"

"تم نے کہا ہو گا کہ میں ڈیرہ اسماعیل خان ہوں، ڈیرہ غازی خان کا …؟" محسن بولا۔

میں نے پھر ہنس کر کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ لوگوں نے اعتبار کیا۔ ظاہر ہے میری صورت دیکھ کر۔" میں نے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ "خدا کا شکر ہے جس نے مجھے تیری صورت نہیں دی۔"

"شکر تو مجھے بھی ادا کرنا چاہیے کہ خدا نے مجھے تیری سیرت نہیں دی۔" محسن نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ اب تک … ہوتا، معتبر ہوتے ہیں شادی شدہ لوگ … بدمعاش اور مشتبہ سمجھے گئے ہو اور سمجھے جاؤ گے۔"

"یار وہ تیری سند شرافت کا حال کیا ہے؟" میں نے کہا۔
"… تو معطل ہونے کے بعد وہ سرکاری جگہ چھوڑ دیں … تھا۔ ظاہر ہے تیری بیوی ان کے ساتھ نکل جائے گی۔ گاڑی … آخری کوٹھی ہماری ہے۔"

"کوٹھری اور کوٹھی میں صرف ایک حرف کا فرق ہے۔" … نے سر ہلا کر پھر کے فلسفیانہ انداز میں فرمایا اور گاڑی کو … دیا۔

"تم بالکل سسرال سمجھو اور گھر داماد کی طرح شان سے رہیے۔" میں نے کہا اور پچھلا دروازہ کھینچ کر کھولا۔ … پہلے ہی … اس لڑکی نے حیرت انگیز طور پر اپنے غم کے آتش فشاں کو بجھا دیا تھا۔ … بہت مضبوط اعصاب اور ارادے رکھنے والی عورت تھی۔ … کمزور نظر آنے کے باوجود اپنی ماں کی بیٹی ثابت ہو رہی تھی۔ اس کے انداز و اطوار میں مجھے ایک نئی خود اعتمادی محسوس ہوئی جو کل تک نہ تھی، شاید اس لیے کہ وہ ماں کی موجودگی میں خود کو … سمجھتی تھی۔ جذباتی طور پر ہی نہیں، عملاً بھی … نے اُسے ماں باپ بن کے پالا تھا، دوست بن کے سہارا دیا تھا اور محافظ بن کے ہر آتش … اور ہر بلا سے بچایا تھا۔ اب وہ نہیں رہی تھی تو … کا احساس خود اعتمادی جاگ اٹھا تھا اور وہ اپنی قسمت وار یوں کا بار خود اٹھانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

… نے سراج کی ماں کو نیچے اتارا۔ "ماں جی! آپ نے ابھی تک ہم سے تعاون کیا ہے۔ امید ہے آپ ہماری مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے کوئی ایسا موقع نہیں آنے دیں گی کہ بعد میں آپ کو افسوس ہو اور ہمیں ندامت۔"

"چل چل، زیادہ تقریر مت بتا مجھے۔" سراج کی ماں نے … سے کہا۔ "تو نہیں جانتی میں کس کی ماں ہوں۔ میں اگر نہ چاہوں تو تم مجھے ایک منٹ قید نہیں رکھ سکتے، ایک قدم چلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔"

"ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں ماں جی۔" … نے نرمی سے کہا اور سراج کی ماں کو کوارٹر میں لے گئی۔ میں، محسن اور غالب دم بخود کھڑے رہے۔

"تم نے اس لڑکی کی گفتگو سنی؟" میں نے غالب سے کہا۔

"صرف گفتگو ہی نہیں سنی، اس کا لہجہ بھی دیکھا۔" غالب نے سر ہلایا۔

"اور جس انداز سے اس نے ہم کا لفظ استعمال کیا۔" محسن نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ "وہ ہم میں سے تھی مگر اس نے ہمیں اپنی زبان سے احساس دلا دیا کہ ہم اسے الگ یا کمتر اور غیر ذمے دار نہ سمجھیں۔ کس آسانی سے اس نے خود ایک کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہمیں بتا دیا کہ وہ ذمے داری قبول کر سکتی ہے۔"

"کمال ہے یار۔" میں نے کہا۔ "ہماری مجبوریاں کہہ کے اس نے دو لفظوں میں ہم پہ واضح کر دیا کہ وہ سب جانتی ہے اور سب سمجھتی ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔ بے شک وہ آج تک … تھی مگر مجھے واقعی اندازہ نہ تھا کہ وہ اتنا سمجھتی بھی ہے۔"

"یہ ایک خوشگوار تبدیلی ہے، مثبت اور تعمیری۔" غالب

www.paksociety.com

نے کہا اور سہارے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اور محسن نے اُسے اُتارا اور اندر پہنچا دیا۔ اندر کچھ بھی نہیں تھا مگر پرانی بان کی دو چارپائیاں دونوں کمروں میں موجود تھیں جو شاید کوارٹر خالی کر کے جانے والے بے مصرف جان کے چھوڑ گئے تھے۔ خسرو جمشید کی گاڑی کا کوڑ ہم ساتھ ڈال لائے تھے۔ اسی میں اسٹول لپیٹ کر ہم نے ایک چارپائی کے نیچے ڈال دیا۔ ضروری تھا کہ چارپائی پر اب ایک دری بستر بھی ہو۔ اس کے لیے میں اپنے محسن کے گھر گیا جو گھر سے نکل کر روانہ ہونے ہی والا تھا۔

"آپ لوگ اپنے ساتھ کچھ نہیں لے کر چلے تھے؟" وہ بولا۔

"سب کچھ لے کر چلے تھے بھائی صاحب!" میں نے کہا۔ "مگر جس گاڑی میں ہم تھے اس کا راستے میں ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بڑے بھائی کی تو ٹانگ ٹوٹی۔۔۔"

"ارے! کہاں ہوا یہ ایکسیڈنٹ؟" وہ بولا۔

"راولپنڈی کے قریب۔" میں نے کہا۔ "دو دن راولپنڈی میں ہی لگ گئے۔ ایکسرے ہوا اور پھر پلاستر لگا۔ گاڑی تو کچھ ختم ہو گئی تھی۔"

"مگر آپ لوگوں کے خراش بھی نہیں آئی۔" وہ مجھے دیکھ کے بولا۔

"اسی کو قسمت کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "حسن ابدال کے اڈے پر ہم اتر گئے تھے کہ چائے وغیرہ پی لیں۔ بھائی صاحب گاڑی لے گئے پیٹرول ڈلوانے کے لیے اور وہاں ایک ٹرک نے آ کے حملہ کر دیا۔ پیٹرول ڈلوا کے نکل رہے تھے کہ وہ غلط سائیڈ سے تیز آ گیا اور بس سامنے سے ٹکر ماری تو۔۔۔ بس اللہ نے جان بچا لی۔ گاڑی کو دیکھ کر تو آپ بھی کہتے کہ اس میں کون بچا ہو گا۔ جو سامان تھا سب غارت ہو گیا۔ ہم تو بڑی مشکل سے راولپنڈی پہنچے اور وہاں سے یہ دوست ہمیں چھوڑنے آ گئے جن کی یہ گاڑی ہے۔ ادھر چھوٹی بہن ہے کہ اس کو میو ہسپتال میں داخل کرا کے آئے ہیں مگر اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔"

وہ ایک دم چونکا۔ "میو ہسپتال میں۔۔۔ یہ تو آپ نے پہلے بتانا تھا جی! کیا ہوا ہے اُسے؟"

"بس جی کیا بتاؤں۔ جو بیماریاں پہلے بوڑھوں کو ہوتی تھیں وہ اب جوانوں کو ہونے لگی ہیں۔ جوان لڑکی کو شوگر کی بیماری ہو گئی پھر گردوں میں پتھری پڑی تو معاملہ خراب ہو گیا۔ پشاور کے ڈاکٹروں نے پوری کوشش کر لی تھی مگر حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ سنا ہے یہاں میو ہسپتال میں بڑے ماہر ڈاکٹر ہیں اور بڑا اچھا انتظام ہے۔ اللہ ہی بچانے والا ہے۔"

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ "تو ابھی آپ میو ہسپتال سے آ رہے تھے؟"

"ہاں جی! صبح کے لاہور پہنچے ہوئے تھے۔ ہسپتال میں دن گزر گیا۔" میں نے کہا۔ "پھر یہاں آئے تو بھائی غازی خان نہیں۔ اب خدا کی قدرت دیکھو کہ ہم اس وقت حسن ابدال میں تھے اور وہ ٹیکسلا میں۔ کہاں پشاور اور لاہور کا فاصلہ اور کہاں کہ وہ چند میل پر بیوی کی آنکھوں کا آپریشن کرا کے بیٹھے تھے اور ادھر ہمارا ایکسیڈنٹ ہوا۔ انہیں پتا چلتا تو دوڑے آتے۔ اب بیٹھنے کی جگہ بن گئی ہے۔ کچھ کھا پی لیں تو پھر ہسپتال جائیں۔"

"آپ اللہ پر بھروسا رکھو جی۔" وہ بولا۔ "اور دعا کرو داتا صاحب کے حضور میں جا کے۔ میں چادر بستر اپنے گھر سے پورے نہیں کر سکتا۔ غازی خان کے گھر سے نکال دیتا ہوں۔ بلکہ آپ یہ چابی لو۔ جو چیز ضرورت پڑے خود اُن سے لے کر پھر تالا ڈال دینا اور چابی میری گھر والی کو دے دینا۔ میں لیٹ ہو رہا ہوں۔"

میں نے چابی لے لی اور وہ سائیکل کے پیڈل مارتا چلا گیا۔ ہمدرد اور کتنا سادہ اعتبار کرنے والے اور مدد کرنے والے یہ لوگ۔ اگر جان لیں کہ ہم کون ہیں اور ہمارے جھوٹ کا انکشاف ہو جائے تو ان کا ردعمل کیا ہو گا؟ میں نے سوچا۔ اطمینان یہ تھا کہ غازی خان آ جائے گا تو میری پوزیشن خراب نہیں ہو گی بلکہ مزید بہتر ہو جائے گی۔ چابی سے قفل کھولنے کے بعد میں کچھ دیر ایک گزرے ہوئے وقت کی تصویر کو دیکھتا رہا۔ اس گھر کا غازی خان تھا اور اس کی اندھی بیوی تھی اور میں تھا مگر سارا حسن اس فضا میں تھا جو میرے فرشتۂ رحمت کی صورت اچانک آ جانے سے پیدا ہوئی تھی۔ احسان مندی اور ممنونیت کے جذبات سے میرے دل کو جو طمانیت اور خوشی حاصل ہوئی تھی وہ ایک انمول احساس رکھتی تھی۔ اس کی یاد بھی بڑی تسکین دینے والی تھی مگر اس وقت مجھے یوں لگا جیسے اپنے اخلاق کا ناجائز فائدہ اٹھا کے میں نے وہ تصویر خراب کر دی ہے اور اس احساس کو مجروح کر دیا ہے۔ میں نے پہلے بھی غازی خان سے جھوٹ بولا تھا مگر اس کا مقصد نیکی کرنا تھا۔ آج پھر اُسی کے سہارے اس گھر میں آیا تھا تو اس نیکی کا صلہ وصول کرنے۔

میں جانتا تھا کہ غازی خان کو کبھی میرے جھوٹ کا پتا نہیں چلے گا مگر وہاں سے سامان اٹھاتے ہوئے تھوڑی سی شرمندگی کا احساس مجھ پر غالب رہا۔ میں نے دریاں، بستر اور تکیے ہی نہیں ضرورت کے برتن بھی اٹھائے اور لا کر کوارٹر میں رکھ دیے جہاں ہمارا بسیرا تھا۔ محسن نے مقامی ہوٹل سے روٹیاں اور دال بھی خریدنے کا نیک کام کیا اور بھوکوں کا پیٹ بھرا۔ سراج کی ماں نے برائے نام کھایا اور پڑ کے سو گئی۔ وہ بڑی [illegible] اس [illegible] دور میں تھک گئی تھی۔ [illegible] نے خود کو [illegible]

تقدیر کے سپرد کر دیا تھا اور ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا کہ دنیا کی ہوں تو اپنے وقت پر۔ اس کے فکر کرنے یا احتجاج کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہم نے اسے بجو لی کی نگرانی میں ایک بیچ میں چھوڑا اور خود دوسرے کمرے میں بیٹھ کے سگریٹ پینے لگے۔ فراغت کا وقفہ میسر آتے ہی سب پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔

میں نے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھو لیا۔ محسن نے بھی یہی کیا تھا۔ اس سے ہمارے تھکے ہوئے جسم اور جاگی ہوئی آنکھوں کو کچھ سکون ملا۔ میں نے ایک قریبی بہن کے میو ہسپتال میں قریب مرگ ہونے کا تذکرہ اس لیے کیا تھا کہ میرے ذہن میں عائشہ کی خود تدفین کا خیال ابھی تک موجود تھا۔ میں اس بات کے امکانات پر غور کر رہا تھا کہ اگر ایک کہانی سنانے کے بعد ہم وہ لاش یہاں اٹھا لائیں اور مشہور کر دیں کہ وہ ہسپتال میں مر گئی تھی۔ لاش کسی کرائے کی ایمبولینس میں بھی لائی جا سکتی تھی۔ پھر یہاں سے اُسے باقاعدہ جنازے کی صورت میں لے جانا ممکن ہو گا؟

محسن اور غالب نے میرے خیال کی مخالفت کی۔

"اس چکر میں مت پڑو۔" محسن نے کہا۔ "وہ جانے اور داور جانے۔"

میں داور کو اسی دباؤ میں رکھنا چاہتا تھا کہ عائشہ [illegible]

"مگر اس میں بہت سی نئی پریشانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔" غالب نے کہا۔ "کہیں کسی کو شک ہو گیا تو پولیس کو اطلاع دے گا۔"

"ویسے بھی لاش کو یہاں لا کے ہم یہ پورا ڈراما اسٹیج کرنے پر مجبور ہوں گے۔ سب کے سامنے رونا دھونا اور مغموم نظر آنا، لوگوں کی تعزیت وصول کرنا، تجہیز و تکفین اور پھر اس کے بعد کا سوگ۔ بجو لی تو شاید ہمارے ساتھ اداکاری کر لے مگر سراج کی ماں بھی ہے، وہ اداکاری برداشت نہیں کرے گی۔ سب کے سامنے چلانے لگی تو کھو جائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر ہم داور کو ہی اطلاع کر دیتے ہیں۔" میں نے ان کے دلائل سے قائل ہو کے کہا۔ "اس کے لیے بھی فون کرنا ضروری ہو گا۔"

"فون ہم کر دیں گے۔ ہمیں ویسے بھی جانا ہے۔" محسن نے کہا۔

"ملنا، وہ گاڑی کا سودا ہو جائے تو کچھ آگے کی پلاننگ ہو۔ اس کے لیے ہمیں ایک ہفتہ شہر میں پھرنے کا رسک لینا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "اس گاڑی کو دوبارہ یہاں نظر نہیں آنا چاہیے اور محسن کو بھی۔"

"تو کیا ہم گاڑی جنگل میں کھڑی کر کے رات گاڑی میں گزارا کریں گے؟" محسن بولا۔

"نہیں، گاڑی کو یہاں سے کچھ فاصلے پر کوئی محفوظ جگہ دیکھ کر پارک کیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جہاں سے ہم صبح پہلے نکلیں تو رات کے وقت اندر آ کے رہ سکتا ہے۔ کوئی بھی سیدھا گھر تک نہیں آئے گا۔ یہ روٹ ہے۔"

"تو اب جا ہو تو سو جاؤ۔" میں نے غالب سے کہا۔ "رات تک سوتے رہو۔ واپس آ کے ہم سو لیں گے ورنہ جاگو گے۔ کل انشاءاللہ تم کسی ڈاکٹر کو بھی دکھا دیں گے۔"

"میری دوائیں تو پہلے آ گئی یار۔" غالب نے کہا۔ "خدا کرے یہ ہفتہ ختم ہونے تک اس پلاستر کا جنجال بھی ختم ہو جائے۔"

ہم بجو لی کو تسلی دے کے روانہ ہوئے تو پہلے کے مقابلے میں زیادہ پرسکون تھے۔ نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس ہماری گاڑی میں پیچھے کی سیٹ کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ ایک بھرا ہوا ریوالور ہم دونوں نے چھپا رکھا تھا اور گاڑی پھر محسن چلا رہا تھا۔

"میرا خیال ہے گاڑی پر نیا رنگ کرا لیا جائے۔" محسن نے اچانک کہا۔ "ابھی نہ سہی، یہاں سے چلتے وقت۔"

"رنگ کھڑے کھڑے نہیں ہو جاتا۔" میں نے کہا۔ "نیا رنگ کم سے کم ایک ہفتے میں ہوتا ہے۔"

"میں چاہتا ہوں یہ گاڑی کچھ بدلی نظر آئے۔" محسن بولا۔ "اور کوئی اس پوائنٹ کا ایک اسپرے کر دے۔ کھڑے کھڑے ایک کوٹ کرے جو اس کا رنگ کو بدل دے۔ مثلاً اس پر سفید رنگ پھیر دے۔ صفائی کی ضرورت نہیں۔ شیشوں وغیرہ پر اور نکل والے حصوں پر اسپرے پڑ جائے تو کوئی ہرج نہیں اور یہ میں ابھی بتاؤں گا کہ دونوں کا کام گھنٹوں میں کیسے ہوتا ہے۔"

"فی الحال میری ایک تجویز ہے۔ جیسے کی طرح منفرد ایک جینئس کے ذہن کی پیداوار۔" میں نے کہا۔

"جینئس آدھے پاگل مشہور ہوتے ہیں لیکن پورے پاگل نہیں ہوتے۔"

"تجویز یہ ہے عزیزم!" میں نے اس کی بات کا بُرا مانے بغیر کہا۔ "کہ گاڑی پر ہم کسی سرکاری محکمے یا ادارے کا نام لکھوا لیں۔ گاڑی کے دونوں طرف ایک پٹی ہو لال رنگ کے حروف کی۔"

"اور نام کیا ہو؟ محکمہ پرورش حیوانات؟" محسن بولا۔

"نہیں، ایسا جو اچھا بھی لگے مگر کسی کی سمجھ میں بھی نہ آئے۔" میں نے کہا۔ "جو بھی سمجھے وہ سوچنے کے سوا کچھ نہ کر سکے کہ کیا ایسا بھی کوئی ادارہ ہے اور سمجھے کہ ہو گا۔ سرکاری گاڑی تنگ سے

www.paksociety.com

محفوظ رہتی ہے۔ آگے پیچھے کی نمبر پلیٹ پر ویسٹ پاکستان گورنمنٹ بھی لکھوایا جاسکتا ہے۔"

"میں تجویز کی معقولیت کے امکانات پر موافقت کے دلائل سے اتفاق کرنے پر آمادگی کے جانے کی رپورٹ پر غور کرنا مناسب سمجھتے ہوئے . . . ."

"فضول بکواس سے گریز کیجیے۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے زحمت نہ دیجیے کہ میں آپ کے ساتھ وہ کروں جو دلاور نہیں کرسکا۔"

"بھائی صاحب! میں نے یہی تو کہا ہے کہ تجویز اچھی ہے۔"

"تو پھر نام بتائیے۔ مثلاً کنٹرولر آف پروڈکشن۔" میں نے کہا۔

"یہ تو بڑی ادھوری سی بات ہوئی۔ کس چیز کی پروڈکشن؟"

"یہ سمجھنے والے کی مرضی ہے کہ وہ جس چیز کی پیداوار چاہے سمجھے۔ زرعی یا صنعتی پیداوار... فلم پروڈکشن، چائلڈ پروڈکشن۔" میں نے کہا۔

محسن ہنسا۔ "اچھا ہے مگر امپریس نہیں کرتا۔"

"اچھا... تو..." میں نے غور کرکے کہا۔ "ڈائریکٹوریٹ آف ڈائریکٹ ڈسپوزل۔"

محسن نے قہقہہ مارا۔ "زبردست، بہترین۔ یہ تو دل ہے۔ ایم آر ایس کا اہم یہی تو کرتے ہیں، براہ راست ہر معاملے کو نمٹاتے ہیں۔"

ایک فارغ بیٹھے ہوئے آدم بیزار پینٹر نے اس مائکروبس پر انگریزی حروف میں اس غیر موجود محکمے کا نام لکھنے کے سو روپے مانگے۔ وہ اپنے کام میں ماہر تھا اور اس کا ہاتھ بہت صاف چلتا تھا مگر خرابی یہ تھی کہ اس کی زبان کسے ... تیز تھی۔ وہ بات نہیں کرتا تھا، کاٹتا تھا اور رفتار بھی اسی لیے ... تھا۔ اس نے دونوں طرف چار انچ کے حروف لکھے اور آگے پیچھے کی نمبر پلیٹ پر ڈیڑھ انچ کے۔ یہ سارا کام اس نے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں مکمل کرلیا۔ یہ اسکیم ایک نفسیاتی چال ہی تھی جو ہمیں بہترین تحفظ فراہم کرسکتی تھی۔

کسی گاڑی پر سرکاری محکمے کا نام ہو تو وہ معتبر ہو جاتی ہے۔

"اب تو ہم ناکا بندی سے بھی گزر سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "شکریہ۔"

"وہاں کوئی سرکاری گاڑی میں کسی مجرم کا تصور ہی نہیں کرتا اور اگر اس میں خواتین ہوں تو دور سے پولیس افسر پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ ہوگی محکمے کے کسی اعلیٰ افسر کی فیملی۔" میں نے کہا۔

"اگر ہم میں سے ایک شوفر کی وردی بھی پہن لے تو کام پکا ہو جائے گا۔" محسن بولا۔

"وردی تو ریڈیمیڈ مل جائے گی تجھے ٹرپل سیون سے۔" میں نے کہا۔

"اب پہلے ٹیلی فون کرلیں۔" محسن نے کہا۔ "ایک کال بھی کروں گا۔"

"اپنی نصف بہتر کو..." میں نے کہا۔ "وہاں... ویسے تو ہم سرکاری ٹیلی فون پر میاں بیوی کو بھی عشق [illegible] ویسے لیکن خیال آتا ہے کہ آج تم کل ہماری باری ہے۔ اسی قانون میں رعایت کرتے ہیں۔"

"تو بھی آج رات پھر کوشش کرنا یار۔ آخر اللہ نے وہ نمبر دیا تھا تو کوئی وجہ ضرور ہوگی۔" محسن نے کہا۔

دلاور کو میں نے ہال کے قریب ایک بوتھ سے [illegible] کیا۔ میں سمجھا تھا کہ وہ اپنے سسرال میں ہوگا اور اس کی ضرورت آج ایک نہیں دو جنازے اٹھے ہوں گے، ظاہر ہے وہاں کی فضا سخت ماتمی ہوگی۔ ایک بچے نے ریسیور اٹھایا اور دلاور کو اطلاع دی۔

"کون بول رہا ہے؟" دلاور نے کہا۔

"وہ شخص جو جانتا ہے کہ تم نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔"

"تمہارے جاننے میں اور ڈیلک کے جاننے میں بہت فرق ہے۔ کوشش کرکے دیکھ لو۔" وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بولا۔ اس نے میرا نام ابھی نہیں لیا۔

"دوسری شادی کب رچا رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "کوئی دلہن تمہارے انتظار میں چشم براہ ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں تم کو ایک پتا بتانا چاہتا ہوں۔ اچھی طرح ذہن نشین کرلو کیونکہ میں دوبارہ فون نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔

"وہ... وہ کہاں ہے؟" اس نے عائشہ کا نام لینے سے گریز کیا اور آواز بھی کم رکھی، شاید اس گھر میں اور لوگ بھی آس پاس تھے جن کے سامنے وہ کھل کے بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔

اور یہ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔ میں نے اسے پتا سمجھا دیا۔ "دوبارہ سنو" [illegible] اور فون بند کر دیا۔ چشم تصور سے میں نے اسے بہرام [illegible] کے کھنڈر ویرانوں میں جاکے عائشہ کی لاش دریافت کرتے دیکھا۔ اس کی صورت کے رد عمل کو دیکھا۔ اس اذیت کو دیکھا جو اس سزا کا نتیجہ تھی اور میرے دل کو ایک کمینی سی طمانیت دینے والی خوشی ہوئی جیسے میں نے رابعہ کی ساری تذلیل اور اس کے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کا تھوڑا سا حساب برابر

رہا ہے۔"

یہ وقت شہلا سے بات کرنے کے لیے مناسب نہیں۔ محسن کا خیال تھا کہ براہ راست انکل رضوی سے لائن مل جائے گی۔ شہلا کو رات کے وقت بلانا آسان ہوگا جب انکل ڈنر کھانے کے بعد [illegible] میں جا چکے ہوں گے۔

"ہم مائکروبس کے کاغذات لے لیں۔" میں نے کہا۔ "اس نے چار بجے کا وقت دیا تھا۔"

"ڈاکٹر حسن نے ٹریڈر کا بندوبست کردیا تو کیا بات ہے۔"

"پیسے کے لالچ میں وہ خود چھپ گیا۔" میں نے کہا۔ "ہمیں [illegible] یہ لوگ کمیشن کی بنیاد پر [illegible] کرتے ہیں۔ اگر کسی دوسرے ڈیلر کے پاس ہماری مطلوب چیز ہوگی تو وہ ہمیں نہیں بھیجے گا۔ دوسرے ڈیلر کو ہمارا نام پتا بھی نہیں بتائے گا، یہی کہے گا کہ ہے ایک بیوقوف پارٹی... سودا فائنل کرے گا تو ہم سے رقم لے کر ادائیگی کرائے گا۔ دوسری پارٹی کو اپنے کمیشن سے غرض۔ بیچ میں اپنا منافع کھرا کرے گا۔ پچاس ہزار تو ضرور زیادہ ہی [illegible] کا ہم سے۔"

شوروم کا مالک ہمارے انتظار کی گھڑیاں ایسے گن رہا تھا جیسے فرقت زدہ عاشق لمحے گنتے ہیں۔ وہ لپک کر آیا اور [illegible] محسن سے ہاتھ ملا کے سینے پر رکھا۔

"مبارک... مبارک خان صاحب؟" وہ بولا۔ "مل گئی۔"

"اچھا... کیسی ہے؟" محسن بولا۔ "ہمارا مطلب ہے رنگ کیسا ہے؟"

"رنگ... رنگ سبز..."

"اور قد... وزن... عمر کیا ہے... کتنا پڑھی ہوئی ہے؟ ذات اور باپ..."

"جناب صاحب! یہ گاڑی کی بات کر رہا ہے، آپ کے رشتے کی نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تو یار معاف کرنا، اپنا جانی کا واسطے لڑکی بھی تلاش کر رہا ہے۔" بھائی صاحب کہا...

شوروم کے مالک کی صورت جو پرانے جوتے کی طرح ہوگئی تھی پھر سنبھل گئی۔ "جناب آپ چل کے ملاحظہ فرمائیں۔ آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ پارٹی ذرا اڑی ہوئی ہے۔"

"کون سا پارٹی؟ ام سب کا اڑی ٹھیک کر دے گا۔ لڑا پارٹی..."

"بھائی صاحب! یہ سیاسی پارٹی کا نہیں بول رہا۔" میں نے محسن کو ٹوکا۔ "معاف کرنا یارا، بھائی صاحب سیاست میں پھنس گیا ہے۔ جو نیا ہے ام وزیر بنے گا۔"

"جی... جی..." شوروم کا مالک بولا۔ "وہ ساڑھے چار

لاکھ مانگ رہے ہیں وہ... مگر ہم چار لاکھ سامنے رکھیں گے تو سودا ہو جائے گا۔ بیعانہ میں نے دے دیا ہے۔ آپ گاڑی تو ابھی دیکھ لیں مگر بات کل ہوگی۔"

"چلو مگر ام گاڑی کا کاغذ بنا لیے تم نے؟" میں نے کہا۔

"وہ... ہاں۔" اس نے ایک میز کی دراز کھینچی۔ "یہ دیکھیے سب کام مکمل کرالیا ایک ہی دن میں۔ رشوت تو دینا پڑی مجھے اپنی جیب سے مگر کوئی بات نہیں۔ کیا اب چلیں؟" میں نے سر ہلایا۔

وہ مائکروبس کے قریب آیا تو ٹھٹک کے رک گیا۔ "یہ ڈائریکٹوریٹ آف ڈائریکٹ ڈسپوزل؟" اس نے نام پڑھا۔ "یہ کون سا محکمہ ہے؟ میرا مطلب ہے کیا کرتا ہے؟"

"ڈائریکٹ ڈسپوزل۔" میں نے کہا۔ "کسی کا بھی ہو سکتا ہے۔ تمہارا بھی، ام ڈائریکٹ کرائے گا۔"

"جی؟" وہ گڑبڑا کے بولا اور پیچھے کا دروازہ گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

میں اور محسن شستہ پنجابی میں باتیں کرتے رہے۔ دلاور کے بارے میں کہ وہ عائشہ کی لاش اٹھاتے ہوئے کس قدر اپ سیٹ ہوگا اور ہمیں کیسی گالیاں دے گا اور خسرو جمشید کے بارے میں جس کی اکلوتی نازپروردہ فنکار مزاج کی مالک اور [illegible] میں لوٹ [illegible] جیسی بہن نے بھائی کے گناہوں کی بڑی بھاری قیمت ادا کی مگر کیا اس سانحے کے بعد اور حقائق سے آگاہی کے بعد وہ سراج سے شادی کرے گی؟

شوروم کا مالک بھونچکا بیٹھا رہا۔ اس کے پلے نہ ہم پڑ رہے تھے اور نہ ہماری زبان پڑ رہی تھی۔ اتنا تو وہ بھی جانتا ہوگا کہ یہ پشتو نہیں ہے اور لگتا ہے اس نے اندازہ کر لیا ہو کہ یہ فراڈ ہے۔ ہمارے پیسے کے علاوہ اسے میرے عہدے نے متاثر کیا تھا اور اب میری فراڈ [illegible]

"[illegible] تو پوچھوں؟" وہ بولا۔ "یہ آپ لوگ کس چیز کا ڈسپوزل کرتے ہیں گورنمنٹ آف [illegible] کیا؟"

"یہ آدمی بے وقوف ہے۔" محسن نے کہا۔

"بھائی صاحب بے وقوف نہیں جاہل ہے۔" میں نے کہا۔

"اس جاہل کو بولو چپ کرے ورنہ ام اس کا منہ بند کرے گا، ہر طرف سے۔" محسن بولا۔

ظاہر ہے اس کے بعد شوروم کے مالک کے بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی بے عزتی ہوئی تھی لیکن وہ عزت کے خلاف شور مچاتا تو اپنا سودا خراب کرتا۔ اس نے خود کو قائل کرلیا ہوگا کہ وہ بازار میں عزت کمانے کے لیے نہیں پیسہ کمانے کے لیے بیٹھا ہے۔ وہ بڑی افسردگی سے ہمیں ہدایات دے۔

www.paksociety.com

رہا۔ سلوا می باغ کے قریب اس نے ایک احاطے کے قریب گاڑی روک کر کہا۔ "یہ محسن گڈز فارورڈنگ ایجنسی کا آفس تھا۔"

"گاڑی اندر لے چلیں؟" اس نے کہا۔ "معلوم نہیں آج ان کا دفتر ابھی تک کیوں کھلا ہوا ہے؟"

"اگر ابھی بات کرنا ہے تو ہم ابھی پیسہ دے گا۔" محسن نے گاڑی کو گیٹ سے اندر لے جا کے ایک سائڈ پر کھڑا کر دیا۔ ٹریلر مجھے گاڑی کو گیٹ کی طرف موڑتے ہی نظر آ گیا تھا۔ دائیں ہاتھ پر بہت سے ٹرک ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ٹریلر بائیں جانب تھا۔ چالیس فٹ کا کنٹینر جس ٹریلر پر رکھا ہوا تھا، اس کے چیسس کے نیچے بارہ ٹائر تھے جو ہر پہیے میں دو ایک ساتھ لگائے گئے تھے۔ اس کا وزن سہارنے کے لیے ٹریلر کے تین پہیے ایک طرف تھے اور تین ہی دوسری طرف آگے پیچھے اور درمیان میں اس ... کا ایک طاقتور انجن کھینچتا تھا جس میں ڈرائیور کا کیبن ... سے آٹھ فٹ اوپر تھا۔ انجن اور کیبن کے نیچے ... ٹائر تھے کیونکہ اس پر کوئی وزن نہیں پڑتا تھا۔ ... یہ کارگو کنٹینر ساری دنیا میں بھاری ساز و سامان کی نقل و حرکت کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ٹریلر کے پیچھے چمکنے والے زرد اور سرخ رنگ کی لکیریں تھیں اور واضح حروف میں لکھا ہوا تھا "وارننگ ویہیکل: ہیوی لوڈ" ٹریلر برائے دوسرے ڈرائیوروں کے لیے تھی۔

میں نے اور محسن نے اُسے ہر طرف سے دیکھا اور پسند کیا۔ یہ بالکل آئیڈیل چیز تھی اور میرے پروگرام کی ضروریات کے عین مطابق بھی۔ اس کی حالت بھی اچھی تھی۔ اُسے بالکل نیا نہیں کہا جا سکتا تھا مگر اس کی دیکھ بھال صحیح طریقے سے کی گئی تھی۔ چنانچہ یہ باقی معاملہ ہو رہا تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والا شوروم کا مالک نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک پست قد اور گول مٹول شخص کے ساتھ نمودار ہوا جس کے چہرے پر چیچک کے پرانے داغ تھے۔

"یہ ہیں جی مالک!" شوروم کے مالک نے ہمیں متعارف کرایا۔ وہ غالباً ٹریلر کے مالک سے بات کر آیا تھا کہ ان بے وقوف نظر آنے والوں کو بے وقوف مت سمجھنا۔ یہ صرف پیسہ پھینکنے کے معاملے میں بے وقوف ہیں اور وہ بھی شاید اس لیے کہ پیسہ گورنمنٹ کا ہے۔

"ہم اس کو لے گا۔" میں نے کہا۔ "مگر ساڑھے چار لاکھ نہیں دے گا۔"

"چار لاکھ دے گا۔" محسن نے سر ہلایا۔

"... ظلم ہے جناب!" ٹریلر کے مالک نے شور مچایا۔

شروع کیا۔ "آپ چیز بھی تو دیکھیں۔ یہ کوئی ہر شوروم میں ملنے والی گاڑی نہیں ہے۔ میں تو شرط لگانے کو تیار ہوں کہ پورے لاہور میں یہ ایک ہی ہے۔"

"شرط لگانے گا؟" محسن نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ہم بھی شرط لگانے گا ایک لاکھ کا۔"

ٹریلر کا مالک گڑبڑا گیا۔ "وہ جناب... دیکھیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں غریب آدمی ایک لاکھ کی شرط کیسے لگا سکتا ہوں۔ وہ تو میرے منہ سے ایک بات ایسے ہی نکل گئی تھی۔ آپ ایسا کریں، سوا چار لاکھ کر لیں۔"

"ہم چار لاکھ دے گا۔" محسن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ابھی دے گا، نقد..." میں نے کہا۔

"دیکھیے خان صاحب! ہم معمولی لوگوں سے سودے نہیں کرتے اور جو چیز ہمارے پاس ملتی ہے وہ کسی کے پاس نہیں ملتی۔" ٹریلر کا مالک بولا۔ "آپ تو آدمی کو پہچانتے ہیں۔ آپ اتفاق سے پھر آئیں گے، ہمارے تو مستقل گاہک ہیں اور سب بڑے بڑے لوگ ہیں۔ مثلاً آپ ان کو دیکھیں، یہ بھی ہمارے پرانے گاہک ہیں، ان سے پوچھ لیں آپ ہمارے بارے میں۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ ایک کار سے استاد پیڈرو اُتر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بلڈاگ کی شکل والے ... تھے۔

ہم سے سو گز یا اس سے کچھ کم فاصلے پر وہاں تھا جہاں ٹرک کھڑے ہوئے تھے۔ محسن نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا اور پیڈرو نے اگر ہمیں دیکھا تو پہچانا نہیں تھا۔ ہم اُسے کئی ماہ کے وقفے سے دیکھ رہے تھے لیکن وہ اپنے اصل حلیے میں تھا۔ وہ جس کار سے اُترا تھا وہ مسٹی رنگ کی اور بالکل نئے ماڈل کی ٹویوٹا کرولا تھی۔ پیڈرو نے دروازہ بند کیا اور چابی گھماتا آفس میں چلا گیا۔

"یہ تمہارا ساتھ کب سے ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ تو ہمارے دیرینہ کرم فرما ہیں۔" گڈز فارورڈنگ ایجنسی کا ڈیلر بولا۔ "دراصل ہم گاڑیاں بیچتے نہیں۔ کبھی کوئی ٹرک پرانا ہو جائے، اس پر وقت کے اخراجات زیادہ آنے لگیں اور یہ راستوں پر بریک ڈاؤن زیادہ ہونے لگیں تو اُسے نکال دیتے ہیں۔ گاہک کے لیے تو وقت کی قیمت ہے جناب! جہاں سے مال بھیجا جانے اور وقت پر نہ پہنچے تو اس کا جہاز نکل جائے گا۔ آگے باہر کے کسی ملک کی پارٹی کے ساتھ جو معاہدہ ہے، وہ ختم ہو جائے گا اور وہ سارے نقصانات ہم سے وصول کرنے آ جائے گا۔"

"ایسا ہوتا ہے کبھی؟" میں نے کہا۔

"نہیں، ابھی تک تو نہیں ہوا۔" وہ بولا۔ "اللہ کا شکر ہے۔ یہاں کوئی ٹرک بھروسے کے قابل نہیں رہتا، اُسے بدل دیتے ہیں۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ایسے تو بہت نقصان ہوتا ہو گا۔"

"نہیں خان صاحب! نقصان ہو تو دھندا کیوں کریں؟" وہ بولا۔ "ٹرک بیچنے سے ختم نہیں ہوتا۔ اپنی لاگت نکال دیتا ہے۔ اس کے بعد جو دام قیمت پر کوئی لے، منافع ہے۔ یہ آدھی قیمت ہمارا منافع بن جاتی ہے اور اب آپ سے کیا پردہ، سب کام مل کے چلتا ہے۔"

"ہاں، اللہ کی مرضی شامل ہو تب۔" محسن نے سر ہلایا۔

"جی... ہاں... وہ تو خیر ہے... میرا مطلب تھا کہ بندوں کی مرضی بھی شامل ہوتی ہے۔" وہ خوشامد سے ہنسا۔ "سرکاری محکموں کے بابو کیسے بھی بیچ دیتے ہیں لوگ... یہ ان جیسے لوگ۔" پھر شوروم کے مالک کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ شوروم کے مالک کا رنگ فق ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم بھی سرکاری آدمی ہیں۔

میں نے حوصلہ افزا اور معاملہ فہم انداز میں مسکرایا۔ "ہم بھی سمجھتا ہے کہ ایسا ہوتا ہے، مگر یہ کیسے ہوتا ہے؟"

"نہیں جی، پُرانے ٹرک پر نیا رنگ روغن اور ڈینٹ پینٹ کرا کے اس کی نئی رجسٹریشن کرا دی، موٹر رجسٹریشن والے سے بات چیت ... باقی حکومت کو بیچا، اس کی چیز سو میں پڑتی تو کسی کا کیا گیا؟ باقی پچاس آدھے آدھے، ٹریلر کے اور خریدار کے۔"

"کوئی اس کو دیکھ کر پکڑتا نہیں ہوتا؟"

"وہ خان صاحب! نیا چمکتا ہوا رنگ ہو، نئی رجسٹریشن ہو اور افسر اسے نیا تسلیم کرے تو پھر کون کہے گا؟" وہ ہنسا۔

"اچھا تو کھڑی گاڑی کرائیں، بات کی۔" پھر شوروم کا مالک گھبرا کے بولا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سرکاری محکموں میں گھپلے کا موضوع مزید طویل ہو۔

"ہاں جی، تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔

"ایک سو ٹیک لے گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی بولو، ہم قیمت ادا کرے گا، نقد..."

"نقد... رجسٹریشن... تو آپ نے دے دیا۔ ٹریلر خریدنے والے ملک کا جو ہو، آپ کی ہو گئی۔ بہتر ہے آپ ادائیگی صبح کر دیں، ہم اس کو اتنی کہاں رکھیں گے؟"

"تو ہم بھی تو صبح آئے گا۔" محسن بولا۔

"وہ... دراصل کسی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ مالک کو وقت پر پیمنٹ نہیں..." وہ بولا۔ "رقم وہی لیتے ہیں اور رسید بھی دیں گے۔"

"اچھا، اچھا!" میں نے سر ہلایا۔ "ہم صبح آئے گا۔ ایک بات اور!"

"فرمائیے!"

"یہ ٹریلر گاڑی لگتا ہے۔ جو ہم خریدا اسے ... معلوم ہوتا جب ... تو ہم اس کو ..." میں نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ خان صاحب! یہ وہ عام قسم کا ٹرک نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے کام کا بھی نہیں، ورنہ ہم رکھ لیتے۔" وہ بولا۔ "آپ سے کیا چھپانا، ہم نہیں گڑی اور بیچ رہا ہے، وہ ادھر والوں سے کرایا تھا، یہاں اُسے کہیں اور جانا تھا۔"

"وہ اس ٹریلر کو یہاں چھوڑ گیا۔" ہمارے ساتھ آنے والے شوروم کے مالک نے کہا۔ "اُسے اپنے مال کی قیمت تو مل ہی گئی تھی اور اس ٹریلر کو بھی بیچ گیا۔ گڈز فارورڈنگ ایجنسی کے مالک نے نقد رقم دے کر لیا تھا۔"

"مگر یہ ہوتا کہ اس کا مطلب کا نہیں تو پھر کیوں لیا؟"

"بس اس لیے کہ کوئی پارٹی مل جائے گی تو چار پیسے منافع میں بک جائے گا۔"

"وہ تو ہوئی۔" محسن بولا۔ "صرف چار پیسے منافع! تم دیکھا بڑا ہو گا، اس نے ٹرک تین لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے روپے ننانوے پیسے میں خریدا، چار لاکھ میں ہم کو دیا۔"

"بھائی صاحب! یہ محاورے کی بات تھی۔" میں نے کہا۔ "اس کا مطلب تھا تھوڑا سا منافع اور تھوڑا کا مطلب بہت ہوتا ہے۔"

محسن نے تعجب سے سر ہلایا۔ "تھوڑا کا مطلب بہت؟"

ساری بات اب میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ کمپنی کے مالک نے دیکھا کہ ٹریلر میں سامان لانے والا مجبور ہے اور اب ٹریلر کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تو اس نے اونے پونے خرید لیا۔ اتنا بڑا ٹریلر بہت سست رفتار ہوتا ہے اور قومی شاہراہ پر عام قسم کے مال کی نقل و حمل میں استعمال نہیں ہو سکتا۔ مخصوص قسم کا سامان مثلاً بھاری مشینری جسے دھوپ اور بارش سے بچا کے لے جانا مقصود ہو، وہی اس ٹریلر پر جا سکتی تھی اور ایسا سامان روز نہیں ملتا۔ جو کمپنیاں یہ کام کرتی ہیں، ان کے پاس پہلے سے اپنے ٹریلر ہیں۔ سو ان لوگوں سے یہ ٹریلر چار لاکھ میں کیوں لینے لگے؟ وہ ہم جیسے کسی احمق کے منتظر تھے۔

جب ہم واپس آ رہے تھے تو میں عمداً آفس سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ "اس کا کیا نام ہے؟" میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "جس کا یہ کاروبار ہے؟"

"نام... نام تو ہم نہیں جانتے، ہم منیجر صاحب بولتے ہیں۔" گڈز فارورڈنگ ایجنسی والے نے کہا۔ "ایک کمپنی کا منیجر ہے۔"

"کس چیز کا کمپنی ہے؟ کیا بیچتا ہے؟"

"وہ کچھ مشینوں کے پرزے وغیرہ کراچی بھیجتے ہیں۔" وہ بولا۔

"کیا تم دیکھتے ہو..." میں کہنے والا تھا مگر پھر اس خیال سے چپ ہو گیا کہ کہیں ہمارے کریدنے سے وہ خواہ مخواہ شک میں نہ پڑ جائے اور پیڈرو سے نہ کہہ دے کہ دو پٹھان اس کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ پیڈرو تو ایسا چور تھا

www.paksociety.com

جس کی وادیوں میں سنگتے رہ سکتے تھے۔ وہ فوراً کھٹک جاتا اور یہ جاننے کی کوشش ضرور کرتا کہ اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے والے کون تھے!

کوئی اور بات ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پیڈرو اچانک آفس سے نکلا اور سیدھا اپنی کار کی طرف گیا۔ کار کا نمبر میں نوٹ کر چکا تھا۔ جب وہ گاڑی کو گھما کے گیٹ سے باہر لے گیا تو ہم نے آہستہ آہستہ آفس کی طرف قدم بڑھائے۔

"ہم اس کا سارا کاغذات دیکھے گا۔" میں نے کہا۔

"ضرور دیکھیں۔ ہم کوئی فراڈ تھوڑی کر رہے ہیں۔ بیاز اس میں بیٹھے ہیں، چار لاکھ لے کر کہیں نہیں جا سکتے۔" وہ تقریباً برا مان کے بولا۔ "اور یہ تو واضح ہے چوری کی کار بک سکتی ہے۔ آسانی سے براہ راست کوئی بیچ سکتا ہے اور خرید کے رکھ سکتا ہے۔"

"اور یا مستقل کہو۔ ان کی آٹو بولی تو بہت ہے۔" شو روم کا مالک حاجی آگے بولا۔

آفس ایک بیرک نما گودام کی عمارت تھی جس میں ڈیزل کی بو بسی ہوئی تھی۔ فرش اور دیواروں پر بھی چکنائی کی تہ ڈیزل کے رنگ کی محسوس ہوتی تھی۔ اصل دفتر صرف دو کمروں کا نام تھا۔ باقی کمروں میں شاید فاضل پارٹز اور اسٹور تھے یا ڈرائیوروں کے قیام کا انتظام تھا۔ آفس بھی کوئی صاف ستھری جگہ نہیں تھی۔ ایک کونے میں وہ ہم جیسے حلیے کے لوگ میزوں پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھے تھے اور ٹرانسپورٹ حضرات کے تمام عملے سے الجھ رہے تھے۔ ان کے درمیان والدہ اور ہمشیرہ کے رشتوں کو ادھیڑ کے بات کرنا بے تکلفی اور دوستی کی علامت تھا۔ کچھ ڈرائیور آئے تھے اور حساب دینا چاہتے تھے۔ وہ ایک ٹیبل کے گرد شور و غوغا کر رہے تھے۔ چرس کی سگریٹیں پی رہے تھے اور فحش مذاق کرتے ہوئے زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ دوسری ٹیبل کے گرد روانہ ہونے والے جمع تھے اور منظر وہاں بھی یہی تھا۔ بابو یا منشی کاغذی کارروائی میں بڑی پھرتی دکھا رہے تھے۔ وہ دیواروں کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے تختوں پر ڈھیر کی صورت میں رکھے ہوئے رجسٹروں اور لیجروں میں سے ایک اٹھاتے تھے تو دوسرا رکھ دیتے تھے۔ غالباً ہر ٹرک کی آمد و رفت کا حساب ایک الگ رجسٹر میں تھا کیونکہ مجھے ایک پرانے رجسٹر پر نمبر نظر آیا تھا۔

ہمیں جس کمرے میں تشریف رکھنے کو کہا گیا وہ غالباً سیٹھ کا کمرا تھا۔ اس میں ایک ہی بڑی میز تھی جس پر دو فون رکھے ہوئے تھے۔ کاغذات اور پرانے اخبار پڑے تھے اور کسی گاڑی کے پسٹن سے بنائی ہوئی ایک ایش ٹرے رکھی ہوئی تھی۔ گلاس کی اس میز کے داغ ظاہر کرتے تھے کہ چائے پینے کے علاوہ اس پر کھانا بھی کھایا جاتا ہے اگر رات کو سونے کے کام آتی ہو تو

کوئی تعجب نہیں، میں نے اس کی وسعت پر غور کر کے سوچا۔ میز کے گرد بید سے بنی ہوئی پرانی کرسیاں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی تھیں۔ بے رنگ، میلی دیواروں کے کونوں میں اوپر سے نیچے تک جالے آویزاں تھے اور اس کی تمنا ایک فٹ کو ایک ٹیوب لائٹ روشن کرنے میں ناکام تھی کیونکہ ٹیوب کی اوپری سطح گرد اور مکھیوں کی غلاظت سے تقریباً سیاہ پڑ چکی تھی۔ مجھے ان چمکتے دمکتے ڈالر والے کارپٹ والے ائیرکنڈیشنڈ دفاتر کا خیال آیا جہاں باس قسم کے لوگ بہترین سوٹ اور ٹائیوں میں گھومنے والی کرسیوں پر بیٹھ کے خوش شکل اور خوش لباس سیکرٹریوں سے انٹرکام پر بات کرتے ہیں۔ یہ مختلف نوعیت کا کاروبار تھا جس میں صفائی رکھنا مطلقاً ناممکن تھا۔

ہمیں اندر لانے والے شخص نے ہمارے لیے چائے کا آرڈر دیا اور خود ایک فائل نکال لایا۔ میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ٹریلر کسی غیر ملکی کمپنی کا تھا جو یورپ سے خشکی کے راستے کچھ سامان لے کر کراچی پہنچا تھا لیکن مگر اس بار سامان کراچی میں نہیں اتارا گیا بلکہ سیدھا لاہور بھیج دیا گیا۔ یہاں کمپنی کے لوکل ایجنٹ نے ٹریلر کو فروخت کرنے کے معاملات طے کیے اور اب ٹریلر بالکل جائز اور قانونی طور پر گڈز فارورڈنگ ایجنسی کی ملکیت تھا اور وہ اس کو بیچنے کا اور ہمارے نام پر ٹرانسفر کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ یورپ کی کارگو کنٹینر سروس کا لوکل آفس کراچی کا ایک کلیئرنگ ایجنٹ تھا۔ ان کاغذات میں سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ یورپ کے کس ملک سے کتنی بار سامان آیا، کس کے نام آیا اور وہ سامان کیا تھا مگر یہ معلومات کراچی کے اس کلیئرنگ ایجنٹ سے حاصل کی جا سکتی تھیں۔ اس کا نام پتا قانونی دستاویز کی صورت میں فائل کا حصہ تھا اور یہ فائل ٹرانسفر ہو کے ہمارے پاس ہی آنا تھی چنانچہ میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔

چائے آنے تک ہمیں فرصت کے چند منٹ میسر تھے۔ جب فائل ہمارے حوالے کرنے والا دوسرے کمرے میں کوئی تنازعہ طے کرنے گیا جس نے نقص امن کا اندیشہ پیدا کر دیا تھا۔

"عزیزم! آپ نے استاد کی یہاں موجودگی کا کیا مطلب نکالا؟" میں نے پیڈرو کا نام لینے سے گریز کرتے ہوئے فرنچ میں کہا۔ شو روم کا مالک چونکا نہیں کیونکہ وہ ہمیں یہ عبرانی، لاطینی قسم کی بولی بولتے سن چکا تھا۔

"یہ لوگ اس کمپنی کے ذریعے ہی اسمگل کرتے ہیں۔" محسن نے [illegible] پیتے ہوئے کہا۔

"کیا ہم ان ٹرکوں کے نمبر حاصل نہیں کر سکتے جن پر کراچی تک مال بھیجا گیا ہے؟"

"اس سے کیا فائدہ؟ وہ مال تو نکل گیا۔" محسن نے کہا۔

"بات اس مال کی نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ معلوم ہو جائے گا کہ کس کس ٹرک کو اس غیر قانونی کاروبار میں استعمال کیا گیا۔ میں ایک پتے کی بات عرض کرتا ہوں۔ ہر ٹرک ڈرائیور آنکھیں بند کر کے ہر قسم کا مال نہیں لے جاتا ہوگا۔ پھر ٹرک ڈرائیور بھی دیکھتے ہیں کہ کیا بھیجا جا رہا ہے اور کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ راستے میں چیکنگ ہو تو وہ دھر لیے جائیں۔"

"ان لوگوں کی چیکنگ کیا فرشتے کریں گے۔ جو کر سکتے ہیں وہ تو پہلے ہی ان کی جیب میں سگنل ہاتھ میں رکھتے ہیں۔" محسن بولا۔

"فرض کرو مال حرام کمانے والوں میں ٹھن جاتی ہے، کوئی مخبری کر دیتا ہے یا کوئی پیچھے لگ جاتا ہے۔ کوئی خبطی قسم کا صحافی یا ایماندار افسر جو نیا آیا ہو۔" میں نے کہا۔ "اگر ٹرک ڈرائیور پکڑا جائے تو کیا مالک تسلیم کر لیں گے کہ یہ مال انھوں نے دیا تھا؟ نہیں، وہ صاف کہیں گے کہ بدمعاش ڈرائیور نے خود لوڈ کیا ہوگا، ہم نے تو کدو لوڈ کر کے دیے تھے۔ یہ بات ڈرائیور بھی سمجھتے ہیں۔ سب ڈرائیور حرام کھانے والے اور غلط کام کرنے والے نہیں ہوتے۔ وہ صرف مزدوری کرتے ہیں۔ اسمگلنگ نہیں مگر پھر بڑے شوق سے ناجائز کام کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگ ہوں گے جو ہمارے شکاری دوستوں کے منظورِ نظر ہوں گے۔ ان کے ٹرک بھی مخصوص ہوں گے۔ عام طور پر ایک ڈرائیور کسی کمپنی کا ایک ہی ٹرک چلاتا ہے۔ اسے ہر روز نیا ٹرک نہیں دیا جاتا۔ وجہ صاف ظاہر ہے جو ڈرائیور کسی ایک ٹرک کو چلاتا ہے وہ اس کی رگ رگ سے واقف ہو جاتا ہے اور کسی حد تک اس سے ایک جذباتی وابستگی رکھتا ہے۔ دوسرے ڈرائیوروں سے کچھ حسد اور چپقلش چلتی ہے۔ وہ کہتے ہیں میرا ٹرک شیر ہے، تیرا ٹرک گیدڑ ہے، مقابلہ کرے گا؟ دوسرا کہے گا کہ میرا راکٹ ہے، راکٹ۔ تیسرا اسے چھو بھی نہیں سکے گا اور ایسا ہی پتا کے ہیں رکھے گا۔ اس میں رنجش کوئی نہیں ہوتی۔ یہ ایک دوستانہ قسم کا مقابلہ ہے جو جاری رہتا ہے محض دلچسپی کے لیے۔"

"میں کو، اب مفہوم سب سمجھ گیا۔" محسن نے کہا۔ "اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ کون کون سے ٹرک بہادر اینڈ کمپنی استعمال کرتی رہی ہے تو ہم خاصے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آئندہ بھی وہ انھی ٹرک ڈرائیوروں پر اور ان کے ٹرکوں پر بھروسا کریں گے اور ہمیں تفصیلات حاصل ہو جائیں تو ہم یہاں سے کراچی تک قومی شاہراہ سے گزرنے والے ہر ٹرک پر نگاہ رکھ سکتے ہیں۔ وہ اس کی منزل بھی بدل سکتے ہیں۔"

"آپ سمجھ گئے۔ خدا آپ سے سمجھے۔" میں نے کہا۔ "اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تفصیلات کیسے حاصل ہوں؟"

"اس کے دو طریقے ہیں۔ زر سے یا زور سے۔"

"ہاں جی، دیکھ لیے آپ نے کاغذات؟" گڈز کمپنی والا جھگڑا ختم کر کے لوٹ آیا۔ "اطمینان ہو گیا آپ کا؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہم صبح آئے گا۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام؟ نام تو معتصم ہے۔ پورا نام اس سے بھی زیادہ مشکل ہے جو ابا جی نے رکھا تھا۔ معتصم احتشام۔ ان کا اپنا نام احتشام تھا۔ یہاں لوگ چکری کہتے ہیں۔ یہی مشہور ہے۔"

"چکری؟ خوب یارا! اچھا نام ہے۔" محسن بولا۔ "وہ کیا بولا تم؟ صورت سے شام؟"

"وہ چھوڑو جی! آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔" چکری ہنسنے لگا۔

"اچھا ہم چلتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم ادھر کا فون نمبر دیا تو ہم صبح آنے سے پہلے فون کر کے آئے گا۔"

"وہ جناب خان صاحب! آپ کو میں لے کر آؤں گا۔" شو روم کا مالک بولا۔ "میرے ذریعے یہ سودا ہو رہا ہے۔ آپ میرے پاس تشریف لائیں۔"

"ہاں یارا! ہم ادھر آ جائے گا۔" میں نے کہا مگر اتنی دیر میں چکری مجھے کمپنی کا کارڈ تھما چکا تھا اور اب شو روم والے کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کارڈ میرے ہاتھ سے چھینے۔ وہ ہمیں براہ راست پارٹی سے ملوا کے پچھتا رہا تھا۔ اسے اندیشہ لاحق ہو رہا تھا کہ اس کا کمیشن مارا جائے گا۔ ہم براہ راست چکری سے سودا کر لیں گے اور جیسا کہ نام سے ظاہر تھا، چکری کوئی چکرباز تھا ورنہ اس کا نام شیطان کی طرح نہ پڑتا۔

ہم باہر آئے تو شو روم کا مالک فوراً ادھر پیچھے پڑ گیا۔ "جناب خان صاحب! میرے کمیشن کا خیال کریں۔ میں نے تو آپ پر بھروسا کیا اور یہاں لے آیا مگر یہ چکری بڑا شیطان ہے۔ سب کے پیٹ پر لات مارتا ہے۔"

"تم اس کو دو لات مارو۔" محسن نے اس کو مشورہ دیا۔ "وہ تمہارا کیوں لے رہا؟ ایسا لات مارو کہ تشریف سہلاتا رہ جائے۔"

میں نے محسن کو بڑی مشکل سے روکا۔ "بھائی صاحب! یہ محاورہ تھا۔ مطلب یہ کہ چکری دوسروں کا حق چھینتا ہے۔"

"خو یارا! ہم اس محاورہ سے بور ہو گیا۔ تنگ ہے۔" محسن نے کہا۔

"خو تم تکرار مت کرو یارا!" میں نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ اس کا کندھا پہلے بھی میری بے تکلفی کا نشانہ بن چکا تھا۔ اس نے بے اختیار دانت کی کی۔ "ہم

www.paksociety.com

تمہارا پاس آنے لگا تو تم کو پیسہ دے گا۔"

"بڑی مہربانی جناب کی" وہ بولا لیکن اس کی صورت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب بھی وہ مطمئن نہیں ہے۔ اگر اس کے پاس قدر رقم ہوتی تو وہ ٹرک ضرور خرید لیتا۔ دو چار نہیں مُنہ مانگی قیمت پر بیچ دیتا لیکن مجبوری یہ تھی کہ ٹرک دوسری پارٹی کے پاس تھا اور ہم دیکھے بغیر قیمت دینے پر رضامند نہ تھے۔ کار ہوتی تو وہ دکھانے کے پیسے لے آتا۔ مگر ٹرک کو لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہم اس سے رخصت ہوئے تو شام بہت پہلے ڈھل چکی تھی اور رات اُتر رہی تھی۔ ریل سے اور محسن نے گاڑی کو ریگل کے قریب کھڑا کیا اور بہت مدت کے بعد شیزان میں قدم رکھا۔ اعلیٰ قسم کی کافی پیتے ہوئے ہمیں اپنی موجودہ زندگی کی سختی اور آزمائش کے قدر کی بھرکنا سالوالت کا شدت سے احساس ہوا۔ ہم دونوں آسودگی کے خمار میں چپ بیٹھے رہے۔

پھر محسن نے ایک سرد آہ بھری۔ "معلوم نہیں وہ دن کب آئے گا؟"

"اور وہ رات کب آئے گی؟" میں نے زیادہ سرد آہ بھر کے کہا۔

"جب میں تجھے فون کرکے کہوں گا کہ سکندر! شام کو تم لوگ کیا کر رہے ہو؟ پھر میں کہوں گا کہ یار شرم آنا چاہیے تجھے کہ آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے اور تم تحفے دیے جاؤ اور تو جشن کرا دو گا ل دے کر کے گا کہ ہم قبول کیسے سکتے ہیں۔ ہم تو سرپرائز دینے والے تھے اور میں کہوں گا کہ سرپرائز تو ہم دے رہے ہیں۔ رابعہ بھابی کے ساتھ لاؤنج میں آ جاؤ۔ چائے پئیں گے پھر الحمرا میں ڈراما چل رہا ہے، وہ دیکھیں گے اور اس کے بعد ڈنر ہماری طرف سے۔۔۔ اور دیکھو گنٹ نہیں لاؤ گے تو لارڈز کے باہر کھڑے رہ جاؤ گے چائے تک بھی نہیں ملے گا۔"

"اور اس کے جواب میں رابعہ سے کہوں گا کہ معلوم ہے کس کا فون تھا؟" میں نے خواب کا دوسرا حصہ شروع کیا۔ "وہ جشن کر کے گی محسن بھائی کے سوا کس کا ہو سکتا ہے۔ آج ان کی شادی کی سالگرہ ہے نا۔ میں نے شہلا کو سرپرائز دینے کا سوچا تھا اور میں کہوں گا کہ اچھا اب تیار ہو جاؤ۔ وہی نیلی آسمان کے رنگ کی اور ستاروں کی افشاں والی ساڑی۔ اور رابعہ کہے گی کہ صرف آپ کی خاطر کچھ اچھا ہی نہیں لگتا اور میں کہوں گا اچھا تو تم پر سب کچھ لگتا ہے کیونکہ مجھے تم اچھی لگتی ہو مگر یہ آسمانی ساڑی اور زرد پھول میرے ماضی کی سب سے خوبصورت یادوں کا گلستان ہیں۔ اُس وقت جب میں حالات کی کڑی دھوپ میں وقت کے بے سمت صحرا میں آبلہ پا چل رہا تھا تو یہی پھول

تسکین قلب و نظر کا سامان تھے اور یہی آسمان کا رنگ میرا غم ساز تھا اور پھر جب وہ رنگ خانۂ دل میں جلوہ گر ہوا اور شرمیلی سی اپنی حیا کی نقاب آلود مسکراہٹ سجائے خوشبو کی سفیر بن کے میرے سامنے آ گئی تو میں شہرِ طلسمات کے مسافر کی طرح پتھر ہو جاؤں گا" اور وہ شروع کرے گی کہ اب چلیے بھی۔۔۔"

"اور جب ہم اپنی چمکتی دمکتی کار سے لارڈز کے سامنے اتریں گے تو ہم اپنی کار سے اُتر رہے ہوں گے، میں اور شہلا سب لوگ ہمیں رشک سے دیکھ رہے ہوں گے۔ اشاروں اشاروں میں کہہ رہے ہوں گے، یہ وہی ہیں، محسن اور سکندر۔" محسن نے کافی کے خالی کپ میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کافی اور بالوں صاحب" ویٹر نے یوں کہا کہ ہمارے سپنے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔

"کافی۔۔۔ ہاں، لے آؤ" میں نے کہا۔ "مجھے سے غرض فقط سہلے کس زرد سیاہ کو۔۔۔ کافی لاؤ۔ کھول لکر کھتی ایام میں امروز کا ۔۔۔"

"جی" ویٹر جو کھلا گیا۔

"کچھ نہیں" میں نے کہا "میں تم سے نہیں کہہ رہا تھا۔"

"معلوم نہیں ایسے خواب رات کو کیوں دکھائی نہیں دیتے؟" محسن بولا۔

"اگر ہم ایسے خواب دیکھ کر جاگے تو سخت فرسٹریشن کا شکار رہیں گے۔ چنانچہ ہمارا دماغ ہمیں بے خواب نیند دیتا ہے تاکہ ہم صرف آرام کے لیے سوئیں۔" میں نے کہا۔

"میں اس وقت چکری کی بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میں شہلا کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس سے رات کو بات کرنا۔" میں نے کہا۔ "چکری سے بات نہ کی تو یہ ایک کامیابی کے راستے کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہو گا۔ صرف اس لیے کہ ہم خواب کے راستوں کی باتوں میں گم تھے میں اُسے فون کر رہا ہوں۔"

میں اُٹھ کر کاؤنٹر تک گیا۔ کارڈ میرے پاس تھا۔ میں نے ریسپشنسٹ سے اجازت لے کر نمبر ملایا تو چکری بھائی سے بات کرنے کا۔

"چکری۔۔۔ بلانا اس نے فون پر کسی نے کہا اور چلایا۔ "او۔۔۔ چکری! تیرے سوہنے وا فون ہے جی!"

میں چکری کا سوہنا یعنی سُسر نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا مگر پھر بھی میں نے اس عزت افزائی کا بُرا نہیں مانا اور نہ کچھ کہہ سکتا تھا۔

"ہاں جی، کون ہے؟" چکری نے ایک منٹ بعد کہا۔

"میں ہوں چکری بھائی! تمہارا دوست۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا میں سمجھ گیا، خیریت ہے نا جناب؟"

"ہاں یار، ایک دم سب خیریت ہے۔ ابھی تم کیا کرتا ہے؟"

نے کہا۔

"نہیں۔۔۔ کچھ نہیں، ابھی تو بس روز کا کام ہے۔"

"تم ادھر آؤ ہم سے ملنے کا واسطے آ سکتا ہے؟ تھوڑا کام اگر ملنے کا واسطے آوے تو تم باہر مل سکتا ہے۔ ہم کو تم سے ملنے کا۔۔۔ پہلے بتاؤ بات کیا ہے؟" وہ متشبہ ہو کر بولا۔

"بات تمہارا فائدہ کا ہے۔ بہت فائدہ ہو سکتا ہے تم کو۔۔۔ بیس ہزار کا۔" میں نے کہا۔ "تم ایک کام کرے گا؟"

"خان صاحب! آپ کہیں کر رہی ہیں۔۔۔ تو یہ کام بیس ہزار میں مشکل ہے۔"

"میں ہنسا۔ "مانا تم کیا بولتا ہے۔ ہم ایسا کام بولے گا تیرے واسطے آسان کام ہے یار۔ ابھی ہم آ رہے ہیں ادھر گھنٹا میں۔۔۔ ادھر اگاڑی دیکھنا ہے۔ ہم باہر انتظار کرے گا۔ کیسی کو بات بولنا کہ ہم نے فون کیا تھا اور کیا بات بولا تھا۔"

"ٹھیک ہے جی" چکری نے کہا۔ "کرنے کا کام ہو گا تو ضرور کرے گا۔ یار پیسہ کمانے کے لیے ہی تو ہم خوار ہیں۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

میں اور محسن لوٹ کر وہاں پہنچے ہی تھے کہ وہ آ گیا۔ ہم بیس منٹ میں پہنچ گئے تھے لیکن بیس ہزار کی رقم کے خیال نے اس کو بدحواس اور مضطرب کر دیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا قریب آیا۔

"دوڑ کیوں لیے مارا؟ اندر بیٹھو۔ ہم تم کو خوراک کے نہیں لے جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اندر بیٹھو، پھر بات کرے گا۔" محسن نے کہا اور وہ اندر بیٹھ گیا۔

"ہم کون ہے؟ تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا۔

"آپ حفاظت والے نہیں ہوں گے اگر میں سچ بولوں؟"

"نہیں، تم بولے گا کہ ہم پیٹ کا بچہ ہے تب بھی ہم ناراض نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "بولو، تم کیا سمجھتا ہے ہم کو؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ لوگ اسمگلر ہیں۔" چکری نے کہا۔ "اور یہ اتنا بڑا ٹرک جس اسی کام کے لیے خرید رہے ہیں۔ وہ بھی اسمگلنگ کا جس کا بہترین تھا۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ "جس کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ چکری اچھا آدمی ہے۔۔۔" محسن نے کہا۔

"مگر خان صاحب! آپ چاہتے ہیں کہ میں اسمگلنگ کا مال ادھر لانا۔ آپ کا ساتھ دوں یا مدد کروں تو آپ کی تو میں نہیں کروں گا۔"

"چکری بہت اچھا آدمی ہے۔" دوسری بار محسن

ہنسے کہا۔

"چکری کنفیوز ہو گیا ہے۔ آخر آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

"چکری! تم کو ادھر کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟" میں نے اچانک پوچھا۔ "لیجیے بولو یا ملازم ہو یہاں؟"

"چکری کا دم نکلو گیا تو آپ۔۔۔ آپ پٹھان نہیں ہیں؟"

"میں ہنسا۔ "میرے پٹھان یا پنجابی، سندھی یا بلوچی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے چکری؟ یہ بتاؤ میں بچکر کیسا ہوں؟"

"ایک شریف۔۔۔ خوش دل۔۔۔ ایک فقیر۔۔۔ اور آپ؟" وہ محسن کی طرف دیکھ کے بولا۔ "آپ بھی۔۔۔"

"بول نہ میں بھی؟" محسن نے مسکرا کے کہا۔ "چور کا بھائی گرہ کٹ۔"

"چکری! ہم خود بھی چکر باز ہیں اور ہم دنیا کی وجہ سے چکر میں ہیں۔ تو دنیا ہماری وجہ سے چکر میں ہے۔" میں نے کہا۔ "چکر کیا ہے یہ ہم نہیں بتا سکتے مگر تم تو خود چکری ہو۔ یہ بتاؤ اس کمپنی میں ملازمت کرتے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

اس نے خود کو سنبھال کے اور بہت سنبھل کے جواب دیا۔ "ہو گئے ہیں کوئی چار سال۔ پہلے ڈرائیور تھا۔"

"اور اب کیا ہو؟" میں نے کہا۔

"اب۔۔۔ آپ نے تو دیکھا۔ اوپر کے سارے کام کرتا ہوں۔ منیجر اسی منشی۔۔۔ سیکریٹری۔۔۔ مینیجر۔۔۔ کچھ بھی کہہ لیں آپ۔ مالک بھروسا کرتے ہیں مجھ پر۔" وہ بولا۔

"ڈرائیوری کیوں چھوڑ دی تھی؟"

"وہ۔۔۔ بس چھوڑ دی۔" وہ بولا۔ "غلط کام نہیں کر سکتا تھا میں۔ میرا ایمان میرے بس کی نہیں تھی۔ جو دوسرے ڈرائیور کر لیتے ہیں۔" وہ بولا۔

"کیسی ہیرا پھیری، کیسے غلط کام؟"

"جی۔۔۔ مالک کا مال کم کر لیا۔ اُدھر کا مال یہاں لے آئے۔ کبھی مالکوں کی مرضی سے کبھی انھیں بتائے بغیر۔" وہ بولا۔ "کبھی پولیس راستے میں پکڑ لیتی تھی تو خرچہ اور گیا ان کا۔ ان کا بھی ٹرک والا میں شامل۔ میں نے کہا جی کہ میرے باپ کا تو یہ ٹرک نہیں چلا سکتا جلنے یہ سب نہیں کر سکتا۔ دوسرے مجھے سمجھاتے تھے کہ پاگل ہوا ہے۔ خالی تنخواہ سے کیا کرے گا۔ ہر پھیرے میں کسی کا مال لے چلے چرس۔۔۔ سونا۔۔۔ اسلحہ۔۔۔ دو چار سال میں اپنا ٹرک خرید لے گا۔ مگر ہوا یہی کہ دو چار سال میں ٹرک پینے والے دو چار سال کے لیے اندر گئے اور مالکوں نے ان کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔"

"پھر تم کو لوگ چکری کیوں کہتے ہیں؟"

"اس لیے کہ وہ خود چکر باز ہیں۔" اس نے بے ساختگی سے کہا۔ "پھر یہ کہ سب کو پتہ ہے کہ تھا کہ میں ان کی شکایت کر دیتا ہوں۔ مالک خود اسی چکر میں رہتے تھے۔ انھوں نے مجھے [illegible]

www.paksociety.com

سے ہٹا لیا اور اپنے ساتھ رکھ لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ شریف اور ایماندار آدمی ڈرائیور تو نہیں ہو سکتا مگر یہاں سارے معاملات ایمانداری سے سنبھال لے تو ان کی بہت سی فکریں دور ہو سکتی ہیں۔

"اور تم ایسے مالکوں کے ساتھ خوش ہو؟"

"خوشی... خوشی کیا جی، نوکری تو مجبوری کا نام ہے۔ پیٹ بڑا کافر ہے جی، مگر پیٹ بھر جاتا ہے تو نظر بے ایمان ہو جاتی ہے، ادھر ادھر بھٹکتی ہے، کبھی مال پر، کبھی عورت پر، کبھی شراب پر، یہ سب مل جائے تو ایمان جاتا ہے، دنیا ملتی ہے تو آخرت جاتی ہے۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا، وہ جاہل اور بظاہر بدنظر دکھنے والا ایک قلندر تھا۔ بڑے صوفی کی بات کی، نفس امارہ کو گرا دینا بات کہنی آسان ہے مگر عملی شکل... یہاں ایک شخص تھا جو اندر کی مضبوطی لئے ایمان کی طاقت سے اور ذہنیت سے ساری نفسانی خواہشوں کے خلاف ڈٹا ہوا تھا۔ بے ایمان اور زر پرست لوگوں کے درمیان رہ کے بے داغ تھا۔ وہ کیچڑ میں اگا ہوا پھول تھا جس نے اپنے وجود کی خوبصورتی کو بچا کے رکھا ہوا تھا اور وہ اس بات سے بے نیاز تھا کہ اس کے آس پاس غلاظت ہے اور ایسے بدزبان اور بدنیت اور بدخواہ لوگ پھول نہیں کانٹا سمجھتے ہیں۔ اسے تقدیر سے بھی گلہ نہیں تھا کہ اسے کس گلشن میں کھلنا تھا۔

"چکری! تم کو یہاں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟" میں نے کہا۔

"پچیس سو۔" اس نے روانی سے کہا۔

"فرض کرو ہم تمہیں دگنی تنخواہ دیں..."

وہ نفی میں سر ہلانے لگا تو میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں آپ کے کام نہیں آ سکتا۔"

"چکری، اگر ہم کہیں کہ تم نے غلط سمجھا تھا، ہم اسمگلر نہیں ہیں اور جب تم ہمارا ساتھ دو گے تو یہ ایک اچھا کام ہوگا، ایک نیک مقصد کے لیے ہوگا۔ تم کو یہ کام پسند آئے گا، تم مطمئن ہو گے اور اس کام میں خوشی بھی محسوس کرو گے۔"

وہ حیران ہو کے ہماری صورت دیکھنے لگا۔ "کیا یہاں بھی کوئی غلطی ہو گئی؟"

"ہاں..... مگر تم نے مجبوری کا ذکر بھی کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہم مجبوری کی بات نہیں کرتے، اس کام میں تم کو خوشی ملے گی۔"

"لیکن جب تک کام کا پتا نہ چلے...؟"

"تم نے کہا تھا کہ تم ڈرائیور ہو؟" میں نے کہا۔ "یہ ٹریلر چلا لو گے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ "میرے پاس ہیوی لائسنس ہے۔"

"ویری گڈ، پھر تم ایسا کرو کہ یہاں سے صرف ایک مہینے کی چھٹی لو کسی بھی بہانے سے۔" میں نے کہا۔ "یہ ایک مہینہ تم ہمارے ساتھ رہو۔ ہم یہاں سے کراچی جائیں گے، اس ایک مہینے میں تم کو سب معلوم ہو جائے گا۔ تم صرف ڈرائیونگ کرو گے۔ وہ

سب کچھ تمہارے سامنے ہوگا جو ہم کریں گے۔ اگر کسی بھی وقت تم کو احساس ہو کہ ہم غلط کام کر رہے ہیں تو تم واپس آ جانا۔ تم جہاں گاڑی روک کے کہو گے کہ میں جا رہا ہوں... ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔ جتنا عرصہ تم ہمارے ساتھ گزارو گے تمہیں بائیس سو روزانہ کے حساب سے تنخواہ ملے گی، کھانا پینا سب ہمارے ساتھ۔ ہم اکیلے نہیں ہیں، اور بھی کچھ لوگ ہوں گے۔ تم ان سب سے ملو گے اور سب کو دیکھ کر فیصلہ کرو گے کہ ہمارا ساتھ دینا فرض ہے یا مجبوری کا ہے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے دلائل سے قائل ہو گیا ہے۔ "لیکن ایک وجہ نہیں بتا سکتا۔"

"سنو چکری، ہم کل پھر آئیں گے، اس سے پہلے ہم... تم اتنا ضرور سوچو کہ ہمارے اصل مقصد کے بارے میں کسی سے بات نہیں کرو گے۔ ہم تمہیں دھمکی نہیں دیتے۔ تم پر اعتبار کرتے ہیں اور تم سے درخواست کرتے ہیں کہ اس راز کو راز ہی رکھنا، اگر تم کسی بھی وجہ سے انکار کرو تب بھی ان باتوں کا حوالہ بھی نہ دینا جو ابھی ہوئی ہیں، یہ سمجھنا کہ ہم ملے ہی نہیں تھے۔"

"ٹھیک ہے جی، اب میں جاؤں؟"

"ٹھہرو! ابھی وہ بات تو ہوئی ہی نہیں جس کے لیے ہم آئے تھے۔" محسن بولا۔

"وہ کیا بات ہے جناب؟"

"جب ہم اس کار ٹریلر کے ساتھ آئے تھے۔" محسن نے کہا۔ "اور تم سے سودا کر رہے تھے تو ایک ٹویوٹا کرولا آئی تھی اسٹینڈنگ کی۔"

"ہاں جی، آئی تھی۔"

"ہم نے اس کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔" محسن بولا۔ "تم اس شخص کو جانتے ہو؟"

چکری نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس کے بارے میں بات بھی ہوئی تھی؟"

"ہاں، یہ بتاؤ وہ کیسا آدمی ہے؟" میں نے کہا۔ "ہماری اطلاع ہے کہ وہ ایک بدمعاش ہے، اسمگلروں کا ساتھی ہے، اطلاع ہے کہ اسمگلر پیلا رہے ہیں۔"

چکری اچھل پڑا۔ "آپ... آپ یہ سب جانتے ہو تو... تو پھر میں کیا کہوں جناب؟"

"کچھ نہیں، تم نے تصدیق کر دی ہے کہ تم ہمارے ہم خیال ہو۔ تم بھی یہ سب جانتے ہو مگر تمہارا یہ کام نہیں کہ اس کے بارے میں زمانے کو بتاتے پھرو کہ وہ کون ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کمپنی کو فائدہ پہنچاتا ہے اور تم کمپنی کے ایک معمولی ملازم ہو، تم ان کا دشمن بھی مول نہیں لے سکتے۔ ایک آخری بات ہم دے سکتے ہیں؟"

"اگر تم ہمارے ساتھ رہو لیکن وہ منظور نہ ہو تو ایک کام اور ہے۔ تم ہمیں کمپنی کے ریکارڈ سے دیکھ کر کچھ معلومات فراہم کر دو۔"

"کس قسم کی معلومات...؟"

"یہی کہ آج تک... فرض کرو گزشتہ ایک مہینے میں اس نے کون کون سے ٹرک پر مال بھیجا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اس ٹرک کا ڈرائیور کون تھا، میرا خیال ہے کہ وہ مخصوص ٹرک ڈرائیوروں سے کام لیتا ہوگا۔"

چکری نے اقرار میں سر ہلایا۔ "یہ تو ٹھیک ہے۔"

"پتا، اس کے علاوہ تیار کردہ ٹرک کہاں گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"اس کے سارے ٹرک کراچی جاتے ہیں۔" چکری نے کہا۔

"چلو پھر یہ بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "کچھ معلوم ہے وہ کیا مال بھیجتا ہے؟"

"میں نے اور فرش کی کوشش کی... پیٹیوں کے پیچھے..."

"چکری، میرا خیال ہے کہ تم حقیقت جانتے ہو مگر بتاتے ہوئے ڈرتے ہو۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ غلط ہے کہ اس مال میں اسلحہ بھی ہوتا ہے؟"

چکری کا رنگ اڑ گیا۔ "صاحب جی ایسی بات مت کریں۔"

"یہ سچ ہے یا غلط؟" میں نے کہا۔

"سچ ہے، میرا مطلب ہے ہوگا، لیکن میں کیسے کہوں؟"

"تم کچھ مت کہو، ہم جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر تم کو معلوم نہیں کہ یہ اسلحہ کراچی سے آگے کہاں جاتا ہے۔ وہ جاتا ہے مشرقی پاکستان اور وہاں کے تخریب کار علیحدگی پسندوں کو، وہاں پاکستان کے دشمنوں کو تقسیم کیا جاتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہاں کے کیا حالات ہیں؟"

"آپ... آپ کون ہیں جی؟" چکری سہم گیا تھا۔

"ہم ان لوگوں کے گروہ کے پیچھے ہیں۔" میں نے کہا۔ "بے شمار لوگ بہت سے پکڑے جا چکے ہیں، کچھ مارے گئے ہیں، بہت سا اسلحہ برآمد کیا جا چکا ہے مگر یہ سلسلہ بند نہیں ہوا۔ ان کو دشمن سے پیسہ ملتا ہے۔ ممکن ہے تم نے ہمارا نام سنا ہو، میں سکندر... ہوں۔"

ایک دم اپنی شناخت ظاہر کرنے کے لیے میں نے رسک ضرور لیا تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ یہ دھوکا نہیں ہے اور مجھے ہماری تحریک کا ایک حامی مل گیا تھا اور اس کے بعد... سلطان جیسے ہی لوگوں میں بہت سے لوگ ہیں جو ہماری مدد کر سکتے ہیں اور ہمارے لیے کام کر سکتے ہیں۔ چکری کے تاثرات جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ چکری اگر دوست نہ بنا تو دشمن بھی نہ ہوگا، اگر وہ بزدل ہوا تو شاید کھل کر ہمارا ساتھ نہ

دے مگر دل سے وہ یقیناً ہمارا ساتھی ہوگا۔

چکری کچھ دیر بے یقینی سے مجھے اور محسن کو دیکھتا رہا، پھر بولا۔ "تم دونوں وہی ہو جنہوں نے دو ٹھاکوروں کو پکڑا تھا، گردھاری کو اور پانڈے خان کو، جو جیل سے فرار ہوئے تھے اور پولیس کو چکمہ دے کے ان کی وردیاں اڑا لے گئے تھے؟"

"بالکل ٹھیک۔" میں نے کہا۔ "یہ تو ابھی کی بات ہے۔"

"میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔" وہ بولا۔

"کس سے سنا ہے؟" میں نے کہا۔

"لوگوں سے، یہاں ڈرائیور، کلینر کراچی تک آتے جاتے ہیں تو سارے زمانے کی خبریں اکٹھی کر لاتے ہیں۔" وہ بولا۔ "استاد پیلہ کے بارے میں تو مجھے معلوم ہے کہ وہ کتنا بڑا... ہے مگر یہ جو تم بتا رہے ہو، وہ عجیب سی بات ہے۔"

"کیا تم نے اسلحہ جاتا نہیں دیکھا؟"

"دیکھا تو ہے۔" وہ بولا۔ "اور... ابھی سمجھ ہے کہ اس کام کا سیٹھ کون نہیں مگر پیلہ ڈرائیور بڑے... ہیں۔" اس نے پھر وہی گالی دی جو اس سے پہلے پیلہ کو دے چکا تھا۔

"تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟"

"ہاں، وہ کیسے معلوم نہیں۔" وہ افسوس سے سر ہلا کے بولا۔ "دشمن کے ساتھ ان کے ایجنٹ مل گئے ہیں۔"

"تم تو بہت سمجھدار نکلے یار۔" میں نے کہا۔ "یہ پیلہ ان میں سے ایک ہے مگر اس کے اوپر بہت سے لوگ ہیں۔ ایک بہت بڑے کارخانے کا پیلہ ایک چھوٹا سا پرزہ ہے اور ہم اس کارخانے کو ٹھکانے لگانے کا کام کر رہے ہیں۔ اس کام میں تم ہماری مدد نہیں کرو گے؟"

"میں... میں کیا کر سکتا ہوں جی، کیا میں اور کیا میری اوقات۔ میں بہت چھوٹا اور کمزور آدمی ہوں، بہت معمولی حیثیت کا۔ میرے چھوٹے بچے ہیں، ان کا بوجھ اٹھانا ہی بہت ہے۔" وہ بولا۔

"تمہیں کون سی توپ چلانی ہے چکری؟" میں نے کہا۔ "تم ایک پیشہ ور ڈرائیور ہو، تم کو کوئی زیادہ تنخواہ اور بہتر سہولتوں کے ساتھ عزت کی نوکری ملے تو کیا تم نہیں کرو گے؟"

"دیکھو یہ بات ایسی نہیں کہ یہاں طے کی جائے۔" محسن نے کہا۔ "تم ابھی یہ پس و پیش کر رہے ہو کہ تمہیں پوری بات معلوم نہیں ہوئی ہے۔ اگر میں کہوں کہ تم کو ایک سرکس کی گاڑی کا ڈرائیور بن کے جانا ہے تو تم کہو گے جی کہ یہ کیا مذاق ہے۔ ابھی آپ اسلحے اور دشمن کے ایجنٹوں اور مشرقی پاکستان کے حالات کی بات کر رہے تھے اور اب آپ سرکس پر آ گئے۔ تم ہمیں بتاؤ کہ آج کل میں تم دو چار ہفتے نکال سکتے ہو؟"

www.paksociety.com

"دو چار گھنٹے؟ کیوں نہیں جی؟" وہ بولا۔
"تمہاری ڈیوٹی کب ختم ہوگی؟"
"ڈیوٹی تو رات تک چلتی ہے اوں گیارہ بجے تک۔"
"اور صبح شروع کب ہوتی ہے؟" میں نے کہا۔
"صبح نو بجے۔" وہ بولا۔ "لیکن میں سیٹھ سے دو چار گھنٹے کی چھٹی لے کر کہیں بھی جا سکتا ہوں۔ آپ بولو تو کل آجاؤں جی؟"
"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "کل کس وقت؟"
"آپ حکم کرو۔" وہ بولا۔
"تم ایسا کرو، آج تو ہمیں ٹرک نمبر اور ڈرائیوروں کے نام بتاؤ، میرا مطلب ہے لکھ دو۔"
"لکھنا کیا جی، مجھے زبانی یاد ہیں۔ اکثر کو سمجھا، ڈرائیور غلام دین، ستائی اڑتیس ڈرائیور بادشاہ گل۔"
"ایسے نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم اتنی جلدی اتنی باتیں یاد نہیں کرسکتے اور اس کے علاوہ ہمیں زیادہ تفصیل چاہیے۔ مثلاً گزشتہ ماہ کی تاریخ وار رپورٹ کہ کون سا ٹرک کس تاریخ کو گیا اور کس کا مال لے کر گیا۔"
"پورے مہینے کی؟ یہ تو لمبا کام ہے۔ ہر ٹرک کے چار پھیرے تو ہوتے ہیں اور شاید دس ٹرک۔۔۔ ہاں، دس ہی ہیں جو اس ہیرا پھیری کے کام میں چالو ہیں۔" چکری نے سوچ کر کہا۔
"بس تو چالیس اکتالیس پھیروں کا اندراج کرو۔ تمہارے لیے کوئی بہت لمبا کام نہیں۔ ٹرک کا نمبر اور ڈرائیور کا نام تو تم زبانی لکھ لو گے، بس تاریخ اور مال کی تفصیل دیکھنا ہوگی۔ ایسا کرو کہ دس پرچیاں بنا لو، ہر پرچی پر الگ الگ لکھتے جاؤ۔ میرا خیال ہے تمہارا آدھا گھنٹا صرف ہوگا۔"
چکری مسکرایا۔ "او نہیں جی! گھنٹا تو لگ جاتا ہے۔ پھر آپ فکر مت کرو، جب نے چاہا تو کل آپ کو مل دوں گا۔"
میں نے دس ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ "یہ ہے اس کام کا معاوضہ۔"
اس نے گڈی کی طرف دیکھا مگر ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔ "یہ تو رشوت ہوگئی، کوئی قرض تو ہوئی جناب۔ آپ ایسا کریں، وہ جو بابو دوسرے کمرے میں بیٹھے تھے ان میں سے ایک ٹرک بک کرتا ہے۔ گنجا اور موٹا۔ وہ بڑے شوق سے آپ کا کام کرے گا۔"
"لیکن ہم اس پر اعتبار نہیں کرسکتے چکری۔" میں نے کہا۔
"اور مجھ پر اعتبار ہے آپ کو؟"
"اس میں شک کی کون سی بات ہے۔ اعتبار نہ ہوتا تو تم کو اپنے بارے میں کیوں بتاتے؟"
"اعتبار ہوتا تو آپ مجھے خریدنے کی کوشش نہ کرتے۔" وہ بولا۔
"معاف کرنا۔" میں نے شرمندہ ہو کے کہا۔ "ہمارا یہ مطلب نہیں تھا، تم کو برا لگا تو ہمیں افسوس ہے۔ کل تم کس وقت فارغ مل سکتے ہو؟"
"جی۔۔۔ میرا خیال ہے کہ آپ یا تو سویرے سویرے آجائیں سات بجے سے پہلے، میں دس گیارہ بجے تک یہاں آجاؤں یا پھر اسی وقت آئیں تو میں رات تک آپ کے ساتھ رہوں گا۔" وہ بولا۔
"ہم کل شام اسی وقت آئیں گے۔" میں نے کہا۔
"یہ آپ نے سرکس کی کیا بات کی تھی جناب؟" وہ اترتے ہوئے بولا۔
"ہاں، یہ جو ٹرک خرید رہے ہیں، ہم اس میں ایک سرکس لے کر روانہ ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "لاہور سے کراچی تک تماشا دکھاتے جائیں گے۔ مقصد کچھ اور ہوگا۔ لوگ تماشا دیکھیں گے، ہم اور ہمارے کچھ ساتھی پبلک کو تماشے میں لگا کے اپنا کام کریں گے۔"
"سرکس میں کون کام کرے گا؟ آپ لوگ۔۔۔؟"
"ہم بھی۔۔۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ہمارے علاوہ دیکھنے والوں کا تماشا دکھانے والے ہوں گے۔ بھیڑیا ہوگا، مداری ہوگا، جھولے اور سائیکل سواری کے کرتب دکھانے والے ہوں گے۔ ایک ڈھول بجانے والا اور دوسرے تم۔ تم جو صرف ٹرک ڈرائیو کرو گے، دوسرے معاملات سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ تمہاری مرضی کی بات ہے ورنہ سب کی طرح تم بھی سرکس کے ساتھ رہو گے تو بس چلتے جائیں گے، دو دو چار چار دن رکتے ہوئے۔"
"سرکس کا تو مجھے بچپن سے بڑا شوق تھا جی۔ امرتسر کا رہنے والا ہوں، جھولا لال کا لاہوری سرکس کا سال میں ایک دو بار پھیرا ہوتا تھا تو میں روز میلا جاتا تھا۔ ایک روز مجھ سے کہا جاتا تھا، گھر والے مال کے پیسے کھا کے جاتا ضرور تھا۔ اللہ معاف کرے۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔ "ابا جی کو میں نے بہت پریشان کیا تھا۔"
"اب کہاں ہیں وہ؟"
"اب اللہ میاں کے پاس۔ فسادات میں شہید ہوگئے تھے۔ میں آٹھ سال کا تھا جب اکیلا پاکستان پہنچا تھا۔ اسپیشل ٹرین میں ایک جاننے والے کے ساتھ ہوگیا تھا۔ اس نے لاہور میں چھوڑ دیا۔ بس اس کے بعد جی تو زندگی ایسے ہی گزری۔ مگر ابھی چار سال ہوئے میں نے شادی کرلی ہے۔ ایک بڑے نیک دل حافظ جی کی بیٹی ہے، مسجد میں امامت کرتے تھے، پچھلے سال انتقال کر گئے۔ اب ان کی بیٹی کا بھی کوئی نہیں۔ ہمارا ایک بچہ ہے، جسے ہم انگلش اسکول میں پڑھائیں گے۔"
"ضرور پڑھانا۔ مگر کیا اسے چھوڑ کر جاؤ گے؟ جب اس کا تمہارا کوئی آگے پیچھے نہیں ہے؟"

"میں نے ابھی کون سا فیصلہ کرلیا ہے جی۔ گھر جا کے بات کروں گا اس سے، وہ کیا کہتی ہے۔"
"اس کو تم صرف یہ بتاؤ گے کہ تم نے ایک سرکس کی گاڑی چلانے کی نوکری قبول کی ہے۔ تنخواہ تین ہزار ہوگی۔" میں نے کہا۔
"ابھی تو آپ بائیس سو بول رہے تھے۔"
"اس وقت ہمیں علم نہیں تھا کہ تم شادی شدہ ہو اور اپنے بچے کو انگلش میڈیم اسکول میں پڑھانا چاہتے ہو۔" میں نے مسکرا کے کہا۔
"وہ تو دور کی بات ہے جی، تین سال بعد داخلہ ہوگا۔"
"مگر اس کے لیے تیاری تو ابھی سے کرنا ہوگی۔ تمہیں کھانے پینے کا خرچ کوئی نہیں، تم ہمارے ساتھ رہو گے، تم جہاں ہو گے تو پوری تنخواہ تین ہزار روپے ہر ماہ تمہاری بیوی کو یہاں دے دی جائے گی۔ تم جہاں بھی ہو گے۔۔۔"
"دس پندرہ دن میں ایک بار تو اس سے ملنے کے لیے آسکوں گا نا؟"
"صاف بات یہ ہے چکری کہ ہم وعدہ نہیں کرسکتے۔" میں نے کہا۔
"یہ ہوسکتا ہے کہ تم ہفتے بھر بعد آجاؤ۔" محسن نے کہا۔ "اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم پورا مہینہ نہ آسکو۔"
"ویسے ڈرائیور کا اتنا کام نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم کسی جگہ دو چار دن کے لیے قیام کریں گے تو تمہاری چھٹی ہی ہوگی۔"
"پھر۔۔۔ پھر تو میں چلوں گا جی۔۔۔ ضرور چلوں گا۔" وہ بولا۔ "ایک بات اور بتا دیں، مجھے یہ نوکری پکی ہے کہ کچی؟"
"پکی۔۔۔ سو فیصد پکی۔ جب تک ہم ہیں تم ہمارے ساتھ ہو۔" میں نے کہا۔
اس نے ایک بار پھر ہم سے مصافحہ کیا اور نیچے اتر گیا۔
"مسٹر سکندر اعظم۔" محسن نے کہا۔ "یہ بھروسا بھی چیز ہے، مگر اس میں اتنی عجلت کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"
"کیا مطلب؟" میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔
"مطلب یہ کہ تم نے ایک ہی ملاقات میں اس پر اپنی شناخت ظاہر کردی۔ یہ رسک کیوں لیا تم نے؟"
"میری چھٹی حس نے مجھے قائل کرلیا تھا کہ آدمی اعتماد کے قابل ہے۔"
"میری ساتویں حس کہتی ہے کہ ہم سے غلطی ہوئی۔" محسن نے کہا۔ "وہ چکری کیوں مشہور ہوگیا؟ تم ذرا گاڑی روک کے اس سے پوچھو۔"
"زبان خلق نے مشہور کیا ہوگا۔" میں نے کہا اور گاڑی روک لی۔
"زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ بڑوں کے کہے کو بڑا سمجھو۔"
"کیا اس کے جواب میں مرزا غالب کا فرمایا ہوا مستند نہیں ہوگا؟" میں نے کہا۔ "ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔ آج تک میری چھٹی حس نے تیری ساتویں حس کو غلط ثابت کیا ہے۔"
"حضور! فرمایا ہے شیکسپیئر نے کہ یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور اس میں رہنے والے سب اداکار۔" محسن نے کہا۔ "کیا ہم اداکار اور بہروپیے نہیں ہیں۔ دن رات میک اپ بدل کے کبھی کچھ بن جاتے ہیں تو کبھی کچھ۔ ولادمر سے بڑا ایکٹر دیکھا تھا پہلے کبھی۔۔۔ مگر بی بی زیب النسا نے اپنی معصوم اداکاری سے اور بھولپن سے ہماری بیداری اور مستعدی، ہوشیاری اور مردانگی کو کیا خوبصورت مات دی اور ثابت کردیا کہ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔"
"میرے کہ وہ تو ہے، اب تو جو ہونا تھا ہوگیا۔" میں نے کہا۔
"ابھی کچھ نہیں ہوا۔" محسن بولا۔ "لیکن غور کرو دوسرے امکانات پر کہ چکری سچ مچ چکر باز ہوا تو کیا ہوگا۔ ہم اس مرحلے پر جوا نہیں کھیل سکتے دوست! ہم صرف اپنی کامیابی کو داؤ پر لگا سکتے ہیں۔ پانسا غلط پڑ جائے تو سب جدوجہد کا حاصل ناکامی، ساری پلاننگ کا ملیدہ۔"
اس کی بات نے مجھے اپنی جلد بازی پر متفکر کردیا۔ "پھر اب کیا کریں؟"
اس سے پہلے کہ محسن جواب دیتا، میں نے چکری کو اس ٹرک کمپنی سے باہر آتے دیکھا۔ ہم جس بس کے پیچھے تھے وہ مدت سے خراب کھڑی ہوئی تھی۔ اس پر پڑی ہوئی گرد کی تہ اور کسمپرسی کی حالت سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ دونوں ٹائروں کی ہوا نکل گئی تھی یا ہم جو بچوں نے نکال دی تھی۔ اندر کی سیٹوں پر کچھ پھٹے پرانے کپڑے ظاہر کرتے تھے کہ اس ڈبے کی حرکت پذیری ختم ہوجانے کا فائدہ کسی بے گھر نے اٹھایا تھا اور اپنے بیڈ روم کو فٹ پاتھ سے بس کے اندر شفٹ کرلیا تھا۔ یہ جگہ زیادہ بسیرا بہتر تھی۔ اندیشہ تھا جس دن کوئی بس کو لے کے گیا تو ہم بھی اپنا بوریا بستر اٹھا لیں گے۔ پائے گدا لنگ نیست، ملک خدا تنگ نیست۔ میں اور محسن اپنی گاڑی سے اتر کے بس میں چڑھ گئے اور اگلے شیشے سے دیکھنے لگے۔ چکری کی نظریں کسی رکشا ٹیکسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے کئی بار ہاتھ دیا مگر قریب آنے پر وہ رکشا ٹیکسی بھرے ہوئے ملے۔ اس کی صورت پر اب ایک ایسا اضطراب تھا جو اس کے کچھ دیر پہلے کے سکون سے بہت مختلف تھا یا شاید یہ محسن کا پیدا کردہ وہ شک تھا جس نے میری نگاہ کو مشکوک کردیا تھا۔ بالآخر ایک خالی رکشا اس کے اشارے پر رک گیا مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ان کے درمیان تکرار ہونے لگی۔
دو منٹ میں تکرار نے تنازعے کی شکل اختیار کرلی اور رکشا ڈرائیور

www.paksociety.com

نے پیچھے آ کے بھکاری کو پکڑ لیا۔ چند لوگ اتنی دیر میں جمع ہو گئے تھے اور ہم دست و گریباں ہونے والوں کو الگ کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

میں نے محسن کو اشارہ کیا اور ہم دونوں ٹیکسی کے گیٹ سے اتر کے ہیڈ کے پیچھے مگر پولیس کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ ایک نیٹا تندرست شخص نے جھگڑا ختم کرا دیا تھا اور اب جسٹس آف پیس کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

"او پہلوان جی! میں کیا کر رہا تھا، آپ چوہدری جی" رکشا والے نے کہنا شروع کیا۔ "میرا جی ٹھیک نہیں سی، فیر وی میں کیا کہ چلو دیہاڑی سواری لبھدی اے تے لے لواں، ایں نہ پہلوان جی..."

"او یار! ایویں بہانے بازیاں کرنے او تسی لوگ" بھکاری بول پڑا۔

"قسم رب دی مینوں بخار اے، تسی آپ ویکھ لو" رکشا والے نے ہاتھ آگے بڑھایا "میں نے گھر جا کے آرام کرنا سی، سوچیا سی ایہ سگ ہو گیا کہ مینوں لے کے چل"

"چل اوئے جانی، ہمیشہ سی یار" پہلوان نے رکشا والے کا ہاتھ تھاما اور قائل ہو کے کہا "یہ بخار تے سچ غریب نوں"

"لیکن جاناں سی کسی پولیس افسر دے گھر" رکشا والے نے فریاد کرتے ہوئے کہا "جو پتا نہیں کیہڑا توپ خاں سی"

"میں ایس ایس پی سراج دی کوٹھی تے جانا سی" بھکاری نے چلا کے کہا۔

"تے ہور رکشے تھوڑے نے" پہلوان نے کہا "ایہنوں تاں کیوں پیا زبردستی کرنا ایں"

"کتھے نے رکشے" بھکاری نے بدتمیزی سے کہا "اوقات بھٹ گیا نے سیریاں گھومتے ہوئے"

"او جی مینوں کیندا کہ تیرا تے بیوی مر جائے گا" رکشا والا پہلوان کی حمایت پا کر گیا "میں کہیا کہ نیر یار ایسے سیوا تاں لیا"

"چل میاں ٹل جا" پہلوان نے رکشے والے کو رخصت کیا اور بھکاری کو گردن سے دبوچ لیا "تیرے اس پولیس افسری تے نیں..." اس نے پولیس افسر کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے بھکاری کو زبردست گالی کے ساتھ ایسا جھٹکا دیا کہ وہ پیچھے گر گیا "جا جن اس ایسے ہیوتوں دس وئیں میرا ناں، پھانسی لا دیوے مینوں، پولیس افسر دا پتر"

دیگر حاضرین نے بھی اس بات پر اتفاق رائے کیا کہ نہ صرف پولیس خود کو ملک کا آقا سمجھتی ہے بلکہ ان کے پیچھے تک فرعون بنے پھرتے ہیں مگر ابھی یہ مجمع منتشر بھی نہیں ہوا تھا کہ میں اور محسن واپس روڈ سے ہم نے اپنی گاڑی میں بیٹھ کے اُسے تقریباً پچاس گز پیچھے کیا۔ پھر کہنے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی، میں نے گاڑی کو یو ٹرن دیا اور ٹریفک میں شامل ہو گیا۔

"اب فرمایئے" محسن نے میری گردن پہ ہاتھ مارا۔

"حضرت... یہ کیا، ادھر دیکھا تو تنہا کا خیال نہیں" میں نے گردن سہلا کے کہا "اگر آپ کی ساتویں حس آج بیکار تھی"

"اتفاقاً" محسن نے مجھے دوسرا ہاتھ مارنے کی کوشش کی "تو میری ساتویں حس ہمیشہ صحیح خبر دیتی ہے"

"میاں میں گاڑی چلا رہا ہوں" میں نے کہا "گاڑی گر پڑی تو کسی کے سر پڑے ہیں"

"اس وقت قدرت نے ہماری مدد کی، اگر اس رکشا والے کو بخار نہ ہوتا تو یہ جھگڑا کھڑا نہ ہوتا۔ بھکاری اس میں سوار ہو کے بیٹھتا اور ہمیں خاک پتا نہ چلتا کہ وہ کدھر گیا" محسن نے لیکچر جاری رکھا۔

یہ قدرت کی طرف سے ملنے والا ایک سبق تھا، میں خود اعتمادی اور قیافہ شناسی کی صلاحیت کے مظاہرے میں حد سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس امر کے باوجود کہ ذہن اتفاقات سے جو دھوکا دیا تھا اس کا زخم تازہ تھا۔ محسن نے ٹھیک کہا تھا، ہم اس پوزیشن میں نہیں کہ ہار دینے سکیں اور جو کھیل کھیلیں، اب یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا کہ خدانخواستہ بھکاری نکل کر سراج کے پاس جا پہنچتا تو کیا ہوتا۔ ہماری ساری اسکیم دھری کی دھری رہ جاتی۔ اتنا بڑا ایک چھوٹی سی غلطی کی نذر ہو جاتا اور ساری ذمہ داری مجھ پر آتی جس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ اب تو ہمیں جان لینا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ سارے چہرے وہ نہیں ہوتے جو دکھائی دیتے ہیں اور انسان ہی انسان کو دوستی، نیکی اور شرافت کے نام پہ دھوکا دیتے ہیں، ان سے دشمنی کرتے ہیں اور نفرتوں کا زہر بانٹتے ہیں۔

پیڈ رد کو وہاں دیکھتے ہی مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ یہاں ہمارا دوست اور حامی یا ہم خیال کوئی نہیں ہو سکتا۔ ملا اور ایجنٹوں کا سارا کاروبار مخصوص مفادات رکھنے والے لوگوں کے باہمی اشتراک سے چل رہا ہے۔ وہ کسی بھی ایسی جگہ نہیں جا سکتے جہاں انہیں کسی ایک آدمی سے بھی اندیشہ ہو کہ وہ مستقبل میں کسی بھی مرحلے کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ جب انھوں نے اس علاقے میں اس شخص کا انتخاب کیا ہوگا تو پوری طرح اطمینان کر لیا ہوگا کہ یہاں سب انھی کے جیسے ہیں۔ انھوں نے فرداً فرداً سب کو آزما لیا ہوگا کہ کس میں حب الوطنی کے جراثیم ہیں اور کون ایمان کو پیسے سے زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ ایسے تمام افراد کو انھوں نے نکلوا دیا ہوگا اور ان کی جگہ ایسے آدمی رکھوا دیے ہوں گے۔ اب ایک طرح سے یہ ان کی اپنی کمپنی تھی جس میں سب مل کے

رہتے تھے۔ سب وطن کی آزادی اور سلامتی کو بیچ رہے تھے، اپنے خزانے بھر رہے تھے، ان کو سب کا علم تھا اور سب زر پرست تھے۔ اسی لیے کسی کو کسی سے ڈر نہیں تھا کہ کوئی کسی پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا اور کسی کو الزام نہیں دے سکتا تھا۔ ایک وہ ہوتے ہیں جو اپنی آنکھ میں شہتیر نہیں دیکھتے مگر دوسرے کی آنکھ کا تنکا دیکھ لیتے ہیں۔ یہاں تو سب تنکا وہ تھے جن کی آنکھوں میں شہتیر تھے۔

محسن بھی مجھے پشیمان دیکھ کر خاموش تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ غلطی کا احساس ہی تجربے کا نام ہے اور انسان غلطیاں نہ کرے تو کیسے سیکھے۔ غلطی اس سے بھی ہو سکتی تھی اور کسی سے بھی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ مجھے زیادہ شرمندہ کرنا بے کار تھا۔ سراج کے گھر کی طرف جاتے ہوئے مجھے وہ سب باتیں یاد آ گئیں جو میں نے اور محسن نے بھکاری سے کی تھیں۔

"یار محسن! ہم نے اُسے بہت کچھ بتا دیا" میں نے کہا۔ "تو نے بھی مجھے نہیں روکا، میرے ساتھ شامل ہو گیا"

"بھائی صاحب! میں روک کے کیا کرتا اور روکتا کیسے؟ جب آپ نے اُسے بتا دیا کہ ہم کون ہیں، اپنے ساتھ میرا تعارف بھی کرا دیا تو میں نے بھی کہا کہ ٹھیک ہے، جب اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں کا کیا ڈر، میں کیسے شامل نہ ہوتا۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ اگر خود سوئمنگ پول میں کود جائے اور اپنے ساتھ دوسرے کو بھی لے جائے، جب ڈوبنے لگے تو کہے کہ میں تو ڈوب ہی رہا ہوں، تم کیوں ڈوب رہے ہو؟" محسن بولا۔

"میرا خیال ہے اس نے سراج کو فون کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"یہاں سے نہیں؟" محسن بولا "وہاں ایک اور معاملہ تھا۔ وہ سب کے درمیان بیٹھے ہوتے، وہ کسی ایس ایس پی سے بات کرتا تو اس کا راز فاش ہو جاتا۔ وہ ایک معمولی فقیر ہو، اس کا کسی ایس ایس پی سے کیا تعلق؟"

"تعلق تو سب کا ہوگا" میں نے کہا۔

"کاروبار کی حد تک" محسن بولا "وہ جانتے ہوں گے کہ کس میں کیا مال جا رہا ہے اور کہاں جائے گا۔ ان کو اس کام کا معاوضہ بھی بہت معقول مل رہا ہوگا لیکن ڈائریکٹ صرف پیڈ رد کو جانتے ہوں گے۔ وہی مال لاتا ہوگا اور ادائیگی کرتا ہوگا۔ ان کے نزدیک وہ کسی کمپنی کا منیجر ہے۔ بھکاری خاص آدمی ہے کیونکہ وہ بھکاری بن کے دوسروں سے زیادہ ہوشیار اور چالاک ہے۔ اُسے سراج نے اپنے مخبر کے طور پر یہاں چھوڑ رکھا ہوگا کہ کبھی کوئی مشکوک حالات دیکھے تو فوراً اطلاع دے۔ شاید وہی ایک شخص ہوگا جو جانتا ہوگا کہ اس کاروبار میں ایس ایس پی سراج کا حصہ بھی ہے بلکہ سب سے آگے ہے۔ دوسروں کی خبر تو مخبر کے ذریعے آمد کی باتیں اور خبریں جاننے کا طریقہ پولیس والے استعمال کرتے ہیں اور یہ فرض کرنے والی سراج نے قبول کر رکھی ہو گی کہ وہ ملک غدار ڈرائیوروں میں ایک ایسا آدمی چھوڑ دے جو ان کی ہر بات اس تک پہنچاتا رہے اور پل پل کی خبر دیتا رہے۔ بے حد ضروری نہیں کہ اُسے ملا اور جنید وغیرہ کے پورے گروہ کی خبر ہو۔ وہ ایس پی کو رپورٹ دینے پر مامور ہوگا اور اس اعتبار سے بڑی مطمئن ہوگا کہ وہ شاہ کا مصاحب ہے۔ ایس ایس پی کا افسر بکا ہے، خاص بھی کم تو نہیں ہوتا۔ تم نے دیکھا وہ رکشا والے سے کس طرح اکڑ گیا تھا جیسے وہ خود ایس پی ہو"

"مجھے تو لگتا ہے کہ کل اس رکشے والے کو اس نافرمانی کی سزا ملے گی۔ بھکاری نے نمبر نوٹ کر لیا ہوگا اس گستاخ رکشا ڈرائیور کا"

"ہم بال بال بچ گئے" محسن بولا۔

"ہاں، بھکاری نے فون پر بات کرنے کے بجائے بذاتِ خود حاضر ہو کے ایس پی صاحب کو ایک سنسنی خیز رپورٹ دینا بہتر سمجھا ہوگا۔ اتنی بڑی خبر تھی کہ اس کا انعام بھی بہت بڑا تھا۔ وہ اندر گیا اور ضروری کام کا بہانہ کر کے نکل گیا۔ یہ مزہ یا چاہتا ہوگا کہ اتنی دیر میں ہم نے گاڑی وہاں سے ہٹا لی تھی۔ بھکاری نے باہر آتے ہی اپنا اطمینان کر لیا ہوگا کہ ہم چلے گئے" میں نے کہا۔

"کتنے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اس نے دس ہزار لینے سے انکار کر دیا" محسن نے کہا "جو سالا ڈرامے باز..."

"اُسے دس ہزار کے مقابلے میں انعام میں ملنے کی امید ہو گی، مگر حرام خوری کرنے کا معاوضہ لینے میں خطرہ تھا کہ ملک سے وفاداری ثابت کرنے میں آئندہ کے لیے بھی اپنی اہمیت اور افادیت کا یقین دلایا جا سکتا تھا اور خود کو بہتر ذمہ دار اور اہل ثابت کیا جا سکتا تھا"

"اب ذرا سوچو کہ کیا کرنا ہے" محسن بولا "ہم سراج کے گھر کے آس پاس بھی نہیں جا سکتے"

"ہم اُسے راستے میں ہی روک لیں گے۔ جب ہم روانہ ہوئے تھے تو وہ دوسرے رکشے کا انتظار کر رہا تھا" میں نے کہا "بھکاری کسی طرح بھی ہم سے پہلے نہیں پہنچ سکتا"

"سوال یہ ہے کہ ہم اسے کس راستے پر اور کہاں روکیں گے"

"ایک رکشا والا ان کے سوچ..." میں نے کہا "تو کون سا راستہ اختیار کرتا"

"سوچ لیا" محسن بولا "تب بھی دو راستے ہیں"

"بالکل ٹھیک۔ ایک راستے پر میں نظر رکھوں گا اور دوسرے پر تم ناکہ بندی کرو گے" میں نے کہا "گاڑی تیسری جگہ ہو گی۔ اس کام میں کوتاہی کی گنجائش نہیں۔ بھکاری کو ہر قیمت پر روکنا ہوگا۔ اب دیکھو اگلے موڑ پر میں تمہیں ڈراپ کرتا ہوں، وہاں سے

www.paksociety.com

سراج کے گھر کا فاصلہ شاید ایک فرلانگ سے بھی کم ہے۔ اس موڑ کے بعد والی سڑک سیدھی سراج کی کوٹھی کے سامنے سے گزرتی ہے۔"
"رکشا اسی سڑک پر مخالف سمت سے بھی آ سکتا ہے۔"
"ہاں، میں ادھر ہی جا رہا تھا۔" میں نے کہا۔
"اس کے لیے تمہیں سراج کی کوٹھی کے بالکل سامنے سے گزر کے جانا ہوگا۔"
"ہاں، میں تیزی سے نکل جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "ایک تو رات کا وقت ہے پھر یہ گاڑی سرکار کی ہے اور میرا حلیہ بھی وہ نہیں جو پہلے تھا۔"
"پھر بھی یہ چانس تو ہے کہ پولیس تمہیں روک لے۔" محسن نے کہا۔
"ہاں چانس تو ہے مگر میں یہ چانس لوں گا کیونکہ اس کے سوا چارہ نہیں۔ اگر میں نے سڑک کے دوسرے کنارے تک پہنچنے کے لیے متبادل راستہ اختیار کیا تو کئی میل کا چکر پڑے گا اور چکری کو بہت وقت مل جائے گا۔"
محسن نے سر ہلایا اور نگرو دیس کی رفتار کم ہوتے ہی نیچے کود گیا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ موڑ کاٹتے ہی مجھے سراج کی کوٹھی کا گیٹ نظر آنے لگا۔ وہاں دونوں جانب [illegible] کا گارڈ تھا اور سڑک کے ساتھ پولیس کا ایک ٹرک کھڑا ہوا تھا جس سے تھوڑے فاصلے پر ایک جیپ تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ حفاظتی انتظامات بدستور انتہائی سخت تھے۔ ابھی میں گیٹ سے کچھ دور تھا کہ کہیں سے اچانک ایک شخص نکل کے سڑک کے درمیان میں آ گیا۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا لیکن اس کی سفید شلوار قمیص اور پاؤں کے بوٹ، اس کے بالوں کا کٹ اور اس کی صورت کی سختی جیسے خود بتاتی تھی کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔
میں نے بریک لگا کے گاڑی روک لی۔ "سلام علیکم۔" "خیریت ہے یارا، مرنے کا ارادہ ہے؟"
"کس کی گاڑی ہے؟" اس نے [illegible] نگرو دیس کی [illegible] ڈپٹی کمشنر [illegible] گاڑی [illegible] میں نے کہا۔
[illegible] وہ [illegible] بولا۔
[illegible] میں نے کہا تو کیا بات [illegible]
[illegible]

اور سر کو ناقابل فہم انداز میں ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کلیئرنس مل جانے پر اطمینان کا گہرا سانس بھی میں نے اسی وقت لیا جب میں کوٹھی کے سامنے سے گزر گیا۔ آگے ایک اور شخص شامل ہوا تھا مگر وہ دوسری طرف سے آنے والی گاڑیوں کو چیک کرنے پر مامور تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ مجھے کلیئرنس مل چکی ہے۔ وہ سارا دن آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھتے دیکھتے اور اس بیزار کن کام کی یکسانیت سے اکتا گئے تھے جس کا حاصل کچھ نہیں ہوا تھا۔ اب وہ سرکاری ڈیوٹی کو دلچسپی کے بغیر ایک سرسری کارروائی سمجھ کے پورا کر رہے تھے۔ گاڑی سرکاری نہ ہوتی تو شاید وہ مجھ سے کاغذات طلب کرتے اور مجھے زیادہ غور سے دیکھتے مگر گورنمنٹ آف ویسٹ پاکستان کے نام نے ان کے سارے شکوک رفع کر دیے تھے۔
میں تقریباً پچاس گز جا کے دائیں طرف مڑا۔ وہاں گاڑی کو چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اسے میں نے راستے سے ہٹا کے اور سڑک کے ایک تاریک حصے میں کھڑا کیا اور خود پیدل چل کے آگے چلا گیا۔ اس سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک جانب کوئی قدیم باغ تھا جس کی کچی دیوار جگہ جگہ سے منہدم ہو گئی تھی اور اندر درخت اندھیرے میں سرنگوں بھوتوں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ دوسری طرف پرانی وضع کے بنگلے تھے جن میں پہلے اصلی گورے حاکم رہتے ہوں گے۔ اب ان میں سراج جیسے کالے افسر رہتے تھے جو بجا طور پر بحیثیت پرانے فرنگی آقاؤں کے صحیح جانشین ثابت ہو رہے تھے۔
مجھے خیال آیا کہ میری نسبت محسن کا کام زیادہ مشکل ہوگا۔ اگر اس نے چکری کو قابو میں کر لیا تب بھی اسے گاڑی تک تو رکشا ہی میں آنا پڑے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ محسن کو چکری کے علاوہ رکشے والے سے بھی نمٹنا ہوگا اور ان دونوں میں سے ایک نے بھی شور مچا دیا تو... مگر ریوالور کی نال کو سامنے دیکھ کر موت کو آواز کون دے گا۔ پھر بھی اسے گیٹ کے سامنے سے تو گزرنا ہی ہوگا۔ وہ ریوالور دیکھ کر مزاحمت نہ کریں مگر اتنے مسلح محافظوں کی موجودگی ان کو واویلا پر اکسائے گی۔ پھر محسن کیا کرے گا؟ بفرض محال اس نے دونوں کو گولی مار دی تب بھی وہ کب تک [illegible] میں فرار ہو سکے گا۔ پولیس والے جیپ لے کر اس کے پیچھے لگ جائیں گے۔
مجھے پلاننگ میں خامی کا احساس ہوا۔ بہتر ہوتا اگر میں محسن کو واپس لوٹ جانے کو کہتا اور آگے آنے کا مشورہ نہ دیتا۔ جہاں گاڑی کھڑی ہوگی وہ رکشے کو کسی خطرے کے بغیر واپس لے جا سکتا تھا۔ گاڑی کو درمیان میں کہیں روکنے کا سوال ہی نہ تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ چکری اس طرف سے نہ آئے۔ ویسے زیادہ امکان یہی تھا کہ چکری کا راستہ میں کاٹوں گا

گا۔ بیشتر رکشے والے دوسری طرف سے آنا پسند نہیں کر سکتے کیونکہ اس طرف کی سڑک بہت خستہ حالت میں تھی۔ گاڑی میں بھی مجھے جھٹکے محسوس ہوتے تھے۔ رکشے کے پہیے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس میں تو پاکٹ اور مسافر دونوں گیند کی طرح اچھلتے ہوں گے۔
میں ایک درخت کے چوڑے تنے کی آڑ لے کر کھڑا ہوا تھا اور ایک ہی سمت میں دیکھ رہا تھا جدھر سے رکشے کے نمودار ہونے کی امید تھی۔ اس کی ایک روشن آنکھ جب نمودار ہوئی تو رات کی خاموشی کو اس کے سائلنسر کی کرخت آواز نے پہلے منتشر کیا۔ میں چوکس ہو گیا۔ آواز بڑھتی گئی اور وہ روشنی قریب آتی گئی۔
عین وقت پر میں نے پیچھے سے پتھر اٹھا کے رکشے پر پھینکا۔ پتھر اس کے سامنے والے حصے سے ٹکرایا۔ رکشا ایک دم رک گیا اور رکشے والا گالی دے کر نیچے اترا۔ مجھے صرف اتنی مہلت درکار تھی کہ میں پیچھے بیٹھے ہوئے مسافر کو دیکھ سکوں مگر وہ مجھے اب بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔
"کیا ہوا یار؟" میں نے چکری کی آواز سنی۔
"پتا نہیں کون... کسی نے پتھر مارا ہے۔" رکشے والا پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ "لائٹ ٹوٹ جاتی تو [illegible]"
"او چل یار اب ٹوٹی نہیں تو..." چکری نے کہا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میں درخت کے تنے کی اوٹ سے نکلا اور آہستہ سے بغیر رکشے کے پیچھے جا پہنچا۔ میں نے دس قدم کا فاصلہ بہت جھک کر طے کیا تھا چنانچہ رکشے والا مجھے نہ دیکھ سکا۔ میں نے بڑی پھرتی سے چکری کے منہ پر ایک ہاتھ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے سر پر ریوالور رکھا۔ اس کی آواز تو نہیں نکلی مگر وہ میری گرفت سے نکلنے کے لیے تڑپا اور کسی گرگ کی طرح ہلا اور رکشے والے نے ایک دم پلٹ کے دیکھا۔
"چپ..." میں نے چکری کو چھوڑ کے ریوالور کا رخ اس کی طرف کر دیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ "کوئی آواز نہ نکلے۔"
اس نے رضاکارانہ طور پر [illegible] یہ لاشعوری قسم کا ردعمل تھا۔ عموماً فلموں میں وہ شخص ہمیشہ ہینڈز اپ کرنے کا حکم دیتا ہے جس کے ہاتھ میں ریوالور ہو۔
"کیا... کیا چاہتے ہو؟" وہ ہکلا کے بولا۔ "مال...؟"
"کچھ نہیں تو۔" میں نے کہا۔ "یہ مال آمادہ دو اور جاؤ بالکل خاموشی کے ساتھ، جس راستے سے آئے تھے اسی سے لوٹ جاؤ اور اس واقعے کو بھول جاؤ۔ سمجھو کہ نہ کوئی مسافر سوار ہوا، نہ تم یہاں آئے اور نہ مجھ سے ملے۔" میں نے چکری کو باہر کھینچ لیا۔
"میری صورت مت دیکھو، جاؤ۔" لڑکے نے ریوالور سے

رکشے والے کو اشارہ کیا۔ "میں تمہاری جان لینا نہیں چاہتا۔"
"خدا کے لیے رحم کرو۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔
"ڈرو نہیں، کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا مگر تم نے خود ہی کسی سے حماقت کی تو پھر کچھ ہو کر اپنی گرفتاری کا سامان خود کرو گے۔ یہ بات ایک بار ہونٹوں سے نکل جائے تو دور تک چلی جاتی ہے۔ اس لیے تمہارے رکشے کا نمبر میں نے دیکھا ہوگا۔ کوئی بھی مسافر بیٹھنے سے پہلے رکشے کا نمبر حفظ نہیں کرتا مگر تم نے بیوی کو بھی بتایا تو سمجھ لینا کہ وہ بیوہ ہوئی۔ عورت کو بھی وہ راز مت بتاؤ جس سے تمہاری زندگی اور سلامتی وابستہ ہو۔"
"وہ بے چاری تو کب کی اللہ کو پیاری ہو گئی۔" وہ بولا۔
"بس تو پھر وہی کرو جو میں نے کہا، بھول جاؤ اس واقعے کو۔"
اس نے تعمیل کی۔ رکشا واپس موڑا اور آہستہ آہستہ روانہ ہو گیا۔ شاید اسے میری بات پر پوری طرح اعتبار نہیں آیا تھا کہ میں اس کی جان لینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس کا خیال ہوگا کہ اس کے پیچھے ہی میں گولی چلا دوں گا پھر جیسے جیسے فاصلہ بڑھتا گیا اس کا یقین بھی بڑھتا گیا اور اس کے رکشے کی رفتار بھی بڑھتی گئی۔ میں نے چکری کو اٹھا کے کندھے پر ڈال لیا تھا۔ دو منٹ سے بھی کم وقت لگا، میں نے اسے گاڑی میں پھینک دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے میں نے سوچا کہ محسن کی طرف لوٹ جاؤں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں اسی راستے سے گزرا تھا اور گاڑیاں چیک کرنے والے سرکاری گاڑی کو پہچان لیں گے اور مجھے گزر جانے دیں گے مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ دوبارہ روک لیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں ڈپٹی کمشنر صاحب کی فیملی کو لینے کے لیے جا رہا ہوں۔ انہوں نے ٹارچ کی روشنی میں اس فیملی کو دیکھنا چاہا تو انہیں صرف چکری نظر آئے گا، بے ہوش لیکن ایک نظر میں لاش نظر آنے والا۔ اس کے علاوہ اب مجھے پہلے وہ روکے گا جس نے آتے وقت نہیں روکا تھا۔
یہ سوچ کے میں نے گاڑی کو اسی سمت میں بڑھا دیا جدھر رکشا گیا تھا۔ مجھے اب کم سے کم تین چار میل کا چکر کاٹ کے وہاں پہنچنا تھا جہاں محسن کو ڈراپ کیا تھا۔ پون گھنٹا پہلے کی بات تھی۔ دوبارہ وہاں پہنچنے میں پندرہ بیس منٹ صرف ہونا لازمی تھے۔ محسن یقیناً پریشان ہوگا کہ اتنی دیر کیوں ہوئی۔ چکری کو دوسرا رکشا پانچ دس منٹ لیٹ مل جانا چاہیے اور اس طرح جانے اور ان کے ایک ہی جگہ پہنچنے میں دس پندرہ منٹ کا فرق ہونا چاہیے۔ وہ جانے گا تو پیش نہیں مگر اندیشے یقیناً اسے پریشان رکھیں گے۔ ناکامی کے اندیشے، صورت حال کے برعکس ہو جانے کے اندیشے، میرے پولیس کے ہاتھ پڑ جانے یا کسی بھی غیر متوقع بات کے اندیشے۔

www.paksociety.com

کم سے کم وقت میں محسن تک پہنچ جانے کے خیال سے میں نے رفتار زیادہ رکھی تھی۔ ماکروویس کا انجن پندرہ سو سی سی کی طاقت کا تھا اور سرفاکس ویگن کی طرح اس کی پک اپ بھی غیر معمولی تھی۔ رات تنگ اور ناہموار سڑک پر میری ساری توجہ ڈرائیونگ کی طرف تھی۔ سن چالیس سے پہلے کی فاکس ویگن میں چھ وولٹ کی بیٹری کی لائٹ بہت ہی کم ہوتی تھی۔ اب بارہ وولٹ سے بھی ہیڈ لائٹس اتنی تیز نہیں تھیں جتنی کہ نئی جاپانی کاروں میں ہوتی تھیں۔

وہ ایک بلائنڈ کارنر تھا جہاں میں نے پوری احتیاط کرتے ہوئے گاڑی کو موڑا تھا مگر دوسری طرف سے ایک ٹرک کسی پاگل ہاتھی کی طرح دوڑتا ہوا آیا۔ میں نے اسٹیئرنگ وہیل کو ایک دم بائیں جانب موڑ کے تصادم کو بچا لیا۔ ٹرک اس کے باوجود ماکروویس کی باڈی کو تقریباً چھوتا ہوا گزرا۔ اس کا اگلا پہیہ ماکروویس کے پچھلے پہیے پر لگا۔

لیکن یہ سب رفتہ گزشتہ والی بات ہو جاتی اگر اسی وقت ایک حادثہ پیش نہ آتا۔ معلوم نہیں کس وقت چکری ہوش میں آ گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کا ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنا مشکل تھا۔ میں نے ناپ تول کے صحیح جگہ پر ضرب لگائی تھی مگر ہر انسان کی قوت مدافعت اور قوت برداشت جدا ہوتی ہے۔ بہ ظاہر بہت صحت مند نظر آنے والے کو سوئی بھی چبھ جائے یا وہ خون کا ایک قطرہ بہتا دیکھ لے تو بے ہوش ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس کمزور نظر آنے والے کو گولی لگ جائے اور خون مسلسل بہہ رہا ہو تو وہ بے ہوش نہیں ہوتا اور مقابلہ کرتا ہے یا جان بچانے کے لیے اپنے پیروں پر چل کے کسی گھر یا اسپتال تک جا پہنچتا ہے۔

چکری موقع کا منتظر رہا اور جب موڑ آیا تو اس نے یہ سمجھتے ہوئے کہ اب میں رفتار لازمی طور پر کم کروں گا، ایک دم دروازہ کھولا۔ ساتھ ہی چھلانگ مار دی۔ اگر یہ عام گاڑی ہوتی جس کا دروازہ باہر کی طرف کھلتا ہے تو پیچھے گزر جانے والا ٹرک اس دروازے سے ٹکراتا اور اسے توڑ کر سڑک پر گرا کے روندتا ہوا گزر جاتا مگر دروازہ سلائیڈنگ تھا اور تھوڑا سا پش کرنے سے کھسک کر سائڈ میں ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ ادھر چکری نے جست لی، ادھر ٹرک سامنے آ گیا۔ اس کے لیے ایک لمحے کی مہلت بھی نہ تھی جس میں وہ خود کو بچانے کی کوشش کے بارے میں سوچ بھی سکتا۔ غالباً وہ ہوا میں ہی تھا جب ٹرک نے سامنے سے اس کو ٹکر ماری۔ ماکروویس کا دروازہ سامنے نہیں آیا مگر چکری آ گیا۔

اگر ٹرک ذرا فاصلے سے گزرتا تو شاید چکری سڑک پر گرتا مگر اس صورت میں بھی اس کے بچنے کے امکانات بہت کم تھے یا تو وہ ماکروویس کے پچھلے پہیوں سے کچلا جاتا یا ٹرک کے اگلے پہیوں سے۔ پیچھے کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا، یہ میں نے سب نہیں دیکھا۔ میں نے عین اس وقت دروازے کے سلائیڈ کرنے کی آواز سنی تھی جب میں ماکروویس کو ٹرک کی زد سے بچا رہا تھا۔ دوسرے لمحے چکری کی ایک بہت مختصر سیکنڈ کے ہزارویں حصے تک یا اس سے بھی کم عرصے تک ارتعاش پیدا کرنے والی... دلخراش اور تڑپ کے کرب سے موت تک کے سفر کا عنوان بننے والی چیخ سنی پھر میں آگے نکل گیا اور میں نے بریک تو ذہن کے ایک خودکار رد عمل کے طور پر لگا دیے تھے مگر ماکروویس کے رکتے رکتے بھی پچیس گز اور گزر گئے۔

ٹرک والے نے واضح طور پر سب دیکھا تھا اور شاید سمجھ بھی لیا تھا کہ فرشتہ اجل نے کسی بدنصیب کو سامنے لا ڈالا ہے تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ اسے تو ایک فٹ کا فاصلہ یا سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی مہلت بھی نہ ملی۔ اس نے چکری کو سامنے سے ٹکراتے، گرتے اور مرتے دیکھا ہوگا۔ چکری شاید فضا میں تصادم کے فوراً بعد ہی مر گیا ہوگا۔ جب وہ سڑک پر گرا ہوگا تو لاش ہوگا اور ٹرک نے کسی جیتے جاگتے آدمی کو نہیں ایک لاش کو کچلا ہوگا۔

ماکروویس کو روکتے ہی میں نے سڑک کے وسط میں وہ دھبا سا دیکھا جو پچاس گز کے فاصلے سے یوں لگتا تھا جیسے سڑک پر کیچڑ ہے اور کچھ غلاظت پھیلی ہوئی ہے۔ چکری سڑک پر پس کر دور دور تک پھیل گیا تھا۔ اس کا خون، گوشت اور ہڈیاں سڑک پر گڈمڈ ہو کر، کنکر، پتھر اور گھاس پھونس میں مل کر بچھ گئی تھیں۔ ٹرک والے عموماً ایسے معاملات میں کچھ دل گردے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کسی اور کے نقطہ نظر سے یہ سنگ دلی اور بربریت ہو سکتی ہے مگر ٹرک ڈرائیور جانتے ہیں کہ نادانستہ قتل کے الزام میں ان کو پولیس، کچہری اور جیل خانے کے کتنے پرعذاب سالوں پر پھیلے ہوئے مرحلے جھیلنے ہوں گے۔ اس کا ارادہ کسی کو مارنے کا نہیں تھا چنانچہ اس کی سب سے بڑی سزا وہ ذہنی اذیت ہی ہوگی جو اس نے بعد میں اس منظر کا تصور کر کے کاٹی مگر اس وقت وہ رکا نہیں، سیدھا گزر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ مرنے والا خودکشی کرنا چاہتا تھا۔ اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا پھر وہ خود کو کیوں نہ بچائے۔

معلوم نہیں آگے اس ٹرک کو کسی پولیس والے نے روکا یا نہیں۔ چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کو وہ کم ہی روک سکتے ہیں۔ ان کا مشغلہ اور ان کی ملازمت ہے ان کو روکنا اور ٹرک دینا جو کمزور ہوں، اپنا دفاع نہ کر سکتے ہوں، دنیاوی طور پر لاوارث ہوں اور خود کو بے گناہ نہ ثابت کر سکتے ہوں چنانچہ ان پر کسی جو... میں فوت ہونے کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔

میں اس حادثے پر تھا سا دل گرفتہ تھا۔ چکری نے مجھے چکر دیا تھا اور اس وقت یہ بھولا ہوا تھا کہ سب سے بڑی چکر باز تقدیر ہے۔ وہ اپنے آقا ولی نعمت کی خدمت میں اپنے کارنامے کی تفصیل بیان کرنے کے لیے حاضر ہونے دوڑا تھا کہ اس نے اپنی چالاکی اور ذہانت سے محسن اور سکندر کو کیا چکر دیا ہے مگر اسے علم نہ تھا کہ راستے میں اجل نے پھندا رکھا ہے۔ وہ سراج کو کچھ بتائے بغیر مر گیا تھا۔ یہ میرے نقطہ نظر سے اچھا ہوا تھا مگر میں ان بدنصیبوں کے عبرت ناک انجام پر افسوس کیے بنا نہیں رہ سکتا جو قدرت کے نظام انصاف کی گرفت میں آنے سے بچتے رہتے ہیں تو بالکل ہی بھول جاتے ہیں کہ دنیا کو چلانے کے لیے خالق کائنات نے اس نظام میں ایک قانون ہمیشہ برقرار رکھا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اب تک انسان کی فطرت اور سرشت میں شامل بدی کا عنصر غالب آ چکا ہوتا اور شیطان ہی خدا کہلاتا۔

میں بے اختیار چند قدم آگے بڑھا۔ سڑک پر خون کی دو متوازی لکیریں سی بن گئی تھیں۔ ان سے ذرا ہٹ کے چکری کے آدھے ادھورے ٹکڑے اور کپڑوں کے چیتھڑے بکھرے ہوئے تھے مگر جس چیز نے مجھے متوجہ کیا، وہ کاغذات تھے۔ غالباً ٹرک کی ٹکر کے ساتھ ہی یہ کاغذات اس کے کوٹ کی جیب سے نکل کر گر گئے تھے۔ میں نے جھک کر ان کاغذوں کو اٹھانا چاہا تو مجھے ایک پرس بھی دکھائی دیا۔ میں نے اسے بھی جیب میں ڈال لیا اور پلٹ کر اپنی گاڑی کی طرف چلنے لگا۔ میری طبیعت اچانک مالش کرنے لگی تھی۔ نیچے جھکتے ہوئے مجھے ایک عجیب سی متلی کر دینے والی بو محسوس ہوئی تھی۔ یہ پوسٹ مارٹم نے تھا بولوں کی گندگی ذرا کانوں میں اور ایک بار کلیجے میں محسوس کی تھی۔ مجھے ایک ذرا سی چکر آئی اور فضا ایسی لگی جیسے مجھے زمین و آسمان گھومتے ہوئے لگے۔ میں نے ماکروویس کا سہارا نہ لیا ہوتا تو میں یقیناً گر جاتا۔

چند منٹ بعد میری طبیعت سنبھل گئی اور میں نے چہرے پر سے وہ پسینہ خشک کیا جو میرے جسم پر بھی بہہ رہا تھا۔ مجھے کمزوری کا احساس ہوا لیکن میں پھر ڈرائیو کرنے لگا۔ اب میں بہت محتاط تھا۔ میں گاڑی کو بہت آہستہ چلا رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ احساس سے اس خونی منظر کو کھرچ کر مٹا دوں مگر وہ ساری لرزہ خیز تفصیلات کے ساتھ میرے ذہن پر یوں نقش ہو گیا تھا جیسے شفاف شیشے پر چپکی ہوئی تصویر۔

ایک طویل سفر طے کر کے میں محسن تک پہنچا تو ذہنی اور اعصابی تکان کے آثار میری صورت سے عیاں تھے۔

"اتنی دیر کیوں ہوئی؟" محسن نے گاڑی کے رکتے ہی قریب آ کے کہا۔ "میں تو گھبرا گیا تھا۔" پھر اس نے میری صورت دیکھی۔ "تجھے کیا ہوا ہے اسکندر؟"

"کچھ نہیں تو۔" میں نے اسٹیئرنگ پر سر رکھ کے کہا۔ "بڑی اچھی بات ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ چکری کچھ نہیں کر سکا۔"

"کیا تو نے اسے مار دیا؟" محسن بولا۔ "اگر مار دیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ ناگزیر سمجھ کے ہی ایسا کیا ہوگا تو نے؟"

"نہیں یار، میں نے اسے نہیں مارا۔ اسے قدرت نے مار دیا۔ اسے وہیں مرنا تھا۔ تقدیر نے ہمیں بھیجا اور ہم نے اس کے لیے وہاں پہنچنے کا سبب پیدا کر دیا جہاں عزرائیل کو اس کی روح قبض کرنے کا حکم تھا۔ جب وقت آتا ہے تو سب وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں موت منتظر ہوتی ہے۔"

"چل تو ادھر ہو۔" محسن نے کہا۔ "گاڑی میں چلاؤں گا تو اطمینان سے بتا مجھے کہ کیا ہوا۔ ایسا کرتے ہیں کہ گلبرگ کی طرف چلتے ہیں، وہاں بیٹھ کے کافی پئیں گے۔ تیری طبیعت کچھ بحال ہو جائے گی پھر وہیں سے سب کے لیے کھانا لے کر گھر چلیں گے۔"

میں نے فقط تائید میں سر ہلایا اور پھر محسن کو چکری کی موت کے بارے میں بتانے لگا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ اچھا ہی ہوا۔" محسن نے پوری بات سن کے کہا۔ "اگر ہم اسے بھی اغوا کر لیتے تو وہ لاء اینڈ آرڈر والے اس واردات کو اغوا کی دوسری واردات کے ساتھ ملا کے دیکھتے اور محتاط ہو جاتے۔ وہ کسی ٹرک پر سامان نہ بھیجتے، وقتی طور پر یہ سلسلہ ضرور روک دیتے۔"

"اور اگر ہم وہیں سے پکڑ لیتے تو شاید وہ سراغ لگا لیتے کہ چکری ہم سے ملا تھا۔" میں نے کہا۔

"اگر وہ ہمارے ہاتھوں مارا جاتا تب بھی شکوک جنم لیتے۔ تفتیش ہوتی اور ممکن تھا کہ بات اس کار ڈیلر تک پہنچ جاتی۔" محسن بولا۔ "اب جو ہوا وہ ایک عام حادثہ ہے۔ سڑکوں پر انسان ان مشینوں کے نیچے پستے رہتے ہیں جن کو وہ خود بناتے اور چلاتے ہیں۔ کارخانوں میں بھی یہی ہوتا ہے اور گھروں میں بھی۔ آدمی نے بجلی ایجاد کی۔ اب ایجاد اپنے موجد کو قتل کر رہی ہے۔ اسے مرنے سے موت مرتی ہے۔ تخلیق اپنے خالق کو ختم کرتی ہے۔" اس نے گاڑی کو پارک کرنے کے لیے تب بھی کھڑی گاڑیوں کی صف میں شامل کر لیا۔

کافی کا پہلا کپ پی کر میری طبیعت بحال ہو گئی اور ڈپریشن کا وہ غبار اتر گیا جو ایک سانحے کا رد عمل تھا۔ سگریٹ سلگا کر میں نے اطمینان سے ایک طویل کش لیا اور پھر وہ کاغذ نکالے جو میں نے سڑک سے اٹھا لیے تھے۔ پرس کے اندر سات ہزار روپے تھے۔ پندرہ پندرہ ہزار کے دو چیک تھے

www.paksociety.com

ایک کراس اور دوسرا بیئرر۔ اس کے نیچے صرف دستخط تھے۔ کراس چیک گڈز فارورڈنگ ایجنسی کے نام پر تھا اور بیئرر چیک ملک حق نواز کے نام پر۔

"یہ ملک حق نواز ہی اس گڈز فارورڈنگ ایجنسی کا مالک ہو سکتا ہے۔" محسن نے چیک کو دیکھ کر کہا۔

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔"

"ظاہر ہے یہ چیک کسی نے دیے تھے، ایڈ ٹرک سے سامان بھجوانے کا معاوضہ ہوگا۔" محسن بولا۔

"یہ تو معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ٹرک کس نے بھیجے تھے۔ ہر چیک پر ایک اکاؤنٹ نمبر ہے۔" میں نے کہا۔ "بیئرر چیک ملتان ہے۔ کراس چیک کراچی کا ہے۔ اکاؤنٹ نمبر سے اکاؤنٹ ہولڈر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا بہت مشکل ہے مگر مشکل سے مشکل کام بھی ناممکن نہیں ہوتا۔"

"خصوصاً اس معاشرے میں جہاں اصول اور قانون سے زیادہ سکہ چلتا ہو۔" محسن نے کہا اور چیک جیب میں رکھ لیے پھر ہم نے کاغذات کا معائنہ شروع کیا۔

یہ ایک ہی کاپی سے پھاڑے ہوئے صفحات لگتے تھے۔ پھر پرانے تھے۔ ان کے مڑے ہوئے کناروں کی خستہ حالی اور میلا رنگ دیکھ کے بھی اندازہ ہوتا تھا۔ صرف ایک کاغذ بالکل نیا اور سفید تھا۔ اس پر صرف نمبر لکھے ہوئے تھے اور یہ سب نمبر گاڑیوں کے تھے۔ غور کرنے پر میں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں بھی کامیاب نہ ہوا کہ سارے نمبر کمرشل تھے۔ پرائیویٹ کار والوں کی سیریز میں یہ نمبر نہیں آتے تھے۔

"یہ غالباً ٹرک ہیں۔" میں نے کہا۔

محسن نے کاغذ سے... "یہ نمبر اس نے کیوں نوٹ کیے ہیں؟"

"ہم نے اس سے کہا تھا کہ ہمیں ان ٹرکوں کے بارے میں تفصیلات درکار ہیں۔" میں نے کہا۔ "نمبر اسے زبانی یاد تھے۔"

"ایک منٹ، اس نے کچھ نمبر بتائے بھی تھے۔" محسن نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آٹھ سو تیئیس... یعنی سیون ون فائیو ون، یہ تو اس میں نہیں ہے۔ دوسرا نمبر کیا تھا؟"

"ستائیس اٹھائیس، تو سیون ون نائن۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی نہیں ہے۔" محسن بولا۔ "کیا خیال ہے، آپ کی سمجھ میں آیا کچھ اس مسئلے کے؟"

"میرا خیال ہے کہ جگری نے بڑی عجلت میں یہ نمبر ایک کاغذ پر لکھے تھے۔" میں نے کہا۔ "غالباً سراج کو بتانے کے لیے کہ ان ٹرکوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے کیونکہ سکندر اور محسن نے پیٹرو کو وہاں دیکھ لیا تھا اور انھیں شک ہو گیا تھا کہ اس کمپنی کے ٹرک دوسرے مال کے ساتھ اسلحے کی ترسیل کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ جگری بتانا چاہتا ہوگا کہ آپ کے دشمنوں نے مجھے دس ہزار کی رشوت دے کر ان ٹرکوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہی تھی، میں نے بہت ہوشیاری سے انھیں ٹال دیا۔"

"بلکہ غلط ٹرکوں کے نمبر دے دیے۔" محسن نے کہا۔ "اور وہ ایسے ڈرائیوروں کے نام بتا دیے جو یہ کام نہیں کرتے یا جن کا وجود ہی نہیں۔"

"اس کا مقصد سراج کو خبردار کرنا ہوگا کہ جو اطلاع ہم اس کے ذریعے سے حاصل نہیں کر سکے وہ کسی اور سے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ خود تو ٹھیک ٹھاک ہے مگر وہ سرد مہری سے کس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی سراج کی خاطر انھیں بتا دے۔ یہ تو اطلاع بھی ایسی ہے کہ کوئی ان کو فون کر کے بھی دے سکتا تھا اور ٹرک دشمنوں کے ہاتھ لگ جاتے تو پتا بھی نہ چلتا کہ کس نے نمک حرامی کی تھی۔ بہتر ہوگا کہ ان ٹرکوں کو روک لیا جائے یا ان کا راستہ بدل دیا جائے۔"

"تیرا مطلب ہے یہ ٹرک روانہ ہو چکے ہیں اور راستے میں ہیں؟"

"ایک نظریہ ہے یہ..." میں نے کہا۔ "دوسرا نظریہ کہتا ہے کہ یہی وہ دس ٹرک ہیں جو والد اینڈ کمپنی کے زیر استعمال ہیں۔ خطرہ محسوس کرتے ہی وہ ٹرک بدل دیتے یا ان کے نمبر بدل دیتے۔"

"یہ تو بہت مفید معلومات حاصل ہو گئی ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم ان ٹرکوں پر نظر رکھ سکتے ہیں۔ فوراً خود کوئی بھی حرکت کرنا پڑتا ہے ہوگا تو وہ اسی کا آدمی ہو۔"

"میں اس شخص کی... محسوس کرتا ہوں جیسے دشمن نے اپنی ٹیلی اسکوپ پر ہدف سے گولی کا نشانہ لینے کا سوچا ہو مگر عین اس وقت جب گولی چلانے والی انگلی حرکت میں آنے لگی ہو، زلزلہ آ جائے اور نشانہ خطا ہو جائے۔ جگری پہلے رکتے... بیٹھ جاتا تو خاموشی سے سراج کے پاس پہنچ کے آتے ہمارے سارے عزائم اور ارادوں کے متعلق بتا دیتا۔ ہم نے تو اس سے سراج کا سارا پلان بتا دیا تھا۔ وہ رکشے والا جس نے اسے سامنے سے ٹکرا دیا، خدا کا بھیجا ہوا کوئی فرشتہ تھا۔"

"خدا کا بھیجا ہوا یا فرشتہ، اجل کا بھیجا ہوا۔" محسن بولا۔ "اس کا تو حساب کتاب غلط ہو جاتا۔ یہ ضروری تھا کہ جگری کو کچھ دیر ہو جاتی کہ وہ مقررہ وقت پر اپنی موت سے ملنے پہنچے۔"

"خدا نے ایک بہت بڑی آفت سے بچا لیا۔ بیچ سے اس کا ورثہ ملے کے پاس جیل کے ٹرک کا سودا کر دو۔" میں نے کہا۔ "خود بھی چاہتا تھا کہ جگری بیچ میں کوئی چکر نہ چلائے۔ جگری کے آنے سے وہ خوش ہوگا۔ ہم بھی اس کا نام نہیں لیں گے۔"

"ہم چار لاکھ روپے اسے ہی کیوں نہ دے دیں؟" محسن بولا۔

"زیادہ دلاں کیوں جائیں جہاں ایک بار بیئرر سے ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی۔ نہ معلوم کل کون مل جائے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "شوروم کے مالک سے لین دین آج ہی ہو جائے تو باقی رقم بھجواؤ اور ٹریلر لے آؤ۔ ہم تم کو جانتے ہیں اور تم پر پوری بھروسا کر سکتے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوگا۔ اسے توقع ہے کہ بچت کے رقم مارنے کا منگوا ارادہ بالکل ختم نہیں ہوگا۔ پھر اس سے کہیں گے کہ ٹریلر کو بھی ہمارے نام پر منتقل کرانے کی ساری کاغذی کارروائی پوری کرے۔"

"کیا ٹریلر بھی عجب خان کے نام پر ہوگا؟"

"اور کس نام پر ہونا چاہیے؟ نورتن سرکس کمپنی کے نام پر؟"

"نہیں، ہونا تو چاہیے کسی شخص کے نام پر۔ کمپنی کا کیا ہے، کل بند ہو جائے۔" محسن بولا۔ "کسی عورت کے نام پر کر دیتے ہیں۔ مثلاً کوئی مشتری بائی یا ثریا قسم کا نام ہو۔"

"بجلی بائی جیسی والی۔" میں نے کہا۔ "نہیں دوست، بے شک سرکس میں اوٹ پٹانگ ناموں والے ملتے ہیں مگر ایسے نام آج کل کون رکھتا ہے۔ نام امپریس کرنے والا ہونا چاہیے جیسے ثریا شاہانی آف بھوپال، بیگم ارجمند بانو قزلباش... یا مسز صبا حسن زادہ شوکت حیات۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" محسن بولا۔ "یہی نام بتا دیں گے آجے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب چلنا چاہیے۔ ورنہ بے چارہ غالب تشویش میں مبتلا ہوگا۔"

ہم نے وہیں سے چھ افراد کے لیے کھانا پیک کرایا اور اسی ہزار کی رقم میں سے ادا کیا۔ ... جگری کی لاش سے ملی تھی۔ یہ مال دشمن کا تھا اور یہ مال حرام بھی ہو سکتا تھا لیکن تنقید کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ہمارے لیے تو یہ مال غنیمت تھا جس کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ساڑھے نو بجے جب ہم گودام کے کوارٹر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر رکے۔ جہاں بہت سی گاڑیاں ایک قطار میں کھڑی ہوئی تھیں، ان میں بیشتر پرائیویٹ بسیں تھیں جو شہر کو مضافات سے ملاتی تھیں اور صبح سے شام تک مسافر ڈھونے کے بعد رات کو یہاں پارک کر دی جاتی تھیں۔ وہاں تین چار گیراج تھے جہاں رات بھر ان بسوں کے چھوٹے موٹے نقائص دور کر دیے جاتے تھے تاکہ وہ اگلا دن بھی باربرداری میں خیریت سے گزار لیں۔

"کوئی کام ہے جناب؟" ایک نوجوان مکینک ہماری طرف جھکا تھا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "چاروں پہیوں کی بریک لائننگ نکلوانی ہے۔"

"ہو جائے گی جناب۔ کب چاہیے گاڑی؟"

"ہم صبح آئیں گے، آج کا دن تو گزار لیا۔" میں نے کہا۔

"گاڑی کھینچ رہی تھی؟" مکینک بولا۔

"ہاں، بہت زیادہ... دائیں طرف۔" میں نے کہا اور محسن کے ساتھ چل پڑا۔

"وہ... جناب چابی!" مکینک نے کہا۔ "میں بریک ٹیسٹ کیسے کروں گا؟"

"دروازہ کھلا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ مت کرنا کہ رات بھر گاڑی دوڑاتے پھرو۔ میں نے میٹر دیکھا ہوا ہے۔"

"آپ فکر مت کریں جی۔" مکینک نے کہا۔ میں نے اسے ایک ایسے کام میں الجھایا تھا اور یہ کام اچھا بھی تھا۔ وہ ایک ایک وہیل کو کھول کے بریک سیٹ کرے گا۔ بریک شو یا واشر کے خراب ہونے کا کوئی امکان نہ تھا چنانچہ ہم صبح اسے حق محنت ادا کرنے کے پابند تھے۔ اگر ہم اسے کہتے کہ یہاں یہ گاڑی کھڑی ہے، رات بھر اس کا خیال رکھنا تو وہ کبھی راضی نہ ہوتا اور ڈرتا کہ کہیں وہ پھنس نہ جائے مگر اب اس کا بھی بھلا ہو گیا تھا اور ہمارا بھی۔ چابی میں نے اس لیے نہیں دی تھی کہ اگنیشن اور ڈور لاک کے علاوہ وہی چابی پیچھے ڈگی کو کھولنے میں بھی کام آتی تھی اور پیچھے کے تختے کے خانے میں اسلحہ بھرا ہوا تھا۔

ہم سوٹ کیس اور کھانے کے بنڈل اٹھائے مارچ کرتے ہوئے دو فرلانگ دور واقع گودام پہنچے تو سناٹے میں تھے۔ غالب سو کے اٹھ گیا تھا اور اب جولی سو رہی تھی۔ سراج کی ماں بھی سو رہی تھی مگر ہماری باتوں کی آواز پر وہ اٹھ بیٹھی۔ ہم نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ قید تنہائی اس کے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی تھی اور یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

"کوئی آیا تو نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"کون آئے گا اس خانہ خرابی میں۔" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "اب تو اس بت کافر کا خیال تک نہیں آتا۔"

"یہ بھی اچھا ہوا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ اس جفا پیشہ کے پیکر خیال سے بعید نہیں کہ آئے تو دوسری ٹانگ بھی توڑ جائے۔"

"تم دونوں کی صورت پر آج فاقہ مستی نہیں، آسودگی ہے۔ تم عیش کرتے رہے ہو۔" غالب نے کہا۔

میں نے حیران ہو کے محسن کی طرف دیکھا۔ "یہ تو سچ ہے مرزا، ایک بار نہیں ہم نے دو بار کافی پی، ایک بار ریسٹورنٹ میں اور وہاں بیٹھ کے اپنے اپنے خواب بھی دیکھے، کیا یہ عیاشی ہے؟"

"ہاں، میری جگہ ایک ٹانگ پہ ستون بن جا کے بیٹھو اور پھر فیصلہ کرو۔" غالب بولا۔

www.paksociety.com

"لیکن ہم نے اور بھی بہت کچھ کیا۔" میں نے کہا "یہ سب کچھ پہلے ٹرپ سے۔"

"جگنو کو بھی اٹھالو۔" غالب نے کہا "وہ کمال حوصلہ رکھنے والی اور صابر لڑکی ہے۔ آخر جیتی جاگتی ہے۔ ماں کی موت کا صدمہ بھی جھیل گئی اور اب بالکل نارمل ہے!"

"جانے اس پر بعد میں کیا بیتی؟" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا

"موت سب کو برابر کر دیتی ہے!" میں نے کہا "یہ بزرگوں کا مقولہ ہے۔ شاہ اور فقیر، مجرم اور منصف اور دوست و دشمن سب مر گئے تو فقط ایک مشتِ خاک رہ گئے۔ جو ہاتھ پر بچے گی وہی کیمسٹری بن پڑا۔ اس سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ لاوارث قرار دے کر دفن کیا گیا یا سرکاری مردہ خانے کے فرش پر ڈال دیا گیا یا چیر پھاڑ کرنے والے متجسس طالب علم ڈاکٹروں کے حوالے کر دیا گیا اور کس کا جنازہ دھوم دھام سے اٹھا اور سوئم چہلم ہوا۔ یہ فرق دنیا کی نظر و تجسس ہے، مرنے والے کو کیا!"

"تم نے والد کو بھی مطلع کر دیا تھا؟" غالب نے کہا۔

"ہاں اُسے بتانے کے وقت میری خواہش تھی کہ اس کا چہرہ دیکھوں!" میں نے کہا "کہ کیا اس خبر کا بھی اس کی صورت پر کوئی ردعمل ظاہر ہوتا!"

"جگنو شام کو قبرستان جانا چاہتی تھی۔" غالب بولا۔

"ہاں ہم نے اس سے وعدہ کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"کل ضرور لے جانا۔" غالب نے کہا "کوئی تازہ ستم دیکھ لینا!"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس مظلوم کو بہلانے کے لیے یہ بھی کرنا ہوگا۔"

محسن نے جگنو کو جگا دیا تھا۔ ہمارے اصرار پر اس نے تھوڑا بہت کھایا۔ غالب کے بعد دُعا حمید نے وقت میں کچھ سکون آور ادویات بھی لے لی تھیں۔ غالب کے لیے دو گولیاں تھیں۔ ایک اینٹی بائیوٹک اور ایک درد کش۔ جگنو نے ایک سکون بخش گولی کھائی اور پھر سو گئی۔ سراج کی ماں نے بہت ضد کی اور ہمیں دھمکی دینا پڑی کہ اس نے گولیاں نہ کھائیں تو ہم زبردستی انجکشن لگا دیں گے۔ آدھے گھنٹے میں وہ بھی سو گئی۔

"اب تم بھی آرام کرو۔ یہ فرصت بہت غنیمت ہے۔" غالب نے کہا۔

"ہم ابھی آتے ہیں، آدھے پون گھنٹے میں۔" میں نے کہا

"اب اس وقت کہاں کی سوجھ گئی ہے؟"

"کل رابعہ کے دیے ہوئے نمبر پہ رابطہ نہیں قائم ہو سکا تھا۔ آج پھر کوشش کرتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"اسے بھی شہلا کی خبر لینا ہے۔" میں نے کہا

"تو اب اسی طرح خبر لینا۔" غالب بولا "آخر شکوہ ... آنے کون روک سکتا ہے تیرے خوابوں میں آتے رہتے ہو"

"ہاں جیسے چاہے آسکتے ہا پردہ یا بے پردہ ہو"

"تمہیں کیا معلوم کہ وہ نہیں آئی!" محسن بگڑ کے بولا

"تو دوزخ جنم اور ایک بار آئی تو تم جیسی دوزخی یاد دلاتے۔" غالب نے ہنس کر کہا "تم میاں بیوی زندگی کی گاڑی کے پہیے جو ایک کی جگہ نکل ہوتی ہے۔"

"دوسرے میں جگہ نہیں بھری ہوئی ہے مجرا۔" میں نے متانت سے کہا۔

اور مطلب سمجھ کے غالب نے قہقہہ لگایا۔ محسن خفت سے دانت نکالنے لگا۔

ہم تفریح کے انداز میں باہر نکلے۔ سگریٹ پیتے ہوئے فٹ پاتھ سے چلتے ہوئے ہم رابعہ اور شہلا کی باتیں کرتے رہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہاں آتے ہوئے میں نے سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر کہاں دیکھے تھے۔ اس کے لیے ہمیں تین چار میل دور جانا پڑا۔ پہلی جگہ ہمیں شرمندگی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا کیونکہ بہت قریب رشتے میں اور اپنا مدعا ثابت ہوا۔ دوسرے دفتر میں دو کلرک تھے۔ ایک تھوڑا سا متامل تھا مگر دوسرے نے ٹپ وصول کر لیا۔ اس نے ایک کمرے کا قفل کھول دیا۔

"بہت لمبی بات مت کرنا بی بی۔" وہ بولا "یہ زیرو پوائنٹ کے برابر بل بنا دے گا۔" وہ نسبتاً سمجھدار آدمی تھا۔

"بے شک بل آگیا تو تم پر الزام نہیں آئے گا۔" محسن نے کہا "سرکاری فون کو دن میں سب ہی استعمال کرتے ہوں گے۔"

"لیکن تم جلدی کرو۔ ہم زیادہ وقت نہیں دے سکتے۔ اگر لائن مل گئی تو زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا!" محسن بولا۔

"آدھا گھنٹا!" چپڑاسی کا دم خشک ہونے لگا۔

"اچھا دس پندرہ منٹ۔" میں نے کہا

"اور دیکھو جی، باہر بات مت کرنا کسی سے۔ باہر جو بات ہوئی تھی اور کتنے پیسے، ہم پکڑے جائیں گے۔" وہ بولا

"تم نے بتایا ہے ناکہ ہم کراچی بات کریں گے۔ مقابلے میں بہتر تو خود نمبر ملا دو۔" میں نے کہا "اور پھر ڈائل میں تالا ڈال کے باہر چلے جاؤ!"

وہ کچھ شرمندہ ہو گیا۔ "نہیں جی، آپ بات کریں۔"

"فضول باتیں کر رہا ہے۔" اس کے ساتھی نے کہا "کل ہم اتنی بات کرنے کے لیے پانچ سو کافی ہوں گے۔" میں نے کہا

"یونہی اتنے بڑے کام کے دو سو۔" چالاک چپڑاسی نے کہا "ڈھائی سو تو دو اور پہلے بات کر کے تم نے خالی جیب دکھا دی تو ہم کیا کر لیں گے۔"

"اصولی تو ٹھیک ہے تمہارا۔" میں نے کہا اور اسے ڈھائی سو روپے نکال کر دے دیے "بے ایمانی میں اعتبار کا کیا کام اور اعتبار کیسا!"

"بڑا افسوس ہے جی۔" وہ ڈھائی سو لے کر بولا "ایک تو ہم آپ کا کام کر رہے ہیں اور آپ ہو کر ہمیں ہی بے ایمان کہہ رہے ہو۔"

"تمہیں یاد رہو تم تو اچھا ہوا، بڑا مال لگتے۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "تم یہ ایمان کہاں ہے جو خدا تمہارا ایمان سلامت رکھے!"

وہ کچھ زیر لب بڑبڑایا۔ اسے میری صاف گوئی اچھی نہیں لگی تھی لیکن ڈھائی سو کے لالچ نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنے ساتھی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ باہر جا کے شاید اس نے دوسرے چپڑاسی پر اپنی ہوشیاری ثابت کی ہو گی کہ اس نے ہماری جیب سے مزید پچاس روپے نکلوا لیے۔ ورنہ ممکن ہے انہیں برا بھلا کہہ کے دل کی بھڑاس بھی نکالی ہو کہ بجلی کا ناسا تھری نہیں۔

محسن نے دروازے سے جھانک کر دیکھا اور مجھے سب ٹھیک ہے کا سگنل دیا۔ میں نے نمبر ملانا شروع کیا۔ تیسری کوشش میں لائن مل گئی۔ رات کے وقت ٹرنک لائن پر لوڈ اتنا نہیں تھا جتنا دفتری اور کاروباری اوقات میں ہوتا ہے۔ محسن نے پاس کے کمرے کا دوسرا ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو۔" کسی نے پہلی گھنٹی پر ہی ریسیور اٹھا لیا۔

آواز کسی مرد کی تھی مگر میں شناخت نہ کر سکا۔ احتیاط کے پیش نظر میں نے بھی اُدھر ماؤتھ پیس پر رومال رکھ کے بات کی "کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"آپ کو کس سے بات کرنا تھی؟" دوسری طرف سے کہا گیا

میں نے محسوس کیا کہ بات کرنے والا بہت محتاط ہے۔ انداز گفتگو سے اپنی شناخت کا شبہ بھی ہونے نہیں دے گا۔ آواز ایسی نہیں تھی، بہت جان کے بول رہا تھا۔

"مجھے اس نمبر پہ بات کرنے کو کہا گیا تھا۔" میں نے کہا "ہم نے کل بھی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"تم کون ہو؟"

"ہم بھی ہیں اور مسٹر اچکن۔" ... "ہم نے بتا دیا، اب آپ بتائیں۔" میں نے کہا کون صاحب بات کر رہے ہیں۔

"کس نمبر سے بات کر رہے ہو؟"

"یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں۔" میں نے کہا "لاہور سے بول رہے ہیں۔"

"اور یہ نمبر آپ کو کس سے ملا تھا؟"

"ایک خاتون ہیں رابعہ۔" میں نے کہا "رابعہ تاری۔"

"انہوں نے آپ کو فون کیا تھا؟"

"مجھے نہیں یاد۔ ایک خاتون اور بھی ہیں جہاں شہلا نام کی۔ رابعہ نے انہیں فون کیا تھا۔ شہلا نے مجھے بتایا۔ تم یہ سسپنس ختم کیوں نہیں کرتے؟"

"کیا سسپنس؟"

"مطلب یہ کہ ابھی تک تم نے یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ تم کون ہو۔ اگر ہم نے رانگ نمبر ڈائل کر دیا ہے تو بتا دو۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"نمبر ٹھیک ہے مگر یہ اطمینان تو مجھے ہونا چاہیے کہ میں غلط آدمی سے بات نہیں کر رہا ہوں۔" وہ بولا "کوئی اور حوالہ دو!"

"کیا نام آر ایس کا نمبر دوں۔ بھول گیا۔"

"ایم آر ایس یہ کیا بتا؟" وہ حیران ہو کے

"سانحت اور راشٹ سو ساتھی۔" میں نے کہ بیٹھے

اس کا مطلب سمجھنے جو میں تھا راہب سکندر بخت بلا مرید بھول اور میرے ساتھ ہے محسن شیرولی۔ اب تم جو بھی ہو اور جو کر سکتے ہو کرو مگر مجھے یہ بتا دو کہ رابعہ نے رابطے کے لیے یہ نمبر دیا تھا تو کیوں دیا تھا، تم اسے جانتے ہو یا نہیں، دوست ہو یا دشمن؟"

اس نے کچھ دیر بعد کہا "کل بتاؤں گا اس وقت فون کرنا۔" اور لائن کٹ گئی۔

"ہیلو... ہیلو..." میں نے سخت جھنجلاہٹ اور کوفت کے عالم میں کئی بار کہا۔ انگلیاں لب پہ لا کر مجھی اضطراب میں۔ وہاں ایک خاموش تیرگی سب کے جواب میں اسالی پہ گئی جو گئی تھی۔ رابعہ جو ایک بھولا بسرا خیال تھی، ٹیلی فون کی لائن کے دوسرے کنارے پر ایک تصویر خواب بن کے روشن ہوئی اور پھر اندھیرے میں کھو گئی۔ اس کی آواز کے ملتے اور ہونٹوں کے سراب تیرہ و تشبیہ تنہائی میں لرزاں رہ گئے۔

پھر میں نے محسن کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا اور یہ مسکراہٹ کی روشنی تھی "جو میں سمجھا تھا تیرے دل کی کیفیت کو۔" وہ بولا "مگر اب کوئی بے چینی نہیں رہی، نام صرف چوبیس گھنٹے کا ایک دن اور ہوا۔"

"پھر کیا ہوگا؟" میں نے ریسیور پہ ہاتھ رکھ کے بے زبانی میں کہا۔

"پھر؟ میں حیران ہوں کہ تیری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔" محسن بولا "بہت زیادہ مایوس ہو گیا ہے تجھے۔ تیرا کیا خیال تھا کہ ایسر

www.paksociety.com

تو نمبر ملانے لگا۔ "ادھر وہ ریسیور اٹھا کے اپنی نقرئی آواز میں کہے گی۔ ہیلو ڈارلنگ، سکندر۔" اس نے زنانہ نخرے کی ایسی نقل اتاری کہ میں ہنس پڑا۔

"پتا نہیں کون پاگل کا بچہ تھا سامنے سے کچھ بولنے ہی نہیں دیا۔ کم سے کم یہ تو بتا دیتا...؟"

"اس سے زیادہ کیا، صاف تو کہہ دیا اس نے کہ گل رابعہ موجود ہوں گی، بات کر لینا۔" محسن نے کہا۔

"کیا اس کی بات کا یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے؟"

"اس کی بات کا دوسرا مطلب ہو ہی نہیں سکتا، شرط لگاتا ہے؟" محسن بولا۔

"کس بات پر؟" میں نے کہا۔

"میں گل رابعہ سے تیری بات ہو گی اور مشتاق لگا ہوں کی نسبتی جانتے گی۔" محسن نے کہا۔ "بول کیا شرط ہے؟"

اچانک میں مسکرانے لگا۔ میرے ہونٹوں پر چھونے والا تحقیق کا نقش میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لہروں کے پھیل گیا ہو تو ... نے کہا۔

"اچھا چلو میں شہلا سے بات کروں۔" محسن نے کہا۔ "ویسے کوفرق پڑتا ہے اب جب عاشق ایک شوہر بنتا ہے۔ ایک تیرا اضطراب، وارفتگی اور تیری وارفتگی اور بے خودی۔ ایک میرا سکون اور اطمینان۔ سارا پاگل پن ختم ہو جاتا ہے اور بیوی ... بڑا دل توڑتا ہے۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "شادی کے بعد محبت کی نوعیت تو بدل ہی جاتی ہے۔ عورتیں کچھ خیال پرست رہتی ہیں۔ پرانے خوابوں کی دنیا کو چھوڑنا ان کے لیے زیادہ مشکل ہوتا ہے مگر اب یہ کیسے ممکن ہے کہ شوہر بے چارہ تمام عمر اسی طرح عاشق کا رول کرتا رہے۔"

"اب دیکھنا میں کیسے کرتا ہوں۔" محسن نے فون اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب یہ نہیں کہ میری محبت کم ہو گئی ہے۔ محبت تو شاید پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے۔ میں گنا ہونے والا ہے۔ وہ جشن مار کے بیٹا ہو مگر کیا شہلا اور کیا رابعہ، یہ اظہار الگ ہیں، مرد تو یقین پر مطمئن رہتا ہے۔"

"یہاں سے اپنے یقین کا اظہار مت فرمائیے۔" میں نے کہا۔ "رضوی صاحب کے گھر کا نمبر آ رہا ہے لیکن ریسیو ہو گا۔ فوراً معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے یہاں سے کال کی تھی، پکڑا جائے گا وہ جس کے ڈھائی سو روپے اینڈ والس ہوتے ہیں۔"

"پھر تو یہی کرنا چاہیے۔" محسن نے نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ "آج ڈھائی سو روپے تھوڑی کل کے ڈھائی سو خرچ کر... آئندہ ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ کم سے کم ایک سرکاری چور تو پکڑے گا۔"

میں نے منفی میں سر ہلایا۔ "یہ نہایت چھوٹا چور ہے۔ امیر ایسی کپڑے اور پکڑے جاتے ہیں۔ وہ جو اوپر بڑے ڈاکو بیٹھے ہیں اور ملک کے خزانے کو ایسے لوٹ رہے ہیں جیسے غنیم کسی شہر مفتوحہ کو لوٹتا ہے۔"

"وہ بھی پکڑے جائیں گے۔ فی الحال چھانٹے ہوں تو جس چھوٹے چور کے گریبان تک پہنچ سکتے ہیں اسے تو نہ چھوڑیں۔" محسن نے کہا۔ "ہیلو۔" اس نے دوسری طرف سے کسی کی آواز سن کے کہا۔ میں فوراً نپتا چھوڑ کے کمرے میں چلا گیا جو بڑے صاحب کے پی اے یا سیکرٹری کا کیبن تھا۔ یہاں اسی کیبن کے فون سے چیک ہو کے آگے جاتا تھی۔ بڑا صاحب ہے یا نہیں ہے، میٹنگ میں ہے یا دورے پر۔ اس کا انحصار کال کرنے والے کی ضرورت اور اہمیت پر ہوتا ہے۔

جب میں نے فون اٹھایا تو محسن کی مسز رضوی سے بات ہو رہی تھی۔

"جب تم فون کرتے ہو تو میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔" انھوں نے کہا۔ "میرا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔"

"یہ بات آپ مذاق میں کہہ رہی ہیں؟"

"نہیں، گزشتہ چند ماہ سے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔" وہ بولیں۔ "ڈاکٹر تو کہتے ہیں کہ ڈپریشن ہے۔ میں سوچا نہ کروں مگر کیا سوچنا کسی کے اختیار کی بات ہے۔"

"مجھے معلوم ہے آپ کیا سوچتی ہیں۔ پلیز آنٹی! آپ اپنی صحت مت خراب کریں۔" محسن نے کہا۔ "ہم پہلے ہی بہت شرمندہ ہیں۔ ہم نے آپ کی نیکی کے بدلے جو کچھ کیا وہ آپ کے حق میں اچھا نہیں ہوا۔"

"میرے حق میں، ہاں تم نے اپنے حق میں کیا اچھا کیا۔" وہ دکھ...

"آنٹی! ہم آپ کے مجرم ہیں اور آپ سے تو معافی مانگنے کا حوصلہ بھی نہیں پڑتا۔" محسن نے کہا۔ "ہماری وجہ سے آپ کے گھر میں ہر جو پریشانی آئی، ظاہر ہے آپ کے سامنے کے مظالم جو آپ کے ڈپریشن کا باعث ہے۔ میرے، سکندر اور رابعہ کے بارے میں، یہ شہلا کی ذہنی واری اضافی ہے۔"

"محسن! آخر تم کو کیا ضرورت تھی شادی کرنے کی؟" وہ آنٹی نے کہا۔ "میں تو خود ایک پولیس افسر کے ساتھ پندرہ سال گزار چکی ہوں۔ اکیلی رہنے کے خطرات اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کی اور رضوی صاحب جیسے شوہر کا ساتھ دینے کی ہمت تھی مجھ میں۔ مجھے گلہ نہیں اپنے شوہر سے کہ وہ اصول پرست، ایمان دار اور فرض شناس کیوں ہیں۔ دوسرے پولیس افسروں کی طرح میرے پاس کوٹھیاں اور کاریں، نوکر چاکر اور عیش و عشرت کے

اسباب کیوں نہیں۔ مجھے فخر ہے ان کی عزت نفس پر۔ یہ تو ہر عورت کو محسوس ہوتی ہے کہ میں ہی تھی جس نے تمہارے ساتھ گزارا کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ دوسری قسم کے افسر ہوتے تو شاید میں ان کا ساتھ نہ دے پاتی۔"

"لیکن اگر ٹھیک ہے آنٹی! آپ کو خدا نے ان کے لیے بنایا تھا جیسے انھیں آپ کے لیے بنایا تھا۔" محسن نے کہا۔

"مگر شہلا کو تم نے شادی کے بعد رفاقت تک نہیں دی۔ مجھے اپنے شوہر سے وہ چیز میسر رہی تھی جس کی مجھے ضرورت تھی اور جس کے بغیر میاں بیوی کا رشتہ ہی بے معنی ہو کے رہ جاتا ہے۔ ان کی محبت اور ان کا اعتماد۔"

"کیا شہلا کو میری محبت اور میرے اعتماد کی کمی محسوس ہوتی ہے؟"

"کہیں تم نے اسے صرف محبت اور اعتماد کے خوبصورت لفظوں سے بہلا رکھا ہے۔ رفاقت کے بغیر ان الفاظ میں کوئی خوشی ہے، تحفظ کی کون سی ضمانت دی ہے تم نے اسے؟"

"وہ آپ کے ساتھ ہے تو اسے ہر ضمانت حاصل ہے۔"

"احمق! تحفظ شادی کے بعد کسی ایک کی ذات سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ میں تم دونوں کی ازدواجی زندگی کے تحفظ کی بات کر رہی تھی۔ یہ ضمانت اسے میں کیسے دے سکتی ہوں؟ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی مگر کیا دل کی بات آنکھوں سے نہ کہنا اس کے لیے ممکن ہے۔ عمر کے فرق کے باوجود وہ بھی عورت ہے اور میں اس کے دکھ سمجھ سکتی ہوں۔ ندامت مجھے احساس اتنا اس سے ہوتی ہے کہ میں اس دکھ کو دور نہیں کر سکتی۔ تم کو یہ سب بتا تو سکتی ہوں مگر سمجھا نہیں سکتی۔ تم سمجھو گے ہی نہیں کیونکہ تم سمجھنا نہیں چاہتے۔"

"ہاں آنٹی!" محسن نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں بھی کچھ کہنا نہیں چاہتا سوائے اپنی مجبوریوں کے اور ان کو آپ بخوبی جانتی ہیں۔ اس لیے حالات کے دھارے کو اسی رخ پہ بہنے دیں۔ اس کا رخ موڑنا میرے یا آپ کے بس کی بات نہیں۔ جب تک وقت خود اس کا درماں فراہم نہیں کرے گا ہم سب اپنے اپنے دکھ کے ساتھ جیتے رہیں گے۔ میں، آپ اور شہلا، رابعہ اور سکندر۔ لیکن ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ رابعہ بالکل خیریت سے ہے۔"

"چلو کوئی تو اچھی بات کی تم نے۔" وہ بولیں۔

"اب آپ نے مجھے بھی اچھی سی بات سنائی۔ اپنی زبانی نہیں، ان کے لبوں سے جن کے لیے میں زبردست جذباتی دور ہوتی ذرا سیلنگ یاد کر کے آیا ہوں۔"

آنٹی ہنسنے لگیں۔ "تم شہلا سے بات نہیں کر سکتے۔"

"یہ کیا ظلم ہے آنٹی! سزا دے رہی ہیں آپ؟" محسن بولا۔

"نہیں، یہ تو انعام ہے قدرت کا جو تمہیں خوشخبری کی صورت ملا ہے۔ مگر وہ جلدی ہوں۔" انھوں نے کہا۔ "وہ اسپتال میں ہے۔"

"اسپتال میں... کیوں؟ کیا ہوا ہے اسے؟" محسن نے چلا کے کہا۔

"ارے ارے، ابھی سے؟ ہو گا جب ہونا ہو گا۔" آنٹی ہنس کے کہا۔

"ہو گی یا ہو گا؟ میں نے فضول معقولات کیا ہو یا ہوں گے؟"

"یہ... یہ کون بولا تھا بیچ میں؟" آنٹی نے چونک کے کہا۔

"بیچ میں؟ کوئی نہیں آنٹی۔" محسن ہنسنے لگا۔ "یہ بتائیں کہ وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"ہاں ہاں، بس ایک رات رہے گی وہاں۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ایک ڈرپ لگ جائے تو اچھا ہے۔" وہ بولیں۔ "مگر کیا بیچ میں سکندر نہیں بولا تھا؟"

"آپ بھی ایس ایس پی سے کم نہیں ہیں آنٹی!" میں نے کہا۔ "آداب عرض کرتا ہوں۔"

"جیتے رہو، خدا خوش رکھے۔"

"بس آپ کی دعا رہی تو کبھی تو قبول ہو گی۔" میں نے کہا۔ "تاہم وہ جو ایک سوال کیا تھا میں نے؟"

"اس کا جواب اپنے انکل سے پوچھ لو۔" وہ بولیں۔ "وہ اسپتال میں ہی ہیں اور اسی لیے میں تم سے بات بھی کر رہی ہوں۔"

"آنٹی! آخر آپ بھی کچھ علم اور تجربہ رکھتی ہیں، کچھ تو فرمائیے کہ کلیسٹرول اور علم اعداد کی روشنی میں..."

"سکندر، مذاق مت کرو! تم بدتمیز ہی نہیں، بے شرم بھی ہونے جا رہے ہو۔" آنٹی نے کہا۔

"آنٹی، مجھ میں تو ہمت ہے نہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ میری طرف سے ایس ایس پی صاحب کی خدمت میں ایک درخواست برائے معافی دائر کر سکتی ہیں؟"

"چھوڑو معافی کو، کس کس بات پر معافی مانگو گے اور کہاں تک؟ ممکن تم کو دینی ہے جو آپ کھوئے آئے ہو۔" انھوں نے تنک کے کہا۔

"مجھے ان کے معطل کیے جانے پر اپنے مجرم ہونے کا احساس ہوتا ہے۔"

"مگر انھیں کوئی صدمہ نہیں ہے اور تم سے یہ کس نے کہا ہے کہ ان کو معطل کر دیا گیا تھا؟" آنٹی نے کہا۔

"پھر... پھر انھیں اس عہدے سے الگ کیوں کیا گیا؟"

"انھوں نے استعفیٰ دیا ہے۔ اپنی مرضی سے۔" آنٹی نے احتجاجی انداز میں میرے الزام کی تردید کی۔ "خود آئی جی نے ان کو بہت مجبور کیا کہ وہ استعفیٰ واپس لے لیں مگر وہ اپنے...

www.paksociety.com

مطمئن تھے۔ انھوں نے کہا کہ "میں نے یہ پندرہ سال عزت سے گزارے ہیں، یہ بھی اب بہت ناممکن سی بات لگتی ہے۔ یہ ملازمت نہیں میرے لیے ہر قدم پہ آزمائش تھی۔ زبانِ خلق پولیس والا جان کے برا کہتی تھی، فیکٹ میں جناب تھا، اچھائی کرنی نہیں دیکھتا تھا۔ عزت سب سے بے سبب ہی ملی تھی مگر اس سے زیادہ انھوں کا رونا تھا جو ہمیشہ مخالف رہے۔ حاسد لوگ، سازشی لوگ اور بدخواہ لوگ میرے خلاف محاذ رکھتے تھے مگر میں پھر بھی پندرہ سال تک ڈٹا رہا اور خدا نے میری عزت رکھی، یہی اس کا انعام ہے مگر اب میرے اعصاب بھی جواب دے گئے ہیں اور میرے حالات بھی میرا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ میں بدخواہوں کے سامنے شرمندہ ہو جاتا ہوں، بہت سی باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔"

"اور یہ ۔ ۔ ۔ یہ ہماری باتیں ہیں جو لوگ ہمارے بارے میں ان کے منہ پر اور پیٹھ پیچھے کہتے ہوں گے کیونکہ وہ بیک وقت ایس ایس پی اور انکل رضوی تھے۔ انھوں نے تو اپنے ایس ایس پی ہونے کی لاج نکال لی۔ ہم انکل رضوی سے رشتے کی لاج رکھنے میں ناکام رہے۔" میں نے افسوس اور دکھ کے ساتھ کہا۔

"تم سمجھتے ہو ان کی پوزیشن خراب ہو رہی تھی!" آنٹی نے کہا۔ "شملا ہمارے ساتھ تھی اور ہم اس کو بیٹیا سمجھتے تھے مگر دنیا کچھ اور سمجھتی تھی۔"

"دنیا نے اسے ایک مجرم کی بیوی سمجھی ہو گی!" محسن نے تلخی سے کہا۔

"ہاں، غلط سوچ رکھنے والوں کا کوئی کیا کرے۔" آنٹی نے کہا۔ "تم کیوں دل برا کرتے ہو۔ تمہارے انکل کسی کی پروا نہیں کرتے۔ پولیس کا تو یہ عام طریقہ ہے کہ مجرم کو پکڑنا ہے تو اس کے بیوی بچوں کو اٹھالو، ماں باپ، بھائی بہن جو ملے ہے اسے تھانے منگوا لو، مجرم خود ہی تھانے حاضر ہو گا مگر تمہارے انکل تو بچوں کے بیے بھی سارا دن رات اسپتال میں رہے، اور انھوں نے اتنا کیا جو شاید تم بھی نہ کر سکتے۔ انھوں نے صاف کہا کہ میں مجرم کو پکڑنے کا پابند ہوں، جس کے خلاف کوئی الزام تک نہیں اور میں ذاتی طور پر مطمئن ہوں کہ اس نے بالواسطہ طور پر بھی مداخلت جرم کی اور نہ مجرم کی مدد کی ہے تو میں مظلوم سمجھ کے بچاؤں گا، اس کے ساتھ بھی ظلم کیا کم ہے کہ مجرم کے ساتھ اس کا نام خواہ مخواہ لیا جاتا ہے۔ کسی مجرم سے رشتہ ہونا کون سے قانون کے تحت جرم ہے اور وہ اب ضبط کر چکے تھے کہ وہ نوکری چھوڑ دیں گے جس پر مخالفوں کو ان پہ جانبداری کا الزام عائد کرنے کا موقع مل رہا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔"

"مگر آنٹی! اب وہ کیا کریں گے؟"

"انھوں نے مجھے نہیں بتایا!" آنٹی نے کہا۔ "کچھ تو ضرور کریں گے۔ وہ فارغ رہنے والے آدمی نہیں ہیں اور گزراوقات کے لیے بھی کوئی سلسلہ چاہیے۔ تھوڑی بہت زمینوں کی آمدنی ہے جو ان کے والد نے چھوڑی تھیں۔ اس بے فکری تو کوئی بات نہیں۔"

"آپ کو تو یہ بنگلا بھی خالی کرنا ہو گا۔"

"ہاں محکمے نے بڑی مستعدی دکھائی ہے اس معاملے میں!" آنٹی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "نوٹس مل گیا ہے کہ ہم ایک ماہ میں اپنا بندوبست کر لیں۔"

"یہ بنگلا تو شاید لیز پہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ان کے لیے نئے کنٹریکٹ پہ اٹھا ہوا تھا۔"

"ہاں، گزشتہ ماہ کنٹریکٹ بھی ختم ہو گیا۔ مالک ایک بیوہ ہے جو معاہدے میں توسیع پر تیار نہیں مگر پولیس کا فکر ہے نا۔ اس پہ دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ مزید تین سال کے لیے لیز کرے۔"

"مگر یہ سرکاری رہائش گاہ نہ رہی تو آپ کہاں رہیں گی؟"

"جہاں سینگ سمائیں، محاورے کے مطابق۔ ہم وہ چھپن کر پولیس سے منتظر ہیں کوئی ٹھکانا مل ہی جائے گا۔ کوئی چھوٹا موٹا گھر کرائے پہ لے لیں گے۔"

"جانے سے پہلے ہمیں پتا بتا کے جائیے گا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں اخبار خط لکھوں گا، پتا ہو تو کوئی پتا بتائے۔"

"آپ... منظر کو بتا جائیں، اسے جانتی ہیں نا آپ؟"

"ہاں، عبدالودود منظر، تمہارا دوست ہے، کوئی وکیل ہے۔" انھوں نے کہا۔

"اچھا آنٹی! وہ کس اسپتال میں ہے؟" محسن نے کہا۔

"جیمز لین روڈ پہ ڈاکٹر یوسف کا پرائیویٹ کلینک ہے، ایک بہت کوالیفائیڈ گائنا کولوجسٹ ہے۔ تمہارے انکل کی کلاس فیلو رہی ہے۔" آنٹی نے کہا۔

"شادی شدہ ہے وہ؟" میں نے کہا۔

"نہیں مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو!" آنٹی نے کہا۔

"شکل کیسی ہے، رنگ روپ، ناک نقشہ؟"

"بدتمیز!" آنٹی نے ہنس کر کہا۔ "وہ تمہارے انکل سے بھی پانچ سال بڑی ہے۔ اٹھاون سال کی بڑھیا ہے مگر بچو ادھر جانے کی بے وقوفی مت کرنا، وہاں سادہ کپڑوں میں پولیس والے بھی موجود رہتے ہیں۔"

"بھیس بدل کے چلا جاؤں گا۔" محسن بولا۔

"تم باز آنے والے نہیں ہو۔"

"آنٹی! اب بہت دل چاہ رہا ہے ہنسنے دیکھنے کو۔" محسن نے کہا۔

"اچھا تمہارے انکل آ گئے ہیں شاید۔" انھوں نے کہا اور فون ایک دم بند ہو گیا۔ ہم باہر آ گئے، دونوں چوکیدار شاید ڈیوٹی سے فارغ ہو چکے تھے اور قناعت ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

"میاں جی! ہم کل بھی آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"مگر بڑے بھائی سودا نہیں دیں گے۔" محسن بولا۔ "ہم پکے گاہک ہیں، کچھ رعایت کرو بلدیہ۔"

"پہلوان جیل وٹیج پر سودا کر لو۔" میں نے کہا۔

"ہفتے وار یا ماہانہ بنیادوں پر کنٹریکٹ کر لو۔" محسن بولا۔

"چلو بھائی جاؤ، معاف کرو ہمیں۔" پہلے والے چوکیدار نے کہا۔ "ہم سے کیوں فضول بازی کرتے ہو۔"

"روز تم بات کرو گے تو مہینے کے آخر میں بل کتنا آئے گا؟" دوسرے نے وسیع تر کاروبار کے امکانات پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"جتنا بھی آئے کون سا تم دو گے۔ گورنمنٹ کے خزانے سے ادا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "اور اگر صاحب نے بہت غیر ضروری بل پر غور کیا تو ایک مہینے بعد ہی کرے گا۔ اسٹاف پہ برہم ہو گا کہ چاہیے... باہر سے محبوباؤں کو کال کرنے دیتے ہو۔ اسٹاف اسے الزام دے گا کہ خود گھنٹا گھنٹا آپ بازی کرتے ہیں، مگر ہم پہ بہرحال الزام نہیں آئے گا۔"

انھوں نے ہنستے ہنستے پیسے لیے مگر کچھ کھانا چیز کی سودے بازی کی، شاید پورے مہینے کی آمدنی کا حساب لگا کے اپنے ساتھی کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس رقم سے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے مگر دوسرا مائل نہ تھا، ہمت نہیں تھا، اسے ڈر تھا کہیں چھاپا نہ پڑ جائے۔ ایک دن کی تو کوئی بات نہیں مگر روز روز کے چکر میں خطرہ ہے۔ معلوم نہیں یہ کون لوگ ہیں جو... انھوں نے ہمیں سر سے جھنڈی دکھا دی۔

واپسی کے سفر میں ہمارا موڈ بہت بہتر تھا۔ انکل رضوی کی قدر و منزلت ہمارے دل میں بہت بڑھ گئی تھی اور احساسِ جرم بہت کم ہو گیا تھا کہ ان کی معزولی میں ہمارا بھی دخل ہے۔ یہ ان کے بدخواہوں نے مشہور کیا تھا کہ وہ معطل اور معزول کر دیے گئے ہیں۔ انھوں نے باعزت طور پر وہ نوکری چھوڑی تھی جس کی وجہ سے ان کی عزت پہ حرف آ رہا تھا۔

"یار! کیا انکل رضوی اب سچ مچ کسی جھونپڑے میں کرائے کے مکان میں رہیں گے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں، اس معاشرے میں ایماندار لوگ ایسے ہی رہتے ہیں۔ حکومت فرض شناس آدمی کی بھی قدر کرتی ہے۔" میں نے کہا۔

"قانا سوچ کہ وہ یہ باتیں کر سکتے تھے۔ ایک معمولی ایس ایچ او کے پاس کوٹھیاں ہوتی ہیں اور کاریں ہوتی ہیں۔ ڈی ایس پی اور ایس پی تو بادشاہ ہیں۔ فرضی ناموں سے وہ گلبرگ کے ہر بلاک میں کوٹھیاں خرید سکتے تھے۔ ان کا کرایہ ہی اتنا آتا کہ ہر سال ایک نئی کوٹھی کھڑی ہو جاتی۔ کرنٹ پر چھاپا نہیں۔ بھائیوں، بھتیجوں اور بیوی بچوں کے نام پر بینک بیلنس چیک ہو سکتا ہے، نہ ہر ایک کا پتا چلایا جا سکتا ہے اور نہ انویسٹمنٹ کا کہ کتنے فیکٹریاں کہاں کہاں کے خرید رکھے ہیں، کتنی بسیں چل رہی ہیں اور کس کس منڈی پر..."

"یہ کون چلائے گا؟" محسن بولا۔ "پتا چلانے والے تو خود یہی کر رہے ہیں۔ محاسبہ تو وہ کر سکتا ہے جس کا اپنا حساب درست ہو۔ آپ تحقیقات ایف آئی اے کے سپرد کر دیں یا اینٹی کرپشن والوں کے حوالے کیجیے یا کمیشن، ان میں سے بیشتر خود انھی الزامات میں ملوث ہوں گے۔ جو دکو چوروں کے بارے میں رپورٹ دینا ہو تو وہ کیا کہے گا، یہی کہ وہ تو بڑا شریف آدمی ہے میری طرح اور چور تو ہیں الزام لگانے والے۔"

"آنٹی بڑی صابر اور حوصلہ مند عورت ہیں۔ خدا نے کیا جوڑی ملائی ہے کہ ایک ستارہ ہے تو دوسرا اس کی کرن مگر یار! بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ آج انھیں گاڑی اسکول لے جاتی ہے، بنگلے پہ گارڈ رہتی ہے اور آنے جاتے لوگوں کو سیلوٹ کرتا دیکھتے ہیں اور اسکول میں بھی ان کی بڑی قدر ہو گی۔ ان کے ذہن کے لیے صورتِ حالات کی اس تبدیلی کو قبول کرنا آسان نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "ایک چھوٹے سے گھر میں جو کسی فضول سے علاقے میں ہو، ان کے لیے بہت سے نفسیاتی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔"

"کیا ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟" محسن نے کہا۔

"بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم یہ گھر خرید کے انھیں پیش کر سکتے ہیں مگر کیا انکل رضوی اسے قبول کر لیں گے؟" میں نے کہا اور نفی میں سر ہلایا۔

"ہاں، ان کی طبیعت اور مزاج کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم مکان ان کی بیوی کے نام کریں یا بچوں کے نام، وہ بالکل نہیں مانیں گے مگر فرض کرو اسے ہم خرید لیں۔"

"کیسے خرید لیں؟" محسن نے کہا۔ "تو نے خواہ مخواہ فرض کر لیا ہے کہ مکان برائے فروخت ہے۔"

"تو یاد رکھ کہ مکان کسی کے لیے کوئی جذباتی اہمیت نہ رکھتا ہو، ہر شخص پرانے مکان کو فائدے میں بیچنے پہ تیار ہو جاتا ہے۔" محسن بولا۔

"چل مان لیا کہ ہم مکان خریدنے میں کامیاب رہے، پچاس ہزار زیادہ دے دیے مارکیٹ پرائس سے اور مالک مکان کو راضی کر لیا، تب بھی انکل رضوی کب راضی ہوں گے؟"

www.paksociety.com

ہمارے کرائے دار کی حیثیت سے اس گھر میں رہنے کو بکواس کرنے والے کیا کہیں گے کہ دیکھا، حقیقت کھل کے سامنے آ گئی نا! جن کی حمایت کرتے تھے ایس ایس پی صاحب وہی اُن کے کام آئے۔ گھر سے بے گھر نہیں ہونے دیا۔ کھڑے کھڑے مکان لے کر اُن کی خدمت میں پیش کر دیا۔ رشوت لینے کے ہزار طریقے ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے۔ بے وقوف آدمی تقدمے کر پھنس جاتا ہے۔ سابق ایس ایس پی خامس رضوی جو ہوشیار تھے کہ سب کمسر حاکم رہے ... کرتے رہے۔ حلال اور نیک بھی کہلائے اور ملبس پر وہ لیسے ہی نہ جانے کس کس سے کیا کچھ نہیں لیتے رہے پتا کیسے چلتا ہے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ وہ ہمارے یہاں کرائے دار بنیں۔ مشلا کا خیال بھی نکال دے اپنے دل سے کہ تو اُسے فینڈ لیڈی بنا دے تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ جیسے وہ اپنا بیٹی کہتے ہیں اُس کے گھر میں رہیں گے۔ وہ تو وضعداری کے اعتبار سے ان پرانے لوگوں میں شامل ہیں جو شادی کے بعد بیٹی کے گھر میں پانی کا ایک گلاس تک نہیں پیتے۔"

"آخر مالک مکان نے اب تک تو مکان کرائے پر دیا ہوا ہی تھا۔ اسے کرایہ بھی باقاعدگی سے مل رہا ہو گا۔"

"کیا معلوم؟" میں نے کہا۔ "پولیس والوں سے کرایہ وصول کرنا بھی آسان کام تو نہیں۔ جن کی عادت ہی مفت خوری کی ہو وہ قیمت اسی کو دیتے ہیں جو ان کا بھی باپ ہو۔ قیمت وصول کرنا جانتا ہو۔ ممکن ہے ہر ماہ تھانے سے ایس ایچ او کے سامنے حاضر ہوتے ہوں کرایہ کی رسید پر دستخط کر دیا انگوٹھا لگاؤ اور لیں۔ محکمے سے ملنے والی رقم بھی ماہانہ آمدنی کا ایک چھوٹا سا ذریعہ شمار ہوتی ہو۔ شکایت کرنے والا کہاں جائے اور کس سے کہے۔ کہے گا تو رسیدیں پیش کر دی جائیں گی کہ جھوٹا ہے اور بکواس کی عادت ہے اسے اور پھر اس ناپاک جسارت پر اسے تھانے بلا کے پاک کیا جائے گا۔"

"یہ ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے اور شاید اسی لیے اب مکان مالک کے لیے نجات کی ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ وہ کرائے نامے کی تجدید نہ کرے۔ بے شک یہ بھی آسان نہیں ہو گا جو ہر ماہ کرائے کی رسید حاصل کر سکتے ہیں، وہ نئے معاہدے کی توثیق بھی کر سکتے ہیں۔" محسن بولا۔

"ایک بات اور بتاؤں۔" میں نے کہا۔ "ایسے مکان سے جان چھڑانے کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اسے بیچ دیا جائے۔ کرایہ داری کے معاہدے کے ساتھ ہی مکانات فروخت کیے جا سکتے ہیں۔ مالک مکان بدلتا ہے تو بدل جائے۔ کرائے دار رہے گا اور بعض اوقات لوگ ایسا کرتے بھی ہیں مگر جس مکان کا کرایہ لینے تھانے والے آتے ہوں اور وہ سیٹھ پکڑ رہے ہوں لیکن دستخط لے جاتے ہوں، اُسے کون خریدے گا؟ بڑی بڑی پیسہ لگائے جائیداد میں اور پھنس جائے مصیبت میں۔ اتنا احمق کوئی نہیں ہوتا۔"

"بس ہم ایک احمق حاصل کر سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "جس کا نام الف خان ہے خان کچھ بھی ہو اور وہ حسب سابق کرائے نامے کی توسیع کرتا رہ جائے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس سے کیا فائدہ؟ اس میں انکل تو بہرحال نہیں رہ سکیں گے۔ مکان محکمے کی لیز پر ہو گا تو اس میں انہی کا کوئی افسر رہے گا۔ نیا ایس ایس پی بھی رہ سکتا ہے۔"

"وہ ویری گڈ۔ تو تمہاری عقل کی داد دیتے ہیں۔"

"ایڈوائس دلوادو۔" میں نے کہا۔ "خواہ بعد میں معلوم ہو کہ آپ نے بونگی ماری۔ فوراً پہلے بات کیجیے۔"

"ایس ایس پی خامس رضوی کے مزاج صرف ہم ہی تو نہیں۔" محسن نے کہا۔ "اور بھی بہت ہوں گے۔"

"ضرور ہوں گے۔ ان کو جاننے والوں میں سے بیشتر ہوں گے۔"

"ان میں وکیل بھی ہوں گے؟"

"بالکل ہوں گے۔"

"ایسے وکیل بھی ہوں گے جو منظر کو بھی جانتے ہوں گے۔"

"کیا قصہ بنا لیا ہے، سیدھی بات کرو۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔

"سنو تو سہی... بھیجے سے سن۔" محسن بولا۔ "فرض کرو ایسے ہم منظر سے کہتے ہیں کہ وہ مالک مکان کا پتا چلائے۔ ان اسباب کا پتا چلائے جن کی بنا پر وہ اپنا مکان مزید تین سال کے لیے پولیس کو کرائے پر دینے کے لیے تیار نہیں۔ ایک وجہ تو وہی ہو سکتی ہے جو تم نے بیان کی۔ ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کرایہ ابھی تک قیام پاکستان سے پہلے کی شرح پر چل رہا ہو۔ اگر یہ بات ہے تو ظاہر ہے کرایہ نہ ہونے کے برابر ہو گا مگر میرے خیال میں کرایہ بہت ہو گا کیونکہ فائدہ اُٹھانے والے دوسرے ہیں جو تھوڑے کو زیادہ نہیں سمجھتے زیادہ کو تھوڑا سمجھتے ہیں۔ کرایہ ملتا ہے سرکاری خزانے سے، دو ہزار روپے ماہانہ کرائے والے مکان کی مالیت دو ہزار بتا کے ایگریمنٹ کرتے ہیں۔ تمام سرکاری محکموں میں اگر کسی نے دو چار مکان بنا رکھے ہیں یا ان کے چاچے، ماموں، بھانجے، بھتیجے کے مکانات ہیں تو وہ اونچی شرح پر گورنمنٹ کو کرائے پر اُٹھا دیے جاتے ہیں۔ حکومت کو بعض اوقات افسران کی رہائش کے لیے مناسب مکانات کی کمی کے باعث پرائیویٹ گھر اور بنگلے لینے پڑتے ہیں تاہم یہ ذرا مختلف کیس ہے کیونکہ اس میں مالک مکان کو نہیں پولیس کے لوگوں کو فائدہ ہو رہا ہے۔ ہم مالک مکان کی مدد کر سکتے ہیں۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے بات کو کچھ سمجھ کے کہا۔

"فرض کرو مالک مکان کسی وکیل کو مختار نامہ دے دیتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اگر انکل رضوی کی بدگمانی کا ڈر نہ ہوتا تو ہم منظر سے کہتے کہ وہ خود مالک مکان کا اٹارنی بن جائے مگر انکل فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ چکر ہم نے چلایا ہو گا چنانچہ منظر سے کہہ کر اپنے کسی بہت بڑے وکیل دوست سے بات کرے۔ سامنے بڑے وکیل سے جس سے پولیس بھی ایک بات کرتے ہوئے دو بار سوچے۔ منظر، مظلوم مالک مکان کو سمجھائے کہ اب مکان کے سلسلے میں نہ وہ کسی سے بات کرے اور نہ ڈرے۔ جو اس کے پاس آئے اُسے آگے اٹارنی کے پاس بھیج دے کہ میں نے تمام اختیارات اُسے سونپ دیے ہیں۔ اب وہ بڑا وکیل پولیس والوں کو صاف جواب دے کہ جناب بہت کھا لیا کرایہ۔ اب حق دے کہ حقدار کو۔ اپنے لیے کوئی دوسرا بے وقوف تلاش کیجیے جو آپ کو مکان بھی دے اور کرایہ بھی دے اور ظاہر ہے کہ اس بڑے وکیل کی بات کا اثر ہو گا۔ پولیس نہ اس کا کچھ بگاڑ سکتی ہے نہ مالک مکان کا۔ بعد میں وہی وکیل انکل رضوی کی خدمت میں حاضر ہو کہ جناب میں آپ کی ایمانداری و شرافت کو جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کے مسائل کیا ہیں۔ مالک مکان نے مجھے اختیار دیا ہے کہ میں جس کو چاہوں یہ مکان کرائے پر اُٹھا دوں سوائے محکمہ پولیس کے۔ تو میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ حسب سابق اسی میں رہیں اور براہ راست مالک مکان کو کرایہ ادا کریں میری معرفت۔ کرایہ وہ جو آپ نے تو تعقف کرے اور نصف کم سے کم پیارے ہے یا انکل رضوی نہ مانیں تو جو کرایہ اب چل رہا ہے وہ رہتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہو کہ محکمہ بیچ میں سے نکل جائے اور انکل رضوی کو نہ نکال سکے۔"

"میں اش اش کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور داد بھی دیتا ہوں۔ یہ لیجیے۔" میں نے اُس کی کمر پر ایک ساتھ دو دھپ مارے۔

"آہ... ایک جینئس ایک شوہر... ایم آر ایس کا ایک نادر پراڈکٹ رات کو قتل ہو گیا..." محسن چلایا۔ "تو تم کیسے بچتے ... تقریباً نصف باپ بھی بنا چکا ہوں میں تو۔"

"معاف کرنا یار۔ میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

*

غالب زندگی سے سخت بیزار بیٹھا تھا۔ اس کی ٹانگ نے اسے قیدی سا بنا دیا تھا۔ وہ بیٹھے رہنے یا لیٹے رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا اور جب ہم باہر سے آ کے اُسے بتاتے تھے کہ ہم کہاں کہاں گئے تھے اور کیا کیا تیر مار آئے ہیں تو اس کو اپنی نظر بندی کا احساس زیادہ ہوتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح جب ہم نے اُسے رابعہ کے ویلے ہونے والے تیر پر ہونے والی گفتگو کا چرچا کی سے ہونے والی بات کا مختصر احوال سنایا اور پھر انکل رضوی کے سلسلے میں اپنی اسکیم کا ذکر کیا تو وہ دل گرفتہ نظر آنے لگا۔

"افسوس کہ میں ایک عضو معطل ہو کے رہ گیا ہوں۔" وہ ... "کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

"غلطی نے کہا تھا کہ وہ بھی بہت کچھ کرتے ہیں جو صرف انتظار کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آدھا اس میں مایوسی اور اداسی کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ تم نے تو وہ کام کیا ہے مرزا جو ہم سے نہ ہو سکا۔ انہوں نے ضرب کھائے ہم ابھی تک سلامت ہیں۔ اپنی ٹانگ تک نہیں تڑوا سکے۔"

"لیکن آج تم کل ہماری باری ہے۔" محسن بولا۔ "ٹانگ ٹوٹنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ عضو معطل ہونے کی باری کسی اور کی آ جائے۔ کبھی کبھی مشین بھی خراب ہو جاتی ہے مگر ٹھیک ہونے کے بعد پھر اس کی کارکردگی وہی ہو جاتی ہے مرزا غالب! اب اور اس سے زیادہ ہم آپ کو نہیں سمجھا سکتے۔" محسن نے بستر پہ دراز ہو کے کہا۔

"کیونکہ آپ کی عقل دانی میں اتنی ہی گنجائش ہے۔" میں نے اتفاق کیا اور تکیہ فرش پہ ڈال کے لیٹ گیا۔ دوسرے کمرے میں بچوں بھی سو رہی تھی اور سراج کی ماں بھی محو خواب تھی۔ کہیں کسی اسپتال میں کمروں کی تنگی سے پیامنٹ کے فرش پہ کیتھرین بھی سو رہی تھی۔ کہیں بے نشان قبروں میں خلقت بھی تھی۔ مر جانے والے اور سونے والے سب قید مقام و وقت سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ فرق صرف اگلی صبح کے سورج کا رہتا ہے جسے سونے والے آنکھیں کھول کے دیکھتے ہیں تو نئے دن کے آغاز کی علامت بن کے زندگی کا احساس بن جاتی ہے اور مرنے کے لیے کچھ نہیں۔ رات... مسلسل رات... اندھیرا اور بے حسی اور صور اسرافیل کا انتظار۔"

ایسے ہی خیالات میں مجھے نیند نے آ لیا۔ لاشعور کے پردے سے رابعہ نکل آئی۔ ہر نقش ماضی ایک خواب کا حصہ بن گیا۔ وقت جو گزر چکا تھا پھر لوٹ آیا۔ جہاں جہاں اس کے آنے جانے کی دھوپ اتری تھی۔ کہاں کہاں اس کے گالوں کی شفق کا رنگ بکھرا تھا۔ کس کس جگہ اس کے لمس کی خوشبو ٹھہری تھی، وہ سب تعاقب کے سلسلے خواب میں پھیلا ہوتے۔ آمد و رفت نے جن کو پھیلائے خواہشوں نے کہ جھپکی اور ماضی وقت کو اسیر کر لیا جو ابھی پیچھے گزر چکا تھا آگے آگے بھاگ رہا تھا اور ہم اس آہوئے خوش خرام کے پیچھے سرگرداں تھے۔ میں نے آنے والے دنوں کی تصویر کے رنگ دیکھے۔ انہونی کے خواب دیکھے اور ماضی سے مستقبل کے سفر میں رابعہ کے ساتھ تھا۔ پھر آنکھ کھل گئی تو دیکھا تھا نہ سورج تھا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کے لیے اُن کے

www.paksociety.com

ساتھ پایا۔ اس میں رابعہ میرے ساتھ نہیں تھی، وہ ماضی میں تھی اور مستقبل میں بھی تھی مگر حال ایک بے وجود حقیقت کے سوا کچھ نہ تھا، ایک خیال جو احساس سے پہلے گزر جائے۔

پھر بھی میں بہت تازہ دم، بہت پُرعزم اور پُرجوش تھا۔ یہ رابعہ کے تصور کے قریب ہونے کا نتیجہ تھا کہ اس نے بچپن سے خوابوں میں جلوہ فشانی کی ورنہ جب میں اسے بھلانے کی کوشش کر رہا تھا تو وہ خوابوں سے بھی دور رہتی اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں ذہنی انتشار سے محفوظ رہا۔ رابعہ کیسے کراچی پہنچی، کراچی تک پہنچنے میں اس پر کیا گزر رہا تھا اور پھر کس طرح وہ اس قابل ہوئی کہ کہیں سے مجھے ایک فون کر سکے، یہ سب خود رابعہ سے ملے بغیر نہیں معلوم ہو سکتا تھا۔ میں مفروضات تو بہت سے قائم کر سکتا تھا لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ رابعہ اب دشمنوں کی قید میں نہیں ہے۔ اس کے ایک مکمل فون نے ہزاروں امکانات کو جنم دیا تھا، مثلاً یہ کہ رابعہ نے فون کیا نہیں تھا، اس سے فون کرایا گیا تھا یا اسے اتفاق سے ایک کال کرنے کا موقع مل گیا تھا اور اس نے کسی کو اپنی مجبوری بتا کے کہہ دیا تھا کہ ہم میں سے کوئی رابطہ قائم کرے تو اسے کیا بتایا جائے۔ یہ فرض کرنا بھی مشکل تھا کہ وہ آزاد ہے۔ وہ آزاد ہوتی تو لاہور آ جاتی یا پھر وہ کال کرتی، اپنا پتا ٹھکانا بتاتی۔

میں نے گھر کی خاموشی پر غور کیا تو گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ میری کلائی کی گھڑی دس بجا رہی تھی۔ بہت مدت کے بعد اتنی لمبی اور گہری نیند نصیب ہوئی تھی۔ محسن میرے قریب ہی دوسری چارپائی پر سویا تھا مگر اب وہاں نہیں تھا۔ غالب کی چارپائی بھی خالی تھی۔ میں نے اٹھ کے دوسرے کمرے میں دیکھنا چاہا تو مجھے اس کی کنڈی باہر سے بند ملی۔ میں تھوڑا سا حیران ہوا اور کنڈی کھول کے اندر گیا۔ اندر صرف سراج کی ماں تھی مگر اس کی حالت دیکھ کر مجھے شدید صدمہ ہوا۔ وہ اپنے کپڑے پھاڑ چکی تھی اور اب بندھی پڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو ملا کے باندھا گیا تھا اور رسّی ایک بند کھڑکی کی سلاخوں سے باندھ دی گئی تھی جو کہ یہ قطار کا آخری کوارٹر تھا، اس لیے ایک کمرے کی کھڑکی بائیں جانب بھی کھلتی تھی۔ باقی کوارٹروں میں یہ کھڑکی صرف عقبی دیوار میں تھی۔ کھڑکی کے پٹ باہر تھے اور سلاخیں اندر لگائی گئی تھیں۔ کھڑکی کو بند کرنے کے لیے سلاخوں میں سے ہاتھ گزارنے پڑتے تھے۔

سراج کی ماں کے سفید بال بری طرح بکھرے ہوئے اور الجھے ہوئے تھے اور اس کا منہ بھی کپڑا ٹھونس کے بند کر دیا گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ خونخوار شیرنی کی طرح غرائی اور اس نے بل کھا کے میری جانب بڑھنا چاہا مگر رسّی نے اسے ایک جھٹکے سے روک لیا۔ اس کی آنکھوں کی وحشت اور نفرت کی نظر نے مجھے ڈرا دیا۔ میں نے دروازہ پھر بند کیا اور باہر صحن کی طرف گیا۔ جُگل دونوں ہاتھوں سے غالب کو سہارا دے کر لا رہی تھی۔ غالب کو باتھ روم جانے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ وہ جُگل اس کے ساتھ جیسا کسی بچے کے گئی تھی۔ غالب کا ایک ہاتھ جُگل کے کندھے پر تھا۔ اگرچہ وہ اپنے وجود کا بوجھ ایک ٹانگ پر سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پھر بھی جب وہ قدم بڑھاتا تھا تو اس کے وزن سے جُگل جھک جاتی تھی۔ اس منظر نے میرے دل میں محبت، خلوص اور دل کے پاکیزہ جذبوں کی طہارت کا احساس پیدا کیا۔ وہ ایک جوان لڑکی، غالب ایک جوان مرد، دونوں اجنبی، ایک مسلمان ایک عیسائی، اس طرح ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے تھے کہ میرا دل چاہتا تھا، میں دنیا کے لوگوں سے کہوں کہ اے ہوس پرستو! تعصب کے جذبات سے مغلوب انسانو! اخلاقی قدروں کے کھوکھلے نعرے لگانے والو! ذہنوں کی غلاظت کی نظروں سے تشہیر کرنے والو! دیکھو کہ یہ کتنا خوبصورت جہان ہے۔ اگر ہم سب ایسے ہوں تو کیا آسمانوں پر کسی جنت کے حاصل ہونے تک ہم اس دنیا میں جنت نہیں بنا سکتے؟

میں نے غالب کو جُگل سے لے لیا۔ "کیا حال ہے جناب پیر کا....؟"

"بہت بہتر، میرا خیال ہے دو چار دن میں چلنے لگوں گا۔" غالب بولا۔

"اپنے خیال کو اپنے پاس رکھیے۔ خیال تو ڈاکٹر بھی اس وقت تک ظاہر نہیں کرتا جب تک کہ ایکسرے نہ دیکھ لے۔" میں نے کہا۔ "محسن کہاں ہے؟"

"اخبار لینے گیا ہے۔" غالب نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جُگل! تم کیا کر رہی ہو؟ کچھ تو کرو۔" میں نے کہا۔

"میں ناشتہ تیار ہی کرنے جا رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "محسن ڈبل روٹی اور مکھن لے آئیں، بس جانے تو بس تیار ہے۔"

"اس کو کیا ہوا؟" میں نے جُگل کے جانے کے بعد کہا۔

"سراج کی ماں کو؟ نروس بریک ڈاؤن۔" غالب بولا۔ "صبح ایک دم دماغ الٹ گیا، اعصاب جواب دے گئے۔ محسن نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ آپ باتھ روم چلیں اور منہ ہاتھ دھو لیں۔ اسی وقت باہر وہ آ گیا جس نے ہمیں یہاں آباد کیا تھا۔ اُدھر چیخنا چلّانے لگی کہ باتھ روم میں بیٹھے قبریں بنا کے جو کل سے یہاں دفن کر دو کہا ہے۔ منہ مارتے ہو تو مرنے دیتے ہو۔ وہ دیوار سے سر مارنے لگی تو محسن نے مجبوراً اسے خاموش کیا۔"

"اور اس سے کیا کہا جو باہر آیا کھڑا تھا؟"

"اس سے کہا کہ ہماری بچی بہن مری اسپتال میں تھی، وہ مر گئی، ماں

بڑائی کے صدمے کا اثر ہے۔" غالب نے کہا۔

"وہ کہاں ہے؟ مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ آتا جگا کر سو گیا۔"

"تو گھوڑے بیچ نہیں پورا اصطبل بیچ کے سو رہا تھا۔" غالب بولا۔ "ہم نے سوچا کہ جگانے سے کیا فائدہ، جتنی نیند مل جائے غنیمت ہے۔ صورتحال پر ہم نے قابو پا ہی لیا تھا۔"

"وہ تو پھر آئے گا جس نے ہمیں مکان دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ پوچھے گا نہیں کہ اب خیریت کا کیا ہو گا؟"

"اس نے پوچھا تھا۔ محسن نے کہہ دیا کہ دو تین دن سے مریض کے لیے گاؤں بھیج دیں گے۔" غالب نے کہا۔ "اس کی گھر والی بھی آئی تھی تعزیت کے لیے، جُگل نے باہر ہی سے ٹرخا دیا۔"

"یہ تو کچھ غلط ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "اب ہمیں بھی جانا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ ہم جس بہانے یہاں ٹھہرے تھے اب وہ بہانہ نہیں رہا۔ یہ تو بڑا عجیب سا لگے گا۔ اگر ہم کسی بہن کی میت کو روانہ کر دیں اور خود یہاں اڑ کے رہیں۔ آئے تو ہم اسی کے علاج کے لیے تھے۔"

"اور کوئی بہانہ چلتا بھی تو نہیں۔" غالب بولا۔ "یہ بڑھیا شروع سے پاگل ہوتی، اس کے اچانک پاگل ہو جانے کی وجہ ایک وجہ میری بھی سمجھ میں آئی۔"

"مجھے اس کی طرف سے فکر لاحق ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی اسے نہ جانے کتنے دن ہماری قید میں رہنا پڑے گا، ایسے تو یہ مر جائے گی۔"

"پھر کیا کریں؟ اسے چھوڑ دیں؟"

"نہیں یار! پھر تو ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ مگر زیب النساء جاگ گئی، عائشہ مر گئی۔ اسے ہم نے چھوڑ دیا تو علاوہ اینڈ کمپنی پر ہمارا دباؤ ہی ختم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

غالب نے کہا۔ "خسرو جہانگیر تو دباؤ سے نکل گیا اور دلاور بھی۔ ان کا رویہ اب پہلے سے زیادہ انتقامی ہو گا۔ صرف سراج پر دباؤ رکھنے سے شاید بات نہ بنے۔"

میں نے کہا۔ "تم یہ سمجھ لو کہ اس پورے وطن فروش گروہ کو اگر سراج کی تائید و حمایت حاصل نہ ہو تو وہ جیل میں نظر آئیں۔ ان کے سارے راستے صرف سراج کے کہنے سے کھلتے ہیں اور سراج کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم جاؤ جہنم میں، تمہاری ماں مرتی ہے تو مر جائے۔ ہم ان کی ایسی تیسی کر دیں گے جو عائشہ کی موت کے ذمے دار ہیں اور جن کی وجہ سے زیب النساء پر یہ ظلم ہوا۔ نہیں، سراج انھیں کچھ نہیں کرنے دے گا جب تک کہ اس کی ماں خیریت سے واپس نہیں پہنچ جاتی۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں رہا اور صرف ایک ماں ہے جس کی خاطر وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور ہماری ہر بات مان سکتا ہے۔"

محسن بھی اخبارات بغل میں دبائے اور ایک کاغذ کا تھیلا ہاتھ میں اٹھائے آیا اور اخبار گرا کے کچن میں چلا گیا۔ ان میں دو اخبارات اردو کے تھے اور تیسرا انگریزی کا تھا۔ میں نے اردو اخبار کھولا۔ اس میں بہت سی خبریں ہمارے نقطہ نظر سے اہم تھیں۔ دلاور کے اغوا پر مزید بیانات تھے اور تبصرے تھے۔ بیانات خود ساختہ سیاسی لیڈروں کے تھے اور نام نہاد رفاہی تنظیموں کے تھے۔ سب نے اغوا کی مذمت کی تھی اور حکومت سے چوہدری دلاور کی بازیابی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ عملی سیاست میں کچھ کرنے سے پہلے ہی دلاور نے اپنی تشہیر کا سامان کر لیا تھا اور ایک لابی بنالی تھی جو اسے سیاست داں بنانے کے لیے بیان بازی میں مصروف تھی۔ یہ اس کی نئی طاقت تھی جس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے صبح کاذب کا اجالا جو جھوٹا ہوتا ہے اور وقتی ہوتا ہے۔

غیر مصدقہ خبریں ایک مخصوص علاقے میں رات کے وقت پولیس کی غیر معمولی سرگرمی کے بارے میں تھیں جہاں کچھ لوگوں نے فائرنگ بھی کی تھی اور ایک دھماکا بھی ہوا تھا۔ جس کا دھماکا معلوم ہوتا تھا تاہم پولیس کی طرف سے اس قسم کی اطلاع پر لاعلمی کا اظہار کیا گیا تھا۔ عائشہ کی لاش کی دستیابی کی خبر اسی طرح چھپائی گئی تھی جیسے زیب النساء کے اغوا اور فرار کی خبر۔ ایک کونے میں بیاہ جا چکے میں مشہور صنعت کار، سوشل ورکر اور سیاسی شخصیت چوہدری دلاور کے خاندان میں ہونے والی دو اموات کا ذکر بڑے جذباتی اور اشتعال انگیز پیرائے میں کیا گیا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ چوہدری دلاور کے اغوا کے بعد ایک نامعلوم شخص نے ان کی بیوی سے فون پر دو کروڑ روپے کی رقم کا مطالبہ کیا تھا اور عدم ادائیگی یا پولیس کو اطلاع دینے کی صورت میں چوہدری دلاور کو قتل کر دینے کی دھمکی دی گئی تھی کیونکہ اہل خانہ اتنی بڑی رقم ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، اس لیے چوہدری صاحب کے خسر نے ایس ایس پی سراج صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد دوسرے فون کے ذریعے چوہدری دلاور کے خسر کو بتایا گیا کہ اب وہ اپنے داماد کی واپسی کی امید نہ رکھیں، اس کی لاش گھر پہنچا دی جائے گی۔ اس اطلاع سے چوہدری دلاور کے خسر کو دل کا دورہ پڑا جو مہلک ثابت ہوا۔ مرحوم دل کے پرانے مریض تھے اور یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے۔ باپ کی موت نے چوہدری دلاور کی اہلیہ کی جان لے لی جو عرصہ دراز سے خون کے سرطان میں مبتلا تھیں اور ڈاکٹر ان کے مرض کو لاعلاج قرار دے چکے تھے۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ جس خبر نے دو افراد کی جان لی وہ بعد میں جھوٹ ثابت ہوئی کیونکہ چوہدری دلاور صاحب اغوا کرنے والوں کے قبضے

www.paksociety.com

ملاقی پا کے گھر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

ملاور نے اپنے اغوا کیے جانے اور پھر رہائی پانے کی کہانی خود گھڑ کے اخبار والوں کو سنائی تھی جس کے مطابق اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کے لے جایا گیا تھا۔ اسے معلوم نہیں کہ اغوا کرنے والے کون تھے مگر وہ دو کروڑ روپے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ انھوں نے یقین نہیں کیا تھا کہ چوہدری ملاور جیسا صنعت کار دو کروڑ کے اثاثے نہیں رکھتا۔ اس بات کا اقرار کرانے کے لیے انھوں نے ملاور کو مارا پیٹا تھا اور اس کے گھر فون بھی کیے تھے جس کے نتیجے میں اس کی بیوی اور سسر کا صدمے سے انتقال ہو گیا تھا۔ ملاور نے بھی تصدیق کی تھی کہ اس کی بیوی کو یہ عارضہ سال بھر پہلے لاحق ہوا تھا اور ڈاکٹروں نے بتا دیا تھا کہ وہ چھ ماہ ہی گزار سکے گی۔ یہ ایک معجزہ تھا اور علاج کا کرشمہ کہ وہ سال بھر زندہ رہی۔ اس دوران میں کئی بار خون بدلا گیا اور لندن سے خصوصی ماہرین کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں مگر مستقل طور پر اس مرض سے شفایابی ممکن نہ تھی۔ تاہم باپ کی اچانک موت ایک بہانہ بن گئی۔ اپنے سسر کے متعلق بھی ملاور نے یہی کہا تھا کہ ان پر دو بار ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا چنانچہ وہ کوئی بری خبر برداشت کرنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ ملاور نے اپنے فرار ہونے کا قصہ بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صرف اپنی ذہانت اور جرأت سے کام لے کر اغوا کرنے والوں کے قبضے سے نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔

ان سب خبروں میں جھوٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سب سے بڑا جھوٹ یہ تھا کہ چوہدری ملاور صاحب سیاست دان، صنعت کار اور سوشل ورکر تھے۔ اس کی بیوی کے قتل کو بلڈ کینسر کی بیماری کا نتیجہ قرار دینا دوسرا بڑا جھوٹ تھا۔ اس عورت کو مرنا ہی تھا۔ ملاور نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور اسے صحیح وقت پر دنیا سے رخصت کر دیا۔ اسے چیلنج کرنے والا اب کوئی نہیں تھا۔ کوئی ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ اسے بلڈ کینسر نہیں تھا۔ کوئی اس ڈاکٹر کا نام نہیں پوچھ سکتا تھا اور یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ لندن سے کون سا خصوصی معالج آیا تھا۔ صنعت کار، سیاست دان اور سوشل ورکر چوہدری ملاور کا فرمایا ہوا مستند تھا۔ غریب آدمی بھوک اور بیروزگاری یا بیماری سے تنگ آ کے خودکشی بھی کر لے تو پولیس اس کی بیوہ کو قتل کے الزام میں دھر لیتی ہے کہ یقیناً کسی آشنا کے ساتھ مل کر شوہر کو مارا تھا۔ خیر اپنے چوہدری صاحب زیادہ سے زیادہ محبت پال لیں۔ ہم اس قتل کو بھی معاف نہیں کریں گے۔ ہم لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم کرائیں گے۔ سال دو سال بعد بھی زہر کے آثار بالوں سے اور ناخنوں سے پتا چل جاتے ہیں۔

ٹیکسی شہر کے نئے ایس ایس پی کے چارج لینے کے بارے میں تھی۔ اس میں پولیس ہیڈکوارٹر کے سابق ایس ایس پی کے شاندار سروس ریکارڈ کے بہت سے حوالے تھے۔ آخر میں ایک سطر اس شخص کے بارے میں تھی جس کا قابل فخر سروس ریکارڈ اس کی سبکدوشی کا سبب بنا تھا۔ کسی نے عامر رضوی کے کردار کی اعلیٰ صفات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ خبر صرف اتنی تھی کہ سابق ایس ایس پی نے ذاتی وجوہ کی بنا پر استعفیٰ دیا تھا جو حکام بالا نے منظور کر لیا۔ اس طرح ایک بے داغ کیریئر کا خاتمہ بھی شکوک و شبہات کی فضا میں کیا گیا تھا۔ اب باتیں کرنے والے باتیں کرتے رہیں گے کہ یار ایسے کون چھوڑتا ہے نوکری۔ کیا ہوگا کوئی ٹاپکیلا جس میں پھنسنے کی ہی صورت تھی، سب اوپر والوں کی ملی بھگت ہوتی ہے۔ یہ جب اپنے جیسے کسی کو پھنستا دیکھتے ہیں تو اسے عزت سے نکل جانے کا موقع فراہم کرتے ہیں تاکہ کل کو وہ پھنسیں تو ان کا راستہ بھی کوئی نہ روکے۔

خبر پڑھ کر میرا بلڈ پریشر کچھ غصے سے بھی اونچا ہو رہا تھا۔ غالب اور محسن دوسرے اخبار پڑھ بیٹھے تھے اور ان کی کیفیت بھی کچھ مجھ سے مختلف نہ تھی۔ صرف بجولی تھی جو بار بار سب سے کہہ رہی تھی کہ خدا کے واسطے ناشتا کر لو، چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ بجولی کی وجہ سے ہم کیتھرین کے بارے میں بات نہیں کر سکتے تھے کہ اس کا کیا بنا۔ اسے پولیس اٹھا کے لے گئی تھی تو یہ خبر کیوں نہیں آئی۔ شاید ملاور نے خود کو بچانے کے لیے خبر رکوا دی تھی کیونکہ کیتھرین کا نام آتا تو ساتھ ہی اس کا نام بھی آتا۔ اس نے تو پہلے فرار کی ایک جھوٹی کہانی سنائی تھی جس میں وہ سب نہیں تھا جو اس کے ساتھ کیتھرین نے کیا تھا یا اس نے کیتھرین کے ساتھ کیا تھا۔ وہ کیتھرین کا قاتل تھا اور یہ بات اچھی طرح جانتا تھا چنانچہ اس نے کیتھرین کے قتل کا ہی نہیں، اس کی لاش کی دستیابی کا ذکر بھی کہیں نہیں آنے دیا۔

حیرت کی بات عائشہ کے اغوا اور اس کی گمشدگی پر ملاور اور اس کے گھر والوں کی خاموشی تھی۔ عائشہ کو یقیناً ملاور نے خاموشی سے سپرد خاک کر دیا تھا مگر اس کی موت کو راز رکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ رشتہ متاثر نہ ہو جو ابھی نیا تھا۔ دو دن پہلے ہی تو عائشہ سے بڑی بہن کی نسبت طے ہوئی تھی۔ اس خاندان میں اب صرف وہ بچی تھی یا اس کی بڑی بہن اور ملاور کی بیوی کے بچے رہ گئے تھے لیکن اب ملاور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ مجھے بے اختیار خیال آیا۔ عائشہ کی بہن بھی کیا عائشہ جیسی ہی ہوگی۔ وہ بچوں کی پرورش بہرحال کرے گی۔ کسی غیر عورت کے مقابلے میں وہ عورت بہتر

ثابت ہوتی ہے جو بہن کے بچوں سے محبت کرتی ہو۔ وہ سوتیلی ماں کے روایتی کردار کو نہیں اپنائی۔ ملاور کو اگر بچوں کی پرورش کا خیال ہوتا اور عائشہ کی بہن بھی ویسی ہی ہوتی تو ملاور شاید اس سے شادی کرنا چاہتا۔ اس کو حاصل کرنا ملاور کے لیے کیا مشکل ہوگا۔ وہ عورت کی ذات کے حصار کو اس کی کمزوریوں سے سر کر سکتا ہے۔ سبز باغ، دولت کا سنہرا جال، پرتعیش زندگی، عزت اور شہرت کے خواب۔ ان سے عائشہ جیسی کوئی عورت کیسے گریز کر سکتی ہے۔ کہاں تک مزاحمت کر سکتی ہے۔ رہا اس کی نسبت طے پا جانے کا معاملہ تو ملاور کسی سے کچھ بھی چھین سکتا ہے۔ کسی کا احساس تمکنت، خودداری، عزت نفس، جائیداد ورنہ زندگی۔ وہ منسوب کو ختم کر دے تو نسبت کہاں رہے گی۔

لاحول ولا قوۃ۔ میں نے سر کو جھٹک کے سوچا۔ مجھے بھی ذہنی عارضہ لاحق ہو گیا ہے سوچنے کا اور ملاور ایک پکچر بنتا جا رہا ہے۔ ایسا ہونا تو نہیں چاہیے۔ مجھے ملاور کے ذاتی افعال سے کیا لینا جن کے لیے وہ قانون یا خدا کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ میری جنگ تو اس کے مقصد سے ہے اور اگر خدا نے اس جنگ میں کامران کیا تو پھر ملاور سے یہ بھی پوچھوں گا کہ میرے والد وزیر خان کی زندگی اور موت کا حساب کیا ہے۔

سب اخباروں کی خبریں ایک سی تھیں۔ مجھے اطمینان صرف یہ تھا کہ کیتھرین کے بارے میں اس کی بیٹی کو کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ ہمارے جھوٹ سے بہل جائے گی۔ اسے ہم پر اعتبار نہ ہوتا تو وہ ہمارے ساتھ ہی کیوں رہتی۔ وہ سمجھتی ہوگی کہ ہم اس کے ساتھ جھوٹ بول ہی نہیں سکتے۔

"بھائی! آج ہم لوگ شام کو چلیں گے نا قبرستان؟" بجولی نے اچانک کہا۔

میں ایسے چونکا جیسے بجولی نے میرے دل کے خیال کو پڑھ لیا ہو۔ "ہاں! بالکل چلیں گے۔ ہم سب چلیں گے۔"

"لیکن ابھی تو ہم نے کہیں اور جانا ہے۔" محسن نے گھڑی پر نگاہ ڈال کے کہا۔

"یہاں سے تو سب ہی کو جانا ہے۔" غالب نے کہا جو ایک فلسفیانہ سی بات لگتی تھی مگر اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔

میں اور محسن اس گیراج میں پہنچے جہاں ہم نے اپنی اسکوڈا کھڑی کی تھی۔ وہ لڑکا سخت بیزار اور پریشان بیٹھا تھا۔

"لیکن آپ نے بھی کمال کر دیا۔" وہ بولا۔ "آپ کی وجہ سے میں بھی بہت لیٹ ہو گیا۔ رات بھر جاگا ہوں۔"

"آپ نے تو منع نہیں کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"مگر گاڑی تو میں نے ہی لی تھی۔" وہ بولا۔ "آپ کو کیا پتا تھا۔ آپ نے تو صبح آنے کو کہا تھا۔"

"تو کیا یہ صبح نہیں ہے؟"

"وہ جی، اور پھر ہو گئی ہماری۔ جیسے لوگوں کی اب صبح ہوئی ہے۔ خیر جناب! گاڑی دیکھ لیں، بریک ایک دم فائن ہیں۔"

"اچھی طرح چیک کر لیے تھے؟"

"ہاں جی! آپ بھی دیکھ لیں۔" وہ بولا۔

میں نے اپنی تسلی کے لیے گاڑی میں ایک میل کا راؤنڈ لگایا۔ اس کا کیا بھروسا۔ اچھے بھلے بریک کھول دیتا اور راستے کا سیاپا اس کے سر دیتا مگر غالباً اس نے ہمیں نا تجربہ کار اور وہمی سمجھا ہوگا کہ بریک ٹھیک تھے اور ہم ٹھیک کرانے آ گئے تھے۔ اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا مگر ہم سے پچاس روپے وصول کر لیے۔

کاروں کے شوروم کا مالک جس کی معرفت ٹرک کا سودا ہوا تھا ہمارے فراق میں سخت بے قرار تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اور اس کا یہ اندیشہ دور ہوا کہ ہم نے براہ راست معاملہ طے کر کے اس کے کمیشن کا خون نہیں کیا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

"جناب! خان صاحب بیوپاری بہت بدمعاش ہے۔" وہ بولا۔

"ہم اس سے بڑا بدمعاش ہے۔" محسن بولا۔ "میری تو خبر تھی۔"

"نہیں جی! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "مقصد تھا ان کی دھوکے بازی سے خبردار کرنا۔ بعض وقت منہ کو دیکھ کر رقم بڑھا دیتے ہیں۔ کل صاف بات ہو گئی تھی۔ رات کو پچاس ہزار زیادہ مانگنے لگے۔"

"اچھا... یہ دیانت۔" وہ اس کا نام کوئی مار دے گا۔ میں نے ریوالور نکال کے کہا۔ "وعدہ خلافی کرتا ہے۔"

"ارے نہیں وہ... وہ میں نے ٹھیک کر لیا۔ آپ اسے جیب میں رکھ لیں۔" وہ گھبرا کے بولا۔ "بالکل فکر مت کریں! سودا اتنے میں ہی ہوگا جتنے میں بات ہوئی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی ہم ایسا آدمی سے بات نہیں کرے گا۔" محسن نے کہا۔ "تم جاؤ اور اس کو پیسہ دو۔ اگر ایک پیسہ بھی زیادہ دے گا تو ہم تم کو گولی مار دے گا۔" اب محسن نے ریوالور نکال لیا۔

"بالکل نہیں، ہرگز نہیں۔" اس کا حلق خشک ہو گیا۔ "میں ایک پیسہ زیادہ نہیں دوں گا۔ آپ یہ گولا بارود چھپا کے رکھیں۔"

"اچھا تو جاؤ، ہم ادھر بیٹھے گا۔" میں نے کہا۔

"اور سبز چائے پیئے گا۔" محسن نے کہا۔

www.paksociety.com

شوروم کے مالک کے لیے اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی کہ وہ خود رقم لے کر جائے اور سودا فائنل کر آئے۔ اب اسے پچاس ہزار بچتے ہیں یا ایک لاکھ... اسی میں وہ خوش ہی تھا۔ بہرکیف تھا۔ ہم دوبارہ وہاں جانے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ چکری کی موت کا راز ابھی جلدی فاش نہیں ہو سکتا تھا۔ جہاں حادثہ پیش آیا تھا وہاں اس کی کوئی شناخت نہیں بچی تھی اور اس کی پراسرار گمشدگی کی رپورٹ درج ہو جانے کے بعد یہ ہو سکتا تھا کہ دو چار دن میں اس کی حادثاتی موت بھی ثابت ہو جاتی۔ لیکن ٹرک اسٹینڈ پر بیٹھے ہوئے اس کے کسی ایجنٹ کا مل جانا بعید از قیاس نہیں تھا۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کوئی تجسس کا مارا ہمیں دیکھے اور یہ پوچھے کہ ٹرک ہم نے کیوں خریدا ہے۔

شوروم کا مالک تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ٹرک کے ساتھ نمودار ہوا۔ میں نے اسے دور ہی سے آتا دیکھ لیا تھا۔ وہ خود ڈرائیور کے ساتھ زمین سے تقریباً آٹھ فٹ کی بلندی پر اس کیبن میں بیٹھا ہوا تھا جو انجن کے پیچھے تھا۔ ڈرائیور ایک صحت مند اور جوان، سرخ و سفید پٹھان تھا جس کی مونچھیں ... قسم کی تھیں۔

"میاں محسن! یہ تو کوئی اصل پٹھان آ گیا۔" میں نے کہا۔

"ہمارا اس سے کیا تعلق اور تعلق نہیں تو ٹوٹنا کیا، جیسے شاعر نے کہا ہے کہ پیار کیا تو ڈرنا کیا۔" محسن بولا۔

"لیکن یہ ہم سے اپنی مادری زبان میں بولنے لگا تو ہمارے پٹھان ہونے کا ڈراما فیل کر دے گا۔" میں نے کہا۔ "ویسے جذباتی ہو تو کسی بھی ہم زبان اور ہم وطن سے گلے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔"

"ہم نے صرف ٹرک منگوایا تھا، یہ ڈرائیور کیوں لے آیا؟"

"ممکن ہے ٹرک کے ساتھ تحفے میں ڈرائیور دیا گیا ہو۔" میں نے کہا۔ "جیسے بعض اشتہارات میں ہوتا ہے کہ دندان شکن منجن کے فیملی سائز کے ساتھ ایک ہوشربا گیلیٹ مفت۔"

"ویسے ڈرائیور بھی دندان شکن ہی لگتا ہے۔" محسن بولا۔ "اگر یہ پشتو بولنے لگے تو فریقین کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

مختصر اور مجرمانہ شوروم کا مالک جست لگا کے اترا اور مطلب ہاں کرتے ہوئے ایک گائے سے ٹکرا گیا جو کسی نے صدقے میں آزاد چھوڑ دی تھی۔ ایسے مویشی ہر شہر میں ہر جگہ آزادانہ پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کوئی ان سے تعرض نہیں کرتا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ لوگ جو گھروں میں قفل لگا کے سوتے ہیں ان کی ناک کے نیچے سے چادر چرا لیتے ہیں وہ بھی ان لاوارث مویشیوں کو پکڑ کے نہیں لے جاتے۔

مذکورہ گائے سے ٹکرانے کے بعد شوروم کا مالک کراہتا ہوا اور لنگڑاتا ہوا اندر آیا تو سخت برہم تھا۔

"بس، چھوڑ دیتے ہیں اب جس سے چاہیں ٹکرا آئیں۔" گاڑیاں راستے اپنے دل سے... وہ بے ربط الفاظ میں بولا مگر صاف ظاہر تھا کہ وہ اس اللہ میاں کی گائے کا شکوہ کر رہا تھا جس نے آتے ہی ٹکر مار دی تھی۔

"خیر! یا خدا کا شکر کرو۔" میں نے کہا۔

"کیا؟ خدا کا شکر ادا کروں؟ کس بات پر؟"

"اس بات پر کہ تم بچ گیا۔" محسن بولا۔ "سالم بچ گیا۔"

"اور اس بات پر کہ وہ گائے تھی، شیر نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "یا ہاتھی نہیں تھا۔"

شوروم کا مالک خون کے گھونٹ پی کر اس مذاق پر مسکرایا کیونکہ وہ مسکرانے پر مجبور تھا۔ "آپ کی چیز آ گئی ہے۔"

"کون سا چیز؟" میں نے کہا۔ "وہ جو اوپر بیٹھا ہے؟"

"وہ تو ڈرائیور ہے۔" شوروم کا مالک بولا۔

"اچھا! ٹرک کا ساتھ ڈرائیور مفت دینے کا ہے؟"

"چار ٹائر پورے۔" شوروم کا مالک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "ہم تو ڈرائیور نہیں رکھتا ہے۔ اس کا قیمت کاٹ کر..."

"...ڈرائیور واپس۔" محسن نے کہا۔ "ٹاٹا چاہیے کہ ٹرک خود چلائیں۔ ہے امید کا کنواں میں موٹر سائیکل چلاتا آ رہا ہے۔"

"مگر جناب! موٹر سائیکل کہاں اور یہ ہیوی ڈیوٹی ٹرک کہاں!" شوروم کا مالک بولا۔ "اگر آپ کے پاس ڈرائیور نہیں ہے تو میری مانیں اسے رکھ لیں، یہ ضرورت مند ہے... اور پریشان ہے۔"

"کیوں پریشان ہے؟"

"اور تم اس کی پریشانی پر کیوں پریشان ہے؟" میں نے کہا۔

"جناب! ایماندار آدمی ہے نا، اس لیے ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔ تین بار نوکری سے نکالا جا چکا ہے کیونکہ غلط کام نہیں کرتا۔ اب جو ٹرک کمپنی والے ہوتے ہیں، ان کے تو ہزار دھندے ہوتے ہیں اور ہزار طریقوں سے وہ راستہ بناتے ہیں۔ جنگل کی لکڑی، اسمگلنگ، نشہ... یہ سب دینے کے تب کہیں جا کے ادھر کا مال ادھر پہنچتا ہے اور ادھر کا مال ادھر آتا ہے۔ مال سمجھتے ہیں نا آپ۔ یہ پٹھان... پٹھان ہے۔ کہتا ہے یہ غلط ہے، دھوکا ہے، گناہ ہے اور جرم ہے۔ ہم یہ نہیں کرے گا اور کسی کو کرنے بھی نہیں دے گا۔ نتیجہ تو آپ خود سمجھ لیں۔ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ کہیں بھی دو ہفتے سے زیادہ نہیں رہتا۔ ویسے ڈرائیور بہت اچھا ہے اور بھروسے کا آدمی ہے۔ اسی لیے میں اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔"

"اچھا ہم دیکھے گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے امید تھی کہ آپ لوگوں کے ساتھ چل جائے گا کیونکہ آپ لوگوں کا کام سیدھا ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی ہیرا پھیری والا نہیں ہے۔"

"اس کو بولو گاڑی کو ملتان روڈ پر لے جائے اور شالیمار اسٹوڈیو سے آگے کھڑا کر دے۔" میں نے کہا۔ "ہم ادھر پہنچ جائے گا۔"

"اگلی بات ادھر کریں گے۔" محسن نے کہا۔

شوروم کا مالک یہ خوشخبری سنانے کے لیے باہر نکل گیا اور اس مرتبہ ایک ... سے ٹکرانے سے بچ گیا۔ ہم نے ٹرک کو پھر روانہ ہوتے دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔ فوری خطرہ ہمارے پٹھان نہ ہونے کا راز فاش نہیں ہوا تھا۔ ڈرائیور کی ہمیں واقعی ضرورت تھی اور جیسا کہ شوروم والے نے بتایا تھا، یہ آدمی اپنی ایمانداری اور اصول پرستی کے باعث دربدر ہو رہا تھا۔ اگر ہمیں اس جیسے شخص کی ضرورت تھی تو اسے بھی ہم جیسے لوگوں کی۔

شوروم والا لوٹ کر آیا اور اس سے باقی معاملات طے کرنے میں مزید آدھا گھنٹہ صرف ہوا۔ ہم نے رسید اور ٹرانسفر پیپر وغیرہ حاصل کیے اور ٹرک رجسٹریشن کے مطابق...

"رجسٹریشن تو نو رتن سرکس کمپنی کے نام پر ہو گا؟" میں نے کہا۔

"آپ ایک دو سوال زیادہ نہیں کر سکتے؟" شوروم والا اب ہم سے بے تکلفی پر آمادہ تھا۔ ہمارے اور اس کے درمیان تمام کاروباری معاملات اہتمام و تنظیم اور خوشگوار ماحول میں طے ہوئے تھے۔ سودا بہت بڑا تھا اور اس کے فائدہ ابھی بہت حاصل کیا تھا۔ چنانچہ وہ خوش تھا۔ اس نے ہمارے متعلق جو اندازہ لگایا تھا، خاطر کی سختی وہ بالکل بدل چکی تھی اور ہم جو بے حد بڑے فراڈ لگ رہے تھے، اس کے نقطہ نظر سے بہت سیدھے ثابت ہوئے تھے۔ ہم نے اس کے کہنے پر ایک ڈرائیور کو بھی ملازم رکھ لیا تھا۔ اس لیے اسے ہمیں ایک اور کاروباری مشورہ دینا مناسب سمجھا۔

"دو سوال ہیں، تین اور وہ ہم نے ابھی رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کیا دھواں دیگا، اس کا علم ہو تو ہے جناب! ہمارا ایک بھتیجا ہے، اسے بڑا شوق ہے اپنے کرتب دکھانے کا۔ چھوٹا تھا تو ایک بار چھت پر سے کود گیا۔ مشکل سے سات سال کا ہوگا۔"

"پھر کیا ہوا؟ لنگڑا ہو گیا سات سال کی عمر میں؟"

"وہ... جی وہ تو نہیں، اس کے والد یعنی میرے بھائی کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔" شوروم والا بولا۔ "انھوں نے بچے کو کیچ کرنے کی کوشش کی تھی، بڑے! بچے کو پکڑنے ... سب سے ... ہو جاتے ہیں۔ دوسری بار جناب اس نے چودہ سال ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگ ماری مگر درخت ذرا دور رہ گیا۔"

"اچھا! پھر اس کا تو ضرور ٹوٹا ہو گا۔"

"نہیں بھائی صاحب! اس کو پھر کس نے کیچ کر لیا ہو گا؟" میں نے کہا۔

شوروم والے نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایک بکری کی ٹوٹ گئی۔ پیڑ کے نیچے کھڑی تھی، وہ بکری کی کمر پہ گرا۔ خیر مرنے سے پہلے اس کو ذبح کر لیا گیا تھا اور یہ بات آج بھی ... اب وہ اکیس سال کا ہے۔"

"پھر سات سال بعد کسی کا کچھ توڑا ہے؟" ... نے فیصلہ کیا۔ "سات سال میں باپ کا ہاتھ، چودہ سال میں بکری کا کمر، اب اکیس سال میں دیکھا تو ... گا۔ ہم دعا کرو، اس کو بولو کہ چڑیا گھر کے پنجرے پر چڑھ کے شیر پہ کود جائے۔"

ظاہر ہے ہمارے اس مشورے کے بعد شوروم والے سے مذاکرات ختم ہو گئے اور ہم اس سے ہاتھ ملا کے جانے سے پہلے اسی طرح مجبوراً کے رخصت ہوئے۔ اس نے کہا کہ وہ نو رتن سرکس کمپنی کے نام فروخت کے ٹرانسفر کی کارروائی کرے گا جو ہیں گھنٹوں میں مکمل کر دے گا۔

"اس ٹرک ڈرائیور کا انٹرویو کر لیں۔" محسن نے وہاں سے روانگی کے بعد کہا۔

"کر لیتے ہیں، شاید ایک کام کا آدمی مل جائے۔" میں نے کہا۔

"ہمیں اس کو اس شہر سے بھی فوراً نکل جانا چاہیے۔" محسن بولا۔ "سراج کی ماں کی وجہ سے گڑبڑ نہ ہو جائے، کہیں پاگل پن میں اس نے بولنا شروع کر دیا سب کے سامنے تو ہم پھنس جائیں گے۔"

"مگر ہم اب جائیں گے کہاں؟"

"میرا خیال ہے کہ ... میں ہم محفوظ ہوں گے۔" محسن بولا۔

"کیا اس پر سرکس کا نام لکھوا لیں؟"

"ابھی نہیں۔" محسن نے کہا۔ "خواہ مخواہ لوگ جمع ہوں گے اور دس قسم کے سوال کریں گے۔ ابھی تو وہ عام قسم کا ٹرک لگتا ہے جو عموماً بڑے شہروں کے درمیان سامان لانے لے جانے کے کام آتے ہیں۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "اگر یہ بیان شہر بھر کا جاتا... کہ مسلم اسپتال میں داخل ہو گئی ہے تو ہم مہینہ وہاں گزار لیتے۔"

"لیکن اب نہیں گزار سکتے، ہمیں روانہ ہونا پڑے گا۔ یہ بتا کے کہ ہم بھی میت کے ساتھ واپس جا رہے ہیں۔" محسن بولا۔

ٹرک ابھی ملتان روڈ پر ہی تھا کہ ہم نے اسے جا لیا۔ اس کی رفتار بہت کم تھی اور شہر کی ٹریفک میں اور بھی کم ہو گئی تھی۔ اس قسم کے ہیوی ٹرک کو مخصوص سڑکوں سے گزرنے کی اجازت تھی۔

www.paksociety.com

تنگ سڑکوں اور بازاروں میں بھاری ڈیوٹی ٹرک نہیں جا سکتے تھے چنانچہ اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے چلتے گئے۔ ہم نے اُسے صرف [illegible] روڈ پر اسٹوڈیو سے آگے جانے کی ہدایات دی تھیں۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ اُسے کتنا آگے جانا ہے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اُسے خود گائیڈ کروں۔ آبادی سے نکلتے ہی میں نے مائکروبس کی رفتار بڑھا کے اُسے اوورٹیک کیا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ آٹھویں میل کے نشان پر مجھے سڑک کے بائیں کنارے پر ایک صاف حصہ نظر آیا جہاں ٹرک کو کھڑا کرنے سے ٹریفک میں ذرا بھی خلل نہیں پڑ سکتا تھا۔

ڈرائیور نے ٹرک کو میری ہدایت کے مطابق بالکل آخری حصے میں روک دیا۔ ٹرک اب سڑک سے تقریباً پچاس گز دور تھا اور یہ جگہ ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔ ایک جانب خیر آباد کھیت تھے جو کسی تعمیراتی کمپنی نے خرید لیے تھے۔ ان کا سائن بورڈ سڑک کے کنارے نصب تھا جس پر مجوزہ منصوبے کے بارے میں پبلک کو [illegible] معلومات فراہم کرنے کے بعد مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ تفصیلات کے لیے فلاں فلاں نمبر پر رابطہ قائم کریں۔ آگے پیچھے مکانات اس خالی پلاٹ کے بعد شروع ہوتے تھے چنانچہ تینوں طرف سے ہم الگ تھلگ تھے۔ چوتھی سمت یعنی سڑک کے دوسرے کنارے پر نئی بنی ہوئی دکانیں تھیں۔ ان میں سے بیشتر کے شٹر گرے ہوئے اور مقفل تھے۔ صرف چار دکانیں آباد ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک میں چائے خانہ اور ریسٹورنٹ تھا جو دو دکانوں کو ملا کے بنایا گیا تھا۔ اس کے اوپر سفید کی چھپر کے پردے پر آرٹسٹ نے بقلم خود شاندار ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ تحریر کیا تھا اور دائیں بائیں ایک ایک پھول بنا کے اس میں یا اللہ اور یا محمد بھی لکھا تھا۔ یہ ہوٹل یوں تھا کہ مسافرانِ شب کے لیے خدا کی بنائی ہوئی زمین پر اور آسمان کے سائبان کے نیچے چارپائیاں ڈال کے سونے کا بندوبست کیا گیا تھا اور یہ اعلان بھی الگ سے پینٹر نے سائن بورڈ پر کر دیا تھا کہ بستر ایک روپیہ [illegible] دکانیں بالترتیب ٹائر میکینک، پنکچر بنانے اور مرمت [illegible] اور تعمیر میں کام آنے والے میٹریل فروخت کرنے والوں کی تھیں۔

[illegible] ڈرائیور نے نیچے اُتر کے ہم سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ "میرا نام شیر علی ہے۔"

مجھے اس کے لہجے پر شک گزرا۔ "شیر علی! تم مجھے پٹھان تو نہیں لگتے۔ میرا مطلب ہے لہجے سے۔"

وہ مسکرایا۔ "میں سو فیصد خالص پٹھان ہوں۔ کوہاٹ کا رہنے والا۔"

"مگر تم اردو بہت صاف بولتے ہو۔" میں نے کہا۔

"اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔ بہت سے دیسی لوگ جب انگریزی بولتے ہیں تو انگریزوں کو شرمندہ کر دیتے ہیں۔" شیر علی نے کہا۔ "انگریزی ہمیں [illegible] یہ تو اپنے ہی وطن کی قومی زبان ہے۔"

"تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے شیر علی؟" محسن نے اس کی بات سے متاثر ہو کے کہا۔

"میں نے اسلامیہ کالج پشاور سے بی اے کیا تھا۔" وہ بولا۔

"اچھا اور تم ٹرک چلا رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"آپ کے خیال میں یہ کوئی بُرا کام ہے جس پر مجھے شرم آنا چاہیے؟" وہ بولا۔

"ہرگز نہیں۔" میں نے فوراً کہا۔ "مجھے تو خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ تم نے محنت کی عظمت کو پہچانا ورنہ بی اے کر کے لوگ جسمانی محنت کے کام میں توہین محسوس کرتے ہیں۔"

"میں محنت کر سکتا ہوں، نوکری شاید نہیں کر سکتا۔"

"میں نے سنا ہے کہ تم کو یہ کام بھی تین بار چھوڑنا پڑا تھا۔" محسن بولا۔

"جی بات دراصل یہ ہے کہ نوکری میں آدمی اپنی خدمات بیچتا ہے اپنی عزتِ نفس، خودداری، دین ایمان یا اصول نہیں بیچتا۔" شیر علی نے کہا۔ "میں تنخواہ لوں گا تو اس کے ایک ایک پیسے کی محنت ضرور ادا کروں گا۔ جہاں کام نہیں ہوگا وہاں میں مفت کی تنخواہ بھی نہیں لے سکتا مگر ملازمت کے نام پر میں غلامی کرلوں یہ ممکن نہیں ہے اور آج کل ہر نوکری ایک غلامی ہے۔"

"اگر تم اور ہم ساتھ رہے۔" محسن نے متاثر ہو کے کہا۔ "تو تم دیکھو گے کہ یہ ملازمت بھی نہیں ہے، رفاقت ہے۔ ہم مل کے کام کریں گے اور ساتھی ہوں گے، نہ کوئی آقا نہ کوئی ملازم۔ ہم عزت دے کر عزت حاصل کرنے کے اصول کو سمجھتے ہیں اور اسی پر عمل بھی کرتے ہیں۔"

"فرض کرو ہم تمھاری خدمات حاصل کرنا چاہیں۔" محسن بولا۔ "تو تم کیا معاوضہ یا حقِ محنت لو گے؟"

"میں اکیلا آدمی ہوں۔ مجھے ایک ہزار بہت ہیں۔" وہ بولا۔ "پانچ سو خرچ کروں گا تو پانچ سو بچاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم تمھیں دو ہزار روپے ماہانہ دیں گے۔ کھانا پینا سب ہمارے ساتھ ہوگا۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "کھانا پینا میرا اپنا ہوگا۔"

"یہ کوئی رعایت نہیں ہے۔ ان سب کے لیے جو ہمارے ساتھ ہوں گے کھانے پینے کا ایک ہی جگہ بندوبست ہوگا۔ سب ایک ساتھ کھائیں گے اور ایک سا کھائیں گے۔ ہم بھی۔ سب کی تنخواہ اس کے علاوہ ہوگی۔ پھر بھی تم بازار سے کھانا چاہو یا اپنا پکانا چاہو تو پانچ سو کا اضافہ کرلو۔"

اس نے کچھ سوچ کے انکار میں سر ہلایا۔ "ایسی صورت میں مجھے منظور ہیں [illegible] کچھ اور سمجھا تھا۔ سب سے الگ [illegible] سمجھا تھا کہ اب آپ مجھے کام بتا دیں گے۔"

"کام۔۔۔ کام صرف ٹرک چلانا۔" میں نے کہا۔

"میں نے سُنا ہے آپ کوئی سرکس قائم کر رہے ہیں؟" وہ بولا۔ "صرف سرکس ہی ہوگا یا کچھ اور بھی ہوگا؟"

"کچھ اور سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب یہ کہ بہت سے تھیٹر سرکس والے آوارہ عورتیں [illegible] رکھ لیتے ہیں۔"

"اوہ نو۔ ہم کوئی بھی غلط کام نہیں کریں گے، تم دیکھ لو گے۔" [illegible] میں نے کہا۔ "ہم اسمگلر بھی نہیں ہیں کہ ٹرک کو غیر قانونی کاروبار کے لیے استعمال کریں۔"

"سرکس کے باقی ساتھی کون ہیں؟" وہ بولا۔

"ان سے بھی تم بہت جلد مل لو گے۔" [illegible] "اگر تم ٹرک کو چھوڑ کے جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔"

"مجھے اپنا سامان لے کر آنا ہے۔" شیر علی نے کہا۔

"سامان کم ہے تو ابھی لے آؤ۔ بس پہننے کے کپڑے، باقی چھوڑ دو۔ ہم ابھی اس چائے خانے میں رہیں گے۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس ہے بھی کیا۔ دو چار جوڑے کپڑوں کے علاوہ [illegible] وہیں چھوڑ آؤں گا۔" وہ بولا۔

[illegible] میں نے کہا اور جیب میں سے پانچ سو روپے نکال کے [illegible] "یہ ایڈوانس رکھ لو کچھ خریدنا ہو تو۔"

"بہت بہت مہربانی۔" وہ بولا۔ "میری بہت تھوڑی ضرورتیں [illegible] کبھی کچھ مانگا نہیں۔ ان [illegible] نے میرے دو مہینے کے پیسے [illegible] جہاں میں پہلے ملازم تھا میں نے ان کو مارا تھا۔"

"کیوں مارا تھا؟" میں نے کہا۔ "مار پیٹ کوئی اچھی بات ہے؟"

"اور کسی کو دھکے کا ذرا شوق [illegible] تذلیل کرنا اور گالیاں دینا کوئی اچھی بات ہے؟ آپ نے مجھے پانچ سو روپے دیے ہیں۔ اس کے ساتھ اگر آپ مجھے گالی دیتے تو میں آپ کو بھی مارتا۔" وہ بولا۔

"[illegible]" [illegible] "[illegible] تم اب جاؤ۔ ہم [illegible] تمھارا گھر ہے اور یہ سامنے [illegible] کے لیے طعام و قیام کا اعلیٰ انتظام ہے۔"

"جب وہ چلا گیا تو میں نے محسن سے کہا۔ "یہ آدمی مجھے کام [illegible] اچھا لگتا ہے۔"

"[illegible] ابھی کوئی رائے نہیں دوں گا۔" محسن بولا۔

"[illegible] نے سب کا اعتبار ختم کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"سانپ کا کاٹا رسی سے بھی ڈرتا ہے اور اس تجربے کے بعد میں کسی پر بھی اعتبار کرنے میں عجلت نہیں کر سکتا۔ آدمی کو دیکھیں گے، پرکھیں گے اور اس کے بعد دوست کہیں گے۔" محسن نے کہا۔

"اب اس ٹریلر کو کیا لاوارث چھوڑ جائیں؟" میں نے کہا۔

"یہ تو بڑے خطرے کی بات ہے۔ کوئی ذرا پہیے جیب میں ڈال کے لے گیا تو؟"

جواب دینے کے بجائے میں نے سڑک کے دوسرے کنارے پر واقع گیراج کا رُخ کیا۔ وہاں ایک گنجے سر والا ادھیڑ شخص فارغ کھڑا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ ایک گاڑی کے اٹھے ہوئے بونٹ میں گھس گیا۔ میں نے بونٹ بجا کے اُسے متوجہ کرنا چاہا تھا مگر بونٹ تو بس اشارے کا منتظر تھا کہ ایک دم گر گیا اور شخص نے ایک زوردار [illegible] کی اور سر کو ٹٹولتا ہوا باہر نکلا۔

"واہ جی واہ! آپ نے تو سر ہی۔۔۔ پھاڑ۔۔۔ دیا تھا۔"

"اور کیا پھاڑتے؟" میں نے کہا۔ "یہ کپڑے تو تمھارے پہلے ہی پھٹے ہوئے ہیں۔ یہ بتاؤ اس گاڑی کی نگرانی کر لو گے؟"

"اس گاڑی کی؟" وہ انگلی سے اشارہ کر کے بولا۔ "یہ گاڑی ہے جی؟"

"گاڑی نہیں ہے تو کیا ہے؟ جہاز ہے؟ [illegible] ہے؟" محسن نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ گا۔۔۔ گا۔۔۔ گاڑی ہوتی ہے کار۔ یہ تو جی۔۔۔ [illegible]۔۔۔ [illegible] ہے۔ استاد کر لیں گے [illegible]۔" وہ بولا۔

"بس تم اپنے استاد سے کہہ دینا کہ [illegible]۔" میں نے کہا۔

میں چل پڑا تھا کہ محسن نے کہا۔ "وہ چاچا۔۔۔ چا۔۔۔ چابی؟"

"چاچا۔۔۔ چابی؟" میں نے کہا۔ "کون چاچا چابی؟"

"چا۔۔۔ چاچا۔۔۔ چابی دے کر جائیں گے تو [illegible] ہوگی نا جی۔" شخص نے دانت نکال کے کہا۔ [illegible] میں نے چابی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ [illegible] سب کے ہی مذاق کا نشانہ بنتا تھا اور بُرا ماننا چھوڑ چکا تھا۔

ہم اپنی سرکاری گاڑی میں واپس ہو گئے۔ ابھی تک سب خیریت تھی۔ ہمارے لیے پراجیکٹ کا سب سے اہم اور مشکل مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ جس جس قسم کے [illegible] کی ضرورت تھی وہ ہمارے پاس تھا اور اب اگلا مرحلہ [illegible] تلاش کرنے کا۔ ہم خود تھے چنانچہ ہمیں سات افراد کی ایک با صلاحیت ٹیم کا انتخاب کرنا تھا لیکن یہ کام آج ہی شروع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سب سے پہلے ہمیں [illegible] سے [illegible] ہونا تھا اور آج ہی رات کو [illegible] فون کرنا تھا۔ ہم نے راستے میں رک کر کھانا بھی کھا لیا۔ دوپہر کے بعد ہم گھر پہنچے تو سراج کی ماں سو رہی تھی۔ غالب نے اُسے خاموش دیکھ کے

www.paksociety.com

لیے بھی سکون آور گولیاں دے دی تھیں۔ اس حالت میں اسے لے جانا آسان تھا چنانچہ کھانے سے فارغ ہوتے ہی ہم نے غالب کو گاڑی میں پہنچایا اور پھر سراج کی ماں کو۔ ایک گھنٹے بعد جب کوارٹر کی چابی دینے گیا تو غازی خان کا بیٹا وہیں موجود تھا۔

"آپ جا رہے ہو جی؟" وہ بولا۔ "غازی خان کا خط آیا ہے وہ بھی شام تک پہنچے گا۔"

"اچھا۔" میں نے کہا "جناب ان سے تو ملاقات نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں جی آپ کی بھی مجبوری ہے۔ بڑا افسوس ہوا..."

"بھی جانی" اللہ کی بھی مرضی تھی وکیل نے ایک سوگوار قسم کی مسکراہٹ سے کہا "یہ بتا دو کہ غازی خان کی بیوی تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں جی، میں نے نہیں بتایا آپ کو کہ اس کا آپریشن کامیاب ہو گیا" وہ بولا "ابھی چھٹی نہیں ملی مگر غازی خان نے لکھا ہے کہ ایک ہفتے بعد وہ چل سکے گی جیسے پہلے چلتی تھی۔"

"تم وہ سامان رکھ لینا جو ہم نے دیا تھا۔"

"مولوی آپ ہمیں شرمندہ کر رہے ہو" وہ بولا "ہم نے تو آپ سے کرایہ بھی نہ لیا مگر کوارٹرز اور کیا تھا۔"

وہ قبول کیا کہ پہلے اس نے مجھے کیا کہا تھا۔ اس نے چند دن قیام کر کے ایک ماہ کا کرایہ ادا کرنے والوں سے ملنے والی رقم جیب میں ڈال لی تھی اور اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اصل مالک مکان سے یہ ذکر تک نہیں کرے گا کہ کوارٹر کرائے پہ اٹھا تھا اب وہ بڑا احسان مند بن رہا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور چل پڑا۔ دس منٹ بعد ہم اس علاقے سے نکل چکے تھے جو گلبرگ کے علاقے میں ایک نیا ہاؤسنگ کالونی تھا جو اس وقت ویران پڑا تھا۔ میں نے اور محسن نے اندر بیٹھ کے کافی پی اور غالب کے لیے گاڑی میں بھجوا دی جو اس نے صرف چاٹ لی۔

"مجھے تو یہ آدمی شیر علی بھی مشکوک لگتا ہے" محسن بولا۔

"اسے ہم مشکوک لگنے لگے ہوں گے" وکیل نے کہا۔

"بالکل لگے ہوں گے اور بہت جلد ہمیں اس کو مطمئن کرنا ہوگا" محسن نے کہا "یہ تو اچھا ہوا کہ اس نے ہمیں پٹھانوں کے بچے میں اردو بولتے سنا ہی نہیں تھا مگر ہم نے غلطی سے بھی انگریزی بولنی شروع کر دی تو وہ سمجھ لے گا فرانسیسی تو خواب میں بھی مت بولنا۔"

"فی الحال میں اردو یا پنجابی پر اکتفا کروں گا" میں نے کہا۔

"کیا یہ بات عجیب نہیں کہ اس نے ابھی تک ہم سے ہمارے نام بھی نہیں پوچھے" محسن بولا "اگر وہ پوچھتا تو ہم کیا بتاتے؟"

"صاحب وہ پوچھے گا تو کیا بتائیں گے جو رجسٹریشن کے کاغذات میں ہیں" میں نے کہا "میں عجیب خان ہوں۔"

"اور میں ہوں عجیب خان ولد [illegible] ساکن ڈیرہ [illegible] شہر ہوں" محسن بولا "تو بھول گیا ہے۔"

ہم تو ساتھ ہی ہوں گے، مگر بات یہ ہے کسی کو کیا معلوم کہ ہم نے گاڑیوں کی رجسٹریشن کس نام سے کروائی ہے۔ صرف پولیس کے کاغذات میں عجیب خان کا نام ہے اور اسے بھی نورتن سرکس یا کمپنی کے نام کر دیا گیا ہے۔ ٹرک بھی نورتن سرکس کی ملکیت ہوگا تو ہم بے نام نہیں چلیں گے۔ ہمارے نام ماڈرن قسم کے ہونے چاہئیں جیسے کہ سرکس یا تھیٹر کمپنی کے مالک رکھتے ہیں یا رکھنا پسند کرتے ہیں" میں نے کہا۔

"مالک تو غالب ہوگا" محسن بولا "ہم صرف جوکر ہیں اور سرکس میں ہمارے نام بھی مسخروں والے ہوں گے مگر اصل نام ہمارے سامنے مزید جاننا چاہیے۔"

"بیٹ برادرز" محسن نے کہا "بیٹ برادرز سرکس... بلی دی سی..."

"مہمانی تو اچھا ہے اور چھوٹا ہے" میں نے کہا "لیکن بیٹ برادرز کے لیے تین عدد ہم وزن اور ہم قافیہ نام بھی مطلوب ہیں۔"

"مثلاً مسعود بٹ لیکن یہ غالب کا جو اصل مجموعہ ہے شاہ کلام ہوا اس لیے مسعود ہے" محسن بولا "مشہور بٹ ہو سکتا ہے مرزا غالب کیونکہ اس کا نام خاصی شہرت رکھتا ہے اور آپ ہمیشہ مغرور بٹ اور اگر یہ پسند نہیں تو زبلو، ہماری پھر کم نام ہیں یا مفعول بٹ، استغفار بٹ اور استغفار بٹ۔ ورنہ انگلش بٹ والی بٹ اور ونڈر بٹ..."

باہر کسی نے مائیکرو بس کا ہارن بجانا شروع کیا۔ غالباً جولی نے غالب کے کہنے پر بتا دیا تھا کہ وہ انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے ویٹر کو بل ادا کیا اور اسے کہا کہ وہ گاڑی میں سے بھی برتن اٹھا لائے۔

"بہت جلد تھک گئے آپ" غالب نے طنز سے کہا۔

"ہم... جی آپ نے بالکل درست فرمایا" میں نے ڈھیٹ بن کر کہا "ہم واقعی کچھ جلدی تھک گئے۔ میرا مطلب ہے اس دنیا میں ہر چیز کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ وہ قبل از وقت پیدا ہوا۔ شاہ محمد تغلق تو..."

"ہم بھی اکیسویں صدی کے لوگ بیسویں صدی میں پیدا ہو گئے تو گویا جلدی ہی آ گئے" محسن نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"پھر آپ لوگ جلدی ہی رخصت کیوں نہیں ہو جاتے اس دنیا سے" غالب نے جھلا کے کہا "شام ہو گئی ہے۔"

"صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ شام ہوتی ہے صبح ہوتی ہے یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔"

"میں چاہتا تھا کہ میں اس ٹانگ کا آخری استعمال کر سکوں جس پر پلاسٹر چڑھا ہوا ہے" غالب نے کہا۔

"آپ غالباً بھول گئے ہیں کہ یہ ٹانگ ٹوٹ گئی تھی" میں نے کہا "اور صحیح فیصلہ آپ کو نہیں کسی ڈاکٹر کو کرنا ہے۔"

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں مجھے کسی آرتھوپیڈک سرجن کے پاس لے چلو" غالب نے کہا "جو پلاسٹر کاٹ کے دیکھے۔"

"او کے۔ مگر پہلے خواتین کو گھر چھوڑ دیں۔ ہمارا اپنا گھر جلنا"

"... پھر گھر" میں نے کہا "اور اس کے بعد....."

"اس کے بعد کیا؟" محسن نے میرے لہجے پر غور کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ زیب النساء کی عیادت کے لیے جاؤں"

میں نے کہا "اسپتال جا کے دیکھوں؟"

"تو پاگل ہو گیا ہے کیا" محسن بولا۔

"میں مرزا پہلے پاگل تھا، پاگل ہوں اور رہوں گا" میں نے کہا۔ "میں خود کو عقلمند سمجھنے والوں میں شامل نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ وہاں وہ سب آئے ہوں گے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ممکن ہے اس کا بھائی آیا ہو مگر وہ صرف ملاقات کے لیے مقررہ وقت پر آیا ہوگا۔ سراج کو اس نے کہاں اور ممکن ہے ضرورت بھی نہ ہو۔"

"پھر تمہیں کیا ضرورت ہے یار؟" غالب نے کہا۔

"نہ جانے کیوں میرے دل پر ایک بوجھ سا ہے" میں نے کہا۔ "بے شک اس کے ساتھ جو زیادتی ہوئی اس کی ذمہ دار وہ خود تھی مگر وہ ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو کچھ نہ ہوتا۔ مگر کیا یہ درست نہیں ہے کہ ابتدا ہم نے کی۔ ہم اسے ساتھ نہ لاتے تو..."

"تو وہاں پہنچ گئے کیسے؟" محسن نے میری بات کاٹ کے کہا۔

"جہاں پہنچا ہے وہاں رہا ہے" میں نے کہا۔

"بچارا..." غالب نے چلا کے کہا "آف یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ بے وفا عاشق بھی صرف بالم ہو جائے۔ جانا کو تو نے ایسے بدل لیا جیسے لیڈر سیاسی جماعت بدلتے ہیں۔ آہ ظالم، اب تیرا کیا ہوگا؟"

"تم کیوں چاہتے ہو کہ پھر ٹانگ کے ٹھیک ہونے سے پہلے میں تمہاری دوسری ٹانگ توڑ دوں" میں نے کہا۔ "میں نے محاورہ استعمال کیا تھا۔"

"اچھا اچھا۔ محاورہ استعمال کیا تھا تو بتا دیتے" غالب نے کہا۔ "میں تو ان پڑھ آدمی ہوں۔"

"دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ اس سے پھر ملوں" محسن بولا "اور پوچھوں کہ اب کیا حال ہے اور کیا خیال ہے۔"

"کیا اس کے خیالات بدل گئے ہوں گے" غالب نے کہا مگر اسے جواب دینے سے پہلے میں نے گاڑی روک دی۔ جولی کو اور سراج کی ماں کو ہم نے ٹریلر کے اندر پہنچا دیا۔ شیر علی لوٹ آیا تھا۔ ہم نے اسے شاندار ہوٹل بھیجا جہاں سے وہ ایک دو پیسے بھی بستر کے ریٹ والا چلو بستر اور چار پائیاں اٹھا لایا۔

"چار پائی کی ضرورت نہیں تھی" میں نے کہا۔

"میں نے کہا تھا کہ صرف بستر سے وہ چار پائی کے اڈے لے کے... کھٹ لو گو وہ کہتے تھا کہ بستر ایک ساتھ ہیں۔ یہ یاد لو وہ بھی ہوگا۔ پھر بھی کیوں چھوڑنا" شیر علی نے کہا۔

"اچھا اچھا" میں نے ہنس کر کہا "ہم باہر سوئیں گے مگر ابھی

ضروری کام سے جا رہے ہیں تم عورتوں کا خیال رکھنا۔"

غالب کو ہم نے ایک پرائیویٹ اسپتال میں چھوڑ دیا جہاں کا آرتھوپیڈک سرجن بہت خوش مزاج بوڑھا تھا۔ پہلے تو وہ مرزا غالب کے نام سے محظوظ ہوا۔

"واہ میاں۔ مرزا غالب اس بیسویں صدی میں" وہ بولا "دل تو خیر شاعروں کا وہ ہوتا ہے۔ کیا کہتے ہیں اسے آبگینہ مگر ٹانگ تو شاعری میں بھی ٹانگ ہوتی ہے۔ یہ ٹانگ کہاں اناڑی کر ٹوٹ گئی؟ پہلے معاملے میں" اپنی بات پر وہ خود ہی ہنسا "خیر ابھی کاٹ دیتے ہیں میرا مطلب ہے پلاسٹر کاٹ دیتے ہیں۔ ٹانگ کا حال تو دیکھا جاتا ہے مگر ہم بھی جان لیں گے ایکسرے دیکھ کر۔ جیسے خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر ویسے ہی تمہاری صورت دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ حال اچھا ہے۔"

"اچھے بھی ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے" غالب نے کہا۔

"ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے۔"

"مرے جانے ہوتا میاں، شاعر اب مر جاتے ہیں۔ وہاں ہوتا ہے جشن مرگ" وہ ہنسا۔ "ایک بار میں بھی گیا تھا بڑا بھاری شاعر تھا۔ مجھ پہ بہت بھاری پڑا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کون کیا کہہ گیا۔ شاعری تو خیر سمجھ لیتا ہوں میں اور وہاں جاتا ہی کیوں مگر وہ لاؤڈ اسپیکر سسٹم بڑا خراب تھا۔ خیر...... تو ہاں تم رونا کیوں بہہ جانا چاہتے ہو اٹھ کے بیٹھے تھے ایک ٹانگ پر..." وہ صرف باتیں نہیں کر رہا تھا کام بھی کر رہا تھا۔ اس نے ایک مریض کو رخصت کیا "جاؤ میاں عیش کرو، یہ ٹانگ ہمارے سے پھر نہیں ٹوٹے گی کسی اور جگہ سے ٹوٹ جائے تو میرا ذمہ نہیں۔ پھر آ جانا۔"

بالآخر غالب کے بارے میں اس نے کہا کہ یہ سارا کام جلدی میں نہیں ہو سکتا چنانچہ ہم لوگ تشریف لے جائیں اور پھر ایک گھنٹے بعد لوٹ کر آئیں۔ میں اور محسن بڑے اچھے موڈ میں باہر نکلے۔

"ایسا ڈاکٹر آدھا مرض باتوں سے دور کر دیتا ہے" میں نے کہا۔

"اور باقی آدھا پاگل کر دیتا ہے" محسن بولا "مجھے تو اس کے سرجن ہونے پر بھی شک ہے۔ اسے سرکس میں جوکر کیوں نہ رکھ لیں۔ مذاق کا کام کرے گا۔ ہم ہڈیاں توڑتے رہتے ہیں اور جڑوا لیتے ہیں۔ نازو کی واپسی کے بعد غالب کو اس کی زیادہ ضرورت رہے گی۔"

"اگر آج بات کراچی کے ٹیلی فون نمبر سے رابطہ ہو گیا اور کل تک رابطہ بات ہو گئی تو نازو کی خیر خبر بھی مل جائے گی" میں نے کہا۔

"کیا تو زیب النساء کی عیادت کے لیے جانے کی بات سنجیدگی سے کر رہا تھا؟" محسن بولا۔

"ہاں مگر کیسے معلوم ہو گا کہ وہ کس اسپتال میں ہے" میں نے کہا۔

"نواب خسرو جمشید کی بہن ہے کسی سرکاری یا تیسرے درجے کے اسپتال میں نہیں ہو گی" محسن بولا۔ "لاہور کا سب سے بڑا اور مہنگا اسپتال کون سا ہے۔ اسے پہلے وہیں دیکھنا چاہیے۔"

www.paksociety.com

"اور وہاں اندر کیسے جائیں گے؟" میں نے کہا۔ "جیسے پہلے کئی بار دوسرے اسپتالوں میں جاتے رہے ہیں۔"

"ہاں اب تو ہر ممنوعہ جگہ تک پہنچنے کا خاصا تجربہ حاصل کر چکے ہیں۔ دیکھیں کس دن کام آئے گا۔" محسن نے کہا۔

محسن کا خیال کچھ دیر بعد درست ثابت ہوا لیکن ہم سراج اور جمشید کے مقابل ہونے سے بال بال بچ گئے۔ محسن نے ابھی مائکرو بس کو اسپتال کے احاطے میں موڑا ہی تھا کہ سامنے والے دوسرے گیٹ سے ایک کار گزر کے باہر گئی۔ ہم نے ان دونوں کی ایک جھلک دیکھی۔ کار کو سراج ڈرائیو کر رہا تھا۔ گیٹ سے سڑک پر آتے ہوئے اس کی تمام توجہ سامنے تھی ورنہ مائکرو بس کے ونڈ اسکرین سے ہم دونوں کی صورت اسے صاف نظر آتی۔ خسرو جمشید دوسری طرف تھا اور وہ بھی سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔

"چلیں یہ بھی خطرہ ٹل گیا۔" محسن نے کہا اور گاڑی کو ایک طرف پارک کر دیا جہاں دوسری بہت سی گاڑیاں صف بستہ تھیں۔ ملاقاتی اب اندر سے باہر آ رہے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے یا ختم ہونے ہی والا ہے۔

زیب النساء کا کمرا اسپیشل پرائیویٹ وارڈ میں گراؤنڈ فلور پر ہی تھا۔ ایک نرس نے ہمیں ریسیپشن پر ہی روک لیا۔

"دیکھیے سات بج گئے ہیں۔" وہ بولی۔ "ملاقات کا وقت پانچ سے سات بجے تک ہے۔ اب آپ کل آئیں۔"

"بس ہم دو منٹ بھی نہیں لیں گے۔" میں نے کہا۔

"سب یہی کہتے ہیں اور پھر اندر جا کے بیٹھ جاتے ہیں۔" وہ بولی۔ "ابھی بھی ڈاکٹر صاحب ہم پر خفا ہوتے ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ سات بج کر پانچ منٹ پر ہم باہر ہوں گے۔ ہم پشاور سے آئے ہیں اور ہمیں رات کو واپس بھی جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "کل ہمیں کوئی وقت نہیں ملے گا۔" میں نے سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"اچھا جائیے۔" نرس نے کاؤنٹر پر ہی نوٹ کو بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ میں منتقل کیا اور ہاتھ کو نیچے غائب کر دیا۔

سپیشل پرائیویٹ وارڈ میں صرف [illegible] کمرے تھے یعنی [illegible] کے دائیں جانب اور چار بائیں جانب۔ کمرہ نمبر تین دائیں ہاتھ پر پہلا کمرا تھا۔ بند دروازے کے پیچھے سے اب بھی باتیں کرنے والوں کی آوازیں [illegible] بظاہر کوئی تبدیلی کر وقتِ ملاقات کے معاملے میں بہت زیادہ سختی نہیں برتی جاتی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ناظران کے لیے یقیناً خصوصی رعایت کا درجہ رکھتی ہے جو اسپیشل پرائیویٹ وارڈ کے مریضوں سے ملنے آتے ہیں۔ تاہم کمرہ نمبر تین [illegible] خاموشی تھی۔ میں نے دروازے پر رک کر چند سیکنڈ انتظار کیا [illegible] ایک نمبر کمرے سے نکلنے والی فیملی کے چار افراد [illegible] ان کے چہرے دوسری طرف تھے۔ میں نے تھوڑا سا جھک کے دروازے کے سوراخ سے اندر جھانکا۔ زیب النساء کا بیڈ میری نظر کے فوکس میں آ گیا۔ وہ دروازے کے مقابل کھڑکی کے ساتھ [illegible] بیڈ پر نیم دراز تھی۔ کوئی شخص بیڈ کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ ایک دم پلٹ کے دروازے کی طرف آیا۔ میں نے محسن کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور دوسری طرف لپک کے چلنے لگا۔ ابھی ہم دو قدم بھی نہیں گئے تھے کہ ہم نے دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنی۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے میں نے مڑ کے دیکھا۔ وہ شخص واپس جا رہا تھا اور ہماری طرف اس کی پشت تھی۔ مجھے اس کی چال سے شک ہوا کہ اسے میں نے پہلے بھی دیکھا ہے مگر پھر وہ گیلری میں مڑ کے غائب ہو گیا۔ میں نے اس کے پیچھے جانے کا سوچا اور پھر کسی خطرے سے دوچار ہونے کو خلافِ مصلحت سمجھتے ہوئے اپنا ارادہ بدل دیا۔

واپس آ کے میں نے بہت آہستہ سے [illegible] کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھل گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ہم جیسے دو اجنبی افراد کو دیکھتے ہی وہ خوفزدہ ہو جائے گی تو چلانے لگے گی۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کی آواز دبا کر خاموش کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ لیکن اندر داخل ہوتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ محسن بھی میرے پیچھے اندر آ گیا تھا اور دروازے کو پھر بند کر چکا تھا مگر زیب النساء کا بیڈ خالی تھا۔ وہ کمرے میں نہیں تھی حالانکہ ابھی دو منٹ پہلے خود میں نے اسے اسی بیڈ پر دراز دیکھا تھا۔ وہ کھڑکی بھی اندر سے بند تھی جس پر [illegible] لگا ہوا تھا۔

ابھی مجھے محسن پر اپنی حیرت کے اظہار کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اگر محسن نے دروازے کو اندر سے لاک نہ کیا ہوتا تو دستک دینے والا سیدھا اندر آ جاتا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات آٹھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

پسندیدہ ناول، ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں
عمران ڈائجسٹ، بیوری
مجددیہ روڈ مسلم عید گاہ روڈ ڈیرہ

معاشرے کے اُن ناسوروں کی روداد جو گوشت پوست کے انسانوں کی ہڈیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے روز و شب موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن، سلگتی راتیں، آس و یاس، خوف، دہشت، سہمے ہوئے خواب، تلخ حقیقتیں۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟" میں نے زیرِ لب کہا مگر میری خاموشی کی زبان کے تاثرات سے محسن نے میرا سوال سمجھ لیا۔

اس نے فقط سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے جواب میں کہا تھا: "میں دیکھتا ہوں۔" اور اب وہ جیب میں سے ریوالور نکال چکا تھا۔ دستک پھر ہوئی تو محسن نے پلٹ کر میری طرف اور پھر باتھ روم کی طرف دیکھا۔

میں نے سر ہلا کے اس پر واضح کیا کہ میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا جو عجیب سی بات تھی۔ زیب النساء نے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل نہیں کیا تھا جو آدمی گھر میں اکیلا ہو اور جسے بالکل اندیشہ نہ ہو کہ کوئی سیدھا اندر آ سکتا ہے وہ بھی باتھ روم میں جاتا ہے تو عادتاً دروازہ بند کر لیتا ہے۔ زیب النساء تو ایک لڑکی تھی کنواری۔ ایک بات تھی جو اس کے باتھ روم میں ہونے کا یقین دلاتی تھی۔ وہ بھوت کی بچی یا چھوتی نہیں تھی کہ پل بھر میں غائب ہو جائے۔ شاید وہ باتھ روم میں سے کسی عجیب نظر دیکھنے جا رہی تھی یا یہ بھی اس کی کچھ غریب معصومیت کا کوئی سمجھ میں نہ آنے والا انداز تھا۔

میں باتھ روم میں ایسے داخل ہوا جیسے مجھے بذریعہ توپ فائر کیا گیا ہو۔ مجھے زیب النساء کی دلخراش "ہائے اللہ" سنائی دینے کا یقین تھا مگر اندر اس کے وجود کی خوشبو تک نہ تھی۔ بس چند سیکنڈ تک احمقوں کی طرح ریوالور تانے کھڑا رہا۔ پھر میں نے دروازہ کھٹکنے کی آواز سنی اور باتھ روم کے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ جسے توقع اندر آنے والا سیدھا گزر گیا تھا اور جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو محسن دروازہ بند کر چکا تھا۔

"کون ہو تم؟" وہ محسن کے ریوالور پر نظر جما کے بولا۔ "اور یہ سب کیا ڈراما ہے آخر؟" وہ ریوالور سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا تھا۔

"تم کون ہو؟" محسن نے تھوڑا سا کنفیوز ہو کے کہا۔

"میں... میں ڈاکٹر ہوں۔" قمیص پتلون میں ملبوس ادھیڑ عمر کے اس سنجیدہ صورت اور صحت مند شخص نے کہا۔ "تم نواب صاحب کے آدمی ہو؟"

"یس سر۔" محسن نے اپنی خفت مٹانے کے لیے دانت نکال کے کہا اور ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ "معاف کرنا... ہم نئے آدمی ہیں۔"

"نئے ہو یا پرانے..." ڈاکٹر نے برہم ہو کے کہا۔ "کس کی اجازت سے گھسے ہوئے ہو تم یہاں؟"

"ہم تو نواب صاحب کے حکم کے غلام ہیں۔" محسن نے کہا۔

"مگر میں نے اس... نواب کو بتا دیا تھا کہ یہ اسپتال ہے۔"

ڈاکٹر غصے میں خسرو جمشید کو گالی دیتے دیتے رک گیا تھا۔ "پچھلے دن بھی میں نے اُسے انکار کر دیا تھا کہ زیب النساء اسپتال میں بالکل محفوظ ہے اور اس کی حفاظت ہماری ذمے داری ہے... اگر وہ مطمئن نہیں ہو سکتا تو اپنی بہن کو کہیں اور لے جائے۔ شہر میں بہت اسپتال ہیں۔ وی آئی پی وارڈ کی طرف ہم کسی غیر متعلقہ شخص کو نہیں آنے دیتے۔ مگر یہاں وی آئی پی وارڈ نہیں ہے جہاں ہماری سیکیورٹی کا خصوصی انتظام ہو۔ کوئی ذاتی باڈی گارڈ متعین کر سکے یا سرکاری حفاظتی عملہ رکھ سکے۔" آہستہ آہستہ اس کی آواز تیز ہو گئی اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "ناؤ گیٹ آؤٹ... اس سے پہلے کہ میں تم کو پولیس کے حوالے کروں... جا کے پوچھو اس نواب آف نواسیٹ سے کہ [illegible]"

محسن مجرموں کی طرح سر جھکائے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس نے میرے نقطہ نظر سے بہت سمجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ ہم میں سے ایک بہ تیز عافیت باہر نکل جائے۔ وہ سر میں تھا اور اپنی پارٹی آنے پر بصورت حال سے نمٹ سکتا تھا۔ بے سبب ہنگامہ آرائی ہمارا مقصد بھی نہیں تھا۔

"مس زیب النساء..." ڈاکٹر نے دروازہ بند کرنے کے بعد باتھ روم کی طرف رخ کر کے آواز دی۔ "پلیز کم آؤٹ ناؤ۔" جواب نہ پا کے وہ چند قدم آگے آیا۔ "مس زیبا۔" اس نے پھر کہا۔ زیب النساء کی بجائے میں نمودار ہوا تو وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس نے مجھ پر ایک قہر و غضب کی نگاہ ڈالی۔ "ہو دی ہیل آر یو؟ تم بھی اسی کے ساتھی ہو؟ اندر کیا کر رہے تھے... زیب النساء...؟"

"ڈاکٹر... وہ اندر نہیں ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"کیا؟ اندر نہیں ہے!" وہ بے یقینی کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس نے کھلے دروازے سے باتھ روم میں ایک نظر ڈالی اور پھر مشتعل ہو کے پلٹا۔

"ویئر از شی؟ (وہ کہاں ہے)"

"دیٹ از واٹ آئی ایم ٹرائنگ ٹو آسک یو اباؤٹ۔" میں نے اسی اطمینان کے ساتھ کہا۔ "میں بھی یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

ڈاکٹر چند سیکنڈ ساکت و صامت کھڑا رہا اور مجھے گھورتا رہا۔ وہ شاید کچھ نہ سمجھا تھا اور نہ کوئی فیصلہ کر سکا تھا کہ ان حالات میں اسے کیا کرنا چاہیے۔

"آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "جب ہم یہاں آئے تھے تب بھی وہ کمرے میں نہیں تھی۔"

"ان دیٹ کیس۔" ڈاکٹر دروازے کی طرف بڑھا۔ "مجھے فوراً پولیس کو خبر کر دینی چاہیے... اور اس کے بھائی کو بھی۔ آئی تھنک آئی ایم ان ٹربل۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے اس کے سامنے آ کے کہا۔ "ابھی ٹھہرو۔"

"تم مجھے اولاً فرض سے روک رہے ہو۔" ڈاکٹر نے اپنی متانت برقرار رکھی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔

"نو سر... میں آپ کو بھی ٹربل سے بچانا چاہتا ہوں اور خود بھی کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتا۔" میں نے خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پولیس آ کر بھی [illegible]... پولیس کا خیال چھوڑ دیجئے۔"

"کیا مطلب... تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"نہیں... لیکن جاننا ضرور چاہتا ہوں..." میں نے کہا۔ "[illegible] اسے اغوا کیا ہے اور اغوا ہوتے دیکھا ہے۔ [illegible]... میرے ساتھ آنے سے چند منٹ پہلے تک وہ کمرے میں موجود تھی، میں نے خود دیکھا تھا مگر باہر وہ گئے۔ اس فلور کے [illegible] میں سے... اس وقت وہ ایسے آدمی اندر تھے جن کی موجودگی میں ہم اندر نہیں جا سکتے تھے... اور چلے جاتے تو ہمیں شاید وہ سب کرنا پڑتا جو اسپتالوں میں نہیں ہوتا... ہونا بھی نہیں چاہیے۔"

"اوہ مائی گاڈ..." ڈاکٹر نے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "مجھے اسی وقت خیال آیا تھا کہ میں انکار کر دوں... جب اس باسٹرڈ نواب نے کہا تھا کہ یہاں میرے محافظ رہیں گے۔ مشکل یہ ہے کہ اس پیشے میں ہم انکار کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔" وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور اس نے مجھے بھی اشارہ کیا کہ دوسرے صوفے پر بیٹھ جاؤں۔

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ کیا ہے؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"زیب النساء کے کیس کے بارے میں؟"

"اوہ نو... وہ میں جانتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن وہ کون لوگ تھے؟"

"یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ انسان کے بھیس میں درندے تھے..." میں نے کہا۔ "سفاک بھیڑیے تھے۔"

"یہ جذباتی ڈائیلاگ میرے سامنے مت بولو۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہمارے لیے یہ ویسا ہی ایک کیس ہے جیسے ہزاروں دوسرے کیس... سیکس ابنارملٹی اور حیوانی جبلت کے بے لگام ہونے کا۔ ہر آدمی کے اندر ایک حیوان ہے مگر فرق صرف اس کنٹرول کا ہے جو ہم اس حیوان پر رکھتے ہیں۔ جیسے گھر کا پالتو کتا... وہ بے ضرر ہو گا اگر مالک کے اشارے پر چلے ورنہ کسی کو بھی کاٹ لے گا۔"

"رائٹ۔" میں نے کہا۔ "وہ کتنے کتے تھے؟"

"کم سے کم دو..." ڈاکٹر نے کہا۔ "تم نے کہا کہ انھیں کوئی نہیں جانتا... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" میں نے کہا۔ "ضروری تو نہیں کہ کسی گھر کا پالتو ہی کاٹے... گلی کوچوں میں بھٹکنے والے ہزاروں آوارہ اور بے نشان کتے بھی تو ہیں۔"

"یو مین... وہ دشمن نہیں تھے؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"کس کے دشمن؟" میں نے کہا۔

"اس نواب آف نواسیٹ کے... یا اس لڑکی کے؟"

"انھوں نے جو کچھ کیا دشمنی میں یا انتقام لینے کے لیے نہیں کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"پھر وہ آج فکر مند کیوں تھا... اپنے دشمنوں کے بارے میں؟" ڈاکٹر نے تفتیش میں سر ہلایا۔ "تم کوئی سہی... نواب کو یقیناً معلوم ہے کہ وہ کون تھے۔ وہ ان کا نام نہیں لے رہا ہے تو اس کے بھی اسباب ہوں گے۔ وہ اپنی عزت محفوظ رکھنا چاہتا ہے... ہر شریف آدمی کی طرح... یہ بات میں محسوس کر رہا ہوں ورنہ میرا خیال ہے کہ نواب [illegible]... بس وہ پولیس کے چکر میں نہیں پڑے گا... خود بدلہ لے گا... اور غالباً اسے ابھی ان دشمنوں سے مزید خطرہ تھا... کہ وہ اس سے زیادہ کچھ کر سکتے ہیں چنانچہ وہ اپنی گارڈز رکھنا چاہتا تھا۔"

"آپ کے اندازے درست ہی ہیں... نواب شریف آدمی نہیں ہے اور اس کے دشمن بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر یہاں گارڈز رکھنے کے اسباب مختلف تھے... میں نہیں بتا سکتا کہ وہ ایسا کیوں کرنا چاہتا تھا۔"

"او کے تم کچھ مت بتاؤ... یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیا کر رہے تھے اور زیب النساء کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے الجھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ زیب النساء فرار ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"شٹ اپ... تم نے اسے اغوا کر لیا ہو گا... یا کسی اور نے... [illegible]" ڈاکٹر نے کہا۔ "میرا کام تو ویسے بھی ختم ہو گیا تھا۔"

"مطلب یہ کہ وہ ٹھیک تھی... خطرے سے باہر ہے؟"

"یس... وہ خطرے کے اندر کبھی نہیں تھی... ایک نروس بریک ڈاؤن کا کیس تھا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "جسمانی طور پہ... وہ بہرحال ایک جوان عورت تھی۔ مگر تم نے کیا اسے فرار ہوتے دیکھا تھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اور کیا ہو سکتا تھا اتنے کم وقت میں۔ جب ہم اندر آئے تو میرا بھی خیال یہی تھا کہ وہ باتھ روم میں [illegible] کھڑکی کا راستہ دیکھئے... کیا یہ ناممکن لگتا ہے آپ کو کہ کوئی بھی مریض بھاگ جائے؟"

"پاگل ہو تو اور بات ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن وہ پاگل نہیں تھی۔ اور ویسے بھی وی آئی پی وارڈ پاگل خانہ نہیں ہوتا... آج تک جنرل وارڈ سے بھی کوئی مریض فرار نہیں ہوا... وہ کیوں فرار ہو گا؟"

"واجبات ادا کرنے کے لیے۔"

"وہ یہاں نہیں آئے تھے۔" ڈاکٹر نے حقارت سے کہا۔ "ناؤ لیٹ می گو... اور یہ مت سمجھنا کہ میں ڈر گیا تھا... تمھارے اس توپ خانے سے..."

"میں آپ کو خالی ہاتھوں سے بھی روک سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"معلوم ہے... کیسے معلوم ہے!" میں نے حیرت سے کہا۔

"میں بہت کچھ جانتا ہوں تمھارے متعلق... بہت کچھ پڑھتا رہتا ہوں کیونکہ میں اخبار کا کیڑا ہوں۔" وہ بولا۔ "تم سکندر بخت ہو نا۔ اور وہ دوسرا ایڈیٹ... وہ تمھارا پارٹنر تھا... محسن... تم دونوں کا کیا تعلق ہے اس لڑکی کے معاملے سے؟"

"کوئی تعلق نہیں۔" میں نے اس وقت کہا جب مجھے یقین آ گیا کہ وہ نیک دل ڈاکٹر ہمارے عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہو گا۔ وہ ہمارے ساتھ اگر نہیں تھا تو اس کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ تھیں۔ مگر وہ ہمارے دشمنوں کے ساتھ بالکل نہیں تھا۔

"تم کو یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ کوئی [illegible] ہمیں ایک ساتھ دیکھے... مجھے بہرحال یہیں رہنا ہے۔"

"تھینک یو..." میں نے ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "یہ بہت اچھا ہوا کہ ہم نے ایک دوسرے کا راستہ نہ روکا، مگر دوستوں کی طرح... مجھے امید ہے کہ اس ملاقات کی خبر ہمارے دشمنوں کو نہیں ہو گی۔"

"اگر دشمنوں سے تمھاری مراد ہے... دیٹ نواب آف نواسیٹ..." ڈاکٹر نے کہا۔ "تو مطمئن رہو... مجھے کمرے میں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ زیب النساء کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئی... جو معلوم کر سکتا ہے کرے۔ میں اسے روکوں گا نہیں مگر پولیس اس اسپتال کے اندر اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال نہیں کر سکتی... گڈ لک ٹو یو۔"

جب [illegible] نکل گیا تو میں نے دوڑ لگا دی اور کھلی کھڑکی [illegible] بھی نکلی ہو گی۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے بھی سمجھا تھا کہ وہ باتھ روم میں ہو گی۔ کھڑکی سے

www.paksociety.com

نکل کے وہ کہاں گئی ہوگی۔ یہ خیال مجھے بھی کھڑکی سے گزر جانے کے بعد آیا۔ میرے سامنے ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ اس کے بعد اسپتال کی دیوار تھی لیکن بائیں جانب اسپتال کی باؤنڈری تھی اور پھر کچھ سرونٹ کوارٹرز تھے جن میں نچلے درجے کے ملازم رہ سکتے تھے۔ زیب النساء کا اسپتال کی دیوار پر چڑھ کے سڑک کی طرف کود جانا محال تھا۔ وہ انہی کوارٹروں کی طرف جا سکتی تھی۔

وقت ملتا تو میں بھی اُدھر ہی جاتا اور شاید اُسے تلاش بھی کر پاتا مگر مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر نے خسرو جمشید کو اور پولیس کو ضرور اطلاع کر دی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بہت جلد سراج اپنی تمام پولیس فورس کے ساتھ اسپتال پر چڑھائی کرنے والا تھا۔ ابھی تک اس ڈاکٹر کو یہ علم نہیں تھا کہ نواب آف نوا اسٹیٹ کی بھتیجی جس کی منگیتر ہے وہ ایس ایس پی ہے۔ ڈاکٹر تو اپنی پوزیشن محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے گا۔ مگر دوسرے عملے کی یقیناً شامت آ جائے گی کہ انہی کی غفلت سے کسی کو اندر داخل ہونے کا اور زیب النساء کو اغوا کر کے لے جانے کا موقع فراہم کیا۔ یہ خسرو جمشید بھی نہیں مانے گا اور سراج بھی کہ وہ بقائمی ہوش و حواس اور اپنی مرضی سے فرار ہوگئی۔ وہ اسپتال کا چپہ چپہ چھان ماریں گے اور سرونٹ کوارٹروں کو کھنگال ڈالیں گے۔ زیب النساء اگر اسپتال سے نہیں نکل سکی ہوگی تو برآمد ہو جائے گی۔

لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایک اطمینان حاصل تھا کہ زیب النساء نکل چکی ہوگی۔ وہ اتنی ہوشیار لڑکی تھی کہ اس نے پورا پلان پہلے ہی بنا لیا ہوگا۔ وہ جب تک بے ہوش تھی یا بے ہوشی کا ڈراما کر رہی تھی تب تک اس کو حالات کا جائزہ لینے اور اپنی پوزیشن کو سمجھنے کی کافی مہلت مل چکی تھی۔ میں اس لڑکی کی معصوم عیاری سے مار کھا چکا تھا چنانچہ مطمئن تھا کہ زندگی میں ایک بار اعتماد کے فریب کا شکار ہونے والی زیب النساء دوسری بار زک نہیں اٹھائے گی۔

میں باہر آیا تو محسن خان کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں دس پندرہ منٹ بعد باہر آیا تھا اور سیدھے راستے سے نہیں آیا تھا۔ محسن پر واجب تھا کہ مجھے چشم براہ ملتا جبکہ یہاں زیادہ دیر رک کر اس کی راہ دیکھنا پولیس کی راہ دیکھنے کے مترادف تھا۔ چند منٹ اِدھر اُدھر نظر دوڑانے کے بعد میں نے واپسی کا وہی راستہ پکڑا جس سے ہم دونوں اسپتال پہنچے تھے۔ ابھی میں سو قدم ہی گیا تھا کہ محسن خان گاڑی دوڑاتے ہوئے پیچھے سے آ گئے۔

"چلو... میں آپ کو لفٹ دے سکتا ہوں۔" اس نے قریب آ کے دروازہ کھولا۔ "بے شک پیدل چلنا صحت کے لیے اچھا رہتا ہے مگر آپ یہ بھی تو جانتے ہوں گے کہ پیدل چلنے والے کی عزت کوئی نہیں۔ عزت اور صحت میں سے کیا بہتر ہے؟"

"دولت۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ اس سے باقی دونوں چیزیں خود بخود حاصل ہو جاتی ہیں۔" اور دروازہ بند کر لیا۔ "تو نے کہیں اس آفت کی پرکالہ عرف شیطان کی خالہ کو دیکھا؟"

"زیب النساء کو؟" محسن نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔ "وہ خالہ ہے تیری؟"

"مذاق کی بات نہیں یار۔" میں نے کہا۔ "وہ نکل گئی۔"

"کیا... وہ باتھ روم میں نہیں تھی؟" محسن بولا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ تو اُسے قابو کر چکا..."

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ فرار ہو گئی۔ اور بعد میں میری اس ڈاکٹر سے جو گفتگو ہوئی... وہ بے حد بوکھلا گیا... وہ دوست ثابت ہوا۔"

"تو نے ڈرا دیا تھا مجھے۔" محسن بولا۔ "میں سمجھا تو اس کو اٹھا لایا۔"

"نہیں یار... ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس نے ہم دونوں کو پہچان لیا تھا اور میں نے اُسے یقین دلا دیا کہ ہم نہ زیب النساء کو اغوا کرنے والوں میں سے ہیں اور نہ اس سے کوئی غلط تعلق رکھتے ہیں۔ تو اس نے کہا کہ بھاگ جاؤ۔ اب تک وہ پولیس کو اور نواب صاحب کو اطلاع دے چکا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"سوال یہ ہے دوست کہ زیب النساء کیوں فرار ہوئی... کیا وہ ہوش میں نہیں تھی؟"

"وہ ہوش مندوں کے ہوش اڑانے کے قابل تھی۔ ذہنی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی۔" میں نے کہا۔

"پھر وہ کیوں فرار ہوئی؟"

"میں یہ نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے بھائی یا منگیتر سے متعلق ہماری فراہم کردہ معلومات کے باعث کسی نفرت کے ردِعمل کا شکار ہوئی۔" میں نے کہا۔ "وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے محسن... اس کی قوتِ مشاہدہ غیر معمولی ہے۔ ہر مصور کو حساس وہ نظر دیتا ہے جو انسانی آنکھ، کیمرے اور کیمرے سے بڑھ کر چیزوں کی حقیقت کو دیکھتی ہے۔ ظاہر کا پردہ ہٹا کے باطن میں جھانکتی ہے اور جذبات کو پڑھ لیتی ہے۔ اپنے بھائی کے بارے میں وہ بہت کچھ پہلے سے جانتی تھی۔ اس کی نجی زندگی کا کوئی پہلو اس کی نظر سے اوجھل نہیں ہوگا۔ ہماری معلومات نے اس کے علم میں صرف اتنا اضافہ کیا کہ اسے بھائی کے کاروبار کا بھی پتا چل گیا۔ ایسے بدکردار، عیاش اور مکار بھائی کی بہن نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا مگر نظرانداز کیا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں تصویریں بناتی رہی۔ جب اس کے بھائی نے رشتہ طے کیا ہوگا تو کیا زیب النساء کو معلوم نہ ہوگا کہ جسے اس کی تمام زندگی کا مالک بنایا جا رہا ہے وہ کون ہے اور کس قماش کا آدمی ہو سکتا ہے۔ چلو مانا کہ وہ سراج

سے ناواقف تھی مگر وہ اتنا تو سمجھتی ہوگی کہ اس کے بھائی کی صحبت کس قسم کے لوگوں میں ہے۔ اُسے یہ ضرور بتایا گیا ہوگا کہ وہ ایک ایس پی ہے۔ کیا زیب النساء نے مان لیا ہوگا کہ وہ ایس پی کوئی فرشتہ سیرت شخص ہوگا۔ کیا زیب النساء جیسی لڑکی کا آئیڈیل ایک پولیس مین ہو سکتا ہے؟ نہیں... اس کے ذہن میں کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ... روشن خیال... باضمیر شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور ہوگا۔ وہ شخص شاعر یا افسانہ نگار... مصور یا موسیقار ہو یا نہ ہو... وہ کوئی پروفیسر یا وکیل بھی ہو سکتا تھا مگر پولیس کے محکمے کا افسر نہیں ہو سکتا تھا۔"

"آپ کیا ثابت کرنے بیٹھے ہوئے ہیں؟" محسن بولا۔

"یہی کہ زیب النساء وقت گزار رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس نے اپنی اور سراج کی نسبت پر اختلاف اور احتجاج کو بے سود سمجھا ہوگا کیونکہ وہ ایک کمزور اور تنہا عورت تھی۔ اندر سے جذبات کا آتش فشاں ہوگا اور باہر سے بالکل سرد... اس کے ذہن میں پہلے سے طے تھا کہ اُسے کیا کرنا ہوگا اور اگر وقت ناگزیر حد تک قریب آ جاتا تو وہ ایسا ہی کرتی... جیسا کہ اس نے آج کیا... وہ گھر سے بھی نکل جاتی..."

"ابھی آپ نے فرمایا ہے کہ وہ اکیلی کمزور عورت تھی۔"

"ہاں... اس کا ثبوت دو جیالے مرد دے چکے ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "مجھے یہ بات ڈاکٹر نے بتائی ہے۔ مگر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بالکل تنہا نہ ہو... اسے کسی کا تعاون مل چکا ہو۔ کوئی پہلے سے اس کے دل میں اپنی محبت کی جوت جگا چکا ہو۔"

"کون ہوگا وہ خوش نصیب؟" محسن بولا۔

"وہی جس کے پاس زیب النساء اب گئی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "یہ تو میں مان ہی نہیں سکتا کہ اس لڑکی کے چاہنے والے کم تھے۔ اس شمع کے پروانے تو بہت ہوں گے۔ مگر وہ جس نے اسے بھی موم کر دیا کوئی ایک ہوگا۔"

"بات سمجھ میں آتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا بھیا کہ آپ سے بھی وہ لگتے ہی وہ ختم فسانہ ہو گیا۔"

"ہاں... مجھے افسوس ہے کہ بانے اور اس کے درمیان ڈونمنٹ کا وقفہ شاید ایک طبی اور کبھی ختم نہ ہونے والی دوری بن گیا ہے۔ وہ مل جاتی تو اس سے پوچھتے... پھر اس کی بھی سنتے۔" میں نے کہا۔ "وہ لڑکی اپنے ڈھب کی تھی۔ اگرچہ اس نے جاتے جاتے زبردست فریب کیا مگر ہم اس کے ساتھ کوئی سی شرافت برتنے جیسے تھے۔ میں اس کی ذہانت اور جرأت کا معترف اور قائل ہوں۔ اس نے واقعی کمال کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اس کے ساتھ ظلم ہوا۔ مجھے اس ظلم کا بھی افسوس ہمیشہ رہے گا کہ کسی حد تک میں خود کو اس میں شامل سمجھتا ہوں۔ نہ ہم اسے یوں لاتے نہ وہ یوں فرار ہوتی... اور نہ وہ سب ہوتا جو ہوا۔ وہ ایک خوب صورت جسم کے اندر ایک خوب صورتی کی خلاق روح کا آزار بھی رکھتی تھی اور ایک جمالیاتی ذوق کی مالک تھی... مگر دیکھنے والوں نے اسے صرف عورت سمجھا... کاش مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ کون تھے تو میں خود انھیں آدابِ مردانگی سکھاؤں..."

"آہ... یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا؟" محسن بولا۔ "تم کو جن سے وفا کی تھی امید... وہ نہیں جانتے وفا کیا ہے۔ رابعہ قاری کے دل پر کیا گزرے گی؟ آج رات میں تیرے خیالات کا متن اُسے سناؤں گا... اور بتاؤں گا کہ محسن جیسے سکندرِ اعظم نے وکیل کی جگہ مصور کو ترجیح دی ہے۔ تو کہاں جائے گی بیچاری ٹھکانا کر لے۔"

"زیب النساء کہاں جائے گی؟" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "میاں محسن خان شیروانی! آپ کی عبرت آموز شرارت میں دخل اندازی پر معافی چاہتا ہوں لیکن ابھی ابھی میرے قابلِ رشک دماغ میں ایک قابلِ غور خیال آیا ہے۔"

"ہاں... اب تو سارے خیال زیب النساء کے ہوں گے۔ آہ رابعہ...!"

"اگر وہ اسپتال سے نکلنے میں کامیاب رہی ہے۔" میں نے محسن کی بکواس کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "تو میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ کہاں پہنچی ہوگی... یا پہنچے گی۔ اگر اسے کسی کی رفاقت قبول کرتے ہوئے اپنی زندگی کے سفر کا آغاز اپنی مرضی سے کرنا ہوتا تو اسے محض اسپتال سے فرار ہونا ضروری نہیں تھا... نہیں محسن... وہ جتنی آزاد تھی اس پر کبھی پہرے نہیں تھے۔ اس کی گاڑی الگ تھی اور شوفر الگ تھا۔ اسے کسی کے ساتھ جانا ہوتا تو پہلے ہی چلی جاتی... یا اسپتال سے لوٹ کر جاتی تو اطمینان سے پورا انتظام کر کے قدم گھر سے نکالتی۔ اسے کون روکتا... یہاں سے وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر اچانک فرار ہوئی ہے تو اس کے اسباب مختلف ہوں گے۔"

"یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "ممکن ہے اس کے سرپرستِ اعلیٰ نواب خسرو جمشید نے فوری طور پر اس کو سراج کے عقد میں دینے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ ہماری دراندازی کے بعد کہیں وہ حقیقت پسند نہ ہو جائے اور رشتے سے انکار نہ کر دے... باغی نہ ہو جائے۔"

"مگر زیب النساء کی حالت ابھی ایسی نہیں تھی کہ وہ ایسا فیصلہ کرتے تو اسے اسپتال میں ہی بتاتے۔" میں نے کہا۔ "یہ کام وہ زیب النساء کو بتائے بغیر گھر جا کے زیادہ آسانی سے کر سکتے تھے۔ زیب النساء کا ذہن ایک صدمے سے متاثر تھا اور ماہرِ علمِ نفسیات کہتا ہے کہ اسی صدمے کے جذباتی ردِعمل نے زیب النساء کو خود

بگڑ ... نہیں کر سکے تھے... یا نہیں کر سکتے تھے۔"

"تیرا مطلب ہے ... اپنا انتقام خود لینے کے لیے نکل گئی؟" محسن نے کہا اور سیٹی بجائی۔

میں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ مارا۔ "شاباش... بالکل صحیح پوچھا۔"

گاڑی تھوڑا سا لہرائی۔ پیچھے آنے والے ایک شخص نے اپنی کار کو بچایا اور آگے نکلتے ہوئے بہت غصے میں کچھ کہہ گیا۔

"پھر... اب کیا کریں... اُدھر چلیں؟" محسن نے اپنے کندھے کو اوپر نیچے ہلاتے کہا۔

"پہلے غالب کو لے لیں۔" میں نے ... "افسوس کہ خیال دیر سے آیا ورنہ اِدھر نہ آتے۔ معلوم نہیں ہمارے پہنچنے تک کیا ہو جائے۔"

غالب کا پلاسٹر کاٹنے والا ڈاکٹر جو کہ اب مریضوں سے فارغ ہو چکا تھا۔ وہ اور غالب آمنے سامنے بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ان کے درمیان زبردست بیت بازی کا مقابلہ چل رہا تھا۔ غالب دیکھنے میں بالکل ٹھیک نظر آتا تھا۔

"بس میاں، تم نے بچا لیا اپنے دوست کو... ورنہ ہو گیا تھا۔" ڈاکٹر نے چائے پہ سوال کیا۔ "ایسا شعر دیا تھا کہ جواب نہیں تھا۔"

"وہ شعر نہیں تھا۔" غالب نے احتجاج کیا۔

"وہ شعر تھا... ردیف، قافیہ اور بحر کے معیار پہ جس سے چاہو فیصلہ کرا لو... ضروری تو نہیں کہ شعر غالب یا میر کا ہو... وہ میرا شعر تھا۔" ڈاکٹر نے فخر سے کہا۔

"ایسے شعر میں ایک سو ایک کہہ سکتا ہوں... فی البدیہہ..."

"پہلے جوابی شعر کہو... پھر باقی شعر کہتے رہنا..." ڈاکٹر زور سے ہنسا۔ "اور ہار نہیں مانتے تو پھر کبھی آ کے سنا جانا۔"

"شعر کیا تھا آخر؟" میں نے غالب کی لٹکی ہوئی صورت دیکھ کر کہا۔

"شعر تھا جناب کہ... میں نے سنایا جب انھیں اپنا پورا کلام یوں لگے کہ گویا ادب کو بھی کر آتا ہے سیو نارتھ؟"

"واہ... گویا مرزا کو اب ڈر سے شروع ہوتے ... الا شعر سنانا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ نے تو شاعری کی ٹانگ توڑ دی۔ شاعر کا کیا حال ہے؟"

"تمھارا شاعر جوڑ دیا۔" ڈاکٹر ہنسا۔ "مگر دونوں ٹانگوں کا فوراً استعمال نہیں کرنا... اس حد تک تو ٹھیک ہے کہ تھوڑا سا چل پھر لیں... مگر ریس کورس میں گھوڑے کے سامنے یا مجرموں کے تعاقب میں دوڑنے کی کوشش ابھی نہ کریں... کم از کم ایک ہفتہ۔"

"تو اب اجازت؟" میں نے کہا۔ "کیا فیس ہوئی آپ کی؟"

"فیس و میاں نذرانہ یا ہدیہ کہتے۔" ڈاکٹر ہنسا۔ "تم سے مل کر لطف آیا... ہم پر تو لازم تھا کہ تمھیں کچھ دیتے... مگر جناب ایک تو اپنی خدمات پیش کر سکتے ہیں۔ اور نصیحت دے سکتے ہیں کہ ایسے سرپھرے شوقین مزاج ... یہ گھڑ بہت لوگ دیکھ چکے ہیں۔ آئندہ کبھی ہڈی پسلی توڑ لے... اور امید ہے کہ جس قسم کے شوق ہیں تمھارے اس میں یہ سب ہوتا ہی رہے گا۔ تو دوبارہ آنے سے پہلے مجھے فون کر لینا میاں سکندر اعظم... میں خود بلاؤں گا موقع محل دیکھ کے... وہ سوال کے لیے اُستاد کہے جو تو اپنی حفاظت کے لیے بھی کچھ کیا کرو... جاؤ فی امان اللہ تمھیں کامیاب کرے۔"

واپسی پہ میں، محسن اور غالب دم بخود بیٹھے رہے۔ غلطی ہم سے خود ہوئی تھی مگر خوبیٔ تقدیر کہ ہمیں پہچاننے والے بھی ہم خیال تھے۔ ورنہ ہم نے تو اپنی طرف سے خود حفاظتی کے سارے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ یہ ایک خوشگوار اتفاق تھا کہ دو مختلف معاملات پہ ملنے والے دو ڈاکٹروں نے ہمیں پہچان لیا تھا۔ یہ اتفاق خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا۔ اس میں کچھ شاید خوبیٔ تقدیر بھی تھا لیکن یہ بھی سمجھا جا سکتا تھا کہ لوگوں میں عام طور پہ جانے جتنا زیادہ تھے اور تعلیم یافتہ افراد جو ملک کے اندر کی ساری صورتِ حالات کا صحیح تجزیہ کرنے کی بہتر صلاحیت رکھتے تھے، بطور خاص ہمارے مشن سے ذہنی طور پہ ہم آہنگی رکھتے تھے۔ وہ سب اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ عملاً ہمارے لیے کچھ کر سکتے مگر ان کا ہمارے خلاف کچھ نہ کرنا بالواسطہ ہماری حوصلہ افزائی کرنا، ہمیں صداقت کی راہ پہ تسلیم کرنا اور ہمارے لیے نیک جذبات کا اظہار کرنا بھی بہت تھا۔

تاہم اس سے تصویر کا دوسرا پہلو بھی سامنے آیا تھا کہ ہم کتنی آسانی سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ راہ چلتے لوگوں کی بھیڑ میں یا سڑکوں بازاروں کی ریل پیل میں کوئی بھی کسی چہرے کو غور سے نہیں دیکھتا لیکن روبرو ہم اپنی شناخت کو چھپانے میں ناکام بھی رہتے ہیں۔ لوگوں میں سب تو محسن، میں اور غالب کے طرفدار نہیں ہوتے۔

"ہم تم لوگ کس سمت میں رواں ہو؟" غالب نے کہا۔

"ہم زیب النساء سے ملنے گئے تھے۔" محسن بولا۔

"اور اب پھر اس سے ملنے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"پہیلیوں میں باتیں مت کرو۔" مرزا غالب نے کہا۔ "میں بہت اچھے موڈ میں ہوں۔ مقام شکر ہے کہ میں پھر دو ٹانگوں پہ چلنے والے حیوانِ ناطق کی نسل میں شامل ہوا۔"

"جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں تمھاری ٹانگ پھر ٹوٹ سکتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "میرے واقف... سکندر کی ناک، تمھاری ٹانگ..."

"پھر مجھے یہیں اتار دو... کم سے کم میں ایک رات تو صحیح سالم گزار لوں... ورنہ آئندہ کے لیے تو ڈاکٹر سلامت کے دروازے کھلے ہی ہیں۔"

"کون ڈاکٹر سلامت؟"

"یہی... جس نے میری ٹانگ جوڑی مگر شاعری کی ٹانگ توڑی اور مجھے بیت بازی میں شکست دی۔" غالب نے افسوسناک لہجے میں کہا۔ "کیا یہ وہی جگہ نہیں آگئی جہاں سے ہم ایسے نکلے تھے کہ خدا دشمن کو نہ نکالے۔"

"ہاں مرزا... زیب النساء اسپتال سے فرار ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "اور میری چھٹی حس کہتی ہے کہ وہ اپنا انتقام خود لینے آئی ہوگی۔"

"تمھاری ساتویں حس کچھ نہیں فرماتی ہے؟" غالب نے بے بسی سے کہا۔ "مارا گیا میں جو بے حس ہوں... تم دونوں کی یہی مصیبت ہے کہ ایک عقل کی بات کرتا ہے تو دوسرا بھی کرتا ہے مگر ایک جھک مارتا ہے تو دوسرا بھی جھک مارتا ہے۔ دونوں ایک ساتھ گھاس کھا گئے ہو... کیا ضرورت ہے اس سے ملنے کی؟ اور جب وہ اسپتال میں نہیں ملی تو...؟"

"تو شاید یہاں مل جائے۔" میں نے کہا۔

"عجیب شاید ہے... ایسے تو شاید وہ یادگارِ پاکستان پہ مل جائے۔ شاید شاہی قلعے کے تہ خانے میں مل جائے... شاید تمھیں اپنے ہی گھر میں مل جائے۔"

"انتقام لینے والی تھیوری قابلِ غور ہے۔"

"دوستو... وہ لڑکی ان لوگوں کی اور اس گھر کی نشاندہی کر سکتی تو سرِ فتح کو بتا دیتی۔ وہ انھیں ترپ دم کرا دیتا... یا اپنے خیالی کو بتاتی اور ان کا کریا کرم ہو جاتا... اسے تو معلوم ہی نہیں کہ وہ کہاں تھی اور وہ جگہ کہاں تھی۔" غالب نے کہا۔

"وہ انجان بنے رہنے کی اور اپنے خیالات پہ ایسا ہی لاعلمی کا پردہ ڈالنے کی ماہر ہے۔" میں نے کہا۔ "خسرو جمشید نے اور سراج نے معاملے کو دبا دیا ہے لیکن زیب النساء نے انھیں بھی کچھ نہیں بتایا تو یہ اس کی چال ہو سکتی ہے یا اس کی انا کی شکست تھی۔ اسے کمزور لڑکی سمجھ کے کچھ جسمانی طور پہ زیادہ طاقتور مردوں نے اس کا استحصال کیا تو وہ ایک وقت کی بات تھی۔ دوسرے وقت کا ادراک اس بات کا ہوگا کہ جسمانی طاقت کو ایک کمزور نظر آنے والی لڑکی کیسے زیادہ عبرتناک شکست دے سکتی ہے۔"

"تم اتنے یقین کے ساتھ یہ بات کر رہے ہو۔" غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔ "جیسے ماہر نفسیات ہو۔ زیب النساء کی نفسیات میں بھی پی ایچ ڈی کر چکے ہو۔ ایک بار مجھے کتے نے کاٹ لیا تھا۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے کہا کہ کیا وہ کتا پاگل تھا۔ میں نے کہا یہ تو میں نے نہیں دیکھا۔ وہ بولا کہ جاؤ دیکھ کے آؤ... میں دیکھنے گیا تو اس نے مجھے پھر کاٹ لیا۔ دوسری ٹانگ پہ... کیا زیب النساء کو یہ خیال نہیں آیا ہوگا کہ وہ کتے پھر کاٹ لیں گے۔ وہ خالی ہاتھ جائے گی وہاں؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ خالی ہاتھ ہوتی تو ایسا نہ سوچتی۔ اس کے پاس ریوالور ہے یا کوئی ایسی ہی چیز... جو اسے اپنی حفاظت کرنے کے لیے دی گئی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "اسپتال میں بھی وہ زیب النساء کی حفاظت کے لیے خصوصی انتظام کرنے پہ مُصر تھے مگر ڈاکٹروں نے اجازت نہیں دی تھی۔"

"آخر کس کا ڈر تھا انھیں؟" غالب بولا۔ "کیا وہ سمجھتے تھے کہ مجرم اسپتال پہنچ سکتے ہیں؟ مجرم تو چھپتے پھر رہے ہوں گے..."

"یار مرزا! حفاظتی انتظامات زیب النساء کو ہم سے محفوظ رکھنے کے لیے تھے۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "کہ کہیں ہم اسے دوبارہ نہ لے جائیں۔ انھیں یہ فکر بھی ہوگی کہ اخباری نمائندے زیب النساء تک نہ پہنچ جائیں۔ وہ کھوج کرتی باتیں پکڑنے والے لوگ ہوتے ہیں۔"

"کیا تمھیں معلوم ہے... کوئی اندازہ ہے کہ وہ اس علاقے میں کہاں ہوگی؟ جس رات وہ غائب ہوئی تھی تو کوئی سراغ نہیں چھوڑ کے گئی تھی۔" غالب نے کہا۔ "کسی کو پتا نہیں چلا تھا۔"

"لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ اتنے کم وقت میں وہ آس پاس کے ہی کسی گھر میں داخل ہو سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

ڈرائیونگ محسن کر رہا تھا اور ہم اس گھر کے آگے پیچھے کی گلیوں سے آہستہ آہستہ گزر رہے تھے جہاں سے ہم جان بچا کے بڑی مشکل سے فرار ہوئے تھے اور اگر ایک دستی بم پھینک کے ہم نے پولیس کی پیش قدمی موخر نہ کی ہوتی تو شاید نکل بھی نہ پاتے۔ یہاں ہم کیتھرین کی لاش بھی چھوڑ گئے تھے اور پولیس نے یقیناً ارد گرد کے سب لوگوں سے جاننے کی معلومات حاصل کی ہوں گی۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں تھی۔ اب بھی اس گھر پہ پولیس کی نظر ہو سکتی تھی جہاں خطرناک مجرم چھپے رہے تھے۔ وہ مجرم جو شہر کی مشہور سیاسی و سماجی شخصیت اور صنعت کار چوہدری دلاور کی ساتھی اور کوتوال شہر کی سالی کو زبردستی اغوا کر لائے تھے۔ چنانچہ ہم خطرے کی جگہ سے دور دور گزر رہے تھے۔

ٹھیک اسی وقت جب ہم اپنی چھٹی اور ساتویں حس کی غلط راہ نمائی پہ شرمسار تھے اور مرزا غالب ہماری نامعقولیت کا تمسخر اڑا کے ہماری شرمندگی میں اضافہ فرما رہے تھے، ایک غیر معمولی بات ہوئی۔ میری نظر نے ایک کوٹھی میں کچھ ہلچل دیکھی۔ وہ بڑے سے رقبے پہ سرکاری جنگلہ تھا جس کے آس پاس اجاڑ باغ اور خستہ گھاس، ویران تھا۔ ایک شخص تیز تیز قدموں سے باہر آ رہا تھا۔ محسن نے میرے کہنے پہ جیپ کو روک لیا۔

"کیا بات ہے بھائی صاحب؟" میں نے کہا۔

"وہ جی... قتل ہوگیا... ڈبل قتل۔" وہ جیسے یہ سنسنی خیز اطلاع دیتے ہوئے سخت بدحواس تھا۔ "میں جا رہا ہوں پولیس کو فون کرنے۔"

"کیا فون نہیں ہے اس گھر میں...؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہے... بلکہ تھا... مگر قاتل نے تار کاٹ دیے باہر سے۔" وہ بولا۔

"اچھا... تو قاتل فرار ہوگیا؟... یا ہوگئے؟" محسن بولا۔

"پتہ نہیں ہوگیا یا ہوگئے۔" وہ بولا۔ "ہوگئی... ایک عورت نے دو لوگ مار دیے... اللہ توبہ... دونوں کے سر میں اور دل میں تین تین گولیاں ماریں... میں تو مارا گیا۔"

"آئیں ہمارے ساتھ۔" میں نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ "ہمارے گھر سے فون کرلیں... اور پریشان نہ ہوں... ہم آپ کی مدد کریں گے۔"

"آپ... قریب ہی رہتے ہیں؟" وہ بولا اور میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ محسن نے گاڑی پھر اسٹارٹ کردی۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کیا کسی نے دیکھا تھا اس لڑکی کو؟"

"اب کیا بتاؤں آپ کو جناب۔" وہ فریاد کے انداز میں بولا۔ "جھوٹ بولوں تو مشکل... سچ بولوں تو بڑی مشکل... میں نے ہی دیکھا تھا اسے... میں بھی یہیں رہتا ہوں۔"

"اچھا... تو مقتول تمہارے کیا تھے؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں جی... بنگلہ ایک سرکاری افسر کو ملا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "اس کے سرونٹ کوارٹر کو میں نے کرائے پر لے لیا تھا۔ میں اسٹوڈنٹ ہوں... ہوسٹل میں جگہ نہیں ملی تھی اور مکان بہت مہنگے ہیں۔ کرائے پر کمرا ملتا بھی نہیں کسی چھڑے چھانٹ کو۔ کسی کی سفارش سے یہ کوارٹر مل گیا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں گے۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی تو میں نے یہیں بستر لاکے ڈالا تھا۔"

"تو تم نے اس لڑکی کو دیکھا تھا؟" میں نے کہا۔

وہ چونکا۔ "ہاں جی... بڑی مصیبت میں پھنس گیا میں تو... میں نے آتے دیکھا ضرور تھا۔ ایک رات وہ بڑی پریشانی میں فون کرنے آئی تھی۔ وہ باہر سے آئی تو میں باہر جا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ گھر میں کوئی ہے۔ مجھے فون کرنا ہے... میں نے اشارے سے اندر بھیج دیا کہ حشمت صاحب ہیں۔ آجکل ان کی فیملی نہیں ہے۔ لائل پور گئے ہوئے ہیں سب کسی شادی میں۔ اور حشمت صاحب کے ساتھ کوئی دوست تھا ان کا... قسم

سے لیں جو میں نے اس لڑکی کو پہلے کبھی دیکھا ہو۔ مجھے تو حشمت بیگ کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم سوائے اس کے کہ... وہ ایکسائز میں تھا... اور یہ کہ..."

"کہ وہ ایک بدکردار آدمی تھا؟"

"بدکردار کا تو مجھے پتا نہیں۔ رشوت خوب لیتا تھا اور عیاشی کرتا تھا۔ وہ اور اس کا دوست شراب پی رہے تھے... یہ بھی مجھے پتا ہے۔" وہ بولا۔

"اور یہ کردار کیا ہوتا ہے؟... خیر... پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا جی... میں باہر چلا گیا تھا۔" وہ بولا۔ "آج میں اپنے کوارٹر میں پڑھ رہا تھا کہ میں نے حشمت کے چلانے کی آواز سنی۔ پھر فائر ہوئے تو میں اُٹھ کے دوڑا۔ میں اندر گیا تو حشمت صاحب اور ان کا دوست دونوں مر چکے تھے۔ ان کے جسم سے نکلنے والا خون سامنے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔ ایک میز اُلٹی پڑی تھی اور ساتھ ہی شراب کی بوتل گلاس وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ میں اتنا بدحواس ہوا کہ اُلٹے پاؤں بھاگا۔ اور اسی وقت اچانک میری نظر کھڑکی سے باہر گئی تو میں نے بس ایک جھلک دیکھی اس کی۔ اسی لڑکی کی جو فون کرنے آئی تھی۔ وہ پیچھے دیوار پھلانگ رہی تھی... میں نے پھر دور سے بھی پہچان لیا اور صورت سے بھی۔"

"اور پھر بھی تم نے اُسے پکڑا نہیں؟" میں نے کہا۔

"میں... کیسے پکڑتا... وہ مجھے بھی قتل کر دیتی... جب آدمی پر خون سوار ہو تو اس سے ڈرنا چاہیے۔ اس کے لیے دو قتل اور دس قتل برابر ہو جاتے ہیں۔" وہ بولا۔ "وہ کوٹھی سے سیدھی باہر نکل گئی۔"

"پیدل تھی وہ؟"

"نہیں جی... باہر کوئی ٹیکسی تھی یا کار... مگر یہ آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟" وہ ایک دم گھبرا کے بولا۔ "ہم تو بہت دُور آگئے۔ تھانہ تو..."

"دیکھو مسٹر..." میں نے اس کی گردن پکڑ لی۔ "تم کو کسی کے گھر جا کے فون کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی جان بچاؤ... سمجھے۔"

"ورنہ پولیس یہ سب کچھ سنے گی تو تمھیں پھانسی لگا دے گی... وہ لڑکی تو ان کے ہاتھ آنے کی نہیں... وہ تم کو ہی اس کا ساتھی ثابت کریں گے اور تم سے اقرار بھی کرالیں گے۔ قتل کے وقت تم ہی یہاں موجود تھے۔ یا وہ کسی لڑکی کے آنے جانے کی بات کو تمہارا جھوٹ قرار دیں گے اور قتل کی واردات کو تم سے منسوب کر دیں گے۔ اس کے لیے تمہارے قبضے سے آلۂ قتل برآمد کرنے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہر تھانے میں ریوالور اسی لیے رکھے جاتے ہیں کہ ضرورت پڑنے پر مشکل کیس کو آسان بنانے میں کام آئیں۔ یہ تم کو آسانی سے قاتل ثابت کیا جا سکتا ہے۔" محسن نے گاڑی روک کر کہا۔

"پھر... پھر میں کیا کروں جی...؟" وہ لڑکا رونے پر آگیا۔ "مجھے تو سب نے مجبور کیا کہ تم ہی اطلاع دو پولیس کو..."

"سب کون؟"

"آس پاس رہنے والے گھروں کے نوکر آگئے تھے۔" وہ بولا۔

"صاحب لوگ نہیں آئے تھے؟" میں نے طنز سے کہا۔

"نہیں جی... انھوں نے نوکروں کو معلوم کرنے کے لیے بھیج دیا تھا کہ یہ فائرنگ کی آوازیں کیسی تھیں۔" وہ بولا۔ "ایک اور سرونٹ کوارٹر میں رہنے والے دو کلرک آگئے تھے... وہ خود کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے۔ چکر میں صرف تم پڑ گئے ہو... کل کو پولیس انھی لوگوں میں سے گواہ حاصل کرے گی... زبردستی کرکے اور دھمکی دے کر وہ کسی کو بھی گواہ بنا لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور یہ لوگ بیان دے دیں گے کہ انھوں نے تم کو آلۂ قتل کے ساتھ گولیاں چلاتے دیکھا تھا۔ یہ چشم دید گواہ تو بیان دے کر الگ ہو جائیں گے مگر تم پہنچ جاؤ گے پھانسی کے تختے پر... میرا تو خیال ہے کہ تم بھی گول ہو جاؤ۔"

"گول ہو جاؤں؟ کیسے... جی...؟"

"کیا یہ سب لوگ تم کو جانتے ہیں؟" محسن نے کہا۔

"نہیں جی... ابھی ہفتہ ہی تو ہوا تھا مجھے یہاں آئے۔"

"اور کوئی جانتا ہے کہ تم یہاں رہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"پتا نہیں جی... مشکل ہی ہے... مجھے یہاں بھیجنے والا بھی تو دبئی گیا۔" وہ بولا۔ "یہاں آنے سے پہلے میں بھی لائل پور میں تھا۔ وہاں سے میں نے ٹرانسفر لیا ہے... کیا میں واپس چلا جاؤں؟"

"اگر جا سکتے ہو تو تمھارے حق میں یہی بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم خاموشی سے کسی کو بتائے بغیر اس سرونٹ کوارٹر سے اپنا بستر اٹھا کے نکل سکتے ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں پچھلی طرف سے جاؤں تو کوئی نہیں دیکھے گا۔"

"تو جاؤ... ابھی پولیس نہیں آئی ہے اور تمہارے لیے موقع ہے۔" میں نے کہا۔ "کوئی اور پولیس کو اطلاع نہیں دے گا کیونکہ اس کام کے لیے تم کو بھیجا گیا تھا۔ وقت سے فائدہ اٹھاؤ اور بھاگ جاؤ اپنے گھر۔"

"لیکن... میری تعلیم...؟"

"بے وقوف... تعلیم تو بعد میں بھی جاری رکھی جا سکتی ہے۔ یہاں رہے تو سمجھو کہ اس دہرے قتل کا الزام تمہارے سر منڈھ دیا جائے گا۔ غریب کی کوئی نہیں سنتا۔ انصاف کا عمل بہت مہنگا اور بہت مشکل ہے۔ اپنے گھر جاکے ماں باپ کو سب بتا دینا اور ایک ہفتے کی بات ہی تو ہے۔ اُن سے کہنا کہ تمہاری موجودگی کے گواہ بنا لیں۔ یہ مشہور کردیں کہ تم دو ہفتے نہیں... کہیں اور گئے تھے۔ مثلاً کسی چاچے مامے کے گھر۔"

"منٹگمری میں میرا بڑا بھائی ہے..."

"ویری گڈ... اسی کے پاس تھے تم... وہ مل کر تم کو بچا سکتے ہیں۔ سچ بول کے تم نہیں بچ سکتے... اس لیے یہ جھوٹ جائز ہے۔ تم قسم کھالو یا حلف اٹھالو تب بھی جائز ہے کیونکہ تم جانتے ہو کہ قتل تم نے کیا ہی نہیں اور اس کا یقین دلانا بے حد ضروری ہے کہ تم جائے واردات سے بہت دُور تھے۔" میں نے کہا۔

"اچھا جی... تو آپ پھر مجھے واپس وہیں لے چلیں۔ پیچھے والی سڑک سے۔" وہ بولا۔ "میں دس منٹ میں چپکے سے بستر اٹھا لوں گا۔"

"بستر چھوڑ دینا... بستر اور کپڑے کتابیں وغیرہ اٹھا لانا۔" محسن نے گاڑی کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ پانچ منٹ بعد ہم نے اُسے جائے واردات سے پچاس قدم کے فاصلے پر دوسری طرف اُتار دیا۔

"خدا حافظ... ہم یہاں کھڑے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم تمھیں بس کے اڈے تک پہنچا دیں گے۔"

"مہربانی جناب... مگر ایک بات پوچھوں۔ آپ نے تو کہا تھا کہ آپ لوگ پڑوس میں رہتے ہیں۔" وہ بولا۔

"ہم نے جھوٹ بولا تھا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیوں جی... اور میری مدد کیوں کر رہے ہیں آپ؟"

"اس لیے کہ ہم نے اس لڑکی کی مدد بھی کی تھی۔" میں نے کہا۔ "ہم ہی اُسے لائے تھے اور ہم ہی واپس لے گئے تھے۔"

"وہ ہماری بہن تھی۔" محسن نے کہا۔ "سگی بہن نہیں تھی، ایک رشتے سے... اور اسے حشمت سے اپنا بدلہ لینا تھا۔ چونکہ تم نے اُسے دیکھ لیا تھا اس لیے ہم خواہ مخواہ نہیں رہنے دے سکتے تھے۔ تمہارے بچنے اور خود کو بچانے کی ایک ہی صورت ہے کہ خاموشی سے چلے جاؤ... ورنہ تم دونوں طرف سے مارے جاؤ گے۔"

"اگر پولیس نے تمھیں مجرم قرار دے دیا... تو ہم تمھیں زبان کھولنے سے پہلے مار دیں گے۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو ہم تمہاری مدد کر رہے ہیں... چلو اترو۔"

وہ ایسے اترا جیسے مجرم عدالت کے کٹہرے سے موت کی سزا سن کے اترتا ہے۔ میں اس کے ساتھ ہی اترا۔ زیب النساء کی مدد کے لیے یہ سب کچھ ناگزیر ہوگیا تھا۔ ہمارے درمیان اس معاملے میں مکمل اتفاق رائے تھا کہ جو کچھ ہوا تھا انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق تھا اور زیب النساء نے ان مجرموں کو وہ سزا دی تھی جس کے وہ مستحق تھے مگر جو انھیں قانون نہیں

www.paksociety.com

جا سکتا تھا۔ زیب النساء کسی ٹیکسی یا پرائیویٹ کار میں آئی تھی۔ یہ بات قدرے ناقابلِ فہم تھی اور میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ نوجوان نے بدحواسی میں کسی گزرنے والی گاڑی کے بارے میں فرض کر لیا کہ وہ زیب النساء کو لے کر نکل جانے والی گاڑی تھی۔ اس کے مشاہدے میں فرق کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا تھا کہ اس نے ہماری بات مان لی تھی کہ ہم ہی زیب النساء کو لے گئے تھے۔ ورنہ ایک ٹیکسی یا کار اور ایمبولینس میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایمبولینس اگر اندھیرے میں نظر نہ آئے تب بھی اس کی ہیڈ لائٹس نسبتاً زیادہ بلندی پر ہوتی ہیں اور پھر سب سے بڑا فرق تو گونج کی آواز کا ہے۔ کار یا ٹیکسی خاموشی سے گزر جاتی ہے جب کہ ڈاکس ویگن کی ایمبولینس اپنی مخصوص آواز سے پہچانی جاتی ہے لیکن قتل کے فوراً بعد اس نوجوان کو اپنا ہوش نہیں تھا وہ صرف اتنا ہی دیکھ سکا تھا کہ وہ لڑکی باہر گئی اور باہر سے ایک گاڑی گزری۔ نتیجتاً اس کے ذہن نے اخذ کر لیا کہ لڑکی اسی گاڑی میں فرار ہو گئی۔

ہم دونوں ایک کوٹھی کی دیوار کے ساتھ چھپ گئے۔ اس کوٹھی میں اندھیرا تھا اور باہر کوئی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ سب ایک جیسے سرکاری بنگلے تھے جو نام کے بڑے افسروں کو الاٹ کر دیے گئے تھے چنانچہ بے بسی کا شکار رہتے تھے۔ ان کی تلاشی کرنی ہوتی تو وہ اس کی دیکھ بھال بھی کرتے۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں مختصر ہونے تک ہی یہاں رہنا ہے۔ پھر کوئی اور آ جائے گا۔ اس سرکاری مکان خانے میں ذاتی دلچسپی لینے کی کیا ضرورت ہے۔

دیوار کے ختم ہوتے ہی ہمارے سامنے دوسری دیوار آ گئی۔ اس کے اوپر سے پھلانگ کر ہم پھر اسی بنگلے کے عقبی حصے میں جا اترے جہاں دو مجرم لاشیں اجنبی لوگوں میں تصویرِ عبرت بنی پڑی ہوئی تھیں۔ ہم بالکل خاموشی سے کھسکتے ہوئے سرونٹ کوارٹر میں داخل ہوئے۔ نوجوان کی ساری کائنات چند بوسیدہ برتنوں، دو چیتھڑوں، بستر اور چند کتابوں پر مشتمل تھی۔ باقی سب کچھ اس نے الماری میں اٹھایا اور ایک ٹین کے صندوق میں بھر دیا۔ میں نے اس کا لپٹا ہوا بستر اٹھایا اور ہم جس راستے سے آئے تھے اسی راستے واپس لوٹ گئے۔

میری طرح محسن [illegible] راستے میں بھی یہ سوال اٹھا کہ زیب النساء نے آخر جانا کہاں ہو گی۔ کیا وہ واپس اسپتال پہنچی ہے یا ایسا تو نہیں کہ اس نے اپنا پروگرام بدلنے کے ساتھ مل کر بنایا ہو بھائی کے اتفاق کیا ہو کہ مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی خواہش کا احترام کرنا بالکل جائز ہے اور ویسے تو یہ کام ایک غیرت مند بھائی کو کرنا چاہیے مگر بہن کے جذبات کی تسکین بھی موت کے قاتلوں کو خود قتل کرنے سے ہوتی ہو تو اس میں بھی کوئی ہرج نہیں۔ زیب النساء پر کوئی الزام نہیں آ سکتا تھا۔ وہ اسپتال میں موجود تھی اور اگر ہم اسے بروقت اس کے کمرے میں نہ پہنچا سکتے تو اس کی عدم موجودگی ثابت بھی نہ ہوتی۔

یہ ایک منطقی جواز تھا۔ میں اسی خیال میں تھا جب محسن نے ایمبولینس کی ڈرائیونگ سنبھالی تو میں اپنا پہلا خیال بدلنے لگا تھا کہ اس نوجوان نے پریشانی میں غلط دیکھا تھا۔ ممکن ہے وہ خسرو جمشید ہی کی گاڑی ہو جو باہر زیب النساء کو واپس لے جانے کے لیے منتظر ہو اور اس سے پہلے کہ کسی کو خبر ہو، زیب النساء واپس اسپتال میں اپنے بیڈ پر پہنچ گئی ہو گی۔ اس حقیقت سے بے خبر کہ اس کا راز ہم پر فاش ہو چکا ہے اور ہماری وجہ سے ایک ڈاکٹر کو بھی بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے جو اسے پہلے معلوم نہیں تھا۔

”کیا آپ مجھے لاری اڈے پر چھوڑ دو گے؟“ نوجوان نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا... آپ کے بارے میں...“

”ہم تم کو اتنی دور نہیں لے جا سکتے۔“ میں نے کہا۔ ”جہاں بھی کوئی تانگہ نظر آیا ہم تمہیں اس میں سوار کرا دیں گے... اور یہ لو...“ میں نے جیب میں سے ایک ہزار روپے نکالے۔ ”یہ تمہارا سفر خرچ۔ تم اس وقت تک محفوظ ہو جب تک تمہاری زبان بند ہے... ہماری بہن کے بارے میں تم نے کچھ بھی کہا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا... پھر تمہاری خیر نہیں... ہم تمہارے گھر بھی آ جائیں گے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تمہارا نام فیصل حیات ہے اور تم ہیلی کالج آف کامرس کے اسٹوڈنٹ ہو۔“

وہ بری طرح کانپنے لگا۔ ”خدا کے لیے جناب... میں بے قصور ہوں... میرا باپ بہت ضعیف ہے اور میری ماں بیمار ہے... آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا... آپ کی بڑی مہربانی۔“

”تم بس اتنا کہنا کہ جس گھر میں تم تھے وہاں قتل ہو گیا تھا۔ کب، اور کیسے اور کیوں، یہ تم کو نہیں معلوم... تم تو اپنی جان بچا کے بھاگ آئے۔ تمہاری زبان سے اتنا ہی بیان کافی ہے اور تم کو اس پر قائم رہنا ہے۔“ میں نے کہا۔

اس نے خدا اور رسول کی قسم کھا کے کہا کہ اس کی زبان سے اس کے علاوہ کچھ نہیں نکلے گا۔ جب ہم نے اسے ایک تانگے میں بٹھا دیا اور تانگہ چل پڑا تو میں نے دیکھا کہ اس کی صورت پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔ ابھی تک اسے ہماری بات پر پورا اعتبار نہیں تھا۔ اس کے دل میں ایک اندیشہ ضرور تھا کہ کہیں ہم اس کا قصہ ہی پاک نہ کر دیں مگر ہم نے اسے بچا لیا تھا تو اسے کم از کم یقین آ چکا تھا کہ ہم اس کے مددگار ثابت ہوئے ورنہ [illegible]

[illegible] گھنٹے میں ہی بیاسی ہو جاتی۔ وہ روانہ ہوتے وقت [illegible] رونے کے انداز میں ہاتھ ملا کے مسکرایا اور ہم نے جواباً [illegible] دوستانہ [illegible] پیار سے الوداع کہا۔

”دیکھا آپ نے... مرزا غالب کے گھوڑے۔“ میں نے سوچتے سوچتے ہی چلا کے کہا۔

”غالب کے گھوڑے کی دُم کے بال۔“ محسن نے ہوا میں مکا چھوڑا۔

”ہماری تیزی اور مسافروں کی جس کے خلاف آخر زبان سنبھل کے [illegible]“ میں نے کہا۔ ”تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ہم اس کی ٹانگ توڑ دیتے۔“

”توڑ دو... توڑ دو... تمہیں میری ساعت؟ ٹانگیں گھڑی کس رہی ہے۔“ غالب خود کو بچاتے ہوئے بولا۔ ”ایسے تو کسی کچھ موسم کا حال بھی درست ہو جاتا ہے۔ جس کی پیش گوئی محکمہ موسمیات والے کرتے ہیں۔“

”کیا خیال ہے اب؟“ محسن بولا۔ ”واپس چلیں؟“

”واپس کہاں...؟“ میں نے کہا۔ ”اسپتال... یا گھر...؟“

”ہم نے پہلی ہی منصوبے اور غالب نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ زیب النساء کو نواب خسرو جمشید یہاں تک لائے۔ زیب النساء نے خود اپنے مجرموں کو خود سزا دی۔ پھر وہ آ کے واپس لے گئے۔“ محسن بولا۔

”یہی بات میری عقل میں بھی آتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”مگر اسپتال سے تو پولیس کو بھی مطلع کر دیا گیا ہو گا۔“ محسن بولا۔ ”اور اگر زیب النساء کے واپس پہنچنے سے پہلے پولیس پہنچ گئی؟“

”تو کیا ہوا... پولیس واپس چلی جائے گی... پولیس بھی تو آ چکی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر خاموش رہنے پر مجبور ہو جائے گا۔ ہماری وجہ سے۔“

”ہماری وجہ سے کیوں؟“

”یعنی اب یا تو وہ کہے کہ زیب النساء کمرے میں نہیں تھی اور اس کے دو گواہ بھی ہیں۔ محسن اور سکندر۔“ میں نے کہا۔ ”یا فرض کر لیا جائے کہ ڈاکٹر کو غلط فہمی ہو گئی تھی۔ زیب النساء تو باتھ روم میں تھی۔ ہم سمجھے کہ آپ آئے کہیں سے... لیکن یہ بچی اپنی جگہ ہی ہے...“

”اگر وہ پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی کمرے میں پہنچا دی گئی تو سب ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر کیا اسپتال کا سارا عملہ گواہ کہ وہ کہیں بھی نہیں گئی۔ یہ تحقیق پانچ فیصد سے بھی کم خطرات کے خلاف حفاظتی انتظام ہے۔ ورنہ اپنے نواب صاحب بچی گولیاں نہیں کھیلتے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ سراغ کے ساتھ ہی واپس گئے تھے۔ ان کے گواہ ایس ایس پی صاحب ہوں گے کہ نواب خسرو جمشید تمام وقت ان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ لگو حقیقت یہ ہو گی کہ نواب صاحب باہر نکلتے ہی اتر گئے ہوں گے۔ اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ان کے جاتے ہی زیب النساء بھی نکل گئی۔ وہ اسپتال کے اندر ہی کھڑی ہوئی نواب خسرو جمشید کی کار میں بیٹھی اور کار چلاتی ہوئی گئی تو گیٹ پر بھی اسے کسی نے نہیں روکا۔ باہر کہیں اس نے نواب صاحب کو پک کر لیا۔ نواب صاحب آ کے وہاں تک لے گئے جہاں زیب النساء کو جانا تھا اور کم سے کم وقت میں واپس پہنچا کے رخصت ہو جاتے لیکن اب شاید انہیں حالات کو سنبھالنے کے لیے رکنا پڑا ہو گا۔“

”جیسے زیب النساء کے اس دوسرے قتل کی واردات میں ملوث ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اور کیا اس بات کا ایک فیصد بھی امکان نہیں کہ تمہارا سارا مفروضہ ہی غلط ہو؟“ غالب نے کہا۔ ”وہ اکیلی آئی ہو قتل کرنے... اس نے کسی کو نہ بتایا ہو۔“

”تب بھی وہ واپس تو جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”اور ممکن ہے کہ تھوڑی بہت خرابی ہو... مگر سنبھالنے والے بڑے بڑے معاملات کو سنبھال لیں گے۔“

”[illegible] کو آدمی کیا... فون کرو اور اسپتال سے معلوم کر لو۔“ غالب نے کہا۔

”یہاں سے تو نہیں... لیکن گھر کے قریب سے کوشش کریں گے۔“ میں نے کہا۔ ”ٹیلی فون لائن قریب سے ہی گزر رہی ہے۔“

”اسے گھر کہتے ہو... اس سرکس کو...؟“

”مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اور خانہ بدوشی کی زندگی میں گھر ایسا ہی ہونا چاہیے کہ جہاں گئے ساتھ لے گئے۔ سہولت کے لیے ہر چیز پورٹیبل بنائی جا رہی ہے۔ یورپ اور امریکا میں بہت سے لوگ تو مستقلاً ایسے چلتے پھرتے گھروں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔“

میں نے محسن اور غالب کو ٹریلر کے قریب اتار دیا۔ رات کے گیارہ بجے بھی سامنے والے ہوٹل میں رونق تھی اور [illegible] بیگم کے گانے اونچی آواز میں بج رہے تھے۔ چار پائیوں پر ڈرائیور اور کلینر حضرات چادر تانے سو رہے تھے یا چائے پی رہے تھے اور گپ شپ میں مصروف تھے۔ ان کے ٹرک دور تک ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ [illegible] سے لے کر دور تک وہ مال لادے [illegible] شہروں تک پہنچا رہے تھے اور چوکیدار ان کے قیام و طعام کے لیے ایسے ہی اڈے قائم تھے۔ موٹر مکینک اس وقت دن کے [illegible]

www.paksociety.com

میں زیادہ مصروف نظر آ رہا تھا۔

ہماری طرف سب ٹھیک تھا۔ ڈرائیور شیر علی لوٹ آیا تھا اور ٹریلر سے کچھ فاصلے پر چارپائی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اُسے محسن سے باتیں کرتا چھوڑا اور خود آگے نکل گیا۔ تقریباً دو میل دور جانے کے بعد مجھے ٹیلیفون کا پول ملا جہاں سے میں کنکشن لا سکتا تھا۔ اسپتال کا نمبر مجھے معلوم نہیں تھا۔ یہ نمبر مجھے ایکسچینج نے دیا۔

"یس سر۔" ایک خوش گوار آواز اور خوش اخلاق آپریٹر نے کہا۔

"میں مس زیب النساء سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"آپ کا نام سر؟" آپریٹر نے تھوڑے سے توقف کے بعد کہا۔

"حشمت بیگ... ایکس اے ایس پی۔" میں نے کہا۔

"ہولڈ آن پلیز۔" آپریٹر بولا اور میں ریسیور کان سے لگائے پیچھے سے چپکا رہا۔

"ہیلو...!" بالآخر زیب النساء کی حیرت زدہ اور سہمی ہوئی آواز آئی۔ "کون ہیں آپ؟"

"میں حشمت بیگ ہوں بی بی۔" میں نے کہا۔ "اتنی جلدی آپ کو میرا نام تو نہیں بھول سکتا۔"

"دیکھیے... ہم آپ کو نہیں جانتے۔" وہ بولی۔ "ہو سکتا ہے کہ میں یاد نہ آ رہا ہوں۔"

"افسوس کہ مجھے اس وقت غالب کا بھی کوئی شعر یاد نہیں آ رہا ہے کچھ اس قسم کا... کہ وہ خود اپنے کشتۂ جفا سے پوچھتے ہیں کہ یہ کیسے مر گیا اور اسے کس نے مارا...!"

"ہم آپ کا مطلب بالکل نہیں سمجھے... آپ بھی مہذب اور معقول آدمی لگتے ہیں... کیا آپ کو یہ زیب دیتا ہے کہ اسپتال کے مریضوں کو فون کر کے بے سبب پریشان کریں۔" وہ بولی۔

"دیکھو، فون مت بند کرنا۔" میں نے کہا۔ "زیب النساء کیا تمھارے بھائی نواب خسرو جمشید کہیں آس پاس موجود ہیں؟"

"خسرو جمشید... ہم یہ نام دوسری بار سن رہے ہیں۔" وہ بولی۔ "بے شک وہ ہمارے بھائی ہیں۔"

"لیکن ان کا نام مرشد رضا خان ہے۔" میں نے کہا۔ "چلیے یوں ہی سہی..."

"آپ... ان کے کوئی شناسا ہیں...؟" وہ کنفیوز ہو کے بولی۔ اس کی حیرانی کا یہ اعتماد انداز مجھے حیران کرنے لگا مگر میں اس کے تجزیے میں آنے والا نہیں تھا۔

"زیب النساء... میں وہ شخص ہوں جس نے تمھیں سمجھ لیا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھاری یہ پُر فریب معصومیت تمھارے جرم کو دنیا سے چھپا سکتی ہے لیکن مجھ سے نہیں۔ ایک چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے سب کچھ ویسے ہی دیکھا تھا... جیسے تمھاری آنکھوں نے...

میں وہیں تھا... جب تم نے ان دونوں کو جہنم رسید کیا۔"

"اللہ... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں... کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"میں تمھیں مبارک باد دینا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "ڈرنے کی تو کوئی بات ہی نہیں... میں سمجھتا ہوں تم نے بہت اچھا کیا... وہ اسی سزا کے مستحق تھے۔ ہم خود بلاواسطہ اور براہِ راست انصاف کے اصول پر یقین رکھتے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ تم بخیر و عافیت واپس پہنچ گئیں۔"

"آپ... آپ وہی تو نہیں ہیں... جو ہمیں زبردستی لے گئے تھے..."

"بالکل صحیح پہچانا تم نے۔" میں نے کہا۔ "ہم ابھی لیے اسپتال آ سکتے تھے کہ اگر تمھاری مدد کر سکتے ہوں تو ضرور کریں..."

"آپ کو شرم آنی چاہیے جھوٹ بولتے ہوئے... آپ ہمیں پکڑے جانے کے ڈر سے آئے ہوں گے... لیکن ہم آپ کو بتا دیتے ہیں کہ ہمارے تکیے کے نیچے ایک پستول ہے اور ہمیں اجازت ہے کہ ہم کسی بھی اندر آنے والے کو گولی مار دیں... جسے ہم نہ پہچانتے ہوں..." وہ خفگی سے بولی۔ "اس دن بھی آپ نے ہمارے ساتھ... اور سب کے ساتھ انتہائی غیر شریفانہ سلوک کیا۔"

"اس دن کی بات چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ آج تو تمھیں کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا...؟"

"کہاں آتے جاتے؟" وہ بولی۔ "آج شام تو ہم..."

"مجھے معلوم تھا کہ تم یہی کہو گی... کہ تم تو کمرے سے نکلی ہی نہیں۔"

"تو کیا ہم غلط کہہ رہے ہیں... ہم جھوٹ نہیں بولتے... ہم باہر بالکل نہیں گئے اپنے کمرے سے..." وہ بولی۔ "اور گئے تو آپ کو کیا... ہم قیدی تو نہیں ہیں۔"

"زیب النساء... جب تم کمرے میں نہیں تھیں تو ہم آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد ہم نے یہ بھی دیکھا تھا کہ تم کہاں گئی تھیں۔ تم نے حشمت بیگ اور اس کے دوست کو شوٹ کیا۔ اس کا ایک چشم دید گواہ بھی ہے..."

"آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟ ہمیں بلیک میل کرنا..." وہ بولی۔ "جب ہم نے بتا دیا کہ کسی حشمت بیگ کا نام ہم نے آج تک نہیں سُنا تو آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں... ہمیں کوئی ضرورت تو نہیں ہے ثبوت پیش کرنے کی... لیکن آپ چاہیں تو اسپتال آ جائیں... تصدیق کر لیں کہ ہم چار دن سے اور کہیں جا ہی نہیں سکتے۔"

"آخر کیا ہماری مدد مطلوب تھی آپ کو...؟" میں نے طنز سے کہا۔

"خواتین سے اس قسم کے سوالات نہیں کرتے جناب۔" وہ بولی۔ "اور ہم اتنی دیر آپ سے ہرگز بات نہ کرتے... لیکن ہمیں آپ سے کچھ پوچھنا تھا کہ کیا وہ سب سچ تھا جو آپ لوگوں نے بتایا تھا۔"

"وہ سب اتنا ہی سچ تھا جتنا اس کے بعد کا سچ جس کی گواہ صرف تم ہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "ایک اس رات کا سچ جب تم ہمیں چکما دے کر نکل گئی تھیں اور ایک آج رات کا سچ جب تم اسپتال والوں کو بھی... قانون کے محافظوں کو بھی چکما دے کر نکلی تھیں اور میں حیران ہوں کہ تم دو قتل کرنے کے بعد بھی اتنی معصوم اداکاری کر سکتی ہو..."

"اللہ...! ہمارا دماغ خراب ہو جائے گا۔" وہ بولی۔ "آپ تو ہمیں بس اتنا بتا دیں کہ وہ کیسی ہیں... جن کو آپ اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے؟"

"عائشہ کے اور سراج کی ماں کے بارے میں پوچھ رہی ہو؟" میں نے کہا۔ "ان میں سے ایک معصوم لڑکی ہوس پر قربان ہو گئی۔ سراج کی ماں کو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے... وہ صرف ایک ضمانت کے طور پر ہمارے ساتھ ہے مگر زیب النساء... تم اتنی سمجھدار اور ذہین لڑکی ہو... تم جانتے بوجھتے خود پر یہ ظلم کر رہی ہو۔"

"کیسا ظلم...؟ ہم سمجھے نہیں..."

"تم سب سمجھتی ہو زیب النساء۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "میری مراد سراج سے تھی۔ بتاؤ کیا تمھارا دل اس جیسے آدمی کے ساتھ شادی کر لو گی؟ یہ ظلم برداشت کر لو گی۔ کیا تم جانتی نہیں ہو کہ اس کی اور تمھاری فطرت اور مزاج میں کتنا فرق ہے... تم میں ہمت نہیں ہے انکار کی... یا تم ڈرتی ہو اپنے بھائی مرشد رضا سے... دیکھو... مجھے تم سے ہمدردی ہے... تم ایک حساس طبیعت رکھنے والی... ضمیر کے ساتھ چلنے والی... فنکارانہ مزاج رکھنے والی نیک دل لڑکی ہو... اگر تم میں ہمت نہیں ہے اس زبردستی کے خلاف... ہیلو... ہیلو... زیب النساء... ہیلو...!" میں نے چلا کے کہا مگر وہ ریسیور رکھ چکی تھی۔ وہ میری توقعات سے کہیں زیادہ ہوشیار ثابت ہو رہی تھی۔ میرے ٹیلی فون نے اسے ہراساں نہیں کیا تھا۔ دوہرے قتل کے الزام اور چشم دید گواہ کا ذکر سن کے بھی وہ بالکل مضطرب نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنا فطری انداز معصومیت برقرار رکھا تھا اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہی تھی... "اُف کیا لڑکی تھی...!" میں نے جھنجلاہٹ میں کہا اور کھمبے سے نیچے اتر آیا۔

زیب النساء کا مشن کامیاب رہا تھا لیکن وہ اس کامیابی کا اقرار کر کے بھی خود کو مجرم تسلیم کرنے پر تیار نہ تھی... وہ بڑی ہوشیاری سے نکلی۔ اس نے دو ایسے افراد کو قتل کیا جو اس کے مجرم تھے۔ اس نے شاید ان کے بارے میں سراج کو بھی نہیں بتایا تھا اور خسرو جمشید کو بھی۔ وہ ایسی لڑکی تھی کہ اپنی سوچ کو ذہن تک محدود رکھتی تھی۔ وہ بہت پہلے طے کر چکی ہوگی کہ اسے بعد میں مجرموں کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے مگر اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ انھیں جانتی ہے اور پہچانتی ہے... اس نے اپنے ذہن کے خیالوں کو بھی مقفل رکھا اور مناسب وقت کا انتظار کرتی رہی... جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا، وہ بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ جو کچھ اس نے کیا، وہ بھی کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ بیک وقت اتنی جذباتی بھی ہو سکتی ہے اور ایسے غیر جذباتی انداز میں بھی فیصلے کر سکتی ہے۔ فنکار بھی ہے اور ایک سفاک قاتل بھی... کمزور عورت بھی ہے اور انتہائی خطرناک حریف بھی۔ معصوم بھی ہے اور اتنی عیار بھی کہ جب چاہے اپنی شخصیت کا بہروپ بدل لے اور اتنی کامیابی سے کہ اصل شخصیت کو چھپا لے۔

میں زیب النساء کے بارے میں سوچتا ہوا واپس پہنچا۔ اس وقت تک مجھے یقین آ چکا تھا کہ چشم دید گواہ کی نظر کو دھوکا ہوا۔ زیب النساء اکیلی ہی گئی تھی اور اطمینان سے قتل کر کے اکیلی ہی لوٹ آئی۔ وہ ڈاکٹر جس نے پولیس کو رپورٹ دی ہوگی کہ ایک مریضہ وی آئی پی وارڈ سے غائب ہے، بیٹا اسے کمرے میں پا کے شرمندہ ہوا ہوگا۔ اور کنفیوز بھی۔ وہ پولیس کے سامنے ہمارا نام نہیں لے سکتا تھا کہ زیب النساء کی عدم موجودگی کے وہ گواہ بھی رہے۔ زیب النساء نے اتنی ہی سادگی اور معصومیت کے ساتھ اسے یقین دلا دیا ہوگا کہ وہ ذرا سی دیر کے لیے باہر ضرور نکلی تھی۔ کینٹین تک گئی تھی یا باغ میں ٹہل رہی تھی۔ بے شک وہ کھڑکی کے راستے گئی تھی مگر اسپتال سے باہر ہرگز نہیں گئی تھی۔ اور ڈاکٹر نے یقین کر لیا ہوگا۔ اسے ماننا ہوگا کہ وہ احمق ہے اور الو کا پٹھا ہے۔ کیونکہ زیب النساء سچی ہے اور اگر وہ ڈاکٹر نہ ہوتا تو پولیس اسے جھوٹی رپورٹ کے نتیجے میں آئندہ سچ بولنے کا ایسا سبق دیتی کہ وہ یاد کرتا۔ [illegible] سمجھ کے لوٹ گئے ہوں گے۔ سراج اور خسرو جمشید عرف مرشد رضا بھی اس کے سچ کے خلاف جانے والے لوگ نہیں تھے۔ میں غصے میں اندر ہی اندر سے دھواں دیتا واپس پہنچا تو سب لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ ٹریلر کے پیچھے شیر علی نے اپنی دری بچھا دی تھی اور اس پر سراج کی ماں کے سوا سب لیٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک فیملی لگتے تھے۔

"زیب النساء سے بات ہوئی؟" محسن نے مجھے غور سے دیکھ کے کہا۔

"ہوئی یا نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔ "پہلے مجھے کھانے کو کچھ دو۔"

محسن ہنسنے لگا۔ "وہ اسپتال میں موجود تھی۔"

"اور اس نے بڑے زور دار الفاظ میں تردید کر دی۔ سب کچھ جو آپ نے فرمایا تھا غلط کر دیا۔" غالب نے بھی ہنس کے کہا۔ "بلکہ ثابت کر دیا کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔"

"ہاں ہاں... میں بھونکتا ہوں۔" میں نے چلا کے کہا۔ "[illegible] بچہ سمجھ رکھا ہے اس نے سب کو۔ جلد ہی

www.paksociety.com

ہے کوئی دوسرے کو بے وقوف سمجھنا۔"

"اگر دوسرا حد سے زیادہ بے وقوف ہو تو حد کیسی؟" غالب بولا۔

محسن اور غالب سب سمجھ گئے تھے چنانچہ ان کو یہ بھی بتانا ضروری نہیں تھا۔ شیر علی نے کسی قسم کے تجسس کا مظاہرہ نہیں کیا اور کھانا ختم کرتے ہی اٹھ کے چلا گیا۔ محسن اور غالب مجھے پیار کرتے

"یہ بتاؤ کہ سراج کی ماں تو ٹھیک ہے نا؟" میں نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں... اسے کیا ہو سکتا ہے۔"

"اس کی وجہ سے ہمیں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے اسے بتا دیا ہے۔" جولی نے کہا۔ "کہ وہ خاموش رہے اور ہم سے تعاون کرے تو اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہم اسے مہمان بنا کے رکھیں گے اور اس کے ہر آرام کا خیال بھی رکھیں گے مگر اس نے شور ہنگامہ کیا تو ہم سب کے لیے اسے پاگل قرار دینا مشکل نہیں۔ ہم دنیا کو یقین دلا سکتے ہیں کہ اس کا ذہنی توازن درست نہیں... اس نے یہ بات سمجھ لی اور اب خاموش ہے۔"

"ویری گڈ جولی... [illegible] تم نے ہمارا بوجھ بہت کم کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ ہی جائے گی؟" جولی نے کہا۔

"نہیں... مجھے امید ہے کہ بہت جلد سراج لینے آ جائے گا۔" میں نے کہا۔

"وہ خود آئے گا یہاں؟" جولی نے ایسے کہا کہ ہم سب ہنس پڑے اور جولی خفیف ہو گئی۔

"سراج اپنی ماں کو لے جائے گا تو کچھ نہ کر سکے گا۔" محسن نے اسے سمجھایا۔ "دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔"

محسن نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ "پونے بارہ بجنے والے ہیں۔" وہ بولا۔

"ہاں... بیس منٹ میں بارہ بجتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"ہم ایک کام سے جا رہے ہیں۔" محسن بولا۔ "ایک گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔"

"ایسے نہیں۔" غالب نے کہا۔ "صاف بتا کے جاؤ کہ کہاں جا رہے ہو۔"

"رابعہ سے بات کرنے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" غالب نے کہا۔ "نازو کو میرا سلام نیاز کہنا۔"

"نازو ٹھیک ہو گئی مگر دماغ خراب ہو گیا۔" محسن نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ "رابعہ کو تو نازو سمجھتا ہے۔"

"یار وہ... ایسا دل بھی مجبور ہے۔" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "جو تم کو رابعہ سے کہنا ہے وہی مجھے نازو سے کہنا ہے جب اپنی کہو تو میری بھی کہہ دینا یہ سمجھتے ہوئے کہ غالب سوختہ جاں اس

محبت طناز سے ہمکلام ہے۔"

"ایسی دردناک باتیں مت کرو دوست... ہم سب فراق کی آگ میں ایک ساتھ اور ایک سمت جل رہے ہیں۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور سڑک پہ لے آیا۔ دوسری جانب ہوٹل کی رونق تھوڑی سی ماند پڑ گئی تھی۔ اب بیشتر لوگ چارپائیوں پر سو رہے تھے اور ٹرکوں کی قطار بھی لمبی نہیں رہی تھی۔

"میں نے یہاں آتے ہوئے ایک تجرباتی فارم دیکھا تھا۔" محسن نے کہا۔ "محکمہ زراعت کا بورڈ لگا ہوا تھا۔"

"کیا وہاں کوئی تجربہ کرنے کا خیال ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ جگہ قریب ہے۔" محسن بولا۔ "باہر سے تو اجاڑ لگتی تھی مگر وہاں ٹیلی فون ہو سکتا ہے۔"

محسن کا خیال درست تھا۔ تقریباً آدھا میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے سڑک کے کنارے ایک پرانا بورڈ دیکھا جو اس حد تک پیچھے جھک گیا تھا کہ خاردار تاروں کی باڑھ کے سہارے [illegible] سب سے اوپر تھا۔ "سیڈ ٹیکنالوجی لیبارٹری" لکھا ہوا تھا۔

"سیڈ ٹیکنالوجی؟" محسن نے حیرت سے کہا۔ "یہاں کیا ہوتا ہے؟"

"غالباً بیج ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ اور کچھ بھی نہ ہوتا ہو تو ایک دفتر کا نام تو چلتا ہے۔ کسی کو سرکار کے خزانے سے کچھ کرنے کی تنخواہ تو ملتی ہوگی۔ وہ کچھ کرے یا نہ کرے۔ ایسے بہت سے محکمے اور دفاتر کسی اسامی کو کھپانے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔"

"میرے ڈیڈی نے بھی ایک واقعہ سنایا تھا کہ محکمہ زراعت کے کوئی سیکرٹری تھے یا ڈپٹی سیکرٹری۔" محسن بولا۔ "ان کے کسی بھانجے بھتیجے نے ایم ایس سی کے بعد بے روزگاری سے تنگ آ کے ٹیکسی چلانے کا فیصلہ کیا تھا اور بڑا اچھا فیصلہ کیا تھا مگر سیکرٹری صاحب کو اپنی ناک کی فکر لاحق ہو گئی کہ لوگ کیا کہیں گے کہ ان کا وہ بھانجا بھتیجا ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ حالانکہ موصوف خود ایک نمبر کے راشی اور بدعنوان تھے مگر انہیں کسی کا محنت کر کے حق حلال کی روزی کمانا اپنی بے عزتی محسوس ہوا۔ انہوں نے ایک ایسا ہی عہدہ اور محکمہ ایجاد کیا۔ کوئی تجرباتی فارم یا لیبارٹری وغیرہ قائم کرنے کی ضرورت پیدا کی جو ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ منظوری ملتے ہی ایک قطعہ زمین پر ایک کمرے کا دفتر بنا دیا گیا۔ ایک مالی رکھا گیا، فرنیچر اور سازوسامان خرید لیا گیا۔ سالانہ بجٹ میں اخراجات کا تخمینہ بنا کر مذکورہ بالا کمرہ بنا دیا گیا تھا۔ اس میں ایک ریسرچ کا سامان، ایک افسر، ایک ماتحت کلرک اور ایک چپڑاسی کی تنخواہ شامل تھی اور دفتری ضروریات کے لیے ٹائپ رائٹر، ٹیلی فون وغیرہ بھی شامل کیے گئے۔ اسی بے روزگار شخص کو ریسرچ آفیسر بنا کے بٹھا دیا گیا اور تمام عمر کے لیے

تو بتا نہیں یہ سب فضول قسم کی کاغذی کارروائی کے نام پر عیش کرتے تھے۔"

"کیا اب اندر چلیں؟" میں نے کہا۔ اگر محسن نے اپنے مرحوم والد انکل خیرانی کا حوالہ نہ دیا ہوتا تو اس وقت میں یہ قصہ اتنے ضبط و تحمل سے نہ سنتا۔ میرے اپنے دل کی کیفیت ایسی تھی کہ تاخیر اور انتظار کا ہر لمحہ مجھ پہ اب بھاری ہو گیا تھا۔ عجب کرب والہانہ سے تصور ملاقات کا خیال پوری طرح میرے اعصاب پہ سوار ہو گیا تھا۔

خاردار تاروں کی باڑھ اس بورڈ کے دونوں جانب سو سوا سو گز تک پھیلی ہوئی تھی۔ بورڈ کے ساتھ ہی ایک کچا راستہ اندر جا رہا تھا اور آگے جو وہاں دوسرا بورڈ یہ اعلان کر رہا تھا کہ بلا اجازت اندر آنے والے کو حوالہ پولیس کیا جائے گا۔ مگر وہاں راستہ روکنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ گاڑی کو اندر موڑتے ہی میں نے ہیڈ لائٹس آف کر کے انجن کو تھوڑا سا چلایا اور پھر بند کر دیا۔ گاڑی اپنے ہی زور میں کسی آواز کے بغیر کھنچتی ہوئی اس دو کمروں کی مختصر سی عمارت تک پہنچی جو اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے نیچے اتر کے چند سیکنڈ انتظار کیا کہ کوئی ہم سے کچھ پوچھے مگر وہاں تو چاروں طرف مختصر تجرباتی نوعیت کے کھیت تھے جن کو کیاری کہنا زیادہ مناسب ہو گا یا گملوں میں لگے ہوئے پودے تھے۔ اس جگہ کو فارم سے زیادہ نرسری بھی کہا جا سکتا تھا۔

برآمدے میں ایک شکستہ کرسی پڑی ہوئی تھی اور وہیں ایک سوئچ بورڈ تھا۔ میں نے اوپر دیکھا تو مجھے چھت میں لگا ہوا بلب بھی نظر آیا اور میں نے بٹن دبا کے اسے روشن کر دیا۔ محسن نے اسے فوراً بجھا دیا۔ اگر وہاں کوئی ہوتا تو اتنی روشنی کا الارم بھی کافی تھا لیکن دو منٹ بعد بھی کوئی نہ پہنچا تو میں نے شیشے کے پینل والے دروازے کو دیکھا۔ اس میں بہت مضبوط قسم کا تالا پڑا ہوا تھا۔ اوپر نیم سائز کی تختی آفیسر کے نام کی لگی تھی۔

"اسے ہم آسانی سے نہیں توڑ سکتے۔" محسن نے کہا۔

"مشکل سے تو توڑ سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"توڑنے کو ہم دروازہ بھی توڑ سکتے ہیں اور دیوار توڑ کے بھی اندر جا سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ "مگر آسان راستہ کیوں نہ اختیار کیا جائے۔"

آسان راستہ پیچھے کی طرف تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں گملوں سے بچ بچ کے اور دیوار کے ساتھ لگ کر چلنا پڑا۔ دونوں کمروں کے پچھلے حصے میں ایک ایک کھڑکی تھی جو زمین سے چار فٹ اوپر تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی شیشے پہ ناک رکھ کے اندھیرے کا جائزہ لینے کی بے سود کوشش کی۔ پھر محسن نے پیچھے سے ایک ٹوٹے ہوئے گملے کا کنارا اٹھایا اور آہستہ سے اوپر کے شیشے پہ مارا۔ شیشہ اندر کی طرف گرا اور کچھ ٹوٹے ہوئے شیشے کی کرچیاں کناروں پر لگی رہ گئیں۔ محسن نے انگلیاں احتیاط سے پکڑ کے کھینچا اور باہر پھینک دیا۔ اوپر کی چٹخنی آسانی سے کھل گئی مگر نیچے کی چٹخنی بھی بند تھی اور اسے کھولنے کے لیے نیچے والا شیشہ توڑنا ضروری تھا۔

"کون ہے؟" اچانک دوسری طرف سے کسی نے چیخ کے پوچھا۔

"غالباً چوکیدار۔" میں نے سرگوشی میں محسن کو بتایا۔ شاید وہ اندر سو رہا تھا۔ قفل صرف ایک دروازے میں تھا۔ دوسرے کو اس نے اندر سے بند کر لیا تھا۔ میں نے محسن کو ایک طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود دوسری طرف گیا۔ مجھے یقین تھا کہ چوکیدار باہر ضرور نکلے گا۔ یہاں چوری ہونے والی کوئی چیز نہیں تھی اور جو بھی تھا سب سرکاری مال تھا، جو کسی کے کام نہیں آ سکتا تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گا کہ کسی نے شیشہ کیوں توڑا۔ باہر نکلتے ہی اسے مائیکرو وین دکھائی دے گی اور اس پہ لکھا ہوا کسی سرکاری محکمے کا نام تو وہ پریشان ہو گا کہ آدھی رات کو یہاں کون سرکاری کام سے آ گیا۔

چوکیدار نے پہلی بار پکارنے کے بعد کچھ دیر جواب کا انتظار کیا تھا اور دوبارہ زیادہ بلند آواز میں پوچھا تھا کہ کون ہے؟ پھر شاید اس نے کچھ وقت ٹوٹے ہوئے شیشے سے باہر جھانکنے میں صرف کیا اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں پھر سامنے کے حصے میں پہنچنے کی مہلت مل گئی۔ دروازوں کے پیچھے اب لائٹ نظر آ رہی تھی۔ میں اور محسن دیوار سے چپک کے کھڑے ہو گئے۔ چوکیدار جیسے ہی کنڈی کھول کے باہر نکلا، اس کی نظر نے سفید مائیکرو وین کو دیکھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور میں نے پیچھے سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے اسے دبوچ لیا۔ وہ جوان آدمی تھا جبکہ اسے گھسیٹ کر اندر لے جانے کے لیے مجھے سخت جدوجہد کرنی پڑی۔

"خبردار جو آواز بھی نکالی۔" میں نے آواز اور لہجہ بدل کے کہا۔ "تمہیں کوئی نقصان نہیں ہو گا... اگر تم نے تعاون کیا۔"

وہ انکار میں گردن ہلانے لگا۔ ابھی تک اس نے میری صورت دیکھی تھی اور نہ محسن کی۔ میں نے اسے دبوچتے ہی اس کا چہرہ دوسری جانب کر دیا تھا اور اسے کمرے کے اندر کی طرف دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔ محسن نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک کونے میں لگے ہوئے میلے کچیلے بستر کی چادر سے بالشت بھر چوڑی پٹی اتار لی۔ اسے تہہ کر کے اس نے چوکیدار کی آنکھوں پہ باندھ دیا۔ اس وقت میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ ہمارے چہرے نہ دیکھے۔ جیسے ہی میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کی وہ تیزی سے پلٹا مگر اس سے پہلے کہ وہ چلاتا، میں نے اس کے کان کے نیچے کھڑی ہتھیلی کا ہلکا سا وار کیا۔ وہ لڑکھڑایا اور نیچے گر گیا۔ ان دونوں کے ساتھ کوئی باتھ روم ہوتا تو ہم اسے بے ہوش نہ کرتے، اسے باندھ کے اور

www.paksociety.com

اس کے کمرے میں کیمرا فٹ کر کے اندر ڈال دیتے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ وہ ہماری گفتگو سنے اور وہ کمرے میں رہتا تو ظاہر ہے سب سنتا۔

اب میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا۔ اس میں ایک میز کرسی تھی میز پر بہت خوب صورت رائٹنگ سیٹ تھا جو کسی کھاد بنانے والے کارخانے کا تحفہ تھا۔ ان کا مونوگرام ہر چیز پر کندہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک ٹیلی فون تھا جو ایک چھوٹے سے لکڑی کے باکس میں آدھا مقفل تھا۔ آدھا اس طرح کہ گھنٹی بجنے پر ریسیور اٹھایا جا سکتا تھا مگر نمبر ملانے والے ڈائل تک رسائی ڈھکنا کھولے بغیر ممکن نہ تھی۔ یہ سرکاری افسران کی مخصوص ذہنیت کا ایک نمونہ تھا۔ وہ خود تمام دن دوستوں سے گپ لگاتے رہیں یا بیویوں اور محبوباؤں کو بے وقت بتاتے رہیں مگر نچلے درجے کے چوکیدار کو رات کے وقت ہنگامی ضرورت کیلئے بھی فون کا "ناجائز" استعمال نہیں کرنے دیتے۔

دوسرے کمرے میں چاروں طرف الماریاں تھیں اور شیشوں کے پیچھے ہر ایک میں مرتبانوں کی قطار تھی۔ ہر مرتبان پر گندم، چاول اور دوسری اجناس کے بہت مشکل نام لکھے ہوئے تھے۔ نمبر پڑے ہوئے تھے اور اقسام کی درجہ بندی کے کوڈ تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ اسٹینڈ جیسی میز تھی جس پر بہت سی تپائیاں، ٹیسٹ ٹیوبیں اور ایسی چیزیں پڑی ہوئی تھیں جو لیبارٹری کے سوا کہیں نظر نہیں آتیں۔ دیواروں پر مختلف اجناس اور زرعی فصلوں کے چارٹ آویزاں تھے اور یہ تمام ماحول یہ ظاہر کرتے تھے کہ یہاں واقعی کام ہوتا ہے۔

محسن نے تالے کو کھول کے توڑنا چاہا تو وہ کنڈی الگ ہو گئی جس میں تالا پڑا ہوا تھا۔ محسن کرسی پر بیٹھ گیا اور میں نے میز پر بیٹھ کے نمبر ملانا شروع کیے۔

"تیرا ہاتھ کانپ رہا ہے۔" محسن نے مجھے اطلاع دی۔

"میرا دل بھی کانپ رہا ہے۔" میں نے کہا اور کراچی کی کال ملانے کے لیے بار بار وہی نمبر گھماتا رہا یہاں تک کہ ایک کلک کے بعد مجھے کوئی بزر کی ٹون سنائی دی۔ اس کے بعد میں نے رابعہ کا دیا ہوا نمبر ملایا۔ گھنٹی ایک بار... دو بار... تین بار بجی... پھر کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو..." میں نے چند سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد کہا۔ میرے دل کے دھڑکنے کی رفتار یکلخت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس کی دھمک میرے وجود کو مرتعش کر رہی تھی۔ "ہیلو..." میں نے حلق کو کھنکار کے کہا۔

"سکندر..." ایک آواز آئی... ہلکی سی... جذبات کے گھمبیر جالوں میں لپٹی ہوئی۔ بوجھل سانسوں کے پیچ و تاب... خوابوں اور خیالوں کے دشت امکان سے پرے کسی شہر طلسمات کے ویران حصاروں میں مقید۔ اس نے سوتے سوتے آنکھیں کھول کے مجھے پکارا اور سیکڑوں میل کی مسافت طے کر کے رابعہ کی آواز نے... جو برقی مقناطیسی لہروں میں ڈھل گئی تھی ٹیلی فون کے تاروں سے گزر کے پھر اصل آواز کا روپ دھارا اور میرے کانوں میں جیتی جاگتی صدا بن کے اتر گئی۔

"رابعہ!" میں نے چلا کے کہا۔ "یہ تم ہو... رابعہ تم...؟" میری آواز میرے حلق ہی میں پھنس گئی۔ میں بھول گیا کہ مجھے کیا کہنا تھا۔ کہنے کو بہت کچھ تھا۔ دوریوں کے ان گنت لمحوں کے فسانے اپنے طول و طویل، سوال قربت دور پر ٹکنے والے تمام صدموں کا حساب، بے خواب راتوں کی بے سروسامانی و انتظار کا حال، امیدوں کی ناامیدی کے کالے اور ناامیدی کو سہارا دینے والی ہر امید کی کرن کا احوال، چاہت کے ہر جذبے کی سوتی جاگتی داستان... یادیں... وعدے... خواہشیں... کئی صدیوں کے قصے۔

محسن نے مجھے جھنجوڑا۔ "سکندر... پاگل مت بن... بات کر رابعہ سے۔"

"سکندر..." رابعہ نے کہا۔ "تم رو رہے ہو...!" اور میں نے دیکھا کہ آنسو اس کی آنکھوں کی شفاف جھیلوں سے تیرتے ہوئے اس کے رخساروں کے چمن زار میں ٹپک رہے ہیں۔

"میں... نہیں تو..." میں نے آنسوؤں کے درمیان ہنس کے کہا۔ "رو تو تم رہی ہو۔"

"جھوٹ..." وہ بولی۔ "جھوٹ تم بھی بول رہے ہو... مجھ سے۔" اور اس کی ہنسی نے مجھے سرشار کیا۔ "بہت دیر کر دی تم نے... میں ساڑھے گیارہ بجے سے انتظار کر رہی تھی... دیکھو وقت کیا ہوا ہے۔"

"وقت... ہاں... آدھی رات گزر چکی ہے... صبح ہو گئی [illegible]؟" میں نے گھڑی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"نہیں سکندر... رات ابھی آدھی گزری ہے۔" وہ بولی۔ "خود کو فریب دینے سے کیا حاصل کہ رات کے بارہ بجنے سے تاریخ شروع ہو جاتی ہے نئے دن کی۔"

"ایسا مت کہو... دیکھو رابعہ... یہ آدھی رات نہیں آدھی صدی تھی جو میں نے انتظار کی سولی پر کاٹ دی۔" میں نے کہا۔ "مجھ سے مت کہو کہ ابھی آدھی رات باقی ہے... مجھے بتاؤ تم کہاں ہو۔ میں اڑ کے تو نہیں پہنچ سکتا مگر دوڑ کے آ سکتا ہوں۔"

"یہ مشکل ہے سکندر..."

"سب کچھ ممکن ہے میرے لیے۔" میں نے کہا۔ "وقت میری گرفت میں ہے اور میں تم کو دیکھ سکتا ہوں... اس تار کے دوسرے کنارے سے... جہاں ہو بس وہیں بیٹھی رہو... میں آتا

ہوں تمہارے سامنے آ جاتا ہوں..."

"نہیں سکندر... ابھی نہیں..."

"ابھی نہیں؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم...؟" میں نے کہا۔

"تم یہاں نہیں آسکتے۔" وہ بولی۔

"اچھا تو تم آجاؤ۔" میں نے چلا کے کہا۔ "سنو... تم لاہور آجاؤ اور مجھ تک پہنچ جاؤ۔"

"سکندر... یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"کیوں؟ کون حائل ہے اب تمہارے اور میرے بیچ میں؟"

"وقت۔" رابعہ نے کہا۔

"وقت کوئی سد سکندری نہیں ہے... کوئی دیوار زنداں نہیں ہے۔ وقت تو ارادوں کا غلام ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ تم کہاں ہو؟"

"میں یہاں کراچی میں ہی ہوں۔" وہ بولی۔ "اور بالکل خیریت سے ہوں..."

"پھر کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں۔" وہ ہنسی۔ "تم سناؤ کیا بات ہے...؟"

"رابعہ... یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" میں نے پھر چلا کے کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ تم کہاں ملو گی؟"

"میں بتا چکی ہوں کہ ابھی میں تم سے نہیں مل سکتی۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"سکندر... تم ٹھیک ہو نا...؟" رابعہ نے کہا۔ "محسن کیسا ہے اور..."

"میں پوچھ رہا ہوں کہ تم سے ملنا کیوں ممکن نہیں... میں کیوں نہیں آسکتا اور تم کو کس نے روکا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہے کوئی مجبوری۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟" میں نے کہا۔ "کیا تم کسی کی قید میں ہو؟"

"نہیں..."

"رابعہ تم مجھے پاگل کر دو گی..." میں نے برہمی سے کہا۔ "آخر یہ کیا معموں میں بات کر رہی ہو... مجبوری کی بات بھی کرتی ہو اور آزادی کی بھی... جب قید میں نہیں ہو تو پھر نہ آنے اور نہ ملنے کا کیا سوال؟"

"سوال ہے نا..." وہ بولی۔ "ابھی صرف اتنا ہی سمجھ لو کہ مجھے اور تمہیں تھوڑا سا انتظار اور کرنا ہے... کیا تم انتظار نہیں کر سکتے؟"

"انتظار تو میں قیامت تک کر سکتا ہوں..."

"تو ہم انتظار کریں گے تا قیامت... خدا کرے کہ قیامت جلد اور آجائے۔" محسن نے زور سے کہا۔

"یہ محسن کی آواز تھی نا۔" پھر رابعہ بولی۔

"گولی مارو محسن کو... مجھے بتاؤ کہ یہ کیا چکر ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا تمہیں یہ سلوک زیب دیتا ہے... جو تم میرے ساتھ کر رہی ہو؟"

"کیا تمہیں اعتماد نہیں ہے مجھ پر...؟"

"مجھے؟ عدم اعتماد کا مظاہرہ میں کر رہا ہوں؟" میں نے برہم ہو کے کہا۔ "تم کچھ چھپا رہی ہو مجھ سے..."

"یہی تو تمہارا عدم اعتماد ہے۔" رابعہ بولی۔ "جب میں کہہ رہی ہوں کہ میں کچھ نہیں چھپا رہی ہوں... تو تم کو مان لینا چاہیے کہ ایسا ہی ہے اور اگر تم نہیں مانتے تو اس کا مطلب ہے تمہارا اعتماد مجھ پر سے اٹھ گیا ہے... تم یہ سمجھنے لگے ہو کہ میں بھی تم سے جھوٹ بول سکتی ہوں؟"

"دیکھو رابعہ..." میں نے بے بسی سے کہا۔ "یہ ناممکن ہے... کہ میں خود پر اعتماد نہ کروں... مگر تم کو کیا عار ہے بتانے میں؟"

"میں صرف انتظار کرنے کو کہہ رہی ہوں... تم اتنے بچے تو کبھی نہ تھے اپنے یقین میں۔" وہ بولی۔ "یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"معلوم نہیں... کیا تم جانتی ہو؟ جانتی ہو تو مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور تم اتنی بے رحم کیوں ہو گئی ہو... صرف اپنی آواز سنانے کے لیے آئی ہو..."

"تصور میں تو میں تمہارے ساتھ ہوں... جیسے تم میرے ساتھ ہو... کبھی دن رات کے کسی بھی لمحے میں ہم جدا نہیں ہوئے۔" وہ مجھے سمجھانے لگی۔ "جدائی تو نام ہے وقت اور فاصلوں کو درمیان میں محسوس کرنے کا اور اگر یہ احساس نہیں تو پھر میرے یہاں اور تمہارے وہاں ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے یا تم سمجھتے ہو کہ محبت نام ہے... جسمانی طور پر یکجا ہونے کا اور یہ محبت آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کی طرح..."

"خدا کے لیے مجھے ایسا افلاطونی محبت کا فلسفہ مت پڑھاؤ... میں صرف تمہارے خیال سے محبت کر کے زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ میں گوشت پوست کا بنا ہوا جیتا جاگتا انسان ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔ صرف تمہارے تصور سے میں نہیں بہل سکتا۔ دیکھو یہ محبت وہ پودا ہے جس کو ہم نے مل کے پروان چڑھایا... جیسے سورج کی روشنی اور ہوا اور زمین کی مٹی۔ ان سب عناصر کا یکجا ہونا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو پودا جی نہیں سکتا... ایسے ہی محبت ایک مادی وجود بھی رکھتی ہے... اسے زندہ رہنے کے لیے میں اور تم اور ہمارے جذبات... سب ضروری ہیں۔ تمہاری عدم موجودگی میں میرا وجود ادھورا رہ جاتا ہے۔"

"سکندر... افسوس یہ ہے کہ تم جذبات کی دھند میں عقل

www.paksociety.com

کا دوست گم کر بیٹھے ہو۔" وہ بولی۔ "میں نے کہا نا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ وہ کیا کہتے تھے تم... کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں... صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں۔"

"اچھا رابعہ... مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم وہاں کیا کر رہی ہو؟ ایم آر ایس کے مشن سے الگ تمہاری کیا مصروفیت ہے اور کیا مجبوری ہے؟" میں نے کہا۔

"بس تو میرا اور تمہارا مشن ہے جو بالآخر ختم ہو جائے گا لیکن اس کے بعد بھی زندگی کی طویل مسافت ہے... یہ مشن تو ایسا ہی ہے جیسے راستے کو وقتی طور پر راہ پہ سے ٹوٹ کر گرنے والی چٹانیں یا پھسل کر نیچے آنے والے برفانی تودے روک دیتے ہیں۔ انھیں صاف کرنے کے لیے رکنا پڑتا ہے اور انتظار بھی کرنا پڑتا ہے مگر اس رکاوٹ سے نہ راستہ بدلتا ہے اور نہ منزل بدلتی ہے... تم بالکل مطمئن رہو... میں نہ کسی کی قید میں ہوں اور نہ مجھے کوئی ایسی پریشانی لاحق ہے جس سے میں ذہنی طور پر بیمار ہوں اور نہ جسمانی طور پر... شکر ہے میں صرف تمہاری طرف سے رہتی ہوں۔ لیکن مجھے اپنی دعاؤں پر پورا بھروسا ہے۔ خدا مجھے یقین دیتا ہے اور مایوسی سے بچاتا ہے..." رابعہ نے کہا۔ "آخر وہ بھی میرے لیے سرمایۂ حیات یہی اعتقاد اور ایمان ہوگا..."

"رابعہ، خدا کے لیے یہ بتاؤ کہ تم کس کے ساتھ ہو...؟" میں نے کہا۔ "اگر میں کراچی آؤں تو تم سے کیسے ملوں... ہم سب بہت جلد پہنچنے والے ہیں؟"

"تم اسی نمبر پر فون کر دینا۔" وہ بولی۔ "اس سے اگلی رات میں تمہیں فون پر منتظر ملوں گی... اسی وقت..."

"آدھی رات کو؟ یہ کیا تک ہے آخر...؟"

"یہ احتیاط کے تقاضے ہیں..." وہ بولی۔

"مگر یہ فون نمبر کس کا ہے؟" میں نے کہا۔

"اس پر تو کوئی نمبر بھی نہیں لکھا ہوا ہے۔" وہ بولی۔ "نام کس کا ہے... مجھے کیا معلوم۔"

"پھر تم کو کس نے بتایا... وہ کون تھا جس نے میرا پیغام تم تک پہنچایا تھا؟" میں نے کہا۔ "جس سے کل میری بات ہوئی تھی؟"

"وہ ایک اچھا آدمی ہے... دوست..."

"اس اُلو کے پٹھے کا نام بھی ہوگا کوئی... ایکس وائی زیڈ۔ وہ بات مت کرنا شیکسپیئر والی کہ نام میں کیا رکھا ہے۔" میں نے چلّاتے ہوئے کہا۔

"اُف... بھئی نام ہی تو بتا رہی تھی... دوست محمد نام ہے اس کا اور وہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"یہ تو میں معلوم کر لوں گا کہ نمبر کس کا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس سے تمہیں کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔" وہ بولی۔ "یہ سرکاری نمبر ہے... ایک دفتر کا... جہاں وہ رات کے وقت موجود ہوتا ہے۔"

"تو میں معلوم کر لوں گا کہ وہ دفتر کہاں ہے۔" میں نے کہا۔

"تم کو وہاں تک پہنچنے کوئی نہیں دے گا۔ اور ویسے بھی تمہارا اس جگہ تک پہنچنا مشکل ہے۔"

"مشکل ہی ہے نا... ناممکن تو نہیں..."

"دیکھو میں ساری رات تم سے باتیں نہیں کر سکتی... میرا یہاں آنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔" وہ بولی۔ "دوست محمد نے کہا ہے کہ جب تک کسی کو شک نہ ہو یہ سلسلہ چلے گا۔ اس کے بعد وہ کوئی دوسری صورت نکال لے گا..."

"کیا تم دوست محمد کے ساتھ ہو؟ اس کے گھر پہ؟"

"یہی سمجھ لو۔" رابعہ ہنسی۔ "رقابت میں جلنے مت لگنا... وہ میرے باپ کی عمر کا آدمی ہے۔ اس کے دو جوان بیٹے کینیڈا میں ڈاکٹر ہیں... دو امریکا میں، اور سب شادی شدہ ہیں۔ یہاں وہ اکیلا ہے۔"

"بیوی تو ہوگی؟"

"نہیں، وہ بچوں کے پاس رہتی ہے۔ کبھی امریکا میں کبھی کینیڈا میں۔ لڑکے ابھی باپ کو خبطی سمجھنے لگے ہیں۔ بلا بلا کے تھک گئے... بہت سمجھاتے رہے کہ اب آرام کریں اور عیش کریں... لیکن وہ ہے ہم سب کی طرح... کہتا ہے کہ میں وطن کو چھوڑ کے کہاں جاؤں اس عمر میں... صرف عیاشی کے لیے اور آرام کی خاطر ترکِ سکونت کروں؟ یہ تو ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی ماں کو چھوڑ دے... اور وہ بھی صرف پیسے کے لیے... خود اس کی بیوی ایک زمانے میں ناقابلِ یقین حد تک خوب صورت تھی۔ اس نے مجھے تصویریں دکھائی ہیں۔ شادی کے سال بھر بعد اس کے جسم پر دھبے سے نمودار ہوئے۔ علاج کے باوجود... کا اور آدھے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ کہتا ہے کہ اس وقت کیا میں بیوی کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ طلاق دیتا تو ہمارے معاشرے میں مرد کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لیتا جو خوب صورت ہوتی۔ مگر یہ شادی تو نہ ہوتی، خوب صورتی کا سودا ہوتا۔ صرف ظاہری خوبصورتی کا۔ اور میرے اپنے جذبوں کی موت اس سے ظاہر ہوتی۔ پھر میں اپنے ملک سے زیادہ خوب صورت یا خوش حال ملک میں کیوں جاؤں۔ جہاں بے شک آرام سہی، آسائش سہی، ہزار خوبیاں سہی... لیکن میرے وطن کا اس سے کوئی مقابلہ نہیں مگر یہ سب صرف جذبات ہیں... مادی اقدار کا نہیں... وہ ریڈیو آفیسر تھا... آرمی سگنل کور میں تھا۔ اسکول آف سگنل راولپنڈی کے کورس کیے۔ پھر حالات ایسے ہو گئے کہ اسے ریٹائرمنٹ لینی پڑی۔ بارہ

سال تک وہ ایک حادثے کے نتیجے میں یادداشت سے محروم رہا۔ دعا اور دوا سے بالآخر وہ ٹھیک ہوگیا۔ جو کچھ اس کے ذہن میں تھا، رفتہ رفتہ سب واپس مل گیا۔ اس نے ریڈیو آفیسر کا کورس کیا اور شاندار کامیابی حاصل کی۔ اب وہ ایک ایکسپرٹ ہے ریڈیو انجینئرنگ میں... ریڈیو ٹیلیفون اور وائرلیس اس کے لیے کھلونے ہیں۔ وہ حج پرسٹ نہیں ہے۔ پرائیویٹ شپنگ کمپنیوں اور مواصلاتی اداروں کے لیے کام کرتا ہے معاہدے کی بنیاد پر لیکن پاکستان نیوی کے لیے بھی اس کی خدمات مستعار لی جاتی ہیں۔ یہ کام وہ رضاکارانہ طور پر کرتا ہے۔ پیسہ وہ جتنا چاہے لے سکتا ہے۔ لوگوں کے حساب سے مگر صرف اتنا ہی لیتا ہے جتنا اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ لوگ اسے کریک سمجھتے ہیں۔ سب اپنا کام نکالتے ہیں اور بعض اوقات یہ بھی سمجھتے ہیں کہ بے وقوف بنا لیا مگر ایسا نہیں ہے۔"

"وہ رہتا کہاں ہے؟" میں نے متاثر ہو کے کہا۔ "تم کو کہاں ملا؟"

"ایسے ہی مل گیا... جیسے ہم سب ملے..." رابعہ نے کہا۔ "گھر اس کا کوئی نہیں ہے... وہ سمندر کو اپنا گھر کہتا ہے۔"

"تم... پھر چھپا رہی ہو نا... آخر وہ آدمی کا بچہ ہے۔ مچھلی کا بچہ تو نہیں ہے کہ سمندر میں رہتا ہو۔" میں نے کہا۔

رابعہ ہنسنے لگی۔ "میں سچ بتا رہی ہوں۔ وہ کبھی ایک لانچ پہ ہوتا ہے تو کبھی دوسری پہ۔ بحری جہاز پہ کبھی ایک جگہ تو کبھی دوسری جگہ... جہاز تو آتے جاتے رہتے ہیں نا... سب جانتے ہیں اسے اور وہ کہیں بھی سو جاتا ہے، جہاں چاہے کھا لیتا ہے۔ یہ نہیں کہ شہر نہیں جاتا۔ وہ ٹاپ کلاس ہوٹلوں میں بھی نظر آتا ہے، اور پہچانا جاتا ہے۔ اس کی ایک پرانی کار بھی ہے جو کلفٹن کے ساحل پہ کھڑی رہتی ہے اور جب اسٹارٹ کرنے کا وقت آتا ہے تو اسے دھکا لگانا پڑتا ہے یا پٹرول ڈالنا پڑتا ہے۔ عجیب قلندر آدمی ہے۔ پینتالیس سال کی عمر ہے مگر جوانوں سے زیادہ جوان اور زندہ دل ہے۔"

"اب بھی تم کہتی ہو کہ میں اس کے خلاف رقابت کے جذبات نہ رکھوں۔" میں نے کہا۔ "جیسے کیا تم بھی اس کے ساتھ ساتھ پھرتی ہو؟"

وہ ہنسی۔ "ہاں... ابھی تو ایسا ہی ہے..."

"لوگ کیا سمجھتے ہیں تمھیں اور اسے ساتھ دیکھ کر...؟"

"وہی جو سمجھنا چاہیے۔" رابعہ نے کہا۔

"ایک جوانوں سے زیادہ جوان اور زندہ دل آدمی کے ساتھ ایک ایسی خوب صورت عورت ہو تو...!"

"بکواس... اس نے سب کو بتا دیا ہے کہ یہ میری بچی ہے اور میرے بیٹوں سے زیادہ قابلِ فخر ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اب میں نے تم کو اتنی تفصیل سے اس کے بارے میں بتا دیا، تم کو میری فکر بالکل نہیں کرنی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے رابعہ... لیکن بہت جلد ہم سب کراچی پہنچنے والے ہیں، ایک سرکس کے ساتھ۔" میں نے کہا۔

"سرکس میں نوکری کر لی ہے؟ چلو اچھا کیا۔" وہ ہنسنے لگی۔

"سرکس قائم کیا ہے ہم نے۔ ایم آر ایس کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے۔" میں نے کہا۔ "نورتن سرکس کمپنی، جس کی مالک ہے بی بی سی۔"

"یہ کیا فضول بات ہے۔ بی بی سی والے دعویٰ کر دیں گے۔"

"بی بی سی تین حروف ہیں۔ کسی کی اجارہ داری نہیں ہے ان پر... جانتی ہو اس کا مطلب ہے بٹ بلڈرز کارپوریشن۔ جس کے نام پر ہم نے اپنی گاڑیوں کی رجسٹریشن کرائی ہے۔ ایک ٹرک ہے اور باقی دوسری گاڑیاں۔ جب ہم کراچی میں وارد ہوں گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ لیکن اس سے پہلے بھی تم کسی بھی وقت ہمیں تلاش کرنا چاہو تو تمہارے لیے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ تم کراچی سے حیدرآباد کے راستے پر کہیں بھی نورتن سرکس کو ڈھونڈ لو گی، ہماری شہرت ہم سے آگے ہوگی۔"

"میں جب بھی یہ سب سمجھوں گی آ جاؤں گی۔" وہ بولی۔ "تمہارے بہت سے کارناموں کی تفصیل میں نے اخبار میں پڑھی۔ باقی کے لیے وقت نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ محسن اور شعلہ... غالب، دوسرے لوگ کیسے ہیں؟"

"محسن اور شعلہ کی خیریت تو محسن سے پوچھ لینا، مجھے بتاؤ نازو اور اکرام شیخ کہاں ہیں؟"

وہ بولی۔ "تمہیں نہیں معلوم؟"

میں نے کہا۔ "معلوم ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتا۔ غالب کی مت پوچھو۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کی طرف سے نازو کو وہ سب کہہ دوں جو اس کی اور میری حالت کی ایک سی کیفیت کی ترجمانی کرے۔"

رابعہ ہنسنے لگی۔ "مگر وہ مت کہنا جو میں غالب کی طرف سے تمام باتیں اظہارِ عشق کر سکوں۔ اکرام شیخ اور نازو نے پورٹ کے علاقے میں تم سب کا انتظار کیا۔ اسی انتظار میں انھوں نے پورا مہینہ گزار دیا اور پھر اچانک غائب ہو گئے۔ دوست محمد نے معلوم کیا تو پتا چلا کہ وہ کسی کارگو شپ پہ کہیں گئے ہیں۔"

"کہیں کا کیا مطلب... ہر بحری جہاز ایک مقررہ راستے پر سفر کرتا ہے اور اس کی ایک منزل ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"مال بردار جہاز کو سنگاپور جانا تھا لیکن بیچ کو ملیشیا کے..." رابعہ بولی۔ "اس پر چٹاگانگ کو بھیجا جانے والا سامان تھا۔ بھارت، سیلون اور سنگاپور کی بندرگاہ جہاں پہ اسے کچھ سامان اتارنا

تھا اور وہاں سے مزید اسباب ملنا بھی تھا۔"

"اسباب کی تفصیلات حاصل نہیں کر سکا۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

"نہیں... کچھ فہرستیں ملیں۔ کچھ نہیں ملیں۔"

"ان کمپنیوں کے نام پتے معلوم ہوئے جنھوں نے سامان منگوایا تھا؟" میں نے کہا۔

"نہیں... سب کے نہیں۔ شپنگ ایجنٹ بتاتے نہیں تھے۔ پھر بھی کلکتہ کی دو فرمیں ہیں جنھوں نے زرعی مشینری کے پرزے برآمد کیے تھے۔ اور غالباً ان کا سامان بمبئی یا کولمبو سے کلکتہ جانے کو بمبئی سے گیا تو زمینی راستے سے پہنچے گا۔ کولمبو گیا تو وہ بحری ہے۔ مجھے شک ہے کہ اکرام شیخ اور نازو انہی دو ناموں کا سراغ لگانے نکل گئے ۔۔ ایک تو زرعی مشینری کے پرزے اور پھر کلکتہ کا پتا..."

"انھوں نے بالکل ٹھیک کیا اور تمھارا خیال بھی سو فیصد درست ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "بعد میں ان کی کوئی خبر ملی؟"

"ہاں... پچھلے دن وہ کارگو شپ غرق ہو گیا۔ افواہیں تو بہت تھیں لیکن یوسف محمد نے تصدیق کی تو سب درست ثابت ہوئیں۔ جہاز پر ایک دھماکا ہوا تھا۔ جہاز کے پرخچے اڑ گئے۔ دس میل دور سے گزرنے والے ایک اطالوی جہاز کے عملے نے دھماکا بھی سنا اور شعلے بھی دیکھے۔ دھماکا رات کے وقت ہوا تھا۔ مگر ان کے پہنچنے تک کچھ نہیں بچا تھا۔ جہاز کے ٹکڑے میلوں تک بکھر گئے تھے۔ اطالوی جہاز کے عملے کا کہنا ہے کہ اس جہاز پر کسی کے زندہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"او مائی گاڈ... اگر نازو اور اکرام شیخ بھی اسی پر تھے..."

"اگر وہ اس جہاز پر تھے تو میرا خیال ہے کہ وہی دھماکے کے ذمے دار بھی ہوں گے۔" رابعہ نے کہا۔ "اور انھوں نے دھماکا کیا ہوگا تو خود یقیناً پہلے ہی نکل گئے ہوں گے... مگر یہ کوئی مصدقہ خبر نہیں۔ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں موقع ہی نہ ملا ہو... اور میں تو وہ بھی تمھاری طرح سرپھرے... سر بکف پھرنے والے۔"

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ "اس کے بعد کوئی افواہ بھی نہیں سنی تم نے؟"

"افواہیں تو گشتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس جہاز پر جو کچھ تھا وہ بحریہ نے غلطی سے راکٹ داغ دیا۔" رابعہ بولی۔ "کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اسے پاکستانی بحریہ کے تارپیڈو نے تباہ کیا۔ بہر صورت اس کارگو شپ میں اسلحے اور آتش گیر مادے کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔"

"یہ کتنی پرانی بات ہے؟"

رابعہ نے کہا۔ "پندرہ سولہ دن پہلے وہ جہاز غرق ہوا تھا مگر اخبارات میں کچھ نہیں آیا۔ یوسف محمد کا کہنا ہے کہ اسے خود انھی لوگوں نے دبا دیا جن کا مال جہاز پر تھا۔"

"یہ کیا بات ہوئی...؟"

"اس کے خیال میں وزن ہے۔" رابعہ بولی۔ "اسلحہ بھیجنے والوں نے کراچی سے دور کھلے سمندر میں پہنچنے کے بعد اپنا مال کسی لانچ پر منتقل کیا یا کسی دوسرے جہاز پر... وہ جہاز بمبئی سے روانہ ہو چکا تھا اور کولمبو کے قریب تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اصل خطرناک سامان بمبئی میں اتار کے دوسرے جہاز سے بھیج دیا گیا۔ اور بھیجنے والے جہاز کو ڈبو دیا گیا۔"

"پھر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اکرام شیخ اور نازو بمبئی میں اتر گئے ہوں۔" میں نے کہا۔

"سب کچھ ہو سکتا ہے... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اکرام شیخ اور نازو پکڑے گئے ہوں۔" رابعہ بولی۔ "وہ اپنی شناخت نہ چھپا سکے ہوں... اور یہ بھی کہ وہ اپنا کام ختم کر کے واپس پہنچنے والے ہوں... یا پہنچ گئے ہوں۔ جب تک وہ خود رابطہ قائم کر کے کچھ نہیں بتاتے ہم قیاس آرائیوں کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔"

"کیا ان کا کراچی میں کوئی پتا ٹھکانا ہے؟"

"ہے تو سہی... لیکن مجھے نہیں معلوم۔" رابعہ نے کہا۔ "وہ خود ہی یوسف محمد کے ذریعے رابطہ قائم کرتے تھے۔ اکرام شیخ کے ذریعے مجھے بمبئی کے سارے واقعات کی خبر ملتی رہی اور وہ سب کچھ معلوم ہوتا رہا جو تم کر رہے تھے۔ ایک بات میں بھول گئی تھی۔ اس کارگو شپ کی تباہی کے دوسرے یا تیسرے دن بندرگاہ کے علاقے میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک یونانی جہاز برمل اتروا جا رہا تھا کہ عملے نے ایک کریٹ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یوسف محمد یونانی جہاز کے کپتان سے کچھ کام کر رہا تھا۔ شور سن کے وہ باہر نکلا اور اس نے ہی مجھے یہ واقعہ سنایا تھا کہ کریٹ پر کسی کمپنی کا پتا تھا اور شہر کا نام تھا ایڈولیٹی۔"

"اور ملک کا نام روسی دانیا؟" میں نے کہا۔

"ہاں... یونانی کپتان نے کہا کہ یہ کیا مذاق ہے۔ جتا اس نام کا کوئی شہر ابھی تک آباد ہوا ہے اور نہ یہ کسی ملک کا نام ہے۔" رابعہ بولی۔ "وہ خود بلڈ پریشر کا مریض تھا۔ اس نے دوا کی شیشی نکال کے دکھا دی کہ یہ دیکھو ایڈولیٹی تو دوا کا نام ہے جو صرف ہائی بلڈ پریشر میں استعمال ہوتی ہے اور روسی دانیا کا مطلب بھی اس نے بتا دیا کہ روسی زبان میں 'خدا حافظ' یا الوداع کو کہتے ہیں۔ اس سے بڑی سنسنی پھیلی۔ کسٹم انٹیلی جنس والے آ گئے اور انھوں نے کریٹ پر قبضہ کر لیا۔ اسی وقت کسی چرچے سے معلوم ہوا کہ اس کریٹ نے انکشاف کیا کہ ایسے ہی بہت سے کریٹ تو کل پرسوں کسی کارگو شپ پر گئے ہیں۔ یہ غالباً وہی تھا جو غرق ہو گیا ہوگا... ابھی یہ ہنگامہ چل ہی رہا تھا کہ ایک شخص آ گیا جس نے ظاہر کیا کہ وہ ایک سپر جوتی ملک کے سفارتی عملے میں شامل ہے اور وہ جہاز یوسف ملک

تھا۔ چنانچہ کریٹ کو اس نے اپنی ملکیت قرار دیا اور اس کا قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ کسٹم انٹیلی جنس والوں کو مطمئن نہ کر سکا کہ کریٹ پر یہ فرضی ایڈریس اور یہ سرنامہ کیوں لکھا گیا تھا۔ وہ کہتا رہا کہ ہم تفتیش نہ کرنے دیں گے مگر کسٹم والوں نے کہا کہ پہلے ہم تو تفتیش کریں۔ یوسف محمد کا کہنا ہے کہ شاید کسٹم والے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کر کے کوشش کرتے رہے مگر جنجھٹ کا حل تھا اس لیے واضح احکامات نہ مل سکے۔ کسٹم والوں کو کچھ ٹیلیفون بھی ملے کہ معاملہ رفع دفع کیا جائے۔ اس کریٹ کو چھوڑ دیا جائے اور اس کا سامان بھی ضبط نہ کیا جائے مگر تصدیق پر وہ فون بھی بوگس ثابت ہوئے۔ اس نے تشکیک میں اضافہ کیا اور کسٹم انٹیلی جنس والوں نے اس شخص کو جانے نہیں دیا۔ اس کی موجودگی میں کریٹ کھولا گیا تو اس میں سے خطرناک قسم کا اسلحہ برآمد ہوا۔ گلاشائٹ، ٹی این ٹی، آتش گیر مواد اور ٹارپیڈو، بارودی سرنگیں جو زیر زمین اور سمندروں میں بچھائی جاتی ہیں۔ اور یہ معاملہ فوراً ملٹری انٹیلی جنس تک پہنچایا گیا۔ یوسف محمد کو صرف اتنا ہی معلوم ہوا کہ اس جعلی ڈپلومیٹ نے تفتیش کا آغاز ہونے سے قبل ہی خودکشی کر لی۔ اس کے دانتوں کی کسی کیوٹی میں سائنائیڈ کا پاؤڈر بھرا ہوا تھا۔"

"پھر تو شک کی بات ہی نہیں رابعہ... یہ یقینی بات ہے کہ نازو اور اکرام اسی جہاز پر چڑھ گئے جس پر باقی کریٹ لوڈ ہو گئے ہوں گے اور وہی جہاز تھا جو انھوں نے غرق کر دیا۔" میں نے کہا۔ "قیاس آرائیاں کوئی کتنی بھی کرے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کارنامہ انھی دونوں نے سر انجام دیا۔"

"تمھارا یقین کس حد تک درست ہے، یہ ان کے واپس آنے کے بعد پتا چلے گا۔" رابعہ نے کہا۔

"وہ آتے ہی تم سے رابطہ قائم کریں گے۔"

"ظاہر ہے... مجھے ان کی طرف سے کسی خبر کا شدت سے انتظار ہے۔ اور دل تو میرا ابھی گواہی دیتا ہے کہ وہ خیریت سے ہوں گے۔"

"رابعہ... وہ استاد ٹیڈی... اس کے بارے میں تو کچھ پوچھا ہی نہیں میں نے... اور تم نے بھی نہیں بتایا۔" میں نے کہا۔

"مجھے خیال آیا تھا۔" رابعہ نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن میں نے خود ہی اس کے ذکر سے گریز کیا..."

"کیوں؟" میں نے ڈوبتے دل کو سنبھالا۔

"اس کی کوئی اطلاع نہیں... میں تو قید سے نکل گئی تھی۔ مجھ سے پہلے کھیرتی فرار ہوئی تھی۔"

"ہاں... مگر وہ تو قید حیات سے ہی چھوٹ گئی۔"

"کیا... کھیرتی مر گئی؟" رابعہ نے کہا اور میں نے اس کے صدمے کو محسوس کیا۔

"ہاں... وہ شہید ہو گئی۔" میں نے دکھی لہجے میں کہا۔

"مگر کیسے؟... کیا بیلی کاپٹر سے کودتے ہی...؟"

"نہیں... اس وقت وہ زندہ رہی تھی۔ بعد میں ایک براہ راست جنگ میں وہ جلادوں کے ہاتھوں ماری گئی۔" میں نے کہا۔

"استاد ٹیڈی... اس نے میری رہائی کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی۔" میں نے کہا تھا کہ رابعہ باجی... آپ جائیں... میری خیر ہے۔ اور حالات ایسے تھے کہ شکندر کا اس کا جرم ثابت ہو گیا ہوگا۔ وہ میرے کپڑے پہن کے میری جگہ لیٹ گیا تھا اور اس نے مجھے جانی تنگ کا بتا کر جاتے ہوئے میں باہر سے تالا لگا جاؤں۔ اس نے مجھے مجبور کر دیا تھا... وہ خود کروٹ لیے پڑا رہا اور... پیچھے سے دیکھنے پر میرے کپڑوں میں وہ بالکل میری طرح لگتا تھا... وہ خود ایک محافظ کو قتل کر کے اور اس کی وردی پہن کے آیا تھا۔ وہی وردی میں نے پہنی، جیسے میں نکل گئی۔ ظاہر ہے یہ بات دیر تک چھپی نہیں رہی ہوگی۔ اس کے دونوں جرم بہت سنگین تھے۔ محافظ کو قتل کرنا اور مجھے فرار ہونے میں مدد دینا... کیا تم امید کر سکتے ہو کہ اسے معاف کر دیا گیا ہوگا؟" وہ یکلخت پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اسی وقت محسن اندر آیا۔

"رابعہ... رو کیوں رہی ہو؟" میں نے اپنے آنسو ضبط کر کے کہا۔ "اگر وہ زندہ ہے تب بھی ہمارے ساتھ ہے... اور نہیں ہے تب بھی... ہم سب دعا ہی کر سکتے ہیں... اور صبر کر سکتے ہیں... تم محسن سے بات کرو... میں بعد میں بات کروں گا۔" میں نے کہا اور رسیور محسن کو تھما کر باہر نکل گیا کیونکہ میں اس کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔ میں ٹیڈی کے لیے رونا نہیں چاہتا تھا مگر باہر آ کے میں اپنے ہی آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ گیا۔

مجھے رابعہ سے دوبارہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ابھی اس کی اور محسن کی گفتگو جاری ہی تھی کہ لائن کٹ گئی اور دوبارہ نہیں ملی۔ چوکیدار ہوش میں آنے لگا تھا۔ میں نے اسے دیوار کا سہارا دے کر بٹھا دیا۔

"معاف کرنا بھائی۔" میں نے کہا۔ "ہمارا ارادہ ہرگز تمھیں نقصان پہنچانے کا نہیں تھا۔ ہمیں مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔"

"ایسی مجبوری ہے۔" وہ آہستہ سے سر کو جھٹک کے بولا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی دھند چھائی تھی۔ "آخر کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

"کچھ نہیں... تم سے ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔" میں نے کہا۔ "ہمارے جانے کے بعد اچھی طرح دیکھ لینا... ہم یہاں سے ایک تنکا بھی اٹھا کے نہیں لے جا رہے ہیں۔ دو شیشے ضرور ٹوٹے ہیں، تو شیشے ٹوٹتے ہی رہتے ہیں۔"

"شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں۔" محسن نے کہا۔

"یہ لو ایک ہزار ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام کے ہتھیلی پر نوٹ رکھتے، "بعد میں گن لینا۔"

"لیکن... یہ کس بات کا انعام ہے؟" وہ تو جیسے شک میں ڈوبا کے بولا: "مجھے تو دال میں کالا نظر آتا ہے۔"

"تم کو تو ہر طرف کالا ہی کالا نظر آرہا ہوگا۔" محسن بولا: "کیونکہ تمھاری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ پٹی کھولو گے تو نوٹوں کے اصل رنگ کو بھی پہچان لو گے۔"

"یہ تمھارا انعام ہے۔ یا اس تکلیف کا معاوضہ جو ہمارے ہاتھوں تمھیں اٹھانی پڑی۔" میں نے کہا: "اب ہم جا رہے ہیں۔ اگر تم خواہ مخواہ ہنگامہ کرنا چاہو تو تمھاری مرضی۔ افسرِ بالا کو اور پولیس کو جسے چاہو رپورٹ کرو۔ وہ تمھیں سوالات سے پریشان کریں گے اور جواب میں تم کچھ نہیں بتا سکو گے کہ تم کو مارنے بے ہوش کرنے والے کون تھے اور کیوں آئے تھے۔ ہم نے ایک کاغذ تک ادھر سے ادھر نہیں کیا ہے۔ تم اگر بھول جاؤ کہ ہم آئے بھی تھے... تو فائدے میں رہو گے... بس پہلے کی طرح دروازے بند کر کے لائٹ بجھاؤ اور سو جاؤ۔"

"تم مجھے بے وقوف بناتے ہو۔" وہ بولا: "تم نے کچھ بھی نہیں کیا اور نہ لیا... تو پھر آئے ہی کیوں تھے... مار کے مجھ سے معافی مانگنے اور ہزار روپے دینے کے لیے؟"

"ہم نے یہ ٹیلی فون استعمال کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم مجھ سے کہتے... تو میں انکار نہ کرتا۔" وہ بولا۔

"ہمیں کیا معلوم تھا کہ تم انکار کرتے یا نہ کرتے۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ تم اندر ہو۔" محسن بولا: "باہر تو تالا تھا۔ لیکن فون..."

"اس کے علاوہ،" میں نے کہا: "ہم نہیں چاہتے تھے کہ تم ہماری گفتگو سنو... ایک ٹیلی فون کال کا کسی کو پتا نہیں چل سکتا۔ سرکاری ٹیلی فون ہے۔ تمھارا افسر سارا دن استعمال کرتا ہوگا۔ اس کو کچھ بتا کے پریشانی میں مبتلا ہونے سے کیا حاصل ہے؟"

"لیکن... تم کل پھر آؤ گے؟"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی: "نہیں بھائی... یہ ہمارا وعدہ کہ ہم پھر نہیں آئیں گے اور آئیں گے تو تمھیں جگا لیں گے۔"

"مگر پھر ہزار روپے نہیں دیں گے۔" محسن بولا۔

"چلو جی آپ کی مرضی... پانچ سو پہلے دے جانا۔" وہ بولا۔

میں حیران رہ گیا... "اللہ بھی کیا لعنت ہے۔" "ہم پانچ سو بھی نہیں دے سکتے صرف ایک ٹیلی فون کرنے کے۔"

"ہاں سو پچاس دے سکتے ہیں۔" محسن نے میرا ہاتھ دبا کے کہا: "سودا کرتے ہو؟"

اس نے جواب میں سر ہلایا اور ہم اسے وہیں چھوڑ کے باہر نکل گئے۔ لائٹ جلائے بغیر ہم نے گاڑی اسٹارٹ کی تاکہ وہ چلے

بھی تو ہماری تعریف نہ دیکھ سکے۔ اس نے ہمارے رخصت ہوتے ہی اپنی بتی آباد کر دی ہوگی کیونکہ اس کے ہاتھ آزاد تھے اور ممکن ہے وہ فوراً اٹھ کے دروازے تک بھی آیا ہو اور کھڑکیوں کے پیچھے سے جھانکتا رہا ہو۔ باہر آنے کی جرأت اس نے بہرحال نہیں کی اور ہم اندھیرے کی پناہ میں نکل گئے۔ ڈرائیور شیر علی اور غالب ٹرک کے بند دروازے کے سامنے ایک ہی چارپائی پر لیٹے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے۔ جلی اور سراج کی ماں اندر سو چکی تھیں۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ ریکارڈنگ بند کر دی گئی تھی مگر ہوٹل کھلا ہوا تھا اور پانچ چھ ٹرک بھی موجود تھے۔ اوسطاً اتنے ٹرک وہاں ہر آدھے گھنٹے میں آ جاتے تھے اور انہی کی آمد و رفت سے 'شان دار ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ' کی رونق برقرار تھی اور انہی سے 'شاہ پاکستان گیراج' کا پروپرائٹر بھی مصروف رہتا تھا۔ وہ جس ٹرک کو چیک کرتا ہوگا اس میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور نکال دیتا ہوگا۔ اچھے مکینک اس قسم کے نقص نکالنے میں ماہر ہوتے ہیں جن کا وجود نہ ہو یا کسی کو پتا نہ ہو۔

میں نے شیر علی سے کہا: "دوست... چائے تو پلواؤ۔"

"اور خود بھی پیو۔" محسن بولا۔

"مجھے تو ویسے ہی نیند نہیں آ رہی ہے۔ چائے پی کے تو ساری رات جاگتا رہوں گا۔" وہ بولا اور کھڑا ہو گیا۔

"ہاں بھائی... یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔" محسن آہ بھر کے بولا: "راتوں کو نیند نہیں آتی۔ دن میں تارے نظر آتے ہیں۔"

شیر علی ہنسنے لگا: "دراصل نئی جگہ ہے۔ ماحول بدل جائے تو ایسا ہوتا ہے۔"

"کسی کی یاد میں جاگنا بھی کوئی بری بات تو نہیں۔" غالب نے کہا: "اب ہمیں ہی دیکھ لو... ہم سب غمِ فراق میں راتوں کو جاگ جاگ کے الو ہو گئے ہیں۔"

جب شیر علی چلا گیا تو غالب نے کہا: "میں شیر علی سے اس کی سوانح حیات کے دلچسپ اور سبق آموز اقتباسات سن رہا تھا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے، جادۂ وفا اور راہِ حق و صداقت پر چلنے والوں اور ایمان سلامت رکھتے ہوئے صراطِ مستقیم پر سفر کرنے والوں کی سرگزشت ایک سی ہوتی ہے۔"

"اچھا... کیا شیر علی بھی گردشِ روزگار اور فلک کج رفتار کی روش خانہ خرابی کا شکار ہے؟" محسن بولا۔

"مشکل اردو تو غالب نے بھی چھوڑ دی تھی۔" غالب نے کہا: "ایسے الفاظ بولو گے تو اپنے ساتھ ایک ترجمہ کرنے والا بھی رکھنا پڑے گا۔ شیر علی بھی ہم میں سے ایک ہے۔ اس کی زندگی بھی

ایسی ہی آزمائشوں کی کہانی ہے جو ہم نے برداشت کی ہیں۔ بہت صاحبِ کمال شخص ہے۔ بولتا کچھ نہیں اور بتاتا کچھ نہیں مگر بے حد ذہین اور پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ہر پڑھے کے پاس پڑھا لکھا نہیں ہوتا۔ شیر علی کی تعلیم کا ڈگری سے کوئی تعلق نہیں۔ پہلے میں نے اُسے اپنی سنائی۔ ایم آر ایس کے حوالے کے بغیر بھی میری... آوارہ گردی بے حد سبق آموز ہے۔ اس نے بڑی دلچسپی سے سنی کہ ہم سلطان ہوں... میرے والدین کیا تھے... اور میں کیا بنا تھا۔"

"یہ نہیں بتایا کہ اب کیا ہوں۔"

"یہ وہ دیکھ سکتا ہے۔ اُسے عقل کا اندھا مت سمجھو۔" غالب بولا: "حیرت کا مقام یہ ہے دوستو کہ ایک قوت ہے جو ہم جیسوں کو اکٹھا کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ کوئی نادیدہ ہاتھ ایک سے دل اور ایک سے دماغ... ایک جیسے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے رکھنے والوں کو گھیر کر ایک مرکز پہ لا رہا ہے۔ اکٹھا کر رہا ہے۔"

"کیا ہم شیر علی کے سامنے بات کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا: "وہ چائے لے کر آ رہا ہے۔"

"میرے خیال میں تو کوئی حرج نہیں۔" غالب نے کہا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا: "احتیاط بہتر ہے ابھی۔"

"برتن وہ خود لے جائے گا۔" شیر علی نے کہا: "اب آپ لوگ باتیں کریں... میں سونے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"اچھا تو تم یہ چارپائی اٹھا کے اتنی دور لے جاؤ کہ ہماری بک بک کی آواز تمھارے کانوں تک نہ پہنچے۔" محسن بولا۔

"میں پیچھے دری بچھا کے سو جاؤں گا۔"

"نہیں بھائی... یہ کھلی زمین ہے... اور وہ بھی غیر آباد۔ کیڑے مکوڑے سونے نہیں دیں گے۔" میں نے کہا: "ہم تو جاگ رہے ہیں... سونا ہوگا تو اندر جا کے سو جائیں گے۔"

شیر علی چائے کے اصرار پہ چارپائی اٹھا کے لے گیا تو میں نے غالب کو والد سے ہونے والی ساری گفتگو کا احوال سنایا اور محسن نے بھی توجہ سے سنا کیونکہ جب میں اور والد بات کر رہے تھے تو اس نے کچھ ہی گفتگو سنی تھی اور جب اس کی باری آئی تھی تو اسے زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں پُرامید رہنا چاہیے۔" غالب نے میرے خاموش ہو جانے کے بعد میری اداس صورت دیکھ کر کہا: "الزام شیخ اور نازو کے بارے میں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ آسانی سے مرنے والے نہیں۔ مطلب یہ کہ خودکشی نہیں کر سکتے۔ اگر انھوں نے ناکو کو شب غرق کیا ہوگا تو خود نہیں ڈوبے ہوں گے۔ ان کے پاس عقل ہے۔"

"اور نازو ہے۔" محسن نے کہا: "جو ایک تباہ کن قوت کا نام ہے۔"

"مجھے استاد شیدی کا خیال آتا ہے تو میں اطمینان کے قریب سے دل کو تسلی نہیں دے پاتا۔" میں نے کہا: "وہ سب سے بچھڑ کے بالکل بے یار و مددگار رہ گیا تھا۔"

"کیوں یار... کیا وہ تنہا جو جانے ساتھ نکلا ہے اور بچ گیا؟" غالب نے کہا: "اس نے جانے دوست کو تنہا چھوڑ دیا ہوگا؟"

"مجھے تو رابعہ کے رویے پر حیرانی ہے... بلکہ تشویش ہے۔" محسن بولا: "آخر وہ کیوں ٹال رہی ہے؟"

"واقعی عجیب سا رویہ تھا۔" میں نے کہا: "پہلے تو کچھ بتانے پر آمادہ ہی نہ تھی کہ وہ کیوں نہیں آسکتی... یا ہم کیوں نہیں پہنچ سکتے اس کے پاس۔"

"ہوگی کوئی وجہ جو وہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔" غالب نے کہا۔

"ہمیں بھی نہیں بتانا چاہتی تھی؟" میں نے تلخی سے کہا: "ایسی کون سی وجہ ہو سکتی ہے؟"

"ہو سکتی ہے... فرض کرو اس سے ہماری پریشانی بڑھتی ہو۔ یا رابعہ سمجھتی ہو کہ ہمارا حوصلہ ڈانواں ڈول ہو جائے گا۔"

"سوال؟" میں نے تلخی سے کہا: "وہ تو اس کے کچھ نہ بتانے سے بھی ڈانواں ڈول ہی ہے... کون سا اب بچ گیا ہے۔"

"یار یہ بے ایمانی ہے۔" غالب نے کہا: "کیا تمھیں اطمینان حاصل نہیں ہوا یہ جان کر کہ وہ خیریت سے ہے؟"

"یہ میں فرض کر سکتا ہوں... مگر خود اس نے تو اس کے برعکس ہی ثابت کیا۔" میں نے کہا: "وہ خیریت سے ہوتی تو کسی مجبوری کی بات نہ کرتی۔"

"پھر بھی... پہلے جب اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں تھی۔ کوئی رابطے کی صورت تک نہ تھی خیالوں کے سوا... اور وہ بھی صرف تم دیکھ سکتے تھے یا وہم سکندر بخت۔" غالب نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا: "آج تم اس سے تقریباً مل آئے ہو۔ لوگ خط کو نصف ملاقات کہتے ہیں... یہ تو کچھ نصف سے زیادہ ہی ملاقات تھی کہ تم نے اس کی آواز سنی... کیا اس کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ... مجبور ہے؟"

"ہاں... ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے پیرول پر رہا کیا ہے۔" میں نے کہا: "وہ آزاد ہوتے ہوئے بھی آزادی کے احساس سے محروم تھی۔ اس کا لہجہ اسیر تھا مگر وہ مجھے یقین دلانا چاہتی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔ اور وہ ہنس بھی رہی تھی مگر میں اس ہنسی کے ہر رنگ کو پہچانتا ہوں... یہ ہنسی اجنبی سی لگتی تھی۔"

"تیرے خیال میں بات کیا ہو سکتی ہے؟" محسن نے پوچھا۔

www.paksociety.com

"میرا خیال ہے۔" میں نے سوچ کے کہا۔ "لاہور ایئرپورٹ پر انھوں نے اسے ایک موقع فراہم کیا۔ بالفاظ دیگر ہم یہ واضح کرسکتے ہیں کہ قیدیوں کا تبادلہ ممکن ہے۔ انھوں نے رابعہ کے زندہ اور خیریت سے ہونے کا یقین صرف اس لیے دلایا کہ سراج کی ماں کو واپس لیا جائے۔ حلاوہ کا اس میں دخل نہیں رہا۔ عاشی کے مرنے کے بعد اس پر کوئی دباؤ نہیں۔۔۔ مگر سراج یقیناً پریشان ہوگا۔ دنیا میں اگر وہ کسی سے محبت کرتا ہے یا کسی کی پروا کرتا ہے تو وہ اس کی ماں ہے اور اس نے کراچی میں کوئی ایسا انتظام کیا کہ رابعہ خود آزادانہ طور پہ مجھ سے بات کرسکے۔۔۔ مگر وہ بدستور قیدی ہے۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں کچھ قائل ہوا۔ تقریباً بیس فیصد۔"

"اب یہ تمہیں معلوم کہ انھوں نے کس طرح رابعہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنے رویے سے سب ٹھیک ہے کا اظہار کرے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے انھوں نے رابعہ کو خوفناک نتائج سے خبردار کیا ہو۔ اور سمجھا دیا ہو کہ سکندر کا مطمئن ہونا شرط ہے اور تم کو پتہ ہے اسے رویے سے اسے مطمئن کرنا ہے۔۔۔ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟" غالب نے کہا۔ "اسے گولی مار دی جائے گی۔ یا دوسری طرف سے شفاہ کی آواز اور سکندر کی آخری چیخ سننے کو ملے گی۔ یہ فضول بکواسیات ہے۔"

"کیا واہیات؟" میں نے گرم ہو کے کہا۔

"یہ مفروضہ۔ تمہاری ذہنی آوارگی۔۔۔ تم فضول سوچنے پر آمادہ ہو تو تمہیں کون روک سکتا ہے۔ مگر رابعہ سے اس قسم کی اداکاری نہیں کرائی جاسکتی۔" غالب بولا۔

"یار وہ بڑے خبیث لوگ ہیں۔ بڑے عیار۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے تو جیپ ایک دوسرے کے انتقال کر جانے کی خبر بھی بڑے مصدقہ انداز میں سنادی تھی۔ کیتھرین کو مرنے سے بہت پہلے مار دیا تھا۔ اور یقین دلا دیا تھا کہ جولی اسپتال میں چل بسی۔۔۔ اور شملا نے آکے اپنا گروہ دیا تھا تو وہ بھی نہیں رہی۔ کیا وہ سب جھوٹ نہیں تھا جسے ہم نے سچ مان لیا تھا۔ اور پھر وہ ڈراما جو رابعہ کے ساتھ کیا گیا تھا اس پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ موت واقع ہونے کا جس نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ کیا رابعہ سے نہیں کہہ سکتے کہ تمہیں چھوڑنا تو ممکن نہیں مگر سکندر سے بات کر۔۔۔ ورنہ وہ مرنے والا ہے۔"

"یہ بات ہوتی تو میں بتا دیتا۔۔۔ یا وہ دما فرماتی۔ میرے سمجھے ہے؟" محسن نے کہا۔ "تمہارے جانے میں وہ مجھ سے سوال نہ کرتی۔۔۔ اور تم بے سبب سے بات کر رہے ہو تو یوں کہتے ہو۔"

"یار تم سب تصویر کا روشن رخ دیکھنے پہ مصر ہو۔" میں نے کہا۔ "اگر کوئی رابعہ کو یقین دلا دے۔۔۔ کہ سکندر کو کینسر ہوگیا ہے مگر یہ بات اسے معلوم نہیں کہ اس کی زندگی کے دو چار مہینے ہی رہ گئے ہیں تو میرا رویہ کیا ہوگا اور رابعہ کا کیا ہوگا؟ ایسا ہی۔۔"

"میں ایک دم پچاس فیصد قائل ہوا۔" محسن بولا۔ "مگر رابعہ وکیل ہے۔ اسے آسانی سے قائل نہیں کیا جاسکتا۔"

"رابعہ پہلے ایک عورت ہے۔ ایک پاگل عورت۔۔۔ ہم سے زیادہ پاگل۔" میں نے کہا۔ "پاگل نہ ہوتی تو آج بھی بہت بڑی وکیل ہوتی۔ مگر اس نے تو سب کچھ گنوا دیا اپنے پاگل پن میں۔"

"یہ نکتہ نوٹ کیا میں نے۔۔۔ آپ نے رابعہ کو اس لیے پاگل قرار دیا کہ وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔" محسن بولا۔

"ارے بابا! ہم سب پاگل ہیں۔ محبت کا ایک روپ تو نہیں ہوتا۔ میں تو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ وکیل ہو یا جج۔۔۔ جذبات اس کی سوچ کو کمزور اور غیر منطقی کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور وہ بہت ہوشیار شکاری ہیں۔ انھوں نے رابعہ کو لاہور کے کسی ڈاکٹر کی رپورٹ، کسی بڑے پیتھولوجسٹ کی رپورٹ اور آنکولوجسٹ کی رپورٹ دکھادی ہوگی۔ شاید اس سے براہ راست بات بھی کرادی ہو۔ اور ان رپورٹوں پہ میرا نام اور میرے مرض کی نوعیت سب کچھ ہو۔ کیا رابعہ سمجھے گی کہ تم سمجھتے ہو؟"

"بالکل کہے گی۔۔۔ سو فیصد کہے گی۔" غالب نے ہوا میں مکا مارا۔

"ہاں۔۔۔ مگر بعد میں خوف اسے مغلوب کرے گا اور وہ ناسمجھ دل آدمی کو شکست دے دیتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور میں تو بات کر رہا ہوں کہ رابعہ کو قائل کرنے کا یہ ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔ ایسے بہت سے طریقے آتے ہوں گے انھیں۔۔۔ ورنہ کیا تک ہے ایک وقت آزادی اور مجبوری کا ذکر کرنے کی۔ میں اس سے کب تک بحث کرتا اور کیا سارا وقت اسی میں گزار دیتا؟"

"میں پچھتر فیصد قائل ہوا۔" محسن بولا۔ "مگر ایک آخری بات جو شک میں ڈالتی ہے وہ رابعہ کی گفتگو ہے۔ وہ پیرول پہ رہا کی جاتی تو اتنی بہت سی باتیں نہ بتاتی۔۔۔ اگر اسے قید خانے میں مشروط طور پہ موقع فراہم کیا گیا ہوتا تو وہ فون پہ اتنی آزادی سے وہ سب نہ بتاتی جو اس نے ناز اور اکرام شیخ کے بارے میں بتایا۔ کیونکہ اسے خیال نہیں آیا ہوگا کہ وہ بالکل آزاد اور محفوظ نہیں ہے۔ اس کی گفتگو شکاری بھی سن سکتے ہیں۔۔۔ اس کے علاوہ۔۔۔ دوست محمد کا کردار۔ کیا اس کے ذہن کی اختراع تھی؟ اور ایسا تھا تو تم نے ہر بات کیوں مان لی؟"

"یار ان مفروضات پہ دماغ خراب کیوں کرتے ہو۔ رابعہ

یہ بات ہوگئی۔ سب کی خیریت مل گئی۔ آج کے لیے اتنا کافی ہے۔" غالب نے جھنجلا کے کہا۔ "اب حقیقت کیا ہے یہ کل معلوم ہو جائے گا۔ ہم کوشش کریں گے معلوم کرنے کی۔"

"میں اس شخص کو تلاش کرواؤں گا۔۔۔ دوست محمد کو۔" میں نے کہا۔ "وہ فون نمبر تو ہے تمہارے پاس۔۔۔ میں تو اب سو رہا ہوں۔ صبح کے چار بج رہے ہیں یار۔"

"ابھی بہت کام باقی ہیں۔ آگے جانے سے پہلے سب تیاری کرنی ہے اور بہت سے لوگوں کا انتخاب کرنا ہے۔۔۔ بہت کچھ خریدنا ہے۔" محسن بولا۔ "اور یہ سارا کام جلد از جلد ختم کرنا ہے۔۔۔ ہم سارا دن اور اکثر راتوں کو خوار پھرتے ہیں۔ آرام کے لیے بالکل وقت نہیں نکالتے۔۔۔ ایسے کب تک چل سکتا ہے۔ ہم سب کی صحت متاثر ہو رہی ہے۔"

"پھر کیا کریں۔۔۔ سارے کام چھوڑ کے سوتے رہیں؟"

"نہیں۔۔۔ مگر کام بھی بہت اچھا کرتا ہے۔۔۔ آدمی جب کام کرنے کے قابل ہو۔" محسن بولا۔

"اچھا تم لوگ سو جاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ میں نہیں سو سکتا۔ حالانکہ میں سونا چاہتا ہوں ورنہ میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔"

"یہ تو ہم بھی جانتا ہوں۔" محسن بولا۔ "اور اسی لیے میں نے یہ گولیاں خرید لی تھیں۔۔۔ ابھی فارمیسی سے باہر آ گئے۔"

"خواب آور گولیاں۔۔۔ بغیر نسخے کے مل گئیں؟"

"سب ملتی ہے دنیا میں بچے۔۔۔ مانگ فقیر سے کیا مانگتا ہے۔ بس دل کا قرار مت مانگنا۔۔۔ وہ اس فقیر کے کشکول میں بھی نہیں ہے۔" محسن بولا۔

خواب آور گولیوں نے صرف اتنا اثر کیا کہ میں آنکھیں بند کرنے کے قابل ہو گیا۔ اسے نیم غنودگی بھی نہیں کہا جاسکتا۔ چند سیکنڈ کے لیے نیند کا ایک جھونکا آتا تھا تو رابعہ کی آواز سنائی دینے لگتی تھی۔۔۔ سکندر۔۔۔ میں کیا کروں؟۔۔۔ کیسے آؤں تمہارے پاس۔۔۔ پہلی بار چونک کے اٹھا اور پھر لیٹ گیا۔ دوسری بار پھر وہ میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔۔۔ میں آنا چاہتی ہوں سکندر۔۔۔ مجھے بلاؤ اپنے پاس۔ تیسری بار اس نے کہا۔۔۔ کیا تم میں ہمت نہیں ہے کہ مجھے تلاش کر سکو۔ ساری بھول بھلیوں سے گزر کے مجھ تک پہنچ سکو۔ میں کھو گئی ہوں سکندر۔۔۔ تم میری آواز تو سن سکتے ہو نا؟ اسی آواز کے سہارے چلے آؤ۔

میں پھر اٹھا۔۔۔ محسن اور غالب ٹرپل بیڈ کے فرش پہ بے خبر سو رہے تھے۔ میں نے آہستہ آہستہ محسن کی واسکٹ کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

محسن ایک دم اٹھ بیٹھا اور اس نے میری کلائی پکڑ لی۔ "چوری؟ پوری شیشی کھا کے ہمیشہ کے لیے سونا چاہتا ہے؟ میں اسی لیے جاگ رہا تھا۔"

"ایک گولی اور دے مجھے۔" میں نے کہا۔ "ایسے تو نہ میں سو سکتا ہوں اور نہ جاگ سکتا ہوں۔"

"کیمسٹ نے کہا تھا کہ دو گولیاں اشد ضرورت میں بے ضرر ہیں۔" محسن بولا۔ "اور میرے ساتھ اس نے بھی دوسری گولی کھالی۔" محسن نے غالب کی طرف رشک سے دیکھا۔ "کیسے مزے سے سو رہا ہے۔ اس آدمی کو دل کا سکون حاصل ہے۔"

"اس کا عشق بے طلب ہے۔۔۔ اور سچا ہے۔" میں نے کہا۔

"کچھ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں۔" محسن بولا۔ "جذبات کے کنٹرول کا سوئچ رکھتے ہیں۔۔۔ آن کیا تو مجسم عشق۔۔۔ آف کیا تو مجسم عقل۔"

"ناحق ہم مجبوروں پہ یہ تہمت ہے مختاری کی۔" غالب نے آنکھیں کھول کے اور ایک ہاتھ پھیلا کے کہا۔ "اس کے نام پہ ایک گولی مجھے بھی دو۔"

"جس کے نام پہ مرتے کم ہو ملتے زیادہ جاتے ہو۔" محسن بولا۔ "تم کو بھی آج نیند نہیں آرہی ہے؟"

"ہاں یار۔۔۔ آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے۔" غالب نے کہا۔

تین گھنٹے کے بعد کسی نے مجھے جھنجوڑنا شروع کیا تو میری نیند اتنی گہری تھی کہ آنکھیں کھولنے اور اٹھ کر بیٹھ جانے کے بعد بھی میں پوری طرح نہیں جاگا تھا۔

"یار غضب خدا کا! اتنی کوشش سے تو مردے بھی اٹھ جاتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"کیا قیامت آگئی ہے؟" میں نے جماہی لے کر کہا۔ "جو آپ صور اسرافیل کی طرح میرے کان میں پھونک رہے ہیں۔"

غالب نے ایک لات محسن کے رسید کی۔ "پھر سو گیا لاتوں کے بھوت۔"

"لاحول ولا قوة۔" محسن ہڑبڑا کے اٹھا۔ "کیا مصیبت ہے یار؟"

"کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صرف سات بجے ہیں۔" محسن نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "اور وہ بھی صبح کے سات۔۔۔ یہ بھی کوئی وقت ہے شرفا کے اٹھنے کا۔۔۔"

"اور یوں اٹھائے جانے کا؟" [illegible] نے کہا اور پھر سونے کی کوشش کی۔ غالب نے پانی کا ایک گلاس [illegible]

"ایسے نہیں اٹھو گے تو پھر اللہ تمہیں اٹھالے گا۔" غالب

نے کہا۔

"یار یہ کیا ہے... جو یہ آپ یادشتی ہو رہی ہے؟" محسن نے کہا۔ جولی اندر آتے ہی ہنسی۔ "شکر ہے صبر یا بھائی... یہ لیں کافی۔" اس نے میرے ہاتھ میں ایک مگ تھما دیا۔

"بلیک کافی!" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"مگر گرم بلیک کافی؟" محسن نے کہا۔ "یا خدا ڈیئر جولی؟"

"کل جب آپ لوگ گئے ہوئے تھے تو میں نے شیر علی سے کچھ سامان منگوا لیا تھا۔" جولی نے کہا اور تیسرا مگ غالب کو تھما دیا۔

"اوہ جولی... یو آر این اینجل۔" میں نے کہا۔

"تم تو فلورنس نائٹ انگیل ہو۔" محسن بولا۔

"تم فاطمہ بنت عبداللہ ہو...!" غالب نے کہا۔

جولی کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا۔ "وہ کون تھی بھائی؟"

"وہ مجاہدوں کو میدان جنگ میں پانی پلاتی تھی۔" غالب بولا۔

"جیسے تم مجاہدوں کو بلیک کافی پلا رہی ہو۔" میں نے تائید میں سر ہلایا۔

"اس پر اقبال نے نظم لکھی تھی۔ تم پر میں لکھوں گا۔" غالب بولا۔

جولی کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ میں نے اس کمرے کی طرف دیکھا جہاں سراج کی ماں تھی... وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ جولی پھر باہر چلی گئی۔

"اسے شیر علی لے گیا ہے۔" غالب نے میری سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔ "گاڑی میں۔"

"کہاں لے گیا ہے...؟"

"کہیں نہیں... قصبہ مانکو دیس میں منتقل کر دیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "جلدی سے کافی ختم کرو... پھر ہمیں چلنا ہے۔"

"... کیا بات ہے آخر... وہ ٹھیک تو ہے نا...؟" میں بہت سے اندیشوں میں گھر گیا۔ "خدانخواستہ قید میں وہ بیمار تو نہیں ہو گئی... مر تو نہیں گئی... اس نے اعصابی دباؤ میں خودکشی تو نہیں کر لی؟"

"یہاں حالات سے فوراً نکلنا ہے۔" غالب نے کہا۔

"سب کو؟" محسن نے پوچھا۔

"صرف شیر علی اور جولی یہاں رہیں گے۔" غالب نے کہا۔ "رات کوشتاوار ہوٹل میں ایک ٹرک ڈرائیور کا قتل ہو گیا ہے۔ ابھی تک پولیس نہیں پہنچی ہے مگر ہمیں پولیس کے سامنے سے بھی دور رہنا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ پولیس کو ہمارا سایہ تک نہ ملے۔"

"تمہیں کس نے بتایا...؟"

"شیر علی نے۔" غالب نے کہا۔ اسی وقت شیر علی اندر آیا۔

"پولیس کی ایک جیپ آ گئی ہے۔" شیر علی کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ "آپ لوگ جاتے کیوں نہیں...؟"

"تم تو ہم سے بھی زیادہ پریشان ہو شیر علی۔" میں نے کہا۔

"سکندر رضا صاحب... آپ تو سمجھتے ہیں ان کی سرشت کو۔" شیر علی نے روانی میں کہا۔ "اصل مجرم کو پکڑنے کے بجائے کسی کو بھی پکڑ سکتے ہیں اور تفتیش کے بہانے یہاں بھی گھس جائیں تو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔"

میں دم بخود بیٹھا ہوا شیر علی کو دیکھ رہا تھا۔ محسن اور غالب بھی شیر علی کی بات سن کر سکتے میں آ گئے تھے۔

"شیر علی...!" میں اٹھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ "تمہیں یہ نام کس نے بتایا؟"

"جی؟... آپ کا نام؟" وہ حیران ہوا۔

"ہاں... تم نے ابھی میرا اصل نام لیا تھا...!" میں نے کہا۔

"میں نے لیا تھا؟" وہ اعتراف جرم کے انداز میں سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "دیکھیے جناب... مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کون ہیں... پہلے مجھے شک ہوا تھا آپ سب کے حلیے سے۔ پھر میں نے معلوم کر لیا۔ میرا تجسس میں مبتلا ہو جانا ایک قدرتی بات تھی۔ مگر آپ ایک مسلمان... ایک پٹھان اور ایک مرد کی زبان پر بھروسا رکھیں۔ وقت آیا تو آپ دیکھیں گے کہ شیر علی آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کے پیچھے بھی ہے تو پیٹھ میں خنجر گھونپنے کے لیے نہیں... آپ کو بچانے کے لیے۔ ویسے تو خطرہ سامنے آیا تو شیر علی آپ سے آگے ہو گا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "شیر علی... ہم اعتماد کے بہت فریب کھا چکے ہیں... اور تم جانتے ہو کہ سانپ کا ڈسا ہوا رسی سے بھی ڈرتا ہے۔ مگر اب جب تم کو سب پتا چل گیا ہے... تو ٹھیک ہے... ہم اعتبار کرنے کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔"

"یہ ہم بعد میں پوچھیں گے کہ تم کتنا جانتے ہو ہمارے متعلق۔" غالب نے کہا۔ "شکر کیا تم یہ جانتے ہو کہ ہم مرنے سے نہیں ڈرتے چنانچہ مارنے میں بھی پس و پیش نہیں کرتے۔"

"آستین کا سانپ زیادہ خطرناک ہوتا ہے شیر علی۔" میں نے کہا۔

"ہوتا تو ہے مگر کیا آپ انھیں نہیں پہچانتے۔" شیر علی نے کہا۔ "انھی کا سر تو کچلا ہے جی آپ لوگ نے۔"

"ہم لوگ کون؟... تم ہمیں کس کے نام سے واقف ہو... اور جو کچھ تمہیں معلوم ہوا ہے کس سے معلوم ہوا ہے؟" غالب نے کہا۔

"دیکھیے... یہ سب آپ بعد میں بھی پوچھ سکتے ہیں مجھ سے... ابھی تو آپ نکلنے کی فکر کریں۔ بہتر ہو کہ وہ خواہ مخواہ ادھر آ جائیں۔ آپ کا یہاں ٹھہرنا سب کو خطرہ ہو سکتا ہے۔" شیر علی نے کہا۔

"اگر ہمارے جانے کے بعد وہ آئے اور تم سے پوچھ گچھ کی تو...؟" میں نے کہا۔

"آپ بتا دیں کیا کہنا ہے۔" شیر علی نے کہا۔ "یا مجھ پر چھوڑ دیں... میں انھیں مطمئن کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے... تم جو چاہو کہہ دینا۔" میں نے کہا۔ "[illegible] مگر جیپ وغیرہ کا ذکر مت کرنا۔"

چند منٹ کے بعد میں اور محسن کود کے باہر نکلے۔ غالب ہم سے پہلے جا چکا تھا۔ ہم نے اسے لینڈ روور کے پیچھے جولی سے باتیں کرتا پایا۔ جولی نے ہماری طرف دیکھا اور نہ جانے غالب کی کس بات پر اقرار میں سر ہلایا۔ سڑک کے دوسری جانب پولیس نے اپنے روایتی انداز میں ڈیرا ڈال لیا تھا۔ دو چارپائیوں کے درمیان ایک میز لگا کر انسپکٹر یا اس سے کم عہدے کا ایک افسر بیٹھ گیا تھا۔ چار پولیس والے اس کے دونوں جانب چارپائیوں پر رائفلیں لیے بیٹھے تھے اور باقی مجمع تھوڑے دور ایک ہجوم کی صورت میں کچھ سہما ہوا اور وحشت زدہ سا کھڑا تھا۔ ایک ٹرک باقی چار ٹرکوں سے الگ کھڑا ہوا تھا اور وہاں بھی دو پولیس والے خاصی بے دلی سے پہرا دینے لگے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ واردات اسی ٹرک کے ڈرائیور کے ساتھ ہوئی تھی چنانچہ دوسرے ٹرک والوں نے خود ہی اپنے ٹرک جائے واردات سے دور لے جا کر روکے تھے ورنہ اس سے پہلے وہ ایک ہی قطار میں کھڑے ہوتے جاتے تھے۔

"قتل ٹرک کے اندر ہوا ہے یا باہر...؟" میں نے چلتے چلتے شیر علی سے پوچھا۔

"اندر ہی جناب۔" شیر علی نے کہا۔ "لاش تو میں نے بھی دیکھی۔"

"کیا تم بھی گئے تھے تفتیش کے لیے؟" محسن نے گاڑی میں بیٹھ کے کہا۔

"تفتیش کیا جی... شور ہوا تو سب ہی اکٹھے ہو گئے تھے۔ میں بھی چلا گیا تھا۔" شیر علی نے کہا۔

"اور کیا معلوم ہوا؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں... ڈرائیور کا نام سب جانتے تھے لوگ... ہمارے علاقے کا آدمی تھا اس لیے میں رک گیا تو شیرہ کا کہتے تھے بادشاہ گل تھا سب جانتے تھے اسے کہ اچھا آدمی ہے۔ اسے کسی نے ٹرک میں ہی مار دیا... وہ کچھ لینے گیا تھا... چائے پیتے پیتے جب لوٹ کر نہیں آیا بہت دیر تک تو کوئی دیکھنے گیا۔ وہ ڈرائیور کیبن میں الٹا پڑا ہوا تھا اور اس کے سینے میں کسی نے ایک برف توڑنے والا نوکیلا سوا گھونپ دیا تھا۔" شیر علی نے کہا۔

"شیر علی... کیا ٹرک کا نمبر پتا نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

شیر علی چونکا۔ "جی... مگر آپ نے کیسے دیکھ لیا!"

"میری نظر بہت تیز ہے شیر علی۔" میں نے ٹرک کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں سے نمبر پڑھ رہا ہوں... وہ ٹرک ہے نا جو الگ کھڑا ہے۔"

ظاہر ہے شیر علی کے لیے میری بات پر یقین کرنا دشوار تھا کیونکہ اتنے فاصلے سے ٹرک کی نمبر پلیٹ تک صاف نظر آتی تھی۔

"اب تم ایسا کرو۔" میں نے کہا۔ "کہ ہماری واپسی تک اسی ٹرک کے بارے میں اور ٹرک ڈرائیور کے بارے میں جتنی معلومات حاصل کر سکتے ہو... خود کو محفوظ رکھتے ہوئے ضرور حاصل کرو۔"

"خود کو محفوظ رکھنا پہلی شرط ہے کیونکہ تمہارے ساتھ ہی ہم بھی غیر محفوظ ہونا نہیں چاہتے۔" محسن نے کہا اور پھر گاڑی سے سر نکالا۔ "یہ غالب کیوں دیر کر رہا ہے؟"

"بڑی لمبی الوداعی ملاقات ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "آنا جانا باقی ہونے کی کیا ضرورت ہے... ہم کوئی مرنے پہ تو نہیں جا رہے۔"

"غالب کے گھوڑے!" محسن نے آواز دی اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ "ہم جا رہے ہیں۔"

غالب نے جواب میں کہا۔ "جاؤ۔" مگر پھر دوڑ کے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ وہ جولی کو ہدایات دے رہا تھا اور اس کے بعد ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنا رہا تھا۔ جولی یہ سب کچھ جاننے کے لیے بہت بے چین تھی۔ گاڑی کے اندر سب سے پیچھے والی سیٹ پر سراج کی ماں اپنی آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ ہم نے آپس میں بات کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہماری گفتگو کا ایک لفظ بھی اس کے کانوں تک نہ پہنچے مگر یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ وہ اپنا یقین کی حیثیت میں بھی کوئی رائے قائم نہیں کر سکتی... وہ کھلی آنکھوں سے بھی بہت کچھ دیکھ رہی تھی اور ہمارے ساتھ ایک خاموش گواہ کی حیثیت سے سفر کر رہی تھی۔ اس نے مانکو ویس بھی دیکھی تھی اور ترکیب بھی دیکھا تھا۔ ہم اسے غیر معینہ عرصے کے لیے اسیری میں نہیں رکھ سکتے تھے... وہ بوڑھی عورت تھی اور اگرچہ اب تک ہم نے اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دی تھی مگر اپنی تنہائی کا اور قید میں ہونے کا خیال ہی کیا تکلیف دہ نہ تھا۔ وہ گھر سے اور بیٹے سے دور تھی اور اس نے بیٹے کے بعد عاشی کو مرتے دیکھا تھا اور جیپ میں اپنی پوتی کو ٹھکانے لگتے دیکھا تھا۔ بے شک اس نے حالات کے خلاف اپنی جدوجہد کو بے مصرف سمجھتے ہوئے خود کو تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔ اس نے حالات سے تعاون اور بے نیازی کا انداز اختیار کر لیا تھا۔ بظاہر وہ سادہ دل تھی اور آنکھیں ہی نہیں کان بھی بند کر لیے تھے مگر اس سے ہمارا مطمئن ہو جانا غلط ہوتا کیونکہ وہ بہرحال سراج کی ماں تھی اور سراج سے بڑا دشمن ہمارا کوئی نہیں تھا۔ خود سراج کی ماں کو بیٹے کے مذموم کاروبار کی حقیقت کا علم ہونے سے بہت زیادہ فرق اس لیے نہیں پڑتا تھا کہ وہ پہلے ایک ماں تھی اور ہر ماں کی طرح ممتا کے جذبات دوسرے تمام جذبات پر حاوی تھے۔ وہ بیٹے کی دشمن (اور ہماری مددگار) نہیں رہ سکتی تھی، خصوصاً ان حالات میں کہ ہم نے اس کے ساتھ اس کے گھر میں بھی اچھا سلوک کیا تھا اور گھر سے باہر اس کے سامنے کوئی قابل تعریف کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے نقطہ نظر سے سوچنے میں حق بجانب تھی۔ ایک عورت کو جو

ہو سکے اس حقیقے تک پہنچ چکی ہو کسی بھی جنگ کے سیاسی یا معاشی پہلو کو سمجھنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ہر معاملے کو اخلاقی یا مذہبی کسوٹی پر ہی پرکھ سکتی تھی چنانچہ اس سے پوچھا جاتا تو وہ کہتی کیا اچھا ہم بھی نہیں کر رہے ہیں۔ اس کا بیٹا بھی بگڑا اور ہم بھی بگڑے تو جو فساد رہ جاری ہو... بیٹا مخلص اور بعید از قیاس تھا۔ آئندہ بھی عملی طور پر وہ جاسوسے خلاف جنگ میں براہ راست شریک نہیں ہوگی۔ مگر اپنے بیٹے کی یوں مدد ضرور کرے گی کہ اسے جاسوسے متعلق تمام معلومات بہم پہنچائے گی۔ بیٹا خود ایک بہتر پولیس افسر تھا اور تفتیش کے سارے طریقے جانتا تھا۔ وہ ماں سے خود ایسے سوالات کر سکتا تھا جن کے جواب میں وہ بتا سکے کہ جاسوسے ساتھ رہ کے اس نے کیا دیکھا اور کیا سنا۔

میں انھی خیالات میں غلطاں تھا کہ محسن نے مجھے ٹوکا۔

"کیا سوچ رہا ہے؟"

"میں...؟ یہی کہ اب کیا کرنا چاہیے" میں نے چونک کر کہا۔

"سراج اور ولادار سے آخری بات کر لینی چاہیے۔" غالب نے کہا۔ "جلاوجہ اس بڑھیا کو ساتھ لیے پھرنا کوئی عقلمندی نہیں۔"

"ہاں۔ عاشی زندہ رہتی تو وادو سے بھی بات کی جا سکتی تھی۔" محسن بولا۔ "اب تو سراج ہی رہ گیا ہے۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھا ہوگا۔"

"اس نے لاہور کا چپہ چپہ چھان مارا ہوگا۔ اندرون باہر کے سارے راستوں کی ناکابندی کی ہوگی۔ مگر ابھی تک ناکامی اور مایوسی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا ہے۔ وہ سخت جھنجلاہٹ اور بے بسی کا شکار ہوگا۔"

"اور یہی وقت ہے کہ ہم اس سے سودا کرلیں۔" غالب بولا۔

"سودا کس کا؟" محسن بولا۔

"اب تو صرف ٹیڈی ہی رہ گیا ہے۔ جس کے بارے میں وہ بتا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں... زاہد تو نکل گئی تھی۔ ناتو اور اکرام شیخ کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔" محسن بولا۔ "مگر ٹیڈی ان کے قبضے میں تھا۔ اس کے بارے میں سراج ضرور جانتا ہوگا۔ اگر وہ زندہ ہے"

"وہ زندہ ہے... اگر کا کیا سوال۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"ہاں... وہ زندہ ہے۔" محسن بولا۔ "میں بھی اس یقین سے محروم نہیں ہوا لیکن میں تصویر کے دوسرے رخ سے نظریں نہیں چرا سکتا۔ اگر وہ زندہ ہے تو سیدھی صاف بات یہ ہوگی کہ ٹیڈی کو چھوڑ دو۔ جس دن وہ ہمارے پاس پہنچ جائے گا اسی دن ہم سراج کی ماں کو گھر پہنچا دیں گے۔"

"کیا وہ انکار کرے گا؟" غالب نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" میں نے کہا۔

"مطلب یہ کہ وہ ٹیڈی کو پہلے چھوڑ دے گا۔ یا چھوڑا جائے گا ہمارے وعدے پر... وہ اعتبار کرلے گا..." غالب بولا۔ "اس کے دل میں خیال نہیں آئے گا کہ بعد میں ہم وعدے سے پھر جائیں گے تو وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

"ہمزاد... ایک بات اس جنگ میں کھل کر سامنے آ چکی ہے... اب تک دونوں فریق ایک دوسرے کے متعلق اچھی طرح جان چکے ہیں۔"

"کیا جان چکے ہیں... کہ کون زیادہ طاقتور ہے؟"

"نہیں... طاقت کا توازن تو ادھر سے ادھر ہوتا رہتا ہے اور غالباً ہماری طرح وہ بھی پُر امید ہیں اور شکست کا خیال ابھی تو وہ نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں بات کر رہا تھا متحارب فریقوں کے مزاج کی۔ ان کی فطرت اور طریقہ جنگ کی... جیسے ہم جانتے ہیں کہ وہ [illegible] جنگ میں انسانیت کے تقاضے کسی حد تک پیچھے چھوڑ سکتے ہیں۔ ایسے ہی ہم نے جنگ کے کردار سے ثابت کر دیا ہے کہ ہم اخلاقی اقدار کی پامالی میں ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ سراج کو ہماری طرف سے یہ اطمینان یقیناً حاصل ہوگا کہ ہم اس کی ماں کے ساتھ بدسلوکی کریں گے اور نہ اس بوڑھی عورت کو اس کے بیٹے کے گناہوں کی سزا دیں گے۔ دشمن ہونے کے باوجود وہ ہمارے بہادر... باضمیر یا با اصول ہونے کا اعتراف کرتا ہے۔ سب کے سامنے نہ سہی... اپنے آپ سے وہ یہ بات بے جھجک جانتا ہے کہ ہم اس کی ماں پر تشدد کریں گے نہ اسے قتل کرنے کا تو سوال ہی نہیں۔ ایک نہ ایک دن اس کی ماں واپس آ جائے گی۔ لیکن اپنی اور ماں کی ذہنی اذیت کا وقفہ کم کرنے کے لیے وہ ہمارا مطالبہ مان لے گا۔"

"یہ تو بڑا اچھا ہو... اگر وہ ٹیڈی کو واپس کر دے۔" غالب بولا

"چلو پھر پہلے تو یہی معاملہ ختم کریں۔" محسن بولا۔ "وقت کہتے ہیں واپس نہیں آتا ہے۔"

"یہ واپس جانے کی جلدی کیوں؟"

"مجھے اس ٹرک ڈرائیور کے قتل سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے میں دست قاتل کو اس کے لہو کی سرخی سے پہچاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

محسن بولا: "ہاں... وہ کیا ہے کہ جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔"

"پولیس تو بس زبان خنجر کی خاموشی چاہے گی... مگر لہو کی فغاں کیا کہتی ہے یہ ہم جاننا چاہیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ واردات ایک پس منظر رکھتی ہے۔"

"سراج سے بات کیسے ہوگی؟" غالب نے کہا۔ "ابھی تو ہمی مواصلاتی رابطے ہیں... ڈائریکٹ ڈائلنگ سے کر لیجیے۔"

میں بول پڑا: "محفوظ طریقہ تو وہی ہے... مگر میں سوچ رہا ہوں کہ انھیں آزمانا چاہیے جو ہمارے مشن کے لیے نیک جذبات کا اظہار کر چکے ہیں۔ وہ عملاً بھی کچھ کر سکتے ہیں یا نہیں۔"

"ایسے تو بہت سے لوگ ملے ہیں۔"

"ہاں... ان میں سب سے پہلے ایک ریٹائرڈ [illegible] ملا تھا۔ خلیفہ پنڈت اور ایک آرمی کا ڈاکٹر تھا میجر سلطان۔" میں نے کہا۔

"مجید اور محسن کو واپس جانا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ٹرک کے پیچھے جانا پڑے۔ میں پنڈت خلیفہ کے ہاتھوں کی کاریگری کا قائل ہوں... میں اس کے نقصانات کی تھوڑی بہت تلافی بھی کرنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ وہ ہمیں ایک نیا ناقابل شناخت حلیہ اور چہرہ عطا کر سکے۔"

"باجماعت اور [illegible] ہیڈ کوارٹر کے گرد و نواح میں کشتی ہو کے جانا کوئی عقلمندی نہیں۔" غالب نے کہا۔

"وہاں تو میں اور محسن جائیں گے" میں نے کہا۔ "پہلے تو سراج سے ہی بات کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ میں میجر سلطان کے گھر سے فون کروں۔"

"کیا فائدہ۔ کال ٹریس ہو جائے گی۔" غالب نے کہا۔

"میجر سلطان خواہ مخواہ خوف زدہ ہو جائے گا۔" محسن نے غالب کی تائید کی۔

"اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کی پوزیشن بہت محفوظ ہے۔"

"محفوظ ہے تو اسے غیر محفوظ کرنا ضروری ہے؟" غالب نے کہا۔ "اس کے علاوہ میجر سلطان اس وقت گھر پر نہیں ڈیوٹی پر ہوگا۔"

غالب کی اس بات نے میرے ارادے کو بدل دیا۔ میں مجبور ہو گیا کہ پھر کسی پبلک فون بوتھ کو تلاش کروں... جب بالآخر ایک بوتھ نظر آیا تو میں نے محسن سے کہا کہ وہ گاڑی آگے لے جائے اور میرا انتظار کرے۔ لیکن اس نے گاڑی غالب کے حوالے کی اور خود میرے ساتھ ہی اتر گیا۔ غالب کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ تو جڑ گئی تھی مگر ڈاکٹر سلامت نے کچھ عرصہ احتیاط کی تاکید کی تھی۔ اسے [illegible] کی ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھانا خلاف احتیاط تھا لیکن ایک خالی سڑک پر سو دو سو گز کی ڈرائیونگ میں زیادہ خطرہ نہیں تھا۔

میں کیبن میں چلا گیا اور محسن پیچھے کھڑا ہو گیا۔ ابھی میں نے نمبر جوڑے ہی تھے کہ ایک کوٹھی کے گیٹ سے ایک کار نکلی اور سیدھی ہماری طرف آئی۔ بے اختیار میری نظر اس [illegible] رنگ کی ٹویوٹا کرولا پر گئی اور اس کا نمبر دیکھتے ہی ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ یہ وہی گاڑی تھی جو میں نے استاد بندو کے پاس دیکھی تھی مگر اس وقت گاڑی میں وہ خود نہیں تھا۔ گاڑی کو محسن نے بھی پہچان لیا تھا اور جب گاڑی اس کے سامنے پہنچ کے رکی

گئی تو قدرتی طور پر وہ چوکنا ہو گیا اور مجھے دیکھ کے میں بھی کسی ناخوشگوار صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔

گاڑی میں سے گینڈے اور گوریلے کی نسلی صفات رکھنے والا ایک دیو قامت شخص برآمد ہوا۔ وہ ساڑھے چھ فٹ قد کے ساتھ ساڑھے چھ سو پونڈ وزن رکھتا تھا [illegible] کے ساتھ کار سے نکلا تھا۔ اس کے سر پر خشخشی بال تھے۔ جو بہت ہموار تراشی گئی دوب کی گھاس کی طرح لگتے تھے۔ اگر میں سر کو بالکل صاف کرا دیتا تو شاید ایک ڈیڑھ ماہ بعد میرے سر کی کیفیت بھی ایسی ہی نظر آتی۔ لیکن اس کے چہرے پر سیاہ و سفید بالوں کی داڑھی بہت پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے بند گول گلے کا کرتہ اور ٹخنوں سے اوپر ختم ہو جانے والی شلوار پہن رکھی تھی۔ کرتہ شلوار دونوں میں کورا لٹھا استعمال ہوا تھا۔ اس کے کندھے پر ایک دستر خوان نما رومال پڑا ہوا تھا اور وہ چپل پہنے ہوئے تھا۔ اس نے موٹے بھاری بھرکم شیشوں اور فریم والی عینک بھی لگا رکھی تھی جس کے پیچھے سے اس کی اصل نسل آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

دائیں ہاتھ سے گز بھر کی تسبیح کے موٹے موٹے دانے گراتے ہوئے اس نے بڑی قرأت کے ساتھ کہا: "میاں السلام علیکم... ہم ابھی کہہ رہے تھے... حالانکہ بزرگ ہم ہیں۔"

"قبلہ بزرگوار..." میں نے کہا۔ "سلام آنے والے پر فرض ہے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔"

"[illegible]... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔" محسن نے اپنی انداز میں قرأت کے ساتھ کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

بزرگوار کے ماتھے پر ناگواری کی شکنوں کا جال گہرا ہو گیا۔ ان کی انگلیاں تسبیح کے دانوں کو زیادہ تیزی سے گردش دینے لگیں...

"پوچھنا یہ تھا کہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"ہم اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ اس [illegible] جواب کے سوا میں ان سے کیا کہتا۔

"ماشاءاللہ۔" وہ داڑھی پر ہاتھ پھیر کے بولا۔ "وہ دونوں بھی بڑے فرض شناس تھے... اور بے حد خلیق اور خدمت گزار۔"

"کون دونوں...؟" میں نے کہا۔

"وہی میاں جن کو بد خواہوں کی شکایات پر معطل کر دیا گیا۔" وہ بولے۔ "سب سے صاحب سلامت رکھتے تھے اور سب کے کام آتے تھے۔"

"انشاءاللہ آپ ہمیں بھی ویسا ہی پائیں گے۔" میں نے ٹالنے کے لیے کہا۔

اس نے میری بات کا غلط مطلب نکالا اور تعریفی انداز میں سر ہلانے لگا۔ "بس میاں یہی ہونا بھی چاہیے۔ تعلق خدا کے ساتھ حسن سلوک اور بندگان خدا کے ساتھ نیکی۔ جس نے حقوق العباد کو

فراموش کیا گویا اس نے مقصد حیات کو فراموش کیا۔ وہ کیا خوب فرمایا ہے کسی نے کہ۔ درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو۔۔۔"

"ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرو بیاں۔" محسن نے سر ہلا کے کہا۔

"سبحان اللہ!" بزرگوار نے کہا۔ "بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کے اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہی چلتا رہے گا۔"

"جی ؟۔۔۔ کیا چلتا رہے گا۔۔۔؟" میں نے کوفت کے ساتھ کہا۔

"وہ۔۔۔ تمہارا دل یا بھی کا جذبہ۔" وہ بولے۔ "تم جیسے کام آ جاؤ گے تو ہم سے فیض پاؤ گے۔۔۔ شکایت کیوں ہو۔۔۔؟"

"دیکھیے۔۔۔ اگر آپ کے فون کی لائن میں خرابی ہے۔۔۔"

"ارے نہیں میاں۔۔۔ فون تو الحمدللہ ٹھیک ہے۔۔۔ خرابی دلوں میں نیت کے کھوٹ سے پیدا ہوتی ہے۔" وہ بولے۔ "طمع اور حرص سے۔۔۔"

"بجا ارشاد۔۔۔ لیکن اس وعظ و نصیحت کا یہ کون سا موقع ہے۔" میں نے جھلا کے کہا۔

"وہ۔۔۔ دراصل میں نے مناسب سمجھا کہ معاملات طے کر لیے جائیں۔۔۔ اور اس حسن انتظام میں خلل واقع نہ ہو۔" وہ بولے۔ "تمہیں کی غلطی۔۔۔ گویا خیر خواہی کے جذبات پر تھی۔۔۔ ہم انھیں سو چیلے علاوہ جیتے تھے۔ بلاشبہ اس گرانی کے دور میں یہ رقم ناکافی محسوس ہوتی ہے لیکن انسان کو قانع ہونا چاہیے اور صبر و شکر اختیار کرنا چاہیے۔" انھوں نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکال کے ادھر ادھر دیکھا اور محسن کی طرف بڑھا دیا۔ "بیا پس میں تقسیم کر لینا۔"

محسن نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ "یہ کیا ہے؟" وہ مشتعل ہو کے بولا۔

"اوہو۔۔۔ ناراضی کس بات کی۔۔۔ یہ لو۔۔۔" انھوں نے سو کا دوسرا نوٹ نکالا۔ "چلو اب تو ٹھیک ہے۔۔۔ بس یہ خیال رہے کہ۔۔۔"

"اگر آپ کا ٹیلی فون بل لاکھوں میں ہو تو ہزاروں تک محدود ہے اور ہزاروں میں ہو تو سیکڑوں میں آ جائے۔" محسن نے کہا۔

"ارے بھئی۔۔۔" میں نے تھا دیا سے کہا۔ "لے لو۔۔۔ آخری محبت سے دے رہے ہیں وہ۔۔۔ آپس کی بات ہے۔" پھر میں نے بزرگوار سے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "معاف کیجیے گا۔۔۔ میں سمجھاؤں گا اسے۔۔۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔۔۔ لیکن ذرا بتا دیں ہمیں اپنے بارے میں۔۔۔ ہم نئے ہیں نا۔۔۔"

"ہم تمہاری معاملہ فہمی سے خوش ہوئے میاں۔" بزرگوار بولے۔ "ہم یہاں رہتے ہیں۔ نام ہے ہمارا حاجی سیٹھ عبداللہ۔۔۔ اور یہاں سے چار فون ہیں۔"

"ماشاء اللہ۔" میں نے کہا۔ "کاروبار کیا ہے آپ کا؟"

"ہم تو بس اب علامہ ریٹائرمنٹ سے آتا ہو گئے ہیں۔۔۔ سارا کاروبار اپنے دونوں لڑکوں کے سپرد کر دیا ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔ بڑا لڑکا یہاں سے فروٹ اسپیرٹ اور مچھلی اور انڈے وغیرہ باہر بھیجتا ہے۔۔۔ میں بس نگرانی کرتا ہوں۔"

"کیا نام ہے اس کا۔۔۔ اور فرم کا۔۔۔؟" محسن نے کہا۔

"غلام رسول۔۔۔ اور فرم کا تو ایک ہی نام ہے۔ عبداللہ اینڈ سنز لاہوری۔ دوسرا لڑکا عبدالرب۔۔۔۔۔ مشینری کا سامان اور مشینری وغیرہ بھیجتا ہے۔۔۔ مگر وہ کراچی میں ہے۔" وہ بولے تو انھوں نے گاڑی کا دروازہ کھول کے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے وزٹ کارڈ نکال لیے۔ "یہ لو۔۔۔ اس میں سب کچھ ہے کسی معاملے میں حاجت مدد کی ضرورت ہو تو بتانا۔۔۔ سب کچھ کر سکتے ہیں ہم۔"

"گویا آپ قادر مطلق ہیں؟" محسن نے کارڈ لے کر کہا۔ "حاجی صاحب یہ تو کفر ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔ میاں ہم۔۔۔ ہمارا مطلب تھا کہ اللہ نے توفیق دی ہے۔۔۔ وہی کارساز ہے سب کا۔۔۔ لیکن وسیلہ تو کوئی بنا رہا ہے۔" انھوں نے خفگی سے کہا اور کار میں بیٹھ گئے۔

"حاجی صاحب۔۔۔ جاتے وقت بھی سلام ضروری ہے۔" محسن نے کہا۔

"وعلیکم السلام۔" حاجی صاحب نے غصے سے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

"الو کا پٹھا۔۔۔ جیسٹ الآمیر۔۔۔" محسن ایک دم پھٹ پڑا۔ "نام تو دیکھو ذرا۔۔۔ اور کرتوت دیکھو۔۔۔ حلیہ دیکھو اور اعمال دیکھو۔ کیا مفہوم نکالا ہے الفاظ نے۔۔۔ حقوق العباد۔۔۔ نیکی۔۔۔ صبر و شکر تو قناعت کا مطلب سمجھا رہا تھا ہمیں۔" محسن نے سو کے دونوں نوٹ کو پرزہ پرزہ کر کے پھینک دیا۔

"افسوس کہ ایسے ہی لوگ دین کو بدنام کرتے ہیں۔۔۔ ریاکار اور منافق۔۔۔ جو اپنے ساتھ ہی نہیں خدا کے ساتھ بھی جھوٹ بولتے ہیں۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔ "ظاہر ہے ایسے باپ کی اولاد کیا ہو گی۔"

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں بچا لیا تھا نہیں۔" محسن بولا۔ "مگر یار اب یہاں سے کھسکنے کی کرو۔ یہ شہر نال علاقہ ہے۔ اس شیطان کی اولاد کا یقیناً انڈر ورلڈ سے کوئی تعلق ہے۔۔۔ غلام رسول اور عبدالرب پیچھے رہ کر یاد کرتے ہوں گے۔۔۔ اور یہ تو اتفاق ہے ہمیں 'عبداللہ اینڈ سنز لاہوری' کا نام معلوم ہو گیا۔ ایسے نہ جانے کتنے دوسرے ادارے ہوں گے جو امپورٹ ایکسپورٹ کے کاغذ لائسنس پر دلالی اور اینڈ کمپنی کے معاون اور مددگار ہوں گے۔"

خود میں بھی یہ بات سمجھتا تھا کہ یہ جگہ واقعی محفوظ نہیں ہے اور ابھی تو ہم بال بال بچ گئے تھے لیکن یہاں کسی بھی وقت کوئی خطرہ پیش آ سکتا تھا۔ میں پندرہ منٹ میں منزل تک پہنچ گیا۔ ہوا کی خیریت کی اور حاجی صاحب کے دفع ہو جانے کی دعا مانگتا رہا

چھتان کی موجودگی میں بات تو میں کیا کرتا خود کو ٹیلی فون لائن میں ثابت کرنے کے لیے میں نے باکس کھول کر تقریباً بیس کام مزید جاری رکھا تھا اور کسی وجہ کے بغیر کچھ کس استعمال کرنے کا تجربہ نکلا تھا کہ میں نے ادھر کے تار کھول کر ادھر جوڑ دیے تھے۔ اس سے کتنے لوگوں کے ٹیلی فون غلط ملط ہو گئے ہوں گے، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔ حاجی صاحب نے پیچھے رہ کر سلیٹی کار میں سوار ہو کے یہ سب ہوشیاری سے کیے تھے۔ وہ خود بیا پھیری کرنے والا آدمی تھا یا اصول آدمی ہوتا تو سب سے پہلے پوچھتا کہ تم لوگ ٹیلی فون لائن میں ہو تو وردی میں کیوں نہیں ہو اور ہم سے شناختی کارڈ طلب کرتا۔۔۔ لیکن اس سے پہلے معاملہ رکھنے والے بھی شاید بغیر وردی کے ہی گھر رہتے تھے۔

پیچھے اتر کے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں اور محسن اس کوٹھی کے سامنے سے گزرے جس میں سے وہ سلیٹی رنگ کی کار نکلی تھی تو محسن نے گیٹ پر پیتل کی چمکتی ہوئی تختی دیکھی۔ روشن خوش خط اس تختی پر تین انچ کے بڑے حروف میں 'عبداللہ اینڈ سنز لاہوری' کا نام کندہ تھا اور نیچے ایک انچ کے حروف میں 'امپورٹرز، ایکسپورٹرز اینڈ جنرل آرڈر سپلائرز' لکھا ہوا تھا۔ کوٹھی کے اندر بائیں ہاتھ پر تین گاڑیاں اور چھ سات موٹر سائیکلیں کھڑی ہوئی تھیں۔ نچلی منزل دراصل دفتر تھی۔ اوپر کی منزل اپنی تعمیر سے دفتر نظر آتی تھی۔ اس کے بڑے بڑے شفاف شیشوں کے پیچھے ونڈو میں ایک ایک ڈبل نظر آ رہی تھیں اور اس کی چھت بھی مشکل سے آٹھ فٹ بلند تھی۔ ائیر کنڈیشنگ کے نظام کی بہتر کارکردگی کے لیے کم سے کم بلندی اسی طرح رکھی جاتی ہے اندر اگر کچھ لوگ فائلوں میں پھیلی جنتری، انڈے اور مچھلی کی درآمد برآمد کا حساب کتاب رکھنے یا ٹائپ رائٹر پر انگلیاں چلانے میں مصروف تھے تو ان کی معروفیت کا باہر بالکل پتا نہیں چلتا تھا۔

غالب سرکاری گاڑی کے ڈرائیوروں کے انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ "ہو گئی بات؟" اس نے سگریٹ اچھال کے کہا۔ وہ آخری ٹکڑے کو ایک انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے فائر کرنے کا عادی تھا۔

"بیا ایک بہت بری عادت ہے۔" محسن نے کہا۔ "دیکھو وہ ٹوٹا کہاں جا کے گرا ہے خشک گھاس اور پتوں کے ڈھیر میں آگ لگ سکتی ہے۔"

"آگ کہاں نہیں لگی ہوئی ہے۔" غالب نے حقیقت شناسی کے لہجے میں کہا اور سگریٹ کے ٹکڑے کو جوتے سے دبا کے بجھا دیا۔ "کیا نتیجہ رہا؟"

"صفر جمع صفر برابر ہے دو صفر۔" محسن بولا۔ "گاڑی میں بیٹھو۔۔۔ ہم دشمن کے علاقے میں ہیں۔"

غالب نے برا سا منہ بنایا۔ "وہ خوفناک صورت کون تھا؟"

"تمہارا ماموں سسر۔" میں نے کہا اور گاڑی چلا دی۔۔۔

"اپنی بھانجی کے مستقبل سے کھیلنے والے ہر شخص کو تباہ کرنے کی دھمکی دے گیا ہے۔"

"میں مستقبل سے نہیں۔۔۔ اس کی بھانجی سے کھیل رہا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "ظاہر ہے مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ مگر تم لوگ پیچھے خواہ مخواہ باختہ لگتے ہو۔"

جواب میں محسن نے اسے عبداللہ اینڈ سنز سے متعارف کرایا اور میں نے گاڑی کو وہیل وہ دے جانے کے بعد روکا اور پھر پیدل چل کے واپس گیا۔ یہ دوسری جگہ جہاں سے میں نے فرزانہ کو فون کیا زیادہ محفوظ تھی۔

"سکندر۔۔۔" سراج نے ریسیور اٹھاتے ہی چلانا شروع کیا۔ "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"ایک ایس ایس پی کو آنا علم نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم واقعی نہیں جانتے کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟"

"دیکھو۔۔۔ میں تمھیں موقع پر موقع دے رہا ہوں۔ ساری محکمے میں نے ابھی تک تمہارے خلاف کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی ہے۔ بلا اغوا کی واردات اس بدمعاشی کی جو تم نے میرے گھر میں کی اور جس کے دس گواہ ہیں۔۔۔ تم نے عاشی کو بھی قتل کر دیا مگر میں نے وہ واردات کو فراموش کر دیا۔"

"یہ سب لکھ کر اپنے افسران بالا کو بھیجا دو۔" میں نے کہا۔ "کہ تم نے سکندر بخت پر کیسے احسانات کیے ہیں۔ اور بدمعاشی کے جواب میں تم نے کتنی شرافت دکھائی ہے اور کیا سختی کی ہے تمہیں اس کا اجر ملے گا۔"

"میں اگر چاہتا تو تمہیں زمین سے کھود کے برآمد کر لیتا۔" وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔

"پھر کیا کیوں نہیں۔۔۔ ہم کوئی گاجر مولی تو تھے نہیں کہ زمین کے اندر ہوتے۔۔۔ ہم تو تو بی کے پھول کی طرح اوپر تھے۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے اپنی اس فضول بکواس سے متاثر مت کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا ہے۔ میرے باپ کی ہڈیاں مجھے آج تک نہیں ملیں۔ تم اپنی ماں کی ہڈیوں کے خاک ہونے تک بھی کے دیکھ لو۔"

"کیا۔۔۔؟" سراج نے چیخ کے کہا۔ "تم نے مار دیا ہے اسے؟" جملے کا اختتام پر اس کے لبوں سے مغلظات کا دریا بہنے لگا۔ "اور اب تم بھی سمجھ لو کہ ان سب کی خیر نہیں۔۔۔ میں ایک ایک کی لاش پر بدذرہ کر بکھیر جاؤں گا۔۔۔ تم کیا مجھے آتنے لیس سمجھتے ہو؟ بہت سے لوگ میرے شکنجے میں آ گئے ہیں۔۔۔ محسن کی بیوی۔۔۔ اس کی بہن تو زید۔۔۔ اور اس کا منگیتر۔۔۔ تمہاری اس نازو کے گھر والے۔۔۔ والد اور تمہارا استاد وحیدی۔۔۔ سب کی

بوتیاں نکتوں سے آگے نہ ڈال دوں تو میرا نام سراج نہیں۔"
"یہ سب تو تم پہلے بھی کر چکے ہو... میرے باپ کو... شہلا کے بھائی کو... رابعہ کی ماں کو... سب کو مار کے تمھیں کیا ملا؟ تم نے دولت کے لیے بہت سے لوگوں کی زندگی چھین لی جو تم سے کوئی نسبت نہ رکھتے تھے۔ عاشی اور دلاور کی بیوی تک اور زیب النسا کی عزت لوٹنے والوں تک تمھارے شیطانی عزائم کی بھینٹ چڑھنے والے کتنے ہیں... شاید سیکڑوں... صحیح تعداد تو خود تم بھی نہیں بتا سکتے... مگر کیا اس سے تمھیں فتح کا اطمینان اور جیت کی خوشی اور کامیابی کا احساس ملا؟ تمھاری ہی وجہ سے مشرقی پاکستان میں..."
"سکندر... یہ بات چھوڑو۔" سراج نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "مجھ سے سودا کرلو... تم نے رابعہ اور ٹیڈی کی بات کی تھی۔ میں نے تمھاری بات رابعہ سے کرادی۔"
"تم نے...؟ تم بکواس کرتے ہو۔"
"ہاں... کیا تمھاری بات رابعہ سے نہیں ہوئی؟" وہ بولا۔
"ہوئی ہے... لیکن اس میں تمھارا کیا دخل تھا؟" میں نے کہا۔
"اگر میں کوشش نہ کرتا... تو دوست محمد کبھی رابعہ کو نہ جانے دیتا اور میں کوشش کرتا تو شاید تمھاری کال بھی ٹریس کرلیتا۔"
"پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟" میں نے کہا۔
"اس لیے کہ میں رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔" وہ بولا۔
"تم چالاک لوگ ہو... آج تک تمھاری کال ٹریس نہیں ہو سکی... ظاہر ہے کہ تم کسی پبلک فون بوتھ سے فون کرکے گلشن ملا کے بات کرتے ہو یا کسی ایکس چینج میں تمھارا کوئی ہمدرد بیٹھا ہوا ہے۔"
"لیکن دوست محمد سے تمھارا کیا تعلق...؟" میں نے اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "تم اسے کیسے جانتے ہو؟"
"اسے بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ ہم نے ہی رابعہ کو اس کی تحویل میں دیا تھا۔" سراج نے کہا۔ "خود اس کی ضمانت پر۔"
"او مائی گاڈ..." میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ سوچا۔ رابعہ تو اُسے اپنا ہمدرد اور دوست سمجھتی ہے۔ اس پر اعتماد کرتی ہے۔ اس نے دوست محمد کی تعریف بھی بہت کی تھی۔ مگر اسے نہیں معلوم کہ دوست محمد کسی کا دوست نہیں ہے۔ وہ تو بس ایک ضامن ہے۔ ایک جیلر ہے... ایک ایسا ٹھیکے دار ہے جس نے ضمانت لے رکھی ہے کہ رابعہ محفوظ اور معلق رہے گی۔ اسے احساس بھی نہیں ہوگا کہ وہ ایک آزاد قیدی ہے۔
میں نے اس سے سوچے سمجھے بغیر بہت سی باتیں کہہ دی تھیں جو مجھے نہیں کہنی چاہیے تھیں۔ مگر اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ٹیڈی کی مدد سے فرار ہوئی تھی۔ ٹیڈی اس کے کپڑے پہن کے لیٹ گیا تھا اور وہ محافظ کی وردی میں نکل گئی تھی۔ کیا وہ سب ڈراما تھا جس کے لیے اسٹیج فراہم کرنے والے خود شکاری تھے؟ میرا دماغ سخت کنفیوژن کا شکار ہو رہا تھا۔ کیا یہ بات رابعہ نہیں جانتی تھی کہ وہ آزاد نہیں ہے؟ اس نے اپنی مجبوری کا ذکر تو کیا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن دوسری طرف اس نے دوست محمد کے ساتھ بالکل محفوظ اور خیریت سے ہونے کا ذکر بھی کیا تھا۔ آخر یہ سب کیا تھا؟ شکاری یہ کون سا جال پھیلا رہے تھے۔ وہ رابعہ کو قید میں آزادی کا یقین دلا کے اپنے کس مقصد کی تکمیل کا سامان کر رہے تھے؟
جواب فوراً میرے ذہن میں اچانک ہی نازل ہوا۔ یہ دام فریب ہمارے لیے پھیلایا گیا تھا۔ شکاری جانتے تھے کہ کوئی اور جائے نہ جائے میں رابعہ کی تلاش میں ضرور جاؤں گا۔ اسے نکال لانے کی کوشش بھی کروں گا۔ انھوں نے رابعہ کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ دوست محمد کے ساتھ ہے تو کسی کی قید میں نہیں ہے اور رابعہ نے یہی یقین مجھے ٹرانسفر کر دیا تھا۔ لیکن رابعہ نے اس یقین میں تھوڑی سی مجبوری کا شک بھی شامل کر دیا تھا۔ شاید خود اس کے یقین میں شک کی آمیزش تھی۔ دوست محمد ہمارا دوست تھا یا ہمارے دشمنوں کا۔ یا بالکل غیر جانبدار ذریعہ تھا۔ مگر وہ ہر وقت دشمنوں کی نظر میں تھا۔ رابعہ کی نگرانی کرنے والے اس کی بھی نگرانی کر رہے تھے۔ انھوں نے ہی دوست محمد کو پیغام دیا ہوگا کہ رابعہ سے سکندر بخت کی بات کرادو۔ نہ رابعہ کو احساس ہو کہ اس انتظام کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے اور نہ مجھے شک ہو... اس کے بعد جذبۂ عشق سلامت ہے تو ہم کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بند سے اور سرکار کو ہم یہاں باندھ لیں گے...
"ہیلو... سکندر... کیا بات ہے... جواب دو میری بات کا؟"
"کس بات کا؟" میں نے چونک کر کہا۔
"میں نے کہا تھا کہ میری بات کرادو... ماں سے..."
"سوری ایس پی صاحب... یہ مشکل ہے۔" میں نے کہا۔
"کیوں مشکل ہے۔ کیا تم کو ٹیڈی سے بات نہیں کرنی ہے؟"
"ٹیڈی سے؟... تم بات کراؤ گے؟" میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ "ابھی؟"
"کیا تم نے سنا نہیں تھا میں نے کیا کہا تھا؟" سراج بولا۔
"نہیں... درمیان میں تمھاری آواز بند ہو گئی تھی۔ شاید لائن خراب تھی۔" میں نے کہا۔
"میں نے کہا تھا ایک گھنٹے بعد تم ٹیڈی سے بات کر سکتے ہو... لیکن میں بھی اپنی ماں سے بات کروں گا۔" وہ بولا۔

"ٹیڈی کہاں ہے؟" میں نے کہا۔
"وہ کہیں بھی ہو... میں ایک گھنٹے میں اُسے لے آؤں گا۔"
وہ جھنجھلا کے بولا۔
اس کے الفاظ پر میرے کان کھڑے ہو گئے... "لے آؤ گے؟ کہاں...؟"
"میرا مطلب تھا... کہ میں لائن پر لے آؤں گا۔" سراج نے بات بنانے کی کوشش کی۔ مگر تیر اس کی کمان سے نکل چکا تھا۔
"سنو سراج... یہ چکر بازی چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "تم ٹیڈی کو میرے حوالے کرو... اور اپنی ماں کو لے جاؤ... اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ تم سے بات کر سکے۔"
"کیا وہ بیمار ہے؟" سراج نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔
"تم اپنی ماں کو جانتے ہو تو یہ سوال فضول ہے... اس حالت میں اس کے اعصاب کب تک ساتھ دے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس نے کھانا پینا سب چھوڑ رکھا ہے۔ ہر وقت روتی رہتی ہے... حالانکہ ہم نے اس کے ساتھ اونچی آواز میں بات تک نہیں کی۔ اُسے پوری عزت دی اور اس کے آرام کا ہر ممکن خیال رکھا۔"
"تم کو جو کرنا تھا وہ تم پہلے ہی کر چکے تھے..." سراج نے مجھے ایک فحش گالی دے کر کہا۔ "وہ مر جائے گی..."
"ظاہر ہے کہ تم نے معاملے کو طول دیا تو وہ مر جائے گی... اس کی عمر بھی تو دیکھو..." میں نے اپنے جھوٹ کے تیر کا نشانہ دیکھ کر کہا۔ "فیصلہ تو اب تمھارے ہاتھ میں ہے۔ بعد میں مجھے الزام مت دینا۔"
"بہت کمینے ہو تم سکندر..." یوں لگتا تھا کہ وہ رو پڑے گا۔
"بولو ایک گھنٹے میں ٹیڈی کو کہاں لاؤ گے؟" میں نے کہا۔
"میں... ابھی نہیں بتا سکتا... وہ میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے دوسروں کو بھی راضی کرنا ہوگا۔" سراج نے کہا۔
"تم جیسے چاہو راضی کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم کو میں ایک گھنٹے کے بعد فون کروں گا۔" میں نے لائن کاٹ دی۔
یہ خیال کہ ٹیڈی زندہ ہے اور لاہور میں ہی ہے میرے حوصلے کو دوچند کرنے کے لیے کافی تھا۔ سوچے سمجھے بغیر میں نے کہہ دیا تھا کہ ٹیڈی کو لے آؤ۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ بفرض محال سراج نے ہاں کہہ دی تو ہم اسے کیسے ملیں گے اور کہاں ملیں گے۔ کس طرح ٹیڈی کو حاصل کریں گے اور سراج کے سپرد اس کی ماں کو کیسے کریں گے۔ یہ بہت خطرناک کام تھا۔ ایک ایس ایس پی اپنے وسیع اختیارات سے کام لیتے ہوئے ایسا جال بھی پھیلا سکتا تھا جو کہیں نظر نہ آتا اور ہم اپنی ساری چالاکی اور ہوشیاری کے باوجود اس میں پھنس جائیں۔ مجھے رابعہ کا خیال تھوڑا آیا تھا کہ میں نے اس کی رہائی کا سودا نہیں کیا مگر وہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ ایک تو وہ کراچی میں تھی اور اس کا وہاں پہنچنا محال تھا۔ دوسرے وہ جس حال میں بھی تھی محفوظ اور مطمئن موجود تھی تو میرے لیے فی الحال یہی احساس باعث طمانیت تھا۔ تیسری بات یہ تھی کہ میں آتش نمرود میں کود پڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اگر رابعہ اور اس کی آزادی کو شکاری دانہ و دام بنائے بیٹھے تھے تو میں یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ میری آنکھوں نے اس دام ہمرنگ زمیں کو دیکھ لیا ہے۔ میں بھی انھیں اسیری کا فریب دے کر رہائی کا مزہ چکھانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے صرف ٹیڈی کی بات کی۔
محسن اور غالب میری بات پر دم بخود رہ گئے۔ ان کا پہلا تاثر بے یقینی اور خوشی کے ملے جلے جذبات کا تھا۔
"یار یہ دھوکا ہے۔" محسن بولا۔ "وہ چکر چلا رہا ہے۔"
"کیا چکر چلا رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "میں اسے اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ اسے ماں کی زندگی عزیز ہے تو جلد فیصلہ کرے گا۔ ہیرا پھیری اور چکر بازی کا موقع وہ نہیں دے گا۔"
"فرض کرو ایسا ہی ہوتا ہے۔" غالب نے کہا۔ "وہ ٹیڈی کو لے آتا ہے... یہ تبادلہ کہاں ہوگا... اور کیسے ہوگا؟"
"میں بتاتا ہوں۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "ڈاکٹر سعید کے کلینک میں۔"
غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم محصور ہو جائیں گے اور ٹیڈی بھی نہیں ملے گا... اور اگر ہم کشتوں کے پشتے لگا کے نکل بھی گئے تو کیا فائدہ... بہت لوگ مارے جائیں گے کلینک میں کشت و خون ہوگا۔"
"ایک اور جگہ ہے۔" میں نے کہا۔ "میجر سلطان..."
"بابا خود گھر پر نہیں ہوگا۔" غالب بولا۔
"اس کے گھر سے ہم معلوم کر لیتے ہیں کہ وہ کہاں ملے گا۔ وہ آرمی میڈیکل کور کا ڈاکٹر ہے۔ کسی سی ایم ایچ میں ہی ہوگا۔ اور ملٹری ہوسپٹل میں ایس پی صاحب بھی بلا اجازت نہیں گھس سکتے۔ اگر ان کو گیٹ پر ہی روک دیا جائے تو وہ کمانڈنگ افسر کی مرضی اور اجازت کے بغیر آگے نہیں جا سکتے۔ میجر سلطان ہماری مدد کر سکتا ہے۔"
"سوال یہ ہے... کہ کیا وہ کرے گا؟" غالب نے کہا۔
"میں اس سے بات کر لیتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"سی ایم ایچ کا نمبر معلوم ہے؟"
"اس کے گھر سے معلوم ہو جائے گا... مجھے گھر کا نمبر یاد ہے۔" میں نے کہا۔
"او کے۔" غالب نے کہا۔ "جلدی کر لو۔"
میجر سلطان کو میں نے ایک ریسٹورنٹ سے فون کیا جہاں

www.paksociety.com

میں نے اور محسن لے جاتے ہیں۔ غالب گاڑی میں رہا اور ایک ویٹر نے تین افراد کے لیے چائے گاڑی میں پہنچا دی۔ ریسیور غالباً اس کی بیوی نے اٹھایا۔

"میجر صاحب تو نہیں ہیں۔" وہ بولی۔

"مجھے معلوم ہے بھابی کہ وہ ڈیوٹی پہ ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "آپ کو زحمت اس لیے دی کہ مجھے ان سے بات کرنی تھی۔ ڈیوٹی کہاں ہے ان کی؟"

"سی ایم ایچ میں۔" وہ بولی۔

میں ہنسا۔ "یہ تو معلوم تھا مجھے۔ سی ایم ایچ کا نمبر بتا دیجیے۔ اور ان کی ایکسٹینشن۔"

اس نے سی ایم ایچ کا نمبر بتانے کے بعد کہا۔ "ایکسٹینشن نمبر ہے سیون ٹو زیرو... آپ کون صاحب ہیں؟"

"میں ان کا ایک دوست ہوں۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ "ایک کال اور کروں گا میں۔" میں نے منیجر سے اجازت لینے کا اخلاقی فرض پورا کیا اور اس کے سر ہلانے سے پہلے ہی سی ایم ایچ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"گڈ مارننگ... سی ایم ایچ ہیلو۔" کسی آپریٹر نے مستعدی سے کہا۔

"گیو می ایکسٹینشن سیون ٹو زیرو... میجر سلطان۔" میں نے کہا۔

"یس سر۔" جواب ملا۔

پھر چند سیکنڈ کے وقفے سے سلطان نے کہا۔ "یس؟"

"میجر سلطان... میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔" میں نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کی پروا کیے بغیر کہا۔ "آپ نے پہچانا... ایک بار ملیں..."

"او... یس... وائی ناٹ... میں نے اس دن بھی پہچان لیا تھا تمہیں۔"

"اور آپ سے میں نے ایک وعدہ کیا تھا... کہ میں پھر فون کروں گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے یاد ہے... بلکہ میں کہوں کہ مجھے انتظار ہے تو غلط نہ ہوگا... تم جب چاہو آ سکتے ہو۔" میجر سلطان نے خوش دلی سے کہا۔

"میں اسی وقت آ رہا ہوں... ایک گھنٹے میں..."

"ابھی؟... لیکن میں تو دو بجے کے بعد گھر پہنچوں گا۔" وہ بولا۔

"میں سی ایم ایچ میں آ کے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟ کیا ایمرجنسی ہے؟" وہ بولا۔ "دیکھو سکندر... آئی ایم اِن سروس مین... اپنی ذاتی حیثیت میں تمہاری مدد تو ضرور کر سکتا ہوں میں، لیکن تم کو سی ایم ایچ میں علاج کی سہولت فراہم کرنا میرے اختیار میں نہیں۔"

"میجر صاحب... میں زخمی نہیں ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اور مجھے سی ایم ایچ سے کچھ نہیں لینا۔ میں آپ کے پاس آؤں گا... آپ کے کمرے میں بیٹھوں گا اور چلا جاؤں گا۔"

"بٹ واٹ از دی ایمرجنسی...؟"

"یہ میں وہیں آ کے بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "کوئی مجھے گیٹ پر روکے گا تو نہیں؟"

"میں گیٹ پر کہہ دوں گا۔" میجر سلطان نے کہا۔ "اپنا نام مت بتانا بس کہہ دینا کہ مجھے میجر سلطان کے پاس جانا ہے۔ تم نے دیکھا ہے میرا آفس۔"

"جی نہیں... آپ مجھے گائیڈ کریں۔"

"اوہ تو... تم بھٹکتے پھرو گے... اور تم کو رسک نہیں لینا چاہیے... ٹھیک ہے تم کو گیٹ سے ایک آدمی لے آئے گا۔" وہ بولا۔

"تھینک یو میجر۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ بل اور کال کے چارجز ادا کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ منیجر مجھے غور سے دیکھ رہا ہے۔

"جی؟ کیا بل بنا؟" میں نے سو کا نوٹ نکال کے کہا۔

"کچھ نہیں۔" منیجر نے مسکرا کے کہا۔ "یہ آن دی ہاؤس ہے مسٹر سکندر... آپ جیسے ہیرو سے پیسے لیں؟" میں نے جان بوجھ کے انجان بننے کی کوشش کی۔ "کیوں؟"

"مجھے اپنا دوست سمجھیے۔" وہ ہاتھ ملا کے بولا۔ "میں تنہا بزدل آدمی ہوں... صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں... کہ آپ کو نہ پہچانوں... آپ سے بھی ایک درخواست ہے... ہر جگہ اپنا نام یوں نہ بتایا کریں... اور ہر جگہ ایسے مت جایا کریں... میری طرح اور لوگ بھی پہچانتے ہوں گے آپ کو..."

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور نوٹ جیب میں ڈال لیا۔ "پیسوں کی تو کوئی بات نہیں... ایسے دوستانہ جذبات اور جذبے کی حمایت بہت اہم ہے؟"

"لیکن... مگر... میں نہیں چاہتا کہ میرا ہوٹل تباہ ہو... مجھے امید ہے آپ پھر نہیں آئیں گے۔" وہ بولا۔ "میں ایک بزدل آدمی ہوں۔"

"اپنی بزدلی کا اعتراف کرنا بھی تو بہادری ہے۔" میں نے کہا۔ "تھینک یو۔"

"وِش یو گڈ لک ایگین!" وہ محسن سے مصافحہ کر کے بولا... "کاش میں بھی آپ جیسا بے غرض اور حوصلہ مند ہوتا کہ اپنے نفع نقصان کی پروا نہ کرتا۔ اور آپ کے ساتھ مل پڑتا... مسٹر محسن..."

باہر آ کے جہاں ایک طرف مجھے اس احساس تفاخر نے سرشار کر دیا تھا کہ لوگ جانتے ساتھ ہیں وہیں مجھے چوکنا بھی کر دیا تھا۔ شکاری اپنے تمام وسائل اور اپنی ساری طاقت صرف

کر کے بھی جیلیں مجرم... قانون شکن اور شرپسند سماج دشمن یا غدار ثابت کرنے کی سازش میں ناکام ہو چکے تھے۔ یا آہستہ آہستہ سچائی نے خود کو ظاہر کر دیا تھا اور ہر جگہ ہر سطح پر ملنے والے اس سچ کا اعتراف کرنے لگے تھے مگر میں اچانک اختیارات میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"شاید ہم ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔" محسن نے میرے خیالوں کی ترجمانی کی۔ ہم دونوں سگریٹ خرید کے لوٹ رہے تھے۔

"ہاں... اسے خوش فہمی کی حماقت بھی کہا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر ہم نے فوری طور پہ خود کو ناقابلِ شناخت نہ کیا... اور روپوش نہ ہوئے تو بہت جلد جانے ہم کے چپے چپے کی گلی ہوں گے۔ کہ سکندر اور محسن فلاں جگہ دیکھے گئے تھے اور فلاں شخص کے ساتھ نظر آئے تھے۔" محسن بولا۔

"اس وقت تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا ہمارا سی ایم ایچ جانا ٹھیک ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اب تو میجر سلطان سے بھی کہہ دیا ہے۔" محسن بولا۔ "اور ہم نیڈی کو بھی چھوڑ تو نہیں سکتے۔"

"ہاں... مگر ہم اس سے شام کو کہیں اور مل سکتے ہیں... بالکل..."

"خطرہ تو ہر جگہ ہوگا... ہم جتنی احتیاط چاہے کریں اور کتنی بھی ہوشیاری سے کام لیں... سو فیصد تحفظ کی ضمانت حاصل نہیں کر سکتے... میجر سلطان دھوکا دینے والا آدمی تو نہیں ہے؟" محسن نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس زندگی کے تجربات نے دوستوں اور دشمنوں کی تفریق تو سکھا ہی دیا ہے۔"

"کیا جیسے دھوکا نہیں دیتے ہیں؟"

"ہاں... مگر میجر سلطان پہ میرا اعتماد غلط نہیں ہو سکتا... اگر وہ چاہتا تو پہلی بار ہی مجھے گرفتار کرا دیتا۔ لیکن میں نے اس کے ہاتھوں وطن دشمنوں کو گرفتار کرا کے ثابت کر دیا تھا کہ ہم کون ہیں اور ہمارا مشن کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آرمی انٹیلی جنس نے ان تخریب کاروں اور دشمن کے ایجنٹوں سے بہت کچھ اگلوا لیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اور میجر سلطان نے اس کا کریڈٹ خود نہیں لیا ہوگا۔ وہ لے بھی نہیں سکتا تھا... یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں شکار کے لیے باہر نکلا اور میں نے یہ دشمنوں کے ایجنٹ پکڑ لیے۔ اس سے سچ اگلوا ہوگا تو ہمارا نام ضرور لیا ہوگا۔"

"کیا بات ہے؟" غالب نے گاڑی سے سر نکال کے کہا۔ "ہم پکنک منانے کے لیے رکے ہیں؟"

"یہ پکنک سے زیادہ دلچسپ ایڈونچر ہے۔" میں نے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سراج کی ماں پچھلی سیٹ پہ اسی طرح گم صم پڑی تھی۔ ہم نے اسے مسکن سکون بخش اور خواب آور گولیاں دی تھیں۔ چنانچہ وہ ہر وقت کچھ سوئی سوئی رہتی تھی۔ ہم اس کے نروس بریک ڈاؤن کا خود حل نہیں لے سکتے تھے اور اسے باندھ کے یا اس کا منہ بند کر کے بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ بوڑھی عورت سختی برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی چنانچہ اس کے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پہ بے حس رہے۔

باہمی مشورے سے محسن اور غالب نے واپس جانے کا فیصلہ کیا اور بجولی میرے اصرار کے باوجود مجھے اکیلا چھوڑنے پہ تیار نہیں ہوئی۔

"آپ اکیلے ہوں گے بھائی تو ان کو کون دیکھے گا۔" اس نے سراج کی ماں کی طرف اشارہ کیا۔

"میرا خیال ہے ان سے کوئی خطرہ نہیں۔"

"نہیں بھائی۔ آپ کو پریشانی لاحق ہو سکتی ہے۔" وہ بولی۔ "کیا آپ انھیں ساتھ اٹھائے پھریں گے... میں گاڑی میں رہوں گی جب آپ میجر سلطان سے ملنے جائیں گے۔"

"ہو سکتا ہے کہ... وہ گاڑی کو اندر نہ جانے دیں... پھر مجھے اندر سے جانا پڑے۔" میں نے کہا۔

"تو کیا ضرورت ہے کہ آپ گاڑی اندر لے جائیں اور ہمیں بھی ساتھ رکھیں۔" وہ بولی۔ "آپ گاڑی کہیں بھی چھوڑ دیں۔ اور پھر حیدری بھائی کے ساتھ وہیں پہنچ جائیں۔ میں انتظار کر لوں گی۔"

محسن نے بھی اس کی تائید کی تو میں نے کہا۔ "تمھاری مرضی۔ تم دونوں کہاں جاؤ گے؟" میں نے غالب اور محسن کو مخاطب کیا۔

"ہمیں یہیں کہیں روڈ کے چوک میں گرا دینا یعنی ڈراپ کر دینا۔" غالب نے کہا۔ "ہم استاد فنکار تخلیف جینئس کو سلام کریں گے اور وہاں سے چہرہ بدلوا کے جائیں گے۔ یہ صورت اب زمانے کو دکھانے کے قابل نہیں رہی۔"

"اس کا احساس تم کو جوانی میں ہو جاتا تو اچھا تھا۔" محسن نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "اس شکل کو تم کر چکے نہیں۔ مر جانے گا جاتا... خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں؟ سوالیہ نشان کے ساتھ۔"

"تم کو اب احساس نہیں کہ سیرت کا حسن کیا ہوتا ہے۔" غالب نے کہا۔ "تمھارا جیسے قدم سے قدم ہے مرنے کے مواقع بہت..."

"خود مرنے کی کیا ضرورت ہے جب اتنے لوگ مارنے کے لیے کوشش کر رہے ہیں اور مایوس نہیں ہوئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تعداد میں زیادہ ہے اور دوست زیادہ ملے ہیں مگر دشمن ایک بھی بہت ہوتا ہے۔ ان چہروں کی اتنی تشہیر ہو گئی ہے کہ اب گمنامی

نہیں بچا سکتی ہے۔ ہم دھر لیے گئے تو سارے پلان دھرے رہ جائیں گے۔"

ان دونوں کو کشمی چوک پر اتار کے میں واپس ہوا۔ اڈے ہیمنٹ کے علاقے کی طرف جانے کے بجائے مال روڈ پر نکل گیا۔ میرے پاس تقریباً آدھا گھنٹہ تھا۔ دس منٹ سے بھی کم وقت میں گاڑی باغ جناح سے آگے نکل گئی۔ میجر سلطان کے پاس جانے سے پہلے سراج سے پوچھنا بھی ضروری تھا کہ اس نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ وہ اپنی ماں کی طرف سے بہت پریشان تھا چنانچہ مجھے کسی حد تک یقین تھا کہ وہ ڈیڈی کو ضرور لائے گا۔ خواہ اس کے لیے اسے دوستوں پر دباؤ ڈالنا پڑے یا ان کی خوشامد کرنی پڑے... پھر بھی تصدیق ضروری تھی۔

وزیروں اور سیکریٹریوں کی رہائش گاہوں کے پاس میں نے گاڑی روک کے اپنا ریوالور جولی کو دیا۔ "میں ابھی آتا ہوں... دس منٹ میں۔"

"بھائی آپ میری فکر نہ کریں۔ اسے اپنے پاس رکھیں۔" جولی نے کہا۔

میں گھنے درختوں کے پیچھے ایک ٹیلی فون بوتھ پر پہنچ گیا جسے میں پہلے بھی استعمال کر چکا تھا۔ حسب توقع سراج میری کال کے انتظار میں تھا۔

"سکندر... میں نے... تمھاری بات مان لی ہے۔" وہ بولا۔

"بلکہ منوا لی ہے سب سے... تم ڈیڈی کو لے جا سکتے ہو۔"

"تم ڈیڈی کو لا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "جگہ کا انتخاب میں نے کیا ہے اور تم کو وہیں آنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے... کیا تم اکیلے آؤ گے؟"

"یہ غیر ضروری سوال ہے۔" میں نے کہا۔ "تم بھی چاہو تو اپنی ساری مسلح نفری کے ساتھ آ جاؤ۔ مقابلے کے بغیر ہم بھی ہار ماننے والے نہیں ہیں۔"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" سراج نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ کسی کو بھی کچھ معلوم نہ ہو... صرف میرے اور تمھارے درمیان ملاقات ہو اور ایک ہی وقت میں تم میری ماں کو میرے حوالے کرو اور میں ڈیڈی کو تمھارے حوالے کر دوں... کیا یہ ٹھیک نہیں ہے؟"

"اگر تمھاری نیت ٹھیک ہے اور تمھارے الفاظ میں نیت کا کھوٹ شامل نہیں ہے تو سب ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

"تو پھر بتاؤ میں کہاں آؤں؟"

"تم اکیلے آؤ گے... کسی کو بتائے بغیر..." میں نے کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"تمھارے وعدے پر اعتبار کرنے والا احمق۔" میں نے کہا۔

"صرف اتنا یاد رکھنا کہ تمھاری شرارت اور چالاکی تمھیں ہی نقصان پہنچائے گی۔ تم تمام عمر خود کو معاف نہ کر سکو گے کہ اپنی ماں کو خود تم نے مارا..."

"آج ماں نہ ہوتی تو میں زندگی میں پہلی بار خود کو اتنا مجبور اور بے بس محسوس نہ کرتا سکندر اعظم... اور تم کو یہ فتح بہت مہنگی پڑے گی۔ ایسے دس ہزار استاد ڈیڈی میں اپنی ماں پر قربان کر سکتا ہوں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"تم کیسے آؤ گے؟"

"اس کا انحصار ملاقات پر ہے۔" وہ بولا۔ "شہر کی حدود میں یا دس میل کے لیے میں ٹیکسی استعمال کروں گا۔ زیادہ دور آنے کے لیے کسی کی گاڑی لوں گا۔"

"تم کو شہر کی حدود میں ہی رہنا ہے... لیکن تم اپنی گاڑی استعمال کرو گے نہ کسی اور کی... تم ٹیکسی میں بھی نہیں آؤ گے... تانگے میں آؤ گے جو کھڑا ہوگا... آگے تم دیکھو گے..."

"یہ نا ممکن ہے..." اس نے میری بات کاٹ دی۔ "تم کیوں بھول جاتے ہو کہ میں ایس ایس پی ہوں... مجھے پہچاننے والے بہت ہیں۔ اس کے علاوہ ڈیڈی تانگے میں نہیں آ سکتے۔ وہ جسمانی طور پر اس قابل نہیں ہے۔"

"اچھا... تو پھر تم ریڈ کراس کی ایمبولینس طلب کرو... ڈیڈی کو اس میں لٹا کے لاؤ۔" میں نے کہا۔ "ایمبولینس گیٹ سے گزر جائے گی اور تم گیٹ پر اتر جاؤ گے۔ ایمبولینس اندر چیک ہوگی... تم کو گیٹ پر چیک کیا جائے گا... کہ تمھارے پاس اسلحہ تو نہیں ہے۔"

"شٹ اپ... یہ میری بے عزتی ہوگی۔"

"کوئی تمھاری جسمانی تلاشی نہیں لے گا۔" میں نے اسے تسلی دلاتے ہوئے کہا۔ "جب تم گیٹ سے گزرو گے تو خود ہی پتا چل جائے گا کہ تمھاری کسی جیب میں ریوالور یا دھات کی کوئی چیز تو نہیں ہے... بہتر ہے کہ تمھاری کسی جیب میں سکے تک نہ ہوں۔"

"لیکن میں ایمبولینس کو چھوڑ نہیں سکتا۔ تمھارا کیا بھروسا کہ تمھارے آدمی ایمبولینس پر قبضہ کر لیں۔" وہ بولا۔ "وہ تمھارا علاقہ ہوگا۔ شاید تمھاری ایم آر ایس کا ہیڈ کوارٹر جہاں تمھارے اپنے سیکیورٹی چیک پوسٹ ہوں گے۔"

میں ہنسا۔ "ایس ایس پی صاحب! آپ کو سی ایم ایچ آنا ہے کیا منہ لٹکائے ہوئے... چھاؤنی کے علاقے میں۔"

"سی ایم ایچ؟" سراج کی زبان اچنبھے حیرت سے گنگ ہو گئی۔

"یس... سی ایم ایچ۔" میں نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ وہ کتنا محفوظ علاقہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اسپتال تو عالمی جنگ میں بھی علاقہ محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ وہاں کشت و خون کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا... اور لڑائی کا بھی... تم قانون کے محافظ ہو۔ تم وہاں پابند ہو گے۔"

"لیکن سی ایم ایچ... کیا تم کو ملٹری کی حفاظت حاصل ہے؟"

"ہم نے جو کام وطن کی سرزمین کے دشمنوں سے حفاظت کے لیے کیے ہیں وہ وطن کا دفاع کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے ہم انھی کے ساتھ ہیں۔ وہ ہم پہ کیسے آنچ آنے دیں گے۔ اگر تمھارے ذہن میں کوئی شیطانی منصوبہ تھا... تو اسے بھول جاؤ... اکیلے آؤ... بالکل اسی طرح جیسے کوئی دکھے دار آدمی اسپتال جاتا ہے۔ میرے آدمی بھی ایمبولینس پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ ریڈ کراس جیسا عالمی ادارہ عزت اور احترام کا مستحق ہے اور ان کے ساتھ زیادتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تم مجھے کہاں ملو گے؟" سراج نے یوں کہا کہ مجھے اس کے لہجے کی مایوسی کا اندازہ ہوا۔

"ممکن ہے میں نہ ملوں۔" میں نے کہا۔ "ایمبولینس ڈرائیور سے کہنا کہ گاڑی کو دوسری گاڑیوں کے ساتھ روک دے۔ تم گیٹ پہ اپنی شناخت کراؤ گے اور کرنل حضور احمد سے ملنے کے لیے اندر جاؤ گے... ان کے بنگلے پر۔"

"یہ کرنل حضور احمد کون ہے؟"

"یہ جاننا تمھارے لیے ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بنگلہ آخری حصے میں ہے اور گیٹ پہ موجود سنتری خود تم کو بتا دے گا کہ تمھیں کدھر سے جانا ہے۔ اگر تم اپنی کار میں آؤ تب بھی کوئی حرج نہیں لیکن کار کو ایمبولینس کے پیچھے رکھنا۔ اور ایمبولینس کے ساتھ موجود رہنا۔ جتنی دیر میں تم اندر کا چکر لگا کے آؤ گے، تمھاری ماں کو ڈیڈی کی جگہ ایمبولینس میں لٹا دیا جائے گا اور تم ایمبولینس کو لے کر روانہ ہو جاؤ گے۔ چونکہ تم اپنی ایک شناخت رکھتے ہو اس لیے سب کو معلوم ہوگا کہ ایس ایس پی صاحب کس کام سے کرنل حضور احمد خان سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ تم کسی قسم کی ہنگامہ آرائی میں ملوث ہو ہی نہیں سکتے۔"

"سنتری پہلے کرنل سے پوچھے گا۔" سراج نے کہا۔

"پوچھنے دو... وہ ایک ایس ایس پی کو بلاوجہ نہیں روکے گا... وہ تمھیں عزت کے ساتھ ریسیو کرے گا... بٹھائے گا اور چائے پلائے گا..." میں نے کہا۔

"وہ پھر بھی تو پوچھے گا کہ میرے آنے کی..."

"تم اس کی وجہ بات بیان کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "ایمبولینس کے ڈرائیور کو سمجھا دینا کہ وہ قبل از وقت مداخلت نہ کرے۔ جب مریض اتار لیا جائے اور دوسری خاتون مریضہ کو لٹا دیا جائے تو وہ تمھاری کوٹھی پہ پہنچ جائے۔ تمھاری گاڑی کا نمبر کیا ہے؟"

"ایل ای اے۔ ڈبل فور ڈبل سیون زیرو... یہ مت بھول سکندر کہ تم دھوکا دے سکتے ہو... آج... میرا کل بھی آئے گا۔"

"کل کی کل سوچیں گے اور دیکھیں گے۔" میں نے کہا۔

"میری طرف سے تم ایک جنٹلمین ہو ورنہ آفت آ کر پہنچ سکتے ہو... تم کو تو مطمئن ہو جانا چاہیے۔ بیٹھے بٹھائے تم جیسے بدمعاش پر اعتبار کر رہا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ مجھے گالی دیتا میں نے لائن کاٹ دی اور نیچے اتر آیا۔ میں نے میجر سلطان کو جو وقت دیا تھا وہ ہو گیا تھا اور ابھی میں سی ایم ایچ سے بہت دور تھا لیکن آگے چھاؤنی کے علاقے تک مال روڈ صاف اور خالی تھی۔ میں نے نئے فاکس ویگن کے سولہ سو سی سی انجن کی طاقت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور سی ایم ایچ پہنچنے تک جولی کو سب کچھ سمجھا دیا۔ حسب توقع گیٹ پر گارڈ نے مجھے بیریئر سے پہلے ہی روک لیا۔

"مجھے میجر سلطان کے پاس جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"اور کون ہے آپ کے ساتھ؟" گارڈ نے کہا۔

"میری بیمار ماں... اور میری سسٹر۔" میں نے کہا۔

گارڈ نے سر ہلا کے اشارہ کیا اور بیریئر اٹھ گیا۔ "سیدھے ہاتھ پر چوتھی بیرک۔ ان کا کمرا ساتواں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ سو گز کے فاصلے پر ایک چوک سا تھا جس کے وسط میں پول پر بہت سے رہنمائی کرنے والے سائن لگے ہوئے تھے۔ میں بائیں جانب چوتھی بیرک کے پاس رکا اور گاڑی سے اتر گیا۔ جولی نے میری جگہ سنبھالی اور گاڑی کو ڈرائیو کرتی ہوئی ادھر لے گئی جہاں بہت سی دوسری گاڑیاں اور ایمبولینسیں کھڑی ہوئی تھیں۔ میجر سلطان کا کمرا تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر پرجوش مصافحہ کیا۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے کچھ دیر ہو گئی۔" میں نے کہا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ پھر نکل گئے کسی غیر متوقع ایڈونچر کے لیے۔" وہ ہنسا۔ "یہ بتاؤ کیا پیو گے... چائے یا کافی؟"

"کافی۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے ایک ضروری بات۔ ایک شخص جو خود کو ایس ایس پی سراج کہتا ہے میرے تعاقب میں ہے۔ اگر وہ یہاں آئے تو اسے گیٹ پر روک لیا جائے۔ اور ریڈ کراس کی ایک ایمبولینس کو چیک کر کے گزرنے دیا جائے۔ اس میں ڈرائیور کے علاوہ صرف ایک مریض ہونا چاہیے۔"

"معاملہ کیا ہے... آئی سی۔" وہ پریشان ہو کے بولا۔

"ایوری تھنگ از فائن۔" میں نے کہا۔

"کیا ہم اس شخص کو گرفتار کر لیں؟" میجر سلطان نے فون اٹھا کے کہا۔ "جو ایس ایس پی بن کے آئے گا۔"

"میرا مشورہ ہے کہ آپ اس چکر میں نہ پڑیں۔ اسے واپس لوٹا دیں تھوڑا سا ڈرا دھمکا کے... یا تھوڑی دیر بند رکھیں اور پھر چھوڑ دیں۔" میں نے کہا۔

میجر سلطان نے سر ہلایا اور فون پر ہدایات دینے لگا۔ پھر اس نے گھنٹی بجا کے بیٹ مین کو طلب کیا اور اس کو کافی لانے کے لیے کہا۔

"اب بتاؤ معاملہ کیا ہے؟" میجر سلطان نے کہا۔

"معاملہ صرف اتنا ہے۔" میں نے کہا: "کہ میرا ایک ساتھی ان کی قید میں تھا۔ وہ اس کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہیں کیونکہ ہم نے بھی ان کا ایک آدمی پکڑ لیا تھا۔ جنگی قیدیوں کا یہ تبادلہ بہت مشکل تھا کیونکہ کسی کو کسی پر اعتبار نہیں تھا۔ میں نے یہ تجویز دی کہ ان کا آدمی ریڈ کراس کی ایمبولینس میں یہاں پہنچا دیا جائے۔ ان کے آدمی کو میں لے آیا ہوں۔ اندر ہی کسی کی مداخلت کے بغیر تبادلہ ہو جائے گا۔ یہاں نہ وہ کوئی گڑبڑ کر سکتے تھے... اور نہ ہم... ایمبولینس ان کے آدمی کو لے کر چلی جائے گی تو میں اپنے آدمی کے ساتھ روانہ ہو جاؤں گا۔ نیوٹرل زون تھا میرے لیے یہ ممکن کارروائی کسی خرابی یا اندیشے کے بغیر آپ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھی۔"

میجر سلطان ہنسنے لگا۔ "بس یار میری نوکری کا خیال رکھنا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ... یہ ایک ہوٹل ہے یہاں کوئی اونچی آواز میں بات بھی کرے تو غلط... گڑبڑ کا کیا سوال..." میں نے کہا۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ "یس؟" میجر نے ریسیور اٹھا کے کہا۔ "ہاں... میں نے کہا تھا کہ ایمبولینس کو گزرنے دو، لیکن چیک کر لو پہلے۔ ڈرائیور کا شناختی کارڈ دیکھو۔ ایک مریض کے سوا کچھ نہیں ہونا چاہیے اس میں۔" اس نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ کافی آ گئی۔ بیٹ مین نے ایک مگ میرے سامنے رکھا اور دوسرا میجر کے سامنے۔ اسی وقت گھنٹی پھر بجی۔

"یس... کیسے؟" میجر سلطان نے کہا۔ "کون کرنل منصور احمد خان؟ کیا تم نہیں جانتے کہ اس نام کا کوئی آفیسر نہیں ہے یہاں... کون ہے؟ وہی ایس پی... ویٹ باسٹرڈ... ہولڈ کرو اس کو اپنے پاس... اندر بٹھاؤ اور جب تک میں نہ کہوں جانے مت دو۔"

میرا دل چاہتا تھا کہ میں قہقہے مار کے ہنسوں۔ اصل ایس ایس پی سراج کو ایک جعلساز قرار دے کر روک لیا گیا تھا۔ اب وہ لاکھ اپنا شناختی کارڈ دکھائے، وہ اسے چھوڑنے والے نہیں جن کے لیے آرڈر از آرڈر۔

"مجھے ایک بات بتاؤ۔" میجر سلطان نے اچانک کہا۔ "کیا یہ واقعی جعلی ایس ایس پی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ اصلی ایس ایس پی ہے۔"

"اور وہ تمہارے پیچھے... تم کو گرفتار کرنے کے لیے آیا ہے؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "تمہیں مجھ کو بچانا ہے میجر سلطان۔ میں تم کو دوست سمجھ کے آیا ہوں۔"

"تم نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔" وہ پریشان ہو کے بولا۔ "کیا کرنل منصور احمد خان کا نام تم نے دیا تھا اسے؟"

میں نے سر جھکا کر گردن ہلا کے اپنے جرم کا اقرار کیا۔

"میرے خیال میں یہ وجہ کافی ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "تم نے اچھا کیا کہ مجھے بتا دیا۔ میرے پاس اس کو روکے رکھنے کی معقول وجہ ہے۔ مجھ پر کوئی الزام نہیں آ سکتا... خیر چھوڑو... یہ بتاؤ کہ آجکل کیا کر رہے ہو؟"

"بہت کچھ... وہی جو پہلے کرتے تھے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تفصیل ابھی نہیں بتا سکتا... کیونکہ مجھے جانا ہے۔"

"یہ تم کو آنے سے پہلے سوچنا تھا کہ تم واپس کیسے جاؤ گے۔" میجر سلطان نے گرج کے کہا۔ اس نے گھنٹی پر ہاتھ مارا۔

میں اس تبدیلی پر ہم بخود رہ گیا۔ "واٹ از آل دس... کیا مطلب ہے آخر اس کا...؟"

"مطلب بھی سمجھ جاؤ گے... یہ ممنوعہ علاقہ ہے... تم نے کیا اپنے باپ کا گھر سمجھ لیا تھا؟" میجر سلطان نے کہا۔ "تم آئے کیسے اندر...؟"

"یس سر..." بیٹ مین نے اٹینشن ہو کے کہا۔

"گارڈ کو بلاؤ۔" میجر سلطان نے کہا اور اس وقت میں نے محسوس کیا کہ بازی الٹ گئی ہے۔ سراج اندر آ چکا تھا اور میری حیثیت اس گیدڑ کی طرح ہو گئی تھی جسے شامت گھیر کر شہر کی طرف لے گئی ہو۔

"**میجر سلطان**" سراج نے ایک تمسخرانہ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور آگے بڑھا۔

"یس۔" میجر سلطان نے کہا۔ "آر یو دی ایس پی؟"

"ایس ایس پی۔" سراج نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"ناٹ جسٹ ایس پی۔ میرا نام سراج ہے۔"

میجر سلطان نے اس سے ہاتھ ملایا اور اسے کرسی پیش کی۔

"میرا خیال ہے..."

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔" سراج بولا۔ "آپ نے مجھے گیٹ پر روک لینے کا حکم دیا تھا لیکن میں پھر بھی اندر آ گیا۔"

میجر سلطان کے چہرے پر ناگواری کے آثار پھیل گئے۔ "مجھے بتایا گیا تھا کہ تم کسی کرنل منصور احمد خان کو پوچھ رہے تھے اور اپنی شناخت بھی نہیں کرا رہے تھے۔"

"واٹ نان سینس۔ میں خود اپنی شناخت ہوں۔ میں کوئی سڑک پر کھڑا ہوا ٹریفک کانسٹیبل نہیں ہوں۔ [illegible]"

"معاف کیجیے یہ وردی میں نے بہت سے فلمی اداکاروں کے جسم پر بھی دیکھی ہے... فلموں میں۔" میجر سلطان نے خشک لہجے میں کہا۔ "جناب والا آپ کی شناخت یہ وردی نہیں ہے اگر کوئی جنرل کی وردی میں بھی آ جائے اور ہم اسے پہچانتے نہ ہوں تو اسے چیک کیا جائے گا۔ اسے اپنی شناخت کا ثبوت پیش کرنے میں عار محسوس نہیں ہوگی اور وہ ہماری فرض شناسی پر خفا نہیں ہوگا۔ ڈیوٹی از ڈیوٹی۔"

"ان دیٹ کیس۔" سراج نے اپنا شناختی کارڈ جیب سے نکال کے میز پر ڈال دیا۔ "یہ آپ دیکھ لیں اور اگر اس پر بھی جعلی ہونے کا شک ہے تو میں یہاں بیٹھا ہوں۔ آپ تصدیق کرا لیں۔"

میجر سلطان نے شناختی کارڈ کو میز سے اٹھا کے غور سے دیکھا لیکن اس تمام عرصے میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی میری طرف سے غافل نہیں ہوا۔ اس کا ریوالور میرے سینے کا نشانہ لیے ہوئے تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ کیا میجر سلطان نے سراج کو پہلے دیکھ لیا تھا اور اس کے رویے میں اچانک جو تبدیلی آئی تھی وہ ایک ضرورت کا تقاضا تھی۔ کیا اس طرح وہ مجھے سراج کی تحویل میں نہ دینے کا جواز پیدا کر رہا تھا۔

"گیٹ پر بھی میں نے اپنی شناخت کرانے سے انکار نہیں کیا تھا۔" سراج نے اپنی بات جاری رکھی۔ "کرنل منصور احمد خان کو پوچھنے کی غلطی ضرور کی تھی میں نے۔ میں دراصل سی ایم ایچ کے او سی کا نام بھول گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاید یہی سی ایم ایچ میں آخری بار میں دو سال پہلے آیا تھا۔ میرا ایک دوست یہاں داخل تھا۔"

"اور آج آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟"

"یو نو میجر۔" سراج نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "اٹ واز اے میٹر آف چانس۔ کہ جس وقت تمہارے حکم پر مجھے روکا گیا تو اندر سے لیفٹیننٹ کرنل بخاری باہر جا رہے تھے۔ ہی از فرام سکھر۔ اور ان کے گھر پچھلے سال ہی میں گیا تھا۔ وہ مجھے جانتے تھے۔ ان کا گھریلو ملازم کچھ چوری کر کے نکل گیا تھا۔ میں نے اسے چوبیس گھنٹے سے پہلے پکڑ لیا تھا اور ایک ایک چیز ان کو واپس مل گئی۔ ان کی وائف کی جیولری میں سے ایک انگوٹھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔ کرنل بخاری نے میری مدد کی۔ میں نے کہا کہ مجھے میجر سلطان... ڈاکٹر میجر سلطان کے پاس جانا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ [illegible] پہنچے۔ پھر انھوں نے گارڈ کو سمجھا دیا۔ اینڈ ہیئر آئی ایم۔"

"فائن۔" میجر سلطان نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "آپ کے آنے کا مقصد میں سمجھ گیا۔ غالباً آپ اس شخص کے تعاقب میں تھے۔"

"غالباً کی اس میں کیا بات ہے۔" سراج نے کہا۔ "یو نو دس مین... یہ ایک خطرناک قاتل ہے۔ مفرور مجرم ہے اور جیسا کہ آپ نے ابھی کہا تھا اس پر غداری اور ملک دشمنی کے الزامات ہیں۔"

میجر سلطان نے اقرار میں سر ہلایا۔ "مجھے معلوم ہے۔"

[illegible] کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ آپ کے کمرے میں کیا کر رہا تھا۔"

"نہیں۔ آپ نہیں پوچھ سکتے۔ میں آپ کو جواب دہ نہیں ہوں مسٹر ایس ایس پی۔" میجر سلطان نے کہا۔ "میں نے اسے گرفتار کر لیا ہے۔"

"بڑے دوستانہ طریقے پر۔" سراج نے تلخی سے کہا۔ "کافی پلا کے۔ شاید یہ ٹریپ کرنے کے لیے ضروری تھا۔"

"کیا ضروری تھا اور کیا نہیں تھا۔" میجر سلطان نے سختی سے کہا۔ "یہ میں سمجھتا ہوں۔"

"اور میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ بالکل غیر ضروری ہے۔ یہ تمہارا کام نہیں ہے میجر۔" سراج نے برہمی سے کہا۔ "تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ اس آدمی کو میرے حوالے کر دو۔"

"ڈونٹ یو فارگٹ۔" میجر سلطان نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کہ جہاں تم اس وقت بیٹھے ہوئے ہو یہاں تمہارے اختیارات کی اہمیت صفر ہے۔ یہ علاقہ تمہاری جیورسڈکشن میں نہیں آتا مسٹر ایس ایس پی۔ اگر تم صرف یہی کہنے آئے تھے تو تم جا سکتے ہو۔ میں تمہارا مطالبہ مسترد کرتا ہوں۔"

"تمہیں ایسا کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔"

"میں پوری طرح با اختیار ہوں۔ میں اس شخص کو ایف آئی یو کے حوالے کر دوں گا۔ اس کے بعد میری ذمہ داری ختم۔" میجر سلطان نے کہا۔ "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ایک رات یہ شخص زبردستی میرے گھر میں گھس آیا تھا۔ میری بیوی ابھی تک نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ ان کو میں نے پکڑ لیا تھا مگر یہ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے دونوں ساتھیوں کو بھی ایف آئی یو کے حوالے کر دیا تھا۔ ایف آئی یو کا مطلب سمجھتے ہو؟ فیلڈ انٹیلی جنس یونٹ۔ یہاں کینٹ میں ان کے ایک آفیسر نے تفتیش کی تو وہ دشمن کے ایجنٹ ثابت ہوئے۔ ان سے بہت سی مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے کیا بتایا۔ مگر ایف آئی یو کے اس آفیسر نے بعد میں مجھ سے فون پر کہا کہ ان کی گرفتاری کے بعد سنسنی خیز انکشافات ہوئے۔ بہت سے دوسرے لوگ پکڑے گئے اور کافی مقدار میں غیر ملکی اسلحہ بھی ملا۔ جو غالباً مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کے حالات کو بگاڑنے کے لیے وہاں بھیجا جانے والا تھا۔ آئی ایم ناٹ شیور۔ یہ خیال ہے میرا...!"

سراج یقین اور بے یقینی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سب کچھ سن رہا تھا اور شاید یہ سوچ رہا تھا کہ وہ پکڑے جانے والے کون تھے؟ اگر اس کے اپنے آدمی ہوں گے تو وہ فوراً سمجھ گیا ہوگا کہ ان کو پکڑوانے والا میں تھا۔

"تمہاری بات سے ابھی تک یہ وضاحت نہیں ہوئی۔" سراج نے کہا۔ "کہ اس وقت یہ مجرم خود تمہارے پاس گرفتار ہونے کے لیے کیوں چلا آیا۔"

"یہ مجھے ایک آفر دینے آیا تھا۔"

www.paksociety.com

"جیسے تم نے مسترد کر دیا ہو گا۔" سراج نے تمسخر اڑانے کے طنزیہ انداز میں کہا۔ "لاکھ لے دیری فتح دار الشرائیہ محب وطن پاکستان اور پھر اس نے تمہیں دھمکی دی ہو گی کہ تمہارے بیوی بچوں کی خیر نہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس فضول اور بے سروپا بات پر یقین کر لوں میجر؟"

"تم کیا کرو گے، یہ میرے سوچنے کی بات نہیں ہے۔" میجر سلطان نے کہا۔ "اور مجھے کیا کرنا ہے یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں۔"

دو گارڈ اندر داخل ہوئے جن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ اس وقت گھنٹی بجی۔

"یس — ہاں — وہ موجود ہیں یہاں۔" میجر سلطان نے کہا۔ "میرے پاس بیٹھے ہیں۔ اوکے — میں بھیج دیتا ہوں۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ "کمانڈنٹ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر آپ کو کوئی کام تھا تو کسی میرے جیسے ماتحت کے پاس آنے کے بجائے آپ کو ان کے پاس جانا چاہیے تھا۔ گارڈ آپ کو وہاں پہنچا دیں گے۔"

سراج کا چہرہ بگڑ گیا۔ "جانے سے پہلے میں ان سے بات کر لوں گا ٹیلی فون پر۔"

میجر سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم صرف وہی کرتے ہیں جو ہم سے کہا جاتا ہے۔ کمانڈنٹ نے کہا ہے کہ آپ کو بھیج دیا جائے اور یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں آپ کو بھیج دوں۔ وہ آپ کے منتظر ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" سراج کھڑا ہو گیا۔ "لیکن مجھے واپسی پر یہ شخص یہیں ملنا چاہیے۔"

"تم مجھے آرڈر دے رہے ہو؟" میجر سلطان نے کہا۔

"آرڈر بھی دے آؤں گا میں۔ میں تمہارے کمانڈنٹ کو پوری صورت حال سمجھا دوں گا کہ ایک میجر اداۓ فرض کی راہ میں حائل ہو رہا ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ اپنے افسر سے بات کر سکتے ہو مگر میں آئی جی صاحب کے ذریعے ہوم سیکرٹری سے اور تمہاری وزارت دفاع کے اعلیٰ حکام سے بھی احکامات حاصل کر سکتا ہوں۔"

"میں تم کو روک نہیں رہا ہوں۔" میجر نے سرد لہجے میں کہا۔ "جب میں اپنا فرض پورا کر رہا ہوں تو مجھے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی دھمکیاں اپنے پاس رکھو۔ شاید تم جانتے نہیں کہ میری واقفیت تمہارے آئی جی صاحب کی کیا ہے لیکن تم جان لو گے بہت جلد۔"

سراج کا رنگ پل بھر کے لیے بدلا۔ "ٹھیک ہے میجر۔ واٹ ایور آل دس ٹرائبل۔ تم سکندر بخت کو میرے حوالے کر دو۔"

"سکندر بخت کون ہے؟" میجر سلطان نے سکون سے کہا۔

"سکندر بخت کون ہے — ڈونٹ پلے فول۔" سراج کا چہرہ سرخ ہوا مگر پھر اس نے مصلحت کا تقاضا سمجھتے ہوئے خود پر قابو پالیا۔ "سکندر بخت یہ شخص ہے۔" اس نے ایک جھٹکے سے میری طرف انگلی اٹھائی۔

"میرا خیال ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس شخص کا نام میری معلومات کے مطابق سکندر بخت نہیں ہے۔" میجر سلطان نے کہا۔

"تو اپنی معلومات کو درست کر لو۔ یہ سکندر بخت ہے۔" سراج کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "میں بتا رہا ہوں تمہیں۔"

"معلوم کرنے والے خود ہی معلوم کر لیں گے۔" میجر سلطان نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اس کے ساتھ جو لوگ پکڑے گئے تھے انہوں نے کچھ اور نام بتایا تھا۔"

"کیا نام بتایا تھا؟"

"اٹ از ناٹ سیکرٹ انفارمیشن۔ میں بھی اس لیے جانتا ہوں کہ میرا براہ راست تعلق ہو گیا تھا، ورنہ صرف تفتیش کرنے والے جانتے ہوں گے یا وہ جو مجاز ہیں۔ میرا کمانڈنگ آفیسر بھی اس معاملے میں ایک غیر متعلق شخص ہے۔ تم اس سے بات کر کے دیکھ لو۔ وہ کچھ نہیں جانتا اور وہ دخل دے گا بھی نہیں۔ آئی تھنک کہ تم کو وہ بات نہیں کرنی چاہیے ایس ایس پی صاحب۔ کمانڈنٹ صاحب کے پاس بہت کام ہوتے ہیں۔ وہ سارا دن آپ کے انتظار میں ضائع نہیں کر سکتے۔"

میجر سلطان کا رویہ تقریباً گیٹ آؤٹ کہنے کا تقاضا تھا۔ بے بسی اور اشتعال کے عالم میں سراج مجھے خون آشام نظروں سے گھورتا ہوا اور اپنی بے بسی پر پیچ و تاب کھاتا ہوا کمرے سے نکلا۔

"دیکھ لوں گا میں۔" اس نے زیر لب کہا۔

"یو سے گو ٹو ہیل۔" میجر سلطان نے بھی زیر لب کہا۔

سراج ایک دم پلٹا۔ "کیا کہا تم نے؟"

میجر سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔ "جو تم نے کہا تھا اس کا جواب میں نے نہیں دیا۔"

دونوں مسلح گارڈ جن کو بیٹ مین نے بھیجا تھا اب میجر سلطان کے اشارے کے منتظر تھے کھڑے ہوئے تھے۔

"انہیں کیپٹن افتخار کے پاس لے جاؤ۔" میجر سلطان نے کچھ سوچ کر کہا۔ "ان سے کہنا کہ ابھی چیک کریں۔ ایک منٹ۔ پہلے میں بات کر لوں۔" اس نے فون اٹھا کے کیپٹن افتخار کا نمبر ملایا۔

"افتخار، جیسی میں ایک کیس بھیج رہا ہوں۔ آئی تھنک ہی از ناٹ نارمل۔ تم ذرا دیکھو کہ کس حد تک ابنارمل ہے۔ میرا مطلب ہے کہ از ہی ڈینجرس۔ پھر میں تم سے وہیں آ کے بات کرتا ہوں۔ ابھی میری گاڑی سروس کے لیے گئی تھی۔ یہ شاید سروس اسٹیشن سے نکلا تو میں چھپ کر بیٹھ گیا اور میرے کمرے میں گھس آیا۔ کہتا ہے کہ میں پاکستان کا بادشاہ ہوں۔ الحمد للہ کہ اگر کسی نے اس کی حکومت کو تسلیم کیا تو یہ اپنا کیس اقوام متحدہ میں لے جائے گا۔ یہ مجھے اپنا وزیر دفاع بنا کا قلمدان سونپنے کو تیار تھا۔" میجر سلطان ہنسا۔ "وزیر اعظم اس نے اپنے ماموں کو نامزد کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ خطرناک نہیں ہے۔ بس کریک ہے۔" اس نے فون رکھ دیا اور گارڈز سے کہا کہ مجھے لے جائیں۔

میں اب بہت مطمئن تھا اور میں نے اس تمام گفتگو کا ذہنی طور سے تجزیہ کیا تھا جو میجر سلطان اور سراج کے درمیان ہوئی تھی۔ میجر سلطان نے بہت ذہانت سے کام لیا تھا۔ اس کے لیے اپنی پوزیشن کو محفوظ رکھنا بھی بے حد ضروری تھا۔ مجھے شرمندگی تھی تو صرف اس بات کی کہ میری وجہ سے وہ ذہنی پریشانی میں مبتلا ہوا اور اسے ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے دس جھوٹ بولنے پڑے۔ بے شک یہ سب جھوٹ نیک نیتی سے بولے گئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ سچ کیا ہے مگر وہ خود اس سچ کو تسلیم کرتا تو سچائی کے راستے پر چلنے والوں کی مدد کرنے کے بجائے ان کی راہ میں مشکلات کا اضافہ کرتا۔ شرمندگی سے زیادہ مجھے پریشانی تھی کہ کیوں سراج کے عزائم کی راہ میں حائل ہو کے میجر سلطان نے اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے مصیبت کا سامان کر لیا ہے۔ یہ کینہ پرور اور کمینے لوگوں کا گروہ تھا جو ہمارے جیسے نیک جذبات رکھنے والوں کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔

ایک جیپ مجھے کیپٹن افتخار کے پاس لے گئی۔ وہ یقیناً میجر سلطان کے لیے قابل اعتماد تھا اور وہ مجھے براہ راست نکالنے سے پیدا ہونے والی مشکلات سے بچنا چاہتا تھا۔ میں طے کر چکا تھا کہ ان حالات میں میرا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ کیپٹن افتخار کا تعلق یقیناً شعبۂ ذہنی امراض سے تھا اور وہ ماہر نفسیات یا سائیکاٹرسٹ ہو سکتا تھا۔

جیپ رکی اور گارڈ مجھے ایک بیرک کے آخری کمرے میں لے گئے۔ بظاہر بیرک خالی لگتی تھی اور وہاں کا سناٹا بھی افسردہ لگتا تھا۔ کیپٹن افتخار نے مجھے اپنے کمرے میں بڑی خوشدلی سے ریسیو کیا۔ وہ گھنی بے ترتیب تراشی ہوئی داڑھی والا فربہ جسم اور لباس کی طرف سے بے پروا شخص تھا۔ اس کی پتلون چونکہ توند کے گنبد پر ٹھہر نہیں سکتی تھی اس لیے وہ کالک والے گیلس کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ ڈھیلی ڈھالی قمیص پر اس نے بہت چوڑی ٹائی باندھ رکھی تھی مگر کالر کھلے ہوئے تھے چنانچہ ٹائی کی ناٹ بھی ڈھیلی تھی۔ وہ منہ میں ایک بجھا ہوا پائپ دبائے کھڑا تھا۔

"ہیلو مائی لورڈ۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "بیٹھو یہاں میرے سامنے۔ تم جاؤ۔" اس نے دونوں گارڈز سے کہا۔ میڈیکل کور اور ایجوکیشن کور میں بھی ایسے لوگ بہت نظر آتے ہیں جو کسی طرح بھی فوجی نہیں لگتے مگر وہ اعزازی عہدے رکھتے ہیں یا پھر شارٹ سروس کمیشن کے لیے اپنی اعلیٰ فنی صلاحیتوں کی بنیاد پر منتخب ہوتے ہیں۔ ان کے لیے جسمانی فٹنس کے معیار کو مدنظر نہیں رکھا جاتا۔

"تو تم ہو پاکستان کے بادشاہ۔" وہ پائپ سلگاتے ہوئے بولا۔

"ہم اس طرز تخاطب کو پسند نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "کیا بادشاہوں سے گفتگو کے یہی آداب ہیں۔ افسوس کہ ابھی ما بدولت تخت نشین نہیں ہوئے ورنہ ہم تمہیں اس گستاخی کی سزا دیتے۔"

"میں معافی کا خواستگار ہوں ظل الٰہی۔" ڈاکٹر افتخار نے مقدور بھر سنجیدہ ہو کے کہا مگر اس کی زیر لب مسکراہٹ بدستور میری دیوانگی کا تمسخر اڑا رہی تھی۔ "تخت نشینی میں تاخیر اور التوا کا سبب کیا ہے؟"

"ہم مناسب وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔" میں نے کرسی پر یوں بیٹھتے ہوئے کہا جیسے وہ تخت طاؤس ہو۔

"حضور والا جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔"

"اجازت ہے۔" میں نے باوقار آواز میں کہا۔

"آپ موروثی بادشاہ تو نہیں ہیں۔ پھر آپ کو پاکستان کا بادشاہ کس نے بنایا؟"

"تمہاری تقرری اور ترقی کے احکامات کہاں سے آتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اوپر سے۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔

"ہمیں بھی اوپر سے حکم ملا۔" میں آسمان کی طرف انگلی اٹھا کے بولا۔ "کہ اے بندے! اٹھ اور اقتدار سنبھال کہ آٹھ سو سالہ عہد حکومت کی یاد تازہ کر مغلوں کے جاہ و جلال کو بحال کر مسلمانان پاکستان کو فاتح عالم قوم بنا اور دنیا میں اسلام کا ڈنکا بجا۔"

"بہت خوب اور یہ احکامات آپ کو کیسے موصول ہوئے تھے شہنشاہ معظم؟" کیپٹن افتخار نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

"یہ سب ہم سے آواز غیب نے کہا۔ ہمیں خواب میں بشارت ہوئی اور خود ہم پر علم و عرفان کے دروازے کھلتے گئے۔" میں نے کہا۔

"آپ کا ارادہ کب تک اپنی بادشاہت کا اعلان کرنے کا ہے؟"

"اس صدی کے اواخر تک۔" میں نے متانت سے کہا۔ "ابھی ہمیں آفت سے بکھرے ہوئے شیرازے کو سمیٹنا ہے۔ اپنی صفوں کو منظم کرنا ہے۔ ہم اپنی کابینہ کے لیے ہم خیال اور باصلاحیت افراد کا انتخاب کر رہے ہیں۔"

"میں نے سنا ہے کہ وزارت دفاع کے لیے آپ نے میجر سلطان کو منتخب فرما لیا ہے۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔

"تم نے ٹھیک سنا ہے۔"

"اور وزارت عظمیٰ کا منصب آپ کس کے تفویض کر رہے ہیں عالم پناہ؟"

"اس کے لیے ہم اپنے برادر نسبتی سے بہتر کسی کو نہیں پاتے لیکن ہم اپنے چچا ابو کو غائبانہ وزیراعظم بنانے کے امکانات کا بھی جائزہ لے رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"غائبانہ وزیر اعظم؟" کیپٹن افتخار نے ہنسی پر قابو پایا۔ "ان کی عدم موجودگی میں؟"

"ان کے عدم آباد میں ہونے کے باعث۔" میں نے سکون سے کہا۔

www.paksociety.com

"اچھا۔ خیر چھوڑیے۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "یہ فرمائیے کہ آپ کو میجر سلطان کا پتا کس نے دیا؟ میرا مطلب ہے، اسے اپنا وزیرِ دفاع بنانے کے لیے آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"ہم جو کچھ کرتے ہیں اس کو تائیدِ غیبی حاصل ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ یہ بے مقصد گفتگو آگے بڑھتی، میجر سلطان اندر آ گیا۔

"ہاں بھئی۔ کیا رپورٹ ہے؟"

"یار سلطان۔ کون ہے آخر یہ؟" کیپٹن افتخار نے انگریزی میں کہا۔

"کچھ نہیں یار۔ ہمارا بہت پرانا ملنے والا ہے۔ آج کل ہمارے ہی پاس رہتا ہے۔" میجر سلطان نے بھی انگریزی ہی میں کہا۔ "تھوڑا سا کریک ہے مگر بے ضرر ہے۔ نام تو غلام علی تھا مگر سب گلو کہتے ہیں۔"

"ہاں۔ اندازہ میں نے بھی یہی لگایا کہ بس تھوڑا سا سنکی ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں، بہت سے لوگوں کو خواب میں بشارت ہوتی رہتی ہے۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "یہ اپنے تصورات کی ایک دنیا بنا لیتے ہیں اور اسی میں سوتے جاگتے ہیں۔ تم اسے یہاں کیوں لے آئے تھے؟"

"میں کہاں لایا یار۔" سلطان نے کہا۔ "یہ پتا نہیں کیسے گاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا اور میں نے تو اس وقت دیکھا جب یہ بھی آفس پہنچ گیا۔ بڑی گڑبڑ ہو جاتی اگر گلو اندر گھومنا شروع کر دیتا اور سب کے سامنے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیتا۔ اسے پکڑ کر گارڈ روم میں بند کر دیا جاتا اور مجھے پتا بھی نہ چلتا۔ میں نے سوچا تمہارے پاس بھیج دوں۔"

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس کی پوری کیس ہسٹری..."

"چھوڑو یار۔ مجھے سب معلوم ہے۔" سلطان نے کہا۔ "دس بارہ سال سے تو میں جانتا ہوں اسے۔ گھر کا سارا کام کر لیتا ہے۔ بس کبھی کبھی بادشاہت کا دورہ پڑتا ہے تو وہ کوئی خاص بری بات نہیں۔"

سلطان کی بات ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے سے ادھوری رہ گئی۔ افتخار نے فون اٹھا لیا۔ "یس۔۔۔ یس سر۔۔۔ جی سر۔۔۔ وہ یہاں ہے۔ وہ کوئی ایسی خاص بات نہیں سر۔ ہی از اے لٹل ابنارمل۔ خود کو پاکستان کا بادشاہ سمجھتا ہے۔ دیٹس آل۔۔۔ ویسے بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے ایک گھنٹے تک اس کو چیک کیا ہے۔ اسے تھوڑے سے ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔ نو سر۔ ہم کیسے رکھ سکتے ہیں۔ وہ میجر سلطان کا ملازم ہے۔ یس سر، ملازم۔ گلو نام ہے اس کا۔"

میجر سلطان نے اسے اشارے سے منع کیا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ نہ کہے۔ اس کی بات افتخار نے [illegible]۔

"نہیں سر۔ مجھے تو سلطان نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ خود میں نے ساری باتیں اس سے پوچھی ہیں۔ وہ ملازم ہے کہ دس بارہ سال سے سلطان کے گھر پر رہتا ہے۔ یس سر۔ اس نے اپنا نام غلام علی عرف گلو خود ہی بتایا ہے۔ نہیں سر۔ میجر سلطان سے میری کوئی خبر نہیں ہوئی۔ نہیں سر۔ آج تو میں نے اسے نہیں دیکھا۔ رائٹ سر۔ اگر وہ ادھر آیا۔ رائٹ سر۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ میں گونگے کی طرح ان دونوں کو دیکھتا رہا اور یہ ظاہر کرتا رہا کہ انگریزی زبان والی اس گفتگو کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔

"تم فوراً غائب ہو جاؤ یہاں سے۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "کمانڈنٹ کو شاید بادشاہ سلامت کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے اور وہ بادشاہ سلامت سے ملنا چاہتا ہے۔ اسے میں وہاں لے کر جا رہا ہوں۔"

"میرے بارے میں کیا بات تھی؟"

"اولڈ مین وانٹس ٹو سی یو۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "معلوم نہیں وہ اتنا خفا کیوں تھا۔ اس نے تمہارے آفس میں بھی تم کو پوچھا تھا مگر تم نہیں تھے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم مجھ سے پہلے پہنچ جاؤ۔"

میجر سلطان نے سر ہلایا۔ وہ کچھ تشویش میں مبتلا تھا اور اس کی یہ تشویش جائز تھی۔ کمانڈنٹ سے گفتگو میں کسی ایس ایس پی کا حوالہ نہیں تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ سراج اس سے ملنے گیا تھا۔ وہ اب بھی وہاں موجود ہوگا اور کمانڈنٹ کے سامنے اصرار کر رہا ہوگا کہ میں گلو نہیں، سکندر بخت ہوں۔ وہ شاید میرے خلاف تمام الزامات کی فہرست بھی سنا چکا ہوگا۔ اب اس کے سامنے سلطان کیسے انکار کرے گا کہ میں سکندر بخت نہیں ہوں، میں کیسے ثابت کروں گا کہ میں غلام علی عرف گلو ہوں اور کمانڈنٹ جیسے تجربہ کار افسر ہوتے ہیں، انہیں بے وقوف بنانا آسان نہیں ہوگا۔ وہ فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ جائے گا۔ کہیں میری وجہ سے میجر سلطان بھی مشکل میں نہ پڑ جائے۔ کمانڈنٹ فیصلہ کرے کہ مجھے پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔

"بادشاہ سلامت!" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "کیا آپ میرے ساتھ چلنے کی زحمت کریں گے؟"

"ہمیں کہاں جانا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ایک بااختیار شخص آپ سے ملاقات کا خواہاں ہے۔ آپ کی بادشاہت کو تسلیم کرانے میں بے حد مددگار ثابت ہوگا اور اگر آپ اسے سپہ سالارِ اعلیٰ مقرر فرما لیں گے تو وہ جاں نثار آپ کے دشمنوں کو نیست و نابود کر دے گا۔"

"پھر ہم اس کو ضرور شرفِ ملاقات بخشیں گے۔" میں نے کہا۔

جب میں ایک جیپ میں جس کے پچھلے دروازے پر سرخ رنگ کا کراس بنا ہوا تھا، کیپٹن افتخار کے ساتھ روانہ ہوا تو مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ یہ جھوٹ کی دلدل ہے اور میں اس میں دھنستا جا رہا ہوں۔ شاید میرے لیے اپنی شناخت کو چھپانے کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ ایک ایس ایس پی سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ پولیس کا سارا ریکارڈ منگوا سکتا ہے میری تصاویر کے ساتھ۔

کمانڈنگ افسر ایک پختہ عمر کا کرنل تھا جس کی عمر کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ چالیس سال کا بھی ہو سکتا تھا اور پچاس کا بھی۔ جسمانی طور پر وہ اتنا تندرست و توانا تھا کہ تیس کا لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی ایسی چمک تھی کہ وہ دیکھتا تھا تو اس کی نظر جسم سے گزرتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے سامنے جاتے ہی سب سے پہلے مجھے یہ دیکھ کر اطمینان حاصل ہوا کہ وہاں سراج موجود نہیں۔ کرنل ٹہلنے میں تھا اور ہاتھ پیچھے باندھ کر کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ سلطان اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک بار چند سیکنڈ کے لیے مجھے غور سے دیکھا۔ میرا دل اس خوف سے بیٹھنے لگا کہ کہیں وہ خود ہی مجھے شناخت نہ کر لے۔

"واٹ از آل دس افتخار؟" اس نے ناراضگی سے کہا۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا سر۔"

"ہاں۔ وہ سب مجھے میجر سلطان نے بھی بتایا۔ لیکن وہ سب کیا تھا جو اس اسٹوپڈ نے کہا۔ ڈیٹ بلڈی ایس پی۔ واٹ واز ہز نیم؟ سراج۔ یس۔" کرنل نے ٹہلتے ہوئے اچانک پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ "یہ آدمی تو مجھے اس سے بھی زیادہ اسٹوپڈ لگتا ہے۔ میرا ذہن تسلیم نہیں کرتا کہ یہ کوئی خطرناک قاتل مجرم ہو سکتا ہے۔"

"او نو سر۔ وہ ایس پی غلط فہمی۔۔۔"

"نو میجر۔ یہ ایس پی اگر خود آیا تھا تو کوئی بات ضرور تھی۔ صرف غلط فہمی کی بات ہوتی تو وہ اتنا اپ سیٹ نہ ہوتا۔" کرنل نے کہا۔ "وہ تمہارے گھر تک تفتیش کرتا۔ یہاں تک اس کا آنا مجھے شک میں مبتلا کرتا ہے۔"

"یہاں تک کا تعاقب کرتا ہوا نہیں آیا تھا سر۔" میجر سلطان نے کہا۔ "وہ کسی کرنل منصور احمد خان سے ملنے آیا تھا۔"

"کرنل منصور احمد خان۔ ہو دی ہیل از ہی؟"

"مجھے بھی نہیں معلوم سر۔ آپ گیٹ سے معلوم کر لیں۔ وہ بضد تھا کہ اسے کرنل منصور احمد خان سے ملنے کے لیے اندر جانے دیا جائے۔ گیٹ سے مجھ سے رابطہ قائم کیا گیا تو پھر میں نے اسے روک دیا۔ مگر اسی وقت اوپر سے لیفٹیننٹ کرنل بخاری آ گئے۔ ہی از فرام سیالکوٹ۔ وہ ایس پی کو جانتے تھے۔ کرنل بخاری نے اسے میرے پاس بھیج دیا اور وہاں اتفاق سے یہ موجود تھا۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، یہ چھپ کر آ گیا تھا۔ اب معلوم نہیں ایس پی کو کیسے کسی کی صورت کی شباہت نے دھوکا دیا۔ وہ میرے پیچھے پڑ گیا کہ گلو کو اس کے حوالے کر دوں۔"

"گلو۔ ہو از گلو؟"

"یہ سر۔" میجر سلطان نے میری طرف اشارہ کیا۔

"اور یہ بادشاہ سلامت؟" کرنل نے کہا۔ "ڈیٹ ایس پی واز ٹوٹلی اڈامنٹ۔ اس نے یہاں بھی سین کری ایٹ کیا۔ آئی تھنک ہی واز آؤٹ آف ہز مائنڈ۔ میں نے اسے یہی کہا تھا کہ کوئی غلط فہمی ہے تو رفع کی جا سکتی ہے۔ اس پر وہ تو بم کی طرح پھٹ گیا کہ غلط فہمی مجھے ہو گی۔ میں ایس ایس پی ہوں۔ آدھی سروس ہے میری۔ آدھی عمر گزر گئی ہے ایسے ہی کام کرتے۔ میں یہ ہوں اور وہ ہوں اور میں نے یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے۔ مائی فٹ۔ وہ تو ایسے بات کر رہا تھا جیسے [illegible]۔ میں نے کہا کہ ایک منٹ۔ جسٹ فارگیٹ کہ تم کیا ہو۔ مجھے حکم مت دو کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں تم کو نکلوا دوں، تم خود چلے جاؤ۔ اس معاملے کو میں خود دیکھ لوں گا۔ اگر وہ انسان کے بچوں کی طرح بات کرتا تو میں اس کی مدد کرتا۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ خود بھی تھوڑا سا ابنارمل ہے اور غالباً ہم سب تھوڑے بہت ابنارمل نہ ہوں تو نارمل نہیں رہ سکتے۔ ایم آئی رائٹ؟"

"وہ تو کرتا اگر کیا تھا سر جو تم پر چڑھ گیا ہو میرے ساتھ تو اس نے حد کر دی۔" میجر سلطان نے جلتی پر تیل چھڑکتے ہوئے کہا۔ "تھینکس گاڈ کہ میرا ٹمپر لوز نہیں ہے ورنہ میں اسے شوٹ کر دیتا۔"

کرنل نے ہاتھ اٹھایا۔ "[illegible]۔ میں اس قسم کی غلط فہمی وغیرہ کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ غلطی تمہاری تھی جو اس کو ساتھ لے آئے۔ تم کو آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔ کل کو خدانخواستہ تمہاری گاڑی میں کوئی خطرناک شخص چھپ کر بیٹھ گیا اور تمہیں پتا نہ چلا تو ہمیں بھی پتا نہیں چلے گا کہ تم کہاں گئے۔ اب لے جاؤ اس بادشاہ سلامت کو یہاں سے۔ لے جاؤ اور جا کے اس پولیس افسر سے ملو۔ کلیئر دس تھنگ۔ میں اس کے بارے میں مزید کچھ سننا نہیں چاہتا۔ اینڈ آئی ڈونٹ وانٹ ٹو سی اینی بلڈی ایس پی ہیئر۔ نیور اگین۔" اس نے ٹوپی سر پر رکھی۔ چھڑی بغل میں دبائی اور باہر نکل گیا۔ "خدا حافظ۔"

"فنٹاسٹک!" میجر سلطان نے اطمینان کی گہری سانس لے کر کہا۔

"مجھے معلوم ہے تم ماہرِ نفسیات ہو۔ تم کو بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لیے میں اعتراف کرتا ہوں کہ بے وقوف میں ہوں۔" میجر سلطان نے کہا۔ "تم کو جو کچھ پوچھنا ہے کل پوچھنا۔ خدا کا شکر ہے ایس ایس پی نے کرنل کے ساتھ جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ ورنہ ابھی وہ سب بتانا پڑتا جو میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔"

"تم کل یا اس کے بعد۔ ایک اطمینان بخش وضاحت کر لو گے؟"

"میں کوشش ضرور کروں گا۔ کوشش تو مجھے کرنی ہی پڑے گی۔"

میجر سلطان نے کہا۔ "ابھی تو تم اس آدمی کو اپنی جیپ میں لے جاؤ۔ میں اکیلا جانا چاہتا ہوں۔ یو آر اے فرینڈ۔ میں تم پر بھروسا کر سکتا ہوں۔"

کیپٹن افتخار نے کچھ دیر سوچا اور پھر وقار میں سر ہلا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اس کو کہاں لے جانا ہے؟" وہ بولا۔

"آپ اطمینان سے اپنے گھر جائیں۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

www.paksociety.com

روڈ کی طرح اور گاڑی کو باہر چھوڑ کے اندر چلے جائیں۔ پھر میں نکل جاؤں گا۔"

"تم ایک بہادر انسان، مخلص سپاہی اور کھرے پاکستانی ہونے کے ساتھ ساتھ اتنے اچھے اداکار بھی ہو۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "مسٹر سکندر بخت!"

"اس دنیا کے اسٹیج پر ہم سب اداکار ہیں۔" میں نے سر کو خم کر کے کہا۔

کیپٹن افتخار زور سے ہنسا۔ "مگر شیکسپیئر یہ کہنا بھول گیا تھا کہ کچھ اداکار اسکرپٹ لیتے ہیں باقی تمام عمر جھک مارتے ہیں۔"

"ہم سکندر کا حق دار تو آپ نے ثابت کیا ہے خود کو۔" میں نے کہا۔

"میں تمام وقت یہی سمجھتا رہا کہ آپ نے مجھے نہیں پہچانا ہے۔"

"پھر تم نے خود کو متعارف کرانے کا رسک کیوں لیا تھا؟"

"میں تو اسے رسک نہیں سمجھتا۔" میں نے کہا۔ "اگر میجر سلطان آپ پر ٹرسٹ کرتے ہیں تو میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"پلیز ڈونٹ ڈواٹ اگین۔" میجر سلطان نے کہا۔ "جو کچھ میں نے کیا اپنی مرضی کے خلاف کیا۔ آل ان آل فیصلہ یہ بہت مشکل کام تھا اور معلوم نہیں اس سے آگے کیا مشکلات پیدا ہوں گی۔"

"یس۔ ایس پی آپ کے لیے پریشانی کا سبب بن سکتا ہے۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "آئی ایم سوری کہ میں نے آپ کو آزمائش میں ڈالا۔"

"اٹ از او کے ناؤ۔" میجر سلطان نے کہا۔ "تمہارے پلان اور میری کوشش میں معمولی سی خامی رہ گئی جس کی وجہ سے وہ اندر آ گیا اور پھر اسے کیا کہا جائے کہ اسی وقت کرنل بخاری نے اسے دیکھ لیا۔ ورنہ تم نکل جاتے۔ میرا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ویسے بھی سپاہی کے لیے تو زندگی ایک میدان جنگ ہے۔ اسی ہفتے میری پوسٹنگ کھاریاں متوقع ہے۔"

"یہ بات اچھی ہی ہے کیونکہ اس طرح آپ خواہ مخواہ کے چکر سے نکل جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور میرے چلے جانے کے بعد پھر ملاقات اپنے اختیار کی بات نہیں رہے گی۔ صرف امید رہ جائے گی۔ جو کچھ آپ نے کیا اس کے لیے میں احسان مند رہوں گا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور کیپٹن افتخار کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ اس طرح کہ وہ اگلی سیٹ پر اکیلا رہا۔ میں پیچھے کی محدود سی جگہ میں چھپ گیا۔ گیٹ تک پہنچنے سے پہلے میں سر اٹھا کے باہر جھانکتا رہا۔ یہ بند جیپ تھی جس کے عقبی دروازے کی کھڑکیوں سے باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ پارکنگ ایریا سے گزرتے ہوئے مجھے مائکرو بس دکھائی نہ دی تو میرے دل کو تھوڑا سا اطمینان حاصل ہوا۔ جولی نکل گئی تھی۔

کیپٹن افتخار نے اپنے سرکاری بنگلے کے احاطے میں جیپ روکی اور پلٹ کے مجھ سے کہا۔ "گڈ بائی۔ اینڈ گڈ لک۔ پانچ منٹ بعد تم نکل جانا۔ باہر کوئی نہیں ہوگا۔"

"تھینک یو کیپٹن افتخار۔" میں نے کہا۔ "آپ نے جو کچھ کیا۔"

"آئی وش کہ میں اس سے زیادہ کر سکتا۔" وہ اترتے ہوئے بولا۔ "اتنا ہی جتنا تم لوگ کر رہے ہو۔ مگر ہم مجبور لوگ ہیں۔"

"پاپا۔" اندر سے کوئی بچہ دوڑتا ہوا آیا۔ "پاپا آ گئے۔"

"ارے شانی۔ بیٹھ گر گئی تم۔" کسی عورت نے چلا کے کہا۔ "ہزار بار سمجھایا ہے کہ ایسے دیوانوں کی طرح مت بھاگا کرو۔"

"ہا ہا۔" افتخار قہقہہ مار کے ہنسا۔ "ارے بھئی تم بھی جلتی ہو۔ ہمارا بھی کوئی دیوانہ ہے تو۔"

"پاپا۔ کل تو آپ ممی سے کہہ رہے تھے کہ ہم تمہارے دیوانے ہیں۔" اس بچی نے اپنی معصوم آواز میں کہا۔

"شانی۔" اس کی ماں نے ڈانٹا اور کیپٹن افتخار نے پھر قہقہہ بلند کیا۔ میں آوازوں سے چھلکنے والی خوشی اور محبت کی خوشبو سے بھرپور فضا کو محسوس کر سکتا تھا جو اس مختصر سے خاندان کی زندگی تھی۔ اس گھر میں وہ سب کچھ تھا جو میرے خوابوں کی تعبیر ہو سکتی تھی۔ محسن اور شہلا یا خالصہ اور سارہ کے خواب بھی ایسے ہی تھے۔ اس عمر میں سب کی آنکھیں ایسے ہی خواب سجاتی ہیں اور سب کے ہاں ایسی ہی تعبیروں کے لیے مچلتے ہیں لیکن ہم نے تو اپنے خوابوں سے بھی رشتہ توڑ لیا تھا اور تعبیر کے بدلے تعزیر قبول کر لی تھی۔

پانچ منٹ کے بعد میں نے پیچھے والا دروازہ آہستہ سے کھولا اور چند سیکنڈ منتظر رہا کہ کسی نے یہ آواز سنی تو نہیں۔ باہر صحن میں کوئی بھی آ سکتا تھا۔ مالی، کوئی نوکر یا پوسٹ مین۔ لیکن باہر کوئی نہ تھا۔ میں نے جیپ سے اتر کے دروازہ بند کیا اور پیچھے دیکھے بغیر گیٹ سے نکل گیا۔ یہ چھوٹا سا ڈی ٹائپ بنگلہ تھا جس کی چار دیواری تک چالیس فٹ کا فاصلہ بھی نہ تھا۔ باہر ایک سنسان اور غیر آباد سڑک تھی جس کے دونوں جانب ایسے ہی بنگلے تھے۔

مجھے صرف اتنا اندازہ تھا کہ میں چھاؤنی کے علاقے میں ہوں۔ سورج کو دیکھ کر میں سمت کا بھی اندازہ کر سکتا تھا لیکن مجھے یاد نہیں تھا کہ میں کسی بڑی سڑک سے یا شہری آبادی سے کیسے نکلوں۔ میرے قدم خود بخود ایک سمت میں اٹھ رہے تھے اور اب میرا ذہن ایک طرف میڈم سے ملنے کے لیے بے قرار تھا اور ان کی بحفاظت واپسی پر خوش تھا تو دوسری طرف مجھے رابعہ کا خیال شرمندہ اور افسردہ کرتا تھا۔ میرے پاس اس سوال کا جواب کوئی نہیں تھا کہ جیسے میں نے سراج سے اس کی مالک کے بدلے استاد کو حاصل کر لیا تھا کیا ایسے ہی میں رابعہ کو بھی لا سکوں گا؟ اس کا جواب اگر ملتا تھا تو نفی میں۔ اب کیا ہے ہمارے پاس کہ ہم اس کی واپسی کا سودا کر لیں؟ اگر عاشی زندہ رہتی تو شاید بات بن جاتی۔ اگر زیب النسا ہمارے ارادوں کی شکست اور اپنی رسوائی کا سامان نہ کرتی تو شاید اس طرح ہم رابعہ کو مانگ لیتے۔ لیکن شاید تقدیر کو میرے اور رابعہ کے درمیان دوری ہی منظور ہے۔ نہ وہ مجھ تک پہنچ سکتی ہے اور نہ میں اس تک پہنچ سکتا ہوں۔ رابعہ اگر مجبور ہے تو کیا میں بھی مجبور ہوں؟ مجھے چلتے چلتے خیال آیا۔ مجھے روکنے والا کون ہے؟

جب تک رابعہ بے یقینی کی سرحدوں کے پار نا امیدی کے اندھیروں میں گم تھی، میرے جذبات پر بھی بے حسی کی برف جمی رہی تھی اور اس کی یاد بھی دل کو بس اتنا ہی تڑپاتی تھی جتنا بچھڑ جانے والوں کی یاد جو زندگی کے سفر میں شریک تھے لیکن جدا ہو کے تو پھر کبھی ملنے کی امید بھی ساتھ لے گئے۔ لیکن اب احساس پر پڑی ہوئی برف ٹوٹ کر پگھلنے لگی تھی۔ اس کی آواز نے دل کے درد کو پھر جگا دیا تھا اور وقت کی راکھ میں دبی ہوئی آرزو کی چنگاری یکلخت شعلہ ساماں ہو گئی تھی۔ اس نے تو نہیں کہا تھا کہ میرے لیے آتش نمرود میں کود پڑو مگر کیا یہ تقاضائے عشق نہیں تھا۔ یوں جینے کے مقصد ہزار ہوں مگر ایک رابعہ کی چاہت میں مرنے کا مقصد اگر نہیں تو زندگی کا راستہ ایک صحرا ہے بے نشان کا بے سمت سفر ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ میرے ذہن سے انتشار کے جالے صاف ہو گئے ہیں اور میں سوچ کی واضح روشنی میں اپنی منزل کا راستہ دیکھ سکتا ہوں۔ میرا دل پہلے کے مقابلے میں بہت مطمئن تھا۔ ایک سڑک تک پہنچتے ہوئے میرے قدموں نے شاید آدھا میل کا فاصلہ طے کیا مگر مجھے پتا نہ چلا۔ جب میں نے ایک تانگے کی ٹک ٹک سنی تو پلٹ کے دیکھا اور اس کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ میں نے سگریٹ جلائی تاکہ سکون کے ساتھ کچھ سوچ سکوں مگر تانگے والا گپ شپ کے موڈ میں تھا۔ اس نے پہلے تو مجھ سے سگریٹ طلب کی۔

"واہ جی واہ۔" اس نے قطری کا سل کے پیکٹ کو دیکھتے ہوئے بڑے احترام سے ایک سگریٹ نکالا۔ "سگریٹ تو یہ بہت ودیا ہے جناب عالی پر ایک بات کی سمجھ ہم کو نہیں آتی۔"

"کس بات کی؟" میں نے کہا۔

"یہ ودیا سگریٹ میں سواد کیوں نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "ایک دم پھیکی اور بے مزہ۔ نہ دھوئیں کا چھوک۔ اب آپ پوچھو کہ مجھے کون سی پسند ہے۔"

"اچھا۔ تمہیں کون سی سگریٹ پسند ہے؟" میں نے مجبوراً کہا۔

"بنگلا مارکہ۔ کیا کوڑا اور ظالم سوٹا ہوتا ہے جی۔" وہ بولا۔ "جگرا چاہیے اس کے پینے کے لیے۔ یہ تو زنانیاں بھی پیتی ہیں ادھر ولایت میں۔"

"کیا تم نے ولایت دیکھا ہے؟" میں نے کہا۔

"لو جی۔ ولایت کس نے نہیں دیکھا۔" وہ بولا۔ "یہ ساری فلمیں جو باہر سے آتی ہیں ان میں ولایت ہی تو دکھاتے ہیں۔ ہم تو جی بس میموں کو دیکھنے جاتے ہیں۔ سچی بات ہے اور وہ سگریٹ شراب سب پیتی ہیں۔ اللہ توبہ۔" اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "ایسے ہی نخرا کرتی ہیں جناب۔ اپنی بنگلا مارکہ سگریٹ پی کے دکھائیں تو ٹھاہ کر کے دھواں نکلتا ہے ادھر سے۔" اس نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔

"اچھا بھئی آئندہ تمہارے تانگے میں بیٹھوں گا تو بنگلا مارکہ سگریٹ ساتھ رکھنا نہیں بھولوں گا۔" میں نے چڑ کے کہا۔

میری بات نے اسے ذرا سی دیر کے لیے چپ کیا۔ پھر اس نے کہا۔ "باؤ جی اک گل تے دسو۔ یہ ادھر مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم کیا ہو رہا ہے۔" میں نے محتاط اور بیزار لہجے میں کہا۔

"او جی یہ بنگالی بڑے سر چڑھ رہے ہیں۔ بھارت کے غلام بننا چاہتے ہیں۔"

"بنگالی مسلمان ایسا نہیں چاہتے۔ وہاں ہندو بہت ہیں۔"

"اچھا جی۔ کیا ادھر ہندو زیادہ ہیں مسلمانوں سے بھی زیادہ؟" وہ بولا۔

"نہیں۔ مگر وہ سیاسی اور معاشی طور پر غالب ہیں اور غداروں کو شہ دے رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ بھارت سے بھی بہت ہندو آ گئے ہیں وہاں اور اسلحہ بھی جا رہا ہے۔" وہ خاصا باخبر آدمی تھا۔

"سنا تو میں نے بھی ہے کہ بھارت نے فوجی مداخلت کا پروگرام بنا لیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اللہ خیر کرے۔"

"لو جی فکر کی کیا بات ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اب حکومت کو جہاد کا اعلان کر دینا چاہیے۔" وہ بولا۔ "ہر مسجد میں ہونا چاہیے اعلان۔ آپ دیکھنا جتھے کے جتھے سر سے کفن باندھ کے جائیں گے۔ [illegible] بنا دیں گے۔ اگر انھوں نے ہماری سرحد کے اندر قدم رکھا۔"

"انشاء اللہ۔" میں نے کہا۔ اس کے سوا میں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ یہ ایک عام آدمی کے جذبات تھے جو پڑھا لکھا نہیں تھا اور شاید سیاسی اور معاشی غلبے کا مطلب بھی نہیں سمجھتا تھا مگر پاکستان کے بارے میں اس کے جذبات بہت واضح تھے اور وہ یقین رکھتا تھا کہ فوج کیا عوام ہی بھارت کے عزائم سے نمٹنے کے لیے کافی ہیں۔ اسی یقین کے سہارے وہ دشمن کے ٹینک پر اپنے تانگے کا مریل گھوڑا لے کر چڑھائی کر سکتا تھا اور شاید ٹینک کا راستہ بھی روک سکتا تھا۔ شاعر مشرق نے یہ بات بہت پہلے محسوس کر لی تھی کہ

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

www.paksociety.com

گلشن چوک میں عین خلیفہ کی دکان کے مقابل اترنے کے بعد میں نے کرایہ ادا کیا اور پھر ایک نظر میں اس جگہ کا جائزہ لیا، جہاں ایک مختصر جنگ لڑ کے ہم تو نکل گئے تھے مگر اپنے پیچھے ایک بھونچال کے لیے صرف تباہی چھوڑ گئے تھے۔ خلیفہ نے اپنی دکان پھر بنا لی تھی اور باہر سے اس کی نئی ترتیب و تزئین دیکھنے سے پرانی دکان کا نقشہ یاد آتا تھا۔ پہلے والی اور موجودہ دکان میں وہی فرق تھا جسے وقت کا فرق سمجھا جا سکتا ہے جو قدیم طرز تعمیر کا حسن رکھنے والی ہائیکورٹ کی عمارت اور الفلاح بلڈنگ کے انداز میں نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔ اچانک میری نگاہ سائن بورڈ پر گئی اور میں رک گیا۔ مجھے دکان کا نام ہی نہیں یہاں کا پینٹر بھی بدلا ہوا نظر آیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک مختصری کیبن جیسی دکان کے بوڑھے مالک سے پوچھنے کا فیصلہ کیا۔ بوڑھا چند رنگ خوردہ مٹی کے ڈبوں میں ٹافیاں اور مُرمرے، سستی جلیبی اور ریوڑیاں لیے اونگھ رہا تھا۔ قطار میں رکھے ہوئے ڈبوں میں باہر کی درجن بھر ٹافیوں کا شیشہ تھا جس میں سے بچوں کو اپنی پسند کی چیزیں نظر آ جاتی تھیں۔ اس قسم کی دکانداری کا مقصد منافع کمانا کم اور وقت گزاری کے لیے خود کو مصروف رکھنا زیادہ ہوتا ہے۔

"چاچا جی" میں نے قریب جا کے کہا "سلام علیکم"

"وعلیکم السلام" اس نے چونک کے سر اٹھایا اور مجھے غور سے دیکھا۔

"چاچا۔ ایتھے ایک پنڈت ہوندا سی۔ خلیفہ" میں نے کہا۔

بڈھے کی صورت پر ایک افسردہ مسکراہٹ نمودار ہوئی "آہو۔ ہوندا سی"

"خیر۔۔۔ او کتھے گیا؟" میں نے کہا۔

"جانا کتھے سی ہونے" بڈھا بولا "او ہوا کھڑا ملے جے اونوں ملنا ملے"

میرا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا۔ دکان اب کسی اور نے لے لی تھی۔ اگر خلیفہ پنڈت کا وہی گھر نہ ہوتا تو مجھے اس بوڑھے سے اور بہت کچھ پوچھنا پڑتا۔ لیکن دروازے کی طرف اشارہ کر کے اس نے خلیفہ کے زندہ ہونے کی تصدیق کر دی تھی۔ باقی باتیں میں خود خلیفہ سے پوچھ سکتا تھا۔ میں نے بوڑھے کا شکریہ ادا کر کے سلام کیا اور درمیان کی گلی عبور کر کے اس دروازے پر جا پہنچا جو دکان کے پیچھے کی تنگ گلی میں کھلتا تھا۔ دروازے کے سامنے ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ جھول رہا تھا اور پٹ نیم وا تھے۔ میں نے کنڈی ہلائی تو ایک عورت نے کسی بچے کو باہر بھیجا۔ وہ پنڈت کا بیٹا تھا۔ وہ ایک بار اندر گیا اور پھر لوٹ کر آیا۔

"ابا کہندا اے ناں دسو"

"نام" میں نے سوچ کے کہا "ابا سے کہو۔ ایک پرانا دوست ہے"

بچے نے نفی میں سر ہلایا جس کا مطلب صاف تھا کہ پوچھے بغیر وہ واپس نہیں جائے گا۔ "ابا کہندے دوست نوں نئیں ملنا"

"اچھا" میں تھکے ہوئے لہجے میں بولا "اسے کہو سکندر بخت آیا ہے"

بچہ اندر گیا ہی تھا کہ ایک عورت نے چلانا شروع کیا "فیر او مرن جوگا سب کجھ تے لے گیا سی۔ ہن کی لین آیا جے ساڈے کولوں"

خلیفہ پنڈت نے اسے ڈانٹ لگائی "چپ کر"

"کیوں چپ کروں" عورت نے باغیانہ لہجے میں چیخ کر کہا۔

پھر ایک چلنے کی آواز آئی "چپ نئیں کریں گی تے تری گچی مروڑ دیاں گا" پنڈت نے کہا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ پنڈت نے مار مار کے اپنی گھر والی کی زبان بند کر دی تھی مگر اس نے جو کچھ کہا تھا، وہ میں سن چکا تھا اور مجھے فوراً ہی شک نہیں رہا کہ پنڈت کی گھر والی میرا نام سن کے کیوں بھڑک اٹھی تھی۔ اس کے نزدیک سکندر بخت ایک دشمن کا نام تھا جس نے ان کو تباہی اور مصائب کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ فرق صرف جذبات کی نوعیت کا تھا۔ عورت بچے، پیار اور اپنی وفاداری کو اپنے شوہر، اپنے گھر اور اپنے بچوں تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔ مرد کی ذمہ داریوں کے دائرے وسیع ہوتے ہیں چنانچہ وہ اپنے جذبات کو سمیٹ کر ایک گھر کے حصار تک محدود نہیں کر سکتا۔

پنڈت میرے سامنے آیا تو صدمے نے میری قوت گویائی سلب کر لی۔ وہ اپنی بے نور آنکھوں سے مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور اس کا ایک بازو میری طرف بڑھا ہوا تھا۔ اس کا دوسرا بازو قمیص کی خالی آستین کی صورت میں لٹک رہا تھا۔ "سکندر صاحب۔ آؤ جی اندر آؤ" وہ بولا "میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "پنڈت۔۔۔ یہ۔۔۔؟"

"او جی، یہ کچھ نہیں" وہ بولا "آپ اندر آؤ۔ آپ کا باہر کھڑے رہنا ٹھیک نہیں ہے"

"میں سمجھتا ہوں کہ میرا اندر آنا بھی ٹھیک نہیں۔ ٹھیک یہ تھا کہ میں کبھی نہ آتا۔ نہ آتا تو اچھا تھا" میں نے بڑے دکھ سے کہا اور اندر داخل ہو گیا۔

"ایسی باتیں مت کرو جی۔ یہ تو سب سوہنے رب کی رضا ہے، وہ جس حال میں چاہے رکھے" وہ بولا "آپ کا اس میں کیا قصور تھا۔ اگر آپ کو معلوم ہوتا تو کیا آپ پھر بھی آتے۔ آپ کی میری کون سی دشمنی تھی کہ آپ مجھے برباد کرتے۔ وہ تو آپ کے ملک کے دشمن تھے۔ اللہ نے بڑی خیر کی کہ آپ کو بچا لیا۔ بات یہ ہے جی، بازو کاٹنے تھے اب، ہم نہیں کاٹتے تو ہماری جگہ دوسرے کاٹ رہے ہیں لیکن جو کام آپ کر رہے ہیں، وہ کون کر سکتا تھا؟"

میں اس کے جذبۂ ایثار پر حیران تھا جبکہ کلام کے جلو میں بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ میرا سب کچھ آپ پر قربان مگر اس شخص نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ صرف گفتار کا غازی نہیں ہے۔ اس کی بصارت زائل ہو گئی تھی۔ وہ دائیں ہاتھ سے محروم ہو گیا تھا اور کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کی آمدنی ختم ہو گئی تھی۔ اس نے ہنرمند ہاتھوں کی کمائی سے اپنے گھر کی خوشحالی کو استوار رکھا تھا اور مستقبل کے تحفظ کو یقینی بنایا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے میری وجہ سے گنوایا تھا مگر اس کی استقامت اس کے حوصلے اور جذبے میں کمی نہیں آئی تھی۔

"خلیفہ پنڈت" میں نے کہا "تمہاری۔۔ وہ دکان۔۔؟"

"وہ میں نے بیچ دی تھی جناب" وہ بولا "اتنا پیسہ نہیں تھا کہ پھر اس کی مرمت کراتا اور سب سامان خریدتا۔ پھر جناب، پولیس نے بہت لوٹا۔ مجھے اسپتال میں پریشان کرتے رہے۔ میرے بیوی بچوں سے زبردستی رقم وصول کرتے رہے کہ تم سب تخریب کاروں سے ملے ہوئے تھے اور ان کو پناہ دیتے تھے۔ اللہ معاف کرے ان کو۔ یہ اپنے سگوں کو بھی بخشنے والے نہیں۔ ان پر بھی کیس بنایا۔ میری گھر والی کو تھانے لے جا کر پوچھ گچھ کرنے کی دھمکی دیتے تھے۔ آپ تو جانتے ہیں ان کی پوچھ گچھ کیا ہوتی ہے۔ عزت بچانے کے لیے اور تھانے سے بچنے کے لیے ان کو ہزاروں دیے۔ میرے کاریگر بیچارے جو میرے بچوں کی طرح تھے، انہیں پکڑ کر لے گئے۔ وہ غریب گھروں کے بچے تھے۔ ان کی تو ضمانت کرانے والا بھی نہ تھا۔ میں نے ان کی بھی گلو خلاصی کرائی۔ ایک ایک کے پانچ ہزار روپے مگر پرچہ نہیں کٹنے دیا۔ وہ کہاں وکیل کرتے اور کب تک پیشیاں بھگتتے۔ اپنا تو سارا جمع کیا ہوا نکل گیا۔ پتا نہیں جی اللہ نے کس گناہ کی سزا دی۔ بندہ بشر نہیں جانتا کہ کب اس سے خطا ہوئی تھی۔ وہ سوہنا رب بے انصاف تو نہیں ہے نا جی کہ خطا کے بغیر سزا دے۔ حرام کمانے والوں کا مال حرام میں جاتا ہے تو دنیا کہتی ہے ٹھیک ہوا، ایسا ہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ مگر قسم پیدا کرنے والے کی، میرا تو پیسہ محنت اور حق حلال کی کمائی کا تھا۔ علاج معالجے پر بھی دس ہزار سے اوپر اٹھ گیا۔ فائدہ صرف یہ ہوا کہ زندگی بچ گئی۔ پھر ایسی اندھی اور معذور زندگی کا بچنا بھی تو سزا ہے۔ دکان بیچنے سے جو رقم ملی، وہ چھوٹے بھائی کو دے دی ہے۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ یہ کام چھوڑو اور میرے ساتھ مل کے بزنس کرو۔ حجامی پیشہ تھا۔ باپ دادا کا فن تھا۔ میرا دل نہیں مانتا تھا کچھ اور کرنے کو۔ اب مجبوری نے سب کرا دیا ہے۔ بھائی کا کاروبار بھی ٹھیک نہیں لیکن آمدنی ٹھیک ٹھاک ہے۔ میرا اپنا کوئی تجربہ نہیں کاروبار کا۔ کسی غیر کو دیتا تو رقم ڈوبنے کا ڈر ہوتا۔ اب یہ اطمینان تو ہے کہ کاروبار اپنے بھائی کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک سب ٹھیک ہے، وہ خود نہیں کھاتا، میرا پیسہ بھی نہیں کھا جائے گا۔ خیر جی، پیسہ آنی جانی چیز ہے۔ مجھے تو بس یہ دکھ ہے کہ اپنا ہنر نہیں رہا اور ہنرمندوں کا ٹھکانا نہیں رہا۔ میرے شاگرد کل میری جگہ لیتے تو میں اتنا ہی فخر محسوس کرتا جتنا میرا باپ مجھ پہ کرتا تھا۔ پتا نہیں اب وہ کدھر گئے۔ ان میں سے دو ایک ملنے آتے تھے۔ بہت رو رہے تھے کہ استاد جی ہم رل گئے۔ جہاں اب کام کرتے ہیں وہ پیسے کم دیتا ہے گالیاں زیادہ۔ میں نے کہا کہ صبر کرو۔ عزت ذلت، بیماری موت سب اللہ کی آزمائش ہے اور آزمائش میں صبر شکر سے کام لینے والا ہی اس کا نیک بندہ ہے۔ گلہ کرو گے تو سوہنا رب ناراض ہوگا کہ انہوں نے اچھے وقت کو اتنی جلدی بھلا دیا۔ خود مجھے دیکھو۔ جہاں مالک تھا اب وہیں نوکر ہوں اور نوکر بھی کیسا۔ گھنٹے دو گھنٹے میں چکر لگاتا ہوں۔ جھاڑو سے فرش پر گرنے والے سارے کٹے ہوئے بال سمیٹتا ہوں اور ایک بالٹی میں ڈال دیتا ہوں۔ اس کے پانچ روپے روز ملتے ہیں مگر میں شکوہ نہیں کرتا۔ شکر کر کے پانچ روپے لے لیتا ہوں۔ گھر والی کہتی ہے کہ تم ہمیں بھی ذلیل کراتے ہو۔ جب گھر بیٹھے گزارے لائق رقم مل جاتی ہے تو جھاڑو دینے کیوں جاتے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ نیک بخت۔ وہ رقم جب مجھے کوئی اور کما کے دیتا ہے تو مجھے خوشی نہیں دیتی۔ یہ پانچ روپے میں اپنی محنت سے صرف اپنی خوشی کے لیے کما کے لاتا ہوں۔ اس سے مجھے حوصلہ اور یقین ملتا ہے کہ میں مرا نہیں۔ ناکارہ نہیں ہوا۔ ایک ہاتھ سے بھی میں کچھ نہ کچھ کر سکتا ہوں لیکن دوسری بات میں اس سے نہیں کہتا۔ عورت ذات ہے نا۔ سمجھے گی نہیں۔ میں وہاں دوسروں کو عبرت دینے جاتا ہوں۔ وہاں میرے پرانے گاہک آتے ہیں جو برسوں سے آتے تھے۔ وہ مجھے جھاڑو دیتا دیکھ کر بہت حیران ہوتے ہیں اور ان کو صدمہ بھی ہوتا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں پنڈت یہ کیا کر رہے ہو۔ اور میں کہتا ہوں کہ جی یہی جو سوہنے رب کی رضا ہے۔ بندے کو اچھے وقت میں آنے والے برے وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ فکرمند اور پریشان ہو جاتے ہیں۔ سوچنے لگتے ہیں کہ آج وہ مالک ہیں یا افسر ہیں۔ کل خدا نخواستہ انہیں نوکر اور ماتحت بن کے ایسی ہی حیثیت کو قبول کرنا پڑا تو وہ کر سکیں گے؟ اور اس طرح میں لوگوں کو بھی پہچان رہا ہوں جناب۔ کل جب میں ایک ہیئر ڈریسنگ سیلون کا مالک تھا تو وہ مجھ سے کیسے ملتے تھے اور آج کیسے ملتے ہیں۔ جو ظرف والے ہیں وہ پہلے سے زیادہ عزت دیتے ہیں۔ کم ظرف سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر میں سب کی سنتا ہوں اور کسی کو جواب نہیں دیتا۔ کچھ نہیں بتاتا کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔ جس کا جو دل چاہے سمجھے"

میں دم بخود بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ ایک مبلغ، ایک ناصح، ایک مفکر کی طرح بول رہا تھا۔ اس کی باتوں میں سچائی تھی اور گہرائی تھی۔ ایسی دانائی کی باتیں بڑے بڑے عالم فاضل کر سکتے

تھے جو اس نے اپنی سیدھی سادی زبان میں کہہ دیں، بغیر یہ جانے کہ نہ وہ لیفٹیننٹ ہے نہ دانشور۔ بلکہ وہ ایک ایسا آدمی ہے — جسے عزت و تکریم کے دوہرے معیار رکھنے والا یہ معاشرہ بڑی حقارت سے ناکارہ کہتا ہے۔ اس کے حوصلے، ظرف اور صبر و قناعت کے جذبات کی ہمسری کا دعویٰ اگر میں کرتا تو غلط ہوتا۔ دنیا میں کہاں کہاں کیسے کیسے مرد قلندر ملتے ہیں۔

"آپ رنجیدہ مت ہوں جی!" وہ شرمندہ لہجے میں بولا۔ "میں بے وقوف ہوں، کہتا بولتا گیا۔ دل کی بات پر اختیار نہیں رہا۔ مجھے تو آپ سے پوچھنا چاہیے تھا کہ خیر سے کیسے ادھر آنا ہوا۔ خلیفہ پنڈت اب کیا کر سکتا ہے آپ کے لیے۔ پھر بھی جو کچھ کر سکتا ہے ضرور کرے گا۔"

"پنڈت!" میں نے کہا۔ "تم کو اس دکان کے کتنے ملے تھے؟"

"چالیس ہزار صاحب۔" وہ بولا۔ "بس جگہ کی قیمت ملی۔ باقی سب تو ملبہ تھا۔"

"اور اب... خیر چھوڑو۔" میں نے کچھ سوچ کے اپنا ارادہ بدل دیا۔ "یہ بتاؤ کہ میرے دو ساتھی آئے تھے یہاں؟"

"ہاں جی — آئے تھے۔" وہ بولا۔ "میں تو ان کی خدمت نہیں کر سکا تھا لیکن انھیں میں نے اپنے ایک بہت ہونہار شاگرد کے پاس بھیج دیا تھا۔ بارہ سال کام کیا اس نے میرے ساتھ۔ بڑا فنکار بنتا جا رہا تھا جی۔ پرانے فلموں کے شوق نے کھینچ لیا۔ ہیرو بننے کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ دوسرے تو مذاق اڑاتے تھے کہ اگر تو ہیرو بن گیا تو دن بھی بن گیا، تو پھر فلم نہیں بنے گی اور بن گئی تو چلے گی نہیں۔ اس کی صورت اور حلیہ پر ہنستے تھے سب لوگ۔ میں سنجیدگی سے سمجھاتا تھا کہ بیٹا گلفام ہر کام ہر شخص نہیں کر سکتا۔ مگر جی وہ دھن کا بڑا پکا تھا۔ نہ میرے سمجھانے سے سمجھتا تھا نہ کسی کے ہنسنے کی پروا کرتا تھا۔ ہیرو تو وہ نہیں بنا مگر دھکے کھاتے کھاتے ایک دن کسی فلم کے سیٹ پر گیا تو وہاں میک اپ مین سے لڑ پڑا کہ تم نے خاک چہرہ بدلا ہے۔ اسے تو اماں بھی پہچان لے گی کہ وہی ہے۔ ڈائریکٹر نے یہ بات سنی تو کہنے لگا کہ تم جانتے ہو یہ کام تو کر کے دکھاؤ۔ اب فرچی وہ جھگڑا ہی بہانہ بن گیا۔ آج وہ بڑا کامیاب میک اپ مین اور ہیئر اسٹائلسٹ ہے۔ مگر ہفتے میں ایک بار سلام کرنے ضرور آتا ہے۔ کہتا ہے آپ استاد نہیں میرے باپ ہو اور یہ کسی حد تک سچ بھی ہے۔ اسے میں نے پالا تھا کیونکہ وہ گھر سے بھاگ آیا تھا۔ پہلے ماں سوتیلی تھی پھر باپ مر گیا تو ماں نے دوسری شادی کر لی اور باپ بھی سوتیلا ہو گیا، معاف کرنا جی۔ جب سے آنکھیں گئی ہیں تو زیادہ بولنے لگا ہوں۔ کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تو باتیں کرتا ہوں۔ پہلے ہاتھ چلتے تھے اب زبان چلنے لگی ہے۔ آپ سے تو پوچھا ہی نہیں کہ کیا پیو گے۔ چائے یا ٹھنڈا؟"

میرے بہت انکار کے باوجود وہ خود باہر گیا اور کسی حلوائی

کی دکان سے لسی کے دو گلاس بنوا لایا۔ اتنی دیر میں اکیلا بیٹھا رہا۔ پنڈت کی بیوی شاید ناراض ہو کے کہیں چلی گئی تھی۔ پنڈت کی باتوں تک میں طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ محسن اور غالب کی باتوں سے مجھے کامل اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ انھوں نے پرانی دکان نیا روپ دیکھ لیا تھا اور سوچے سمجھے بغیر اندر گھسنے کی غلطی نہیں کی۔

"معاف کرنا جی — مجھے کچھ دیر لگ گئی۔" پنڈت نے کہا اور جیب سے لسی کے پیسے نکال کر اور میرے سینے پر اتنی رقم دیتے ہوئے کہا۔ "میں تو اس جگہ بیٹھنے کا ملنے کی حقدار ہوں — بھئی... (لاعلم) اکثر میں آپ کو ساتھ لے جاتا تو بڑھاپے کی بات ہوتی۔"

"استاد!" میں نے کہا۔ "اپنے اس ہونہار شاگرد کا پتا بھی دو۔ کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

"گلفام۔" وہ بولا۔ "کوئی شہزادہ گلفام کہتا ہے کوئی شہزادہ۔"

"تمھارا اس پر پورا بھروسا ہے نا؟"

"نوجی۔ بھروسا نہ ہوتا تو میں آپ کو وہاں بھیجتا۔ وہ تو غلام ہے بالکل۔ میں کہوں کہ گلفام قتل میں نے کیا ہے، پھانسی چڑھ جا۔ تو وہ چڑھ جائے گا۔"

"اچھا تو وہ رہتا کہاں ہے؟"

"آپ ادھر سے جائیں نا جی سیدھے بازار کی طرف سے۔ تو ایک گلی رام گڑھ کی طرف نکلتی ہے۔" وہ بولا۔ "اس میں سیدھے ہاتھ ساتواں یا آٹھواں گھر ہے۔ نمبر تو مجھے نہیں پتا لیکن اس کے گھر کے دروازے سے نیچے بیٹھی ایک اوپر کے حصے میں گلفام رہتا ہے۔ اس نے تار باندھ کے گملے لٹکا رکھے ہیں پھولوں کے..."

"بس اتنا کافی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں پہنچ جاؤں گا۔"

میں اس سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا اور گلی سے باہر آ کے کچھ دیر دکان کے باہر کھڑا رہا۔ اس کے سائن بورڈ "بالی وڈ اسٹائل ہیئر ڈریسنگ سیلون" کا چمکتا دمکتا بورڈ خوبصورتی سے اور میری نظر میں چھید رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہیئر کٹنگ اسی اشتہار کے مطابق وہ تصویر بنانی تھی جس کا سر کے بالوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ موجودہ مالک کے ذہن اور فکر کی نمائندگی کرنے والا یہ سائن بورڈ مجھ سے اختلاف کا اعلان کرتا تھا۔ پنڈت سے ہمدردی اور اس کے تعلقات کی تھوڑی بہت تلافی کرنے کا خیال نیک تھا اور یہ میری اخلاقی ذمہ داری بھی تھی مگر میں خود کسی مصیبت کا شکار ہو جاتا تو یہ ایک بات ہوتی کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ سر پھر کے رہنے نہ ادھر کے نہ ادھر کے۔

میں نے پہلے گلفام سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ تانگے یا ٹیکسی کی نسبت رکشا زیادہ محفوظ تھا۔ آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں رکشے نے مجھے گلفام کے گھر پہنچا دیا۔ اس کا معلق گملوں والا مکان میں نے فاصلے سے ہی دیکھ لیا تھا۔ گملے جھولے رہے تھے اور ان کی گری ہوئی مٹی کو دیکھ کر میں نے اندازہ کیا کہ وہ نیچے گلی سے گزرنے والوں کے سر پر لٹکنے والی خطرے کی تلوار سے کم نہیں۔ کوئی بھی گملا کسی کے بھی سر...

کے سر پر گر سکتا تھا۔

گلفام بالکل نام... بگلی شہزادہ گلفام کی مثال تھا۔ وہ تقریباً میرا ہی ہم عمر دبلا پتلا اور قد میں چھوٹا سا، جوان آدمی تھا۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ اور دانت پان کھانے سے خراب ہو چکے تھے۔ وہ بنگالن کا بیٹا والا تھا اور اس کے لہجے میں اب بھی فرق تھا، حالانکہ وہ تمام عمر یہی محلے میں گزار چکا تھا۔ اس کی ناک چپٹی اور چھوٹی تھی۔ ماتھا بہت آگے نکلا ہوا تھا لیکن سامنے کے حصے سے بال بہت پیچھے تک گر چکے تھے۔

"میرا نام شکندر بخت ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر بیٹھ کر کے بولو۔" اس نے تکلفاً سے کہا اور دونوں دیوانوں کے بیچ میں مسکراہٹ کے ساتھ مجھے گھورتا رہا۔

"مجھے تمھارے استاد خلیفہ پنڈت نے بھیجا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا — استاد نے بھیجا ہے تم کو۔" اس کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ "ہم سے پھر غلطی ہو گیا۔" وہ مجھے راستہ دیتے ہوئے بولا اور افسوس سے سر ہلانے لگا۔

"پھر سے کیا مطلب ہے؟" میں نے اس کی صورت پر شرمندگی اور ملال دیکھ کر کہا۔ وہ پہلے ہی اتنا عجیب آدمی تھا کہ اس کی جوانی بھی عمر کا آزار لگتی تھی۔ معلوم نہیں زندگی کے سب سے خوبصورت دور میں وہ اتنا دکھی کیوں تھا اور اتنا مظلوم کیوں نظر آتا تھا۔ شاید دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں اسے یہی احساسِ محرومی وافر دیا تھا۔ اس کی بدصورتی پر اس کے نام کا طعنہ دینے والے لوگوں نے اس کی فطرت کی خوبصورتی پر کم نگاہ کی تھی۔

"پھر یہ کہ — تھوڑا دیر پہلے دو بابو لوگ آیا تھا۔ ان کو بھی استاد نے بھیجا تھا۔" وہ بولا۔ "اور ہم نے ایسا ہی بات کیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں بھی ہوں۔"

"تم تو پتلا نہیں ہے۔ ہم دبلا پتلا ہے۔" وہ بولا۔ "تشریف رکھو اور حکم کرو۔ آپ کو بھی میک اپ کرنے کو مانگتا؟"

"ہاں۔" میں نے ایک کرسی پر بیٹھ کے آئینے میں اپنا چہرہ ملاحظہ کیا۔ "ویسے تو یہ بھی میرا اصل چہرہ نہیں ہے لیکن اس کو پھر بدلنا ضرورت ہو گیا ہے۔"

"وہ بھی ایسا بولتا تھا۔" گلفام سوچ میں پڑ گیا۔ "وہ تمھارا دوست تھا، ہم سمجھ گیا۔ ایک ہی گینگ کا آدمی ہے تم سب۔"

"گینگ سے تمھارا مطلب ہے کہ چوروں ڈاکوؤں کا گروہ تو یہ تمھاری غلط فہمی ہے کیونکہ تمھارا استاد چوروں ڈاکوؤں کا ساتھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ ایسے لوگوں کو نہیں پہچانتا اور پہچان لے تو ان کی مدد کرتا ہے؟"

"اوہ — ہم سے پھر غلطی ہو گیا۔" وہ سر پر ہاتھ مار کے بولا۔ "ہم تم سے معافی مانگتا ہے۔ ابھی بولو تم کیا بنے گا؟"

"میں... کچھ طے نہیں کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میرے دونوں دوست کیسا میک اپ کرا کے گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"وہ — ایک جیسا بن گئے ہیں۔" گلفام نے کہا۔ "بالکل ایک صورت جیسے جڑواں بھائی ہوتے ہیں۔"

"ویری گڈ۔" میں نے غالب اور محسن کی دانش مندی پر خوش ہو کے کہا۔ "وہ بھائی تو کہلاتے ہیں جڑواں۔ اگر تین ہوں تو؟"

"تین؟"

"ہاں تین — یہ تو عام سی بات ہے۔ بچے کتنے ہوئے ہیں۔ میں نے بلکہ شاید کسی نے چھکا مارنے کا ریکارڈ بھی قائم کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تم ایسا کرو کہ مجھے بھی انھی جیسا بنا دو۔"

"یہ آئیڈیا کیسا ہے۔" وہ بولا۔ "کسی فلم میں ہوتا تو جاندار تھا۔"

"تم یہ سمجھو کہ ہماری زندگی بھی ایک فلم ہے۔ مار دھاڑ اور جنگ و جدل، ہنسی مذاق اور عشق و محبت سے بھرپور۔" میں نے کہا۔ "گویا باکس آفس پر کامیابی کے فارمولے پر بنی ہوئی۔ ہر شخص کی زندگی ایک فلم ہوتی ہے۔ کسی کامیڈی اور کسی ٹریجڈی۔ جیسے کہ تمھاری زندگی۔"

اس نے ایک سرد آہ بھری اور سر ہلانے لگا۔ "تم سچ کہتا ہے۔ مگر ایک بات بولو ہم کو۔ اپنا بارے میں تم کو کس نے بتایا کہ ہمارا الف ایک دم ٹریجڈی ہے۔"

"تمھارے استاد نے سب سے پہلے۔" میں نے کہا۔ "پھر تمھاری محبت نے اور صورت نے۔ تمھیں کچھ یاد پڑتا ہے کہ آخری بار تم کب مسکرائے تھے، کب ہنسے تھے، کب کپڑے بدلے تھے۔ تم کبھی کسی پر عاشق ہوئے۔ اس حد تک کہ تمھارے عشق کا علاج نہ حکیم ڈاکٹر کر سکیں نہ سمجھانے والے۔ دنیا میں کسی کو تم نے اپنا دوست سمجھا۔ دنیا پر کبھی غور کیا کہ بغیر میک اپ کے بھی پھولوں کا رنگ اور چاندنی، لتا کی آواز اور پہاڑوں کی برف سے جھلکتی دھوپ، انگریزی بیک کی فلم اور صوفیہ لورین کی اداکاری اور ماجد خان کی بیٹنگ کے کمال میں کتنا حسن ہے اور خوشی حاصل کرنے کے کتنے سمندر پوشیدہ ہیں۔ پھر تم صحرا میں کیوں بھٹک رہے ہو؟"

وہ احمقوں کی طرح میری صورت دیکھنے لگا۔ "تم تو فلاسفر ہے بابا۔ مگر تمھارا تھوڑا سا بات سمجھ میں آتا ہے۔ ہم ایک دم اکیلا ہے۔ ہمارا کوئی فرینڈ نہیں، کوئی ماسوک نہیں اور یہ سب ہمارا شکل کا قصور ہے۔"

"ابھی تو وقت نہیں ورنہ میں تم کو سمجھاتا کہ صورت کو صرف تم ہی اپنے آئینے میں دیکھتے رہتے ہو۔ دوسروں کی آنکھوں سے دیکھ سکتے تو تمھیں اندازہ ہو جاتا کہ اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ تو صرف شناخت کا ایک ذریعہ ہے۔ تمھاری خوبصورتی یا بدصورتی تو تمھارے اندر ہے۔ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے بدصورت بنا دو۔"

اس نے صرف آدھے گھنٹے میں میری صورت بگاڑ دی۔ وہ میک اپ مین تھا چنانچہ اس کے پاس صورت گری کا سب سامان بھی تھا اور ہنر بھی۔ اس نے میرے بالوں کو ایک جھلی کے نیچے یوں چھپا دیا کہ میرا سر کسی کے استرے کی تیز دھار سے وجود میں آنے والی ٹنڈ بن گیا۔ فٹ پاتھوں کے بہت سے فنکار صبح سے شام تک سر مونڈنے کے چمکانے کا کمال دکھاتے رہتے ہیں اور میں نے ان صاف شدہ سروں پر پالش کے لیے آم کی گٹھلی رگڑنے کا رواج بھی دیکھا تھا۔ میرا سب بال و پر سر ایسا ہی ہو گیا مگر گلفام نے مزید حسن یہ پیدا کیا کہ اس گنجے سر کے گرد بالوں کی ایک جھالر سی چپکا دی۔ اب میں وہ ادھیڑ عمر شخص لگتا تھا جس کے بال غم روزگار اور فکر بے روزگار نے اڑا دیے ہوں۔ گلفام نے مجھے بتایا کہ اوپر کی جھالر کیسے ہٹانے کے بعد میں بالز بھی بن سکتا ہوں اور اس گنجے سر پر حسب ضرورت کوئی وگ کیسے لگائی جا سکتی ہے۔ پھر اس نے میرے چہرے کے گرد مغل شہنشاہوں کے انداز کی داڑھی سجائی جو ایک مشت سے کچھ کم اور برابر سے برابر تھی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں غیور لگان تو سینے پر لیبد نقلی داڑھی ہٹا بھی سکتا ہوں۔ فی الحال اسے دن میں باہر جاتے وقت استعمال کرنے میں کوئی خطرہ نہیں۔ کوئی اسے نقلی نہیں کہہ سکتا۔ اس نے پیچ کرتی ہوئی مونچھیں لگا کے مجھے وہ کچھ رنگ دیے جن کو پانی میں حل کر کے بالوں پر لگانے سے داڑھی مونچھوں کو براؤن یا بلیک کیا جا سکتا تھا۔ اصل حالت میں داڑھی مونچھوں کا رنگ سیاہ و سفید کا وہ امتزاج تھا جسے کھچڑی بال کہا جاتا ہے۔ اس نے میرے ایک دانت پر سونے کا ایسا رنگ چڑھا دیا کہ وہ دانت اصلی سونے کا نظر آنے لگا۔ سامنے کا یہ دانت مسکراتے ہوئے بہت نمایاں ہو جاتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے خود کو آئینے میں دیکھا اور گلفام کی مہارت کا قائل ہوا اور اچانک مجھے ایک اور خیال بھی آیا۔ گلفام بھروسے کا آدمی تھا۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اس کے قابل اعتماد ہونے کی سند خلیفہ نہمت دے چکا تھا۔ ایسا شخص ہمارا ساتھی بن سکتا تھا۔ ہر وقت ہمارے کام آ سکتا تھا اور انتہائی مددگار ثابت ہو سکتا تھا تاہم یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ خود اپنے فن کو پیشہ بنانے کے بجائے وطن کی خدمت کے لیے وقف کرنے پر رضامند ہو۔ اس نے معاوضے کی بات پر خفا ہو کے یہ تو بتا ہی دیا تھا کہ وہ ایک جذباتی آدمی ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

"بھائی گلفام! تمھارے بارے میں جیسا سنا تھا تمھیں ویسا ہی پایا۔"

"کیا سنا تھا آپ...؟" وہ بولا۔

"یہی کہ تم بڑے اچھے میک اپ مین ہو کتنا کما لیتے ہو ہر مہینے؟" میں نے کہا۔

وہ بادل ناخواستہ مسکرایا۔ "اپنا مرضی کا بات ہے۔ میرے جیسے لوگ دن رات کام کرتے ہیں۔ ہر فلم لینے کو بھاگتے ہیں۔ وہ بیس ہزار بنا لیتے ہیں۔ میں زیادہ بھی بنا سکتا ہوں کیونکہ میں کسی کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ کام خود میرے پیچھے بھاگتا ہے۔ مگر میں زیادہ کما کے کیا کروں گا۔"

"عیش کرنا۔ دنیا عیش کرتی ہے پیسے سے۔" میں نے کہا۔

"اپنا دنیا کی طرح نہیں ہے۔ اکیلا آدمی ہے۔ دو چار ہزار بہت ہوتا ہے۔ دو تین ڈائرکٹر ہے۔ ان کے سوا کسی کا کام نہیں کرتا۔ وہ اچھا فلمیں بناتا ہے اور ان کی ٹیم میں سب لوگ اچھا ہے۔ گندا فلم کوئی دیکھتا نہیں۔ وہ ڈائرکٹر لوگ کو فنانسر نہیں ملتا سب بولتا ہے کہ فلم وہ اچھا جو اچھا بزنس کرے۔ پڑھا لکھا لوگ اور اخبار والا کیا بولتا۔ ان سب کو گولی مارو۔ پبلک کو دیکھو۔ ابھی وہ اتنا بے دل ہے کہ فلم لائن چھوڑنے کی سوچتا ہے۔ پھر ہم بھی کچھ سوچے گا۔"

"اچھا گلفام!" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "تم واقعی بہت اچھے آدمی ہو۔ تمھارا استاد تمھاری بجا تعریف کرتا ہے۔ میں پھر آؤں گا تم سے ملنے۔"

گلفام کے چہرے پر تھوڑی سی خوشی کی مسکراہٹ آئی۔ "کیا نام بولا تھا تم... ہم بھول گیا۔"

"میرے دوستوں نے بھی اپنا نام تو بتایا ہوگا۔"

"ہاں۔ ایک نے کہا کہ میں اوّل خاں ہوں۔ دوسرا بولا کہ میں اوّل خاں ہوں۔ یہ دوئم خاں ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "دونوں مذاق کر رہے تھے۔ اوّل خاں میں ہوں۔" اور اسے ہکا بکا چھوڑ کے باہر نکل گیا۔ اب میں زیادہ اعتماد اور اطمینان کے ساتھ گھوم پھر سکتا تھا۔ اس حلیے میں دلاور جیسا کائیاں دشمن بھی مجھے شناخت نہ کر پاتا۔ میں نے اپنے لیے ایک شلوار قمیض کا جوڑا خریدا اور پھر کھانا کھانے کے لیے فوڈ کورٹ میں گیا۔ وہاں میں نے عمداً سالن کی پلیٹ کپڑوں پر گرائی اور اس بہانے واش روم میں جا کے کپڑے بدل آیا۔ ویٹر کے اور میرے درمیان معمولی سی تکرار بھی ہوئی۔ پھر گویا میں اپنی غلطی کو اس کے سر منڈھنے پر مصر تھا۔ بالآخر اسے ہی خاموش ہونا پڑا۔

شام کے چار بجے میں واپس پہنچا تو قتل کی تفتیش کرنے والے جا چکے تھے لیکن وہ ٹرک اب بھی وہیں کھڑا ہوا تھا جس کا ڈرائیور مارا گیا تھا۔ محسن اور غالب ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ جولیا نے مجھے دیکھا تو پہچان نہ سکی۔

"شیر علی۔ دیکھو یہ کون گھسا چلا آ رہا ہے۔"

شیر علی دوسری طرف سے آیا۔ "کیا بات ہے کس سے ملنا ہے؟"

"کس سے ملنا ہے؟" میں نے آواز بدل کے انگریزی کے کہا۔ "سب کو ایک دن مٹی میں ملنا ہے بندے۔"

"میرا مطلب تھا کہ آپ کا یہاں کیا کام ہے؟" شیر علی بولا۔

"کبھی تو نے سوچا بندے کہ دنیا میں تیرا کیا کام تھا؟" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "اور تو کیا کرتا رہا؟"

جولیا سہم کر شیر علی کے پیچھے ہو گئی تھی۔ "یہ تو پاگل لگتا ہے مجھے۔"

"تم چاہو خواہ وہ فرق ہو۔ میں اس کا سارا پاگل پن نکال دوں گا۔" شیر علی نے کہا اور آگے بڑھ کر اس نے میری گردن دبوچ لی۔

"سیدھی طرح بتاتا ہے یا نہیں کہ یہاں کیوں آیا تھا۔"

ہم ٹرالے کے پیچھے تھے چنانچہ ٹرک کے دوسرے کنارے سے ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے خود کو چھڑانے کی واجبی سی کوشش کی اور پھر ایک دم شیر علی کو اپنے سر کے اوپر سے گزار کے جھٹک دیا۔ جولیا ایک دم چیخ مار کے اس کی طرف لپکی۔

"شیر علی... تم... ٹھیک ہو نا؟" وہ اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے بولی اور اس وقت جولی کے لہجے سے میں نے اس کے جذبات کا اندازہ کیا۔ کھٹکا تو مجھے اسی وقت تھا جب جولی نے عادتاً اسے بھائی نہیں کہا تھا۔ اس کے شیر علی کہنے میں بھی تھوڑا سا حجاب آمیز اپنائیت کا انداز تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ابھی شیر علی نے اسے محسوس نہ کیا ہو یا محسوس کیا ہو تو وہ کچھ ظاہر ہونے نہ دینا چاہتا ہو۔ وہ ٹھنڈے مزاج کا بعد تحمل برتنے والا اور خاموش طبع آدمی تھا۔

شیر علی کچھ خفت اور اشتعال میں ایک دم کھڑا ہوا۔ "میں ٹھیک ہوں۔" اس نے جولی کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔

"ٹھیک ہو تو پھر آؤ۔" میں نے اپنی اصلی آواز میں کہا۔

"بھائی سکندر۔" جولی اپنی جگہ پر منجمد ہو گئی۔ "آپ...؟"

شیر علی مسکرانے لگا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "معاف کرنا دوست۔ جب ہم لوگ بے تکلف ہو جاتے ہیں تو ایسے ہی مذاق کرتے ہیں۔" پھر میں جولی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "اپنا استاد ونیڈی کہاں ہے؟"

جولی نے ہاتھ سے ٹرالے کی طرف اشارہ کیا۔ "اندر لیٹے ہوئے ہیں۔"

"وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

جولی نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہاں۔ آپ دیکھ لیں۔"

"تمھیں وہاں کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی تھی؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ ریڈ کراس کی ایمبولینس کا ڈرائیور شریف آدمی تھا۔ اس نے میری مدد کی۔ بھائی ٹیک محمد کو ہماری گاڑی میں شفٹ کیا اور سراج کی ملاں تو خود ہی نکل گئی۔ جاتے جاتے اس نے کہا..."

"کیا کہا...؟"

"کہنے لگی کہ خدا تم سب کو عقل دے۔ میرے ساتھ تم نے جو کچھ کیا اس پر میں تم کو معاف کرتی ہوں۔ پھر اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ لڑکی۔ تو نے بہت خدمت کی میری۔ اللہ تجھے اپنی امان میں رکھے۔ ریڈ کراس کی ایمبولینس کا ڈرائیور دور جا کھڑا ہوا تھا۔ اور کچھ حیران تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے جاتے ہی میں بھی نکل گئی تقریباً پانچ منٹ کے بعد بہت عرصے

کے بعد ڈرائیونگ کی تھی میں نے۔ بھولی تو نہیں تھی مگر اتنی بڑی گاڑی چلانے میں خاصی مشکل پیش آئی۔ ایک جگہ تو بس مار ہی دی تھی میں نے۔ ایک پرائیویٹ کار تھی۔ اس نے مجھے بچایا تو فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ آگے کی جالی ٹوٹ گئی اس کی گاڑی کی۔ بہت لال پیلا ہو کے آیا تھا مگر میں نے رونی شکل بنا کے معافی مانگ لی کہ کیا کروں۔ بھائی بیمار ہیں گاڑی چلا نہیں سکتے انھیں خود ہی اسپتال لے جا رہی ہوں۔ اس پر وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔"

"تم بھی چالاک لومڑی ہوتی جا رہی ہو ہماری صحبت میں۔"

"آپ کی تو ساری چالاکی دھری رہ جاتی اگر میں عقل سے کام نہ لیتی۔ عین وقت پر مجھے خیال آ گیا کہ انھوں نے ہماری گاڑی کا نمبر دیکھ لیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔"

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ "پھر۔ تم نے کیا کیا؟"

"کیا کرتی۔ ایک نلکا نظر آ گیا مجھے۔ میں نے زمین پر سے تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور نلکے سے پانی لے کر گیلی کر لی۔"

"وہاں اور بھی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ کسی نے دیکھا نہیں تمھیں؟"

"میرا خیال ہے کہ نہیں دیکھا۔" وہ بولی۔ "دائیں بائیں جو گاڑیاں تھیں ان کے تو ڈرائیور ہی موجود نہیں تھے اور میں نے ادھر ادھر دیکھ کے یہ کام کیا تھا۔ کسی نے دیکھا ہوگا تو یہی کہا ہوگا کہ میں ہاتھ دھو رہی ہوں۔ پھر میں نے ایک نمبر پلیٹ پر ہاتھ پھیر دیا۔ جو سامنے تھی۔ دوسری آگے تھی اور اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ گاڑی کا اگلا بمپر دیوار سے صرف چھ انچ دور تھا جس پر مٹی کا رنگ پھیرا تھا وہ نمبر پلیٹ نہیں پڑھی جا سکتی تھی۔"

"مگر وہ مشتبہ ضرور نظر آنے لگی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "باہر کوئی بھی شک میں مبتلا ہو کے پیچھے لگ جاتا تو۔"

"پہلے تو میں ایسے راستے سے آئی تھی جہاں ٹریفک پولیس کے ملنے کا ڈر نہیں تھا۔" وہ ہنسی۔ "کوئی مل جاتا سامنے سے تو اسے کوئی شک کی بات نظر نہ آتی۔ پھر آدھے راستے میں ایک جگہ رک کے میں نے مٹی کو کپڑے سے صاف کر دیا تھا۔ اب دیکھ لیں آپ۔"

میں نے ماتھے والی پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر شیر علی کو دیکھا۔ وہ جولی کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ستائش کے اس انداز میں مجھے کوئی جذباتی وابستگی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ صرف جولی کی ذہانت اور ہمت سے متاثر نظر آتا تھا مگر جولی کو احساس ہوا کہ شیر علی کی نگاہیں اس پر ہیں تو اس کے گالوں میں حیا کی لالی مسکرانے لگی اور اس کی آنکھیں بھی شوخ اور بے باک ہو گئیں۔ شیر علی سرخ و سفید پٹھان، وجیہ و شکیل اور صحت مند نوجوان تھا۔ اس کی متانت آمیز خاموشی کی عادت نے بھی ایک وقار دیا تھا۔ اپنے کردار کے اوصاف سے وہ پہلے ہی خود کو با اعتبار ثابت کر چکا تھا چنانچہ جولی اگر اس سے متاثر ہو گئی تھی تو یہ کوئی حیران کن

www.paksociety.com

بات نہیں تھی۔ اسے دلجوئی اور سہارے کی ضرورت تھی۔ ستم گر وقت نے اس کو بڑے دھوکے دیے تھے۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے خود کو دو حصوں میں بٹا ہوا پایا تھا۔ اس کی ماں کا مذہب الگ تھا اور باپ کا الگ۔ پھر باپ کی بھی شخصیت کے دو روپ تھے۔ وہ بہرام دادا کے روپ میں ایسا ڈاکو تھا جس کے نام سے لوگ کانپتے تھے لیکن گھر میں وہ ایک فراخ دل انسان، محبت کرنے والا شوہر اور بیٹی پر مرنے والا باپ تھا۔ جولی کے ذہن میں نیکی بدی اور عذاب و ثواب کے تصورات خلط ملط ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے وجود کی یہ داخلی کشمکش باپ کی موت سے ختم ہوئی تو خود اس کی اپنی موت عالم شباب کی امنگوں اور خوشیوں کی دشمن بن کے سامنے آگئی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس نے جینے کے عذاب سے نجات کی دعائیں مانگنا بھی چھوڑ دی تھیں کیونکہ دعا بھی بے اثر ہو گئی تھی مگر اسی وقت قدرت نے اجل کو واپس بلا لیا اور اسے ایک نئی زیادہ پرامید اور پرمسرت زندگی کی طرف لوٹا دیا مگر یہ خوشی بھی اسے راس نہ آئی اور ماں کے مرتے ہی وہ تنہا رہ گئی لیکن وہ ایک حوصلہ مند لڑکی تھی۔ ہمارے درمیان رہ کے اس نے خلوص اور محبت کے حقیقی رشتوں کو محسوس کیا اور اپنی زندگی کی گم ہو جانے والی خوشیاں پھر حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گئی۔ خوشی کا ایک انداز چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو میں بھی زندہ تھا۔ ہر نوجوان لڑکی کے جذبات اس کے دل میں بھی مچلتے تھے اور اس کے خوابوں میں بھی رنگ بھرتے تھے۔ کیا تاریخ اتنی جلدی اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ کیتھرین کے روپ میں جولی اور بہرام دادا کے روپ میں شیر علی محبت کی ایک اور داستان رقم کریں گے اور ثابت کریں گے کہ عشق کا مذہب کوئی نہیں ہوتا۔

ٹرالر کے اندر آخری حصے کا روشن دان کھلا ہوا تھا۔ اس کے بالکل نیچے فرش پر کوئی چادر تانے سو رہا تھا۔ یہ ٹیڈی تھا۔ استاد ٹیڈی۔ خوبی۔ خواجہ نیک محمد۔ ہمارا وہ یار جس نے سب سے بڑھ کر یاری کا حق ادا کیا۔ میں اور محسن تو بچپن کے دوست تھے۔ استاد ٹیڈی سے ہماری دوستی کی عمر بہت کم تھی مگر اس نے برق رفتاری سے پیش قدمی کی تھی اور اب دوستی کی اسی منزل پر تھا جہاں ہم سب اکٹھے تھے۔ فرط جذبات نے میری آواز روک لی۔ میں اس کے قریب جا بیٹھا اور اسے کچھ دیر ایسے ہی دیکھتا رہا پھر میں نے آہستہ سے کہا "ٹیڈی!" مگر چادر کے نیچے کوئی جنبش نہ ہوئی۔ دوسری بار میں نے اسے زیادہ بلند آواز میں پکارا لیکن وہ بہت گہری نیند میں معلوم ہوتا تھا۔

میں نے اسے جگانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اٹھا ہی تھا کہ جولی میرے پاس آ کے کھڑی ہو گئی۔ اس کی پراسرار خاموشی دیکھ کر میں نے کہا "جولی!"

"بھائی! مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ یہ بتانے کی" وہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے رونے لگی۔

"کیا بتانے کی؟" میں نے دل میں اترنے والے خوف سے لرز کر کہا۔

"آپ۔ آپ نے دیکھا نہیں" جولی نے آنسوؤں کے بیچ سر اٹھایا۔

میں نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا اور پھر بیٹھ گیا۔ میرے ایک ہاتھ نے جھٹکے سے چادر ہٹا دی۔ نیچے ٹیڈی آنکھیں کھولے ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ زبردستی مسکرایا۔ ٹیڈی کے گال پچک گئے تھے اور آنکھیں گہرے گڑھوں میں دھنس گئی تھیں۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا اور صاف نظر آتا تھا کہ اس کی یہ حالت جسمانی تشدد کا نتیجہ ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں کے سہارے اٹھا اور میرے گلے سے لپٹ گیا۔ اس کے گرم گرم آنسو میری گردن پر گرے۔

"ٹیڈی! میری جان۔ اب رونے کی ضرورت نہیں۔ ہم سب پھر ساتھ ہیں" میں نے کہا اور اس کے کندھے کو تھپکا "مجھے معلوم ہے تم نے بہت سختی جھیلی ہے لیکن خدا کا ہزار شکر ہے کہ ہم ان سفاک دشمنوں سے تمہیں لانے میں کامیاب ہوئے۔ ایک نہ ایک دن ہم ان کے ہر ظلم کا حساب بے باق کریں گے۔ ابھی ان کا وقت ہے لیکن وقت ہمیشہ ان کا نہیں رہے گا"

اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں اکیلا ہی بول رہا ہوں۔ ٹیڈی خاموشی سے آنسو بہانے اور کانپنے کے سوا کچھ نہیں کر رہا ہے۔ میں نے اسے ایک جھٹکے سے الگ کیا۔

"ٹیڈی! تم بولتے کیوں نہیں؟" میں نے کہا "جب میں نے تم کو آواز دی تھی تب بھی تم نے جواب نہیں دیا تھا حالانکہ تم جاگ رہے تھے۔ کیا تم نے میری آواز نہیں سنی تھی؟ ٹیڈی! کیا بات ہے، جواب دو مجھے ٹیڈی" میں نے اسے زور زور سے جھنجھوڑنا شروع کیا۔

ٹیڈی زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ میں نے وحشت سے جولی کی طرف دیکھا... "کیا... کیا یہ بول نہیں سکتا؟"

"بھائی! یہ سن بھی نہیں سکتے" جولی نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں۔ کیا ہوا ہے تمہیں ٹیڈی؟" میں نے چلا کے کہا "زبان تو ہے تمہارے منہ میں۔ پھر تم کیوں نہیں بول سکتے۔ بولو۔ بولو ٹیڈی؟"

"بھائی! خود پر قابو رکھیں" جولی نے کہا "ان کی یہ حالت دشمنوں نے کی ہے۔ محسن اور غالب کسی ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں۔ کوئی ڈاکٹر ہیں جو غالب کے والد کے دوست تھے۔ ان کے پاس [illegible] بھی رہی تھیں۔ بھائی نیک محمد کو بھی وہ وہیں چھوڑنا چاہتے ہیں۔ اس حالت میں انہیں ساتھ نہیں لے جایا جا سکتا۔ ممکن ہے یہ عارضی ہو اور علاج سے یہ ٹھیک ہو جائیں"

جولی بول رہی تھی اور میں ٹیڈی کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے

اسے پھر سیدھا لٹا دیا تھا اور اب ہم دونوں اپنے اپنے دل کا درد آنسوؤں کی زبان میں بیان کر رہے تھے۔ میرے دل میں رنج و غم کا ایک آتش فشاں ابل رہا تھا مگر اس کی تپش میرا ہی خون جلا رہی تھی۔ میں ٹیڈی کا بدلہ کسی سے نہیں لے سکتا تھا۔ میں انہیں جانتا تھا اور چاہتا تھا کہ میرے ہاتھ ان کی گردن تک پہنچ جائیں تو میں ایک ایک کے گوشت پوست کے ریشے بکھیر دوں اور ان کو خاک میں ملا کے نیست و نابود کر دوں مگر بے بسی کا احساس مجھے پاگل کر رہا تھا۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ اسے اغوا کر کے لے جانے والے کون تھے اور اس کے ساتھ راجہ اور کیتھرین کو کہاں لے گئے تھے۔ راجہ کا کچھ پتا نہیں چلا تھا کہ قید میں ہے یا آزاد ہے۔ کیتھرین مہلک تھی اور ٹیڈی لوٹ کر آیا تھا تو اپنی مظلومیت کی لہو رلانے والی تصویر بنا ہوا تھا۔

آہستہ آہستہ میں نے بھی صبر کا دامن امید سے باندھا اور میرے صدمے کی شدت میں دیوانگی نہ رہی۔ ٹیڈی سن نہیں سکتا تھا مگر میں نے اسے ہر طرح سے یقین دلایا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا حالانکہ میرا اپنا یقین ایک آرزو کے سوا کچھ نہ تھا۔

"جولی! وہ لوگ اپنے ساتھ گاڑی میں کیوں نہیں لے گئے" میں نے کہا۔

"وہ معلوم کرنے گئے ہیں" جولی نے کہا "کہ بھائی نیک محمد کو کہاں چھوڑا جا سکتا ہے۔ اگر وہ ڈاکٹر صاحب نہ ملے۔ یا انہوں نے پس و پیش کیا تو پھر شاید وہ انکل رضوی سے بات کریں گے"

"انکل رضوی سے؟" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں۔ شہلا باجی بھی ہیں وہاں"

"لیکن۔ شہلا کی بات اور ہے" میں نے کہا "ٹیڈی تو ان کی نظر میں ایک مجرم ہو گا"

"بھائی! وہ اب ایس ایس پی نہیں رہے"

"مگر ان کی سوچ تو نہیں بدلی ہو گی۔ اس کے علاوہ ایک شہلا ہی کیا کم بوجھ تھی ان پر۔ کہ ایک معذور اپاہج کی ذمہ داری بھی ان پر ڈال دی جائے"

"یہ بات نہیں بھائی۔ سکندر صاحب کا خیال تھا کہ یہ شہلا باجی کے ساتھ خوش رہیں گے اور کہیں نہیں۔ وہ ان کا خیال رکھ لیں گی اور اگر خدا نے چاہا تو یہ ٹھیک ہو جانے کے بعد شہلا باجی کی دیکھ بھال کریں گے اور ان کے بچے کے ساتھ ان کا دل لگ جائے گا۔ آگے ان کے ذہن پر نفسیاتی صدمہ ہو گا تو اس کا اثر زائل کرنے کے لیے سب سے اچھا ماحول وہی مل سکتا ہے۔ انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ طے کیا تھا کہ وہاں میں سے ایک جگہ ٹھیک رہے گی"

"بشرطیکہ انکل رضوی نے ایک مجرم کو قبول کرنے سے انکار نہ کیا" میں نے کہا۔

"پھر بھی نہ ہوا تو میں یہاں تک جاؤں گی" جولی نے کہا "جب تک بھائی نیک محمد ٹھیک نہیں ہو جاتے یہ کسی اسپتال میں داخل رہیں گے اور میں..."

"نہیں۔ پھر ہم سب ساتھ رہیں گے" میں نے کہا "ٹیڈی کا علاج ہمارے ساتھ رہ کے بھی ہو سکتا ہے"

"انکل رضوی مان جائیں گے بھائی" وہ بولی "میں نے ان کی باتیں سنی تھیں۔ بھائی محسن کہہ رہے تھے کہ ان کی رہائش وہیں رہے گی۔ انکل رضوی کی۔ ان کے مکان کا کچھ بندوبست ہو گیا ہے۔ وہ جو آپ کے وکیل دوست ہیں ان کی معرفت۔ وہ اب براہ راست مالک مکان کو کرایہ دیتے رہیں گے"

"چلو یہ اچھا ہوا" میں نے کہا "یہ بتاؤ تم نے ٹیڈی کو کھانے کے لیے کچھ دیا ہے۔ یہ بہت کمزور ہو رہا ہے"

"میں تھوڑا سا جوس اور سوپ دے چکی ہوں" وہ بولی۔

ٹیڈی سونے لگا تھا۔ اس کے نزدیک ہماری سب گفتگو بے معنی تھی۔ وہ ہمارے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ سکتا تھا۔ شاید یہ بھی سمجھتا تھا کہ ہم اسی کے بارے میں بات کر رہے ہیں مگر وہ خود خاموشی سے پلکیں جھپکانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ ٹیڈی پاگل نہیں ہوا تھا۔ اندھا نہیں ہوا تھا اور یادداشت سے محروم نہیں ہوا تھا۔ میں باہر نکلا تو شیر علی اکیلا چارپائی پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو شیر علی؟" میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔

"کچھ نہیں سکندر صاحب۔ ساتھی بہت سی باتیں ہیں جو مجھے معلوم نہیں اور میں کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا" وہ بولا۔

"آہستہ آہستہ سب معلوم ہو جائے گا تمہیں بھی" میں نے کہا "تم اب ہمارے ساتھ ہو تو تم سے ہم کچھ نہیں چھپا سکتے"

"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا سکندر صاحب۔ یہ جو سب نے ایک سا حلیہ بنا لیا ہے" وہ بولا "دو کی حد تک تو ٹھیک تھا مگر ایک جیسے تین افراد سب کو متوجہ کرتے ہیں۔ آپ برا مت مانیں میری بات کا"

"صاف گوئی کا ہم میں سے کوئی برا نہیں مانتا" میں نے کہا "تم یہ بتاؤ کہ اس قتل کے بارے میں کیا معلوم ہوا؟"

"کوئی خاص بات نہیں جی" شیر علی نے کہا "قاتل کو کسی نے بھی نہیں دیکھا لیکن خیال ہے کہ یہاں دو چار دن سے ایک ملنگ قسم کا جو فقیر بیٹھنے لگا تھا وہی قتل کر کے فرار ہو گیا"

"قتل کا سبب بھی کچھ پتہ چلا؟"

شیر علی نے نفی میں سر ہلایا "میں نے براہ راست تو کسی سے کچھ نہیں پوچھا لیکن باتیں سن کے اندازہ لگایا ہے کہ ڈرائیور سہ پہر آتا تھا اور اکثر اس راستے پر چلتا تھا۔ سب ہی جانتے تھے اسے"

"اور اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے؟"

"رائے اچھی رکھتے تھے" شیر علی نے کہا "نیک اور ایماندار تھا۔ یہاں سے کراچی مال لے جاتا تھا۔ جیسا لوکل چھوٹا موٹا مال ہوتا تھا"

"تمھارا مطلب ہے بشری جیل اینڈ سنز؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی" شیر علی نے کہا۔

"کیا وہ عبداللہ اینڈ سنز کا ملازم تھا؟" میں نے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک بتایا آپ نے" شیر علی بولا۔ "کمپنی کا مالک آپ کے جانے کے بعد آیا تھا۔ اس نے پولیس سے سارا معاملہ طے کر لیا۔"

"کون تھا وہ سیٹھ — ایک موٹا تازہ پلا ہوا سا آدمی؟" میں نے کہا۔ جس نے دنیا کو دھوکا دینے کے لیے بہت بڑی سی داڑھی چہرے پر سجا رکھی تھی اور تسبیح ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی جیسے اللہ کی تو نوکری کرتا ہو۔

"ہاں جناب — آپ جانتے ہیں اسے؟"

"شیطان کو کون نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "خیر تم بتاؤ کہ ٹرک میں آج کیا مال تھا؟"

"کم سے کم ایک کریٹ میں بھی نہیں تھے۔" شیر علی نے کہا۔ "اس کا پتا یوں چلا کہ ڈرائیور کو ہٹانے کے بعد وہ چھوکرے ٹرک پر چڑھ گئے۔ ایک تو وہی گیراج والا لڑکا تھا جس سے آپ نے بات کی تھی۔ وہ غالباً اس قسم کی چوری کرتے رہتے ہیں ہر وقت یہاں رہتے ہیں اس لیے جانتے ہیں کہ کس ٹرک میں کیا مال ہوگا۔ ایک پیٹی انڈوں کی غائب کر دی یا ایک کریٹ پھلوں کا اتار لیا۔ کھاتے کتنا ہوں گے کسی کو بیچ دیتے ہوں گے۔ ایک پورے ٹرک میں سے جو اوپر تک بھرا ہوا ہو ایک پیٹی نکل جائے تو کسی کو پتا نہیں چلتا۔"

"مال بھیجنے والے اتنے بے وقوف تو نہیں ہوتے شیر علی۔ وہ گن کر پیٹیاں رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ فوراً پتا نہیں چلتا۔" شیر علی نے وضاحت کی۔ "کراچی پہنچنے کے بعد مال اتارتے وقت معلوم ہوتا ہوگا۔ یہ تو مالکوں پر منحصر ہے کہ وہ اپنے ڈرائیور پر اعتبار کرتے ہیں یا نہیں۔ ایک پیٹی مال کچھ نہیں ہوتا۔ پیٹی راستے میں گر بھی جاتی ہے۔ کسی کو نہ ملنے میں بھی پیٹی چڑھائی ہے۔ مال چڑھاتے ہوئے گنتی غلط ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں لونڈے جب پیٹیاں اٹھانے گئے تو ان کو پسینہ آ گیا۔ پیٹی بہت زیادہ وزنی تھی جبکہ پھلوں یا انڈوں کے وزن کا تو انھیں اندازہ تھا۔ وہ حیران ہوئے ہوں گے کہ اس میں کیا ہے اور تجسس میں انھوں نے ایک کونا کسی چیز کی مدد سے اٹھا کے دیکھ لیا۔ اس میں پستول اور ریوالور بھرے ہوئے تھے۔ پہلے تو وہ گھبرائے۔ پھر انھوں نے ایک ایک پستول نکال لیا۔ یہ ان کی بڑی بے وقوفی تھی۔ انھوں نے معلوم نہیں کیا سوچا تھا۔ یہ کہ بعد میں کسی کو بیچ دیں گے یا وہ پستول ہاتھ میں لے کر خود کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینا چاہتے تھے جس سے یہ محنت مزدوری کا چکر ختم ہو جائے اور وہ عیش سے زندگی گزاریں۔ وہ جو ملنگ قریب سڑک کے کنارے بیٹھا رہتا تھا اس نے ان کو ٹرک سے اترتا ہوا دیکھ لیا اور چلانے لگا "چور — چور"۔ تو وہ گھبرا گئے اور پستول پھینک کر بھاگ گئے۔ ملنگ نے دونوں پستول اٹھائے اور سڑک کے بیچ میں ناچنے لگا۔ دونوں پستول اس نے دونوں ہاتھوں میں اوپر

اٹھا رکھے تھے اور مسلسل فائر کر رہا تھا۔ پستولوں میں گولیاں نہیں تھیں۔ منہ سے ٹھاہ — ٹھاہ کی آوازیں نکال رہا تھا۔ دوسرے لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور اس سے ریوالور چھین لیے۔ اس سے بہت پوچھا گیا کہ یہ کہاں سے آئے مگر اس نے کچھ نہیں بتایا بس یہی کہتا رہا کہ چور پھینک گئے تھے چوری کر کے — ڈاکوؤں کے گھر میں — اس کا مطلب کسی نے نہیں سمجھا۔ چونکہ وہ نئے اور غیر ملکی ساخت کے ریوالور تھے اس لیے ملنگ کو تو پاگل سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔ ریوالور چھیننے والوں نے پھر ڈرائیور سے پوچھا۔ اس نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔"

"ان لڑکوں نے کچھ نہیں بتایا؟" میں نے کہا۔

"وہ پہلے تو بھاگ گئے تھے۔ پھر انھوں نے اپنے استاد کو بتانا مناسب سمجھا اور استاد نے ان کو مارا اور کہا کہ خبردار جو منہ سے ایک لفظ بھی نکالا۔ اندر ہو جاؤ گے سالو! اس نے گل بادشاہ کو الگ بلا کے اس سے بات کی۔ گل بادشاہ نے کہا کہ تم بچے ہو گیراج کے مالک۔ شکر کرو بچ گئے دیکھ لو۔ تمھاری کوئی پیٹی کھلی ہوئی تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے خود تمھیں بھی علم نہ ہو کسی نے اپنا مال بیچ میں ڈال دیا ہو۔ اس پر گل بادشاہ اوپر چڑھا اور اس نے درمیان کی ایک پیٹی کو تھوڑا سا کھلا ہوا پایا۔ وہ بہت پریشان ہوا اور اس نے نیچے آ کر گیراج والے سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ پولیس کو اطلاع مت دو۔ ورنہ تم پھنس جاؤ گے کہیں۔"

"اور وہ دو ریوالور کہاں گئے؟" میں نے کہا۔

"سنا ہے کہ وہ ہاتھوں ہی ہاتھوں میں غائب ہو گئے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ سب دیکھ رہے تھے۔ ایک سے دوسرے کے ہاتھ میں گیا اور دوسرے سے تیسرے کے ہاتھ میں۔ اللہ معلوم کس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی کہ کسی کو پتا نہیں چلا۔ کچھ لوگ اسی وقت ٹرک سے اترے تھے اور کچھ جا رہے تھے۔ اسی میں گڑبڑ ہو گئی۔" شیر علی نے کہا۔ "گل بادشاہ نے بالآخر اپنے مالکوں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ پہلے سارا معاملہ ان کے علم میں لانا چاہتا تھا۔ وہ ٹرک میں سے کوئی نوٹ بک نکال لے گیا تھا جس میں ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے تھے مگر وہ لوٹ کر نہیں آیا اور جب کافی دیر گزر گئی تو گیراج والے نے پیچھا کر کے دیکھا۔"

"اندازاً کتنی دیر کے بعد؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم جناب۔" شیر علی نے کہا۔

میں نے کہا۔ "کیا یہ گیراج والے کا بیان ہے؟"

"ہاں جی — اس نے سب کچھ پولیس کو سچ سچ بتا دیا تھا۔ پولیس تو اسے اپنے ساتھ لے جاتی مگر جب سیٹھ آیا تو اس نے کہا کہ بابا بولنے والے کو پکڑتے ہو — چور کو پکڑو۔"

میں نے کہا۔ "کون چور — وہ دونوں لڑکے؟"

شیر علی نے کہا۔ "ان کا تو نام پتا لکھوا دیا تھا استاد نے

سیٹھ کو ان غائب ہو جانے والے پستولوں کی فکر تھی مگر وہ کس کس کو پکڑتے۔ وہاں تو رات بھر ٹرک آتے جاتے رہتے تھے۔ دونوں طرف سے۔"

"وہ لڑکے تو مارے گئے۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "مجرم سمجھے ہو کر قتل کا شک اس ملنگ پر کیا گیا — آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ واردات کے کچھ دیر بعد ہی وہ غائب ہو گیا تھا۔"

"وہ غائب نہیں ہوا۔ اسے اٹھا لیا گیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "تم نے بہت کچھ معلوم کر لیا شیر علی۔ پولیس نے تم سے بھی تو کچھ پوچھا ہوگا؟"

"ہاں جی — پوچھا تھا۔" شیر علی نے کہا۔ "میں نے بتایا کہ مرحوم گل بادشاہ میرے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ انھوں نے کہا کہ پھر تم اس کی لاش لے جاؤ۔ لیکن میں نے کہا کہ یہ مالکوں کی ذمے داری ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ کسی پڑوسی کے گھر جاؤں تو اس کی لاش لے کر۔ وہ جو حاجی صاحب تھا اس نے میری بات مان لی۔"

"تم سے نہیں پوچھا گیا کہ کون ہو اور کیا کرتے ہو؟"

"پوچھا تھا — میں نے بتا دیا کہ پہلے کس کے پاس تھا اور اب بے روزگار ہوں۔" شیر علی نے کہا۔ "اسی لیے یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "بہت سے لوگوں نے تم کو یہاں آتے جاتے دیکھا ہوگا۔"

"میں نے کہا کہ اس کمپنی میں جگہ خالی ہے۔ مالک آئیں گے تو بات کروں گا۔ میں نے تو حاجی صاحب سے بھی کہا تھا کہ مجھے رکھ لیں۔ وہ مجھے شرمندہ کرنے لگے کہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ تمھارا پڑوسی مارا گیا اور تم اس کی میت تک نہیں لے جا سکتے۔ اس کا ٹرک لے جانے کے لیے بے تاب ہو۔ اس کی موت تمھارے لیے روزگار کی خوش خبری۔ وہ ایک بک کر تمام کہ یہ حالت ہے ہمارے اخلاق و کردار کی۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں اصل بات پی گیا تھا۔ وہ مجھ پہ کیسے بھروسا کر لیں۔ اب ان کا اپنا کوئی آدمی آئے گا تو ٹرک لے جائے گا۔ وہ حاجی صاحب بہت مکار آدمی تھا۔ اس نے فوراً پولیس کی ساری کارروائی ختم کرا دی اور سب کو اپنے ساتھ لے گیا۔ بات بات پر تو وہ تقریر شروع کر دیتا تھا کہ سب اس کی رضا کے سامنے مجبور ہیں اور آدمی کو صبر شکر اختیار کرنا چاہیے۔ مرحوم کا وقت آ گیا تھا۔ وقت ہم میں سے کسی کا بھی آ سکتا ہے۔ اس کے ورثا کو میں خود معاوضہ ادا کرنے جاؤں گا۔ خبیث — جان کے معاوضے کی بات کرتا تھا۔ اس کا مقصد معاملے کو جلد از جلد ختم کرنا تھا اور اس میں وہ کامیاب رہا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس نے تو شاید پرچا بھی نہیں کٹنے دیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "پولیس گواہوں کو لے گئی تھی؟"

"نہیں — کسی کو نہیں۔" شیر علی نے کہا۔ "حاجی صاحب نے کہا کہ بس نام پتے لکھ لو اور ضرورت پڑے گی تو بیان کے لیے بلا لینا۔ پولیس تو اس کے اشارے پر چلتی تھی جناب۔ جیسے وہ افسر ہے ان کا۔"

"کچھ ایسا ہی ہے شیر علی — افسروں کا افسر اُن کے ساتھ ہے اور حاجی صاحب کے پاس پیسہ ہے۔ وہ معاملے کی اس حد تک تفتیش نہیں چاہتے تھے کہ بات اخبار والوں تک پہنچے۔ وہ فرد فرد جو چشم دید گواہ کہلاتے، زبان بند رکھنے کے فائدے اور سچ کا اظہار کرنے کے نقصانات بتا دیے گئے۔ اس ملنگ کا غائب ہو جانا البتہ ایک پُراسرار معاملہ ہے۔ وہ پاگل تھا تو اس پر قاتل ہونے کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔ یا تو وہ پاگل نہیں تھا۔ کوئی واقف حال تھا جسے ٹھکانے لگا دیا گیا۔ یا وہ خود صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے روپوش ہو گیا۔"

"کیا وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہوگا؟"

"ہو سکتا ہے۔ اور وہ بیچارہ پاگل تھا تو تفتیش کو یہیں روکنے کے لیے اسے قاتل قرار دے دیا گیا تاکہ کسی اور پر الزام نہ آئے۔ اصل بات کیا ہے، یہ وہی جانتے ہوں گے۔ ہم تو صرف اندازہ کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔

شام کے چھ بج چکے تھے لیکن ابھی تک نہ حسن کا کچھ پتا تھا اور نہ غالب کا۔ ادھر میرا دماغ دوسرے راستے پر چل نکلا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ ٹرک اب پھر رات کی تاریکی میں روانہ ہوگا۔ اس کے لیے رات کو حاجی صاحب خود کسی قابلِ اعتماد ڈرائیور کو بھیج دیں گے۔ ٹرک دن میں اس لیے نہیں جا سکتا تھا کہ دن میں راستوں کی نگرانی کرنے والے دوسرے لوگ ہوں گے۔ جن سے اس ٹرک کو گزارنے کی بات طے تھی وہ اب پھر رات کو ہی ڈیوٹی پر ملیں گے۔ حاجی صاحب انھیں بتا دیں گے کہ گزشتہ رات ٹرک کیوں نہیں پہنچا تھا اور وہی ٹرک آج کون لے کر جائے گا۔

"شیر علی!" میں نے کہا۔ "گاڑی لے کر میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں جناب؟" شیر علی نے کہا۔ "جولی کو بھی لینا ہے ساتھ؟"

میں نے کہا۔ "نہیں — جولی یہاں رہے گی۔ ٹیڈی کی دیکھ بھال کے لیے۔"

"اگر — تھوڑی دیر انتظار کر لیتے… جولی کو اکیلا چھوڑنا مناسب نہیں ہے کچھ…"

"کیا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں ہے، یہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں شیر علی۔" میں نے کہا۔ "جولی اپنی حفاظت کر سکتی ہے اور میں تم کو ایک خاص کام سے لے جا رہا ہوں۔ ہم ایک گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔"

"جیسی آپ کی مرضی جناب۔" وہ بولا۔ "آپ جولی کو بتا دیں۔"

"یار تم کو جولی کی بہت فکر ہے۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا تاکہ اس کی شرمندگی کچھ کم ہو جائے۔ میں نے جولی سے کہا کہ میں ایک ٹیلی فون کرنے جا رہا ہوں اور آدھے گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔ پھر میں شیر علی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ شیر علی نے گاڑی کو موڑنا چاہا تو میں نے کہا۔

" گاڑی کو آگے لے جاؤ۔ ملتان کی طرف "
شیر علی نے کوئی سوال کیے بغیر گاڑی کو پھر موڑا اور پھر ٹرک کی اوٹ سے نکل کے تھوڑا سا کچا راستہ طے کرنے کے بعد سڑک پر آ گئے۔
آدھے گھنٹے میں گاڑی تیس میل دور آ چکی تھی اور میں دونوں طرف کے علاقے کو دیکھتا جا رہا تھا۔ ایک پٹرول پمپ گزرا تو میں نے شیر علی سے کہا۔
" گاڑی ایک طرف کھڑی کر لو۔ مجھے یہاں اترنا ہے "
شیر علی نے تعمیل کی " محسن صاحب کو اور دوسروں کو کیا بتاؤں جناب "
میں نے کہا " صرف یہ کہ میں کسی ضروری کام سے گیا ہوں۔ دو چار دن بعد لوٹوں گا "
شیر علی نے کہا " کیا میں یہ بھی نہ بتاؤں کہ آپ کہاں اترے تھے "
" بتا دینا۔ لیکن اس کا فائدہ کچھ نہیں " میں نے کہا " میں اس جگہ تو نہیں ٹھہرا رہوں گا۔ تم کو کچھ اور بھی کہنا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اب تم لوگ بھی وہاں سے کوچ کرو۔ وہ کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے۔ وہاں آتے جاتے ٹرک ڈرائیور سب ہی اتنے بڑے ٹریلر کو دیکھ چکے ہیں۔ ٹریلر کوئی انوکھی چیز نہیں لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ اس ٹریلر کو کچھ لوگ پہچانتے ہوں جس کمپنی سے یہ ٹریلر خریدا گیا تھا اس کے ٹرک بھی وہاں سے گزرتے ہیں۔ ٹریلر کو آگے لے آؤ۔ پانچ دس میل۔ پھر وہیں یہی کوئی جگہ دیکھ کر کھڑا کر دو۔ سڑک کے کنارے سے ذرا ہٹ کر فاصلے پر کر ٹریفک میں کسی قسم کا خلل نہ پڑے۔ کوئی بھی پوچھے تو کہو کہ بریک ڈاؤن ہو گیا ہے اور ایک پرزہ ٹوٹ گیا ہے اب کراچی سے وہ پرزہ آئے گا تو مرمت ہو گی۔ اس بہانے تم وہاں رک سکتے ہو مگر باقی لوگ اگر ٹریلر سے ہٹ کے کسی جگہ خیمہ لگا کر رہیں تو اچھا ہے "
" میں یہ سب سمجھا دوں گا " شیر علی نے کہا۔
" دوسری بات " میں نے کہا " محسن کو سمجھانا کہ یہ سرکاری گاڑی ہے۔ اس کا شہر میں پھرنا تو شک پیدا نہیں کرتا لیکن ویرانے میں کھڑے ہوئے ایک ٹریلر کے پاس آنا جانا ٹھیک نہیں۔ یا تو اس گاڑی کو کہیں اندر کھڑا کر دیں اور تانگہ رکشا میں آئیں جائیں۔ یا گاڑی کا رنگ بدل کے سرکاری محکمے کا نام مٹا دیں۔ تیسری بات یہ کہ جلد از جلد کرسی کے لیے آدمی بھرتی کر لیں اور تمام ضروری سامان خرید کے سفر کی تیاریاں مکمل کر لیں "
" آپ کی باتوں سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا ارادہ ابھی واپس آنے کا نہیں ہے " شیر علی نے کہا۔
" ارادہ تو ہے لیکن ارادے بدل جاتے ہیں یا بدلنے پڑ جاتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مجھے زیادہ دن لگ جائیں " میں نے کہا " تم سب لوگ اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو۔ میرا انتظار مت کرنا۔ میں واپس آؤں گا تو خود ہی تم کو تلاش کر لوں گا۔ مگر کسی صاف جگہ ہو گا اس پاس

کے گاؤں دیہات میں اس کی شہرت ہو گی "
" آپ کیا اسلحے کے اس ٹرک کے پیچھے جا رہے ہیں "
" ہاں شیر علی " میں نے کہا " تمہارا اندازہ درست ہے "
" اگر آپ کسی کو ساتھ لے جاتے تو کیا برا تھا " وہ بولا " کم سے کم محسن صاحب کو ساتھ رکھیے "
" اس کام کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں " میں نے کہا " آخری بات اور سن لو۔ محسن اور غالب سے کہنا کہ خلیفہ پنڈت کی دکان اسے واپس دلوا دیں "
" کس کی دکان " شیر علی حیرانی سے بولا۔
" خلیفہ پنڈت " میں نے کہا " تم اسے نہیں جانتے۔ وہ ہمارا محسن اور دوست ہے جو ہماری مدد کرنے کے جرم میں تباہ ہوا۔ اس کو اپنی دکان کم فروخت کرنی پڑی۔ ممکن ہے موجودہ مالک آسانی سے دکان واپس نہ کرے کیونکہ وہ بہت موقعے کی اور چلتی ہوئی دکان ہے اور اس نے کافی خرچ کیا ہے۔ اسے لاگت سے دوگنے تک کی پیشکش کر دینا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے چالیس ہزار میں دکان خریدی تھی۔ میں پچیس ہزار اور پگڑی کے ہوں گے۔ وہ شرافت سے مان جائے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ پھر دوسرا طریقہ اختیار کرنا "
" دوسرا طریقہ کیا ہو گا "
" سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلے تو کیا کرنا پڑتا ہے " میں نے کہا " ٹیڑھی انگلیوں سے نکالنا پڑتا ہے۔ محسن اور غالب اسے ایک بار سمجھا دیں گے تو دوسرے طریقے سے سمجھائیں گے۔ خلیفہ پنڈت کو اس کا ٹھکانا واپس مل جائے گا تو اس کے دوسرے شاگرد بھی واپس آ جائیں گے۔ جن سے بچھڑنے کا اسے بے حد قلق ہے۔ یاد رہیں گی یہ سب باتیں "
" میرا حافظہ اتنا خراب نہیں ہے جناب " شیر علی نے کہا۔
" اچھا تو ذرا مجھے مختصر سناؤ۔ کیا کہو گے تم " میں نے کہا۔
شیر علی مسکرایا اور اس نے میری ہر بات دہرا دی۔
" ویری گڈ " میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا " اب تم جا سکتے ہو لیکن پہلے مجھے چابیاں دو ایک منٹ کے لیے "
شیر علی نے چابیاں نکال کے مجھے تھما دیں۔ میں نے پیچھے کا خانہ کھولا اور کچھ دیر سوچتا رہا کہ اپنے لیے کس قسم کا اور کتنا اسلحہ نکالوں پھر میں نے ایک ریوالور اور چار راؤنڈ نکال لیے۔ شیر علی نے یہ خانہ پہلی بار دیکھا تھا مگر اب تک وہ ہمارے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ اس کے لیے حیرانی کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ خانے کو بند کر کے میں نے چابیاں شیر علی کے ہاتھ پر رکھ دیں اور سامان کا دوسرا خانہ کھولا۔ دلاور سے وصول ہونے والی ساری رقم اس سوٹ کیس میں تھی جو گاڑی کے پچھلے حصے میں پڑا رہتا تھا۔ تقریباً نصف رقم میں ٹریلر اور سامان خریدنے میں صرف کر دی تھی۔ میرے اندازے کے

مطابق اب بھی ساڑھے چار لاکھ باقی تھے۔ اس میں سے میں نے صرف ایک گڈی نکالی اور سوٹ کیس کو شیر علی کے سامنے ہی بند کر دیا۔ دس ہزار کی یہ رقم میری کسی بھی فوری ضرورت کی کفالت کے لیے کافی تھی۔
" اچھا۔ اب خدا حافظ " میں نے پھر شیر علی سے ہاتھ ملایا۔
" خدا حافظ " شیر علی نے کہا " جلد واپس آنے کی کوشش تو کریں گے آپ "
" ہاں بھئی۔ تم سب سے دور اور اکیلا میں کیا کر سکتا ہوں اور کیسے رہ سکتا ہوں "
" یہاں سب آپ کے لیے فکر مند رہیں گے " وہ بولا " آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ اپنی خیریت کی اطلاع دیتے رہیں "
" میں کوشش کروں گا " میں نے کہا " کہ محسن کے لیے کہیں پیغام چھوڑ دوں۔ منظور کے پاس یا ڈاکٹر سلامت کے پاس۔ میجر سلطان کے گھر کے فون پر یا خلیفہ پنڈت کے پاس۔ ایک فون میں لے جا رہا ہوں۔ دوسرا محسن کے پاس ہو گا۔ وہ معلوم کرتا رہے "
تیسری بار خدا حافظ کہنے کے بعد شیر علی نے گاڑی کو واپس موڑا تو رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ہم شاید پندرہ بیس منٹ تک ایک ہی جگہ ٹھہرے تھے اور اس دوران میں پندرہ بیس گاڑیاں ایک طرف سے اور اتنی ہی دوسری طرف سے گزر گئی تھیں۔ ان میں بسیں کاریں اور ٹرک سب ہی شامل تھے۔ جیسے میں تنہا رہ گیا تو میں نے سڑک سے ہٹ کر درختوں کی قطار کے پیچھے چلنا شروع کیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ٹرک رات کو دس بجے سے پہلے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ رات کے وقت اس ایک ٹرک کو پہچان کر روکنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا۔ اندھیرے میں تو صرف ہیڈ لائٹس نظر آتی ہیں اور دور سے یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ لائٹس کس بس کی ہیں یا ٹرک کی۔ ہر بس اور ٹرک کو روکنا کیسے ممکن ہو گا۔
تقریباً ایک میل آگے جانے کے بعد میں نے سڑک عبور کی اور دوسری طرف سے واپس ہوا۔ میرا ذہن بدستور الجھن میں مبتلا تھا کہ میں نے ایک خشک ہو جانے والے درخت کا کھوکھلا تنا دیکھا جو نہ جانے کب سے گرا پڑا تھا۔ میں نے اسے ہلا کے دیکھا۔ یہ بہت ہلکا تھا۔ چھ سات فٹ لمبا اور ڈیڑھ دو فٹ موٹا لکڑی کا لٹھا مجھ سے اٹھانا دشوار ضرور ہوتا مگر دیمک نے اسے اندر سے چاٹ لیا تھا۔ اس کا وزن اب دس سیر بھی نہیں رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ترکیب میرے دماغ میں آ گئی۔ تجربے کے لیے میں نے کھوکھلے تنے کو خالی سڑک کے بیچ میں ڈال دیا اور خود درخت کے پیچھے بیٹھ گیا۔ لاہور کی طرف سے آنے والی ایک بس کے ڈرائیور نے قریب آ کے بریک لگائے۔ نیچے اتر کے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر جلدی سے لٹھے کو ایک طرف پھینکا اور بس کو نکال لے گیا۔ عام طور پر اسی طرح بس کو ڈاکو روکتے ہیں۔ ڈرائیور کے بیچ سڑک سے نکال کے جانا بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ دونوں

ایک خشک برساتی نالے کی پلیا تھی جس نے راستے کو محدود کر دیا تھا دونوں طرف درخت کا تنا بہت اونچا اور بھاری بھرکم دکھائی دیتا تھا اور کوئی ڈرائیور بھی یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ بس کو اس کے اوپر سے گزار کر لے جائے۔ بس ڈرائیور نے خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ یہ کسی کی شرارت تھی۔ راستہ روکنے والے ڈاکو نہیں تھے۔
وقفے وقفے سے میں نے تین بار تجربہ کیا اور ہر بار یہی ہوا کہ بس یا ٹرک کے ڈرائیور نے نیچے اتر کے درخت کے تنے کو ہٹایا اور یہ حرکت کرنے والے کے نام کوئی گالی دے کر وقت ضائع کیے بغیر بھاگ گیا۔ یہ کام خطرناک بھی تھا کوئی مجھے درخت کو سڑک پر رکھتے ہوئے دیکھ لیتا تو مجھ پر گولی بھی چلا سکتا تھا۔ رات کے وقت سفر کرنے والے ٹرک اور بس ڈرائیور عموماً مسلح ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ایک ساتھ دو تین ٹرک اور بسیں رک جائیں۔ اور یہ بھی کہ کوئی راستے کی رکاوٹ کو ہٹانے کے بعد لکڑی کے کھوکھلے تنے کو بھی اٹھا لے جائے کہ مزے سے جلانے کی بات ہے۔ کبھی بانسری۔
میری گھڑی میں ابھی ساڑھے آٹھ بھی نہیں بجے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے کم سے کم ڈیڑھ گھنٹہ اور اسی طرح گزارنا تھا۔ مجھے بھوک بالکل نہیں تھی۔ شام سے کچھ دیر قبل ہی میں نے دو چپاتی کھا لی تھی۔ پیاس میں برداشت کر سکتا تھا۔ تقریباً ایک میل دور مجھے پٹرول پمپ کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ دوسری طرف تاحد نگاہ پھیلے ہوئے درختوں والا جنگل تھا اور رات کا اندھیرا تھا۔ میں نے ایک درخت کا انتخاب کیا اور اوپر دو شاخوں کی صورت میں بیٹھے ہوئے تنے پر پاؤں پھیلا کے اور کمر ٹکا کے بیٹھ گیا۔ ایک سگریٹ جلا کے میں نے چند کش لیا اور سوچنے لگا کہ میرے اس اقدام کا محسن اور غالب کیا مطلب نکالیں گے۔
میں نے شیر علی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ میرا ارادہ اسلحے کے ٹرک کا پیچھا کرنے کے علاوہ بھی کچھ کرنے کا ہے۔ محسن یقیناً خفا ہو گا کہ ایک ٹرک کو روکنے یا اس پر قبضہ کرنے کے لیے میں کسی سے مشورہ کیے بغیر چل پڑا۔ یہ کام تو ان میں سے کسی کو ساتھ لے کر بھی کیا جا سکتا تھا اور اس کے لیے اتنی افراتفری میں روانہ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ میں انہیں اس لیے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ پھر وہ مجھے روکتے اور مجھے قائل کرنے کے لیے دلائل دیتے۔ مجھے سمجھاتے کہ یوں رابعہ کو واپس لانے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم دشمنوں سے نمٹنے کے مشن کو بھول کر ایک عورت کو بچانے کے مشن کو زیادہ اہم سمجھیں۔
رابعہ ان کے لیے ایک عورت تھی۔ پہلے میں نے بھی اس خیال سے سمجھوتا کرنے کے لیے اپنے دل کو پتھر کیا اور جذبات کو عقل پر غالب نہیں آنے دیا تھا مگر اس کی آواز سننے کے بعد میرے لیے سمجھوتا کرنا ہی نہیں ناممکن ہو گیا تھا۔ بے شک وہ ہمارا مشن نہیں تھی مگر وہ مشن کا ایک حصہ تو تھی۔ ہم نے اس کی رہائی کے لیے جو پلان بنایا تھا وہ ناکام ہو گیا تھا۔ عاشی مر گئی تھی اور زیب النساء بھی چل دے کر نکل گئی

"۔۔۔اور ہم رابعہ کو بھی اسی طرح حاصل کر لیتے جیسے ٹیڈی کو واپس لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب مجھے رابعہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ غیر محفوظ محسوس ہوتی تھی۔ اس کی آزادی کا سودا کرنے کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ دوسری طرف وہ شکاری تھے جو ایک بار مجبور ہو گئے تھے کہ اپنا شکار ہمارے حوالے کر دیں۔ مگر رابعہ اب بھی ان کے پاس تھی۔ اس کی آزادی کا یقین ادھورا تھا۔

اس ادھورے یقین نے میرے دل کو ایک ایسی خلش میں مبتلا کر دیا تھا جس سے مجھے سوتے جاگتے دن رات کے کسی لمحے قرار نہ ملتا تھا۔ اگر مجھے پورا یقین ہوتا کہ وہ قید میں ہے اور اس سے ملنے کی کوئی صورت نہیں تو میں پہلے کی طرح صبر کی سل سینے پر رکھ کے اس وقت کے انتظار میں زندہ رہتا جب اسے مجھ سے دور اور مجبور رکھنے والے حالات مٹ کر میرے اختیار میں ہوں گے۔ وہ مجھے اپنے آزاد ہونے کا پورا یقین دے سکتی تو۔۔ مگر یہ تو اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ میرے پاس پہنچ جاتی اور کہتی کہ سکندر! دیکھو میں تمہارے سامنے ہوں۔ میں تمہارے تصور کا سراب نہیں ہوں۔ میں خواب بھی نہیں ہوں۔ میں حقیقی وجود رکھنے والی جیتی جاگتی تمہاری اپنی رابعہ ہوں۔ یا وہ کہتی کہ سکندر! تم مجھے لے جاؤ۔ میں تمہارے انتظار میں ہوں۔ پھر وہ مجھے سرحد افلاک پر ملتی۔ وہاں ملتی جہاں زمین آسمان ملتے ہیں یا جہاں زندگی کی سرحد موت سے ملتی ہے۔ میں سر کے بل جاتا۔ مگر اس نے تو مجھے اپنا پتا بھی بتا دیا تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔ یہ بھی کہا تھا کہ میں بالکل خیریت سے ہوں اور کسی کی قید میں نہیں ہوں۔ مگر آنے کی بات مت کرو۔ میں نہیں آؤں گی۔ آخر کیوں؟ وہ کیوں نہیں آسکتی؟ اور کیوں وہ مجھے دور رکھنا چاہتی ہے؟ یہ کیسی ستم گری کی ادا ہے۔ کیسا امتحان ہے . . .

میرے خیالات کی رو اس وقت ٹوٹی جب سڑک سے گزرنے والی ایک کار اچانک کچھ فاصلے پر مڑ گئی اور سیدھی میری سمت میں آ گئی۔ میں جہاں تھا وہیں منجمد ہو گیا۔ ہیڈ لائٹس ناہموار زمین کے جھٹکوں سے اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ روشنی بار بار مجھ پر پڑتی تھی اور اگر میں ذرا بھی حرکت کرتا تو ان کی نظر میں آجاتا جو وہ شکاری کے پیچھے سے شاید میری ہی جستجو میں وہاں پہنچے تھے۔ میرے سامنے اور آگے پیچھے بہت کم پتوں والی شاخیں تھیں۔ میں زمین سے دس بارہ فٹ کی بلندی پر تھا۔

سب سے پہلا خیال مجھے یہی آیا کہ آخر وہ کون ہو سکتے ہیں؟ سوائے شیر علی کے کسی کو معلوم نہ تھا کہ میں یہاں ہوں۔ کار اس جگہ سے ایک فرلانگ پہلے ہی سڑک چھوڑ چکی تھی۔ پٹرول پمپ سے یہاں تک میں نے کوئی کچا راستہ نکلتا نہیں دیکھا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ کار درختوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ یہ ما نگروس ہرگز نہیں تھی۔ اس کی لائٹس اونچی ہوتی ہیں اور انجن کی آواز سب سے الگ ہوتی ہے۔ کیا یہ محسن اور غالب ہو سکتے ہیں جو مجھے لے کر مجھے تلاش کرنے آئے ہوں۔ شیر علی نے انھیں سب بتا دیا ہو اور وہ مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے یا میرا ساتھ دینے کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہوں۔ وہ شہر میں بھی آ سکتے تھے اور کسی سے چھینی ہوئی کار میں بھی۔ شیر علی نے ان کو بتا دیا ہو گا کہ سکندر صاحب پٹرول پمپ سے ایک میل آگے اترے ہیں۔ مگر یہ بھی یقینی نہیں تھی۔ قریب آنے سے پہلے ہی کار نے پہلو تھوڑا سا بدل لیا اور اس کی ہیڈ لائٹس آف ہو گئیں۔ گیارھویں یا بارھویں تاریخ کا چاند درختوں سے اوپر ابھر چکا تھا اور اس کی روشنی راستہ دکھانے کے لیے کافی تھی۔ اب کار بالکل رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی پوزیشن بدلی اور بندر کی طرح شاخ پکڑ کر جھولتا ہوا درخت کے اس حصے پر پہنچ گیا جس سے میں کار کو دیکھ سکتا تھا۔ جہاں تنا ۔۔ پانچ فٹ اوپر جانے کے بعد میں خود کو تنے کے پیچھے گم کرنے میں کامیاب رہا۔

کار مجھ سے بیس پچیس گز کے فاصلے پر رکی تو میں نے اس میں سے یکے بعد دیگرے چار افراد کو اترتے دیکھا۔ انھوں نے اپنی اپنی ٹارچ روشن کی تو میری ساری خوش فہمی دور ہو گئی۔ یہ محسن اور غالب نہیں تھے۔ ہر ٹارچ کی روشنی کا دائرہ زمین پر تھا مگر اس اجالے میں بالکل بے مشکل ہوا تھا کہ میں نے گاڑی کو پہچان لیا۔ اس میں سے اترنے والی پانچویں سواری حاجی عبداللہ کی تھی۔ وہی اس گاڑی کو چلا کے لایا تھا اور اس کا بھاری بھرکم وجود کار کے دروازے سے پھنس کر نکلا تھا۔ باقی چار حکم کے غلام معلوم ہوتے تھے کہ دست بستہ کھڑے ہوئے تھے۔ ان سب کی صورت تو نظر نہیں آتی تھی لیکن وہ جوان اور چاق و چوبند لوگ تھے۔ ان کے جسم پر گہرے رنگ کی قمیص پتلون تھی۔ چاند کی دھندلی روشنی میں مجھے وہ سیاہ پوش لگے۔ صرف حاجی صاحب کی شلوار قمیص کا رنگ سفید تھا۔

حاجی عبداللہ کے ہاتھ میں اس وقت تسبیح نہیں اسٹین گن تھی اور اس جنگل میں اپنے چیلوں کے سامنے وہ ایک شیطان نظر آتا تھا۔ دنیا کے سامنے اس کے ظاہر اور باطن کا جو فرق میں نے دیکھا تھا وہ یہاں ختم ہو گیا تھا۔

"دیکھو۔ تم میں سے دو ایک ساتھ اس طرف جاؤ۔" حاجی صاحب نے بارعب لہجے میں کہا۔ "دو دوسری طرف سے۔"

"ابا جی۔ سب کو الگ الگ جانے دیں۔" ایک شخص نے کہا۔

"یہ ٹھیک کہتا ہے۔" دوسرے نے کہا۔ وہ غالباً حاجی صاحب کا بڑا برخوردار تھا کیونکہ اس کے لہجے میں بھی ویسی ہی رعونت تھی اور اس کے بولنے کا انداز بھی انھیں ابلیس اور ابلیس کی اولاد ثابت کرتا تھا۔

پھر حاجی صاحب نے اس کی تصدیق کر دی۔ "میرے باپ مت بنو۔ میں تمھارا باپ ہوں۔" اس نے برہمی سے کہا۔ "عقل کی بات بتا رہا ہوں تمھیں۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ والی بات بنتی ہے نا؟"

"اس کا مطلب تو ہوتا ہے اتحاد میں برکت ہے۔" بڑے احمق

نے کہا۔ "اور ہم سب کہتے ہیں کہ آپ ہمارے باپ نہیں ہیں۔" سب سے چھوٹا ہنسنے لگا۔

"بکواس مت۔ ایک آدمی جنگل میں ایسے غائب ہو جاتا ہے کہ پتا بھی نہیں چلتا۔ تم سب ایک ایک کر کے غائب ہو جاؤ گے اور سمجھے ہو گے کہ دوسرے سب محفوظ ہیں۔" حاجی صاحب نے گرج کے کہا۔ "تم میں سے ایک آگے چلے گا۔ دوسرا اس سے بیس قدم پیچھے سے اس کو دیکھے گا۔ آگے والا بھی مسلح ہے۔ ہر ایک کے پیچھے چلا جائے گا۔ اسے بھی برابر پیچھے نظر رکھنی ہو گی۔"

"آپ کو یقین ہے کہ یہی وہ جگہ ہے؟"

"تمہارے سامنے پٹرول پمپ والوں نے کیا کہا تھا؟" حاجی صاحب بولے۔ "وہ اسی علاقے میں ہے۔ بس ایک میل کے اندر اندر۔"

خوف کی سرسراہٹ مجھے اپنے جسم پر چیونٹیوں کی طرح محسوس ہونے لگی، جیسے میرے بدن پر چیونٹے رینگنے لگے ہوں۔ وہ مجھے تلاش کر رہے تھے اور میرے سامنے پھر وہی سوال تھا کہ انھیں میرے بارے میں اطلاع کس نے دی؟ میرا دل یہ اعتراف کرتے ہوئے انجام کے خیال سے کانپنے لگا کہ حاجی صاحب کو یہ بات صرف شیر علی ہی بتا سکتا تھا اور اگر شیر علی بھی دوست کے بھیس میں دشمن تھا تو پھر باقی سب کا بھی اللہ ہی حافظ ہے۔

"ایک دوسرے کو اور مجھے خبردار رکھنا۔" حاجی صاحب نے کہا۔

"بس ابا جی!" چھوٹے برخوردار نے ایک تیز سیٹی بجائی جو دونوں انگلیاں منہ میں ڈال کے ہم بھی بجاتے تھے۔ "یہ ہے ہمارا سگنل۔ اپنے کانوں کے دروازے کھلے رکھیے۔"

"تم دوبارہ سیٹی بجاؤ گے۔ اتنی لمبی نہیں۔" حاجی صاحب بولے۔

"مجھے سب پتا ہے ابا جی۔" بڑے لڑکے نے جھلا کے کہا۔

"اچھا شیرو اور ڈبو کو نکالو۔" حاجی صاحب نے حکم دیا۔

باقی دو آدمی جو اب تک چپ رہے تھے گاڑی کی طرف بڑھے۔ ڈگی کھولی اور کوئی چیز اٹھا کے باہر کر دی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ان شکاری کتوں کو دیکھا جو بالکل چپ کھڑے ہوئے تھے۔ ڈبو اور شیرو کے نام سے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کتے لے کر آئے ہیں۔ مگر ایسے کتے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے جو حلق سے آواز نہ نکالتے ہوں۔ عموماً شکاری کتے خونخوار جبڑے کھولے اور حلق سے زبانیں نکالے ہوئے ہانپتے ہیں مگر کھڑے ہوئے بھی وہ بالکل چپ نہیں رہتے۔

"آپ اپنا خیال رکھیں۔" چھوٹے لڑکے نے ایک کتے کی رسی تھام کر کہا۔ "یہ نہ ہو کہ وہ پیرا شوٹ سے آپ کے اوپر اتر جائے اور آپ دائیں بائیں دیکھتے رہ جائیں۔"

"چلو اب دفع ہو جاؤ۔" حاجی صاحب نے گرم ہو کے کہا۔

"بس صرف ہم دفع ہو جاتے ہیں۔" چھوٹے والے نے کتے کو تھپکی دی اور ایک شخص کو روانگی کا سگنل دیا۔ کتے نے زمین کے ساتھ تھوتھنی لگا کے چلنا شروع کیا۔ وہ ایک منہ زور کتا تھا جو رسی تھامنے والے کو اپنی مرضی کے مطابق کھینچ کر لے جا رہا تھا۔ حاجی صاحب کے دونوں لڑکے ایک ایک کتے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ انھوں نے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ٹارچ بجھا دی تھی۔ ان کے پیچھے چلنے والے دوسرے شخص نے حاجی صاحب کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنا فاصلہ برقرار رکھا تھا لیکن وہ وقفے وقفے سے ٹارچ روشن کرتا تھا اور بجھا دیتا تھا۔ غالباً یہ آگے جانے والے کے لیے ایک اشارہ تھا کہ پیچھے سب خیریت ہے اور پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں نے سینے میں رک جانے والے سانس کو خارج کیا۔ نہ جانے کس وقت میرے ہاتھ نے ریوالور نکال لیا تھا۔ اگر وہ اس درخت کے نیچے پہنچ جاتے تو میں بلا توقف ان سب کتوں کو شوٹ کر دیتا۔ میں بہت محفوظ مقام پر پہنچ چکا تھا۔ خطرہ صرف حاجی صاحب کی طرف سے تھا جو میری رینج سے باہر تھے لیکن وہ اندازے سے بھی اسٹین گن کا برسٹ مار دیتے تو میں مر کے نیچے گرتا لیکن اب مجھے اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ وہ کسی اور کو تلاش کر رہے تھے۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ شیر علی سے منسوب خدشے غلط ثابت ہوئے۔ اگر وہ بھی دوست نما دشمن ہوتا تو پھر اعتبار کا لفظ ہی بے معنی ہو جاتا۔

دو تین منٹ کے بعد میں نے ایک سیٹی سنی۔ اس کے جواب میں دو سیٹیاں سنائی دیں۔ میں نے حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ ایک کھلی جگہ پر اسٹین گن دونوں ہاتھوں میں تھامے بڑے مستعد نظر آ رہے تھے اور ان کی نظریں چاروں طرف مسلسل گردش کر رہی تھیں۔ میں نے ریوالور سے ان کے سر کا نشانہ لیا۔ بیس پچیس گز کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ مجھے اپنے نشانے پر بھی بھروسا تھا لیکن حاجی صاحب کا سر متحرک تھا اور روشنی کم تھی۔ نشانہ خطا نہ ہوتا تب بھی فائر کی آواز پر چار مسلح افراد کا دوڑتے ہوئے آنا یقینی تھا۔ پھر وہ مجھے چاروں طرف سے گھیر سکتے تھے۔ اگر میں حاجی صاحب کو مار کے ان کی اسٹین گن پر قابض ہو جاتا تو ان چاروں کو بھی لپیٹ سکتا تھا مگر پہلی بات تو رسک لینے کی تھی۔ درخت کی اتنی بلندی سے نشانہ خطا ہونے یا نہ ہونے کے چانس ففٹی ففٹی تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ان سب کو مار کے مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہوتا۔ ابھی تو میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس وقت وہ جنگل میں مجھے شکار کرنے نہیں آئے تھے تو ان کا شکار کون تھا۔

درخت پر چڑھنے کے مقابلے میں درخت سے اترنا بہت آسان کام تھا۔ اگر مجھے ایک منٹ کی مہلت بھی ملتی تو میں شاخ سے جھول کے زمین پر اس طرح قدم جما دیتا کہ اس نام کے حاجی کو آہٹ تک محسوس نہ ہوتی لیکن وہ بہت چوکنا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی پشت سڑک کی جانب تھی۔

www.paksociety.com

وہ مطمئن تھا کہ اس طرف سے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ میری طرف اس کا چہرہ تھا۔ وہ خفیف سی حرکت کو بھی دیکھ سکتا تھا کیونکہ جنگل میں کسی درخت کا ایک پتا بھی نہیں ہل رہا تھا۔ اس کے کان بھی بہت تیز تھے۔ کسی درخت پر اپنے آشیانے میں کوئی پرندہ بھی پھڑپھڑاتا تھا تو وہ فوراً ادھر متوجہ ہو جاتا تھا۔ اس عمر میں حاجی صاحب کی بصارت اور سماعت کی قوت بہت سے نوجوانوں سے بہتر تھی۔

میں دم سادھے بیٹھا ہوا خدا کے حضور بہت سی فضول خواہشات کو دعا بنا کے ارسال کر چکا تھا۔ مثلاً یہ کہ اے خدا۔ اس وقت مجھے چھینک نہ آئے۔ سنا ہے کہ موت، عشق اور چھینک کا کوئی وقت مقرر نہیں اور یہ کہ مجھے سانپ بچھو نہ کاٹیں۔ کوئی چیونٹی میرے جسم کے علاوہ پتلون میں داخل ... ایسی جگہ کاٹے کہ میں بلبلا اٹھوں۔ کچھ دعائیں غیر اخلاقی بھی تھیں۔ یہ بھی نہیں مثلاً یہ کہ اچانک اس کو حاجی کی جانے والی زندگی کی آخری سانس لینی ہو فرشتہ اجل کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ وہ ایسی بے قیمت روح قبض کرنے پہنچتا ہے۔ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی۔ حاجی صاحب نہ عمر رسیدگی کے عارضہ کے لیے بہت موزوں ہے۔ یہ نہیں تو اسے پیشاب کی حاجت ہی محسوس ہو کہ وہ چند منٹ کے لیے مشین گن رکھ کے اور انگریزی محاورے کے مطابق پانی بنانے جائے۔

مگر ایسی دعائیں نہ دل سے نکلتی ہیں اور نہ اثر رکھتی ہیں۔ حاجی ایک خونی کے چالاک چیتے کی طرح وہیں موجود رہا۔ جنگل میں سے اس کے لواحقین کی سیٹیاں سنائی دیتی رہیں۔ جو اپنے ملازمین کے ہمراہ ایک محدود علاقے کو چھان رہے تھے۔ ادھر میری گھڑی میں ساڑھے نو بج گئے تھے اور میرے اندازے کے مطابق اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اس ٹرک کو آنا تھا۔ ٹرک رات کے بارہ بجے کے بعد بھی آ سکتا تھا لیکن گیارہ بجے تک میرا آنز بردلیشن پوسٹ ... خال بینا ضروری تھا۔

درمیان میں یہ نئی صورت حالات سامنے آ گئی تھی اور میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ عبداللہ اینڈ سنز کی واپسی کتنی دیر میں ہو گی۔ وہ ساری رات بھی شکار کھیل سکتے تھے۔ سیٹیوں کی آوازیں بہت دور سے آنے لگیں اور پھر معدوم ہو گئیں۔ شکاری اور ان کے ساتھی اتنی دور نکل گئے تھے کہ ان کے سگنل اب حاجی صاحب کو موصول نہیں ہو رہے تھے۔ حاجی بڑی بے قراری سے جنگل کی طرف دیکھ رہا تھا اور پارے کی طرح مضطرب تھا۔ آدھے گھنٹے بعد اچانک ایک فائر ہوا تو میں بھی اچھل پڑا۔ جنگل کا سکوت میرے اعصاب پر سوار تھا لیکن میں بہت نزدیک ہونے والے دھماکے کا اثر زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہوا۔

"کون ہے؟" حاجی نے چلا کے کہا اور ... سٹین گن کو لیوں سامنے کر لیا جیسے درختوں کی اوٹ سے دشمن کی فوج کا مسلح دستہ نمودار ہونے والا ہو۔ جواب میں دوسرا فائر ہوا اور حاجی نے خود کو گاڑی کی اوٹ میں کر لیا۔ میں نے کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ وہ شاخوں اور جھاڑیوں کی سرسراہٹ کے درمیان بھاگتا ہوا ادھر ہی آ رہا تھا اور وہ اچانک سامنے آ گیا۔

"خبردار!" حاجی صاحب نے چلا کے کہا۔ "رک جاؤ ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔ میرے پاس سٹین گن ہے۔"

وہ دوڑتے دوڑتے اسی پیڑ کے پیچھے چھپا جس پر میں سوار تھا۔ پیچھے سے ایک اور گولی آئی اور وہ درخت پر چڑھنے کی کوشش کے پہلے مرحلے میں ہی ناکام ہو کے نیچے گرا۔ اس کا جسم دو تین جھٹکے کھانے کے بعد ساکت ہو گیا۔ پندرہ فٹ اوپر سے میں مرنے والے کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ وہ کوئی دبلا پتلا سیاہ فام جنگلی تھا جس نے دھوتی کی طرح بنیان پہن رکھی تھی۔ وہ جنگل کی پیداوار تھا۔ ننگے پاؤں بھاگ کر ہوا ... وہ گولی کی رفتار سے نہیں جیت سکا تھا۔ ورنہ چند سیکنڈ میں وہ بھی اس درخت پر آ جاتا جہاں میں پہلے سے پناہ گزین تھا۔

قاتل اس کے پیچھے تھا اور جنگلی کے گرتے ہی وہ بھی سامنے آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرے ہاتھ میں گلے کے پٹے سے بندھی ہوئی ڈوری کا سرا۔ یہ حاجی کا کوئی بیٹا تھا۔ اس کے ساتھ چلنے والا دوسرا شخص خود کو گھسیٹتا ہوا نمودار ہوا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی ... گر کے منہ کے بل گرا اور پھر آگے رینگنے لگا۔

حاجی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا آگے آیا۔ "یہ تو ملنگ ہے؟"

"ہاں۔ غالباً ..."

"غالباً کے بچے۔ یہ تم نے کیا کیا؟" حاجی صاحب گرجے۔

"جو اس نے کیا وہ بھی تو دیکھیں ابا جی۔ پہلے اس نے گولی چلائی تھی۔ کیا یہ اندھا ہو گیا تھا؟" یہ حاجی کا بڑا لڑکا تھا۔

"اور تم اندھے نہیں تھے؟ تم دیکھ سکتے تھے کہ یہ بابا ملنگ ہے۔"

"اس کی گولی مجھے بھی لگ سکتی تھی۔"

"لگی تو نہیں تھی۔" حاجی صاحب نے برہمی سے کہا۔ "چلو اب اٹھاؤ۔ پھر سے دوسرے بھی واپس آنے والے ہوں گے۔ قاتل ... پھر بھی ہوں گے کہ بڑے بھائی نے شکار مار لیا۔"

میں ان کی گفتگو سننے کے ساتھ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ دونوں شخص کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہے جو جنگلی کی گولی سے شدید زخمی اور مرنے کے قریب نظر آتا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ ورنہ وہ مر جائے گا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے سوا کسی کے کانوں تک اس کی آواز پہنچ ہی نہیں رہی ہے۔ اس نے خدا کو خدا رسول کا واسطہ دیا مگر باپ بیٹے کو اپنے ہی ایک آدمی کے خون کی بنا پر سارے جانے کا صدمہ زیادہ تھا۔ ملنگ جی کے بارے میں اس کے سوا میں کیا فرض کرتا کہ وہ درمیان کی کوئی چھوٹی سی کڑی تھا۔ نہیں ہو سکتا تھا کہ ملنگ جی اس ویران جنگل میں کیوں چھپا ہوا تھا۔ ایک بات اور نوٹ کی۔ ستم کا منہ بند رکھنے کے لیے اس کی ... کوئی خول چڑھا دیا گیا تھا یا زبان پلٹی گئی تھی۔ اس طرح ... سوچنے کے لیے استعمال کر سکتا تھا مگر اپنی مرضی سے بول نہ سکتا تھا۔

جرم کے لیے چلانے والا ابھی کراہتے کراہتے خاموش ہو گیا۔ کسی نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں کہ وہ بے ہوش ہوا تھا یا مر گیا تھا۔ جنگل کی طرف سے ... ایک سیٹی سنائی دی۔ اسے جوابی سگنل دیا گیا اور وہ اپنی جھوٹی کے پاس چلے آئے۔ تمام وقت میں کچھ کرنے یا نہ کرنے کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ تجسس بھی میری راہ میں حائل تھا۔ میں نے بہت کچھ سن لیا تھا اور دیکھ لیا تھا لیکن اصل بات کا ابھی تک پتا نہیں چلا تھا۔ اس وقت جب باپ بیٹا درخت کے نیچے کھڑے ہوئے تھے، میں دونوں کو ایک ہی جست میں سمیٹ سکتا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے میں دونوں کے سر بھی توڑ سکتا تھا۔ باقی پیر بھی اور گردن بھی۔ مجھے ان کی سفاکانہ بے حسی پر اتنا ہی غصہ آیا تھا جتنا مرتے ہوئے شخص کی حالت پر رحم۔ لیکن میں نے خود کو سمجھا لیا تھا کہ یہ جنگ ہے۔ مجھے صرف اپنی ذات کے تحفظ کی فکر کرنی چاہیے۔

دوسرا شکاری دس منٹ بعد لوٹا تو اکیلا نہیں تھا۔ اس کے آگے آگے ایک عجیب حلیے کا شخص چل رہا تھا۔ اس نے شوخ رنگ کے پھولوں والی دھوتی پہن کر دھاریوں والا کرتا پہن رکھا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھا اور اس کا سر بال ہی میں استرے سے صاف کیا گیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کلائی کے برابر موٹا ڈنڈا تھا اور دوسرے ہاتھ میں کشکول۔ اسے گھیر کر لانے والے چار قدم کے فرق سے اس کے پیچھے دائیں بائیں چل رہے تھے۔

"لو ابا جی۔ آپ کے سوہنی آ گئے۔ اب آپ ان کی سادگی بتاؤ یا مزار شریف؟" چھوٹا لڑکا ذرا غیر سنجیدہ قسم کی گفتگو ضرور کرتا تھا مگر اپنے کام میں زیادہ ہوشیار تھا۔

حاجی نے بڑے بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کبھی تم بھی عقل میں جسے ہونے کا ثبوت دے دیا کرو نا۔"

"یہ پتا نہیں کس خوشی میں چلاتے جا رہے تھے۔" چھوٹے لڑکے نے کہا۔ پھر اس کی نگاہ نے دونوں لاشوں کو دیکھ لیا۔ "میرا خیال ہے کہ میں نے تین فائر سنے تھے۔ تیسری لاش کہاں ہے۔ یا انہیں ان کی ڈیڑھ گولی ماری گئی ہے۔"

مگر حاجی اس کی نہیں سن رہا تھا۔ وہ اس ملنگ کی طرف متوجہ تھا جس کو بابا کا ملنگ پر بادشاہ گل کے قتل کا الزام تھوپ دیا گیا تھا۔

"اس کے پاس سے کچھ ملا؟" حاجی نے کہا۔

"آپ کے مطلب کی تو یہی دو چیزیں ہیں۔" چھوٹے لڑکے نے کہا اور اپنی دو جیبوں سے دو ریوالور نکال کے باپ کے قدموں میں ڈال دیے۔ "باقی کچھ تصویریں تھیں۔"

"کیسی تصویریں؟" حاجی نے کہا۔ "دکھاؤ مجھے۔"

"ابا جی۔ وہ صرف ہم جیسے بالغوں کے مطلب کی ہیں۔ آپ کیا کریں گے اس عمر میں دیکھ کر؟" وہ بولا۔

"بکواس مت کرو۔ ادھر لاؤ تصویریں۔"

"آپ کی مرضی۔" اس نے جیب سے دو تصویریں نکال کے باپ کو تھما دیں۔

"لاحول ولا قوۃ۔" حاجی نے تصویروں کو دیکھتے ہی کہا۔ "خبیث! کیوں جھوٹ بولتے ہو؟" اس نے تصویریں پھاڑ کے پھینک دیں۔ "پھر بتاؤ اس کی تلاشی لی تھی تم نے؟"

لڑکا ہنسا۔ "ابا جی! فقیر ملنگ لوگوں کی جیب میں اور کیا ہوگا؟"

"یہ دونوں ریوالور تم نے غائب کیے تھے؟" حاجی نے ملنگ سے پوچھا۔

"یہی سمجھ لو۔" ملنگ نے بڑی متانت سے کہا۔

حاجی کا مکا اس کے منہ پر پڑا۔ "سمجھ لو کے بچے سیدھی طرح بتاؤ کہ یہ تم نے کس سے لیے تھے۔ خریدے تھے؟"

"یہ جان کے تم کیا کرو گے۔ تمہارا مال تمہیں مل گیا۔"

حاجی نے اس پر سٹین گن کا بٹ مارا۔ "اگر ریوالور تمہیں کسی نے بیچے تھے تو مجھے بیچنے والے کا نام بتا دو۔ میں تم کو چھوڑ دوں گا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اس لیے میں بھی سچ نہیں بول سکتا۔"

"رانا شمشاد علی! تم نے خود بھی لوگوں سے سچ اگلوایا ہوگا۔ تمہاری تیس سال کی نوکری کا ریکارڈ میں جانتا ہوں۔" حاجی نے کہا۔ "خفیہ پولیس میں تمہیں اچھی کارکردگی کی بنا پر بھیجا گیا تھا۔ مگر تمہارے اپنے محکمے کے لوگوں نے مجھے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ تم کس چکر میں ہو اور تب سے میرے آدمی تم پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تم نے حکام بالا کو جو رپورٹ بھیجی وہ غلط ثابت ہوئی۔ چار مرتبہ چھاپا مارنے والوں کو کچھ نہیں ملا۔ ہم نے جان بوجھ کے تمہیں گمراہ کیا تھا تاکہ تم دوسروں کو گمراہ کرو۔ اب تھانے کے ایک افسر نے تمہاری کارکردگی کو سخت مایوس کن اور ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ آئندہ تمہاری اطلاع کو اس وقت تک مصدقہ نہ سمجھا جائے جب تک دوسرے ذرائع سے بھی تصدیق نہ ہو جائے۔"

"اس بار میری رپورٹ غلط نہ ہوتی حاجی۔" رانا شمشاد علی نے کہا۔ "لیکن اس پر کارروائی نہیں ہوئی کیونکہ دوسرے ذریعے نے تمہاری دلاوری پر شدید شبہ ظاہر کیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ وہ دوسرا ذریعہ تمہارا زر خرید ہے۔" رانا نے بے خوفی سے کہا۔ "وہ بھی تمہاری طرح غدار ہے۔ تمہارا یہ دینداری اور پرہیزگاری کا سارا ڈھونگ ..."

حاجی کے بڑے لڑکے نے اس پر مکوں کی بارش کر دی۔ ساتھ ساتھ اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا بدبودار طوفان امڈ پڑا۔

"یہ ساری دنیا زر خرید ہے۔ سب پیسے کے غلام ہیں اور وہ سب بھی ڈھونگ رچاتے ہیں جو تیری طرح محب وطن بنتے ہیں۔"

رانا شمشاد علی گر گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا تھا۔

وہ اٹھا اور اپنے کرتے کی آستین سے منہ صاف کرنے لگا۔ "آج نہیں تو کل۔ بہت جلد تم کو اندازہ ہو جاتا کہ تمھاری آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ تم سچ دیکھ ہی نہیں سکتے حاجی۔ ورنہ تم دیکھتے کہ غدار اور وطن فروش آستین کے سانپ کے برابر بھی نہیں۔ اس مرتبہ میں نے ثبوت بھی حاصل کر لیا تھا تمھارے خلاف۔ پکا ثبوت۔"

"یہ ریوالور" حاجی نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ تم اپنے کسی فرض شناس افسر کی خدمت میں پیش کرتے اور کہتے کہ دیکھیے جناب یہ کہاں سے برآمد ہوئے ہیں۔ یہ مہلت حاصل کرنے کے لیے تم نے ڈرائیور بادشاہ گل کو مار ڈالا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میرے ہاتھوں ایک بے گناہ کا خون ہوا۔" رانا نے کہا۔ "وہ تو خود بھی بے خبر تھا کہ اس کے ٹرک میں کیا چھپا ہوا اسلحہ ہے۔"

"تم نے اس کی بے گناہی کا کیسے یقین کر لیا؟"

"آدمی مرتے وقت سچ ضرور بولتا ہے۔" رانا شمشاد علی نے کہا۔ "جب میں نے وہ زہر پلا کر اس کے دل میں اتار دیا تھا تو وہ بہت حیران ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا دشمن کوئی نہیں ہے اور اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ جب میں نے اسے بتایا۔ تو اس نے کلمہ پڑھ کے کہا کہ بھلا اللہ تم کو معاف کرے میں غدار تھا نہ غداروں کے ساتھ تھا۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں خود یہ ٹرک لے کر حاجی عبداللہ اینڈ سنز کے دفتر میں گھس جاتا اور ان سب کو ایک دھماکے میں نیست و نابود کر دیتا۔"

"تم نے صرف ٹرک کو روکے رکھنے کے لیے بادشاہ گل کو مارا تھا مگر رانا شمشاد علی! تم نے صرف چوبیس گھنٹے کی دیر کرا دی۔ ٹرک آج رات بارہ بجے روانہ ہو جائے گا۔ ٹرک کل بھی گزر سکتا تھا اور اس کے بعد بھی۔ تم سے پہلے بھی ایک احمق ایسی ہی فرض شناسی کے چکر میں اپنی جان دے چکا تھا۔ پھر تم نے یہ بے وقوفی کیوں کی؟ میں نے تو بہت اچھی آفر دی تھی تمھیں۔ تم نے ان سب کی کوٹھیاں اور ان کے ٹھاٹھ باٹھ بھی دیکھے ہوں گے جو میرے لیے کام کرتے ہیں۔ حاصل نہیں ہوئے۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور تمھارے جیسے پیروں پر" شمشاد علی نے حاجی کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ جانتا تھا کہ حاجی اور اس کے شکاری بیٹے اب اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اگر وہ اب ان سے تعاون کرنے کا وعدہ کر کے جان بچانے کی کوشش کرتا تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ چنانچہ مرنے سے پہلے اس نے کسی بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا اور شاید حاجی کے منہ پر تھوکنا اس کی آخری آرزو تھی جو پوری ہوئی۔ اس کے فوراً بعد حاجی کے بڑے بیٹے نے اپنا ریوالور اٹھایا اور رانا شمشاد علی کے سر پر رکھ کے گولی چلا دی۔ رانا زمین پر گرا اور اس کا جسم گرتے ہی ساکت ہو گیا۔ قدرت نے اس شہید کے لیے نزع کے عذاب کو انتہائی مختصر کیا

"یہ تمھیں کہاں ملا تھا؟" حاجی نے کہا۔

"وہیں۔ اپنے ٹھکانے پر۔ ڈیلو مجھے سیدھا اس کے گھر لے گیا۔"

"کسی نے دیکھا تو نہیں تمھیں؟"

"مجھے کون دیکھ سکتا تھا۔" وہ بولا۔ "گاؤں میں سب گھروں میں تھے اور اس کا گھر تو باہر ہی ہے۔"

"گھر میں اور کوئی نہیں تھا؟"

"ایک تو اس کی ماں تھی۔ میرا خیال ہے کہ اسے رات کے وقت کچھ نظر نہیں آتا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر اٹھ بیٹھی تھی۔ کہنے لگی۔ رانا! کیا تو جا رہا ہے اور میں اسے جواب دیے بغیر اندر چلا گیا۔ اس کی موٹر سائیکل بھی وہیں کھڑی ہوئی تھی۔"

"خبیث۔ صبح ہوتے ہی یہ نکل جاتا۔" حاجی نے لاش کو ٹھوکر مار کے کہا۔

"یہ اپنی محبوبہ سے ملنے نکلا تھا۔" حاجی کے چھوٹے لڑکے نے قہقہہ مار کے کہا۔ "کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے باہر جھانکا تو یہ دونوں نظر آ گئے۔ پھر میں بھی کھڑکی سے نکل گیا۔ یہ دونوں بہت اونچے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھے تھے۔ سر جوڑے۔ میں نے کھنکار کر اونچی آواز میں کہا کہ کون ہے بھئی۔ اور لڑکی ایک دم اٹھ کے بھاگی تو اس نے قابو کر لی۔" اس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ "میں نے اس کے سینے پر ریوالور رکھ دیا کہ لڑکی کی زندگی چاہتے ہو تو چپ چاپ چلو۔ یہ چل پڑا۔"

"اور تم نے اسے چھوڑ دیا۔ جو چشم دید گواہ تھی۔" بڑے بھائی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم ہوتے تو شاید اسی شرافت کا مظاہرہ کرتے۔ میں شریف آدمی نہیں ہوں۔"

"مار دیا تم نے اسے۔" حاجی نے کہا۔

"ہاں ابا جی۔" وہ ایک حسرت بھری ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "مارتا نہ تو کیا کرتا۔ لڑکی اچھی تھی۔ مگر وقت برا تھا اور قسمت خراب تھی میری کہ اکیلا نہیں تھا۔ وہ کتے میرے ساتھ سائے کی طرح لگے ہوئے تھے۔"

"پھر بتایا اس نے کہ اس نے کسی کو اطلاع تو نہیں دی تھی۔" حاجی بولا۔ "گھر میں کوئی ٹرانسمیٹر وغیرہ تو نہیں تھا۔"

"نہیں ابا جی۔" بڑے لڑکے نے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ مکرجی کو پیچھے لگا رکھا تھا۔"

"تو مکرجی نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔ مگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ ضرور بتاتا۔ اور رانا کو کہاں معلوم تھا کہ وہ ہماری نظر میں ہے۔ وہ بالکل مطمئن تھا کہ اس کو جیسے بھی ہو کسی نے شناخت نہیں کیا۔ صبح یہ موٹر سائیکل پر نکل جاتا اور اپنے افسر اعلیٰ کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کر دیتا۔ ٹرانسمیٹر بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا اس کے پاس۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اب واپس چلو۔" حاجی نے کہا۔

"ان کو بھی لے جانا ہے؟"

"صرف مکرجی کو۔ رانا صاحب کو ان کے وارث لے جائیں گے۔" حاجی نے طنز اور تمسخر کے ساتھ کہا۔

انھوں نے دونوں کتوں کو اسی طرح کار کی ڈکی میں ڈال دیا لیکن ان کے منہ کھول دیے۔ وہ ایک دم غرانے اور دھاڑنے لگے۔ میں نے یہ نوٹ کیا تھا کہ وہ حد سے زیادہ مضطرب ہیں۔ جب ان کا منہ بندھا ہوا تھا تب بھی وہ اپنی وحشیانہ قوت کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر آزاد ہوتے ہی ان کی وحشت میں جنون کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ یہ کچھ حیوانی جبلت کا قصور تھا۔ آدمی کے ہاتھ بھی اگر پیچھے باندھ دیے جائیں اور اسے دوڑنے کو کہا جائے تو وہ جسم کی پوری قوت کے ساتھ نہیں دوڑ سکتا لیکن ہاتھ آزاد ہوں تو وہ بہت تیز جاتا ہے۔ ہاتھوں کا رفتار سے کوئی تعلق ہونا تو نہیں چاہیے کیونکہ دوڑتا آدمی ٹانگوں سے ہے لیکن بندھے ہاتھوں کے ساتھ اس کے پورے جسم کی توانائی جیسے محدود ہو جاتی ہے۔ وہی کتے جو پہلے زیادہ خطرناک محسوس نہیں ہوتے تھے اب خون آشام درندوں کی طرح چنگھاڑ رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ سابقہ تجربے کی بنا پر وہ جانتے تھے کہ اب ان کو انعام ملے گا۔

"صبر کر یار۔" حاجی کے چھوٹے لڑکے نے کہا۔ "مالک تم بڑے بے صبرے ہو۔"

حاجی کے ایک ملازم نے مکرجی کی لاش اٹھائی۔ "اسے پاگل ہو گیا ہے کیا۔ کپڑوں سمیت ڈال رہا ہے۔"

ملازم چند سیکنڈ ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے تعمیل حکم کی اور مکرجی کی لاش کے کپڑے اتار کے ڈکی میں پھینک دیے۔ پھر وہ لاش اٹھا کے کار کی جانب بڑھا۔ کتوں نے ایک شور برپا کر دیا۔ میرا دل لرزنے لگا۔ غصے کی ایک پاگل کر دینے والی لہر کے سامنے میں ڈوبنے لگا۔ میں نے سوچا کہ مصلحت کے تقاضے اور حالات کی ضرورت سب کو بھول جاؤں اور انجام کی پروا کیے بغیر اس شکاری ٹولے پر ٹوٹ پڑوں جو انسانوں کا شکار کرتے تھے اور اس شکار پر اپنے کتے پالتے تھے۔ انھوں نے کتوں کو آدم خور بنا دیا تھا اور وہ بے قیمت مل جانے والے انسانی گوشت سے ان کا پیٹ بھرنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔

لاش کے ڈکی میں گرتے ہی کتے یوں غرائے کہ میرا سارا وجود سن ہو گیا۔ مجھے ایک انسان ہونے پر شرم آئی اور اپنی بزدلی، بے بسی اور کمزوری پر شرم آئی۔ اس وقت مجھے افسوس ہوا کہ جب وہ میں پیچھے تھے تو میں نے انھیں کیوں چھوڑ دیا۔ اب وہ اتنے فاصلے پر تھے کہ میں بجلی کی رفتار سے حملہ کرتا تب بھی انھیں پلٹ کر پوزیشن لینے کی مہلت مل جاتی۔ پھر وہ میری لاش کو بھی ان کتوں کے سامنے ڈال دیتے جو اس وقت میرے ہی جیسے گوشت پوست کے بنے ہوئے ایک انسان کو اپنے بے رحم پنجوں اور سفاک دانتوں سے بھنبھوڑ رہے تھے۔ اس کا گوشت ادھیڑ رہے تھے اور ہڈیاں چبا رہے تھے۔ یہ ایک ناقابل برداشت عذاب تھا اور وہ وقت ناقابل فراموش تھا جب میں نے انسانیت کی اس تذلیل کو دیکھا اور کچھ نہ کر سکا۔ مکرجی میں اور مجھ میں صرف ایک فرق یہ تھا کہ وہ ہندو تھا اور میں مسلمان۔ وہ غدار تھا اور میں وطن کی مٹی سے جسم و جان کے رشتے کو مقدس سمجھنے والا سپاہی۔ لیکن اس کے باوجود مکرجی انسان تھا اور کوئی مذہب، کوئی معاشرہ، کوئی قانون اور کوئی ضابطۂ اخلاق کسی دوسرے انسان کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ انسانوں کو حیوانوں کا راتب بنائے۔

مگر یہاں ایک شخص جو دنیا کو دھوکا دینے کے لیے خود کو حاجی کہتا تھا، وہ سب کچھ کر رہا تھا جو شاید انسانی کھوپڑیوں کے میناروں کی بلندی سے اپنی طاقت کے غرور میں مبتلا ہونے والے ہلاکو خان جیسے ظالموں نے بھی نہ کیا ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت ان سب کو شوٹ کر دینے کی خواہش پر میں نے کیسے قابو پایا اور کیوں قابو پایا لیکن خود کو یہ سمجھاتا رہا کہ میرے پیش نظر عظیم تر مقصد ہے اور مجھے صرف اپنی جنگ لڑنی ہے اور اگر میں اپنی محبت کی ترجیحات کو دیکھوں تو سب سے پہلے میری اپنے وطن سے محبت اہم ہے، پھر اللہ کی محبت ہے۔ اس کے بعد جذباتی رشتوں کی اور پھر انسانیت کی اور اخلاقی بنیادوں کی محبت ہے۔ مکرجی دشمن تھا اور اب دشمن ہی کے ہاتھوں اپنے منطقی انجام کو پہنچا تو مجھے اس کی خاطر جذبات میں اندھا ہو کے اپنا نقصان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ سب جنگل کے شکاری ہیں جو جنگل کے قانون کے مطابق لڑ رہے ہیں اور درحقیقت حیوان ہی ہیں۔

جب گاڑی چلی گئی تو میں اپنے آپ سے شرمسار نیچے اترا۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ آدمی کے ضمیر کو مطمئن رکھنے والے دلائل بھی تاثیر کھو دیتے ہیں اور عقلی جواز کو دل اسی طرح قبول کرتا ہے جیسے ایک بزدل بچہ انجکشن کی سوئی کو برداشت کرتا ہے۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر جا بجا لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ رانا شمشاد علی کی جو شاید مجھے نہیں جانتا تھا مگر میں نے اسے دیکھا تو جان لیا کہ وہ بھی ہمارا ساتھی تھا۔ ایم آئی کے نام سے بھی ناواقف ہونے کے باوجود وہ ایم آئی میں شامل ہو جانے کا حلیف تھا اور اسی کی طرح اس شان سے شہید ہوا تھا کہ جان گئی مگر آن نہ گئی۔ اس سے کچھ دور حاجی کا ایک ملازم بھی پڑا تھا۔ میں نے اس کی جامہ تلاشی لی لیکن اس کے پاس سے کچھ بھی نہیں ملا۔

رانا شمشاد علی کے پاس بھی ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے اس کی شناخت ممکن ہوتی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ حاجی کے کہنے کے مطابق اس ٹرک کو رات بارہ بجے اس طرف سے گزرنا تھا۔ میرے پاس کم سے کم ایک گھنٹا اور تھا۔ میں نے سوچا کہ رانا شمشاد علی کے گاؤں تک جا کے کسی کو بتا آؤں کہ اس بدنصیب نوجوان کی لاش کہاں پڑی ہوئی ہے اور اس کے قاتل کون ہیں۔ وہ گاؤں اس جگہ سے زیادہ دور نہیں ہو سکتا تھا۔ حاجی کے کہنے کے مطابق وہاں تک جا کے

ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں لوٹ آتے تھے۔ مجھے تھوڑا بہت اندازہ اس سمت کا بھی تھا جدھر وہ گئے تھے۔ میں درخت پر بیٹھا ہوا ان کی سیٹیوں کے سگنل سنتا رہا تھا۔ اس کے باوجود جب میں نے قدم بڑھانے تو میری ہمت جواب دے گئی۔ میرے پیچھے ایک ماں کی بے نور آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو دیکھنا ناممکن تھا۔ اس ناخوشگوار منظر لینے سے گریز اور منت نے کیا۔ صبح ہوگی تو رات کی ساری بے بسی کا راز فاش کر دے گی۔ زیادہ سے زیادہ وہ ماں صدمے سے مر جائے گی۔ موت اپنے خوابوں کی موت کے بعد زندہ رہنا کب چاہتی ہے۔ وہ ماں ہو یا محبوب۔ دونوں کے دل حسرت تعمیر پر دھڑکتے ہیں۔ ماں اپنی اولاد کو تخلیق سے تشکیل و تعمیر کے سارے مراحل سے گزار کے بھی اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے جدوجہد جاری رکھتی ہے۔ اس کے یہ خوبرو جوں کا سلسلہ دراز کرتی جاتی ہے۔ وہ آگے دیکھتی ہے جب اس کا لگایا ہوا پودا پھل دے گا اور بیٹوں کے بعد پوتے جوان ہوں گے۔ بہو عورت جو محبوبہ اور بیوی بن کے ماں بننے کے عظیم رتبے پر فائز ہوتی ہے اپنی خوابوں کو وقت کے آگے کارواں میں شامل کر دیتی ہے اور خود بھی شریک سفر ہو جاتی ہے۔

اس وقفے میں جب میرا ذہن انتشار کے بدترین عذاب سے دوچار تھا، میں نے منکر حق کے بارے میں بھی سوچا کہ اس کے وجود کا کتنا حصہ کیڑوں کے پیٹ میں پہنچے گا اور مقتول بن کے مٹی میں ملے گا اور کتنا بچا ہوا جسم کتے بھیڑیے کھا سکیں گے۔ بالآخر سب مٹی میں ملے گا مگر کتنا بے آبرو ہو کے۔ کیا منکر حق نے کبھی ایسا سوچا ہوگا۔ کیا رانا مشتاد علی نے اس وقت جب وہ اپنی محبوبہ کے کندھے پر سر رکھے اس کی خوشبو سے زلف اور اس کے بدن کی ساحرانہ مہک میں کھویا ہوا تھا، یہ سوچا ہوگا کہ اس ساعت نایاب کے بعد کا لمحہ اجل کی خونی آشنائی کا ہوگا۔ پھر میں کیا سوچ رہا ہوں اور کیوں سوچ رہا ہوں۔ را بطہ مکمل رہائی کی راہ تو بہت لمبی ہے۔ دلوں میں مقتول اور سالوں کے زمانے بھی مختصر ہوتے ہیں۔ درمیان میں ... حائل ہو جائے تو انتظار جاری رہتا ہے۔ لا انتہا تک۔ یوم حشر ... صاف ظاہر تھا کہ میں ایک انسانیت سوز منظر کا تماشائی ... سے قنوطیت کے دورے میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں نے اس جگہ ... جانا بہتر سمجھا۔ جاتے جاتے میں نے رانا مشتاد علی کے سامنے ... ایک دن میں اس حاجی کہلانے والے شیطان سے اور ... جسم گناہ اولاد سے ان سب کا حساب ضرور لوں گا جو ان کے ناپاک ... کی سفلی قوت کا شکار ہوئے اور اگر ممکن ہوا تو انھیں ہی سزا بھی ... ضابطہ اخلاق کے مطابق دوں گا۔ اگر اس کے لیے مجھے کتنا بھی گرنا پڑا ہو۔ انتقام اور اشتعال کے جذبات سے مغلوب ہو کے انسانیت کی سطح سے نیچے جانا بھی چاہوں۔ تو شاید میں خود کو نہ بچا پاؤں۔ میرے مذہب میں تو ہر بھی دشوار اور ممنوع ہے ... اور ایذا دے کر مارنا۔ سڑک پر اب گاڑیوں کی آمد و رفت پہلے کے مقابلے میں بہت کم ہو گئی تھی۔ پانچ دس منٹ کے وقفے سے کوئی ٹرک یا بس لاہور سے ملتان یا ملتان سے لاہور جاتی نظر آتی تھی۔ لکڑی کا وہ لٹھا اب بھی پڑا ہوا تھا اس پر بیٹھ کے میں نے ایک سگریٹ جلائی اور شعلے کو چھپانے رکھنے کے لیے دونوں ہاتھوں کی پناہ فراہم کی۔ میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بھی ایک ہاتھ سامنے رکھا تاکہ سڑک پر سے گزرنے والا کوئی بھی اس چنگاری کی طرف متوجہ ہو۔ وقت کے تجربات سے حاصل ہونے والا سبق آہستہ آہستہ میرے دل کو سخت کر رہا تھا اور میں محسوس کرتا تھا کہ اب میری وہ حساس طبیعت نہیں رہی جو قتل اور خونریزی کے واقعات پڑھ کر یا سن کر ہی خراب ہونے لگتی تھی۔ منکر حق کے عبرتناک انجام اور رانا مشتاد علی کی افسوسناک موت کا اثر بھی کم ہونے لگا۔ میں پھر رابعہ کے بارے میں سوچنے لگا جس کی طلب اور تلاش نے مجھے یکلخت اپنا راستہ سب سے الگ کر لینے پر مجبور کر دیا تھا لیکن اس سے میری منزل کھوٹی ہوئی تھی۔ یہ تو کچھ ویسی ہی بات تھی کہ جو راہ ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کے جاتی ہے۔ میں بیک وقت دو مقاصد کے حصول کے لیے نکلا تھا اور دونوں غلط نہ تھے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر سے میرا یکطرفہ فیصلہ غلط ہو سکتا تھا مگر دوسروں کا معاملہ وہ نہیں تھا جو میرا اور رابعہ کا معاملہ تھا۔

پونے بارہ بجے کے بعد میں مستعد ہو گیا۔ میں نے ایک کام تو یہ کیا کہ اپنے حلیے میں تھوڑی سی ترمیم کر لی۔ مجھے شیر علی کی بات غلط نہیں لگی تھی کہ تین افراد کا ایک جیسا نظر آنا شکوک پیدا کر سکتا ہے۔ میں نے سر کے اوپر سے بالوں کی جھالر ہٹا دی اور صرف وہ جھلی رہنے دی جس سے میرا سر بالکل صاف گھٹا ہوا نظر آتا تھا۔ ایسا کرنا میں نے اس لیے بھی ضروری سمجھا کہ آگے چل کر میں کسی کی نظر میں آؤں تو غالب یا حسن گرفت میں نہ آئیں۔

پہلے چار ٹرک ایک ہی سمت سے آئے۔ ان سب کے ڈرائیوروں نے مجھے دیکھ کے سے رد عمل کا اظہار کیا۔ یعنی وہ کچھ ڈر سے گئے ... اور محتاط رہتے ہوئے انھوں نے گلینر سے کہا کہ درخت ہٹائے اور جاتے ہوئے نامعلوم شرپسند کو حسب توفیق گالیاں دے گئے۔ دو بسوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایک بس میں کوئی بہت بزدل یا بہت چیخنے والی بیٹھی ہوئی تھی کہ انھوں نے ڈاکوؤں کے اندیشے کا ذکر سنتے ہی رونا پیٹنا اور چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ رات کے سوا بارہ بجے تک وہ بھی جا چکے تھے۔

میں سڑک کے کنارے پلیا کے پیچھے دبکا بیٹھا رہتا تھا تاکہ ٹرک رکے تو سر اٹھا کے نمبر پلیٹ کو دیکھ سکوں۔ بالآخر میرا انتظار ختم ہو گیا اور میں نے اچانک اس ٹرک کو رکتے ہوئے دیکھا جس کا ڈرائیور بادشاہ گل تھا۔

"اوئے مردار" ڈرائیور نے غصے سے کہا "نیچے اتر کے دیکھ"۔ اس نے جملہ ایک بھاری بھرکم گالی پر ختم کیا۔

"کیوں۔ کیا ہے جی استاد جی؟" کلینر نے کہا۔ جو شاید سو رہا تھا۔ جب وہ سمجھ گیا کہ استاد نے کیا دیکھنے کو کہا ہے۔ وہ اسی طرف سے نیچے اترا۔ پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔

"او جی۔ استاد جی۔ یہ تو ڈاکو ہے"

"اوئے ڈرپوک۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ نزدیک آنے والے کو جہنم کے رکھ دوں گا" استاد نے کہا۔

چراس وقت جب کلینر درخت کا لٹھا اٹھا رہا تھا میں بے آواز مگر انتہائی پھرتی سے سڑک پر آیا اور اس سے پہلے کہ ڈرائیور میری طرف پلٹ کے دیکھتا، میں اس دروازے سے ٹرک میں بیٹھ چکا تھا جو کلینر نے اترنے کے بعد کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ڈرائیور نے اپنے ساتھی کو کھڑکی سے سر نکال رکھا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں واقعی مشین گن تھی مگر اس طرح کہ اگر کوئی سامنے آ جاتا تو وہ وہیں بیٹھ کے اسے نشانہ بنا سکتا تھا اور اگر سیدھے ہاتھ میں ریوالور ہوتا تو شاید وہ فائر کر دیتا۔ مگر مشین گن کو دونوں ہاتھوں میں تھامنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے یا تو وہ پیچھے ہٹتا اور مشین گن کو کھڑکی پر رکھ کے چلاتا یا پھر اسے نیچے اترنا پڑتا۔ بڑے ہتھیار نے اسے زیادہ بے بس کر دیا۔

"ہاتھ آہستہ آہستہ اندر کرو" میں نے دروازہ بند کر کے کہا۔ "مشین گن نیچے رکھو اور ٹرک آگے بڑھاؤ"

مریل سا کلینر لکڑی کا لٹھا پھینک کر بھاگا۔ میں نے ریوالور بائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اسی ہاتھ کو باہر نکال کے میں نے بڑی پھرتی سے ایک فائر کیا۔ کلینر اچھلا اور چیخ مار کے سڑک سے دور اس سمت میں بھاگ کھڑا ہوا جدھر دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ڈرائیور نے میری اس اصلاح کو اپنے فائدے اٹھانے میں دیر نہیں کی۔ وہ ایک گرم پر جھکا ہوا۔ مشین گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے وہی کچھ کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ایسا ہوگا۔ میں نے مشین گن کے وار کو ہاتھ پر روکا اور پھر جھٹکا دیا تو ڈرائیور کا سر دروازے کی سائیڈ سے لگا۔ مشین گن میرے ہاتھ میں آ گئی۔ ڈرائیور نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور کراہنے لگا۔

"اور اب گاڑی سٹارٹ کرو" میں نے کہا۔ "یہ ٹرک میں خود بھی چلا کے لے جا سکتا ہوں۔ تمھاری لاش کے اوپر سے"

"آخر کیا چاہتے ہو تم؟" ڈرائیور بولا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم ٹرک چلاؤ" میں نے کہا۔

"دیکھو۔ تمھیں پیسہ چاہیے۔ تو میرے پاس دس ہزار سے کچھ اوپر ہے" وہ پنڈی کے پوٹھوہاری لہجے میں پنجابی بول رہا تھا۔

"اتنی رقم میرے پاس بھی ہے" میں نے کہا "بلکہ اس کے علاوہ میرے پاس یہ مشین گن بھی ہے۔ ایک ریوالور بھی ہے لیکن فضول باتوں میں گنوانے کے لیے وقت نہیں ہے"

"تمھیں معلوم ہے یہ ٹرک کس کا ہے؟" صورت سے عادی مجرم نظر آنے والے ڈرائیور نے چالاکی سے کہتے ہوئے کہا۔

"بیڈفورڈ کمپنی کا" میں نے کہا "نیا ماڈل"

"یہ ٹرک حاجی کا ہے" ڈرائیور نے ٹرک کو گیئر میں ڈال کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس حاجی کا نام دوبارہ میرے سامنے مت لینا۔ مجھے دورہ پڑ جاتا ہے اور پھر میں بہت خطرناک ہو جاتا ہوں۔ پاگل کتے سے بھی زیادہ" میں نے کہا "تم یہ ساری باتیں مجھے نہ بتاؤ۔ میں تو اس حاجی کی اولاد گناہ کے نام بھی بتا سکتا ہوں۔ یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ اس ٹرک کو کل تک ایک باضمیر اور نیک ڈرائیور بادشاہ گل چلاتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ کہاں اور کیسے مارا گیا تھا"

"رانا مشتاد" ٹرک ڈرائیور اچانک بولا "تم بہت بے وقوف آدمی ہو۔ کس سے دشمنی کر بیٹھے ہو۔ اپنی اور بیوی بچوں کی جان کو داؤ پر لگا کے تمھیں کیا ملے گا۔ حاجی..."

"میں نے ڈرائیور کے منہ پر تھوک دیا" میں نے کہا "تم کو کہا تھا کہ اب یہ نام مت لینا۔ کمینے۔ تو لے پالک ہو"

"رانا" ڈرائیور نے چہرے کو آستین سے صاف کیا "اب بھی وقت ہے چھوڑ دو یہ دھندہ۔ وہ افسر جس نے تم کو پالنے پر چڑھایا تھا میں ڈی ایس پی جتوئی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ گیا۔ خیبر پولیس سے بھی اور پنجاب سے بھی"

"پنجاب سے تو ہم بھی جا رہے ہیں۔ سندھ کی طرف" میں نے کہا اور اس صورت حال سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ وہ میرے گنجے سر اور مشکوک چہرے کے باعث یہ سمجھ رہا تھا کہ میں رانا مشتاد علی ہوں جس نے حلیہ بدل رکھا ہے۔ تھوڑی سی تشویش مجھے کلینر کی طرف سے تھی جو فرار ہو گیا تھا۔ گولی غالباً اس کی ٹانگ میں لگی تھی کیونکہ وہ لنگڑا کر بھاگ رہا تھا۔ وہ ابھی تو بدحواسی میں منہ اٹھا کے جنگل کی طرف نکل گیا تھا مگر یہ بات یقینی تھی کہ وہ صبح ہونے سے پہلے ہی لوٹ کر آئے گا اور کسی ذریعے واپس پہنچنے کی کوشش کرے گا۔

"تمھیں یہ بھی ضرور معلوم ہوگا کہ اس ٹرک میں کیا ہے" ڈرائیور بولا۔

"ہاں۔ آگے انجن ہے" میں نے کہا "پیچھے جو پہیے ہیں۔ ٹائر ہیں۔ ٹائروں میں ہوا ہے۔ ہوا میں تقریباً تین چوتھائی نائٹروجن ہے اور پانچواں حصہ آکسیجن"

ڈرائیور نے کچھ حیران ہو کے میری طرف دیکھا "اس ٹرک میں اسلحہ ہے"

"اچھا۔ کیا کیا ہے؟" میں نے کہا "ایٹم بم کتنے ہیں۔ مجھے تو بس ایک چاہیے اس حاجی کے لیے۔ میں اسے بم پر بٹھا کے بم کو تیلی دکھا دوں اور۔ بوم۔ حاجی کی روح بھی فنا ہو جائے"

ڈرائیور نے مجھے یقیناً بہت جاہل سمجھا ہوگا کہ میں ایٹم بم کو ایک دیا سلائی سے پھٹنے والا بم سمجھتا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھ کے مسکرایا۔

"تم ہو تو میرے بھی دشمن۔ مگر باتیں مزے کی کرتے ہو"

"تمھیں مجھ سے ڈر نہیں لگتا" میں ...

... نے تم کو سرکاری ملازم تم ...

کیا ڈرنا۔ تم زیادہ سے زیادہ مجھے گرفتار کرا دو گے۔ چلو اپنا یہ شوق بھی پورا کر لو۔ تمہارے پہلے کی بات کی تھی تو تم نے مذاق میں ٹال دیا۔"

"چلو اب مذاق ختم۔" میں نے کہا۔ "نام بتاؤ پہلے اپنا۔"

"میرا نام۔۔ ڈنگا۔" وہ بولا۔ "لوگوں نے خود ہی کہنا شروع کر دیا۔"

"کیوں؟ کیا تم بہت سیدھے تھے؟"

"نہیں۔ ماں باپ نے غلط نام رکھ دیا تھا۔ مستقیم خان۔ جس کا مطلب وہی ہوا کہ سیدھے تھے خان۔" وہ بولا۔ "مگر میں بچپن سے جلیبی کی طرح سیدھا تھا۔ سب طعنے کے طور پر کہتے تھے کہ نام مستقیم مگر خود کتنا ڈنگا ہے۔ ڈنگا کہتے کہتے ہو نام ٹیڑھا۔"

"میں تم کو سیدھا کر دوں گا۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"وہ جس پڑاؤ کیسے کیسے گھامڑ پولیس میں بھرتی ہو جاتے ہیں۔ او یار داتا چلے تو خود سیدھا ہو جا۔ اس ٹرک کو کہاں لے جانا ہے تو نے؟ اپنے سودے کے گھر؟"

"تمہیں معلوم ہے میرے سسر کا گھر؟" میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے ویسے چلو۔ وہ تم ہی نے کا سارا اسلحہ اور مجھے دکان ڈال دے گا۔"

"وہ جو کیبن جانے گیا اس کا نام کیا تھا؟" میں نے اچانک کہا۔

"وہ کلینر نہیں تھا۔" ڈنگے نے کہا۔ "میرے ساتھ رہتا تھا۔" وہ ذو معنی طرز لیجے پر اور نہایت فحش انداز میں آنکھ مار کے ہنسا۔

"میں نے اس کا نام پوچھا تھا۔ کام نہیں۔" میرا ہاتھ ایک دم حرکت میں آیا اور ضرب اس کی ناک پر پڑی۔ ٹرک ذرا سی دیر کے لیے لہرایا۔ ڈنگے نے درد سے بلبلا کے بریک لگائے اور اسے روک لیا۔ سامنے سے آنے والا ایک ٹرک چند انچ کے فاصلے سے گزر گیا۔

"پاگل ہو گئے ہو پتر۔ ابھی ٹکر ہو جاتی۔" ڈنگے نے چیخ کر کہا۔

"کلینر کا نام کیا تھا؟" میں نے اس کے دوسرا ہاتھ رسید کیا۔ اس کا سر ونڈ شیلڈ پر بڑی آواز کے ساتھ لگا۔

"بچا ان دین۔" ڈنگا سر اٹھا کے بڑی مشکل سے بولا۔ وہ اب کچھ خوفزدہ نظر آنے لگا تھا۔ "کسی کو معلوم نہیں کہ وہ سفر میں میرے ساتھ جاتا تھا۔"

"ٹرک چلاؤ۔" میں نے کہا۔ "اور میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دیتے رہو۔ ورنہ میں تم کو واقعی سیدھا کر دوں گا اور سیدھا اس راستے پر روانہ کر دوں گا جو جہنم کو جاتا ہے۔"

"واہ اوئے شیر دیا پترا۔ ہاتھ میں بندوق لے کر کیا بول رہا ہے۔" ڈنگے نے حقارت سے کہا۔ ٹرک پھر روانہ ہو گیا۔ ڈنگا اپنی ناک سے بہنے والے خون کو ایک میلے کپڑے سے صاف کرتا جا رہا تھا۔ میں نے گلوز کمپارٹمنٹ کھولا۔ اس میں بس ایک ریوالور تھا اور کچھ کاغذات تھے۔

"رانا شمشاد علی۔ تم مجھے چلنے دو۔" ڈنگے نے کہا۔ "اس ٹرک میں تمہارے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر پہلے تھی تو اب نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ کھجل ہو رہے ہو۔"

"تم نے یہ روڈ سائن دیکھا؟" میں نے کہا۔

"کون سا روڈ سائن؟"

"میں نے دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "آگے دائیں طرف کوئی چھوٹی سڑک ہے۔ ٹرک ادھر ہی موڑ لینا۔"

"اور اگر میں نہ موڑوں؟"

"تو میں تمہاری گردن موڑ دوں گا۔ ایسے کہ تم پیچھے دیکھنے لگو گے اور تمہاری گردن کی چوڑیاں الٹی ہو جائیں گی۔" میں نے کہا۔ "تم تو صرف ڈنگے ہو۔ میں بڑا ڈونگا ہوں۔۔ بہت گہرا۔"

ڈنگے نے مجھ پر ایک حقارت کی نظر ڈالی۔ "پتا چل جائے گا یہ بھی۔" اور ٹرک کو سیدھے ہاتھ کی پتلی سی سڑک پر موڑ لیا۔ سڑک کسی چھوٹے سے قصبے کی طرف جاتی تھی چنانچہ اس کی خستہ حالی بہت نمایاں تھی۔ اس کے دونوں جانب درختوں کی قطار تھی اور پھر کھیت تھے۔ میں بہت سکون سے اپنے سامنے دیکھ رہا تھا اور کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا۔ شین گن میرے پیروں میں دبی ہوئی تھی اور ریوالور اب میرے سیدھے ہاتھ میں تھا۔

"رفتار کم رکھو۔" میں نے کہا۔ "دس میل۔ اور یہ دیکھو الٹے ہاتھ پر ایک کچا راستہ ہے۔"

ڈنگے نے ٹرک کچے راستے پر اتار لیا۔ جھکولے کھاتا ٹرک تقریباً دو سو گز تک رینگتا ہوا گیا۔ پھر مجھے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ میں نے ٹرک کو الٹے ہاتھ پر درختوں کے پیچھے لے جانے کا اشارہ کیا۔

"مسٹر ڈنگے۔ ٹرک روک دو۔" میں نے کہا۔ "اور سیدھی طرح نیچے اتر آؤ۔"

ڈنگے نے مجھے ریوالور اور ٹرک کے گلوز کمپارٹمنٹ میں رکھتے دیکھا اور بڑی چالاکی سے کام لیتے ہوئے چابیاں نکال کے مٹھی میں دبا لیں۔ میں نے اس کی نیت کو بھانپ لیا تھا۔ وہ ابھی تک مجھے رانا شمشاد علی سمجھ رہا تھا چنانچہ اس خوف سے بالکل بے نیاز تھا کہ میں اسے قتل بھی کر سکتا ہوں۔ میری توقع کے مطابق اس نے چابی کھیتوں کی طرف اچھال دی۔ اس وقت میں ٹرک کے سامنے سے گزر کے آ رہا تھا۔ میں نے ظاہر کیا کہ میں نے ڈنگے کی یہ حرکت بھی نہیں دیکھی۔ ڈنگے نے اپنی دانست میں بہت بڑا تیر مارا تھا کہ ٹرک کو ناقابل استعمال بنا دیا تھا۔ حالانکہ کسی بھی گاڑی کو ڈائریکٹ تار جوڑ کے اسٹارٹ کرنا معمولی بات ہے۔

"ہاں بھئی ڈنگے۔ اسلحہ نہیں ہے تو پھر ٹرک میں کیا ہے؟"

"تیری ماں حسے الٹے۔" ڈنگے مجھے گالی دے کر بولا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں خالی ہاتھ ہوں چنانچہ اس کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس نے ایک دم نیچے جھک کر مٹی کا سخت ڈھیلا اٹھایا اور میری طرف پھینکا۔ میں بمشکل اسے بچا گیا۔ ڈنگا ایک دم پلٹ کے بھاگا اور اس نے اچانک نیچے جھک کر کوئی چیز اٹھائی۔ میں اس کے پیچھے لپکا ہی تھا کہ وہ پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے کسی درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ اٹھا

لی تھی۔ میں نے اسے کچھ دیر برداشت کیا۔ میں کئی دفعہ گرا اور بچا۔ ہر شکست تسلیم کرنے کے انداز میں پیچھے ہٹتا گیا۔ میں نے اسے ڈنگے بھائی بھی کہا۔ وہ اور شیر ہو گیا اور مجھے وہ گالیاں بکنے لگا جو انتہائی غلیظ شمار ہوتی ہیں۔ پانچ منٹ بعد میں نے کھیل ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک بار وہ ڈنڈے جیسی شاخ گھما کے تھوڑا سا قریب آیا ہی تھا کہ میں ایک دم ہوا میں اچھلا اور میں نے اس کے سینے پر کک ماری۔ میرا خیال ہے کہ اسے چوٹ اتنی نہیں آئی تھی جتنا کہ اسے حیرت کے صدمے نے بے حال کیا۔ یہ ایک خالص پروفیشنل کک تھی جو بڑے بڑے سورماؤں کو چت کر دیتی۔ روزمرہ کی لڑائیوں میں گھونسے لاتیں اور ٹکریں مارتے تو اس نے سب کو دیکھا ہوگا مگر یوں اڑ کر دونوں پیروں کی ضرب لگاتے شاید فلموں میں ہی دیکھا ہوگا۔

"او مسٹر ڈنگے۔" میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "اس وقت تو میرے ہاتھ بھی خالی ہیں۔ تم کو شکایت تھی نا کہ اسلحہ ہاتھ میں لے کے تم شیر بن گیا تھا؟"

وہ خود ہی اٹھا۔ اس کا ارادہ مقابلے کو جاری رکھنے کا نہیں تھا مگر وہ میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نہ پکڑتا تو یہ ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہوتا۔ وہ ایک بار پھر بڑک مار کے مجھ پر لپکا۔ غالباً وہ میرا ہاتھ تھام کے مجھے اپنی جانب کھینچنا چاہتا تھا اور میرے سینے پر اپنا سر مارنے کی سوچ رہا تھا مگر ہوا اس کا الٹا یعنی پہلے میں اس کی طرف بڑھا اور پھر ایک دم جام ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس کو جھٹکا لگا اور اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ جھک کر تھوڑا سا آگے آیا ہی تھا کہ میں نے اسے دوسرا جھٹکا دے کر ایک گھٹنے پر اٹھایا اور پلٹ کے دوسری جانب پھینک دیا۔ اس دفعہ وہ بلبلایا اور اس نے اٹھنے کی کوشش بھی نہیں کی لیکن میں نے اسے کھینچ کر پیروں پر کھڑا کر دیا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے گھبرا رہا تھا۔

"میں یار۔" میں نے کہا۔ "تم تو بچپن سے ڈنگے ہو۔ اتنی جلدی سارے بل نکل گئے۔ کتے کی دم سے بھی گئے گزرے ہو تم تو یار۔ اسے بھی بارہ برس تو نلکی میں رکھنا پڑتا ہے۔ پھر بھی سنا ہے وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہتی ہے۔" میں نے اس کے منہ پر مکا مارا۔ وہ کراہ کے دہرا ہوا تو دوسرا مکا اس کے پیٹ میں لگا۔ وہ گرنے لگا تھا کہ میں نے اسے اوپر اٹھا لیا اور تھوڑا سا گھمایا۔

"رانا صاحب۔۔ رانا جی۔ غلطی ہو گئی مجھ سے۔ معاف کرو۔" وہ ایک دم منت خوشامد پر اتر آیا۔

میں نے اسے دور پھینکنے کے بجائے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ "غلطی انسانوں سے ہوتی ہے۔ تم شیطانوں میں شامل ہو۔ تم سے گناہ اور جرم ہوتے ہیں۔ ایک بار پھر سوچ کر کہو میں نے گناہ کیا۔ کیا پاجی کو جانتے ہو؟"

وہ جب کھڑا لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ "ہاں۔۔ جی۔"

میری لات پڑتے ہی وہ منہ کے بل گرا۔ اس کا چہرہ اور اس کے کپڑے سب کھیتوں کی مٹی میں بھر گئے۔ "ہاں جی کے بچے۔ جو میں نے کہا ہے وہ دہراؤ۔"

"میں۔۔ گناہ کیا میں نے کہ۔۔۔ پاجی کو۔۔۔ حاجی کہا مجھو۔"

میں نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ مارا۔ "دوسری بات یہ یاد رکھنا کہ میں تمہارا بچہ نہیں ہوں۔ دشمن ہوں۔ اب یہ بتاؤ کہ اس ٹرک میں کیا مال ہے؟"

"صرف چھل جناب۔" وہ بولا۔ "آپ بے شک دیکھ لو۔"

"دیکھنے کے لیے وقت نہیں ہے مسٹر ڈنگے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہاری بات پر اعتبار کرتا ہوں۔ اب اپنی عزت اٹھاؤ جو خاک میں مل چکی ہے۔" میرا اشارہ اس کی پگڑی کی طرف تھا۔ وہ ایک لنگی تھی جو اس نے بدمعاشوں کے انداز میں سر پر لپیٹ رکھی تھی۔

ڈنگے نے لنگی اٹھائی اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ "اب اس کو لمبائی کے رخ چار حصوں میں تقسیم کر دو۔" میں نے کہا۔ "پھر حصے کو گانٹھ باندھ کے لمبی رسی بناؤ۔ اسے پٹرول۔۔ میرا مطلب ہے ڈیزل کے ٹینک میں ڈال کے نکالو۔"

"وہ کس لیے جی۔۔۔ جناب۔" وہ بولا مگر پھر میرے تیور دیکھ کے تعمیل حکم میں مصروف ہو گیا۔ میں نے ڈیزل میں بھیگی ہوئی لمبی رسی کو ٹرک سے باندھ کے دور تک پھیلایا تو ڈنگا سمجھ گیا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے دوسرا ریوالور بھی نکال لیا۔ دونوں ریوالور اپنی جیبوں میں ٹھونس کر میں نے شین گن اٹھائی۔ سیٹ ہٹا کے دیکھنے سے مجھے اس کا ایک اضافی راؤنڈ دستیاب ہوا۔

"اب اسے آگ لگاؤ۔۔ اور میرے ساتھ چلو۔" میں نے کہا۔

"یہ۔۔ آپ کیا ظلم کر رہے ہیں۔۔ وہ حاجی۔۔ میرا مطلب ہے پاجی تو مجھے مار ڈالے گا۔" وہ فریاد کرنے لگا۔ "میرے بیوی بچوں کو بھی اٹھوا لے گا۔ وہ اپنا نقصان کرنے والے کو نہیں چھوڑتا۔"

"اپنا نقصان کوئی بھی پسند نہیں کرتا ڈنگے۔ مگر نقصان کا سودا تم بہت پہلے کر چکے تھے۔" میں نے کہا۔ "فائدہ تو بہت عارضی تھا اور اس نقصان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا جو اب تمہیں ہوگا۔ بس اس وقت تمہیں یقین تھا کہ نقصان کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ بیوی بچے تو جیتے جی مارے جاتے ہیں۔ وہ کچھ کرتے نہیں مگر سزا بھگتتے ہیں۔ تم نے پہلے سوچا ہوتا تو وہ بچ جاتے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ چلو آگ لگاؤ اپنے گھر کو۔"

اس نے جیب سے ماچس نکالی۔ کچھ دیر یوں تکتا رہا جیسے وہ واقعی اپنے گھر کو جلانے کا خیال کر رہا ہے۔ پھر شعلہ لپک کر رسی اور ٹرک کی طرف دوڑنے لگا۔ میں نے فوراً اس کا ساتھ دینا پڑا۔ مجھے یقین تھا کہ ڈنگا جھوٹ بول رہا ہے اور ٹرک میں اب بھی اسلحہ ہوگا۔ میں نے رسک نہیں لیا تھا۔ اس نے ٹرک کا حال بدل دیا تھا لیکن اگر یہ خبر دشمنوں کے کانوں تک پہنچ گئی ہو تو وہ محفوظ رہے۔ جس جرم کے کاروبار میں وہ ملوث تھا اس میں دشمن ہی زیادہ ہوتے ہیں۔

دس منٹ میں ہم پھر بڑی سڑک کے قریب تھے۔ ڈنگا بک طرح

www.paksociety.com

ناپ رہا تھا۔ تقریباً آدھا میل دور ہم ٹرک کو ایک روشن الاؤ کی صورت میں دیکھ سکتے تھے۔ اس میں صرف ایک دھماکا ہوا تھا جو غالباً پیٹرول ٹینک کے پھٹنے کا دھماکا تھا۔ اس سے آگ اور بھڑک اٹھی تھی مگر مزید دھماکے نہیں ہوئے تھے جس کا مطلب یہی تھا کہ ٹرک میں صرف چاول تباہ ہو رہے تھے۔ مجھے امید تھی کہ جب یہ الاؤ بھڑکے گا تو گرد و نواح سے کچھ لوگ ضرور آئیں گے۔ قریب ترین آبادی بھی زیادہ دور نہیں ہو سکتی تھی۔ پانچ سات میل بعد کوئی نہ کوئی گاؤں آ ہی جاتا ہے۔ سڑک کی طرف سے کسی کے آنے کا بھی امکان تھا۔ چنانچہ میں نے بھاگتے ہوئے جنگل کے درختوں کے درمیان سے [illegible] اختیار کیا تھا اور اس طرح ٹرک سے دور رہا تھا۔ کھیتوں میں [illegible] کی کھدی ہوئی مٹی میں بھاگنا خاصا دشوار کام تھا۔

ٹرک [illegible] ہو گئی۔ وہ [illegible] روشنی کے ساتھ مجھے ہر گزرتے [illegible] دی [illegible] کا شور بھی سنائی دینے لگا تو میں نے ڈنگے کو روک دیا۔ [illegible] پھول رہی تھی۔

"ڈنگے۔" میں نے کہا۔ "اس ٹرک کا اسلحہ کس ٹرک میں منتقل کیا گیا تھا؟"

ڈنگا [illegible] کی طرح سانس لیتا رہ گیا۔ "نہیں . . . معلوم۔"

"[illegible] اور پوچھوں گا" میں نے کہا۔ "اس سوال کے صحیح جواب پر تمہاری زندگی یا موت کا انحصار ہے۔ معافی شاید تم کو بخش دوں۔ [illegible] یقین کرو کہ تم کو کس طرح [illegible] کیا گیا تھا؟"

"[illegible] کیا گیا تھا؟"

"[illegible] اغوا" میں نے کہا۔ "تمہارا وہ دوست [illegible] ہے۔ اس کے علاوہ تم کو بہت سے ہیں اور ٹرک [illegible] جو گواہی دیں گے کہ انھیں بھی اسی طرح لٹکا گیا تھا۔"

"تم [illegible] روکا تھا؟"

"صرف نمبر [illegible] کے لیے" میں نے کہا۔ "تم مجھے دوسرے ٹرک کا نمبر بتا دو۔"

"رانا صاحب" وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔

"دیکھو، نمبر تو میں پوچھ کر رہوں گا" میں نے کہا۔ "اور یہ خیال بھی دل سے نکال دو کہ تم کوئی بھی نمبر دے کر مجھے ٹال سکتے ہو۔ میرے پاس ان سب ٹرکوں کے نمبر ہیں جو اس کام میں استعمال ہوتے ہیں۔"

یہ بات غلط بھی نہیں تھی۔ یہ فہرست بچکری کی فراہم کردہ تھی۔

"میں تصدیق کروں گا۔ سچ بتاؤ گے تو تمہیں انعام میں وہ دس ہزار واپس مل جائیں گے جو تمہارے پاس ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرے دس ہزار . . ."

"ہاں — میں تم سے وہ دس ہزار نہیں لوں گا" میں نے کہا۔ "مگر تم اس باجی سے کہہ دینا کہ رانا نے سب چھین لیا۔ اسلحہ بھی اور رقم بھی۔ اسے جلا ہوا ٹرک دیکھ کر یقین آ جائے گا۔ میں تم کو بے ہوش کر کے یا باندھ کے ایسی جگہ ڈال جاؤں گا جہاں سے کوئی بھی تم کو اٹھا لے گا۔ لیکن . . ."

وہ منتظر رہا کہ میں آگے کیا کہتا ہوں۔

"اگر تم نے مجھے اس ٹرک کا غلط نمبر بتایا" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ "تو میں سب سے پہلے ایک ایک کر کے تمہاری انگلیاں توڑوں گا۔" میں نے اس کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی یوں توڑ دی جیسے وہ کچی پنسل تھی۔ ڈنگا بری طرح چلایا۔ میں نے اس کا منہ بھینچ [illegible]

"تم نے دیکھا کہ ایک انگلی کتنی مشکل سے ٹوٹتی ہے اور ایک جگہ سے ٹوٹی ہے۔ لاؤ میں اس کو درمیان سے توڑ کے دکھاؤں۔"

ڈنگا ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ شدت تکلیف میں کراہ رہا [illegible] اپنے ہاتھ کی انگلی کو پکڑے کھڑا تھا۔ "مجھ پر رحم کرو۔"

"تمہارا وہ باجی آقا تم پر رحم کرتا ہے؟" میں نے کہا اور ایک بار اس کا ہاتھ پھر دبوچ لیا۔ "وہ تو تمہارا ان داتا ہے۔ تم اس کا نمک حلال ہو۔ میں دشمن ہوں۔ مجھ سے رحم کی امید کیوں رکھتے ہو؟"

ڈنگے نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی پوری کوشش کی مگر میں نے اس کا بازو مروڑ کے اسے بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ پھر میں نے اسے نیچے گرا دیا اور اس کی پیٹھ پر اپنا گھٹنا رکھ کے اسے ہلنے کے ناقابل چھوڑا۔

"ہاں — کیا نمبر ہے اس ٹرک کا؟" میں نے اس کے ہاتھ کی دوسری انگلی کو اینٹھ کر کہا۔ وہ تکلیف کے باعث چیخ رہا تھا اور "رانا صاحب — رانا صاحب" کہہ رہا تھا۔ اس کے لیے اپنی [illegible] کر کے دوسری انگلی کو بچانا بھی ناممکن تھا۔

"دس انگلیاں تیس جگہ سے توڑنے کے بعد [illegible] سکا تو ڈنگے خان۔" میں نے اس کی سب سے چھوٹی انگلی پھر سے توڑ دی۔ وہ تڑپا اور بلبلا کے اچھلنے لگا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور اس کی دونوں ٹوٹی ہوئی انگلیوں کو ہلانے لگا۔ وہ ایسے کراہا جیسے مرنے والا ہو لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی وہ بے ہوشی کے [illegible] بے ہوش بھی نہیں ہو سکتا۔ "دس انگلیاں تیس جگہ سے توڑ لینے کے بعد تم بہادری سے اس باجی کے وفادار رہے تو میں [illegible] بازو توڑوں گا۔ کہنی سے نیچے، کلائی کے پاس سے۔ پھر [illegible] اس کے بعد شانوں کے قریب سے۔"

میں نے اس کے بازو پر ہر جگہ نشان لگانے کے [illegible] مار کے اسے یقین دلا دیا کہ ایسا بھی ممکن ہے۔

"اور جناب ڈنگے خان صاحب" میں نے کہا۔ "اس کے بعد بھی تم زندہ رہے تو پھر تمہاری ٹانگوں کی باری ہے۔ [illegible] میں شاید دو سو اور کچھ ہڈیاں ہوتی ہیں۔ میں سب نہیں توڑوں گا لیکن اوپر سے نیچے تک تم اتنی جگہ سے ٹوٹ جاؤ گے کہ [illegible]

جاں بحق نہ ہو گے اور کوئی بہت ماہر ہڈیوں کا ڈاکٹر ہوگا تو ممکن ہے سب جوڑ دے۔ مگر ایک تو اس میں خرچ بہت ہے۔ کون دے گا تمہیں اتنا پیسہ۔ وہ باجی تو دینے سے رہا۔ اس کے لیے تم ویسے ہی بے کار ہو جاؤ گے جتنا یہ ٹرک بے کار ہو گیا ہے اور ٹھیک ہونے کے بعد بھی تم ٹیڑھے ضرور ہو جاؤ گے۔ اب نہیں ہو تو لنگڑے ہو جاؤ گے۔ تمہارے ہاتھ پیر بالکل سیدھے نہیں رہیں گے۔ تم ٹیڑھا چلو گے۔ ٹیڑھا دیکھو گے۔"

"خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں بتاتا ہوں" وہ وحشت زدہ ہو کے چلانے لگا۔

"بولو بولو۔ مگر آہستہ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے تمہارے منہ میں کچھ بھرنا پڑے۔ یہاں تو یہی گوبر وغیرہ ہے" میں نے کہا۔ "تمہارا منہ میٹھا کرانے کے لیے مٹھائی نہیں لا سکتا میں۔"

اس نے مجھے ایک نمبر بتایا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور جیب میں سے ایک کاغذ نکالا۔ دیاسلائی جلا کے اس پر لکھے ہوئے نمبروں سے چیک کیا۔ وہ نمبر ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔ ڈنگا اب بھی بیٹھا بری طرح لرز رہا تھا اور رو رہا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ [illegible] یہ تکلیف [illegible] تھا لیکن وہ اس درد کا علاج کرنے سے قاصر تھا۔

"یہ ٹرک کب ملتان سے چلے گا؟" میں نے کہا۔

"رات دو بجے" وہ بولا۔ "اور تین بجے کے درمیان۔"

"گویا ابھی تھوڑی دیر ہے" میں نے گھڑی کے روشن ڈائل کو غور سے دیکھ کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔ تمہیں ایک گھنٹے میں معلوم ہو جائے گا جھوٹ کا انجام۔ اگر وہ ٹرک نہ آیا تو میں آؤں گا۔ اور تم سے پھر پوچھوں گا لیکن جرمانہ وصول کرنے کے بعد۔ پہلے میں تمہارے دونوں ہاتھ توڑوں گا۔"

"تم مجھے ایک ہی بار گولی کیوں نہیں مار دیتے" وہ پاگل ہو کے مجھے گالیاں بکنے لگا۔

"ڈنگے . . . میں تمہارے قتل کا الزام اپنے سر کیوں لوں۔ تم نے کہا بھی تھا کہ تم کیا قتل کرو گے۔ ملازم سرکار۔ میں واقعی قتل نہیں کروں گا لیکن میں تم کو موت سے زیادہ سخت سزا دے سکتا ہوں۔ میں تم کو لنگڑا لولا ہی نہیں، اندھا بھی کر کے چھوڑ سکتا ہوں۔ اس کے بعد تم چاہو تو خودکشی کر لینا۔ [illegible] موت مر جانا۔ اگر وہ ٹرک آ گیا تو چھوڑ جاؤں گا [illegible] کوئی آ جائے گا تم کو اٹھانے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور غالباً اس خیال سے خوش ہوا کہ شاید اسے آزاد چھوڑ جانے کی حماقت کا مرتکب ہو رہا ہوں۔

"ڈنگے بادشاہ" میں نے کہا۔ "تم کو باندھنے کے لیے میرے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں۔ تم کچھ بندوبست کرو۔"

"میں؟" وہ خون آلود خشک لبوں پر زبان پھیر کے بولا۔ "میں کیا کروں؟"

"تم یہ کرو کہ اپنا ازار بند نکال کے مجھے دے دو" میں نے کہا۔

"یہ کیسے — ہو سکتا ہے؟"

"سب کچھ ہو سکتا ہے" میں نے کہا۔ "تم شلوار کو اوپر ایسے باندھ لو جیسے دھوتی باندھتے ہیں۔"

"رانا صاحب — میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

"میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ" میں نے کہا۔ "پہلے وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ ورنہ تم چلتے ہوئے کا [illegible] بھی کر سکتا ہوں۔"

ڈنگے نے بادل ناخواستہ [illegible] اس کا [illegible] ازار بند [illegible] جب وہ شلوار کو کمر کے گرد [illegible] ایک وحشت کے ساتھ کھڑا کیا اور اس کے دونوں ہاتھ [illegible] پیچھے سے گزار کے ایک ساتھ باندھ دیے۔ [illegible] اس کی کلائیوں کے گرد لپیٹنے کے بعد میں نے اس [illegible] کوشش کرتا تو [illegible] نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی ٹوٹی ہوئی انگلیوں کی خفیف سی حرکت اسے شدید تکلیف میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اس کا منہ بند کرنے کے لیے میں نے اس کی قمیص کا دامن پھاڑا اور کپڑے کا گولا اس کے حلق میں ٹھونسنے کے بعد [illegible] اس کو منہ باندھ دیا۔

"چار پانچ گھنٹے کی بات ہے" میں نے کہا۔ "پھر صبح ہو جائے گی۔ ممکن ہے اس سے پہلے ہی میں لوٹ آؤں۔ تمہیں غلط بیانی کی سزا دینے کے لیے ابھی وقت ہے۔ اگر تم نے جھوٹ بولا ہے تو بتا دو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی اور وہ اپنا سر بلند رکھنے میں بھی ناکام تھا۔ مجھے جواب دے کر اس نے پھر سر کو یوں جھکا لیا جیسے وہ [illegible] ہو۔

"مسٹر ڈنگے۔ سیدھے بیٹھے رہو گے اور ہاتھ پیر نہیں چلاؤ گے تو تمہاری دھوتی بھی نہیں کھلے گی۔ زور آزمائی کرنے یا چیخنے چلانے کی کوشش سے بھی فائدہ کوئی نہیں ہوگا۔ صبر اختیار کرو" میں نے کہا۔

دس منٹ بعد میں پھر ٹرک پر تقریباً اسی جگہ تھا جہاں سے میں نے ٹرک کو دائیں جانب موڑا تھا۔ ملتان کی طرف سے ایک گاڑی آئی اور میں نے صرف پلٹ کر ہی دیکھا تھا مگر وہ تھوڑا سا آگے جا کے رک گئی۔ میں قریب پہنچا تو گاڑی سے ایک شخص نے سر نکالا۔

"تم یہیں کے رہنے والے ہو؟" وہ کوئی زمیندار معلوم ہوتا تھا۔

"ہاں جی" میں نے کہا۔

"کچھ بتا سکتے ہو کہ یہاں سے پٹرول پمپ کتنی دور ہوگا؟"

"پٹرول پمپ" میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کے کہا۔ "زیادہ دور نہیں ہے۔ میں بھی ادھر ہی جا رہا تھا۔ خیر تو ہے؟"

"ہاں ہاں" وہ بولا۔ "بیٹھو پیچھے۔ گاڑی میں پٹرول ختم ہو گیا ہے۔ فیول میٹر دھوکا دے گیا۔ ہو سکتا ہے گاڑی کو دھکا لگا کے پٹرول پمپ تک پہنچانا پڑے۔"

www.paksociety.com

"آپ کے پاس کوئی خالی ڈبا نہیں ہے؟"
"ہے۔ لیکن پمپ والے کھلا پٹرول کہاں دیتے ہیں؟" وہ بولا۔
"آپ جا کے حاجی عبداللہ کا نام لینا۔ اسی کا پٹرول پمپ ہے۔" میں نے کہا "اور بولنا کہ میں ڈنگے کو جانتا ہوں، وہ پٹرول دے دیں گے۔"
"کون ہے یہ ڈنگا؟" وہ حیران ہو کے بولا۔
"ایک ٹرک ڈرائیور ہے۔ روز کے آنے جانے والے ڈرائیوروں کو یہ سب پٹرول پمپ والے جانتے ہیں۔" میں نے کہا "ڈنگا وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو یہاں سے گیا ہے۔ مجھے راستے میں ملا تھا۔ اسی نے یہ حوالے دیے ہیں۔"
"کیا۔ تم ڈنگے ہو؟"
میں نے دانت نکال دیے۔ یہ تردید تھی اور تائید بھی۔ پھر وہ جگہ آ گئی جہاں میں نے ڈنگے کا ٹرک روکا تھا۔ گاڑی کا مالک سخت تشویش میں مبتلا تھا اور اس کی نظر بار بار فیول میٹر پر تھی۔ جس کی سوئی آخری حد چھو چکی تھی اور نہ جانے کب سے ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ گاڑی بند نہیں ہوئی۔ وہ گاڑی میرے سپرد کر کے خود ڈبے میں پٹرول لینے کے لیے کبھی نہ جاتا۔ وہ تو یا مجھے کہتا کہ جاؤ اور پٹرول لے کر واپس آؤ۔
"بس جی۔ مجھے اتار دیں یہاں۔" میں نے کہا۔
اسے گاڑی کو روکتے وقت گراں گزر رہا تھا کہ سامنے پٹرول پمپ کی لائٹس نظر آنے لگی تھیں اور وہ چند قطرے پٹرول کے ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے کار کو آہستہ کیا اور بولا "چلو اترو۔ گاڑی بند ہو گئی تو خواہ مخواہ پریشانی ہو گی۔"
"مہربانی جناب کی۔" میں نے چھلانگ مارتے ہوئے کہا۔ گاڑی ایک دم آگے بڑھی۔ میں نے اس کی ٹیل لائٹس کو غائب ہونے تک دیکھا اور امید کی کہ وہ پٹرول پمپ پہنچ گیا ہو گا۔ پھر اسے حاجی عبداللہ یا ڈنگے کا حوالہ دینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔
مجھے جانے اور واپس آنے میں ڈیڑھ گھنٹہ لگا تھا۔ اب رات کے سوا دو بج رہے تھے۔ میرے پیچھے وہی جگہ تھی جہاں رانا شمشاد علی اور ایک نامعلوم شخص کی لاشیں اب ٹھنڈی ہو کے اکڑ چکی تھیں۔ ادھر ہی ڈنگے کا خاص دوست فرار ہوا تھا۔ وہ ایک بزدل قسم کا لڑکا تھا جو ایک اخلاقی جرم میں بھی شریک تھا۔ چنانچہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ کچھ عرصہ روپوش رہے گا۔
سڑک پہ اب گاڑیاں اکا دکا ہی گزر رہی تھیں۔ دس پندرہ منٹ میں ایک ادھر سے اور ایک دوسری طرف سے۔ یہ بھی سب ٹرک اور بسیں تھیں۔ میں نے ملتان کی طرف سے آنے والی ٹریفک کو نظر انداز کیا اور جنوب کی طرف سے آنے والی تین گاڑیوں کو روکا۔ ان میں دو ٹرک تھے۔ مزدی کا وہی کہنا تھا میرے کام آیا۔ ڈرائیوروں نے مجھے غائبانہ گالیوں سے نوازا اور چلے گئے۔ صبح کے سوا تین بجے تھے جب میں نے چوتھے ٹرک کو روکا اور اس کی نمبر پلیٹ دیکھی۔ ایک بار ڈرائیور نے کلینر کو آواز دے کر نیچے اترنے کو کہا۔ کلینر اس کے ساتھ نہیں تھا بلکہ پچھلے حصے میں سامان پر ڈھکی ہوئی ترپال سے اوپر چڑھا ہوا تھا۔ آگے میں نے ڈرائیور کے ساتھ ایک عورت کو دیکھا جس کی صورت کے خدوخال نمایاں نہیں تھے۔ بوٹے۔ ڈرائیور نے پکارا۔
"یہ کیا چکر ہے؟" وہ سہم کر چلائی۔
ڈرائیور ہنسا "کچھ نہیں جان۔ کوئی چکر نہیں۔ چکر میں تو ہم ہیں تمہارے۔"
"مذاق چھوڑو۔ کوئی ڈاکو تو نہیں ہیں؟"
"تم سے بڑا ڈاکو کون ہے بلبل۔ جس نے ہمارا سب کچھ چھین لیا اور اگر ڈاکو ہوں تو پولیس ان کو ایک ترچھی نظر سے دیکھنا بھی حرام دے ہوتے۔"
"کیا ہے استاد جی؟"
"او چھٹے آفتاف!" استاد نے کہا اور عورت نہ جانے کیوں چلائی۔
بوٹا نیچے اترا اور ٹرک کے آگے سے درخت کا تنا ہٹانے گیا۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں نے مشین گن کو ریل پیل اور ریوالور کافی سمجھتے ہوئے ٹرک کے پچھلے حصے میں جگہ بنا لی۔ اندازہ ہوا کہ ترپال کے نیچے آدھے حصے میں بوریاں ہیں اور باقی آدھے میں کریٹ ہیں۔ میں آخری حصے میں ساکت ہو کے لیٹ گیا۔ ایک سرے سے میں نے ترپال کو تھوڑا سا اوپر اٹھا دیا اور اس طرح کچھ فاصلہ بنا لیا۔ اب بوٹا اوپر آتے ہی مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔
بوٹا چند منٹ بعد بڑبڑاتا ہوا اوپر آیا۔ اسے حیرت تھی کہ کس نے اسے اتنی بلندی سے نیچے اترنے کی زحمت دی۔ مگر اپنی ماشوک نہیں چھوڑی گیا تھا اگر خود اتر جاتا۔ مگر اس کی تو شان گھٹتی تھی۔ رعب جمانا مقصد تھا اپنی ماشوک کے سامنے۔ ٹرک اس کے اچھے سے بہت پہلے چل پڑا تھا۔ بوٹے کی ساری توجہ توازن برقرار رکھتے اپنی جگہ تک پہنچنے پہ مرکوز تھی۔ نیچے ٹرک کے انجن کا شور تھا اور ڈرائیور اپنی ماشوک سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا اور اس کی تفریح طبع کے لیے ٹیپ کا ایک کیسٹ بجا رہا تھا۔ چنانچہ جب میں نے بوٹے کو دبوچا اور کسی توقف کیے بغیر یا رحم دلی کے جذبات کی مداخلت سے پہلے اسے سڑک کے کنارے کی طرف اچھالا تو بوٹے کی فریاد ڈرائیور کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ میں نے صرف اتنی احتیاط کی تھی کہ اسے سڑک پہ نہیں پھینکا تھا تاکہ اسے چوٹ کم آئے اور وہ مرنے سے بچ جائے لیکن بے ہوش ہو جائے تو کسی گاڑی سے نہ کچلا جائے۔
یہ احساس تو مجھے حرام کے بوٹے کو پھینک دینے کے بعد ہوا کہ وہ کون تھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے اسی نے مکرمی کی لاش کو گویا سامنے ڈالا تھا۔ وہ عبداللہ کے بیچ جانے والے ذرخرید غلاموں میں سے

ایک تھا۔ جسے بطور خاص ٹرک کے ساتھ اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ راستے کی دشواریوں سے نمٹنے میں ڈرائیور کی مدد کر سکے۔ وہ بھی اس پالیسی کا خاص آدمی تھا۔ مجھے اس کے انجام پر بالکل تاسف کا احساس نہ رہا۔
ڈرائیور کی صورت میں نے ابھی تک نہیں دیکھی تھی اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ عورت کون ہے۔ ڈنگے کے ساتھ بھی ایک لڑکا تھا مگر مجھے عبداللہ سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ کسی ڈرائیور کے ساتھ اس کی ماشوک کو بھی یہ ذمہ داری دے گا۔ ماشوک کو خود ڈرائیور نے بے ٹکٹ مسافر کی طرح بٹھایا تھا یا وہ بھی کوئی افسر بکار خاص تھی۔ ایک حادثے کے بعد جس میں بادشاہ گل مارا گیا تھا اور اسلحے کی کھیپ کا راز فاش ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ عبداللہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ مال کسی غیر ذمہ دار شخص کے حوالے کر دے۔
میرے لیے مال کا جائزہ لینا بھی مشکل تھا۔ اصل مال نیچے دبا ہوا ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بوریوں میں اناج ہو اور اسی میں گولیاں بھی ہوں۔ ٹرک اگر کراچی جا رہا تھا تو ساڑھے چھ سو میل کا سفر باقی تھا اور یہ مسافت ختم ہونے سے پہلے ہی میرا اور ڈرائیور کا تعارف ہونا یقینی تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا ڈرائیور کو کسی ٹرک اسٹینڈ تک پہنچنے دوں۔ ملتان سے پہلے شیر شاہ پر ٹرک والے عموماً چائے ناشتے کے لیے رکتے ہیں۔ وہاں ڈرائیور نے بوٹے کلینر کی جگہ مجھے پایا تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔ ٹرک ڈرائیوروں کی برادری کے اتنے لوگ جمع ہو جائیں گے کہ میری آواز بھی ان کے شور میں دب جائے گی اور وہ میری سنے بغیر مجھے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ اس کے بعد رہے نام اللہ کا۔ پولیس والے جانیں اور ڈنگا جانیں۔
میں نے طے کیا کہ صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے ہی مجھے ٹرک پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ اکیلے ٹرک ڈرائیور سے نمٹنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں اوپر سے ایک بار دردناک نعرے بلند کرتا تو ڈرائیور ضرور پوچھتا کہ کیا ہوا۔ جواب کیوں نہیں دیتا حرام دے بوٹے۔ اور پھر بھی جواب نہ ملتا تو ٹرک روک کے صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے خود دیکھتا۔ اگر کسی تشویش میں مبتلا ہوتا تو کلینر خود وہاں اوپر آتا۔ تب بھی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اوپر سے نیچے آ سکتا تھا۔ براہ راست اس کے اوپر۔ ڈرائیور کو رعایت دینے کا کوئی سوال نہیں۔ اسے مار کے ایک طرف پھینکنے سے عورت کو بھی تابع فرمان بنایا جا سکتا تھا۔ وہ ضرور جانتی ہو گی کہ ڈرائیور کون تھا اور اسے کہاں جانا تھا۔
ابھی میں قطعی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا کہ ٹرک گھوم گیا۔ میں نے اوپر سے جھانک کے دیکھا تو یہ کوئی سائڈ روڈ تھی۔ گھڑی میں ساڑھے چار بج رہے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ ٹرک نے لاہور کو تقریباً سو میل پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ سیاہ گہری کھیتوں اور درختوں کے ایک سے منظر کے باعث کسی اور جگہ کی شناخت صرف سنگ میل سے ممکن تھی یا اس روڈ سائن سے جو بڑی سڑکوں پر تیر کے نشان سے کسی خاص قصبے یا گاؤں کا پتا دیتے ہیں۔
ٹرک کی منزل کراچی نہیں تھی۔ یہ بات تو اب ثابت ہو چکی تھی۔ یہ بھی تقریباً ثابت تھا کہ وہ لڑکی یا عورت ڈرائیور نے اپنی مرضی سے تفریح طبع اور سفر کو رومانٹک بنانے کے لیے نہیں بٹھائی تھی۔ اسے ڈرائیور کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ عورت اس ڈرائیور کی بیوی ہو۔ اور اس نے ٹرک صرف بیوی کو گھر چھوڑنے کے لیے موڑا ہو۔ وہ کسی کام سے اس کو جاتے وقت اپنے ساتھ لے گیا ہو اور اب واپسی میں ساتھ ہی لے آیا ہو۔ اسے گھر چھوڑ کے وہ واپس کراچی کا راستہ پکڑے۔
ٹرک اسی وقت پھر گھوما اور ایک نیم پختہ سڑک پر چلنے لگا۔ اندھیرے میں کسی آبادی کے خدوخال نمایاں ہونے لگے۔ کچے مکان اندھیرے میں اپنی پسماندگی کی تصویر نظر آتے تھے۔ یہاں ابھی بجلی نہیں پہنچی تھی۔ اس اعتبار سے یہاں کے رہنے والے انیسویں صدی سے بھی پیچھے تھے۔ یہاں ٹیلیفون کی بھی سہولت نہیں ہو گی۔ اسکول اور اسپتال نہیں ہوں گے اور ریڈیو ٹی وی ان کے لیے عجائبات اور طلسمات کا درجہ رکھتے ہوں گے۔ اس ترقی کی دوڑ میں جو شہروں کو بیسویں صدی سے اکیسویں صدی میں پہنچا رہی تھی۔ گاؤں والے اور پیچھے ہوتے جا رہے تھے کیونکہ وہ پہلے کی طرح محکوم و مجبور و فقیر تھے۔ گورے آقاؤں کے بعد کالے آقا ان کے حقوق کا اور ان کی محنت کا اور ان کے جذبات کا پہلے سے زیادہ استحصال کر رہے تھے۔
ٹرک ایک دیوار کے ساتھ چلنے لگا جو باہر سے کچی نظر آتی تھی۔ اس پر جھومتے گارے کی ایک اینچ موٹی تہ تو ضرور ہو گی۔ اندر لیکن اینٹوں کی چنائی تھی اور شاید یہی ہماری منزل تھی یا سفر کا پہلا پڑاؤ تھا۔ ایسے کہ ٹرک اگر صرف رات کے اندھیرے میں ہی چلتے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ آدھی رات سے صبح کاذب تک چھ گھنٹے ہو جاتے ہیں اور پھر چھ گھنٹے کی مسافت پر ایک ٹھکانا ہو تو لاہور سے روانہ ہونے والا مال پانچویں دن بحفاظت کراچی پہنچ سکتا ہے۔ میں نے ریوالور چیک کیا اور تیار ہو کے بیٹھ گیا۔
چالیس پچاس گز کی دیوار کے وسط میں لکڑی کا دس بارہ فٹ اونچا پھاٹک تھا۔ ڈرائیور کے ہارن دینے سے قبل ہی کسی نے اس پھاٹک میں ایک کھڑکی کھولی۔ کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اندر سے کسی نے پوچھا۔ ٹرک کی ہیڈ لائٹس بجھ گئیں۔
"ڈنگے بادشاہ۔ خیر ہووئی۔"
"ڈنگے دے پتر!" ڈرائیور نے کہا "باہر نکل کے دیکھ اندھے۔ تیرا باپ آیا ہے۔"
"معاف کریں وی نال لیا ندا ہے؟" اندر والا ہنسا اور اس نے پھاٹک کھول دیا۔ ٹرک گزرا تو اس نے پھاٹک پھر بند کر دیا۔ میں اوپر سے احاطے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس میں دوسرا کوئی ٹرک نہیں تھا۔ ایک پرانی طرز کی ولایتی جیپ اس برآمدے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی جس کے پیچھے چار پائی

دکھائی دے رہے تھے۔ کوئی شخص برآمدے میں کھڑا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ اندھیرے میں ہر کش کے ساتھ سگریٹ کی چنگاری زیادہ فروزاں ہو جاتی تھی۔ عورت اتری اور اندر چلی گئی۔

"ٹرک کو یہاں کیوں لائے ہو؟" ڈرائیور سے کہا۔

"اور کہاں لے جاتا جی؟" ڈرائیور نے کہا۔

"کیا سب تھا سن کھا گئے ہیں؟" وہ شخص برہمی سے بولا۔ "معلوم نہیں کہ یہاں چھاپا پڑ سکتا ہے۔ اس رانا شمشاد علی نے خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ کسی نے تمہیں بتایا نہیں؟"

ڈرائیور ہنسنے لگا۔ "بڑے سیدھے ہو حاجی؟ آپ تو شمشاد ہو... رانا اب کہاں؟"

"کیوں... اس کا ٹرانسفر ہو گیا ہے کیا؟"

"ٹرانسفر ایسا ویسا۔" ڈرائیور نے کہا۔ "سیدھا دوسری دنیا میں۔ مرنے والے کو گالی دے کے کیوں گناہگار ہوتے ہو؟"

"دیکھو سائیں... مجھے کوئی اطلاع نہیں۔"

"یار بڑے افسوس کی بات ہے۔ کیا ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟"

"جھوٹی اطلاع تمہیں بھی تو مل سکتی ہے۔" وہ بولا۔

"حاجی صاحب دے سکتا مجھے جھوٹی اطلاع؟"

"حاجی صاحب... اس نے خود کہا تھا تم سے؟"

"تم شرمیلی جی سے پوچھ لو۔" ڈرائیور نے برہمی سے کہا۔ "اور اگر ایسی نگہداری پر شکے ہو تو میں چلا جاتا ہوں۔ تو حرام دے ہو... تو ابھی تک مرا پڑا ہے اوپر۔" پچھلے اترو۔ ڈرائیور بھی اسی دروازے سے اندر چلا گیا جس سے عورت اندر گئی تھی۔ باہر کھڑا ہوا شخص بھی آہستہ آہستہ چلتا اور اس کے پیچھے غائب ہو گیا۔

میں ایک دم پیچھے اتر آیا۔ چند سیکنڈ بعد میں ان کمروں کی قطار کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ پچھلی طرف ہر کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ یہ پیچھے نظر آنے والے بڑے بڑے کمرے تھے۔ میں نیچے جھک کر پہلی کھڑکی تک پہنچا اور پھر تھوڑا سا اٹھا۔ اندر صرف اندھیرا تھا اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورنے کے باوجود کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کوئی چارپائی چرچرائی اور میں نے چوڑیاں کھنکنے کی آواز سنی۔ پھر سناٹا چھا گیا اور رفتہ رفتہ کسی نے خراٹے لینے شروع کیے۔ خراٹوں کی آواز مردانہ تھی۔ "ایک مرد ایک عورت؟" میں نے سوچا۔ ایک عورت ابھی ابھی اندر گئی ہے جسے ڈرائیور نے شرمیلی کہا تھا۔ راستے میں وہ اسے جلیل کہہ کے پکارتی ہے۔ بے تکلفی جتا رہا تھا اور فاتحانہ اس کے ساتھ کچھ فاسقانہ اشتراک بھی کر رہا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی وہ اس کے لیے فریبی بن ہو گئی۔ تو کیا وہ مسلمان نہیں تھی؟

میں تھوڑا سا آگے بڑھا اور دوسرے کمرے کی کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ خاموشی یہاں بھی گہری تھی اور اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا لیکن میں نے انتظار کیا اور دو منٹ بعد اس کا فائدہ ہوا۔ کوئی عورت گہری نیند میں گنگنائی۔ آخر شب کی نیند یا تو بہت پکی تھی یا وہ خواب دیکھ رہی تھی۔ کسی مرد نے کہا: "کیا مصیبت ہے۔" میں تیسری کھڑکی پر پہنچا۔ یہاں ایک لالٹین رکھی ہوئی تھی جس کی لو انتہائی کم کر دی گئی تھی۔ برائے نام سی روشنی میں مجھے ایک پارٹیشن نظر آئی۔ کمرے کی اونچائی بارہ فٹ کے قریب تھی۔ چوڑائی بھی شاید اتنی ہی تھی لیکن لمبائی میرے اندازے میں اسی فٹ یا اس سے کچھ زیادہ تھی۔ اس لمبائی کو آٹھ فٹ اونچی تین دیواروں نے اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ کمرے میں چھ فٹ چوڑے اور بارہ فٹ لمبے تین کمرے یا کیبن بن گئے تھے۔ ہر کیبن اوپر سے کھلا ہوا تھا لیکن باہر کی طرف سب کے دروازے الگ تھے اور یہ دروازے بند تھے۔ لالٹین کی روشنی راہداری تک محدود تھی۔ کھڑکیاں کھلی رکھنے کا مقصد تازہ ہوا کی فراہمی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اندر کی تقسیم نے ایک بڑے کمرے کو تین افراد کے لیے قابل استعمال بنا دیا تھا اور جیسا کہ میں آوازوں کو سننے کے بعد سوچنے پر مجبور تھا، یہ ایک پرائیویٹ عشرت کدہ، نائٹ کلب یا ایسی ہی کوئی جگہ تھی جہاں پر بدقماش مرد اور بدکردار عورتیں اکٹھے ہوتے تھے۔

سوال یہ تھا کہ اس دور افتادہ گاؤں میں جہاں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے ائیر کنڈیشنر تو کیا پنکھے تک نہ تھے اور عیاشی کے اسباب بھی محدود تھے، کس نے یہ سب اہتمام کیوں کیا تھا۔ میرے پاس زیادہ دیر یہاں رہ کے سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ بہت جلد ہونے کی بجائے بغیر جدوجہد کے راز خود بخود فاش ہو جاتا۔ اس دشمن کے قلعے میں میرا چھپنا بہت مشکل تھا جس کا پورا جغرافیہ بھی ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

سب سے زیادہ حیرت مجھے اس عورت پر تھی جو ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی۔ وہ کس اندھیرے کمرے میں غائب ہو گئی تھی۔ اس کے پیچھے جانے والا ڈرائیور کہاں گیا تھا اور جو شخص برآمدے میں پہلے سے موجود تھا وہ کہاں تھا۔ میں کسی کے باتیں کرنے کی آواز بھی نہیں سن رہا تھا۔ یہ فرض کرنا محال تھا کہ وہ سرگوشیوں میں گفتگو کر رہے ہوں گے۔ جب انہوں نے باہر خود بھی نہیں سمجھا تھا تو اندر ان کو ڈرنے کی ضرورت کیا تھی۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ اندھیرے میں ہی بیٹھے ہوں۔ ڈرائیور کو اور اس عورت کو سو میل تک ٹرک میں سفر کے بعد کم سے کم ایک پیالی چائے کی ضرورت ہوتی۔ اگر وہ سو گئے تھے تب بھی کپڑے وغیرہ تو بدلیں گے اور ایک دوسرے سے کوئی بات کیے بغیر ان کے سونے کا کیا سوال۔

صاف بات یہ نظر آتی تھی کہ وہ کسی زیر زمین کمرے میں اتر گئے جہاں وہ اطمینان سے بیٹھے ہوں گے۔ میرا ذہن اور ... موجود افراد کو بھی مختلف زاویۂ نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ سب غدار ہو سکتے تھے۔ ایسے بے ضمیر لوگ بھی ہو سکتے تھے جو پیسے کے لالچ کے چکر میں پھنس گئے تھے اور اب دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ عورت کو جال کے طور پر استعمال کرنے کا حربہ پرانا ہے۔ یہ عورتیں بھی شاید ہوں گی جو احمق مردوں یا ناتجربہ کار لونڈوں کو پھانستی ہوں گی اور جب وہ پھنس جاتے ہوں گے تو انہیں بلیک میل کیا جاتا ہو گا۔ اس ڈرائیور نے شرمیلی جی کہا تھا تو شاید سب اگل دیا تھا۔ میں ہی احمق تھا کہ اتنی دیر میں سمجھا۔

اس وقت میں نے طے کیا کہ اب واپسی کا راستہ اور دروازہ تو بند ہے۔ آگے بڑھنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ٹرک میں سے کوئی سٹین گن حاصل کر کے تان لینی چاہیے یا وہ ریوالور ہی کی قوت کے سہارے اندر داخل ہو جانا چاہیے۔ مجھے ڈرتے ڈرتے خیال آیا۔ اس نے اپنی سیٹ کے نیچے سٹین گن چھپا رکھی تھی۔ کیا اس ڈرائیور کے پاس اپنی حفاظت کے لیے کچھ نہیں ہو گا۔ میں تیزی سے کوئی آہٹ کیے بغیر واپس ہوا۔ ٹرک تک جاتے ہوئے میں نے افق پر سفیدی کو پھوٹتا دیکھا۔ یہ صبح کاذب تھی۔ کچھ دیر کے لیے پھر اندھیرا غالب آئے گا اور اس کے بعد صبح آئے گی۔ سونے والے جاگ اٹھیں گے۔ دو چار گھنٹے بعد مجھے پناہ دینے والا اندھیرا بھی نہ ہو گا۔ میں نے ٹرک کا دروازہ کھولا تو اس کی آواز سے خود ہی ڈر گیا۔ لیکن اب ڈرنے اور رک کر بیٹھنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے سیٹ اٹھائی اور پھر ٹٹول کر دیکھا۔ ابھی تک باہر کوئی نہیں آیا تھا۔ میرا ہاتھ فوراً سیٹ کے نیچے گیا اور جب سٹین گن کے ساتھ باہر آیا تو میرا حوصلہ دگنا ہو گیا۔ میں اسی طرح جھکے جھکے واپس ہوا۔

پہلی کھڑکی سے اندر اترتے ہوئے میں نے پوری احتیاط سے کام لیا۔ میں قبل از وقت خون خرابے کے حق میں ہرگز نہیں تھا۔ میں نے پنجوں پر چلتے ہوئے راہداری میں آگے بڑھنا جاری رکھا اور ایک ایک دروازے کو آہستہ سے دبا کر دیکھا۔ وہاں ایک سے بارہ دروازے تھے اور ہر دروازے کے پیچھے کا منظر میں چشم تصور سے دیکھ سکتا تھا۔ ساتواں دروازہ خلاف توقع پیچھے ہو گیا۔ میں نے اندر کسی چٹخنی کے گرنے کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ شاید وہ دروازہ کھلا رہ گیا تھا یا اندر سے اسے بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر اسے بھیڑ دیا گیا تھا۔ میں نے اسے تھوڑا سا اور دھکیلا اور دل ہی دل میں دعا مانگی کہ اس کے قبضے آواز نہ کریں۔ دروازہ کچھ اور کھل گیا۔ بہت آہستہ آہستہ میں نے اپنا راستہ بنایا اور اس کیبن میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں ایک ہی ڈبل بیڈ تھا مگر اس پر سونے والے وہ دو تھے جو ایک جان دو قالب ہو رہے تھے۔ اس منظر نے میرے ذہن کو غیر متوقع مدد نہیں پہنچائی کیونکہ میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا اور میرے جذبات میں کوئی ہلچل نہیں ہوئی کیونکہ میں اس وقت آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور دماغ سے سوچ رہا تھا۔ میرا جسم عمل کے لیے پوری طرح مستعد تھا لیکن اس عمل میں دل کے جذبات کا ذرا بھی دخل نہ تھا۔

دروازے کو پھر اسی طرح بھیڑ کر کہ وہ باہر سے دیکھنے والے کو بند نظر آئے، دوسرا مشکل مرحلہ تھا جو میں نے کامیابی سے سر کیا۔ پھر میں سونے والوں کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ لڑکی بیس بائیس سال کی اور خاصی دلکش تھی۔ اس کا رنگ مجھے اندھیرے میں سانولا سا لگا۔ مرد بھی اسی کا ہم عمر معلوم ہوتا تھا۔ میری آنکھیں اب اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو رہی تھیں۔ جھک کر دیکھنے سے مجھے لڑکی کے ماتھے پر بندیا نظر آئی۔ اس نے میرے لیے فیصلے کو آسان بنا دیا۔

میں نے صرف ایک وار کیا۔ لڑکی کا جسم تڑپا۔ مرد ایک دم ہڑبڑا کے اٹھا تو میں نے اسے یوں دبوچ لیا کہ اس کے حلق سے آواز باہر نہ نکل سکے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس عورت کو دیکھتا رہا جس کا بے لباس اور بے آبرو جسم موت کے کرب میں بل کھا رہا تھا۔ میرے وار نے اس کی گردن توڑ دی تھی۔

"دیکھو... میں نے اس حرافہ کو مار ڈالا ہے۔" میں نے سسکتے ہوئے نوجوان کے کان میں سرگوشی کی۔ "اس طرح میں تمہاری گردن بھی توڑ سکتا ہوں لیکن میں تمہاری جان بخشی بھی کر سکتا ہوں۔ اگر تم خاموش رہنے کا وعدہ کرو اور میرے ساتھ تعاون کرو۔"

لڑکی کا جسم اب ساکت ہو گیا تھا۔ چنانچہ میری گرفت میں بے بس نوجوان کے لیے میرے الفاظ پر یقین نہ کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میں نے سٹین گن ایک طرف رکھ کے ریوالور نکال لیا۔ ریوالور کی نال کو اس کے سر سے لگا کے میں نے اس نوجوان کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت بیٹھا لرز رہا تھا۔ اسے اپنی برہنگی کا قطعی احساس نہ تھا۔

اچانک میرے کانوں نے ایک زنانہ ہنسی کی صدا سنی۔ پھر کسی مرد نے کہا: "وہ کمینہ حرام دا پتر... وہ تمہارے ساتھ آیا تھا تو اندر کہاں غائب ہو گیا۔ تلاش کر والے... سب جگہ دیکھو۔"

اس آواز پر میرا لہو میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ کیونکہ اس آواز کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔

یہ آواز استاد پیلدو کی تھی جو میں نے طویل وقفے کے بعد سنی تھی لیکن اس نام سے اور اس آواز سے میری زندگی کی اتنی ہی اذیت یادیں وابستہ تھیں کہ میں ہزاروں کے مجمع میں اس آواز کو پہچان سکتا تھا۔ دس سال یا بیس سال بعد بھی میرا ردعمل مختلف نہ ہوتا۔ نفرت کی پرانی آگ میرے وجود کو جلانے لگی اور میرے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی کہ میں سٹین گن لے کر باہر نکلوں اور اس کے ناپاک جسم کو چھلنی کر دوں۔ اس طرح کہ جسم میں دوڑنے والے گندے خون کا ایک ایک قطرہ بہہ جائے۔ مگر میں نے آسانی سے اس خواہش کو تھپک کر سلا دیا۔ "ابھی نہیں..." میں نے دل کو سمجھایا۔ "ابھی کچھ کام باقی ہیں جو ذاتی انتقام کی خواہش سے زیادہ بڑے اور اہم ہیں۔ پیلدو ایک آدمی ہے۔ اسے ایک گولی ختم کر دے گی مگر اس کے مرتے ہی وہ سب شکاری روپوش ہو جائیں گے جو ہماری نظروں میں ہیں اور وہ اپنی شکار گاہیں بدل لیں گے۔"

"جاؤ سائیں... کیا میرا منہ دیکھتے رہو گے۔" پیلدو نے بگڑ کے کہا۔

"ہاں جی... دیکھتا ہوں۔" سائیں نے کہا۔ "مجھے ڈر ہے..."

"کیا ڈر ہے؟" پیلدو نے اس کے اچانک چپ ہو

جانے پر کہا۔
"کہیں وہ پیچھے نہ رہ گیا ہو؟"
"پیچھے کہاں؟"
"یہ تو پتا نہیں... وہ راستے میں ایک جگہ اُترا تھا۔" سائیں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
"کیوں اُترا تھا؟"
"سڑک پر سے رکاوٹ ہٹانے کے لیے۔" سائیں بولا۔ "ایک خشک درخت کا تنا پڑا ہوا تھا۔ شاید کسی ٹرک سے گرا ہو گا۔"
"کیا بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو۔ درخت سامنے پڑا ہو گا۔"
"ہاں... اچانک سامنے آ گیا تھا۔"
"یار تو کیا تم اس کے اوپر سے گزر کے آ گئے...؟"
"او نہیں استاد... بھئی ایسا ہوتا ہے... وہ کبھی پیچھے آ رہا ہے تو میں اندازہ کر لیتا ہوں کہ پیچھے چڑھ گیا ہو گا۔ ہوشیار لڑکا ہے اور دوڑ کے چڑھ جاتا ہے..."
"مطلب یہ ہے کہ تم فرض کر لیتے ہو... کہ وہ چڑھ گیا ہو گا۔ تصدیق نہیں کرتے اور ٹرک پہلے ہی چلا دیتے ہو؟" پیڈرو نے برہمی سے کہا۔
"میں... کیا... سب ہی ایسا کرتے ہیں جی..."
"سب کو گولی مارو... جاؤ اور دیکھو وہ تمہارے ساتھ پہنچا بھی ہے یا نہیں۔" پیڈرو نے کہا۔ "کہیں اُسے جنگل میں تو نہیں چھوڑ آئے۔ وہ دوڑتا رہ گیا ہو تمہارے پیچھے... تم نے تو اس کی آواز تک نہیں سنی ہو گی... بہت ستی ہیں یہ تم... مجھے زلزلہ نے ملایا ہے..."
"آپ اس بچری کی بات مت کرو جی۔" ڈرائیور نے اپنی عزت بچانے کے لیے کہا۔ "مستی میں تو وہ خود تھی۔ میں تو اُسے منع کرتا رہا کہ آرام سے بیٹھے... میں ٹرک چلا رہا ہوں مگر..."
"چھوڑو یہ اگر مگر... جاؤ لونڈے کو دیکھو۔"
"یو جی فکر نہ کریں استاد جی... اوّل تو وہ میرا خیال تھا... ایسا کبھی پہلے نہیں ہوا... مگر بندہ بشر ہے... کہیں پیچھے رُک گیا ہو ذرا سی دیر کے لیے... پیر میں کانٹا لگ گیا ہو... یا پیشاب کرنے بیٹھ گیا ہو... وہ آ گیا ہو گا تو آ جائے گا... وہ آنا ہے... سڑک اور ناواقف بھی نہیں ہے کہ یہاں نہ پہنچ سکے... کسی بھی پیچھے آنے والے ٹرک میں بیٹھ سکتا ہے۔"
"سامنے ٹرک یہاں نہیں آتے۔" پیڈرو بولا۔
"ہاں... مگر سڑک تک تو آ سکتا ہے... آگے یہ دس میل کا راستہ ہے۔" سائیں بولا۔ "پیدل سفر کرے گا۔"
"بچو اس بند کرو اپنی... اگر وہ نہیں ہے تو اُسے لینے کے لیے جاؤ۔ یہاں میرے سامنے کھڑے ہو کے کتے کی طرح بھونکتے مت رہو۔" پیڈرو نے دہاڑ کے کہا۔
"زیادہ گرمی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے... میں کتا ہوں تو حاجی کا تمہارا دیا نہیں کھاتا۔" سائیں مشتعل ہو گیا۔
"حاجی کس کا دیا کھاتا ہے... یہ معلوم ہے؟" پیڈرو غرّایا۔
"مجھے کوئی ضرورت نہیں معلوم کرنے کی۔" سائیں نے کہا۔ "تم میرے ساتھ انسانوں کی طرح بات کرو۔ ایسے میں نے اپنے باپ کی بھی باتیں نہیں سنی تھی... تم میرے باپ یا آقا نہیں ہو... تم خود بھی کسی کے کتے ہو۔"
پیڈرو نے اُسے ایک گالی دی۔ بات بہت بڑھ گئی تھی اور وہ دونوں گتھے ایک دوسرے کے گریبان کے درپے ہو گئے تھے۔ غالباً ان کے درمیان پہلے سے اختلاف اور رنجش کے اسباب موجود تھے۔ پیڈرو خود کو بڑا اور زیادہ طاقتور حریف ثابت کرنے کے سبب یہ حادثہ مرنا چاہتا ہو گا، مگر شاید میں جو تھا سو وہاں گیا۔
سائیں نے جواب آں غزل کے طور پر پیڈرو کو زیادہ مرچ گالی دی اور اگلے چند سیکنڈ میں نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ پیڈرو نے ریوالور پر جھٹکا لیا یا ڈرائیور نے پیڈرو پر... میں ایک فائر کے دھماکے پر اُچھل پڑا۔ اس نوجوان نے چلا کے کہا۔ "قتل... قتل ہو گیا..."
میں نے ریوالور اس کے منہ میں ڈال دیا۔ "ابھی تمہارا قتل ہو جائے گا۔ منہ بند رکھو اپنا۔"
وہ کوئی بنگالی تھا۔ اس کے لہجے اور الفاظ سے یہ عیاں تھا کہ اس کی گنجائش نہ چھوڑی کہ وہ علیحدگی پسند غداروں کے ٹولے کا آدمی تھا۔ وحشی کا شکن کر وہ آمادہ حواس ہوا تھا کہ میری ہدایات پر عمل کرنا بھول گیا تھا اور بے اختیار چلانے لگا تھا۔ دوسرے خلوت خانوں سے کئی مردوں عورتوں کی ملی جلی چیخیں ابھریں۔ اس کی آواز دب گئی تھی۔ اس کی طرح دوسرے داد عیش دینے والے بھی دہشت زدہ ہو گئے تھے۔
"سب اندر چلو..." پیڈرو نے چیخ کر کہا۔ "خبردار جو کوئی باہر آیا... میں گولی مار دوں گا سب کو..."
خوف اور سراسیمگی کے مارے ہوئے واپس دوڑے۔ دروازے دھڑ دھڑ کرکے بند ہوئے۔ ایک عورت ہسٹریائی انداز میں چلانے لگی۔
"کھون... کھون..."
"چپ... شٹ اپ... بڑکی۔" کسی مرد نے کہا۔ "تیرے باپ کا کھون ہوا ہے جو اتنا شور کر رہی ہے۔" عورت کی آواز بند ہو گئی یا کر دی گئی۔
پیڈرو کی آواز تھمنے کے بعد مجھے بالکل شک نہیں رہا تھا۔ اس مختصر اور اچانک شروع ہو جانے والی جنگ میں شکست کس کی ہوئی تھی۔ ڈرائیور مارا گیا تھا اور میں باہر جھانکے بغیر چشم تصور سے اس کی لاش کو وہاں پڑا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ یہ صورتِ حالات بجی طور پر میرے حق میں ہو گئی تھی کیونکہ جسے میں نے پہلے ٹرک سے برآمد کرنا چاہا تھا وہ پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ ڈرائیور اب مارا گیا تھا، چنانچہ عجیب تری ہو گی کا راز افشا ہونے کے امکانات وقتی طور پر معدوم ہو گئے تھے۔
وہ بنگالی جس کے منہ میں ریوالور کی نال تھی، سانس روکے بیٹھا تھا۔ تھرتھر کانپ رہا تھا اور بے ہوش ہو کر گرنے والا تھا... اُسے زیادہ ڈر یہ ہوگا کہ مجھ سے غیر ارادی طور پر ٹریگر نہ دب جائے۔
میں نے ریوالور باہر نکال لیا۔ "جو خدمت کرنا ہے؟" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اپنی زندگی کی قیمت خود تمہیں ہو گی۔ مجھے اتنی زیادہ نہیں ہے۔"
"میری غلطی ہو گئی۔" وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ "معافی دو بابا۔"
"بابا؟... میں بابا نظر آتا ہوں تمہیں؟" میں نے اُسے گھور کے کہا۔
"نہیں... ہم ایسا نہیں بولا... تم نہیں ہم بابا۔" وہ بکنے لگا۔ "یہ سالا لوگ ہم کو پھنسایا۔"
میں نے اُسے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش ہو جانے کو کہا کیونکہ باہر بہت افراتفری تھی۔ لذت خواب عشرت سے بیدار ہوتے ہی خوف اور دہشت کے عذاب سے دوچار ہونے والے سہمے ہوئے تھے اور آخری شب کے بستر کو پیوں سے نکل پڑا پھٹے تھے۔ بعد ازاں پیڈرو کی آواز تھی۔ جواب بھی سنائی دے رہی تھی۔ "اُٹھا لو اس کتے کی لاش اور باہر لے جاؤ۔"
"باہر کہاں...؟" کسی نے پوچھا۔
"پچھلی طرف... جہاں کل اس لڑکی کو گاڑا تھا۔" پیڈرو بولا۔ "اسی قبر کو کھود لو... مٹی ابھی نرم ہو گی۔ دوسری قبر کھودو گے تو زیادہ وقت لگے گا۔"
"ٹھیک ہے جناب۔" حکم کا غلام بولا۔
"اوئے بے وقوف... اس طرح مت اُٹھاؤ۔" پیڈرو نے کہا۔ "کیا سارے راستے خون ٹپکاتے جاؤ گے؟... دری لاؤ کوئی... اس میں لپیٹ کر اُٹھاؤ۔"
"دری تو یہاں کوئی نہیں..."
"نالائق کے بچے... کسی بھی کمرے میں سے دری نکال لو..." بہت پریشان کن لہجے میں پیڈرو بولا۔ "سب جاگے ہوئے ہیں... اور دیکھو... وہ دری کا کفن بھی ساتھ ہی دفنا دینا مٹی میں... یہ نہ ہو کہ مت لالچ کر کے وہ دری واپس لے آؤ۔"
"جی جناب۔" یہ دوسرے حکم کے غلام کی آواز تھی۔
"اس کے بعد واپس آؤ اور یہ فرش کیلے کپڑے سے رگڑ کے اچھی طرح صاف کرو... نشان نظر نہ آئے۔"
"جی جناب..."
"کیا جی جناب جی جناب لگا رکھی ہے... جاؤ... دفع ہو جاؤ... مرو اپنی جگہ سے..." پیڈرو نے دہاڑ کر کہا۔ "کہیں وہ حرام زادہ لونا نہ آ جائے اپنے استاد جی کے پیچھے... دیر کر دو گے تو وہی قبر تیسری بار کھودنی پڑ جائے گی... میں نہیں چاہتا کہ وہ استاد جی کی موت یا تدفین کا چشم دید گواہ بیٹھے۔"
"مگر جناب... وہ پوچھے گا کہ ٹرک تو کھڑا ہوا ہے۔ استاد جی کہاں ہیں؟"
"اُسے میں جواب دے دوں گا... کہ وہ ٹرک کو یہاں چھوڑ کے کسی سے ملنے گیا تھا کسی عورت سے۔ اس کے ناجائز مراسم تھے۔ وہ اس کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ ایک بہت بڑے اور بوڑھے زمیندار کی بیوی ہے۔" پیڈرو کسی حکم کے غلام سے نہیں بلکہ خود سے ہم کلام تھا اور یہ کیفیت اس کے ذہنی انتشار کی غماز تھی۔
"واہ جناب... کیا دماغ پایا ہے۔" پہلا غلام بولا۔ "سمجھنے والے خود ہی سمجھ جائیں گے کہ وہ کیوں واپس نہیں آیا۔"
"ہاں۔" پیڈرو کے لہجے میں کچھ اطمینان آ گیا۔ "مگر تم دونوں بھی سمجھ لو کہ تمہیں بھی یہی کہنا ہے... میرا ساتھ دو گے تو فائدے میں رہو گے..."
"ہماری طرف سے بے فکر رہیں جناب... لیکن یہ دو جستہ... ان کو چھوڑ دو... یہ کل چلے جائیں گے... ان کی جگہ نئے...؟ جائیں گے نہ انھیں کسی کا نام اور کام معلوم ہے... نئے آنے والوں کو معلوم ہو گا۔" پیڈرو بولا۔ "شاباش، اب جلدی کرو... اور یہ لو... ایک ہزار تمہارے... اور ایک ہزار تمہارے... ابھی یہی ہیں میرے پاس... بعد میں اور انعام ملے گا۔"
صاف ظاہر تھا کہ پیڈرو ڈرا ہوا ہے۔ وہ اس قتل پر پردہ ڈالنے کے انتظامات اسی لیے کر رہا تھا کہ وہ خود کو الزام سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ سائیں کوئی عام ڈرائیور نہیں تھا کیونکہ وہ ایک خاص آدمی کا اثر والا خاص تھا۔ حاجی اس کے قاتل کو آسانی سے معاف نہ کرتا۔ پیڈرو کی پشت پناہی کرنے والے یقیناً طاقتور لوگ تھے مگر انھوں نے بھی پیڈرو کو بے سبب قتل کرتے پھرنے کا کھلا لائسنس نہیں دے رکھا تھا۔
مجھے ان کی گفتگو سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ اس جگہ ابھی پیڈرو کی ماتحتی میں دو ہی افراد تھے، ورنہ وہ سارے کام انہی کے سپرد نہ کرتا... زیادہ مددگار ہوتے تو وہ دو کو تدفین پر مامور کرتا اور دو یا کم سے کم ایک کو خون کا سراغ مٹانے پر لگاتا لیکن اب جو کچھ کرنا تھا انہی دو کو کرنا تھا۔ ایک شخص کو میں نے رات کے اندھیرے میں دیکھا تھا جو سائیں کو ٹرک تک پہنچا تھا۔ دوسرا گیٹ پر متعین تھا۔

www.paksociety.com

تھا۔ اس طرح میرے حساب سے اتنے ہی افراد بھی ہو سکتے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ چوکیدار نے گولی چلنے کی آواز نہ سنی ہو مگر وہ اپنی ڈیوٹی کی جگہ چھوڑ کے نہیں آ سکتا تھا۔ یہ تھا خود پیڈرو تھا اور نرملا نام کی ایک عورت تھی جو کسی نامعلوم جگہ پر موجود تھی مگر گولی کی آواز سن کے بھی نہیں آئی تھی تو اس کے متعدد اسباب ہو سکتے تھے۔ وہ گہری نیند میں تھی یا کسی ساؤنڈ پروف کمرے میں تھی یا ڈر کے مارے باہر نہیں نکلی تھی۔

میں نے اس بنگالی کو دیکھا جس نے دھوتی اور لنگی باندھ لی تھی اور اس نے شاید ابھی کچھ نہیں پہن رکھا تھا۔ صبح کا اجالا اب باہر اجلی دھوپ کی خبر دے رہا تھا۔ اس روشنی میں میری نگاہ اس لڑکی کو بھی واضح طور پر دیکھ رہی تھی جو عورت کی میت میں بالکل بے سکون تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سر تکیے پر یوں رکھا ہوا تھا کہ رخساروں کے گرد بال پھیل گئے تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کبھی تھی۔ ہر عورت جو کسی بھی مجبوری پر خود کو بیچتی ہے طوائف کہلاتی ہے۔ مگر میرے نزدیک وہ بنگالی بھی طوائف تھا۔ اس نے بھی خود کو اسی سکۂ رائج الوقت کی خاطر بیچا تھا جو اس عورت کو ملتا تھا۔ جسم کی قربانی دونوں کے لیے ناگزیر تھی اور فرق اگر تھا تو صرف قیمت کا... قیمت کا فرق بہرحال نہ تھا۔ بنگالی نے شاید خود کو ایک لاکھ میں بیچا ہو تو اس عورت نے ایک ہزار میں۔ دونوں بے غیرتی اور بے حیائی میں، دونوں کے جذبات ایک سے تھے۔

باہر اب قدرے خاموشی تھی۔ شاید دونوں حکم کے غلام اپنا اپنا کام کر چکے تھے اور پیڈرو ان کی کارکردگی سے مطمئن ہو کے کوئی دوسرا احکام نافذ کرنے کے لیے جا چکا تھا۔ میں نے دروازے سے ہٹ کے ایک پٹ کو تھوڑا سا کھینچا اور باہر جھانک کے دیکھا۔ راہداری میں کوئی بھی نہیں تھا۔ دائیں جانب ایک دروازے سے اندر پہنچنے والی دھوپ کا آدھا مستطیل حصہ فرش پر پھیل جانے والے خون کو روشن کر رہا تھا۔ خون کا آدھا داغ سائے میں تھا۔ ایک ہی شخص کے دو رنگ نظر آتے تھے۔ جس کا یہ خون تھا وہ کسی بے نشان مدفن کی مٹی میں ملنے کے لیے جا چکا تھا۔

اچانک میں نے نرملا کی آواز سنی۔ "چلیے بھئی آپ لوگ... اٹھ جائیے۔" اس نے تالی بجا کے حکم دینے کے انداز میں کہا۔ "سورجا... سادو تری... شیاما... چلو اٹھو... ناشتے کا وقت ہو گیا۔" وہ ہر بند دروازے پر دستک دیتی آ رہی تھی۔ دوسرے سب لوگ پہلے ہی جاگ چکے تھے اور صرف پیڈرو کے حکم کی تعمیل میں اندر بند بیٹھے تھے۔

"اس کا نام کیا ہے؟" میں نے سرگوشی میں بنگالی سے کہا۔

بنگالی نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم نہیں جانتا۔"

"اچھا اس عورت کو جواب دو... کہ تم جاگ گئے ہو۔" میں نے ریوالور ہلا کے کہا۔ "اور تمہارا جواب غلط ہوا تو انجام بھی غلط ہوگا۔"

میں نے دروازے کو اندر سے دبا کے رکھا۔ باقی دروازے کھل رہے تھے اور ان باہر نکلنے والوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ بالآخر نرملا نے اس دروازے کے پٹ پر ہاتھ مارا۔ میں نے بنگالی کے سر کو اشارہ کیا۔

"چلو اب باہر آ جاؤ... کوئی خطرے کی بات نہیں۔" نرملا بولی۔

"آتا ہے دیدی۔" بنگالی نے ریوالور پر نظر جما کے اونچی آواز میں جواب دیا۔ نرملا مطمئن ہو کے لوٹ گئی۔ اس کی چپل کی ٹپ ٹپ فرش پر تال دیتی ہوئی نرملا کے دور ہو جانے کی خبر کرتی گئی۔

"تم نے ایک رات اس عورت کے ساتھ گزاری اور نام پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔

"ہم پوچھا تھا۔" بنگالی بولا۔ "اس نے نہیں بتایا۔ بولتی تھی نام جانتی ہے۔"

"کیوں؟" میں نے چونک کر لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"بولتی تھی... ہم مر گیا ہے۔" بنگالی نے کہا۔ "ہم وہ لڑکی نہیں جس کا کوئی نام ہو... پہلے نام تھا، گھر تھا اور ماں باپ تھا۔ اب کچھ نہیں ہے۔"

"اور... تم نے...؟" کوئی چیز میرے حلق میں اٹکنے لگی۔

"ہم بولا کہ یہ کیا بات ہے؟ ہم کو اپنا گھر اور ماں باپ کے بارے میں بتاؤ... یہ بولا کہ نہیں... ہم کچھ نہیں بتائے گا۔ اللہ ناراض ہوگا... خراب نہیں کرے گا... ہم تو مر گیا ہے مگر ان لوگ کو جینا ہے۔ ایسا ویسا سوال مت کرو... ہم سچ نہیں بولے گا... روز ہم ایک جھوٹا اسٹوری سناتا ہے اور اب کوئی اسٹوری بھی نہیں ہے۔ سب تنگ کرتا ہے۔ ہمارا بارے میں پوچھتا ہے... ہم کو کیا نہیں چاہیے... ہم بھی کسی سے نہیں پوچھتا ہے کہ تم کون ہے۔ تم بھی مت پوچھو۔"

میرے ہاتھوں ماری جانے والی لڑکی مرنے سے پہلے ہی مر چکی تھی۔ وہ خود کو لاش سمجھتی تھی اور اب ایک لاش ہی تھی۔ جس طرح وہ اپنے کسی خریدار کا نام و نسب نہیں پوچھتی تھی اسی طرح مرنے سے پہلے اس نے اپنے قاتل کے بارے میں کچھ نہیں جانا تھا۔ رنج و ندامت کے احساس سے بوجھل ایک سرد آہ خود بخود میرے سینے سے نکل گئی۔

"تم خود کون ہو؟" میں نے کہا۔

"ہم طاہر میاں۔" وہ بولا۔

"گویا مسلمان اور پاکستانی۔" میں نے تلخی سے کہا۔

وہ چپ چاپ کھڑا رہا... اسے خوف ضرور لاحق تھا کہ میرے ہاتھوں اس کا انجام کیا ہوگا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ شرمندہ

نہیں ہے۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"بنگورشس..." اس نے کہا۔

میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور میرا الٹا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا۔ وہ پیچھے لاش کے اوپر گرا۔ آس پاس کے کمرے خالی ہو چکے تھے چنانچہ اس طمانچے کی آواز کسی نے نہیں سنی۔ وہ چلانے ہی والا تھا کہ میں نے پھر اس کے منہ میں ریوالور گھسیڑ دیا۔

"تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ تعاون کرو... مجھے ہر بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔" میں نے کہا۔ "اس لڑکی کے ساتھ ہی میں تمہاری گردن بھی توڑ سکتا تھا۔ تمہیں یہ رعایت اسی شرط پر مل سکتی ہے... ورنہ تمہاری جگہ دوسرا لے سکتا ہے۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔

"اسے ہٹاؤ اب وہ" میں نے آہستہ سے پیچھے ہٹ کے کہا۔ اور مجھے غالب کا شعر وہ یاد آیا۔ "تو تھا پاکستان نے وارث جو بیدردی" میں ورنہ ہر پاس میں غائب وجود تھا۔ یہ بات اس لڑکی پر بھی صادق آتی تھی۔

طاہر میاں نے چادر کو پھر لاش کے اوپر تک کھینچ دیا۔

"میں اپنا سوال دہراتا ہوں... کہاں کے رہنے والے ہو تم؟"

"مشرقی بنگال..."

میں نے پھر اس کے منہ پر ویسا ہی الٹا ہاتھ مارا۔ "مشرقی پاکستان کہو... میں آخری بار پوچھوں گا اور اس مرتبہ غلط جواب ہوا تو اپنی گردن کے ٹوٹنے کی آواز بھی شاید نہ سن پاؤ۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"مشرقی... پاکستان کا..." وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے بولا۔

"مشرقی پاکستان کے کس شہر، ضلع یا دیہات کے...؟"

"چاٹگام۔" اس نے مختصر ترین جواب دیا۔

"کتنے عرصے پہلے یہاں آئے تھے؟"

"ایک مہینہ ہوا۔" وہ بولا۔

"اکیلے آئے تھے؟ یا ان سب کے ساتھ؟" میں نے دوسرے خالی کمروں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہم اکیلا آدمی آیا تھا۔" وہ بولا۔

یہ آدمی مجھے بہت کچھ بتا سکتا تھا لیکن میرے پاس وقت کم تھا۔ جو لوگ نہا دھو کے ناشتہ کرنے گئے ہوئے تھے انہیں اچانک خیال آ سکتا تھا کہ ان کے دو ساتھی غیر موجود ہیں اور کوئی بھی ان کو جگانے کے لیے آ سکتا تھا۔ اگر کوئی آ جاتا تو اس کیمپ میں کسی دشمن کی موجودگی کا راز ایک لاش کی ٹوٹی ہوئی گردن سے فاش کر دیتی۔

"اس وقت سب لوگ کہاں ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"کچن میں..." وہ بولا۔ "ناشتے کے لیے۔"

"کچن کہاں ہے؟"

"آخری حصے میں۔" بنگالی نے کہا۔ "سیدھا ہاتھ پیچھے۔"

"اگر میں باہر جانا چاہوں۔" میں نے کہا۔ "تو میرے لیے کون سا راستہ محفوظ ہوگا؟"

"سامنے سیدھا ہاتھ پر دروازہ ہے۔ اس میں سے باہر جاؤ اور دیوار کے اوپر سے کود جاؤ۔" وہ بولا۔

"مجھے کوئی نہیں دیکھے گا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"نہیں..." وہ بولا۔ "ادھر کوئی نہیں ہوتا۔ اس وقت سب"

"باہر دو آدمی ایک قبر کو دوبارہ کھود رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ ادھر نہیں ہے۔" بنگالی نے کہا۔ "تم مشرق کی طرف کو جائے گا، وہ سیدھے ہاتھ پر جنوب کی طرف والی دیوار کے پیچھے ہے۔"

"اچھا۔" میں نے کہا۔ "تو پھر اٹھاؤ اس لاش کو، ہم سب اسی راستے سے نکلیں گے۔"

بنگالی کا رنگ پھر اڑ گیا۔ "تم جاؤ بابا... ہم کو چھوڑ دو۔"

میں نے اس کی گردن یوں دبوچ لی کہ اس کا سانس رکنے لگا اور آنکھیں باہر نکل آئیں۔ "تم کو میرے ساتھ جانا ہے یا دنیا سے جانا ہے؟"

بلاشبہ وہ ایک بزدل آدمی تھا مگر غدار، لالچی، کمینہ اور بزدل ہوتا ہے وہ وطن کی خاطر جان دینے سے ڈرتا ہے۔ بنگالی نے بڑی مشکل سے سر ہلا کے رضامندی کا اظہار کیا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ ابھی وہ لاش کو چادر میں لپیٹ کر اٹھانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ باہر سے زنانہ سینڈل کی ٹھک ٹھک سنائی دینے لگی۔ نرملا کسی سے باتیں کرتی ہوئی آ رہی تھی۔

"بس وہی دونوں سوئے پڑے ہیں۔"

"تم جگاؤ انہیں اور تیار کرو۔" پیڈرو نے کہا۔ "میں ذرا گاڑی لے کر جاتا ہوں۔"

"زیادہ دیر مت کرنا۔" نرملا بولی۔ "ان سب کو آج جانا ہے۔"

"میں بس گیا اور آیا۔" پیڈرو بولا۔ "زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں... مجھے سڑک تک جا کے بوڑھے کو دیکھنا ہے۔ وہ پیدل آنے والا تو ہے نہیں... بیٹھا ہوگا سڑک کے کنارے اس انتظار میں کہ کوئی آئے اور لے جائے۔"

"کون ہے یہ بوڑھا؟"

"وہی کلینر... جو ٹرک کے ساتھ تھا۔ وہی کام آ سکتا ہے اب... اسے ٹرک چلانا بھی آتا ہے اور یہ ذمہ داری بھی سونپی جا سکتی ہے۔"

"تم کو جو مناسب لگے، ٹھیک ہے۔"

"وہ بھی حاجی کا خاص آدمی ہے۔ میں بوڑھے کو سمجھا لوں گا

www.paksociety.com

کر اُسے کیا حاصل ہو جاتا ہے۔" پیڈرو بولا۔

"اگر وہ راضی نہ ہوا..." نرملا نے کہا۔ وہ دونوں شاید دروازے کے سامنے ٹھٹھک گئے تھے۔

"راضی کیوں نہیں ہوگا۔ اسے ڈرائیور بننے کا موقع ملے گا۔ میری طرف سے دس ہزار کی رشوت ملے گی۔" پیڈرو بولا۔ "عرف بھی کہتا ہے آپ کے ڈرائیور ساتھی کو اس کا ضمیر گوارہ کرنے لگا تھا اور وہ ٹرک سمیت کسی تھانے میں حاضر ہونے کی سوچ رہا تھا چنانچہ میں نے اُسے مار دیا اور ٹرک میں اس کی لاش یہاں لے آیا۔ لاش ہم دکھا سکتے ہیں حامی کو۔ وہ ایک نمک حرام کے مارے جانے پر خوش ہوگا اور بدلے کو اس کی جرأت اور فرض شناسی پر انعام ملے گا۔ بڑا یقیناً ہم سے تعاون کرے گا۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

"میری واپسی تک سب کو تیار رکھنا۔" پیڈرو نے کہا اور شاید باہر نکل گیا کیونکہ اس کی آواز کچھ فاصلے سے سنائی دی تھی۔ نرملا سینڈل بجاتی آگے آئی۔ میں نے بنگالی کو اشارہ کیا کہ وہ لاش کے ساتھ ... جائے۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھا ... سے چند انچ کا فاصلہ رکھتے ہوئے لیٹ گیا۔

"بھئی کیا کھا کے سوئے ہو..." نرملا نے دروازہ بجاتے ہوئے کہا۔ "کیا اُٹھنے کا ارادہ ہی نہیں ہے..." وہ نہایت بے تکلفی سے ہنسی۔ "ارے بابا یہ تمہاری زندگی کی آخری رات تو نہیں تھی۔"

پھر وہ اندر آ گئی کیونکہ اُسے جواب نہیں ملا تھا۔ وہ یقیناً جانتی تھی کہ اس دروازے میں کنڈی اندر سے نہیں لگائی جا سکتی۔

وہ دروازے سے سیدھی بیڈ کی طرف گئی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا جو دروازے کے پیچھے تھا۔ یہ چند سیکنڈ کی مہلت تھی۔ اس کے بعد میں خود کو چھپا سکتا تھا اور نہ حقیقت کو... وہ ابھی بیڈ تک نصف راستہ ہی طے کر پائی تھی کہ میں نے ایک پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ چونک کر تیزی سے پلٹی اور ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ پر منجمد ہو گئی۔ میں نے اسی ایک لمحے میں اُسے دبوچنے کے لیے جست لگانے کی غلطی کی۔ غیر متوقع طور پر نرملا غوطہ مار کے پیچھے سے نکل گئی اور میں اپنے ہی زور میں بیڈ پر گیا تو اس لاش پر گرا جو ٹھنڈی ہو کے اکڑنے لگی تھی۔ بنگالی حلق سے عجیب سی آواز نکال کے اُچھلا مگر میں نے اُسے اہمیت نہیں دی۔ میں نے نرملا کو دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس کی پھرتی نے مجھے حیران بھی کر دیا تھا اور یہ سبق بھی پھر سکھا دیا تھا کہ حالات کیسے بھی ہوں، مجھے محتاط رہنا چاہیے اور اپنی طاقت کی برتری پر اندھا یقین رکھنے سے گریز کرنا چاہیے۔

میں گرتے ہی اُٹھا اور ابھی نرملا دروازے تک پہنچی تھی کہ میرے ہاتھ نے اُسے واپس اندر کھینچ لیا۔ اس نے ایک چیخ ... پھر میں نے اس کے سر پہ ریوالور کا دستہ مارا اور وہ بے ہوش ہو کر فرش پر گر گئی۔ اس ایک چیخ نے صورت حالات ... کمرے کے سناٹے کی جگہ باہر تک پھیل گئی۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس چیخ کو ان سب نے سنا ہوگا جو وہاں موجود تھے۔ کیمپ کے محافظ تو ضرور اس چیخ کا سبب جاننے کے لیے لپکے ہوں گے۔ وہ سب آئیں گے ... جو خود کو ... جسم ... رکھ چکے تھے۔ ابھی ... ریوالور کو کافی سمجھا تھا۔ ... نے ریوالور جیب میں ڈال کر شین گن اٹھانے کا ارادہ ... اسی وقت یہ خیال بنگالی کو بھی آیا کہ وہ میری شین گن مجھے ... لے۔

وہ شین گن اٹھا چکا تھا جب میں نے اس کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ کمرے کی مخالف سمت پیچھے ہٹتا ... شین گن کو سیدھا کر کے فائر کرنے کا موقع مل جاتا ... میں اس سے پہلے کچھ سوچنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ ... سے اسے دیوار کے ساتھ جا لیا۔ اس نے آخری وقت میں ... اُٹھا کے مجھ پہ مارنی چاہی لیکن میں نے وار کو اُلٹے ہاتھ ... پیٹ میں گھونسا مارا اور ایک جھٹکے میں شین گن چھین لی۔ وہ سمجھ گیا ... اس بغاوت کی سزا کیا ہوگی چنانچہ وہ چلانے لگا۔ "نہیں ... بچاؤ..." پھر میں نے سیدھا ہاتھ ... کر اس کی گردن ... سے اسے اپنی طرف کھینچا اور جب وہ آگے آیا تو میں نے ... گھٹنا اٹھا کے اس کے پیٹ پر مارا۔ وہ بلبلا کے دوہرا ہوا اور ... اٹھی ہوئی ٹانگ پہ ٹھٹک گیا۔ اس کا جسم کمان ہو رہا تھا اور ... درد سے تڑپ رہا تھا کیونکہ اس سے زیادہ تکلیف اس کے ... میں تھی ہی نہیں۔ میں نے ایک زوردار جھٹکا دیا اور اس کی گردن ایسے چٹخ کر ٹوٹی جیسے سوکھی ہوئی لکڑی ٹوٹتی ہے ... اور ساکت ہو گیا۔ اس کی گردن جو صرف گوشت پوست کے ... اور چمکدار رنگوں کے ساتھ جسم سے جڑی رہ گئی تھی ... لٹک گئی اور اس کا سر میرے گھٹنے کے اوپر سے دوسری طرف پنڈولم کی طرح جھولنے لگا۔

میں نے اُسے نیچے گرا دیا۔ یہ سب ایک منٹ ... وقت میں ہو گیا تھا۔ گناہ کی ایک رات کی مسافت میں ... سفر طے کرنے والے تھوڑے سے فرق سے راہِ عدم پر روانہ ہو ... تھے۔ شین گن تھامے میں نے دروازے کے قریب پوزیشن سنبھال لی جہاں نرملا بھی لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑی تھی لیکن مجھے باہر کسی قسم کی ہلچل محسوس نہیں ہوئی۔ بنگالی ... خوف سے ... گئی تھی لیکن نرملا ... شفاف تھی اور بیرک کے اندر آخری منظر سب ...

کوئی آیا کیوں نہیں؟ کیا اس ... نے یہاں ایسی چیخوں کو سننے والے ... تھے؟ یہاں ایسی چیخوں سے دل نہیں دہلتے تھے کیونکہ ... کسی کا رشتہ کوئی نہیں رکھتا تھا۔ یہ خود غرض جنونیوں کی دنیا تھی جس میں صرف اپنی ذات اور اپنے مفادات کا تحفظ اہم تھا۔ کون آیا اور کون گیا، کیوں گیا اور کیسے گیا... اور کہاں گیا... اس سے کسی کو کیا۔ شاید یہاں ہر روز ... والے چلاتے ہوں گے۔ کسی غلطی پہ ملنے والی سزا کے خلاف فریاد کرتے ہوں گے اور مدد کے لیے پکارتے ہوں گے۔ ... کوئی نہیں آتا ہوگا۔ حاکموں کا حکم ہوگا کہ خبردار جو کوئی دخل دے ... حقوق ... کا مرتکب ہوا۔ پیڈرو نے گزشتہ روز کسی لڑکی کے دفن کیے جانے کا ذکر کیا تھا۔ اسی قبر میں دوسرا مردہ ... جا رہا تھا۔ لیکن سب چپ تھے۔ وقتی طور پر جو اضطراب کی لہر اٹھی تھی اسے پیڈرو کی ایک ڈانٹ نے دبا دیا تھا۔ وہ اس چیخ کو ... بیٹھے ہوں گے۔ یہ سوچ کر رہ گئے ہوں گے کہ جو ہوگا سامنے آ جائے گا۔ انھیں کیا ضرورت ہے کہ دخل اندازی کا الزام لیں۔ لیکن محافظ... کیا انھوں نے بھی نرملا کی چیخ نہیں سنی تھی؟ میرے اندازے کے مطابق یہاں کم سے کم چار افراد تھے۔ ان میں سے پیڈرو گیا ہوا تھا۔ چوکیدار باہر کے گیٹ پر تھا۔ باقی دو قبر کھود رہے تھے۔ کسی کے بھی نہ آنے کے ظاہری اسباب میری سمجھ میں آ چکے تھے لیکن اصل اسباب مختلف بھی ہو سکتے تھے۔ محافظ چار کے بجائے تعداد میں ... بھی ہو سکتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ... میں وہ کسی خطرے کے خلاف موثر کارروائی کے لیے اقدامات میں مصروف ہوں۔

میں نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھول کے باہر جھانکا۔ مجھے باہر نکلنے کا راستہ صاف نظر آیا۔ خوش ہونا ... ابھی صاف نہیں ہوا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ دونوں حکم کے غلام ابھی ڈرائیور کو گاڑنے میں مصروف ہیں۔ میں نے نیچے پڑی ہوئی نرملا کو دیکھا اور ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا۔ مجھے پیڈرو کی واپسی سے پہلے ہی اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہیے ورنہ محصور ہو جانے کے بعد میں کچھ نہ کر سکوں گا۔

میں نے نرملا کو اُٹھا کے بائیں کندھے پر ڈال لیا... وہ گھبرائے ہوئے ... والی جوان لڑکی تھی لیکن بہت ہلکی پھلکی۔ اس کی دونوں ٹانگیں میری پشت کی جانب رہیں اور دونوں ہاتھ آگے ... میرا خیال ہے کہ اس کی کمر ایک بالشت تھی ورنہ میرے شانے پر اس کا جسم متوازن کیسے ہوتا۔ اس کا چہرہ بھی آگے کی جانب جھکا رہا اور اس کے کالے بالوں کی چوٹی میرے گھٹنوں تک پہنچ گئی۔ وہ جنوبی ہندوستان کے کسی حصے کی رہنے والی معلوم ہوتی تھی ... سانولی رنگت کے باوجود صورت کے تیکھے نقوش اور بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں جادو کا اثر رکھنے والی۔ اس نے بالوں میں ناریل کا تیل لگا رکھا تھا اور اس کے جسم سے بھی کچے ناریل کی مہک آتی تھی، تازہ اور میٹھی۔

اس کے کومل بوجھ کو سنبھالے شین گن اٹھائے میں باہر نکلا اور دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔ دروازے تک پہنچنے کے بعد میں نے باہر جھانکا۔ بیرک کے عقبی حصے میں ایک دیوار تھی لیکن میں اکیلا بھی اس دیوار کو عبور نہیں کر سکتا تھا۔ دیوار تقریباً دس فٹ بلند تھی اور اس کے اوپر ایک ایک فٹ کے فاصلے سے خاردار تاروں کی تین لکیروں کا حصار تھا۔ انھیں چھوئے بغیر میں ہزاروں وولٹ کے اس کرنٹ کو دیکھ سکتا تھا جو ایک بے وجود اور نظر نہ آنے والی ہلاکت خیز قوت تھی۔

بیرک سے دیوار تک کا فاصلہ اٹھارہ بیس گز تھا۔ دیوار کے دامن میں حلقہ در حلقہ اُلجھے ہوئے خاردار تاروں کا جال بچھا ہوا تھا اور یہ دیوار پیچھے دونوں جانب پچاس پچاس گز تک پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ بنگالی نے غلط بیانی کی تھی چنانچہ اب مجھے دائیں یا بائیں اپنے رسک پہ جانا تھا۔ بیرک تو مشکل سے بیس گز لمبائی رکھتی تھی۔ اس کے دونوں جانب چالیس گز تک کھلا میدان کس لیے رکھا گیا تھا، یہ آگے جا کے ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

بیرک کی دیوار کے ساتھ ساتھ رینگتے ہوئے میں دو بند دروازوں اور تین کھلی کھڑکیوں کے سامنے سے گزرا۔ کھڑکیوں کی فرش سے اونچائی چار فٹ تھی۔ میں اکیلا ہوتا تو جھک کے گزر جاتا لیکن نرملا کے ساتھ یہ ناممکن تھا۔ میں اسے پیچھے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ایک تو وہ کسی حد تک میری ڈھال تھی۔ اُسے اپنے تحفظ کی ضمانت بنا کے میں نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ پھر وہ دوسری سب لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ مفید معلومات فراہم کر سکتی تھی چنانچہ میں ہر کھڑکی کے سامنے سے سیدھا گزر گیا۔

بیرک کا موڑ کاٹتے ہی میری نظر نے سب سے پہلے ان دونوں کو دیکھا جو دھوپ میں کھڑے ہوئے ایک قبر ... نکال چکے تھے۔ انھوں نے کام تقریباً مکمل کر لیا تھا۔ مٹی کا ڈھیر قبر کے دونوں کناروں پہ جمع تھا اور ان میں سے ایک قبر میں اترا ہوا تھا۔ دوسرا اسے اوپر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بے حد مضبوط جسم کا مالک اور قد آور شخص تھا۔ اس کا رنگ کالا تھا اور بال پیچھے ... پسینے میں مل کر کیچڑ بن جانے والی مٹی اس کے چہرے اور بازوؤں پر پھیل گئی تھی۔ دوسرے کی صورت بھی اس وقت نظر آئی جب وہ پیچھے سے مٹی اوپر پھینکنے کے لیے اٹھا۔ وہ باہر کھڑے ہوئے شخص سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔ یہ ایک جیسے ڈیل ڈول اور حلیے کا نتیجہ تھا یا ان کی شکلیں واقعی جڑواں بھائیوں جیسی تھیں۔

www.paksociety.com

کرنا مشکل تھا۔

دوسری طرف وہ ٹرک ان سے دس گز دور راویریک کی سیدھ میں کھڑا ہوا تھا جس نے مجھے یہاں پہنچایا تھا۔ ٹرک کے اوپر سایہ رکھنے کے لیے ترپال پھیلا دی گئی تھی مگر میں اس کا تھیر دیکھ سکتا تھا۔ مبانی کے مقابلے میں اس احاطے کی چوڑائی نصف تھی۔ باقی خالی جگہ میں مجھے دو چوکور سیمنٹ کے قطعے نظر آئے جو کسی مین ہول کے چوکور ڈھکن لگتے تھے۔ ظاہر ہے یہ زیرِ زمین گودام یا تہ خانوں کے راستے تھے اور میں فرض کر سکتا تھا کہ ان تہ خانوں میں اسلحہ رکھا جاتا ہو گا۔

اگر میں اگلے موڑ تک جاتا تو شاید مجھے وہ گیٹ نظر آتا جس سے ٹرک اندر آیا تھا لیکن دس گز کا فاصلہ طے کرنے سے پہلے ہی مجھے دونوں گورکن دیکھ لیتے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ دوسرا بھی قبر سے باہر آ جائے۔

اوپر آتے ہی اس نے مجھے پہلے دیکھا کیونکہ دوسرا شخص میری جانب پیٹھ موڑے کھڑا ہوا تھا۔ ڈرائیور رشائیں کی لاش اس کے قریب ہی مٹی کے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ قبر کے گڑھے سے نکلنے والے نے اپنے ساتھی سے چلا کے کچھ کہا اور خود ایک جست لگا کے بیلچہ اٹھانے کے لیے جھکا۔ دوسرا اتنی دیر میں میری جانب پلٹ کر دیکھ چکا تھا اور اس کا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا تھا لیکن اس سے زیادہ برق رفتاری کا مظاہرہ میں نے کیا۔ خاموش فضا شین گن کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی اور وہ دونوں پیٹ کے بل ذرا سا اچھلے اور زمین پر لوٹنے لگے۔ گولیاں ایک کے پیٹ اور سینے میں لگی تھیں اور دوسرے کے بازو، نرخرے اور کمر کے نچلے حصے میں۔ اس کا اندازہ مجھے خون کی پھوٹتی دھاروں سے ہوا۔

میں نرملا کو اٹھائے ہوئے بھاگا۔ ابھی میں قبر کی خندق سے آٹھ دس فٹ دور تھا کہ پہلا فائر ہوا اور گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ دوسری گولی نے میرے بازو کو مس کیا اور مجھے ایک جلتی ہوئی خراش سی محسوس ہوئی۔ پھر میں نے نرملا کو نیچے پھینکا اور خود قبر میں کود گیا۔ جب اس لاش پر گرا جو چند گھنٹے پہلے دبائی گئی تھی، ایک عجیب سی کراہیت رکھنے والی اور دماغ کو ماؤف کرنے والی بدبو نے اور اس خیال نے کہ میں ایک لاش پر پڑا ہوا ہوں میرے احساس کو شدید صدمے سے دوچار کیا لیکن میرے لیے اور کوئی جائے پناہ بھی تو نہ تھی۔ اس قبر کے مورچے میں بیٹھ کے میں زندگی کی جنگ لڑ سکتا تھا۔

فائرنگ اب تین طرف سے ہو رہی تھی۔ میرا یہ اندازہ غلط ہو گیا تھا کہ وہاں پیلدہ سمیت چار افراد کیمپ کی نگرانی کرتے ہیں۔ دو کو میں نے پہلے ہی ماؤنڈ میں مار دیا تھا اور اس کے باوجود تین

مجھے قبر سے نکل لیٹنے کے لیے مسلسل گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ [illegible] نہیں سکتا تھا لیکن اندازہ ضرور کر سکتا تھا کہ بے ہوش نرملا کتنی گولیوں کا نشانہ بنا ہوگا۔ میں اسے پھینک سکتا تھا کیونکہ قبر کے اندر اس کے لیے جگہ نہ تھی۔ [illegible] کر کود جاتا تو خود بھی پھنس جاتا اور آزادانہ حرکت نہ کر پاتا۔ قبر میں ایک مردہ اور دو زندہ افراد کی گنجائش نہیں تھی۔

"تم جو بھی ہو، کسی سے چالاکی کے ساتھ باہر آ جاؤ۔" [illegible] انداز سے وہ مجھے کوئی فوجی لگا۔ "ورنہ وہیں مارے جاؤ گے جہاں اس وقت چھپے ہو....."

"تم مقابلہ نہیں کر سکتے۔" یہ دوسری آواز تھی۔

"اپنا اسلحہ پہلے باہر پھینک دو۔" تیسرے شخص نے [illegible] سمت سے کہا۔ وہ میرے سامنے اور دائیں بائیں سے آ رہے تھے۔

"ول لو تھا آف لیفٹیننٹ شاپ۔" پہلے شخص نے [illegible] سے کہا۔ "میں بات کر سکتا ہوں... یا تم زیادہ قابل ہو؟"

"سوری کرنل۔" ایک ماتحت بولنے والے ماتحت جیپ [illegible]

"تم نے سنا... میں نے کیا کہا ہے۔" کرنل نے چند لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ "لو آر نے فول... اگر تم سمجھتے ہو کہ [illegible] یہاں سے نکل جاؤ گے۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو اس کے بعد میں دیکھوں گا۔"

"کیا دیکھو گے تم کرنل بھوت ناتھ؟" میں نے چلا کے کہا۔ "تم دنیا کو آخری بار دیکھ رہے ہو... زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہتھیار ڈال دو اور ہاتھ اوپر اٹھا کے آگے آ جاؤ۔"

"اچھا از میٹ..." کرنل نے کچھ حیران ہو کے کہا۔ "کیا تم [illegible] ہو، کیا تمھیں معلوم ہے کہ تم کہاں بیٹھے ہو؟ آخر تم ہو کون؟"

"میں یم دوت ہوں... موت کا فرشتہ۔" میں نے [illegible] اونچی آواز میں کہا۔ "جس نے تمھارے باپ [illegible] سب کی جان لی تھی۔ آج تمھاری باری ہے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر کرنل نے کہا۔ "کیا تم [illegible]"

غالباً وہ اپنے کسی ماتحت سے مشورہ کر رہا تھا۔

"ہم سب سکندر بخت ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم [illegible] ایک سکندر بخت ہے کیونکہ سکندر بخت صرف ایک نام [illegible] ہم سب ایک جذبہ ہیں، ایک مشن ہیں اور ایک منزل [illegible]"

"بکواس بند کرو۔ میں تمھیں صرف دس سیکنڈ [illegible]"

نے برہمی سے کہا۔ "مجھے بے وقوف بنانے کی ضرورت [illegible] بعض پرجوش مجاہدوں نے پہلے ہر طرف سے شوقِ شہادت [illegible]

بھی یہاں چڑیا کا بچہ بھی پر مارے تو ہمیں پتا چل جاتا ہے۔"

"چڑیا کے بچے... میں تم کو سیکنڈ دے رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"دس سیکنڈ؟" کرنل نے تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا۔ "اس کے بعد تم کون سی توپ چلاؤ گے؟"

"تمھاری اپنی توپ۔" میں نے کہا۔ "کیا میں کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دوں؟"

"ضرور کرو... لیکن یہ خیال رکھنا کہ ایک دستی بم پانچ سیکنڈ میں تمھارے کاؤنٹ ڈاؤن کو ختم کر سکتا ہے۔"

"ایسی کوئی بھی حرکت خودکشی کہلائے گی۔" میں نے کہا۔ "ایک سیکنڈ سے بہت کم وقت میں گولی اس ٹرک کی ٹنکی تک پہنچ جائے گی جسے میں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ شاید تم بھی دیکھ سکتے ہو۔ میرا نشانہ اس کا پیٹرول ٹینک ہوگا۔ جب پیٹرول میں آگ لگے گی اور ٹینک پھٹے گا تو تم اور تمھارا یہ سارا خفیہ ٹھکانہ دھواں بن کے اڑ جائے گا۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس سے مجھے اپنی دھمکی کے کارگر ہونے کا یقین آیا۔ شاید وہ آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ بالآخر کرنل نے کہا۔ "ہم تمھیں بحفاظت نکل جانے کا موقع دے سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے... میں یہ راستہ بھی کچھ نہیں لیتا۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ موقع میں خود حاصل کر لوں گا... لیکن ایسی ہی فراخدلانہ پیش کش میری طرف سے بھی ہے۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم سب نکل جائیں۔" کرنل نے برہمی سے کہا۔

"اگر تم ان ڈیوٹی مرنا چاہتے ہو... تو یو آر ویلکم..." میں نے کہا۔ "تو دستی بم پھینکو... میں ایک گولی چلاتا ہوں... تمھارے ساتھ یہ سب گرائے کے مرد اور عورتیں... تمھارا اور طوائفوں کا یہ اڈہ بھی ختم ہو جائے گا۔"

"اور تم بچ جاؤ گے؟" اس نے طنز سے کہا۔

"ہم ایک اعلیٰ مقصد کے لیے جان دیں گے۔" میں نے کہا۔ "چنانچہ میں شہید کہلاؤں گا اور تم جہنم رسید ہو جاؤ گے۔ یہ تمھارے لیے گھاٹے کا سودا ہو سکتا ہے... میرے لیے نہیں۔"

میں بڑی عجیب صورت حال میں گرفتار تھا۔ میرے ذہن میں ایسی کوئی صورت نہ تھی کہ میں بحفاظت اس مورچے سے نکل سکوں۔ ان کی پیش کش بھی ایک دھوکا تھی۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ میرے باہر نکلتے ہی وہ مجھے گولیوں سے چھلنی نہیں کریں گے۔ میں خود بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ سامنے آئیں اور خود کو میرے حوالے کر دیں... اگر وہ کہتے کہ ٹھیک ہے ہم جا رہے

ہیں... تو میں یہ بات کیسے مان لیتا کہ وہ واقعی چلے گئے ہیں۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میرے لیے تصدیق کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں ان کی صحیح تعداد سے ناواقف تھا۔ ان میں سے آدھے اندر چھپ کے بیٹھ سکتے تھے اور آدھے مجھے یہ تاثر دے سکتے تھے کہ وہ روانگی اختیار کر چکے ہیں۔ میں کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا کیونکہ باہر جانے کے لیے استعمال ہونے والا واحد راستہ میری نظر سے اوجھل تھا۔ وہ خود بھی اسی کشمکش و پیچ کا شکار تھے کہ اگلی چال کیا ہو۔ شطرنج کی بازی کی طرح سب کے سب پھنس گئے تھے اور ایک بھی غلط چال چلنے والے کو مات ہو سکتی تھی۔

سورج آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اور دھوپ کی تیزی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ میں نے رات سے کچھ بھی کھایا پیا نہیں تھا اور زیادہ دیر اس مورچے میں نہیں گزار سکتا تھا جس میں میرے پیروں کے نیچے زمین نہیں ایک عورت کی لاش تھی۔ یہ احساس ہی میرے اعصاب کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھا۔ اضافی عذاب اس تعفن کا تھا جو میت سے ہوا میں منتقل ہو رہا تھا۔ باہر مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کم سے کم تین لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک مقتول سائیں کی اور دو اس کی ٹیم کے بدبخت خدام کی۔ چوتھی لاش نرملا کی ہو سکتی تھی۔ لیکن میں یہ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ ابھی تک وہ بے ہوش پڑی ہوئی ہے یا گولیاں لگنے سے بے ہوشی میں ہی موت سے ہمکنار ہو چکی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ خود میرے حریف قوتِ فیصلہ سے محرومی کے باعث پریشان ہیں اور میری طرح وہ بھی باتوں میں وقت گزارتے ہوئے کچھ سوچنا چاہتے ہیں۔ ان کی اور میری پوزیشن میں ایک فرق بہت نمایاں تھا۔ وہ جتنا وقت چاہتے گزار سکتے تھے اور اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے لیے باہر سے مدد حاصل کر سکتے تھے۔ اس کے برعکس میں یہاں دو چار گھنٹے بھی گزار لیتا تو یہ میری قوتِ برداشت کی سخت ترین آزمائش ہوتی۔

دھوپ میرے سر کو گرم کر رہی تھی اور اب قبر کے ایک گوشے سے ترچھی بھی پہنچنے لگی تھی۔ دیکھتے دیکھتے میں نے لاش کے چہرے پر نگاہ کی۔ عورت یقیناً جوان تھی لیکن اس کے بالوں اور اس کی آنکھوں میں مٹی بھر گئی تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر نمی نے مٹی کو کیچڑ کی تہ بنا دیا تھا۔ میں صرف اس کا سائیڈ پوز دیکھ سکتا تھا۔ جب اسے قبر میں پھینکا گیا تھا تو وہ ٹخنے کے بل گری تھی اور الٹی پڑی رہ گئی تھی۔

شین گن میرے ہاتھ میں تھی اور میری ہتھیلیاں پسینے میں تر ہو رہی تھیں۔ اس وحشت ناک ماحول کے عذاب کا ہر لمحہ میرے لیے شکست کے اسباب فراہم کر رہا تھا۔ دشمن کی طرف سے خاموشی کا وقفہ

www.paksociety.com

بھی بہت سے اندیشوں کو جنم دیتا تھا۔ معلوم نہیں اب وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کی نئی حکمت عملی کیا ہوگی۔ میرے مقابلے میں ان کا زیادہ پُراعتماد ہونا بھی جائز تھا۔ بکتر میں محصور تھا اور وہ محاصرہ کیے بیٹھے تھے۔ آہستہ آہستہ میری گردن اور کمر سے بہنے والا پسینہ ایڑیوں تک پہنچنے لگا تھا۔

پھر اچانک ہی اس سکوت میں ایک ڈرامائی عنصر شامل ہو گیا۔ نہ جانے کہاں سے کسی نے چیخ کر کہا "ہوشیار ہو جاؤ کتو... تم سب کی موت کا وقت آ گیا..." وہ قہقہہ مار کے ہنسا... اس ہنسی میں صرف دیوانگی تھی۔

"مدن موہن... تم...؟" میں نے کرنل کی آواز سنی۔

"ہاں... میں... مدن موہن..." وہ اسی طرح چیخ کے بولا۔ "اچھی طرح دیکھ لو مجھے... میں اس کی روح نہیں ہوں... میں جیتا جاگتا مدن موہن ہوں۔"

"مگر... یہ تم... کیا کر رہے ہو؟"

"وہی جو مجھے کرنا چاہیے... جو تم نے میری موہنی کے ساتھ کیا تھا کمینو... سور کے بچو... خبردار جو کوئی بھاگا... ہتھیار نیچے پھینک دو۔" پھر اسٹین گن کے ایک برسٹ کی آواز آئی۔ کوئی بڑے بھیانک انداز میں چلایا۔ یہ سب ڈراما میری نظروں کے سامنے نہیں ہو رہا تھا مگر میری آنکھیں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں... ابھی ابھی کوئی اس دیوانے مدن موہن کا حکم نہ ماننے کی پاداش میں مارا گیا تھا۔ مگر وہ کون تھا اور کہاں سے سب پر حکم چلا رہا تھا، اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

تاہم ایک بات یقینی تھی۔ وہ اپنے حریفوں کے سامنے سے نمودار نہیں ہوا تھا۔ اس نے انھیں پیچھے سے اچانک اور غیر متوقع طور پر آ لیا تھا۔ ممکن ہے اس نے گیٹ پر متعین محافظ کو بھی خاموشی سے مار دیا ہو۔ محافظ نے اسے اندر داخل ہونے سے نہیں روکا ہوگا کیونکہ وہ اندر کا آدمی تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کسی دوسرے راستے سے اندر پہنچا ہو۔ وہ جانتا ہوگا کہ گیٹ کے علاوہ آنے جانے کے کتنے محفوظ راستے ہیں... اور اب وہ انھیں اپنے سامنے بے بس کیے کھڑا ہوا تھا تو یقین کے ساتھ وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ اب دشمن کی نظر میری طرف نہیں ہے۔ وہ ایک دم پلٹے بھول گئے اور اب اسی پوزیشن میں کھڑے ہوئے ہوں گے۔

اس خیال نے مجھے بڑی تقویت دی۔ میں نے خدا کا نام لیا اور اس ٹینک سے باہر نکل آیا جس میں مزید قیام پر گھٹن اور سانس لینا زیادہ دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ میرا دماغ اس حبس سے پھٹنے لگا تھا۔ مجھے وہ دیر تک بھی وہاں گھٹ کر رہنا پڑتا تو شاید میں پاگل ہو جاتا اور اس اذیت سے چھٹکارا پانے کے لیے دیوانہ وار بند دشمنوں پر حملہ کر کے مارا جاتا... اب موقع ملتے ہی میں اسی جہنم کدے سے نکل بھاگا جہاں پاور سے آگ برس رہی تھی تو پیچھے سے ایک سرد لاش میرے احساس میں رہبر چہرے کا نشان چھوڑ رہی تھی۔

بیرک کے سامنے ٹینک میں ایک جست میں پہنچ گیا۔ کوئی سے فائر کرنے کی پوزیشن میں تھا مگر رکا تھا کہ کسی کو کی آہٹ کسی کو متوجہ کرے تو سامنے آنے والا چند آدمیوں سے بھی ہو جائے۔ اس کے بعد کوئی مجھے چھلنی کرنے تو میری قسمت... مگر چند سیکنڈ سکوت میں گزر گئے تو میں نے چین کا سانس لیا اور پلٹ کے دیکھا۔ نرملا کا جسم ویسے ہی ساکت تھا۔ مجھے ایک نظر میں خون بھی دکھائی دے رہا تھا۔ شاید گولی چلانے والوں نے اچھا خاصا کام لیا تھا اور ترملا کو نشانہ بنا دیا تھا۔ وہ ایک جھاڑی کے پیچھے گری تھی جہاں سے

"مدن موہن... ہوش میں آؤ۔" کرنل کی آواز سنائی دی۔ "کل سے ہم تمھیں تلاش کر رہے تھے... کہاں تھے تم؟"

میں جیسے پیدل آگے بڑھا اور بیرک کی دیوار کے ساتھ آخری موڑ تک جا پہنچا۔ وہاں سے وہ چند قدم کے فاصلے پر اور میں ان کی ساری گفتگو سن سکتا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ اس طرح مجھے مدن موہن دکھائی دیا اور اس کی نگاہ کے لیے بھی یقیناً وہی لمحہ اس کی زندگی کا فیصلہ کر رہا تھا۔

"میں پھر کہتا ہوں کہ ہتھیار نیچے ڈال دو۔" مدن موہن بولا۔

"دیکھو مدن موہن... ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ... موہنی کو میں نے نہیں مارا تھا... کیپٹن شرما نے مارا تھا..." کرنل کی آواز آئی۔ "اور تم نے اسے مار دیا... اب یہ اسٹین گن رکھ دو... ہم... دیکھتے ہیں... بیٹھو... بس؟" وہ چالاک آدمی اپنے حواس برقرار رکھتے ہوئے پوری کوشش کر رہا تھا کہ مدن موہن کے انتقام اور جنون کی کیفیت کو ختم کر سکے اور پھر اس پر قابو پا لے۔

"ہاں مدن موہن۔" دوسرے افسر نے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ کوئی غلطی...

"اپنی موہنی کے قاتل سے تم نے انتقام لے لیا۔" کرنل بولا۔ مدن موہن نے ایک اور پاگل پن سے بھرا قہقہہ لگایا۔

"ابھی سے گھبرا گئے... شرما نے تو صرف گولی چلائی تھی۔ اسے چلانے کا حکم کس نے دیا تھا؟ یہ حساب ابھی برابر نہیں ہوا۔ تم جانتے ہو کہ میں کہاں چلا گیا تھا... میں تم سب کی موت کا انتظار کر رہا تھا... شرما کی موت اور اس کے بھائی لیفٹیننٹ وراج کی... وہ دونوں مجھے ایک ہی گھر میں ایک ساتھ مل گئے تھے۔ میرا کام آسان ہو گیا... پھر میں تمھاری موت کے پاس گیا تھا... ان سب کا کریا کرم بھی ہو چکا..."

"یہ کیا بکواس ہے... تم نے... لیفٹیننٹ کو..."

مدن موہن کی دیوانی ہنسی پھر گونجی... "ڈر گئے... مر جاؤ... تم نے میری موہنی کو کتنی آسانی سے میرے سامنے مار دیا۔

وقت تم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ جو تم دوسروں کے ساتھ کرتے ہو وہی تمھارے ساتھ دوسرے بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے تو تم سمجھ رکھا تھا... پالتو کتے سے بھی زیادہ... اب بتاؤ ذرا کیا حال ہے؟ کیا گزری تم پر یہ خبر سن کے اور ابھی تو صرف خبر سنی ہے تم نے اسے مرتے ہوئے نہیں دیکھا... جیسے میں نے موہنی کو مرتے دیکھا تھا... کاش یہ میرے لیے ممکن ہوتا... کہ میں اسے گھسیٹ کر تمھارے سامنے لاتا... یا جیسے تم موہنی کو کیسے گھسیٹ کر لائے تھے... اس کے بالوں سے پکڑ کے... اور گولی تمھارے بھائی نے کیسے چلائی تھی؟"

"یہ... یہ جھوٹ ہے... بکواس کرتے ہو تم... وہ ہیں کہیں چھپے ہوں گے تم خاموش ہو گئے تھے، ورنہ تم نے چلانے کا ارادہ کیا تھا، کم وقت میں تم یہ سب نہیں کر سکتے۔"

مدن موہن پھر چلایا۔ "لاہور سے امرتسر کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔ ورنا... صرف اکتیس میل... یہاں مجھے سرحد عبور کرانے والا وہی تھا جس سے تم نے مجھے ملوایا تھا... اور اپنے دیش کی سرحد میں جانے کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم تینوں ایک ہی رجمنٹ سے تعلق رکھتے ہو... اور وہ رجمنٹ امرتسر کے نواح میں ہے... وہیں تم سب رہتے بھی تھے... وہیں میری ٹریننگ ہوئی تھی یاد ہے؟... میں نے تم سب کے گھر دیکھے تھے۔ وقت بے وقت تم مجھے طلب کر لیتے تھے... خصوصی تربیت کے لیے... تین مہینے میں نے کیمپ کے اندر ہی ایک قیدی کی طرح گزارے تھے۔ میری وجہ سے ہی موہنی اس مشن میں شامل ہوئی تھی۔ مگر وہ ایک بزدل اور کمزور عورت تھی۔ وہ کہتی تھی کہ موہن یہ تم کو مجھ سے چھین لیں گے... یہ بہت منحوس ہے جو تم کو مجھ سے جدا کر دے گا... مگر میں نے اسے سمجھا لیا تھا کہ اس مشن کی کامیابی ہماری زندگی کی کامیابی ہوگی... ہم اپنا گھر بنا لیں گے... شادی کر لیں گے... کاروبار کریں گے... تمام عمر عیش کریں گے... مگر وہ پھر بھی ڈرتی تھی۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ کسی کو پتا لگا تو کیا ہوگا... سرحد پار کرنے والا وہ دونوں طرف کا مخبر ہی نہیں رہتا۔ وہ جاسوس اور تخریب کار بھی کے پکڑ لیا جائے تو اس کا حشر کیا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتی تھی سب کو جاسوس کو تو اپنے لوگ بھی پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ بھی اجنبی بن جاتے ہیں جو وطن کے نام پر جان دینے کے لیے اکساتے ہیں... ملا ... ... وہ ٹھیک ہی کہتی تھی... وہ ڈرتی تھی کہ کسی نے اسے پکڑ لیا تو اس کی آستی ان کا غذ کے پرزوں سے متعین ہوتی تھی... بس میاں بیوی اور پاکستانی ثابت کرتے تھے۔ تم نے تو بہت دیر سے جانا کرنل کہ اس کے ضمیر پہ بوجھ ہے۔ وہ تو پہلے ہی تباہ کاری کے لیے ملنے والے پیسے سے نفرت کرنے

لگی تھی۔ اور جب پتا چلا تو تم نے اسے مار دیا... صرف اس لیے مار دیا کہ اس کا ضمیر جاگ اٹھا تھا جو تمھارے لیے خطرناک تھا۔ تم نے مجھے کوئی موقع نہیں دیا کہ میں اسے سمجھاتا... میری منت سماجت بھی نہیں مانی... تم مجھے بھی مار ڈالتے اگر میں احتجاج کرتا... میں نے دل کو پتھر کر لیا اور وہ سب دیکھا جسے دیکھنے کے بعد میں مر جاتا اگر مجھے ایک خیال سہارا نہ دیتا... انتقام لینے کا خیال۔ اور اسی خیال نے مجھے راتوں رات سرحد پار امرتسر پہنچا دیا۔ تمھاری رجمنٹ کے علاقے میں بہت سے لوگ مجھے جانتے تھے۔ میں نے کہا کہ میں تم سب کی بیویوں کے لیے پیغامات لے کر آیا ہوں۔ کسی دشواری کے بغیر میں تمھارے گھر پہنچ گیا... اور فوراً... جب تمھارے گھر کے سب لوگ جمع ہو گئے... تمھارے ماں باپ... بھائی بہن... اور تم دونوں بھائیوں کی بیویاں... ماہ حوری اور مدھوجی... جو نئی نویلی دلہنیں تھیں... واقعی ابھی ان کے ہاتھوں سے مہندی کا رنگ بھی نہیں چھوٹا تھا۔ جب ہم ٹریننگ لے رہے تھے تب ہی تو شادی ہوئی تھی تم دونوں بھائیوں کی... ان دونوں بہنوں سے... وہ دونوں واقعی خوب صورت تھیں... مگر میری موہنی سے کم... موہنی میری دھرم پتنی نہیں تھی۔ ابھی ہم نے اگنی کے پھیرے نہیں لیے تھے۔ لیکن بھگوان جانتے ہیں... کاہن بندھن تھا جو کسی طرح بھی شادی سے کم نہ تھا۔ کمزور نہ تھا اور اتنا ہی مقدس بھی تھا۔ وہ میری قاعدہ سب کچھ چھوڑ آئی تھی۔ اپنے گھر کو اپنی ذات کے غرور میں مبتلا ماں باپ کو جو مجھ جیسے شودر کے ساتھ اس کا بیاہ کبھی نہ کرتا... جس کسی پنڈت کے اشلوک اور کسی مندر کے پھیروں کی ضرورت نہیں تھی۔ بھگوان ہمارے گواہ تھے اور اس بندھن کی پوترتا کو مانتے تھے... تم نے اس بندھن کو ختم کر دیا ہار اکھشش... میں تم کو مار دیتا اسی وقت... مگر میں نے نہیں... پہلے تم بھی وہی دکھ اٹھا لو... جو میں نے جھیلا تھا... میں نے جلدی کی ورنہ شرما بھی جان لیتا کہ اس کی بے گناہ بیوی نے اس کے جرم کا کفارہ کیسے ادا کیا۔ مگر میں تم کو بتاتا ہوں... ان دونوں نے ایک جیسی ساڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ گلابی رنگ کی اور لال پھولوں والی بنارسی... اور جب میں نے ان کے سر پہ پیار اور رکھ کے گولی ماری... بالکل اسی طرح جیسے شرما نے موہنی کو ماری تھی۔ تو ان دونوں کے سروں سے خون کے فوارے چھوٹے اور انھوں نے ایک دوسرے کی ساڑیوں کو اپنے خون سے رنگین کر دیا۔ تمھارے ماں باپ اور بھائی بہن صدمے سے سکتے کی حالت میں کھڑے رہ گئے اور میں کھڑکی سے کود کر فرار ہو گیا۔ اس وقت وہ دونوں فرش پر تڑپ رہی تھیں۔"

ورما ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں سب کچھ سن رہا تھا

اور شاید بھائی کی موت نے اُسے وقتی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔ اچانک اس کے مزاج کا توازن بگڑ گیا۔ صدمہ اس کی قوتِ برداشت سے بڑھ گیا۔ اس نے چیخ کر ملن موہن کو گالی دی۔ میں دیکھ کچھ نہیں سکتا تھا مگر میں نے کرنل کی آواز میں کے سبب سمجھ لیا۔ کرنل نے اپنے ماتحت کو روکنے کی بے سود کوشش کی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ "ورما..." اور اس کا انداز تنبیہ کا تھا مگر ورما شاید ملن موہن پہ حملہ کر چکا تھا۔ جسے گن نے بے موت اُگلی۔ ایک راؤنڈ نے ورما کے پرخچے اڑا دیے۔ ورما کی آواز بند ہو گئی۔ ملن موہن کے جنونی قہقہے باقی رہ گئے۔

"ملن موہن... بھگوان کے لیے دیا کرو مجھ پہ..." کرنل نے موت کو سامنے دیکھتے ہوئے سارے گرد و فکر کو بالائے طاق رکھ دیا۔ افسری کی شان کو فراموش کر دیا۔ اس ساری تربیت کو بھلا دیا جو اسے اوائلِ فرض کی خاطر بہادری کے ساتھ جان دینے کے لیے ملی تھی۔ وہ ایک عام آدمی رہ گیا جو مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب تک اس نے جانے کتنے اپنے جیسے انسانوں کو مارا تھا۔ وہ سیاست کی شکار گاہ میں نفرت اور تعصب کے جذبات، اسلحے کی طاقت، تجربے اور مہارت کے ساتھ ایک مشن کی تکمیل کے لیے آیا تھا اور وہ مشن تھا ایک ملک کے دو حصے کرنا۔ بھائی کے ہاتھوں بھائی کا خون کروانا۔ مسلمان سے مسلمان کو لڑوانا... قومیت... ثقافت اور استحصال کے نام پر اور چھ نکات کو بنیاد بنا کے... وہ اس مشن کے لیے سینکڑوں ہزاروں یا لاکھوں انسانوں کو چیونٹی سے حقیر جان کے قربان کر سکتا تھا اور بہت پُرامید تھا کہ اس کارنامے کو سرانجام دے کر وہ اپنے ملک کے نیتاؤں کے سامنے فخر سے جائے گا اور وہ اس کے سینے پر بہادری اور فرض شناسی کی اعلیٰ مثال قائم کرنے پر کوئی تمغہ سجا دیں گے۔ اسے کرنل سے ترقی دے کر بریگیڈیئر بنا دیا جائے گا۔

اور یہ سب کچھ اسے اپنے امکان میں نظر آتا تھا... لیکن اچانک ایک چیونٹی نے ہاتھی کا راستہ روک لیا۔ یہ چیونٹی عورت تھی۔ اس نے ہاتھی کو مسل دیا... خاک میں ملا دیا... اسے صرف ایک کمزور عورت جان کے مٹا دیا اور بھلا دیا۔ لیکن اسی عورت کا نام محبت تھا۔ ایٹمی توانائی سے زیادہ قوت رکھنے والی مگر نظر نہ آنے والی۔ موہنی کے بے جان جسم سے بھی اپنی ہلاکت خیزی پھیلانے والی یہ محبت ملن موہن کے دل میں زندہ تھی اور ایک آتش فشاں بن گئی تھی۔ اچانک کرنل نے محسوس کیا تھا کہ زمین نے اس کے قدم پکڑ لیے ہیں۔ اور وہ اس آتش فشاں کے پھٹنے... خاکستر کر دینے والے... تباہ کن لاوے کے سیلاب سے بچ کے فرار نہیں ہو سکتا۔

"... ملن موہن... یہ... یہ دو لوگ... ان کی تو بچی بھی ہوئی تھی..." کرنل گڑگڑا رہا تھا۔ "ان کی بیویاں بھی... لیکن خود بھی مر گئے... لیکن میرے بچے ہیں... ان کا دنیا میں اور کوئی نہیں..."

"اچھے... سیدھا کھڑا ہو... کمینے خود غرض... بزدل ہو... میں تجھے بخشنے والا نہیں ہوں... تیرے بچوں کی خاطر میں نے تیری بیوی کو نہیں مارا تھا... اس عورت کی زندگی اس نے مجھ سے مانگی تھی اور میں نے دے دی تھی کیونکہ ماں تو صرف ماں ہوتی ہے..."

"تم نے... اُسے نہیں مارا؟" کرنل نے کہا۔

"ہاں... میں اُسے مارنے ہی گیا تھا۔ مگر اس عورت نے کہا کہ پہلے ان بچوں کو مار دو... میں موت سے نہیں ڈرتی۔ ان بچوں کو یوں چھوڑنے سے ڈرتی ہوں... بعد میں ان کی زندگی ادھوری رہ جائے گی... سوتیلی ماں کے ہاتھوں بگڑ جائے گی... میں ان کو اپنے ساتھ ہی لے جاؤں تو اچھا ہے... وہ بہت بہادر عورت تھی کرنل... نہ وہ روئی، نہ گڑگڑائی... نہ اس نے منت سماجت کی۔ نہ اس کا یہ حال ہوا... جو تمہارا ہو رہا ہے... دیکھو ذرا کہ تم کس طرح کانپ رہے ہو... کاش تمہاری یہ حالت وہ بھی دیکھتی کہ کرنل صاحب کی تو پتلون بھی خراب ہو گئی ہے۔ تمہاری بیوی دیکھتی کہ اس کا وہ شوہر جو بہادری اور جواں مردی کی ڈینگ مارا کرتا تھا موت کے سامنے کتنا بے بس ہو گیا ہے... وہ عورت تو بہت پُرسکون رہی تھی اور پھر اس کے بچے... وہ ماں کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہو گئے تھے... وہ تمہارے بچے نہیں ہو سکتے کرنل... تم تو چھوٹے چھوٹے بچوں سے زیادہ ڈرے ہوئے ہو اور بے حال ہو۔ انھوں نے کہا کہ پہلے گولی ہمیں لگے گی... پھر ماتا جی کو... اور انھوں نے... میں نے ان سے... ان کی ماں کو نہیں چھینا..."

"تم اچھے آدمی ہو... ایک نیکی اور کر سکتے ہو... وہ عورت تو صرف ماں تھی... میں بیک وقت ان بچوں کا باپ بھی ہوں اور اس عورت کا شوہر بھی... مجھے مار دو گے تو ان بچوں کو یتیم کرو گے اور عورت کو بیوہ کرو گے۔" کرنل نے اپنی منت سماجت جاری رکھی۔

"میں تم کو چھوڑ دیتا... اگر ایسا ہی ہوتا۔"

"کیا مطلب... ایسا ہی ہے ملن موہن..."

"نہیں... اس عورت نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم مجھے کیوں مارنے آئے تھے؟"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے اُسے اصل سبب بتا دیا۔" ملن موہن بولا... وہ ہال میں رکا... کمپاؤنڈ ایریا کے اندر فائرنگ کی آواز...

تھی... اور جب میں فرار ہوتے ہی تیرا... گھر والوں کے کمرے میں بچا ہوا تھا... میں جانتا تھا کہ یہی ہوگا... چنانچہ میں بیچ ہی میں تمہارے گھر میں گھس گیا..."

"وہ دراصل پہرے دار... تم کو نہیں روکا؟"

"میں اتنا بے وقوف ہوتا تو تم میرا انتخاب اس مشن کے لیے نہ کرتے کرنل صاحب..." ملن موہن نے کہا۔ "میں پچھلی طرف سے اندر کود گیا تھا اور کچن کے راستے تمہارے بنگلے میں پہنچا تھا... مگر ذرا سی دیر میں پورے ایریا کے اندر میری تلاش شروع ہو گئی اور فوجی وہاں بھی آ پہنچے۔ تمہاری بیوی نے کہہ دیا کہ یہاں کوئی نہیں آیا اور نہ آ سکتا ہے... میں نے ریوالور کے زور پر اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ کیا کہے گی... اس نے کہا تم فکر مت کرو... اس گھر کے اندر تم محفوظ ہو... اندر کوئی نہیں آ سکتا۔" میں نے اس کی زندگی بخش دی تھی... پھر وہ میری زندگی کیسے نہ بچاتی... مگر احتیاط کا دامن میں نے ہاتھ سے نہیں چھوڑا... میں نے اس کے دونوں بچوں کو اپنے ساتھ رکھا اور اسے کہا کہ وہ میری تلاش میں آنے والوں کو مطمئن کر کے رخصت کر سکی تو ٹھیک ہے ورنہ وہ خود بچ جائے گی مگر اس کی گود خالی ہو جائے گی... میں تو جان ہتھیلی پر رکھ کے نکلا ہوں اور ویسے بھی جینا نہیں چاہتا... جب فوجی جوان چلے گئے تو میں نے بچوں کو چھوڑ دیا... اس نے کہا کہ تم نے کبھی کوئی ایسی عورت دیکھی ہے... کوئی ماں، بہن یا بیوی بیٹی جو اپنے شوہر... بھائی... باپ یا بیٹے کے لیے اپنی زندگی قربان کرنے کا حوصلہ نہ رکھتی ہو... بچوں کو یرغمال بنا کے خوفزدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی... میں نے کہا کہ مجرم تمہارا شوہر تھا... اسے زیادہ سخت سزا دینے کے لیے میں تمھیں بھی مارنے کا فیصلہ کر چکا تھا مگر تمھیں چھوڑ دینے کا مطلب یہ نہیں کہ میں اصل مجرم کو بھی چھوڑ دوں گا... اور معلوم ہے اس نے کیا کہا؟"

"اس نے کہا ہوگا... کہ اسے معاف کر دو..."

"نہیں... اس نے کہا کہ تمہارے کسی فیصلے کو میں کیسے بدل سکتی ہوں... تم وہی کرو گے جو تمہارے لیے ضروری ہوگا..." ملن موہن نے کہا۔ "تمھیں تو انتقام لینا ہے... تم معاف کر دینے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہو کیونکہ تمھیں کوئی موت نہیں ملا... تم نے دو بے گناہ عورتوں کو قتل کر دیا ہے... تم تیسرا قتل ضرور کرو گے... تم مجسم کینہ ہو... اصل مجرم کو نہیں چھوڑو گے... میں نے کہا کہ میری جگہ تم ہوتیں تو کیا کرتیں... اور اس عورت نے مجھے اجازت دے دی تھی کہ تم کو قتل کر دوں۔"

"تم... تم بہت بکتے ہو..."

"نہیں... تمہاری بیوی نے صاف کہا کہ میری جگہ وہ ہوتی تو ایسا ہی کرتی... ویسے بھی اسے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑے گا... وہ شخص اب صرف دنیا کو دکھانے کے لیے میرا شوہر رہ گیا ہے... سب ہی جانتے ہیں کہ وہ ملٹری ہاسپٹل کی ایک نرس فرزانہ کے چکر میں ہے... اسی کے ساتھ رہتا ہے اور دھرم اور قانون کا مسئلہ نہ ہوتا تو اب تک اس سے بیاہ کر چکا ہوتا... بچے بھی اتنے چھوٹے نہیں ہیں کہ کچھ نہ سمجھتے ہوں... وہ سب جانتے ہیں اور انھیں باپ کی صورت سے نفرت ہے... کیا مطلب نکالا جا سکتا ہے اس بات سے کرنل صاحب... یہی کہ تمہارے بیوی بچوں کو تمہاری ضرورت نہیں ہے... پہلے تم سمجھتے کہ ان کی ضرورت سے بے نیاز ہو گئے... اب تم مرو یا جیو انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا... اسے میں اجازت ہی سمجھتا ہوں..."

"تم تو ایسے بات کر رہے ہو... جیسے وہ اجازت ضروری تھی تو تم مجھے چھوڑ دیتے..." کرنل نے تلخی سے کہا۔

"یہ ہو سکتا تھا... بالکل ہو سکتا تھا کرنل۔" ملن موہن نے کہا۔ "اس وقت میرے جذبات کا رُخ بدلا ہوا تھا۔ میں دو دشمنوں کو ان کے کمرے میں سائے رکھنے والوں کے سامنے گولی مار چکا تھا... اس وقت میں پاگل ہو رہا تھا... مگر انھیں مرتا دیکھ کے میرے ذہن کی کیفیت میں عجیب سی تبدیلی آئی۔ میں کچھ احساسِ جرم و ندامت کا شکار ہو گیا تھا۔ اُن کی موت نے مجھے جھنجھوڑ کر میرے احساس کو بیدار کر دیا تھا۔ میں نے بھاگتے ہوئے سوچا تھا کہ میں نے اچھا نہیں کیا... مجھ سے زیادتی ہو گئی ہے کہ میں نے مجرم کو سزا دینے سے پہلے بے گناہ کو مار دیا ہے۔ بے شک اس میں اصل مجرموں کے لیے بہت ذہنی اذیت کا سامان ہے مگر ان تتلی تولی ولمثوں کو سو دو الزام تو نہیں سمجھا جا سکتا اور شرما اور ورما سے زیادہ دکھ تو ان کے ماں باپ اور بھائی بہن اٹھائیں گے۔ اسی ردِ عمل کا نتیجہ تھا کہ میں تمہاری بیوی کو ایک دم گولی نہ مار سکا... جیسا کہ میں نے سوچا تھا۔ اور جب اس نے تم پر بے وفائی کا الزام بھی ثابت کر دیا تو وہ عورت مجھے مظلوم لگی۔ میں صبح ہونے تک تمہارے گھر میں چھپا رہا... صبح تمہاری بیوی نے مجھے اپنی گاڑی میں سرحد سے چند میل دور چھوڑ دیا۔"

"اس عورت نے... ایک قاتل کی مدد کی۔" کرنل چلایا۔

"وہ مجبور تھی... اگر وہ ایسا نہ کرتی تو اس کے بچوں کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی... میں نے انھیں باتھ روم میں بند کر دیا تھا اور خود باہر سو گیا تھا۔ یہ تمھیں بہت عجیب لگے گا کہ آدمی دو قتل کرے اور پھر سکون کی نیند سے بھی محروم نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کرنل صاحب کہ اپنی موہنی کے قتل کا بدلہ لے کر میرے دل کو بڑا سکون حاصل ہو گیا تھا۔ دو راتوں کے بعد میں نے چین کی نیند پوری کی۔

اور صبح آٹھ بجے تھانے سے بیوی بچوں کو آزاد کیا۔ پھر تمھاری بیوی نے میرے لیے ناشتا تیار کیا اور میں نے تمھاری بیوی کو سمجھا دیا کہ اسے کیا کرنا ہوگا... میں تمھارے چھوٹے بیٹے کے ساتھ ڈگی میں چھپ گیا اور تمھاری بیوی کار خود چلاتی ہوئی مجھے بوتھ ایریا سے نکال لائی۔ رات بھر بوتھ ایریا میں میری تلاش جاری رہی تھی۔ کوئی کیسے فرض کر سکتا تھا کہ میں کار میں چھپ کر نکل سکتا ہوں۔ تمھاری بیوی چاہتی تھی کہ میں بچے کو ڈگی میں ساتھ نہ رکھوں۔ وہ میری مدد کا وعدہ کر چکی ہے تو نبھائے گی۔ لیکن میں عورت ذات پر، خواہ وہ دشمن افسر صاحب کی بیوی ہو، بھروسا نہیں کرتا۔ تریا چلتر سے ڈرنا بھی چاہیے۔ میں نے بچے کو ضمانت بنا کے ساتھ رکھا اور وہ مجھے سخت چیکنگ کے باوجود باہر نکال لائی۔ کس کی مجال تھی کہ کسی ایس پی صاحب کی بیوی کو روک لیتا۔ صبح ساڑھے سات بجے وہ مجھے بارڈر سکیورٹی فورس کے حوالے کر کے لوٹ گئی۔ بی ایس ایف والوں کو اپنے مشن کے بارے میں بتا کے میں یہاں سرحد عبور کر آیا... اور اب دیکھ لو... چوبیس گھنٹے کے اندر اندر میں نے موہنی کے قاتلوں کو سزا دے دی ہے۔"

"مجھے اپنی موہنی کا قاتل مت سمجھو... میں نے کسی کو حکم نہیں دیا تھا کہ اسے مار ڈالیں۔ یہ اطلاع ورما نے دی تھی کہ موہنی کا دماغ خراب ہو رہا ہے اور شرما نے کہا تھا کہ ہمارے پاس کسی کا دماغ درست کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ آسان اور محفوظ طریقہ یہ ہے کہ اس دماغ کو نیست و نابود کر دو۔" کرنل نے کہا۔

"تم نے انھیں روکا کیوں نہیں تھا؟"

"میں نے روکا تھا... کہا تھا کہ پہلے اس لڑکی کو سمجھاؤ... مگر وہ کمبخت کہنے لگے کہ یہ سمجھانے کی نہیں سمجھنے کی بات ہے۔ اسے سب سمجھا دیا گیا تھا یہاں آنے سے پہلے۔ اب سمجھانے کا وقت گزر چکا..."

"تم اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہے ہو۔"

"میں قسم کھا سکتا ہوں..."

"میں جانتا ہوں کہ تم کتنے سچے ہو... اور تمھاری قسم کتنی سچی ہوگی... لیکن میں تم کو ایک چانس دوں گا کہ تم خود کو بے قصور ثابت کر سکو... میں ان سب سے پوچھوں گا جو اس وقت موجود تھے۔ ان میں تمھاری نرملا بھی شامل تھی۔" مدن موہن بولا۔ "وہ سب مجھے نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

"ان سب کو ہم نے تہ خانے میں بند کر رکھا ہے۔"

"کیوں؟"

"یہاں دشمن کا ایک ایجنٹ گھس آیا تھا۔ اس نے ایک لڑکی اور ایک لڑکے کو مار دیا... نرملا اسی کے قبضے میں ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو...؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" کرنل نے زیادہ وثوق اور اعتماد سے کہا: "وہ غالباً خود سکندر بخت ہے یا اس کا کوئی ساتھی۔"

"اس وقت کہاں ہے وہ؟"

"تمھاری موہنی کی لاش پر قدم جمائے کھڑا ہوا ہے۔" کرنل نے محسوس کیا کہ بالآخر اپنی حاضر دماغی اور ہوشیاری سے وہ مدن موہن کا ذہن اس مقام کا خیال نکالنے اور اس کے خیالات کا رخ پلٹنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

"میری موہنی کی قبر پر...؟" مدن موہن چلایا۔

"قبر پر نہیں... قبر کے اندر... اس کی لاش پر..." کرنل نے اس کے غصے کی آگ پر تیل چھڑکا: "ہم نے تو موہنی کی تدفین کر دی تھی باعزت طور پر... یہاں چتا جلانے کی تو گنجائش ہی نہیں تھی۔ مگر وہ قبر کھود کے اندر اتر گیا... اور اب وہیں مورچا بنائے بیٹھا ہوا ہے... ہم سب اس کو قبر سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے کہ تم آ گئے... وہ پلید جوتوں سمیت موہنی کے جسم پر سوار ہے۔"

"میں... میں اسے کتے کی موت ماروں گا... اس کا خون پی جاؤں گا... جس نے میری موہنی کے ساتھ ایسا سلوک کیا..." مدن موہن پاگلوں کی طرح تڑپنے لگا: "مجھے بتاؤ وہ پلید کہاں ہے؟"

"ادھر... ادھر سے دیکھو..." کرنل نے کہا۔

میں بہت پہلے سے تیار تھا۔ مدن موہن ایک دم میرے سامنے آ گیا... وہ کسی طوفانی بگولے کی طرح گزر رہا تھا کہ میں نے ٹھوکر ماری جو اس کی ٹھوڑی پر لگی۔ وہ چیخ مار کے الٹ گیا... مشین گن اس کے ہاتھوں سے نکل کے دور جا گری اور چند قدم پیچھے جا گری۔ کرنل نے میری توقع کے مطابق اس پر جھپٹنے کے لیے جست لگائی۔ میں نے اپنی مشین گن کا بٹ اس کے سر پر مارا اور وہ کراہ کے ایک سائڈ پر گرا۔ ضرب صحیح نہیں پڑی تھی جیسا کہ اس نے اٹھنا چاہا مگر میں نے اسے پے در پے ٹھوکریں ماریں... سر، پسلیوں میں اور پیٹ میں۔ وہ چلاتا رہا اور لڑھکتا رہا۔

اس دوران مدن موہن نے اٹھنا چاہا... وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ میں نے مشین گن کا رخ اس کی طرف کر دیا: "خبردار... اپنی جگہ پر کھڑے رہو..." میں نے کہا: "میں تمھارا دشمن نہیں۔"

"تم جھوٹ بکتے ہو۔" مدن موہن غرایا۔

"جھوٹ یہ بکتا ہے۔" میں نے بے سدھ پڑے ہوئے کرنل کی طرف اشارہ کیا: "کون ہے موہنی کی قبر میں... کوئی تو آ رہا ہے، جوتوں سمیت اس کی لاش پر کھڑا ہوا... وہ دیکھو... وہ ہے تمھاری موہنی کی قبر..."

مدن موہن نے پلٹ کے دیکھا۔

"وہ مٹی کا ڈھیر نظر آ رہا ہے تمھیں؟" میں نے کہا: "وہی ہے موہنی کی قبر... اور اس کے پاس ہی تین لاشیں اور پڑی ہوئی ہیں۔"

"تین نہیں... چار ہیں..."

"ان میں سے ایک نرملا ہے... وہ زندہ ہے... دوسرا ایک لڑکا ڈرائیور مانیں ہے... باقی دو کو پہچانتے ہو تم؟"

مدن موہن نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا: "وہ محافظ تھے... اپنے آقاؤں کے حکم پر دم ہلانے والے... ذلیل کتے... بے دھرم درندے۔"

"انہی ملک کے غداروں نے تمھاری موہنی کو یہاں گاڑا تھا۔ اب وہ اس کی قبر کھود کے اسی میں دوسری لاش بھی دبانے والے تھے... مائیں ڈرائیور کی لاش..." میں نے کہا: "لیکن وہ میرے ہاتھوں مارے گئے... کرنل نے جھوٹ بولا تھا تم سے کہ میں موہنی کی لاش پر جوتوں سمیت چڑھا ہوا ہوں... میں ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا مدن موہن... اس نے تمھاری توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کے لیے اتنا بڑا جھوٹ بولا تھا کہ میں مشین گن کے ساتھ قبر میں مورچا بنائے بیٹھا ہوا ہوں... ابھی تک تو میں نے قبر کے اندر جھانکا بھی نہیں۔"

"پھر تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ موہنی کی قبر ہے؟"

"میں نے مائیں ڈرائیور کے قتل کے بعد کسی کو حکم دیتے سنا تھا۔ اس نے ان دونوں سے کہا تھا کہ ڈرائیور کو بھی اسی قبر میں گاڑ دو جس میں کل موہنی کو گاڑا تھا... اس وقت نرملا بھی موجود تھی... وہ تصدیق کرے گی میری بات کی... تم کو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں... میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا..."

"مگر... تم ہو کون؟"

"میں ایک پاکستانی ہوں..." میں نے مختصراً کہا: "اور جو کچھ کر رہا ہوں پاکستان کے لیے کر رہا ہوں... اپنے لیے کچھ نہیں کر رہا ہوں۔"

"پھر تو تم... مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے..."

"یہ میری مرضی اور میرے اختیار کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر تم نے مجھ سے تعاون کیا تو ہو سکتا ہے کہ میں تمھیں رعایت دے دوں... میں جانتا ہوں کہ تم کو میری ذات سے کوئی دشمنی نہیں۔ جو کچھ تم کر رہے تھے پاکستان سے دشمنی کے جذبات کے باعث نہیں کر رہے تھے۔ جو پیار کے جذبات سے مغلوب ہو کے کر رہے تھے... تم ایک ایسے شخص ہو جس کا کوئی وطن... کوئی ضمیر اور کوئی اصول نہیں۔ تمھارا دھرم ایمان صرف پیسہ ہے... اگر تمھیں پیسے دیے جاتے تو... تم خود اپنے ہی بھارت دیش کے خلاف میری مدد کرتے... اس لیے میں قصوروار تمھیں نہیں سمجھتا۔ میں اسے تمھاری غربت کی خرابی یا کمزوری سمجھتا ہوں... لالچ میں پیسے کے لیے ساری دنیا میں لوگ اپنا... اپنے ناموس کا... وطن کا... انسانیت اور شرافت کا... عزت اور غیرت کا... ہر چیز کا سودا کرتے ہیں اور تم بھی انھی میں سے ایک ہو۔"

"تم مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہو؟"

"تم مجھے کرنل کے اور اس کے مشن کے بارے میں سب کچھ بتاؤ گے... جو کچھ بھی تم جانتے ہو۔" میں نے کہا: "مثلاً سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ اس وقت وہ سب لوگ کہاں ہیں؟"

"کون لوگ؟"

"تمھارے جیسے وطن فروش... جسم فروش... ایمان فروش... وطن فروش مرد اور عورتیں..." میں نے کہا: "وہ سب جو کل رات تک یہاں داد عیش دے رہے تھے... کرنل نے تمھیں بتایا تھا کہ وہ کسی تہ خانے میں ہیں... تم کو معلوم تو ہوگا کہ وہ تہ خانہ کدھر ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور پھر قبر کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم موہنی کو دیکھنا چاہتے ہو؟"

اس نے پھر اقرار میں سر ہلایا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا: "اسے کل شام میں دبایا گیا تھا اب تک اس کی لاش سڑنے گلنے لگی ہوگی... عام طور پر چوبیس گھنٹے میں پیٹ پھول کے پھٹ جاتا ہے... گوشت میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں... کیا بتاؤں تمھیں یہ اذیت ناک منظر دیکھ کر... تمھارے ذہن میں موہنی کی صورت کچھ اور ہوگی۔ اسی آخری تصویر کو یادوں میں تازہ رکھو... اگر تم نے اس کی خاک وطن میں لتھڑی ہوئی بدہیئت و متعفن لاش دیکھ لی تو ساری عمر اس منظر کو بھلا نہ پاؤ گے۔ تمھاری جگہ میں ہوتا تو شاید پاگل ہو جاتا... موہنی مر چکی ہے... اس کی موت کو ایک حقیقت سمجھ کے قبول کر لو... اس کے تصور میں یہ صورت کو شامل مت کرو۔"

اس نے یوں آہستہ سے سر ہلایا جیسے میری بات سمجھ رہا ہے لیکن اس کی نگاہ بدستور کھلی قبر پر جمی رہی۔

"چلو مجھے اس تہ خانے تک لے چلو..." میں نے اچھل کے اسے حکم دیا: "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"کیا تم سب کو آزاد کر دو گے؟"

"ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتا..." میں نے کہا: "یہ ان سب کے رویے پر منحصر ہے... پہلے تو میں انھیں اسی کام پر لگاؤں گا... وہ موہنی کی قبر کو بند کریں گے... اور باقی تین لاشوں کو ٹھکانے لگائیں گے۔"

"تہ خانے کا راستہ اندر سے ہے۔" وہ بولا۔

میں نے مشین گن ہلا کے اسے آگے چلنے کو کہا۔ دوسری مشین گن وہیں پڑی ہوئی تھی جہاں سے اسے کرنل نے اٹھانے

www.paksociety.com

کی بے سود کوشش کی تھی۔ میں نے اُسے بھی اُٹھا لیا۔ بیک وقت دو مشین گنوں کو استعمال کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا لیکن میں اس ہتھیار کو کرنل کے لیے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مدن موہن پر مشین گن استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اُسے میں خالی ہاتھوں سے بھی قابو میں رکھ سکتا تھا۔ مدن موہن کے پیچھے جانے سے پہلے میں نے مناسب سمجھا کہ کرنل کا طبّی معائنہ بھی کر لوں... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مکر کیے پڑا ہو اور میرے جاتے ہی اُٹھ کھڑا ہو۔ پیچھے بیٹھ کر اُسے غور سے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ اس کی نبض بھی تھمی ہوئی تھی۔ میرا پہلا اندازہ یہی تھا کہ شاید میرے ہاتھوں کی کوئی ٹھوکر مہلک ثابت ہوئی اور دماغ کے اندر کوئی رگ پھٹ گئی یا جگر کی چوٹ نے کام تمام کر دیا مگر پھر مجھے اس کے بند ہونٹوں پر چھوٹے سے جھاگ نظر آئے... میں نے بہت قریب سے سونگھا تو مجھے کڑوے باداموں جیسی بُو آئی۔ کرنل نے خودکشی کر لی تھی۔ اس کے منہ میں کسی دانت یا داڑھ کے خول میں سائنائیڈ کا انتہائی قاتل زہر پوشیدہ تھا جسے وہ ایسے ہی وقت میں خاص طریقے سے دبا کے توڑ سکتا تھا... یہ بہت پرانا طریقہ ہے جو سب جاسوس اور تخریب کار بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ اگر وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے لیے فرار کے سارے راستے بند ہو گئے ہیں تو دشمن کی قید میں جانے سے بہتر وہ خودکشی کو سمجھتے ہیں جو دشمن زیادہ اذیت دے کر اور سب کچھ معلوم کرنے کے بعد مارتا ہے۔ کسی بھی انسان کے لیے جسمانی ایذا رسانی کے جدید طریقوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں... وہ بالآخر سچ اُگل دیتا ہے اور جب دشمن کو یقین آ جاتا ہے کہ اب معلوم کرنے کو کچھ بھی نہیں رہا تو وہ باقی ماندہ ٹوٹے پھوٹے شکستہ اور نامکمل آدمی کو فاسفورس اور پیرافین والی اطلاع سمجھتے ہوئے بھٹی میں ملا دیتا ہے... غدار اور جاسوس کو تو اپنے معاف کرتے ہیں نہ پرائے۔ چنانچہ سمجھدار وہی ہوتا ہے جو فوری اور بے عذاب موت قبول کر لے۔

میں نے کرنل کی جامہ تلاشی لی... وہ عام آدمی جیسی شلوار قمیص میں تھا اور اگر مخاطب کرنے والوں نے اسے کرنل نہ کہا ہوتا تو مجھے کبھی اس کے عہدے کا پتا نہ چلتا۔ وہ مقامی آدمیوں سے ذرا بھی الگ شکل نہ تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ سری لنکا، نیپال، بھوٹان اور تبت کے لوگ بھی ایک جیسے رنگ، چہرے کے نقوش اور لب و لہجے کے مالک ہوتے ہیں۔ کرنل کی قمیص کی کسی جیب سے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے اس کی شناخت ممکن ہوتی۔ ایک جیب میں سے مجھے سگریٹ کیس اور لائٹر ملے۔ انھیں میں نے سنبھال کے رکھ لیا... یہ ٹرانسمیٹر بھی ہو سکتے تھے اور خطرناک قسم کے مہلک ہتھیار بھی... شلوار کے اندر بھی ایک جیب تھی۔ اس میں سے ایک بھرا ہوا ریوالور میرے ہاتھ لگا جو یقیناً حفاظتی انتظام کا ایک حصہ تھا۔ اگر کوئی اس سے مشین گن یا ریوالور چھین لینے کے بعد یہ سمجھتا کہ اس نے کرنل کو نہتا کر دیا ہے تو وہ اسی غلط فہمی کے باعث مارا جاتا۔

میں نے مدن موہن کو نگاہ میں رکھا تھا... وہ ایسا شخص تھا جس کو انتقام کی آرزو نے جوش و خروش سے بے قابو کر دیا تھا مگر جیسا وہ دیوانہ نہیں تھا۔ وہ ایک ذہین اور تعلیم یافتہ آدمی ہوگا جسے جاسوسی اور تخریب کاری کے اس مشن کے لیے منتخب کیا جاتا۔ تخریب کاری کی تربیت دینے والے انسانی فطرت کی کمزوریوں سے بخوبی واقف ہوتے ہیں... کوئی مایا جال میں پھنس جاتا ہے تو کوئی ہوس کے جال میں... وہ تو ترسے ہوئے محروم مارے ہوئے، خواہشوں کی ناکامیوں سے دل برداشتہ لوگوں کو بھی تاکتے ہیں۔ بھلا پیسہ کسے نہیں... انھیں اس نوجوانی پر ... وہ دولت مندی کی منزل کو اپنی دسترس میں دیکھتے ہیں۔ پھر ان کو عیش و عشرت کی اس زندگی سے روشناس کراتے ہیں جو ان کی زندگی میں صرف خوابوں تک محدود تھی اور بالآخر انھیں ... طور پر زندگی کا جوا کھیلنے پر آمادہ کر لیتے ہیں کہ کامیابی کا سہرا ... کی اس زندگی کا دوام ہے مگر جیت گئے تو کیا کہنا۔ دنیا ہی جنت ہوگی... ہار کے بھی کیا بازی مات نہیں... کیونکہ اس جہنم سے نکل گئے جس میں تم اب زندہ ہو۔

لیکن انتخاب وہ اہلیت کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ اپنا وقت، اپنے وسائل اور اپنا تجربہ کسی ایسے امیدوار پر ضائع نہیں کرتے جس کی ناکامی کے امکانات زیادہ ہوں۔ جو جرأت... حوصلہ مندی اور قوتِ فیصلہ سے محروم ہو... مدن موہن میں یہ سب صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس نے اپنے آقاؤں کو صحیح فیصلے پر پہنچایا تھا اور اس میں کامیاب بھی رہا تھا... وہ کیمپ سے فرار ہو کے جس طرح افسر اور کیمپ ایریا کے اندر گیا اور اپنا کام کر کے جس طرح نکل آیا، وہ اس کی ذہانت اور عیاری کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ تاہم جو بات اس کی ذہنی پختگی کی دلالت کرتی تھی وہ کرنل کی بیوی کے قتل سے باز رہنا تھا۔ اس نے کچھ سوچا اور محسوس کیا اور ارادہ بدل دیا۔

مدن موہن کو یقیناً صدمہ ہوگا کہ اپنے دشمن کو وہ خود ... لیکن دوسری طرف اس کے اطمینان کے لیے یہ بات کم نہ تھی کہ وہ دونوں ... کو خود اس نے مار دیا جن میں سے ایک نے ... کو پکڑا تھا اور دوسرے نے اس پر گولی چلائی تھی۔ مدن موہن ... میں پاگل ہو رہا تھا۔ اس کا دماغ خراب نہیں ہوا تھا۔ اس نے ... سب سمجھ لی تھی اور مان بھی لی تھی کہ اب موہنی کو دیکھنے ...

...میرے لیے فائدہ مند بھی ہو سکتا تھا اور خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا... ابھی وہ مجبور تھا... کچھ جذباتی اُلجھن سے اور کچھ غلط فہمی کے باعث۔

اس نے تہ خانے تک میری رہنمائی کی... یہ برآمدے کے دوسرے کنارے پہ واقع ایک زینہ تھا جس کا دروازہ اوپر سے مقفل تھا۔

"مدن موہن!" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "تم اندر کیسے آ گئے تھے؟"

"گیٹ سے اور کیسے؟" وہ بولا۔

"لیکن وہاں ایک دربان مسلح ہتھیار رہتا ہے..."

"وہ مجھے پہچانتا تھا۔" مدن موہن بولا۔ "اس نے جیسے ہی میرے لیے گیٹ کھولا، میں نے اُسے مار دیا۔"

"کیسے مار دیا؟ گولی چلتی تو آواز آتی۔"

"میں نے اس کے سر پہ پتھر مارا تھا۔" مدن موہن بولا۔ "جو میرے ہاتھ میں تھا لیکن میں نے پیچھے چھپا لیا تھا... وہ اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ وہ چکرا گیا پھر میں نے اس سے مشین گن چھین لی۔ پھر اسی کے وار سے اس کا سر پھاڑ دیا۔"

"اس نے شور نہیں مچایا تھا؟"

"وہ چلایا تھا۔ جب میں نے اس کے سر پہ پتھر مارا تھا۔"

"میں نے تو کوئی آواز نہیں سنی تھی۔" میں نے کہا۔ "اور شاید دوسروں نے بھی نہیں سنی تھی... ورنہ وہ ضرور آتے..."

"گیٹ کافی دور ہے... اور وہ بہت بلند آواز میں نہیں چیخا تھا۔ جب وہ پیچھے گرا تو میں نے ایک بہت بھاری پتھر سے اس کا سر کچل دیا تھا..." مدن موہن نے کہا۔

جب قفل والا دروازہ سامنے آ گیا تو میں نے مدن موہن کی طرف دیکھا۔ "اس کی چابی...؟"

"انھی میں سے کسی کی پاکٹ میں ہوگی۔" وہ بولا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ کیا میں واپس جاؤں اور شرانوں کی جیبوں کو بھی ٹٹولوں... پھر میں نے تالا توڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے تالے پہ مشین گن کے بٹ سے مسلسل چوٹیں لگائیں... دروازے کے پیچھے سے میں نے عورتوں کے چیخنے چلانے کی آواز سنی۔ ان سب کو حفظِ ماتقدم کے طور پر اسیر کر دیا گیا تھا... وہ حیران پریشان ہو گئے کہ دروازہ کھولنے والے کے بجائے دروازہ توڑنے والا کون آ گیا۔ تالا اور دروازہ دونوں میری توقع سے زیادہ مضبوط ثابت ہوئے۔ اس سے مجھے تھوڑی سی جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی... بس ایک سیکنڈ کے لیے میری ساری توجہ ... اور میں نے اس پہ آخری وار پوری قوت سے کرنے کا فیصلہ کیا... مدن موہن نے اس ایک سیکنڈ کو تاڑ لیا اور اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مجھ پہ حملہ کر دیا۔

دلیرانہ، بر کار، خونخوار، ہوشیار... مدن موہن نے اپنا انتقام لے لیا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ میں بھی اس کرنل کا اور اس کے حواریوں کا جانی دشمن ہوں مگر وہ یہ بات نہیں بھولا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں... ایک مشترک دشمنی کا جذبہ رکھنے کے باوجود ہمارے درمیان دوستی اور تعاون کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ میں بھی اُسے وہی سزا دوں گا جو کرنل اسے پکڑ جانے کی صورت میں دیتا... شاید میری سزا زیادہ سخت ہوگی۔

اس کے پہلے حملے نے میرے قدم اکھاڑ دیے۔ میں اس دروازے سے ٹکرایا جس پہ وار کر رہا تھا۔ میرا سر دروازے پہ لگا اور مشین گن بٹ سے بے ڈھنگے طریقے پہ دروازے سے ٹکرا کے اُچھل گئی۔ میں تیزی سے گھوما... یہ میرے جسم کا خود کار دفاعی عمل تھا بالکل ایسا ہی جیسے غلطی سے انگارے کو چھو لینے والا ہاتھ ایک جھٹکے سے پیچھے آ جاتا ہے... مجھے احساس تھا کہ دشمن میرے پیچھے ہے مگر پلٹ کر دیکھنے کے باوجود مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ اس ضرب نے جو میرے دروازے پہ لگنے سے آئی تھی، میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلا دیا تھا۔ یہ اندھیرا فوراً ہی چھٹ گیا... خطرے کے احساس نے میرے حواس کو سہارا دیا اور میں نے سر کو جھٹک کے دیکھا تو مجھے مدن موہن کے ہاتھ میں مشین گن نظر آئی جسے وہ زمین سے اُٹھا چکا تھا۔

ابھی وہ سیدھا بھی نہ ہوا تھا کہ میرا دایاں پیر حرکت میں آ گیا اور فٹ بال اسٹائل کی یہ کک مشین گن پہ ہی پڑی... مشین گن مدن موہن کے ہاتھ سے نکل کے اوپر گئی اور چھت سے ٹکرا کے واپس آئی لیکن اتنی دیر میں خود مدن موہن اوپر اُٹھ چکا تھا... وہ نیچے گرا تو اس نے مشین گن کو میرے ہاتھ میں دیکھا۔

"بس مدن موہن... جہاں پڑے ہو وہیں پڑے رہو۔" میں نے مشین گن کا رُخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تم نے اپنے حق میں اچھا نہیں کیا... میں سوچ رہا تھا کہ تم سب کو آزاد کر دوں اور واپس چلا جاؤں... تم سب بھٹکے ہوئے لوگ ہو... جو بہکاوے میں آ گئے تھے... تمھیں زندہ رہنے کا ایک موقع ملنا چاہیے۔"

"نہیں چاہیے مجھے یہ موقع..." مدن موہن نے کراہ کے کہا۔ "میں جینا بھی نہیں چاہتا موہنی کے بغیر... مار ڈالو مجھے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے مرنے جینے کا اختیار بہت پہلے گروی رکھ دیا تھا... یہ اختیار پہلے کرنل کے پاس تھا اور اب میں نے لے لیا ہے... نہ میں تمھاری یہ درخواست قبول کروں گا کہ تمھیں جینے دوں اور نہ یہ خواہش پوری کروں گا کہ مار دوں..."

www.paksociety.com

اس کا قیصر وقت کرے گا۔" میں نے ایک دم گھوم کر تالے پہ دو فائر کیے۔ تالا ٹوٹ کے بکھر گیا۔ اندر سے ہسٹریا میں مبتلا عورتوں نے چیخنا شروع کیا۔ میں نے کنڈی کھولی اور دروازے کو لات ماری... نیچے جانے والا زینہ میرے سامنے آگیا۔ تھوڑا سا اُجالا اوپر کے حصے میں ہی ختم ہو جاتا تھا۔ آگے سرنگ جیسا اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے کو سو واٹ کا ایک بلب اپنی زرد روشنی سے پُرآسیب بنا رہا تھا... جہاں زینہ ختم ہوتا تھا وہاں وہ سب خوف اور وحشت میں مبتلا کھڑے ہوئے تھے... وہ نہیں جانتے تھے کہ میں کون ہوں... دوست ہوں یا دشمن ہوں۔ ان کو اس قید زنداں سے نجات دلانے آیا ہوں یا قید حیات سے... تاہم ان کے خوف سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرے ارادے اور اپنے انجام کو میری صورت پہ پڑھ رہے ہیں۔

"چاروں مرد اوپر آجائیں۔" میں نے حکم دیا اور میری آواز خود مجھے بڑی اجنبی لگی۔ اس آواز میں تہ خانے کی بازگشت تھی۔ "چاروں عورتیں پیچھے ہٹ جائیں۔"

مردوں نے تعمیل کی اور عورتوں کو دھکا دے کر آگے بڑھے۔

"ایسے نہیں..." میں نے کہا۔ "چاروں ہاتھوں پیروں پہ چل کے آنا ہے... کتے کی طرح... جس نے بھی سر اٹھا کے دیکھا اس کا بھیجا فوراً کردوں گا... زینے کا دروازہ بند کر دو۔ عورتیں نہیں آئیں گی۔"

وہ چاروں بڑے مضحکہ خیز انداز میں زینہ چڑھ کے اوپر آگئے۔ میں نے انھیں بیرک کے کوریڈور میں بھی اسی طرح ایک قطار میں رکھا۔ آگے پیچھے چلتے ہوئے وہ بیچ جانور لگتے تھے۔ ملن موہن سب کے آگے تھا۔ میں انھیں بیرک میں سے گزار کے باہر لے گیا۔ آتے جاتے میری آنکھوں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ جگہ اسلحے کی تقسیم و ترسیل کا ایک ڈپو تھی جہاں سے تربیت یافتہ تخریب کار اسلحہ لے کر آگے جاتے تھے... انھیں جبر کی صورت میں کسی مشن پہ روانہ کیا جاتا تھا... ایک مرد اور ایک عورت کی مقامی آبادی میں آسانی سے گم ہو سکتی تھی۔

"ملن موہن... اب تم فرملا کو اٹھا کر لے آؤ گے۔" میں نے باہر آکے حکم دیا۔ "باقی چار آدمی دس منٹ میں تین لاشوں کو قبر میں ڈال لیں گے اور مٹی برابر کریں گے۔"

میں ان سے دس قدم پیچھے رہا۔ باہر کی زمین دھوپ میں تپ رہی تھی لیکن میں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی اور ان سب کو چوپایوں کی طرح لے گیا۔ ان کی ہتھیلیاں جھلسنے اور یقیناً چھلے ہوں گے مگر میرے نزدیک وہ بدترین سزا کے مستحق تھے۔ ملن موہن سب سے پہلے فرملا کے نزدیک پہنچ کر رکا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور میں نے اسے کھڑا ہونے کی اجازت دی۔ میں نے صرف سر کے اشارے سے ایسا کیا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ آہستہ آہستہ اُٹھے گا لیکن وہ بجلی کی طرح اُٹھا اور اس نے مجھ پہ فائر جھونک دیا... دیوار اس نے فرملا کے پاس سے اٹھایا تھا اور شاید یہی دیکھنے کے لیے اس نے سر گھمایا تھا کہ میں کس پوزیشن میں اور کہاں ہوں۔ میں نے اُسے اجازت مانگنے کا انداز سمجھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جان کی بازی لگادی۔ ویسے بھی جینے کی خواہش سے محروم ہو چکا تھا اور بے حد بے بس تھا۔ اگر گولی مجھے لگ جاتی تو وہ اپنے ساتھ دوسروں کی جان بچا لیتا... لیکن عجلت میں آگ نہ لینے سے گولی نے مجھے چھو تک نہ...

بالکل غیر ارادی طور پہ میں نے جو فائر مارا اور ملن پہ بیٹھ...

اس طرح میری جان بچ گئی کیونکہ دوسری گولی ملن موہن نے ... سے کر چلائی تھی... اس سے زیادہ کی اسے مہلت نہ ملی۔ ... شیطانی کھیل کا ڈراپ سین ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ملن موہن کا یہ کھیل بھی ختم ہو گیا جس میں تقدیر نے اسے ہر قدم پہ سراب دکھائے تھے اور وہ ہر سراب کو حقیقت جان کے اس کے پیچھے دوڑتا رہا تھا... وہ مظلوم بھی تھا اور ظالم بھی... ملن موہن نے عدالتِ انصاف سے ایک قتل پہ چار مجرموں کو موت کی سزا دلائی تھی۔ ان میں سے دو عورتیں مجرم نہیں تھیں۔ وقت نے ان کے قاتل کو بھی مہلت نہ دی۔

باقی چار افراد خوف زدہ ہو کے زمین پہ اُلٹے لیٹے ہوئے تھے اور ابھی تک سلگتی ہوئی زمین پہ پڑے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں پھر اٹھنے اور اپنا کام ختم کرنے کا حکم دیا۔ ملن موہن کا انجام ان کے سامنے تھا۔ اس کی لاش میں کئی سوراخ تھے اور ان سے رستا خون مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کی کھلی آنکھیں آسمان میں بہت بلندی پہ اُڑنے والے چیل کوؤں کو دیکھ رہی تھیں۔ اب موہنی کی لاش پہ اوپر تلے چار لاشیں ڈال دی گئیں... میں اس کے محبوب کی لاش بھی تھی جس سے دنیا میں ان کا ... بہت عارضی تھا۔ شاید کہیں کائنات میں ان کی محبت کے لیے کوئی جگہ ہو جہاں وہ دنیاوی زندگی کی حدود سے پرے ... کے رہ سکیں۔

قبر لاشوں سے ہی بھر گئی تھی چنانچہ بہت کم مٹی اوپر ڈالی۔ میں نے انھیں واپسی کا حکم دیا۔ ان میں سے تین اسی طرح چار ہاتھوں پیروں پر چلتے واپس آئے۔ چوتھے نے فرملا کو اٹھا لیا۔ ... کی اتنی طویل بے ہوشی میرے لیے حیرت کا باعث بھی تھی اور ... کا بھی... اتنا تو مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی ... ہے... ملن موہن کی بات سن کے مجھے اجنبیت کا سبب معلوم ہو گیا تھا... وہ کرنل کی منظورِ نظر تھی جسے وہ شاید موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ساتھ ہی لے آیا تھا۔ ملن موہن کے بیان کے مطابق وہ کسی اسپتال میں نرس تھی۔ میں اس سے بہت

مفید معلومات حاصل کر سکتا تھا لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہوش میں آجائے... سر کی اندرونی چوٹ سے وہ بے ہوشی کی کیفیت میں مر بھی سکتی تھی اور اس کی بے ہوشی کا وقفہ لامحدود بھی ہو سکتا تھا۔

مجھے ہیڈ کوارٹر سے بھی واپسی کا اندیشہ تھا... وہ کہہ کر تو ہی گیا تھا کہ 'حرام شے بھتے' کو لینے جا رہا ہے۔ اس بات کو دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ وہ کسی بھی وقت آسکتا تھا۔ حالات اب میرے محسوس میں تھے چنانچہ میں اس کا شایانِ شان استقبال کر سکتا تھا... تاہم مجھے اتنی مہلت درکار تھی کہ میں ان سب مردوں اور عورتوں کو پھر تہ خانے میں ڈال دوں اور اس بار کو یقینی بناؤں کہ ان کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ لاحق نہیں... میں بھوک پیاس سے بھی بے حال ہو رہا تھا اور محض اپنی قوتِ برداشت اور قوت ارادی کے سہارے ان حالات کا مقابلہ کر رہا تھا۔ کیمپ میں کھانے پینے کی کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ کیمپ ہی نہیں ایک عشرت کدہ بھی تھا۔ میں نے کرنل کی جیب میں سے نکلنے والی سگریٹ سلگانے کا سوچا تھا لیکن خشک حلق اور خالی پیٹ کے ساتھ دھواں نگلنا مشکل کام تھا چنانچہ میں نے دل کو صبر کے میٹھے پھل کی دلیل سے بہلا لیا۔

تہ خانہ درحقیقت کچھ عجائب قسم کی چیز تھا۔ یہاں حضرات اور خواتین کو دیواریں پھلانگنے... رکاوٹیں عبور کرنے اور ایسی ہی مشکلات سے نمٹنا سکھایا جاتا تھا... اس کے لیے لانگ جمپ ہائی جمپ... دیوار پہ کسی سہارے کے بغیر سیدھا چڑھنا، بلندی سے کودنا، رسّے سے کمند ڈالنا اور رسّی کو جھولا بنا کے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچنا۔ خندق یا کھائی عبور کرنا اور ایک دیوار سے دوسری دیوار پہ پہنچنا سکھایا جاتا تھا۔ تہ خانے کی گہرائی شروع میں بارہ فٹ اور آخری حصے میں اٹھارہ فٹ کے قریب تھی... گہرائی بتدریج بڑھتی تھی اور اس ہال کی چالیس فٹ لمبائی ایک مسلسل نشیب کا راستہ تھی۔ اس راستے پہ بیس فٹ کے بعد پہلی دیوار تقریباً آٹھ فٹ اونچی تھی۔ غالباً اوپر سے دوڑ کر آنے والے جمپ لگا کے یا کسی بانس کے سہارے سے پہلے سے عبور کرتے ہوں گے۔ دوسری دیوار اس سے دس فٹ آگے اور بارہ فٹ بلند تھی۔ بالکل آخری حصے میں چھت کے کنڈوں سے رسّے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک رسّہ قدرے لمبا تھا۔ اس کی لمبائی چھت سے فرش تک تھی۔ دوسرا صرف چھ سات فٹ لمبا تھا۔

حالانکہ بھی بہت کچھ تھا جو تخریب کاروں کی تربیت کے مختلف مراحل میں کام آتا تھا... یہاں سخت ترین حالات سے گزرنے کی تربیت عملی طور پہ وہ حالات پیدا کر کے دی جاتی تھی جو ایجنٹ اور دشمن علاقے میں پیش آسکتے تھے۔ انھیں بھوکا پیاسا رہنا بھی سکھایا جاتا ہوگا اور درختوں کے پتے کھا کے گزارا کرنا بھی... اس کے علاوہ ان کو نظریاتی تعلیم دینے کے لیے ایک مختصر سا کلاس روم جیسا تھا... وہاں ان کو سمجھایا جاتا ہوگا کہ انھیں دشمن کے علاقے میں گھسنے کے بعد کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ کس قسم کے مشن کی تکمیل کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور مقامی معاونت سے کیا مدد لینی چاہیے... وغیرہ وغیرہ... ظاہر ہے انھیں وہاں مختلف قسم کے اسلحے کا استعمال بھی سکھایا جاتا ہوگا لیکن اسلحہ انھیں وقت سے پہلے نہیں دیا جاتا ہوگا... کتے کو بھی جب تک پوری طرح سدھا نہ لیا جائے اس پہ کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی وقت اچانک مالک کو نہیں کاٹ لے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سب نہتے تھے... پستول صرف فرملا کے پاس تھا جو میں اس لیے نہیں نکال سکا تھا کہ مجھے نظر نہیں آیا تھا... اس کے پاس کوئی پرس یا ہینڈ بیگ ہوتا تو میں ضرور اس کی تلاشی لیتا مگر غالباً پستول کو اس نے اپنے زنانہ سیفٹی ڈیپارٹمنٹ میں یعنی بلاؤز میں چھپا رکھا تھا۔ جب میں نے اسے جھٹکا دیا تو پستول باہر گر گیا تھا۔ ملن موہن نے اسے فرملا کے قریب جا کے دیکھا ہوگا... ذرا سی بے احتیاطی میری جان لے سکتی تھی۔ ملن موہن کی بدحواسی کے باعث میں بچ گیا تھا۔ اب مجھے خیال آیا کہ پستول تو فرملا کے پاس بھی ہونا چاہیے جو انھی کے ساتھ دفن ہو گئے۔ ملن موہن کے انجام نے باقی سب کے حوصلے پست کر دیے تھے ورنہ وہ بھی ایسی ہی کوشش ضرور کرتے۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ مقابلے سے بازی جیتنے کے امکانات معدوم ہو گئے ہیں... زندہ رہنے کی امید کو اب میرے رحم و کرم سے ہی وابستہ رکھا جا سکتا تھا... وہ نہایت معقول بردباری اختیار کیے ہوئے تھے اور شاید سوچ رہے تھے کہ منت سماجت اور آہ و زاری سے وہ مجھے جاں بخشی پہ آمادہ کر لیں گے۔

مجھے ابھی بہت کچھ دیکھنا اور پوچھنا تھا لیکن پہلے میں اپنی جسمانی کمزوری کا ازالہ کرنا چاہتا تھا جو بھوک پیاس کی صورت میں مجھ پر غالب آرہی تھی... میں نے ان سب کو ہال کے ایک باتھ روم میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگادی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہاں کوئی اسلحہ نہیں ہے لیکن وہ سب مل کے کوشش کرتے تو ایسی بہت سی چیزیں تھیں جن سے دروازہ توڑا جا سکتا تھا... اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ فرار ہونے کی کوشش بھی کریں کیونکہ پھر مجھے ان سب کو شوٹ کرنا پڑتا اور میری تفتیش ادھوری رہ جاتی۔

باتھ روم زیادہ بڑا نہیں تھا اور وہ سب اس کے اندر لیٹ کھڑے رہ سکتے تھے... نیچے تہہ خانے میں عورتیں مسلسل رو رہی تھیں اور تقریباً ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ وہ ہاتھ جوڑ رہی تھیں اور دہائی مانگ رہی تھیں... خدا رسول کے واسطے دے رہی تھیں اور وضاحت کر رہی تھیں کہ وہ اپنی مجبوری کے باعث

اس غلط کام میں پھنس گئیں لیکن میں نے ان کی اوقات سے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ مرد خود اپنی نظروں میں ذلیل تھے اور چھپے ہوئے تھے کہ اب سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔

اب باہر صرف نرملا رہ گئی تھی... میں نے اس کا سرسری معائنہ کیا۔ نبض کی رفتار اور دل کی دھڑکن مجھے نارمل لگی... مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ مکر کیے نہ پڑی ہو۔

"نرملا...؟" میں نے اسے آہستہ سے ہلا کے کہا۔ "نرملا! ہوش میں آؤ..."

میں نے اس کے گالوں کو تھپکا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا جو صرف اداکاری تھی۔

"لاحول ولاقوۃ۔" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "یہ تو گلے پڑ گئی۔" پھر میں نے کچھ دور جا کے سگریٹ جلائی اور چند کش لیے۔

"اچھے بابا اب تو ہوش میں آ جاؤ۔" میں نے یوں کہا جیسے میں اس کی بے ہوشی سے سخت عاجز آ گیا ہوں۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" اس کے پاس بیٹھ کے میں نے نرمی سے کئی بار اس کا نام پکارا اور پھر اچانک جلتی ہوئی سگریٹ اس کی گردن پر لگا دی۔ ایسے وقت میں جب اسے مجھ سے اس قسم کے سلوک کی ذرا بھی امید نہ تھی۔

نرملا نے ایک چیخ ماری اور آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ میں نے ایک قہقہہ مارا۔ "تو تم بے ہوش نہیں؟" میں نے کہا۔ وہ اٹھ بیٹھی اور ایک ہاتھ سے بال سنوارنے لگی۔

"میں مانتا ہوں تمہاری قوتِ برداشت کو۔" میں نے کہا۔ "اور تمہاری اداکاری کو کہ تم نے بے ہوشی کا اتنا لمبا ڈراما کامیابی سے کیا۔ کیا تمہیں امید تھی کہ بالآخر تمہارے چاہنے والے کرنل صاحب اور ان کے مددگار و معاون شرما اور ملہوترا آ جائیں گے... تم ہماری جاری گفتگو سنتی رہیں... اور انتظار کرتی رہیں میری شکست کے لمحے کا۔"

اس نے حیرانی سے پلکیں جھپکا کے مجھے دیکھا۔ "میں کتنی دیر سے بے ہوش پڑی رہی ہوں... میں نے تو... وہ سب کہاں ہیں؟"

"گویا تمہیں کچھ معلوم نہیں؟" میں نے طنز سے کہا۔ "یہ بھی کہ وہ دونوں جہانی مدن موہن کے ہاتھوں جہنم رسید ہو گئے۔"

"کیا؟... مدن موہن نے...؟ تعجب ہے!" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں ہنس کے بولا۔ "تم اب یہ بھی کہو گی کہ تمہیں اپنے کرنل صاحب کے مارے جانے کی بھی خبر نہیں..."

"بکتے ہو تم..." وہ ایک دم چلائی۔ "مجھے وحشت زدہ کرنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہو۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "کیا تم اس کی لاش دیکھنا پسند کرو گی؟"

نرملا کا رنگ پیلا پڑ گیا... وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے تکتی رہی... یہ ایک فطری ردِعمل تھا جسے میں اداکاری نہ سمجھنے پر مجبور تھا۔

"یہ... یہ ٹھیک ہے کہ میں ابھی ہوش میں تھی... اس وقت جب تم نے میرے جلتی ہوئی سگریٹ لگائی تھی..." وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں تمہیں شوٹ کرنے کا موقع تلاش کر رہی تھی۔"

"خالی ہاتھوں سے شوٹ کرنے کے لیے؟" میں نے پھر طنز کیا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر گیا۔

"تمہارے ریوالور سے مدن موہن بھی مجھے شوٹ کرنا چاہتا تھا مگر وہ اس ریوالور سمیت دفن ہو گیا... اس کی قبر شاید جس میں تم موہنی کو گاڑ گیا تھا... کیا یہ سب تمہیں معلوم نہیں؟"

اس نے شدت سے انکار میں سر ہلایا۔ "مجھے... صرف اتنا یاد ہے کہ... تم نے... مجھ پر حملہ کیا تھا... اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ شاید میں گر پڑی تھی... پھر جب میں نے دیکھا تو... تم مجھے اٹھا کے لا رہے تھے۔"

میں نے اس کے جواب پر غور کیا تو میرے شک کی بنیاد ہی غلط ہونے لگی... ایک وقت ایسا آیا تھا جب وہ آگے آ سکتی تھی اور مجھے پیچھے سے گولی مار سکتی تھی... اس وقت میں مدن موہن کے ہمراہ تہہ خانے کے دروازے کی طرف جا رہا تھا... تہہ خانے کے قیدیوں کو باہر نکالنے میں میرے چند مددگار مصروف ہو گئے تھے اور اس وقت نرملا کو کسی کا خوف نہ تھا... یہ میری کوتاہی تھی کہ میں نے اسے بے ضرر سمجھتے ہوئے وہاں چھوڑ دیا تھا... مجھے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ وہ مسلح ہے... یہ سب تنہا ہونے والی مگر ناقابلِ معافی غلطیاں تھیں... اگر میں اکیلا نہ ہوتا اور کوئی میرے ساتھ ہوتا تو ایسی بھول چوک نہ ہوتی... محسن میرے ساتھ ہوتا تو ایک صورتِ حال کی نگرانی کرتا اور دوسرا تلاشی لیتے اور مجرموں کو باندھ کر باقی کارروائی پوری کرتا... یہ ایک آدمی کا حسن ہی تھا کہ میں نے اب تک تقدیر کی یاوری سے کامیابی کی سمت بڑھتا رہا تھا... لیکن میں خود کب اس حسن پر نازاں تھا... میرا مشن تو ادھورا تھا مگر تقدیر نے مجھے یہاں پہنچا دیا تو میں کیا کرتا!

"دیکھو نرملا..." میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے... یہ بازی تمہارے کرنل صاحب ہار چکے ہیں... مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے کہ یہاں کیا ہوتا تھا... نہیں معلوم تو وہ معلوم ہو جائے گا... یہاں اگر کسی کو کسی کے اعمال گھیر سکتے ہیں تو وہ استاد پنڈت ہے۔"

"استاد پنڈت...؟"

"ہاں... یہ اس کا ایک نام ہے۔" میں نے کہا۔ "اس لیے چونک جانے کی ضرورت نہیں... ممکن ہے تم سے اس کا تعارف کسی اور نام سے کرایا گیا ہو... وہ گاڑی لے کر گیا تھا مقتول ڈرائیور کے ساتھی کلینر کی تلاش میں... اگر وہ آ گیا تب بھی وہ کوئی توپ نہیں چلا سکتا۔"

"آخر... تم کیا چاہتے ہو؟" وہ سر جھٹک کے بولی۔

"صرف تمہارا تعاون..." میں نے کہا۔ "تعاون کے لفظ سے غلط فہمی پیدا نہ ہو اس لیے وضاحت کر دیتا ہوں کہ میری مراد اس تعاون سے نہیں ہے... جو تم کرنل صاحب سے کرتی رہی ہو۔"

"میں تم سے ہر قسم کا تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔" وہ آنکھ مٹکا کے بولی۔

"ویری گڈ... تمہاری اس کایا کلپ کو میں کیا سمجھوں...؟ ابھی تو میں نے کوئی قیمت بھی نہیں لگائی تھی کہ تم نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر لیں... تم سب کچھ بھول گئیں کہ تم نے کرنل سے کیا عہد باندھا تھا۔ تمہارا تعلق کس ملک سے ہے اور تمہارے مذہبی عقائد کیا ہیں؟"

"تم کچھ بھی سمجھ لو..." وہ نخوت سے مسکرائی... مگر یہ مسکراہٹ بے جان اور مصنوعی تھی۔

"دیکھو سمجھنے سمجھانے کے لیے تو بہت وقت ہے۔ فی الحال تم اپنے تعاون کا آغاز امورِ خانہ داری سے کرو۔" میں نے کہا۔

وہ مجھے حیرانی سے دیکھنے لگی۔ "کیا کروں؟"

"آخر تم عورت ہو... اور ہندوستانی عورت... جو کام تم کرو گی بچپن میں تو ماں باپ نے نہیں سکھایا تھا... مگر جو سکھایا تھا وہ سب تم بھول نہیں ہو گی یعنی چائے بنانا... کھانا پکانا اور کھلانا... یہاں کوئی کچن بھی ہو گا... ذرا سی دیر کے لیے فرض کر لو کہ میں تمہارا پتی پرمیشور ہوں... میں تھکا ہارا اور بھوکا پیاسا گھر لوٹا ہوں۔ اب تم کس طرح سیوا کرو گی...؟"

"ایسا مت کہو... بھگوان کے لیے۔" اس کا چہرہ ایک دم تاریک ہو گیا۔ "ایسے خوابوں کے آسیب نے میری زندگی اجیرن کر رکھی تھی... بڑی مشکل سے ان سب کو مارا تھا میں نے... اور دفن کر دیا تھا... جیسے لوگ اپنے گناہ مٹی میں چھپا دیتے ہیں۔ ہندوستانی عورت کیا... میں عورت بھی نہیں ہوں... میں فقط ایک جسم ہوں... بکنے والی جنس اور مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ خریدار کون ہے... میری قیمت بھی حالات اور ضرورت کے مطابق بدلتی رہتی ہے... تم نے تو قیمت نہیں لگائی مگر آج میری قیمت صرف زندہ رہنے کا حق ہے... جو تم تجارت سمجھ کے بھی دو گے تو میں قبول کر لوں گی۔" وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی... اور پیچھے گر گئی۔

میں نے اسے بازو سے پکڑ کے کھڑا کر دیا۔ "ڈراما مت کرو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تم کس کا ساتھ دے رہی تھیں اور کیوں... یہ قتل و غارت گری اور خون ریزی کا مشن تھا... کبھی تم نے سوچا تھا کہ ان کا خونِ ناحق، مرد، عورتیں، بوڑھوں اور بچوں کی زندگی بھی ایک قیمت رکھتی ہے جو تمہارے اس مشن کی بھینٹ چڑھ گئے... اور بے حقیقت بن گئے۔ وقت بدل گیا ہے تو قیمت کے بجائے تم حیات مانگ رہی ہو... میں تم سے جھوٹا وعدہ بھی نہیں کر سکتا کہ تمہیں حیات مل جائے گی۔"

میں اسے دھکیلتا ہوا کچن کی طرف لے گیا... وہ آگے آگے تھی اور خود ہی قدم بڑھاتی جا رہی تھی مگر جہاں اس کی رفتار کم ہوتی تھی میں اس کو پیچھے سے لات رسید کرتا تھا۔ وہ دو بار گری اور پھر اٹھ کے چلنے لگی۔ وہ میرے لیے ایک گھٹیا قیدی تھی لیکن میں کسی جنیوا کنونشن کے اصولوں کا پابند نہ تھا... عام حالات میں ایک عورت کے ساتھ یہ سلوک نامناسب سمجھا جا سکتا تھا مگر یہ عورت میری، میرے ملک کی اور میری قوم کی دشمن تھی۔ اس کے ہاتھ لاتعداد بے گناہوں کے خون میں رنگے ہوئے تھے بلکہ اس کو بدترین عذاب کے ساتھ قتل کرنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پا رہا تھا۔ اور وہ اب تک زندہ تھی تو صرف اس لیے کہ میرے نزدیک اس کی اہمیت ایک ایسی دستاویز سے زیادہ نہ تھی جس سے مجھے کارآمد معلومات حاصل ہونے کی امید ہو... جس کو پڑھنے کے بعد ہی طے کیا جا سکتا تھا کہ اسے تباہ کر دیا جائے یا آئندہ ضرورت کے لیے محفوظ اور مقفل رکھا جائے۔

کچن میں وہ سب کچھ تھا جس کی مجھے توقع تھی یا خواہش تھی... اس نے الیکٹرک کیتلی کو پلگ لگایا... فریج میں سے مکھن، انڈے اور ڈبل روٹی نکالے... پھر آملیٹ بنانے کے لیے انڈے توڑنے لگی... میں اس کے قریب ہی ایک اسٹول پر بیٹھ گیا تھا کہ اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھ سکوں... اگر وہ میرے لیے آملیٹ یا کافی میں زہر ملا دیتی تو اس سے کچھ بعید نہ تھا۔

"کام کے ساتھ ساتھ تم باتیں کر سکتی ہو۔" میں نے کہا۔

"کیسی باتیں...؟"

"میں تم سے جو پوچھوں اس کا جواب دیتی رہو۔" میں نے کہا۔

اس نے سر ہلایا۔ "پوچھو۔" اور پیشانی پر سے بالوں کی ایک لٹ کو پیچھے پھینکا جو ایک سیکنڈ بھی اپنی جگہ نہیں ٹھہرتی تھی۔

"غالباً یہ کہنا ضروری نہیں کہ تم جو کہو گی سچ کہو گی... مجھے بہت کچھ تو پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے... تم نے تو مجھے بہت دیر سے دیکھا تھا... میں نے راستے میں ہی اس ٹرک کے ڈرائیور کو مار دیا تھا جسے سامنے جلا رہا تھا۔ شاید تمہیں یاد ہو گا کہ ایک جگہ سڑک پر لکڑی کا لٹھا پڑا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے اسے ہٹانے کے لیے اترا تھا۔ مگر وہ پھر ٹرک پر نہیں چڑھ سکا تھا۔ اس کی جگہ میں نے لے لی تھی... مجھے معلوم تھا کہ ٹرک کس وقت وہاں سے گزرے گا اور یہ بات

مجھے ایک اور ڈرائیور نے بتائی تھی جس کا نام ڈنگا تھا۔ میں تھانے
سے سیدھا یہاں پہنچا تھا اور رات کو بھی فارغ نہیں بیٹھا تھا۔ میں نے
یہیں نمبر تین میں داخل ہو کے ایک بوڑھے کو ڈس آرم کیا تھا۔۔۔
ڈرتے ڈرتے اس نے اپنی جان بخشی کے عوض بہت سی
کارآمد باتیں بتا دی تھیں۔ اس کے بعد میں نے بھی معلومات لینا
اختیار کیا مگر وہ مارا گیا۔۔۔ شہزاد اور ماہی بھی ضائع ہوئے لیکن ملک بجرت
سب کو ہاتھ لگ گیا تھا۔۔۔ اسے بھی میں نے بچا لیا تھا اور وہ
مرتے مرتے بہت کچھ بتا گیا۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں سخت جان
اور زندگی کی امید نہیں کرتے۔۔۔ مر جاتے ہیں مگر سب نہیں کھولتے
ابھی تک مجھے اتنا بہادر آدمی کوئی نہیں ملا۔۔۔ یہ سب تم کو بتانے
کا مقصد یہ ہے کہ جھوٹ بولو یا سچ کو چھپاؤ تو سوچ لینا۔۔۔"

"اس سے کیا فائدہ ہوگا۔۔۔؟" وہ تلخی سے بولی۔ "وہ بھی کہاں
کے بچے تھے جن سے سچ اگلا تھا۔۔۔ ان سے بھی تم نے ہی کہا ہوگا۔"

"ہاں۔۔۔ کہا تھا۔۔۔ مگر جیسے ہی انھوں نے جھوٹ بولا
مجھے پتا چل گیا اور پھر میں ان سے کیے ہوئے وعدے کا پابند
نہیں رہا۔" میں نے کہا۔ "ان کو مارنے سے پہلے یہ بات میں نے
انھیں بتا دی تھی۔ سچ کا مطلب ہے سو فیصد سچ۔ اگر ایک فیصد
بھی کم ہو تو وہ سچ نہیں۔"

اس نے کاپی کا ایک الماری میں سے نکالا۔

"تم ایک نرس تھیں۔" میں نے کہا۔ "نرس کا پیشہ تو زخموں
پر مرہم رکھنا اور بیمار جسموں کو شفا یابی کی منزل تک لے جانے
میں مدد کرنا ہوتا ہے۔ تم کرنل کے ساتھ کیسے آ گئیں؟"

"اس سوال سے تو تمھاری لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔"

"کرنل سے تمھارے ناجائز مراسم تھے؟" میں نے اطمینان
سے کہا۔ "اس کا اعتراف میرے سامنے اس کی بیوی نے کیا تھا۔"

"تم اس کی بیوی سے مل چکے ہو؟" نرملا چونکی۔

"اس کے علاوہ میں ثمرہ اور ردا کی بیویوں سے بھی مل چکا
ہوں۔۔۔ وہ دونوں بہنیں ہیں۔ صرف تین مہینے پہلے ان کی شادی
ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔

[illegible]

وہ شکر ادا کرنے لگی۔۔۔ شاید اس لیے امید کر رہی تھی کہ مقصد
میں کامیاب رہا تھا اور اس نے سمجھ لیا تھا کہ جھوٹ نہیں چلے گا۔

"کرنل تم پر بہت اعتماد کرتا تھا؟" میں نے کہا۔ "اس حد تک کہ
تم ایک ٹاپ سیکرٹ مشن میں اس کے ساتھ رہیں۔۔۔ کیا تمھیں یہ
معلوم تھا کہ اس ٹرک میں کیا ہے جو سرحد پر جا رہا تھا؟"

"ہاں۔۔۔ اس میں اسلحہ تھا۔۔۔"

"کہاں سے آیا تھا یہ اسلحہ؟" میں نے کہا۔

"لاہور سے۔۔۔" وہ کام میں مصروف رہی۔

"لاہور میں کہاں سے؟"

"ٹرک عبداللہ اینڈ سنز کے آفس سے روانہ ہوا تھا۔۔۔ میں
وہیں موجود تھی۔۔۔ پچھلے سے۔۔۔" وہ بولی۔

"جس وقت ٹرک روانہ ہوا تھا۔۔۔ تو وہاں اور کون موجود تھا؟"

"ایک شخص چوہدری دلاور نام کا تھا۔" وہ بولی۔ "اسے میں
نے پہلی بار دیکھا تھا۔"

"پھر اس کا نام کیسے جان لیا تم نے؟"

"وہ دوسرے سب اسے چوہدری دلاور کے نام سے ہی مخاطب
کر رہے تھے۔"

"وہ دوسرے کون؟"

"خود حاجی عبداللہ۔۔۔ ڈرائیور ساتھی۔۔۔"

"تم نے ان کی گفتگو سنی تھی۔۔۔؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ کرنل ہمیشہ کہتا تھا کہ لڑکی اپنے کان اور اپنی آنکھیں
سوتے میں بھی سلامت رکھے۔ اس سے قدرت سے بوجھل لمحے شاید
اور پھر اچانک سے پل جائے۔۔۔ یہ اور اس کی عادت میں شامل تھی۔

[illegible]

گھر بار اور دفاتر کو بھول کے اس پر مرتا تھا تو قصور صرف اس کے
دل کا تھا جس پر اسے اختیار نہ رہا تھا۔ شبیر نرملا ایسی عورت تھی اور اس
کے حسن و شباب میں وہ جادو تھا جو کرنل سا ذہین بھی
پھسل پھسل گیا تھا۔۔۔ وہ بلاشبہ ان عورتوں میں تھی جو کرشمہ زنی کی جگہ
کرتی ہیں اور حکومتوں کے تختے الٹتی ہیں۔۔۔ بات صرف موقع ملنے
ملنے کی ہے۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔؟ زہر نہیں ملایا ہے میں نے اس
میں۔" وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھ کے بولی۔

میں چونکا۔ "تمھیں موقع نہیں ملا۔" میں نے نخوت سے
کہا اور اس ٹرے کو اپنے قریب کر لیا جو نرملا نے میرے سامنے رکھ
دی تھی۔۔۔ وہ اب پہلے سے زیادہ پُراعتماد انداز میں مسکرا رہی تھی
اور اس کی وجہ وہ غلط فہمی تھی جو اسے میرے وقتی انہماک سے ہوئی
تھی۔ اس نے کام کرتے ہوئے یہ محسوس کر لیا تھا کہ میں تمام ہے
سفاکی اور سنگدلی کے مظاہرے کے باوجود میں ہر حال ایک مرد ہوں

[illegible]

جو اس سے پہلے۔۔۔
مزاحمت کی کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔۔۔
پہلے بھی ہوا ہوگا چنانچہ اسے اپنی قوت تسخیر پر ناز تھا تو بے جا نہ
تھا۔ اس ہنگامہ دارو گیر میں اس کی قمیص بائیں شانے پر سے پھٹ
گئی تھی اور مجھے اس کی سفید جلد پر خراشوں کی سرخی بہت نمایاں
نظر آتی تھی۔

اپنے موجودہ حالات میں میرا ذہن خیالوں کے آتش کدہ
تھا اور میں ایک وقت بہت کچھ سوچ رہا تھا۔۔۔
تک سچ بولا ہے مگر اس نے تعاون جاری رکھا تو کیا ہو سکتا

اس کو ساتھ رکھنا ممکن ہوگا؟ مجھے تو آج ہی پھر اس سفر پر روانہ ہونا
پڑے گا جس کی منزل راہدہ تھی۔۔۔ میں نرملا کو کیسے ساتھ رکھ سکتا ہوں
اور اسے ساتھ رکھنا ممکن نہ ہو تو میں دو مختلف راستوں میں سے کوئی
ایک اختیار کر سکتا تھا۔۔۔ اسے آزاد کر دوں یا سب کے ساتھ
ختم کر دوں۔ ویسے میں شاکی حاجی کے تعلق سے بھی متفکر تھا۔ حاجی
کے حوالے سے کوئی بھی بات یاد آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب تک کسی نے ڈھنگ
سے اطلاع دی ہوگی اور وہ میرے ظلم کی خبر پا کر حاجی کے پاس
پہنچ چکا ہوگا یا پہنچنے والا ہوگا۔ میں حاجی اور چوہدری دلاور کے
تعلق پر بھی غور کر رہا تھا اور حاجی کی روانگی سے قبل آخری کا منصوبہ
بھی بنا رہا تھا۔۔۔ مگر یہ سب کام میرا ذہن کر رہا تھا۔ میری آنکھیں
وہ دیکھ رہی تھیں جو میرے سامنے تھا اور اس کی نظر میں خوبصورتی
کشش کا سامان صرف نرملا فراہم کر رہی تھی۔۔۔ کسی بھی حسن شناس
نظر رکھنے والے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ خوب صورتی سے نظر
چرا لے۔۔۔ اسے میری کمزوری نہیں سمجھا جا سکتا تھا مگر نرملا نے میری
نظر کا مفہوم غلط سمجھا۔

اس حقیقت کا ادراک ہوتے ہی میں محتاط ہو گیا۔ میں نے
اس کے ناز و انداز اور خوش گمانی کے خلاف اپنا دفاع مضبوط کر لیا۔
میں نے کہا۔ "کیا تم نے میرے سوال کا جواب دے دیا ہے؟"
وہ مسکرائی۔ "کون سا سوال؟"
"میں نے پوچھا تھا کہ وہاں دوسرے کون تھے؟"
"دوسرے۔۔۔ یعنی ٹرک ڈرائیور اور وہ لڑکا۔۔۔ جسے سب
حرام والا کہتے ہیں۔" وہ بولی۔
"گفتگو میں اور کسی کا ذکر آیا تھا۔۔۔ کوئی ایسا نام سنا تھا تم نے
جو پہلے کبھی سنا ہو؟" میں نے کہا۔
"ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ سکوئیرن لیڈر ہشام میاں کا ذکر کر رہے تھے اور
رانا کا ذکر بھی آیا تھا۔" وہ بولی۔ "انھوں نے کرنل پر تم کی بات بھی
کی تھی۔"
"یہ کرنل پر تم کون ہے؟"
اس نے دکھ اور ملامت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

[illegible]

میں جلتا۔ میں تمھاری زبان سے اس کا نام سننا چاہتا تھا۔۔۔
یہ ہشام میاں کون ہیں؟" میں نے آخری سوال کے ساتھ آمیزش
ختم کرتے ہوئے کہا۔
"وہ جا چکا ہے۔۔۔ ایک ہفتہ قبل وہ اپنے گروپ کے ساتھ
نکل گیا تھا۔ اسی روز ہم پہنچے تھے۔"
"ہر گروپ یہاں صرف ایک ہفتہ تربیت دی جاتی ہے؟"
"ایسا ہی ہے۔"
"تم نے یہاں۔۔۔ سب جا چکے ہیں؟"

یہ ہے مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔۔۔ شاید یہ تم بھی نہیں بتا سکتے
تھے کہ یہ سلسلہ کب سے جاری تھا اور کہاں کہاں سے کتنے لوگ اس
مشن کے لیے منتخب ہوئے تھے؟ نرملا نے کہا۔ "تو اچانک
حکم ملا کہ پاکستان کو رپورٹ کرو۔۔۔ ایک ٹاپ سیکرٹ مشن کے لیے
۔۔۔ جب اسے یہاں پہنچنے کو کہا گیا تھا کیپٹن ثمرہ اور لیفٹیننٹ ردا کا انتخاب
خود کرنل کی سفارش پر ہوا تھا۔"

"اور تمھارا؟"

"ہر گروپ کے کمانڈر کو اس کی مرضی کے مطابق ایک فرد کے
انتخاب کا موقع دیا جاتا تھا جو مشن کی تکمیل میں اس کے لیے قابل اعتماد
معاون ہو۔۔۔ ان میں ایک عورت کا ہونا شرط تھی۔ کرنل نے
میرا نام دیا تھا تو کسی کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔" وہ بولی۔
"عورتوں کو عموماً راز داری کے معاملات سے دور رکھا جاتا ہے۔"
"یہاں تربیت پانے والوں میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ ان
کو کنٹرول کرنے کے لیے بھی تو کوئی ہونا چاہیے۔ عورتوں کے سامنے

[illegible]

ان کے مسائل کو ہینڈل کر سکتی ہے۔۔۔ اور یہاں ہر گروپ میں عورتوں
کی تعداد مساوی رکھی جاتی تھی۔۔۔ ایک مرد اور ایک عورت کی ایک
ٹیم۔۔۔ یہاں سے ہر گروپ کی صورت میں جاتے تھے۔ آگے ہر ٹیم
الگ ہو جاتی تھی مگر ان کے درمیان رابطہ رہتا تھا۔"

"اور یہ مرد عورتیں۔۔۔ کس خوشی سے آتے تھے؟" میں نے کہا۔
"مجھے نہیں معلوم۔۔۔ ظاہر ہے انتخاب کرنے والے وہ ہوتے
لوگ تھے۔۔۔ وہ اپنا اطمینان کر لینے کے بعد ہی انھیں یہاں بھیجتے
تھے۔۔۔" وہ بولی۔ "تاہم ان کو آتی رعایت ملتی تھی کہ اپنے پارٹنر
کا خود انتخاب۔۔۔"

"آئی سی۔۔۔" میں نے کہا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ سب کرائے
کی عورتیں ہیں۔"

"صرف مرد کرائے کے ہیں۔" وہ طنز کرتے ہوئے بولی۔ "ان
کے ساتھ عموماً دیہی آبادی ہیں جوان سے پیار کرتی ہیں۔۔۔ اور ان
کی خاطر جان دینا قبول کر لیتی ہیں مگر بے وفائی قبول نہیں کرتیں۔۔۔"

[illegible]

"کیا ملن موہن نے اپنا سے اور مونی کے بارے میں نہیں بتایا؟"
بتایا تھا۔۔۔" میں نے کہا۔ "ان کی بھی ایسی ہی منظوری تھی۔"
صرف ایک مرد ہے ان میں۔۔۔ جو اپنی مرضی سے آیا ہے
ایک لڑکی کا ساتھ چننے کے لیے۔" نرملا نے کہا۔ "انتخاب لڑکی کا
ہوا تھا۔۔۔ مجھے خود کرنل نے بتایا تھا کہ جب بھی کوئی لڑکی منتخب
ہوئی تو اس کو ساتھ چننے والا نہ ملا۔ کسی اجنبی کے ساتھ اپنے
پیدا نہ ہونے سے اچھا ہے کہ ہر ایک کو پاپ کر دینا۔ لیکن مرد منتخب
ہوئے۔۔۔ ان میں سے بہت کم ڈرائیور ہوتے۔"

"یہ بھی مرد تھیں... لڑکے لگتے ہیں۔"

"یہ لڑکے ہی ہیں... انھیں کالجوں سے نکل کے بے روزگاری کا سامنا تھا اور یہ لوگ مایوسی کا شکار تھے۔" نرملا نے کہا۔ "ایسے ہی لوگ زندگی کو داؤ پر لگاتے ہیں۔ اور یہ لڑکیاں جو ان سے محبت کرتی تھیں اسی لیے ساتھ شامل ہو گئیں کہ تقدیر کی جو بازی رہی تو واپسی پر ایک لاکھ نقد ملیں گے... ایک پلاٹ اور مکان بنانے کے لیے قرض ملے گا... باقی زندگی سکھ چین سے گزر جائے گی... اور تقدیر کو اس جنم میں ملن منظور نہ ہوا تو پھر ایک ساتھ مر جائیں گے۔"

"ان سب کو الگ الگ مشرقی پاکستان بھیجا جائے گا؟"

"الگ الگ نہیں... یہ ایک ہی بحری جہاز میں کلکتہ جائیں گے... وہاں سے ان کو کشتی یا کسی واسطے سے جائیں گے۔ یہ سرحد عبور کرنے کے بعد مقامی آبادی میں اپنے ٹھکانے بنائیں گے... یہ خود سب اردو بولنے والے شخص ہیں اور مغربی پاکستان کی شہریت کا ثبوت رکھتے ہیں اس لیے [illegible] یہ ایک طرف وفادار پاکستانی کے دوست ہوں گے اور ان کے بارے میں مختلف معلومات حاصل کر سکیں گے تو دوسری طرف بنگالی بول کے ان میں گھل مل جائیں گے جو شیخ مجیب کے حامی ہیں اور اپنا الگ بنگلہ دیش بنانا چاہتے ہیں... یہ ایسے عناصر کی نشاندہی کریں گے اور انھیں اسلحہ پہنچاتے رہیں گے... پھر ان کے ذریعے اسلحہ آگے جائے گا... خاموشی اور رازداری سے یہ سب اسلحہ انھی ہاتھوں میں پہنچے گا جو ہم خیال ہیں یعنی مجیب کے چھ نکات کی بنیاد پر مغربی صوبے کے خلاف لڑ سکتے ہیں۔ انھی کی تخریبی سرگرمی باہمی [illegible] خاموشی سے مخالف عناصر کا خاتمہ بھی کرتے رہیں گے۔"

"اور ان کو کتنا عرصہ وہاں گزارنا ہوگا؟"

"ایک مہینہ..." وہ بولی۔ "ان سے تین مہینے کا معاہدہ ہوتا ہے۔ ایک ماہ کی تربیت... ایک ماہ کی ایکٹیو سروس... اور ایک مہینہ [illegible] کے لیے... یعنی آنے جانے کے لیے۔"

"کبھی یہ معلوم ہوا کہ ایک جوڑا ایک مہینے میں کتنے انسانوں کے قتل کا سبب بنتا ہے؟" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "کتنے گھر اجاڑتا ہے، کتنی عورتوں کو بیوہ کرتا ہے اور کتنے بچوں کو یتیم؟"

"تم جذباتی ہو کے سوچ رہے ہو... جنگ تو جنگ ہے۔"

"ہاں..." میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اس کا احساس ان لوگوں کو اپنی ایکٹیو سروس کا ایک مہینہ پورا کرنے کے بعد ہو جاتا ہوگا... کیا آج تک کسی کو ایک لاکھ دیے گئے ہیں؟ کوئی ہے ایسا جو لوٹ کے [illegible] سے پلاٹ ملا ہو اور قرضہ بھی... اور اس نے اپنا گھر [illegible] جہاں وہ شادی کر کے آباد ہے... اسی عورت کے ساتھ [illegible] کرتا تھا... ایک لاکھ کی رقم کاروبار میں [illegible]"

نرملا خاموشی سے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی اور دوسری طرف دیکھتی رہی۔ "میں جانتا ہوں اس نفرت کی سیاست کے [illegible] دلفریب... مگر یہ بے وقوف لڑکے اور لڑکیاں [illegible] سے سرشار [illegible] یہ نہیں سمجھتے کہ ان کو سبز باغ دکھا کے اور وعدوں سے بہلا کے موت کی قربان گاہ میں بھیجنے والے [illegible] انھیں ایک گولی دور رہتے کی چیز [illegible]... جو جوڑا [illegible] دریچے میں ٹکاتا ہوا اس پر ایک ہزار خرچ کرنے والا کون [illegible] ہو سکتا ہے... ایک جوڑے کا کام ختم ہوا... اس کا کام [illegible] پانچ چھ ہفتے میں دو گولیاں مارنا اور لاش سمندر میں ڈال [illegible] بے حساب [illegible] بچ گئے... ان کی جگہ دوسرے آ جائیں گے... انھیں بتاؤ کہ بیچنے والوں کو سرکار نے [illegible] دیا اور وہ کہاں آباد ہیں... وہ یقین کر کے مر جائیں گے۔"

ناشتا ختم کرنے کے بعد میں نے وہی سگریٹ پی لیا تھا جو کرنل کی جیب سے برآمد ہوئے تھے اور جب سگریٹ پی کے میں بالکل تازہ دم ہو گیا تھا میری جسمانی توانائی کو [illegible] نے پوری طرح بحال کر دیا تھا... آدھے گھنٹے تک میں [illegible] ایک اسٹول پر بیٹھا رہا تھا جس کی [illegible] قریب ہی رکھی ہوئی تھی۔ اگر پیڈرو آ جاتا تو اس کی گاڑی کی آواز سنتے ہی [illegible] چڑھا دیتا... میں پیڈرو کے ساتھ حاجی عبداللہ کے استقبال کے لیے بھی پوری طرح تیار تھا۔ نرملا میرے سامنے تھی اور اس کے [illegible] کاٹی تھا... اگر وہ کسی الماری میں سے اچانک ریوالور یا دستی بم نکال لیتی تب بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ میں نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا اور جب تک وہ ناشتا بنانے میں مصروف رہی تھی، میں نے اس پر سے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ [illegible] سے کچھ غلط فہمی پیدا ہوئی تھی اور نرملا نے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ دلکش بناتے ہوئے یہ دیکھنا چاہا تھا کہ اس کا شکاری حسن و شباب مجھے شکار کر سکتا ہے یا نہیں... اور وہ خاصی پُرامید ہو کے پیش قدمی کر رہی تھی۔

میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا تو اسے مایوسی ہوئی۔ "باتوں میں بہت وقت ضائع ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "دراصل مجھے انتظار تھا پیڈرو کی واپسی کا... ورنہ میں نکل جاتا۔"

"یہ پیڈرو کون ہے؟"

"وہ شخص جو گاڑی لے کر نکلا تھا... جس نے ڈرائیور سائیں کو قتل کیا تھا... وہ کون ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "تم اس کے ساتھ تھیں؟"

"وہ... وہ تو پاکستانی آدمی کا بھیجا ہوا ہے۔"

"بکواس کرتا ہے وہ کمینہ..." میں نے کہا۔ "نام بدنام کرتا ہے پاکستانی آدمی کا... وہ ایک خطرناک بدمعاش ہے۔ ایک ضمیر فروش غدار اسمگلر کا دستِ راست... اور... اور میرے باپ کا قاتل..."

"اسی لیے تم...؟"

"نہیں..." میں نے لات مار کے اسٹول گرا دیا۔ "یہ ذاتی عداوت کی بات نہیں ہے... میں اپنے باپ کے قاتل کو معاف بھی کر سکتا ہوں... مگر اسے نہیں جو غدار ہے... ملک کا دشمن ہے... انسانیت اور شرافت کا دشمن ہے۔"

"تم پھر جذباتی ہو رہے ہو۔"

"ہاں..." میں نے چیخ کے کہا۔ "میں جذباتی آدمی ہوں... میں سینے میں دل رکھتا ہوں... احساس رکھتا ہوں... محبت اور نفرت کر سکتا ہوں... نیکی بدی میں تمیز کر سکتا ہوں، خوب صورتی کو بدصورتی سے الگ کر کے دیکھ سکتا ہوں... نہ میں فرشتہ ہوں نہ شیطان... میں انسان ہوں اس لیے میرے جذباتی ہونے پر حیرانی کیسی...؟ اب جو میرے ساتھ... جب تک تم نے میرے ساتھ تعاون کیا ہے... اگر تمھارا یہی رویہ رہا تو..."

"تو کیا...؟" وہ تلملا کے بولی۔

"تو کچھ نہیں..." میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

اس بریف کیس سے مجھے بہت کچھ ملا... ایک بہت بڑا سوٹ کیس تو کپڑوں سے بھرا ہوا تھا... ظاہر ہے یہ سب تخریب کاروں میں تقسیم کیے جانے تھے... آخر میں نے باہر رکھ دیا... ایک الماری میں بھی [illegible] تھیں جن سے [illegible] اور [illegible] پاکستانی ثابت کیا جا سکتا تھا... ان کو میں نے ایک بریف کیس میں ڈال لیا... یہ بریف کیس مجھے کرنل کے کمرے سے ملا تھا اور اس میں کرنل کے ذاتی کاغذات تھے۔ لیکن ان کاغذات سے کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ کرنل کی وردی ایک جگہ [illegible] رکھی تھی... اسے بھی میں نے بریف کیس میں ڈال لیا۔ بہت جلد مجھے بریف کیس کا اسباب ایک سوٹ کیس میں منتقل کرنا پڑا۔ کیپٹن شیرو اور لیفٹیننٹ ورما کے ذاتی کپڑے بھی میرے کام آ سکتے تھے۔ ایک اور الماری سے زیادہ کارآمد اشیا کا ذخیرہ ملا... ایک ڈبے میں مختلف رنگ کے [illegible] تھے۔ انھیں غور سے دیکھنے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ [illegible] پستول تھے۔ ان کے [illegible] کا کام لیتے تھے اور ان کے [illegible] زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے جو گولی کی طرح جسم میں پیوست ہو سکتے تھے۔ دوسرے ڈبے میں ایسی ہی مختلف رنگ کی سوئیاں تھیں... جو [illegible] ڈال سکتی تھیں... تیسرے ڈبے میں بہت چھوٹے چھوٹے بم تھے... اتنے چھوٹے کہ [illegible] میں چھپائے جا سکتے تھے۔ میں نے انھیں کھول کر نہیں دیکھا مگر میرا خیال تھا کہ ان [illegible] یہ بھی [illegible] ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہوں گے... [illegible] کہ وہ خنجر کسی کی جلد میں چبھو دیا جاتا تو اسے صرف ایک خراش کا احساس ہوتا مگر یہی خراش بعد میں اس کی جان لے لیتی... مجھے دو اسٹیتھو سکوپ بھی ملے... مگر وہ عام ڈاکٹروں کے استعمال میں آنے والے اسٹیتھو سکوپ نہیں تھے۔ ان کا نچلا حصہ ایک مائیکروفون قسم کی چیز تھا... اور [illegible] کے دونوں بازوؤں میں سے ایک [illegible] تھا اور دوسرے میں [illegible] تھے... ان کو ٹیسٹ کرنے کے لیے وقت نہیں تھا مگر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ ان دونوں کی فریکوئنسی ایک ہوگی اور [illegible] بیٹھے دو افراد ایک محدود فاصلے پر بات کر سکتے ہوں گے۔

نرملا نے میرے کسی کام میں مداخلت نہیں کی اور مجھ سے کوئی سوال بھی نہیں کیا... وہ عدم دلچسپی کا انداز اپنائے مجھے خاموشی سے دیکھتی رہی۔ میں اس کے تعاون کا سبب سمجھ سکتا تھا۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا اور جتنا میں نے پوچھا تھا اس سے زیادہ بھی بتا دیا تھا... وہ [illegible] تو اس کے [illegible] اور [illegible] اس اعتماد اور اطمینان کے مقابلے کو غیر فطری سمجھتے ہوئے [illegible] مجبور تھا۔ وہ اب متفکر اور پریشان نظر آتی تھی... جیسے [illegible] تحفظ کی ضمانت دے دی ہو یا اسے [illegible] وعدہ کر لیا ہو... ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ان حالات میں کوئی بھی مضبوط سے مضبوط اعصاب رکھنے والی عورت نارمل نہیں رہ سکتی تھی مگر وہ نارمل تھی... حالانکہ وہ ابھی اس طاقت کو بھی آزما چکی تھی جو تھرڈ [illegible] مردوں کو پگھلا کے موم کر دیتی اور اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ میں اس کے ناز و ادا اور جلوۂ بے حجابی کا شکار نہیں ہوا۔ وہ میرے ساتھ رہی اور میں نے بھی اسے ایک لمحے کے لیے اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ اس کا سکون مجھے الجھن میں مبتلا کرنے لگا... آخر یہ عورت کیا چاہتی ہے... کیا سوچ رہی ہے اور کیا کر رہی ہے... کیا یہ سمجھتی نہیں کہ اس کی مدد کرنے والا کوئی نہیں اور میں اسے بھی مار سکتا ہوں... وہ رضاکارانہ طور پر میرا ساتھ کیوں دے رہی ہے... اسے ڈرنا چاہیے مجھ سے... پوچھنا چاہیے مجھ سے کہ میں نے کیا سوچا ہے... دوسروں کے بارے میں اور خود اس کے بارے میں...

بالآخر میں نے کہا۔ "تمھارے پاس اور کپڑے بھی تو ہوں گے۔"

"ہاں...؟" وہ بولی۔ "کیا میں بدل آؤں؟"

"تم کو بدل لینے چاہئیں... کیوں پھر رہی ہو تم ان پھٹے ہوئے کپڑوں میں؟" میں نے [illegible] کہا۔ "کہاں ہیں تمھارے کپڑے؟"

"وہیں... کرنل کے کمرے میں..." وہ بولی۔ "جہاں سے تم نے اس کی وردی اٹھائی تھی... کیا تم نے زنانہ کپڑے نہیں دیکھے تھے؟"

"دیکھے تھے... خیر، چلو..." میں نے کہا۔ "میں تمھارے ساتھ رہوں گا... میں تم کو اکیلا چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ بولی۔

اس نے میری موجودگی میں ہی کپڑے تبدیل کر لیے... کسی قسم کے تذبذب یا شرم و حیا کے مظاہرے کے بغیر... اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھا کہ میں کدھر دیکھ رہا ہوں... میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا... اس طرح کہ وہ تھوڑا سا بائیں جانب تھی۔

"یہاں کوئی گاڑی تو ہوگی..." میں نے کہا۔

"ایک گاڑی تو وہ لے گیا ہے... مینیجر شاہ..."

"میں بتا چکا ہوں کہ وہ مستور کا مینیجر نہیں ہے۔" میں نے خفگی سے کہا۔

"اچھے... بس عادت سی ہے... آئندہ نہیں کہوں گی۔" وہ بالوں کو برش کرتے ہوئے بولی۔ "دوسری گاڑی گیراج میں ہے... مجھے گیراج کی چابیوں کا علم ہے اور میرے پاس اس گاڑی کی چابیاں بھی ہیں۔"

"یہ سب چیزیں یہیں چھوڑ دو..." میں نے کہا۔ "اور مجھے گیراج تک لے چلو۔"

"گیراج اسی احاطے میں ہے۔" وہ بولی۔

"لیکن مجھے تو وہاں کوئی گاڑی نظر نہیں آئی تھی۔" میں نے تشکیک لہجے میں کہا۔

"تم آخر تک نہیں گئے تھے... گاڑی ہے... جیپ اسٹیشن ویگن فور وہیل ڈرائیو۔" وہ بولی۔

"مجھے چکر دے رہی ہو؟" میں نے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور اس کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔ "کس طرف جاتی ہے وہ گاڑی... [illegible] کے راستے...؟"

"تم خود دیکھ لو گے..." وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سپاٹ لہجے میں بولی۔ "میں تم کو لے چلتی ہوں... چلو..."

"تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"آتی ہے۔" وہ بولی۔

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ "تم انکار بھی کر سکتی تھیں۔"

"اس سے کیا حاصل ہوتا؟"

"ایک چانس... پھر ڈرائیونگ میں کرتا... اور تمہارے ہاتھ آزاد ہوتے۔" میں نے کہا۔

"میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔" وہ اسی سپاٹ لہجے میں بولی۔ "میں زندہ رہنے کے لیے پوری کوشش کروں گی... تم کو بالکل موقع نہیں دوں گی کہ تم میری کسی بات کو بہانہ بنا کر مجھے مار ڈالو... تمہارے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے... تم نے اتنے بہت سے لوگوں کو [illegible] رہا ہے... پہلے بھی مار چکے ہو گے... پھر میں کیا ہوں... اس کے باوجود تم مجھے مارنا چاہو تو بھلا مزاحمت کروں... صاف کہہ کر

نرملا... میں تم کو معاف نہیں کر سکتا کیونکہ تم دشمن ہو... خواہ [illegible] مجھ پر کوئی [illegible] کرنا... تمہیں [illegible] سے [illegible] ہے کہ مجھے [illegible]

"تمہاری حقیقت پسندی قابل تعریف ہے۔" [illegible] لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا... نہ میں اس سے کوئی وعدہ کر سکتا تھا اور نہ اپنی زبان سے ایسے الفاظ کہہ سکتا تھا جن کی آڑ سے کوئی غلط توقعات وابستہ کر لے... مجھے جانے والے راستے پر وہ آگے رہی اور میں اس کے پیچھے رہا... نہ جانے کیوں میں نے اپنے دل میں ایک عجیب سی بے کلی محسوس کی... رابعہ کا خیال میرے احساس پر یوں سایہ فگن ہونے لگا جیسے سورج گرہن میں چاند کا سایہ زمین کو ڈھک لیتا ہے... رابعہ کا خیال میرے شعور پر [illegible] اس نے شعور پر قبضہ کر لیا۔ دو بار مجھے یوں لگا جیسے میرے سامنے نرملا نہیں رابعہ چل رہی ہے۔

یہ بڑا عجیب خیال تھا... لیکن بہت جلد میں نے اس کا سبب تلاش کر لیا... نرملا نے جو لباس بدلا تھا وہ رنگ اور ڈیزائن میں ویسا ہی تھا جیسا رابعہ نے پہن رکھا تھا... جب آخری بار میں نے دیکھا تھا... پھر نرملا کے بالوں کا انداز بھی رابعہ جیسا ہی تھا... اس کی صورت کے نقوش میں رابعہ کی جھلک نہیں تھی لیکن [illegible] پیچھے سے دیکھنے پر وہ [illegible] رابعہ [illegible] خیال [illegible] کا سبب تھا۔

باہر روم کو دیکھتے ہی میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "اور وہ گاڑی... انھیں تو میں بھول ہی گیا تھا..."

"پریشانی کی اس میں کون سی بات ہے۔" نرملا نے کہا لیکن اس کے لہجے میں طنز کی کوئی بات نہ تھی۔

"وہ دم گھٹنے سے مر گئے ہوں سب..." میں نے کہا۔

[illegible] پڑتا ہے کہ وہ کیسے مرے تھے۔" وہ بولی۔ [illegible] "تمہارا رویہ مجھے بہت مصنوعی لگتا ہے... تمہارے جذبات کی صورت کوئی نہیں... تم [illegible] ان کے ساتھ ہو..."

"میں صرف اپنے ساتھ ہوں..." وہ بولی۔ "کل بھی [illegible] جو کچھ کیا تھا صرف اپنے لیے کیا تھا... آج بھی یہی کر رہی ہوں... [illegible] کس قدر [illegible] ہے... کسی کے [illegible] ہے... کدھر جاتی ہے اور [illegible] ہے... آدمی کے دل [illegible]... [illegible]..."

[illegible] مجھے [illegible] لگی تھی... مگر وہ [illegible] اعتماد [illegible] اخلاق [illegible] اس نے کرنل [illegible] زندگی میں ایک سامان سمجھ لیا تھا۔

[illegible] حفاظت میں پناہ لے چکی تھی اور کل کسی بھی [illegible] موت کے سامنے ٹھہر سکتی تھی۔ اس [illegible] کر لیا تھا کہ وہ کسی کی نہیں صرف اپنی ہے... وہ کسی کے [illegible]

[illegible] دروازہ کھولنا ایک دشوار کام ثابت ہوا... وہ [illegible] کی خاموشی ہی بتاتی تھی کہ اب کوئی بھی ہوش میں نہیں... وہ بے ہوش ہو کر جہاں کھڑے تھے وہیں ڈھیر ہو گئے... دروازے کے اوپر تلے پڑے ہوئے جسموں نے دروازے کو [illegible] کر دیا تھا... کوشش کے بعد دروازے کو دھکیل [illegible] موت ان لوگوں کا مقدر ہو چکی تھی۔

[illegible] ہوش میں لانے کا فائدہ کوئی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ میں ان کی تعداد اور ان کی نوعیت کی معلومات حاصل کر سکتا تھا کہ وہ کون ہیں... کہاں سے آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں... وغیرہ وغیرہ...

یہ سب مجھے نرملا سے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔

میں آگے بڑھ گیا... نرملا کی طرف میں نے دیکھا ہی نہیں [illegible] آخری حصے میں دیوار کے بالکل پیچھے جیپ کی بالکل نئی اسٹیشن ویگن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی رجسٹریشن فائل پوری تھی اور کاغذات دیکھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ [illegible] نامی کسی [illegible] سے خریدا گیا تھا۔ [illegible] کا پورا نام پتا رسید پر موجود تھا مگر ٹرانسفر لیٹر کسی کے نام پر نہیں تھا۔ اوپن لیٹر پر ٹرانسفر بہت عام بات ہے۔ گاڑی دس بار بک جاتی ہے مگر [illegible] رہتی ہے۔ خریدار اپنے نام ٹرانسفر کرائے تو اس پر کوئی جرم ثابت نہیں ہوتا۔ وہ [illegible] شدہ مگر بغیر نام اور تاریخ والا ٹرانسفر لیٹر دکھا کے کہہ سکتا ہے کہ اس نے تو ابھی گاڑی خریدی ہے اور مقررہ مدت میں ٹرانسفر بھی کرا لے گا... یہ اوپن لیٹر میرے کام بھی آ سکتا تھا۔

گاڑی کو چیک کرنے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ اس کو بہت کم چلایا گیا ہے... شاید وہ زمیندار کوئی سابق رکن اسمبلی وغیرہ تھا جس نے یہ گاڑی [illegible] وغیرہ ادا کیے بغیر منگوائی تھی اور اس کا مقصد [illegible] ہوگا۔ اتفاق سے [illegible] بھی وہ [illegible] اور کر سکتے تھے۔ گاڑی کا میٹر دس ہزار چار سو [illegible] تھا... [illegible] ٹینک کے بھرے ہوتے [illegible] اس لیے انجن کو آن کرنا ضروری تھا۔ چابی [illegible] مجھے [illegible] کو تار کنکشن سے اسٹارٹ کرنا تھا [illegible] اور [illegible] کے تاروں کو [illegible] الگ کر دیا۔

[illegible] کوشش میں انجن [illegible] ہو گیا۔ میں نے ہاتھ سے [illegible] اور پھر تار الگ کر دیے

انجن سلو موشن میں چلتا رہا۔

دیوار کے عقب میں وہ دروازہ تھا جو میں نے نہیں دیکھا تھا... اس کے سامنے بارہ فٹ اونچی دیوار تھی جس نے آٹھ فٹ اونچے شٹر والے گیٹ کو چھپا لیا تھا۔ وہاں سے گیٹ تک کا فاصلہ [illegible] اسٹیشن ویگن کو صرف ریورس گیئر میں ڈال کر نکالا جا سکتا تھا۔ [illegible] گن اب میرے کندھے پر [illegible] رہی تھی اور ریوالور میرے ہاتھ میں تھا... [illegible] دونوں [illegible] کے فرش پر [illegible] دیے گئے تھے... [illegible] کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔

دروازے کو تھوڑا سا اٹھا کے میں نے باہر جھانکا تو مجھے ایک اوپر چڑھتا ہوا راستہ دکھائی دیا جو بائیں طرف گھوم گیا تھا۔

"میں دروازے کو اٹھاتا ہوں..." میں نے نرملا کی طرف دیکھ کے کہا۔ "تم جیپ کو نکالو۔"

"[illegible] آخر تک ریورس میں لے جانا پڑے گا۔" وہ بولی۔

"تم نے کہا تھا کہ تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے۔"

"یہ بھاری گاڑی ہے... اور ریورس میں..." اس نے تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ کہا اور پھر [illegible] دیکھ کر آگے بڑھی۔ گاڑی کے دروازے [illegible] مقفل نہیں کیے تھے کیونکہ [illegible] گاڑی ہی مقفل [illegible] جب نرملا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی [illegible] گاڑی ایک جھٹکے سے پیچھے گئی۔

"[illegible]" نرملا نے [illegible] سے سر ہلایا۔ میں نے [illegible] تھا۔

لیکن اس کے بعد یہ ہوا کہ جیسے ہی میں نے شٹر [illegible] انجن غرایا اور گاڑی ایک دم آگے بڑھی... اگر میں سامنے نہیں ہوتا تو یقیناً ٹکر سے پیچھے گرتا اور کچلا جاتا... اب میں بائیں جانب [illegible] میں نے گاڑی کو دیوار کی طرف بڑھتے دیکھا... وہ صرف ایک لمحے کی بات تھی جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا... نرملا نے [illegible] بارہ فٹ اونچی دیوار سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا تھا... مضبوط اور طاقتور اسٹیشن ویگن کی باڈی [illegible] سے تباہ ہو سکتی تھی [illegible] بیٹھی ہوئی نرملا [illegible] نہیں دب سکتی تھی۔ صرف [illegible] دیوار کے نیچے دفن ہو سکتا تھا [illegible] دیوار سے چند فٹ کے فاصلے پر ہی تو تھا۔

پُرسکون اور [illegible] والی نرملا نے اس پہلے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا تھا جو میں نے اپنی غلطی سے فراہم کیا تھا۔

میں نے [illegible] ہوئے ہی [illegible] کیا [illegible] گیا... لیکن وقت پر مجھے احساس ہو گیا کہ [illegible] گئی ہے... دیوار سے [illegible] ایک [illegible]

www.paksociety.com

اتنی دیر میں تو بے کے کان دھماکا سُن لیتے اور دیوار کی جگہ ملبے کا ڈھیر نظر آتا... پھر میں نے نرملا کو گاڑی سے اترتے دیکھا۔ اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"نہیں... میں یقین نہیں کر سکتی۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

میرا ہاتھ اٹھا ہوا رہ گیا۔ "تم نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا؟"

"کیا؟" وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی۔ "غلطی سے فرسٹ گیئر لگ گیا تھا..."

"تم نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی۔" میں نے کہا۔

"سامنے تو دیوار تھی۔" وہ بولی۔ "تم کہہ سکتے ہو کہ میں خودکشی کرنا چاہتی تھی... لیکن کامیاب نہیں ہوئی... وقت پر بریک لگ گئے۔"

ایک بار پھر میں نے خود کو اس پر یقین کرنے کے لیے مجبور پایا اور وہ اسی بے نیازی کے ساتھ دوپٹے کے آنچل سے پسینہ صاف کرنے لگی۔ میں کچھ دیر تک گھورتا رہا اور پھر گاڑی میں جا بیٹھا۔ اسے میں نے کھینچ کر اپنے ساتھ بٹھا لیا... وہ کچھ نہیں بولی۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے گاڑی کو واپس دروازے کے سامنے پہنچایا اور آہستہ آہستہ باہر نکال لیا۔ اب میں ایک سات آٹھ فٹ چوڑے راستے پر تھا جو سیمنٹ سے بنایا گیا تھا۔ اس کے دونوں جانب اونچی دیواریں تھیں جن کی بلندی پیچھے کی طرف بتدریج کم ہوتی تھی۔

نرملا جیسے اب بھی کچھ سہمی ہوئی تھی۔ اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ "کیا میں تمھیں گرا دوں؟" اس نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "تم وہی کرو گی جو میں کہوں گا... مجھے معلوم ہے کہ تم موقع کی تلاش میں ہو۔"

"اور تم شاید بہانہ ڈھونڈ رہے ہو۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "حالانکہ میں چاہتی تو بہت پہلے تمھیں شوٹ کر سکتی تھی۔"

"نگاہ غلط ہے؟" میں نے طنز سے کہا اور گاڑی کو پیچھے کرتا رہا۔

"نہیں... اس کی وجہ اور ہے..." اس نے اچانک اپنے بلاؤز کے اندر ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال کے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

میں ہکا بکا رہ گیا... ایک دم بوکھلا کے میں نے پارکنگ بریک کھینچے اور ریوالور اٹھا لیا... یہ اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور تھا اور پوری طرح لوڈڈ تھا۔ "یہ... یہ کہاں سے آگیا...؟"

وہ مسکرائی: "بہت ہوشیار بنتے تھے تم تو... پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتے بھی رہے تھے... تمھیں نہیں پتا چلا؟"

میں نے خود کو ایک حد سے زیادہ چالاک بننے والے احمق کی طرح حقیقت میں بے وقوف پایا۔ "مجھے واقعی پتا نہیں چلا۔"

"جب میں کپڑے بدل رہی تھی تو تم کدھر دیکھ رہے تھے؟"

"تمھیں نہیں دیکھ رہا تھا... کوشش کر رہا تھا کہ نہ دیکھوں۔"

میں نے محسوس کیا کہ میرے کانوں کی لوئیں سرخ ہو کے دہکنے لگی ہیں۔

وہ ہنسی... آہستہ سے اور پُر تمسخر انداز میں بولی۔ "بچکانے رہتے...

جب حیا مجھے نہ آئی تو تم کیوں شرما گئے تھے؟" اس نے [illegible] دیا... اور مجھے ہنسی...

میں نے اس کے گھٹنے پر آنچ ہاتھ مارا۔ "لیکن [illegible] ساتھ... مجھے یہ احساس بہت دلاتی ہو تم میرے لیے خطرہ ہو۔ میں تمھارے جوان جسم کی خوب صورتی سے نہیں ڈرتا... بلکہ یہ شیطانی ذہانت تمھاری جان لے سکتی ہے۔" میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

وہ طمانچہ کھا کے بھی مسکراتی رہی۔ "کیا میں دوبارہ آغاز کروں؟" وہ شوخی سے بولی۔ "مجھے یہ تھپڑ اپنے منہ پر محسوس نہیں ہوا... تمھیں لگا؟"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور گاڑی کو تیزی سے چلاتا ہوا وہاں لے آیا جہاں راستہ سطح زمین کے برابر ہو گیا تھا۔ گیٹ اب بیرک کے سیدھے ہاتھ پر تھا جس سے ٹرک گزر کے اندر آیا تھا۔ مجھے مدن موہن کے ہاتھوں قتل ہونے والے چوکیدار کی لاش کہیں نظر نہ آئی۔ گیٹ کے دونوں پٹ بند تھے مگر مقفل نہیں تھے۔ میں جیپ کو آگے بڑھا کے اسی راستے پر لے گیا جس پر سے ٹرک گزرا تھا۔ بیرک کی عمارت عبور کرنے کے بعد میں نے بائیں جانب مڑتے ہی ٹرک کو دیکھا تو سارا نقشہ میری سمجھ میں آگیا۔ میں نے گاڑی روک کے نرملا کو بھی اترنے کا اشارہ کیا اور ٹرک کی طرف چلنے لگا۔ اس نے کرنل کی لاش کو دیکھا لیکن کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

میری توقع کے مطابق چابیاں ٹرک میں ہی لگی ہوئی تھیں۔ ٹرک ڈرائیور اس حفاظتی حصار میں داخل ہو جانے کے بعد خود کو نفسیاتی طور پر محفوظ سمجھتا ہوگا... یہ اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اندر داخل ہو کے ٹرک لے جا سکتا ہے... چنانچہ چابیوں کو ساتھ رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا... نرملا بھی میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ میں کیا کرنے والا ہوں؟" میں نے چابی گھما کے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کروں گی میں کچھ پوچھ کے..." وہ بولی... "ویسے مجھے معلوم ہے کہ تم کیا کرو گے۔"

"کیا معلوم ہے؟" میں نے ٹرک کو پہلے گیئر میں آگے بڑھایا۔

"تم ٹرک کے ساتھ ہی اس جگہ کو اڑا دو گے... لیکن اس سے پہلے مجھے لے کر جیپ میں نکل جاؤ گے۔" اس نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"میرا خیال ہے کہ کرنل اسی لیے تم پر مرتا تھا اور تم پر اتنا اعتماد کرتا تھا۔" میں نے کہا۔ "تم صرف دو دھاری تلوار ہو... بلکہ دو دھاری تلوار ہو۔ تم صرف جسمانی خوب صورتی پر ہی نہیں ذہنی سطح پر بھی ناز کر سکتی ہو۔ اس کی بیوی تو ایک پرانی وضع کی بدصورت اور بھاری بھرکم، کم عقل اور جاہل عورت ہوگی۔"

"تم تو اس کی بیوی سے مل چکے ہو۔" وہ بولی۔

ایک لمحے کے لیے میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ اس نے مجھے چھوا نہیں تھا۔ مجھے ایسے ہی آئینے میں اپنا چہرہ دکھا دیا تھا لیکن میں اس کے دوسرا طمانچہ نہ مار سکا۔

"یہ سب... وہ سب کچھ مدن موہن نے بتایا تھا تمھیں۔" میں نے کہا اور ٹرک کو جیپ کی جانب اسی راستے پر موڑ لیا جس پر جیپ کو اندر لایا گیا تھا۔ اس راستے کی تنگی ایک مسئلہ تھی۔ ٹرک کی بیرونی دیوار سے دو انچ ہی دور ہوگی۔ تجربہ کار ڈرائیور کا کوئی حصہ کبھی دائیں طرف رگڑ کھاتا تو کبھی بائیں طرف اور دیوار جگہ جگہ سے ٹوٹ رہی تھی۔ جب یہ ہموار راستہ سامنے آگیا تو میں نے اسپیڈ بہت کم کی اور بالکل سیدھے کیے اور ہینڈ بریک کھینچ دیا۔ ٹرک وہیں رک گیا۔ میں نرملا کے ساتھ واپس جیپ تک گیا اور نرملا کو بٹھا کے جیپ پیچھے وہاں تک لے گیا جہاں ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ اس مرتبہ میں نے جیپ کو ریورس کر دیا اور اسی ڈھلوان راستے پر ایک ایک انچ بڑھاتا ہوا ٹرک کے قریب لے گیا۔ جب ٹرک ایک ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تو میں نے جیپ کو بھی ہینڈ بریک لگا کے روک لیا۔ ٹرک اور جیپ اب مخالف سمتوں میں روانگی کے لیے تیار تھے اور ان کے پیچھے تقریباً ملے ہوئے تھے۔

نرملا کو تنہا چھوڑنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اسے ساتھ لے کر میں گیٹ تک گیا اور دونوں پٹ بنا آہٹ کے کھول کے واپس آیا۔ نرملا یہ سب کارروائی خاموشی سے دیکھتی رہی مگر منہ سے کچھ نہیں بولی... آخری کام میں نے یہ کیا کہ جیپ سے وہ دونوں سوٹ کیس اٹھا لایا جن میں سے ایک نوٹوں سے بھرا ہوا تھا اور دوسرا مختلف کاروباری چیزوں سے... ان کا وزن بہت زیادہ تھا... اوپر آتے آتے میں ہانپ گیا... دونوں سوٹ کیس میں نے جیپ کے پچھلے اوپر کھلنے والے دروازے سے اندر ڈال دیے۔ جیپ کا انجن بھی آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور ٹرک کا بھی۔

"تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" نرملا نے اچانک کہا۔

"کس بارے میں؟" میں نے ٹوٹی ہوئی دیوار کی اینٹوں کو اٹھا کے کہا۔

"تمھارے بارے میں۔" وہ بولی۔ "مجھے یہاں سے لے کر کہاں جاؤ گے؟"

"تم آزاد ہو گی..." میں نے کہا۔ "فی الوقت میں تمھیں کہیں نہیں جانے دے سکتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم مجھے پولیس یا ملٹری انٹیلی جنس کے حوالے کر دو... کرنل نے خودکشی نہ کی ہوتی..."

"اس نے... خودکشی کر لی تھی؟" نرملا نے کہا۔

"اسے... میں چاہتا تھا کہ وہ زندہ رہے... اس سے بہت کچھ پوچھا جا سکتا تھا... مگر وہ بھی تجربہ کار آدمی تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ ہار گیا ہے تو اس نے موت کو دشمن کی قید پر ترجیح دی۔" میں نے کہا۔ "کیپٹن شرما اور اس کے بھائی کو خود مدن موہن نے مار دیا تھا ورنہ میں انھیں بھی زندہ گرفتار کر کے لے جانا پسند کرتا۔"

نرملا کا چہرہ مایوسی اور اداسی کی تصویر بن گیا۔ اس کی آنکھیں خلا میں دیکھنے لگیں۔ "تم مجھے ان لوگوں کے ساتھ چھوڑ کے نہیں جا سکتے؟" اس نے تہ خانے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

میں ٹرک کے اگلے پہیوں کے سامنے چار چار اینٹوں کی رکاوٹ کھڑی کر رہا تھا۔ "میرا خیال تھا کہ تم زندہ رہنا چاہتی ہو۔"

"ہاں... مگر کسی ٹارچر سیل میں نہیں۔" وہ بولی۔

"گاڑی میں بیٹھو..." میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ آہستہ آہستہ میں نے ٹرک کے پارکنگ بریک ہٹا دیے... ٹرک ایک دو انچ ہلا اور رک گیا۔ اینٹوں کا چھوٹا سا ڈھیر ٹرک کو اس کے وزن سمیت روکنے میں کامیاب رہا تھا۔ اگر میرا اندازہ غلط ہو جاتا تو ٹرک کے اگلے ٹائر اینٹوں کو روندتے ہوئے گزر جاتے اور مجھے شاید بالکل مہلت نہ ملتی۔ اب میں اطمینان سے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ نرملا میرے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا رنگ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔

میں اس کی طرف دیکھ کے مسکرایا اور کلچ دبا کے میں نے جیپ کو فرسٹ گیئر میں ڈالا... پھر پارکنگ بریک چھوڑ دیے۔ جیپ پیچھے گئی اور اس نے ٹرک کو ٹکر ماری۔ تصادم کی آواز کے ساتھ ہی میں نے کلچ چھوڑ دیا اور ایکسیلیریٹر دبا دیا۔ جیپ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ بیک ویو مرر میں مجھے ٹرک آگے بڑھتا دکھائی دیا... جیپ نے دھکا دیا تو ٹرک نے اینٹوں کی رکاوٹ کو عبور کر لیا۔ اس کا سارا وزن ڈھلوان راستے پر اس طرح متوازن تھا کہ اسے ایک معمولی جھٹکے کی ضرورت تھی۔

جیپ کو میں نے بڑی تیزی سے سیکنڈ گیئر میں ڈالا اور ابھی موڑ کاٹا ہی تھا کہ میرے کانوں نے بلند دھماکا سُنا۔ ٹرک آٹھ فٹ اونچی دیوار سے ٹکرایا... گیٹ سے ٹکرا کے دیوار کو توڑتا ہوا اندر چلا گیا تھا۔ میں نے جیپ کی رفتار کو اور بڑھا دیا۔ اس کے طاقتور انجن نے مجھے مایوس نہیں کیا... مجھے معلوم تھا کہ ٹرک نے وزن کے ساتھ رفتار پکڑی ہوگی اور تہ خانے میں داخل ہونے کے بعد سلنڈر کی بارہ فٹ اونچی دیوار سے ٹکرائے گا تو تباہ ہو جائے گا۔ اس میں آگ لگ جائے گی اور یہ آگ گولہ بارود کے ذخیرے کو اڑا دے گی۔ عام طور پر اس قسم کے حادثات کے بعد پٹرول ٹینک کے پھٹنے سے اور تاروں کے شارٹ سرکٹ ہونے سے آگ لگ جاتی ہے... لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ آگ نہ لگے... ایسی صورت میں مجھے واپس جانا پڑتا اور ملبے کے ڈھیر میں کھڑے ہوئے ٹرک کو آگ لگانے کی کوئی ایسی صورت

paksociety

بیدا کرتی چلی گئی تھی دیر میں آگ ٹرک تک پہنچے گی ... واپس ... تک پہنچ جاؤں۔

ابھی جیپ گیٹ تک نہیں پہنچی تھی کہ جیسے زلزلہ آگیا۔ وہ دھماکا تھا جس نے زمین کو دہلا دیا۔ ایک لمحے کے لیے گاڑی بے قابو ہوگئی۔ میں نے اسٹیئرنگ سنبھال رکھا اور رفتار بڑھاتے ہوئے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جیپ ابھی تو سے سیل کی طوفانی رفتار سے گیٹ کراس کر گئی۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا... یہ پہلے دھماکے سے زیادہ بڑا تھا لیکن میں اس وقت تک کافی فاصلہ طے کر چکا تھا۔ پیچھے بیک ویو مرر میں بھی کچھ نظر نہیں آرہا تھا سوائے دھوئیں اور گرد و غبار کے... میں نے جیپ کو دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر نے کے بعد روکا اور نیچے اتر گیا۔

جہاں وہ ٹریننگ کیمپ تھا وہاں سو گز کے دائرے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے دھماکے اب بھی ہو رہے تھے اور پوری فضا میں اینٹوں کے ساتھ بہت کچھ اڑتا ... جا رہا تھا... میری توقع کے مطابق ٹرک میں آگ لگ گئی تھی اور ... پھٹ کر ہونے ٹرک نے کسی بہت بڑے بم کا کام کیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس پورے کیمپ کی جگہ صرف گڑھا رہ گیا ہوگا۔ اور وہ سب لاشیں جو باہر بکھری پڑی تھیں... جو ایک قبر میں لا ویسے پڑی تھیں اور جو تہ خانے میں بے ہوش انسانوں کی صورت میں قید تھیں، ایک ساتھ زندہ زندہ ہو کے بکھری چلی گئی... اس کیمپ کا عمارت سے پیچھے تقریباً آدھے میل کے فاصلے پر کوئی بستی تھی... تباہی کے اثرات ایک حد تک وہاں بھی محدود ہے تھے مگر دھماکے سے بستی کے ہر گھر کے در و دیوار بھی کانپ اٹھے ہوں گے۔ کچھ دیر میں بستی کے لوگوں کا وہاں پہنچ جانا یقینی تھا... میں واپس گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس خیال نے مجھے ایک طمانیت آمیز غرور اور اطمینان کی خوشی عطا کی تھی کہ میں نے ایک اور تخریب کاری کا خاتمہ کر دیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے تخریب کار تربیت پا کے نکلتے تھے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس قسم کا یہ واحد مرکز تھا۔ عام گھر چلانے پر تخریب کاری کا ہر گرام چلانے والوں سے اپنی سرگرمیوں کو بھی اپنے ملک میں پھیلا رکھا ہوگا... سب کا پتا چلانا اور سب کو تباہ کرنا میرے اکیلے یا ایم آر آئی ایس کے بس کی بات نہیں تھی۔ تو یہ ان معاملات سے نمٹنے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی اور عوام بھی ملک دشمنوں کے خلاف پوری ... ساتھ ... مجھے یہ اتفاق تھا یا دوست غیب کا اشارہ ... منصب پہنچ گیا۔ اس میں میری نیت کو دخل تھا اور ارادے کو... شاید ایمان کی یہ جیالا ایمان ... تھا... اس نے میرے دل میں اور میرے ساتھیوں کے دل میں ... جب جہاد پیدا کیا تو ہمیں عزم حوصلہ اور توفیق سے بھی محروم نہیں ... وسائل فراہم کیے مشکلات کو دور کیا اور ہمارے راستوں کو کشادہ رکھا۔

نرملا کے بارے میں میرا ذہن ابھی تک کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ ایک خیال یہ تھا کہ مجھے اسے ... چاہیے تھا۔ وہ ایک زیادہ خطرناک عورت تھی اور کسی بھی وقت مجھے مصیبت سے دوچار کر سکتی تھی۔ وہ انتہائی ... اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ظاہر ہوا کہ وہ زندہ رہنا چاہتی ہے اور اس رعایت کے لیے مجبوراً تعاون کر رہی ہے لیکن مجھے ایسا لگتا تھا کہ اس کا مقصد اور ہے... اگر وہ میرا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہی تو اگلی کامیابی کا مرحلہ میرے لیے شکست کا مرحلہ ہے... اپنا کام چلا لیا اور خود میرے حوالے کر کے مجھ پر ثابت ... چاہا تھا کہ وہ میری دشمن نہیں ہے۔ یہ بات ... وہ میری دشمن نہ ہوتی تو اس شخص کیوں ... کو سمجھنے کے باوجود وہ صرف ... تک ... ہے کر نہیں آئی تھی مگر وہ ... ذہن و دماغ کے ساتھ ... والی عورت تھی۔ اپنی خوب صورتی اور ... جوانی کو بھی ... مقصد کا ایک ذریعہ سمجھتی تھی۔ اس نے پہلے جسمانی طور پر بھی ... کی کوشش کی تھی مگر ... ذہنی طور پر میرے قریب آنا چاہتی تھی ... اسی ڈرامے کا ایک حصہ تھا۔ وہ مجھے یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ مجھ سے متاثر ہو گئی ہے اور میرے لیے سب کچھ کر سکتی ہے... پلٹنا بھی سے کرتی کہ میرے ساتھ ایک سنہرے مستقبل کے ... ہو سکتی ہے۔ ایسا اس نے زبان سے نہیں کہا تھا مگر ... سے سمجھا دیا تھا۔

دوسری طرف میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ عام عورت نہیں ہے۔ صرف ایک ... یا ایک کرنل کی محبوبہ نہیں تھی۔ مجھے تو یہ بھی ... کرنل ... بھی ایک پردہ تھا اور کرنل کے ساتھ وہ اس ... نہیں تھی۔ شاید اس طرح وہ اوپر والوں کے احکامات کی تعمیل کر رہی تھی۔ ... کرنل پر اور اس کے دونوں ... پر نظر رکھتی ... کسی اور کو باخبر رکھتی تھی... وہ اپنی ذہانت، حسن اور جذباتی انداز فکر کے باعث ان کے لیے زیادہ اہم تھی ... لوگوں کا انتخاب کرتے تھے، انھیں صلاحیت اور استعداد کے مطابق مشن سونپتے تھے... اور ان کی صلاحیت اور استعداد ... میں ... رپورٹ ... دیتی تھی۔ مختصر یہ کہ وہ ... کرتی تھی یا خود اس کا ایک حصہ تھی۔

اپنی دانست میں وہ مجھ سے ایک رعایت ... پہلی بازی جیت چکی تھی۔ اس نے خود کو میرے ہاتھوں ... بچا لیا تھا۔ ثابت کر دیا تھا کہ وہ عام عورت نہیں ہے ... سمجھتا تو سب کے سامنے ... باقاعدہ ...

... اپنے ساتھ ... آپ ... کی ... خود کو مجھ سے مخلص ثابت کرے ... اپنی راہ عمل متعین کرنے ... چاہتا ہوں تو وہ ایک خوفناک حسن و شباب رکھنے والی ... مجھے مکمل طور پر اپنے تابع کر لے۔ مجھے جسمانی شکست ... ذہنی طور پر بے بس کر دے۔ اگر میں جسم کے جال سے نکل جاؤں تو مجھے ... کہ وہ مجبور تھی... اپنی مجبوری کی کوئی قابل یقین داستان سنائے کہ وہ کرنل کے ساتھ اپنی مرضی سے نہیں آئی تھی۔ ... کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اس کے ماں باپ اور بھائی بہن ... اس کے انکار سے مصیبت میں پڑ سکتے تھے... وہ کہہ سکتی تھی کہ اس کے واپسی کا اب کوئی سوال نہیں... وہ تائب ہو کے میرا ساتھ دینے کو تیار ہے... مسلمان بھی ہو سکتی ہے اور اپنے ماضی کی ہر غلطی کا کفارہ یوں ادا کر سکتی ہے کہ اب میرے ساتھ دشمنوں کے خلاف میری مدد کرے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہے... یہ خبر تو آگے پہنچ ہی جائے گی کہ وہاں جتنے بھی تھے سب مارے گئے۔

یہ سب ذہن میں رکھ کے میں نے نرملا کو ساتھ لے لیا تھا... مجھے اس سے زیادہ مفید معلومات حاصل ہونے کی امید تھی۔ ابھی تو میں نے صرف اندازہ کیا تھا کہ اس کی ہر بات مان لی گئی... مزید کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ میں اس کو کچھ اور قریب آنے کا موقع دوں... ذہنی طور پر... اور اگر یا ہو تو جسمانی طور پر بھی... تاکہ وہ یہ سمجھے کہ اس نے مجھے شکار نہیں کیا تو گھائل ضرور کر دیا ہے... اور گھائل ہونے والا شکار ہونے سے کیسے بچ سکتا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" آتی دیر سے ..." نرملا نے کہا۔

میں نے چونکنے کی اداکاری کر کے مسکرایا۔ "اگر میں کہوں کہ تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا تو؟"

"تو میں خوش ہوں گی کہ..." وہ رک گئی۔

"کہ یہ جھوٹ ہے؟"

"نہیں... یہ سچ ہے..." وہ بولی۔ "تم ضرور سوچ رہے ہو گے کہ اب اس کا کیا کیا جائے... غالباً تم ابھی ... اس کشمکش سے نکل نہیں پائے کہ مجھے زندہ رہنے دینا چاہیے یا نہیں..."

میں اس کی منطقی سوچ پر حیران رہ گیا لیکن میں نے اپنی حیرت کا اظہار نہیں ہونے دیا... میں نے نفی میں سر ہلایا اور ہنس پڑا۔ "غلط ... کیونکہ میں تو ... سے ... پہنچا تھا... ... کو ... کا شکار نہیں ہوں مس نرملا... تم نے تعاون کا وعدہ ... کی ... ہو گی۔ ... اب بھی ... ابھی ... نہیں کیا کہ تمہیں آزاد کر دوں ... کہاں ... جاؤ..."

"واپس بھی جاؤں؟" وہ حیران ہو کے بولی۔ "کس کے پاس؟"

اپنے گھر..." میں نے ظاہر کیا کہ اس کے جواب پر مجھے حیرانی ہوئی۔

"میرا کوئی گھر نہیں..." وہ بولی۔

"عزیز رشتے دار، دوست تو ہوں گے..." میں نے کہا۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں... میں واپس جاؤں گی تو مشکل میں پڑ جاؤں گی۔ مجھ پر مقدمہ چلایا جائے گا... ناکامی کا جرم غداری سے کم نہیں سمجھا جاتا... پھر تفتیش ہوگی کہ کیمپ تو اس کیمپ کی تباہی میں ملوث نہیں... عورت ہوں نا... اور خوب صورت بھی ہوں۔ شک کرنے والے شک کر سکتے ہیں کہ میں بھی کسی ... کے جال میں اور اگل دیا ہوگا سب... یہ تو جواب بھی پوچھا جائے گا کہ تم اکیلی کیسے بچ گئیں... کہاں رہیں... واپس کیسے آئیں... دشمن کی قید میں رہ کر آنے والا مشکوک ہو جاتا ہے... ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ خود اپنے ملک کے خلاف کام کرنے لگتا ہے۔ دشمن سے کچھ بعید نہیں... ایسی ... پوزیشن ہو تو کچھ ثابت نہ ہونے کے باوجود نگرانی کی جاتی ہے اور ملازمت تو کہیں بھی نہیں ملتی۔ سماج میں تو وہ کوڑی کی عزت نہیں رہتی... تعریف زادیاں ... کہتی ہیں کہ دشمن کی قید میں رہ کے آئی ہے... معلوم نہیں کہاں کہاں کس کس نے زیر تفتیش رکھا۔"

"اوکے... تم واپس جانے پر تیار نہیں تو میں زبردستی نہیں سرحد کے پار نہیں دھکیل سکتا..." میں نے کہا۔ "اور اب میرے لیے زیادہ مشکل یہ فیصلہ ہے کہ تم کو کہاں رکھوں... تم سرکاری تحویل میں بیٹھنے کو تیار نہیں اور میرے پاس تو اپنا ٹھکانا نہیں... مگر خیر... کچھ سوچتے ہیں۔"

میں نے گاڑی کو ایک کچے راستے پر موڑ لیا۔ درختوں کے درمیان سے گزرتی اور چھوٹی موٹی جھاڑیوں کو روندتی اسٹیشن ویگن نما جنگل سے گزری... یہ ہموار چٹانوں کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے گاڑی روک لی اور نیچے اتر گیا... کچھ آگے مجھے کسی سوکھے ہوئے برساتی دریا کی تہ دکھائی دے رہی تھی اس کے بعد پھر جنگل تھا۔ میں نے ٹریکی وصل ... اور درختوں کے بیچ میں سے آگے گزرتے بھی دیکھا۔ مگر فاصلہ اتنا تھا کہ کہیں کہیں حرکت سی محسوس ہوتی تھی اور باقی سب میرا تصور تھا جو چیونٹیوں کی آواز سے تصویر بنا رہا تھا۔ یہ جگہ ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔ میں کم از کم آج کا دن اور ایک رات یہاں روپوش رہنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بلا آخر ... حاجی عبداللہ میں سے کوئی ٹرک کے بارے میں معلوم کرنے آئے گا اور پھر انیو ساتھی کی پُراسرار گمشدگی کا معاملہ بھی اٹھے گا تو کیمپ کی تباہی دیکھ لے گا... لاشوں کے ٹکڑے دیکھ کر وہ مرنے والوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہ کر سکیں مگر انھیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ اسٹیشن ویگن غائب ہے... انھیں ٹرک کا ڈھانچہ ملے یا اس کے الگ الگ ٹکڑے۔ وہ جیپ کا ڈھانچہ اور اس کے پرزے

بھی تلاش کریں گے اور جب اس کا سراغ ہی نہیں ملے گا تو وہ سمجھ جائیں گے کہ جس نے کیمپ کو تباہ کیا، وہی جیپ لے کر بھاگ گیا۔ وہ سب کو مار گیا لیکن خود اسٹیشن وگن نہ پا کے نکل گیا۔ پھر وہ پیچھے کراچی سے پشاور تک کی سڑک پر تلاش کریں گے۔ آج دن میں اور پھر رات بھر... اس امید میں کہ شاید میں رات کے اندھیرے کی پناہ میں نکلوں۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" نرملا نے بڑی امید بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔

"کچھ نہیں... میں نے ایک جھونپڑی کی طرف دیکھ کر سوکھے پتوں پر لیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ جگہ روپوش رہنے کے لیے اچھی ہے۔"

"جگہ تو اچھی ہے... مگر ہم یہاں کب تک رہ سکتے ہیں؟"

"روپوشی کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں۔" میں نے آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر ہمارے پاس کچھ بھی تو نہیں ہے... کھانے پینے کو..."

"میں نے سنا ہے کہ آدمی کھائے پیے بغیر ایک ہفتہ زندہ رہ سکتا ہے... ہم ایک دن تو ویسے بھی گزار لیتے ہیں... ہم روزہ رکھتے ہیں... تھوڑی عبادت کرتے ہو۔" میں نے جیب سے سگریٹ نکال کے سلگائی۔ "صرف دو گھنٹے پیدل ہی تو ہم نے جیٹ جھاڑا ہے۔ شام تک تو کوئی مسئلہ نہیں۔"

"کیا رات بھی یہیں گزرے گی؟"

"کیا تم ڈرتی ہو...؟"

"کس سے؟" وہ گھاس پر بیٹھ گئی۔

"مجھ سے... یا رات سے..." میں نے مذاق اڑایا۔

"ڈرتے تو تم بھی ہو... مجھ سے بھی اور رات سے بھی... مرد ہونے کے باوجود۔"

"یہی تو مجھے حیرانی ہے... کل اور آج میں زمین کی گردش نہیں بدلی... سورج کی سمت نہیں بدلی... لیکن تم نے زندگی کا راستہ بدل لیا۔ اس طرح تو کوئی بھی ایک نئی زندگی اختیار نہیں کر سکتا جس میں پرانے جذبات کے رشتے... زمین سے اور انسانوں سے... وقت سے اور مقامات سے اور یادوں سے... یہ سب بے وجود ہو جائیں... یہ ناممکن ہے۔"

"مجبوری میں احتیاط کی بات کرتے ہو...؟"

"میں نے تم پر کوئی جبر نہیں کیا...؟" میں نے کہا۔ "اشاعت میں نے تمہیں اختیار دیا تھا کہ واپس لوٹ جاؤ... لیکن تم نے کہا کہ میرا کوئی گھر نہیں... کوئی عزیز دوست اور رشتے دار نہیں... تم نے میرا ساتھ دینا پسند کیا... آخر کیوں...؟ تم نے تو یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کون ہوں۔"

"میں جانتی ہوں کہ تم سکندر بخت ہو..."

میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ "یہ جانتی ہو تم؟ مگر کیسے... کیسے پہچان سکتی ہو تم سکندر بخت کو...؟"

"مجھے اس کے بارے میں بتایا گیا تھا... اس کی تصویر دکھائی گئی تھی..."

"وہ ایسی ہی تصویر تھی جیسا میں ہوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"مجھے ایک نہیں... کئی تصویریں دکھائی گئی تھیں، ہم مختلف بھیس میں۔"

"کس نے دکھائی تھیں یہ تصویریں؟"

"خود کرنل نے..." وہ بولی۔ "لیکن میں نے تمہیں صورت سے نہیں پہچانا۔"

"پھر کیسے پہچانا... صورت تو بدل سکتا... یا بیٹھی جس رنگ"

"میں نے تمہاری آواز پہچانی..."

میں چونکا رہ گیا۔ "آواز... میری آواز بھی سنی تھی تم نے کیسے...؟"

"تمہاری آواز کے ٹیپ موجود ہیں۔" وہ بولی۔ "مجھ سے کہا گیا کہ اس آواز کو ذہن میں رکھو... وہ صورت بدل سکتا ہے مگر آج تک اس نے اپنی آواز بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ اسی طرح پہچانا جا سکتا ہے۔"

"اور... تم نے جو ٹیپ سنا تھا... اس میں کیا کہہ رہا تھا میں کس سے بات کر رہا تھا؟" میں حیرت سے اس کی حالت دیکھ رہا... یہ ایک ایسا انکشاف تھا جس نے میرے کان کھڑے کر دیے تھے... بلاشبہ خود کو حد سے زیادہ چالاک سمجھنے والا کوئی معمولی مجرم بالآخر تباہ کن ثابت ہونے والی غلطی کرتا ہے۔

"تم کسی چوہدری فلاور سے بات کر رہے تھے... تم نے اس سے کہا تھا کہ باغ جناح میں ملو... منٹگمری ہال کے پاس... پھر تم نے اقبال پارک کے باہر شاہی قلعے کے سامنے بلایا تھا۔"

بے اختیار میرا ماتھا ٹھنکا... یہ بہت پرانی بات تھی اس دن میں نے اور محسن نے مال روڈ سے ایف ایم مائیکرو فون خریدا تھا اور کار کے ریڈیو پر فلاور سے بات کی تھی۔ ہم ایک دوسرے کی آواز ایف ایم بینڈ کو ٹیون کر کے سنتے رہے تھے... فلاور نے سب کچھ ٹیپ پر ریکارڈ کر لیا تھا اور میری دی آواز بھی شناخت کے طور پر استعمال کرائی جا رہی تھی۔ آدمی کے بہترین دوست اس کے دشمن ہوتے ہیں جو اس کی غلطیاں اور خامیاں نشان زد کرتے ہیں اور اسے موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ ان سے سبق سیکھے... بڑا سرپرست ہونی بات تھی جو ہماری عقل میں نہ آئی کہ آدمی کی شناخت صرف چہرے سے ہی نہیں ہوتی۔ اس کی آواز بھی انگلیوں کے نشان کی طرح ہے... جیسے ایک آدمی کے فنگر پرنٹ دوسرے سے نہیں ملتے ایسے ہی ایک آواز دوسری آواز سے مختلف ہوتی ہے۔ کسی سائنسی مشاہدے اور تجربے کے بغیر اس فرق کو عام آدمی بھی محسوس کر لیتا ہے۔

ہر ٹیپ پر اور محسن یا غالب کسی کے ہم ہونگے ان میں بھی نہ تھا کہ ہماری آواز ایک دشمن کے پاس محفوظ ہیں۔ نرملا نے غلط نہیں کہا تھا۔ مجھے وہ گفتگو اب بھی جزوی طور پر یاد تھی۔

مجھے کچھ بہ نرملا نے تفصیل سے بتایا اور وہ گفتگو تقریباً لفظ بلفظ دہرا دی جو میں نے اور محسن نے فلاور سے کی تھی۔ اسے ٹیپ بار بار سننے سے سب زبانی یاد ہو گیا تھا... جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، ہم نے وہ ٹیپ حاصل کر کے تباہ کر دیا تھا مگر فلاور پلاٹ آف تھا... اس نے کوئی اور بندوبست بھی کیا تھا... ہماری آواز ایک جگہ نہیں دو جگہ ریکارڈ ہوئی تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم محسن کی آواز بھی پہچانتی ہو؟"

نرملا نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں کیا... بہت سے لوگ جانتے ہیں جن کو اس مقصد کے لیے بھیجا جاتا ہے۔"

"کس مقصد کے لیے؟" میں نے کہا۔

"یہی... جاسوسی اور تخریب کاری... اسلحے کی ترسیل اور تقسیم۔ تم جانتے ہو... سب کچھ۔ پھر کیوں پوچھتے ہو؟" وہ کھل کے ہنسی لب تک سجاتی رہی۔

"جانے مجھ سے متعلق اور کیا کیا بتایا جاتا تھا؟"

"تمہارے متعلق... یہ کہ تم بہت چالاک اور خطرناک ہو... جوڈو کراٹے میں بلیک بیلٹ سے زیادہ جانتے ہو۔ باتیں بہت پیچ دار کرتے ہو کیونکہ تم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو... تم اور محسن دونوں... مذاق بہت کرتے ہو... انتہائی پرخطر حالات میں بھی سیریس نہیں ہوتے... لڑکیوں کو خاص طور پر تاکید کی جاتی تھی کہ تم سے بچ کر رہیں۔ تم انھیں بیچارا کر لیتے ہو۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "کیا تم بھی اسی ٹیم کے زیرِ اثر یہ سب بتا رہی ہو؟"

"کیا یہ سب غلط ہے؟"

"میری تعریف ضرورت سے زیادہ ہو رہی ہے... میں بلیک بیلٹ ہوں... نہ ہی عورتوں کا شکاری..." میں نے کہا۔ "ہندوستان، پاکستان میں تمہیں ایک بھی لڑکی نہیں ملے گی جو یہ ثابت کر سکے۔"

"سوائے دو لڑکیوں کے... ایک کا نام فوزیہ ہے۔ اس کی اب شادی ہو چکی ہے... دوسری کا نام رابعہ ہے۔ وہ ابھی تک تمہارے ساتھ ہے... تمہاری شریکِ حیات ہے... اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تمہاری بیوی ہے۔" نرملا نے کہا۔

میری ساری شوخی کافور ہو گئی۔ "مائی گاڈ... تم... اتنا جانتی ہو تم میرے بارے میں؟"

"میں وہی جانتی ہوں جو مجھے بتایا گیا ہے... اور اس کا مطلب ہے کہ اور بھی بہت سے لوگ یہ سب کچھ جانتے ہیں بلکہ شاید اس سے زیادہ بھی جانتے ہیں۔" نرملا نے کہا۔ "اور بتاؤں...؟"

"تمھارا یہ کہنا کہ تم عورتوں کے شکاری نہیں ہو... یہ بھی غلط ہے... جب تم انگلستان میں تھے تو سفید فام مائیں اپنی جوان بیٹیوں کو تمھارے سامنے سے بھی دور رکھتی تھیں۔ تم لیڈی کلر مشہور تھے۔ ایک لارڈ کی بیٹی تو تمھارے ساتھ جلاوطن بھی ہونے کو تیار تھی۔ تم نے ایک نہیں درجنوں عشق کیے... یہ بات تمھارے لیے درست ہے تو وہی محسن کے لیے بھی درست ہے۔"

میں اب پوری طرح دلچسپی لینے پر مجبور تھا... نرملا نے مجھے خود میرے بارے میں ہی نہیں بتایا... اس نے رابعہ اور فہمیدہ کے متعلق بتایا... نازو کے بارے میں بتایا کہ وہ بے حد حسین اور بے حد خطرناک ہے... مردوں کو تاکید کی جاتی تھی کہ اس آفت کی پرکالہ سے بچیں جو کمزور اور معصوم نظر آتی ہے لیکن خالی ہاتھوں سے بھی طاقتور مردوں کو چت کر دیتی ہے اور اس کا حسن تو مصیبت ہے ہی۔

نرملا کی باتوں نے مجھے پریشان کر دیا۔ وہ رفتہ رفتہ طور پر سب کچھ بتا رہی تھی... میرا ذہن یہ بات قبول کرنے سے قاصر تھا کہ نرملا منحرف ہونے کا ڈرامہ کر رہی ہے جب قائل ہونے لگا تھا کہ شاید وہ جھوٹ نہیں بول رہی ہے... اس نے ماضی کو پیچھے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور مستقبل کو مجھ پر چھوڑ دیا ہے... میرا خیال تھا کہ اس سے تفتیش کا عمل طویل اور مشکل ہوگا... وہ مزاحمت کرے گی... جھوٹ بولے گی اور مجھے گمراہ کرے گی... لیکن وہ میری ساری توقعات کو غلط ثابت کر رہی تھی۔ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ وہ میرا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ایک ماہر شکاری عورت کی طرح جال پھیلائے گی تاکہ جیسے مکڑی جال پھیلا کے مکھی کو گرفتار کر لیتی ہے۔ ایسے ہی مجھے بھی پھانس لینے کی کوشش ضرور کرے گی... مگر ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے خود کو میرے حوالے کر دیا تھا... یہی بات میری عقل قبول نہیں کرتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کرے گی... کیا وہ بے وقوف تھے جنھوں نے اس پر اعتماد کیا... ملنے پر کیا آزمایا اور پھر وہ کے تحت قابل پا کے کرنل کے ساتھ بھیج دیا؟ کیا وہ اسی لیے ان کی ہر آزمائش میں پوری اتری؟ آخر کار ان کا ساتھ چھوڑ کے اب ان کے دشمنوں سے مل جائے۔ آخر کیوں؟ اسے کیا ضرورت تھی اس کی... وہ ہندو تھی... بھارتی شہری تھی... وہ پاکستان سے یا کسی پاکستانی سے جذباتی تعلق کیوں رکھے گی... بالفرض محال وہ منحرف ہونا ہی چاہتی تھی تو بہت پہلے زیادہ آسان طریقہ اختیار کر کے بھی آ سکتی تھی۔

میں نے فیصلہ کیا کہ ان حالات میں مجھے نرملا کو ساتھ ہی رکھنا ہوگا... لیکن اس کی طرف سے بہت محتاط رہنا بھی ضروری ہوگا۔ اس کی باتوں میں آ کے اس پر اعتماد کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اب یہ بہت مشکل تھا کہ میں اسے گولی مار دوں... لیکن میں اسے سہولت کے ساتھ مار سکتا تھا... پھر مجھے نہ افسوس ہوتا اور نہ پریشانی ہوتی۔

"نرملا... اگر میں تم کو یہیں چھوڑ جاؤں؟" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ پہلی بار خوف زدہ ہوئی۔

"کیوں نہیں کر سکتا؟" میں نے کہا۔ "تم زبردستی تو میرے ساتھ نہیں جا سکو گی۔"

"میں تم کو بھی نہیں جانے دوں گی... جانا ہے تو مجھے یہیں مار کے پھینک جاؤ۔" وہ چلائی۔ "بابا لوگ اور وہ سب گئے... میں خود بھی مشکل سے بچی ہوں۔"

"تم زندہ بھی رہ سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "خدا نے تمہیں عقل اور ذہانت بھی دی ہے۔ خوب صورتی اور جوانی بھی دی ہے۔ ضروری نہیں کہ تم واپس انہی کے پاس جاؤ... ہندوستان بہت بڑا ملک ہے... اس کی آبادی میں تم کہیں بھی گم ہو سکتی ہو۔"

"لیکن میں واپس جانے کے لیے نہیں آئی تھی۔" وہ چلائی۔

"پھر کس لیے آئی تھیں... اس ملک کی شہریت تو تمہیں مل نہیں سکتی تھی اور تمہارا قیام بھی کب ہے اس ملک کے؟" میں نے کہا۔ "تم کب سے جو یہاں... میں نے تمہیں ... سے واپس آتے ہوئے دیکھا تھا بالفرض محال تم کو اتنا ہی شوق تھا یہاں رہنے کا تو وہیں سے واپس آنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہیں رہ جاتیں۔"

"لیکن... مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں ہو... میں اس وقت انتظار کر رہی تھی... جب میں تم سے ملوں..."

میں ہنس پڑا۔ "وہ تو گڈو... کیا خاک انتظار ہو گیا تھا تم کو مجھ سے؟ میں تمہارے خوابوں اور خیالوں میں بس گیا تھا؟"

"یہ بات نہیں ہے..."

"پھر کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ بھارت کے کئی بڑے شہروں بمبئی کلکتہ وغیرہ میں بہت بڑی آبادی فٹ پاتھوں پر رہتی ہے۔ اور ہر جگہ خانہ بدوش یا فقیر بے گھر رہتے ہیں۔ مگر تم ایک تعلیم یافتہ عورت ہو... تم ہر رنگ کے پیشے میں تھیں اور تمہاری صورت... تم نے کبھی نہیں دیکھی۔ تم کہتی ہو کہ تمہارے میرے دوست رشتے دار نہیں... یہ میں کیسے مان لوں؟ تم تو جس کی طرف ایک نظر دیکھ لو وہ تمہارا ہو جائے۔"

"کیا تمہارا کوئی گھر ہے؟" وہ آہستہ سے بولی۔

ایک لمحے کے لیے میرے الفاظ گم ہو گئے اور میری زبان گنگ ہو گئی۔

"خاموش کیوں ہو گئے؟ کہاں ہے تمہارا گھر جو تمہارے ماں باپ بھائی بہن رشتے دار... یہ سب کہاں ہیں؟" اس نے تلخی سے کہا۔ "تم بھی تعلیم یافتہ ہو... خانہ بدوش یا فقیر نہیں ہو..."

"یہ... یہ ٹھیک ہے لیکن..." میں نے سنبھل کے کہنا شروع کیا۔ "تم جیسے تعلق بڑی اچھی پرورش ... ہے۔ واقعی میں گھر اور خون کے رشتوں سے محروم ہوں... لیکن میرے پاس دوسرے بڑا گہرے رشتے ہیں... وطن کی مٹی جیسا پیارا ہے... محبت جیسے خلوص کے... ماں باپ کی محبت کے... بھلا تمہیں ان کی کیا قدر کے اور ان گنت ایسے جیسے افسانوں کی محبت کے ... اور اخلاق یا اقدار کے رشتے سے میرا خاندان ہیں۔"

"اگر میں اس خاندان میں شامل ہونا چاہوں تو...؟"

میں ہنس پڑا۔ "اس کے لیے تمہارے پاس کیا جواز ہے؟ کیا تم مجھے کوئی حب الوطنی کی داستان سناؤ گی...؟ کہ تم اس معاشرے سے متنفر تھیں اور تمہارا استحصال ہوا تمہیں جبراً ... مجبور کیا گیا جس کو تمہارا ضمیر قبول نہیں کرتا تھا... تم پہلے بھی ... یہاں تک پہنچی ہو جس کا صلہ... جھوٹ بولنے والے کا حافظہ کمزور ہوتا ہے... لیکن مجھے یاد ہے کہ ایک وقت میں تم نے کیا کہا تھا اور دوسری بار خود اپنی تردید کر دی تھی۔"

"کیا تمہیں اپنا بچپن یاد ہے کبیر خان؟"

میں چونک پڑا۔ "یہ بھی بتا دیا گیا ہے تم کو؟ ... تھا... بڑی ریسرچ ہوئی ہے مجھ پر... تمہیں تو شاید میرے ... تمام اعمال تمام واقعات کا بھی علم ہو گا جو ان کے ساتھ یا میرے ساتھ پیش آئے تھے۔"

وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔ "مجھے جو کچھ ملے تو کسی ... سے بھی یہ سب پوچھا... جو میں جانتی ہوں۔"

"کیا جانتی ہو تم... ایسی کون سی بات ہے...؟"

"کبیر خان... کیا تم کو چاچا دینا ناتھ یاد نہیں؟" وہ بولی۔

"دینا ناتھ... پنڈت دینا ناتھ...؟" میں نے محسوس کیا ... جنگل میں ہر طرف آدم خور خونخوار... سفاک بھیڑیے... خون آشام چیتے... چند ناتے ہوتے صاحب اور ... تک مارنے والے ... بڑے ٹکڑے نکل آئے ہیں۔ اور میں جان بچانے کے لیے اس دشت کی ویرانی میں بھٹکتے بھٹکتے ایک گھر تک جا پہنچا ہوں جس کے محفوظ دروازوں کے پیچھے میرے گھر سے سلامتی... تحفظ اور عافیت ہے۔ محبت پیار اور شفقت ہے... وقت جو کئی برس پیچھے چلا گیا... ایک گھر کو میری نظروں نے فوکس کر لیا... اس گھر میں اور کون تھا؟

"تم میرے گھر میں بیٹھے تھے نا کبیر خان؟" قمر ملا نے کہا۔ "کیا تم یہ بھول گئے ہو؟"

"نہیں... نہیں... مجھے ... بھولا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "لیکن میں اس وقت کی کوئی بات سننا نہیں چاہتا... کیا تم نے؟ تم نے مجھے اس وقت کی یادوں کے نام پر دھوکا دینے کی کوشش کی تو میں تم کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔"

"تم کچھ بھی کر سکتے ہو کبیر خان...؟" وہ سہم کے بولی۔

"مت کہو مجھے کبیر خان۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "دغا باز عورت... میں اس مکر و فریب کے جال میں پھنسنے والا نہیں ہوں..."

"میں تو اسی نام سے جانتی تھی تمہیں... اور مجھے نہیں معلوم ... بہت کب سے بولتے... اور کیوں جھوٹ ہے؟" وہ کانپنے لگی۔ "تم مجھے مار ڈالو گے... میری بات سن لو... یہ جان لو کہ میں وہی ہوں..."

"وہ کون؟" میں شعلوں کے ساتھ میں اپنی اجلی آواز کو ...

"چاچا دینا ناتھ کی بیٹی..."

میں ایک دم اٹھا اور میں نے چاہا کہ اس کا گلا گھونٹ دوں... جھوٹ بولنے والی زبان کو کھینچ کر باہر نکال دوں... جب اس نے ... ہاتھ اٹھایا اور میرا ہاتھ اس کی گردن پر رک گئے... اس کا چہرہ میرے سامنے میرے بہت قریب آ گیا... اتنا قریب کہ میں اس کی آنکھوں کے اندر جھانک کر دیکھ سکتا تھا۔ اس کا وجود میرے سخت ہاتھوں کی بے رحم گرفت میں تڑپا اور اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کے قطرے تیزاب کی طرح میرے ہاتھوں پر گرنے لگے... اس کے بعد مجھ سے اور کچھ نہ ہو سکا... آہستہ آہستہ میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور اس کے ... میں اب بھی اس کی آنکھوں کی گہرائی میں جھانک رہا تھا... وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہی تھی... میں بہت ... ہو گیا تھا جیسے ... برس پیچھے رہ جانے والے وقت کے سامنے دیکھ کر اصلی اور نقلی چہروں کے درمیان فرق کو محسوس کرنا بہت مشکل تھا... ناممکن تھا... آخر میرے لیے اس جھوٹ کا سچ زیادہ ناممکن کیوں ہے؟

میں نے اپنے آپ سے سوال کیا... میں سچ کی کسوٹی کہتا ہوں تو مجھے ڈر کیوں ہے؟ عقل کی دلیل نے مجھے ہوش میں آنے پر مجبور کر دیا... میں نے اسے چھوڑ دیا۔

وہ ریت کے گھروندے کی طرح گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ میں اتنی ہی بے حسی کے ساتھ اس کے قریب کھڑا اپنے احساس کی آگ میں ... کے تھپیڑے برداشت کرتا رہا۔ ... گزرے ہوئے وقت کی ... جو ... مسلسل گرد ... کی گرد اور یادوں کی گلیوں کی دھول ... تھی... اس میں آگ کی لپٹ تھی اور جلتے جسموں کی ... ذہن کے ... تھے ... کچھ بھی نہیں ... لپٹا تھا۔

وہ اچانک اٹھی اور میرے پیروں سے لپٹ گئی۔ "کبیر خان! مجھے بچا لو... آخر کیا ہو گیا ہے تمہاری آنکھوں کو... کیا تم دیکھ نہیں سکتے کہ میں کون ہوں... میں قمر ملا نہیں ہوں..."

میں نے اسے بڑی بے دردی سے جھٹک دیا۔ "تم قمر ملا ہو..." میں نے چیخ کر کہا۔ "تم موہنی نہیں ہو..."

... تو وہ ہنس پڑی۔ "تم کو یاد ہے میرا نام... بچپن کا ... یاد رہا تمہیں یہ نام کبیر... چوبیس سال میں تم بہت سے نام بھلا چکے ہو گے... پھر یہ نام کیوں نہیں بھولے تم... کیا تم مجھے بھولنا نہیں چاہتے تھے؟"

آہستہ آہستہ میرا وجود سرد پڑنے لگا... میری نظر اس پر ٹھہر گئی۔ اس کی صورت کے نقوش میری نگاہ میں تھے اور میں دل کے اندھیرے کنویں میں اتر کے تشنگی کے مدفون لمحوں کی روشنی ڈھونڈ رہا تھا۔

"صرف نام کے فرق کو دیکھ رہے ہو... نام تو تم نے بھی بدل لیا ہے... مگر کیا خود تم بدل گئے ہو...؟" وہ بولتی رہی... "زیادہ پرانی ... کیا وہ پرانا اعتماد نہیں... بتاؤ مجھے کہ اس بدلے ہوئے چہرے بہروپ کے اندر کون ہو تم؟"

میں گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا... میں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کے اپنی طرف کر لیا۔ "اب بھی کہہ دو کہ یہ جھوٹ ہے جو تم مجھے بے وقوف بنانے کے لیے بول رہی تھیں اور تم موہنی نہیں ہو... تم وہی ہو جو میں نے تمہیں سمجھا تھا۔"

"کبیر... میرے ساتھ پیچھے لوٹ چلو... اس گھر تک جہاں تم اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ تم سات بہن بھائی تھے... پانچ بہن بھائی جنونی بلوائیوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ تمہاری ایک بہن اپنی عزت بچانے کے لیے کنویں میں کود گئی تھی۔ اور تمہاری ماں... جیسے کہ بچا نہ سکی تھی... وہ بھی بچوں کو بچاتے ہوئے تم پر قربان ہو گئی تھی... یہ سب میں نے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے میرے پتا جی نے بتایا تھا... پنڈت دینا ناتھ نے... اور بعد میں موہن نے بھی بتایا تھا... تم سال بھر ہمارے گھر میں رہے تھے... یاد ہو گا تمہیں... تم بھول کیسے سکتے ہو؟"

"ہاں... اور وہاں تمہارے گھر میں... ایک ریڈیو تھا... کوئی اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا... مگر چاچا دینا ناتھ نے وہ ہمارے کمرے میں رکھ دیا تھا۔ جہاں موہن اور میں... اور تم... اس کے کان مروڑتے رہتے تھے... مجھے بہلانے کے لیے... تم سب نے بہت کوشش کی تھی... اور جب میں نہیں مانا تھا تو تمہارے پتا جی نے مجھے ایک چانٹا لگایا تھا... وہ پولیس میں حوالدار تھے نا... بعد میں مجھے حفاظت سے ماما کے گھر بھیج دیا گیا تھا... سرحد... وہاں اور میرے گھر کے درمیان کوئی جگہ تھی... وہاں سے میں پھر تمہارے گھر آ گیا تھا اور اس کے بعد ابا مجھے لینے آ گئے تھے..."

"کبیر...!" موہنی نے ایک چیخ ماری اور مجھ سے لپٹ گئی۔ "تم وہی ہو نا... میرا دل گواہی دیتا تھا... تم نے مجھے پہچان لیا؟"

وہ آنسو جو چوبیس برسوں سے رکے ہوئے تھے۔ وہ لاوا جو منجمد ہو جانے والے زخموں میں بھر گیا تھا... وہ جذبے جو دل میں پتھر ہو گئے تھے... وہ بارش کے قطروں کے ساتھ بہہ گئی تھیں ان

www.paksociety.com

سسپنس نے مل کے مجھے شکست دی اور سچ کے یقین کا عذاب دیا... بالآخر میں نے اُسے اپنے سے جدا کیا۔ وہ بے ہوش تھی اور مجھے تاڑ رہا تھا... میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا جو اس نے نہیں سنا تھا۔

میں نے اُسے آرام سے لٹا دیا۔ میں گاڑی تک گیا اور اس کے پچھلے سامان کے ڈھیر میں سے ایک کینوس کا ٹکڑا اٹھا لایا جو اتنا بڑا تھا کہ اس کو ایمرجنسی میں بستر بنایا جا سکتا تھا۔ چند سیدھی اور لمبی شاخیں مل جائیں تو اسی کو میں خیمہ بھی بنا سکتا تھا۔ فی الحال میں نے اسے کھول کے زمین پر بچھایا اور موہنی کو اس پر منتقل کر دیا۔ ابھی تک میں ذہن میں اٹھنے والے اس سوال سے گریز کر رہا تھا جس کا تعلق موہنی کے مستقبل سے تھا... ابھی مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا بھی تھا... لیکن سب سے پہلے مجھے اس کو ہوش میں لانے کے لیے کچھ کرنا تھا۔

ایک چٹان پر چڑھ کے میں نے غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں چاروں طرف دیکھا... میرا تاثر ندی کے پار مجھے دھواں سا نظر آیا... پھر میں نے ایک گوالے کو دیکھا جو اپنے ریوڑ کے ساتھ ندی کے ساتھ ساتھ پلٹ کے گزر رہا تھا۔ یقیناً ادھر کوئی آبادی تھی۔ یہ فاصلہ میرے اندازے کے مطابق آدھے میل سے زیادہ اور ایک میل سے کم تھا... وہاں آنے جانے میں میرا ایک گھنٹہ صرف ہو سکتا تھا... ایک گھنٹے بعد تو جنگل میں رات ہو گی... اندھیرے میں واپسی کا سفر کیسے ہوگا۔ میں لوٹ کر اس جگہ کیسے پہنچوں گا... اگر میرے قدم ذرا بھی بھٹک گئے تو موہنی اکیلی پڑی رہ جائے گی۔ اور اس جنگل میں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے... وہ تو ایک لڑکی ہے... نہیں... اسے اکیلا چھوڑ کے جانے میں کوئی عقلمندی نہیں۔ اگر میرے جاتے ہی اُسے ہوش آ گیا تو وہ نہ جانے کیا سمجھے گی لیکن میں اُسے ساتھ بھی کیسے لے جاؤں... اُسے کندھے پر ڈال کے لے جاؤں گا تو یہی فاصلہ دو گھنٹے میں طے ہوگا اور پھر گاؤں کے لوگ نہ جانے کیا سمجھیں گے... میں گاڑی سے کر بھی سکتا تھا مگر اس سے بھی شکوک و شبہات جنم لیتے۔ سب کو یہ بات عجیب لگتی کہ میں جنگل کی طرف سے ایسی شاندار گاڑی میں نمودار ہوا اور واپس جنگل میں گم ہو گیا۔

بالآخر میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ میں نے واپس گاڑی میں جا کے گلوو کمپارٹمنٹ کھولا۔ اس میں گاڑی کے کاغذات کے نیچے ایک بال پوائنٹ پین بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک سادہ صفحہ پھاڑ کے اس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا۔ "میں ابھی واپس آتا ہوں..." اور یہ چٹ موہنی کے کپڑوں پر سامنے کی طرف لگا دی... کاغذ اڑ کے چلا نہ جائے اس کے لیے میں نے ہیئر پن کا ایک کانٹا استعمال کیا۔ مجھے یقین تھا کہ ہوش میں آتے ہی موہنی کی نظر اس پیغام کو دیکھ لے گی۔

گاڑی کی چابیاں میری جیب میں تھیں... سامان تھا اور گاڑی کے دروازے بند تھے۔ میں نے ایک نظر موہنی پر ڈالی اور تیز تیز قدموں سے روانہ ہو گیا۔ میری جیب میں خاصی رقم موجود تھی، چنانچہ مجھے وہ سوٹ کیس نہیں کھولنا پڑا جو مالِ غنیمت سے بھرا ہوا تھا۔ اپنی حفاظت کے لیے میں نے پاس ریوالور رکھا ہوا تھا جو مجھے موہنی نے دیا تھا۔

میں جنگل کے راستے پر تقریباً دوڑ رہا تھا۔ اس جگہ آ جانے کے بعد مجھے پریشان کرنے والے سوالات ستانے لگے۔ وہ بد روحوں کی طرح میرا تعاقب کرنے لگے اور مجھے ڈرانے لگے۔ اگر یہ جھوٹ ہوا... یہ بھی اداکاری ہوئی... کسی نے اسے بنا دیا ہوگا سکندر بخت... وہ موہنی کیسے ہو سکتی ہے... [illegible] ہوگی... موہنی کا تو اپنا ایک گھر تھا... اس کا بھائی ہوگا، ماں باپ ممکن ہے زندہ نہ ہوں... مگر موہنی کی شادی ہوئی ہوگی وہ کہیں اپنے شوہر اور بچوں میں الجھی ہوگی... یہ عورت [illegible] تماشا ہے... اس نے اپنے آنسوؤں سے اور اپنے جذبات سے تم کو پاگل کر دیا۔ اس نے تمہارے ماضی کے متعلق [illegible] والے دکھوں کی کسک کو بیدار کر دیا کیونکہ وہ جانتی تھی [illegible] کہاں ہیں... اب تم کیسے تصدیق کرو گے کہ وہ جھوٹ [illegible] تمہارا یقین حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے [illegible] لے جاؤ گے جو تم اس پر اعتبار نہیں کر سکتے... تم کو اعتبار [illegible] چاہیے... وہ تمہاری ہم مذہب نہیں... اس کا تعلق دشمن [illegible] سے ہے اور وہ آج بھی دشمنوں کے ساتھ تھی... وہ ہو [illegible] سکتی... اور موہنی ہو تب بھی کیا... وہ بچپن کا دور تھا [illegible] اور اس وقت کے جذبات کا آج کے حالات سے کیا تعلق... دھوکا کھاؤ گے اور نقصان اٹھاؤ گے... اپنے ساتھ اپنی تباہی کا سبب بنو گے۔

پھر میں کیا کروں... اسے مار دوں؟... یہ ناممکن ہے... اسے سرکاری حکام کے حوالے کر دوں؟ یہ اور بھی زیادہ ناممکن... اس سے تو بہتر ہوگا کہ میں اسے مار ڈالوں... کیا میں اسے چھوڑ کر بھاگ جاؤں؟ لیکن یہ تو بہت بے حد بزدلی کی بات ہوگی... اس پر نظر رکھنی زیادہ ضروری ہے... یہ معلوم کرنا بھی ضروری [illegible] وہ موہنی سے زرملا کیسے بنی اور کیوں بنی... وہ کیوں مجھ سے [illegible] تھی اور اب کیوں میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے؟

گاؤں تک پہنچتے پہنچتے میرا دماغ خراب ہونے لگا۔ میں [illegible] سمت جنگل میں پہنچ گیا تھا اور قوتِ فیصلہ سے بالکل محروم تھا... گاؤں کے پہلے گھر پر دستک دیتے ہوئے میں نے دیکھا سورج کی آخری لکیر کے پیچھے گم ہو گیا تھا... [illegible] جانے والی ایک عورت نے دروازے تک آ کے کہا۔ "کون ہے تو...؟"

میرا حلیہ بے حد مشکوک تھا مگر اس دیہاتی عورت نے مجھے عادت اور روایت کے مطابق ویر کہہ کے مخاطب کیا تھا۔

"مجھے کچھ کھانے کو چاہیے۔" میں نے کہا۔

"روٹی کھانی ہے؟" وہ بولی۔ "کہاں سے آیا ہے تو...؟"

"میں راستہ بھول گیا ہوں..." میں نے کہا۔

عورت نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا اور اندر چلی گئی۔ پھر ایک مرد آ گیا جو اس عورت کا شوہر ہو سکتا تھا... "کیا بات ہے بھائی؟" وہ بولا۔

"بات یہ ہے بھائی کہ ہم شکار پر آئے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہم کون...؟" وہ بولا۔ "تو تو اکیلا ہے۔"

"میں تو نوکر ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرا صاحب اور بیگم اپنی گاڑی میں نکلے تھے... رات کے وقت جنگل میں گاڑی خراب ہو گئی... انہوں نے مجھے بھیجا کہ جا کے کہیں سے مستری کو لاؤ۔ مستری یہاں کہاں... میں نے کہا کہ کچھ کھانے پینے کو لے آتا ہوں... صبح شہر جا کے مستری کو لاؤں گا۔"

وہ مجھے غور سے دیکھتا رہا جیسے میری بات پر یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہو... بالآخر اس نے مجھے بھروسے کے قابل پایا۔ "کتنی دور ہے گاڑی؟"

"اُدھر... میل بھر پرے گاڑی کھڑی ہے۔" میں نے ہاتھ سے بالکل غلط سمت میں اشارہ کیا۔ "میں پیسے دوں گا... مجھے کھانے پینے کو کچھ دے دو۔"

مرد کی آنکھوں میں لالچ اتر آیا۔ "کتنے پیسے دے گا؟"

"سو روپے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں برتن بھی لے جاؤں گا۔ پانی کا ڈول اور کھانے کی چنگیر..."

"او لے جانا یار..." وہ اندر دیکھ کے بولا۔ "لیکن پہلے سو روپے نکال... اور ہاں... کسی کو بتانا نہیں ہے کہ تو نے سو روپے دیے ہیں مجھے ورنہ چوہدری کا [illegible] دروازے پہ..."

"میں نہیں بتاؤں گا..." میں نے اسے سو کا نوٹ پیش کیا جو اس نے فوراً اپنے تہبند میں اڑس لیا۔ "تمہاری ماں کو بھی نہیں بتاؤں گا۔"

"میری گھر والی تھی وہ۔" وہ خفا ہو کے بولا۔ "اچھا اندر... تیرا صاحب تو بڑا امیر ہوگا... مرغی کھاتا ہوگا... مرغیاں ہیں ہمارے گھر... میری گھر والی کو دس روپے دے دینا... وہ پکا دے گی۔"

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "جو ہے ابھی دے دو۔"

"اس وقت کیا ہوگا... روٹی... گڑ... مکھن۔" وہ بولا۔ "شاید لسی بھی مل جائے مگر تیرا صاحب اور بیگم صاحب کیسے کھائیں گے؟"

"کھا لیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم اتنا ہی کرو تو کافی ہے۔"

وہ بہت خوش ہوا کیونکہ سو روپے اس کو مفت کے مل گئے تھے۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ سب باندھ دے... جو کچھ بھی گھر میں ہے۔

"سب باندھ دوں؟ ایک آدمی کے لیے؟" اس نے کہا۔

"یہ ایک آدمی نہیں ہے۔" شوہر نے جھنجلا کے کہا۔

"ایک نہیں ہے تو کیا دو ہیں؟"

"ایک ایک کر کے گنتا... جو میں کہہ رہا ہوں وہ کر۔" وہ دہاڑ کے بولا۔

"پھر تو کیا کھائے گا... میرا سر... ؟ بچے کیا کھائیں گے؟"

اس سے پہلے کہ وہ اپنی نافرمان بیوی کی بک بک کو [illegible] سے بند کرتا میں نے دخل اندازی کی۔ "بیوی جی... تم بعد میں اپنے لیے بندوبست کر لینا۔" میں نے ایک سو کا نوٹ اس کے سامنے ڈال دیا۔ میاں کی تو باچھیں کھل گئیں۔ لیکن عورت دل گرفتہ اور شرمندہ نظر آنے لگی۔ اس نے سو کے نوٹ کو چھوا بھی نہیں... اس نے [illegible] باندھ دیا جو موٹی موٹی چار روٹیوں، پاؤ بھر مکھن کی ڈلی... اور شاید ایک پاؤ گڑ پر مشتمل تھا۔ اس نے روٹیاں چنگیر میں رکھیں۔ اس پر مٹی کا پیالہ اور گڑ رکھ کے ایک کپڑے کی گٹھڑی سی بنا دی... وہ مجھے لسی بھی دینا چاہتی تھی، مگر میں نے صرف سادہ پانی کو ترجیح دی۔ دو سو روپے وصول کرنے کے بعد صاحب خانہ مجھے ڈول دے دیتا تب بھی نقصان میں نہ رہتا مگر وہ طبیعت کمینہ تھا۔ اس نے ایک پرانے ٹین کا انتخاب کیا جس میں آٹا بھرا ہوا تھا۔ آٹے کو ایک کپڑے پر انڈیل کے اس نے وہ ڈبہ [illegible] اور ایک رسی [illegible] باندھ کے اسے باقاعدہ ڈول کی شکل دی اور پانی سے بھر کے میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ رسمی طور پر اس نے کہا کہ میں چھوڑ آؤں۔ مگر میرے پہلے انکار پر ہی بیٹھ گیا۔ وہ ایک کاہل اور نکما آدمی تھا۔ شاید اسی لیے پیسے کا محتاج تھا۔ جب میں باہر نکل چکا تھا تو میں نے پھر میاں بیوی کے لڑنے کی آواز سنی۔ وہ بیوی سے سو کا دوسرا نوٹ بھی چھیننا چاہتا تھا اور بیوی نے "حرام" کے لقب سے نوازنے کے بعد صاف اعلان کر دیا تھا کہ اسے ایک پیسہ نہیں دے گی۔

واپسی پر میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے سات بج رہے تھے۔ مجھے پون گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ واپسی کے سفر میں سب سے زیادہ خطرہ راستے سے بھٹک جانے کا تھا۔ میں نے آتے وقت چند نشانیاں ذہن میں رکھی تھیں۔ اب انہی نشانیوں کو تلاش

www.paksociety.com

کتا ہوا میں اپنے اندازے کے مطابق صحیح سمت میں بڑھ رہا تھا لیکن آدھے گھنٹے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ میں راستہ بھول گیا ہوں۔ وہاں سب درخت ایک سے تھے اور اندھیرے میں جنگل کا ایک حصہ دوسرے حصے سے ذرا مختلف نہ لگتا تھا۔

بھٹک کر زیادہ دور جانے کے بجائے میں نے وہیں اپنی سمت درست کر لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کپڑا اور پانی کا ڈول نیچے رکھا اور ایک درخت پر چڑھ گیا۔ میں اس چٹان کو تلاش کرنا چاہتا تھا جس پر سے میں نے گاؤں کے کسی گھر سے اٹھنے والا دھواں دیکھا تھا۔ گاؤں اب مجھے اپنے پیچھے دکھائی دیا۔ اس کے چند گھروں میں سے ٹمٹمانے والے چراغ تاریکی میں جگنو سے لگتے تھے۔ دائیں جانب وہ سوکھا ہوا برساتی دریا تھا۔ ان دو فوری مقامات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے پھر اپنی سمت کا تعین کیا تو مجھے وہ چٹان بھی نظر آ گئی۔ اندھیرے میں اس کا سیاہ ہیولا بہت دھندلا نظر آتا تھا مگر میں نے اس کی مخروطی بناوٹ کو پہچان لیا۔

میں اترنے ہی والا تھا کہ میری نظر بہت دور کی ایک تیز روشنی سے چندھیا گئی۔ دور کسی بڑی گاڑی نے موڑ کاٹا تھا اور یہ اس کی ہیڈ لائٹس تھیں جن میں خفیف سے لرز گیا۔ غالباً یہ وہی سڑک تھی جس پر میں نے واپسی کا سفر کیا تھا۔ سمت سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ بڑی سڑک سے نکلنے والی وہی چھوٹی سڑک ہے جس پر گزشتہ رات میں نے موتی کے ساتھ ایک ٹھکانے میں سفر کیا تھا۔ کوئی گاڑی اسی سڑک پر کیمپ کی سمت جا رہی تھی... میں درخت پر سے اس کی متحرک روشنی کو آگے بڑھتے ہوئے صاف دیکھ سکتا تھا۔ بائیں جانب افق سرخ … تھا غالباً کیمپ میں بھڑکنے والی آگ ابھی تک بجھی نہیں تھی۔

جب گاڑی کی … میری نظر سے اوجھل ہوئی تو میں نیچے اترا۔ اس تباہ شدہ کیمپ کی طرف جانے والی یہ گاڑی دشمنوں کی بھی ہو سکتی تھی اور پولیس کی بھی۔

دس منٹ بعد میں نے اچانک خود کو وہیں پایا جہاں میں موتی کو چھوڑ گیا تھا۔ اس مرتبہ میں نے اپنی سمت تعین کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ لیکن موتی وہاں نہیں تھی جہاں میں اسے کیموس بچھا کے لٹا گیا تھا۔ کیموس کا وہ ٹکڑا اسی طرح بچھا ہوا تھا اور غور سے دیکھنے پر مجھے سیاہی میں سفیدی کا چھوٹا حصہ نظر آیا... یہ وہی پرچہ تھا جسے میں موتی کے کپڑوں پہ لگا گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ ہوش میں آتے ہی اس نے میرا پیغام پڑھ لیا تھا۔ اس کا … کہ وہاں موجودگی یہ بھی ثبوت تھی کہ موتی کچھ دیر پہلے ہی اٹھی ہو گی … زیادہ دیر تک پڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ معمولی سا ہوا کا جھونکا اسے اڑا لے جاتا۔

فوری طور پر مجھے دو خیال آئے۔ پہلا یہ کہ موتی کو انجکشن … استعمال کرنے والی زہر … ہوش میں آتے ہی فرار ہو گئی ہو گی … کہ اس عرصے میں کوئی اسے اٹھا لے گیا۔ ہم ابھی تک اس تربیت گاہ سے اتنے دور نہیں ہوئے تھے کہ خود کو محفوظ سمجھنے لگتے۔ شکست کے احساس سے دوچار ہو کر وہ چوٹ کھائے ہوئے ناگ سے زیادہ مشتعل ہو گئے ہوں گے۔ انھیں معلوم ہو گا کہ کوئی یہاں سے اسٹیشن ویگن نکال کے لے گیا ہے … وہ سب اردگرد کے علاقے کو چھان ڈالیں گے۔ یہ جنگل محفوظ پناہ گاہ ہے … یہ بات وہ بھی جانتے ہیں … جو بات میرے ذہن میں تھی وہ ان کے دماغ میں بھی آ سکتی ہے۔ وہ سوچ سکتے ہیں کہ فی الحال میں اسٹیشن ویگن سے کراچی یا پشاور جانے والی سڑک سے دور رہوں گا … اور اس وقت تک جب جستجو کرنے والے مایوس ہو جائیں۔

ہر صورت میں یہ میری کوتاہی سے زیادہ کم عقلی تھی … اگرچہ وہ لڑکی جو بلاشبہ بہت ہوشیار اور باخبر تھی مجھے … کی بنا پر موتی ہونے کا یقین دلانے میں کامیاب رہی اور میں موتی کی تصویر دیکھ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا … میری جذباتی حماقت تھی۔ اور اگر کوئی شکاری جو میری تلاش میں آیا تھا اسے اٹھا کر لے گیا تو یہ میری حماقت کا انجام تھا … سوچنا چاہیے تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے اور اگر ایسا ہوا تو وہ اپنا دفاع نہیں کر سکے گی۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا اور بہت آہستہ سے آواز دی۔ "موتی..." خاموشی نے میری پکار کا مذاق اڑایا … کون جانے موتی … تھی … میں ڈرتے ڈرتے چٹان کی طرف بڑھا جس کے پیچھے میں نے گاڑی کو چھپا کے کھڑا کیا تھا … یہ میری بھول تھی کہ … دشمن پر اعتبار کیا اور ایک عورت کی باتوں میں آ گیا۔ مجھے … کہ تربیت یافتہ بڑے بڑے عاقل … پٹ جاتے ہیں۔ وہ یقیناً گاڑی بھی لے گئی ہو گی۔ وہ … کے انتظار میں تھی … گاڑی کے ساتھ وہ سب کچھ لے گئی … سب ثبوت جو تخریب کاروں کی سرگرمیوں کو ثابت کرتے … لاکھوں روپے کی پاکستانی کرنسی جو تخریب کاروں کے لیے بنی تھی … اور وہ اسلحہ جو میرے کام آ سکتا تھا … میں اب خالی ہاتھ اس جنگل میں بھٹک رہا تھا … بائیں جانب سے … میں اس چٹان کے پیچھے پہنچا۔

گاڑی کو اپنی جگہ دیکھ کے میری جان میں جان آئی۔ … جاتے ہوئے گاڑی بھی لے جاتی تو میری ساری محنت … جاتی۔ اب بھی اس نے میری کامیابی کے غرور میں شرمندگی کا احساس تو کر ہی دیا تھا جس نے … تھا کہ موتی ایک ہی …

… دلدار نہیں لگا جا سکتا … یہ وہی عورت تو نہ تھی مگر بہرحال یہ بھی عورت تھی جس کا اعتبار کرنے کی سزا زیب النسا نے دی تھی … معصومیت کے انداز میں چھپی ہوئی عیاری نہ دیکھ سکا تھا اور وہ مجھے چکمہ دے کر نکل گئی تھی۔ یہ دوسری عورت تھی جس نے میرے دل میں پیار کے چراغ روشن کیے تھے۔ میں … بھول گیا تھا کہ وہ ایک تربیت یافتہ ایجنٹ ہے جس کو … کی جزئیات اور تفصیلات پر بھی دسترس … کر دیے گئے ہوں گے۔ وہ میرے بارے میں اتنا جانتی تھی جتنا … جانتے تھے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ اس نے مجھ سے میرا یقین بھی چھین لیا تھا۔

میں اسی حالت میں خاموش جنگل کی ویرانی سے گزرنے والی … کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ شام کو آشیانوں میں بسیرا کرنے سے پہلے شور مچانے والے پرندے اب خاموش تھے اور دور کہیں سے … گزر رہی تھی۔ میں ایک ہاتھ میں بوتل اور دوسرے میں … تھامے خود کو سفر کی اگلی منزل کے لیے تیار کر رہا تھا۔ وہ عورت اگر اتنی چالاک اور ہوشیار ہوتی تو اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ کسی بھی طرف سے سڑک تک پہنچ جائے اور میرے بارے میں تفصیلی رپورٹ دے کر شکاری کتوں کو خبردار کر دے۔ وہ میرا راستہ پہلے سے روکنے کے لیے استقبال کے لیے موجود ملیں۔

ان حالات میں میرا اسٹیشن ویگن سے جانا ایک اور … فضول تھی۔ اب میں چھپ کر ہی نکلنے کی امید کر سکتا تھا مگر گاڑی لے کر جانا ایسا ہی ہوتا جیسے راجا کا ہاتھی چڑیا کے گاؤں کے سامنے جانا۔ یہ سب میں کیسے لے جاؤں گا جو میں نے مال غنیمت سمجھ کے اٹھایا تھا؟ اس سوال کا میرے ذہن میں کوئی جواب نہ آیا تھا کہ میرے کانوں میں ایک عجیب سی آواز آئی۔ میں اچھل پڑا۔

… تاریکی میں ایک سایہ نے گاڑی کی اوٹ سے نکل کر … خفت سے میرا برا حال ہو گیا کیونکہ یہ موتی تھی۔ میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا اندیشہ ہائے دور و دراز میں … تھا اور وہ شاید مجھے دیکھ رہی تھی … مجھے غصہ بھی آیا لیکن … پی گیا۔

"کیا بات ہے موتی؟" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

"کیا... وہ چلا گیا؟" وہ گاڑی کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گئی۔

"کون چلا گیا؟" میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

"معلوم نہیں کون تھا۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"تم نے دیکھا نہیں تھا؟"

"نہیں... میں نے صرف آہٹ سنی تھی۔"

"ہو گا کوئی جانور۔" میں نے کہا۔ "آخر جنگل ہے... مگر اس جنگل میں شیر چیتے تو کیا بھیڑیے تک نہیں ہیں..."

"وہ جانور نہیں تھا..."

"تو پھر کیا تھا... بھوت...؟"

"مذاق مت کرو... میں کیا انسانی قدموں کی آواز اور جانور کے چلنے کی آواز میں فرق محسوس نہیں کر سکتی۔" وہ بولی۔

"آدمی تھا تو کیا سامنے نہیں آیا؟" میں نے کہا۔

"نہیں... میں تو ادھر چھپ کر دیکھ بھی رہی تھی... وہ خاصا قریب آیا تھا... اس جگہ تک جہاں تم مجھے چھوڑ گئے تھے پھر مڑ گیا۔"

"مڑ کر کدھر گیا؟"

"اسی طرف... جدھر سے تم آئے ہو۔" وہ بولی۔

"مگر مجھے تو راستے میں کوئی نہیں ملا..."

"نہیں ملا تو میں کیا کروں۔" وہ چڑ کے بولی۔ "مجھ میں تو اتنی ہمت تھی نہیں کہ اس کے سامنے جاتی اور کہتی کہ میر جان صاحب ادھر گئے ہیں تم ان سے ضرور مل لینا... آتے ہی ہوں گے۔"

میں ہنس پڑا۔ "چلو چھوڑو... پھر آ جائے گا اگر کوئی ملاقاتی ہو تمھارا یا میرا۔"

"مجھے وہاں ڈر لگ رہا تھا... تم کو مجھے اس طرح چھوڑ کے نہیں جانا چاہیے تھا۔" وہ شکایت کے انداز میں بولی۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ... یہ وہی عورت بول رہی ہے... جو میرے دشمنوں کے ساتھ ایک خطرناک مشن پر جاسوسی کرنے کے لیے آئی تھی... جو قاتلوں اور بدمعاشوں کے ساتھ بے خوف رہتی تھی... قتل و غارت گری کے منصوبوں کی عادی تھی اور خود ایک زبردست ایجنٹ تھی۔" میں نے کہا۔

"تم خود کیوں ڈر گئے تھے... مجھے بتاؤ..." وہ بولی۔

"وہ... میں کچھ اور سمجھا تھا...؟" میں نے سر جھکا کے کہا۔

"سمجھا تھا کہ میں بھاگ گئی... مجھے تو بتا کے... جھوٹ بولو گے؟"

"ہاں... جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں یہی سمجھا تھا۔"

"مگر تم گئے کہاں تھے... اور کیوں گئے تھے؟"

"تم تو بے ہوش ہو کے لیٹ گئی تھیں... جو کچھ کرنا تھا مجھے ہی کرنا تھا... میں پانی لے کر آیا ہوں۔" میں نے بوتل اٹھا کے کہا۔ "آؤ..."

"کہاں سے؟" وہ بولی اور میرے ساتھ چلنے لگی۔

"جوئندہ یابندہ..." میں نے کہا۔

"مجھے فارسی کیا اردو بھی نہیں آتی۔" وہ بولی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تلاش کرنے سے کیا نہیں ملتا... مجھے

www.paksociety.com

ایک گاؤں مل گیا۔ وہاں ایک لالچی آدمی مل گیا۔۔۔ اس سے سب کچھ مل گیا۔" میں نے کہا۔

"مجھے بھوک تو خیر بالکل نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "مگر تم لائے کیا ہو؟"

"خالص قدرتی خوراک جو میرے آباؤ اجداد کو میسر تھی۔" میں نے پوٹلی کھول کے کہا۔ "خالص مکھن۔۔۔ خالص گڑ۔۔۔ خالص گندم کی روٹی اور خالص پانی۔۔۔"

"تم کھا لو گے یہ سب؟" اس نے حیرانی سے کہا۔

"کھانا تو پڑے گا۔۔۔" میں نے کہا۔ "ورنہ بھوک میں تو نہ نیند آئے گی اور نہ عقل کام کرے گی۔۔۔ مگر کاش۔۔۔"

"کاش کیا؟" وہ پانی کا ڈول اٹھا کے بولی۔

"کاش اس وقت کوئی فرشتہ نمودار ہو کے پوچھے کہ اپنی ایک خواہش بیان کرو۔" میں نے کہا۔ "تو میں کہوں کہ ایک مگ کافی۔۔۔ ویری بلیک اینڈ ویری ہاٹ۔۔۔ اینڈ تھینک یو ویری مچ فرشتے۔"

وہ ہنس پڑی۔ اس نے ڈول سے دو گھونٹ پانی پی لیا تھا۔

"فرض کرو ایسا ہو جائے۔۔۔ میں فرشتہ تو نہیں۔"

"ہاں۔۔۔ فرشتے غالباً مذکر ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم واقعی کچھ نہیں کھاؤ گی؟ مجھے تو سخت بھوک لگی ہے۔"

"میں چائے بناتی ہوں۔" اس نے کہا۔

میں خاموشی رضا سے کھانے لگا تھا۔ ان الفاظ [illegible] سیکنڈ بعد واضح ہوا تو میرا ہاتھ رک گیا اور ایک نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا۔

"کیا کہا تم نے۔۔۔ کیا بنانے کی بات کی؟" میں نے لقمہ نیچے اتارنے کے لیے ڈول سے منہ لگا کے پانی پیا۔ "میرے کانوں نے غلط سنا۔"

"تم نے ٹھیک سنا۔۔۔ کافی تو نہیں مگر چائے مل سکتی ہے۔" وہ بولی۔

"کیسے مل سکتی ہے۔۔۔ جادو سے؟ یا تم وائرلیس پر پیغام دو گی کہیں؟"

"اسٹیشن ویگن میں ایک ہفتے کا ٹورائی راشن رہتا ہے۔۔۔ تم نے دیکھا نہیں؟" وہ بولی۔ "ابھی تو ہم چار آدمی پورا ہفتہ گزار سکتے تھے۔"

"وہ ٹورائی راشن۔۔۔ جو فوجیوں کو میدانِ جنگ کے لیے ملتا ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس کا مطلب ہے تم نے دیکھا ہے۔"

"دوسری جنگِ عظیم کے بعد کی کچھ چیزیں دیکھی تھیں۔" میں نے کہا۔ "جن میں چھوٹی چھوٹی ڈبیاں بھی ہوتی تھیں۔ ایک ڈبیا کھول لو۔ نیم گرم پانی میں ڈال دو۔ ایک کپ چائے تیار۔۔۔ کیا یہ بھی ویسی ہی چیز ہے۔۔۔ خیر جیسی بھی ہے۔۔۔ تم لے آؤ۔"

"تم بہت سے ساتھ تھے۔" وہ بولی۔

اسٹیشن ویگن کے پیچھے والے حصے میں سیٹ کے نیچے ایک باکس سا تھا۔۔۔ اگر میں اسے دیکھتا تو شاید ٹول بکس یا کسی ہنگامی مرمت میں کام آنے والے اوزار سمجھتا لیکن اس کے اندر سے موہنی نے کئی پیکٹ نکالے۔ گیس کا چولہا اندر چھت میں لگی ہوئی لالٹین سے روشن ہو گئی تھی۔ اس کی روشنی میں چند چیزیں میں نے پہچان لیں۔۔۔ ایسے تو بیچ بسکٹ تھے۔۔۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کس طرح بنائے جاتے ہیں لیکن ان میں کیلوریز بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ ایک چوبیس گھنٹے کے لیے غذا اور توانائی فراہم کرتا ہے۔ آدھا بسکٹ پونے گھنٹے کے برابر ہوتا ہے۔ یہ سخت بھی ہوتا ہے اور میں نے کسی فوجی سے لے کر چکھا تھا اور بہت مشکل سے چبایا تھا۔ اس سے مجھے پیٹ بھر جانے کا احساس ہوا تھا۔

باکس میں ویسے بسکٹ پیکٹ کی صورت میں رکھے تھے اور ایک ایک درجن والے جو پیکٹ تھے ان کو کافی [illegible] سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی سوپ کی بیگز تھے۔۔۔ جو چائے بنانے کے لیے۔۔۔ کنڈنس ملک کے ڈبے اور دودھ کے پاؤڈر تھے۔ چینی کی جگہ سیکرین کی گولیاں تھیں۔ ہر گولی دال کے دانے جتنی چھوٹی تھی۔۔۔ یہ سیکرین تھی جو ذیابیطس کے مریض بھی استعمال کرتے ہیں اور میری معلومات کے مطابق [illegible] سو گنا سے بھی زیادہ میٹھا کرنے کی صلاحیت حاصل ہے [illegible] کے باوجود تجارتی نام [illegible] چینی کی جگہ عام استعمال کی جاتی ہے۔ ایک گولی ایک چمچ چینی کے برابر تھی اور جو ڈبیا موہنی نے مجھے دکھائی اس میں شاید پانچ سو گولیاں ہوں گی۔ باقی حصے میں سگریٹ کے پیکٹ تھے۔

یہ لاٹری میں نکلنے والا انعام تھا۔ اس کی دریافت نے اتنی ہی خوشی دی جتنی امریکا کی دریافت نے کولمبس کو دی ہو گی۔ میرا موڈ تھوڑی دیر کے لیے بالکل بدل گیا۔۔۔ میں جنگ اور سیاست کے حالات اور ماضی و مستقبل کو بھول کے حال کے لطف میں گم ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جنگل میں پکنک کی رات ہے۔ یہاں صرف ایڈونچر اور مسرت کی تلاش میں آئے ہیں۔ ان کے درمیان بہت فاصلے تھے۔۔۔ وقت کے۔۔۔ عقیدوں کے۔۔۔ رشتوں کے اور جذبوں کے۔۔۔ مگر میں تھا اور وہ تھی۔ ایک عارضی خوشی کی پناہ کے لیے کھیل گئے۔

میں نے بڑے شوق اور انہماک سے جنگل کے [illegible] ٹہنیاں توڑیں۔۔۔ اس وقت مجھے وہ بات یاد نہیں آئی جو کہی تھی کہ درخت بھی جاندار رہتے ہیں اور رات کو [illegible] میں نے سوچا کہ میں ان کو شاخوں سے محروم کر رہا ہوں۔

ڈالنے اور جب اپنے مطلب اور ضرورت کے مطابق لکڑیاں جمع کر لیں تو موہنی نے اس کینوس کے تھیلے کا خیمہ کھولا گیا۔ [illegible] جیسے حصے میں دو شاخیں آپس میں آنکھ کے پھندے کی طرح [illegible] دو شاخیں تھیں ان کے اوپر [illegible] ایک لکڑی اور شاخ آ گئی جس سے دونوں آنکھ کے پھندوں کی ایک [illegible] درست کر لیا۔ جب میں نے اس پر کینوس ڈالا تو یہ ٹوک سے [illegible] بن گیا جو نیچے سے پانچ فٹ چوڑا تھا اور پیچھے آنکھ تک [illegible] ہوا تھا۔ اس کی بلندی تین فٹ تھی۔

اتنی دیر میں موہنی نے خشک لکڑیاں اکٹھی کر کے پانی والے ڈول کو درخت کی ایک شاخ کے ساتھ باندھ دیا۔ پتلی سی شاخ اس کے وزن سے جھکی تو ڈول زمین سے ایک فٹ اوپر معلق ہو گیا۔ موہنی نے اس کے نیچے لکڑیاں جلانے میں زیادہ مہارت کا مظاہرہ کیا اور آدھے گھنٹے میں آدھا ڈول ابلتی ہوئی چائے تیار ہو گئی۔۔۔ یہ شاید دس کپ چائے تھی۔ موہنی نے اس میں پندرہ ٹی بیگز ڈال دیے تھے۔ چائے چھاننے کے لیے وہ رومال صاف کیا گیا جس میں مکھن تھا۔ مکھن کو دو ڈبوں کے درمیان پیک کر دیا گیا اور تھوڑی سی ابلتی ہوئی چائے نے پیالے کی چکنائی صاف کر دی۔

جب موہنی نے مجھے چائے کا پیالہ پیش کیا تو میں جیسے کے گھیلے کی تہ میں صاف کر رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ چائے ہے اور کیا ہے۔" وہ بولی۔

"اسے چائے کہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "دودھ کے ڈبے کھول دیے کیا؟ چینی بھی سب ڈال دی ہو گی۔"

"پی کے تو دیکھو۔" موہنی نے خفگی سے کہا۔

"یہ تم پیو۔۔۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو صرف چائے چاہیے۔ اس رات سے زیادہ کالی۔۔۔ پیچ سے زیادہ تلخ۔۔۔ [illegible] کی طرح [illegible]"

"صرف تم وہ پیو گے؟" وہ افسوس سے سر ہلانے لگی۔ "ایسی مزیدار چائے ہے۔"

"مزیدار ہو گی۔۔۔ مگر چائے نہیں ہے۔" میں نے اسے سمجھایا۔

جب بالآخر میری باری آئی تو میں نے نہایت ترکیب سے [illegible] کے بعد تھوڑے تھوڑے وہ پیالے حلق میں اتار لیے۔۔۔ میری زبان اور ہونٹ جلے مگر لذت اور سرور کی کیفیت نے مجھے احساس نہ ہونے دیا۔۔۔ عام زنانہ سوچ کے مطابق موہنی کو بھی سخت صدمہ تھا کہ میں کافی زہر پی کے اپنی جان جلا رہا ہوں۔۔۔ میں نے اس کے خیالات [illegible] بالکل کوشش نہیں کی۔ کرنل کی جیب سے ملنے والے سگریٹوں کے پیکٹ میں سے پانچ ابھی باقی تھے۔ اس کے بعد مجھے وہ سگریٹ پینے تھے جو اسٹیشن ویگن کے اسٹاک میں تھے۔

ایک گھٹیا برانڈ جو بھارت میں مقبول تھا۔

"تم نے یہ خیمہ لگانے میں بڑی محنت کی۔" موہنی نے اس وقت کہا جب میں دوسرا سگریٹ پہلے سگریٹ سے جلا رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ مجھے فضول محنت کی عادت ہے۔" میں نے کہا۔ "کچھ کیے بغیر رہا نہیں جاتا۔" میں فرشِ خاک پر بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا۔

وہ مجھ سے دو فٹ دور بیٹھی ہوئی تھی۔ "سونے کے لیے گاڑی تھی۔"

"نیند کے بارے میں مشہور ہے کہ سولی پر بھی آ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو یہاں بھی نہیں آ رہی ہے۔۔۔ تم چاہو تو گاڑی میں جا کے سو جاؤ۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔۔۔؟"

"کیا پوچھوں؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ۔۔۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟" وہ بولی۔ "میں نے اپنوں کا ساتھ کیوں چھوڑا۔۔۔ تم نے موہن کے بارے میں بھی نہیں پوچھا۔"

"موہن؟ تمہارا بھائی؟" میں نے کہا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"وہ۔۔۔ اپنی ماں جی کے پاس۔" وہ تلخی سے بولی۔

"کیا مطلب؟" میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔

"مدن موہن میرا بھائی ہی تھا۔" وہ بولی۔ "تمہیں تو اس کا پورا نام کہاں یاد ہو گا۔"

"وہ۔۔۔ مدن موہن۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میرا دماغ سن ہو گیا۔

"میں تمہیں الزام نہیں دیتی۔" وہ بولی۔ "تم نے وہی کیا جو تمہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے بھی موقع ملتا تو وہ تمہیں نہ چھوڑتا۔۔۔ وہ تمہارا اتنا ہی دشمن تھا جتنا کرنل۔۔۔ یا شرما۔۔۔ شاید ان سے بھی زیادہ۔"

"تمہیں۔۔۔ اس کی موت کا کوئی افسوس نہیں؟" میں دم بخود بیٹھا رہا۔

"نہیں۔۔۔ میرے لیے تو وہ بہت پہلے مر گیا تھا۔" وہ اچانک خاموشی سے رونے لگی۔ "کتنی بدنصیب ہوتی ہے وہ بہن جس کا ایک ہی بھائی ہو اور وہ اس کی محبت، شفقت اور جذباتی قربت سے محروم ہو۔۔۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے؟" میں نے افسوس سے کہا۔ "وہ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔"

"ہاں۔۔۔ مگر وقت بدلا تو اس کی فطرت بھی بدل گئی۔" موہنی نے کہا۔ "کیا تمہیں یاد ہے کہ میرے پتا پنڈت دینا ناتھ کیسے آدمی تھے؟"

"وہ انسان تھے۔۔۔ مکمل انسان۔۔۔" میں نے کہا۔ "نہ ہندو نہ مسلمان۔۔۔"

"یہی انسانیت پرستی ان کے لیے تباہی کا سبب بنی۔" موہنی

www.paksociety.com

نے کہا۔ "انھوں نے فسادات میں تمھارے گھر والوں کا ساتھ دیا... وہ کسی اور کو تو نہ بچا سکے مگر تمھیں انھوں نے سال بھر اپنے گھر میں رکھ کے سب کو اپنے خلاف کر لیا تھا۔ وہاں انتہا پسند اور متعصب ہندو اکثریت میں تھے اور ان کی شدید غنڈہ گردی سے انھیں دن رات دھمکیاں ملتی تھیں کہ اس مسلمان کے بچے کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"اچھا... انھوں نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا۔" میں نے ایک احمقانہ بات کی۔

"تم کو کیسے بتاتے... تم تا نک ہار بھی تو نہیں تھے۔" وہ بولی۔ "لیکن ایک بار انھوں نے تم کو میرے ماما کے گھر بھیج دیا تھا بُرقع میں۔"

"تمھارا ماما مجھے یاد ہے... وہ ایک خوفناک، خونخوار اور ہیبت ناک شخص تھا۔" میں نے کہا۔ "غالباً میں اسی کی وجہ سے وہ مجھے رکھنے پر مجبور ہو گیا تھا ورنہ تو وہ مجھے شہید کر دیتا۔"

"ابھی تمھیں تم کو واپس بلا لیا گیا تھا۔" موہنی بولی۔ "پھر جب چاچا وزیر خان تم کو لے گئے تو ہماری تو شامت آ گئی... تمھارے زندہ نکل جانے پر وہ سخت چراغ پا ہو گئے جو تمھیں ختم کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے ہمارے خلاف [illegible]... یہ تک کہا کہ ہم اپنے مذہب سے پھر گئے ہیں اور چوری چھپے مسلمان ہو چکے ہیں۔ موہن کو لڑکوں نے کئی بار مل کے مارا اور کہا کہ تم دو غلے ہو... غدار ہو اور چھپے ہوئے ہو... کیونکہ تم نے ایک ناپاک مسلمان کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھایا ہے... اور ایک ہی گلاس سے پانی پیا ہے... انھوں نے موہن کے ساتھ بات کرنا چھوڑ دیا... ایک مرتبہ اس کی مار پیٹ اسکول میں ہوئی... کسی بڑے لڑکے نے اعلان کر دیا تھا کہ موہن نے اپنی بہن اس ملّے کو دے دی ہے۔ موہن کا مشتعل ہونا جائز تھا مگر شکایت الٹی ہوئی اور ماسٹر نے پتا جی کو بلا کے برا بھلا کہا۔ پتا جی نے ماسٹر سے کہا کہ آپ طالب علموں میں مذہبی تعصب کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں... بات آگے گئی اور موہن کو اسکول سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد موہن نے اپنا بدلہ لیا۔ وہ رات کو گھر سے سبزی کاٹنے کی چھری لے کر گیا اور اس لڑکے کو زخمی کر آیا جس نے اسے بہن کی گالی دی تھی۔ وہ لڑکا اسپتال میں پڑا رہا اور موہن حوالات میں... متعصب اخباروں نے اس خبر کو خوب اچھالا اور نمک مرچ لگا کے شائع کیا۔ ایک اخبار نے تو یہ لکھ دیا کہ پنڈت دیانا تھ کی بڑی بیٹی کے کبیر خان سے ناجائز مراسم تھے... تم سوچو ذرا... میں تو موہن سے بھی چھوٹی تھی۔ کسی نے تصدیق تک نہیں کی کہ میری تمھاری عمر کیا تھی... پتا جی کس کس کے خلاف آواز اٹھاتے یا مقدمے بازی کرتے۔"

"اس کا مطلب ہے انھوں نے تردید بھی نہیں کی۔" میں نے غصے کی آگ میں جلتے ہوئے کہا۔

"نہیں... وہ خود اخبار کے دفتر گئے۔" موہنی بولی۔ "اور انھوں نے یہ خبر چھاپنے والے کو مارا... اخبار کا سارا عملہ موجود تھا... سامنے پتا جی نے ایڈیٹر کا سر پھاڑ دیا... پھر [illegible] نہیں کوئی اپنا شناس کہہ سکتا تھا... موہن تو بچ گیا مگر [illegible] کو دو سال کی قید ہوئی۔ اس میں ہمارا سب کچھ [illegible] بک گیا... غنڈے ایک بار مجھے اٹھا کے لے گئے [illegible] ماتا جی کو..."

"اٹھا کے لے گئے؟" میں جیسے چیخ پڑا۔ "کیوں؟"

"غنڈے عورتوں کو کیوں اٹھا کے لے جاتے ہیں؟" [illegible] نے تلخی سے کہا۔ "میں اس وقت چودہ سال کی تھی... اور [illegible] تئیس سال کی۔"

"او مائی گاڈ... یہ سب میری وجہ سے ہوا۔" میں نے سر تھام لیا۔

"یہ سب پنڈت دیانا تھ کی شرافت اور انسانیت کی فطرت کے باعث ہوا تھا۔" موہنی نے کہا۔ "تمھیں [illegible] کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد کا وقت [illegible] کسی اسکول میں داخلہ نہ ملا۔ وہ اپنے گھر سے [illegible] باپ نے [illegible] نے اخلاقی اقدار سے سب سے متنفر اور [illegible] ساری خرابی کی جڑ تمھارے پتا جی ہیں... وہ تمھیں پناہ [illegible] یہ مصائب کہاں ٹوٹتے... معلوم نہیں اس کے خیالات [illegible] تبدیلی کیوں آئی۔"

"یہ ایک شکست خوردہ ذہنیت کی علامت تھی [illegible]"

"کچھ بھی سمجھ لو... وہ تمھارے وجود کو ساری مصیبت کی [illegible] سمجھنے لگا۔ اور تمھارا غائبانہ دشمن ہو گیا۔" موہنی نے کہا۔ "[illegible] اٹھنا بیٹھنا بھی غلط قسم کے لوگوں میں ہو گیا... جب [illegible] استعمال ہوا تو موہن نے رشتے کے بجائے خوشی کا اظہار کیا اور [illegible] مارا کہ میں جس باپ کی وجہ سے [illegible] خود بھی ہوں۔"

"اس میں... ان بدمعاشوں سے بدلہ لینے کی ہمت [illegible] تھی؟" میں نے بے بسی سے کہا۔ "جو اس کی ماں اور بہن کو اٹھا لے گئے تھے؟"

"ان کے بارے میں... تو دیکھو مجھے نہیں معلوم تھا [illegible] تھے... اور آج تو میں بات بھی کر سکتی ہوں۔ [illegible] میں اپنی ماں سے آنکھ نہیں ملا سکتی تھی۔ اور ماں تو [illegible] وہ ایسی باتیں کرتی تھی کہ سن کے مجھے پسینہ آ جاتا تھا [illegible] حرمت کی جس چادر کو اپنی نسوانیت کی ناموس جانا [illegible] تار ہو گئی تو اس کا احساس ہی مر گیا... باپ کی موت کے بعد [illegible] نے گھر آنا بھی چھوڑ دیا... یہیں کوئی پوچھنے والا [illegible]"

"کیوں... تمھارا دھماکا... جو تمھاری ماتا جی کا [illegible]"

"وہ ایک بار آیا تھا... ماتا جی نے پاگل پن میں اس سے کہا [illegible] وہ بیان نہیں کر سکتی... وہ بات چھوڑ کے بھاگ گیا کہ [illegible] اپنے گھر میں کیسے رکھوں... وہ ایک حادثہ تھا [illegible] کو خاصہ کا دورہ پڑ گیا... وہ فاحشہ نہیں تھی مگر [illegible] مرتے دم تک وہ اپنے شوہر کی وفادار تھی۔ [illegible] لفظ بھی نہ سنا ہو گا... مگر اس حادثے کے بعد وہ [illegible] باتیں دہرانے لگی تھی... جو اسے اٹھا کر لے گئے تھے [illegible] گندی باتیں تھیں لیکن اس کی اپنی باتیں نہیں تھیں... ان [illegible] نے اس کے ذہن کو جلا دیا تھا اور اس کے حافظے میں اپنی غلاظت انڈیل دی تھی... وہ بھی انھی سے اگلتی تھی۔ باپ کی موت کے بعد وہ مشکل سے چھ ماہ زندہ رہی... اس تمام عرصے میں موہن ہم سے بالکل لاتعلق ہو گیا... اور تم جانتے ہو ہم نے وہ دن کیسے گزارے [illegible] میں بزدل اور بے شرم تھی ورنہ مر جاتی... خودکشی کر [illegible] کھانے سے بہتر تھی... لیکن مجھے [illegible] کر لیتا جو [illegible] زندہ تھے اور میں مر جاتی تو ان کا کیا بگڑتا [illegible] جیسے بھیڑیے جب بھیڑ کی تلاش میں [illegible] کے ہمدرد بن کے آئے اور انھوں نے مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے ان ہاتھوں کو پہچان لیا۔ میں نے ان کی مدد قبول کر لی احسان سے بدلہ بھی لیتی رہی [illegible] بے حیائی کو نظر انداز کر دیا... یہ ساری زندگی جو میں نے اب [illegible] کے مقصد سے آ گئی تھی... میں پہلے تین [illegible] سب سے بڑے بدمعاش کی محبوبہ رہی... اس کے ہاتھوں میں [illegible] دوسرے بدمعاش کو مروا دیا... اور تیسرے کے خلاف گواہی دے کر اسے بھی پھانسی چڑھوا دیا۔ تیسرا بدمعاش میری خاطر گواہ بنا تھا... اس کا خیال تھا کہ وہ ایک تیر سے دو شکار کر سکتا ہے... مجھے بھی حاصل کر سکتا ہے اور سب سے بڑے بدمعاش کا جانشین بھی بن سکتا ہے... اس کی یہ آرزو تو پوری ہوئی مگر اس کے ساتھ ہی زندگی بھی پوری ہو گئی۔ اس کی لاش ساتویں دن ایک گٹر سے نکلی... اب میں تفصیل سے کیا بتاؤں... میں نے ایک طوائف سے بدتر زندگی گزاری... طوائف تو صرف پیسے کے لیے ہی خود کو بیچتی ہے... میں نے پیسہ بھی لیا اور پیسہ دینے والوں کی جان بھی لی... بالآخر ایک وقت ایسا آ گیا کہ میرے لیے یہ کھیل جاری رکھنا ناممکن ہو گیا اور میری اپنی زندگی خطرے میں پڑ گئی... کسی نے مجھے بروقت خبردار کر دیا کیونکہ اس کا تعلق انہی بدمعاشوں سے تھا۔ میں فرار ہو کے دہلی چلی گئی اور وہاں سال بھر ٹھوکریں کھاتے [illegible] ایک سفارش کی بنیاد پر نرس بن گئی۔ اس طرح میری زندگی کا دوسرا [illegible] دور شروع ہوا۔ تم نے ایک لیب اسسٹنٹ [illegible] کہانی سنی ہے جس سے میرے دو بچے ہوئے۔ ایک پیدائش کے وقت مر گیا... دوسرا پیدائش کے بعد صرف ایک ماہ زندہ رہا۔ میری زندگی کا یہ باب بھی تین سال پہلے ختم ہوا۔"

"کیا تمھارا شوہر مر گیا؟" میں نے [illegible] کے ساتھ کہا۔

"نہیں... اس نے اپنی بیوی کو مار دیا۔" وہ بولی۔ "اس نے ایک دن مجھ سے کہا کہ تم چاہو تو میری ترقی ہو سکتی ہے... میں نے کہا کہ پاگل ہوئے ہو... کیا میں تمھاری افسر ہوں... اس پر وہ بے شرمی سے بولا کہ افسر کیا چیز ہے... میرا افسر تو تمھارے حکم کا غلام ہے... اور میں پھر بھی نہیں سمجھی تو اس نے بتایا کہ اس کا وہ افسر ہونے ترقی دے کر لیب اسسٹنٹ سے لیب انچارج بنا سکتا ہے، مجھ پر فریفتہ ہے... چنانچہ میں اس کے پاس جاؤں اور میری ترقی کا حکم نامہ لے کر آؤں۔ میں بیوہ ہو گئی... لیکن جب شوہر کی ترقی ہو گئی تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میں نے اسے صاف بتا دیا کہ اب میں تمھاری نہیں سب کی بیوی ہوں... جو مجھے قیمت دے سکے... اور میں نے اپنی زندگی کو اسی ڈھب سے گزارا۔ آج میں تمھارے سامنے ہوں۔ یہ مختلف شہروں اور ہاتھوں سے ہوتی ہوئی یہاں تک آئی تھی۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا... اس موہنی کے لیے جو میرے بچپن کی سب سے خوب صورت یاد تھی۔ سب سے زیادہ معصوم اور پاکیزہ جذبوں کی امین اور محبت کے اولین بے غرض احساس کی آئینہ دار تھی۔ وہ موہنی زمانے کے ہاتھوں برے طریقے سے مر گئی تھی۔ اس کی جگہ جو میرے سامنے دوسری موہنی بیٹھی تھی جو مجھے زمانے کے ہاتھوں اپنی سفاکانہ موت کی کہانی سنا رہی تھی۔ اور میں محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے وزیر خان کا مدفن پھر کھود ڈالا ہے۔ اس کی لاش کی ہڈیاں نکال کے میرے لیے ایک خالی گڑھا چھوڑ دیا ہے... میں احترام اور عقیدت کے پھول چڑھاؤں تو کہاں... دعا مانگوں تو کس طرح مزار کے سرہانے کھڑا ہو کے... موہنی ایک خوب صورت یاد کا مزار تھی۔ اس پر میں نے زندگی کے سب سے زیادہ معصوم جذبوں کے پھول نچھاور کیے تھے۔ لیکن ظالم کی ایک ٹھوکر نے سب کچھ تہس نہس کر دیا تھا۔ اس نے پھولوں کو راکھ کر دیا تھا اور یادوں کو ڈوبتے لمحوں میں ڈھال دیا تھا۔

"آخر تم کیوں زندہ رہیں موہنی؟" میں نے کہا۔

"کبھی تم نے اپنے آپ سے بھی یہ سوال کیا ہے؟" وہ بولی۔ "کیا تمھاری زندگی کبھی ایسے موڑ پر نہیں آئی جب تم موت سے ایک آبرومندانہ سمجھوتا کر سکتے تھے... مگر تم کر نہ سکے۔"

میں نے شرمندگی سے کہا۔ "تو میں بھی بزدل تھا۔"

"نہیں... ہم سب احمق لوگ ہیں... مرنا جینا کچھ نہیں جانتے۔" وہ بولی۔

"تم نے کہا تھا کہ... تم مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔" میں نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

"ہاں... میں تمھارا نام نہیں بھولی تھی۔"

www.paksociety.com

"صرف نام... نام بھی کیوں یاد رہا تمھیں؟" میں نے کہا۔

"یہ تو تم بھی جانتے ہو... جب میں ان باتوں کا مطلب نہیں سمجھتی تھی تب بھی تم مجھے اچھے لگتے تھے۔ اس جذبے کو تم کیا نام دو گے جو خود تمھارے دل میں میرے لیے تھا؟" وہ بولی۔

"وہ محبت تو نہیں تھی۔"

"ہاں... وہ کیا تھا... وہ احساس..." میں نے کہا۔ "اور اس احساس پر تو وقت کی آندھی گرد چڑھا چکی تھی۔"

"اب سے تین مہینے قبل میں نے تمھارا نام سنا۔" وہ بولی۔ "اسی یونٹ میں لوگ تربیت کے لیے بھیجے جاتے تھے... جہاں میری پوسٹنگ تھی... میں نے تمھارا ذکر سنا... اخباروں کے تراشے دیکھے... تمھاری تصویریں دیکھیں... اور نہ جانے کیوں وہ گرد ہٹنے لگی... میرے جذبات کا رنگ نمایاں ہونے لگا۔ میں نے اور جستجو کی... اور مجھے معلوم ہو گیا کہ تم وہی ہو... میں یہ بات کسی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ تم کون ہو... میں نے تمھارے نام پر اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا... لیکن اپنی مرضی سے نہیں... تمھارا نام سن کر دیا تھا مجھے توڑا تھا... اس کے باوجود میرے دل میں تمھارے خلاف نفرت نہیں تھی... میں تم سے انتقام لینا نہیں چاہتی تھی... جیسے کرومن چاہتا تھا۔"

"کیا اُسے بھی پتا چل گیا تھا کہ میں وہی کیپٹن ہوں؟"

"ہاں... اور اسی لیے وہ سامنے آ گیا... اس نے کچھ پیسے کے لالچ میں اور کچھ تمھاری دشمنی میں اپنی خدمات پیش کر دیں۔ جب اس نے اپنے بارے میں بتایا تو اُسے فوراً اس مشن میں شامل کر لیا گیا۔ وہ کیپٹن جان کو پہچانتا تھا اور اس کا ذاتی دشمن بھی تھا۔ یہ بات مجھے معلوم ہوئی تو میری راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ موہنی کے اور میرے درمیان جذباتی وابستگی ہمیشہ رہی تھی... میں اُس سے نفرت کرتی تھی جب اس نے تمھاری جان لینے کے مشن میں شرکت اختیار کی تو یہی مجھے مدد ملی... میں نے تمھاری جان بچانے کا مشن اپنا لیا۔"

"صرف اسی اختلاف کے باعث؟"

"نہیں... ایک وجہ اور بھی تھی۔" وہ بولی۔ "میں ایک بار تم سے مل کے تمھیں بتا دینا چاہتی تھی کہ تمھاری موہنی کے ساتھ ڈولیا نے کیا ظلم کیا تھا۔ اور موہنی نے وہ سب ظلم سہہ کے بھی تم سے نفرت نہیں کی... موہنی اپنے دل کے ساتھ بے بس تھی... میں کوئی شریف عورت نہیں ہوں... اسی لیے مجھے موہنی سے ترحم بنتا تھا... موہنی تمھارے لائق تھی نہ ہی تمھارے جسم کی غلاظت سمیٹنے کے قابل بھی نہیں... مگر میں پھر تمھارے پاس آ گئی ہوں۔"

"ایسا مت کہو موہنی۔" میرا دل آنچ پر رکھے ہوئے کانچ کی طرح ٹوٹنے لگا۔ "میرے لیے تم وہی ہو... سوچنا مجھے یہ ہے کہ اب تم کو کس طرح ساتھ رکھوں۔"

"تم اب جب سے ملتے ہو تو" وہ بولی۔ "تم محبت کرو... مگر میں کبھی نہیں مانگوں گی... میں مانگ بھی نہیں سکتی اور تم [illegible] نہیں سکتے لیکن تمھارا ساتھ دینے والے تو بہت سے ہوں گے... ان میں مجھے بھی شامل کر لو... میں کبھی تمھاری راہ میں حائل نہیں ہوں گی... کبھی تمھارے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کروں گی... جس طرح چاہو مجھے رکھنا... میری جان... میرا جسم... میری جان... سب تمھارے قبضے میں رہے گا..."

"یہ... یہ کیا کہہ رہی ہو تم..." میں نے گھبرا کے کہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی میں نے ایک آہٹ سی سنی۔ کوئی محتاط قدم رکھتا آگے آ رہا تھا... میں نے موہنی کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا... پچھلی طرف خیمے سے باہر آ گیا۔ قدموں کے وزن سے ٹوٹ جانے والے پتوں نے مجھے ہر طرف سے محصور ہونے کا احساس دلایا... ایک نہیں کم سے کم چار آدمی تھے جو چار مختلف سمتوں سے بڑھتے آ رہے تھے... میں ان کے تاریک سایوں کو شاخوں کے پیچھے بھی دیکھ سکتا تھا۔ اسٹیشن ویگن کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے ان سب کو چند قدم کے فاصلے پر دیکھا... اب مجھے کھڑی ہوئی اسٹیشن ویگن تک پہنچنا بھی ناممکن محسوس ہو رہا تھا۔ میں بالکل خالی ہاتھ تھا اور مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں اسٹیشن ویگن میں ہم شکاریوں کا شکار نہ ہو جائیں۔

تعداد میں چار تھے اور ان کی پیش قدمی کا انداز شاید عزم کی غمازی کرتا تھا۔ وہ سانس روکے چونک چونک کر قدم رکھتے انتہائی محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ شکاریوں کی طرح جو کسی وحشی درندے سے کمین گاہ پر حملہ کرتے ہوئے خود شکار ہونے کے اندیشے میں گرفتار ہوں۔

وقت اور موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے میں نے اسٹیشن ویگن تک پہنچنے کا خیال چھوڑ دیا۔ میں جان کی بازی لگا کے لڑتا تو اپنے بارے میں کچھ امید رکھتا مگر موہنی کو ساتھ رکھتے ہوئے ایسی کوشش مرجانا خودکشی کے مترادف محسوس ہوتی تھی۔

میں نے موہنی کو پیچھے کھینچ لیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کرنے کو کہا۔ وہ تیز دھار رکھنے والی خشک گھاس، کانٹوں کی چبھن رکھنے والی زمین پر لیٹ کر دراز ہو گئی... اس کا آدھا جسم میرے اوپر... ایک بہت بڑے پتھر کے درمیان پھنس گیا۔ خود میں جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرک سکتا تھا کیونکہ دوسری طرف گھنی جھاڑیوں کا جھنڈ تھا۔

میرے کان جھاڑیوں کے پیچھے نمودار ہونے والے دشمنوں کے قدموں کی آہٹ بھی سن رہے تھے اور وہ سرسراہٹ بھی جو جھاڑیوں کے اندر سے سنائی دینے لگی تھی۔ اس جھنڈ میں سانپوں کے بسیرے بھی ہو سکتے تھے جن کو ایک انسانی جوڑے کی اپنی خلوت گاہ [illegible] کو شل کر دیا ہو۔

"اف... میرا تو جسم چھل گیا۔" موہنی نے بل کھا کے کہا۔

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "جب تک ہم خود ان کو خبر نہیں دیں گے وہ ہمیں تلاش نہیں کر سکیں گے۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"لیکن... اس وقت تک میری کھال اُدھڑ جائے گی۔" وہ سسک کے بولی۔

"یہ تمھاری کھال کھینچ لیں گے۔" میں نے کہا۔ "اگر انھوں نے تمھیں یہاں میرے ساتھ دیکھ لیا۔"

"یہاں تو کیڑے مکوڑے بھی ہیں۔" وہ بے چینی سے بولی۔

"یہ کیڑے مکوڑے بھی کچھ برے ہوں گے۔" میں نے مذاق میں کہا۔ "اگر یہاں تو سانپ بچھو بھی ہو سکتے ہیں تو وہ ڈنک [illegible]"

"اف... یہ کیا چیز رینگ رہی ہے... میری ٹانگوں پر..."

"میں نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے کہا۔ "بس چند منٹ کی بات ہے۔"

"میری گردن پر کسی چیز نے کاٹا ہے۔" وہ دہشت زدہ ہو کے بولی۔

"پلیز... حوصلہ رکھو... اس وقت ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے" میں نے کہا۔ "تم اپنا ہلنا بند کرو..."

"ہلنے کی جگہ بھی کہاں ہے۔" وہ بولی۔ "مگر کیا سانس بھی نہ لوں؟"

یہاں دشمن کی نگاہ ہمیں نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن میں ان کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔ اگر وہ ہماری جستجو میں آگے آتے تو میں ان کو آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا۔ مجھے خود کو اور موہنی کو ہی نہیں بچانا تھا، اسٹیشن ویگن کی حفاظت بھی کرنی تھی۔

وہ لوگ اب اس عارضی کیمپ تک آ گئے تھے جہاں چند منٹ پہلے ہم دونوں جنگل میں منگل منا رہے تھے۔ فضا یکلخت فائروں کی آواز سے دہل اٹھی۔ پرندے آشیانوں سے چلاتے ہوئے اڑے اور تاریکی میں درختوں کے درمیان گشت کرنے لگے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کم سے کم دو افراد نے بیک وقت خیمے پر اپنے ریوالور خالی کر دیے۔ موہنی کانپنے لگی... اس کے جسم کی لرزش میرے جسم میں ارتعاش پیدا کرنے لگی۔

"وہ یہاں نہیں ہیں سر۔" کسی نے کہا۔

"اندر جا کے دیکھو۔" یہ دوسری آواز تحکمانہ تھی۔ "لیکن احتیاط سے... ایک آگے سے جاؤ... دوسرا پیچھے کی طرف سے دیکھے۔"

میں نے طنابوں کے ٹوٹنے کی آواز سنی... یقیناً انھوں نے کیلوں کے کونے کو کھینچ کر خیمہ گرا دیا تھا۔

"وہ یہاں تھے سر۔" یہ تیسری آواز تھی۔

"مگر اب نہیں ہیں سر۔" پہلے نے تصدیق کی۔

"وہ جا چکے ہیں..."

"مگر اتنے کم وقت میں وہ زیادہ دور نہیں جا سکتے۔" دوسرا بولا۔ "تم دونوں واپس دائیں جاؤ... ایک شمال کی طرف، دوسرا جنوب کی طرف... زیادہ دور نہیں جانا ہے... بس ایک فرلانگ تک دیکھو اور پھر واپس اسی جگہ پہنچو۔ اپنی فائرنگ کا خیال رکھنا... کہیں بے خبر ہو کر راستہ بھول جاؤ... ہم ساری رات کسی ایک کی واپسی کے انتظار میں نہیں گزار سکتے۔"

اس کی آواز کرخت اور درشت تھی... وہ اپنے ماتحتوں پر غلاموں کی طرح حکم چلانے کا عادی معلوم ہوتا تھا اور کوئی چھوٹا موٹا سر پھرا فوجی افسر لگتا تھا... اس کی آواز کو غور سے سننے کے باوجود میں شناخت نہ کر سکا۔ میرے ذہن میں سیکڑوں ہزاروں جانی پہچانی آوازیں ایسے محفوظ تھیں جیسے کسی لائبریری میں کتابیں رکھی رہتی ہیں مگر میں عام آدمی کی طرح مشکل سے سو آوازوں کے چہرے تصور کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ باقی آوازیں لاشعور سے بھی نیچے تحت الشعور کے نہاں خانوں میں بند تھیں اور انھیں حوالوں کے بغیر نہیں پہچانا جا سکتا تھا۔

"میرے لیے کوئی حکم تو نہیں سر؟" یہ پہلا شخص تھا۔ اس کے سر کھجانے کے انداز میں طنز آمیز لجی محسوس ہوتی تھی۔

دوسرا شخص ہنسا۔ "تم آرام کرو... ایک سگریٹ دو مجھے۔ تم اور میں اکیلے ہوں تو افسری اور ماتحتی کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے... وہی پرانی گوریلا [illegible]..."

"تو سر... یہ اب ممکن نہیں رہا۔"

"اب اور تب کیا..." پہلے شخص نے غالباً سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "تم کو ایسا نہیں سمجھنا چاہیے کہ... میں نے تم کو بلیک میل کیا۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جس کو میری بیٹی نے پسند کیا ہے... اُسے میں بھی پسند کر سکتا ہوں یا نہیں... اور اسی لیے میں نے تمھارا نام دیا تھا... جب مجھے اپنی ٹیم کے انتخاب کا حق ملا تھا... میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا ہونے والا داماد ایک نااہل... بزدل اور ... غیر عملی شخص ہو... تمھارے بارے میں یہ تصور تھا کہ تم ایک آئیڈیلسٹ ہو... خیالوں کی جنت کے تصور میں گم رہنے والا ادیب... ادب اور موسیقی اور یہ سب فلسفے... یہ خراب چیزیں نہیں ہیں۔ لیکن آدمی کی کمزوری بن جائیں... خصوصاً ایک فوجی کی... تو یقیناً قابلِ نفرت ہیں..."

میں ان کی گفتگو سے پریشان ہونے لگا تھا... جنگل میں ایک فرلانگ جانے اور واپس آنے کے لیے ایک گھنٹے کا وقت بھی کم تھا لیکن میرے اور موہنی کے لیے یوں ایک گھنٹے تک تکلیف دہ حالت میں لیٹے رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ جھاڑیوں میں پھر سرسراہٹ ہو رہی تھی اور موہنی شکایت کر رہی تھی کہ اس کی پشت میں تو کیڑے چیونٹوں کے

www.paksociety.com

کمرے میں موجود ہو گئے ہیں تو جائز تھی۔ اچانک اس نے کروٹ لی اور اوپر آگئی۔۔۔۔۔۔ جسمانی اذیت کے ناقابل برداشت ہو جانے کے بعد موہنی کے ذہن میں نجات کی اور کوئی آسان صورت نہیں آئی۔ پہلے بھی میں مجبور تھا اب زیادہ مجبور ہو گیا۔۔۔ میں آسمان اٹھا کے نیچے نہیں چھپ سکتا تھا۔ ایک طرح سے میرے لیے بھی پہلے سے بہتر پوزیشن تھی۔ اس کے وزن کے نیچے سانس لینا زیادہ آسان تھا۔

اب میں اس قابل بھی ہو گیا تھا کہ اپنا ہاتھ اپنی جیب تک لے جا سکوں۔ سابقہ پوزیشن میں دشمن کے سامنے آتے ہی مجھے ایک دم اٹھنے کے بعد ریوالور نکالنے کا موقع ملتا۔

"اب میں اٹھتی ہوں" موہنی نے میرے کان کے قریب لا کے سرگوشی کی تو اس کے بال میرے چہرے پر بکھر گئے۔۔۔ "پھر تم بھی اٹھ جانا۔۔۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ موہنی نے پوزیشن بدلنے کے لیے سوچا تھا تو ٹھیک ہی سوچا تھا۔

[illegible] اس نے میرے دوسرے کان کی طرف [illegible] "مگر ٹھہرو۔" اور ایک ٹھنڈی سانس [illegible] میں نے دل ہی دل میں اسے ایک گالی دی [illegible] میرے دونوں دشمن ہوش میں آ چکے تھے۔

"میں منافقت پسند نہیں کرتا۔۔۔"

"ہم سب منافق ہیں۔۔۔ عادات اور ضروریات کو بنیاد بنا کے اپنے سچ جھوٹ بنتے ہیں۔"

"لیکن میں منہ پر کہہ رہا ہوں۔۔۔ مجھے نفرت ہے جنگ سے۔" یہ وہی نوجوان تھا جو دوسرے شخص کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔۔۔

"مسٹر [illegible] ایک امن کا نتیجہ ہوتی ہے۔۔۔ جارحیت کا ارتکاب کرنے والے کو ختم کرنا چاہیے۔۔۔ بالآخر ایسا وقت آ جاتا ہے جب کوئی بھی جارحیت کی ہمت نہیں کرتا۔"

"یہ فیصلہ کون کرے گا کہ جارحیت کا مرتکب کون ہے۔۔۔ اور اس کے لیے اصول۔۔۔ آپ کے ہوں گے یا فریق ثانی کے؟"

"شٹ اپ۔۔۔ کیا تم ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تم وہی احمق آئیڈیلسٹ ہو۔۔۔ اگر ایسا ہے تو مجھے افسوس ہے کہ میری زندگی میں تمہارا میری بیٹی سے شادی کرنا ممکن نہیں ہو گا۔"

"آپ کی زندگی میں؟" نوجوان طنز سے ہنسا۔ "یہ مجھے معلوم تھا۔"

"میں یہ اعلان کرنے والا تھا [illegible] کہ میری بیٹی ایک ایسے شخص کی بیوی ہے۔۔۔ جس نے [illegible] میں آ کے [illegible] کی تھی۔ میں بھی اپنے مستقبل میں شرمندگی دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"میں آپ کو سرخرو کروں گا۔۔۔ اپنی بہادری کی تمام جھوٹی اور مبالغہ آمیز رومانی داستانوں کے ساتھ۔۔۔ آپ کی یہ زندگی ایک قابل فخر اختتام کو پہنچ جائے گی۔"

"واٹ۔۔۔ واٹ از دس۔۔۔ تم پاگل ہو گئے ہو؟"

"نو سر۔۔۔ جیسا کہ آپ نے کہا۔۔۔ اور میں نے بھی کہا۔۔۔ [illegible] کی زندگی تھی جو ہمارے درمیان حائل تھی۔۔۔ اور آئندہ [illegible] کو ممکن بنانے کے لیے میرے پاس یہی سبب سے اچھا [illegible]"

"تم۔۔۔ مار رہے ہو مجھے؟ تمہارا کورٹ مارشل ہو جائے [illegible]"

وہ پھر ہنسا۔ "میری شادی ہو جائے گی۔۔۔ آپ کی بیٹی [illegible] بہت آسانی سے۔۔۔ عزت سے۔۔۔ وہ غم و غصہ [illegible] وہ آپ کو مس کرے گی۔۔۔ کچھ روئے گی۔۔۔ مگر [illegible] دلہن بنی۔۔۔ اور آپ کی تصویر کے سامنے۔۔۔ ایک تصویر کے قریب کھڑی بھی بڑی عقیدت سے ہار پہنا دے گی۔۔۔ گویا یہ شخص ایک عظیم ہیرو تھا [illegible] دشمن کی سرزمین پر بہادری کے ساتھ مارا گیا۔۔۔ گولی کا زخم سینے پر تھا۔۔۔ بھاگنے والوں کی طرح پیٹھ پر نہیں تھا۔۔۔ اسے بھارت [illegible] نے مرنے کے بعد ایک اور اعزاز دیا تھا۔۔۔ میں ایک ایسی کہانی بیان کروں گا کہ وہ اعزاز دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"سنو۔۔۔ ایسا مت کرو۔۔۔ فار گاڈ سیک۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ۔۔۔" وہ چلایا مگر اس کی آواز ایک فائر کی گونج میں دب کے گئی۔۔۔ ڈراما ختم ہو گیا۔ پھر وہ گرا تو جنگل کے باسی جو دم سادھے اس منظر میں گم تھے ایک جھٹکے سے ہوش میں آ گئے۔ انہی میں ہم دونوں بھی شامل تھے۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ موہنی نے آخری بات کیا اور کب کی تھی۔۔۔ وہ خود بھی بھول چکی تھی کہ اس نے [illegible] کیا تھا جو پہلے ہونے والی فائرنگ پر احتجاج کر کے آشیانوں میں لوٹ گئے تھے وہ اب پھر چلا رہے تھے۔

اسی وقت میں نے اچانک جھاڑیوں سے گھبرا کے نکل آنے والے سانپ کو دیکھا۔ موہنی نے ایک چیخ ماری۔۔۔ یہ ایک فطری اور اضطراری عمل تھا مگر اس کی یہ حماقت ہم دونوں کی جان لے سکتی تھی۔ فرار ہونے والا سانپ پلٹ کے مجھے ڈس سکتا تھا اور وہ قاتل آئیڈیلسٹ جس نے ابھی ابھی اپنی محبت پر فرض کو قربان کیا تھا موہنی کو شوٹ کر سکتا تھا اس کے لیے کسی چشم دید گواہ کو زندہ چھوڑنا کورٹ مارشل میں قتل عمد کے لیے سزائے موت پانے کے مترادف [illegible]

میں نے بھی جو کچھ کیا وہ ذہن کے شعور کا عمل نہ تھا [illegible] میں نے موہنی کو پیچھے اچھال دیا اور خود قلابازی کھا کے [illegible] گیا۔ وہ گولی جو موہنی کی چیخ کا تعاقب کرتے ہوئے چلائی گئی تھی [illegible] اگر ہم وہیں ہوتے تو ہمیں ہی لگ جاتی۔۔۔ گولی چلانے والا [illegible] بہرحال نہیں تھا۔

اگلی جست نے جو میں نے آگے کر کے [illegible] مجھے [illegible] شخص کے سامنے [illegible] میری خوش قسمتی یا اس کی بد قسمتی تھی [illegible] وہ ایک سانس کے ساتھ [illegible]

گرفت میں آ گیا کیونکہ ابھی مجھے کے ایک حصے میں ہمارے دشمن کی نظر [illegible] دشمن کی طرف اٹھی تھی۔ اس نے تیزی سے ایک [illegible] دیکھا اور قبل اس کے کہ [illegible] سانپ کو [illegible] یہ فیصلہ میں نے کر لیا۔۔۔ میں نے [illegible] ہوئے خود کو بچایا اور دائیں ٹانگ سے اس کی کمر پر وار کیا۔ وہ ایک جھٹکے سے آگے گیا۔ اس وقت وہ خود بھی [illegible] فائر کرنے والا تھا۔۔۔ لات پڑتے ہی اس کا توازن بگڑ گیا۔۔۔ سانپ [illegible] وہ سانپ کے راستے میں منہ کے بل گرا اور [illegible] سانپ نے [illegible] اس نے [illegible] سانپ کو ایک ہاتھ سے [illegible] اور کروٹ لے کر [illegible] سانپ کتنا [illegible] ہو اس کے کاٹنے سے آدمی فوراً ہلاک نہیں ہوتا۔ یہ بات وہ بھی جانتا ہو گا کہ سب سانپ زہریلے نہیں ہوتے۔۔۔ یہ ہو سکتا تھا کہ سانپ کے زہر سے وہ ہلاک نہ ہو۔۔۔ مگر وہ سانپ سے زیادہ خطرناک تھا۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

مگر میں نے اسے کچھ کرنے نہیں دیا۔ میں نے اس کی کلائی پر اپنا پاؤں رکھ کے اپنے جسم کا وزن ڈال دیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس نے مجھے پیچھے گرانا چاہا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا تو اس کا بازو کندھے سے اتر گیا۔

"ریوالور چھوڑ دو۔۔۔" میں نے کہا۔ "ورنہ تمہاری کلائی ٹوٹ جائے گی۔" اس نے ریوالور چھوڑ دیا۔ موہنی جو درخت کے پیچھے آ گئی تھی آگے بڑھی اور اس نے ریوالور اٹھا کے مجھے تھما دیا۔ میں نے زمین پر بیٹھے ہوئے نوجوان کو آزاد کر دیا۔ وہ مشکل سے بیس سال کا لگتا تھا۔ اس کی اصل عمر تیس سال بھی ہو سکتی تھی مگر کچھ ایسے چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو لڑکپن کے نقوش برقرار رکھتے ہیں اور عمر میں اضافے کے باوجود ان کی صورت پر بھولپن باقی رہتا ہے۔

وہ آہستہ آہستہ اٹھا اور [illegible] ایک سوال اس کی آنکھوں میں صاف پڑھا جا سکتا تھا لیکن میں نے اس کا جواب دینے میں وقت ضائع نہیں کیا۔۔۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کچھ بعد [illegible] ہونے والے فائروں کی آواز سن کر وہ دونوں یقیناً پلٹے [illegible] جو جنگل میں مجھے تلاش کرنے نکلے تھے۔

"ادھر چلو۔۔۔" میں نے ریوالور کے اشارے سے حکم دیا۔ اس نے سر ہلایا اور کسی تذبذب کے بغیر چل پڑا۔

میں نے ریوالور موہنی کے ہاتھ میں تھما دیا: "اسے چٹان کے پیچھے لے جاؤ۔۔۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا۔۔۔"

"میں ہر بات کا خیال رکھ سکتی ہوں۔" وہ بولی۔ "اگر اس نے پلٹ کے [illegible] تو میں اس کے ریوالور کی گولی سے [illegible]"

"میں تمہارے تجربے اور تمہاری مہارت پر بھروسہ کرتا ہوں۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن مجھ پر بھروسا کرتے ہوئے ڈرتے ہو؟" وہ بولی۔ "کیوں؟"

"وجہ تم جانتی ہو۔۔۔" میں نے کہا۔ "وفاداریاں بدلنے والے کسی کا اعتماد فوراً حاصل نہیں کر سکتے۔"

"میں بتا چکی ہوں کہ میری ساری وفاداریاں میری مجبوریاں تھیں۔" وہ برہمی سے بولی۔ ساتھ ہی اس نے [illegible] ریوالور سیدھا کیا۔

"ٹھہرو۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہو۔۔۔؟" میں نے کہا۔

"ثبوت فراہم کر رہی ہوں اپنی وفا کا۔۔۔" وہ بولی اور اس نے نوجوان پر گولی چلا دی۔

نوجوان شاید اندازہ کر چکا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اس نے اپنی چستی پر بھروسا کرتے ہوئے غوطہ مارا اور زمین پر گر گیا۔ گولی اس کے شانے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

"بے وقوف!" میں نے چلا کے کہا۔

"کیا یہ گولی میں تم پر نہیں چلا سکتی تھی؟" موہنی نے بھی چلا کے کہا۔ "آخر میں کیسے یقین دلاؤں تمہیں کہ میں غدار نہیں ہوں۔۔۔ میں پہلے بھی موہنی تھی جس پر [illegible] نے غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ میں نے اس [illegible] کو مار دیا اور اب پھر موہنی ہوں۔۔۔ اور صرف تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔ میں نے سب کا ساتھ چھوڑا ہے تو تمہارے لیے۔۔۔ میں اپنے بھائی کے قاتل کے ساتھ ہوں تو کیوں؟ یہ کیوں نہیں سوچتے تم؟"

"آئی ایم سوری۔۔۔ چلو تم اسے لے جاؤ۔۔۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "میں آتا ہوں۔"

"تمہیں اب یہاں کیا کام ہے؟"

"میں باقی دونوں سے بھی نمٹ لوں۔" میں نے کہا۔ "وہ آتے ہی ہوں گے۔"

وہ اسی وقت آ گئے۔ موہنی اپنے قیدی کو چٹان تک لے جا چکی تھی کہ ایک فائر ہوا۔ میں نے ایک [illegible] کی اور جست لگا کے چٹان کی اوٹ میں ہو گیا۔۔۔ میری چال کامیاب رہی۔ گولی چلانے والا ایک دم سامنے آ گیا۔۔۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ اس کی گولی نے میرا کام تمام کر دیا ہے۔ پھر اس کی نگاہ نے اپنے باس کی لاش کو دیکھا اور اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس خیال سے کہ غلط فہمی میں اس نے ہی باس کو گولی ماری ہے۔ اس نے جھک کر دیکھا اور کچھ مطمئن نظر آنے لگا۔ افسر اس کی گولی سے ہلاک نہیں ہوا تھا۔ گولی کا نشان عین افسر کے دل پر تھا اور اس زخم سے خون نہیں بہہ رہا تھا۔

اس نے ریوالور ہاتھ میں رکھتے ہوئے چاروں طرف گھوم کے دیکھا۔ پھر اس کی نظر چٹان پر ٹھہر گئی۔۔۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کا دشمن اگر چھپے گا تو اسی چٹان کے پیچھے۔۔۔ اسی وقت کسی اژدھے نے

www.paksociety.com

کبیر سٹ نے میری گردن پر ٹھک مارا۔ میرے حلق سے تو آواز نہیں نکلی تھی لیکن بے اختیار میرے جسم نے جھٹکا لیا تھا اور میرا ہاتھ گرفت پر گیا تھا۔ اس نے یقیناً وہ سی حرکت محسوس کر لی اور فائر کر دیا۔ گولی میرے چہرے کے سامنے پتھر پر لگی اور سنگریزے میرے منہ پر کانٹوں کی طرح چبھے۔ میں نے جوابی فائر کیا اور اپنے دشمن کو اچھل کر زمین پر گرتے دیکھا۔

میں دوسرے آدمی کی طرف سے بے خبر نہیں تھا مگر وہ اپنے ساتھی کی نسبت چالاک ثابت ہوا۔ وہ میرے پیچھے سے آیا اور اس نے فائر کیے بغیر مجھے دبوچنے کے لیے جست لگائی۔ میں اپنے اوپر اچانک آپڑنے والے وزن کو نہ سنبھال سکا اور نیچے گرا۔ وہ میرے اوپر آیا اور اس نے ریوالور میرے سر میں مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ وہ ایک طویل قامت اور بھاری بھرکم آدمی تھا اور پہلوانی کے فن سے آشنا معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس نے مجھے یوں چت کیا تھا جیسے ہم دنگل اکھاڑے میں ہوں۔

میں نے ضرب سے بچنے کے لیے سر کو جھٹکا۔ اس کے باوجود ریوالور کا دستہ میری پیشانی پر لگا۔ جو تارے مجھے دن میں نظر آئے وہ آسمان پر چمکتے روشن تھے۔ میں نے ان کی چمک کو ماند پڑتے محسوس کیا۔ میرا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔ میں نے کوشش کی کہ اس پہاڑ جیسے شخص کو اچھال دوں۔ اگر ہوش و حواس ساتھ دیتے تو یہ کام مشکل نہ تھا۔ وہ ایک جھٹکے میں اوپر اٹھتا اور میرے پاؤں اسے پیچھے پھینک دیتے لیکن اب میرا جسم تھوڑی دیر کے لیے ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ یہ بات اس نے بھی محسوس کر لی جو میرے سینے پر سوار تھا۔ اس نے میرے دونوں بازو اپنی دونوں ٹانگوں کو موڑ کر دبا رکھے تھے۔ اب اس نے میرے گلے کو اپنے بڑے بڑے گدھ کے پنجوں جیسے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ کسی ناقابلِ فہم زبان میں اس نے اپنے جنون آمیز اشتعال کا اظہار بھی کیا اور میرے گلے پر دباؤ بڑھنے لگا۔

ستارے ڈوب گئے اور میں نے اپنی سانس کو سینے میں رکتا ہوا محسوس کیا۔ ہوا کی نالی بند ہو گئی تھی اور میرے پھیپھڑے جیسے پھٹنے والے تھے۔ خالی ہاتھوں سے لڑنے کے فن کی ساری مہارت دھری رہ گئی تھی۔ ایک اناڑی کے ہاتھوں ایک کھلاڑی کو شکست ہونے لگی تھی۔ ریوالور جو میرے ہاتھ میں تھا نہ جانے کہاں گر چکا تھا۔ آخری خیال جس نے میرے احساس سے گزر کیا یہ تھا کہ میں مر رہا ہوں اور میرے لیے وہ سب بے معنی ہو رہا ہے جو زندگی سے مشروط تھا... رابعہ کا عشق... حسرتِ تعمیر... جدوجہد اور بے تعبیر خوابوں کا سفر... پھر میں مر گیا۔

مجھے مرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا چنانچہ میں اور کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میرے نزدیک احساس سے بیگانگی کا نام ہی موت تھا۔ مگر کیا احساس مر گیا ہے؟ جو مر جاتے ہیں وہ تو کچھ بھی نہیں سوچ سکتے۔

لیکن میں سوچ رہا ہوں... اس خیال نے مجھے پھر زندگی کی … لمحے یقین کی خوشی میں گزر گئے اور یہ خوشی میرے جسم … کو بیدار کرنے لگی... پھر مجھے سماعت نے آواز آنے لگی … ایک آواز سنی، یہ موہنی کی آواز تھی۔

"کبیر... ہوش میں آؤ۔" اس کے ہاتھ … میرے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑے تو مجھے ایک ہوش آگیا۔ میں نے سر کو جھٹکا اور اٹھ بیٹھا۔ وہ شخص جو میرا گلا گھونٹ رہا تھا میرے قریب ہی الٹا پڑا ہوا تھا۔

"یہ... یہ کیسے مر گیا؟" میں نے ایک ہاتھ سے گردن … کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے... مجھے کیا معلوم۔" موہنی نے کہا۔

"اسے تم نے نہیں مارا!" میں نے حیران ہو کے پوچھا۔

"نہیں... کیا گولی تم نے نہیں چلائی تھی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس لاش کو پلٹ کے دیکھا۔ وہ سجدہ کرنے کے انداز میں زمین پر جھکا پڑا تھا۔ جب وہ سیدھا ہوا تو مجھے اس کی پیشانی سے بہنے والا خون نظر آیا جو ابھی تک جنگل کی سوکھی مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کا ریوالور بھی قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کے میگزین کو چیک کیا۔ اس میں ایک بھی گولی کم نہیں تھی۔ یہ بعید از قیاس بات تھی کہ اس نے خود کو گولی ماری ہو۔ شکست کے … مغلوب ہو جانے والا دشمن تو ایسا کر سکتا ہے لیکن وہ تو … تھا اور اس کے ذہن میں صرف مجھے ہلاک کرنے کا خیال تھا۔

میں نے یہ دوسرا ریوالور بھی موہنی کو تھما دیا۔ میرے … کا اسلحہ تھا جو اب تک ہاتھ لگا تھا … ریوالور مجھے تلاش کرنے پر چٹان کے قریب ایک جھاڑی میں … مل گیا۔

اس دوسرے شخص کی موت کا معمّا حل کرنے میں مجھے … نہیں لگی۔ وہ اپنے ہی ساتھی کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا جس نے … چٹان کی اوٹ سے فائر کیا تھا۔ مجھے تصدیق کا موقع نہیں ملا تھا … میں قریب جا کے اس کی موت کا یقین کرتا، گولی لگتے ہی وہ … تھا اور زمین پر گر گیا تھا۔ اسی وقت دوسرا شخص مجھ پر آ گرا تھا۔

اب لاشوں کی پوزیشن دیکھ کر میں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ … جس شخص کو گولی لگی تھی وہ فوراً نہیں مرا تھا۔ وہ … ہوا تھا اور اس میں کچھ جان باقی تھی کہ وہ اپنے آپ کو کھینچتا ہوا … بارہ فٹ … گیا۔ اس کے بعد شاید وہ حوصلہ ہار گیا۔ اس نے … کے سامنے مجھے اور اپنے ساتھی کو اوپر نیچے دیکھا۔ … گھپ اندھیرا تھا اور خود اس کی آنکھوں میں موت کا اندھیرا … اس نے نشانہ لیا … نے اسے دھوکا دیا۔ اس نے مجھے …

دہشت زدہ ہو کر گولی چلا دی ہو جو اس کے اپنے ساتھی کی پیشانی میں … یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا نشانہ خطا ہونے سے ایسا ہوا ہو۔ تاہم اس میں کوئی شبہے کی بات نہیں تھی کہ اسی نے گولی چلا کے مجھے بچا لیا۔ گولی نہ موہنی نے چلائی تھی اور نہ میں نے تو صاف ظاہر ہے کسی تیسرے شخص نے چلائی تھی۔ تیسرے شخص کا خیال آتے ہی میرا ذہن اس نوجوان کی طرف گیا جسے موہنی لے گئی تھی۔

"موہنی... تم نے اسے کہاں چھوڑا ہے؟" میں نے کہا۔

"میں نے... میں نے تو اسے نہیں چھوڑا۔" موہنی نے سر جھکا کے مجرم لہجے میں کہا۔ "وہ خود ہی چھوڑ گیا مجھے..."

"کیا مطلب؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"مطلب یہ کہ وہ بھاگ گیا۔" موہنی نے ناک سکیڑ کر کہا۔

"کیسے بھاگ گیا...؟" میرا پارہ چڑھ گیا۔ "جبکہ ریوالور تمہارے ہاتھ میں تھا۔"

"اس نے... اس نے دھکا دیا مجھے..."

"دھکا دیا؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "آگے تم نہیں یاد رہا تھا؟"

"آگے چلتے چلتے وہ ایک دم آتی تیزی سے پیچھے آیا... چند فٹ کا ہی فاصلہ تو تھا..." موہنی سہم کر بولی۔ "کہ میں بچ نہ سکی... اگر وہ آگے بھاگتا... تو میں اسے نہ جانے دیتی... میں بالکل تیار تھی اور اسے گولی مار دیتی... ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟ اگر تم نے … کا موقع فراہم کیا ہے تو...؟"

"تو کیا... مجھے گولی مار دو گی؟"

"میں خود کو گولی مار لوں گی۔" وہ بلک کے بولی۔ "جب میں اسے گولی مارنے والی تھی تو تم نے مجھے روک دیا تھا... اس کا فائدہ اٹھا لیا اس نے... تو میرا کیا قصور ہے...؟"

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم عورت ذات ہو... ناقص العقل اور ناقابلِ اعتبار... اور میرا قصور یہ ہے کہ میں نے تم کو ایک ایسی ذمہ داری سونپ دی تھی جس کی تم اہل نہ تھیں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ "یہ لاؤ یہ دونوں ریوالور مجھے دے دو... ورنہ تم واقعی گولی مار لوگی خود کو... اس لیے کہ تم احمق ہو... مارے غصے تمہیں … سوجھتی ہو۔"

وہ ہیجان کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی... میرے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں وہ بل کھانے لگی۔ "چھوڑو میرا ہاتھ... وحشی۔ جنگلی... کیا کلائی توڑ دو گے میری؟"

"ضرورت پڑنے پر میں تمہاری گردن بھی توڑ دوں گا۔" میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"ابھی کیوں نہیں توڑ دیتے۔" اس نے دونوں ہاتھ سے اپنی گول گول صراحی جیسی گردن پکڑ کر کہا۔ "لو... مارو ایک ہاتھ اور جاؤ... تمہارے جیسے جنگلی کا … نامی... زبردستی میں نہیں کر سکتی... زبردست تم ہو... میں ایک ناقص العقل عورت بچپن سے جوانی تک تمہاری یاد کو دل سے نہ نکال سکی... بائیس سال سفر میں رہی... ہماری سرحدیں عبور کر کے یہاں پہنچی... یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے... یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم کسی اور سے پیار کرتے ہو... یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے اور تمہارے درمیان وقت، مذہب، سرحد، شعور اور تجربات کے فاصلوں کی بہت سی دیواریں ہیں۔ بے وقوفی کی حد یہی ہے... تم بہت عقل مند ہو... ختم کر دو میرا یہ دیوانے پن کا سلسلہ۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"آئی ایم سوری..."

"نہیں... یہ بھی الفاظ مت دُہراؤ بار بار... کل تم پھر کہو گے کہ میں بھروسے کے قابل نہیں... الفاظ سے نہیں کہو گے تو رویے سے بتاؤ گے کہ میں ناقابلِ قبول ہوں... کیونکہ میں ہندو ہوں اور تم مسلمان ہو... میں بھارتی ہوں اور تم پاکستانی... میں نرتکی ہوں اور تم سکندر ہو... وہ موہنی جس سے کبیر نے کچھ کہا تھا... وہ مر گئی... بہت پہلے..."

"کیا کہا تھا؟" میں نے شرمندگی سے کہا۔

"تمہیں یاد نہیں... تو یاد دلانے سے فائدہ؟" وہ افسوس کر کے بولی۔

"مجھے یاد ہے... میں نے کہا تھا کہ موہنی جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو تم سے بیاہ کروں گا۔" میں نے کہا۔ یہ سو فیصد جھوٹ تھا... مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ شاید میں نے ایسی ہی بات کی ہوگی۔

"تمہیں یاد ہے؟" موہنی نے رونا بھول کے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ "اور... تم کو یاد ہے میرا جواب؟"

"ہاں ہاں! سب یاد ہے..." میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ "مگر یہ کوئی سا وقت ہے ان باتوں کو یاد کرنے کا... اور پھر وہ بچپن کی بات تھی... اب ہم بچے تو نہیں ہیں۔"

"ہاں... ہم ہمیشہ بچے کیسے رہ سکتے تھے۔" وہ اداسی سے بولی۔ "بچپن کی معصومات یاد دلانے کا مقصد بھی یہ نہیں تھا کہ میں تم سے کچھ مانگ رہی ہوں... یا میں چاہتی ہوں کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو... میں تو اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ میرا وہ حق بہت پہلے ختم ہو چکا تھا اور اب میرے پاس بھی تمہیں دینے کو کچھ نہیں ہے... میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی، اس لیے میں نے بتا دیا تھا کہ میں اپنی شرافت کو بھی نیلام کرتی رہی ہوں... اور میرا جسم بھی میرا نہیں... مگر میرا احساس تو وہی ہے..."

"چلیے موہنی... ہم بعد میں بات کریں گے..." میں نے کہا۔ "ہمیں جلد یہاں سے نکلنا چاہیے... ابھی تو یہ چار آئے تھے... ایسا نہ ہو کہ ان کے پیچھے آٹھ دس اور آجائیں... آخر یہ لوگ کیسے آ پہنچے

www.paksociety.com

ٹھکانوں... ظاہر ہے وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں... ممکن ہے کہ انھوں نے مجھے مرنے والوں میں شمار کر لیا ہو... لیکن وہ جانتے ہیں کہ میں اسٹیشن وِنگ سے نکل گیا... وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ٹریننگ کیمپ کو میں نے تباہ کیا تھا... وہ اس کا بدلہ ضرور لیں گے۔"

میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ وقتی طور پر میں نے اس کے جذبات کے دھارے کا رُخ بدل دیا تھا۔ مگر آئندہ کے بارے میں خود بے یقینی کا شکار تھا۔ میں موہنی کو کس طرح اپنے ساتھ رکھوں گا۔ اس سوال کا جواب بہت مشکل تھا۔ اور میں اس کو ساتھ نہ رکھنے کے لیے کیا کروں گا، یہ پہلے سوال سے زیادہ مشکل سوال تھا۔ اب میں اُسے دشمن ملک کی ایجنٹ تو نہیں سمجھ سکتا تھا کہ گولی مار سکتا تھا۔ اُسے پولیس کے حوالے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وقت گزر چکا تھا جب میں ایسا کر سکتا تھا۔ اب وہ مجھے بچپن کی یادوں کے حوالے سے یہ احساس دلانے میں کامیاب ہو چکی تھی کہ میرے اور اس کے درمیان ایک بھولا بسرا تعلق ضرور ہے۔ میں اُسے کس طرح دشمن سمجھ سکتا تھا جبکہ وہ میرے محسن کی بیٹی تھی۔ پنڈت دیاناتھ چند ضرور تھا مگر اس نے میری جان بچائی تھی اور اس کے صلے میں اپنی جان گنوا دی تھی۔ اس نے اپنے خاندان کے مستقبل کو قربان کر کے میرے مستقبل کو محفوظ کیا تھا۔ میں اس کا مقروض تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں موہنی کو وہ قرض مع سود کیسے ادا کروں گا... مجھے اس سے کسی قسم کی جذباتی وابستگی نہیں تھی جبکہ وہ کہہ چکی تھی کہ اس کے دل نے کبھی مجھے اور میری چاہت کو فراموش نہیں کیا تھا اور جیسے سرحد پار کرنے والے قافلے راہ میں لٹ جاتے ہیں ایسے ہی مجھ تک پہنچتے ہوئے وہ بھی لٹ گئی تھی... مگر اس نے اپنا سفر جاری رکھا تھا اور سب کچھ لٹا کے بالآخر اپنی منزل تک پہنچنے میں کامیاب رہی تھی... مگر کیا واقعی منزل پا سکے گی؟

دشمنوں کی جیبوں کو ٹٹولتے ہوئے میں نے بہت کچھ سوچا اور سوچوں کے جال میں اُلجھنے کے باوجود سوچتا رہا۔ کسی لاش کی جیب میں سے مجھے کچھ نہیں ملا... ایسے لوگ اپنی شناخت کا سامان نہیں لیے پھرتے... وہ تو اپنی شناخت کے سامنے سر اٹھا کے آگے جاتے ہیں۔

"اب یہاں ٹھہرنا بے سود ہے۔" میں نے کھڑے ہو کر کہا۔

"وقت کیا ہوا ہے؟" موہنی نے پوچھا۔

"وقت... سوا بارہ۔" میں نے کلائی کی گھڑی کو آسمان کی طرف گھما کے تاروں کی مدھم روشنی میں چمکنے والے ڈائل کو دیکھا۔

"ابھی تو صبح بہت دور ہے۔" موہنی نے کہا۔ "ہم چار پانچ گھنٹے آرام کر سکتے ہیں۔"

میں نے سر ہلایا اور موہنی کے ساتھ چلتا ہوا لاشوں کو وہیں چھوڑنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ دن کا اُجالا پھیلنے کے بعد ان کے ساتھی یا گاؤں والے انھیں اٹھا لیں گے اور نہیں اٹھائیں گے تو جانور کھا لیں گے... مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کو دفن کروں۔ میرا دماغ بھی ماؤف ہو رہا تھا اور اس سے میرا فیصلہ بھی متاثر ہو رہا تھا... میں خود بھی چاہتا تھا کہ سو جاؤں تو میرا دماغ تازہ ہو۔

اسٹیشن وِنگ اس پہاڑی نما چٹان کے پیچھے تھا [illegible]۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ سونے کی صورت کیا ہوگی... سو سکتا تھا لیکن میری حالت ایسی تھی کہ میں جاگ نہیں سکتا تھا۔

"تم پیچھے سو جاؤ۔" میں نے موہنی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم بھی پیچھے سو سکتے ہو۔" وہ بولی۔

"میں آگے سو رہا ہوں... ڈرائیونگ سیٹ پر۔"

"سارا اسلحہ سیٹ کے نیچے رکھ لینا۔" وہ [illegible]

کی چابیاں محفوظ رکھنا اور دروازے اندر سے لاک کر لینا۔

"تم سمجھتی ہو میں ڈرتا ہوں تم سے؟" میں نے کہا۔

"تم اپنے آپ سے ڈرتے ہو۔" وہ بولی۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن [illegible] اس نے کہا تھا۔ میرا ذہن اب اس قابل ہی نہیں رہا تھا کہ [illegible] کے معاملے میں جذباتی عقلیت کا مظاہرہ کرے [illegible] کو نظر انداز کر سکے... میں نے اس کے بڑبڑانے کی پروا نہیں کی [illegible] کو مقفل کر کے سو گیا... اب جو ہو سو ہو... میں نے آنکھیں بند کر کے خود سے کہا۔ موہنی فرار ہوتی ہے تو فرار ہو جائے۔ [illegible] گاڑی لے کر فرار نہیں ہو سکتی اور مجھے قتل کر کے فرار نہیں ہو [illegible] وہ باہر سے دروازہ نہیں کھول سکتی۔

بہت دیر تک میں گہری نیند کی آرزو اور جاگتے رہنے کی ضرورت کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ایک طرف جسم کو چند گھنٹوں کے لیے سکون اور آرام کے وقفے کی طلب تھی تاکہ وہ اپنی تھکن اتار [illegible] اور آئندہ کے لیے توانائی کا تھوڑا بہت ذخیرہ کر لے۔ دوسری طرف خطرات کے حصار سے نامعلوم اندیشے پکارتے تھے کہ جاگتے رہو... بہت سی باتیں دل اور دماغ کے درمیان تصفیہ طلب تھیں۔

موہنی کی مجھ سے جذباتی وابستگی سمجھ میں آتی تھی۔ ایسی ہی وابستگی رابعہ کو بھی میری منزلوں کی راہ میں ہم سفر بنا رہی تھی۔ وہ بات [illegible] سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ موہنی کو قربان کر کے وہ سب کچھ کرنے [illegible] تھی جو اس نے کیا تھا۔ اسے اگر میری جستجو تھی تو وہ کسی بھی [illegible] سرحد عبور کر کے پاکستان آ سکتی تھی۔ دونوں ملکوں کے لوگ اپنے اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے قاعدے اور ضابطے کے مطابق بھی آتے جاتے ہیں اور چوری چھپے بھی اسمگل کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان سے پاکستان منتقل ہونے اور یہاں کی شہریت حاصل کرنے کے آرزو مند مسلمانوں کا تناسب زیادہ تھا خصوصاً لڑکیوں کا۔ وہ سب وہاں ہندوستان میں فرقہ وارانہ تعصب کے باعث اپنی لڑکیوں کے مستقبل کو غیر محفوظ سمجھتے تھے یا پھر رشتوں سے مایوس تھے۔ وہ پاکستان [illegible] اپنی لڑکیوں کو حقیقی رشتے داروں کے پاس بھیج دیتے تھے اور وہ ان کے گھروں میں روپوش رہتی تھیں اور شادی کے بعد ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا تھا کہ ان کے پاس پاکستانی شہریت ہے یا نہیں۔ اگر موہنی چاہتی تو ایک غلط نام پتے سے پاسپورٹ بنوا کے کسی بھی جانے والے کے پتے پر پہنچ سکتی تھی اور پھر مجھے تلاش کر سکتی تھی۔ اگر اس کی معلومات اتنی وسیع تھیں کہ وہ رابعہ اور محسن کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی تو پھر اس کے لیے مجھے تلاش کرنا بھی مشکل نہیں تھا۔ لیکن اس نے ایک مشکل راستہ اختیار کیا تھا اور اب اپنے لیے نئی مشکلات پیدا کر لی تھیں۔ ایک طرف وہ اپنوں کی نظروں میں غداری کے جرم کی مرتکب ہوئی تھی تو دوسری طرف بھی اس کے لیے اعتبار حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ میں اپنے جذبات کو الگ رکھتے ہوئے غیر جانبداری سے سوچتا تو اس پہلو پر [illegible] اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ محسن [illegible] لوگ، محسن اور غالب اور اس کی بیوی [illegible] میرے اس اقدام کو کس نظر سے دیکھیں گے۔

دل و دماغ اور موہنی کے درمیان نظریاتی اختلاف بھی سمجھ میں آتا تھا مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ اس اختلاف کے باوجود ایک ایسے مشن پر کیوں کیسے ہوئے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے بھائی کے قاتل کے خلاف کسی قسم کے جذباتی ردِعمل میں مبتلا نہ ہو... [illegible] اور اس سے نفرت کرنے کے بجائے وہ اس کو [illegible] چاہتی رہے۔

بلاشبہ ابھی تک موہنی نے اپنے قول و فعل سے یہی ثابت کیا تھا کہ وہ میرے ساتھ ہے اور اس کے ہر قدم پر شبہ کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا مگر ایک خیال کبھی کبھی سانپ کی طرح [illegible] شکوک کا سرچشمہ بن جاتا تھا۔ کہیں یہ سب اس کی کوئی چال نہ ہو۔ وہ عورت ہے جو خوب صورت بھی ہو اور ذہین بھی... بے باک بھی ہو اور بے حیا بھی تو وہ کسی بھی انتہا تک جا سکتی ہے اور سب کچھ کر سکتی ہے۔ کہیں موہنی بھی وہ دام ہمرنگِ زمین تو نہیں پھیلا رہی ہے جو میری نگاہ نہیں دیکھ سکتی۔ اس کا مقصد میری ذات تک رسائی نہ ہو۔ اس نے میری ذات کو ایک وسیلہ بنا لیا ہو اور اپنا مقصد حاصل کرنے کا مقصد میرے مشن کو سبوتاژ کرنا ہو... جانے پلان... جانے عزائم... جانے طریق کار اور ان سب تفصیلات کے بارے میں زیادہ تفصیل سے جان [illegible] بعد وہ غائب ہو جاتے اور اپنی ہائی کمان کو پوری رپورٹ پیش کرتے۔ ایک کامیاب اور تجربہ کار ایجنٹ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہوتا ہے کہ وہ جان جوکھم میں ڈال کے دشمن کے کیمپ میں چلا جائے۔ وہاں اپنی ذہانت سے با اعتماد ساتھی شمار ہونے لگے اور سارے راز جان لے اور دشمن کو اچھی طرح بے وقوف بنانے کے بعد اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل جائے۔

ابھی تک موہنی نے متعدد مواقع پر یہ ثابت کیا تھا کہ وہ میری خاطر جسم اور جان دونوں قربان کر سکتی ہے لیکن مجھے اس سے [illegible] کی ضرورت تھی... یہ ہو سکتا تھا کہ دشمن کی [illegible] کے اعلیٰ حکام نے میرے اور موہنی کے درمیان بچپن کے جذباتی رشتے کا سراغ لگا لیا ہو اور پھر فیصلہ کیا ہو کہ موہنی کو میرے خلاف میری کمزوری بنا کے استعمال کیا جائے۔ اعلیٰ سطح پر ایسے ویسے بہت سے فیصلے ہو جاتے ہیں۔ موہنی اگر خود راضی نہ ہوتی تو اُسے دباؤ ڈال کے بھی راضی کیا جا سکتا تھا۔ [illegible] حربہ ناکام ہو جانے پر خطرناک نتائج کی دھمکی [illegible] کہ تم اس شخص کو بہت اچھی طرح جانتی ہو... تم اس کے بچپن کی ساتھی ہو اور ہماری معلومات کے مطابق تمہارے گھرانے کے سب افراد نے تقسیم کے بعد اُسے بچایا تھا اور پاکستان پہنچانے میں اس کی مدد کی تھی۔ اب تم جاؤ اور اُسے قابو کرو... اس کے ذریعے تمام کارآمد معلومات حاصل کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارے ماں باپ کی اور بھائی کی خیر نہیں... وہ تمہاری کامیابی تک نظر بند رہیں گے اور جانے [illegible] تم وکرم پہ [illegible] گئے... تم نے غداری کی یا کمزوری دکھائی تو سزا انھیں ملے گی [illegible] آدمی وقتاً فوقتاً تم سے رابطہ قائم کرتے رہیں گے۔

اگر ان سب باتوں کو مدنظر رکھا جاتا تو بہت سے امکانات کے دروازے کھل جاتے تھے۔ مثلاً کرن سے اس کے تعلق کی کہانی جھوٹی ہو سکتی تھی۔ اس کے والدین کے ساتھ پیش آنے والے واقعات جھوٹے ہو سکتے تھے۔ مجھے یہ واقعات سنانے کا مقصد مجھ پر احسان کے قرض کا بار لادنا ہو سکتا تھا... اب تو میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ میرے محسن کی بیٹی ہے جس کا سارا خاندان میری وجہ سے تباہ ہوا... لیکن میرے پاس تصدیق کا کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے میں معلوم کر سکتا کہ کیا واقعی ایسا ہوا تھا... اور کرن موہن واقعی اس کا بھائی تھا یا محض اس جھوٹے ڈرامے کا ایک کردار...

انھی مثبت اور منفی خیالوں کی کشمکش میں بھٹکتا ہوا میں نہ جانے کس وقت نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ یہ نیند بھی محض بے خبری اور بے ہوشی کی نیند نہیں تھی۔ میرا جسم سو رہا تھا... شعور بھی خوابیدہ تھا لیکن لاشعور کے خوف جاگ رہے تھے اور خطرے کا الارم بجا کے بیدار کرنے کی ڈیوٹی پہ مامور پہرے دار بہت مستعد تھے۔

معلوم نہیں کس وقت میری آنکھ بے سبب کھل گئی۔ ابھی میرے

www.paksociety.com

چاروں طرف جنگل میں رات کا اندھیرا چھایا تھا۔ خاموشی کو صرف ان گیدڑوں کی چیخ و پکار مجروح کر رہی تھی جو شاید بھوکے تھے اور بہت دور سے چلا رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ابھی ابھی میں نے کسی کی چیخ سنی ہو، پتا نہیں تھا کہ وہ خواب تھا یا نہیں... میں کوئی خواب بھی نہیں دیکھ رہا تھا ورنہ مجھے یاد آ جاتا کہ خواب کیا تھا... پھر کیا گاؤں کی طرف سے کوئی کتا بھٹکتا ہوا آ گیا تھا؟ کتے آبادیوں میں یا ان کے قریب رہتے ہیں۔ گھنے جنگلوں میں نہیں بھٹکتے پھرتے۔

دروازہ کھول کے میں نیچے اترا۔ ایک تشویش خیال کے تحت میں نے اسٹیشن ویگن کا پچھلا دروازہ اوپر اٹھایا۔ اندر ایک لائٹ جل گئی۔ اس کی مدھم روشنی میں میری آنکھوں نے دونوں پچھلی سیٹوں کو دیکھا جو خالی تھیں۔ ان میں سے ایک پر موہنی کو ہونا چاہیے تھا لیکن وہ غائب تھی۔

میں نے اندر داخل ہو کے باقی اسباب کو چیک کیا۔ سارا اسلحہ تو میں نے آگے ہی رکھا تھا لیکن پیچھے وہ سوٹ کیس تھے جن میں کرنسی بھری ہوئی تھی۔ موہنی کے کپڑے تھے اور وہ سب دستاویزات تھیں جو میں نے قبضے میں کر لی تھیں۔ سب چیزیں اپنی جگہ موجود تھیں۔

میں واپس نیچے اتر آیا... مجھے یقین آنے لگا تھا کہ موہنی فرار ہو گئی... اس کے بارے میں میرے اندیشے سچ ثابت ہوئے تھے۔ لیکن وہ ابھی تک کیوں رکی ہوئی تھی؟ وہ میرا اعتماد حاصل کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی تھی اور اگر اس کا مشن یہی تھا کہ وہ مجھ سے معلومات حاصل کرے۔ ہمارے ٹھکانوں کے بارے میں یا ساتھیوں کے متعلق اور ہمارے مستقبل کے پلان کے متعلق... تو ابھی تک میں نے اسے کچھ بھی نہیں بتایا تھا... وہ مشن کو ادھورا چھوڑ کے کیوں چلی گئی... حالانکہ اس کی کامیابی کے امکانات خاصے روشن ہو چلے تھے... اگر اس کا مقصد صرف مجھے ٹھکانے لگانا تھا تو اس نے متعدد مواقع کیوں ضائع کیے... کیا اس کا حوصلہ ساتھ چھوڑ گیا۔ اس کے جذبات نے عقل کو بے بس کر دیا... وہ اپنے ارادوں کے سامنے کمزور پڑ گئی؟ میرے سامنے آنے کے بعد وہ سب کچھ نہ کر سکی جو وہ کرنا چاہ رہی تھی؟

میں نے آس پاس بیس پچیس گز کے فاصلے میں دیکھا کہ شاید وہ کسی ضرورت کو رفع کرنے کے لیے آ رہی ہو۔ میں نے اسے آوازیں بھی دیں مگر مجھے مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ تین لاشیں اسی طرح خاک بسر پڑی تھیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے چوتھے آدمی کا خیال آیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ خود موہنی نے اسے فرار ہو جانے کا موقع دیا ہو؟

اپنی کمزوری پر مجھے غصہ آنے لگا۔ آخر میں نے اسے اتنی ڈھیل ہی کیوں دی؟ کیوں نہ سنی اس کی بات؟ مجھ پر لازم تھا کہ اس چوتھے آدمی کو اسی طرح گولی مار دیتا جس طرح اس نے اپنی مجبور کے باپ کو ماری تھی... اس نے ایک معمولی سے مقصد کے لیے یعنی صرف ایک عورت کو حاصل کرنے کے لیے ایک … اپنے افسر کو خود ہی حالت جنگ میں مار دیا۔ پھر … خفا ہے اب وہ لوٹ کر جائے گا تو میرے … کی تفصیل … جائے گا۔ موہنی کی کامیابی کی رپورٹ دے گا کہ اس نے … عصبر خان عرف سکندر بخت پر اپنا جادو چلا دیا تھا... اور … زیادہ طاقت کے ساتھ نئے شکاری بھیج دیں گے۔ ایک … کی تباہی سے سبق حاصل کریں گے اور دوسرا … پر سب کو چوکس کر دیں گے۔

میں واپس اسٹیشن ویگن تک آیا اور اپنی جذباتی کم عقلی اور کوتاہ بینی پر کڑھتا ہوا پھر سیٹ پر دراز ہو گیا... موہنی کے فرار میں میرے ذہن کے لیے تسکین کا صرف ایک پہلو تھا کہ وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکی اور مجھ سے کچھ معلوم نہ کر سکی۔ اگر وہ ساتھ رہتی تو … میں اسے کتنی رعایت دیتا اور اس پر کتنا اعتماد کرتا... شاید … ساتھ رکھتا اور وہ بہت کچھ جان لیتی۔ میں ممکنہ نقصانات سے … جانے پر مطمئن تھا۔ اسے ساتھ رکھنا ایک خطرناک … جاتی۔ اب میں بےکھٹکے تھا اور کسی اندیشے کے بغیر اپنا سفر جاری رکھ سکتا تھا۔

صبح کے ساڑھے تین بجے تھے۔ میں نے کلائی کی گھڑی … کے بعد دو گھنٹے آرام سے سونے کا فیصلہ کیا... مجھے خیال … کہ موہنی کے فرار ہونے کے بعد میرے لیے قیام کو طول دینا … بھی ہو سکتا ہے اور مجھے بھی فوراً نکل جانا چاہیے تاکہ وہ … اور کے ساتھ آئے تو اسے مایوسی ہو۔ لیکن رات کے وقت … سے بھٹک جانے کا ڈر تھا اور یہ خیال بھی تھا کہ کہیں میں خود … کے حصار میں نہ پہنچ جاؤں۔

خود کو خدا کی حفاظت میں دے کر لیٹ گیا پھر سونے کی … اور اس ارادے میں کامیاب بھی رہا۔ نیند کے اس دوسرے دور … مجھے ایک خواب نے ستایا۔ خواب میں کچھ عجیب سا منظر تھا۔ سامنے سرسوں کے کھیت تھے۔ زرد پھولوں کے … سے دور تک … آنکھیں … نیلا آسمان تھا... آسمان بھی ہوا سے لہرانے لگا۔ جیسے کسی نے آسمانی چادر … سوکھنے کے لیے الگنی پر پھیلا دیا ہو... سرسوں کے پھول … رہے تھے کہ ایک لڑکی آئی اس نے نیلا آنچل اپنے سر پر … پہلے میں نے اسے پیچھے سے دیکھا تھا مگر جب … سامنے آیا تو میں رابعہ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا... وہ مجھے دیکھ کر … سے مسکرائی اور کہنے لگی... کیا تم راستے سے بھٹک گئے ہو؟ … اور میں نے کہا کس راستے کی بات کر رہی ہو... میں اور تم ایک … پر تو ہیں... وہ پلٹ کر جانے لگی تو میں نے اسے …

"رابعہ!... رابعہ!" اتنا ہی وہ ساری کہانی ہے جس کے تیسے رنگ میں … بچھونوں کا گلشن تھا... اور وہ آنچل لہرا کے بولی... تمہارے … آسمان کو دیکھو اور زمین کو دیکھو... اور ابھی میں دم بخود … کھڑا … وہ غائب ہو گئی... وہ نیلا آسمان اور سرسوں کے پھول سب غائب ہو گئے۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے چاروں طرف صبح پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر … زیادہ روشن تھا۔ نیچے درختوں سے چھن کر آنے والی دھوپ … بالکل سفید تھے۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو سوا آٹھ بج رہے تھے... میں ضرورت سے زیادہ سوتا رہ گیا تھا... اگر میں چھ بجے اٹھ بیٹھتا تو اب تک اس جنگل سے نکل گیا ہوتا... میرے … گاؤں تھا جہاں سے میں گزشتہ رات کھانے پینے کا سامان لایا تھا۔ اسی سمت میں تھوڑا سا پیچھے دیکھنے پر مجھے آسمان کی طرف اٹھنے والی دھوئیں کی پتلی سی لکیر نظر آئی۔ یہ غالباً وہی جگہ تھی جہاں سے … موہنی کے ساتھ فرار ہوا تھا... اگرچہ وہ جگہ کئی میل دور تھی لیکن میں نے یوں محسوس کیا جیسے فضا میں انسانی لاشوں کے جلنے کی بو ہے اور سڑتے ہوئے گوشت کا تعفن ہے... وہ بھی تو موہنی ہی تھی جس کی … ایک دن پرانی لاش … اس کا نام … اتفاق نہیں تھا۔ کچھ نام بہت عام ہوتے ہیں۔

ایک آہٹ سن کے میں چونکا اور پھر باہر آیا... مجھے یہ آواز اسٹیشن ویگن کے عقبی حصے سے آئی تھی۔ آگے والے کیبن اور پیچھے کے حصے کے درمیان ایک پارٹیشن تھا جو ہر اسٹیشن ویگن میں نہیں ہوتا۔ کسی خاص رازداری کے مقصد کے تحت اس گاڑی میں آگے بیٹھنے والوں کو الگ کر دیا گیا تھا... اس طرح یہ ایک ڈیلیوری وین قسم کی چیز بن گئی تھی۔

پچھلا دروازہ اوپر اٹھاتے ہی میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ موہنی ایک سیٹ پر سوئی پڑی تھی۔ اس کا ایک بازو سیٹ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ وہ خود الٹی لیٹی ہوئی تھی چنانچہ اس کے بال بھی بکھرے ہوئے تھے اور ایک ریشمی ڈھیر کی صورت میں گاڑی کے فرش پر پڑے ہوئے تھے۔

"موہنی...!" میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کے ہلایا۔ "اے موہنی...!"

"کیا ہے؟" وہ ٹانگ کھینچ کر کسمسائی۔

"اٹھو!" میں نے سیٹ کو بجا کر کہا۔

وہ آہستہ آہستہ اٹھی... اس نے جماہی لے کر مجھے دیکھا اور مسکرا کے انگڑائی لی۔ اس کی تھکی ادا کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا... … میرے خیالات بہت بدل گئے تھے۔

"بہت دیر ہو گئی۔" وہ بولی۔ "ایسے کیوں گھور رہے ہو؟"

"رات کو تم کہاں تھیں؟" میں نے اس پر نظر جما کے کہا۔

"رات کو تم کہاں تھے؟" وہ بولی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے سختی سے کہا۔

"تم نے کہاں دیکھا تھا؟" وہ بولی۔

"میں نے دیکھا تھا تم یہاں نہیں تھیں۔"

"وہ پیچھے اتر آئی۔ اس وقت دیکھا ہوگا جب میں سونے سے پہلے نکلی تھی۔ ٹوئیلٹ واش۔"

"جھوٹ مت بولو۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اس وقت ساڑھے تین بجے تھے۔"

"تمہیں بھول گئے۔" وہ سادگی سے بولی۔ "میرے پاس تو گھڑی نہیں تھی۔"

"میں نے گھڑی دیکھی تھی... تم ساڑھے بارہ ایک کے درمیان سونے گئی تھیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں... مگر میں سوئی نہیں تھی... نیند نہیں آ رہی تھی بہت دیر تک اور آتی بھی کیسے... تم نے اس ڈبے میں جو بند کر دیا تھا... معلوم نہیں کب تک کروٹیں بدلتی رہی... پھر ضرورت محسوس ہوئی تو پہلے میں نے سوچا تمہیں بھی جگاؤں... ڈر لگتا تھا نیچے اترتے ہوئے... میں نے درمیان کی پارٹیشن کو بجایا بھی تھا لیکن تم جاگے نہیں... تو میں اکیلی چلی گئی۔"

میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جھوٹ کے آثار تلاش کرتا رہا۔ اس حد تک وہ درست کہہ رہی تھی کہ ساڑھے تین بجے میں نیند سے جاگا تھا۔ اس سے پہلے میں سو رہا تھا... اور اگر وہ جاگ رہی تھی تو میں کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"کہاں تک گئی تھیں تم؟" میں نے کہا۔

"ادھر... پندرہ بیس قدم..."

"بے وقوف مت بناؤ مجھے... میں نے ہر طرف دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو؟" وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "جو کہنا ہے صاف کہو... مجھ سے مت کہلواؤ۔"

"دروازہ تو بند تھا؟"

"کیا میں کھلا چھوڑ جاتی؟" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ "تم پہلے کس سمت میں گئے تھے... یاد کرو..."

"یہ ٹھیک ہے کہ... میں نے پہلے مخالف سمت میں دیکھا تھا۔"

"جب تم اُدھر تھے تو میں واپس آ گئی۔" وہ بولی۔ "اس میں کون سی تفتیش طلب بات ہے... اور یہ سب پوچھنے کا مقصد کیا ہے؟"

"مجھے تم پر اعتبار نہیں کہ تم سچ بول رہی ہو۔"

"کیا میں تمہیں وہ جگہ دکھاؤں؟" وہ مشتعل ہو گئی۔ "وہ تمہارے کہنے کو..."

میں نے اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور روک لیا۔ وہ مجھے چیلنج کرنے کے انداز میں مسکرائی کہ ہمت ہے تو مار کے دیکھو۔ طمانچہ کس کے منہ پر پڑتا ہے... سچ بولنے والے کے یا سچ سننے کی توقع

www.paksociety.com

برداشت نہ رکھنے والے کے۔

"ہاں... میں پریشان ہو گیا تھا۔" میں نے فوراً اپنی حکمت عملی بدل لی... اگر موہنی نے دل میں وہ نہیں سوچا جو اس کی زبان پر ہے تو مجھے دل کی بات جاننے کے لیے جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا ہوگا... وہ مجھے کسی غلط مقصد کے حصول کا ذریعہ بنانے آئی ہے اور میرا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے تو مجھے جارحانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ میں اس کے جال میں پھنس رہا ہوں... اس کے برعکس اگر وہ غلط عزائم نہیں رکھتی تو میرا رویہ اس کی پریشانی کا سبب نہیں بن سکتا۔

"کس بات سے پریشان تھے؟" وہ بولی۔ "یہ سمجھے تھے کہ میں بھاگ گئی... تمہارے دشمنوں کو خبر دینے...۔"

"ارے، تم ایسی بات مت کرو... میں تمہارے لیے پریشان تھا۔ یہ کوئی تفریح گاہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے ہر وقت خطرات کے سائے اپنے تعاقب میں نظر آتے ہیں... خصوصاً جو کچھ گزشتہ رات ہوا اس کے بعد... ایک آدمی کا بچ کے نکل جانا اچھا نہیں ہوا۔"

"سچ کہو... تم یہ تو نہیں سمجھے کہ اسے میں نے بھگا دیا؟"

"اگر مجھے ذرا بھی شک ہوتا تو اس جرم کی سزا تمہارے لیے بہت سخت ہوتی..." میں نے مسکرا کر کہا۔ "چلو اب ناراضگی ختم کرو اور چلنے کی تیاری کرو۔"

"مجھے کیا تیاری کرنی ہے؟" وہ بولی۔ "چلو..."

"کل رات تو ایک آرزو پوری ہو گئی تھی... مگر ہر دعا میری ہی کیسے قبول ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا اور آگے کا دروازہ کھول دیا۔

"اب کیا مانگتے... اگر ملنے کی امید ہوتی؟" وہ میرے ساتھ بیٹھ کے بولی۔

"چلو سلائس... بٹر... دو انڈے ہاف فرائی... مکھن جام اور کافی کا ایک مگ۔" میں نے کہا اور اگنیشن میں چابی گھمائی۔

"سب اپنے لیے؟" وہ ہنسی۔

"اور کیا تمہارے لیے... بابا اپنے ناشتے کا انتظام خود کرو..." میں نے کہا اور انجن کو پھر اسٹارٹ کیا۔ تیسری کوشش میں انجن بحال ہو گیا۔

"بابو جی نے کبھی ہمیں جانے تک نہیں پوچھا۔" وہ اداس ہو کے بولی۔ "جب تک وہ زندہ رہے ہم ناشتے میں ایک گلاس دودھ کا پیتے تھے... اب تو یہ حال ہے کہ آنکھ کھلتے ہی چائے کی طلب ہوتی ہے... دن کا آغاز چائے سے ہوتا ہے... یہاں سے سڑک کتنی دور ہوگی؟"

"مجھے قطعی اندازہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "دو چار میل تو ہوگی۔"

گاڑی نصف دائرے میں گھوم کے نکلی اور اس جگہ سے دور ہونے لگی جہاں ایک رات کے قیام نے میری زندگی کو امید کی نئی جہت عطا کی تھی۔ دشمن جو میری تلاش میں بھٹک کے پیچھے آئے تھے... اور اب دن کے اجالے میں مجھے تعاقب کا خوف محسوس ہوتا تھا لیکن مجھے اس نوجوان کا خیال پریشان کرتا تھا جو موہنی کے کہنے کے مطابق وہ کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا تھا... کیا وہ کسی کو بتائے گا کہ میں نے اس کی ساری گفتگو سنی تھی۔ وہ جنگل کے خلاف تھا... مرضی کے بغیر زبردستی یہاں لایا گیا تھا۔ اس نے موقع پاتے ہی... کرنے والے کو قتل کر دیا تھا اور اپنی محبت کی راہ میں حائل... تھی۔ وہ کچھ نہیں کرے گا... وہ سیدھا واپس لوٹ جائے گا جہاں کوئی نامعلوم لڑکی اس کی واپسی کی راہ میں آنکھیں بچھائے... وہ اپنے جرم پر ایک اچھی سی کہانی کا پردہ ڈالنے کا... سسر کی آمد تو خیر بہت مشکل ہوگی۔ مگر اس کی بیٹی کو قرار... کر جانا ہی بہتر تھا اور حکام کو یقین آ جائے گا کہ وہ... فرض میں مارا گیا۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ... میرے لیے کوئی مشکل پیدا کرنے سے گریز کا راستہ اختیار کرے گا۔

یہ اسٹیشن ویگن میری پریشانی کی دوسری وجہ تھی۔ مجھے... میں مجبوراً سفر کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ جنگل میں کسی قسم کے ذرائع حمل و نقل دستیاب نہ تھے۔ میں اکیلا اور خالی ہاتھ تو اس جنگل سے... سکتا تھا لیکن میرے ساتھ سامان سفر میں اسلحہ بھی تھا... بھی اور ایک لڑکی بھی۔ میں کچھ بھی پیچھے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کسی دوسری گاڑی کا بندوبست ہونے تک اسٹیشن ویگن کا استعمال کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سڑک پر پہنچتے ہی... بدل لوں گا۔ یہ گاڑی دشمن کے زیر استعمال تھی اور اب ان کی نظریں... کی جستجو کر رہی ہوں گی... پیسہ میرے پاس بہت تھا... کو اسے ساتھ لے کر پھرنا عقل مندی نہ تھا... ڈکیتی کے جرم میں دھر لیا جاتا... اگر مجھے یقین ہوتا کہ... کے خلاف سازش کے لیے دیا گیا تھا سرکاری خزانے میں... دیا جائے گا تو میں ساری رقم کسی بھی تھانے میں... چلتے آدمی کو دے دیتا مگر مجھے معلوم تھا کہ اتنا پیسہ دیکھ کر... کا ایمان ڈول جائے گا... یہ پیسہ خورد برد ہو جائے گا... اس سے بہتر تھا کہ میں خود ہی اسے آگ لگا دوں۔

سڑک اچانک آ گئی... یہ بھی روڈ نہیں تھی... تھی جس پر سفر کرتا ہوا میں دشمن کے ایک خفیہ کیمپ کے اندر... ہو گیا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ جنگل میں... ہوا اور گاڑی نے میرا ساتھ دیا۔ دھوپ میں تیزی تھی اور... ناہموار جنگل راستے پر... نے مجھے کچھ تھکا دیا تھا۔... سے بھی زیادہ محسوس... تھا۔

سامنے آ گئی تھی۔ دشمن کے علاقے سے دور جانے کے بجائے میں پھر ان ہی... سے گزشتہ روز فرار ہوا تھا۔

... میں نے گاڑی کو بریک لگائے۔

"کیا ہو گیا؟" موہنی نے چونک کر کہا۔

"... آئے راستے پر جا رہے تھے۔" میں نے گاڑی کو موڑا... "تم نے بھی نہیں روکا۔"

"مجھے کیا معلوم؟" موہنی نے کہا۔

مجھے پھر اس پر اعتبار کرنا مشکل ہو گیا... میں تو اس راستے پر... آیا تھا اور دائیں کے بجائے بائیں مڑ گیا تھا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی مگر موہنی تو اس راہ سے واقف تھی۔ وہ سارے... کے ساتھ جس اعتماد سے سفر کر رہی تھی اس سے تو یہی پتا چلتا تھا کہ وہ اکثر آتی جاتی رہی ہے۔ پھر وہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ اس نے میری غلطی کو... نہیں کیا تھا۔ تاہم میں نے اس سے کچھ نہ کہنا بہتر سمجھا۔

چار میل کے بعد سڑک سیدھی ہو گئی... درختوں کی شاخیں آپس... تنگ سڑک ایک لمبی سرنگ محسوس ہوتی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب کھیت تھے۔ کھلیانوں سے فصل اٹھائی جا چکی تھی اور نئی فصل کے لیے زمین تیار کرنے کا کام ابھی شروع نہیں ہوا تھا چنانچہ تا حد نگاہ ویرانی کا راج تھا۔ صرف ایک جگہ میں نے آبادی کے آثار دیکھے۔ وہ کوئی بہت مختصر سا گاؤں تھا۔

اکا دکا کھیتوں میں مجھے ہل چلانے والے بھی دکھائی دیے اور پیدل چلنے والے بھی جو شاید ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جا رہے تھے۔

اچانک میرے سامنے سڑک کے وسط میں ایک دھبہ نمودار ہوا۔ سورج کی چمک نے مجھے کسی آنے والی کار کی خبر دی۔

"ادھر کون آ سکتا ہے؟" میں نے اسٹیئرنگ سنبھال کے کہا۔

"کوئی بھی آ سکتا ہے۔" موہنی نے کہا۔ "سڑک سب کے لیے ہے۔"

"کیا تم نے پہلے کبھی غیر متعلق افراد کی گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھا تھا؟" میں نے سامنے نظر جما کے کہا۔ "غیر متعلق کا مطلب سمجھتی ہو نا؟"

"ہاں... عموماً وہی لوگ آتے تھے..." موہنی نے کہا۔

"اچھا... تو پھر تیار ہو جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یہ وہی لوگ ہوں گے۔"

موہنی کا رنگ اڑ گیا تھا۔ "تم... کیا کرو گے؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مقابلہ کرنے کے سوا... فرار کے لیے نہ راستہ ہے نہ گنجائش...۔"

گاڑی بہت قریب آ چکی تھی... میں ابھی تک کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا... ایک صورت تو یہ ہو سکتی تھی کہ میں رفتار بڑھا دوں اور کار کو ٹکر مار کے تباہ کرتا ہوا نکل جاؤں۔ اسٹیشن ویگن مضبوط تھی وہ کار بہت کمزور تھی مگر ایسے حادثے کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل تھا... یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں گاڑی کو نہ سنبھال سکوں اور خود بھی اسی حادثے کا شکار ہو جاؤں... یہ بہت خطرناک فیصلہ ہوتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں گاڑی کو اسی جگہ روک دوں اور شین گن لے کر سڑک سے دور کسی نشیبی جگہ پر بیٹھ جاؤں مگر میں اکیلا صرف ایک شین گن سے یہ جنگ کب تک جاری رکھ سکتا تھا۔

میرے لیے فیصلہ کرنا اس وقت آسان ہو گیا جب میں نے تیزی سے بڑھتی ہوئی گاڑی کو موڑ کاٹ کے رکتے ہوئے دیکھا... اب وہ کار لمبائی کے رخ سڑک کو بلاک کیے کھڑی ہوئی تھی۔ اس جگہ سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی پٹی ہوئی تھی۔ میں دونوں جانب کی سفید دیوار سے اندازہ کر سکتا تھا کہ میرے لیے سائڈ سے گاڑی نکالنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ گاڑی اب بھی دو فرلانگ دور تھی کہ میں نے ایک خطرناک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سیٹ کے نیچے سے شین گن نکال کے قریب رکھ لی۔

"موہنی..." میں نے کہا۔ "دروازہ کھولو... میں رفتار کم کرتا ہوں جیسے ہی کہوں ایک... دو... تین... تم فوراً باہر کود جانا۔"

"چلتی گاڑی سے!" وہ دہشت زدہ ہو کے بولی۔

"ہاں چلتی گاڑی سے۔" میں نے چلا کے کہا۔ "ایک... دو... تین۔" موہنی نے دروازہ کھولا اور باہر کود گئی... اس کے پاس سوال جواب کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ میں نے ایک سیکنڈ کے لیے بریک جام کر دیے تھے اور گاڑی کی رفتار گھٹ کر دس میل پر آ گئی تھی۔ میں نے اسے کچی زمین پر گرتے اور پھر کھڑا ہوتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے رفتار میں اضافہ کیا جب میرے اور کار کے درمیان فاصلہ سو گز سے بھی کم رہ گیا تو میں نے ایک سفید کپڑا ہاتھ میں پکڑ کے کھڑکی سے باہر لہرانا شروع کیا۔ کپڑا بالکل سفید نہیں تھا لیکن میرا مقصد تو صرف ایک پیغام دینا تھا کہ مجھ پر فائرنگ نہ کی جائے۔ میں لڑنے کے ارادے سے نہیں آ رہا ہوں۔

وہ کار میں صرف چار چند بیٹھے تھے اور انہیں یقین تھا کہ میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو جاؤں گا یا مجبور کر دیا جاؤں گا۔ اب میں گاڑی کو پہچان رہا تھا... یہ سیاہ رنگ کی اور بالکل نئی... بالکل ویسی ہی جیسی نواب یا خورشید کی ملکیت تھی۔ میرے سفید جھنڈے نے دشمنوں کے لبوں پر مسکراہٹیں بکھیر دی ہوں گی کہ انہوں نے بہت آسانی سے مجھے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

گاڑی پچاس گز دور تھی جب میں نے ایک ہاتھ سے اپنی طرف کا دروازہ کھولا۔ دوسرے ہاتھ سے شین گن تھامی اور ایکسیلیٹر پر اپنے پیر کا سارا دباؤ ڈال دیا... گاڑی کسی وحشی درندے کی طرح جست لگا کے آگے بڑھی۔ اسی وقت میں دروازے سے کود گیا۔ میں نے خود کو اڑتا ہوا محسوس کیا۔ میں نے شین گن پھینک دی

www.paksociety.com

اور خود کو اس پوزیشن میں کر لیا کہ میں زمین پر گروں تو تصادم کی شدت کو کم سے کم کر سکوں۔

زمین پر جسم کے لگتے ہی میں نے آنکھ کی طرف قلابازی کھائی اور ایک دم اٹھ کے بھاگا۔ یہ چند سیکنڈ کا وقفہ تھا۔ پھر میں نے مشین گن کے فائر سنے اور دوبارہ زمین پر گرا ہی تھا کہ ایک خوفناک دھماکے کی آواز سنائی دی... میں پھر اٹھا اور مشین گن کی طرف لپکا... اتنی دیر میں مجھے دو باتوں کا علم ہو چکا تھا... ایک یہ کہ میرے جسم پر خراشیں ضرور آئی ہوں گی۔ مگر خدا کے فضل سے میں بچ گیا تھا اور میری کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ دوسرے یہ کہ گاڑی میرے ہاتھوں سے نکلنے کے بعد بھی سیدھی گئی تھی۔ اس کا اسٹیئرنگ سیدھا رہا تھا اور پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی اس کی رفتار کم نہیں ہوئی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ انھوں نے گولیاں پاگل ہاتھی کی طرح بڑھنے والی اسٹیشن ویگن کو ماری ہوں گی لیکن وہ مشینی ہاتھی چند سو راؤنڈ ہو جانے سے مر نہیں سکتا تھا۔ ممکن ہے آخری وقت میں انھوں نے کار کا دروازہ کھول کے نکل جانا چاہا ہو لیکن اسٹیشن ویگن نے انھیں آ لیا۔

مرسیڈیز کو سامنے سے ٹکر لگی تھی اور اسٹیشن ویگن کے زیادہ مضبوط بمپر اور باہر نکلے ہوئے بمپر نے سامنے سے ٹکر ماری تھی۔ کار کی باڈی تھی اور اسٹیشن ویگن کا انجن والا حصہ۔ جب میں مشین گن کی طرف لپک رہا تھا تو میں نے دھماکا سنا اور پلٹ کر دیکھا تو مرسیڈیز دو بار الٹنے اور سیدھا ہونے کے بعد پھر الٹ چکی تھی۔ اسٹیشن ویگن ایک بار الٹنے کے بعد بھی نہیں رکی تھی اور اس سے دوبارہ ٹکرا کے ایک سائڈ پر رک گئی تھی۔

میں مشین گن ہاتھ میں لیے کھڑا ہوا تھا کہ مونی بھاگتی ہوئی میرے پاس آگئی۔ ابھی تک میں نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

"تم... تم ٹھیک ہو نا؟" وہ ہانپتے ہوئے بولی۔

میں چونک کر پلٹا۔ "تم... بے وقوف..." میں نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف جھٹک دیا۔ "مرنا چاہتی ہو... خبردار جو سر بھی اٹھایا۔"

وہ سڑک سے قدرے نشیب میں جا پڑی اور میں مخالف سمت میں مڑ کر اس جگہ سے چند گز کے فاصلے پر لیٹ گیا۔ جہاں مرسیڈیز کا تباہ شدہ ڈھانچا پڑا ہوا تھا۔ میرے کان ان لوگوں کی آوازیں سن رہے تھے جو بچی ہوئی کار کے اندر ہی پھنس کر رہ گئے تھے اور شاید بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ اس بات کا بہت ہی کم امکان تھا کہ ان میں سے کوئی بچ سکے... وہ شدید زخمی ہوئے تھے اور بری طرح چلا رہے تھے۔

آہستہ آہستہ میں کار کے قریب ہو گیا... میرے لیے سب سے زیادہ اطمینان کا سبب یہ تھا کہ کسی گاڑی میں آگ نہیں لگی تھی۔ زخمی پھنسنے والے اگر باہر نکلنے کے قابل ہوتے تو اب تک نکل آئے ہوتے

لیکن دو بار سائڈ پر الٹ کر سیدھی ہونے والی اور پھر الٹ جانے والی گاڑی کے دروازے اتنے اندر دب چکے تھے کہ اب ان کے کھلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر مرسیڈیز کو بھی سامنے سے ٹکر لگتی تو شاید وہ بچ جاتے۔ کار کا انجن تباہ ہوتا لیکن باڈی محفوظ رہتی... گاڑی کو آڑا اکھڑا کر کے انھوں نے خود اپنی موت کا سامان کیا تھا۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں اسی طرح رینگتا ہوا گاڑی تک پہنچا۔

گاڑی کے اندر چار افراد تھے۔ ان میں سے دو کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ وہ مر چکے ہیں... وہ آگے ڈرائیور اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر تھے۔ ان کے ہاتھ پیر ٹوٹ کر کچھ اس انداز سے اسٹیئرنگ وہیل، سیٹوں اور کھڑکیوں کے درمیان پھنس گئے تھے کہ گاڑی کو کاٹے بغیر انھیں نکالا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ خون کے دھارے ان کے جسم کے ہر حصے سے پھوٹ رہے تھے اور ان کے چہرے کی جانب سے کھلی آنکھوں میں حیرت کا افسانہ لیے بیٹھے ہوئے تھے۔

باقی دو پیچھے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا۔ وہ نواب خسرو جمشید تھا۔ اس کی شیروانی اور طرہ و کلاہ و دستار سب خون رنگ ہو چکے تھے۔ وہ بھی اپنے دوسرے ساتھی کی طرح شدید زخمی تھا اور مدد کے لیے چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا دوسرا شخص ایسی خراب حالت میں تھا اور دم توڑ رہا تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اسے کہاں زیادہ چوٹ آئی ہوگی کیونکہ وہ سر سے پیر تک لہو میں ڈوبا ہوا تھا۔

نواب خسرو جمشید سیٹ کے درمیان دوہرا ہو جانے سے اور دروازوں کے اندر گھس جانے سے اس طرح پھنس چکا تھا کہ میں اسے کسی طرح بھی کھینچ کر باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ میں نے دونوں جانب کے دروازوں کو دیکھا کہ شاید کوئی کھولا جا سکے مگر ان کے تو ہینڈل تک ٹوٹ چکے تھے اور جسم کے چڑمڑ ہو جانے کے بعد دروازے جیسے چوکھٹ کے اندر گھس گئے تھے۔ میں نے کسی دروازے کو ہاتھ لگا کے کھولنے کی کوشش کا بھی کوئی فائدہ نہ دیکھا۔ تصادم نے شیشوں کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا اور یہ کانچ کے ٹوٹے ہوئے والے ٹکڑوں کی طرح اندر بیٹھنے والوں کے جسم کو کاٹتے اور چھیلتے ہوئے گزرے تھے اور ان کی جلد میں پیوست ہو گئے تھے۔

پیچھے کی طرف زمین پر بیٹھ کے میں نے خسرو جمشید کو دیکھا۔ وہ الٹا پھنسا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں اوپر دو سیٹوں کے شکنجے میں کسی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھ اپنے ہی جسم کے نیچے آ گئے تھے۔ جھٹکے یا کرب میں بل کھا کے اس کا جسم گھوم گیا تھا اور میں اس کا ہنسنا اور چیخ اس خلا میں دیکھ سکتا تھا جو ونڈ شیلڈ کے غائب ہو جانے سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی کی پوزیشن بالکل الٹی تھی۔

سر کے بل نیچے گرا تھا اور اس کا سر فرش پر پچھلی سیٹوں کے درمیان آ گیا تھا۔ پیچھے سے اوپر تک شکستہ دھڑ بھی میری نظروں سے اوجھل تھا۔ ادھر صرف اس کی دونوں ٹانگیں تھیں جو وہ مسلسل چلا رہا تھا جیسے وہ لوگ کسی آسن کے مطابق الٹ ہو کے ہوا میں سائیکل چلانے کی مشق کر رہا ہو... اس کے حلق سے نکلنے والی بھیانک آوازوں کو سن کے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کتنے شدید عذاب سے گزر رہا ہے۔

خسرو جمشید کی ناک اور آنکھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ شاید شیشے کے ٹکڑے اس کی آنکھوں میں گھس گئے تھے۔ اب وہ اندھا تھا اور مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"نواب خسرو جمشید" میں نے اسے آواز دی۔

"کو... کون... کون...؟" وہ بلبلایا۔

"میں سکندر بخت ہوں جمشید..." میں نے کہا۔

"سکندر... سکندر مجھے نکالو... میری مدد کرو... ورنہ... میں مر جاؤں... گا..." وہ چلانے لگا۔

"میں اکیلا ہوں جمشید... اور خالی ہاتھوں سے تم کو نہیں نکال سکتا..."

"مجھے نکالو... سکندر... خدا کے لیے..." وہ چیخنے لگا۔ "مجھے معاف کر دو... میں مجرم ہوں تمہارا..."

"جمشید... اس وقت کے آنے سے پہلے تم ایسا نہیں سوچتے تھے... اور چند منٹ قبل بھی تمھیں خیال تھا تو صرف مجھے مشین گن سے بھون کر چھلنی کر دینے کا۔" میں نے کہا۔ "لیکن تقدیر نے پلک جھپکتے میں تمہارے وجود کو اپنی طاقت کے غرور اور برتری کے زعم کے ساتھ خاک و خون میں ملا دیا۔ اس حالت میں بھی تم میرے دشمن تو ہو... مگر میں تم سے دشمنی نہیں نکال سکتا... دشمن جب زبردست ہو اور اتنا بے بس ہو تو اس پر طاقت آزمائی میں کوئی مردانگی نہیں..."

"سکندر... یہ سب ٹھیک ہے... یہ میرے اعمال کی سزا ہے یا... تمہارے ساتھ... ہونے والے ظلم... کا بدلہ... لیکن اس وقت تم مجھے بچا لو... مجھے مرنے مت دو۔"

"جمشید... یہ میرے بس میں ہوتا تو میں ضرور کرتا۔" میں نے کہا۔

"تم جھوٹ... بولتے ہو... تم کچھ بھی کرنا نہیں چاہتے..." وہ چیخنے لگا... "تم... مجھے نکال سکتے ہو... مگر نکالنا نہیں چاہتے..."

"تم دیکھ نہیں سکتے جمشید کہ تم کس بری طرح پھنسے ہوئے ہو... تمہیں گاڑی کو کاٹ کے نکالا جا سکتا ہے یا ٹانگیں کاٹ کے اور یہ دونوں کام میں کیسے کر سکتا ہوں... میرے پاس لوہا کاٹنے والی آری تو کیا چھری تک نہیں ہے... اور تمہاری ٹانگیں کاٹ کے نکال لیا جائے تب بھی کیا تم زندہ رہو گے... تمہارا بہت خون بہہ گیا ہے..."

"خدا کے لیے کسی کو... لاؤ... جو تمہاری مدد کرے..."

"سوری جمشید... یہاں میلوں تک کوئی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اس حالت میں تم زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکو گے۔"

"نہیں... تم جھوٹے ہو... جھوٹ بکتے ہو... میں زندہ رہوں گا... مجھے زندہ رہنے دو سکندر... میری مدد کرو..." وہ پاگلوں کی طرح رونے لگا۔

"یہ سب پیسے کا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم یہ سوچ چاہتے ہو کہ بچ جاؤ گے... اگر میں مدد لینے جاؤں تب بھی میری واپسی شام سے پہلے نہیں ہو سکتی کیونکہ مجھے اپنے ساتھ گاڑی کو کاٹنے والے لے کر... ایمبولینس سب لانے ہوں گے... اور یہ سب کچھ شہر میں ملتا ہے... شام تک تم اسی طرح پھنسے رہے تو کیسے زندہ رہو گے... تمہارے جسم میں جتنا خون ہے وہ ایک گھنٹے میں قطرہ قطرہ بہہ جائے گا۔" میں نے کہا۔

وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ "تم میرے قاتل ہو... تم نے مارا ہے مجھے۔"

"نہیں جمشید... تمہارے ارادوں نے تمہیں مارا۔" میں نے کہا۔ "راستہ تم نے روکا تھا... مجھے قتل کرنے کے لیے... اس وقت تم سوچ بھی نہیں رہے تھے کہ یہ دام اجل تم خود اپنے لیے پھیلا رہے ہو... تم بہت تجربہ کار اور پرانے شکاری تھے مگر اجل تم سے زیادہ عیار شکاری ہے... جو ازل سے آج تک تم جیسے اور تم جیسے انسانوں کے غرور کو شکست دیتی آئی ہے اور اسے اپنی بے بسی اور بے خبری کا احساس دلاتی آئی ہے... اور ایک طے شدہ مگر غیبی انتظام کے تحت شکار ہونے والوں کو گھیر کر وقت کے اس لمحے تک اور اس مقام تک لاتی رہتی ہے جہاں انھیں اپنی افلاطونیت، رعونت اور یقین کی قوت کے ساتھ فرشتۂ اجل کی موجودگی میں آخری سانس لینی ہوتی ہے۔ اس وقت دنیا کی کوئی طاقت انھیں نہیں بچا سکتی ہے جیسے تم نے آج مجھے بچا لیا۔ اس کے وسیع امکانات میں بس یہ مجبوری ہے۔ لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا... تم خود کچھ کرنا چاہو تو مرنے سے پہلے کوئی نیکی کر سکتے ہو جو تمہارے سفر آخرت کا توشہ بن جائے۔"

جمشید کا دوسرا ساتھی مر چکا تھا... اس کی ٹانگیں جو قینچی کی طرح چل رہی تھیں ساکت ہو کے نیچے لٹک آئی تھیں اور اس کی فریاد و فغاں کا دلخراش شور ختم ہو گیا تھا... صرف جمشید باقی تھا جو اپنی موت کو سامنے دیکھ رہا تھا لیکن اس سے بچ کے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی سب سے بڑی چیز انسان کو احساس دلاتی ہے کہ اس کی زندگی ایک بے حد ناقابلِ اعتبار اور عارضی قوت کا نمونہ تھی۔ یہ جمشید اس قوت نے اس کے سینے میں دل کی گہرائی اور پرتوں کی بلندی... اور تکبر کی طاقت اور علاوہ کی تسخیر کو ممکن کیا مگر وہ خود ایک مشت خاک سے عبارت تھی۔

مجھے جمشید پر ترس آیا۔ موت سے کسی کو رستگاری ہے مگر کچھ لوگ مرنے میں آسان کی موت بھی باعث رشک ہوتی ہے۔ جمشید کی موت میں صرف سامان عبرت تھا۔ اگر یہی حادثہ کسی شہر کی سڑک پر پیش آتا

تو شاید اُسے بچایا جا سکتا تھا۔ اُسے گاڑی کو کاٹ کے نکال لیا جاتا اور بروقت طبی امداد فراہم ہو جاتی تو تھا وہ معذور زندگی گزارتا مگر زندہ رہتا۔ اُسے موت بھی کہاں آئی جہاں اس کا واحد تماشائی ایک دشمن تھا۔ اور وہ دشمن بھی اُسے معاف کر دینے کے باوجود بچا سکنے سے قاصر تھا... موت ابھی دُور تھی مگر موت کے لمحے نے اُسے قید کر دیا تھا... وہی کار جس کی شان و شوکت جمشید کے لیے وجہِ افتخار تھی، اب موت کا سبب بن گئی تھی۔ اس کی آرام دہ نشستوں پر اس نے طویل فاصلے کی مسافتیں طے کرتے ہوئے کامیابیوں کے بہت سے سفر کیے تھے مگر آج انہی سیٹوں نے اُسے جکڑ رکھا تھا کہ ٹھہرو... یہیں اٹک کر موت کی راہ دیکھو... روح قبض کرنے والا فرشتہ ابھی کہیں اور مصروف ہے لیکن اس کو یہاں بھی آنا ہے۔ اور تب تک یہ ہمارا کام ہے کہ تمہیں روکے رکھیں۔

"جمشید..." میں نے بہت دکھ کے ساتھ روتے ہوئے بے بس آدمی کو دیکھا۔ "آخری وقت کی توبہ قبول نہیں ہوتی... مگر آخری وقت کی نیکی ضرور کام آ جاتی ہے... کیا تم سچ بولنے کے لیے تیار ہو...؟"

"ہاں... اب بھی سچ نہ بولا تو کب بولوں گا..." وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "مگر پہلے ایک بات سن لو... میں نواب خسرو جمشید نہیں ہوں۔"

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ "کیا...!"

"میں... نواب خسرو جمشید نہیں ہوں۔" اس نے دہرایا۔

"پھر تم کون ہو؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اس کا غلام..." وہ بولا۔ "اس کے حکم پر... اس کی جگہ لینے والا... اور اس کی جگہ... مرنے والا..."

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کیا یہ خیال پہلے نہیں آیا تھا تم کو... کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے... اس کی جگہ تم نشانہ بن سکتے ہو... تم کو معلوم تھا کہ وہ کس قسم کے کاروبار میں ملوث ہے... اس کی جان کے دشمن کتنے ہیں... اس کے باوجود تم نے اپنی زندگی اس کے پاس گروی رکھ دی تھی۔ کیا معاوضہ دیتا تھا وہ تم کو اپنی ڈھال بنانے کا؟"

"بہت... اتنا کہ... کہ میں اور کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا..."

"کب سے تم اس کے ساتھ ہو؟" میں نے کہا۔

"ایک سال سے کم... دو ماہ ہونے ہیں..."

"تمہارا اصلی نام کیا ہے... گھر بار... بیوی بچے ہیں...؟"

"کوئی نہیں... نام ہے گوہر..." وہ چیخ مار کے تڑپا اور اس کے منہ سے خون بہہ نکلا۔

"وہ خسرو کہاں ہے...؟"

"اس وقت... مظفر گڑھ..." وہ مشکل سے بولا۔ "وہاں ایک حویلی ہے..."

"کیا نام ہے اس جگہ کا... جہاں یہ حویلی ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ... رانی کی حویلی کہلاتی... ہے۔" وہ بولا۔ "سب جانتے ہیں..."

"اور نواب خسرو یہاں کب تک ملے گا...؟"

"کل... صبح تک..."

"کیا وہ اکیلا ہو گا؟"

"ہاں... ایک عورت ضرور ہو گی... کوئی فاحشہ..."

"اور اس کے محافظ؟" میں نے کہا۔

"وہ محافظ... ایک ہی تھا... ایک گن مین..." وہ کراہ کر بولا۔ "اندر ملازم ہو سکتے ہیں..."

"گھریلو ملازم؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... دو میاں بیوی... مگر وہ بھی..." وہ سسکی لے کر بولا۔ "آہ مجھے... پیاس لگی ہے..." وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔

"پانی... یہاں پانی کہاں ہے۔" میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"میں لاتی ہوں پانی۔" موتی نے بیک سیٹ سے کہا۔ میں اُلجھن میں پڑا۔ میں اسے بالکل بھولا ہوا تھا لیکن وہ نہ جانے کب سے ساری گفتگو دم سادھے سن رہی تھی۔ میں نے اُسے سامنے پڑی ہوئی اسٹیشن ویگن کی طرف جاتے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ گاڑی کے ریڈی ایٹر سے پانی نکالنا چاہتی تھی... لیکن یہ کام اس کے اکیلے کے بس کا نہیں تھا۔

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ "کبیر...!"

"کیا بات ہے؟" میں نے اٹھتے ہوئے...

وہ اوپر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس دروازے کو کھولنا خاصی دقت سے ہی ممکن تھا۔ میں ایک وہیل پر قدم جما کے اوپر چڑھا اور دروازے کو کھینچ کر کھولا۔ کروٹ کے بل پڑی ہوئی گاڑی کا بھاری دروازہ اپنے وزن سے خود بخود گر کے بند ہونے لگتا تھا۔ میں نے اُسے ایک ہاتھ سے کھینچ کر روکا اور کیبن میں داخل ہو گیا۔ سیٹ خون آلود کھڑی ہوئی تھی... میں نے اوپر سے نیچے پہنچنے کے لیے ہاتھوں کو سہارا بنایا اور بالآخر بونٹ کھولنے والے لیور کو کھینچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ شخص اب پانی... پانی چلا رہا تھا۔

موتی کو بونٹ اٹھانا نہیں پڑا... اس نے بونٹ کو ایک پیٹی کے دروازے کی طرح باہر کھول دیا۔ ریڈی ایٹر اس کے سامنے تھا۔ اس نے اپنا دوپٹہ تر کرنے کے لیے ریڈی ایٹر کیپ کو تھوڑا سا کھولا۔ پانی اس میں سے قطرہ قطرہ اور پتلی سی دھار بن کے بہنے لگا۔ اس نے دوپٹے کو ایک ایسا... جیسے وہ رستی کی طرح ... کر اس کا گیلا سا... چکی تھی۔

لیکن جب وہ بھیگا ہوا دوپٹہ لے کر مرتے ہوئے شخص کے حلق میں پانی نچوڑنے پہنچی تو اسے یہ دیکھ کر صدمہ پہنچا کہ وہ اب پلک

مروت سے بے نیاز ہو چکا ہے۔

"یہ تو مر گیا..." میں نے افسوس سے کہا۔

موتی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ عورتیں طبعاً رقیق القلب ہوتی ہیں۔

"اتنا مجبور سا کیا اس نے جیسے تمہارا دل ہے۔" میں نے موتی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کون کہتا ہے اس وقت یہ نواب جمشید... اس کی موت... شخص کی بلا وقت؟"

"چھوڑو کبیر... اب مرنے والے کو کیا کہنا۔" موتی نے میرا بازو تھام لیا... وہ رو رہی تھی اور اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ شاید ایسی خوفناک موت اس نے پہلے نہیں دیکھی تھی... کچھ دیر پہلے وہ بھی تصور نہیں کر سکتی تھی کہ ایک خاموش صبح کے سفر کا انجام اتنا دردناک ہو گا۔

"مجھے ابھی اس سے اور بہت کچھ پوچھنا تھا۔" میں نے کہا۔

موتی نے ایک ہچکی لی... میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ یہ جسم کا طبعی ردِعمل تھا جو خون کو بہتا نہیں دیکھ سکتا اور انسانی خون کا ایسا نظارہ کمزور طبیعت رکھنے والوں کے اعصاب پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔

وہ گرنے ہی والی تھی کہ میں نے اُسے سنبھال لیا اور دونوں ہاتھوں میں اٹھا کے دور لے گیا۔ سڑک سے چند قدم کے فاصلے پر مجھے ایک سرسبز قطعہ زمین نظر آیا۔ میں نے موتی کو وہاں لٹا دیا اور لوٹ کر بھیگا ہوا دوپٹہ لے لیا۔ اُسے موتی نے اوندھی پڑی ہوئی کار کے ایک کونے پر لٹکا دیا تھا۔ کچھ پانی جمع ہو گیا تھا مگر اُسے نچوڑ کر کام چلایا جا سکتا تھا۔

میں واپس آیا تو موتی بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے دانت آپس میں مضبوطی سے جڑ گئے تھے اور ہاتھ پاؤں اینٹھ چکے تھے۔ خاصی کوشش کے بعد میں اس کا منہ کھول کے پانی کے چند قطرے ٹپکانے میں کامیاب ہو گیا۔ گیلا دوپٹہ میں نے اس کے چہرے پر پھیرا اور اس کے گلے، بازوؤں اور پیروں پر پھیرا لیکن اسے ہوش نہ آیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مجبوراً میں نے اُسے وہیں چھوڑا اور لوٹ کر اسٹیشن ویگن کی طرف گیا۔ اس کے پچھلے دروازے کو کھولنا نسبتاً آسان کام تھا۔ دو تین سوٹ کیس لڑھک کر اس ساحل پر گر گئے تھے جو سڑک سے نیچی ہوئی تھی... میں نے انہیں باہر کھینچ لیا۔ ایک ایک کر کے میں دونوں سوٹ کیس سڑک سے بہت دور لے گیا... وہاں خودرو جنگلی جھاڑیوں کا ایک گھنا سا قطعہ تھا۔ میں نے انہیں جھاڑیوں کے درمیان پھینک دیا۔ اب سڑک پر سے تو کیا قریب سے بھی کسی کی نظر انہیں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسٹیشن ویگن کے پچھلے حصے میں مرنے والوں کا اسلحہ بھی مل سکتا تھا۔ ریوالور اور کافی گولیاں میرے حق میں تھیں، جن میں سے ایک میں نے جیب میں اور ایک بیلٹ کے نیچے چھپا لیا۔ ریشم کی

میری جیب میں معروف تھی۔ اسے بھی میں نے جھاڑیوں میں اچھال دیا۔

موتی کراہنے لگی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بہت جلد ہوش میں آ جائے گی۔ میں تیزی سے تباہ شدہ مرسیڈیز تک گیا جس میں چار لاشوں کا عدد اب مکمل ہو چکا تھا۔ اس کی کراہت پیدا کرنے والی بُو ذہن کو ماؤف کر رہی تھی مگر میں نے دل کڑا کر کے اندر جھانکا۔ اگر میں کوشش کرتا تو آگے کی سیٹ پر پڑی ہوئی دونوں لاشوں کی جامہ تلاشی کے لیے ہاتھ اندر پہنچا سکتا تھا مگر اس طرح میرے ہاتھ خون میں بھر جاتے۔ پیچھے ایک شخص کی طرف ٹانگیں اوپر تھیں لیکن خسرو جمشید کی ڈمی کی جیب تک پہنچنا مشکل نہ تھا۔ مشکل وہی تھی کہ اپنے ہاتھوں پر لہو کا داغ آ جاتا۔

موتی کی آواز پر میں واپس دوڑا... وہ مجھے پکار رہی تھی۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"موتی...!" میں نے اس کے قریب بیٹھ کے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ "ہوش میں آؤ۔"

وہ دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئی۔ "چلو... یہاں سے نکل چلو۔"

"چلتے ہیں۔" میں نے اسے نرمی سے الگ کیا۔ "پہلے تمہاری حالت تو اس قابل ہو جائے... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی کم حوصلہ ہو۔"

"یہاں سے چلو کبیر... کوئی آ جائے گا..."

"آ جائے گا تو ہمیں کیا...؟"

"ہم پکڑے جائیں گے۔" وہ کانپتے ہوئے بولی۔

"کیوں... ہم نے کیا کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ... سب ہماری وجہ سے..."

"پاگل... کسی کو کیا معلوم کہ اس دوسری گاڑی میں کون تھا۔" میں نے کہا۔ "جو مر گئے، وہ تو کچھ بتانے سے رہے... اب رہے ہم تو ہمیں بھی کچھ معلوم نہیں کہ حادثہ کب ہوا تھا اور کیسے ہوا تھا... ہم تو یہاں سے پیدل گزر رہے تھے۔ اگر راستے میں کوئی نظر آیا تو ہم یہی کہیں گے۔ لیکن ہمارا یہاں رُکنا کسی صورت مناسب نہیں... خدا کا شکر ہے کہ آس پاس کوئی نہیں تھا اور اس آدھے گھنٹے میں کوئی آیا بھی نہیں۔ کیا تم چل سکتی ہو؟"

"میں کوشش کروں گی۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تم کو اٹھا کر نہیں چل سکتا۔" میں نے کہا۔

"کتنی دور جانا ہے کبیر؟" موتی نے میرے کندھے کا سہارا لے کر کہا۔

"معلوم نہیں... سڑک کے ساتھ جانے کتنا فاصلہ ہے۔" میں نے کہا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ فوری طور پر میں چاہتا تھا کہ اس جگہ سے جتنا بھی دور جا سکوں اچھا ہے۔ پھر کوئی جگہ مل جائے جہاں ہم چھپ کر آرام کر لیں۔ تھکن اور بھوک پیاس سے ہم دونوں کی حالت

www.paksociety.com

غیر ہو رہی تھی لیکن یہاں ہماشے سے پتھروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

رک رک کر قدم قدم چلتے ہوئے ہم بالآخر ایک فرلانگ دور چلے گئے۔ ہم سڑک سے پچاس گز دور ہٹتے ہوئے سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے رہے تھے... سڑک کو نظروں میں رکھنا ضروری تھا ورنہ ہم اس ویرانے میں بھٹک جاتے۔

دو فرلانگ کے بعد امید کی ہلکی روشنی نے مجھے سہارا دیا... سڑک پر دائیں جانب ایک کچا راستہ نمودار ہوا۔ اس راستے پر میں نے دور سے آتی ہوئی بیل گاڑی کو دیکھا... میں رک گیا اور میں نے موہنی کو ایک کیکر کی دھوپ چھاؤں میں بٹھا دیا۔ بیل گاڑی آہستہ آہستہ قریب آ گئی۔ اسے بارہ چودہ سال کا ایک لڑکا چلا رہا تھا۔ اس نے ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"دیکھو بچے... کیا تم ہماری تھوڑی سی مدد کر سکتے ہو؟" میں نے بچے کے راستے کے درمیان میں آ کے کہا۔

"کیسی مدد؟" لڑکے نے پنجابی میں کہا۔

"میری بیوی بیمار ہے...؟"

"اچھا اچھا... تو آپ کو حکیم جی کے پاس جانا ہے... مگر وہ تو اُدھر جانے کے گاؤں سے بھی چار کوس دور بیٹھتے ہیں۔" لڑکا بولا۔ "میں واپس جاؤں گا تو ابا مارے گا۔"

"نہیں واپس نہیں جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں اُدھر آگے کے گاؤں... کھل سوتری لینے۔" وہ بولا۔

"اُدھر؟" میں نے اس کے ہاتھوں کی سمت کو دیکھا۔ "کتنی دور ہے یہ گاؤں...؟"

"یہ تو پتا نہیں۔" وہ بولا۔ "میں اس وقت جاتا ہوں تو شام تک گھر واپس پہنچ جاتا ہوں۔"

"اچھا وہ بڑا گاؤں ہے... تو وہاں کوئی سواری بھی مل جائے گی؟"

"ہاں جی... تانگہ بھی شاید مل جائے... ورنہ بس جاتی ہوں گی... آپ کو جانا ہے تو میرے ساتھ بیٹھو۔" وہ بولا۔

میں نے موہنی کو پیچھے بٹھایا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

بیل گاڑی ہچکولے لیتی ہوئی چلنے لگی۔

"آپ... کدھر کے رہنے والے ہو جی...؟" لڑکے نے بالآخر وہ سوال کر لیا جس کا مجھے انتظار تھا... گاؤں کے رہنے والے اپنے علاقے میں ہر اجنبی کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔

"ہم یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں۔" میں نے اسے گول مول جواب دیا۔

"وہ تو مجھے پتا ہے۔" وہ بیلوں کی دُم مروڑ کے بولا۔

"تمہیں کیسے پتا ہے؟"

"تم کوئی گاؤں کے رہنے والے ہو؟" وہ بولا۔ "تم شہری بندے ہو۔"

"تم ہر گاؤں سے واقف ہو؟" میں نے کہا۔

"آس پاس دس کوس تک۔" اس نے ہاتھ کو ... میں حرکت دے کر کہا۔

"ہم ملتان سے آ رہے تھے۔" میں نے اعتراف کیا ...

"پیدل آ رہے تھے؟" وہ لڑکا سخت ...

"نہیں یار... چند دوست تھے ساتھ... سب ... آ گئے تھے۔"

"اچھا... جبھی کل رات ٹھاہ ٹھاہ ہو رہی تھی؟" وہ بولا۔

"تم نے سُنی تھی گولیاں چلنے کی آواز؟" میں نے کہا۔

"میں نے تو نہیں... لیکن ابا جی نے سُنی تھیں... سوتا ہے نا..." لڑکا بولا۔ "تمہارے وہ دوست کدھر گئے؟"

"یہ تو ہمیں بھی نہیں معلوم۔" میں نے سکون سے کہا۔ "ہم تو ان کے ساتھ ہوتے... تمہارے چودھری ..."

"کس میں؟" لڑکے کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے میں نے ... گاڑی کو بہت افسوسناک کہانی سنا دی ہے۔

"چودھری جہاز ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

لڑکا واقعات لگانے لگا۔ "کیا تم ان سے بچھڑ گئے تھے؟"

"ہاں دوست... فلمی کہانیوں میں ایسا ہی ہوتا ہے..."

موہنی کو دیکھ کر وہ بھڑکی۔ "کیا تم فلمیں دیکھتے ہو؟"

"ایک دیکھی تھی... بچے والی..." وہ بولا۔ "ابا نے ... مارا تھا۔ حالانکہ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ مسرت نذیر کیا غضب ... ہے جب ٹوپی سر پہ رکھ کے نکڑ چلاتی ہے۔"

"تمہیں بتایا تھا؟"

"میں نے سُن لیا تھا... وہ اپنے یاروں کے سامنے ... رہا تھا کہ اس نے پچھلے دنوں سات دن تک روز دیکھی ہے..."

اور بیل گاڑی کو دوسری طرف جانے والے ... موڑ لیا... یہ راستہ چھوٹی سڑک پر ... لڑکا ایک ماہر گاڑی بان اور بیلوں کی رفتار ... بطور ایکسیلیٹر استعمال کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک نوکیلی لکڑی بھی تھی جو بیلوں کی دُم کو مہارت سے مروڑ کے چبھوتا تھا تو بیل دوڑنے لگتے تھے۔ بیلوں کا ... باعث ... صبح اب دوپہر میں ڈھلنے لگی تھی۔ سورج آسمان پر آ گیا تھا۔ دھوپ کی تمازت ناقابلِ برداشت ہونے لگی تھی۔ خود میرا حلق خشک ہونے لگا تھا۔ میری زبان پر کانٹے پڑ رہے تھے۔ موہنی کی حالت زیادہ خراب تھی۔ وہ نیم بے ہوش سی گاڑی میں پڑی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے ایک ٹیوب ویل نظر آیا... اس کا رہٹ گھوم رہا تھا اور شفاف ٹھنڈے پانی کی ... کنوئیں کی گہرائی سے طلوع ہو کے ایک نالی میں گرتے جا رہے تھے۔

میرے کہنے سے لڑکے نے گاڑی روک لی۔ میں نے موہنی کو سہارا دے کر اتارا اور ہم نے گھٹنوں کے بل جھک کر منہ لگایا اور چوپایوں کی طرح پانی پیا۔ اس کی ٹھنڈک ... تک اور آتش ... راحت اور سکون کا احساس رگ رگ میں اترتا گیا۔ شاید ... کسی اعلیٰ ترین ... ہوٹل اور ریسٹورنٹ میں بہترین مشروب ... کا بھی اتنا لطف حاصل نہ کیا ہوگا جتنا اس بچے کے ٹیوب ویل سے نکلنے والی سوندھی سوندھی خوشبو رکھنے والے پانی سے ملا۔

میں نے اس پانی سے اپنے ہاتھ دھوئے اور منہ پر چھپکے مارے۔ موہنی نے پانی کے بہتے دھارے میں سر رکھ دیا اور اس کی ... سر کو تراوٹ پہنچنے لگی۔ میں نے ... اور اگرچہ صرف پانی تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس پانی نے مجھے نئی توانائی بخش دی ہے ... اس نیم غسل سے تازہ دم ہو گیا تھا۔

موہنی نے سر نہیں بھگویا تھا لیکن ہاتھ منہ دھونے کے بعد اس نے پانی کے دھارے میں پیر ڈبو دیے تھے اور جب میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دی تھی۔ اس کا رنگ روپ ... مسکراہٹ بالکل ... اور اُجلے ہو گئے تھے ... پہلے ہمیں دیکھ کر حیران ہوا تھا اور اب خوشی سے مسکرا رہا تھا۔ اس ... چودھری کے پائلٹ نے اسے ہمارے متعلق ضروری معلومات فراہم کر دی تھیں۔ اس نے اصرار کیا کہ ہم اس کے ساتھ چل کے روٹی شوٹی کھائیں اور لسی وسی پئیں۔ مگر ہم نے شکریہ ادا کر کے رخصت ہو جانا بہتر سمجھا کیونکہ منزل اب بہت قریب تھی۔

گاؤں ایک میل کے بعد آ گیا اور ابھی کچے مکان شروع ہی ہوئے تھے کہ ایک موڑ پر منڈی آ گئی۔ یہ ایک دیہاتی مارکیٹ تھی جس میں حضرات اور خواتین کی مساوی تعداد خرید و فروخت کر رہی تھی۔ سارا بازار ہمیں دیکھ کر لین دین بھول گیا۔ نوجوان گاڑی بان بڑے فخر کے ساتھ ہمیں سب کے درمیان سے یوں گزار کے لے گیا جیسے بیل گاڑی نہیں چاند گاڑی ہے اور وہ خود نیل آرمسٹرونگ ہے جو چاند سے واپس لوٹا ہے تو اپنے ساتھ وہاں کی مخلوق کے نمونے لایا ہے۔

اس ... آدمی ... نے موہنی کو بہت نروس کیا۔

"یہ لوگ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے؟"

"نہیں... تم دیکھنے کی چیز ہو..." میں نے کہا۔ "کیوں نہ دیکھیں؟"

"... تو تم بھی ہو۔"

"جب آسمان پر بیک وقت چاند اور سورج نظر آ رہے ہوں تو آنکھیں ... سورج کی روشنی سے چندھیا جاتی ہیں۔" میں نے کہا۔

بیل گاڑی رک گئی۔ وہ ایک چوک سا تھا جہاں چار درخت اور ... میں آ کے ملتی ہوئی گلیاں ملتی تھیں۔ ... ڈاڑھی والے بابا اور گٹھے ہوئے سروں والے نوجوان لنگیاں باندھے اور ... پہنے کالی پڑ جانے والی بان کی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ ... میں لٹکانے اور چاندی کے گڑوے ... حقوں ... کی ایک جماعت فرشی ... پر قیام پذیر تھی — ان میں مجھے سب بوڑھی اور تیزی سے بڑھاپے کی طرف بڑھنے والی نظر آئیں۔ ایسے مجمع کے درمیان ہم نے خود کو زمین پر آ گرنے والی خلائی مخلوق کی طرح محسوس کیا۔

وہ ایک لسی اور چائے کا ہوٹل تھا۔ اس کے سامنے دو تانگے اور دو رکشے بھی کھڑے تھے۔ وہاں ہر چیز اونگھتی ہوئی لگتی تھی یا پھر ہنکارتی ہوئی۔

"یہ شکاری ہیں۔" ہمیں لانے والے چھوٹے چودھری کے پائلٹ نے اچانک اعلان کیا۔ مجمع ایک بار پھر دم بخود رہ گیا۔ انھوں نے کبھی ایسے شکاری نہیں دیکھے تھے جن کے پاس بندوق کیا غلیل تک نہ ہو لیکن ایک میم ٹائپ کوہ قاف کی پری ساتھ ہو۔

کچھ دیر میں شکوک اور تجسس کی دھند چھٹ گئی۔ ہماری طرف سے پائلٹ نے ایک وضاحتی بیان جاری کیا اور مجمع گھڑے سے جیسے سر ہلانے لگا... ہم نے صرف مسکرانا جاری رکھا۔

"اچھا بھئی نوجوان..." میں نے لڑکے کو تھپکی دے کر ایک پچاس کا نوٹ پیش کیا۔ "بڑی مہربانی تمہاری اب تم جاؤ۔"

لڑکے نے کچھ نہیں کہا۔ اس کی آنکھیں پچاس کے نوٹ پہ جم کے رہ گئی تھیں۔ باقی لوگ بھی اس اسراف ... سے پریشان تھے۔

"ملے نو..." موہنی نے کہا۔ "تم بہت اچھے لڑکے ہو۔"

لڑکے کا سماجی مرتبہ اس تعریفی سند سے بہت بلند ہو گیا تھا جو اسے سب کے سامنے عطا کی گئی تھی۔ اس نے پچاس کا نوٹ تقریباً جھپٹ کے اپنے کھیسے میں اُڑس لیا۔ پھر وہ ایسے بھاگا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ ہم نوٹ واپس نہ مانگ لیں۔ یا مطالبہ کر دیں کہ وہ دو روپے رکھ کے اڑتالیس واپس کرے۔

"... پیسہ نہیں دینا چاہیے۔" ایک شخص نے حسد میں مبتلا ہو کے مجھے مطعون کیا۔

"وہ شہر بھاگ جائے گا تو ماں باپ کو وحشت ڈالے گا۔" دوسرے بوڑھے نے اس کی تائید کی... میں پریشانی میں مبتلا ہو گیا... سخاوت کا مظاہرہ بھی موقع محل دیکھ کر ہی کرنا چاہیے... یہی انعام میں نے سب کے سامنے نہ دیا ہوتا تو ... اور لڑکا زیادہ خوش ہوتا کہ اس کے باپ یا چاچے کو معلوم نہیں ہوگا۔ اب تو زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ ایک بھاری رسید کر کے باپ اس سے نوٹ نکلوا لے گا۔

میری اور موہنی کی مشکل ہوٹل والے نے آسان کی۔ وہ ایک برآمدے پر مشتمل ریسٹورنٹ تھا۔ برآمدے کی چھت گھاس پھوس اور لکڑیوں سے بنائی گئی تھی مگر عقبی حصے میں ایک کچی دیواروں والا کمرا بھی تھا جس میں ہوٹل والا رات کے وقت اپنا سامان بند کر جاتا ہوگا۔ ہمیں اس وی آئی پی لاؤنج میں مدعو کیا گیا۔ وہاں بھی ایک چارپائی تھی جو ہمیں اندھیرے میں قدم رکھنے کے کچھ دیر بعد دکھائی دی۔ اسی کے سامنے ایک چھوٹی میز لا کے رکھی گئی۔ ہیڈ پائلٹ نے بقلم خود

www.paksociety.com

میز پوش کے قرانفق سنبھالے اور جالے سے لیے اجینش، چلتے بنا کے لایا۔ اس کا ذائقہ بالکل ایسا تھا جیسے اس نے لسی کے دو گلاس چلتے کی پتی ڈال کے ابال دیے ہوں۔ کھانے کے لیے کہیں سے لنگ سا مزنگ گرم جلیبی و آمد کی گئی جو مقامی بولی میں جلیب کہلاتی تھی... جلیبی کا ذائقہ... اس کی تازگی کا یہ عالم تھا کہ اس میں سے گرم گرم شیرا ٹپک رہا تھا اور ٹھنڈا ہوتے ہی وہ اپنی گڑ کی شکل اختیار کر رہا تھا۔

تاہم جب پیٹ میں دوڑنے والے چوہے بھی بھوک سے بے ہوش ہو چکے ہوں اور قُل ہو اللہ پڑھنے والی آنتیں انا للہ کا ورد کرنے لگی ہوں تو محاورے کے مطابق گدھا بھی باپ لگتے ہیں... وہ جلیب اور چائے جیسا گرم مشروب اس وقت کسی سینڈوچ اور بلیک کافی سے زیادہ پُر لطف اور تازگی دینے والے ثابت ہوئے۔ میلا پنجابی لوں خیریت کی دیوار گرانے اور اجنبیت کی فضا کے ختم کرنے میں بے حد مددگار ثابت ہوا۔

"مجھے کوئی سواری چاہیے... مثلاً تانگا۔" میں نے ہوٹل والے سے کہا۔ وہ ایک سابق پہلوان اور علاقے کا رستم زماں تھا۔ اب اس کی دیگ جیسی توند لٹکنے لگی تھی مگر قد کاٹھ سے وہ اب بھی اپنے ماضی کے دھندلا جانے والے آئینے کا عکس نظر آتا تھا۔ مونچھیں تو اس کی مونچھیں دیکھ کر یہی جا رہی تھی جو گالوں کے دونوں جانب چھ چھ انچ تک پھیلی ہوئی تھیں اور بڑے خطرناک انداز میں اٹھی رہتی تھیں مگر وہ ایک نرم گفتار اور شگفتہ مزاج شخص تھا۔

"تانگہ... ایک نہیں دو دو کا حکم کرو تو وہ حاضر۔" وہ بولا۔

"نہیں پہلوان جی... ابھی تو ایک ہی کافی ہے۔" میں نے کہا۔

"جانا کہاں ہے؟" وہ بولا۔

"اس جگہ کا نام... تو معلوم نہیں کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ لڑکا جو تانگا جو مجھے یہاں لایا تھا... ادھر سے واپس جا کے... سڑک پہ پیچھے کی جانب تقریباً ایک میل پہ ہمارا سامان پڑا ہے...۔"

"کوئی بندہ بیٹھا ہے ادھر؟"

"نہیں... ہم نے جھاڑیوں میں رکھ دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "بس دو سوٹ کیس ہیں... وہ اٹھانے ہیں اور پھر واپس بڑی سڑک تک جانا ہے۔"

"ملتان روڈ کے اڈے تک؟"

"ہاں... کتنی دور ہے وہ یہاں سے؟" میں نے کہا۔

"ہوگا یہی کوئی... بیس میل..." پہلوان نے کہا۔

"کتنی دیر میں پہنچا دے گا تانگا...؟"

"یہی کوئی... تین گھنٹے..." پہلوان بولا۔ "آپ اُدھر سے پھر کے جاؤ گے تو چار گھنٹے...۔"

"اچھا تو پہلوان جی... تم ہی کسی سے طے کر دو۔"

"کیا طے کرنا ہے؟"

"یہی... کرایہ... مجھے تو کچھ اندازہ نہیں۔" میں نے کہا۔

"او بادشاہو... آپ بھی کمال کرتے ہو۔" پہلوان بولا۔ "جو آپ کے زیادہ ہے... آپ مسافر ہو اور میرے علاقے میں مہمان ہو۔ مہمان کو لوٹنے کا تو وہ پھر اپنی ہڈیاں سلامت کیسے لے جائے گا یہاں... جو آپ کی خوشی ہو تھما دینا۔"

پہلوان کو دھوکا دینا... ماحول تھا۔ ایک تو اس نے بتایا تھا کہ میں نے جیپ گاڑی میں سواری کے لیے پچاس روپے کرایہ کی پیشکش دیا تھا... ظاہر ہے میں کنجوس نہیں احمق تھا... وہ پہلوان کے ذاتی مہمان کی حیثیت اختیار کرنے کے بعد مزید خصوصی برتاؤ کا حقدار ہو گئے تھے... شاید وہ حکم دیتا کہ میرے مہمانوں کو تانگا مفت میں... تو تانگے والا ہڈیاں بچانے کے لیے چل پڑتا۔

جب تانگا آ گیا تو میں نے پہلوان کو چائے اور جلیب کی قیمت دینے کی بے وقوفی کی۔ پہلوان کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔

"او رہنے دے باؤ..." اس نے ایک خوفناک تیور دکھا کے کہا۔ "رکھ لے اس نوٹ کو کھیسے میں۔"

میں نے نوٹ کو فوراً واپس لے لیا۔ "معاف کرنا... مجھے پتا نہیں تھا، معلوم ہوتا..."

"او نئے ہو آئے ہو، بے غیرت نہیں ہوتے ہیں ابھی۔" وہ اسی طرح دہاڑ کے بولا۔ "اگر مہمان بھی نہیں ہو اور ... بھی ..."

موتی سہم کر میرے پیچھے ہو گئی تھی کیونکہ وہ پنجابی نہیں سمجھ رہی تھی اور اس کا خیال تھا کہ اب خون خرابہ ہونے ہی والا ہے۔ میں نے دس کا نوٹ پیش کر کے پہلوان کو مشتعل کر دیا تھا اور پھر سو کا نوٹ نکال لینا چاہیے۔

"کیا کر رہے ہو...؟" وہ آہستہ سے بولی۔ میں نے کہا: "تم چپ کر کے دیکھو۔"

موتی نے سر ہلایا اور سو کا نوٹ نکال کے آگے بڑھا دیا۔ "جی ناراض نہ ہوں... پیسے کم تھے تو یہ سب رکھ لیں۔"

کچھ دیر بعد پہلوان نے ایک گونج دار قہقہہ بلند کیا جس میں اس کا تھال جیسا پیٹ اوپر نیچے ہونے لگا۔ "او بھئی..." اس نے اپنا بھاری ہاتھ موتی کے سر پر رکھ دیا۔ "جب بیاہ ہو تو پیسے مانگ... دلہن کا کام ہے دینا۔" دیگر حاضرین نے ہنستے ہوئے سر ہلایا۔ اس نظریے کی توضیح کی تو موتی کو اصل بات کا پتا چلا۔ جب اس نے سب کے ساتھ مجھے بھی ہنستے دیکھا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

تانگے میں بیٹھنے کے بعد بھی اس کا منہ پھولا رہا۔ وہ دوسری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے جانتے بوجھتے اس کا مذاق اڑا دیا تھا۔ "پیسے بچانے کے لیے اسے چاچا جی بنا لیا۔" میں نے

"... وافر نیت تھی..."

"واقعی کیا سوال... تم نے مجھے بے وقوف بنایا سب کے سامنے۔"

"سب کے سامنے میں تمہیں عقل مند کیسے بناتا؟" میں نے کہا۔

"تو تم نے بے وقوف بنا دیا تھا؟"

"تم کیسے بے وقوف بنتے تھے؟"

"تم کو گھر والی بنا کے..." میں نے کہا۔ "لوگ کیسے دیکھ رہے تھے۔"

"کیسے دیکھ رہے تھے؟" وہ مسکراہٹ کو دبا کے بولی۔

"جیسے حور کے پہلو میں لنگور... خدا کی قدرت۔" میں نے کہا۔ وہ ہنس پڑی۔ تانگے والے نے مڑ کے دیکھا... پھر گھوڑے نے بھی گردن گھمائی۔ "ہاں... دیکھ لو... تیری مرضی..." تانگے والے نے اس کی دُم کے قریب چابک مار کے کہا۔ گھوڑا اچھلا اور ہم گرتے گرتے بچے۔ ہمارے ساتھ تانگے والا بھی ہنسنے لگا۔

میری ہنسی اس وقت کافور ہوئی جب میں نے دور سے ہی جائے حادثہ پہ اجتماع دیکھا۔ آتی دیر میں دونوں گاڑیوں کے ٹکرانے کی خبر کسی ذریعے سے آگے اور پیچھے تک پہنچ گئی تھی اور اب جو لوگ وہاں جمع تھے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ دوست ثابت ہوں گے یا دشمن۔

"یہ... آگے تو سڑک بند ہے۔" میں نے کہا۔

تانگے والے نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ "سڑک کیوں بند ہے؟"

"دیکھ نہیں رہے ہو... لوگ جمع ہیں... حادثہ ہوا ہے کوئی..."

"ہوا ہے... مسافر اُتریں گے... لوگ خود ہی راستہ دے دیں گے۔" تانگے والے نے...

"نہیں... تم تانگا موڑ لو۔" میں نے اسے تند لہجے میں سختی سے کہا۔ "واپس چلو ملتان روڈ کی طرف۔"

"سامان نہیں اٹھانا؟"

"ابھی نہیں اٹھانا..." میں نے کہا۔

"پھر کب اٹھاؤ گے؟"

"فضول بکواس بند کرو اور تانگا موڑو۔" میں نے بے رخی سے کہا۔

تانگا آہستہ آہستہ گھوم کر واپس ہوا اور ملتان روڈ کی طرف چلنے لگا۔ وہاں سے دو فرلانگ واپسی کا سفر طے کرنے تک میرا دل اس خوف کا شکار رہا کہ کہیں پیچھے والوں نے دیکھ نہ لیا ہو... تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ وہ مجھے اور موتی کو اچھی طرح سے پہچانتے تھے۔ کہیں انھیں اپنی طرف آنے والے تانگے کا اچانک واپس ہونا مشکوک نہ لگے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا... لوگ دونوں کاروں کے اور چار مرنے والوں کے نقصان کو دیکھ رہے تھے۔ ایک دیہاتی تانگے سے انھیں دلچسپی نہیں تھی جو راستے میں رکا وہ دیکھ کے واپس چلا گیا... یہ بھی ممکن تھا کہ حادثے کی جگہ پر پہنچنے والے غیر جانبدار لوگ ہوں... لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس راستے پر وہی دشمن سرگرداں ہوں جو میری تلاش میں تھے۔ ان کا ایک اہم مرکز اور واسطے سے جڑا ہوا ایک ٹرک ضائع ہو گیا تھا۔ تربیت یافتہ کتے اور انھیں تربیت دینے والے مارے گئے تھے اور نقصانات کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ شہزادی ایک مرسڈیز پارٹی لوٹا چکی تھی اور اب یہ دونوں گاڑیاں اور ان کے سب مسافر خود اپنی داستانِ عبرت کہہ رہے تھے۔ شکاری اپنی بڑی شکست سے کتنے آتش زیر پا ہو گئے، اس کا میں اندازہ کر سکتا تھا۔

اگر میرے لیے ممکن ہوتا تو میں واپسی کے لیے بھی کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتا اور اس سڑک سے بھی دور رہتا جس پر کسی وقت بھی کوئی شکاری ہمارے تعاقب میں آ سکتا تھا یا ہمیں سامنے سے گھیر سکتا تھا۔ تانگا ایک بیزار کن یکساں رفتار سے چلتا جا رہا تھا۔ اس کی رفتار میں تسلسل کے مطابق کوچوان نے بے حد محنت سے مسحور کر دیا تھا... ہم نے جس کے ساتھ نہایت غیر دوستانہ رویہ اختیار کیا تھا، اگر وہ مجھ پر شہر ہوتا تو کہیں بیچ میں اتار دیتا، جہاں سے ہم نے واپسی کے معاملے میں زبردستی کی تھی۔ ایک طرف تصور سے زیادہ ملنے والے معاوضے کا خیال تھا تو دوسرا پہلوان کا ڈر۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ پھر وقت رینگنے لگا۔ میں آدھے گھنٹے بعد گھڑی دیکھتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ دس منٹ گزرے ہیں... تارکول کی کالے فیتے جیسی سڑک سمٹنے کے بجائے لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ دونوں طرف کے مناظر کی یکسانیت... تیز دھوپ... خاموشی میں گونجنے والی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز... ہچکولے اور اعصابی کشیدگی... یہ سب سفر کو زیادہ بیزار کن بنا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہم خلا میں گردش پذیر ہیں اور یہ سفر کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ موتی بھی خاموش تھی اور اپنے خیالوں میں گم تھی۔ میں نے اندازہ کرنا چاہا کہ اس کے خیالات کیا ہوں گے مگر صورت سے لگتا تھا کہ کچھ بھی نہیں سوچ رہی ہے۔ میں نے خاموشی کے اس وقفے میں چار سگریٹ پیے اور اپنے مستقبل کے لائحہ عمل پہ غور کیا۔

میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب مجھے سڑک کے کنارے ایک چائے خانہ نظر آیا۔ اس کے آگے کھڑی پبلک بس کے سامنے وہی بوسیدہ سی چارپائی ڈال دی گئی تھی جو ہماری تاریخ اور تہذیب کا سب سے بڑا سمبل ہے اور گاؤں سے شہر تک ہر قدر میں ایک ہی صورت رکھتی ہے۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقا کا اطلاق چارپائی اور تکیے پر یا حقے پہ نہیں ہوتا... میں نے اس فضول خیال کو جھٹلا کے تانگے کو روکنے کا حکم دیا۔

میرے لیے تانگے میں طویل ترین سفر کا ریکارڈ پہلے ہی قائم ہو چکا تھا اور ابھی ایک طویل سفر باقی تھا۔ تانگے سے اتر کے مجھے احساس ہوا کہ میرے رگ پٹھے اور جوڑ سب بدستور حرکت میں ہیں۔ جب میں چلا تو میری چال اس مسخرے کی طرح ہو گئی جو اپنی چال

www.paksociety.com

بھول گیا ہو۔ کیفے ڈی پیرس کے عقب میں گھاس تھی اور ایک پتلی سی نالی میں بہتا ہوا صاف پانی بہہ رہا تھا۔ وہاں پانی میں پیر ڈال کے بیٹھنے اور ابلتا ہوا دودھ جیسی چائے کا لیس دار مکسچر پینے کے بعد ہم دونوں سفر کے اگلے مرحلے کے لیے تیار ہو گئے۔

دوسرا مرحلہ زیادہ کٹھن رہا کیونکہ سورج سر کے اوپر سے گزر کے سامنے آگیا تھا اور ہمیں براہ راست فراوانی کر رہا تھا۔ تانگے کی چھت ہمیں دھوپ سے بچانے میں ناکام تھی۔ ان کے ہوتے تب پیچھے تانگے نے بڑی سڑک پہ چلنا شروع کیا تو میں نے چابک مار کے گھوڑے سے آگے دوڑنے کی خواہش پہ بڑی مشکل سے قابو پایا۔ میں بیچ راہ راست پہ آگیا تھا اور میں اس بچے کی طرح محسوس کر رہا تھا جو جنگل میں بھٹک گیا ہو اور اچانک اسے گھر کا راستہ مل جائے۔

لاری اڈے سے پہ تانگے والے نے مڑ کر میری طرف دیکھا تو میں نے اسے چلتے رہنے کا اشارہ کیا۔ اس سڑک پہ خاصی ٹریفک تھی اور میں کسی نسبتاً غیر آباد حصے کا انتخاب کر رہا تھا۔ ایک میل آگے جانے کے بعد تانگے والے کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

"بیگم صاحب جی نے لکھیا تھا لاری اڈے..."

"کیا تم تنگ آگئے ہو؟" میں نے کہا۔

"میں... نہیں جی... مگر گھوڑا بے زبان جانور... اس نے بھی تو کچھ مسافر لے جانا ہے جی۔" وہ بولا۔

"اوہ... تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا" میں نے کہا "بس ابھی جگہ روک دو... اب ہم ایک قدم آگے نہیں جائیں گے۔"

"تسی آپ کو جانا کہاں تھا؟" وہ لگام کھینچ کے بولا۔

"لاری اڈے" میں نے اترتے ہوئے مختصراً کہا۔

"لاری اڈا تو پیچھے رہ گیا" وہ حیران ہو کے بولا۔

"ہمیں معلوم ہے کہ لاری اڈے پہ اترنا تھا۔" میں نے کہا اور سو کا نوٹ آگے بڑھا دیا۔ حیرت کی ڈبل ڈوز نے کوچبان کی زبان بند کر دی... میری بات نے اور پھر اس اچنبے نے اسے بھونچکا کر دیا۔

"یہ گھوڑے کے لیے" میں نے پچاس کا ایک اور نوٹ نکال کے کہا "ہم نے اس بے زبان پر بہت ظلم کیا۔ اسے واپسی پانی کے بغیر دوڑایا... تم ہماری طرف سے معافی مانگ لینا۔" معلوم نہیں تانگے والے نے واپس جاتے ہوئے شہزادوں کی ذہنی حالت کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہو۔

"اب کیا ہوگا؟" موہنی نے سڑک کے کنارے ابھری ہوئی منڈیر پہ ٹکتے ہوئے کہا۔

"یہ سوال ہر جگہ اور ہر وقت کیا جاتا ہے نا قون۔" میں نے کہا۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ اب کیا ہوگا اور کچھ ہوگا یا نہیں ہوگا... بقول شاعر... ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

"کیا پہلا سفر ہو مصیبت کر دیے تھے؟" وہ مسکرائی۔

میں نے سر ہلا کے کہا "تم تو آسمان کی منزل پہ ہو... پہلا خسورہ سمجھو۔"

"میرا مطلب تھا کہ اتنا لمبا سفر کیا اس لیے کیا تھا کہ کنارے ڈیرا ڈال لیں؟"

"تم فوراً دیکھتی جاؤ" میں نے کہا اور ایک کار والے کو ہاتھ سے اشارہ کر کے لفٹ مانگی۔ اس نے سخت تیور ان کے پیچھے پانچ انگلیوں کا علامتی نشان دکھایا جس کے معنی....... پھر لاحول... اس کم بخت پر لعنت... وہ مجھ پر لعنت بھیجنے میں برحق تھا۔ ایسی سڑک پر جہاں بہت خوبصورت دن رات چلتی ہو کوئی اپنی سجی سجائی گاڑی ایک مشکوک نظر آنے والے جوڑے کے لیے کیوں روکے۔ مگر نا امیدی میرے مذہب میں حرام تھی۔ میں ملتان کی طرف جانے والی سب کاروں کو انگوٹھا دکھاتا رہا اور کاریں زنّاٹے سے گزرتی رہیں۔

"یہاں کوئی نہیں روکے گا گاڑی" موہنی نے آدھے گھنٹے بعد کہا۔

"ہاں... میرے لیے کوئی نہیں رکے گا۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔

"اب تم بیٹھو... میں کوشش کرتی ہوں" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں اس کی جگہ جا بیٹھا اور اس نے بال سنوارے... پریشان کیے، دوپٹہ ہاتھ میں تھاما اور اپنے سراپا کے حسن کو بہت بے باک طریقے سے نمایاں کر کے آنچل لہرانے لگی۔ پچھلی کار میں ایک بوڑھے شخص تھے۔ انھوں نے خاصی ملامت آمیز نظروں سے موہنی کو دیکھا اور کہا بھی... شاید وہی تھا جو مجھے ایک شخص نے پانچ انگلیاں دکھا کے کہا تھا... میں نے ایک قہقہہ لگایا... موہنی نے غصے زدہ ہو کے دیکھا اور دوسری کار کو اشارہ دینے لگی۔ اس میں ایک ہی آدمی تھا جو اس نے مجھے دیکھا تو رفتار پھر بڑھا دی۔ حالانکہ موہنی نے خاصی بے باکی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ایسے کوئی نہیں پھنسے گا بھئی" موہنی نے جھلا کے کہا۔

"اس سے زیادہ کیا کرو گی؟" میں نے کہا۔

"تم کباب میں ہڈی بنے ہوئے ہو" وہ جھنجھلا کے بولی۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"مطلب یہ کہ لیلیٰ کے ساتھ کوئی مجنوں ہو تو کوئی نہیں لیتا۔" وہ چڑ کر بولی۔

"اچھا لیلیٰ... کتا اپنی شکل گم کرتا ہے" میں نے کہا اور اس منڈیر کے پیچھے لیٹ گیا اس طرح کہ فوراً نظر نہ آؤں۔

موہنی کو فوری کامیابی ہوئی۔ ایک کار نے اتنی قوت سے بریک لگائے کہ پہیے چیختے ہوئے جام ہو گئے اور میں نے اندازہ لگایا کہ گاڑی کی رفتار کتنی زیادہ تھی... پھر گاڑی ریورس گیئر میں واپس آئی۔

"ہیلو... سوئیٹی..." کسی نے لوفروں کے انداز میں چہکتے ہوئے کہا۔

"لفٹ چاہیے؟" یہ کسی دوسرے کی آواز تھی۔

"یس... اف کورس ڈارلنگ..."

"بٹ بٹ..." پچھلی والی سیٹ پہ جن کی طرح آواز نکال کے بولا "ایسے جھلک لیتے ہیں کہ کوئی بھی شے..."

"مجھے تو آپ کے پاس ہی" موہنی نے کہا "آ گئی ہیں..."

"بچے... بچے دل میں ہوتی ہے بیٹی..." دوسرا بولا "کم آن..."

"تم تو مجھے بیٹی بھی بول لیتی ہو... جنگل کی پری۔"

اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ میں پیچھے سے لنگڑاتا ہوا اور کراہتا ہوا نکل آیا۔ موہنی نے میرے لیے دروازہ تھام لیا۔ میں نے آگے پیچھے بیٹھے دونوں بگڑے دل رئیس زادوں کو دیکھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات بے یقینی سے مسخ ہو گئے۔

"ہو از دس ڈرٹی سوائن؟" ایک نے غصے سے کہا۔

"یہ ایک غریب آدمی ہے... بیمار تھا" موہنی نے ایک ادا سے میرے متعلق کہا "راستے میں اتر جائے گا۔"

"تم بھی اس کے ساتھ ہی اترو گی؟" دوسرا فیصلہ کن انداز میں پچھلی سیٹ سے بولا۔

"اوہ نو..." موہنی نے کہا۔

"تم کہاں جاؤ گی؟" پہلے نے موہنی کو آنکھ ماری۔

"ابھی تو فیصلہ نہیں کیا..." موہنی بولی۔ اس کا لہجہ یہی کہتا تھا کہ یہ فیصلہ تو تم کو کرنا ہے۔

"او کے... ویٹ اینڈ سی..." دوسرا بولا۔

"مجھے معلوم تھا" موہنی نے مجھے بٹھاتے ہوئے کہا "یو آر سو نائس اینڈ جینٹل مین۔" پھر وہ خود میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ غریبوں کی مدد کرنا چاہیے" ڈرائیو کرنے والے نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "لیکن یہ غریب بہت غلیظ ہوتے ہیں۔ گاڑی گندی کرتے ہیں۔"

"اور محسن فراموش ہوتے ہیں" دوسرا بولا۔ وہ اب انگریزی میں باتیں کر رہے تھے اور انھیں یقین تھا کہ میں کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں۔

"بائی دا وے... ابھی تک ہم نے ایک دوسرے کو متعارف نہیں کرایا۔"

"میں جونی ہوں... نام تو جان محمد تھا... مگر تم سوچو ذرا کتنا عجیب اور دقیانوسی لگتا ہے میرے جیسے نوجوان کو جان محمد کہنا۔" پچھلے والے نے کہا "یہ میرا بڑا بھائی ہے شفیع محمد... اسے سب جیکی کہتے ہیں۔ جاننے والے اور دوست... ہمارے ڈیڈ کو ایسے ہی نام رکھنے کا شوق ہے۔ خود کو نواب سلطان محمد خان گردیزی لکھتا اور کہتا ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے پہلے ظلِ سبحانی کیوں نہیں لگا لیتے..." وہ قہقہہ لگا کے ہنسا۔

"بھئی قسمت اپنی اپنی" پہلا والا بولا۔ "تم نے ابھی تک اس جنگل کی پری سے نہیں پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہی تھی؟"

موہنی مسکرائی "میرا بھی کیس عجیب ہے... میرے والد پٹھان مولوی ہیں۔ میری ماں سے نہیں بنی۔ انھوں نے میرا نام رضیہ سلطانہ رکھا تھا... مگر سب مجھے روزی کہتے ہیں۔"

"روزی... بیوٹی فل..." جیکی نے لَلکار ماری "فائن روز۔"

"آج میرا ان سے جھگڑا ہو گیا تھا... میں گھر سے نکل آئی" موہنی بولی "جب بھی میرا ان سے جھگڑا ہوتا ہے میں واک آؤٹ کر جاتی ہوں۔"

"اور واک ان کب کرتی ہو؟" جونی بولا۔

"جب میرا موڈ ٹھیک ہو جائے۔"

"موڈ کون ٹھیک کرتا ہے؟" جیکی نے کہا۔

"میرے دوست" موہنی نے ہنس کے کہا "مجھے دوستوں کی کمی کبھی نہیں رہی۔"

"تمھیں دوستوں کی کمی نہیں ہو سکتی۔"

"آج سے ہم بھی تمھارے دوست ہیں... اینی ٹائم... اینی پلیس" جیکی نے گانا شروع کیا "ڈے اینڈ نائٹ..."

میں نے آہستہ سے ریوالور نکالا اور جیکی کے سر پہ مارا۔ اس کا گراموفون رکا؟ اٹک گیا۔ ڈے... ڈے... اینڈ... پھر ریکارڈ رک گیا۔ جونی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ جیکی اب دروازے کی طرف لڑھک رہا تھا۔

"یہ کیا ہوا ہے... یہ او کے ہے؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"ہی ول بی فائن ان نو ٹائم" میں نے ریوالور اس کی گدی پہ رکھ کے کہا "آئی ایم ہیئر ٹو ڈو وٹ آئی وانٹ یو ٹو ڈو" وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا بشرطیکہ تم نے جو کہتے ہیں عمل کیا۔

"اینڈ اف آئی ڈونٹ؟" وہ چند سیکنڈ تک دہشت سے منجمد بیٹھا سامنے والے آئینے میں مجھے گھورتا رہا اور انگریزی بولا تو...

"دین یو ول بی نو بیٹر" میں نے کہا "پھر تمھارا حشر اس سے بھی برا ہو سکتا ہے۔"

"تم دونوں... سوئنڈلر ہو...؟" جونی نے کہا۔

"اور تم دونوں مجھے کسی سوئنڈلر کی اولاد لگتے ہو" میں نے انگریزی میں کہا "کسی ایسے دھوکے باز یا نوسرباز کی ناجائز اولاد جو ناجائز آمدنی پہ پلتی ہے تو ایک ذلت، نفرت اور فرسٹریشن سے بھرپور معاشرہ وجود میں آتا ہے۔"

اس نے حیرانی سے نظریں اٹھا کے مجھے دیکھا "تمھیں کیا چاہیے؟" وہ بولا "ہمارے پاس دس بارہ ہزار روپے ہوں گے۔"

"اتنے ہی تمھارے جیب میں بھی ہوں گے... شاید زیادہ ہوں مگر میرا مسئلہ کچھ اور ہے... میں ایک مفرور قیدی ہوں۔ راولپنڈی سنٹرل جیل سے بھاگا ہوا" میں نے کہا "مجھے پھانسی ہونے والی تھی۔"

"پھر ہوئی کیوں نہیں؟"

"مجھے کوئی پھانسی نہیں دے سکتا تھا" میں نے شیخی مارنے کے انداز میں کہا "وہ تو بس میں کچھ وقت گزار رہا تھا جیل میں آ کر پریس اور پبلک خاموش ہو جائے۔ میرے ساتھیوں کے ہاتھ بہت

www.paksociety.com

بنے تھے۔ وہ کسی بھی وقت مجھے جیل خانے کی دیواروں میں سے نکال سکتے تھے کیا تم نے کبھی بہرام ڈاکو کا نام سنا ہے؟"

"بہرام ڈاکو... آف کورس... تم بہرام ہو؟"

میں قہقہہ مار کے ہنسا۔ "وہ میرا دادا تھا... میرا گرینڈ انکل آف مائی فادر... میرے سگے چچا کا چچا جو دوسرے رشتے سے میرے ماموں کا ماموں ہوتا تھا۔ پھر چچا کی خلیری بہن سے ماموں کے پھوپی زاد بھائی کا رشتہ طے ہوا تو..."

وہ پریشان ہو کے بولا۔ "تمھارا کیا نام ہے؟"

"میں بہرام ثانی مشہور ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم نے کتنے قتل کرائے ہیں اب تک؟" میں نے جوجی کو مخاطب کیا۔

"مجھے... تعداد تو یاد نہیں۔" وہ سٹپٹا کے بولی۔ "ڈائری میں سب لکھا ہوا ہے۔ تاریخ... مقام... رقم اور قتل کیے جانے والے کا نام۔"

"یہ کون ہے تمھاری؟"

"سیکرٹری... پارٹنر اور دوست۔" میں نے کہا۔ "اسی نے باہر میرے ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور مجھے نکالنے کے لیے ایکشن پلان بنایا۔ تم نے سلطانہ ڈاکو کا نام سنا ہے؟"

"یس... ایک فلم بھی تھی۔"

"یہ سلطانہ ڈاکو کی نواسی ہے... اس کے بہنوئی کی دوسری بیوی کا سالا بہرام ڈاکو کا سمدھی تھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے رشتوں سے کوئی دلچسپی نہیں... کیا یہ بھی تمھارے ساتھ ڈاکے ڈالتی ہے؟"

"ہر بیوی کو شوہر کا ساتھ دینا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "یہ ہر جگہ میرے ساتھ جاتی ہے... جتنے قتل میں نے کیے ہیں اتنے ہی اس نے۔"

"اور... تم... تم نے کتنے قتل کیے ہیں؟"

"گیارہ..." میں نے فخر سے کہا۔ "پھانسی تو ایک ہی بار ہو سکتی تھی نا... جیسے میں نے اس کا ہر الزام بھی اپنے سر لے لیا... بائیس قتل کرنے کی فرد جرم عائد کی گئی تھی مجھ پر... میں اب بائیس قتل اور کر سکتا ہوں اپنی پارٹنر کی مدد سے... [illegible] تو کیسے؟"

"میں پھر نکال لاؤں گی تمھیں..." جوجی نے کہا۔

"کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اس دوسرے راؤنڈ میں سب سے پہلے میں تم کو فوت کروں؟" میں نے خطرناک لہجے میں کہا۔ "کیوں [illegible]؟"

"بیٹ دانی؟... میں تو... میں تو کوآپریٹ کر رہا ہوں... بالکل وہی کر رہا ہوں... جو آپ فرما رہے ہیں..." جوجی ہکلا کے بولا۔

"کوآپریشن کا مطلب سمجھتے ہو؟" میں نے پستول کو اس کی گدی پر رکھ کے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ جو میں کہوں وہ کرو...

سوال کوئی مت کرو... اور زبان بند رکھو... ہے جب تک زندہ رہنا چاہو جس دن تمھاری زبان سے کوئی ایک لفظ بھی نکلا... تم نے اپنے باپ کو یا پولیس کو کسی بھی حماقت کو بتایا اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد... سمجھے... بہرام ثانی تم سے ملنے آئے گا..." میں نے کہا۔ "تم اس سے چھپ کے قبر میں بھی جا لیٹو گے تو وہ تم کو نکال لے گا... کفن اندر رہ جائے گا لاش باہر... اور..."

"آئی... آئی پرامس... میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"اگر تم نہیں بتاؤ گے تو فائدے میں رہو گے... کافی فائدے میں... اور تمھارے ساتھیوں کی [illegible] تم بہرام کی پناہ میں آ جاؤ گے... اور جو بہرام کی پناہ میں ہو اسے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔"

"سمجھ گیا... بہت اچھی طرح..." وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔

"اب شرافت سے چلتے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اگر کسی کو اشارہ بھی کیا تو سلطانہ ڈاکو کی نواسی دروازہ کھول دے گی اور جیکی باہر لڑھک جائے گا... یوں ہی... وہ دروازے کے ساتھ لگا ہوا ہے... اسے دھکا دینے کی ضرورت بھی نہیں ہو گی۔"

"جانا کہاں ہے آپ کو؟... میرے گھر پاس پہنچوں گا..."

"میں دیکھ رہا ہوں... تم مجھ سے کہو گے" میں نے کہا۔ "قتل کرا لو جیسے میں مروں گا... لیکن یہ ضرور یاد رکھنا کہ جو شخص پھانسی کے تختے سے جیل بھاگا ہو وہ آسانی سے واپس جیل نہیں جاتا... وہ سب پہلے مارے جائیں گے جو مجھے گرفتار کرنے یا کرانے کی کوشش کریں گے... تمھارے باپ کو دو جوان بیٹوں کی موت کا صدمہ اٹھانا پڑے گا... وہ بیٹے ہیں تو اسی قابل کہ انھیں گولی مار دی جائے... کیا اس کی کوئی اولاد صالح بھی ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بس ہم دو جڑواں بھائی ہیں... پیدائش کے وقت ماں مر گئی تھی۔"

"پھر تو موت کے وقت باپ مر جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اس کی ساری دولت جائداد کسی اور کو مل جائے گی۔ کون ہے وہ؟"

"اس کی دوسری بیوی... جو اس کی تیسری سیکرٹری تھی اور اس کے منہ پر چڑھا بیٹھی ہے... [illegible] ہے۔" وہ نفرت سے حقارت سے بولا۔ "جو اس کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے... جیسے بچوں ہی سے ہو کر رہتے ہوں گے... ایسے رہتے ہیں وہ..."

"اپنی والدہ کے بارے میں..."

"والدہ... مائی فٹ..." وہ بولا۔ "تم بہرام... کر سکتے ہو... میں آئندہ بھی تمھاری مدد کر سکتا ہوں... جب تم مجھے فون کر کے بلاؤ گے تو میں آ جاؤں گا... اور تم میری کوٹھی بھی مجھ سے ملنے آنا چاہو تو میں تم کو اپنا مہمان رکھ سکتا ہوں

[illegible] صاحب جگر جاوی کو تھیلیاں ہیں... مری میں بھی [illegible]... لیکن تم میرا ایک مسئلہ حل کر سکتے ہو۔"

"تم کیا... اس کی ہمت نہیں ہے؟"

"[illegible] تو..." وہ بولا۔ "ہم کوئی شریف آدمی نہیں ہیں۔ [illegible] بات نہیں۔"

"تم اپنے باپ کو قتل کرانا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"[illegible] اس نے ہمارے لیے بہت قربانیاں دی تھیں۔ [illegible] اس نے شادی نہیں کی ہماری خاطر... ایک گورنس نے [illegible] بے شک وہ اچھی عورت تھی۔ اگر ہمارا باپ اس سے شادی کر لیتا تو ہمیں اعتراض نہ ہوتا مگر یہ بات ایک دن میں نے [illegible] جانے لگا اور بولا کہ سن... تم ان معاملات کو نہیں سمجھتے... وہ اس لیے اچھی ہے کہ تمھاری سوتیلی ماں نہیں ہے۔ [illegible] میری بیوی نہیں ہے... ملازمہ ہے۔ مگر وہ گورنس بہت [illegible] عورت [illegible] اکیس سال کے تعلق کو ختم کر دیا۔ [illegible] اس نے کہا [illegible] مجھے یہ ایک [illegible] تمھاری پرورش کی... وہ میں نے پوری کر دی۔ اب بالغ ہو اور اپنی مرضی کے مالک ہو... اچھا برا بھلا خوب سمجھتے ہو... پھر اب مجھے کیوں روکتے ہو... تم مجھے اپنی مرضی کا [illegible] کیوں چاہتے ہو... گورنس نے [illegible] میری ذمہ داری پوری ہو گئی... اب مجھے جانے دو... ہم نے اسے بہت روکا لیکن وہ چلی گئی۔ ایک دن صبح اس کا کمرا خالی تھا... اس نے خط میں لکھا تھا کہ مجھے تلاش مت کرنا... یوں ہی... یہی سب خرابی کی جڑ ہے وہ عورت ہے۔"

"میں اتفاق کرتا ہوں تم سے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تمھارا باپ چوتھی سیکرٹری سے شادی نہیں کرے گا؟"

"نہیں... شاید وہ دوبارہ غلطی نہ کرے لیکن اس نے پھر ایسا کیا..."

"...کیا تم پھر میری مدد نہیں کر سکتے؟"

"کیا تیسری بیوی کا... پھر چوتھی اور پانچویں کا قتل؟"

"تم نے کہا کہ مل کے تم دونوں..."

"ہاں... ہم ایسے قتل اور کر سکتے ہیں... لیکن صرف تمھارے [illegible]" میں نے کہا۔ "ہم مول [illegible] نہیں لیتے... وہ تو [illegible] ہم ہمیشہ [illegible]"

"اور [illegible]... تم ایک بار تو یہ کام کر سکتے ہو..."

"ہم چلے گئے..." میں نے کہا۔

"سوچتا کیا... تم ہمارے گھر میں ڈاکا ڈالنے آؤ۔ وہ عورت ہر وقت زیورات میں لدی پھندی رہتی ہے۔ سونے اور پلاٹینم کے بہت [illegible] والے سیٹ ملیں گے تمھیں۔ اسے اپنے ساتھ لے جانا اور گردن کاٹ کے اتار لینا۔" وہ بولا۔ "اور پھر کہیں گاڑ دینا... میرا باپ تو یہی سمجھے گا کہ وہ بھاگ گئی۔ ہم اسے یقین دلا دیں گے کہ ایسا ہی ہے۔ وہ [illegible] ہم تجوری سے نکال نہیں سکے... تمھارے لیے..."

"کیا زبردست منصوبہ ہے۔" میں نے جوجی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم تو جینئس ہو پہلے سے سب طے کیے بیٹھے ہو۔"

"کوئی کام کا آدمی نہیں ملا تھا اب تک۔" وہ مسکرایا۔

"او کے... پہلے تم میری مدد کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں کل تک تمھاری ضرورت پڑے... یا ہم رات کو تمھیں فارغ کر دیں۔"

"مجھے گھر پہنچنے کی کوئی خاص جلدی نہیں ہے۔ کیا میں [illegible] سنبھال لوں؟" وہ بولا۔

"ضرور لے لو۔" میں نے کہا۔ "[illegible] جیکی..."

"کوئی پوچھے گا تو میں کہہ دوں گا کہ سو گیا ہے۔" وہ بولا۔

جیکی آدھے گھنٹے بعد جاگ اٹھا۔ اس وقت گاڑی تیزی سے ملتان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"[illegible]... یہ شخص ابھی تک زندہ ہے جوجی؟" اس نے ہوش میں آتے ہی سر پکڑ کے چلانا شروع کیا۔

"مجھے تو تعجب ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو۔" میں نے انگریزی میں کہا۔ جیکی نے پلٹ کر مجھے خون آشام نظروں سے دیکھا اور میرے ہاتھ میں پستول دیکھتے ہی سیدھا ہو گیا۔ پھر اس نے جوجی کو مسکراتے دیکھا۔

"اٹس آل رائٹ برادر" جوجی نے اس کے کندھے پر تھپکی دے کر کہا۔ "یہ سب غلط فہمی میں ہو گیا تھا۔ وی آر فرینڈز۔"

"فرینڈز؟" جیکی نے یوں کہا جیسے اسے سخت صدمہ ہے کہ جب وہ بے ہوش تھا تو اس کے اپنے بھائی نے بے ہوش کرنے والے سے صلح نامہ کر لیا۔ لیکن جوجی نے آہستہ آہستہ اسے صلح نامے اور باہمی معاہدے کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ وہ سر ہلاتا رہا اور بار بار اس جگہ کو دباتا بھی رہا جہاں ایک گومڑا ابھر آیا تھا۔

"اگر یہ بات ہے۔" اس نے ساری بات سن کے کہا۔ "تو بے شک ہم دوست ہیں۔" اور مجھ سے ہاتھ ملانے کے بعد جوجی سے بھی ہاتھ ملانا چاہتا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔

"اپنی بیوی کی طرف سے میں ہاتھ ملاؤں گا۔" اور دوبارہ

www.paksociety.com

مصافحہ کیا۔

وہ تھوڑا سا خفیف ہوا۔ "ہم دونوں بھائی نہیں، دوست ہیں۔" وہ بولا۔ "اور اچھے دوستوں کی طرح ہم انڈر اسٹینڈنگ کو اہمیت دیتے ہیں۔"

"اور ہر معاملے کو شیئر کرتے ہیں۔" جونی نے کہا۔

"خدا کرے آپ دونوں میں یہ اشتراک شادی کے بعد بھی برقرار رہے۔" میں نے کہا۔

وہ دونوں بے تکلفی سے مجھ سے چپک کر ہنسنے لگے۔ پھر مجھے سڑک کے کنارے ایک ریسٹورنٹ نظر آیا جو غالباً ٹرک کی قسم کی گاڑیوں کے مسافروں کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں ہمیں کھولی ہوئی کافی اور بہت اعلیٰ قسم کے سینڈوچ ملے۔ جیکی نے مجھے بہت اعلیٰ قسم کے غیر ملکی سگریٹ پیش کیے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے بھائی کے مقابلے میں زیادہ چالاک ہے۔ اس کی نظریں بار بار میرے چہرے کا طواف کرتی تھیں اور وہ کچھ کہتے کہتے رک جاتا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں شک نظر آ رہا تھا۔

بالآخر شک اس کی زبان پر آ گیا۔ "اولڈ مین... ایک بات کہوں... تم برا تو نہیں مانو گے؟"

"نہیں... میں دوستوں کی بات کا برا نہیں مانتا۔"

"تم... اور تمہاری وائف... دونوں کی عمر میں بہت فرق ہے۔" وہ بولا۔

"ہاں... یہ میری چوتھی بیوی ہے۔" میں نے کہا۔

"چوتھی؟... مائی گاڈ... باقی تین کہاں ہیں؟" وہ بولا۔

"ایک تو وہی بولیس۔" میں نے گول مول بات کی۔ اس کا مطلب یہ بھی سمجھا جا سکتا تھا کہ انتقال کر گئیں اور یہ بھی کہ وہ ماں باپ کے گھر بیٹھی ہیں۔

"میرا خیال ہے... کہ تم اتنے بوڑھے نہیں ہو... جتنے نظر آتے ہو۔" وہ مجھے غور سے دیکھ کر بولا۔ "یا نظر آنا چاہتے ہو... تم نے میک اپ کیا ہے؟"

"مجبوری ہے..." میں نے کہا۔ "میں دوبارہ جیل جانا نہیں چاہتا۔"

جیکی نے اطمینان کا سانس لیا۔ "تم کچھ بھی نہیں ہو۔" وہ بولا۔ "اور تمہاری یہ داڑھی بھی نقلی ہے۔"

"تم نے کیسے جانا؟" میں تھوڑا سا متفکر ہو گیا۔

جیکی ہنسا۔ "ہر شخص جس کی نظر تیز ہو گی، وہ سمجھ لے گا کہ تمہارے گھنے سر اور میک اپ کے ساتھ داڑھی تمہارا چہرہ سوٹ نہیں کرتا... میرا مطلب ہے کہ... اپنے ہاتھ دیکھو... کتنے جوان ہیں۔ اور تمہاری گردن کے قریب جو کھال ہے وہ بہت نازک اور فریش ہے۔"

میں اس کی شناخت سے پریشان رہ گیا۔ [illegible] سے محسوس کیا جا سکتی تھی۔ "اس کا مطلب ہے [illegible] محتاط ہو جانا چاہیے۔" میں نے کہا۔

ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ جیکی تھک کر [illegible] آگے رکی۔ میں تھوڑا سا آگے جھکا ہوا [illegible] انتظار کر رہا تھا۔ چنانچہ میں نے بیک ویو مرر [illegible] ہوئے شخص کی طرف ایک جھلک سی دیکھی۔ [illegible] بھول گیا۔ مجھے شک ہوا [illegible] طرف مجھے جیسے تصویریں دکھا رہا ہے [illegible] سب حقیقت سے نہیں... لیکن [illegible] آنکھوں پر یقین آیا۔ میں نے سینڈو کو ہی دیکھا تھا [illegible] وہی تھی سلیٹی رنگ کی ٹویوٹا... شاید میری صورت [illegible] نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اس نے بھی پیچھے دیکھا [illegible] بہت آگے نکل آئے تھے اور سینڈو کی کار نظروں سے اوجھل [illegible]

"بال بال بچے اس وقت تو۔" جیکی نے [illegible]

میں اچھل پڑا لیکن یہ بات اس نے [illegible]

"کیسے... کیا ہوا؟" جونی نے کہا۔

"[illegible] ویسٹ فیس،" جیکی بولا۔ "اس کی [illegible] پیچھے آ کے رکی تھی۔"

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

"ہماری ڈریم ہاؤس کا بلڈر [illegible]" جیکی نے کہا۔ "اسے کوئی مار دے گا... لگتا ہے وہ پھر زندگی کو ترنوالہ بخشنا چاہتا ہے۔"

"اوہ تو..." جونی نے کہا۔ "اب وہ کیا لینے آیا [illegible]"

پہلے سینڈو کو میں نے پیچھے دیکھ کر [illegible]

میں اتنا حیران اور پریشان ہوا تھا کہ سانس بھی [illegible] خدا نے تو مجھے بال بال بچایا تھا اگر میں [illegible] سے سینڈو مجھے ضرور دیکھ لیتا۔ اور اس [illegible] یہ ہو سکتا تھا کہ وہ میرے موجودہ حلیے سے واقف [illegible] کمپنی بہت باخبر لوگ تھے۔ مونی کو اس نے [illegible] اس کا صرف سر نظر آیا ہو گا۔ مونی کا چہرہ [illegible] اوٹ میں تھا لیکن ابھی سے کیا کہا جا سکتا ہے کہ سینڈو [illegible] دیکھا یا نہیں... اگر اس نے دیکھا ہو گا تو وہ اطمینان [illegible] میں آ جائے گا۔ اس نے کار کا نمبر نوٹ کر لیا ہو گا۔ [illegible] پہلے وہ اپنی بڑی کار کو دوڑاتا ہوا لائے گا [illegible] روانہ ہو کے بھی اس فرق کو ختم کرنے میں کامیاب ہو [illegible] جیکی اور جونی کی گفتگو نے مجھے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا [illegible]

[illegible] بات کر رہے تھے یا کسی اور کی۔ [illegible] وہ سینڈو کی بات کر [illegible] نہیں پہچان سکا تھا۔ کون تھا ان کی ڈریم ہاؤس کا [illegible] سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس طرح نہیں کہ [illegible] ان کے دل میں شکوک پیدا کرے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ [illegible] سے مسافر کی بات کر رہے ہوں۔ میں منتظر رہا [illegible] وہ خود ہی کوئی بات کریں گے لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھے کچھ [illegible] نہیں [illegible] اس سے پہلے کہ موضوعِ سخن بدل [illegible] "یہ تم کس کی بات کر رہے تھے؟"

"[illegible] ایک شیطان... اس نے ہمیں تقریباً لوٹ لیا ہے۔ [illegible] یہ جو ہماری بلڈنگ ہے... یہ اسی کا بھائی [illegible] مجھے شک ہے۔"

"کیا شک ہے؟" میں نے ظاہری بے نیازی سے کہا۔

"یہی... کہ وہ بھائی بہن ہیں..." جیکی بولا۔ "اس نے [illegible] کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ چکر چلایا ہے۔"

"تمہارا ڈیڈ مجھے ایسا آدمی تو نہیں لگتا جیسے کوئی بے وقوف بنا سکے۔" میں نے کہا۔

"مرد کی عقل اس عمر میں گھاس چرنے جا سکتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب گھاس بہت تر و تازہ اور قریب ہو۔" جیکی بولا "اور ایک بوڑھا بیل برسوں سے بھوکا ہو۔" وہ [illegible] انداز پر دونوں قہقہہ مار کے ہنسے۔

"ہماری کچھ بہت قیمتی زمین تھی... بہت عمدہ لوکیشن [illegible] جونی صاحب آگے بڑھا [illegible] اس کا نام [illegible]"

"مرزا کی!" جونی نے کہا۔ وہ اپنی حیرانی چھپانے کی کوشش [illegible] معاملات کے قابو میں آ جانے کے بعد وہ جتنی دیر [illegible]

"پارہ... یہی ہے اس کا نام... اور صفت بھی ایسی ہی [illegible]" جیکی بولا۔ "بیگم پارہ صفت۔"

[illegible] "بیگم پارہ!"

یہ چونکا دینے والا نام مجھے عجیب لگا لیکن [illegible] لاشعور [illegible] میں نے ایک فلم دیکھی تھی۔ استاد سینڈو جس [illegible] مرکزی کردار [illegible] اور اس کی ہیروئن تھی بیگم پارہ [illegible] کارہ جیسے بک رول کیے تھے [illegible] خاصی شہرت [illegible] مجھے بیگم پارہ کا نام سنتے ہی استاد سینڈو کا خیال آیا [illegible] کا نام [illegible] حقیقت کی دنیا میں رشتہ قائم ہوا تو [illegible]

"[illegible] مجھے اس اداکارہ کا خیال آ گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"ارادہ تو یہی ہے۔" جیکی نے اس وضاحت سے مطمئن ہو کے کہا۔ "تم ایسا کیوں نہیں کرتے... آج رات ہمارے مہمان ہو جاؤ۔"

"او یس..." جونی نے کہا۔ "تم صورت حال کو دیکھو اور سمجھ سکو گے۔"

"اسے تو میں نے سمجھ لیا ہے۔" میں نے کہا۔ "آئی وش کہ میں تمہاری دعوت قبول کر سکتا... لیکن آج کی رات میرے لیے اہم ہے... میں وقت ضائع نہیں کر سکتا۔"

"اچھا... تو پھر ایسا کرو... دو چار گھنٹے کے لیے اسٹاپ اوور کرو۔"

"ہاں... اتنی دیر میں یہ لوگ بھی پہنچ جائیں گے۔" جونی بولا۔

"میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ جا کے پیچھا کر رہے ہوں گے۔"

میرا خون خشک ہونے لگا۔ "کیوں؟ یقین سے نہیں...؟"

"اس لیے کہ وہ اپنی ڈیل فائنل کریں گے۔" جیکی بولا۔ "میں جس زمین کی بات کر رہا تھا وہ انڈسٹریل ایریا کا پلاٹ ہے۔ ہم خود یہ چاہتے تھے کہ وہاں انویسٹمنٹ کریں... اس کی قیمت تو پہلے بھی بہت مل رہی تھی لوگ... ہم اسے بیچنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ایسی جگہ تھی کہ کوئی بھی پارٹی ہمارے ساتھ مل کے ایک ٹیکسٹائل مل لگانے پر تیار ہو جاتی... ہم نے کچھ بات بھی آگے بڑھائی تھی کہ اس عورت نے کوئی چکر چلایا اور ہمارے ڈیڈ نے وہ زمین بیچ دی... صرف پچاس لاکھ کے لیے... اور اس عورت کو غالباً اسی لیے ہمارے ڈیڈ کے پیچھے لگایا گیا تھا۔"

"یہ دوسری پارٹی وہاں کیا کرنا چاہتی ہے؟"

"وہ کوئی [illegible] فیکٹری قائم کر رہے ہیں۔" جیکی بولا "زرعی مشینری کے آلات اور پرزے بنانے کا پروجیکٹ ہے جو میرے خیال میں بالکل منافع بخش نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسی ہی دو فیکٹریاں خسارے میں چل رہی ہیں... اور ایک تو ہمیں بہت سستی مل سکتی ہے... اگر یہ ان کی بلاش ہے تو وہ گئے سرمائے سے بیزار ہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

لیکن اصل بات یہ لڑکے نہیں سمجھ سکتے تھے، ان کی بات میں نے سمجھ لی تھی۔ زرعی مشینری کے پرزوں کا نام سنتے ہی مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے تھے اور میرے دماغ کے کمپیوٹر نے بہت سے حقائق کو یکجا کر کے ایک رزلٹ میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ یہ چوہدری دلاور کے ذہن کی منصوبہ بندی تھی کہ اس نے لاہور کے [illegible] انجینئرنگ کمپلیکس کو ختم کیا وہاں سے تمام [illegible] کو ہٹا لیا کیونکہ ہم ان کے کاروبار کی تہہ تک پہنچ چکے

www.paksociety.com

تھے۔ وہ زیادہ عرصہ وہاں قدرتی چشموں کے گردونواح کے نام پہ
اسلحہ سازی نہیں کر سکتے تھے۔ دلاور نے اس پلانٹ پر فری
اسپتال بنانے کا اعلان کر دیا۔ میدانِ سیاست میں قدم رکھنے
کے پیچھے یہ ایک چال تھی جو دلاور سب کی تعریف و توصیف حاصل
کرنے والا عمل تھا۔ چوہدری دلاور نے بہت اچھا اسٹارٹ
لیا تھا۔ دوسرا قدم اس نے یہ اٹھایا کہ اسپتال کو اپنے مرحوم دوست
وزیر خان کے نام سے منسوب کر دیا۔ چوہدری دلاور دوست گوندل نے کریف
چراغ مارد جس کو اپنے ہاتھوں مارا اسی کے نام سے نیکی کمائی۔
سب کے دل سے شکوک و شبہات مٹ گئے اور بات یوں سمجھو
ہوئی کہ دوست ہو تو ایسا... بدنام بھی ہوا کر اسے بدنام کیا۔ تیسرا
قدم اس نے مختلف سمت میں لیا۔ اٹھایا کہ کسی کو پتا نہ چلا...
اس نے ملتان کے قریب کوئی جگہ منتخب کر لی، جہاں وہ ایم
جلیبہ وی کمپلیکس کو منتقل کر سکے۔ میرا کاروبار نئی جگہ پر جم سا رہا
ہے۔ میری وجہ سے انھیں منتقلی کے عمل سے گزرنا پڑا لیکن یہ
چوہدری دلاور کے شاطر ذہن کا کمال تھا کہ اس نے زحمت کو
رحمت میں بدل لیا۔ اس نے میڈم سے کہا کہ وہ زمین حاصل
کرے۔ شاید یہ زمین حاصل کرنے میں انھیں دشواری پیش
آئی۔ جان محمد عرف جونی اور شیخ محمد عرف جیکی بگڑے ہوئے
ضرور تھے مگر بے وقوف نہیں تھے۔ بنگالان کو پیسے کی فراوانی
نے بگاڑا تھا لیکن وہ تھے تو سلطان محمد خان گوندل کی اولاد... وہ
ایک ذہین، حوصلہ مند اور سیلف ڈسپلن کا پابند مضبوط
قوتِ ارادی اور صحیح قوتِ فیصلہ رکھنے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔
یہ خواص اس کی اگلی نسل میں بھی منتقل ہوئے تھے۔ جونی اور جیکی
نے باپ کی مخالفت کی اور شاید وہ کامیاب بھی ہو جاتے مگر
ایک عورت کے شباب اور عشوہ گری نے بوڑھے دماغ کو شکست
فاش دی۔ میڈم نے آدمی کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا جس
نے اسے جنت سے نکلوایا تھا۔ ایک جنت تھا جس نے اس کی
قوتِ فیصلہ مفلوج کر دی اور جوان بیٹے کچھ نہ کر سکے۔

فیصلہ میں نے توڑا گیا۔ میں نے کہا۔ "میں ایک شرط پہ
رک سکتا ہوں۔"

"وہ کیا شرط ہے؟" وہ دونوں بولے اور پھر چپ ہو گئے۔

"شرط یہ ہے کہ میں سامنے نہیں آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اگر
تم کوئی ایسا انتظام کر سکتے ہو کہ مجھے کوئی بھی نہ دیکھے... لیکن ہم
ان سب کو دیکھ لیں... جن سے ہمارا واسطہ ہو گا۔"

"میں سمجھ گیا۔" جیکی نے چٹکی بجائی۔ "تم بہت محتاط انسان ہو۔"

"ایسے کاموں میں ہونا پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ ہر قتل کے
بعد پھانسی ہوتی تو اب تک بائیس بار ہو جاتی۔"

"ان کو پیچھے سے لے جانا۔" جونی نے کھڑکی کھولتے ہوئے
کی طرف سے اوپر لے جانا۔"

"اوپر... بگڑے ڈیڈ کا بیڈروم ہے اوپر..."

وہ بیڈروم میں جائیں گے گیارہ بارہ بجے تک...

"ہم زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ٹھہر سکتے ہیں..."
جیکی نے گھڑی دیکھی۔ "ہم سات بجے تک...
جائیں گے۔ سوا سات ساڑھے سات بجے تک... اوپر
جاتا ہے۔"

"اگر تمھارے نوکروں نے دیکھا تو...؟" میں نے پوچھا۔

"وہ نہیں دیکھیں گے۔ ہم ان سے کہہ دیتے ہیں... تو
بند کر لو تو وہ آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔" جیکی بولا۔ "ایسا...
صورتِ حال کا تقاضا یہ تھا کہ ہم یہ سب برداشت کریں...
نے آہستہ سے جونی کا ہاتھ دبایا اور آگے خاموش...
یقیناً حیران ہو گی کہ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں لیکن...
کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

غروبِ آفتاب کے بعد ہم ملتان پہنچے اور تقریباً...
منٹ بعد جیکی اور جونی کے جار ثنال پر پہنچے ہوئے... محل
قدیم طرز کی کوٹھی تھی جو تعمیر میں مشرقی روایات کا عکس...
صدر دروازے پہ میں نے ایک مسلح محافظ کو ٹہلتے دیکھا...
بہت سی گاڑیاں نظر آئیں جو ایک طرف کھڑی تھیں...
کھڑی تھیں۔ ان میں یقیناً ملنے کے لیے آنے والوں کی گاڑیاں
ہوں گی... وہ جن پر ہے زمر کا نیلی کون رکھتا ہے

جیکی مجھے اور جونی کو پچھلی طرف لے گیا۔ پچھلی طرف...
کھلنے والے ایک دروازے سے گزر کر اندر...
کوارٹروں میں سے کوئی عورت نکلی اور اس نے جیکی کو سلام...

"تیرا میاں کہاں ہے؟" جیکی نے کہا۔

"نہیں معلوم چھوٹے صاحب۔" وہ گھبرا کے بولی...

"چل پھر تو بھی اندر ہو جا... باہر کیوں کھڑی ہے؟"
نے کہا۔

وہ عورت فوراً غائب ہو گئی۔ میں نے اندازہ...
حکم بھی فرمانِ شاہی کا درجہ رکھتا ہے اور... بلا چون و چرا
تعمیل کے عادی ہیں۔ اس نے پہلے مروت...
دروازہ کھولنے والی ایک جوان اور صحت مند عورت تھی
نے پھول دار ریشم کی تنگ قمیص پہن رکھی تھی۔

"ابا کہاں رُکا... وہ تیرا خصم کہاں ہے؟"

"وہ کھانے کی تیاری کر رہا ہے۔" وہ ہنس پڑی...

"اسے فوراً باہر بھیج دے۔" جیکی بولا۔

"ہائے یہ انگلینڈ والی لڑکیاں کیسے جو تم؟ وہ تو بڑی زبردست
... اور بہت خوب صورت بھی ہے۔" میں نے کہا۔
"ہاں ہے... اس کا نام حوا الیاس ہے۔" جیکی بولا۔ "اور اس کا شوہر بابا
... جیکی سے پہلے... اور جنھیں نو دیکھنے والی نظریں
... ڈیڈ کے پیچھے چھوڑ باقی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ اس
... بیاہی جانے والا کوئی نہیں... پانچ سال سے وہ یہی
... جب سے وہ مرحوم باپ کے ڈیڈ کو نظر نہیں آئی۔"
... اس قسم کے اصولوں میں یہ وہ شخص باپ جیسا لڑکے عیاشی
... میں نے سوچا۔ ان کے نزدیک ہر عورت صرف عورت
... کسی کی بھی ماں، بہن یا بیوی، بیٹی ہو۔
... بابا ایک پچھرا... اس کی عمر تو زیادہ نہیں تھی اور
... کے مطابق چالیس پینتالیس سال کا ہو گا مگر وہ
... زیادہ لاغر تھا۔ اس کی سیاہ کھال اس کے جسم کے ڈھانچے
... نظر آتی تھی اور اپنی فربہ بدن گوری چٹی بیوی کے
... بے حد مزوہ بھی لگتا تھا۔

"بابا بادشاہ... کیا گل کھلا رہے تھے؟" جیکی نے کہا۔ "دیکھو
ہمارے ساتھ مہمان آئے ہیں۔ انھیں گرو خانہ میں پہنچا دو۔"
بابا نے سر ہلایا اور ہمیں ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ جیکی اسی
دروازے سے باہر چلا گیا۔ غالباً صدر دروازے سے باقاعدہ اندر
داخل ہو کے ڈیڈ کو سلام کرنے کے لیے۔

میں نے بابا کے پیچھے مختلف کمروں اور راہداریوں سے
گزرتے ہوئے محسوس کیا کہ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ ہے اور اس
کی آواز ڈوبتی جا رہی ہے۔ غالباً وہ دم لگا چکا تھا نشے کا اثر غالب
آ رہا تھا۔

جب وہ ہمیں ایک انتہائی آراستہ خواب گاہ میں چھوڑ
کے چلا گیا تو جونی صوفے پر گر پڑا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھیں یہاں آنے کی کیا ضرورت
تھی...؟"

"میری ہر ضرورت تمھاری سمجھ میں آنی بھی نہیں چاہیے۔"
میں نے کہا۔

"میرا تو... بڑی غلط جگہ ہے۔ کیسے عجیب لوگ ہیں۔" وہ
... باہر دیکھ کے بولی۔ "ایسا نہ ہو ہم بھی
یہاں قید ہو جائیں... ایسا لگتا ہے کہ یہاں آنے کے بعد جانے
کا راستہ نہیں ملتا ہو گا۔"

"اس وقت آٹھ بجے ہیں۔" میں نے کہا۔ "دس بجے ہم
یہاں سے لوٹ جائیں گے۔"

ٹھیک بیڈروم میں چاروں طرف چھت سے فرش
تک سرخ ریشمی پردے تھے۔ نیچے وال ٹو وال گہرا سبز قالین بالکل
قدرتی گھاس کے رنگ کا تھا۔ کنگ سائز بیڈ ملتان کی دستکاری
کی شاہکاری کا نادر نمونہ تھا اور اس کی سائیڈ پر ایک تپائی تھی جس
میں ایک درجن کے قریب سوئچ لگے ہوئے تھے۔ کمرے
کے چار کونوں میں چار رنگ کی اسپاٹ لائٹ نظر آئی۔ تجربے
کے لیے میں نے ایک بٹن کو دبا کے دیکھا۔ سرخ روشنی کا دائرہ
بیڈ کے مرکز میں ٹھہر گیا۔ میں نے اسے آف کر دیا۔ بیڈ کے بالکل
اوپر چھ فٹ لمبا اور چوڑا آئینہ بڑی مہارت سے آویزاں کیا گیا تھا۔
اس کو معلق رکھنے والی راڈ چھت تک پہنچی تھی۔ باقی سوئچ ٹی وی
اور میوزک سسٹم آن کرنے کے تھے۔ کال بیل اور انٹرکام کے تھے
میں نے سب کو چیک نہیں کیا کیونکہ جیکی یا جونی میں سے کوئی
کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ کمرے میں روم ایئرکنڈیشنر چل رہے تھے
اور ایئر فریشنر کے ساتھ ان کی ٹھنڈک مل کے بڑی فرحت بخش
فضا پیدا کر رہی تھی۔

جیکی اچانک اندر آ گیا... وہ کچھ اپ سیٹ تھا۔

"وہ خبیث آ گیا ہے۔" جیکی نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اس
نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ اس نے ڈیڈ سے شکایت کی کہ ہم اسے نظر انداز
کر کے نکل گئے۔"

"تم نے نام نہیں بتایا ابھی تک اس کا۔" میں نے کہا۔

"وہ خود کو میر شرافت علی کہتا ہے۔" جیکی نے کہا۔

میں بے اختیار اچھل پڑا۔ اگر جیکی میرے سامنے قیامت
کی طرح اُتر کر چھت سے جاگتا تو میں اتنا حیران نہ ہوتا۔ "میر
شرافت علی...؟"

"کیا تم اسے جانتے ہو؟" جیکی نے حیرانی سے پوچھا۔

اس وقت میں سچ بولتا تو کہتا کہ ہاں۔ میں میر شرافت علی
کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں کیونکہ میں اس کا قاتل ہوں۔ اسے
میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ اس کا قاتل وہی ہے جو آج میر
شرافت علی بن کے آیا ہے۔ کیا ایسا بھی ہوا ہے کبھی کہ قاتل نے
مقتول کا نام رکھ لیا ہو اور اس کا روپ دھار لیا ہو۔ قانون تو
قتل کی فردِ جرم مجھ پہ عائد کرتا ہے مگر میر شرافت علی زندہ ہے تو
میں بھی قاتل نہیں رہا۔ جب مقتول کوئی نہیں تو قاتل کون؟ یہ
اسے بتا سکتا تھا کہ میرے ایماندار اور اصول پرست باپ نے
جزیرہ خان اینڈ کمپنی قائم کی تھی۔ یہ وہ میر شرافت علی کے تعاون
ہی سے ہیروئن اینڈ کمپنی بن گئی تھی۔ جب دلاور شامل ہوا
تو وہ ایم ٹی وی انجینئرنگ کمپنی ہو گئی تھی لیکن اس سے
ایم اور ڈی ہی ایسے خارج کر دیے گئے جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔
مگر میں نے اس سوال کے جواب میں کہا۔ "نہیں... مگر

www.paksociety.com

کسی میر شرافت علی کو کیسے جان سکتا ہوں... اس وقت وہ کہاں ہیں؟"

"بیٹے ڈیڈ کے ساتھ کانفرنس میں شریک ہیں۔"

"کیا میں انھیں دیکھ سکتا ہوں... یا اُن کی گفتگو سن سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"دیکھنا ذرا مشکل ہوگا۔ گفتگو سن لو... لیکن دیکھو... یہ ایک خفیہ اجلاس ہے۔ ڈیڈ کو بھی اس کی خبر نہیں۔" وہ بولا اور اس نے میز کے نیچے بیڈ سائڈ ٹیبل کا مقفل خانہ کھول کر ایک چھوٹا سا وائرلیس نکالا۔ اس کے انٹینا کو کھینچ کے لمبا کیا اور اسے آن کر دیا۔ ڈائل پہ ایک ننھی سی سرخ علامت روشن ہوگئی۔ اس نے وائرلیس مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اسے کان سے لگا لیا۔

"یہ تو غلط بات ہے سلطان صاحب۔" میں نے پیڈرو کی آواز سنی۔ "آپ بیعانہ لے چکے ہیں۔"

"اچھا... مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔" یہ یقیناً جیکی اور جونی کا باپ تھا۔ وہ اسی لہجے میں مگر زیادہ اعتماد کے ساتھ بات کرتا تھا۔

"کیا مطلب... ایم ڈی سعید نقش ہیں... آپ پر بھروسا کیا اس لیے آپ انکار کر سکتے ہیں؟" پیڈرو برہمی سے بولا۔

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔" سلطان بولا۔ وہ بے حد منجھا ہوا اور ہوشیار آدمی تھا۔ غالباً اسے اندیشہ تھا کہ اس کی گفتگو کوئی ریکارڈ نہ کر رہا ہو۔ یا وہ اس لیے محتاط تھا کہ اسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔

"سلطان صاحب... اب ہم بھی سمجھ گئے ہیں۔ آپ کا رویہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔" پیڈرو نے بے بسی سے کہا۔ "رقم بڑھائی بھی جا سکتی ہے۔"

"بات یہ ہے میر صاحب کہ میرے بیٹے میری مخالفت کر رہے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں جو ہوا یہ سودا ہے... معاف کرنا میرے پاس ثبوت کچھ قابلِ اعتماد نہیں رہیں اس عمر میں۔" سلطان بولا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور جانتے بوجھتے پیڈرو کو زچ کر رہا ہے۔

"آئندہ ہم تحریری معاہدہ کریں گے۔ بیچنے کا تحریری قانون کے مطابق ساری کارروائی ہوگی۔ وکیلوں اور گواہوں کی موجودگی میں۔" پیڈرو نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "ہماری آفر پچاس لاکھ کی تھی۔ دس فیصد بیعانہ دیا تھا ہم نے... آپ اسے بھول بھی جائیں تو ہم بھی بھول جاتے ہیں۔ ہم بقیہ پچاس لاکھ دیں گے... یکمشت مگر اس وقت جب سیل ایگریمنٹ کی رجسٹری ہوگی۔"

"اخراجات آپ کے؟"

"اخراجات بھی ہمارے... منظور... مگر اب آپ صاف بات کریں... اپنے بیٹوں سے کہہ دیجیے کہ بندوق رکھ کے نہ چلائیں۔

یس یا نو..." پیڈرو کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا تھا۔

"اگر میں نو کہہ دوں تو کیا ہوگا؟" سلطان نے ٹھنڈے لہجے میں سوال کیا۔

"وہ آپ دیکھیں گے..."

"تم دھمکی تو نہیں دے رہے ہو پیڈرو۔" سلطان مشتعل نہیں تھا۔ البتہ وہ پیڈرو کا مذاق اڑا رہا تھا۔

"ہم کچھ دوسری طرح کے لوگ ہیں سلطان صاحب۔ چوکنا ہو کر گزرتے ہیں۔ دھمکی کیا دیتے۔"

"یہ اچھی بات ہے... میں بھی دوسری طرح کا ہوں۔" سلطان نے جیسے خوش ہو کے کہا۔ "ایک بات کہوں میر صاحب... آپ کے فائدے کی بات ہے... یہ غیرت والے نہیں تھا..."

"مجھے معلوم ہے وہ اپنی فیکٹری بیچ کر لاہور..."

"کمال ہے... تم نے بنائی چلتی ہوئی فیکٹری کیوں..." سلطان نے کہا۔ پھر ان کے درمیان کاروباری گفتگو ہونے لگی۔ میں نے وائرلیس جیکی کو تھما دیا۔

"ان مذاکرات میں تمہاری والدہ ماجدہ شریک تھیں؟"

"وہ ایک بہت فیشن ایبل خوش شکل عورت ہے۔" جیکی نے ماجدہ کے نام پر بڑا معنی خیز منہ بنایا۔ "ورنہ وہ ڈیڈ کو انا بھی کیا تم اتنا پسند کرو گے؟ ایسا زبردست مزاج... بالقوت کی طرف دیکھ کے ہنسنے ہوتی کا چہرہ گلابی پڑ گیا... نے سر ہلا دیا۔

"ہم صرف تمہاری بیگم پارہ کو ایک نظر دیکھیں گے... بھائی میر شرافت علی کو۔" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں وہ کس وقت آئیں گی۔" جیکی نے...

"اس کی کوئی تصویر تو ہوگی؟"

"آف کورس... بچے ساتھ آؤ... مگر ذرا دھیان سے۔ ڈیڈ کے کمرے میں جانا ایسا ہی ہے جیسے شیر کی کچھار میں جانا۔" وہ بولا اور باہر کو بڑھ گیا۔ جاتے جاتے اس نے جونی کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں باہر نکلا تو جونی بھی اٹھ کر...

"تم ٹھہرو..." میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے ڈر لگتا ہے... میں معلوم نہیں کیا ہو جائے۔"

اس کی بات جیکی نے نہیں سنی تھی۔ ہم نے نو سوالوں جیسے رنگ کی تالیوں والی الماری میں جھانکا... چوتھا دروازہ کھولنے کی کوشش کی، وہ مایوسی سے بولا... مقفل تھا... اسی وقت جونی نمودار ہوا۔ اس نے...

"... وہ تالے کھولنے کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔

"وہ تصویر کہاں ہے؟" جونی نے پیچھے دیکھ کر کہا۔

"ابھی ہے..." جیکی بولا۔ "کیا کر رہی ہے؟"

"بیٹھی ہے چچا سوکہ لڈ بھائی کے ساتھ... اور وہ اُسے یاد کر رہا ہے... خیطان..." جونی نے برہمی سے کہا۔

"ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھو تو زبان اڑ گئی کہ وہ بہن بھائی ہیں۔"

"میں ان کو تصویر دکھانے لایا تھا۔" جیکی بولا۔

"جلدی سے دیکھو اور نکل جاؤ۔" جونی نے کہا۔ "کہیں وہ لباس بدلنے کے لیے ہی نہ آ جائے۔"

جیکی نے کہا۔ "وہ ہر ایک گھنٹے کے بعد لباس بدلتی ہے۔" اس پیڈ روم کی شان و شوکت ہی نرالی تھی۔ یہ بیڈ روم اپنی بیوی کا کسی لاس اینجلس کی ناٹ کلب یا نوکیو کے کسی خانہ بدوش اسٹار ہوٹل کا برائیڈل سوئٹ لگتا تھا... میں نے جیسے میاں کی ششدر طبع کے ساتھ یہ بڑا گیا۔ ہوتی تو ایسی کھڑکی کی ممکن ہوتا تو وہ اُٹھ کے باہر بھاگ لیتی۔ مگر وہ اپنی مرضی سے آئی تھی اور اب یہ جانے رہتی ہیاں کے اندر۔ وہ کمرہ پیپر سے گھری جونی کا تپ رہی تھی اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ پسینہ اس کے سر سے پیر تک جاری ہوگا۔ صرف بیڈ کے سامنے والی دیوار خالی تھی اور اس پہ ایک ہی عورت کی قدِ آدم پورٹریٹ لگی ہوئی تھی۔

اس تصویر کے قدموں میں رکھتے ہی میں بھی مبہوت کھڑا رہ گیا اور دونوں بھائی میری حیرت پہ خندہ زن تھے۔

"بولو... جانتے ہو ڈیڈ کتنے باذوق ہیں؟"

"اور بہت زیادہ جوان دل رکھتے ہیں۔"

پھر میں نے اس پورٹریٹ کو دیکھا اور مجھ پہ بجلی گر پڑی... زیب النسا۔ میرے کپکپاتے لبوں سے بے اختیار نکل گیا۔

"زیب النسا؟" جیکی نے حیران ہو کے کہا۔ "اس کا نام پارہ ہے... میں نے بتایا تھا۔"

"ہاں... ہاں..." میں نے خود کو سنبھالا۔ "مجھے یاد آ گیا۔"

"یہ زیب النسا کون ہے؟" جونی نے کہا۔ "جو تمہیں یہ پورٹریٹ دیکھ کر یاد آئی۔"

"وہ... شاید تم نے تاریخ نہیں پڑھی۔" میں نے اپنے آپ کو بے حد جلدی سنبھال لیا تھا۔ "شہنشاہ اورنگ زیب کی بیٹی بہت خوب صورت عورت تھی اور شاعرہ تھی۔ یہ ہو بہو اس کی تصویر ہے۔"

مجھے یقین تھا کہ یہ وضاحت انھیں مطمئن کر دے گی... زیب النسا اورنگ زیب کی بیٹی تھی۔ تخت پہ بیٹھے رہی بھی... اس کا تخت پہ شہنشاہ بنتے بھائی کے عہدِ حکومت میں وہ قید میں گزرا شاعر...

اور مصوّر معتوب تھے۔ شاید اسی لیے میں نے زیب النسا کی کوئی خیالی تصویر تک نہیں دیکھی تھی۔ انگلش میڈیم کے جیکی اور جونی نے تو اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

میرے دماغ میں زیب النسا کی اس تصویر نے عجیب طوفان بپا کر دیا تھا۔ اگر اس تصویر اور زیب النسا کے نقوش میں سر مو فرق ہوتا تو میں اس مشابہت کو اتفاقیہ سمجھتا لیکن اب میں قسم کھا سکتا تھا کہ یہ وہی زیب النسا ہے جو نواب خسرو جمشید کی بہن تھی لیکن وہ لاہور میں تھی اور اس کے روز و شب کا سارا احوال مجھے معلوم تھا۔ وہی زیب النسا کسی سلطان محمد خان کی عشوہ فروش بیوی کیسے ہو سکتی تھی۔ بلاشبہ وہ زیب النسا بھی عشوہ گر تھی مگر وہ عشوہ فروش نہیں تھی۔ وہ بھی اپنی عشوہ طرازی سے قتلِ عام برپا کرنے کی اہل تھی اور اپنی معصوم اداؤں کے حسن سے بڑے بڑے اخلاقِ نیت کے دعوے رکھنے والوں کو کاٹھ کا اُلو بنا سکتی تھی اور اپنی مردانگی پہ ناز کرنے والوں کو اشارۂ ابرو سے چت کر سکتی تھی... یہ عورت بھی ایسا ہی کر رہی تھی لیکن مختلف انداز سے۔ جیکی اور جونی کے بیان کے مطابق یہ عورت ان کے باپ کی سیکرٹری بھی رہی تھی۔ چنانچہ طے شدہ طور پہ یہ زیب النسا نہیں تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پھر یہ کون تھی؟ کیا زیب النسا کی کوئی اور بہن؟ پورٹریٹ میں تو مصوّر نے شباب کے سورج کو نصف النہار پہ دکھایا تھا لیکن ایسا تو سب ہی مصوّر کرتے ہیں۔ کوئی عورت ایسی پورٹریٹ پسند نہیں کرتی جو اس کی اصل عمر ظاہر کرے۔ وہ خود کو پورٹریٹ میں بہرحال ہمیشہ جوان دیکھتے رہنا چاہتی ہے۔ یہ زیب النسا کی بڑی بہن ہو سکتی تھی۔ مگر اس کا فیصلہ میں پارہ کو دیکھ کر ہی کر سکتا تھا۔ اس سوال کا جواب بھی صرف نواب خسرو جمشید ہی دے سکتے تھے کہ زیب النسا کے علاوہ بھی اس کی کوئی بہن تھی یا نہیں... جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا اس نے زیب النسا کو اپنی اکلوتی بہن کہا تھا۔ میرا دماغ اس نکتے میں اُلجھنے لگا تھا۔ پیڈرو... بیگم پارہ... زیب النسا اور خسرو جمشید۔ ان سب کے درمیان تعلق تو ثابت تھا اور اس کی نوعیت بھی واضح تھی۔ یہ ایک ایسی مستطیل بنتی تھی جس کے دو ضلعے جمشید اور زیب النسا تھے تو دوسرے دو ضلعے پیڈرو اور یہ عورت بیگم پارہ... جسے پیڈرو میر شرافت علی کی اپنی بہن کہتا تھا مگر جیکی کا یقین بہن بھائی کے رشتے کی نفی کرتا تھا۔ پھر آج رات خسرو جمشید سے تو ملاقات ہونی ہے، میں نے سوچا۔

"اب چلو بھی نا..." میں نے جونی کی آواز سنی اور جیکی کہتا ہوا دکھائی تو چونکا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں بہت دیر تک اس پورٹریٹ کو گھورتا رہا ہوں۔ میں پلٹا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور میں نے سلطان محمد خان کو اپنے سامنے پایا۔ اسے ایک نظر دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ جیکی اور جونی کا باپ ہے۔ اس کی صورت

www.paksociety.com

میں اپنے دونوں بیٹوں سے تھوڑی سی جھلک تھی۔ اس کی آنکھیں جیکی کی آنکھوں کی طرح بڑی اور بادامی تھیں۔ اس کی ناک جونی کی طرح اٹھی ہوئی تھی۔ بال جیکی کی طرح براؤن خضاب شدہ تھے تو داڑھی جونی کی طرح تھی۔ وہ قد کاٹھ میں دونوں بیٹوں سے بہتر تھا اور پچاس سال کی عمر میں بھی قابلِ رشک صحت رکھتا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اس نے مجھے اور موہنی کو گھورنے کے بعد دونوں بیٹوں کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں ڈیڈ..."

"کچھ نہیں کے بچے... تم نے دروازہ کیسے کھولا... کس کے پاس ہے چابی...؟" اس نے جیکی کی جانب ہاتھ پھیلایا۔

جونی نے چابی نکال کے باپ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ باپ کے سامنے ان دونوں کی ساری سرکشی اور شوخی ہوا ہو گئی تھی۔

"یہ دونوں کون ہیں؟"

"ہمارے مہمان۔" جیکی نے بے اعتمادی لہجے میں کہا۔

"مہمان؟" سلطان نے طنز سے کہا۔ "یہ لڑکی تو ہو سکتی ہے لیکن یہ بڈھا کار ہو... یہ تمہارا مہمان نہیں ہو سکتا... کیوں لائے تھے ان کو سیکرٹ بیڈروم میں... تمہارے مہمان تھے تو تمہارے کمرے میں کیوں نہیں ہے؟" وہ اب شیر کی طرح گرج رہا تھا۔ صورتحال یکلخت خطرناک ہونے لگی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں جیکی اور جونی سچ نہ بک دیں۔ باپ کے سامنے وہ احمق اور بے بس لگتے تھے۔ موہنی ڈر کے تقریباً مجھ سے چمٹ گئی تھی اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ پیڈرو اسی گھر کی چھت کے نیچے موجود تھا اور یہ شور سن کے اوپر بھی آ سکتا تھا۔ اپنی بہن کے گھر میں وہ بلا روک ٹوک ہر جگہ جانے کے لیے آزاد تھا۔

"تم لوگ نہیں بتاؤ گے؟" سلطان نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں خود معلوم کر لوں گا۔"

"ڈیڈ... یہ شخص..." جیکی نے کہا۔ "اور اس کی بیٹی..." سلطان کا ہاتھ ایک سوئچ کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ "یس؟"

"یہ آپ کو کچھ بتانا چاہتا تھا..." جیکی نے کہا۔ "اس زمین کے بارے میں جس کا سودا آپ میر شرافت علی سے کر رہے ہیں۔"

"وہ میری زمین ہے... اس کے بارے میں کوئی مجھے کیا بتائے گا؟" سلطان نے کہا۔

"یہ دونوں بہت دیر سے باہر بیٹھے ہوئے تھے کوئی ان کو اندر نہیں آنے دیتا تھا۔" جیکی نے کہا۔ "اور یہ بضد تھے کہ صرف آپ سے بات کریں گے... وہ بھی اکیلے میں... چنانچہ..."

"چنانچہ تم ان کو سیکرٹ بیڈروم میں لے آئے؟ کیا اکیلے میں کہیں اور بات نہیں ہو سکتی تھی؟" سلطان نے برہمی سے کہا۔

"ایسی کون سی بات تھی بڈھے... اسی وقت بتاؤ ورنہ بہتر نہیں ہوگا..."

"ہم اپنے پیر و مرشد کے حکم سے آئے تھے۔" میں نے اوپر انگلی اٹھا کے کہا۔ "اس زمین کو جانے دو... پیر و مرشد سو گئے اور کہا ہے کہ نہیں سونا ہے... مگر کوئی سوال نہیں رہا ہے۔"

"او شٹ اپ..." سلطان نے جھلا کے کہا۔ "یہ کس قسم کا ڈرامہ ہے... گویا اب تم مجھے ان پیروں فقیروں کے ذریعے قائل کرو گے کہ میں غلطی کر رہا ہوں... آتا ہے... ہو تم جیسے... میں انھیں اور ان کے پیر و مرشد جیسے سیدھا کرنا جانتا ہوں... مجھ سے بڑا پیر کوئی نہیں۔" اس نے ایک بٹن دبا دیا۔

حسب توقع دو خادم نمودار ہو گئے۔ وہ دونوں تندرست تھے اور مسلح بھی ہو سکتے تھے۔ موہنی نے...

"ان دونوں کو تہ خانے میں لے جاؤ۔" سلطان نے کہا۔ "اور الٹا لٹکا دو... مجھے یہ کوئی نوسرباز لگتے ہیں... جو یہاں آئے تھے... اور میرے احمق بیٹے انھیں اندر لے آئے... کا تماشا دیکھ لیں۔ بعد میں گروہ کے دوسرے لوگ بھی آئیں تو پریشانی نہ ہو... میں خود ان سے تفتیش کروں گا... ذرا پیچھے چلے جائیں۔"

وہ دونوں آگے بڑھے اور انھوں نے اپنے... سے خود کو خاندان کا باپ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ جیکی اکڑ گیا۔ وہ خود کو اس صورتحال کا ذمہ دار سمجھتا تھا اور شاید اپنی فکر تھی۔ اس نے اور جونی نے مجھ سے ایک معاہدہ کیا تھا اور اب اسے سخت پریشانی لاحق ہو گئی تھی کہ تفتیش کے نتیجے میں ہم نے اس معاہدے کے بارے میں بھی بتا دیا تو ان کا کیا حشر کریں گے؟

میں نے ان دونوں کو نظر انداز... وہ ایسے بڑھ رہے تھے جیسے وہ مرغیوں کی جگہ... ہم دونوں کمزور مرغوں کا جوڑا۔ ان کی خوش فہمی ایک... ہو سکتی تھی اور ایک جھٹکے میں دو... کر دیتے... میں جاگتے اور شاید پھر اٹھ بھی نہ پاتے... لیکن میں نے... کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ یہ لڑنے بھڑنے کے لیے صحیح جگہ نہیں تھی۔ میں اس کمرے سے نکل جاتا تو اتنی بڑی کوٹھی میں سے... نکل پاتا۔ میں نے موہنی کے کندھے پر تھپکی دے کر اسے... رکھنے کو کہا۔

"رک جاؤ۔" میں نے کڑک کر ایک نعرہ مارا۔ "اللہ کا ولی... فقیروں کو ہاتھ مت لگا... بھسم ہو جاؤ گے۔"

وہ دونوں رک گئے۔ یہ ایک فطری عمل تھا۔

میں خود آگے بڑھ کے چل... "ہم خود چلتے ہیں تیرے ساتھ... تو کیا طاقت آزما... ہم تجھے اپنا جلال دکھاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تو... ہم اللہ ہو سے کاٹ دیں گے... آنکھ دیا ہے... ہم بیچ سار سے... دیں گے۔ حق اللہ..."

میں سمجھتا ہوں میری اداکاری کام کر گئی۔ وہ دونوں تذبذب کا شکار ہوئے کیونکہ وہ جاہل اور کمزور عقیدے کے لوگ تھے جو پیروں فقیروں کے شعبدوں اور درویشوں کی کرامات کے جھوٹے سچے قصے سنتے رہتے تھے اور دل میں ان کے لیے عقیدت کے جذبات بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔ خود سلطان خان کے غصے کا آتش فشاں سرد پڑنے لگا۔ اب میں سینہ تانے آگے چل رہا تھا اور موہنی میرے ساتھ تھی۔ دونوں غلام میرے پیچھے ہو گئے تھے۔

"سنو... ایک منٹ ٹھہرو۔" سلطان محمد نے کہا۔

دونوں محافظ رک گئے۔ میں نے حق اللہ کا ایک اور نعرہ مارا۔

"انھیں باہر چھوڑ آؤ۔" سلطان محمد نے کہا۔ "لیکن جیکی یہ... تم ایسی حرکتوں سے میرا فیصلہ نہیں بدل سکتے۔"

"یس ڈیڈ..." جیکی نے اطمینان کا سانس لیا۔

"چلو اللہ لوک۔" دونوں محافظوں میں سے ایک نے... ہو کے کہا۔ "گستاخی معاف..."

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور پیڈرو سے ٹکرا گیا جو سیدھا اندر آ رہا تھا۔ وہ نعرے بازی سن کے تیزی سے اوپر آیا تھا اور اسے مجھ سے مڈبھیڑ ہونے کی بالکل توقع نہیں تھی۔ اس کے برعکس میں جانتا تھا کہ وہ گھر میں ہے۔ اسے تصادم کے بعد مجھے غور سے دیکھنے کی مہلت نہ ملی۔ میں نے تیزی کا جھرجھری سے اس کا ایک ہاتھ... کیا کہ وہ گھوم گیا۔ اتنی دیر میں میرا دوسرا ہاتھ... نکال... تھا۔ میرے آرم لاک نے پیڈرو کو بے بس کر دیا تھا وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ زور لگاتا تو اس کا بازو کلائی پہ سے ٹوٹ جاتا۔ میں اب... میں تھا اور موہنی ایک دم پیچھے آ گئی تھی۔ باقی سب اس ڈرامائی تبدیلی کو... اسٹیچو بنے کھڑے رہ گئے تھے۔ جب محافظوں کو اپنا... آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

"خبردار... بالکل آرام سے کھڑے رہو... اللہ کے بندو!" میں نے اسی فقیرانہ لہجے میں کہا۔ "جس نے حرکت کی وہ فقیر کا جلال دیکھے گا۔"

"سلطان!" پیڈرو نے چیخ کر کہا۔ "گولی مار دو اس کتے کو..."

میں تمہارے گھر میں ہوں... تمہارا مہمان ہوں..."

سلطان نے سر ہلایا۔ "فکر مت کرو... یہ تم کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا... جیکی... تم اسے ساتھ لائے تھے؟"

جونی اور جیکی نے بمشکل تمام سر ہلایا۔ "تم... یہ کیا کر رہے ہو؟"

"یہ تمہارے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم ابھی بچے ہو... بہتر ہے کہ خاموش رہو۔"

ایک محافظ نے بڑی تیزی سے جست لگائی تھی مگر میرا سیدھا پاؤں بجلی کی طرح حرکت میں آیا۔ ٹھوکر اس کے سینے پہ پڑی۔ وہ ایک چیخ مار کے دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرایا اور نیچے گر گیا۔ وہ بالکل فٹ بال کی طرح اچھل کے گیا تھا اور یہ منظر ان سب کے لیے ناقابلِ یقین تھا کہ ایک کھچڑی داڑھی اور گنجے سر والے بوڑھے نے چھ فٹ قد والے دو سو پونڈ وزن کے جوان آدمی کو ایسے اچھال دیا تھا۔ پیچھے گرنے والا اب درد سے جھلا رہا تھا اور سینے کو سختی سے پکڑے لوٹ رہا تھا۔

"میر صاحب کی جیب سے ریوالور نکال لو۔" میں نے موہنی کو اشارہ کیا۔ موہنی ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی۔

"کمینے..." پیڈرو نے اپنے دانت پیس کے گالی دی اور اس کا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا۔ موہنی اگر اچھل کے پیچھے نہ ہو جاتی تو یہ تھپڑ اس کے منہ پر پڑتا۔

میں نے پیڈرو کو آگے جھٹکا دیا اور اس کی کمر میں سر مارا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے آیا تو میں نے پھر اس کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ وہ آگے جھکا اور اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ ایک عورت پیچھے سے چیختی ہوئی اوپر آئی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ سلطان کی دوسری بیوی تھی جو زیب النسا کی ہم شکل ضرور تھی مگر اس کی اور زیب النسا کی عمر میں بہت فرق تھا۔ زیب النسا میرے اندازے کے مطابق اٹھارہ بیس سال کی تھی تو یہ عورت اڑتیس چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ معصومہ نے اس کی پوری بیٹی... میں دس سال کم کیے تھے تو دس سال خود وہ اپنی عمر سے چھوٹی لگتی تھی۔ اس میں کمال اس کی صورت کے نقوش اور جسم کی ساخت کا بھی تھا اور خود اس کی توجہ اور محنت کا بھی... جو اس نے خود کو فٹ رکھنے میں صرف کی ہوگی۔ لباس اور میک اپ کا انداز اس کا مزید مددگار ثابت ہوا تھا مگر اس کے باوجود مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ زیب النسا کی بڑی بہن نہیں، اس کی ماں ہے۔

"خدا کے لیے چھوڑ دو اسے... یہ کیا کر رہے ہو تم۔" وہ شیرنی کی طرح میری طرف جھپٹی تھی کہ موہنی نے اس کو اپنی ٹانگ سے روک لیا۔ اس نے اپنی ٹانگ اڑا دی اور وہ تیز رفتاری کی وجہ سے خود کو سنبھال نہ سکی۔ وہ منہ کے بل گری اور پھر اٹھی تو موہنی نے

www.paksociety.com

اُسے اندر دھکیل دیا۔

پیڈرو اب ایسے جھوم رہا تھا جیسے وہ نشے میں ہو۔ میں نے پھر موتی سے کہا۔ اس کو نہتا کر دو۔ اب اس نے کوئی حرکت کی تو میں اس کے کپڑے اتار کر سب کے سامنے اتنا ماروں گا کہ یہ اپنی اصلیت بھی بھول جائے گا۔"

موتی نے اس کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

"جیکی... میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اپنے ڈیڈ سے کہو کہ میرا راستہ روکنے کی کوشش نہ کریں۔ میں صرف اس شخص... میر شرافت علی کے لیے آیا تھا اور اسے ضرور اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو اور تمہاری میر شرافت علی سے کیا دشمنی ہے... لیکن جو تم چاہتے ہو وہ نہیں ہو سکتا۔"

"ڈیڈ... پلیز آپ دخل مت دیں۔" جولی نے کہا۔

"آپ کو کیا ضرورت ہے۔" جیکی نے کہا۔

"ضرورت ہے..." سلطان نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ان کی دشمنی اس گھر کی چار دیواری سے باہر رہنی چاہیے۔ یہاں جو بھی ہے سلطان محمد خان کا مہمان ہے۔ اس کی حفاظت میں ہے۔"

"کیا یہی ضمانت آپ میرے لیے بھی فراہم کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"تمہارے لیے؟ تم میرے مہمان نہیں ہو۔" سلطان نے حقارت سے کہا۔

"آپ ہمارے مہمانوں کو اس گھر کا مہمان نہیں سمجھتے؟" جیکی نے تیز ہو کے کہا۔

"اگر آپ اپنے مہمانوں کی حفاظت کر سکتے ہیں تو ہم بھی اپنے مہمانوں کی حفاظت کر سکتے ہیں۔" جولی نے سرکشی سے کہا۔

"کیا... تم دونوں پاگل ہو گئے ہو؟" سلطان نے اپنے جوان بیٹوں کو دیکھا جو اس کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔

"تم نہیں جانتے... یہ کون ہے..." پیڈرو کراہ کے بولا۔

"میر صاحب... یہ بھی نہیں جانتے کہ آپ کون ہیں۔" میں نے کہا۔

"دیکھو... یہ ناممکن ہے کہ تم اس حویلی سے میری اجازت کے بغیر نکل سکو... تمہیں اندازہ نہیں کہ باہر حفاظتی انتظامات کتنے سخت ہیں اور کتنے محافظ ہیں جو تمہارا راستہ روک سکتے ہیں۔" سلطان نے کہا۔ "تمہیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ تم کس کے گھر میں ہو۔ میرا ایک ٹیلی فون کافی ہے۔ میں کمشنر یا ڈی آئی جی سے براہ راست بات کر سکتا ہوں اور..."

"میں آپ کو فون تک جانے کی اجازت دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر سلطان صاحب... اگر آپ عزت دار آدمی ہیں تو اس بات کو گھر کی چار دیواری سے باہر نہ جانے دیں۔ اسی میں آپ کا فائدہ ہے ورنہ آپ کو بہت کچھ بتانا پڑے گا جو آپ کے مفاد میں نہیں ہوگا۔ آپ ایسے چکر میں آ جائیں گے کہ... شرافت علی۔" میں نے اسے ایک جھٹکا دیا اور اس کا سر دیوار سے لگا۔

"بتاؤ انہیں... کہ ان کے حق میں کیا بہتر ہے۔" میں نے کہا۔

پیڈرو سر ہلانے لگا۔ "میں... مجھ سے نمٹ لوں گا۔ آپ دخل مت دو۔" وہ ایسا کہنے پر مجبور تھا۔ اگر وہ میرے جواب میں ایک بھی لفظ زبان سے نکالتا تو میں سلطان پر اس کی اصلیت عیاں کر دیتا۔ پیڈرو سمجھتا تھا کہ ہم کسی کے روکے رکنے والے نہیں ہیں... ہم اسے بھی مار سکتے ہیں اور سلطان کو بھی۔ اور کچھ نہ کریں تو سلطان کو یہ ضرور بتا سکتے ہیں کہ اس کا نام پیڈرو ہے... وہ جولیو کا ساتھی ہے اور ایسا قزاق ہے جو اس کی مقدس زمین کو بھی اسلحہ اسمگلنگ کے لیے استعمال کرے گا... اور وہ سب اسلحہ ملک کے دشمنوں کو فروخت کیا جائے گا۔

"لیکن... یہ تم کو مار دیں گے۔" بیگم پارہ چلائی۔ "تم انہیں روکو سلطان...؟"

جیکی اور جولی ایک دم اپنے باپ کے دائیں بائیں آ گئے۔ "ہم اپنے مہمانوں کے محافظ ہیں... کیوں ڈیڈ؟"

سلطان نے سر ہلایا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس وقت بیوی کی عشوہ فروشی کا جادو بے اثر ہے۔ اس کے مقابل جوان اولاد ان کی زندگی تھی۔ اس گھر کی عزت تھی اور اس کا مستقبل تھی۔ وہ مجبور ہو گیا تھا کہ جوش کے بجائے ہوش سے کام لے اور حالات کو زیادہ خراب ہونے سے بچائے۔ وہ میر شرافت علی کو اپنا محسن سمجھتا تھا مگر سامنے جب اپنی اور بیٹوں کی زندگی ہو تو قربان نہیں کر سکتا تھا... اگر انتخاب کا یہ حق کسی بھی شخص کو دیا جائے تو وہ مجبور ہوگا کہ اپنی انا کی شکست قبول کر لے۔ اگر پہلے ایسا نہیں ہوا تھا تو اب ہو رہا تھا کہ سلطان محمد خان اپنی حویلی میں اپنے ایک مہمان کو تحفظ کی ضمانت دے کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ بہت کچھ جو پہلے نہیں ہوا تھا اب ہو رہا تھا... اور آئندہ بھی ہوگا... وقت... قدریں... اصول... سب بدلتے ہیں۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں...

سلطان کی بیوی اب بھی چلا رہی تھی۔ جیکی اور جولی خوش تھے کہ معاملات بگڑ گئے اور پھر بات بنی تو یوں بنی کہ سلطان اور میر شرافت علی کے درمیان بداعتمادی پیدا ہو گئی اور ان کے درمیان جو صدیوں پرانے سودے کی خرابی یقینی ہو گئی۔ وہ یہی چاہتے تھے جو وہ میری مدد کر رہے تھے۔

"تم حوصلہ رکھو۔" سلطان نے اپنی بیوی سے کہا۔ "تمہارے بھائی کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ میں ان کے ساتھ باہر تک جاؤں گا۔"

"ہم بھی باہر تک ساتھ جائیں گے۔" جیکی نے کہا۔

"اندر کوئی خون خرابا نہیں ہوگا۔" سلطان نے کہا۔ "کوئی گولی نہیں چلائی جائے گی۔"

"کوئی جارحانہ اقدام نہیں کرے گا... اپنی گھر والی کو بھی یہ بات سمجھا دو کہ تمہاری واپسی تک کچھ نہ کریں۔" میں نے کہا۔ "ہم وعدہ کرتے ہیں کہ کسی کو ہمارے یہاں آنے کی خبر ہوگی نہ جانے کی۔"

"ٹھیک ہے... باہر دو گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں۔ ایک سفید رنگ کی ہنڈا ہے۔" سلطان نے کہا۔ "دوسری سیاہ رنگ کی پراڈو... ایک میر شرافت علی کو لے جائے گی۔ دوسری تمہیں... ایک کو جان محمد ڈرائیو کرے گا۔ دوسرے کو شفیع محمد... اور باہر نکلنے کے بعد ایک دائیں طرف جائے گی اور دوسری بائیں طرف... دونوں گاڑیاں ٹھیک پانچویں میل پر تمہیں ڈراپ کر کے واپس آ جائیں گی۔ اس وقت تم دونوں کے درمیان دس میل کا فاصلہ ہوگا۔"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے کہا۔

"دونوں گاڑیوں میں ایک ایک مسلح محافظ بھی ہوگا... اسٹین گن کے ساتھ جو میرے بیٹوں کی حفاظت کرے گا۔" وہ بولا۔

"مجھے یہ بھی منظور ہے۔" میں نے کہا۔ "صرف آپ کی عزت کی خاطر میں میر شرافت علی جیسے دشمن کو چھوڑ رہا ہوں... اس سے پھر کبھی کہیں اور ملاقات ہوگی۔"

"چھوڑنے والا میں بھی نہیں ہوں تمہیں۔" پیڈرو کا حوصلہ لوٹ آیا۔ "نمٹ لوں گا جب وقت آئے گا۔"

سلطان کو پیڈرو کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ وہ اسے یا اس کے بیٹوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ جو محافظ بھی جا رہا تھا وہ اسی کی حفاظت کے لیے تھا لیکن اسے یہ اطمینان تھا کہ جیکی یا جولی کی موجودگی میں پیڈرو اس محافظ کو جارحیت کے لیے مجبور نہیں کر سکے گا۔ کوئی مشتعل ہو کر کسی قسم کی محاذ آرائی کا سوال ہی نہ تھا۔ پیڈرو گڑبڑ کرنے کی صورت میں ہم خود بھی مصیبت میں پڑ سکتے تھے۔

میں نے اس دشمنی سے دستبرداری قبول کر لی۔ آج کی رات مجھے دوست کے دشمن سے نمٹنا تھا۔ منظور گوجر ملتان سے دور نہیں تھا اور وہاں کسی رانی کی حویلی میں نواب خسرو جمشید سے ملاقات زیادہ اہم تھی۔

دونوں کاریں ایک ساتھ روانہ ہوئیں۔ سلطان ہمارے ساتھ باہر تک آیا اور اس وقت تک کھڑا رہا جب تک کاریں گیٹ سے نہیں نکل گئیں۔ ہم سفید ہنڈا میں تھے۔ اسے جیکی چلا رہا تھا۔ محافظ آگے اس کے ساتھ اسٹین گن لے کر بیٹھا تھا اور اسے سلطان نے بہت واضح احکامات دیے تھے۔ ان مہمانوں کو ٹھیک پانچ میل کے فاصلے پر اتار کے گاڑیاں واپس لے آؤ... جیکی یا جولی کے لیے خطرہ محسوس ہو تو بے دریغ جان پر کھیل جاؤ... مار دو اور مر جاؤ... بصورت دیگر خاموشی سے لوٹ آؤ۔

جیکی نے مجھے پانچویں میل پر ایک ایسی جگہ اتارا جہاں سے بس کا اڈہ بہت قریب تھا۔ جب میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے اس سے مصافحہ کیا تو اس نے میرا ہاتھ دبایا۔ یہ شکریہ ادا کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ وہ ساتھ بیٹھے ہوئے محافظ کی موجودگی میں کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ کار واپس ہوئی اور چند سیکنڈ میں نظر سے اوجھل ہو گئی تو میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

"اچھی اداکاری کی تھی تم نے۔" میں نے کہا۔

"مجھے الزام دے رہے ہو۔" موتی چراغ پا ہو کے بولی۔ "میں نے کہا تھا کہ ان کے مہمان بنو؟"

"بڑے بڑے پھنسے تھے... مگر خیر... قسمت اچھی تھی کہ نکل بھی آئے... تم نے تو میر شرافت علی کو پہچان لیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ہاں... یہ وہی جعلی میجر تھا... مگر اس نے بھی تو مجھے پہچان لیا ہوگا۔" وہ بولی۔

میرے پاس اس خدشے کے لیے بالکل وقت نہیں تھا۔ حالات مجھے ایسے موڑ پر لے آئے تھے کہ ایک ساتھ دو بڑے شکاری ایک ہی رات میں میرا شکار ہو سکتے تھے مگر مجھے ایک کا انتخاب کرنا پڑا۔ میں اگر چاہتا تو پیڈرو کو یوں نہ نکلنے دیتا لیکن میں جیکی اور جولی کے گھر میں خون خرابا نہیں چاہتا تھا۔ ان دونوں لڑکوں کی دوستی سے مجھے آگے چل کے زیادہ فائدہ ہو سکتا تھا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ وہ درمیان کی کڑی بن گئے اور مجھے دہرا فائدہ حاصل ہوا۔ ایک طرف تو پیڈرو کی منہ بولی بہن کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات ہوئے۔ دوسری طرف اسی بہانے جیکی اور جولی کا تعاون ملا... ہوا اور لاڈلا اپنے کیے کا بنا بنایا کام بگڑ گیا۔ معلوم نہیں سلطان محمد خان کس لیے

www.paksociety.com

میں ان کو اپنا قطعہ زمین بیچنے پر تیار ہو گیا تھا جس کی قیمت بچاس لاکھ کو بھی اور جعلی بہت کم سمجھتے تھے جبکہ ہے ڈالر اینڈ کمپنی نے سلطان کو بھی اپنے کاروبار میں سلیپنگ پارٹنر بننے کے دس پندرہ فیصد منافع دینے کی بات کی ہو۔ بظاہر سلطان انھیں اپنا پلاٹ بیچنے پر رضامند نظر نہیں آتا تھا اور اب یہ گم پارہ کے دباؤ میں یہ سودا کر رہا تھا۔

"اب کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟" موتی نے کہا۔ "کہیں وہ بدمعاش پھر دوبارہ نہ آجائیں۔"

میں چونکا۔ "وہ ادھر کیسے آسکتے ہیں؟"

"اچھا تو پھر جاتے رہو۔" موتی چڑ کے بولی۔ "جب وہ آجائے تو اس سے پوچھ لینا کہ بھائی صاحب کیسے تشریف لائے ہو؟"

میں ہنس پڑا۔ "گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔"

"معلوم نہیں گیدڑ کون ہے۔" موتی شگفتگی سے بولی۔ "اس وقت تو سب ہی شہر میں ہیں۔"

"چلو پھر ہم شہر سے بھاگ جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن کیا بس کا سفر ہمارے شایان شان ہوگا؟"

"پتا نہیں... پہلا تو کوئی شاہی بجرہ منگوالو۔"

میں نے ایک طرف گلنے کی سوزوکی گاڑیوں کے ساتھ کاروں کی قطار دیکھی۔ یہ کوئی پارکنگ ایریا نہیں تھا، جہاں کسی کو چھوڑنے یا لینے کے لیے آنے والے گاڑیاں کھڑی کرتے ہیں۔ پھر ان کے ڈرائیور بھی مگر امید نظر سے آنے جانے والے مسافروں کو دیکھ رہے تھے اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ پرائیویٹ ٹیکسیاں ہیں۔ ابھی میں نے ایک سے ہی بات کی تھی کہ مجھے چار نے گھیر لیا۔ مظفر گڑھ تک جانے کے ایک نے چار سو مانگے۔

"چار سو...!" میں نے یوں کہا جیسے مجھے ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔

"چلو جی تین سو دے دینا۔" وہ جھٹ سے فوراً رعایت دی۔ پہلے والے نے اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔

"تین سو بھی بہت زیادہ ہیں۔" میں نے فریاد کی۔

"تو کیا تم بدلے میں جانے کا خیال ہے؟" پہلے والا بالوں سمیت جل پڑا۔ "میں تو کہتا ہوں پیدل چلے جاؤ۔"

"ہاں... تین سو روپے بھی بچ جائیں گے۔ جان مفت میں بچے گی۔" دوسرا بھی الگ ہو گیا۔

"بابا جی... ڈھائی سو میں چلتے ہو تو بات کرو۔" تیسرے نے بھی داؤ لیتے ہوئے کہا۔

"دو سو میں لے کر چلوں گا، جو تھا کچھ تیار ہو رہا تھا کہ میں نے فوراً تیسرے سے بات پکی کر لی۔ دراصل وہ سب سے کمزور اور قیم

سورت بنا اور چوتھا کچھ پہلوان اور بدمعاش نما لگ رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد ہم مظفر گڑھ کے بازار میں اتر گئے۔ پھر سب سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری گفتگو میں سلطان محمد کا کوئی حوالہ آئے یا مظفر گڑھ میں تشریف آوری کا مقصد کسی کو معلوم ہو۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ پیڈ روبیس کے اڈوں پر جائیں گے اور میرا حلیہ بتا کے معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ میں کس طرف گیا ہوں۔ ... ریلوے اسٹیشن پر بھی کر سکتا تھا۔ اسے یقیناً پریشانی ہو رہی ہوگی کہ میں کے مظفر گڑھ پہنچ گیا اور وہ بھی موتی کے ساتھ۔

رات کے دس بجے مظفر گڑھ کے بازار میں بہت سی دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ مشروبات بھی پی جانے اور شربت بیچنے والوں کی دکانیں اور مٹھائی کی دکانیں اور چند ہوٹل کھلے رہ گئے تھے۔ ایک ہوٹل پر سائن بورڈ پر اعلان کر دیا گیا تھا کہ یہاں خواتین کے لیے علیحدہ اعلیٰ انتظام ہے، اور اس کے ساتھ ہی فیملی روم کی نشاندہی کرنے کے لیے تیر کا نشان بنایا گیا تھا۔ میں نے موتی کے ساتھ رات کا کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔

ہمارے داخل ہوتے ہی شرفا کا ایک جوڑا جو کیبن میں بیٹھا تھا، اس کی پرائیویسی میں اس وقت کسی کی دخل اندازی سے ... بے نیاز تھا۔ جو کچھ دیکھا ... موتی کا رنگ لال پڑ گیا۔

"یہ کیا واہیات جگہ ہے؟" اس نے دونوں کیبن میں بیٹھ کر...

"کوئی جگہ خراب نہیں ہوتی... لوگ خراب ہوتے ہیں یا ان کے اعمال۔" میں نے ایک فلسفیانہ نقطہ پیش کیا۔ "اب اس کے برعکس اگر میں اس اسپتال کی مثال دوں جہاں تم زیر علاج تو وہ جگہ اور تمہارا پیشہ بے حد قابل عزت سمجھے جاتے ہیں... تم خود..."

"میں یہاں تمہاری گالیاں کھانے نہیں کھانا کھانے آئی ہوں۔" وہ بولی۔

"سوری۔ کبھی کبھی پیٹ میں پیچ کا مروڑ اٹھتا ہے، غیر ضروری بات بھی زبان سے نکل جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ اسی وقت ویٹر نمودار ہوا۔

میں اس انتظار میں تھا کہ اب وہ فرفر مینو پڑھنا شروع کر دے گا جس کے کچھ الفاظ یقیناً میری سمجھ میں آجائیں گے مگر اس نے کہا "دال قیمہ" اور موتی کو گھورنے لگا۔

"آگے بھی بولو استاد۔" میں نے اس کے سامنے چٹکی بجائی۔

"آگے کچھ نہیں... سب ختم ہو گیا۔" وہ شرمندہ ہو کے بولا۔

"بس تو پھر پوچھنا کیا... بسم اللہ..."

کھانا واہیات تھا مگر ہوٹل والا کے بہت اچھی ملی... پھر

گئے سے اس وقت تک بازار مزید ویران ہو چکا تھا۔ سگریٹ کی چیک ... پل کر گئے۔ سگریٹ والے سے کہا۔ "بابو... یہ داڑھی کی حویلی کدھر ہے؟" سلطان ... والی حویلی؟ اس وقت جاؤ گے؟" وہ میٹھا پان بناتے ہوئے ... میں نے موتی کو بات کہتے دیا۔ "بے شک... پان کی پلیٹیں بلا ... جانے کے لیے وقت مقرر ہے؟" میں نے سادگی سے کہا۔

"نہیں... مگر تمہارے ساتھ زنانی ہے۔" وہ بولا۔

"کیا وہاں عورتوں کا جانا منع ہے؟"

"اوبابو... داڑھی بری جگہ... عقل نہیں آئی؟" وہ جھلا کے بولا۔ "ادھر سے گھوم کے جاؤ تو سیدھی سڑک وہاں جاتی ہے... مگر راستہ ویران ہے، جنگل پڑتا ہے بیچ بیچ میں۔"

"کیا جنگل میں شیر ہیں آدم خور؟" میں نے سہم کر کہا۔

"اف... کیسے کیسے پاگل ... سے پڑے ہیں دنیا میں۔"

"کیا میں نے غلط کہا؟ جنگل میں ڈاکو ہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں... کچھ نہیں... تمھارے لیے راستہ بتا دیا ہے... آدھی عمر ہی بنا رکھی ہیں، جھنڈے لگا رکھے ہیں... وہ چلا کے بولا۔ "جاؤ..."

میں سر ہلا کے چل پڑا... اگلے موڑ پر میں نے اس سیدھی سڑک کو دیکھا۔ اس کے دونوں جانب کچھ دور تک مکانات کا سلسلہ تھا مگر اس کے بعد تاریکی اور ویرانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"کیا اب تین میل پیدل چلنا ہو گا؟" موتی نے کہا۔

"نہیں... میں نے پہلوانوں کا شاہی بجرہ منگوایا ہے۔" میں نے موتی کو اسی کے الفاظ لوٹا دیے اور اچانک ایک بہت پرانا گیت میری زبان پر آگیا جو میں اور محسن ایسے ہی مواقع پر گایا کرتے تھے۔ "چل چل رے نوجوان! ... دور تیرا گاؤں اور تھکے پاؤں..." بہرحال یہ سب مجھے یاد پڑتا تھا یہ علم سکندر اعظم کا ترانہ تھا اور معلوم نہیں کس نے گایا تھا؟

جب میں نے گانا شروع کیا تو میرا ساتھ دینے کے بجائے موتی کو تقریباً دوڑنا پڑا۔ "اف... یہ کیا مصیبت ہے... ایسے ... لگے مجھے۔"

"میں فرسٹ کلاس میں ہوں خاتون۔" میں نے کہا۔ "میری رفتار اس سے کم نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا تو پھر جاؤ۔" وہ خالی سڑک پر دھرنا دے کر بیٹھ گئی۔ "واپسی پر مجھے یہیں سے لے لینا۔"

میں کوئی سو قدم گیا اور پھر امید تھی کہ بالآخر وہ دوڑتی ہوئی آئے گی۔ اس سنسان سڑک پر جہاں دونوں جانب درختوں کے سوا کچھ نہیں، وہ کب تک اکیلی بیٹھی رہے گی... مگر سو قدم

پہنچنے ہونے سے پہلے ہی مجھے مایوسی، خفت اور جھنجلاہٹ ہونے لگی کیونکہ اب واپس جا کے اسے ساتھ لانا اگر یہ ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پیچھے سڑک پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں۔ میں واپس ہوا تو تیز روشنی میں میں نے موتی کو سڑک سے اٹھ کر ایک کنارے پر کھڑے ہوتے دیکھا... ابھی میں دس قدم ہی گیا تھا کہ گاڑی موتی کے پاس پہنچ کے رک گئی۔

اچانک میری چھٹی حس نے مجھے ہوشیار کیا۔ اسی کے ساتھ میں نے موتی کی چیخ بھی سنی اور میں سرپٹ بھاگا۔ میرے پہنچنے تک وہ بدمعاش موتی سے لپٹ چکے تھے اور اسے کھینچ کر جیپ میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک نے موتی کو چھوڑ دیا اور میری طرف لپکا۔ وہ خوب اچھا خاصا پلا ہوا سانڈ تھا۔ اس نے مجھے نالی سے کوفرنا گھمایا۔ میں تھوڑا سا جھک گیا اور اس کا مکا میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ وہ خود اپنے زور میں گھوم گیا۔ میں نے اس کی کمر پر لات ماری... وہ ایک جھٹکے سے آگے گیا اور ایک درخت کے تنے سے ٹکرا گیا... آخری وقت میں اس نے دونوں ہاتھ آگے کر لیے تھے، ورنہ اس کا منہ چپٹا ہو جاتا۔

جب وہ پلٹا تو مجھے اس کے ہاتھ میں خنجر نظر آیا جو اس نے ڈب میں سے نکالا تھا۔ خنجر کے پھل کی دھندلی سی چمک بھی مجھے اندھیرے میں موت کی بھیانک مسکراہٹ لگی۔ اس نے چیتے کی طرح غرا کے مجھے گالی دی اور ایک جست لگا کے مجھ پر وار کیا۔ میں نے پینترا بدلا اور اس کے خنجر والے ہاتھ کی کلائی پر ایک ماری۔ خنجر اس کے ہاتھ سے طوطوں کی طرح اڑ گیا اور وہ بچے کی طرح بلبلایا۔

اسی وقت میں نے موتی کے چلانے کی آواز سنی۔ اس نے صرف میرا نام پکارا تھا۔ بروقت اس کی طرف دیکھنے سے میں بچ گیا۔ دوسرے بدمعاش نے خنجر کے وار کو ناکام دیکھ کر پستول نکال لیا تھا۔ انھیں بالکل امید نہ تھی کہ صورت بدلتا نظر آنے والا کوئی شخص خالی ہاتھ ہونے کے باوجود دو جوانوں کے مقابلے پر اتر آئے گا۔

گولی کی آواز جنگل میں گونجی تو درختوں سے پرندے چیختے چلاتے اڑ گئے... مجھے صرف یہ احساس ہوا کہ گولی میرے بہت قریب سے گزر گئی ہے۔ پھر میں نے ایک فلائنگ کک ماری اور پستول سے فائر کرنے والا الٹ کر جیپ پر گرا۔ اس کا سر پائدان سے ٹکرا کے پھٹ گیا۔ وہ ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چلایا اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کے کھڑا ہوا۔ غالباً وہ سر سے بہنے والے خون کے فوارے کو روکنے کی احمقانہ

www.paksociety.com

کوشش کر رہا تھا کھڑا ہوتے ہی وہ لڑکھڑا کے آگے بڑھا اور منہ کے بل گرا۔

خنجر نکالنے والے نے اندازہ کر لیا تھا کہ بازی مات ہو گئی ہے یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گی۔ انھوں نے تو سوچا ہو گا کہ بڈھا خنجر دیکھ کر ہی تھر تھر کانپنے لگے گا اور پھر بھی مقابلے پہ آیا تو پستول اُسے بے ہوش کرنے کے لیے کافی ہو گا۔ اب بچ جانے والا فرار ہونا چاہتا تھا مگر اسے ایک فکر تو جیب کی تھی اور دوسری اپنے ساتھی کی کسی ایک کو چھوڑ کر جانے کا مطلب تھا اپنا پتا چھوڑ جانا۔ معاملہ آگے گیا تو اس کا زخمی ساتھی دوسرے کے بارے میں خود بتائے گا اور وہ مر گیا تب بھی جیپ کے نمبر سے پولیس اس کا سراغ لگا لے گی۔

اس نے ایک آخری کوشش کے طور پر خنجر دوبارہ اٹھا لیا لیکن مقابلے پر آنے کے بجائے اس نے خنجر موتی کے پیچھے سے اس کی پشت پر رکھ دیا۔ ”میں مار ڈالوں گا اسے۔“ وہ دیوانوں کی طرح چلایا۔ ”اس کا پیٹ پھاڑ دوں گا۔“

”تم اس کے بعد بھی زندہ بچ کے نہیں جا سکتے۔“ میں نے سکون سے کہا اور ایک قدم آگے بڑھا۔

”میں کہتا ہوں رک جاؤ۔“ وہ چیخ کر بولا مگر میں نے ایک ایک قدم اس کی جانب پیش قدمی جاری رکھی۔

”مار ڈالو اسے... انتظار کیوں کر رہے ہو میرا... میں تو جو حال تمھارا بتیجے ہی جاؤں گا... تم مجھ سے بچ کے کہاں جاؤ گے؟“ میں نے کہا۔ ”اور میرے ہاتھوں کو کیسے روکو گے... جو تمھاری گردن مروڑ سکتے ہیں۔ جیسے مرغی دبوچا جاتا ہے ویسے... ایسے میں تمھارے جسم سے خون نچوڑ لوں گا۔“

وہ ایک دم سڑک پر سجدہ ریز ہو گیا۔ ”مجھے معاف کر دو... میں شیطان کے بہکاوے میں آگیا تھا... میری توبہ... میرے باپ کی توبہ۔“ وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔

میں نے اسے گردن سے پکڑ کے اوپر اٹھا لیا... وہ کسی مردہ چوہے کی طرح نظر آرہا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ”دیکھو تمھارا بہادر ساتھی کیسے مرا پڑا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”موت کبھی کبھی ایک خوب صورت عورت بن کے سامنے آتی ہے اور میرے جیسا ایک بڈھا فرشتہ اجل بن کے روح قبض کر لیتا ہے۔“

وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ ”ابا جی... میری ماں مر جائے گی۔ دس کا ایک ہی تو بیٹا ہوں میں... میری شادی ہونے والی ہے محرم کے بعد۔“

”اس وقت تک تو تمھارا جنازہ بھی ہو چکا ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”خدا نے ایک لڑکی کو تم جیسے شیطان کی بیوی بننے سے بچا لیا۔“ وہ پھول پھول کر کے رونے لگا۔ ”آپ کہتے ہو تو میں ابھی سے بھی شادی نہیں کروں گا۔“

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ ”پھر کیا؟ اس سے کیا ہوگا؟“ میں نے موتی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تو تمھیں بہت پسند آئی کہ تم عقل اور جذبات پر قابو نہ رکھ سکے تھے... ایسے تم زندہ رہ سکتے ہو؟“

”میں سب کچھ کر سکتا ہوں جی... آپ حکم کریں۔“

”اپنے اس ساتھی کی لاش اٹھا کے جیپ میں ڈالو۔“ میں نے کہا۔ ”اور جیپ لے کر آگے چلو... جہاں دونوں آئے تھے حویلی کے پاس چھوڑ دو اور جیپ لے کر واپس چلے جاؤ... کسی نے دیکھ لیا ہے مگر تم خاموش رہو گے تو ان کا کوئی کچھ نہیں کرے گا۔ لاش کو جیسے چاہو ٹھکانے لگاؤ اور خود کو بچانے کے لیے کچھ بھی کرو۔“

وہ مجبور تھا کہ اپنا کیا سامنے آیا ہے تو بھگتے... اس نے سڑک کے کنارے سے لاش اٹھا کے آگے ڈالی۔ وہ خود ڈرائیور کی جگہ پر بیٹھا۔ میں اور موتی پیچھے کی دو سیٹوں پر بیٹھ گئے جو آمنے سامنے بنائی گئی تھیں۔ تنگ سڑک بالکل تاریک تھی مگر روشن تھی۔ میں نے اسے حکم دیا کہ وہ ہیڈ لائٹس بند کر دے اور رفتار کم کر دے۔

”آپ... راتی کی حویلی میں جاؤ گے جی؟“ وہ کچھ دیر بعد بولا۔

”ہاں... جب حویلی سو گز دور رہ جائے تو گاڑی روک لینا۔“

”وہاں... کیا کام ہے جی آپ کو...؟“

”تمھاری جنت سے کوہ قاف کا ویزا لینا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم چلو گے؟“

”وہ جی... اس وقت... کوئی نہیں جاتا وہاں۔“ وہ بولا۔ ”بختی کے احسان کا بدلہ ادا کرنے کے لیے چلیں بھی تو منحوس جگہ تھا۔ اور جو جاتا ہے وہ تو واپس نہیں آتا۔“

”ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم بھی واپس نہیں آئیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر کیا تم کسی کا نام بتا سکتے ہو جو وہاں رات کے وقت گیا اور لوٹ کر نہیں آیا؟“

”ہاں جی... ایک تو فتنو تھا۔ اس کا باپ پولیس میں تھا اور وہ بھی ایسے ہی غائب ہو گیا تھا۔“ وہ بولا۔

”کیا نام تھا اس کے باپ کا؟“

”احمد علی یا محمد علی... کچھ یاد نہیں۔“ وہ بولا۔ ”پرانی بات ہے۔“

”کتنی پرانی؟“

”اسے تو شاید دس سال سے اوپر ہو گیا... فتنو کو وہ چاند...“

”اور نسیم صاحب کب اُدھر گئے تھے؟“

”فتنو سے دو سال پہلے... بس وہ ہوش میں نہ آیا تو...“

میں دیکھتا ہوں خود جا کے... ہاں سے صرف نشان تھا کہ باپ اُدھر گیا تھا۔ پولیس نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ میں یہی لکھا تھا۔“

”اچھا اور کوئی؟“

”اور بہت سے ہیں... میں سب کو نہیں جانتا۔“ وہ بولا۔ ”ایک بڑی بھی بہت خوب... دل پہ ہی کرتی تھی... لال کپڑے پہنتی تھی... ہونٹ لال... آنکھیں لال، گال بھی لال... اسے تین آدمی لے گئے تھے۔ وہ گاڑی تو بعد میں اسی جگہ مل گئی تھی... ایک فرلانگ پیچھے۔“

”بڑی کیسی تھی؟“

”مجھے نہیں معلوم جی... پولیس تھانے میں رپورٹ موجود ہے اس میں سب نمبر وغیرہ مل جائے گا۔“ وہ بولا۔

”کیا راتی کی حویلی میں کوئی نہیں رہتا؟“

”سنا ہے کوئی نہیں رہتا۔“ وہ گاڑی روک کے بولا۔ ”وہ سامنے ہے حویلی۔“

”اچھا تم کیا جانتے ہو اس حویلی کے بارے میں... اس کا مالک کون ہے؟“ میں نے کہا۔

”کوئی سندھ کا تھا... وہ بھاگ گیا تو ایک جاگیردار نے لی تھی یہ میں نے سنا ہے جی... وہ بے اولاد تھا۔ پہلی بیوی کو طلاق دی... دوسری اولاد کے لیے کی تھی۔ وہ مر گئی... تیسری بھاگ گئی۔ پاگل ہو کے... سب بے اولاد ہیں۔ بچہ تھی کو اس نے خود مار دیا اور پھر خودکشی کر لی۔ اس کے بعد سے حویلی بند ہے... کچھ عرصہ ایک پیر صاحب کا ڈیرا رہا تھا... معلوم نہیں وہ کدھر گئے۔“

”اچھا... اب تم واپس جاؤ۔“ میں نے کہا اور دایاں ہاتھ کا لیور نکال لیا۔ ”تمھاری خیریت اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرو۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو بھول جاؤ کہ تم ہم سے ملے بھی تھے... ورنہ یاد رکھو کہ میں تمھیں تلاش کر لوں گا اور تمھاری ماں کے سامنے تمھیں گولی مار دوں گا۔“

وہ سخت بدحواسی میں فرار ہوا۔ میں اس کے لیے انتہائی خوفناک بڈھا ثابت ہوا تھا۔ میں نے اس کے ایک ساتھی کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا... خنجر اور پستول سے ڈرا خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔ آسیب زدگی کے سارے واقعات جس کے بھی نظر میں آئے تھے... اور میرے پاس بھی ریوالور تھا جو میں نے آخری وقت تک چھپائے رکھا تھا۔ یہ وجوہ اس کے لیے کسی بھوت سے کم پُراسرار نہ تھا۔

”یہ ہو سکتا ہے خوب صورت ہونے کا نتیجہ۔“ میں نے کہا۔

”تم بتا دو مجھے بدصورت۔“ وہ بولی۔ ”اپنے جیسا...“

میں نے پلٹ کر حویلی کی طرف دیکھا۔ ”آؤ میرے ساتھ اس راستے پر قدم بڑھاؤ جس پر جا کے کوئی واپس نہیں آیا... کیسا ڈائیلاگ ہے؟“

”تم کیا واقعی... اندر جاؤ گے؟“ وہ بولی۔

”میں اور تم سو فیصد اندر جائیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”اور اس میں کوئی شک یا مبالغے کی بات نہیں کہ یہاں ہمیں ایک خبیث جن ملے گا۔“

”کیا پہیلیوں میں بات کر رہے ہو...؟“

”سیلی... یہ پہیلی نہیں حقیقت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس جن کا نام ہے خسرو جمشید اور وہ نام کا نواب بھی ہے۔“

موتی کے جسم کو ایک جھٹکا لگا... یہ جھٹکا میں نے اس لیے محسوس کیا کہ میں نے اس کی کلائی پکڑ رکھی تھی... اس نے اپنی کلائی چھڑا لی۔

”خسرو جمشید... تم مذاق کر رہے ہو۔“ وہ اپنے خوف کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”اس مذاق سے تمھیں کرنٹ کیوں لگا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”کیا تم اسے جانتی ہو... یہ وہ اندر موجود ہے۔“

”تم... غلط کہتے ہو۔“ وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔

”میں پاگل نہیں ہوں جو اس وقت یہاں آیا ہوں... میں ان بھوت پریت اور انسانوں کے غائب ہو جانے کی کہانیوں پہ ایک فیصد بھی یقین نہیں رکھتا مگر لوگ کل سے کہنے لگیں گے کہ ایک بڈھا اور اس کی جوان خوب صورت بیٹی اُدھر گئے تھے جو لوٹ کر نہیں آئے۔ حالانکہ انھیں منع بھی کیا گیا تھا۔ آج رات کے بعد ہم واقعی یہاں نظر نہیں آئیں گے مگر یہ تو اب خسرو جمشید تو دنیا ہی سے غائب ہو جائے گا۔ وہ کہیں بھی پھر نظر نہیں آئے گا۔“

”تم پاگل ہو... میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“

میں نے ایک دم اس کی کلائی پھر پکڑ لی۔ ”تمھارا تو باپ بھی جائے گا۔“

”چھوڑو مجھے۔“ وہ چلائی مگر میں نے ایک دم اس کا منہ دبا دیا۔

”کیا بات ہے... تمھارا رویہ میرے لیے بے حد مشکوک اور پُراسرار ہو گیا ہے مس موتی۔“ میں نے کہا۔ ”کس کا خوف ہے تمھیں... خسرو جمشید کا نام سننے سے پہلے تم کو کسی کا ڈر نہیں تھا۔ تم میرے ساتھ جن بھوتوں کے ڈیرے میں جانے کو تیار تھیں۔ تمھارے حلق سے اونچی آواز نکلی نا تو یہ ممکن ہے کہ وہ تمھاری... زندہ ہو... میں تم کو ہر صورت میں اپنے ساتھ لے جاؤں... وہ مجھے تم کو خاموش رکھنے کے لیے تمھارا یہ خوب صورت

www.paksociety.com

گلا بھی کیوں نہ دبا بیٹھے۔"

میں نے اسے چھوڑا تو وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے بے رحم بھی ہو سکتے ہو... میرے ساتھ کیا تم واقعی حوصلہ رکھتے ہو مجھے قتل کرنے کا؟ میرا گلا گھونٹنے کا... اتنا لمبا سفر اسی لیے کیا تھا میں نے... اتنا انتظار اسی سلوک کے لیے کیا تھا میں نے؟ میں کہاں سے کہاں آگئی تمہارے ساتھ..."

اس نے پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کیا۔

"مگر اب چند قدم چلنے کے لیے تیار نہیں... آخر کیوں؟"

"تم کیا سمجھتے ہو آخر... یہی نا کہ میں دشمن کی ایجنٹ ہوں اور میرا کوئی خفیہ تعلق ہے خسرو جمشید سے... ہاں ہے... یہاں سب سے پہلے مجھے اسی کے حضور پیش کیا گیا تھا... مگر وہ ایک جانور ہے... خطرناک پاگل جانور... مہذب نظر آنے والا وضعدار سمجھا جانے والا نواب خسرو جمشید ایک وحشی جنونی درندہ ہے۔ اور یہ بات پوچھنی ہے تو اُن سے پوچھو..."

"آئی ایم سوری..."

ایک طمانچہ میرے منہ پر لبوں پر جما کر میں جھونچکا رہ گیا۔ میرا خون کھولنے لگا۔

"میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ الفاظ مت دہرانا میرے سامنے یہ گالی سے بدتر ہیں میرے لیے۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے اشتعال کی شدید لہر نے اس کی گردن مروڑ دینے پر مجبور کیا مگر میں نے اس خواہش کو ملتوی کر دیا۔ "اس طمانچے کی قیمت ادا کرتے وقت تمہیں افسوس ہوگا موہنی" میں نے دل ہی دل میں کہا "میں وقت اور حالات سے مجبور نہ ہوتا تو اسی وقت اور اسی جگہ موہنی کو سزا دے سکتا تھا لیکن اب تک موہنی کو خسرو جمشید کے سامنے لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے خسرو جمشید کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ سچ ہو سکتا تھا مگر یہ موہنی کے خوف کا سبب نہیں تھا۔ اس وقت میں موہنی کے ساتھ جو کر سکتی تھی کہ مجھے اس رات کے وحشیانہ سلوک کا بدلہ لینا ہے اور اس نام کے نواب کے منہ پر تھوکنا ہے... یا اس کے منہ پر طمانچہ مارنا ہے... میرے ساتھ اسے کسی قسم کا خوف درپیش نہ تھا... وہ بالکل محفوظ تھی مگر پھر بھی ڈر رہی تھی۔ میں اس ڈر کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔

"چلو اب غصہ تھوک دو۔" میں نے موہنی کو اپنے قریب کرکے کہا۔ "آخری بار معاف کر دو مجھے۔"

وہ میرے سینے پر سر رکھ کے سسکیاں بھرنے لگی۔ "...کیا یہ بھی اس کی اداکاری ہے؟" میرے دماغ میں ایک سوال نے سر اٹھایا۔ اس وقت میں جذباتی طور پر موہنی سے بہت دُور تھا میرے دل میں محبت کے نہیں نفرت کے جذبے ابھرتے تھے لیکن میں اس مرحلے پر بتا یا کھل نہیں سکتا تھا۔ اس وقت جب کہ موہنی مجھ پر اپنا اعتبار قائم کرنے میں تقریباً کامیاب ہو چکی تھی ایک بات ایسی ہو گئی تھی جو... پھر کھٹک گیا تھا اور اسے مختلف نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ نظر سے وہ مجھے پھر ایک انتہائی چالاک اور مکار... عیار امریکی ایجنٹ لگتی تھی جسے بطور خاص میری کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھیجا گیا تھا تاکہ وہ میری قربت حاصل کرکے میرے سارے منصوبے اور ارادے بھی جان لے۔

دس پندرہ منٹ کے بعد موہنی پھر نارمل ہو گئی اور عورت کی طرح خوش نظر آنے لگی جیسے اس نے محبوب سے روٹھ کے اور ناک رگڑ کے منا لیا ہو۔

رانی کی حویلی کی وسعت کا اندازہ قریب جا کے ہوا۔ باغ سمیت شاید اس کا رقبہ سوا ایکڑ ہوگا۔ چہار دیواری دس فٹ بلند تھی مگر جگہ جگہ سے ٹوٹ رہی تھی اور اس میں شگاف ایک دروازہ تھا مرکزی دروازہ تھوڑا سا بائیں جانب تھا۔ میں نے بالکل سامنے جا کے اندر جھانکنے سے گریز کیا... سکتا تھا اگر گیٹ پر کوئی پہرے دار موجود ہو تو مجھے دیکھتے ہی شور کر دے۔ بدبخت مقتدر بخت کا نام بھی ان میں شامل ہو جو رانی کی حویلی کی طرف گئے مگر لوٹ کر نہیں آئے۔

"تمہارے پاس پستول ہے نا؟" میں نے موہنی سے کہا۔

"ہاں... کیا تمہارے حوالے کر دوں؟" وہ فوراً بولی۔

"نہیں... اسے تیار رکھو۔" میں نے سرگوشی میں کہا اور اس کا ہاتھ تھام کے ایک شگاف سے اندر داخل ہو گیا۔ دیوار کے اندر جھاڑ جھنکاڑ قسم کا جنگل نما باغ تھا جو کسی... کا تھا... میں نے حویلی کی عمارت کو تقریباً سو گز کے فاصلے پر دیکھا۔ آگے قدم بڑھاتے ہوئے مجھے شکاری کتوں کا خیال آیا... اگر اندر کتے ہوتے تو اب تک بھونکنا شروع کر دیتے اور چاروں طرف سے آ رہے ہوتے۔

عمارت کی ویرانی کو دیکھ کر میں کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ کہیں اس خسرو جمشید کے چمچوں نے جھوٹ بول کر مجھے بے وقوف تو نہیں بنایا تھا مگر مرتے وقت آدمی جھوٹ نہیں بولتا... یہ تو قانون بھی تسلیم کرتا ہے جو بڑی سزا کے لیے ثبوت شہادت ہے... اندر آبادی کے آثار یکسر ناپید تھے اور حفاظتی انتظامات کی عدم موجودگی نے مجھے مزید شبہات میں مبتلا کیا۔ لوگ کہتے ہیں یہاں کوئی نہیں رہتا ممکن ہے یہ ٹھیک ہی ہو... تو اب جو عیاشی کے لیے یہاں آ جاتا ہو اس کے لیے حفاظتی انتظامات کی کیا ضرورت ہے... مجرم میں سے کسی کے یہاں پہنچنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے اور مقامی آبادی تو ویسے ہی ادھر آنے سے گریز کرتی ہے۔ ادھر آنے والوں کو قتل کرکے اور ان کی لاشیں غائب کرکے حویلی کے بارے میں خود دہشت پھیلا رکھی ہے۔

عمارت کے شمالی حصے کی سمت تین دروازے تھے اور تین کھڑکیاں تھیں۔ سب دروازے مضبوط شاہ بلوط کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور مقفل تھے۔ روایات کے مطابق یہ سو سال پرانی... زنگ خوردہ تالے نہیں تھے۔ ساخت کے اعتبار سے بھی وہ زیادہ پرانے نہیں تھے۔ میں نے تاریکی اور خاموشی میں ڈوبی ہوئی عمارت کا جائزہ لیا تو مجھے اس میں کوئی شک نہ رہا کہ عمارت کم سے کم پچاس سال پرانی ہے اور تقسیم ہند سے پہلے کی تعمیر ہوئی تھی۔

پھر میں پیچھے گیا اور میں نے عمارت کو لمبائی کے رخ دیکھا۔ باغ پیچھے بھی تھا اور تقریباً سو گز کے فاصلے سے گزرنے والی شکستہ چہار دیواری تک اسی طرح جنگل بن چکا تھا جیسے سامنے والے حصے میں... موہنی کچھ ڈری ہوئی تھی اور مجھ سے لگ کر چل رہی تھی۔

"مجھے تو یہاں کوئی نظر نہیں آتا۔" میں نے کہا۔

"وہ تو ہوں گے... شاہ جنات۔" موہنی نے کہا۔ "جن سے تمہیں ڈرایا گیا تھا کوہ قاف کا۔"

"وہ تو میں نے اس لڑکے کا امپریس کرنے کی کوشش کی تھی۔" میں نے کہا۔ "ورنہ کیا وہ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ کوہ قاف کی پری..."

میرا جملہ خاموشی میں گونجنے والی ایک چیخ سے نامکمل رہ گیا۔ یہ چیخ کسی عورت کی تھی اور اس نے ایک لمحے کے لیے مجھے بھی دہلا دیا... موہنی تو مجھ سے چمٹ گئی اور مجھے باہر کی طرف کھینچنے لگی۔

"چلو کبیر... یہاں سے نکل چلو..."

میں نے موہنی کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھا۔ "یہ کسی چڑیل نے چیخ نہیں ماری تھی... کسی روح کی آواز نہیں تھی... یہ کسی عورت کی چیخ تھی... مگر سوال یہ ہے کہ آواز آئی کہاں سے تھی؟"

"یہاں کوئی نہیں ہے کبیر..."

"پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کوئی ہے میرے ساتھ آؤ۔"

وہ بادلِ ناخواستہ میرے ساتھ آگے بڑھی۔ میں نے عمارت کی لمبائی کے رخ طویل برآمدے کو طے کیا اس کی لمبائی ڈیڑھ سو فٹ تھی... مجھے بہت سے دروازے اور کھڑکیاں بند نظر آئے مگر وہ مقفل نہیں تھے۔ آخری حصے میں رک کر میں نے پھر کان لگا کے کچھ سننے کی کوشش کی مگر اب پھر وہی بے صدا آسیب تھا جو ہر سمت سے لپکتا محسوس ہوتا تھا۔

میں نے عمارت کی تیسری سائڈ کا جائزہ لیا۔ اس طرف کا نقشہ بھی مختلف نہیں تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ادھر کے سامنے دروازے کھڑکیاں اندر سے بند کیے گئے تھے۔ اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ مخالف سمت میں تین کمرے زیرِ استعمال تھے اور وہاں تین تالوں کی موجودگی کا مطلب تھا کہ ان کی چابیاں تین افراد کے پاس ہیں۔

ابھی تک میں نے سامنے کے حصے کو نہیں دیکھا تھا۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ میں کسی کی نظر میں آئے بغیر عمارت تک پہنچ جاؤں اور پھر دیکھوں کہ اندر تک جانے کے لیے سب سے محفوظ راستہ کون سا ہے۔ میں اس بات کا بھی یقین کر لینا چاہتا تھا کہ وہاں کوئی محافظ یا پہرے دار نہیں ہے۔

میرے کان ابھی تک اس ایک چیخ کی بازگشت کو سن رہے تھے جو خاموشی کے سمندر میں ایک پتھر کی طرح تھی اس کا شور ختم ہو چکا تھا اور صرف تصور باقی رہ گیا تھا۔ میرے کان دوبارہ کسی آواز کے منتظر لگے ہوئے تھے مگر خاموشی کسی منجمد جھیل کی سطح بن گئی تھی۔

سامنے والے حصے میں آتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میں نے موہنی کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں سوال کیا کہ بولو... اب کیا کہتی ہو۔ وہ فریب سماعت بھی نہیں تھا اور بھوت پریت کی آواز بھی نہیں تھی۔ گھنی جھاڑیوں اور الجھی ہوئی عشق پیچاں کی پرانی بیلوں سے ڈھکے ہوئے ایک کنج کے تاریک سائے میں ایک کار کی چمک یوں محسوس ہوتی تھی جیسے غبار آلود آسمان میں ستاروں کی دمک... وہ ایک ایسی جگہ پر کھڑی ہوئی تھی کہ جب تک کوئی بالکل سامنے نہ آ جائے اسے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ چار ستونوں پر چھت کا درمیانی فاصلہ چالیس فٹ کے قریب تھا کسی زمانے میں لوہے کا جال ڈالا گیا ہوگا۔ اس کے اوپر اور چاروں طرف پھولوں کی سرسبز بیلیں چڑھائی گئی ہوں گی۔ اب یہ بیلیں گھنی شاخوں کی دیواریں بن چکی تھیں۔ اوپر بھی زنگ خوردہ جال ان کا وزن برداشت کرنے کے قابل نہ رہا تھا چنانچہ ایک طرف سے کھلے ہوئے شامیانے کی طرح وہ کمرے میں ہر سمت سے شاخیں اندر آ رہی تھیں... اوپر سے لٹک رہی تھیں اور ستونوں کے گرد لپٹ چکی تھیں۔

اس کا درمیانی حصہ اب بھی خالی تھا اور اوپر چھت کی بلندی جو پہلے پندرہ فٹ تھی اب شاخوں کی چھت کے نیچے

www.paksociety.com

جانے کے بعد بھی دس فٹ سے زیادہ تھی۔ خسرو جمشید کی کار اسی کنجِ چمن میں کھڑی ہوئی تھی جہاں پہلے اس کے اصل مالک نے برسات کی مہکتی پھواروں اور چودھویں شب کی چاندنی میں زندگی کی بہت سی خوب صورت شاموں اور پُرمسرت راتوں کے یادگار لمحے بسر کیے ہوں گے۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ... نظیر اکبرآبادی میرے کان میں بولا۔

اچانک موتی نے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔ ”تم نے کچھ دیکھا؟“

”میں بہت کچھ دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم بتاؤ تم نے کیا دیکھا؟“

”کار کے اندر... کوئی ہے...“ وہ آہستہ سے بولی۔

میں نے دیوار کی اوٹ سے سر نکال کے غور سے دیکھا۔ ونڈ اسکرین کے پیچھے ایک ستارہ سا روشن ہوا اور بجھ گیا۔ کوئی کار کے اندر بیٹھا ہوا یا لیٹا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ اگر اس کا چہرہ ہماری طرف ہوتا تو وہ یقیناً ہمیں دیکھ چکا ہوتا لیکن وہ سیٹ پر دراز تھا اور اس کی نظر عمارت کی طرف نہیں تھی۔ وہ مخالف سمت میں دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ بیٹھا ہوا ہوتا تو اتنی دیر میں ایک بار تو سر گھماتا۔ میں نے اب زیادہ توجہ کے ساتھ سگریٹ کی ہلتی ہوئی روشنی کو دیکھا۔ جب وہ کش لے کر سگریٹ ہٹاتا تھا تو اس کا ہاتھ سامنے نہیں ہوتا تھا۔ چمک پیچھے کی طرف ڈوب جاتی تھی۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ سیٹ پر نیم دراز ہے اور اس کا سگریٹ والا ہاتھ سیٹ سے پیچھے کی جانب لٹکا ہوا ہے۔

میں نے موتی کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود دبے پاؤں آگے بڑھا۔ میرے اور کار کے درمیان شاید بیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ کار کے شیشے چڑھے نہ ہوتے تو وہ یقیناً میرے قدموں کے نیچے فریاد کرنے والے خشک پتوں کی آواز سن لیتا۔ اس سے زیادہ احتیاط ناممکن تھی۔ میں برسوں سے بچھے ہوئے سوکھے پتوں پر پیر رکھتا تو کہاں رکھتا۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ وہ کہیں اپنی پوزیشن تبدیل نہ کرے۔ کار کے اندر آدمی زیادہ دیر تک ایک ہی پوزیشن میں نہیں پڑا رہ سکتا... یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سگریٹ ختم ہو تو وہ اسے باہر پھینکنے کے لیے دروازہ کھولے۔

کار کے بالکل قریب پہنچ جانے کے بعد میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں میدانِ جنگ میں دشمن کے مورچوں کے درمیان سے گزر آیا ہوں۔ اب میں زیادہ پُراعتماد تھا۔ میں پیچھے کی طرف سے گھوم کر گیا اور اسی سمت میں پہنچ گیا جدھر وہ دیکھ رہا تھا لیکن میں فرش پر پیٹ کے بل رینگ رہا تھا اور اس کی نظروں سے محفوظ تھا۔ میں نے ادھر ادھر ٹٹول کر ایک چھوٹا سا پتھر اٹھایا اور کار کے دوسری جانب اچھال دیا۔

حسبِ توقع وہ ایک دم باہر آیا۔ اس وقت میں کار کے پیچھے تک پہنچ چکا تھا۔ پیچھے سے مجھے اس کی پشت نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوا ادھر ادھر دیکھ رہا ہوگا۔ بہرحال یہی تھا کہ میں نے دونوں ہاتھ بڑھا کے اس کے ٹخنوں سمیت اوپر اٹھا دیے اور اسے ایک جھٹکے سے کھینچا تو سانپ بنا ہوا وہ پیچھے سے نکل آیا۔

وہ کسی طرح منہ کے بل گرا لیکن فوراً پلٹتے ہی اس نے جھٹکا دے کر خود کو آزاد کرا لیا اور کروٹ لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جسم کے اٹھنے کے انداز سے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ تربیت یافتہ کوئی ہے اسے زیر کرنا آسان نہیں ہوگا۔ یہ احساس ہوتے ہی میرا جسم متحرک ہو گیا اور میرے ذہن نے اپنی تربیت کے سارے داؤ پیچ یاد کیے ان میں کچھ انتہائی مہلک وار بھی تھے جو ایسے ہی وقت میں کام آتے تھے۔

میرے حریف نے ایک ایسا ہی وار آزمایا تھا۔ میرا خیال ہے وہ بھی کم سے کم وقت میں جنگ کو ختم کر دینا چاہتا تھا لیکن اس بات سے پہلے کہ میں نے اس کی مہارتِ فن کا اندازہ کر لیا تھا جبکہ اسے میرے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ میں نے بروقت خود کو بچایا اور پھر اتنی تیزی سے وہی وار آزمایا کہ میرے حریف کو جان ہونے کا موقع تک نہ ملا... وہ زمین پر گرا اور آواز نکالے بغیر مر گیا۔

اب میں نے کار کے اندر جھانکا اور سب سے پہلے وہ مشین گن اٹھائی جو اگلی سیٹ پر پڑی ہوئی تھی۔ پھر میں نے کار کی چابیاں نکالیں اور پیچھے جا کے ڈکی کھولی۔ اس میں ایک چھوٹا سا فریج بنا ہوا تھا اور فریج میں شراب کی بوتلیں بستر بنی بھری ہوئی تھیں۔ میں نے موتی کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ ایک دم اندھیرے کی اوٹ سے نکل آئی۔

”تم اب گاڑی میں بیٹھو۔“ میں نے کہا۔ ”میرے سوا جو بھی قریب آنے کی کوشش کرے اسے بلاتکلف شوٹ کر دو۔ نتائج کی پروا کیے بغیر۔“

موتی نے سر ہلایا۔ پہلے نیچے پڑی ہوئی لاش کو، پھر میرے ہاتھ کی مشین گن کو دیکھا۔ ”تم مجھے ساتھ نہیں رکھ سکتے؟“

”نہیں... باہر بھی تو کسی کو رہنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

جب وہ کار میں بیٹھ گئی تو میں پھر برآمدے میں آ گیا لیکن اس بار پہلے میں نے سامنے والے حصے کا جائزہ لیا۔ میں نے مشین گن کو فائر کرنے کی پوزیشن میں کر لیا تھا اور اس بات کے لیے بالکل تیار تھا کہ کوئی بھی میری جان لینے والا نظر آئے تو اسے بھون کے رکھ دوں۔ ایک بار پھر میں اکیلا ہی دشمن کے حصار میں داخل ہو چکا تھا اور ذہنی و جسمانی طور پر اتنا الرٹ تھا کہ میرے پانچوں حواس کے ساتھ چھٹی حس بھی پوری طرح بیدار تھی۔

میں نے وہ چیخ پھر سنی۔ وہی دبی دبی اور بے اذیت اور مجھے خود بخود سامنے والی موتی کی بات یاد آئی۔ اس حادثے کے بعد آگے قدم بڑھاتے ہوئے میرے کانوں نے وہی فریادی چیخ سنی۔ میں اندازہ کر چکا تھا کہ یہ آواز زمین کے اوپر سے نہیں بلکہ نیچے تہ خانے سے سنائی دے رہی ہے۔ مجھے اب تہ خانے تک پہنچنے والے راستے کی تلاش تھی۔ ایک دروازے کے سامنے مجھے کلاشنکوف کی خالی ٹوپیاں پڑی نظر آئیں۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا... وہ کسی آواز کے بغیر کھل گیا۔

میں نے خود کو مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا پایا۔ میں اپنے دائیں بائیں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا... یہ بھی نہیں کہ جہاں میں کھڑا ہوا ہوں وہ کوئی کمرہ ہے یا راہداری۔ پھر میں نے سنبھل سنبھل کے قدم بڑھانا شروع کیا۔ کئی بار میرے قدموں نے کسی چیز کو چھوا اور میں نے راستہ بدلا۔ پھر میں ایک دیوار سے جا لگا... دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں ایک دروازے کے قریب جا پہنچا اور دروازے سے گزر گیا۔

اسی وقت باہر کہیں ایک دروازہ کھلا اور گھپ اندھیرے میں تھوڑا سا اجالا پھیل گیا۔ میں نے خود کو ایک خالی کمرے میں دیکھا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی میری طرف آ رہا تھا۔ چال سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ کوئی فوجی ہے۔ وہ اپنے پیچھے دروازہ کھلا چھوڑ کے نیچے آیا تھا اس کے باوجود روشنی برقرار تھی مگر یہ روشنی کم زیادہ ہو رہی تھی... جیسے کوئی ٹارچ تھی اور اس کے ہلنے سے دیوار پر سائے بھی ہلتے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ شخص اپنے ہاتھ میں ٹارچ لائٹ لیے ہوئے ہے۔

جب روشنی دروازے تک پہنچی تو میں نے مشین گن کو نیچے رکھ دیا۔ وہ دروازے کے سامنے سے گزرنے لگا تھا کہ میں نے اسی حرکت میں اسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتا یا آواز نکالتا، میں نے اس کے سر کو ایک زور کا جھٹکا دیا۔ اس کی گردن کا منکا خشک لکڑی کی طرح ٹوٹ گیا۔

ٹارچ لائٹ اس کے ہاتھ سے پہلے ہی گر چکی تھی مگر ٹوٹی نہیں تھی۔ میں نے اسے اندر گھسیٹا اور ٹارچ لائٹ اٹھا لی۔ روشنی اس کے چہرے پر ڈالتے ہی میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے میرے سامنے ایک لڑکی کے باپ کو اطمینان سے قتل کر دیا تھا کیونکہ وہ اس کی محبت کی راہ میں حائل تھا۔ جس نے میدانِ جنگ کے قواعد و ضوابط کو نظر انداز کر کے اس بچے کو مار دیا تھا اور وہ... موتی کے بیان کے مطابق... اسے دھکا دے کر فرار ہو گیا تھا۔ شک پہلے بھی تھا۔ اب اس کی شدت دو چند ہو گئی۔ غالباً خود موتی نے اسے فرار ہونے کا موقع فراہم کیا تھا ورنہ وہ یہاں نہ آتا۔ سرحد پار کرتا اور اپنی محبوبہ سے جا ملتا۔

ٹارچ لائٹ نے میرا کام آسان کر دیا۔ میں نے اس کی روشنی کے دائرے کو محدود رکھا اور راستہ تلاش کرنے لگا۔ اب میں خسرو جمشید کے جنگل میں پھنسی ہوئی اور اس کی بربریت کا شکار ہونے والی کسی لڑکی کی درد بھری چیخوں کو زیادہ واضح طور پر اور مسلسل سن رہا تھا۔ انہی چیخوں نے تہ خانے تک میری رہنمائی کی۔ ایک حیوان کسی بند دروازے کے پیچھے شراب کے نشے میں وحشت کا ایسا شیطانی کھیل شروع کر چکا تھا۔ ایک حیوان میرے اندر بیدار ہو رہا تھا جو اس شیطان کے خون سے اپنی پیاس بجھانا چاہتا تھا۔

ایک زینہ مجھے تہ خانے تک لے گیا۔ زینے میں زیرو واٹ کے ایک بلب کی روشنی تھی جو ماحول کو زیادہ دہشت ناک بنا رہی تھی یا شاید یہ میرے جذبات تھے جو اس پُرآسیب فضا میں سفاکی اور بے رحمی کی بو سے برانگیختہ ہو رہے تھے۔ جہاں زینہ ختم ہوتا تھا وہاں ایک بھاری دروازہ تھا۔ دروازہ آدھے انچ سے بھی کم کھلا ہوا تھا۔ روشنی کی یہ لکیر بالکل سیدھی کھڑی ہوئی تھی اور باہر میرے پیروں کے نیچے لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند کر کے میں نے خدا کو یاد کیا اور دروازے پر ایک لات ماری۔ اسی وقت میرے کانوں نے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ تجربے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ آواز کسی مرسیڈیز کے ڈیزل انجن کی تھی۔ اور جس گاڑی میں میں موتی کو چھوڑ کے آیا تھا، وہ مرسیڈیز وہ سو ڈی ماڈل تھی۔

ایک لڑکی نے چیخ مار کے خود کو بیڈ شیٹ کے پیچھے پوشیدہ کر لیا۔ میں نے اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھی وہ جوان اور خوب صورت تھی۔ اس کے بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے اور اس کے جسم کی چمکتی ہوئی چاندنی میں ایسے داغ نمایاں تھے جو مہذب انسان کے اندر چھپے ہوئے وحشی حیوان کی بربریت کا المناک افسانہ کہتے تھے۔

خسرو جمشید بھی ایک دم اٹھا تھا مگر میرے ہاتھ میں مشین گن کو دیکھتے ہی وہ منجمد ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وہی بے یقینی کی کیفیت دیکھی جو کسی بھی جوان، صحت مند اور زندگی کی بھرپور جدوجہد میں حصہ لینے والے کو بے سبب اچانک ایک سے مرتے وقت ہوتی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب خواہشوں کا ہجوم اور کامیابیوں کے سامنے خوابوں کی تعبیر اپنی دسترس میں محسوس ہوتی ہو اور خوشیاں یوں زندگی میں بکھری ہوئی ہوں جیسے فصلِ بہار

www.paksociety.com

میں پھولوں کی خوشبو... تو خوشتر اجل سے مجھے پھر کسی امکانات کا کوئی تصور تک نہیں کرتا۔

خسرو جمشید کے لیے میرا آتی ہو وراہ ایسے گمنام عشرت کدے میں یکلخت نادر ہو جانا ایسا ہی تھا۔ بلکہ خود اُسے یقین آ گیا کہ اس کی آنکھیں دھوکا نہیں دے رہی ہیں اور میرا چہرہ اس کے خوف کا تراشا ہوا خیال اور عفریت نہیں ہے۔

"تم..." اس نے بمشکل تمام کہا۔ اس میں شکست، حیرت، خوف اور ناامیدی کے سارے جذبات عیاں تھے اور یہ ایک لفظ ایک سوال بھی تھا اور اعتراف بھی کہ سوال بے مقصد ہے۔

"ہاں قبلہ نواب صاحب!" میں نے کہا۔ "میں ہی ہوں۔ آپ بھول نے تو نہ ہوں گے مجھ کو... ایک مدت کے بعد ملے ہیں نا اس لیے آپ کچھ حیران اور غالباً پریشان بھی ہیں۔ مگر یہ ملاقات کبھی نہ کبھی ایسے بھی ہونی تھی سو آج ہو گئی... وہ کیا فرماتا ہے فلمی شاعر کہ ہم بھی ایسے تم بھی ایسے رات سہانی..."

"تم... یہاں کیسے پہنچے...؟" نواب نے بے خیالی میں ایک احمقانہ سوال کیا... اس سوال کے جواب سے اُسے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ "کو وا تری محفل میں کوئی وہم سے نہ ہوگا... وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہوگا۔"

نواب نے اپنے کپڑوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں جمشید!" میں نے آگے بڑھ کر اس کے کپڑے دور اچھال دیے۔ "تم کو ان کی کیا ضرورت ہے... شیطان اور حیوان کا شرم حیا سے کیا رشتہ۔ بے شک تم مہذب لباس پہن کر دنیا کو دھوکا دیتے ہو مگر یہاں وہ دنیا کہاں ہے... یہاں تو صرف میں ہوں یا اوپر وہ ہے، خدا تو سب کچھ پہلے سے دیکھ رہا ہے اور سب جانتا ہے میں اس کا حقیر بندہ تمھیں سمجھانے آ مزدور ہوں۔"

"ہاں... ہم ایسے ہی حمام میں ہیں۔" جمشید نے تلخی سے کہا۔

"مگر میں ننگا نہیں ہوں جمشید..." میں نے کہا۔ "میں تو یوں سمجھ لو کہ وہ قاتل ہوں جو تمھاری میت نہلانے آیا ہو۔"

"مجھے قتل کرنے کے علاوہ تم کیا کر سکتے ہو سکندر بخت۔" جمشید نے کہا۔ "غالباً تمھارے بارے میں یہ بات غلط ہے کہ تم ایک بہادر دشمن ہو۔"

"ہر دشمن بہادر ہوتا ہے جمشید... بہادر نہ ہو تو دشمنی کیسے نبھائے۔"

"مگر مشین گن کے ساتھ ایک نہتے آدمی کو مار دینے میں کون سی بہادری ہے۔" وہ بولا۔

"میرے جذبات سے کھیلنے کی فضول کوشش مت کرو..." میں نے کہا۔ "میں ایسی باتوں سے متاثر ہو کے یہ نہیں کروں گا کہ

مشین گن تمھاری طرف بڑھا کے کموں کہ آؤ... اب مقابلہ ہو جائے نہیں... میں دشمن کو ایک فیصد رعایت دینے کا قائل نہیں... یہ تو وقت کا کھیل ہے... ہر کھیل میں وقفہ آتا ہے جب سانس لی جاتی ہے۔ اب تک تم اس طرف تھے جدھر جانے سے وہ داور اب تم نے کچھ پوائنٹ زیادہ حاصل کر لیے تھے مگر تم نے میچ جیتا نہیں تھا۔"

"اور تم سمجھتے ہو کہ تم اب یہ گیم جیت لو گے؟"

"ہاں... تمھارے اور میرے درمیان آج یہ بازی ختم ہو جائے گی... یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ کون شکاری تھا اور کون شکار ہوا۔" میں نے کہا۔

جمشید نے افسوس کے انداز میں سر ہلایا۔ "تم بڑے... ذہین و اصول پرست تھے سکندر... تم سب کچھ کر سکتے تھے۔ اگر چاہتے تمھارا شمار چند انتہائی خوش قسمت افراد میں ہوتا جو دولت کو لونڈی باندی بنا کر رکھتے ہیں اور جب چاہیں ادب کے کوب بنا لیتے ہیں۔ تم سیاست میں قدم رکھتے تو شاید اس ملک کے صدر منتخب ہو جاتے مگر تمھیں ہمیشہ اندازوں کی غلطی نے دھوکا دیا۔ تم خود سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار رہے... اور تم نے زندگی کے راستے پر چلتے ہوئے صرف بلندی کی طرف دیکھا۔ یہ خیال نہیں رکھا کہ ٹھوکر اچانک آ سکتا ہے... تم روشنی میں چلتے رہے اور اندھیرے کو بھول گئے۔ تمھاری خوش نصیبوں نے تمھیں ہمیشہ عزت سے نوازا۔"

"مجھے یہ تقریر پسند آئی۔" میں نے کہا۔ "پہلی بار میں نے تم کو ایک پیراگراف بولتے سنا ہے ورنہ تم ہمیشہ مختصر جملے بولتے تھے۔ یا پھر بالکل نہیں بولتے تھے... کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم مجھے آئینے میں میری صورت کیوں دکھا رہے ہو؟"

"اس لیے کہ تمھیں کامیابی پر غرور کے نشے نے یہاں تک پہنچا دیا۔ مگر اپنی فخری نمائی کے باعث تم نے واپسی کے راستوں کی فکر نہیں کی۔" وہ اب خاصا پُر اعتماد نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ تم نے ٹھیک کہا۔ میں کبھی واپسی یا پسپائی کی نہیں سوچتا۔" میں نے کہا۔ "میں ہر ساحل پر اترتے ہی اپنی کشتیاں جلا دیتا ہوں۔ تم نے کبھی ایسا نہیں کیا ہو گا کیونکہ تم ہر بار شکست اٹھا کے بھی بھاگ نکل جاتے تھے۔ تم نے ایم آر ایس کا نام تو سنا ہوگا؟"

وہ مختصر سے لیکن تمسخرانہ انداز میں مسکرایا۔

"اس قوت کا جو دنیا میں ازل سے تھی اور ابد تک رہے گی... ہو تو کچھ ایسا ہی ہے کہ مرنے سے شہید اور زندہ رہ جانے سے غازی... بہت جلد تم شہادت کا اعزاز حاصل کر لو گے... تمھارے ساتھ اصول اور نیچا ہو جائے گا... جمہوریت کے سہارے... سب کا ایک قصور کی پیداوار ہیں... تم حب الوطنی... دوستی... قربانی اور ایثار..."

...بہادری، شرافت اور انسانیت کی سب صفات کو اپنی ذات سے منسوب کر کے خود ہی خوش ہو جاتے ہو... مجھے مار کے تم کو کیا ملے گا۔ تمھارے لیے چند سرپھرے کہیں گے کہ وطن کا بیٹا، بہت ادا کرنے عظیم مقصد میں شہید ہوا۔" جمشید نے کہا۔ "مگر یہ صرف الفاظ کا فرق ہے۔"

"یہ ایمان اور ایقان کا فرق بھی ہے جمشید... مگر اب تم نہیں سمجھو گے۔" میں نے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "لیکن بات پوری کیے بغیر میں تمھیں اچھی طرح سمجھا دوں گا... ابھی تو تاریخ بھی نہیں بدلی... میں کہہ سکتا ہوں کہ کل تک جانے پاس بہت وقت ہے... صبح ہونے سے پہلے میں چلا جاؤں گا۔"

"صبح ہونے سے پہلے؟" وہ زبردستی ہنسا۔ "تم صرف آدھے گھنٹے بعد کوشش کر کے دیکھنا... تمھیں سلاخوں کے پیچھے بند ملیں گے سکندر... مجھے معلوم ہے کہ تم اعتبار نہیں کرو گے... یہ کمرے کی کھڑکی تمھیں بیوقوف بنانے کا وقت حاصل کر رہا ہوں... لیکن... ۱۰۰ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ "ایک آدمی اب سے دس منٹ بعد یہاں پہنچے گا۔ اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہوں گے..."

"تم کسی فوجی کی بات تو نہیں کر رہے ہو؟" میں نے بڑے آرام سے سگریٹ جلا کے کہا۔ "غالباً آرمڈ فورسز کا ایک جونیئر آفیسر؟"

"تم نے اُسے جاتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"ہاں... جب جہنم میں تمھاری اس سے ملاقات ہو تو یہ پوچھنا کہ آخر تمھاری گردن کیسے ٹوٹ گئی تھی۔" میں نے کہا۔

"تو تم نے اسے مار دیا۔" جمشید ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا... اب تم ہو تمھاری گفتگو جتنا وہ سب نشر ہو چکی ہے... انھوں نے سب سن لیا ہوگا۔"

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ میں ایک بے احتیاطی کا مرتکب ہوا تھا۔ مجھے اندر آتے ہی پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے تھا کہ کہیں کوئی خفیہ مائیکروفون تو نہیں ہے۔ ایسی ہوس آمادہ جگہ پر خسرو جمشید جیسے صاحب سے بالکل کسی کے بچنے کی توقع کیسے کر سکتا ہے اس کے پاس ٹیلیفون تو نہیں ہے مگر رابطے کا کوئی اور ذریعہ ضرور ہوگا۔ ہنگامی صورت حال میں پیغام بھیجنے اور پیغام وصول کرنے کے لیے اس عشرت کدے میں کسی ٹرانسمیٹر کی موجودگی کو بعید از امکان نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اُٹھو... تم بھی... اور تم بھی۔" میں نے لڑکی کے جسم پر ایک ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔ اس نے پھر ایک ہیبت زدہ چیخ ماری لیکن میں نے اسے پیچھے گھسیٹ لیا۔ خسرو جمشید کا ہاتھ ایک پینٹنگ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں نے اس کے سر پر ٹھوکا مارا۔ وہ چکرا گیا۔ اس کی تیسری لات کھوپڑی میں اس کا مقتول گیا ہو گا۔ میں نے بالوں سے پکڑ کے جھٹکا دیا اور پیچھے گرا لیا۔

"دونوں اُٹھتے لیٹ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یہاں نہیں۔ آگے کھسک کر دیوار کے قریب جاؤ۔"

"چلو... کوئی بات نہیں..." جمشید نے لڑکی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی اس کی بات مان لو... پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے پینٹنگوں کے پیچھے دیکھا۔ جو قدِ آدم کے پیچھے ایک دیوار تھا۔ میں نے اُسے خالی کر کے کو لیاں وزر بھیک دیں۔ پھر میں نے بڑے سائز کی پینٹنگ کو کھولا۔ اس کے اوپر دو خانے تھے۔ میں وہ دراز لیا اور تھا۔ میں نے اُسے بھی خالی کر دیا۔ نیچے والے خانے کا پٹ کھولتے ہی میں چونک پڑا۔ اس کے اندر روشنی ہو گئی تھی بالکل اسی طرح جیسے کار یا فریج کا دروازہ کھولتے ہی لائٹ جلنے سے ہوتی ہے۔ میں نے ایک بار پھر پٹ سے بند کیا اور کھولا... لائٹ کا سوئچ اسی سے منسلک تھا۔

اندر ایک ٹیلیفون تھا اور رکھا تھا۔ اس میں ڈائل بھی تھا لیکن ڈائل کے علاوہ کچھ بٹن تھے۔ ان میں سے ایک پر "پاور" لکھا ہوا تھا اور یقیناً یہی بٹن تھا جو اس وقت دبا ہوا تھا۔ دوسرے پر "کوڈ" لکھا ہوا تھا اور تیسرے پر "ڈی کوڈ"۔ باقی دو بٹن والیوم اور ٹرانسمیشن کے تھے۔ اس ٹیلیفون سے منسلک تار پیچھے سے نکل کے بیڈ کے نیچے چلا گیا تھا اور غالباً باہر کسی انٹینا سے منسلک تھا۔ یہ جو تار تھا جس کے اندر دو یا تین تار بھی ہو سکتے تھے غالباً دوسرا تار کسی بیٹری سے یا لائٹ کی تار سے ملا ہوا تھا۔

میں نے پاور کو آف کیا اور ریسیور اٹھا لیا۔ اس میں عام فون جیسی ڈائل ٹون آ رہی تھی۔ میں نے ٹھٹھک کر جمشید کا نمبر کے سامنے بورڈ پر بار عدد والے فون نمبر لکھے تھے۔ میں نے ایک نمبر ڈائل کیا۔ کہیں دور گھنٹی بجنے لگی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھا کے کہا۔ "ہیلو۔"

میں نے کہا۔ "چوہدری صاحب مبارک ہو۔ چوہدری بھینس نے کٹا دیا ہے۔" اور ریسیور رکھ دیا۔ میرا خیال غلط ثابت ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی نہیں ہے لیکن یہ مخصوص قسم کا فون تھا۔ میں نے پاور کا بٹن چھوڑ دیا اور ریسیور اٹھا لیا۔ اس میں صرف سوں سوں جیسی آواز آتی تھی۔ عام ٹیلی فون جیسی ڈائل ٹون کی جگہ ایک بہت ہلکی سیٹی باقی رہ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے کہیں تیز ہوا شاخوں سے گزر رہی ہے۔ جمشید اور اس عورت نے دیوار تک کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ وہ کوئی بازاری عورت تھی۔ آج پہلی بار اسے اپنی آبرو کے بدلے پیسہ نہیں ملا تھا۔ اپنے اور خریدار کے اعمال نامہ اعمال میں درج سب گناہوں کی سزا مل رہی تھی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی اور جمشید کو گالیاں دے رہی تھی جس کی وجہ سے وہ بھی مصیبت میں پھنسی۔

میں نے "کوڈ" کا بٹن دبایا تو سوں سوں بند ہو گئی اور پھر

www.paksociety.com

عجیب سا شور سنائی دینے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دو عورتیں قینچی کی طرح زبان چلا رہی ہیں اور لڑ رہی ہیں مگر ایک چینی زبان بول رہی ہے تو دوسری عربی۔ درمیان میں کوئی طبلہ بجا رہا ہے اور شاید کچن میں ایک بچہ برتن گرا رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ دوسری طرف سے کوئی پیغام توڑا جا رہا ہے لیکن وہ کسی جیمنگ نظام کے ذریعے ناقابلِ فہم بن گیا ہے۔ میں نے "ڈی کوڈر" کا بٹن دبا دیا اور یکلخت سارا شور ختم ہو گیا۔ کسی نے چلانا شروع کیا۔

"ہیلو... یہ کیا ہے؟ نواب جمشید... جواب کیوں نہیں دیتے تم... ہیلو... ہیلو... واٹ دی ہیل... یہ کون عورت شور کر رہی ہے... کیا تم پاگل ہو گئے ہو... اسٹاپ دس نان سنس۔"

اچانک میں نے ایک ریڈیو ڈراما پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ریسیور کو میز پر رکھا اور ذرا دور سے چلا کے کہا۔

"میجر... دیکھو ہر طرف سے گھیر لیا ہے نا؟"

پھر میں چند قدم پیچھے گیا اور میں نے آواز بدل کے کہا۔ "یس سر"

"واٹ یس سر" میں نے آگے آ کے پھر کرنل کی آواز میں کہا۔

"اچھی طرح کیموفلاج کر دو سب کو..."

"وہ میں نے دیکھ لیا ہے سر" میں نے پیچھے ہو کے کہا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" جمشید نے چیخ کر کہا۔ وہ میری چال کو سمجھ گیا تھا۔

"اوہ شٹ اپ!" میں نے کرنل کی آواز میں دہاڑ کے کہا۔ "ابھی تو میں نے صرف کپڑے اتارے ہیں تمہارے... کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری کھال بھی اتار لوں... یو ایڈیٹ..." میرے شور میں جمشید کی آواز دب گئی۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ یہ سب دھوکا ہے اور میری چال ہے۔

"جاؤ... میرا منہ مت دیکھو..."

"یس سر..." یہ بات میں نے میجر کی آواز میں کہی۔ "آپ فکر نہ کریں... ان میں سے کوئی بچ کے نہیں جائے گا۔"

"کال دی ریسکیو آفیسر ان..." میں نے دہاڑ کر کہا اور پھر کہا "یہ کیا ہے... وائرلیس فون... اوہ گاڈ... تم سب اندھے ہو... کسی نے نہیں دیکھا..." میں نے قریب جاتے ہوئے کہا۔ یکایک یہ تماشا ... تھا کہ میں دوسری طرف کی گفتگو بالکل نہیں سن رہا ہوں۔ فون بند کرنے سے پہلے میں نے ریسیور سے کان لگائے تو مجھے دو افراد کے بولنے کی آواز سنائی دی۔

"یہ کیا چکر ہے... یہ تو کوئی گڑبڑ ہو گئی!"

"کون ہے یہ کرنل...؟"

"پاکستانی آرمی کا لگتا ہے۔"

"باپ رے باپ... اور نواب کہاں ہے...؟"

"اور ایک میجر... انھوں نے سب کو گھیر لیا ہے..."

"یہ کیسے ہو سکتا ہے...؟"

"ہو گیا ہے پاگل کے بچے..."

"پھر اب کیا کریں... ان کو سگنل دینا..."

"کیسے سگنل دیں... وہ راستے میں ہوں گے..."

"مارے جائیں گے بے چارے..."

"یہ فون کس نے لگایا تھا...؟"

"میرا خیال ہے کہ نواب نے کوشش کی تھی۔ کامیاب نہیں ہوا..."

"وہ اندر تک پہنچ گئے ہیں؟"

"ہاں... انھوں نے نواب کو مار دیا ہے... اور شاید بھی... تماشا یہ کہ..."

"تماشا کی جگہ ہے... اور نواب گیا جہاز میں... چار آدمی تو گئے... مارے گئے۔"

"مارے جائیں تو فکر نہیں... پکڑے نہ جائیں..."

"یار اسے تو بند کرو..."

فون ڈیڈ ہو گیا... وہ دونوں کون تھے اور کہاں سے بات کر رہے تھے، یہ معلوم کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں صرف اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ دس پندرہ میل کی ریڈیئس میں ہوں گے کیونکہ نواب نے کہا تھا کہ بس ایک دو گھنٹے میں اس کے مددگار پہنچ جائیں گے۔ اس لحاظ سے ان کے پاس مختصر فاصلے کا وائرلیس ٹرانسمیٹر تھا اور جیسے ہی باہر کا پیغام آن کیا جاتا تھا... ایک وائرلیس ریسیور بھی ... تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ عام لوگ یہ گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔ اگر کوئی سنتا تو اسے وہی شور سنائی دیتا جو میں نے سنا تھا۔ اس کو ڈی کوڈ کر کے صرف اسی فون پر سنا جا سکتا تھا اور ایسے ہی دوسرے فون پر دوسری طرف دو آدمی بات کر رہے تھے۔ وہ دونوں سخت پریشان لگتے تھے اور یہ میرے ڈرامے کے کامیاب ہونے کے حق میں ایک دلیل تھی۔ مگر میں نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا کہ ڈراما وہ بھی کر سکتے ہیں اور ممکن ہے ان کی پریشانی کا تاثر ایک فریب ہو۔ تاہم مجھے ایک کارآمد بات ضرور معلوم ہو گئی تھی کہ کہیں سے چار آدمی نواب خسرو جمشید کی امداد کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

نواب خسرو جمشید بزدل ہی نہیں، بے وقوف بھی تھا۔ وہ چلا چلا کے کہہ سکتا تھا کہ یہاں کوئی کرنل نہیں اور نہ ہی آس پاس پاکستانی فوج کے لوگ ہیں لیکن وہ سمجھتا تھا کہ ایسی غلطی اس کے حق میں فوری ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔ تھا کہ

... کوئی نہیں بچا سکتا تھا مگر وہ اپنی دانست میں ... کام سے کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ امید کا دامن ہمیشہ ... کے ساتھ بندھا رہتا ہے یہاں تک کہ تختۂ دار کی سمت ... آخر تک کسی معجزے کے رونما ہونے کی امید ... شاید اچانک کوئی قاصد آ جائے... کوئی ... کہ سزائے موت پر عمل درآمد منسوخ کر دیا گیا ہے یا ... کر دیا گیا ہے... کسی خاص تقریب کے سلسلے میں تمام موت کی سزا پانے والے قیدیوں کی سزا کو عمر قید میں بدل دیا گیا ہے۔

اسی امید نے خسرو جمشید کو مجبور کیا کہ وہ میری فرماں برداری کرے اور کوئی ایسی بات نہ ہونے دے جو میرے جذبات میں اشتعال کا باعث بنے۔

وہ عورت ہسٹیریا میں تقریباً پاگل ہو چکی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس نے جمشید کو ننگی گالیاں دیں بلکہ اس کے منع کرنے پر اسے نوچا اور اس کے بال کھینچے۔ جمشید پہلے ہی احساسِ ذلت و شرمساری سے مرا جا رہا تھا اور اس کی بے بسی کے جذبات کو ... رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اس ذلیل کے جرم میں کوڑے مار مار کے میری کھال ادھیڑ دیتا اور میں غلطی سے بھی اس کے قریب خالی ہاتھ پہنچ جاتا تو وہ میرا گلا ضرور گھونٹ دیتا... یا اس کی کوشش ضرور کرتا۔

مگر یہ اس کی خواہش تھی اور خواہش پہ کس کا بس چلتا ہے! خسرو جمشید اچھی طرح سمجھتا تھا کہ میرے ہاتھ میں کچھ نہ ہو تب بھی میں اس جیسے دس کو قریب نہ پھٹکنے دوں اور ایک ایک کر کے سب کو جان سے مار دوں... چنانچہ جب اس کے اعصاب پر ... ناقابلِ برداشت ہو گیا اور اس کسبی نے بھی اسے ذلیل کرنا جاری رکھا تو نواب کے جذبات کا آتش فشاں پھٹ گیا۔

"ختم... بھونکے چلی جا رہی ہے... دو کوڑی کی رنڈی..." اس نے ایک دم اسے گردن سے دبوچ لیا۔ شاید تصور میں اس نے ... کی گردن دبالی تھی اور یہ احساس بھی اس کے زخمِ رسوائی کا مرہم ... تو تھا۔

میں نے اس عورت کی ساری بکواس کو غیر اہم سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا تھا... وہ نواب صاحب کو ذلیل کر رہی تھی تو گویا میرا ہی ایک کام کر رہی تھی۔ مجھے اس کو منع کرنے کی کیا ضرورت تھی... اگر وہ مجھے کچھ کہتی تو شاید میں بھی اسے کچھ کہتا۔

مجھے اس کی فصاحت و بلاغت پر حیرانی ضرور تھی۔ وہ ... عورت تو نہیں لگتی تھی، خصوصاً اپنے ترشے ہوئے اور سیٹ کیے ہوئے بالوں سے... مگر یہ سارے انداز نمائشی تھے۔ اندر سے ایک ... طوائف تھی۔ اس کا جسم ہی بے حیا نہیں تھا بلکہ

جذبات و احساسات بھی فحش تھے۔ پھر فحش الفاظ کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ آج تک اس نے اپنے اطوار پر تہذیب و شائستگی یا سوشل ... کا پردہ ڈال رکھا تھا تو موت کے خوف نے وہ بے وجود پردہ ہٹا دیا تھا۔

جب خسرو جمشید نے مشتعل ہو کے اس کی گردن دبوچی تو وہ ہوش میں نہیں تھا۔ میں نے عورت کو چیختے سنا اور اسے جمشید کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں پھڑکتے بھی دیکھا جیسے شکاری باز کے پنجے میں کوئی چڑیا پھڑپھڑاتی ہے۔ میں اسے بچانے کے لیے آگے بڑھا اور رک گیا۔ آخر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں ایک گنہگار کے ہاتھوں دوسرے گنہگار کو قتل ہونے سے روکوں۔ جبکہ ہر اعتبار سے واجب القتل دونوں ہی تھے۔ عورت کا قانون کی نظر میں جرم کوئی نہ تھا تب بھی مذہب اسے سنگسار کرنے کا حکم دیتا تھا اور خسرو جمشید کے دامن پر تو اتنے بے گناہ لہو کے داغ تھے کہ ہر داغ پہ اگر ایک بار بھی پھانسی دی جاتی تو اسے ہزاروں بار مرنا پڑتا۔

میں نے جمشید کو موقع دیا کہ وہ گناہ کی راہ پہ ایک گنہگار کے بوجھ کو کم کر دے۔ معلوم نہیں خدا کے نزدیک اس کی نیکی شمار ہوتی یا ایک اور گناہ... حقیقت کو دیکھا جائے تو جمشید نے کسی اصلاحی جذبے سے مغلوب ہو کے ایک طوائف کا قتل نہیں کیا تھا۔ اس نے ذاتی عداوت میں اسے مار دیا تھا۔

چند منٹ میں وہ مر گئی اور اس کا ساکت جسم کھلی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ یوں جیسے وہ اپنی موت کا الزام مجھے دے رہی ہو کہ یہ سب تمہارا قصور تھا۔ نہ تم آتے نہ موت آتی... لیکن میں نے اپنے ضمیر پر بھی یہ الزام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس جنگل میں اب تک بہت سے بے گناہ بھی مارے گئے تھے پھر ایک گنہگار عورت کا کیا ہے؟

آہستہ آہستہ خسرو جمشید پر حقیقت آشکار ہونے لگی کہ غصے میں اس نے کیا کر دیا ہے۔

"تم نے ایک قتل اور کر دیا ہے مرنے سے پہلے" میں نے اس کو ذہنی اذیت دینے کے لیے کہا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ اس کی نظریں خلا میں دیکھتی رہیں۔

"تم نے سن ہی لیا ہوگا... جو کچھ میں نے کہا تھا۔"

"تمہارے کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ بے وقوف نہیں ہیں۔" خسرو جمشید نے کہا۔

میں نے کہا "میرا بھی یہی خیال تھا... مگر اب نہیں ہے مسٹر نواب صاحب... یہ کون لوگ تھے؟"

"جب وہ آئیں تو انہی سے پوچھ لینا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ نہیں آ رہے ہیں جمشید... میں

www.paksociety.com

تمہیں یقین کرنے پر مجبور نہیں کرتا... تم ان کا انتظار کرتے رہو۔ تم نے دس منٹ کہا تھا نا... ایک گھنٹا کافی ہے تمہیں؟"

"ایک گھنٹے کے بعد کیا ہوگا؟" وہ تلخی سے بولا۔

"ایک گھنٹے کے بعد میں پھر آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اس وقت حالات بدل چکے ہوں گے... ابھی تو تمہیں یقین ہے کہ کوئی تمہیں بچانے آئے گا جب اس کی امید بھی نہیں رہے گی تو میں دیکھوں گا کہ تمہارا رویہ کیا ہے۔"

جمشید نے سر اٹھا کے پُر امید نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "پھر تم کیا کرو گے؟"

"تمہارا مطلب ہے کیا میں تمہاری جان بخشی کر دوں گا؟... تو یہ وعدہ کرنا بہت مشکل ہے... ہاں مخصوص حالات میں تمہارا کیس ایم آر ایس کی جیوری کے سامنے رحم کی درخواست کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے اور اگر تم اپنی افادیت ثابت کر سکے... یعنی بتلانے میں کامیاب رہے کہ تم نے اپنے ساتھیوں کو چھوڑ دیا ہے ماضی کی غلطیوں سے توبہ کرنے کے بعد آئندہ کے لیے بھی تائب ہو چکے ہو اور اس کا قرض ادا کر سکتے ہو..."

"کس قسم کا قرض؟"

"یہی کہ تم آئندہ ہمارے ساتھ تعاون کرو... تم بہت کچھ جانتے ہو کیونکہ اب تم ملادور کے دست راست تھے ڈاکٹر سلوا کی موت کے بعد... اس کا دوسرا بازو سراج تھا تم ہمیں کارآمد معلومات فراہم کر سکتے ہو... اور تصدیق کے بعد وہ معلومات درست ثابت ہوں گی تو ممکن ہے تمہاری زندگی تمہیں بخش دی جائے... ظاہر ہے کہ پھر تم دھوبی کے کتے بن جاؤ گے۔ تمہارے لیے دونوں راستے بند ہوں گے... مگر تیسرا راستہ کھلا ہوا ہوگا... تم واپس ولایت جا سکتے ہو... جہاں تم پہلے رہتے ہو... لیکن اسے [illegible] مت سمجھنا یہ تو دوسروں کی مرضی پر منحصر ہے۔ اگر تم نے ہمارے دشمنوں کے بارے میں ہر بات بتا دی تو اس ذخیرہ معلومات کے بدلے تمہاری جان کا سودا ہو سکتا ہے بشرطیکہ معلومات مستند... مکمل اور اہم ہوں... ظاہر ہے تم کو اپنے ساتھیوں سے غداری کرنی ہوگی... مگر غداری ایک بار کی جائے یا دس بار... برابر ہے۔ یہ تمہارے مسلک میں اور فطرت میں شامل ہے۔ ورنہ آدمی ایک بار بھی غداری کرنے پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ تم زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ اس لیے غداری کرو گے تو یہ تمہاری اپنی نظر میں عقل مندی ہوگی جس سے تمہاری جان بچ جائے گی۔ ورنہ تم جانتے ہو کہ [illegible] آدمی سے معلومات ایسے نچوڑی جا سکتی ہیں جیسے شکنجے میں سے رس نکالا جاتا ہے... ایک بار... پھر دوسری بار... پھر تیسری بار ریزہ ریزہ کر کے جب گنے کو مشین سے گزارا جاتا ہے تو آخر میں صرف پھونک رہ جاتا ہے۔ دونوں انتخاب تمہارے ہیں... غداری کرو یا دوستوں سے یا دشمنوں کے ہاتھوں پھوک ہو جاؤ۔"

یہ سب بکواس تھی۔ میں صرف جمشید کو ذہنی طور پر توڑ رہا تھا۔ ہر غدار اور بے ضمیر آدمی بزدل ہوتا ہے۔ وہ زندگی سے پیار کرتا ہے کہ غیرت و حمیت، عزت آبرو، شرم و حیا اور انسانیت کے سارے جذبوں کو قربان کرنا گوارا کرتا ہے... جیسی زندگی جمشید گزار رہا تھا۔ [illegible] شراب اور شباب میں ڈوبی ہوئی عشرت کی وہ زندگی جو دولت کی فراوانی سے حاصل ہوئی تھی۔ جس میں دنیا ہی جنت تھی۔ اسے خسرو جمشید کیسے آسانی سے ختم ہونے دیتا۔ [illegible] میں نے اس کو تھوڑا سا یقین واپس کیا تھا تاکہ وہ کسی [illegible] کے بغیر ملادور اینڈ کمپنی کے سارے راز اگل دے۔

میں نے گھڑی دیکھی تو دس منٹ گزر چکے تھے۔ مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں کیا حکمت عملی اختیار کروں۔ [illegible] ان چار افراد کا انتظار کروں جو جمشید کی مدد کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور جن کو واپس بلانے کے معاملے میں دوسری طرف کے لوگ بے بس نظر آتے تھے۔ وہ اسی حویلی والے ہوں گے۔ گھر کے اندر رہ کر میں زیادہ محفوظ تھا اور ان چاروں کو اندر آتے ہی شوٹ کر سکتا تھا۔

لیکن یہ یقینی تھا کہ ایک ساتھ وہ چاروں اندر آنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ ان میں سے کوئی ایک اندر آئے گا تو باقی تین باہر محاصرہ قائم کریں گے۔ جیسے ہی ایک مارا گیا باقی تین چوکس ہو جائیں گے اور خود اندر آنے کے بجائے مجھے باہر نکالنے کی کوشش کریں گے۔ وہ باہر رہ کے آزاد تھے اور امداد بھی حاصل کر سکتے تھے... اندر صرف ایک مشین گن پر میں کب تک انحصار کر سکتا تھا؟

چنانچہ دوسری صورت یہ تھی کہ میں نواب کو کہیں باندھ کر ڈال جاؤں اور خود باہر نکل کے مورچہ بندی کر لوں۔ تیسری صورت یہ تھی کہ میں نواب کے ساتھ فرار ہو جاؤں۔ لیکن اس آخری صورت میں مسئلہ یہ تھا کہ ہم شہر سے بہت دور تھے اور میرے پاس وہ گاڑی بھی نہیں رہی تھی جو جمشید کی ملکیت تھی۔ [illegible] ہم تباہ کر چکے تھے اور [illegible] گاڑیوں کا شور قریب معلوم ہوتا تھا اور اس اعتبار سے [illegible] مجھے [illegible] ڈھونڈنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ [illegible] ناقابل اعتماد ثابت کر کے نکل گئی تھی [illegible] میں کامیابی حاصل کر لی تھی لیکن پھر ایک ایسا مرحلہ آ گیا کہ اس کے ارادے خاک میں ملنے کے آثار پیدا ہو گئے۔ کوئی ایسی وجہ نہیں تھی کہ وہ [illegible]

[illegible] سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے [illegible] کہانی بھی سنا دی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ [illegible] بھی ہو گیا تھا مگر حقیقت کچھ اور تھی... [illegible] سلیقے سے تار ملا کے اعتبار [illegible] یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے اور جس عورت کو [illegible] کی تربیت دے کر ایسے مشن پر بھیجا گیا ہو اس کے لیے تو [illegible] بلیک میلنگ بھی مشکل نہ ہوتا۔

"جمشید... تم کیا پسند کرو گے؟" میں نے کہا۔ "اسی حالت میں [illegible] ساتھ جنگل میں [illegible] کرنا... رضاکارانہ طور پر ہاتھ پیر بندھوا کے اور [illegible] کرا کے بے ہوش ہونا... یا ناک آؤٹ ہو کے [illegible]...؟"

"میں دوسرا طریقہ پسند کروں گا... اگر تم واقعی میری پسند کا [illegible] لینے کے [illegible] ہو..."

"اس کا تو ابھی پتا چل جائے گا۔" میں نے کہا اور مشین گن ایک طرف رکھ دی... خسرو جمشید نے میرے حکم پر ایک پردہ پھاڑا [illegible] اس میں سے چار ساڑھے چار فٹ لمبی پٹیاں پھاڑیں۔ پھر وہ [illegible] بالکل سیدھے کر کے اور [illegible] جوڑ کے [illegible] اس کے گرد لپیٹ دی۔ پھر میں نے ساری پٹیاں جوڑ کے ایک لمبی رسی بنائی اور اسے پیروں کی طرف سے لپیٹنا شروع کیا۔ نائلون کے پردوں کی پٹیاں [illegible] مضبوط تھیں۔ جمشید [illegible] ہوا تھا چنانچہ جب اس کے پورے جسم پر [illegible] تو وہ بالکل [illegible] نظر آنے لگا۔ میں نے اس بات کا اطمینان کر لیا تھا کہ [illegible] ہاتھ ہلانا بھی چاہے تو وہ [illegible]۔

اس کام میں میرے دس منٹ صرف ہو گئے۔ اب مجھے باہر [illegible] کی جلدی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس عمارت کے اندر [illegible] دشمن کے ہاتھوں تنگ جاؤں۔

خسرو جمشید کے [illegible] کے میں نے اس کو [illegible] اور اسے باتھ روم میں لے گیا لیکن وہاں ایسی کوئی جگہ نہ تھی [illegible] چھپا سکتا یا باندھ کے رکھ سکتا۔ مجبوراً میں نے اس [illegible] کر کے [illegible] پہنچایا اور بیڈ کے سرہانے کی جانب نیچے [illegible] دیوار اور بیڈ کی درمیانی جگہ میں پھنس گیا اور میں نے اسے [illegible] سے ایک پلنگ کے ساتھ باندھ دیا۔ دوسری طرف [illegible] رسی کا ایک پھندا بنا کے ڈالا کہ وہ اٹھنے [illegible] کوشش کرتا تو پھندا تنگ ہو جاتا اور وہ [illegible] خود کو پھانسی لگا لیتا۔

مجھے امید تو نہیں تھی کہ پیچھے تمہارا تعاقب آنے والے ایک عورت کی لاش دیکھنے کے بعد جمشید کو کمرے میں تلاش کریں۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کمرے میں ادھر ادھر نگاہ ڈالیں یا باتھ روم میں جھانک لیں۔ اس وقت نواب کروٹ اور سر ہلا کے بیڈ کو کھینچ سکتا تھا تاکہ وہ متوجہ ہو جائیں۔ بصورت دیگر اس بات کا امکان نہیں تھا کہ وہ نواب کو ایسے تلاش کریں جیسے کوئی گم ہو جانے والی چیز تلاش کرتا ہے۔

"اب تم سیدھے لیٹے رہو گے تو زندہ رہو گے۔" میں نے مشین گن اٹھا کے کہا۔ "اگر ہلنے کی کوشش کرنا چاہو تو تمہاری مرضی... یہاں آ کے کسی نے تم کو بچا لیا تب بھی باہر تمہاری لاش ہی جائے گی۔ میں حویلی کے اندر ہی ہوں... میں بھی دیکھ لوں کہ تمہارے جاں نثار تمہیں بچانے کیسے آتے ہیں یا نہیں۔ آئیں گے تو میں ان کا استقبال کروں گا اور تمہیں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے مناسب سمجھا کہ ٹیلیفون ریسیور کو بھی مشین گن کا بٹ مار کے توڑ ڈالوں... پھر میں سیڑھیاں چڑھ کے باہر نکل گیا۔ ٹارچ لائٹ میرے ہاتھ میں تھی۔ حویلی سے نکل کے میں نے اسے بجھا دیا اور ایسی جگہ رکھ دیا جہاں سے پھر آسانی کے ساتھ اٹھایا جا سکے۔ یہ عمارت ایک منزلہ تھی اور چھت پر چاروں طرف ایک ایسی منڈیر بنی ہوئی تھی جیسی [illegible] نظر آتی ہے۔ چاروں کونوں پر چار برج سے تھے۔ اوپر پہنچنے کے لیے زینہ ابھی تک مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ تلاش کرنے پر چھت تک جانے کا راستہ مل ہی جاتا لیکن چھت بھی حرکت پذیری کو محدود کر دیتی تھی۔ بے شک چھت پر چڑھ کے میں دور تک دیکھ سکتا تھا اور اگر مورچہ قائم کر لیتا تو سامنے سے آنے والوں کو نشانہ بھی بنا سکتا تھا مگر یہ یقینی نہیں تھا کہ وہ سامنے سے ہی آئیں... وہ چاروں سمتوں سے بھی آ سکتے تھے۔ میں چاروں طرف سے ان کا راستہ کیسے روکتا؟

میں نے گھنے باغ کی پناہ کو بہتر سمجھا۔ صدر دروازے سے باہر جانے والا راستہ اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ ادھر سے آمد و رفت ہوتی ہے۔ اندھیرے میں بھی جھک کر دیکھنے سے مجھے گاڑیوں کے نشانات نظر آ گئے۔ گیٹ سے سڑک تھوڑا سا بائیں طرف گھوم کر جاتی تھی اور پھر اس سیدھی سڑک سے مل جاتی تھی، جس پر چل کے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔

میں نے صدر دروازے سے باہر آ کے خود کو جھاڑیوں کے پیچھے محفوظ رکھتے ہوئے چلنا شروع کیا۔ تقریباً سو گز چلنے کے بعد پھر موڑ آ گیا۔ یہ جگہ مجھے دفاعی نقطہ نظر سے مناسب ترین لگی۔ وہ سڑک کی طرف سے بھی آ سکتے تھے مگر یہ ممکن تھا کہ وہ گیٹ سے داخل ہونے سے گریز کریں۔ میں خود بھی [illegible] ایک [illegible] سے گزر کے اندر گیا تھا۔ اگر وہ عقل اور احتیاط سے کام لیں گے تو چار

www.paksociety.com

مختلف سمتوں سے اندر جا سکتے تھے... اور یہاں بیٹھ کے میں کم سے کم تعداد افراد کو دیکھ سکوں گا کہ وہ کہاں سے داخل ہوتے ہیں۔ مجھے ان چاروں کو ایک ہی راؤنڈ میں بھون دینے کا موقع بھی مل سکتا تھا بشرطیکہ وہ چاروں میرے سامنے ایک گاڑی سے اتریں یا گاڑی کو گیٹ کی طرف لے جائیں۔

ابھی میں نے یہ پوزیشن بھی نہیں لی تھی کہ میرے کانوں نے دور سے آنے والی گاڑی کی آواز سنی۔ میں نے غور کیا کہ یہ آواز کس قسم کی گاڑی کی ہو سکتی ہے۔ کاریں تو عموماً بے آواز ہوتی ہیں۔ جیپ کے، مرسیڈیز کے انجن اور فاکس ویگن کے انجن کی آواز جدا ہونے کے سبب پہچانی جا سکتی ہے لیکن رفتہ رفتہ قریب ہونے والی یہ آواز سب سے جدا تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کار کے سائلنسر میں سوراخ ہے اور کار سیکنڈ گیئر میں پندرہ میل کی رفتار سے چل رہی ہے یا اس سے بھی آہستہ۔

کار کے آہستہ چلنے کا سبب سمجھ میں آتا تھا۔ اس کی ہیڈ لائٹس بجھا دی گئی تھیں۔ اندھیری رات میں جنگل کے درمیان سے گزرنے والی ناہموار سڑک کو دیکھنا مشکل کام تھا۔ یہ کام وہی کر سکتا تھا جس کی نظر بھی تیز ہو اور جسے اس سڑک پر آنے جانے کا کچھ تجربہ بھی ہو... یہ معلوم ہو کہ سڑک پر یہاں تک کوئی موڑ نہیں آتا۔ کوئی گڑھا نہیں ہے اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ گاڑی اگر کچی سڑک سے ذرا نیچے اتر بھی جائے گی تو کوئی نقصان نہیں ہوگا اور اگر خدانخواستہ گر بھی گئی تو یہ معلوم ہوتے ہی آسانی سے واپس سڑک پر لانا مشکل نہ ہوگا۔ مجھے اور یہ بھی کہ یہاں تک پہنچنے والا اس راستے سے واقف تھا۔ اس کی جگہ میں گاڑی چلا رہا ہوتا تو یہ کام میرے لیے آسان نہ ہوتا۔

سڑک کے درمیان میں ٹھہر کے میں نے آواز کی سمت میں دیکھا۔ جواب خاصی واضح تھی۔ انھوں نے پارکنگ لائٹس تک بجھا رکھی تھیں اور میرے اندازے کے مطابق اب بھی وہ دو فرلانگ دور تھے مگر آواز سے لگتا تھا کہ وہ چند گز کے فاصلے پر موجود ہیں۔ میرے ذہن میں اس آواز کو سن کے کھٹارہ گاڑی کا خیال آتا تھا لیکن اس علاقے میں کھٹارہ گاڑی لے کر آنے کی غلطی وہ کیسے کر سکتے ہیں۔ جو خاص طور پر استعمال کی گاڑی ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ جیسے ٹینک لے کر چڑھائی کرنا۔ یہ کوئی سرحدی علاقہ نہیں تھا جہاں اس قسم کی کارروائی ممکن ہو۔

پھر اچانک بات میری سمجھ میں آگئی۔ وہ ٹریکٹر پر آ رہے تھے۔ اس علاقے میں کسی کا بھی رات کے وقت ٹریکٹر پر چڑھ کر آنا شک پیدا نہیں کر سکتا... مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ٹریکٹر پر یہ تنہا ہی ہوں؟

ابھی میں انھی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ انجن بند ہو گیا اور رات کے سکوت میں جیسے ٹھہراؤ آگیا۔ یعنی ایک سکتہ سا ہو گیا۔ یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ اسی وقت ٹریکٹر ... تھیں۔ اگر یہ سامنے ہوتا تو وہ مجھے دیکھ لیتے اور شاید ... شروع ہو جاتی۔ یہ لڑائی کم اور شکار زیادہ ہوتا جس میں بیک وقت پانچ افراد شکاری اور شکار کی حیثیت سے حصہ لیتے۔ کس کو کس پر فوقیت ہو سکتی ہے اور ... بے خبری میں گولی مار سکتا ہے ... سے زیادہ محنت کے باوجود ... پر منحصر ہوتا۔

آہستہ آہستہ میں نے سڑک پر آگے بڑھنا شروع کیا ... سڑک سے دس گز دور درختوں کی قطار کے پیچھے ... میں ان کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جانا چاہتا تھا ... کم ہونے لگا تھا۔ ان کے قدموں کی چاپ میں ... مگر وہ الگ الگ چل رہے تھے چنانچہ میرے قدموں کی آہٹ ... محسوس نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ انھیں یہ خیال ... کہ کوئی ان کی طرف آ سکتا ہے۔ اگر وہ کوئی سرسراہٹ سن ... تو اسے جنگل کے کسی جانور کی حرکت سمجھتے۔

"بس... یہاں رک جاؤ۔" کسی نے آخر میں کہا۔

میں خود بھی رک گیا۔ اب میں نے اپنی ساری توجہ ان کی گفتگو پر مرکوز کر دی۔

"تم سب نے نقشہ سمجھ لیا ہے؟" اسی شخص نے کہا۔ کوئی بنگالی تھا۔

"آہو جی... بس وستو اگاں..."

"سوار جی؟" بنگالی نے خفگی سے کہا۔ "یہ کیا ہے... تم نے کیا کہا ہے؟"

"میں نے عرض کی سرکار حکم کریں..."

"تو یہ بات تم انگریزی میں نہیں کہہ سکتے؟ تم جانتے ہو کہ باقی سب تمھاری بھاشا نہیں سمجھتے۔"

"او جناب... آتی انگریزی آتی تو ہم بھی لفٹین ہوتے۔"

"تم بہت ٹال مٹول کرتے ہو ہر وقت... مجھے سمجھانا پڑے گا... انگریزی نہیں آتی تو اردو بولو۔" بنگالی ...

"چلیں جانے دیں سر۔" کسی اور نے کہا۔ "آپ تو جانتے ہیں اس کی عادت..."

"اچھا دیکھو۔ سامنے سے کوئی نہیں جائے گا۔" بنگالی ...

"سوائے میرے... مگر میری بات اور ہے... سوار جی... آپ پچھلے کے لیے پیچھے سے راستہ بنا دو گے اور اوپر سے ... کرو گے۔"

"فکر نہ کریں جناب عالی... پہنچ گیا میں کوٹھے تے۔"

"باقی دو کو مشرق اور مغرب کی طرف سے جانا ہے..."

... معلوم نہیں وہ کدھر چھپے ہوئے ہوں۔" وہ بولا۔ "... خیالی ہے کہ وہ سب اندر ہوں گے۔ ... آیا تو اپنے ساتھ رکھو... کام آئے گا..." بنگالی نے ... "اب جاؤ... بکھر جاؤ۔"

وہ مجھ سے پچاس ساٹھ فٹ دور تھے اور میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں ایک برسٹ مار کے سب کو ختم ... ایک راؤنڈ چلانے کے بعد میں بھی خالی ہاتھ رہ جاتا اور ان میں سے ایک بھی بچ جاتا تو وہ مجھے نہ چھوڑتا۔ وہ بچ جاتے تو ہر طرف سے فائرنگ کی زد میں آ جاتا اور وہ مجھے چھلنی کر ... یہ ضروری تھا کہ میں ان سے فرداً فرداً نمٹوں۔

میں نے ان کے جنگل میں گھسنے کی سرسراہٹ سنی... مجھے ... نے بھی واپسی ... ان کی حرکت ... سمجھنے کے بعد ... پلان مرتب کرنا آسان ہو گیا تھا۔

سب سے پہلے میں بنگالی کو خوش آمدید کہہ سکتا تھا جو غالباً ... کرنے کے لیے سامنے سے اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔ ... سڑک کے موڑ تک گیا اور انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ کوئی ادھر ہی آ رہا ہے۔ یہ بنگالی ہی ہو سکتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا وہ گیٹ سے گزرے گا؟ نہیں... وہ اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا۔

میں نے سڑک پار کی اور فصیل کے اس حصے کی طرف گیا جس کے شگاف سے ہم اندر گئے تھے۔ یہ شگاف تقریباً سڑک کی سیدھ میں تھا۔ اندر جا کے میں نے ادھر ادھر دیکھا تو مجھے نیم کا ایک درخت فصیل کے اوپر سے باہر تک پھیلا ہوا دکھائی دیا۔

میں نے اسٹین گن پیچھے رکھ دی اور پیڑ پر چڑھ گیا... یہ کام آسان نہیں تھا۔ اس کا تنا بہت موٹا تھا اور اس پر ... ہوئے تھے ... کئی بار ... جنھوں نے میرے بازو پر چلنے لگے اور آستین میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے میری بغل میں کاٹا۔ میں برداشت نہ کرتا تو کیا کرتا... فصیل پر پہنچنے والی ایک شاخ پر رینگ کے میں نے ان چیونٹیوں کو ... مسل دیا جو مجھے کاٹنے ... گوشت کھانے لگے تھے۔ ... آنے والے لمحوں کی اذیت کسی ... تھی۔

فصیل پر اترنے کے بعد میں نے اس پر لیٹ کر آٹھ دس ... اذیت میں کیا کیونکہ اس پر بھی وہی ... تھے ... وہ بھی تھا کہ یہ فصیل کا کوئی حصہ گر نہ جائے۔

... شگاف کے عین اوپر پہنچ گیا۔ یہ سب سے خوفناک جگہ ... فصیل میں نیچے پانچ فٹ کا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ اوپر ایک ... گیا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ یہ پرانی ... اینٹوں کا پانچ فٹ لمبا ٹکڑا تو وہ اپنے وزن سے بھی گر سکتا تھا جس پر میں نے اپنے وزن کا اضافہ کر دیا تھا۔

میں نے سانس روک کے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا تو مجھے ایک سائے کی خفیف سی حرکت محسوس ہوئی۔ میں چوکنا ہو گیا۔ یہ بنگالی تھا جو سر تا پا سیاہ لباس میں آگے بڑھ رہا تھا۔ کسی سیاہ چیتے کی طرح۔ عیاری سے اور بے آواز قدموں سے چلتا ہوا۔ وہ درختوں کے تنوں کے پیچھے پناہ لیتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ میں سانس روکے اس کا انتظار کرتا رہا۔ ابھی تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کدھر جائے گا لیکن میں ایسی پوزیشن میں تھا کہ اس کی ہر حرکت پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔

جب وہ سیدھا شگاف کی طرف آیا تو میں نے اطمینان کا گہرا سانس بھی روک لیا۔ میں نے اس شکستہ فصیل کی معلق اینٹوں پر ٹھہر کے خود اپنے لیے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ میں اینٹوں سمیت گرتا تو نیچے میری ہڈی پسلیوں کا چورا ہو جاتا۔ لیکن خدا نے مجھے بچائے رکھا تھا اور میری محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔

بنگالی نے شگاف کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ میں نے پیروں کو سمیٹا۔ ہاتھوں کے بل پیچھے خود کو گرایا اور بنگالی پر یوں جست لگائی کہ وہ میرے جسم کے نیچے دب گیا۔ خود بخود میرے ہاتھ اس کے سر اور ٹھوڑی پر جم گئے۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں بائیں ہاتھ سے ٹھوڑی پکڑ کے میں نے سر کو دائیں ہاتھ سے جھٹکا دیا اور بنگالی کی گردن یوں گھوم گئی جیسے سر اور دھڑ کے درمیان کوئی ہڈی تھی ہی نہیں... ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز تو خود اس کے کانوں نے بھی نہ سنی ہو گی۔

تیس سیکنڈ بعد میں کھڑا ہو گیا۔ بنگالی کا جسم اب بھی ہل رہا تھا لیکن جسم کا دماغ سے رشتہ ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کا احساس مر چکا تھا اور جسم مر رہا تھا۔ میں نے اس کی جامہ تلاشی لی اور حسب توقع مجھے اس کے پاس سے کچھ نہیں ملا۔ اس کی اسٹین گن میں نے ایک کندھے پر ڈالی اور اپنی گن دونوں ہاتھوں میں تھام کے حویلی کی طرف بھاگا... ہر قسم کی احتیاط کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ مجھے معلوم تھا کہ باقی تین ابھی دور ہوں گے۔ انھیں تھوڑا سا گھوم کر آنا تھا۔ سب سے کم فاصلہ جنوب کی طرف سے آنے والے کو طے کرنا تھا۔ تقریباً دگنا فاصلہ شمالی سمت سے داخل ہونے والے کو درپیش تھا۔ سوار جی کا چکر لمبا تھا کیونکہ ان کو عقبی حصے تک پہنچنا تھا مگر میں نے پہلے انھی سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔

چھت تک پہنچنے کا راستہ تلاش کرنے میں وہ بارہ ... بہت کار آمد ثابت ہوا جس نے وہ دروازہ بند کر دیا جس سے

www.paksociety.com

میں اندر گیا تھا اور ٹارچ کی روشنی کی مدد سے مختلف کمروں سے گزرا جو سب ویران پڑے ہوئے تھے۔ لوگ انہیں آسیب زدہ کمرے سمجھتے تھے تو حق بجانب تھے۔ اس کو دیکھنے والوں نے بعد ویران رکھا تھا اور اس سے بعوث بیت کی خون آشامی کی داستانیں منسوب کی تھیں۔ خسرو جمشید ایک اسمگلر تھا۔ اس نے راتی کے حویلی کو اپنا ایک ٹھکانا بھی بنا رکھا تھا اور عشرت کدہ بھی مگر جو کچھ تھا وہ زیر زمین تھا۔ کوئی شامت کا مارا اوپر آ پہنچتا تھا تو اس کی خبر نیچے مل جاتی تھی۔ اسے مار کے آس پاس ہی کہیں گاڑ دیا جاتا تھا اور معلوم نہیں اب تک کتنے بے گناہ ان ٹھکانوں کا نشانہ بن چکے تھے۔

زینہ مجھے عقبی حصے میں ملا۔ اوپر تک جانے والی سیڑھیاں بھی ٹوٹ رہی تھیں لیکن میں احتیاط سے قدم رکھتا ہوا چھت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ سوار جی بھی پہلے زینہ ضرور تلاش کریں گے مگر پھر سوچا کہ ہو سکتا ہے اس کا کیا ہو وہ سا کر راہ گیر کا جائزہ لے اور زینے سے اوپر پہنچنے کی کوشش کرے۔

لیکن سوار جی نے تو حیرت زدہ کر دیا۔ ٹیڑھ پیچھے حویلی کے کنکریٹ سے بلاک سے کچرا کا سلسلہ ہی تھے کہ نیچے ایک منڈیر پر اُبھر نے والا سر دکھائی دیا جو اندھیرے میں سیاہ گولے کی طرح اُبھرا اور غروب ہو گیا۔ میں دیوار کے سائے میں لیٹ کر ساکت ہو گیا۔ سر پھر اوپر آیا اور اس مرتبہ قائم رہا۔ اوپر آنے والا اب چھت کا جائزہ لے رہا تھا اور میں حیران تھا کہ آنے کا یہ کون سا راستہ ہے۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک لگرین پائپ کے سہارے چڑھ کے اوپر آئے تھے۔

میں نے سر کے بعد دھڑ کو منڈیر پر نمودار ہوتے دیکھا۔ پھر ایک سایہ چھت پر اتر آیا۔ آہستہ آہستہ جیسے پاؤں اس نے منڈیر کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ میں چوکس ہو گیا کیونکہ اس کا رخ اسی سمت میں تھا جدھر میں دبکا پڑا ہوا تھا۔ بے شک وہ دور سے اندھیرے

میں میرے خدوخال کو عمارت کے خاکے سے جدا نہیں دیکھ سکتا تھا مگر قریب آتے ہی وہ دیوار اور آدمی کے فرق کو محسوس کر لیتا۔

میں نے ادھر ادھر ہاتھ مارا تو پلاسٹر کا ایک ٹکڑا ہوا ٹکڑا میری گرفت میں آ گیا۔ آسے میں نے ہاتھ کو کم سے کم حرکت دیتے ہوئے یوں اُچھالا کہ وہ مخالف سمت میں کہیں چھت پر گرا۔ سوار جی ایک دم گھوم گئے اور ان کی اسٹین گن کا رخ بدل گیا۔ وہ چند سیکنڈ تک اسی پوز میں منتظر رہے کہ کچھ ہو یا کوئی سامنے آئے۔

میں بھی چند سیکنڈ کی مہلت ہی چاہتا تھا۔ جس پر بغیر بے کھڑا ہونا ممکن ہو۔ سوار جی کے اور میرے درمیان بیس فٹ کا فاصلہ ہو گا۔ یہ فاصلہ اس وقت بہت زیادہ ہو جاتا ہے جب حریف کے ہاتھ میں اسٹین گن ہو اور وہ فائر کھول دینے کے لیے تیار

کھڑا ہوا ہو۔

میں نے اپنی اسٹین گن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سوار جی نے پلٹ کے دیکھا۔ گویوں کا ایک برسٹ اس طرح فوطہ مار کے نکل چکا تھا۔ چھت سے اٹھنے والی دیوار میرے پیچھے سے ٹکرا کر پھوٹنے لگی۔

تھا دوسری بار اسٹین گن کی تڑ تڑ سے گونج اٹھی۔ ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی اور وہ اچھلا تو اس کے ہاتھ بھی اوپر اُٹھ گئے۔ اس کی اسٹین گن ایک دھماکے سے گر کی چھت پر گری۔ وہ خود منڈیر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اچھل کر جب وہ نیچے آیا تو اس کا آدھا دھڑ منڈیر پر لٹک گیا۔ اس کی کرب کے ساتھ ایک بل کھایا تو اس کی ٹانگیں گئیں۔ وہ منڈیر سے غائب ہو گیا۔ اس کی لاش پچھلے والے حصے میں تقریباً اٹھارہ فٹ کی بلندی سے گری۔

اسی وقت تیسرا شخص شامت اعمال کے باعث سامنے آ گیا... وہ جنوب کی طرف سے اندر پہنچ چکا تھا اور اس طرح بہت مطمئن تھا کہ وہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہا۔ محاصرہ قائم کرنے والی پاکستانی فوج کے کسی نے اُسے نہیں دیکھا۔

جب سکھ فوجی میری چلائی ہوئی گولیوں سے زخمی ہو کر اچھلا تھا تو اس کی پگڑی گر گئی تھی۔ جب وہ نیچے گرا تو تیسرے شخص نے یہ سمجھا کہ شاید سردار جی نے چھت پر موجود شخص کو چھلنی کر دیا ہے مگر دشمن بچ گیا اور اس نے جان بچانے کے لیے نیچے چھلانگ ماری ہے۔ تیسرا شخص دُور نہیں تھا۔ اس کی نظر دھوکا کھا گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سوار جی کے سر پر پگڑی نہیں تھی اور نیچے گرنے کے بعد وہ ایک دشمن ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے بھی نیچے گرتی ہوئی لاش پر

ایک راؤنڈ چلا دیا۔

مرے کو مارے شاہ مدار۔ یہ شاہ مدار اپنی جلد بازی پر پشیمان ہوا ہو گا مگر جنگ کے میدان میں غلطی یا غلط فہمی شکست کے اسباب پیدا کرتی ہے۔ لاش پر گولیاں برسانے کا تاسف کے سوا کچھ نہ ملا ہو گا لیکن مجھے اس کی صحیح پوزیشن کا سراغ مل گیا۔ اب میں عجلت پسندی کا مظاہرہ کرتا تو تیسرا شخص کا رخ اس کی سمت دیکھتے ہوئے فائر کھول دیتا لیکن جب سامنے کوئی نہیں تھا۔ وہ گھاس اور جھاڑیوں میں روپوش تھا۔ میری کوشش کی کامیابی اور ناکامی کے امکانات نصف نصف تھے۔ ادھر میری پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ میں چانس لے سکوں۔ میں نے سر کو جھکایا اور گھٹنوں کے بل دوڑتے ہوئے

نیلی کا مرکز... وقت چوڑا اور اونچا تھا۔ اوپر سے اس کی چوکور کنگوروں کے درمیان جہاں ان کی قوس بنی ہوئی تھی ایک خلا سا آتا تھا۔ اس خلا سے میں نیچے جھکے ہوئے تیسرے آدمی اپنی جائے پناہ سے نکلتا تو میں اسے بھی نشانہ بنا دیتا اور اسٹین گن سے اس کے جسم میں بالکل اندر تک پیوست کر دیتا لیکن وہ اپنی کمین گاہ سے باہر نہیں آیا۔ چھت کے آخری حصے میں پہنچ کے میں نے نیچے جھانکا۔ پھر میں ادھر سے آیا تھا۔ اب میں اسی شخص کی تقلید کر رہا تھا جس کے بارے میں خیال تھا کہ اس کی عقل گھٹنوں والی ہو گی... میں نے وہی پائپ تلاش کیا جو لوہے کا تھا لیکن زنگ کھا چکا ہوا تھا۔

پائپ کے سہارے میں نے قدم زمین پر رکھے اور دیوار کے سائے میں ہوا کو نے تک گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک حویلی میں داخل ہونے والا چوتھا شخص بھی پہنچ چکا ہو گا مگر میں نے نظر انداز کر دیا۔ میری ساری توجہ اتفاق اس تیسرے شخص پر تھی جو ابھی تک سامنے کی لمبی گھاس میں لیٹا ہوا تھا یا بیٹھا ہوا۔ مجھے ایسی کوئی ترکیب نہ سوجھی جو اُسے باہر نکالنے میں کار آمد ثابت ہوتی۔ میرے جیسا آدمی صبر کے سوا چارہ نہ تھا۔

پانچ منٹ... دس منٹ... پھر پندرہ منٹ گزر گئے... میں نے جس جگہ نظر جمائے بیٹھا تھا جہاں میرے خیال میں دشمن چھپا ہوا تھا، اس وقت جب میں مایوس ہو کے سوچنے لگا تھا کہ ایک مفروضے کو حقیقت سمجھے تو نہیں بیٹھا ہوں، دشمن نے اپنی موجودگی کا سراغ دے دیا۔ اسے ایک طرف اس کی بدبختی کہیے کہ وہاں دم سادھ کر بیٹھے تھے۔ اسے اچانک چھینک

آ گئی۔ چھینک کو روکنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ اس نے کوشش ضرور کی ہو گی لیکن غلط وقت پر نازل ہونے والی چھینک کو روک لے مگر ناک سے اندر کی۔

اس نے چھینک کو دونوں ہاتھوں کی پناہ میں اور گھٹنوں میں دبا کر بند کیا ہو گا۔ آواز کم سے کم رکھنے کی کوئی دوسری تدبیر نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے وہ آواز سن لی۔ اب میرے لیے نشانہ لینا آسان ہو گیا۔ کامیابی کی سو فیصد ضمانت اب بھی نہ تھی۔ مجھے یہ احساس پریشان کر رہا تھا کہ میں ساری رات یہاں بسر نہیں گزار سکتا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اپنے اندازے پر بھروسا کرتے ہوئے اسٹین گن کا رخ صحیح سمت میں کیا اور پورا برسٹ چلا دیا۔ اسٹین گن کو تھوڑا سا دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے

میں نے تقریباً پانچ چھ گز میں گولیاں برسائیں۔

جب میں نے اس کی دردناک چیخ اور نزع کے کرب کی صدا سنی تو مجھے یقین آیا کہ میرا نشانہ خطا نہیں گیا اور میں اپنی جگہ سے نکل کے بھاگا... میرا رخ اب باہر کی طرف تھا۔ مجھے یقین تھا کہ چوتھا شخص فائرنگ کی آواز سن چکا ہو گا اور جب اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھے گا۔ تہ خانے میں جا کے نواب کو غیر موجود پائے گا مگر اُسے نواب کے ساتھ داد عیش دینے والی طوائف کی لاش ملے گی پھر وہ دیکھے گا کہ رفا غائب ہے اور ٹرانسمیٹر ٹوٹا ہوا ہے تو وہ یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ ہم نواب کو اغوا کر کے نکال لے گئے یا اُسے پاکستانی فوجی گرفتار کر کے لے گئے۔ پھر وہ وہاں سے فرار میں ہی عافیت سمجھے گا۔

سیدھی سڑک پر میں نے پیچھے دیکھے بغیر اپنا سفر جاری رکھا لیکن آئی احتیاط ضروری کہ سڑک سے ہٹ کے چلوں مبادا کوئی اور گاڑی نمودار ہو جائے۔ مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں ان کے ساتھ پانچواں شخص ڈرائیور نہ ہو۔

نیلی ٹرک جو وہاں کھڑا ہوا تھا اُسے سڑک سے کچھ فاصلے پر درختوں کے پیچھے چھپانے ...... کی واجبی سی کوشش کی گئی تھی۔ اس سڑک پر سے اس وقت گزرنے والا کون تھا جس کا انکشاف ہوتا مگر میری نظر دونوں جانب دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے فوراً دیکھ لیا۔ اس لیے بھی کہ ٹرک کا رنگ زرد تھا۔

میں اب راتی کی حویلی سے تقریباً آدھا میل کے فاصلے پر تھا۔ ٹرک کے پچھلے والے حصے سے ٹیک لگا کے میں نے شانوں کی اسٹین گن کا بار اپنے شانے سے اتارا اور زمین پر یہی پھیلا کے بیٹھ گیا۔ بے اختیار میرا ہاتھ سگریٹ کی طلب میں جیب کی طرف گیا مگر میرے پاس نہ سگریٹ تھی اور نہ ماچس۔

میں نے ٹرک میں چڑھ کے سامنے والے خانے کی تلاشی لی۔

پھر پیچھے دیکھا تو مجھے ایک تھیلا سا پڑا ہوا نظر آیا۔ اس میں گرم کافی تھی۔ یہ خدا کی دین تھی اور بقول شاعر کہ آگ سینے کو جا تیں، تمبیر کی مل جائے۔ سگریٹ تو نہیں ملی مگر کافی مل گئی جس کی طلب ان حالات میں یوں دب گئی تھی جیسے غربت میں سوکھی روٹی میسر ہو تو عشق بھی نہیں سوجھتا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور مزے سے لے لے کافی کے دو گھونٹ حلق میں اتارے۔ تھرماس ابھی آدھی ہی کافی تھی۔ خالی تھرماس کو میں نے جنگل کی طرف اچھال دیا۔ اس نعمت غیر مترقبہ نے میرے حوصلے اور میری جسمانی توانائی کے گراف کو میرے ارادوں سے بھی بلند کر دیا۔ رات کا ایک بج گیا... پھر ڈیڑھ بج گیا۔ انتظار میرے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگا اور میرے ذہن میں نئے اندیشے

www.paksociety.com

بیدار ہو گئے تھے۔ کہیں وہ جو تھا شخص کسی اور طرف سے تو نہیں نکل گیا۔ میں نے ایک تحقیقی تنظیم کو تباہ کر دیا تھا۔ لیکن وہ کسی اور طرح بھی تو اپنا پیغام آگے پہنچا سکتا ہے۔ مزید کمک طلب کر سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کوئی پورٹیبل وائرلیس ہوا... مگر نہیں... اس کے ساتھیوں کی گفتگو سننے کے بعد یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ روانہ ہو جانے والوں کو واپس نہیں بلا سکتے۔ ان کے پاس وائرلیس ہوتا تو وہ رابطہ قائم کر لیتے؟ مگر کیا اس عمارت میں دوسرا فون نہیں ہو سکتا؟

اچانک میں نے باتوں کی آواز سنی۔ میں ایک دم چوکنا ہو گیا۔ کم سے کم دو آوازیں ایک طرف سے آ رہی تھیں۔ جیسے جیسے وہ قریب آتے گئے ان کے الفاظ واضح ہونے لگے۔ ان میں سے ایک خسرو جمشید تھا جو دوسرے شخص کو اپنے ساتھ ہونے والی ساری واردات کا احوال سناتے ہوئے سخت مشتعل تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو آزاد کر لیا تھا یا وہ تہ خانے میں بند ہو جانے والے دوسرے شخص کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو اسے رہا کر کے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ خسرو جمشید نے اسے بتا دیا ہوگا کہ آس پاس کوئی پاکستانی فوج نہیں، اور نہ وہاں کوئی کرنل بھجوا سکتا تھا۔ وہ سب میرا ڈراما تھا۔

میں نے چوتھے شخص کے ساتھ نواب کی تشریف آوری کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ وہ اب بالکل بے خوف تھے کیونکہ ان کو کسی کا ڈر نہیں رہا تھا نہ پاکستانی فوج کی موجودگی کا اور نہ میرا۔ شاید میرے بارے میں انھوں نے فرض کر لیا تھا کہ میں تنہا افراد کا مقابلہ نہ کر سکا اور جان بچا کے نکل گیا۔

وہ سیدھے تہ خانے کی طرف آ رہے تھے۔ میں سانس روکے کھڑا رہا اور آفات ناگہانی سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتا رہا کہ مجھے چھینک نہ آ جائے یا اچانک کوئی سانپ نمودار نہ ہو جائے یا کوئی اڑنے والا کیڑا میری ناک کو ڈاک ٹکٹ ماننے کے لیے پسند نہ کر لے۔

جب وہ تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ گئے اور ان پر میری موجودگی کا راز افشا نہ ہوا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ خسرو جمشید اب لباس بدل چکا تھا۔ اس کا ساتھی جیسے کوئی دیہاتی لباس میں تھا مگر وہ انگریزی بول رہا تھا اور اپنے لب و لہجے سے بنگالی لگتا تھا۔

وہ نواب پر برہم تھا۔ "تم بھی ویسے ہی نواب ہو جو شطرنج کی ایک بساط پر سلطنت ہار دیتے ہیں اور مشہور طوائفوں کے ناز و انداز پر اور قصیدہ گو شاعروں پر زر و جواہر نچھاور کرتے کرتے خود فقیر ہو گئے۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو... میں ایک عزت دار آدمی ہوں۔" جمشید نے گرم ہو کے کہا۔

"مجھے پتا ہے... عالی قدر... تم شراب کے نشے میں ... ہوئے تھے اور اس طوائف نے تمہیں عقل و ہوش سے بیگانہ کر ... تھا ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ دشمن یوں سر پر آ پہنچتا۔"

"یہ تو میں بھی نہیں سمجھ پایا۔" جمشید نے ... کہا۔ "آخر وہ کمینہ وہاں پہنچا کیسے... کس نے اسے ... اس جگہ کا پتا؟"

"ہوشیار لوگ سب معلوم کر لیتے ہیں... خصوصاً جب ... معلوم ہو کہ حریف کو اپنا ہوش نہیں۔"

"عزیز میاں! اس جگہ کا علم میرے سوا کسی کو نہیں تھا۔" ... نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی تمہاری غلطی تھی۔" وہ بولا۔ "اگر تمہارا آدمی ... تک نہ پہنچتا تو ہم تمہاری مدد کے لیے کیسے آتے... کیا تم نے ... دکھا دی تھی؟ اور نواب صاحب... کیا سکندر بخت کو بھی تمہارے یہاں ملنے کی خبر فرشتوں نے پہنچائی تھی؟ اگر تمہارے سوا کسی کو علم نہیں تھا تو اس راستے پر وہ کیسے آ گیا... تم جھوٹ بول رہے ہو مجھ سے..."

"ایک آدمی اور تھا۔" نواب نے کہا۔ "میرا شوفر... بیچارہ وہی بھی تھا اور رحمان بھی۔"

"وہی جو تمہارے لیے ایک وقت میں قتل بھی کرتا تھا...؟" عزیز نے تمسخر اڑانے کے انداز میں پوچھا۔

"ہاں..."

"اس وقت کہاں ہے وہ؟" عزیز میاں نے کہا۔

"وہ ساتھ نمبر کیمپ کی طرف گیا تھا۔" نواب نے کہا۔

"جو تباہ کر دیا گیا تھا؟"

"ہاں۔"

"وہاں اب کیا تھا؟" عزیز میاں بولا۔ وہ دونوں ... بیٹھے ہوئے یوں باتیں کر رہے تھے جیسے انھیں کسی کا کھٹکا ...

"میں نے اسے نہیں کہا تھا۔ میں نے تو مخالفت کی تھی مگر یہ حکم دینے والوں کو میری کار اور شوفر دونوں درکار تھے۔" جمشید نے کہا۔

"بس تو پھر اس پر خاطر جمع رکھو۔" عزیز میاں نے کہا۔ "اس جگہ کا پتا وہی آدمی جانتے تھے تو شک کی کون سی گنجائش رہ جاتی ہے کہ سکندر بخت کو اسی نے سب بتایا... اور اب بیٹھا بھی خوشی سے بقضا و رغبت ... بتا رہا۔"

"اگر وہ مارا گیا تو میں... انھیں معاف نہیں کروں گا۔"

"کیسے معاف نہیں کرو گے؟" عزیز میاں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"...جنھوں نے اُسے زبردستی بھیجا تھا... یہ جانتے ہوئے بھی کہ سکندر بخت اور اس کے ساتھی وہاں موجود ہیں۔ انھی ... وہ آتی تباہی چھپا بیٹھے تھے۔ ان کو زندہ گرفتار کرنے کا سوچنا پاگل پن تھا اور دیکھ لو اس کا نتیجہ... صرف ایک بچ کے واپس پہنچا تھا... وہ بھی موت کی وجہ سے... جو ایک عورت تھی۔"

"میں نے اس کی لاش بھی دیکھ لی ہے۔"

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ اس نے اپنے کرنل کو خود گولی مار دی تھی؟"

"واٹ نان سینس...!"

"یہ بات خود اس نے مجھے بتائی تھی۔" جمشید نے کہا۔

"کیا ان کے درمیان دشمنی تھی؟"

"ہاں... تم کہہ سکتے ہو... دشمنی کی وجہ ایک لڑکی تھی جو کرنل کی بیٹی تھی اور کرنل اس کی شادی کے معاملے میں اپنے رویے میں ایک سوت کی لچک پیدا کرنے پر تیار نہ تھا۔ ... زندہ رہتا تو..."

"پھر تو ٹھیک ہی ہوا کہ وہ مارا گیا... ورنہ اس کا کورٹ مارشل ہوتا تو اسے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے مرنا پڑتا... حد ہے بدمعاشی کی... ڈسپلن اور مورال کوئی چیز ہی نہیں رہا... ایک لڑکی کے لیے اپنے باس کو... اپنے سینیئر افسر کو قتل کر دینا بہت سنگین جرم تھا۔" عزیز میاں اب بے حد مشتعل تھا۔ "مگر کمینے جرنیلوں کا نواب صاحب کہ یہ سب آپ کی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اس نے میرے سکھ باڈی گارڈ کو قتل کر دیا تھا..."

"باڈی گارڈ!" عزیز میاں نے حقارت سے کہا۔ "ایسی ... ایسے ہی فرشتے... وہ بھی وحشت پڑا ہوگا... تمھارے ... شخصیں یا مجرموں کا وہم لگا کے معلوم نہیں تم جیسے آدمی کو قابل اعتماد سمجھ لیا گیا... میری رائے میں تم اس قسم کی ذمہ داری کے لیے نااہل ہو۔"

"تم یہ بھول رہے ہو عزیز میاں کہ میری تو عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔" جمشید ایک دم غصے میں قابو سے باہر ہو گیا۔ "تم عدم سے وجود میں بھی نہیں آئے تھے جب میں نے ... کشتی مجاہدوں کو پہنچائی تھی۔ وہ تحریک خلافت کا دور تھا۔"

"پھر اب آپ مجاہدوں کے ساتھ کیوں نہیں ہیں؟" عزیز ... کے لیے بولا۔ "کشتی نے رخ کیوں بدل لیا ہے؟"

"وقت بدل گیا ہے میاں... اور جب وقت بدلتا ہے تو قدریں بدل جاتی ہیں۔ شرافت کے معیار بدل جاتے ہیں۔ انسانوں کی نظریں اور ان کے دل بدل جاتے ہیں۔" نواب خسرو جمشید نے تلخی سے کہا۔ "کیا ملا تھا مجاہدوں کو... تحریک خلافت میں جان دینے والوں... اور..."

"اور کیا... تم تقسیم کی بات کرتے ہوئے ڈرتے ہو؟"

"نہیں... ڈرتا نہیں ہوں... لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد میری آنکھیں کھل گئیں۔ کون نہیں جانتا ان کی شہادت کے پیچھے کار فرما عوامل کو... اس حادثے نے مجھے... دل برداشتہ کر دیا۔ میں نے کہا میاں جمشید، یہ اصول اور نظریات سب کتابی باتیں اور جذباتی نعرے، اب ختم ہوئے۔ اب لوٹ کھسوٹ کا دور ہے... تم اسے منفی سوچ کہہ سکتے ہو مگر جب صرف پیسہ ہی عزت کا پیمانہ بن جائے اور حرام حلال، جائز ناجائز کی تفریق مٹ جائے اور ترقی مذاق ہو جائے تو سوچ سیدھی کیسے رہ سکتی ہے... یہ ٹھیک ہے کہ اب بھی سیدھی سوچ رکھنے والے موجود ہیں... اور میرا دشمن ہے تو کیا وہی سکندر بخت کو صحیح سوچ رکھنے والے مثالی انسان کی طرح پیش کر سکتا ہوں۔ جب عمر ڈھل گئی تو بھٹک گیا اور میں بھی دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے کمانے والوں میں شامل ہو گیا... میں سمجھتا ہوں کہ میں کچھ غلط نہیں رہا... خصوصاً جب میں ان کی کسمپرسی اور حالت زار دیکھتا ہوں... جو ابھی تک وضعداری نبھا رہے ہیں۔ تو مجھے کوئی شک نہیں رہتا کہ میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔"

"میرا خیال ہے کہ بنگالی بھی مارا گیا ہوگا۔" عزیز میاں نے کہا۔ "ہم کب تک انتظار کریں اس کی واپسی کا؟"

"اس کی لاش تو نظر نہیں آئی۔"

"ہاں... مگر اتنی دیر میں وہ دس بار اندر جا کے واپس آ سکتا تھا۔"

"چلو عزیز میاں اب یہ ٹھکانا بھی چھوڑا۔" جمشید نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "لگتا ہے کہ اب ہم پر زمین تنگ ہو گئی ہے۔ کہیں سر چھپانے کا ٹھکانا بھی نہ ہو تو آدمی کہاں جائے... کیوں کب تک..."

یہ خسرو جمشید کی شخصیت کا وہ روپ تھا جو پہلی بار میرے سامنے آیا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ اس کی ہوس پرست لالچی فطرت نے اسے اتنی جلدی سیدھے راستے سے بھٹکا دیا۔ اگر اس کے خیالات اور نظریات میں استقامت ہوتی تو وہ... یہ ستم ظریفی سے ... کے عقیدے سے منحرف نہ ہوتا۔

میں نے پہلے فیصلہ کیا تھا کہ تہ خانے سے نکل کر ان ... اور عزیز میاں کو مار کے جمشید کو اپنے ہمراہ لے جاؤں لیکن پھر مجھے عقل

www.paksociety.com

نے روک لیا۔ میں نے ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے جگہ میں نے پہلے ہی منتخب کرلی تھی۔ جب ٹریکٹر اسٹارٹ ہوا تو میں پیچھے پیر لٹکا کے بیٹھ گیا۔

ٹریکٹر نے موڑ کاٹا اور واپس ظفر گڑھ جانے والی سڑک پر مڑنے لگا۔ اس کا دوڑنا ایسا ہی تھا جیسے اونٹ کا دوڑنا۔ مجھے بہت جھٹکے لگ رہے تھے اور جب اچانک ٹریکٹر کچی زمین پر سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گیا تو میرے لیے توازن برقرار رکھنا ایک مشکل کام ثابت ہوا۔ ایک طرف مجھے اسٹین گن کو سنبھالنا تھا تو دوسری طرف خود کو۔ کئی بار اسٹین گن ٹریکٹر کی باڈی پر لگی مگر ٹریکٹر کے چلنے سے اتنا شور ہو رہا تھا کہ آگے بیٹھے ہوئے عزیز میاں اور جمشید نے کچھ نہیں سنا۔

عزیز میاں یقیناً مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسند عناصر کا ایجنٹ تھا اور بھارتی ایجنٹوں کے ساتھ مل کے کام کر رہا تھا۔ اگر میرا اندازہ درست تھا تو ان کے لیے کیمپ کا نہیں اب دو ہی آدمی تھے جن کی گفتگو میں نے وائرلیس فون پر سنی تھی۔ تیسرا عزیز میاں تھا چنانچہ میرے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں ان تینوں کو فنا کر سکتا تھا۔

ٹریکٹر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے چلتا رہا۔ جنگل کے راستوں پر کئی بار دائیں بائیں مڑنے سے میں صحیح سمت بھی بھول گیا۔ پھر میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا تو قطب ستارے نے میری مدد کی۔ رات کے دو بجے ٹریکٹر اچانک رک گیا۔ اس کے پہیوں کے سامنے کوئی سنڈریا آگئی تھی۔ جھٹکا لگا تو میں اچھل کے نیچے جا پڑا اور چونکہ انجن بند ہو گیا تھا اس لیے عزیز میاں نے وہ آواز سن لی جو اسٹین گن کے گرنے سے پیدا ہوئی تھی۔

میں ایک دم اٹھا اور میں نے اپنا ہاتھ اسٹین گن کی طرف بڑھایا لیکن اتنی دیر میں عزیز میاں نیچے اتر کے اپنا ریوالور نکال چکا تھا۔ اس نے فائر کیا اور میں غوطہ مار کے ٹریکٹر کے بڑے پہیے کے پیچھے ہو گیا۔ ٹریکٹر نہ ہوتا تو میرے لیے دوسری گولی سے بچنے کے لیے جائے پناہ نہ ملتی تاہم عزیز میاں کو تیسری گولی چلانے کی مہلت نہ ملی۔ میں نے ایک دم سامنے آکے فائر کھول دیا اور کم سے کم نصف درجن گولیاں اس کے جسم کے پار ہو گئیں۔

وہ خیمہ میں نے بعد میں دیکھا جس کے اندر سے دو افراد فائرنگ کی آواز سن کے دوڑتے ہوئے نکلے تھے۔ وہ بھی اس فائرنگ کی زد میں آگئے۔ میں نے اسٹین گن کا رخ بدل کے انہیں موقع ہی نہیں دیا کہ وہ مجھ پر گولی چلا سکتے۔ ان کے ریوالور ہاتھوں میں ہی رہ گئے اور وہ خاک اور خون میں لوٹنے لگے۔

خسرو جمشید کود کے خیمے میں جا گھسا تھا۔

"اندر جو بھی ہے باہر آجائے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "ورنہ گولیوں سے بھون کے رکھ دوں گا۔"

صرف خسرو جمشید اپنے ہاتھ سر پر رکھے ہوئے باہر آیا۔ "اور کوئی نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"یہ میں خود دیکھ لوں گا۔" میں نے کہا۔ "تم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔"

اس خونریزی نے جمشید کو سخت وحشت زدہ کر دیا تھا۔ "دیکھو سکندر، خدا کے لیے مجھے مت مارو۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم نے جو کہا تھا میں وہی کروں گا... میں تم کو سب بتا دوں گا..."

"کیا بتا دو گے؟" میں نے اسٹین گن کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

"جو کچھ مجھے معلوم ہے... جو تم پوچھو گے وہ بتاؤں گا۔"

"اندر کیا ہے... اسلحے کے علاوہ...؟"

"اندر اسلحہ نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "صرف وائرلیس سیٹ..."

"اچھا... تو یوں کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ سب اسلحہ باہر نکال لو... پھر اس خیمے کو آگ لگا دو۔"

"آگ لگا دوں!"

"ہاں... ٹریکٹر کے لیے پٹرول تو ہوگا؟" میں نے کہا۔ "اندر یا ہر جگہ چھڑک کے ماچس دکھا دو... اور خود یہاں آکر کھڑے ہو جاؤ۔ میں یہاں سے بیس گز دور تمہارا انتظار کرنے لیٹ جاتا ہوں۔"

"وہ... دراصل... مجھے بالکل صحیح اندازہ نہیں..." خسرو جمشید کی حالت غیر ہو گئی... "ممکن ہے کچھ اسلحہ ہو... جس کا مجھے علم نہ ہو۔"

"تمہارا علم کتنا محدود ہے... یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں نواب کے کھلونے۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے... اندر چلو میرے آگے آگے۔"

نواب نے تعمیل کی اور میں اس کے پیچھے اس خیمے میں داخل ہوا جو خاصا کشادہ تھا... اور ایک طرف زمین پر ترپال بچھی تھی۔ یہ ان کے سونے کی جگہ تھی۔ دوسری طرف کچھ کاٹھ کباڑ کا بندوبست تھا اور تیسری جانب وائرلیس ریسیور رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ٹرانسمیٹر بھی تھا جس سے ظاہر تھا کہ ان لوگوں کا رابطہ دور دور تک تھا۔ شاید سرحد پار بیٹھے ہوئے ایجنٹوں اور بھارت تک ہوگا۔ ٹرانسمیٹر وائرلیس کار بیٹری سے آپریٹ ہوتا تھا۔

اس جگہ مجھے لکڑی کا ایک صندوق نظر آیا جو اسلحے سے بھرا ہوا تھا۔ ڈھکن کھول کر دیکھتے ہی مجھے سٹین گن کے راؤنڈ، دستی بم اور ڈائنامائٹ نظر آئے۔

"اسے اٹھا کر باہر لے جاؤ۔" میں نے جمشید کو حکم دیا۔

"میں اسے اٹھا نہیں سکتا۔" وہ بولا۔

"تو اسے گھسیٹ کر تو لے جا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

پھر پٹرول کی دو کین خیمے کے باہر سے لکڑی کے صندوق سے دستی بم اور ڈائنامائٹ نکال کے میں نے ٹریکٹر میں ڈال دیے۔ صندوق کو میں نے پھر خیمے میں پہنچا دیا۔ جمشید نے میری ہدایات کے مطابق سارا پٹرول اس خیمے پر چھڑک دیا۔ میں نے ایک کاغذ جلا کے خیمے کے پاس پھینکا تو خیمہ جل اٹھا۔ خیمے کے کینوس نے آگ پکڑ لی تھی۔ جمشید ٹریکٹر پر میرے ساتھ بیٹھا اور میں نے ٹریکٹر واپس موڑ لیا۔

سو گز کے فاصلے سے میں نے اس خیمے کو ایک الاؤ کی صورت میں دیکھا جس کے شعلے تیس چالیس فٹ اونچے تک اٹھ رہے تھے۔ اس آگ سے کچھ بھی نہیں بچ سکتا تھا۔ یہ تین لاشوں کی ... سامان رسد اور ان کے مرکز کی تباہی تھی اور دشمن کے ایک بڑے کیمپ کا خاتمہ تھا۔ اچانک رات کی خاموشی ... کے پھٹنے کی آواز نے منتشر کر دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پٹاخے چلائے جا رہے ہیں جیسے کسی جشن مسرت میں سلسل چلائے جا رہے ہوں۔ بے شک یہ میرے لیے تو ایک جشن مسرت تھا۔

میری نگاہ پھر گھڑی پر پہنچی۔ یہ نصف شب کے بعد ... بجے کی گھڑی تھی۔ رات کے ڈھائی بج چکے تھے اور اب مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ خسرو جمشید کا کیا کروں اور خود کہاں جاؤں۔ ... تھا کہ میں واپس جا کے اس آسیب کا خاتمہ کر دوں جو ... حویلی سے منسوب تھا۔ جب حویلی ہی کھنڈر بن جائے ... کہانیاں ختم ہو جائیں گی اور فراموش کر دی جائیں گی۔

لیکن یہ کوئی ایسا مقصد نہیں تھا جس کے لیے میں اپنے ... وقت کا ایک حصہ ضائع کرتا۔ میں نے واپس ظفر گڑھ ... سڑک کا رخ کیا۔ نواب بالکل خاموش اور دل گرفتہ بیٹھا ... اپنی ہار کا شاید اتنا غم نہ تھا جتنا اپنی رسوائی کا... ... اپنے جبار وغیرہ کو تو خیر باد کہہ دیا تھا مگر میں کسی ... ہونے والا نہیں تھا۔ ... ذہن کا ایک حصہ اپنے ... میں الجھا ہوا تھا تو دوسرا نواب کی طرف سے ہوشیار تھا۔

... مجھے مونا کا خیال بھی نہیں بھولا تھا۔ اگر وہ ... بنانے کے مقصد میں ناکامی کا یقین آجانے کے بعد اپنی مرضی سے چلی گئی تھی تو یہ بات یقینی تھی کہ وہ لوٹ کر انہی کے پاس گئی ہوگی جن کی وہ آلۂ کار تھی۔ وہ کسی اور وجہ سے فرار ہوئی تھی تب بھی اس کی واپسی کی امید نہیں کی جا سکتی تھی مگر یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ میرے بارے میں دشمنوں کو ساری معلومات فراہم کرے گی اور وہ اسی کے مطابق نئی حکمت عملی اختیار کریں گے۔ وہ چالاک عورت تھی، کار کو چابی کے بغیر لے جا سکتی تھی، اور مرسیڈیز جیسی گاڑی میں دو تین میل کے فاصلوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ سارے راستوں سے واقف تھی اور کہیں بھی پہنچ سکتی تھی۔

اپنی احمقانہ خوش فہمی کی بے وقوفی پر اب جھنجھلاہٹ بے سود تھی۔ میں اس دغاباز عورت کے خلاف اشتعال انگیز انتقام کے جذبات کا شکار ہو رہا تھا جس نے بچپن کی معصوم یادوں کے حوالے سے میرا جذباتی استحصال کیا تھا۔ وہ مجھے مل جائے تو...

اچانک ٹریکٹر کی ہیڈ لائٹس نے سڑک کے درمیان ایک حصے کو روشن کیا اور مجھے وہاں ایک ڈھیر سا نظر آیا۔ چند سیکنڈز میں ڈھیر نے کسی انسانی جسم کی شکل اختیار کر لی اور جب میں نے بیس گز کے فاصلے سے دیکھا تو مجھے وہ جسم کسی عورت کا نظر آیا۔

ایک سنسناتے ہوئے اندیشے نے لہو کو میری رگوں میں منجمد کر دیا۔ میں ٹریکٹر روک کے نیچے اترا۔

"یہ تو کوئی عورت ہے۔" جمشید بولا۔

"تم نیچے آؤ۔" میں نے سختی سے کہا۔

جمشید نیچے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ "تم ڈرتے ہو مجھ سے؟"

میں نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ "شیطان سے ڈرنا چاہیے۔"

"جب میں وعدہ کر چکا ہوں..." وہ گال پر ہاتھ رکھ کے دکھی اور مجروح لہجے میں بولا۔

"میں تمہارے وعدے پر اعتبار کرنا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔"

جمشید نے تعمیل کی اور میں نے اس کی تلاشی لے کر ایک ریوالور برآمد کیا جو اس کی شیروانی کے اندر کرتے کے نیچے دبا ہوا تھا۔

"اب یہ بات سرگزشت ہو، کہ تمہاری چالاکی یا بہادری ضرور تمہاری جان لے گی۔ میں ایک سیکنڈ کی مہلت دیے بغیر تمہاری گردن مروڑ دوں گا... تم اچھی طرح جانتے ہو مجھے۔"

اس کو ساتھ لے کر میں چند قدم آگے گیا۔ جھک کر دیکھے بغیر میرا اندیشہ ایک بھیانک حقیقت میں ڈھل گیا۔ وہ عورت مونا ہی تھی جو سڑک پر یوں چت پڑی ہوئی تھی کہ اس کا...... جسم لہو سے داغدار تھا۔ اس کے ہاتھ پیر بڑے عجیب انداز سے

بیٹھے ہوئے تھے کسی نے انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کے اُسے زندگی کی لذّت نہ چکھایا تھا۔

میں نے جھک کر اس کی نبض دیکھی۔ نبض کی رفتار کم تھی اور بے قاعدہ تھی۔ سینے میں دل کی دھڑکن بھی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے جسم پر گہری خراشیں تھیں۔ ایسی ہی خراشیں موہنی کے چہرے پر بھی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے کسی نوکیلے ناخن رکھنے والے وحشی جانور نے نوچا کھسوٹا ہے۔ موہنی کے بال الجھے ہوئے اور گرد آلود تھے اور اس کے جسم پر بھی مٹی کے ساتھ خس و خاشاک نظر آتے تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اُسے سڑک سے دور جنگل میں لے جا کر ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد سڑک پر پھینک دیا گیا تھا۔

ہر مہذب انسان کا خون ایسے نظارے پر کھولنے لگتا ہے۔ میں بھول گیا کہ موہنی نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔ میں صرف یہ سوچنے لگا کہ اس کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک کس نے کیا ہے؟

"کیا موہنی زندہ ہے؟" جمشید نے کہا۔

میں نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ "تم جانتے ہو اس عورت کو؟"

"ہاں... یہ ایک خوب صورت اور خطرناک عورت تھی۔"

"تمھارے لیے ہر عورت صرف عورت ہوتی ہے... اسے تم خطرناک کیوں کہتے ہو؟"

"اس نے مجھ سے تمھارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔" جمشید نے کہا۔

"کس قسم کی معلومات؟"

"یہی کہ تم ان معاملات میں کیسے ملوث ہو گئے... تمھارا ٹھکانا کہاں ہے... اور یہ کہ تمھاری کوئی تصویر مل سکتی ہے جس میں تمھاری اصل صورت ہو۔" جمشید بولا۔ "مجھے شک ہوا کہ یہ سب پوچھنے کا مقصد کیا ہے اور پھر میں نے موہنی کے بارے میں اصل پتا چلا لیا۔"

"پھر... تمھیں کیا معلوم ہوا؟"

"یہی... کہ یہ لڑکی اور تم بچپن میں اکٹھے تھے۔" جمشید بولا۔

"تم نے موہنی سے نہیں پوچھا تھا؟"

"بعد میں پوچھا تھا... اور اسی رات بے خبری میں موہنی نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔" جمشید نے کہا۔ "اس نے مجھ پر خنجر سے وار کیا لیکن میں بچ گیا۔ میرے شانے پر معمولی سا زخم آیا۔ مگر یہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔"

وجہ مجھے معلوم ہو گئی تھی کہ موہنی کیوں جمشید کا سامنا کرنے سے گریزاں تھی لیکن میں نے کہا۔ "موہنی نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے بھی اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا۔ تم نے ہوس کے ساتھ اسے جسمانی تشدد کا نشانہ بھی بنایا تھا۔"

جمشید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ [illegible]

"چلو اسے اٹھاؤ۔" میں نے کہا۔

"کیا تم اسے اسپتال لے جاؤ گے؟"

"اسے بچانے کے لیے میں سب کچھ کروں گا۔" [illegible]

ہم دونوں نے موہنی کو اٹھایا اور [illegible] مسئلہ اس کے لباس کا تھا۔ میں نے جمشید سے کہا [illegible] اتار دے۔ جمشید نے اس میں تامل نہیں کیا اور [illegible] موہنی کو شیروانی پہنا دی ——— خسرو جمشید [illegible] شلوار میں خود کو یوں سمیٹ رہا تھا جیسے عورت [illegible] میں سمٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ شیروانی کے بغیر [illegible] عادی نہ تھا۔

میرے ذہن میں اب دوسرا سوال گردش کر رہا تھا۔ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ [illegible] کو انھوں نے ہی سزا دی ہے جن کے ساتھ وہ [illegible] کی مرتکب ہوئی تھی۔ وہ پہچان گئے [illegible] وہ آئے تھے اور اسے اغوا کر کے لے گئے۔ گاڑی کے [illegible] آواز تو میں نے بھی سنی تھی۔

لیکن اس خیال کو عقل دو وجوہات کی بنا پر [illegible] تھی۔ ایک تو یہ کہ راوی کی حویلی تک آنے والے صرف [illegible] کیوں لے گئے جبکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ [illegible] ہوں۔ دوسری بات یہ تھی کہ غداری کے جرم کی سزا یہ نہیں [illegible] یہ تو کوئی سزا ہی نہ تھی۔ موہنی ایک ایسی عورت تھی جس کے پاس آبرو کا خزانہ لٹانے کے لیے بچا ہی نہ تھا۔ [illegible] لینا موہنی کے لیے ذہنی اذیت کا سبب [illegible] غداری کی سزا دینے والے اُسے عبرت ناک موت دیتے [illegible] اذیت کے ساتھ۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے [illegible] دیکھا اور میری نظر نے اس مقام کو پہچان لیا جہاں [illegible] جاتے ہوئے میرے ہاتھوں سے ایک بدمعاش مارا گیا [illegible] بالکل وہی جگہ تھی۔ اس خیال نے مجھ پر سب کچھ [illegible] عیاں کر دیا۔ موہنی سے اس شخص نے انتقام لیا تھا جو [illegible] کی لاش واپس لے گیا تھا۔ وہ بعد میں اکیلا یا کسی ساتھی [illegible] راوی کی حویلی پہنچا۔ موہنی اسے کار میں مل گئی۔ [illegible] تھیں۔ وہ زبردستی موہنی کو لے گئے اور [illegible] بے آبرو کر کے چھوڑ گئے جہاں اس کی وجہ سے ان کا ایک [illegible] مارا گیا تھا۔ وہ موہنی کو سڑک پر [illegible] عبرت بنا کے [illegible]

[illegible] مجھے واپس آنا تھا۔

[illegible] میرے ذہن میں کوئی الجھن نہ رہی۔ میں نے موہنی کو اپنی [illegible] پچھلے حصے میں ڈالا جہاں وہ آرام سے تو نہ تھی لیکن [illegible] کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔

[illegible] زیادہ دور نہیں تھا، حادثات کے وقت کسی [illegible] قتل ہوتا اگر میں اسے سرکاری اسپتال لے جاتا تو ڈاکٹر [illegible] کا کیا جواب دیتا کہ یہ عورت کون ہے اور اس کی یہ حالت [illegible] سے ہوئی۔ یہ شیروانی کیوں پہنے ہوئے ہے اور تم کون ہو؟ [illegible] ڈال کے لائے ہو۔ ہم جھوٹ بول سکتے تھے کہ [illegible] نہیں جانتے۔ یہ اسی حالت میں ملی تھی اور ہم اسے اٹھا [illegible] ڈاکٹر بے وقوف نہیں ہوتے... وہ پولیس کو خبر کر [illegible]

"کیا تم کسی ڈاکٹر کو جانتے ہو یہاں [illegible] آتے رہتے ہو؟" میں نے جمشید سے کہا۔

"اکثر... ہاں... وہ مہینے میں ایک بار۔" وہ بولا۔

"تمھاری ضروریات کے لیے تو سب سے قریبی بازار ظفر گڑھ [illegible] ہے۔"

"میں اپنی ضروریات کا سامان خود نہیں خریدتا۔" وہ بولا۔

"وہ لڑکی تمھارے ساتھ ہی آئی تھی؟"

"نہیں... ظفر گڑھ کا ایک زمیندار میرا جاننے والا ہے [illegible] نے بھیجا تھا۔"

"کسی مزارع کی بیوی یا بیٹی ہو گی؟" میں نے نفرت سے کہا۔

"وہ اپنی مرضی سے آئی تھی... وہ مزارع تو اس کا شوہر ہونے [illegible] نکلتا... وہ پیا پیچ ہے۔"

"گویا تم از راہِ ہمدردی اس کی مدد کر رہے تھے۔ کون ہے تمھارا زمیندار دوست؟" میں نے کہا۔

"اس کی بات چھوڑو... تم ڈاکٹر کی تلاش میں ہو تو میں تم کو [illegible] ڈاکٹر کے گھر لے جا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "اسے مطمئن کرنا تمھارا [illegible] ہے اگر وہ انکار کر دے..."

"وہ انکار نہیں کرے گا۔" میں نے اسٹین گن اٹھا کے [illegible] بات کر سکتا ہوں [illegible] لیکن یہ آخری راستہ ہے پہلا راستہ [illegible] ہو گا۔"

[illegible] جمشید نے سر ہلایا اور میری راہنمائی کرنے لگا۔

"کیا تمھیں یاد ہے کہ میرے پاس چار دستی بم بھی ہیں؟" [illegible]

"کیا تم انھیں استعمال کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ تم پر منحصر ہے۔ میں راستوں سے نا واقف ہوں۔ مجھے اپنے [illegible] لے جاؤ گے تو میں چاروں دستی بم استعمال کر دوں گا۔"

میں نے کہا۔

ڈاکٹر کا گھر ایک اسپتال کی چار دیواری میں تھا۔ جمشید نے مجھے بتایا کہ یہ سرکاری اسپتال ہے۔ ڈاکٹر کے گھر کا ایک دروازہ باہر کی جانب تھا چنانچہ ہمیں مین گیٹ سے اسپتال میں داخل نہیں ہونا پڑا۔ جمشید نے دستک دی تو کسی بوڑھے نے دروازہ کھولا جو حلیے سے نوکر نظر آتا تھا۔

"کیا بات ہے... کیوں دروازہ توڑ رہے ہو؟" وہ بولا۔

"ہمیں ڈاکٹر صاحب سے کام ہے۔" میں نے کہا۔

"چلو چلو... صبح اسپتال آنا۔" وہ ہمیں جھڑک کر بولا اور دروازہ بند کرنے لگا۔ میں نے دروازے کو دھکا دیا تو وہ پیچھے جا گرا اور چلانے لگا۔ پھر میرے ہاتھ میں اسٹین گن دیکھ کر چپ ہو گیا۔ اندر سے ایک جوان آدمی نائٹ سوٹ میں نمودار ہوا۔ اس نے ایک نظر مجھے اور پھر نوکر کو دیکھا۔ "کیا چاہیے تم لوگوں کو؟ میں اکیلا رہتا ہوں... نہ زیور ہے میرے پاس..."

"ہمیں ایک مریض کا علاج کرانا ہے ڈاکٹر صاحب۔ انتخاب تمھارے ہاتھ میں ہے۔" میں نے کہا اور جیب میں سے ہزار روپے کے نوٹ... نکال کے اس کے آگے پھینک دیے۔ "یہ ہے تمھارا معاوضہ... اور اگر یہ قبول نہیں تو پھر..."

"مریض کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے سکون سے کہا۔ وہ سمجھ دار آدمی تھا۔

"باہر... تم اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرو گے۔ وہ ایک عورت ہے۔" میں نے کہا۔

"تمھاری کیا لگتی ہے؟" اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں... ہم اسے راستے سے اٹھا کے لائے ہیں لیکن ہماری یہ بات کوئی نہیں مانے گا اور ہم پولیس کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے۔" میں نے کہا۔

"کیا وہ بہت زخمی ہے؟"

"تم دیکھ لو گے..." میں نے کہا۔

"ٹھہرو... اگر خنجر یا گولی کا زخم ہے تو میں مجبور ہوں۔ میرے پاس گھر میں آلاتِ جراحی نہیں ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپریشن نہیں کر سکتا۔"

"اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے... اسے اندر لے آؤ۔" وہ بولا۔ پھر اس نے اپنے نوکر کو اشارہ کیا کہ وہ نوٹوں کی گڈی اٹھا لے۔

"تم ہمارے ساتھ چلو گے۔" میں نے کہا۔

موہنی کو جمشید نے اٹھایا اور اندر لے گیا۔ ڈاکٹر سے زیادہ ڈاکٹر کا نوکر ایک عورت کو صرف شیروانی میں ملبوس دیکھ کر حیران

www.paksociety.com

ہوا مگر ڈاکٹر نے اُسے خاموش رہنے کا حکم دیا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق وہ پانی اُبال کے لایا۔ اس میں دوا ملا کے ڈاکٹر نے موحی کا جسم صاف کیا اور پھر اُسے ایک انجکشن لگا دیا۔

"اس کی حالت تشویشناک نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "ابھی تو یہ سوتی رہے گی لیکن جب اُٹھے گی تو بالکل ٹھیک ہوگی... اس کی یہ حالت کس نے کی تھی؟"

"اس کے قرقے دار مجرم نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم اسے سڑک کے درمیان میں پڑا ہوا چھوڑ کے نہیں آ سکتے تھے۔"

"کیا تم اسے ساتھ لے جاؤ گے؟ جب کہ تم اسے جانتے نہیں۔"

"ہم اس سے پوچھیں گے۔" میں نے کہا۔ "آپ کی مدد کا بہت شکریہ مگر کیا آپ ایک کام اور کر سکتے ہیں؟ اس کے لیے نازک کپڑوں کا ایک جوڑا چاہیے۔ ہم اس کی قیمت الگ دیں گے۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ اکیلے رہتے ہیں۔"

"ہاں... اب میں اکیلا ہوں۔" وہ خلا میں دیکھنے لگا۔ "لیکن تمہیں اس عورت کے لیے کپڑے مل جائیں گے۔" پھر اس نے اپنے نوکر کی طرف دیکھا اور بولا۔ "جاؤ... دو جوڑے لے آؤ بیگم صاحبہ کے۔"

"بیگم صاحبہ؟" میں نے کہا۔ "آپ شادی شدہ نہیں ہیں؟"

"میں شادی شدہ تھا۔" وہ بولا۔

"پھر... کیا خدانخواستہ... ان کے اور آپ کے درمیان علیحدگی ہو گئی ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ "یہی سمجھو... میں اس دنیا میں ہوں اور وہ دوسری دنیا میں۔"

"آئی ایم سوری۔" میں نے بے اختیار کہا۔

ڈاکٹر نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میرے لہجے نے میرے تعلیم یافتہ ہونے کا راز فاش کر دیا تھا۔ نوکر دو قیمتی اور نئے جوڑے لے آیا۔ میں نے ان میں سے ایک موحی کو پہنا دیا۔ اس وقت میں نے دیکھا تو نوکر کی آنکھوں میں مجھے خاموش احتجاج نظر آیا۔

"ان کے پیسے انھیں واپس کر دو۔" ڈاکٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ نوکر نے خاموشی سے نوٹوں کی گڈی میری طرف بڑھا دی۔

"یہ کیا ڈاکٹر صاحب؟" میں نے کہا۔

"میری بیوی کو تم جیسے بدمعاش اغوا کر کے لے گئے تھے۔ وہ اسی طرح بندوق لے کر آئے تھے۔" وہ بولا۔ "یہ یہاں کی بات نہیں ہے۔ جانتے ہی جون کی بات ہے۔ ہم مری اور نتھیا گلی کے درمیان ایک کاٹیج میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اسے صبح پھر لوگ ایسی ہی حالت میں اُٹھا کے لائے تھے۔ وہ زندہ تھی... میں نے اسی طرح اس کی دیکھ بھال کی۔ اسے انجکشن دے کر سلا دیا۔ مجھے خیال

تھا تو صرف ان سے انتقام لینے کا... [illegible] تھا کہ میں اس کو بچا نہ سکا تھا۔ وہ مجھے اپنے [illegible] تھے۔ میری نظر میں وہ آج بھی پاک دامن تھی جتنی شادی [illegible] تھی مگر جب وہ ہوش میں آئی تو یہ بات اس کے ذہن سے نکل گئی۔ اس پر صرف ایک جنون طاری ہوا تھا۔ اب [illegible] قابل نہیں رہی۔ اس کی لاش تین دن بعد ملی تھی... نتھیا گلی کے پہاڑوں میں دفن ہے۔"

"مجھے معاف کر دیں ڈاکٹر صاحب... میں آپ کو کچھ نہیں [illegible] سکتا۔" میں نے انگریزی میں کہا۔ "ورنہ تمہیں اندازہ ہو جاتا کہ میں تم سے زیادہ مظلوم ہوں۔ ظلم کسی چیز سے [illegible] احساس کی شدت کی پیمائش کرنے جاؤ تو [illegible] پھر بھی یہ سچ ہے کہ ہم سب اپنے اپنے دکھ کے ساتھ [illegible] مجبور ہیں۔ ظالم نظر آنے والے بھی بعض اوقات بہت مظلوم ہوتے ہیں۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ ایک بار پھر جمشید نے موحی کو [illegible] میں نے دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ جانے کے پیچھے دروازہ [illegible] گیا۔ لیکن مجھے ایک اور خیال نے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس مرتبہ خود ڈاکٹر آیا۔

"ڈاکٹر صاحب... میں نے جو کچھ کیا..."

"اسے بھول جاؤ... ان حالات میں شاید [illegible] بھی ہوتا۔"

"میں نے آپ کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا..."

"میں سمجھتا ہوں تمہاری ذہنی کیفیت کو۔" وہ [illegible] پر قابو پا کر بولا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا۔ محض آدھے گھنٹے کی نیند گنوانے کے سوا۔"

"میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ [illegible] کے رہنے والے ہیں؟"

"ہاں... مولانے اس زمانے کے جب میں میڈیکل [illegible] کرنے کے لیے ملتان میں تھا۔ میری زندگی کے چوبیس سال شہر میں گزرے ہیں۔" وہ بولا۔

"پھر تو آپ کو بہت لوگ جانتے ہوں گے... اور آپ بہت سے لوگوں کو پہچانتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "مجھے ایک آدمی کی تلاش ہے۔"

"اس کا نام کیا ہے؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "صرف حلیہ بتا سکتا ہوں [illegible] کا نمبر... وہ ایک جیپ تھی... نیلے رنگ کی... [illegible] کا ملٹری ماڈل جس میں آگے بہت سی اضافی لائٹس [illegible]

ہوئی ہیں۔ وہ دونوں جانب جھکنے والے زرد رنگ کی [illegible]

"لیکن تلاش کر رہے ہو تم اسے؟" وہ بولا۔

"پچھلا ہے... ایک حساب برابر کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"اپنی بیوی کا؟" وہ بولا۔

"یہ میری بیوی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے ہو؟" وہ بولا۔ "مجھے معلوم ہے کہ [illegible] کے پاس کیوں نہیں جاتے ہو... تم نے سرکاری ہسپتال [illegible] کیوں نہیں گئے اور ایک ڈاکٹر کو اس کی گن سے دہشت زدہ [illegible] ایک ہزار روپے کا لالچ دے کر اپنا کام کیوں نکالا... تم [illegible] بدنامی اور رسوائی سے... بدنامی کے اف فون... لوگوں کی [illegible] سے... اور ان باتوں سے۔"

"میں کسی اور سے ڈر رہا ہوں یا نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ الگ بات ہے... مگر آپ سے جھوٹ بول کے مجھے کیا ملے گا... اگر یہ میری بیوی ہوتی تو میں تسلیم کرتا... یہ بھی مانتا کہ اس کی آبرو لوٹے جانے کے بعد بھی میرے دل سے اس کی محبت نہیں چھینی۔ انھوں نے [illegible] محبت اور رفاقت کے جذبات [illegible] اعتماد تو ایک احساس کا نام ہے۔ آپ [illegible] بیوی آپ کے لیے پہلے کی طرح پاک دامن تھی، مگر وہ خود اپنی ذلت کے احساس سے نجات حاصل نہ کر سکی [illegible] اور احساس کے عذاب سے بچنے کے لیے اس نے تیرہ حیات سے نجات پائی تھی۔ میں اس عورت سے جذباتی وابستگی نہیں رکھتا۔

[illegible] جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے جو انسان کا لباس پہنے پھر رہا ہے مگر [illegible] ہے۔ اگر میں نے اسے ختم نہ کیا تو کل وہ پھر کسی کو شکار [illegible] اس کو سزا نہیں مل سکتی۔ ایسے سارے شکاری [illegible] سمجھتے ہیں اور ان کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے جب [illegible] تک نہیں آتی۔"

"اور تم یہ کام کرو گے... جو قانون کے بس کا نہیں... تم کیا [illegible] ہو؟" وہ بولا۔

"بس ایسا ہی سمجھ لیں... جہاں میرے جیسے [illegible] کو... میری عقل [illegible] کو مجرم کے مجرم ہونے کا یقین آ جائے، وہاں میں [illegible] سنبھال لیتا ہوں اور منصف کے بھی... اور پھر [illegible] بغیر سزا پر عمل درآمد کرتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم پاگل... اور جنونی ہو..."

"ہاں... مگر اب یہ بتاؤ کہ تم میری مدد کرو گے یا میں جاؤں؟ [illegible] میں تم سے انتظام انصاف اور اس کی [illegible] پر ساری رات بحث نہیں کر سکتا۔"

"وہ ایک بہت با اثر شخص کا بیٹا ہے۔"

"میں صرف اس کا نام پتا جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کے شجرہ نسب اور اس کے خاندان کی شوکت و عظمت سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔"

"وہ رانا آفتاب خان کا بیٹا ہے۔ رانا قمرالدین عرف قمرو... ان کی کوٹھی اقبال ٹاؤن میں ملتان جانے والی سڑک پر ہے مگر تم وہاں گھس نہیں سکتے۔" وہ بولا۔ "لیکن تم اسے بلوا سکتے ہو۔" وہ کچھ سوچ کے بولا۔

"کہاں بلوا سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "اور میرے بلانے سے وہ آنے لگا کیوں...؟"

"اس کے ہر بُرے کام میں شریک اور بُرے وقت میں کام آنے والا نیو امپائر ہوٹل کا مالک جیکب ہے۔ وہ تمہیں ہوٹل کی اینکسی میں مل سکتا ہے... اور جیسے تم نے مجھ سے طبی امداد حاصل کی۔ ایسے ہی تم اس سے قمرو کو فون کرا سکتے ہو۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "تھینک یو ڈاکٹر... تم نے جتنی مدد کی ہے وہ سب مجھ پر احسان ہے۔"

"میری ایک درخواست ہے... کبھی کسی سے ذکر مت کرنا کہ میں نے تمہارے ساتھ کوئی نیکی کی تھی۔" وہ بولا۔

"فارگیٹ اٹ... ہم کبھی ملے ہی نہیں۔"

"اور آئندہ بھی نہیں ملیں گے۔" اس نے پھر دروازہ بند کر دیا۔

جمشید کی حالت موحی کو اُٹھا کے گاڑی تک لے جانے سے غیر ہو رہی تھی۔ ہم گلی کے آخر تک آئے اور میں نے [illegible] کو اسٹارٹ کیا۔ وقت اب بہت کم رہ گیا تھا اور صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے [illegible] کا سفر بہت سست رفتار عمل تھا۔ مجھے ایک گاڑی کی ضرورت کا احساس شدت سے ہونے لگا تھا۔

گاڑی مجھے ایک فرلانگ چلنے کے بعد مل گئی۔ وہ سفید رنگ کی فاکس ویگن تھی جو ایک گھر کے سامنے چپ چاپ اور تنہا کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے نیچے اتر کے اس کے دروازے میں مختلف چابیاں آزمائیں جو [illegible] کی اگنیشن کے ساتھ ایک ہی چین میں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک چابی کام کر گئی اور دروازہ کھل گیا... بیشتر گاڑیوں کے دروازے آسانی سے کھولے جا سکتے ہیں خصوصاً ان چابیوں سے جن کے کنارے گھسے ہوئے ہوں، خواہ چابیاں کسی سیف کی ہوں یا دراز کی۔

میں نے جمشید کو ایک رسّی دی جو [illegible] کے پچھلے حصے میں پڑی ہوئی تھی۔ اس نے میری ہدایت کے مطابق فاکس ویگن کے

www.paksociety.com

لگا۔ میں پورٹیکو کے پچھلے حصے کے ساتھ بنے اندھیرے میں تھا۔ میں نے کار کا ہینڈل کھینچا اور دروازہ آہستہ سے بند کر کے پھر تیزی سے پیچھے چلا گیا۔ میں فاکس ویگن کو وہاں اسٹارٹ کرتا تو اس غافل مالکوں کو سوتے سے جگا دیتا۔ یہ سب کام پانچ منٹ میں ہو گیا۔

فاکس ویگن کو میں دھکیل کر ایک فرلانگ تک لے گیا۔ پھر وہ سڑک آگئی جو پورٹیکو کے ساتھ متوازی بنی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے سوچا کہ فاکس ویگن کی پچھلی سیٹ پہ ڈال آگے والا بونٹ کھول کے اس میں اپنی اسٹین گن اور وہ سب اسلحہ رکھا جو مجھے دشمن کے کیمپ سے ملا تھا۔ جس چابی سے دروازہ کھولا تھا اسی سے پچھلا انجن کا بونٹ بھی کھل گیا اور میں نے جمشید کو سمجھایا کہ اسے سلف کے کون سے تاروں کو ملانا ہے تاکہ گاڑی اسٹارٹ ہو جائے۔ میں خود ڈرائیونگ سیٹ پہ جا بیٹھا۔ جمشید بھی تک انتہائی فرماں برداری کا ثبوت دے رہا تھا۔ اس نے تاروں کو ملایا ہی تھا کہ انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ اس کی خوش قسمتی بہت عمدہ تھی۔

ثواب کے بیٹھتے ہی میں نے گاڑی بڑھا دی۔ یہ نئی گاڑی تھی۔ آج اس موسم سرما میں پہلی مرتبہ باہر دو وقت بیری کا نزول ... اس کا انجن روایتی شور سے بے حد طاقتور تھا اور اس کا ٹیپ ایک شاہکار تھا۔ لیکن جو تبدیلی فاکس ویگن کو دوسری گاڑیوں پر فوقیت دیتی ہے وہ اس کا ایئر کولڈ انجن ہے۔ اسے میں کراچی سے پشاور اور پشاور سے کراچی تک نان اسٹاپ لے جاتا تب بھی فرق کوئی نہ پڑتا کیونکہ اس میں ریڈی ایٹر تو ہوتا ہی نہیں جس میں پانی ڈالنا پڑے۔

صرف آدھے منٹ میں گاڑی کی رفتار ساٹھ میل سے تجاوز کر چکی تھی اور چوڑے سیدھے ہیں کے باعث اس کی رفتار ٹریپ بڑھ گئی تھی۔ میں اسے اسی تک لے گیا۔ اس رفتار پر بھی وہ دوڑ سکتی تھی لیکن میں نے خیر ضروری عجلت سے گریز کیا۔

ابھی ساڑھے چار بجے تھے گویا صبح ہونے میں کم سے کم ایک گھنٹہ باقی تھا اور ساڑھے چھ بجے سے پہلے کار کے مالکوں کو چوری کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ کار والے عموماً سحر خیز نہیں ہوتے اور کوئی بھی آنکھ کھلتے ہی باہر جا کے گاڑی کی خیریت معلوم نہیں کرتا۔

نیو ایمپائر ہوٹل کا نیون سائن مجھے اتفاق سے نظر آگیا ورنہ میں کسی سے پتا پوچھتا۔ سڑک پہ تو کوئی تھا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ مجھے گشت کرنے والی پولیس بھی دکھائی نہ دی۔ جمشید کی بے چینی بڑھی تھی۔ شاید زندگی میں کبھی اس نے خود کو اتنا اکیلا محسوس نہیں کیا ہو گا۔ وہ قاتل بھی تھا اور اس کے کسی ساتھی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس کے ساتھ ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں کوئی اس کا بدترین جانی دشمن ہو سکتا ہے تو وہ میں ہوں اور مجھ سے مقابلے کا یا فرار کا خیال اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا

چنانچہ اس نے خود کو میرے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا تھا اور تقدیر پہ شاکر ہو گیا تھا۔ منتظر رہنے یہ جس کی امید ... نا امیدی اس کی ذہنی کیفیت تھی۔ اب ہوٹل میں آ کے نئی تھی۔ یہ بڑی امید افزا بات تھی۔

نیو ایمپائر ہوٹل کا انگریزی اس کے ٹائپ سے متعلق تھا۔ طرف تھی۔ راستہ ایک ہی تھا۔ گیٹ کیپر نے ... مہمان کی طرح سیلوٹ جھاڑ کے خوش آمدید کہا لیکن جمشید کو اس کی تحویل میں نہیں دیا بلکہ مخالف سمت ... دوڑتا ہوا جاتے ہے پیچھے آیا۔

"ریسپشن ادھر ہے صاحب۔" وہ بولا۔

"ہمیں معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم جگیب صاحب سے ملنے آئے ہیں کراچی سے ... ان کے دوست ہیں۔"

"اوہ ... معاف کرنا صاحب ... ہمارا تو فرض ہے ... نے کال بیل تو دہی دبائی۔" ادھر جگیب صاحب کے والد صاحب بھی ہوں گے صاحب خیریت سے ہے؟"

"ہاں ... ایک خیریت سے ہے ... دوسرا نہیں۔" میں نے کوئی معقول جواب دیا۔ "ٹھیک ہے اب تم جاؤ ... جگیب کیا ہے؟"

چوکیدار سلام کر کے لوٹ گیا تو دروازہ کھلا۔ ایک پستہ قد مگر گٹھے ہوئے جسم والے شخص نے مجھے غور سے دیکھا۔ اس کے گہرے سانولے رنگ کے چہرے پر جگیب کے پلاسٹر تھے۔ دیکھنے پر دائیں اور بائیں ابرو کے اوپر بڑے بڑے خراشیں ہوئے زخموں کے دو نیلے جیسے نشانات تھے جن میں ...

یہ زخم نہیں بلکہ آرائش کے لیے کسی ماہر جراح نے ناپ تول کے چاقو سے بنائے ہیں۔ مجموعی طور پر وہ کرخت نقوش ... چہروں سے مختلف لگتا تھا اور بدصورت نظر آتا تھا۔

"یس ...؟" اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔

"ہم کراچی سے آئے ہیں۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

"ہوٹل کا راستہ دوسری طرف ہے۔" وہ غرایا۔

"مجھے تمہاری بہن نے بھیجا ہے۔"

"الزبتھ نے ... اب کیا ہو گیا؟" وہ بدستور دروازے میں کھڑا رہا۔

"بات تمہارے والد کی ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے ... تم اگر اس کے نامہ بر بن کے آئے ہو تو یہ پیغام لائے ہو کہ اس بڈھے شرابی کو میری طرف سے کورا جواب سمجھو۔" وہ دروازہ بند کرنے لگا۔

"مسٹر جگیب ... تمہارا باپ مر سکتا ہے۔" میں نے دروازے میں ٹانگ اڑا دی۔

"پھر کیا ہوا ... ایک دن تو یہ ہونا ہے ... اور جو کل ہونا ہے آج ہو جائے تو مجھے خوشی ہو گی۔" وہ بولا۔ "یہ میرے بیٹا ہونے کا تو ذرا بھی نہیں ہے؟"

"وہ بھی نہیں ہے ... وہ ہماری تحویل میں ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر تو صرف دس ہزار کی خاطر یتیم کہلانا پسند نہیں کرو گے مسٹر جگیب ...؟"

"میں یتیم ہونا پسند کرتا ... اور میں باپ کا جو بیٹا بننا ... مگر کیا تم مجھے دھمکی دینے آئے ہو کہ میں نے دس ہزار نہ دیے تو تم اسے قتل کر دو گے؟"

"بات تو تم نے سمجھ لی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم جانتے ہیں کہ تم ایسی بات کر سکتے ہو ... آخر ہم کراچی سے آئے ہیں۔ پانچ ہزار ہمیں ... تو چلے میں جاؤ ... میں فون کروں گا ... مگر ...

"الزبتھ پہ کیا گزرے گی ... وہ کہاں سے آگئی؟" "اس نے کہا تھا کہ میں دس ہزار دوں گی ... مگر وہ اپنے باپ سے پھر گئی اور اس نے ہمیں تمہارے پاس بھیج دیا ... ابھی تم نے غلامی سے نکلنے والی بہن کا خیال نہ کیا تو ہمیں لوٹ کر اسی کے ہاں جانا پڑے گا۔ تمہارے لیے وہ ایک اچھی بہن ہے ... ہمارے لیے اچھی عورت۔" میں نے ہونٹوں پہ زبان پھیر کے کہا۔

جگیب نے ایک گالی دے کر مجھ پہ حملہ کیا۔ میں نے پہلے ہی سے اس کا اندازہ کر لیا تھا۔ میں اسے اندر لے گیا۔ اس کی گردن میرے بازو کی گرفت میں تھی اور پیچھے سے میں نے اس کی کمر کے ساتھ پستول لگا دیا تھا۔ جمشید میرے پیچھے آیا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"مسٹر جگیب ہم نے سب بکواس کی تھی۔" میں نے کہا۔ "نہ ہم کراچی سے آئے ہیں اور نہ تمہاری بہن کو یا والد کو جانتے ہیں۔ ہم بیٹھ کے قصے کے قائل ہیں اور ہمیں کسی کے قتل پہ مامور کیا گیا ہے مگر وہ شخص تم نہیں ہو۔" میں نے اسے چھوڑ دیا۔

"پھر ... پھر کون ہے وہ ...؟" جگیب نے ہانپتے ہوئے کہا اور بستر پہ ٹک گیا۔

"قمرو ..." میں نے کہا۔ "رانا اقبال خان کا بیٹا۔"

"تمہیں اس کو قتل کرنے کا ٹھیکا کس نے دیا ہے؟"

"ہم اس کا نام نہیں بتائیں گے۔"

"یہ تو بتا سکتے ہو کہ اس کام کا معاوضہ تمہیں کیا ملے گا؟" وہ بولا۔

"ہاں ... پچیس ہزار ایڈوانس لیے گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پچیس ہزار ...؟" جگیب کی گھگی بندھ گئی۔ "فرض کرو میں تمہیں پچیس ہزار دوں ... کہ اسے قتل کر دو ... جس نے تمہیں بھیجا ہے؟"

"پہلی بات تو یہ کہ ہم صرف پانچ ہزار کی خاطر بدعہدی نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔ "جاؤ کہ ہم غیر جانبدار ہیں۔ نہ کسی کے دوست ہیں اور نہ دشمن ... پھر بھی تم ہمیں خریدنا چاہو تو معقول آفر دو ..."

"کتنی معقول؟"

"جتنی تم دو ... پچاس ہزار۔" میں نے کہا۔

"آل رائٹ ... میں قمرو کو جانتا ہوں۔" وہ بولا۔ "ممکن ہے یہ سودا ہو جائے ... ایک بات اور بتاؤ ... قتل تم قمرو کو کرنے آئے تھے تو میرا دروازہ بجا کے مجھے کیوں جگایا؟"

"ہم براہ راست قمرو کے گھر نہیں جا سکتے تھے۔" میں نے کہا۔ "تم اسے ... یہاں آنے کو کہو گے؟" جگیب کا رنگ اڑ گیا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے ... تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔"

"ٹھیک ہے ... میں اسے فون کرتا ہوں۔" وہ بولا۔

"تمہاری گفتگو ہم بھی سنیں گے۔" میں نے کہا۔

"تم کیسے سن سکتے ہو؟"

"زیادہ چالاک مت بنو ... تمہارے پاس ایکس ٹینشن ہو گی ... یا پھر بیڈ روم میں فون ہو گا۔" میں نے کہا۔

جگیب کا منہ لٹک گیا۔ اس نے دوسرے کمرے سے ایک فون کے ذریعے ریسیور اٹھائے بغیر نمبر ملایا۔ اس کے چھوٹے سے اسپیکر میں مجھے دوسری طرف بجنے والی گھنٹی صاف سنائی دی۔ تقریباً دو منٹ کے بعد کسی نے ریسیور اٹھا کے ہیلو کہا۔

"قمرو ... میں جگیب ہوں۔"

"جگیب ... نیند آتی رات کو کیا بات ہے؟" قمرو کی آواز آئی۔

"یار تو فوراً آ جا ... کسی کو بتائے بغیر ..."

"خیریت تو ہے نا ... ہوا کیا ہے آخر ...؟" قمرو نے پریشانی سے کہا۔

"خیریت بالکل نہیں ہے ... میں فون پہ نہیں بتا سکتا۔"

"یار ... کہیں اس لڑکی کا معاملہ تو نہیں ہے؟" قمرو کچھ سوچ کے بولا۔ "جسے ہم نے ..."

"یہی سمجھ لے ... پولیس بیٹھی ہے میرے پاس۔"

"کون آیا ہے؟ کوئی انسپکٹر؟ مجھے نام بتا اس کا ..." قمرو نے اپنے باپ کے اثر و رسوخ کے غرور میں کہا۔

"کوئی ایس پی آیا ہے ملتان سے ... معاملہ ابھی ختم نہ ہوا تو لمبا ہو جائے گا ... وہ بڑی پارٹی تھی یار ..." جگیب نے کہا۔

"کتنے میں ختم ہو جائے گا؟"

"کم از کم پچاس ہزار۔" جگیب نے کہا۔ "پچاس میرے ..."

"ایک لاکھ؟"

www.paksociety.com

"یار وہ لڑکی مرگئی ہے... اور میں مروایا تیری جیب سے۔ سارا زمانہ پہچانتا ہے۔" جیکب نے خفگی سے کہا۔
"تیرے پاس میں پچاس ہزار ہے؟"
"نکال لیے پڑیں گے قمرو... میں تو تباہ ہو جاؤں گا، میرا تو نمبر ہے؟"
"اچھا میں ابھی آتا ہوں... دس پندرہ منٹ میں۔"
"خالی ہاتھ مت آنا..."
"نہیں... خالی ہاتھ نہیں آؤں گا۔ رانا صاحب کی سیف خالی کروں گا..." وہ بولا۔ "میرے کو پاس اس وقت آتی رقم کہاں۔"
"تو تجوری کھولے گا... چابی ہے تیرے پاس؟"
"نہیں... رانا صاحب سوئے ہیں۔ انھیں تکلیف نہ کیا جائے۔"
"ٹھیک ہے... مگر دیکھ... کسی کو پتا نہ چلے کہ تو باہر کہیں گیا ہے... سب یہی سمجھیں کہ تو کمرے میں سویا ہوا ہے..."
"تو فکر مت کر... میں بے وقوف نہیں ہوں تیری طرح۔"
خود کو عقل مند قرار دینے والا اسپنے ایک کمینے اور خود غرض دوست کے ہاتھوں بے وقوف بن چکا تھا۔ وہ دوست بھی نہ تھے۔ وہ بدمعاشی کے ساتھی تھے۔ وہ خلوص اور ایثار کا جذبہ ان کے درمیان کہاں سے آتا جو بے غرض دوستی کی جان ہوتا ہے۔ جیکب نے اپنی جان بچانے کے لیے قمرو کو ہمارے ہاتھ بیچ دیا۔ اس نے پچاس ہزار کا مطالبہ بھی قمرو کی طرف سے ماری بنا دیا۔ بعد میں وہ قمرو سے کہہ سکتا تھا کہ میں نے تو تیری جان بچالی، ورنہ تیرے ساتھ وہ مجھے بھی مار ڈالتے... میں جھوٹ نہ بولتا تو کیا کرتا؟

لیکن اس سے ایک بے وقوفی بھی سرزد ہوئی تھی۔ اس نے قمرو کو قائل کرنے کے لیے ایک سچ کا سہارا لیا تھا اور ہمارے سامنے ایک جرم کا اقرار کر لیا تھا۔ اس جرم میں وہ خود بھی برابر کا شریک رہا تھا لیکن یہ بات نہیں جانتا تھا کہ ہم کسی کے ایجنٹ نہیں ہیں بلکہ قمرو کو اسی جرم کی سزا دینے آئے ہیں۔
"ابھی تمھیں پچاس ہزار مل جائیں گے،" وہ بولا۔ "مجھے امید ہے کہ تم وعدے کے مطابق کام کرو گے۔"
"ہم نے ابھی تک تو کوئی وعدہ نہیں کیا،" میں نے کہا۔
"کیا تم نے کہا نہیں ہے کہ پچاس ہزار لے کر تم قمرو کے دشمن کو ٹھکانے لگا دو گے؟" وہ چلانے لگا۔
"بات آہستہ کرو... میں نے صرف یہ کہا تھا کہ تم ہمیں خریدنا چاہو تو معقول آفر دو... میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم بدعہدی نہیں کرتے۔"
"اس کا کیا مطلب تھا آخر؟"
"ہم قمرو کو قتل کیے بغیر واپس چلے جائیں گے... یہ مطلب کیسے نکال لیا تم نے؟" میں نے کہا۔ "ایک کام کا معاوضہ ایک شخص نے دیا ہے۔ دوسرے کام کا معاوضہ تم نے دیا ہے تو ہم

دونوں کام کریں گے۔ پہلے قمرو کو ماریں گے... پھر تم کو بھی مار دیں گے۔"
غصے اور بے بسی سے جیکب کا چہرہ لال ہو گیا۔ ایک دم فون کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر میں نے ... دیا۔ پلگ فون اس کے ساتھ ہی آ گیا۔ میں نے ...
"تم... دھوکے باز... بے ایمان ہو۔" جیکب ...
"اور تمھارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے... با ضمیر اور نیک چلن ہو؟" میں نے کہا۔ "کس لڑکی کو ... تھے تم؟"
"تم کو اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے..."
میں نے آتی تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے پیٹ پر ماری کہ وہ اٹھ بھی نہ سکا۔ وہ دوہری شدت سے بلبلایا اور ... دوہرا ہو گیا۔ میں نے اس کی پسلیوں پر دو دستی ... ماری تو وہ ... گر گیا۔
"میرا تعلق ہے اس لڑکی سے مسٹر جیکب،" میں ... "تم نے قمرو سے ٹھیک کہا تھا... وہ بڑی پارسا تھی... اسے خریدا نہیں جا سکتا تھا تو کسی کے باپ کا اثر و رسوخ دبا سکتا ہے... اسے بیچ سے اٹھا لیا۔ یہ تم نے جو کام آسان کر دیا ... قمرو سے ہی پوچھنا پڑتا کہ دوسرا کون تھا... تو یہ خسرو جمشید ... خسرو جمشید اصل نام سے کا طب کیے جانے پر ...
"جاؤ... اس لڑکی کو لے آؤ،" میں نے ...
میں سے دیکھ رہا ہوں۔" یہ بات کہنے کا مطلب یہ تھا کہ موقع سے فائدہ مت اٹھانا اور یہ مت سمجھنا کہ میں جیکب سے نمٹ رہا ہوں تو تمھاری طرف سے غافل ہوں اور تم موہنی سمیت گاڑی لے کر ... ہو سکتے ہو۔
جیکب بہت خوف زدہ تھا اور فرش پر پڑا نیم بے ہوشی کی حالت ... ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور کار کا رخ اس کی طرف کر دیا اور دروازہ ... گیا۔ خسرو جمشید لے کار کی سیٹ پر ... سے پیچھے جا کر دیکھا اور ... کھول کے اندر جھک گیا۔ اگر موہنی بے ہوش ہوتی تو خسرو جمشید ... کو... دروازوں والی گاڑی میں سے اسے نکالنے کے لیے محنت کرنی پڑتی لیکن موہنی ہوش میں آ چکی تھی اور شاید اس ... ہمیں دروازے پر جیکب سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا ... اب بھی یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ خسرو جمشید کو دھکا دے کر ... لگے اور اس کے ساتھ آنے سے انکار کر دے۔ میں نے ... کھول کے خود کو نمایاں کیا اور موہنی کو ہاتھ ہلا کے بلایا ... جیکب نے مجھے غافل سمجھنے کی غلطی کی۔ وہ ایک جست ... آیا تاکہ مجھے دھکا دے کر باہر کر دے اور پھر مدد کے لیے شور ...

... ہی نے گھوم کر اس کی ٹھوڑی کے نیچے بھرپور لگ رسید کی ... اور پیچھے گرا تو اس کا سر صوفے کے بازو ... سے ٹکرا کر پیچھے گیا ...
... نے موہنی کو کار سے نکلنے اور آہستہ آہستہ چل کر گیا تو دیکھا ... اس کے پیچھے کسی نوکر کی طرح چل رہا تھا۔ وہ میری طرف ... نے اسے ہاتھ تھام کے اندر کھینچ لیا۔
... حال ہے اب طبیعت کا؟" میں نے مسکرا کے کہا۔
"ٹھیک ہوں۔" وہ کمزور لہجے میں بولی۔ "مگر میں ... شاید ... پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ کون سی جگہ ہے اور ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟ ... کیوں ہمارے ساتھ ہے اور ہم پھر کیسے مل گئے ... مگر وہ کچھ نہ پوچھ سکی۔ اس کی نگاہ صوفے پر جیکب کو دیکھا ... چیخ مار کے وہ مجھ سے لپٹ گئی۔
"موہنی... دیکھو ذرا حوصلے سے کام لو،" میں نے اسے ... دیتے ہوئے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ "تمھارے ساتھ جو ... ہو چکا... اب دیکھو کہ ایم آر ایس کی عدالت انصاف ... مجرموں کو کیا سزا دیتی ہے۔ دوسرا مجرم بھی آ رہا ہو گا؟" میں ... ساتھ ایک صوفے پر بٹھا دیا۔
دوسرے مجرم نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ میں نے باہر ... گاڑی کے رکنے کی آواز سنی۔ پھر قمرو کھلے دروازے سے ... اندر آ گیا۔ میں دروازے کے پیچھے ہو گیا تھا۔ قمرو کے گزرتے ... نے لات مار کے دروازہ بند کر دیا۔ قمرو چونک کے پلٹا۔
... حالت تو جیکب کو فرش پر بے ہوش اور موہنی کو صوفے پر ... دیکھ کر ہی غیر ہو گئی تھی۔ میری شکل دیکھتے ہی اس کا رنگ ... پڑ گیا۔
"سامنے والی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ،" میں نے ریوالور کے اشارے سے حکم دیا۔
"تم... کیا سمجھتے ہو؟"
... نے آگے بڑھ کے اسے اٹھایا اور سر کے اوپر سے جا ... پر پھینک دیا۔ "میں تو سب سمجھتا ہوں مگر تم میری بات ... سمجھے تھے،" میں نے کہا۔ "تم یہ سمجھے تھے کہ ایک کمزور عورت ... کر تم نے انتقام لے لیا ہے لیکن مجھ سے انتقام لینے کا ... نہیں تھا تم میں؟ چلو اب سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"
... شکل سے اٹھا اور دیوار کے ساتھ لگ گیا۔
"تم شاید یہ بھی سمجھتے تھے کہ تم قانون کی دسترس سے باہر ہو ... تمھارے پاس باپ کی دولت اور اثر و رسوخ کی طاقت ہے ... رانا صاحب کو بھی منگوا لیں؟ سزا تو اس باپ کو ... چاہیے جس نے تم جیسی اولاد پیدا کی اور پھر اس کی تربیت

میں اپنی فرعونیت کا انداز پیدا کیا۔ وہ بھی بھولا ہوا ہے کہ ہر فرعون کے لیے خدا نے ایک موسیٰ بھیجنے کا سلسلہ ختم نہیں کیا۔ تم سے بڑا مجرم تمھارا باپ ہے مگر میرے پاس وقت کم ہے۔ اس کے غرور کو شکست دینے کوئی اور آئے گا۔ ابھی تو اس کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ وہ جوان اولاد کو قبر میں اتارے اور اپنے وقت کا انتظار کرے۔"
قمرو چلانے لگا۔ "خدا کے لیے مجھے معاف کر دو... میں اس عورت کے پاؤں پکڑ سکتا ہوں۔"
میں نے بالوں سے پکڑ کے اس کا سر دیوار پر مارا۔ "چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تمھاری مدد کے لیے کوئی نہیں آ سکتا۔ اور آ گیا تو وہ بھی مارا جائے گا۔"
یہ بات غلط نہیں تھی۔ جیکب اکیلا رہتا تھا۔ اس کے گھر میں کوئی نوکر بھی نہیں تھا کیونکہ ہوٹل اس کا اپنا تھا اور اس کے سارے ملازم اسی کے ملازم تھے جو دن میں گھر کی صفائی بھی کر جاتے ہوں گے۔ اس کا کھانا پینا سب ہوٹل میں تھا جہاں آدھی رات کے بعد بھی وہ صرف بیل بجا کے طلب کر سکتا تھا۔
اب ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ جیکب پھر ہوش میں آ گیا تھا۔ میں نے اسے بھی گھسیٹ کر قمرو کے ساتھ کھڑا کر دیا۔
"موہنی... تم ان دونوں کو پہچانتی ہو نا؟" میں نے کہا۔
"ان کی شکلیں میں کیسے بھول سکتی ہوں۔" موہنی لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔
"تم دونوں اس عورت کو جانتے ہو؟" میں نے کہا۔ "کیا تم اپنے جرم کا اقبال کرتے ہو؟"
انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اس امید میں سر ہلا کے اقرار کیا کہ شاید یوں وہ مجھ سے کچھ رعایت حاصل کر لیں گے۔
"میں ایم آر ایس کے ایک منصف کی حیثیت سے تم دونوں کو موت کی سزا دیتا ہوں،" میں نے کہا۔ "کیونکہ تم اس ملک کے قانون کو دھوکا دے سکتے ہو اور کبھی اس کی گرفت میں نہیں آ سکتے۔"
موت کا یقین آتے ہی ان کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی۔ انھوں نے ایک ساتھ مجھ پر حملہ کیا۔ قمرو آگے تھا۔ میں نے کراٹے کا وہی مہلک وار استعمال کیا جو گردن توڑ دیتا ہے۔ آدھے راستے میں قمرو ڈھیر ہو گیا۔ جیکب اس کے باوجود بڑھتا رہا۔ ایک منٹ بعد وہ بھی مر چکا تھا۔ میں نے قمرو کی دونوں جیبوں میں سے پچاس ہزار روپے نکال لیے۔ اس کے علاوہ مجھے جیکب کے گھر کی تلاشی لینے پر ایک میز کی دراز سے مزید ایک لاکھ روپے ملے۔ اس کے تکیے کے نیچے سائلنسر لگا ہوا ایک ریوالور بھی تھا۔ یہ ایک

www.paksociety.com

کارآمد چیز تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ کا ریوالور موہنی کے ہاتھوں میں دے دیا اور یہ قیمتی ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

"اب ہمیں چلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "تم چل کے دوسری گاڑی میں بیٹھو۔ پچھلے والی سیٹ پہ... چابیاں غالباً اسی میں لگی ہوئی ہیں۔"

"تم کیوں نہیں آتے؟" موہنی نے کہا۔

"میں آتا ہوں... ان لاشوں کو چھپا دوں۔" میں نے کہا۔ "جمشید تم بھی جاؤ... اور آگے بیٹھو۔ موہنی! ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں... اگر تمہارا دل چاہے تو نواب صاحب کے سر پر سوار رہنا۔ اس کے لیے نواب صاحب کی کسی غلط حرکت کا جواز پیش کرنا قطعی ضروری نہیں ہوگا۔"

ان کے جاتے ہی میں نے دونوں لاشوں کو گھسیٹ کر باتھ روم میں بند کیا۔ یہ دو کمروں پر مشتمل انیکسی ہوٹل کے وی آئی پی سوئٹ کی طرح تھی۔ اس کے ایک کمرے کو بیڈ روم کے طور پر اور دوسرے کو مہمانوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک لاؤنج نما جگہ پر گول میز کے گرد چار کرسیاں کھانے کے لیے لگا دی گئی تھیں لیکن کچن کوئی نہیں تھا۔ میز کی دراز سے مجھے دروازوں کو مقفل کرنے والی چابیاں بھی مل گئیں۔ ان میں سے ایک باہر والے دروازے کی تھی۔ میں نے جیکب کا ایک لباس بدلا اور اپنی جگہ اتار کے پھینک دی۔ جب میں نے باہر کے دروازے کو لاک کیا تو افق پر صبح صادق کی سپیدی نمودار ہو چلی تھی۔ لیکن کار کے اندر چند شیشوں کے پیچھے اتنا اندھیرا تھا کہ کسی کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ قمرو ایک نئی مزدا میں آیا تھا۔ یہ پندرہ سو سی سی کی گاڑی ان دنوں بہت مقبول ہو رہی تھی۔ اور جب میں نے اسے دیکھا تو اس کی ظاہری خوبصورتی نے مجھے متاثر کیا۔

موہنی بڑی ہوشیاری سے خسرو جمشید کو سنبھالے ہوئے تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے دیکھا تو حسب توقع مجھے کار کی چابیاں اگنیشن سوئچ میں جھولتی نظر آئیں۔ قمرو اور جیکب گھر سے باہر تھے۔ ہوٹل کے احاطے میں قمرو اپنی گاڑی کو اتنا ہی محفوظ سمجھتا تھا جتنا اپنے گیراج میں۔ چنانچہ وہ چابیاں نکالنے اور گاڑی کو لاک کرنے کی تکلیف نہیں کرتا تھا۔

میں نے شیشے چڑھا کے کار اسٹارٹ کی اور گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار کے سیلوٹ کو نظر انداز کرتا ہوا نکل گیا۔ چوکیدار کو نظر کچھ نہیں آیا تھا۔ اس نے قمرو کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب اس نے فرض کر لیا اور مطمئن ہو گیا کہ جانے والا بھی قمرو ہی تھا۔ اس سے پہلے کراچی سے آنے والے مہمان ابھی تک جیکب صاحب کے گھر میں موجود تھے کیونکہ ان کی سفید فاکس ویگن باہر موجود تھی۔

میں موڑ پر آتے ہی میں نے گاڑی کی برق رفتاری ... ویگن کی طرح یہ گاڑی ایک دم تو اسپیڈ نہیں پکڑتی تھی مگر اس کی اوسط رفتار فاکس ویگن سے زیادہ تھی ... بھی تھی اور بے آواز بھی۔ خانان تک ... میں نے دھیان رکھا اور شہر سے بھی گزرا تو ... میل کے درمیان رہی۔ صبح کے ساڑھے چھ ... آباد ہو چکی تھیں لیکن پھر بھی خالی خالی لگتی تھیں ... گنجان آباد علاقے سے گریز کیا۔ اور باہر باہر سے نکلنے ... کی۔ موہنی نے میری ہدایت پر ایک جنرل سٹور سے ... خریدا اور پھر اس سے چند قدم کے فاصلے پر واقع ریسٹورنٹ ... گئی جو ایک بہت اچھے ہوٹل کے گراؤنڈ فلور پر تھا ... کافی سینڈوچ اور سگریٹ لانے کو کہا تھا ... کہاں آ گئے ہیں۔ پھر میں کار کو سیدھا لے گیا اور ... ویران مزار کے پیچھے روک دیا۔

اب میں نے صورت حال پر غور کیا۔ میرے پاس ... نقد تھے۔ اگر صبح صبح کا وقت نہ ہوتا تو میں خانان سے ... کار خرید لیتا۔ کاروں کے شوروم دس گیارہ بجے سے پہلے ... کھلتا۔ میں جانتا تھا کہ فوری طور پر میرے لیے خطرے کی کوئی ... نہیں۔ جیکب معمول کے مطابق بھی دس بجے سے پہلے ہوٹل ... پہنچتا ہوگا۔ چوکیدار شاید منیجر کو بتائے گا کہ رات کو کوئی ... مہمان آئے تھے۔ یہ بات تب تک پیدا ہوئے گی کہ جیکب ... نے مہمانوں کے لیے چائے کافی ناشتا کچھ نہیں منگوایا ... تصدیق میں وقت لگے گا۔ پولیس کو رپورٹ کرنے اور دروازہ ... کھلوا کر داخل ہونے تک دوپہر گزر جائے گی۔ دوپہر کے بعد ... مجھے اس کار کی ضرورت بھی نہیں رہے گی اور جہاں یہ کار ہوگی ... پولیس کا خیال بھی نہیں پہنچ سکے گا۔ جب انھیں خبر پہنچے گی ... وہ چار دن پرانی ہو چکی ہوگی۔ شہر میں سنسنی پھیلی ہوئی ہوگی کہ ... دوست قمرو اور جیکب کس کے ہاتھوں مارے گئے اور کیوں مارے گئے ... سوائے منظر پر دھوکے کے ایک ڈاکٹر کے یہ تھا کوئی ... مگر وہ تو ہم سے کبھی ملا ہی نہیں۔ ہم اس علاقے میں اجنبی تھے۔ پولیس فاکس ویگن کے مالک کو پکڑ لے گی اور وہ کار کی چوری کی رپورٹ پیش کرے گا۔ وہ بھی کوئی ایرا غیرا تو ہوگا نہیں ... زیادہ سے زیادہ قتل کا الزام اس پر دھر دے ... یہ بھی ثابت ... جائے گا کہ اس کا کبھی قمرو یا جیکب سے کوئی تعلق نہیں ... نتیجہ بالآخر تسلیم کرے گی کہ ... اعمال کا انجام ... ہو سکتا تھا ... بہت سے ہیں۔ سوچتا رہی تو ایک ہو یا دن ... کے تو ایک دن کو توال کا۔ ان میں ترمیم کی جا سکتی ہے کہ ...

... نیک دل مظلوم کا کسی نے سب کا حساب برابر کر دیا ... دباؤ ڈالیں گے اور "نامعلوم قاتل" کے خلاف ... سے مطمئن نہیں ہوں گے مگر اس سے پہلے ... مدعی کمزور تھے اور مقتول ... کے لوگ تھے ... طاقت کے مقابل آنے کی ہمت نہیں رکھتے ... اب اپنی جان سے کچھ بھی ہو۔ اندھا انصاف کی اندھی ... وقعت کھا رہے جیسے چاہیں گھمائیں۔

ایک بار پھر موہنی پر میرا اعتماد بحال ہو گیا تھا لیکن خطرے ... ابھی تک میں نے کچھ طے نہیں کیا تھا۔ رات سے ... شدید اعصابی دباؤ کا شکار رہا تھا اگرچہ وہ فولاد کی طرح ... ہوتا یا پینڈولم کی طرح خونخوار تو آتی ... کی طرح قدم ... کے ساتھ ساتھ نہ چلتا رہتا۔ وہ فولاد ... ذہنی اور جسمانی طور پر ... مالی طور پر شاید ... مضبوط حیثیت کا مالک تھا۔ چنانچہ اس کی اہمیت ... سٹر تھی۔

ایک کچی سڑک پر کار کو ... میں نے کار سے نکل کے دیکھا یہ ... تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں تھرماس اٹھا رکھا تھا اور ... میں ایک بیگ۔ وہ رات والے کو جیسے ... والے کی صورت پر حیرانی کے آثار دیکھ سکتا تھا... موہنی ... کا ایسے ویرانے میں اتر جانا جہاں سڑک کے دونوں ... شہر خموشاں تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ مجھے ... بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

موہنی سب کچھ لے آئی تھی لیکن میں نے وہاں مزید رکنا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے رک جانے کی مشکوک نظروں نے مجبور کر دیا تھا ... محفوظ تر مقام کا انتخاب کروں۔ قبرستان کے ختم ہوتے ہی ... باغ آ گیا جس میں آم کے گھنے درخت تھے۔ اس کی ... چار ... دیواری ... باقی رہ گئے تھے۔ یہ جگہ آرام کے لیے بہت ... تھی۔ میں کار کو ایک کچے راستے سے اندر لے گیا۔ ... میں ایک چھوٹی سی ہٹ بنی ہوئی تھی۔ کار کی آواز سن ... ایک منحوس صورت بوڑھا بڑی بدحواسی میں باہر نکل آیا۔

"بابا ہم مسافر ہیں۔" میں نے کہا۔ "کراچی سے پشاور جا رہے ہیں۔ ... اجازت ہو تو تھوڑی دیر یہاں رک کے آرام کر لیں۔"

"جی آؤں نوں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "جب تک ... جی چاہے آرام کرو... نواب صاحب تو خود بڑے مہمان نواز ... ان کا مہمان خانہ کبھی خالی نہیں رہتا۔"

"کون نواب صاحب؟" میں نے کہا۔

"انھی کا باغ ہے... میں تو مالی ہوں ان کا..." وہ بولا۔

"دروازے کھلے ہیں۔ اندر کسی چیز کی کمی ہو تو حکم کرنا۔"

اندر واقعی کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ پُرتکلف بیڈ... صوفے اور قالین... اشیائے خورد و نوش سے بھرے ہوئے فریج اور ڈیپ فریزر... شاید اٹیچ باتھ روم کا سامان تھا جو وہاں نہیں تھا۔ رات بھر کے تھکا دینے والے سفر کی مشکلات کے بعد فارم ہاؤس کسی صحرا میں اچانک آ جانے والے نخلستان کی طرح راحت افزا ثابت ہوا۔

میں نے وہاں کچھ دیر رکنے کا فیصلہ کیا۔ اپنا سائلنسر لگا ہوا ریوالور موہنی کے ہاتھ میں تھما کر میں نے باتھ روم کا رخ کیا۔ وہاں گرم اور ٹھنڈے پانی کی لائن تھی۔ شاور اور ٹب تھے اور صاف ستھرے تولیے لٹک رہے تھے۔ کیبنٹ میں صابن، شیمپو اور ٹوائلٹ کی شیشیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اگرچہ موسم سرد نہیں تھا مگر میں نے جسم کی تھکان دور کرنے کے لیے گرم پانی سے دیر تک غسل کیا اور بہت تازہ دم ہو کے باہر نکلا۔

بیس منٹ بعد موہنی آئی تو میں اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ غسل نے اس کا رنگ روپ ہی بدل دیا تھا۔ نہ جانے کب سے اس نے منہ نہیں دھویا تھا اور بال نہیں سنوارے تھے۔ اس نے وہی جوڑا پہنا تھا جو ... سلی ہوئی پہنتی ہوگی۔ مگر کیا وہ پہلی اس لباس میں اتنی ہی جاذب نظر اور دلکش لگتی ہوگی۔ میں نے سوچا۔ مگر یہ لباس کا نہیں موہنی کے حسن کا نیا انداز تھا جس نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔

وہ میری نظر کو سمجھ کے شرمائی مسکرائی اور میرے مقابل بیٹھ گئی۔ "ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"اور کیسے دیکھوں؟" میں نے کہا۔

موہنی کا رنگ خوشی اور حیا سے گلابی ہو گیا اور اس کے موتی جیسے دانت مسکراہٹ سے جگمگانے لگے۔

"ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" اس نے میری توجہ ناشتے کی طرف دلائی۔

"میں تو ناشتا شروع کرنے ہی والا تھا۔" میں نے کہا۔

"پھر انتظار کیوں کیا؟"

"لیڈیز فرسٹ میڈم۔" میں نے کہا۔ پھر مجھے جمشید کا خیال آیا جو ابھی تک سامنے والے صوفے پر پتھر کے بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ شاید اتنے تعاون کے بعد وہ ہم سے رعایت کی امید رکھتا تھا لیکن میں اس شخص کے ساتھ کوئی نیکی کیسے کر سکتا تھا جس کا وجود بدی سے عبارت تھا۔ وہ اب تک زندہ تھا تو صرف اس لیے کہ میں نے ہوش سے کام لیا تھا۔

"کیا تم مجھے غسل کی اجازت نہیں دو گے؟" جمشید نے کہا۔

"تم اب ایک ہی بار غسل کرو گے... تدفین سے پہلے..."

www.paksociety.com

بشرطیکہ زمین نے تمھیں قبول کیا۔" میں نے کہا۔ "تمھیں یقیناً بھوک بھی لگی ہوگی... مگر جمشید... تم اب ایک قیدی ہو۔"

"میں نے تم سے پوری طرح تعاون کیا ہے... اور آئندہ...؟"

"آئندہ کے بارے میں ابھی تک میں نے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا کہ تمھیں کس کے حوالے کروں۔" میں نے کہا۔ "ملٹری انٹیلی جنس کے... ایم آئی والے یا حضرت عزرائیل کے۔"

وہ مجھے گھورتا رہا اور اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ موہنی کی پاس کی طرف بیٹھی تھی۔ جب میں نے تعزیت سے لے کر سینڈوچ کھانا اور کافی پینا شروع کیا تو جمشید نے اپنی نظر پھیر لی۔ ناشتے کے بعد میں نے سگریٹ سلگائے۔ موہنی نے پاؤں پھیلا دیے۔

"تم جا کے بیڈروم میں سو جاؤ۔" میں نے موہنی سے کہا۔ "اگر کسی نے مداخلت نہ کی تو ہم رات تک یہاں قیام کریں گے۔"

"میرا تو دل چاہتا ہے کہ اسی قیام میں عمر گزر جائے... کیسی اچھی پُرسکون اور پُرآسائش جگہ ہے۔" موہنی ایک انگڑائی لے کر بولی اور مسکرائی۔

میں نے اس کی آنکھوں کے پیغام کو سمجھا اور نظر انداز کر دیا۔ زندگی کی راہ میں بہت سے پُرفریب دھوکے ہیں مگر سفر ابھی جاری ہے۔ ہم ایسی خواہشوں کے جال میں نہیں پھنس سکتے۔ وہ بیڈروم میں چلی گئی۔ اسے میرے گریز عمل نے مایوس کیا تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں چونک پڑا۔

موہنی پھر دروازے میں نمودار ہوئی۔ "کیا کروں... یہ ریسیور اٹھالوں؟"

"نہیں... مالی کو بلاؤ..." میں نے کہا لیکن مالی تھا باہر برآمدے میں ہی بیٹھا تھا فوراً اندر آگیا۔ میں نے موہنی کو اپنی جگہ بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔

"یہ مالک کا فون ہوگا جی۔" مالی نے کہا۔

"تم نے ابھی تک ان کا نام نہیں بتایا۔" میں نے کہا۔

"سلطان صاحب ہیں جی اس کے مالک۔" مالی نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو... سلام چھوٹے صاحب... جی نہیں صاحب... وہ ادھر تو نہیں آئے ابھی تک..." اور ریسیور رکھ دیا۔

"کون ہیں یہ چھوٹے صاحب؟" میں نے کہا۔ "جنگی یا جونی؟"

"آپ جانتے ہیں انھیں؟" مالی نے کہا۔

"نمبر بتاؤ مجھے ان کا۔" میں نے فون اپنی طرف کر کے کہا۔

اسی وقت میں نے کار کی آواز سنی... سائلنسر نے آواز کو بہت کم کر دیا تھا مگر جب بیچ میں صرف ایک دروازہ حائل ہو تو تھوڑی آواز بھی بہت محسوس ہوتی ہے۔

"میں تمھاری ہڈیاں کھول دوں گا... فاحشہ..." نواب نے چیخ کر کہا اور اس کے منہ سے غلیظ گالیاں ابلنے لگیں۔

"تم نے پھر حرکت کی تو میرا اشارہ [illegible] نہیں ہوگا۔" یہ موہنی کی پُرسکون آواز تھی۔ مالی کا رنگ [illegible] کی طرح سفید تھا۔ لیکن میں نے یہ ظاہر کیا جیسے کوئی غیر معمولی بات نہیں [illegible]

"کیا تم اونچا سنتے ہو؟" میں نے سختی سے کہا۔ "[illegible] کے بیٹے میرے دوست ہیں جنگی یا جونی [illegible]"

"جی... جی صاحب... میں بلا دیتا ہوں..." مالی [illegible] ہو کے کہا۔

"تم کو بھونکنے کی اجازت ہے۔" موہنی نے کہا۔ "لیکن اس سے تمھیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"تیری اصلیت تو آجائے گی اس کے سامنے [illegible]"

"میں اسے چوبیس سال پہلے بھی جانتی تھی... اور ہم برسوں پہلے میں اور وہ ایک ہی گھر میں تھے۔" موہنی نے کہا۔ "تم اسے کیا بتاؤ گے...؟"

مالی نے ریسیور مجھے تھما دیا۔ اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

"کون جنگی...؟" میں نے کہا۔ "کیا حال ہے...؟"

"میں نے پہچانا نہیں۔" جنگی کنفیوز ہو کے بولا۔

"تمھارے اس پلاٹ کا جھگڑا تو ختم کرا دیا تھا میں نے..."

"تم...!" جنگی حیران ہو کے بولا۔ "کہاں سے بات کر رہے ہو؟"

"بھئی میں پھر تمھارا مہمان ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمھارے فارم ہاؤس میں رکا ہوں ایک دن کے لیے... یہ بتاؤ آج ادھر کوئی آئے گا تو نہیں؟"

"کیا مطلب؟ تم سے تو کوئی بھی آسکتا ہے۔"

"میں چاہتا تھا... میرا مطلب ہے کوئی ایسا بندوبست ہو کہ مجھے پورا دن مل جائے۔ کوئی مداخلت نہ کرے۔ میں [illegible]"

"تم رات کو بھی رک سکتے ہو۔ کوئی نہیں آئے گا ادھر۔"

"مگر میں تم سے ملنا چاہتا ہوں... ابھی... مجھے تم سے ایک کام ہے۔" میں نے کہا۔

"میں ایک گھنٹے میں آتا ہوں... جونی کو ساتھ لاؤں؟"

"ضرور لاؤ۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے اپنے اس مالی کو بتا دو کہ ہمیں مہمان سمجھے۔"

"ٹیلی فون اسے دو... کیا اس نے کوئی بدتمیزی کی ہے؟"

"نہیں... مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ دل و جان سے خدمت کرے۔" میں نے کہا۔

"کیا تم اکیلے ہو؟" وہ بولا۔

"نہیں... میرے ساتھ وہی ہے... موہنی۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا..." وہ معنی خیز انداز میں ہنسا۔ "عیش کرو... خلل نہیں ہوگا... مگر یہ تو بتاؤ کہ تم ہمارے فارم ہاؤس پر کیسے پہنچ گئے؟"

"مجھے کہاں معلوم تھا کہ یہ تمھارا فارم ہے... میں تو بس ایسے ہی ایک جگہ دیکھ کے رک گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "سوچا تھا کہ [illegible] ہوگا تو اسے خوش کر دیں گے... تمھارا فون آیا تو پتا چلا۔"

معلوم نہیں جنگی نے مالی سے کیا کہا مگر اس کا رنگ اڑ گیا۔ وہی حضور... جی سرکار کہتا رہا اور پھر ریسیور رکھ کے پوچھنے لگا کہ کون سی گستاخی ہوگئی تھی۔ [illegible] جنگی کے درمیان [illegible] کچھ بھی نہیں سمجھ پایا تھا... میں نے اسے تسلی دی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے وہ باہر بیٹھے اور جب چھوٹے مالک آئیں تو بتا دے۔

موہنی سونے کے لیے لیٹ گئی تو میں پھر جمشید کے سامنے جا بیٹھا۔

"میں کبھی بھی پکڑا نہیں جا سکتا تھا۔" وہ اچانک بولا۔

"اسی لیے تم جا رہے تھے اور تمھاری یہ حرکت خودکشی کے برابر تھی۔" میں نے کہا۔

"دیکھو سکندر... میرا بچپن تنگدستی میں گزرا تھا اور جوانی کے بعد سے اب تک میری زندگی عیش و عشرت میں بسر ہوئی ہے۔ [illegible] میں نے سختی کبھی نہیں دیکھی۔ میں ملاور کے کاروبار میں ایک سلیپنگ پارٹنر تھا۔ اس کے لیے سرمایہ میں نے فراہم کیا تھا لیکن میں نے صاف بتا دیا تھا کہ میں عملاً کچھ نہیں کر سکتا... [illegible] نہیں رہ سکتا۔ قتل خونریزی تو دور کی بات ہے میں [illegible] سے بھی ڈرتا ہوں۔"

"تم اس پیسے سے کوئی جائز کاروبار نہیں کر سکتے تھے؟"

"کر سکتا تھا... لیکن اس میں منافع کم ہوتا ہے اور درد سر زیادہ کرنی پڑتی ہے۔" جمشید نے کہا۔ "ملاور نے مجھے سو فیصد منافع کا یقین دلایا تھا... سو فیصد ماہانہ... جو کسی کاروبار میں ناقابل تصور ہے... ہیروئن یا اسمگلنگ... منشیات کے دھندے یا بردہ فروشی جیسے کاروبار میں بھی ممکن نہیں۔ ملاور کے پاس لائسنس یافتہ پول تھا... پارٹی تھی اور انتظامی امور سے نمٹنے کی صلاحیت تھی۔ اس نے مجھے یہ ضمانت بھی دی کہ مجھے کچھ نہیں کرنا ہوگا... لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میری حیثیت صفر ہوگی۔ مجھے مشورہ دینے اور ان کے نفع نقصان اور کاروبار کی پالیسی معلوم کرنے اور ان کی ہر میٹنگ میں شرکت کا حق حاصل رہے گا۔"

"اور تمھارا سرمایہ... کیا تمھیں یہ حق حاصل تھا کہ جب چاہو الگ ہو جاؤ؟"

"ایسا تو کسی بھی کاروبار میں ممکن نہیں اور جب کاروبار [illegible] طور پر چل رہا ہو تو ایسا کون چاہے گا؟" جمشید نے کہا۔

"تم نے کتنا سرمایہ فراہم کیا تھا؟"

"ابتدا میں بیس لاکھ۔"

"کیا ایک مہینے بعد وہ چالیس لاکھ ہو گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"نہیں... لیکن تیس لاکھ ہو گئے تھے۔"

"گویا تمھیں دس لاکھ کا منافع ادا کر دیا گیا تھا...؟"

"معاہدے کے مطابق کاروبار کا آغاز ہونے کے تیسرے ماہ سے منافع کی تقسیم شروع ہوئی تھی۔ تیسرے مہینے کے بعد یہ شرح برقرار رہی۔"

"لیکن یہ سو فیصد ماہانہ منافع تو نہیں تھا۔"

"ہاں... مگر پچاس فیصد ماہانہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ چونکہ مجھے فوری طور پر ضرورت نہیں تھی اس لیے میں نے منافع کی دو اقساط وصول کرنے کے بجائے سرمائے میں شامل کر دیں۔ اس طرح میں چالیس لاکھ کا پارٹنر بن گیا۔ بعد میں مجھے اوسطاً پندرہ سے بیس لاکھ ماہانہ ملتے رہے... اور اب بھی مل رہے ہیں۔"

"پندرہ لاکھ تو پچاس فیصد سے بھی کم ہوگئے۔"

"وہ... دراصل میرا خیال ہے کہ ابتدا میں ملاور نے کچھ مبالغے اور کچھ غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ سو فیصد ماہانہ منافع ممکن نہیں تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ملاور اور سراج وغیرہ مل کے ڈنڈی مار جاتے ہوں۔ جو زیادہ وصول کرتے ہوں مجھے کم دیتے ہوں۔ مگر میں اسے ہی بہت سمجھتا ہوں کہ مجھے کچھ کیے بغیر پندرہ بیس لاکھ ہر مہینے مل جاتے ہیں۔ دو چار لاکھ کم کے لیے جھگڑا کیا کرنا۔ اور کسی کاروبار میں تو دس فیصد ماہانہ بھی نہیں ملتے۔ میرا خرچ پانچ سات لاکھ ماہانہ ہوتا ہے۔ باقی جمع ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ہمیشہ چلنے والا کاروبار نہیں ہے۔"

"تمھارا سرمایہ ملک میں ہی ہے؟"

"نہیں... سب کی طرح میں نے بھی اپنا پیسہ سوئٹزرلینڈ میں محفوظ کیا ہے۔" جمشید بولا۔

"ڈی سلوا بھی ایک پارٹنر تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں... دس فیصد کی حد تک۔" جمشید نے کہا۔

"اس نے بھی سوئٹزرلینڈ میں دولت جمع کی ہوگی جو کسی کے کام آئے گی جب خود اس کے کام نہ آئی۔" میں نے کہا۔ "علاوہ سراج اور سید [illegible] بھی پارٹنر ہیں؟"

"پارٹنر تو سب ہیں... ذمہ داریوں کی نوعیت کے اعتبار سے سب کے کام الگ ہیں اور انھیں جو منافع ملتا ہے وہ ان کے فرائض کی اہمیت کے تناسب سے ملتا ہے۔" جمشید نے کہا۔

"ہر ایک کا نقد سرمایہ کتنا تھا؟"

www.paksociety.com

"دلاور کا پانچ لاکھ... سراج کا ایک لاکھ۔ مگر دلاور سارے رسک کور کرتا تھا اور سامنے رہتا تھا۔ کل منافع میں سے چالیس فیصد میرا ہوتا تھا، دلاور کا پچیس فیصد، سراج کا پندرہ فیصد۔ اخراجات نکالنے کے بعد۔"

"اور باقی دس فیصد؟"

"وہ دوسرے ماتحت مددگاروں کا۔ پہلے یہ ڈی سلوا کو ملتا تھا۔ پھر یہی دس فیصد تقسیم ہونے لگا۔ پانچ فیصد پیڈرو کو مل جاتا ہے اور باقی دوسروں کو۔"

"گویا پیڈرو پارٹنر نہیں ہے؟"

"معاہدے میں اس کا نام پارٹنر کی حیثیت سے شامل نہیں ہے۔ سالانہ دس ہزار ڈالر جیسے ملازم دیے جاتے تھے۔ ڈی سلوا کے مرنے کے بعد جب پانچ فیصد ملنے لگے تو اب یہ پچیس ہزار ہو جاتے ہیں۔ ویسے وہ ملازم ہے۔ دلاور کے رویے نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔" جمشید نے کہا۔

"کیا تم یہ نہیں جانتے کہ ایک غیر قانونی معاہدے کی قانونی حیثیت کچھ نہیں ہوتی؟" میں نے کہا۔ "مثلاً اسی کاروبار کی تمام آمدنی اگر دلاور تمہارا حصہ ختم کر دے تو تم اس کے خلاف کسی عدالت میں دعویٰ دائر نہیں کر سکتے۔ تم لاکھ کوشش کر لو کچھ نہیں کر سکتے مگر شریک جرم سمجھے جاؤ گے اور اندر ہو جاؤ گے۔"

"تم سمجھتے ہو کہ میں کاہل ہوں اور بزدل ہوں۔ لیکن میں احمق نہیں ہوں۔" وہ بولا۔ "میرا پیسہ لٹنے مرنے کی حد تک محفوظ ہے۔ دلاور کی فیکٹری میرے پاس رہن ہے اور موٹر بوٹ، پیپرز، عالیشان اپارٹمنٹ اور جیولری کے ساتھ میرے بینکرز کی تحویل میں ہیں۔"

"ایم ٹیلیوڈی کمپلیکس... تمہارے پاس رہن ہے؟" اس انکشاف نے مجھے سن کر دیا۔ مجھے نفرت اور انتقام کی پرانی آگ پھر میرے لہو کو تیزاب کرنے لگی۔ "کیا حق حاصل تھا اسے۔ کمینے کو... کہ میری اور میرے باپ کی جائداد کو رہن رکھے؟" میں نے ایک دم خسرو جمشید کو دبوچ لیا اور اسے دیوانہ وار مارنے لگا۔ وہ لڑنے جھگڑنے والا آدمی نہیں تھا۔

وہ چلانے لگا۔ "سکندر... مجھے مت مارو... مجھے چھوڑ دو۔ میں مجرم ضرور ہوں۔ لیکن میں نے تمہیں نقصان نہیں پہنچایا۔"

میں نے اسے صوفے پر پھینک دیا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور خون اس کی ناک سے اور ہونٹوں سے بہہ رہا تھا۔ موہنی نے بیچ کے دروازے سے جھانک کر دیکھا اور لوٹ گئی۔ ماں نے اندر آنے کی ہمت ہی نہیں کی۔

"مجھے مار کے... تمہیں کچھ نہیں ملے گا..." خسرو جمشید بڑی مشکل سے اٹھا اور اس نے کرتے کے دامن سے ہونٹ صاف کیے۔ "جو کچھ میں تم کو بتا سکتا ہوں تم کسی سے بھی نہیں معلوم کر سکتے۔ میں نے تو صرف پیسہ دیا تھا۔ تم مجھے جو بھی سمجھتے ہو۔ میں خود بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میں غدار ہوں لیکن براہ راست میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ تم مجھے..."

"بکواس بند کرو، کمینے کے بچے!" میں نے چیخ کر کہا۔ "بھی قاتل کہلاتا ہے جو کسی کے ہاتھ میں خنجر رکھتا ہے... ہونے بھی کہ اس سے کسی کا گلا کاٹ جانے کا کیا تم کو معلوم نہیں تھا کہ اس کاروبار کا دلاور اکیلا مالک نہیں ہے؟"

"پہلے وہ اکیلا مالک نہیں تھا۔ تمہارے والد اور میر شرافت بھی اس کے مالک تھے۔" جمشید نے کہا۔ "مگر... اس نے ان کے کانٹے کاٹ دیے۔ تمہارے والد کو راستے سے ہٹا دیا اور میر شرافت کو مروا دیا۔ اس کے بعد تو مالک وہی تھا۔ میر شرافت بے اولاد تھا۔ تم اپنے باپ کے اکلوتے وارث تھے۔ تم کو یہ نظر آگیا تھا کہ حصہ تم سے کر الگ کر دیا جائے گا۔ اور اگر تم نے کاروبار میں شرکت پر رضامندی کا اظہار کیا تو تمہارا بھی حصہ مقرر کر دیا جائے۔ مگر فیکٹری تو دلاور پہلے ہی رہن رکھ چکا تھا۔ اگر تم وارث ہو کر مقدمہ چلاتے تو یہ بات سامنے آ جاتی۔ مگر تمہارا رویہ دیکھتے ہوئے ایسا انتظام کر لیا گیا کہ تم عدالت میں پیش ہی نہ ہو سکو... اور دیکھ لو آج تمہاری کیا پوزیشن ہے۔"

"تم اپنی پوزیشن دیکھو نواب خسرو جمشید... کہ تمہارے پیسے نے تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔" میں نے کہا۔ "کیا تم کو یقین ہے وہ سب پیسہ جو تم نے سوئٹزرلینڈ کے کسی بینک میں جمع کیا ہے۔ یا میری فیکٹری کے رہن رکھے جانے کے کاغذات... دلاور، سراج... یہ سب مل کے تمہیں بچا سکتے ہیں... میں تو اپنا حق حاصل کر ہی لوں گا۔"

"تمہارے لیے میری زندگی میری موت سے زیادہ کارآمد ہوگی سکندر۔"

"لیکن پھر تمہاری زندگی ان کے حق میں موت بن جائے گی جو آج تمہارے پارٹنر ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم یہ مجبور نہیں کر سکو گے جمشید... میرے ہاتھوں نہ مارے گئے تو تم ان کے ہاتھوں ضرور مارے جاؤ گے... ابھی میری نظر میں غدار ہو... پھر ان کی نظر میں بھی غدار ٹھہرو گے۔"

"ان کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔" جمشید نے کہا۔ "جب میں نے اس کاروبار میں قدم رکھا تھا تو صرف منافع نہیں دیکھا تھا۔ میں نے خطرات کو بھی سمجھ لیا تھا اور پہلے دن سے میں صرف اپنا دفاع مضبوط کر رہا ہوں۔ میرا اکاؤنٹ سوئٹزرلینڈ میں نہیں ہے۔

دنیا تو سب بتا چکا ہے۔ ہیں اور انھیں تلاش بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں نے تو ایک ایسے ملک کا انتخاب کیا تھا جہاں ان کے تصور کی رسائی بھی نہیں ہوگی۔ وہاں میں نے اپنی دولت سے سرمایہ کاری کی ہے کہ مجھے اس ملک کی معیشت اور سیاست میں اہم مقام حاصل ہے۔ میں وہاں کا وی آئی پی ہوں مگر میرا اصل نام، میری اصل شہرت... یہ سب انھیں بھی معلوم نہیں... میں جب چاہوں جس جہاز سے چاہوں وہاں جا سکتا ہوں۔ ویسے میں ایک بزنس مین بھی ہوں۔ وہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ میں کاروباری دورے پر جاتا ہوں یا پھر اپنے سوئٹزرلینڈ کے محل میں مقیم ہوں... حالانکہ سوئٹزرلینڈ میں کوئی محل وحل نہیں ہے۔ میں تمہیں ایک پیش کش کرتا ہوں... تم مجھے نکل جانے دو۔ میں ایسا ایک انتظام کر جاؤں گا کہ تمہارا حق تمہیں مل جائے گا۔ تم ایم ٹیلیوڈی کمپلیکس کے مالک بن جاؤ گے۔"

"مجھے بے وقوف مت بناؤ جمشید۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اول تو وہ ایم ٹیلیوڈی کمپلیکس رہا ہی نہیں۔ وہ تو دلاور وہاں اسپتال بنا رہا ہے۔ وزیر ہوسپٹل۔"

"پھر کیا ہوا۔ رہن کے کاغذات میں یہ شق شامل ہے کہ اس زمین پر موجودہ عمارت میں اضافہ، ترمیم یا رد و بدل کیا جا سکے لیکن وہ بہرحال بدستور میرے پاس رہن رہے گی۔"

"دلاور تمہارے تیس لاکھ مار سکتا ہے۔"

"اسے کیا ضرورت ہے تیس لاکھ میں ایک ایسی پراپرٹی چھڑانے کی جس پر اس کا قانونی حق چیلنج ہو چکا ہے۔ وہ خود بھی اسے اپنا قانونی جانشین نہیں رکھ سکتا۔ اس کا اپنا کوئی گھر نہیں... وہ کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کبھی اسے اچانک بھاگنا پڑا تو وہ جائداد اٹھا کے نہیں لے جا سکے گا۔ اس کے کام وہی پیسہ آئے گا جو باہر محفوظ ہے۔ یہاں تو کسی بینک میں ذاتی پیسہ بھی اتنا ہی رکھتا ہے جو وقت ضرورت کام آ سکے۔ تیس لاکھ وہ باہر سے منگوائے گا نہیں کہ رہن رکھی ہوئی جائداد کو چھڑائے۔ وہ تو اس سے سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تاکہ خود محفوظ رہے۔ میں اس رہن نامے کو تمہارے نام منتقل کر دیتا ہوں... یہ کیسے ہوگا... اس معاملے میں تم اپنے وکیلوں سے مشورہ کر سکتے ہو... تمہارے دوست بہترین وکیل ہیں۔ اس طرح تم مستقبل میں تعمیر ہونے والے وزیر اسپتال کے مالک خود بخود بن جاؤ گے۔"

"مگر میں قانونی کارروائی کے لیے کسی عدالت میں نہیں حاضر ہو سکتا۔" میں نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ابھی وہ جائداد یعنی وزیر ہسپتال میرے نام رہن ہے... میں تمہارے دوست اور وکیل عبدالودود منظر کو اپنا مختار بنا کے مکمل اختیارات دے سکتا ہوں۔ دلاور عملاً اس جگہ سے دستبردار ہو چکا ہے۔ تمہارا دوست تمہاری واپسی تک اس اسپتال کو اپنی مرضی کے مطابق چلا سکتا ہے۔"

"اس کے لیے تم کو بھی تو عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔"

جمشید نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرے قانونی مشیر میری ہدایات پر یہ کام کر لیں گے... وزیر اسپتال تمہارا ہو جائے گا... تم کہو گے تو میں اس کی تکمیل کے لیے پیسہ بھی فراہم کر دوں گا۔"

"اور کیا دلاور اتنا احمق ہے تمہیں ایسا کرنے دے گا؟ کیا انھیں معلوم نہیں ہو جائے گا کہ تم منحرف ہو گئے ہو؟"

"انھیں فوراً معلوم ہو جائے گا... مگر وہ میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ وہ میرے قانونی مشیروں کو یا تمہارے وکیل دوست کو کیسے منع کر سکتے ہیں۔ اس کام میں ایک دو مہینے لگ جائیں گے۔ اس عرصے میں تم مجھے اپنی قید میں رکھو گے اور میری حفاظت کرو گے۔ جب ساری قانونی کارروائی تمہارے اطمینان کے مطابق پوری ہو جائے اور اسپتال بھی مکمل ہو جائے تو تم مجھے خاموشی سے باہر نکل جانے کا موقع دینا۔ اس سے زیادہ میں تم سے کچھ نہیں چاہتا۔ بس تم مجھے رہا کر دینا کہ جہاں تمہارا جی چاہے جاؤ۔ میں بھیس بدل کے جاؤں یا نام بدل کے... تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں... میں کوئی نام... کوئی پاسپورٹ استعمال کروں گا اور کئی مختلف جہاز بدل کے بالآخر اپنی پناہ گاہ تک پہنچ جاؤں گا۔"

اس کی بات نے مجھے کشمکش میں ڈال دیا۔ اب تک میرے ذہن میں ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ مجھے خسرو جمشید کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔ مسئلہ صرف انتخاب کا تھا کہ میں اسے سزا دینے کا اختیار اپنے پاس رکھوں... اسے غالب اور محسن کے سپرد کر دوں یا میر سلطان کے حوالے کر دوں۔ ہر صورت میں وہ سزا اس کا مقدر تھی جو غدار کو ملنی چاہیے۔

اس کی یہ بات کوئی مسترد نہ کر سکتا تھا کہ اس نے براہ راست مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ نہ وہ میرے والد کے قتل میں شریک تھا نہ کسی اور کے۔ نہ اس نے تباہ کاری و خونریزی کے کسی منصوبے میں شرکت کی اور نہ اس کا مقصد ملک دشمنی تھا۔ اس کے پیش نظر تو منافع تھا جو آتا چلا تھا کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ویسے تو سب ہی ملک دشمن ہیں۔ اسمگلر بھی، منشیات فروش بھی... ذخیرہ اندوز بھی، رشوت خور اور ٹیکس چور بھی، سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے والا بھی۔ کسی بھی شریف کے ہاتھ سے قیمتی پرس یا لیب چھیننے والا بھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ خسرو جمشید نے جانتے بوجھتے اپنا سرمایہ ان لوگوں کے حوالے کیا جو ملک توڑنے کے درپے تھے۔

www.paksociety.com

دوسری بات کا تعلق میری ذات سے تھا۔ جو چیز مجھے سر توڑ کوشش کے باوجود نہیں ملی تھی۔ میرا قانونی حق ہونے کے باوجود مجھے نہیں ملی تھی اور اپنا سب کچھ گنوا کے بھی نہیں ملی تھی وہ اچانک ایک معمولی سی شرط پر مجھے دی جا رہی تھی۔ اگر وہ میرا سرمایہ تھا جو غصب کر لیا گیا تھا تو غاصبوں کا ایک ساتھی مجھے وہ سرمایہ اس پر جیسے اللہ واسود سمیت لوٹا رہا تھا۔ اگر میں نے ذہنی و جسمانی اذیت برداشت کی تھی تو اس کا بھی ازالہ مجھے مل رہا تھا۔ وہ اس طرح کہ ایک کارخانے کی جگہ مجھے ایک مکمل اسپتال کی پیشکش تھی۔ کارخانہ صرف فولاد کو چیزوں میں ڈھالتا تھا مگر اسپتال دکھی اور بیمار انسانوں کے لیے مسیحائی فراہم کرتا تھا۔ کارخانہ صرف مادی فوائد حاصل کرنے کا ذریعہ تھا لیکن وزیر خان کے نام پر تعمیر ہونے والا اسپتال ایک صدقہ جاریہ ثابت ہو سکتا تھا۔ میں اس اسپتال کو غریبوں کے مفت علاج کے لیے کھول سکتا تھا اور اس کی اپنی آمدنی سے چلا سکتا تھا۔

جب میرا ذہن یہ امکانات قبول کرنے لگا تو مجھے ایک اور خیال بھی آیا۔ گزشتہ روز میں نے جب اسٹیشن ویگن کو ایک مرسیڈیز سے ٹکرا کے خسرو جمشید کے ڈبل کو ہلاک کر دیا تھا اس شخص نے یہ تسلیم کیا تھا کہ وہ خسرو جمشید نہیں ہے ورنہ مجھے کبھی اس کا پتا نہ چلتا۔

اسی نے مجھے بتایا تھا کہ اصل خسرو جمشید کہاں ملے گا۔

اگر کسی طرح یہ مشہور اور ثابت کر دیا جائے کہ وہی اصل خسرو جمشید تھا تو وہ لاعدد یا سراغ کیسے تصدیق کر سکتے تھے کہ حقیقت کیا تھی جسے میں ختم کر دیتا۔ اس طرح ایک دو بیٹے خسرو جمشید کو قید میں رکھنا کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ وہ اپنی مرضی سے قید میں رہے گا۔ اپنی جان بچانے کے لیے اور جب قانونی معاملات میری مرضی کے مطابق طے پا جائیں گے یعنی عبدالودود مستقل تصدیق کر دے گا کہ اب قانونی طور پر کوئی مقدمہ نہیں اور وہ وزیر خان اسپتال کا مہتمم و منتظم ہے۔ اس کے پاس اسپتال کی تکمیل کے لیے خسرو جمشید کی فراہم کردہ رقم ہے اور قانونی اختیار ہے تو کسی بھی رات خسرو جمشید کو رہا کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی سزا جلا وطنی کی صورت میں بھگتے گا۔ گمنامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گا۔ کسی ایسے ملک میں جہاں وہ خود بھی اپنے لیے اجنبی ہو گا۔ وہ مالی طور پر آسودہ ہو گا مگر یہ صرف جسم کو آسودہ کرتا ہے۔ جذباتی رشتے اور محبتوں کے سامنے جو روح کی تسکین کرتے ہیں خریدے نہیں جا سکتے۔ ایسی ہی زندگی گزار کے مرنے والے کے لیے ایک بھی آنکھ سے وہ آنسو نہ ٹپکیں جن میں جدائی کا درد ہو اور دل کا نوحہ ہو تو کیا مرنے کے بعد بھی روح کو قرار مل سکتا ہے۔ پھر خسرو جمشید اپنے سب جرائم کا اپنے تمام گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے خود ہی یہ سزا بھگتنے کو تیار ہے۔ جرمانہ ادا کرنے کو تیار ہے اور غداری کے جرم میں وہ سرمست فریبی کی سزا مول لینے کو تیار ہے تو مجھے کیا۔

ایک بار اس نے میرے کھرے جذبات کو مسترد کر دیا تھا۔ ویسے خسرو جمشید کو گھور رہا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی پیشکش نے میرے پتھر دل کو پگھلانا شروع کر دیا ہے کا اندازہ مجھے اس کی صورت پر امید کے آنے سے ہوا۔ جواب اتنا ہی زیادہ ہو چکا تھا جتنی دیر سے مقابلہ کی صورت۔

جیکی اور جونی ایک ساتھ اندر آ گئے۔ وہ دونوں ہٹے کٹے خوبصورت جوان تھے۔ انھوں نے "ہائے" کہہ کے مجھے سلام کیا اور پھر خسرو جمشید سے۔

"اچھا ہوا تم پھر آ گئے۔" جیکی بولا۔ "میں تو ترس رہا تھا اس دن کہ تم سے کچھ کہہ سکیں۔۔۔ یو ڈرٹی سوائن۔۔۔"

"تمھاری ایکٹنگ!" جونی بولا۔ "نیور۔۔۔"

"ہم سے تو بات نہیں بنی تھی۔" جیکی بولا۔ "بلکہ بے وقوفی پر پشیمان تھا کہ سوچے سمجھے بغیر کیا کر دیا۔"

"لیکن تم نے جس طرح بگڑی بات بنا لی۔۔۔ میں تو۔۔۔ ورنہ تم اگر تہ خانے میں پہنچا دیے جاتے تو معلوم ہے کیا ہوتا؟" جونی نے کہا۔

"کیا ہوتا۔۔۔؟" میں نے ہنس کے کہا۔

"تمھاری روح بھی اندر ہی قید رہتی اور چمگادڑ کی طرح اندھیرے میں پھڑپھڑاتی رہتی۔" جونی نے کہا۔ "اور تمھارا ڈھانچا۔۔۔ خیر چھوڑو۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ جو ہوا ٹھیک ہوا اور اچھا ہوا۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تم نے اس خبیث کو کہاں چھوڑا تھا؟"

"پانچ میل سے بھی آگے۔۔۔ اس نے بہت شور مچایا۔ لالچ دیا اور دھمکی دی۔۔۔ میں نے کہا کہ میں خلاف اصول بات نہیں کر سکتا اور وہی کروں گا جس کا مجھے حکم ہے۔۔۔ ورنہ واپس گھر سے جاؤں گا۔"

"وہ کیا چاہتا تھا؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے تمھارا تعاقب کرنا چاہتا تھا۔" جیکی بولا۔

"بعد میں کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "جب تم پہنچے۔"

"اس وقت تک سب کچھ ہو چکا تھا۔" جیکی نے کہا۔ "بیگم پارہ کہرام مچا کے خاموش ہو چکی تھیں اور ڈیڈی اعلان کر چکے تھے کہ وہ اپنا فیصلہ نہیں بدلیں گے۔"

"خواہ بیگم پارہ روٹھ کے اور روٹھ کے گھر سے جائیں بلکہ دنیا سے چلی جائیں۔" جونی قہقہہ مار کے ہنسا۔ "ڈیڈی کو یقین ہو گیا تھا کہ ان

میں کچھ کالا ہے۔"

"ہاں میں کالا ہی کالا تھا۔۔۔ سفیدی کا نام بھی نہیں تھا۔"

"تمھیں ڈیڈی نے درست فیصلہ کر کے خود کو بہت بڑی پریشانی سے بچا لیا۔" میں نے کہا۔

"پرنس۔۔۔ میرا خیال ہے۔" جیکی سگریٹ جلا کے بولا۔ "کہ تم ہمیں جو بتانا چاہتے ہو۔۔۔ ایم آئی رائٹ؟"

"ڈیفنیٹلی۔" میں نے کہا۔

"تم نے کچھ کھایا پیا۔۔۔ یہاں سب کچھ ہے۔۔۔ بیک ٹائم ہے۔۔۔"

"تھینک یو۔۔۔ میں چائے کافی سے آگے نہیں سوچتا۔" میں نے کہا۔

"آل رائٹ۔۔۔ ناؤ کم ٹو دی پوائنٹ۔" جیکی بولا۔ "تم نے کیوں بلایا تھا ہمیں؟"

"تم سے ایک کام تھا۔" میں نے کہا۔

"ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔" جونی نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔

"ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ یہ بہت بڑا بول ہے۔" میں نے کہا۔ "آدمی کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنی پوری کوشش کرے گا۔"

"او کے۔۔۔ او کے۔۔۔" جونی نے کہا۔ "مسٹر فلاسفر تم بولو کہ کیا ہے۔ تم سے مجھے کچھ عقیدت ہو گئی ہے۔"

"عقیدت۔۔۔ یہ تو بہت بڑا لفظ ہے۔" میں نے کہا۔

"یس عقیدت۔" وہ بولا۔ "ہم نے کیا سوچا تھا۔۔۔ اور پھر تم نے بدلے میں کیا لیا۔۔۔ جو ہم نہیں کر پائے تھے وہ تم نے یوں کر دیا۔" وہ چٹکی بجا کے بولا۔

"میرا کام چٹکی بجاتے میں نہیں ہو گا۔ یہ مشکل اور لمبا کام ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ناممکن نہیں ہے۔"

"کیا کسی کو قتل کرنا ہے؟" جیکی رازدارانہ لہجے میں میری طرف جھکا۔

"فرض کرو یہ بھی کرنا پڑے تب بھی۔" میں نے کہا۔ "ویسے تو معاملات کو آخر تک۔۔۔ میں نہیں ہوا اور قتل کی نوبت آئی تو میں خود ہی معاملات سنبھال لوں گا۔"

"اب بتاؤ بھی کہ بات کیا ہے؟" جونی نے بے صبری سے کہا۔

"تم نے اس شخص کو پہلے کبھی دیکھا ہے؟" میں نے جمشید کی طرف اشارہ کیا۔

ان دونوں نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

"یہ میرا پرانا دشمن ہے۔" میں نے مختصراً کہا۔

وہ دونوں ہم تجو ہو کے رہ گئے۔

"اسی طرح تم اس کا جانی دشمن ہو؟" میں نے کہا۔

"یہ بہت پرانی دشمنی ہے اور میرے جذبات کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ اگر میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا پھر ان ٹکڑوں کو قیمہ کرنے والی مشین میں ڈال سکتا اور اس قیمے کو کتوں اور چیلوں کے سامنے پھینک سکتا، تب بھی میری تسلی نہیں ہوتی۔"

جیکی نے منہ گول کر کے سیٹی بجائی اور آنکھیں پھیلا کے خوف اور حیرت کا اظہار کیا۔

"پھر تم نے یہ نیک کام کیوں نہیں کیا؟" جونی بولا۔ "ویسے تم جانتے ہو کہ یہ کام یہاں ہو اور کوئی سن نہ سکے۔۔۔ تو سمجھو کہ دنیا اندھی ہو گئی ہے۔ چاروں طرف اونچی دیوار ہے اور رات کا وقت ہے۔ چنانچہ سوائے خدا کے کسی کو علم نہیں ہو سکتا۔"

جیکی نے کہا۔ "یس۔۔۔ یہ چوہا بھی ہے نا۔۔۔ سمجھو کہ یہ اندھا گونگا اور بہرا ہے۔"

جونی نے دونوں انگلیاں منہ میں زبان کے نیچے ڈال کے ایک تیز سیٹی بجائی۔۔۔ مالی دروازے میں نمودار ہو گیا۔ جونی میری طرف دیکھ کے مسکرایا۔ "اتنی جلدی تو الہ دین کے چراغ کا جن بھی حاضر نہیں ہوتا ہو گا۔" مالی دانت نکالنے لگا۔

"چاچا خواہ مخواہ۔۔۔ یہ ہمارے دوست ہیں۔" جیکی بولا۔

"جی حضور۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔" مالی نے کہا۔

"تمھیں اور کیا معلوم ہے؟" جیکی نے کہا۔ "جو کچھ معلوم ہے وہ سب ان کو بتا دو۔"

مالی گڑبڑا گیا۔ "آپ۔۔۔ پوچھیں مالک۔۔۔"

"اچھا تو یہ بتاؤ کہ اس باغ میں ہمارے کتنے دشمن اور بدخواہ دفن ہیں؟" جیکی نے کہا۔

"جی۔۔۔ کیا بتاؤں۔۔۔ بھول گئے بچارے۔۔۔"

"ویری گڈ۔۔۔ آپ کا یہ صحیح جواب ہے۔" جیکی بولا۔ "تم بتا سکتے ہو کہ کون کہاں دفن ہے ویسے تو پتا نہیں چلتا۔"

"مگر میں بتا سکتا ہوں جناب عالی۔"

"اچھا۔۔۔ اور کتنی جگہ ہے؟"

"جگہ بہت ہے حضور۔" مالی نے پریشان ہو کے کہا شاید اس قسم کے سوالات اس سے پہلے نہیں کیے گئے تھے۔

"تم لان کی صفائی کی تیاری کرو۔" جیکی بولا۔

"کس چیز کی سرکار۔۔۔؟" مالی نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"باغ صفائی کی۔" جونی بولا اور ہنس پڑا۔

"میں سمجھا نہیں چھوٹے سرکار۔" مالی بدستور ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔

"چاچا خواہ مخواہ۔۔۔ یہ چاول بننے کی جگہ دیکھ لو اب سمجھ آگئی ہے تو جاؤ۔" جیکی نے کہا۔

جب مالی چلا گیا تو جونی نے غور سے میری طرف دیکھا۔ "اس

www.paksociety.com

کی تیسری نسل بھی ہماری غلام ہے۔ اس کا باپ ہمارے دادا کا ملازم تھا۔ اس کا بیٹا ہمارا شوفر ہے۔ یہ تین نسلوں کے راز دار ہیں اور وہ سب اپنے ہی راز ہیں۔"

میرا دماغ چکرا گیا۔ یہ کیسے لوگ تھے جو بیسویں صدی کے مہذب قانون کے پابند اور ترقی یافتہ معاشرے میں ایسی بے نام حکومت چلا رہے تھے۔ جہاں قوانین ان کے اپنے تھے اور ان کی رعایا آج بھی ان کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں رکھتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ سندھ اور پنجاب ہی نہیں سرحد اور بلوچستان میں بھی جاگیردار... وڈیرے اور میر... قبائلی سردار اور سابق ریاستوں کے والی اپنے اپنے علاقے میں ایک مطلق العنان حکمران ہیں جو متضاد صفات رکھتے ہیں۔ وہی بادشاہوں کے مزاج والی جس کے بارے میں شیخ سعدیؒ نے فارسی میں کہا کہ کبھی گالی پر خلعت دے سکتے ہیں تو کبھی سلام پر سزا۔ وہ سخی اور فیاض بھی ہیں مگر جبر و استحصال کے پیکر بھی... ملک کے قانون کی عملداری ان کے علاقوں کی سرحد تک ہے... آگے ان کا اپنا حکم چلتا ہے۔ ساری رعایا اس حکم کو نعوذ باللہ خدا کے حکم سے بڑھ کر سمجھنے پر مجبور رہتی ہے۔ ان کے اپنے قید خانے ہیں اور ان کی دی ہوئی سزا کے خلاف اپیل صرف داورِ محشر کے حضور دائر کی جا سکتی ہے۔

یہاں میرے سامنے دو ایسے لوگ بیٹھے ہوئے تھے جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اسی مطلق العنان خاندانی حیثیت کے وارث تھے۔ یہ اپنے دشمنوں کو بھی معاف نہیں کرتے تھے اور بدخواہوں کو بھی لوحِ جہاں سے حرفِ مکرر کی طرح مٹا دیتے تھے اور کوئی احساسِ جرم و ندامت ان کے ضمیر کو پریشان نہیں کرتا تھا۔ وہ خوش باش اور عیش کوش تھے۔ یاروں کے یار بھی تھے۔ دولت ان کے گھر کی باندی تھی اور دنیا ان کے لیے صرف عیاشی کے لیے بنائی گئی تھی۔ انھیں دنیا کی سیاست، ادب، ثقافت اور تاریخ و تمدن یا تہذیب کے ارتقا اور علوم و فنون سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ دنیا میں جو کچھ ان کی زندگی کے عیش و آرام میں اضافے کے لیے بازار سے دستیاب ہوتا تھا ان کی قوتِ خرید میں ہوتا تھا اور یہی عزم ان کے لیے کافی تھا۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے تائیدِ ایزدی سے ان کی حمایت حاصل ہو گئی۔ حالات موافق نہ ہوتے تو مجھے ان کی دشمنی ملتی، جو ملٹری انٹیلی جنس کی دشمنی سے کہیں زیادہ تباہ کن اور ہلاکت خیز ہوتی جتنا ایک عام بم کے مقابلے میں ایٹم بم ہوتا ہے۔ خسرو جمشید نے پچاسویں بار منہ سے وہی بات کہی تھی اور وہ خاصا ڈرا ہوا لگتا تھا۔

میں نے ان دونوں جوانانِ رعنا کو بچے کی طرح مضطرب توت سے بھرپور اور طاقت پر مغرور نوجوانوں کے جذبات سے کھیلنے کا فیصلہ کیا۔

"یہ بتاؤ جب تم لوگ کسی کو دوست کہتے ہو تو یہ صرف کہنے کی بات ہوتی ہے یا تم دوستی نبھاتے بھی ہو؟"

"ہم خاندانی لوگ ہیں... ایسی گالی ہم نہیں سنتے کہ کوئی ہم پر بدعہدی کا طعنہ دے۔ بے غیرت سمجھے یا بزدل کہے۔" جیکی نے کہا۔

"جب دوست کہہ دیا تو پھر جان دے دینا یا جان لینا ایک ہے۔ جتنی آسانی سے ہم تمھارے دشمن کی جان لے سکتے ہیں اتنی ہی آسانی سے اپنی جان بھی دے سکتے ہیں۔ ہمارے آبا و اجداد نے بار بار یہ ثابت کیا ہے اور وقت آیا تو ہم ان کی روحوں کو شرمندہ نہیں ہونے دیں گے۔" جونی بولا۔

"تو پھر غور سے سنو" میں نے کہا۔ "میں کسی بہت اونچے خاندان سے تعلق کا دعویٰ تو نہیں رکھتا مگر میں بھی مرد ہوں... ویسا ہی مرد جیسے تم ہو۔ حسب نسب کے سوا میری صفات وہی ہیں جو تمھاری اور وقت آیا تو تم دیکھو گے کہ میں نے صرف تمھارا دل رکھنے کے لیے ایسا نہیں کہا تھا۔ اب میں تم کو اس مسئلے کے بارے میں بتاتا ہوں۔"

جیکی نے پھر منہ میں انگلیاں ڈال کے سیٹی بجائی... ملازم کے نمودار ہوتے ہی اس نے کہا "ان دونوں سے کہو گاڑی میں بیٹھے رہیں کہ اندر کوئی نہ آنے پائے۔"

"جی سرکار" مالی جانے لگا۔

"اور سنو" جیکی بولا۔ "ابھی تو کافی لاؤ... مگر ایک گھنٹے بعد ہم اور ہمارے مہمان کھانا کھائیں گے۔"

"ایک گھنٹے بعد؟" مالی پریشان ہونے لگا۔

"چاہا تو خواہ مخواہ... کھانا منگوا لو... گاڑی میں جا کے لے آؤ" جیکی بولا۔

"یہ شخص..." میں نے مالی کے جانے کے بعد سوچا کہ کہنا شروع کیا۔ "خسرو جمشید ہے۔ یہ نام کا نواب ہے مگر اس کا باپ واقعی نواب تھا۔ میرا باپ ایک صنعت کار تھا۔ وہ مر چکا ہے بلکہ جب میں برطانیہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو اسے ایک سازش کے تحت مار دیا گیا۔ لیکن یہ قتل ثابت نہیں ہو سکا۔"

"یہی تو مشکل ہے۔ سب عدالتی قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس لیے جب تمھیں یقین تھا تو پھر وہ فریاد کیا ضرورت تھی؟" جیکی نے کہا۔

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں پڑھا لکھا بزدل آدمی ہوں... قانون کی بالادستی پر یقین رکھتا ہوں اس لیے کہ یہ بس ایک

بات نہیں جو تمھیں حاصل ہے" میں نے کہا "لیکن میں کسمسا... ورثہ ملنا کا سب سرمایہ اور جائداد... کوٹھی اور کارخانہ جس... ایسے حالات تھے یا میرے مرحوم والد کی غلطی تھی کہ مجھے معلوم نہ ہو سکا... مجھے واپس آنے کے بعد سب پتا چلا۔"

"پھر تم نے اپنے حق کے لیے عدالت میں درخواست دی؟" جونی نے طنز سے کہا۔

"نہیں... اس کا کوئی فائدہ نہ تھا" میں نے کہا۔ "قانونی طور پر کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے والد کے خلاف سازش کرنے والوں نے مجھے بھی سازش میں الجھایا اور میرے خلاف جھوٹے مقدمات بنائے گئے۔ مجھے فرار اور روپوش ہونا پڑا۔"

"کون ہیں وہ لوگ... مجھے بتاؤ" جیکی نے میز پر مکا مارا۔

"ہوش میں مت آؤ... میں بتا رہا ہوں" میں نے کہا۔ "ان لوگوں نے مجھے پیش کش کی کہ میں ان کے ناجائز کاروبار میں شریک ہو جاؤں۔ وہ اسمگلر تھے اور مجھے اپنا ایجنٹ بنانا چاہتے تھے۔ میں نے انکار کر دیا اور صرف اپنا حق مانگا یعنی فیکٹری کی ملکیت مانگی۔ وہ پیسہ مانگا جو میرے والد سے چھین لیا گیا تھا اور کوٹھی وغیرہ جو ان کے پاس تھی... ان کے انکار سے دشمنی کا آغاز ہوا۔ میرے ساتھ کبھی دو چار دوست تھے۔ انھوں نے میری مدد کی۔ پھر آج ایک بہت بڑا دشمن ہمارا قیدی ہے اور ہماری شرائط پر جان بخشی چاہتا ہے۔"

جیکی اور جونی نے نفرت سے جمشید کی طرف دیکھا۔

"اور وہ شرائط کیا ہیں؟"

"جہاں میرا کارخانہ تھا... یعنی میرے والد کا... وہ جگہ اس شخص کے پاس بیس لاکھ میں رہن رکھ دی گئی تھی" میں نے کہا۔ "یہ ناجائز رکھنے والے اسلحے کے اسمگلر تھے اور مشرقی پاکستان کے تخریب کار علیحدگی پسندوں کو اسلحہ بیچتے تھے۔ انھوں نے فیکٹری میں بھی اسلحہ بنانا شروع کر دیا تھا۔"

"کس قسم کی فیکٹری تھی تمھارے والد کی؟"

"زرعی مشینری کے پرزے اور آلات بنانے کی..." میں نے کہا۔ "اس میں ریوالور اور پستول بننے لگے۔ جب راز فاش ہونے لگا تو اس جگہ کو رہن رکھ کے مشینوں کو منتقل کر دیا گیا اور فیکٹری گرا دی گئی۔ اس کی جگہ ایک اسپتال بنانے کا اعلان کر دیا گیا... غریبوں کے لیے... ظاہر ہے یہ سب رائے عامہ کو گمراہ کرنے اور پبلک کو دھوکا دینے کی کوشش تھی۔ اب سنو کہ کس طرح تم ان لوگوں کے چکر میں پڑنے سے بال بال بچ گئے۔ جو مشینیں اسلحہ سازی کی تھیں وہ فیکٹری سے ہٹائی گئیں تو ان کے لیے متبادل جگہ کی تلاش کا مرحلہ آیا اور انھوں نے ایک عورت کو تمھارے والد کے پیچھے لگا دیا۔ اپنے ایک ایجنٹ کے ذریعے... کہ وہ تمھارا صنعتی پلاٹ حاصل کریں تاکہ یہ مشینیں وہاں لگائی جائیں۔"

"او مائی گاڈ..." جیکی نے سر پر ہاتھ مارا۔ "اتنا بڑا دھوکا... میں ڈیڈی کو بتاؤں گا۔"

"میں اس کو شوٹ کر دوں گا۔" جونی نے کہا۔

"دیکھو... تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا... اس سے زیادہ کرو گے تو نقصان مجھے ہوگا" میں نے کہا۔ "وہ معاملہ تو ختم ہو گیا اب اس کی بات ہی مت کرو... ہاں وہ دوبارہ کوشش کرے تو یہ سب اپنے ڈیڈی کو بتا دینا... ابھی تو میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ اب یہ شخص میرے قبضے میں ہے۔ میں اس کو قتل کرنے کے لیے یہاں لایا تھا مگر اس نے خود ہی اپنی جان کے بدلے ایک سودا کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں سودا کر لوں۔ مگر میں ایک مفرور مجرم ہوں اور مجھ پر بہت سے جھوٹے مقدمات قائم ہیں۔ میں قانونی معاملات طے کرنے کے لیے عدالت میں حاضر ہوا تو عدالت مجھ سے پہلے میرے جرائم کا حساب پوچھے گی۔ جو اسپتال میری فیکٹری کی جگہ بن رہا ہے جمشید وہ اسپتال مجھے دینے پر تیار ہے۔ اس کے وکیل میرے وکیل سے مل کر سارے معاملات طے کریں گے۔ یہ شخص اسپتال کی عمارت اور سازوسامان کے لیے سرمایہ بھی فراہم کرے گا۔ تکمیل تک عمارت کا قبضہ میرا دوست اور وکیل عبدالودود لے گا۔ وہ خود تم سے ملنے آئے گا۔ اسپتال کے مکمل ہونے میں تو شاید سال چھ مہینے لگ جائیں۔ اس کی لاگت کا جتنا تخمینہ ہے اتنی رقم خسرو جمشید کے اکاؤنٹ سے عبدالودود کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو جائے گی تو پھر تکمیل کا کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔ جب تک منتقلی کے قانونی معاملات پوری طرح طے نہیں ہو جاتے تم اس شخص کو اپنی تحویل میں رکھو گے... سب سے چھپا کے... کیا تم یہ کام کر سکتے ہو؟"

جیکی مسکرایا۔ "کتنے سال رکھنا ہے؟"

"زیادہ سے زیادہ دو ماہ" میں نے کہا۔ "تم اس کے اور میرے وکیلوں سے ملاقات بھی خود ہی کراؤ گے لیکن اس طرح کہ کسی کو بھی معلوم نہ ہو... خصوصاً اس کے وکیل کو بالکل پتا نہ چلے کہ تم کون ہو اور تم نے جمشید کو کہاں قید کر رکھا ہے... تم جمشید سے پوچھ کر اس کے وکیل کو بلواؤ... یا اس کی فون پر بات کرا دو۔ انھیں آنکھوں پر پٹی باندھ کے لاؤ کسی بند گاڑی میں۔ اصل بات یہ ہے کہ سارا کام ختم ہونے تک جمشید کی موجودگی صیغۂ راز میں رہے اور جب تک میرا وکیل کلیئرنس نہ دے تب تک اسے چھوڑا نہ جائے۔ اگر بعد میں یہ کسی بھی معاملے میں بدعہدی کرے تو تمھیں ہر طرح کا اختیار ہے جس طرح چاہو اس سے کام کراؤ۔"

www.paksociety.com

اور بالفرض محال کام کسی صورت نہ بنتا ہو یا اندیشہ ہو کہ یہ بھاگ جائے گا یا اس کو چھڑانے والے چھاپا مار کر لے جائیں گے... تو پھر اس کے ساتھ وہی کرنا جو آج تک تم نے اپنے دشمنوں اور بدخواہوں کے ساتھ کیا ہے۔ مختصر بات یہ کہ تمھیں میرا کام کرانا ہے۔ جمشید تمھاری تحویل میں رہے اور کام لیتے ہو گا نہ بتانے کے لیے میز وکیل تو تب سے بطور رکھے گا۔ کیا اتنا کافی ہے؟"

"یہ بہت کافی ہے۔" جیکی بولا۔ "آج سے دو مہینے کے اندر وہ اسپتال تمھارا ہوگا۔ اس کی تکمیل کی ضمانت کے ساتھ... ہم یہ ذمے داری قبول کرتے ہیں۔"

"اگر ایسا نہ ہوا تو دو ماہ کے بعد تم کو اس کی لاش مل جائے گی۔ جگہ طے کرنے کے آلات اور تعمیر کرنے کی مشین کے ساتھ جیل کا گیٹ اور کتنے بھی ہم فراہم کریں گے۔" جونی نے کہا۔

"تم نے مجھے بہت بڑے بوجھ سے آزاد کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم نے اپنے خلاف مقدمات کے بارے میں نہیں بتایا... ہم عدالت کے گواہ وغیرہ پیش کرنے کا ٹھیکا بھی لے سکتے ہیں۔" جیکی بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "تفصیلات میں پھر کبھی بتاؤں گا... وہ غیر ضروری ہیں۔"

"یہ تو ضروری ہے کہ ہمیں تمھارا نام معلوم ہو... اصلی نام؟"

"ہاں... دوست مجھے سکندر بخت کے نام سے جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"سکندر بخت!" ان دونوں نے ایک ساتھ چونک کے کہا۔

"اوہ نو..."

"اوہ یس۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "میں اب شیطان کی طرح مشہور ہوں۔"

"اوہ مائی گاڈ... تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ تمھیں تو ہم ایسے جانتے ہیں جیسے... جیسے رابن ہڈ کو۔" جیکی بولا۔ اردو کی کسی داستان کا کردار [illegible] یاد آیا۔

"تمھارے بارے میں ہم بہت کچھ پڑھتے رہے ہیں... تم تو ہیرو ہو ایک عوام کے ہیرو۔" جونی بولا۔ [illegible]

"میں سپر ہیرو ہوتا تو یہ دنیاوی مشکلات کیا تھیں۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "مشکل تو یہی ہے کہ میں ایک عام آدمی ہوں۔ بہت معمولی سا حقیر اور کمزور... جسے کامل اعتقاد ہے تو خدا کی ذات پر اور اس کے قانون مطلق ہونے پر۔ چنانچہ میں جو کچھ کرتا ہوں انجام کی پروا کیے بغیر کرتا ہوں... انجام تو صرف وہ جانتا ہے... پھر میں کیوں ڈروں... جو ہونا ہے وہ تو ہوگا۔"

"مگر... تم نے تو دھاک بٹھا رکھی ہے..." میں مسکرایا۔

"یہ سچ ہے کہ تم نے دشمنوں کے بہت سے قلعے فتح کیے ہیں۔ ان کی فوج کتنی تھی... تم نے سب کو تہس نہس کر دیا۔ ان کے قریب تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکی اور تم نے سب کا قلع قمع کر دیا۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ "کہنے کو لوگ بڑھا چڑھا بھی دیتے ہیں۔ مختصر آج تجربہ ہوا کہ داستان ہوتی ہے تو ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچتے پہنچتے حقیقت کا عنصر کتنی تیزی سے کم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ حقیقت غائب ہو جاتی ہے اور صرف افسانہ رہ جاتا ہے۔ یہ ہم سب کی کمزوری ہے کہ ہم حقیقت سے داستان کو زیادہ دلچسپ اور دلکش پاتے ہیں جیسے سپرمین اور ٹارزن جیسے افسانوی کردار اپیل کرتے ہیں اور ہم ہیرو ورشپ کے عادی ہیں۔ ہر شخص کے ذہن میں اس کے تصوراتی ہیرو کا ایک خاکہ ہوتا ہے جو کبھی کرکٹر ہوا اور کبھی آرٹسٹ یا سیاسی لیڈر... ہر صورت یہ وہ غیر معمولی صفات اور اعلیٰ ترین اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔"

"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔" میں نے کہا۔ "اچھے بھائی کچھ بھی نہیں... تم جیسا آدمی ہوں۔ میں نے ایسا کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا اور نہ یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی ایک فوج کو شکست دے سکے۔ یہ تو ایسی فلموں میں ہوتا ہے جس پر اب بچے بھی ہنستے ہیں۔"

"وہ دراصل... سُنا بہت کچھ ہے تمھارے بارے میں۔ اور اخباروں میں تمھارا نام بھی دیکھا ہے۔" جیکی جھینپ کر بولا۔

"آخر کوئی تو وجہ ہوگی۔" جونی نے تائید کی۔

"یہ ٹھیک ہے کہ مجھے چند ملک دشمن عناصر کا سامنا ہوا اور میں نے ان کے ایک دو ٹھکانے بھی تباہ کیے مگر میں اکیلا نہیں تھا۔ میرے ساتھ میرے دوست بھی تھے... بہت کچھ ساتھی تھے۔"

"اوہ یس... وہ ایک نام یاد آیا ہے مجھے۔ جسن..."

"بالکل ٹھیک۔" جیکی نے چٹکی بجا کے کہا۔ "اور ایک لڑکی ہے... بالکل صوفیہ لارین... ویسی ہی تھی۔ جو تمھاری سویٹ ہارٹ ہے... کیا نام ہے اس کا...؟"

"رابعہ... رابعہ..." جونی نے فوراً کہا۔ "واٹ اے ونڈر فل گرل...!"

"مگر... وہ لڑکی... جو اس دن تمھارے ساتھ تھی۔" جیکی نے سوچ کر کہا۔ "وہ کون تھی... وہ رابعہ تو نہیں تھی..." "کیا بگڑتا ہے اور آج ہم دونوں کس نام سے... وائی ڈونٹ یو فول... گلاب کو کسی بھی نام سے پکارو وہ گلاب ہی رہتا ہے۔"

"ہاں... وہ کچھ ایسا ہی شیکسپیئر نے کہا تھا کہ نام میں کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہماری ایک ٹیچر تھی جینیفر کالج میں... شی واز کریزی اباؤٹ شیکسپیئر۔" جیکی بولا۔ "ویسے تمھاری جگہ میں ہوتا تو اسے بدلی کہتا۔"

"میں رابعہ پسند کرتا ہوں... کیونکہ میں رابعہ کو پسند کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہ تم نے کیا حلیہ بدل رکھا ہے؟" جیکی بولا۔ "تمھاری اصل صورت تو کچھ رچرڈ برٹن سے ملتی جلتی ہے۔"

"اوہ نو... جان وائن سے..." جونی نے کہا اور ان کے درمیان زبردست تکرار شروع ہو گئی۔

"پلیز... پلیز..." میں نے کہا۔ "نہ میری صورت رچرڈ برٹن سے ملتی ہے نہ جان وائن سے... میری صورت صرف اپنے آپ سے ملتی ہے۔"

جیکی نے سر ہلایا۔ "تم واقعی خوش مزاج بھی ہو... مجھے تو بالکل یقین نہیں آتا کہ تم ہو... میں سچ بتاؤں... میں تم جیسا بننا چاہتا ہوں... لیکن بن نہیں سکتا۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

"کیوں نہیں بن سکتے؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ میں جان گیا ہوں کہ صرف جیکی ہوں۔" وہ بولا۔

"جیکی... مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔" جونی نے کہا۔ "تقریباً ایک مہینہ پہلے ڈیڈی کی اس سے بحث ہوئی تھی۔ ڈیڈی نے اخبار میں تمھاری کسی پریس کانفرنس کا حال پڑھا تھا۔ تم نے مودی کو پکڑا تھا اور شاید کوئی قلعہ بھی فتح کیا تھا۔"

"قلعہ نہیں... ایک اسلحہ خانہ تباہ کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"ڈیڈی نے تمھاری بہت تعریف کی اور کہا کہ ملک اور قوم کو ایسے ہی جوانوں کی ضرورت ہے۔" جونی بولا۔ "اور معلوم نہیں کیوں وہ بگڑ گیا۔ ہمارے چچا ڈیڈی کے واحد فیملی کا برادر ان لاء... اس نے کہا کہ یہ سب اخبار والوں کا ڈراما ہے ورنہ وہ ایک قاتل اور ڈاکو ہے جیل سے بھاگا ہوا مجرم ہے اور پھر ان کے درمیان خوب بحث ہوئی تھی۔ اب میں سمجھ رہا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔"

"میں بھی سمجھ رہا ہوں۔" جیکی نے سر ہلایا۔ "وہ تمھارا ایک دشمن تھا اور یہی وجہ تھی کہ تم دونوں جب ہمارے گھر میں ملے تو تم نے ایک دوسرے کی جان لینے کی کوشش کی۔"

"تم ٹھیک سمجھے ہو... اور سب جانتے ہو اس لیے تمھیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں رہی۔" میں نے کہا۔ "میں تم پر پورا بھروسا کرتے ہوئے ایک کام تمھیں سونپ رہا ہوں۔"

"اس کے علاوہ کچھ بتاؤ... تمھیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟" جیکی بولا۔

"کسی بھی وقت... دن رات کی پروا کیے بغیر..." جونی نے کہا۔ "تم ہمیں بلا سکتے ہو... ہمارے پاس آ سکتے ہو... ہمیں فون کر سکتے ہو... یہ جگہ تو دیکھ ہی لی ہے تم نے... تم کو یہاں کوئی نہیں دیکھ سکتا... تم یہاں رہ سکتے ہو کیونکہ ڈیڈی بھی ادھر نہیں آتے۔"

"اور آ بھی جائیں تو کیا... ہی از یور فین ٹو۔"

میں ہنسنے لگا۔ "مجھے ان کی دعائیں چاہئیں... مگر دوستو! ابھی تم اس بات کو سیکرٹ رکھو گے... یوں سمجھو کہ ہم ملے ہی نہیں... یہ ایک طرح سے میری بہت بڑی مدد ہوگی کہ تمھاری مورل سپورٹ حاصل ہے مجھے... یہ جگہ... تمھارا ٹیلی فون نمبر سب میرے ذہن میں ہے... اگر مجھے ضرورت پڑے گی تو میں ضرور آؤں گا یا کال کروں گا... لیکن فی الحال اپنے جذبات کو قابو میں رکھو اور کسی سے کچھ مت کہو... اگر یہ کام کر دیا تم نے... جو میں نے تمھیں سونپا ہے... تو یہ ایک احسان ہوگا مجھ پر..."

مالی نے دروازے کو انگلی سے بجایا۔ "کھانا حاضر ہے مالک۔"

"لے آؤ۔" جیکی نے کہا۔ مالی ایک ٹرالی دھکیلتا ہوا لایا۔ اس میں اوپر نیچے درمیان کی تینوں ٹرے کھانوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایسے کھانوں کی مدت سے میں نے خوشبو تک نہیں سونگھی تھی۔

"یہ سب... اتنے کم وقت میں کہاں سے اکٹھا ہو گیا...؟" میں نے کہا۔

"میرے نوکر جانتے ہیں کہ کہاں سے کون سی چیز لانی ہے۔" جیکی نے فخر سے بتایا اور پھر تفصیل سے بتانے لگا کہ مرغ بریانی کس ہوٹل کی ہے اور مرغ قورمہ کس ہوٹل کا ہے... اب چونکہ صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی تھی، اس لیے میں نے خسرو جمشید کو بھی کھانے کی اجازت دی مگر اسے الگ بٹھایا۔ میرے لیے اس شخص کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کے کھانے کا خیال ہی اذیت ناک تھا جسے میں اپنا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔

"واٹ اباؤٹ ویٹ گرل؟" جیکی کھاتے کھاتے بولا۔

"وہ سو رہی ہے... بہت تھکی ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔

"لیکن وہ ہے کون؟"

"ابھی میں خود نہیں جانتا... کہ وہ دوست ہے یا دشمن۔" میں نے کہا۔

"پھر اسے ساتھ کیوں لیے پھر رہے ہو؟" جیکی بولا۔

"تمھیں کیوں اعتراض ہے اگر وہ ایک گرل فرینڈ ساتھ رکھتا ہے۔" جونی بولا۔

میں مسکرایا۔ "ہے تو وہ گرل فرینڈ... لیکن صرف زبانی جمع خرچ ہے... ہم ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے ہیں۔"

"کمال ہے... پھر بھی کہتے ہو کہ..."

www.paksociety.com

"ہاں... دراصل وہ سرحد پار سے آئی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کشتی بنانے صرف میرے گھر لیے... مجھے شک ہے کہ جاسوسی کے لیے... وہ جنازہ بھی ہے۔"

"پھر تو تمہارا شک جائز ہے۔" جیکی بولا۔

"شک بالکل غلط ہے۔" جونی نے کہا۔ "یہ بچپن کی محبت ہے اور خالص ہوتی نہیں سکتی۔"

"تم کیا جانو... تمہیں کس سے محبت تھی بچپن میں یا کسی کون سی لڑکی ہے...؟"

"میں نے ناولوں میں پڑھا ہے... فلموں میں دیکھا ہے۔" جونی بولا۔

"وہ سب بکواس ہے... میں جانتا ہوں۔"

"تم کچھ نہیں جانتے۔"

"میں تم سے بڑا ہوں... دس منٹ۔" جیکی نے منہ پر مکا مارا۔

"تم دونوں بالغ ہو کے بھی بچے ہو۔" میں نے ان کی جنگ پھر ختم کی۔ "میں اس عورت کو یہیں ہی الان چھوڑ کے جا رہا ہوں۔"

جیکی کا ہاتھ رک گیا۔ "ہمارے پاس؟"

"ہاں... کیا تم اسے نہیں رکھ سکتے؟" میں نے کہا۔

"لیکن کیا وہ رہے گی؟"

"اسے رہنا پڑے گا... قید میں رکھنا ضروری نہیں... بس اس سے کہہ دینا کہ میں واپس آؤں گا اور وہ میرا انتظار کرے۔"

"لیکن... شی از میری بیوٹی فل..." جیکی نے بے بسی سے کہا۔

"اور ہم... اگر امانت میں خیانت ہو گئی تو... دوستی کا نام بدنام ہو جائے گا۔" جونی بولا۔

"نہیں ہو گا..." میں نے اسے آنکھ ماری۔ "وہ تمہاری اچھی گرل فرینڈ ثابت ہو گی۔ اس کے عیش و آرام کا خیال رکھنا اور اسے شاپنگ... قسمت اینڈ نائٹ... پھر وہ کہیں نہیں جائے گی... اور جانا چاہے تو جانے دینا... کچھ ایسا بندوبست کرنا کہ اسے احساس نہ ہو کہ وہ قید میں ہے لیکن وہ بھاگنے نہ پائے۔ میں بہت جلد واپس آؤں گا... شاید ایک ہفتے بعد تو اسے لے جاؤں گا۔" میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میں جا رہا ہوں۔"

وہ پھر دم بخود رہ گئے۔ "یہ کیا ہوا... بیٹھے بیٹھے؟"

"میں جلدی میں ہوں۔" میں نے کہا۔ "قسمت کو تم سے ملانا تھا اس لیے یہاں آ گیا تھا... میری منزل کچھ اور ہے۔"

"تمہیں... پیسہ وغیرہ تو نہیں چاہیے؟"

"تمہیں پیسے کی ضرورت ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں اپنی قسمت آزمانے جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ڈھیروں رکھے ہیں میرے پاس۔"

"اب تم کہاں جاؤ گے؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "باہر آؤ... اپنے دونوں محافظوں کو خدا خود کر وہ یہاں انتظار کریں... تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہو گا... شہر تک...۔"

جیکی اور جونی بھی کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ جونی نے منہ میں انگلی ڈال کے سیٹی بجائی اور جیب ہاتھ ... دیا کہ وہ دونوں میں سے ایک محافظ کو بلا لے۔

"تم لوگ سب سمجھ گئے ہو نا؟" میں نے باہر آ کے کہا۔ "میں کراچی جا رہا ہوں... وہاں سے میں تم کو فون کرتا رہوں گا... معلوم کرنے کے لیے کہ پیرو گیس کیا ہے... اور سب ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں۔"

"پہلے اس شکل نام والے وکیل کو بھی سمجھا دیا تھا۔"

"تم اسے صرف منتظر کہہ سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "وہ تم کو فون کرے گا۔"

"یہ گاڑی تمہاری ہے؟" جیکی بولا۔

"نہیں... تم اسے لے جاؤ... اور کسی بھی سڑک پر یا پولیس اسٹیشن کے سامنے چھوڑ دو... یہ میں نے چوری کی تھی۔" میں نے کہا۔ "پولیس خود اسے منظر کر کے گھر پہنچا دے گی......"

"ایک بات اور... تم کو اپنی دوسری ماں کی طرف سے ہوشیار رہنا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ وہ خسرو جمشید کی بہن ہے۔"

وہ اچھل پڑے۔ "بہن... یہ کیا ہے... ہر بار کتنے کے بعد تم ایک بم گرا دیتے ہو۔"

"وہ خسرو جمشید کی حقیقی بہن ہے۔" میں نے کہا۔ "جب تم جمشید کو قید میں رکھو گے تو وہ ایک پرابلم ہو گی... میرا مطلب ہے اسی گھر میں اگر بہن بھی ہو گی تو تمہارا کام زیادہ مشکل ہو جائے گا۔"

"مشکل تو ہو جائے گا... لیکن ہم ہینڈل کر لیں گے۔" جیکی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تم مطمئن رہو۔"

"جونی... تم میرے ساتھ چلو۔" میں نے کہا۔ "مجھے ملتان سے ایک کار خریدنی ہے... کار یا جیپ... پچاس ساٹھ ہزار تک جو کراچی تک سفر کے قابل ہو۔ اس کی رجسٹری وغیرہ سب بوگس نام سے ہونی چاہیے... تاکہ میں محفوظ رہوں۔"

"نو پرابلم..." جونی نے چٹکی بجا کے کہا۔ "تم کار والا اور جو باقی کام مجھ پر چھوڑ دو... ایک گھنٹے میں یہ چیزیں مل جائیں گی۔"

جونی نے واقعی ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ میں نے دیکھا ہر جگہ اسے لوگ جانتے تھے۔ یہ اثر و رسوخ کی بات تھی۔ پیسے کی یا ذاتی تعلق کی... ملتان میں اس کے بہت دوست تھے۔ نیچے سے اوپر تک وہ ہر کام کرا سکتا تھا۔ وہ شام تک میرے ساتھ رہا اور اس نے میرے بہت سے ایسے کام کیے جو میں اکیلا نہیں کر سکتا تھا۔

اس بار مجھے ایک اوپل ریکارڈ ملی جو چھپا سنڈر کا ماڈل تھا اور اس کا آئس سوسی ہی کا انجن ہے عمدہ ٹائر اور میک زدہ تھا۔ یہ گاڑی کار تھی اور مجھے کچھ مہنگی بھی پڑی تھی لیکن جونی نے بیچ کھو کر دیا اور کچھ تو خود بھی اس پہ عاشق ہو گیا۔ اس کی ہیڈ لائٹس جو گول تھیں اور پیچھے کی لائٹس بالکل گول۔ آدھے دائرے میں ونڈ اسکرین اور انڈی کیٹر... دوسری کے آدھے دائرے سے ایک ونڈ اور پارکنگ لائٹ اس کی ڈکی بھی بڑی تھی اور پیچھے والی سیٹ بھی۔ جونی نے رجسٹریشن کے کاغذات میں میرا نام سعادت علی خان گردیزی لکھوایا اور اس کا پتا دیا۔ اس نے کہا اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوئی تو ہم یہاں نمٹ لیں گے۔ اس نام سے تم جانے پہچانے غیر ثابت ہوتے ہو۔

جونی کی مدد سے ہی مجھے ڈرائیونگ لائسنس بھی خاص بہ میرے نام تھا لیکن تصویر قدرے مختلف تھی۔ میں جونی کے سوٹ میں تھا۔ اس نے مجھے اپنے دو سوٹ دے دیے تھے اور کچھ نئے بھی بازار سے خرید لیے تھے۔ ہیٹ جو سوٹ مانی میرے فریم کے چشمے اور گنجے سر کے ساتھ میں ایک مڈل اور فزرلس ایجنٹ یا سیکرٹری کے لیول کا بگ باس نظر آتا تھا۔ مجھے روکنے یا چیک کرنے کی ہمت کرنے سے پہلے ڈی ایس پی لیول کا پولیس افسر بھی دو بار سوچتا۔

تمام کوششیں نے جونی کو خدا حافظ کہا اس وقت بھی جب وہ میرے ساتھ تھا میں نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا جو پہلے نہ سمجھا سکا تھا۔ اب ان دونوں پر میرا اعتماد قائم ہو چکا تھا اور میں مطمئن تھا کہ ایک طرف سے ذمے داری اور پریشانی کا بوجھ بھی کم ہوا اور ایک مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

رات کے نو بجے میں نے کار کو عین اس مقام پر روک لیا جہاں میں نے ایک جھاڑی میں دو سوٹ کیس پھینکے تھے۔ اس تنگ سڑک پر اب خاصی روشنی تھی اور نہ خسرو جمشید کے مرحومین... مگر دونوں سوٹ کیس وہیں پڑے ہوئے تھے۔

میں نے دونوں سوٹ کیس ڈکی میں ڈالے اور کچھ دیر اس منظر کے تصور میں گم رہا جس کے نکڑ پہ اسی سڑک پر یہاں سے الٹی ٹیک بکھرے ہوئے تھے لرزتا ہوا کیپ سے یہاں تخریب کار خود اپنے جیسے نے جیسے ہی انجام کا شکار ہو گئے تھے۔ اس مقام تک جہاں میں نے اور موہنی نے چھپ کر ایک رات بسر کی تھی اور آخری خونی جھڑپ تک جس میں خسرو جمشید کا ہم صورت مارا گیا تھا۔ اب یہاں کوئی نہیں تھا۔

میں نے گاڑی کا رخ موڑا اور واپس اسی راستے پر روانہ ہو گیا۔ آگے ایک طویل رات کا سفر تھا جس میں میرے ساتھ صرف میری یادیں تھیں اور سوچیں تھیں اور میرے اندیشے تھے۔ کیا جیکی اور جونی وہ سب کچھ کر لیں گے جو میں نے ان کو سمجھایا ہے۔ خسرو جمشید یا اس کی بہن ان کے ارادوں کی شکست کا سبب تو نہیں بن جائیں گے۔ موہنی کا ردعمل کیا ہو گا؟ میں اُسے کچھ بتائے بغیر بھاگ آیا تھا۔ دراصل میں اس کو ساتھ رکھنے کے اعصابی دباؤ اور ذہنی انتشار سے بچنا چاہتا تھا۔ رابعہ کی تلاش میں میرے ساتھ رابعہ کے خیال کی رفاقت اور اس کی چاہت اور اس کے جمال دل نشیں کا تصور بہت تھا۔

مجھے بہت سے کام بھی کرنے تھے۔ ان میں سرفہرست عبدالودود جنفر کو فون کرنا تھا اور اسے تمام صورت احوال سے آگاہ کرنا تھا۔ اُسے یہ بتانا تھا کہ اگر محسن یا ثاقب میں سے کوئی اس سے رابطہ قائم کرے تو انھیں میری خیریت سے مطلع کر دے۔ مجھے شہلا کی خیریت بھی دریافت کرنی تھی اور اس سے پوچھنا تھا کہ رابعہ نے یا اکرام شیخ میں سے تو کسی کا کوئی پیغام نہیں ملا۔

صبح میں حیدرآباد میں تھا۔ رات بھر کی ڈرائیونگ نے مجھے جسمانی طور پر بہت تھکا دیا تھا۔ اس سے گزشتہ رات بھی میں نہیں سویا تھا اور اگر رابعہ کی کشش نہ ہوتی تو میں دوسری رات جاگ کر ڈرائیونگ کا تصور محال تھا لیکن جیسے جیسے فاصلہ کم ہو رہا تھا میرے ذہن سے سب کچھ فراموش ہو رہا تھا اور رابعہ جو کہیں وحشت خیال کی وسعتوں میں گم تھی اپنے قرب کی خوشبو سے میرے قلب و نظر کو مہکانے لگی تھی۔ یادِ ماضی کا ہر نقش جاگ اٹھا تھا اور ایک خواب بن گیا تھا۔ اس خواب کی تعبیر میری دسترس میں ہونے لگی تھی۔ قریب آتی جا رہی تھی۔ خواہشوں میں رنگ جنوں شامل ہونے لگا تھا۔

حیدرآباد میں مجھے سفر ملتوی کرنا پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری جسمانی توانائی کا گراف نیچے آ گیا ہے۔ کئی بار میری آنکھیں خود بخود بند ہوئیں اور جو تیری چنگی حس نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ میں نے خود کو تر و تازہ رکھنے کی کوشش کی... رابعہ کا چہرہ میرے ذہن کے ... نہیں رہا تھا اور ایسی حالت میں کار تیز چلانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

میں نے ایک ہوٹل میں دن بھر قیام کا فیصلہ کیا۔ رات اس اعتبار سے محفوظ رہی تھی کہ مجھے کسی نے روکا نہیں تھا۔ جہاں کہیں بھی چیک پوسٹ آئی تھی میں نے اپنی رفتار اس حد تک کم کر لی تھی کہ دیکھنے والے مجھے ایک معزز شخصیت کے روپ میں دیکھیں۔ انھوں نے مجھ سے تعرض نہیں کیا تھا۔ میں انھیں کسی بھی پہلو سے مشکوک نظر نہیں آیا تھا۔ الٹا وہ مجھے روکنے سے بھی اس لیے گریز کرتے رہے کہ عموماً ایسی فرض شناسی کا صلہ خرابی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

ایک بیل بوائے میرے دونوں سوٹ کیس اٹھا کے

www.paksociety.com

وہ آئی پی سوئٹ میں لے گیا جو اتفاق سے صبح ہی خالی ہوا تھا۔ میں نے غسل کے بعد ناشتا روم سروس سے طلب کیا اور ناشتے کے بعد سو گیا۔ اٹھا تو لنچ کا وقت گزر چکا تھا، شام کے پانچ بج رہے تھے چنانچہ میں نے صرف کافی اور سینڈوچ طلب کیے۔

مجھے رات کو پھر سفر کرنا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ آٹھ بجے روانہ ہو جاؤں تو دس بجے تک کراچی پہنچ جاؤں گا۔ جسم مزید آرام کا متقاضی تھا تو دل تاخیر کا روادار نہ تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں رات بھر سو کے صبح چھ بجے روانہ ہو جاؤں اور صبح کے آٹھ بجے کراچی پہنچ جاؤں۔ یوں میں بالکل تازہ دم پہنچوں گا تو مجھے پورا دن ملے گا۔ رابعہ، نازو یا اکرام شیخ کا پتا چلانا آسان نہ ہوگا۔ اس کا تو مجھے اندازہ تھا۔ مضافات اور جھگیوں میں بسنے والے لاکھوں افراد میں سے کسی لاوارث اور گمنام شخص کو تلاش کیا جا سکتا تھا مگر جو روپوش ہو، اس کا پتا کون بتائے گا۔

دروازے پر دستک سُن کے میں نے کہا 'یس' تو روم سروس کا ویٹر کافی کے ساتھ کلب سینڈوچ کی پلیٹ رکھ گیا۔ اسی ٹرے میں اخبار بھی تھا۔ اوپر کے صفحے کو میں نے سینڈوچ اٹھاتے ہوئے اور کافی پیتے ہوئے سرسری نظروں سے دیکھا۔ اس پر بین الاقوامی اور اہم ملکی خبریں تھیں۔ مشرقی پاکستان کی نازک صورت حال کے ابتر ہوتے ہوئے حالات کی تفصیل پڑھنے سے میں نے عمداً گریز کیا۔

یہ کراچی سے آنے والا اخبار تھا۔ اندر کا پہلا صفحہ شہری مقامی خبروں کے لیے وقف تھا۔ دلچسپ خبریں باکس میں لگائی گئی تھیں۔ ایسی ہی ایک خبر نے مجھے متوجہ کر لیا۔ چند سطروں کی خبر تھی مگر میں نے جسے پڑھا تو میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کافی کا مگ میرے ہاتھ میں تھا۔ جب گرم کافی میرے کپڑوں پر گری تو ہوش آیا۔ اس خبر نے میرے ہوش گم کر دیے تھے اور میں نے محسوس کیا کہ میرے دل کی دھڑکن میں طوفانی شدت آ گئی ہے۔ پسینے کی نمی جو میرے ماتھے پر نمودار ہوئی تھی اب میرے جسم پر ٹھنڈک بن کے پھیل رہی تھی۔ خوف بن کے میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر رہی تھی۔

خبر میں بتایا گیا تھا کہ ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی جس کو بندرگاہ کے علاقے سے مردانہ لباس میں گھومتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا، پراسرار طور پر پولیس کی تحویل سے فرار ہو گئی۔ پہلے تھانے سے ملی اطلاع کے مطابق اس نے اپنی حفاظت پر مامور دو پولیس والوں کو زخمی کر دیا۔ ڈیوٹی پر موجود ایک اے ایس آئی کو اسی کے پستول کی ضرب سے بے ہوش کر دیا اور شکایت درج کرانے کے لیے آنے والے ایک تاجر سے اس کی گاڑی چھین لی جسے اس نے فرار کے لیے استعمال کیا۔ دونوں پولیس والوں کو بازو اور ٹانگوں کے فریکچر کے باعث ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ ڈیوٹی افسر کو غفلت برتنے کے الزام میں معطل کر دیا گیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ لڑکی کسی خطرناک تخریبی گروہ کی رکن ہو سکتی ہے۔ پولیس اسے سرگرمی سے تلاش کر رہی ہے۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

خبر پڑھ کر مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ ایک ایسی خبر تھی جسے محدود حلقے میں مقامی خبروں کے درمیان جگہ ملی تھی۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ اس خبر کو لاہور یا راولپنڈی کے اخبارات نے بھی شائع کیا ہو۔ وہاں کی مقامی خبروں کے لیے دوسرے سنسنی خیز واقعات ہوں گے۔ چنانچہ رحمت یا غالب اور میرے دوسرے ساتھیوں کو اس خبر کی تفصیلات معلوم ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ کراچی کے دوسرے اخبارات سے مجھے اضافی معلومات حاصل ہو جاتیں۔ ہر اخبار کا نمائندہ اپنے وسائل رکھتا ہے اور کسی خبر کی تہہ تک پہنچنے کے لیے محنت کرتا ہے۔ اس کا انحصار اس کی ذاتی دلچسپی اور لگن پر ہوتا ہے۔

مجھے ذرا بھی شبہ نہ تھا کہ وہ آفت کی پرکالہ جس نے اس سنسنی خیز خبر کو جنم دیا، نازو کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ خبر میں اس کا نام تو نہیں تھا مگر ہر سطر پکار پکار کے کہتی تھی کہ کوئی معجزہ ہے اس پری وش زنگاری میں تو وہ نازو ہے۔ اس نے جانے کون کون سے غیر معمولی داؤ پیچ اور سو سو طرح حرکت کرنے والے پولیس والوں کو بتا دیا کہ بجلی کیسے کوندتی ہے اور جس پر گرتی ہے اسے کمند بے دست و پا چھوڑ جاتی ہے۔

اس منظر کے تصور سے ہی مجھے ہنسی آ گئی جب پولیس کے تیس مار اکڑ خان قسم کے جوانوں پر انکشاف ہوا ہوگا کہ 'سوہنا منڈا' تو درحقیقت الٹی کھوپڑی کی بلا ہے۔ اور اس ناقابل اعتبار تبدیلی جنس کے کیس پر ان کی عقل دنگ ہوگئی ہوگی تو نازو کے حسن و قیامت خیز نے ان کے دل پر چھری پھیر دی ہوگی۔ تعجب کہ وہ واقعی قسمت پر رشک کر رہے ہوں گے جس نے ان کے ہاتھوں میں ایسا مال کو خوش کرنے والا کیس دیا اور سب [illegible] کے لیے بے قرار ہوں گے۔ پھر چشم زدن میں انہوں نے وہ دیکھا ہوگا جو ان کے تصور میں بھی نہ ہوگا اور جب ہوش آیا ہوگا تو نظر آیا ہوگا کہ ابھی وہ بھی وہ تو فسانہ ہو گیا۔ کی داستان عبرت بنے پڑے ہوں گے۔ نازو ایک جادوگر تھی جو تماشا دکھاتے وقت ناظرین کی توجہ ایک طرف مرکوز کرتا ہے تو دوسری طرف ہاتھ کی وہ صفائی دکھاتا ہے جو بالکل ناممکن اور جادو کا کرشمہ لگتی ہے۔ نازو بھی بے حد عیاری اور چالاکی سے سب کو اپنے حسن بے مثال، اپنی نزاکت و رعنائی اور حسن کی اداؤں کے جال میں بے بس کرنے کی اہل تھی اور جب وہ دیکھتی تھی

کہ سب بے بس ہو گئے ہیں تو وہ یوں حرکت میں آتی تھی کہ اس سے [illegible] کرتا دیکھ پاتی تھی اور نہ عقل سمجھ پاتی تھی۔

سب سمجھتے ہوں گے ایک روحانی پیکر کمزور سی لڑکی صنف نازک [illegible] جان کے اس کی طرف سے غافل ہونے کی غلطی [illegible] مطمئن ہو گئے ہوں گے کہ اتنے شیر دل مسٹنڈوں کے [illegible] کہاں جا سکتی ہے۔ پھر اسے [illegible] ہونے کا فائدہ بھی ملا ہوگا جو اس کے ساتھ تھانے میں [illegible] ہوگا جو ہر نئے مہمان کے ساتھ روایتی طور پر کیا جاتا ہے اور یہ احساس دلانے کے لیے کیا جاتا ہے کہ [illegible] مطلق العنان حکومت کی حدود میں قدم رکھ چکے ہیں [illegible] خوف خدا وغیرہ کا کوئی کام نہیں۔ ہاں کام ہے [illegible] کے نام کا، رشوت یا سفارش کا، جیسا کام ویسے دام [illegible] آشنا ہی بڑا نام ہو تو آرام ہی آرام ورنہ جیسا حرام [illegible] ایک الزام۔

نازو کے متعلق بہت کچھ اخبار کی اس مختصر خبر میں نہیں تھا۔ [illegible] بندرگاہ کے علاقے سے کیوں گرفتار کیا گیا تھا۔ بندرگاہ [illegible] نازو ثابت کرتا تھا کیونکہ میری آخری اطلاعات کے [illegible] نازو اور اکرام شیخ دونوں دبئی میں سرگرم عمل پائے گئے تھے۔ خبر [illegible] اکرام شیخ کا تذکرہ بھی نہیں تھا۔ اس نے دبئی جیل کی رہائی میں کوئی [illegible] نہیں کیا تھا مگر یہ ناممکن تھا کہ وہ قریب و جوار میں موجود [illegible] گرفتاری کے وقت نہ ہوا تو بعد میں تھانے کے آس پاس [illegible] ہوگا۔ تاہم میں اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا [illegible] اکرام شیخ نے کسی خطرناک مشن پر اسے ہمراہ رکھنا مناسب نہ سمجھا [illegible] کسی حصول سے کام کو آسانی سے نکلتے دیکھ لیا ہو۔

نازو کا مردانہ حلیے میں پھرنا ایک دلچسپ بات تھی۔ اس [illegible] معلوم ہوتا تھا کہ جس نے مکمل طور پر خود کو ٹیم آر ایس کے مشن کے لیے وقف کر دیا ہے اور اپنے ساتھ بھائی کو بھی شامل کر لیا ہے۔ [illegible] جانتے ہیں کوئی اطلاع تھی یا نہیں وہ دوسروں سے [illegible] کرنے کی کوشش کر چکے تھے یا نہیں اور انہیں ہمارے [illegible] علم تھا یا نہیں ان سوالات کا جواب وہ خود ہی دے سکتے تھے [illegible] ایک بات واضح تھی۔

نازو اور اکرام نے اپنا علیحدہ محاذ کھول رکھا تھا انہوں نے [illegible] سے کٹ کر اور ٹیم آر ایس کے مرکز سے جدا ہو کے رہنمائی [illegible] نہیں کیا تھا اور نہ انہیں کوئی توقع تھی کہ وہ کسی سے [illegible] کارنامہ سرانجام دینے کا اعزاز حاصل کریں۔ وہ حالات [illegible] گئے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بہت [illegible] ایک بٹالین دشمنوں کے علاقے میں محصور ہو جائے تو اپنی بقا کے لیے ہائی کمان کی پالیسی اور ان کے مشوروں اور ان کی ہدایات کے بغیر بھی لڑائی جاری رکھے، اپنی اسٹریٹجی بھی خود مرتب کرے اور اپنے وسائل پر انحصار کو ناگزیر جان لے۔

خبر میں نازو کا نام بھی نہیں تھا۔ پولیس والے اور کچھ پوچھیں نہ پوچھیں نام اور شجرہ نسب ضرور پوچھتے ہیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ سامنے کون ہے کیونکہ یہی مرتبہ ان کے ذہنوں کی ہیبت بڑھاتی ہے اور بدکاری کی مشق میں کام آتی ہے۔ ودھی مرغی کو وہ ذبح کرتے رہتے ہیں اور سونے کا انڈا دینے والی مرغی ایک وی آئی پی ہوتی ہے۔ چنانچہ زیر تفتیش ملزموں کی درجہ بندی کی جاتی تو آوارہ گردی کے الزام میں دھر لیے جانے والے لاوارث یا لڑائی جھگڑے میں اور پولیس کی تفتیش میں گستاخی کے مرتکب ہونے والے نچلی قسم کے مجرم سمجھے جاتے ہیں۔ چور اور گرہ کٹ دوسری قسم کے جو انھیں باقاعدہ نذرانے پیش کرتے رہتے ہیں اور ڈاکو تیسری قسم کے ان سے لاکھوں کا مال ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ جب حکومت زیادہ انکم ٹیکس دینے والوں کو معززانہ اور اعلیٰ طبقے میں شمار کرتی ہے تو پولیس انھیں کیوں نہ سمجھے جو زیادہ مال دیتے ہیں۔

نازو کے بارے میں یہی اطلاع لمحہ گریز والی تھی۔ اس سے نازو کا پتا تو نہیں ملتا تھا مگر یہ امید ضرور ملتی تھی کہ اب وہ بے نام و نشان نہیں رہی۔ کسی نہ کسی خبر کے حوالے سے اسے کراچی میں ڈھونڈ نکالنا مشکل تو ہوگا مگر بہت مشکل نہیں ہوگا۔ میں ہوٹل کے کمرے میں ٹہلتے ہوئے سخت مضطرب تھا۔ رابعہ کا خیال پس منظر میں چلا گیا تھا لیکن آہستہ آہستہ خبر کی سنسنی خیزی کا اثر کم ہوا تو وہ بھی احساس کے افق پر ابھرنے لگی۔ یہ بالکل ایک نہ شد دو شد والا کیس تھا۔ میں رابعہ اور صرف رابعہ کی جستجو میں آیا تھا اور اس مقصد کے حصول سے پہلے کوئی مقصد نہ تھا۔

اب میں سوچنے پر مجبور تھا کہ سب سے پہلے کس کو تلاش کروں۔ رابعہ بھی تھی خیریت سے تھی اور دوری کے احساس اور جدائی کے غم کے سوا اسے کوئی دکھ نہ تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ آرام سے ہے اور مجھے اس کی طرف سے بالکل بے فکر رہنا چاہیے۔ یہ جدائی ایک وقتی مجبوری ہے اور ناگزیر ہے جس کا سبب جاننا بھی ضروری نہیں لیکن نازو پریشانی میں مبتلا تھی۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا بھائی اکرام بھی اس کے ساتھ ہے یا خدانخواستہ اس خدانخواستہ کے آگے بہت سے پریشان کرنے والے اور ہولناک خیالات کا سلسلہ تھا۔ کہیں وہ دشمنوں کے قبضے میں تو نہیں، کہیں وہ اپنوں کی قید میں تو نہیں، کہیں وہ زخمی تو نہیں... کہیں وہ مارا تو نہیں گیا۔ میں ایسی کوئی بات سوچتا تو

www.paksociety.com

نہیں چاہتا تھا مگر سوچ کے سامنے دیوار کھڑی کرنے کا کوئی طریقہ مجھے نہیں آتا تھا چنانچہ وہ وحشت زدہ کرنے والے خیالات بھی بدروحوں کی طرح مجھ سے چمٹے ہوئے تھے۔

بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ بیٹھے بیٹھے نازو کا ہی سراغ لگانا چاہیے۔ جب وہ مل جائے گی تو الیاس بھی مل جائے گا۔ نازو مجھے خود اس سے ملوائے گی۔ اس کام میں وہ میری بہترین معاون ثابت ہوگی۔ نالوم شیخ میں اور نازو مل گئے تو ایسے ہوں گے جیسے آرمی ایئر فورس اور نیول کی متحدہ قوت اور ہماری مشترکہ جدوجہد الیاس کو آزاد کرانے میں زیادہ موثر کردار ادا کر سکے گی۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے روم سروس سے رابطہ قائم کیا۔

"یس سر" مستعد نوجوان نے کہا۔

"مجھے آج کے اخبارات چاہئیں۔" میں نے کہا۔

"اخبار آپ کے کمرے میں موجود ہے سر"

"میں نے صبح کا استعمال کیا تھا۔" میں نے دکھاوے سے کہا جیسے لوگوں کی طرح۔ "اس کا مطلب ہے کہ تمام اخبارات۔"

"تمام اخبارات؟"

"ہاں... وہ سب جو کراچی سے یا حیدرآباد سے شائع ہوتے ہیں۔ صبح کے بھی اور شام کے بھی۔ انگریزی، اردو، سندھی، گجراتی اور اگر کوئی چینی، عربی اور ڈچ زبان کے ہوں تو وہ بھی۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ دوسری طرف ریسیو تھامے کر بیوقوفوں کی طرح بیٹھے ہوئے شخص نے یقیناً دل میں کہا ہوگا کہ یہ سامنے بیٹھے والے خبطی کیوں ہو جاتے ہیں۔ بس ہر چیز خرید کر حاضر کر دو، خواہ وہ کام کی ہو یا نہ ہو اور سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

اخبارات کے لیے مجھے تقریباً ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ انتظامیہ نے اس پریشان کن مطالبے کو پورا کرنے کے لیے خصوصی انتظام کیا ہوگا اور کسی پڑھے لکھے بندے کو کسی رکشے یا ٹیکسی کے پاس بھیجا ہوگا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ شخص اپنے مشن سے کامیاب لوٹا اور تقریباً دس بارہ اخبارات اور رسائل کے وزن سے ہانپتا کانپتا حاضر ہوا۔

"سب مل گئے سر" وہ بولا۔ "بس عبرانی کا نہیں ملا۔"

حیران ہونے کے باوجود میں نے اسے سو کا نوٹ انعام میں دیا تو اس کے ماتھے کا پسینہ اور جسم کی تھکن کا معاوضہ ادا ہو گیا۔ وہ بیچ بیچ غیر ملکی زبانوں کے بہت سے اخبارات بھی اٹھا لایا تھا۔ ملکی اخباروں میں سندھی اور گجراتی روزنامے میرے لیے بے کار تھے۔ میں نے صبح کراچی سے شائع ہونے والے پانچ اردو کے اور دو انگریزی کے اخبارات الگ کیے۔ شام کے چاروں اخبارات جو

سنسنی خیز خبروں کی توانائی سے چھپتے ہیں اپنی سرخیوں میں مجھے اپنے مقصد میں خاصی کامیابی ہوئی۔

شام کے ایک اخبار نے اس کار کی تصویر شائع کی تھی جو پولیس کو ٹھٹھہ کے علاقے سے لاوارث کھڑی ملی تھی اس کار کو خوفناک حیثیت نے قرار دے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ یہ وہی کار تھی جس کا نمبر واضح تھا مگر اس کے ساتھ ہی یہ بتایا گیا کہ پولیس کو اس لڑکی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ پہلی بار پورٹ تک صاف کر لی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کار کے اندر کی تصویر بھی اور بیان تھا۔ اس نے تو یاد کی تھی کہ وہ پہلے پڑھنے والے ایک اخبار کی رپورٹ درج کرائی گئی تھی جو اس میں جل کے اور نٹ گیا اور اب پولیس نے ضروری اس کی حفاظت کر کے مزید لوٹا جا چکی ہے۔ جب پولیس نے روایات کے مطابق یہ موقف اختیار کر لیا تھا کہ کار والا بھی اس تحریر چھٹی زیر و زبر و سیوں کے ذرائع پر شش کی مدد کے لیے بروقت کر باہر موجود پایا گیا تھا چنانچہ وہ اس کا ساتھی ہے اور جب ثابت کرے ورنہ عدالت کا فیصلہ ہونے تک مجرم کرے یا کرے پھر لوٹا کا دے جائے۔

دوسرے شام کے اخبار نے ان کی تصویر شائع کی تو سوال اچھا لے سکتے تھے کہ میرا یہ وارڈ میں دیکھو مجھے جو وہ ہوئے لوگ ہوئی کی تصویر سے لیتے ہوئے تھے۔ یہ وہی دونوں کا ہیں جو نازو کے نازک ہاتھوں سے اپنے موزوں ہاتھ تو دیکھے تھے۔ تصویر سے تو یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے سے زیادہ ہو۔ کسی ایک ایک لائک بھی خستہ حال حد بھی ہوئی اور اوپر ہوئی تھی۔ وہ صحت مند بار نظروں سے کیمرے کو گھور رہی اور محفوظ ہوتے تو ان کی رسوائی کو مشتہر کرنے والوں کو معلوم ہوتے۔ سب اسکنڈر کی تصویر صرف ایک اخبار میں تھی جس اس کے سر پر پٹی دکھائی گئی تھی۔ تاہم اس نے کسی قسم کا بیان دینے سے انکار کر دیا تھا۔

شام کے تقریباً سب ہی اخبارات نے یہ اطلاع دی تھی کہ پولیس کی ایک خصوصی ٹیم ایک ڈی ایس پی کی قیادت میں تشکیل دی گئی ہے جو مفرور ملزمہ کا سراغ لگائے گی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا گیا کہ تمام تھانوں کو چوکس کر دیا گیا ہے اور شہر سے باہر جانے والی سڑکوں کی ناکہ بندی جاری ہے۔ لیکن ان جملوں کا کوئی قبول نہیں کرتی تھی کیونکہ عام طور پر سب کا خبری کارروائی کے تحت نہیں ہوتا تھا۔

شام کے اخبارات دیکھ کے میں نے صبح کے اخبارات دیکھنا شروع کیا اور ایک اخبار کے نمائندہ خصوصی کی رپورٹ

نے یقیناً ہانگ کانگ، دوڑا اور عرق ریزی کی تھی یا پھر پھر تو وہ یا اس کے اندر اس کے ایک بہت گھومے اور مضبوط تھے۔ اس ذرائع بہت ہی باوثوق ذرائع سے ایک خصوصی اسٹوری دی تھی۔ اس کے پاس کے مطابق تقریباً دو ہفتے قبل بندرگاہ کے علاقے سے ایک غیر ملکی جہاز راں کمپنی کے عملے کے چند ارکان نے دو افراد کو اغوا کیے جانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ یہ دونوں افراد وہ تھے اور بعض عینی شاہدوں کے کہنے کے مطابق ہم شکل بھی تھے نہ ملتا تھا۔ چنانچہ اغوا کی کوشش کو بالکل اسی انداز میں ناکام بنا دیا جیسے گزشتہ روز ایک نوجوان نے اپنی گرفتاری کی کوشش ناکام بنا دیا۔ اس سے جوڑ کر لانے میں اپنی حیرت انگیز مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صنف نازک کے بارے میں پائی جانے والی خوش فہمی بھی رفع کر دی کیونکہ وہ نوجوان ایک لڑکی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس وقت اس نوجوان کو گرفتار کیا گیا، اس وقت بھی وہ اپنے ساتھی کے ساتھ ایک غیر ملکی جہاز پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے جینز اور بیگی شرٹ پہن رکھی تھی اور سر پر ملاحوں والی ٹوپی لگا رکھی تھی۔ جسے خود پر لیے سب انسپکٹر آفیسر نے شناخت کیا اور پکڑ کر پولیس کے حوالے کرنا چاہا لیکن اس کوشش میں وہ اپنی کار لے کر فرار ہو گئی تھی جس کے بارے میں اب یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ چوری کی ہوگی۔ جانے واردات سے غائب ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ جہاز کے دیگر عملے کی مدد سے اس لڑکی پر قابو پا لیا گیا اور اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ جہاز کے کپتان کی طرف سے کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی گئی ہے۔ کپتان نے نامہ نگار کے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کیا اور اسے انسپکٹر آفیسر سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی جس نے لڑکی کو شناخت کیا تھا اور چند لوگوں سے معلوم ہوا کہ ان سے کچھ بھی کہنا تھا کہ تم پھر آ گئے ہمارا جہاز... کپتان نے اس بیان کی صحت سے بھی انکار کیا۔ یہ جہاز کراچی سے ممبئی، کولمبو، مدراس اور کلکتہ کے راستے بنکاک جاتا ہے۔ اس کا کپتان ایس کے مہتی آئرین نسل ہے اور سیکنڈ آفیسر رشید میاں مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاز کا عملہ سنگاپور اور فلپائن سے لیا گیا ہے اور جہاز کی رجسٹریشن پانامہ کی ہے۔

بھگتنے والے کو کھلی آنکھوں سے سچائی جانے والی حقیقت اخبار نگار سمجھتے ہیں اور کسی بھی سچ سے منکر ہو سکتے ہیں۔ جہاز والوں کے عملے نے غلط قرار دیا تھا اور کچھ باتوں کو پولیس نے کہانیاں بنا کر خود کو محفوظ رکھتے ہوئے سارے معاملات کا الزام کر دیا تھا۔ دروغ بر گردن راوی کہہ سکتے سے

الزام کسی پر نہیں آتا۔

اس بیان کی صداقت کو کلی طور پر تسلیم کرنے والا شاید میں دوسرا شخص تھا۔ پہلا تو وہی رپورٹر تھا جو نہ جانے کیسے کہاں سے یہ بات نکال لایا تھا۔ اس نے کہا تھا اور اندر کی خبر لوٹ کر کے باہر لے آیا تھا۔ ایک کامیاب رپورٹر کی طرح اس نے یہ کام دو طریقے سے کیا ہوگا۔ ایک طریقہ مال خرچ کرنے کا ہے۔ اس نے عملے کے کسی غیر اہم سمجھے جانے والے مگر سب کچھ جاننے والے غلام قسم کے رکن کو خرید لیا ہوگا۔ دوسرا طریقہ جان ہتھیلی پر رکھ کے خبر کی بھادر کی گھسنے کا ہے۔ لیکن بیٹھے وہ بھیس بدل کر جہاز پر پہنچنے میں کامیاب رہا ہوا اور جاسوسی کر کے کامیابی سے لوٹ آیا ہو۔ بہرصورت اس رپورٹر نے ایک کارنامہ سر انجام دیا تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ کیا اس طرح اس نے اپنی جان کے لیے حقیقی خطرے کا سامان پیدا نہیں کیا ہے؟ یہ ضرورت سے زیادہ جان لینے والوں کی جان لینے والے لوگ وہی تھے جنہوں نے نازو اور اکرام شیخ کو اغوا کرنے کی ناکام کوشش کی تھی وہ انھیں پہچانتے تھے ورنہ وہ ایسا کیوں کہتے کہ تم پھر آ گئے ہو۔ ہمارا بیڑا غرق کرنے؟ ظاہر ہے کہ ایک بار ان کا بیڑا غرق ہو چکا تھا اور وہ بیڑا غرق کرنے والوں سے مل چکے تھے۔

ایک بات جو یہ سراغ رساں نامہ نگار بھی نہیں جانتا تھا، وہ میں جانتا تھا۔ میرے پاس نازو اور اکرام کی طرف سے ملنے والی آخری خبر یہ تھی کہ وہ کسی کھوکھوشپ پر چڑھ کر کہیں نکل گئے ہیں اور اس کشتی پر جو سامان لوڈ کیا گیا تھا اس میں وہ اسلحے سے سلے کر بیٹھے تھے جن پر شہر کا نام 'الڈ و ویسٹ سٹی' اور ملک کا نام 'وسی وانیا' تحریر تھا۔ ہم اس سے پہلے ہی معلوم کر چکے تھے کہ دنیا کے نقشے میں اس نام کا نہ کوئی شہر ہے اور نہ ملک۔ ڈیڈ ویسٹ درحقیقت پانی پلیٹ برتن کے مرض میں استعمال ہونے والی ایک دوا کا برانڈ نام تھا اور 'وسی وانیا' روسی زبان میں در حقیقت رکھتا ہے جو اردو میں الوداع یا خدا حافظ۔ ہم نے یہ معلومات آ گے ارسال کر دی تھیں اور ہم نے سنا تھا کہ وہ جہاز راستے میں غرق ہو گیا تھا جیسے مال سے کر روانہ ہوا تھا۔ صرف ایک کریٹ کسی کی غلطی سے رہ گیا تھا جو بعد میں پولیس اور حفاظتی عملے نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

سیکنڈ انجینئر کے بدتر عمل سے میں یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ نازو اور اکرام شیخ ہی اس اسلحہ بردار جہاز کو غرق کرنے کے ذمہ دار تھے جیسے نازو اور اکرام بچ گئے تھے ایسے ہی غالباً مرشد میاں بچ گئے تھے اور اب وہ ستم جہاز پر تھے کہ انھوں نے بیڑا غرق کرنے والوں کو دیکھ لیا۔ ذہنی عمل محترمہ تھا اور یہ ان بعض بھائیوں کی بدقسمتی تھی کہ ان میں ایک صورت آشنا دار نکل آیا۔ ظاہر ہے نازو اس کی کارروائی کے نشانے پر تو اس کی گردن توڑ کے

www.paksociety.com

تعلق۔ اسے روکنا اتنا آسان نہیں تھا۔ تمام چیزوں کے تناظر میں یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ دونوں بھی بھائیوں کو اغوا کرنے کی کوشش کا مقصد یہی تھا کہ انھیں بیلٹ ترقی کرنے کے جرم میں سزائے موت دی جائے۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ اصولاً مجھے یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں نے بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کے مطابق نئے سرے سے منصوبہ بندی کی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ کراچی پہنچنے کے بعد اس پلیٹ فارم سے منوں جو موسوں کے مقابلے میں زیادہ باخبر تھا اور اپنے پیشے کے ساتھ جاں نثاری کی حد تک مخلص بھی۔ ایسا شخص کسی بھی وطن دوست کا ساتھی بن سکتا تھا لیکن کسی غدار کے ہاتھوں کسی قیمت پر نہیں بک سکتا تھا۔ اس بات کی بھی خاصی امید تھی کہ وہ میرے نام نامی سے بخوبی واقف ہوگا

اور میرے کارنامے نمایاں کے باعث اپنے دل میں میرے لیے ستائش کے ویسے ہی جذبات بھی رکھتا ہوگا جیسے آج تک مجھے بہت سے نادیدہ دوستوں اور محب وطن کے ملنے والوں کے دل میں محسوس ہوئے تھے۔ انھی میں ایک نابینا فقیر چندات تھا۔ (خدا کرے محسن اور غالب نے اسے اپنی دکان واپس دلوا دی ہو) دوسرا پیچر سلطان تھا۔ تیسرا ایک ڈاکٹر تھا تو چوتھا ایک کیفے کا مالک۔ یہ لوگ زندگی کے ہر طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ہر جگہ موجود تھے مگر کسی کے دوستانہ جذبے پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لینے کی غلطی میں نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے آپریٹر سے کہا کہ وہ لاہور کا ایک نمبر ملا دے۔ یہ نمبر عبدالودود منظر کے گھر کا تھا۔ دس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی تو میں نے منظر کی آواز سنی۔ نہیں منظر نہیں اس کی اولاد نے ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔

"کون بول رہا ہے؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

"ارے بھائی... تم کس سے بات کر رہی ہے... میں منظر بول رہا ہوں۔"

"کیا فائدہ ایسے بولنے کا الو کے پٹھے" میں نے اپنی اصل آواز میں کہا۔ "لگتا ہے تیری بیوی کی آواز بالکل ہنسانی نقلی ہو رہی ہے۔"

منظر چلانے لگا: "ابے تو... دنیا میں میری تباہی کے ذمے دار... کہاں سے بول رہا ہے تو...؟"

"اپنے خوش گفتار خوب صورت شہر سے" میں نے کہا۔

"ابے کیوں بول رہا ہے آخر... میں تو سمجھا تھا کہ اللہ نے بچا لیا اس آواز سے جو میری شامت کو پکارتی ہے۔" وہ پھیلا اپنے نکونیاں سے کہنے لگا "بچو... تمھارے باپ کا فون آیا ہے۔"

میں تو قصہ یار کے بہت... تیری بیوی تو اس الزام سے... ہوگی مگر میں اس ٹیم کی قیادت سنبھالنے سے انکار کر...

"دیکھیں گے... دیکھیں گے بیٹا... جب تمھاری... میں اترے گی نا تب پتا چلے گا ابھی تو خالی پیچ پر لکھ... ہو... دیکھ تو اب جلدی سے یک... کر تو نے کیوں فون... سمجھے... کون سا نیا خیال آیا ہے تجھے میرے وہ... گوشتوں کو تیم کرنے کا اور میری اکلوتی گھروالی کے سر سے... اٹھانے کا...؟"

"یار تو چڑچڑا ہوتا جا رہا ہے... حالانکہ تیری تو اب... کی توند ہے" میں نے کہا۔ "فکر سے ہلکان مت ہو... ملتان سے کسی نے فون کیا ہے تجھے؟"

"ہاں... دن میں آیا تھا۔ میری بیوی بہت ناراض... کوئی لوگ تھے۔ پوچھنے لگے کہ یہ منظر ایڈووکیٹ کا... میں نے کہا جی بیٹا" جیسے تیرے ہی وہ دونوں۔"

"شریف والے وہ حیثیت کہنے لگے کہ تم کون ہو... کی سویٹ ہارٹ تیری یا تیسری؟" منظر چلانے لگا۔ ... میری بیوی نے انھیں اپنی مادری زبان میں بتایا کہ وہ کون ہے...

"یعنی وہ پھر فون کریں گے ایک... میں انھیں تیری مدد درکار ہے" میں نے اصل معاملے کو... گول کر دیا۔

"اچھا... بہت بڑی ڈیل ہے کیا؟"

"ہاں یار... تو اب ایک نواب ابن نواب ہیں... ہفت پشتوں سے بھی آگے تک" میں نے کہا۔ "یہاں کے کسی... ہسپتال کی بات کریں گے۔ ان کا کام میرا کام سمجھ کر کروانا۔"

"تیرے کیا لگتے ہیں وہ؟" منظر کے لہجے میں تجسس آگیا۔

"کچھ نہیں... تو میرا کیا لگتا ہے یار؟ لیکن میری کیا لگتی ہے... ظاہر ہے کچھ نہیں" میں نے کہا۔

منظر نے مجھے گالیاں دینی شروع کر دیں تھیں کہ غالباً ان کی بیوی آگئی۔ وہ ایک دم مہذب اور شریف آدمی بن گیا... بات بتا۔"

"یار میں کراچی جا رہا ہوں" میں نے کہا۔ "اکیلا ہوں۔"

"کیوں... وہ سب ساتھ چھوڑ گئے... یا جوتے..."

"نہیں... وہ ایک سرکس میں کام کرتے ہیں" میں نے کہا۔ "تو کوئی یار سب کو۔"

"ایک یار سامنے تو آ گئے ہو" منظر بات نہیں کرتا...

"کراچی میں ایک لیڈر ہے افتخار عارف" میں نے...

"اس کے اخبار کا فون نمبر نوٹ کرے۔ وہ اس وقت مل جائے... اس سے پوچھنا کہ وہ میرے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے اور..."

"وہ تو میں بتا سکتا ہوں...."

"بیچ میں مت بول... اس سے پوچھنا کہ اگر میں اس کے... کے لیے جاؤں... ایک قتل کے سلسلے میں... تو کیا وہ میری... کرے گا؟"

"ہاں... وہ پولیس کو فون کرے گا کہ آئیے اور انھیں لے جائیے کیونکہ دنیا میں خاص لوگ سکون سے رہ سکتے ہیں۔"

"میں پھر فون کروں گا... آدھے گھنٹے میں..." میں نے اس کی... کو نظر انداز کر کے ریسیور رکھ دیا۔

پھر میں آدھے گھنٹے تک ٹہلتا رہا۔ اس خواہش کو دبانے کے لیے کہ میں انکل ضامن رضوی کے گھر فون کروں اور... اس خواہش سے لڑنا بہت مشکل کام تھا۔ ... ایکسیڈنٹ کے بعد انکل رضوی کے جذبات میں تبدیلی ہو... ہو گی پھر بھی ان سے کیسے بات کروں گا... اور اگر فون آنٹی نے اٹھا لیا؟ وہ تو رونا شروع کر دیں گی۔ ان کے آنسوؤں کا جواب کیا دوں گا میں؟ خود کو سمجھانے کی کوشش... "چلو" تو کیا میرے منہ سے آواز نکلے گی؟ اگر میں نے اس کی خیریت دریافت کی تو وہ بے ہوش ہو جائے گی... میری آواز سنتے ہی... اس کی ذہنی حالت ابھی نہیں ہے کہ وہ کسی قسم کے جذباتی صدمے کی متحمل ہو سکے۔ بلقیس بھابی اس نے ہسپتال میں چلانا شروع کر دیا کہ... والی... لوٹ آئیے خدا کے لیے... یار العبد کے بارے میں کوئی... اطلاع نہ دی۔ محسن کے بارے میں کچھ بتا دیا۔ وہ کہے... بتایئے آپ کہاں ہیں... آپ کو میری قسم... رابعہ کی قسم... جھوٹ مت بولیے گا... نہیں... میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ ... نے فیصلہ کیا۔

کلاک نے ایک گھنٹا بجا کے رات کے ساڑھے آٹھ بجنے کا اعلان کیا تو میں چونکا۔ میں نے پھر فون اٹھا کے آپریٹر سے کہا کہ... نمبر ملا دے۔ اس مرتبہ لائن فوراً مل گئی لیکن... نے اٹھایا تھا۔ مجھے آواز بدل کے بات کرنی پڑی۔

"سلام بھی جان..."

"بھی جان... کہاں فون کیا ہے آپ نے... کون ہیں آپ؟"

"بیٹے... آپ بھی یہ پوچھ رہی ہیں کہ میں کون بول رہا ہوں؟... آپ کا سب سے خوب صورت عاشق ہوں... قاسمی عرف مقتص... باغی... کیا یہ منظر ایڈووکیٹ کا گھر نہیں ہے؟"

"ہے تو... میں ملتی ہوں۔" وہ گڑبڑا کے بولی... بار... قافیے کی آواز سننے سے میرا گلا ڈکھنے لگا تھا۔

"کون ہے؟" منظر نے ایک منٹ کے بعد کہا۔

"حضرت عزرائیل کا افسر تیار تقاص" میں نے کہا۔

"کا... وہ آپ کو اس وقت... منظر..."

"میری بیوی کے ساتھ ایک دن میں دوسرا کیس ہوا ہے..."

"ڈلیوری کا... مبارک ہو...."

"بکتے ہو تم فون پر چھیڑتے ہو... وہ لڑکیوں کی طرح شرماتے ہوئے جھوٹا غصہ دکھا رہی ہے" منظر بولا۔ "یعنی شرم آ رہی ہے..."

"میرا کام ہوا؟"

"ہاں... کچھ ہوا..." وہ بولا۔ "بہت چالاک شخص ہے وہ... کہنے لگا کہ کیا ثبوت ہے تمھارے پاس کہ تم وہی ہو جو خود کو ظاہر کر رہے ہو۔"

"تو نے کیا ظاہر کیا تھا خود کو؟"

"اپنے ظاہر کیا... اور یاد کیا" وہ بگڑ کے بولا۔ "میں جو ہوں، بس وہی ہوں... اور یہی میں نے اس سے کہا تو وہ بولا کہ اچھا اپنا نمبر بتاؤ اور فون رکھ دو۔ پھر اس نے مجھے رنگ کیا اور کہنے لگا کہ اب ٹھیک ہے مسٹر منظر... تم... کے ساتھ کوئی بھی بات کہہ سکتے ہو... وہ بات مجھ سے... بھی نہیں پوچھ سکتے۔ تب میں نے تمھارا ذکر کیا اور کہا کہ وہ کراچی میں ہے اور تم سے کہاں مل سکتا ہے تو وہ تو یار ایسا پرجوش عقیدت مند ہے تیرا کہ میرے پیچھے پڑ گیا اور بولا کہ اپنے دوست سے کہو آج ہی ملے۔ وہ رات گیارہ بجے کے بعد ڈیوٹی سے فارغ ہوتا ہے اور اکیلا رہتا ہے۔ مارٹن روڈ پر جو سرکاری کوارٹر ہیں نا۔"

"ہوں گے بھائی... مجھے کیا معلوم۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو اس کا پتا نوٹ کر لے۔ وہ جہانگیر روڈ ویسٹ کے کوارٹرز میں رہتا ہے... ایف سات سو بیس... اس کے... نہیں ہے کہ اس نے پردے رکھا ہے۔"

"کوئی ٹیلی فون وغیرہ بھی ہے؟"

"یہ تو... میں نے نہیں پوچھا" منظر بولا۔ "اور اس نے بھی نہیں بتایا۔"

"تو نے کیا کہا تھا... کس سلسلے میں ملاقات کرنی چاہتا ہوں میں؟" میں نے کہا۔

"وہی جو تو نے کہا تھا... اپنی طرف سے میں کچھ اور کیسے کہہ دیتا" منظر بولا۔ "بیٹا میں تو کہتا ہوں اب بھی وقت ہے، اس چکر سے نکل آ۔ حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں۔"

"کس کے لیے؟ تیرے لیے یا ملک کے لیے؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے ملک کے لیے... وہی تیرے حالات بھی رہیں" منظر نے کہا۔ "کچھ لوگ تو ملک کے حالات میں اس لیے... اڑاتے ہیں کہ ان کے سامنے کوئی تعمیری مقصد ہوتا ہے۔"

www.paksociety.com

وہ کچھ بن جاتے ہیں یا کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ تو صرف گنوا رہا ہے اور وہ بھی بے مقصد... ایک جان سے تیری کا جیں پہ بہت ناز ہے مجھے۔"

"ہاں، راجو پہ بہت ناز ہے مجھے۔ وہی تو میری جان ہے۔" میں نے کہا۔ "باقی رہی مقصد کی بات تو یار میں سیاستدان نہیں ہوں اور نہ میں نے کچھ بننے یا حاصل کرنے کی خاطر اپنی جان مصیبت میں ڈالی ہے۔ تجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ اس دلدل میں قدم میں نے اپنی مرضی سے نہیں رکھا تھا۔ مجھے اس میں دھکیل دیا گیا تھا لیکن خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ اُسے مجھ سے ایک کام لینا تھا جو میں کر رہا ہوں۔ ممکن ہے تیرے نزدیک یہ مقصد تیری نظر میں کچھ نہ ہو مگر اس کاروبار میں اپنے لیے میں نہ کوئی کوٹھی تعمیر کر رہا ہوں نہ کارخانہ... مگر تعمیر کا دوسرا انداز تخریب میں بھی ہے جسے میں دیکھ سکتا ہوں۔"

"یار تو سیریس ہو گیا... ہم تو جانتے ہیں سب کہ تو کتنا بڑا کام کر رہا ہے۔" منظور بولا۔ "ہم تو بس یہی بھائی۔ کولھو کے بیل جو ایک محدود دائرے سے باہر نکل ہی نہیں سکتے اور کچھ دیکھ بھی نہیں سکتے اور محسوس بھی نہیں کرتے۔ یار زندگی کی گاڑی کو کھینچنے والے بیل جو حال بہت ماٹھا ہو گیا ہے... یہ بتا دوسرے کیسے ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں... آج کل میں ٹرنک کال نہیں کر سکتا کہ فرداً فرداً سب کا احوال بتا دوں... تو بتا شہلا کیسی ہے۔ اور انکل؟"

"انکل تو بس گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ ایک اسکول چلا رہے ہیں آج کل۔" وہ بولا۔ "ان کی خواہش ہے تو وقت ہے تو... وقت گزارنے کے علاوہ قوم کی خدمت کا جذبہ ان میں بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ایک جہنم سے نکال کر معصوم فرشتوں کی اس جنت میں بھیج دیا۔ سالے شہر کے اندیشوں سے آزاد ہو گئے۔ وہ خوامخواہ منتظر ہیں اور ان کی بیگم ہیڈ مسٹریس۔"

"گزر اوقات کیسی ہو رہی ہے؟"

"وہ تو کہتے ہیں کہ پہلے سے بہتر۔" منظور نے کہا۔ "تو بات کر لے۔"

"نہیں یار... ابھی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔" میں نے کہا۔ "شہلا کی کوئی خیر ہے؟"

"ہاں... مزے میں ہے۔" وہ بولا۔ "فون کرتی رہتی ہے۔"

"آج کل فون کرنے میں خطرہ تو کوئی نہیں ہے؟"

"نہیں... سراج نے تو کوشش کی تھی کہ میرے اور انکل رضوی کے گھر کو آبزرویشن پر رکھا جائے۔ مگر رضوی صاحب کی اعلیٰ حکام کی نظر میں بہت عزت ہے۔ اور مجھ سے قانونی کارروائی کا ڈر تھا اس لیے اس کی ایک نہیں چلی۔"

"اور کیس کیسے ہیں؟"

"کیس چلتے رہیں گے اور چلتے رہیں گے... جب تک مسلم پکڑا نہیں جاتا سب ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "اب کیسوں سے کیا ڈرنا... خود مجھے نہیں معلوم کتنے ہیں... والد کی فرم کو میں نے سنبھال لیا ہے اور کام بہت بڑھ گیا ہے۔"

"اچھا یار... جو کچھ تو نے کیا اس کے لیے بھی اور جو کرے گا اس کے لیے بھی شکریہ... محسن کا بھی فون آئے تو اسے کہہ دینا کہ میری فکر نہ کرے... اپنا کام جاری رکھے۔ میں واپسی کو زیادہ دن نہیں لگاؤں گا۔ آگے اللہ کی مرضی کیونکہ حالات پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے... یہ بھی بتا دینا کہ نازو اور اکرم کراچی میں ہیں۔"

"تجھے معلوم ہے چوہدری دلاور صوبائی اسمبلی کے لیے کھڑا ہو رہا ہے؟" منظور نے اچانک یاد کر کے کہا۔ "اپنی پارٹی کا تو بس نام ہے، سارا کھیل پیسے کا ہے۔ کسی ایڈورٹائزنگ فرم کو اپنی کنویسنگ کا ٹھیکا دیا ہے۔"

"اس کی کنویسنگ تو میں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "ذرا وقت آنے دے۔ انتخابات میں اس جیسے کھڑے ہوتے ہی ہیں۔ صوبائی اسمبلی میں پہنچنے سے پہلے اسے قبر میں نہ لٹا دیا تو میں سکندر نام نہیں۔ اچھا خدا حافظ۔"

مجھے اچانک احساس ہو گیا تھا کہ میں نے روانی میں اپنا نام لے دیا ہے۔ ٹیلی فون لائن پر محفوظ گفتگو میں بھی خدشات ہوتے ہیں کہ کسی کال سے غیر متعلق شخص سب سن لے گو وہ آپریٹر تو دونوں کی سنتا ہی ہے۔ یہ ہوٹل خاصا معیاری تھا اور میں ایک وی آئی پی کی حیثیت سے یہاں مقیم تھا چنانچہ آپریٹر سے اس بدتمیزی اور بدتہذیبی کی امید نہیں تھی کہ وہ میری گفتگو سنے گا... دن رات خبر ملتے رہتے ہیں اور اس عمل کی میناکاری... میں ان کے تجسس کا جذبہ اس طرح باقی نہیں رہتا جیسے گورکن کے لیے کسی مرنے والے کے لواحقین سے ہمدردی کا جذبہ۔

منظور سے میری گفتگو بھی ایک روح افزا ٹانک ثابت ہوئی اور اس نے میرے خیالات کے انتشار کو بہت حد تک کم بھی کیا۔ اب میں زیادہ اطمینان قلب اور یکسوئی کے ساتھ اپنے مشن کے اگلے مرحلے پر روانہ ہو سکتا تھا۔ تقدیرات میری محافظ و معاون تھی اور اب یہ پہلے سے زیادہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں سہولیات سے فائدہ اٹھاؤں۔ اس سے اگلی رات کا کیا بھروسا کہ ستاروں کی چال بدل جائے اور میرا بچا کھچا ہوا پانسہ پلٹ جائے۔

ایک گھنٹے بعد میں کراچی کی جانب رواں تھا۔ میرے بیگ میں

ہوٹل سے کوچ کرنے کے برابر ہی ٹرنک کال کے چارجز شامل ہو گئے تھے۔ مجھے اخراجات کی فکر نہیں تھی۔ گو عجیب سی بات ہوئی تھی کہ ہوٹل کے قواعد و ضوابط کے مطابق میرے سویٹ نمبر کے فون سے ملائی جانے والی دونوں کالوں میں منظور کے ٹیلی فون نمبر کا اندراج ہو گیا تھا۔ ویسے تو یہ بہت فکر کی بات تھی کہ کوئی اس طرح مجھے تلاش کر لیتا۔ خصوصاً ان حالات میں جبکہ میں نے ہوٹل میں اپنا نام وغیرہ سب غلط لکھوایا تھا اور ہوٹل والے میرے حلیے کو یاد رکھنے کے پابند نہیں تھے۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے میں کراچی پہنچا۔ سپر ہائی وے پر ایک جگہ بلند و بالا گیٹ سے بنے ہوئے تھے۔ یہ گویا بلدیہ عظمیٰ کراچی کی میونسپل حدود کے آغاز کی علامت۔ دونوں جانب قطاروں میں کاریں، ٹرک اور بسیں محصول ادا کر کے ٹکٹ لیتے جا رہے تھے اور نکلتے جا رہے تھے۔ مجھ سے آگے ایک ٹرک تھا۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ اس ٹرک کو روک لیا گیا۔ غالباً کسی کی مخبری کے باعث پولیس والوں کے جھگڑے میں کوئی جھگڑا پڑ گیا تھا۔ آگے نمبر میرا تھا۔ کسٹم ایکسائز کی وردی میں ایک افسر میری جانب بڑھا۔

"آپ بھی پیچھے اتر آئیں۔ گاڑی سائیڈ پر لگا لیں۔"

"مگر کیوں؟" میں نے پُرسکون رہتے ہوئے متانت سے کہا۔

"اس لیے کہ ہمیں اس ٹرک کو روکنے کے احکامات ملے ہیں۔" وہ بولا۔ "جلدی درست کریں، ٹریفک بلاک ہو جائے گا۔"

"ویٹ اے منٹ... احکامات ٹرک کے لیے ہیں تو اسے روکو... مجھے روکنے کا تو کسی نے نہیں کہا ہے۔" میں نے کار کو ایک طرف کر لیا۔

"کہا تو کسی نے نہیں ہے۔" وہ پھر میرے سامنے آ گیا۔ "مگر ٹرک تو آپ کا ہی ہے۔"

"ٹرک میرا ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "کون الو کا پٹھا کہتا ہے... کیا یہ تمہاری اپنی منطق ہے کہ جو کار میں اس ٹرک کے پیچھے ہو گا وہی ٹرک کا مالک ہو گا؟"

"ایسا وہ ڈرائیور کہتا ہے جو ٹرک چلا رہا ہے۔" کسٹم والا متاثر ہوئے بغیر بولا۔

"وہ بکواس کرتا ہے۔" مجھے اب واقعی طیش آنے لگا تھا۔ "آپ پیچھا کر کے یہ بات اس کے سامنے کہہ دیں... اور ثابت کر دیں۔" اس نے اچانک ہاتھ بڑھا کے چابی نکال لی۔

"چابی واپس دو۔ تم جانتے ہو میں کون ہوں..." میں نے لہجے کو ترشانہ انداز میں تیز کر کے کہا۔ "تم نہیں جانتے..."

"میں اپنے اختیارات کو جانتا ہوں... اور مجھے اس ٹرک کے علاوہ تمہاری کار کو بھی ضبط کرنے کا اختیار حاصل ہے۔" وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔

میں نے دیکھا کہ وہاں اس ٹرک پہ چھاپا مارنے والی پولیس پارٹی نے اپنے مخصوص انداز میں ناکہ بندی کی تھی اور اب ان کا کام پورا ہو گیا تھا تو وہ قطعی بافراغت انداز میں کھڑے تھے۔ ان میں سے بیشتر ٹرک کو گھیرے ہوئے تھے اور اپنی رائفلوں کو حسب عادت لاٹھی کے طور پر سہارے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

"او کے... لیکن کیا تم ایک منٹ میرے پاس بیٹھ کے اس سارے معاملے کی وضاحت نہیں سن سکتے۔" میں نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔

"میں تو زبردستی کا قائل نہیں۔" وہ بھی معنی خیز طور پر مسکرایا۔ اور میری مسکراہٹ اگر سوال تھی تو اس کی مسکراہٹ میں جواب پوشیدہ تھا۔ میں نے پوچھا تھا کہ کیا ہم کچھ لو اور کچھ دو کے زریں اصول پر عمل نہیں کر سکتے اور اس نے جواب دیا تھا کہ بے شک عقل مند وہی ہوتے ہیں جو اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔ میں نے دروازہ کھولا اور وہ میرے ساتھ بیٹھنے کی غلطی کر بیٹھا۔

"کیا ہے اس ٹرک میں؟" میں نے کہا۔

وہ بے تکلفی سے بولا۔ "میرا خیال تھا... کہ تم بات ختم کرنا چاہتے ہو۔"

"تمہارا خیال غلط نہیں تھا۔ مگر مجھے پتا تو چلے کہ بات شروع ہی کیوں ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔ "اور تم کیوں بضد ہو مجھ سے منوانے پر کہ وہ میرا ہی ٹرک ہے؟"

اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اتنا غصہ بھی اچھا نہیں ہوتا۔" میں نے کہا اور جیکٹ کے کیسے سے ملنے والا ریوالور نکال لیا۔ "اس چیز کو پہچانتے ہو... اسے سائلنسر کہتے ہیں۔ اگر کوئی شور مچانا چاہے تو یہ خاموشی سے اسے خاموش کر دیتا ہے۔"

کسٹم انسپکٹر کا رنگ اُڑ گیا۔ "اور اس کے بعد... تمہارا کیا خیال ہے کہ تم اپنے ٹرک سمیت فرار ہو جاؤ گے؟"

"ٹرک جائے بھاڑ میں۔" میں نے کہا۔ "میں خود تو فرار ہو سکتا ہوں... تمہاری لاش سے کر۔"

"کیا واقعی... وہ تمہارا ٹرک نہیں ہے؟" پہلی بار اس کا اعتماد متزلزل ہوا۔

"تمہیں نام معلوم ہے میرا؟"

"تم ملتان سے آ رہے ہو نا؟" وہ بولا۔

"مخبری کرنے والے نے میرا کیا نام بتایا تھا؟" میں نے کہا۔

"جہاں محمد عرف جونی۔" وہ بولا۔ "تم وہاں کے ایک نامور شخص سلطان محمد خان کے بیٹے ہو؟"

"اچھا!" میں نے حیرت سے کہا۔ "اور ٹرک میں کیا ہے؟"

www.paksociety.com

"غیر قانونی طور پر ملک میں لایا جانے والا اسلحہ۔" وہ بولا۔ "کچھ روسی ساخت کا... کچھ بھارت میں بنا ہوا۔"

"کیا یہ اسلحہ تم مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں کو فروخت کرتے ہو؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اس کا جواب تم خود جانتے ہو۔" وہ بولا۔

"کیا تم نے اسلحہ برآمد کر لیا ہے؟"

"اس میں کیا دیر لگتی ہے۔" وہ بولا۔ "اصل بات یہ ہے کہ ڈرائیور نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے... مگر اس کا کہنا ہے کہ وہ مجبور تھا۔ ملک اس کے پیچھے سائے کی طرح لگے ہوئے ہیں اور اسے مار ڈالیں گے۔"

"پیچھے والی گاڑی میں تمہارا اسمگلر ہوتا تو تم کیا کرتے؟"

"ڈرائیور میرے اسمگلر کو نہیں جانتا، شک تمہیں جاتا ہے۔"

میں نے اپنے شناختی کاغذات نکالے۔ ان میں گاڑی کی رجسٹریشن کے کاغذات بھی تھے۔ "تم دیکھ سکتے ہو کہ میں کون ہوں۔"

اس نے کاغذات کو گاڑی کے اندر کی لائٹ جلا کے غور سے دیکھا اور مجھے واپس کر دیے۔ "یہ جعلی بھی ہو سکتے ہیں۔"

"بالکل ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن جان محمد عرف جونی وہ نہیں ہو سکتے۔ اس ڈرائیور کا کیا نام ہے؟"

"دریا خان۔"

"تم اسے مجھ سے ملوا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

"تم اس سے مل سکتے ہو... چیک پوسٹ پر۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے... میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں اس ڈرائیور سے چند سوالات کروں گا۔ اس دوران میں تم بالکل خاموش بیٹھے رہو گے اور ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے جس سے تمہاری جان اور یہ عہدہ جائے۔ جان ہے تو جہان ہے اور یہ عہدہ ہے تو اس جہان میں کیش ہی نہیں ہے بلکہ عیش ہی عیش ہے۔ بعد میں مجھے پھانسی بھی ہو جائے تو تمہیں یہ قیمتی زندگی نہیں مل سکتی۔"

اس نے سر ہلایا۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ مجھے ایک مختصر سے کمرے میں لے گیا جو دو دروازوں کے بیچ میں تھا۔ وہاں ٹرک ڈرائیور ایک کونے میں مرغا بنا ہوا تھا۔ دو پولیس والے بڑی بے نیازی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ اپنے افسر کو دیکھتے ہی انھوں نے کرسیاں خالی کر دیں اور دونوں جانب کے دروازوں پہ اٹینشن ہو گئے۔

"بس سیدھا ہو جا۔ گلو بھی پتر۔" ایک سپاہی نے کہا۔

مرغا سیدھا ہو کے آدمی بن گیا۔ وہ بے عزتی کا عادی اور خاصا سخت جان مجرم نظر آتا تھا۔ اس نے مجھ سے نظریں ملائیں۔

"میری طرف دیکھو۔" میں نے کہا۔ "کیا میں جان محمد ہوں؟"

اس نے نظر اٹھا کر اقرار میں سر ہلایا۔

"یہ بات کہنے پر تم کو کس نے مجبور کیا تھا...؟" میں نے کہا۔

"کسی نے نہیں... میں وہی کہہ رہا ہوں جو... سچ ہے۔"

"تم نے جان محمد عرف جونی کو دیکھا ہے کبھی؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا کھوکھلا اعتماد بھی ختم ہونے لگا ہے۔ وہ کچھ نروس ہو رہا تھا۔

"اس کا حلیہ بیان کرو ذرا۔" میں نے کہا۔

"آپ سامنے کھڑے ہو جی... حلیہ کیا بتاؤں۔" وہ بولا۔

"آپ کا یہ فون [illegible] ہے؟" میں نے کسٹم انسپکٹر سے کہا۔ "فون ملتان ملائیں۔ سلطان محمد خان کے گھر کا نمبر میں دیتا ہوں۔ اس سے پوچھو کہ جونی کہاں ہے؟"

"تمہارا دیا ہوا نمبر تو کسی کا بھی ہو سکتا ہے... جو ریسیور اٹھائے گا کہہ دے گا کہ میں سلطان محمد خان ہوں اور جونی تو میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔"

"ذہانت کی بات کی تم نے۔" میں نے کہا۔ "چلو وہاں کے ڈپٹی کمشنر یا علاقے کے ڈی ایس پی کا نمبر ملا دو... وہ فون تصدیق کر کے دس منٹ میں جواب دے سکتے ہیں۔ ڈی سی آفس والی طرف سے کوٹھی ہے یا شاید پانچویں۔ ڈی ایس پی کا دفتر ملتا ہے۔ دونوں ذاتی طور پر سلطان محمد خان کو بھی جانتے ہیں اور جونی کو بھی۔"

کسٹم انسپکٹر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر تذبذب کی حالت سے نکل کے شک میں ڈال دیا۔ ڈرائیور کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ کسٹم افسر نے نمبر ڈائل کیا۔ آدھی رات کے وقت لائن آسانی سے مل گئی۔

"کیا دفتر اس وقت بند نہیں ہوں گے؟"

"ڈی ایس پی کا آفس اور تھانہ ایک ہی عمارت میں ہیں۔" میں نے کہا۔

"پھر تھانے والوں سے ہی کیوں نہ کہہ دیا جائے۔" کسٹم انسپکٹر [illegible] "وہ بھی تو تصدیق کر سکتے ہیں۔"

"ہاں... تصدیق تو وہ ملتان کر سکتا ہے۔"

"آدھی رات گئے۔ سلطان محمد خان کو ڈسٹرب کرنا...؟"

"کمال ہے... ان کے بیٹے جونی کو اسلحے کی اسمگلنگ کے سنگین جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے... تم کو ان کی نیند خراب ہونے کا ڈر ہے... اگر تم نے انھیں بتائے بغیر ایسا کیا تو زیادہ خرابی ہو گی۔"

کسٹم افسر نے کسی سے پوچھ کے تھانے کا نمبر ملایا۔ "کون؟... ایس ایچ او صاحب ہیں... دیکھیں سر... ہم نے ایک بندے کو کراچی میں پکڑا ہے جو خود کو سلطان محمد خان کا بیٹا کہتا ہے۔ وہ ایک ٹرک کے ساتھ پکڑا گیا ہے... جان محمد عرف جونی جانا جاتا ہے... کیا... ابھی آپ کے پاس تھا... کتنی دیر پہلے... ہاں جی... ہاں جی... بالکل... یہ ہے کوئی جعلساز... ذرا مجھے کچھ حلیہ بتا دیں اس لڑکے جان محمد کا...۔" پھر وہ "بس ٹھیک ہے... ہاں جی... ہاں جی" کرتا رہا... بالآخر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"آئی ایم سوری... اس کتے کے بچے نے جھوٹ بول کے آپ کو بھی ٹریپ کرنا چاہا تھا۔" کسٹم افسر نے ڈرائیور کو گھور کے کہا۔

"میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ اس نے مجھے کیوں جان محمد کہا۔"

"آپ مجھے اور اسے پولیس اسٹیشن لے چلو۔" ڈرائیور [illegible] بیٹھا۔

یک لخت مجھ پر اس سازش کے محرکات واضح ہو گئے۔ ان کا مقصد مجھے پھنسانا تھا۔ یہاں بھی سب کی موجودگی میں اپنی زبان سے یہ میں نے بیان دیا کہ جان محمد جونی ولد سلطان محمد خان سے تعلق تسلیم کر رہا تھا اور تھانے پہنچ کر بھی میں اپنی بات پر قائم رہتا کہ میں جان محمد عرف جونی نہیں ہوں۔ ظاہر ہے تصدیق اور تفتیش کے مرحلے ہوتے... اس سے قبل ہی یہ معلوم ہو جاتا کہ میں کون ہوں... یہ جانے والے ڈرائیور کو لے جاتے یا وہ خود بتا دیتا... بے گناہی ثابت کر کے رخصت ہو جاتا۔ تلاشی لینے پر ٹرک سے ایک گولی بھی ملتی تو اسے روکنے کا جواز باقی نہ رہتا۔ مگر میں دھر لیا جاتا۔ انھوں نے بہت ہوشیاری سے جال بچھایا تھا اور کوشش کی تھی کہ اسمگلر سے دو تھکا رہ جائیں۔ یعنی سکندر بخت تو پکڑا ہی جاتا، اس کے ساتھ ہی جان محمد بھی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے کہ وہ اس کا ساتھی تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ سیٹھ رو کے علاوہ کسی کی سازش نہیں ہو گی۔ اسے ہی جونی اور حسینہ پر غصہ تھا جنھوں نے مجھے بیچ میں لا کر اس کا بنا بنایا کام بگاڑ دیا تھا۔ وہ تھوڑی بہت سزا انھیں دلوانا چاہتا تھا۔ زیادہ کا امکان اس لیے نہیں تھا کہ سیٹھ رو سے زیادہ سلطان محمد خان کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ ان کے بیٹے کو کسی سازش میں کوئی ملوث نہیں کر سکتا تھا۔

"تھانے کو اب سب کو ہی جانا پڑے گا۔" کسٹم انسپکٹر نے اٹھ کے کہا۔ "ملتان کے تھانے والوں نے کہا ہے کہ وہ صبح تصدیق کر کے بتا سکتے ہیں... رات کو سلطان صاحب کو تنگ نہیں کیا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں... کیا آپ میرے ساتھ میری گاڑی میں چلیں گے؟"

کسٹم انسپکٹر تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ میرے [illegible] بہت اثر و رسوخ ہے ورنہ وہ مجھے گرفتار کرتے اور میری گاڑی کی تلاشی لینے کا حکم دیتا... شاید وہ ڈر رہا تھا کہ میں راستے میں [illegible] اور اس سمیت وہ چار آدمی ٹھکانے لگا دوں۔ وہ میرے ساتھ ہرگز نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔

"تم... آپ ہمارے ساتھ جیپ میں چلیں۔"

میں نے صاف انکار کر دیا۔ "یعنی میں اپنی کار کو یہاں چھوڑ جاؤں... آپ کے پاس چابیاں ہیں تو آپ ڈرائیو کریں۔ یا مجھے ڈرائیو کرنے دیں۔"

"آپ کے ساتھ دو سپاہی جائیں گے... اور ٹرک ڈرائیور جائے گا۔" کسٹم انسپکٹر نے فیصلہ کیا۔ "میں جیپ میں ٹرک کے پیچھے آؤں گا۔"

اس کے فیصلے نے مجھے خوش کیا۔ اس نے میرے لیے بہت سی مشکلات کا خاتمہ کر دیا تھا۔ میں ابھی طے نہیں کر پایا تھا کہ تھانے پہنچنے سے پہلے اس کسٹم انسپکٹر سے کیسے گلو خلاصی ہو گی اور ڈرائیور کس طرح میرے قبضے میں آئے گا۔

"آپ کے پاس... کوئی ہتھیار ہے تو...؟"

"میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے۔" میں نے کسٹم انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

"مجھے تلاشی لینی ہو گی...۔"

"میرا خیال ہے کہ تم ایسی حماقت نہیں کرو گے۔" میں نے سرد سفاک لہجے میں یوں کہا کہ میرے لہجے سے نتائج کی دھمکی واضح ہو جائے اور یہ بات صرف کسٹم انسپکٹر سمجھ سکے جو نشانے پر تھا اور ابھی میرے الفاظ بھولا نہیں تھا۔ میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا تھا چنانچہ وہ کسی ماتحت کو بھی اشارہ نہیں کر سکتا تھا کہ مجھے دبوچ لے۔ بالآخر اس نے اپنی جان بچاتے ہوئے مجھے دو سپاہیوں کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ٹرک پکڑ لیا تھا اور بحفاظت تھانے بھی پہنچا دیا تھا۔ دوسرے اگر کسی غفلت کے مرتکب ہوتے ہیں تو وہ قصوروار نہیں۔

ٹرک ڈرائیور کو میرے ساتھ بٹھانے کی سرکاری وجہ یہ بتائی گئی کہ بصورت دیگر وہ ٹرک سمیت فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ حالانکہ ٹرک کوئی جیٹ طیارہ نہیں کہ پولیس کی جیپ کو چھوڑ کے اڑن چھو ہو جائے۔ دو کانسٹیبل جن کے پاس وہی بھاری بھرکم بندوقیں تھیں جو زمانہ قبل از آزادی کی یادگار تھیں، اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ ایک تانگے [illegible] کی سی مونچھیں پہلے ہی [illegible] تھیں مگر وہ انھیں بقول شاعر مشرق، گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر... تاؤ دیتا اور ان پر پالش کرتا رہتا تھا۔ تھانے میرے ساتھ آگے بٹھایا گیا۔ یقیناً اسے زیادہ ذمہ دار سمجھتے ہوں گے اور زیادہ مستعد رہنے کی تاکید کی گئی ہو گی۔

جب اولڈ [illegible] کے دو ہزار سی سی کے انجن نے انگڑائی لی اور کار نے [illegible] کے مانوس ہوتے ہی محافظوں کے خیالی [illegible]

www.paksociety.com

ٹانک رفتار پکڑی تو وہ تھوڑے سے پریشان ہوئے۔

"سر جی... اپنی سپیڈ..." ٹانک بولا۔ "گاڑی الٹ جائے گی تو آپ کا... نقصان ہو جائے گا۔"

"میرے نقصان کی فکر مت کرو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں دوسری کار خرید لوں گا۔" اور رفتار مزید بڑھا دی۔ "تم ڈر تو نہیں رہے ہو نا؟"

"نہیں مگر وہ... اچھا تھا اُن کو بھی ساتھ رکھتے۔" ٹانک بولا۔

"وہ اور ہم ایک ساتھ کیسے چل سکتے ہیں... خرگوش اور کچھوے کی رفتار برابر تو نہیں ہو سکتی نا...؟" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ اگر اس گاڑی کو پچاس میل فی گھنٹا کی رفتار سے کم پر چلایا جائے تو اس کے انجن کا سیر پول مریض ہو جاتا ہے۔"

"کیا... سیر پول کیا...؟"

"وہ ہوتی ہے ایک خرابی۔" میں نے کہا۔ "جو مشین جالکس کی کم رفتار سے بیچ ماتس توڑ دیتی ہے۔"

ٹانک جو کچھ کا دیکھا تھا میں نے خالص جنی اصطلاحات کا استعمال کیا تھا... وہ ان پڑھ آدمی... اُسے کیا معلوم کہ سیر پول بیمر یج تو دماغ کی رگ پھٹنے کو کہتے ہیں۔

"خیر میں رفتار کم کر لیتا ہوں..." میں نے کہا۔ "جانا تو ہم سب کو ایک ہی جگہ ہے... بالآخر..."

وہ سمجھ نہ سکا کہ بات میں نے دیلنے فانی کا تذکرہ کر رہا ہے یا میری مراد تھانے سے ہے۔ آگے مسلسل اندھیرا تھا اور میں حیران تھا کہ کراچی کا نام و نشان نہیں مگر گول پل اور والوں نے محصول وصول کر لیا ہے۔ ایک میل کے بعد میں نے کلچ دبا کے ایک دم چھوڑا۔ ٹانک کو زبردست جھٹکا لگا اور اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ میں نے ایسے ہی دو تین جھٹکے دیے... پھر کلچ دبانے بغیر گیئر بدلنے کی کوشش کی تو گیئر بکس میں سے رگڑ کی ایک خوفناک آواز سنائی دی۔

"یہ کیا ہوا؟" ٹانک گھبرا کے بولا۔

"وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔" میں نے گاڑی روک دی۔ اس کا بونٹ کھولا اور جھک کر اگنیشن کوائل کا ایک تار الگ کر دیا۔ ٹانک میرے ساتھ ہی اترا تھا میں نے پھر اپنی جگہ بیٹھ کے گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کا ڈراما کیا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اب انجن گھومتا رہے گا مگر اسٹارٹ نہیں ہو گا۔ دو چار مرتبہ کی ناکام کوشش کے بعد میں نے جھلاہٹ اور جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے پھر بونٹ کھولا اور تار لگا دیا۔ ٹانک کو پھر میرے ساتھ اتر کر پڑا۔

"اپنے بندوں سے کہو کہ تھوڑا سا دھکا لگائیں۔" میں نے ٹانک کو مخاطب کیا۔

"گاڑی اسٹارٹ ہو جائے گی؟" اس نے تشویش سے پوچھا۔

"یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے... اس کے حکم کے بغیر تو پتا نہیں ہلتا... یہ تو مت بھولی گاڑی ہے۔" میں نے کہا۔ "بندہ کوشش ضرور کر سکتا ہے۔"

ٹانک قائل ہو گیا کہ کائنات کا نظام ایسے ہی چل رہا ہے۔ اس نے دونوں ماتحتوں سے کہا۔ "شاوا بھئی جوانو... ذرا زور لگاؤ، جان گاڑی تو... ذرا جان لگا کے۔"

دونوں رنگروٹ دونوں کانسٹیبل نیچے اتر کے گاڑی کو دھکا لگانے کے ثواب آمیز کام سے فارغ ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ انھوں نے دروازے بند کر دیے اور پیچھے گاڑی کو دھکیلنے لگے۔ آگے بیٹھے ہوئے ٹانک نے فوراً اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے اصل مجرم کو نظروں سے بیاد کیا کہ منصوبے کے مطابق وہ پیچھے بیٹھا تھا اور دروازہ کھول کر بھاگ بھی سکتا تھا... میں گاڑی چھوڑ کے کہاں جا سکتا تھا۔

پھر ہوا کہ میں نے بیک ویو مرر میں ٹرک اور جیپ کو دیکھا۔ ان کی ہیڈ لائٹس آگے پیچھے ہونے سے چار بجے نظر آتی تھیں مگر اونچائی کے فرق سے اندازہ ہو تا کہ اب آگے جیپ ہے یا ٹرک۔ میں نے ایک دم چابی گھما کے انجن اسٹارٹ کیا۔ کلچ چھوڑ دیا۔ گاڑی سیکنڈ گیئر میں تھی۔ رکیں ہیچھے ہی جب تک کے آگے بڑھی۔ پیچھے سے دھکا لگانے والے یقیناً منہ کے بل گرے ہوں گے... اور ٹی سڑک پر سجدہ کرنے سے ان کا دل گئی ہو تو ممکن تھا۔ میں نے پلک جھپکنے میں ٹانک کو دیر پائیں ہاتھ کی کہنی ماری اور قریب اس کی کنپٹی پر ٹھیک پڑی۔ وہ اس موڑ کے تو بیٹھا ہوتا تو میرا کام اتنا آسان نہ ہوتا۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور کے کچھ سمجھنے سے پہلے میں نے ایمرجنسی بریک لگا دیے۔ وہ ایک جھٹکے سے آگے آیا اور میں نے گھوم کر اس کے سر پہ مکا مارا۔ اس کا دروازے کی سائڈ سے لگا۔ کار رک گئی تھی۔ اپنا تجربہ کہ میں نے ریوالور نکال لیا۔ ڈرائیور سخت جان تھا اور مجھ پہ حملہ کرنے سے آگے ہی تھا کہ ریوالور کا دستہ اس کے سر پہ پڑا... اور وہ وہیں گر گیا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور جھٹکے سے کر مند جانے والی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لیے اسٹارٹ کیا۔ سو گز کے فاصلے سے میں نے پیچھے رہ جانے والے سپاہیوں کی دالفلیں سڑک پر گرا دیں۔ مجرمانہ غفلت کے جرم میں اتنا گناہ نے کا سنگین جرم بھی شامل ہو جاتا تو وہ کہیں کے نہ رہتے۔ اب وہ آگے آئیں گے تو انھیں اپنا اسلحہ ضرور مل جائے گا۔

زیادہ بجھوں نہیں یا نہ ملیں۔

دس منٹ بعد میں نے خود کو کراچی کے کسی مضافاتی علاقے میں پایا۔ آدھی رات کے بعد وہاں سناٹا اور ہو کا عالم تھا۔ پہچانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ایک گشتی پولیس موبائل نظر آئی تھی لیکن میں ان سے ایک سوال کرتا تو وہ سوال شروع کرتے۔ ایک وردی پوش ٹانک کے بے ہوش کے اوندھا پڑا ہوا تھا اور دو سپاہی پیچھے گرے ہوئے سڑک پہ پڑے ہیں۔ ٹانک کو میں نے وہیں ایک جگہ ڈراپ کیا... معلوم نہیں وہ کون سی جگہ تھی جہاں مجھے ایک سائیکل والا نظر آیا۔ اس نے مجھے مطلع کیا کہ "بھیا... یہ فیڈرل بی ایریا ہے۔ یہ بلاک سولہ ہے۔ اُدھر سترہ... تمھیں کہاں جانا ہے؟"

"جہانگیر روڈ ویسٹ۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو بھیا تم یوں کرو کہ اللہ کا نام لے کر سیدھے چلے جاؤ... مڑ کر مت دیکھنا... بس یہی سڑک تم کو لے جائے گی۔ ولیکا سے گزر و گے نا تو سیدھے ہاتھ پہ سرکاری کوارٹر ہیں، پانچ نمبر کے چوک کے بعد۔"

"اندازاً کتنا فاصلہ ہو گا؟"

"فاصلہ... وہ تو میں نے کبھی ناپا نہیں... مگر ہاں... تم یہ سمجھو بھیا... کہ پہلا چوک عائشہ منزل... دوسرا کریم آباد... تیسرا... پاپوش... اس کے بعد تیسرا دس نمبر..."

"یہاں چوک بھی دس نمبر کا ہوتے ہیں؟"

"بھیا نے وانت لگا ہے، دس نمبر لالوکھیت کا تیسرا چوک تھا ڈاک خانے کی چورنگی... بس اس کے بعد تین ہی چورنگی..."

بلاشبہ اس نے میری بہترین راہنمائی کی تھی۔ میں نے چار چوک عبور کیے... سب پہ چار چار سڑکیں ایک ساتھ ملتی تھیں۔ پانچوں راؤنڈ اباؤٹ آتے ہی میں نے کوارٹر دیکھے جو یکسانیت سے سرکاری طرز تعمیر کی بدصورتی کا نمونہ تھے۔

کمانڈر نے چوک پہ بیٹھا کچھ بے رونق تھی اور ایک آدھ جگہ نظر ہو تا تھا مگر میں نے کسی سے کچھ مناسب نہیں سمجھا۔ میرا خیال تھا شہر یار کا کوارٹر آسانی سے تلاش کر لوں گا۔ سب قطاروں میں ہیں اور نمبر سب پہ لکھا ہے تو کسی سے پوچھنا کیا۔ میرا اندازہ غلط ہو گیا جب نمبر چیک کرنے لگے۔ مشکل یہ تھی کہ اندھیرا تھا اور کوارٹروں کے اندر بند لوگ سب مر چکے تھے۔ اندھیرا ایسا ہو کے پڑا رہتے تھے۔ سب نیند میں تھے اور مشکلاً چند میں بیٹا تو تھی ہی، یہ بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ کوارٹروں کے مالکان کوئی ایک پیشے بعد بھی بتا سکتا تھا

کہ اس کا رنگ کیا تھا اور اس کو چلانے والا کون تھا اور کہاں گیا تھا!

یہ اندھیرے کے ہاتھ پیر تنگ جانے والی بات تھی کہ اچانک مجھے سات سو دس کا ہندسہ دکھائی دے گیا۔ اس پہ الف بھی لکھا تو کچھ نہیں لکھا ہوا تھا مگر میں نے گاڑی روک دی۔ اس قطار میں دس کوارٹر تھے۔ گویا اگلی قطار یا پچھلی قطار میں گو نے والا کوارٹر... میں پیدل چل کے آگے گیا تو مجھے سات سو کا عدد نظر آیا اور اس کے ساتھ ہی لکھا ہوا الف بھی۔ اب شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ پیچھے والی قطار کے پہلے کوارٹر کو غور سے دیکھنے کے لیے میں دروازے تک گیا اور اس پہ چاک سے لکھے ہوئے نمبر کو پڑھنے میں کامیاب رہا۔

پچھلی سیٹ پہ پڑے ہوئے ڈرائیور کے ابھی ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ شاید وہ خود ہوش میں آ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے تھوڑی بہت طبی امداد ضروری تھی۔ میں نے کار کے شیشے چڑھا کے دروازے لاک کیے اور پیچھے کی طرف گیا۔ کوارٹر کا نقشہ سمجھ لینے کے بعد میں نے صحن کی سات آٹھ فٹ اونچی دیوار کے اوپر سے اندر کودنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں دروازہ بجا کے کسی کو جگانا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے ریوالور کو ہاتھوں میں دبایا اور خود کو ہاتھوں کے زور پہ اونچا اٹھا کے دیوار کے اوپر سے گزر گیا۔ میں ایک اندھیرے صحن میں اترا مگر کراچی کا آسمان اتنا سیاہ نہیں تھا کہ میں کچھ دیکھ نہ پاتا۔ یہ مٹیالا سا اندھیرا تھا جیسے خالص اندھیرے میں دس فیصد اجالے کی ملاوٹ کر دی گئی ہو۔ صحن کے بعد برآمدہ تھا اور پھر دائیں بائیں دو کا ایک نما خانے... ان میں سے ایک کچن ثابت ہوا۔ سامنے دو کمرے تھے اور دونوں کے دروازے کھلے پڑے تھے۔

میں نے ایک کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ کھٹ سے سوئچ آن ہوا اور میں نے خود کو سو واٹ کے بلب کے نیچے ایک عجیب چیز کے روبرو پایا۔ وہ تھا تو تیس پینتیس سال کا جوان آدمی مگر اس نے اپنی جوانی کا ورق مختصر کر لیا تھا جو کہ جاز عفران کا کر سکتا ہے۔ اس کے بال لمبے الجھے ہوئے اور خشک تھے۔ اس نے موٹے شیشے والی بھاری فریم کی عینک لگا رکھی تھی اور غالباً یہ داڑھی نہیں تھی بلکہ ہفتے بھر میں بڑھ جانے والی شیو تھی جس نے اس کی شان قلندری کو دوبالا کر دیا تھا۔ وہ ایک ایسی پتلون پہنے ہوئے تھا جسے پاجامہ کہنا بھی غلط ہوتا جب وہ سلی ہوئی تو یقیناً صاف ہو گی اور درزی نے اس پہ استری بھی کر کے دی ہو گی مگر وہ کچھ اس اصول کا قائل معلوم ہوتا تھا کہ لباس جب پھٹ جائے تو بدل لو... دھونے استری کرنے کا روگ کیا پالنا۔ ایسی ہی حالت

www.paksociety.com

قیمیں کی بھی تھی۔

"جی؟" وہ بولا۔ "کیسے تشریف لانا ہوا؟"

"آپ... افتخار عارف ہیں؟" میں نے کہا۔

"اور ہم کیا لگتے ہیں بھلا... وہ کسولی والے عارف افتخار چودہ کلی کر کے ہنسا مگر اس کی ہنسی کی آواز نہیں آئی۔ "یعنی ہم آپ کے لیے چشم براہ تھے... کیا تھے؟"

"چشم براہ..." میں نے کہا۔

"جی... اور بس اچانک آپ آگئے... بھلا کیسے؟" وہ یوں کہا جیسے تماشا عاشک جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجاتے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ "آپ سکندر اعظم ہیں نا جو اکیلے دنیا کو فتح کرنے نکلے ہیں... بڑا غلط ہے جناب آپ کا... آج ایک عجیب شخص نے ہمیں مطلع کیا کہ آپ نے ہمیں منتخب کیا ہے میزبانی کے لیے۔ ہم نے کہا واہ... چشم ما روشن دل ما شاد... غریب خانہ حاضر ہے موجود ہر بلا کے لیے۔"

"ایک بلا اور بھی ہے میرے ساتھ۔" میں نے کہا۔ "باہر میری کار میں پڑی ہے... اجازت ہو تو اندر لے آؤں؟"

"اجازت؟" وہ پھر ہنسی کر کے ہنسا اس کی ہنسی باہر تو جاتی تھی مگر پھر کہیں حلق سے نیچے اتر کے گم ہو جاتی تھی۔ "ارے بھائی! یہاں کس سے اجازت لینی ہے۔ فقیر کا ڈیرا ہے۔ جس کا جی چاہے آئے جائے۔ ہر چیز پر حق ملک الموت پر پابندی ہے۔"

میں پریشان ہو گیا... میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اتنا ہنسنے والا ریٹائرڈ ایسا باتونی اور مجنونی صفت ہوگا کہ میرا دماغ چاٹ جائے گا۔ بہر حال دروازہ اندر سے کھول دیا گیا اور بے ہوش ڈرائیور کو اندر اٹھا لیا۔ کوارٹر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ غالب نے اپنے وقت میں کہا تھا کہ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا۔ آج کا یہ صحافی بھی اس گھر میں اپنی ویرانی کے ساتھ رہتا تھا اور اپنی فقیری میں بھی شاہی کے احساس سے سمجھوتا کیے ہوئے تھا۔ دیواروں پر گرد تھی اور جالے تھے یا میلے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ دونوں کمروں میں ایک ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ ان پر میلے بستر تھے... باقی سب جگہ کتابوں اور رسالوں کے ڈھیر تھے... فرش پر... الماریوں میں... ریک پر... یہ بات عجیب لگتی تھی یہ تھی کہ سب رسالے اخبار بڑی ترتیب اور سلیقے کے ساتھ رکھے گئے تھے جبکہ گھر یا اس کے مکین کو دیکھ کر ترتیب اور سلیقہ بے معنی الفاظ لگتے تھے۔ میں نے ڈرائیور کو ایک چارپائی پر ڈال دیا۔

"یہ تمہارا ساتھی ہے؟" وہ بولا۔

"نہیں... یہ بھی ایک دشمن ہے۔" میں نے کہا۔ "جب ہوش میں آئے گا تو اس سے کچھ پوچھیں گے... ابھی تو مجھے دو

مسائل درپیش ہیں۔ ایک تو باہر جو میری گاڑی کھڑی ہے اسے روپوش کرنا ہے۔ کیونکہ پولیس میرے تعاقب میں ہے۔"

وہ ہنسا۔ "جہاں گاڑی کھڑی ہے وہ بہترین جگہ ہے۔ کیا سمجھے؟"

"بہترین جگہ؟" میں نے کہا۔ "مگر..."

"یہ غریب کلرکوں کی بستی ہے۔ کار والے اور نہیں رہتے چنانچہ کسی کار کو تلاش کرتے یہاں کون آسکتا ہے... اور پھر پولیس ہماری... ماشاء اللہ... اس سے کیا ڈرنا۔ اب دوسرا مسئلہ بتا جاؤ۔"

"دوسرا مسئلہ ہے پیٹ کا۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "میں نے شام کے بعد سے کچھ نہیں کھایا... تم کیا کھاتے ہو؟"

"ہم تو بھائی جو ملے وہ کھاتے ہیں۔ کبھی قوم کا غم... کبھی پبلک کی گالیاں، کبھی ایڈیٹر صاحب کی جھاڑ... مگر یہ سب تمہارے ہضم کرنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو اس گھر میں ایک بھی بیوی نہیں ہے... نہ کبھی ہوگی شاید... چنانچہ مطبخ صرف روح میں چلتی ہے... تم یہ سوٹ بوٹ اتارو اور اتارو... ہم بناتے ہیں کافی جس کے ہم اسپیشلسٹ ہیں کیا پیو گے؟"

"اسپیشلسٹ؟" میں نے مجبوراً جواب دیا۔

"باسی ڈبل روٹی چلے گی؟" وہ بولا۔

"چلے گی کیا دوڑے گی۔" میں نے کہا۔ "مگر کافی بلیک؟"

"ظاہر ہے بلیک ہی ملے گی۔ ہم دودھ ویسے بھی ملاوٹ والا نہیں پیتے۔" وہ بولا۔

"یعنی سب کے لیے ایک نسخہ؟" میں نے کہا۔

"بالکل ایک... چاہے کافی میں تو دودھ ڈالنے کی ہمت ہی نہیں... جسے دودھ کا شوق ہو باہر جا کے دکان سے پئے۔" وہ بولا۔

جب وہ کافی بنانے کے عمل میں مصروف تھا تو میں باہر گیا اور گاڑی میں سے دونوں سوٹ کیس پلاسٹک بیگ اٹھا لایا۔ ان میں سے ایک میں کچھ کپڑے بھی تھے۔ دو فوجی وردیاں کے علاوہ جو میں نے غداروں کے ٹریننگ کیمپ سے چند عام استعمال کے کپڑے بھی اٹھا لیے تھے جو نہ معلوم کس کے تھے۔ کسی بے حیث پاکستانی کے یا بھارتی دشمن کے... ان میں ایک استعمال شدہ جینگ سوٹ بھی تھا جو میرے کام آگیا۔ موچی کے کپڑے دیکھ کر مجھے اس کا خیال آیا۔ معلوم نہیں وہ کیا سوچتی ہوگی میرے یوں خاموشی سے غائب ہو جانے پر اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ میں اس پر بھی کبھی اعتماد نہیں کرتا تھا حالانکہ آسان بھی نہ تھا، بچپن کے جذبات اور اس کی فیملی کے احسانات اپنی جگہ لیکن

بلاشبہ بہت مختلف تھے اور سرحد کے اس پار دشمنوں کے ساتھ ان کا یہ بھائی بھی ہوتا تو قابل اعتبار نہ ہوتا۔

اچانک مجھے "کلک" کی آواز سنائی دی جو چند سیکنڈ میں اب بوجھی۔ یہ جناب افتخار عارف تھے جو... نسوانی کپڑوں میں ہاتھ میں دیکھ کر چونکے تھے۔

"پہن لیں... کچھ بھی پہن لیں۔" وہ کافی کے مگ اور ایک بریڈ کے ہوئے بولا۔ "رات کا وقت ہے اور ہمارے سوا کون دیکھ رہا ہے... اور اگر ہم سے بھی شرم آتی ہے تو ہم عینک اتار کے رکھ دیتے ہیں..."

"یہ کپڑے میرے نہیں ہیں۔" میں نے خفت سے کہا۔

"اچھا تو پھر ان کے ہوں گے... جو ان کے اندر نہیں ہیں۔ مگر ہم نے تو عرض کیا یہ چند روزہ جدائی تو کوئی بات نہیں۔"

میں جاتے جاتے رک گیا۔ ایک بہت بھولی بسری یاد نے میرا راستہ روک لیا۔ ایک بار جب میں جیل سے نکلا تو اپنی مایوسی کے اندھیروں میں اور پھر خوف و خیالوں کی بند گلیوں میں بھٹک رہا تھا تو فیض کے یہی دو شعر کسی کے دست عنایت نے امید کی روشنی دکھانے کے لیے بھیجے تھے۔ قفس نے کنج زنداں کو اس خوبصورت نے زلف یار کی صورت مہکا دیا تھا اور میں پھر بھی اس خیال سے نہیں ڈرا تھا کہ جلا ہیں آج اگر ہم تو کل نہ جلتے ہوں گے یا نہیں۔

وہ میرے چہرے سے میرے جذبات کو پڑھنے میں مصروف تھا اور میرے بارے میں کوئی اندازہ رکھتا تھا تو یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ کس حد تک صحیح یا غلط تھا۔ وہ صورت سے ٹھیلی اور باتوں سے بچگانہ نظر آنے والا شخص اپنی ذات کے گرد دبیز خول رکھتا تھا۔ وہ بے وقوف نظر آنے کی اور بے وقوف بننے کی پوری کوشش کرتا تھا لیکن یہی اس کی عیاری اور ہوشیاری تھی جس سے وہ دوسروں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب رہتا تھا۔ شاید یہی اس کی کامیابی کا راز تھا۔ لوگ اسے احمق اور بے ضرر سمجھتے ہوئے وہ سب کہہ دیتے تھے جو اپنے آپ کو عقل کل اور افلاطون سمجھنے والے بلاوجہ بک مار کے بھی معلوم نہیں کر پاتے تھے۔ یہ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں کامیاب وہی ہے جو خبریں نکال لائے خواہ انھیں راز داری رکھنے والوں نے سات پردوں میں چھپا کے رکھا ہو۔ ہر کالم نگار خود اپنی صداقت کا شاہد ہو اور مشکل ہو۔ سچائی کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ہر شخص اپنی عقل، ذہانت اور ہمت کے مطابق راستہ بناتا ہے لیکن افتخار ان میں سے نہیں تھا جن کا راستہ رک جاتا ہے کیونکہ وہ نیچے کہیں نیچے سے سرنگ بنا کے اپنا راستہ نکالتا تھا اور اسی خفیہ راستے سے سچ کو اغوا کر کے لے جاتا تھا۔

نازو کے بارے میں اس کی رپورٹ یہی ثابت کرتی تھی اور بعد کے حالات نے میرے خیال کی تصدیق کی۔

جب میں کپڑے بدل کے آیا تو وہ ڈھیلی چارپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے تمام دیواروں پر چسپاں رنگین تصاویر کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

"کیا یہاں کوئی شریف آدمی نہیں آتا ہے؟"

وہ ہنسا۔ "شریف آدمی ہم سے ملنے نہیں آتے اور انہی سے ملنے آتے ہیں۔ خصوصاً اس وقت جب انھیں بے کیف اور بلیک اینڈ وائٹ خوابوں کی شکایت لاحق ہو۔"

"میرے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟" میں نے رنگ اڑا کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"سب جانتے ہیں ہم... اور جو نہیں جانتے وہ پوچھ لیں گے مگر آپ فرمائیں کہ کسی تعارف کے بغیر آپ ہمارے پاس کیوں تشریف لے آئے کیا لے آئے؟"

"تشریف!" میں نے جھلا کے کہا۔ "یہ کیا فضول عادت ہے تمہاری؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "ضروری نہیں کہ تم میری بات شریف... فرض کرو یہاں میں نہ ملتا پولیس ملتی۔"

"میں ایسی بات فرض کر سکتا تو تم سے رابطہ ہی قائم نہ کرتا۔ تم جیسا آدمی سب کچھ کر سکتا ہے مگر کسی کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔

"تمہارا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔"

"نہیں... تمہاری رپورٹ دیکھنے کے بعد میں سمجھ گیا تھا کہ تم صرف سچ بول سکتے ہو۔ اور سچائی کو سمجھتے ہو... مجھے اپنی سچائی پر بھروسا تھا۔ چنانچہ مجھے معلوم ہوا کہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو تو مجھے کوئی ڈر نہ رہا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ مجھے تم سے نازو کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔"

"آں؟" وہ الو کی طرح گول گول دیدے گھما کے مجھے دیکھنے لگا۔ "یہ کیا چیز ہے؟"

"وہی لڑکی جس کے بارے میں تم نے سب سے الگ رپورٹ دی تھی۔"

"تم جانتے ہو اسے؟" اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔

"ہاں... اور مجھے اسی کی تلاش ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کا اصل نام نازلی بیگم ہے۔ اس کا ساتھی ڈبل ایس آئی شیخ ہے جو رشتے میں اس کا بڑا بھائی بھی ہے۔"

"ڈبل ایس آئی ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"وہ پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔ سب انسپکٹر سید اکرام شیخ

www.paksociety.com

چنانچہ میں اُسے ڈبل ایس آئی تسلیم کرتا تھا۔ کچھ بچپن کی وجہ سے اور کچھ جرم شناسی کے جنون میں اُسے پولیس کی نوکری کو ترک کرنا پڑا۔ حالانکہ وہ خدمتِ خلق کے جذبے سے بھرپور دل کے ساتھ اس پیشے سے وابستہ ہوا تھا۔۔۔ وہ دونوں جانے ساتھی ہیں۔"

"ذرا تفصیل سے سمجھاؤ۔" وہ بولا۔

میں نے باسی ڈبل روٹی پانی کے ساتھ نگل لی تھی اور اب کافی کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ سگریٹ سلگا کے میں نے اُسے تفصیل سے بتایا۔ اپنے بارے میں۔۔۔ محسن اور رابعہ کے بارے میں۔۔۔ شعلا اور نازو، اکرم شیخ اور غالب کے بارے میں۔ ظاہر ہے اس میں ملاور اینڈ کمپنی کا ذکر بھی تفصیل سے آیا۔۔۔ وہ بیچ بیچ میں سوالات کرتا گیا۔ میں نے غیر اہم تفصیلات سے گریز کیا اور وقت بچایا۔ پھر بھی صبح ہو گئی۔ اس نے دوسری بار کافی بنائی اور ایک گولی نگل لی۔

"یہ کیا دوا تھی؟" میں نے کہا۔

"یہ نیند بھگانے کی گولی تھی۔۔۔ کھاؤ گے؟" وہ بولا۔

"نہیں۔۔۔ میں مسلسل جاگتے رہنے کی بہت مشق کر چکا ہوں۔"

"ہم تو نائٹ برڈ ہیں نا۔۔۔" وہ بولا۔ "دن چڑھتے ہی غنودگی طاری ہونے لگتی ہے۔۔۔ میں ذرا مستعد رہنا چاہتا ہوں۔"

"یہ گاڑی میرے لیے ایک مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے غائب کرنے کی کوئی صورت ہے؟"

"کئی صورتیں ہیں۔" وہ بولا۔ "ایک تو یہ ہے کہ اسے شیر شاہ کے مرحوموں کے سپرد کر دیا جائے۔"

"کون شیر شاہ۔۔۔ سوری؟"

"شیر شاہ ایک ایسا میوزیم ہے جس کی نظیر دنیا میں شاید کہیں نہ ہو۔" وہ بولا۔ "پرانی گاڑیوں کے پرزے وہاں کوڑیوں کے مول بکتے ہیں۔ کسی بھی ملک کی کسی بھی گاڑی کے کسی بھی ماڈل کی بات کرو اور کوئی بھی پرزہ مانگو۔۔۔ وہ حاضر کر دیں گے۔۔۔ ویسے تم آٹو پارٹس کی ساری مارکیٹ چھان مارو تو نہیں ملے گا۔ یہ پرزے اسکریپ کی صورت میں جہاز بھر بھر کے لائے جاتے ہیں، اور بعض پرزے تو ایسی گاڑیوں کے ہوتے ہیں جو دوسری جنگِ عظیم کے بعد بننا بند ہو گئی تھیں۔ جیسے ماہر قصاب زندہ گائے کو دیکھتے دیکھتے بوٹی بوٹی کر دیتا ہے ایسے ہی شیر شاہ کے ڈیلر کسی پرانی کار کا پرزہ پرزہ یوں الگ کر دیتے ہیں کہ کار واقعی غائب ہو جاتی ہے۔ کوئی سالم گاڑی اگر چوری ہو جائے تو شیر شاہ کے چند سرتیق ایسے بھی ہیں جو چند گھنٹے میں گاڑی کا سراغ تک باقی نہیں چھوڑتے۔ وہ مشکوک گاڑیاں خریدتے بھی تول کر ہیں۔ چنانچہ انھیں بالکل نئی گاڑی کو ختم کرتے ہوئے کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ پھر ڈیش بورڈ کہیں گیا۔۔۔ دروازے کہیں۔۔۔ ڈرائیونگ اسٹیئرنگ۔۔۔ انجن کہیں اور۔۔۔ جو بعد میں اس پر نیا نمبر ڈال کے بیچ دیا جاتا ہے۔ ضرورت مند کو۔"

"مجھے ایسی گاڑی کا یہ حشر منظور نہیں۔"

"تو پھر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کا رنگ بدلوا دیا جائے اور کوئی نیا نمبر لگوا لیا جائے۔۔۔ انجن پر بھی اور چیسس پر بھی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ "کیا یہ بھی ممکن ہے؟"

"ناممکن یہاں کچھ نہیں۔ نیا رجسٹریشن نمبر بھی مل سکتا ہے۔" وہ بولا۔

"لیکن کاغذات میں کچھ اور ہوگا تو۔۔۔؟"

وہ ہنس پڑا۔ "کاغذات کا کیا ہے۔۔۔ اس کے مطابق ہو جائیں گے۔"

"نہیں بھائی۔۔۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"تو پھر تیسری صورت یہ ہے کہ اسے فروخت کر دیا جائے سیکرٹ سروس کے ذریعے۔" وہ بولا۔ "جہاں چوری کی گاڑیاں خریدی جاتی ہیں اور غیر علاقے میں بھیج دی جاتی ہیں۔۔۔ جب مالک چاہے تو پولیس کے ساتھ جائے تاوان ادا کرے اور گاڑی لے آئے ورنہ کوئی اور لے جائے گا۔۔۔ بس وہ قیمت کم لگاتے ہیں۔۔۔ تقریباً ایک تہائی۔۔۔ وہ تہائی بھی نقد دیتے ہیں۔ تقریباً دس ہزار مل جائیں گے تمہیں۔"

"تمہارا رابطہ ہے ان سے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"ہاں۔۔۔ شہر میں رہ کے شہر سے رابطہ تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔" وہ بولا۔

"بس تو یہ ٹھیک ہے۔۔۔ اسے بیچ دو۔۔۔ میں دس ہزار سے لوں گا۔" میں نے کہا۔

"بہت پیسہ ہے تمہارے پاس؟" وہ بولا۔

"ہاں۔۔۔ اتنا کہ خود مجھے اندازہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "صندوق بھرے پڑے ہیں۔"

"کیا یار۔۔۔ تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟" وہ ہنسنے لگا۔

"یہ مذاق کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم دیکھ سکتے ہو۔" باری باری میں نے اسے دونوں باکس کھول کے دکھائے تو اس کی صورت پر بارہ بج گئے۔

"یہ سب مالِ غنیمت ہے۔۔۔ دشمن سے لوٹا ہوا مال" میں نے کہا "اور یہ دستاویزات۔ جعل سازی کا سامان۔۔۔ جعلی مہریں لیٹر پیڈ اور یہ سب پاسپورٹ۔۔۔"

"بھائی۔۔۔ تم تو بہت خطرناک آدمی ہو۔" وہ بولا۔ "ساتھ لیے پھرتے ہو؟"

"اور کیا کروں۔۔۔" میں نے کہا۔ "کسی بینک کے لاکر دوران؟"

"میں کر پاؤں گا؟" وہ بولا۔ "ورنہ یہاں وہ گم کر دیں گے۔"

"انھیں کیا معلوم۔۔۔؟"

"دشمن کو سب معلوم ہو جاتا ہے میاں سکندرِ اعظم۔۔۔ ان بیٹیوں والے اور جماعت تفتیش کا اندک لوگ مل کے کام کر رہے ہیں اس وقت۔۔۔ کوئی نیا نمبر چلتا کر انھوں نے کتنے ایسے پرچے پاس ہو چکے ہیں۔ وہ تو ہی نظریے سے بیچ چکے ہیں اور سوناروں پر پانچ ہو چکے ہیں۔ خواہ اس کی تعبیر کتنی ہی بھیانک کیوں نہ خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہاں سرکاری دفاتر میں سیکرٹریٹ میں پرائیوٹ اداروں میں کام کرنے والوں کا ایمان ڈانواں ڈول ہو رہا ہے۔۔۔ شیخ جیسا اور اس جیسے دوسرے سیاسی بازیگروں نے ان کے جذبات بھڑکنے کے لیے استحصال کا نعرہ بلند کیا ہے۔ یہ شعور بیدار رکھا ہے کہ مغربی حصے کی حکومت ہے اور مشرقی حصہ محکوم ہے۔ آمدنی ان کی ہے اور کھا جاتے ہیں ہم مغربی پاکستان والے۔ وہاں آبادی اکثریت کوئی نئی بات نہیں ہے۔ شہری آبادی میں کمی کے سامنے بنگالی تیل ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے عزت کر نہیں ہو سکتی معاشی دنیا بھی استحصال کا حربہ ہے [illegible] جانبوں کو گمراہ کر چکا ہے۔ بادنام [illegible] کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور [illegible] وفاداری غیر یقینی ہو [illegible] ہے۔ شاید اتنی دشمنی کے جذبات [illegible] معلوم نہیں [illegible] کہاں کس کس جگہ سے وہ [illegible] نقصان پہنچا رہے ہیں [illegible] باعث دشمن کے عزائم کا ساتھ دے رہے ہیں۔۔۔ [illegible] کتنے وفادار رہ گئے اور کتنے نہیں۔ [illegible] کی بات ہے نا۔ انھیں کسی بھی محکمے میں کسی [illegible] سکتا ہے اور ان سے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کسی [illegible] لگا دو۔۔۔ وہ ٹاپ سیکرٹ فائلوں تک رسائی رکھتے ہیں اور انھیں منع کرنا ناممکن ہے۔ سب پر نظر بھی نہیں رکھی جا سکتی۔ [illegible] آس پاس ان کوارٹروں میں بنگالی بھرے پڑے [illegible] معلوم ہے کہ وہ بات کو چھپ کے کہیں اکٹھے ہوتے [illegible] ایک کے گھر کبھی دوسرے کے اور شیخ مجیب الرحمان کے [illegible] پر بحث کرتے ہیں۔۔۔ خفیہ جماعت میں ہوتے ہیں [illegible] انھیں یہاں سے کیسے نکالا جا سکتا ہے۔ جب تک کہ وہ [illegible] کی بات نہ کریں یا قول و فعل سے غدار ثابت نہ ہوں۔"

جب وہ بول رہا تھا تو میں نے ایک مختلف آدمی کو دیکھا۔ [illegible] ملامتی نگاہیں رکھنے والا۔۔۔ باریک بین۔۔۔ منطقی [illegible] سچا پاکستانی اور کٹر قوم پرست۔۔۔ غیر جذباتی شخص۔

"تم جن سے لڑ رہے ہو نا۔۔۔ وہ تو سامنے کے دشمن ہیں۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "زیادہ خطرناک وہ ہیں جو ابھی تک وفاداری کا اور دوستی کا نقاب چڑھائے بیٹھے ہیں۔۔۔ حقیقی جذبات پہ مصلحت کا پردہ ڈالے خاموشی سے وقت کا انتظار کر رہے ہیں اور تذبذب کا شکار ہیں۔۔۔ اگر حالات نے موافقت کا انداز اختیار کیا تو۔۔۔ واہ واہ۔۔۔ یہ فوراً بوریا بستر سمیٹ لیں گے اور جاتے جاتے اپنے انتقامی جذبات کی تسکین کے لیے جتنا نقصان کر سکنے کی پوزیشن میں ہوں گے ضرور کریں گے۔۔۔ ان کی کھوپڑی میں بیٹھ گئی ہے کہ مغربی پاکستان نے ان پر ایک بہت ظلم کیا۔۔۔ انگریزوں سے بھی بڑا۔۔۔ اپنی دانست میں وہ ہم سے ایک جنگِ آزادی لڑ رہے ہیں۔۔۔ اور تم تو جانتے ہو کہ انھیں تھپکی دینے والے اور لڑانے کے لیے اسلحہ دینے والے ہاتھ کس کے ہیں۔۔۔ یہ کیا بہت سے لوگ یہ سب جانتے ہیں مگر کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اب یہاں کی مثال لو۔ جن بنگالیوں کو بھی کوارٹر الاٹ ہیں وہ جاتے وقت کسی کو بیچ اور دے گئے تو کیا ہوگا۔۔۔ ویسے تو انھیں باقاعدہ اسٹیٹ آفس سے کلیئرنس لے کر اور کوارٹر باقاعدہ حوالے کر کے جانا چاہیے لیکن بہت سے فرار ہو رہے ہیں۔۔۔ راتوں رات۔۔۔ ہوائی جہاز سے نہ بحری جہاز سے بلکہ بھارتی اور مشرقی لنکا کے راستے۔۔۔ نیپال کے راستے۔ معلوم ہے وہ کیا کر رہے ہیں۔۔۔ وہ ڈھاکہ تک آرام سے کیا کر رہے ہیں۔۔۔ کوئی دروازے تک بیچ رہے ہیں۔ کون پکڑے گا انھیں۔ نقصان تو سرکاری ہے۔۔۔ خیر۔۔۔ یہ تو لمبی بات ہے اور شاید اس میں تمھارے لیے کوئی نئی بات کوئی نہ ہو۔"

"سرکاری دفاتر میں کام کرنے والوں کے خفیہ کام کا ذکر کر کے تم نے میرے ذہن میں زیادہ بڑے خطرے کا احساس پیدا کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ان حالات میں تو میرا یہاں رہنا ایسا ہی ہے جیسے بھارتی ایجنٹوں کے درمیان رہنا۔۔۔ تم مجھے کہیں اور منتقل نہیں کر سکتے؟"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور چپ رہا۔ پھر اس نے چٹکی بجائی۔ "ادھر گھڑی میں وقت دیکھو۔ ابھی ساڑھے چھ بجے ہیں۔ بابو لوگ سات بجے کے قریب گھروں سے نکلتے ہیں۔ یہ وقت یہاں سے نکلنے کے لیے بہت اچھا ہے۔۔۔ تمھارا یہ قیدی مر تو نہیں جائے گا؟"

"امید تو نہیں۔۔۔ مر گیا تو مجھے صرف یہ افسوس ہوگا کہ اس سے کچھ پوچھنا تھا وہ نہ پوچھ سکا۔" میں نے کہا۔

"تو اسے لپیٹو ایک چادر میں اور لے جاؤ۔۔۔ میں دونوں سوٹ کیس اٹھاتا ہوں۔" وہ بولا۔ [illegible] سوٹ کیس اٹھا لو۔"

www.paksociety.com

اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ ایک منٹ میں اس نے چادر والاں کے ڈرائیور کو لپیٹا اور کندھے پر ڈال لیا۔ وہ چھ فٹ کا خاصا صحت مند آدمی تھا مگر اپنے حلیے سے اس نے خود کو بیمار بنا رکھا تھا۔

"تم... ایسے ہی چلو گے؟"

"اور کیا ڈرائی کلینر کے پاس سے نیا سوٹ لا کے پہنیں گے ہم؟ ارے میاں ہمارا نائٹ سوٹ... ڈے سوٹ... ڈنر سوٹ سب ایک ہے۔" وہ بولا۔ "اور تم بھی یہ نخرے چھوڑ دو۔"

"کیا مطلب... اسی نائٹ سوٹ میں؟"

"ہاں بھائی... فرض کر لو کہ رات ہے۔" وہ بولا۔ "کسی کو کیا کہ تم اپنے دماغ میں دن کو رات فرض کیے جا رہے ہو۔"

پانچ منٹ میں اس نے دروازے کو مقفل کیا اور ہم گاڑی تک جا پہنچے۔ اس نے سوٹ کیس ڈکی میں رکھوا دیے اور بے ہوش ڈرائیور کو پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ میں نے چپل اور نائٹ سوٹ میں پہلی بار کراچی جیسے بڑے اور ماڈرن شہر کی سڑکوں پر ڈرائیونگ شروع کی۔ مجھے حیرت ہوئی جب کسی نے مجھے گھور کے بھی نہیں دیکھا۔ غالباً ہمارا اپنا احساس ہمیں زیادہ پریشان رکھتا ہے کہ ہم کیسے نظر آتے ہیں دیکھنے والوں کو... قمیص کے کالر کا داغ... ٹائی کی بھدی ناٹ... ان سب کا خیال صرف ہمیں اندر ہی اندر شرمندہ کرتا ہے، ورنہ دوسروں کو تو ان کی پروا ہوتی ہے نہ خبر... سب اپنے اپنے کام سے اپنے اپنے راستے پر جا رہے تھے اور کوئی کسی کے لباس پر غور نہیں کر رہا تھا۔ شاید میں صرف نیکر پہن کے بھی گاڑی چلاتا تو کچھ نہ ہوتا۔ کوئی دیکھتا بھی تو خود رک کر اور میرا راستہ روک کے مجھے شرمندہ کرنے کے لیے وقت ضائع نہ کرتا۔ زیادہ سے زیادہ دل میں کہتا کہ کیسے کیسے پاگل کے بچے کاریں لیے پھر رہے ہیں... اور بس...

مجھے کراچی کی سڑکوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا مگر میرا ایڈوانس ڈرائیونگ کنسلٹنٹ کرتا جا رہا تھا۔ قائداعظم کے مزار کو مکمل دیکھ کر میں تھوڑا سا جذباتی ہو گیا تھا۔ "یہ کام بھی ہو گیا بائیس سال میں۔"

"ہاں... ہم سو برس میں سوچتے اور کام کرنے لگے ہیں۔ اور قوت فیصلہ اور قوت عمل دونوں سے محروم ہو گئے ہیں۔" وہ بولا۔ "ایک وہ جیتی ہیں... جناتی قوم... ہمارے ساتھ آزاد ہوئے تھے... سنتے ہیں تو یقین نہیں آتا کہ انھوں نے وہ کام دنوں میں کیے جو ہم نے سالوں میں کیے۔ آئین توڑ کے سو توڑے ہیں۔ اب ملک کو توڑنے کے درپے ہیں۔ ہم جب بابائے قوم کے مزار کے سامنے سے گزرتے ہیں تو خود کو شرمندہ محسوس کرتے ہیں۔ کئی بار سوچا مگر ہمت نہیں پڑتی اندر جا کے فاتحہ پڑھنے کی۔ یہی خیال آنکھ سے جو ہمارے چچا غالب کو آیا تھا کہ کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب... وہ ہم کیا منہ دکھائیں قائداعظم کو۔ پاکستان کا یہ حشر... یہاں سے بائیں جانب مڑو تو... یہ وکٹوریہ روڈ ہے۔"

"ایک بات کہوں... برا تو نہیں مانو گے؟" میں نے کہا۔

"ہم جانتے ہیں تم کیا کہو گے... برا کیا ماننا۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولا۔ "ہم کچھ نہیں ہیں۔"

"نہیں... آپ صورت سے احمق نظر آتے ہیں یا نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔"

"آپ اپنی صورت پر مت اترائیں زیادہ۔" وہ جل کے بولا۔ "ہم بتائیں گے آپ کو کراچی کے آدھے شہر کی لڑکیاں اسی صورت پر فریفتہ ہیں۔"

"اور باقی آدھے شہر کی؟" میں نے تجسس ظاہر کیا۔

"وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ہم انھیں شمار کریں۔" وہ بولا۔ "وہ بس دیکھنے میں لڑکیاں نظر آتی ہیں... یہ فوارہ دیکھ رہے ہو؟"

"نہیں... ایک مینار نما چیز دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہ میموریل تو نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "جب صدر آئزن ہاور نے پاکستان کا دورہ کیا تھا تو بنایا گیا تھا۔ اب صرف فوارہ ہے۔ میموریل کی تختی کسی نے نکال لی ہے یا ختم ہو گئی ہے۔"

میٹروپول ہوٹل سے اس نے مجھے دائیں جانب مڑنے کو کہا۔ وہاں کھڑے ہوئے سنتری نے افتخار کو سلام کیا۔

"یہ تمھیں پہچانتا ہے؟"

"نہیں نہ جانے کتنے لوگ پہچانتے ہیں۔" وہ بولا۔

"پھر تو یہ اچھا نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔ "اس نے تمھیں میرے ساتھ اِدھر جاتے دیکھ لیا۔"

"یہ جیلیں ہر جگہ آتے جاتے دیکھتا ہے۔ کبھی تنہا کبھی..."

"میرا مطلب تھا اس نے یہ کار دیکھ لی ہے۔"

"وہ ہر روز ہزاروں کاریں دیکھتا ہے... اور ان میں... نہیں بتا سکتا کہ کون سی تو کس ونگ کی تھی اور کون سی... دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا خرس اور خرگوش میں۔"

"لیکن وہ رنگ اور حلیہ بتا سکتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ... کیسے بتا سکتا ہے... اور بتا..."

"تو ہم انتظار نہیں کر سکتے۔" وہ جھلا کے بولا۔ "اس کے..."

"میں تو ہماری ہی ناک جائے گی... ہم جہاں سے گزرے..."

"کیونکہ ہم اس وقت سوتے ہوتے ہیں... ہمارا زیادہ..."

"ہے یہاں ہے۔ اس کے بعد کوئینز روڈ کے قدیم ٹائپ بنگلے ہیں۔ ان میں زیادہ تر نیوی کے افسر رہتے ہیں مگر بہت سے خالی پڑے ہیں۔ حالانکہ الاٹ ہو چکے ہیں۔ بڑی ٹائپ ہیں جو افسران کو ملتے ہیں مگر وہ ان گول ٹین کی چھت والے بیرک نما کوارٹروں سے جان چھڑاتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ گارڈن روڈ یا لارنس روڈ کی طرف چلے جائیں... نہ جا سکیں تو کرائے پر اٹھا دیتے ہیں۔ میرے پاس ایک بیرک کی چابی ہے۔"

"وہ کس کے نام الاٹ تھی؟"

"ہے ایک چھوٹا سا لاوارث محکمے کا افسر۔"

"یہ سڑک آگے کہاں جاتی ہے؟" میں نے کہا۔

"کیماڑی کی طرف... مگر تم اسی جگہ سے موڑ لو۔" وہ بولا۔

بیرک میں تالا ضرور لگا ہوا تھا مگر اسے کسی خانہ بدوش نے توڑ کر اندر ڈیرا ڈال لیا تھا۔ کار سے افتخار کو اترتا دیکھ کے وہ بدحواس ہو گئے۔ افتخار نے ان پر گرجنا شروع کیا۔ "باپ کا گھر ہے، سالے چور اُچکے... کیسے گھسے تم لوگ اندر، اور وہ جو سامان تھا اندر ایک ریکٹ کا وہ کہاں ہے؟ ابھی بلاتا ہوں پولیس کو، تمھاری روح تک قبض ہو جائے گی۔"

وہ افراتفری میں بیوی بچے اور گدڑیاں سمیٹ کر فرار ہوئے تو میں نے ایک ایسی عمارت دیکھی جس کے اوپر نیم دائرے کی شکل کی چھت منڈھ دی گئی تھی۔ نیچے دیواریں اونچی کر کے اور خانے بنائے گئے تھے۔ ٹین کی چھت کے نیچے جو چھت بنائی گئی تھی وہ ادھڑ چکی تھی۔ دیواروں پر سوراخ پڑے تھے اور صرف دو ہولڈر اس قابل تھے کہ ان میں بلب لٹکائے جا سکیں۔ بے حد قدیم بجلی کا سوئچ میں نے جلایا تو مجھے کرنٹ لگا۔ افتخار ہنسی سے دوہرا ہو کے رہ گیا۔

"میرا خیال ہے کہ پہلے گاڑی کو اندر کر دوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"گیراج باہر ہے۔" وہ بولا۔ مجھے حیرت ہوئی... ایک گیراج نما ٹین کی چھت والا کمرہ تھا۔ اس کے پٹ بند تھے... کھولا تو انکشاف ہوا کہ اندر ایک ٹیکسی کا ڈرائیور... غالباً... اس نے گاڑی کو اندر داخل کیا۔ گاڑی کے اطراف صرف اتنی ہی جگہ باقی رہتی کہ دروازے کھولے جا سکیں... گھر کا اسباب... ٹوٹ پھوٹ کر بکھرے پڑے تھے۔

"یہ جگہ ہمارے لیے بہت محفوظ جگہ ہے۔" افتخار نے کہا۔ "تم اگر ایسی ویسی حرکت نہ کرو... تو..."

"ایسی ویسی حرکت سے تمھاری مراد ہے شراب پی کر غل غپاڑا اور عاشقی معشوقی...؟"

"نہیں... تم اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کو ایسی ویسی حرکت میں شمار کر سکتے ہو۔ جیسی جہاں مار دھاڑ ہونے لگے گولیاں چلیں اور بم پھینکے جائیں تو کیا ہو گا۔" افتخار نے کہا۔ "میں گمنام رہ کر جب تک رہنا ہے... ایسے کہ کسی کو آنے کا پتا چلے نہ جانے کا... یہاں کوئی کسی سے سروکار نہیں رکھتا۔ کسی نے تم پر شک کر کے پوچھا کون ہو؟"

"یہ ایک بڑا کام ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "باقی مسائل میں حل کر لوں گا جن کا تعلق میری ذات سے ہے۔ مثلاً کھانے پینے اور سونے کا بندوبست... اصل کام جس کے لیے میں یہاں آیا ہوں وہ بھی پہلا کام ہے۔ نازو کی تلاش... اس کے بعد... بڑا مسئلہ یہ ہے کہ رات کو تم مصروف ہوتے ہو اور دن تمھیں سونے کے لیے چاہیے۔ میرے معمولات اس کے برعکس ہوں گے... عام طور پر... چنانچہ اس تلاش میں تم میرا ساتھ نہیں دے سکو گے۔"

"یہ تو ہے۔" وہ سر کھجا کے بولا۔ "پھر بھی میرے بس میں جو کام ہو وہ ضرور بتانا... میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔"

"ایک کام تو یہ کر دو کہ مجھے کوئی گاڑی دے دو جو ابھی راستے میں مجھے شہر میں نظر آئی تھیں۔ وہ سب پرانی گاڑیاں تھیں نا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "پانچ ہزار سے پانچ لاکھ تک کی مل سکتی ہے۔"

"میں نے ایک دو جگہ زرد نمبر پلیٹ والی گاڑیاں دیکھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ زرد نمبر پلیٹ کس کی ہیں؟"

"ہاں... کسٹم کی... بہت ہیں یہاں۔"

"مجھے ایسی ہی گاڑی لا دو۔ بیشک نمبر پلیٹ والی۔"

"تم ذرا بھی ڈیوٹی نہیں لگتے۔" وہ مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھ کے بولا۔

"میں فرنچ پر عبور رکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تھوڑی بہت جرمن بھی سمجھ اور بول لیتا ہوں... رہی شکل تو وہ میں کبھی ایک نہیں رکھتا۔ مجھے کسی ایکسپرٹ میک اپ مین کی خدمات درکار ہیں تاکہ میں بے خوف و خطر پھر سکوں۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ ایک سوٹ کیس میں جعلی دستاویزات کی تنکٹری بند ہے۔ بے شک وہ سارے جعلی پاسپورٹ ہیں مگر جب ملک سے باہر جانے کے لیے کسی ہوائی جہاز یا بحری جہاز پر سوار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا اسے کون غور سے دیکھے گا۔ شہر کے اندر جو پولیس ہے وہ اصلی نقلی کے فرق کو سمجھ ہی نہیں سکتی... وہ تو بس میری شناخت کا ذریعہ ہو گا... اور مقامی پولیس سے محفوظ رہنے کا وسیلہ... میرے دشمن بھی مجھے تلاش کرتے رہیں گے اور میں سب کے درمیان رہ کے بھی سب

سے الگ رہوں گا... مجھے بندرگاہ کے علاقے میں بھی رہنا ہوگا...
دو چار دن تو کم سے کم... اور وہ خوفناک جگہ ہوگی میرے لیے۔"

"ابھی کیا پروگرام ہے؟" وہ بولا۔ "میں رات کے وقت آؤں گا تو گاڑی بھی ساتھ لاؤں گا اور میک اپ کرنے والے کو بھی۔"

"یہاں لاؤ گے اسے؟" میں نے کہا۔

"اچھا تمہیں لے چلوں گا اس کے پاس۔" وہ بولا۔

"ابھی میں تمہارے ساتھ واپس چلوں گا۔" میں نے کہا۔ "یار بھوک سے بُرا حال ہے... تم چاہو تو سو جانا... میں ذرا اس بندے سے کچھ پوچھوں گا۔"

"میرے کوارٹر میں...؟"

"اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کے رکھوں گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو یہ بے ہوش ہے اور مجھے تشویش ہو رہی ہے کہ ہوش میں نہ آیا تو کیا ہوگا۔ کوئی ڈاکٹر ہے جو بھروسے کے قابل ہو؟"

"سب ہو جائے گا... یہ مر گیا تو اس کی تدفین بھی ہو جائے گی... تم کہو گے تو پوسٹ مارٹم بھی ہو جائے گا۔" وہ بولا۔

"اچھا تو پھر تم ایک ٹیکسی لے آؤ... ہم واپس چلتے ہیں۔"

اصل مقصد اس کار کو چھپانا تھا اور ایک ٹھکانا حاصل کرنا تھا... میں خود کو بہت محفوظ سمجھ رہا تھا کسٹم انسپکٹر اور پولیس کی رپورٹ میں میرا حلیہ اور کار کا نمبر جستجو کرنے والے مجھے آسانی سے تلاش نہیں کر سکتے تھے... میں شہر میں خاموشی سے وارد ہونا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیسے تمہاری میرے پیچھے لگ گئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ایک معرکہ سر کرنا پڑا۔ وہ ٹرک کس کا تھا اور کہاں گیا تھا یہ اب اس کا پتا افتخار عارف بھی نہ چلا سکے مگر ٹرک کے مالکان یقیناً شہر میں اپنے کارندوں کو چوکس کریں گے کہ ٹرک کا رنگ کیا... میرا گمان کہتا تھا کہ ڈرائیور اس بدمعاش حاجی عبداللہ کا کتا ہو سکتا ہے اس کے ساتھ ایک مخبر بھی ہوگا... وہ اس واردات کی پوری رپورٹ آگے پہنچا دے گا۔

افتخار عارف سے راستے میں ایک جگہ ٹیکسی رکی۔ یہ اس کے کسی جاننے والے ڈاکٹر کا گھر تھا۔ وہ کوئی نوجوان ڈاکٹر تھا۔ اور افتخار سے بے تکلف تھا۔ اس نے ڈرائیور کو باہر آ کے ٹیکسی میں ہی دیکھا... وہ پچھلی سیٹ پر بے سدھ پڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا تھا... آخر اسے...؟" ڈاکٹر نے اس کی نبض دیکھی۔

"کیا بتا کر کے بتاؤں... یا تمہیں گر کے دکھاؤں... یہاں کوئی زینہ ہے؟"

"پہچ... " ڈاکٹر نے سر پر ایک جگہ ابھار دیکھ کر شبہ ظاہر کیا۔ "پیچھے کوئی گومڑ تھا؟"

"نفسا... حادثہ کا گومڑ ہوتا ہے... اور پھر اس سانحہ کا جو تو کتنا شمار ہوتا ہے؟" وہ بولا۔

"ابے چھوڑ... اس کے سر پر یہ چوٹ کیسی ہے؟"

"بیوی نے مجھے کہاں کھینچ کے مارا تھا۔ اس نے اپنا سر آگے کر دیا تو سر اغر جانی چھوڑ علاج کرو۔"

"اس کیس میں آبزرویشن ضروری ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "میں ایک انجکشن دے رہا ہوں... انگلیاں نہیں آ رہی ہیں تو کوئی بے ہوشی کی چیز کا اثر ہو... جھٹکے سے تقریباً جاتا ہے۔ دو تین گھنٹے میں ہوش نہ آیا تو پھر ہسپتال لے جانا پڑے گا۔ سر کا ای ای جی کرانے کے لیے۔"

وہ اندر گیا اور پھر باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک سرنج تھی۔ اس نے ڈرائیور کے بازو میں سوئی اتار دی۔

"یہ دو ڈیڑھ سو لے لینا۔" اس نے ایک پرچی افتخار کو تھمائی۔

"تیری منگیتر کا کیا حال ہے؟" افتخار ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اسے فون مت کیا کر... وہ تیرے جال میں نہیں پھنسے گی۔"

"میں اسے اغوا کر کے بھی لے جا سکتا ہوں... مگر سوچتا ہوں جلدی کیا ہے تیری شادی کے بعد سہی۔" افتخار نے کہا۔

"اپنی شادی سے پہلے میں تجھے سانپ کا انجکشن لگواؤں گا... یا لگوا دوں گا... ویسے میں سٹکیا دے دوں گا۔" ڈاکٹر بولا۔ اور واپس گھر میں گھس گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور دم بخود بیٹھا تھا۔

افتخار نے اسے ڈانٹا۔ "تم چلو گے اب یا میں دھکا دوں؟"

***
***

ہم دونوں ٹرک ڈرائیور کو اٹھا کے اندر لے گئے اور ایک پلنگ پر لٹا دیا۔

"اس کے ہوش میں آنے سے پہلے مجھے نہا دھو لینا چاہیے اور تمہیں ناشتا وغیرہ تیار کر لینا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"میں ناشتے کا عادی نہیں ہوں۔ عموماً لنچ ہی کرتا ہوں مگر تمہارے لیے پوری چھولے لا دیتا ہوں۔" وہ بولا۔

"ایک بات تو بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "جب میں آیا تھا تو تمہارا انداز گفتگو... طور طریقہ سب مختلف تھا۔"

وہ ہنسا۔ "دو دن سے میں یہی رول کر رہا تھا۔ ایک تیلی شخص کا... جو شاعر بھی ہے۔ تمہاری نازو کے بارے میں جو رپورٹ میں نے حاصل کی وہ تیلی بن کے حاصل کی تھی۔ ایک کسٹم آفیسر بھی بڑے شاعر پرست بنتے ہیں۔ ان کے توسط سے منصور علاقوں تک پہنچا اور اب تم سے کیا چھپانا۔ ایک بنگالی کسٹم افسر اور اس جہاز کے کپتان کا لنک بھی دریافت کر لیا۔"

"اس جہاز کا نام کیا ہے؟"

"ایس ایس کراچی سٹار۔" وہ بولا۔

"ابھی بندرگاہ میں موجود ہے؟"

"ہاں... ایک ہفتے بعد سیل کرے گا۔" وہ بولا۔ "تم اس کے چکر میں مت پڑنا... میرا کیس بھی خراب کرو گے۔ میں اس بنگالی کو رنگے ہاتھوں پکڑوانے کے لیے جال پھیلا چکا ہوں۔ وہ کلیئرنس میں مدد دیتا ہے۔"

"کس چیز کی کلیئرنس میں؟"

"غالباً اسمگل... کریٹ پر تو لکھا ہوتا ہے کہ ٹوٹنے والا سامان۔ اور وہ سارے نشانات بنے ہوتے ہیں۔ تیر کا اور چھتری کا یعنی بارش سے بچائیے اور سیدھا رکھیے۔ ہک مت استعمال کیجیے۔"

میں نے فقط سر ہلایا اور نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔ وہاں شامپو وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ مجھے باتھ اور رنگ استعمال کرنا پڑے۔ میں نہا کے فارغ ہوا تو افتخار ناشتے کا بندوبست کر چکا تھا ناشتے کے بعد وہ باہر نکل گیا اور میں سگریٹ سلگا کے ٹرک ڈرائیور کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ انجکشن کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے اور وہ ہاتھ پیر ہلا کے اوں آں کر رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور پھر ہاتھوں کو کمر کے پیچھے لے کے باندھ دیا تاکہ وہ پٹی نہ ہٹا سکے۔

ایک گھنٹے بعد وہ اس حد تک ہوش میں آ چکا تھا کہ میں نے اسے سہارا دے کر بٹھایا اور ایک مگ سیاہ کافی زبردستی پلائی۔ اس دوران میں آواز بدل کے اسے تسلی دیتا رہا کہ وہ بالکل پریشان نہ ہو۔ اسے واپس کراچی پہنچا دیا جائے گا۔

"لیکن... میں ہوں کہاں؟"

"تم حیدرآباد میں ہو...؟" میں نے کہا۔ "تمہیں کچھ یاد ہے تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

اس نے رک رک کے وہی بتایا جو ہوا تھا۔

"وہ کون تھا جس نے تمہارے سر پر ڈنڈا مارا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم... مجھ سے تو بس یہ کہا گیا تھا کہ... تم کو پولیس پکڑے گی... ڈرنا نہیں... وہ تم کو روک کے رکھیں گے۔ پھر تمہارے پیچھے ایک کار آ جائے گی... کسٹم بتا دے گا وہ ٹرک کا مالک جب اسے تھانے لے جائیں تو تم بھی چلے جانا... تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"کس نے کہا تھا یہ سب؟"

"وہ حاجی صاحب کا خاص آدمی ہے۔" وہ بولا۔

"سکرائی ناک... کانوں میں مندریاں پہنتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی... آپ جانتے ہو اسے؟"

"ہاں... وہ تمہیں کہاں ملا تھا؟"

"ملتان میں جی۔"

"اور تم نے یہ سب کیوں کیا؟ ڈر کی وجہ سے یا لالچ میں؟"

"دونوں ہی باتیں ہیں جناب۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ سخت ڈرا ہوا ہے۔ شاید اس نے ایسے کام پہلے کبھی نہیں کیے تھے اور اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ مجھے اس پر زیادہ تشدد نہیں کرنا پڑا۔ وہ خود ہی سب کچھ بتا رہا تھا۔ ساری سازش چیف رو کی تھی... وہ ملتان سے میرے پیچھے لگا رہا۔ میرے غائب ہو جانے کے بعد اس نے چنگی اور جونی پر نظر رکھی اور مظفر گڑھ سے واپسی پر جب میں نے دوبارہ ان سے رابطہ قائم کیا تو چیف رو کی محنت ٹھکانے لگی۔ اس نے وہیں دیکھ لیا ہوگا کہ مجھے کون سی کار فراہم کی گئی ہے۔ یہ بات بعد میں پتا چلی ہوگی۔ سلطان محمد خان کے بیٹے ملتان میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ کسی کار ڈیلر نے تصدیق کر دی ہوگی کہ آج ان کے ایک ... نے فلاں کار خریدی ہے۔ میرے ... حیدرآباد میں ٹرک جانے سے اس کے پلان میں خلل پڑا ہوگا مگر دوسری رات وہ کامیاب رہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ... میں آ رہا ہوں؟"

"ہم تو ابھی راستے ایک ... میں پیچھے کھڑے تھے جی۔" وہ بولا۔

"ہم کون؟"

"میں اور وہ... اسٹاپ... بیچ دو نام ہے شاید اس کا... صرف ... حاجی صاحب سے ٹریفک ٹھیک سے کرتا تھا۔"

"تب نے ٹھیک سنا تھا۔" میں نے کہا۔

"اچانک اس نے کہا کہ گاڑی آ گئی... تم اب ٹرک لے کر جاؤ... اور پھر وہ خود آ گیا۔"

"آگے کہاں گیا؟"

"اپنی کار میں واپس حیدرآباد۔" ڈرائیور نے کہا۔

"ٹرک میں تم کیا لا رہے تھے؟"

"سبزیاں اور پھل۔" وہ بولا۔

"تمہیں یقین ہے کہ اس میں اسلحہ نہیں تھا؟"

"ہوگا جی... یا نہیں ہوگا... مجھے کیا معلوم...؟"

"وہ تم پر بھروسا کرتے تھے... تم ان کے وفادار اور نمک خوار تھے۔" میں نے کہا۔ "تم اعتبار کے قابل نہ ہوتے تو وہ ٹرک تمہارے سپرد نہ کرتے اور نہ تم سے ایسا کام کرنے کو کہتے۔"

"مجھے معلوم ہے جی۔"

"پھر یہ تم کیا کرتے ہو... سب کو بتاتے ہو... کیا تمہیں واپس نہیں جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں تو وہ نہیں چھوڑیں گے نا؟"

"میں نے کون سی ایسی بات بتائی ہے... جو چیف رو نے کہا تھا وہ میں نے کیا۔ وہ جانے اور حاجی صاحب جانیں..."

www.paksociety.com

میں جو کچھ ہوا تھا، وہ میری غلطی سے تو نہیں ہوا تھا، ویسے بھی یہ میرا آخری پھیرا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں وہاں نہیں جا رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "میں تو پھنس گیا تھا لیکن وہاں سے نکلنا آسان نہیں تھا... اب میں کراچی جاؤں گا۔ وہاں میرے بھائی کا گھر ہے۔ اس نے میرے لیے دبئی سے کام کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"کس ملک کے لیے؟"

"سعودی عرب کے لیے... وہ خود بھی وہیں ہے۔ میں نے آپ کو اس لیے سچ بتا دیا ہے جناب کہ آپ مجھے ... میں آپ کا دشمن نہیں ہوں... میں مجبور تھا... میری غلطی کو معاف کر دو۔" وہ ایک دم رونے لگا۔

"اچھا... رونے کی ضرورت نہیں... میں تصدیق کروا لوں گا تمہارے بھائی کے گھر سے... اگر یہ سب جھوٹ نہ ہوا تو تم جا سکو گے۔" میں نے کہا۔

میرا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا تھا کہ میری ملتان میں موجودگی کا کسی کو علم نہیں... جیدے نے میرا سراغ لگا لیا تھا۔ پھر مجھے یہ فکر بھی لاحق ہوئی کہ ان کا کیا ہوگا جنہیں میں جوگی کی تحویل میں چھوڑ آیا تھا۔ کیا وہ موتی اور نواب خسرو جمشید کی حفاظت کر سکیں گے؟

"تم اپنے بھائی کے گھر کا پتا بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"کراچی میں اس کی بیوی کا گھر ہے... وہ اپنے بھائی کے ساتھ رہتی ہے۔" وہ بولا۔

"کہاں؟ مکان نمبر، گلی نمبر؟"

"جیکب لائن میں جھگی ہے جی۔" وہ بولا۔ "آپ نشتر روڈ سے اندر جائیں۔"

"یہ نشتر روڈ کہاں ہے؟"

"نشتر روڈ کا نہیں پتا جی آپ کو؟" وہ قدرے حیران ہوا۔ "پرانی نمائش کے چوک سے اُلٹے ہاتھ کو جو سڑک اندر جا رہی ہے... گونگے بہروں کے اسکول کے سامنے سے... وہی تو ہے نشتر روڈ... آگے جا کے بریگیڈ تھانے کے قریب ایک کوارٹر کے ساتھ ہماری جھگی ہے۔"

"کوارٹر کا کیا نمبر ہے؟"

"وہ تو مجھے معلوم نہیں... میں سیدھا جھگی تک پہنچ جاتا ہوں۔ آپ بابو پان والے کو پوچھ لینا۔ میرے بھائی کا سالا ہے۔ اُسے سب جانتے ہیں۔" وہ بولا۔

مگر میں اس کی بات کم سن رہا تھا اور اپنے خیالوں میں زیادہ کھویا ہوا تھا۔ اگر جیدے نے جیکی یا جوگی کا پیچھا کر کے میرا پتا چلا لیا ہوگا تو اس بات کا امکان بھی پیدا ہو جاتا تھا کہ وہ نور ہاؤس میں موتی اور خسرو جمشید کی موجودگی کے راز سے بھی باخبر ہو جائے۔ وہ موتی کو مار ڈالے گا۔ پھر اس کا عزم کیا ہوگا اور میں خود ابھی تک طے نہیں کر سکا تھا کہ اس کا کیا کروں۔ مگر خسرو جمشید کو لے گئے تو میرا سارا معاملہ چوپٹ۔ اس نے جو وعدہ کیا تھا، وہ وزیر ہسپتال کی تعمیر اور وصیت نامہ میرے وکیل کے نام کرنے کا اور ہسپتال کی تکمیل کے لیے ضروری سرمایہ بھی فراہم کرنے کا، یہ سودا تو ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا۔

اس خیال نے مجھے اتنا مضطرب کیا کہ میں ٹرک ڈرائیور کو وہیں چھوڑ کے جانے کی سوچنے لگا۔ کہیں نہ کہیں سے مجھے فون کر کے صورت حالات کا پتا کرنا تھا۔ جیکی اور جوگی کو خبردار کرنا تھا۔ لوکل کال ہوتی تو میں کہیں سے بھی کر سکتا تھا مگر ٹرنک کال کے لیے مجھے ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کے کسی پی سی او تک جانا ہوگا... رات کو کراچی کے قریب آ کے واپس ہو گئے وہ ... اگر ابھی تک ملتان نہیں پہنچا ہوگا تو پہنچنے ہی والا ہوگا۔

میں نے ابھی تک ٹرک ڈرائیور کے صرف ہاتھ باندھے تھے۔ اب میں نے اس کے پیر بھی چارپائی کے ساتھ باندھ دیے۔ اس کے لیے میں نے چارپائی کو تانے رکھنے والی رسی بھی استعمال کی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے میں نے اسے تاکید کی کہ وہ فرار ہونے کی کوشش بھی نہ کرے، ورنہ وہ مارا جائے گا اور پہنچانے والے اسے سوڈان نہیں قبرستان پہنچا دیں گے۔

ڈھونڈنے پر مجھے وہاں ایک ہی تالا ملا۔ اتفاق کسی دروازے کو مقفل نہیں کرتا تھا۔ کہیں جاتے وقت وہ باہر کے دروازے میں بھی اس لیے تالا ڈال دیتا تھا کہ ملاقات کے لیے آنے والوں کو اس کی عدم موجودگی کی خبر ہو سکے۔ کسی چور کے لیے تالا ایک دعوت نامہ ہوتا ہے لیکن پاکستان کے اس نام نہاد مگر غریب صحافی کے گھر میں آ کے چور بھی شرمندہ ہوتا جہاں سوائے حسرت کے تیرے گھر میں خاک نہیں... والی بات تھی۔ زیادہ سے زیادہ وہ فلپس کا ایک بینڈ کا ریڈیو لے جا سکتا تھا جس کی قیمت سو سوا سو روپے تھی۔ باقی میلے کچیلے کپڑے تھے۔ چند برتن تھے اور چور کے نقطہ نظر سے باقی جو کچھ تھا وہ کسی بھی ردی کی ... ردی ہی اس پڑھے لکھے آدمی کا سرمایہ افتخار تھی۔ ذریعہ معاش بھی اور شوق کا سامان بھی۔ دنیا بھر کے مختلف اخبارات و رسائل اور ان کے تراشے، خصوصی مضامین کے حوالے اور جائزے۔ اس کی یہ ذاتی لائبریری اس نے نہ جانے کتنے برسوں تک مسلسل جمع اور جدوجہد کے بعد بنائی تھی۔

میں اپنا سوٹ کیس لے کے اور دروازے کو باہر سے تالا لگا کے نکل گیا۔ مین روڈ کوئی ایک فرلانگ دور تھی... دونوں جانب ایک سے بنے ہوئے ایف اور ای ٹائپ کوارٹر تھے۔ طبقاتی تقسیم کی ایک بنیاد معاشی خوشحالی یا بدحالی ہے۔ نچلا طبقہ... متوسط طبقہ... اور بالائی طبقہ... سرکاری قواعد و ضوابط میں یہ تقسیم اسکیل اور گریڈ کے حساب سے الگ چلتی ہے اور تنخواہ کے فرق کے حساب سے الگ... پونے تین سو سے نیچے والے کو ایف ٹائپ، چار سو تک والے کو ای ٹائپ... ساڑھے سات سو تک لینے والے کو ڈی ٹائپ... اس سے اوپر سی ٹائپ۔ چنانچہ پرانا کلرک اور نیا افسر ڈی ٹائپ میں ایک ساتھ ... محمود و ایاز آج بھی ایک صف میں ہیں۔ عملاً ایسا نہیں تھا۔ گریڈ سترہ کے افسر کا پڑوسی گریڈ گیارہ کا اسسٹنٹ ہے تو ان کے درمیان چھ گریڈوں کا فاصلہ ہے۔ وہ پڑوسی کی حیثیت سے برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔ ہمسائے ماں جائے کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہاں سب اخلاقی و مذہبی تعلیمات پر کیسے عمل کر سکتے ہیں جن سے گریڈ کا فرق ہی ختم ہو جاتا۔ افسران کو یہ برابری ناپسند تھی۔ وہ تو چاہتے تھے کہ سیدھا سیدھا طریقہ ہو کہ کلاس ون گزٹڈ افسر کو سی کلاس، کلاس ٹو کو ڈی کلاس... اس کے نیچے بھی گریڈ کے حساب سے... آقا اور غلام میں مساوات کی تلقین کرنے والے مذہب کے پیروکار انگریز کے بنائے ہوئے قوانین کے اب تک اسیر تھے جس کی پالیسی ہی یہ تھی کہ تقسیم کرو اور حکومت کرو... علامہ فرماتے ہیں تو فرماتے رہیں کہ کیوں حاکم و محکوم میں فاصلہ رہے... حضرت عمر فاروقؓ کے اپنے غلام کے ساتھ سلوک کی مثال بچوں کو پڑھانے کے لیے اچھی ہے۔

بڑی سڑک پر آ کے میں رک گیا۔ ٹریفک کا ایک سیل رواں تھا جو میری نگاہوں کے سامنے سے گزرتا جا رہا تھا... مجھے اپنے بائیں ہاتھ پر ایک بینک کی عمارت دکھائی دی۔ اس کے ساتھ ہی گورنمنٹ کا یوٹیلٹی اسٹور تھا۔ ایک ... نہیں تھا ... خراب تھا ... ایک ... نے بتایا ...

"دیکھیے مجھے ایک بہت ضروری کال کرنی ہے ملتان۔"

"آپ صدر چلے جائیں... یا پھر ادھر ..."

"میں کراچی کی سڑکوں سے بالکل ناواقف ہوں... یہ بتا دیں کہ کون سی جگہ زیادہ آسانی ہوگی؟" میں نے کہا۔

"آسانی تو صدر میں ہی ہوگی۔" وہ بولا۔ "میکلوڈ روڈ پر چلے جائیں... ملے گی۔"

تقریباً پون گھنٹہ میں نے کسی سواری کے انتظار میں گزار دیا۔ اول تو کوئی رکشا ٹیکسی خالی گزرتی ہی نہیں۔ جو گزرتے تھے وہ مخالف سمت میں جانے کا اشارہ کر کے پوچھتے تھے کہ بھئی ہم تو ادھر جا رہے ہیں۔ چلنا ہے تو چلو ورنہ خدا حافظ! اپنی بے بسی پر تاؤ کھانا بھی بے کار تھا۔ غالباً یہی آزادی ہے کہ جیب میں ہو مگر چیز نہ ملے۔ بسوں کا یہ حال تھا کہ لوگ دروازوں کھڑکیوں سے چمٹے لٹکے ہوئے تھے اور میں حیران پریشان یہ دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے ایک بھی ٹپک کر نیچے نہیں گرتا۔

مجھے ولایت یاد آیا... وہاں سڑک پر کھڑے ہوئے عورت یا مرد کو لفٹ مانگنے کے لیے صرف انگوٹھے سے اشارہ کرنا کافی ہوتا ہے، ورنہ کوئی نہ کوئی خود ہی رک کر پوچھ لیتا ہے کہ کیا بات ہے۔ یہاں کاریں زن زن گزرتی جا رہی تھیں۔ میں نے دل کڑا کر کے دو چار کو اشارہ بھی دیا مگر نتیجہ صفر رہا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اسی جگہ بے ہوش ہو کے گر جاؤں تب بھی کوئی رکنے کا نہیں... لندن میں آدمی سڑک پر گر جائے یا بیٹھ جائے تو سب رک جائیں گے، چند منٹ میں ایمبولینس تک موجود۔ یہ احساس مجھے الگ پریشان کر رہا تھا کہ میرا سر عام اپنی نمائش کرنا خطرے کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ جو مجھے پہچانتے ہیں میری تلاش میں ہیں۔

پھر ایک معجزہ رونما ہوا۔ ایک ٹیکسی میرے قریب سے گزری اور چند قدم کے فاصلے پر رک گئی... میں اس کی طرف لپکا۔

"بھائی... مجھے ایک بہت ضروری کام سے وہاں جانا ہے... ٹیلی فون ہاؤس... میکلوڈ روڈ پر کہیں ہے... میں سو روپے دوں گا تمہیں۔" میں نے کہا۔

"بیٹھو..." ٹیکسی ڈرائیور نے پلٹ کر مجھے بغور بڑی نخوت سے کہا جیسے میری درخواست کو شرف قبولیت بخش کے اس نے مجھ پر احسان کیا ہو۔

"عجیب شہر ہے۔" میں نے ہاتھ سے پسینہ صاف کر کے کہا۔ "آدمی مرتا ہو تو مر جائے... کوئی اسے ہسپتال لے جانے کے لیے راضی نہیں ہوگا۔ یہ جائیں گے تو اپنی مرضی سے جدھر وہ جا رہے ہیں... کوئی اخلاق نہیں کوئی قانون نہیں۔ جبھی سے اپنی مرضی سے وہاں جاؤں گا جہاں مجھے جانا ہے، پیسے پورے دوں گا بلکہ زیادہ ہی دوں گا۔" میں اتنا برہم تھا کہ میں نے دل کا بخار نکالنے کے لیے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدف بنائے بغیر ایک مذمتی تقریر جاری رکھی۔

"تمہارے پاس بہت پیسہ ہے؟" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

"بہت... کیا مطلب ہے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "اچھا تو تمہیں کیا؟"

"دن میں سو سو کے کتنے نوٹ تقسیم کرتے ہو... اچھی گاڑی کیوں نہیں خرید لیتے؟"

www.paksociety.com

مجھے اس کے مشورے صادر ہوتے دونوں پر غصہ آیا مگر میں نے کہا۔ "یہی کروں گا... مگر ذرا فرصت تو ملے... ایک دوست نے کہلا بھیجا ہے۔ شام تک وہ کراچی سے آ جائے گا کسی نہ کسی گاڑی کا بندوبست۔"

"جیب میں پیسے ہیں تو انتظار کیا... یہ ٹیکسی خرید لو۔"

میں جھنجلا کر رہ گیا۔ "یہ ٹیکسی... تمہارا مطلب ہے ٹیکسی چلاؤں میں؟" میں نے کہا۔

"ٹیکسی بھی کار ہی ہوتی ہے۔" وہ بولا۔ "ذرا رنگ مختلف ہوتا ہے بس... چار پیسے بھی کما لوگے چلتے پھرتے۔"

"ٹھیک ہے لو... جس دن یہ پیشہ اختیار کرنے کا سوچا اس دن تمھیں بتا دوں گا۔" میں نے کہا۔ شہر ہی نہیں یہاں کے رہنے والے بھی عجیب تھے۔ رکشا میں ہوتا تو وہ کہتا رکشا خرید لو بس میں جاتا تو وہ بس برائے فروخت پیش کر دیتا۔

"یہ ٹیلی گراف ہاؤس ہے۔ ٹیلی فون ہاؤس نہیں ہے۔ وہ دیکھو اوپر لکھا ہوا ہے۔" اس نے ٹیکسی ایک پختہ فرش والے احاطے میں روک دی۔ میں نے سو کا نوٹ اس کی طرف پھینکا اور اندر چلا گیا۔ وہاں ٹیلی فون کرنے والے ایک انار سو بیمار والا سین پیش کر رہے تھے۔ ایک بوتھ لیڈیز کے لیے تھا۔ دوسرا لوکل کال کے لیے۔ دو فون خراب تھے۔ باقی دو کے لیے دو قطاریں تھیں۔ ایک کال بک کرانے والوں کی... ایک اپنی باری کا انتظار کرنے والوں کی... لیکن اس مشکل کا کوئی حل نہیں تھا۔ چنانچہ میں صبر و ضبط کی پریکٹس کرتا رہا۔

جب بالآخر میری باری آئی تو کھڑے کھڑے میری ٹانگیں اکڑ چکی تھیں۔ "کون... جیکی...؟"

"نہیں... میں جوتی بول رہا ہوں... تم سکندر..."

"ہاں... دیکھو وقت کم ہے... یہ بتاؤ وہاں سب خیریت ہے نا... میرے پیچھے تو اس خبیث نے آدمی لگا دیے تھے۔" میں نے کہا۔

"یہاں بھی گڑبڑ ہو جاتی... خدا نے بچا لیا ہمیں... رات کو نہ جانے کتنے لوگوں نے قادم ہاؤس پر حملہ کیا تھا۔ باقاعدہ اسٹین گن اور دستی بم لے کر آئے تھے وہ لوگ۔"

"اوہ مائی گاڈ... پھر کیا ہوا؟"

"ہم وہاں نہیں تھے۔" جوتی بولا۔ "تمہاری امانت کو ہم نے منتقل کر دیا تھا... اپنے تہہ خانے میں... لیکن وہ رو رہی ہے؟"

"اسے کیا ہوا...؟"

"حملہ آوروں سے ڈر گئی تھی... وہ اندر ہی جل کے راکھ ہو گئی۔ بیچارا ڈنلی سب سے پہلے نشانہ بنا... قادم ہاؤس اب ایک ملبے کا ڈھیر ہے اور ابھی تک تو پولیس کو کچھ نہیں ملا ہے... موہنی کی لاش بھی نہیں ملی... ڈیڈ بہت پریشان ہیں کیونکہ ان کا دشمن نظر نہیں... انھوں نے کوٹھی کے چاروں طرف گارڈز کھڑے کر دیے ہیں... میں اور جیکی بالکل باہر نہیں نکل سکتے۔ گارڈ ساتھ لیے بغیر۔"

"تمھارا فون تو ٹیپ نہیں ہو رہا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم..." وہ بہت نروس ہو رہا تھا۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ "اچھا... اب جو ہوا سو ہوا... میری وجہ سے تم پر یہ آفت آئی۔"

"اوہ نو... ہم نے تمھیں..."

"تھینک یو... ذرا سوچ سمجھ کے بات کرو۔" میں نے کہا۔ "تم اس شخص کو اپنے گھر سے شفٹ کر دو۔ کسی محفوظ مقام پر۔"

"ہمارے تہہ خانے سے زیادہ محفوظ مقام کوئی نہیں۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں... دشمن بھی تو اندر ہیں... کوئی نوکر ڈرائیور کا لے... جب تک ہمارا کام ختم ہو جائے اس کا زندہ رہنا ضروری ہے۔"

"پانچ منٹ ختم ہو گئے۔" کسی کرخت آواز والے آپریٹر نے کہا اور لائن کاٹ دی۔

"ہیلو... ہیلو... ٹائم بڑھا دو..." میں نے کریڈل کو بار بار دبا کے کہا مگر لائن ڈیڈ ہو چکی تھی... میرے باہر آنے سے پہلے ہی پھر بجی۔

"آپ نے کیا تو اس سے بات کریں... گلاب دین۔"

"گلاب دین۔" کاؤنٹر پر سے کسی نے چلا کے کہا۔ "چل بھئی تیری باری..."

میں سخت اشتعال کے عالم میں باہر نکلا۔ "آخر کیا بیہودگی ہے... ایک تو میں بات کر رہا تھا۔"

"آپ کے پانچ منٹ ہو گئے تھے۔" بکنگ کلرک بولا۔

"میں نے کب کہا تھا کہ مجھے پانچ منٹ بات کرنی ہے؟"

"تو کیا آدھا گھنٹا بات کرنی تھی؟" وہ سر اٹھائے بغیر بولا۔

"یہ میری مرضی... آدھا گھنٹا بات کروں یا ایک گھنٹا۔" میں نے غصے سے کہا۔ "پیسے مجھے دینے تھے۔"

"یہ پبلک کال آفس ہے... آپ اپنا فون لگوا لیں۔" اس نے مجھے مشورہ دیا۔ میں نے اس کے جبڑے پر مار کے اسے کرسی سے دھکیلنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور بڑبڑاتا ہوا باہر کی طرف چل پڑا... بہت سے لوگ میرے چراغ پا ہونے سے محظوظ ہوئے۔ ایک اجنبی شہر میں خود کو بے بس اور سب کے لیے باعث تفریح سمجھنا بہت ناخوشگوار تجربہ تھا۔

نامکمل گفتگو کے باعث میرے اضطراب اور تشویش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک عجیب بے یقینی کی سی کیفیت تھی۔ جولا یقین غلط بھی ہو سکتا تھا اور جیسے ان کے قادم ہاؤس پر حملہ ہوا تھا ایسے ہی حملہ کرنے والے ان کے محافظوں کی فوج کو شکست دے کر اندر تہہ خانے تک داخل ہو سکتے تھے اور خسرو جمشید کو چھڑا کر لے جا سکتے تھے۔ یہ جنگ دو جانوں میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ باپ مارا جائے یا دونوں بیٹے مارے جائیں۔ صرف اور صرف میری وجہ سے یہ الجھنیں اس جرم تھا جس سے نجات حاصل کرنے کی صورت نہیں تھی۔ میں صرف خواہش کر سکتا تھا اور دعا کر سکتا تھا کہ اللہ ان دونوں بچوں کو بچائے جو اپنی حفاظت کا ہنر نہیں جانتے اور یہ نہیں جانتے کہ ان کے مقابلے کتنے خطرناک شکاری ہیں۔

موہنی کی موت سے میری فکر اپنی جگہ تھی۔ اگر اس کی لاش نہیں ملی تو اس کا صاف مطلب یہی نکالا جا سکتا ہے کہ اسے کوئی لے گیا یا وہ خود جان بچا کے فرار ہو گئی۔ مگر فرار ہوتی تو وہ سلطان محمد خان کی بجائے اپنے گاؤں کا رخ کرتی۔ اسے کون لے جا سکتا ہے؟

اس سوال کے ذہن میں آتے ہی بے شمار اندیشوں کا ایک باب کھل گیا۔ کہیں اسے وہی درندے تو نہیں لے گئے جن سے تنہا اس کی بہت پرانی دشمنی کا انتقام لیا تھا۔ ان کے بھی تو ساتھی ہوں گے جنھوں نے شعبدہ... کے سامنے موت دی تھی۔ ایک چھوٹے سے علاقے میں کسی گاڑی کی نقل و حرکت کا سراغ لگانا مشکل نہیں۔ انھوں نے لوگوں سے پوچھ لیا ہوگا۔ جہاں سے انھیں تعزیر ملی ہوگی وہیں سے معلوم ہوا ہوگا کہ ایک خاص ویگن چوری ہوئی ہے۔ اس ویگن کو اسٹارٹ کرنے کے لیے میں اسے ٹریکٹر کے پیچھے باندھ کر لے گیا تھا... اور پھر ہاں... میں نے وہ رسی کلہاڑی سے کاٹ کر ویگن چھوڑ دی تھی۔ انھوں نے پولیس سے مدد لی ہوگی۔ اپنے تمغے بھیجے ہوں گے اور معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہ ویگن ملتان میں کہاں کہاں سے گزری تھی اور بالآخر کہاں گئی تھی۔ یا پھر جوتی اور جیکی تک سے کوئی اسے واپس چھوڑنے گیا ہوگا تو پتا لگا لیا ہوگا... مگر وہ سلطان محمد خان کا بیٹا تھا۔ اس پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا... نمبر پلیٹ کے ذریعے سے معلوم کرنے والوں نے پتا چلا لیا ہوگا کہ یہی قادم ہاؤس۔ نوکروں سے پوچھا جا سکتا ہے کہ مہمان کون ہیں... کتنے ہیں اور کیسے ہیں... یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ میں گھر کے اندر نہیں ہوں... تہہ خانوں کی تلاشی لی جا سکتی ہے جہاں آسانی مشکل کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہ قاتل ویگن اس باغ میں کہاں کھڑی رہی تھی... میری خوش قسمتی تھی کہ میں نکل گیا تھا۔ صرف موہنی ہی ان کے ہاتھ لگی... مگر اس کے ساتھ جوتی تھا... جیکی یا جوتی... خسرو جمشید کو تہہ خانے میں منتقل کر رہا تھا۔ کبھی موہنی کو وہاں نہیں پکڑا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ یقیناً کوئی ہوگا۔ حملہ آوروں نے کہا ہوگا... یا جوتی... تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں... اور ہم سلطان محمد خان سے دشمنی مول لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ مگر اس عورت کو اور اس کے ساتھی کو ہم نہیں چھوڑیں گے۔ اس نے ہمارے باس کو مار ڈالا... ہمارے یار کو مار ڈالا لعنت ہماری یاری پر اور نمک خواری پر اگر ہم ان کے خون کا بدلہ نہ لے سکے... جیکی یا جوتی کچھ نہ کر سکے ہوں گے... انھیں اپنی جان بھی عزیز تھی اور عزت بھی... وہ باپ کی طرف سے بھی ڈرتے ہوں گے کہ اسے معلوم ہو گیا تو کیا ہوگا چنانچہ انھوں نے موہنی کو ان کے حوالے کیا اور خود نکل گئے۔ بعد میں قادم ہاؤس تباہ کیا گیا اور مالی کو گولی مار دی گئی۔ اب موہنی ان کے چنگل میں ہوگی اور وہ ہر انسانیت سوز طریقے سے اسے اذیت پہنچا کے پوچھیں گے کہ بتاؤ وہ میرو کہاں گیا؟ وہ کچھ جانتی ہی نہیں تو انھیں کیا بتائے گی۔ اس کی موت کی اذیت بہت طویل ہوگی۔ شاید اس وقت بھی وہ کسی ناقابل برداشت اور رسوا کن آزار میں مبتلا ہوگی۔

میرے خدا... میں کیا کروں... میں کچھ بھی تو نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہی ہے جیسا میں نے سمجھا ہے تو موہنی کی موت کو آسان کر دے۔ آمین۔ دعا بھی۔

معلوم نہیں کب سے میں برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوا اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ کسی نے کیا دیکھا اور کیا سمجھا۔ مجھے اس کی پروا ہی نہ تھی۔ اچانک ایک ٹیکسی گھوم کر میرے سامنے آ گئی۔ میں نے بے خیالی میں دیکھا اور چونک پڑا۔ یہ وہی ٹیکسی تھی۔ دور سے گیٹ کیپر نے سیٹی بجائی۔ "او پاگل کا بچہ... ادھر کہاں لے جاتا ہے ٹیکسی۔"

"بیٹھو..." اس ٹیکسی ڈرائیور نے کہا اور میں دروازہ کھول کے بیٹھ گیا... ٹیکسی نے پھر راؤنڈ لیا اور گیٹ سے گزری تو گیٹ کیپر اور ڈرائیور کے درمیان ایک دوسرے کو خونخوار نظروں سے گھورنے کا مقابلہ ہوا۔

"کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

میں چونک پڑا۔ "کیا ہوا ہے مجھے؟"

"صورت سے تو یہ لگتا ہے کہ ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ کیا ہسپتال لے چلوں؟"

"فضول باتیں مت کرو۔ مجھے واپس جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم اتنی دیر سے کیوں کھڑے ہوئے تھے؟"

"مجھے معلوم تھا کہ آپ کو یہاں پھر ٹیکسی نہیں ملے گی۔ اس سے پھر آپ کا بلڈ پریشر ہائی ہو جائے گا۔ تب پھر اس شہر کو۔ یہاں کے ٹیکسی والوں کو اور رہنے والوں کو گالیاں دیں گے۔ جب کوئی بھی باہر کسی پنڈ سے یہاں وارد ہوتا ہے تو اس کی ایسی ہی حالت ہوتی ہے۔"

www.paksociety.com

"میں تم کو... کسی پنڈ سے آیا ہوا... پینڈو لگتا ہوں؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"سوٹ تو اب دیہاتی بھی پہنتے ہیں۔" وہ بولا۔ "تم خیر... پنڈ سے نہیں آئے ہیں آپ تو پھر لاہور سے آئے ہیں۔"

"تم ضرورت سے زیادہ ہوشیار بنتے ہو اور ہوتے ہو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ تم ایسے آدمی ہو کہ تم نے میری ضرورت کو سمجھا۔ تم پڑھے لکھے بھی لگتے ہو مجھے۔"

"میں نے مائکروبیالوجی میں ڈاکٹریٹ کی ہے۔" وہ بولا۔

"اور ٹیکسی چلاتے ہو؟" میں نے کہا۔ "بے وقوف بناتے ہو مجھے۔ ابھی بے روزگاری کا مسئلہ اتنا شدید نہیں ہوا۔"

"مجھے ٹیکسی چلانے کا شوق ہے آپ کو اعتراض ہے؟" وہ بولا۔ "اس میں آمدنی بھی زیادہ ہے۔ میں لیکچرر بنتا تو اتنا نہ کماتا۔"

"بندۂ خدا... عزت بھی کوئی چیز ہے۔"

"پنڈ سے آنے والے عزت کے لیے ہی تصورات رکھتے ہیں۔ ورنہ شہر میں عزت ہے اس کی جس کے پاس تین کاف ہوں۔" وہ بولا۔

"تین کاف... تین حرف تو سنے تھے۔"

"کار... کوٹھی... کیش۔" وہ بولا۔ "اس شہر میں عزت کا معیار پیسہ ہے... سمجھے؟"

"سمجھ گیا... مگر میں پنڈ سے نہیں آیا ہوں۔ میں نے چار سال لندن میں گزارے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور تم غلط کہتے ہو کہ تم نے مائکروبیالوجی میں ڈاکٹریٹ کی ہے... تم کو چیلنج کرتا ہوں کہ اسے ثابت کرو۔"

"او کے... اُدھر جمشید روڈ کوارٹرز تھانے چلتے ہیں۔"

"تھانے... کیا مطلب؟" میں نے بگڑ کے کہا۔ "یعنی وہاں تم مجھ سے زبردستی منواؤ گے؟"

"نہیں... وہاں میرے بھائی کا سالا ہے... ڈی ایس پی۔"

"لعنت بھیجو اس پہ... میں مانتا ہوں کہ تم ڈبل پی ایچ ڈی ہو۔" میں نے کہا۔ "مائکروبیالوجی میں بھی اور بچا سولوجی میں بھی۔"

ایسے عجیب ٹیکسی ڈرائیور سے اپنے ملک میں میرا پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ لندن اور پیرس کے تجربات پرانی بات تھے۔ وہاں ایسے ایک دلچسپ کردار... یہاں اس ٹیکسی ڈرائیور نے جہاں میرے ساتھ شرافت برتی وہیں میرے ساتھ وہ رویہ بھی اختیار کیا تھا جو ایک چالاک شہری کسی سادہ لوح دیہاتی کے ساتھ اختیار کر سکتا ہے... میرا خون کھولنے لگا۔ یعنی حسرت ہو گئی۔ میں نے سارا یورپ دیکھا جو اس نے خواب میں نہیں دیکھا ہو گا... یہ مجھے پینڈو سمجھنے پر بضد ہے اور خواہ مخواہ منوانا چاہتا ہے کہ وہ مائکروبیالوجی میں پی ایچ ڈی ہے... حالانکہ اسے اُلو بنتا ہے اُلو کا پٹھا۔

"دیکھو آگرہ روڈ... میرا مطلب ہے تم اب گرجا تلاش کرو جہاں جانا تھا۔" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔ "یا اور کہیں جانا ہے؟"

"تھوڑا سا آگے... بینک کے پاس سے بائیں جانب..." میں نے سو کا ایک اور نوٹ نکال کے طے کیا کہ جلد جان چھڑاؤں اس ڈرائیور سے... تمام سڑک گاڑی کا بند ہست ہو جائے گا۔

"ایک نوٹ اور بیٹھو۔" اس نے ٹیکسی روک کے کہا۔

"کیا یہ وہ سو والا نہیں ہے؟" میں اترتے اترتے رک گیا اس وقت میری نظر نے اشتیاق احمد عارف کے دروازے پر لگے ہوئے مجمع کو دیکھا۔ کم سے کم دس افراد گھنے دروازے کے سامنے کوٹھی کے اندر جھانک رہے تھے اور میری نگاہ نے ان کے چہروں پر تجسس آمیز خوف کی تحریر بھی دیکھ لی۔ میری چھٹی حس ایک دم قوی... "خطرہ" چلانے لگی۔

"دیکھو... ایک منٹ ٹھہرو۔" میں نے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہو سکتا ہے مجھے... پھر جانا پڑے۔" یہ سوچتے ہوئے میں پیچھے اتر کے چند قدم گیا۔ پھر میں نے پولیس کے سائرن کی آواز سنی اور فوراً پلٹ کر ٹیکسی کے پیچھے ہو گیا۔ دو ایمبولینس سائیکلوں پر میری طرف دیکھے بغیر گزر گئے۔ پھر ایک جیپ آئی جس میں چار سپاہی تھے۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے لوگ ایک دم الگ ہو گئے۔ جو مقفل منہ تھا انھوں نے کھٹکا شروع کیا۔ ایک نیاپن اور دھوتی والا بنگالی میرے پاس سے گزرا۔

"کیا ہوا ہے یہاں...؟" میں نے اسے روک لیا۔

"کتل... کھون... مرڈر..." وہ وحشت زدہ لہجے میں بولا۔

"یہاں تو کوئی اخبار والا رہتا تھا؟"

بنگالی نے سر ہلایا۔ "اسی کو مار دیا کوئی سالا لوگ..." وہ بازو چھڑا کے بھاگ گیا۔ میرا جسم خوف سے کانپنے لگا اور ٹھنڈا پسینہ میرے جسم پر پانی کا ریلا بن کے بہنے لگا۔ اشتیاق عارف کو مار دیا؟ کسی نے؟ اس ٹیکسی ڈرائیور نے؟ یا اس نے خود کو آزاد کرا لیا اور چاچی کے کسی ٹھکانے پر جا پہنچا جہاں وہ ٹرک موجود ہوگا... وہاں سے جو لوگ بھیجے گئے ان کو پتی تو نہیں ملا۔

اچانک کسی نے میرا بازو پکڑ کے کھینچا۔ "تم یہاں بیٹھے ہو؟" میں نے پلٹ کے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا اور اقرار میں سر ہلا دیا۔ "کل رات ہی تو آیا تھا۔"

"اس سے پہلے تم نہیں جانتے تھے اسے؟"

"نہیں... مجھے کسی نے کہا تھا کہ... تم اس کے پاس جا کر ملتے ہو۔ اشتیاق عارف نام تھا اس کا۔" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "ایک اچھا اخباری رپورٹر تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔ "میرا مشورہ ہے کہ تم فوراً یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ... ورنہ سب سے پہلے تم پر شک کیا جائے گا اور اس معاشرے میں پولیس آئنسٹائن شاید نہیں کر سکتی کیونکہ پریس، پبلک اور انتظامیہ سب کا دباؤ ہو گا۔"

میں پھر چونکا۔ کیا اس شہر کے ٹیکسی ڈرائیور بھی اتنے مخلص اور دور اندیش ہو سکتے ہیں؟

"بیٹھو..." اس نے ایک بار پھر تحکمانہ انداز میں کہا اور دروازہ کھول دیا۔ میں سوچے سمجھے بغیر بیٹھ گیا۔ اس نے ٹیکسی کو ریورس کرنے کے بجائے سیدھا نکال لیا اور معلوم نہیں کوارٹروں کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک سڑک پر آ نکلا جہاں بالکل سامنے نادرنی سینما تھا۔

اشتیاق کی موت کے صدمے نے مجھے ذہنی طور پر جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میری جستجو میں آنے والوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا تھا... یا شاید جب وہ ناکامی کے بعد واپس جا رہے تھے تو اشتیاق نے انھیں دیکھ لیا اور انھوں نے کسی عینی شاہد کو زندہ چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس شہر میں بھی جو لاہور سے ساڑھے سات سو میل دور تھا، خطر ناک دشمن میرے تعاقب میں ملک الموت کی طرح آ گئے تھے اور عدم تحفظ کا وہ احساس جو وقتی طور پر مٹ گیا تھا ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ جاگ اُٹھا تھا۔

ٹیکسی اچانک رک گئی۔ ڈرائیور نیچے اتر گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے تشویش سے کہا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" وہ بولا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہنگامہ آرائیوں میں غائب ہو گیا... وہ ٹیکسی کی چابیاں بھی لگی ہوئی چھوڑ گیا تھا لیکن مجھے ڈرائیور کے رویے نے حیرت اور تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس میں کوئی بات ایسی تھی جو ٹیکسی ڈرائیوروں میں نہیں ہوتی۔ اس کے بات کرنے کا انداز... اس کا رویہ... اس کا اظہارِ اعتماد... تعاون کا جذبہ... یہ سب کیا تھا اور کیوں تھا؟ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس ڈرائیور کا میرے ساتھ رہنا بے مقصد نہیں ہے۔ وہ خود ہی مجھے دیکھ کر رکا تھا۔ اس نے ایک گھنٹے تک ٹیلیگراف آفس میں میرا انتظار بھی کیا تھا حالانکہ میں نے اسے رکنے کو نہیں کہا تھا۔ اس ایک گھنٹے میں وہ دو سواریاں اُٹھا سکتا تھا۔ لیکن اس نے مجھ سے دو سو پچاس روپے وصول کر لیے تھے۔ یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میں بے وقوف، ضرورت مند، مجبور اور پیسے والی اسامی ہوں۔ وہ ایک مردم شناس اور ہوشیار شخص تھا۔ اس نے چونکا دینے والی باتوں سے خود کو ایک غیر معمولی شخصیت ثابت کیا اور مجھ سے مرعوب ہو رہا تھا... وہ بدستور میرا ساتھ دے رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ ہمدردانہ جذبہ بے غرض نہیں تھا۔ اب وہ مجھ سے پانچ سو نہ لے گا کہ آپ کو خطرے سے نکال لایا ورنہ آپ تو دھر لیے جاتے۔ وہ مجھے بلیک میل بھی کر سکتا ہے کیونکہ وہ اتنا با خبر بھی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کوارٹر میں ایک صحافی رہتا ہے۔ مگر ٹیکسی ڈرائیور شہر کے ہر صحافی کا پتا ٹھکانا جانتا ہو، یہ ناممکن سی بات تھی... پھر کیا اس کو اشتیاق عارف سے کوئی تعلق تھا؟

میں خیالات کی کھینچا تانی میں اعصابی کشیدگی کا شکار تھا۔ اور کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔ صرف قیاس کی بنیاد پر کوئی حتمی فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا کہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے، وہ کیوں ہو رہا ہے۔ سب داستان میں یہ جو خونی ڈراما کھیلا جا رہا ہے اس کی اصل کہانی کیا ہے۔ اشتیاق عارف کے مارے جانے کی اصل وجہ کیا ہے۔ اس ٹیکسی ڈرائیور کے اصل عزائم کیا ہیں؟

وہ اچانک ایک کوارٹر کی اوٹ سے نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ متفکر تھا اور ماتھے کی ہر شکن کسی الجھن کی عکاسی کرتی تھی۔ مجھ سے کچھ کہے بغیر اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔ میں سوچ میں پڑ گیا... ابھی تک میں نے اس کی صورت کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ علم نفسیات کا مسئلہ ہے کہ ہم کسی ریسٹورنٹ میں جیسے بیرے کا... سڑک پر ٹریفک کانسٹیبل کا... ٹرین میں ٹکٹ چیکر کا اور ٹیکسی ڈرائیور کا چہرہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ صرف اس کی وردی کو دیکھتے ہیں اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ آرڈر دیتے وقت ویٹر پر نہیں مینیو پر نگاہ رکھتے ہیں... یا باتیں کرتے کرتے کھو دیتے ہیں چلتے لاؤنج وہ چائے رکھ جاتا ہے۔ پھر بوتل اٹھا لیتا ہے اور بل لے جاتا ہے مگر اس کی طرف غور سے دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہم ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ تھما دیتے ہیں اور جب وہ پنچ کر دیتا ہے تو واپس لے کر باہر دیکھنے لگتے ہیں۔ ٹیکسی میں بیٹھ کے صرف اتنا کہتے ہیں کہ فلاں جگہ چلو اور پھر اپنے خیالوں میں یا باہر کے منظر میں یا اپنی باتوں میں گم ہو جاتے ہیں اور منزل پر پہنچ گئے تو میٹر کو دیکھتے ہیں اور کرایہ ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ اس کی صورت دیکھے بغیر۔

میرے ساتھ یہی ہوا تھا۔ جب ٹیکسی رکی تھی تو میں نے صرف ٹیکسی کو دیکھا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کے میں نے خود کو اس سے متعارف نہیں کرایا نہ اور اس سے تعارف حاصل کر کے ہاتھ نہیں ملایا تھا... جیسے دو اجنبی ایک مشترک دوست کے ساتھ مل جائیں تو پہلے رسمی تعارف ہوتا ہے۔ میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ایک گونہ پریشانی سے نجات ملنے کی تسکین محسوس کی تھی۔ پھر میں اس شہر کے بیہودہ ٹریفک کے نظام پر غور کر رہا تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کا لباس دیکھا تھا۔ اس کی آواز بھی سنی تھی اور اس کا مناسب جواب بھی دیا تھا لیکن اس کی صورت کو اہمیت نہیں دی تھی۔ میں پچھلی سیٹ پر تھا اور مجھے پیچھے سے... بھی اس کا چہرہ صرف ٹوپی کی حد تک

www.paksociety.com

نظر آ رہا تھا۔

اب مجھے اس کا چہرہ دیکھ کر عجیب سی پریشانی لاحق ہو گئی۔ اس چہرے کے کچھ نقوش میرے لاشعور کے کسی گمنام گوشے میں محفوظ تھے لیکن ان سے اصل چہرے کا تصور کرنا محال تھا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے آدمی کو کسی کوڑے کے ڈھیر میں سے کسی کتاب کے چند صفحات مل جائیں۔ مثلاً ساتواں صفحہ... ایک سو دسواں صفحہ... دو سو بیسواں صفحہ... اسے خیال تو آئے گا کہ یہ کسی پڑھی ہوئی کتاب کے صفحات ہیں مگر سیکڑوں ہزاروں پڑھی ہوئی کتابوں میں سے تین صفحوں کو دیکھ کر اصل کتاب کا نام یاد کرنا یقیناً ناممکن ہوگا۔

"بات سنو... تم کون ہو؟" میں نے کہا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

"میرے نام کو گولی مارو... یہ بتاؤ کہ وہ شخص کون تھا جو اس کوارٹر میں بندھا پڑا تھا؟"

اگر وہ اچانک پلٹ کے مجھ پر فائر کر دیتا تب بھی میں اتنا نہ اچھلتا۔ "کیا؟... تم...؟"

"میں وہیں گیا تھا۔" وہ بولا۔ "پولیس کو ایک شخص چارپائی سے بندھا ہوا ملا۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور آنکھوں پہ بھی پٹی تھی۔ اس کا منہ کپڑا ٹھونس کے بند کر دیا گیا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ یہ تمہاری حرکت تھی۔"

"وہ... بکواس... جھوٹ۔" میں نے گڑبڑا کے کہا اور پھر ایک دم ریوالور نکال لیا۔ "مجھے پہلے ہی شک ہو رہا تھا تم پر... مگر تم مجھے اپنی مرضی سے کہیں نہیں لے جا سکتے... تم کیا سمجھتے ہو کہ میں بیوقوف ہوں؟ عقل سے پیدل ہوں؟ مجھے بہت پہلے شک ہو گیا تھا کہ تم میرے پیچھے بلاوجہ نہیں پڑے ہوئے ہو۔"

"میں اپنی بات پہ قائم ہوں۔" وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔ "تم بیوقوف ہو اور عقل کے دشمن بھی... یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"ریوالور... اور اس میں سائیلنسر بھی لگا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔

"پہلے کبھی چلایا ہے؟" وہ بولا۔ "اور اس کا کیا ثبوت کہ یہ اصلی ہے۔"

غصے سے میرا برا حال ہو گیا۔ میں نے چلا کے کہا۔ "یہ اصلی ہے یا نہیں اس کا پتا تمہیں اس وقت چلے گا جب تم فوت ہو جاؤ گے اور تمہاری کھوپڑی کے سوراخ سے تمہارا سب بھوسہ باہر آ جائے گا... میں نے ریوالور... اسٹین گن... دستی بم... توپ ٹینک... راکٹ... ایٹم بم سب چلائے ہیں۔"

"یہ بتاؤ جانا کہاں ہے؟" وہ بے نیازی سے بولا۔

"کوسٹر روڈ... وہاں میں تم سے پوچھوں گا۔"

"ریوالور جیب میں رکھ لو۔" وہ بولا۔ "راستے میں کسی نے دیکھ لیا تو خواہ مخواہ نئی پریشانی پیدا ہوگی۔"

میرا سارا غصہ ایسے ختم ہو گیا جیسے پنکچر ہوتے ہی ٹائر کی ہوا ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا اور سر کو نشست کی پشت سے ٹکا کے لمبے گہرے سانس لینے لگا۔ تاکہ میرا سکون بحال ہو جائے اور دماغ ٹھنڈا ہو جائے۔ وقفے وقفے سے میں باہر بھی دیکھتا رہا کہ ٹیکسی کس راستے پہ جا رہی ہے۔ چونکہ میں اتفاق سے خود بھی اسی راستے پر ڈرائیونگ کرتا گیا تھا اس لیے دوبارہ انہی مقامات سے گزرتے ہوئے مجھے خاصا اطمینان حاصل ہوا کہ ٹیکسی ڈرائیور مجھے غلط سمت میں نہیں لے جا رہا ہے اور میرے کراچی میں نووارد ہونے کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے۔

کوسٹر روڈ تک پہنچتے پہنچتے میں کافی حد تک نارمل ہو گیا تھا اور سب سے پہلے اس ٹیکسی ڈرائیور پر یہ ثابت کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ میرے سامنے وہ عقل مند بنے یا گدھا ہے؟ اب مجھے یقین آنے لگا تھا کہ وہ دشمنوں کا ایجنٹ بہرحال نہیں ہے اور اگر میں صحیح طرح سے ہینڈل کروں تو اسے دوست بنا سکتا ہوں۔

ٹیکسی جب بیرک کے سامنے رکی تو میں نے پھر ریوالور نکال لیا اور اسے کہا۔ "اندر چلو۔"

"پہلے آپ۔" وہ بولا۔ اور میں نے آگے گردن سے پکڑ کے اندر دھکیل دیا۔ اس کی ٹوپی گرد آلود فرش پہ گر گئی۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکا لیکن اچانک اس نے میرا ریوالور والا ہاتھ پکڑ کے ایک جھٹکا دیا اور ہاتھ مروڑ کے مجھے پلٹ دیا۔ میں اس کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ چنانچہ میں نے ریوالور کو اپنی گرفت سے نکل کر گرتے دیکھا اور خود کو فرش خاک پر لیٹا ہوا پایا۔ اس سے پہلے کہ میں اٹھتا ریوالور اس نے اٹھا لیا۔

"اب بتاؤ کہ تم کون ہو مسٹر سکندر بخت۔" وہ بولا۔

میں اپنی جگہ پہ منجمد ہو گیا... میری آنکھیں اس پہ مرکوز ہو گئیں۔ اس کی ٹوپی سرک جانے سے گھنے سیاہ بال نمودار ہو گئے تھے اور صورت سے آشنائی کا احساس پہلے سے زیادہ گہرا ہو کر نقش ہو گیا تھا۔

"مجھے معلوم ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں کچھ نہیں معلوم... تم ایک بیوقوف ہو... عقل کے بھی اندھے ہو اور آنکھوں کے بھی..." اس نے اچانک آواز بدل کے کہا۔ "الو کے پٹھے ہو تم اور گدھے ہو۔"

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے راکٹ پر بٹھا کے فائر کر دیا۔

"اکرام... اکرام شیخ... سالے تو ایس آئی۔" میں نے چیخ

کر کہا۔ "ڈبل کراس کر رہا تھا مجھے... تیری تو..."

وہ مجھ سے لپٹ گیا... اس نے مجھے بہت ٹکّے مارے اور بہت گالیاں دیں اور کئی بار بیوقوف کہا۔ میں ہنستا رہا اور روتا رہا اپنی عقل پہ... قدرت کے اس احسان پہ... تائید ایزدی کے اس اظہار پہ... اس اتفاق پہ... ہم فرش پہ بیٹھ کے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ "سکندر اعظم کی اولاد۔" اس نے بالآخر کہا۔

"یار تو نے... پہچان لیا تھا مجھے... کیسے پہچان لیا تھا؟" میں نے کہا۔ "یہ تو کمال ہو گیا۔"

"ایک پولیس مین رہا ہوں... وہ بھی ایسا ویسا نہیں۔ بالکل [illegible] کا شاگرد۔" وہ بولا۔ "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تو ایسے کراچی کی سڑک پہ کھڑا ہوا مل جائے گا۔"

"بس یار... ملنا تھا مقدر میں... ایک گھنٹے سے کھڑا ہوا تھا اور کوئی سالا لفٹ نہیں دے رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ تیری حماقت تھی۔" وہ بولا۔ "بھائی آپ ایک بے مثال قومی شہرت رکھتے ہیں اور چشم بد دور... یہاں آتے ہی آپ اپنے ساتھ سارے مصائب بھی سمیٹ لائے ہیں۔"

"یار ساری باتیں چھوڑ... پہلے نازو کے بارے میں بتا۔"

"کیا بتاؤں... خود میں اسے تلاش کر رہا ہوں دو دن سے۔"

وہ ایک دم رنجیدہ ہو گیا۔ "حرام ہے جو اب تک کچھ بھی پتا لگا ہو۔"

"کیوں یار... نازو جیسی لڑکی کے لیے فکرمند ہونے کی تو ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ خود تلاش کر لے گی تجھے... اپنی حفاظت وہ خود کر سکتی ہے۔"

"تو نے اخبار عارف کی رپورٹ ضرور پڑھی ہوگی؟"

"ہاں... اور میں اس کے پاس کیوں پہنچا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس رپورٹ نے مروا دیا اسے۔" وہ بولا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ اس کیس میں خطرناک حد تک ملوث تھا اور اسے راستے سے ہٹایا گیا تھا..." اس نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کا وجود ان کے لیے ایک خطرہ بن گیا تھا۔"

"مجھے تو اس نے کچھ نہیں بتایا۔"

"تجھے کیوں بتاتا... یہ سب معلومات جو اس نے حاصل کر لی تھیں ابھی اس کے دماغ میں جمع ہو رہی تھیں۔ وہ ثبوت جمع کر رہا تھا اور شہادتیں حاصل کر رہا تھا... اس کا فیچر تو ایک ڈھونگ تھا صرف یہ دکھانے کے لیے کہ وہ سطحی معلومات حاصل کر سکا... کامیاب رہا ہے مگر جاننے والے جان چکے تھے کہ وہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی حدود سے بہت آگے بڑھ گیا ہے اور اس نے بہت اعلیٰ سطح پہ وزارت دفاع کے اسسٹنٹ سیکرٹری یا ڈپٹی سیکرٹری کی سطح کے کسی افسر سے کہا تھا کہ وہ ملک دشمنی میں ملوث چند سرکاری افسران کی سرگرمیوں کے بارے میں براہ راست انٹیلی جنس کے چیف سے بات کرنا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات لیک آؤٹ ہو گئی۔"

"تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"اس نے بتایا تھا کہ بات کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میں اسے روز گھر سے آفس لے جاتا تھا اور رات دو بجے آفس سے گھر لاتا تھا۔ اس کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اسسٹنٹ سیکرٹری یا ڈپٹی سیکرٹری خود بھی بنگالی ہے۔ اس کے نام سے وہ دھوکا کھا گیا۔ پھر کسی نے اسے غلط اطلاع بھی دی کہ وہ ذاتی طور پر جا چکا ہے۔ اور وہ افسر راولپنڈی کا رہنے والا ہے... اسے جانتے بوجھتے گمراہ کیا گیا اور آئی ایس آئی کے چیف تک تو بات پہنچی نہیں۔ اس کے قاتلوں تک پہنچ گئی۔"

"یار کیا اس نے غلطی نہیں کی... مطلب یہ کہ وہ ایک صحافی تھا۔ اسے گمراہ کرنا آسان تو نہیں تھا۔ اس نے کیوں مان لی وہ بات تصدیق کیے بغیر؟"

اکرام نے ایک آہ بھری۔ "اگر تو مجھ سے کہے کہ تیرا محسن تجھ سے ملنے کے قابل ہے تو کیا میں تصدیق ضروری سمجھوں گا؟ وہ اعتماد کے خنجر سے مارا گیا جو اپنے ہی کسی دوست نے اس کی پیٹھ میں گھونپا۔ مگر خیر میں بھی پولیس والا ہوں۔ مجھے تھوڑا بہت اندازہ تو ہے کہ وہ کون تھا جس پہ وہ بھروسا کرتا تھا... میرے علاوہ۔ میں تفتیش کر رہا ہوں... اور مجھے چوبیس گھنٹوں میں ملزم میری گرفت میں ہوگا۔"

"میں تو سمجھا تھا کہ اتفاقاً ان کے ہاتھوں مارا گیا جو مجھے قتل کرنے آئے تھے؟" میں نے کہا۔ "کیا اس تفتیش کو پولیس نے لے لیا؟"

"ہاں... ابھی اس کا بیان نہیں ہوا۔" اکرام بولا۔ "ظاہر ہے اس نے قاتلوں کو دیکھا تو نہیں ہوگا مگر ان کی باتیں تو سنی ہوں گی۔ مشاہدے پہلے اس نے کچھ اوٹ پٹانگ باتیں کی تھیں۔ کہتا تھا کہ میں حیدرآباد میں ہوں۔ پولیس نے دو ہاتھ مارے تو نشہ اتر گیا۔"

"وہ نشے میں نہیں تھا۔ یہ بات میں نے اس کے دماغ میں ڈالی تھی۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے اسے گزشتہ رات سے اب تک کے سارے واقعات سنا دیے۔

"شکاری یہاں بھی تیرے پیچھے ہیں اور تو سینہ تان کے پھر رہا ہے کہ آ بیل مجھے مار۔" وہ بولا۔

"بس یار... بھول چوک ہو جاتی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اتنا بڑا شہر ہے۔"

"جیسے میں مل گیا تھا... ایسے کیا کوئی اور نہیں مل سکتا تھا؟"

"مل سکتا تھا... مگر میں کیا کرتا... میرے لیے بہت ضروری

www.paksociety.com

ہوگیا تھا کہ میں عثمان فون کروں۔" میں نے کہا۔
" عثمان کی اسٹوری کیا ہے؟"
" کوئی ایک اسٹوری نہیں ہے۔" میں نے کہا۔" ذرا سے
گی تو سناؤں گا۔ تو پہلے یہ بتا ٹیکسی کس کی ہے؟"
" میری اپنی... اسی کی آڑ میں تو بچا ہوا ہوں... تھوڑا سا میک اپ کرلیا ہے۔" وہ بولا۔" بالوں کا اسٹائل وہ نہیں رہا۔ یہ عینک بس فریب نظر ہے۔"
" اور تو یہاں کہاں ڈرائی ملتا ہے؟"
" مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔" وہ بولا۔" ایک ہفتہ پہلے یہ شو روم میں تھے... کیا زری کی طرف۔ پھر نازو کے ساتھ ایکٹیو ہو گئی۔"
" تو بھی ساتھ تھا؟"
" ہاں یار... اب یہ تو بس شامت اعمال ہی تھی نا کہ اس جہاز پر ایک غرق شدہ جہاز کا آدمی نکل آیا اور اس جیسٹ کی نظر اتنی تیز تھی کہ اس نے مجھے پہچان بھی لیا۔" وہ بولا۔" میں تو نکل گیا تھا مگر نازو کو تا ڑ لیا اس نے۔ اس کے لیے مردوں جیسے کام کرنا تو آسان ہے مگر مرد بننا ذرا مشکل ہے... بس وہیں گڑبڑ ہو گئی۔ جب اسے پولیس لے گئی تو مجھے بڑی غیرت اور شرم آئی کہ میں کیسا بھائی ہوں۔"
" اگر وہ خود نہ نکل پاتی تو آپ کیا توپ چلاتے؟"
" کچھ نہ کچھ تو کرتا... رشوت کی توپ چلاتا۔" وہ بولا۔" کیونکہ اس کے خلاف جہاز والوں نے کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی تھی۔ پھر جب وہ خود ہی نکل گئی تو اب تک مجھے بھی نہیں ملی۔"
" کیوں؟ اپنے ٹھکانے پر کیوں نہیں پہنچی وہ؟"
" وہ دراصل... گڑبڑ یہ ہوئی کہ ہم نے ایک ہفتہ قبل یہ پایا گھر بدلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہاں کے لوگوں کو ایک مولوی نے بھڑکانا شروع کر دیا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ جو اس کا بھائی ہے وہ غالباً کوئی عورت ہے جسے وہ بھگا لایا ہے۔ ہمارے گھر آنا کوئی نہیں تھا اور ہم بھی کسی کے گھر نہیں جاتے تھے۔ مگر ایک رات کیا ہوا کہ شراب کے نشے میں کوئی منچلا کوئی لالچ پر کام کرنے والا ہمارے گھر میں گھس گیا۔ غلطی سے... اس نے نازو کو زنانہ کپڑوں میں دیکھ لیا۔"
" کیا وہ روز میک اپ بدلتی تھی؟"
" نہیں یار... اس روز سالگرہ تھی اس کی۔ بس میں جذباتی ہوگیا اور میں نے کہا کہ چلو کہیں باہر چل کے مناتے ہیں... کسی کلب کلاس ہوٹل میں... وہ اس کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ میں نے اس شرابی کو دھکے دے کر نکال دیا مگر باہر ایک مولوی صاحب عشاء

کی نماز پڑھ کے آ رہے تھے۔ انھوں نے شرابی کو ستانا شروع کیا تو وہ پکارنے لگا کہ سب مجھے ہی کہتے ہو۔ اسے نہیں کہتے جس نے...
" جس نے کیا؟"
اکرام کا چہرہ سرخ ہوگیا۔" کہنے لگا کہ یہ جو لوہ قافہ کی پری پکڑ لایا ہے سالا ٹیکسی ڈرائیور... مولوی صاحب پہلے تو سمجھے کہ وہ نشے میں بک رہا ہے مگر اسی وقت نازو اور میں ٹیکسی میں بیٹھ کر نکلے تو مولوی صاحب کی عقل خبط ہوگئی۔ انھوں نے غل مچانا کرلیا۔ رات بارہ بجے ہم آئے تو دروازے پر مجمع تھا۔ میں نے کہا آپ لوگ ہوش میں رہ کے بات کریں... یہ میری سگی پھوپی کی بیٹی ہے۔ آج ہی کراچی سے آئی ہے مگر کوئی ماننے کو تیار نہ تھا۔ مولوی صاحب مجمع کو مسجد میں لے گئے۔ ہم سے کلمہ پڑھوا کے قرآن اٹھوایا گیا۔ ہم نے اٹھالیا اور وہی کہا جو سچ تھا۔ اس وقت تو مولوی صاحب کی بولتی بند ہوگئی مگر اس کے بعد دو تین دن تک نازو کو اصل زنانہ روپ میں رہنے کی حماقت سے منا پڑا۔ گھر میں رہنا پڑا اور ملنے والوں سے جھوٹ بولنے پڑے۔ پھر میں نے دوسرا گھر تلاش کرلیا... تیاری میں... اور نازو کو بھی بتا دیا مگر جس دن نازو پکڑی گئی اسی دن کچھ لوگوں نے ہمارا سامان باہر رکھ دیا۔ معلوم ہوا کہ مالک مکان جعلی تھا اور اصل مالک مکان تو ایک کانسٹیبل ہے... میرا خیال ہے کہ ان دونوں نے مل کر یہ دھندا چلا رکھا ہے یعنی ایک کسی ضرورت مند کو گھیر لاتا ہے۔ اس سے دو چار ہزار ایڈوانس وصول کرلیتا ہے۔ پھر کانسٹیبل وردی پہن کر آ جاتا ہے اور تھانے کی دھمکی دیتا ہے۔ کرائے دار کا سامان باہر رکھ دیا جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا ہے... اب تو سوچا یار... کہیں تو وہ ایک سابق ایس آئی... مجھے ایک کانسٹیبل نے ہاتھ مار کے باہر کردیا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ تھانے نہیں جا سکتا تھا اور کسی پولیس والے کے مکان میں نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر میں نے خاموشی سے سامان اٹھالیا اور پھر جو گھر ملا وہ ادھر دھوبی گھاٹ کی طرف ہے... مگر اس کا نازو کو پتا نہیں۔"
" وہ پہنچی ہوگی اس کانسٹیبل کے مکان پر؟" میں نے تشویش سے کہا۔" تو نے معلوم کیا؟"
" ہاں... وہ پہنچی تھی۔" اکرام بولا۔" اسے کسی نے بتا دیا کہ مکان تو پھر خالی ہے۔ وہ فوراً واپس چلی گئی۔ رکشے میں آئی تھی۔ اب کل سے ٹیکسی لیے پھر رہا ہوں کیونکہ وہ میری ٹیکسی ہی تلاش کرے گی۔"
" تو یہاں کیسے گم ہوا ہے؟"
میں نے اسے مختصر بتایا اور گیراج کھول کے کار بھی دکھائی۔ ہم دونوں نے مل کے گاڑی کو اچھی طرح صاف کیا اگر

اس پر کہیں بھی کوئی فنگر پرنٹ نہ رہے۔ پھر دونوں سوٹ کیس ٹیکسی میں رکھے۔ بیں دولت مند خیر کا تو انعام ہے جانے کے موڈ میں نہیں تھا مگر اکرام شیخ نے کہا کہ ایسے دھوکے باز جاہلوں کو یہ سزا تو ملنی ہی چاہیے۔ اس نے نوٹوں سے بھرا ہوا گھڑا بھی ڈکی میں ڈال دیا اور گیراج کا دروازہ بند کردیا۔
" اب فوری طور پر تو اس کار کے دریافت ہونے کا امکان نہیں ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔" کبھی رات کو پھر آئیں گے تو اس کا کریا کرم کریں گے۔"
" یار اکرام..." میں نے ٹیکسی کے روانہ ہونے کے بعد کہا۔" تو نے ایک سوال نہیں پوچھا۔"
" پوچھوں گا بھی نہیں کہ تو کیوں آیا ہے؟ یہ بتا اتنی دیر سے کیوں آیا ہے؟" اکرام نے کہا۔" ہم تو انتظار کرتے کرتے مایوس ہو چلے تھے۔ ایک سفر پر نکلے تھے۔ پندرہ دن بعد لوٹے تو اس کی پریشانی میں پڑ گئے کہ کہیں درمیان میں تو آکے تو نہیں لوٹ گیا۔"
" تم کسی بحری جہاز میں نکل گئے تھے؟"
" ہاں... اسے ڈبو دیا... خود بال بال بچے۔ مچھلیوں کی خوراک بنتے بنتے۔" وہ بولا۔" چوبیس گھنٹے ایک تختے کے سہارے پہ پانی میں غوطے کھاتے رہے۔ پھر ایک ماہی گیروں کی کشتی نے بچا لیا۔"
" تم لوگ منزل کو فون کرسکتے تھے۔" میں نے برہمی سے کہا۔
" یا نازو فون کرسکتی تھی شعلہ کو۔"
" کئی بار کوشش کی... کبھی منزل نہیں ملا کبھی فون نہیں ملا۔" وہ بولا۔" شعلہ کو تو رائی ہی نہیں کیا۔ ایس ایس پی صاحب سے ڈر لگتا تھا۔"
" آخر رابعہ نے بھی تو فون پر بات کی تھی۔"
" بالآخر... ہاں یہ یاد نہ آیا یہ کس کا نام آیا۔" وہ ہنسا۔
" تمھیں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔
اکرام نے نفی میں سر ہلایا۔" نازو نے ایک بار ٹی سے دیکھا تھا، کسی لانچ پر۔"
" وہ فون نمبر میرے پاس لکھا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔" میرا مطلب ہے کہ مجھے یاد ہے۔ میں ایک شخص دوست محمد کو بھی جانتا ہوں۔ وہ انجینئر ہے۔ فری لانسر قسم کا... ملازم کسی کا نہیں مگر اسے کوئی بھی لے جا سکتا ہے۔"
" اس کا کیا تعلق ہے رابعہ سے؟"
" کوئی تعلق ضرور ہے۔" میں نے کہا۔" اس نے رابعہ کو یقیناً کہا ہے یا قید کر رکھا ہے... رابعہ نے صاف نہیں بتایا... جانتے بوجھتے یا مجبوری کے تحت کچھ چھپاتی رہی۔ ایک طرف

کہتی تھی کہ میری بالکل فکر مت کرو میں خیریت سے ہوں۔ دوسری طرف کہتی تھی کہ میں آنکھیں بھی کھول کر اپنا پتا نہیں بتا سکتی۔"
" اتنا کافی ہے۔" اکرام بولا۔" ہم اسے بھی ڈھونڈ نکالیں گے مگر ایسے نہیں... یہ صورت نہیں چلے گی۔"
" میں نے آج ہی صبح اعتماد سے کہا تھا کہ مجھے کسی میک اپ مین کے پاس لے چلو... میں فرنچ جانتا ہوں۔ کسی شو روم سے ایک پرانی ڈپلومیٹک نمبر کی کار دلا دے۔"
" ڈپلومیٹ کے بچے... یہ سب نہیں چلے گا... خود کو نمایاں کرنا بے وقوفی ہے... ایسا حلیہ بناؤ کہ ہزاروں میں شامل ہو سکو... جیسے میں ٹیکسی ڈرائیور رہوں تو ہر جگہ آنے جانے میں کوئی دشواری نہیں... کیا ضرورت ہے کار کی جب چابی جائے... یہ ٹیکسی بھی تو کار ہے۔"
" یہ آپ نے صبح بھی فرمایا تھا کہ ٹیکسی بھی کار ہوتی ہے بس رنگ کا فرق ہوتا ہے۔" میں نے وائٹ نکال کے کہا۔" مگر آپ نے درست فرمایا... کیا خیال ہے میں کہاں جاؤں... کراچی میں بہت گم جاتے ہیں۔"
" ویسے تو بندرگاہ... ڈاکیارڈ اور فش ہاربر کے علاوہ بھی سیکڑوں کشتیوں لانچوں اور بحری جہازوں سے بلاواسطہ لاکھوں افراد کا روزگار وابستہ ہے۔" اکرام نے کہا۔" ان میں خاص ٹیکنیکل نیچر کا کام کرنے والے بھی ہیں۔ مثلاً انجینئرز اور ریڈیو آپریٹر نیوی گیٹر وغیرہ۔ لیکن سیکڑوں دوسرے پیشے بھی ہیں۔ مال بردار مزدور سے لے کر ماہی گیر تک ہر پیشے میں ہزاروں لوگ ہیں۔"
" تمھارے خیال میں مجھے فشنگ کرنی چاہیے۔ ڈوبو اور جیسی ہے کرو؟" میں نے کہا۔
" ابھی تم مچھلی پکڑنے سے فروخت کرنے محفوظ کرنے اور ایکسپورٹ کرنے کی پوری انڈسٹری کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اس ایک پیشے میں کتنے افراد یہ کام کرتے ہیں۔ میں نے کسی اعداد و شمار کے بارے تو نہیں پوچھا مگر میرا خیال ہے کہ یہ تعداد لاکھوں تک ضرور پہنچتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمھارے لیے سب سے مناسب پیشے دو ہیں جن میں تم چھپ کر رہ سکتے ہو اور بلا روک ٹوک ہر جگہ جا سکتے ہو۔ ایک تو تم ماہی گیر بن سکتے ہو۔ ایک چھوٹی سی کشتی جو تمھاری لانچ ہو یا نہ ہو۔ تمھارا تم کراچی کے پورے ساحل پر اور کھلے سمندر میں جہاں چاہو جاؤ جب چاہو جاؤ۔ دن رات کی کوئی قید نہیں۔ ہے محکمہ کسٹم اور نیوی کی پولیس چیک کرلیتی ہے مگر وہ کسی بھی ماہی گیر کو کچھ نہیں کہتے۔ ان کی نظر اسمگلنگ میں ملوث لانچوں پر رہتی ہے... تم کراچی یا مکرانی کا روپ دھار کے ماہی گیروں کے حلیے میں مزے سے گھومو۔ رابعہ کو

www.paksociety.com

قلاش کر دیا۔ ایس ایس کراچی تھرٹی۔" یہ نمبر رکھو۔۔۔ تم کسی کی نظر میں نہیں آؤ گے۔"

"میں اس تجویز کی افادیت کا قائل ہوتا جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب سوال یہ ہے کہ تمھارے لیے کیا مناسب ہے۔ تو میرا خیال ہے کہ تم ایک انجن والی چھوٹی لانچ سے کہو تو سب سے بہتر۔ ورنہ وہ آج بادبانی کشتی اور مچھیروں کا جال۔ تم کشتی پہ ہی گھر بنا سکتے ہو۔ اور آباد کر سکتے ہو۔ ایک خاتون جو ہائی کورٹ کی نامور وکیل تھیں ایک مچھیرن کے روپ میں۔"

"بالکل فلمی آئیڈیا ہے۔ بہترین بیسٹ سیلر فلم بن سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "فلم میں رومانی سین بھی آسکتے ہیں۔ کھلا سمندر۔۔۔ چاند۔۔۔ لہروں کی سرگم اور کوئی دوگانا از قسم میں ترا چاند تو مری چاندنی۔"

"دوسرا پیشہ ہے مزدوری کا۔" اکرام نے گاڑی چلاتے چلاتے اپنی سنجیدگی میں فرق نہیں آنے دیا۔ "مزدور بھی سیکڑوں قسم کے ہیں۔ ہر قسم کے جہاز لانچ یا کشتی پہ سامان چڑھانے اور اتارنے والے۔ سامان کو اندر سے باہر اور باہر سے اندر پہنچانے والے۔ لوڈر اور ہیلپر۔۔۔ یہ کام بغیر کسی تحریر کے ہو سکتا ہے اور اس پیشے میں بھی آدمی کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے کہ وہ جہاں چاہے چلا جائے اور جو چاہے کرے۔ یہیں اسے کسی ایجنٹ کے ذریعے مزدوری کا حق ملتا ہے۔ جو اس سے بھتہ وصول کرتا ہے اور آگے سب میں تقسیم کرتا ہے۔ بندرگاہ میں جتنے اچھے برے کام ہیں۔ جائز اور ناجائز دھندے ہیں اتنے ہی لوگ بھی ہیں جو قواعد و ضوابط میں رعایت برتتے، آنکھیں بند رکھتے اور ہر قسم کا اپنی اوسی بیٹے کا معاوضہ وصول کرتے ہیں۔"

"تو اتنے کم وقت میں بندرگاہ میرا ایک اتھارٹی ہو گیا ہے۔ بہت ریسرچ کی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ مزدوری والا کام کچھ مشکل اور وقار انسان کے خلاف نہیں ہے؟"

"اس میں خلاف شان وہ غیر قانونی اور ناجائز کام ہیں جو کرنے بھی پڑتے ہیں اور کرانے بھی پڑتے ہیں۔" اکرام بولا۔ "ورنہ مزدوری اگر صرف مزدوری ہو تو اتنا ہی قابل احترام پیشہ ہے جتنا کوئی اور پیشہ۔"

"میرا خیال ہے کہ لانچ یا کشتی والا آئیڈیا ہی چلے گا۔"

"اب میری رائے بھی کشتی کے حق میں ہوں۔" وہ بولا۔ "کسی مچھلی پکڑنے والی بادبانی کشتی کا مشاہدہ کرو۔ اس میں پندرہ بیس پاؤنڈ وزن بھی لدا جا سکتا ہے۔۔۔ یا ما کا۔۔۔ یا کسی اور کیٹی کا۔ جو اتارنا بھی آسانی سے ہوتا ہے۔ بادبانی کشتی میں فائدہ یہ ہے کہ اس میں ایک ٹیم کام کر سکتی ہے۔ تین چار افراد کی۔ جال پھینکنے اور کھینچنے والے۔ بادبان چڑھانے اور اتارنے والے۔ پیشے والے۔ مرمت کرنے والے اور مچھلیاں الگ کرنے والے۔ وہ کشتی پہ ہی رہتے ہیں چنانچہ ان کے پاس تھوڑا بہت اپنا سامان بھی ہوتا ہے۔ اور اس سامان کو کھول کر بڑی آسانی سے چھپایا جا سکتا ہے۔۔۔ دو چار شخص اگر اندر رہیں تو کسی کو تو پتا بھی نہیں چلتے۔ حلیہ اور صورت مچھیروں جیسی ہو تو آپ کسی بھی جہاز کے قریب سے گزر جائیں۔ کوئی نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھے گا۔"

"مجھے فلم 'گنز آف نیوران' کا منظر یاد آرہا ہے جس میں انتھونی کوئن اور ڈیوڈ نیون اور تمام گیری کو پیک تھے۔ وہ بھی ماہی گیر بنے ہوئے تھے اور جب دشمن کی ایک لانچ نے انھیں روکا تو ہیرو جرمن خفیہ پولیس کے مسلح ارکان تھے تو وہ مقبول بے حد غربت زدہ ماہی گیر جیسے جال مرمت کر رہے تھے مگر جال کے نیچے مشین گن اور دستی بم لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے جرمنوں کا پلک جھپکنے میں صفایا کر دیا تھا۔ یار یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"پریشان مت ہو۔ کراچی میں رہو گے تو فاصلوں کا علم ہو جائے گا۔" اکرام بولا۔ "یہاں دس پندرہ میل ادھر ادھر لیے رہتی ہیں۔ جیسے لاہور میں دو چار میل۔۔۔ ویسے اب ہم پہنچ گئے ہیں۔"

میرے دائیں جانب ایک ندی یا نالہ سا تھا جس کے نشیب میں ایک عجیب منظر تھا۔ دور دور تک ہزاروں درخت سوکھے کھڑے تھے اور ندی کے بیچ میں ایک نیم پختہ ٹوٹے پھوٹے راستے پہ ٹریفک آجا رہی تھی۔ اس کے پار ایک قبرستان کے آثار دیکھ سکتا تھا۔ بائیں جانب عجیب خستہ حال گھر تھے اور ٹیڑھی میڑھی گلیاں تھیں۔ سڑک پہ ہر چار قدم کے بعد ایک اسپیڈ بریکر سا آجاتا تھا۔ اکرام نے بتایا کہ یہاں ہر شخص اپنے گھر کے سامنے اپنی مرضی کے مطابق اونچا نیچا۔۔۔ سیمنٹ یا بجری کا اسپیڈ بریکر بنانے یا نالی کھودنے کا اختیار رکھتا ہے اور یوں ہر گاڑی کی اولاد تو آدھی رہ جاتی ہے مگر اسپیڈ بریکر بنانے والا کو یقین ہے کہ اس طرح وہ تیز رفتاری کے سبب ہونے والے حادثات کو ختم کر سکتے ہیں۔

ٹیکسی کو اس نے ایک گلی میں موڑا۔۔۔ پھر دوسری گلی۔۔۔ پھر تیسری اور چوتھی۔۔۔ دائیں بائیں کچے پکے مکان۔ سیمنٹ یا ٹین کی چادروں کی چھتیں۔۔۔ درمیان میں بہتی ہوئی نالی اور نالہ کو حسب توفیق جسمانی اخراج سے مزید گندا کرتے ہوئے بچے جو ٹیکسی کے پیچھے دوڑتے تھے اور اس سے لٹکنے کی ناکام کوشش کرتے تھے۔ اکرام بہت محتاط بھی تھا اور اس نے محبت بھرے لہجے میں بچوں کو متعدد بار کچھ کی طرح ڈانٹا اور ایسا دیکھا۔ سختی بالغ افراد سے یہ کام لیا جاتا تو بچوں کے والدین مار مار کے اکرام کا قورمہ بنا دیتے۔ وہ ہم سے ایسا ہی کر دیتا دوسرے کرتے ہیں۔

جان بیسیوں شہر کے مختلف حصوں میں رہنے کے ادب آداب اور طور طریقے جدا جدا تھے۔ کلفٹن اور ڈیفنس میں۔۔۔ لالو کھیت میں۔ ملیر میں۔ کھارادر میں الگ الگ انداز زندگی اور جدا جدا طرز بود و باش ہے۔

بالآخر ٹیکسی ایک جگہ رک گئی۔ یہ دو مکانوں کے درمیان اندر کی طرف ایک کھانچا سا تھا جو کسی گلی کی موجودگی سے پیدا ہوا تھا۔ اس طرح تنگ گلی بلاک نہیں ہوئی۔ اکرام نے ایک دروازے کی کنڈی کھولی جس میں ایک بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ اس سے سیدھا گزرنے کی کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرا سر دہلیز پر لگا۔ اندر صحن بھی برائے نام تھا۔۔۔ آگے ایک الگ عجیب لگا کہ تو کمرے کے دروازے کو توڑتا ہوا اندر جا گرتا۔

یہ دو کمروں کا گھر تھا۔ دونوں کمرے تاریک تھے اور ان میں وہی بو تھی جو عرصہ دراز تک غیر آباد اور ویران گھروں کی پابندی تھی۔ اکرام مختصر ترین اسباب زندگی کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ چنانچہ دو کمروں میں دو ہی چارپائیاں تھیں۔ لوہے کے پائپ والے فریم سے بنی ہوئی جن کو چوڑیاں گھما کے کھولا بھی جا سکتا تھا۔ ایک بغیل کی میز تھی اور اسٹیل کی دو فولڈنگ کرسیاں۔ ایک ٹیبل فین دونوں کمروں میں موجود تھا اور دونوں کمروں کی دیواروں پہ کچھ ٹنگے ہوئے تھے ان میں اپنی ضرورت کا الگ الگ سامان رکھا ہوا تھا۔ اکرام کا صندوق اس کے پلنگ بلکہ کرسی کے تخت کے نیچے تھا اور نازو کا صندوق نازو کے تخت کے نیچے۔

اکرام نے میرے دونوں سوٹ کیسوں کو بھی اسی طرح دو کمروں میں تقسیم کر دیا اور دونوں تختوں کے نیچے سوٹ کیس بھی روپوش ہو گئے۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس غریب بستی کے اس خستہ حال گھر میں کتنی دولت کا ذخیرہ جمع ہے اور کتنے لاکھ کا اسلحہ موجود ہے جو اس ملک کے دشمنوں کا عطیہ ہے۔ میں نے اکرام کو بتایا کہ کار میں کچھ گولہ بارود بھی ہے تو اس نے کہا کہ اگلے پھیرے میں وہ بھی لے آئیں گے۔

"یہ بڑا اچھا ہوا کہ تم ان لوگوں سے تیسرے سوٹ کیس پہ شک کی تلوار نہیں گرا لیں۔" اکرام بولا۔ "اب یہ لباس اتار کے جلا ڈال۔ اور میں تجھے ایک خلعت فاخرہ عطا کرتا ہوں۔ وہ زیب تن کر۔"

اس کی عطا کردہ خلعت فاخرہ ایک میلی سفید شلوار اور ڈھیلی ڈھالی سفید قمیص پر مشتمل تھی جو غالباً کسی وقت پانچ سال پہلے سفید خریدی گئی تھی۔ میں نے اس کے کپڑے پہنے اور ایک گول ٹوپی سر پہ رکھی پھر ہم کھانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس وقت تین بجنے والے تھے۔ چنانچہ اکرام مجھے صدر لے گیا۔

"مجھے بمبئی کی مسالے والی بریانی کھلاتے ہیں۔" وہ بولا۔ "یہ کراچی کا تین نمبر تحفہ ہے۔"

"دو نمبر اور ایک نمبر کیا ہیں؟"

"ایک نمبر ہے تمھاری جو ہر طبقے ہر کلاس ہر محلے اور بازار میں ہر قیمت پہ ملتی ہے۔" وہ بولا۔ "دوسرا نمبر پہ ہے حلیم۔"

چار بج رہے تھے چنانچہ بھوک سے میرا حال خراب تھا۔ مجھے بریانی بہت اچھی لگی۔ میں کھانے ہی میں محو تھا کہ مجھے اچانک اکرام کی حالت میں رونما ہونے والے جذباتی تغیر نے متوجہ کیا۔ وہ اداس ہو گیا تھا اور اس نے کھانا چھوڑ دیا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "کچھ نہیں یار۔"

میں سمجھ گیا کہ اسے نازو یاد آگئی ہے۔ "دیکھ۔۔۔ اس طرح عورتوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پہ ملول ہونے اور دل کو رنجیدہ کرنے سے تو کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا۔ نازو کہیں نہیں جا سکتی۔ وہ ہمیں ضرور ملے گی لیکن وہ اپنے جرم کی سنگینی کے پیش نظر مجبور ہے کہ بالکل روپوش رہے۔ دو چار روز میں یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو وہ بھی ایسے ہی گھومتے پھرتے مل جائے گی جیسے میں ملا تھا۔"

"بس یار۔۔۔ ایسے ہی جب اس کا خیال آتا ہے تو عقل کی ساری تسلیاں بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ یہی سوچنے لگتا ہوں کہ نہ جانے اس وقت وہ کہاں ہو گی۔ کس حال میں ہو گی۔ اس نے کچھ کھایا بھی ہو گا یا نہیں۔۔۔ اور خدانخواستہ۔۔۔ خدانخواستہ۔۔۔" وہ پلیٹ سرکا کے اور منہ چھپا کے رونے لگا۔

نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا۔ میری بھوک مر گئی اور میں نے بھی اپنی پلیٹ ایک طرف رکھ دی۔ "یار کہیں مرد اس طرح روتے ہیں۔ اور نازو جیسی بہن کا بھائی جو خود بھی ایک باچلا اور نڈر پولیس افسر رہا ہو۔"

"اس کا اور میرا اب دنیا میں اور کوئی نہیں رہا تھا۔" وہ آنسو صاف کر کے بولا۔ "ماں باپ تھے تو ایک پہلے سے دل کا مریض تھا اسے دنیا والوں کی انگشت نمائی نے نہ جینے دیا۔ دوسرے کے لیے یہ صدمہ ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ مجھے اس گھر کی خانہ ویرانی کے تصور سے ندامت بھی ہوتی ہے اور وحشت بھی۔"

"ایک گھر میرا بھی تھا اکرام۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اور اب بھی ہے۔۔۔ اس کی خانہ ویرانی مجھے بھی ملال ہوتا ہے۔ گھر غالب کا بھی تھا جواب ایک اجڑا دیار ہے۔۔۔ محض ایک کھنڈر۔ گھر تو بنتے ہیں بستے ہیں، اجڑ جاتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں مگر

www.paksociety.com

پھولوں کی جگہ نئے گھر بستے ہیں اور نئی خوشیوں کے ساتھ آباد ہوتے ہیں۔ جیسے خزاں میں سالمے پتے درختوں سے جھڑ جاتے ہیں اور پھول مرجھا جاتے ہیں، مگر بہار پھر آتی ہے... نئے، زیادہ خوش رنگ اور زیادہ حسین رنگ لے کر۔ ہم سب آج بے گھر ہیں مگر ہم سب کے خوابوں اور خیالوں کا گھر تو آباد ہے۔ ایک دن اس کی تعبیر بھی حقیقت کا روپ دھار لے گی۔ اسی دن کے لیے ہماری جدوجہد جاری ہے۔ ہم اسی گھر کو بنانے اور بچانے کے لیے تو لڑ رہے ہیں... وقت سے... اپنی خوشیوں کے دشمنوں سے... ان خواہشوں سے جو ہمارا راستہ روکتی ہیں۔ ان خود غرض جذبوں سے جو ہمیں آج کی جھوٹی خوشیوں، عارضی مسرتوں اور دلچسپیوں کی طرف بلاتے ہیں۔ وہ وقت میری جان، بہت دور نہیں ہے۔ جب محسن اور شہلا کا ایک گھر ہوگا۔ میرا اور رابعہ کا ایک گھر ہوگا... نازو کا ایک گھر ہوگا..."

وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "غالب کا کیا حال ہے؟ اس کا تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔"

"سب اسی طرح اپنی امیدوں اور جذبوں کے ساتھ جی رہے ہیں اور آگے بڑھ رہے ہیں... جیسے میں..." میں نے دل میں تیسرے گھر کی تکمیل کی خوشی کو محسوس کیا۔ نازو کے گھر کے ساتھ ہی اکرام نے غالب کا ذکر کر کے لاشعوری طور پر مجھے بتا دیا تھا کہ وہ غالب کا ہی گھر ہوگا... یہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ ایک وقت تھا کہ اکرام میرے خلاف صفِ دشمناں میں شامل تھا۔ بلاشبہ اس کی دشمنی میں ذاتی عداوت کے جذبات شامل نہ تھے۔ وہ اصول پرستی اور فرض شناسی کے تقاضے تھے جنھوں نے مجھے اور اسے ایک دوسرے کے مقابل رکھا تھا اور اس حد تک مجبور کر دیا تھا کہ ہم اپنی دوستی کو بھول کر جان کی دشمنی مول لے بیٹھے تھے۔ مگر پھر اس دنیا کے دوغلے، موقع پرست، لالچی اور بے ضمیر لوگ اکرام کے بھی دشمن ہو گئے اور بدعنوان، رشوت خور اور بدکردار پولیس افسروں نے اس محکمے کا کانٹے کی طرح کھٹکنے والے وجود کو نکال باہر کیا۔ اب بھی وہ اصولی بنیادوں پر میرا ساتھی تھا۔ وہ میرے دشمنوں کا دشمن تھا اور اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ ہمارا اندازِ جنگ ہی موثر اور حقیقت پسندانہ ہے۔ اس نے چھوٹی بہن کی محافظت کے لیے بھی ہم سے اتحاد کر لیا تھا اور یہ تازہ ترین خوشخبری تھی کہ اس نے غالب کا رشتہ بھی منظور کر لیا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ نازو کے ساتھ غالب کا نام سننا بھی گوارا نہ کرتا۔ مگر نازو کے جذبات اور غالب کے خلوص کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی اور یہ مان لیا تھا کہ ان کی محبت بھی اتنی ہی معصوم اور نیک ہے جتنی ہم سب کے صادق جذبوں کی بے غرضی۔

"ڈی ایس پی اکرام شیخ کس نام سے ٹیکسی چلاتا ہے؟" میں نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کہا۔

"ڈرائیونگ لائسنس پر میں امیر خان ولد کبیر خان ہوں۔" وہ مسکرایا۔

میں ہنس پڑا۔ "شکر ہے کبیر خان ولد وزیر خان کو یہ عرض کرنے کی عزت افزائی ہے آپ کی کہ مجھے والد ماجد کے منصب پر فائز کیا۔"

"کیا لوگ وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ نہیں بنا لیتے؟" وہ بولا۔

"بادشاہ خان ولد شہنشاہ خان رکھنے میں کیا حرج تھا؟"

"آپ نے میری ٹیکسی کے پیچھے لکھا ہوا شعر نہیں پڑھا؟" اکرام نے کہا۔

"پیچھے تو لکھا ہوا ہے چھو یار تنگ نہ کر۔"

"اس کے نیچے۔" اکرام بولا۔ "میں دل کا بادشاہ ہوں لیکن دھکے کھا رہا ہوں۔ بلا ڈانس کی جگہ دیکھو ڈاکٹر چلا رہا ہوں۔"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ "یہ ٹرانسپورٹ بجائے خود مصوری کا شاہکار کے نمونے میں سارا دن دیکھتا رہا ہوں۔ یہاں سب کا ذوق بہت اعلیٰ ہے کیا ٹیکسی رکشا اور کیا ٹرک اور بس... ایسی ایسی غیر معمولی تصویریں نظر آتی ہیں کہ مصور کے تخیل پر رشک آتا ہے... آج ہی میں نے ایک ٹرک کے پیچھے ایک سہانا منظر دیکھا کہ دریا پہاڑوں سے گزر کے شاداب جنگل سے گزر رہا ہے اور دریا کے کنارے شیر اور بکری ایک ساتھ پانی پی رہے ہیں۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا 'انصاف اور قانون'۔"

"خیالی دنیاؤں کے تصوراتی ماحول میں رہنے والے مظلوم لوگ اور کیا کریں۔" اکرام بولا۔ "جو دنیا میں نہیں ہے، وہ مصور کے موئے قلم میں تو ہے... اس کی تصویر تو دیکھی جا سکتی ہے اور دکھائی بھی جا سکتی ہے۔"

"حقیقی انصاف اور قانون کا شاہکار افتخار عارف کا قول ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس شہر میں جو مہذب پڑھے لکھے لوگوں کا شہر ہے... پیسے والوں کا شہر ہے۔ حکومت کس کی ہے؟"

"میرا ایک نام اور کام اس سے الگ بھی ہے۔" اکرام شیخ نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی میں پرانی پولیس کی وردی پہن لیتا ہوں۔ میرے پاس دو وردیاں تھیں۔ کسی شناختی کارڈ کے بغیر وہ وردی بے اختیار ہوتی ہے، لیکن میرا شناختی کارڈ بھی سب ہے۔"

"کیا استعفا دیتے وقت وہ واپس نہیں کرنا پڑتا؟"

"ایک بار میرا اصل شناختی کارڈ کھو گیا تھا۔" وہ بولا۔ "میں نے قاعدے ضابطے کے مطابق رپورٹ لکھوائی اور وارننگ بھی دی گئی مجھے... کے بعد ڈپلیکیٹ بنا دیا گیا۔ تین چار ... جعلی کارڈ ... بھی مل گیا۔ وہ درازوں کے ... اب میں تو رپورٹ لکھوا چکا تھا کہ فلاں بس ... فلاں مقام پر کسی نے میری جیب کاٹ لی ... ہی شناختی کارڈ بھی چلا گیا۔ ایسا کرنا ضروری تھا۔"

"یہ قواعد و ضوابط بھی آدمی کو کتنا جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں یار... اگر میں سچ بولتا کہ وہ مل نہیں رہا ہے... سارا گھر چھان مارا اور غالباً میں کہیں رکھ کے بھول گیا ہوں۔ تو یہ میری غفلت کا کیس بنتا۔ میں نے الزام ایک نامعلوم جیب تراش پر رکھا اور پتا کیا اصل کارڈ ملنے کے بعد میں کیسے جا کے کہتا کہ وہ رپورٹ جھوٹی تھی۔ میں نے اسے پڑا رہنے دیا۔ جب استعفا دینے کا وقت آیا تو وہ ڈپلیکیٹ واپس کر دیا گیا۔ اصل میرے پاس رہا اور اب کام آ رہا ہے۔ اب تک صرف دو بار میں نے وردی پہن کے اور اس شناختی کارڈ کی مدد سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ پنجاب پولیس کا کارڈ ہے مگر ایک صوبے کے افسر دوسرے صوبے کے شہروں میں جاتے رہتے ہیں۔ کبھی ملزم کا پیچھا کرنے کبھی تفتیش یا اور کسی سلسلے میں۔ کبھی اسپیشل ٹیم کے ساتھ یہاں مجھے کوئی پوچھنے بھی نہیں جاتا۔ پھر کسی کو معلوم نہیں کہ سب انسپکٹر اکرام شیخ نے استعفا دے دیا ہے۔"

"مگر خطرہ تو ہے۔"

"اسی لیے کبھی کبھار استعمال کرتا ہوں جب اس کے بغیر کام نہ نکلتا ہو۔" وہ بولا۔

ہمارے آس پاس بہت سے لوگ ہر قسم کی گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے بریانی کھا رہے تھے اور یہ سب گاڑیاں آڑی ترچھی ایک بیچ میدان میں کھڑی ہوئی تھیں۔ سب کھانے کا وقت گزر چکا تھا چنانچہ بہت کم گاڑیاں رہ گئی تھیں۔ اکرام شیخ نے میری معلومات میں اضافے کے لیے بتایا کہ دوپہر اور رات کو کھانے کے وقت یہاں گھمسان کا رن پڑتا ہے اور گاڑی کھڑی کرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ بظاہر وہ ایک جھگی نما ہوٹل تھا مگر اکرام شیخ نے کہا کہ اس کی صبح سے آدھی رات تک کی سیل کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ منافع ہزاروں میں سمجھا جا سکتا ہے۔

"سب قدرت کے کھیل ہیں۔" اکرام نے گفتگو سے ... نوٹ نئے کے استری کرنا شروع کیے اور بل وصول کرنے کے لیے کھڑے ہوئے لڑکے کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں یا الٰہی یہ

کبھی نہ ہوا ہوگا کہ کوئی بل پہنچنے کے قبضے میں نوٹ بھر کے لائے اور اسی میں سے ادائیگی کرے۔ جب بینک نہیں تھے تب بھی لوگ پیسہ گھڑوں میں بہرحال نہیں رکھتے تھے، تجوریوں میں اور الماریوں میں رکھتے تھے۔ اب تو کراچی میں گھڑا بھر نوٹ لے کے پھرنا گویا چوروں اور ڈاکوؤں کو اپنے پیچھے لگا لینے کے مترادف تھا۔ اکرام نے ویٹر کو دس روپے ٹپ میں دیے۔

"مالِ مفت دلِ بے رحم۔" میں نے کہا۔ "پہلے کبھی اتنی ٹپ دی تھی؟"

اکرام ہنسا۔ "دوسرا محاورہ ہے کہ خدا شکر خورے کو ہی شکر دیتا ہے۔ اس سالے فقیر نے جمع کیا اور عیش ہم کر رہے ہیں۔ کیونکہ سب چیزوں کی طرح خوشی اور عیش بھی کسی کی تقدیر میں نہ ہوں تو وہ تمام عمر ترستا رہتا ہے اور روتا رہتا ہے۔ میں نے ایسے لعنتی کیا کروڑپتی کنجوس دیکھے ہیں جو دوا دارو کے لیے سرکاری شفاخانے میں جاتے ہیں اور حلیے سے جنگلی نظر آتے ہیں۔ بس وہی بات ہے کہ پیسہ تو خدا نے دیا مگر مقدر میں خوشی نہیں لکھی اور آرام نہیں لکھا۔"

"اس گھڑے میں کتنی دولت ہوگی... اندازاً؟"

"میرا خیال ہے کہ پچاس ہزار سے نیچے۔" میں نے کہا۔

"جھوٹی شرط..." اکرام بولا۔ "میں کہتا ہوں کہ پچاس ہزار سے اوپر۔"

"شرط کیا ہے؟"

"شرط؟" وہ سوچ کے بولا۔ "دو منٹ تک مرغا بن کے تین بار کہنا ہے کہ میں کاٹھ کا الو ہوں۔"

ہم وہاں سے روانہ ہو رہے تھے جب ایک ٹیکسی پاس کے قریب آ کے رکی اور اس میں سے ایک کانسٹیبل اترا۔ ایک اے ایس آئی اور ایک کانسٹیبل اندر بیٹھے رہے۔ ان کے ساتھ کوئی ملزم بھی تھا جس کی ہتھکڑیاں کھول دی گئی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ملزم کے خرچ پر بریانی سے پیٹ کے تندور میں آگ بجھانے آئے تھے اور اس کے بدلے ملزم کو یہ غیر قانونی رعایت دے رہے تھے۔

"یہ اسی تھانے کے بندے ہیں۔" اکرام نے کہا۔ "جو صبح ملے تھے افتخار عارف کے قتل کی ابتدائی تفتیش کے لیے۔"

میں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ میری نظر ملزم پر گئی۔ اور میرے ذہن کو ایک کرنٹ سا لگا... تھا۔

"اکرام... بھاگ یہاں سے... چل۔" میں نے کہا۔

اکرام ذہین آدمی تھا... اور میری صورت کے تاثر نے اسے وہ سب سمجھا دیا جو میں زبان سے نہ کہہ سکا تھا۔ اس نے ایک دم ٹیکسی بیک میں لی۔ مگر اتنی دیر میں ملزم

www.paksociety.com

مجھے دیکھ چکا تھا۔ اس نے چلا کے کچھ کہا اور پھر دیوانہ وار مالے کے پیچھے دوڑا۔ ٹیکسی ڈرائیور بریانی لینے گیا ہوا تھا۔ ایک کانسٹیبل دھابا کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی رائفل اندر ہی رکھی ہوئی تھی۔ پچھلی سیٹ پر دوسرا کانسٹیبل موجود تھا مگر وہ بھی بڑے سکون سے بریانی کا انتظار کر رہا تھا جس کی خوشبو اس کی اشتہا کو بڑھا رہی ہوگی۔ ایک سب انسپکٹر یا اے ایس آئی آگے تھا مگر وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں سر کو پیچھے ہیڈ ریسٹ پر رکھے بیٹھا ہوا تھا۔

ملزم کے ایک دم نکل بھاگنے سے یقیناً ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہوں گے۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کہ کوئی پولیس پارٹی کسی ملزم کو رشتے داروں سے ملوانے یا ناشتا کرانے اور کھانا کھلانے کے لیے لے گئی۔ اس رعایت کی رشتے داروں کی طرف سے بھاری رشوت الگ ملتی ہے اور اچھا کھانے میں وہ برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملزم ہتھکڑی سمیت بھاگ جاتے ہیں یا ہائی جیک کر لیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات بہت تگڑی رشوت پر ہائی جیکنگ کا ڈراما بھی رچایا جاتا ہے اور ظاہر کیا جاتا ہے کہ محافظوں کو حملہ کر کے بے بس کر دیا گیا تھا۔ مجرمانہ غفلت میں معطل ہونے والے کانسٹیبل عارضی طور پر معطل ہو جاتے ہیں اور دو چار مہینے فارغ رہتے ہیں تو آرام کرتے ہیں۔ پھر بحال کر دیے جاتے ہیں۔ بلکہ بلیک میں بیس پچیس ہزار بڑھ جاتے ہیں۔

اس وقت یہ صورت حال نہیں تھی۔ معاملہ ایک معروف صحافی کے قتل کا تھا۔ بھاگنے والا کس لیے بھاگا تھا، یہ کسی نے نہیں دیکھا۔ سب نے یہی سمجھا کہ سب سے اہم شخص جسے قوت پہنچنے پر مجرم ثابت کر کے لٹکایا بھی جا سکتا تھا، ہاتھ سے نکل گیا۔ پولیس والے اپنی تاریخی رائفلیں اٹھائے دوڑتے ہوں گے۔ ان کے افسر اعلیٰ کی غنودگی کیفیت کافور ہو گئی ہوگی۔ اس نے سب سے پہلے پیلا اور تکال کے فائر کیا۔

ہماری ٹیکسی اتنی دیر میں بہت دور جا چکی تھی۔ میں نے سر گھما کے پیچھے والے شیشے میں سے دیکھا تو فوراً ڈرائیور اچھل کے زمین پر گرا تھا۔ میں نے اس کے سر سے پھوٹنے والا خون کا فوارہ بھی دیکھا۔ یہ پولیس کی کوتاہ اندیشی تھی یا ایک دانستہ حرکت کہ انھوں نے تعاقب کر کے اسے گرفتار کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ وہ اگر سوچ سمجھ کے فائر کرتے تو ملزم کی ٹانگ کو نشانہ بناتے۔

لیکن پیچیدہ اور الجھے ہوئے کیس یوں بھی ختم کیے جاتے ہیں۔ عرف عام میں پولیس مقابلے کے ذریعے۔ انھوں نے اچھی طرح دیکھ بھال کے سر کا نشانہ لیا۔ اب اس واردات کی

تفتیش ہوگی تو حقیقت بیان کرنے والے گواہ بہت... معاش کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئے تاکہ خود پولیس پر الزام نہ آئے کہ انھوں نے مجرم کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ اس کے بعد اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے ایک مشترکہ موقف اختیار کیا جا سکتا ہے کہ ملزم کے ساتھی وہیں موجود تھے۔ ان کی شہ پر ملزم نے ہتھکڑیوں سمیت فرار ہونا چاہا اور اس کے ساتھیوں نے فائرنگ کی مگر وہ ملزم کو بچا نہ سکے اور خود فرار ہو گئے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے یہ واقعہ بالکل ایسے ہی پیش آیا تھا وہ دس گواہ حاضر دی گے بریانی کھانے والے تو گئے۔ رہ گئے وہاں کے نوکر بیرے تو ان کی کیا مجال کہ پولیس کی مرضی کے مطابق بیان نہ دیں۔ یہاں تو یہ بھی ہوتا ہے کہ گواہوں سے سادہ کاغذ پر دستخط لے لیے جاتے ہیں اور پولیس اپنی مرضی کے مطابق بیان بعد میں لکھ لیتی ہے۔ دیدہ دلیری کی انتہا اس وقت ہوئی تھی جب لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج کے سامنے کوئی فائل پیش کی گئی تھی جس میں ایسے ہی دستخط شدہ سادہ کاغذ بھی لگے رہ گئے تھے۔

"یہ تو بہت برا ہوا یار۔" اکرام بولا۔

"فکر مت کرو... اس نے ہمارا نمبر نہیں دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور دیکھا بھی ہوگا تو اسے موقع کہاں ملا کہ کسی کو بتا سکتا۔"

"کس قدر سفاک اور بے رحم لوگوں کے ہاتھ میں قانون اختیار اور اسلحہ دے دیا گیا ہے۔" اکرام نے نفرت سے کہا۔

"اسے مروا دیا گیا ہے دوست!" میں نے کہا۔ "وہ نااہل ثابت ہوا تھا اور دشمن کے قابو میں آ گیا تھا۔ اس نے بہت کچھ بتا بھی دیا تھا۔"

"ہم آج رات افتخار عارف کے گھر چلیں گے۔"

"گھر؟ اس قبرستان میں جہاں وہ دفن کیا جائے گا؟" میں نے دل میں اٹھنے والی ٹیس کو دبا لیا۔

"نہیں... اسی گھر میں جہاں وہ مارا گیا تھا۔" اکرام نے کہا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ بندرگاہ کی طرف جاؤں۔ دوست محمد سے ملنے۔"

"وہاں بھی چلے جائیں گے۔" اکرام نے کہا۔ "رات کے وقت بالکل... پہلے یہ کام ضروری ہے۔"

"وہاں کون جانے دے گا ہمیں؟"

"میں پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے جاؤں گا۔" وہ بولا۔ "مجھے امید ہے کہ وہاں سے کچھ ضرور ملے گا۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ سے جانے والے وہ سب گئے ہوں گے۔ وہ اتنے بے وقوف نہیں تھے کہ افتخار عارف کو

اٹھا لیے ہوں اور لے کر کچھ چھوڑ گئے ہوں۔"

"ایک چانس یہ بھی ہے کہ نظمیں موقع پر نہ ملا ہو۔ وہ اچانک نہ ہوا ہو اور انھیں فرار ہونا پڑا ہو۔" اکرام نے کہا۔ "میں خود کو ایک تفتیشی افسر ظاہر کر کے اندر جاؤں گا اور اطمینان سے رات بھر تلاشی لوں گا... باہر ایک سپاہی ہوگا یا دو ہوں گے۔ وہ مداخلت نہیں کریں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سارا مواد میرے ہاتھ لگ جائے جو افتخار عارف نے اکٹھا کیا تھا اور جو وہ آئی ایس آئی کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔"

"ٹھیک ہے... کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں... کیا یہ پتا نہیں چلایا جا سکتا کہ وہ ٹرک کہاں گیا؟"

"مشکل ہے۔" اکرام نے کہا۔ "ممکن ہے ٹرک واپس جا چکا ہو۔"

"تجھے اس کا نمبر یاد ہے۔"

"نمبر کچھ نہیں ہوتا۔ راستے میں چار بار بدل دیا جاتا ہے۔ کیا تو نے خود کو سٹم انسپکٹر ظاہر کرنے والے کا نام پوچھا تھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے خیال نہیں رہا۔"

"بڑے بڑے لکھے بھی کیسی جہالت کا ثبوت دیتے ہیں۔" وہ بولا۔ "بابا پولیس والا ہو یا کسٹم انسپکٹر... میٹر ریڈر ہو یا ٹیلی فون کا لائن مین... پہلے اس کا شناختی کارڈ تو دیکھنا چاہیے۔ اس احتقانہ روش کے نتیجے میں روز وارداتیں ہوتی ہیں۔ یہ معاش گھر میں گھس کر سب کچھ لے جاتے ہیں۔ بعض اوقات گھر والیوں کی عزت بھی۔ مگر عورتوں کو کیسے کوئی جیب تم جیسے پڑھے لکھے کو کو قابل مان لیتے ہیں... محض اس کے کہنے پر۔"

"یاد کرانا کہ غلطی ہو گئی۔ اب ایک بات میری سمجھ میں آئی۔ اس اخبار میں جہاں افتخار عارف تھا، اس کا کوئی دوست تلاش کرنا چاہیے۔ ایسے تو صحافی سب آپس میں دوست ہوتے ہیں مگر سب قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ پریس کلب سے معلوم ہو سکے تو ہم اس شخص کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں اور افتخار کے قتل کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتے ہیں۔"

"اصولی طور پر تو یہ اچھی تجویز ہے۔" اکرام نے کہا۔ "مگر جناب پہلی بات تو یہ کہ کسی کے قابل اعتبار ہونے کا کیسے پتا چلے گا؟ پھر یہ معاملہ ایسا ہے کہ افتخار کا انجام سب دیکھ رہے ہوں گے۔ ہر صحافی جبر باز نہیں ہوتا... شاید یہاں تھیلی پر رکھ کے افتخار عارف کے نقش قدم پر چلنے کی ہمت اس شخص میں نہ ہو... اگر پریس کلب چلنا ہے تو چلو... یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اصل رونق رات کو ہے۔"

"مگر میں اور تم وہاں داخلے کا حق نہیں رکھتے۔"

"ایک ویٹر سے تعارف ہے۔ میں اس کی بیوی کو ہسپتال

لے گیا تھا۔" اکرام بولا۔ "اس کی علاج موجودگی میں ہی آپ داخل بھی کرا دیا تھا اور پھر پریس کلب جا کے اسے باپ بننے کی مبارک باد بھی دی تھی۔ وہ بہت احسان مند ہوا تھا۔"

"بس تو پھر چلو..." میں نے کہا۔

پریس کلب کے احاطے میں اس وقت آٹھ دس کاریں کھڑی ہوئی تھیں مگر لوگ اندر تھے صرف ایک میز پر ایک خاتون اور دو حضرات چلے بیٹھے تھے مگر انھوں نے صرف ٹیکسی کو دیکھا اور فرض کیا کہ اس میں بھی انہی کا کوئی ہم پیشہ اندر آیا ہو گا۔ اکرام پچھلی حصے سے اندر گیا اور چند منٹ کے بعد اس ویٹر کے ساتھ نمودار ہوا۔ وہ دونوں ایک کونے میں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ ویٹر نے میری طرف بھی دیکھا اور غالباً اکرام کو کھینچ کر اصرار کیا کہ اپنے مہمان کے ساتھ چائے پیے۔ اکرام نے اس کے ہاتھ پر کچھ رکھ دیا اور لوٹ آیا۔

"قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے نہیں ہوتے پر یہاں کے چیتھڑے پریس کلب کے ویٹر با خبر ہوتے ہیں۔" اکرام نے پھر ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "سب کی سنتے ہیں نا۔"

"کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟"

"ہاں... افتخار عارف کی ایک بہن ہے۔ اس کا شوہر لندن میں ہے۔" اکرام ٹیکسی کو ریورس میں گیٹ تک لے گیا۔ "اور ایک بہت قریبی دوست جو اکثر اس کے ساتھ نظر آتا تھا آج کل شوبزنس کے ایک پرچے کا ایڈیٹر ہے۔ پہلے اسی کے ساتھ تھا۔"

"ویری گڈ... اگر یہ کام کا آدمی ثابت ہو تو ہم افتخار عارف کا کیس ایسے ختم نہیں ہونے دیں گے۔" میں نے کہا۔ "کہ قاتل وہ ٹرک ڈرائیور تھا جو فرار ہونے کی کوشش میں مارا گیا۔ اب کیسا پرچہ اور کیسا چالان... عدالت بھی پھانسی نہیں دیتی نا۔"

"جذباتی مت ہو... پولیس کے لیے سب کام آسان ہیں۔ تو اگر یہ سمجھتا ہے کہ ان کو مشکل میں ڈال دے گا تو یہ تیری بھول ہے۔ تو خود اپنے لیے مشکل پیدا کرے گا... اپنے اصل مقصد سے ہٹ جائے گا۔" اکرام نے تنبیہ سے کہا۔

میرا بھٹکا ہوا ذہن راہ راست پر آ گیا۔ واقعی نظام پولیس کے محکمے کی اصلاح تو نہیں ہے۔ مجھے دلاور کو تلاش کرنا ہے۔ اکرام کے ساتھ نازو کو ڈھونڈنا ہے۔ پھر دیکھنا ہے کہ یہاں کتنے خفیہ ہیں اور اس خفیہ گاہ میں ان کو کیسے گھیرا جا سکتا ہے۔

"میرے پاس ایک ٹیلی فون نمبر ہے۔" میں نے کہا۔ "جس پر میری دلاور سے بات ہوئی تھی۔ کیا یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ نمبر کس کا ہے؟"

www.paksociety.com

"میرے خیال میں یہ کوئی مشکل بات نہیں۔" اکرام نے کہا۔
"کوئی بھی فون آپریٹر بتا سکتا ہے... یا بتا سکتی ہے؟"
"بتا سکتی ہے ایک آپریٹر۔" اکرام مجھے آنکھ مار کے مسکرایا۔

"اگر میں چاہو تو اس سے پوچھوں؟"
"یہ تو بہت مشکل کام ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تو نہیں کر سکتا اگر وہ کوئی بدصورت لڑکی نما چیز ہو۔"
"وہ لڑکی ہے ایک غریب کلرک کی۔" اکرام بولا۔ "جو مجبوری کی وجہ سے نوکری کرتی ہے۔ اس شہر کی ہزاروں لڑکیوں کی طرح وہ بھی مردوں کے درمیان خود کو ایسے محسوس کرتی ہے جیسے بھوکے بھیڑیوں کے درمیان بھیڑ... مگر ابھی تک وہ خود کو بچا رہی ہے۔"
"کیا آپ بھی... ؟"
"نہیں... میں وہ ہیرو ہوں جو عموماً وقت پر نمودار ہو کے لڑکی کو پریشان کرنے والوں کا دھڑن تختہ کر دیتا ہے۔" وہ بولا۔ "اگر میں مدد نہ کرتا تو وہ اغوا ہو جاتی... بلکہ یہ ہو سکتا تھا کہ میں خود اسے اپنی ٹیکسی میں اغوا کر کے لے جاتا۔ وہ تو بے ہوش تھی۔ مگر میں نے اسے گھر پہنچایا اور اس کے باپ کو بہت ڈانٹا کہ جوان لڑکیوں کو گھر سے بھیجتے ہی کیوں ہو۔ جانتے ہو دنیا کیسی ہے۔ پھر اس نے مجھے دعائیں دیتے ہوئے بتایا کس طرح ایک افسر کے ذاتی عناد کی بنا پر اس کو ریٹائر کیا گیا اور اب دو سال سے وہ چکر لگا رہا ہے لیے پی آئی اے کے ہیڈ آفس والے سروس بک اور متعلقہ ریکارڈ ہی نہیں بھیج رہے ہیں۔ سب اسی افسر کی کارستانی ہے۔ وہ مجبور تو اب دفتر میں گھس بھی نہیں سکتا... مجبوراً بیٹی کی کمائی کھا رہا ہے۔"
"اچھا... رومانٹک اسٹارٹ ہے۔" میں نے کہا۔
"اس کے بعد بس۔" اکرام بولا۔ "میں نے اس سے کہا کہ آئندہ جب رات کو ڈیوٹی ختم ہو تو مجھے بتا دے میں آ کے لے جایا کروں گا... اور حمایتیوں میں اس کی عزت کے محافظ کی حیثیت سے اپنا اخلاقی فرض اب بھی ادا کرتا ہوں۔"
"اخلاقی فرض... یہ فرمائیے کہ عشق کس مرحلے پر ہے۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی... یا ابھی تک [illegible]"
"وہ تو شروع سے تھی اور رہے گی۔ اس کی تو منگنی بھی ہو چکی ہے۔ اپنے کسی کزن سے۔" وہ بولا۔ "بس وہ وہیں سے آیا تو... دی اینڈ۔" اس نے ٹیکسی موڑ دی اور کسی اسٹریٹ میں گھس گیا۔
"یہ نمبر... کس نے دیا تھا تمہیں؟" اس نے واپس آ کے پرتشویش لہجے میں کہا۔
"کیوں... خیریت تو ہے نا؟"

"ابھی تک تو نظر آ رہی ہے... آگے کا پتا نہیں۔ نمبر بیٹھو چاند بھائی موٹا والا کا ہے۔" وہ بولا۔
اس نام نے مجھے محظوظ کیا۔ "یعنی سورج بھائی چھوٹا والا؟"
"یہ مذاق کی بات نہیں... چاند بھائی شہر کا نامی گرامی سمگلر اور بدمعاش ہے۔" اکرام نے کہا۔ "یہ اس کے گھر کا نمبر ہے۔"
"مجھے... غلط تو نہیں بتایا اس نے...؟"
"یہ نمبر کس نے تم کو دیا تھا؟" اکرام نے ایک چپت مجھے لگا دی۔ "اب فون کر کے پوچھ لے۔"
میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اب مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ اکرام نے ٹیکسی کا رخ اپنے گھر کی طرف موڑا۔ اس نے میرے فضول سوالات کے معقول جوابات تک نہیں دیے اور صاف کہا کہ چاند بھائی کے گھر جانے سے بہتر ہے کہ تو دل میں حاضر ہو جا [illegible] میں اس نے میرے جذبات کو دیکھتے ہوئے سوچنے اور حساب کارروائی کرنے کا وعدہ کیا۔
ہم جب واپس ہوئے تو ہر طرف اندھیرا تھا۔ ٹیکسی کو ہم نے سڑک پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ جب اکرام شیخ پہلے کی طرح سب انسپکٹر بن گیا تو میں نے گلی میں جھانک کر "ڈان" اور "ہیرو" کا سگنل دیا اور وہ باہر آ گیا تو میں نے تالا لگا دیا۔ پھر میں اس کے ساتھ کسی زیر حراست ملزم کی طرح چلنے لگا۔
جہانگیر روڈ ویسٹ کے اس کوارٹر میں بھی اندھیرا تھا... موت کا سا حبس... سرد، سفاک اور آسیب زدہ اندھیرا جس میں اختیار عارف سے مختصر ملاقات کی یادیں گم ہو گئی تھیں... باہر پہرا بھی کوئی نہیں تھا مگر پولیس نے مجسٹریٹ کی موجودگی میں کوارٹر کو سر بمہر کر دیا تھا۔ پھر رات کا وہ وقت تھا جب پی ٹی وی پر شوکت صدیقی کے ناول پر مبنی سیریل "خدا کی بستی" پیش کیا جاتا تھا اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ سڑکیں اور گلیاں کچھ سنسان ہو گئی تھیں اور گھروں کی کھلی کھڑکیوں کے سامنے اور دکانوں کے سامنے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ یوں کھڑے نظر آتے تھے جیسے انھیں پینٹنگ کا منظر کر دیا گیا ہو۔
کسی نے ہمیں کوارٹر کی دیوار پھاند کے اندر داخل ہوتے نہیں دیکھا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ہم ایک سنگین جرم کے مرتکب ہو رہے تھے لیکن میں اکرام کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ ابھی ہم صحن میں اترے ہی تھے کہ اندھیرے سے ایک سایہ سا برآمد ہوا اور کسی نے کہا۔ "آئیے... تشریف لائیے... مجھے معلوم تھا کہ آپ یہاں ضرور آئیں گے... مگر یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟"
میں اور اکرام اپنی جگہ پر منجمد ہو گئے۔ اس کا اور میرا ہاتھ اپنے ریوالور کی طرف بڑھا اور رک گیا۔

وہ آواز میرے لیے بالکل اجنبی تھی اور شاید اکرام کے لیے بھی۔
"کون ہو تم...؟" اکرام شیخ نے حواس برقرار رکھتے ہوئے کسی حقیقی پولیس افسر کی طرح سوال کیا۔
وہ شخص جو اندھیرے میں صرف ایک سایہ لگتا تھا، اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے کھڑا تھا اور اس کی بیرل کی غیر معمولی طوالت بتاتی تھی کہ ریوالور میں سائلنسر کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس نے اکرام کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔
"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ گھر پولیس کی تحویل میں ہے؟ پھر تم نے جرأت کیسے کی اس طرح اندر داخل ہونے کی؟" اکرام شیخ نے گرج کے کہا۔
اندھیرے سے دو اور سائے جدا ہوئے اور پہلے شخص کے دائیں بائیں سے آگے بڑھے۔
"اپنے ہاتھ اوپر رکھنا سورما۔" پہلے والے شخص نے کہا۔ "ورنہ تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ تمہارے شریر سے کب تمہاری آتما کا ساتھ چھوٹا۔"
"شریر اور آتما۔" میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ہندی کے الفاظ تو اردو میں بالکل بے تکلف ہیں جیسے پریم اور شانتی... وغیرہ اور آتما یا دھرم جو عام لوگ بھی استعمال کر لیتے ہیں مگر جسم اور روح کی بجائے شریر اور آتما وہی استعمال کرے گا جو ہندو ہوتا ہو۔
[illegible] میں نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔ "تم اتنی آسانی سے ہمیں نہیں پکڑ سکتے... ہم مرتے مرتے تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔"
اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میرے لیے ناقابل یقین تھا۔ میں نے سائلنسر میں دب جانے والی گولی کی آواز سنی اور ریوالور میرے ہاتھ سے ایسے اڑ گیا جیسے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ یہ دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک ماہر نشانے باز موجود ہیں۔ جن کے سامنے یہ ناچیز محض طفل مکتب ہوں... یہ حقیقت مجھے بادل ناخواستہ تسلیم کرنی پڑی کیونکہ اس شخص نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر اندھیرے میں نشانے سے گولی چلائی تھی اور کمال یہ کیا تھا کہ میرے ہاتھ پر خراش بھی نہیں آنے دی تھی۔ باقی دونوں آگے بڑھنے والے گونگے لگ رہے تھے۔ وہ اندھیرے میں سیاہ بھوت نظر آتے تھے۔ اپنے چھ فٹ سے زیادہ لمبے ہونے کے قد اور توانا جسموں کے باوجود وہ اس شخص کے حکم کے غلام تھے جو دبلا پتلا اور پست قامت تھا۔ مگر جس کے سکون اور مستقل مزاجی اور ٹھنڈے دماغ [illegible]
"تم کیا سمجھتے ہو کہ تم یہاں سے بچ جاؤ گے؟" اکرام شیخ نے کہا۔ "باہر پولیس کا پہرا ہے۔"

"اپنا ریوالور رکھ دو۔" پہلے شخص نے کہا۔ ابھی تک وہ اکرام شیخ کے لہجے سے متاثر ہوا تھا اور نہ اس نے یہ ضروری سمجھا تھا کہ اس کی کسی بھی بات کا جواب دے۔
"شیخ وہ یار... کچھ مانگنے والے کو انکار نہیں کرنا چاہیے..." میں نے اکرام سے کہا۔ "یہی ہماری شان ہے... جو دل مانگے لے دو دل، جان مانگے تو جان... یہ تو صرف ریوالور مانگ رہے ہیں... ڈراما ختم ہو گیا اپنا۔"
"تم نے ٹھیک سمجھا۔" پہلا شخص بولا۔ "اپنے ساتھی کو بھی سمجھا دو کہ ہمارا راستہ روک سکنے والا کوئی نہیں ہے... ان دونوں پولیس والوں کی لاشیں اندر پڑی ہیں جو باہر پہرا دے رہے تھے۔"
اکرام شیخ نے اپنا ریوالور ان کی طرف اچھال دیا... وہ ریوالور کسی کے ہاتھ میں بھی جا سکتا تھا یا نیچے گر سکتا تھا لیکن اس نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا۔ اس کی حرکت کسی بہترین [illegible] کے بہترین فارورڈ کے پاس کی طرح تھی جس سے کوئی بہترین کھلاڑی پورا فائدہ اٹھا کے گول کر سکتا تھا۔
ایک گول ہو سکتا تھا [illegible] کہ اکرام نے ریوالور [illegible] وہ ایک دم [illegible] کے لیے بائیں جانب جھکا اور ایک سیکنڈ کے لیے اپنے ساتھی سے [illegible] گیا۔ میں نے اس سیکنڈ کے مختصر وقفے میں [illegible] انداز میں حرکت دی اور میری ایک [illegible] پسٹن کی طرح پوری قوت کے ساتھ [illegible] اپنے ساتھی پر گرا۔ ابھی اس کا جسم [illegible] ایک ماری اور اس کے [illegible]
گھٹنے ہوئے پہلے شخص پر گرانا چاہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک آسے پڑ جاتی تو وہ دونوں ایک ہی وار سے شکار ہو جاتے لیکن یہاں مجھے میرے اندازوں اور میری توقعات کی توہین نے شکست دی۔
میرا حریف عام آدمی نہیں تھا جو لڑنا تو بہت دور رہا [illegible] جانتا ہو۔ وہ فن حرب سے پوری طرح واقف تھا اور میں یہ نہیں کہ میں بہتر تھا تو وہ سوا سیر۔ تو یہ غلط نہ ہوگا۔ اس نے میرے وار کو ناکام بنانے کے لیے [illegible] اور جب میں سطح زمین کے متوازی اڑتا ہوا اس کے اوپر سے گزرا تو اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے پیٹ دیا۔
میں منہ کے بل فرش پر گرا اور پھر اٹھ نہ سکا کیونکہ اس نے [illegible] لگا کے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ گردن اٹھا کے میں نے اکرام کو دیکھا... وہ دوسرے گورے کی گرفت میں بے بس ہو چکا تھا اور خود کو آزاد کرانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

www.paksociety.com

"ان دونوں کو اندر لے آؤ۔" پہلے والے شخص نے کہا اور کوئی آہٹ کیے بغیر پلٹ گیا۔ اس نے ایک بند کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر غائب ہو گیا۔

جو شخص مجھ پر سوار تھا اس نے مجھے ایک جھٹکے سے اٹھایا اور میرے دونوں ہاتھوں کو بغل کے نیچے سے اپنے ہاتھوں میں اس طرح جکڑ لیا کہ میں گردن تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ وہ میرے پیچھے مجھ سے چپکا ہوا تھا اور اس نے میرے لیے ٹانگوں کو پچھلی طرف دولتی کے انداز میں چلانا بھی ناممکن کر دیا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ میں اناڑی نہیں ہوں۔ وہ خود ایک ماہر کھلاڑی تھا چنانچہ اس نے دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے میرے لیے جارحیت کے امکانات کو صفر کر دیا تھا۔

کمرے کے اندر پہنچ کے مجھے ان دونوں سپاہیوں کی لاشیں نظر آئیں جو ابتدائی تفتیش مکمل نہ ہونے کے باعث جائے واردات کی نگرانی پر مامور تھے۔ ان پیشہ ور قاتلوں کے سامنے ان بے چاروں کی کیا اوقات تھی۔ وہ تو انھی روایتی رائفلوں کے ساتھ ایک ضابطے کی کارروائی پوری کر رہے تھے اور کسی بھی حملہ آور سے مقابلے کے لیے آئے ہی نہیں تھے۔

اسی کمرے میں صبح میں نے افتخار عارف کو زندگی کی بھرپور توانائی اور امیدوں کے ساتھ تڑپتے دیکھا تھا۔ اب شاید اس کی انصاف طلب لاش کسی مردہ خانے کی متعفن فضا میں فرشی خاک پر پڑی تھی اور اسے کسی قسم کی ضابطے کی کارروائی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ پوسٹ مارٹم... تفتیش کے مرحلے... سراغرسانی۔ پکڑ دھکڑ... تجہیز و تکفین... تعزیتی پیغامات اور خراج تحسین پیش کرنے والے بیانات...... شہید وطن کا خطاب ملنے کی لغاتی۔

یہ سب ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے اور اس سے کسی کو ذرا بھی فرق نہیں پڑتا۔ نہ مرنے والوں کو... نہ مارنے والوں کو... نہ زندہ رہ جانے والوں کو جو کاروبار کو حسب سابق چلاتے ہیں۔

کمرے میں روشنی تھی... انھوں نے سڑک کی جانب کھلنے والی دونوں کھڑکیوں کے شیشوں پر کالا رنگ پھیر دیا تھا... یہ رنگ بھی نہیں تھا تارکول تھا جس کی بو کمرے میں محسوس ہو رہی تھی۔

مجھے اور اکرام شیخ کو دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑا کر دیا گیا۔ کسی نے ہمارے دونوں ہاتھوں کو ملا کے کلائیوں میں ایک ہتھکڑی ڈال دی۔ مقابلے میں ہماری تیز چالوں کو انھوں نے ناکام کر دیا تھا۔ اکرام شیخ کی وردی اور پولیس کے لہجے میں رعب ڈالنے کی کوشش... ریوالور سے انھیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے کی کوشش اور پھر... موقع ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی... کے مصداق پہل کرنے کی کوشش... وہ کسی پریشانی یا دشواری کے بغیر ہم پر غالب آ چکے تھے۔ اب آخری کوشش ہم یہ کر سکتے تھے کہ زور زور سے چلاتے لیکن ایسے خطرناک دشمنوں سے کچھ بعید نہ تھا کہ ہمارا گلا پھاڑ دیں کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری... یعنی نہ ہو... بہتر ہے زندگی... ایسے گزرے کہ کوئی نہیں بانس بجھے...

"آج سے پہلے میں نے تم کو کبھی نہیں دیکھا۔" ایک شخص نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

"تم نے ابھی بہت کچھ نہیں دیکھا... لیکن بہت جلد دیکھ لو گے۔" وہ بولا۔ صورت سے ہی ہندو نظر آنے والا اب بولا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "میں ایک تو تاج محل دیکھنا چاہتا ہوں چاندنی رات میں... اس کے علاوہ قطب مینار کے اوپر سے اور شہر کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کتنا بڑا لگتا ہے۔"

"پھولتے مرو... اور کیا دیکھنا چاہتے ہو؟"

"اور... اور تمھاری چتا کے جلنے کا منظر۔" میں نے کہا۔ "وہ آدم خوروں کی لڑائی... جیسے کتے اور سور کی لڑائی ہوتی ہے یہ جانور تمھارے دیش کے کس حصے میں ملتے ہیں شری...؟"

"تم مجھے ڈبڈی کر سکتے ہو؟" وہ چالاکی سے اپنے غصے کو پی گیا۔ "تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔"

"ملتے جانتے ہو تم؟" میں نے کہا "کمال ہے... پھر تو تمھیں یہ بات بھی معلوم ہونا چاہیے... میں قیس میاں کے بھائی کی سالی کا منہ بولا بھائی ہوں... میرے بھائی کے سسر کے سمدھی کے ماموں کے سالے تھے۔"

اس مکالمے پر تناؤ کی ایک شکن نمودار ہوئی۔ "تمھارا نام قیس میاں ہے؟" اس نے اکرام شیخ سے پوچھا۔ "وردی پہ نام کچھ اور لکھا ہے جو!"

میں مایوس ہونے لگا تھا کہ میری فضول بکواس سے کوئی نتیجہ نہیں ہو رہا ہے... لیکن اچانک مجھے ایک معمولی سی کامیابی ہوئی۔ میں نے سخت شرمندہ ہو کے اکرام کی طرف دیکھا۔ "یار غلطی ہو گئی۔"

اکرام شیخ نے مجھے خونی نظروں سے گھورا۔ "اسی لیے میں تمھیں ساتھ نہیں لا رہا تھا کہ تم بکواس سے باز نہیں آؤ گے... اب کہتے ہو غلطی ہو گئی ہے..."

"قیس میاں... نام تو ہم معلوم کر ہی لیتے... مامائی اتنا آسان بھی نہیں ہے۔" ادھیڑ عمر شخص نے خشک لہجے میں کہا۔ "تمھارا کام خطرناک تھا جس کے لیے تمھیں اپنا نام چھپا کے آنا پڑا... ادھر تم سمجھ رہے ہو گے کہ میں تمھیں قتل کر دوں گا یا نام کو جاننے کے لیے تم سے کچھ پوچھوں گا... نہیں... میرا کام نہیں ہے... مجھے تو خاص طور پر صرف اس لیے بھیجا گیا تھا کہ تمھیں اور اس شخص کو زیادہ تمھاری قیمتی ہے..."

"بالکل..." میں نے چیخ کر کہا۔ "وہ ہماری اہلیہ ہیں۔"

وہ مسکرانے لگا۔ "کون؟"

"قیس میاں کی ہمشیرہ شبّو..." میں نے کہا۔

"چلو مان لیتے ہیں کہ اس کا نام شبّو ہے۔" وہ بولا۔ "تم اپنے لیے کوئی اچھا سا نام بتا سکتے ہو۔"

"تم نے بتایا تھا اپنا نام؟" میں نے کہا۔

"میرا نام رشی جوشی ہے۔" اس نے ایک سگریٹ جلائی۔ "اور تم بیٹھ گیا۔ میں نہ کسی کا دوست ہوں اور نہ دشمن۔ تم لوگ شاید سمجھ رہے ہو گے کہ میرا سمبندھ بھارت کی سینا سے ہوگا یا کسی اور... نہیں... میرا سمبندھ تو راشٹر سے بھی نہیں ہے اور سب سے... میں سب کے کام آتا ہوں اور اپنے کام کی منہ مانگی قیمت لیتا ہوں... میں انٹرنیشنل ہوں... ہر ملک کا پاسپورٹ رکھتا ہوں... نام بھی بدلتا رہتا ہوں... لیکن جب کسی کام کی ہامی بھر لیتا ہوں تو وہ ہو جاتا ہے۔ وہ کام ایسا ہوتا ہے جو کوئی اور نہیں کر سکتا... یا کرتے ہیں تو... بہت نقصان اٹھاتا ہے اور بڑی شرمندگی ہوتی ہے... تم اگر چاہو تو بیٹھ سکتے ہو۔"

میں نے اکرام کی طرف دیکھ کے سر ہلایا اور ہم دیوار کے ساتھ سر ٹکاتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئے۔

"میں نے بارہ بجے کا سمے دیا تھا۔" وہ بولتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ "بارہ بجے میں تم کو ان کے حوالے کروں گا جن سے میں نے ایک لاکھ روپے لیے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں یہ کام ہو جائے گا۔ ان کو یقین تو نہیں تھا۔ مگر میرا پچھلا ریکارڈ ایسا ہی ہے کہ وہ خاموش ہو گئے۔"

"وہ کون ہیں؟"

"وہی... بھارت سرکار کے نمک خوار..." وہ بولا۔ "بھارت ماتا کے سپوت... وہ مجھ سے چڑتے ہیں مگر میرے سامنے بول نہیں سکتے... جانتے ہیں ناں کہ مجھے کس نے بھیجا ہے... مجھے بھارتی سینا کے ایک اعلیٰ افسر نے بلوایا تھا... بھارت سرکار کو پھر میری ضرورت پڑی تھی۔"

"تم کیا ہو آخر مسٹر رشی؟" میں نے کہا۔ "کوئی عظیم جاسوس؟ بین الاقوامی دہشت گرد کا دادا... جیسے..."

"میں کچھ بھی نہیں ہوں... بس کبھی کبھی ایسا ہی ٹھیکا لے لیتا ہوں۔" رشی جوشی نے کہا۔ "دہلی سرکار نے مجھے ڈاکو پکڑنے کے لیے بلوایا۔ انھوں نے اتر پردیش اور مہاراشٹر کے علاقے میں سب کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ پولیس، فوج اور خفیہ پولیس سب تھک ہار بیٹھے تھے۔ دس لاکھ کا انعام تھا ان کو زندہ یا مردہ پیش کرنے کا مگر سال بھر میں کوئی سامنے نہ آیا... اور انھوں نے سرکار کا ایک کروڑ روپیہ لوٹ لیا اور نہ جانے کتنے گاؤں جلا دیے۔ سیکڑوں قتل کر چکے تھے وہ لوگ... میں نے پچیس لاکھ مانگے۔ رقم پیشگی ایڈوانس وصول کرتا ہوں... ایک مہینے کی مہلت مانگی۔ اتر پردیش والا ڈاکو تو میرے ساتھ ہی پکڑا گیا اور ہم دونوں کو ایک ہی دن پھانسی بھی ہوئی۔"

"مجھے بھی دو بار پھانسی ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ مسکرایا۔ "پھانسی کا ڈراما سرکار نے رچایا تھا... ظاہر ہے کہ لاش صرف اس کی باہر آئی... میں باہر آیا تو دوسرے ڈاکو کی باری ہو گئی... اس کے بھی پچیس لاکھ ملے تھے مگر وہ زندہ نہیں ملا... بہرحال میں نے اس کی لاش پیش کر دی تھی۔ پہلے میں چھوٹے ٹھیکے بھی لیتا تھا۔ کسی اپوزیشن لیڈر کو قتل کرنا، اپوزیشن کے جلسوں اور جلوسوں کا بندوبست کرنا اور پھر ان میں بم دھماکا کرنا... کسی کے خلاف اسکینڈل کھڑا کرنے کے لیے کسی بیوی کو ساتھ ملانا اور پھر ان کی بنی فلم سرکار کے حوالے کر دینا۔ اب یہ دھندے بہت سے لوگ کرنے لگے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ میرا آخری مشن ہے۔ اس کے بعد میں کہیں چلا جاؤں گا۔ اتنا پیسہ جمع ہو گیا ہے کہ اب کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا... سوائے عیش کے۔"

"یہ سب باتیں تم ہمیں کیوں سنا رہے ہو؟"

"بس ایسے ہی... وقت گزارنے کے لیے... تم نے تعارف کرانے کو کہا تھا ناں۔"

"تعارف کے بعد لوگ رسماً کہتے ہیں کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" میں نے کہا۔

"لیکن تم ایسا نہیں کہہ سکتے۔"

"کیوں نہیں کہہ سکتا؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ یہ سراسر جھوٹ ہوگا۔" وہ بولا۔

"لوگ بھی عموماً جھوٹ ہی کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جانے تمھارے سب آداب میں بھی منافقت کا رنگ آ گیا ہے۔ لیکن تمھاری صاف گوئی سے متاثر ہوا..."

"یہ بھی جھوٹ ہے۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"میں سمجھتا ہوں کہ خوشامد سے تمھیں خوش کر کے میں اپنے لیے کوئی رعایت حاصل نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے میں نقد سودے کی بات کرتا ہوں۔"

"کیا تم سودا کرنے کی پوزیشن میں ہو؟" وہ مسکرایا۔

"جو شخص... اس کے جذبات یا اس کا ایمان اور ضمیر برائے فروخت ہوں... اس سے کوئی بھی شخص سودا کرنے کی پوزیشن میں رہتا ہے جس کے پاس معاوضہ ادا کرنے کی طاقت ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ میرا ایک خاص نقطۂ نگاہ ہے۔ تم اس سے اختلاف

www.paksociety.com

کرسکتے ہو... کہ تم بھی ایک طوائف ہو۔"

وہ ہنس پڑا۔ "واٹ اے فنی تھنگ تو سے

یس... طوائف کا لفظ تو عورت کی ذات اور پیشے سے منسوب ہوگیا ہے۔" میں نے کہا "صرف اس لیے کہ وہ خود کو بیچتی ہے۔ کسی ضابطۂ اخلاق پہ یقین نہیں رکھتی اور کسی کی وفادار نہیں ہوتی سوائے اس کے جو اسے خرید سکے... غور کرو کیا یہی تینوں صفات تمہاری ذات میں موجود نہیں ہیں۔"

وہ سنجیدہ ہوگیا۔ اسے یکلخت اپنی نظر میں وہ عزت، وقعت اور اہمیت حاصل نہیں رہی تھی جو اس کی طاقت تھی۔ جس پر اسے غرور تھا۔

"گویا تم مجھے خریدنا چاہتے ہو؟" وہ بولا۔

"ہاں... تم خریداروں کے درمیان فرق تو نہیں رکھتے نا، مال دینے والے گورے کا... ہندوستانی یا پاکستانی کا؟"

"ول یو پلیز شٹ اپ...!"

"تم کس قسم کے پروفیشنل ہو... صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم ایک مقامی سطح پر طاقت حاصل کرلینے والے بدمعاش ہو... تم نے کاروبار کا نام ضرور رکھا ہوگا... اس کی خدمات ہر حکومت حاصل کرسکتی ہے... کوئی بھی صنعت کار... اسمگلر یا ڈرگ ڈیلر حاصل کرسکتا ہے... اپنے حریف کے خلاف... تم کو بھی اسی کی سطح پر آکے غیر جذباتی انداز میں کام کرنا چاہیے... قومیت... مذہب... ملک اور نسل... سیاسی نظریات اور اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کے... جسٹ بزنس... دیٹس آل۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" اس نے لاجواب ہو کے کہا۔

"یہی کہ اگر تم کو میری گرفتاری پہ مامور کیا۔ اس کی ایک قیمت ادا کی۔ تم نے کیوں اور کیسے کا کوئی سوال نہیں کیا... یہی کام میں تم سے لینا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

مطلب تو بہت صاف ہے اور تم جیسے ذہین آدمی کو سمجھ جانا چاہیے... یعنی تم کو پانچ لاکھ زیادہ آفر کرتا ہوں۔" ... "کس بات کے...؟"

"مجھے تم نے پکڑا اور معاوضہ ادا کیا۔" میں نے کہا "مگر مجھے ... کرو... میں تم سے کنٹریکٹ کرتا ہوں کہ ... سامنے زندہ یا مردہ پیش کرو... اور جتنا معاوضہ اس نے تم کو دیا ہے... پانچ لاکھ زیادہ دیتا ہوں۔"

"کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟"

"کیوں... اس میں کون سی پاگل پن کی بات ہے؟ میں سمجھا پانچ کم ہیں تو دس لاکھ کرلو... مگر ویٹ از دی لمٹ۔"

"کہاں سے لاؤ گے تم اتنی رقم؟" وہ مجھے گھورنے لگا۔

"یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔" میں نے کہا "میں تم کو رقم ادا کردوں گا۔"

"مگر یہ اب کیسے ہوسکتا ہے... کہ میں دونوں پارٹیوں سے کنٹریکٹ کروں؟" وہ جھلا کے بولا۔

"ہو کیوں نہیں سکتا... تم بھول گئے بزنس کینسل ہوسکتا ہے۔ ہر معاہدہ کسی بھی وقت کینسل ہوسکتا ہے۔"

"مگر دونوں فریقوں کی رضامندی سے۔" وہ بولا۔

"دوسرا فریق تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟" میں نے کہا "تم کہہ سکتے ہو کہ سوری... مقدر بخت ہاتھ سے نکل گیا اور اس کا کچھ نہیں چل رہا ہے کہ ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھ کے بیٹھ گیا ہے... بجز انکار کی تو ہیں... اور تم ایمانداری سے اس کا دیا ہوا معاوضہ واپس کرسکتے ہو۔"

"ڈیم اٹ... یہ ایمانداری کا نہیں... میری گڈول کا مسئلہ ہے۔" وہ جھلا کے بولا "تم چاہتے ہو کہ پہلے میں اپنی ناکامی کا اعتراف کرلوں... صرف دس لاکھ کے منافع کی خاطر اپنی گڈول قربان کردوں؟ آئندہ کیا ہوگا یہ جانتے ہو... بلکہ مجھے کنٹریکٹ دیتے ہوئے تذبذب کا شکار رہیں گے۔ آج تک وہ کہتے ہیں کہ میرے کنٹریکٹ میں ناکامی کا لفظ شامل نہیں ہوتا... شک ہی نہیں ہوتی کہ میں ناکام رہا تو کیا ہوگا۔ ایک ناکامی پہلی ناکامی ہوگی تو آگے چل کر میری مارکیٹ خراب ہوجائے گی۔ اس کے علاوہ... کیا تم انھیں بے وقوف سمجھتے ہو کہ وہ میرے کہنے کو سچ مان لیں گے۔ انھیں بالآخر معلوم ہوجائے گا کہ مقدر بخت ماؤنٹ ایورسٹ پر بیٹھے ہوئے بجز انکار کی تو ہیں... پھر وہ سمجھیں گے میں نے ان کے اعتماد کو دھوکا دیا۔ شاید تم سے مل گیا۔ پھر کیا وہ مجھے معاف کریں گے؟"

اسے ... لاجواب ہوگیا۔ "تم نے پیمانہ ... کی بات کی تھی... اس آخری کنٹریکٹ میں تم دس لاکھ زیادہ دے کر فائدے میں رہتے۔"

"یہ قول... میں تمام عمر افسوس کرتا... کہ صرف دس لاکھ کے لیے میں نے اپنے کیریئر کو ناکامی پر ختم کیا ... بالکل ... ہے تو مرتے دم تک اس احساس سے ... رہتا ہے کہ ... شکست نہیں دی تھی۔ دوسرا ... ہوتا ہے جو اس حقیقت کو نہیں سمجھتا کہ دنیا کے میدان میں ہر شخص کسی بھی وقت ... خودار ہوجانے والے ... کے سامنے سرنگوں ہوسکتا ہے ... لافانی کوئی چیز نہیں ہے ..."

وہ ایک دم چپ ہوگیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ میری ذہانت سے قائل ہوگیا ہے اور جلا ہوا لگتا ہے ... آپ کی بات ... صرف ایک نقطہ ... کہہ کے بھی بات ختم کرسکتا تھا۔ خاموش ہو کے بیٹھ گیا اور انکار ... کے بھی۔

اس نے اپنی گھڑی دیکھی... پھر ایک ... وقت ختم ہوگیا ہے۔"

"ابھی دس منٹ باقی ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ ... سے مسکرایا "مجھے معلوم ہے۔"

"یہ منٹ ... بہت کچھ ہوتا رہا ہے۔" میں نے کہا "... کے تخت کو الٹ دیا۔ ... جہاں سے ایک ... شہنشاہ ہند کو ... کرلیا ... ایک ... ختم کردی۔"

"یہاں ایک منٹ میں تم ... دس منٹ ... وہ ..."

"... قدرت ... ہے۔" میں نے ... "... ہو جائے۔"

لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ باہر ایک کار کا ہارن سنائی دیا اور وہ ... میں نے اس کے چہرے پہ اطمینان کی اور خوشی کی مسکراہٹ دیکھی۔

"میں اپنا آخری معاہدہ پورا کرنے میں کامیاب رہا مسٹر مقدر بخت اور اب میں چلتے چلتے ایک بات کا اعتراف کرلوں۔ اس میں میرے لیے شرمندگی کی بات نہیں... تم یقیناً مجھ پر برتری رکھتے تھے... اور میرے لیے سب سے مشکل اور طاقتور ثابت ہوئے۔ اس خیال میں میرے لیے ہمیشہ فخر کی بات ہوگی بالکل اسی طرح جیسے کوئی شکاری فخر سے کہتا ہے کہ اس نے جو آخری آدم خور شیر مارا وہ سب سے خطرناک تھا۔"

ہارن پھر سنائی دیا۔

"ان سے کہو کہ اندر آجائیں۔" وہ گوریلوں میں سے ایک سے مخاطب ہو کے بولا "تاکہ میری فتح کی ... ختم ہو۔"

ایک گوریلا دروازے سے باہر گیا۔

"تمہاری آفر بہت اچھی تھی۔" وہ بولا "مگر کاش تم مجھ سے ... ہوتے... پھر بھی... اس پیشے میں بھی ایک ... تو ہوتی ہے۔"

باہر جانے والے گوریلے کے ساتھ ایک شخص اندر آگیا۔

"کیوں ہارن بجا رہے تھے باہر سے... اندر آتے ہوئے ... ہے؟"

"ڈر کی بات نہیں... میں اکیلا تھا۔" ... نے برہمی سے کہا "گاڑی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا... تمہیں کیا پریشانی تھی کہ باہر نہیں آسکتے تھے؟"

"مجھ سے بات طے ہوئی تھی کہ تم لوگ اندر آکے انھیں خود اپنی تحویل میں لوگے۔" وہ بولا۔

"میں نے بتایا نا کہ میں اکیلا تھا۔" نووارد بولا "کسی اور کو کیسے ساتھ لاتا... ویسے... وہ محافظ جو چار کے برابر بیٹھے ہیں... میں اور تم..."

"میں تمہارے ساتھ نہیں جا رہا ہوں... میری کار الگ ہوگی۔"

"آئی ڈونٹ تھنک دی کرنل ول لائک دیٹ۔" نووارد نے ناگواری سے کہا "میرا خیال ہے کرنل یہ پسند نہیں کرے گا۔"

"آئی ڈونٹ کیئر اباؤٹ یور کرنل۔ مجھے تمہارے کرنل کی پروا نہیں۔" اور کیپٹن... "اگر اس نے تمہیں بھیج دیا تو یقیناً اس کو تم پر اعتماد ہوگا... ورنہ وہ خود آسکتا تھا۔ اس سے کہہ دو ... وہ خود آئے گا... ناؤ ... مدد ... ہے۔"

کیپٹن نے اسے خون آشام نظروں سے دیکھا مگر وہ چپ رہا اور مختصر سا آدمی انتہائی اعتماد کے ساتھ نپے تلے قدم اٹھاتا باہر چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں اسلحہ بھی نہیں تھا اور اس کے مقابلے میں کیپٹن بہت زیادہ جسمانی طاقت کا مالک تھا مگر وہ غالباً اس شخص کے پس منظر سے ذہنی طور پر خائف تھا کہ اس نے ریوالور ہاتھ میں ہونے کے باوجود اس کا راستہ نہیں روکا۔

"چلو... ان دونوں کو زیور پہناؤ۔" کیپٹن نے ایک ہتھکڑی نیچے پھینک دی۔ گوریلے ... اور ... زبان بولتے تھے مگر اشاروں سے کیپٹن کی بات سمجھ لی۔ نوجوان کیپٹن سفید شلوار قمیص میں تھا اور اس کی مونچھیں ... تھیں۔ راہ چلتے کسی نے اسے غور سے بھی نہیں دیکھا ہوگا... یہ خیال کسی کو کیسے آسکتا تھا کہ وہ انڈین آرمی کا کیپٹن... ایک دشمن ... کار ہے۔

اکرام شیخ اس تمام عرصے میں بالکل خاموش اور متفکر رہا تھا۔ اسے اپنی نہیں بہن کی فکر تھی... اب وہ کہاں جائے گی اور بھائی کو کہاں تلاش کرے گی کب تک تلاش کرے گی ... نہ چھوڑنے والے لوگ تھے اور معلوم نہیں اسے کس کس عقوبت خانے میں ... کسی زیر زمین تہ خانے میں قید کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا ... کے بارے میں کہا تھا تو کہاں جانتی تھی ... کچھ اپنا ... کرے ... تھے... مگر ... کے تصور سے خائف ہو کے بھی کیا ... تھا۔

www.paksociety.com

دونوں گوریلوں نے ہمیں یوں دبوچ لیا جیسے بلی اپنے پنجوں میں چوہے کو دبوچتی ہے... بے شک ایک دو منٹ میں ان کی گردن توڑنے پر قادر تھا لیکن بے سبب خودکشی کو میں نے کبھی جائز نہیں سمجھا تھا۔ لڑنا اگر جان بچانے کے لیے ہو تو جائز ہے۔ جان بچانے کے لیے بھی لڑنا ایک مقصد رکھتا ہے مگر جہاں موت مرنے کے لیے لڑنا پاگل پن ہے۔ میرے سامنے جو تلوار مارکہ مونچھوں والا کیپٹن کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں اب وہی سائلنسر لگا ہوا ریوالور تھا جو وہ چھوٹا سا آدمی جاتے جاتے اسے تھما گیا تھا۔ اس سے قبل بھی کیپٹن کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اس پر سائلنسر بھی تھا مگر اپنے ریوالور سے مارا جانا مزید افسوس ناک ہوتا... اپنی جوتی اور اپنا ہی سر۔

ہتھکڑی میں ہم دونوں کو ایسے باندھا گیا کہ پہلو بہ پہلو کھڑے ہوئے میرا دایاں ہاتھ اور اکرام کا بایاں ہاتھ ایک ہو گیا۔ پھر انھوں نے مخالف سمتوں کے بازو گھما کے یعنی میرا بایاں ہاتھ اور اکرام کا دایاں ہاتھ۔ یہ بڑی خاصی مشکل پوزیشن تھی مگر وہ تھوڑی سی عقل سے کام لیتے تو ہم دونوں کی پشت ملا کے آسانی سے دونوں کے سیدھے اور الٹے ہاتھ جوڑ دیتے۔ کیپٹن نے دو ڈرائیوروں سے جلدی کرنے کو کہا اور انھوں نے نہ جانے کہاں سے دو کالے کپڑے کے رومال برآمد کیے۔ ایک رومال میری آنکھوں پر آ گیا تو دنیا میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے فرض کیا کہ یہی اکرام کے ساتھ ہوا ہوگا۔

میری توقع کے مطابق آخری کام یہ ہوا کہ میرے لبوں پر مہرِ خموشی ثبت کر دی گئی یعنی بہت مضبوط چپکنے والے ٹیپ لگا کے مجھے شٹ اپ کر دیا گیا۔ تاہم وہ میرے خیالوں کو شٹ اپ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے زبانِ خاموشی میں فیض کا شعر پڑھا۔
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے... ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے... اور اپنے دل کو شاد کیا۔

یہ ایک عادت سی ہو گئی تھی کہ بدترین حالات میں بھی جب ناامیدی کے سوا کچھ نہیں رہتا تھا، دل کسی گمنام امید کی کرن کو تلاش کرتا رہتا تھا اور پُرسکون رہتا تھا۔ اسے کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایمان بالغیب... یقینِ محکم... اعتماد کامل حد سے بڑھی ہوئی رجائیت۔

"اب چلو..." کیپٹن نے غرا کے کہا۔ اسے غرانے کا شوق تھا۔ "تم کیا دیکھ رہے ہو جیلر؟"

دونوں حکم کے غلام فوراً حرکت میں آ گئے... انھوں نے مجھے دھکیلنا اور گھسیٹنا شروع کیا۔ میں نے بالکل مزاحمت نہیں کی... ہم دروازے سے گزرے... پھر کسی نے دروازہ بند کر دیا۔

"ان دونوں کو پیچھے ڈالو... احمق..." کیپٹن نے دانت پیس کے کہا۔ "ایک دائیں طرف بیٹھو... تم ادھر دوسرے دروازے سے اندر جاؤ... نہیں ہے جگہ تو بناؤ... سور کے بچے... کس نے کہا تھا اتنا پھیلنے کو... چلو وقت ضائع مت کرو... آگے آؤ..."

ایک سور کا بچہ آگے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ ناممکن تھا کہ ہم دونوں کے ساتھ وہ دونوں بھی پیچھے کی ایک سیٹ پر بیٹھ سکتے... میں خود کو بہت مضحکہ خیز اور تکلیف دہ پوزیشن میں محسوس کر رہا تھا۔ میرا بایاں ہاتھ شانے پر سے مڑ کے درد کرنے لگا تھا اور میں تقریباً اکرام کے اوپر پڑا ہوا تھا۔ ہم آدھے سیٹ پر تھے اور آدھے سیٹ سے نیچے اور اپنی ٹانگیں چلا کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر میرے ہاتھوں کی رسائی ہوتی تو میں دروازہ کھولنے والے ہینڈل کو گھماتا اور کسی بہت زیادہ ٹریفک والی سڑک پر دروازہ پورا کھول دیتا۔ اس بات کے نوے فیصد امکانات تھے کہ کوئی دوسری گاڑی اچانک گھس جاتی یا دروازے کو آگے یا پیچھے سے ٹکر مارتی اور دروازہ ٹوٹ کے نکل پڑتا۔ دوسری گاڑی والا اپنے نقصان پر روتا اور اس گاڑی کو ہرگز نہ جانے دیتا جس کے ڈرائیور کی مجرمانہ غلطی سے دروازہ کھلا اور حادثہ ہوا۔ شاید اتنی ٹریفک میں وہ فرار نہ ہو پاتا اور جب بہت سی گاڑیاں رک جاتیں اور بہت سے لوگ آ جاتے تو وہ دیکھتے کہ پچھلی والی سیٹ پر تو عجیب سی صورت حال ہے۔

مگر یہ سب میں نے صرف تصور میں دیکھا... ایک منٹ سے بھی کم وقت میں... عملاً میں ہاتھ ہلا بھی نہ سکا... میں نے دل کو تسلی دی کہ میرا پلان ویسے بھی کامیاب نہ ہوتا... عام طور پر ایسی گاڑیوں کے اندر سے ہینڈل نکال لیے جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ ایک گوریلا تو ہمارے ساتھ ہی تشریف فرما تھا اور دو مزید اگلی سیٹ پر کوئی سا دو پر تھا۔

"او مائی گاڈ!" کیپٹن نے اچانک چلا کے کہا۔ معلوم نہیں کس بات پر... پھر دروازہ بند ہوا اور کار کا انجن اسٹارٹ ہو... انجن کی آواز پر میں نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ شیورلیٹ امپالا یا ڈاج ڈارٹ گاڑی تھی۔ دونوں میں زیادہ فرق تھا تو اتنا کہ دونوں امریکن گاڑیاں تھیں۔ دونوں طبقۂ امرا یا ڈپلومیٹ قسم کے لوگ رکھتے تھے جیسے جاتے والے دوسری پیڑھی کے لوگ تھے جو ایک ڈپلومیسی کے حسن پر تھے۔

گاڑی چلی تو ایسی آواز آئی جیسے کوئی مرکب پر چل گاڑی چلے... گڑگڑاہٹ کے چند لمحے لڑکھڑاتے قدم چلنے کے بعد گاڑی رک گئی۔ کیپٹن نے ایک بار پھر غرا کے "او مائی گاڈ..."

دیکھے ہوں گے۔ میں نے اس کی جھنجلاہٹ پر ایک خاموش قہقہہ لگایا۔ ایک ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا۔ مگر گاڑی کسی طرف بھی جھکی ہوئی نہیں تھی جس سے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کون سا ٹائر فلیٹ ہوا ہے۔ اس سے یہ بھی فرض کیا جا سکتا تھا کہ دونوں اگلے یا دونوں پچھلے ٹائروں کی ہوا نکل گئی ہے۔ پھر اسے اتفاقیہ پنکچر ہونا نہیں سمجھا جا سکتا تھا... میرا دل ایک دم پُرامید ہو گیا... شاید ایسا ہو... شاید کسی نے عمداً ہوا نکالی ہو... ایک ٹائر تو بدلا جا سکتا ہے... دو نہیں بدلے جا سکتے... مگر اب کیا کر سکتا ہے یہ؟ میں نے کیپٹن کی آواز سنی... اس نے دروازہ کھولا اور ذرا اونچا، "تم دونوں... جانور..." اس نے حکم کے غلاموں کو بڑی روانی سے گالیاں دیں۔ میرا دل اس خوش خبری سے باغ باغ ہو گیا کہ دو نہیں کسی نے چاروں ٹائروں کی ہوا نکال دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ خود کیپٹن نے کار کو لیول میں محسوس کیا... اسے اندھیرے میں کار کسی طرف سے جھکی ہوئی نہیں لگی۔ کار اپنی جگہ پر سیدھی موجود تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ کھڑی ہوئی نہیں تھی بیٹھی ہوئی تھی۔

"یہ سب اس باسٹرڈ کی وجہ سے ہوا... اینڈ موسٹ ڈیم فول آف اے کرنل..." اس نے سخت اشتعال اور پریشانی میں کہا۔ "وہ خود آتا تو یہ نہ ہوتا... لیکن اس کو تو زیادہ خیال تھا بیٹی اس ماں کا..." وہ شاید کرنل کی کسی آشنا کا حوالہ دے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اس کی خودکلامی میں خوف بھی شامل ہو رہا تھا۔

"یہ... بچوں کی شرارت نہیں ہو سکتی... یہ سازش ہے..." وہ بولا اور پھر ہم سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو... میں تم دونوں کو شوٹ کروں گا... اور کار کو آگ لگا دوں گا... ایک اور فائر سے... یہی کرنا چاہیے مجھے... پٹرول ٹینک... یس... چلو تم دونوں... نکلو... تمھاری... دفع ہو جاؤ... مگر نہیں... ٹھہرو... میں بات کرتا ہوں پہلے... اس کرنل کی تو..." وہ اب دنیا بھر کو ماں بہن کی گالیاں دے رہا تھا۔ "میں اکیلا کیا کروں..." اس نے شاید کار میں کوئی وائرلیس ٹرانسمیٹر آن کیا اور مائیکروفون پہ بولنے لگا۔ "ہیلو... تھری ٹو تھری... ہیلو... ٹاؤن ڈاؤن بیئر... تھری... یو ریڈ می!" وہ چلانے لگا۔ پھر گالیوں پر آ گیا... کیونکہ اسے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

اب وہ گھبراہٹ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے باہر نکل کے صورت حال کا جائزہ لیا۔ آس پاس وہ سرکاری کوارٹرز تھے جن میں رہنے والے کولہو کے بیل کی طرح زندگی کو محدود معمولات کے دائرے میں گزارنے کے عادی ہو چکے تھے۔ صبح نوکری پر جانے کی تیاری کر کے سو چکے تھے۔ اس کا اندازہ میں نے اس سکوت سے لگایا جس میں کبھی کبھار کسی بچے کے رونے کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ اب کیپٹن کی خوش قسمتی کا بچا کھچا ترکش کا آخری کارتوس تھا اور اس کی چڑھائی کے رخ کھڑی ہوئی کار کسی حد تک چھپی ہوئی تھی۔

"ہٹ... تم ادھر آؤ..." اس نے غالباً کسی گوریلے کو حکم دیا۔ "ایک ٹائر بدلو... پھر دوسرے کو پٹرول پمپ تک لے جاؤ... ادھر جہانگیر روڈ پر آدھا میل پہلے پٹرول پمپ ہے... اس سے ہوا بھروا کے لاؤ... اسے لگاؤ اور دوسرے کو لے جاؤ۔ پنکچر کسی میں نہیں ہوگا... یہ کسی نے جان بوجھ کر ہوا نکالی ہے... اچھا ٹھہرو..."

وہ ایک اچھے فوجی افسر کی صفات سے محروم تھا اور غالباً سفارش پر یا خاندانی طبیعت رکھنے کے باعث یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کی قوتِ فیصلہ ذرا سی آزمائش میں ختم ہو گئی تھی۔ وہ خوف میں مبتلا تھا اور ڈرا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے کسی نادیدہ دشمن کو ہر طرف تلاش کر رہا ہوگا اور خود کو ایک نظر نہ آنے والے پُرخطر حصار میں گھرا ہوا پا کے نروس ہوگا۔

وہ تین ٹائروں میں ہوا بھروا کے کام چلا سکتا تھا اور یہ تین چکر اس حکم کے غلام کے لیے آدھے گھنٹے کی بیگار تھے مگر کیپٹن صرف ایک محافظ کے ساتھ رہ جانے کے خیال سے بھی ڈرتا تھا۔ اس کے ذہن میں یقیناً یہ خیال بھی آیا ہوگا کہ وہ کسی دوسری جگہ سے فون کر کے امداد حاصل کرے مگر اتنی رات گئے کسی کال آفس کا کھلا ملنا مشکل تھا۔ پھر یہ رازداری کا معاملہ بھی تھا ورنہ وہ کسی گھر کا فون استعمال کر لیتا۔ اس نے ٹیکسی میں جانے کا بھی سوچا ہوگا مگر کوئی ٹیکسی والا اس حالت میں دو قیدیوں کو لے جانے پر راضی نہ ہوتا... وہ سمجھتا کہ اغوا کی اس واردات میں اس کی ٹیکسی کا نمبر مل آ جائے۔ وہ ہمیں ان دو گوریلوں کی تحویل میں چھوڑ کے خود ٹیکسی لے کر جاتا اور اپنے عیاش کرنل سے دوسری گاڑی لے کر آتا تو اتنی دیر میں نہ جانے کیا ہو جاتا... دونوں حکم کے غلام عقل سے بھی پیدل تھے اور غالباً بول نہیں سکتے تھے۔ وہ گونگے تھے یا ان کی زبانیں کاٹ دی گئی تھیں۔

آخر میں اس نے یہی کیا۔ اس نے محافظوں میں سے ایک کو دو منٹ جا کر کچھ ہدایات دیں اور محافظ تو لوٹ آیا مگر کیپٹن کی آواز سنائی نہ دی تو پانچ منٹ بعد مجھے اس کی عدم موجودگی کا یقین آنے لگا۔ وہ ایسا شخص ہی نہ تھا جو پانچ منٹ چپ رہ سکے۔

وہ ایک سوال جو میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا اکرام کے ذہن میں بھی ہوگا کہ یہ خفیہ کارروائی کس نے کی؟ یقیناً

www.paksociety.com

کوئی وہیں موجود تھا جو سب پڑے سے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے موقع پاتے ہی کام دکھا دیا۔ مگر وہ تھا کون جو ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا؟ وہ ہمارا دشمن نہیں ہو سکتا تھا جس سے ہمارے دشمن کا وہ مجرا ہے کیا اس کا یقیناً کوئی نیک مقصد تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر وہ اس قدر کیوں لرز رہا تھا؟

اسی وقت ایک گولی سا دھماکہ ہوا... کسی نے کار کے پچھلے حصے میں شیشے پر چھوٹا سا پتھر پھینکا تھا۔ پتھر بہت بڑا ہوتا تو ونڈ اسکرین بکھر جاتا اور گر ہوتا تو آواز آتی بڑی نہ ہوتی۔ محافظوں میں سے ایک فوراً باہر نکلا۔ دو سگریٹ رہا اور کی نال میرے سر پر لگا دی... یہ بڑا خوفناک لمحہ تھا۔ خوف اور اعصابی کشیدگی کی اس کیفیت میں کوئی جلا رادہ بھی چل سکتی تھی۔

میں نے سانس روک کے خدا کے حضور ایک دعا ارسال کی جس میں کہا گیا تھا کہ خدا دنیا پر اختیار رکھنے والے معبود... تیری رضا پر مرنا تو سب کا مقدر ہے اور ایمان ہے۔ مگر اس موت کو حادثاتی نہ بنا... ہمیں موقع دے کہ ہم جان دیں تو کسی مقصد کی خاطر... مارے جائیں تو لڑتے ہوئے... یوں بے بسی کی حالت میں نہیں۔

پہلا گوریلا لوٹ کر نہیں آیا... میرے دل کی دھڑکن آتی تیز ہو گئی کہ کسی اتھلیٹ کو پیچھے چھوڑ سکے۔ شمار کرنے لگا۔ ایک... دو... تین... چار... مگر گنتی سو تک پہنچنے سے پہلے ہی گڑبڑ ہو گئی... عام حالت میں دل فی منٹ بہتر بار دھڑکتا ہے تو اس وقت شاید دگنی رفتار سے دھڑک رہا تھا لیکن گھڑی پر نظر رکھے بغیر وقت کا حساب رکھنا ناممکن ہو گیا تھا کیونکہ میرے لیے ایک منٹ کے بعد پیار اور ہر منٹ ایک گھنٹے کے برابر یا اس سے بھی زیادہ طویل ہو چکا تھا۔

بالآخر کسی نے ڈکی کھولی اور دو نمبر گوریلے نے بے اختیار سر گھما کے دیکھا۔ اس کے ریوالور کی نال میری پیشانی پر نہیں رہی تو مجھے کچھ سکون نصیب ہوا۔ میرے اضطراب اور بے چینی میں بہر حال اضافہ ہو گیا کیونکہ نہ میں دیکھ سکتا تھا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے اور نہ پوچھ سکتا تھا کہ ماجرا کیا ہے؟

میں اور اکرام ایک دوسرے سے بڑے غلط انداز میں منسلک تھے اور وہ زنجیر شاید ٹارزن بھی نہیں توڑ سکتا تھا جس نے ہمیں باندھ رکھا تھا۔ ویسے میں اندھا دھند کارروائی کرتا تو گوریلے کو سر سے ٹکراتا یا دونوں پیر اٹھا کے اس کے منہ پر مار دیتا۔ مگر اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف تھا۔ اس میں جیتے مرنے کے امکانات ففٹی ففٹی تھے۔

ڈکی کھولی ضرور گئی تھی لیکن ابھی تک بند نہیں کی گئی تھی۔

یہ آواز پر کان لگائے جیتا تھا اور منتظر تھا کہ اور کوئی آواز اپنی پہچان دے۔ سب سے بڑا مسئلہ وقت کا تھا جو ہر ساعت کو شکست دینے پر تلا ہوا تھا۔

بالآخر دو سگریٹ گوریلے کو خدا نے عاقبت کی راہ دکھائی... عاقبت نااندیشی کی توفیق عطا کی... وہ آزمائش... بھرے ہتھے والوں کے سپرد نہیں بھیجتا۔ ایسے سب کچھ ہو جاتا ہے کہ باطل کے پرستاروں کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی اور ان کی آنکھوں پر گمراہی اور نادانی کا پردہ پڑ جاتا ہے۔

دو سگریٹ گوریلے نے یہ سمجھتے ہوئے کہ سب ٹھیک ہے... کار سے باہر قدم رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک آواز آئی جیسے مکان کی دوسری منزل سے جیسے کوئی پیچھے کر رہا ہو۔ ایک ہاتھ نے میرے منہ سے ٹیپ کھینچ دیا اور اس عمل میں وہ ہاتھ میرے لبوں پر آیا تو اس نے چھوڑ دیا۔ اس لمس میں نزاکت اور نرمی تھی۔

"نازو...!" میں نے کہا مگر میرے حلق سے جو آواز نکلی وہ عجیب تھی کہ میں خود حیران ہوا۔ حیران میں اس بات پر بھی ہوا کہ یہ لفظ میری زبان سے نکلنے سے پہلے دل میرے سینے سے کیوں نہیں نکل گیا۔ حیرانی مجھے اپنی عقل پر بھی ہوئی کہ یہ نام میری زبان پر آنے سے پہلے میرے دماغ میں کیوں نہیں آیا۔

غالباً مجھ سے پہلے ہی اکرام شیخ نے بھی تڑپ کر نازو کا نام لیا تھا... بھائی نے بہن کے ہاتھوں کی خوشبو کو پہچان لیا تھا۔ ہم دونوں نے بیک وقت اٹھنا چاہا۔

"آہستہ... آہستہ... آرام سے..." نازو نے سرگوشی میں کہا۔ "شور مت مچاؤ..."

"نازو... یہ تم ہو... یا میرے کان دھوکا دے رہے ہیں مجھے۔" اکرام شیخ رو دینے کے قریب ہو گیا۔

نازو کے ہاتھ نے میری ٹوپی کھینچ کر سر کے اوپر سے گزار دی اور میں نے اس طرح نازو کو چند لمحے کے فاصلے سے تب دیکھا جب وہ اکرام شیخ کی آنکھوں پر سے پٹی اتار رہی تھی۔

"تم... تم سوچ رہے ہو کہ آنکھیں دھوکا دے رہی ہیں؟" وہ بولی۔

"تم... تو بھائی کیسے ہو... اور تم... ٹھیک ہو..." شیخ بولا۔ میں اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ وہ بلیک کلر ڈرائیور کی یونیفارم میں تھی۔ سر پر آگے تک سایہ کرنے والی کیپ... ڈھیلی ڈھالی بش شرٹ جس میں چار جیبوں کے علاوہ دو درجن پیتل کے بٹن تھے۔ خاکی پتلون... یہ سب کپڑے اس کو بہت ڈھیلے تھے لیکن اسی وجہ سے وہ اپنی نسوانیت کو چھپانے میں کامیاب تھی۔

"میں سب بعد میں بتاؤں گی..." وہ بولی۔ "تم دونوں باہر نکلو... میں ٹیکسی لے کر آئی ہوں تمہاری۔"

ہم دونوں ایک منٹ بعد اس گاڑی سے باہر آ چکے تھے اور قریب ہی ایک درخت کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے تھے۔

"یار... یہ تیری بہن آخر چیز کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "قیامت ہے یہ چھلاوہ۔"

"پتا نہیں یار..." اکرام شیخ بولا۔ "اس معاملے میں تو میں خود بھی شکوک میں ہوں... میں دنیا کا واحد بھائی ہوں جو اپنی بہن کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ انسان ہے یا جن بھوت۔"

"مجھے شک ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اب تو میں بھی کہہ سکتا ہوں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"نہیں یار... دیکھو نا یہاں اور کون ہے؟" میں نے کہا۔

نازو اسی وقت ٹیکسی سے برآمد ہوئی۔ ہم درخت کی اوٹ سے نکلے اور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر گر گئے۔ نازو ہنسی۔

"ابھی یہ بندی آپ دونوں کو جدا کرنے سے قاصر ہے۔" وہ بولی۔

"اسے ملیا نازو ایک کرنے کا ہاتھ۔" اکرام نے کہا۔

"وہ میں مار چکی... وہ جیسے جیسی موٹی گردنیں ابھی ابھی توڑی ہیں..." وہ ٹیکسی چلاتے ہوئے بولی۔

"اور تمہاری کلائی نہیں ٹوٹی؟" میں نے کہا۔ "غضب خدا کا!"

"تم کلائی کی بات کرتے ہو؟" وہ ٹیکسی کو تیز چلاتے ہوئے بولی۔ "اگر میرا وار غلط پڑ جاتا تو وہ مجھے توڑ دیتے۔ شکایت کرو... میں جان بچانے آئی ہوں..."

"لیکن میں نے انھیں دیکھا نہیں۔"

"ایک ڈکی میں پڑا ہے۔" وہ بولی۔ "دوسرے کو گاڑی کے نیچے دھکا دیا ہے... یہ بتاؤ جانا کہاں ہے؟ چلو پہلے تمہیں آزاد کر دوں۔"

"کہاں جانا ہے؟" اکرام شیخ نے میری طرف دیکھا۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے کہا۔ "جہاں سب کو جانا ہے۔"

"کیا مجھے سمجھ جانا چاہئے؟" نازو نے ٹیکسی روکی اور ہم دونوں کی ہتھکڑی کھول دی۔

"یار اس حالت میں ہم وہاں نہیں جا سکتے۔ اپنے ڈیرے پر..." اکرام شیخ بولا۔ نازو نے پھر ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔

"تو پھر سیدھے ہوٹل چلو۔" میں نے کہا اور اپنی کلائی کو ملنے لگا۔

"فضول باتوں کے لیے بھی وقت ہے یا؟"

"یہ فضول بات نہیں ہے۔" میں نے اسے چیلنج کیا۔ "ہم ادھر ہی گئے تھے۔" ہتھکڑی میں نے سیٹ کے نیچے ڈال دی۔

اکرام شیخ کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ "اچھا... تیرے اس ٹھکانے پر..."

"ہاں..." میں نے کہا۔ "جہاں میری کار کھڑی ہے۔"

"وہاں وہ فقیر بادشاہ ملیں گے۔" اکرام شیخ بولا۔

"کوئی بات نہیں... ان کا گھوڑا محفوظ ہے... ہم نے اس میں سے صرف بریانی ہی تو کھائی ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔" نازو نے کہا۔ "کار... فقیر... گھوڑا... بریانی..."

"تم نے پوچھا تھا نا مزہ..." میں نے کہا۔ "کیا تم کراچی کے راستوں سے واقف ہو؟"

"کافی حد تک..."

"تو پھر کوئٹہ روڈ چلو۔" میں نے کہا۔ "سیدھا راستہ ہے۔"

"نازو... تو کہاں رہی؟"

"چھوڑو بھیا۔" وہ ہنسی۔ "میں جہاں بھی رہی خیریت سے رہی۔"

"میں بہت پریشان رہا۔"

"اس میں میرا کیا قصور ہے؟" وہ معصومیت سے بولی۔

"اور کیا میرا قصور ہے؟" اکرام شیخ گرم ہو گیا۔ "قسمت اچھی تھی کہ تھانے سے نکل آئی۔"

"میری قسمت تو ایسی ہی ہے۔" وہ بولی۔ "جیسی تھی... خراب قسمت ان کی تھی جو اب اسپتال میں لیٹے ہوئے ہیں اور کسی کو منہ دکھاتے ہوئے شرماتے ہیں۔"

"تم یہاں کیسے آ گئیں؟" میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کیا کوئی الہام ہوا تھا؟"

وہ ہنسی۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ رابعہ کیسی ہے؟"

"رابعہ بہت اچھی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔ "میرا مطلب تھا کہ خیریت سے ہے نا... محض شغلا غالب سب کہاں ہیں؟"

"اسی دنیا میں ہیں ابھی۔" میں نے کہا۔ "بس میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"اس کیوں کا جواب بہت لمبا ہے۔" میں نے کہا۔ "فرصت ملے گی تو دوں گا... تم نے میرے سوال کا جواب گول کر دیا۔"

"بات یہ ہے مجاہدین اسلام۔" نازو نے کہا۔ "کہ خدا نے مجھے تھوڑی بہت کارآمد عقل دی ہے... میں حساب لگا کے آئی تھی۔"

www.paksociety.com

"کون صاحب... ستاروں کا یا قسمت کی لکیروں کا؟"

"نہیں... حادثات اور واقعات کا حساب..." وہ بولی۔ "بھیا کو تو جیب والے گھر سے رخصت کر دیا گیا تھا... مجھے اس بدمعاش کا نیشل سے بھی حساب برابر کرنا ہے۔"

"چل چھوڑ... سارے زمانے سے حساب برابر نہیں کرتے۔" اکرام شیخ نے خفگی سے کہا۔ وہ ابھی تک اپنی کلائی رگڑ رہا تھا۔

"کیسے چھوڑ دوں... میں نے تو انھیں وارننگ بھجوا دی ہے۔ ان دونوں ٹھگوں کو۔" نازو نے ہنس کے کہا۔

"کیسی وارننگ؟"

"یہی کہ آئندہ را احتیاط..." وہ بولی۔ "لوگوں کو بے وقوف بنا کے جتنا لوٹا وہ معاف... مگر یہ آخری واردات تھی۔"

"ہوں... تیرا کیا خیال ہے کہ وہ باز آ جائیں گے؟" اکرام نے کہا۔

"نہیں... مجھے معلوم ہے کہ وہ یہ دھندا جاری رکھیں گے۔" نازو بولی۔ "ایک بدمعاش ایڈوانس وصول کر کے مکان کرائے پر اٹھانے لگا... پھر اسے مکان کا نیشل بیچ جانے لگا کہ مکان تو میرا ہے... پولیس پاس کرنے کے جرم میں بند کرانے کی دھمکی دے گا اور سامان باہر رکھ دے گا... انھوں نے میری وارننگ کو ہنس کے ٹال دیا ہو گا۔"

"اور تو کیا کرے گی؟"

"میں نے وارننگ میں کہا تھا کہ پھر ایسا ہوا تو ان کا علاج معالجے پر اتنا ہی خرچ ہو جائے گا، جتنا وہ ایڈوانس لیں گے۔" نازو نے کہا۔ "جو تکلیف اٹھائیں گے وہ بونس ہیں... اس سے اگلی بار حرکت کی تو انھیں باقی عمر ایک بیساکھی کے سہارے پر چلنا پڑے گا... تیسری بار بھی باز نہ آنے کی صورت میں وہ بیساکھیوں پر پھریں گے۔ انھوں نے سمجھا ہو گا کہ کسی پاگل نے مذاق میں کیا یا کسی دل جلے نے دھمکی دے کر اپنے دل کو خوش کیا ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں..."

"ضرورت ہے بھیا۔ خرابی جہاں نظر آئے اسے ٹھیک نہ کرنے سے خرابی بڑھتی ہے۔" وہ بولی۔ "اور پھر یہ کام تو فرصت کا شغل ہے..."

"شغل کی بچی... اب میں تجھے گھر پر بند کر کے بٹھاؤں گا۔"

نازو ہنسی... "پھر تو بھی پہنا دو گے شٹل کاک برقع... وہ پیرزادیا آ گئی اب بتاؤ کدھر؟"

"سیدھے چلو... پل کراس کر کے بائیں جانب ہٹس بنی ہوئی ہیں... جیسے مرزم کو آدھا کر کے اینٹ کے رخ رکھ دیا گیا ہو۔"

"میں نے دیکھی ہیں۔" وہ بولی۔

میری ہدایات کے مطابق اس نے ٹیکسی کو دور کا بیرک... گھپ اندھیرا تھا۔ بہیمانہ روشنی... کشتی میں اکرام شیخ نے نکلنے والا سوئچ ڈھونڈ نکالا اور لکڑی کے ایک بوسیدہ دروازے کو دھکیل کر اندر گئے تو اس نے بجلی کا جھٹکا کھائے بغیر ایک بلب کو روشن کرنے کا کامیاب تجربہ کیا۔ اس پوری انتہائی وسیع بیرک کے لیے وہ سورج کا تھا جیسے وحشت کے لیے ایک اندھیرا۔ اس کمرے میں ہم فقط ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور ٹکرائے بغیر گھوم پھر سکتے تھے۔

میں نے گیراج کے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا تو کار اپنی جگہ کھڑی تھی۔ وہ دولت مند فقیر کہیں نہ تھا جس کے دنیاوی اسباب اور مال و متاع کو ہم شریف لٹیرے لے گئے تھے۔

میں واپس بیرک میں گیا تو دونوں بھائی بہن تقریباً ایک سے لباس میں اطمینان سے زمین پر آلتی پالتی مار کے بیٹھے ہوئے تھے اور اس بات سے قطعی بے نیاز تھے کہ فرش پر دھول کی کتنی موٹی تہ ہے... مجھے ان دونوں میں خاصی مشابہت کا احساس ہوا... جو پہلے اتنی شدت سے نہیں ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ نازو جیسے عام طرحدار قسم کے فیشن ایبل لباس میں، رنگ برنگی خوشبو زلف لہرانے کا کام کی مکمل تصویر بنی پھرتی تھی اور اکرام شیخ اس کے برعکس پولیس کی وردی میں رہتا تھا جس سے بد... اور سفاکی کا تصور منسوب ہو گیا ہے۔ اس وقت ان کے درمیان احساس کا تضاد و مشابہت کے احساس کو دبا دیتا تھا۔

"میں تیسری بار اپنے سوال کا جواب مانگتا ہوں۔" میں نے بیٹھنے کے لیے جگہ دیکھتے ہوئے کہا۔

نازو نے ایک دم میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے وہیں بٹھا دیا جہاں میں کھڑا تھا۔ اکرام شیخ ہنسنے لگا۔

"شروع کر دی خواہ مخواہ کی زور آزمائی۔" میں نے خفت سے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ "میں لڑکیوں سے نہیں لڑتا۔"

"شادی کے بعد بیوی سے تو لڑو گے نا؟" وہ ہنسی۔

"لڑکی اور بیوی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا میس اور بکوٹ میں یا چاول اور بریانی میں۔" میں نے کہا۔ "اب بتاؤ۔"

"میں شام سے وہاں ڈیرا ڈالے بیٹھی تھی۔" نازو نے اپنی بات شروع کر دی۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم وہاں ضرور آؤ گے۔"

"یہ کیسے فرض کر لیا تھا تو نے؟" اکرام شیخ بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک ریوالور میرے بارے میں مفصل رپورٹ چھاپ دے اور تم اس سے..."

"مگر جب میں وہاں پہنچی تو اس کا دروازہ مقفل تھا۔ دوسری بار شام کو پہنچی تو... صورت حال یکسر بدل چکی تھی۔ وہ بے چارہ

قتل ہو چکا تھا۔ یہ تو میں سمجھ گئی تھی کہ کمال پاشا کے پچھلے کچھ لوگ برہم ہیں۔ غالباً وہ اور بھی بہت کچھ جان چکا تھا یا اسے قتل کرنے والوں کو اندیشہ تھا کہ جان لے گا... وہ پھر بابر بننے کے چکر میں مارا گیا... میں تو خود اس سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ ہمارے لیے بہت کام کا آدمی ثابت ہو سکتا تھا۔"

"کیا تم نے پولیس آتے نہیں دیکھا تھا؟" میں نے کہا۔

"دیکھی تھی۔" وہ ہنسی۔ "تم لوگ آئے اور پولیس کا پیچ دیکھ کر بھاگ گئے... میں ذرا دور تھی۔ لیکن میں نے اپنے مکمل در صاحب کو دیکھ لیا تھا۔" اس نے میرا نام ولادور کے لہجے میں لیا۔

"کہاں سے دیکھ لیا تھا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "میں نے کیوں نہیں دیکھا؟"

"تم دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔" وہ بولی۔ "میں ایک خالی گاڑی کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ اس کے برآمدے کی جالیوں کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ پچھلی طرف سے دروازہ کھول کے نکل آؤں مگر پھر میں نے کہا کہ اب تو شک کی بات ہی نہیں رہی۔ تم لوگ یقیناً پھر آؤ گے خصوصاً جانتے بھیا کے اندر جو پولیس میں ابھی تک آن ڈیوٹی ہے وہ فوراً انھیں کھینچ لائے گا... چور کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

"چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔" میں نے کہا۔

وہ پھر ہنسی۔ "تو پولیس والوں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ وردی اور نوکری سے جائے مگر تفتیش سے نہ جائے... اپنے بھائی کی عادت اور فطرت کو مجھ سے بہتر کون جانتا ہے... میں وہیں رہی... پولیس کے جانے کے بعد بھی... پھر مغرب کے بعد وہ لوگ آئے... اور ڈیوٹی پر بیٹھے ہوئے دونوں پولیس والوں کے الٹے جانے کا سارا ڈراما میں نے دیکھا۔ اس وقت مجھے بہت افسوس ہوا کہ میرے پاس مووی کیمرا نہیں تھا، ورنہ میں پوری فلم بنا لیتی اور ان کے فرشتوں کو علم نہ ہوتا... خیر جب وہ اندر چلے گئے اور باہر نکلے ہی نہیں تو میں نے صورت حالات کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا... اور دیوار کے اوپر سے اندر جھانکنے میں کامیاب ہو گئی... وہ لوگ اندر کچھ بھی نہیں کر رہے تھے سوائے انتظار کے اور ظاہر ہے کہ وہ تمھارا ہی انتظار کر رہے تھے۔"

"پھر بھی تم نے ہمیں باہر نہیں روکا؟" میں نے کہا۔

"میں ضرور روک لیتی... بس ایک منٹ کا فرق پڑ گیا۔" وہ بولی۔ "میں کار سے واپس اسی کھڑکی میں جا کے پوزیشن سنبھالی، میرا خیال تھا کہ جیسے ہی تم آنے میں جال کے پیچھے سے تم کو آواز دے کر بلا لوں گی اور پھر ہم تینوں مل کے کچھ کریں گے لیکن ہوا یہ کہ میں گھوم کر پیچھے کی طرف سے کوارٹر میں گئی اور اتنی دیر میں تم دونوں نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ جب میں نے دیکھا تو تم اندر جا چکے تھے اور تمھیں متوجہ کرنے کا وقت نکل چکا تھا۔ ظاہر ہے پھر میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے باہر آ کے بھیا کی ٹیکسی دیکھی اور اس کی چابی نکالی۔"

"چابی کیا اسی میں لگی چھوڑ دی تھی تم نے؟" میں نے اکرام شیخ سے کہا۔

"نہیں... یہ دوسری چابی کی بات کر رہی ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ "میں ڈپلی کیٹ چابی گھر پر نہیں رکھتا۔ گاڑی کے پیچھے بمپر کے نیچے کی تھیلی میں لپیٹ کر ٹیپ سے باندھ رکھی ہے کہ کبھی ضرورت پڑے تو گھر نہ جانا پڑے۔"

"مجھے تو معلوم تھا نا کہ چابی کہاں ہو گی۔" نازو نے دیوار کا سہارا لے کے پیر پھیلا دیے۔ "اس چابی سے میں نے ڈگی کھول کے دیکھی تو اس میں دو سوٹ کیس تھے، حیرت مجھے اس گھڑے پر ہوئی جس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے... یہ کوئی نیا فیشن ہے؟"

میں نے اسے فقیر صاحب کے بارے میں بتایا۔ "معلوم نہیں اس پر کیا گزری... کہیں ہارٹ فیل نہ ہو گیا ہو بیچارے کا۔"

"یار ہارٹ فیل ہوتا ہے کنگلوں کا... جن کو امید نہیں ہوتی کہ پھر اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا۔" اکرام شیخ بولا۔ "اس نے تو تہیہ کر لیا ہو گا کہ ڈبل شفٹ میں سخی لوگوں کو لوٹے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ تھانے گیا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "لاؤ وہاں پولیس نے اسے بند کر دیا ہو گا کہ سالے فقیر بنا پھرتا ہے اور بات کرتا ہے ایک گھڑا نوٹوں کی... بتا باقی خزانہ کہاں دبا رکھا ہے۔ پولیس کو تو خدا موقع دے کمائی کا... وہ مار مار کے چٹنی کر دیں گے۔"

"سچ ہے بابا۔" ایک آواز آئی اور ہم سب چونک کر کھڑے ہو گئے... ایک جھاڑ جھنکاڑ داڑھی اور الجھے بالوں والا فقیر لنگڑاتا ہوا اندر آیا اور فرش پر سیدھا لیٹ گیا۔ اس نے ہمارے ریوالور کی طرف دیکھا تک نہیں۔ اس کا نقشی رنگ... کا چہرہ کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

"کیا سچ ہے بابا؟" میں نے نازو اور اکرام کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"دیکھ لو... مار مار کے چٹنی کر دیا ہے کہ نہیں؟" وہ کراہ کے بولا۔ "یا میرے مولا... کیسا زمانہ آ گیا ہے... فقیر کی بددعا سے بھی کوئی نہیں ڈرتا۔"

"تم فقیر کہاں ہو... سیٹھ ہو..." میں نے ہنس کر کہا۔

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ "تم... تم ہی تو نہیں ہو وہ؟" پھر اس نے ریوالور دیکھا اور اس کی حالت غیر ہو گئی۔ "یہ... یہ اصلی لگتا ہے بیٹا... یا اللہ... ڈاکوؤں کے ہاتھوں مقدر میں موت لکھی تھی تو تھانے کس لیے بھیجا... آہ... کیا کیا ہے ظالموں نے..."

www.paksociety.com

نازو کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ کسی نے لوٹا کسی نے لوٹا۔
تم پر تو بڑا ظلم ہوا بابا... چلو اللہ تمہاری مغفرت کرے۔
"اور اللہ تمہاری مغفرت نہ کرے۔" وہ چیخا۔ "... تم نے فقیر کا مال کھایا ہو... دیکھو میری خون پسینے کی کمائی واپس کرو مجھے۔"
"یہ خون پسینہ کہاں سے آ گیا اس کمائی میں... ؟" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "ہاتھ پھیلانے کے سوا کچھ کیا ہے تم نے ؟"
"ارے بابا... سمجھو... عقل کی بات کرو... ہاتھ پھیلانا کیا آسان کام ہے۔" وہ سر پٹخ کے بولا۔ "تم پھیلا سکتے ہو کسی کے سامنے ہاتھ ؟ سارا دن فٹ پاتھ پر دھوپ میں بیٹھ سکتے ہو ؟ اس میں پسینہ نہیں بہے گا تو کیا... کیا... کوکا کولا بہے گا... اور خون... یہ دیکھو... میری ناک سے... میرے دانتوں سے... پتا نہیں کہاں کہاں سے خون بہہ رہا ہے... اتنی مار کھا سکتے ہو تم ؟ اور وہ بھی اس رستم کی اولاد کے ہاتھ سے... جو تیرہ تمبر کا چھتر مارتا ہے تو چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔"
ہم سب کو بے ساختہ ہنسی آ گئی... وہ بہت اچھا ڈراما آرٹسٹ تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ سوچنے پر بھی مجبور تھا کہ وہ ان پڑھ نہیں ہے۔ اس کی گفتگو سے ہی ظاہر ہوتا تھا۔
"یہ تو واقعی مشکل کام ہے۔" میں نے کہا۔ "کب سے کر رہے ہو ؟"
"کیوں بتاؤں تمہیں ؟ کیا پتا تم کون ہو..." وہ ایکدم محتاط ہو گیا۔ "انکم ٹیکس افسر یا... نہیں... تم تو چور ہو..."
"ہم چور نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ ہمارا ہی کوارٹر تھا جس میں تم یوں ڈیرا ڈالے بیٹھے تھے۔"
"ارے تو بابا فقیر سے کہہ دیتے گیٹ آؤٹ... فقیر ڈیرا اٹھا لیتا... اس کا گھڑا کیوں اٹھا لیا ؟" وہ فریاد کے انداز میں بولا۔
"چلو بھول جاؤ گھڑے کو..." نازو نے کہا۔
"بھول جاؤں ؟" اس نے ایک دلخراش چیخ ماری... "آہ... تم کیا جانو بی بی... کتنے ارمانوں سے وہ گھڑا بھرا تھا... دوسری بار..."
"دوسری بار ؟"
"ہاں... پہلی بار ڈاکو لے گئے تھے... قذافی اس کا بیڑا غرق کیا۔" وہ بولا۔ "ان کی لانچ ڈوب گئی... میرا گھڑا بھی ڈوب گیا۔ چالیس ہزار..." وہ ایک دم چپ ہو گیا۔
"اور اس دوسرے گھڑے میں کتنے تھے ؟"
"تھے ؟" وہ اُچھلا۔ "تھے کا کیا مطلب ؟ ہیں۔" وہ چلایا۔
"چلو ہیں سہی۔" نازو نے کہا۔ "کتنے ہیں ؟"
"تم... تم نے نہیں گنے ؟" وہ [illegible] ہیں بولا۔

"نہیں... سب ویسے ہی رکھے ہیں... [illegible]" میں نے کہا۔
"جاؤ معاف کیا... لیکن تمہیں کس طرف سے [illegible]"
وہ بولا۔ "مگر میرا گھڑا... ؟"
"گھڑا مل جائے گا... پہلے یہ بتاؤ کہ تم بھیک کیوں مانگتے ہو ؟ کام کیوں نہیں کرتے... ڈرو نہیں ہم سے... ہم دوست ہیں تمہارے۔"
"کیا اچھا کام بھی ؟" وہ آہ بھر کے بولا۔ "بڑے پاپڑ بیلے۔ ایمانداری سے زندہ رہنے کے لیے... مگر کام ملا نہیں... ملا تو مجھ سے ہوا نہیں... وہ سب ایسے ہی کام تھے... ایمان فروشی کے... یا اس کام میں عزت نہیں تھی... آخر میں نے سب کچھ چھوڑ دیا... عزت ایمان... شرم دیکھا۔ پھر یہ کام شروع کر دیا۔ اللہ کا فضل ہے... اب اچھی آمدنی ہے۔ کلرک کیا افسر بھی نہیں کما سکتے اتنا... اگر حرام نہ لیں۔"
"تم تو پڑھے لکھے لگتے ہو۔"
"ہاں بابا... بی اے کیا تھا... تو ڈیرا... تھرڈ ڈویژن میں۔" وہ آہ بھر کے بولا۔ "جب نوکری ہی نہ ملی تو آگے داخلہ... جوتیاں گھس گئیں۔ فاقوں کی نوبت آ گئی... ماں باپ سرکاری اسپتال میں مر گئے... تو ہم نے بھی دنیا پر لعنت بھیج دی... کیونکہ دنیا ہم پر بہت پہلے لعنت بھیج چکی تھی۔ اب ہم کسی کے نہیں... کوئی ہمارا نہیں... بس پیسہ یار ہے اور پیسہ ہی رشتے دار ہے... یہی باپ ہے یہی بیٹا..."
ہم سب دم بخود بیٹھے رہے۔
"لیکن اس پیسے کا فائدہ ؟" نازو نے کہا۔ "مطلب یہ کہ گھر بار... نہ بیوی بچے..."
وہ تلخی سے ہنسا۔ "ارے بی بی... یہ گھر نہیں ہے کیا ؟ یہاں سے چلے جائیں گے تو کہیں بھی ڈیرا جما لیں گے... جانے گھر اپنے ہیں... بیوی بچوں کا جھمیلا کون پالے... کماتے ہیں بیٹھے ہیں موج اڑاتے ہیں۔"
"تم جیسے فقیر کو... میرا مطلب ہے کہ..."
"میں سمجھ گیا بی بی... دنیا آدمی کے ظاہر کو دیکھتی ہے... تو میرا بھی ظاہر یہ نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "سب کے ظاہر اور باطن الگ ہو گئے ہیں... سب کے چہرے اصلی نہیں ہیں... میں بھی بہروپ بنا کے پھر رہا ہوں فقیروں کا..."
"بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب... تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کچھ تماشا ہمیں بھی دکھاؤ۔"
"میرا گھڑا واپس کر دو گے نا... تم شریف لوگ لگتے ہو۔" وہ بولا۔
"گھڑا ہمارے پاس ہے... ایک ایک پیسہ تمہارا تمہیں مل جائے گا۔" نازو کو اچانک اس سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ "تو پھر دکھاؤ تماشا۔" وہ بولا اور اس نے اپنے سر کے اوپر سے وگ اتار دی... نیچے اس کے بال سیاہ اور چمکدار تھے... پھر اس نے داڑھی اتاری اور اس کا کلین شیو چہرہ سامنے آ گیا۔ یہ تبدیلی ہم سب کے لیے ناقابل یقین تھی۔ بالکل جادو کی طرح اس نے اپنی شخصیت بدل لیا تھا۔ اس نے چغہ کھینچا اور کینچلی کی طرح اتار دیا... اس کے نیچے وہ سرخ رنگ کی ٹی شرٹ اور پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے چغے سے منہ کو رگڑ کر صاف کیے... وہ سب داغ دھبے غائب ہو گئے جو زخم اور خون کے نشان لگتے تھے... اب ہمارے سامنے ایک اسمارٹ نوجوان آدمی کھڑا تھا۔
"او مائی گاڈ..." میں نے کہا۔
"تم نے دیکھا میرا اصل روپ کیسا ہے ؟" وہ بولا۔ "رات میں اس طرح بھی پھرتا ہوں... اس حلیے میں کوئی روک سکتا ہے مجھے... کہیں بھی جا سکتا ہوں۔ اب میں دن رات میں دو الگ شخصیتوں کا مالک ہوں مگر دنیا اسے ایک سمجھتی ہے۔ اس دنیا میں ہر شخص ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کے کم از کم دو روپ ہوتے ہیں ورنہ تین بھی اور چار بھی... یہ دنیا سب کرتے ہیں۔ وفادار شوہر ہے... کرپشن کا جادو... مگر انہیں ایک دوسرے کی دوسری شخصیت کا علم نہیں ہوتا۔ جو بظاہر ہوتی ہے یا حیا شرم ہوتی ہے۔ ایماندار نظر آتے وہ سب سے بڑا ایمان فروش ہو سکتا ہے... کیا حاکم کیا محکوم... کیا کلرک کیا افسر... عوام اور سیاستدان... تاجر اور آجر... سب میری طرح ہیں۔ ایک اڈا میرا ہے۔ میں نے دس ہزار میں لیا ہے... وہاں کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ ایسے ہی سب کے اڈے ہیں... سیاستدانوں کا اڈا اس کی پارٹی ہے تو ڈاکٹر کا اڈا اس کا کلینک... ہم جو بھی گونی بیچتے ہیں عوام کو... ڈاکٹر اسپرین کی گولی دے کر پیسے لیتے ہیں... وہ روپے کا انجکشن لگا کے ہزار روپے لیتے ہیں مریض کچھ نہیں جانتا... موٹر مکینک بھی یہی کرتا ہے... پھر میں کیا غلط کرتا ہوں ؟ کسی کو دھوکا دے کر نقصان تو نہیں پہنچاتا... بس جھوٹ بولتا ہوں... وہ بھی بغیر... جس کے دل پر اثر کرتا ہے وہ دے جس کا دل پتھر ہو وہ بھاڑ میں جائے... میں کسی سے زبردستی تو نہیں لیتا۔ [illegible] ملک... پولیس میں اور انکم ٹیکس افسر... یہ تم بیکار [illegible] سب [illegible] ... اور کم سے کم یہ تسکین تو ہے جاتے ہیں کہ انھوں نے کار ثواب کیا... اپنے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھوا لی۔"
"تم بہت... خطرناک آدمی ہو۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ تم ضرورت سے زیادہ سچ بولتے ہو... تم معاشرے کے باغی ہو۔"
"تم نے جھوٹ بولا تھا ہم سے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "کہ تم جھگڑے میں پٹ کر آئے ہو۔"
اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں نے گاڑی دیکھ لی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ کوارٹر کے اصل مالک آ گئے ہیں۔ میں تمہارے انتظار میں تھا۔"
"کب سے ہماری باتیں سن رہے تھے ؟" میں نے کہا۔
"ڈرو نہیں... میں بھی دشمن نہیں ہوں۔" وہ بولا۔ "دوست ہوں..."
یہ ہمارے ہی الفاظ تھے جو اس نے ہمارے خلاف استعمال کیے... نازو اتنی حیران پریشان بیٹھی تھی کہ پلک نہیں جھپکا رہی تھی۔
"اس شخص پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔" اکرام نے کہا۔
"کیوں... ایسی کیا بات کی ہے میں نے ؟" وہ بولا۔ "میں نے تو پوچھے بغیر ہی تم کو اپنے بارے میں سب بتا دیا حالانکہ ڈراما ضرور کیا تھا میں نے... مگر وہ ضروری تھا... ورنہ اپنا گھڑا تو میں نے ٹیکسی میں رکھا ہوا دیکھ لیا تھا۔"
"پھر تم نے نکالا کیوں نہیں ؟ دروازہ تو کھلا ہوا تھا۔"
"میں تجسس میں پڑ گیا تھا۔ تم لوگ چور ڈاکو ہوتے تو واپس یہاں کیوں آتے ؟" وہ بولا۔ "میں صرف تم لوگوں کی صورت دیکھنا چاہتا تھا اور جب میں نے اس آدمی کو دیکھا۔" اس نے میری طرف انگلی اٹھا کے کہا۔ "تو میں ڈر گیا۔"
"تم... جانتے تھے... کہ میں کون ہوں ؟" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔
"ہاں... تم کو بھلا کون نہیں جانتا... تم تو محسن رفعت ہو... یہ دونوں یقیناً تمہارے ساتھی محسن اور شہلا ہوں گے۔" وہ بولا۔
ہم سب یوں بیٹھے رہے جیسے سب پر بجلی گر پڑی ہو۔
"یہ محسن... اور شہلا نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔
اس نے جیب میں سے گولڈ فلیک کا پیکٹ نکالا۔ "لو پیو اور بے فکر ہو جاؤ... نہیں... چرس وغیرہ نہیں ہے اس میں۔"
"میرے سگریٹ... ہیں میرے پاس۔" میں نے کہا اور اکرام شیخ کی طرف دیکھا۔ اس نے میری نظر کے سوال کو سمجھ لیا کیونکہ یہی سوال خود اس کی اور نازو کی نگاہ میں بھی تھا۔ اب کیا کرنا چاہیے اس آدمی پر اعتبار کر کے ہم اسے زندہ رہنے کا موقع دینا چاہیے یا اسے مار دینا چاہیے۔ بلاشبہ وہ بے حد عیار اور ذہین

www.paksociety.com

بازآدمی تھا۔ اس نے کیا سوچا؟ مگر وہ اعتماد حاصل کر کے اپنی جان بچائے اور مجھے پولیس کے حوالے کر دے۔

"تمہارے دل میں شکوک جنم لے رہے ہیں۔" وہ سگریٹ کا ایک کش لے کر بولا۔ "تمہاری پوزیشن ہی ایسی ہے مگر میں پھر تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں... بد خواہ ہوتا تو خاموشی سے واپس شہر لوٹ جاتا اور پولیس کے ساتھ نہ آتا... مجھے ایک لاکھ کا انعام مل سکتا تھا۔ تمہیں تو پتا بھی نہ چلتا کہ میں کب آیا اور کب گیا... خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے تمہیں... اور میرا شکریہ بھی کہ میں نے ایک لاکھ کو ایک پیسے کے برابر نہیں سمجھا... میں بتا چکا ہوں کہ میں ایمان فروش بہرحال نہیں ہوں۔"

اس کی بات نے ایک دم ہم سب کو قائل کر لیا... میں نے اطمینان کی گہری سانس لی اور اکرام شیخ نے بھی... ہم نے ریوالور جیب میں ڈال لیے... نازو پھر دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔

"تم کیا جانتے ہو میرے بارے میں؟" میں نے کہا۔

"وہ سب جو اخباروں میں آ چکا ہے... میں اخبار ضرور پڑھتا ہوں اور بہت تفصیل سے۔" وہ بولا۔ "پہلے مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ تم ہو... پھر میں بہت خوش ہوا کہ خدا نے مجھے تم سے ملوایا۔ ویسے معاف کرنا تم اتنے عقل مند ہو نہیں جتنے مشہور ہو گئے ہو۔ ایک تو تمہارا حلیہ صاف چغلی کھاتا ہے کہ تم کون ہو۔ میری طرح اور بھی لوگ تم کو پہچان سکتے ہیں۔ بیشتر لوگ تمہارے طرف دار ہوں گے... مگر پولیس بھی تو ہے... تم آخر کیا سمجھتے ہو... کراچی کی پولیس کو کچھ معلوم نہیں؟ یا وہ اندھے ہیں؟ اور تم سب کو بے وقوف بھی سمجھتے ہو... فرض کرو میری جگہ ایک جاہل فقیر ہوتا تو کیا وہ مان لیتا کہ تم ہی اس کار شے کے مالک ہو؟ مالک ایسے رہتے ہیں اور یوں ریوالور نکال کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیوں مسٹر محسن؟"

"میں محسن نہیں ہوں۔" اکرام شیخ نے تمتماتے لہجے میں کہا۔

"اور میں فصیلا نہیں ہوں۔" نازو نے بھی کہا۔ "ہم دونوں بہن بھائی ہیں۔"

اس نے نازو کو غور سے دیکھا اور سر پر ہاتھ مارا۔ "ہم بھی کیا بیوقوف عقل کے اندھے ہیں۔ تم تو وہی ہو... نازیہ..."

"کیا بکواس ہے یہ؟" اکرام شیخ نے گرم ہو کے کہا۔

"معاف کرنا بھائی صاحب... وہ ایک ایکٹریس تھی نا... ملیر ہاؤس سے پھر لوٹی جس کا نام نازیہ تھا۔" وہ بولا۔ "تمہاری اس بہن کی تو پوری اسٹوری پڑھی تھی میں نے... کمال ہے کہ میرا دماغ ادھر نہیں گیا... اب میں سب سمجھ گیا۔ تم اس کے دوسرے ساتھی ہو

جس کا اختیار عارف نے اپنی رپورٹ میں ذکر کیا تھا کہ وہ بھاگ گیا۔"

اکرام شیخ ریوالور نکال کے کھڑا ہی تھا کہ میں نے اسے منع کیا۔

"ٹھہرو یار... یہ آدمی دشمن نہیں ہے تو اسے دشمن بنانے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اسے دوست بنا سکتے ہیں۔"

"ایسے ہر ایک کو دوست بناتے ہو تو مارے جاؤ گے۔" اکرام شیخ نے برہمی سے کہا۔ "یہ پولیس کا مخبر بھی ہو سکتا ہے۔"

"مخبر ہوتا تو کب کی مخبری کر چکا ہوتا۔" وہ بھی تیز لہجے میں بولا۔ "اور اس وقت تم سب حوالات میں بند ہوتے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے بھیا۔" نازو نے بھی تائید کی۔

"خاک ٹھیک کہہ رہا ہے... ابھی تک نام تو بتایا نہیں اس نے اپنا۔" اکرام شیخ نے کہا مگر اب وہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

"میرا نام؟" وہ طنز سے ہنسا۔ "تم مان لو گے اگر میں کہوں کہ میرا اصل نام جو ماں باپ نے رکھا تھا رزاق تھا... وہ بھی کہتے تھے مگر میں نے بعد میں اسے راجا کر لیا... ویسے تو نام میرے کام نہیں آتا۔ مگر رات کو میرے دوست مجھے راجا کہتے ہیں... میرا ایک حلقہ ہے جس میں چند عیاش اور اوباش رئیس زادے شامل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں کوئی اسمگلر ہوں یا کسی بین الاقوامی گروہ کا رکن ہوں۔ کیونکہ میری شخصیت بہت پُراسرار ہے۔ میں نے کبھی کسی کو اپنا ٹھکانا نہیں بتایا۔ کبھی کبھی مل گیا میں غیر ملکیوں میں مل جاتا ہوں۔ جب بھی شراب کباب کا ہنگامہ ہو ہے۔ ان کی گرل فرینڈز بھی آتی ہیں اور میں انھیں مرعوب کرتا ہوں... کہ میں سنگاپور اور ہانگ کانگ گیا ہوا تھا... اب چار دن میں یورپ کی طرف جانا ہے۔ پھر میں غائب ہو جاتا ہوں... ان کی کاروں کو سڑک پہ سے گزرتے دیکھتا رہتا ہوں... ایک بار تو انہی میں سے ایک نے اپنی گرل فرینڈ کو امپریس کرنے کے لیے میرے کشکول میں سو کا نوٹ ڈال دیا تھا۔"

"تمہاری کوئی گرل فرینڈ نہیں رہی ہے؟" میں نے کہا۔

"گرل فرینڈ...؟" وہ ایک دم سنجیدہ اور کچھ اداس ہو گیا۔ "نہیں، میں یہ روگ نہیں پالتا... کسی کو پانے کا... وہ سب ایک ہی ہوتی ہیں... آدمی انھیں خرید تو سکتا ہے۔ ان سے محبت نہیں کر سکتا... مگر... میرا خیال ہے... کہ یہ موضوع کچھ مناسب نہیں۔" اس نے نازو کی طرف دیکھا جو نظر جھکائے فرش پر انگلی سے کچھ لکھ رہی تھی... میں نے دیکھا تو اس نے شیر لفظ لکھا تھا۔

پہلے میں حیران ہوا کہ ایسے ماحول میں نازو کو شیر کیسے یاد آ گیا جب کہ گرد و نواح میں کوئی ایک موجود ہی نہیں تھا۔ آدمی ذہین ہے... اس کی سمجھ میں آنے کا نہ سمجھانے کا... اس کی بھول...

نہیں تھا راستہ نہیں ملتا اور خیالات کا سلسلہ کتنا ہی بے ربط ہو... ایک خیال کی کڑی دوسرے خیال سے منسلک رہتی ہے۔ ربط یا بھی کو تلاش کرنا... تحلیلِ نفسی کے ماہرین کا ہی کام ہے مگر اس وقت اچانک میں اس نقطے کے پیچھے پوشیدہ مفہوم سمجھ گیا۔ شیر کے وہی معنی تھے جو اسد کے ہوتے ہیں۔ اسد نام تھا اسد اللہ خان غالب کا جنھوں نے ابتدا میں اپنا تخلص اسد بھی کیا مگر شہرتِ دوام اپنے دوسرے تخلص غالب سے پائی۔

نازو نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ پھر میری نظروں کے تعاقب میں اس لفظ کو دیکھا جو اس نے غیر شعوری طور پہ لکھ کر گویا راز آشکار کر دیا تھا۔ پھر اس نے سمجھ لیا کہ میں سمجھ گیا ہوں اور اس کی چوری پکڑی گئی ہے... وہ [illegible] روپ دل کے غلطی سے میرے سامنے آ گیا تھا... وہ یہی کہہ سکتی تھی کہ شیر... شیر میں کیا ہے... شیر ایک جانور ہے۔ شیر کچھ بھی ہو سکتی تھی... وہ اور بھی لکھ سکتی تھی مگر وہ جانتی تھی اپنے دل کی... یہ شیر ایک جذبہ تھا... ایک نام تھا... ایک یاد تھی اور ایک خلش... خاموش تھی۔ اس نے اعترافِ جرم کیا جو شیر کے لفظ کو شیر ہی لکھ کر دیا۔

"کیا سوچ رہے ہو یار؟" اکرام نے کہا۔

میں چونکا۔ "سوچنے کے لیے اب کیا رہ گیا ہے... تم بتاؤ کیا کرنا ہے؟"

"میں بتا چکا ہوں... میرا ووٹ خلاف ہے۔" وہ بولا۔

"میرا ووٹ تمہارے خلاف ہے۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں کی نظر نازو کی طرف اٹھی۔ اس نے اپنے ناخن دیکھے اور مسکرائی۔ "میں غیر جانبدار ہوں۔"

"او کے... بہت اچھا... تم کیا کہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"میں کیا کہوں... تم سے کہنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں... تم [illegible] جو تمہارے دل میں آئے گا۔" وہ بولا۔ "تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی اسی شک سے دو چار ہوتا۔ اتنی آسانی سے کسی کا اعتبار نہ کرتا... ایک مقصد کو یقیناً ایک آدمی کے لیے داؤ پر نہیں لگایا جا سکتا۔ ایک آدمی کو ایک مقصد پر البتہ قربان کیا جا سکتا ہے خواہ وہ آدمی دوست ہی کیوں نہ ہو۔"

"چلو ٹاس کر لو۔" نازو نے غیر سنجیدگی سے کہا۔

میں نے برہمی سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا زندگی اور موت کے فیصلے کو ایک سکے پہ چھوڑا جا سکتا ہے... عقل و شعور... انصاف اور احتیاط... یہ سب بے معنی الفاظ ہیں [illegible] فیصلہ [illegible]

جایا کرے۔ عدالتوں میں گواہ شہادت ثبوت اور جرح سب کی ضرورت ہی نہ رہے۔ جج کٹہرے میں کھڑے ہوئے مجرم سے کہے کہ مانگو ہیڈ یا ٹیل، اگر سکہ الٹا گر جائے تو ملزم کا فیصلہ ہو گیا۔ وہ مجرم ہے۔ اس نے ہیڈ مانگا۔ ہیڈ نہیں آیا۔ اس کا ہیڈ قلم کر دو۔"

"میرا... یہ مطلب نہیں تھا۔" نازو نے میرے گھورنے سے اور رہا جا کی ملامت نظروں سے گھبرا کے کہا۔

"میں اسے اپنے رسک پہ چھوڑتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر ہم اس پر نظر رکھیں گے۔"

"ٹھیک ہے مسٹر جسٹس سکندرِ اعظم!" وہ بولا۔ "فی الحال میں سونا چاہتا ہوں... کیا مجھے اجازت ہے کہ میں باہر جا کے کپڑے بدل آؤں۔ اور اپنا بستر اٹھا لاؤں۔ میرے بیڈ روم میں تو آپ کی کار سو رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے تم سو جاؤ..." اکرام اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

وہ دونوں باہر چلے گئے تو نازو نے کہا۔ "میرا ووٹ تمہاری طرف تھا... مگر..."

"مگر دوسری طرف ہو جاتی تھا۔" میں نے طنز سے کہا۔ "اس لیے تم نے سیاست سے کام لیا۔ یعنی منافقت سے کام لیا... سچ کہنے سے گریز کیا... اتنی بزدل ہو تم... شیرنی۔"

اس کا رنگ لال پڑ گیا۔ "کیا غالب مجھے یاد کرتا ہے؟" اس نے نظر جھکا کے کہا۔

"ہاں... جب اس کے جوڑ درد کرنے لگتے ہیں تو تمہیں دعا دیتا ہے۔" میں نے کہا۔

"جوڑوں میں درد ہوتا ہے یا؟" اس نے مایوسی سے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ جب دل میں درد اٹھتا ہے تمہاری یاد کا۔" میں نے کہا۔ "نازو، وہ تمہیں بہت چاہتا ہے اور چاہت بڑا عجیب جذبہ ہے۔ اسے ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔ جس کے دل میں کسی کی چاہ نہ رہی ہو... وہ نہیں جان سکتا کہ چاہت کیا ہوتی ہے۔"

"میں جانتی ہوں... میں نے دیکھا ہے... لیکن کو کس طرح چاہتے ہو۔" وہ دیوار پر نظر جما کے بولی۔

"تم بھی غالب کو چاہتی ہو؟"

"معلوم نہیں... ابھی میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"جھوٹ مت بولو میرے سامنے۔" میں نے کہا۔ "ابھی تم نے کیا لکھا تھا؟"

"وہ... بس ایک خیال تھا۔"

"گویا تمہیں اس کا خیال آتا ہے؟" میں نے کہا۔ "اکثر اوقات"

www.paksociety.com

جب کوئی وہ سزا نہیں ہوتا؟ یا جب تم نشے میں بھی تنہا ہو جاتی ہو۔"

وہ گھٹنوں پر سر جھکائے نیچے گرد آلود فرش کو دیکھتی رہی اور اس کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔۔۔ اس نے خیالوں کے کسی عکس کو چہرے تک آنے ہی نہیں دیا۔۔۔ پھر اکرام آگیا اور راجا آگیا۔۔۔ راجا نے ایک کونے میں بستر سا بچھایا اور اس پر دراز ہوگیا۔۔۔ وہ اب باباجی اور جیالوں میں تھا۔ اس نے ہاتھ سر کے نیچے رکھا اور دو منٹ میں سو گیا۔ کچھ لوگ جو ذہنی اعصاب کی کشمکش کا شکار نہیں ہوتے وہ خوش قسمت ہوتے ہیں کہ آنکھیں بند کرتے ہیں اور خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔

"یار یہ سو گیا۔۔۔ اتنی جلدی؟" اکرام نے شک سے کہا۔

"تم پولیس والے ہو۔۔۔ چیک کر لو کہ مکر کر رہا ہے یا پہنچ سو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر سو گیا ہے تو ظاہر ہو جائے گا کہ اس کے دماغ میں کوئی خلفشار نہیں۔۔۔ جھوٹا اور خوف کا مارا پریشان آدمی اتنی جلدی سکون سے نہیں سو سکتا۔"

اکرام نے سر ہلایا۔۔۔ اٹھ کر راجا کے قریب گیا اور ایک منٹ سے بھی کم وقت میں لوٹ آیا۔ "میں قائل ہونے لگا ہوں تمہاری نظر کا۔۔۔" وہ بولا۔ دور کسی گھر میں کلاک نے رات کے دو بجائے۔

"کیا ہم یونہی بیٹھے رہیں گے رات بھر؟" نازو نے کہا۔

"سونے کے لیے بیڈ روم حاضر ہے۔۔۔ بیڈ کے بغیر۔" میں نے کہا۔

"نیند تو مجھے نہیں آرہی ہے۔۔۔ لیکن بھوک بہت سخت لگی ہے۔" نازو نے کہا۔ "شام سے یہ وقت ہو گیا۔۔۔"

"تو چلو۔۔۔ اسٹیشن چلتے ہیں۔۔۔ کینٹ اسٹیشن کے آس پاس بہت سے ہوٹل ہیں۔" اکرام نے کہا۔ "جو رات بھر کھلے رہتے ہیں۔ چائے کے لیے تو میں ایسے ہی تڑپ رہا ہوں جیسے ماہی بے آب۔"

"مگر راجا صاحب کا کیا ہوگا؟"

"دیکھو۔۔۔ نور سکس تو گیم ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم تھوڑی آسانی سے آزما سکتے ہیں کہ راجا کس حد تک ہمارے ساتھ مخلص ہے۔ اگر واپسی پر بھی وہ ہمیں ایسے ہی سوتا ہوا ملا تو پھر سارا معاملہ صاف ہو جائے گا۔"

اکرام نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلا دیا۔۔۔ ہم تینوں دبے پاؤں باہر نکل گئے اور اپنے پیچھے دروازہ کھلا چھوڑ گئے۔ اکرام نے گاڑی اسٹارٹ کی تو نازو اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں ریلوے لائن کے پیچھے برگد کی اوٹ میں کھڑا رہا۔ ٹیکسی کا انجن غرّایا اور میں نے ٹیکسی کو جاتے ہوئے دیکھا۔

پانچ منٹ بعد ٹیکسی واپس آئی۔ اس وقت تک میں مستعد کھڑا رہا تھا۔ اگر راجا ٹیکسی کے جانے کی آواز سنتا اور اس کے دل میں کوئی غلط خیال ہوتا تو وہ اس سمت سے فوراً اٹھتا۔ مگر خود اکرام نے بھی دیکھ لیا کہ وہ اسی طرح سو رہا تھا۔

نازو نے راستے میں ہمیں وہ بات بتائی جو راجا کی موجودگی کے باعث ادھوری رہ گئی تھی۔ اس نے ایک جملے میں وہ مرحلہ دخل اندازی سے گریز کیا تھا۔ یہ جاننے کی خواہش تھی کہ ہمیں جو گاڑی سے جانے کے لیے آئی تھی اس میں صرف ایک کیپٹن ہی آیا تھا۔ اگر اس کا کرنل بھی ساتھ آتا تو پچھتاتا۔ کیونکہ نازو قلعے سے کرنے کا موقع تو تھا۔ کرنل نے غالباً یہ سمجھا تھا کہ اب افرادی قوت کا کوئی مسئلہ نہیں رہا۔۔۔ قیدی حراست میں ہیں۔ انھیں پکڑنے والا وہ شکاری ہے جس کے جال سے کوئی بچ کے نہیں نکلا۔ جب کیپٹن کو اندر جانا پڑا تو نازو نے چاروں پہیوں کے والو نکال دیے۔ اس کے لیے نازو کو پولیس تک جانا پڑا تھا۔ مگر وہ ٹیکسی میں گئی اور پانچ منٹ میں واپس آ گئی۔ اس نے والو کھولنے والے شخص سے ہزار کے روپے پیچ کرالیے اور "ابھی واپس لاتا ہوں" کہہ کے بھاگ آئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا جب اسے واپسی پر کار اپنی جگہ ملی۔ والو اوپنر کے بغیر چاروں ٹائروں کی ہوا نکالنا بہت نمایاں ہوتا اور کوئی شک کوئی اسے دیکھ لیتا۔ والو اوپنر سے اس نے یہ کام پانچ منٹ میں کر لیا اور پھر چھپ کر انتظار کرتی رہی۔ پہلو بدلتا وقت گزر گیا جب وہ ٹائر بدلنے کے لیے ڈکی میں سے جیک نکال رہا تھا۔ نازو نے جو کار کے پیچھے دبکی ہوئی تھی خاموشی سے باہر نکل کے اور اس کے پیچھے جا کے گردن پر ہاتھ مارا۔ وہ وہیں گر گیا۔ ڈکی کھلی رہ گئی چنانچہ سر گھما کے دیکھنے پر وہ دوسرے کو پیچھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ دھماکا سن کے باہر نکلا تھا کہ نازو کے نازک ہاتھ کی ضرب نے اس کی گردن بھی توڑ دی۔ وہ گرا تو نازو نے اسے گاڑی کے نیچے دھکیل دیا۔

ٹیکسی اب کینٹ اسٹیشن پہنچ گئی تھی۔ وہاں کا ماحول ویسا ہی تھا جیسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ اسٹیشن کے باہر کار پارکنگ کے ہوٹلوں کے ساتھ متعدد تیسرے درجے کے ہوٹل بھی نظر آ رہے تھے۔ ان کی پرانی عمارتیں بے رنگ اور غلیظ نظر آتی تھیں لیکن آباد لگتے تھے۔ ہر ہوٹل کے نیچے ایک چلتا ہوا ریسٹورنٹ تھا جہاں ہر قسم کی مخلوق موجود ہوتی تھی۔۔۔ عام لوگ۔۔۔ ڈرائیور۔۔۔ قلی۔۔۔ دلال۔۔۔ ملنگ۔۔۔ بیکار لوگ۔۔۔ اس وقت کوئی گاڑی نہیں جاتی تھی چنانچہ اسٹیشن کا علاقہ ویران پڑا تھا۔

اکرام نے ایک ریسٹورنٹ کے باہر گاڑی روک لی۔ وہاں بیٹھنے کے ایک دروازے پر فیملی روم بھی لکھا ہوا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ نازو بالکل لڑکا نظر نہیں آتی تھی اور ہم ہال میں سب کے درمیان بیٹھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ اکرام کھانا لینے چلا گیا۔

"تم نے اپنا یہ کیا حال بنا رکھا ہے نازو؟" میں نے کہا۔

"میں نے نہیں۔۔۔ تقدیر نے یہ حال بنایا ہے۔" وہ خود کو دیکھ کر مسکرائی۔

"تم نے اپنے بال بھی کٹوا دیے ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ٹوپی کے نیچے ہیں۔"

"تمہارے تو۔۔۔ بہت لمبے اور گھنے بال تھے۔" میں نے کہا۔

"میں نے تو نہیں دیکھے تھے۔" وہ بولی۔ "مجبوری تھی۔"

"غالب تمہیں ان کپڑوں میں دیکھ لے تو۔۔۔"

"تو کیا؟ بھول جائے نازو کو۔۔۔" وہ بولی۔

"تم نے غلط سمجھا۔ وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر خدانخواستہ تم گنجی ہو جاؤ۔۔۔ کانی یا لنگڑی لولی ہو جاؤ۔۔۔ تب بھی اسے فرق نہیں پڑے گا۔۔۔ خدا نہ کرے تم بدصورت ہو جاؤ۔۔۔"

"کوس کیوں رہے ہو؟" وہ بولی۔ "میں تو خود ہی تمہارے اور رابعہ کے درمیان سے نکل گئی ہوں۔"

اسی وقت اکرام آگیا۔ اس کے ساتھ ایک بیرا تھا جو کھانے کی ٹرے لایا تھا۔ اس میں چائے کے ساتھ نہایت فضول قسم کے سموسے اور کچھ کیک پیس تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ایک کیک پیس چائے کے ساتھ نگلا جو آٹے کی طرح میرے حلق میں چپک گیا تھا۔ نازو نے کمال کیا اور سارے سموسے صاف کر دیے۔ پھر کیک پیس کھا گئی۔

"یار یہ اتنا کھاتی ہے۔۔۔ جاتا کہاں ہے؟" اکرام ہنس کر بولا۔

"کھاتی نہیں۔۔۔ رزق ضائع کرتی ہے۔" میں نے کہا۔ "کوئی اور کھائے تو پھول کر کپا ہو جائے۔ یہ وہی ہڈی کی ہڈی رہتی ہے۔"

"ہاں جلتے کیوں ہو۔۔۔ تم بھی کھاؤ۔۔۔" وہ بولی۔ "اللہ کی مہربانی ہے۔۔۔ تم بھی اوقات میں رہتے ہیں۔"

"نازو۔۔۔ وہ تیسرا کیپٹن کدھر گیا تھا؟"

"کون تیسرا کیپٹن۔۔۔" وہ سڑ سڑ کر کے چائے پینے لگی۔ "وہی جو کار سے کر آیا تھا۔۔۔ وہ ایک ہٹا کٹا کیپٹن تھا۔"

"پھر وہ گیا ٹرک میں۔۔۔" نازو نے چائے ختم کر کے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ واپس جاتا تو میں سمجھ گئی کہ اب یہ دوسری گاڑی لائے گا۔" نازو نے کہا۔ "میں اس کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھی۔ تیسری لائن کے کوارٹر کی اوٹ میں۔۔۔ وہاں ایک ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ وہ وہاں سے گزرا تو میں نے ٹانگ اڑا دی۔ وہ منہ کے بل گرا اور پھر میں نے اسے دو منٹ میں ٹرک کے اندر ڈال دیا۔ وہ مرا نہیں تھا۔ بے ہوش ہوا تھا میرے وار سے۔۔۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ گرا میں الٹا تھا۔ اور سر کے بل آدھا ٹرک میں دھنس گیا تھا۔۔۔ البتہ ایک آدمی کے نکل جانے کا افسوس ہے۔"

"اس بچھے سے آدمی کی بات کر رہی ہو؟"

"ہاں۔۔۔ اس کے باہر آتے ہی کہیں سے ایک گاڑی آگئی۔ نیلے رنگ کی اور وہ اس میں بیٹھ کے چلا گیا۔ واپس اُدھر ہی چھوڑ کے گاڑی آئی تھی۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اس نے وائرلیس پہ بات کی تو ڈرائیور کار لے آیا تھا۔ اور پھر اس کے کہنے پہ گھما کے الٹے راستے سے لے گیا۔۔۔ وہ سیدھے راستے سے جاتا تب بھی میں اس کو روک نہیں سکتی تھی۔"

"یہ ٹھیک ہے مس نازو۔۔۔ اس کا راستہ روکنا شاید تمہارے بس کی بات بھی نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "وہ ایک بہت خطرناک آدمی تھا۔۔۔ تم نے گاڑی کا نمبر وغیرہ دیکھا تھا؟"

نازو نے نفی میں سر ہلایا۔ "نمبر پلیٹ تو تھا ہی نہیں یا مجھے اندھیرے میں دکھائی نہیں دیا۔" وہ بولی۔

"ہوتا بھی تو بوگس ہوتا۔" اکرام ہنس کے کہا۔ "گاڑی کون سی تھی؟"

"اسکوڈا۔۔۔ چار سال پرانی۔" وہ بولی۔

"نیلی اسکوڈا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "تم نے اس شہر میں کتنی گاڑیاں دیکھی ہیں۔۔۔ جن کا رنگ نیلا ہو؟"

"اسکوڈا تو ایک بھی نہیں۔" وہ بولی۔

"پھر وہ کچا رنگ کرا کے لایا ہوگا۔۔۔ ایسا رنگ جو دھونے سے اتر جائے۔" میں نے کہا۔ "وہ بہت چالاک آدمی تھا۔۔۔ وہ نیلے رنگ کی اسکوڈا تمہیں پھر کہیں نظر نہیں آئے گی اور شاید وہ شخص بھی پھر نہیں ملے گا۔۔۔ یہ اس کا آخری مشن تھا آخری کامیاب مشن۔" میں نے نازو کو اس سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ بتا دیا۔

"میرا خیال ہے کہ اس نے یہ آخری مشن ہی زندگی کا ہارا۔ یعنی تمہیں جانتے بوجھتے رعایت دی؟"

"نہیں۔۔۔ اس نے مجھے کوئی رعایت نہیں دی۔ سارا مسئلہ مجھے زندہ یا مردہ ان کے حوالے کرنے کا تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ ذاتی طور پر میرا دشمن ہوتا تو مجھے گولی مار کے میری لاش ان کے

www.paksociety.com

حوالے کرتا... یہ کام زیادہ آسان تھا مگر وہ شخص کسی کا دوست یا دشمن نہیں تھا۔ ٹنڈا ہی اس نے مال حوالے کرتے وقت یوں دی کر خود مجھے لے کر نہیں گیا۔ ان سے کہا کہ آؤ اور مال لے جاؤ۔ غالباً تجارتی نوعیت کے بین الاقوامی معاہدے بھی ایسے ہی ہوتے ہیں... ایک تو یہ کہ مال کی قیمت ادا کر دی اور بیچنے والا فارغ... خریدار چاہے تو بحری جہاز سے لے جائے ہوائی جہاز سے یا سر پر اٹھا لے... کسٹم ڈیوٹی سب وہ خود ادا کرے... دوسری یہ کہ بیچنے والا مال کو خریدار کے گودام یا دروازے تک پہنچانے کے سارے رسک اور اخراجات کا ذمے دار ہو۔ میرے سلسلے میں بھی معاہدہ غالباً یہی ہوا تھا کہ مجھے ان کے حوالے کیا جائے گا۔ وہ اڑ گیا کہ حوالے تو میں کر رہا ہوں مگر جہاں مال ہے وہاں آ جاؤ... کیپٹن اسی پہ مشتعل تھا۔ لیکن وہ بول نہیں سکتا تھا۔ اسے تو کرنل کے حکم کی تعمیل میں آنا پڑا تھا... اب کیپٹن تو مارا گیا... کرنل جوابدہی کرتا پھرے... وہ شخص دوبارہ کسی کے ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔"

"لوگ کہتے ہیں دنیا بہت چھوٹی سی جگہ ہے۔" اکرام بولا۔

"ہاں... فاصلے سمٹ گئے ہیں... ایک ہی چھت میں رہنے والے لوگ ہر جگہ بار بار ملتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جیسے ایک محلے کے لوگ... مگر وہ شخص اپنی پرانی شخصیت کو اپنے ماضی کے ساتھ دفن کر دے گا۔ پھر وہ دوسرا آدمی ہو گا۔ ایک نئی زندگی کے ساتھ نئی دنیا میں نو وارد..."

"میری خواہش ہو گی کہ وہ پھر ملے۔" نازو نے اچانک کہا۔

"تمہاری خواہشات ایک بے لگام پاگل اور اندھے گھوڑے کی طرح ہوتی ہیں جو بحر ظلمات میں دوڑ رہا ہو۔" میں نے کہا۔

اکرام شیخ میری بات پر بہت خوش ہوا۔

"بہت تنگ کر رکھا تھا مجھے... میں بولتا نہیں تھا... کچھ لحاظ کرتا تھا۔" وہ چلتے چلتے برتن لے جاتے ہوئے بولا۔

نازو اس کے جانے کے بعد منہ پھلائے بیٹھی رہی۔

"میرا مطلب یہ تھا مس نازو..."

"مطلب وطلب کچھ نہیں... تم خود ایک بے لگام پاگل اور اندھے گھوڑے ہو جو بحر ظلمات میں دوڑ رہے ہو... وہ بھی بلا ضرورت۔" وہ چلا کے بولی۔ "بلکہ تم گھوڑے بھی نہیں ہو... اس سے ملتی جلتی چیز ہو۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ "او کے... میں گدھا ہوں... میں مانتا ہوں، مگر تم بھی مان لو۔"

"کیا مان لوں؟" وہ مصالحت آمیز لہجے میں بولی۔

"کچھ بھی مان لو... جو تمہارا جی چاہے۔" میں نے کہا۔ "مثلاً یہ زمین گول نہیں ہے... اور گدھے کے سر پر سینگ ہوتے ہیں!"

وہ ہنسنے لگی۔

واپسی پر صبح کے چار بجے ہم نے راجا کو اسی حالت میں سوتا ہوا پایا۔ اکرام کسی مسافر خانے سے پرانے گدے خرید لایا تھا جو ہم نے نیچے بچھائے اور سو گئے۔ تھکن سے سب ہی بے حال تھے چنانچہ ہم دس بجے اس وقت اٹھے جب راجا نے ہمیں جگایا۔ وہ پھر اپنے لباس فقیری کو دوگنی ہیئت میں پہن چکا تھا۔

"فقیر ڈیوٹی پر جاتا ہے بابا... تم بے فکرے لوگ سوتے ہو مگر من کی آنکھیں کھول سکے۔" وہ بولا۔ "کہیں دنیا تمہیں ابدی نیند نہ سلا دے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے آنکھیں مل کے کہا۔ "تم بھیک مانگنے جا رہے ہو؟"

"اور نہیں... صبح صبح بدشگونی کر دی۔" وہ بولا۔ "ارے بابا! فقیر تو دنیا کی سخاوت آزمانے جاتا ہے۔ یہ دیکھنے جاتا ہے کہ لوگوں کے دل چھوٹے اور ہاتھ تنگ تو نہیں ہوئے۔ تم سکوں کے بدلے ثواب بانٹنے کو بھیک مانگنا کہتے ہو... ہاتھ کا میل لے کر ثواب دینا۔"

"بیٹھو یہاں۔" میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے ایک جھٹکا دیا۔

"یا میرے مولا۔" وہ کندھا پکڑ کے بولا۔ "فقیروں کو کمال شہ زوروں سے جھگڑا دیا۔"

"تم آج سے بھیک مانگنے نہیں جاؤ گے... سنا تم نے... خود کو اور ہمیں بے وقوف مت بناؤ۔" میں نے کہا۔ "جو کچھ تم کرتے ہو وہ بھیک مانگنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

اکرام میری آواز پر اٹھ بیٹھا۔ "یہ کیا شور و غوغا ہے؟"

"صبح صبح فقیر کے پیٹ پر لات پڑی ہے اس لیے جلا بھنا بیٹھا ہے۔" راجا نے کہا۔ "روزی کا ایک وسیلہ ہے... یہ تھا۔"

"اچھا... تمہاری اوسط یومیہ آمدنی کیا ہے؟" اکرام بولا۔

"دو سو... کبھی تین سو... عید بقرعید محرم پر چار پانچ سو... ماہانہ نہیں... روزانہ..." وہ بولا۔

"اچھا ہم تمہیں دو سو روپے روز دیں گے۔" اکرام بولا۔

"پھر تو یہ کام چھوڑ دو گے؟"

"تم کتنے دن دو گے بابا، دو چار دن دو گے پانچویں دن دھتکار دو گے کہ مفت خورے... جا دفع ہو۔"

"نہیں... ایسا نہیں ہو گا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ "تم ہمارے ساتھ رہو گے... ہمارے لیے کام کرو گے... بے شک تمہیں کام کرنے کی عادت نہیں رہی ہو گی... مگر وہ دلچسپ کام ہیں۔ یہ کھیل نہیں ہے، تجارت نہیں ہے اور ایمان فروشی بھی نہیں ہے۔"

اس کا چہرہ ایک دم روشن ہو گیا۔ "تم لوگ... اپنے ساتھ کام کرو گے مجھے؟ میں ایک ناکارہ آدمی ہوں۔"

"تم کارآمد ہو جاؤ گے... تمہاری ذہنی اور جسمانی صلاحیت سے دنیا نے فائدہ نہیں اٹھایا اور تم نے امید کا دامن چھوڑ دیا۔ حوصلہ ہار گئے... بے حسی بے اعتمادی اور بے یقینی کا یہ زنگ بہت جلد اتر جائے گا... اور ایک دن تم خود محسوس کرو گے کہ پیسہ تو ہاتھ کے میل سے بھی بدتر ہے۔ اور وہ ہری زندگی جو تم گزارتے رہے سوائے تمہارے دوسروں کے لیے نہیں تھی جو صرف تمہیں خوشی دے سکتی تھی۔ وہ سچی بھی اور خالص بھی... خیرات میں ملنے والی... بے غیرتی کے احساس سے سمجھوتا کر کے ملنے والی۔"

راجا کا چہرہ سپاٹ ہو گیا... جیسے سینما کا خالی اسکرین۔

"دیکھو... میں ایک ضرورت کے تحت ایسا کر رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "جو میں... یہاں نہیں بتا سکتا۔"

میں اسے بازو سے پکڑ کے ایک طرف لے گیا۔ "ایسی کون سی بات ہے جو تم سب کے سامنے نہیں کر سکتے؟"

"...سب کے سامنے کیا... میں تم سے بھی نہیں کر سکتا۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" وہ بولا۔

"تم کو کتنا پیسہ چاہیے... بولو۔" میں نے کہا۔ "ایک لاکھ... دو لاکھ... دس لاکھ..."

"چاہیے تو مجھے پانچ لاکھ۔" وہ بولا۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں... میں تم کو اسلحہ فراہم کرتا ہوں۔ تم کسی بینک کو لوٹ لو۔" میں نے کہا۔ "بہادری کا کام کرو... جو بے غیرتی کے کام سے بہتر ہے... اور پسند ہو تو اس لڑکی کو ساتھ لے جاؤ... یہ تمہارا کام کرے گی۔"

وہ شرمندہ اور خجل میرے ساتھ آیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ نازو اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"راجا جی... کیا راز پاٹ چلا گیا۔" نازو نے کہا۔ "یہ آدمی بہت خطرناک ہے... دیتا کچھ نہیں اور سب کچھ لے لیتا ہے۔ زندگی بھر کے لیے اپنا قیدی بنا لیتا ہے۔"

"مسٹر راجا... ہم رسک نہیں لے سکتے... کہ تمہیں جانے دیں۔"

"ارے تو کون کمبخت جا رہا ہے بابا۔" وہ زمین پر بیٹھ کر لاچاری سے بولا اور اس نے ٹانگ اتار کے زمین پر رکھ دی۔ "مگر یہ بتاؤ کہ کیا تم لوگ واقعی سیریس ہو... میں کچھ کر سکتا ہوں تمہارے لیے؟"

"تم بہت کچھ کر دو گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "لیکن بھیک نہیں مانگو گے... لاؤ یہ لباس مجھے دے دو... آج سے یہ کام میرا..."

وہ چونکا۔ "تمہیں... یعنی تم بھیک مانگو گے؟"

"ہاں... تمہارے مقابلے میں مجھے اس لباس زیادہ خوب جچے راجا جی۔" میں نے کہا۔

ہم نے جرگی کا دروازہ بند کرنے سے پہلے بستر سمیٹ کر کونے میں رکھ دیے... پھر ہم یوں نکلے کہ راجا کے روپ میں بھکاری میں بنا ہوا تھا اور نازو نے دوپٹی کے کپڑے پہن لیے تھے۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ دوپٹی کون تھی۔ مجھ سے کہاں اور کیسے ملی تھی اور پھر کیسے لاپتا ہو گئی تھی۔ اس نے جاتے جاتے بہت سے غیر ضروری سوالات کیے تھے۔ یہ کہ بچپن سے اب تک دوپٹی کے جذبات نہیں بدلے تھے تو پھر کیوں بدل گئے تھے۔ اور پھر وہی اخذ کیا کہ مرد کی ذات میں وفا نہیں... اکرام شیخ نے بھی اختصار کے ساتھ وہ سب واقعات سنے تھے جو ان کی عدم موجودگی میں پیش آئے تھے اور ہم سے کچھ فاصلے پر راجا بے وقوف بنا بیٹھا رہا تھا۔ ابھی تک ہم نے اسے شریک راز کیا تھا اور نہ پوری طرح واضح کیا تھا کہ ہم اسے کس حد تک قابل اعتماد سمجھتے ہیں اور اس سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔ وہ خود کو ابھی تک ہماری قید میں محسوس کر رہا تھا اور کچھ مایوس نظر آتا تھا۔

جب نازو نے لباس اور حلیہ بدلا تو راجا کی عقل خبط ہو گئی۔ وہ نازو کے بارے میں پڑھ چکا تھا کہ وہ کتنے سے کس طرح محافظوں کی نظریں توڑ کے فرار ہوئی تھی۔ جب اس نے نازو کو دیکھا تھا تو وہ میلے کچیلے گرد آلود خاکی رنگت کے ساتھ بدوضع ہیئت میں تھی اور اس کے حسن کی تمام آب و تاب اسی طرح محسوس نہیں ہوتی تھی جیسے کیچڑ میں پڑے ہوئے ہیرے کی چمک... جب نازو نے نہا دھو کے دوپٹی کے کپڑے پہنے... جو اسے کچھ ڈھیلے تھے۔ تو اس کی بکھری رعنائی اپنی تمام ساحرانہ قوت کے ساتھ سامنے آئی۔ راجا کی جگہ کوئی بھی مرد ہوتا تو اس کا متاثر ہونا لازمی تھا۔

میں اور نازو اب شناخت کے خطرے سے کافی محفوظ ہو گئے تھے۔ راجا کے فقیرانہ لباس نے مجھے بہروپ دے دیا تھا اور کسی دشواری کے بغیر میں اس قابل ہو گیا تھا کہ کراچی میں آزادانہ گھوم پھر سکوں... نازو کا حلیہ یہ تھا کہ وہ اب ایک معزز خاتون نظر آتی تھی اور کوئی بھی پولیس مین اس کی طرف راہ چلتے شک کی نظر بھی نہیں ڈال سکتا تھا... وہ اپنے بھائی کے ساتھ آ گئی تھی جو کسی ڈرائیور کی وردی میں گاڑی چلا رہا تھا۔

دوپہر ڈیڑھ بجے کے بعد ہم نے لنچ نما ناشتا کیا اور اتنا کھا لیا کہ پھر شام تک کھانے کی ضرورت سے بے نیاز ہو گئے۔

"اب تم تینوں کا پروگرام کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"تم الگ جا رہے ہو کہیں؟" اکرام نے پوچھا۔

www.paksociety.com

"ہاں... میں بندرگاہ کے علاقے میں دوست محمد کو اور اس کے ذریعے سے راجہ کو تلاش کر لوں گا۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ مشکوک بات نہیں ہوگی؟" اکرام نے کہا۔ "اگر ایک فقیر بندرگاہ میں بھیک مانگتا پھرے تو کوئی توجہ نہیں کرتا... مگر وہ کسی کا پتا پوچھتا پھرے تو یقیناً لوگوں کو حیرانی ہوتی ہے۔"

"حیران ہونے دو لوگوں کو..." میں نے کہا۔

"تم راجا کو ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟" اکرام نے کہا۔ "اسے کوئی نہیں جانتا۔"

"کچھ لوگ مجھے ضرور پہچانتے ہیں۔" وہ بولا۔

"ہاں... مگر وہ بندرگاہ کے علاقے میں تو نہیں ہوں گے۔" اکرام نے کہا۔ "اور دن کے وقت..."

"دن کے وقت میرا ایک فقیر کے ساتھ پھرنا شک پیدا نہیں کرے گا؟" وہ بولا۔

"تم دونوں کا اکٹھے رہنا ضروری نہیں۔"

"راجا جی... مجھے ایک شخص کی تلاش ہے۔ اس کا نام دوست محمد ہے اور وہ ایک میرین انجینئر ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کسی جہاز پر ملازم نہیں ہے۔ اس کی خدمات سب کے لیے وقف ہیں۔ ملاح سے لے کر تجارتی جہاز تک سب ہر جگہ اسے بلا لیا جاتا ہے اور وہ خدمت تعلق نہیں کرتا... معاوضہ لیتا ہے... اس کے پاس کوئی میرانی کار ہے جو بندرگاہ کے ہی علاقے میں کہیں کھڑی رہتی ہے۔"

"تمہیں کیا کام ہے اس سے؟" وہ بولا۔

"جب وہ ملے گا تو کام بھی بتا دوں گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو ہم دونوں بندرگاہ کے علاقے میں پہنچ کر آگے پیچھے ہو جائیں گے۔ تم آگے رہو گے... لوگوں سے پوچھتے رہنا کہ دوست محمد کہاں ملے گا... میں تم پر نظر رکھوں گا اور بھیک مانگتا ہوا آگے بڑھتا جاؤں گا۔"

"پہلے روک دیا بھیک مانگنے سے... اب خود کرو گے یہ کام؟"

"یہ کام تو کچھ اور ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اس کے لیے بھیس بدلنا ضروری ہے... وہ کام ہو گیا تو پھر یہ کام بھی ختم۔"

راجا نے اقرار میں سر ہلایا۔ اکرام شیخ نے ہمیں بندرگاہ سے ایک فرلانگ دور اتار دیا۔

"اب تم دونوں گھر جاؤ گے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... آج کے دن تو آرام ہی کریں گے۔"

"اگر ممکن ہو تو ستقر فون کرنا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پوچھنا کہ ملتان کی کیا صورت حال ہے۔ جونی اور جیکی نے اس سے رابطہ قائم کیا ہے یا نہیں... اور ہاں... مجھے ایک ٹیلیفون چاہیے۔"

"کیا چاہیے؟" اکرام بھونچکا رہ گیا۔

"ٹیلی فون... وہ جو لوگ جیب میں لیے پھرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یار وہ میں کہاں سے لا دوں؟"

"دنیا میں ہر چیز ملتی ہے دوست... کبھی قدرت سے کبھی زور سے۔" میں نے کہا۔ "تمہارے پاس تو پولیس کی وردی ہے اور ایک شناختی کارڈ بھی ہے... تم ٹیلی فون کیا ٹیلی فون کے مالک کو گرفتار کر سکتے ہو۔"

اکرام ہنسا۔ "اچھا دیکھو... ایس ایس کار تک تقرری کا معاملہ ہے نا..."

"ہاں... لیکن میں اس کے کپتان سے یا فرسٹ انجینئر سے بھیک مانگنے نہیں جا سکتا۔" میں نے کہا۔

"وہ جہاز دو تین دن میں روانہ ہوگا۔" اکرام نے کہا۔ "اس کے کارگو پر نظر رکھنا... اگر ممکن ہو... لیکن ذرا دور رہ کے اور احتیاط کے ساتھ... وہ غافل نہیں ہیں... خصوصاً جب سے ان کا ایک جہاز ڈوبا ہے۔ اللہ کے آدمی سادہ کپڑوں میں ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔"

"میں رات کو گھر آ جاؤں گا... امید ہے اس وقت تک تمہارا وہ گھر وہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

جب ٹیکسی واپس چلی گئی تو میں اور راجا ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

"تمہارا یہ ساتھی بہت سخت مزاج ہے۔" راجا نے شکوہ کیا۔

"وہ پولیس میں تھا پہلے... اور تم احتیاط کو شک سمجھے ہو۔" میں نے کہا۔ "چند دن ساتھ رہو گے تو بہت کچھ جان لو گے اور ہیں ایک بار سمجھ ہو گئے تو پھر بھی غلط فہمی پیدا ہی نہیں ہوگی۔ میرا دل بہرحال تمہاری طرف سے صاف ہے۔"

"مجھے اپنا گھر اسے کرائے پر دے دینا چاہیے تھا۔" اس نے دل شکستہ لہجے میں کہا۔ "بس میں جذباتی ہو گیا... میں تب سے تنہا تھا اور اکثر سوچتا تھا کہ تمہارے لیے کچھ کروں... سوچتے سب ہیں وہ سب نوجوان اور بوڑھے جو پاکستان کی سالمیت کو سب سے مقدم سمجھتے ہیں۔ مگر عمل کرنے کی توفیق خدا سب کو نہیں دیتا۔ کچھ لوگ بزدل ہوتے ہیں اور حالات کو بہانہ بنا لیتے ہیں... کچھ لوگوں کے لیے حالات واقعی سازگار نہیں ہوتے... میں اکیلا آدمی... اپنی جان کے سوا کسی کی فکر نہیں... آج تک جو کیا اپنی جان کے لیے کیا... وطن کے لیے کچھ نہیں کیا... حالانکہ وقت کا تقاضا ہے..." وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

"تم کو کس نے روکا ہے؟" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بات بتاؤ... تم اتنی معقول باتیں کرتے ہو... پھر یہ کیا کام کرتے تھے؟"

"میں بچپن سے جھکی اور خبطی مشہور تھا۔" وہ بولا۔ "الٹے کام ہوتے... میری باتوں سے بھی سب پریشان ہوتے تھے کہ آخر وہ کرنا کیا چاہتا ہے... اور دیکھو میں کیا بنا؟ اس سے پہلے جو کچھ میں نے کیا اس کی تفصیل سنو تو حیران رہ جاؤ... اتنے پیشے اختیار کیے کہ میں نے اور اتنے کام کیے ہیں... اتنے بھیس بدلے ہیں کہ بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے... میں نے دیکھ لیا تھا کہ دنیا میں صرف پیسہ کام آتا ہے اور پیسہ آرام دیتا ہے اور عزت دیتا ہے۔ آج رات چل کے دیکھنا کہ میری کتنی عزت ہے... عزت دار کہلانے والوں میں... مگر یہ تو میں جانتا ہوں کہ نہ وہ عزت دار ہیں اور نہ میں ہوں... تو یہ گداگری کا پیشہ مجھے بس ایک پیشہ تھا، پیسہ آسانی سے اور بے حساب ملتا تھا۔ چنانچہ میں نے عزت اور ذلت کو الگ کر دیا تھا اور اپنی شخصیت کے دو حصے کر دیے تھے۔"

"کیا تم... تمام عمر بھیک مانگتے رہتے... اور اسی طرح زندگی گزارنے کو کامیابی سمجھتے... کہ جتنا ملا عیاشی میں اڑا دیا... تمہیں کبھی ضرورت نہیں پڑی جذباتی رشتوں کی؟" میں نے کہا۔

"جذباتی رشتے خریدے تو نہیں جا سکتے نا... ورنہ میں ماں باپ کے بعد بھائی بہن بنا لیتا۔ جا کے سامنے آتا۔" وہ بولا۔

"تم اس عمر کے جذبات سے بھی بیگانہ ہو؟ تم کو کسی سے محبت نہیں ہوئی کبھی؟"

"کئی بار ہوئی..." وہ بولا۔ "کئی دن رہی... کئی مہینے بھی چلی... میعادی بخار کی طرح۔"

"وہ محبت نہیں کہلاتی... میں اس محبت کی بات کر رہا ہوں جس میں آدمی خود کو کبھی خیالوں میں بھی تنہا محسوس نہیں کرتا۔ جس میں وہ سوتے جاگتے خواب دیکھتا ہے... اپنے گھر کے... اپنے بچوں کی ماں اور اپنے بچوں کے بچوں کے۔"

وہ خلاء میں گھورتا رہا۔ اس نے میری بات کا جواب کوئی نہیں دیا مگر میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں اتر آنے والے خواب وہی تھے جو میرے اپنے خواب تھے۔ جو سب محبت کرنے والوں کے خواب ہوتے ہیں... جو اپنا وجود تسلیم کرا لیتے ہیں خواہ آدمی اپنی زبان سے اقرار نہ کرے اور مسلسل انکار کرتا چلا جائے۔

"میں یہاں ایک لڑکی کے لیے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "پہلے وہ میرا مقصد حیات تھی۔ پھر اس نے میرا ساتھ دیا اور ہم نے اپنی محبت کے سامنے خوابوں کو موخر کر دیا... ہم ایک مشن پر ہیں... اس مشن کی کامیابی یا ناکامی تک ہماری زندگی [illegible] ہوتی ہے... اگر ہم دونوں نہیں رہے... ہماری محبت کا کوئی افسانہ بھی نہیں ہوگا... جیسے مجنوں یا شیریں فرہاد کے قصے کی طرح... یا پھر یہ محبت ایک حقیقت ہوگی۔ رشتہ زندگی ہم اپنے سارے خوابوں کو عمل کی زنجیر دے دیں گے اور زندگی کی آخری سانس تک خوشیاں سمیٹتے رہیں گے۔ ایک خوشی کے بیج سے دوسری خوشی کا نخل آئندہ پھوٹے گا اور پھر اس میں کتنی خوشیوں کے پھول ہوں گے۔ پھر ان پھولوں پر کتنی رنگین اور خوب صورت تتلیاں آئیں گی ہو..."

وہ مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ "کیا تم شاعر بھی ہو؟"

"میں جس پر غلط ہر محبت کرنے والا خود شاعر بن جاتا ہے... محبت اسے آدمی سے عاشق اور عاشق سے شاعر بنا دیتی ہے۔"

"اور شاعر سے شوہر... پھر کیا ہوتا ہے؟" وہ بولا۔

"پھر وہی ہوتا ہے... جو تم جانتے ہو..." میں نے کہا۔ "مجھے بتاؤ وہ کون ہے؟"

"وہ ایک یہودی کی بیٹی ہے۔" راجا ایک آہ بھر کے بولا۔

"یہودی کی بیٹی... کیا مطلب؟ اس کا باپ...؟"

"اس کا باپ ایک کینیڈین اور خبیث بڈھا ہے۔"

"اور اس کی بیٹی؟"

"اس کی بیٹی ایک بلینک چیک ہے... اس کے لیے" راجا نے کہا۔ "وہ اتنی خوب صورت ہے... اتنی خوب صورت ہے۔"

"میں سمجھ گیا..." میں نے کہا۔

"تم نہیں سمجھے... تم یہ سمجھے ہو کہ میں مجنوں ہوں تو لیلیٰ ہی میرے لیے دنیا کی سب سے بڑی خوب صورتی ہے۔" وہ بولا۔ "مگر میں دوسروں کی بات کر رہا ہوں۔ اس کے حسن کے خریداروں کی قطار بہت لمبی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک گوہر نایاب ہے... اس کا باپ ایک بزنس فروش ہے لیکن اس کی بیٹی کے لیے رشتے آتے ہیں کسٹم افسروں کے... آرمی آفیسرز کے، تاجروں کے... وہ بڈھا سب سمجھتا ہے چنانچہ وہ بولی بڑھاتا جا رہا ہے..."

"یعنی وہ نقد طلب کر رہا ہے؟"

"نہیں... مگر اس کی شرائط سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی ہیں... وہ سب کو انکار کر رہا ہے۔ بہتر سے بہتر کی امید پر۔"

"اور تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں اسے اغوا کرنے کا سوچ رہا ہوں... یا اس کے باپ کو قتل کرنے کا... وہ بڈھا جانتا ہے جو گزشتہ سال اس خبیث نے [illegible] کیا... اس نے کہا۔ سلطنے نامہ لکھ لیا راجا [illegible] علم کا کچھ نہیں۔ مگر اٹھا کے چلے آئے رشتہ مانگنے [illegible] کے نام پر... میلے محبت ہے تو اس کے لیے

www.paksociety.com

کوٹھی بنا... کار لا... بینک بیلنس بنا... خالی خولی محبت فلموں میں چلتی ہے اُلو کے پٹھے... اپنے ساتھ میری بیٹی کو بھی خوار کرے گا... چل بھاگ..."

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ "پھر تم بھاگ آئے؟"

"ہاں... مگر میں نے اس کے سامنے ایک تقریر کی... فلمی تقریر... میں نے کہا میں جا رہا ہوں... لیکن میں پھر آؤں گا۔ اور بہت جلد آؤں گا... کوٹھی کار کیش سب لاؤں گا اور اسے لے جاؤں گا... لیکن خیال رکھنا کہ وہ میری ہے... وہ کہنے لگا کہ تمہارے انتظار میں اسے کب تک بٹھائے رکھوں گا میں... میں نے کہا زیادہ نہیں... بس دو سال... اور اس نے شاید مجھے ٹالنے کے لیے کہا اچھا دو سال دیتا ہوں میں... دو سال کے اندر اندر گلشن اقبال میں کم سے کم دو سو چالیس گز کی کوٹھی ہو... کار ہو... ایک لاکھ نقد ہو... اسے یقین تھا کہ یہ کام میرے لیے ناممکن ہوگا، مگر وہ مجبور بھی تھا... اپنی بیٹی کی وجہ سے جو ہر رشتے کو مسترد کر رہی ہے... اس نے باپ کو صاف بتا دیا تھا کہ راجا سے شادی نہیں ہوئی تو پھر کسی سے نہیں ہوگی اور ہوگی تو اس گھر سے فقط میرا جنازہ اٹھے گا۔"

"یہ تو بہت عام فلمی ڈائیلاگ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے باپ پر کیا اثر ہوا؟"

"وہ بھی فلمی باپ ہے... ایسے ہی ڈائیلاگ وہ بھی بولتا ہے کہ میں ٹکڑے کر دوں گا... گولی مار دوں گا یا مار لوں گا... دونوں اپنی اپنی جگہ اڑے ہوئے ہیں... میری بات نے دو سال کے لیے عارضی صلح کے امکانات پیدا کر دیے اور اس نے یہ بات اپنی بیٹی سے کہی کہ وہ تیرا کنگلا راجا ترنگ کے نشے میں آیا تھا اور بڑے اونچے بول بول رہا تھا... پری جیب مجھ سے تھی۔"

"پری یا کوہ قاف کی پری؟" میں نے ہنس کے پوچھا۔

"اس کا نام پری ہے... میں پری کہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "پری نے کہا کہ تم نے آنا ہے تو ٹھیک ہے... میں نے بیٹھنے پہ ہاتھ مارنے والا تو ہوں... ٹھیک کہا ہے اس نے کہ تم واقعی فقیر تھے... ایسی فضول بات کیوں کی تم نے... میں نے کہا کہ یہ کوئی فضول بات نہیں... میں دو سال میں یہ سب کر کے نہ دکھا دوں تو میرا نام بدل کر رکھ دینا... میں باہر جا رہا ہوں... ظاہر ہے وہ پیسے کی کہاں جا سکتے ہو۔ پری نے دعا دی... اور اسے یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ میں واقعی سیریس ہوں اور مجھے دوبئی جانے کا بہترین چانس مل گیا ہے... اس نے مجھے بہت قسمیں دیں، پیسے سر پر دو سال سے زیادہ مت ٹھہرنا... لوگ جاتے ہیں تو پھر لوٹ کر نہیں آتے... پیسہ کمانے میں لگے رہتے ہیں... میں بھی محبت کا ایکسپرٹ ہوں... محبت سچی ہے، مگر سچ کے سہارے چلتی نہیں... بہت جھوٹ بھی بولنے پڑتے ہیں ان لڑکیوں کو مطمئن رکھنے کے لیے۔"

"گویا تم اب دوبئی میں ہو؟"

وہ چونکا۔ "ہاں... میں دوبئی میں ہوں... وہاں میرا ایک دوست ہے۔ میں یہاں سے اسے خط کا مضمون بھیجتا ہوں۔ اسے وہ لفافے میں ڈال کے پوسٹ کر دیتا ہے... اس بیہودی کی بیٹی کے نام... ظاہر ہے خط باپ سنسر کرتا ہے... اس میں بھی خاصا جھوٹ ہوتا ہے مگر مستند کہ میری تنخواہ اب دو ہزار ریال ماہانہ بڑھ گئی ہے اور میں نے قسم پوری کرنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھ لیا ہے۔ کھجور کے پتے کھا کے اور سوکھی روٹی کے ٹکڑے کا پانی پی کے گزارا کر رہا ہوں... اور یہ بھی ظاہر ہے کہ پری کا باپ خوش ہوتا ہوگا... وہ خود بھی ایسی ہی کفایت شعاری کا قائل ہے کہ بس چلے تو پارک میں گھاس چرے اور مفت میں کارپوریشن کا پانی پیے... اور پھر گنگے کی طرح دودھ دے اور پیسے اور پیسہ جمع کرے۔"

چلتے چلتے میرا برا حال ہو گیا... ایک شخص کے بارے میں کسی ہونے والے داماد کی رائے اتنی خراب بھی ہو سکتی ہے یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مبالغے سے کام لے رہا ہے۔

"تم گزشتہ سال کے سلوک کی بات کر رہے تھے... یہ سوچا ہے تم نے کہ آئندہ سال کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"آئندہ سال میری شادی ہوگی... پری سے..."

"مگر کیسے... وہ دوبئی والی بات تو جھوٹ ہے۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔ "کمائی تو سچی ہے... آئندہ سال تک میں اپنی قسم پوری کر دوں گا۔"

میں چونک گیا۔ "اس ایک گھوڑے میں کتنی رقم ہے؟"

"وہ ایک گھوڑا ہے۔ ایسے چار گھوڑے اور بھی ہیں۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "یہ تو اتفاق سے تمہارے ہاتھ لگ گیا ورنہ میں اسے بھی دفن کر دیتا ہوں... جہاں چار گھوڑے دفن ہیں... ہر گھوڑے میں پچاس ہزار نقد موجود ہیں۔"

"تم مجھے پاگل کر دو گے۔" میں نے سر پکڑ کے کہا۔ "بھیک مانگ کے اتنا اکٹھا کیا ہے تم نے؟ یقین نہیں... میں نہیں مان سکتا۔"

"یقین آ جائے گا آزما لو..." وہ بولا۔ "ہاتھ کی صفائی کو آزمائش کیا..." شروع میں بہت گھبراہٹ ہوتی تھی... ہاتھ ڈالتے ہوئے... مگر اب... کے وقت جاتے... بس انسان کی جیب میں گھس جاؤ۔ جب ملاقاتیوں کے آنے کا وقت ہوتا ہے۔ یہ ذرا مشکل کام ہے کیونکہ گڑبڑ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تم کسی کے آگے ہاتھ مت پھیلاؤ... پھر کوئی نرگس یا کیپٹن یا آپریشن تھیٹر دیکھے ہیں تم نے؟ خیر دروازے کے باہر کھڑے ہو جاؤ... ڈاکٹر حمید اس کا نگراں ہے اور بہت سخت آدمی ہے۔ وہاں جو آپریشن ہوتے ہیں گھنٹوں چلتے ہیں اور ان میں ففٹی ففٹی چانس ہوتے ہیں مریض کے مرنے یا بچنے کے... لواحقین باہر سخت بدحواسی کے عالم میں دست بدعا رہتے ہیں... تم جیسے ہی دیکھو کہ اسپتال کے عملے کا کوئی فرد نہیں دیکھ رہا ہے... فوراً کسی عورت کے سامنے جا کے کہو... اپنے بچے کی زندگی کا صدقہ دے... اور یہ جملہ بڑا مؤثر جملہ ہے۔ اس میں تم مائی، باجی ان کا متبادل استعمال کر سکتے ہو... یہ دیکھو کہ کون عورت زیادہ رو رہی ہے... پھر اس جملے کا اثر دیکھو... وہاں وہ سب صدقہ خیرات کرنے کے موڈ میں ہوتے ہیں... پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا... آزما لو کہ وہ سو سو کے نوٹ یوں دیتے ہیں جیسے ایک کا نوٹ... تم کو ہزار بھی مل سکتے ہیں... کسی اہلکار سے معاملہ کر لو۔ آدھے اس کے آدھے تمہارے... ہر روز نئے مریض ہوں گے اور نئے صدقہ دینے والے۔ انتہائی نگہداشت کا یونٹ بھی ایسی ہی جگہ ہے۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں راجا کا گلا گھونٹ دوں... کتنی جذباتی بے حسی کے ساتھ وہ لوگوں کا جذباتی استحصال کر رہا تھا اور صدقے کے بدلے ان کو جھوٹی دعاؤں کی تسلی دے رہا تھا۔

"دیکھو... تم مشتعل ہو رہے ہو۔" وہ بولا۔ "مگر میں مجبور ہوں اس کیس میں... میں پری کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اغوا اور قتل کی بات تو کر سکتا ہوں مگر ایسا کر نہیں سکتا۔ میرا ٹارگٹ پانچ لاکھ ہے۔"

"اور اب تک اس میں سے تم کتنے جمع کر چکے ہو اب تک؟" میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"ڈھائی لاکھ۔" وہ بولا۔ "اگلے سال..."

"تم اگلے سال کی بات کرتے ہو... اب اگر تم نے یہ بدمعاشی نہ چھوڑی تو میں تمہارا وہ حشر کروں گا..."

"سکندر صاحب! میں بہت برا آدمی ہوں... مگر میں سب سے برا آدمی نہیں ہوں... میں غلط ذرائع اختیار کر رہا ہوں... یہ غیر اخلاقی ذرائع تھے... لوگ تو غیر قانونی ذرائع اختیار کرتے ہیں، بھتہ، ڈکیتی اور اسمگلنگ سے پیسہ جمع کرتے ہیں۔ کسی مقصد کے لیے یا کسی ناجائز مقصد کے لیے... ملک میں آگ پھیلانے کے لیے... لاشوں کی سیاست کے لیے... شراب اور شباب پر لٹانے کے لیے... میرا مقصد تو نیک ہے نا... جب میں اپنا کچھ نہیں کر سکتا... تو پھر کیا کروں...؟"

"بکواس بند کرو اپنی..." میں نے کہا۔ "آج رات کو تمہیں ڈھائی لاکھ مل جائیں گے۔"

"کہاں سے مل جائیں گے؟"

"میں دوں گا تمہیں..." میں نے کہا۔ "اور تم کل ہی ایک خط ڈالو گے اس بیہودی کے نام... کہ تم واپس وطن آ رہے ہو... وہ سب لے کر جس کا تم نے وعدہ کیا تھا... تم کوٹھی خریدو گے... کار خریدو گے اور ایک لاکھ کا بیلنس اسے دکھا دو گے... مگر اس کے بعد تمہارے پاس جو ایک سال بچے گا وہ میرے پاس گروی رہے گا..."

"میں سمجھا نہیں۔"

"تم شادی ایک سال کے بعد کرو گے... یہ ایک سال تم مجھے دو گے اور اپنے ذہن کو دو گے... اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے۔"

"لیکن... اس ایک سال میں اس بیہودی نے... پری کی شادی کسی اور سے کر دی تو؟"

"تم فکر مت کرو... اس کا انتظام بھی میں کروں گا... پری تمہاری رہے گی... میں صرف ایک بار اس کے باپ کو سمجھانے جاؤں گا... پھر دیکھنا وہ سمجھتا ہے یا نہیں..." میں نے کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہے کہ تم مجھے ایک سال کی تاخیر سے ملے ورنہ یہ سب نہ ہوتا جو تم نے کیا... مجھے تو شرم آتی ہے یہ سوچ کر۔"

"بے شرم بننا آسان نہیں تھا... مگر میں شرم کرتا تو محبت کی دکان بند ہو جاتی... پری کو کالا دیو لے جاتا یا کالا ناگ..."

"چلو چھوڑو... آؤ اندر چلیں۔" میں نے کہا۔ "باقی بات رات کو کریں گے۔"

"تم واقعی مجھے ڈھائی لاکھ دو گے... بے سبب؟" وہ بولا۔ "میرا دماغ خراب کیوں کرتے ہو؟"

"تمہارا دماغ پہلے سے خراب ہے۔" میں نے کہا۔ "اور میں تم کو ڈھائی لاکھ بے سبب نہیں دے رہا ہوں... تم کو سیدھے راستے پر لانے اور محبت پر اعتبار کے لیے دے رہا ہوں... مجبوری نے تم کو منفی سوچ دے دی تھی۔ تم کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ تم محبت میں اندھے ہو کر کدھر جا رہے ہو... میں تم کو روشنی دے رہا ہوں۔"

وہ کچھ نہیں بولا اور سامنے دیکھتا رہا۔ اس بنچ پر ہم دونوں بلکہ ہر ایک دوسرے سے بے تعلق بیٹھے ہوئے تھے اور بنچ ایک فٹ پاتھ کے آخری حصے میں لگی ہوئی تھی اس کے بعد جنگلا سا تھا جس کے اندر گودام اور کریٹ کوئی چھوٹی جھونپڑی

www.paksociety.com

بیل سے نثار اور دعا نے بھر کا ٹکڑا بھرا ہوا تھا۔

"چلو اب چلیں۔" میں نے کہا۔ "تم اس علاقے سے واقف ہو نا...؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اگر دوست محمد مل جائے تو...؟"

"تو تم رک جانا..." میں نے کہا۔ "میں تم سے دس بیس قدم پیچھے رہ کر بھیک بھی مانگتا رہوں گا اور تم پر بھی نگاہ رکھوں گا۔"

میں اس کے پیچھے دس قدم کے فاصلے سے روانہ ہوا... وہ جس دروازے سے گزرا اس میں سے بیک وقت بہت سے لوگ آجا رہے تھے... ان میں مزدور قلی بھی تھے اور سامان لانے لے جانے میں مدد کرنے والے بھی... کلیئرنگ فارورڈنگ ایجنٹ... انشورنس ایجنٹ... اسمگل ہو کر آنے والے سامان کی تاک میں پھرنے والے۔ یارڈ اور مارکیٹوں کے دلال بھی... آدھے دام پر سر مال نکالنے والے بھی... خفیہ راستوں کے ماہر بھی اور چور دروازوں پر متعین چوروں کے نمائندے بھی... یہ ایک ایسی دنیا تھی جہاں اکثریت تین طرح کے افراد پر مشتمل تھی۔ ایک لوٹنے والوں کی... دوسری لٹنے والوں کی اور تیسری دلالوں کی جو لوگوں کو فائدے کی بات سمجھاتے تھے اور سمجھدار لوگ اپنا نقصان نہیں کرتے تھے... کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر عمل کرتے تھے۔ اس سے نقصان حکومت کو ہوتا تھا۔ اس درآمد کنندہ کو ہوتا تھا جو چار روپے کا مال امپورٹ کرتا تھا اور حکومت کو سارے واجبات ادا کرتا تھا۔ یہ کسمپرسی کی دنیا تھی جہاں اپنی ذات سے وابستہ مفاد کے سوا کوئی کچھ نہیں دیکھ رہا تھا۔

مجھے بھی کسی نے نہیں دیکھا... بھیک مانگنا ویسے بھی مشکل کام تھا۔ معلوم نہیں مجبور آدمی کس طرح دست سوال دراز کرتا ہے اور اس کے لیے کتنی بار وہ اپنی عزت نفس کو قتل کرتا ہے۔ جو کچھ میں کر رہا تھا وہ عزت نفس کا نہیں اپنے تحفظ کا مسئلہ تھا... مجھے جب کہ سب کے درمیان رہنا تھا اور کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے رہنا تھا... یہ سرفروشی کا مشن بھی تھا۔ مجھے بیک وقت ملک دشمنوں کی مشتبہ سرگرمیوں پر بھی نظر رکھنی تھی اور رابعہ کو بھی تلاش کرنا تھا۔ اپنے فقیرانہ لباس کے باعث میں بہت غیر نمایاں ہو گیا تھا۔ وہاں تو جانے کتنے لوگ مجھ سے زیادہ پھٹے پرانے کپڑوں میں معذوریت کی تصویر بنے درد مند دل رکھنے والوں کو متوجہ کرنے کے لیے رقت آمیز پیرائے میں... خدا رسول کے واسطے دے کر... اپنے دکھ اور مصائب کی جھوٹی کہانیاں سنا رہے تھے اور بیٹھے تھے۔ ان کے زخم مصنوعی تھے... ان پر خون نہیں تھا لال رنگ تھا... ان کا لہجہ مصنوعی تھا۔ بس ان کی آواز میں معذوریت کی پکار اصلی لگتی تھی۔ اس فن سے ان کا معاش وابستہ تھا، چنانچہ وہ اپنا سارا کمال فن اپنی آواز کو زیادہ سے زیادہ دردناک بنانے میں صرف کرتے تھے اور ایسی باتیں بکثرت کہتے تھے کہ حساس دل رکھنے والے کا ہاتھ خود بخود جیب میں چلا جائے۔

پہلے چند قدم میں خاموش چلتا رہا... پھر میں نے جھک کر ایک ٹوٹا ہوا بانس اٹھا لیا جو غالباً کسی فرش صاف کرنے والے برش کا باقی ماندہ حصہ تھا اور بے کار سمجھ کے پھینک دیا گیا تھا۔ اس کو لاٹھی بنا کے میں نے تھوڑا سا جھک کر چلنا شروع کیا۔ میں نے ایک موٹی توند والے ادھیڑ عمر کے سیٹھ ٹائپ شخص کو اپنے قریب سے گزرتا دیکھا۔ "اے بابا۔" میں نے اس کا دامن پکڑ لیا۔ "مرے جا بچے..."

"کیا ہے جاؤں... یہ واسکٹ ہے۔" اس نے واسکٹ چھڑا لی۔

میں پھر اس کے پیچھے چل پڑا۔ "اللہ تجھے کیسے نیند... تیرا ہارٹ فیل نہ ہو... تو کسی بس کے نیچے آکے نہ مرے۔"

وہ شخص ایک دم خوفزدہ ہو گیا۔ "یہ لو..." اس نے اپنی واسکٹ میں سے سو کا نوٹ نکالا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اب اللہ کرے کہ یہ سب تیرے دشمنوں کے ساتھ ہو۔" میں نے دعا دی۔ "سو بچے میں تو بچ گیا بچے... اب ذرا اپنے دشمنوں کو بھیج دے... یا ان کا نام بتا جا۔ فون نمبر بتا دے۔"

"کیا مطلب؟" اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"انہیں بھی تو ایسی ہی دعا کی ضرورت پڑ سکتی ہے بابا۔" میں نے کہا۔

"یہی دعا تم ان کے لیے بھی کرو گے؟"

"کیوں نہیں کریں گے بابا... فقیر کا تو کام ہی دعا دینا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ زیادہ سخی ہوں... وہ سو روپے والی دعائیں... جو زیادہ پاور فل ہوتی ہے... پانچ سو والی اسپیشل بددعا ہے تیرے خلاف کیونکہ وہ تیرے دشمن ہیں... آگے اللہ کی مرضی... فقیر کی دعا لگے یا بددعا۔"

اس شخص کا غصہ اور بے بسی کی حالت دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آنے والی تھی لیکن وہ جلدی میں تھا اور جو سو کا نوٹ میں اندر والی جیب میں ڈال چکا تھا وہ واپس نہیں ہو سکتا تھا... وہ مجھے گھورتا ہوا اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ میں نے اسے اچھا سبق دیا تھا۔ اپنے حق میں کسی اور سے [illegible] دعا کرانے والے اور دشمن کے لیے تباہی مانگنے والے [illegible] بھول جاتے ہیں کہ ان کا وہ دشمن بھی تو یہ سب کچھ [illegible] دعائیں اور بددعائیں، تعویذ گنڈے... جادو ٹونے... [illegible] اور اگر یہ تدبیر کے فیصلے یوں بدلنے لگیں تو کاتب تقدیر کا [illegible] حرف غلط ہو جائے۔

وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے ایک بد قماش شخص عورت سے دس روپے جھٹکے... صرف اس دعا پر کہ اللہ تجھے موذی سے بچائے اور ساس سے نجات دلائے۔ پھر اچانک ایک مونچھوں والے نے مجھے لات ماری... میں منہ کے بل گرنے سے بچا۔

"تو کون ہے بے؟ کس کا آدمی ہے؟"

"کیا تو آدمی نہیں ہے بچے... ہم تو اللہ کے بندے ہیں۔" میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔ وہ بھاری بھرکم جسم لمبی مونچھوں والا کرخت صورت شخص کوئی بدمعاش تھا۔ اس نے پیچھے گلے سے دبوچ لیا۔

"چرسی بازی کرتا ہے..." اس نے مجھے ایک گالی دی۔ "کس کی اجازت سے آیا ہے یہاں کمائی کرنے؟ سالے ہڈی پسلی ایک کر دوں گا... جانتا نہیں یہ میرا علاقہ ہے۔"

"ارے معاف کر دے استاد۔" میں نے گڑگڑا کے کہا۔ "بھول ہو گئی ہم سے کہ تم سے لائسنس نہیں لیا۔"

اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ "کہاں سے آیا ہے؟"

"حیدرآباد سے استاد۔" میں نے کہا۔ "ادھا ختم ہو گیا تھا۔"

"دیکھ... ہم سے ہیرا پھیری نہیں چلے گی۔" وہ بولا۔ "یہ کراچی ہے کراچی... نکال پچیس روپے۔"

"پچیس روپے؟... یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

"زیادہ ہیں تو باہر نکل..." وہ بولا۔ "باہر کھڑے رہنے کے بھی دس روپے دینے پڑیں گے۔"

"کس کو... تمہیں؟"

"نہیں... وہ دوسرا ٹھیکیدار ہے۔" وہ بولا۔ "یہاں فائدہ ملے گا... آج دو جہاز لگے ہیں۔"

"مگر استاد ابھی تو دہاڑی شروع ہوئی ہے۔"

"یہ کراچی ہے کراچی... یہاں ادھار نہیں چلتا بیٹا۔" وہ بولا۔ "پہلے صبح آتے ہی جتنا مانگا دے دو... پھر تمام دن مانگتے پھرو۔ جو ملے تمہاری قسمت کا وہ تمہارا... سات بجے باہر..."

"سات بجے کیوں استاد؟"

"سات بجے کے بعد دوسرے ٹھیکیدار کے آدمی آ جاتے ہیں۔ تو حیدرآباد سے نیا آیا ہے اس لیے بتا رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"اچھا..." میں نے پچیس روپے نکال کے اسے تھما دیے۔ "کیا میں شام کی شفٹ میں نہیں جا سکتا؟"

"وہ تیری مرضی... پچاس روپے لگتے ہیں۔" وہ بولا۔ "رات سے صبح تک۔"

"رات کے ڈبل کیوں؟"

"ابے ساری کمائی تو رات کو ہی ہوتی ہے... مگر یہ اچھا بات نہیں ہے... فیصلہ کر لے آج کر دوں میں نہ کے گا یا رات کو۔" وہ جاتے جاتے بولا۔ "اپنی اور اس کی بہت لگتی ہے۔"

جب وہ چلا گیا تو میں راجا کے پیچھے بھاگا۔ وہ بہت دور نکل گیا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں بھیڑ بھاڑ میں اسے گم نہ کر دوں۔ فقیروں کے ٹھیکیدار سے ملاقات کا تجربہ میرے لیے نیا تھا۔ راجا ایک لانچ کے کسی ملازم سے بات کر رہا تھا۔

"کچھ پتا چلا؟" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "دوست محمد تو یہاں بہت ہیں مگر ان میں منگیک کوئی نہیں ہے۔"

"یار ایک شخص نے مجھ سے پچیس روپے رکھوا لیے... بڑا بدمعاش بن رہا تھا۔"

"ٹھیکیدار ہو گا اس علاقے کا۔"

"کیا مطلب... میں بھیک بھی نہیں مانگ سکتا یہاں؟"

"نہیں... یہاں جتنا سب کو دینا پڑتا ہے... تو خواہ ننگا یا اندھا ہو... بھیک مانگ یا مزدوری کر... جس ٹھیکیدار کا علاقہ ہے، وہ اپنا حصہ وصول کیے بغیر تجھے گھسنے نہیں دے گا۔" وہ بولا۔

"مزدوری کی مزدوری میں سے بھی حصہ بٹاتے ہیں وہ؟"

"مزدوری ملتی ہی ان کے ذریعے ہے۔" وہ بولا۔

"یہ ٹھیکیدار کیا ہوتا ہے؟"

"مڈل مین... وہ سب کو ان کا حصہ پہنچاتا ہے۔ پولیس کو... بندرگاہ کے ان مہربان حکام کو جو فقیروں کو اندر آنے دیتے ہیں... نیچے سے اوپر تک سب کو خوش تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ پچھلے ٹھیکیدار نے پچاس میں سے دس اپنے پاس رکھے گا۔ باقی پندرہ دوسروں میں تقسیم کرے گا۔"

"جو باتیں تم مجھے بتا رہے ہو کیا یہ دوسرے نہیں جانتے؟"

"کیوں نہیں جانتے۔" راجا نے کہا۔ "پولیس اور پبلک کی آواز کوئی نہیں سنتا... اچھی اپنی کمائی کے ویسے یہ لوگ کیسے بند کر سکتے ہیں... ابھی تم دن بھر پھر کے دیکھو... کیسے دلچسپ تجربات ہوں گے... یہ بتاؤ کمائی کتنی ہوئی؟"

"ایک سو دس روپے ملتی پچیس دے چکے۔" میں نے کہا۔

وہ حیران نظر آنے لگا۔ "اتنی سی دیر میں ایک سو دس مل گئے؟"

"دینے والے کی مرضی۔" میں نے اوپر انگلی اٹھا کے کہا۔

شام تک ہمیں دوست محمد کی تلاش میں کوئی خاص کامیابی

www.paksociety.com

حاصل نہیں ہوئی۔ ایک شخص سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ اس قسم کا ایک آدمی ہے تو سہی مگر وہ کہاں ملے گا... یہ کوئی نہیں بتا سکتا... میں نے تقریباً پانچ سو روپے کمائے۔ آدمی کی صورت اس کا حلیہ اور پریشانی دیکھ کر حسبِ ضرورت دعا دی۔ شام تک میں تھک گیا اور ایک جگہ بیٹھنے پر مجبور ہو گیا۔
"حق اللہ..." میں نے نعرہ لگایا۔ "جو اسے خدا دے دے اس کا بھلا... جو نہ دے اس کا بھلا کرے۔"
ایک نوجوان چلتے چلتے واپس آ گیا۔ اس نے مجھے دس روپے دیے اور کہا "بابا... بس دعا کرو آج ڈیل ہو جائے۔ کئی سو دوں کا اگر یہ دعا قبول ہو گئی... السلام علیکم..."
"اللہ کرے تیری چھت تجھ پر نہ گرے۔" میں نے ایک قلی کو جاتے ہوئے دیکھ کر صدا لگائی۔ "تجھے کرنٹ نہ لگے۔ تیرے بچوں کو خسرہ نہ ہو۔ یرقان اور کالی کھانسی نہ ہو... کسی کو پاگل کتا نہ کاٹے۔" ایک عورت رک گئی۔ اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ مجھے دس روپے نذر کیے۔ اس کا شوہر بڑبڑاتا رہا کہ یہ سب فراڈ لوگ ہیں۔ تم آ جاتی ہو ان کی باتوں میں... اتنی مضبوط چھت ہے... گر کیسے سکتی ہے۔ اور بچوں کو تو ہم نے سارے ٹیکے لگوائے ہیں... یہ مجھے پاگل کتا کہہ رہا ہے۔"
مگر عورت کی سوچ جذباتی اور غیر منطقی ہوتی ہے اور وہ بچوں کی صحت کا تحفظ مانگتی ہے۔ خواہ وہ کہیں سے بھی ملے... کسی جھوٹے پیر سے یا تسلی کے دو بولوں سے۔
مجھے کچھ ناخوشگوار تجربات بھی ہوئے... بہت سے لوگوں نے مجھے دھتکارا۔ چند ایک نے گالیوں سے نوازا اور شرمندہ کرنے کی کوشش بھی کی کہ ہٹے کٹے مشٹنڈے ہو... کام کیوں نہیں کرتے... میں نے جواب میں کہا کہ جاؤ بابا تم کام کرو۔ فقیر کا نام مت ضائع کرو۔ پھر ایک پولیس والا آ گیا۔ اس نے مجھے شوقیہ ایک ڈنڈا رسید کیا اور مجھ سے دس روپے مانگے۔
"بابا صبح سے تو صرف یہی پچیس روپے۔" میں نے فریاد کی۔
"نکال دس روپے۔" وہ آنکھیں نکال کے غرایا۔ "ورنہ ابھی چرس برآمد کرا دوں گا۔"
میں نے اسے با دلِ ناخواستہ دس روپے دیے۔
"سگریٹ نکال۔" وہ مطمئن ہو کے میرے پاس ہی ایک مٹکے پر بیٹھ گیا۔ "ایک نمبر والا یا کر دو نمبر..."
"میں سگریٹ نہیں پیتا۔" میں نے کہا۔ اس کی بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی۔
"او تیری میاں... نہیں تو مت دے۔" وہ بھنّاتے ہوئے بولا۔
کیا عجیب بات ہے... جو سگریٹ نہ پیتے ہوں وہ بھی پلانے کے لیے ضرور اپنے پاس رکھیں۔ میں نے سوچا کہ قطعاً ہی نہیں۔
سپاہی کا منہ لٹک گیا۔ "باہر سے جھاڑ آیا ہے نا۔ ایک نمبر کی پانچ میں بک گئی... دو نمبر کی تین روپے میں... اچھا... ادھر دیکھتا ہوں۔" وہ ہاتھ سے اشارہ کر کے بولا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ایک نمبر اور دو نمبر سگریٹوں کے نشے ہیں۔ اور فقیر بھی یہ دھندا کرتے ہیں۔ ممکن ہے تکّی بھی کرتے ہوں... وہ جاتے جاتے واپس لوٹ آیا۔
"تو نیا آدمی ہے... ایک کام کرے گا؟"
"کیسا کام؟" میں نے کہا۔ "کوئی فائدے کا کام ہے؟"
"پانچ سو مل سکتے ہیں۔" وہ بولا۔ "سویرے ہوں گے۔"
"اچھا... کام کیا ہے؟" میں نے کہا۔
"صبح اکیاسی نمبر ملے گا تجھے۔"
"اکیاسی نمبر کیا؟"
"او پاگل کے پتر... اکاسی نمبر قلی اور کیا۔" کانسٹیبل جھنجلا کے بولا۔ "اس کے ساتھ ایک گورا ہو گا۔"
"گھوڑا... کیسا گھوڑا... کالا یا سفید...؟"
سپاہی نے مجھے ایک ڈنڈا رسید کیا۔ "گھوڑا نہیں گورا... ولایت کا رہنے والا... وہ تجھے ایک سگریٹ کی ڈبی دے گا... پیچھا کر کے وہ اپنے ساتھ اندر لے آنا۔ اور بیاسی نمبر مجھ سے ڈبی لے کر پانچ سو دے گا۔ تری کھولنی نہیں ہے۔ میرے دو بندے ہوں گے اکیاسی بیاسی..." بکھر مار کر سگریٹ... دو بندے... میری عقل چکرا گئی۔ لیکن میں نے اس معمے کو حل کر لیا۔ سگریٹ کے پیکٹ میں یقیناً چرس یا کوئی ایسی ہی چیز ہو گی... جو کوئی گورا امریکی یا برطانوی... فرانسیسی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہو گا۔ اس کے لیے کسٹم کی چیک پوسٹ سے گزرنے کا عمل خطرناک تھا۔ تلاشی میں چرس برآمد ہو سکتی تھی۔ پھر اسے کسٹم والوں سے سودا کرنا پڑتا جو شاید پانچ ہزار مانگتے۔ ایک فقیر کے ذریعے اس کا کام پانچ سو میں ہو رہا تھا۔ کسٹم والے پرانے مخبروں کو بھی پہچانتے ہوں گے جو یہ کام کر کے ان کا حق مارتے ہوں گے... مگر میں نیا تھا۔ ایک پولیس مین کے ذریعے اکیاسی بیاسی نمبر کے قلیوں سے معاملات طے کرتے تھے۔ اس میں پولیس والے کا حصہ دو سو روپے تھا۔ سو سو کے دو نوٹ... شاید سو وہ خود رکھے گا اور سو دونوں قلیوں میں بانٹ دے گا۔
میرا خون کھولنے لگا... یہ کیسے لوگ تھے جو سو پچاس روپے کے لیے ملک کے قانون کو دھوکا دے رہے تھے... معلوم نہیں ایسے کتنے لوگ تھے۔ کہاں کہاں موجود تھے جو دونوں

ہاتھوں سے قومی خزانے کا مال اپنی جیبوں میں ڈال رہے تھے۔ یہ سب ملک دشمن اور غدار لوگ تھے جو فقیر اور محنت کش مزدور اور پولیس مین کا روپ دھارے پھر رہے تھے... بے شک سب ایسے نہیں تھے مگر بدنام تو سب ہی ہو چکے تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ان میں شریف، فرض شناس اور محبِ وطن کتنے ہیں۔ آٹے میں نمک کے برابر یا نمک میں آٹے کے برابر۔
رات رہ گئی تھی اور گداگری کے "قواعد و ضوابط" کے مطابق مجھے دوسری شفٹ والوں کے لیے جگہ خالی کرنی تھی۔ راجا کی بات اب مجھے درست نظر آ رہی تھی... یہ سارے کالے دھندے رات کی تاریکی میں زیادہ بے باکی سے ہوتے ہوں گے... رات کی کمائی عورت کھاتی ہے تو فاحشہ... کسبی، طوائف... اور یہ جو اکیاسی بیاسی نمبر لگائے پھرتے ہیں۔ پولیس کی پیٹی باندھے پھرتے ہیں... کالی رات کی ساری سیاہی اپنے چہرے پر مل رہے ہیں... یہ کیا ہیں؟ کیا یہ طوائف سے زیادہ قابلِ نفرت، بدکردار اور ذلیل نہیں؟
میں نے راجا کو بتا دیا تھا کہ میرا اس کے ساتھ رہنا ممکن نہیں... ایس ایچ او اسے تھانے لا اور اے ایس پولیس مین کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے میرا راستہ روکا تھا اور اس عرصے میں راجا دو بار میری نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔ دو بار میں نے اسے تلاش کر لیا تھا مگر تیسری بار میں نے طے کر لیا تھا کہ اس کی اور میری ملاقات کہاں ہو گی۔ اس کے نہ آنے سے مجھے کچھ تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ ایک خیال تو یہی تھا کہ مجھے رات کی گداگری کا ٹھیکے وار مل گیا ہے۔ پچاس روپے کی کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے کان سے پکڑ کے باہر کر دے اور کہے کہ میں نے فی الحال دیگر وقت بند کر رکھی ہے اور تعمیر کی کوئی ویکنسی نہیں ہے۔
وہ خیال جسے میں بار بار جھٹک دیتا تھا راجا پر میرے اعتماد کی بنیادوں کو ہلا دیتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ فرار ہو جائے۔ اگر وہ فرار ہونے والا آدمی ہوتا تو میرے ساتھ ہی کیوں آتا... گزشتہ رات ہی بھاگ جاتا۔ وہ اپنے بارے میں کوئی بات ہی نہ کرتا۔ اس کا گھوڑا بھی اکرام شیخ کے پاس تھا مگر وہ پیسے کی پروا نہیں کرتا ہے۔ اس کے پاس دو لاکھ روپے پڑے ہیں اور اسے وہ تمام ٹھکانے معلوم ہیں جہاں وہ سب گر آتے ہیں جن سے دولت حاصل کرنا ممکن ہے۔ مجھے بار بار حیرت ہوتی تھی کہ کیا ایک پڑھا لکھا شریف آدمی محبت میں اتنا مجبور بھی ہو سکتا ہے کہ رسوائی تک قبول کر لے خود اپنی تعلیم کو نہ بھول جائے... اپنی عزتِ نفس کو بھول جائے۔ اصل بات وہی ہے

لکھتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا... پیشے عشق کے جو کلاسیکی افسانے مشہور ہوئے ان میں عاشقوں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ کیا مجنوں فقیروں کے لیلیٰ کے در پر سوالی نہیں ہوا تھا۔ کیا فرہاد نے پہاڑ سے دودھ کی نہر نکالنے کا ناممکن ٹھیکا نہیں لیا تھا؟ ایک صاحب وہ تھے کہ انھوں نے اپنی ران کے کباب بنا کے محبوبہ کو ارسال کر دیے تھے، حالانکہ محبوبہ قطعی آدم خور نہیں تھی۔ پھر راجا نے پانچ لاکھ جمع کرنے کی شرط قبول کر لی اور اس کے لیے یہ راستہ اختیار کر لیا تو اسے عشق کے سوا کیا سمجھا جائے گا؟
راجا کی آمد نے میرے خیالات کا تسلسل ختم کر دیا۔
"بھائی سکندر... وہ مل گیا۔" اس نے مسرت سے اعلان کیا۔
میں نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا۔ "میرا نام لینا قطعی ضروری نہیں۔ کیسے وثوق ہے؟"
"سوری... وہ جو دوست محمد ہے نا... وہ ایک لانچ پر کام کر رہا تھا۔" راجا نے کہا۔ "لانچ کو ٹرائی کرنے کے لیے گئے ہیں... رات تک آ جائیں گے واپس۔"
"کون سی لانچ ہے... نام نمبر...؟"
"نام تو اس کا ہے 'دل جلی'۔ یہ جیمن یا دس ہارس پاور کے انجن والی لانچ ہے۔" راجا نے کہا۔ "مالک کا نام بھی دوست محمد ہے۔"
"یا مظہر العجائب... وہ بھی دوست محمد ہے؟" میں نے کہا۔
"ہاں... مگر مالک کا پورا نام دوست محمد پردیسی ہے۔" راجا نے کہا۔ "اور وہ جو تمھارا دوست محمد ہے نا... وہ بس دوست محمد ہے۔"
"تو کچھ اندازہ ہے ان کی واپسی کب تک ہو گی؟"
"نہیں... نیا انجن بنایا ہے... معلوم نہیں کتنی دور تک لے جاتے ہیں مگر چار گھنٹے سے پہلے واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ رفتار کم ہوئی اور راستے میں خرابی نہ ہوئی تو وہ دو گھنٹے سیدھا جا کے لوٹیں گے۔"
"کیا وہ ابھی گئے ہیں؟" میں نے کہا۔
"ابھی دس منٹ پہلے۔" راجا نے کہا۔ "ذرا سی دیر ہو گئی ورنہ ان سے ملاقات ہو جاتی۔"
"اچھا... تو پھر تم جاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں انتظار کروں گا۔"
"یہاں انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ قسمت بارہ بجے جائیں گے واپس یہ۔" راجا نے کہا۔
"اچھا تو پھر تم نکلو میں بھی آتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اسی بنچ کے پاس جہاں ہم بیٹھے رہے تھے۔"
راجا نے سر ہلایا اور روانہ ہو گیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کسی نے ہم پر شک نہیں کیا تھا۔ دیکھنے والوں نے بھی یہی سمجھا ہو گا

www.paksociety.com

کہ ہے کوئی فقیروں سے عقیدت رکھنے والا۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک حواس باختہ مریل سا شخص میرے سامنے آ بیٹھا۔

"بابا جی... آج تو مہربانی کرو۔" اس نے کوئی چیز میری مٹھی میں دبا دی۔ میں نے کھول کے دیکھا تو وہ سو کا نوٹ تھا جسے اس نے بالکل تعویذ بنا لیا تھا۔

"کیا مانگتا ہے بچے؟" میں نے آنکھیں بند کر کے اور جھوم کر کہا۔

"ایک نمبر... جو تقدیر بدل دے۔" وہ میرے پیر دبانے لگا۔ "اب تو کچھ نہیں رہا... سب ہار گیا ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ سٹے کا نمبر پوچھ رہا ہے۔ "سیدھا ہو جا۔" میں نے گرج کے کہا۔ "الف ہو جا۔" میں نے انگلی اٹھا کے کہا۔ "ورنہ پچھتائے گا۔"

اس نے خوشی سے چیخ ماری۔ "ایک نمبر میں سمجھ گیا بابا جی۔"

"تو نہیں سمجھا سور کے بچے... تیری سمجھ دانی ٹھیک ہوتی تو بہت پہلے ہی سمجھ جاتا تو۔" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ مایوسی کی تصویر بن گیا۔ "ایک نمبر نہیں تو پھر؟"

میں نے اپنا دایاں ہاتھ اسے دکھایا۔ "یہ دیکھ۔" اور ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑایا اور سنبھل گیا۔

"پانچ نمبر؟" وہ پھر خوشی سے چلایا۔

"یہ بھی دیکھ۔" میں نے بایاں ہاتھ اٹھا کے کہا اور دوسرا تھپڑ اس کے بائیں گال پر پڑا۔ "اب کیا خیال ہے؟"

"اب میں بالکل سمجھ گیا... دس نمبر..." اس نے میرے ہاتھ چومے اور اپنے گال سہلانے لگا۔

"ہاں... دس نمبر ہے۔" میں نے کہا اور اٹھ کے چل پڑا...

میں جانتا تھا کہ ایسے لوگ کیسے کیسے طریقوں سے تقدیر بدل دینے والا نمبر نکالتے ہیں۔ اگر میں اس کے دو لاتیں رسید کر دیتا تو وہ سمجھتا کہ دو نمبر... یہ جیتے خوابوں کے پیچھے بھاگنے والے اور اپنا سب کچھ جھوٹی امیدوں پر ہارنے والے۔ انھیں کون کیسے سمجھائے کہ تقدیر تو کسی کے تابع نہیں... مگر تدبیر کا اختیار خدا نے بندے کو دیا ہے اور اس کے لیے عقل و شعور کی دولت سے نوازا ہے۔

باہر راجا میرے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے کباڑ خانے کی دیوار پھاند کر اپنا لباس بدلا۔ فقیری حلیے کے نیچے میرے اپنے کپڑے بالکل ٹھیک تھے۔ وگ اور داڑھی مونچھیں اتار کے میں نے یہ سب اسباب ایک پرانے اخبار میں لپیٹا اور باہر آ گیا۔

"یہ تم نے... حلیہ کیوں بدل لیا؟" راجا پریشان ہو کے بولا۔

"یار ان ہیرا والوں کی بو میرے لیے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ ایک فقیر تمہارے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھتا تو یہ بھی عجیب لگتا اور ہم اکرام کے گھر بھی اسی حلیے میں پہنچتے تو..."

"اکرام کون ہے... وہی جسے تم محسن سمجھا تھا؟"

"ہاں... ڈبل ایس آئی شیخ۔" میں نے کہا اور ہم دونوں فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ میں نے اسے اکرام شیخ اور نازو کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ اب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ چنانچہ ہم سڑک سے ہٹ کر چلتے ہوئے بالکل محفوظ تھے۔ وہاں کوئی رکشا یا ٹیکسی خالی بھی نہیں آ رہی تھی چنانچہ ہم چلتے رہے۔ ایک گھنٹے تک اور چلتے چلتے صدر جا پہنچے۔ اس ایک گھنٹے میں راجا کو ہم سب کے متعلق وہ باتیں بھی معلوم ہو گئیں جو اخباروں سے معلوم نہیں ہو سکتی تھیں۔

"یار میں تو تھک گیا ہوں۔" راجا نے کہا۔ "چلو چائے پیتے ہیں۔"

"کافی نہیں مل سکتی کہیں؟" میں نے کہا۔

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہاں سامنے ایرانی ہوٹل ہیں۔"

ایرانی ہوٹل کراچی کی اصطلاح میں ایک مخصوص فضا رکھنے والے ریسٹورنٹ ہیں۔ جس ہال نما کمرے میں ہم جا کے بیٹھے وہاں ہر میز کے گرد چار کرسیاں تھیں۔ یہ کرسیاں بہت ہلکی تھیں اور غالباً بید کی لکڑی سے بنائی گئی تھیں یا ان کی سیٹ بید کی بنی ہوئی تھی اور گول پشت والا حصہ بید کا تھا۔ چار کرسیوں کے درمیان ماربل ٹاپ میز تھی جس پر سفوف کا جگ اور نمک رکھے تھے اور مل سے چپک رہے تھے۔ اندر بھانت بھانت کے لوگ کرسیوں کے اوپر پاؤں رکھے سڑپ سڑپ چائے پی رہے تھے، سموسے کھا رہے تھے اور زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک ویٹر نے بڑی پھرتی سے گیلا کپڑا ٹیبل ٹاپ پر مارا۔

"دو دودھ پتی۔" راجا نے کہا۔ "ڈبل... اور سموسے۔"

"یہ کیا منگوا لیا تم نے... ہم چائے پینے آئے تھے۔" میں نے کہا۔

"ابھی یہ آ گئے تو معلوم ہو جائے گا کہ میں نے چائے ہی منگوائی تھی۔" راجا بولا۔ میں نے ریسٹورنٹ کا جائزہ لیا۔ وسیع و عریض کاؤنٹر کے پیچھے ایک سرخ و سفید اور موٹا تازہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے دیوار پر ملکہ فرح دیبا اور شاہ ایران کی تصویر ایک فریم میں لگی ہوئی تھی۔ باقی دیوار پر لکڑی اور شیشے کی الماریاں بنی ہوئی تھیں اور ان میں جنرل اسٹور کا تقریباً سب سامان موجود تھا۔ بسکٹ، پاؤڈر اور ٹوتھ پیسٹ سے لے کر شو پالش تک۔ یہ بھی ایرانی ہوٹلوں کا خاصہ ہے... پنجاب یا سرحد میں ریسٹورنٹ صرف چائے، لسی یا کھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ ایرانی ہوٹل بیک وقت ریسٹورنٹ اور جنرل اسٹور ہوتے ہیں۔ بیشتر لوگ سنگل چائے پی رہے تھے ایک ہی ساسر کے آدھے بھرے ہوئے

کپ کے لیے وہ صرف چار آنے دیتے تھے اور پھر ان کی مرضی وہ جب تک چاہیں بیٹھے رہیں۔ بیرا ان کے سامنے بل رکھ کے نہیں کہے گا کہ چلیے صاحب جگہ خالی کیجیے۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا شخص بار بار ایک زور دار تیز گھنٹی بجا کے کسی ویٹر کو متوجہ کرتا تھا... ویٹر کہیں بھی ہو کاؤنٹر کی طرف دیکھتا ہے اور اگر اس گاہک کو موجود پاتا ہے جس کو اس نے سرو کیا تھا تو با آواز بلند اعلان کرتا ہے۔ "کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنے۔" یہ لطیفہ بہت عام ہے۔ بہرحال گاہک کا بل یوں چیخ کر بتاتا ہے کہ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا مالک شور و غل کے باوجود صاف سن لے۔

ویٹر نے دھڑام سے درمیان میں چائے کے دو کپ رکھے۔ ایک پیرچ میں دو سموسے اور دوسری میں چٹنی رکھی اور غائب ہو گیا۔ میں نے چائے کو غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ بالکل [illegible] کے رنگ کی طرح تھا۔ کھلتا ہوا سنہری مائل سفید۔ یہ ایک خوش ذائقہ گاڑھا میٹھا اور گرم مشروب تھا اور اسی تعریف پہ پورا اترتا تھا کہ ایک دوشیزہ کے لبوں کی طرح... اس میں گرمی بھی ہے مٹھاس بھی ہے۔ مگر میں نے اسے چائے ماننے سے انکار کر دیا۔ راجا نے مجھے اس دل پسند مشروب کی تیاری کا فارمولا بتایا جس کے مطابق دودھ میں چائے کی پتی ڈال کے اتنی دیر ابالا جاتا ہے کہ پتی گل جائے۔ پھر چینی ڈال کے جوش دیا جاتا ہے یہاں تک کہ مشروب سے شیرے کی مہک آنے لگے۔ چائے کی دوسری قسم "کڑک" تھی۔ اس میں دودھ کم اور پتی زیادہ ڈالی جاتی تھی اور اس کا ذائقہ تلخ سمجھا جاتا تھا۔ عموماً یہ "کٹ" ہوتی تھی۔ چائے کے تیار کنندگان صبح سے شام تک حسب ضرورت ایک سماوار یا پتیلے میں وقفے وقفے سے تھوڑا تھوڑا چائے اور پانی ڈال کے ابالتے رہتے تھے اور سارا دن اوپر سے جوشاندہ نکال نکال کے گاہکوں کو پلاتے رہتے تھے۔ ممکن ہے دن میں ایک دو بار جب برتن میں نیچے چائے کی پتی اتنی بھر جاتی ہو کہ پانی ڈالنے کی گنجائش نہ رہتی ہو تو اسے خالی کیا جاتا ہو۔ عام طور پر صبح ڈالی جانے والی پتی تازہ دم پتی کے ساتھ ایسے ہی ابلتی رہتی تھی جیسے جہنم میں نئے پرانے گنہگار ایک ساتھ جلیں گے۔

"پھر میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا آخر... کہ تم نے مجھ بے بس کے ساتھ یہ دھوکا کیا؟" میں نے مظلوم آواز بنا کے کہا۔

راجا بھونچکا رہ گیا۔ "دھوکا... تمہارے ساتھ؟"

"ہاں میرے ساتھ... تم نے کہا تھا کہ چائے پلاؤں گا... اس میں چائے کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ تو کچھ مائع قسم کی ربڑی ہے۔"

راجا ہنسنے لگا۔ "اچھا میں چائے منگاتا ہوں۔"

اس نے پھر ویٹر کو چیخ کر متوجہ کیا اور اسے "ایک اسپیشل" لانے کو کہا۔ ویٹر نے سر ہلایا اور غائب ہو گیا۔ دوسری مرتبہ وہ ایک ٹرے کے ساتھ حاضر ہوا۔ اس میں چائے کے تمام اجزائے ترکیبی الگ الگ پائے جاتے تھے۔ فلاسک قہوہ... دودھ اور چینی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس شہر میں چائے بھی ملتی ہے۔

جب میں سموسے کو توڑ کے نگلنے کی مشق کر رہا تھا تو میری نظر بھٹک گئی۔ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دو اجنبی تھے۔ پہلے شخص کی میری طرف پشت تھی لیکن میں اس کا سائڈ پوز دیکھ کر اسے پہچان گیا تھا۔ یہ وہی بچہ باز غنڈا لیور تھا جو افتخار عارف کے گارڈ سے فرار ہو گیا تھا۔

میں ایک دم کرسی سے اٹھا۔ "راجا... تو ادھر آ جا۔"

راجا نے مجھ سے کرسی بدل لی۔ "اس کرسی میں کھٹمل ہیں کیا؟ کراچی میں رہنا ہے تو..."

"یار پیچھے ایک شخص بیٹھا ہے۔"

"تمہارے پیچھے دس ہزار اشخاص بیٹھے ہیں۔" راجا نے کہا۔

"وہ جس نے دھاری دار جاکٹ پہن رکھی ہے۔" میں نے کہا

"وہ... ہاں... اس کے ساتھ والے نے قراقلی ٹوپی لگا رکھی ہے۔"

"ساتھ والے کو گولی مارو۔" میں نے کہا۔

"پستول تمہارے پاس ہے۔" راجا نے کہا۔ "مگر نمبر... ناؤ؟"

"راجا... یہ مذاق کی بات نہیں۔ اس آدمی کا پتا کرنا ہے۔ کیا نام ہے اس کا اور کہاں رہتا ہے۔ یہ ایک خطرناک گروہ کا آدمی ہے اور غالباً اسی نے افتخار عارف کا قتل کیا ہے۔ اس نے یا اس کے کسی ساتھی نے۔ یہ مجھے پہچانتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھیں نہیں جانتا۔"

"تم کیا چاہتے ہو... میں اس کے پیچھے لگ جاؤں... نہیں دوست... میں اس مرحلے پہ فوت ہونا نہیں چاہتا جب کہ میں نے عشق کا آدھا امتحان پاس کر لیا ہے۔" وہ بولا۔

"یار عقل اور ہمت سے کام لو... دور رہ کے دیکھو... یا قریب جا کے ان کی باتیں سنو۔" میں نے کہا۔ "شاید کسی کا نام معلوم ہو جائے... انتظار کرو باہر... شاید کسی کار میں آئے ہوں تو کار کا نمبر پتا چل جائے... میں جا رہا ہوں۔"

"اگر تم نے وہ فقیری لباس نہ بدلا ہوتا تو تمھیں کسی کا ڈر نہ ہوتا اور تم خود یہ کام کر لیتے۔" راجا نے مجبوراً سر ہلایا... میں سیدھا دروازے کی طرف بڑھا اور باہر نکل کے پان سگریٹ کی ایک دکان پہ رک گیا۔ سگریٹ کا پیکٹ خرید کے میں سامنے بورڈ کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ میں دوسری سگریٹ سلگا

www.paksociety.com

رہا تھا کہ وہ تینوں نمودار ہوئے اور مخالف سمت میں فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ ان کے پیچھے راجا نمودار ہوا۔ اس کی نظریں مجھے تلاش کر رہی تھیں۔

"کچھ پتا چلا؟" میں نے اس کے قریب جا کے کہا۔

وہ اچھل پڑا۔ "ہاں... اس کے بارے میں تو نہیں مگر وہ جو قراقلی ٹوپی والا تھا نا... اس کا نام سیٹھ اکبر ہے۔ ویٹر اور منیجر سب اسے جانتے ہیں۔ وہ یہاں آتا رہتا ہے۔"

"اچھا؟ پھر میں آیا ایک منٹ میں۔" میں نے کہا اور لوٹ کر ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔ میں نے کاؤنٹر کے پاس رک کر ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور پھر منیجر کے پاس چلا گیا۔

"وہ... سیٹھ اکبر نہیں آیا؟"

"آیا تھا... چلا گیا..." منیجر نے مختصراً کہا اور اپنے کام میں مصروف رہا... وہ مختلف درازوں میں سے نکلے نوٹ اور کوائن نکال کے گاہکوں اور ویٹروں کو دے رہا تھا۔

میں نے سر پہ ہاتھ مارا۔ "اپن کو یہی ڈر تھا... تھوڑا دیر ہوگیا پر اپن کیا کرے... سالا ٹرین ایچ لیٹ تھا۔"

"کام کی بات کرو بابو... سیٹھ اکبر کو ملنے کا مانگتا ہے؟" بے حد مشینی انداز میں کام کرنے والے منیجر نے پوچھا۔

میں نے سر ہلایا۔ "سیٹھ اکبر کا بہت نقصان ہو جائیں گا۔"

منیجر نے کھٹاک سے ایک دراز کھولی۔ ایک پرچی اور بال پوائنٹ نکال کے کچھ لکھا۔ کچھ کہے بغیر اس نے پرچی مجھے تھما دی اور وہ بے حد کرخت آواز والی گھنٹی دبا دی جو بالکل خطرے کے الارم کی طرح تھی۔ میں پرچی کو دیکھتا ہوا باہر آگیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا: "مٹھی بائی بلڈنگ، جاجیانی لین... کھارادر... تیسرا مالا۔"

راجا نے مجھے سمجھایا کہ یہ مشکل پتا ہے۔ ہم کھارادر کے علاقے سے واقف نہیں تھے۔ جاجیانی لین کو تلاش کرسکتے تھے اور پھر آسانی سے مٹھی بائی بلڈنگ تک پہنچ سکتے تھے۔ میں نے خود کو راجا کے سپرد کیا۔ بقول شخصے شاعر "ناخدا میری قسمت کے جی چاہے جہاں لے چل۔" میں خود اس بکھرے شہر کے جغرافیے سے بالکل بھی واقف نہیں تھا۔

راجا ایک ماہر سراغ رساں ثابت ہوا۔ اس نے پرانے شہر کی پیچ در پیچ گلیوں میں مختلف افراد سے انھی کی زبان میں رہنمائی حاصل کی اور جاجیانی لین تلاش کرلی۔ اس تلاش میں ہم وزیر مینشن کے سامنے سے بھی گزرے جو قائداعظم کی جائے پیدائش تھی اور اب ایک قومی یادگار ہے۔ اس وقت عمارت بند تھی چنانچہ میں نے اس کے در و بام کو جذباتی وابستگی کے ساتھ دیکھا اور ایک عجیب احساس سے دوچار ہوا۔ میں نے اس شخص کا در بھی ایسے ہی گزرتے گزرتے دیکھا جسے قوم نے بابائے قوم کا خطاب دیا تھا۔ اب میں اس جگہ کھڑا تھا جہاں پیدا ہونے والے بچے نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی ناقابل فراموش جنگ لڑی تھی۔ ایک قوم کی رہنمائی کی تھی اور بالآخر ان کو ایک ملک جسے کہ تاریخ میں لاثانی و لافانی مقام حاصل کرلیا تھا۔ یہی اس شخص کا مشن تھا جس کے پورا ہونے کے بعد وہ بس ایک سال جیا۔ اس نے کہا کہ لو... پاکستان تمھیں میں نے خدا کی مدد سے اپنی زندگی میں ہی بنا کے دے دیا۔ اب اسے تم سنبھالو۔

مگر کیا ہم اسے سنبھال سکے تھے؟ آج کے دن تک ہم نے بابائے قوم کے ساتھ کیے ہوئے کسی وعدے کو پورا کیا تھا؟ ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی تھی؟ یہ گھر ایک عظیم زندگی کا نقطۂ آغاز تھا تو وہ مزار اسی زندگی کے عظیم خواب کی تکمیل کی علامت۔ مگر بابائے قوم کی قوم اس کے بتائے ہوئے راستے سے بھٹک گئی تھی بلکہ ملک کے اندر ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے والے اور اس کی بنیادوں کو کمزور کرنے والے عناصر اتنے طاقتور ہوگئے تھے کہ ایک ملک کے وہ حصے کرنا چاہتے تھے۔ وہ مذہب کی مشترک اساس کو بھول کر زبان اور جغرافیائی محل وقوع کے اختلاف کی سیاست میں الجھ گئے تھے۔ اتحاد، یقین محکم اور تنظیم کے تین اصول بھول کر چھ نکات کے نعرے لگا رہے تھے۔

راجا نے مجھے کھینچا تو میں چونکا۔ "یہاں پھر کبھی آئیں گے۔"

میں نے تلخی میں سر ہلایا۔ "مجھے تو حوصلہ نہیں پڑتا... ڈر لگتا ہے کہ میں نے ان دیواروں کے اندر قدم رکھا تو مجھے قائداعظم مل جائیں گے۔ اور وہ مجھ سے کہیں گے۔ ویل مسٹر سکندر بخت۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے... ممکن ہے وہ یہی بات دوسروں سے بھی پوچھتے ہوں۔ کوئی جواب ہے کسی کے پاس اس سوال کا؟"

"تم بہت جذباتی آدمی ہو۔"

"تم غلط کہہ رہے ہو۔ میں بہت پریکٹیکل آدمی ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایسا نہ ہوتا تو میں اپنی ذات کی حد سے آگے نہ بڑھتا۔ میں انھی جذبات پر قناعت کرلیتا جو راجہ کے لیے میرے دل میں تھے۔ اور اس میں اپنا گھر بساتا اور دس کروڑ مسلمانوں کے اس گھر کے غم میں خوار نہ ہوتا جسے ہم پاکستان کہتے ہیں۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ایک جسم کے دو بازو ہیں۔ دونوں بازو بھی الگ ہوتے ہیں۔ مگر وہ ایک وجود سے تو بے تعلق نہیں ہوتے۔ دایاں ہاتھ کبھی بائیں ہاتھ سے نہیں کہتا کہ میں مظلوم ہوں... یا افضل ہوں... اور اس جسم سے الگ ہونا چاہتا ہوں۔"

مٹھی بائی بلڈنگ پانچ منزلہ عمارت تھی جس میں فلیٹوں کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے تو بس لاتعداد بالکونیاں نظر آئیں جن میں بچے کپڑے فالتو سامان ٹی وی کے انٹینا سب کچھ بھرا ہوا تھا۔ یہ جگہ کی کمی کا مسئلہ تھا کہ شہر اب اوپر اٹھنے لگا تھا۔ لوگ مرکز سے دور نہیں جانا چاہتے تھے تاکہ آمد و رفت کے مسائل سے بچ سکیں۔ چنانچہ عمارات کی بلندی بڑھ رہی تھی۔ ایسا صرف شہر کے وسطی کاروباری علاقے میں تھا۔ مضافات کی پوش آبادیوں میں دو ہزار اور چار ہزار گز پر محیط کوٹھیاں بھی بن رہی تھیں۔

"کیا خیال ہے۔ چوتھے مالے پر چلیں؟" راجا نے کہا۔

"چلو... مگر وہ قراقلی ٹوپی والا سیٹھ اکبر مل گیا تو کیا کہو گے اس سے؟" میں نے کہا۔ "میں تو اس کے سامنے جا نہیں سکتا۔"

"کیوں نہیں جا سکتے؟ کیا ہر شخص تمھیں پہچانتا ہے؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر وہ ہر شخص میں شمار نہیں ہوتا۔ وہ ایک مخصوص گروہ کا آدمی ہے اور اس گروہ نے صرف میری تصویریں ہی نہیں میری آواز کے ٹیپ تک پھیلا رکھے ہیں تاکہ میں حلیہ بدلوں تو آواز سے پکڑا جاؤں۔"

"اچھا... میں جاتا ہوں۔" وہ بولا۔ "پہلے تو اس کے فلیٹ کا نمبر دیکھ آؤں۔"

"ہاں... اگر وہ اندر ہو تو اس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہو تو پوچھ لینا کہ صبح وہ کہاں ملے گا۔"

"کس سے پوچھ لوں؟"

"گھر میں... اس کی بیوی ہو سکتی ہے... بچے ہو سکتے ہیں یا ورنہ آس پاس کے لوگ ہوں گے۔"

"اور انھوں نے پوچھا کہ تم کیوں پوچھ رہے ہو... پھر؟"

"پھر میرا سر۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "کیا میں تم کو بولنا بھی سکھاؤں... ویسے تو بہت باتیں کرتے ہو۔"

وہ سر کھجاتا ہوا پرانے زینے پر چڑھ گیا اور میں ایک کھمبے کے پاس کھڑا ہوگیا جہاں چار نوجوان تاش کھیل رہے تھے اور چار پانچ تماشائی ان کے مشیر بنے ہوئے تھے۔ یہاں کوئی میری صورت پر غور کرنے والا نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے کھیل میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے شروع سے بازی دیکھی ہوتی تو اور بات تھی۔

اچانک کھیل کا میدان جنگ کا میدان بن گیا۔ ایک شخص نے اپنے پتے پھینک دیے۔ "پتا رکھ کے کون کہتا ہے؟"

"کون... کہتا ہے...؟" فریق ثانی نے ایک اچھی سی گالی دے کر کہا۔ تیسرے نے چیخ کر کہا۔ "پتے دکھاؤ۔"

یہ جو تھا جو اصل مجرم تھا فوراً اس پہ حملہ آور ہوا... پلک جھپکتے میں انھوں نے ایک دوسرے کو مکے مارنے شروع کیے اور ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑ دیے۔ دو تماش بین بھی جو پیوستہ واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے علم صداقت بلند کرتے ہوئے جہاد میں شرکت کی اور مار کھانے لگے۔ ایک تو بہت ہی منحنی سا بانس نما شخص تھا جب اس کے پیٹ میں کسی نے سر سے ٹکر ماری تو وہ مجھ پر آ گرا۔ میں نے اسے فوراً واپس کر دیا مگر اس کا نقصان یہ ہوا کہ دوسری ٹکر نے مجھے چت کر دیا۔ ٹکر مارنے والا بیل نہیں تھا مگر بل فائٹنگ میں بل کا پارٹ ادا کر سکتا تھا۔

راجا نے آکے مجھے اٹھایا۔ "یہ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں... معمولی سا معرکۂ حق و باطل تھا۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ باقی لوگ پھر کھیل جاری رکھنے پر متفق ہوگئے تھے اور متنازعہ بازی منسوخ کر دی گئی تھی۔

"وہ تیرہ نمبر فلیٹ میں رہتا ہے۔" راجا نے مجھے مطلع کیا۔ "مگر اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس کے بیوی بچے یہاں نہیں رہتے۔"

"پھر کہاں رہتے ہیں؟"

"کیا یہ بھی معلوم کرنا تھا؟" راجا نے کہا۔

"نہیں... مگر یہ بات کس نے بتائی تمھیں؟"

"ایک پڑوسی نے... پان کھا کر تھوک رہا تھا کہ وہ آ گیا۔ میں نے پوچھ لیا کہ اکبر سیٹھ کہاں ملے گا۔ اس نے کہا ابھی تو پتا نہیں۔ صبح آفس میں ملے گا۔ اس کا آفس آگرہ تاج کالونی سے آگے ہے۔ جہاں سب ٹرک اسٹینڈ ہیں۔ وہ آرلے والا اینڈ کمپنی کا منیجر ہے۔"

"آرلے والا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "نہ آرلے سنز نہ آرلے برادرز... یہ کیا بات ہوئی؟"

"باپ کاروبار کرتا اور بیٹے شریک ہوتے تو نام آرلے سنز ہوتا... یہاں معاملہ الٹا لگتا ہے۔" راجا بولا۔ "کہ بیٹوں نے کاروبار شروع کیا اور والد ماجد کو اخلاقاً پارٹنر بنا لیا۔ مثلاً رشید عزیز اینڈ کمپنی کو رشید عزیز والا اینڈ کمپنی کر لیا یا مختصراً آرلے والا اینڈ کمپنی۔"

"ایسی اوٹ پٹانگ حرکت کرتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔"

"آئندہ تم ایسا نہیں کہہ سکو گے۔" راجا ہنسا۔ "یہ کراچی ہے پیارے کراچی۔"

"کیا یہ بتانا ضروری سمجھا جاتا ہے؟ جسے دیکھو یہی کہتا نظر آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں بھی جانتا ہوں کہ یہ کنبو یا کھٹمنڈو نہیں ہے۔"

"لاہور والے بھی تو کہتے ہیں کہ لاہور لاہور ہے۔" راجا بولا اور اس کی دلیل نے مجھے لاجواب کر دیا۔ غالباً ہر شخص اپنے

www.paksociety.com

ملک! اپنے شہر اپنے قصبے گاؤں جیتے اور گھر سب پر ناز کرنے کا حق رکھتا ہے۔

میں نے آپ لے والا وایند کیتی کے معاملے کو شورے وشورے میں منتقل کیا اور کلائی کی گھڑی دیکھ کر واپسی کی فکر میں مبتلا ہو گیا۔ رات کے سوا نو بج چکے تھے۔ اکرام شیخ اور نازو یقیناً ہمارے انتظار میں پریشان ہو رہے ہوں گے۔

میکلوڈ روڈ پر اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی پرانی عمارت کے سامنے راجا نے ایک ٹیکسی روک لی۔ دھوبی گھاٹ کا نام سن کے ڈرائیور نے برا سا منہ بنایا مگر اس سے پہلے کہ وہ انکار کرتا میں دروازہ کھول کے اندر بیٹھ گیا۔

"میں اُدھر نہیں جا رہا ہوں۔" ڈرائیور برافروختہ ہو کے بولا۔

"مگر ہمیں تو اُدھر ہی جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور ہم تمھیں بھی لے کر جائیں گے۔"

"اڑی کرتا ہے۔" مکرانی ڈرائیور نے پلٹ کر کہا۔ "ابھی پھر بولتا ہوں کہ اتر جاؤ نہیں تو چھوٹا لگا دوں گا۔"

"یہ ہماری شانِ مردانگی کے خلاف ہوگا۔" میں نے کہا۔ "آخر تم ٹیکسی کس کے لیے چلا رہے ہو... لوگوں کے ٹوٹے لگانے کے لیے؟"

"اُدھر سے واپسی کا سواری نہیں ملتا۔" میرے بیچ نے اسے کچھ ٹھنڈا کیا۔ "نقصان ہوتا ہے۔"

"نقصان کا یہ کاروبار تم اپنی مرضی سے کر رہے ہو... نہیں کر سکتے تو چھوڑ دو... کوئی اور دھندا کرو۔" میں نے بے رخی سے کہا۔

راجا نے میٹر پھیر دیا۔ "چلو یار... تم کو دس روپے زیادہ دیں گے۔"

"میٹر سے پندرہ روپے اوپر لیں گا..." اس نے فیصلہ سنایا اور روانہ ہو گیا۔

"یہ کیا طریقہ ہے آخر۔" میں نے راجا سے کہا۔

"یہ کراچی ہے پیارے کراچی۔" راجا نے مجھے آنکھ مار کے کہا۔ "ابھی تم تماشا دیکھو۔"

راجا نے اچانک مکرانی سے اسی کی زبان میں دوستانہ گفتگو شروع کی۔ راجا کراچی کی پیدائش تھا اور اسی شہر کی مٹی کھا کے پلا بڑھا تھا۔ اسے گجراتی اور بلوچی دونوں زبانیں آتی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے فضا بدل گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور دانت نکالنے لگا۔ پھر انھوں نے زور زور سے ہنسنا شروع کیا۔ راجا نے ڈرائیور سے سگریٹ لی۔ اس کے پیکٹ میں دو قسم کے سگریٹ تھے۔ راجا نے چرس والا سگریٹ منتخب کیا مگر پچھلی سیٹ پر ہاتھ پیچھے جا کر مجھ سے بدل لیا۔ وہ ڈرائیور پر ظاہر کرتا رہا کہ وہ بھی چرس والا سگریٹ پی رہا ہے... نتیجہ یہ کہ جب ہم نے دھوبی گھاٹ سے کچھ پہلے ٹیکسی رکوائی تو ڈرائیور نے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور کرایہ لیے بغیر واپس چلا گیا۔ بعد میں راجا نے بتایا کہ ہم زبان ہونے کے علاوہ اس نے خود کو ہم پیشہ بھی ثابت کر دیا تھا۔ یہ کہا تھا کہ اس کی اپنی ٹیکسی ہے مگر وہ تھانے میں بند ہے کیونکہ اس کی ٹکر سے ایک ٹریفک حوالدار کی موٹر سائیکل گر گئی تھی۔

نازو گھر پر اکیلی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ "آئیے سکندرِ اعظم ثانی... میں تو سمجھی تھی کہ اب جنارگاہ فتح کر کے ہی آؤ گے لیکن صورت سے لگتا ہے کہ..."

"خبردار جو صورت کو کچھ کہا۔ لاکھوں میں ایک ہے۔" میں نے چارپائی پر گر کے کہا۔ "غالب نہیں ہوں میں۔"

"بھیا تمھارے لیے سخت پریشان تھے۔" نازو کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"اور تم... تم پریشان نہیں تھیں؟" میں نے کہا۔ "صورت سے تو ایسا لگتا ہے..."

"خبردار جو صورت کو کچھ کہا۔" وہ چیخ کے بولی۔ "لاکھوں میں ایک پانی ہے... رالعہ نہیں ہوں میں۔"

میرے ساتھ راجا بھی ہنسنے لگا۔ اس سے پہلے وہ اپنے گھڑے کو گھور رہا تھا جو ایک کونے میں رکھا ہوا تھا... اسی وقت اکرام شیخ آ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا رنگ بھی کچھ اُڑا ہوا ہے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "یہاں بھی نوٹس مل گیا جگہ کا؟"

اکرام شیخ مسکرایا۔ "نہیں یار... تم سناؤ آج کیا کیا ہے؟"

"جھک مارتے رہے۔" میں نے کہا اور انھیں جیب تک کمائی کرنے سے پولیس کے ڈنڈے کھانے اور دوست بننے کے علاوہ اکبر سیٹھ سے ملنے تک کے سب واقعات سنا دیے۔ نازو اور اس کا بھائی ہنستے رہے لیکن مجھے پھر احساس ہوا کہ ان کی ہنسی زبردستی کی ہے۔

"اکرام... تو کیا چھپا رہا ہے مجھ سے... اور کیوں چھپا رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "وقت کم ہے اس لیے فوراً بتا دے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں یار۔" اکرام نے کہا۔ "چلو کھانا تو کھا لو... آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"آج نازو نے کھانا پکایا ہے۔" وہ رونی شکل بنا کے بولا۔

"اور ہم سب کو وہی کھانا ہے۔"

"پھر تو ہاتھ دھونے کی بجائے میں وضو کر لوں... اور اللہ سے اپنے گناہ تو بخشوا لوں۔" میں نے کہا۔

"میں ہر اشتعال انگیزی کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں اور دل شکستہ ہو کے رونے والی بھی نہیں ہوں۔" وہ بولی۔

دسترخوان پر بیٹھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ نازو امورِ خانہ داری میں صفر ہے۔ اس نے جو چیز مٹر پلاؤ کے نام سے ایجاد کی تھی وہ نئی خشک اور بدمزہ تھی کہ میں اور اکرام ٹھنڈی آہیں بھرتے رہے اور پانی کے ساتھ نوالے حلق سے اتارتے رہے۔ راجا کا حال ہم دونوں سے بھی ابتر تھا۔

"مٹر اور چاول جو ہمارے معدے کے تالاب میں تیر رہے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "جب پانی بخارات بن کے اُڑ جائے گا تو مٹر چاول لیے رہ جائیں گے جیسے کنکر پتھر۔"

"اور جب ہم حرکت کریں گے تو ہمارے پیٹ میں سے ایسی آوازیں آئیں گی جیسے ہم آدمی نہیں جھنجھنے ہیں۔" اکرام بولا۔

نازو کا چہرہ سرخ ہوا مگر وہ غصہ کو پی گئی۔

"مرغ قورمے کے لیے پلاسٹک کی مرغی اچھی رہتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اب یہ ٹانگ دیکھیے۔ اسے آپ دس بار شوربے میں ڈال کے دس مہمانوں کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔"

"ویسے گھی بالکل اصلی ہے۔" اکرام نے کہا۔ "لطیفی اتفاق ضرور حاصل ہوتا ہے کہ ہم چکن قورمہ کھا رہے ہیں۔"

جب کھیر لائی گئی تو حالات بگڑ گئے۔ اکرام نے اُسے دودھ میں چاول کا زیاں قرار دیا۔ "حکومت کو خوراک کو ضائع کرنے والے افراد کے خلاف ایکشن لینا چاہیے۔ جو دودھ کو ضائع کرتے ہیں بلکہ کھانے کو بھی اور ...... کھانے والے کو بھی... یہ کھیر ہے کہ تھوبہ ہے جو گلے میں جا کے لگتا ہے۔"

"یہ کھیر ہی کھیر ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے کھانے کے لیے آدمی بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ کتے کی دُم کی طرح... پھر اسے بارہ برس تک نلکی میں ڈال کے رکھنا پڑتا ہے۔"

"کیسے... کھیر کو...؟"

"نہیں... کھیر پکانے والے کو۔" میں نے کہا۔

اس کے بعد نازو کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "تم سب بدتمیز جنگلی اور جاہل گھر میں رکھنے کے لائق جانور ہو... تم کو انسانوں والی خوراک راس نہیں آ سکتی۔" اس نے دسترخوان کا ایک کونا پکڑا اور سالن کے برتن الٹ دیے۔ دعا ہے بچارہ نازو کو سمجھا نہیں تھا۔

[illegible] نے کہا ذائقے... دیکھیے..." اور دو [illegible] وہ ہوا میں دو قلابازیاں کھاتا کونے میں جا گرا... اکرام شیخ بڑا بھائی تھا اور نازو میری طرف ہاتھ بڑھاتی تو خود وہاں نظر آتی جہاں اکرام لیٹا ہوا کراہ رہا تھا۔ بہت زود رنج عضوِ ضعیف... اس کے غصے کا نشانہ راجا بن گیا جس نے مصالحت کنندہ کے فرائض سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد جب ہم اپنی ہنسی پر قابو پاتے نازو کو منانے اور راجا کو تسلی دینے میں کامیاب ہوئے تو میں نے گھڑی دیکھی۔

"اب مجھے واپس جانا ہے... فرش بار بر..." میں نے کہا۔ "دل جانی سے ملنے۔"

"میں تمھیں لے چلتا ہوں۔" اکرام شیخ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بھی چلتا ہوں۔" راجا بولا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا۔

وہ نروس ہونے لگا... اسے یہ بات عجیب سی لگ رہی تھی کہ ہم اسے نازو کے ساتھ گھر میں اکیلا چھوڑ کے جا رہے تھے۔ مگر یہ بات ہم ہی سمجھ سکتے تھے کہ نازو کو کسی سے خطرہ لاحق نہیں... خصوصاً راجا جیسے نوجوان سے... اس کے علاوہ میں راجا کو اتنا ہی قابلِ اعتماد سمجھنے لگا تھا جتنا اپنے دوسرے ساتھیوں کو۔

"تم نازو کا خیال رکھو گے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"مگر... میرا خیال کون رکھے گا؟" وہ ایسے مظلوم لہجے میں بولا کہ مجھے غالب یاد آ گیا... وہ نازو کو چھیڑتا تھا۔ جانتا تھا کہ اس چھیڑ خانی کا انجام کیا ہوگا مگر اس کی چاہت کا انداز نہیں بدلتا تھا۔

"نازو بی بی... تم راجا جی کو ریلیف کرو۔" میں نے کہا۔ "انھیں ایم آر ایس کے موضوع پر ایک مکمل معلوماتی لیکچر دو... اور ہاں مسٹر راجا جی نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا۔"

اکرام دوسرے کمرے میں ٹیکسی ڈرائیور کی وردی پہن رہا تھا۔ میں نے تخت کے نیچے سے سوٹ کیس نکالا اور لاکھوں کے راجا کے سامنے کر دیا۔ "پانچ لاکھ پورے کرنے کے لیے تم اس میں سے جتنی رقم چاہو لو... ڈھائی لاکھ سے زیادہ کی ضرورت پڑے تب بھی کوئی حرج نہیں۔" میں نے سوٹ کیس کو ایسے ہی کھلا چھوڑ دیا۔ راجا سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔

"یہ جعلی نوٹ تو نہیں ہیں راجا جی..."

"میں... میں یہ رقم نہیں لوں گا۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"تمھارا تو باپ بھی لے گا۔" میں نے کہا اور اکرام کے ساتھ باہر نکل گیا۔

"یہ کیا ڈراما ہو رہا تھا۔" اکرام نے کہا۔

"راجا جی ایک کوہ قاف کی پری کے چکر میں ہیں۔ پری ایک لالچی دیو کی قید میں ہے... اس کی شرط ہے کہ پانچ لاکھ لاؤ اور پری کو لے جاؤ... راجا اسی لیے بھیک مانگتا تھا...

www.paksociety.com

چوری، ڈکیتی اور اسمگلنگ کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ویسے پری کا اصلی نام پروین ہے۔"

"ایک اور مریضِ عشق۔" اکرام نے سر پیٹ لیا۔ "یہ ایم آر ایس تو جانباز عاشقوں کی انجمن بنتی جارہی ہے۔"

"اسی لیے تمھاری ممبر شپ آفر کی ہے... مکمل رکنیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تم بھی کسی کے عشق میں پاگل ہو جاؤ... اتنے پاگل کہ... خیر مثال میں کیا دوں۔ تم تو پاگلوں میں گھرے ہوئے ہو۔"

"ابھی وہ لڑکی پیدا نہیں ہوئی جو مجھے پاگل کر سکے۔"

"ترمیم... وہ لڑکی دریافت نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔ "پیدا تو ہو چکی ہے اور جوان بھی ہو چکی ہے۔ بس اس کے تمھارے سامنے آنے کی دیر ہے... پھر دیکھنا... ہم بھی دیکھیں گے، دنیا بھی دیکھے گی۔"

اکرام نے مجھے اشارہ کیا۔ "یار... وہ آج میں نے تمھارے وکیل دوست سے بات کی تھی۔"

"اچھا... ہوگئی بات... ہم" میں نے دلچسپی سے کہا۔ "کیا جواب ہے؟"

"خیر... اچھی بھی اور بری بھی۔" وہ بولا۔ "میں نے تازہ سے بھی ذکر نہیں کیا ہے ابھی تک... اسے شک بہرحال ہو گیا ہے۔"

"بری خبر پہلے سناؤ۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"تمھارا وہ سرکس پلان ختم ہو گیا۔" اکرام نے کہا۔ "محسن نے منظر کو فون پر بتایا کہ صرف وہ اور جولی بچے ہیں!"

خوف کے عفریت نے مجھے یوں جکڑ لیا کہ میرا دل ڈوبنے لگا۔ "یہ... تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"انھوں نے رات کے وقت حملہ کیا تھا۔" اکرام نے کہا۔ "کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کتنے آدمی تھے، دھماکا ٹرک کے اندر ہوا۔ بس کے پرخچے اڑ گئے... اللہ بچانے والا ہے۔ محسن کچھ دیر پہلے ہی جولی کو اپنے ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔ جولی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔"

"اور... وہ..." آواز میرے حلق میں پھنس گئی۔

"اس کا مجھے بھی بہت رنج ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "ہمارا استاد ٹیڈی ہمارے مشن پر قربان ہو گیا... شہید ہو گیا۔"

ٹیڈی مر گیا... استاد ٹیڈی مر گیا... وہ شخص جو نیک محمد تھا... وہ مر گیا۔ وہ شخص جس نے زندگی کی غلط روش کو صرف اس لیے ترک کر دیا تھا کہ وہ اپنے وطن کے دشمنوں کے خلاف جنگ میں ہمارا ساتھ دے سکتا تھا۔ وہ استاد ٹیڈی جو ایک محدود حلقے میں بدمعاش سمجھا جاتا تھا۔ احساسِ محرومی کا مارا ہوا جب اسے ہم سے عزت ملی... محبت ملی اور پیار ملا تو اس کے اندر کا انسان جاگ اٹھا۔ وہ دریا دل ٹیڈی جو یاروں کا یار تھا۔ اس یاری میں اپنا سب کچھ قربان کرتا آیا تھا۔ شہلا کا منہ بولا بھائی... رابعہ کا بھائی... سب کو بھائیوں سے زیادہ چاہنے والا... سب سے زیادہ سختی جھیلنے والا... وہ مر گیا۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو کے وطن کی مٹی میں مل گیا۔ اس کی خاک پہ بکھر گیا۔ ہر فصلِ بہاراں میں نئے شگوفوں کی خوشبو میں شامل ہونے کے لیے... نئے پھولوں کے رنگ میں نکھرنے کے لیے... ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے۔ تم ان کو مردہ مت کہو کیونکہ وہ شہید ہی تو ہیں جو زندہ رہتے ہیں... اپنی دوستی کی یادوں... قربانیوں اور خلوص کی نشانیوں کے ساتھ۔

میں نے محسوس کیا کہ میں رو رہا ہوں... ٹیکسی اب شہر کے باہر کھڑی ہوئی تھی اور اکرام شیخ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے مجھے تسلی دے رہا تھا... حوصلہ رکھنے کی تلقین کر رہا تھا۔

"اس کے ساتھ... ایک اور بہادر آدمی بھی تھا۔" میں نے آنسو پونچھ کے کہا۔

"ہاں... بشیر علی نام تھا اس کا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "وہ بھی شہید ہو گیا... جولیا..."

"جولیا کو کیا ہوا..." میں نے اکرام کے اچانک خاموشی اختیار کرنے پر چونک کے کہا۔ "بول یار... جولیا کے لیے تو تم نے کہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔"

"ہاں... اسے کچھ نہیں ہوا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "مگر وہ اب ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ محسن اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ وہاں اس پر ایک عجیب انکشاف ہوا... وہ ماں بننے والی تھی۔"

میرے دماغ کو بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ "ماں بننے والی تھی... یہ کیسے ہو سکتا ہے... ڈاکٹر کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

"محسن کا بھی یہی خیال تھا... مگر ڈاکٹر نے کہا کہ اس میں کوئی شک کی بات ہی نہیں۔" اکرام نے کہا۔ "محسن واپسی پر اس سے نہیں بولا... جولیا نے خود ہی بات کی... اور کہا کہ محسن بھائی... آپ کو تو سب معلوم ہو ہی گیا ہے... میں نے آپ کے اعتماد کو دھوکا دیا... میں گنہگار ہوں... مجھے جانے دیں... محسن نے اسے مارا اور پوچھا کہ اسے شیر علی سے محبت ہو گئی تھی تو کیا وہ الو کا پٹھا شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔ کہہ سکتا تھا... میں انکار کبھی نہ کرتا... میں ہوتا بھی کون ہوں انکار کرنے والا... مگر اب میں اسے نہیں چھوڑوں گا... یہ سب باتیں یقیناً ہوئی تھیں جب محسن نے شیر علی کو گالیاں دیں... جولیا اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔"

"وہ شیر علی کو پسند کرتی تھی... مجھے بھی معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"اس نے محسن کو بتایا کہ چوری چھپے وہ شادی کر چکے ہیں۔ شیر علی کے سامنے کلمہ پڑھ کے مسلمان ہو گئی تھی۔" اکرام نے کہا۔ "نکاح کا بندوبست خود شیر علی نے کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ابھی وہ الگ رہیں گے... مگر شاید ایسا ممکن نہ ہوا۔ ہر آدمی کا نفس ایک شکاری ہے جو گھات میں رہتا ہے... اس نے بھی جذباتی کمزوری کے لمحے سے فائدہ اٹھا لیا ہوگا... جولیا کی بدقسمتی سے محسن مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ شیر علی کو سزا ضرور دینا چاہتا تھا... مگر وہ واپس پہنچے تو ٹریلر جل چکا تھا۔ وہ شہر سے بیس میل آگے جنگل میں کھڑے ہوئے تھے۔ ٹریلر میں بچے اور سرکس کا تماشا دکھانے والے بھی جل کے مر گئے... جانوروں سمیت... کسی کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ٹریلر کے جو ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے تھے ان سے جنگل میں آگ لگی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر جولیا کا دماغ الٹ گیا۔ وہ شیر علی پکارتی ہوئی بھاگی۔ محسن نے اسے روک تو لیا مگر صرف جل کر راکھ ہونے سے... صدمے سے ہونے والی دماغی خرابی کو نہیں روک سکتا تھا۔"

"او مائی گاڈ..." میں نے کراہ کے کہا۔ "کچھ لوگ کتنے بدقسمت پیدا ہوتے ہیں... کتنے مظلوم رہتے ہیں اور کتنی قابلِ رحم زندگی گزارتے ہیں۔ اس لڑکی کو موت کے شکنجے سے چھین کر لانے کے لیے ہم سب نے کیا نہیں کیا تھا۔ مگر کتنی مختصر تھی زندگی کی خوشی... باپ تو پہلے ہی نہیں تھا۔ ماں اس کی نظروں کے سامنے ماری گئی... اور اب یہ ستم کہ سہاگن بنتے ہی بیوہ ہو گئی۔ ماں بننے کی خوشخبری نے اس کا سہاگ اجاڑ دیا... اب کہاں ہے وہ؟"

"جہاں اسے ہونا چاہیے؟" اکرام شیخ نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے پاگل خانے میں؟"

اکرام نے اقرار میں سر ہلایا۔ "محسن اسے کسی نہ کسی طرح نکال کے گھر لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اسے رکھ سکتا۔ مجبوراً اسے اسپتال منتقل کیا۔ انھوں نے چند دن اپنے پاس رکھ کے پاگل خانے بھیج دیا۔ منظر نے کہا تو ہے کہ اس کا خیال رکھا جائے اور بہترین علاج ہو۔ وہ سارا خرچ دے گا اور اسے دیکھنے کے لیے آتا رہے گا۔"

"کیا اس کی کیفیت جنونی ہے؟"

"نہیں... وہ بس گم صم بیٹھی رہتی ہے... نہ بولتی ہے نہ کچھ سنتی ہے... کھانا پڑا رہتا ہے... جب بھوک لگتی ہے تو کھا لیتی ہے... جب نیند کا پتا ہو نہیں رہتا تو گر کے سو جاتی ہے۔ بالکل ایک زندہ لاش ہو گئی ہے... ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ شفایابی کے امکانات معدوم نہیں ہیں مگر سال دو سال لگ سکتے ہیں۔"

"سال دو سال... اور اس عرصے میں..."

"ہاں... اس عرصے میں وہ ماں بھی بنے گی... وہیں۔" اکرام نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ بچے کی ولادت کے بعد احساس کی دنیا میں واپس آ جائے۔ ڈاکٹر اسی چانس پر انحصار کر رہے ہیں۔ غالب کے والد کا کوئی ڈاکٹر دوست ہے۔ غالباً جولیا کو اس کے گھر پہنچانے کی بات ہو گئی ہے۔ انکل ضامن ذمہ داری کی کوشش سے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "کیا یہ بات شہلا کو بتائی گئی ہے؟"

"نہیں... وہ اسپتال میں تھی..."

"تھی کا مطلب کہ اب نہیں ہے؟"

"نہیں... زچہ و بچہ خیریت سے ہیں۔" اکرام مسکرایا۔ "یہی دوسری اچھی خبر تھی۔"

"کیا... ٹیڈی نے اسے دیکھا تھا؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"کیسے؟ شہلا کو تو اس کے بچے کے ساتھ؟" اکرام نے کہا۔ "ہاں وہ اسی دن اسپتال گیا تھا... سب کے منع کرنے کے باوجود۔ وہ بہت خوش تھا کہ میں ماموں بن گیا۔"

مجھے یاد ہے۔ "ایک بار پھر میری آنکھوں میں آنسو آگئے کہ کس طرح ایک دن وہ اور غالب اس بات پر... کہ میں بچے کا ماموں ہوں... نام میں رکھوں گا... تھا کہ وہ چچا ہے اور یہ اس کا حق ہے۔"

"اس کا نام ٹیڈی رکھا... بھی رکھا تھا۔" اکرام بولا۔

"چلو اس کی ایک آرزو تو پوری ہوئی۔"

"اب تم چاہو تو گھر جاؤ..."

اکرام نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں تمھارے ساتھ رہوں گا۔"

قتل ہار پر کے علاوہ... تھے میں مچھلیوں کی باس ہوا... تمیں ریزن کی مٹی اور ریلا رہ رہی تھی بھی بس گئی تھی... ایک عجیب سی نم آلود فضا میں سمندر کی دنیا آباد تھی... ان کے خاندان... ماہی گیری کے قبیلہ دار... ان کے ایجنٹ

www.paksociety.com

مزدوری کرنے والے، جال اور بادبان مرمت کرنے والے، انجن مکینک... سرکاری محکمے کے اہلکار... سب مصروف کار تھے۔ ہر سائز اور شکل و صورت کی سینکڑوں کشتیاں اور لانچیں روانہ ہو رہی تھیں۔ دل جانی ابھی واپس نہیں آئی تھی۔

"یہ سب رات بھر مچھلی پکڑیں گے، اور صبح دم لوٹیں گے۔" اکرام شیخ نے بتایا۔ "لیکن ان کی واپسی سے پہلے ہی ہر کشتی اور لانچ کا آکشن ہو جائے گا۔"

"کیا مطلب؟ کل دوسرے لوگ ہر کشتی اور لانچ خرید لیں گے؟"

اکرام ہنسا۔ "نیلام ان مچھلیوں کا ہوگا جو ہر کشتی اور لانچ لے کر واپس لوٹے گی۔"

"مچھلی واپسی سے پہلے نیلام کیسے ہوگا؟ کسی کو کیا معلوم کون خالی ہاتھ آئے گا اور کون کتنی مچھلی لوٹے گا؟"

"یہی تو نیلام میں بولی لگانے والوں کا کمال ہے کہ وہ کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے۔" اکرام بولا۔ "جب وہ بولی لگاتے ہیں تو ان کی پوزیشن وہی ہوتی ہے جو ریس کے گھوڑے پر رقم لگانے والوں کی ہوتی ہے جو جانتے ہیں کہ گھوڑا کس نسل کا ہے، اس سے پہلے کتنی بار جیت چکا ہے... جوکی کون ہے اور جوکی کا ریکارڈ کیسا ہے۔ یہ لوگ بھی جانتے ہیں کہ کون سی کشتی یا لانچ کدھر گئی ہے اور اس موسم میں وہاں کس قسم کی مچھلی آتی ہے۔ جھینگے ملتے ہیں یا کیکڑے تو کہاں ملتے ہیں۔ اس کشتی یا لانچ کا عملہ یعنی ماہی گیر کون ہیں۔ ان کا ساز و سامان کیسا ہے اور تجربہ کتنا ہے... پھر یہ کہ اس سے پہلے وہ اوسطاً کتنی اور کس قسم کی مچھلی لاتے رہے ہیں۔ یہ سب ذہن میں رکھتے ہوئے وہ بولی لگاتے ہیں... اور جیسا کہ کسی بھی نظام میں ہوتا ہے، بولی لگانے والوں کے درمیان بھی ایک اجارہ دارانہ رجحان ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مچھلی ضائع ہو جانے والی چیز ہے۔ اسے اسٹور نہیں کیا جا سکتا... اور خریدار وہی محدود لوگ ہیں۔ وہ ایک حد سے آگے نہیں جاتے اور عموماً آپس میں طے کر لیتے ہیں کہ تم فلاں لانچ کی بولی اتنی لگاؤ اور لے لو... مگر فلاں لانچ میری... سارا منافع تو یہی ٹھیکیدار اٹھاتے ہیں۔ ماہی گیر غریب کو تو شب بھر کی بیداری اور محنت کا پورا صلہ تک نہیں ملتا۔"

"یہ استحصالی نظام تو ہر جگہ موجود ہے۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"آج کل غیر ملکی ٹرالر ہماری حدود میں گھس آتے ہیں۔ روسی اور جاپانی ٹرالر بین الاقوامی سمندر سے ہمارے سمندر میں آ کے مچھلیاں پکڑتے ہیں اور وہ جدید ترین آلات سے لیس جہاز ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے اس سے چھوٹے ماہی گیر متاثر ہوتے ہیں، انہیں کم مچھلی ملتی ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "جب نیوی یا کوسٹ گارڈ پولیس کی لانچ آتی ہے، تو وہ بھاگ جاتے ہیں۔ پانی میں دیوار تو اٹھائی نہیں جا سکتی۔"

"کیا وہ صرف مچھلیاں پکڑتے ہیں؟" میں نے اس بحث کو اپنے طور پر دوسرے زاویے سے دیکھا۔

"مچھلیوں کے ساتھ تو جال میں سب ہی پکڑے جاتے ہیں، ہر قسم کی سمندری مخلوق..."

"میرا مطلب تھا کہ کیا وہ مچھلیاں پکڑنے کے سوا کوئی کام نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "کر تو سکتے ہیں نا؟"

"ہاں... کرنے کو سب کچھ کر سکتے ہیں۔" اکرام شیخ میری بات کو سمجھتے ہوئے بولا۔ ہم دونوں ایک وسیع شیڈ کے اندر داخل ہو رہے تھے۔

"رات کے وقت سمندر میں کون دیکھتا ہے کہ کس نے کس سے کیا لیا اور کسی کو کیا دیا۔" میں نے کہا۔ "ہماری سمندری حدود کہاں تک ہیں؟"

"غالباً دو سو میل تک..."

"پھر تو یہ بہت آسان ہے۔" میں نے کہا۔ "کہ ہماری کوئی ماہی گیری کی لانچ اسلحہ لے کر جائے۔ مقررہ وقت پر کوئی ٹرالر یہ دیکھتے ہوئے کہ دیکھنے والا کوئی نہیں ہے ہماری حدود میں داخل ہو جائے۔ دو چار میل اندر یا باہر کا فرق کیسے پتا چلے گا۔"

"ہاں... گھنٹے دو گھنٹے تک لانچ اور ٹرالر ساتھ ساتھ سفر کرتے رہیں تب بھی کسی کو اعتراض نہیں ہوگا... اور اگر خطرہ دیکھا تو دونوں واپس اپنی اپنی سرحد میں۔ بھارتی اور روسی ٹرالر پکڑے بھی جاتے ہیں مگر پھر ڈپلومیٹک سطح پر بات چیت کے ذریعے چھڑا لیے جاتے ہیں... یا ایک تیسری پارٹی سمندر میں موجود رہتی ہے جو ان کے سودے میں اپنا کمیشن وصول کرتی ہے اور انہیں کلیئر کر دیتی ہے۔"

"اس تیسری پارٹی کو ہی ففتھ کالم بھی کہتے ہیں... گھر کا بھیدی بھی جو لنکا ڈھاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ دوست نما دشمن جو پیٹھ پیچھے سے وار کرتا ہے۔"

"او بھائی... کون پوچھتا پھرا تھا دل جانی کو؟" ایک مکرانی نے چلا کے کہا۔ "وہ آ گیا ہے دل جانی۔"

"کدھر... کہاں...؟" میں اور اکرام اس کی طرف لپکے۔

"وہ میری بیلی لائٹ والا لانچ نظر ہے۔" مکرانی نے انگلی کے اشارے سے بتایا۔

میں اور اکرام شیخ واپس ہوئے اور اس جیٹی تک پہنچے جہاں سے گزر کے دل جانی کا عملہ واپس آ رہا تھا۔ آگے پیچھے دونوں کسی بات پر بحث یا لڑائی میں مصروف تھے۔

"او بابا... ہم بولتا پڑا ہے کہ انجن ایک دم ڈاؤن ہے۔ تم ہماری بات نہیں مانتا۔"

"تمہاری بات مانے گا استاد... مگر وہ گڑ گڑ کا آواز پہلے نا تھا۔"

"وہ ٹھیک ہو جائے گا... وہ پسٹن کا آواز نہیں ہے۔ شافٹ جب چالو ہوئیں گا تو آواز ختم ہو جائیں گا... نہیں غلط تم کو بولو... تمہارا پیسہ واپس... ہم مکینک ہے کوئی نیا باز نہیں ہے۔"

"تجربے باز تم کو کون بول سکتا ہے استاد... تم تو خفا ہی ناراض ہوتا پڑا ہے... یہ لو آٹھ سو روپیہ۔"

استاد کہلانے والے نے نوٹ جھپٹ کے اپنی نیلی قمیض کی جیب میں ٹھونس لیے اور ایک طرف چل پڑا۔ اکرام شیخ اس کے پیچھے گیا۔

"یہ دوست محمد ہے؟" میں نے آٹھ سو دینے والے سے پوچھا۔

"ہم ہی دوست محمد ہے۔" وہ بولا۔

"مگر تم دوست محمد بلوچی ہے؟"

"ایک دم ٹھیک... تم کون ہے؟ ہم کو کیسے جانتا ہے؟" وہ ہاتھ ملاتے بولا۔ تقریباً پچاس سال کے اس خاکی شخص کا چہرہ ایک فولادی شکنجہ تھا۔

"مجھے کسی نے بتایا تھا کہ تم لانچ فروخت کر رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"کون بولا تھا؟ یہ لانچ بیچ دے گا ہم تو پھر خود کیا کرے گا؟ ہمارا خراب ہو گیا؟ دوسری ڈال کے مچھلی پکڑے گا کیا؟"

پھر دونوں ساتھی قہقہہ مار کے ہنسے۔ "جا دفع ہو بابا، تم کو ادھر کون بولا ہے؟"

"ایک دم سچ بولا ہے۔" دوسرا بولا۔

دوست محمد بلوچی گرم ہو گیا۔ "اڑے چلو ادھر سے... سمندر آ گیا ہے... جب ہم بات کرتا ہے کسی شریف سے تو بیچ میں کیوں ٹانگ اڑاتا ہے۔ ابھی ماریں گا چانٹ..."

دونوں ماتحت فوراً غائب ہو گئے۔ میں نے دوست محمد بلوچی سے معذرت کی۔ اس نے دوستانہ طریقے پر مجھے بتایا کہ فلاں فلاں لانچ بیچنے کی بات چل رہی ہے مگر میں نا واقف لگتا ہوں۔ کمیشن لینے والوں سے بچوں اور فلاں لانچ کے مالک سے براہ راست بات کروں۔ اس کو یقین تھا کہ میں کوئی اسمگلر ہوں یا کسی کا ایجنٹ اور لانچ کو دوبئی سے مال لانے کے لیے استعمال کروں گا... اس یقین کی وجہ یہ تھی کہ میں کسی صورت سے ماہی گیر بالکل نہیں لگتا تھا۔

میں دوست محمد بلوچی سے پیچھا چھڑا کے بھاگا۔ فش ہاربر کے باہر میں نے اکرام کو جا لیا... وہ دوست محمد کو گھیرے کھڑا ہوا تھا۔

"لو... وہ آ گیا میرا دوست۔" اکرام نے کہا۔

ایک بار پھر میں نے کہا۔ "تم دوست محمد ہو نا میرے چیتے؟"

وہ ایک خشک مزاج بوڑھا آدمی تھا میں نے اس کی عمر کا اندازہ پچپن ساٹھ سال کے درمیان کیا۔ اس عمر میں بھی وہ قابل رشک صحت کا مالک تھا۔ یہ لوگ سمندر کی کھلی فضا میں رہتے تھے اور محنت مشقت کی زندگی گزارتے تھے۔ ان کی سب سے اہم غذا سمندری مخلوق تھی۔ مچھلی، جھینگے اور کیکڑے۔ کیکڑے کا سوپ کراچی کے ہر چینی ریستوران میں بڑے تکلف اور اہتمام کے ساتھ ملتا تھا اور ایک مقبول ڈش تھا۔ اسی طرح فرائیڈ پلاؤ ایک پسندیدہ ڈش تھی۔ لیکن سمندر کی دنیا کے لوگ یہی چیزیں دن رات کھاتے تھے۔ پکا کے، بھون کے یا ابال کے۔ ضرورت

موسیقی کی ابجد کا قاعدہ
گانا سیکھنے کے لیے نہایت موزوں کتاب
ابجد موسیقی

www.paksociety.com

پڑھا۔ پہ پکی مچھلی بھی وہ کراہیت کے کسی احساس کے بغیر کھا جاتے تھے۔ یہ پروٹین اور معدنیات سے بھرپور غذا ان کے جسم کو توانا رکھتی تھی۔ وہ وٹامن سے اور قوت بانی کی کمی کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کی آنکھیں روشن اور معدہ مضبوط تھا۔ ممکن ہے وہ بڑھاپے میں وٹامن سے لبالب لبالب خوش ہوتے ہوں مگر اس سمندری آب و ہوا کی دنیا میں پپیتا بھی کثرت سے استعمال ہوتا تھا۔ اور وٹامن سی بھی۔ چنانچہ وہ بیمار نہیں ہوتے تھے اور طویل عمر پاتے تھے۔

"دوست محمد... میں تم سے ملنے کے لیے بہت دور سے آیا ہوں۔" میں نے تمہید باندھی۔

"کہاں سے آئے ہو؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"پشاور سے۔" میں نے کہا۔ خلاف توقع وہ چونکا نہیں۔

"میں نے تم کو پہلے کبھی دیکھا نہیں..." وہ بولا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"کیا ہم کہیں اکیلے میں بیٹھ کے بات نہیں کرسکتے؟" میں نے کہا۔

"یہاں کیا ہے؟" وہ بولا۔ "اچھا آؤ۔ ہوٹل میں بیٹھتے ہیں۔"

"ہوٹل میں نہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے گھر..."

"میرا گھر...؟" وہ ایک کھٹارا کار کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ "میرا تو کوئی گھر نہیں ہے۔"

"یہ کار تمہاری ہی ہے نا؟" میں نے کہا۔ "اس میں بیٹھ کے تم کہاں جارہے تھے؟"

"شہر کی طرف... کسی ہوٹل میں رات گزارنے کے لیے۔"

"کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں... ہم راستے میں بات کرلیں گے۔"

"کوئی ضرورت نہیں... یہاں بات کرو..." وہ بگڑ گیا۔

"دوست محمد... میرا نام سکندر بخت ہے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ میری صورت دیکھتا رہا۔ "اچھا... آگے بولو۔"

"میں رابعہ سے ملنے... اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔" میں نے کہا اور ادھر ادھر دیکھ کر یقین کرلیا کہ میری بات سننے والا کوئی نہیں ہے۔ دوست محمد کی کار ایک پرانے شیڈ کی اوٹ میں کھڑی ہوئی تھی۔

"تو لے جاؤ... مجھ سے کیوں پوچھتے ہو... میں کیا باپ ہوں اس کا اور یہ رابعہ کون ہے آخر...؟"

"دوست محمد... ایسے بات بگڑ جائے گی... تم بخوبی جانتے ہو۔" میں نے پرسکون رہتے ہوئے کہا۔

"رابعہ؟" وہ سوچنے لگا۔ "تم اس کی بات تو نہیں کر رہے ہو... نور محمد کی بیوی کی؟ تم کو کوئی مار دے گا وہ۔"

"لاحول ولا قوۃ... میں کسی کی بیوی کو بھگا کے نہیں لے جانا چاہتا۔ میں جس رابعہ کی بات کر رہا ہوں... وہ کسی کی بیوی نہیں ہے۔"

"اور تو کسی رابعہ کو نہیں جانتا میں۔"

میرا حوصلہ جواب دینے لگا۔ "بکواس کرتے ہو تم... میں رابعہ قاری کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے رابعہ کی ایک تصویر نکالی۔ "اس رابعہ کی جو تمہارے ساتھ رہتی ہے۔"

دوست محمد نے تصویر لے کر روشنی کے رخ دیکھی۔ میں اس کی صورت کو غور سے دیکھتا رہا۔ لیکن مجھے دوست محمد کے چہرے پر الجھن اور حیرت کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آیا... اس نے تصویر مجھے واپس کردی۔

"ہم قسم کھا کے بولتا ہے کہ ہم نے اس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا... تم بولتا ہے یہ ہمارے ساتھ رہتا ہے۔"

دوست محمد نے اپنی زبان کے ساتھ لہجہ بھی بدل لیا تھا۔ شک پیدا کرنے کے لیے یہی چیز کافی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور ریوالور نکال لیا۔ "دوست محمد... تم کو بتانا ہی پڑے گا کہ رابعہ کہاں ہے... چلو اپنی گاڑی میں بیٹھو..." دوسرے ہاتھ سے میں نے اکرام کو اشارہ کیا کہ وہ جائے۔

دوست محمد کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر ساکت و صامت کھڑا رہا اور پھر کار میں بیٹھ گیا۔ اس کے دروازے مقفل نہیں تھے۔ یہ رائٹ ہینڈ ڈرائیو گاڑی تھی چنانچہ میں اس کے دائیں جانب والی سیٹ پر بیٹھا۔

"یہ دھکا اسٹارٹ گاڑی ہے۔" دوست محمد ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔ اور اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ اس کار میں ہم دونوں کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ میں نے پلٹ کے دیکھا اور ریوالور میرے ہاتھ میں کانپنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ حقیقت نہیں خواب ہے۔ کسی دشواری کے بغیر دوست محمد نے ریوالور میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ میں نے اس کی مذاق اڑانے والی ہنسی کی آواز سنی۔

ساتھ وہ خطرناک قسم کا ریوالور میری جانب اٹھا ہوا تھا۔ **ایک نقاب پوش** اٹھے ہوئے تھے کہ میرے لیے حرکت کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ ہاتھ کس کے تھے جو ریوالور لیے خاموشی سے بیٹھا تھا؟ گاڑی کی پچھلی ہوئی گرد آلود سیٹ پر براجمان تھے یہ میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

انھوں نے نقاب پوشی کا آسان اور سستا طریقہ اختیار کیا تھا جو دہشت گرد اور تخریبی عناصر میں بہت مقبول تھا لیکن یہاں میں نے دیکھا تھا کہ چہرہ چھپانے کے لیے لوگ چادر یا پگڑی جیسی چیز کو ڈھاٹے باندھنے کے لیے استعمال کرتے تھے جو خاصا مشکل اور الجھن پیدا کرنے والا طریقہ تھا۔

عقبی سیٹ پر دونوں حضرات نے بڑے سائز کی سیاہ نائلون کی جرابوں کا ایک جوڑا استعمال کیا تھا۔ ایک جراب کو ایک نے کھینچ کر سر پر چڑھا لیا تھا اور دوسرے نے دوسری جراب کو۔ سر کے سائز میں تھوڑا بہت فرق ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ نائلون کی جراب میں لچک بہت زیادہ ہوتی ہے۔

اب ان دونوں کے سر دو سیاہ رنگ کے گولے سے نظر آتے تھے جن کے نقوش بالکل غائب ہوگئے تھے۔ صرف ان کا ابھار تھا جو محسوس ہوتا تھا ورنہ جرابیں ان کی گردن سے بھی نیچے تک آگئی تھیں۔ آنکھوں کی جگہ دو چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے جن میں سے وہ یقیناً مجھے گھور رہے تھے۔

ان کے ماسک ہی نہیں کپڑے بھی کالے تھے اور یہی وجہ تھی کہ میں انھیں گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے نہ دیکھ سکا تھا۔ مجھے امید بھی نہیں تھی کہ اس جھگڑے میں جو مقدر سے تنکا اٹک لگتا تھا کوئی میرے انتظار میں ہوسکتا ہے۔

"یہ کیا مذاق ہے بابا؟" میں نے فقیرانہ لہجے میں کہا۔ "فقیروں کی طرف توپوں کا رخ کرکے کیا ملے گا۔ کشکول میں کچھ ڈالو گے تو ثواب پاؤ گے۔"

"سائیں سکندر... یہ ڈراما ابھی چھوڑ دو۔" دوست محمد نے کہا۔ "پہلے تو ذرا نیچے اترو اور دھکا لگاؤ گاڑی کو۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "اچھا... فقیر سے دھکا لگواؤ گے تو دنیا میں دھکے کھاؤ گے۔" اور نیچے اتر گیا۔ ایک نقاب پوش بھی میرے ساتھ اتر آیا۔

"جیسے تو تم پہلے ہی کھا رہے تھے۔" میں نے اس کے قریب کر اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ "مگر کیا تمہیں یقین ہے کہ اس ضعیف و ناتواں گاڑی میں دم ہے؟"

"نہیں ہے تو دم ڈالو سائیں۔" دوست محمد بیچ سے توتکار موڑ میں بولا۔ "کوئی وظیفہ پڑھ کے پھونک مارو کہ یہ راکٹ بن جائے۔"

نقاب پوش نے اب ریوالور پتلون میں اڑس لیا تھا... غالباً وہ میرے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں رکھتے تھے ورنہ ایسا رسک نہ لیتے۔ میں پیچھے ساتھ دھکا لگانے والے کو دس سیکنڈ میں ناکارہ بنا کے اس کا ریوالور حاصل کرسکتا تھا لیکن مجھے ایک حیرت آمیز تجسس نے روک لیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کس قسم کے لوگ ہیں۔ رابعہ نے تو لکھا تھا کہ دوست محمد کے ساتھ وہ بالکل محفوظ ہے لیکن میرے ساتھ دوست محمد کا رویہ ذرا بھی دوستانہ نہیں تھا۔

مجھے یہ اطمینان بھی حاصل تھا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ اکرام کہیں نہ کہیں سے سب دیکھ رہا تھا اور یہ ناممکن تھا کہ وہ ہمارا پیچھا نہ کرے۔ وہ ایک انتہائی ذہین اور مستعد پولیس افسر رہا تھا چنانچہ مجھے اغوا کرنے والے اس کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے تھے۔

نقاب پوش نے اور میں نے مل کر گاڑی کو تھوڑا سا دھکا دیا تو گیئر میں پڑتے ہی اس نے جھٹکے سے ایک ہچکی لی اور اس کا انجن اسٹارٹ ہوگیا... اور کیوں نہ ہوتا۔ کار کا مالک ابھی بچپن پار سی پاور والی لانچ کے ڈیزل انجن کو ٹھیک کرکے آرہا تھا۔ اس کے لیے کار کا یہ چھوٹا سا انجن ایک کھلونا تھا۔

میں نے اطمینان کا سانس لے کر ہاتھ جھاڑے۔ "سائیں دعا دینے لگا۔ تم خاصے حرام خور ہو۔"

نقاب پوش نے حلق سے ہنسنے جیسی آواز نکالی... جو غصے کے اظہار کا ایک انداز تھی۔ کسی بے چہرہ آدمی سے بات کرنا بڑا عجیب لگتا تھا۔

"میں تمہاری صورت دیکھنے کے لیے بے چین ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم یا تو بہت بدصورت ہو کہ چہرہ نہیں دکھاتے... یا اتنے خوب صورت ہو کہ نظر لگ جانے سے ڈرتے ہو۔"

"ابھی چلو سائیں۔" دوست محمد نے جھلا کے کہا۔ "اس سے کیا پوچھ رہے ہو... جو پوچھنا ہے ہم سے پوچھنا۔"

میں پھر آگے بیٹھ گیا۔ "سیٹھ چاند بھائی کا کیا حال ہے؟" میں نے بے نیازی کا انداز برقرار رکھتے ہوئے اچانک کہا۔

دوست محمد چونکا۔ "تم کیا جانتے ہو اس کے بارے میں؟"

میں نے ایک مصنوعی قہقہہ مارا۔ "وہ اپنا یار ہے... اپنا تیکر بدل بھائی ہے۔"

"تیکر بدل بھائی؟" دوست محمد نے کہا۔

"ہاں! جیسے دوپٹہ بدل کے عورتیں بہنیں بن جاتی ہیں۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا: "میں اور تمہارا سیٹھ چاند بھائی موٹا والا بچپن میں پگڑی بدل کے بھائی بن گئے تھے۔ پہلے وہ اتنا موٹا نہیں تھا کہ میں اسے موٹا بھائی کہتا۔ اب تو سنا ہے کھا کھا کے سؤر ہو گیا ہے۔ ہم تو چندا کہتے تھے۔ اب چاند نکل آئی ہے تو چاند بھائی ہو گیا۔ ایک نہ ایک دن سب کو گنجا ہونا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو مسٹر سائیں۔" دوست محمد نے اطمینان کی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

ابھی تک ہمارا راستہ وہی تھا جس پر چل کے میں اور آرام یہاں تک پہنچے تھے۔ پھر نہ جانے کہاں سے راستہ بدل گیا۔ ابھی مجھے کراچی آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے۔ مجھے سب سڑکیں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔ دونوں جانب کارخانے تھے۔ کچھ رات کے وقت غیر آباد تھے... کچھ میں زندگی کے آثار محسوس ہوتے تھے۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ کبھی کبھار کوئی ٹرک مال سے بھرا ہوا گزر جاتا تھا۔

"دوست محمد... تم مجھے اغوا کر کے کہاں لے جا رہے ہو۔ اور کیوں لے جا رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"آرام سے بیٹھو۔ ابھی سب معلوم ہو جائیں گا۔"

"اس سیٹ پر آرام سے کوئی کیسے بیٹھ سکتا ہے جس کے اسپرنگ نکلے ہوئے ہیں اور جس میں کھٹمل پلنگ ہیں۔ لیکن یہ جو دو موت کے فرشتے پیچھے بیٹھے ہیں، یہ مجھے پاگل لگتے ہیں۔ ان سے خطرہ ہے کہ خواہ مخواہ مجھے کوئی نہ مار دیں۔"

"یہ پاگل نہیں ہیں۔" دوست محمد میرا تمسخر اڑانے کے انداز میں بولا۔

"پاگل نہ ہوتے تو جراب کو پیروں میں پہنتے... سر پہ نہ پہنتے۔ یہ ضرور پاؤں پر پگڑی باندھتے ہوں گے۔" میں نے کہا: "ویسے یہ اپنا چاند بھائی کیسا آدمی ہے؟ تم تو جانتے ہو۔"

وہ پھر چونکا: "معلوم ہو جائے گا تمھیں بھی۔"

"ہاں... میرا خیال ہے کہ اچھا ہی ہوگا۔" میں نے اظہارِ خیال کیا: "ورنہ آرام اس کے پاس کیوں ٹھہرتی... اور خیریت سے کیوں ہوتی؟"

"تم چپ نہیں بیٹھ سکتے؟"

"نہیں دوست... یہ ایک بیماری ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک بیماری ہوتی ہے جوع البقر... آدمی ہر وقت کھاتا رہتا ہے۔ رعشے کی بیماری میں ہر وقت ہلتا رہتا ہے۔ ایسے ہی میری زبان خراب ہو گئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے دماغ خراب نہیں ہوا۔ زبان چلتی رہے تو کوئی حرج نہیں۔ دماغ چل جائے تو..."

"خدا کے لیے چپ کرو ورنہ ہمارا دماغ گھوم جائے گا۔" دوست محمد نے دہاڑ کے کہا۔

میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میرے دشمن بن گئے ہیں تو کتنے خطرناک ہیں۔ لیکن وہ مجھے برداشت کر رہے تھے تو اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خود کچھ بھی نہیں ہیں... نہ دوست نہ دشمن... وہ مجھے کہیں لے جا کے پیش کر دینے پر مامور تھے۔ غالباً سیٹھ چاند بھائی کی خدمت میں۔

اور میرا یہ قیاس کچھ دیر بعد حقیقت میں بدل گیا۔ گاڑی نے ایک موڑ کاٹا تو سامنے اندھیرے آسمان کے نیم روشن پس منظر میں کالے پہاڑوں کی لکیر سی نظر آنے لگی جو دائیں بائیں پھیلی ہوئی تھی اور لہروں کی طرح نشیب و فراز رکھتی تھی۔

"لو... ہم مری آ گئے۔" میں نے خوش ہو کے کہا۔ "بہت اچھا سینری ہے۔"

"یہ منگھو پیر کا پہاڑ ہے۔" دوست محمد بولا۔

"کون سا پیر؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "اور یہ پہاڑ انھوں نے خریدا تھا یا بنایا تھا؟"

"پیر سائیں کے بارے میں تم بکواس کریں گا تو ہم تم کو بھی مار دیں گا تم کو..." دوست محمد مشتعل ہو گیا۔ "اور بول دیں گا سیٹھ کو کہ سالا بھاگ گیا تھا۔"

"معاف کرنا دوست، دوست محمد۔" میں نے جہالت سے کہا: "میرا مقصد تمہارے جذبات کو مجروح کرنا نہیں تھا... حقیقت یہ ہے کہ میں ایک بے علم، بے بصیرت اور بے فیض شخص ہوں۔"

"ادھر پیر سائیں کا مزار ہے جا کے دیکھو۔" وہ میری معذرت سے مطمئن ہو گیا۔ "کتنی خلق خدا آتا ہے۔ گرم پانی نکلتا ہے پہاڑ سے اور اس میں جو نہاتا ہے اس کا ہر بیماری ٹھیک ہو جاتا ہے۔ خارش ہوا، جذام ہوا... اور ادھر پیر صاحب کا تالاب میں مگرمچھ ہے۔ سب ان کو کھلانے کو دیتا ہے۔ وہ کسی کو کچھ نہیں بولتا۔"

"ایک مگرمچھ ہے؟"

"نہیں... بہت ہے۔" وہ بولا اور گاڑی کو اچانک ایک گیٹ کی جانب موڑ لیا جو کھلا ہوا تھا۔ اس ویران علاقے میں یہ واحد کوٹھی نہیں تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے چار اور بھی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں اور زیرِ تعمیر کوٹھیوں کی تعداد دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ زیرِ تعمیر کوئی نئی آبادی ہے جہاں سب متمول لوگ رہیں گے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ناظم آباد کا علاقہ تھا۔

مختصر سا راستہ طے کر کے کار رک گئی۔ اس کے سامنے ایک اور کار پہلے سے موجود تھی۔ اندر باہر بہت سی خوب صورت لائٹس روشن تھیں مگر عقبی حصے کی کھڑکیاں تاریک تھیں اور ان کے باہر نصب ہوئے ونڈو ایئرکنڈیشنر رات کی خاموشی میں زیادہ ہی آواز دیتے محسوس ہو رہے تھے۔

میرے حساب سے وہ کوٹھی ایک کنال کی تھی۔ یہ لاہور کا حساب تھا، ابھی تک میں کراچی کے مربع گز والے حساب سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ تاہم میرا اندازہ زیادہ غلط بھی نہیں ثابت ہوا۔ وہ چھ سو گز کا پلاٹ تھا۔

برآمدے میں منقش پیتل اور کرسٹل کی آب و تاب رکھنے والا ایک فانوس معلق تھا۔ گاڑی رکنے کی آواز سنتے ہی اندر کا ایک دروازہ کھلا اور ساڑھے چھ فٹ قد کا بے حد توانا جسم والا ایک پٹھان چوکیدار برآمد ہوا۔ طرہ دار دستار کے ساتھ اس کی ٹوپی بھی ملا کے قد ساڑھے سات فٹ بنتی تھی۔ اس نے گھیردار شلوار کے اوپر قمیص و اسکٹ اور واسکٹ پر کارتوسوں کی نمائشی بیلٹ سجا رکھی تھی۔ نمائشی یوں کہ اس بیلٹ سے وحشت کا تاثر تو قائم ہوتا تھا مگر وہ پرانے وقتوں کے فیشن کی چیز تھی۔ جو اسلحہ اس کے کندھے پر بیلٹ سے لٹک رہا تھا وہ بہت جدید تھا۔ اس میں کارتوس استعمال نہیں ہوتے تھے۔

"السلام علیکم۔" میں نے پٹھان چوکیدار سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا جیسے ہم پرانے بچھڑے ہوئے دوست ہیں۔ "سنگہ حال وے؟"

"پخیر راغلے۔" پٹھان نے خوش اخلاقی سے ہاتھ ملایا اور پشتو بولا۔ "راشہ... ماسٹر راشہ۔"

اتنی پشتو مجھے نہیں آتی تھی مگر ہاتھ کے اشارے سے میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے اندر چلنے کی درخواست کر رہا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ منکر نکیر غائب ہو چکے تھے جو مجھے یہاں تک لائے تھے۔

پٹھان چوکیدار دروازہ کھولے منتظر تھا کہ میں اندر جاؤں۔ اس نے کہا: "سے ہورے نے؟" جس کا میں خاک مطلب نہیں سمجھا چنانچہ میں نے نفی میں سر ہلایا اور اندر چلا گیا۔ دوست محمد بے مقصد رہا اور میری بدحواسی پہ متبسم نظر آ رہا۔

اندرونی آرائش کی شان و شوکت دیکھ کر میں حیران نہیں ہوا۔ یہ سب لوگ جو ناجائز اور لامحدود ذرائع آمدنی رکھتے تھے اپنی خوش ذوقی کی نمائش میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لیے ان کے ذوقِ جمال کو قابلِ ستائش نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

"استاکت مے دلتہ۔" چوکیدار نے مجھے بتایا۔ وہ اپنا ہم زبان سمجھ کے مادری زبان میں گفتگو پہ آمادہ تھا۔ ایک بار پھر میں نے ہاتھ کے اشارے سے سمجھ لیا کہ وہ مجھے تشریف رکھنے کو کہہ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ کا اشارہ ایک صوفے کی طرف تھا۔

صوفے پر بیٹھ کے میں نے بہت عجیب محسوس کیا کیونکہ میرے جسم پہ وہی لباس قیدی تھا جو جانی یونیفارم سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ یونیفارم ابھی ڈیوٹی کے وقت پہنی جاتی ہے اور رہا بھی یہ کپڑے ڈیوٹی پر ہی زیب تن کرتا تھا۔ لیکن میں ایک انتہائی بیش قیمت سامان سے سجے ہوئے بے حد قیمتی آرام دہ اور اسپونج صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ صرف اس لیے کہ میں قیدی نہیں تھا۔ اصل قیدی اس لباس میں شاید گیٹ سے اندر قدم رکھتا تو پٹتا۔

دوست محمد میرے دائیں ہاتھ پہ بیٹھ گیا اور مجھے گھورنے لگا۔ میں نے سینٹر ٹیبل پر رکھے ہوئے سنہرے میوزیکل باکس کا بٹن دبایا۔ اس میں جلترنگ سی بجنے لگی اور ایک سگریٹ باہر آ گیا۔ میں نے سگریٹ نکالا تو موسیقی بند ہو گئی۔ باکس سے منسلک لائٹر ایک سنہرے رنگ کا مجسمہ تھا جو امریکی "مجسمۂ آزادی" کی طرح مشعل اٹھائے ہوئے تھا۔ دراصل یہ اسی کا نمونہ تھا... میں نے دوسرا بٹن دبایا تو مشعل روشن ہو گئی۔ میں نے سگریٹ جلا کے بٹن چھوڑا تو مشعل بجھ گئی۔ میرے خیال میں وہ دونوں چیزیں خالص سونے کی بنی ہوئی تھیں۔ میرے غریب وطن کا عام شہری جس نے صرف اپنے گاؤں دیکھا یا اپنے قصبے اور اپنے شہر کی گلی سے آگے کی دنیا نہیں دیکھی، یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ دولت مندی کی انتہا کہاں ہے اور اس کو خرچ کرنے کے لیے انھیں کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں جن کے پاس یہ دولت اسی طرح پھیل رہی ہے جیسے ناقابلِ علاج کینسر پھیلتا ہے۔ میں نے فرانس میں ہزاروں ڈالر کی پرفیوم کی ننھی سی شیشی دیکھی تھی تو میں حیران ہوا تھا۔ پھر میں نے سوئٹزرلینڈ میں خالص سونے کے بنے ہوئے ٹی سیٹ دیکھے جن کے خصوصی ڈیزائن کے کیڈ تھے اور گھڑیاں دیکھیں جن میں ہندسوں کی جگہ بیش قیمت ہیرے جڑے تھے۔ جرمنی میں آرڈر پہ بننے والی وہ کاریں دیکھیں جن کی باڈی سونے کی ہوتی تھی یا رنگ خالص پلاٹینم کا۔ تو میں نے حیرت ہونا چھوڑ دیا۔ اسی زمانے میں ایک رئیس فرانس میں کار کے حادثے میں مارے گئے تھے۔ موصوف کے ساتھ ایک بے حد حسین فرانسیسی شہزادی اور ماڈل گرل تھی۔ وہ بھی اس حادثے میں ہلاک ہوئی۔ اس کے دو جوتوں میں سے ایک جوتا ملا تو معلوم ہوا کہ اس میں ڈھائی لاکھ ڈالر یا پونڈ کے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ دوسرا جوتا کسی جانے والے دولت سے فرار ہو گیا۔ غالباً اس کی سات نسلیں خوش حال ہو گئی ہوں گی اس جوتے کے طفیل...

www.paksociety.com

یہاں مسجدوں سے جوتے چرانے والے پکڑے جاتے ہیں۔
میرے خیالوں کو ایک شخص کی آمد نے منتشر کر دیا۔ وہ چالیس بیالیس سال کا آدمی تھا جس کی شخصیت کو پُرکشش کہا جا سکتا تھا۔ اس کے بال گھنے سیاہ تھے مگر کنپٹیوں پر سفیدی نمودار ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ صحت مند اور دوستانہ جذبات کی مسکراہٹ سے روشن تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں بھی ذہانت کی چمک تھی لیکن سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ اپنے ہی گھر کے ڈائننگ روم میں مجھ سے ملنے کے لیے بہترین سوٹ اور ٹائی کے ساتھ آیا تھا... یا تو وہ اس رکھ رکھاؤ کا عادی تھا یا کہیں جانے کے لیے تیار ہوا تھا۔
"مسٹر سکندر بخت...!" اس نے ہاتھ ملا کے کہا۔ "کیا پیو گے یا کھاؤ گے... بالو تکلف؟"
"اگر کوئی پرابلم نہ ہو۔" میں نے سوچ کے کہا۔ "تو میں کافی کے ساتھ چکن اینڈ ایگ سینڈوچ کھاؤں گا... بلیک کافی۔"
"نو پرابلم۔" اس نے کہا اور صوفے کی سائڈ پر لگے ہوئے ایک بٹن کو دبایا۔ اس کے دوسرے بٹن اسپیکر یونز کے سسٹم کے تھے۔
"یس سر!" صوفے کی پشت سے آواز آئی۔
"کافی بلیک... سینڈوچ..." اس نے مختصراً آرڈر دے کر بٹن چھوڑ دیا۔ میں نے بالکل کسی فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ کے کسٹمر کی طرح آرڈر دیا تھا اور اس نے ہیڈ ویٹر کی طرح تعمیل کی تھی۔ میں نے یہ اعتراض بدتمیزی سمجھا کہ اس نے صرف سینڈوچ کیوں کہا۔ دوست محمد کے لیے میرا اعتماد اور انداز باعثِ حیرت ثابت ہو رہا تھا۔
ابھی تک میں طے نہیں کر پایا تھا کہ وہ کون ہے۔ سیٹھ چاند بھائی ہونا والا تو بہت بڑا اسمگلر تھا لیکن اپنے نام اور حلیے سے وہ ایسا نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ مجھے پوچھنا پڑا۔
"آپ تو مجھے جانتے ہیں... مگر..."
"میں سیٹھ چاند بھائی ہونا والا ہوں۔" اس نے سوال کا مطلب سمجھ کے اور مسکرا کے کہا۔
میں دم بخود رہ گیا۔ "آپ کو اپنا نام پولی فرسٹ میں بدل لینا چاہیے۔ اس سے بڑا دھوکا ہو سکتا ہے۔"
"نام میں کیا رکھا ہے مسٹر سکندر بخت۔" وہ بولا۔ "آخر تم بھی تو پیر جان تھے... اور معلوم نہیں آج کل کیا ہو... مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ تمہارا حلیہ نہیں ہے۔ تم نام اور حلیے دونوں بدلنے کے ماہر ہو۔"
"میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میرے بارے میں تمہاری معلومات مکمل ہوں گی۔" میں نے کہا۔
"وہ کیوں؟"
"تم جیسے لوگوں کے وسائل سی آئی اے یا کے جی بی سے کم نہیں ہوتے اور پیسے تو دنیا میں بس ٹھیک مارتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ یہ دنیا تو در حقیقت آپ جیسے گنے چنے لوگوں کی ملکیت ہے۔ اصل میں تو اپنی مرضی سے اور خوشی سے آپ ہی کی کلاس زندگی گزارتی ہے۔ باقی سب جیتے ہیں مجبوراً ہیں۔"
"میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔" وہ غیر جذباتی لہجے میں بولا۔ "کیا تم تقدیر کے فلسفے کو نہیں مانتے ہو؟"
میں گڑبڑا گیا۔ "میں مگر مانتے یا نہ مانتے سے..."
"میں مانتا ہوں۔" اس نے میری بات تحمل سے اطمینان سے کاٹ دی۔ "ہر شخص کو دنیا میں وہی ملتا ہے جو اس کا مقدر ہو۔ اچھے بُرے کا معیار بھی بدلتا ہے' جائز ناجائز کا بھی۔ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں کہ تم یا کوئی اور مجھے کیا سمجھتا ہے اور میرے اعمال میرے انجام اور میری عاقبت کے بارے میں کیا رائے یا فتویٰ دیتا ہے۔ آئی ایم ان دی پریزنٹ۔ ماضی سے میں سروکار نہیں رکھتا اور مستقبل کے خیال سے پریشان نہیں ہوتا۔"
"تم نے جتنا مجھے حیران کیا ہے اس سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ تم سچ بولتے ہو اور سچ کو مانتے ہو۔ میں منافقوں سے سخت نفرت کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب کیا ہم اصل بات کریں؟"
"ٹیک اٹ ایزی۔" وہ بولا۔ "جلدی کیا ہے۔"
اس سے پہلے کہ میں جلدی کا سبب بتاتا ایک لڑکی ٹرالی کو بڑی نزاکت سے دھکیلتی ہوئی میرے سامنے لے آئی... بہت خوب صورت اور جوان لڑکی تھی لیکن وہ انڈین یا پاکستانی نہیں تھی۔ وہ یورپین یا یوریشین نسل کی لڑکی تھی جس نے ریشمی چوڑی دار پاجامہ کرتے کے ساتھ پہن رکھا تھا اور بڑے سلیقے سے دوپٹا بھی دونوں شانوں پر ڈال رکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں اور آنکھوں میں سرمہ تھا۔ میں احتراماً کھڑا ہونے ہی لگا تھا کہ چاند بھائی نے کہا۔
"پلیز سیٹ ڈاؤن... شی از اونلی اے میڈ۔" "تشریف رکھیے... یہ تو ایک معمولی خادمہ ہے۔"
خجالت اور حیرت سے میرا برا حال ہو گیا۔ "میں... میں سمجھا تھا کہ یہ تمہاری مسز ہوں گی۔"
لڑکی نے جو جھک کر کافی انڈیل رہی تھی ایک ادا سے ناز سے اپنے سنہرے ریشمی بال ہٹائے اور مجھے بڑی عجیب

نظروں سے دیکھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں دُکھ بھی تھا حسرت بھی تھی... کہ اے کاش ایسا ہی ہوتا جیسا تم نے کہا۔ اور میرے لیے ملامت بھی تھی کہ تم نے ایسا کیوں سمجھا جو میری مزید تذلیل کا سبب بنا۔
چاند بھائی نے خندۂ استہزا کے سوا میری بات کا جواب کچھ نہیں دیا۔ جب وہ کافی رکھ کے چلی گئی تو اس نے کہا۔
"میرے پاس گھریلو کام کاج کرنے والی سب خادمائیں امپورٹڈ ہیں۔ ایک انگلش... دو فرنچ... ایک ڈچ۔"
"یہ آپ اس کلاس کی نمائندگی کر رہے ہیں جو دیسی ہوا میں بھی مجبوراً سانس لیتی ہے ورنہ ان کے لیے فضا سورج کی روشنی اور وہ مٹی بھی امپورٹڈ ہو جس میں ان کو ملنا ہے' یا اپنے کمپلیکس کی تشہیر کر رہے ہیں؟" میں نے تلخ طنزیہ لہجے میں کہا۔
"یس... مجھے ایک کمپلیکس ہے۔ مگر وہ کلاس کمپلیکس نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "میں ان سفید چمڑی والوں کی خدمت سے تسکین حاصل کرتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ نوآبادیاتی نظام ختم ہو جانے کے بعد بھی رنگ دار غلاموں کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ کھلے بندوں۔ انھوں نے افریقہ کو اپنی منڈی بنا رکھا ہے اور ایشیا کے پسماندہ ممالک کو بھی وہ سب گھٹیا کام جو ہم سے لیتے رہے ہیں اور لیتے ہیں' میں ان سے لیتا ہوں... اور جو تذلیل آمیز رویہ ان کا رہا ہے' وہی میں بھی روا رکھتا ہوں۔ وہ کالوں سے نفرت کرتے ہیں' میں گوروں سے نفرت کرتا ہوں... کیا اس میں کوئی برائی ہے؟"
میں جھلا کر بیٹھا تھا۔ "برائی... ہاں... برائی تو برائی ہی ہے گی... نفرت کرنا یا تعصب رکھنا ایک برائی ہے۔"
"ہو گی۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "میں ایسی اخلاقیات میں نہیں پڑتا اور تمھیں یہ بھی بتاؤں... میں ان کی نسل کو خراب کر رہا ہوں... جیسے انھوں نے یہاں اینگلو انڈین کلاس پیدا کی یہ ایک انتقامی رد عمل ہے... ویری پرسنل۔"
میں نے حیرانی سے سر ہلایا۔ "ایک زمانہ تھا۔ جب میں لندن میں زیر تعلیم تھا... تو میرا رد عمل بھی یہی تھا۔ یہی رویہ تھا لیکن وہ ناپختہ شعور کا دور تھا۔"
"مجھے معلوم ہے۔" وہ بولا۔ "پلیز کھانا جاری رکھو۔"
"تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"
"میں نہیں چاہتا کہ تم میرے بارے میں کوئی غلط تاثر قائم کرو۔" وہ سگریٹ سلگا کے بولا۔ "یہ سمجھو کہ میں نے اس بہانے ایک حرم آباد کر لیا ہے اور انتقام کے پس پردہ عیاشی مقصود ہے۔ اس کے لیے مجھے شادی کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں یورپ کے ہر ملک میں رہتا ہوں اور کوئی پارسا نہیں ہوں۔ شرافت کا دعویٰ کوئی ملک نہیں کرتا... تم نے چوکیدار کو دیکھا؟ وہ پاکستانی ہے اور میں اسے بہت زیادہ عزت دیتا ہوں۔ وہ میرا دوست اور باڈی گارڈ ہے۔ میری پرسنل سیکریٹری کوئی نہیں۔ میں نے شادی بھی نہیں کی کیونکہ پھر میں صرف ایک بیوی سے وفاداری کے ضابطہ اخلاق کا پابند ہو جاتا جو میرے لیے ناممکن تھا۔ میں اسے فریب دیتا... وہ مجھے فریب دیتی اور یہ بھی مجھ سے برداشت نہ ہوتا۔"
دوست محمد بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا اور اس نے کافی بھی نہیں پی تھی بلکہ مجھے بلیک کافی پیتا دیکھ کے ایسا منہ بنایا تھا جیسے یہ تلخ مشروب اس کے حلق میں اتر رہا ہے۔
میں جاننا چاہتا تھا کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے اور وہ نقاب پوش کون تھے۔ چاند بھائی اتنا بڑا اسمگلر ہے اور بہت خطرناک سمجھا جاتا ہے تو اس کی شخصیت میں یہ تضاد کیوں ہے۔ وہ اچھا خاصا تعلیم یافتہ مہذب اور با اصول آدمی بھی تھا اور دوسری طرف اخلاق اور قانون اور مذہب میں جرم و گناہ کا درجہ رکھنے والے ہر فعل میں بھی ملوث تھا۔ اس کو پیسے کی کمی نہیں تھی۔ پھر وہ اسمگلنگ ہی کیوں کرتا تھا۔ میں اس سے رابعہ کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ لیکن اس کی باتوں نے مجھے مطمئن کر دیا تھا کہ ذاتی سطح پر وہ میرا دشمن نہیں دوست ہے۔ چنانچہ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ دوستی کے ان جذبات کی بنیاد تو مشترک نہیں ہے؟ بالکل اسی طرح جیسے نسلی تعصب کے خلاف اس کے اور میرے رویے میں ایک قدر مشترک تھی۔
"کیا تم شادی کے قائل ہی نہیں... میرا مطلب ہے ایک روایتی فیملی لائف تو خوش کن ہے؟" میں نے کہا۔ "ہر دولت مند کو ایک وارث کی ضرورت تو پڑتی ہے۔"
اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "بہت جلد میں شادی کروں گا۔ اور کسی بہت معزز اور شریف گھر کی لڑکی سے... مڈل کلاس میں اخلاق و کردار... عصمت و عفت کا اور شوہر پرستی کا جو تصور ہے اس میں بڑی کشش ہے میرے لیے۔ میری بیوی اسی طبقے کی روایات کے مطابق رہنے والی بیوی ہوگی۔ اور تم نے ٹھیک کہا۔ مجھے ایک وارث کی ضرورت نہ ہوتی تو میں بیوی کے چکر میں نہ پڑتا۔ ایک مظلوم و بے زبان اللہ میاں کی گائے قسم کی ذہین چندے آفتاب چندے ماہتاب اور سلیقہ شعار لڑکی کو اس محل میں قید کرکے رکھنا مجھے پسند تو نہیں لیکن مجبوری ہے۔ اور اتفاق ہے کہ انھی دنوں میں ایک لڑکی مل بھی گئی ہے۔"
"تمہاری زبان اور تمہارا لہجہ۔" میں نے کہا۔ "تمہارے

www.paksociety.com

نام سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔"

"یہ میرا کاروباری نام ہے۔" وہ بولا۔ "بالکل اسی طرح جیسے اداکاروں کے فلمی نام ہوتے ہیں اور لکھنے والوں کے قلمی نام ہوتے ہیں۔ اصل نام کچھ اور ہوتا ہے۔" وہ بولا۔ "تم کو سمجھے ہو ناکہ جیسے فلمی دنیا میں 'کمار' بہت چلتا ہے۔ دلیپ کمار... اشوک کمار، کشور کمار، منوج کمار۔ یہاں تک کہ ہمارے ملک میں سنتوش کمار... تو یہاں ایسے کاروباری نام بہت مقبول ہیں۔ گڈ ول رکھتے ہیں اور کامیابی کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔"

"اب تو خیر تم پاکستانی ہو میری طرح... لیکن تمہارا تعلق کس شہر سے ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ ایک ایسا سوال ہے جس سے میں بھی چڑتا ہوں۔ لیکن میں ابھی تک تمہارے بیک گراؤنڈ کا تعین نہیں کر سکا۔"

"میرا بیک گراؤنڈ۔" وہ سوچ کے بولا۔ "میرا کوئی بیک گراؤنڈ نہیں۔ میری ایک ماں تھی۔ میں نے اسے دیکھا نہیں۔ یقیناً کوئی باپ بھی ہوگا۔ اُسے بھی میں نہیں جانتا... ممکن ہے کہ وہ دونوں زندہ ہوں... یا نہ ہوں... میری پرورش کانونٹ میں ہوئی۔ اُسے تم عیسائی مشن کا یتیم خانہ کہہ سکتے ہو۔ جہاں لاوارث بچے قبول کیے جاتے ہیں اور انھیں تربیت کے لیے بہترین ماحول فراہم کیا جاتا ہے۔ یہی ایک فرق ہے ہمارے اور ان کے یتیم خانوں میں۔ وہ ہر بچے کو معصوم فرشتہ سمجھ کے رکھتے ہیں اور اسے ایک راسخ العقیدہ کرسچن بنا دیتے ہیں جو اسلام سے ہی نہیں مسلمانوں سے بھی نفرت کرتا ہے۔ ان کی تعلیمات سے عقائد سے روایات سے..."

اس نے اُٹھ کر ٹہلتے ہوئے اچانک گھڑی دیکھی اور کہا۔ "دوست محمد... تم جاؤ آرام کرو۔ تم سے صبح ملاقات ہوگی۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کے اسے تھما دیے۔ "معاف کرنا باتوں میں دیر ہو گئی۔"

"اپنا بہت ٹیم خراب ہوا صاحب۔" دوست محمد نے ناگواری سے کہا۔ "آپ لوگوں کا بات اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔"

چاند بھائی ہنسا۔ "سوری یار تم بور ہوتے رہے... اچھا دیکھو اگر کوئی باہر ہے...؟"

"ایک ٹیکسی والا پیچھے آیا تھا۔" دوست محمد نے کہا۔

"اسے کہو گھر جائے۔" چاند بھائی نے کہا۔

"وہ میرا دوست ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"تو ہمارا ایک دشمن ہے۔" چاند بھائی بولا۔ "اسے کہنا کہ فکر نہ کرے... سب خیریت ہے۔"

میں کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ دوست محمد بڑبڑاتا ہوا نکل گیا۔

"اچھا آدمی ہے۔ ذرا خبطی ہو گیا ہے اس عمر میں۔" چاند بھائی بولا۔

"کیا ہم سب خبطی نہیں ہوتے؟" میں نے کہا۔ "خبط کی نوعیت جدا ہو سکتی ہے... لیکن تم اور میں اپنے اپنے خبط کا شکار ضرور ہیں۔"

"تم یہ کپڑے بدل لو۔" وہ بولا۔ "میں ایک گھنٹے بعد واپس آؤں گا... اگر تم سونا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ورنہ ہم رات کو بات کریں گے۔" اس نے پھر بٹن دبا دیا۔

"جانے سے پہلے مجھے رابعہ کے بارے میں تو بتا دو۔" میں نے کہا۔ "وہ کہاں ہے؟"

لیکن اس نے میری بات کے جواب کو ضروری نہیں سمجھا اور اس لڑکی سے مخاطب ہو گیا جو کال بیل پر اندر آ کے سر جھکا کے کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ پہلے والی لڑکی نہیں تھی لیکن اپنے حسن و شباب کی غارت گری میں اس سے کسی طور کم نہ تھی۔ اس کے بال بھی بھورے تھے اور آنکھیں بھی بھوری تھیں۔ لباس اس نے بھی کنیزوں والا پہن رکھا تھا۔ یہ خیال مجھے اچانک آیا کہ چاند بھائی نے عمداً انھیں شاہی دور کی کنیزوں والا لباس دے کر ان کی حیثیت کے ظاہر کو بھی بدل ڈالا ہے۔ اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ یورپ کی ماڈل گرل نظر آنے کے لیے وہ لباس پہننا پسند کرتیں جو کم سے کم لباس ہو اور زیادہ سے زیادہ فیشن۔ اس نے پہلی کنیز کو نام سے نہیں پکارا تھا مگر اس لڑکی کو اس نے مرجانہ کہہ کے مخاطب کیا اور اس سے فرنچ زبان میں بات کی۔ یہیں وہ مار کھا گیا۔ اس نے میرے بارے میں بہت کچھ سنا پڑھا اور معلوم کیا تھا لیکن ان سب معلومات کا جو اسے حاصل ہوئیں 'میری مصروفیات' سے تعلق تھا۔ کوئی اسے بتا سکتا تھا کہ سکندر بخت فرنچ بھی سمجھتا ہے۔ صرف محسن ہی وہ شخص تھا جس کے ساتھ میری فرنچ میں گفتگو ہوتی تھی لیکن وہ بھی ہر جگہ نہیں۔ خاص مواقع پر جب رازداری کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ہم فرنچ میں وہ کہہ دیتے تھے جو انگریزی یا اردو میں نہیں کہہ سکتے تھے۔

اس نے مرجانہ سے کہا۔ "یہ میرا مہمان ہے چنانچہ اس کی خاطر تواضع میں کسی قسم کی کوتاہی یا کمی ہوئی تو میں بہتر ہے تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا... تم اس کو نا نہیں کرو گی خواہ یہ تم سے جان مانگے... سمجھیں۔"

"آپ مطمئن رہیں جناب۔" لڑکی نے ایسے عاجزانہ غلامانہ لہجے میں کہا کہ مجھے اس کے انکسار میں شدید ترین نفرت کے زہر کی تلخی اور اس کے لہجے کی ترشی میں وہ کاٹ محسوس ہوئی جو بلیڈ کی دھار میں ہوتی ہے۔ خود چاند بھائی نے گفتگو کا جو لہجہ اختیار کیا تھا وہ بے حد شریفانہ اور مہذب تھا۔ اگر میں فرنچ نہ سمجھتا تو مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ اتنی نرمی سے وہ کتنی سخت بات کہہ گیا۔

"اور ہاں۔" اس نے دروازے کا رخ کرتے ہوئے مسکرا کے کہا۔ "اگر یہ کوئی سوال کرے خصوصاً اس عورت کے بارے میں جو کل شام بھی یہاں آئی تھی' میں اس کا نام لینا ضروری نہیں سمجھتا' یہاں بہت عورتیں آتی ہیں مگر میں تم سے جس عورت کی بات کر رہا ہوں' وہ عام عورت نہیں ہے۔ یہ بات تم جانتی ہو۔"

"میں جانتی ہوں جناب..."

"تم اُسے کچھ نہیں بتاؤ گی... اگر تم نے بتایا تو مجھے معلوم ہو جائے گا اور پھر تمہیں اندازہ نہیں کہ تمہارے ساتھ یا مارسیلز میں کسی اور کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔"

میں نے لاتعلقی کا انداز برقرار رکھتے ہوئے کن انکھیوں سے اس لڑکی کو دیکھا۔ آخری دھمکی پر اس کا رنگ اڑ گیا تھا اور مجھے یوں لگا جیسے میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ لڑکی کا وجود خوف کی سردی سے کانپ اٹھا ہے۔ مارسیلز میں کون تھا جس کا حوالہ دیا گیا؟ میں نے سوچا۔ کیا چاند بھائی کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ سات سمندر پار کسی کی گردن تک پہنچ جاتے ہیں؟ اور یہ سب لڑکیاں جو کنیزیں بنی ہوئی ہیں' درحقیقت خوف کی اسیر ہیں۔ چاند بھائی ان سے انتقام لے رہا ہے یا انھیں بلیک میل کر رہا ہے؟ ان کو اس نے سفید غلام زادیوں کی طرح اپنی دولت سے خریدا ہے یا طاقت سے دبوچ رکھا ہے؟

جب وہ چلا گیا تو میں نے سر کو جھٹکا اور گویا فضول خیالات کو جھٹک دیا۔ چاند بھائی یقیناً ایب نارمل تھا۔ نفسیاتی مریض تھا۔ ایک جینئس اگر منفی سوچ اختیار کرے تو بہت بڑا مجرم یا دہشت گرد بھی بن سکتا ہے۔ لیکن مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اس پاگل آدمی کے پاگل پن کے اسباب اور نفسیات کے چکر میں پڑوں۔ اتنی فرصت کہاں ہے میرے پاس کہ ان کنیزوں کے بارے میں سوچوں اور ان سے جذباتی ہمدردی کا اظہار کروں۔ مجھے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ چاند بھائی یقیناً خطرناک آدمی تھا۔ میں اس سے دشمنی مول لے کر کیا کروں گا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ یہاں میرے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ ہے۔ اور مجھے اس کے دوستانہ رویے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رابعہ سے ملنا ہے اور کسی طرح اسے نکال کے لے جانا ہے۔

"کیا آپ میرے ساتھ آنا پسند کریں گے۔" اس لڑکی نے انگریزی میں کہا۔

"اوہ یس مرجانہ۔" میں نے چونک کر کہا۔ "کیا میں بہت دیر سے تم کو گھور رہا تھا؟ کوئی بات نہیں... تم ہو ہی ایسی چیز مگر گھورنے سے تمہارے حسن کی آب و تاب کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ اگر کوئی چاند کو گھورتا ہے تو کیا چاندنی میں فرق آتا ہے؟"

وہ مجھے پلکیں جھپکائے دیکھتی رہی۔ غالباً وہ زیادہ انگریزی نہیں سمجھتی تھی اور میں نے تو شاعری کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ تاہم جو بات ہر عورت ہر زبان میں سمجھ لیتی ہے خواہ وہ عبرانی ہو یا گورمکھی، وہ اس نے بھی سمجھ لی۔ یہ حسن کی توصیف و ستائش کی زبان تھی جس کو سمجھنے کے بعد اس کے عارض پھر تازہ گلابوں کی مہک دینے لگے تھے۔

وہ مجھے ایک خواب گاہ میں لے گئی۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ وہ خواب گاہ ویسی ہی تھی جیسے فقیروں کے لیے نہیں بادشاہوں کے لائق تھی۔ دنیا کے سب سے اعلیٰ فائیو اسٹار ہوٹل کا سب سے اچھا کمرا بھی اس کی شان و شوکت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

"یہ باتھ روم ہے۔ اس کے ساتھ ڈریسنگ روم ہے۔ اگر آپ کو میری مدد کی ضرورت ہو تو..."

"نہیں... وہ تو جب میں بہت چھوٹا تھا تب امّاں نہلاتی تھیں۔" میں نے گھور کے کہا۔ "اب میں خود نہا سکتا ہوں بلکہ کپڑے بھی بدل سکتا ہوں۔"

وہ ہنس پڑی۔ "تم فقیر کیوں بنتے ہوئے ہو؟"

"تم کنیز کیوں بنی ہوئی ہو مرجانہ؟" میں نے کہا۔

اس نے خوف زدہ ہو کے ادھر ادھر دیکھا۔ "اس جن کو آپ مجھے بلانے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔" اس نے میری بات گول کرتے ہوئے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کمرے میں ہونے والی گفتگو کہیں سنی یا ریکارڈ کی جا سکتی ہے۔

"کیا کبھی کسی نے تمہیں بتایا ہے کہ مرجانہ کون تھی؟"

"میری جوانا... یہ غالباً ایک نشہ ہوتا ہے۔" وہ بولی۔

"میری جوانا نہیں... مرجانہ..." میں نے کہا۔ "ویسے تو تم بھی نشہ ہو... مگر اصل مرجانہ ایک کنیز تھی... علی بابا کی..."

"کون علی بابا؟"

"وہی... قاسم کا بھائی۔" میں نے کہا۔ "مرجانہ نے اپنی ذہانت سے چالیس چور ہلاک کیے تھے۔ یعنی جو کام علی بابا کے بس کا نہیں تھا وہ مرجانہ نے کر دکھایا... اور... خیر یہ کہانی بہت لمبی ہے اور تم سُن کے کیا کرو گی... دوبارہ سوچتے ہوئے میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے تمہاری... اور تمہاری مدد کی اشد

www.paksociety.com

ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور میں تمہارے پہلے سوال کا دوسرا جواب یوں دیتا ہوں کہ... یس... راف یو پیٹر۔" میں نے اسے انگلی کے اشارے سے قریب بلایا اور پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میں نے نقری چغہ اتار دیا تھا۔ نیچے میرے اپنے کپڑے تھے جو اتنے برے نہیں تھے کہ میں انہیں بھی اتار پھینکتا۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور زور سے کہا۔ "آؤ نفیسہ آنے کا شکریہ باتھ کا۔" اور اسے اندر کھینچ لیا۔

"ڈرو نہیں۔" میں نے سرگوشی میں قریب ہوتے ہوئے کہا۔ اور دروازہ بند کر کے شاور چلا دیا۔

اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ خوف بھی شامل تھا۔

"کیا ہماری گفتگو کوئی سن رہا ہے؟" میں نے اس کے کان میں کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "تم... تم کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "جس لہجے میں اس کتے کے بچے نے تم سے بات کی تھی۔ آخر وہ کیا سمجھتا ہے خود کو۔ اسے خواتین سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔"

"پیٹر... ایسی باتیں مت کریں یہاں۔" وہ رونے کے قریب ہو گئی۔

"تم کیوں ڈرتی ہو اس سے؟" میں نے کہا۔

"اس سے سب ڈرتے ہیں... تم بھی ڈرو۔"

"اور سلینڈ میں تمہارا کون ہے؟" میں نے کہا۔

"سب تھا... میرے گھر والے... ماں باپ... دو بہنیں... ایک بھائی... اور منگیتر... ہماری شادی ہونے والی تھی۔"

"دیکھو... خدا کے لیے ہسٹریا میں مبتلا مت ہو جانا۔" میں نے کہا۔ "اپنے آپ کو سنبھالو... تم سے ہمدردی کر کے میں تمہیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔"

"فرانس میں ہی نہیں پورے یورپ میں اس کے مراسم مافیا کے ایجنٹوں سے ہیں۔" وہ آنسوؤں سے رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"اور ان کے ذریعے..."

"ان کے ذریعے اس نے مجھے... میرے خاندان کو... سب کو بلیک میل کیا اور مجھے ایک سال کے لیے یہاں لے آیا... اپنی کنیز بنا کے... وہ وقت ختم ہونے کے لیے جس کا میں سوچ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن میں یہ وقت صبر و شکر سے کاٹ... دوسری سب لڑکیوں کی طرح... تاکہ باقی لوگ محفوظ رہیں اور میں واپس جا کے شادی کر سکوں۔ اگر میں نے احتجاج کیا... یا بغاوت کی... تو بہت برا ہو گا... میں جانتی ہوں...

یہی وجہ ہے کہ میں جنٹری کی مار بھی برداشت کر جاتی ہوں... کیا تم دیکھو گے اس مہذب وحشی کا انتقام؟" وہ ایک دم پلٹی۔

"نہیں... پیٹر... میں نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ "دیکھ لیا تو بھول نہیں سکوں گا۔"

"ایک لڑکی یہ سب برداشت نہیں کر سکی تھی۔ ایک دن اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے مزاحمت کی اور... قتل کر دیا۔ اس کی لاش دیکھی تھی میں نے بھی۔" اس کا وجود لرزنے لگا۔

"کیا تمہاری عزت محفوظ ہے؟" میں نے الفاظ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کے کیا۔

"ہاں... یہی ایک اچھی بات ہے۔ وہ صرف غلامی کی ذلت دیتا ہے اور بس..." وہ بولی۔ "کچھ لڑکیاں تو اسے بھی تذلیل سمجھتی ہیں کہ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔ مرد کی نظر سے دیکھتا ہی نہیں... حالانکہ وہ سب خوب صورت اور پرکشش ہوتی ہیں۔ ان کو ایک سال قید با مشقت کاٹنی پڑتی ہے پھر ان کی جگہ دوسری آ جاتی ہیں۔"

"میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں... کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔" وہ بولی۔ "آٹھ مہینے گزر گئے ہیں۔ باقی چار بھی گزر جائیں گے۔"

"تمہارا یہ ظالم آقا ابھی کس عورت کی بات کر رہا تھا؟" میں نے اچانک سوال کر دیا۔

وہ جھجکی لیکن خاموش رہی۔

"میں نے وہ جملے بھی سنے تھے، جو اس نے تمہیں کہے تھے۔" میں نے کہا۔

"پھر تو تمہیں مجھ سے یہ سوال کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"دراصل... ایک اتنی ہی بڑی مجبوری میری بھی ہے۔" میں نے الفاظ کو چبا چبا کے کہا۔ "جتنی بڑی تمہاری... بس فرق سیکس کا ہے۔"

"مجبوری کی بھی سیکس ہوتی ہے؟"

"ہاں... کیوں نہیں ہوتی۔" میں نے کہا۔ "مثلاً تمہاری مجبوری مذکر ہے اور میری مونث۔ وہ تمہارا منگیتر ہے جس کی خاطر تم اپنی سب سے بڑی چیز قربان کر رہی ہو... یعنی عزت نفس... اور وہ میری منگیتر ہے جس کی خاطر میں یہ بھیس بدل کے گھومتا پھرتا یہاں تک آ پہنچا ہوں۔ مجھے شک نہیں یقین ہے کہ وہ بھی یہیں کہیں ہے۔"

"اگر ہے تو تم اسے لے جا نہیں سکتے..."

"وہ کیا ہے کہ... ہم دونوں کے لیے انتظار اور جدائی جھیلنا بالکل ناممکن ہے... ہم یا تو ایک ساتھ جی سکتے ہیں ورنہ اکٹھے مر سکتے ہیں... ہمارے لیے ایک ہی بات ہے... [illegible] ایک دوسرے کو چاہتے رہنے پر مجبور نہیں ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ زندہ نہ رہنے کی صورت میں چاہت کہاں رہتی ہے؟" وہ بولی۔

"رہتی ہے... یہی تو بات ہے جو تم مغرب والے نہیں سمجھتے۔ ہمارے مشرق کی عاشقانہ روایات میں محبت صرف جسم کی نہیں ہوتی روح کی بھی ہوتی ہے اور اس دنیا میں جسم کا وجود نہ رہے تو دوسری دنیا میں روحیں مل جاتی ہیں۔ اس عقیدے سے ہی ہمارے لیے بے سکونی کا سامان ہے چنانچہ ہم مر جانا پسند کرتے ہیں لیکن جدائی قبول نہیں کرتے۔" میں نے اسے ایک خود ساختہ نظریاتی فلسفے سے قائل کیا۔

"کیا یہ آواگون کا فلسفہ ہے؟" وہ کنفیوز ہو کے بولی۔

"لاحول ولا قوۃ... نہیں، وہ تو ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ روح کے سات جنم ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اس کا ایک مضحکہ خیز پہلو یہ بھی ہے کہ جسم سے ایک بار نکل جانے والی روح دوبارہ دنیا میں آتی ہے تو ضروری نہیں کہ اسی نسل میں آئے یا اسی مقام کی باشندہ ہو۔ ممکن ہے سو سال بعد کسی اور کے قالب میں نمودار ہو۔ ان کے عقیدے کے مطابق تو یہ ہے کہ اس سال کی مس یونیورس فوت ہو جائے تو اس کی روح اگلے جنم میں کسی چڑیا گھر کے خرگوش میں ہو سکتی ہے یا افریقہ کے کسی آدم خور قبیلے کے سردار کے جسم میں بھی مل سکتی ہے۔ کچھ ایسی ہی خرافات ہیں۔ ہم تو روح کی ابدیت کے قائل ہیں... خیر... تم یہ سمجھ لو کہ مجھے میری محبوبہ مل گئی تو میں یہیں اسی گھر میں تمہارے سامنے اپنا گلا کاٹ لوں گا۔ کسی چھری سے یا قینچی کی دھار سے... اور وہ اس گھر میں ہوئی تو اسی وقت وہ بھی ٹکرا کے اپنا سر دیوار پر پھاڑ لے گی یا دونوں انگلیاں بجلی کے ساکٹ میں ڈال کے کھڑی ہو جائے گی اور ایسے ہی لرزتے ہوئے ٹھنڈی ہو جائے گی جیسے تم لرز رہی ہو... دونوں خون تمہاری وجہ سے ہوں گے۔ اس دہرے قتل کے الزام میں تم کو دنیا کی کسی عدالت سے تو سزا نہیں ہوگی لیکن تمہارا ضمیر تمام عمر تم کو قاتل کہے گا۔"

"یہ... کس مصیبت میں ڈال دیا ہے تم نے مجھے... کسی اور سے پوچھ لو... میں نہیں بتا سکتی۔"

"چلو اتنا ہی بتا دو کہ کیا اس کا نام رابعہ ہے؟"

وہ خاموش باتھ روم کی دیوار سے پشت لگائے کھڑی رہی اور میں نے اس کے اوپر یوں جھکا دیا کہ میرے دونوں ہاتھ دیوار پر تھے اور وہ تقریباً میری گرفت میں تھی۔ اگرچہ میرے اور اس کے جسم کے درمیان تھوڑا ہی فاصلہ تھا مگر میں اس کے بدن سے پھوٹنے والی خوشبو کی ہیجان انگیزی کو محسوس کر سکتا تھا اور اس کے قریب کی آنچ کی تابکار شعاعوں سے محفوظ نہ تھا۔

"آئی ایم سوری۔" میں نے اس کے سکوت سے تنگ آ کے نفسیاتی دباؤ کا یہ دور ختم کر دیا اور الگ ہو گیا۔ "مت گھبراؤ... لیکن یاد رکھو جو شخص مرنے کے لیے تیار ہو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ پاگل بھی ہو سکتا ہے اور... اور شرافت، اخلاقیات اور نیکی بدی کی تمیز کھو دے تو کم سے کم ایسی تیسی۔ جب ہم نہیں تو زمانہ نہیں... محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ یہ فلسفہ تو تمہارے ماحول میں بھی قبولیت کی سند رکھتا ہے۔ میں وہ سب جانثار بھائی کو بتا دوں گا جو تم اب تک مجھے بتا چکی ہو... تاکہ تم بھی دوسری دنیا میں ہمارے ساتھ چلو۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہو کے دھڑام سے غشی کے عالم میں فرش پر گر جائے گی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

"تم... بلیک میل کر رہے ہو مجھے؟"

"یس... جس حد تک میں جا سکتا ہوں ضرور جاؤں گا... مجھے کسی کی پروا نہیں۔" میں نے کہا۔ "جب تمہیں اپنی فکر ہے اور مجھ پر اعتماد نہیں۔"

"پلیز... ایسا مت کرنا... یقین کرو میں کسی رابعہ کو نہیں جانتی ورنہ ضرور بتا دیتی۔" اس کے کپکپاتے ہونٹوں نے سرگوشی کی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

"اچھا وہ عورت کون تھی جو کل شام آئی تھی۔ اس نے نام لینے سے گریز کیا تھا اور کہا تھا کہ تم سمجھتی ہو۔"

"وہ... اس عورت سے شادی کرنے والا ہے۔ میں نے سنا ہے... وہ کوئی انڈین ہے... بہت خوب صورت اور ایسی گلیمرس کہ میں نے ایسی عورت نہیں دیکھی۔ فلموں میں نہ تصویروں میں... اور وہ بہت خوش گفتار... مہذب اور نیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوئی انڈین پرنسس ہے..."

وہ بولتی جا رہی تھی لیکن میں کچھ نہیں سن رہا تھا۔ میرے ذہن میں ہونے والے پہلے دھماکے نے ہی میرے خیالات کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ میں نے ایک دم اسے شانوں سے پکڑ لیا۔ میرے ہاتھوں کی وحشیانہ گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کی چیخ نکل گئی۔

"چھوڑو... چھوڑو مجھے... تم پاگل ہو رہے ہو۔" وہ چلائی۔

لیکن یہ ایسی بات تھی جو خطرناک نہیں تھی۔ اگر کوئی سنتا تو یا تو وہ سمجھتا میری زیادتی کے خلاف اس کا احتجاج ہے

www.paksociety.com

صرف مسکراتا۔

"نہیں... میں تمہیں چھوڑ دوں گا تمہیں۔" میں نے بھی بلند آواز میں کہا مگر اسے چھوڑ دیا۔

"دیکھو اچھی لڑکی۔" میں نے بہت نرمی سے سرگوشی میں اس کی منت سماجت کی۔ "مجھ پر رحم کرو... میں تم سے زیادتی کی معافی مانگتا ہوں... بس مجھے رابعہ کے بارے میں بتا دو... یہ یقین دلا دو کہ وہ عورت رابعہ نہیں تھی جو کل شام آئی تھی۔ جس کا چاند بھائی نے حوالہ دیا تھا۔"

"میں یہ سوچ سمجھ کو گواہ بنا کے کہتی ہوں... کہ میں اس کے نام سے واقف نہیں۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں تمہیں بتا سکتی ہوں کہ اس لڑکی کی شکل و صورت کیسی تھی... مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آئی تھی... اور لوٹ کر کہاں گئی۔ میں نے تو کوئی گاڑی بھی نہیں دیکھی تھی۔"

"تم بتاؤ کہ وہ کیسی تھی... اس کی آنکھیں... اس کے بال... اس کے لب... ناک نقشہ... قد و قامت، لباس... یہ سب تو دیکھا ہوگا تم نے...؟"

اس نے سوچ سوچ کے اور یاد کر کے مجھے خاصی تفصیل فراہم کی مگر اس سے میرا ذہنی خلفشار کم نہیں ہوا۔ یہ رابعہ ہو بھی سکتی تھی اور نہیں بھی... دراصل رابعہ کے خدوخال میں کوئی بات منفرد تھی تو وہ اس کے حسن کی نکہت اور ساحرانہ قوت تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ یا بالوں کا رنگ اور چہرے کی ساخت اور اس کے حسن کا بیان ہوتا تو یہ کسی کی بات بھی ہو سکتی تھی۔ کوئی اسے اپنی چشم تصور سے مینا کاری سمجھتا تو کوئی تیلو... کوئی جنت کی حور کہتا تو کوئی کوہ قاف کی پری۔

اب وقت بہت کم رہ گیا تھا اور میں کچھ معلوم نہیں کر سکا تھا۔ یہ سوچ کے میرا دماغ پھٹنے لگتا تھا کہ چاند بھائی کے دماغ میں رابعہ سے شادی کا خیال ہے۔ میں نے صفائی میں ایک لفظ کہنے کا موقع دیئے بغیر قتل کر دینے کی سوچا تھا۔ پھر عقل کی دیوار سامنے آ جاتی تھی... پاگل مت بنو... وہ رابعہ نہیں ہو سکتی... اور کیا رابعہ ایسا کر سکتی ہے... ہو سکتی ہے... جیسا کہ تم نے ابھی کہا تھا... مگر یہ تسلیم تم نہیں کر سکتی۔ دیکھو... سوچو... سمجھو... حالات کا جائزہ لو... حقیقت اور اصلیت تلاش کرو!

"تم جاؤ۔" میں نے ایک دم اسے بازو سے پکڑ کے دروازے کی طرف کھینچا۔

"جاتی ہوں... مگر..."

"میں نہیں بتاؤں گا... میں اتنا کمینہ آدمی نہیں ہوں۔"

میں نے دروازہ بند کر دیا اور ٹھنڈے پانی کی دھار کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ میرا ابلتا ہوا خون ٹھنڈا پڑنے لگا اور میرے دماغ سے اٹھنے والا شکوک و وسوسوں اور اندیشوں کا دھواں چھٹ گیا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت لوٹ آئی۔

ایک گھنٹے بعد چاند بھائی واپس آیا تو میں نہا دھو کے تازہ دم ہو چکا تھا اور کپڑے بھی بدل چکا تھا۔ وہاں ہر شخص کے لیے ہر وقت کی ضرورت کے مطابق ہر سائز کے ملبوسات سے وارڈ روب بھرا ہوا تھا۔ دوسرے وارڈ روب میں زنانہ ملبوسات تھے اور یہ سب اہتمام مہمانداری تھا۔ اس کے یہاں ہر طرح کے مہمان آتے ہی رہتے ہوں گے۔

میں نے آرام کے لیے ایک پاجامہ سوٹ اور گاؤن منتخب کر لیا تھا کیونکہ طے شدہ طور پر مجھے رات بھر تو یہیں رکنا ہی تھا۔ اس کے بعد کہیں جانا ہوگا تو کہاں جانا ہوگا میں نہیں جانتا تھا۔ نازو اور اکرام کی طرف سے اب مجھے تشویش لاحق نہیں رہی تھی۔ اکرام شیخ میرے تعاقب میں آیا تھا اور میری طرح خوش قسمتی کا شکار وہ بھی ہوگا کہ دیکھنے والا کوئی نہیں۔ مگر اسے ٹوٹ کر لیا گیا تھا اور چاند بھائی کے احکامات کے مطابق واپس بھی کر دیا گیا تھا۔

چاند بھائی سیدھا میرے کمرے میں آیا اور مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر بڑی دوستانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم بہت بہتر نظر آ رہے ہو۔" اس نے کہا اور ایک صوفے میں دھنس گیا۔ "مجھے ایک بزنس اپائنٹمنٹ کے سلسلے میں جانا پڑا۔"

میں نے خود کو بالکل نارمل رکھا۔ "کیا اب تم فارغ ہو؟"

"ہاں... فی الحال۔" اس نے گھڑی دیکھی۔ "اس کے بعد پھر شاید تمہیں ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑے۔"

"تم بہت مصروف آدمی ہو... اور بہت بدنام بھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ تمہارے نام سے ڈرتے ہیں۔"

"کون لوگ؟"

"وہی جو تمہارے کاروبار سے منسوب ہیں۔"

"اور تم انہیں بھی جانتے ہو؟" اس کا لہجہ میرا مذاق اڑاتا تھا۔

"نہیں... مگر جیسا کہ میں نے سنا ہے؟" میں نے کہا۔

"کس سے سنا ہے آخر؟ تم تو ابھی کراچی پہنچے ہو۔ اتنے کم وقت میں تم کراچی جیسے بڑے شہر کے نیک نام اور بدنام لوگوں سے واقف ہو گئے؟" وہ بولا۔ "یہ تو میں جانتا ہوں کہ میری یہ شہرت یا بدنامی لاہور تک ابھی نہیں پہنچی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میرا یقین بے بنیاد ہے۔" میں نے

جھنجھلا کے کہا۔ "کیا یہ بات غلط ہے؟"

"نہیں... وہ بات کیسے غلط ہو سکتی ہے جسے میں نے خود ایک سچ ثابت کیا ہے۔" وہ بولا۔ "دراصل یہ پبلسٹی کا زمانہ ہے۔ سیاست کی طرح تجارت میں بھی شہرت ہونی چاہیے۔ اچھا کاروبار ہو تو اچھی اور بُرا ہو تو بُری... بہت اچھی یا بہت بُری۔ میرا اپنا ایک پبلسٹی بیورو ہے سمجھ لو... جو ایسی خبریں پھیلاتا ہے جن سے میری دہشت قائم رہے۔ میرے کاروبار میں اس آدمی کو مشہور ہونا چاہیے لیکن منفی انداز میں... یعنی یہ کہ وہ ناقابل تسخیر ہے، تباہ کن ہے اور معاف نہیں کرتا۔ جلاد صفت ہے اور آدمی کی جان کی اتنی بھی پروا نہیں کرتا جتنی..."

"کیا تم واقعی ایسے ہو؟"

"تمہارا کیا اندازہ ہے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم اچھا رول بھی... ایک ایوال جینئس... تم مثبت راہ اختیار کرتے تو شاید اس ملک کے وزیر اعظم بھی بن سکتے تھے اور نمبر لائن میں جاتے تو دلیپ کمار سے زیادہ شہرت پاتے۔ کوئی بھی فیلڈ تمہارے لیے لامحدود کامیابیوں کا ضامن ہو سکتا تھا مگر تم نے یہ فیلڈ منتخب کر لیا۔ تم انتقامی ردعمل میں... صرف دشمنوں کے دشمن نہیں بنے۔ تمام انسانوں کے دشمن بن گئے اور اگر میں کہوں کہ انسانیت کے دشمن ہو گئے تو شاید غلط نہ ہو... تھوڑے سے بہت اچھا رول ہم سب ہوتے ہیں، تھوڑے سے بہت اذیت پسند بھی — مگر تم انتہا پر ہو۔ حالانکہ دیکھا جائے تو اس مرحلے پر تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے کہ تم بُرے آدمی بنے رہو... تم راستہ بدلنے پر بھی قادر ہو۔ جو آدمی دنیا کو شکست دے سکتا ہے وہ خود پر بھی فتح حاصل کر سکتا ہے... تم نے دنیا کو سرنگوں کر دیا۔ میری مراد ان قوتوں سے ہے جو اخلاقی، مذہبی... معاشرتی یا قانونی عدل کے ضابطے مرتب کرتی ہیں۔ طاقت — دولت اور شہرت... سب تم نے دنیا سے چھین لیا۔ اب کیا رہ گیا ہے جس کے لیے تم جدوجہد کر رہے ہو؟ تم نے اندھیرے کی منزل کا سفر طے کر لیا۔ کیا اب تمہیں یہ خیال نہیں آتا کہ روشنی کی سمت بھی چلنا چاہیے؟ دیکھنا چاہیے کہ میں اپنی قوت تسخیر پر غلط ناز تو نہیں کرتا؟"

معلوم نہیں میں کیوں اتنا بول گیا اور کیسے بول گیا۔ اس سے زیادہ تعجب مجھے چاند بھائی پر ہوا جو بڑے سکون سے سب سنتا رہا اور سگریٹ کے کش لیتے ہوئے مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے انداز و اطوار میں خفگی یا برہمی... غیر سنجیدگی اور لاتعلقی محسوس ہوتی تو میں چپ ہو جاتا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت غور سے میری بات سن رہا ہے اور سمجھ رہا ہے۔ اس نے مجھے موقع فراہم کیا کہ میں اس کے بارے میں اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کر سکوں۔

"مسٹر سکندر بخت۔" اس نے خاموشی کے مختصر وقفے کے بعد کہا۔ "میں لوگوں سے بے تکلف نہیں ہوتا۔ میرے دوست نہیں ہیں۔ سب کاروباری تعلقات رکھنے والے لوگ ہیں جن کے مفادات مجھ سے وابستہ ہیں۔ باقی خوشامدی، مفت خورے، ملازم اور کارکن وغیرہ ہیں۔ میں سب کو جانتا اور پہچانتا ہوں۔ لیکن میں ایسے لوگ بھی ہیں فلاں دوست تھا... میں اسے کھرا اور صاف سمجھتا ہوں چنانچہ اس کی بات کا بُرا نہیں مانتا... اور بھی کچھ لوگ ہیں جن کے مشورے کو میں اہمیت دیتا ہوں۔ مگر ان میں سے کوئی دوست نہیں ہے۔ اس وقت جب میں دوست بنا سکتا تھا ضائع ہو گیا۔ دوستی کے جذبے کی بنیادیں اس دور میں رکھی جاتی ہیں تو پائیدار ہوتی ہیں جب آدمی مفادات کا مطلب تک نہیں جانتا۔ لیکن جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا میری پرورش میرے دشمنوں نے کی تھی۔ اس وقت میں انہیں دوست سمجھتا تھا۔ وہ شفیق اور مہربان تھے۔ نیک دل اور نیک نیت بھی لگتے تھے لیکن جب مجھے ان کے عزائم کا اندازہ ہوا اور مالی دولت کے بارے میں ان حقائق کا پتا چلا جو ذہن کے لیے ناقابل قبول تھے تو میرا ذہن باغی ہو گیا۔ میں عام بچہ نہیں تھا جس کے ذہن کو وہ غلام بنا لیتے۔ جیسے چھپا تاثر کرنے والا صرف اسی کو حصول بنا سکتا ہے جو قدرتی طور پر ذہین ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ قدرت نے مجھے ایک ایسا دماغ دیا تھا کہ میری بربریت و اتنگ ممکن ہی نہیں تھی۔ پڑھ لکھ کے میں زیادہ منطقی اور... زیادہ باغی ہو گیا۔ میں نے تاریخ پڑھی اور تاریخ کے اوراق میں سفید فام قوموں کے استحصال کا سبق پڑھا تو مجھ پر خود دو اور دو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ادھر میرے ماضی کا زہر میرے خون میں انتقام کی آگ بھڑکا رہا۔ کچھ کرید نے اور تحقیق کرنے سے میرے سامنے وہ حقائق آئے جو مجھے پاگل کرنے کے لیے کافی تھے۔ تو مجھے معلوم ہوا کہ میرا باپ ایک انگریز فوجی افسر تھا جس نے میری ماں سے شادی کی یا شادی کا ڈھونگ رچایا۔ تین سال اس کے ساتھ رہا اور آئیسر ہو اٹھا جس میں واپس برطانیہ چلا گیا۔ جب میں ایک سال کا تھا اور میری ماں کو بھلے بقیہ وہ کوئی لیفٹیننٹ بریڈلے تھا۔ اس سے زیادہ میری ماں نہیں جانتی تھی... یا اسے کسی نے بتایا نہیں۔ وہ انگریز افسروں کے پاس جاتی رہی۔ انھوں نے بریڈلے کی طرف داری کی اور میری ماں کو دھتکارتے بھی

www.paksociety.com

ہے... اور چیکا رہتے بھی ہے کیونکہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ غالباً میں اسی کا عکس ہوں۔ وہ انگلستان جانے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی اور جاتی بھی تو بریڈلے کو کہاں تلاش کرتی۔ وہ اپنے بارے میں کچھ بھی تو بتا کے نہیں گیا تھا اور جو بتا گیا تھا وہ غلط تھا۔ ایسا شخص انگلستان میں میری ماں کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ بالفرض محال وہ پہنچ جاتی اور اس کا گریبان تھام لیتی' ہندوستانی عورت کی طرح روتی چیختی فریاد کرتی کہ تم تو میرا سہاگ ہو' میری مانگ کی افشاں ہو اور ماتھے کا سیندور ہو تو وہ اسے ایک مار مار کر غلام زادی... تو حرام خور بھی ہے کہ میرے دامن پہ داغ لگاتی ہے اور وہ متعصب حاکم لوگوں کا نفرت کرنے والا معاشرہ بھی اسے ٹھوکریں مارتا... قصہ مختصر... وہ بچے ایک رات کانونٹ کے دروازے پہ چھوڑ کے غائب ہو گئی۔ وہ مختلف فوجی افسروں کی داشتہ رہی اور پھر گم ہو گئی۔ یہ اپنی سوانح عمری میں نے برسوں میں بڑی محنت سے مرتب کی ہے۔ میں نے بریڈلے کا سراغ لگا لیا تھا لیکن وہ دوسری جنگ عظیم میں نازی فوجیوں کا قیدی بن کے انتہائی عبرتناک موت سے دوچار ہو چکا تھا۔ غالباً اس واقعے کے بعد میں اور اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ اس کی یونٹ کے پرانے فوجی افسر مجھے ملے... مگر وہ ریٹائرڈ لائف گزار رہے تھے اور سب کچھ بھول چکے تھے۔ انھیں جنگ عظیم اور ہندوستانی سیاست کے سوا فوجی کیریئر کے عام واقعات تو یاد تھے مگر ایک مقامی عورت کیسے' ہزاروں خوب صورت عورتوں سے ہزاروں افسروں کے مراسم تھے۔ جن سے انھوں نے شادیاں بھی کی تھیں' شادی کے نام پہ دھوکے بھی دیے تھے' بیوی بچوں کو چھوڑ کے لوٹ بھی گئے تھے... سوری۔ بریڈلے کی اس والنٹ کے بارے میں اب کیا بتایا جا سکتا ہے کہ وہ بعد میں کس کے ساتھ تھی؟ ایسے تمام حوصلہ شکن جوابات سُن کے بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور بالآخر تین افراد کو تلاش کرنے میں کامیاب رہا جنھوں نے اعتراف کیا کہ ہاں ایک ایسی عورت تھی تو سہی۔ بس وہ بریڈلے کو تلاش کرتی رہتی تھی۔ بعد میں ہم نے اسے سپورٹ کیا۔ میں سپورٹ کا مطلب سمجھتا تھا۔ ان تینوں کو میں نے قتل کر دیا۔ لیکن یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ اس سے بہت پہلے جب میں بیس سال کا تھا اور اس کانونٹ میں جہاں میری تعلیم و تربیت مکمل ہوئی تھی اور امید کی جا رہی تھی کہ میں ایک اچھا کرسچین بن کے تبلیغ کرنے والوں کے مشن کا نام روشن کروں گا' میں نے خاموشی سے ان لوگوں کو ٹھکانے لگانا شروع کیا جن کو میں نے پہلے ہی منتخب کر رکھا تھا کہ وہ اصل دشمن ہیں۔ اس کانونٹ کی مدر سپیریئر انتہا پسند نہیں تھی اور تمام مذاہب کو قابل احترام قرار دیتی تھی۔ مذہب اختیار کرنے کے معاملے میں فرد کی آزادی کے حق کو بھی تسلیم کرتی تھی چنانچہ میں نے اُسے چھوڑ دیا لیکن ایک اور نن تھی جو صرف اور صرف مسلمانوں کی اور اسلام کی دشمن تھی۔ اُس نے مجھے یہ سمجھانے کی پوری کوشش کی کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور مسلمان ایک بربریت پسند مذہب کے پیروکار ہیں... اور میں نے چھپ چھپ کے تاریخ اسلام سے آگاہی حاصل کر لی تھی اور اسلامی عقائد کے خلاف اس کے پروپیگنڈا کا مجھ پہ الٹا اثر ہو رہا تھا۔ مائنڈ یو... اس وقت جنگ عظیم جاری تھی جب وہ نن مجھے اپنے مذہب اور اپنی قومیت سے منحرف کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ مجھے بہت افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میرے بہت سے ساتھی اس کی تبلیغی شعلہ بیانی کا شکار ہو کے کرسچین بنے اور مسلمانوں کے خلاف تبشیری سرگرمیوں میں شامل ہو گئے۔ دوسرا ایک پادری تھا۔ وہ یہی کام بڑی نرمی اور متانت سے کرتا تھا جیسے کوئی زہر کی گولی کو مٹھائی میں لپیٹ کر حلق سے اتار دے۔ تیسرا ایک ہندو تھا جو عیسائی ہونے کے بعد ڈاکٹر آف تھیالوجی کی ڈگری حاصل کر چکا تھا۔ اس کا نام ہربرٹ جے ولیم تھا اور وہ صرف مذہبی بنیادوں پر نہیں سیاسی نظریات کی بنا پر بھی مسلمانوں کا دشمن تھا۔ ان تینوں کی وجہ سے اکثر بحث چھڑتی تھی۔ باقی بیوقوف بحث کرنے کے قابل ہی نہیں تھے۔ میں ظاہر یہ کرتا تھا کہ مجھے صرف جستجو ہے اور میں تجسس کا شکار ہوں تو زیادہ جاننے کے لیے... وہ مزید زہر افشانی کرتے تھے۔ میں حقائق سے موازنہ کرتا رہتا تھا مگر ان سے کبھی کچھ نہیں کہتا تھا۔ وہیں سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی اپنی قوم اپنے وطن اور اپنے مذہب کے لیے کچھ کروں' اسی جذبے کے ساتھ جیسے یہ تین افراد کارِ ثواب سمجھ کے کر رہے تھے۔ انگریزوں کا عموماً ہندوستانیوں کے ساتھ جو رویہ تھا اس کی گواہ تاریخ ہے۔ مشنری جو کچھ کر رہی تھی اس کو میں نے بھگتا تھا اور یہی وہ عوامل تھے جنھوں نے مجھے باغیانہ انتقامی اور تخریبی جذبات میں مبتلا کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔ اور مجھے فوراً کچھ کرنا چاہیے۔ دلائل سے میں ان کے عقائد اور مشن کو تبدیل نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میں نے راست اقدام کیا۔ اس زمانے میں مسلم قوم پرستی کی تحریک عروج پر تھی۔ انگریز رخت سفر باندھ رہے تھے۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور جمہوری حکومت کے انتخابات نے مسلم لیگ نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی

واحد نمائندہ جماعت ہے۔ میں نے ایک فہرست بنائی اور اس کے مطابق اپنی مہم شروع کی۔ وہ جنگ جس کے لیے میں کئی سال سے ذہنی تیاری میں مصروف تھا۔ سب سے پہلے میں ہربرٹ جے ولیم سے ملا۔ وہ ایک مشن کالج میں پڑھاتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ عیسائیت کے فروغ کے لیے میری کوششیں کس حد تک بار آور ہو چکی ہیں؟ وہ مجھے ہوسٹل میں اپنے کمرے میں لے گیا۔ اسی کمرے سے تیسرے دن اس کی لاش برآمد ہوئی۔ جب لاش کی بو مقفل دروازے سے باہر پہنچی... پھر میں نے اس نن کو ختم کیا اور پھر اس پادری کو... میں نے اُسے شربت میں زہر ملا کے پلا دیا۔ وہ بھی تو یہی کرتا تھا... پھر میں مسلم لیگ کے رضاکاروں میں شامل ہو گیا اور جلسوں جلوسوں میں شرکت کے لیے وہاں بھی گیا جہاں میری فہرست کے مطابق دیگر مذہب اپنی جارحانہ تبلیغ کا زہر پھیلا رہے تھے۔ سات مختلف افراد انتہائی پُراسرار حالات میں ملے گئے۔ ان میں تین مسلمان تھے... سابق مسلمان... اور چار ہندو... وہ ڈاکٹر تھے جو مشن اسپتالوں میں جسم کے ساتھ 'روح' کو شفا دینے میں مصروف تھے۔ باقی تحریر لیکچرر تھے۔ ظاہر ہے ایک مخصوص ادارے سے تعلق رکھنے والے مشن کے قابل فخر خدمات انجام دینے والوں کی اموات کا سلسلہ پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں پکڑا جاتا یا مارا جاتا میں پاکستان بھاگ آیا۔ یہاں میں نے اپنی زندگی کے دوسرے مشن کا آغاز کیا یعنی اپنی ماں کے ساتھ ظلم اور زیادتی کرنے والوں کو تلاش کرنا اور انھیں وہ سزا دینا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس دوسرے مشن میں بہت سے دلچسپ واقعات بھی پیش آئے۔ وہ سب سنانے بیٹھ گیا تو رات گزر جائے گی مگر بات ختم نہیں ہوگی۔ صرف وہ واقعات سناتا ہوں۔ برطانیہ میں جو تین افراد میرے ہاتھوں مارے گئے تھے انھوں نے مرنے سے پہلے واضح الفاظ میں اعتراف کر لیا تھا کہ انھوں نے بریڈلے کے جرم کو چھپایا... میں نے تحفظ فراہم کیا اور میری ماں کو اپنے ساتھ رکھا مگر بریڈلے کے سب بیچارے تھے نہیں۔ اس کام میں میرے کچھ سال صرف ہوئے تھے۔ سب سے پہلے مارا جانے والا رائل ایئر فورس کا ایک ونگ کمانڈر نیلسن تھا۔ وہ رنگون اور کلکتہ پہ جاپانیوں کی بمباری کے قصے یوں سناتا تھا جیسے انھیں مار بھگانے والا وہی ایک آدمی تھا۔ میں نے اس سے دوستی کی۔ اس کی سب سے چھوٹی بیٹی کو بھگایا۔ اس سے جعلی میرج کی اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ دن آنے والا ہے تو میں نے ایک دن دونوں کا گلا گھونٹ دیا اور گلا بند کر کے بتا دیا کہ میں کون ہوں اور میں نے یہ کس لیے کیا تھا۔ میں نے ونگ کمانڈر نیلسن کو پنکھے سے لٹکا کے پھانسی دی اور اس کی بیٹی کو بے ہوش چھوڑ کے فرانس بھاگ گیا۔ وہاں سے واپس پاکستان آیا اور دو سال بعد پھر برطانیہ پہنچا تو ایک بدلا ہوا شخص تھا۔ نام صورت اور حلیے سے مجھے کوئی پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔ میرا دوسرا شکار ایک آرمی آفیسر کیپٹن گاڈفرے تھا۔ اس کے ساتھ بھی میں نے بالکل وہی کیا جو ونگ کمانڈر نیلسن کے ساتھ کیا تھا۔ اس کی بڑی بیٹی بلاشبہ بہت حسین تھی اور مجھ سے محبت بھی کرتی تھی لیکن محبت تو میری ماں بھی بریڈلے سے کرتی تھی اور وہ بھی بہت خوب صورت تھی۔ تیسری بار میں انگلینڈ گیا تو میں نے میجر ہربرٹ کی بیٹی سے شادی کی اور چھ ماہ بعد اس کے باپ کو اس کی نظروں کے سامنے پھانسی دے کر لوٹ آیا۔ ان سب پر میں نے واضح کر دیا تھا کہ ان کو میں انہی کے سکوں میں ادائیگی کرنے آیا تھا۔ انگریزی کے اس محاورے کا مطلب تم سمجھتے ہو گے۔ اب تم یہ سمجھ رہے ہو گے کہ یہ سب اتنا آسان تو نہیں ہو سکتا کہ ایک ہندوستانی وہاں جائے' کسی مغرور اور متعصب انگریز کی حسین و جمیل لڑکی کو بھگائے' اس سے شادی کرے' پھر اسے پھانسی دے اور بھاگ آئے۔ تم جانتے ہو میرے لیے کیوں آسان ہوا؟ میرے گورے رنگ کی وجہ سے اور میرے کانونٹ کے بیک گراؤنڈ کی وجہ سے۔ میں انگریز کے لہجے میں انگریزی بولتا تھا' انگریز نظر آتا تھا' انگریزوں کے رسم و رواج اور مذہبی عقائد سے واقف تھا۔ چنانچہ میں نے جب بھی شادی کی تو خود کو خالص انگریز ثابت کر کے کی... تم دیکھ سکتے ہو کہ انگریز بننا میرے لیے مشکل نہیں... ورنہ یہ تو ناممکن تھا کہ کسی ہندوستانی پر کوئی خالص انگریز شریف زادی فریفتہ ہو جاتی تو اس کا باپ شادی کی اجازت کی بجائے بیٹی کو بھی گولی مار دیتا۔ نتیجہ یہ کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے کسی ہندوستانی پاکستانی کو نہیں ایک انگریز نوجوان کو تلاش کرتے رہے جس کے تین مختلف نام تھے' تین مختلف اور متضاد حلیے تھے جو بعد میں بوگس ثابت ہوئے۔ انھوں نے بالآخر اسے ایک جنسی دیوانے کا فعل قرار دیا مگر تینوں قتل دو دو سال کے وقفے سے ہوئے جب لوگ پرانے کیس کو بھول چکے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آج برطانیہ میں کہیں میرے تین ناجائز بیٹے لاوارث پھر رہے ہیں۔ میری خواہش تھی ان کی مائیں بھی جسم فروشی پہ مجبور ہوں لیکن اس معاشرے میں کنواری ماں اور بن باپ کے بچے کے ساتھ وہ سلوک نہیں ہوتا جو یہاں ہوتا ہے۔ اُلٹا وہ سب کی ہمدردی کے مستحق ٹھہرے جو میرے انتقام کا

www.paksociety.com

نشانہ بنے تھے۔ میرے انتقامی مشن کا تیسرا دور یہ ہے جو ابھی ختم نہیں ہوا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ میں پاگل ہوں... ٹھیک ہے... میں پاگل ہوں... میں قانون کی نظر میں مجرم ہوں کیونکہ میں جو کچھ کر رہا ہوں خلافِ قانون ہے لیکن اس سے مجھے تسکین حاصل ہوتی ہے... کیا یہی تم بھی نہیں کر رہے ہو؟ کیا تمہاری پوزیشن بھی بالکل ایسی نہیں ہے؟ میں ان سفید فام اقوام کی نسلوں کو تباہ کر رہا ہوں جنھوں نے ڈیڑھ سو سال تک حکومت کے نام پر افریقی اور ایشیائی ملکوں کو لوٹا' ان کی عورتوں کو مالِ غنیمت سمجھا' ان کے وسائل پر قبضہ کیا اور وہاں اپنے ظلم و استبداد کی اتنی نشانیاں چھوڑ گئے کہ شاید ہماری آزادی ادھوری رہ گئی۔ ہماری اقدار... ہماری تہذیب... ہمارا مزاج سب بدل گئے۔ ان کا نظامِ انصاف' نظامِ حکومت اور نظامِ زندگی سب باقی ہیں۔ انھوں نے ہمارے معاشرے' قوم اور ملک کو خراب کیا۔ اب میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ وہاں منشیات کا زہر پھیلا دوں اور ان کو اخلاقی اور روحانی طور پر تباہ کر دوں۔ ان کا پیسہ یہاں لاؤں جیسے وہ ہندوستان سے سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ برطانوی' فرانسیسی اور ڈچ' یہ تینوں ہی زیادہ استعمار پسند اقوام تھیں۔ آج میری سرگرمیوں کا مرکز یہی تینوں ممالک ہیں۔ میں وہاں کی ان گنت لڑکیاں غلام بنا کے لا چکا ہوں اور مڈل ایسٹ کی منڈی میں بیچ چکا ہوں۔ ان گنت لڑکیوں کو جسم فروشی کی راہ پر لگا چکا ہوں اور ان ملکوں کی دولت کو اپنے ملک میں کھینچ رہا ہوں اور یہ دولت ایک طرف تو ملک کی صنعتی ترقی میں کام آ رہی ہے' بے روزگاری کم کر رہی ہے اور پیداوار بڑھا رہی ہے لیکن دوسری طرف خود میری دولت میں اضافہ کر رہی ہے۔ کیا تم یقین کرو گے کہ ہر سال میں اپنی آمدنی کا دو تہائی حصہ بانٹ دیتا ہوں...؟ میں اسلامک مشن... دینی مدارس' اسلامی تاریخ و تہذیب پر ریسرچ' اسپتالوں' اسکولوں اور فلاحی اداروں میں تقسیم کرتا ہوں۔ بالکل گمنام رہتے ہوئے میں نے لاکھوں روپے کی گرانٹس مختص کر رکھی ہیں' ان اداروں کے لیے جن کے بارے میں خود میں مطمئن ہوں کہ وہاں کوئی غبن اور ہیرا پھیری نہیں ہے۔ ان میں یتیم خانے اور محتاج گھر بھی شامل ہیں۔ میں صحیح تعداد تو نہیں بتا سکتا کہ میں نے کتنے مستحق طلبا کو باہر بھیجنے اور اعلیٰ تعلیم دلانے کے اخراجات برداشت کیے' کتنی غریب لڑکیوں کے لیے جہیز فراہم کیا' کتنے مریضوں کو اپنے خرچ پر باہر بھیجا اور خدا نے انھیں شفا دی۔ اب وہ صحت مند ہیں اور محنت کر کے اپنے کنبے کی کفالت کر رہے ہیں لیکن تم پہلے آدمی ہو جس کے سامنے میں یہ اعترافات کر رہا ہوں۔ جانم جہانی مولوداں ایک بہت خطرناک اسمگلر مشہور ہے۔ لیکن وہ ایک فرضی کردار ہے۔ وہ میں نہیں ہوں اور یہ سب میں کسی مقصد کے بغیر کر رہا ہوں۔ تم کہو گے کہ یہ کیا بات ہوئی۔ مقصد کے بغیر بھی کوئی کام ہوتا ہے؟ میری مراد کسی صلے کی تمنا سے ہے۔ میں نیک نامی خریدنا چاہتا ہوں نہ ثواب کمانے کی فکر میں ہوں۔ میں ایک مجرم' گنہگار اور جنونی شخص ہوں یہ میں جانتا ہوں لیکن میں نے جو کیا اپنی تسکین کے لیے کیا۔ اچھا کیا یا برا کیا۔ اس سے مجھے غرض نہیں۔ آگے اس کی مرضی' مجھے بخشے یا نہ بخشے۔ اب ایک آخری سوال رہ جاتا ہے کہ میں نے یہ سب تمھیں کیوں بتایا جو کسی کو معلوم نہیں۔ تو اس کا جواب میں کھانے کے بعد دوں گا۔"

میرے ذہن کی کیفیت بڑی عجیب تھی۔ میں قوتِ فیصلہ سے محروم ہو چکا تھا اور یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ اس شخص کو کیا سمجھوں۔ دیوانہ یا فرزانہ۔ مجرم یا بے قصور۔ اس نے دنیا کے ساتھ وہی کیا تھا جو دنیا نے اس کے ساتھ کیا تھا... غالب نے کہا تھا کہ "ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں"۔ وہ بھی انسانوں کا کاٹا ہوا تھا مگر وہ ڈرنے والا نہیں تھا۔ اس نے پلٹ کر ان انسانوں کو کاٹنا شروع کر دیا تھا جو کٹکھنے تھے یا جو بے حس تھے۔ اس کی منطق نرالی تھی مگر میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا کہ میری اپنی پوزیشن اس سے مختلف نہیں تھی۔ ہم الگ اس لیے تھے کہ ہمارے وقت کے درمیان فاصلے تھے ورنہ راستہ تو میرا بھی وہی تھا۔ وہ انتہا پسند تھا لیکن ایسا میں نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے نزدیک میں بھی انتہا پسند تھا۔ اعتدال کا راستہ اختیار کرنا مصلحت یا منافقت اس کے لیے بھی اتنی ہی ناممکن تھی جتنی میرے لیے اور اگر وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا تو اس کے نامۂ اعمال میں گناہ سے زیادہ ثواب تھے۔ مگر اس کا فیصلہ تو خدا کے سوا کوئی کر ہی نہیں سکتا تھا۔

کھانا بہت اچھا تھا اور کھانے کا ماحول بھی بہت اچھا تھا لیکن مجھ سے کچھ نہیں کھایا گیا۔ ایک نہیں ہزاروں سوالات تھے جو میرے سینے کا بوجھ بنے ہوئے تھے۔ ان کے وزن سے میرا دم گھٹ رہا تھا اور میں ایک سوال کے جواب کو دوسرے سوال سے متصادم پاتا تھا۔

کھانے کے بعد وہ پھر غائب ہو گیا اور مجھے ایک گھنٹے کی تنہائی میں بہت کچھ سوچنے کا موقع ملا لیکن سب سوالوں کی بنیاد وہی ایک سوال تھا کہ آخر یہ سب اعترافات میرے سامنے کیوں؟ اپنی داستانِ حیات سنانے کا' اپنے جرائم اور اپنی نیکیاں گنوانے کا مقصد کیا ہے؟ کیا فائدہ ہے اس کا؟ میرا اس میں کیا؟

www.paksociety.com

باتوں سے آشنا ذہین، منطقی سوچ رکھنے والا، مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نظر آنے والا، اچھائی اور برائی کو سمجھنے کی صلاحیت رکھنے والا بہ ظاہر اعتبار سے کامیاب۔ ایسے ماحول میں کیسے زندہ ہے... یہ کنیزیں کہ ان کے ساتھ اس کا سلوک، غلام زادیوں کی خرید و فروخت، منشیات کا دھندا، نسلیں خراب کرنے کا مشن، یہ انتقام ہے یا پاگل پن، میں تو اسے خطرناک قسم کا پاگل پن ہی کہوں گا حالانکہ وہ کسی کے لیے ذرا بھی پاگل اور خطرناک نہیں۔ مگر جو آدمی صرف نفرت کر سکتا ہو جس کے دل میں محبت نہ ہو... مگر یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں آخر اسے احساس تو ہے کہ لوگ دکھی ہیں، غریب ہیں، پریشان ہیں اور وہ ان کے لیے سب کچھ کر رہا ہے۔ کیا یہ انسانیت کی محبت نہیں ہے؟ نہیں... وہ مانتا ہے کہ یہ سب وہ اپنی ذات کی تسکین کے لیے کرتا ہے... اسے صرف اپنے آپ سے محبت ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے صرف اپنے لیے کرتا ہے۔ وطن، قوم، مذہب سب کے نعرے خود فریبی ہیں۔

جب وہ آیا تو میں کمرے میں چکر لگاتے ہوئے سگریٹ کا پورا پیکٹ پھونک چکا تھا۔

"سوری... مجھے پھر جانا پڑا۔" وہ بیٹھ گیا۔ "کافی ہو گئے؟"

"ہاں... اور تم اب میرے سوالوں کے جواب دو گے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں بھی پاگل ہو جاؤں گا۔"

"کچھ لوگوں کے نزدیک تم پاگل ہی ہو۔" وہ ہنسنے لگا۔

"وہ لوگ یہاں نہیں ہیں... یہاں تم ہو اور میں ہوں۔"

میں نے کہا: "تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے تھے... میں نے صرف سیٹھ چاند میانی سونا والا کا نام سنا تھا... مگر وہ تم نہیں ہو... تم نے خود بتا دیا کہ تم کون ہو... اور یہ بھی اعتراف کر لیا کہ جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے وہ آج تک کسی اور کو نہیں بتایا۔ اگر یہ جھوٹ نہیں ہے تو پھر بتاؤ کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"مجھے معلوم تھا کہ سب سے اہم یہی سوال ہے۔" وہ بولا اور اس نے ملازم کو کافی کے لیے کہا۔

"ہاں... پہلے میرے نزدیک زیادہ اہم ایک اور بات تھی، مگر اب اس کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"مسٹر سکندر بخت۔" وہ سگریٹ جلا کے اطمینان سے بیٹھ گیا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ اب انتقام کا سلسلہ ختم کر دوں کیونکہ اس میں تسکین کا سامان نہیں رہا۔ جب سے میں نے تمہارا نام سنا تھا اور مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم چوہدری دلاور کے خلاف جنگ لڑ رہے ہو، مجھے تمہاری ذات سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ میں نے تمہارے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرنے کے بعد محسوس کیا کہ میرے خیالات بدل رہے ہیں اور اب مجھے اپنے انتقام کے مشن کو جاری رکھنے کا جواز بہت کمزور نظر آنے لگا ہے۔"

"تم چوہدری دلاور کو کیسے جانتے تھے؟"

"کاروباری حریف ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔" وہ سادگی سے بولا۔

"چوہدری دلاور... تمہارا حریف ہے؟"

"ہاں... صرف کاروبار کی حد تک۔" وہ بولا۔ "میں پہلے میر شرافت علی کے ساتھ مل کے منشیات کی منڈی میں آیا۔ پھر قدم جماتے... اس نے میرے رستے راست کو کھینچ لیا نواب خسرو جمشید کو۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تم... ان سب سے واقف ہو؟"

"میں نے کہا نا کہ اس کاروبار میں وہ بھی شامل تھا۔ اس کا مقصد منافع کمانا تھا۔ منافع میں بھی کما رہا تھا لیکن میری پالیسی ذرا مختلف تھی، اس لیے تو میں نے سوچا کہ چوہدری دلاور کو سزا دوں اور نواب خسرو جمشید کو ٹھکانے لگا دوں۔ یہ کام جتنی جلدی ہو سکتا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ کیا فائدہ... کام تو ہم ایک ہی کر رہے ہیں اور مجھے کوئی نقصان نہیں ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں نے دونوں پر لعنت بھیجی اور اپنے کام میں لگا رہا۔ پھر اچانک تمہاری اور چوہدری دلاور کی دشمنی کی خبریں آنے لگیں اور میں نے صرف دلاور کا نام سن کے دلچسپی لی۔ تمہیں تو میں نام سے بھی نہیں جانتا تھا۔ میں کئی بار لاہور گیا اور مختلف لوگوں سے ملا تو مجھے پتا چلا کہ دلاور نے نیا دھندا شروع کر دیا ہے اور وہ ملک دشمن عناصر کا آلہ کار بن رہا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ تمہارے اور اس کے درمیان اصلی جنگ چھڑ گئی ہے اور تم نے کوئی تنظیم بنا لی ہے... ملک دشمنوں، تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں کے خلاف لڑنے کے لیے۔ میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے تمہارے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے وسائل کا استعمال کیا تو بہت سی نئی باتیں سامنے آئیں۔ اب میرے پاس ایک مکمل فائل ہے جس میں تمام اخبارات کے تراشے ہیں۔ تمہارے خلاف درج کیے جانے والے سارے مقدمات کی تفصیل ہے۔ تمہارے سب ساتھیوں کے بارے میں بنیادی معلومات ہیں۔ اس ریسرچ کے نتیجے میں مجھ پر بہت

www.paksociety.com

سے انکشافات ہوئے۔ ایک یہ کہ تمہارا مشن بھی انتقامی ہے۔ تم بھی اسی طرح جذباتی ہو جتنا میں تھا۔ تم بھی مظلوم ہو لیکن تمہارے پیش نظر بھی قومی اور ملکی مفادات ہیں۔ تم نے بھی قتل سمیت وہ تمام جرم کیے ہیں جو میں نے کیے تھے۔ پھر میں نے فرق پہ غور کیا تو فرق بہت واضح تھا۔ تم دولت نہیں کما رہے تھے دولت سے عیش نہیں کر رہے تھے۔ تمہارے پیش نظر حصول دولت کا مقصد تھا ہی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم نے ذاتی انتقام کے جذبات سے شروع ہونے والی جنگ کو ایک غیر ذاتی جدوجہد میں بدل دیا تھا جو ایک مثبت پہلو رکھتی تھی۔ ایسا میں نہیں کر سکا تھا۔ میں ابھی تک اپنی ماں کے ساتھ ہونے والے ظلم کا انتقام لے رہا تھا۔ تمہی سے میری سوچ بدلی۔ میں نے سوچا کہ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں کہ اس جنگ کو ختم کر دوں جو میں نے انگریزوں اور تمام استعماری قوتوں کے خلاف شروع کی تھی اور جس کا واحد مقصد اب انھیں زیادہ سے زیادہ ذلیل کرنا اور نقصان پہنچانا رہ گیا تھا۔ میں اپنی توانائی، صلاحیتیں اور وسائل سے اس دوسری جنگ میں شامل ہو سکتا ہوں جو زیادہ اہم ہے۔ اپنے ہی ملک کے غداروں کے خلاف۔۔۔ آہستہ آہستہ مجھے یہ علم بہت معمولی اور۔۔۔ گھٹیا لگنے لگا کہ میں بے بس اور کمزور لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کر دوں، انھیں خریدوں اور بیچوں۔ ان پر ظلم روا رکھوں۔۔۔ حالانکہ یہ وہ نہیں جو ظلم میری ماں کے ساتھ ہوا تھا تو میں اس طرح انتقام کے ذریعے ظلم کو ختم نہیں کر رہا ہوں۔۔۔ ظلم کو پھیلا رہا ہوں۔"

"پھر تم نے کیا قدم اٹھایا۔" بہ حرف سوچا اور سوچ کے رہ گئے۔ یہ جو ماحول میں دیکھ رہا ہوں۔۔۔ یہ کنیزیں اور ان کے ساتھ تمہارا سلوک اور انداز تخاطب۔۔۔" میں نے کہا۔

وہ چونکا "تم سن رہے تھے۔۔۔ اور۔۔۔ سمجھ رہے تھے؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "میں فرنچ جانتا ہوں۔"

وہ کچھ دیر صدمے کی حالت میں بیٹھا رہا "اس کا مطلب ہے تمہارے بارے میں میری معلومات نامکمل تھیں۔"

"کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ مکمل معلومات رکھتا ہے۔ خود اپنے بارے میں وہ سب نہیں جانتا۔" میں نے کہا "علم کے کمال اور کامل ہونے میں بہت فرق ہے۔"

"خیر۔۔۔ وہ تو میں خود ہی بتا رہا ہوں۔۔۔ کہ میں یہ سب کھیل ختم کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "میں ان سب کو واپس بھیج دوں گا اور۔۔۔ اس کاروبار سے بھی دستبردار ہو جاؤں گا۔"

"کیا تم احساس جرم کی خلش زیادہ محسوس کرنے لگے ہو؟"

"مجھے بھی کہہ لو۔۔۔ ہر آدمی کی زندگی میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب وہ بہت سی چیزوں کو اور زندگی کے مفہوم کو مختلف انداز سے دیکھنے لگتا ہے۔" وہ بولا "کیا تمہاری زندگی میں ایسا ہی موڑ نہیں آیا تھا جب تم نے اچانک محسوس کیا تھا کہ وہ سب بے معنی ہو گیا ہے۔۔۔ جو تم کر رہے تھے۔۔۔ اور پھر تم نے اس انقلاب کو قبول کر لیا تھا؟"

"ہاں۔۔۔ ایسا ہوا تھا۔" میں نے سوچ کے کہا "لندن سے واپس آ کے میں نے اس تبدیلی کو ناگزیر سمجھتے ہوئے قبول کیا تھا ورنہ اس سے پہلے میری زندگی یکسر مختلف تھی۔"

"مگر ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا۔" وہ بولا "لیکن پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے فیصلہ آسان کر دیا۔ چوہدری دلاور کے کچھ لوگوں نے میری ایک لانچ پہ قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ معلوم نہیں غلط فہمی کی بنا پہ یا عمداً۔ لانچ کے عملے نے مقابلہ کیا اور حملہ کرنے والوں میں سے کچھ مارے گئے کچھ سمندر میں کود کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ جس لانچ پہ وہ خود آئے تھے وہ ہم نے پکڑ لی۔ اس میں اسلحہ تھا اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکی کو نکال لینے کے بعد لانچ غرق کر دی گئی۔ مجھے یہ سب معلوم ہوا تو میں نے کہا کہ لڑکی کو یہاں لاؤ۔ دراصل اسی لڑکی نے مجھے بتایا کہ وہ دلاور کے آدمی تھے اور ان کی لانچ کے بارے میں اندیشہ تھا کہ ڈوب جائے گی۔ معلوم نہیں اس میں کیا نقص پیدا ہو گیا تھا۔ عملے نے طے کیا کہ وہ کسی دوسری لانچ پر قبضہ کر لیں۔ میں نے اس معاملے میں دلاور سے بات کی۔۔۔ بہت سخت لہجے میں کہ میں نے پہلے تمہیں معاف کر دیا تھا جب تم فسروشیند کو لے گئے تھے لیکن یہ کیا حرکت ہے؟ اس نے معافی مانگی اور کہا کہ وہ جرمانہ یا ہرجانہ ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کون لوگ تھے۔ انھیں میرے حوالے کرو۔ وہ اس پر رضامند نہیں ہوا اور اصرار کیا کہ غلطی بھی انسان سے ہی ہوتی ہے اور یہ کافی ہے کہ وہ معافی بھی مانگ رہا ہے اور اگر نقصان ہوا ہے تو وہ بھی پورا کرنے کو تیار ہے۔ میں نے کہا کہ چلو ٹھیک ہے۔ میرے دو آدمی مارے گئے تھے وہ واپس لا دو تو بات ختم۔۔۔ ورنہ سزا میں خود دوں گا اصل مجرموں کو۔ اس نے فون بند کر دیا۔ پھر میں نے تفصیلات کو اس لڑکی سے مزید بات کی، وہ لڑکی رابعہ تھی۔"

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات نویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

پسندیدہ رسائل و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں
عمران لائبریری
مسجد بیورو ڈ محلہ عید گاہ روڈ [illegible]

شکاری

نئی صدی نیا سال نیا رنگ نیا آہنگ
احمد اقبال کے شہرۂ آفاق قلم سے

معاشرے کے ان ناسوروں کی روداد جو گوشت و پوست کے پیکر انسانی ہڈیوں میں اتر رہے تھے
ایک کمسن پرجوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے جلد دن سنگین ہوتے
آس و یاس، خوف و ہراس، تلخ حقائق، مخبری، حرب

یہ اتنا بڑا دھماکا تھا کہ میں اچھل پڑا۔ "رابعہ؟"

"ہاں... وہ رابعہ تھی۔" چاند بھائی مسکرایا۔ "اس نے مجھے بہت کچھ بتایا۔ تمہارے بارے میں اور ولاور کے بارے میں۔ جب میں نے اسے یقین دلا دیا کہ وہ محفوظ ہے اور میں تمہارے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ جانتا ہوں، تو اس نے کچھ نہیں چھپایا..."

"پہلے مجھے رابعہ کے بارے میں بتاؤ۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ میرے دل میں جذبات کا آتش فشاں یکلخت اُبل پڑا تھا۔

"اور کیا بتاؤں؟" چاند بھائی نے حیرانی سے کہا۔

"یہی کہ اب وہ کہاں ہے؟"

"اب؟... یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں؟" وہ بولا۔

"کیوں... کیوں نہیں بتا سکتے؟" میں نے چلّا کے کہا۔ "مجھے تو معلوم تھا کہ وہ یہاں ہے... میں اسی کے لیے آیا تھا۔ تم سے ملنے نہیں... اس نے تمہارے ہی گھر سے فون کیا تھا۔ وہ اگر میرے پاس نہ ہوتا تو میں کیسے پہنچتا؟"

"یہ تو ٹھیک ہے کہ اس نے یہاں سے تمہیں فون کیا تھا مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ اب بھی یہاں ہے؟"

میں نے ایک دم جست لگا کے اسے دبوچ لیا۔ "دیکھو مجھ سے چکر بازی کی باتیں مت کرو... یہ ٹھیک ہے کہ میں خالی ہاتھ ہوں اور تم مسلح ہو... تمہارے قلعے میں تمہارے محافظ ہیں اور میں ان کی قید میں ہوں۔ مگر یہ بھی سمجھ لو کہ تمہارے اور موت کے درمیان میرے ہاتھ کی صرف ایک حرکت حائل ہے۔"

وہ اسی طرح پُرسکون رہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم گردن توڑنے کے ماہر بھی ہو... میری گردن توڑ سکتے ہو لیکن اس سے حقیقت تو نہیں بدلے گی۔ تمہیں رابعہ نہیں ملے گی... میری جان چلی جائے گی اور تمہاری بھی... اس کے بعد کیا ہوگا؟... جب رابعہ کو معلوم ہوگا کہ تم نے سوچے سمجھے بغیر خود کو ایک دوست کی حمایت سے اور زندگی سے محروم کر لیا تو وہ خود کیسے زندہ رہے گی؟ تمہارے ساتھی کتنے مایوس ہوں گے اور تمہارا مشن ادھورا رہ جائے گا۔ تم ولاور کے لیے میدان کھلا چھوڑ دو گے؟"

اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ اپنے گریبان سے الگ کر دیا اور میں جو شدتِ جذبات میں پاگل ہو رہا تھا آہستہ آہستہ ہوش میں آ گیا۔

"بیٹھو آرام سے اور میری پوری بات سنو۔" وہ بولا۔

میں بیٹھ گیا۔ اسی کے ساتھ والے صوفے پر گر گیا۔

"آئی ایم سوری۔۔۔" میں نے کہا۔ "یہ میرے اعصاب کا قصور ہے۔ میں تو بالکل ہی بھول گیا باتوں میں۔" اس نے سر ہلا کے کہا۔ "کافی؟" اس نے ایک بٹن دبا کے کہا۔

"کیا رابعہ واقعی یہاں نہیں ہے؟" میں نے مایوسی سے کہا۔ "تمہیں معلوم تو ہو گا کہ وہ کہاں ہے؟"

چاند بھائی نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ یہاں رہی تھی۔۔۔ تین ہفتے اور میں نے اُسے زبردستی روک کے رکھا تھا کیونکہ اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ دلاور کے آدمی اسے کہیں لے جا رہے تھے لیکن یہ اس کی اور تمہاری خوش قسمتی تھی کہ قدرت نے اسے میرے پاس پہنچا دیا۔ میں نے اسے تین ہفتے تک بہترین طبی امداد فراہم کی اور آرام کرنے سے وہ بہت جلد ٹھیک ہو گئی۔ وہ بھی نروس بریک ڈاؤن کا شکار تھی۔ اس نے کئی بار بھاگنے کی کوشش کی لیکن یہاں سے کوئی کیسے نکل سکتا ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ جب تک میں خود مطمئن ہو کے اسے اجازت نہیں دوں گا وہ نہیں جا سکے گی۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے یہ بات سمجھ لی کہ میں اس کا مددگار ہوں اور تمہارے دشمن کا دشمن ہوں چنانچہ تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ تیسرے ہفتے میں اس نے مجھے تمہاری اور اپنی زندگی کے بارے میں بتایا۔ پھر اس تنظیم کے بارے میں بتایا جس میں تم چند دوست شامل ہو۔۔۔ محسن اور غالب۔۔۔ ٹیڈی۔۔۔ میں سب کے بارے میں پوچھتا رہا اور اس نے کچھ نہیں چھپایا۔ میں اس لڑکی سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی لڑکی میری نظر سے پہلے کبھی گزری ہی نہیں تھی۔ یہ جسمانی خوب صورتی کی بات نہیں۔ اس کی شخصیت میں جو حسن تھا وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

میں نے اچانک محسوس کیا کہ تعریف کے اس انداز میں چاہت کے جذبات کا رنگ شامل ہے۔ حسد کی آگ میرے وجود کو جلانے لگی۔ شکوک کے سانپ میرے ذہن میں کلبلانے لگے۔

"تیسرے ہفتے میں ہی اس نے تمہیں ٹیلی فون کیا تھا جب تم نے اس سے بات کی تھی۔"

"چاند بھائی۔۔۔ اس کی باتوں نے ہی مجھے شک میں ڈال دیا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ میرے بارے میں فی الحال کوئی بات نہ کرے۔"

"تم جھوٹ بکتے ہو!" میں نے چیخ کر کہا۔ "اس نے دوست محمد کا حوالہ دیا تھا۔۔۔ آخر کیوں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ بولا۔ "جب وہ بات کر رہی تھی تو میں موجود نہیں تھا۔ ان دنوں میں فرانس میں تھا۔"

"میں نہیں مان سکتا۔ آخر اس نے تین ہفتے بعد کیوں فون کیا تھا۔ کیا اس سے پہلے رابعہ کو یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اُسے اپنی خیریت سے کسی نہ کسی کو آگاہ کر دینا چاہیے۔۔۔ مجھے، دوستی۔۔۔ منظر کو۔۔۔ وہ دوست ہے ہمارا اور ایک وکیل ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"وہ انکل رضوی کے گھر [illegible] بھی جا سکتی تھی۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن اس کی حالت ایسی کہاں تھی۔" وہ بولا۔

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ وہ بالکل پاگل ہوتی تب بھی میرا نام نہیں بھول سکتی تھی اور۔۔۔ اور مجھ سے ملے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ پاگل پن کی حالت میں اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور سوائے سکندر کے کسی کا نام تک نہیں لیتی تھی، مگر پھر ڈاکٹروں نے اُسے سکون آور انجکشن دے کر سُلائے رکھا اور دو ہفتے تک اسے خود اپنی خبر نہ رہی۔۔۔ جب وہ آہستہ آہستہ صحت یاب ہوئی تو میں نے اسے یقین دلایا کہ سکندر بخت بالکل محفوظ ہے اور اس سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہے تو بتاؤ، میں بات کرا دیتا ہوں۔ اس نے مجھے ایک فون نمبر دیا اور تمہاری اس سے بات ہو گئی لیکن جیسا کہ میں نے کہا۔۔۔ میں یہاں تھا ہی نہیں۔ میں نے کچھ نہیں سنا کہ اس نے تم سے کیا کہا اور تم نے اس سے کیا کہا۔"

"تمہارے جھوٹ میں مجھے بدنیتی شامل نظر آتی ہے سیٹھ چاند بھائی۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی یہاں سے فون کرے اور تمہیں خبر نہ ہو۔ یہاں ہر کال کو مانیٹر کرنے والے ہوں گے اور ٹیپ کرنے والے ہوں گے۔ انھوں نے تمہیں بتا دیا ہو گا۔"

"نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ تم بتاؤ کہ اس نے کیا کہا تھا؟" وہ بولا۔ "اس نے میرے ذاتی فون کو استعمال کیا تھا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اور فرض کر لیا کہ وہ سچ بول رہا ہے ورنہ بحث سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ رابعہ سے میری فون پر کیا گفتگو ہوئی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ اس نے جانتے بوجھتے تم کو اندھیرے میں رکھنا پسند کیا۔" اس نے میری بات سن کے کہا۔

"کیوں۔۔۔ وہ ایسا کیوں کرے گی؟"

"ممکن ہے اس کا مقصد تمہیں محفوظ رکھنا ہو۔ غیر ضروری پریشانی سے بھی اور خطرے سے بھی۔" وہ بولا۔ "یہاں سے وہ تین ہفتے بعد چلی گئی تھی اور اس نے یہی کہا تھا کہ میں واپس جا رہی ہوں۔"

"اور تم نے اُسے جانے دیا؟"

"میں اسے کیسے روکتا۔۔۔ وہ سمجھنے لگی تھی کہ میں نے بھی اُسے قید کر رکھا ہے۔" وہ بولا۔ "اور میری نیت ٹھیک نہیں ہے۔"

ایک کنیز نے دستک دی اور پھر کافی رکھ کے چلی گئی۔

وہ کافی بنانے لگا۔

"اگر میں یہ سچ مان لوں۔" میں نے کہا۔ "تو پھر۔۔۔ تم نے کس عورت کے بارے میں ہدایات دی تھیں کہ اس کے متعلق مجھے کچھ نہ بتایا جائے جو کل شام آئی تھی۔ تم نے اپنی کنیز کو دھمکی دی تھی کہ مجھے کچھ بتایا تو مار دیئے جائیں گے۔ اس کی فیملی تک محفوظ نہیں رہے گی۔ اور تم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ وہ کوئی پاکستانی لڑکی ہے۔ انتہائی خوب صورت اور گریس فل۔ بقول تمہارے شخصیت کے حسن کی دلکشی رکھنے والی۔۔۔ گورا رنگ۔۔۔ گلابی لب۔۔۔ سیاہ بڑی بڑی آنکھیں اور لمبے کالے بال۔۔۔ ساڑھے پانچ فٹ قد اور ایک سو کیس پونڈ وزن۔۔۔ وہ اسے کوئی انڈین پرنسس سمجھی تھی۔"

"اوہ۔۔۔ تو اس نے بتا دیا تمہیں۔۔۔" وہ کافی بنا کے بولا۔ "مجھے یہی ڈر تھا کیونکہ تم بہت چالاک ہو اور وہ بہرحال ایک لڑکی ہے۔ لاکھ مجھ سے ڈرتی ہو مگر ہے تو لڑکی۔"

"اب تم اس کے ساتھ وہی کرو گے جو تم نے کہا تھا۔۔۔ تم اس سفید فام کنیا کی کھال اُدھیڑ دو گے؟ اس کے ماں باپ اور متعلقین تک کسی کو نہیں بخشو گے۔ قصور میرا ہے۔ میں نے اسے باتوں سے بے وقوف بنایا تھا۔ فرانسیسی بول کے اس کے جذبات کو گرمایا تھا اور ہمدردی حاصل کر کے سچ اگلوا لیا تھا۔"

"میں اسے کوئی سزا نہیں دوں گا۔" وہ بولا۔ "کیونکہ الزام تم نے قبول کر لیا ہے۔ تاہم اُسے غلط فہمی ہوئی۔ ان یورپی اقوام کے دماغ میں تو ہمارے بارے میں ایسے ہی خیالات بھرے ہوئے ہیں کہ یہاں یا تو ہر شخص راجا مہاراجا ہو کے ہاتھی پہ پھرتا ہے یا سپیرا ہو کے بین اور پٹاری میں سانپ رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک ہم ایک کالی بدصورت قوم ہیں۔ حسن تو صرف ان کی میراث ہے اور یہاں کوئی گریس فل خوب صورت عورت ہے تو وہ پرنسس ہے۔ حالانکہ یہاں جو مجھ سے ملنے آتی ہیں وہ سب کسی پرنسس سے کم نہیں ہوتیں۔۔۔ سب پاکستانی اور اعلیٰ خاندانوں کی عورتیں ہوتی ہیں۔"

میں لاجواب ہو گیا لیکن میرے ذہن کا شک دور نہیں ہوا۔ میں اس کو دلیل سے ہی قائل کر سکتا تھا۔ زبردستی یہ بات نہیں منوا سکتا تھا کہ وہ رابعہ کے بارے میں مجھے گمراہ اور بے خبر رکھنا چاہتا ہے۔

"اچھا۔۔۔ تم نے مجھے اغوا کیوں کیا تھا۔۔۔ وہ کون نقاب پوش تھے جو مجھے یہاں لائے تھے؟" میں نے کہا۔

"میرے آدمی تھے۔۔۔ اور مقصد تم سے ملاقات کرنا تھا۔"

"انھیں کیا الہام ہوا تھا کہ میں دوست محمد کی تلاش کرانے میں مصروف ہوں گا؟" میں نے کہا۔

"تم دوست محمد کو پوچھتے پھر رہے تھے۔ دوست محمد کو ڈر تھا کہ اسے دلاور کے آدمی تلاش کر رہے ہیں کیونکہ اس اٹیچی والے واقعے کے بعد جس میں میرے دو آدمی مارے گئے تھے، میں نے دلاور سے صاف کہہ دیا تھا کہ اب وہ خود کو محفوظ نہ سمجھے۔ چوہدری دلاور جانتا ہے کہ میں کون ہوں اور کتنے لمبے ہاتھ رکھتا ہوں۔ دوست محمد میرا خاص آدمی ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے میں نے دو آدمی چھوڑ رکھے تھے جو اس پر نظر رکھتے تھے۔۔۔ تمہاری کوٹھی میں وہی موجود تھے اور تم آ گئے تو وہ تمہیں بھی یہاں لے آئے۔۔۔ اچھا۔۔۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "شب بخیر۔"

اس کے جانے کے بعد میں بے بسی اور مایوسی کے عالم میں بہت دیر تک جاگتا رہا۔ اب مجھے چاند بھائی میں قطعی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں اس کی حمایت بھی نہیں چاہتا تھا۔ پہلے لامحدود وسائل کے ساتھ وہ یقیناً دلاور کے مقابلے میں ہمارا زبردست اتحادی ثابت ہو سکتا تھا لیکن میرے خیالوں میں تو رابعہ بسی ہوئی تھی جس کی تلاش مجھے یہاں لائی تھی۔۔۔ باقی۔۔۔ اتفاقات کا سلسلہ تھا جس نے مجھے اختیار خان سے۔۔۔ پھر اکرام بخش سے اور بالآخر نازو سے ملوا دیا تھا اور یہاں پہنچا دیا تھا۔

اب مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں راستہ تلاش کرتے کرتے اچانک کسی جنگل کے آخری سرے پر پہنچ گیا ہوں جہاں آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ دوست محمد جا چکا تھا اور اس سے مزید کچھ پوچھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ چاند بھائی کی ایک بات میرے دل کو لگی تھی کہ شاید رابعہ نے مجھے پریشانی اور خطرات سے دور رکھنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا ہو۔

لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ یہاں سے کہاں گئی تھی؟ اس نے واپس جانے کی بات کی تھی مگر واپس نہیں پہنچی تھی تو پھر کہاں چلی گئی تھی۔ یہاں تو اس کے لیے کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ رہ سکتی ہو۔ کوئی گھر ایسا نہیں تھا جہاں وہ پناہ لے سکتی ہو اور اسے ضرورت بھی کیا تھی کہ وہ ہم سب سے دور رہے۔

کہتے ہیں خطرات اور پریشانیاں انسان کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے لیے امتحان کا درجہ رکھتی ہیں اور امتحان در پیش ہو تو آدمی کی استعداد اور کارکردگی غیر معمولی ہو جاتی ہے۔ شاید اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ مجھے ایک ایسا خیال آیا کہ میں بھونچکا رہ گیا۔۔۔ یہ ہو سکتا ہے کہ رابعہ واپس چلی گئی ہو لیکن مجھ سے نہ ملی ہو۔ وہ لاہور میں ہی ہو۔ انکل رضوی کی پناہ میں یا منظر کے گھر میں۔ عمداً اس نے خود کو اس مشن سے الگ رکھا ہو

www.paksociety.com

جس میں وہ میرا ساتھ دیتی تو میری پریشانیوں میں اضافہ ہوتا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی محبت میرے پاؤں کی زنجیر ہے اور بعض اوقات میں اس محبت میں اپنے فرض کو غیر اہم سمجھنے لگتا ہوں۔ ایسا ہونا تو نہیں چاہیے لیکن آدمی جذبات سے لاتعلق بھی تو نہیں رہ سکتا۔ شاید یہی سوچ کے اس نے خود کو الگ کر لیا کہ یوں وہ میری زیادہ مدد کر سکتی ہے۔ اس نے میرے ذہنی سکون اور اطمینان کے لیے اس بات کا یقین دلا دیا کہ وہ بالکل محفوظ اور خوش ہے لیکن مجھے منع بھی کر دیا کہ میں اسے تلاش نہ کروں۔ اس نے اپنی مجبوری بیان بھی نہیں کی اور ظاہر بھی کر دی۔ اس کے لیے دوست محمد کا نام لے کر رابعہ نے ایک ایسا جھوٹ بولا جس پر میں یقین نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم اسے توقع نہیں ہوگی کہ میں اس طرح مجنوں بن کے اس کو تلاش کرتا ہوا دوست محمد تک جا پہنچوں گا۔ اس نے مجھے بے وقوف بنایا۔ وہ لاجواب ہی تھی۔ قسمت نے اس کی مدد کی اور مجھے بے خبر رکھا۔ لیکن کیا خود رابعہ کے لیے ممکن ہے کہ وہ اتنی لمبی جدائی کی سزا کاٹ سکے؟

ایسے ہی متضاد خیالات کی کشمکش آخر شب تک جاری رہی۔ پھر مجھے نیند نے آلیا اور میں بے سکونی کی نیند میں بار بار چونک کر جاگتا رہا۔ ایسے ہی ایک بار میری آنکھ کھلی تو مجھے یوں لگا جیسے میرے قریب رکھے ہوئے فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی ہے۔ یہ بجلی سی ٹن کی آواز تھی۔ جیسے کوئی ایک ہی لائن سے ملے ہوئے دوسرے فون کا ریسیور اٹھاتا ہے۔

میں نے اٹھ کے فون کو غور سے دیکھا۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کے کان سے لگا لیا۔

"نہیں... میں نے اسے یقین دلا دیا ہے۔" وہ آواز سیٹھ چاند بھائی کی تھی۔

"وہ آسانی سے یقین کرنے والا آدمی نہیں ہے۔" یہ آواز سن کر میرا دل دھڑکنا بھول گیا کیونکہ یہ رابعہ کی آواز تھی۔

"تمہاری خاطر میں نے اسے یہ بھی یقین دلا دیا ہے کہ دلاور کے خلاف میں اس کی ہر طرح سے مدد کر سکتا ہوں۔" وہ بولا۔

"میری خاطر...؟" وہ تلخی سے بولی۔

"اور کس کی خاطر۔ تم تو جانتی ہو کہ دلاور سے میرا کوئی تعلق نہیں بلکہ میں تو اس کے نام سے بھی ناواقف تھا۔ پھر بھی میں نے وہ کہانی سنا دی کہ کس طرح اس نے خسرو جمشید کو توڑ لیا تھا اور لانچ والا واقعہ بھی سنا دیا۔"

"اور تمہیں یقین ہے کہ وہ قائل ہو گیا ہے؟"

"قائل نہ ہونے کی وجہ کوئی نہیں۔" چاند بھائی نے کہا۔

"یہ بھی اس نے مان لیا کہ تم یہاں کیسے آئی تھیں۔ لیکن اس بات سے میں ابھی تک وہ شک کا شکار ہے کہ تم یہاں نہیں ہو۔"

"میں نے کہا تھا نا... وہ نہیں مانے گا۔"

"تم اس کی فکر مت کرو... میں اسے مطمئن کر کے بھیج دوں گا۔ لیکن رابعہ اس کے بعد تو کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا نا... میں اس کی پوری مدد کروں گا۔ اس کی حفاظت بھی کروں گا۔ میرے سارے وسائل اس کے لیے وقف ہوں گے۔ میں سامنے آئے بغیر اس کو وہ سب کچھ فراہم کرتا رہوں گا جس کی اسے ضرورت ہو گی۔"

"سامنے آتے ہوئے ڈرتے ہو؟"

"میں بتا چکا ہوں کتنی بار کہ یہ ایک سیاسی جنگ ہے اور میرا کسی قسم کی سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ایک کاروباری آدمی ہوں۔ جو اب تک غلط کاروبار میں ملوث تھا غلط راستے پر چل رہا تھا۔ صرف تمہارے لیے میں نے وہ سب کچھ چھوڑ دینا منظور کیا۔ اپنی زندگی کو بدل دینا قبول کیا۔ تمہاری ہر شرط میں نے پوری کر دی۔"

"تم نے صرف وعدہ کیا ہے اور جواب میں میں نے بھی وعدہ ہی کیا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"تم دیکھ لو گی... میں ایک شریف آدمی بن جاؤں گا۔ میں ان سب کنیزوں کو رخصت کر دوں گا... اپنی سابقہ روش ترک کر دوں گا۔ ویسا ہی بن جاؤں گا جیسا تم چاہتی ہو۔"

"پھر تم بھی دیکھ لو گے کہ میں وعدے پر قائم ہوں۔"

"لیکن ایسے صرف وعدوں پر کب تک گزر ہوگی... میں زیادہ دن انتظار نہیں کر سکتا۔ تم مجھے ٹال تو نہیں رہی ہو... یہ نہ ہو کہ میری قوت برداشت جواب دے جائے۔" وہ بولا۔ "تم جانتی ہو کہ میں آج تک کسی عورت کے سامنے... اس کے لیے اتنا مجبور نہیں ہوا۔ میری اس مجبوری سے فائدہ مت اٹھاؤ۔"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" رابعہ نے بے بسی سے کہا۔

"ایک تاریخ... اس ہفتے یا اس مہینے یا اس سال میں۔ لیکن کوئی حد ضرور ہونی چاہیے۔"

"ابھی سے میں... تاریخ کیسے دوں؟"

"کس کا ڈر ہے اب تمہیں۔ کس بات کا شک ہے۔ جو تم نے چاہا وہ میں نے کیا۔ پھر اور کر کے دیکھو۔"

"ابھی سے گھبرا گئے... ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔"

"لیکن یہ امتحان ہی تو زندگی نہیں ہو سکتے۔" وہ بولا۔

"ایک بادشاہ نے تاج و تخت ٹھکرا دیا تھا۔ یہ قصے کہانیوں کی بات نہیں ہے۔ وہ انگلستان کا بادشاہ تھا۔"

"میں جانتا ہوں... تم ایڈورڈ ہشتم کی بات کر رہی ہو اور مسز سمپسن کی جو ایک بیوہ تھی۔" وہ بولا۔

"تم بھی ٹھکرا سکتے ہو اپنی اس سلطنت کو... جس کے تم بے تاج بادشاہ ہو۔" رابعہ نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"نہیں... میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں... میں تمہارے ساتھ جنگل کی خاک چھاننے نہیں جا سکتا اور کسی جھونپڑے میں نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ اپنا سب کچھ تمہارے سپرد کر سکتا ہوں۔ تمہیں اختیار ہوگا کہ جیسے چاہو رہو... جہاں چاہو رہو۔ یہ دولت جیسے جس کاروبار میں چاہو لگا دو۔ غیر مشروط طور پر میں تمہیں شریک حیات ہی نہیں بزنس پارٹنر بھی بنا سکتا ہوں اور مشترکہ طور پر تم اس سب کی مالک بن سکتی ہو جو میرا ہے۔"

"یعنی تم نے کہا تھا کہ اپنا سب کچھ دے سکتے ہو!"

"ہاں! جو میرا ہے وہ تمہارا... اور جو تمہارا ہے وہ میرا۔ قانونی طور پر۔" وہ بولا۔ "جب تک ہم ایک دوسرے کے ہیں۔"

"کیا تمہارے ذہن میں یہ خیال بھی ہے؟"

"ہاں... زر اور زن مل کے بہت بڑی طاقت بن جاتے ہیں۔ ابھی تم کو اندازہ نہیں ہے میری دولت کا... اس کے لیے میں نے جد و جہد کر کے ایک عمر گنوا دی ہے۔ میں قربانی ضرور دے رہا ہوں لیکن پاگل نہیں ہوا ہوں۔ میں سازش کے امکانات کو ختم کرنا چاہتا ہوں جو کوئی بھی اتنی دولت کے لیے کر سکتا ہے۔ میں بے وقوف بننا نہیں چاہتا۔ اس لیے صاف ہے کہ یہ بات واضح ہے کہ تمہیں اس دولت پر اختیار میری زندگی تک حاصل رہے گا۔ جس مقصد کے لیے تم یہ اختیار چاہتی ہو وہ پورا نہیں ہوگا۔ بعد اگر میں مر گیا تو جو کچھ میرا اور تمہارا ہے وہ ہماری اولاد کی ملکیت ہو جائے گا۔ تمہارا اپنا کچھ نہیں ہوگا۔ تم ان کے ساتھ مالک بن کے رہو گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا... مگر تم نے کسی اور کو اپنایا تو ظاہر ہے تمہیں اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔"

"اگر ہم اولاد سے محروم رہے تو...؟"

"یہ ناممکن ہے... میں اس معاملے میں ماہرین سے... میرا مطلب ہے میڈیکل ایکسپرٹس کی رائے لے چکا ہوں... جو متفقہ طور پر ایک ہی ہے۔ ہم دونوں میں والدین بننے کی صلاحیت ہے... اب بتاؤ؟"

"کیا بتاؤں...؟"

"یہی کہ ہم کب ایک ہوں گے؟"

"جب مجھے مکمل یقین اور اطمینان حاصل ہو جائے گا۔" وہ بولی۔ "اور اس کا انحصار تمہاری کوششوں پر ہے۔"

"ٹھیک ہے..." وہ ایک سرد آہ بھر کے بولا۔ "میں تمہیں جبر اور زبردستی سے حاصل کرنا نہیں چاہتا۔"

لائن کٹ گئی لیکن میں کسی مفلوج آدمی کی طرح ریسیور لیے بیٹھا رہا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ جو کچھ میں نے سنا ہے وہ خواب میں نہیں سنا ہے۔ رابعہ میری نہیں رہی۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے... اپنے آپ کو گروی رکھ دیا ہے... میرے نام پر... نہیں... ایسا ممکن ہی نہیں... وہ مجبور ہے... اس کے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں رہا... اس اسمگلر، دولت اور طاقت رکھنے والے... خود کو دنیا کی ہر چیز کے حصول پر قادر سمجھنے والے نے رابعہ کو خرید لیا ہے۔ اس نے کہا ہوگا کہ تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔ یا مجھے قبول کر لو اور یہ سب تمہارا ہے۔ بصورت دیگر سکندر بھی تمہارے پاس نہیں رہے گا۔ میں اسے چیونٹی کی طرح مسل دوں گا۔ ابھی اس نے صرف دلاور کو دیکھا ہے اور دلاور جیسے میری ٹھوکروں میں رہتے ہیں... تم اسے چھوڑ دو تو میں وہ سب چھوڑ دیتا ہوں جو تمہارے نزدیک معیوب اور قابل اعتراض ہے۔ میں سکندر کے تحفظ اور اس کی ہر ممکن مدد کا وعدہ بھی کرتا ہوں... اور رابعہ نے محبت کے لیے خود کو قربان کرنے کا سودا کر لیا۔

لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا... یہ کاروباری سودا کیسے ہو سکتا ہے۔ رابعہ کی زندگی پر میرا بھی حق ہے۔ رابعہ اکیلی یہ فیصلہ نہیں کر سکتی... مجھے اس کی قربانی کے طفیل ملنے والی حمایت نہیں چاہیے۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس تحفظ کی ضمانت پر جو مجھے اپنی محبت کی قیمت میں ملے۔ میں مر سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں رابعہ کو بھی... مگر ایسی زندگی قبول نہیں کر سکتا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کانپ رہا ہوں اور میرا دوران خون سر کی جانب بڑھ گیا ہے۔ میرا چہرہ تپ رہا تھا اور کانوں کی لویں سرخ ہو گئی تھیں۔ میری مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور میں جنون میں مبتلا ہو رہا تھا۔ رابعہ ایسا نہیں کر سکتی۔ کوئی اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کے اس سے محبت کا سودا نہیں کر سکتا۔ میں اس کی مجبوری کو بھی ختم کر دوں گا اور ایسی مجبوری پیدا کرنے والے کو بھی۔

میں کسی آتش فشاں کے لاوے کی طرح ایک تباہ کن قوت بن کے اس کمرے سے باہر آیا۔

"یس سر!" ایک انگریز لڑکی نے مسکرا کے کہا جو سیدھی میری طرف آ رہی تھی۔

"کہاں ہے وہ تمہارا مالک..." میں نے چیخ کر کہا۔ "وہ شیطان زادہ؟"

"آپ سیٹھ چاند بھائی کو پوچھ رہے ہیں سر؟" اس نے

www.paksociety.com

شائستہ نرم لہجے میں اور رواں انگریزی میں کہا۔

"ہاں... مجھے بتاؤ ورنہ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے اسے یوں دبوچا کہ اس کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی۔

"وہ... وہ یہاں نہیں ہیں سر..." وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ "باہر ہیں۔"

"جھوٹ... جھوٹ... جھوٹ..." میں نے چلاتے ہوئے اس کی گردن کو اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں کس لیا۔ "وہ ابھی یہاں تھا۔ ابھی اس نے کسی لڑکے کے کسی فون پر بات ختم کی ہے۔"

"سر... پلیز... وہ چلے گئے تھے... صبح کی فلائٹ سے لندن چلے گئے تھے۔" وہ چلائی اور تڑپی۔ "مجھے یہی معلوم ہے۔"

"اچھا... میں خود دیکھ لوں گا۔" میں نے اسے ایک طرف پھینکا اور دیوانہ وار ایک بند دروازے کو ٹھوکر ماری... دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر جا گرا... میرے سر اٹھنے سے پہلے کسی نے میرے سر پر ڈنڈا مارا۔ میری نظروں کے سامنے اندھیرے کا ایک بھنور آیا۔ میں اسی میں ڈوب گیا۔

جب میں پھر ہوش میں آیا تو وہ میرے سامنے تھا لیکن میں رسیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور پیروں میں بیڑیاں... میری گردن میں جو طوق تھا اس کا ایک حلقہ دیوار میں نصب کڑے کے ساتھ منسلک تھا۔ وہ کمرا اسی گھر کا تھا یا کسی دوسرے گھر کا... میں نہیں جان سکتا تھا۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ اس ویران کمرے میں صرف ایک کرسی تھی۔ وہ اسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کے وہ مسکرایا۔ "تم نے دیکھا سکندر بخت کہ وقت بدل گیا... تمہاری اپنی بے صبری کے باعث۔"

"وقت پہلے بھی بدلا ہے... میں وقت سے نہیں ڈرتا..."

"کتے... ذلیل شیطان!" میں نے کمزوری کے باوجود چلا کے کہا۔ "تو مجھ سے میری رابعہ کو نہیں چھین سکتا۔"

"میں نے رابعہ کو چھینا نہیں... میں چھین سکتا تھا... مگر اس بار میں نے ایسا نہیں کیا۔" وہ بولا۔ "دنیا کی کوئی عورت میری دسترس سے باہر نہیں رہی... اور رہے گی... لیکن اس مرتبہ بات کچھ مختلف تھی کہ میں نے خود کو بچایا اور بے بس محسوس کیا۔ میں نے رابعہ کو طاقت یا دولت سے حاصل نہیں کیا... میں نے اس کا دل جیتا ہے۔"

"اپنی دولت سے کر... تو کیا سمجھتا ہے کہ وہ بکاؤ مال ہے؟"

"سر دست میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ کیا ہو سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے سکندر بخت کہ اس نے کسی لالچ یا دباؤ کے بغیر یہ فیصلہ کیا۔"

"بکواس کرتے ہو تم... کمینے ہو... جھوٹ بولتے ہو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "اس نے محبت کو مجبوری سمجھ لیا کیونکہ وہ تمہاری قیدی تھی۔ اس کے پاس چوائس نہیں تھی۔"

"چوائس..." وہ بولا۔ "چوائس تو میں نے اسے اوپن دی تھی۔ میں نے اس کا راستہ نہیں روکا... کوئی شوہرانہ تعلق نہیں کی۔ شرائط اس نے رکھیں جو میں نے قبول کرلیں۔ حقیقت یہ ہے سکندر کہ اس کے جذبات بدل گئے تھے۔"

"تم میرے پاس ہوتے... اور میں آزاد ہوتا تو میں تمہارے منہ پر تھوک دیتا... اور تم اسے چاٹتے۔"

"تمہارا ذہن اس حقیقت کو قبول کرے گا لیکن ایک دم نہیں، کیونکہ یہ صدمہ غیر متوقع اور ناقابل برداشت ہے لیکن آج نہیں تو کل حقیقت خود اپنا وجود تسلیم کرا لے گی اور سامنے آ جائے گی۔" وہ بولا۔ "تم آدمی کو آخر کیا سمجھتے ہو؟ کمپیوٹر؟ کہ جو کچھ اس میں ڈال دیا گیا وہ بدلے گا نہیں؟ جذبات کیا کمپیوٹر کے اعداد و شمار ہوتے ہیں؟ وقت اور حالات کے ساتھ آدمی کے خیالات، جذبات اور احساسات سب بدلتے ہیں۔ تصورات اور نظریات میں تبدیلی آتی ہے۔ ایسے ہی محبت کا مفہوم بدلتا ہے۔"

"محبت کبھی نہیں بدلتی۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "ایک زمانے میں تم فوزیہ پر مرتے تھے۔ جو محض کی بہن تھی۔"

مجھے یوں لگا جیسے اس نے زناٹے سے میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہے... اور اس تھپڑ کی اذیت جسمانی نہیں تھی۔ اس نے میرے دل میں وہ خنجر اتار دیا تھا جسے خود میں نے آب دی تھی۔

"مجھ سے نہیں... اپنے آپ سے پوچھو... پوری ایمانداری کے ساتھ کہ کیا اس وقت فوزیہ کے لیے تمہارے جذبات کی نوعیت اور شدت وہی نہیں تھی... جو آج رابعہ کے لیے ہے؟ وہ بھی محبت ہی تھی نا... تم اسے چاہتے تو تمہیں کھو گئے۔ وہ مجھ پر اثر انداز ہوتا رہا۔ آج تم فوزیہ کو یاد بھی نہیں کرتے... وہ اپنے گھر میں شاد اور آباد ہے اور تمہارا کوئی رقیب اس کے بچوں کا باپ بن چکا ہے مگر تم اس رقیب کے خلاف دل میں کوئی رقابت کا جذبہ تک نہیں رکھتے۔ آخر یہ تبدیلی کیسے آئی... تم کھو گئے وقت کے ساتھ... میں بھی اتفاق کروں گا کہ یہ وقت ہی تھا جس نے تمہاری محبت کا رخ بدل دیا۔ تم فوزیہ کے تھے پھر رابعہ کے ہو گئے۔ آج اگر یہی رابعہ کے ساتھ ہوا ہے تو تمہیں ناممکن کیوں لگتا ہے... یعنی یہ کسی اور کی زندگی کا تجربہ یا حادثہ تو نہیں۔ تمہاری اپنی زندگی کا واقعہ ہے۔ جب تک تم نے رابعہ کو نہیں دیکھا تھا تم فوزیہ کے لیے عاشقی کے سارے سپنے سجائے رکھتے تھے۔ پھر وہ حرف غلط ہو گئے۔ یہی میں کہتا ہوں کہ جب تک میں رابعہ سے نہیں ملا تھا وہ تم کو چاہتی تھی۔ دیوانہ وار چاہتی تھی۔ اتنا چاہتی تھی کہ اس نے تمہاری خاطر اپنا گھر بار... اپنا کیریئر... اپنا مستقبل سب کچھ تباہ کر لیا اور ان راستوں پہ تمہارا ساتھ دیا جن پر کوئی دوسری لڑکی اتنی استقامت کے ساتھ نہیں چل سکتی تھی اور مجھ سے ملاقات نہ ہوتی تو سب کچھ ویسے ہی رہتا مگر اب ایسا نہیں رہا تو یہ تقدیر کا فیصلہ ہے۔ میں خود پہلی بار محبت سے آشنا ہوا ہوں... رابعہ کے لیے تو یہ ولیا پچا موڑ ہے..."

"میں... میں نہیں مان سکتا..." میں اذیت سے چیخا۔ جو اس بے رحم سچ کے خلاف ترغیب کے عذاب سے کم نہ تھی۔

"ہاں... ابھی تم نہیں مانو گے۔ اس لیے کہ تم ہوش میں نہیں ہو اور یہ نقصان اتنا بڑا ہے کہ تمہارا دماغ اسے برداشت کرنے کے قابل نہیں۔ غیر متوقع حادثات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مگر دیکھو فوزیہ بھی تو زندہ ہے اور خوش بھی ہے اب... دراصل خوشی بھی حالات کا ایک سانچا ہے جس میں ہم بالآخر ڈھل جاتے ہیں۔ ایک بات اور بتاؤں۔ رابعہ کے جذبات کا رخ بدلنے میں تمہارے حالات کو بہت دخل رہا لیکن لاشعوری طور پر اس نے جب مجھے پسند کیا تو دراصل اس نے میرے ساتھ میں عافیت اور مستقبل کا یقین دیکھا جو اسے تمہارے ساتھ نہیں تھا۔ عورت ذات کے لیے میرے دل میں کوئی اچھے خیالات نہیں لیکن رابعہ ایک الگ عورت تھی۔ اس میں وفادار بننے کی صلاحیت تھی۔ مگر لالچ وہ صلاحیت کوئی نہیں رکھتا۔ میں یہ دعویٰ غلط نہیں کرتا کہ بیشتر عورتیں مجھ پر دولت کی وجہ سے فریفتہ ہوتی ہیں... مگر ایسی بھی کم نہیں جو میری شخصیت اور وجاہت پر مرتی ہیں۔ تم فریقانہ طور پر اس سے مقابلہ نہیں کر سکتے کسی تیسرے فریق سے فیصلہ لو... عورت ہو تو بہتر ہے... کہ ہم دونوں میں سے کون زیادہ پرکشش ہے... دولت کے بغیر... میں جا سکتا ہوں کہ فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔ رابعہ کو بھی ایک پناہ کی ضرورت تھی۔ یہ پناہ میں نے فراہم کر دی۔ میرے جذبات حقیقی تھے۔ جذبات تمہارے بھی حقیقی تھے... مگر اضافی چیز میری دولت اور اس سے حاصل ہونے والی خوشی تھی۔ جس کے لیے وہ ترس رہی تھی۔"

"اگر یہ سب کچھ رابعہ مجھ سے کہہ دے... میرے سامنے آ کے... تو میں مان لوں گا..." میں نے اس کا تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا۔

"کہہ تو دے گی... لیکن سامنے آ کے نہیں۔" وہ کچھ دیر سوچ کے بولا۔

"ہاں... تم مجھے کوئی ٹیپ سنوا دو گے جو پہلے سے حاصل کر لیا گیا ہوگا۔"

"نہیں... تم اس سے براہ راست بات کرو گے۔" وہ بولا۔ "اس وقت جب تم بالکونی اور اس کے سر پر پستول لیے کھڑا ہوگا۔ پہلے سے کہا جائے گا کہ اگر تم نے ہماری مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی کہا تو سکندر سے آخری گفتگو سمجھ لینا۔"

"نہیں... یہ بھی نہیں... میں جبر کر سکتا تھا مگر میں نے نہیں کیا اور اس لیے نہیں کیا کہ وہ کوئی نئی بات نہ ہوتی۔ اس بار جو نئی بات ہوئی ہے وہ محبت ہے۔ اسی محبت کے لیے میں سب کچھ کر رہا ہوں... تمہارے لیے بھی اور اس کے لیے بھی۔ میں ابھی اور اسی وقت تم سے اس کی براہ راست بات کراؤں گا لیکن ٹیلی فون پر... تم جو چاہو اس سے پوچھ لینا اور جس طرح چاہو اپنی تسلی کر لینا... وہ تمہارا ساتھ چھوڑ چکی ہے اپنی مرضی سے۔" اس نے بالکل فلمی انداز میں تالی بجائی اور ایک شخص اندر آ گیا۔ سیلولر فون لے کر...

آزمائش کا یہ دوسرا مرحلہ زیادہ کٹھن تھا لیکن یہ آتش نمرود میں کود پڑنے کا چیلنج تھا۔ میرا عشق اگر قائم ہوتا تو محو تماشائے لب بام رہتا لیکن مجھے رابعہ کے عشق پر اتنا ہی یقین تھا جتنا آتش نمرود کو گلزار بنانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے بے خوفی سے کہا۔

"اگر یہ تمہارا جھوٹ نکلا تو مجھے کیا سزا ملے گی؟"

وہ مسکرایا۔ "کیا میں تم سے ڈرتا ہوں؟ جھوٹ آدمی لالچ میں بولتا ہے یا خوف کے باعث... مجھے تم سے لالچ بھلا کیا ہوگا... کیا ہے جو میری پہنچ سے باہر ہو... تم کو سزا دینی ہوتی تو میں تمہیں کبھی یہاں نہ بلاتا... تمہیں اپنی زندگی کی کہانی نہ سناتا جس سے میری شرافت زیادہ ثابت نہیں ہوتی۔ میں رابعہ کو کہیں باہر بھجوا دیتا اور تم ساری عمر کھپاتے رہتے مگر اس کا سراغ بھی نہ پاتے... یہ تو اچھا ہے کہ تم مطمئن ہو کے جاؤ۔ تمہارے دل میں کوئی خلش یا آزار نہ رہے۔"

وہی شخص عام قسم کے ریموٹ کنٹرول والا فون اٹھا لایا۔

"ان کے ہاتھ کھول دو۔" چاند بھائی نے حکم دیا۔

میرے ہاتھ کھول دیے گئے۔

"تم اس فون کو چیک کر سکتے ہو۔" وہ بولا۔ "اس میں کوئی ٹرک نہیں ہے۔ جرم کا بھی کوئی بھی نمبر ملا کے دیکھو۔"

www.paksociety.com

"کراچی کا تو میرے پاس ایک ہی نمبر تھا اور وہ تمہارا نمبر نکلا۔" میں نے فون لے لیا جو پارٹیشن پر رکھا تھا اور آٹھ انچ کے قریب لمبا تھا۔ ڈائل کرنے والے بٹن اس کے وسط میں تھے۔

اس کا ایک سرا اسپیکر تھا اور دوسرا ریسیور۔ مجھے فون پکڑانے والے نے اسٹینا کو بیٹھے ہی کھینچ کے تقریباً دو وقت باہر کر دیا تھا۔

"کیا میں ڈائریکٹری منگواؤں؟" وہ بولا۔ "سوائے پولیس اور اخبار کے تم کہیں بھی فون کر سکتے ہو۔۔۔ چلو ایک دو نمبر میں تمہیں دیتا ہوں۔ ایک ہوٹل میٹروپولیٹن کا ہے" دوسرا پی آئی اے کا۔"

میں نے دونوں نمبر ملائے۔ نمبر بھی ٹھیک تھے اور فون بھی صحیح کام کر رہا تھا۔ "اب بتاؤ رابعہ سے کس نمبر پر بات کروں؟"

وہ مسکرایا۔ "اور ملاؤ۔ میں نمبر ملا دیتا ہوں۔"

ریسیور مجھ سے لیتے ہوئے ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ میرے ہاتھوں کی رسائی میں تھا اور میں چاہتا تو اس کی گردن پکڑ سکتا تھا یا ہاتھ مار کے توڑ سکتا تھا مگر میں نے صرف اس خیال سے ایسا نہیں کیا کہ پھر میرے زندہ بچ کے جانے کا تصور بھی محال ہوتا اور دامنِ امید جو زندگی کی آخری سانس سے بھی

بندھا رہتا ہے میرے ہاتھ سے نکل جاتا۔ ابھی مشروط طور پر زندہ رہنے کی سہولت تو تھی اور یار زندہ صحبت باقی۔۔۔ ابھی تو سہی پھر کبھی پھر کہیں رابعہ کا اس دنیا سے غائب ہو جانا بعید از قیاس تو نہ تھا۔

وہ سب مجھے نمبر بتا رہا تھا اور مجھے یقین تھا وہ نمبر رابعہ کا ہوگا ہی نہیں مگر اس نے نمبر ملاتے ہی ریسیور پھر مجھے پکڑا دیا۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی۔ ادھر میرے دل نے بے قابو ہونا شروع کیا۔ کیا ابھی چند لمحے میں کانوں میں وہ صدائے دل نواز اترے گی؟ ریسیور کے مخملی حلق سے اسی واحدِ جاں کی آواز آئے گی جس کے لب ہلیں گے تو ہر لفظ جراحتِ دل کا مداوا ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے بات کرے گی اور پھر سے فاصلوں کو اور درد و فرقت کو سمیٹ دے گی؟

میں گن رہا تھا اور مایوس ہو رہا تھا۔ ساتویں گھنٹی پر بھی کوئی ریسیور اٹھانے نہیں آیا تھا۔

"ممکن ہے وہ آرام کر رہی ہو۔" چاند بڑبڑایا۔

اسی وقت گھنٹی بند ہو گئی۔ "ہیلو۔" رابعہ نے اپنے مخصوص دلنشین انداز میں یوں کہا کہ میرا بے قرار دل تڑپ کے اچھلا۔ ایک بار تو جذبات نے مجھے اتنا مغلوب کر دیا کہ بے قابو ہو کے میں نے چلانے کا سوچا اور پوچھنے کی خواہش ایک موہوم بلا جبر کی طرح اٹھی کہ رابعہ۔۔۔ تمہیں کچھ خبر ہے کہ میں کہاں ہوں۔۔۔ کس حال میں ہوں اور جہاں ہوں وہاں کیوں ہوں؟ یہ صرف تمہاری چاہت کا الزام ہی تو ہے کہ میرے گلے میں طوق اور پیروں میں زنجیر ہے۔

مگر میں نے ہوش سے کام لیا کہ کہیں یہ وقت کا تصرف مجھ سے نہ چھن جائے جو نصف ملاقات کا میسر ہے۔

"ہیلو۔۔۔" رابعہ نے پھر کہا۔ "کون ہے؟"

"تم ہی بتاؤ۔۔۔ میں کون ہوں۔" میں نے بمشکل تمام کہا لیکن میری آواز فرطِ جذبات سے اتنی بدلی ہوئی تھی کہ خود مجھے اجنبی لگی۔

"معاف کیجیے۔۔۔ ایسے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔" اس نے اجنبی لہجے میں بے رخی سے کہا۔ "آخر کون ہیں آپ؟"

"پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟" میں نے اب لہجے کو نارمل کر لیا۔ "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔" میں نے آہ بھری۔

اس کے بعد کوئی شک و شبے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ میری آواز وہی تھی جو رابعہ کے لیے ناآشنا نہ تھی اور میں نے شعر میں بھی غالب کے حوالے سے بہت کچھ واضح کر دیا تھا۔

لیکن مجھے بڑا صدمہ ہوا جب اس نے کنفیوز ہو کے کہا۔ "آپ کو شرم آنی چاہیے۔۔۔ یہی فون پر لوگوں کو پریشان کرتے ہو۔"

"رابعہ۔۔۔ میں سکندر ہوں۔" میں نے صدمے سے سنبھل کے کہا۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ چشمِ تصور سے میں نے بہت کچھ دیکھا اور خیالوں میں بہت کچھ محسوس کیا۔

"رابعہ۔۔۔ خاموش کیوں ہو۔۔۔ بولتی کیوں نہیں؟"

"تم۔۔۔ یہاں کیوں آئے ہو سکندر؟" اس نے کہا۔

"کیا یہ بھی پوچھنا ضروری ہے؟ ظاہر ہے تمہارے لیے۔"

"لیکن میں نے تو تمہیں منع کیا تھا۔"

"میں مجبور تھا رابعہ۔" میں نے کہا۔

"تمہیں میری مجبوری کو بھی سمجھنا چاہیے۔" اس نے قدرے بے رخی کے ساتھ کہا۔

"تمہیں کیا مجبوری لاحق ہے؟" میں نے کہا۔ "تم نے پہلے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔۔۔ کس نے روک رکھا تھا تمہیں۔۔۔ اور اب کیا تم کسی کی قید میں ہو۔۔۔ کہ۔۔۔؟"

"میں کسی کی قید میں نہیں ہوں۔۔۔" رابعہ نے میری بات کاٹ دی۔

"پھر کیا تم اپنی مرضی سے یہاں ہو؟"

"یہی سمجھ لو۔" وہ مختصراً بولی اور مجھے اس کے لہجے سے رکھائی اور بیزاری کا احساس ہوا۔

"میں یقین نہیں کر سکتا۔۔۔ تم پر یقیناً کوئی دباؤ ہے۔ تم کسی کے خوف سے یا دھمکی سے ڈر کے ایسا کہنے پر مجبور ہو۔"

"میں نے بتایا نا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ تم مانو یا نہ مانو۔۔۔ تمہاری مرضی۔۔۔" وہ بولی۔ "بہتر ہوگا کہ تم واپس چلے جاؤ۔"

"واپس چلا جاؤں؟" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "یہاں تک آ کے تم سے ملے بغیر لوٹ جاؤں!"

"مجھ سے ملنا بالکل ضروری نہیں۔۔۔ بات ہو گئی۔۔۔ اور کیا چاہیے۔۔۔ تم کو تو آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"یہ۔۔۔ تم کہہ رہی ہو۔۔۔ مجھے یقین نہیں آتا رابعہ۔"

"اس میں یقین نہ کرنے کی کون سی بات ہے سکندر۔۔۔ ان حالات میں یہ مشکل ہو گیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہوں۔۔۔ تمہاری فرض داریوں میں خلل پڑتا ہے۔ تمہیں میری حفاظت بھی کرنی پڑتی ہے۔ مجھے بھی خطرات سے نکلنا پڑتا ہے۔۔۔ اور جیسا کہ تم خود تسلیم کرتے ہو۔۔۔ تمہارا مشن میں نہیں ہوں۔۔۔ پاکستان کی سلامتی ہے۔"

"وہ تو ہے۔۔۔ مگر تمہارے بغیر نہیں رابعہ۔"

"میں مجبور ہوں سکندر۔۔۔ حالات۔۔۔"

"حالات تو وہی ہیں۔" میں نے بے رخی سے کہا۔ "کون سی ایسی تبدیلی آئی ہے حالات میں؟"

"یہی تو۔۔۔ تمہیں سمجھنا چاہیے۔" وہ بولی۔ "حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔۔۔ اور مجھے امید بھی نظر نہیں آتی کہ مستقبل قریب میں تم مجھے وہ سب کچھ دے سکو جس کی خاطر میں نے اب تک تمہارا ساتھ دیا تھا اور۔۔۔ سب کچھ کھو کے بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔"

"اور اب۔۔۔ تم ہمت ہار گئی ہو۔" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔

"ہاں سکندر۔۔۔ دیکھو میں ایک عورت ہوں۔ میری زندگی کے بیس سال عمر کا سب سے خوب صورت حصہ تھے جو میں نے تمہاری نذر کیے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ میں ساری عمر صرف امید اور خوابوں کے پیچھے بھاگتے گزار دوں۔ اپنے جذبات کو اور ارمانوں کو تشنگیوں کی نذر رکھوں کہ بہت جلد آلام و مصائب کا یہ دور ختم ہو جائے گا اور ہم اپنا گھر آباد کر سکیں گے۔ اس سے زیادہ دکھ اٹھانے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے سکندر۔۔۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ میں نے بہت مصائب جھیلے۔۔۔ بہت قربانیاں دیں اور بہت سختی برداشت کی۔۔۔ اب میں تھک گئی ہوں۔۔۔ میں تو چاہتی تھی کہ تم میرا سہارا ہو لیکن اب لگتا ہے تم کو سہارا دینا پڑ رہا ہے۔۔۔ تم کہہ سکتے ہو کہ میں نے اپنی شکست مان لی ہے اور اس مشن میں تمہاری ہمسفری کے تقاضے ساتھ نہیں چل سکتی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے سامنے زیادہ بڑا مقصد ہے۔ ایک رابعہ کے نہ ہونے سے تم کو فرق نہیں پڑنا چاہیے۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو۔۔۔ تم میرا ساتھ چھوڑ رہی ہو!" میں نے چیخ کے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔۔۔ تم مجھے بے وفا کہو یا بزدل لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ میں بزدل تھی اور نہ بے وفا۔ بس میرا حوصلہ لامحدود نہیں تھا جیسا کہ تم نے سمجھ لیا تھا۔" وہ بولی۔ "جس حد تک میں تمہارے ساتھ چل سکتی تھی چلتی رہی۔ اب میں تھک گئی ہوں۔ مجھے یہیں چھوڑ دو اور جاؤ۔ تمہیں تو بہت آگے جانا ہے۔۔۔ تمہارے مقاصد اور تمہارے عزائم بہت بلند ہیں۔ ایک عورت کی طلب کو تمہاری راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔ جب تم کامیاب لوٹو گے تو تمہیں ہر قدم پر ایک رابعہ دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ملے گی۔"

"مجھے کوئی دوسری رابعہ نہیں چاہیے۔" میں نے دیوانہ وار چلا کے کہا۔ "مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

"لیکن تمہیں میری ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری زندگی میں تمہارے مقاصد حیات ہیں اور تمہارے جذبات میں میری حیثیت اب تک ثانوی رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔۔۔ تمہاری ضروریات اور ترجیحات میں میرا نمبر بہت بعد میں آتا ہے۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کہو رابعہ۔۔۔ تم سے زیادہ میرے لیے کوئی چیز اہم نہیں۔" میں نے کہا۔

"خود کو دھوکا دینے سے کیا فائدہ سکندر۔۔۔ اب تک جو وقت ساتھ گزرا ہے اس میں میرا وجود تو ثانوی تھا۔ آج کے غم مختلف ہیں۔" وہ تلخی سے بولی۔ "اور تمہیں ساتھ دینے والوں کی کیا کمی ہے۔ جیمسن اور غالب تمہارے دوست ہیں اور سب سے بڑھ کر نازو ہے۔۔۔ کیا کمی ہے اس میں۔۔۔ کیا خامی ہے اس کے جذبات میں؟"

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی رابعہ کہ تم اس حد تک گر جاؤ گی۔" میں نے چراغ پا ہو کے کہا۔ "نازو کا یوں ذکر کرتے ہوئے تم کو شرم نہیں آتی!"

"شرم نازو کو نہیں آتی تو مجھے کیوں آئے۔ کیا نہیں کیا اس نے تمہارے لیے۔۔۔ بچانے تک کو تو گولی مار دی تھی۔"

"یہ تم نہیں بول رہی ہو۔ اس انداز گفتگو کے پیچھے کچھ اور ہے۔۔۔ تم کبھی ایسی نہ تھیں۔۔۔" میں نے دل گرفتگی کے دکھ میں ڈوب کے کہا۔

"تم خود فریبی میں مبتلا رہنا چاہتے ہو تو رہو۔ لیکن اتنی بات

www.paksociety.com

صاف ہے کہ میں اب تمھارا ساتھ نہیں دے سکتی۔"

"اس... عیش و عشرت کی زندگی کے لیے... تم نے محبت کو بیچ دیا... بے وفا کر دیا تم نے... میری زندگی برباد کر دی تم نے... بے غیرت... بے حیا... فاحشہ..." میں نے چیخنا شروع کیا۔

"تم مجھے جتنی گالیاں دے لو وہ لیٹ آپ کو ہی دو گے۔" رابعہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کیا سمجھتے تھے آخر تم مجھے؟ ایک عورت ہوں یا چٹان؟ میرے بھی جذبات اور احساسات... میرے ارمان... میری خواہشیں... ان سب کے قتل کو تم محبت کہتے ہو؟"

"رابعہ... پلیز... ایک بار مجھ سے مل لو... میری سن لو۔ پھر جو فیصلہ چاہو کر لینا۔" میں نے منت کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں سکندر... جتنی کی نہ اب اہمیت ہے نہ ضرورت۔ تم حالات کا اب بہتر طور پر مقابلہ کر سکو گے... میرے بغیر۔"

"تمھارا مطلب ہے تم اسے اس غریب کی دولت سے اور اس کی حمایت سے؟ تو میں لعنت بھیجتا ہوں اس کی صورت پر اور اس کی حمایت پر... میں اس حرام زادے کو قتل کر دوں گا رابعہ۔ تم نے کیا سمجھا ہے مجھے... رابعہ... رابعہ..."

لیکن دوسری طرف رابعہ ریسیور رکھ چکی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ کا ریسیور اٹھا کے زمین پر دے مارا۔ اس کے ٹکڑے منتشر ہو گئے۔

چاند بھائی اس تمام عرصے میں صرف مسکرا رہا تھا۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"اگر ایک ریسیور توڑ کے تمھیں تسکین حاصل ہوئی ہے تو میں ایسا ہی دوسرا منگوا دیتا ہوں۔" وہ بولا۔

میں نے اُسے ایک سے ایک گندی گالی دی اور بار بار کہا کہ میں اُسے چھوڑوں گا نہیں... جواب میں اس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ پھر وہ مجھے پابہ زنجیر کرنے کا حکم دے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد جب میری ذہنی کیفیت کسی خوفناک پاگل سے کم نہ تھی، وہی شخص اندر آیا جو پہلی فون دے کر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رومال تھا۔ اس میں سے اسونیا جیسی تیز مہک اٹھ رہی تھی جس نے میرے حواس پر غنودگی... میرے جسم نے جھٹکا لیا اور زنجیر کی جھنکار سنائی دی۔ یہ احساس کی سرحد تھی۔ اس کے آگے کچھ نہیں تھا۔

دوبارہ آنکھیں کھولتے پر میرے تواطن میں اندھیرا اجب اللہ یوں جلنے بجھنے لگے جیسے کسی قمر میں بچے نے روشنی کا سوئچ آن آف کرنے کا کھیل شروع کیا ہے۔ پھر روشنی ٹھہرنے لگی اور اندھیرے کے وقفے کم ہوتے گئے۔ مگر ایک نیا تماشا یہ شروع ہو گیا کہ میرے چاروں طرف ہر چیز گھومنے لگی۔ کبھی یوں لگتا تھا جیسے میں چکر دار جھولے میں بیٹھا اڑتا ہوا جا رہا ہوں تو کبھی یوں محسوس ہوتا کہ دنیا

تو ساکت ہے لیکن وہ میڈ گروش میں ہے جس پر میں دراز ہوں۔

اس دائرے کی گردش کے دوران میں مجھے کچھ اجنبی اور کچھ مانوس چہرے سے بھلک دکھا کے ہٹتے اور غائب ہوتے رہے۔ ان میں ایک چہرہ چاند بھائی کا تھا تو دوسرا محسن کا... اور اس کیفیت میں بھی میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ ان دونوں کا ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں نظر آنا محال تھا۔

پھر آوازوں نے میری سماعت کو سب سے پہلے ہوشیار کیا۔ میں نے پہلے محسن کی آواز سنی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔

"سکندر... ہوش میں آ جیٹے... اب چھوڑ یہ مکر... ہم جانتے ہیں تو ابھی ایکٹنگ کر رہا ہے۔"

پھر اکرام شیخ نے کہا۔ "جب برداشت نہیں ہوتی تو آتی پیتے کیوں ہو بھائی؟ جتنے کو پانی پی لیا کرو۔ اس سے نشہ نہیں ہوتا۔"

اور نازو بولی۔ "کمال ہے... آپ دونوں مذاق کر رہے ہیں۔"

"اور کیا کریں؟" اکرام شیخ نے اُسے ڈانٹا۔ "اب تمھارا دل نہیں بھرا تیرا رونے سے... چل جا کافی لا۔"

"ہاں... مردہ زندہ ہو رہا ہے۔" محسن نے تائید کی۔ "اب وہ فلمی سوال کرنے ہی والا ہے کہ... میں کہاں ہوں؟" اس نے مزاحیہ لہجے میں ہیرو کی آواز بنا کے کہا۔

"اور ہم اسے بتائیں گے کہ آپ دارالارواح میں ہیں۔"

"نہیں یار... کسی کو دھوکے میں کیوں رکھیں... صاف کہیں گے کہ آپ جہنم میں ہیں۔" محسن بولا۔ "آپ کے مطلب کی جگہ ہے۔"

میرا شعور اب جاگ چکا تھا لیکن مجھ میں کسی بات کا جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ ایک تو میرا سر درد کی شدت سے تڑخ رہا تھا پھر میری زبان تھی جو خشک ہو کے تالو سے جا لگی تھی۔ تاہم یہ سوچ کے حیران ہو رہا تھا کہ میں نے جو کچھ دیکھا تھا اور سنا تھا وہ کیسا ایک ڈراؤنا خواب تھا؟ میرا کراچی جانا، وہاں اکرام اور نازو سے ملاقات، اختر رضا کا قتل... چاند بھائی سے دوست کے ذریعے ملاقات اور رابعہ کی بے وفائی کا صدمہ۔

لیکن ابھی میری سوچ میں بھول تھا۔ ورنہ میں حقیقت کو خواب نہ سمجھتا اور اتنا ضرور سوچتا کہ کیا میں پھر گزرے ہوئے اس وقت میں پہنچ گیا ہوں جب ہم سب اکٹھے تھے۔

نازو کافی لائی جو بے حد تلخ اور گرم تھی۔ یہ دوا میرے حلق سے اسی طرح اتاری گئی جیسے بیمار جینس کے حلق سے دیسی مرکبات کا مکسچر اتارا جاتا ہے... اثر بہت جلد ہوا۔ چند منٹ میں بے یقینی کی دھند چھٹ گئی اور میرے ذہن نے واقعات کو ترتیب کے ساتھ وقت کی زنجیر میں جوڑ لیا۔

"محسن!" میں نے کہا۔ "ایک سگریٹ دے مجھے۔"

"کیپ... بگلا مار کر جو بس والا... یار کٹ...؟" محسن نے کہا مگر ایک سگریٹ جلا کے میرے منہ سے لگا دیا۔

"تو کب آیا؟" میں نے کہا۔

"ابے تیئس برس پہلے کی بات ہے۔" محسن نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "موسم برشگال کی ایک طوفانی رات تھی جب آدھی دنیا سورج کے ادھر تھی اور آدھی اُدھر۔ اس حقیر فقیر پُر تقصیر نے عدم سے وجود کا سفر کیا۔"

"بکواس مت کر... تو لاہور سے کب آیا؟" میں نے کہا۔

"پہلے تو بتا کہ تُو یہاں کیسے آیا؟" محسن بولا۔

"اچھا بھائی... پہلے میں ہی بتا دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو میں سڑک کے کنارے پڑا ہوا ملا تھا۔" محسن بولا۔ "جب میں بہت چھوٹا تھا... کوئی دس بارہ کوڑے کا... تو میری ماں بھی مجھے اس سوال کا یہی جواب دیتی تھی... کہ میں سڑک کے کنارے پڑا ملا تھا۔"

"میں بتاتی ہوں آپ کو۔" نازو نے میرا سر دباتے ہوئے محسن کو گھورا۔ "اکرام بھائی نے خود فون کیا تھا۔ وہاں سے ان کے آنے کی خبر ملی۔ اکرام بھائی ٹرین سے کام پہ گئے اور انھیں ٹیکسی میں یہاں لے آئے۔ خود آپ کے بارے میں یہ تو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ سڑک کے کنارے بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔"

میں ہمت کر کے بیٹھ گیا۔ "تمھیں تو انھوں نے واپس کر دیا تھا؟"

"ہاں... مجھ سے دوست محمد نے کہا کہ تم جاؤ، تمھارا دوست حرست میں ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں... میں نے کہا کہ اگر ایسا ہی ہے تو مجھے اس سے ملا دو۔ صرف ایک منٹ کے لیے... پھر میں چلا جاؤں گا... وہ کہنے لگا کہ بابا اس کا آرڈر نہیں ہے... کالے کو بھلا کر بے منت ہیں۔ تمھارا یار بھی شوق سے بات کرتا پڑا ہے... کیا تو واقعی رابعہ کے ساتھ تھا؟"

رابعہ کے نام سے میرے دل میں ایک سلگتا ہوا تیر پیوست ہو گیا۔ "رابعہ... کون رابعہ؟" میں نے بے خیالی میں کہا۔

ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔

"جس رابعہ کی تم بات کر رہے ہو نا...؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "وہ اب نہیں ہے... کہیں نہیں ہے۔"

یکلخت ان تینوں کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" نازو سب سے پہلے چلائی۔ "انھیں سے کا کیا مطلب؟"

"اس کا مطلب یہی کہ اب وہ رابعہ نہیں رہی جسے تم جانتے ہو... جس کی تلاش مجھے یہاں لائی تھی... جو نہیں ہے وہ نہیں ہے اور ہماری تمھاری زندگی ایسی ہی رہے گی۔ اس میں لوگ آتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے چلے جاتے ہیں کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے... صرف ان کی یاد رہ جاتی ہے... پھر وہ بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور وقت ہمیں کھینچ کر آگے لے جاتا ہے۔"

محسن اور اکرام شیخ کا چہرہ بے جان ہو گیا تھا... نازو بے اختیار رونے لگی۔ ان سب نے میری بات کا وہی مطلب نکالا تھا جو نکالا جا سکتا تھا۔ میں نے نہیں کہا تھا کہ وہ مر گئی مگر انھوں نے یہی سمجھا تو غلط نہیں سمجھا... اور میرے لیے سب سے زیادہ آسان یہی تھا کہ میں فسانۂ دل کو یوں مختصر کر دوں۔ ورنہ میں وہ سب بتاتا جو میرے دل پر بیتی تو بتا نہ پاتا۔

"یہ... یہ سب کیسے ہوا سکندر؟" محسن نے طویل خاموشی کے بعد ہمت کر کے کہا۔

"کیا کیسے ہوا؟" میں نے کہا۔ "مجھ سے کیا پوچھتے ہو... جب ہیرو شیما پر ایٹم بم گرا تھا تو کسی نے یہ سوال مرنے والوں سے کیا تھا؟ کوئی کرتا تو وہ کیا بتاتے؟ ہاں وہ جو زندہ بچے تھے وہی بتا سکتے تھے کہ یہ سب کیسے ہوا تھا۔ تم نے تیلڈی کی لاش سے پوچھا تھا کہ دوست... یہ کیسے ہوا... اس نے کیا جواب دیا تھا؟"

بڑی خاموشی سے محسن باہر چلا گیا۔ اکرام شیخ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ نازو میرے سرہانے بیٹھی روتی رہی اور مجھے نہ رونے کی تلقین کرتی رہی۔ ہمت سے کام لینے کو کہتی رہی۔ بے ہمت لڑکی! وہ کیا جانے ہمت اور حوصلہ کسے کہتے ہیں۔ وہ میری جگہ ہوتی... وہ سب سنتی جو رابعہ نے مجھ سے کہا اور جو جھوٹ نہیں تھا تب میں دیکھتا اس کا پیچ سہنے کا حوصلہ... ایسے تو سب ہی صبر جمیل کی بات کر لیتے ہیں۔ رسم دنیا نباہنے کے لیے مگر کیا الفاظ کسی کے دکھ کا مداوا ہوتے ہیں۔ یہ تو میں ہی تھا کہ میں نے دل کو پتھر کر لیا اور وہ کہہ دیا جو شاید میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

محسن پھر آیا تو اس کے ساتھ ایک اجنبی تھا... اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔

"اس شخص سے کہو کہ چلا جائے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں خود اسے باہر پھینک دوں گا۔"

ڈاکٹر کے قدم رک گئے۔ "پلیز..."

"پلیز کے بچے... اب تم کہو گے کہ تم نہیں جانتے کہ تمھیں آرام اور سکون کی ضرورت ہے اور پھر مجھے کوئی سکون آور انجکشن ٹھونک دو گے۔ گیٹ آؤٹ... میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ۔ مجھے نہیں ہے ضرورت اس مصنوعی سکون کی۔"

www.paksociety.com

ڈاکٹر بڑی گھبراہٹ میں واپس ہوا۔ نازو میرے بازو سے تقریباً لٹک گئی: "سکندر بھائی۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔"

"چپ۔۔۔" میں نے اُسے جھٹک دیا۔ "تیز جلتی ہے اکرام تیغ میں نہیں۔۔۔ وہ کہتی تھی۔" میں نے رابعہ کے الفاظ دہرانے کی کوشش کی لیکن میرے حلق میں پھندا لگ گیا۔ وہ بات میں دہرا بھی نہیں سکتا تھا۔۔۔ باہر محسن، غالب، ڈاکٹر کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں خطرناک قسم کا پاگل ہرگز نہیں ہوں۔

"محسن۔۔۔" میں نے چلا کے کہا: "ڈاکٹر صاحب کو آنے دے آ۔۔۔ مجھے سُلا دیں۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔" اور بستر پہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ میں نے ایک منٹ بعد انجکشن کی سوئی کی چبھن بھی محسوس کی لیکن میں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔۔۔ دھیرے دھیرے میرا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔ میرے خیالات کے گرداب میں رابعہ کا چہرہ ڈوبنے اور اُبھرنے لگا۔ اس چہرے کے ہزار روپ تھے۔۔۔ ہزار جلوے تھے۔۔۔ سب دل نشیں۔۔۔ سب نظر فریب۔۔۔ سب یادوں کے نقش۔۔۔ سب سراب۔

تیسرے دن میں بالکل فٹ ہو گیا۔ یہ تین دن میں نے سوتے جاگتے گزارے۔۔۔ میں نے محسن کے علاوہ غالب کو بھی دیکھا، ان دونوں کے لباس بھی دیکھے۔ ان کی سرگوشیاں بھی سنیں۔ نازو کے آنسو بھی محسوس کیے جو کبھی کبھی تیزاب کے جھلسا دینے والے گرم قطروں کی طرح میرے ماتھے پر یا میرے ہاتھ پر ٹپک جاتے تھے۔ میں نے ان کی باتیں بھی سنیں جو وہ مرحوم خواجہ بیگ۔۔۔ ہوٹ خوبی۔۔۔ ہوٹ استاد شیدائی کے لیے کرتے تھے اور رابعہ کے لیے کرتے تھے۔۔۔ جو تھی ہی خواب نہیں تھی۔۔۔ جب میرے لیے نہیں تھی تو ان کے لیے کہاں سے ہوتی۔

جب میں فٹ ہو گیا تو میں نے خود ہی کہا: "دوستو! انھیں رونے سے کیا جو ہمارے ساتھ نہیں۔ کیا یہ کم ہے کہ ہم ساتھ ہیں۔ کون جانے کل کس کو بچھڑنا ہے۔ آج کے دن کو اور اس لمحے کو غنیمت جانو اور انھیں بھول جاؤ۔۔۔ بھولنا تو پڑتا ہے۔ پھر کل کا کام آج ہی کیوں نہ کریں۔ دُکھ کی مدت کو کم کیوں نہ کریں اور آنے والے دن کی کیوں فکر نہ کریں کیونکہ وقت کے ساتھ ہم بھی حرکت میں ہیں اور ماضی میں نہیں ٹھہر سکتے۔ ہمیں مستقبل میں سفر کرنا ہی پڑے گا۔"

وہ سب حیران رہ گئے لیکن انھوں نے میری بات مان لی۔ انھوں نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ استاد شیدائی کی موت کس طرح اچانک واقع ہوئی۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی نے مار دیا تھا کہ سرکس کی آڑ میں کیا تماشا ہونے والا ہے۔ میں نے جولی کے متعلق پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر لطیف کے گھر میں ہے جہاں رابعہ بھی رہی تھی۔ انکل رضوی اس کو دیکھنے جاتے ہیں مگر اس کی حالت میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ عقل و زندگی کے احساس سے ماورا ہو کر بیٹھی ہے اور اب امید کی واحد کرن وہ بچہ ہے جو اس پاگل عورت کو مامتا کے جذبے سے بھرپور کر دے اور اس کا پاگل پن دُور کر دے۔

میں نے انھیں خسرو جمشید، جیکی اور جونی کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ زیب النساء کی ایک بہن ممتاز ہے۔ غالب مسکرانے لگا: "وہ اس کی ماں ہے۔ تم نواب سعد کی تیسری بیوی کی بات کر رہے ہو نا؟"

"تیسری۔ اپنے علم کے مطابق وہ دوسری تھی۔ مگر خیر۔۔۔ تیسری بھی ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا: "وہ زیب النساء کی ماں ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیا مطلب، زیب النساء کی ماں نہیں ہو سکتی؟" محسن بولا۔

"یہ تو سُنا تھا کہ فلاں کا باپ نہیں۔۔۔ مگر ماں تو ان کی بھی ہوتی ہے جن کے باپ نہیں ہوتے۔"

"میرا مطلب تھا کہ وہ بڑی نہیں لگتی تھی۔"

"ہاں یہ کہو کہ تمھاری نظر نے اس کی عمر کا غلط اندازہ کیا۔ ایسا ہو جاتا ہے۔" غالب نے کہا: "جب میری عبدالودود منظر سے بات ہوئی تب مجھے پتا چلا کہ خسرو جمشید سے تمھارا کیا معاہدہ ہوا ہے۔"

"اس معاہدے کی حیثیت کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"منظر بھائی نے کارروائی تو بڑی تیز رفتاری سے شروع کی ہے اور وہ بہت پریشان ہے کیونکہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکا۔ اس نے تو سیاسی مقاصد کے استعمال کے لیے اسپتال کی تعمیر کا اعلان کر دیا تھا۔ اسپتال کا منصوبہ پہلے کاغذی میں چلا۔ اب خسرو جمشید وہ سب زمین تمھیں دے رہا ہے اور کاغذات جو اس کے پاس رہن نامے کی صورت میں موجود تھے عدالت کی تحویل میں جا چکے ہیں۔ تمھارے والد کی وہ فیکٹری تو تمھیں نہیں مل سکی مگر اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ ساری برائی چوہدری دلاور کے کھاتے میں گئی۔ تمھیں اس کی جگہ بنا بنایا اسپتال مل جائے گا۔۔۔ اس کا ثواب تم کماؤ گے۔۔۔ ابھی تو ابتدائی مراحل کے معاملات چل رہے ہیں۔ تعمیر کا سلسلہ بعد کی بات ہے۔ اس کے لیے بھی خسرو جمشید نے تمھارے اکاؤنٹ میں فنڈ ٹرانسفر کر دیے ہیں بلکہ ڈیپازٹ کی صورت میں چار لاکھ کی رقم ہے۔ جب یہ سب معاملات طے ہو جائیں گے اور دلاور اینڈ کمپنی

کا حشر نشر ہو جائے گا، تب ہم اسپتال کا سنگِ بنیاد رکھیں گے۔ ابھی رکھا تو وہ اسے اُکھاڑ پھینکے گا۔ اسپتال کو بھی اُڑا دے گا لیکن زمین کو وہ نہیں اُڑا سکتا۔ اس کی سب سے بڑی مجبوری یہ ہے کہ اپنے نواب خسرو جمشید کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ وہ ہے کہاں؟"

"کہاں ہے وہ؟" میں نے کہا۔

"جیکی اور جونی کی قید میں۔" غالب نے کہا: "میں نے اپنے تمام وسائل اور تعلقات کی مدد سے اس کا سراغ لگا لیا تھا اور جیکی جونی سے مل کے سب حالات بھی معلوم کر لیے تھے۔"

"انھوں نے بتا دیا تمھیں؟"

غالب ہنسا: "ایسے یار وہ لونڈے ہیں۔ ہم انھیں چٹکیوں میں اُڑا دیں۔۔۔ سمجھتے ہیں بہت ہوشیار ہیں مگر ہیں گدھے۔۔۔ تاہم اچھے گدھے ہیں اور کام کے گدھے ہیں۔۔۔ تم سے بہت متاثر ہیں اور تمھیں بالکل ٹیلوڈ جیفنس ([illegible]) کا حقیقی روپ سمجھتے ہیں۔"

ٹیلوڈ جیفنس اس زمانے کی مقبول ترین انگلش فلم سیریز 'فیوجیٹیو' کا مرکزی کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کہانی کی ایک سو قسطیں دکھائی گئی تھیں اور فیوجیٹیو یعنی مفرور ایک ایسا ڈاکٹر تھا جس پر اپنی بیوی کو قتل کرنے کا الزام تھا۔ وہ اسے کسی ایک جھلک دکھی تھی مگر قتل کے الزام میں وہ خود پکڑا گیا اور تمام واقعاتی شہادتیں اس کے خلاف تھیں۔ کسی نہ کسی طرح وہ پولیس کی تحویل سے نکل بھاگا اور اس نے اپنی بیوی کے اصل قاتل کو تلاش کرنا اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔ ہر جگہ پولیس اس کے پیچھے رہی اور وہ مختلف بھیس بدل کے آگے آگے بھاگتا رہا لیکن اس نامعلوم قاتل کو بھی تلاش کرتا رہا تاکہ ایک طرف تو اس سے انتقام لے سکے اور دوسری طرف اپنی بے گناہی کا ثبوت فراہم کر سکے۔ ٹیلوڈ جیفنس ایک ڈاکٹر بنا تھا یعنی وہ بھی ایک تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ اس اعتبار سے واقعی میری زندگی کی کہانی اور اس ٹی وی سیریل کے واقعات میں خاصی مماثلت تھی۔ فرق تھا تو صرف یہ کہ میری کہانی کا آغاز اپنے والد کے نامعلوم قاتل کی تلاش سے شروع ہوا تھا اور اس کے بعد حالات نے مجھے بھی کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

'فیوجیٹیو' سے میرا موازنہ ایک فطری رد عمل تھا۔ خصوصاً جیکی اور جونی جیسے نوجوانوں کے لیے جو اس حقیقی زندگی سے بہت قریب نظر آنے والے ٹی وی سیریل کو بڑی والہانہ دلچسپی سے دیکھتے تھے اور میرا خیال ہے کہ ٹی وی نے پھر کبھی ایسا کوئی فلم سیریل پیش نہیں کیا جو اتنا طویل عرصہ چلا ہو اور جس نے عملاً لوگوں کو دیوانہ کر دیا ہو۔

"تو وہ مجھے فیوجیٹیو سمجھتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"کیا غلط سمجھتے ہیں؟" غالب نے سوال کیا: "اچھا ہے نا، کو بُرا نہیں سمجھتے۔ ان سے مجھے اور بھی مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ مثلاً یہی اپنی زیب النساء کی والدہ کے بارے میں۔"

"اپنی زیب النساء؟" محسن نے کھنکار کے کہا: "دوبارہ کہنا ذرا تاکہ انھیں اپنی اوقات یاد دلائی جائے۔"

نازو کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے گلابی ہوا۔

غالب نے دانتوں کی نمائش کی: "تو مجھے چڑانے کی مذموم سازش کر رہا ہے شہلا کے میاں۔۔۔ جورو کے غلام۔۔۔ زن مرید۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔"

"آپ کچھ اور فرما رہے تھے۔ غالباً کوئی اختتامِ قصہ۔" میں نے کہا۔

"جی فرماتا ہوں۔" غالب بولا: "قصہ کچھ یوں ہے کہ نواب خسرو جمشید کے دادا مرحوم ایک وضعدار آدمی تھے۔"

"خسرو جمشید تو آدمی کا بچہ نہیں لگتا!" محسن بولا۔

"مگر وہ آدمی تھے۔" غالب بضد رہا: "ان کی دو بیویاں تھیں۔ ایک سے نوعمر لڑکا تھا جو خسرو جمشید کا باپ تھا۔۔۔ چھوٹی لڑکی تھی مہر النساء جو دس برس کے وقفے سے پیدا ہوئی تھی۔ اس کی ماں مہر النساء کی پیدائش کے وقت مر گئی تھی۔ وہ چھوٹی تھی چنانچہ لاڈلی تھی۔ نوابزادی بھی تھی لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے حسنِ بے مثال نے دھوم مچا دی تھی۔ نوابزادی کے پرستاروں کی تعداد بڑھتی گئی اور بالآخر ایک ایسا شخص اس قدر شہسوار کو لے گیا جو حسب نسب اور مالی حیثیت کے اعتبار سے نواب مرحوم کی جوتیاں اُٹھانے والوں کے برابر تھا۔ کم سے کم وہ ایسا ہی سمجھتے تھے مگر وہ ایک دلکش مرد اور حرفوں کا بنا ہوا آدمی تھا۔ اس نے تو دولت کے لالچ میں مہر النساء سے شادی رچائی تھی مگر نواب مرحوم نے روایت اور وضعداری کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اسے عاق کر دیا اور وہ بعد میں اسی طرح خوار ہوئی جیسے گھروں سے نکلنے والی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ وہ ناتجربہ کار بھی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح اس نے دنیا کو دیکھا ہی نہیں تھا مگر دنیا نے اُسے دیکھا تھا اور اس کے بے شمار پرستار بڑھ بڑھ کے آگے آتے رہے کہ خوش آمدید۔۔۔ ہمارے دل کا مکان خالی ہے۔ یوں مکاں بہ مکاں ہوتی وہ بالآخر ان مرحوم نواب سلطان محمد خان آف ملتان کی حویلی میں پہنچی۔ اس کا رابطہ استاد شیدائی سے کیسے ہوا یہ کوئی نہیں جانتا لیکن مہر النساء کے روابط کی وسعت کو دیکھتے ہوئے اسے کوئی عجیب بات نہیں سمجھا جا سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس نے پہلے یا دوسرے یا تیسرے کسی شوہر کی واحد

www.paksociety.com

اولاد کو ایک دن خاموشی سے خسرو جمشید کے دروازے پر ایک خط کے ساتھ چھوڑا اور فرار ہو گئی۔ جمشید نے نجوں الحسن کی پیدائش کی اور یوں زیب النساء نے خسرو جمشید کے زیر سایہ ہوش سنبھالا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خسرو جمشید زیب النساء کا سوتیلا بھائی ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کا بالکل یہی مطلب ہے۔" غالب نے کہا "اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ عورت جو سلطان محمد خان کی بیوی ہے خسرو جمشید کی پھوپھی ہے لیکن ان کے درمیان جو رشتہ تھا وہ بیس سال پہلے ٹوٹ گیا تھا تو وہ بچہ چھوڑ گئیں۔ جانتا خسرو جمشید نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ وہ اب اپنے آپ کو اس خاندان سے بے تعلق سمجھے... اور بچی کو بھی بھول جائے چنانچہ زیب النساء نہیں جانتی کہ اس کی ماں زندہ ہے۔"

"یہ تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو؟" نازو بولی۔

"اس لیے کہ زیب النساء نے کبھی ماں کا حوالہ دیا ہی نہیں۔" محسن بولا۔ "پھر خسرو جمشید اس قسم کا آدمی تھا کہ اس نے باپ کے ترکے کے احکامات منسوخ کرتے ہوئے اس عورت کو رعایت نہیں دی ہوگی، جو اس کے خاندان کے نام پر ایک بدنما داغ بن گئی تھی۔ خود زیب النساء بھی ایسے عیاش اور بدنام لاڈلے بھائی کے ساتھ کیوں رہتی اگر اسے علم ہوتا کہ ماں موجود ہے۔ سلطان محمد خان کا گھر بہرحال خسرو جمشید کے گھر سے بہتر تھا۔"

"یار اکرام شیخ... تم چاند بھائی موٹا والا کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" میں نے کہا۔

"جو کچھ میں جانتا تھا وہ میں بتا چکا ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے..." میں نے کہا۔ "شاید کوئی کچھ بھی نہیں جانتا... کیونکہ وہ صرف ایک نام ہے۔ ایک ایسا نام جو ایک مخصوص کاروبار میں اس کی ساکھ کو قائم رکھتا ہے۔ بس یہ وہ جو شخص ہے وہ چاند بھائی موٹا والا نہیں ہو سکتا... وہ ایک بالکل مختلف اور منفرد شخصیت ہے۔"

"یہ نتیجہ تم نے کیسے اخذ کیا؟" اکرام شیخ بولا۔

میں نے اس سوال کے جواب میں وہ سب کچھ بتا دیا جو سیٹھ چاند بھائی موٹا والا نے مجھے بتایا تھا۔ ذہنی صدمے کے ایک پاگل کر دینے والے عارضی دور سے گزر کے میں نے زندگی سے سمجھوتا کر لیا تھا اور ایک غیر جذباتی انداز... تنہا رہتے ہوئے میں نے جو زہر کا پیالہ مسکراتے ہوئے پینا قبول کر لیا تھا۔ میں نے انہیں رابعہ کے بارے میں بھی بتا دیا تھا وہ جو چاند بھائی نے رابعہ کے متعلق کہا تھا، پھر وہ جو رابعہ نے مجھ سے بلا واسطہ کہا تھا۔ وہ سب ایسے گم صم اور دم بخود بیٹھے رہے جیسے یہ حقیقت نہیں طلسم ہوشربا کی کہانی ہے جس میں دلچسپی کے لیے تو بہت کچھ ہے مگر یقین کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔

ابھی تک سب یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ رابعہ ہلاک کر دی گئی ہے۔ اس نئی صورت حالات کی تصویر نے رابعہ کو پھر زندہ کر دیا مگر یوں کہ سوالات کے بے یقینی کے احساس کے کچھ باقی نہ رہا۔ بیچ طرح پہلے وہ بھی سمجھے کہ یہ فریب سماعت ہے اور جو کچھ وہ سن رہے ہیں وہ غلط ہے اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا لیکن ایسا ہو چکا تھا اور جب میں نے اسے مان لیا تھا تو وہ کیسے نہ مانتے۔

بہت دیر چپ رہنے کے بعد محسن نے کہا "کیا تجھے یقین ہے کہ رابعہ پر کوئی دباؤ نہیں تھا؟"

"یہ وضاحت میں کر چکا ہوں۔"

"اور وہ آواز رابعہ کی ہی تھی؟"

"کیا کسی اور کی آواز کو میں رابعہ کی آواز مان سکتا ہوں؟ یا کسی کی آواز کو شہلا کی آواز سمجھ سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ تو ایسا ہی ہوگا جیسے میں کسی اور کو محسن یا غالب مان لوں۔"

"یار... وہ ٹیپ بھی تو ہو سکتا ہے۔" غالب نے کہا "جو پہلے بھر لیا ہوگا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کوئی اخباری بیان نہیں پڑھ رہی تھی۔ جو سوالات میں نے کیے وہ کسی سیاسی انٹرویو کے سوالات نہیں تھے جن میں پوچھا جاتا ہے کہ آپ کا پسندیدہ مشغلہ کیا ہے؟ آپ کو کون سا شاعر پسند ہے... کون سا رنگ اچھا لگتا ہے۔ اور ان متوقع سوالات کے جوابات پہلے سے حاصل کر کے مجھے رابعہ کی آواز میں ٹیپ سنوا دیا جاتا۔ ہماری گفتگو بلاشبہ تو نہیں تھی لیکن ایسی ہی تھی جیسے وہ میرے سامنے ہو۔ میں نے اسے اور اس نے مجھے نام سے مخاطب کیا۔ ہمارے درمیان بحث ہوئی... پھر تلخ کلامی اور آخر میں... آخر میں نے اسے گالیاں دیں... جب میں صدمے کی شدت سے ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔"

وہ پھر کچھ دیر گم صم افسردہ و ملول اور غصے میں بھرے بیٹھے رہے۔ پھر محسن نے ہی کہا۔

"یار... اس کا تو یہی مطلب ہے کہ دنیا میں محبت اور اعتماد کوئی چیز ہی نہیں رہی... کل کو شہلا بھی مجھے چھوڑ سکتی ہے۔"

"ایک عاشق کی فیاضی پر بھی اعتماد کرنا پاگل پن ہوگا کہ اب ایسے ہی حالات میں دنیا تباہ ہو جائے گی۔" میں نے کہا "ہر عورت رابعہ نہیں ہو سکتی... یہ پہلے بھی سچ تھا...

اور آج جب کہ حالات برعکس ہیں، تب بھی درست ہے۔"

"اور تم اسے... بھول جاؤ گے؟" نازو نے کہا۔

"ہاں... میں اسے بھول چکا ہوں۔" میں نے دل پہ جبر رکھ کے کہا۔

"جھوٹ... تم خود سے کیوں جھوٹ بولتے ہو؟"

"جھوٹ کیا ہے اس میں؟" میں نے کہا۔ "آئینے جھوٹ نہیں بولتے اور رابعہ نے صرف آئینہ دکھا کے مجھے سچ کے وجود کا اقرار کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں کیسے تردید کر سکتا ہوں کہ مجھے فوزیہ سے محبت نہیں تھی... اور آج بھی محبت نہیں تھی... یہ بات محسن جانتا ہے۔ پھر میں نے اپنی محبت بدل لی۔ اس کا تو صاف مطلب یہی ہوا ناں کہ محبت ایک تغیر پذیر جذبہ ہے۔ اس میں مرد اور عورت کی تخصیص کیسی... جو میں نے کیا وہی رابعہ نے کیا تو کوئی ناممکن واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس نے ایک شخص کو پسند کر لیا جو مجھ سے بہتر تھا... اس کی نظر میں... تم اس تبدیلی کو اپنی نظر سے دیکھ رہے ہو... میں اس سے گلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے مر بھی نہیں سکتا اور اپنے عشق سے بھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔ میرے لیے لکھے ہوئے تقدیر سمجھ کے قبول کرنا زیادہ آسان ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اس طرح قدرت نے مجھے وہی سزا دی جو میں نے فوزیہ کو دی تھی۔ پھر مجھے کرنا بھی وہی چاہیے جو فوزیہ نے کیا یعنی حالات سے سمجھوتا کر کے خوش رہنا چاہیے۔"

"میرا دماغ تو کام نہیں کر رہا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "اگر یہ سب سچ ہے تو پھر...!"

"خاموش کیوں ہو گئے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔" اکرام شیخ نے سوچ کے کہا۔ "مثلاً یہ کہ اس دن جب میں تمہارے تعاقب میں گیا تھا اور دور سے دیکھ رہا تھا تو مجھے یقین تھا کہ مجھے کسی نے نہیں دیکھا لیکن میرا یقین اس وقت غلط ثابت ہوا جب دوست محمد نے خود مجھ سے آ کے کہا کہ چاند بھائی... تمہارا دوست اندر بیٹھا رابعہ کے ساتھ عیش کر رہا ہے... اور... اور اس نے بڑے معنی خیز انداز میں... لوفروں کی طرح مجھے آنکھ بھی ماری تھی... میں برداشت کر گیا اور جب واپس آنے لگا تو دوست محمد میری ہی ٹیکسی میں بیٹھ گیا تھا۔"

"کیوں؟ اس کی اپنی گاڑی جو تھی۔" میں نے کہا۔

"یہی تو وہ بات ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ "اس نے کہا کہ مجھے تمہارے گھر پہنچا دو۔ میں نے کہا کہ تمہاری گاڑی کیا ہوئی... تو اس نے جواب دیا کہ وہ رابعہ لے جائے گی... کیا مطلب ہوا اس کا آخر؟ کیا رابعہ وہیں موجود تھی لیکن وہاں رہتی نہیں تھی۔ اسے کہیں اور جانا تھا۔ مگر جانا تھا تو وہاں گاڑیوں کی کمی نہیں تھی۔ اس کا وہ خبیث عاشق ذرا سے مرسیڈیز کا نیا ماڈل پیش کر سکتا تھا۔ وہ پھر بھی اس کھٹارا گاڑی میں گئی... یا گئی ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ دوست محمد واقعی چھومنتر ہو گیا... جبکہ میرا خیال تھا کہ وہ میرے ساتھ جائے گا اور میرا گھر دیکھتے میرے اصرار کے باوجود نہ رکے گا۔ بیچ کے اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے کرایہ بھی دیا۔ نذرانہ تھی... اور پھر غائب ہو گیا... ایسا غائب ہوا کہ پھر نظر نہیں آیا... تین دن سے میں اس کے بارے میں پوچھتا پھر رہا ہوں مگر نہ کسی نے اسے دیکھا ہے نہ کسی کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہوگا۔"

"تم کو وہیں جانا چاہیے تھا... چاند بھائی کی کوٹھی پہ۔"

اکرام طنز سے ہنسا۔ "تم مجھے اتنا کوتاہ اندیش سمجھتے ہو؟ بھائی میں پولیس مین کا دماغ اب بھی رکھتا ہوں۔ عہدہ نہیں رہا تو کیا ہوا۔ میں وہاں بھی گیا تھا اور مجھے بڑا شاک سا لگا... وہیں لگا کہ اس کوٹھی میں کوئی نہیں تھا۔"

ہم سب ایک ساتھ چونکے۔

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ چاند بھائی موٹا والا نہیں تھا؟" میں نے کہا۔ "میں بتا چکا ہوں کہ وہ ایک فرضی اور کاغذی کردار ہے۔"

"وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔" اکرام شیخ نے اپنی بات پر اصرار کیا اور پھر مسکرا کے کہا۔ "کوئی آدم نہ آدم زاد... کوٹھی خالی پڑی ہوئی تھی۔ اس میں سامان تک نہیں تھا... میں نے بند کھڑکیوں کے شیشوں میں سے جھانک کر دیکھا تو فرش اور دیواریں سپاٹ تھیں... بالکل اسی طرح جیسے کسی نئے مکان کے در و دیوار جس میں ابھی مکین نے قدم تک نہ رکھا ہو۔ اندر ایک تنکا تک نہیں تھا۔ جب میں کوٹھی کے ہر کمرے میں جھانک رہا تھا تو ایک پٹھان چوکیدار آ گیا۔ اس نے مجھے للکارا کہ کیا کر رہا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کوٹھی کب سے خالی ہے۔ وہ کہنے لگا کہ تم کو کرائے پر لینی ہے تو ہم سے بات کرو۔ عجیب الٹی کھوپڑی کا آدمی تھا۔ میں نے کہا کہ بھائی میں اس کوٹھی کا سرونٹ کوارٹر بھی کرائے پر نہیں لے سکتا... مجھے تو ان سے ملنا تھا جو یہاں تھے۔ وہ کہنے لگا کہ یہ کون سا طریقہ ہے کہ تم کھڑکیوں میں سے جھانک رہے ہو... تم کو شرم آنی چاہیے۔ اندر عورتیں ہوں تو خیر... یہ شریف لوگوں کا علاقہ ہے۔ میں نے معافی مانگی اور کہا کہ چلو غلطی ہوئی۔ اب بتاؤ کہ یہاں کون تھا اور وہ کہاں گیا۔ اس نے پھر مجھے ٹالا اور کہا کہ تھا کوئی کرائے دار۔ ہمیں نہیں معلوم کہ کون تھا اور کیا کرتا تھا اور کہاں چلا گیا... اس کے بعد مزید بات کرنے کی گنجائش نہ رہی اور میں واپس آ

www.paksociety.com

گیا۔ اپنی ٹیکسی کو میں نے کوٹھی کے سامنے ہی روکا تھا اور آس پاس کا جائزہ لینے کے بعد ظاہر یہ کیا تھا کہ ٹیکسی خراب ہو گئی ہے۔ جب مجھے یقین آگیا کہ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے تو میں پیچھے کی طرف سے گیا تھا اور دروازے بند دیکھ کے حیران ہوا تھا۔ کوٹھی ویسے بھی ویران نظر آتی تھی۔ جھانک کر دیکھنے سے اس کی بے سروسامانی بھی عیاں ہو گئی۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"کل کی۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "اور میرا..."

"تم نے ہمیں بھی کچھ نہیں بتایا۔" نازو نے احتجاج کیا۔

"میں بتانے والا تھا لیکن اس کے بعد اور کچھ واقعات پیش آئے جو پُراسرار سمجھے جا سکتے ہیں۔" اکرام شیخ بولا۔ "میں چند گھنٹے گیا اور دوست محمد کو تلاش کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ان معاملات پر یقیناً روشنی ڈال سکتا ہے۔ عام طور پر وہ آسانی سے مل جاتا تھا۔ کوئی نہ کوئی اس کے بارے میں ضرور بتا دیتا تھا کہ وہ کہاں ملے گا یا کب ملے گا لیکن کل تو مجھے بڑی حیرت ہوئی جب کئی لوگ مجھ سے کہنے لگے کہ تم اسے دیکھو تو فلاں فلاں کو بتا دینا۔ وہ اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ کئی دن سے لاپتا ہے۔ میں مایوس ہو کے واپس آگیا لیکن سب سے بڑا شاک ابھی باقی تھا۔ واپسی پر میں نے اپنی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر ایک سر بند لفافہ دیکھا۔"

اس کی خاموشی سب کے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی۔

"کیا ہے بھیا!" نازو نے بگڑ کے کہا۔ "سسپنس پیدا کر رہے ہو خواہ مخواہ... کیا تھا اس لفافے میں؟"

"تیرے لیے کچھ نہیں تھا۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"پھر کس کے لیے تھا؟" غالب نے کہا۔

"اور کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"بتاتا ہوں... بتاتا ہوں۔" وہ بولا۔ "بے صبرے کیوں ہو رہے ہو۔ وہ خط سکندر بخت کے نام تھا۔ میرا مطلب ہے لفافے پر سکندر بخت کا نام تھا۔ خط تو میں نے پڑھا نہیں کیونکہ اس پر لکھا ہوا تھا۔ صرف کے ٹو کے لیے..."

"یہ مذاق کرنے کا بہت بھونڈا طریقہ ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ مذاق نہیں ہے۔"

"پھر کے ٹو کا کیا مطلب ہوا؟" غالب بولا۔ "کسی نے قراقرم کی چوٹی کے ٹو کے نام خط لکھا تھا کہ مجھ سے شادی کر لو۔"

"مرزا غالب کے بھتیجے۔ تم ایسا ہی بے تکا مطلب نکال سکتے ہو کیونکہ تمھاری عقل پولیس مین کی عقل نہیں ہے۔"

"یہ غلط فہمی ہے تمھاری کہ پولیس مین کے پاس بھی عقل ہوتی ہے۔" غالب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اس کے پاس صرف نیرہ نمبر کا جوتا ہوتا ہے۔"

"کاش وہ میرے پاس ہوتا... تو آپ کی عقل ٹھکانے آجاتی۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "میں تم سے منوا کے چھوڑتا کہ تمھاری محدود عقل کے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل تھا لیکن میں نے اس کا مطلب نکال لیا۔ یہ خط سکندر بخت کے لیے تھا جس کا وہ قلمی یا جعلی نام بھی ہے۔ ڈبل کے معنی کے ٹو۔"

غالب پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور نازو نے غالب کو ایسے دیکھا کہ اسی عقل پر افلاطون بنتے ہو۔ غالب نے سر جھکا لیا۔

"کہاں ہے وہ خط؟" میں نے بے چینی سے کہا۔

اکرام شیخ نے جیب میں سے مڑا ہوا بند لفافہ نکالا اور میرے سامنے ڈال دیا۔ یہ کافی کا عام سستا سا بند لفافہ تھا لیکن اس کا انداز تحریر عام نہیں تھا۔ یہ رابعہ کی تحریر تھی جسے میں پہچانتا تھا۔ میرا دل یوں دھڑکا جیسے پھٹ جائے گا۔ میں لفافے کو گھورتا رہا۔ آخر کیا ہوگا اس میں؟ بہی کہ اب کہنے کو کچھ بھی نہیں... پھر میں نے خود سے کہا کہ دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے... اور خط کو کھول لیا۔ اس میں فیض کی ایک نظم کا اقتباس تھا۔

گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا!
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

یہ ایک مختصر سے سادہ کاغذ پر بے نام تحریر اسی کے ہاتھ کی تھی جس نے مجھے یکلخت زندگی کی طرف لوٹا دیا اور وہی امید... وہی امنگ، وہی ارمانوں کی تندی، وہی جذبات کی تپش اور وہی احساس کی آرزومندی عطا کر دی جو رابعہ کے نام سے اور اس کے تصور سے اور اس کی چاہت سے منسوب تھی۔ تحریر اس کی نہ ہوتی اور اس پر تاریخ بھی نہ ہوتی تو میں سمجھتا کہ یہ پرانا خواب ہے جو بالکل یہی پیغام مجھے رابعہ نے جیل خانے میں اس وقت بھیجا تھا جب میں زندگی سے مایوس تھا اور اتنا اکیلا تھا کہ خود اپنی ذات کے اعتماد سے محروم ہو چکا تھا۔ اس وقت رابعہ نے جو کچھ کیا وہی آج بھی کیا تھا اور وہ بتاتی تھی کہ کوئی توضیح کوئی توجیہہ اس سے زیادہ مکمل اور تسلی دینے والی نہیں ہو سکتی۔ اس نے آخری شعر کا اضافہ کر کے وہ سب کہہ دیا تھا جو آتا تھا کہ اس کے معاملے میں ناامیدی سے دور رہ کے تمام عمر انتظار کرسکتا تھا۔

میری ظاہری حالت میں تغیر پوشیدہ رہنے والی بات نہیں تھی۔ ایسے وقت میں جبکہ مایوسی کی انتہا کو پہنچ کے میرا احساس بھی منجمد ہو چکا تھا اور اپنے دل سے اس محبت کے نقش کو کھرچ کے مٹانے کی کوشش کر رہا تھا یوں جیسے فنکار اپنے سب سے عظیم فن پارے کو اپنے ہاتھوں سے فنا کر دینے کی سعی لاحاصل میں مصروف ہو، یہ چند سطروں کا خط لفظ کن فیکون سے کم نہ تھا اور کوئی شخص کسی حریف آتش سے کسی دلیل سے اور کسی بیان حلفی سے مجھے وہ یقین نہیں لوٹا سکتا تھا جو اس مختصر ترین "اظہار محبت" نے دے دیا۔

"تم نے... اس خط کو اب تک چھپا کے رکھا؟" میں نے بالآخر فرط خوشی سے مرتعش آواز میں کہا۔ "یہ رابعہ کا خط ہے۔"

"میں پہلے سے کیسے جان سکتا تھا۔" اکرام شیخ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور پھر جناب کی حالت ایسی کہاں تھی۔"

"جھوٹ... تمھیں معلوم تھا کہ یہ خط کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔"

"مجھے شک ضرور ہوا تھا مگر میں رابعہ کی تحریر کو نہیں پہچانتا۔ یہ تو مجھے محسن نے بتایا۔" وہ بولا۔

"پھر میں نے اُسے کھولا اور پڑھا۔" محسن نے ڈھٹائی سے کہا۔ "حالانکہ پرائی ہوبیٹیوں کے خط پڑھنا مشرق کا قاعدہ نہیں۔" غالب نے اتفاق کیا۔ "مگر ہم شرفا ہیں کب۔"

"پھر کون ہیں آپ؟" نازو نے کہا۔

غالب نے اس کی طرف دیکھا "آہ" بھری اور بولا۔ "ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔" پہلا مصرع اس نے نہیں پڑھا مگر نازو نے سمجھ لیا اور وہ منہ پھیر کے مسکرانے لگی۔

"اب تو یقین آگیا تجھے کہ خواب تھا جو کچھ تو نے دیکھا جو بھی سنا افسانہ تھا؟" محسن بولا۔

"نہیں... نہ وہ خواب تھا اور نہ افسانہ... مگر ہاں... میں جس یقین سے محروم ہو گیا تھا وہ مجھے مل گیا ہے۔ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور تھا۔ رابعہ نے جو کچھ کہا وہ کسی مقصد کے تحت کہا۔ یا کسی ایسی مجبوری کے تحت کہا جس کا اظہار بھی ممکن نہیں تھا۔ اتفاق کی بات ہے میں بھی وہ نہیں جان سکتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہے؟ سیٹھ چاند بھائی موٹا والا سے شادی؟" محسن نے ہنس کے کہا۔ "آخر کیسے مان لیا تیرے دل نے کہ ایسا ممکن ہے؟"

میں شرمندہ ہو گیا۔ "میری جگہ تو ہوتا... تو شاید تو بھی مان لیتا۔ کبھی کبھی عشق کو عقل کے ہاتھوں شکست بھی ہو جاتی ہے۔"

"تو اب مرے بھی کچھ خوار میں... رابعہ کو معلوم ہوا کہ تیرا جذبۂ عشق ابھی تک خام ہے تو اسے کتنا دکھ ہوگا... اسے دیکھ کہ کسی نہ کسی طرح اپنا پیغام پہنچا ہی دیا۔"

"وہ مر جانے گی... بہت آسانی سے۔" غالب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "لیکن کسی اور کی نہیں ہوگی۔ وہ رابعہ نہیں اس کی مجبوری بول رہی تھی اور اس مجبوری میں بھی یقیناً ہمارا مفاد وابستہ تھا۔ اب تو صاف سمجھا دیا ہے اس نے کہ مایوس مت ہونا۔"

"تمھیں یہ خط... میرا مطلب ہے ٹیکسی میں یہ خط پہنچا کیسے؟" میں نے کہا۔

"میں کچھ نہیں بتا سکتا۔" اکرام شیخ بولا۔ "ممکن ہے یہ خط کسی نے اسی وقت اندر ڈال دیا ہو جب میں اس خالی کوٹھی میں جھانک رہا تھا۔ یہ چوکیدار کا کام بھی ہو سکتا ہے۔ رابعہ نے جانے سے پہلے کسی طرح اُسے راضی کر لیا ہو۔ سمجھا دیا ہو کہ پھر کوئی آئے تو اسے یہ پیغام دے دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خط دوست محمد ٹیکسی میں چھوڑ گیا ہو۔ وہ پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور جب وہ اتر کر چلا گیا تھا تو میں نے سیٹ کو دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔"

میں اچھل پڑا... "یہ... یہ اسی کی حرکت ہوگی... اسی لیے وہ ایک فضول سا بہانہ کر کے ٹیکسی میں بیٹھا تھا... وہ رابعہ کا ہمدرد ہے... لیکن وہ اس سیٹھ چاند بھائی سے بھی ڈرتا ہوگا۔"

"خیر جو بھی ہے... اب تو اپنے دل سے سارے اندیشے نکال دے اور سمجھ لے کہ رابعہ صرف تیری ہے اور تیری رہے گی۔ اور یقین رکھ کہ تم دونوں کا ملاپ ضرور ہوگا۔ اس دنیا میں یا پھر اُس دنیا میں۔" محسن بولا۔

"بکواس مت کر... خود تو اسی دنیا میں عیش کر گیا ہے اور میرے لیے دوسری دنیا کی بات کرتا ہے۔" غالب نے کہا۔

"میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ول شکستہ ہجر کے مارے ہوئے قابل رحم دوستو۔" محسن نے بیک وقت مجھے اور غالب کو مخاطب کیا۔ "کہ تم لوگ اوائل محبت کو بھول جاؤ کیونکہ فرض ہمیں پکار رہا ہے۔"

"اچھا! ڈائیلاگ ہے؟" غالب نے سر ہلا کے کہا۔

"یہ ڈائیلاگ نہیں ہے... خطرے کی گھنٹی بجا رہا ہوں میں بلکہ گھنٹا بجا رہا ہوں تاکہ تم جاگو اور کمر کس لو۔" محسن بولا۔ "معلوم ہے کل جب میں دوست محمد کو تلاش کر رہا تھا تو میں نے کسے دیکھا؟"

ہم سب سیریس ہو گئے۔ جائے پر سوالیہ نشان بن گئے۔ میں نے چوہدری علاء داد اور میلاد... دونوں کو دیکھا۔" محسن بولا۔

www.paksociety.com

اور وہ بھی یوں کہ خود بال بال بچا۔ اس ٹیکسی ڈرائیور کی مدد تھی کہ گولی سے بچا لیا، ورنہ وہ تو ایک دم سامنے آ گئے تھے۔ میں ایک دم نہیں پلٹ سکتا تھا لیکن چند قدم چل کے میں واپس ہوا تو وہ کالی ہنڈا نکل گئے تھے۔ میں نے ولادر کو ایک کار میں بیٹھ کے جاتے دیکھا۔ وہ سلیٹی رنگ کی ٹویوٹا تھی۔ اس کا نمبر میں نہیں دیکھ سکا۔ حیدر واپس آیا اور اتفاق سے اس وقت راجا بھی میرے ساتھ تھا۔ چنانچہ اس نے سیٹھ اکبر کو پہچان لیا۔ حیدر اس کے ساتھ ایس پی کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ایک اور شخص بھی ان کے ساتھ تھا۔ راجا نے بتایا کہ تم نے ان دونوں کو پشاور کے کسی ہوٹل میں کھاتے پیتے ہوئے ایک ساتھ دیکھا تھا۔ سیٹھ اکبر کو اور اس کے ساتھی کو۔"

"وہ۔۔۔ وہی جمیشٹ ڈرائیور تھا جس نے مجھے گرفتار کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" میں نے کہا۔ "مگر وہ ایک جھوٹ بول کے اور میری عدم موجودگی میں کسی طرح خود کو آزاد کر کے نکل گیا تھا۔ اسی کی وجہ سے اختیار عارف مارا گیا تھا۔ خیر پھر کیا ہوا؟"

"پھر کچھ نہیں ہوا۔" محسن بولا۔ "وہ تینوں ایس پی کی گاڑی میں اس لانچ پر چلے گئے جسے تم چھوٹا موٹا مال بردار بحری جہاز بھی کہہ سکتے ہو۔۔۔ ہم منہ دیکھتے رہ گئے۔"

"کس کا؟" غالب بولا۔

"ایک دوسرے کا اور کس کا۔" محسن بولا۔

"بڑا دردناک واقعہ ہے۔" غالب نے آہ بھر کے کہا اور نازو مسکرائی۔

"راجا ابھی تک وہیں ہے۔" محسن نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اپنی ضعیفت کھیتری پہنے بیٹھا ہے۔ کمائی بھی کر رہا ہے اور ان پر نظر بھی رکھے ہوئے ہے۔"

"ڈبل شفٹ کا بھتا دینا پڑا ہوگا اسے۔" میں نے کہا۔ "مگر محسن میاں۔۔۔ یہ کوئی دانش مندی کا ثبوت نہیں دیا تم نے۔ کیا ضروری ہے کہ وہ اسی راستے سے واپس آئیں؟"

"ایک بچے کے باپ ہو گئے مگر عقل نہیں آئی۔" اکرام شیخ بولا۔

میں چونکا۔ "یار محسن۔۔۔ بچے کی بات تو میں بالکل ہی بھول گیا تھا۔ تجھے مبارکباد تک نہیں دی۔"

"اس نے کون سی مٹھائی کھلا دی ہے۔" اکرام بولا۔

"یار میں بال بچوں والا ہو گیا ہوں۔۔۔ خرچہ بڑھ گیا ہے میرا۔ مٹھائی بالکل افورڈ نہیں کر سکتا۔" محسن مظلوم صورت بنا کے بولا۔ "مٹھائی تم لوگ کھلاؤ مجھے۔"

"یار وہ ہے کیسا؟" میں نے کہا۔ "صورت کیسی ہے؟"

"ابھی تو بندر کے بچے جیسی ہے۔" محسن بولا۔ "ویسے پتا نہیں کہ کس پر گیا ہے۔"

"خدا کرے تیری صورت پر نہ جائے۔" غالب بولا۔

"جب تیرا ہوگا تو میں کہوں گا کہ تیری سیرت پر نہ جائے۔" محسن نے لڑنا شروع کیا۔ "تیری صورت پر جائے سامنے تکوں گے کر۔"

"بچو بس کرو۔" نازو نے دونوں کو ڈانٹا۔ "ذرا خیال کرو سکندر کو آرام کی ضرورت ہے۔۔۔ بہت باتیں ہو گئیں۔ اب کھانا کھاؤ اور سو جاؤ۔۔۔ ورنہ سکندر کو سونے دو۔"

"یار تو اپنی جاری بھی مجھے نہیں دے سکتا۔" غالب نے میرے کان میں کہا۔ مگر نازو کے تیور دیکھ کے پیچھے ہٹ گیا۔

نازو نے گزشتہ تین دن میری تیمارداری میں یوں گزارے تھے کہ میں نے اسے جب بھی دیکھا جاگتے دیکھا۔ اس نے کوآرڈر اور دواؤں سے اسپیشل سوپ تک سب خود پلایا اور میری جینے کی خواہش سے زیادہ اس کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ تین دن بعد میں پھر فٹ ہو گیا۔

"میں تو اب جاتا ہوں راجا کی خبر لینے۔" اکرام شیخ بولا۔ "سکندر کی بات نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ دوسری طرف سے بھی نکل سکتے ہیں۔"

"دوسری طرف یعنی سمندر کی طرف سے؟"

"ہاں۔۔۔ لانچ سے اتر کے کسی کشتی میں بیٹھیں اور پھر دور جا کے اتر جائیں۔" اکرام شیخ بولا۔ "ہمیں کیا معلوم انھیں شک ہو گیا ہو۔ چوہدری ولادر بہت کائیاں آدمی ہے اور راجا کا اب تک نہ آنا بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ وہ اتنی دیر کیا کریں گے ایک جگہ پہ ٹھہر کے۔۔۔ میں لوں گا کہیں کھانا۔ ابھی مجھے بھوک بھی نہیں ہے۔"

وہ چلا گیا تو ہم نے کھانا کھایا اور اس دوران میں محسن باتیں کرتا رہا۔ ایک بچے کے بارے میں جو اس کا بچا تھا، یا ٹیڈی اور جولی کے بارے میں جو ڈاکٹر لطیف کے گھر میں یقیناً محفوظ تھی لیکن اس کی زندگی کے المیے نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا وہ لڑکی زندگی میں کبھی خوشی نہیں دیکھے گی۔ آخر ایسا کون سا گناہ کیا ہے اس نے کہ قسمت نے اسے صرف دکھ دیے ہیں اب تک۔ ٹیڈی کا تو معاملہ ہی الگ تھا۔ اس کی یاد سے دور کے ان گنت نشتر روح میں پیوست ہو جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی موت کی خبر بھی غلط ہے اور وہ ابھی تک زندہ ہے۔ اس اعتبار سے وہ واقعی زندہ تھا کہ وہ شہید تھا اور شہید کبھی مرتے نہیں۔

نازو نے مجھے زبردستی سلا دیا۔ وہ اکیلی عورت اس گھر

کی منتظم تھی۔ قطع نظر اس کے کہ اس کا گھر میں رہنے والے چار افراد سے کیا رشتہ تھا اور اس رشتے کی جذباتی نوعیت کیا ہے۔ وہ اکرام کی سگی بہن تھی تو غالب کے لیے غزل اور حسن غزل بھی۔ وہ بیک وقت بہن، ماں اور بیوی کی طرح مہربان تھی۔۔۔ اور مجھ پر وہ دیکھ بھال اور تیمارداری اسی طرح کر رہی تھی۔ حالانکہ نہ میں اس کا بھائی تھا نہ شوہر اور نہ بیٹا۔۔۔ مگر جذبات کے رشتوں کی یک جہتی اور اعتماد کے خلوص کے اعتبار سے وہ محسن کی بھی سب کچھ تھی۔ اور دنیا والوں کے نقطۂ نظر سے کسی کی کچھ نہیں لگتی تھی۔ مگر ایک گھر میں اس نے سب کو اپنا اپنا مقام دے دیا تھا اور اسی کے اعتبار سے سب کے لیے وہ سب کچھ کر رہی تھی جو صرف ایک عورت کر سکتی تھی۔ جب وہ مردانہ لباس میں مردوں کی طرح پھر رہی تھی تو ان امور قلندری کے بارے میں سوچتی بھی نہ تھی جن کے بارے میں اب وہ ہر وقت فکرمند رہتی تھی۔ اس کی انتظامی حاکمیت کو سب بلا چون و چرا قبول کرتے تھے کیونکہ اسی سے یہ گھر بھی گھر تھا۔

معلوم نہیں کس وقت میری آنکھ کھلی تو میں نے غالب اور محسن کو نوٹوں کی گڈیاں بنانے میں مصروف دیکھا۔ وہ ایک جیسے نوٹوں کو الگ کر کے شمار کرتے جا رہے تھے اور سو سو نوٹوں کی شکل میں گن کر رکھ رہے تھے۔ نازو ایک کاپی پنسل لیے بیٹھی ہوئی تھی۔۔۔ اور پنسل کو مسواک کی طرح چبا رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے جھک کر ایک گڈی اٹھائی اور دوسرے ڈھیر میں شامل کر دی۔ "ہوش میں نہیں ہو کیا؟"

غالب نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا اور دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "نہیں۔۔۔ اور میں ہوش میں آنا بھی نہیں چاہتا۔۔۔ جب تک تم سامنے ہو۔"

دوسرے لمحے وہی ہوا جو پہلے بھی ہوتا تھا۔ غالب حد سے بڑھ گیا تھا۔ نازو کو بھی یاد آ گیا کہ ایسی علامات ظاہر ہونے لگیں تو علاج کیا ہوتا ہے۔ اس نے غالب کو ایک جھٹکے سے کلائی پکڑ کے کھینچا اور اچھال دیا۔ غالب نے ایک قلابازی کھائی اور دھپ سے زمین پہ گرا۔

"اب آ گیا ہوش میں؟" نازو نے کہا اور محسن ہنستا رہا۔

"نہیں۔۔۔" غالب نے پھر ان ہی نظروں سے دیکھا۔ "کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے۔۔۔ ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے۔ نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی۔۔۔ تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی۔"

میں خاموشی سے دیکھتا رہا کہ نازو اب کیا کرتی ہے۔

"اور سنو گی؟ یا پہلے داد سخن دو گی؟" غالب نے کہا۔

"بڑا مشکل شعر ہے۔ مگر فکر نہ کرو تو غلط وارد ہی کہو ہم۔۔۔ کیوں ہم جدید خوبی تیغ ادا نہ تھے۔ تم کس کی ہو خاموشی سے؟ میں تو انتظار میں ہوں۔"

یکلخت نازو کو احساس ہوا کہ میں اور محسن اسے دیکھ رہے ہیں اور غالب نے سرعام اس کے عشق کا اعلان کر دیا ہے۔ اسے چیلنج کر دیا ہے کہ اب وہ کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ اس کو سب منظور ہے۔ وہ ایک دم اٹھی۔

"ڈھیٹ ہو گئے ہو تم تو۔" اس نے کاپی پنسل پھینک کے کہا اور دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔ محسن کے ساتھ میں بھی قہقہہ مار کے ہنسا اور غالب اطمینان سے اٹھ کے پھر وہیں آ بیٹھا۔

"الو کی بیٹی۔۔۔ سمجھتی تھی کہ ہم بے زبان ہیں۔" غالب نے کہا۔ "کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔"

"گالی مت دو۔۔۔ ورنہ بہت ماروں گی آ کے۔" نازو نے دوسرے کمرے سے چلا کے کہا۔

"ہم تو پہلے ہی مر چکے ہیں جانِ جاناں۔۔۔ اور کیا مارو گی۔" غالب نے خالص فلمی انداز میں جواب دیا۔ "دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔"

"چپ یار۔" محسن نے اسے ڈانٹا۔ "یہ کیا بدتمیزی پہ اتر آیا ہے۔"

"اسے کچھ نہیں کہتے۔ کتنی تیز طراری کا مظاہرہ کرتی ہے۔" غالب نے کہا۔ "میں تو اب یہی کروں گا۔۔۔ اس کے بھائی کے سامنے۔۔۔"

"چل چل۔۔۔ نوٹ گن۔۔۔ مجنوں کی اولاد۔" محسن نے کہا۔

"یہ نوٹ کیوں گنے جا رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ایک لانچ کا سودا ہو گیا ہے۔ ادائیگی کرنی ہے شام تک۔" محسن نے کہا۔

"اکرام نہیں آیا ابھی تک؟"

"میاں تم سوئے تھے لمبی تان کے۔۔۔ اور خاصے غیر شریفانہ خواب بھی دیکھ رہے تھے غالباً۔" محسن بولا۔ "تمھیں کیا پتا کہ یہاں کیا ہو گیا؟"

میں اٹھ بیٹھا۔ "کیا ہو گیا؟"

"راجا نے ایک بہت سنسنی خیز انکشاف کیا ہے۔" محسن بولا۔ "وہ رات پھر وہیں بیٹھا رہا تھا۔۔۔ رات دو بجے تمھارا آفیشل رقیب روسیاہ آیا۔"

"جو تم سے زیادہ ہینڈسم ہیرو ہے۔" غالب نے لقمہ دیا۔

اور وہ بھی لانچ پر چلا گیا۔ پھر وہ اور حیدر صبح چار بجے

www.paksociety.com

چالیس ہو گئے اور ایک ساتھ چلے گئے۔ اکرام سے پتا لگا لیا ہے کہ 'ایس ایس کرانتی تھرٹی' پر کل سامان لادا جائے گا۔" محسن بولا۔

"کیا سامان لادا جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"یہی چائے پتی اور چاکلیٹ، بسکٹ اور مٹھائی، رس گلے وغیرہ۔" محسن نے کہا۔

مجھے اپنے سوال کے بے تکے پن کا احساس ہوا۔ "یہ اطلاع مستند ترین ہے؟"

"نہیں... محض ایک افواہ ہے جو شہر میں پھیل گئی ہے۔" محسن نے ہنستے کہا۔ "کیا ضروری ہے کہ سب احمقانہ سوالات آپ ہی کریں؟"

"چل تو بھی کر لے ایک سوال۔" میں نے جھینپ کر کہا۔

"جواب دینا پڑے گا۔" محسن نے کہا۔ "ہاں یا نہیں میں۔"

"یہ غلط بات ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔ "یہی بات عدالت کے کسی فاضل جج نے ایک گواہ سے کہی تھی کہ سوال کا جواب ہاں یا نہیں میں دو تو گواہ نے کہا تھا کہ جناب والا کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں اور جج صاحب سے صرف ایک سوال کیا تھا۔ کیا آپ کی بیوی اب بھی آپ کو جھاڑو سے مارتی ہے؟"

محسن ہنسنے لگا۔ "ایسا سوال نہیں ہوگا جس سے تیری عزت پر حرف آئے۔ سوال یہ ہے مسٹر کے ٹو کہ آپ رابعہ کے بیلے یہاں بیٹھے دن آہیں بھرتے اور راتیں تارے گنتے گزاریں گے یا ہمارے ساتھ چلیں گے؟"

"ہمیں امید تھی برخوردار کہ تمہارا سوال احمقانہ ہی ہوگا۔" میں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ "آہیں بھرنے اور تارے گننے کا پارٹ ٹائم جاب تو تمہارے ساتھ رہ کے بھی کیا جا سکتا ہے... جیسے سرکاری افسر اپنے سب ہی کام سرکاری اوقات میں کرتے ہیں۔ مگر آپ لوگ... میرا مطلب ہے ہم لوگ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

"بھاڑ جھونکنے۔" محسن نے کہا۔ "جھک مارنے۔"

"حسب معمول۔" غالب نے سر ہلا کے تائید کی۔ "یہ کتنے ہو گئے بھائی... اے میاں اکاؤنٹنٹ افسر صاحب۔" اس نے ہانک لگائی۔

نازو پھر نمودار ہوئی اور کاپی پنسل لے کر بیٹھ گئی۔ "دو لاکھ چالیس ہزار ہو گئے تھے۔"

"کوئی غلط ہے... پھر حساب کرو۔" غالب نے کہا۔

"تم بھی نوٹ پھر گنو۔" نازو نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا۔

"چلو تم دونوں ڈس مس... اُدھر جا کے لڑو... یا دوگانے گاؤ۔" محسن بولا۔ "تو اُٹھ بھائی عاشق... یہ پانچ دس اور سو کے نوٹوں کے الگ الگ ڈھیر ہیں۔"

میں ان کے پاس جا بیٹھا۔ "کل کتنی رقم چاہیے؟"

"سوا لاکھ۔" محسن بولا۔ "یار تو بڑا خوش قسمت ہے کہ تجھے رقیب بھی ایسا شاندار ملا۔ لانچ اسی کا تحفہ ہے۔"

"سوا لاکھ میں تحفہ خریدے ہو؟" میں نے کہا۔

"اصلی قیمت تو دگنی ہوگی... مگر اس کا پیغام تھا کہ رابعہ کے کہنے پر اس نے ایک لانچ کا بندوبست کیا ہے۔ میں پھر دہرا رہا ہوں۔ رابعہ کے کہنے پر۔"

"ہم وہ لانچ نہیں لیں گے۔" میں نے گرم ہو کے کہا۔

"ہم وہ لانچ لے چکے ہیں۔" محسن بولا۔

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ... کہ وہ خود ایک شکاری ہے!" میں نے برہمی سے کہا۔

"جس نے رابعہ کو شکار کر لیا ہے۔" غالب بولا۔

"خواہ مخواہ رابعہ کو بیچ میں مت لاؤ۔" میں نے کہا۔ "وہ پیٹر، رعا اور اکبر سیٹھ کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ اس لانچ پر... کیا نام ہے اس کا؟"

"ایس ایس کرانتی تھرٹی۔" غالب نے کہا۔

"ہاں... اسی لیے ہم نے سودا کیا ہے۔" وہ بولا۔ "شکاری سمجھتا ہے کہ ہم اس کے جال میں پھنس چکے ہیں۔ یہ بیڑہ غرق ہو تو اس کا۔"

"اور ہم کیا ساتھ نہیں ڈوبیں گے؟" میں نے کہا۔

"نہیں رابعہ کی سیکرٹ سروس کے ذریعے دوسرا پیغام ملا ہے کہ لانچ کے کریو کیبن میں دونوں جانب سیٹوں کے نیچے ٹائم بم ہیں جو تختہ اکھاڑنے سے نظر آئیں گے۔"

"یار یہ رابعہ کیا کر رہی ہے۔" غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔

"اچھا ہی کر رہی ہے ہمارے لیے۔" محسن بولا۔

"خود اپنے حق میں وہ بہت برا کر رہی ہے۔ یہ ڈبل گیم وہ جاری نہیں رکھ سکتی۔" غالب نے کہا۔ "کہ چاہے کے ٹو اور چاہت کا اظہار کرے، ڈونٹ اپوسٹ ہے... سوچو ذرا وہ کس کو بے وقوف بنا رہی ہے۔"

"یہ کیا تم لوگوں نے میرا نام لگا رکھا ہے؟" میں نے جھلا کے کہا۔

"سیکرٹ سروس والوں کے اور ہم جیسے گروہوں میں اس قسم کے نام بہت چلتے ہیں... ایکس ٹو... ایم نائن... یہ نام تو خود میں نے پڑھے ہیں۔ کے ٹو آپ کے اصل نام کا مخفف ہے اور آئندہ ہم تمہیں اسی نام سے پکاریں گے۔ تم ہماری زبان کیسے پکڑو گے۔" محسن نے کہا۔ "اے بھائی... سوچ لیا؟"

"تین لاکھ دس ہزار..." نازو نے چونک کے کہا۔ وہ خاصی اُلجھ رہی تھی۔ "اب کتنا رہ گیا ہے۔ میرے دماغ میں تو اعداد و شمار بکھر گئے ہیں۔"

"اچھا ہے۔ جو ہے سو بہتر ہیں۔" غالب بولا۔ "ایک شعر...

سن کے دیکھو ذرا۔" نازو نے کاپی پنسل رکھ دی۔ "پہلے وہ جگہ بتا دو جہاں تم اترنا پسند کرو گے۔"

"یار کیا مصیبت ہے۔" غالب بڑبڑایا۔ "اب کیا شاعری بھی شجر ممنوعہ ہو گئی ہے۔" اس کی بات بہت ذو معنی تھی مگر نازو نہیں سمجھی۔

یہ بریف کیس سے ملنے والی رقم تھی جو دشمنوں نے بھی ملک کے غداروں سے حاصل کی تھی چنانچہ اس کا انہی کے خلاف بہترین استعمال کیا جا سکتا تھا۔ نصف رقم الگ کر لینے کے بعد باقی رقم کو پھر سوٹ کیس میں ڈال دیا گیا۔ اس کے اوپر کچھ دینے کا فیصلہ موخر کر دیا گیا۔ رقم کسی شپنگ ایجنٹ کے ذریعے ادا کی جانی تھی جس نے تمام ضروری دستاویزات کے ساتھ لانچ کو ہماری جائز ملکیت بنانے کے لیے چند گھنٹے کی مہلت طلب کی تھی اور اس کام کے پانچ ہزار مانگے تھے۔ بصورت دیگر ہم خود یہ کام کرتے تو اس میں ایک مہینہ بھی لگ سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بنا بنایا کام بگڑ جائے۔ پانچ ہزار میں سامنے آئے بغیر یہ کام کرا لینا بہتر تھا۔

غالب کا سوال ابھی تک میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ کیا واقعی رابعہ جو محض ایک خوب صورت عورت ہے ایک مکار اور عیار، چالاک اور پُرفریب نفسیاتی مریض اور خطرناک قسم کے بین الاقوامی مجرم کے ساتھ ڈبل کراس کر سکتی ہے؟ وہ خود وکیل ہے اور اس کی ذہانت میں بھی شبہ نہیں مگر جس آدمی کا دین ایمان، اصول اور ضمیر کچھ نہ ہو اس کے ساتھ یہ کھیل کھیلنا جان جوکھوں کا کام ہے... خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اس نے یہ ڈراما کیا ہو تاکہ وہ سکندر کا ساتھ دیتے دیتے تنگ آ گئی ہے اور یہ سختیاں جھیلنے کا حوصلہ نہیں رکھتی چنانچہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ کے چاند بھائی سے شادی کر لے گی... وہ یقیناً چاند بھائی کو اپنے حسن اور ذہانت سے ہپناٹائز بھی کر سکتی ہے اور جس شخص نے عورت کو ہمیشہ غلام زادی یا دل بہلانے کا کھلونا سمجھا اسے آمادہ بھی کر سکتی ہے کہ وہ اس کے اشارۂ ابرو پر چلنے لگے۔ وہ ہمیں مہلت فراہم کرنے کے لیے سوچنے کی مہلت بھی لے سکتی ہے۔

لیکن دوسری طرف وہ ہم سے رابطہ رکھ کے اور ہمیں چاند بھائی کے خفیہ منصوبوں سے آگاہ کر کے کتنا بڑا خطرہ مول لے رہی ہے... کیا یہ بات وہ سمجھتی ہے اور اس کے نتائج کی سنگینی کا اندازہ کر سکتی ہے؟ اس نے ایک پیغام مجھے بھجوا دیا تھا کہ غم نہ کرنا... میں کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ کافی نہ تھا کہ اس نے دوسرا پیغام بھجوا دیا۔ پیغام رساں کتنا بھی معتبر کیوں نہ ہو چاند بھائی جیسے شخص کی نظر سے گھر کا بھیدی کیسے چھپا رہ سکتا ہے۔ اور جس دن اسے معلوم ہوا کہ وہ عورت جس کی خاطر وہ بہت کچھ کرنے کو تیار تھا اسی کو بے وقوف بنا رہی تھی تو اس کا ردعمل دیوانگی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ پھر اس کے ماضی کا زہر ہے کچھ اپنی انا کی تسکین کے لیے عزت، دولت، طاقت حاصل کر لینے کا غرور... اور پھر اپنی شخصی دلکشی سے ہر عورت کو قابل تسخیر سمجھنے کا یقین جو اس انکشاف کے ساتھ ہی شکست سے دوچار ہوگا کہ شاید سب عورتیں ایسے ہی اسے بے وقوف بناتی رہی ہیں۔ اس کی انا پر یہ ضرب کاری لگانے کی رابعہ کو بہت سخت سزا ملے گی۔

چاند بھائی نے مجھے اعتماد میں لینے سے پہلے تھوڑا سا سچ بولا تھا جو اپنے وجود میں آنے کی گھناؤنی داستان اور ایک نفرت بھرے ماحول میں پرورش پانے کے انتقامی ردعمل کے طور پر انگریز قوم کو 'خراب' کرنے والی بات بھی سچ تھی مگر اس کے بعد دلاور سے دشمنی کی کہانی بے بنیاد تھی۔ ظاہر ہے، وہ سچ سے آغاز نہ کرتا تو مجھے جھوٹ پر بھی یقین کیسے دلاتا۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا جو اس نے اکثر پہلے بھی آزمایا ہوگا۔ رابعہ نے ثابت کر دیا کہ وہ کتنی ذہین ہے۔ اس نے سچ اور جھوٹ کو الگ الگ کر کے دیکھ لیا اور پھر خود بڑی ہوشیاری سے ایک جھوٹ بولا۔ اس طرح کہ وہ یقین کر سکے۔ اس نے ایک عورت کی حیثیت سے اس کی کمزوری کو اپنی ضرورت بنا لیا اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہی۔

لیکن اب وہ جو کچھ کر رہی تھی وہ بارود خانے میں بیٹھ کر آگ سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ مجھے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ اس سے رابطے کی صورت نہ ہونے کے باعث یہ بات میں اسے سمجھا نہیں سکتا۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ آئندہ کوئی پیغام نہ بھیجے۔ ہم سے رابطے کی کوشش بھی نہ کرے۔ بس چپ چاپ یہ ظاہر کرے کہ وہ مجھے بھول جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میرا نام بھی اس کی زبان پر نہیں آنا چاہیے۔

میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ شک کے ایک زہریلے سانپ نے پھن اٹھایا اور مجھے ڈس لیا۔ اگر یہ میرا مفروضہ ہو کہ رابعہ نے مجھے سچ مچ چھوڑ دیا اور اسے اپنا لیا تو؟ آخر وہ گوشت پوست کے اعصاب رکھنے والی عورت ہی تو ہے۔ اس کے

www.paksociety.com

اعصاب جواب بھی دے سکتے ہیں۔ خصوصاً ایسے حالات میں صرف الزام سے ذاتی قبول کرکے وہ سب کچھ پا سکتی ہو، زندگی کی ہر راحت، ہر نعمت، ہر آسائش اور مصائب و آلام کی اس آزمائش بھری زندگی کا آسیب اس کا پیچھا بھی چھوڑ سکتا ہو۔ کوئی انسان فرشتہ نہیں ہو سکتا کہ سو فیصد "فول پروف" ہونے کا دعویٰ رکھے اور "مزاحمت پروف" ہو کہ اس کے خیالات اور جذبات میں تغیر کی ایک فیصد گنجائش بھی بعید از امکان ہو۔ اس ایک فیصد کا امکان ہی میرے دل کی خلش بڑھانے کے لیے کافی تھا لیکن اس خلش کا درماں میرے بس میں نہ تھا۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ پُرامید رہنے کی کوشش کروں اور اپنے مشن کی تکمیل میں دل و جان کی بازی لگا دوں۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کامیابی کی صورت میں واپسی پر مجھے انعام میں کیا ملے گی یا زندگی کی آخری ساعت تک محرومی کی سزا۔

اکرام شیخ شام کو ذرا سی دیر کے لیے آیا اور رقم لے کر چلا گیا۔ جانے کسی سوال کا جواب اس نے نہیں دیا۔ وہ خاصا پریشان لگتا تھا لیکن کسی کو اس پریشانی کے بارے میں بتانے کے لیے تیار نہ تھا۔ لانچ کے بارے میں ہم نے جتنے سوالات کیے ان کا مختصر جواب یہی ہو سکتا تھا کہ خود دیکھ لینا! اس نے صرف ایک کام کی بات کہی کہ اب ایس ایس کراچی تھرو، شاید دو دن بعد جائے گی۔ اس پر لادا جانے والا مال ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔

غالب اور محسن اپنی پلاننگ مکمل کر چکے تھے۔ ہم سب کو ماہی گیروں کی حیثیت سے سفر کرنا تھا۔ ہم چار مرد اور ایک عورت نازو اور پلان آف ایکشن تقریباً "فکس آف تھیوری" والا... ہم ماہی گیروں کی ایک فیملی ہوں گے جو اسی لانچ پر رہتی ہے اور جس کا گھر خشکی پر نہیں سطح آب پہ ہے۔ راجا اس سلسلے میں ضروری سامان کا بندوبست کر رہا تھا۔ جانے ملبوسات سے ماہی گیری میں کام آنے والے تمام اسباب تک ہر چیز کی فراہمی اس کے ذمے تھی اور اسے بطور خاص تاکید کر دی گئی تھی کہ وہ کوئی چیز بالکل نئی نہ لائے جس سے شبہ پیدا ہو کہ ہم نقلی ماہی گیر ہیں، اصلی نہیں۔

جو اسلحہ میں اپنے ساتھ لایا تھا اس میں چار دستی بم تھے اور "ڈو ڈائنا مائیٹ"... ایک اسٹین گن تھی اور سائلنسر والا ایک ریوالور... یہ سب تخریب کاروں کے کیمپ سے حاصل ہونے والے اسلحے کے ساتھ ایک سوٹ کیس میں بند پڑا ہوا تھا لیکن اسے ہرگز اپنے ساتھ نہیں لے جایا جا سکتا تھا کہ کہیں بھی چیکنگ ہو تو ہم پکڑے جائیں۔ اس مسئلے کا حل ابھی تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"کیا یہ کرنسی ساتھ لے جانی ضروری ہے؟" غالب نے کہا۔

"ہاں... اوّل تو پیسے ہی علاقے میں راستے کی ہر رکاوٹ کو صرف ہاتھ کا میل دُور کرے گا۔" میں نے کہا۔ "پھر ... مجھ تک تو خارت اسے پہنچ سکے گا... جیکب میں ڈالر یا ہیرے لینے کے لیے یہ نوٹ بھی نہ ہوئے تو کام کیسے چلے گا۔"

"کیا کسی کو معلوم ہے کہ ایس ایس کراچی تھرو کی منزل کیا ہے؟" محسن نے کہا۔

"مجھے تو نہیں معلوم۔" اکرام شیخ نے سر کھجا کے کہا۔ "مال بردار جہاز کبھی کولمبو یا کلکتے جا سکتا ہے۔"

"ثابت کرو۔" محسن بولا اور نوٹ واپس رکھنے لگا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" غالب نے کہا۔ "کامن سینس کی بات ہے یہ تو... تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں تک یہ اسلحہ لے جانے کے لیے بھارت کا راستہ ہی اختیار کیا جا سکتا ہے۔"

"یہ کامن نان سینس ہے۔" محسن نے کہا اور مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ "تمھیں معلوم ہے؟"

"مجھے... مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"گویا تم سب اپنے جاہل ہونے کا اقرار کرتے ہو؟" وہ بولا اور افسوس سے سر ہلانے لگا۔ "میں اکیلا عاقل و بالغ..."

"تم ابوجہل ہو گئے ہو۔" غالب نے جھنجلا کے کہا۔ "کیونکہ وہ جو تمھاری اولاد ہے نا... وہ ابھی بالکل جاہل اور ان پڑھ ہے۔ بالغ تم کبھی نہیں ہو گے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ وہ جہاز کہاں جائے گا۔" محسن نے دانت نکال کے کہا۔ "وہ جہاز چٹاگانگ تک جائے گا... لیکن میں کیوں بتاؤں تم لوگوں کو؟"

"مت بتاؤ..." میں نے کہا۔ "اس لیے کہ ہم صرف تمھاری معلومات کو غلط کرنے کے لیے جہاز کو چٹاگانگ نہیں جانے دیں گے خواہ اسے تھانے سے جانا پڑے۔"

"تھانہ ایک جگہ ہے بھارت میں... مگر بندرگاہ نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہم بندرگاہ بھی بنا دیں گے اسے۔" غالب نے کہا۔

"ہاں... جہاں اتنے بندر اکٹھے ہوں گے وہی جگہ بندرگاہ تو بن ہی جائے گی۔" محسن بولا۔

اکرام شیخ اور راجا ایک ساتھ آئے۔ پہلے میں نے ٹیکسی کے دروازے بند ہونے کی آواز سنی، پھر وہ دونوں کسی بات پہ ہنسے اور میں نے دروازہ کھول کے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی نظر پہ دھوکے کا گمان ہوا۔ پھر میرا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ ان کے درمیان ایک عورت سر جھکائے آ رہی تھی۔

کم روشنی ہونے کے باوجود میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ عورت موہنی ہے۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ اندر آ چکی تھی۔ غالب اور محسن نے اسے پہلی بار دیکھا تھا لیکن وہ میری نظر کو دیکھ رہے تھے اور شاید اندازہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ پاکستانی بچوں میں سو فیصد مسلمان نظر آنے والی یہ خوب صورت لڑکی کون ہو سکتی ہے۔

موہنی کے ساتھ اکرام شیخ اور محسن بھی مجرمانہ خاموشی کے ساتھ کھڑے رہے۔ انھیں بھی میرے جذبات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ پھر اندر سے نازو نے جھانک کر دیکھا کہ یہ غیر معمولی سکوت کس طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ ہم خاموش بیٹھنے والے لوگ نہیں تھے۔

"تم...؟" میں نے بمشکل تمام اپنے جذبات پر قابو پا کے کہا۔ "تم زندہ ہو؟"

"تم نے تو چاہا تھا کہ میں مر جاؤں۔" موہنی نے آہستہ سے کہا۔

"بکواس بند کرو... زندگی اور موت میرے خدا اور تمھارے بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "مگر یہاں کیوں آئی ہو تم؟" پھر میں اکرام شیخ اور محسن پر برس پڑا۔ "مجھ سے پوچھے بغیر... مشورہ کیے بغیر... اس عورت کو یہاں لا کے تم نے..."

"آہستہ بولو یار۔" محسن نے مجھے کندھے پر تھپکی دی۔

"غصے ہونے سے کیا ہو گا... بیٹھ کے بات کر لیتے ہیں۔" غالب نے بھی اس کی تائید کی۔ "اب آ تو گئی ہے... اور زندہ بھی ہے۔"

"زندہ ہے تو مار دو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ ہم سب مارے جائیں گے... سب بتا چکا ہوں میں تم لوگوں کو کہ یہ عورت نہیں..." میں ایک دم رک گیا۔ میں اسے طوائف کہنا چاہتا تھا مگر یہ گالی بے محل تھی اور نازو کی موجودگی میں ضروری تھا کہ میں تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑوں۔

"یہ دشمن کی ایجنٹ تھی... ہے۔" میں نے اپنے غصے کو ایک گہری سانس کے ساتھ خارج کر دیا۔ "کیا تم نہیں جانتے؟"

"میں جانتا ہوں کہ یہ تمھارے بچپن کی سہیلی یا وہ ہے۔" محسن یکلخت اس کی طرفداری پر اتر آیا۔ "اس کا اعتراف تم بھی کرتے ہو... یہ پہلے کیا تھی اور اب کیا ہے... اس کا فیصلہ عقل سے بھی کیا جا سکتا ہے اور وقت خود بھی بتا دے گا... مگر تم خود بھی یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ جو کچھ تم نے بتایا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ تم بیک وقت اعتماد بھی کرتے تھے اور دل میں شک بھی رکھتے تھے۔"

"ہاں... اور یہی شک ساری خرابی کی بنیاد ہے۔" میں نے کہا۔

"تو ہم نے غلطی کی اسے یہاں لا کے؟" اکرام شیخ نے افسوس کے ساتھ کہا۔

"اور کیا نیکی کی ہے؟" میں نے کہا۔ "تم تو کچھ اور کرنے گئے تھے... اسے کہاں سے لے آئے... یہ نہیں مان سکتا کہ یہ راہ چلتے مل گئی اور تمھارے ساتھ ہو لی... تم میں سے کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔"

"سکندر بادشاہ... ایک عورت سے اتنا ڈرتے ہو تم... یہ تو ہمیں معلوم نہیں تھا۔" راجا بولا۔

"تمھیں ابھی کچھ نہیں معلوم... نہ عورت کے بارے میں نہ اس عورت کے بارے میں... نہ میرے بارے میں کہ میں ڈرتا ہوں تو کیوں اور نہیں ڈرتا تو کیوں۔" میرا پارہ پھر چڑھ گیا۔

"اچھا تو پھر نکالو اپنا وہی سائلنسر والا ریوالور۔" راجا نے سنجیدہ ہنستے ہوئے کہا۔ "اور ڈرتے نہیں ہو تو اس عورت کو گولی مار دو... ہم میں سے کسی کو افسوس نہیں ہو گا۔"

"بلکہ اس طرح ہماری غلطی کا کفارہ ادا ہو جائے گا۔" اکرام نے کہا۔ "جو ہم سے نادانستگی میں ہو گئی۔"

"نہیں... تم یہ نہیں کہہ سکتے، تم سب جانتے تھے۔"

"ہم وہ جانتے تھے جو تم نے ہمیں بتایا تھا۔" اکرام شیخ نے برہمی سے کہا۔ "اور کم سے کم میرے نزدیک وہ بہت کافی تھا یہ یقین دلانے کے لیے کہ... جس عورت نے اتنی قربانی دی، اتنی مشکل زندگی گزاری اور اتنا لمبا سفر طے کیا... اور جس حد تک تمھارا ساتھ دیا، وہ تمھاری اور ہماری دشمن ہو سکتی ہے۔ میری عقل ناقص ہو گی۔ مگر میں تم سے اختلاف کرتا ہوں سکندر۔"

اکرام شیخ کی بات نے گویا سب کو زبان دے دی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان سب کے خیالات میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ وہ سب یہ سمجھتے تھے کہ میں زیادتی کر رہا ہوں اور عدم اعتماد میں حد سے بڑھ چکا ہوں۔ غالب اور محسن بھی ہم نوا تھے۔ یہاں تک کہ نازو بھی غیر جانبدار نہیں رہی تھی۔ ریوالور جو محسن نے میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا میری کمزوری بن گیا... ایک طرف میں تھا۔ میرے مقابل موہنی نقش دیوار بنی کھڑی تھی... جیسے عدالت کے کٹہرے میں مجرم کھڑا ہو، کہ جیسے جیوری کے ارکان میرے اپنے ساتھی تھے جو اسے بے قصور قرار دے چکے تھے لیکن موہنی پھر بھی سہمی ہوئی، افسردہ اور دل شکستہ مظلوم اور احساس جرم سے مغلوب کھڑی ہوئی تھی... پھر خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں موہنی کا حوصلہ جواب دے گیا۔

"کیا ہو گیا اب تمھیں؟" وہ چلائی۔ "چلاؤ گولی مجھ پہ۔ مار دو"

www.paksociety.com

مجھے... انکار کر دو مجھے پہچاننے سے... کہہ دو تم میں کوئی احساس نہیں باقی، تم اس کے باپ کا اور نہ اس عورت کے ہندو خاندان کی قربانی کا۔ مجھے بدکردار اور بدچلن کہو۔ آبرو باختہ کہو، مگر خدا کے لیے دشمن کی ایجنٹ مت کہو۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی اگر تم مجھے قتل کر کے گاڑ دو۔ کون ہے میرا والی وارث جو تم سے پوچھے گا۔ آج تک تو کوئی آیا نہیں... ایک بھائی کا رشتہ تھا۔ اسے خود تم نے بعد میں ختم کیا۔ تم سے پہلے میں ختم کر چکی تھی۔" اس نے زاروقطار رونا شروع کیا۔

نازو ایک دم آگے بڑھی۔ "مت رو موہنی... کوئی کچھ نہیں کہے گا تمہیں۔" اس نے موہنی کے سر کو اپنے سینے سے لگالیا۔

"میں... میں موہنی بھی نہیں رہی اب۔" وہ روتے روتے بولی۔ "میں نے تمہارا نام تو سب بدل لیا ہے... اب میں رضیہ سلطانہ ہوں... میں نے کلمہ پڑھا ہے ملتان میں ایک مولوی صاحب کے ہاتھ پر۔ وہ ایک مسجد کے امام ہیں۔ تمہیں یقین نہ ہو تو معلوم کر لو... میں نے ان کو کچھ نہیں بتایا... سوائے اس کے... کہ میں پہلے ہندو تھی اور اب اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں... اپنی مرضی سے... کسی کے لیے نہیں... صرف اپنے لیے... کوئی گواہ نہیں میرا سوائے ان کے اور چند نمازیوں کے۔ جن کو میں نہیں جانتی... مگر وہ... میں بتا سکتی ہوں، وہ مسجد کہاں ہے۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" نازو نے کہا۔ "تم آؤ میرے ساتھ... ہاتھ منہ دھو لو... پھر بات کریں گے ہم سب آرام سے بیٹھ کے... کھانا کھا کے..." وہ اسے کسی بچی کی طرح دوسرے کمرے میں لے گئی، جو گھر سے نکل گئی ہو اور پھر لوٹ کے ماں کے پاس آگئی ہو۔ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ دنیا نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا اور کیوں کیا تھا۔ اسے واپس آنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ سب سوالات ابھی نہیں کیے جا سکتے تھے۔

آہستہ آہستہ ہم سب بیٹھ گئے۔ محسن اور غالب چپ تھے، مگر شرمندہ نہیں تھے۔ اکرام شیخ شرمندہ نظر آتا تھا لیکن راجا کے لبوں کی بے نام سی مسکراہٹ میری بے بسی کا مذاق اڑاتی محسوس ہوتی تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں پریشان بھی تھا، شرمندہ بھی، مشتعل بھی اور مطمئن بھی... مطمئن اس احساس سے کہ باقی سب نے موہنی کو وہ نہیں سمجھا تھا جو میں سمجھتا تھا۔ شاید قصور میری ہی سوچ کا تھا۔ وہ سب تو غلط نہیں ہو سکتے تھے۔

"چلو اب... جو ہونا تھا ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "اب آؤ تو بتاؤ کہ یہ بلا نازل کیسے ہو گئی۔"

"ہمیں تو خود بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔" اکرام شیخ بولا۔ "میں نے لاہور فون کیا تھا... تمہارے دوست منظر کو... اس کو یہ تو معلوم تھا کہ شاید دو چار دن بعد ہم کو کہیں جانا پڑے۔ غالب اور محسن کے پہنچ جانے کی اطلاع دی تھی۔ شہلا کی اور احسن کے بچے کی خیریت معلوم کرنی تھی۔ مجھے ایک جگہ سے فون کرنے کا موقع مل گیا تھا۔"

"کہاں سے فون کیا تھا؟"

"اسی ٹریولنگ ایجنٹ کے آفس سے جس کے ذریعے ٹکٹ کا سودا ہوا ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ "وہ مجھے کچھ دیر کے لیے آفس میں اکیلا چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ میں نے لاہور فون گھما دیا۔ سننے والا کوئی نہیں تھا اس لیے اطمینان سے بات ہوئی۔"

"میرے کمال بچے مجھے دعا کہتے ہیں نا؟" محسن بولا۔

"ہاں... بیوی نے کہا ہے کہ دو دونوں تمہارا خیال رکھیں پھر۔ بچہ خیر سے بالغ ہو گیا ہے اور تعلیم بالغاں کا وہی کورس پڑھ رہا ہے جو سب پڑھتے ہیں۔" اکرام شیخ بولا۔

"یار یہ بھی کوئی وقت ہے مذاق کا۔" میں نے کہا۔

"سوری یار... منظر نے ایک کام کی بات تو یہ بتائی کہ وہ زمین جس پر ایم ڈبلیو ڈی کا پیلس تھا اور جس پر لاہور نے وزیراعظم سیکرٹریٹ تعمیر کرنے کے منصوبے کا اعلان کیا تھا تو اب خسرو جمشید کی مہربانی سے..."

"مہربانی کیسی... اس نے اپنی جان کا سودا کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"بہرحال، اس زمین کے حقوق ملکیت کے کاغذات عدالت میں داخل کر دیے گئے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "اور فیصلہ ہونے تک خود منظر مختار عام کی حیثیت سے بھی تمام معاملات کا نگراں ہوگا۔ جمشید نے حسب وعدہ پانچ لاکھ روپے اسپتال کی تعمیر کے فنڈ میں منتقل کر دیے ہیں اور وزیر ہوٹل ٹرسٹ کے معاملات کا ورثہ انکل رضوی اپ ڈیٹ کریں گے۔ مشترکہ طور پر منظر کے ساتھ۔"

"یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔" میرا موڈ ایک دم ٹھیک ہو گیا۔

"دوسری بات اس نے یہ کی تھی کہ کیا خسرو جمشید کو چھوڑ دیا جائے؟"

"ابھی سے چھوڑ دیا جائے!" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"ملتان سے جیکی یا جیوتی نے فون کیا تھا کہ اس کو قید خانے میں رکھنے کی ذمے داری بہت سخت ہے کیونکہ اسی گھر میں جمشید کی بھتیجی بھی ہے۔ بے شک ان دونوں کے درمیان رشتہ منقطع ہو چکا ہے لیکن قانونی کارروائی سے جذبات کا کیا

تعلق۔ خصوصاً چچا بھتیجی کا معاملہ ذرا مختلف ہوتا ہے۔ جمشید نے اس کی صورت بھی دیکھنا کبھی گوارا نہیں کیا مگر بہرحال وہ اسے چچا ہی سمجھتی ہے اور یہ بھی جانتی ہے کہ اس بھتیجے سے اس کی بیٹی کو بڑے ناز و نعمت کے ساتھ پال پوس کے جوان کیا ہے جس کا باپ بیٹی کو کوئی تیار نہیں تھا۔ یہ خسرو جمشید کا بہت بڑا احسان ہے اس پر... یہ ہو سکتا ہے کہ اسے پتا چلے اور موقع ملے تو وہ اپنے محسن چچا کو بچانے کے لیے سب کچھ کر گزرے۔"

"تم نے پھر کیا کہا؟"

"میں کیا کہتا۔ منظر نے بھی یہی جواب دیا تھا کہ پہلے یہاں کے سب معاملات نمٹ جانے دو... یہ نہ ہو کہ وہ باہر نکلتے ہی منحرف ہو جائے اور ہم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ جب اس کی ضرورت نہیں رہے گی اور اس کا باہر آنا کسی خطرے کا موجب نہیں رہے گا تو ہم اسے نکال دیں گے۔ اس ملک سے باہر۔ اگر اسے اپنے ذاتی جیل خانے میں رکھنا مشکل ہو رہا ہے تو کسی دوسری جگہ شفٹ کر دیا جائے گا۔"

"یہ بالکل صحیح جواب دیا منظر نے۔" میں نے کہا۔ "پھر انھوں نے کیا کہا؟"

"انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے... ایسا ہی ہوگا... یعنی جب تک قانونی مسائل ختم نہیں ہوتے اور ہم کلیئرنس نہیں دیتے، وہ جمشید کو بطور امانت رکھیں گے... خواہ کہیں بھی رکھیں۔" اکرام نے کہا۔

"چلو یہ فکر تو نہیں رہی۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد عید والو وہ منظر نے ایک عورت کی بات کی جو اپنا نام رضیہ سلطانہ بتاتی ہے... وہ آپ سب لوگوں سے ملنے کے لیے کراچی پہنچ چکی ہے۔ ظاہر ہے میں نے کہا کہ وہ کشکند بخت کے ساتھ تھی اور تم جانو یا نہ جانو... وہ تمہارے بارے میں مکمل معلومات رکھتی ہے۔ تم سب کو جانتی ہے اسی طرح جیسے تم لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہو۔ وہ دو دن منظر کے گھر میں رہی تھی اور انکل رضوی سے بھی ملی تھی۔"

"ظاہر ہے شہلا سے بھی ملی ہو گی۔" محسن بولا۔

"ہاں... اور خود انکل رضوی نے اس سے تفصیلی انٹرویو لیا۔ جسے پولیس کی زبان میں تفتیش کہتے ہیں۔" اکرام بولا۔ "مگر وہ اب پولیس میں تو نہیں ہیں نا... وہ بھی مطمئن تھے۔ انھوں نے منظر سے کہا کہ پتا معلوم ہے تو اسے بتا دو۔ منظر نے کہا کہ پتا تو میں بھی نہیں جانتا مگر کسی کا فون آیا تو اسے بتا دوں گا۔ رضیہ سلطانہ یعنی موہنی اسی دن کراچی روانہ ہو گئی اور اس نے صدر کے ایک ہوٹل کا نام لیا کہ اس کے بارے میں وہاں سے پوچھا جا سکتا ہے۔"

"اور تم چل پڑے ہوٹل کی جانب؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ تجسس تو ہمیں بھی تھا کہ یہ تو نئے کون سی نئی رضیہ سلطانہ دریافت کر لی جس کی ہمیں بھی خبر نہیں۔ مگر میں کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ مجھے شک تھا کہ یہ موہنی ہو۔ حالانکہ اس کے بارے میں واقعاتی شہادت سے تو ثابت ہوتا تھا کہ وہ جل کے مر چکی ہے مگر اس کا ثبوت نہیں ملا تھا اور یہ کوئی ناممکن بات نہیں تھی کہ وہ جان بچا کے پہلے ہی نکل گئی ہو یا قدرت نے اسے بچا لیا ہو... اسے معجزہ تو نہیں مگر اتفاق کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں ہوٹل پہنچا تو کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے رضیہ سلطانہ کے نام پر مجھے غور سے دیکھا اور کہا کہ میں انتظار کروں۔ میں وہیں ان کے ڈائننگ ہال میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں چائے آگئی۔ پھر وہ خود لوٹ آیا اور اس نے مجھ سے مخصوص سوالات کیے۔ جیسے کہ کیا میں جانتا ہوں کہ رضیہ سلطانہ کہاں سے آئی ہے؟ اور اسے کس نے بھیجا ہے۔ میں نے دونوں سوالوں کے درست جوابات دیے تو وہ مجھے اوپر ایک کمرے میں لے گئے۔ وہاں موہنی موجود تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے موہنی ہونے کا یقین مجھے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی آ چکا تھا جب منیجر چلا گیا... وہ شخص منیجر تھا... تو میں نے رضیہ سلطانہ سے بات کی۔ اس کے جوابات سے میرے شکوک دور ہو گئے اور... میں اسے یہاں لے آیا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ میں اسے جنڈ گاہ لے گیا جہاں مجھے راجا سے ملنا تھا۔ پھر ہم سب یہاں آ گئے۔"

"سوال یہ ہے کہ اب کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "میں کوئی ذمے داری نہیں لے سکتا۔ کوئی ضمانت نہیں دے سکتا کہ یہ موہنی واقعی رضیہ سلطانہ بن گئی ہے یا اس نے کوئی چال چلی ہے۔"

"اوّل تو تم سے کوئی ضمانت مانگ نہیں رہا ہے اور نہ اسے تمہاری ذمے داری سمجھتا ہے۔ یہاں ہر ذمے داری مشترک ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہم سب مل کے کوئی فیصلہ کریں گے۔"

"پھر یہ کہ اس نے پہلے تیرے ساتھ کون سی چال چلی ہے؟" محسن بولا۔ "اب تک کتنی بار وہ خود کو مخلص ثابت کر چکی ہے۔ اسے ان گنت مواقع ملے تھے جب وہ تیرا بیڑا غرق کر سکتی تھی مگر اس نے تیرے ساتھ ڈوب جانا منظور کیا۔"

"میں کسی کے ساتھ ڈوبنے کے لیے تیار نہیں۔" میں نے کہا۔ "سوائے رابعہ کے..."

"ہم اس آگ کے دریا کی بات نہیں کر رہے ہیں جس میں آپ کو ڈوب کے جانا ہے۔" غالب نے کہا۔ "اپنے مشن کی بات

www.paksociety.com

کر رہے ہیں۔"

"تم اسے ساتھ رکھنے کے حق میں ہو؟" میں نے ان سب کی طرف باری باری دیکھا۔ سوائے راجا کے سب کے چہروں پہ اقرار کی تحریر تھی۔

راجا نے کہا "میں ایسے معاملوں میں حصہ نہیں۔۔۔

بھول کیونکہ ابھی میں نے مبر شپ کے لیے کوالیفائی نہیں کیا ہے۔"

"اس میں کتنا رسک ہے؟" میں نے کہنا شروع کیا۔

"رسک تو اوّل تا آخر ہے۔ ہر قدم پہ ہے۔۔۔ ہر وقت ہمارے ساتھ ہے، ہمارے وجود سے منسوب ہے۔" غالب نے کہا "مگر رضیہ سلطانہ کے نام سے مجھے امید منسوب نظر آتی ہے۔"

"کیسی امید۔۔۔؟"

"وہ ہمیں گائیڈ کر سکتی ہے۔۔۔ وہ بتا سکتی ہے جو ہم نہیں جانتے۔"

"وہ دوسروں کو بھی بہت کچھ بتا سکتی ہے۔ جو وہ نہیں جانتے۔" میں نے کہا "تمہیں معلوم ہے وہ کس قماش کی عورت ہے۔ اس کے سوا کوئی عورت اکیلی اس ہوٹل میں ٹھہر نہیں سکتی تھی۔۔۔ مگر اس سے تو تیجر نے کچھ بھی چارج نہیں کیا ہوگا۔"

"ہم اس کے ذاتی کردار پر بحث نہیں کر رہے ہیں۔"

"ذاتی کردار ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ آئینہ ہوتا ہے جس میں کسی کا عکس دیکھتے ہوئے ہم آئندہ کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ تم یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو کہ ان دو دنوں میں جب وہ ہوٹل میں تھی، اس نے کسی سے رابطہ قائم نہیں کیا۔۔۔ یا کسی نے اس سے رابطہ قائم نہیں کیا۔"

ان سب کو سانپ سونگھ گیا۔

"تمہیں کیا معلوم کہ ہوٹل سے بندرگاہ تک اور یہاں تک کوئی تمہارے پیچھے نہیں آیا۔"

"خیر اب میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں۔" اکرام شیخ نے کہا "کوئی آتا اور مجھے پتا نہ چلتا۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔ میری آنکھیں پیچھے بھی ہیں۔"

"یہی تو مشکل ہے۔" میں نے کہا "یہ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی ہی مروا دیتی ہے۔ تم بے وقوف نہیں ہو تو کیا شکاری بے وقوف ہیں؟ وہ بھی تو چال چلنے سے پہلے سوچتے ہوں گے۔ تم کہتے ہو تمہاری آنکھیں پیچھے بھی ہیں۔"

"ہر اچھے پولیس مین کی ہوتی ہیں۔" وہ بولا۔

"اور یہ بات ہر اچھا مجرم جانتا ہے۔" میں نے کہا "چنانچہ وہ پیچھا کرتے وقت یہ بات نہیں بھولتا۔ یہ تو بعد میں پتا چلتا ہے کہ کس کا اعتماد برحق تھا۔ یہ بتاؤ تم اسے لانچ پر تو نہیں لے گئے تھے؟"

اکرام شیخ کی صورت پر بارہ بج گئے "نہیں۔۔۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے راجا سے ملنا تھا۔"

"یہ تم نے غلطی نہیں بے وقوفی ہوگئی دوست۔" غالب نے متفکر ہو کے کہا "تم اسے باہر چھوڑ کے بھی جا سکتے تھے۔"

"ہاں۔ وہ کچھ دیر تمہارا انتظار کرلیتی۔" محسن بولا۔

میں نے اس دروازے کی طرف دیکھا جسے نازو نے عمداً بند کر دیا تھا "دیکھو دوستو۔۔۔ یہ ہماری سلامتی کا نہیں، ہماری ناکامی یا کامیابی کا مسئلہ ہے۔ اسے ہم تک یا رسک کی نذر نہیں کر سکتے۔ اب سوچو۔۔۔ یا رضیہ سلطانہ آ ہی گئی ہے تو اسے ہماری بے وقوفی، غلطی یا بدقسمتی کہہ کے بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ ہمیں مشترکہ طور پر اس معاملے میں ایک رائے ہو کے کوئی لائحہ عمل طے کرنا ہوگا۔۔۔ اور پھر جو سب کا فیصلہ ہوگا وہ مجھے بھی منظور ہوگا۔۔۔ فی الحال میری ایک بات سب کو ماننی ہوگی۔"

ایک بار پھر ان سب کے چہرے سوالیہ نشان بن گئے۔

"رضیہ سلطانہ یہیں رہے گی۔" میں نے کہا "ہم اسے کسی اہم فیصلے میں شامل نہیں کریں گے اور اس پر نظر رکھیں گے اگر کوئی کسی وقت بھی اس کی ذات سے مشکوک ہوتا ہے یا خطرہ محسوس کرتا ہے تو اسے یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ۔۔۔ اسے شوٹ کر دے۔ اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ ظاہر ہے ہر شخص کا ذہن کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے متعلق اسباب رکھتا ہے کوئی اسے بلاوجہ قتل نہیں کرے گا۔ صرف شک کی بنیاد پر بھی نہیں کرے گا۔ بلکہ ایسا اسی صورت میں کرے گا جب یہ ناگزیر ہوگا۔"

"مجھے۔۔۔ بلکہ شاید کسی کو اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔" محسن نے کچھ دیر بعد دوسروں کی طرف دیکھ کے کہا "مگر ایک بات رہ گئی۔ رضیہ اگر ساتھ نہیں جائے گی تو کہاں جائے گی۔ میرا مطلب ہے یہاں رہے گی تو کہاں رہے گی اور کس کے ساتھ رہے گی؟"

"ایسے تو یہ سوچنا ہمارا درد سر نہیں۔۔۔ مگر ہم اسے تنہا چھوڑنے کا رسک بھی مول نہیں لے سکتے۔" میں نے کہا "وہ ہم میں سے کسی کے ساتھ رہے گی۔"

"بالفاظ دیگر۔۔۔ ہم میں سے کوئی اس کے ساتھ رہے گا۔ اس کی نگرانی کے لیے۔۔۔ اس کا جیلر بن کے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"تم نے اچھا کیا جو صاف بات کہہ دی۔"

"سوال یہ ہے کہ وہ جیلر کون ہوگا اور جیل کہاں ہوگی۔" اکرام شیخ نے کہا "اور قیدی کے ساتھ جیلر کتنے دن اندر رہے گا؟"

"جیل تو اب یہی ہے۔" میں نے کہا "رہا سوال یہ کہ جیلر کون ہوگا۔ تو شاید ہم میں سے کوئی بھی اس کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ اس کا فیصلہ قرعہ اندازی کے سوا کسی دوسرے طریقے سے ممکن ہی نہیں۔ قرعہ جس کے نام نکلے گا وہ یا تو ہم سے الگ ہو جائے گا اسی مشن سے الگ ہو جائے گا یا اپنی خوشی یا مجبوری سے قبول کرے گا۔"

کسی نے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس میں وہ بھی اختلاف یا اتفاق کی گنجائش نکالنے سے قاصر تھے اور میں بھی جذبات کی بنیاد پر کسی کے لیے رعایت کی گنجائش نکالنے سے قاصر تھا۔ شاید کچھ سوچ کے وہ کچھ کہتے لیکن نازو نے اس کی مہلت نہ دی۔

"حضرات اور حضرات۔" اس نے دھڑ سے دروازہ کھول کے اعلان کیا "ڈنر کے لیے پاؤں سمیٹ لیجیے۔"

"کیا سلیقے کا اعلان ہے۔" غالب نے افسوس سے سر ہلا کے کہا "شرفا سے کہا جاتا ہے کہ ماحضر تناول فرمانے کے لیے ہاتھ دھو لیجیے۔"

"آپ لوگ شرفا ہوتے تو ایسا ہی کہا جاتا۔" نازو بولی۔

"چل بید ہما ہو جا۔۔۔ کیونکہ کھانے سے پہلے ورزش کھانا چاہتا ہے۔" محسن نے اپنے سر پہ ہاتھ رکھ لیے۔ ہم سب دیوار سے ٹیک لگا کے پیر پھیلائے بیٹھے تھے چنانچہ نازو کا اعلان غلط نہیں تھا۔

کھانا ایک نا خوشگوار خاموش فضا کی رسمی کارروائی ثابت ہوا جس میں ہر شخص نے دوسرے کا دل رکھنے کے لیے زبردستی کچھ کھایا۔ مذاق پھیکے اور بے محل تھے اور مسکرانے کی کوشش بھی مصنوعی تھی۔ اجنبیت کے احساس نے ہمارے درمیان اعصابی کشیدگی پیدا کر دی تھی چنانچہ سب نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔۔۔ موہنی جو بقول اس کے رضیہ سلطانہ بن چکی تھی اب نارمل تھی۔۔۔ یہ نازو کی دلجوئی کا کمال تھا یا اس کے اعصاب ہی ہر صدمے کا اثر عارضی طور پر قبول کرتے تھے۔

نازو نے ذہانت سے کام لیا اور موہنی کے ساتھ سونے کے لیے چلی گئی۔ اس طرح ہمیں وہ باتیں کرنے کا موقع ملا جو ہم اب تک نہیں کر سکے تھے۔

"لانچ کے معاملات طے ہو گئے نا؟" محسن نے کہا۔

اکرام شیخ نے اقرار میں سر ہلایا۔

"اور وہ کام جو تمہارے سپرد کیا گیا تھا؟"

راجا بڑے انہماک سے کان میں ماچس کی تیلی گھما رہا تھا "فقیر نے تو اپنا کام کرلیا۔ سارا مال لانچ پر پہنچا دیا انشاء اللہ تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ سوائے چراغ الہ دین کے وہ نہیں ملا۔" اس نے ایک دردناک سرد آہ بھری۔

"مل جاتا تو کیا کرتے؟" غالب نے پوچھا۔

"میں۔۔۔ اسے اٹھا لیتا۔۔۔ اپنی پری کو۔" وہ بولا "ظاہر ہے پری کو جن ہی اٹھا کے لا سکتا ہے۔"

"اس قبیلے میں سب جن بھوت ہیں۔۔۔ یا پیر بالا ہیں؟"

غالب نے کہا "جس کا نام خواہ مخواہ ایم آر ایس پڑ گیا ہے۔"

"ایم آر ایس؟" راجا نے تیلی کے سرے کو غور سے دیکھا۔

"مانٹیلا ارزامنٹ سوسائٹی۔" محسن نے وضاحت کی۔

"اس کے بانی ارکان میں یہ خاکسار۔۔۔ محسن۔۔۔ رابعہ اور سکندر شامل تھے اور اتفاق سے ان کے نام کے ابتدائی حروف بھی یہی بنتے ہیں۔"

"ایم آر ایس۔" راجا نے دہرایا "اس کا نام تو ایل پی ایس بھی ہو سکتا تھا۔ لاٹھی اینڈ بھینس سوسائٹی۔"

"یہ بہت قریبی ہو گیا ہے۔" محسن نے مجھے مخاطب کیا۔

"رابعہ کو کیا کہہ رہا ہے۔"

"یار یہ تم نے جس پری کو شیشے میں اتارا ہے۔" غالب نے کہا "یعنی وہ یہودیوں کی بیٹی۔۔۔ کیا وہ بھی بلیک جیک مانگتی ہے؟"

"اس کے لیے تو میں بلیک جیک ہوں۔" راجا بولا "مگر وہ اپنے ظالم باپ کی قید میں ہے۔"

"یہ طلب نہیں مانتا اسے عشق۔" غالب نے سر ہلایا "ایسے دل جلے تحریک والے عشق سے تو ہم بارہا گزرے۔ ایک بار الزبتھ ٹیلر سے ہوا پھر صوفیہ لارین اور بریجٹ باردوت سے بیک وقت۔ عشق کی تو اصل تعریف یہی ہے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔"

"آگ تو برابر ہے۔"

"خاک برابر ہے۔۔۔ برابر ہوتی تو سب کچھ پھلانگ لیتی اور اس کو نہ مقفل دروازے روک سکتے نہ پتھر کی دیواریں اور نہ آہنی زنجیریں۔۔۔"

"چلو چلو۔۔۔ وہ لڑکی ہے۔۔۔ مارزن کا زمانہ اڈیشن نہیں ہے۔" راجا نے برا مان کے کہا۔

"اچھا تو تم جن بن کے اسے نکال لاؤ۔۔۔ دراصل یہ جو چراغ الہ دین کہلاتا ہے نا۔۔۔ یہ آدمی کا یقین ہے۔ جو دل میں جوت جگاتا ہے تو آدمی سب کچھ کر گزرتا ہے۔۔۔ جو شاید جن بھی نہیں کر سکتے۔ وہ ٹیلوک آف وِنڈسر کی طرح تاج پھینکا تیر کھلا سکتا

www.paksociety.com

ہے۔ ایک فانتی کی طرح ماؤنٹ ایورسٹ پر کھڑا ہو سکتا ہے اور نیل آرمسٹرونگ کی طرح چاند پر قدم رکھ سکتا ہے۔ تم ایک لڑکی کو ان کے نہیں لا سکتے۔"

"نہیں... میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اب تو میں وہی کروں گا جو اس کے باپ سے وعدہ کیا ہے۔" وہ بولا اور لمبا لیٹ گیا۔ "شب بخیر۔"

"میاں ڈاکیل ایس آئی۔" میں نے کہا۔ "کیا خیال ہے چلیں؟"

"کہاں چلیں؟ اس وقت آدھی رات کو؟"

"چلتے ہو تو چین کو چلیے کہتے ہیں کہ یہاں اس ہے۔" غالب نے کہا۔ "شب بخیر۔" وہ فوراً آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ "اس وقت تو میں فرشتۂ اجل کے ساتھ بھی نہ جاؤں۔"

"چلو ہم چلتے ہیں۔" میں نے اکرام شیخ سے کہا۔ "میں اس لانچ کو اور وہاں کے انتظامات کو ایک نظر دیکھ لوں۔"

"یہ کام صبح بھی ہو سکتا ہے۔" اکرام شیخ نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"صبح اگر انھوں نے لوٹنگ شروع کر دی؟" میں نے کہا۔

"چل یار۔" محسن نے اسے اٹھا دیا۔ "نیند ویسے بھی نہیں آتی اب تو..."

"ہم دونوں ہی اُلّو ہو گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"سچ کہا آپ نے... مگر میں تو اُلّو کا پٹھا نہیں ہوں... مجھے کیوں ساتھ گھسیٹتے ہو۔" اکرام شیخ بولا۔

"تم ہمارے شوقر ہو۔" محسن نے اسے باہر کھینچ لیا اور غالب کے ایک لات رسید کی: "کروٹ کرو۔ اٹھو اور اندر سے دروازہ بند کر لو۔"

"تم جاؤ اس مرغ خانے سے۔ ہم لیٹ گئے کرایا کرم سے۔" غالب نے جھنجھلا کے کہا۔

بندرگاہ کے علاقے میں رات کی رونق بھی دن سے کم نہ تھی۔ ہم اکرام شیخ کے پیچھے چلتے گئے۔ وہی پاتا تھا کہ اس سمندر کی سطح پر تیرنے والی ہزاروں کشتیوں اور لانچوں، موٹر بوٹس اور بحری جہازوں کے درمیان وہ لانچ کہاں ہے جسے ہم پہچان سکتے ہیں۔

"وہ... ادھر... ایس ایس کراچی تھرڈ ہے۔" اکرام شیخ نے انگلی سے اشارہ کیا۔

"وہ... وہ کدھر... ادھر تو مجھے ایک سوا ایک جہاز نظر آ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یار نو مولود کا نام کیا ہے؟ میری مراد اس لانچ سے ہے۔"

"ماہین۔" اکرام شیخ بولا۔ "اس کا ماہی سے کوئی تعلق نہیں، مذہبی مہ جبیں ماہ ہی سے... ماہی یہاں آ بہتے۔"

"پھر اس کا مطلب کیا ہے آخر؟" محسن بولا۔

"مطلب کیا... بس رجسٹرڈ ہے اس نام سے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے... روشنی کی کرن۔" میں نے کہا۔ "تم لوگ عربی فارسی میں میری طرح عالم فاضل ہوتے تو سمجھ لیتے۔"

"پھر تو یہ... بہت خوصلہ افزا بہت نیک نام ہے۔" محسن بولا۔ ہم اب نسبتاً کم آباد اور تاریک حصے میں تھے اور اکرام شیخ سے دس بار کہہ چکا تھا کہ بس اب دس قدم کی بات ہے۔ پھر اس وقت جب میں تنگ آ کے دس قدم اور دس میل کا فرق پوچھنے ہی والا تھا، اکرام شیخ نے ایک لانچ کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"وہ ہے ہماری روشنی کی کرن۔ ماہین۔"

ہم چند سیکنڈ خاموش کھڑے اس لانچ کو دیکھتے رہے جو تاریک سمندر کے متلاطم سینے پر ساکت نظر آتی تھی کیونکہ اب بھی اس کے اور ہمارے درمیان کئی سو فٹ کا فاصلہ حائل تھا۔ ایک چھوٹی سی کشتی نے جس کو ایک مرد اور عورت چپو سے چلا رہے تھے، ہمیں لانچ تک پہنچایا۔ وہ دونوں مختنی بڈھا اور بڑھیا آدھی رات کے وقت دس روپے کی کمائی پر بہت خوش خوش واپس لوٹ گئے۔ باری باری ہم سب لانچ پر چڑھے اور اکرام شیخ نے ہماری رہنمائی کی۔ یہ پرانی لانچ تھی اور اس کے عرشے پر ماہی گیری کے جال ہی نہیں اور بھی بہت کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ اس ماحول میں مچھلیوں کی بُو سب پر حاوی تھی اور سمندر کی شناخت کا ایک حصہ تھی۔ میں احتیاط سے قدم اٹھاتا نیچے اترا جہاں اکرام شیخ کے کہنے کے مطابق دو کیبن تھے۔

اس وقت دونوں میں اندھیرا تھا، ابھی میں نے روشنی کے لیے جیب سے لائٹر نکالا بھی نہیں تھا کہ برق رفتار سے تیز روشنی کے دھاروں نے یلغار کی۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں لیکن اندھا ہونے سے پہلے میں نے پولیس کی وردی دیکھ لی تھی۔ پھر کسی نے بنگالی زبان میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔

معلوم نہیں وہ کیا بات تھی جس نے مجھے شک میں مبتلا کیا کہ یہ سارا کھیل غلط ہے، دھوکا ہے اور جعل سازی ہے۔

"کون ہو تم لوگ؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور میری لانچ پر کیا کر رہے ہو؟"

وہ پر تین جانب سے روشنی کی یلغار ہو رہی تھی۔ ایک لائٹ وسط میں تھی اور دو میرے دائیں بائیں۔ میرے سوال کا جواب دینے کے لیے بیچ والی سرچ لائٹ کے پیچھے چھپا ہوا شخص آگے آ گیا اور اسے دیکھتے ہی میرے شبہات کی تصدیق ہو گئی۔ وہ شاید پانچ فٹ قد کا شوکھا سا آدمی تھا جس کو طاقت ور بنانے والا ایک ریوالور تھا۔ یہ ریوالور اس نے یوں میرے دل کا نشانہ لیتے ہوئے اٹھا رکھا تھا جیسے وہ گولی چلانے ہی والا ہے۔

اس ریوالور کے بغیر وہ کچھ نہیں تھا۔ ہم تینوں میں سے کوئی بھی اسے اٹھا کے سمندر میں پھینک سکتا تھا۔ اس کے کندھے کے نشانات اسے ایس پی ظاہر کرتے تھے لیکن میں نے افسر تو کیا مغربی پاکستان کی پولیس میں اتنے لائٹ ویٹ اور لوپو ٹیبل قسم کے کانسٹیبل تک نہیں دیکھے تھے۔

پھر وہ بات بھی واضح ہو گئی جو میرے ذہن میں اولین شک کا سبب بنی تھی۔ یہ وردی ان سب نے پہن رکھی تھی، وہ پولیس کی موسم سرما میں پہنی جاتی تھی جب کہ یہ گرمیوں کا موسم تھا۔ ان کے بہروپ میں یہ بنیادی خامی ان کی کوتاہ بینی کا ثبوت تھی جو اپنے کام میں ماہر ہوتے ہیں، وہ ایسی غلطی نہیں کرتے۔

"اپنا ہاتھ اوپر اٹھاؤ مسٹر۔" اس نے بنگالی لہجے میں اردو کا آملیٹ بناتے ہوئے کہا۔

"ہم خالی ہاتھ آئے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"ہم دیکھے گا... ہاتھ اٹھاؤ شالا۔" بنگالی نے ڈانٹ کر کہا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" میں نے غرا کر کہا۔

"دے گا۔ تم کو بھی جواب دے گا۔" بنگالی نے کہا۔ "ایسا جواب دے گا کہ تم سوال بھول جائے گا۔ ابھی ہاتھ اوپر کرو۔"

"اگر میں نہ کروں تو؟" میں نے کہا۔

بنگالی کی شکل بچّو سے ملتی تھی اور اس کی آنکھیں سانپ کی آنکھوں سے مشابہ تھیں۔ مجھے گھورتے ہوئے اس نے اپنی ایک جیب میں ہاتھ ڈالا اور سائلنسر نکال لیا۔

"ہم تم کو گولی مارے گا۔" وہ سائلنسر کو ریوالور کے اوپر فٹ کرتے ہوئے بولا۔

"اس کے بعد کیا ہو گا؟" میں نے بے خوفی سے اس کا تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا۔ "تم میری لاش کو سمندر میں پھینک دو گے۔ میرے باقی دو ساتھیوں کو بھی مار ڈالو گے لیکن پھر تم خود یہاں سے کیسے جاؤ گے؟"

"تمھارا لانچ لے کر۔" وہ بولا۔

"اور تمھارا کیا خیال ہے کہ میرے ساتھی تم کو اتنی آسانی سے جانے دیں گے؟" میں نے کہا۔ "جو باہر موجود ہیں۔"

وہ بلّی والوں کی طرح ہنسا مگر اس کا فطری انداز ایک کامیڈین کا تھا۔ "باہر شالا تمھارا باپ ہے؟" وہ بولا۔

"گھوش دادا... ذرا پیچھے سے کسی نے کہا۔ "اس کا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟"

"ہاں دادا... باہر تین تھے تو اندر دو کیسے رہ گئے؟" یہ سوال کسی اور نے اٹھایا۔

اس سوال پر میں چونک پڑا تو میری بات بگڑ جاتی، چنانچہ میں نے بظاہر کہا جیسے میں سب جانتا ہوں۔ درحقیقت یہ تو میرے لیے بھی ایک انکشاف تھا کہ ہم دو ہیں۔ محسن نے تو بات کی تھی اندر اپنی موجودگی ثابت کر دی تھی، چنانچہ صاف ظاہر تھا کہ اکرام شیخ غائب ہے۔

اکرام شیخ کی ذہانت اور مستعدی کا اب مجھے ہم آئی تھی۔ شاید اندر قدم رکھتے ہی جب اس نے مجھے کسی نادیدہ دشمن کے مقابل پایا تو مجھ کے سوچ یا ہزار لیا۔ حقیقت میں اس کے ذہن نے خطرے کو بھانپ لیا اور ایک خودکار جسمانی ردعمل کی برق رفتار کارکردگی کا مظاہرہ اس نے یوں کیا کہ اگلا قدم جو آگے اٹھ چکا تھا اسے پیچھے ہٹا لیا۔ دشمن سامنے تھا اور راستہ آگے سے بند تھا۔ اس سے پہلے کہ واپسی بھی ممکن نہ رہتی، وہ پلٹ گیا اور اندھیرے میں کسی سائے کی طرح تحلیل ہو گیا۔

گھوش دادا ایک دم نروس ہو گیا اور اپنے ساتھیوں پر برس پڑا۔ وہ بنگالی میں لڑ رہے تھے اور میں صرف اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو اس کوتاہی کا ذمے دار ٹھہرا رہے ہیں۔

اکرام شیخ کے بحفاظت فرار ہو جانے کا اثر میرے مورال پر بہت اچھا پڑا تھا۔ میرا خوف زائل ہو گیا تھا اور اب مجھے موقع کا انتظار تھا جب میں ان بیوں کو باری باری داخل جہنم کر سکوں۔

گھوش دادا نے چلّا کے کسی کو آواز دی۔ اندر سے کسی نے بنگالی میں کچھ کہا۔ چند منٹ بعد مجھے گڑ گڑ کی آواز سنائی دی۔ کوئی لانچ کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "تم لانچ کو چوری کر کے لے جا رہے ہو؟"

www.paksociety.com

"اور ابھی اغوا کر بیٹھے ہیں" محسن نے کہا۔ "بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم شریف مت ہو تو بہت بڑے بدمعاش نکلتے ہو۔ بڑے بدمعاش ایسے چھوٹے کام نہیں کرتے۔"

"ہاں — یہ جو لاتعداد بڑے بڑے جہاز کھڑے ہوئے ہیں، ہر قسم کے مال سے بھرے ہوئے" میں نے کہا۔ "ان میں سے کوئی لے جاتے۔"

"کسی صنعت کار کو یا اس کی فیملی کے کسی فرد کو اٹھاتے۔ تو منہ مانگی رقم ملتی" محسن بولا۔ "نیلو یا رانی کو لے جاتے اور عیش کرتے۔"

"بکواس مت کرو۔"

"ہم سچ کہہ رہے ہیں" محسن بولا۔ "ہمارے لیے تو سو روپے مانگ کر بھی پچھتاؤ گے — ہمارے دوست بھی وہ ہیں جن کے پاس صرف خلوص ہے۔ پیسہ نہیں ہے — ساڑھے پانچ روپے بھی نہیں دیں گے ہم دونوں کے۔"

"اس سے تو اچھا تھا کہ تم میرے ماموں کو اٹھا لیتے۔ میں ان کے بدلے تمہیں سوا سو تک دے سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

ہماری خوش فہمی اور خوش گفتاری اس وقت ختم ہوئی، جب لانچ کا انجن اسٹارٹ ہوتے ہی کسی نے پیچھے سے مجھے دھکا دیا — دھکا محسن کو بھی دیا گیا تھا۔ ہم دونوں سامنے دیکھ رہے تھے اور پیچھے سے کسی خطرے کا خیال تک ہمارے ذہن میں نہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ ہم دونوں منہ کے بل گرے۔ اس کے ساتھ ہی ہم پر ایک جال گرا۔ یہ ماہی گیری کا جال تھا جو راجا ہی لایا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ ہم مچھلیاں پکڑتے، ہم خود اس میں پکڑے گئے تھے۔ لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا — اس صورت حال کی بہترین تفسیر یہی تھی۔

لانچ چل پڑی تھی۔ اس کے ہچکولے متلاطم سمندر کے سفر کا پتا دیتے تھے۔ اس سفر کے لیے ہم نے بڑی محنت اور منصوبہ بندی کی تھی مگر وقت سفر آیا تو یوں کہ ہم بالکل تیار نہ تھے اور اب تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ نشانِ راہ کیا ہے اور منزل کیا ہے۔

جال کی ڈوری کھینچنے والے یہ کام یقیناً اچھی طرح کر سکتے تھے — میں اور محسن یک جان دو قالب ہو گئے۔ ایک گٹھری سی بن گئے۔ اپنے طور پر ہم دونوں نے ہی ہاتھ پیر مار کے اس تنگ سے تنگ تر ہونے والے لچک دار پنجرے سے رہائی کی بے سود کوشش کی۔ ان ناخنوں کی ڈوریوں سے بنے ہوئے جال کے کسی پھندے کو توڑنا یا کاٹنا ممکن ہی نہیں تھا۔

وہ روشنیاں گل ہو گئیں اور جال سے شکنجہ مضبوط تر کو کسی نے گھسیٹنا شروع کیا۔ ہم دونوں لانچ کے فرش پر آ چکے تھے۔ رگڑ کی خراشوں اور چوٹوں کے درد کو برداشت کرتے اور روشنی کے ہوتے دس پندرہ منٹ گئے۔ پھر ایک دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ ہم گھپ اندھیرے اور خاموشی کے حصار میں پڑے رہ گئے۔

باہر سطح آب پر ایسی بہت سی لانچیں اور کشتیاں رواں تھیں اور سمندر کے ساحل کی دنیا میں بھی وہی ہنگامہ کاروبار تھا۔ جائز اور ناجائز دھندے جاری تھے اور دنیا مال کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ مال دو — مال لو — مال لاؤ اور لے جاؤ — ادھر کا مال ادھر کرنے میں چوہے سے کوتوال تک سب مستعد اور سرگرداں تھے اور یہ کوئی بھی نہیں جاننا چاہتا تھا کہ اس شب کے پردے کے پیچھے کیا ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہیے — اور کیوں ہو رہا ہے۔

امید کا دامن صرف اکرام شیخ سے بندھا ہوا تھا۔

"ابے یار — یہ تیرا گھٹنا..." محسن نے کہا۔ "میری پسلیاں توڑ رہا ہے — پرے کر اسے۔"

"تیری کہنی کے نیچے میری ناک چپٹی ہو گئی ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔ "اور تو جانے تیرا ایک ہاتھ کتنی غلط جگہ پر ہے؟"

"پھر میں کیا کروں یار —؟"

"آپ ذرا دور ہو جا — بلکہ دفع ہو جا۔" میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے رہائی کی واہیات سی کوشش کی۔ کسی امید کے بغیر — لیکن مجھے جال کو ڈھیلا ہوتے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس کی رسی کھینچ چھوڑ دی گئی تھی — چند منٹ میں ہم دونوں آزاد ہو گئے۔

لانچ اب خاصی رفتار سے سفر کر رہی تھی۔ میں نے ہاتھ آگے کی طرف پھیلا کے چلنا شروع کیا۔ چار قدم کے فاصلے پر دیوار آ گئی۔ میں نے اس کی سطح پر کسی لائٹ کے سوئچ کی تلاش میں ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ اسی وقت محسن چلایا۔

"کیا ہوا —؟" میں نے کہا۔

"صدمہ — برقی صدمہ —" محسن نے کہا۔ "تار کھلے پڑے تھے۔"

"یہ کون سی حکیم آ گئی میدان میں؟" میں نے کہا۔ "کھٹمل دوا کا نام پہلے تو کبھی نہیں سنا تھا۔"

"یہ بو کیسی ہے؟" محسن نے گہری سانس لے کر نتھنوں سے بو کرتے ہوئے کہا۔ "امونیا —" وہ چلایا۔

اسی وقت امونیا کی تیز چبھنے والی بو نے میرے دماغ کو جھٹکا دیا۔ "سانس روک لے۔" میں نے چلا کے کہا۔ "اور دیکھ کدھر سے آ رہی ہے یہ زہر کی ہوا۔"

میں نے نیچے جھک کر فرش کے ساتھ ساتھ نتھنوں کے بل جھکتے ہوئے ہر کونے کو ٹٹولا اور شاید یہی محسن بھی کر رہا تھا — پھر میں نے اوپر چھت کے کسی سوراخ سے آنے والی ہوا کو محسوس کرنا چاہا مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ بو بہت آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی اور میرے لیے سانس لینا ناممکن ہو گیا تھا — مجھے ایسا لگتا تھا کہ دباؤ سے میرے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ جب قوتِ برداشت جواب دے گئی تو میرے جسم نے خود ہی امونیا کو اندر کھینچ لیا۔ میں نے شل محسوس کیا اور مجھے اپنا وجود کسی بگولے کی زد میں آ جانے والے سوکھے پتے کی طرح گھومتا ہوا اور اوپر اٹھتا ہوا محسوس ہوا — جیسے سگریٹ کا دھواں فضا میں تحلیل ہوتا ہے ایسے ہی میں آہستہ آہستہ بے وجود ہو گیا۔

پھر مجھے ہوش آیا تو لانچ چل رہی تھی یا شاید گرداب میں گھوم رہی تھی۔ ایک روشنی تھی جو بار بار کسی دور کے ستارے کی طرح جھلک دکھا کے غائب ہو جاتی تھی۔ میں نے اس کیفیت سے نجات پانے کی جدوجہد جاری رکھی اور اس میں کامیاب بھی رہا۔ بالآخر میرا ذہن صورت حالات کو کسی حد تک سمجھنے لگا۔

میں کسی اجنبی جگہ پر تھا۔ یہ ایک خالی کمرا تھا جس کے فرش پر مجھ سے قریب ہی محسن پڑا ہوا تھا اور اس سے چند فٹ کے فاصلے پر اکرام شیخ — زمین ٹھنڈی تھی اور بند کمرے میں گھٹن کے ساتھ نیم تاریکی تھی۔ اس کی نمی شمالی خصوصیت نے مجھے سمندر یاد دلایا — پھر میرے کانوں نے بھی سمندر کی گونجتی ہوئی سرسراہٹ سنی جو لہروں کے تصادم سے پیدا ہو رہی تھی۔

یک لخت مجھے یاد آ گیا کہ اس کمرے سے پہلے میں سمندر میں ایک لانچ پر تھا۔ اس لانچ پر کیا ہوا تھا؟ ہاں — محسن اور میں جال میں پکڑے گئے تھے اور پھر کسی نے لانچ کے ہر طرف سے بند کیبن میں امونیا گیس چھوڑ دی تھی — امونیا ایک زہریلی گیس تھی جو ہلاک بھی کر سکتی تھی۔ اس کی زیادہ مقدار ہماری سانسوں کے ساتھ جسم میں شامل ہو جاتی تو ہم یقیناً مر جاتے — لیکن ہم زندہ تھے جس کا یہ مطلب تھا کہ ہم زندہ رکھے گئے تھے — ہمیں مارنا ہی مقصود ہوتا تو وہ کیبن کو امونیا سے بھر دیتے اور ہماری بے ہوشی خود بخود موت کی نیند میں بدل جاتی۔

ذہن بیدار ہوا تو مجھے اکرام شیخ کو دیکھ کر بھی حیرانی ہوئی — وہ تو نکل گیا تھا — صرف میں اور محسن پکڑے گئے تھے — پھر وہ یہاں کیسے آیا —

میں دونوں ہاتھوں کے بل پر اٹھا اور کچھ دیر سر تھام کے بیٹھا رہا جو مجھے اپنے کندھوں پر ایک ڈولتی ہوئی چٹان لگتا تھا۔ سر کے اندر بھی درد کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور یہ دلیا درد نہیں تھا جو اسپرین کی دو گولیاں نگل لینے سے ٹھیک ہو جاتا تھا۔ یہ عجیب سا درد تھا جس کا مرکز کہیں سر کے اندر تھا۔ اس مرکز سے درد کی ایک لہر سی اٹھتی تھی اور سر کی دیواروں سے یوں ٹکراتی تھی جیسے ساحل کی چٹانوں سے موجیں ٹکراتی ہیں۔

اس وقت جب میں کمرے کا جائزہ لے رہا تھا، میں نے محسن کی آواز سنی — وہ شعلہ کا نام لے رہا تھا اور اپنے بیٹے کو یاد کر رہا تھا — ناامیدی کے صحراؤں میں بھٹکنے والا مسافر خوبصورت جذبوں کے سراب میں گم تھا۔

"محسن — !" میں نے اس کے شانے کو ہلایا۔ پھر اکرام شیخ کو جھنجھوڑا لیکن وہ ابھی ہوش کی منزل سے دور تھے۔ یہاں میں ان کو جلد ہوش میں لانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کمرا صرف چار دیواری کا حصار تھا جس میں ایک ہی دروازہ تھا اور سمندر کی جانب چھ... روشن دان تھا۔ وہ فرش سے دس فٹ اوپر تھا — ایک مربع فٹ کے اس روشن دان میں بھی زنگ خوردہ لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ لوہے کو سمندر کی نمکین ہوا چاٹ رہی تھی۔ "کیا ہم انہیں توڑ سکیں گے؟" میں نے سر اٹھا کے روشنی کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کو دیکھا — جس سے آسمان دکھائی دیتا تھا۔ بادل اس کے سامنے سے اڑتے ہوئے نکلے جا رہے تھے۔

باہر سمندر کے شور میں بھی سناٹا شامل تھا۔ ایک عذاب سخن سکوت تھا جو اپنے وجود سے احساس کو قید میں مبتلا کرتا تھا۔ میں نے بہت دھیان سے سنا مگر مجھے اور کوئی آواز سنائی نہ دی — نہ کسی پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ — نہ کسی چڑیا، مینا یا موسیقی کے چہچہانے کی آواز — کہیں کوئی کتا نہیں بھونک رہا تھا۔ کوئی بچہ نہیں رو رہا تھا — کوئی مشین نہیں چل رہی تھی — موٹر سائیکل، تانگہ، بس یا ٹرک کسی کی حرکت کو محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا اور یہی احساس خلا کا اور منجمد وقت کا تصور پیدا کرتا تھا — مرنے سے پہلے اور دفن ہو جانے سے پہلے آدمی اس دنیا میں کہاں اتنا تنہا ہو سکتا ہے۔

میں نے گھبرا کر پھر محسن کو ہلایا۔ "محسن — یار اٹھ... ہوش میں آ۔"

وہ ہوش میں آ چکا تھا۔ "میں... اٹھ نہیں سکتا — سر چکر... گھوم رہا ہے... میرا سر... سر بھی لٹو کی طرح گھوم رہا ہے یار۔"

تنہائی کا آسیب ختم ہو گیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ نبض چل رہی تھی — محسن کے دل کی طرح اور اس کی نبض کی طرح — اکرام شیخ کے دل کی طرح — ہم سب کے جسموں میں خون رواں تھا۔ اس کی گردش میں حرکت کا تواتر تھا اور یہ زندگی کا یقین دینے والی خوشی تھی۔

میں نے محسن کو سہارا دے کر بٹھا دیا۔ "آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا — پہلے مجھے بھی ایسے ہی لگا تھا۔"

محسن نے خود کو پیچھے گھسیٹا اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔ "یہ

www.paksociety.com

"ہم کہاں آگئے ؟"

"سمندر کے قریب کوئی جگہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کمرے میں ہمارے ساتھ اکرام شیخ بھی ہے۔"

محسن نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ "وہ.... وہ تو بھاگ گیا تھا۔"

"شاید وہ — بھاگ نہیں سکا تھا۔" میں نے کہا۔ "اسے باہر ہی پکڑ لیا گیا ہوگا — باہر بھی کچھ لوگ ضرور رہے ہوں گے — ورنہ پیچھے سے ہمیں کون دھکا دے سکتا تھا؟"

"ہاں — ایسا ہی ہوا ہوگا۔" محسن بولا۔ "مجھے تشنگی ہو رہی ہے۔"

"تشنگی تو مجھے بھی ہو رہی ہے ... وہ احمق نہیں جانتا۔"

"تو... کیا پانی نہیں ہے یہاں؟"

"ہے... باہر ایک سمندر ہے۔" میں نے کہا۔ "اندر کچھ نہیں ہے ان دیواروں کے سوا۔"

"یہ گھر ہے...؟"

"پتا نہیں — ایک کمرا بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے چھت کی جانب روشن دان کو دیکھا۔

"اور... ہمارے سوا یہاں کوئی نہیں؟"

"ابھی تک تو میں نے کسی کی آواز نہیں سنی —" میں نے کہا۔

"کیا... وہ ہمیں... اس لیے یہاں چھوڑ گئے ہیں کہ... ہم بھوک کے مارے مر جائیں —؟" محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا۔"

"ہاں — ہمیں مارنا ہوتا تو — وہیں مار دیتے..." میں نے اس کی تائید کی۔ "زیادہ امید نہ رکھیں دے کے۔"

"وہ کون — لوگ تھے یار —؟"

"گھوش دادا ... وہ تو کوئی ہندو بنگالی تھا۔ اس کے ساتھی تو میں نے بھی نہیں دیکھے۔" میں نے کہا۔

"انہیں کس نے بھیجا ہوگا —؟"

"ہمارے دشمن کا کوئی ایک نام تو نہیں ہے — وہ اور بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "درمیان کے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو علیحدگی پسند عناصر کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور ان کو اسلحے کی فراہمی کے لیے راستہ، وسائل، تربیت کی سہولت اور ہر قسم کی امداد فراہم کرتے ہیں — یا پھر مشرقی بازو کے غدار عناصر کی... قیادت کرنے والے ہو سکتے ہیں۔"

"مجھے تو یہ... تیسرے گروہ کے ارکان لگتے تھے۔" محسن بولا۔

"ہاں — گھوش دادا ایک بنگالی نام ہے —" میں نے کہا۔ "ہم تو جانتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کو الگ کرانے کی کوششوں میں بنگال کے ہندو تاجر کا ذہن اور سرمایہ سب سے اہم کردار ادا کر رہا ہے — ہم ان کی راہ میں روڑے اٹکانے والے لوگ ہیں۔"

"ظاہر ہے — ہم نے جتنا اسلحہ... اسلحہ خانے اور ان تخریب کاروں کے ٹھکانے تباہ کیے — وہ انہی کا نقصان تھا جو اس شورش کی پشت پناہی کرتے ہیں۔"

"خیر یار دشمن کوئی بھی ہو — سوال یہ ہے کہ ہم کیا کریں گے۔" میں نے کہا۔

"ہم کیا کر سکتے ہیں؟" محسن نے مایوسی سے کہا۔ "سوائے انتظار کرنے کے — کوئی نہ کوئی تو آئے گا — قفل کھل آئے یا جل آئے۔"

"کیا تجھ میں ہمت ہے؟"

"کیسی ہمت — کیا سر سے ٹکر مار کے دیوار گرا دوں؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ نیک کام تو کر۔"

"یار ایسے بیٹھے رہنے سے تو کچھ نہیں ہوگا — یاد کر ہم نے کیسی کیسی شجاعت اور ہمت کی داستانیں پڑھی تھیں اور فلمیں... دیکھی تھیں — جو حقیقی واقعات پر مبنی تھیں — اور جن میں قید خانوں سے فرار ہونے والوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔"

"میں نے تو کہا ہے آپ سے کہ بسم اللہ — نعرۂ تکبیر کے ساتھ حملہ کیجیے اور دیوار سے گزر جائیے —" محسن بولا۔

"میں اس روشن دان سے جھانک کر دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کچھ پتا تو چلے کہ ہم کہاں ہیں — کیا تو ایک طاقت ور مرغا بن کے مجھے بلند مقام عطا کر سکتا ہے؟"

"جی نہیں — ابھی تو میں خود کو بھی بلند نہیں کر سکتا۔"

"اچھا تو میں مرغا بنتا ہوں — تو مجھے گدھا سمجھتے ہوئے سوار ہو اور باہر جو نظر آئے بیان کر۔" میں نے کہا۔

"یہ ہو سکتا ہے —" محسن نے کہا۔

میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے رکوع کی حالت میں کھڑا ہوا اور محسن خاصی کوشش کے بعد میری پیٹھ پر قدم جمانے میں کامیاب رہا — اس کا چہرہ عین روشن دان تک پہنچ گیا۔

"اب کچھ بول نا یار —؟" میں نے بوجھ سے دب کے کہا۔

"کیا بولوں —" محسن نے کہا۔ "باہر کچھ بھی نہیں ہے۔ موسم بڑا سہانا ہے — نکھرے نکھرے سے نیلے آسمان کی نیلاہٹ میں بادل..."

میں سیدھا ہوا تو محسن سلاخیں پکڑ کے لٹک گیا ورنہ وہ نیچے گرتا — اب وہ فرش سے دو فٹ اوپر لٹکا ہوا تھا — اس نے آہستہ سے سلاخوں کو چھوڑا اور نیچے آگیا۔

"میں بالکل صحیح رپورٹ دے رہا ہوں —" محسن نے کہا۔

"میں نے موسم کی رپورٹ سننے کے لیے تیرے ناپاک قدموں کو اپنی پشت مبارک پر جگہ نہیں دی تھی —" میں نے کہا۔

"اور باہر جو کچھ ہے وہ سمندر کا ہے — ایک سمندر ہے تا حد فاصلہ — کوئی فرلانگ دور — معلوم نہیں کون سا سمندر ہے — میں اس کا نام پوچھنے ہی والا تھا — سمندر میں پانی ہے — پانی میں نمک کچھ زیادہ پڑ گیا ہے — اوپر ایک دو پرندے اڑ رہے تھے — ان میں ایک شاید بگلا تھا یا بگلی تھی — دوسرا مرغابا تھا یا مرغابی تھی — بہت دور ایک دو بحری جہاز جا رہے تھے یا آ رہے تھے — ہاں — ایک مچھلی بھی تھی جو پانی میں اچھل رہی تھی۔"

"بس — یا اور کچھ —" میں نے کہا۔

"اور کیا — یہاں سے ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ تو نظر آنے سے رہی۔"

"آس پاس کوئی عمارت نہیں؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی تو نہیں ہے — لیکن ایک دن میں اس ساحل پر اپنا بیچ ہاؤس بناؤں گا۔"

"یہ قید خانہ کیسا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہمارا ڈائننگ روم — ڈرائنگ روم اور بیڈ روم — جو کچھ عرصے بعد مشترکہ مزار شریف کہلائے گا۔"

"یار محسن! خدا کے لیے... یہ کیا مذاق ہے؟"

"یہ ایک سنگین حقیقت ہے۔" محسن بولا۔ "ہم جہاں ہیں وہاں کسی کے خیال کی رسائی بھی ممکن نہیں — دائیں بائیں کچھ دکھائی نہیں دیتا مگر یہ جگہ کسی چٹان پر ہے — ذرا فاصلے پر دونوں طرف ایسی ہی کئی چٹانیں ہیں۔"

"روشن دان کی سلاخوں کو خاصا زنگ لگا ہوا ہے — کیا انہیں توڑا نہیں جا سکتا — یا نکالا نہیں جا سکتا؟"

"توڑا بھی جا سکتا ہے اور نکالا بھی جا سکتا ہے — بشرطیکہ مناسب آلات و اوزار فراہم ہوں —" محسن بولا۔ "ڈرل مشین اور بجلی کی آری — لوہا کاٹنے والی — خالی ہاتھوں سے تو صرف دعا مانگی جا سکتی ہے کہ اللہ ناممکن کو ممکن کر دے — وہی نکال سکتا ہے ہمیں یہاں سے یا پھر دشمن ہی — جو لائے تھے وہ لے جا بھی سکتے ہیں۔"

"بکواس مت کر۔" میں نے چڑ کے کہا۔ "ہمارے دوست بھی تو باہر ہیں — غالب اور رازا... اور نازو۔"

"انہیں کیا فرشتے خبر دیں گے کہ ہم کہاں ہیں؟"

"تو مایوسی کی باتیں کیوں کر رہا ہے — ہم زیادہ سخت امتحانات سے گزر چکے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تو پھر رشتے کا اللہ ہونے کی کیا ضرورت ہے — پھر تجھے کیا کہ میں کچھ گھبرا رہا ہوں کیا۔" محسن بولا۔

اچانک اکرام شیخ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ "اس بار... بہت پھنسے یار۔"

"آپ بقائمی ہوش و حواس لیٹے ہوئے ہماری گفتگو سن رہے تھے؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں نے میری... طرف — دیکھا ہی نہیں — میں تو دیکھ رہا تھا۔" اکرام شیخ بولا۔ "جب... تم باہر جھانک رہے تھے۔"

"تم ہمارے ساتھ کیسے آگئے تھانے دار صاحب؟" محسن بولا۔

"تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو تھانے داری بھی بچ جاتی۔" وہ بولا۔ "لیکن کوئی بدقسمتی سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے — میں نے روکا بھی تھا کہ یہ کوئی وقت نہیں ہے — لانچ صبح بھی دیکھی جا سکتی تھی۔"

"یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" محسن بولا۔

"تم تو پہلے نکل گئے تھے شیخ جی —" میں نے کہا۔

"بس خیال ہے تمہارا —" وہ بولا۔ "میں بھاگ کے کہاں جا سکتا تھا — اس وقت اتنا ہی موقع ملا تھا کہ پلٹ جاؤں — آگے سمندر تھا... تیرنا آتا تو کود بھی جاتا۔"

"کیا ڈوبنا بھی نہیں آتا —؟" محسن نے سوال کیا۔

"ڈوبنا آتا ہے —" وہ بولا۔ "تمہارے ساتھ رہ کے یہی سیکھا ہے کہ خود تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔"

"یا میرے مولا — پولیس والا شعر پڑھ رہا ہے۔" محسن بولا۔ "کیا زمانہ آگیا ہے۔"

"میں ایک کیبن میں جا چھپا تھا۔" شیخ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "مجھے کچھ معلوم تو تھا نہیں کہ کدھر کیا ہے — بس جو پہلا دروازہ سامنے آیا اسے دھکا دیا — اتفاق سے وہ بند نہیں تھا — میں اندر چلا گیا تو مجھے وہ لانچ کے ناخدا کا کمرا لگا — کچھ صاف ستھرا اور دل فریب تھا — اس میں میز کرسیاں تھیں اور ایک بیڈ تھا — تختہ تھا — میں اس کے نیچے گھس گیا — میرے پیچھے پیچھے وہاں وہ سب آگئے۔"

"وہ سب کون؟"

"وہ سب جو پولیس کی وردی میں تھے۔"

"مگر وہ پولیس کے آدمی نہیں تھے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو میں بھی سمجھ گیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "ان کی سڑی ہوئی والی وردی دیکھ کر جو انہوں نے گرمی میں پہن رکھی تھی۔"

"ان میں ایک تو ایس پی بنا ہوا تھا۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"گھوش دادا۔" میں نے کہا۔

"ہاں — اس کو تو انہوں نے وہیں مار دیا تھا۔" اکرام شیخ

www.paksociety.com

نے کہا۔ میں بچے سے سب دیکھ اور سن رہا تھا ۔۔۔ غالباً گورنش دلوا کے بھر دو کوئی ایک کام کیا گیا تھا، جس کا اسے نصف معاوضہ پہلے ادا کر دیا گیا تھا۔"

"وہ کیا کام تھا؟"

"اس کا پتا نہیں چل سکا۔" شیخ نے کہا۔ "جب اس نے وہ کام کر لیا تو معاہدہ کرنے والوں نے اس کے بھر دو دوسرا کام کرنے ... وہ مجبور تھا کہ دوسرا کام بھی کرے ۔۔۔ اس کی نوعیت واضح نہیں ہو سکی اور یہ تیسرا کام ہمارے بارے میں مخبری یا ہماری شناخت کا تھا، جو اس سے چھڑا لیا گیا۔ اسے بلیک میل کر کے۔"

"ایسے کاموں میں تو یہی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اب شاید وہ کچھ اور چاہتے تھے۔" اکرام شیخ بولا۔ "وہ چلانے لگا کہ یہ بدعہدی ہے ۔۔۔ اب وہ اور کچھ نہیں کرے گا۔ بس اسے باقی رقم دے دی جائے تا کہ وہ گھر جا سکے ۔۔۔ وہ اپنی فیملی کے لیے بھی پریشان تھا، جو مشرقی پاکستان کے حالات میں غیر محفوظ ہو گئی تھی ۔۔۔ بس اسی پہ جھگڑا بڑھا ۔۔۔ وہ سب اس کو مزید بلیک میل کرنا چاہتے تھے اور اس کی قوت برداشت ختم ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے اس کی پوری زندگی صرف آدھا معاوضہ لے کر ختم ہونے والوں کی یہ بھی نیت ہی نہیں تھی کہ اسے باقی رقم دی جائے ۔۔۔ وہ تو دیکھ رہے تھے کہ وہ کہاں تک اور کس حد تک کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اب تک اسے ڈرا دھمکا کے ہی کام نکالا تھا ۔۔۔ لیکن جب انتہا ہو گئی تو انھوں نے وہی کیا جس کا فیصلہ وہ... بہت پہلے کر چکے تھے ۔۔۔ کاش وہ احمق یہ بات اس دلدل میں قدم رکھنے سے پہلے ہی سمجھ لیتا۔ بات بہت بڑھ گئی تو انھوں نے اسے مارا ۔۔۔ اور اسے صاف بتا دیا کہ اس راستے پر قدم رکھنے والے واپس نہیں جاتے ۔۔۔ مجھے اس بے چارے پر بہت ترس آیا کیونکہ وہ واقعی بہت بے وقوف تھا ۔۔۔ تم نے دیکھا کہ اس نے ایسی پی آئی کی وردی بھی پہن لی تھی ۔۔۔ گرمیوں کے موسم میں تو سرما والی وردی ... اس سے کام لینے والے چالاک تھے اور اسے مارتے ہوئے اس کا بہت مذاق اڑا رہے تھے ۔۔۔ ایک نے کہا کہ تیری گھر والی خوبصورت ہے تو فکر مت کر اس کی ۔۔۔ اسے ایک نہیں کئی چاہنے والے مل جائیں گے اور تجھ سے ہزار درجہ بہتر ۔۔۔ وہ ان کی منت سماجت کرتا رہا ۔۔۔ ان کے آگے ہاتھ جوڑتا رہا ۔۔۔ لیکن ان سب کی نیت کا اندازہ ہو چکا تھا ۔۔۔ اور وہ بہت سفاک قسم کے لوگ تھے۔ مارنے سے پہلے وہ اس کی موت سے کھیل رہے تھے۔ ایک اپنا ریوالور بار بار نکالتا تھا اور نشانہ یوں لیتا تھا جیسے گولی چلا دے گا مگر پھر جیب میں ڈال کر نئی بات چھیڑ دیتا تھا۔ باقی تین لاتوں گھونسوں سے مار رہے تھے ۔۔۔ وہ ان کے مقابلے میں کمزور بھی تھا ۔۔۔ وہ گنے کی طرح پٹتا رہا اور ۔۔۔ میں تو بیڈ کے نیچے تھا، مگر اندھیرے میں تھا ۔۔۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی کیا حالت ہو گئی ہے ۔۔۔ اس کی پسلیاں سب ٹوٹ گئی ہوں گی۔ اس کی ناک اور منہ سے خون نکل رہا تھا اور ۔۔۔ بالآخر وہ مر گیا ۔۔۔ ایک بھیانک موت ۔۔۔ مجھے وہ منظر نہیں بھولتا۔"

"وہ چاروں کون تھے ۔۔۔ میرا مطلب ہے کس کے آدمی تھے وہ ...؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ سب آپس میں ایسی کوئی بات کرتے تو پتا چلتا ۔۔۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ وہاں سے آئے تھے۔ مشرقی بنگال سے ۔۔۔ یا کلکتہ سے۔" اکرام شیخ بولا۔ "کیونکہ کچھ دیر بعد وہاں ایک اور شخص آ گیا تھا۔ اس نے کہا کہ اب تو ٹھیک ہے نا ۔۔۔ اور انھوں نے خاصی ناراضگی کا اظہار کیا کہ ٹھیک تو ہے مگر سب ٹھیک کیسے ہو گیا ۔۔۔ باقی لوگ کدھر ہیں ۔۔۔ اس نے کہا کہ وہ بھی آ جائیں گے۔"

"اس کی مراد ... غالب سے ہو گی ۔۔۔؟" محسن بولا۔

"ہاں ۔۔۔ راجا کو وہ کیا جانیں ۔۔۔ ابھی اسے چلے ہوئے چند ہی دن تو ہوئے تھے۔" اکرام شیخ بولا۔

"شاید وہ استاد ٹیڈی ..."

"نہیں ۔۔۔ دشمن کو اتنا بے خبر نہیں سمجھنا چاہیے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "مگر ہاں ۔۔۔ نادرہ ان میں شامل ہو سکتی ہے جن کا وہ انتظار کر رہے تھے ۔۔۔ آخر میں آنے والا انھیں اطمینان دلا رہا تھا کہ وہ بے فکر ہو کے مال اٹھائیں۔ اب خطرہ نہیں رہا اور اس نے اپنا کمیشن بھی مانگا تھا مگر وہ اڑ گئے کہ پہلے راستہ بالکل صاف ہونا چاہیے ۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ پھر بیڑا غرق ہو جائے۔"

"تم کیسے پکڑے گئے ...؟"

"بس ۔۔۔ شامت اعمال ۔۔۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "پانچواں شخص اپنے کمیشن کی رقم بڑھانا چاہتا تھا اور ٹیڈو النس مانگ رہا تھا۔ اس نے کہہ دیا کہ چل کے خود دیکھ لو ۔۔۔ ان دونوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ اس پہ وہ لڑ لیے کہ دونوں کیوں ۔۔۔ تینوں کیوں نہیں ۔۔۔ تیسرا کدھر گیا ۔۔۔ ان کے درمیان تھوڑی سی تکرار اس بات پر ہوئی کہ لانچ پر آنے والے دو تھے لیکن انھوں نے منوا لیا کہ تین آئے تھے۔ نتیجہ یہ کہ تلاش شروع ہوئی اور اچھا ہوا کہ مجھے وہیں دریافت نہیں کیا گیا ورنہ وہیں جان سے مار دیتے۔ وہ باہر گئے تو میں بھی نکل بھاگا اور پہلے کمرے میں واپس آ گیا ۔۔۔ وہاں تم دونوں الٹے پڑے تھے ۔۔۔ لیکن زندہ تھے ۔۔۔ وہ اچانک آ گئے اور انھوں نے مجھے وہیں پکڑ لیا ۔۔۔ شاید اسی سے تمھاری جان بچ گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور تازہ ہوا ایک طرف سے ایسے آ رہی تھی جیسے سرنگ میں سے گزر کے آ رہی ہو ۔۔۔ تمھیں تو وہ مردہ مان ہی چکے تھے ۔۔۔ انھوں نے مجھے گھیر لیا ۔۔۔ مقابلہ بے سود تھا ۔۔۔ ایک نے میرے سر پر ریوالور کا دستہ مارا ۔۔۔ چوٹ تو خاصی آئی تھی لیکن میں ... بے ہوش نہیں ہوا تھا ۔۔۔ میں تو ایسے ہی گر گیا اور ساکت ہو گیا۔ انھوں نے کہا، چلو چھوڑو اسے بھی اور نکلو یہاں سے ورنہ انھی کے ساتھ لیٹنا پڑے گا ۔۔۔ اس وقت بھی کیبن میں امونیا کی تیز بو بھری ہوئی تھی ۔۔۔ وہ فوراً دروازہ بند کر کے نکل گئے ۔۔۔ مجھ پر چوٹ کا اثر تھا اور کچھ امونیا کا ۔۔۔ جب میں نے اٹھنا چاہا تو چکرا کے گر گیا۔"

"پھر ہم سب فوت کیوں نہیں ہو گئے؟" میں نے کہا۔

"ہاں ۔۔۔ امونیا کے اثر سے تو ہمیں مر جانا چاہیے تھا۔" محسن نے تائید کی۔

"میرا خیال ہے کہ امونیا کی مقدار ناکافی تھی۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم ایک ساتھ اس کیبن میں بند ہو جاتے اور پھر دروازہ کوئی نہ کھولتا تو شاید زندہ نہ بچتے ۔۔۔ ممکن ہے لانچ پر امونیا کا ایک ہی سلنڈر لایا گیا ہو ۔۔۔ اور اس کی گیس کھول کے وہ مطمئن ہو گئے ہوں کہ بس ہمارا کام تو تمام ہوا ۔۔۔ اکرام شیخ نے دروازہ کھولا تو امونیا نکل گئی اور تازہ ہوا نے اس کی جگہ لے لی ۔۔۔ پھر تو رہی سہی گیس اتنی نہیں رہی ہو گی جو مہلک ثابت ہوتی۔"

"یہ سب بحث بے مقصد ہے۔" محسن بولا۔ "سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے اتنا تردد کیوں کیا ۔۔۔ مارنا ہی تھا تو امونیا گیس کا سلنڈر لانے کا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی ۔۔۔ تین گولیاں مارنا آسان تھا اور سستا طریقہ تھا۔"

"ممکن ہے وہ فائر کی آواز سے ڈرتے ہوں۔"

"چلو یہ بھی مانا ۔۔۔ مگر اس وقت جب ہم دونوں بے ہوش پڑے ہوئے تھے انھوں نے ہمیں سمندر میں کیوں نہیں پھینک دیا؟" محسن بولا۔ "ہم سمندری مخلوق کا رزق ہو جاتے ۔۔۔ یہی اکرام شیخ کے ساتھ بھی کیا جاتا تو قصہ ختم ہو جاتا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ پروفیشنل لوگ نہیں تھے ۔۔۔ پروفیشنل سے میری مراد ہے پیشہ ور قاتل ۔۔۔ تخریب کار ۔۔۔ یا کانٹریکٹ ... وہ کسی قسم کے ایسے افراد تھے جو موجودہ سیاسی صورت حال سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ... جن کا دھن سمیٹ رہے ہیں ۔۔۔ سرمایہ انھی کا ہے جو سیاست میں کام آ رہا ہے ... انھیں اپنے منافع سے غرض ہے ۔۔۔ اس سے نہیں کہ سیاست کیا ہے ۔۔۔ اسلحہ کس کے ہاتھ میں پہنچ رہا ہے اور کیوں پہنچ رہا ہے ۔۔۔ مختصراً یہ کہ دوسری سائیڈ کے یہ مہرے ملادا اینڈ کمپنی ۔۔۔ ان سے کمیشن اور ٹیڈ والنس کی بات کرنے والا یہاں کا آدمی تھا۔"

"تم نے دیکھا تھا اسے؟" میں نے کہا۔

"ہاں ۔۔۔ مگر وہ ان میں سے کوئی نہیں تھا ۔۔۔ ملادا کے ان ساتھیوں میں سے جن کو ہم جانتے ہیں۔"

"پھر بھی ۔۔۔ حلیہ تو بتاؤ۔" میں نے کہا۔

جب اکرام شیخ نے اس کا حلیہ تفصیل سے بتایا تو میں سمجھ گیا ۔۔۔ وہ خود حاجی عبداللہ تھا۔

"حاجی عبداللہ ۔۔۔؟"

"ہاں ۔۔۔ تم نے نہیں دیکھا اسے ۔۔۔ اس کی فرم لاہور میں ہے، جو حاجی عبداللہ اینڈ کمپنی کے نام سے بزنس کرتی ہے ۔۔۔ بظاہر تازہ پھل، سبزیاں اور انڈے، مچھلی وغیرہ کے امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے لیکن دراصل وہی ہے جو دلاور سے اسلحہ لیتا ہے اور اسے آگے پہنچاتا ہے ۔۔۔ اپنے ٹرکوں میں ۔۔۔ ظاہر ہے وہ اس کا کمیشن وصول کرتا ہے ۔۔۔ ملادا اینڈ کمپنی کچھ اسلحہ چلاتی ہے اور کچھ اسمگل کرتی ہے ۔۔۔ حاجی عبداللہ اینڈ سنز اس کی ترسیل کے ذمہ دار ہیں ۔۔۔ ٹرانسپورٹر ہیں ۔۔۔ دلاور کے پاس اپنے ٹرک تو ہیں نہیں اور وہ کسی گڈز فارورڈنگ ایجنسی کے ذریعے مال بھیجنے میں خطرہ محسوس کرتا ہے ۔۔۔ یہ نام کا حاجی جو دراصل پاجی کہلانے کا مستحق ہے اس کے لیے بہترین کور فراہم کر رہا ہے ۔۔۔ کوئی اس پہ شک کر ہی نہیں سکتا ۔۔۔ اس کا سارا کاروبار بڑی خاموشی سے لاہور کے ایک غیر کاروباری علاقے میں ہو رہا ہے ۔۔۔ لاہور سے ہزاروں ٹرک روز کراچی آتے ہیں ۔۔۔ ان میں دو چار ٹرک اس کے بھی آتے ہوں گے ۔۔۔ اوپر انڈوں کی پیٹیاں ۔۔۔ پھلوں کے کریٹ ۔۔۔ نیچے گولہ بارود ۔۔۔ ہم خود بھی ایک ٹرک پکڑ چکے ہیں ۔۔۔ اس کے دو بیٹے بھی اس کام میں باپ کے مددگار ہیں ۔۔۔ وہ اپنی داڑھی ۔۔۔ اپنے حلیے ۔۔۔ نام اور انداز گفتگو سے بڑا ... دھوکا دیتا ہے ۔۔۔ ایسا متقی، پرہیزگار اور صاحب ایمان نظر آتا ہے کہ کسی کا دھیان اس کے کالے کرتوتوں کی طرف جا ہی نہیں سکتا۔"

"تم نے مجھے اس کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔"

"وہ بعد میں ملا تھا ۔۔۔ جب تم اور نادرہ کراچی آ چکے تھے۔" میں نے کہا۔

"اگر وہ تم دونوں کو پہچانتا تھا تو ۔۔۔ پھر اس کے علم میں یہ بھی ہو گا کہ تمھارا وجود اس کے لیے اور اس کے کاروبار کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو چکا ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "اس کے باوجود حاجی عبداللہ نے تمھیں زندہ رکھا ۔۔۔ آخر کیوں؟ اور اس نے باقی لوگوں کو یہ جھوٹا یقین کیوں دلایا کہ ہم سے اب کوئی خطرہ لاحق نہیں رہا ۔۔۔؟"

www.paksociety.com

"شاید وہ باقی سب کو بھی فریب کرنا چاہتا ہے — کہیں یہاں بند کر گیا اور لانچ کو واپس لے گیا —" میں نے کہا۔ "اس امید پر کہ جو پیچھے رہ گئے ہیں، وہ ہماری تلاش میں وہیں پہنچ جائیں گے جہاں لانچ کھڑی تھی — لانچ انھیں وہیں ملے گی — وہ لیے گرفتار ہو جائیں گے جیسے چوہے دان میں چوہا پھنس جاتا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" محسن نے تشویش سے کہا۔ "وہ تو واقعی پکڑ لیے جائیں گے۔"

"اور اسی جگہ لائے جائیں گے —" میں نے کہا۔ "حاجی ہم سب کو اپنی موت آپ مرنے کے لیے اس ویرانے میں چھوڑ جائے گا جہاں کسی کے آنے کا امکان نہیں — وہ خود ہاتھ خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا ہوگا۔"

"تاکہ کہہ سکے کہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" محسن نے تلخی سے کہا۔ "وہ تو سب کو فلاں جگہ چھوڑ آیا تھا — آگے اللہ کی جو مرضی — وہ بھوک کے پیاسے مر گئے اور چیختے چلاتے رہے مگر ان کی مدد کے لیے کوئی نہ آیا تو ظاہر ہے ان کی قضا آ گئی تھی — قضا تو آدمی کو وہیں پہنچا دیتی ہے جہاں فرشتہ اجل کو حکم ہوتا ہے کہ ان کی روح قبض کرے — اور قضا نہ آئی ہو تو سب کچھ ہو جاتا ہے — کوئی بھی وسیلہ بن کے مدد کے لیے پہنچ جاتا ہے — تائید غیبی حاصل ہو جاتی ہے.... کوئی معجزہ ہو جاتا ہے۔"

"ہاں — وہ ایسا ہی آدمی ہے — ایک مذہبی فراڈ — جو اس قسم کی تاویلوں سے اپنے ضمیر کو بھی دھوکا دیتا ہے اور خدا کو بھی، مگر دنیا میں معتبر بنا رہتا ہے —" میں نے کہا۔ "خبیث... شیطان جس نے فرشتے کا روپ دھار لیا ہے — دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے۔"

"ایسے لوگ ہی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں —" اکرام شیخ بولا۔

بولتے بولتے ہم سب تھک گئے تھے لیکن اور ہم کر بھی کیا سکتے تھے — ہمارے جسم توانائی سے محروم تھے اور ہم خالی ہاتھ تھے۔ ہمیں یہاں قید کرنے والوں نے ہمارے تن پر کپڑے چھوڑ کر بڑی مہربانی کی تھی، ورنہ وہ چاہتے تو یہ بھی اتار لیتے — اب میرے حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے تھے اور میری زبان خشک ہو کے اکڑ رہی تھی۔ میرے خیالات کا ارتکاز ختم ہونے لگا تھا — بات کرتے کرتے بار بار مجھے احساس کے سراب متوجہ کر لیتے تھے — ایک بار مجھے یوں لگا جیسے کہیں پانی کی دھار گر رہی ہے۔

"محسن! کیا تو... سن رہا ہے — یہ آواز؟"

"کیسی آواز —؟" وہ بولا۔

"کہیں کوئی نل کھلا رہ گیا ہے — پانی بہہ رہا ہے۔"

"نہیں یار — یہ... یہ تو کچھ ایسی آواز ہے جیسے پتھر کی سنگ چٹان کے درمیان سے پانی کا چشمہ گر رہا ہو۔"

"یہ خیالوں کے سراب ہیں محسن۔"

"ہاں — ابھی مجھے بھی ایسا لگا تھا جیسے کہیں کوئی تنور میں روٹیاں لگا رہا ہے —" اکرام شیخ نے کہا۔ "بڑی سوندھی... اشتہا انگیز اور پاگل کرنے والی خوشبو تھی — گرم گرم.... روٹیوں کی۔"

سب کی کیفیت ایک سی تھی — مجھے ممکن چیزوں کی خوشبو بہکاتی تھی — میرے تصور میں خوشبو دار ابال اٹھتی تھی — اُبلتی کافی کی — مہکتی چائے کی — اعلیٰ قسم کے تمباکو کے دھوئیں کی — مجھے مینو یاد آتے تھے — دال روٹی سے مغلئی اور چینی کھانوں تک سب کی مہک قید تھی۔

"یار... کیا اب رات ہو رہی ہے؟" خاموشی کے بہت طویل وقفے کے بعد اکرام شیخ بولا۔

میں نے چونک کر گھٹنوں پر سے سر اٹھایا — "ہاں، روشن دان بھی غائب ہو گیا ہے۔"

"تم دونوں بھی غائب ہو گئے ہو —" محسن بولا۔ "اندھیرے میں گھل گئے ہو۔"

"اس بند دروازے کے اُدھر کیا ہے؟"

"دروازہ کھول کر دیکھ لو —" محسن نے مجھے مشورہ دیا۔

"کیا..... ہم سب مل کے ایک دروازہ نہیں توڑ سکتے؟"

"میں تو ایک پاپڑ بھی نہیں توڑ سکتا —" اکرام شیخ نے کہا۔

"یار! حد ہو گئی —" میں نے ہنس کے کہا۔ "ہم نے ابھی تک ہمت بھی نہیں ہاری — شاید ادھر کوئی تو ہوگا۔"

"کون ہوگا —؟"

"یار! ادھر بیوی ہے میری —" محسن نے کہا۔ "شلوار سے اور وہ بچے کو دودھ پلا رہی ہے — اسی نے دروازہ بند کر دیا ہے۔"

"دودھ کیا ہوتا ہے —؟" میں نے سوال کیا۔ "دودھ گھڑا دودھ چراغ محفل — دودھ کہتے ہیں دھوئیں کو — تیری بیوی دھواں پلا رہی ہے تیری اولاد کو۔"

"اسموکر ہے وہ باپ کی طرح —" محسن نے کہا۔

"یار — خدا کے لیے حواس بحال رکھو —" اکرام شیخ نے کہا۔ "ہوش سے کام لو — ایسے تو صبح تک تم بالکل ہی پاگل ہو جاؤ گے۔"

میں اور محسن ہنسنے لگے — "سالے تھانے دار — پاگل تھا ہمیں بند کرا دیا جاتا ہے ہمیں —" میں نے کہا — "تو خود پاگل ہے۔"

محسن نے قہقہہ مار کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "پاگل تھانے دار!"

میں نے بیٹھی بیٹھی بھری آواز میں گانے کی کوشش کی — "تھانے دار جی... تھانے.... دار جی — آگ لگ گئی — اور بار جی —"

"سنو —" اکرام شیخ چلایا — "دیکھو کوئی آ رہا ہے — تم جیپ کی آواز سن رہے ہو —؟"

"پاگل تھانے دار —" میں نے نعرہ لگایا۔

"اس کے باپ نے خالی جیپ بھیجی ہے... اس کے سسر نے ٹرک بھیجا ہے پاؤ ڈبے کا — دوسرے ٹرک میں قورمہ ہے — تیسرے میں کباب — اس کا سسر اچھا آدمی ہے — ٹرک میں روٹی لائیں گے۔"

اکرام شیخ ہمیں خاموش کرانے کی کوشش کرتا رہا — ہم اس پر ہنستے ہوئے اور اپنی مضحکہ خیز آوازوں میں اس کا مذاق اڑاتے ہوئے — اس نیم دیوانگی کی کیفیت کے بہت سے اسباب تھے — امونیا گیس کے مضر اثرات — بھوک، پیاس کی نقاہت — تاریکی کے آسیب — سناٹے میں گونجنے والا سمندر کے چنگھاڑنے کا شور — ناامیدی اور بے بسی کا اعصاب کو شکست دینے والا احساس اور موت کے خوف کا سرد بازو جو شکنجے کی طرح دل کو دبا رہا ہے — دبائے جاتا ہے —

یک لخت سراب کے ان گنت سنہریوں کو حقیقت کے ایک اژدہے نے نگل لیا — جیپ کے انجن کی غراہٹ نے ہمیں چپ کرا دیا — جیپ رک گئی تھی — میں اور محسن ایک ساتھ دروازے کی طرف دوڑے۔

"کوئی آیا ہے —" میں نے چیخ کر کہا۔

"کون ہے —؟" محسن نے دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ "کوئی ہے —؟"

باہر کسی نے قفل میں چابی لگائی — پھر کنڈی کھٹاک سے کھلی اور دروازہ اندر کی طرف کھلا تو میں اور محسن پیچھے فرش پر جا گرے۔ پس منظر میں ایک تیز روشنی تھی اور دروازے کے فریم سے حاجی عبداللہ کا بھاری بھرکم اور وسیع و عریض وجود گھور رہا تھا۔

"السلام علیکم.... یا اہل القبور —" حاجی نے بڑی قرات کے ساتھ اور طنزیہ انداز میں کہا۔

"لعنت تجھ پر خدا کی — مردود — شیطان —" میں نے جواب میں کہا — "اور ان پر جو تجھ سے منسوب ہوتے۔"

"عذاب نازل ہو تجھ پر اور تیری آل اولاد پر — دنیا و آخرت میں —" محسن نے میری تقلید کی۔

حاجی کے پیچھے دو آدم خور قسم کے دیوزاد نمودار ہوئے... انھوں نے کندھوں پر بوریاں سی اٹھا رکھی تھیں۔ اس بوجھ کو انھوں نے یوں اتار پھینکا جیسے انھیں پہلے سے ہدایات مل چکی تھیں کہ انھیں کب کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے — معلوم نہیں وہ کس علاقے کے رہنے والے تھے — میں نے تو ان کے ساڑھے چھ فٹ قد — لوہے کے سانچے میں ڈھلے ہوئے بدن اور باڈی بلڈرز جیسے پٹھوں کو دیکھا — ان کے کالے سیاہ چہروں کو دیکھا جن پر غالباً سیاہی مل دی گئی تھی — انھوں نے کمر سے ایک تولیا سا کپڑا لپیٹ رکھا تھا چنانچہ وہ زمانی تاثر بہت مکمل تھا کہ وہ ایسے حبشی غلام نظر آ رہے تھے جو اپنے آقا کی زبان کے سوا کوئی زبان نہ سمجھتے ہوں اور اس کے اشارے کے سوا کچھ نہ سمجھتے ہوں۔ وہ ملانے کو کہے تو مار دیں اور مرنے کا اشارہ کرے تو مر جائیں۔

میرے قریب آ کر گرنے والے غالب اور واجد تھے، میری توقع کے عین مطابق وہ بھی یہاں پہنچ گئے تھے۔

دونوں غلام دروازہ بند کر کے اور ہاتھ اپنے کالی چٹان جیسے سینوں پر باندھ کے دروازے کے قریب کھڑے ہو گئے۔

حاجی عبداللہ نے ہمارے اشتعال انگیز جوابات پر کچھ نہیں کیا تھا — سوائے زور سے کھنکھارنے کے تھوکنے کے —

"بھئی یہ آ گئے تھے تمھیں تلاش کرتے ہوئے —" اس نے کسی سے مخاطب ہوئے بغیر کہا — "ہم نے کہا کہ چلو میاں! ہم تمھیں ملوا دیتے ہیں — بچھڑے ہوؤں کو ملانے کا بڑا... اجر ہے۔"

"تم شیطان کے بندے ہو — وہی اجر دے گا تمھیں ایسے شیطانی اعمال کا —" میں نے کہا۔

"اللہ سے تو امید ہے کہ تمھیں دنیا و عقبیٰ میں اس سے بھی زیادہ ذلیل و خوار کرے گا۔"

"تم لاکھ بُرا چاہو تو کیا ہوتا ہے —" اس نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ "ہم تو میاں توبہ بھی کرتے رہتے ہیں اللہ سے — اور وہ بڑا غفور الرحیم ہے — خیر کہو... کیسی گزر رہی ہے تمہاری احباب کے ساتھ —؟ بہت غرور ہو گیا تھا تم کو اپنی طاقت کا — بڑے بلند بانگ دعوے کرتے پھر رہے تھے، جیسے دنیا میں تمہارا سکہ چلتا ہے... اور خدا کی خدائی سے بڑھ کے چلتا ہے — نعوذ باللہ — شداد کی طرح تم بھی کوئی جنت بنانے کی سوچ رہے تھے — فرعون سے زیادہ رعونت رکھتے تھے اور نمرود سے بڑھ کر سفاکیت کا مظاہرہ کرتے تھے۔"

www.paksociety.com

میں اور محسن ابھی تک غالب اور راجا کی حالت دیکھ رہے تھے چنانچہ اسے ہڑواس کو رنے کا موقع مل گیا — وہ لوقت ذہنی ہماری طرف سے غافل نہیں ہوا — اس نے خود کو دور رکھا اور ایک دیوار اور ہاتھ میں تھامے اس فاصلے کے درمیان کھڑا رہا جو دو... دیواروں کے وسط میں تھا — عین دروازے کے سامنے اور پیچھے دونوں حبشی دیو زاد غلاموں کی جانب پشت کیے —

غالب کی نبض کی رفتار معمول پر تھی اور اس پر بے ہوشی کا اثر ختم ہوتا محسوس ہو رہا تھا مگر راجا کی حالت قدرے ابتر تھی تاہم تشویشناک نہیں تھی — بظاہر ان دونوں کے جسم پر تشدد کے آثار نہیں تھے —

ان کی طرف سے مطمئن ہو کے میں نے حاجی کی طرف دیکھا جو مسلسل بول رہا تھا اور پھر اس طرح جیسے وہ بڑا نیکی کرنے والا اور خدا ترس آدمی ہے۔

"اپنا بھونکنا بند کر — کتے کی اولاد —" میں نے کہا "اور دفع ہو جا یہاں سے — نہ ہماری زندگی اور موت تیرے ہاتھ میں ہے اور نہ تقدیر — جس مرنا ہو گا تو ہم راضی بہ رضا ہیں — تجھ سے رحم کی بھیک مانگنے والے پر لعنت — ہم کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں، یہ ہمارا خدا جانتا ہے — اور وہ نیتوں سے بھی واقف ہے، اس لیے تو الفاظ سے ہمیں اور خود کو دھوکا مت دے۔"

"دیکھو میاں سکندر اعظم —" وہ متاثر ہوئے بغیر اپنی پاٹ دار آواز میں بولا — "اللہ تعالیٰ نے انسان کو نطق اور عقل عطا کی ہے — اسی سے وہ اشرف المخلوقات ہوا — اس عقل کو جذبات کی طغیانی میں بہا دینے سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا — تم کو ابتداً میں چوہدری دلاور سے عناد تھا — ایک ذاتی سبب تھا اس کا جو ہماری سمجھ میں آتا ہے — اس نے تمہارے والد..... اللہ ان کی مغفرت کرے ..."

میں نے اسے ایک ناقابلِ بیان گالی دی — "ان کو تیرے غلیظ لبوں سے کسی دعا کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تاہم — ان کے کاروبار کے وارث بلاشبہ تم تھے" وہ بولا اور اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کے ایک لمبی کریہہ ڈکار لی — "شرفا مرحوم کی جملہ جائیداد منقولہ و غیر منقولہ پر تمہارا حق بنتا تھا — دلاور نے یقیناً محسن کشی ہونے کا ثبوت دیا اور غاصب ہونے کا بھی — تم نے اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہیں کی اور براہ راست اس سے تصادم کی راہ اختیار کی — یہ تمہاری پریشانیوں میں اضافے کا سبب بنا اور تم متعدد قانونی معاملات میں ملوث ہوتے چلے گئے — یہ سب غلط تھا — ہم جانتے ہیں کہ تم کوئی اخلاقی مجرم نہیں ہو — تاہم تم دیکھو کہ تمہارے جذباتی فیصلوں سے کتنے لوگوں کو پریشانی ہوئی۔"

مجھ میں جسمانی طور پر طاقت کا فقدان تھا اور میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ میں حاجی کو مغلوب نہیں کر سکتا — جب وہ خدا کا نام لیتا تھا اور شریعت کی بات کرتا تھا — مذہبی انسان کا لہجہ اختیار کرتا تھا اور علم و دین کے حوالے سے دلائل دیتا تھا تو اشتعال سے میرے جسم کا رُواں رُواں سلگنے لگتا تھا — میں جانتا تھا کہ وہ ایسا عادت اور ضرورت کے تحت کرتا ہے ورنہ کیا وہ خود اپنے بارے میں نہیں جانتا کہ ابلیس کا نام اس جیسے لوگوں کے اعمال سے زندہ ہے —

اس کے باوجود ایک وقت آیا کہ میرے اعصاب جواب دے گئے — اس سے پہلے میں نے سوچا تھا کہ اسے بھونکنے دوں — جواب میں کچھ کہنا بے سود تھا — اسے گالیاں دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور اس پر جھپٹنا لاحاصل — ... مقصد تھا — اس سے بحث بے مصرف تھی اور اس کے خلاف احتجاج بے کار — میں اور محسن خاموش رہنے پر مجبور تھے — اکرم شیخ نے بھی سر کو جنبش دے کر یہی طے کیا تھا کہ سنی ان سنی کر دے —

مگر میرے جذبات ایک ایسی آگ کی طرح تھے جو دبائے تو دبتی ہو اور خاکستر بن رہتے ہوں تو اشتعال کا ایک جھونکا انہیں پھر بھڑکا دیتا ہو — ایسے ہی کسی مشتعل کر دینے والے لمحے شکست کھا کے میں اس پر حملہ آور ہوا — گالیاں میرے منہ سے یوں نکلیں جیسے آتش فشاں سے لاوا ابلتا ہے۔

حاجی کے پیچھے کھڑے ہوئے دونوں غلام ایک دم حرکت میں آئے — ان میں سے ایک نے ہاتھ گھما کے میرے سر پر مارا اور میں گھوم کے الٹی آیا — محسن نے مجھے نہ سنبھالا ہوتا تو میں دیوار سے جا ٹکراتا —

"یہ کیا بے وقوفی کر رہا ہے سکندر —" محسن نے مجھے اپنی گود میں لٹا لیا — مجھے اوپر چھت کسی چکی کے پاٹ کی طرح گھومتی ہوئی محسوس ہوئی — میرے کانوں میں سائیں سائیں ہوتی رہی۔ میرا جسم کانپتا رہا — میرے ہونٹوں سے گالیاں ٹوٹ ٹوٹ کر نکلتی رہیں —

"یار حوصلہ رکھو — بکنے دو سالے کو —" اکرم شیخ نے میرے کان میں سرگوشی کی — اس کا لہجہ بہت دکھی تھا۔

"... ہم تو یہ کہتے ہیں بھئی کہ جانے دو تمہارے بیچ یہ تو فساد کا سبب کوئی بھی نہیں — ہم تو ایک عرصے تک ایک دوسرے کے نام سے بھی آشنا نہیں تھے — اور ملاقات تو خیر حال ہی کی بات ہے —" یہ حاجی کی آواز تھی جو میرے کانوں

تک پہنچ رہی تھی۔

"...... ہمارے کاروباری معاملات میں دخل اندازی کسی طور پر مناسب نہ تھی — میاں ہم اپنا کام کرتے ہیں — ادھر کا مال ادھر پہنچا دیا — مال ادھر کا ادھر — اپنا حق محنت وصول کیا اور اللہ اللہ خیر صلا — اب کون بُرائی کرتا ہے اور کس کے ساتھ کرتا ہے — کیا کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے — اس سے ہمیں سروکار نہیں — بُرائی اس کے اعمال میں لکھی جائے گی، جو بُرائی کرے گا۔"

"پھر تو حاجی صاحب ... آپ بہت سے دوسرے کام بھی کر سکتے ہیں —" محسن بولا۔

"مثلاً — ؟"

"مثلاً یہ کہ اپنی بہو بیٹیوں کو ایک کوٹھا لے دیں — وہاں وہ پیشہ کرنے بیٹھیں تو گناہ گار وہ — جیب آپ کی تو آپ پر حلال —"

میرا دل خوش ہو گیا کیونکہ حاجی کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے متغیر ہو گیا تھا — لیکن وہ بڑا عیار اور مکر و فریب سے پُر انسان تھا جو ناجائز کو جائز اور حرام کو حلال قرار دینے کے فن میں ماہر تھا۔

"تم نے ٹھیک کہا میاں — ہم بھی سمجھتے ہیں کہ بُرا تو کوٹھا ہوتا ہے نہ کوٹھی —" وہ داڑھی پر ہاتھ پھیر کے بولا۔ "سب نیت اور مقصد سے ہوتا ہے — طوائف بھی نہ چاہے تو اسے کون جسم فروشی پر مجبور کر سکتا ہے — بُرائی بھی ایک خود اختیاری فعل ہے —"

"چلیں ایک بات تو بولا آپ نے کہ شیطان کی پیروی آپ اپنی مرضی سے کر رہے ہیں —" محسن بولا۔

"ہم صرف کاروبار کر رہے ہیں میاں — بُرا تم سمجھتے ہو اسے تو یہ تمہاری نظر کا قصور ہے —" وہ بولا — "ہماری طرح کتنے لوگ اسلحہ فروخت کر رہے ہیں — حکومت کا لائسنس ہے ان کے پاس — لیکن کیا وہ ذمہ دار ہیں اس خون خرابے کے — ڈکیتی یا اغوا کی واردات کے جو اس اسلحے کے زور پر کی جائے؟ ایک شخص شکار کے لیے رائفل لے یا ذاتی حفاظت کے لیے پستول — اور بعد میں ڈاکو بن جائے تو اسلحہ فروش کا کیا گناہ — بازار میں چھری چاقو — خنجر کلہاڑی سب فروخت ہوتے ہیں اور عام گھروں میں بھی دستیاب ہیں — ان سے کیا قتل نہیں کیے جاتے —؟ بلکہ شاید اعداد و شمار نکالے جائیں تو خنجر یا کلہاڑی سے کیے جانے والے قتل زیادہ ہوں گے جو دیہات میں ہوتے ہیں — زر، زمین اور زن کے فساد میں جو عورتیں بیوہ ہوئیں یا جو بچے یتیم ہوئے کیا اس کے چھری خنجر کلہاڑی اور ڈنڈے کے بنانے والے اور بیچنے والے ہوں گے؟ کیا یہ گناہ ان کے نامۂ اعمال میں درج ہو گئے — یقیناً نہیں۔ پھر ہمارا کاروبار کیسے ناجائز ہو گیا —؟ میاں، دلاور ہمیں ایک بندوق دیتا ہے — یا اسلحے کا ایک ٹرک بھر کے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کراچی میں فلاں کو پہنچا دو — ہم نے اُجرت لی اور مال پہنچا دیا — دوسرے مال کی طرح — اب فلاں کون ہے — اس سے ہمیں کیا — وہ زید بکر کوئی بھی ہو — ہم کیا پہلے چوہدری دلاور سے کہیں کہ وہ فلاں کی شرافت اور نیک چلنی کا سرٹیفکیٹ دے اور حلف اٹھائے کہ وہ مذکورہ مال سے خلق خدا میں فتنہ و فساد کو عام نہیں کرے گا —"

"او یار حاجی — خدا کے لیے یہ بکواس بند کرو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ — تم ایسی باتوں سے کسے بے وقوف بنانے ہو آخر؟ خود تو تم اتنے بے وقوف ہو نہیں ورنہ یہ سارا.... بدمعاشی کا دھندا کیسے چلاتے — ہمیں بھی بے وقوف سمجھتے تو اتنی تکلیف نہ اٹھاتے ہمارے لیے — اپنی شرافت اور نیک چلنی کے ثبوت تو لے ساتھ لائے ہو تم —" اس نے غالب اور پھر راجا کی طرف اشارہ کیا۔

"تو میاں — اس میں بھی سراسر غلط فہمی ہوئی تمہیں —" اس نے پوری قوت کے ساتھ کہا — "ہم تو سب کی بھلائی کے لیے یہاں آ گئے — تمہارے دوستوں کو بھی لے آئے — یہ تمہارے بغیر بہت بے قرار تھے — یہاں تم کو چین نہیں ہو گا ان کے بغیر — ہم نے کیا بُرا کیا، اگر سب کو اکٹھا کر دیا — اب یہاں تم یہ سمجھو کہ انہیں ہم نے مار لیے یا ان کی بے ہوشی میں ہمارا ہاتھ ہے — تو استغفر اللہ — ہم نے ان کو اسی حالت میں پایا تھا اور ہم سے کہا گیا کہ انہیں فلاں جگہ پہنچا دو، تو ہم نے کہا — بسم اللہ پہنچا دیتے ہیں —"

"ہاں — ڈلیوری کے لیے تو تم ہر وقت تیار ہو" محسن نے اس کی وسیع توند کو گھور کے کہا — "کسی کا بھی ہو — وہ مال —"

"دراصل ... ہم خود بھی چاہتے تھے کہ یہ معاملات طے ہو جائیں — جن میں سب کا نقصان ہو رہا ہے —" وہ خوش دلی سے مسکرایا — "پہلے ایک دلدار چوہدری صاحب .... اپنے چوہدری دلاور نے کوشش کی تھی — اور خاصی معقول پیشکش تھی ان کی ماشاء اللہ، لیکن آپ لوگ مانے نہیں — اب میاں"

www.paksociety.com

وہ کیا کہتے ہیں کہ ہاتھی لڑیں تو پس جاتے ہیں حشرات الارض۔ مطلب یہ کہ ہمارا نقصان ہونے لگا۔ درمیان میں پسنے سے... خواہ مخواہ —"

وہ کچھ دیر کے لیے رکا اور اس نے پلٹ کے ایک غلام سے کچھ کہا — وہ دروازہ کھول کے باہر نکل گیا — میں نے راہداری کی ایک جھلک سی دیکھی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان ہے — راہداری کے آخر میں بھی ایک دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا اور اس میں سے مجھے وہ جیپ نظر آئی جو پورچ میں یا سامنے کے کھلے حصے میں کھڑی ہوئی تھی۔

"اب یہ جاسوسی تو گویا ایک مسئلہ بن گیا میاں محسن!" اس نے پہلی بار محسن کو نام لے کر مخاطب کیا "کاروباری مسائل کو ابھی تم نہیں سمجھتے برخوردار — ہم کیا مال لائیں جب مال کے آگے جانے والے راستے میں تمہارے احباب حائل ہوں — ابھی کچھ عرصہ قبل ایک مال بردار جہاز آپ لوگوں میں سے ہی کسی نے غرق کیا تھا۔"

"وہ تو ان شاء اللہ آئندہ بھی کریں گے —" میں نے قرأت سے جواب دیا۔

حاجی ہنسا — "جزاک اللہ — حسِ مزاح خوب عطا ہوئی ہے تمہیں برخوردار — میاں جیتے تو کچھ کرتے نا۔ یا عالمِ ارواح میں پہنچ کے بھی یونہی فتنہ و فساد پھیلاؤ گے —؟"

"اس کے بعد ہم زیادہ تباہ کن ہو جائیں گے —" میں نے کہا۔ "بھوت بن کے چمٹ جائیں گے تمہاری برادری کو — ایک ایک کو پاگل کتے کی طرح ہلاک کریں گے — ایک جہاز کیا چیز ہے — ہم تمہارا بیڑہ ہی غرق کر دیں گے۔"

"چلو چھوڑو مذاق —" وہ بولا۔ "ہم تو آئے تھے مطلب کی بات کرنے — کہ اب بھی یہ معاملات طے ہو سکتے ہیں، کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر — حال ہی میں ایک تجارتی وفد کے ارکان اس مسئلے پر گفت و شنید کے لیے پہنچے ہیں —"

"اس وفد کی ہم تک رہنمائی کرنے والے آپ کے والد گھوش دادا تو نہیں تھے؟" محسن نے کہا۔ "ہم مل چکے ہیں اس بچے سے — حیرت ہوتی ہے کہ اس نے تم جیسا سپوت کیسے پیدا کیا۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو میاں — ہم تمہاری زبان کی اس غلاظت کو برداشت کر رہے ہیں۔"

"کیونکہ تم غلاظت کی پیداوار.... غلاظت میں رہنے والے اور مجسم غلاظت ہو —" میں نے کہا۔

حاجی بپھر گیا — "ہم سے چوہدری دلاور نے کہا ہے کہ ان سب کو ایک بار پھر سمجھا دو — کہ باز آ جائیں اور اس زندگی کی قدر کریں — خودکشی کو اللہ تبارک تعالیٰ نے حرام موت تعبیر فرمایا ہے — اور جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو وہ صریحاً خودکشی کے مترادف ہے۔ ہم اس جگہ تم سب کو اکٹھا کر رہے ہیں تاکہ سب مل کے کچھ سوچو اور مشورے سے طے کرو کہ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم اس آخری موقع سے فائدہ اٹھاؤ — سوچنے کے لیے تمہیں بہت مہلت ملے گی — جب تک تمہارا دل چاہے سوچو — لیکن اس ہفتے کے اختتام تک طے کر لو — گو سات دن ہیں — خدا نے چاہا تو اس ہفتے کے اختتام تک تمہارے احباب کو بھی یہاں لے آئیں گے۔"

محسن نے قہقہہ مارا — "کہاں کہاں سے پکڑ کر لاؤ گے، وہ تو یہاں سے وہاں تک ہر جگہ موجود ہیں —"

"کہاں .... سے کہاں تک؟" حاجی کا چہرہ ایک سوال بن گیا۔

"جہاں سے بھی تمہارا گزر ہے — ہر راستے پہ وہ تم سے ایسے ملیں گے کہ کھلی آنکھوں سے روزِ روشن میں تمہارے سامنے ہوں گے مگر تم انہیں دیکھ نہ پاؤ گے — ان کی موجودگی کا ثبوت تمہیں ملتا رہے گا — ہر جگہ — تم کیا سمجھتے ہو ہم صرف معدودے افراد ہیں پاگل سے پھرتے —؟ اتنا بڑا کام ہم کیسے کر سکتے؟ کیا یہی آٹھ دس لوگ ہیں جن کے نام تمہارا چوہدری دلاور جانتا ہے — اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ اب ہم بڑی قوت بن گئے — لاہور سے تم کراچی تک آ گئے — تم دیکھنا پھر لگا کہ ہم ہر جگہ تھے — یہاں سے آگے بھی تم دیکھو گے پھر — ہم سمندر میں بھی ملے تھے — صرف ایک جہاز کے ڈوبنے پر ہی تم بدحواس ہو گئے — ابھی دیکھو اور کتنے سفینے ڈوبتے ہیں — تم نے کبھی پوچھا اس غدارِ اعظم چوہدری دلاور سے کہ ہم نے کتنے اسلحہ خانے اب تک تباہ کیے ہیں — کتنے ٹرک جو اسلحے سے بھرے ہوئے تھے، اغوا کیے اور تباہ کر دیے — ہم اپنے دشمن کو پہچانتے ہیں — ایک حصے میں تو دلاور کے ساتھی ہیں — دوسرے درمیان کے لوگ ہیں — تم جیسے تیسرے گھوش دادا کی طرف ہیں — ہم سے کوئی چھپا ہوا نہیں اور جو چھپا ہوا ہے وہ بھی کب تک چھپا رہے گا — سمندروں سے آگے بھی ہم ہیں — تم کس کس کو خریدو گے، کس کس سے سودا کرو گے؟ — یہ تو ہزاروں کی بات ہے — ہزاروں کفن بردوش وطن پرست مجاہدوں میں سے صرف ایک کو خریدنے کے لیے بھی وہ سب دولت ناکافی ہے جو تم نے تمہارے باپ چوہدری دلاور نے اکٹھی کی ہے — تم کیا سودا

کرو گے ہم سے؟"

میرا دل چاہا کہ بے اختیار محسن کا منہ چوم لوں — اس نے ہم سب کے جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا تھا — ایک ایسے وقت میں جب کہ ہم اس قابل نہ تھے — یہی نہیں — اس نے تو اپنی ذہانت سے کام لیتے ہوئے حاجی عبداللہ کے مصنوعی اعتماد کی بنیادیں ہلا دی تھیں — اسے اپنے اعتماد سے پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا — یہ پریشانی اس کی صورت پر اس کی خباثت سے زیادہ نمایاں ہو گئی تھی —

چونکہ حاجی سن رہا تھا اس لیے محسن بولتا رہا اور اس نے جو منہ میں آیا کہا مگر بے ربط نہیں کہا اور بے مقصد نہیں کہا — وہ حاجی کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ ہم واقعی یہاں سے وہاں تک ہیں اور ہمارے ساتھی، مددگار اور حامی ہزاروں ہیں جو ان کی تباہی کے مشن میں آئندہ بھی سرگرمِ عمل رہیں گے — ہمارے زندہ رہنے یا نہ رہنے سے معاملات طے نہیں ہوں گے —

اسی وقت حبشی لوٹ آیا — اس کے ہاتھ میں دو بنڈل تھے اور ایک بالٹی تھی —

"لو میاں — ہم تو خیر سگالی کے جذبات کا یوں اظہار کرتے ہیں کہ —" اس نے ایک بنڈل زمین پر رکھ کے ہماری طرف دھکیل دیا — "اس میں کچھ اشیائے خورد و نوش ہیں... اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان افہام و تفہیم کا جذبہ پیدا کرے — ہم نے سب کچھ فراہم کرنے کی کوشش کی ہے —"

"کیا تم رازق اور رزاق ہونے کا دعویٰ کر رہے ہو؟"

"استغفراللہ — ہم تو بس وسیلہ ہیں —" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا — "اس میں سگریٹ اور کافی.... اور ادویات وغیرہ ہیں — اور یہ پانی ہے — خوراک کا یہ ذخیرہ تمہیں ہفتہ بھر چل جانا چاہیے — اس کے بعد فی امان اللہ — ہم سے شاید اس وارداتی میں ملاقات نہ ہو —"

"یہ بالٹی ذرا آگے رکھوا دیں —" محسن نے کہا۔ "یا مجھے اجازت دیں کہ میں ......"

"ہاں میاں — جاؤ — بہ شوق سے پانی — پیاس لگی ہو گی سب کو — انہیں بھی پلاؤ —" حاجی نے محسن کے عاجزانہ اندازِ گفتگو سے متاثر ہو کے کہا۔

محسن آہستہ آہستہ آگے بڑھا — اس نے پانی کی بالٹی اٹھائی — میری اور اکرام شیخ کی نظر بھی اس پہ تھی اور خود حاجی عبداللہ بھی زیادہ چوکنا نظر آنے لگا تھا — اس نے ریوالور کو بالکل تیار کر لیا تھا اور اپنے گرگوں کو بھی اشارے سے کچھ سمجھا دیا تھا۔ وہ بھی اپنی خون آشامی کا مظاہرہ کرنے کے لیے مستعد ہو گئے تھے۔

میرا خیال پہلے یہ تھا کہ محسن مجھے موقع فراہم کرنا چاہے گا کہ حاجی کی نظر چوکے تو میں اس پہ جست لگا دوں اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لوں — مگر ایک تو حاجی کسی طرف سے بھی غافل نہیں تھا — دوسرے مجھ میں جست لگانے کی تو کیا... اٹھنے کی بھی ہمت نہیں تھی — مجھے یقین تھا کہ ٹھنڈے شفاف پانی کا نظارہ بھی میری نظر کی پیاس بجھا سکتا ہے — یہ پانی نہیں آبِ حیات تھا جس کا ایک گھونٹ مجھے ہی نہیں ہم سب کو زندگی کی نوید دے سکتا تھا کیونکہ ہم سب کی حالت اس مسافر سے بدتر تھی جو بے آب و گیاہ صحرا کے بیابان سفر میں کئی دن پیاسا رہا ہو۔

جب محسن نے بالٹی اٹھائی تو میرا خیال بدل گیا — شاید وہ بالٹی اٹھا کے پانی حاجی پر پھینک دے گا — اس کے منہ پہ اچھال دے گا — لمحے بھی چوکے گا اور اس کے اسلحے کو بھی بیکار کر دے گا — میں محسن کو پہلے سے خبردار کرنا چاہتا تھا کہ وہ ایسا نہ کرے — یہ آسان کام نہیں تھا — بالٹی کو اوپر اٹھانے... دوسرے ہاتھ سے تھامنے — اس کا رخ حاجی کی طرف کرنے اور پھر پانی اس پہ پھینکنے کا عمل انتہائی تیز رفتاری سے کیا جاتا تب بھی اس میں دس سیکنڈ تو صرف ہوتے — اس کے برعکس صرف ایک سیکنڈ میں حاجی عبداللہ ٹریگر دبا دیتا اور دوسرا سیکنڈ شروع ہونے سے پہلے گولی یقیناً محسن کے دل میں جگہ بنا لیتی — اپنی موجودہ حالت میں محسن اس تیز رفتاری پر قادر بھی نہیں تھا۔

چنانچہ مجھے بڑی طمانیت آمیز مسرت اور فخر آمیز سکون کے جذبات نے قہقہہ لگانے پہ مجبور کر دیا جب محسن نے بڑے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ پانی کی بالٹی کو وہیں فرش پہ الٹ کے خالی کر دیا — اور جب پانی اس فرش کی مٹی میں جذب ہونے لگا تو محسن نے اس پہ تھوک دیا اور اس کے بعد دھیرے دھیرے چلتا ہوا لوٹ آیا —

"اللہ مجھے معاف کرے —" محسن نے کہا۔ "پانی اس کی نعمت ہے جس کی میں نے تحقیر کی — مگر وہ جانتا ہے کہ میری نیت تمہارے خیر سگالی کے جذبات کی تحقیر کے سوا کچھ نہ تھی — حاجی عبداللہ — اگر یہ گناہ اتنا بڑا نہ ہوتا تو میں اس پہ پیشاب کر دیتا —" محسن نے زمین پر رکھے ہوئے بنڈل کی طرف اشارہ کیا — "لیکن یہ رزق ہے جس کی تذلیل میں نہیں کر سکتا — تم سمجھو کہ میں نے حلال نہ سہی — اصطبل خانہ ایسا ہی کیا — اب تم اسے لے جاؤ یا چھوڑ جاؤ — تمہاری مرضی — ہفتہ کیا مہینے بھر بعد بھی تم

www.paksociety.com

آؤ گے نا تو یہ سامانِ خورد و نوش ——— تمھاری خیرات میں ملنے والے سگریٹ اور کافی سب اسی جگہ ایسے ہی پڑے ہوئے ہوں گے ——— ممکن ہے ساتھ ہی ہماری لاشیں بھی پڑی ہوں ——— مگر حاجی ——— اس کو اچھی طرح دیکھ کر جاؤ ——— اس خوراک کے ذخیرے میں سے ایک ذرہ کم نہ ہو گا۔"

احساسِ تذلیل سے حاجی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس پر جنون سوار ہو گیا تو وہ ہم سب کو ایک ہی بار میں ختم کر دے گا ——— اس کا ریوالور ہم پر خالی ہو جائے گا تب بھی اس کا اشتعال باقی رہے گا۔

لیکن حاجی میں غیرت کا جذبہ بہت پہلے کمزور پڑ چکا تھا۔ عزتِ نفس اور محبت کے اعلیٰ جذبات کا تعلق آدمی کی اپنی زندگی اور اس کی شخصیت کے ہر رنگ سے ہوتا ہے ——— جو شخص ذاتی اصولوں، اخلاقی قدروں، کاروبار اور معمولاتِ حیات میں بے غیرتی قبول کرتا ہو وہ عزت و وقت کو فنا کر لیتا، کا مسئلہ کیسے بنا سکتا ہے۔ نہ وہ عزت سے جی سکتا ہے اور نہ عزت کے لیے مر سکتا ہے چنانچہ حاجی نے خود پر قابو پایا اور اپنی بے غیرت مسکراہٹ سے یہی یہ تاثر دینے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ کتنا متحمل مزاج ہے۔

"میاں ——— تم نے بہت چاہا کہ ہم طیش میں آ جائیں مگر برخوردار ——— ہم نے بھی یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ ہم تم جیسے بچوں کے کھیل سمجھتے ہیں ——— تمھارا دل مرنے کو چاہتا ہے تو ہم تمھیں کیسے روک سکتے ہیں ——— ہم جانتے ہیں مگر تمھیں بتانا ضروری ہے کہ ہم کیا پیغام لائے تھے۔"

"تمھارے لیے ضروری ہے تو بکو ——— ویسے ہم سننا بھی نہیں چاہتے پاجی کی اولاد ——— " میں نے کہا ——— "اپنا نام بدل لے حاجی عبداللہ ——— پاجی عبدالشیطان ولد ابو ابلیس رکھ لے۔"

"بس یا کچھ اور ——— ؟" اس نے خون آشام نظروں سے مجھے گھور کے اور خون کے گھونٹ پی کر کہا۔ "ہم یہ ایک چیز یہاں چھوڑ کے جائیں گے ——— " اس نے اپنی جیب میں سے ایک چھوٹا پاکٹ سائز ریڈیو نکالا اور زمین پر رکھ دیا ....

"انشاءاللہ تمھارے باقی ماندہ دوست بھی تم سے آ ملیں گے ——— ان میں خواتین بھی ہوں گی۔"

"ماشاءاللہ ——— آپ کی تو بیٹیاں جوان ہی ہوں گی۔ ضرور بھیجیے ——— ہم تنہا لوگ ہیں ——— " میں نے کہا۔

"تمھاری یہ زبان ہم انگاروں سے جلا دیتے ——— " اس نے پھر سرخ ہو کے کہا ——— "تمھارے حلق میں اتنی ہی گولیاں اتار دیتے جتنی اس ریوالور میں ہیں ——— لیکن ..."

"لیکن ہم بے غیرت ہیں اور ہمیں پیسہ زیادہ عزیز ہے" میں نے جملہ مکمل کیا۔

"..... ہم مفاہمت اور مصالحت کے لیے آئے تھے۔ ہماری طرف سے اور دوسروں کی طرف سے پیش کش بہت واضح ہے ——— تم سب اکٹھا ہو جانے کے بعد سوچ لو کہ تمھیں کہاں جانا ہے ——— تمھیں وہیں پہنچا دیا جائے گا ——— اس دنیا میں کہیں یا پھر دوسری دنیا میں ——— تم جتنا مانگو گے دیا جائے گا بشرطیکہ رقم ایک ارب سے زیادہ نہ ہو۔"

وہ اپنی بات جلد از جلد ختم کر کے نکل جانا چاہتا تھا چنانچہ اس نے جیب میں سے ایک کاغذ نکالا۔ "اس پر سارا نقشہ اور تمام تفصیلات لکھی ہوئی ہیں۔"

محسن نے اسے کاغذ کے استعمال کے بارے میں ایک خاصا عام فہم مگر گندہ مشورہ دیا۔

"یہ ریڈیو نہیں ——— ٹرانسمیٹر ہے ——— اس کے ذریعے جب چاہو ہم سے بات کر سکتے ہو ——— لیکن نہ کچھ اور سن سکتے ہو نہ کسی اور کے لیے کوئی پیغام نشر کر سکتے ہو ——— " اس نے پیچھے جھک کر ریڈیو اٹھایا ——— ابھی وہ سیدھا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کے پیچھے ایک دھماکا ہوا۔

یہ دھماکا نہیں تھا ——— کسی نے دروازے کو باہر سے ٹھوکر لگائی تھی مگر اس کی آواز خالی کمرے کے سکوت میں اسی طرح گونجی ——— حاجی ایک دم چونک کے پلٹا ——— اس کے دونوں محافظ بھی بے اختیار دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ جسم کا ایک فطری اور غیر ارادی ردِ عمل تھا۔

میں نے اس ایک لمحے میں وہ قوت کہاں سے حاصل کی جس نے مجھے ایک جست میں اٹھا کے پیروں پر کھڑا کر دیا اور حاجی عبداللہ تک پہنچا دیا ——— اس کا جواب میں آج بھی نہیں دے سکتا ——— میرا خیال کوئی معنی نہیں رکھتا ——— یہ ایک آفاقی حقیقت ہے کہ زندگی کو موت کے روبرو پا کے ہر ذی روح مقابلے کے لیے جسم میں پوشیدہ توانائی کے اس ذخیرے کو بروئے کار لاتا ہے جو قدرت نے ایسے ہی مواقع کے لیے رکھا ہے۔ یہ بیزور ازلی ہے تو آپ بھی شیر بن کے حملہ کرتی ہے اور آدمی وہ کر گزرتا ہے جس کی وہ اپنی ذات سے توقع بھی نہیں رکھتا ——— وہ پھر جن بن جاتا ہے اس کے لیے میڈیکل سائنس کی باقاعدہ وضاحت ہے جس کو پیش کرنا یہاں غیر ضروری ہے۔ میں اسے تائیدِ ایزدی کہنا پسند کروں گا ———

اس تائیدِ ایزدی نے مجھے حاجی پر بھرپور حملے کے قابل

کیا اور اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کے خود حفاظتی کے لیے کچھ کر پاتا میں نے کراٹے میں اپنی مہارت کا صرف ایک ہی مظاہرہ کیا۔ وہ کسی کٹے ہوئے درخت کے تنے کی طرح فرش پر گرا تو اس کے ہاتھ سے چھوٹنے والا ریوالور پھسل کر دور گیا ——— میں نے محسن اور اکرام شیخ کو ایک ساتھ اس کی طرف لپکتے دیکھا اکرام شیخ نسبتاً قریب تھا ——— وہ ریوالور حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔

"بس ——— " اس نے چیخ کر کہا "رک جاؤ ——— "

یہ آخری الفاظ اس نے ایک غلام سے کہے تھے جو اتنی دیر میں بہت آگے بڑھ چکا تھا ——— جب گولی چلنے کی سنسناہٹ ہوئی تو میرا دل خوشی سے بھر گیا ——— معلوم نہیں کیسے ایک بار پھر پانسا پلٹ گیا تھا۔

"مار دے ——— اسے بھی مار دے ——— " یہ محسن کی آواز تھی جو میں نے سنی۔

پہلا غلام ایک بھیانک چیخ مار کے زمین پر گر چکا تھا اور کسی خونخوار درندے کی طرح حلق سے بھیانک آوازیں نکال رہا تھا۔ اکرام کی چلائی ہوئی گولی کہیں اس کے گھٹنے پر لگی تھی کیونکہ اس کا چہرہ بھی لہولہان تھا اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ نوچ رہا تھا۔ جیسے اس طرح وہ اپنی اذیت کو نوچ کر پھینک دینا چاہتا ہے جو کسی ظالم شیطان نما خونی کیکڑے کی طرح اس کے چہرے پر پنجے گاڑ چکی ہو۔

اب میں بہتر پوزیشن میں تھا اور دیکھ سکتا تھا کہ مجموعی طور پر صورتِ حال پوری طرح ہمارے قبضے میں ہے ... دوسرا غلام دیو زاد اکرام شیخ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب اس نے اپنے ساتھی کو گرتے اور موت کے کرب میں چلاتے دیکھا ——— اس کا رخ محسن کی طرف تھا چنانچہ محسن نے اکرام شیخ سے کہا تھا کہ اسے بھی ختم کر دے تو یہ مطالبہ جائز اور بروقت تھا۔ محسن یقیناً اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ جسمانی طاقت میں اس گوریلے کا مقابلہ کر سکتا ——— جو اپنے ہاتھ پھیلائے اس کو گھیرتا ہوا دیوار کی طرف لے جا رہا تھا ——— پل بھر کے توقف کے بعد وہ پھر محسن کی طرف بڑھا اور اس نے اپنے لمبے مضبوط بازو آگے بڑھائے ——— وہ محسن کی گردن کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لینا چاہتا تھا ——— محسن پیچھے ہٹنے کی کوشش میں دیوار سے جا لگا تھا اور اس کے لیے دونوں جانب سے نکلنا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا ہزیمت سے پسپا ہونا ——— چنانچہ اس نے اکرام شیخ ... کو آواز دیتے ہوئے خود کو بچانے کی آخری کوشش یہ کی کہ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ پیچھے سرک گیا۔

محسن کا اچانک بیٹھ جانا اس کے لیے زندگی کی ضمانت بن گیا ——— اس نے اپنی گردن کو اس انسان نما بن مانس کے قاتل پنجوں سے بچا لیا ——— محسن نے خود کو اس گولی سے بھی بچا لیا جو اکرام شیخ نے اسے بچانے کے لیے چلائی تھی ——— گولی کا نشانہ اس گوریلے کا سر تھا مگر تھوڑے سے فرق کے باعث یہ گولی اس کی گردن کی پشت پر لگی اور گردن کے سامنے والے حصے میں سوراخ کرتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی۔

یہ اکرام شیخ کی غیر ارادی غلطی تھی ——— اس نے محسن کی آواز پر گھوم کے فائر کیا تھا۔ سوچنے کی مہلت ملتی تو وہ سر کے بجائے کمر کا نشانہ لیتا ——— گلے میں سوراخ کر کے پار ہو جانے والی گولی محسن کو بھی لگ سکتی تھی ——— اگر وہ گوریلے کے بازوؤں کی قید سے نکلنے کے لیے خود بار کے نیچے نہ ہو جاتا۔

دوسرے غلام کا سر گولی کی ضرب سے دیوار پر لگا۔ پھر وہ ایک لرزہ خیز چیخ مار کے واپس آیا اور کمر کے بل فرش پر گرا ——— اس کے دونوں ہاتھ اب اپنی ہی گردن پر تھے جو خون کا فوارہ اس کے حلق سے چھوٹا تھا اس کی دھار محسن پر گری جو دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

اب میں دروازے کی طرف بڑھا "یہ ... یہ کون تھا یار ——— جس نے باہر سے ٹھوکر لگائی تھی ؟"

اکرام شیخ ابھی تک سکتے کی سی حالت میں کھڑا ہوا تھا اور دونوں دم توڑتے ہوئے غلاموں کی آخری پُر اذیت آوازیں سن رہا تھا ——— وہ کسی زخمی درندے کی طرح تڑپتے ہوئے اور فرش پر لوٹتے ہوئے لہو کو ہر طرف پھیلا رہے تھے مگر اب ان کے جسم میں قوت کا سرچشمہ خشک ہونے لگا تھا ——— وہ ایک ہی جگہ پر الٹے پڑے ہوئے نزع کی کیفیت میں پل رہے تھے اور نزع کے کرب میں موت کی انگڑائیاں لے رہے تھے ——— اب میں دیکھ سکتا تھا کہ پہلی گولی نے اپنے شکار کے جبڑے میں سوراخ کیا تھا اور شاید اوپر تالو سے گزر کے دماغ میں گھس گئی تھی ——— وہ اپنے منہ سے خون اگل رہا تھا ———

میں نے دروازہ بجایا ——— اس پر اپنے دونوں ہاتھ مارے اور چلایا ——— "کوئی ہے ؟"

"آخر ایسا کس نے کیا تھا ——— ؟" محسن نے اپنی قمیص اتار کے چہرے سے خون صاف کیا ——— اس نے ایک ابکائی لی۔

"ایک نامرد ہی تو باہر ہماری اتنی بے ——— " میں نے کہا اور دروازے کو ہلانے کی کوشش کی مگر وہ بہت مضبوطی

www.paksociety.com

سے جا ہوا تھا ۔۔۔ میں نے اس پر جھکتے ہوئے اور پھر ملایا ۔ "کوئی ہے باہر ۔۔۔؟"

"باہر کوئی ہوتا تو ضرور جواب دیتا۔" اکرام شیخ نے ایک گہرا سانس لے کر کہا اور ریوالور کو جیب میں رکھ لیا۔ "اور نازو یہاں کیسے پہنچ سکتی ہے۔"

"مگر یار ۔۔۔ کسی نے تو کنڈی لگائی ہی تھی ۔۔۔ وہ جن بھوت تو ہو نہیں سکتے۔"

"یا رب ۔۔۔۔ اس خون کی بو مجھے پاگل کر دے گی۔" محسن نے ایک کونے میں قے کی اور اپنی قمیص کو دیوانہ وار منہ پر رگڑنے لگا۔

اسی وقت حاجی اٹھ بیٹھا ۔۔۔ اس کی زبان اب بند تھی لیکن اس کی آنکھیں اب بھی بول رہی تھیں ۔۔۔ میں ایک دم پلٹا اور میں نے چند قدم دوڑ کے اس کے سر پر ایسے کک ماری جیسے وہ سر نہیں تھا فٹ بال تھی اور میں وہ تیر تھا جیسے ایک پنیلٹی کک تھی۔

حاجی بلبلایا ۔۔۔ "یا اللہ" ۔۔۔ اور زمین پر لڑھک گیا۔

"ابلیس کو یاد کر۔" میں نے اسے ایک گندی گالی دی۔ "جس کے راستے پر تو چلتا رہا ۔۔۔ اور یہاں تک پہنچا ۔ ابھی تک بھونک رہا ہے کتے؟"

"میں ۔۔۔ میاں ۔۔۔ میں نے کیا کیا ہے۔" وہ فرش پر پڑا ہوا اینٹھ رہا تھا اور اس کا پیٹ کسی مشک کی طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا۔

"تو اب بھی بھونک رہا ہے ۔۔۔ اپنی آنکھوں سے۔" ہم نے پے در پے اس کی پسلیوں میں ٹھوکریں ماریں۔

"ہاں ۔۔۔" وہ بری طرح بلبلایا ۔ "میں ۔۔۔۔ مر جاؤں گا۔"

"اتنی آسانی سے نہیں مرے گا تو ۔۔۔ تیری جان تو میں قطرہ قطرہ نچوڑوں گا ۔۔۔ تیرے اس حرام گوشت کا ریشہ ریشہ الگ کروں گا ۔۔۔ پھر تیری ہڈیوں کے ٹکڑے کروں گا۔" میں نے دیوانہ وار اسے مارنا جاری رکھا۔ پھر میں تھک کے گر پڑا ۔۔۔ میرے جسم کی رہی سہی توانائی ختم ہو چکی تھی۔

"کیا ۔۔۔ کسی نے گولی چلنے کی آواز بھی نہیں سنی؟" اکرام شیخ نے الجھن سے کہا۔

"اس پر سائیلنسر چڑھا تھا۔" محسن نے کہا۔ "سننے والا کوئی ہے بھی نہیں ۔۔۔ شاید وہ اسی کا کوئی ساتھی تھا ۔۔۔ اسے ہم سے ہمدردی تھی یا حاجی سے دشمنی ۔۔۔ کہ وہ کنڈی لگا کے بھاگ گیا ۔۔۔ وہ اندر نہیں آ سکتا تھا۔"

"حاجی اپنے دشمن کے ساتھ یہاں آتا؟"

"میرا مطلب تھا ۔۔۔ کوئی وفادار ۔۔۔ جس کے دل میں کسی بات پر عناد تھا ۔۔۔ کوئی کینہ پرور جو دل ہی دل میں کڑھتا رہا ہو موقع کے انتظار میں تھا۔" محسن بولا۔

مگر اسی وقت کنڈی کھٹاک سے کھلی ۔۔۔ ہم ایک ساتھ گھوم گئے ۔۔۔ دروازہ اب بھی بند تھا۔ میں پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے اکرام شیخ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے ریوالور دوبارہ ہاتھ میں رکھتے ہوئے اقرار میں سر ہلایا جو اشارہ تھا کہ آگے بڑھو ۔۔۔ میں تمہارے پیچھے ہوں ۔۔۔ میں بڑا محتاط ہوتے ہوئے چند قدمی کی اور پھر ... لات مار کر دروازہ کھول دیا۔

کوریڈور خالی پڑا تھا ۔۔۔ اس کے بعد والا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا اور میں بالکل آخر تک دیکھ سکتا تھا۔ پہلے میں نے ایک جیپ دیکھی تھی وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اور اکرام شیخ آگے پیچھے باہر تک آ گئے۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" میں نے باہر آ کے کہا۔

"کنڈی کیا خود بخود بند ہوئی اور خود بخود کھل گئی۔ یہ تو مجھے جادو لگتا ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "کنڈی ریموٹ کنٹرولڈ تو نہیں ہو سکتی۔"

"اور جن بھوت معمولی جیسے معاملات میں کیوں دلچسپی لینے لگے۔"

وہ کوریڈور بہت مختصر تھا۔ اس میں دونوں جانب دو دو دروازے تھے۔ آخری یعنی پانچواں دروازہ بائیں جانب کھلتا تھا جس میں سے مجھے دور تک پھیلے ہوئے سمندری نباتات نظر آ رہے تھے ۔۔۔ یہ آبی پودے بہت گھنے تھے اور ان کے درمیان کہیں کہیں جھلک دکھلاتا پانی یہ ظاہر کرتا تھا کہ ان پودوں کے نیچے یہ دلدل جیسی زمین ہو گی ۔۔۔ اس سمندری جنگل سے پہلے ریت کی خشک پٹی تھی اور پھر ایک پتلی سی سڑک جس کے دوسرے کنارے پر بھی پٹی تھی ۔۔۔ خشک اور بکھری ۔۔۔ ہوا نے اس ریت کو سڑک پر بھی پھیلا دیا تھا۔ جیپ شاید اسی سڑک پر نظر آئی تھی مگر اب وہاں تاحد نگاہ کوئی نہ تھا ۔۔۔ سڑک کو میں نے دائیں اور بائیں جانب ایک کالی لکیر کی طرح پھیلا ہوا دیکھا۔

"یہ سینڈز پٹ کا آخری حصہ ہے۔" اکرام شیخ نے بالآخر اعلان کیا۔ "یہ کوئی ہٹ ہے۔"

مجھے اب ان ہٹس کی ایک قطار نظر آ رہی تھی جو ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔ "یہ جگہ شہر سے کتنی دور ہے؟"

"شہر کے کس مقام سے؟" اکرام شیخ نے کہا۔ "شہر کسی ایک جگہ کا نام تو نہیں ہے۔"

"ہمارے گھر سے کیا فاصلہ ہو گا؟"

"شاید دس میل ۔۔۔ کیونکہ ہم اسی طرف والے حصے میں ہیں ۔۔۔ شہر کا دوسرا حصہ تیس میل کے فاصلے پر بھی ہو گا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ وہ کسی سے بڑھ کر کراچی کے جغرافیے کو جانتا تھا اور فاصلوں کے بارے میں اس کے فیصلے کو چیلنج کرنا میرے لیے محال تھا۔

"اب فوراً یہاں سے نکلنے کی کرنی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "یہ بعد میں سوچیں گے کہ وہ فرشتۂ غیب کون تھا ۔۔ جس نے ہمیں ... میں بنیادی کردار ادا کیا۔"

"یہاں سے پیدل ہی جانا پڑے گا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "ممکن ہے آگے کسی ہٹ میں کوئی رات گزارنے آیا ہو۔ ہمیں کچھ کھانے پینے کو مل جائے۔"

"کھانے کو حاجی کے پاس ہے ۔۔۔ اب وہ ہم پر حرام نہیں رہا۔" میں نے کہا۔

"اب کیا ہو گیا ہے؟"

"پہلے وہ دشمن کی خیرات تھی ۔۔۔ اب مال غنیمت ہے۔ وہ حق ہے جو ہم نے لڑ کے حاصل کیا ہے ۔۔۔ مال غنیمت حلال ہوتا ہے۔"

"میرا دل نہیں چاہتا ۔۔۔ جو کچھ محسن نے کہا تھا۔"

"اس وقت حالات مختلف تھے ۔۔۔ ہم اپنی عزت نفس کے بدلے اس کی خیرات قبول نہیں کر سکتے تھے ۔۔۔ ورنہ وہ تو خدا کا دیا ہوا رزق ہے ۔۔۔ پاک صاف اور زندگی بخش۔" میں نے کہا۔ "اسے ٹھکرانا اب کفران نعمت ہو گا۔"

ہم واپس ہوئے ۔۔۔ واپسی پر میں نے سیدھے ہاتھ کا ایک دروازہ کھول کے اندر جھانکا۔ اندر گھپ اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا ۔۔۔ پھر میں نے بائیں طرف دیکھا ۔۔۔ وہ بھی کسی ویران مزار کی طرح تاریک تھا۔ اگلے دونوں دروازے بھی ہاتھ لگاتے ہی کھل گئے ۔۔۔ اگر وہاں روشنی ہوتی تو ہم تفصیل سے جائزہ لیتے۔ بالکل بے خیالی میں آخری دروازے سے اندر جھانک کے میں پلٹا ہی تھا کہ کسی نے دروازے کی اوٹ سے ٹانگ اڑائی اور میں ایک دم منہ کے بل گر گیا۔

اکرام شیخ نے یہی سمجھا تھا کہ میں ٹھوکر کھا کے گرا ہوں ۔۔۔ وہ مجھے اٹھانے کے لیے جھکا ۔۔۔ اسی وقت آواز آئی ۔۔۔

"ہینڈز اپ .... بھنا رول دوں گا۔"

اکرام شیخ اچھل پڑا اور اس نے سوچے سمجھے بغیر ریوالور گرا دیا ۔۔۔ پھر اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا ۔۔۔ میں بھی اتنی دیر میں کھڑا ہو گیا تھا۔

"لڑکی ہی ہے۔" میں نے جلا بھنا فقرہ کہا اور اسے اندھیرے میں سے باہر کھینچ لیا۔ "باہر نکل۔"

اکرام شیخ کا خوف، غصے، خوشی اور حیرانی سے برا حال ہو گیا۔ "اتنی دیر سے پریشان کر رکھا ہے۔" وہ جھینپ کر بے بسی سے بولا۔

نازو کا ہنستے ہنستے برا حال ہو رہا تھا ۔۔۔ اس نے خشک لکڑی کا ڈنڈا اندر پھینک دیا۔ "دونوں بہت ہوشیار ہو بھئی ۔۔۔ مان گئے۔"

"مجھے تو شک تھا ۔۔۔" میں نے کہا۔

محسن دروازے میں لالٹین کے ساتھ نمودار ہوا۔ "مجھے یقین تھا۔"

"اور میں نے تو کہا تھا ۔۔۔" اکرام شیخ بولا۔

"چلو چھوڑو۔" نازو بولی۔ "اب تو جن بھوت کے سب لیکن اتنی دیر سے میں سن رہی ہوں ۔۔۔ کسی نے نام لے کے پکارا مجھے ۔۔۔؟"

اکرام شیخ نے اسے بے اختیار گلے لگا لیا۔ "مجھے تو اپنی شرمندہ کر دیا تو نے۔"

"ہم شرمندہ نہیں ہو سکتے۔" محسن نے اعلان کیا۔ "کیونکہ ہم سب بے شرم لوگ ہیں۔"

"میں تو شرم سے واٹر واٹر ہو رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ ہم زندگی کے لیے ایک عورت ہمیں زیر بار احسان کرے۔"

"پھر کیا ہمیں ڈوب مرنا چاہیے؟" محسن بولا۔

"ابھی بھی کیا جلدی یار ۔۔۔" میں نے کہا۔ "پہلے تو یہاں سے نکلنے کی سوچو ۔۔۔ پھر ڈوبنے یا ڈبونے کی بات کریں گے۔"

"ہاں ۔۔۔ غالب سے بھی پوچھ لیں گے۔" محسن بولا۔ "وہ ابھی بے ہوش ہے۔"

www.paksociety.com

"ابھی تو ڈوب سکتا ہے ــــ بعد میں کہہ دوں گا کہ میں اکیلا نہیں ڈوبوں گا ــــ وہ شعر پڑھے گا ــــ کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم... تم کو بھی لے ڈوبیں گے ــ" میں نے کہا اور نازو نے احتجاجاً انداز میں مارچ کیا تو میں اور محسن ایک ساتھ ہنسے۔

یہ زندگی کی خوشی تھی اور موت کے منہ سے بچ نکلنے کا اطمینان تھا جس نے ہمیں طاقت بھی عطا کر دی تھی اور اس بھوک پیاس کے احساس کو بھی مٹا دیا تھا جس کی شدت نے ہمارے حواس مختل کر رکھے تھے۔

اندر کا نقشہ دیکھ کے نازو ٹھٹکی ــــ وہ ٹیکسی ڈرائیور کی وردی میں تھی اور اگرچہ بالوں کو اس نے حسب سابق اپنی کیپ کے اندر محصور کر دیا تھا مگر پھر بھی اس کی نسوانیت کا تاثر حسن یوں چھلکا پڑتا تھا کہ... کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے ــــ حاجی کی عقل تو اسے دیکھ کر ہی خبط ہو گئی تھی۔

نازو نے فرش پہ پھیلے ہوئے خون کو دیکھا اور پھر دو سیاہ فام دیو زادوں کی لاشوں کو ــــ ویران کمرا اس پورٹیبل سرچ لائٹ کی روشنی میں زیادہ بھیانک نظر آنے لگا تھا ــــ یہ بحری جہازوں پر استعمال ہونے والی واٹر پروف قسم کی بھاری بھرکم لائٹ تھی جسے طوفان اور بارش میں بھی روشن رکھا جا سکتا تھا اور سگنل دینے کے لیے لہرایا جا سکتا تھا۔

غالب ہوش میں آ چکا تھا اور وحشت زدہ نظروں سے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے ــــ روشنی میں چمک دینے والے منجمد خون کے سرخ رنگ کو دیکھ رہا تھا اور ان لاشوں کو دیکھ رہا تھا جن کے درمیان وہ خود بھی لیٹا ہوا تھا پھر اس کی نظر ہم پر رکی اور وہ چند سیکنڈ پلک جھپکائے بغیر نازو کو دیکھتا رہا۔

"آ گیا ہوش مرزا غالب کے نواسے؟" محسن نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کے کہا۔

"اب ہوش کا سامان جمع ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

غالب اٹھ بیٹھا اور اپنے سر کو دبانے لگا ــ نازو اس کے پاس بیٹھ گئی ــ "ایسے کیا دیکھے جا رہے ہو ــ کیا دکھ رہے ہو؟"

"میں...؟" غالب نے کراہ کے کہا۔ "جدھر دیکھتا ہوں... ادھر تو ہی تو ہے ــ"

"ہاں ــ مثلاً یہ ــ" میں نے ایک سیاہ فام کی طرف اشارہ کیا۔ "پھر دوسرے کی طرف ــ اور یہ ــ" میں نے حاجی کی طرف دیکھ کے کہا جو گوشت کا ایک بدوضع ڈھیر لگ رہا تھا۔ "یہ سب نازو کی طرح ہی تو ہیں ــ"

"چلو اٹھو" نازو نے غالب کا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ غالب کی حالت پہ اس کی آنکھوں میں دل کا درد اتر آیا ہے ــــ وہ ہم سب کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اور کسی کی بات کی پروا نہ کرتے ہوئے اس سے ہمدردی کر رہی تھی ــ غالب نے اس کے ہاتھ کو آہستہ سے تھپکا اور مسکرایا۔

"کیا یہ لڑکی سچ مچ غالب سے اتنی محبت کرنے لگی ہے؟" میں نے حیرت، مسرت اور طمانیت کے ساتھ سوچا۔ بالکل پیار کیا تو ڈرنا کیا والی ــــ اسے نہ ہمارا خیال ہے نہ بھائی کی موجودگی کا۔

"میں ٹھیک ہوں ــ" غالب نے کہا اور راجا کو دیکھا جو ابھی تک ویسے ہی ساکت پڑا ہوا تھا۔

"نازو ــــ تم آئی کیسے تھی؟" اکرام شیخ بولا۔

"تمہاری ٹیکسی میں ــ" وہ بولی۔ "اسے میں نے پیچھے چھوڑ دیا تھا ــــ باقی راستہ پیدل چل کے یہاں تک آئی تو مجھے پھر وہ جیپ نظر آ گئی ــــ تم چل کے باقی باتیں بتاؤں گی ــــ کہ یہاں تک میں پہنچی تو کیسے؟"

"اب وہ جیپ کہاں ہے؟"

نازو نے ہاتھ سے اس سمت میں اشارہ کیا جدھر سمندری نباتات نے دلدل سی بنا دی تھی ــ "اس میں غرق ہو گئی ــ"

"لیکن ــــ ہم نے تو کوئی آواز نہیں سنی تھی... جیپ کے چلنے کی ــ" میں نے کہا۔

"میں نے اسے اسٹارٹ نہیں کیا تھا۔" وہ بولی۔ "نیوٹرل گیئر میں ڈال کے چھوڑ دیا تھا ــــ جیپ یہاں ڈھلان پہ کھڑی ہوئی تھی ــــ ہینڈ بریک چھوڑتے ہی الٹی دائیں طرف سڑک کے پار دلدل کے پانی میں اتر گئی ــــ جھاڑیوں کے بیچ چلی گئی ــ"

"اچھا اب تو جا ــــ اپنی ٹیکسی لے آ۔" اکرام شیخ نے کہا ــــ "کتنی دور ہے یہاں سے؟"

"ہو گی کوئی دو فرلانگ دور ــ" نازو بولی۔ "کیا میں اکیلی جاؤں؟"

"آئی بھی تو اکیلی تھی ــ" اکرام شیخ نے کہا۔ "تب ڈر نہیں لگا تھا؟"

مجھے بڑی حیرت اور خوشی ہوئی جب غالب کھڑا ہو گیا ــ "میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ ــــ چلو۔"

نازو نے تھوڑے سے تذبذب کا مظاہرہ کیا ــــ ایک نظر بھائی کی طرف دیکھا اور پھر سر ہلا دیا ــــ اس نے پلٹ کے دروازے کی طرف چلنا شروع کیا تو غالب یوں آگے بڑھا جیسے پیچھے وہ نازو کا محافظ بن کے جا رہا ہے ــــ اس کے قدم ذرا نہیں لڑکھڑائے اور اس کی چال پر اعتماد رہی۔

محبت آدمی کی کتنی بڑی طاقت بن جاتی ہے ــ میں نے انہیں باہر رات کے اندھیرے میں دو سایوں کی طرح گم ہوتے دیکھ کر سوچا ــــ نہ میں نے اور نہ محسن نے اس رفاقت پر کوئی تبصرہ کیا البتہ اکرام شیخ نے کسی ردعمل کا اظہار کیا۔ "اب کیوں نہ ہم اتنی دیر میں کچھ پیٹ پوجا کر لیں؟"

میں نے بنڈل کھولتے ہوئے کہا ــ "حاجی عبداللہ صاحب اپنے خلوص اور محبت کے ساتھ ہماری دعوت کے لیے کتنی دور آئے تھے۔"

اکرام شیخ نے وہ پاکٹ ٹرانسمیٹر اٹھایا اور اس کی ساخت پر غور کرنے لگا ــ "اب یہ حاجی صاحب کے کام آئے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا ــ "ان کے کام کوئی نہیں آئے گا۔"

"چلے راجا کو کچھ دو یار ــ" اکرام شیخ نے کہا۔

اس پیکٹ میں جو گتے کا خاصا بڑا کارٹن تھا... بہت کچھ تھا ــــ بلاشبہ حاجی نے ہمارے لیے آخری طعام کا انتظام کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا مگر بیشتر چیزیں ہم ابھی نہیں کھا سکتے تھے ــ مسلسل فاقے کے بعد ہمارے معدے کی حالت پتلی تھی ــــ ہم لوگ مرغن کھانے پر ٹوٹ پڑتے تو فوری ری ایکشن ہوتا اور شاید ہم جتنا کھاتے وہ سب الٹی کر دیتے ــــ میں نے احتیاط کے ساتھ بسکٹوں کا ایک پیکٹ کھولا اور پھر وہ تھرموس جس میں کافی ابھی تک گرم تھی ــــ ایک بسکٹ کو کترتے ہوئے میں نے سارا ڈبہ نگل جانے کی خواہش کو بے مہار نہیں ہونے دیا لیکن کافی کی مہک نے میری قوت ارادی کو خاصی زک پہنچائی ــــ میں نے ایک گھونٹ بھر لیا ــــ پھر مجھے اپنی خود غرضانہ خواہش پر شرم آ گئی۔

میں کافی کا مگ لے کر راجا کے پاس پہنچا ــــ میں نے اور اکرام شیخ نے خاصی کوشش کے بعد اس کے حلق سے چند گھونٹ گرم کافی کے اتار دیے ــــ اس کا حلق یقیناً جلا ہو گا مگر یہ علاج فوری طور پہ کارگر ثابت ہوا۔ چند منٹ میں راجا نے آنکھیں کھول دیں ــــ محسن اس عرصے میں حاجی سے مخاطب رہا اور اسے دہشت زدہ کرنے کا فریضہ بخوبی سرانجام دیتا رہا ــــ ریوالور اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا چنانچہ ہم بالکل بے فکر ہو گئے تھے۔

"تم نے دیکھا حاجی ــــ یہ قدرت کے فیصلے میں دخل دینے کا نتیجہ ہے کہ اب تم وہاں ہو جہاں ہم تھے ــ" محسن کہہ رہا تھا۔ "تم نے سوچا تھا کہ ہمیں یہاں چھوڑ کے واپس لوٹ جاؤ گے مگر قدرت نے اس کے بالکل برعکس طے کر رکھا تھا ــــ چنانچہ اب ہم چلے جائیں گے اور تم یہاں بالکل اکیلے رہ جاؤ گے ــــ ہم تو تین تھے اور دوست تھے ــــ خدا کی ذات پر پورا بھروسا رکھتے تھے کہ وہ ضرور مدد کرے گا ــــ تم شیطان سے واقف ہو ــــ وہ ایسے ہی مرواتا ہے اور ایسی جگہ لے جا کر مارتا ہے جہاں کوئی ساتھ دینے والا نہ ہو ــــ ابھی تم دیکھنا ــــ تمہارا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جائے گا کیونکہ یہ لائٹ تو ہم لیے جائیں گے ــــ تمہیں اندھیرے میں سایہ کہاں ملے گا... ہاں یہ دو لاشیں ضرور ہوں گی تمہارے ساتھ ــــ انہی سے باتیں کرنا ــــ زندگی میں یہ تم سے خوف زدہ رہتے تھے لگتے کہ تمہارے اشارے پہ مر گئے مگر حکم سے سرتابی کی جرأت نہ کر سکے ــــ مرنے کے بعد تم ان سے کیسے ڈر سکتے ہو... اور یہ تمہیں کیسے ڈرا سکتے ہیں ــــ لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم انہی کے خوف سے مر جاؤ گے ــــ بھوک پیاس سے نہیں مرو گے ــــ تمہارے جسم پہ کتنی چربی ہے ــــ ایک ہفتہ تو ہو گی ــــ یہ چربی تمہیں خاصا سہارا دے سکتی ہے ــــ تم کھاتے رہتے اور یہ چربی بطور ذخیرہ توانائی استعمال کرتے رہتے مگر تم جیسا بھاری بھرکم آدمی بھوک ذرا مشکل سے ہی برداشت کرتا ہے ــــ لیکن بڑے پیٹ کے جہنم میں جتنا ایندھن ڈالو کم ہو گا ــــ کل تک یہ خون بو دینے لگے گا ــــ سڑنے لگے گا ــــ پھر یہ لاشیں چوبیس گھنٹے میں خراب ہوں گی تو ان کے پیٹ پھول جائیں گے ــــ اڑتالیس گھنٹے کے اندر ان کے پیٹ پھٹ جائیں گے اور ساری آلائش باہر آ جائے گی ــــ اس کی بو کیسی ہو گی ــــ اس کا تم ابھی اندازہ نہیں کر سکتے ــــ اگر تم ہوش میں رہے تو دیکھو گے کہ لاشوں میں کیڑے کلبلا رہے ہیں اور گوشت گل رہا ہے...."

حاجی بت بنا سب سن رہا تھا ــــ وہ جانتا تھا کہ ہم سے کچھ کہنا، رحم مانگنا یا رعایت طلب کرنا بے سود ہے ــــ محسن کی باتوں نے اس کا رہا سہا حوصلہ ختم کر دیا ــــ وہ ایک دم

www.paksociety.com

بلبلایا اور دو بار چیخیں مار کے رونے لگا —
"یا اللہ — میرے گناہ معاف کر دے۔" وہ چلّایا۔
"ارے حاجی — تم یہ کیا کر رہے ہو —" محسن بولا۔
"کیسے گناہ اور کس کے گناہ — تم نے کیا کیا تھا یہاں آنے کے بعد — کہ تم توبہ کی اور خیر سگالی کے جذبات سے مغلوب ہو کے آ گئے ہو — تم نے آتے وقت سلام بھی کیا تھا یہیں — ہم جاتے وقت سلام کا جواب دیں گے۔"

میں اور اکرام شیخ اس کی کوشش سے لطف اندوز ہو رہے تھے — آہستہ آہستہ بسکٹ کھا رہے تھے اور ایک ہی گھونٹ سے باری باری کافی کے گھونٹ بھر رہے تھے — اس سُست رفتار عمل نے جانے جسم میں توانائی کو رفتہ رفتہ بحال کرنا شروع کیا۔ پھر میں نے ایک سگریٹ جلائی اور خود محسن کی جگہ جا بیٹھا —

"حاجی — تم ہمارے ساتھ جانا چاہتے ہو تو اس کی چند شرائط ہیں —" میں نے کہا۔
"وہ کیا شرائط ہیں —؟" حاجی نے روتے ہوئے کہا۔ اس حالت میں وہ بہت مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔
"ایک تو یہ کہ تم ہمیں اپنا ٹھکانا بتا دو۔" میں نے کہا
"میرا یہاں کوئی ٹھکانا نہیں ہے —"
"اچھا تو وہ ٹھکانا بتا دو جہاں تم مال پہنچاتے تھے۔"
"وہ بھی مجھے معلوم نہیں — کراچی پہنچتے ہی کوئی ٹرک اپنے چارج میں لے لیتا تھا — اور کہیں لے جاتا تھا۔" وہ بولا — "ٹرک کوئی اور واپس لاہور پہنچاتا تھا —"
"بہت خوب — کتنے بے خبر اور معصوم آدمی ہو تم —"
"آدمی نہیں — معصوم گدھے — بے خبر سُؤر —" محسن بولا۔
"یہاں کس نے بھیجا تھا تمہیں —؟" میں نے کہا — "ایک ادب رسیلے کی پیش کش کے ساتھ — اس شرائط نامے کے ساتھ — ہمارے دو ساتھیوں کو تمہارے حوالے کس نے کیا تھا —؟ تم کو بہت کچھ بتانا ہوگا حاجی — ایک ایک سوالوں کے جواب دو گے تو اپنی ایک جان بچا سکو گے — تم کبھی تھانے گئے ہو —؟"
"لا ... لاحول ولا قوۃ —"
"کبھی سی آئی اے کی تحویل میں رہے ہو —؟" میں نے کہا
"خدا نہ کرے —"
"شاہی قلعے کا ٹارچر سیل دیکھا ہے —؟ اس کے بارے میں سنا تو ضرور ہوگا —؟" میں نے کہا — "فرض کرو تم کو اس سے زیادہ پُرعذاب جگہ پہنچا دیا جائے —؟"
"ایسی کون سی جگہ ہے —؟" وہ سہم کے بولا۔
"ایم آر ایس کا تفتیشی مرکز —" میں نے کہا "وہاں سے ہم ایک سو ایک غلط سوال بھی کریں گے تو تم ایک سو دو جواب دو گے — قبر سے تمہارا ڈھانچہ نکال کے لایا جائے تو وہ بھی بولنے لگا۔"

باہر ایک کار رکنے کی آواز آئی — "نازو آ گئی —" اکرام شیخ نے کہا — "اب کیا کرنا ہے —؟"
"تم لوگ واپس جاؤ —" میں نے کہا۔
"اور تم —؟"
"میں صبح تک یہیں ہوں —" میں نے کہا — "باقی سب لوگوں کو گھر چھوڑ دو اور تم اکیلے ٹیکسی سے واپس آ جاؤ — ہم اس گناہ کی بوری کو ڈھو کے لے جائیں گے —"
"کہاں لے جائیں گے —؟"
"یہ بعد میں طے کریں گے —" میں نے کہا — "ابھی رات کا وقت ہے اور اندھیرا ہے — تم لوگ بحفاظت گھر پہنچ سکتے ہو — سب کے کپڑوں پہ — یا جہاں بھی خون کے داغ ہیں — وہ اس وقت نظر نہیں آئیں گے —"

کسی بات پہ نازو کھل کھلا کر ہنسی — پھر غالب بھی ہنسا اور وہ دونوں اندر آ گئے — غالب نے بھی تھوڑا بہت کھایا پیا — پھر وہ مجھے حاجی کے ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ جاتے وقت انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور ... ایک کونے میں رکھ دی۔

"ہاں جی —" میں نے حاجی کا ایک ہاتھ تھام کے کہا — "پھر کیا خیال ہے —" میں نے اس کی ایک انگلی کو آہستہ سے جھٹکا دیا۔

حاجی نے چیخ ماری — اس کی انگلی کی ہڈی درمیان سے ٹوٹ گئی تھی — "یا اللہ — ان جلّادوں سے بچا لے مجھے —" وہ ہاتھ کو زور زور سے جھٹکنے لگا۔
"جلّاد — ہم جلّاد ہیں —" میں نے اس کا ہاتھ پھر پکڑ لیا اور اس نے تھوڑی سی زور آزمائی کی تو میں نے کھڑے ہو کے اسے یوں کھینچا کہ وہ زمین سے اوپر اٹھ گیا۔ میں نے اس کا بازو اپنے گھٹنے پر تھوڑا سا اوپر اٹھا کے رکھا اور پھر جھٹکا دیا تو کہنی سے اوپر بازو کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی اور حاجی پلٹ کے دوسری طرف جا گرا۔ وہ اب درد سے تڑپ رہا تھا اور بُری طرح بلبلا رہا تھا۔

دوسری بار میں نے اس کا دوسرا بازو توڑا۔
"تم نے دیکھا حاجی — وقت کتنی جلدی بدل گیا اور تمہارے لیے دنیا میں اعمال کی سزا کا دن آ پہنچا —" میں نے کہا۔
حاجی بُری طرح چیخ رہا تھا — اس کے دونوں بازو ناکارہ ہو کے لٹک رہے تھے اور وہ انہیں سنبھالنے کی بے سود کوشش میں مصروف تھا۔
"ہائے اللہ — میری توبہ — میاں جی معاف کر دو — خدا اور رسول کا واسطہ تمہیں — ہم سے غلطی ہو گئی — جرم ہوا — گناہ ہوا — ہم بہت گناہگار ہیں —"
"تمہارے گناہوں کی سزا کا وقت ابھی نہیں آیا — تمہارے جرائم کی سزا بھی تمہیں قانون ہی دے سکتا ہے —" میں نے کہا — "میں تو صرف اپنے معاملات طے کر رہا ہوں — تم معاملات طے کرنے آئے تھے نا —؟ تمہارا اپنا طریقہ کار تھا — میرا طریقہ یہی ہے — چند شرائط تم نے میرے سامنے رکھی تھیں — میں نے بھی چند شرائط رکھی ہیں۔ مگر میری طرف سے تمہیں ایک ہفتے کی مہلت نہیں مل سکتی — ابھی اور اسی وقت میرے سوالات کے جواب دو تو تم اذیت موت سے بچ سکتے ہو، ورنہ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے — کیا تم یہ جانتے ہو کہ انسان کے جسم میں کل کتنی ہڈیاں ہوتی ہیں؟ غالباً — دو سو چھ ہیں یا دو سو چالیس — ان سب کو دو پہ تقسیم کرنے سے کیا حاصل ہوگا —؟ تمہارا ایک عبرت آموز وجود —" میں نے اس کا ایک ٹوٹا ہوا ہاتھ تھام لیا اور آہستہ سے جھٹکا دیا — وہ چیخ مار کے اچھلا۔
"اے میں مر گیا — ظالم — شقی القلب ....."
میں نے اس ہاتھ کی دو انگلیاں پہلے توڑ دی تھیں۔
اب میں نے تیسری انگلی توڑ دی — "یہ بڑا مؤثر طریقہ ہے جو ابھی ہماری پولیس نے بھی اختیار نہیں کیا — دراصل ان کو جواب بھی دینا پڑ جاتا ہے کہ ٹوٹ پھوٹ کیسے ہوئی — ہمیں جواب کسی کو نہیں دینا اس لیے ہم سب کچھ کر سکتے ہیں — اور یہ حقیقت ہے کہ پولیس کے تھانے، سی آئی اے کے ٹارچر سیل اور شاہی قلعے کے عقوبت خانوں میں کسی ملزم کے ساتھ اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتا جو ہم کسی ملزم کے ساتھ کرتے ہیں — اب یا تو وہ مر جاتا ہے — مر جائے تو ہم اس کی لاش کے ٹکڑے کتوں کو ڈال دیتے ہیں — ہڈیاں تک باقی نہ رہیں تو سُراغ کیا —؟"
حاجی اپنا ہاتھ چھڑا بھی نہیں سکتا تھا اور اس کا بیل کی طرح ڈکرانا مجھ پر بالکل اثر نہیں کر رہا تھا — میں اپنے سوال دہراتا رہا اور اس کی ایک ایک انگلی توڑتا رہا۔ مگر وہ عجیب آدمی تھا کہ چیختا دہاڑتا رہا — تڑپتا رہا — خدا رسول کے واسطے دے کر رحم کی بھیک مانگتا رہا اور اپنے ساتھ مجھے بھی گالیاں دیتا رہا مگر اس نے کسی سوال کے جواب میں کوئی کام کی بات نہیں بتائی — اس کی ضد نے میرے اشتعال کو ہوا دی — میں نے اس کے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں بھی توڑ دیں — پھر وہ بے ہوش ہو گیا — اس نے اتنی اذیت برداشت کر لی — یہی کمال تھا۔
اکرام شیخ تقریباً دو گھنٹے بعد لوٹ کر آیا۔
"اسے کیا ہوا —؟" وہ فرش پہ پڑے ہوئے حاجی کو دیکھ کر بولا۔
"کچھ نہیں — میں ذرا تفتیش کر رہا تھا۔"
"کوئی کام کی بات معلوم ہوئی —؟"
میں نے نفی میں سر ہلایا — "اب اس کا کیا کریں؟"
"میرا تو خیال ہے کہ کہیں چھوڑ جائیں اسے —" شیخ نے کہا۔
"ہاں — مجھے لگتا ہے کہ یہ کچھ نہیں بتائے گا — بلاوجہ اس لاش کو اٹھائے پھرنے سے کوئی فائدہ نہیں —" میں نے کہا — "یہ دونوں طرف سے ڈرتا ہے — اگر بتا دیتا ہے تو ولاور اینڈ کمپنی الگ سزا دے گی — گھوش دادا یا ... اس سے بدتر سزا دے گی — اس کے کاروبار اور خاندان کا نام و نشان تک مٹ جائے گا —"
"دوسروں کے لیے — اور خود اس کے لیے — باقی زندگی میں اب کیا رہ گیا ہے —؟" شیخ نے کہا۔
"وہ آئیں اور اسے ہمارا جواب سمجھ کے لے جائیں —"
"تو وہ ٹرانسمیٹر لایا ہے؟"
"ہاں — وہ تو میری جیب میں ہی ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔
"ادھر لا — مجھے دے —" میں نے کہا۔
اکرام شیخ نے ٹرانسمیٹر میرے حوالے کر دیا — میں نے اس کو غور سے دیکھا لیکن اس کی بناوٹ میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی — اس میں صرف ایک ہی بٹن تھا — میں نے اسے دبا کے آن کیا — اس کے چھوٹے سے اسپیکر میں سے کھڑکھڑ سنائی دینے لگی۔
"ہیلو ... ہیلو —" میں نے کہا۔
"ہیلو —" اسپیکر سے ایک اجنبی آواز سنائی دی — "جو کچھ تم کو کہنا ہے کہہ دو —"

www.paksociety.com

"تم کون بول رہے ہو؟" میں نے کہا مگر دوسری طرف خاموشی رہی۔

"میرا خیال ہے کہ دوسری طرف سے کوئی بھی بات نہیں کر رہا ہے اصاب کو فی جواب نہیں ملے گا۔" شیخ نے کہا۔

میں سمجھ گیا۔ ہماری آواز کے سگنل کو ریسیو کرتے ہی کہیں کوئی ٹیپ ریکارڈر آن ہو گیا تھا اور اس کے ٹیپ پر ایک جواب پہلے سے ریکارڈ تھا جو ہمیں سنا دیا گیا تھا۔ باہر اس قسم کے فون عام ہیں جن میں آپ اسی طرح کیسٹ فٹ کر کے جا سکتے ہیں۔ آپ کی عدم موجودگی میں جیسے ہی کوئی کال آئے گی، ٹیپ چل پڑے گی۔ ٹیپ پر آپ اپنا یا کسی کی آواز میں کوئی بھی جواب ریکارڈ کر کے چھوڑ سکتے ہیں مثلاً کال کرنے والے کو اس قسم کا جواب مل سکتا ہے کہ آپ سات بجے کے بعد کال کیجیے یا کوئی پیغام ہے تو ریکارڈ کرا دیجیے۔ اپنا نام اور پتا یا فون نمبر بھی دے دیجیے۔ یا یہ کہ آپ اس وقت فلاں نمبر پر ان سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں جہاں وہ ڈنر پر کسی کے ساتھ شریک ہیں۔

یہ بھی جواب دینے والی مشین تھی۔ اس قسم کے ٹیلی فون آنسرنگ مشین کہلاتے ہیں۔

"پیغام یہ ہے کہ ہم نے ساری شرائط منظور کر لی ہیں اور ہم سے فوراً رابطہ قائم کیا جائے۔" میں نے کہا۔

"اتنا کافی ہے۔" شیخ نے کہا۔

میں نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ "وہ آواز تو پہچان ہی لیں گے۔"

"بس اب نکلنے میں دیر کرنا خطرناک ہو گا۔" شیخ بولا۔ "کیا پتا وہ قریب ہی کسی ہٹ میں موجود ہوں۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا اور ہم ہر چیز کو جوں کا توں چھوڑ کر باہر آ گئے۔ صرف ٹرانسمیٹر کو میں نے اپنے ساتھ ہی رکھا کیونکہ یہ فریق ثانی سے پھر رابطے میں معاون ثابت ہو سکتا تھا۔

اکرام شیخ کی ٹیکسی دیوار کی اوٹ میں کھڑی ہوئی تھی۔ واپسی پر اس نے دوسرا نسبتاً لمبا راستہ اختیار کیا اور ہم ٹیکسی میں جیسے نکل گئے۔ یہ سڑک بڑے پیچ و خم کے بعد منوڑہ کے جزیرے تک پہنچتی تھی۔ مشکل صرف یہ تھی کہ اس راستے نیوی کے جوان چیک پوسٹ پر آنے جانے والی گاڑیوں کے نمبر نوٹ کرتے تھے اور یہ بات اکرام شیخ کو معلوم تھی اور نہ مجھے۔ تقریباً پونے گھنٹے بعد واپس آنا پڑا۔ چیک پوسٹ والوں نے بتایا کہ دن میں یہ گاڑیاں پاس کے ساتھ اندر جا سکتی ہیں مگر انھیں واپسی پر چیک آؤٹ کرنا پڑتا ہے۔ رات کے وقت ٹیکسی کی اجازت تو بالکل نہیں دی جا سکتی۔ عام پبلک کے لیے کیماڑی کی طرف سے سمندری راستہ تھا۔

واپس آتے ہوئے میں نے افق پر صبح کے ستارے کو روشن دیکھا۔ میں نے راحیلہ کو یاد کیا جس کی محبت کا نقش میرے دل میں زمانہ روشن تھا لیکن اس کا تصور میرے احساس کے لیے ایک سوال بن گیا تھا۔ کہاں ہو گی؟ محصور ہو گی یا جاگ رہی ہو گی؟ کسی کے ساتھ ہو گی یا میرے خیال کے ساتھ؟... درد کا ایک تسلسل تھا جو بکھرنے والا خیال نہیں، وہ سب مجبوری تھا جو مصلحت کے تحت بولا گیا تھا۔ وہ سب وفاداریاں تھیں، کیا؟ وہ کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ میری ہے اور میری ہی رہے گی۔

"کس سوچ میں گم ہو بھائی؟" شیخ نے ٹیکسی کو ایک جھٹکے کے ساتھ روک لیا۔ "سامنے دیکھو کیا ہو رہا ہے۔"

میں نے چونک کے دیکھا۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ حالات کو دیکھتے ہوئے پہنچ گئے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"ابھی ایک کار رکی ہے، دو شخص باہر نکلے ہیں اور انھوں نے اس ہٹ کا رخ کیا ہے۔"

"پھر کیا کرنا ہے یہاں رک کے؟" میں نے کہا۔

"اور کیا کریں؟ اسی طرح ان کے سامنے سے گزر جائیں تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ لیں۔" شیخ نے طنز کیا۔

"ہم تو انھیں دیکھ ہی سکتے ہیں اگر کوشش کریں۔" میں نے کہا۔

"کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔" شیخ نے کہا اور ساتھ اترتے ہی ہم نے سمندر کے ساحل کی طرف ریت پر دوڑنا شروع کیا۔ ہم اس جگہ سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر تھے۔ آدھا فاصلہ طے کر کے رفتار کم کی اور ساحل سے ہٹ کے پھر ویران ہٹس کی آڑ میں آگے بڑھنے لگے۔

"میں نہیں سمجھتا کہ وہ زیادہ دور نہیں ہو سکتے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "اتنے چھوٹے ٹرانسمیٹر کی رینج زیادہ نہیں ہو سکتی۔"

"یہ بھی اچھا ہوا اکرام نے واپسی کے لیے سیدھا راستہ اختیار کیا ورنہ وہ ہمیں راستے میں ہی روک لیتے۔ منوڑہ کی طرف جانے اور لوٹنے میں بھی قدرت کی مصلحت پوشیدہ تھی۔"

"اس مصلحت کو سمجھنے کے لیے خدا نے مجھے عقل عطا کی۔"

"ایسے دعوے مت کرو، کہیں پھر نہ پکڑے جاؤ۔" میں نے کہا۔

"میں نے واپسی پر ... جس نے تجربہ ... کا مشورہ دیا تھا۔" وہ بولا۔

اب ہم اسی ہٹ کے عقب میں پہنچ گئے تھے مگر ... تھی۔ میں نے سامنے والے حصے سے ایک کار کے روانہ ہونے کی ... سنی۔ میرے دوڑ کے سامنے آنے تک کار دور جا چکی تھی۔ اس کی ... جھلک ہی دیکھی۔ پھر بھی مجھے شک گزرا کہ یہ وہی گاڑی تھی۔ کار کا نمبر یا رنگ تو دیکھا ہی نہیں جا سکتا تھا لیکن گاڑی کی ساخت کچھ واضح تھی۔

"وہ واپس کر رہے گئے؟" میں نے کہا۔

"کیا چاہتے تھے ... مار گئے؟ ہمیں اندر جھانک کر دیکھنا تو چاہیے۔"

میں نے کہا۔

اس بار اس نے کچھ خوف سے راستہ تلاش کیا۔ مگر ادھر سامنے کھڑکی اور دروازے بند تھے۔ پھر میں نے ہٹ کے دائیں جانب اور اکرام شیخ نے بائیں جانب چلنا شروع کیا۔ ایک کمرے کا دروازہ ... کیا جہاں کھڑکی ... ہوا اس کی کلی ... نکل گیا تھا یا ... کوئی ضرورت منداپنی ہٹ میں گھسنے کے لیے نکال لے گیا تھا۔ اس غلطی سے اکرام شیخ اندر پہنچا اور پھر کمرے کی تاریکی سے گزر کر دروازے تک۔ راہداری میں کھلنے والے دروازے کے پٹ کسی نے بند نہیں کیے تھے۔ اس سے جھانک کر دیکھنے پر مجھے باہر اور اندر صرف خاموشی اور تاریکی محسوس ہوئی۔

اکرام شیخ کو اپنے پیچھے پا کے میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے آگے جانے کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔ ریوالور شیخ کے ہاتھ میں تھا اور میں اس سے دو قدم پیچھے کسی بھی حملہ آور سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ صرف لاشیں چھوڑ گئے تھے اور ان کا ... میں نے ماچس سے تیلی جلا کے دیکھا تو مجھے ہر چیز ویسی ہی دکھائی دی جیسی گھنٹا بھر پہلے تھی۔ فرش پر ... کھانے پینے کی اشیاء کا ڈھیر اور ... بالکل ویسے ہی پڑی تھی۔ صرف ... کا جسم اٹھا لیا گیا تھا۔

ہم ... اور خالی سڑک پر پیدل چلتے ہوئے پھر ٹیکسی تک پہنچے۔

"کیا جانے سے پہلے ہم انھیں کوئی اور پیغام نہیں دے سکتے؟"

اکرام شیخ نے کہا۔ "ہماری تو یہ ٹرانسمیٹر بے کار ہو جائے گا۔"

"کیوں بے کار ہو جائے گا؟"

"اس لیے کہ پیغام موصول کرنے والا اس علاقے تک ایک میل کے اندر کہیں موجود تھا۔ شاید ابھی ہو۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "مجھے ... یہاں سے نکل جائیں گے اور وہ بھی بے مقصد تو نہیں بیٹھے رہیں گے۔"

میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔ "اور کیا کہنا ہے؟"

"اب مجھے دو ٹرانسمیٹر۔" اکرام شیخ نے کہا اور ٹرانسمیٹر کو کان سے لگا کے بولنے لگا۔ "ہیلو۔"

ایک بار پھر دوسری طرف سے ٹیپ نے جواب دہرایا۔ "اب پیغام ہے ... ہمارا جواب ہے ... اگر ... کوشش کی گئی تو ... واپس لے جایا جائے گا۔ ... افسوس ... پھر ... کے لوگ ... ۔ دیگر شرائط کا جواب یہ ہے کہ ہم سب اکٹھے ہی زندہ ہیں اور یہاں ... سکتے ... لیکن اسی وطن کی مٹی میں دفن ہونے کے لیے۔ زندگی کے لیے ہم یہ وطن قبول نہیں کر سکتے۔ خدا کی تائید پر ہمیں پہلے بھی بھروسا تھا اور آئندہ بھی کوئی ناکامی ہمارے یقین کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ ہم آزاد ہیں اور ہمارا وطن بھی چند غداروں کی کوشش سے آزادی سے محروم نہیں ہو سکتا۔ آخری شرط خسرو خورشید کی تھی۔ اسے ہم خود چھوڑ دیں گے لیکن اس وقت جب ہم سے کیے گئے معاہدے کی تکمیل ہو جائے گی۔ اس کے بعد وہ تمہارے پاس آئے، کہیں نا ... جائے یا جہنم میں۔ ہمیں سروکار نہیں۔ ہم چودھری دلاور اور سراج ... عبداللہ اور گھمنڈی ... اور ایسے وطن دشمنوں تک سب کو چیلنج کر چکے ہیں اور اب ہماری طاقت پہلے سے بڑھ گئی ہے اور یہ حق کی قوت ہے جسے باطل کبھی شکست نہیں دے سکتا۔ فقط ایم آر ایس۔"

"جوش خطابت میں آپ زیادہ ہی بول گئے مگر..." میں نے کہا۔

"اب چلیے۔"

"کہاں چلیے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ راستہ کھلا ملے گا آپ کو؟"

اکرام شیخ نے ٹرانسمیٹر جیب میں رکھ لیا۔ "وہ منتظر ہوں گے، دیکھ کر ہم گزریں تو وہ ہمارا استقبال کر سکیں۔"

"کہاں منتظر ہوں گے؟"

"جہاں انھیں پیغام ملا تھا۔ ایک میل کے دائرے میں یا اس سے بھی کم۔ بہت نزدیک کسی دوسری ہٹ میں۔ دائرہ چاروں طرف کہاں تک ہو گا۔ ایک جانب سمندر ہے، دوسری جانب دلدل سے بھرا ہوا دلدلی جنگل، تیسری سمت سے ہم آئے ہیں، چوتھی سمت وہی رہ جاتا ہے جدھر واپسی کا راستہ ہے۔"

"ہم قائل ہوئے لیکن ... صاحب، ہم یہاں بھی تو قیام نہیں فرما سکتے۔"

"کچھ دیر انتظار تو فرما سکتے ہیں۔ شاید اس دوسرے پیغام کو وصول کرنے کے بعد وہ پھر ہماری تلاش میں نکلیں۔ وہ بھی یا دائیں طرف جا سکتے ہیں یا پھر ادھر آ سکتے ہیں۔ آگے پیچھے تو وہی جنگل اور سمندر ہے۔"

"وہ ادھر آ گئے تو ہم کیا کریں گے؟"

"ہم چھپ کر دیکھیں گے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "ٹیکسی تو انھیں کھنڈر میں دکھائی ہی نہیں دے گی۔ ہم کسی دوسری جگہ سے ان پر نظر رکھ سکتے ہیں۔"

رات کے وقت تمام ہٹس سنسان پڑی تھیں۔ وہ چوکیدار بھی نہیں تھے جو دن میں پھرتے رہتے ہیں کہ کوئی پکنک منانے والی پارٹی بلا اجازت یا ان سے سودا کیے بغیر کسی ہٹ پر قابض نہ ہو جائے۔ میں اور شیخ دونوں ایک ہٹ پر چڑھ گئے جس کا زینہ ہی سلامت تھا۔ باقی ہٹ گر چکی تھی۔ شیخ کا خیال بہت جلد درست ثابت ہوا۔ ابھی دس منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ کار جس پر مجھے پہلے ہی گاڑی ہونے کا شک گزرا تھا بڑی تیزی سے آئی۔ میں اس کھنڈر کے مقابل رکی اور

www.paksociety.com

اس کے چاروں دروازے ایک ساتھ کھلے۔ ان میں سے چار ایک سے سیاہ لبادوں میں برآمد ہوئے۔

"وہ اسی طرف گئے ہیں۔ ادھر ہی ہیں۔" یہ آواز واضح طور پر بھری سنائی دی تھی لیکن مجھے اس کا نام یاد نہ آیا۔

"تم سب باری باری ہر سمت میں دیکھو۔" اس شخص نے پھر حکم دیا تھا "اور جلدی کرو۔ ہم رات نہیں لگا سکتے۔"

"میرے استاد۔ ابھی دیکھو۔ ادھر تو بہت ہے۔"

"بکواس مت کرو اور کام شروع کرو۔" وہ سب سے شخص نے غرا کے کہا اور میں نے پیڈرو کی آواز کو فوراً پہچان لیا۔

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں ان سب کو شوٹ کر دینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ چار تھے۔ ہمارے پاس ریوالور تھا اور اس میں بھی چار گولیاں تھیں لیکن ہمارے حریف کھلی جگہ پہ تھے اور ان کے پاس وافر اسلحہ تھا۔ کم سے کم دو کو میں نے سب مشین گن سے مسلح دیکھا۔ میں نشانہ خطا نہ کرتا تو شاید دو کو مار سکتا تھا۔ باقی دو یقیناً بھاگ کے جان بچا لیتے اور ہماری طرح مورچا بند ہو جاتے۔ پھر وہ دو طرف سے آ سکتے تھے اور ہم ایک ریوالور کی دو بچی ہوئی گولیوں سے اس محاذ پہ دونوں جانب نہیں لڑ سکتے تھے۔

ان میں سے ہر ایک نے ہر سمت میں جا کے دیکھا۔ ایک اس کھنڈر کی طرف بھی آیا جس کی دیوار پہ ہم چوکی بنائے بیٹھے تھے مگر اس دیوار سے ٹھیک نیچے کے سوا وہاں کوئی جگہ تھی ہی نہیں جہاں وہ ہمیں تلاش کرتا۔ وہ واپس چلا گیا ورنہ میں تیار تھا کہ وہ اوپر کا رخ کرے تو اسے آڑے ہاتھوں لوں۔ محاورے کے مطابق نہیں بلکہ کراٹے کے داؤ پیچ کے حساب سے۔

دس منٹ میں وہ پھر گاڑی میں اکٹھے ہوئے اور واپس چلے گئے۔ نہ جانے کیوں انھوں نے آگے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شاید ان کے پاس سگنل ریسیو کرنے کے وہ آلات تھے جو سمت اور فاصلے کا تعین بھی کر دیتے تھے۔

"یہ دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔" شیخ نے میری تشویش کو سن کے کہا "کہ جیسے ہی ہم مطمئن ہو کے نکلیں، پکڑ لیے جائیں۔"

"اچھا بھائی، بیٹھے رہتے ہیں اسی کھنڈر میں الو کی طرح، صبح تو ہونے والی ہے۔" میں نے صبح کاذب کے غائب ہونے والے آثار دیکھ کے کہا "یہاں سے طلوع آفتاب کا نظارہ کیسا خوب ہو گا۔"

"سالوں کو ٹیکسی بھی دکھائی نہیں دی۔" شیخ بولا "اللہ نے ان کو اندھا کر دیا ہو گا۔"

"نہیں دوست، یہ دیکھ بات ہے، شکاری ہمیں بے خوف کر کے اس جائے پناہ سے خود نکل آنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔"

"انھوں نے ٹیکسی دیکھ لی لیکن انجان بن کے لوٹ گئے۔" شیخ بولا "اب ہمیں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا ہو گا۔"

"ہم ایسا کرتے ہیں کہ بائی پیر نکل جاتے ہیں۔" میں نے کہا "دیکھتے رہ جائیں گے تعاقب کرنے والے۔"

لیکن اکرام شیخ کا تربیت یافتہ پولیس مین ہونا کام آ گیا۔ نیچے اترنے کے بعد اس نے واپس اس سمت میں جانے کی تجویز دی جدھر ممنوعہ تھا۔

"ایک بار تو نیوی کی پولیس نے شرافت سے ہمیں لوٹا کر واپس کر دیا تھا۔" میں نے کہا "اب پیدل گئے تو وہ کہیں گے کہ بے وقوف بناتے ہو۔ کبھی بار سائیکل پر آؤ گے، پھر اونٹ پر، گدھے پر۔ اندر گھسنا چاہتے ہو۔"

اکرام شیخ اچانک رک گیا "یہاں سے ہم لفٹ لیں گے۔"

"تو روک لو۔ آتی کاریں گزر رہی ہیں، کسی کو روکو۔"

مگر اکرام شیخ بزدل ہو کے ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔ دور سے خالی سڑک کو گھورتا رہا۔ اب افق پر روشنی نمایاں ہو رہی تھی۔ صبح صادق کا اجالا اترنے لگا تھا۔ فضا میں نمی اور خنکی بھی بڑھ گئی تھی۔ دھیمی آبی پرندوں سے ڈھکے ہوئے قطعہ سمندر کے اوپر دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ اچانک اس خاموشی کو کسی قریب آتی ہوئی بھاری گاڑی کی آواز نے ختم کر دیا۔ شیخ فوراً چلنے لگا۔ پھر ادھر کھڑے ہوئے جدھر سے ہم آئے تھے۔ منٹ کے بعد ایک ٹرک نمودار ہوا۔ یہ نیوی کا بھاری ٹرک تھا۔

ٹرک جب بالکل قریب آ گیا تو شیخ نے زور زور سے ہاتھ ہلانا شروع کیا۔ ڈرائیور نے بریک لگائے اور سر باہر نکالا۔

"کہاں جانا ہے رے تم کو؟"

"بڑی مہربانی سائیں آپ کی۔ ہم کو ادھر پھاٹک کے باہر دو۔ ادھر سے ہم کو بس مل جائے گی۔"

"لیکن تم لوگ کون ہو؟ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ٹیکسی ڈرائیور ہیں سائیں!" شیخ نے سندھی ڈرائیور سے خوشامدانہ لہجے میں کہا "رات کو سواری لائے تھے جی۔ ادھر کو گاڑی چھین کے بھاگ گیا تو سب بدمعاش، ابھی جلدی کا کام ہے۔"

"اچھا، اچھا، چڑھو پیچھے۔" دردِ دل رکھنے والے ڈرائیور نے کہا "پر اپنا کھڑا رکھنا بابا، کوئی دیکھے نہیں۔"

حسب ہدایت ہم پیچھے والے کھلے حصے میں یوں لیٹ گئے کہ سڑک پہ کھڑا ہوا کوئی شخص بھی ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ٹرک دونوں جانب کی دیواروں کو جھانکتے رہے۔ پیچھے کا حصہ کھلا گر جاتا تھا۔ اس کے اور سائیڈ کے درمیان ایک حصہ ثابت نہ ہونے کے باعث کھڑکھڑا رہا تھا۔

ابھی ہم ایک میل بھی نہ گئے تھے کہ میں نے سڑک کے کنارے پیڈرو کی گاڑی دیکھ لی۔ وہ گاڑی کے اندر بیٹھا ہوا تھا اور اس کا سر سٹیرنگ پہ تھا۔ غالباً رات بھر جاگنے کے بعد اس پہ تھکن طاری تھی۔ دوسرا شخص کار کا سہارا لیے ہاتھ باندھے بیزار کھڑا سامنے دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے نیوی کے ایک خالی ٹرک کو بالکل قابل توجہ نہیں سمجھا تھا۔

اکرام شیخ نے مجھے مشتبہ کیا "وہ ادھر کھڑے ہوں گے۔"

"پیڈرو کی طرف کا ہی تھا۔" میں نے اسے بتایا۔

"رات کو کالے کپڑوں میں تھے۔" شیخ بولا۔

"اب تو شریف دنیا کی نظر آ رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"وہ ہمارے پیچھے جرم پراہ تھے۔ اب تو یقین آیا؟"

"میں... تو خود ہی یقین دلا رہا تھا۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔

شیخ نے جیب سے وہی پاکٹ سائز ٹرانسمیٹر نکالا "اب کیا ارادہ ہے؟" میں نے کہا "انھیں پیچھے بلانے کا؟"

شیخ مسکرایا "چیز خوبی سے چل جائے انشاءاللہ"

میں نے سر پکڑ لیا "خدا کے لیے آپ صحیح فقرہ پڑھا کریں۔ یہ کسی پولیس میں ہاں افسر کو نہیں دیتا کر دو۔ اعلیٰ ذوق کا مظاہرہ کر کے شعر ٹھیک پڑھتے۔"

"اچھا میں اسے غلط کر دیتا ہوں۔ چیز خوبی سے چلی جانے غالب۔ اب کیا خیال ہے؟" پھر ٹرانسمیٹر آن کر کے بولا۔

"او سنو، عقل کے اندھو! الو کے پٹھو!" اس نے ریڈیو پیام انگریزی میں گالیوں کا اضافہ کیا "ہم نے تمہیں دیکھا مگر تم ہمیں نہ دیکھ سکے۔ ہم جنات کی طرح غائب ہونا بھی جانتے ہیں۔ جب تک تمہارا دل چاہے بھٹکو۔ یہ ہمارا آخری پیغام ہے۔ تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

آگے نیوی کے ٹرک کا ڈرائیور کچھ بھی سننے سے قاصر تھا کیونکہ ایک تو ہمارے درمیان پارٹیشن حائل تھی۔ پھر انجن کا شور اس کے زیادہ قریب تھا اور ٹرک کی باڈی خستہ حال سڑک پہ جھٹکوں کے باعث مسلسل بج رہی تھی۔

"اب اس کا تو کوئی مصرف نہیں رہا۔"

"نہیں، آپ خطاب جاری رکھیں۔" میں نے کہا "آپ کی جان کے دشمن چپ سے محفوظ ہو رہے ہوں گے۔"

"آپ کو بیر ایرانا شاید حتیاً لگا۔" اکرام شیخ نے کہا "مجھے آپ بھی تو ذرا لیجیے۔ کچھ بھی سنائیے، طرز آ گئی ہے بیا۔"

شیخ نے ٹرانسمیٹر ہاتھ میں لے کے ایک ہاتھ کان پہ رکھا اور "آن آن" چلانا شروع کر دیا۔

آگے سے ڈرائیور نے چلا کے کہا "او دانے چپ کر کے بیٹھو۔" "اچھا بھائی۔" شیخ نے چلا کے جواب دیا اور ٹرانسمیٹر کو باہر اچھال دیا۔ وہ سڑک کے کنارے ریت پر گرا۔ ٹرک اس وقت موڑ کاٹ رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے ایک جھونپڑی ریسٹورنٹ نظر آیا جس کی ساری رونق بھی ہری ہی۔ جھونپڑی پٹرول اور شیشوں سے لے کر ویلڈنگ تمام وائلن سر انجام دینے والے فرد واحد کی محنت تھی۔ وہ ایک بالٹی سے کر نکلے تھے کہ ٹرانسمیٹر ان کے قدموں میں آ گرا۔ میں نے اسے حیران ہوتے دیکھا۔

میں نے ہاتھ ہلا کے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور گویا اسے اجازت دی کہ وہ تحفہ قبول کر سکتا ہے۔ اس نے تو یہی سمجھا ہو گا کہ ہم پاگل ہیں جو چلتے چلتے ریڈیو باہر پھینک گئے۔ عام آدمی کیسے جان سکتا تھا کہ وہ ریڈیو نہیں ٹرانسمیٹر ہے۔

"بہت خوشی ہے کہ صبح صبح کیا چیز مل گئی۔" میں نے کہا۔

"ہاں، اصل خوشی اسے کچھ دیر بعد ملے گی۔" اکرام شیخ بولا "جب پیڈرو اچھی آواز کی سن کے گاڑی دوڑاتا ہوا آئے گا اور پوچھے گا کہ ... کون بکواس کر رہا تھا اور وہ چیز کہاں ہے؟"

ٹرک نے ہمیں دس منٹ کے بعد پھاٹک سے آگے اتار دیا۔ پھاٹک دراصل سیٹھ تک چلنے والے راستے پر ایک ٹریفک بیریر تھا جہاں ہر گاڑی والے کو ٹول ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ کار ہو یا ٹیکسی، ٹرک ہو یا بس، مال کے ریٹ جدا تھے مگر ٹول ٹیکس جمع کرنے والے ٹھیکیدار کے کارندے کسی کو ٹکٹ لیے بغیر آگے نہیں جانے دیتے تھے اور واپسی پر بھی ٹکٹ دکھا کے ثابت کرنا پڑتا تھا کہ وہ ٹیکس ادا کر گئے تھے لیکن نیوی کا ٹرک تھا جس پہ اس پابندی کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

ہم نے ڈرائیور سے ہاتھ ملا کے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس نے مزید ہمدردی کا اظہار یوں کیا کہ ہمیں قریب ترین پولیس چوکی کا پتا بتایا اور امید ظاہر کی کہ ہمیں ٹیکسی مل جائے گی۔ وہاں ایک چھوٹا سا بازار تھا اور شہر سے آنے والی بس کا آخری اسٹاپ بھی۔ ایک بس روانگی کے لیے مزید مسافروں کے انتظار میں تیار کھڑی تھی۔

ہم نے جلدی جلدی دو کپ گرما گرم چائے جیسا مشروب نوش کیا اور پھر بس میں بیٹھ گئے۔ ابھی بس روانہ نہیں ہوئی تھی کہ ہم نے پیڈرو کی گاڑی کو قریب سے گزرتے دیکھا۔ اس کی رفتار بہت زیادہ تھی۔ ایک سائیکل سوار نے بمشکل تمام خود کو بچایا مگر اس کوشش میں وہ سائیکل سمیت گرا۔ کچھ لوگ اس پر ہنسنے لگے۔ اس نے سائیکل کو اور خود کو اٹھانے کے بعد نامعلوم کہنے کے لیے ڈرائیور کو گالی دی اور پھر پیدل منزل کو روانہ ہو گیا۔

"یہ لوگ نیوی کے ٹرک کے تعاقب میں گئے ہیں۔" میں نے اکرام شیخ سے کہا۔

اس نے تائید میں سر ہلایا "ہاں، اس جھونپڑی ریسٹورنٹ والے نے بتا دیا ہو گا کہ اس کی طرف تحفہ کیسے ارسال کیا گیا تھا اور تحفہ پھینکنے والے کون تھے؟"

www.paksociety.com

"بہت جلد آپ پہنچیں گے، شکاری ہمارے تعاقب میں ہیں۔"

"ہاں، بال بال بچے ہیں ہم۔" اکرام شیخ بولا۔

"دراصل وہ آپ کی قربت سے پہلے ہی چوکنے ہونے لگے تھے۔" میں نے کہا۔ "انہیں فوراً پتہ چل گیا کہ اکرام پیچھے نہیں ہیں، آگے نکل گئے ہیں۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ واپس بھی آ جائیں گے۔ ٹرک والا شاید انہیں بتا سکے گا کہ اس نے ہمیں کہاں اتارا تھا۔"

"اور ہم نے اسے کیا کہانی سنائی تھی۔"

اتفاق رائے سے ہم تو رستے ہی والے تھے کہ بس کی شکل نمودار ہوا جو بانس کی طرح خشک اور پتلا تھا مگر اس نے ویسپ کا لباس شامل بنا رکھا تھا اور آنکھوں میں سرمے کی سلائی پھیر رکھی تھی۔ اس کی آنکھیں بیک وقت سرخ و سیاہ ہو رہی تھیں اور وہ بار بار آئینہ میں نظر آتا تھا۔ اس نے گنگناتے ہوئے سامنے چہرہ مقابل شیشے کو ملاحظہ کیا جس میں تمام مسافروں کا عکس دکھائی دیتا تھا اور کنڈکٹر کی ڈبل سے اشارہ ملتے ہی روانہ ہو گیا۔

کنڈکٹر نے جرات مند کے ڈبل سے بھی زیادہ بلند تھا اور ہاتھ بس کی باڈی پر بھی مارتا تھا۔ یہ سنگل ڈبل کا سگنل کراچی کی بسوں میں ایسے ہی استعمال ہوتا ہے جیسے ٹرین میں گاڑی روکنے کے لیے لال جھنڈی اور روانگی کا اشارہ دینے کے لیے سبز جھنڈی استعمال ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ٹرین میں ہر مسافر جھنڈی نہیں دیتا مگر یہاں بس میں ہر مسافر بس رکوانے کے لیے مروجہ طریقے کے مطابق دھڑ سے بس کی چھت پر ہاتھ مارتا ہے۔ وہ آگے پائیدان تک پہنچتا ہے تو وہ آنے والے اسٹاپ پر یا کسی بھی نامناسب جگہ پر بس روک لیتا ہے۔ مسافر اترتے وقت خود دو بار ہاتھ مار جاتے تو دیگر مسافر یہ خدمت رضاکارانہ طور پر کرتے ہیں یا پھر کنڈکٹر۔ کراچی میں نووارد کے لیے یہ تماشا ذرا عجیب ہوتا ہے۔ وہ چیختا شور مچاتا ہے کہ بس روکو اور کنڈکٹر سے الزام ... بیٹھنے کو کہا یا روکنا تھا تو ایک ہاتھ مارنا تھا۔ دو ہاتھ مار کے ڈرائیور کو کیا بولتے ہو۔ بس اسٹاپ کراچی میں ایک بے حقیقت چیز ہے۔

"بہت جلد وہ واپس آ جائیں گے۔" اکرام شیخ نے مجھے یاد دلایا۔ "ابھی تک میری اندر دم کچھ ہے۔"

"وہ دوسری جانب سے گزر گئے۔" میں نے کہا۔ "آپ نگاہ نہ بدور رکھیے۔"

کار سامنے سے آئی اور اس کی رفتار کم ہوئی۔ خالی تو وہ ... مسافر ایسے بے لگام بس میں تلاش کر رہے تھے مگر بس میں مسافر کوٹ کوٹ کر بھرے تھے کوئی ان کے سر گنتا اور پھر پیر شمار کر کے حساب سے نام وہ سے مسافروں کی صحیح تعداد معلوم کرنے کی کوشش کرتا تو جواب حیران کن ہوتا۔ مثلاً ساٹھ ... مسافر جن میں کوئی تین ٹانگ والا مسافر بھی ہے یا ستر سر اور ایک سو اسی ٹانگیں۔ اب آپ سوچتے رہیے کہ کس کے دو سر ہیں یا کون دو ٹانگوں کے بغیر کھڑا ہے۔ پھر یہ گنتی بیچارے ریاضی دانوں کو گھورتے ہوئے شناخت کر لیتا۔

کار گزرگئی تو میں نے ٹھوکر کھا کر خفیف جھٹکا کھایا۔ اسے گرا گیا۔ گرا...

"کون... کون گر گیا؟" ایک ساتھ بہت سے ہم ... بس نے کہا۔ وہ باہر جھانک کر نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ وہ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے یا ایک دوسرے میں دھنسے ہوئے تھے۔ کوئی کسی کا تو کوئی کسی کی ٹانگوں میں۔

"وہ میرا پرس گر گیا۔" میں نے چلا کے کہا۔ "رو کو گاڑی روکو۔" فوراً ایمرجنسی کا اعلان کیا۔ وہ بار بس کی چھت کو تھپتھپا رہے تھے اور ہم دونوں نے دروازے تک یوں سفر کیا جیسے پچھلا دریا کے تیز رو کے خلاف جاتے ہاتھ تیرتا ہو۔ جنگل میں دھکیل دیا گیا۔ بس جس کے اندر وہ گھڑی دروازوں سے بھی چپکے ہوئے تھے جیسے مسافروں کی رواں ہوگئی۔ وہ بس کی چھاتی تک رکتا دیکھ کر دوڑتے ہوئے آئے، پھر پتا نہیں کیسے اندر گم ہو گئے تھے۔

"میری پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔" اکرام شیخ نے بیٹھنے پر لمبی گہری سانس لے کر کہا۔

"میری چال کچھ تیز ہی معلوم ہو رہی ہے شاید۔" میں نے ... کے کہا۔ "آخر سب کچھ کیوں ہوتا ہے یہاں؟"

"کیا ہوتا ہے؟" اکرام شیخ نے چلتے ہوئے کہا۔

"یہی کہ صبح شام مسافروں کو بسوں میں اس طرح پیک کرانا ... متعلق نہ رکھنا۔ شاید پیٹرول ڈالنے والے ... انسداد بے رحمی ... اپنا کام کریں۔" میں نے کہا۔

"انجمن انسداد بے رحمی حیوانات کا تعلق ابھی نہیں ہے۔" شیخ بولا۔

"یہ راستہ کدھر جاتا ہے؟" میں نے بغلی سڑک کی جانب اشارہ کیا۔

"مقام جنت کی تعظیم بہشت کی طرف۔ یہاں والے ... لوٹنے کے شوق میں پیر الٰہ ٹرپوائنٹ کہتے ہیں۔"

"کیا ہم شہر تک پیدل جا رہے ہیں گے؟" میں نے کہا۔

"قرنتا یہی ہے یہ وار ہے کا ہم تیرا ... کے چل جانا" اکرام نے کہا مگر ایک ٹیکسی اسی وقت ہمارے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ ڈرائیور واپسی کی سواری نہ ملنے پر خاصا دل شکستہ تھا۔ جیب ... اسے دور کا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ پھر اس نے ہمارا حلیہ دیکھا۔

"جیب میں کچھ ہے؟" وہ بولا۔

"بھاڑ میں گیا بھاڑا۔" میں نے ریوالور نکال کے کہا۔

"یہ... یہ کیا بدمعاشی ہے؟ ٹیکسی چھیننا چاہتے ہو۔" اس کی حالت غیر ہوگئی مگر اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔

"نہیں... اتنے بدمعاش ہوتے تو ہم اپنی ٹیکسی نہ لیتے؟" ریوالور جیب میں رکھ کے کہا۔

"ہاں، وہ تمہاری ٹیکسی چھین کر لے جاتے تھے۔" اکرام شیخ روتی آواز میں بولا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھا۔ اس نے آنکھیں نکالیں ہی تھیں تو جا رہا تھا لیکن اکرام شیخ نے اسے خاصے دردناک لہجے میں بتایا کہ کس طرح اسے چند شرفا نظر آنے والے سیٹھ ٹائپ نے گھیر لیا تھا، مگر وہ فرار ہو گئے، ہم ٹیکسی سے اتر کے پیدل آگئے۔

"کہاں ہے پارٹنر؟" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔ "تم نے اس وقت ریوالور کیوں نہیں نکالا؟ کیا تو پہلے تھا ان کے پاس؟"

"نہیں، ریوالور تو نکالا تھا مگر وہ بھاگنے لگے تھے۔"

"کیا ریوالور دیکھ کے بھاگنے لگے؟"

"ہاں، ریوالور نقلی ہے نا، ایسے ہی اپنی حفاظت کے لیے ساتھ رکھتے ہیں۔ مگر تم جانتے ہو کیسی کیسی جگہ جانا پڑتا ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے مذاق کیا۔ "ہاں جانا تو پڑتا ہے مگر میں اصل ریوالور رکھتا ہوں۔" اس نے گلوز کمپارٹمنٹ میں کاغذات کے نیچے سے ریوالور نکال کے دکھایا۔ "اصل تو یہ بھی لگتا ہے۔"

"ہاں، اگر وہ پہچان گئے کہ نقلی ہے۔"

"اب تم کیا کرو گے؟" ٹیکسی ڈرائیور نے اپنے ہم پیشہ سے اظہار ہمدردی کیا۔

"دیکھو! اب چلا دوں گا۔ گو جا گاڑی کا یار ذرا سٹارٹ کرو۔"

"تم قسطوں پر لے لو نا یار۔" وہ ٹیکسی تو اب ملنے سے رہی۔ رپورٹ درج کرا دو۔ مگر خاطر خواہ کوئی نہیں۔ اس نے کہا۔ "سیدھا چوک پر بہت لوگ قسطوں پر ٹیکسی رکشا دیتے ہیں۔ خود میں نے ایسے ہی لی تھی۔"

"اوہ، ٹیکسی کتنے کی ملے گی؟" اکرام شیخ بولا۔

ٹیکسی والے نے چونک کے پیچھے دیکھا۔ "یہ بہت مہنگی ہے۔ چالیس ہزار لگ چکے ہیں مگر قسطیں ہیں، دور ملے گی پچاس میں۔ تمہارا بہت نقصان ہوا ہے۔"

گھر کے قریب اترتے ہوئے اکرام نے ہمارے درمیان دوستانہ مراسم استوار ہو چکے تھے اس نے نہ صرف یہ کہ ہم کو کرایہ معاف کر دیا جو ہماری جیب میں تو نہیں تھا مگر ہم گھر سے لا سکتے تھے، ہم نے بتایا بھی کہ ٹھکانہ ... ٹیکسی کی بات کرنا ہو تو آ جانا۔

"کیا حرکت تھی؟" میں نے ٹیکسی کے جانے کے بعد کہا۔

"ٹیکسی تو پہلی ہی پہنچے گی دوست۔" اکرام شیخ بولا۔

"اور وہ جو وہاں چھوڑ آئے ہیں؟"

"اس کے بچوں کو ... تم شکاری جب ٹیکسی کو تلاش کرتے تو قبضہ کر لیا اور ... اس کے ... اپنا سامان بے بسی کا تعاقب ... ٹیکسی کو آگ لگا کے ... اس کے ... لانے کے لیے ہمارا جانا ضروری ہے ورنہ خود گرفتاری کے لیے پیش کرنا ہے۔ ہمارے دشمن بھی یہ بات سمجھتے ہوں گے کہ ہم اسے نہیں... چند فیصد کا پتہ ٹیکسی سے ہی لے سکتے ہیں۔"

گھر کا دروازہ بند تھا اور اندر خلاف معمول خاموشی تھی۔ اکرام شیخ نے دستک دی تو نازو نے دیوار کے قریب آ کے کہا۔ "کون ہے؟"

"کوئی بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"میں نہیں جانتی اس نام کے کسی آدمی کو۔" نازو نے کہا مگر دروازہ کھول دیا۔ "آپ کے سر پر کوئی نہیں۔"

"یہاں تو واقعی کوئی نہیں۔" اکرام شیخ نے اندر جا کے کہا۔

"کیا میں آپ کو نظر نہیں آ رہی ہوں؟" نازو نے تشویش سے کہا۔

"مگر شہر جو دوسری چیزیں بھی ... کیا تھا۔ حسن ... اور غالب نام کے ...؟" اکرام شیخ نے کہا۔

"وہ سب کام سے گئے ہیں۔" نازو نے کہا۔ "اور کہہ گئے ہیں کہ باقی سب حضرات بھی فوراً آ جائیں۔"

"مگر تم نہیں جاؤ گی؟"

"میں بھی حضرات میں شامل ہوں، میری ہمدردی..."

"ملازمین جیسے جہاز کے بغیر پائلٹ نہیں ہوتا، ایسے ہی ٹیکسی کے بغیر ڈرائیور نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

"کیوں، ٹیکسی کہاں گئی؟" وہ بولی۔

"بس، کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ جیسے اور بہت سے ... ہو۔" میں نے کہا۔

"اندر چلیے، جو چل سکا ... آں، اٹھاں۔"

"پھر لوگ کیسے آئے ہو؟"

"ٹیکسی کی اندر کہانی ہے۔" میں نے اسے تو واقف کرکھا۔

"اوہ، کیا مصیبت ہے۔ ابھی احکامات نہیں کر سکتے پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ وہ سب منتظر کر رہے ہوں گے۔" نازو نے چرا کا با ہو کے کہا۔

راستے میں اکرام شیخ نے اسے سب بتا دیا۔ "وہ کہاں ہوں گے یہاں سب؟"

"کوئنز روڈ، راجا کے ٹھکانے پر۔" نازو نے کہا۔ "اور کہاں جاتے؟"

"اچھا، اب تو یہ کپڑے بدلنے ... یہاں سے ہم ایسے نہیں نکل سکتے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "ٹیکسی ساتھ تھی تو دوسری چلی جاتی۔"

نازو نے اپنے کپڑے بدلے اور اب سب ساتھ روانہ ہوئی تو پھر وہی کہانی نازو تھی اور اپنے اصل روپ میں نازو وہ ساحرانہ شخصیت تھی جس کے خلاف عقل کی مزاحمت بے وجود ہو جاتی تھی۔ اسے ایک بار دیکھنے کے بعد پھر دیکھنے کا عہد کرنے والے کو شکست تسلیم کرنا پڑتی تھی۔ وہ ایک ایسی برق تپاں تھی جس کا نظارہ نگاہوں کو خیرہ کر دیتا تھا۔ ایک زیبا شعلہ سے مجذوب تھی جس کے مقابل حسن کا غرور ... محفوظ نہ تھا۔ میں نے خود کو اس کے طلسم کا اسیر ہونے سے بڑی مشکل سے بچایا تھا اور میری کامیابی درحقیقت دامن کے عشق کی کامیابی تھی جو زلیخا جیسی قوت تھا۔ ... اس کے بادجود جب ... نازو وہ اسے حسن کی ساحری ... معصومیت کے ساتھ جلوہ نما

www.paksociety.com

ہوتی تھی تو اس پل بھر کے لیے مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اسے میری کمزوری سمجھ لیا جائے یا میرے ذوقِ جمال کی کمزوری کہا جانا چاہیے۔ اس سے میرے عشق یا محبت نہیں ہو سکتی تھی۔ ستائشِ حسن و محبت الگ الگ جذبات کی کیفیات ہیں۔ رابعہ کے بارے میں میں غیر جانبدار رہتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دنیا کی سب سے خوبصورت عورت تھی مگر مجھے محبت صرف اسی سے تھی اور محبت کی خوبصورتی میں مجھے اس کا ہمسر اور کوئی نظر نہ آتا تھا لیکن محبت کے جذبات کی عینک کے بغیر دیکھنے والوں کے لیے نازو یقیناً رابعہ سے بہت زیادہ حسین تھی۔ اور بھی ہوں گی جو نازو سے زیادہ حسین ہوں گی۔ ایک تو فریب النظر ہی تھی مگر یہ تو ایک گلدستہ سا تھا کا موازنہ حسن تھا ساری کائنات کے حسن کو دیکھتے ہوئے سب سے زیادہ حسین عورت کا تصور اتنا ہی محال تھا جتنا خود کائنات کی وسعت کا تصور۔

راہ چلتے میں نے لوگوں کو ٹھٹک کر رکتے دیکھا جیسے وہ کسی جادوگرنی کی شاہزادی کو دیکھ کے پتھر ہو گئے ہوں۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ اکرام شیخ اس ردعمل کا عادی ہو گیا تھا چنانچہ وہ انجان بن جاتا تھا مگر مجھے حیرت ہوتی تھی جب خود نازو بھی انجان نظر آتی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک عورت اپنے حسن کی قوتِ تسخیر سے واقف نہ ہو اور اداسی حسن کی معصومہ ندامت سے ان کا اندازہ نہ رکھتی ہو۔

خود دیکھنے والے کہاں سمجھتے تھے کہ وہ صرف ایک مثالی مرقع حسن ہی نہیں بلکہ ایسی بجلی بھی ہے جسے چھونے کی ذرا سی جسارت کرنے والا ایک جھٹکے میں چت ہو جائے گا۔ اس وقت بھی چلتے چلتے ایک ناخوشگوار چھوٹا سا واقعہ پیش آیا مگر اس سے صورتحال میں بڑی تبدیلی آئی۔

ابھی ہم گلی سے سڑک پر ہی پہنچے تھے کہ سامنے سے ایک شخص بدتمیزی سے آیا اور نازو سے ٹکرا گیا۔ نازو بچنے کی کوشش کے باوجود گر گئی اور بھائی کی مدد سے فوراً کھڑی بھی ہو گئی۔ یہ صرف حادثہ ہوتا تو ہم معذرت کی زحمت بھی نہ کرتے اور دامن بچا کے نکل جاتے مگر جب میں نے دیکھا تو ٹکر مارنے والا شخص بڑی اشتعال انگیز بے شرمی سے ہنس رہا تھا۔

وہ اگر کوئی بڑا بدمعاش نہیں تھا تو اپنے طرزِ عمل سے ایسا ثابت کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ بہت لمبا چوڑا اور طاقتور تھا۔ اس کی مونچھیں اس کی بدمعاشی کا سائن بورڈ بنی ہوئی تھیں اور اس کی ہنسی چیلنج دیتی تھی۔ مزید یہ کہ تین اسی جیسے اس کے پیچھے کھڑے دانت نکال رہے تھے اور ان کی مکروہ صورتوں پر بھی بدمعاشی کا اشتہار تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"تو بتاؤ کیا بات ہے؟" وہ میرا تمسخر اڑانے والے انداز میں بولا اور آگے بڑھ گیا۔ "یہ عیاشی کی جگہ بھی رکھی ہے نا تم نے؟"

"چلو چھوڑو، نکلو یہاں سے" نازو نے میرے تیور دیکھ کے کہا۔ میں نے غصے کو ایک گہری سانس کے ساتھ خارج کر دیا۔

"ہمارا راستہ چھوڑ دو" میں نے نرمی سے کہا۔

"پہلے بات پوچھی ہے تو بات سن لے" وہ اور آگے آ گیا اور اس کے تینوں ساتھی گلی میں پیچھے کے کھڑے ہو گئے۔ "کہاں سے لایا ہے یہ چیز ...... وہ تو مال ہے ایک دم"

میرے صبر کا پیمانہ چھلک کے لبریز ہو گیا۔ میں نے اس کے پیٹ پر ایک بھرپور مکا مارا۔ یقیناً ضرب اس کے وہم و گمان سے زیادہ تھی کہ اس کا منہ کھلا اور پل بھر کے لیے اس کا سانس رک گیا۔ وہ بے اختیار آگے جھکا اور میں نے اس کی ٹھوڑی پر گھٹنا رسید کیا۔ اس کے جبڑے اور دانت بج گئے ہوں گے۔ وہ اچھا خاصا تھا کہ میں نے اس کی گردن کو بغل میں دبا لیا اور اسے ایک جھٹکے سے یوں اٹھایا کہ اس کے پیر اکھڑ گئے۔ پھر میں نے اسے ایک چکر دیا اور دیوار پہ دے مارا۔ یہ سب شاید بیس سیکنڈ میں ہوا۔ میں نے اس کے ناک اور منہ سے خون بہتا دیکھا۔

لیکن اتنی دیر میں تین دوسرے بدمعاشوں نے جو اپنے استاد کے پیچھے تھے خنجر نکال لیے۔ میں نے اکرام شیخ کو ایک ہاتھ سے اپنے پیچھے کر دیا اور دونوں پیر پھیلا کے قدم زمین پہ گاڑ لیے۔ ہاتھ کے اشارے سے میں نے انہیں اپنی طرف بلایا۔

ان میں سے دو مجھ پہ حملہ آور ہوئے۔ ان کے انداز سے جو پتہ چلا تھا وہ صرف غنڈہ گردی تھی۔

آگے بڑھنے والا زیادہ پھرتیلا تھا۔ اس نے بڑی مہارت کے ساتھ خنجر کا وار کیا تھا لیکن میں جھکائی دے گیا اور فرشی لات گھما کے اس کی کنپٹی پہ پیچھے سے ماری۔ اس کا بازو اوپر تھا اور خنجر ہوا میں اڑتا نظر آیا۔ اس کی کنپٹی کا جوڑ ضرور ٹوٹ گیا ہو گا .... کیونکہ وہ بڑی اذیت سے چلایا۔ اس نے فوری طور پر پسپائی اختیار کرنے کا سوچا تھا مگر پیچھے اس کا دوسرا ساتھی تھا۔ وہ مجھ پر حملہ کر چکا تھا لیکن ذرا سے فرق کے باعث خنجر کا یہ وار اس نے اپنے ہی ساتھی پہ کیا۔ خنجر کی دھار نے شانے کے پاس سے اس کی گردن کاٹ دی ہے۔ وہ دہشت زدہ ہو کے چلایا۔ اس نے اپنی کٹی ہوئی گردن کو سہارا دینے کے لیے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔

غلطی سے اپنے ساتھی پہ قاتلانہ حملہ کرنے والا پاگل ہو گیا اور چیخ کر گالی دیتے ہوئے اس نے مجھ پہ جست لگائی۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے وہ بھی فضا میں بلند ہوا اور پھر نیچے آیا تو میری لات پیٹ سے دبا کر طرف گیا۔ لیکن وہ بیا بھی بجلی کا کھمبا تھا اس کا سر ان سے کھمبے پہ لگا۔

اس چند ہجوم کی کاروں سے دو چار ہوتا دیکھ کے تین اور بدمعاش نہ جانے کہاں سے تیکب پڑے۔ میں نے دیکھا کہ آس پاس افراتفری پھیل گئی ہے۔ ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے پٹھان اور مکرانی آنکھ آنکھ کے ساکت رہے ہیں۔ راہ چلتے لوگ رک گئے تھے یا درگاہ کے آخری حصے میں جمع ہونے سے ہمارا راستہ بالکل ہی رک گیا ہے۔

نئے حملہ آور بھی یا کسی گروہ کے ارکان ہوں گے۔ ان شعل نے نفی کسی مری طاقت اور پھر آنے والی تھی اور بھی گئے تھے کہ گروہ بدرداں ہوئی تیاں کا مرشد بھی مختلف نہیں ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے شکست قبول کرتے ہوئے میرا گھونسہ سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ نازو پہ حملہ آور ہو گئے۔

ان کا خیال تھا کہ وہ نازو کو یرغمال بنا لیں گے تو شاید بچ جائیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ نازو کسی طرح بھی اس جھگڑے میں ملوث ہو جائے۔ ایک شخص کے غیر ارادی قتل سے بہت سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ ہو جو ایک شخص کی گردن کٹی اور چیخ و پکار سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ جس شخص کی گردن کٹی تھی وہ مر گیا ہے یا مر رہا ہے۔ اب میں جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ دس پندرہ منٹ بعد پولیس آ جائے گی اور پولیس آ گئی تب بھی ایک مشتعل ہجوم ہم پر یلغار کر دے گا اور ہمارے فرار کے سارے راستے بند کر دے گا۔ ان سب کا یہی خیال تھا کہ ہم وہ ان چند لوگوں میں ہیں جنہوں نے اس علاقے کو عیاشی کے اڈے کے طور پر منتخب کر رکھا تھا۔

نازو خود اس حالت کی نزاکت کو سمجھتی تھی چنانچہ اسے مقابلے پہ آنا پڑا۔ صرف ایک شخص میری طرف آیا تھا جسے میں نے پہلے والوں کی طرح ٹھکانے لگا دیا لیکن میں نے دیکھا کہ آنکھ کی دیر میں نازو نے انہیں بتا دیا ہے جو اسے ایک نازک کرنہ عورت سمجھنے کی غلطی کرتے ہوئے بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ ان میں سے ایک کو اس نے کلائی سے پکڑ کے اٹھایا اور یوں گھمایا کہ اس کا دوسرا ساتھی بھی لپیٹ میں آ گیا۔ پھر اس نے کلائی چھوڑ دی اور وہ شخص سیدھا کھمبے پہ جا کے لگا۔ دوسرا شخص نازو کے بجلی کی طرح چلتے ہوئے ہاتھوں اور پیروں کی زد میں آ گیا اور کئی جگہ سے ٹوٹ کے گرا۔

بھیڑ جو پہلے مشتعل تھا، اب دم بخود خوفزدہ اور حیرت سے آنکھیں پھاڑے کھڑا تھا۔ یہ جنگ شاید دس منٹ بھی جاری نہیں رہی۔ سات میں ایک تو یقیناً مارا گیا تھا اور باقی بری طرح مجروح ہو گئے تھے یا بے ہوش پڑے تھے۔ ان میں سے چار میرا شکار تھے، وہ تین کو نازو نے ٹھنڈا کیا تھا۔ یہ بہت بڑی واردات تھی جس نے سارے علاقے میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ سب کچھ گلی میں مکانات کی چھت پر سے عورتیں تماشہ دیکھ رہی تھیں اور آگے ٹریفک جام ہو رہا تھا۔ دکاندار دکانوں کو تالے لگا رہے تھے تاکہ وہ لوٹ مار کی نذر نہ ہو جائیں۔ ہوٹل والا کرسیاں میز یکسر سمیٹ کر بے فکر بیٹھا رہا تھا اور خود بھی فرار ہونے کی فکر میں تھا۔

اچانک اکرام شیخ نے ریوالور نکال لیا۔ "ہٹ جاؤ سامنے سے سب" اس نے دھاڑ کے کہا۔ "ورنہ بھیجوں کے ٹکڑے اڑا دوں گا"

لوگ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے۔ اس کے فائر میں وہ دہشت اور ہمارے لیے تھوڑا سا راستہ بن گیا۔ میں نے نازو کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور سامنے آنے والے کئی افراد کو دائیں بائیں گرایا پھر ہم نے خود کو سڑک پہ پایا۔

پھر لوگ ہمارے پیچھے دوڑے مگر شیخ نے ایک ہوائی فائر کیا تو وہ رک گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک پولیس نہیں آئی۔ ہم نے سڑک عبور کرتے ہوئے ایک کار کو دیکھا جو سیدھی ہماری طرف آ رہی تھی۔ عین سڑک کے بیچ میں ٹھہر گیا۔ کار والے نے زبردست بریک لگائے پھر بھی فاصلہ کم تھا۔ میں پیچھے نہ ہٹتا تو ٹکر سے گر جاتا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" صورتحال سے ناواقف گاڑی والے نے چیخ کے کہا۔

"نیچے اتر کے دیکھو" میں نے اسے کالر سے پکڑ کے کھینچ لیا۔ "سب معلوم ہو جائے گا"

اکرام شیخ اور نازو آنا فانا میں پچھلے دروازے کھول کے بیٹھ چکے تھے۔ کار والا سڑک پہ گرا اور پھر اٹھ کے آگے آیا تو میں نے اس کے ایک مکا پوری قوت سے رسید کیا۔ وہ الٹ کر اس منڈیر پہ گرا جو سڑک کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کے پھر اٹھنے سے پہلے میں گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔

میں نے اندھادھند گاڑی کو بھگایا اور اس جگہ سے دور نکل جانے کی کوشش میں ایک گدھا گاڑی سے ٹکرا گیا۔ دو موٹر سائیکل سوار جو میرے گاڑی چلانے کا مستعدی سے جھگڑا کر رہے تھے تو وہ گاڑی سے ٹکرا کے گرتے اور مر جاتے کتنے پیدل چلنے والوں نے بھاگ کے زندگی بچائی اور دونوں بمشکل گاڑی سے بچ پائے۔

بالآخر ہم محفوظ علاقے میں آ پہنچ گئے جہاں سڑکیں بھی نیم آباد تھیں اور دونوں جانب کوٹھیاں بھی خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے کہا اور گاڑی روک دی۔

"شرف آباد" اکرام شیخ نے کہا۔ سارا راستہ ہم خاموش رہے تھے۔ یہ ناخوشگوار واقعہ یہ سب کا ایک سا احساس تھا تاسف پریشانی تاہم تھا۔

گاڑی کو وہیں چھوڑ کے ہم نے شاہراہ لیاقت تک پیدل سفر کیا۔

"یہ بہت برا ہوا" میں نے کسی سے مخاطب ہوئے بغیر کہا۔

"اپنی شامت سے وہ خود ذمہ دار ہے" اکرام شیخ بولا۔ "ہم نے بہت ضبط سے کام لیا تھا اور بہت کوشش کی تھی کہ جھگڑا ..."

"ان لوگوں کے ذہنوں میں کتنی غلاظت بھری ہوئی تھی۔ کیا گھروں میں ..." نازو کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"ماں بہن بیٹی سب ان کے گھروں میں بھی ہوتی ہیں مگر اس کی بات بھول جاتے ہیں۔ غلاظت انہیں گھر سے نہیں ملتی۔ باہر کی دنیا سے ملتی ہے۔ ماحول دیتا ہے اور یہ غلط رستے پر چلتے جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا ہے جو آج ہوا ہے"

"اب ہم لوٹ کر وہاں نہیں جا سکتے" نازو نے افسوس سے کہا

www.paksociety.com

"ظاہر ہے اب پولیس آئے گی، لوگوں کے بیانات لے گی اور معلوم کرے گی کہ ہم کہاں رہتے تھے۔ وہ بلا، سے ان کو بہت کچھ مل جائے گا۔ پھر سے دونوں سوٹ کیس جن میں اسلحہ تھا الله جانے کیا ہوتا۔"

"وہ سب، تو اپنی قسمت سے نکل گیا" نازو نے کہا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ لوگ جاتے وقت ساتھ لے گئے تھے"

"کیوں؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"پتا نہیں۔ محسن کا اصرار تھا۔ اس نے کہا کہ میری ساتویں حس کہتی ہے کہ اس قسم کا سامان یہاں نہیں ہونا چاہیے۔"

پریشانی کے باوجود میں مسکرایا۔ اس کی ساتویں حس اور میری چھٹی حس میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ میں جب بھی کہتا تھا کہ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے تو وہ فوراً اپنی ساتویں حس سے تائید کر دیتا تھا۔"

نازو مسکرانے لگی "آج غالب نے آٹھویں حس ایجاد کر لی۔ وہ محسن کے سامنے اینٹھ گیا کہ میری آٹھویں حس نہ جانے کب سے کہہ رہی ہے۔ خیر پھر وہ متفق ہو گئے کہ اس اسباب کو وہیں اس گاڑی کے ساتھ چھپا دیں۔ وہاں کوئی نہیں پہنچتا۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "چلو، اچھا ہوا۔"

"اچھا تو کم ہوا، خرابی زیادہ ہو گئی" اکرام شیخ بولا "اب کل غبول بھی چھپ جائیں گی تصویر میں کے ساتھ۔"

"تصویر کس نے لی؟" میں نے کہا۔

"تم تو مصروف تھے مار دھاڑ میں، تمہیں پتا نہیں چلا۔"

"مگر وہاں کون تھا؟"

"مجھے کیا معلوم، میں تو فلیش لائٹ پر چونکا تھا" اکرام شیخ نے کہا "مجھے بھی تصویر اتارنے والا دکھائی نہیں دیا۔"

"ایک ہی تصویر اتاری تھی ۔۔۔"

"دو فلیش تو ہوئے تھے" اکرام شیخ بولا۔

میں نے سر پر ہاتھ مارا "اسے کہتے ہیں بلاوجہ کی شامت اعمال۔ وہ خود بھی مرے ہمیں بھی مروا دیا۔ میرا خیال ہے کوئی اخباری نمائندہ گزر رہا ہو گا ادھر سے، اسے بہترین خبر مل گئی۔ اب وہ کراچی سے کئی ملا لیں گے اور چھپ جائے گی کہ تھانے سے مار دھاڑ کر کے فرار ہونے والی حسینہ کا ایک اور سنسنی خیز کارنامہ۔ شیخ تو اس معرکے میں شریک ہی نہیں تھا، میری اور تمہاری تصویر اس نے اتاری۔ تمہارا ریکارڈ تو زیادہ پرانا نہیں۔ میرا ریکارڈ بھی وہ نکال ہی لیں گے۔"

شام ہو گیا تو ہم پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی ورنہ بیس منٹ بعد ہم کو نظر روڈ کی بس کے قریب پہنچ جاتے کہ بس پر اتر گئے۔ یہاں سے وہ جگہ چند منٹ کی پیدل مسافت پر تھی جو نازو نے اندر اس کی منتظر تھے دکھائی تھی اور جہاں ہماری راجا سے

پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

ملاقات میں بات کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا اور ابھی کم بہت سی باتیں جواب طلب تھیں۔ مثلاً یہ کہ نازو کس طرح حاجی عمران کا تعاقب کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ ہماری لانچ اب کہاں ہے اور شکاری اب کیا کر رہے ہیں۔ چوہدری دلاور اور جاوید بھائی کے گروہ اور اسلحہ لے جانے والے جہاز، ابھی یہ کہ آج کی ... کے بارے میں معلومات کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا جس کے بارے میں اطمینان سے بیٹھ کے ہی بات کی جا سکتی تھی۔

تھکن اور بھوک سے بھی میرا برا حال تھا اور نازو تو کئی دن ... کے بعد میں فوری طور پر سگریٹ کے چند کش لگانے کو بھی ترس گیا تھا۔ ہمارا قید ہونا ہی کم آفت نہ تھا کہ راہ میں ملنے والی ... نے میرے اعصاب کو مزید متاثر کیا۔

وہ کیبن نما کمرے کے اندر ایک قطار میں دیوار سے ٹیک لگائے اور گرد آلود فرش پر پیر پھیلائے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے بکھرے ہوئے اسباب خورد و نوش کو دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دعوت اڑا چکے ہیں۔ سوزی سب سے الگ دوسرے کنارے پر سو رہی تھی۔

"آ گئے شہزادے..." محسن نے سگریٹ کا دھواں چھوڑ کے کہا "ہم تو سمجھے تھے کہاں گئے نئے ساتھی؟"

"یہی ... بچے تھے ہم تو شاید کبھی خواب ..." ... نے کہا "ویسے تو آپ حضرات و خواتین کی ... صورت دیکھ کے ... آتی ہے"

"ہم سنجیدہ نہیں رنجیدہ ہیں" میں نے محسن کو ڈانٹتے ہوئے کہا اور اس کے مقابل بیٹھ گیا "اکیلے زہر مار کر لیا"

"نہیں یار، تمہارا نام لے کے پہلے نیاز دی تھی" محسن بولا

"اور یہ بھی کہا تھا فاتحہ کے بعد کہ اے خدا یہ سب ان کے نام کا صدقہ سمجھ کے قبول فرما" غالب نے کہا "مگر تم لوگ تو لوٹ آئے خیریت سے۔"

"اور کیا نہ آتے؟" نازو نے جھلا کے کہا "یہ نہیں پوچھو گے بعد میں کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا؟"

"وہ تو ہمیں معلوم ہے" غالب نے کہا "تم کوئی گل کھلائے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔"

میں نے بلا تکلف بچا ہوا کھانا اپنی طرف کھینچ لیا "آج ہم نے وہ کیا ہے جو تمہارے ... نے ... ساحل پر کیا تھا۔ تم نے کیا کیا؟"

"ہاں، مگر تم کو ادھر جانے کا مشورہ کس نے دیا تھا۔ سیدھے گھر بھی جا سکتے تھے، کیا ساری کشتیاں جلا دی ہیں؟" غالب نے کہا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا "واپسی کی اب کوئی صورت نہیں۔ مرزا غالب" میں نے کہا "نکل آئے وہاں سے بہت بے آبرو ہو کے"

پہلا دن تھی۔ تفصیلات کے لیے انتظار فرمائیے"

کھانے سے فراغت کے بعد میں تو سگریٹ جلا کے لمبا لیٹ گیا اور اکرام شیخ نے مختصراً سارا واقعہ سنانے کی کوشش کی تھی مگر پھر اسے میں نے ... انگیا انداز سے خاصا دھواں دھار بیان لیا۔

"چوہدری دلاور ... سولہ گھوڑوں والا گئے" محسن نے کہا۔

"ہاں، نہیں جائیں گے وہاں۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ کہیں بھی جانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ سوائے ... گھر کے اندر ... یہی جہاں سب کو جانا ہے"

"تم ہوتے وہاں تو" نازو نے غصے سے کہا "بہت پہنچے ہوئے یہاں ہوا سب ہو گئے"

"دیکھو بی بی! ہم تو تمہارے جیسے کر سکتے ہیں۔ یہ جو تم نے طریقہ اپنایا ہے نا، مار دھاڑ اور اغوا کے۔ ان کا انجام معلوم ہے کیا ہوگا؟" غالب نے کہا۔

"ہاں، میں دیکھ رہا ہوں دوست کہ تمہارا مستقبل نہایت ... دیکھ رہا ہوں" میں نے کہا "تم کو ابھی ... کھیل ... تو بھی لینا چاہیے"

"اور ... کا تو خود ... لینا چاہیے" محسن نے میری حالت پر کہا۔

"اچھا، ایک مجھے ... لکھوا کے رکھ لو۔ قتل یا ... سے کچھ کم نہ تھا۔ پرسے ... آگے تو ... نہ تھا"

نازو اور غالب دونوں کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ اکرام شیخ نے ان کی ... کو فوراً موضوع بدل دیا۔

"کسی کو معلوم ہے اس لانچ کے بارے میں؟"

"مجھے معلوم ہے" نازو نے کہا "لانچ اب وہاں نہیں ہے جہاں تھی"

"لاحول ولا قوۃ ... پھر کہاں ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم" وہ بولی "ان دونوں سے پوچھو جو ... رہ گئے تھے۔ راجا جی اور اپنے مرزا غالب"

"اپنے مرزا غالب؟ ہم ... اچھا ہوا تم نے ... کر دیا" میں بولا۔

"ہم سب تو اپنے نہیں ہو سکتے" محسن نے ہنس کر کہا۔

"ہم سے ایک غلطی ہوئی" غالب نے فوراً بات گول کر دی۔

"صرف ایک غلطی" میں نے کہا "آپ اسی غلطی کی طرف تو اشارہ نہیں کر رہے ہیں جو ... سب کرتے ہیں"

"بھاڑ میں جاؤ تم سب" غالب اٹھ کھڑا ہوا "آپ سے ... ہوا ... وہ ... گیا ..."

میں نے ایسی سوالیہ نظروں سے نازو کی طرف دیکھا کہ وہ خود ہی مطلب سمجھ گئی ... اس کا رنگ ... اڑ گیا۔

"بہت نیاز دی کرتے ہیں آپ لوگ بھی" وہ مسکرانے کے قریب ہو گئی تھی۔

"تم نے کبھی نہیں سوچا، کتنی عجیب بات ہے"

"بالکل، ورنہ لڑکیاں تو ذرا ذرا سی بات پر مرنے کی اتنی ماہر ہوتی ہیں کہ خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ اس حاجی کا کیا بنا؟"

"آ ملیں گے" میں نے بتایا۔

"کیا مطلب ہوا؟ کوئی کام کی بات؟"

"مجھے تو افسوس ہے" میں نے نفی میں سر ہلایا "اگر زندہ ہو تو تمام عمر روبوٹ کی طرح اپنے ہاتھ استعمال کرے گا۔ جانے کچھ نہیں بتایا"

"اب کہاں ہے؟"

"خود کے پاس" میں نے کہا "جن کا وہ ایجنٹ تھا۔ راجا تم سب کو کم بیٹھے ہو کیسا لگا، پہلا تجربہ ہے"

"تم ہو گے اس ... کی ... کے تصور میں"

"حق ہے" راجا نے ... کے کہا "کاش میں اپنی داستان ... اسے سنا سکتا اور ... تو خیر وہ نہ کرتی مگر اس کے باپ کو ضرور پریشانی لاحق ہو جاتی کہ ... عاشق تو ... خاک ہو گیا ہے"

"تم نے پانے خان نے تمہارے ساتھ لانچ پر کیا ہوا تھا؟"

"ہونا کیا تھا، ہم تمہیں تلاش کرتے ہوئے ... تھے۔ میں نے تو غالب سے کہا تھا ... کیا بات ہے"

"ہاں، مرتے ہیں تو مر جائیں، جہنم میں جائیں"

"یار کمال ہے" راجا نے خفگی سے کہا "ہر بات کا الٹا مطلب نکال لیتے ہو۔ میں نے تو جب لانچ کو وہیں موجود دیکھا تو کہا تھا کہ ظاہر ہے سب خیریت ہے۔ وہ لوگ کسی اور کام سے کہیں گئے ہوں گے۔ غالب نے اصرار کیا کہ لانچ پر جا کے دیکھنا چاہیے۔ غالب آگے تھا اسی کے سر پر پہلے ڈنڈا پڑا۔ میں تو بھاگ گیا تھا۔ مگر پیچھے ایک اور فرشتہ اجل موجود تھا۔ اس نے مجھے دبوچ لیا اور یوں ہم بھی وہیں پہنچ گئے"

"اور نازو ــ وہ دور کھڑی تماشا دیکھتی رہی؟"

اس نے یہ ثابت کیا کہ عورت ذات ناقص العقل نہیں ہوتی" راجا بولا "ویسے وہ بیوقوفی کی بیٹی تو ہے۔ نازو کے بارے میں ہمیں بھی علم نہیں تھا کہ ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔ وہ لانچ پر نظر رکھے ہماری واپسی کی منتظر تھی کہ اس نے چند روکو اور حاجی کو ایک ساتھ دیکھ لیا۔ پھر وہ لانچ پر گیا تو واپس نہیں آیا اور لانچ روانہ ہو گئی۔ نازو اس حاجی کے پیچھے لگ گئی۔ اکرام شیخ کی ٹیکسی باہر موجود تھی۔ اس نے فوراً ... استعمال کی اور حاجی کی گاڑی کا تعاقب کیا۔ وہ حاجی ... میں ... کے گھر گیا اور نازو پیچھے انتظار کرتی رہی۔ حاجی واپس آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ وہ دونوں سیاہ فام تھے۔ نازو کا کہنا ہے کہ اس وقت وہ حبشی نہیں لگتے تھے۔ سیاہی وغیرہ انہوں نے بعد میں منہ پر ملی ہوگی

www.paksociety.com

جاتی کی گاڑی جہاں بھی گئی۔" نازو نے کہا "تعاقب کیا اور یوں وہ اس جگہ تک آ پہنچی۔"
"آفرین ہے تم پر مس نازلی!" میں نے کہا۔ "کہ تم نے پہلی بار عقل سے کام لیا ورنہ تو ہمیشہ مرنے مارنے پر تلی رہتی ہو۔"
"احسان فراموش ہو تم سب۔" نازو نے بگڑ کے کہا۔ "جان بچائی ہے سب کی میں نے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے پایا تم نے۔" میں نے کہا۔ "مگر کیا یہ باہر سے کنڈی لگانا تمہارا ارادہ نہیں تھا؟"
"اور کیا کرتی میں، خود بھی اندر آ جاتی۔ خالی ہاتھ۔"
"خالی ہاتھ کیوں۔ اس قسم کے حالات میں تو بچکانا اسلحہ رکھنا چاہیے مثلاً توپ اور ٹینک۔"
"میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے بھی وہیں بند کر دوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اندر کیا پوزیشن کیا ہے۔ ایک دو سے میں خالی ہاتھ بھی نمٹ لیتی مگر یہ ممکن تھا کہ اس سے تمہیں نقصان ہو جاتا۔ ایسی صورت میں کہ وہ خود بھی قید ہو گیا تھا یا اس کے ساتھی آتے اسے چھڑانے کے لیے یا وہ اندر تم لوگوں سے صلح صفائی کر کے اپنی جان بچانے کے لیے یا خود بھی مرنا قبول کرتا۔ میں باہر منتظر تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ کیسے وہ ایک بزدل آدمی لگتا تھا، چور دل اور کمینہ۔ میں یہی سمجھ گئی تھی کہ وہ تم سے کوئی سودا کرے گا۔"
"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا تھا؟"
"وہ کہانے چپکے کا صفحہ ادھورا تھا۔" نازو بولی۔ "ظاہر ہے، مناسب ہے سب سمجھ گئی تھی۔"
"اگر وہ بھی مار دیتے اور دروازہ توڑ کے نکل جاتے؟"
"دروازہ آسانی سے ٹوٹنے والا نہیں تھا۔" وہ بولی۔ "وہ نکل کیسے جاتے۔ میں جو باہر موجود تھی۔ ان دو غلاموں پر اچانک ٹوٹ پڑتی تو انہیں مقابلے کا موقع بھی نہ ملتا۔ خاص تو بس گوشت کا پہاڑ تھا۔ ایک لات پڑتی تو لیٹ جاتا۔"
"اور اگر ان کے ساتھی آ جاتے تو؟"
"اگر وہ تو میرے سامنے ہی آتے۔" وہ بولی۔ "کسی ایک پر قابو پا کے اسلحہ حاصل کر لیتی۔ یہ تو مجھے اندازہ تھا کہ یہاں فوج کی پوری پلٹن نہیں آ سکتی۔ دو تین ہوتے تو ایک دو کو گرا لیتی۔"
میں نے قہر بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ "تمہارے اندازے غلط بھی ہو سکتے تھے مگر ہوئے نہیں۔ مجھے یہ فائدہ ہوا کہ دروازہ بند ہونے کی آواز پر وہ بے اختیار پلٹ گئے۔ ان کی توجہ تم پر سے ہٹ گئی اور بس۔ میں نے موقعے سے فائدہ اٹھا لیا۔"
غالب جو خلاف توقع اس تمام وقت کے بعد ایوان میں لوٹ آیا تھا، نازو کو قابل رشک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اکرام شیخ نہ جانے کب باتیں سنتے سنتے سو گیا تھا۔ محسن اونگھ رہا تھا۔ میں نے بھی کچھ دیر سو جانا بہتر سمجھا۔

کوٹھی کے قریب جا کے نازو بھی سو گئی تھی۔
جب میں جاگا تو ہر طرف گھپ تاریکی تھی۔ کھلے دروازے سے تیسرے جانے کا ہم اٹھائے ہیں۔ مجھے سر پر بوجھ سا لگا تو میں نے لائٹ جلانے کی کوشش کی اندھیرے کے ایک کونے میں جھٹکے سے محسوس کر کے بھی آن ملا پایا تو ہنگامہ کرنے لگا۔
"اللہ!" میں نے نعرہ مارا۔
نازو سب سے پہلے گھبرا کے اٹھی۔ "کیا ہوا؟" پھر غالب اٹھ بیٹھا۔ میں نے لائٹ جلاتے ہوئے کہا۔ "کہاں کیا ہوا؟ کسی نے بھی تو پکڑ نہیں ہوا۔"
نازو نے غالب کی طرف دیکھا۔ "کچھ تو ہوا تھا۔"
"ہوا نہیں ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ میرے سامنے ہو رہا ہے۔ دماغ پھٹ رہا ہے۔ تم دونوں خواب بھی ایک جیسے دیکھ رہے تھے۔ اٹھے بھی ساتھ ہی، اب آنکھیں چار کر رہے ہو۔ آخر یہ کیا ہے؟"
محسن نے آنکھیں کھول کے پھر بند کر لیں اور بولا۔ "دو اپنے حال پہ چھوڑ دو۔ کیا کرے... جو سانس بھی نہ لے سکے وہ آہ کیا کرے۔"
"پھر چالو ہو گیا ریکارڈ۔" نازو نے کہا۔ پھر اس کی نگاہ دروازے کی طرف گئی۔ "وہ کیا ہے؟"
میں نے کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک لفافہ پڑا ہوا تھا۔ میں اسے اٹھانے لپکا۔ یہ سادہ مگر بند لفافہ تھا۔ اس کے اندر سے ایک مختصر تحریر والا کاغذ کا پرزہ نکلا۔ اسے دیکھتے ہی میرے دل نے والد کا نام لیا اور قلابازی کھائی۔ رابعہ نے لکھا تھا۔
"میری فکر نہ کرنا، اپنا کام کرو۔ رات ایک بجے سبزی منڈی میں ٹرک نمبر ... آر ... پر نظر رکھو۔ لاپتا مل جائے گی۔"
"ہا ہا ہا... ہو ہو ہو۔" میں نے چیخ ماری۔ ایک قلابازی کھائی اور پھر کھڑا ہو گیا۔ سب نے مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھا مگر خاموش رہے۔
"اسے کیا ہوا؟" غالب بولا۔
"میرا خیال ہے، لفافے میں جن تھا۔" محسن نے تشویش سے کہا۔
"لفافے میں جن؟" نازو نے پہلی دفعہ چونک کے کہا۔
"ہاں، پہلے پہلے بوتل میں بند کیے جاتے تھے جس نے کبھی کھولا اس کی شامت۔" محسن بولا۔
غالب نے کہا۔ "مجھے تو خوشی کا بھوت نظر آتا ہے۔"
"آپ نے سچ جان لیا پیر و مرشد۔" میں نے کہا اور وہ پرزہ غالب کو تھما دیا۔ ان سب نے بے حد اشتیاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے غالب کے قریب جا کے اسے پڑھا اور پھر ایک دوسرے سے چھین کے پڑھا۔
"یہ آیا کہاں سے؟"
"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ جب ہم سوئے تھے تو دروازہ بند تھا۔"

"پھر کسی نے دروازہ کھولا اور خط یہاں ڈال دیا مگر آنے والا قریب آ کے کیوں لوٹ گیا؟" غالب بولا۔
"نامہ بر ہم سے ملے کے پیغام زبانی بھی دے سکتا تھا۔"
"وہ چھوڑو یہ بحث۔" محسن نے کہا۔ "یہ دیکھو کہ تحریر کس کی ہے؟ کہیں یہ کوئی دھوکا تو نہیں؟"
"تحریر کے بارے میں تو میں اپنے دل کی گواہی سے بیان حلفی داخل کر سکتا ہوں۔" میں نے مسرت سے کہا۔ "اس میں کوئی دھوکا نہیں۔"
"دل کے نام پر بہت دھوکے کھائے ہیں تم نے، سوچو کہ مراد..." محسن بولا۔ "اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ تحریر زبردستی حاصل نہیں کی گئی ہے؟"
"اگر ایسا ہوتا تو میرا دل گواہی نہ دیتا۔" میں نے کہا۔ "اور اچھا یہ بھی تو سوچو کہ جو ہمیں دھوکے سے رات ایک بجے سبزی منڈی بلانا چاہتا تھا، اس نے ہمیں یہیں اسی جگہ کیوں نہیں پکڑ لیا۔ ہم تو سوئے پڑے تھے۔"
"یہ تیری بات دل کو لگتی ہے۔" محسن بولا۔ "جو بھی یہ اطلاع دے رہا ہے وہ دشمن نہیں تھا۔"
"دوست تھا تو اس نے کیسے جانا کہ ہم یہاں ہوں گے؟"
"تیل دیکھو۔" غالب نے بڑے سکون سے کہا۔ "کیونکہ کوئی راہ ہوتی ہے۔"
"سوال یہ ہے کہ کیا اس اطلاع کو درست تسلیم کرتے ہوئے ہم کوئی قدم اٹھائیں گے؟" اکرام شیخ نے کہا۔
"ہم اسے نظر انداز کیسے کر سکتے ہیں؟" راجا نے کہا۔ "یہ کام بھی آسان نہیں ہے۔ ہم سب کو مل کے کرنا ہوگا کیونکہ آدھی رات کے بعد سبزی منڈی میں مال لے کے سیکڑوں ٹرک آتے جاتے ہیں۔ کوئی آدمی سب پر نظر نہیں رکھ سکتا۔ سب کو مختلف راستوں پر پوزیشن سنبھالنا ہو گی۔"
"یہ تو ٹھیک ہے۔" محسن بولا۔ "فرض کرو ایک نے ٹرک کا نمبر نوٹ کر لیا تو وہ کیا کرے گا۔ اکیلا اس کے پیچھے جائے گا تو دوسروں کو کیسے مطلع کرے گا۔ ہمارے پاس ایک دوسرے سے رابطہ رکھنے کا انتظام تو ہے نہیں۔"
"نادان ہو... کیا کہوں اسے۔" محسن بولا۔ "اس کو یہ بھی تو بتانا تھا کہ ٹرک آ کے کہاں جائے گا۔ بس نمبر لکھ دیا۔ ایک جملہ اور لکھتے ہوئے کیا انگلیاں ٹوٹ رہی تھیں؟"
"اب کیا معلوم اسے جلدی میں لکھنا پڑا ہو۔ وہ کسی مجبوری میں ہو۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو۔" غالب نے کہا۔ "اس میں بھی خطرہ ہوگا۔ اور پھر ممکن ہے نامہ بر انتظار نہ کر سکتا ہو۔ اس نے تار کی زبان میں یہ سب لکھ دیا جو ضروری تھا اور اسے تھما دیا۔"
"اور کہنے کو ہم ٹرک پر نظر رکھیں گے مگر اس کا تعاقب کرنا پڑا تو کیسے کریں گے؟" میں نے کہا۔ "فرض کرو کہ ہم یہ گاڑی نکالنے کا خطرہ بھی مول لے لیتے ہیں۔"
"اب اتنا خطرہ نہیں رہا۔ پولیس بھول بھلیوں میں گم ہو گئی اس کیس کو۔" محسن بولا۔
"پھر بھی دوسری گاڑی تو ہونی چاہیے۔ چار آدمی اگر چار کونوں میں جانا چاہیں تو جا سکیں۔ یہ نہ ہو کہ کسی کو ٹرک کے پیچھے دوڑ لگانا پڑے۔"
"ہم سیٹھ نیپئر سے دو ٹیکسی حاصل کرنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں۔" اکرام شیخ بولا۔ "اگر راجا جائے۔"
"میرا تو باپ بھی نہ جائے۔" راجا نے کان پکڑ کے کہا۔
"ہم بھی ساتھ چلیں گے یار۔" میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اس گاڑی میں۔ اگر ٹیکسی نظر آ گئی تو صحیح سالم تو کام بن جائے گا۔"
"اور وہاں وہ جیسے ہی سر پر ہوئے تو؟"
"ان کی تو ایسی کی تیسی۔ ہم کیا خالی ہاتھ جائیں گے؟" میں نے کہا۔ "جتنا اسلحہ ہے سب لے جائیں گے۔"
"خاطر جمع رکھیں، چار دن تک ہم بھی یہیں علاوہ ایک اسٹین گن کے۔" محسن نے اتفاق کیا۔ "ٹیکسی مل گئی تو وہ اس میں واپس آ جائیں گے دو گاڑیاں۔"
"اور دو گاڑیاں چار راستوں پر نظر رکھنے کے لیے کافی ہو سکتی ہیں؟" راجا نے کہا۔
"وہ کیسے؟ آدھی آدھی گاڑی رہ جائے گی سب کو؟"
"نہیں، وہ خود بہتر بنا کے ہے۔" راجا نے کہا۔ "جو ٹرک وہاں سبزی پھل وغیرہ لاتے ہیں، سب یقیناً ایک ہی راستے کی طرف سے آتے ہیں۔ فیکٹریوں کی طرف سے کوئی نہیں آتا۔ ایک سڑک دوسری طرف بھی ہے جہاں سے ایک راستہ نیشنل اسٹیڈیم کی طرف جاتا ہے۔ حسن اسکوائر ملتا ہے جہاں۔"
"ہم اس علاقے سے ناواقف ہیں۔" دو نے کہا۔
"میں سمجھ گیا۔" اکرام شیخ نے کہا۔
"دونوں گاڑیاں اس چوک سے ذرا آگے کھڑی ہوں۔ ایک جانے والی سڑک پر، ایک آنے والی سڑک پر۔ تو یہ ناممکن ہے کہ ٹرک وہاں سے گزرے اور دکھائی نہ دے۔ ہر گاڑی میں دو افراد ہوں۔ دونوں پارٹیاں مسلح ہوں۔"
"ترکیب پسند آئی۔" میں نے کہا۔ "اب یہ کس حد تک قابلِ عمل ہے، اس کو تو رات کو ہی پتہ چلے گا۔ فی الحال تو میں فریش ہونے کے موڈ میں ہوں۔"
"میں بھی نہا دھو کے کپڑے بدلنا چاہتا ہوں۔" غالب بولا۔
"میں بلیک کافی کے ساتھ کلب سینڈوچ کھانا چاہتا ہوں اور پھر ... کرنا چاہتا ہوں۔"
"سب ہو جائے گا... سب ہو جائے گا۔" میں نے انہیں تسلی دی۔ "لگا باہر سے بازار جا کے تھا... پھر میں گیا تو"

www.paksociety.com

گاڑی کا مالک تھا اور ہم سب سمجھتے ہیں اچھا پٹے اسے اللہ پر سے کر لے۔

اویل ریکارڈ کو میں نے ملتان سے خریدی تھی۔ گرد و غبار جس نے اور چھت تک آبادی پر مٹی کی حفاظت کے باعث پہچانی بھی نہ جاتی تھی۔ اس کے کاغذات محفوظ تھے جن میں میرا نام سعادت علی خان گوہیز لکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی فوٹو اسٹیٹ لائسنس تھا اس کی گاڑی کا نام مدیح تھا۔

پیکنگ میں کافی پیٹرول تھا لیکن طویل عرصہ دراز سے بند رہنے کی وجہ سے انجن خشک ہو گئی تھی۔ پہلے گاڑی کو دھکیل کر باہر لایا گیا۔ اسٹارٹ کرنے کی کوشش سے پہلے میں نے اس کو بڑی محبت سے دھویا اور چمکا دیا۔ وہ ایک بہت شاندار لنگڑی سیڈان تھی جو جرمن سیڈ بنتو تھی مگر اس سے مقابلہ کر سکتی تھی۔

ایئر فلٹر ہٹا کے میں نے منہ سے پیٹرول کھینچا اور جب پیٹرول منہ تک پہنچ آیا تو کاربوریٹر میں پیٹرول سے کلی کر دی۔ راجا، غالب اور محسن نے اسے دھکا لگایا۔ پہلی کوشش میں انجن ڈیڈ رہا۔ بیٹری میں بالکل جان نہیں رہی تھی۔ انھوں نے پھر کوشش کی اور گاڑی نے تھوڑی سی سپیڈ پکڑی تو انجن غرایا مگر بند ہو گیا۔

"شاباش... شاباش، بس ایک بار اور جوانو!" میں نے کہا مگر وہ ہانپ رہے تھے کیونکہ وہ بہت بھاری گاڑی تھی۔ مجھے گاڑی کو اور اس کے موجد کو اور تقدیر کو قصوروار کہتے سنے کے بعد وہ پھر پیچھے متحد ہو کے اپنی قوت صرف کرنے لگے۔ اس مرتبہ گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ میں نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا اور گاڑی کو ریس دیتا رہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ انجن پھر نہ رک جائے۔ اتنا عرصہ کھڑی رہنے والی گاڑی کی پوزنگ ٹھیک نہیں رہ سکتی تھی۔

وہ تیار ہو کے آئے تو نازو نے آگے والی سیٹ پر قبضہ کیا جو بی کیلس کے مطابق جائز تھا۔ تینوں حضرات نے پہلے فرنٹ سیٹ کا ... پر اصرار کیا۔

"ذرا گھومنے کے لیے گاڑی بند کرنا پڑے گی۔"

"تو کر دو۔ یہ پوچھنے کی کیا بات ہے" غالب نے کہا۔

"تمہاری مرضی، تم ہی پھر دھکا لگاؤ گے۔ بیٹری ابھی تک چارج نہیں ہوئی" میں نے باہر آ کے کہا۔ "راجا اور موہنی کہاں ہیں؟"

"دھکا اب آپ لگائیں چیف کے" محسن بولا۔ "گاڑی اسٹارٹ ابھی بھی آتی ہے۔ راجا اور موہنی تیار ہو رہے ہیں۔ ہم نے بہت کہا۔"

انھوں نے دونوں سوٹ کیس ڈگی میں ڈالے۔ پھر میں نے بسم اللہ پڑھ کے اگنیشن میں چابی لگائی اور دعا کی... انجن اسٹارٹ ہو گیا تو میں نے قہقہہ مارا۔

"پیڑھے آئے مجھ سے دھکا لگوانے والے۔ یہ آخر ہماری گاڑی ہے، ہماری فرمانبردار ہے، وفادار ہے۔ اتنی خوب صورت اور سبک رفتار ہے۔"

"آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں گاڑی کا یا بیوی کا؟" محسن نے کہا۔ "اور بیوی کا ذکر کس کی بیوی کا؟"

"آپ کی بیوی ان تمام صفات سے محروم ہے۔ برا مت مانیے گا" غالب نے کہا۔ "ہم جھوٹ نہیں بول سکتے۔"

"جھوٹ نہ سہی، تم بول کیسے سکتے ہو۔ بندر کیا جانے ادرک کا سواد" محسن نے کہا۔

"تم خود کو بندر اور بیوی کو ادرک تسلیم کرتے ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں" غالب نے کہا۔

"اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم نے سرِ عام ہتک عزت کیا ہے اب فیصلہ ڈوئیل سے ہو گا" محسن بولا۔ "ایک دن ہم پر ماریں گے ایک تم اور گے۔ دس قدم مخالف سمت میں چل کر۔ قاعدے کے مطابق۔"

"لیکن ماریں گے کس پر؟" غالب بولا۔

"کسی پر ماریں گے، مقتول بہر حال اپنے سسر کو دولہا کے گھر لا کر دے" محسن نے کہا۔ "اور ڈوئیل ہو گا شادی کے بعد۔"

"چلو چلو" ریحانہ نے کہا۔ "میرا ابھی سسر خاموش ہے تیلی۔"

"وہاں یار، ہم سب بے سسرے لوگ ہیں" محسن نے ... لیے میں کہا۔

نازو بھی مسکرا دی۔ میں بھی منتظر تھا اور گاڑی نے راستے کا سفر جاری رکھا۔ ہم نے دل کھول کے سیر کی۔ بے فکری سے ہر جگہ گھومے گئے اور رات کے دس بجے سپیڈ بیٹ کے لیے روانہ ہوئے تو سب اتنے خوش تھے گویا اس بہر گئے تھے ... یاد کر کے جو ہمارے ساتھ نہیں تھے اور ... محسن اور غالب اور استاد ڈیڈی تھا جو اپنی جگہ خلا چھوڑ گیا تو

"موہنی کا تو ضرور موڈ خراب ہے" محسن نے اچانک کہا "مگر یہ راجا..."

"موڈ کیوں خراب ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔

"تمہارے رویے کی وجہ سے۔ راجا بھی اسی لیے نہیں آیا۔"

"یہ ایک شاندار تھیوری ہے۔ موہنی کا موڈ خراب ہے میری وجہ سے اور راجا کا موڈ خراب ہو گیا موہنی کی وجہ سے" میں نے کہا۔ "کیا بات ہوئی؟"

"پیچھے ذکر کرنا چاہتے تھے اپنے تھانیدار صاحب" محسن بولا۔ "کیونکہ موہنی کسی صورت ساتھ آنے پر تیار نہ تھی۔ انہیں تو ہم نے کھینچا مگر ان کی وجہ سے راجا رک گیا کہ موہنی اکیلی کیسے رہے گی۔ ویسے بھی ... تھا کہ غیر کا دل بھر گیا ہے یا ان اچھے ہوٹلوں کے کھانے کے خلاف۔ امید ہے ٹیکسی کی گشت کے درمیان بالکل ایسی حالت میں کھڑی نظر آئی پیچھے ہم نے سامنے چھوڑا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ پیٹ بند کے ساتھ آنے والوں کو ٹیکسی دکھائی نہ دی ہو۔ انھوں نے تمام طلبی کا انتظام نہ تھی۔ امکان اس بات کا تھا کہ وہ لوگ وہ رُکتے نہیں آئے اور اس کے جانے کے بعد پہنچے ہوں۔ جلدی وہ کھنڈر تک پہنچنے سے قبل ہی واپس چلے گئے یا انھوں نے زیادہ مستعدی نہیں دکھائی اور صرف آنکھ بند کر کے حوالی کیا جہاں پہنچنے کی جگہ تھی۔

تاہم میرے ذہن نے دوسرے امکان کو بھی مسترد نہیں کیا کہ ٹیکسی کو دیکھ لینے کے باوجود انھوں نے اسے نقصان پہنچانے سے گریز کیا۔ اس امید میں کہ شاید ہم ٹیکسی کو واپس لے جانے کے لیے آئیں گے۔ اگر ایسا ہی تھا تو ہم نے انہیں مایوس نہیں کیا تھا اور یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کہیں چھپ کر ہمیں دیکھ رہے ہوں اور خوش ہو رہے ہوں کہ ان کا شکار اسی طرح اپنے شکاری کے دام کے قریب آتے دیکھتا ہے ... سمجھتا ہے کہ ... ٹیپنے کی جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔

محسن نے میرے خیال سے اتفاق کیا اور ہم پہلے تو اس مقام سے سیدھے بہت آگے تک چلے گئے اور پھر واپس ہو کے گاڑی کو ہم نے ایک نئی تعمیر شدہ عمارت کے عقب میں کھڑا کر دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ چوکیدار ضرور ہو گا مگر وہ سویا ہوا تھا یا موجود ہی نہیں تھا۔

تھوڑا پیدل چل کر ہم الگ الگ ہو گئے... میں اور اکرام شیخ سمندر کے ساحل کی جانب سے گئے۔ محسن اور غالب نے سڑک کا راستہ اختیار کیا۔ نازو گاڑی میں ہی موجود تھی مگر اس نے واضح کر لیا کہ ہم ایک گھنٹے میں نہ لوٹے تو وہ بھی نکل کھڑی ہو گی۔

"یار سکندر" ڈاکٹر اکرام شیخ نے رات کے سمندر کی گونج میں کہا۔ "ایک بات پوچھوں؟"

"صرف ایک بات؟"

"تم موہنی کو رضیہ سلطانہ کیوں نہیں کہتے ہو؟"

"اس لیے کہ میں اسے رضیہ سلطانہ نہیں سمجھتا" میں نے کہا "مگر وہ کہتی ہے..."

"وہ کہتی ہے نا" میں نے شیخ کی بات کاٹ دی "وہ کچھ بھی کر سکتی ہے اور میں ہر ... بات پر استاد وصدق کہنے کا عادی نہیں۔"

"تم ضرورت سے زیادہ وحشی اور وحشی ہو۔"

"یہ میرے حالات کا تقاضا ہے" میں نے کہا۔ "مگر تم کیوں ضرورت سے زیادہ ... ہو؟ آخر مطلب؟"

"اس کا جواب کوئی دے سکتا ہے" وہ بولا۔ "تم نے دیکھا کہ ... حاصل نہ ہونے کے باعث وہ سب کے درمیان رہ کے بھی خود کو کیا محسوس کرتی ہے۔"

"ہر لڑکی ... کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"نہیں، درست، تم اس سے الرجک ہو گئے ہو خواہ مخواہ۔"

"خواہ مخواہ نہیں۔ اس کا کردار ایسا ہی رہا ہے" میں نے کہا۔

"ہے کیا مطلب ہے؟ ... پیچھے کیا رہا ہے اور اب کیا ہے۔ فیصلہ پہلے کیا تھا مگر اب کیا ہے۔ آج سے کوئی شریف زادی ماتا تھا مگر تم نے اسے ... اور اب وہ سب نام شاد شریف زادیاں ہے صادق ہے۔ ان سب سے بڑھ کر استاد ڈیڈی کی مثال ہے۔ خدا اسے جنت نصیب کرے گا یاد وہ ایک بدمعاش نہیں تھا۔ وہ سب آخر ایسا کیسے ہی تھے مگر وہ خود بھی اپنی بدمعاشی پر ناز کرتا تھا۔ استاد ڈیڈی ہی اندر کا نام تھا جو اپنا ترک کیا اس کا وہ کردار باقی رہا؟"

میں لاجواب ہو گیا "تم موہنی کی وکالت کیوں کر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ اس کے ساتھ بہت ہتک آمیز بلکہ ذلت آمیز سلوک ہو رہا ہے صرف تمہاری وجہ سے۔"

"میں نے کسی کو منع تو نہیں کیا۔"

"منع نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ تمہارے جذبات کا رخ دیکھتے ہوئے دوسرے بھی اس کے ساتھ وہ سرد مہری رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں وہ جب سے آئی ہے تنہا ہے۔ صرف نازو اس سے بات کر لیتی ہے باقی سب تو اس کی طرف نظر اٹھا کے دیکھتے تک نہیں۔"

"تم تو دیکھتے ہو نا، اسی لیے یہ سب جانتے ہو۔"

"ہاں، میں دیکھ رہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ وہ اپنی کشمکش میں ناکام ہو جانے کے بعد اب مایوسی اور دل شکستگی کا شکار ہے اور اس نے نازو سے کہا بھی ہے کہ میری تو ساری زندگی ضائع ہی ہو گئی۔ میں نے جذبات کے اندھے کنویں میں چھلانگ لگا دی اور اپنا سب کچھ لٹا دیا میرا ماں باپ سے جدا ہو گئی۔ سب رشتوں سے محروم ہو گئی۔ اپنا نام ... اور آخر میں کیا ملا! جس کو اپنا جانا انھوں نے مجھے اپنانے سے انکار کر دیا۔"

"تم خود سوچو یار۔ کیا اس کی خاطر راجا کو چھوڑ دوں! یہ کوئی قمیض بدلنے کی بات تو نہیں ہے کہ میں محبت بدل لوں۔"

"وہ کب تم سے کچھ مانگ رہی ہے۔ اس نے راجا اور تمہارے تعلق کی حقیقت کو ایک ناقابلِ شکست سچائی جان کے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ وہ تو صرف اعتبار مانگتی ہے۔ اسے صدمہ ہے کہ تم اس سے نفرت کرتے ہو۔ اس کی صورت دیکھنا اور اس کے وجود کو برداشت کرنے کے روادار نہیں اور یہ سراسر ظلم ہے۔ اس نے نازو سے کہا تھا کہ اب تو زندہ رہ کے بھی کیا کرنا ہے۔ مجھے تو مر جانا چاہیے تاکہ ذلت اٹھانے کے بجائے آہستہ آہستہ اس کا یہ خیال راسخ ہوتا جا رہا ہے۔ جانتے ہو میں کیوں تمہارے ساتھ آ گیا اور راجا کیوں نہیں آیا؟"

"کیا راجا اسے جذباتی سہارا دینے کے لیے کوئی روحانی پیر و مرشد بنا رہا ہے؟" میں نے طنز کیا۔ "اسے یقین دلانے کا کہ کوئی اسے ضرور چاہتا ہے جس کی خاطر اسے زندہ رہنا ہو گا۔"

وہ ہمارے ساتھ آنے پر کسی صورت رضامند نہ تھی اور مجھے اس کے انکار سے کچھ خوف آیا۔ میری چھٹی حس کچھ کہ رہی تھی...

www.paksociety.com

"پچھلی جس میں میری جنت سماتی ہیں محسن کی اور اتمھیں غالب کی،" میں نے کہا۔

"چلو میری تو یہ جنت کا کر رہے ہو لو اسے کہ مجھے خطرہ محسوس ہوا۔"

"کس قسم کا خطرہ؟"

"یہ خطرہ کہ ہماری عدم موجودگی میں وہ بھٹک کر گر رہے گی۔"

"تو پھر راجا کیا کرے گا؟" میں نے کہا۔ "اسے یقین دلائے گا کہ یہ دوست ہے شہیر سے امید سہارا رکھ۔ ایک نہ ایک دن سکندر لوٹ آئے گا، اگر تمہاری محبت سچی ہے۔"

"وہ اسے یقین دلانے کو کہ میں اسے چاہتا ہوں۔"

میں اچھل پڑا۔ "تم... تم غلط کر رہے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ صرف اسے سہارا دینے کے لیے جھوٹ موٹ کی چاہت کا اقرار کرنا چاہتے ہو۔"

"میں صرف چاہت کا اقرار کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "کیا چاہت جھوٹی بھی ہوتی ہے، مجھے اس کا تجربہ نہیں۔"

میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔ "تھانیدار صاحب! کیا تمہاری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے؟"

"کیا عشق میں سب کی عقل گھاس چرنے نہیں چلی جاتی؟"

"مگر دوست، تم اسے... میرا مطلب ہے کہ تمہیں آٹھ دن ابھی ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"محبت تو ایک نگاہ میں ہو جاتی ہے۔" وہ بولا۔

"لو ایٹ فرسٹ سائٹ۔" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "تم اس کے قائل معلوم نہیں ہوتے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "محبت کا جذبہ دل میں ننھی آرزو کی طرح پھوٹتا ہے، اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے مگر اسے برگ و ثمر اور درخت بننے کے لیے اور اپنی جڑیں روح کی گہرائی تک گاڑنے کے لیے سازگار حالات، جذبات اور احساسات کی مطابقت اور خیالات کی ہم آہنگی، مزاج اور خیالات کی یکسانیت، ایک دوسرے کو سمجھنے کی مہلت اور خود کو سمجھانے کے مواقع، ان سب کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ دل کا سودا ہے مگر عقل اگر رہنما نہ ہو تو محبت فلمی ہو سکتی ہے، حقیقی اور دائمی اور مکمل نہیں ہوتی۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "مجھ کو آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا، اس لیے آپ نے فرض کر لیا ہے کہ ایسا کہیں بھی نہیں ہوتا اور ہو ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ دنیا اس حقیقت کو مانتی اور جانتی ہے کہ بس ایک نگاہ میں ہوتا ہے فیصلہ دل کا۔"

"شعر! پھر شعر! تھانیدار صاحب! خدا کے لیے تم شاعری کی کوشش نہ کرو۔"

"تم مذاق اڑا سکتے ہو میرا۔" اکرام شیخ آزردہ ہو گیا۔ "مگر میں جانتا ہوں..."

"کیا جانتے ہو؟" میں نے کہا۔ "میں تو کچھ نہیں جانتا۔"

"تم جانتے ہو کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے؟"

"ہاں، ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"تو میں بھی جان چکا ہوں کہ..."

میں چلتے چلتے رک گیا۔ "کہ وہ بھی تمہیں چاہنے لگی ہے؟"

"میں نے یہی جاننے کے لیے راجا سے کہا تھا اور راجا اسی لیے پیچھے ٹھہر گیا۔"

"وہ عدالت عشق میں تمہارا وکیل ہے، تمہاری پیروی کرے گا۔" میں نے کہا۔ "اچھا وکیل منتخب کیا ہے تم نے۔ ایک زبردست انجنیئر ہے۔"

"وہ ایک ایسا عاشق ہے جس کے عشق کو تم سب پاگل پن کہتے ہو کیونکہ جو کچھ اس نے محبت کی خاطر کیا وہ تم کبھی نہیں کر سکتے تھے، نہ تم نہ محسن نہ کوئی اور۔"

اس نے عمداً غالب کا نام نہیں لیا۔ "اچھا، اگر یہ خیالات ہیں تمہارے تو میری دعائیں اور نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

"اس کی ضرورت مجھ کو زیادہ ہے۔"

"اس کے لیے بھی کوشش کروں گا کہ میرے جذبات دوسری جانب بھی اور وہی حالات کہ تم اس پر فریفتہ ہو۔ میں مجبور ہوں۔"

"کوئی مجبوری نہیں تھی۔" وہ بولا۔ "تم موسیٰ پر اعتماد نہیں کر سکتے تو تمہاری مرضی۔ ہم تمہارے راستے سے ہٹ جائیں گے۔"

"ہم! یہ جمع کا صیغہ؟"

"ہاں، میں موسیٰ سے شادی کر لوں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔ پھر ہماری دعائیں اور نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔"

میں جھنجھلا گیا۔ "یار اکرام شیخ! عقل کے اندھے، تم اس حد تک جانے کی سوچ رہے ہو!"

"میں مجبور ہوں۔" اس نے میرے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔

"کوئی مجبوری نہیں تھی، تم جا سکتے ہو۔"

اس کا چہرہ اتر گیا۔ شاید اسے مجھ سے دو ٹوک فیصلے کی امید نہیں تھی۔

"مگر جانے سے پہلے سن لو۔" میں نے جملہ مکمل کیا۔ "تم دونوں کو اعتماد کے ساتھ تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری نیک تمناؤں کی اور دعاؤں کی نہیں تھانیدار صاحب۔" میں نے اس کا کندھا تھپکا اور وہ بھی ہنسنے لگا۔

اچانک رات کی خاموشی کو ایک فائر کی آواز نے منتشر کر دیا۔ میں نے ایک سائے کو اس طرف سے لپکتے دیکھا جس کے سامنے ہم کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ دور ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔

بے اختیار میں اور اکرام شیخ اسی طرف لپکے۔ بھاگنے والا سڑک کی

طرف بھاگا تھا اور اس کی چال اجنبی تھی۔ ریوالور میں نے بھی نکال لیا تھا اور اکرام شیخ نے بھی۔ یکلخت آگے دوڑنے والا پلٹا، ایک ساتھ ہم دونوں ساحل کی ریت پر گرے۔ فائر کی آواز گونجی اور پھر ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ فائر ہم پر ہی کیا گیا تھا۔ بھاگنے والا ہم سے تقریباً سو گز آگے تھا لیکن دھندلی چاندنی میں اس کی صورت شکل واضح نہیں تھی۔ پھر کچھ اور بہت سے غالب یا محسن نے گولی چلائی اور دوڑنے والا منہ کے بل گر گیا۔ اس کے دوبارہ اٹھنے میں کچھ وقت لگا اور اتنی دیر میں ہم اس کے بہت قریب جا پہنچے۔

اب وہ دوڑنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا کیونکہ گولی اس کے پاؤں میں لگی تھی۔ وہ ایک پرانی ٹیکسی کی طرف کھسکنے کی کوشش کر رہا تھا جو بظاہر لاوارث کھڑی نظر آتی تھی مگر ایسی بہت سی گاڑیاں ہوٹل کے باہر موجود تھیں۔ ان کے مالک اپنے اپنے عشرت کدوں کی روشنی میں تھکے خواب میں کھو رہے تھے۔

اب میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی ڈرائیور تھا جس نے کراچی پہنچنے پر مجھے گرفتار کرانا چاہا تھا مگر چستی کے باعث وہ خود گرفتار ہو گیا تھا۔ اس نے فرار ہو جانے کے بعد انتقاماً قتل کرنے والوں کی رہنمائی کی تھی اور وہ بعد میں مجھے سیٹھ ایوب کے ساتھ بھی نظر آیا تھا۔ حاجی عبداللہ کا ملازم تھا اور اپنے آقا کے اعتماد پر پورا اترا تھا۔ خیال تھا کہ اسی اعتماد کی وجہ سے اس کو یہاں چھوڑا گیا تھا کہ وہ مجھ پر نظر رکھے اور میرے ساتھیوں پر بھی۔

"خبردار! بھاگو!" غالب نے چلا کے کہا۔ "ورنہ دوسری گولی سے کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

نشانے کی مہارت میں غالب ہم سب میں فوقیت رکھتا تھا مگر یہ بات جان بچا کے فرار ہونے والا نہیں جانتا تھا۔ اس نے آخری کوشش کی اور ٹیکسی کا دروازہ بھی کھول لیا۔ وہ بلا شبہ زبردست قوت برداشت کا مالک تھا کہ ایک زخمی ٹانگ کے ساتھ بھی دوڑتا رہا اور مقابلہ بھی کرتا رہا۔ اب یہ ناممکن تھا کہ وہ فرار ہو سکتا۔ دروازہ کھول کے گاڑی میں بیٹھنا اور اسے اسٹارٹ کرنے کے عمل میں وقت لگتا تھا۔ اس نے بھی دور دیکھنے کی آخری کوشش کی اور پھر فائر کیا لیکن اس حالت میں کہ وہ اس کا آخری فائر تھا۔ محصور ہو چکا تھا اور زخمی تھا۔ اس کا نشانہ کیسے درست ہو سکتا تھا۔

میں نے اسے جا لیا۔ اکرام شیخ میرے ساتھ تھا۔ پھر غالب اور محسن ایک دیوار کے اوپر سے کود کے اور انھوں نے دوسری طرف سے گھیرا کر لیا۔

"تم وہی خبیث ہو نا!" میں نے اس کا ہاتھ تھام کے جھٹکا دیا۔ ریوالور دور جا گرا۔ "تم سے تو مجھے پرانا حساب برابر کرنا ہے۔" میں نے اسے باہر کھینچ لیا۔

"یہ اچانک کیسے بھاگ نکلا؟" اکرام شیخ نے کہا۔

"ہم اس کے سر پر پہنچ گئے تھے۔" غالب نے کہا۔ "یہ ٹیکسی کے انجن میں کچھ کر رہا تھا۔ اس نے ہمیں آتا دیکھ لیا۔"

"تم نے دیکھا، ٹیکسی میں کیا نقص ہے اس نے؟"

"ابھی چل کے دیکھ لیتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"ہم نے کیا ہو گا اور کیا۔" محسن بولا۔

زخمی ڈرائیور اپنی شکست تسلیم کر چکا تھا۔ اس نے خود کو چھڑانے یا مقابلہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جب میں نے اسے دھکیلا تو وہ لنگڑاتا ہوا آگے چلنے لگا۔ اکرام شیخ اور محسن ہم سے آگے نکل گئے۔

"میں اس پر پٹی باندھ لوں۔" اس نے کہا اور چلنے کے بعد اس کے زخم سے کافی خون بہہ چکا تھا اور وہ اس کی تکلیف بھی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اسے جیب میں سے رومال نکال کر دیا جسے اس نے ٹانگ پر باندھ لیا۔ گولی اس کی پنڈلی کے پچھلے حصے میں لگی تھی مگر اس نے صرف گوشت ادھیڑا تھا۔ ہڈی بچ گئی تھی ورنہ وہ چلنا تو کیا سیدھا کھڑا ہونے کے قابل بھی نہ رہتا۔

سامنے سے ہم نے نازو کو آتے دیکھا۔ فائرنگ کی آواز پر وہ پریشانی کے عالم میں دوڑی آ رہی تھی۔ "کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"ہاں، سب ٹھیک ہیں۔"

"سوائے میرے۔" غالب نے کہا۔ "میرا حال خراب ہے۔"

"ٹھیک کر دوں گی تمہارا حال اور مزاج۔" نازو نے کہا۔

"حال تو وہ نہیں تم پر تو جھوٹ سوار رہتا ہے ہر وقت۔"

"تم اپنے آپ کو جھوٹ کہہ رہے ہو یا اپنے خیال کو؟" میں نے کہا۔

"یہ دل لگی یا مذاق دل سے راہ ہوتی ہے۔" غالب بولا۔ "ہم جو جاتے ہیں اور نہ کہتے ہیں کہ حال اچھا ہے۔ اشارے پر کہتے ہیں۔ جیسے میں کہہ رہا ہوں کہ حال خراب ہے تو کہو تم ہی پوچھ لو کیوں؟"

"وجہ معلوم ہے مجھے۔" نازو تنک کے بولی۔ "موسم کا اثر ہو گا یہ، یا پھر بادام کا۔"

"جی نہیں، یہ معدے پر کیا کیا اثر ہے۔" غالب نے خفگی سے کہا۔ "پیٹ میں تو اس جنگل کے سے آثار ہیں۔"

"پھر کوئی بات نہیں، سمندر قریب ہے۔" میں نے کہا۔

"تھوڑا کھانا ہی!" نازو بولی۔ "کتنے دن کا دشمن بھرا تھا؟"

"نہیں کیا، مجھے اب ہیضہ ہو گیا ہے۔ صبح تک میں فوت ہو جاؤں گا۔" غالب نے کہا۔

"ان شاء اللہ۔" نازو نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے اگر اللہ نے چاہا تو ظاہر ہے کچھ نہیں ہو گا کسی کے چاہنے سے۔"

"تم چاہتی ہو کہ میں مر جاؤں۔" غالب نے ٹیکسی کے اندر جھک

www.paksociety.com

کہا۔ "احمق کہیں کا ہے بچے۔۔۔ میں تم پر مرتا ہوں اس لیے تمہیں مکمل
میرے ساتھ بھی نہیں۔" نازو چیخ پڑی۔
"تم مرنے والوں میں نہیں، مارنے والوں میں ہو مگر پھر بھی تم
اچانک سنجیدہ ہو گئی "ہو تو میں بھی تیار ہوں۔ محسن دوبارہ پاس کی تمام سے
ساتھ مرنے کو۔"
"یعنی اتنی سال بعد، اسے تھوڑے سے دن ہی کرکے لیے گئے؟"
نازو نے حیرت سے کہا۔
"بہت سے کام ہیں۔ کرنے کے لیے ابھی۔" غالب آہ بھر کے بولا۔
"مثلاً بیٹیوں کی تعلیم کے، تو پہلے کرنے ہوں گے اور بیٹیوں کی بارات کا شوق کا لگا ہوگا۔ پھر بچے کی سعادت سے سرخ رو ہوں گے۔"
"غالب کے بچے!" نازو چلائی۔
"ہاں ہاں، غالب ہی کے بچے ہوں گے اور ان کے بچوں کے بچے۔" غالب نے کہا۔ "بس تم ہاں۔۔۔!"
اس سے پہلے کہ ساحلی شہر کی چاندنی راتوں میں غالب کی تان اٹھاتے ہم نے اکرام شیخ کو رکشا کی طرف آتے دیکھا۔ محسن اس کے پیچھے تھا۔
"خدا نے بچا لیا یار۔" اکرام شیخ بولا۔ "ورنہ آج ہم شہید ہوتے۔"
"یہ دیکھو۔" محسن نے مجھے ایک چیز دکھاتے ہوئے کہا جسے میں نے فوراً شناخت کر لیا۔ "یہ ٹائم بم تھا جسے اسٹیک لگا رہا تھا۔"
"انجن میں ٹائم بم لگایا تھا اس نے۔" اکرام شیخ نے غصے سے مغلوب ہو کے مجرم کے ایک جھانپڑ مار دیا۔
"کوشش ملائی تھا گیشن سوچ سے۔ ادھر چلو۔۔۔ گھنٹہ ادھر تحت بالخیر۔" محسن نے کہا۔
"میاں محسن خیر ہونی۔" ملک نے کہا۔ "یہ لوگ اتنے احمق نہیں ہو سکتے کہ صرف ٹائم بم لگانے کا کام آخری وقت کا انتظار کرتے۔ جو کام پہلے بھی ہو سکتا تھا اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ کوئی ہماری تشریف آوری کے انتظار میں بیٹھا رہے۔ یہ حرکت کا مقصد تھا۔"
"تیرا مطلب ہے کوئی اور بم۔"
ابھی میں نے اقرار میں گردن ہی نہیں ہلائی تھی کہ اس کھنڈر میں دھماکا ہوا جس میں ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہم منہ کے بل گر گئے۔ یہ ایک غیر ارادی حفاظتی نوعیت کا ردعمل تھا۔ ہم اگر قریب ہوتے تو شاید دھماکے سے اچھلنے والے ملبے سے ہم پر بھی گرتے لیکن ایک تو بم زیادہ طاقت ور نہیں تھا ۔۔۔ صرف ایک گاڑی کو تباہ کرنے کے لیے تھا۔ اس سے کھنڈر کی دیواریں بھی گریں لیکن ہم محفوظ رہے۔ خصوصاً محسن اور اکرام شیخ جو ٹیکسی کی حالت پہ بہت کوشش بغیر سنانے آگے چلے آئے تھے۔ وہ دھماکے سے پہنچنے کا انتظار کرتے تو اسی کھنڈر میں دفن ہو جاتے۔
اٹھنے کے بعد چند سیکنڈ تک ہم سب بولنے کے قابل نہ تھے اور اس گرد کے بادل کو دیکھ رہے تھے جو رفتہ رفتہ چھٹنے لگا تھا۔
"اگر ہم اس کے پیچھے نہ جاتے۔" غالب نے بالآخر کہا۔ "تو سب ہو گئے تھے مرحوم۔ نہ کہیں جنازہ، نہ کوئی مزار ہوتا۔"
"اکیلی نازو دعا کرتی سب کی دعائے مغفرت کے لیے۔" محسن نے کہا۔ اسی وقت سامنے سے ایک ریکارڈ نمودار ہوئی جو کسی اندھے دیو کی طرح ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔
"بھاگو۔" میں نے چلا کے کہا۔ "جان بچاؤ اپنی۔" لیکن میرے خبردار کرنے سے پہلے ہی سب کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ تیزی سے بڑھتی ہوئی موت کی زد میں ہیں۔ محسن اور اکرام شیخ نے ایک جست لگائی اور قریبی ہٹ کے پیچھے ہو گئے۔ غالب نے نازو کو اس وقت اٹھا لیا تھا جب دہشت نے اسے مفلوج کر دیا تھا۔ وہ اسے اٹھا کے بھاگا مگر لڑکھڑا کے گر گیا۔
اور اس وقت اچانک میری سمجھ میں آیا جس نے مجھے سب سمجھا دیا۔ وہ شخص جو اس وقت میری گاڑی پہ قابض تھا اور اسٹیئرنگ پر میری جگہ بیٹھا ہوا تھا ہم سب کا دشمن ضرور تھا لیکن وہ ہم سب کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ صرف ایک شخص کو مارنا چاہتا تھا جو ہماری قید میں تھا اور ان کے لیے باعث خطرہ ہو گیا تھا۔
میں نے ونام مڑ کر بالکل آخری وقت میں کھینچ کر دھکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی خشک ریت پہ گرا جو سڑک کے کنارے بچھی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی ریکارڈ کو چند انچ کے فاصلے سے ایک دیو ہیکل پہیے کے سامنے کی طرح گزرتے دیکھا۔ وہ ونام جو اب ہماری قید میں تھا قریب سے بچ گیا۔
گاڑی گزر چکی تھی جب میں نے سر اٹھا کے ریوالور نکال لیا اور فائر کیا۔ نشانہ میری اناڑی پکڑ کا منتظر نہیں تھا۔ نشانہ خطا ہو گیا مگر اس کے فوراً بعد ہونے والے فائر نے میری آرزو پوری کر دی۔ گاڑی کا ایک پچھلا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ یہ کارنامہ غالب ہی سرانجام دے سکتا تھا۔
گاڑی کسی شرابی کی طرح لڑکھڑائی اور رک گئی۔ اس میں سے دو افراد ایک دم دونوں جانب کے دروازے کھول کر نکلے اور ادھر بھاگے جہاں ایک کھنڈر نما فاکس ویگن کھڑی ہوئی تھی۔ ہمارے قیدی نے بھی اسی فاکس ویگن تک پہنچ کے فرار ہونا چاہا تھا۔
بڑی افراتفری میں انھوں نے پے در پے کئی فائر کیے۔ ان کا مقصد صرف ہماری پیش قدمی کو روکنا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ نہیں سکتے تھے تو نشانہ کیسے لے سکتے تھے۔ جب وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے تو میں سر جھکا کے بھاگا۔ درمیان میں ہماری اپنی ریکارڈ تھی چنانچہ وہ مجھے حرکت کرتا دیکھ سکے۔ ادھر فاکس ویگن فوراً اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ میں نے اونچی کار کی آڑ لیتے ہوئے کھلے دروازے سے اندر ہاتھ ڈالا اور اپنی سیٹ کے نیچے سے ایک دستی بم نکال لیا۔

فاکس ویگن کا انجن ایک دم غرایا اور گاڑی آگے بڑھی۔ میں نے دستی بم کا پن دانتوں سے کھینچ کر نکالا اور پھر فاکس ویگن کے پیچھے دوڑ کے پوری قوت سے اچھال دیا۔ میرے زمین پر گرتے ہی دھماکا ہوا اور میں نے سر اٹھا کے دیکھا تو جہاں فاکس ویگن تھی وہاں اب کچھ نہیں تھا۔ آسمان سے راکھ [illegible] اور جلتے ہوئے کار کے ٹکڑے اور دھوئیں کے [illegible]۔
میں تیزی سے اٹھا اور واپس دوڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ دھماکا سب کو متوجہ کرے گا۔ فاکس ویگن ہماری کار سے تقریباً سو گز آگے جا کے تباہ ہوئی تھی۔
غالب دوڑتا ہوا میری طرف آیا۔ "تم زندہ ہو نا؟"
"نہیں، پہلے یہ بتاؤ کہ وہ زندہ ہے؟" میں نے کہا۔
"ہاں، گاڑی کا ایک پہیہ اس کی ٹانگ پر سے گزر گیا تھا جو پہلے ہی زخمی تھی۔" غالب بولا۔ "ٹانگ ٹوٹ گئی۔ باقی سب خیریت ہے۔"
"شیخ سے کہو اسے اٹھا کے کہیں پیچھے لے جا کے کہیں بھی بٹھا دے اور اس کا منہ بند رکھے۔" میں نے کہا۔ "باقی سب یہاں آ جاؤ۔ ہم ایک فیملی ہیں۔ ہم تفریح کے لیے آئے تھے اور واپس جا رہے تھے کہ ہمارے سامنے والی کار دھماکے سے پھٹ گئی۔ نہیں، ہماری گاڑی کا ایک ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا۔ ہم اسے بدل رہے تھے کہ یہ کار گزری اور آگے جا کے بم کی طرح ایک دم پھٹ گئی۔"
چند منٹ بعد نازو کار میں آگے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی موجودگی ہماری شرافت اور ہمارے بے ضرر ہونے کی سند بن گئی۔ جو لوگ وہاں جمع ہوئے انھوں نے ہمیں ایک فیملی مان لیا۔ غالب اور محسن تو نارمل رہے تھے۔ میں نے اور محسن نے دو تین افراد کو فرنچ بول کے پریشان کیا۔ ان میں سے زیادہ تعداد عربی بولنے والوں کی تھی۔ دو صاحب ہمارے ملک کے بھی پریشان ہو کے نکل آئے تھے۔ نازو نے ان کی سہولت کی خاطر ہمارے بیانات کا اردو میں ترجمہ کیا اور بتایا کہ ہم فرنچ اور انگلش سکتا کہ ان میں اور باقی ہم تینوں ایک ہی فیملی ہیں۔
"میرا مشورہ ہے کہ آپ لوگ یہاں سے فوراً چلے جائیں۔" نازو نے سب لوگوں کو بلا کے کہا۔ "ابھی کچھ دیر میں پولیس آ جائے گی۔ آپ لوگ خواہ مخواہ گواہی کے چکر میں پھنس جائیں گے۔"
بیشتر لوگوں نے اس مشورے پہ عمل کرتے ہوئے کھسک جانا زیادہ بہتر سمجھا۔ ایک شخص نے کہا۔ "آپ لوگ تو چشم دید گواہ ہیں۔"
"ہماری کوئی بات نہیں۔ پولیس ہمیں پریشان نہیں کر سکتی کیونکہ ہمیں سفارتی تحفظ حاصل ہے۔" نازو نے کہا۔
آخری شخص بھی غائب ہوا اور اس کے روانہ ہوتے ہی ہم نے پولیس کی سائرن کی آواز سنی جو بہت دور تھی۔ چند منٹ بعد ہم اس مقام سے ایک میل دور جا چکے تھے۔
"ابھی اکرام شیخ تو نہیں ہے۔" محسن بولا۔ "اور۔۔۔"
"ہم اگر واپس جائیں گے تو شکریہ ادا ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "پھر وہ زخمی ہمارے ساتھ ہوا اور راستے میں کسی نے چیک کر لیا تو وضاحت مشکل ہو جائے گی۔"
"یار کہیں وہ پھنس نہ جائے۔" غالب نے کہا۔ "اسے ساتھ لانا بھی ضروری ہے۔"
"اچھا۔" میں نے سب کے اصرار کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا اور گاڑی کو ایک پرائیویٹ کمپنی کی بہت خوبصورت ہٹ کی طرف موڑ لیا۔ "میں، محسن اور غالب یہاں رک گئے ہیں۔ نازو جا کے اور بھائی کو لے آئے۔"
"اکیلی نازو؟"
"ہاں، اسے جگہ تو معلوم ہے۔ اکیلی عورت کو اس وقت کون روکے گا۔ واپسی میں اس کے ساتھ تو شیخ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اس سے کہنا کہ قیدی کو منہ چھپا کے ڈکی میں بند کر کے لائے۔"
وہ واپس آ گئے اور نازو نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے گاڑی کو موڑ لیا۔ ہٹ کے اندر سے مغربی موسیقی کے ساتھ مردوں اور عورتوں کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے ایک دروازے پر دستک دی تو ایک گورا صرف انڈرویئر پہنے ہوئے نکلا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اور برا بھی مانتا، میں نے فر فر بولنا شروع کر دیا اور فوراً ہی اس کا چہرہ ایک دم کھل اٹھا۔ وہ خود بھی فرنچ تھا۔ میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے ایک فرضی نام لے کر پوچھا کہ موسیو فلاں یہاں موجود ہیں؟ ظاہر ہے کہ موسیو فلاں وہاں نہیں تھے۔ میں نے اپنا تعارف ایک فرنچ آرٹسٹ کی حیثیت سے کرایا تھا اور چونکہ ہم مراکش میں قیام کے دوران اکثر فرانس کا دورہ کرتے رہتے تھے اس لیے وہاں کے تمام جغرافیے سے بخوبی واقف تھے۔
ہم نے غالب کو بطور مترجم متعارف کرایا۔ اندر چند خواتین بھی موجود تھیں۔ سب مرد و خواتین انڈرویئر میں تھے۔ خواتین کا لباس بھی مختصر تھا۔ ہمیں محسوس ہوتا تھا۔ انھوں نے ایک آرٹسٹ سے مل کے خاص خوشی کا اظہار کیا۔ فرانسیسی قوم مصوری کے معاملے میں خاص ذوق رکھتی ہے۔ انھوں نے ہمیں اس اتفاقیہ ملاقات پر ڈنر میں بھی شریک کرنا چاہا مگر ہم نے معذرت کر لی۔
"ہمیں افسوس ہے کہ ہم مخل ہوئے۔" میں نے کہا۔ "ہم کچھ لمبی بات تھی۔"
"دراصل ہم راستہ بھول گئے تھے۔ اب تلاش کر لیں گے۔" محسن بولا۔
"آپ لوگ چاہیں تو رات کو یہاں ٹھہر سکتے ہیں۔" ایک خاتون نے کہا کہ میں ان حالات میں کہتا چشم ما روشن دل ما شاد۔ مگر اب میں نے کہا
"یہ بہت عزت کی بات ہے کہ ہم اپنے دوستوں سے ابھی ملیں گے۔ ہمیں ایک ساتھ واپس جانا ہے اور وہ صاحب نہ جانے کس کے ساتھ یہاں

www.paksociety.com

چھپا بیٹھا ہے یا لیٹا ہے تو میں نے کہا۔
واقعی میری بات پر محظوظ ہوئے۔ میری رنگ گھڑی پر تھی اور کان آواز پر تھے۔ دس منٹ میں نازو کو واپس آجانا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ اور اب بارہ منٹ ہوگئے تھے۔ چنانچہ ان سے رخصت لے کر ہم پھر باہر نکل آئے۔ مقصد صرف روپوش رہنا تھا جو پورا ہوچکا تھا۔

ہم نے سامنے سے کار کا ہیڈ لائٹس کو دیکھا اور ادھر ہی چلنا شروع کر دیا۔ اب رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور ہمارے لیے بارہ بجے تک سبزی منڈی پہنچنا بھی ضروری تھا کہ ٹرک نمبر کے آنے سے پیشتر ہماری نظر سے اوجھل ہو کے دوڑ جائے۔

گاڑی بہت تیزی سے ہماری طرف آرہی تھی اور مجھے ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ یہ ہماری کار نہیں ہوگی۔ بالکل آخری وقت پتا چلا جب میں نے دیکھا تو وہ پولیس کی جیپ تھی۔ ہمارے پاس آکے جیپ رکی اور اس میں سے ایک انسپکٹر کے ساتھ دو کانسٹیبل کود کے اترے۔

اپنے حلیے سے ہم دونوں ٹیپیکل اسٹائل کے لوفر اور آوارہ گرد نظر آتے تھے۔ چنانچہ انسپکٹر نے ہم سے وہی انداز گفتگو اختیار کیا جو وہ اپنے لاوارث مجرموں کے ساتھ اختیار کرتا تھا تو اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اور اس نے پولیس کی فرعونیت اور بدتمیزی کا نمونہ پیش کرنے کی روایت پر عمل کیا تو یہ بھی باعث حیرت نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نے تمسخر سے ہی کہا۔ "کون ہو تم ...؟" اور اس سے پہلے کہ ہم جواب دیتے، اس نے اپنے دست اختیار سے ہی ایک ایک ڈنڈا رسید کیا اور اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ "ڈالو ان دونوں کو ہتھکڑی لگا کے گاڑی میں..." ہم سب کے لیے اس نے ایک ہی گالی کو کافی سمجھا۔

"لیکن، ہمارا قصور تو بتائیے صاحب!" غالب نے فریادی لہجے میں کہا۔ وہ ذرا فاصلے پر تھا، اس لیے تھانیدار کی ضرب کلیم سے محفوظ رہا۔

"قصور بھی پتا چلے گا بچو... بہت وارداتیں ہو رہی تھیں یہاں، آج ہاتھ آئے ہو۔" اس نے غالب کو گردن سے دبوچ کے کھینچ لیا۔

دوسرے میں نے دوسری گاڑی کی ہیڈ لائٹس کو دیکھا اور فوراً فیصلہ کر لیا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ میں اپنی کار، نازو اور ایک مجبور قیدی کے ساتھ تھانے جانے کا خطرہ مول لے ہی نہیں سکتا تھا۔

دو کانسٹیبل میری طرف بڑھے تو انہیں میری طرف سے مزاحمت کا بالکل اندیشہ نہیں تھا۔ ہماری مظلومیت کے پیش نظر وہ ہم سے کسی جارحیت کے ارتکاب کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ لیکن میں ان کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا اور جب میں نے دیکھا کہ

اب میرے ہاتھ ان کی گردنوں تک پہنچ سکتے ہیں تو میں نے بیک وقت دونوں ہاتھوں سے ان کی گردنیں دبوچیں اور پلک جھپکتے میں ان کے سروں کو آپس میں اتنی قوت سے ٹکرایا کہ وہ نیچے گرنے سے پہلے ہی ادھ غفیل ہوگئے۔ سروں کے تصادم سے پیدا ہونے والی آواز ایسی ہی تھی جیسے کوئی ناریل کو فرش پہ مار کے توڑنے کی کوشش کرے۔

دونوں کانسٹیبلوں کی بیہوشی یا ہلاکت نے ان کا افسر تھانیدار، جو کہ قصور پوچھنے کی سزا کا جواب دینا چاہتا تھا، ماتحتوں کی ولی خواہش سن کے وہ چونکا۔ اس نے ریوالور نکالا ضرور تھا۔ مگر صرف ہمیں خوف زدہ اور خبردار کرنے کے لیے۔ عام طور پر قانون کے ہاتھ اسلحہ دیکھ کر ہی بلیک پہ دہشت طاری ہو جاتی ہے اور تاویل کے بجائے خطرناک اسلحے سے لیس مجرم تو جیل یا پولیس کے ہاتھ اور زبان کی طاقت کو کافی سمجھتی ہے۔

میری لات پڑتے ہی تھانیدار کے ہاتھ سے ریوالور ایسے گیا جیسے ہاتھوں کو فرش تک پہنچا دیا۔ پھر جھک کر اس کے ہاتھ طوطے اڑ گئے تھے۔ میں نے اسے بولنے کا موقع بھی نہیں دیا اور اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ اس کا سر جیپ کی باڈی سے لگا۔ اور یہ ضرب بھی اتنی شدید ثابت ہوئی کہ وہ آہستہ آہستہ نیچے پھسل گیا۔

کار اتنی دیر میں قریب آکے رک چکی تھی۔ نازو نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں جنگ و جدل کا منظر دیکھ لیا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟" وہ نیچے اترتے ہی بولی۔ "اتنی سی دیر میں؟"

"ہم نے کچھ نہیں کیا۔" غالب نے معصومیت سے کہا۔ "یہ تو خود ہم سے لپٹنے آئے تھے۔"

"ہمیں اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کر رہے تھے۔" محسن بولا۔

اکرام شیخ نے نیچے آکے صورت حال کا مطالعہ کیا۔ "اب جلدی سے فیصلہ کرو، ان کا کیا کرنا ہے۔ یہیں چھوڑ کے جانا ہے یا انہیں مار کے رکھنا ہے؟"

"چھوڑ تو جائیں گے انہیں... مگر ایسے نہیں۔" محسن بولا۔ "ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک لاجواب آئیڈیا آیا ہے۔"

"خواہ مخواہ آئیڈیا مت جھاڑا کرو۔" میں نے کہا۔ "میں پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔"

نازو واپس کار میں جا بیٹھی اور ہم نے کچھ رات کی تاریکی کے پردے سے فائدہ اٹھایا اور کچھ جیپ کی اوٹ سے۔ میں نے کانسٹیبل کی وردی پہنی کیونکہ وہ میرے سائز کا تھا۔ دوسرے کانسٹیبل کی وردی محسن کو ذرا چھوٹی رہی۔ اپنے سابقہ تجربے کے باعث تھانیدار کی وردی اکرام شیخ کو عطا کی گئی۔

"مرزا غالب! افسوس کہ تم پولیس میں بھرتی نہیں ہو سکے۔" میں نے کہا۔ "کسی اور محکمے میں کوشش کرو۔"

"تم یہاں نازو کو لے کر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "بارہ بجنے میں صرف دس منٹ رہ گئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ٹرک نکل جائے۔"

نازو کے ساتھ جانے میں غالب کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"ہم نے تو اپنا جامہ بدل لیا ہے۔" محسن بولا۔ "تم ذرا شرافت کے جامے میں رہنا۔"

"اب آنکھیں کھلی رکھنا، ہوش و حواس پر قابو رکھنا۔" میں نے کہا۔ "یہ نہ ہو کر سامنے سے ٹرک گزر جائے اور تم کہیں اور دیکھتے رہ جاؤ۔"

"ہم تو خیر جاتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "مگر تم لوگ...؟"

"ہم بھی آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ذرا یہاں کے حالات ٹھیک کر کے۔"

جب کار نظروں سے گزر گئی تو وہاں تین بے وردی پولیس والے رہ گئے اور تین جعلی پولیس والے۔ جو بے وردی تھے انہیں آسانی سے قدرت یا ٹرک کے کنارے تماشائے اہل نظر کے لیے چھوڑا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ہم انہیں کندھوں پر ڈال کے ایک سمت میں لے گئے۔ ان کی ہتھکڑیاں انہی کے ہاتھوں میں اس طرح ڈالیں کہ وہ آپس میں جڑ گئے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ ایک حلقہ بنا سکتے تھے مگر ایک ہاتھ کو دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے تھے۔ ہتھکڑی کے ساتھ ایک زنجیر بھی تھی جو عموماً ملزمان کو فرار سے روکنے کے لیے قانون کے محافظ اپنی پیٹی سے جوڑ لیتے ہیں۔ اس زنجیر کو ہم نے تینوں مختلف سمتوں میں ایک درخت کے گرد لپیٹ کر ایک کھڑکی کی چوکھٹ اور ایک کو کھمبے سے باندھ دیا۔ اب وہ اٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔

آخری کام انہیں خاموش رکھنے کا تھا۔ اس کے لیے ہم نے حسب دستور کے مطابق کپڑا تلاش کیا مگر جو چیز ہمیں اس جگہ دستیاب ہوئی وہ کپڑا نہیں، کپڑے کی بنی ہوئی تھی۔ زنانہ استعمال کے لیے مخصوص بھی۔

ٹھیک بارہ بجے ہم جیپ لے کر فرار ہوئے تو ہمیں سب سے زیادہ اس ٹرک کی فکر تھی۔ ابھی ہم آدھے گھنٹے سے پہلے کسی صورت اس جگہ نہیں پہنچ سکتے تھے جہاں ہمیں سڑک کے ایک طرف [illegible] ملنی تھی۔

جیپ کے علاوہ پولیس کا ایک ریوالور بھی ہمارے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اب ہم تینوں مسلح تھے۔ ریوالور کے علاوہ رائفل جیپ کے اندر تھی۔ ڈرائیونگ محسن کر رہا تھا اور اکرام شیخ اس کے ساتھ تھانیدار بنا بیٹھا تھا۔ مال غنیمت میں سے ساڑھے تین ہزار نقد اس کی جیب میں سے نکلے۔ میری اور محسن کی جیبوں میں سے علی الترتیب

دو سو دس اور دو سو چالیس روپے برآمد ہوئے۔

"بے چاروں پر برا وقت آیا ہوا تھا۔" محسن بولا۔

"ہاں، کاروبار میں مندی کا رجحان تھا۔ ورنہ تھانیدار کی جیب سے صرف ساڑھے تین ہزار۔" اکرام شیخ نے افسوس سے سر ہلایا۔

"کیا خیال ہے؟ وہ صبح سے پہلے کچھ کر سکتے ہیں؟"

"ہاں، ہوش میں آ سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "[illegible] لے سکتے ہیں یار ہم بھی دل والے ہیں۔"

"مجھے کیوں؟ میں نے تو بڑی مروت کا مظاہرہ کیا تھا جب اس نے ڈنڈا مارا، تب بھی خاموش رہا تھا۔" محسن بولا۔

"یار... وہ بندہ مر گیا۔" اکرام شیخ نے اچانک کہا۔

"کون؟ وہ ڈرائیور؟" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں، میں نے اسے وہیں چھوڑ دیا۔"

"مگر وہ کیسے مر گیا، تم نے کچھ کیا تھا؟" محسن بولا۔

"ہاں، میں نے تفتیش کی تھی۔ فارغ تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔" اکرام شیخ بولا۔ "میں نے کچھ سوالات پوچھے تھے لیکن وہ جواب دینے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔"

"اسے معلوم نہیں تھا کہ تم تھانیداری میں ہر طریقہ تفتیش کا عملی تجربہ حاصل کر چکے ہو۔ کیا تم نے مارا تھا اسے؟"

"نہیں، میں بس اس کے زخموں پر نمک چھڑکتا رہا۔ اور نمک چھڑکنے کے لیے زخم لگاتا رہا۔"

"نمک کہاں سے مل گیا؟"

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "کمال ہے یار۔ آخر نمک کہاں سے نکالا جاتا ہے؟ اسی سمندر سے۔ مجھے طریقہ معلوم نہیں تھا اچھا پچھلی بیس پانی لاتا رہا۔ اچھا خاصا نمک ہوتا ہے اس میں۔ میری جیب میں ایک چھوٹا سا چاقو تھا، پاکٹ نائف۔ اس سے میں نے کھال چھیلنے کا کام کیا۔ سمندر کا پانی میں دو بوتلوں میں بھر لایا تھا۔ اس بوٹ میں شراب کی خالی بوتلیں بکھری پڑی تھیں۔"

"پھر کچھ بتایا اس نے؟"

"صرف ایک بات کام کی بتائی۔ وہ بھی اس وقت جب میں نے اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر بھیجو ضرب کا پانی ڈالا۔ اور اسے تھوڑا سا بہت ہلایا۔ اس نے مجھے بتا دیا کہ لانچ کہاں ہوگی۔"

"یہ بتا دیا اس نے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، کورنگی کریک سے آٹھ ناٹیکل میل دور جنوب کی طرف کوئی جگہ ہے جہاں چٹانیں ہیں۔ لانچ وہیں کہیں چھپائی گئی ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے مایوسی سے کہا۔ "اب ہم آٹھ ناٹیکل میل جائیں اور چٹانوں سے پوچھیں [illegible] کہ وہ کوئی محفوظ جگہ نہیں ہوگی۔ انہی لوگوں کا اڈا ہوگا [illegible] ان کا ہیڈ [illegible] ہوگا وہاں۔"

www.paksociety.com

"مل سہی۔ تلاش بھی تو آسان نہیں ہوگی اور ملازمہ کو بھی اٹھا
جھڑپ کے امکان پر تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔" محسن بولا۔
"یہ کام آج بھی ہو سکتا ہے۔ صبح ہونے سے پہلے۔ آج
حالات موافق ہیں۔ پولیس کو چھاپا مارنے سے کون روک سکتا ہے
روکنے والا سامنے تو آئے گا۔" شیخ نے کہا۔
میں نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "تھانیدار کی
بات تو تم نے پتے کی اور کھری کی ہے۔ ہم پولیس کی وردی میں
چھاپا مارنے کے لیے جا سکتے ہیں... لیکن..."
"لیکن کیا؟"
"لیکن یہ کراچی جیسی جگہ پولیس نہیں جاتی۔ انھیں نہ جانے سے
کیا فائدہ ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔ "بڑے مجرموں کے ہاتھ بھی
لمبے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسے افسروں کی ضرورت سے زیادہ
مستعدی اور فرض شناسی پسند نہیں آتی۔ وہ حیوان جیسے روکی طرح
کھاؤ اور کھلانے دو، لوٹو اور لوٹنے دو کے اصول پر سختی سے عمل
کرتے ہیں۔ ہم نے چھاپا مارنے کا ڈراما کیا تو فوراً چالان لیے جائیں
گے کہ تحصیل ہوتے ہیں۔"
"کیوں؟ نئے نوجوان اور جوشیلے افسر کیا خود دماغ نہیں ہوتے۔
جو شروع شروع میں قوم کی خدمت کے، ایمانداری کے اور اولے
فرض میں جان دینے کے جذبات رکھتے ہیں۔ جنھیں کچھ عرصہ بعد
راہ راست پر آجاتے ہیں اور سمجھوتا کر لیتے ہیں کہ روم میں رہنا
کرنا چاہیے جو لوگ روم میں کرتے ہیں۔ مگر کچھ ناقابل اصلاح قسم کے لوگ
کچھ کر کے سے زیادہ ٹیڑھے ثابت ہوتے ہیں۔ ایک مثال خود آپ
کی ہے۔" محسن بولا۔
"آپ بھی براہ راست بھی کچھ کر سکتے تھے۔" شیخ نے بڑی
سے کہا۔ "میرے بھائی! کیا انکل رضوی دوسری مثال نہیں ہیں؟"
"دونوں مثالیں آؤٹ آف ڈیٹ ہیں۔ پرانے وقتوں کی
بات ہے۔"
"مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب پولیس کے محکمے میں کوئی
ایماندار افسر نہیں رہا۔ اب بھی بہت
سے رضوی اور ... کا نمونہ بن کے جا سکتے ہیں۔"
اکرم شیخ نے کہا۔
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "انھیں خبر دینے والے پہلے ہی سے
بتا دیتے ہیں کہ کوئی نیا افسر آیا ہے جو بہت بڑھ چڑھ کے بولتا تھا
اسے سیدھا کر لینا۔ مگر خیر... تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ اگر چھاپے
کے ڈرامے سے کام نکل جاتا ہے تو ہم تمھارے ساتھ ہیں۔"
"ہم ہر قسم کے مقابلے کے لیے تیار ہو کے جائیں گے۔ وہ
پہلے تو معاملہ طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس میں ناکامی
کا یقین آجائے تو آسانی سے راستہ نہیں دیتے۔"

"سب حالات اور وقت پر منحصر ہے۔" ممتاز نے کہا۔
"خیر آج رات ہمیں فرصت ملے نہ ملے، کہاں جانا پڑے۔"
میں نے گزرتے ہوئے سڑک کے دوسرے کنارے
کار کو دیکھ لیا۔ غالب اس کے انجن کا بونٹ اٹھائے اس کے پاس
یوں کھڑا تھا کہ وہ سڑک پر پیچھے آنے والی گاڑی کے پیچھے کھڑا ہوا نظر نہیں آ
سکتا تھا۔ کسی گاڑی کا ڈرائیور اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نازو کار کے اندر
تھی اور نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے لیے پیچھے سے آنے والی ہر گاڑی
کے نمبر کو سامنے سے پڑھنا آسان تھا۔ اس طرح وہ کوئی گاڑی مس
نہیں کر رہے تھے اور شاید ہر گاڑی کے آگے پیچھے کے نمبروں کو ملا
کر دیکھ رہے ہوں۔
غالب یا نازو میں سے کسی نے ہماری طرف نہیں دیکھا ہوگا
بلکہ کوشش کی ہوگی کہ ہم بھی انھیں نہ دیکھ پائیں۔ ان کے نزدیک
تو یہ ایک پولیس کی جیپ تھی جس میں تین پولیس والے بھی تھے۔
"کیا خیال ہے؟ مرزا جی کا تھوڑا سا خون خشک کر دیں۔" شیخ
نے ہنس کے کہا۔
"مناسب نہیں ہے، ورنہ ضرور کرتے۔" میں نے کہا۔ "اس وقت
تو جالا بہت اونچے اڑ رہے ہوں گے۔"
"ہاں! اسپرٹ بہت ہائی ہوگی۔" محسن بولا۔
میں نے گاڑی کو چوراہا کراس کرنے کے بعد ایک موڑ کے
سائے میں روک لیا۔ "کمال کا آدمی ہے یہ بھی، بالکل چھپا رستم۔ اس
کے کتنے آہستہ آہستہ کھلتے ہیں۔ پھر پتا چلتا ہے کہ شکل سے احمق
اور باتوں سے اکتا دینے والا شخص کتنا ذہین ہے... کتنا بہادر اور نڈر
ہے اور کتنا مخلص ہے اور کتنا کشادہ دل رکھتا ہے... کہ کسی بات کا
برا مانتا ہی نہیں۔"
"کم سے کم میں مار نہیں کھا سکتا تھا کسی لڑکی سے... اور
وہ بھی یوں کہ خود شامت کو دعوت دے کر۔" محسن بولا۔
"یار... ایک بات بتاؤں؟" اکرم شیخ نے کہا۔ "میں تمھاری
ہر بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ نازو سے کتنی
محبت کرتا ہے... لیکن پھر بھی، بعض اوقات ایک خلش پریشان
کرتی ہے... آخر وہ بہن ہے میری۔ میرا لحاظ بھی بہت کرتی ہے
اور خود میں دنیا سے نہیں ڈرتا کیونکہ ہماری تو دنیا ہی الگ ہے۔
اس میں جانے سوا کون ہے جو اسے بدنام کر سکے۔"
"میں سمجھ گیا تمھاری بات درست۔" میں نے اس کے کندھے
پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "اس خلش کو دل سے نکال دو۔ غالب میں اور
محسن میں یا پھر مجھ میں کیا فرق ہے آخر؟ جس نے اس شخص کو جنم دیا تھا
کا احمق دیا تھا جسے زبان خلق اچھا نہیں کہتی تھی... نے سب
کر لیے تھے۔ قریب سے دیکھا کس نے تھا۔ صرف ہم تھے جنھوں
نے اسے اپنا لیا تھا اور پھر وہ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ دیکھ لو کہ وہ

سر کر گیا۔ راہ وفا میں جان دینے میں اس نے
ہم سب کو پیچھے ... اس کے ساتھ رابعہ کو بھی چھوڑ دیا... شہلا کو بھی چھوڑ
گیا۔ ہم نے ... کبھی نہیں کیا کہ وہ ہمارے اعتماد پر پورا نہیں اترے
گا۔ وہ ایسا شخص تھا کہ خود بھی ایسا سوچنے سے پہلے مرجانا پسند کرتا۔"
"پھر تم غالب سے ڈرتے ہو؟"
"نہیں... ڈرتا تو شاید میں اپنے آپ سے ہوں۔ اس احساس
کے آسیب سے ڈرتا ہوں کہ میں ایک جوان بہن کا بڑا بھائی ہوں۔
جو بہت خوبصورت بھی ہے..."
"عشق جب ایمان کا درجہ حاصل کر لیتا ہے دوست تو پھر
یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ برا خیال بھی دل میں آئے، جیسے عبادت کرتے
ہوئے برائی کا خیال دل میں نہیں آ سکتا۔ شہلا اور رابعہ کہاں کہاں
ساتھ رہے۔ کیسے کیسے حالات کے امتحان سے گزرے۔ محسن اور
شہلا اس کے گواہ ہیں۔ یہ خود بھی شادی سے پہلے شب و روز ساتھ
رہے تھے۔"
"شادی کے بعد بچھڑ گئے۔" محسن نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔
اکرم شیخ ہنس پڑا۔ "ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔" اور
پھر سنجیدہ ہو گیا۔ "کیا یہ غالب شادی کرے گا نازو سے؟"
"اس کا تو اب ... کرے گا... اور شادی نازو سے نہیں
کرے گا تو زندہ کیسے رہے گا۔" میں نے کہا۔
"یا پھر خود نازو اس کا جھٹکا کرے گی۔" محسن بولا۔
"بعض اوقات... وہ مجھے کچھ نارمل نہیں... غیر ذمے دار سا
لگتا ہے۔"
"یہی اس کی شخصیت کی گہرائی ہے کہ وہ زندگی کے بارے
میں سطحی سا رویہ اختیار کیے رہتا ہے۔ بات محسن کی بھی ٹھیک ہے
کہ ابھی تو... پھر خیر ہاں سے چلی جائے، انتہا والی بات ہے دونوں
تفریح لیتے ہیں۔ مگر نازو اسے چھوڑنے والی نہیں ہے۔ تم تو جانتے
ہو بھئی، عورت کی فطرت کو۔ لیکن خود غالب کم نہیں۔ وہ بڑی آسانی
سے جان لے سکتا ہے اور دے بھی سکتا ہے۔ مگر نازو کو چھوڑ
نہیں سکتا۔ ہم سب جیسے جنونی لوگ ہیں بھائی...!"
اس وقت رات کے ایک بج کر بیس منٹ ہوئے تھے
جب وہ ٹرک اچانک ہمارے قریب سے گزرا۔ اس کا رخ سپر
ہائی وے کی طرف تھا چنانچہ وہ دوسری طرف پر تھا۔ مگر محسن کی تیز
نظر نے نمبر پڑھ لیا۔
"یہ وہی ٹرک تھا۔" محسن نے پرجوش لہجے میں کہا۔
"مگر تو نہیں دیکھ سکا اتنی دور سے۔" میں نے کہا۔
"شیخ نے دیکھ لیا۔" اکرم شیخ نے محسن کی تائید کی۔
اس کی تصدیق ایک منٹ بعد ہوئی جب وہ ٹرک چوک
سے لگتے یار ن کے قریب سے گزرا۔ کار ہم سے دور ... گزر

تھی۔ مگر ہم نے ٹرک کے گزرتے ہی اس کا بونٹ گرتے دیکھا۔
پھر غالب کا سایہ سا نظر آیا جو کار کے اندر غائب ہو گیا۔ کار کی
ٹیل لائٹ روشن ہو گئی۔
"وہ جا رہا ہے اس کے پیچھے۔" محسن بولا۔
"انھیں جانے دو۔" میں نے کہا۔
"اور ہم یہیں کھڑے رہیں؟"
"ہم کیسے قریب جا سکتے ہیں یار... وہ پولیس کی جیپ
دیکھتے ہی ہوشیار ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔
"اکیلا غالب کیا کرے گا؟ اس کے ساتھ نازو بھی ہے۔ کبھی
رات کے ڈیڑھ بجے کسی عورت کے ساتھ ہیرا منڈی جاتا ہے
کوئی...؟"
"غالب کو یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم آگئے ہیں۔"
"ابھی ٹھہرو۔" میں نے کہا۔ "ٹرک ... کی طرف گیا
ہے۔ اب دیکھو کہ وہاں مال اتارا جاتا ہے یا چڑھایا جاتا ہے۔"
"ٹرک تو اوپر تک بھرا ہوا تھا۔ کریٹ ہی کریٹ تھے۔"
"یہ تو میں نے بھی دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "مگر کریٹ خالی
تھے یا بھرے ہوئے، ان میں اوپر کیا تھا اور نیچے کیا؟ یہ تو ہم نہیں
جانتے نا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ابھی اس میں واقعی پھل اور سبزیاں ہوں۔
مگر جب وہ واپس جائے تو اس پر دوسرے کریٹ لاد دیے
جائیں۔ اس میں وقت لگے گا۔ اور اس عرصے میں غالب کو یقیناً ہماری
طرف سے بھی تشویش لاحق ہے کہ ہم کہاں گئے اور ابھی تک
پہنچے کیوں نہیں۔ وہ خود آئے گا یا نازو کو بھیجے گا۔"
تقریباً پندرہ منٹ بعد میرا خیال درست ثابت ہوا جب
ایک کار نے راؤنڈ اباؤٹ سے سیدھا ہماری طرف رخ کیا اور
اس کی ہیڈ لائٹس چند سیکنڈ کے لیے گھوم کر جیپ پر پڑیں۔ یہ ہماری
اوپل ریکارڈ تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں غالب یا نازو کو آواز دے کر
متوجہ کر لوں ورنہ وہ تو پولیس کی جیپ کو دیکھتے ہی دور سے گزر جاتے
گے۔ لیکن کار آہستہ آہستہ آئی اور ہم سے دس قدم کے فاصلے پر رک
گئی۔ میں نے ونڈ اسکرین کے پیچھے نازو کا چہرہ دیکھا۔ پھر غالب
دروازہ کھول کے اترا اور ہماری طرف آیا۔
"اس ٹرک سے مال اتارا جا رہا ہے۔" اس نے کسی تمہید کے
بغیر کہا۔ "اور وہ سیٹھ اکبر بھائی آدھی کا گودام ہے۔"
"نامعقول! پولیس والوں سے کیا اول فول بک رہا ہے۔
ڈرتا بھی نہیں ہم سے۔" محسن نے اسے ڈانٹ کے کہا۔
"تم تو سالے جنرل کی وردی میں بھی کارٹون لگو گے۔" غالب نے کہا۔
"چونکہ تم نے سالا تسلیم کر لیا ہے، اس لیے ہم معاف بھی
ساتھ کرتے ہیں۔" محسن بولا۔
"کیا تم نے بھی دیکھ لیا تھا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

www.paksociety.com

"ہاں، حبیب! تم جیپ میں آئے تھے تو میں نے ایک چوکور کا نمبر دیکھ لیا تھا۔" غالب نے کہا۔ اور محسن کی جانب اشارہ کیا۔

"قانون کے محافظوں کو مسخرہ کہتا ہے؟" محسن بولا۔

"تم کیا وردی میں۔ جو ایک کانسٹیبل کی وردی ہے، ڈی آئی جی کی طرح اکڑے بیٹھے تھے۔" غالب نے کہا۔ "سارے [illegible] کی طرح گردن اکڑا رہے تھے۔"

"میں اس میں پھنس چکا تھا۔" محسن نے اعتراف کیا۔

"تم واپس کیوں آگئے؟" اکرام شیخ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور کیا کرتا؟ آپ کی ہیرو کو اس وقت شاپنگ کے لیے سبزی منڈی کے [illegible] جانا۔" غالب نے کہا۔

"۔۔۔ بے تو کون سے تلاش ہو جاتے، کیونکہ بیٹے خرید سکتے۔" محسن بولا۔

"یہ شاپنگ تم مرزا شاہ کے ساتھ، دیکھا ہی ہو گا ابھی سبزی منڈی میں سنا۔" غالب نے اسے گھور کے کہا۔ "میں تو یہ بتانے آگیا تھا کہ واپسی میں وہ ٹرک ادھر سے کیا گزرے گا۔"

"کیا ٹرک نے خود بتایا ہے تمہیں؟" محسن نے پھر دخل دیا۔

"میں کار کو باہر روک کے خود اندر چلا گیا تھا۔" غالب نے اس کی اشتعال انگیزی کو نظر انداز کر دیا۔ "وہاں اس وقت گھمسان کا رن پڑ رہا ہے۔ شہر بھر کے سبزی فروش آگئے ہیں۔ ٹرک آ رہے ہیں اور خالی ہو رہے ہیں۔ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں ہے، میں اس لیے کافی قریب چلا گیا تھا۔"

"ٹرک ڈرائیور کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسے تو میں نہیں پہچانتا۔" غالب نے کہا۔ "وہ بہت چیخ چلا رہا تھا مزدوروں پر کہ سب حرام خور ہیں۔ ایسے کام کرو گے تو رات بھر میں ٹرک خالی کرو گے کیا، پھر واپس چیخ چلا کس وقت جائے گا؟ دم نہیں رہا ہاتھوں میں تو ہٹ جاؤ۔ میں دوسرے مزدور لگا دیتا ہوں، [illegible] لوٹ آیا۔ تازہ [illegible]"

"اور آپ کو بہت خیال تھا اس کی حفاظت کا۔" محسن نے اسے چھیڑنا جاری رکھا۔ "حالانکہ اسے آپ کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا تھا۔"

"۔۔۔ میں اکیلا جا رہا ہوں۔" غالب نے غرا کے کہا۔

"جانا تو سب کو اکیلے ہی ہے۔" محسن نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔

"تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ ہم چاروں تمہیں لے کر جائیں گے۔" غالب نے جاتے جاتے کہا۔

"مرزا جی! زیادہ بہادر مت بننا۔ دور سے ہی دیکھتے رہنا تاکہ واپس بھی آسکو۔" محسن نے چلا کے کہا۔ "دو ٹانگوں پر۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے ایک خیال ظاہر کیا کہ نازو کو واپس گھر بھیج دیا جائے تاکہ وہ رضا اور صوفی کو [illegible] میں بتا سکے۔ محسن نے اس سے اختلاف کیا۔

"ہم تو پولیس والے بن کے چھاپہ مارنے گئے تھے [illegible] ٹرکوں پر جانا چاہیے جو ناکامی کی صورت میں مدد کو آسکے۔"

نازو اب بھی ہم سے کچھ فاصلے پر کار میں بیٹھی [illegible] غالباً ہماری پولیس کی وردیوں کو دیکھتے ہوئے اس نے [illegible] رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آدھی رات کے بعد کسی لڑکی کا [illegible] میں نظر آنا خواہ مخواہ کا تجسس پیدا کرتا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ [illegible] فارغ ہو کر لوٹنے والا اخباری کارکن یہ منظر دیکھے تو [illegible] پھیل جائے۔

"میرا خیال ہے شیخ صاحب کہ تم اس کے پاس [illegible]" [illegible] نے کہا۔ "اور پچھلی سیٹ پر لیٹ جاؤ [illegible] اس کے ساتھ رہو۔ ابھی ٹرک کافی دیر تک [illegible] ہوگا۔"

"ہاں، ٹرک خالی ہونے اور پھر لوڈ ہونے میں دو ڈھائی گھنٹے لگیں گے۔" محسن نے کہا۔

"[illegible] رہے گی؟" [illegible] نے کہا۔ "یہاں [illegible] ہے۔۔۔"

"[illegible] تمہارے ساتھ جا رہا ہے۔۔۔"

"جاؤ، حبیب [illegible] جانے کب تک ہم [illegible] اور اس کے ساتھ ساتھ [illegible]" میں نے کہا۔ [illegible]

اکرام شیخ نے سر ہلایا۔ "کیوں نہ تب تک [illegible] جائے، وہ تین گھنٹے آرام کر لے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ دروازے اندر سے لاک کر کے پچھلی سیٹ پر لیٹ جائے۔" محسن بولا۔

"اگر کسی نے دیکھا کار میں جھانک کے تو۔۔۔؟"

"کیسے دیکھے گا کوئی۔ اور ابھی تو کار [illegible] کھڑی ہے [illegible]"

"ہاں، اور یہ کار سڑک سے ہٹ کے ایسی جگہ [illegible] ہے کہ شک کی کوئی بات نہیں۔ بلاوجہ کوئی سڑک سے [illegible] جا کے اندر جھانکے گا۔" اکرام شیخ بولا۔ "میں اسے کیسے سمجھاتا [illegible] اس کا ہم میں سے کسی کے ساتھ آنا [illegible] بالکل نامناسب ہوگا۔"

"اچھا، تم جاؤ تو پھر چلتے ہیں کچھ آرام کرنے [illegible]"

"یہ کیا بچوں سا فرار ہے [illegible] آپ [illegible] کیوں غالب بھی؟"

"اچھا۔۔۔ یہ بات ہے؟ میں بتاؤں گا غالب کو [illegible] کہ آپ ان کے بارے میں کیا پوچھ رہے تھے، وہ خود تو اب [illegible]"

"وہ تین گھنٹے [illegible] میں ٹرک کو [illegible] کام ہے۔ [illegible] کیوں نہیں جا کے چائے پی لیں [illegible]"

"میں نے [illegible] کہا تھا، مگر وہ [illegible] کی بات [illegible] اس [illegible] کے باوجود نہیں [illegible]"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "[illegible]"

"[illegible] ہیں؟ نہیں یار! ہم اچھے پولیس والے ہیں۔ ہم قیمت [illegible] مفت میں کھا لیتے ہیں؟ ادا کر دیں گے۔"

"میاں مقتدر اعظم! جب ایک گشت کرنے والی پولیس پارٹی کا تھانیدار کسی کو شرف میزبانی بخشتا ہے تو میزبان کے لیے اس سے قیمت وصول کرنا ممکن ہی نہیں رہتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس نے یہ جسارت کی تو [illegible] کل دن ہماری قیمت چکانا پڑے گی۔"

اکرام شیخ واپس آیا تو اس نے گھڑی دیکھی۔ "رات کے دو بج گئے ہیں۔ جمیلہ روڈ پر ہوٹل کھلے ہوں گے۔"

"یہ جمیلہ روڈ کہاں ہے اور کتنی دور ہے؟"

"زیادہ نہیں، یہاں سے تین میل۔" وہ بولا۔ "وہاں رات بھر بسیں مرمت ہوتی ہیں۔"

"صرف بسیں؟"

"زیادہ تر بسیں، کیونکہ مالکان انہیں صبح پھر سڑک پر لانا چاہتے ہیں۔ ہم دوسری گاڑیوں کو بھی انکار کوئی نہیں کرتا۔ شہر میں وہی ایک جگہ ہے جہاں رات کو ہر قسم کے مکینک اور گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس سب مل جاتے ہیں۔" اکرام شیخ نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہوگا کہ ہم [illegible] تک لوٹ آئیں۔"

"راستے میں یہ ٹاؤن پولیس اسٹیشن پڑتا ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"انہیں ابھی کچھ معلوم نہیں ہوگا۔" محسن بولا۔ "اصل بندے صبح ہی [illegible] نہ جانے کب [illegible] ہوں گے؟"

"ایسے تو شاید ابھی نہ ہوں۔ نہ وہ کسی کو مدد کے لیے پکار سکتے ہیں، نہ خود آزاد ہو سکتے ہیں اور نہ وہاں سے کسی گزرنے والے کو خیال آ سکتا ہے کہ اندر کوئی قید ہوگا۔"

"ایسے تو وہ مر بھی سکتے ہیں۔" اکرام شیخ بولا۔

"نہیں، ہم انہیں مرنے نہیں دیں گے۔" میں نے کہا۔ "تو اس مشن سے فارغ ہو لیں، پھر خود ہی فون کر کے کسی پولیس اسٹیشن کو بتا دیں گے کہ جاؤ فلاں جگہ سے اپنی چیزیں اٹھا لو۔"

جمیلہ روڈ پر واقعی بڑی گہما گہمی تھی اور رات جاگ رہی تھی۔ سیکڑوں مکینک [illegible] بسوں، ٹرکوں کی ہر قسم کی مرمت میں مصروف تھے۔ ان میں انجن کا کام کرنے والے سے لے کر ٹائر [illegible] الیکٹریشن، ریڈی ایٹر [illegible] والے تک سب ہی شامل تھے۔ انہی کے [illegible] جن میں [illegible] حضرات کے علاوہ بھی بہت سے لوگ بے وجہ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کراچی میں [illegible] عام ہے۔ معلوم نہیں یہ کون لوگ تھے جو اس وقت گھر کے آرام سے محروم تھے کہ کوئی کام بھی نہیں کر رہے تھے اور کوئی کام کی بات بھی نہیں کر رہے تھے۔ وقت ان پر اتنا گراں کیوں ہے کہ یہ پہلے دن کو کاٹتے ہیں، پھر رات کو کاٹتے ہیں اور پھر بھی یہ سلسلہ روز و شب سلامت ہے۔

حسب توقع ایرانی ہوٹل میں نائٹ شفٹ کے مجبور ویٹر نے کہا۔ "کیا بات کرتا ہے ابھی آپ تھانیدار صاحب، ہم آپ کا، یہ ہوٹل آپ کا، آپ سے ہم پیسے لیوے گا؟"

"ہاں، ہم چائے کے پورے پیسے دیں گے۔"

"ابھی ایسا بات مت بولو تھانیدار صاحب! ایسا پہلے کبھی ہوا ہے۔ آپ نیا ہے، ہم سمجھ گیا۔ ہم تو روز ادھر ہوتا ہے جب پولیس پارٹی آتا ہے۔" وہ بولا۔ "اکھا رات ڈیوٹی کرتا ہے [illegible] ہم چائے پانی کا پیسہ لیں گا؟"

"دیکھو یار! فضول وقت مت ضائع کرو ہمارا۔" اکرام شیخ نے دس کا نوٹ کاؤنٹر پر ڈال دیا اور چل پڑا۔ "اس میں سے جتنے پیسے بچیں رکھو۔"

"اے مائی باپ!" منیجر چلایا۔ "ایسا ظلم مت کرو نی۔ [illegible] دس روپیہ کدھر سے ہو گیا۔ تین روپے کی جگہ دس لیں گا تو تم ہی ہم کو بلیک میں پکڑ لیں گا۔ بابا، اپنا باقی سات روپیہ لو اور ہم کو معاف کرو۔ ہم سمجھا تم بھی ویسا ہی ہے۔"

سات روپے لے کر ہم نکلے ہی تھے کہ وہاں ایک اور جیپ آکے رکی اور اس میں سے اترنے والی پولیس پارٹی اپنے مخصوص مالکانہ غرور کے ساتھ ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئی۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ اصل لوگ ہیں جو ہر روز ہوٹل کو شرف میزبانی بخشتے ہیں۔

"ابھی ساری تھانیداری اتر جاتی تیری۔" محسن نے اکرام شیخ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اصل نقل کا فرق بھی نہیں آنے والا کا پتا بھی معلوم ہو جاتا۔"

اکرام شیخ نے [illegible] کو [illegible] دیا۔ "ابے یار! علاقے کے [illegible] دوسرے تھانیدار بھی تو ہو سکتے ہیں ہم۔"

"وہ علاقہ پوچھ لیتا پھر؟"

"کیوں پوچھتا؟ وہ اس [illegible] ۔۔۔۔۔۔ [illegible] کا ایک بھی دوسرے کی طرف انگلی نہیں اٹھاتا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "آخر میں تھانیداری کا پرانا تجربہ رکھتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جب یہ وردی پہننے والا خود کو قانون کا محافظ سمجھنے کے بجائے قانون کا ٹھیکیدار سمجھنے لگتا ہے تو پھر گویا ایک عام والی بات ہو جاتی ہے۔ شہر اپنا ہے اور شہر میں رہنے والے اپنی رعیت ہیں۔ رعایا کا مال اپنا مال ہے۔"

"اور ایک وہ تصور ہے پولیس مین کا، جو ہم نے برطانیہ میں دیکھا تھا۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"ہاں، وہاں وہ حقیقی معنوں میں عوام کے خادم ہیں۔" محسن بولا۔ "ولایت کی بات یہاں مت کیا کرو، جو وہاں ہے وہ یہاں نہیں ہے۔"

www.paksociety.com

"مگر تم یہاں سے کیا وہ سب وہاں ہے؟" اکرام شیخ بولا۔

"مثلاً لاہور کے آلو چھولے، کراچی کا حبشی حلوہ، نہاری اور شکار پور کا اچار۔ سگریٹ بازاروں یہاں تک کہ اسپتالوں کی دیواروں پر پان کے داغ اور اسکولوں کی دیواروں پر حکیموں کے اشتہار۔"

"کیوں، مشرقی تہذیب کی روایات میں کوئی خوبی نہیں؟ ہماری سب اقدار فرسودہ اور آؤٹ آف ڈیٹ ہو گئی ہیں۔ ہم جو عورت کی عزت و حرمت اور آبرو کی تقدیس پر فخر کرتے ہیں، رشتوں کی تقدیس کو مانتے ہیں...."

"بجا ارشاد، لیکن ہم ماضی پرست ہیں۔ مستقبل کی طرف دیکھتے ہیں تو صرف خوابوں کی صورت میں، وہ ہماری آنکھیں بائیں کے تعبیر شدہ نہیں ہوتے۔ ہم ان کی خرابیاں سمیٹ کر فخر کرنے لگتے ہیں کہ ہم ترقی یافتہ ہو گئے ہیں۔ اس معاشرے کا ڈسپلن، ان کی اصول پرستی، ہر شعبے میں پرفیکشن حاصل کرنے کا جذبہ، اور بھی تو بہت کچھ ہے جس کا ہم ذکر ہی نہیں کرتے تاکہ ہماری اپنی خامیاں نمایاں نہ ہوں۔ ہم بات کرتے ہیں تو ان کے معاشرے میں جنسی بے راہ روی کی، ذرائع ابلاغ میں عریانیت اور فحاشی کے فروغ کی، شرح طلاق میں اور کنواری ماؤں کی تعداد میں اضافے کی۔ اور خوش ہو جاتے ہیں کہ صاحب ہم تو فرشتے ہیں ان کے مقابلے میں، ان کی تعلیم، اقتصادی اور صنعتی ترقی۔"

"چلیں بھائی بس...." اکرام شیخ نے کہا۔ "تم ہارے اور آپ جیتے۔"

"افسوس ہوتا ہے یار۔" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "جب میں اس ملک کی تاریخ پڑھتا ہوں۔ دو عشروں کی بھی کیا تاریخ ہے کہ اس پر تاریخ بھی شرمائے۔ اتنے کم وقت میں وہ جذبہ کہاں گیا جس نے ایک ملک کی تخلیق کی تھی، وہ لوگ کہاں گئے جو.... میر کارواں تھے۔ منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔ کیوں کہنا پڑا یہ سردار نشتر مرحوم کو؟ کیا کیا ہم نے لیاقت علی خان کو شہید کرنے کے بعد۔ قانون اور آئین بنا نہیں، اسلامی اقدار اور اخلاقی تعلیمات تک کو بھلا دیا، زمانہ گواہ ہے کہ ہم نے حکومت تو حاصل کر لی مگر ہم حکومت چلانے کے اہل نہ تھے۔ ہماری وفاداریاں کتنی بار تبدیل ہوئیں، محض سیاسی شعبدہ گریوں کے باعث پھر مارشل لا لگا۔ پھر ایک عجیب سی آئینی حکومت کا ڈرامہ چلا۔ جمہوریت کے نام پر جو انتخابات کا ڈھونگ رچایا گیا اس میں مادر ملت جیسی ہستی کو بھی صرف شرمندگی ملی اس قوم سے۔ اور اب دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ یہ کیوں ہو رہا ہے تو کیا جواب دیں گے ہم یا اہل اقتدار، سیاست داں اور دانشور۔"

"مکمل حیرت نوٹ نہیں، تاریخ ہاتھ ہر سوال کا جواب دیتی ہے۔"

"تاریخ صرف بیس سال میں نہیں بنتی۔" میں نے کہا۔ "مغلیہ دور حکومت میں اکبر اور اورنگ زیب نے تقریباً نصف صدی تک حکومت کی۔ تقریباً پچاس سال اکبر کے اور انچاس سال اورنگ زیب حکمران رہا۔ دور میں بھی کبھی بنگال کا صوبہ بغاوت کر دیتا تھا تو کبھی دکن کا۔ پچیس سال دکن میں بیٹھا رہا۔ بیس سال تو کچھ بھی نہیں۔ خدانخواستہ اندر اور باہر کے دشمن اس ملک کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو تاریخ میں کیا لکھا جائے گا؟ صرف یہ کہ بیسویں صدی کے وسط میں کچھ عرصہ مشرقی اور مغربی مسلم اکثریت والے صوبوں نے قائم کر لی تھی جو بد نظمی اور انتشار کے باعث جلد ہی ٹوٹ گئی۔ اس سلطنت کچھ نہیں۔ مغلوں کے زوال کے تو اوراق تاریخ کی زینت ہیں۔ ہم اپنے کو نیا ملک سر انجام دے رہے ہیں، ابھی تک جس کا تذکرہ بھی کرے گا کوئی مورخ اور ملکوں کی تاریخ اور تہذیب کے دو صدیوں میں مرتب ہونے...

"تو تو بھی ہو رہا ہے یہ ملک قائم رہنے کے لیے بنتا ہے اور کتنی ہی کوششیں کریں، اگلی صدی کیا، اس کے بعد آنے والی صدیوں میں بھی جاری رہیں۔" محسن نے کہا۔

"ایسا ہونا تو فطری ہے۔" میں نے کہا۔ "تم دیکھو کہ اس ملک کے خلاف آج کتنے مخالف عناصر سرگرم عمل ہیں۔ جو ہر کمی و دار اور ناحکم کا نمائندہ ہے جس کا ایمان پیسہ ہو گیا ہے۔ خواہ وہ کسی بھی ناجائز ذریعے سے آئے اور یہ لوگ اپنی ذات کے مفاد پر ملک و قوم سب کو بھی قربان کر سکتے ہیں۔ ایس ایس پی سراج اس با اختیار گروہ بدکردار اور جرائم پیشہ انتظامیہ کا نمائندہ ہے جو صرف قانون کو عوام کے تحفظ کے لیے نہیں، انھیں لوٹنے اور بے بس کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے اور حاجی عبداللہ تیسرے طبقے کا نمائندہ ہے جو مذہب کا لبادہ اوڑھ کے بے خبر لوگوں کو دھوکا دیتا ہے، مذہب کا استحصال کرتا ہے اور اپنے شیطانی عزائم کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔ یہ سب مل کے قومیت کے جذبات کی، ملک کی سلامتی کی اور مذہبی اقدار کی دھجیاں بکھیر کر کھوکھلی کر رہے ہیں، ضمیر بیچ کے بیٹھے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔"

گاڑی رک گئی تھی اور وہ سب خاموش تھے کیونکہ میں تو بھی سب کا اعتراف جرم بنا رہا تھا۔

"کیا یہاں صرف شکاری رہ گئے ہیں؟" محسن نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ "وہ جو انسانوں کی شرافت اور نیکی کے شکاری ہیں، ایمانداری کے شکاری، انسانی ضمیر کے شکاری، قانون اور انصاف کے شکاری جو سب اپنے اپنے جال پھیلائے ہیں اور شکنجے بچھے ہیں... یہ جنگل بن گیا ہے جہاں جنگل کے قانون کی حکمرانی ہے، طاقتور زندہ رہیں، کمزور کے لیے صرف موت ہے؟"

"اسی لیے تو ہم بھی ایم اے ایل بنانے پر مجبور ہوئے کہ اگر ریڈ لائٹ تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم بھی اپنی طرح کے شکاری بنے، جینے کا حق مانگنے کا زمانہ نہیں رہا۔ تو ہم حق چھین لیں گے... نے تو بہت پہلے یہ بتا دیا تھا کہ ازل سے آج تک جنگ...

دنیا بدلتی ہے جیسے وقت اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدل جانے کی صلاحیت حاصل کی۔ ڈائنوسار ختم ہو گئے، ہاتھی اور شیر کی نسل... مگر کاکروچ پچیس کروڑ سال سے زندہ ہے کیونکہ وہ پانی میں بھی زندہ رہ جاتا ہے اور خشکی میں بھی، اڑ بھی سکتا ہے، تیر بھی سکتا ہے اور رینگ بھی سکتا ہے۔ ماحول کے مطابق سب کچھ کھا کے زندہ رہا جا سکتا ہے۔ دنیا میں ایسا ہی باعث تبدیلی تھا... اور معاشی طور پر وہی قوم باقی رہے گی جو وقت کے خلاف جنگ میں بھی طاقت کے ساتھ شریک ہوگی۔ قدیم قبائل، قدیم تہذیب، رسم اور رواج سب مٹ رہے گیا۔ سائنس اور صنعتی ترقی کے لیے اپنی طاقت اور صلاحیت کو پوری طرح بروئے کار لانے کی صلاحیت رکھنے والے پھر باقی رہتے ہیں۔"

میں اور محسن بول رہے تھے۔ اکرام شیخ اسٹیئرنگ پر سر رکھ کے سو گیا تھا اس کا احساس ہمیں اپنی خاموشی سے ہوا۔

"ہمارا یہ ہی خیال تھا کہ بابو شیخ سو گیا۔" محسن بولا۔

"کہاں ہے، سنا تو تھا کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر اسٹیئرنگ وہیل پہ سو...."

محسن نے ایک دھاگے کو بل دے کے اس کی ناک میں گھمایا تو وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

"یہ کیا شرافت ہے؟" محسن بولا۔ "تم سونے آئے ہو؟"

"کون کم بخت سو رہا تھا؟" وہ جھلا کے بولا۔

"سانپ ابھی نہیں آئی؟" میں نے کہا۔

"کیا وقت ہو گیا ہے؟" وہ جھینپ کے بولا۔

"ساڑھے تین۔" میں نے گھڑی کو روشنی کے رخ کیا۔ شاید اسٹریٹ لائٹ منعکس ہو کے نازو تک پہنچی۔ میں نے دور کھڑی ہوئی کار میں بھی ایک جگنو سا چمکتا دیکھا۔ میں نے اپنی کلائی کو پھر گھما کے سامنے کیا۔ نازو نے پھر اسی طرح سگنل دیا۔

"یار! تیری بہن سگریٹ پی رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"تیرا کیا جاتا ہے؟"

"دیکھ لے تو۔" میں نے کہا۔ "جب وہ کش لیتی ہے تو سگریٹ کی روشنی نظر آتی ہے۔"

محسن اور اکرام شیخ نے غور سے کار کے ونڈ اسکرین سے دیکھا۔

"یہ کیا ہے یار!" محسن بولا۔ "اگر سگریٹ نہیں ہے تو...."

"تم لوگ پاگل ہو، نازو سگریٹ پیتی ہے؟" اکرام شیخ غصے سے بولا۔ "تو تم تو کیا، نہ سگریٹ پی سکتی ہے، اور نہ پیتی ہے۔" محسن بولا۔

"سمجھ لو کہ کار کی لائٹ تو نہیں پڑ گئی اسے۔" میں نے کہا۔ "پیچھے دونوں خاص گراؤنڈ رہا ہے وہ اور اچھے ماحول میں بھی نہیں رہی یہ کراچی کا شہر ایسا ہی ہے۔"

اکرام شیخ آگ بگولا ہو کے جیب سے اترا اور کار کا رخ کیا۔ میں نے محسن کو بتایا کہ اس نے چپکے کار لاک کیا ہے۔

"تم نے دیکھ لیا تھا۔" محسن بولا۔ "تو ریسٹ واچ سے سگنل لے رہا تھا۔" اور قہقہہ مار کے ہنسا۔ جب شیخ واپس آیا تب بھی ہم ہنس رہے تھے۔ وہ خفت سے حالت نکالتا رہا۔ آس پاس کا سارا علاقہ غیر آباد، تاریک اور سنسان تھا۔

اکرام شیخ نے ہمیں بتایا تھا کہ آگے گلشن اقبال ہے جو خوش حال لوگوں کی بستی ہے، مگر ابھی وہاں آبادی بہت کم ہے اور ترقیاتی کام جاری ہیں۔ یونیورسٹی روڈ تھی جو تاحد نظر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اس پر صرف اسٹریٹ لائٹس تھیں اور دونوں جانب آبادی کے آثار تھے۔ ایک ویرانہ تھا جس کا نام گلشن رکھ دیا گیا تھا۔ اس ویرانے میں مزید پانچ چھ میل کے فاصلے پر کراچی یونیورسٹی کا نیا کیمپس تھا۔ رات کے وقت اس سڑک پر کسی قسم کی ٹریفک نہیں رہتی تھی۔ بس کوئی اکا دکا گلشن اقبال میں رہنے والا کوئی شخص اپنی کار میں گزرتا تھا تو ٹوٹی سی خستہ حال سڑک پر رفتار زیادہ رکھتا تھا اور کسی کو لفٹ نہیں دیتا تھا کیونکہ سنسان سڑک پر لٹیرے متعدد وارداتیں کر چکے تھے۔

ٹرک اچانک نمودار ہوا مگر یونیورسٹی روڈ سے سیدھا آنے کے بجائے وہ اسٹیڈیم کی طرف جانے والی سڑک پر گھوم گیا۔ میں بالکل تیار تھا مگر نازو نے ایک بار لائٹ جلا کے آف کر لی۔

"یہ کیا کرنا چاہتی ہے بھائی؟" محسن نے کہا۔

"میں جا کے پوچھتا ہوں۔" اکرام شیخ بولا۔ مگر اتنی دیر میں نازو بھی ٹرک کے پیچھے ہماری طرف آنے کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔

"تم لوگ سو رہے ہو کیا؟" نازو نے قریب آ کے کہا۔ "ٹرک گزر گیا اور تمھیں پتا نہیں چلا۔"

"ٹرک گزر گیا؟" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ کہا۔

"ادھر مڑ گیا۔" نازو بولی۔ "میں نے پہچان لیا تھا۔"

"کیا پہچان لیا تھا؟" محسن نے کہا۔

"سب ٹرک ایک سے لگتے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"اُف، ابھی ... اس کو بھی دیکھ لیا تھا۔" نازو نے اپنے سر پہ ہاتھ مار کے کہا۔ "... کے لیے آرام، الگ سے بہتر۔"

"مگر وہ ادھر کیوں مڑ گیا؟" میں نے کہا۔

"یہ اس سے پوچھ لو جا کے۔ ٹرک ڈرائیور سے۔"

"اور وہ تمھارا.... غالب طرف منسوب کہاں گیا۔ اسے بھی وہ گدھ ٹیلوں کے ساتھ لے گئے۔" محسن بولا۔

"ہاں، وہ کیوں نہیں آیا ابھی تک؟"

www.paksociety.com

"یہ بھی اسی سے پوچھ لینا؟" نازو چڑ کے بولی۔ "اب جاؤ گے یا یہیں کھڑے بولتے رہو گے۔"

"جا رہے ہیں بی بی۔ مگر ایسا تو نہیں کر سکتے کہ اکمل اس کے پیچھے سانپ کی طرح لگ جائیں۔" میں نے کہا۔

"اندر وہ نکل گیا کسی اور طرف تو....؟" نازو نے کہا۔ مگر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اندھیرے میں سے ایک سایہ دوڑتا ہوا نمودار ہوا۔ یہ غالب تھا۔

"کیا ہوا؟ ہانپ کیوں رہے ہو؟"

"صرف نازو کھڑی ہوئی ہے۔ ہم جیپ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"لاحول ولا... تم نے ٹرک مس کر دیا؟"

"ہم نے تو کر دیا تھا مگر مس نازو نے مس نہیں کیا۔" محسن بولا۔

"یہ بھی ٹرک کے تعاقب میں جانے پر تُلی ہوئی تھیں۔"

"ہم اب جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اتنے ہی وقفے سے جانے سے پیچھے آؤ۔"

"مگر اس طرح کہ ہمیں پتہ چلے۔" اکرام شیخ نے جیپ کو اسٹارٹ کیا۔

"اس میں اوپر تک مال لادا گیا ہے۔" غالب نے کہا۔

"مال کا اندازہ تمہیں ہوا؟"

"نہیں۔ مگر چیک کی کوئی بات نہیں۔ سبزی یا پھل کے کریٹ اٹھانے والوں پر بھی میری نظر تھی۔ پندرہ بیس سیر کا وزن اٹھانا انھیں مشکل نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن جب انھوں نے دوسرے کریٹ اٹھا کے رکھے تو ان کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کئی من وزن اٹھا رہے ہیں۔"

"مزدور وہاں کے تھے؟"

"ہاں۔ میرا خیال ہے ان کے اپنے آدمی ہیں۔" غالب نے کہا۔ "مزدوری لوگ ہوتے ہیں۔ شاید انھیں تختہ بند رکھنے اور کوئی سوال نہ کرنے کی اجرت زیادہ ملتی ہوگی۔ ورنہ وہ پوچھ سکتے ہیں کہ ان کریٹوں میں کیا لوہا بھرا ہوا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "پانچ منٹ ہو گئے۔ ٹرک اگلے چوراہے تک ہی پہنچا ہوگا۔" اور جیپ بڑھا دی۔

"اس کی رفتار کم تھی۔" محسن نے کہا۔

"وزن جو زیادہ تھا۔" میں نے اس کی تائید کی۔

"اگلا چوک اسٹیڈیم کے پاس ہے۔" اکرام شیخ نے ہیڈ لائٹس آف کر کے جیپ کو اس ویران اور اندھیری سڑک پر دوڑانا شروع کیا۔ "وہ دائیں ہاتھ ہی جائے گا۔"

"الٹے ہاتھ پر کیا ہے؟"

"حیدرآباد کا راستہ۔ لیکن کارساز روڈ سے وہ رُخ بدل سکتا ہے۔"

"کارساز... ؟ کیا وہاں کاریں بنتی ہیں؟" محسن نے کہا۔

"کارساز نیوی کا ایک ٹریننگ سینٹر ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"ٹیکسی ڈرائیوروں کے پیشے نے تجھے اس شہر کا جغرافیہ دان بنا دیا ہے۔" محسن نے اعتراف کیا۔

"ماہر؟ اس شہر میں چند سڑکوں پر پھرنے سے صرف سڑکوں کا اور مقامات کا پتا چلتا ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "... ابھی آدھا شہر بھی نہیں دیکھا۔"

"سامنے دیکھو۔" تم نے کہا۔ ... جیپ ٹرک کے ... گزرتے ہوئے اچھل گئی۔

"سپیڈ بریکر ... ہوا۔" اکرام شیخ نے متانت سے کہا۔

"ہم شکر کریں ... خیر سے۔" ... نے کہا۔

"وہ... ٹرک تو بائیں طرف مڑ گیا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "کیوں؟" اور جیپ کو سیدھے ہاتھ کی طرف موڑ لیا۔

"فالو کرنا چاہئے۔ یہ راستہ کدھر جاتا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ واپس وہیں ... ملک کی طرف جاتا ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "ٹرک جہاں سے روانہ ہوا تھا اس مقام سے کوئی دو فرلانگ دور اسی سڑک پر۔"

"یہ چکر کس لیے؟" محسن بولا۔ "دو فرلانگ واپس جانے کو ٹرک نے دو میل کا لمبا راستہ اختیار کیا ہے؟"

"آگے ٹرک کہاں جا سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بائیں ہاتھ پر... ہم بھی ادھر ہی گئے تھے جانے پہچانے ... مگر میرا خیال ہے کہ ٹرک شیر شاہ ... روڈ پر جائے گا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "وہاں سے سیدھا....... گورا قبرستان، کالا پل، پھر کورنگی روڈ پر۔"

"دیکھو بھائی! ہم اجنبی ہیں اس شہر میں۔ ایسے نام ہم سے مت کرو۔" محسن نے کہا۔ "بس ذرا فاصلے سے ان کا تعاقب رکھو... اور یہ بتاؤ کہ انھیں روکنا ہو تو کہاں روکا جائے؟"

اکرام شیخ نے پھر جیپ اسٹارٹ کی۔ "اگر وہ کورنگی روڈ پر جاتے ہیں تو آگے سب ویرانہ ہے۔ راستے میں کسی بھی جگہ انھیں روکا جا سکتا ہے۔"

"پیچھے والوں کا کچھ پتا ہے؟" میں نے پلٹ کے دیکھا۔

"ہاں، آ رہے ہیں وہ بھی۔" محسن نے تصدیق کی۔

اکرام شیخ کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ ٹرک اسی راستے پر جا رہا تھا جو اس کے ذہن میں تھا۔ ہم سے کافی پیچھے کاریں تھیں جن کی ہیڈلائٹس جلتی تھیں اور بجھ جاتی تھیں۔ نازو بھی بتا چکی تھی کہ وہ جانتے ہیں مگر میرے نزدیک یہ ایک غلط حرکت تھی۔ ہم سے آگے جانے ... ٹرک کا ڈرائیور بھی بے وقوف نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس ... مال ہے اور یہ مال پکڑا جائے تو پریشانی لاحق ہو سکتی ہے۔ وہ پھر سے ... کوئی ہوگا جو یہی کام بہروز پوری قوت و دلیری کے ساتھ کرتا ہوگا۔ جیپ بھی اسے قدرت سونپی جاتی ہوگی وہ پوری طرح ... اس مال کو منزل مقصود تک پہنچاتا ہوگا۔ وہ یقیناً آگے کی طرح پیچھے بھی نظر رکھتا ہوگا۔ وہ جیپ کی ہیڈلائٹ دیکھ سکتا تھا۔ شیر شاہ ... روڈ پر پہنچ کر ٹرک کی رفتار ایک دم بڑھ گئی تھی۔ ... تجربہ کار ... تعاقب کو نقصان ہوگا۔ غالباً ٹرک ڈرائیور نے ہمیں تعاقب کرتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے محسن سے مشورہ کیا اور پھر ہم نے تعاقب چھوڑ دینے کے بجائے ٹرک کو روکنے کا فیصلہ کیا۔

اکرام شیخ نے ہیڈ لائٹس آن کرتے ہی جیپ کی رفتار بڑھا دی اور فور وہیل ڈرائیو جیپ نے دس منٹ میں ٹرک کو جا لیا۔ یہ ایک ویرانہ اور سنسان جگہ تھی۔ دائیں طرف مجھے پہاڑیاں سی نظر آ رہی تھیں اور بائیں جانب بہت بڑی کوٹھیاں رات کے آخری پہر میں ... تھیں۔

اکرام شیخ نے ٹرک کو بڑی ہوشیاری سے اوورٹیک کیا۔ میں نے اور محسن نے اپنا اپنا ریوالور نکال لیے تھے۔ جیپ نے آگے نکلتے ہی رفتار کم کی اور ٹرک کو اپنے پیچھے رہنے پر مجبور کر دیا۔ پھر شیخ نے ہاتھ باہر نکال کے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور اسے ایک کنارے پر روک کر جیپ اس کے سامنے آ گئی۔

میں اور محسن بڑی مستعدی سے چھلانگ مار کے نیچے اترے۔ اکرام شیخ افسرانہ تمکنت کے ساتھ آیا۔ ٹرک ڈرائیور نے دروازہ کھولے بغیر کھڑکی سے سر نکالا۔

"کیا بات ہے جناب عالی؟" وہ عاجزی سے بولا۔ مگر اس عجز میں تمسخر اور طنز کا انداز واضح تھا۔ "حکم کرو۔"

"نیچے آؤ۔" اکرام شیخ نے غرا کے کہا۔ "حکم کے غلام۔"

"خیر ہو سرکار کی۔" ٹرک ڈرائیور نیچے آیا۔ وہ ایک بھاری بدن اور لمبے قد کا شخص تھا جو پولیس کو دیکھ کر بالکل ہراساں نہیں ہوا تھا۔

"لو جی، نیچے آ گئے۔" اس نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ "اب حکم کرو۔"

"اس ٹرک میں کیا ہے؟" اکرام شیخ نے کہا۔

"اس میں؟" اس نے ٹرک کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ خود ٹرک کو دیکھ کر بہت حیران ہے۔ "بہت کچھ ہے جناب عالی...! الغرض ... "

اسے زیادہ کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ ... انداز میں شیخ نے اس کو گالی دی اور اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا بھرپور طمانچہ رسید کیا۔ ... جیسی آواز رات کے سکوت میں کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی۔

اس شخص کی ساری ظرافت ختم ہو گئی۔ بے اختیار اس کا ایک ہاتھ گال پر گیا۔ اور دوسرا واسکٹ کی طرف بڑھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں جو پہلے چرس کے نشے میں لال ہو رہی تھیں اب بے عزتی کے احساس پر طیش سے انگارا ہو گئیں۔ میں نے ہاتھ سے اسے روک دیا۔

"سیدھا کھڑا رہو۔ افسر بات کر رہا ہے اور تو جیب میں ہاتھ ڈال رہا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے مجھے ایک گالی دی اور دانت پیس کر میری طرف بڑھا۔

"تیرے جیسے افسر سے تو میں بعد میں نمٹ لوں گا..."

میرے قریب آنا اسے مہنگا پڑا۔ میں نے بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ اسے کندھے پر سے اٹھا کے پٹخ دیا۔ پٹخنے کا یہ انداز عرف عام اور پرانی کشتی کے فن کی اصطلاح میں دھوبی پٹکا کہلاتا ہے۔

"سیدھا کھڑا ہو جوان۔" میں نے کہا۔ "افسر کھڑے ہیں اور تو لیٹا ہوا ہے گستاخ۔"

وہ آہستہ آہستہ کھڑا ہوا۔ "تم کو معلوم ہے یہ کس کا ٹرک ہے؟" اس نے خطرناک دھمکی دینے والے لہجے میں کہا۔

"ہاں، ... کا۔" محسن نے سر ہلایا۔ "افسر بھی یہ بات جانتے ہیں۔"

"تمھیں معلوم ہے اس کا مالک کون ہے؟" ڈرائیور غرایا۔

"میاں! ہم سب کا، کائنات کی ہر چیز کا مالک اللہ ہے۔" میں نے انگلی اوپر اٹھا کے عین حاجی کے انداز میں کہا۔

وہ چونکا۔ "جب تم جانتے ہو تو پھر راستہ کیوں روکا ہے؟"

"کیا تم جانتے نہیں کہ پولیس کا یہی کام ہے؟" اکرام شیخ نے کہا۔ "چیکنگ کرنا۔"

"دیکھیں تھانیدار جی... مجھے نہیں معلوم تم کون ہو اور کہاں سے بیچ میں آ گئے ہو۔" ڈرائیور نے کہا۔ مگر اب اس کا لہجہ پہلے کی طرح غیر شریفانہ نہیں رہا تھا۔

"میرا نام اس وردی کی جیب پر لکھا ہوا ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ "اور اس سے تم کو مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔"

"افسروں سے پوچھتا ہے کہ کہاں سے آئے ہو۔" میں نے اس کی گدی پر ہاتھ مارا۔ "مجھے بتا کہ کہاں جاؤ گے؟"

اس نے قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "او تھانیدار! اپنے بندے کا ہاتھ روک لے ورنہ..."

"ورنہ تو مجھے مرغا بنائے گا بندے کا اور تیرے میں صرف الف کا الٹ پھیر ہے۔" میں نے اس کے ... ہاتھ مارا مگر وہ بچ گیا۔

"تھانیدار...!" وہ چلایا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے... جب ہمارا

www.paksociety.com

سامان تم سے طے ہو گیا ہے... حصہ پہنچ گیا ہے...“

”اوئے... اوئے... افسروں پر تہمت لگاتا ہے رشوت کی۔“ محسن نے اسے ایک لات رسید کی۔

”اور وہ بھی رشوت دیے بغیر!“ میں نے اسے ٹانگ اٹھا کے منہ کے بل گرا دیا۔ ورنہ وہ محسن پر حملہ کر دیتا۔

”چل، اٹھ بدبخت... خاک تیرے منہ میں۔“ میں نے کہا۔ ”تو افسروں کو دھمکی دیتا ہے۔“

”اپنا منہ صاف کر... اور اب سے سیدھا کھڑا ہو الف کی طرح...“ محسن نے کہا۔

ڈرائیور کی آنکھوں میں شکوک کے سائے پھیل رہے تھے۔ ”کون ہو آخر تم لوگ... جو نئے آئے ہو یہاں تو سمجھو کر اس راستے پہ حاجی کے ٹرک کو روکنے کی ہمت پہلے کبھی کسی نے نہیں کی۔ پچھلے ہفتے تک یہاں دوسرا تھانیدار تھا۔“

”وہ تو گیا۔“ میں نے دعا کے انداز میں دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کے کہا۔ ”اب تم اپنی فکر کرو۔“ محسن نے میری تائید میں سر ہلا دیا۔

”پرانی باتیں بھول جاؤ۔“ اکرام شیخ نے اپنی متانت برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بتاؤ ٹرک میں کیا ہے... ٹرک کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے؟“

”تھانیدار صاحب!“ ڈرائیور نے مخاطب ہو کے کہا۔ ”میں تو ملازم ہوں حاجی صاحب کا... لاہور سے پھل فروٹ کراچی لاتا ہوں۔“

”اور کراچی سے کیا لے جاتے ہو؟“ اکرام شیخ نے کہا۔

”یہ میں نہیں بتا سکتا۔“ وہ بولا۔ ”آپ اپنے افسروں سے بات کر لو... میں نام بتا دیتا ہوں...“

اکرام شیخ نے اس کے دوسرا چانٹا زیادہ پھرتی کے ساتھ اور زیادہ قوت سے مارا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ ”میں نے کسی افسر کا نام نہیں پوچھا۔ ان کے نام میں جانتا ہوں۔ جو میں نے پوچھا ہے وہ بتا فوراً۔“

”جناب عالی! ہم پہ کیوں ناراض ہوتے ہیں۔“ اس کا لہجہ ایک دم خوشامدانہ ہو گیا۔ ”ہم تو آپ کے بھی خادم ہیں۔“

”فی الحال مجھے کسی نوکر کی ضرورت نہیں۔ سارا کام میں خود اپنے ہاتھ سے کر لیتا ہوں۔“ اکرام شیخ نے اسے ہاتھ دکھا کے کہا۔ ”اس ہاتھ سے۔“

”میری عرض تو سنیں جناب! اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی ہے تو میرے کو معاف کر دیں۔“ وہ بولا۔ ”لاہور سے کراچی تک جانے سارے سب تعاون کرتے ہیں۔ یہاں بھی ایسی ویسی بات کبھی نہیں ہوئی۔ ہم تو سب کو راضی خوشی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ بھی ناراضگی ختم کرو۔ مجھے اختیار تو نہیں، لیکن میں بتا دیتا ہوں... آپ بھی راضی خوشی ہو جائیں۔ اور مجھے بھی جانے دیں۔ ہم آئندہ بھی کام آئیں گے آپ کے۔ آپ شیر... کیونکہ اب آپ سے واسطہ تو پڑے گا۔ میں حاجی صاحب سے بول دوں گا کہ نیا افسر آیا تھا۔ اس کو خرچہ پانی دینا پڑتا ہے۔“

”اوئے... اوئے... خرچہ پانی، رشوت۔“ محسن نے پھر لات ماری۔ ”چاہئے افسر کو...“

وہ اس لات کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ وہ براہ راست شیخ سے مخاطب تھا جو اس کی بات دلچسپی سے سن رہا تھا۔ وہ میری طرف آیا تو میں نے بھی لات مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ”اوئے، خانہ خراب کھوتے... سیدھا تیر ہو جا نہیں تو بنا دوں گا۔“

”تھانیدار صاحب! یہ... تم منع کیوں نہیں کرتے ہو“ اس نے گالی کو لبوں پہ روک لیا۔

”کتنا خرچہ پانی دے سکتے ہو تم اس وقت؟“ شیخ نے نرمی سے پوچھا۔

”پہلی بار ہے ناجی؟“ وہ کچھ مطمئن ہوا۔ ”ابھی آپ پانچ ہزار لے لو پھر ہر پھیرے کے آگے...“

اکرام شیخ نے پھر تھپڑ مار کے اسے حیران کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب تو مصالحت کے فارمولے پہ اختلاف ختم کر دیا ہے۔

”او یار! پھر تم بھی اتنے ہی لالچی ہو... جیسا وہ... لیتا تھا۔“ وہ بولا۔ ”ہر پھیرے کے پانچ؟“ اس نے ایک تھانیدار کو ظالم کے لقب سے بھی یاد کیا۔

”اسے تو میں بتا دوں گا کہ تم اس کو کیا کہتے تھے۔“ اکرام نے کہا۔ ”ابھی تو صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ ٹرک میں کیا ہے اور کہاں جا رہا ہے؟“

”یار، تم ویسے پہلے بات کر لو۔“ ڈرائیور نے مشتعل ہو کر کہا۔

”اوئے... اوئے... افسر کو یار بولا۔“ محسن نے ایک لات ماری۔ ”افسر کا یار افسر ہوتا ہے۔ کھوتے کے پتر!“

”ہاں ہاں... پتا چل جائے گا کہ کس افسر کو کونسا افسر...“ وہ توہین کے گھونٹ پی کے بولا۔ ”یہاں بہت کچھ کر سکتے ہو، اکیلا ہوں نا۔ وہاں چل کے ان سے پوچھنا جو کچھ پوچھنا ہے۔ یار افسروں کو بھی بلا لیں گے وہ۔“

”یہ بات تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ اکرام شیخ نے کہا۔ ”بے چارہ ملازم ہی تو ہے۔ مالکوں سے بات کرنا چاہیے۔ چلو چلتے ہیں۔ مگر یہ بتاؤ وہاں اس وقت کون ملے گا؟“

ڈرائیور نے کہا۔ ”یہ تو جا کے ہی پتا چلے گا۔“

اکرام شیخ کا تیر نشانے پہ بیٹھا تھا۔ ڈرائیور مطمئن ہو گیا۔ مالکوں میں سے کسی کو تو وہ جانتے ہیں۔ لاہور کے حاجی کراچی کے کسی سیٹھ اور حاجی بھائی کو کسی حوالے سے خبر ہو گئی... مبتلا ہو سکتا تھا پھر ممکن ہے وہ ہمیں اپنے ٹھکانے تک نہ لے جاتا۔

”تمہارے ساتھ... وہ کلینر نہیں آیا؟“

”اس کو بخار ہو گیا تھا۔ میں نے کہا کہ تو ادھر لیٹا رہ جا۔ میں واپس آؤں گا تو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔“ وہ بولا۔

شیخ کا یہ سوال بھی ذہانت پر مبنی تھا کہ کوئی ٹرک ڈرائیور بغیر کلینر کے سفر نہیں کرتا۔

”چلو پھر میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

”میرے ساتھ؟“ وہ ایک دم گھبرا گیا۔ ”جیپ تو ہے آپ کی۔“

”جیپ میں یہ دونوں آ جائیں گے۔“ اکرام شیخ نے کہا اور ریوالور سے اشارہ کیا۔ ”چلو۔“

ٹرک ڈرائیور کھڑا رہا۔ اس کا چہرہ کسی نامعلوم کشمکش اور کسی منصوبے کی ناکامی کے جذبات کا ترجمان ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔ باری باری ہم سب کو دیکھ رہا تھا اور کسی نتیجے پہ پہنچنے سے قاصر تھا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ وہاں لے جانے کا مقصد صرف دھوکا دینا تھا۔ وہ ٹرک میں بیٹھتا تو شاید ہمیں عدم آباد پہنچا دیتا۔ وہ تو اس خوش فہمی میں آ گیا تھا کہ خواہ مخواہ راستہ کاٹنے والوں کو حاجی کے نام سے اور بڑے افسروں کے حوالے سے یا نوٹ دکھا کے چپت کر دے گا۔ یہ ذلت اٹھانے کا اس نے سوچا بھی نہ ہوگا۔ اب اپنی کوشش میں ناکام ہو جانے کے بعد اس نے ہمیں وہ سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا جس کے ہم مستحق تھے۔ یہ اسلحے کے کاروباری لوگ تھے جو راستے فریب سے چلتے تھے یا پھر راستے کی رکاوٹیں صاف کر دیتے تھے۔ زندہ نہ رہنے دیتے۔

اگر وہ ٹرک میں بیٹھ کے چل پڑتا اور ہم اس کے پیچھے روانہ ہو جاتے تو ممکن تھا وہ ہم پر دستی بم پھینک دیتا یا کسی مشین گن کا فائر کھول دیتا جو آگے احتیاط سے رکھی گئی ہوتی۔ کسی خفیہ جگہ پر، مثلاً سیٹ کے نیچے۔ ہم نے تو اسے ریوالور تک نکالنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

”یہ تو غضب ہو گیا سر جی!“ میں نے کہا۔

”اوئے... اوئے... افسروں کے سامنے سوچتا ہے۔“ محسن نے اپنے مخصوص لہجے میں بولتے ہوئے لات چلائی۔

”مجبوراً سن لیا اوئے۔“ اکرام شیخ نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی ڈرائیور کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ ایک دم بھاگ کے ٹرک کی پناہ میں جانا چاہتا تھا تاکہ وہاں خود کو محفوظ رکھتے ہوئے ہم پر فائر کرے۔ مگر ہم بھی غافل کہاں تھے۔ اس بار محسن ایک دم جھپٹا اور ڈرائیور اس کے اوپر سے گزرنے کی کوشش میں منہ کے بل گرا۔ میں نے اسے پھر اٹھنے نہیں دیا۔

وہ طاقتور آدمی تھا اور اس نے خود کو چھڑانے کی زبردست کوشش کی۔ وہ محسن کے بھی ایک لات مارنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس لات نے محسن کو کافی دور پہنچا دیا تھا مگر اس کے بعد میں نے اپنا کام دکھایا اور اسے دو منٹ تک اچھالا اور ٹرک پر مارا۔ یہاں تک کہ وہ نیم جان ہو گیا اور بری طرح ہانپنے لگا۔ اس میں گالیاں بکنے کا حوصلہ بھی نہ رہا۔ اکرام شیخ اور محسن 'واہ! سبحان اللہ' اور 'شکر' کہتے رہے۔

محسن نے اس کی جامہ تلاشی میں دو ریوالور برآمد کیے جو بالکل نئے اور غیر ملکی ساخت کے تھے۔ ایک اس کی واسکٹ میں باہر والی جیب سے نکلا اور دوسرا شلوار کی ڈب میں سے۔

”تم... تم پولیس کے بندے نہیں ہو۔“ اس نے جاری آپس کی گفتگو سن کے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”حق ہے میاں!“ میں نے کہا۔ ”مگر تم پہ سچائی کا انکشاف بڑی مشکل سے ہوا۔ کافی محنت کرنا پڑی ہمیں۔“

”اور کافی مار کھانا پڑی تمہیں۔“ محسن بولا۔

”اسے ڈالو اپنی گاڑی میں۔“ اکرام شیخ نے کہا۔ ”اچھی طرح پیک کر کے۔“

”تم سمجھ گئے نہیں، وہ معمولی لوگ نہیں ہیں جن کے ساتھ تم نے پنگا لیا ہے۔“ وہ چلانے لگا۔

”اوئے... اوئے... افسروں سے بدتمیزی!“ محسن نے اب بے خوف ہو کے اسے لات ماری۔

”پیکنگ کا سامان لاؤ یار!“ میں نے محسن سے کہا۔ ”اس الو کے ثبوت کے لیے۔“

محسن نے جیپ... اور ٹرک میں سے تلاش کر کے ایک رسی نکال لی۔ ڈرائیور نے مدد کے لیے چلانے کی خاطر منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس میں ریوالور ڈال دیا۔

”آہستہ... منہ کیا زبان بھی مت ہلانا!“ میں نے کہا۔ ”ورنہ گولی چل جائے گی۔ حلق میں سوراخ ہو جائے گا۔“

”پھر آواز دونوں طرف سے نکلے گی۔“ محسن نے کہا۔ ”آگے سے بھی، پیچھے سے بھی۔“

ڈرائیور ساکت ہو گیا۔ محسن نے اس کو اکرام شیخ کے ساتھ مل کر یوں باندھا کہ وہ گٹھڑی بن گیا۔ پھر اس کا منہ کپڑا ٹھونس کے سیل کیا گیا۔ ہم نے اسے جیپ میں ڈالا اور ایک کانفرنس کی۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ محسن بولا۔

”تم جاؤ۔ پیچھے کہیں نانو اور غالب کار روکے کھڑے ہوں گے۔ انہیں لے آؤ۔“ میں نے کہا۔

”اس کے بعد؟“

www.paksociety.com

"اس کے بعد تم جاؤ اپنے راستے۔ ہم جائیں گے اپنے راستے۔ تم لے جاؤ ڈرائیور۔ ہم لے جاتے ہیں ٹرک۔" میں نے کہا۔

"اگر میں کہوں کہ تم لے جاؤ ڈرائیور اور ٹرک مجھے دے دو؟" محسن نے احتجاج کیا۔

"تو تم کمینے نکلے۔ شٹ اپ... تم ماتحت ہو۔" اکرام شیخ بولا۔

"ایسی کی تیسی تمہاری اور افسری کی۔"

"ابے... ابے... افسر کو گالی دیتا ہے؟" میں نے محسن کے لہجے کی نقل اتاری۔ مگر لات کھانے سے پہلے وہ بھاگ گیا۔

میں نے اور اکرام شیخ نے ٹرک پر چڑھ کے کریٹ دیکھے۔ مجھے ہر کریٹ کو کھولنا ناممکن تھا۔ وہ عقیل اپچز اور ٹول بکس میں ملنے والے چند جیک کی مدد سے میں نے چند کریٹ کے ڈھکنے ہٹائے۔ جیسے توقع تھی ان میں ہر قسم کا اسلحہ تھا۔ وہ راکٹ لانچر اور بموں سے بھرے ہوئے تھے۔ دو میں غیر ملکی ساخت کے دستی بم تھے اور ایک میں بارودی سرنگیں۔

کار آئی تو ہم نیچے اتر آئے۔ محسن اور اکرام شیخ نے ڈرائیور کو ڈگی میں ڈال دیا۔ غالب اور نازو نے مجھے مبارک باد دی۔

"تمہیں بھی مبارک ہو۔" میں نے مختلف لہجے میں کہا۔ "تمہارا لیڈر مان گیا ہے۔"

"کیا مان گیا ہے؟" غالب نے غور سے نازو کو دیکھ کر کہا۔

"وہی بات، جو نازو نے مجھ سے کہی تھی کہ... بھیا سے کہہ دینا۔"

"سکندر بھائی!" نازو نے گھبرا کے پیچھے دیکھا۔ "ایسا جھوٹ۔"

"قسم خدا کی تمہارے بچے نے بتایا تھا اسے... اور تمہیں بھی یہ بتا رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اب تم لوگ جاؤ۔" میں نے محسن اور اکرام شیخ کو آتے دیکھ کر کہا۔

خوشی کے مارے غالب کی ہنسی نکل رہی تھی۔ دوسری طرف نازو کی حالت بھی غیر تھی۔

"یہ... اسے کیا ہو گیا؟" محسن نے تشویش سے کہا۔

"یہ بیک وقت ہنسنے کی اور رونے کی اور کوئی موزوں شعر پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"اور اسے؟" اکرام شیخ نے نازو کو دیکھا۔

"میں... میں پریشان ہوں آپ لوگوں سے۔" میرے کچھ کہنے سے قبل ہی نازو بول پڑی۔ "اب کہاں جا رہے ہو؟"

"بی بی! اکرام شیخ کو کراچی کے راستے معلوم ہیں۔ یہ میرے ساتھ رہے گا۔" میں نے کہا۔ "ہم صبح ہونے تک ٹرک کو سمندر میں ٹھکانے لگا کے لوٹ آئیں گے۔ تم اس قیدی سے جو معلومات حاصل کرنا چاہو کر لینا۔ یا کچھ نہ کرنا۔ نہا دھو کر اور موبائل بند کر کے سب خیر ہے۔ اور خود بھی چین سے سو جانا۔"

"خاک سوؤں گا۔ اب ان آنکھوں میں نیند کہاں؟" غالب نے خوش لہجے میں کہا۔

"مطلب یہ کہ صبح تو ہونے ہی والی ہے۔" نازو گھبرائی۔ "ہم چلتے ہیں۔ تم دیر مت کرنا... اور ذرا احتیاط سے کام لینا۔"

"چل چل... بڑی آئی ہمیں نصیحت کرنے والی... تو اپنی بھاری..." اکرام شیخ نے اسے ڈانٹا۔

"بھیا! میں نے آپ کو شیطان تو نہیں کہا؟" وہ معصومیت سے بولی اور پھر ہنس پڑی۔ ایک کی خوشی اور غالب کی خوشی کا رنگ ایک لگا۔ جیسے ایک ہی شاخ کے دو گلابوں کی خوشبو۔

جب کار واپس ہوئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ جگہ لی اور اکرام شیخ میرے پاس بیٹھ گیا۔ ہم نے اپنے ہتھیار واپس دے دیے تھے اور اب ہمارے پاس وہی ریوالور اور پستول تھے جو ڈرائیور کے قبضے سے برآمد ہوئے تھے۔ میں نے ٹرک کو اسٹارٹ کیا اور اکرام شیخ نے اس کے ڈرائیونگ کیبن کی تلاشی لی۔

گلو کمپارٹمنٹ میں کاغذات کے نیچے سے ایک ریوالور برآمد ہوا۔ اکرام شیخ نے صرف کاغذات جیب میں ڈال لیے اور وہیں چھوڑ دیا۔

"اب کدھر سے چلنا ہے؟" میں نے کہا۔

"سیدھا جانا تو مناسب نہیں ہوگا۔" وہ سوچ کے بولا۔ "واپس چلو۔ کارساز کی طرف سے چلتے ہیں۔"

"تم نے سمندر دیکھا ہے؟" میں نے کہا۔

"کراچی میں سمندر کسے نہیں دیکھا۔ اگر کسی نے نہیں دیکھا تو گویا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔" اکرام شیخ بولا۔ "جیسے لاہور والے کہتے ہیں جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جمیا ہی نہیں۔"

میں نے ٹرک کو شہر میں لے کر سوچا... ایک سنسان علاقہ ہے جہاں سے ہم ٹرک کو براہ راست پانی میں...

"کیا ٹرک کو بھی سپرد آب کرنا ضروری ہے؟"

"ٹرک کا ہم کیا کریں گے؟" میں نے کہا۔

"ٹرک بہت کام آ سکتا ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ "ہم اسے ٹریپ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ معلوم نہیں اسے کہاں جانا تھا مگر صبح تک اس کی گمشدگی کا راز فاش ہو جائے گا اور تب تک... ابھی کتنی دیر ہے؟"

"صبح ہو جائے گی ایک گھنٹے میں۔"

"ایک گھنٹے میں ہم یہ کارروائی مکمل نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنا پلان بدل دینا چاہیے۔"

"کیا تبدیلی ہو سکتی ہے اب...؟"

"ہم واپس چلتے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"واپس کہاں...؟ سیٹھ اکبر کے پاس... کہ بھائی معاف کرنا ہم غلطی سے آپ کا یہ مال سے بھرا ہوا ٹرک ہائی جیک کر کے لے گئے تھے۔ اب امانت واپس لے آئے ہیں؟"

"یار! میں جو خطرہ محسوس کر رہا ہوں... وہ تیری نظر میں کیوں نہیں؟" اکرام شیخ بولا۔ "پہلے تو یہ دیکھو کہ ہم نے پہن کیا رکھا ہے۔ یہ پولیس کی وردی ہے۔ کیا پولیس والے اس قسم کے مال بردار ٹرک چلاتے ہیں؟"

"او... ہاں! گاڈ...!" میں نے کہا۔ "یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

"اس وقت ہم کپڑے بدل بھی نہیں سکتے۔" وہ بولا۔ "اگر کوئی پولیس پٹرول کار مل گئی تو معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ ہم کیا جواب دیں گے؟ انہیں یہ شبہ ہوگا کہ چھاپا مارا تھا اور یہ مال پکڑا ہے تو وہ پوچھیں گے کہ وہ بندے کہاں ہیں جو مال لا رہے تھے یا لے جا رہے تھے اور ہم کسی سوال کا صحیح جواب نہیں دے سکتے۔ پھر یہ کہ ہاں کیا ہے؟ ہم وہاں والوں کی شناخت... پولیس والے کو پولیس والا ضرور پہچان لیتا ہے۔ تمام پولیس افسر ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میری تھانیداری کا بھید تو فوراً کھل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے... یہ ٹرک واپس کہاں لے جائیں؟" میں نے ... سے ٹرک کو روک لیا۔

"اپنے گھر۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"وہاں... اتنا بڑا ہاتھی چھپا سکتے ہیں ہم؟"

"بیرک بہت بڑی ہے اور خالی پڑی ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "وہ تو جانوروں کا گودام ہے۔ ٹرک اس میں اندر جا سکتا ہے۔"

"مگر تھانیدار صاحب! اس کا دروازہ انسانوں کے گزرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"پروا نہیں... ہم ٹرک گزار دیں گے۔" وہ بولا۔ "دروازہ کیا چیز ہے۔"

"مگر دیوار بھی گر جائے گی۔" میں نے کہا۔

"گرنے دو۔" اکرام شیخ بولا۔

"دھماکا بھی ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ہونے دو۔" اکرام شیخ اڑ گیا۔

"یار! کچھ عقل سے کام لو۔ وہ پوری بیرک گر سکتی ہے۔"

"نہیں یار! بیرک نہیں گر سکتی۔ اس کی بناوٹ ہی ایسی ہے۔ صرف سامنے والی دیوار میں شگاف ہوگا۔ دروازہ اور چوکھٹ نکل جائیں گے اور دو بڑے شہتیر تک جہاں ابھی نکل جائیں گی۔ مگر وہ شہتیر اوپر... چھت اسی جیسی کئی متوازی شہتیروں پر قائم ہے۔"

بحث کرنے میں وقت ضائع ہوتا۔ میں نے اکرام شیخ کی تجویز قبول کر لی اور ٹرک کو اس راستے پر ڈال دیا جس پر کچھ دیر پہلے ہماری کار آئی تھی۔

"آج سارا دن ہم ٹرک کو وہاں چھپائے رکھیں گے۔"

"وہ کیسے؟ لوگ تو اسی جانب آتے جاتے ہیں..." میں نے کہا۔

"ابھی لوگ سو رہے ہیں اور وہ شہری آبادی کا علاقہ نہیں ہے۔ بازار بھی نہیں ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ "بعد میں ہم وضاحت کر سکتے ہیں کہ دیوار بوسیدہ تھی گر گئی۔"

"باقی دیواریں کیوں کھڑی ہیں... وہ بھی تو بوسیدہ ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ نہایت فضول وجہ ہے۔ مگر ایک صورت ایسی ہو سکتی ہے کہ کسی کو بھی شک نہ ہو۔ ہم کار کو اندر لے کر بیرک کے قریب ٹکرا سکتے ہیں اور یہ وضاحت کر سکتے ہیں کہ ہمارا بھی ایک نامعقول اور عاقبت نااندیش ساتھی جسے ڈرائیونگ نہیں آتی گاڑی کو واپس لا رہا تھا۔ بوکھلاہٹ میں بریک دبانے کے بجائے اس نے ایکسیلیٹر دبا دیا۔ گاڑی دیوار سے ٹکرا گئی۔ اور انجام آپ کے سامنے ہے۔"

"ویری گڈ... اس طرح وہ صرف کار کو دیکھیں گے۔ ان کا دھیان ٹرک کی طرف جائے گا ہی نہیں۔"

"کیا وہاں رہنے والوں کی نظر اتنی کمزور ہے؟"

"یہ تو پتا نہیں۔ مگر ہم پردہ ڈال دیں گے نا۔" اکرام شیخ بولا۔

"اتنا بڑا پردہ کہاں سے آئے گا... اس وقت؟"

اکرام شیخ نے ہنس کے چٹکی بجائی۔ "یہی تو حاضر دماغی کہلاتی ہے۔ میاں یہ جو ترپال پڑی ہوئی ہے ٹرک کے اوپر۔ یہ کس کام آئے گی۔ اس سے بہتر پردہ کیا ہوگا؟"

"ہم قائل ہو گئے۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔ "میں اس تجویز کے حصہ اول سے کلی طور پر اتفاق کرتا ہوں۔ ہم ٹرک کو چھپا کے رکھیں گے آج... اس کے بعد...؟"

"رات کو میں دوسرا ٹرک لاؤں گا۔ کوئی بھی ٹرک جو شہر میں سامان لانے لے جانے کے لیے کرائے پر ملتے ہیں۔ یہ سب سامان ہم آج دن میں اتار کے باہر ڈھیر کر دیں گے اور اس کے اوپر بھی کچھ ڈال دیں گے۔ کوئی دوسری ترپال لے آئیں گے۔ رات کو ہم یہ مال دوسرے ٹرک میں لوڈ کر کے یہاں سے نکال لے جائیں گے اور سمندر میں غرق کر دیں گے۔"

"تب وہ دوسرا ٹرک والا گواہ ہے۔"

"یار! کچھ خود بھی سوچا کرو۔ وہاں سے مال اٹھا کے ہم کسی دوسری جگہ اتار سکتے ہیں۔ شہر میں بہت گودام ہیں جو کرائے پر ملتے ہیں اور ذرا ... کوئی ایسا بندوبست کریں گے کہ وہ مال تھوڑا تھوڑا کر کے کشتیوں کے ذریعے سمندر میں ڈبو دیا جائے۔ یا پھر ہم کوئی ٹرک حاصل کریں۔ فلاں ٹرک۔ اس کے ڈرائیور کو دن بھر قید میں رکھیں اور یہ مال اس کے ٹرک میں ڈال کے ایسی جگہ پہنچا دیں جہاں اسے سپرد آب کیا جا سکے۔ اس کے لیے ایک

www.paksociety.com

لانچ بہرحال بیکار ہو گی۔ ہم اپنی لانچ کے واپس ملنے تک اس کا خرچہ کو التوا میں رکھ سکتے ہیں۔ فرض کرو ہم سینڈز پٹ یا ہاکس بے کے ساحل پر کسی جگہ ٹرک لے جائیں اور وہاں سے وہ چار پھیروں میں لانچ بھر بھر کے لے جائیں۔ سمندر میں ایک میل آگے تک اور مال کو سمندر میں غرق کر کے لوٹ آئیں۔ ٹرک اس کے ڈرائیور کے حوالے کریں اور معذرت کے ساتھ اسے دو چار ہزار اس کی تکلیف کے لیے پیش کر دیں اور رخصت کرتے ہوئے تاکید کر دیں کہ وہ اس واقعے کو بھول جائے اور خوش رہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن محض اگر سیدھی انگلیوں سے نکلتا ہو تو ٹیڑھی انگلیاں کرنے سے فائدہ؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ ایک پرانا ٹرک خرید لیں۔ کتنے میں ملے گا؟ تیس چالیس میں..."

"اس ٹرک کو اونے پونے خرید لیں۔ یعنی اس پر جھگڑا ہو نہ بس بڑا شعر لکھا ہو۔" میں نے کہا۔ "اسے حسب ضرورت ایک دو دن یا ہفتہ بھر استعمال میں رکھیں اور پھر پڑا تو اسی پارٹی کو واپس بیچ دیں، دو چار ہزار کم پہ یا کسی اور سے سودا کر لیں۔ ممکن ہے دو چار ہزار کا منافع ہو جائے۔ نہ کوئی خطرہ نہ کوئی پریشانی۔"

"جیسے کہ تو... تمہاری کھوپڑی کام نے والی ہے۔" اکرام شیخ بولا۔

اب ہم کنسٹرز روڈ پہ پہنچ گئے تھے۔ افق پہ صبح کی سفیدی نمودار ہو رہی تھی۔ ہیرک سے کچھ فاصلے پہ میں نے ٹرک روک دیا اور اکرام شیخ باقی لوگوں کو خبردار کرنے گیا کہ ہٹ جاؤ سامنے سے ہاتھی اندر آ رہا ہے۔

وہ دس منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ غالب محسن اور راجا بھی تھے۔ وہ سب پریشان اور بدحواس ہو گئے تھے۔

"یہ تم لوگوں کو کیا سوجھی؟" غالب نے کہا۔

"ہٹ جاؤ سامنے سے۔" میں نے کہا۔ "باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ تم لوگ دھماکے کے اثرات سے نمٹنے کے لیے تیار رہو۔"

میں نے ٹرک آگے بڑھاتے ہوئے ہیرک کا جائزہ لیا۔ بلاشبہ یہ وسعت اور بلندی کے اعتبار سے کسی چھوٹے جہاز کا ہینگر ہی لگتی تھی۔ میں ٹرک کو سیدھا وہاں دروازے تک لے گیا اور اس کی رفتار انتہائی کم رکھتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔

دروازہ معمولی سے دھکے سے ٹوٹ کر اندر گرا۔ ایک دیو ہیکل ٹرک کے طاقتور انجن کے سامنے اس کی حیثیت ہی کیا تھی۔ میں نے ٹرک کو اور آگے بڑھایا۔ کھڑکی پہلے ہی نکل چکی تھی۔ اب اس کے آس پاس کی دیواریں بھی ملبا منہدم ہو گئے۔ یہ سارا ملبہ ٹرک کے اگلے حصے پر گرا۔ اگر یہ پیچھے گرتا تو سامان کے اس ڈھیر میں ایک

چنگاری بھی پیدا کر سکتا تھا۔ پھر ٹرک رکا تو ہیرک اور دیواروں کے گرنے سے دھماکا ضرور ہوا تھا۔ آس پاس کے دوسرے گھروں کی دیواریں بلند ہے۔ میں انجن کے غرانے کا شور بھی شامل ہو گیا تھا۔

"اب کیا دیر کر رہا ہے۔ جلدی سے آگے بڑھنا۔" نے چلا کے کہا۔

"اس کے پیچھے... پیٹیوں کے نیچے سے ملبہ ہٹا" نکال کے کہا۔

غالب اور محسن ایک طرف جھک گئے۔ راجا اور اکرام شیخ پیچھے والے دونوں پیٹیوں کے لیے راستہ بنایا۔ میں نے ریورس دی اور ایکسیلیٹر دبا کے ایک دم بریک چھوڑا۔ ٹرک نے جھٹکے سے آگے جمپ لگائی اور ہیرک میں داخل ہو گیا۔

ایک تربیت یافتہ ٹیم کی طرح جو اس ڈرامے کی کئی بار ریہرسل کر چکی ہو، وہ سب ایک ساتھ مصروف عمل ہو گئے۔ نے ٹرک کو چاروں طرف سے کور کرنے والے کینوس کو پانچ منٹ میں اتار لیا۔ ترپال کے کناروں پر بکل کے لگے ہوئے تھے۔ ترپال کو تنا ہوا رکھنے والی ڈوری تھی اور اب بھی تھی اور ترپال ایک پردہ قائم کرنے میں کام سب نے مل کے اگلے پانچ منٹ میں ترپال کو چھت کے پر باندھ دیا اور اس کے پچھلے حصے کو بلا کول سے دبا دیا۔ پھر طرف مشکل سے دو فٹ چوڑا حصہ کھلا رہنے دیا گیا جو جگہ اندر آنے جانے کے لیے تھا۔ ہم سب اب تھے۔ راز ونے باہر یہ کام کیا تھا کہ اور اسے الٹا چلاتی ہوئی ٹھیک اس جگہ تک لے آئی تھی کا ڈھیر تھا۔ گرد و غبار اب بیٹھ رہا تھا۔ شکست و ریخت کسی زلزلے کی تباہ کاری کے آثار سے کم نہ تھے۔

آس پاس رہنے والوں نے بھی دھماکا سنا تھا۔ لیکن اٹھ کر کپڑے پہننے اور باہر آنے میں دس منٹ سے زیادہ پھر کر سب نکلے بھی نہیں۔ طبعاً بے نیاز سے پھر سو گئے کہ چلو سب خیریت ہے۔ یہ زلزلہ نہیں تھا دھماکا نہیں تھا۔ ہم محفوظ ہیں تو پھر فکر کیسی۔ بعد میں کچھ لوگ تھوڑے سب ہی کچھ کے سونے والے گئے جن کے کان پر جوں تک نہ رینگی ہو گی۔

نتیجہ یہ کہ چار افراد جن میں دو ملازم اور دو غیر ملازم تھے جائے واردات پر پہنچے۔ وہاں نازو بیگم اسے ڈانٹ رہا تھا۔ "دیکھا اپنے شوق کا انجام۔ اب تنخواہ میں سے سارا نقصان پورا کرے گی۔ خدا کا شکر ادا کرو

پہنچے وہ ورنہ ہیرک گر جاتی ہے اور یہ سارا کام گزر جاتی سب کے اوپر سے۔"

"چلو پھر چھوڑو، یہ توقع تو ٹھیک ہے۔" غالب نے کہا۔

"یہ بے وقوفی ہے یا پاگل پن ہے۔" محسن چلانے لگا۔

حاضرین میں سے ایک عظیم تنومند والا تھا جس کی بنیان اوپر کے حصے کی کچھ معلوم ہوتی تھی۔ پیچھے اس نے ایک دھاری دار پاجاما پہن رکھا تھا۔ اس نے مجھ سے رجوع کیا۔ اس کا ازار بند گھٹنوں تک لٹک رہا تھا۔

"یہ کیا ہو گیا جی؟"

"یہ بہن ہے ہماری پگلی۔" میں نے افسر بالا کی طرح پروپرائٹر رعب سے کہا۔ "بہت شوق ہے کار چلانے کا، مگر کار بڑی ہے اور نہ اس کو دیکھو، جہاز اڑانے کا شوق ہے۔"

"مگر اس وقت؟"

"ہاں، اور اتنا میں تو سب روکتے تھے نا، یہ اس وقت چابیاں لے کر شوقیہ پار کر ہی تھی۔ نئی کار ہے۔"

"ہاں، کار تو نئی ہے۔ بہت قیمتی بھی ہے۔" دوسرے صاحب نے حسد سے کہا۔ وہ غالباً انہی سوکھی سی شکل کا تھا اور ہاتھ گرنے سے مار کے ہی ریلے رنگ و حسد میں اپنا خون جلانے کا شوقین تھا۔

"پھر خیریت گزری۔" ایک ملازم نما شخص بولا۔ "ورنہ یہ ہیرک..."

"لیکن، یہ ہیرک ابھی بچی ہے۔" دھاری دار پاجامے والا بولا۔

"آپ نئے آئے ہیں؟" حسد سے سوکھ جانے والے نے کہا۔

"ہاں، ابھی چند دن ہوئے ہیں۔"

"مگر نقصان تو نہیں ہوا؟" دوسرے ملازم نما شخص نے کہا۔

"نہیں، بہت فائدہ ہوا ہے۔" غالب نے غرا کے کہا۔

دوسری طرف اکرام شیخ بھی محسن کو غضب آگیں گھور رہا تھا۔ "بھائی جان، کیا ضرورت ہے رپورٹ کرنے کی۔ ہم اپنے خرچ سے دیوار بنوا دیں گے۔ کھڑکی دروازے بھی لگ جائیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے بھائی صاحب۔" دھاری دار پاجامے والا بولا۔ "خواہ مخواہ سرکار کو بھی تکلیف دو گے۔ اسٹیٹ آفس والے دو کے چار لگائیں گے اور پھر ٹھیکا دیں گے کسی کو پوری ہیرک گرانے کا۔ انھیں تو وہ کہنے لگے کہ ہیرک ہی قابل استعمال نہیں رہی ہے۔"

"مالک مکان استعمال تو یہ کبھی نہیں تھیں۔" ملازم نما شخص بولا۔

"میاں کے انکوائری آفس والے تو بھی آجائیں گے۔" محسن نے تشویش سے کہا۔

"انکوائری والے سے ایک اور خبر آئے گی۔ سو روپے لے کر وہ اس کے بہت ہی بے کار۔" دھاری دار پاجامے والے نے اچھا تو کیہ

بنیان کو کھینچتے ہوئے کہا۔ وہ آدمی دل کا اچھا تھا۔

دس پندرہ منٹ میں ہم سب کو مطمئن کر کے رخصت کرنے میں کامیاب رہے۔

"کیسے احمق لوگ تھے۔" غالب نے ان کے جانے کے بعد کہا۔ "کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ کار سے دیوار گری ہے تو کار پر خراش تک نہیں آئی۔ اس کی تو وہ کی تباہ ہو جانا چاہیے تھی۔"

"خواتین کی موجودگی کے باعث وہ آگے نہیں آئے ورنہ دیکھ لیتے۔" میں نے کہا۔

"اور احمق نہ آتے تو یہ جھوٹ کیسے چلتا۔ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ چالاک لوگ نہیں آئے۔" محسن بولا۔

اللہ کا شکر کر کے ہم نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور اس ٹرک کو دیکھا جو واقعی ہیرک کے اندر پہنچ چکا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی چڑیا گھر سے ہاتھی چرا لے اور پھر اپنے ڈرائنگ روم میں باندھ دے۔ مگر کسی کو معلوم نہ ہو کہ اس ٹرک میں انتہائی تباہ کن اسلحہ تھا جس کی مالیت لاکھوں تک پہنچتی ہو گی — یہ ان لوگوں کا مال تھا جو خود بھی بہت تباہ کن تھے اور ہم نے انھیں عالیس ڈنڈی کی گھٹی کر اور یہ لیسی میں وہ سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے بولیں گے اور زخم خوردہ شیر کی طرح دہاڑتے ہوئے بولیں گے اور یہ سوچ سوچ کے پاگل ہونے لگیں گے کہ ٹرک پہ سے اتنا بڑا ٹرک کیا جن اٹھا کے لے گئے۔ ٹرک سپر ہائی وے سے روانہ ہوا اور غائب ہو گیا۔ ان کو شک ڈرائیور پہ بھی ہو گا کہ وہ ٹرک لے کر غائب ہو گیا۔ مگر بہت کم۔ ڈرائیور بیٹا نمک خوار تھا اور وہ ٹرک لے کے جائے گا بھی کہاں۔ اسلحے سے بھرا ہوا ٹرک آخر کس کام کا۔ اس کا تو خریدار بھی کوئی نہیں ہو گا۔ سب جانتے ہیں کہ حاجی عبداللہ اور بچہ بہادر ولد رحیم کینا سیٹھ یا جاند بھائی کا مال ہضم نہیں کیا جا سکتا۔

ظاہر ہے ان کو صرف ہم پہ شک ہو گا۔ وہ ہماری اور ٹرک کی تلاش میں سارے کراچی کو چھان ماریں گے۔ مگر کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ ان کے ساتھ پولیس بھی ہو گی اور ممکن ہے وہ اسی حد تک سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں کہ ٹرک کے غائب ہونے سے پہلے سینڈز پٹ پر پکنک منانے والے غائب ہوئے تھے۔ جب وہ ملیں گے تو بہت سی کڑیاں مل جائیں گی۔ وہ بتا دیں گے کہ انھیں باندھ کر ڈالنے والے اور ان کی جیپ لے جانے والے کس قسم کے لوگ تھے۔ شاید وہ یہ بھی بتا دیں کہ رات کو یہاں دو فرنچ بولنے والے آئے تھے جو خود کو فرانس کا آرٹسٹ کہتے تھے۔ سامنے سے تصدیق ہو جائے گی کہ وہ میں اور محسن تھے۔ پھر ان کو پولیس کی جیپ اسٹیڈیم کے پاس کھڑی ہوئی ملے گی تو وہ سمجھ جائیں گے کہ اس جیپ میں پولیس کی وردی پہن کر آنے والے محسن اور سکندر ساں ان کا ٹرک لے گئے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا

www.paksociety.com

کر محسن اور سکندر سیٹشڈ بیٹ کی ایک بیٹ میں قید تھے، جہاں وہ حاجی عبداللہ کو چکمہ دے کر چھوڑ گئے تھے اور تیوری کے ایک ٹرک میں چھپ کر فرار ہو گئے تھے اور پولیس کی گشتی پارٹی بھی وہیں غائب ہو گئی تھی۔ تاہم جو سوال ان کی عقل کو مسلط رکھے گا، یہ ہو گا کہ ٹرک اب کہاں ہے کہ اس کا کوئی سراغ تک باقی نہیں۔

ہم سب فرش پر بیٹھے ٹرک کو دیکھ رہے تھے اور خوشی کے ساتھ حیرانی اور پریشانی کے ملے جلے جذبات کا شکار تھے۔ میں نے مونچھی سے کہا کہ وہ چائے بنا کر لائے۔ بہت عرصے بعد میں نے اس سے براہ راست بات کی تھی اور ایک فرمائش کی تھی۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک دم کھل اٹھا۔

"یہ اکرام شیخ کی فرمائش ہے۔" محسن نے کہا۔

مونچھی جاتے جاتے ذرا سی دیر کے لیے پلٹی اور اس نے اکرام شیخ کو غور سے دیکھا۔ "تم تو پھر جانے نہیں ہو گئے۔"

"میں... میں نے... میں نے کچھ نہیں کہا۔" اکرام شیخ نے بوکھلا کے کہا۔ "سب پینے لگے چائے تو..." مونچھی ہنسی اور چلی گئی۔

"مگر تمھارے طفیل۔" راجا نے بھی اصرار کیا۔ "ہمارا کون ہے یہاں بابا جو فقیر ہو..."

"سالے، فقیر کی اولاد..." میں نے کہا۔ "ہم سب سے زیادہ دولت مند ہے تو... تیرا تو سسر بھی سیٹھ ہے، ہم سب کے سسر ہیں۔"

"اس کا سسر بھی پیسے والا ہے۔" محسن نے کہا۔ "یہودی۔"

"یار وہ میری بیوی کا باپ ہے۔ اسے کچھ مت کہو۔" راجا نے آہ بھر کے کہا۔ "مجھے پیسے کا کتا بھی پیارا ہے۔"

"راجا، ہوش میں آجا۔" محسن بولا۔ "ایسا عشق تیرا بھی کہا مرے گا بابا، تو اپنے سسر کو کھا جا۔"

غالب بے اختیار ہنسا۔ "کیا خوب فرمایا۔ آزاد شاعری میں تو نے بالکل صحیح جذبات کی عکاسی کی ہے۔"

"کس کے صحیح جذبات؟" راجا نے کہا۔

"ہم سب کے۔" میں نے کہا۔ "ہم ایسے نامعقول عشق کے سخت خلاف ہیں۔ یہ تو بالکل جن اور پری کا عشق ہے جس کا انسانوں کی دنیا سے تعلق ہی معلوم نہیں ہوتا۔"

"میری مانو تو ہم سے سبق لو، اپنے سسر کا دماغ درست کر دو۔"

"دیکھے... میرا مطلب ہے دماغ تو میرا خراب ہے۔"

"وہ ہم ٹھیک کر لیں گے۔" غالب نے کہا۔ "تم ایسا کرو کہ اپنے چاروں مدفون گھڑے نکلوا لو۔ جن میں تمھاری کمائی..."

"خون پسینے کی کمائی۔" راجا نے تصحیح کی۔

"خون پسینے کی کمائی بھری ہوئی ہے۔ یہ گھڑے اپنے سسر کے سر پر پھوڑ دو۔ اس کا سارا خون پسینہ بہہ جائے۔" غالب نے اپنی بات جاری رکھی۔ "پری کے مارے ایک اچھا تجربہ کرا لو کہ پھر ساتھ، ورنہ میں کہتا ہوں نیلو سے شادی۔"

سب بہت عرصے بعد بہت ہنسے۔ رات پھر کی اعصابی کشیدگی ذرا سی گپ شپ میں دور ہو گئی۔

پھر میں نے کہا۔ "میاں اکرام شیخ! اللہ تمھاری عمر دراز کرے، ذرا بتاؤ تو سہی کہ کیا سوچ کے تم یہ چیز یہاں لائے ہو؟"

"ہاں، یہ عشق سے زیادہ تباہ کن چیز ہے۔" غالب نے کہا۔

اکرام شیخ نے انھیں اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ اتنی دیر میں مونچھی چائے بنا لائی تھی۔ اس نے ناشتے کے ساتھ کچھ بسکٹ بھی رکھے جو ہم سب چٹ کر گئے۔ اس دوران شیخ نے اپنا منصوبہ بالکل واضح کر دیا۔

"فرض کرو، ہم نے یہ سب کر لیا۔ اسلحہ غرق کر دیا اور پھر بیچ دیا۔" غالب نے سب سن کے کہا۔ "اس کے بعد یہ کس کام آئے گا۔ اسے ٹریپ کے طور پر کیسے استعمال کیا جائے؟"

"ہم اسے کسی بھی جگہ چھوڑ دیں گے اور پھر نگرانی کریں گے۔ دیکھتے رہیں گے کہ اسے کون لینے آتا ہے اور کہاں لے کر جاتا ہے۔ اس عرصے میں ٹرک ڈرائیور سے بھی تو کچھ معلوم ہو گا۔"

"ہاں۔" میں نے چونک کر کہا۔ "وہ ہے کہاں؟"

"حوالات میں۔" محسن نے گیراج کی طرف اشارہ کیا۔ "دن میں کسی وقت تفتیش کریں گے۔"

"وہ آدمی خطرناک لگتا ہے۔"

"ہاں، مجھ جیسے والا... ہے۔ کالا تھا..." شیخ بولا۔ "دیکھا نہیں تھا کتنی جلدی اس کا لہجہ بدل گیا۔ مجھے جانتا تھا اور مجھ سے ناراض ہو گیا تھا۔"

"وہ دیکھنے ہی میں ایسا لگتا ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے انسپکٹر کو دیکھا تھا جس کے زخموں پر نمک چھڑک کے تم نے کوشش کی تھی کہ بچ جائے۔ وہ مر گیا مگر اس نے کچھ بتایا نہیں۔ حالانکہ وہ بھی زخمی تھا۔ اسی طرح عبداللہ خاموش رہا۔"

"خاموش رہا؟ اس نے تو سب سے زیادہ بکواس کی تھی اور بعد میں برا بھلا اور چلایا تھا۔ بہت گالیاں دی تھیں..."

"پھر بھی کچھ قبول نہیں کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "... قلعہ ہے۔ اس کا کوئی حصار کمزور نہیں ہوتا۔"

"چلو دیکھ لیں گے۔" غالب نے کہا۔ "ابھی تو بتاؤ کہ..."

"مجھے تو کم سے کم ایک خواب دیکھنے دو، بہت..."

محسن نے تلملا کے کہا۔ "تم سب تو پہلے جاؤ، اللہ میاں سے ناتا۔"

"منی اس کی بات۔ ... شادی شدہ ہو کے ہم سب غیر شادی شدہ خواتین و حضرات کے ساتھ کیسا سلوک کر رہا ہے۔" غالب نے کہا۔ "جیسے ہم خانہ بدوش بلکہ خانہ خراب ہیں۔"

"حالانکہ ہم نے کبھی نہیں کہا کہ تو شوہر ہے۔ اور خانہ داری کیوں نہیں سنبھالتا؟" میں نے کہا۔ "جا کے جوتیاں سیدھی کر بیوی کی، بچوں کے پوتڑے دھو، برتن مانجھ اور پھر کہہ بیوی میں تیرا غلام۔ ... کھو ہو۔"

"دیکھا، یہ بالکل نہیں کہا تھا نکاح کے وقت۔" محسن نے ... "تم لوگ ... ہو گئے۔"

"مجھے ضرورت ہی نہیں ... تو پہلے ہی خود کو زن مرید، غلام اور نفس پرست ثابت کر چکا تھا۔ اور تیری صورت بھی ..." میں نے کہا۔

"تم سب جلتے ہو۔" محسن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور پھر سو گیا۔

"ایسے نہیں بچے گا شوہر غالب۔" شیخ بولا۔ اس نے غالب کو آنکھ سے اشارہ کیا اور وہ دونوں پھرتی سے اٹھے۔ محسن کو اس وقت خبر ہوئی جب انھوں نے اسے اٹھا لیا۔ ایک نے ٹانگوں سے پکڑا اور دوسرے نے بازوؤں سے۔ وہ شور مچاتا رہا۔ لیکن میں نے اور راجا نے بھی غالب اور شیخ کی مدد کی ورنہ وہ خود کو چھڑا لیتا۔ ہم اسے باہر لے گئے اور نل کے نیچے رکھ کے ٹونٹی کھول دی۔

"ابے یار... لوگ دیکھ رہے ہیں۔" اس نے شور مچایا۔ "سامنے کھڑے ہو گئے۔"

"اب سوئے گا؟"

"نہیں، میرے باپ کی توبہ... جو کبھی سونے کا نام لوں۔"

جب ہم اندر آئے تو ناز دروازے کے پاس زور زور سے ہنس رہی تھی۔ اس نے بھی یہ تماشا دیکھا تھا مگر محسن اندر آتے ہی پھر لیٹ گیا۔

"پھر وہی... ابھی کیا کہا تھا؟"

"... سونے کا نام نہیں لوں گا۔ سونا تو مجھے خریدنا بھی نہیں ہے۔ مگر سونے کا نام لیے بغیر گزارا کیسے ہو گا۔ غالباً مجھے ..."

"... تو یہ ... کی نشانی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں ... فوراً ... کر دینا چاہیے۔" شیخ بولا۔ "تیرے پاس دنیا میں ... ہے؟"

"ایک بیوی، بچے کے سوا۔" غالب نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "... ہم سب ..."

"چلو چھوڑو بس کرو۔" ناز نے دخل دیا۔ "اب ضروری کچھ بہت دیر سے سب ایک ہی کے پیچھے پڑے ہوئے ہو..."

غالب فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ "تو میں تو ہار گیا، بلکہ میں خود بھی سو جاتا ہوں۔"

"سالے... ! مجھے کہتا تھا زن مرید۔" محسن نے قہقہہ مارا۔

"زن مرید تو ہم بھی ہیں میاں، ماشاء اللہ۔" میں نے جمائی کے بیچ میں کہا۔ "ہم بھی خواب خر کے مزے لیتے ہیں..."

"خواب خر...؟"

"معاف کرنا، خرگوش پرنٹ ہونے سے رہ گیا۔"

"اچھا تو میں جاتا ہوں۔" راجا نے کہا۔ "میں تو رات بھر سو کے اٹھا ہوں۔ دیکھتا ہوں کسی ٹرک کی بات بن جائے۔"

"اللہ تیرا بھلا کرے بابا۔" میں نے کہا۔ "مگر دیکھ ٹرک کے لیے بھیک مانگنے مت بیٹھ جانا۔ عادت پرانی ہے تیری۔"

"خیرات میں ٹرک مت مانگنا۔" محسن نے کہا۔ "ویسے خیرات میں کوئی ٹرک نہیں دیتا یہاں۔"

"اچھا تو کالا کچھا پانچ ہزار روپے۔"

"پہلے اس یہودی سسر سے لوٹا یار۔" محسن نے کہا۔

"ہاں، قرض لے لو بچارے سے۔" غالب نے تائید کی۔ "اور بھاگ جانا۔ وہ صدمے سے مر جائے گا۔ تمھارا راستہ صاف ہو جائے گا۔"

"تم اسے یوں بھی تو قتل کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"مشورہ تو اچھا ہے۔" راجا سوچ کے بولا۔ "شادی کے بعد ہی کروں گا، ابھی تو میں نے وصیت مانگی تو وہ چیزیں آ جائیں گی میری۔"

"اچھا تو پھر یہ تو کہیں سے بھی۔" میں نے کہا۔ "تمھارے مدفون گھڑے پڑے ہیں، ایک گھڑا نکال لو۔"

مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب اس نے کہا۔ "اچھا، اگر تم کہتے ہو تو، مگر بار بعد میں مجھے پورے کر دینا۔ میں وعدہ کر چکا ہوں۔ تم نے اس گھڑے میں سے صرف بریانی ہی کھائی تھی نا؟"

"ابے یار... تم تو سیریس ہو گئے۔"

"نہیں... اگر تمھارے پاس پیسے نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں۔" راجا بولا۔ "کل ضرورت بھی تو تمھاری ہے... اور اب تک یہ پیسا کس لیے محفوظ رہا کہ تم نے اسے مال غنیمت نہیں سمجھا تھا۔"

"ناز دیکھا!" میں نے کہا۔ "اس فقیر کو پچاس ہزار روپے خیرات میں دے دو۔ ہم ابھی ایسے کنگال بھی نہیں ہوئے کہ خیرات لیتے پھریں۔"

"ذہن سب پھیلاتے آیا۔ خدا کے علاوہ دنیا میں بھی سب کو کسی نہ کسی سے کچھ مانگنا پڑتا ہے۔" وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ "ہم سب بھکاری ہیں۔ ... ہم جلیس نے جو کتاب لکھی تھی نا، چالیس کروڑ بھکاری ... کی آبادی اس وقت چالیس کروڑ ہی تھی۔ اس کو پوچھو گے تو تم بھی مانو گے

کہ تم بھی شکار میں جنگل میں جا رہی ہو۔"

میں حیران رہ گیا۔ "تم نے... وہ کتاب بھی پڑھ رکھی ہے؟"

"ہاں پڑھ لکھ کے ہی تو وہ کو اٹھائے تمہارے سامنے۔ اَن پڑھ کو صرف اپنی ذات کا غم ہوتا ہے۔ پڑھا لکھا سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں لیے پھرتا ہے۔ فلاں ملک میں یہ ہو گیا، فلاں کا قانون ہے۔ نسل پرستی باعثِ شرم ہے، اقوامِ متحدہ ڈرامہ ہے، یہ سب وہی سوچتا ہے اور ایسی ہزاروں باتیں۔" راجا نے کہا۔

"اچھا اب سنو میرے فلسفی دانشور فقیر عاشق دوست۔ تم کو ایک تو ٹرک کا سودا کرنا ہے، ہو سکے تو آج ہی فائنل کر لینا پھر تم کو ایک جگہ ادھر کا بھی لگانا ہو گا۔ بندرگاہ کا۔ یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ بحری جہاز 'امیرہ الیس' کا کتنی تھرڈ کلاس ہے یا نہیں۔"

"وہ تو تھرڈ ہی رہے گا، اس کا مال جو یہاں پڑا ہے۔" راجا نے کہا۔

"ذرا معلوم تو کرنا کہ وہاں کیا چل رہا ہے؟"

"گویا میں اپنی پونجی نام میں جاؤں۔" وہ بولا۔ "فقیر بن کے۔"

"یہ کام کرنے کے لیے تم کچھ بھی بن جاؤ...."

"یا کچھ بھی نہ بنو۔" محسن نے ایک آنکھ کھول کے کہا۔

"تم جاگ گئے سو کے؟ خواب دیکھ لیا؟"

"ابھی تو خواب کا ٹریلر دیکھا ہے۔" وہ بولا۔ "اصل خواب اب شروع ہو گا۔ ذرا آہستہ بات کرو۔ مجھے نو ڈسٹربنس۔"

نازو نے ایک پیکٹ سا لا کے راجا کو تھما دیا۔ "یہ سب کچھ دس ہزار ہے۔"

"اگر کسی لانچ یا کشتی والے سے بات ہو جائے جو رات کو ایک خفیہ کام میں ہماری مدد کر سکے۔" میں نے کہا۔ "تو اس سے جگہ اور وقت طے کر لینا۔ یہ لوگ سب کچھ کر کے بھول جاتے ہیں۔"

"ہاں، سب ہی لوگ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اگر پیسے ہوں۔" راجا نے کہا۔ "میرا مطلب ہے وہ سب بیٹھے ہیں ابھی یہاں بھی میں جانتا ہوں کہ کون کون غلط کام کر سکتا ہے، بگاڑ سکتا ہے یہ کراچی کے ساحل پر رات کو کہاں کہاں جاتے ہیں، کیا کیا مال لاتے ہیں اور ساحل تک پہنچاتے ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے جیسے ٹرک والے نوّے فیصد جائز کام کرتے ہیں تو دس فیصد ہیرا پھیری والے کام بھی کرتے ہیں۔"

"تم اتنا اندر کے بھید جانتے ہو، یہ معاملہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ کیونکہ تم بندرگاہ کے حالات اور معاملات سے واقف ہو اور کراچی میں رہتے ہو اس لیے کراچی کے لوگوں کو جانتے ہو۔ اپنے مطلب کے آدمی سے پکا سودا کر لو آج ہی رات کے لیے۔"

"معاوضہ زیادہ لیتے ہیں۔"

"دے دینا یار۔ تم خود جانتے ہو کہ جان کا کیا ہے اور اس کے مطابق بات کرنا۔" میں نے کہا۔ "اصل ذمہ داری کا ہے یہ صحت

بتا کر کام کیا ہے۔"

"میں مال آمانت کی بات کروں گا۔" راجا بولا۔

"کہ کہاں سے اٹھانا ہے اور کہاں لے جانا ہے، یہ تو اسے پتا چلے گا کہ الٹا کام ہے یعنی مال ساحل سے سمندر کی طرف جا رہا ہے۔ کل یا پرسوں کسی کو بتا دیا تو؟"

"بتانے دو۔" میں نے کہا۔ "اس سے بھی کیا، یہ سب ایک بار غرق ہو گیا تو سمجھو کام ہو گیا۔"

"اور... اگر وہ پھر نکال لے جائیں گے؟"

"مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہاری احتیاط اپنی جگہ نیاں۔ ہم ایسا کریں گے کہ کسی ذریعے دار آدمی کو فون کر کے کسی اخبار والے کو وہ خبر دیں گے کہ اسمگلروں نے زہریلا مواد ذخیرہ پانی میں ڈبو دیا ہے۔ وہ جا کے تو خبر لگانے سے پہلے تصدیق کرے گا، نیوی والے باقی معاملات کو سنبھال لیں گے۔ واپسی میں کیچڑ سے آنا، ایسے ہی کچھ مختلف ہو گا۔"

راجا نے سر ہلایا اور اپنا فقیر والا لباس تبدیل کرنے میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد وہ باہر نکلا تو میں حیران رہ گیا۔ صورت بگاڑ لی اور حالت کو قابلِ رحم بنانے کے کام میں مہارت کا مظاہرہ کیا تھا۔

"کمال ہے یار، اتنی جلدی تم نے یہ سب کر لیا۔"

"سب پریکٹس کی بات ہے۔" وہ مسکرایا۔ "ابھی تو دیکھنا

میں ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

"اس میں کیا ہے؟"

"ہلدی، مسالہ، لال کتھا، مہندی اور ایسی ہی چیزیں،"

وہ بولا۔ "میک اپ ہے۔ تم پانی سے دھو لو گے کام آتا ہے۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ "کمال کا آدمی ہے، کیسا بہروپ بدلتا ہے۔"

"ہاں، کچھ لوگ بہروپ بدل سکتے ہیں اور کچھ بھی بن سکتے ہیں۔" مونی نے میرے قریب سے کہا۔ "کچھ اپنی اصلیت میں ہوں تب بھی کوئی انہیں نہیں پہچانتا۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مگر جواب میں کچھ کہنے سے پہلے کوئی باہر شور کرنے لگا۔ محسن غائب اور واقعی سو چکے تھے۔ مجبوراً میں باہر نکلا۔

میں نے ایک مشتی سے داڑھی والے کو دیکھا جو ہوا تھا جیسے اسے کمرے تک کے دھوپ میں اٹھانے کے لیے

"یہ ہنگامہ آپ ہی پر کر رہے تھے؟" میں نے کہا۔

"جی! مدد چاہیے یعنی آپ کے گورنمنٹ

یہ سرکاری کارروائی ہے۔ افسر رہتے ہیں یہاں۔" وہ

"اپنے ایجنٹ کا والیوم کم کرو۔" میں نے اسے انگریزی میں ڈانٹا۔ "مجھے یہ سب کیا بتا رہے ہو؟ کیا میں افسر نہیں لگ رہا؟ صورت سے خانہ باپ لگتا ہوں؟"

اس کا لفظ اتر گیا۔ "وہ... دراصل یہ بتانا تھا کہ آپ سے گزارش ہے بیچارہ...؟"

"بچوں والا ہے۔ اس شہر میں جو نازل ہونے کا دعوے دار ہو۔" میں نے کہا۔ "تو اسے لے آؤ۔ وہ ایسی ہی دوسری دیوار گرا کے رکھ دے مجھے تو تمہیں ایک لاکھ انعام۔"

وہ ہکلا گیا۔ "جی... میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا... میں تو بس تا... یہاں انکوائری آفس میں ہوتا ہوں... فقط ایک کلرک..."

"ڈانٹ تو تم مجھے گورنر کی طرح رہے تھے۔ یہ دیکھے بغیر کہ جو تمہارے سامنے کھڑا ہے وہ گورنر تو نہیں مگر گورنر سیکرٹریٹ کا سیکشن افسر ہے۔" میں نے کہا۔

اس کی حالت غیر ہو گئی۔ "جی... معافی چاہتا ہوں... دراصل یہ کام ہے بیچارہ... غلطی ہو گئی آپ کی۔"

"یہ تم پہلے دیکھ رہے تھے یا اب نظر آئی ہے کہ جب انہیں ہی نظر آنے لگتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جاؤ اور اپنے افسر کو بھیج دو۔ ہم ان سے کریں گے بات۔"

"حضور، ہم تو خادم ہیں آپ کے۔ ہم سے کیجیے بات۔ کیونکہ اوور سیئر صاحب بھی تو ہم سے ہی کہیں گے کہ رپورٹ لاؤ... مل جا ہو جائے گا حلوہ آپ کے لیے بھی اور چائے بھی۔ میں آج کل یہ سب ٹھیک کر دوں گا۔ انکوائری آفس میں سب ہے اور کیٹ مرمت اور کھڑکی دروازے، آپ فکر ہی نہ کریں۔"

"اور مرمت کرنے کے لیے کتنے دن؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"وہ... وہ فرق دیکھ لیں آپ۔" اس نے سر کھجایا۔ "آپ کراچی سے تو ہزار لگ جائیں گے، ہم آدھے میں کرا دیں گے۔"

"ٹھیک ہے، تم جاؤ اور جلدی جلدی کر کے بتاؤ۔" میں نے کہا۔

وہ دانت نکال کے چلا گیا۔ یہ بے خبری اور بے غیرتی کی انتہا تھی۔ جو اداکاری وقت بچانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ہمارے پاس تو سب ہے ناکی... دیکھ بھال کے لیے گورنمنٹ نے دے رکھا ہے۔

پہلے میں نے حکومت کے مال کو لوٹ کا مال غنیمت سمجھ کے استعمال کرنے پر شرمندگی محسوس کرنے کا سوچا۔ پھر سوچا کہ اسے لوٹنے ایک ہزار ... اور کتنے ... سرکاری مال نکلوایا بازار سے لاؤ ... ارادہ ترک کر دیا ... یہ کام سرکاری ... سو بخش دیے۔ یہ بخشش لینے ... نے مجھے سلام کیا اور کہا کہ میں گاڑی بھیجتا ہوں تاکہ کام آج ہو جائے۔ مگر ... نے کہا کہ وہ پریشان نہ ہو گاڑی تو آ

جائے گی لیکن کام کل دوپہر تک ہو جانا چاہیے۔ اس نے مجھے دوسرا سلام کیا۔

"حضور...! جو جا کے جلتے ہیں نا!" ایک عرض تھی۔"

"فیس اور سیکرٹری سے کچھ نہ کہوں۔" میں نے کہا۔

وہ خفت سے مسکرایا۔ "جی نہیں۔ اللہ کو تو بتانا ہی پڑے گا۔"

"اچھا میں کہہ دوں گا کہ چار سو دیے تھے۔" میں نے کہا۔

"آپ بڑے دانا آدمی ہیں۔ اللہ آپ کو...."

"اللہ کو بیچ میں مت لاؤ۔ ہم دونوں نے یہ کام اللہ کو خوش رکھنے کے لیے نہیں کیا ہے کہ وہ ہمیں خوش رکھے۔ اس میں خدا کی ناراضی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے جاؤ۔ سمجھو کہ ہم دونوں مجبور تھے اس لیے خدا جانے گناہ کو معاف کرے۔"

وہ بڑی عجلت میں مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ پلٹ کے پیچھے میں نے نازو کو دیکھا۔

"یہ کیا خرافت ہے؟ کیا یہ سب ضروری تھا؟" وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کے بولی۔ "وہ سمجھ جاتا تو؟"

"تم غلط آدمی کو ڈانٹ رہی ہو۔" میں نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔ "میں بہرا ہوں۔ تمہاری وحشت کا سبب کُھلے گا۔"

"اگر پتا چلا تو؟" غالب نے یوں کہا جیسے وہ نیند میں بڑبڑا رہا ہے۔

"سب ایک سے بڑھ کے مکار۔" میں نے کہا۔ "کچھ پتا نہیں چلتا کون سو رہا ہے، کون جاگ رہا ہے اور کون مر گیا ہے۔"

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی۔" مونی نے مجھے ہنستے دیکھ کر کہا۔

"مجھے معلوم ہے تم کیا سوچو گی۔" میں نے کہا۔ "میں سو کے اٹھوں گا تو جواب دوں گا یا سوتے میں دے دوں گا غالب کی طرح۔"

"اتنی نیند آ رہی ہے؟"

"تم تو سو لیں جو ساری رات کو۔" میں نے کہا۔ "ہم جاگ رہے لگے ہوئے تھے اور ہم تو نہیں ہیں۔"

"میں بھول آتو۔" نازو نے کہا۔ "مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی ہے۔ تم میرے ساتھ باتیں کرو۔"

"ذرا دور جا کے۔ جہاں صبح خراشی نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "مونی کو یہ بھی بتا دینا کہ تم رات کو تین چار گھنٹے کار میں سوئی تھیں۔"

"تم مجھے مونی کب تک کہتے رہو گے؟"

"گلاب کا نام بدلا نہیں جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "اور بقول عقلمندوں کے گلاب کو کسی نام سے بھی پکارو گلاب ہی رہے گا۔"

یہ فلسفی بات تھی۔ میں مونی سے یہ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا کہ میرا ذہن اسے رضیہ سلطانہ تسلیم نہیں کرتا اور یہ اقرار کر کے بھی مجرم بننا نہیں چاہتا کہ مونی کے نام سے میرے بچپن کی یادیں وابستہ ہیں۔ جیسا بچپن کا انتخاب میں نے مونی پر چھوڑ دیا کہ وہ جو چاہے سمجھے۔ جو مطلب چاہے نکالے۔ پھر میں سو گیا اور میری نیند اتنی گہری تھی

www.paksociety.com

کر میں نے خواب کوئی نہیں دیکھا۔

میں شاید شام تک سوتا رہتا، مگر تین بجے کے قریب مجھے نازنہ نے جگا دیا۔

"تمہاری زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔" اس نے مجھے اطلاع دی۔

"کیا ہو گیا ہے؟" میں نے اٹھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

"آپ آرڈر دیں، وہی چیز حاضر کر دی جائے گی۔" وہ بولی۔

"چکن کارن سوپ، فرائیڈ پراون، شامی کباب، فروٹ کسٹرڈ اور کافی۔" میں نے کہا۔

"بالکل نئے کھانے کا آرڈر نوٹ کر لیں۔ آج ہمارے دو سال بعد۔" نازنہ نے کہا۔ "فی الحال تو دال چاول حاضر ہیں۔"

"اور اسے تم کیا ناشتہ کہتی ہو؟" میں اسے دیکھتا رہا۔ "اس کے لیے جگانا ضروری تھا؟ ایسے خاطر لاتی ہو تو اس رزق سے موت اچھی۔"

"اچھا تو کھانا نہ ہوتی پھر سو جاؤ۔" نازنہ نے کہا۔ "جنت کی حوا کھا۔"

مگر اب دوبارہ سونے کا اس لیے بھی سوال نہ تھا کہ خود میرا پیٹ بھوک سے نڈھال ہونے لگا تھا اور دال چاول کی خوشبو مجھے تو سرے بریانی کی خوشبو سے زیادہ اشتہا انگیز محسوس ہو رہی تھی۔

غسل اور کھانے سے فراغت کے بعد میں نے گیراج کا رخ کیا، جہاں میرا ایک حوالاتی فرخ کسمپرسی کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا تو اسے تیز بخار تھا، مگر اس کے علاوہ تشویش کی بات کوئی نہ تھی۔ میں نے زبردستی اسے اسپرین دی اور اس کے لیے چائے منگوائی۔

"تم نے... مجھے کیوں بند کر رکھا ہے؟" وہ بولا۔ "میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتاؤں گا... مر جاؤں گا..."

میں نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ "تم بہادر آدمی ہو، کیا پہلے کبھی تمہیں مرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ مذاق نہیں ہے۔ دراصل تم نے آج تک لوگوں کو مرتے دیکھا ہے۔ طبعی موت اور حادثاتی موت کے علاوہ کسی گولی سے اور کسی خنجر سے۔ ممکن ہے خود بھی قتل کیے ہوں لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مرنا تو بڑی آسان ہے اور موت کو اس لیے نجات دہندہ کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جینا کبھی کبھی بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اتنا مشکل کہ آدمی موت کے لیے روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، ہاتھ جوڑ کے منت سماجت کرتا ہے اور روٹھ جاتا ہے، مگر موت تو اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے لیے وہ وقت ابھی دور ہے۔ اس سے بہت پہلے تمہارے خیالات بدل چکے ہوں گے۔"

اس کی صورت پر ذرا سی دیر کے لیے ایک تاریک سایہ سا آ کے گزر گیا۔ "میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"ڈاکو لوگ بڑی لوٹ مار کر کے آتے ہیں تو تمہیں آسانی سے مال نہیں دیتے۔ پہلے تو سب یہی کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے مگر تھوڑا وہ نکلوا لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم خود کو ڈاکو سمجھتے ہو...؟"

"اور تم اپنے کو بہت شریف آدمی سمجھتے ہو...؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "شیطانی کام کرتے تو جانا چاہیے۔ ذاتی چہرے جا... دشمنی رکھنے والے کو مروا دو، خدا ترس اور نیکوکار مان لیے جاؤ۔ ہم اور وہ ایک ہی میدان کے کھلاڑی ہیں، فرق صرف اپنی اپنی منزل کا اور مقصد کا ہے۔"

"مگر میں... میں تو تمہارے مقابلے پر نہیں ہوں، تم مجھے کیوں مروا رہے ہو...؟"

"کبھی شطرنج کا کھیل دیکھا ہے تم نے۔ اس میں پیادے سب سے زیادہ اور آگے ہوتے ہیں۔ پہلے وہی مرتے ہیں۔ بادشاہ تک پہنچنے سے پہلے فیل اور گھوڑے اور وزیر سب مارے جاتے ہیں۔ جب ہاتھی لڑتے ہیں تو حشرات الارض مرتے ہیں۔ پھر زور آور... تو وہ مخلوق جان گنواتی ہے جس کے پاس گنوانے کے لیے اپنی جان کے سوا نہ مال و متاع، نہ عزت و آبرو، نہ خوشیوں کے خزانے۔ کیا یہ بات تم نہیں جانتے تھے...؟ ہم اتنے نادان تو نہیں..."

"وہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

"ہاں۔ بصورت دیگر ہم تمہیں مار ڈالیں گے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "خود تم نے کیا تھا ورنہ تم کسی اور پیشے میں بھی جا سکتے تھے... رہے تھے مگر اب انتخاب تمہارے ہاتھ میں نہیں رہا ہے۔ یہ ہے کہ تم جن سے غداری کرو گے وہ بھی تمہیں معاف نہیں کریں گے، مجبوری کے حالات کا کوئی عذر نہیں سنیں گے۔ میرے ساتھ دنیا کا... ہاں دشمنوں سے تم رعایت حاصل کر سکتے ہو، خود کو اس کا مستحق ثابت کرو تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم تمہیں آزاد کر دیں۔ آگے تمہاری زندگی ہے، تم خود اسے بچانے کی کوشش کر سکتے ہو۔"

"تم غلط کہتے ہو... تم بھی آخر میں مار دو گے مجھے۔"

"تم ضمانت طلب کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو... ضمانت نامہ داخل کروا لوں گا۔" میں نے کہا۔ "انتخاب کر لو یا انکار کرو... تمہاری مرضی۔"

"میرے بیوی بچوں کا دنیا میں کوئی نہیں۔"

"دنیا میں تمہیں جنت کا کوئی ان کا خدا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور تمہارے اعمال کی سزا انھیں بھی کاٹنی ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ یہ کوئی انوکھا پہلا واقعہ تو نہیں ہو گا کہ تمہارے بچے یتیم نادار... بدکاروں اور زرداروں کے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں۔ تمہاری بیوی... ہو گی ابھی تو..."

وہ بے بسی کے عالم میں گالیاں دینے لگا۔ میری باتوں نے اسے وحشت میں مبتلا کر دیا تھا۔ "یہ سب تمہاری اولاد کے ساتھ ہو گا... ہر کسی کے ساتھ، مال، جنوں کے ساتھ ہو۔"

میں ہنس پڑا۔ "میرے بچے ... ہوں گے ... میں بھی نہیں تو بچے بھی نہیں تھا۔" بجھرات کرتے کرتے ہی اس نے اس کے منہ پر پڑا ہوا تو اسے ... یہاں تک کہ اس کی ناک سے اور اس کے منہ سے خون نکلنے لگا۔

"وہ ٹرک لے کر کہاں جا رہے تھے تم؟"

اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا اور زمین پر پڑا بلبلاتا رہا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا اور جب اس کی خاموشی ختم نہیں ہوئی تو میں نے اسے سیدھا کر دیا۔ اس مرتبہ میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا۔ پھر اس کے دونوں پاؤں ایک ساتھ باندھ کے رسی کو گیراج کی چھت کے ایک ہک سے گزار دیا۔ جب میں نے رسی کو کھینچا تو وہ زمین سے اٹھ گیا اور الٹا لٹک گیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو میں نے رسی سے کمر کے پیچھے کس دیا اور باقی رسی اس کی دونوں ٹانگوں پر گھٹنوں سے گھٹنوں تک لپیٹ دی۔ اب وہ ایک لاش کی طرح الٹا لٹکا جھول رہا تھا۔

میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکال کے کہا۔ "یہ آخری موقع ہے تمہارے لیے..."

"بچاؤ... بچاؤ... کوئی ہے؟" وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا تو میں نے کپڑا پھر اس کے منہ میں ٹھونس دیا اور باہر نکل گیا۔ کار کی آواز ابھی کہیں بجے کے قریب سنائی دی تھی۔ اسے میں نے نازنہ سے چابی لے کر آگے بڑھایا اور گیراج اور پورچ کے درمیان فٹ کر دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟" نازنہ نے باہر آ کے پوچھا۔

"بہت کچھ کر رہا ہوں بیک وقت۔ تمہیں دیکھ رہا ہوں اور..."

"وہ کیوں چلا رہا تھا...؟" نازنہ نے میری بات کاٹ دی۔

"کرنا چھوڑ رہا تھا... میں نے تو کچھ نہیں سنا۔ تم کیوں چلا رہی ہو؟"

"باہر سب نے سنا ہو گا۔"

"باہر کہاں؟ کوئی سڑک ہماری طرح ... ٹریفک کا شور... میرے سنائی نہیں دیتی۔" میں نے کار کو لاک کر کے ڈگی کھولی۔

"مجھے اطلاع ہو تو آپ سکتے رہو۔"

"خیر اب دیکھو، بیٹھ کر شعر وادب لکھا کرو۔ تمہارا مزاج شعر و ادب کا ہے۔" میں نے کار کی ڈگی کو اٹھانے والا جیک اور ہینڈل نکال لیا۔ "غالب سے رجوع کرو۔ اس کی شاعری حقیقی زندگی کے قریب ہے۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میرے لہجے کی سرد مہری سے اس نے کچھ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ جو میرے دل میں ہے اور اس کی اپنی ... غالب اور اقبال کی ... ضرور تھی مگر ... بات تھی۔ میں واپس گیراج میں پہنچا تو وہ جھٹکے لے رہا تھا اور خود کو اوپر اٹھانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔ ہاتھوں کی مدد کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کامل سکون اور اطمینان کے ساتھ میں نے جیک اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان فٹ کر دیا۔ گھٹنوں سے ذرا اوپر جہاں میں نے اضافی رسی لپیٹی تھی۔

جیک کی ہینڈل لگا کے میں نے اسے تھوڑا سا گھمایا تو جیک اپنی جگہ پھیلنے لگا۔ اس کی رانوں کے درمیان خاصا گوشت تھا، لیکن جیک دونوں طرف سختی سے پھنس چکا تھا۔ میں نے ہینڈل گھمایا اور وہ تڑپ کے انداز میں اچھلنے لگا۔ نیچے دونوں گھٹنے آپس میں مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے کہ وہ کھل نہیں سکتے تھے اور جیک اس کے گوشت میں گڑ گیا تھا۔ گھٹنے کے اوپر بندھی ہوئی رسیاں بھی اس کی ٹانگوں کو قینچی کی طرح گوشت کو کاٹ رہی ہوں گی لیکن جیک ابھی آدھا بھی نہیں کھلا تھا۔ وہ سخت اذیت میں تھا۔ گھٹنوں سے اوپر اس کی ٹانگیں چیر رہی تھیں اور اوپر نیچے کے جوڑ جام ہو چکے تھے۔ اس کی کمر اور ریڑھ کی ہڈی کے مہرے تک اس کھینچا تانی سے کھنچ رہے ہوں گے۔ اسے سب بل نکلے ہوئے بھی دس منٹ ہو گئے تھے۔ خون کی گردش نیچے کی طرف بڑھ جانے سے اس کا چہرہ لال پڑ گیا تھا اور آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ اس کی گردن اور چہرے پر پسینے والا پسینہ بھی آنکھوں میں جا رہا تھا اور درد کی شدت سے اس کے جو آنسو نکلے تھے وہ پیشانی پر کیچڑ بن جانے والے بالوں کو سیراب کر رہے تھے۔

"کیا خیال ہے اب؟" میں نے کہا۔ "کچھ یاد آیا کہ تم وہ ٹرک لے کے کہاں جا رہے تھے؟"

اسے جواب کا موقع دینے کے لیے میں نے پھر کپڑا منہ سے نکالا تو اس نے ایک دہشت ناک آواز نکالی۔ "ہائے... ارے میں مر گیا... اللہ مجھے معاف کر..."

میں نے اس کا منہ پھر بند کر دیا اور جیک کو مزید دو بار گھمایا۔ وہ ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے آہستہ آہستہ جیک کو گھمانا جاری رکھا۔ اب ایک ایک ملی میٹر کا فرق اس کے جسم کی قوت برداشت سے باہر ہونے لگا تھا۔ اگر وہ اپنی ضد جاری رکھتا اور میں جیک کو پورا کھول دیتا تو اس کی رانوں کی ہڈی درمیان سے ٹوٹ جاتی یا کمر کے نیچے سے اس کے جوڑ الگ ہو جاتے اور ٹانگیں گوشت چیر جانے سے الگ ہو جاتیں۔

اچانک وہ ساکت ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اپنی تمام قوت ارادی کو بروئے کار لانے کے باوجود اس کا جسم اذیت کی اس انتہا سے آگے اس کے احساس کا ساتھ نہ دے سکا تھا۔ بے ہوشی ایک ایسی پناہ گاہ ہے جہاں احساس اور اعصاب دونوں کو وقتی طور پر پناہ مل جاتی ہے تاکہ وہ توانائی کی کمک حاصل کر لیں اور دوبارہ اذیت کا مقابلہ جاری رکھیں، تا آنکہ موت ان کی شکست کا اعلان نہ کر دے۔

میں نے اسے نیچے اتارا اور فرش پر لٹا کے باہر چلا گیا۔ مزاحمت

www.paksociety.com

کی قوت کا سب سے مضبوط حصار ٹوٹ چکا تھا۔ آگے صرف یہ دیکھنا تھا کہ شخص کی طاقت سے اس کا جذبہ زیادہ قوی تو نہیں۔ جذبہ بعض اوقات ناقابل تسخیر ثابت ہوتا ہے۔ طاقت پر فتح کچھ نہیں دیتی۔ احساس پشیمانی اور جھنجلاہٹ کے سوا۔

میں دس منٹ تک باہر ٹہلتا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔ یہ ایسا وقت تھا کہ ملازمت پیشہ لوگ واپس نہیں لوٹے تھے اور ان کی بیوی بچوں کو فراغت حاصل تھی۔ نچلے درجے کے افسروں کی بیگمات ہو بھی تھیں یا فلم کے شو دیکھنے گئی ہوئی تھیں یا شاپنگ کے لیے۔ ان کی اولاد اگر ساتھ نہیں تھی تو ٹیوشن پر یا کھیل کے میدان میں تھی۔ تو لوگ بہت کم گھروں میں تھے اور ہر بیرک کا دوسری بیرک سے درمیانی فاصلہ بھی سو گز ضرور تھا۔

چنانچہ میں نے اندازہ لگایا کہ ڈرائیور کی چیخ و پکار کسی کو متوجہ نہیں کر سکتی۔ اگر ایسا ہوتا تو اب تک کوئی نہ کوئی آ کے پوچھتا۔ مگر یہاں لوگ ذات اپنے گھر اپنی مصروفیات اور اپنے مفادات کی محدود دنیا میں رہنے والے لوگ خود غرضی کی حد تک دوسروں کے وجود کو نظرانداز کرنا جانتے تھے۔

دس منٹ بعد میں پھر اندر گیا۔ میں نے جیک کو ڈھیلا کیا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو وہ ہوش میں آگیا۔

"تم تو بہت کم ہمت نکلے یار۔" میں نے کہا۔

"خدا کے لیے... مجھے... مار دو... میری جان لے لو۔"

میں نے قہقہہ مار کر دیکھا۔ "میں نے کہا تھا ناکہ بہت جلد تم موت مانگنے لگو گے۔ مرنا بہت مشکل ہو گا۔ اس کا تمہیں اندازہ نہیں تھا۔ حالانکہ تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ میں تمہارا دشمن ہوں۔ میں تمہیں کوئی آسانی فراہم نہیں کر سکتا۔ کیا تم میرے سوال کا جواب دو گے؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں... مر جاؤں گا... تو کمبخت میرے بیوی بچوں کے گزارے کا بندوبست کریں گے وہ۔"

میں طنز سے ہنسا۔ "افسوس، یہ حاجی ٹائپ لوگ کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اپنا کام نکالنے کے لیے اور کیسے احمق ہوتے ہیں جو ان کی فطرت کو سمجھتے ہیں اور پھر بھی ان پر اعتبار کرتے ہیں۔ اس نے یقیناً کہا ہو گا کہ کبھی ایسی ویسی بات ہوئی تو تمہارے خاندان کو مکمل تحفظ ملے گا۔ کبھی کوئی مالی پریشانی نہیں ہو گی۔ مگر جب تم قبر میں پہنچ جاؤ گے تو یہ کیسے جانو گے کہ وہ جھوٹ تھا۔ اگر حاجی تم سے زیادہ چالاک نہ ہوتا تو تم سے یہ کام کیوں لیتا۔ اب میں کیا بتاؤں تمہیں کہ خود حاجی کس حال میں ہے۔ میں تم کو پانچ منٹ دیتا ہوں۔"

میں پانچ منٹ تک اندر ہی کھڑا رہا۔

"میں تمہیں ایک رعایت دینے کی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ تھوڑا سا امید سے روشن ہوا۔

"میں تمہیں انتخاب کا حق دے رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "پہلی صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ میں تمہیں پھر اسی شکنجے میں کس دوں اور سر کے نیچے دو فٹ پر دہکتی ہوئی کوئلوں کی انگیٹھی رکھ دوں۔ یہ تمہارا مختصر سا ہیڈ فرائی ہو گا۔ باقی جسم بعد میں۔ یا میں تم کو پانی میں راڈ ہیٹر کے ساتھ ڈال دوں۔ آہستہ آہستہ پانی گرم ہو گا حتیٰ کہ ابلنے لگے گا۔ اس سے پہلے ہی تمہارا سوپ بن چکا ہو گا۔ تمہارا گوشت گل جائے گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ میں ان کے درمیان تمہارے ہاتھ پھنسا کے جیک کو بند کر دوں اور تمہارے ہاتھوں کی ساری ہڈیاں چور چور کر دوں۔ پھر پیروں کی۔ بعد میں زندہ تو رہو گے مگر ایسے کہ ٹخنوں سے نیچے پیر ہوں گے نہ کلائی کے بعد ہاتھ..."

"تم... ایسے مجھے ڈرا کے کچھ نہیں پوچھ سکتے۔"

"تیسرا مرحلہ سب سے سخت ہو گا۔" میں نے کہا۔ "جب تمہارے بیوی بچوں کو سامنے لے آئیں گے اور جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا ان کے ساتھ ہو گا تم صرف تماشا دیکھو گے۔"

"تم... ان تک نہیں پہنچ سکتے۔" وہ چیخ کر بولا اور مجھے ایک غلیظ گالی دینے لگا۔

"تم اگر تمہارے اس نام کے حاجی۔ تمہارے چوہدری اور چاند بھائی کی طرح کے شکاری نہ ہوتے تو کب کے باہر بیٹھے ہوتے مگر جو یہ لوگ کر سکتے ہیں ہم ان سے زیادہ کر سکتے ہیں۔"

سب سے آسان طریقہ دہکتے کوئلوں کی انگیٹھی والا تھا مگر اس کے لیے دونوں چیزیں خریدنے کا دفتر دور تھا جتنا تم کہہ سکتے کیا کر بازار جانا ہی پڑتا تو میں صرف راڈ ہیٹر خرید لاؤں گا اور آدھے گھنٹے بعد مجھے ایسا ہی کرنا پڑا۔

راڈ ہیٹر اور تار دونوں مجھے حاجی کیمپ کی ایک دکان سے مل گئے۔ میں آدھے گھنٹے میں واپس آگیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ طریقہ زیادہ موثر ثابت ہو گا۔ اس پر عمل کرنے کے لیے مجھے کچھ سوچنا پڑا۔ پھر میں ایسا انتظام کرنے میں کامیاب ہو گیا جس سے مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکیں۔

بیرک کے عقب میں تارکول کے ڈرم تھے۔ پہلے ہی خالی تھے۔ ایک ڈرم کو میں لڑھکا کے گیراج تک لے آیا۔ اس کا ڈھکن پہلے ہی کھلا تھا۔ میں نے اسے توڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہ کوئی منٹ کا کام تھا۔ اگر ذاتی ملکیت ہوتی تو مجھے کوئی اور طریقہ ڈھونڈنا پڑتا۔

میں نے ڈرم کو پانی سے بھر دیا اور پھر ڈرائیور کو اٹھا کے اس میں ڈال دیا۔ وہ میری نیت بھانپ گیا تھا اور بہت مزاحمت کر رہا تھا مگر جسمانی طور پر مزاحمت کی قوت بہت کم رہ گئی تھی۔ میں نے اسے گردن تک ڈرم میں غرق کر دیا لیکن اس کے بازو ڈرم سے باہر

رکھے۔ اس کے بازوؤں کو ڈرم کی بیرونی سطح کے ساتھ لگا کے میں نے رسی باندھ دی۔ بہت مضبوطی سے یوں پیوست کر دیا کہ وہ جا بجا تب بھی کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے بیٹھنا بھی مشکل تھا اور وقتی اذیت اس کی ٹانگوں نے محسوس کی۔ اس کے بعد یہ ہونا تھا کہ تکلیف دہ تھا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ وہ سر سے راڈ ہیٹر گرا دے گا چنانچہ میں نے اس کی گردن کے گرد بھی ایک حلقہ سا بنایا اور اسے پیچھے کی طرف کر کے اس طرح اس کی گردن ڈرم کے کنارے سے ٹک گئی۔

اس کے بعد میں نے راڈ ہیٹر لگا دیا۔ اس کا ایک حصہ ڈرم کے کنارے پر ٹھہر گیا مگر پانی میں ڈوبا رہا۔ تار کا دوسرا حصہ میں نے پلگ میں لگا دیا۔ سوئچ آن کرتے ہی راڈ ہیٹر کے اوپر پانی کی سطح پر بلبلے بننے لگے۔

"اب تمہارے پاس زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ ہے۔" میں نے اس کے سامنے ٹھہرے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے اتنا وقت بھی نہ لگے کیونکہ تمہارے جسم کے برابر پانی اس ڈرم میں سے خارج ہو گیا ہے۔ پچاس گیلن کا ڈرم پورا بھرا ہوا ہو تو ڈیڑھ گھنٹے میں پانی ابلتا ہے۔ تم چالیس منٹ میں محسوس کرو گے کہ پانی گرم ہونے لگا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی تپش تمہارے جسم محسوس کرے گا۔ ڈرم کی بیرونی سطح پر اور تمہاری بغلوں کے نیچے ڈرم کے کنارے تپش دینے لگیں گے۔ پھر پانچ منٹ کے بعد میں تم سے اپنے سوال کا جواب مانگنے کے لیے آؤں گا۔ یہ تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ تمہارا چیخنا چلانا بے کار ہے۔ یہاں دور دور تک سننے والا کوئی نہیں ہے سوائے میرے۔"

وہ دہشت سے لرز رہا تھا اور میں اس کی صورت پر چھائی موت کے تصور سے پھیلے جانے والے خوف کو بھی دیکھ سکتا تھا۔

میں نے پانی میں انگلی ڈال کے بتایا۔ "نہیں۔ ابھی کچھ نہیں ہوا۔ بعد میں درجہ حرارت تیزی سے بڑھے گا۔ افسوس کی بات ہے کہ حاجی نے تمہیں خودکشی کی سہولت بھی فراہم نہیں کی۔ حالانکہ وہ تو جانتا ہو گا کہ ایسا وقت کسی پر بھی آ سکتا ہے کسی بھی جگہ۔ پہلے وہ جاسوس کیسے لیے رہتے تھے جو بتانا نہیں چاہتے تھے وہ بیت گئے۔ انہوں نے کوئی کیپسول نگل لیا۔ یا دانت میں پوشیدہ چھوٹا سا ٹم سا کھا کے جان چھڑا لی۔ تمہارے پاس اس وقت کوئی چیز ہوتی تو اب تک تم سکون سے مر چکے ہوتے۔ دراصل موت کچھ نہیں۔ ایک لمحہ بھی ہو سکتا ہے جو آدمی کو دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ مگر جب یہ لمحہ پھیل کر ایک گھنٹہ یا ایک دن یا ایک ماہ و سال پر محیط ہو جائے تو موت کا خوف سب سے بڑا عذاب بن جاتا ہے۔ پانچ منٹ بعد میں آؤں گا۔ کیا اب تم بتاؤ گے کہ تم ٹرک کہاں لے جا رہے تھے؟"

اس نے سرگوشی میں مجھے جنبش نہیں دی۔

"دراصل سوال صرف ایک نہیں ہے۔ چار یا پانچ سوال ضیا کی ایجنسی نے تیار کر کے دیے ہیں۔ اب تم ان کے اور قتل کے مجرم بننے سے پہلے میں پہلے تین منٹ کے اندر جواب دے دو تو اچھا ہے۔ کبھی تم نے کسی کو زندہ ابلتے دیکھا ہے؟ زندہ جسم پر گرم پانی گرتا ہے تو وہ کتنا شور کرتے ہیں اور کتنا تڑپتے ہیں۔"

میں نے پھر پانی کو چیک کیا۔ "ہاں۔ اب کچھ گرم ہو رہا ہے۔ خود میں نے ایسا نظارہ کبھی نہیں دیکھا۔ عام آدمی دیکھ ہی نہیں سکتا۔ وہ تو بے ہوش ہو جائے گا مگر میرا دل بہت سخت ہے۔ پھر بھی زیادہ تھا تو نہیں مگر زمانے نے کر دیا۔ میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں۔ یہ بالکل نیا تجربہ ہو گا میرے لیے۔ سنسنی خیز اور دلچسپ۔ جب تم ابلنے لگو گے پھر تمہارا گوشت پھول جائے گا۔ پھٹ جائے گا۔ پانی میں خون شامل ہو جائے گا۔ تمہارا اپنا خون۔ پھر اسی میں تمہارا اسہال اور پیشاب بھی شامل ہو جائے گا۔ یہ سب تم سونگھو گے یا نہیں اس کا مجھے بھی پتا نہیں۔ بہرحال میں تم کو تمہاری موت کے بعد بھی ابالتا رہوں گا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ انسان کا جسم کیسے رنگ بدلتا ہے۔ تمہارا پیٹ پھٹا تو دل گردے اور پھیپھڑے سب باہر آ جائیں گے۔"

میں نے محسوس کیا کہ میرا لیکچر رحمان بھائی پھر اس کو نفسیاتی طور پر مارنے میں موثر کردار ادا کر رہا ہے۔ وہ پاگل ہو رہا تھا اور سر کو ادھر ادھر پٹخ رہا تھا۔ وہ چلا بھی نہیں سکتا تھا۔ پانی سے باہر بھی نہیں آ سکتا تھا اور پانی کو گرم ہونے سے بھی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ مرنا مشکل نہیں سمجھتا تھا اس لیے مرنا چاہتا تھا مگر اب وہ خود کو مرتے دیکھ رہا تھا تو اس کے حواس جواب دے گئے تھے۔

میں نے تیسری بار سوال پوچھا تو پانی کافی گرم ہو چکا تھا۔ میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا تو وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔

"میں بتاؤں گا۔ سب بتاؤں گا۔ خدا کے لیے مجھے اس طرح مت مارو۔ مجھے نکالو۔ اللہ! مجھے معاف کر دے۔ میری اماں... ادھر سے نکال..."

"ابھی نہیں۔ پہلے جواب دو میرے سوال کا۔" میں نے اس کی تمام گالیوں کو نظرانداز کر دیا۔ "ٹرک لے کر کہاں جا رہے تھے؟"

"بندرگاہ... وہ چلا دیا۔ ارے آگ... پانی... میں جل گیا... ہائے پانی ہلا دو۔"

"بندرگاہ میں کہاں۔ کس کے پاس؟" میں نے سکون سے کہا۔

"کسی... جہاز پر چڑھانے کے لیے۔" اس نے ایک بھیانک چیخ ماری۔

"اس جہاز کا نام کیا تم کو معلوم ہے؟"

"ہاں... اسے چا... پانی... آگ لگ گئی..."

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "بتاؤ ورنہ میں سوئچ آف کر دیتا ہوں۔ ٹرک کہاں لے جا رہے تھے؟"

"گودام... گودام... گودام...!" وہ چیخنے لگا۔ میں نے سوئچ آف

www.paksociety.com

کر دیا۔ اس سے فوری طور پر فرق تو نہیں پڑا مگر اسے کچھ نفسیاتی سکون ملا۔ "گرودام کہاں ہے؟"

"پہلے... نکالو مجھے... ٹھنڈا پانی..."

میں نے سوئچ پھر آن کر دیا۔ "گرودام کہاں ہے؟"

وہ بری طرح چیخ پڑا۔ "مار دیا... سنگھ بیر... ایسے میں مر جاؤں گا ظالم شیطان... میں بتا رہا ہوں... بتا رہا ہوں۔"

میں نے پھر سوئچ آف کر دیا۔ "گرودام کس کا بیٹا ہے؟"

"دلاور... اکبر... آہ... ہائے... سارے تیری..." اس نے پھر سے گالیاں دینی شروع کر دیں۔

"چاند بھائی کا کس سے تعلق ہے؟"

"ہاں... وہ بھی آ رہا ہے... ہائے... یا اللہ... اللہ... اللہ...؟"

"لانچ کہاں ہے؟" میں نے دل کڑا کر کے کہا۔

"نہیں... نہیں معلوم... مجھے..."

"رابعہ کہاں ہے؟" میں نے آخری سوال کیا۔

"نہیں... ما... لو... مر..." وہ بے ہوش ہو گیا۔

میں نے رسی کھول کے اسے باہر نکالا اور زمین پر ڈال دیا۔ پانی ڈرم میں بہت نیچے اتر گیا۔ ابھی پانی کے اُبلنے کا مرحلہ تو نہیں آیا تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ اتنے تیز گرم پانی سے نہانا کسی کا ممکن نہ تھا۔ اس میں غرق رہنے کے پانچ منٹ بھی بہت تھے۔ اس نے تو دس منٹ گزار دیے تھے جو اس کی جسمانی قوتِ برداشت کے غیر معمولی ہونے کا ثبوت تھے۔

میں نے اس کے اوپر ٹھنڈے پانی کی بالٹی الٹ دی۔ اس نے تڑپ کے ایک گہری سانس لی۔ اس کا جسم کرب میں اینٹھنے لگا اور مجھے خیال آیا کہ کہیں میں نے ایک دم اس پر ٹھنڈا پانی ڈال کے غلطی تو نہیں کی۔ مجھے چاہیے تھا کہ اسے آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونے دیتا۔ کہیں شدید ردِعمل سے وہ مر نہ جائے۔

مگر وہ زندہ رہا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ہوش میں بھی آ گیا اور ڈرم کو دیکھ کر چیخنے لگا۔ "مجھے مت ڈالو اس میں۔"

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "نہیں ڈالوں گا۔ تم میرے باقی سوالوں کا جواب دو گے تو بچ جاؤ گے۔"

مگر وہ مزید سوالات کے جواب دینے کی پوزیشن میں تھا ہی نہیں۔ وہ ذہنی توازن کھو چکا تھا اور ہذیان بک رہا تھا۔ مجبوراً میں نے اسے باندھا اور کمبل ڈال کے لٹا دیا۔ اس کا جسم کمبل کے نیچے بھی لرزتا رہا۔ بتا رہا اس سے مجھے خاصی تشویش ہو گئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ گرودام کا مکمل پتا بتائے بغیر مرے۔

میں بیرک میں واپس پہنچا تو نازو دونوں میں روئی ڈالے اور ... دو پٹہ پہنے دونوں کمینوں کے درمیان سر دبائے لیٹی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں اب وہ میرے طریقۂ تفتیش کا سامنا کرنے کی ہمت تھی یا وہ وحشت زدہ ہو گئی تھی۔

"مجھے... مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے سفاک اور سنگدل بھی ہو۔" وہ پھیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"آج معلوم ہو گیا نا۔" میں نے کہا۔ "نازو! پہلے تم تو بہت بہادر بنی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے چھرا اٹھا لیتی تھیں۔ حسنوں کے اپنے ہاتھوں نازک ہاتھوں کی طاقت سے مگر مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ تم اتنی کمزور ہو۔"

موتی نے مسکرا کے کہا۔ "میں تو بہت دیر سے سمجھا رہا تھا۔"

"مجھے نہیں، اس درندے کو سمجھاؤ۔" نازو نے میری طرف انگلی اٹھا کے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"ہر انسان کے اندر ایک درندہ ہے۔ سب درندے ایک سے طاقتور نہیں ہوتے مگر ... بہت فرق ہے۔ دیکھا جائے تو ہم سب گوشت خور حیوان ہیں۔ ایک دوسرے کو کھانے والے۔ چیتا اور بلی، کتا اور بھیڑیا۔ چیتا اور انسان۔ اور یہ طاقتور کا ہے وہ کمزور کو کھا جاتا ہے۔ تم نے جنگل کو کیا کھیل سمجھا تھا۔ جنگل کی طرح۔ اس میں تو یہ سب ہوتا ہے اور آئندہ بھی ہو گا۔ اس سے زیادہ ہو گا۔"

میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ غالب پردہ ہٹا کے اندر آ گیا اور اس وقت ایک عجیب بات ہوئی۔ نازو جو شدید نفرت سے ... میں کانپ رہی تھی اور رو رہی تھی، ایک دم دوڑ کے آئی اور غالب اسے نہ سنبھالتا تو وہ نیچے گر جاتی۔

"اسے... اسے کیا ہوا؟" غالب بھونچکا رہ گیا اور نازو کو حیرت سے دیکھنے لگا جو اس کے بازوؤں میں جھول رہی تھی۔ "نازو...!"

"اسے تمہارے مضبوط سہارے کی ضرورت تھی، کمزور عورت ہے نا۔" میں نے کہا۔

غالب اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کے لے آیا اور فرش پر بچھے ہوئے بستر پر لٹا دیا۔ "تم نے کچھ کہا تھا؟"

"اس سے تو نہیں کہا تھا۔" میں نے کہا۔ "کچھ معلومات حاصل کرنا تھا اپنے قیدی سے۔ اعصاب اس کے جواب دے گئے۔"

"میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔" غالب باہر جانے کے لیے لپکا۔ میں نے اسے اتنا بے بس اور اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"ایک نہیں، مریض دو ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک یہ نازو اور دوسرا حوالاتی۔ اسے بھی دیکھے۔ محسن اور اکرم کہاں ہیں؟"

"میں کیا کروں گا دیکھ کے۔"

"اس کی حالت دیکھ لے۔ اگر ضرورت ہو تو کہیں ... کر دے۔" پھر بھی ڈاکٹر کو لاؤ۔ اس سے سوچ سمجھ کے بات کرنا۔"

"وہ تم خود کر لینا۔" وہ باہر جاتے ہوئے بولا۔ "میں تو لینے کسی کو لاتا ہوں۔ محسن اور شیخ علاؤ الدین گئے ہیں۔"

وہ بہت غصے میں بھی تھا اور مجھے اس سے دوسروں کے بارے میں کچھ پوچھنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ میں لوٹ کر گیراج میں گیا تو کمبل کے نیچے اس نے کوئی حرکت دکھائی نہ دی۔ میں نے کمبل ہٹا کے دیکھا۔ وہ ہر ضرورت سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں احساسِ جرم و پشیمانی میں مبتلا ہوا مگر پھر میں نے خود کو قائل کیا کہ اس نے بھی شدید تکلیف پہنچا کے جان دی۔ میں تو نہیں چاہتا تھا کہ اس کی جان لوں۔ مجھے اس سے معلومات تو بہرحال حاصل کرنی تھیں۔

ڈاکٹر نے مریضہ کو کم اور گرد و پیش کو دیکھنے میں زیادہ دلچسپی لی۔ اسے کچھ حیرت بھی تھی کہ ہم وہاں کس قسم کے حالات میں رہتے ہیں۔

"یہ آپ کیا کرتے ہیں؟" اس نے غالب سے براہِ راست پوچھا۔

"سب کچھ اور کچھ نہیں۔" غالب نے کہا۔ "کیا آپ مریض کو نہیں دیکھنے آئے؟ ہمارا پیشہ بھی پوچھتے ہیں؟"

ڈاکٹر شرمندہ ہو گیا۔ "آئی ایم سوری۔ اگر آپ کو برا لگا۔"

"مجھے اچھا لگا۔" غالب نے کہا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔" وہ بولا۔ "اٹ از جسٹ اے میجر آف شاک۔ کوئی خاص بات ہو گئی تھی کیا؟"

"ہاں اور نہیں۔" غالب نے کہا۔ "سوال جواب آپ خود کر رہے ہیں۔ ایک خاص بات کیا ہوتی ہے باقی واقعے؟"

ڈاکٹر مسکرانے لگا۔ "یہ تو مختصر ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے بڑی سے بڑی ٹریجڈی بھی خاص بات نہیں اور کوئی چھوٹا تو رائی کا پہاڑ بنا لے۔"

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "خواتین اس دوسرے گروپ سے تعلق رکھتی ہیں۔"

ڈاکٹر نے نسخہ لکھتے ہوئے کہا۔ "آپ پڑھے لکھے لوگ نظر آتے ہیں۔" اس نے یہ بات انگریزی میں کہی۔

"آپ بھی نظر آتے ہیں۔" غالب نے خوش اخلاقی سے کہا۔

ڈاکٹر نے برا نہیں مانا۔ "پڑھے لکھے لوگ ایسے ماحول میں نہیں رہتے۔"

"آپ نسخے میں کوئی اچھا سا ماحول بھی لکھ دیں۔ ہم خرید لائیں گے۔" غالب نے انگریزی میں جواب دیا۔

میں نے غالب کو پھر دبایا۔ مقصد اسے غیر ضروری باتوں سے روکنا تھا۔ میری اس حرکت کو ڈاکٹر نے دلچسپی سے دیکھا۔

"شاید آپ لوگ ... کی مجبوری کو سمجھتا ہوں۔" وہ نسخہ دینے کے بعد بھی رکا رہا۔

"مجبوری؟ مجبوری کیسی؟" میں نے کہا۔

"میرا مطلب، آپ لوگ [illegible] رہنے پر مجبور ہیں۔ کسی فرسٹ کلاس ہوٹل میں قیام نہیں کر سکتے۔ کیا یہ مجبوری نہیں ہے؟"

"مجبوری کیسے؟ اس معیار پر ملک کے ننانوے فیصد لوگ پورے اترتے ہیں اور اس طرح تو شاید وہ بھی خود کو مجبور کہیں گے جو ملک چلا رہے ہیں، کوٹھی تیار کر رہے ہیں اور ملازموں کی فوج کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہوں گے جو کہتے ہوں گے کہ ہم مجبور نہ ہوتے تو سوئٹزرلینڈ میں رہتے۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر ہنس پڑا۔ "میرا حوالہ مالی مجبوری کی طرف نہیں تھا۔"

"پھر...؟"

"آپ لوگ کہیں بھی رہیں گے تو نمایاں ہوں گے۔" وہ بولا۔

میں نے اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"یہاں آپ کی موجودگی سے کوئی واقف نہیں ہے۔ یہ تو [illegible] کی سرکاری رہائش گاہ ہے جہاں کوئی کسی سے سروکار نہیں رکھتا۔ اور اس لیے رہتا ہے کہ رہنے کو دوسری جگہ نہیں۔ پھر بھی یہاں افسر ٹائپ لوگ رہتے ہیں اور اندر سے میں نے ان ... ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"لیٹ از ناٹ... ..." میں نے کہا۔ "یہ تمہیں الاٹ نہیں ہوا۔"

"ایک دوست نے رہنے کو دے دیا ہے۔" غالب بولا۔ "ہم نے یہاں ناجائز طور پر قبضہ نہیں کیا۔"

"میں آپ لوگوں کو اس سے بہتر جگہ پیش کر سکتا ہوں، اگر آپ مجھے اعتماد کے قابل جانیں۔" وہ بولا۔ "ایسے تو فقیر بھی نہیں رہتے۔ یہاں اندھیرا، گرد اور گندگی سب کچھ ہے۔ کوئی فرنیچر نہیں اور بجلی نہیں۔ میرا مقصد آپ لوگوں کی بدحالی کا مذاق اڑانا نہیں ہے۔ میں تو کچی بستیوں میں بھی جاتا ہوں۔ کیا آپ لوگ جانتے ہیں کچی بستی کیا ہوتی ہے؟"

"جی، کراچی میں کچی بستی تو ایک کیمپ ہے..."

"مگر کیا آپ کبھی جھگی کے اندر گئے ہیں؟" وہ بولا۔ "جہاں کوڑا اور بانس، ٹاٹ اور پرانے اخبار، ٹین اور ... کے ڈبوں، بوریوں اور ... کے ٹکڑوں سے ... یہ سب ... ہے اور اس سے جو گھر بنتا ہے اس میں آدمی سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ نیچے مٹی ہوتی ہے۔ بعض اوقات صرف دس بائی دس کے حجرے میں دس افراد رہتے تھے۔ ... حساب آپ لگائیے، جتنی جگہ ایک مردے کو قبر میں ... ایک آدمی کو جگہ کافی ہوتی ہے۔ وہاں وہ پیدا ہوتا ہے۔ موقع ملے تو پڑھتا ہے۔ سوتا ہے۔ شادی کرتا ہے۔ بچے پیدا کرتا ہے اور ان کی شادیاں کرتا ہے اور مرتا ہے۔"

"یہ سب آپ ہمیں کیوں بتا رہے ہیں؟"

www.paksociety.com

اس نے ایک گہری سانس لی۔ "آئی ڈونٹ نو۔ شاید اس لیے کہ میں بھی ایسی ہی ایک جھگی میں پیدا ہوا تھا۔ جب آٹھ دس کی عمر کا تھا، ماں باپ مر گئے اور جھگی پر میرے ظالم چچا نے قبضہ کر لیا۔ مجھے اس کے سلوک کی وجہ سے وہاں سے نکلنا پڑا۔ ورنہ ماحول کا تو میں عادی تھا۔ کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟"

"ضرور... اگر کوئی جگہ بیٹھنے کی ہے تو ضرور تشریف رکھیے۔" میں نے کہا۔

وہ اطمینان سے نیچے بیٹھ گیا۔ "خدا کی زمین سے بہتر انسان کے لیے کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔ میں اسی مٹی کے فرش پر پیدا ہوا تھا، اسی میں مر کے سو جاؤں گا۔ اس سے میرا رشتہ ماں کی گود سے زیادہ مضبوط اور دائمی ہے۔" وہ بولا۔

میں اور غالب اس فلسفی ڈاکٹر کی گفتگو پر حیران بھی تھے اور پریشان بھی۔

"میں آپ کے لیے چائے یا کافی بھی لا سکتا ہوں۔"

"ضرور... مگر فیس میں سے پیسے تو نہیں کاٹو گے۔" وہ بولا اور ہنس پڑا۔ "کیا میں سگریٹ پی سکتا ہوں؟"

"شیور۔" میں نے کہا اور اپنا پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ میرے اشارے پر موجی خود ہی کافی بنانے چلا گیا تھا۔

"کیا آپ بالکل فارغ ہیں ڈاکٹر صاحب؟" غالب نے کہا۔ "آپ کی پریکٹس بالکل نہیں چلتی؟"

"اتنی دیر میں کم سے کم دس مریض دیکھ لیتا ہوں۔ میں رات اور دن کے چوبیس گھنٹے کام کرتا ہوں۔"

"سوتے کس وقت ہیں پھر؟"

"جب بھی موقع ملے۔ سات آٹھ گھنٹے سونا تو شہر کی بیکاری ہے، تنخواہ قسطوں میں سونا پڑتا ہے۔" وہ بولا۔

"پھر بھی کام کم نہیں ہے آپ کے پاس۔ آپ نے کہا تھا کہ میں غریب آدمی ہوں۔" غالب نے خشک لہجے میں کہا۔

"اس میں طنز کی کوئی بات نہیں۔ فی الحقیقت ایسا ہی ہے۔"

"کراچی میں وہ ڈاکٹر جو دن رات کی پروا کیے بغیر کام کرتے ہیں لکھ پتی ہوا ہو۔"

"تھیسیں... یہ میں نے نہیں کہا۔ میں نے کہا ہے کہ میں دن رات کام کرتا ہوں۔" وہ بولا۔

"خدمت خلق؟"

"ہاں... مجھے تم جیسے مریض ہی ملتے ہیں۔" وہ بولا۔ "فیس نہ دینے والے۔"

"ہم تو فیس دیں گے۔"

"میں نہیں لوں گا۔" وہ بولا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم سے کتنے ہیں۔ باقی لوگوں کی بات اور ہے۔ وہ دے ہی نہیں سکتے۔ اگر ضرورت ہو تو دوا بھی دینی پڑ جاتی ہے۔ مگر میرے پاس کافی اسٹاک ہوتا ہے جو میڈیکل ریپ چھوڑ جاتے ہیں۔ ہزاروں ہزار فیس کی قیمت ملتی ہے پانچ پانچ دس دس روپے کی صورت میں۔ وہ بھی میں دوا پر خرچ کر دیتا ہوں۔ یہ تو اتفاق ہے کہ میں تم کو مل گیا۔ ورنہ میں تو لیاری میں رہتا ہوں۔ تم لیاری ضرور دیکھنا۔"

"یہ مجھے راہ چلتے مل گئے تھے۔" غالب نے میری طرف دیکھ کے کہا۔ "مجھے یہ ڈاکٹر نظر آتے تھے۔ میں ساتھ لے آیا۔"

"تمہیں معلوم ہے میں کس نام سے مشہور ہوں؟ اصل نام تو میں جانتا ہوں۔ یا میری بیوی کو اور چند دوست احباب کو معلوم ہے۔ لوگ مجھے ڈاکٹر جھلی والا کہتے ہیں۔ یعنی پاگل۔ جھلی والا جو ہے، وہاں بہت مقبول ہوں میں۔"

"کیا تم بھی جھگی میں رہتے ہو؟ ابھی تک؟"

"نہیں... میں ایک کوٹھی میں رہتا ہوں لیکن وہ میری بیوی کی ہے۔" وہ بولا۔ "میرا کلینک صبح کے وقت لیاری میں اور شام کو اور جگہ ہوتا ہے۔ شام کو بیوی کے ساتھ ہوتا ہوں۔"

"وہ بھی ڈاکٹر ہوں گی؟" میں نے کہا۔

"تم نے ٹھیک اندازہ کیا۔" وہ بولا۔ "وہ بھی ڈاکٹر ہے۔ صبح وہ ایک سرکاری اسپتال میں ملازمت کرتی ہے۔"

"پھر تو بہتر ہے۔"

"کتنی تنخواہ ملتی ہے اسے؟ یہ تو آپ کا سوال ہے۔"

"میں غلط لفظ استعمال کر گیا۔ وہ کام کرتی ہے وہاں۔ ملازمت نہیں۔ اور یہ بھی سوشل سروس ہے۔" وہ بولا۔

"خوب۔ میاں بیوی دونوں سوشل سروس کر رہے ہو۔ پھر بھی رہتے کوٹھی میں ہو؟"

"کوٹھی کیا کاٹ کھاتی ہے میرے پاس۔ ہمارے پاس بنگلہ ہے۔ وہ ملکیت ہے نا، ہم کہیں نہیں جا سکتے۔ ہمارے دو بچے ہیں اور دو ملازم۔" وہ بولا۔

"اور تم غریب آدمی ہو؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ذاتی طور پر ڈاکٹر جھلی والا غریب آدمی ہے۔ کراچی کے معیار پر۔" وہ بولا۔ "بیوی جب جھگی سے نکلا تو ... تھی۔ اس کا مجھے علم نہیں تھا کہ میں خوش قسمت پیدا ہوا تھا۔ دوسروں کو ایک حادثہ بھی میری خوش قسمتی کے باعث پیش آیا۔ ماں باپ کی موت کی وجہ سے مجھے ایک شخص یتیم خانے سے لے گیا۔ خاصی اسٹوری ہے میری۔ وہ آدمی بہت دولت مند اور نیک تھا۔ اسے میں اچھا لگا۔ پھر جب میں نے پڑھنا شروع کیا اور اس کا نام روشن کیا تو وہ اپنے آپ کو بھی خوش قسمت کہنے لگا۔ میری بیوی اسی کی بیٹی ہے۔ ہم شروع سے آخر تک ساتھ رہے۔ میٹرک ایک ساتھ کیا۔ کالج تک ساتھ پڑھے۔ میڈیکل کالج میں بھی پہنچ گئے۔ ہم ایک ساتھ ڈاکٹر بنے اور فراغت کے بعد یہ ناممکن تھا کہ ہم جدا ہو سکتے۔ ہم ایک دوسرے کا عکس ہو گئے تھے۔ چنانچہ ہماری شادی ہو گئی اور جب میرا وہ باپ مر گیا جس نے پیدا کرنے کے سوا میرے لیے سب کچھ کیا تھا، تو وہ بہت سے پیسے چھوڑ گیا۔ وہ بہت بڑا بزنس مین تھا۔ ہم نے اس کے بزنس کو اداروں کے ساتھ بیچ دیا کیونکہ ہم تو اسے چلانے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ یہ سب رقم جو تھی اسے بینک اور پھر کئی انوسٹمنٹ پلان میں لگا دی گئی۔ اس کا منافع بھی بہت ہوتا ہے۔ ہم حسب ضرورت کے مطابق دن میں ہزار، پچاس ہزار یا ایک لاکھ تک نکلواتے رہتے ہیں۔ حج کے لیے جاتے ہیں تو سال میں ایک بار عمرے پر جاتے ہیں۔ دو بار یورپ بھی ہو آئے ہیں۔ وہ رقم اب ایک کروڑ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ مطلب یہ کہ جتنا ہم نے خرچ کیا زیادہ اس منافع کی آمدنی سے کم رہا جو ہمارے حساب میں جمع ہوتا تھا۔ تم اگر اسے سود سمجھتے ہو تو پھر ہم دونوں حرام کھاتے ہیں۔ ہمیں کمانے کی نہ ضرورت ہے نہ عادت۔ جو کام ہم میاں بیوی صبح سے رات تک کرتے ہیں اور رات کو بھی انکار نہیں کرتے، وہ ہماری ضرورت بھی ہے اور عادت بھی۔ ہمیں مزید پیسوں کی ضرورت نہیں چاہیے لیکن سکون، اطمینان اور خوشی اس کے بغیر ہم نہیں رہ سکتے۔ یا رہ سکتے ہیں؟ مسٹر سکندر بخت؟"

میں اچھل پڑا۔ شک تو مجھے ہو گیا تھا مگر سوال اس نے ایسے وقت میں اچانک کیا جب میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ خوش قسمت شخص دیکھا ہے یا کبھی دیکھوں گا اور اس جوڑے سے زیادہ اچھا جوڑا کہاں ہوگا۔ ان سے زیادہ جنتی کون ہوگا اور وہ حرام کی بات کر رہا تھا۔ اس کے رزق سے زیادہ رزق حلال کس کا ہے۔ بیسویں صدی کے کراچی جیسے شہر میں بھی ایسے لوگ ہیں۔ کوئی لاکھوں کے گھر میں نہیں رہتے، مگر دنیا کے فرشتے لگتے ہیں۔ کیا ڈاکٹر اور کیا مزدور۔ ہر پیشے میں، ہر ملک، قوم، مذہب اور بستی میں۔ وہ دنیا جن کے نام سے ابھی تک زندہ ہے۔

"تمہارے دوست کو تو میں نہیں جانتا۔ مگر تمہیں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا اور میں نے جو وقت یہاں صرف کیا وہ میرے لیے بہت قیمتی تھا۔ نہ جانے کتنے مجھے غیر موجود پا کے مایوس لوٹے ہوں گے۔ کچھ دوسرے ڈاکٹروں کے پاس گئے ہوں گے اور انھیں بھاری فیس دینی پڑی ہوگی۔ معاف کرنے کا اس مختصر غیر حاضری کے وقفے میں کوئی بڑا ہو، مگر یہاں صرف ایک بیٹا لوٹ گیا تھا۔ مسٹر سکندر، کم

تمہارے اور میرے مشن میں کوئی فرق نہیں۔ بس کام کا انداز جدا ہے اور نوعیت جدا ہے۔ ایک آدمی ملک و قوم سے بیماری دور کرتا ہے۔ دوسرا جہالت مٹاتا ہے۔ تیسرا اسے غنڈہ راج سے پاک کرتا ہے۔ کیا وہ ایک مشترکہ مقصد نہیں رکھتے؟ اور اسی لیے میں نے یہ سب تمہیں بتایا اور تمہیں ایک پیشکش کی کہ میں تم کو بہتر جگہ فراہم کر سکتا ہوں۔ زیادہ محفوظ اور آرام دہ۔"

"اگر ہم... ہمارے بارے میں سب جانتے ہوئے بھی۔" میں نے آخر کہا۔ "تو تمہیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ہم یہاں آرام کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں۔"

"ٹھیک۔ مگر یہاں تم بیمار ہو گئے پھر بھی تم کو فٹ رہنا ہے اور تندرست رہنا ہے۔ صحت مند آدمی ہی قوت و ارادے سے ٹھیک سکتا ہے۔ بیمار تو خود ایک فرض دار بن جاتا ہے۔ یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم سب تندرست نہیں ہو۔ ناقص خوراک، کم آرام، تھکن اور اعصابی کشیدگی۔ ان سب کا اثر تمہاری صورتوں سے ظاہر ہے۔"

"اور آپ کی فیس دینے سے یہ اثر ختم ہو جائے گا؟ تمہیں کیا معلوم ہمارا یہاں قیام کتنے دن کا ہے؟"

"جتنے دن بھی ہو۔" وہ بولا۔

اس نے پھر بیگ سے اپنا پیڈ نکالا اور اس پر کچھ لکھنے لگا۔ پھر کاغذ الگ کر کے اس نے مجھے تھما دیا۔ "یہ ہے ایک پتا۔ جا کے دیکھو۔ پسند آئے تو مجھ سے چابی لے جانا۔ میرا پتا اور فون نمبر اوپر درج ہے۔"

میں نے وہ پرچہ لے لیا۔ اس پر ڈاکٹر کا نام انوار احمد خان لکھا ہوا تھا۔

"تم کسی وقت بھی آ سکتے ہو بے خوف و خطر۔" وہ بولا۔ "ہم آدھی رات تک ضرور گھر پہنچ جاتے ہیں۔ کلینک تو دس بجے سے پہلے بند کر دیتے ہیں مگر اس کے بعد دعوتیں بہت ہوتی ہیں۔"

"تم زیادہ دعوتیں کھانے والے تو نہیں لگتے۔" میں نے کہا۔

"دعوت میں جانا ضروری ہوتا ہے، کھانا نہیں۔ یہ سمجھو ہم تو دونوں ہی ڈاکٹر ہیں۔ سخت ڈسپلن کے قائل ہیں خوراک کے معاملے میں۔ کبھی کبھی کی کوئی بات نہیں۔ جس دن کہیں دعوت نہ ہو اس دن باہر کھاتے ہیں۔ خوب بدپرہیزی کرتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ کہیں مدعو کرنے والے بھی دوست ہی ہیں۔ جھگی والے۔ ان کے خلوص میں زبردستی کو بہت دخل ہوتا ہے۔ یہ بات ہم پہلے نہیں کہتے تھے۔ اب واضح کر دیتے ہیں کہ ہم آئیں گے مگر صرف اس شرط پر کہ ہمیں کھانے کے معاملے میں کوئی مجبور نہیں کرے گا۔ ہم روزہ بلا ناغہ رہتے تو سب کچھ کھا سکتے اور ان کو بھی اعتراض نہ ہوتا۔ چنانچہ ہم ایک ہی بہانہ رکھتے ہیں کہ ہم رات کو کھانا نہیں کھاتے۔ پھل کھا لیتے ہیں۔ لوگ مایوس تو بہت ہوتے ہیں جب ہم ایک سیب یا ایک کیلا کھانے کی اجازت

www.paksociety.com

لیتے ہیں۔ سگو، لائف از ناٹ ویسٹ۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم سب کو شاید اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جو تم کو بنانا تھا کھانے جا رہے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ابھی آپ نے ہم سب کو دیکھا کہاں ہے؟" میں نے اس سے پُرجوش مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لوں گا۔" وہ بولا۔ "ایک گھنٹا ہو گیا ہے مجھے...."

"چلیے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔" ... "وہ کار میرے پاس ہے...."

"بہت قیمتی کار ہے۔" وہ بولا۔ "سگو میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اس میں تمہارے لیے رسک ہے۔ ٹھیک ہے، میں چلا جاؤں گا۔ مل جائے گی کوئی ٹیکسی۔" اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔

"میں مرزا غالب ہوں۔" غالب نے کہا۔ "اب تعارف کرا رہا ہوں، بوقتِ رخصت۔"

ڈاکٹر نے اس سے بھی ہاتھ ملایا۔ "غالباً تم صحافی تھے۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ہماری کسی منسٹری کا بھی معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کچھ خبروں سے۔ اخبار کا مطالعہ کر رہا ہوں۔"

"یہی وجہ ہے۔ اس سے پہلے جو بھی ملے ہیں وہ خبروں کے ذریعے مجھ سے متعارف تھے۔ اور پتا نہیں کیا بات ہے کہ سب اتنی بڑی دلچسپی سے خبروں میں ہماری جستجو کرتے رہے تھے اور سب دوست تھے۔"

"کوئی تمہارا دشمن ہو بھی کیسے سکتا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "جب تک کہ وہ خود ملک کا دشمن نہ ہو۔ ہر پاکستانی فخر کر سکتا ہے تمہارے کارناموں پر۔ دعا کر سکتا ہے تمہاری کامیابی کے لیے اور اگر تم سے ملے تو ناز کر سکتا ہے اپنی خوش قسمتی پر۔"

"یہ بہت زیادہ ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "ہم کیا اور ہماری بساط کیا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ لوگوں کے جذبے اور دوستوں کی دعائیں کام آتی ہیں۔ دشمن واقعی آگے ہیں ملک کے ... اس لیے ہم پہچانے جانے سے ڈرتے ضرور ہیں مگر ایسا بھی نہیں کہ گھر سے نہ نکلیں۔ میرا خیال ہے سیکڑوں ہزاروں نے کہیں نہ کہیں ہمیں پہچانا ہوگا مگر دیکھ کے گزر گئے ہوں گے۔"

"سن لیا؟" اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔ میں اور غالب اسے سڑک پر پورے اعتماد کے ساتھ جاتا دیکھتے رہے۔ زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہمارے جذبات اور احساسات مشترک تھے۔

"میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر انوار کی پیشکش قبول کرنے میں فائدہ ہے۔" غالب نے کہا۔

"کیا فائدہ ہے۔" میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "میں کہوں گا ہم کچھ آرام سے دیئے جائیں گے۔ جان بنا لیں گے۔"

"نہیں۔ ایک اور پہلو بھی ہے اس مسئلے کا۔" غالب ... "اگر آج رات خواتین کو یہاں سے نکال کے کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ یہاں ایک ٹرک ہے۔ سامان ... ٹرک پر لوڈ کرنے میں پوری رات بھی لگ سکتی ہے۔ ... یہ کارروائی دیکھیں گے۔ ساتھ ہی ... کوئی اگر کل آئے تو ... نہیں ملنا چاہیے۔"

"یہ تجویز کی افادیت کا قائل ہوا۔"

"کیا معلوم خاموش کے آدمی ... دیکھ لیں۔ وہ شہر بھر میں ... پھر رہے ہوں گے کہ ٹرک کہاں گیا۔" غالب نے کہا۔ "اگر وہ ... ہماری روانگی سے قبل ... تو مقابلہ ہوگا۔ ظاہر ہے ہم ٹرک تو ... نہیں دیں گے۔"

میں نے بات سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ "ٹرک پہ ... ہوگی۔ ... اسلحہ بڑا بارود کا ذخیرہ ..."

"اگر چار دو کوئی ہوا۔ تو پھر یہی کریں گے۔ ہم خود ... ہوں گے۔" غالب نے کہا۔ "لیکن ہم بھاگ سکتے ہیں۔ اس وقت ... اور اسبابِ خانہ کے ساتھ نکلنا محال ہوگا۔"

محسن اور اکرام شیخ سے پہلے راجا آ گیا۔ باہر ایک ٹرک آ کے ... پھر وہ اچانک نمودار ہوا۔ اب وہ اپنے ... ہم دونوں ایک ساتھ باہر نکلے۔

"ٹرک مل گیا؟"

"سب مل جاتا ہے بابو، دنیا کے بازار میں۔" وہ بولا۔

"کتنے میں ملا؟" میں نے ٹرک کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔

"چالیس میں.... پینتالیس میں سودا ابھی کیا ہوں۔ بیعانہ دے آیا ہوں پانچ ہزار۔" راجا نے ایک سوٹ کیس زمین پر پٹخا۔ "اور تم سب کے دنیا کی کفن بھی لے آیا ہوں۔"

"آفرین ہے تجھ پہ راجا۔" میں نے اس کو شاباش دینے کو ہاتھ مارا۔ "پانچ ہزار کا منافع اپنی شادی کے اکاؤنٹ میں ڈال لے۔"

"ٹرک کب اس کے حوالے کرنا ہے؟"

"میں نے ایک دن کی مہلت لی ہے۔ کل شام کو باقی ادائیگی ہوگی اور پیپر ... ادھر آیا اُدھر گیا۔" راجا نے کہا۔

ہم پھر اندر آ گئے۔ "اور لانچ کی بات ہوئی؟"

"ہاں۔ پہلے مجھے کچھ الجھن ہوئی ... تیار ہوا۔ تم سب مزے سے سوتے رہے ہو۔" وہ دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔

"ہم کل رات تیار ہوئے تھے۔ وہ یاد نہیں؟" غالب نے کہا۔

"کتنی ہے کام تمہیں بتا تھا۔" وہ بولا۔ "ایک لانچ والے سے پانچ ہزار میں بات ہو گئی۔"

"کہاں سے؟ کہاں جاؤ گے؟ اور کس وقت؟"

"جگہ مجھے معلوم ہے۔ وقت رات کے دو بجے کا ہے۔" راجا نے کہا۔ "اس وقت چھ بجے ہیں۔"

"اگر آٹھ گھنٹے میں جانے پائیں...."

"پھر کیوں۔ آٹھ گھنٹے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"دو گھنٹے جانے کے ... تین گھنٹے میں آپ کو ٹرک خالی کرنا ہے اور تین گھنٹے میں لوڈ کرنا ہے۔"

"ہیں۔ تو بہت مشکل کام ہے۔" غالب نے کہا۔

"باقی دو گھنٹے کہاں گئے؟" راجا بولا۔

"وہ بھی آ جائیں گے یہاں بھی۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے اکبر سیٹھ کا گھر پہنچے ہوں گے۔"

"خیال کیا مطلب۔ تم کے نہیں گئے؟"

"میں اس وقت تفتیش کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "ذرا پہلے اٹھ گیا تھا۔ باقی پتا نہیں کب اٹھے اور کب کھانا کھانے نکل گئے۔"

"انہوں نے کچھ بتایا؟" غالب بولا۔

مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا وہ میں نے انہیں بتا دیا۔ مجھے یہ بھی بتانا پڑا کہ نازو کی بے ہوشی کا سبب کیا تھا۔ جب نازو کی بات ہوئی تو راجا کو ڈاکٹر انوار کے بارے میں بھی بتانا ضروری ہو گیا۔

"اب تم ایسا کرو راجا۔" غالب نے کہا۔ "کہ گاڑی میں دونوں کو لے جاؤ۔ اور اپنا سامان بھی لے جاؤ۔"

"یہ ہے پتا اس ڈاکٹر کا۔" میں نے کاغذ کا پرزہ اسے تھما دیا۔ "ہم کل کسی بھی وقت پہنچ جائیں گے۔"

راجا نے پتا غور سے دیکھا۔ "میں تو پھر چلا جاؤں گا۔ تم لوگ بعد میں وہاں کیسے جاؤ گے، جہاں لانچ والے سے ملنے کو کہا ہے؟"

"ہم یہاں تمہاری واپسی کا انتظار کریں گے۔" غالب نے کہا۔

"اور یہ جو لوڈ اَن لوڈ کرنے کا کام ہے نا، یہ ہم خود کیوں کریں؟" میں نے کہا۔ "میں ٹرک پارک کر کے جاتا ہوں اور مزدور لے آتا ہوں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ہمیں تھکنے سے بچنا چاہیے۔"

میں اپنے ساتھ چار مزدور لے کر لوٹا۔ وہ بوجھ اٹھانے اور مشقت کرنے کے عادی تھے۔ میری واپسی تک نازو اور ... نے کھانا ... کی تیاری مکمل کر لی تھی۔

مزدوروں نے ... کام شروع کر دیا۔ ان کو اجرت سے ... تھا کہ کام دو گھنٹے میں ختم کر لیا تو ڈبل ... اب وہ دوڑ دوڑ کے ٹرک کے اندر سے کریٹ اتار رہے تھے۔ کچھ ... دوسرے ٹرک پر چڑھا رہے تھے۔ اکرام شیخ اور محسن آدھے گھنٹے بعد آئے۔ راجا دس منٹ بعد ... محسن نے بتایا کہ سیٹھ اکبر کے فلیٹ میں گزشتہ رات ... کچھ لوگ رات کے وقت آئے اور سیٹھ اکبر سمیت اس کے سارے خاندان کو مار گئے۔ وہاں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ کارروائی کس دشمن کی ہے۔

"لیکن ہم جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم پولیس کو ان کا نام بھی بتا سکتے ہیں۔ یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ قتل کیوں ہوا تھا۔ ٹرک اب کہاں ہے اور ٹرک ڈرائیور کہاں ہے۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کا کیا فائدہ۔ پولیس فوراً ٹرک پر قبضہ کرے گی اور انہیں پہنچا دے گی۔ ہم کسی اخبار والے کو غالب کے ذریعے یہ اسٹوری مفت فراہم کر دیں گے۔"

"مجھے تو معاف رکھو۔ جانتے ہو ... میں اپنے کسی صحافی برادری کے آدمی کو اس جان لیوا خبر میں الجھانا نہیں چاہتا۔" غالب بولا۔

"یار صحافی کا کام اور کیا ہوتا ہے۔ خبر کا کھوج لگانا اور سچ کی تہ تک جانا۔ پھر اس سچ کو ... عوام کے سامنے پیش کر دینا ... کے ساتھ۔"

"اور پھر مارے جانا۔" غالب نے کہا۔

"ضروری تو نہیں کہ ہر بار کوئی ... مارا جائے۔ وہ ہر صحافی کو اور ہر پولیس مین کو قتل نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔ "اگر کوئی ایسا اخبار ہو جو خبر دے مگر حوالہ شائع نہ کرے، مخبر کا ذریعہ نہ بتائے، تو وہ اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟"

"ہاں.... یہ ہو سکتا ہے۔" غالب نے سوچ کے کہا۔

ٹرک رات کے دس بجے لوڈ ہو گیا تو ہم نے مزدوروں کو خوش کر کے رخصت کیا۔ انہیں شکوہ تھا کہ مال کا وزن بہت تھا۔ ان کی تو کمر ٹوٹ گئی ہے۔ ایک نے پوچھا بھی تھا کہ آخر اس میں کیا ہے۔ وہ دوسروں سے زیادہ متجسس اور چالاک لگتا تھا۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ اس میں نٹ بولٹ اور مشینوں کے پرزے ہیں۔

اس وقت تک راجا بھی لوٹ آیا تھا۔

"کیا اب ہمارے یہاں رکنے کی ضرورت ہے؟" مزدوروں کے جانے کے بعد میں نے کہا۔

"ابھی تو دس بجے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ہم بارہ بجے روانہ ہوں گے تو ساڑھے بارہ بجے وہاں پہنچ جائیں گے اور لانچ آنے لگے دو بجے۔"

"لانچ کے آنے سے پہلے ہم مال ساحل پر رکھ لیں تو اچھا ہے۔ ٹرک وہاں نظر ہی نہ آئے۔"

"وہ راستہ کیسا ہے؟"

"آخری حصہ بہت دشوار گزار ہے۔" راجا نے کہا۔ "ٹرک آخر تک نہیں جا سکتا۔ پتا نہیں ایک فرلانگ تک ..."

"تو کیا یہ کریٹ ہمیں ایک فرلانگ تک اٹھا کے لے جانے ہوں گے؟" محسن نے روتی آواز میں کہا۔

"یہ میرا اندازہ ہے۔ فرلانگ میں نے اندازے سے بتایا

www.paksociety.com

"بیٹے اگر دو قبر آتم تک ہو تو مجھے معاف کر دینا۔" ماما بولا۔

"اللہ ہم سب کو معاف کرے۔" محسن نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "یارگناہ کیا کام تھا کہ دنیا میں یہ بوجھ ڈھونے کی سزا بھی ملی۔"

"صبح تک کام سے فارغ ہو جائیں گے تو سب کی چال بدل چکی ہوگی۔" غالب نے یقین دلایا۔ "کوئی دائیں طرف سے جھکا ہوا ہوگا تو کوئی بائیں طرف سے۔ سب کا ایک شانہ اونچا ہوگا دوسرا نیچا۔"

"کمر ٹیڑھی ہو گئی تو ایک آستین نیچی ہو گی ایک چھوٹی۔"

"چلو وہ تو جب ہوگا تب ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو نکلو یہاں سے۔ یہ کام مزدوروں نے دو گھنٹے میں نمٹایا ہے تو ہم سے چار گھنٹے میں بھی ہو گا۔"

"اس دوسرے ٹرک کا کیا کریں؟"

"کچھ نہیں۔ اسے اگر ہم یہیں چھوڑ دیں؟" غالب بولا۔

"چھوڑ دیتے اگر ہم نے یہ دیوار نہ گرائی ہوتی۔" میں نے کہا۔ "اب تو وہ خبیث انکوائری آفس کا کلرک ہمارے بارے میں بہت کچھ بتا دے گا۔ لوگوں نے ہماری کار بھی دیکھی تھی۔ کیا پتا کسی کو نمبر یاد رہ جائے۔ اسے بھی یہاں سے لے چلو۔ مع ڈرائیور۔"

میں نے ڈرائیور کی لاش گیراج سے اٹھائی اور ٹرک میں لا کے ڈال دی۔ ہم سب نے اپنے لباس بدل لیے تھے اور اب پختہ وجود سے سندھی نظر آتے تھے۔ ہمارے سروں پر مخصوص سندھی ٹوپیاں تھیں اور کندھوں پہ اجرکیں — خامی صرف ایک تھی کہ ہم سندھی نہیں بول سکتے تھے مگر ہمیں فی الحال کسی سے بات کرنی بھی نہیں تھی۔ وہ صرف ان کی نظر کو دھوکا دینا تھا جو شاید یہاں بھی ہماری تلاش میں ہمہ وقت سرگرداں تھے۔

عرصہ دراز سے ہم نے خیمہ نشینی کا بتانا کی تھی چنانچہ ہم سب باریش ہو گئے تھے۔ میری داڑھی گہری زردی سرخی کے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تھی اور اس کا رنگ بھی میرے بالوں کی طرح بھورا تھا۔ غالب کی داڑھی سب سے مختصر تھی۔ داجا کلین شیو تھا اور اس نے اپنا فقیری لباس ترک نہیں کیا تھا۔ اس لباس میں وہ ہر جگہ ایک بے ضرر فقیر کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔

"میں خالی ٹرک لے کر پیچھے آتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم لوگ دوسرے ٹرک میں آگے چلو۔"

"ٹرک نکلے گا کیسے یہ لوریں؟" محسن نے کہا۔

"ہم لوگ انھی ہاتھوں سے ملبہ ہٹا کے راستہ بنا لیں گے۔" غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔ "یہ قلم اٹھانے والے ہاتھ تھے۔ جنھوں نے تلوار اٹھائی تھی۔ اب یہ ہاتھ کیا اٹھا رہے ہیں۔ بلاک پتھر تو لے جا رہے ہیں۔"

"آ۔ ہم... ایک چیز اور اٹھائی تھی آپ نے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "اس کا تذکرہ بھی فرما دیجیے۔"

"کون سی چیز؟" غالب نے بے خیالی میں کہا۔

"اچھی چیز تھی۔ منگ بے ہوش تھی۔" میں نے کہا۔ اس کے کان کا زیور کیا وہ دانت نکالنے لگا۔ "کیا نصیب پائے ہیں — ایک وہ وقت تھا۔"

"وہ وقت میری جان بہت دور نکل چکا ہے۔" میں نے مصرع مختلف معنی میں پڑھ کے کہا۔ "اب چلو۔"

ٹرک کے پیچھے واپسی کا راستہ بنانے اور اس کی تیاری تک ہمارے اپنے ٹرک پہ ڈالنے میں مزید آدھا گھنٹا صرف ہوا۔ ہم نکلے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ غالب اور محسن پچھلے حصے میں سامان کے اوپر بیٹھے تھے اور میں محسن کو سیر کراتے سن رہا تھا۔ یہ دانشمندی کی غلطی تھی۔ اسے سندھی شاعری کا انتخاب کرنا چاہیے تھا اگر گانا ضروری تھا۔

گیارہ بجے ہم نے خالی ٹرک کو ایک ویرانے کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ جو کوہ آبلو کے علاقے میں ایک جگہ کھیرنے کے لیے استعمال کی گئی تھی۔ یہاں کسی کا محض ٹرک کو دیکھنے کے لیے آنا اور لاش دریافت کرنا اتفاق ہو سکتا تھا اور ایسے سیکڑوں ہزاروں ٹرک ہر جگہ کھڑے نظر آتے تھے اور کسی کو ایک ٹرک سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے تا وقتیکہ وہ اس کا اپنا ٹرک نہ ہو۔

اب میں بھی محسن اور غالب کے ساتھ زینت کی نعش سے باتیں اور پر تشریف رکھنے پر مجبور ہوا کیونکہ آگے داجا اپنے استاد ڈرائیور اکرام شیخ کا کلینر بنا بیٹھا ہوا تھا۔

"کیسا لگتا ہے اتنی بلندی پہ؟" محسن نے کہا۔

"اونٹ پہ بیٹھ کے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہوگا کہ آدمی باقی دنیا کے مقابلے میں کتنا سر بلند ہو گیا ہے۔" غالب نے کہا۔

"پچھتے کے آدمی؟" محسن نے کہا۔ "تفتیش سے حاصل ہونے والی معلومات میں کسی پیر کا نام آیا تھا؟"

"منگھو پیر کا نام آیا تھا اور اس نے ماری پور کا نام لیا تھا۔" اس نے کہا۔ "کیا اس کا یہ مطلب نکالا جائے کہ ان کے دونوں نام ہیں؟"

"تعداد ازدواج کی طرح گود لینے پر کوئی پابندی نہیں ہے میاں۔" محسن نے کہا۔ "دو چار چھ جتنے وہ چاہیں رکھ سکتے ہیں۔"

"صرف ماری پور... یا منگھو پیر سے تو کچھ پتا نہیں چلتا۔ ہم کیسے تلاش کر سکتے ہیں؟"

"اس کے لیے تو وہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ یعنی ٹرک پر نظر رکھی جائے اور جہاں سے جانے کے لیے آئے ہم ان کے ساتھ ہو لیں۔ کرنا بھی پیری قسمت کے تو چاہے جہاں لے چلو۔" محسن نے پھر گانا شروع کیا۔

"کچھ سنا؟ اپنے ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پتا نہیں چلتا؟ اداکار سے نکل رہی ہے۔"

"یہ فلم بوار بھی ایسا ہی ہے۔" غالب نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"رات گیارہ بجے اگر منبو خالی ہو گا تو اس میں سے الیسی ہی آواز نکلے گی۔" محسن بولا۔

"تو نے میرے دل کی کہی۔ بلکہ پیٹ کی کہی۔" میں نے کہا۔ "کیا ہمارا پائلٹ کہیں اسٹاپ اوور کرے گا؟"

"ہاں کرنا تو چاہیے۔ آخر وہ بھی انسان ہے۔" محسن بولا۔ "پہلے تھا نہار منہ تو کیا ہوا۔ بھوک تو وہ بھی ہے۔"

"اگر اس نے فرض کو بھوک پر ترجیح دی اور چلتا گیا تو کیا ہم بھوکے پیٹ مزدوری کو نکل گئے۔" غالب نے کہا۔ "اسے شعر کو درست کر کے۔"

"لیکن کیسے؟" محسن بولا۔ "آگے اتنا شور ہے اور اتنی بلندی سے کون سنتا ہے فغاں درویش۔"

"ہم درویش کو پائلٹ کے کان تک پہنچا سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

محسن ٹرک پر کیبن کے قریب ہو کے جھکا اور ہم نے اس کا ایک ایک پیر پکڑ لیا۔ آہستہ آہستہ ہم ڈھیل دیتے گئے اور محسن الٹا لٹکا ہوا نیچے کی طرف بڑھتا گیا۔

اس نے چیخ کے کہا۔ "ابے ساقی تھا ہشیار رہ" اور پھر قہقہہ مار کے ہنسا۔ ٹرک تھوڑا سا لہرایا۔ میرا خیال ہے کہ اکرام شیخ اپنے کان کے قریب یہ نعرہ مستانہ سن کے اچھلا ہوگا اور پھر ایک سر کو معلق دیکھ کر۔ پھر محسن نے شور مچانا شروع کیا کہ اسے اوپر کھینچا جائے۔

"نہیں۔ ایسے ہی ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

"اور یہ جگہ خستہ ہے۔" غالب نے کہا۔ "ویسے بھی تم پیچھے الٹے ہوا لے رہے ہو۔ دنیا کو نئے زاویے سے دیکھنے میں بھی لطف آتا ہوگا۔"

محسن غالب کو کوسنے اور چیخنے چلانے لگا۔

"اتنی کھوپڑی اٹکے سے زیادہ شور کیا تو ہم چھوڑ دیں گے۔" غالب نے کہا۔

"اچھا اچھا۔ کھینچے رہو میرے پیر۔" محسن بولا۔ "بلکہ میرے توسے جاؤ۔"

ٹرک رک گیا۔ سامنے چراغاں سا ہو رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اکرام شیخ نے نیچے اتر کے ڈانٹنا شروع کیا۔ "خواہ مخواہ سب کو ستو پر کرنے لگے۔"

"سب کہاں؟"

"سامنے ایک چائے خانہ ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ اس نے محسن کو اتار لیا۔

"جہاں یہ چراغاں ہو رہا ہے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "یہ تو کچھ زیادہ ہی ہے۔"

"یہ آن دی لفا ہے۔" وہ بولا۔ "شاید اسی کے ملازم ہیں جو آتے جاتے ہوئے چائے پیتے ہوں گے۔"

اکرام شیخ کا خیال درست تھا۔ اس ایک کمرے کے کیفے ڈیلی ورڈ سائڈ میں سب کچھ تھا سوائے کھانے کے۔ مجبوراً ہم نے بیکری کی مختلف مصنوعات چبائیں۔ ان کے نام جدا تھے اور شکل و صورت دیکھ کے نہیں رکھے گئے تھے مثلاً جسے کیک رس کا نام ملا تھا اس میں نہ کیک تھا اور نہ رس۔ ذائقہ سب کا ایک سا تھا۔ اس غذا پہ ہم نے بہت سا گرم مشروب انڈیلا جسے چائے کہنا مشکل تھا مگر قیمت بڑا بے رحم استاد ہے۔ جو کچھا دیکھتے کر بتا دیتا ہے کہ شہر وہاں کیا اچھا اور کیا برا۔

ریسٹورنٹ کا بھولا سا مالک ہماری بے مقصد گفتگو اور بے وجہ ہنسی پر حیران تھا۔

"تم لوگ کیا کرتے ہو؟" اس نے سرپا کے پوچھا۔

"ہم سب کچھ کرتے ہیں۔ اچھے کام بھی اور برے کام بھی۔" محسن نے کہا۔

"اس وقت ٹرک لے کر ادھر کہاں جا رہے ہو؟ آدھی رات کو؟" وہ بولا۔

"کسی نے بلایا ہے۔" محسن شرما کے بولا۔

"صاف بتا نا چاچا گر۔" غالب نے کہا۔ "اسے بلایا ہے ایک لڑکی نے ملاقات کے لیے۔"

بڈھا دم بخود رہ گیا۔ "اس وقت جاؤ گے تم لوگ؟"

"ہم اس کے باڈی گارڈ ہیں۔" میں نے کہا۔ "راستہ ذرا خطرناک ہے نا۔ بے چارہ ڈر رہا تھا۔"

"مگر وہ لڑکی پاگل ہے کیا؟"

"نہیں... وہ بہت سیانی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ اس کو لے کر نکل جائے گی۔ کراچی کی طرف۔"

"ہم تو بس سی آف کرنے جا رہے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "واپسی میں یہ ہمارے ساتھ نہیں ہوگا۔"

"اس کا باپ بڑا ظالم ہے۔ کئی بار اسے گولی مار چکا ہے۔" غالب نے کہا۔

"کئی بار...؟" بڈھے نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ نشانہ ذرا خراب ہے اس لیے یہ بچ گیا۔ دوسرے مارے گئے۔" غالب نے کہا۔ "جو اس کے ساتھ تھے۔"

"تم بے وقوف بنا رہے ہو مجھے۔" بڈھا خفا ہو گیا۔ "تم تو مجھے اسمگلر لگتے ہو۔"

"واہ چاچا۔" میں نے کہا۔ "تم تو بہت سمجھدار ہو۔ ہم واقعی اسمگلر ہیں۔" میں نے کہا۔

"اس ٹرک میں سونا بھرا ہوا ہے۔" محسن نے کہا۔ "لو گے؟"

"دور رہو بے۔" میں نے کہا۔

ہم بڈھے کو زیادہ ناراض کر کے رخصت ہوئے۔ اس میں

www.paksociety.com

شک نہیں کہ وہ بڈھا تھا اور بے وقوف بھی لگتا تھا لیکن وہ ایسی جگہ بیٹھا ہوا تھا جہاں سے وہ آتے جاتے ہر ٹرک کو دیکھتا تھا اور شاید جانتا تھا کہ اس وقت ادھر جانے والے کون ہوتے ہیں۔

"یہ بڈھا مروا نہ دے۔" غالب نے کہا۔ "شک ہو گیا تھا اسے۔"

"اس کے پاس کیا موبائل فون تھا؟" میں نے کہا۔ "وہ کسی کو کیسے اطلاع دے سکتا ہے۔"

"اس کے علاوہ، اگر وہ جانتا ہے کہ اس وقت اسمگلر یہاں آ جاتے ہیں۔" محسن بولا۔ "تو یہ بات بھی وہ اچھی طرح سمجھتا ہوگا کہ اسمگلر کیسے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ ان سے روز دشمنی مول لیتا تو کب کا یہاں سے اٹھ چکا ہوتا۔ اس کا بے ضرر ہونا ہی اس کے وجود کی ضمانت ہے۔ سب جانتے ہوں گے کہ بڈھا خبطی ہے مگر اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔"

"ہاں۔ آخر رات جو کچھ بھی ہو چلنا ہے۔"

باقی سفر ایسے کٹا کہ خود مجھے سمت کا اندازہ نہ رہا۔ آگے اکرام شیخ پائلٹ کے فرائض انجام دے رہا تھا اور راجا نیوی گیٹر کے۔ وہ اس کی ہدایات کے مطابق راستہ اختیار کر رہا تھا۔ اب سمندر کے قریب کا ثبوت ہوا کی مہک دیتی تھی اور اس میں سمندری ہوا کی نمی کا تناسب بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سمندر کے چنگھاڑنے کی گونج بھی سنائی دینے لگی۔ جھٹکوں سے ہمارا برا حال تھا۔ ٹرک کے پہیے ریت پر آگے بڑھتے تھے تو پیچھے گہری نالیاں بناتے تھے اور انجن کو زیادہ زور لگانا پڑتا تھا۔ راجا نے کہا تو تھا کہ یہ جگہ محفوظ ہے مگر ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے تھے جب تک بخیریت سفر کا اختتام نہ ہو جائے۔ یہ علاقہ اسمگلروں کا آپریشنل ایریا تھا۔ یہاں چھاپے بھی مارے جاتے ہوں گے۔ چھاپہ مارنے کے فوراً بعد ٹن کیسے جاتے ہوں گے۔ پولیس مقابلے بھی منعقد ہوتے ہوں گے۔ ابھی کیا معلوم وہ لانچ والا بھروسے کے قابل تھا یا نہیں۔ وہ ڈبل ایجنٹ بھی ہو سکتا تھا۔ اور ہماری سے بات کر کے ادھر پولیس کو مطلع کر دے۔

بالآخر ٹرک رک گیا اور ہم جو سمندر کی موجوں پر بکھری ہوئی چاندنی سے روشن لہروں کے کھیل میں گم تھے چونک کر نیچے اترے۔ ہمارے دائیں بائیں چٹانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور جب میں نے راجا کے ساتھ جا کے دیکھا تو سمندر جگہ جگہ ان چٹانوں کے اندر تک پہنچ رہا تھا۔ موجیں جہاں گہرائی آتی تھیں اور چٹانوں کے علاوہ میں گم ہو جاتی تھیں۔

ایک نسبتاً بلند چٹان پر کھڑے ہو کے راجا نے سیٹی بجائی۔ اپنی دو انگلیاں منہ میں ڈال کے۔ یہ مہارت کا کام تھا جو میں نہیں کر سکتا تھا۔ جواب میں ویسی ہی سیٹی دو بار سنائی دی۔

"آ گیا ہے وہ۔" راجا نے خوش ہو کے کہا۔ "ہم زیادہ دور نہیں ہیں۔" اس نے پھر سیٹی سگنل دیا۔ جواب پھر پہلے کی طرح ملا۔ راجا وقفے وقفے سے بتاتا رہا کہ ہم کس سمت میں جا رہے ہیں اور جوابی سگنل سے مجھے اندازہ ہوتا رہا کہ درمیانی فاصلہ کم ہونے لگا ہے۔ بالآخر ایک چٹان کی اوٹ سے نکلا اور ہماری طرف آ گیا۔

ہمیں ٹرک کو مزید آدھا میل آگے لے جانا پڑا۔ جو خطرناک والا مکرانی بھاری بھرکم حفاظت کے لیے آگے پیدل چلتا گیا۔ ہم کچھ پیچھے کیونکہ ٹرک کی رفتار بہت کم تھی۔ ٹرک اب راجا چلا رہا تھا۔ اکرام شیخ ٹرک کے دائیں جانب پچاس گز پیچھے چل رہے تھے۔ غالب اتنے ہی فاصلے سے دوسری طرف تھے اور ہم سے کوئی پچاس گز دور تھے۔

ریت پر چلنا ایک دشوار کام تھا۔ ریت اور ہم سب تھک گئے تھے۔ ذہنی طور پر ہم سب ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ اس وقت اچانک حاجی کے گرگے آ جاتے یا پولیس نمودار ہو جاتی تو ہم سب کا رد عمل یکساں ہوتا۔ ہم ریت پر لیٹ جاتے اور فائر کھول دیتے۔ ہمارا نشانہ ٹرک ہوتا۔ ظاہر ہے اس کا نتیجہ ہماری جنگ ختم ہو جاتی کیونکہ ہم ختم ہو جاتے۔

مگر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ راجا نے انتخاب میں غلطی نہیں کی تھی۔ وہ مکرانی آدمی اعتبار والا تھا۔ زیادہ خوشی مجھے اس وقت ہوئی جب میں نے لانچ کو دو چٹانوں کے درمیان پایا۔ ٹرک سے آگے سوائے پانی کے کچھ نہیں تھا اور اس کے دونوں طرف چٹانوں کا سلسلہ ایک حصار فراہم کرتا تھا۔

ٹرک سے پہلا کریٹ اتار کے میں نے لانچ تک کا سفر شروع کیا۔ اس وزن کے ساتھ مجھے یہ فاصلہ واقعی دو فرلانگ لگا۔ اگر فاصلہ دو فرلانگ ہوتا تو شاید مجھے دو میل لگتا۔ میں نے سوچا کہ ٹرک سے کریٹ اتارنا آسان ہے۔ یہ لاد کے جانا اور پھر لانچ پر آسان کام نہیں ہوگا۔

لیکن لانچ پر قدم رکھتے ہی مجھے ایک خوشگوار حیرت کا سامنا ہوا۔ یہ ہماری لانچ تھی۔

"راجا!" میں نے خوشی سے چیخ کے کہا۔ "یہ تو ہماری لانچ ہے۔ ہماری لانچ۔"

راجا دانت نکالنے لگا۔ "اچھا، مجھے معلوم نہیں تھا۔"

میں نے اس کی کمر میں مکا مارا۔ "یہ بات تو نے اب تک چھپائی تھی؟"

"ہاں یار۔ میں نے سوچا تم کو ایک دم سرپرائز دوں تو خوشی حاصل ہوگی۔" وہ بولا۔ "سمجھ لیا دوست۔"

"تو مجھے مار ہی ڈالتا۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ بتا کہ..."

"مجھے بندرگاہ پر دوست محمد مل گیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ پہلے تو میں سمجھا نہیں مگر اس نے چند قدم چل کے پھر پیچھے دیکھا اور بہت واضح انداز میں گردن کے اشارے سے بلا لیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے بہت دور تک گیا۔ ایک جگہ کے اس نے مجھے اپنے ساتھ ... میں بند کر لیا۔"

"کس چیز میں بند کر لیا؟"

"ٹوائلٹ۔ باتھ روم۔ لیٹرین۔ لیوٹری۔" راجا نے جھنجلا کے کہا۔ "سب ایک ہی چیز کے نام ہیں۔ وہاں اس نے مجھ سے دو باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ لانچ ... کو کمال ... گئی۔ وہ ہماری تلاش میں تھا۔"

"اور دوسری بات؟" میں نے دھڑکتے دل کو سنبھال کے کہا۔

"دوسری بات؟ وہ تو میں بھول گیا۔" راجا نے معصومیت سے کہا۔

"تیری یادداشت ٹھیک کروں؟" میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔

"آہ... اے فقیر کا بچہ بدبخت۔" وہ چلایا۔ "مجھے یاد آ گیا۔"

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ "رابعہ کے بارے میں کچھ کہا ہوگا؟"

"ہاں۔ کہا تو تھا۔" وہ گردن سہلا کے بولا۔ "تمہاری رابعہ آزمائش سے نکل گیا۔ ... کے لانا ہوں۔" وہ ایک دم بھاگا۔

"یہ کیا حرام خوری ہے۔ ... ہم دونوں؟" محسن نے چلانا شروع کیا۔ "ایک ہم یہاں مرے جا رہے ہیں۔"

اکرام شیخ اور غالب ہمارے پاس سے گزرے۔ ہم دونوں الجھتے ہوئے ان کے پاس سے گزر گئے۔ ٹرک کے پاس پہنچ کے میں نے اسے پھر پکڑ لیا۔

"محسن بھائی! بچاؤ۔" راجا چلایا۔ "ایک تو میں لانچ واپس لے آیا ہوں۔ تمہاری والی لانچ۔"

"ہماری لانچ! یہ ہماری لانچ ہے؟" محسن نے ٹرک پر سے چھلانگ لگا دی۔ وہ کریٹ اتارنے پر مامور تھا۔

"ہاں۔ اور تمہارا دوست مجھے قتل کرنا چاہتا ہے یہ۔" راجا نے اس کے پیچھے پناہ لے لی۔ "میں نے صرف رابعہ کا نام لیا تھا کہ اس پر پاگل ہو گیا۔"

محسن قہقہہ مار کے ہنس گیا اور راجا پکڑا گیا۔

"استاد! بھی کتنی بار بولوں کہ رابعہ مزے میں ہے۔ اس نے بولا ہے کہ میری فکر مت کرو۔" راجا ہنسنے لگا۔

"مجھ سے ... بس یہی کہا ہے؟"

"الیاس نے کہا ہے، دوست محمد نے کہا ہے کہ رابعہ کا فکر ..."

"تم تو جانتے ہو کہ وہ ہے کہاں؟"

"پوچھا تھا۔ ... وہ گرم ہو گیا کہ تم کو کیا۔ ابھی شکل گم کرو۔" راجا ... کے ساتھ۔"

میں نے ایک گہری اور بھری سانس لی اور پھر کریٹ اٹھا کے ... "بہت اچھا ... آ تو جانتا ہے ... مجھے نیند ... کے لیے ... خیال سے ممکن ہو تو ... کیا تھا۔"

لانچ ... روانہ ہوئی تو صبح کے تین بجے تھے۔ ... اس کا ... کہ صرف وہ ... جانے کے خیال نے سب کو ایسی خوشی دی تھی کہ سب کا حوصلہ بلند ہو گیا تھا۔ پچھلا ڈنڈ بشن راجا کے ہمراہ سب ساتھ گئے۔ راجا ٹرک پر موجود رہا۔

تقریباً دو میل کا فاصلہ ہم نے دس منٹ میں طے کیا۔ پھر ہم نے مکرانی ناخدا سے کہا کہ وہ ایک فرلانگ کے دائرے میں واپسی کا چکر شروع کرے۔ وقفے وقفے سے ہم سب کریٹ پانی میں گراتے گئے۔ جب پانی اچھلتا تھا تو ہمارے کپڑے بھیگ جاتے تھے اور چھینٹے منہ پر آتے تھے مگر یہ کھیل بڑا دلچسپ تھا۔ واپسی کے سفر کا ایک چکر پورا ہونے تک ہم نے لانچ کو خالی کر دیا تھا۔ اسلحے کا یہ سارا ذخیرہ سمندر میں ایک میل کے دائرے میں پھیل گیا تھا اور سینکڑوں فٹ کی گہرائی میں جا کے بیٹھ گیا تھا۔

دوسرے راؤنڈ میں ٹرک کا باقی سامان ہم نے تھوڑے سے مختلف زاویے پر چلتے ہوئے پھر ڈمپ کیا اور واپس لوٹے تو صبح کے ساڑھے چار بج چکے تھے۔ مکرانی نے ہمیں بتایا کہ لانچ اسی جگہ رہے گی اور وہ اجرت یہاں لے گا۔ ہم نے اس سے دوستوں کی طرح ہاتھ ملایا اور روانہ ہو گئے۔

واپسی میں ہم پھر انہی مقامات سے گزرے تو ایک بار پھر عجیب سی مسرت آمیز سرور میں مبتلا تھے۔ ہم نے تباہ کن اسلحے کا ایک بہت بڑا ذخیرہ دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونک کے یوں غائب کیا تھا کہ اسے وہ ابھی تک زمین آسمان کے درمیان تلاش کر رہے تھے۔ ... کا مال سمندر نگل چکا تھا۔ ان کے لیے مالی نقصان کے علاوہ اپنے مقاصد کے حصول میں ناکامی کا صدمہ الگ تھا۔ نہ جانے کہاں تخریب کار اس کے پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے اور امید لگائے بیٹھے تھے کہ وہ بہت جلد ایک اور کامیابی حاصل کریں گے۔ ایک اور معصوم اور بے گناہ عوام کی بستی کا نشان مٹا دیں گے۔ ایک اور شاہراہ کو کاٹ دیں گے یا دشمن ... الوادی کے خلاف ایک اور محاذ فتح کر لیں گے۔ لیکن اب کچھ نہیں ہوگا۔ ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ اسلحہ کہاں پہنچتا مگر ہم اندازہ کر سکتے تھے کہ کتنے بڑے ذخیرے سے کتنی انسانی زندگیوں کو ختم کیا جا سکتا تھا۔ خدا نے ہمیں توفیق دی تھی کہ ہم انہیں بچا لیں۔ سینکڑوں بچوں کی چیخیں اور سینکڑوں عورتوں کی ... سینکڑوں ماؤں کے جینے کا آسرا اور سینکڑوں جوان بیٹوں کی زندگی جو والدین کے بڑھاپے کی لاٹھی تھی موت کے خونی سایوں سے محفوظ ہو گئی تھی۔

صبح کاذب کے اجالے میں ہم گھوم آباد سے گزرے ... حاجی عبداللہ ... کا ٹرک اور بوڑھا ... کی لاش کے ساتھ موجود تھا۔

"کیا اس ٹرک کو اسی جگہ چھوڑنا ٹھیک ہوگا؟" محسن بولا۔

"کیا حرج ہے؟" میں نے کہا۔

"یہاں ہم ان پر کیسے نگاہ رکھیں گے؟" محسن نے کہا۔ "اس کے علاوہ کسی نے لاش دیکھ لی تو معاملہ پولیس کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" غالب نے کہا۔ "ابھی کچھ دیر میں دھوپ نکلے..."

www.paksociety.com

گی تو وہ پھر ایک لاش بن کر خود سب کو تشویش میں مبتلا کر دے گی۔"

"چلو پھر راستے سے چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لاش کو کہیں راستے میں ڈال دیتے ہیں یا اچھا ہے اسے پولیس لے جائے اور تفتیش کر کے پتا چل جائے کہ مرنے والا کون تھا۔ ہم کو تو جانے دو۔"

میں نے ٹرک اسٹارٹ کیا تو غالب دوڑتا ہوا آیا اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ دونوں ٹرک آگے پیچھے چلنے لگے۔

"کل تم نے ایک بات کی تھی۔" غالب نے کہا۔

"میرا خیال ہے کل میں سارا دن بولتا رہا تھا۔ بہت سی باتیں کی تھیں۔"

"نازو کے اور میرے بارے میں۔ تم نے کسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا؟"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ "مجھے افسوس ہے دوست۔ اس کا دماغ بہت خراب ہے تمہارے بارے میں۔ تم نازو کا خیال چھوڑ دو کسی اور سے دل لگاؤ۔"

"مشکل راستہ ہے۔" وہ بولا۔

"نہیں۔ اچھے نیک کاموں میں دل لگاؤ۔ عاقبت کی فکر کرو۔ یہ عشق تمہارے بس کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارا سالا تھانیدار بھی ممکن ہے کہ بعد میں کیا ہوگا۔ فرض کرو وہ بستر میں ایک اسٹریچر جیسا اور چلتی پھرتی سب کچھ ہے تب بھی کیا ہوگا۔ اس کی چند شرائط ہیں۔"

"وہ کیا شرائط ہیں؟"

"ایک تو تم بلیک بیلٹ ہو۔" میں نے کہا۔

"وہ پانچ سات کی مقتب ہے۔ کالے رنگ کا بیلٹ پہلے بھی میرے پاس ہے۔"

"پھر یہ کہ تم کسی ہڈیوں کے ڈاکٹر سے کنٹریکٹ کر لو۔ ماہ شہریاری میں ہڈیوں کو فیاد دے۔" میں نے کہا۔ "یا اپنا سالار کی ہڈیاں شادی سے پہلے تڑوا دو پھر ہر طرح بچ جاؤ گے۔"

"بس یا کچھ اور ہے شرط؟ شرط نہیں ہے کہ بیوی کو ہاتھ بھی مت لگانا؟"

میں ہنسنے لگا۔ "نہیں یہ شرط نہیں ہے۔"

"بس تو باقی سب شرائط مجھے منظور ہیں۔" غالب نے کہا اور منہ پر ہاتھ رکھ کے ایسی آواز نکالی جیسی کسان اپنے کھیتوں سے جانور بھگانے کے لیے نکالتے ہیں۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا سالا کس کے عشق میں مبتلا ہو چکا ہے؟" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ وہ موتی پر مرمٹا ہے۔"

"کمال ہے۔ تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"پہلا جب چاند نکلتا ہے تو سب کو نظر آتا ہے۔ دیکھ رہا پارٹی سنگل ہے۔ رہنا ہے۔"

آگے والے ٹرک میں سے محسن نے ہاتھ ہلا کے کچھ اشارہ کیا تھا، پھر ٹرک کو سائڈ میں روک لیا۔ شہر کراچی سے باہر نکل کے بیابان شروع ہو گیا تھا۔ اسٹریٹ لائٹس بجھ گئی تھیں اور مشرق کے افق پر سنہرا اجالا پھیلنے لگا تھا۔

"اس ٹرک کو ہم ساتھ لے جائیں گے؟" محسن نے کہا۔

"کہاں لے جائیں گے؟"

"وہیں جہاں غالب بھی رہتا ہے۔ جہاں رات کو راجا خواتین کو چھوڑ کر آئے تھے۔" محسن نے کہا۔ "تم اب لاش کو سنبھالو۔ موقع دیکھ کر ہم ذرا آگے جا کے انتظار کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ "مگر فاصلہ زیادہ مت رکھنا۔ مجھے تو راستے کا بھی نہیں معلوم۔"

اگلے موڑ پر میں نے ڈرائیور کی لاش کو ایک جھٹکے سے اٹھا کر باہر گرا دیا۔ یہ سڑک ویران تو نہیں تھی مگر پیچھے سے دوسری گاڑی نظر نہ آئی تو میں نے اس وقفے سے فائدہ اٹھایا۔ فوراً ہم نے ساتھ کر دیا تھا۔ اس نے میرے انتظار سے پہلا ہی پیچھا چھڑا لیا۔

آگے والے ٹرک پر نظر رکھے ہوئے ہم جب بیچ شہر سے نکلے تو کافی اوپر آ گیا تھا۔ یہ کوئی نئی آباد ہونے والی بستی تھی۔

"ٹرک اس دیوار سے لگا کے روک دو اور ہمارے ساتھ آ جاؤ۔" اکرام شیخ نے سر نکال کے کہا۔

میں نے ان زیر تعمیر گھروں کو دیکھا جن کی تعمیر کا کام شاید … سے رکا ہوا تھا۔ غالب نے ٹرک کو اس کے سامنے کھڑا کیا اور کود کے نیچے اتر گیا۔ ہم نے چابیاں ٹرک میں لگی چھوڑیں اور آگے والے ٹرک پر سوار ہو گئے۔ ٹرک سیدھا گیا پھر گھوم کے واپس آیا اور ایک خالی پلاٹ پر ٹھہر گیا۔

"کیا یہ ہم وہیں نہیں آ گئے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ بس ایک گلی کا فرق ہے۔" اکرام شیخ بولا۔

"ہمارا واسطہ ہم پیچھے سے گزر کے ایک منٹ میں یہاں آ سکتے تھے۔" راجا نے کہا۔ "لیکن احتیاط اچھی چیز ہے۔"

وہ شاید دو نمبر کا مکان تھا۔ راجا نے میرے اندازے کی تصحیح کی اور بتایا کہ یہ دو سو مربع گز کا مکان ہے۔

"یہاں مرے اور کہاں نہیں پہنچے۔"

"گویا یہ انجھو مرے پہ جتا ہوا ہے۔" میں اپنی بات پہ قائم رہا۔

یہ مکان دیکھنے میں کوٹھی لگتا تھا۔ اس کا نقش باہر سے بہت خوبصورت تھا اور بظاہر یہ نو تعمیر شدہ مکان تھا۔ ہم ایک بہت بڑے پھاٹک سے گزر کے اندر داخل ہوئے۔ پورچ … اور بائیں کا اندر بہت خوبصورت کھڑکی ہوئی تھی۔ ایک اوپن کچن تھا …

آمنے سامنے کمرے یا بیڈ روم تھے۔ سب پر … ہر ایک کا رنگ بھی جدا تھا مگر وہ سب خالی پڑے ہوئے تھے۔ لاؤنج میں سب سے بڑا ایک ساتھ تھا۔ ایک چھوٹا سا فانوس تھا اور اس کے دونوں طرف دو آویزاں تھے۔ چاروں دیواروں پر جو پینٹنگ تھیں ان کا اور فانوس کا ذوق بھی باقی ہر گھر کی طرح ویسا ہی تھا۔

"یہ دونوں ابھی یہاں ہیں؟" محسن نے پورا گھر دیکھ لینے کے بعد کہا۔

"یہ بھی دونوں ہیں۔" راجا معصوم بن گیا۔

"آپ کی چھوٹی اور بڑی باجی۔" میں نے کہا۔

"انہوں نے تو بھی سسرال ہی میں رکھنا تھا۔"

"اب آگے تو بھی نہیں رہنا چاہتا شاید۔" محسن نے اسے پکڑ لیا۔ "بولو کیسے بتلاؤ گے۔ سو پیاز اور سو جوتے کھاؤ گے؟"

راجا نے اقرار میں سر ہلایا۔ "پیاز وہ سو گن لینا۔ اپنا تو کھانا ہضم ہو جائے گا۔"

"میں بیٹھے بٹھائے لوں گا۔"

"ہم نے جوتے کھالیے گے۔" میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "نازو اور موتی کہاں ہیں؟"

"وہ… اچھا… وہ تو سامنے والے گھر میں ہیں۔ یہ بات پوچھتے تھے تم تو ہم راجا نے کہا۔ "اکرام سے پوچھیے۔ شریفوں کی طرح۔"

"سنو… وہاں کون ہے؟" محسن نے اسے چھوڑ دیا۔

"مجھے کیا معلوم۔ وہ پھر کر گیا۔ "ہوں گی ان کی یا تمہاری کوئی رشتہ دار ہم بھی۔ ابھی تم سب کے میکے اور سسرال والوں کو کہاں جانتا ہوں۔" اس بار میں نے راجا کو ایسا دبوچ لیا کہ اس کی گردن میری بغل میں پھنس گئی۔

"محسن سب کے بارے میں بتلاتا ہے۔"

محسن نے اس کی بغل میں گدگدی شروع کی۔ "ایک تو ہے میری خالہ کی ماں۔ دوسری میری خالہ کی خالہ۔ اور ان کی بیٹی اور بیٹا بھی ہیں … بچے ہیں۔"

راجا چیختا رہا۔ "اللہ چھوڑ دو یار۔" "ابے مر گیا چھوڑ دو مجھے بھوت کے بچے۔" اللہ ہنستے ہنستے چھینک بھی مارتا رہا۔ "ارے بتاتا ہوں یار۔"

"کیا مصیبت ہے یہ۔ پڑوس کے لوگ کیا سمجھیں گے کہ کون پاگل آ گئے ہیں۔" غالب نے تشویش سے کہا۔ "آئی ہیں اور پکارتے رہیں گے تو آ جائیں گے پوچھنے۔"

اکرام نے ہنسی کی۔ "اسے بھی اتنا جنگلا ہے۔"

محسن نے راجا کو چھوڑ دیا۔ … "کوئی نہیں آئے گا۔ یہاں سے ہم مت کرو۔ یہاں بھوت رہتے ہیں۔ ہم سے پہلے بھی۔"

"چھوڑو اس بات کو۔"

"نہیں… وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "یہ ایک آسیب زدہ مکان ہے۔ سارے علاقے میں مشہور ہے۔ اسی لیے خالی پڑا ہوا تھا۔ مجھے کسی نے بتلایا تھا۔"

"نازو نے … جب اندر آ کے … آیا تھا تو سامنے سے ایک … باہر نکلتے دیکھا تھا اور پوچھا تھا کہ ہم کون ہیں۔ میں نے بتا دیا کہ شریف لوگ ہیں اور کرائے دار ہیں۔ انہوں نے کہا شریف تو نظر آ رہے ہو مگر بیوی بچوں کے ساتھ رہنا ہے تو کوئی دوسرا مکان دیکھ لو کرائے پر۔ یہ بھوت مکان ہے۔ میں یہاں تم … سے رہے ہو۔ اصل بات تمہیں معلوم نہیں۔ چنانچہ موتی اور نازو کو میں نے ان کے ساتھ بھیج دیا کہ اصل بات معلوم کریں۔ اور خود واپس چلا گیا۔"

"انھیں وہیں چھوڑ کے آ گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"اور کیا کرتے۔ بڑی بی نے خود کہا کہ میاں تم جاؤ۔ باقی سامان لے آؤ۔ بچیاں یہاں رہیں گی۔"

"بچیاں؟" محسن نے طنز سے کہا۔ "بڑی بی کو صرف دو بچیاں ہی اچھی کیوں لگیں۔ تم سے کہہ دیا کہ دفع ہو جاؤ۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے دو بیٹوں کے لیے رشتہ تلاش کر رہی ہوں۔ جانے کیا بات ہے، اللہ نے گھر بیٹھے بھیج دیا۔"

"چلو یار پہلے باقی مکان دیکھ لو۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "پھر بلوائیں گے انھیں بھی۔"

ہم سب زینے کے راستے اوپر گئے۔ کھلی چھت پر صرف ایک کمرا بنا ہوا تھا۔ اس کمرے میں بھی کچھ نہیں تھا۔ باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں شیشہ لگا ہوا تھا اور شیشے سے دیکھنے پر گرد و نواح کا سارا علاقہ نظر آتا تھا۔ ہمارا ٹرک کوئی سو گز دور کھڑا ہوا تھا۔

"یہ آسیب کا چکر کیا ہے؟" غالب نے کہا۔

"ایسے چکر ہر جگہ ہوتے ہیں۔" راجا نے کہا۔ "معلوم نہیں کیسے یہ مکان بدنام ہو گیا۔ خدا سے کوئی خریدتا ہے نہ کرائے پہ لیتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ساتھ والے گھر میں بھی کوئی نہیں رہتا۔ دائیں طرف والا مکان دو مہینے سے خالی ہے۔ بائیں طرف ابھی چند دن پہلے کوئی آیا ہے مگر وہ بھی جانے کی سوچ رہا ہے۔ اس کی بیوی ڈرتی ہے۔"

"کون ہے؟"

"کوئی سرکاری ملازم ہے۔ پشاور سے ٹرانسفر ہو کے آیا ہے۔ سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔" راجا نے کہا۔ "بہت پریشان تھا۔"

"چلو اس سے ملتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اسے سمجھاتے ہیں کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

ہمارا پڑوسی الفت خاں بہت نیک اور مہمان نواز آدمی ثابت ہوا۔ اس نے ہمیں تپاک اور خندہ پیشانی کے ساتھ اس کمرے میں بٹھایا جس میں صرف دو کرسیاں تھیں اور ایک دری بچھی ہوئی تھی۔

"غریب آدمی ہوں جی۔" وہ بولا۔ "فرنیچر ابھی خریدا نہیں ہے۔"

ہم سب جوتے اتار کے اطمینان سے دری پر بیٹھ گئے۔ میں فرش پر پالتی مار کے اور دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔

"ہم خود غریب آدمی ہیں اور دری کو ترجیح دیتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"ویسے بھی فرنیچر کا خلوص سے کوئی تعلق نہیں۔" غالب بولا۔

www.paksociety.com

ہماری باتوں نے اسے کچھ مطمئن کیا۔ اپنی گھر والی کو اس نے اندر سے جا کر چائے بنانے کا حکم دیا اور پھر خود بھی ہمارے پاس بیٹھ گیا۔

”آپ لوگوں کے آنے سے میرا مسئلہ حل ہو جائے گا جی ورنہ میں تو...“ اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”نوکری چھوڑتا اور کیا کرتا۔ واپس جا کے کیا کرتا؟ یہ بھی نہیں سوچا تھا۔“

”اس میں کیا بات ہے؟“ میں نے کہا۔

”بات کیا جی۔ صورت حال کی شکل میں“ وہ بولا۔ ”ابھی جب میں پشاور سے ہو کے آیا تو ایک مہینہ بھی نہیں رہا۔ الامان۔ اتنا کرایہ مکان کا کہ ساری تنخواہ اٹھ جائے۔ بھی ایسا مکان تو ملتا ہی نہیں۔ ایک کمرے کا مکان لینا بھی مشکل تھا۔ آدھی تنخواہ نکل جاتی۔ اللہ نے سبب بنایا تو یہ مکان ملا۔ صرف سو روپیہ کرایہ۔ میں نے پہلے تو شکر کیا پھر میرے کو شک پڑا۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو مالک مکان بولا کہ خان صاحب بات یہ ہے کہ پڑوس کے گھر میں جن بھوت ہیں۔ میں نے کہا کہ اس گھر میں تو نہیں ہیں نا۔ وہ بولا کیا کروں جو کرائے دار آتا ہے لوگ ڈرا دیتے ہیں۔ سب کہانی سنا کے۔ میں نے کہا کہ آپ خود کیوں نہیں رہتے ادھر۔ وہ کہنے لگا کہ میری بیوی کی بھی تو عزت ہے۔ ممکن ہے کہ میرے بچوں کو اور مجھے معاف کرو۔ خود جا کے رہو وہاں۔ مالک مکان نے کہا کہ سو روپے کرایہ نہیں ہے۔ کرایہ تو پانچ سو ہوتا مگر خالی مکان کا میں کیا کروں۔ اس کے لیے کوئی تو چاہیے اور رکھوں تو سو روپے بھی سے دوں۔ لیکن جی میں نے کہا کہ آپ بے فکر ہو جاؤ۔ ہم رہیں گے ادھر کوئی پھر بھی کے اور ہم کسی جن بھوت سے نہیں ڈرتے۔ گھر کو نقصان ہے؟“

ابھی اس کا بیان جاری ہی تھا کہ اندر والا دروازہ بجا۔ اس کے ساتھ چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ الفت خان اٹھا اور چائے کی ٹرے لے کر واپس آ گیا۔

”ابھی جناب میں پشاور گیا اور اپنی بیوی کو ادھر لایا تو میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا کہ کراچی میں کتنے کرائے ہیں اور یہ مکان سستا کیسے ملا ہے۔ میں نے تو کہا کہ کراچی بہت اچھی جگہ ہے۔ مکان بہت اچھے ملے اور کرائے بہت کم۔ لیکن جناب یہ جھوٹ دو دن بھی نہیں چلا۔“ وہ چائے بناتے ہوئے مسکرانے لگا۔ ”ادھر ادھر کی عورتوں نے میری بیوی کو سب بتا دیا کہ ساتھ والے مکان میں جنات ہیں۔ چڑیلیں اور بھوت ہیں اور معلوم نہیں کیا قصے کہانی سنائے۔ بس جی اس نے تو رونا شروع کر دیا۔ میں نے بہت کہا کہ یہ سب باتیں مشہور ہو جاتی ہیں، حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ وہ کہنے لگی کہ سارا محلہ پاگل ہے اور تم افلاطون ہو۔ اس کو میں کیسے سمجھاتا۔ وہ رات کو سوتی نہیں۔ خواہ مخواہ ڈرتی ہے۔ چیخیں مارتی ہے۔ مجھے تو ڈر تھا کہ میں نے ضد کی اور زبردستی کی تو وہ پاگل ہو جائے گی۔ آپ جانتے ہیں نا جی؟“

”ہاں۔ پتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بس جی میں نے بولا اسے کہ نیک بخت! واپس [illegible] افسر تو نہیں

سکتے۔“ وہ بولا۔ ”بہت کوشش کی تب بھی سال بھر پہلے [illegible] جا گھسے گے۔ آخر نوکری ہے۔ اگر یہاں نہیں رہتا تو [illegible] اور ہم حالیہ پشاور چلتے ہیں۔ مگر چلتے چلتے یہ بتا دو کہ پھر کیا کریں گے۔“ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے ساتھ پشاور چلا [illegible] گا۔ میں نے کہا کہ یہ خیال نکال دو دل سے۔ [illegible] وہ گھر داماد ہے۔ کراچی میں کرائے کا مکان اچھا ہو تو [illegible] کے برابر کرایہ ہوتا ہے۔ اس کا کیا فائدہ کہ [illegible] ویسے خود وہ تھے کہ رہیں گے کیا اور اگر سو روپے کا مکان [illegible] نہیں ہو گا۔ جھگی ہو گی۔ یا کسی کوارٹر کا ایک کمرہ ہو گا [illegible] پانی گلی میں سے بھر کے خود لانا۔ وہ بھی اس وقت جب [illegible] اور لاش ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ڈر جائے گی۔ [illegible] جانے کا ارادہ بدل دے گی۔ مگر جناب وہ کہنے لگی کہ [illegible] جھگی میں انسان ہوں گے نا آس پاس۔ جن بھوت تو نہیں [illegible] پالنے پڑا کار سامنے ہے اس نے آپ کو بھیج دیا۔“

”مگر ہم نے تو۔ میرا مطلب ہے آپ نے تو [illegible] ہو گیا؟“

”وہ ایسے جی“ الفت خان بولا ”کہ میں نے اسے کہا دیکھو۔ ان کے ساتھ بھی عورتیں ہیں اور تم تو ڈرتی ہو [illegible] ہیں۔ وہ جن بھوتوں کے ساتھ رہنے آئی ہیں۔“ اس نے [illegible] غور کیا۔ بے وقوف نہیں ہیں۔ انھیں سب معلوم ہے [illegible] نہیں ڈرتے۔“

میں نے، محسن نے اور غالب نے ایک دوسرے کو نظروں سے دیکھا۔ کیا واقعی ایسا ہے۔ یعنی ہم ڈر نے [illegible] اور ہم ان کے وجود کو تسلیم کریں یا نہ کریں۔ [illegible] میں کیا رد عمل ہو گا۔ [illegible] باتیں سننے کے بعد [illegible]

”تو جی اس بات نے میری گھر والی کو قائل کیا۔“ الفت [illegible] اپنا بیان جاری رکھا۔ ”اب اگر آپ لوگ [illegible] گے ادھر تو [illegible] گے۔ میری نوکری بھی بچ جائے گی اور میری بیوی بھی [illegible]“

”ہاں... مگر مسئلہ یہ ہے“ میں نے کہا۔ ”تو [illegible] کا بھی۔ وہ کہتے ہیں کہ کوئی آسیب وغیرہ نہیں تھا۔ [illegible] یہ سب خواہ مخواہ مشہور ہو گیا تھا۔“

”ظاہر ہے اب تمہارے مالک مکان کو بھی [illegible] کا تجربہ تمہارے حق میں اچھا نہیں نکلے گا۔“ محسن نے [illegible]

”وہ کیسے جی؟“

”وہ ایسے کہ جب آسیب کا چکر نہیں رہے گا تو [illegible] والے بہت ہوں گے۔ ابھی تو ان تینوں مکانوں کے [illegible] کوئی نہیں رہتا۔ [illegible] تو بھاگ جاتے ہیں۔“

”یہ بھاگ کیسے جاتے ہیں؟“ غالب نے [illegible]

[illegible] ضرور سوال ہے۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”مگر ظاہر ہے [illegible] مالک مکان کو وہ [illegible] سو یا چار پانچ سو میں پھر کرایہ پر دے دے گا۔“

[illegible] الفت خان ”اپنا بندوبست کرو۔“

الفت خان کا چہرہ اتر گیا۔ ”یہ تو آپ نے سچ کہا۔“

”تم فکر مت کرو“ میں نے کہا۔ ”ہم آسیب کے قصے سناتے رہیں گے۔ تمہارے مالک مکان کو بھی۔ اور محلے والوں کو بھی۔“

”بس تم اپنی بیوی کو سمجھا دینا کہ یہ سب ڈرامہ ہے [illegible]

[illegible]“ محسن بولا۔

”وہ تو ابھی [illegible] کہ کون چیخ رہا ہے۔“

”وہ [illegible] رہا تھا میرے [illegible] کا [illegible] جا کے کہا۔

”ہم [illegible] آدمی [illegible] کی طرح چیخ و پکار مچا کے تھوڑا سا ہنگامہ کریں گے۔ پھر کوئی کہانی سنا دیں گے کہ رات کو ایک چھت سے [illegible] ہو گئی۔ وہ شاہ جنات کا داماد تھا۔“ میں نے کہا۔

”ویسے یہ آسیب کا مسئلہ شروع کہاں سے ہوا تھا؟“ غالب بولا۔

”واللہ اعلم جی۔“ الفت خان مسکرایا۔ ”ہم نے تو بس سنا ہے کہ [illegible] ہے۔ کوئی بھوت ہے کوئی کچھ۔ ادھر پشاور میں جناب [illegible] بازار کے اندر بھی ایک مکان ہے۔“

”ایسے مکان ہر شہر میں مل جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”[illegible] ایک بدھ کا مزار ہے۔“ الفت خان بولا۔ ”پہرے داروں کا دکان ہے۔ اس نے بولا کہ ’خان! ادھر سے چلے جاؤ ورنہ نقصان ہو گا۔‘ ہم بولا کہ یارا اللہ مالک ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس نے بتایا کہ ادھر کوئی قبر تھا۔“

”مجھے بھی یہی شک تھا۔“ اکرام شیخ نے کہا۔

”کس کی قبر تھی؟ کسی بزرگ کی؟“

”کوئی ملنگ تھا جی [illegible] میلا کچیلا پڑا رہتا تھا۔ لنگ دھڑنگ۔ کبھی کبھی رات کو جمعرات کی رات کو [illegible] اٹھ کے [illegible] کے بیٹھ جاتا تھا۔ رات بھر قوالی سنتا۔ لوگ جمع ہو جاتے تھے کہ کوئی کچھ سناتا نہیں دیتا تھا سو نعرے مارتا تھا۔ الٹے سیدھے اور [illegible] رہتا تھا۔ اسے [illegible] قوالی ہو رہی ہو۔ لوگ کہتے تھے کہ فرشتے قوالی کرتے ہیں۔ اس نے ایسا ہی کوئی نہیں سنتے۔ یہ بات مشہور ہو گئی کہ [illegible] لوگ نذر نیاز دینے لگے۔ سارے شہر کے اس کے پاس جب [illegible] قوالی سنتے رہتے تھے۔ وہ اکیلا جھومتا رہتا تھا۔ پھر ایک [illegible] مر گیا۔ لوگ آ گئے قوالی ہو گئی [illegible] اور بارہ [illegible] سو رہا تھا۔ اس نے [illegible] آج کوئی نہیں آئے گا۔ لوگ بیٹھے [illegible] معلوم نہیں کس نے مشورہ دیا کہ اسے [illegible] پلاٹ تھا اور مالک معلوم نہیں کہاں تھا۔ لوگوں

نے کسی سے پوچھے بغیر اس کو وہیں دفنا دیا اور قبر پر پھولوں کی چادر چڑھا دی۔ پھر کئی مہینے تو ہر جمعرات کو قوالی ہوتی رہی۔ آخر مالک کو پتا چلا تو وہ روتا پیٹتا آیا۔ جوگیوں نے اسے مار کے بھگا دیا مگر وہ کسی بہت بڑے پولیس افسر کا باپ تھا۔ اس نے درخواست دی اور جناب پھر سرکاری کارروائی ہوئی۔ کے ڈی اے والے آئے اور انھوں نے لاش نکال لی۔ پلاٹ کا قبضہ مالک کو دیا اور اس لاش کو کہیں اور جا کر دفنا دیا۔ مالک نے فوراً تعمیر شروع کروا دی مگر بنیادیں کھودتے ہوئے ایک مزدور مارا گیا۔ اس کے ساتھی نے اسے قتل کر دیا اور بنیادوں میں ہی دفن کر دیا۔ اس کے اوپر کنکریٹ پڑ گیا تو کسی طرح پولیس کو معلوم ہوا۔ وہ پھر آئے اور انھوں نے دیوار گرا دی۔ بنیادیں کھودیں اور لاش نکال لی۔ چھ مہینے بعد مالک مکان مر گیا۔ اس کے بھائی نے پھر کام شروع کرایا۔“

”مالک مکان کیسے مر گیا؟“

”وہ چھت پر سے گر گیا تھا۔“ الفت خان بولا۔ ”واللہ اعلم جناب۔ کہتے ہیں اس کی بیوی نے اسے دھکا دیا تھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور اس کا شوہر جس افسر کا باپ تھا اس کی نظر تھی اس پر۔ ایسا ہی کچھ کچھ پتا نہیں۔ مرنے والے کا بھائی بہت بدمعاش تھا۔ اس نے بھابی سے کہا کہ مجھے سب معلوم ہے۔ بہتر ہے کہ مجھ سے شادی کر لو۔ تو جناب اس طرح یہ مکان بنا۔ مگر اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ اس عورت کے [illegible] اس کے دوسرے شوہر کے ساتھ مل کر عورت کو مروا دیا۔ سنا ہے عورت اس پولیس افسر کو بلیک میل کرتی تھی۔ اس کا دوسرا شوہر راستہ دکھاتا تھا کہ جاؤ اس سے دس ہزار لے آؤ۔ وہ مجبور تھی۔ پولیس افسر بھی مجبور تھا مگر پولیس افسر کبھی مجبور نہیں ہوتا جی۔ اس نے عورت کو ٹھکانے لگوایا اور اس کے قتل کا الزام لگوا دیا دوسرے شوہر پر۔ پھر اس کے پہلے شوہر کا بے غیرت بھائی تھا۔ اسے بھی پھانسی لگ گئی۔ یہ مکان اس وقت تک پورا ہو گیا تھا مگر اس پر سے جو عورت ناجائز طور پر دخل کر لیتی تھی۔ مکان کسی کو نہیں ملا۔ وارث اب اس عورت کا بھائی ہے۔“

”اس کی اولاد کوئی نہیں تھی؟“

”ایک لڑکا تھا۔ اسے ماموں لے گیا تھا۔“ الفت خان بولا۔ ”مگر ماموں بھی بدنیت تھا۔ اس نے بھانجے کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تاکہ وہ بھاگ جائے۔ وہ کہاں تک ذلت اور ظلم برداشت کرتا۔ اس نے ایک دن ماموں کو چاقو مار دیا۔ ماموں مرنے سے تو بچ گیا مگر وہ لڑکا بورسٹل جیل بھیج دیا گیا۔ بچوں کی جیل۔ وہاں ایک سے ایک بدمعاش لڑکا ملا اسے۔ اندر ہی اس نے کوئی قتل کر دیا۔ اب وہ پتا نہیں کب باہر نکلے گا۔ ابھی تو نابالغ ہے، [illegible] بڑا ہو جائے گا۔ مجبوری ہے کر کچھ نہیں سکتا۔“

”چلو ابھی تو تم بے فکر ہو [illegible]“ میں نے کہا۔ ”اور [illegible] جو رہے ساتھ ہیں ان سے ہم نمٹ لیں گے۔“

www.paksociety.com

"یہ سب باتیں کمزور ذہن کے لوگ مشہور کر دیتے ہیں اور بات سے بات نکلتی ہے تو افسانے بن جاتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ یہاں کراچی میں جہاں اب امریکن قونصلیٹ آفس ہے وہ لاشہریوں کا ہے۔" راجا نے کہا۔ "اس کے بارے میں کتنی باتیں مشہور تھیں۔"

"کیا باتیں مشہور تھیں؟" مجھ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یہ کہانی اخباروں میں بھی آئی تھی۔" راجا نے کہا۔ "سنا ہے یہاں پہلے پرانی عمارت سے پہلے کوئی بیرک تھی۔ اس میں چار فوجی رہتے تھے۔ انھوں نے ایک ہی خواب دیکھا۔ معلوم نہیں ایک بار یا کئی بار۔ کوئی فقیر خواب میں ان سے کہتا تھا کہ آگ ہو یا پانی یا خاک۔ بعد میں ایک ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہوا۔ دوسرا سمندر میں غرق ہوا۔ تیسرا لالٹین جلا کے پڑھ رہا تھا کہ لالٹین الٹ گئی اور وہ کوئی جھونپڑا یا لکڑی کا مکان تھا جو آگ کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ جل کے مر گیا۔ چوتھا زلزلے میں زندہ دفن ہوا۔ پھر وہ جگہ کسی پارسی نے خریدی تھی اور اس نے نئی عمارت تو بنوالی مگر اسے رہنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو بچانے کی کوشش میں اس کی دوسری منزل سے گر کے ہلاک ہوا۔ ایک مزدور بھی پراسرار حالات میں مرا۔ تب یہ جگہ آسیب زدہ مشہور ہو گئی اور برسوں ویران پڑی رہی۔"

"یہ جگہ ہے کہاں؟" محسن نے پوچھا۔

"فریئر ہال کے بالکل سامنے۔ اب تو بہت شاندار عمارت بنی ہے۔ جب امریکن حکومت نے یہ جگہ خریدی تو وہ ویران پڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے سستا سودا کر لیا کیونکہ اور کوئی یہ جگہ لیتا نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہ تو توہم پرست لوگ نہیں مگر پھر بھی ایک دلچسپ حادثہ پیش آگیا۔ جس دن اس کا افتتاح ہوا اسی دن کوئی افسر یا خود وزیر لاک ہو گیا۔ اسے تالا توڑ کے نکالا گیا۔ یہ خبر بھی اخبار میں آئی تھی۔ یہاں کے توہم پرستوں نے تو اسے بھی آسیب کا اثر ہی کہا تھا۔ مگر کیا آسیب اور کہاں کا آسیب۔ اب جا کے دیکھو وہاں کتنی رونق ہے اور وہ جگہ کتنی آباد ہے۔"

"کیا وہاں بھی کوئی پیر فقیر دفن تھا؟"

"مجھے کچھ یاد نہیں۔ پرانی بات ہے۔" راجا بولا۔ "مگر غالباً یہ چکر بھی تھا۔"

"اچھا اب ہم چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تو آپ لوگوں نے بتایا ہی نہیں کہ... کہ آپ سب کیا کرتے ہیں؟" الفت خاں بولا۔

"ہم سب کوئی غلط کام نہیں کرتے۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "آپ بے فکر رہیں۔ ورنہ ایسی جگہ اسمگلر اور ڈاکو ہی چھپتے ہیں۔"

"نہیں... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ شرمندہ ہو گیا۔

"اب آپ کے ساتھ رہیں گے تو سب معلوم ہو جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "کون کیا کرتا ہے۔"

ہم بات گول کرنے میں کامیاب رہے اور باہر [illegible] میں کسی نے ابھی الفت خاں کو اپنا نام بھی نہیں بتایا تھا۔ ابھی آسیب زدہ مکان کی ہسٹری معلوم ہوئی تھی اور یہ بات [illegible] آگئی تھی کہ ڈاکٹر انور احمد خاں نے کیوں اس جگہ کو [illegible] موزوں قرار دیا تھا۔

"جاؤ بیٹا اب تو بلا لو انھیں۔" میں نے اپنے گھر [illegible] خواتین کو غیر حاضر پا کے کہا۔

"بڑی بھابی نے کیا انھیں ضبط کر لیا ہے۔" بطور شناخت [illegible] نے کہا۔

"کس چیز کی شناخت؟"

"ہماری ٹیکنیک کی ضمانت۔" غالب بولا۔ [illegible] سے لگتی ہے۔ یہ معاشرے سے نہیں لگتی۔"

راجا کچھ دیر بعد واپس آیا تو پریشان تھا۔

"یا تو وہ کہتی ہیں کہ لڑکیاں جا چکی ہیں [illegible] گئے ہوئے۔" راجا نے کہا۔

"پوچھا انھیں کس کے ساتھ گئی تھیں؟"

"پوچھا تھا۔ بڑی بی نے کہا کہ وہ تو خود ہی چلی گئی تھیں [illegible] کرنا ہے۔" راجا بولا۔ "دیکھو کہیں اور تو نہیں چلی گئیں۔"

"ایسے تو سارے محلے کو عاشق بنا لیں گی [illegible] رہنا ہے۔" محسن نے خفگی سے کہا۔

"زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہو گا۔" غالب [illegible]

ہم نے اوپر جا کے دیکھا مگر وہ اوپر بھی نہیں تھیں۔ نیچے آکے دیکھا مگر وہ کہیں بھی نہیں تھیں [illegible] کے کہنے کے مطابق تو انھوں نے دونوں کو گھر میں داخل ہوتے [illegible]

قسم

"کوئی ایسی جگہ سوچ سکتے ہو [illegible] جہاں وہ جا سکتی ہوں؟" میں نے کسی کو مخاطب کیے بغیر [illegible] جواب سب دے سکتے تھے جو ایک بھی [illegible] تھا۔ غالب نے نفی میں سر ہلایا۔

محسن نے کہا۔ "یوں اچانک...!"

"اور ہمیں بتائے بغیر۔" مجھ نے کہا۔

"یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟ وہ جو سامنے [illegible] ان کا کہنا کیا ہے؟ اندازاً کتنی دیر ہوئی ہو گی؟"

"چلو انھی سے پوچھ لیتے ہیں۔" محسن بولا۔

تشویش سب کو ایک سی تھی اور میرا خیال ہے [illegible] سب کو صاف محسوس ہو رہا تھا مگر فی الوقت کوئی [illegible] نکالنا نہیں چاہتا تھا جو تو سوشکی ہو اور [illegible] کا سبب [illegible] بڑی بی نہ جانے کیوں دروازے کا آدھا [illegible] رہی تھیں۔ ہم نے قریب جا کے سلام کیا۔

"اے نیلی چھوڑ دو!" انھوں نے پان کی پیک کو شش کے اندر [illegible] "مل گئیں چھوریاں؟"

"کہاں خالہ۔ مل گئی ہوتیں تو پھر آپ سے یہ پوچھنے کیوں آتے۔" [illegible] میں نے کہا۔

"اے لو۔ میں تو بتا چکی... اور کیا بتاؤں؟"

"جی... صرف اتنا بتا دیں کہ... کہ کیا آپ نے خود دیکھا تھا انھیں سامنے والے گھر کے اندر جاتے ہوئے؟"

"اے اور کیا۔ میں تو یہاں کھڑی رہتی ہوں۔ میں نے کہا تو از ماشہ [illegible] مجھے پروا انکی [illegible] جو کہا [illegible] خواب ہے [illegible] انھوں نے [illegible] کے [illegible] ایک [illegible] میں نے کہا تم چھوریاں اندر ہی جا رہی ہو۔ پھر یہ دروازہ بند کر لوں گی... اور میں نے بتا بھی دیا تھا [illegible] کوئی بات ہو تو آواز دے لینا۔ پھر جب [illegible] انھوں نے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے تاکید کی تھی کہ جب تک تمہارے گھر والے نہ آئیں بند کیے رکھنا..."

"خالہ! یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟ 'اندازاً'؟" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ... کوئی گھنٹہ بھر تو ہو گیا۔" انھوں نے سوچتے ہوئے کہا۔ [illegible] آنے والی... آتے ہی وقت تو ہو گیا۔ میں نے نماز پڑھی تھی پھر [illegible] مرغیوں کو... انھوں نے جو دانہ کھلایا... تھے تب سے [illegible] ہوا کہ یہ [illegible] بات ضرور ہے۔

"اے شکیں کیوں اتری ہوئی ہیں۔ کیا کوئی ایسی ویسی بات ہے؟" [illegible] "چھوریاں گھر میں نہیں ہیں کیا؟"

"گھر میں تو نہیں ہیں۔ لیکن ایسی ویسی بات کوئی نہیں شاید [illegible]"

"ناہید... میں نے تو منع کیا تھا۔ اگر کوئی بلا ہے تو جا ماست۔ یہاں [illegible] سر نہ بیا جاتو۔ کون منحوس دل میں کیا رکھتا ہے اور کس سے ملا جلتا ہے..."

"وہ نہ بازار چلی گئی ہوں گی؟" محسن نے اچانک اپنے لہجے میں تھکاوٹ لاتے ہوئے کہا۔ "اپنے جملے کے ساتھ؟"

"ہاں... گھر تو رکھی تھیں کہ بہت کچھ لانا ہے۔ گھر کا سودا سلف [illegible] منہ کو ان کی تسلی ہو گئی۔"

"ٹھیک ہے خالہ آپ پریشان نہ ہوں ہم تو بس ایسے ہی پوچھ [illegible]" محسن بولا۔

"اے بیٹا میرا تو کلیجا دھک دھک کر رہا ہے۔ چھوریاں اکیلی [illegible] دو ہی جنا۔ ورنہ بولنا تھا مجھے۔ وہ کہہ گئے مجھے۔" خالہ نے کہا۔ "اور بات [illegible] ... اسے سمجھا تھا کہ بھی بتا جاتیں؟"

"ہاں جی بھی ہیں ناں خالہ۔" میں نے کہا۔

"اچھا لیے تو یوں بولا ہوں۔" غالب نے میری بات پکڑ لی۔ "ہوتیں بچاری آج کل کی لڑکیاں جیسی تو میں کاہے کو فکر کرتی۔ مگر اللہ بری نظر سے بچائے۔ دونوں اتی معصوم اور بھولی بھالی ہیں ابھی۔"

"وہ... خیر... اتنی نادان بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"ماشاء اللہ۔" محسن بولا۔ "ہوشیار ہیں۔"

ہم فوراً واپس ہوئے۔ گھر پہنچنے تک ہم نے نہ پلٹ کے دیکھا اور نہ کوئی بات کی۔ مجھے یقین تھا کہ خالہ اب ہمیں اسی طرح دیکھ رہی ہوں گی جیسے وہ ناہید اور سعدیہ کو دیکھتی رہی تھیں۔ گھر کا دروازہ بند کرتے وقت میں نے دیکھا تو... وہ واقعی دروازے کی اوٹ سے جھانک رہی تھیں۔

ہماری صورت دیکھتے ہی باقی تینوں حضرات کے چہرے بھی اتر گئے۔ ہم کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔

پھر غالب نے کہا۔ "مجھے دال میں کالا نظر آتا ہے۔"

"سفید کیسے نظر آ رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہم نے بڑی بی سے تو چھپا لیا کہ وہ غائب ہو گئی ہیں۔" محسن بولا۔ "ورنہ آتے ہی مشکوک حالات پیدا کرنا چاہتی تھیں یا ایسا ہونا تھا۔"

"اور مکان کے آسیب زدہ ہونے پر یقین رکھنے والے تمام تک قائل ہو جاتے کہ یہ سب جنات نے کیا۔"

"فوراً پھیل جاتی بات کہ جنات کر لے گئے وار آئے تھے۔ آئے یہ نہیں ہوا کہ جن بھوت انھیں اٹھا لے گئے۔ گھر کی دو لڑکیوں کو۔" میں نے کہا۔ "گمنام رہنے کی خواہش دھری رہ جاتی۔ شام تک تو اتنی شہرت ہو جاتی کہ اخبار والے انٹرویو لینے آ جاتے۔"

"سوال یہ ہے کہ اب کیا کریں؟ صرف انتظار...؟"

"انتظار کے لیے امید ضروری ہے۔" غالب نے کہا۔ "اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا آنا مرضی کی بات نہیں جیسے ان کا نہ جانا ان کی مرضی کی بات نہیں تھا۔ ہماری عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی نے انھیں اغوا کر لیا۔"

"ہاں۔ ورنہ انھیں کہاں جانا تھا۔"

"غلطی ہم سے ہوئی۔ کوئی ہمارے تعاقب میں۔ ہمارا وہاں تک جانا بے خبر نہ ہو سکا۔"

"پھر اب کیا کریں؟ یہ بھی تو کہو۔" غالب نے جھنجلا کے کہا۔

"صرف تیا کی آرزوؤں سے اور باتوں سے تو کچھ ہو گا نہیں۔"

"تم بتاؤ کیا کریں؟" محسن نے کہا۔ "کہاں تلاش کرنے جائیں انھیں؟"

"ہاں۔ یہ تو معلوم ہے کہ انھیں جبراً کوئی لے گیا ہو گا۔ جو کچھ بھی ہوا ہو گا اچانک اور بے خبری میں ہوا ہو گا۔ ورنہ ناہید آسانی سے قابو میں آنے والی لڑکی نہیں ہے۔ وہ طاقت میں ان سے زیادہ ہوں گے۔ یا انھوں نے موقع ہی نہیں دیا ہو گا کہ وہ اپنے دفاع میں کچھ کر سکیں۔" اکرام سنجیدگی سے بولا۔

www.paksociety.com

"حیرت کی بات ہے کہ کسی نے دیکھا نہیں؟"

"یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ باہر سے کون دیکھنے والا۔ ایک گاڑی خاموشی سے آ کر رکی ہو گی۔ دو لڑکیوں کو دروازے سے باہر لے جا کر کار میں ڈالنے کے لیے دو منٹ بھی بہت ہوتے ہیں اور گاڑی ایک بار چل پڑے تو پھر کسی کو گاڑی کے سوا کیا نظر آ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم لوگ شیخوں میں ذرا سا اعتراض [illegible] کا عمل [illegible] ہوں۔ گاڑی میں کچھ تو دیکھا ہی تھا۔" اکرام شیخ اٹھ کھڑا ہوا۔

دس منٹ بعد اس نے متعدد اہم انکشافات کیے جو ناقابل تردید شواہد پر مبنی تھے۔ نمبر ایک یہ کہ عین دروازے کے قریب دائیں اور بائیں جانب کچھ اجنبی جوتوں کے نشانات تھے۔ اس نے باری باری ہم سب کے جوتوں کے سول دیکھے۔ سب کے سول سادہ تھے اور گھسے ہوئے تھے لیکن فرش پر گرد کی تہ میں دو پرنٹ نئے جوتوں کے تھے۔ دونوں مردانہ جوتوں کے نشانات تھے۔ ایک پر چھوٹے چھوٹے گول حلقے بنے ہوئے تھے۔ دوسرے کے سول پر ترچھی لہریں سی تھیں۔ جیسے اردو میں آٹھ کے ہندسے کو ملا کے لکھا جائے۔ پرنٹ بہت صاف تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ نئے جوتے کا سول ہے۔ شیخ نے اسے ٹائر سول والی پشاوری چپل قرار دیا۔ ہم نے اس کی دانش کو چیلنج نہیں کیا کیونکہ سب جانتے تھے کہ وہ ایک پیشہ ور شوٹر تھا جس کو سراغ لگانے کا عملی تجربہ تھا۔ اس نے خاصے یقین کے ساتھ کہا کہ اندر صرف دو افراد تھے۔ پھر اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے فرش کو زیادہ غور سے دیکھا اور دوسرا نتیجہ اخذ کیا کہ کشمکش یا مزاحمت کی نوبت نہیں آئی۔ ورنہ جوتوں کے بے ترتیب اور ترچھے نشانات ہوتے۔ دروازے کے دونوں طرف آخری کونے تک گرد کی تہ اسی طرح ہموار تھی۔

"اگر مزاحمت کا موقع ملتا تو مقابلہ ہوتا اور ایک طرف دونوں تھیں [illegible] ہوں تو یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کی ایک چوڑی کا بھی ٹکڑا نہ ملے۔ جب کوئی کسی پر حملہ کرتا ہے تو بے خبری میں مارا جانے والا بھی غیر ارادی طور پر اپنے دفاع میں ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اگر ان پر وار کیا جاتا تو وہ بھی ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرتیں۔ وار ہاتھ پر پڑتا تب بھی بہت سی چوڑیاں ٹوٹتیں اور اگر کوئی پہلے ان کی کلائی پکڑ کے بے بس کرتا تب بھی [illegible]۔ ایسا نہیں ہوا۔ یہاں ایک بھی چوڑی کا ٹکڑا نہیں ہے۔"

"نازو نے زرد چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔" غالب نے کہا۔ میں نے اور محسن نے اسے گھور کے دیکھا۔ وہ خاصا خفیف ہوا۔

"اور موہنی کی چوڑیوں کا رنگ کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"وہ... غالباً سفید اور کاسنی۔" وہ مزید بوکھلایا کیونکہ یہ بات غلط تھی۔ اس کی نظر میں تو صرف نازو کی کلائی کا اور اس کی چوڑیوں کے رنگ کا منظر سمایا ہوا تھا۔

"موہنی نے ہرے رنگ کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔" محسن نے اطمینان سے کہا۔

"یار! رنگ سے کیا فرق پڑتا ہے جو تم لوگ [illegible]" شیخ جھلا کے بولا۔ "یہاں ورنہ بھی [illegible] رنگ کے [illegible] بات تھی جب ہم سے چوڑی کا ایک بھی ٹکڑا نہیں [illegible] اور ثابت ہوتا ہے؟"

"یہ کہ انھیں ایک دم ناک آؤٹ کر دیا گیا [illegible] رومال وغیرہ رکھ کے بے ہوش کر دیا گیا۔" میں نے [illegible] "پھر آگے ٹرک چلانے والی کسی کار میں انھیں ڈال کے [illegible] باہر سراغ تلاش کر کے اس نظریے کی تصدیق [illegible]"

"میں اب یہی سوچ رہا تھا کہ ان دو [illegible] دیکھوں۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن اب اس سے زیادہ [illegible] ہم میں سے کوئی ان کے ٹرک پر نظر رکھے ہوئے [illegible] نازو اور موہنی کو وہی لوگ لے گئے ہیں اور وہ [illegible] تو پھر صاف ظاہر ہے کہ انھیں اب تک سب کچھ [illegible] اپنا ٹرک ابھی لے جا سکتے ہیں اور جا رہا بھی [illegible] کار میں [illegible] سب کو تباہ کرنا چاہیں تو یہ بھی کر سکتے ہیں۔ مختصر [illegible] بارگین کر سکتے ہیں۔"

میں نے اس کی تائید کی۔ "ہاں۔ اگر میں [illegible] کچھ دیر انتظار کر لیتے۔"

"آپ لوگ اس کے ہر پہلو کو نظر انداز کر رہے ہیں [illegible]" نے کہا۔ "کیا ان کے یہاں تک آ پہنچنے کی کوئی اور صورت نہیں [illegible] امکان ہے تو صرف یہ کہ انھوں نے ہمارا تعاقب کیا۔"

"دیگر امکانات پر آپ روشنی ڈالیے۔"

"بابا روشنی کیا ڈالیں۔ ہم [illegible] ایک بہت اہم بات بھول [illegible] ہیں۔ اور وہ یہ کہ ہم نے دونوں لڑکیوں کو پہلے [illegible] ہمارے ساتھ نہیں آئی تھیں کہ کسی نے ہمارا پیچھا کیا اور یہاں [illegible] انھیں لے گیا۔ میں اس امکان کو بھی اتنا ہی اہم سمجھتا [illegible] انھیں کار میں یہاں آتے وقت دیکھا۔ راستے میں [illegible] جتنی گاڑیاں تھیں، ان میں کوئی گاڑی ایسی نہیں تھی جس [illegible] موجود تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی اور ہماری بدقسمتی کہ اتفاق [illegible] نظر نے تینوں میں سے کسی کو شناخت کر لیا [illegible] کار چلانے والے کو اگر نازو کو پہچانا یا موہنی کو [illegible] ہے کہ وہ دلاور [illegible] عبداللہ [illegible] کا آدمی تھا۔ [illegible] وہ کار کے پیچھے لگ گئے [illegible] اکیلی رہ گئیں تو انھیں لے گئے لیکن ایک صورت [illegible] فرض کرو کسی نے صرف موہنی کو دیکھا۔ موہنی [illegible] نہیں۔ وہ بھی ہمارے دشمن ہیں مگر [illegible] بہت بعد میں شروع ہوئی۔ وہ تو سب سے [illegible]

موہنی جس [illegible] پھر اس نے سنڈ بدل لی۔ اپنوں کی نظر میں غدار ہو گئی اور [illegible] ہمیں دیکھ لیا۔ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے [illegible] کسی نے موہنی کو دیکھ لیا [illegible] واقف نہیں۔ وہ باہر کے آدمی ہیں جو ہمارے ملک میں گھس آئے ہیں اور اندر کے غداروں کی مدد سے اپنی تخریبی کارروائی [illegible] کی صورت میں ہی۔"

"شیخ صاحب! کیا فرماتے ہیں آپ بیچ اس مسئلے کے؟" میں نے کہا۔ "کہ غالب تو آپ سے زیادہ دور کی کوڑی لایا ہے۔"

"یہ دور کی کوڑی نہیں۔ خاصی معقول بات ہے۔" شیخ نے [illegible] "خفت کے بجائے [illegible] ہمارے ساتھ شامل ہو کے موہنی نے خود کو بہت [illegible] دشمن کی نظر میں [illegible] ہے کہ غداری کے جرم کی سزا [illegible] نازو سے زیادہ سنگین جرم موہنی کا سمجھا جائے گا اگر اسے دشمن کے ایجنٹ لے گئے ہیں۔"

"[illegible] ایک اور امکان عرض کرتا ہوں۔" غالب نے [illegible] "نازو کی تلاش [illegible] یہاں پہنچا [illegible] خود بخود [illegible] وہ بھی تھا [illegible] ہیں اور فرار ہو کے [illegible] غیرت پر [illegible] ہے۔ پولیس بھی [illegible] ہے۔ ہر جگہ گھوم رہا ہے۔ نازو کی اطلاع انھیں سب سے زیادہ مطلوب ہے تاکہ وہ اس کو بھا [illegible] گیسوں کے ساتھ [illegible] جائے [illegible]

[illegible] ساتھ تھی تو جو نازو کا مقصد وہ اس کا۔"

غالب نے سب کو کنفیوژن میں ڈال دیا۔ پہلے سب متفق تھے [illegible] شمار کیے گئے۔ اس نے تردید کی گنجائش نہ چھوڑی [illegible] نظر انداز نہیں ہو سکتے تھے یہ ہم شک کرتے ہیں۔ دوسری اور تیسری قسم [illegible] نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔

"ایک بار پھر وہی سوال اٹھتا ہے۔" خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد محسن بولا۔ "کہ ہم کیا کریں؟ پھر کریں کیونکہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔"

"ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟" راجا بولا۔

"[illegible] ٹرک کو مت چھوڑو۔ ایک جال بچھا دیا [illegible]" اکرام شیخ بولا۔ "اس جال پر نظر رکھو۔ یہ نہ ہو [illegible] جال سمیت بھاگ جائے۔"

"[illegible] صرف انتظار کر سکتے ہیں۔"

"[illegible] بات کا ذکر وہ آ گئیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے [illegible] ایک خونریز جنگ لڑی جائے یہاں اور ہم محصور ہو کے [illegible] اطلاعات [illegible] فوراً منتشر ہو جانا چاہیے اور یہاں سے تو [illegible] جانا چاہیے۔"

"[illegible] میں نے کہا۔ "دروازہ بند ہے نا؟"

"[illegible]" محسن بولا۔

"[illegible] دیکھو۔ آگے پیچھے سب ٹھیک ہے؟"

"سب ٹھیک ہے۔" محسن نے تصدیق کی۔

"بس تو دروازے کو بند رہنے دو۔ اندر سے کنڈی لگا دو۔" میں نے کہا۔ "کوئی آنا چاہے تو خاموشی سے آ جائے۔ تم اور غالب" میں نے محسن کی طرف اشارہ کیا۔ "چھت پر پوزیشن سنبھالو۔ ایک آگے نظر رکھے گا دوسرا پیچھے۔ ظاہر ہے دائیں بائیں سے کوئی نہیں آ سکتا۔ راجا! تم اپنا [illegible] اور یار [illegible] کھیل میں سب سے اہم اور خطرناک کردار تمھارا ہے۔ تم اپنا فقیری لباس پہن کے جاؤ اور ٹرک کے قریب موجود رہو۔ یہ فیصلہ تم خود کر سکتے ہو کہ تمھارا [illegible] ایک ہی جگہ قیام مناسب ہو گا یا [illegible]"

"یا میرے مولا۔ دنیا سے کنوارا ہی اٹھانا۔ نہ مجھے نہ میری [illegible] پوری کرو۔" وہ ٹھنڈا سانس لے کے بولا۔

"جلدی کرو۔ لباس بدلو اور جاؤ۔"

"دس منٹ تو دو یار زندگی کے۔" وہ بولا۔

"ہاں۔ دس منٹ میں۔" محسن [illegible] سامنے غالب کے پاس جا [illegible] میں نے کہا۔ "ایک تو انھیں اطمینان سے بتا کر [illegible] ذرا عجیب [illegible] ڈرتے ہیں لہجے۔ پھر ان سے [illegible] کیسی ہوں تو کام بتا جانے گا۔ یہاں کڑاکی کے بہت [illegible] پڑے رہیں۔"

محسن کو وضاحت کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ وہ میرا مطلب سمجھ کے فوراً نکل گیا۔ راجا بھی فقیرانہ لباس اور حلیہ بدلنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔

"اب رہ گئے میں اور تم شیخ صاحب۔" میں نے کہا۔ "تو ہم ساتھ والے گھر میں کود سکتے ہیں۔ ایک طرف تو ہمارا یار الفت خان ہے۔ دوسری طرف کا مکان بھی خالی ہے۔ ہم چھت سے چھت پر جا سکتے ہیں۔"

"یہ راجا تو سالا [illegible] کھائے گا۔ ہم لوگ کیا بھوکے بیٹھے [illegible] پر؟"

"کم سے کم رات ہونے تک تو فاقہ ہو گا۔" میں نے کہا۔ "اور میری چھٹی حس بتاتی ہے کہ رات سے پہلے بھی کچھ ہو گا۔"

"اچھا یا برا؟"

"امید اچھے کی رکھنی چاہیے۔ برے کے لیے ذہن تیار رہنا چاہیے کہ جو اس کی مرضی۔" میں نے کہا۔

"حیرت ہے کہ میری چھٹی حس بھی یہی عرض کر رہی ہے آج۔" غالب نے کہا۔ "کہ کوئی پیغام ضرور ملے گا۔ یا انھیں [illegible] ملے گا۔ [illegible] حکمت عملی سے اتفاق کرتا ہوں [illegible] کے تو [illegible] انتظار کرنا چاہیے صبر اور حوصلے کے ساتھ۔"

"اور بھوکا بھی رہنا چاہیے [illegible] رہنا چاہیے یہ تو نہیں کہتی نا چھٹی حس۔" شیخ بولا۔ "میں کہتا ہوں جب راجا باہر جا ہی رہا ہے تو کچھ [illegible] ایک پھیرا لگا کے ادھر [illegible] آ سکتا [illegible]"

"وہ راجا کی مرضی۔" میں نے کہا۔ "مگر راجا کو ہم زیادہ [illegible]

www.paksociety.com

بھیج سکتے کھلانے کے لیے۔"

"ارے بابا! فقیر کے پیٹ بھر دو گے یہ دعا ہے۔" اچانک ایک فقیر ان کے لنگڑاتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کی حالت قابلِ رحم نظر آ رہی تھی۔ "ہو سکے تو کھانا... بعد تم بھی کھا لینا۔ بچا کھچا... اچھا۔"

"ایک منٹ ٹھہرو۔" میں نے کہا۔ "محسن کو آنے دو۔"

محسن تھوڑی دیر کو گداگر کی طرح گھومتا اور گلیوں میں... نمودار ہوا۔ "بچے مٹھیاں بڑی شریر ہیں۔" وہ خالہ کے انداز میں نقل اتار کے بولا۔ جانے کے لیے ادھر ادھر بکھرے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں میں سے دو اٹھا لیے۔ یہ ٹکڑے لکڑی کے دروازے بنانے وقت کاٹ چھانٹ میں بچ رہے ہوں گے جو بے مصرف سمجھ کے چھوڑ دیے گئے تھے کہ مکان کی صفائی ہوگی تو یہ کوڑا بھی اٹھا لیا جائے گا۔

آدھے انچ موٹے ٹکڑے میں سے دو انچ لمبی کیل پوری گولائی کے ساتھ ڈیڑھ انچ بلند رہی۔ اب ان ٹکڑوں کو فرش پر سیدھا رکھا جاتا تو کیل کا نوکیلا حصہ اوپر اٹھا رہتا ۔۔۔ ٹائروں کو پنکچر کرنے کے لیے یہ نسخہ ہم پہلے بھی آزما چکے تھے لیکن دوبارہ مجھے ترکیب استعمال کرنی پڑی۔

"ان میں سے ایک کو تم پیچھے والے ٹائر کے عین پیچھے اس طرح فٹ کرو گے کہ ٹرک چلے تو کیل ٹائر میں گھس جائے۔ ٹرک میں پچھلی طرف چار پہیے ہوتے ہیں۔ دو ایک طرف، دو دوسری طرف۔ چنانچہ کسی ایک ٹائر کے فلیٹ ہونے سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ ٹرک دوسرے ٹائر پر چلتا رہتا ہے، اس لیے یہ دو ٹکڑے ایک ہی جانب کے دو ٹائروں کو پنکچر کرنے کے لیے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم پیچھے بیٹھو وہ سائڈ منتخب کرو جو ڈرائیور کے بائیں ہاتھ پر ہوتی ہے۔ دائیں طرف آگے بیٹھتا ہے۔ اس کے بالکل پیچھے والے دونوں پہیوں کو چھوڑ دو۔ دوسری طرف کے پہیوں کو پنکچر کرو۔ اگرچہ اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ... ڈرائیور کچھ چیک کرے مگر اس کی نظر اتفاق سے پڑ سکتی ہے جہاں میں بتا رہا ہوں وہاں اس کی نگاہ نہیں جا سکتی۔ لکڑی کے یہ ٹکڑے بالکل نئے اور چکیلے ہیں۔ ان کو تھوڑا سا میلا کر دینا یا ان پر تھوڑی سی مٹی ڈال دینا۔"

"اس کو اردو میں کہتے ہیں دامِ ہم رنگِ زمین۔" غالب نے کہا۔

"یہ اردو نہیں فارسی ہے۔" محسن نے اس کی تردید کی۔

"تم دونوں دھیان سے سنو۔" میں نے کہا۔ "میری بات دھیان سے سنو اگر کوئی ٹرک لے جانے کے لیے آئے گا تو تمھیں فوراً معلوم ہو جائے گا کیونکہ تم یہیں کہیں آس پاس موجود ہو گے لیکن تمھارے پاس ہمیں فوراً مطلع کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ مطلب یہ کہ نہ تم اس ٹرک لے جانے والے کو روک سکتے ہو نہ ہمیں فون کر سکتے ہو۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی روانگی کو مؤخر کر دیا جائے۔ ٹائر پنکچر ہوں گے تو اسے بدلنے بھی پڑیں گے۔ تم آدھی دیر میں ہمیں اطلاع دینے کے لیے آ سکتے ہو۔۔۔ باقی کارروائی

پھر ہم کر سکتے ہیں۔ اب جاؤ۔"

"اللہ تمھارا بھلا کرے بابا۔ فقیر کو خالی پیٹ لوٹا دیا جاتے جاتے ہوئے کہا۔

"ابے بابا! دیکھ۔ ہم بھی صدا دیتا جا۔ جو کھانے میں ملے اس میں سے کچھ ہمارے لیے بھی لے آنا۔" محسن بولا۔

"فقیر پہلے خود لنچ کرے گا، ویسے آج شبِ برات ہے حلوا ہی ملے گا۔" وہ بولا اور باہر نکل گیا۔

"آج شبِ برات ہے؟" میں نے حیرانی اور افسوس سے کہا۔ "عجیب بات ہے کہ ہمیں یاد ہی نہیں تھا۔"

"یاد آتا بھی تو ہم کون سا حلوا پکا لیتے۔"

"حلوا تو بہانہ ہے خوشی منانے کا۔ مگر دیکھو... ہم سا الجھے ہوئے ہیں کہ دنیا کی خبر ہے نہ دنیا کی۔" میں نے کہا۔ "تمہیں یاد... حلوے پکائے جائیں گے طرح طرح کے، پٹاخے چلیں گے اور موم بتیاں جلیں گی۔ بڑے قبرستانوں کا رخ کریں گے... زندگی اور رحمت و برکت کے لیے عبادت کریں گے... بچا لیں گے جس نے انھیں اپنی ہر نعمت سے نوازا ہے۔ ہر فقیر کی... ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ خدا ہمیں توفیق دے...

"اس کا احسان ہے کہ ہم آج تک ناکامی سے..." محسن بولا۔

"جب ہمارے گھر ہوں گے۔" غالب بولا اور پھر چپ ہو گیا۔

"جب؟" میں نے کہا۔ "مگر یار وہ... سے کیا حاصل۔ چھوڑو شیخ صاحب، ہم اپنا... اکرام شیخ نے سر ہلایا اور سہارا تھام دیا۔ ہم دونوں ساتھ والے گھر کی چھت پر اتر گئے۔ دونوں چھتیں... انھیں جدا کرنے والی دیوار مشکل سے چند فٹ اونچی تھی۔

یہ بھی نیا مکان تھا اور آگرہ ہم بہت لوگوں کی... آباد نہ ہو سکا تھا۔ ہم نیچے جا کے بھی دیکھ سکتے تھے لیکن... تم ہوتا۔ خالی مکان میں ویرانی کے سوا دیکھنے کو کیا تھا... کے ساتھ گھوم کے دیکھا۔ گلی کی سمت دیوار... چنانچہ ہم میں سے ایک آسانی سے ادھر نگاہ رکھ سکتا تھا... بائیں جانب مکانوں کا سلسلہ تھا اور پیچھے... اسے عموماً گندی گلی کہا جاتا ہے کیونکہ... کوشش کرتی ہیں اور جتنا بھی کوڑا کرکٹ ہے وہ... کے باہر پھینک دیتی ہیں، خواہ وہ گلی کے وسط میں ہو... اور پھر رہا سہا کسر صفائی نہ کرنے والے پوری کر دیتے ہیں... واقعی گندگی رہتی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ اس طرف سے... کوئی..."

"میں نے اس کے خیال کی تردید نہیں کی۔" ہاں۔ اتنا کوڑا ہے اور پانی بھرا ہوا ہے۔"

"بہتر ہو گا کہ ایک سامنے گلی کو دیکھے، دوسرا ساتھ والی چھت پر بیٹھ سا تھیوں کو۔ خدا نخواستہ وہ کسی مشکل میں پھنس گئے تو ہم ان کی مدد کر سکیں گے۔"

ساتھ والی چھت پہ غالب اور محسن نے کمانڈ پوزیشن سنبھال لی تھی۔ ہم میں سے کوئی بھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کیا ہو گا۔ کون ہمارے لیے پیغام لے کر آئے گا یا قزاقی بھر کے مسلح افراد کو ساتھ لائے گا۔

ٹرک صرف ایک گلی کے فرق سے اور اس جگہ سے سو گز دور کھڑا ہوا تھا مگر ہم میں سے کوئی اسے براہِ راست نہیں دیکھ سکتا تھا۔ درمیان میں جو گلی تھی اس کے مکانات حائل تھے جو دو منزلہ تھے۔ ایک منزلہ ہوتے تو شاید ٹرک کا کچھ حصہ ہم دیکھ سکتے۔

"یار شیخ! تم پریشان نظر آ رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"پریشان تو ہوں۔ مگر وہ میں ظاہر نہیں کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "پریشانی کا اظہار اگر میں نے رو پیٹ کے اور شور مچا کے کروں تو اس سے مجھے یا تمھیں کیا ملے گا؟"

"میرا دل گواہی دیتا ہے کہ نازو اور سوزی کے بارے میں کوئی اطلاع ضرور آئے گی۔ خواہ کسی طرف سے بھی آئے۔" میں نے کہا۔

"یہ تمھاری باتیں مجھے بھی اطمینان دیتی ہیں۔" وہ بولا۔

"نازو غیر معمولی ذہانت اور ہمت کی مالک ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر بھی ہے تو وہ لڑکی۔"

"ہاں، لڑکی ہو کر بعض اوقات کتنا غلط ہو جاتا ہے۔ مرد اتنا نہیں سوچتا۔" میں نے کہا۔

"پھر بھی اتنا ٹھیک ہے کہ اس نے ہمارا ساتھ دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ رابعہ خوبصورت ہے مگر نازو کے علاوہ حسن سے بھی بہت کچھ جیسے... رشتہ نازک سے ہوتے گزرے دن اور جوانی ابھی تک طاری ہے۔"

"ہاں۔ دوسری جنگِ عظیم... ہے، انسان کی تاریخ کی دوسری جنگ... ایک محبت کی جنگ تھی جس میں اس نے سہراب دارا کا ساتھ دیا... محبت ترین حالات میں دوسری نفرت کی جنگ تھی جس میں... لے... نے... کے دشمنوں سے پھر ہمارے دشمنوں سے وہ ایک بلند حوصلہ عورت تھی۔ جو اس سے زیادہ بہادر ثابت ہوئی۔ اس نے دشمن کی نفرت کا جنگ... اور وہ... اس کے اعصاب اتنے مضبوط نہ... نئے حالات کا مقابلہ کر سکتی۔ مگر مجھے امید ہے کہ... پھر ٹھیک ہو کے ہمارے ساتھ آ ملے گی۔"

"تم کچھ نیا کر سکتے تھے، آخر کیوں؟" شیخ نے اچانک کہا۔

"میں... کر سکتا ہوں؟" میں نے مسکرا کے کہا۔ "مگر چھوڑو اس کی بات تم کرو۔"

"میں اس کی کیا بات کروں۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "وہ تو پاگل ہے تمھارے پیچھے۔ کون لڑکی وہ سب کچھ نہیں کر سکتی جو اس نے تمھاری خاطر کیا۔ کتنا طویل سفر طے کیا اس نے اور یہ سفر آسان بھی نہیں تھا۔"

"ہر مسافر کو منزل مراد نہیں ملتی۔ یا صرف چاہنے سے مل جاتی ہے۔ خواہ جذبہ کتنا ہی صادق کیوں نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"تم تو دل کی بات کہہ رہے ہو۔ اپنے الفاظ میں کہو مثال یار فقط آرزو کی بات نہیں۔" شیخ نے کہا۔ "مگر یہاں خواہش کے ساتھ جدوجہد بھی ہے۔ کسی نے جان کی بازی لگا دی۔"

"دیکھو دوست! یہ ہو سکتا ہے کہ جدوجہد اور محنت سے آدمی چاند ستاروں کو تسخیر کر لے۔ ذرے کا جگر پاش کرے اور اس سے توانائی پیدا کرے۔ مگر یہ جو کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے والی بات ہے نا، یہ مختلف ہے۔"

"وہی فلسفہ کہ محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔"

"کیا تم اسے غلط کہہ سکتے ہو؟" میں نے اس کے سینے پر انگلی رکھ کے کہا۔ "زمانے کی نہیں، اپنی بات کرو۔"

"اپنی میں کیا بات کروں۔ وہ تو مجھ سے بات بھی بس مروت میں کر لیتی ہے۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "اب تمھاری بات ہو تو وہ مسلسل بولتی ہے۔ اپنے اور تمھارے بچپن کے ان گنت واقعات، چھوٹی چھوٹی باتیں۔ لڑائی جھگڑوں کے قصے۔ روٹھنے منانے اور کبھی پھر بات نہ کرنے کی سوگند کھا کے خود ہی بات کرنے کے واقعات۔ میں تو حیران ہوتا ہوں کہ اسے اتنی پرانی باتیں اتنی تفصیل سے کیسے یاد ہیں جیسے یہ کل کی بات ہو۔"

"کیا تمھیں اپنا بچپن یاد نہیں؟"

"یاد تو ہے لیکن یادوں کے نقوش بہت دھندلے اور مٹے مٹے سے ہیں۔ ادھورے بھی۔" وہ بولا۔ "سوزی کی طرح نہیں کہ جیسے چھوٹی سے چھوٹی بات یاد ہے۔ مثلاً یہ کہ تمھیں کیا پسند تھا اور کیا ناپسند۔"

"کیا پسند تھا مجھے؟"

"تمھیں... ایک تو گاجر کا حلوا، جو اس کی ماں بناتی تھیں اور تل کے لڈو جو اس کی خالہ بنا کے بھیجتی تھیں گاؤں سے... ایک بار تم نے اسے مجبور کیا تھا کہ ماں کو کہہ کر تم اس کے لیے مرغی کی ٹانگ... گئے تھے۔ اس نے کہا کہ یہ ہم نہیں کھاتے۔ تم آگ بگولہ ہو گئے... اس نے کہا کہ ہمارے دھرم میں یہ پاپ ہے۔ تو تم نے کہا کہ ایک چچا کر دو میری خاطر اور یہ بھی تو بہت پاپ ہے۔ یوں گئے تم نے یاد آج تک کوئی پاپ نہیں کیا؟ اور اس دلیل سے قائل ہو کے اس نے تمھارے سامنے اقرار کیا کہ پاپ تو پہلے بھی کیے ہیں مثلاً ایک دفعہ ماں کے

www.paksociety.com

سامنے رام اور سیتا جی کے بارے میں کوئی بہت غلط سوال کیا تھا۔ اور ایک بار ایک چیز چرائی تھی جو اس کی تو نہیں تھی، مندر میں ملی تھی؟ جو اس نے چپکے سے اٹھا کے مٹھی میں دبالی تھی۔ تو ظاہر ہے کہ بھگوان کے گھر میں چوری کی گئی تھی۔ یہ سب گن کے تم نے کہا کہ جب تم اتنے بڑے بڑے پاپ کر چکی ہو تو یہ ایک چھوٹی سی مرغی کی ٹانگ کھا کے کیا مر جاؤ گی؟"

"اچھا... پھر؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"پھر اس نے تمہاری خاطر ماس کھا لیا تھا۔" وہ بولتا رہا اور "تمہیں اپنی قسم دی تھی کہ کسی کو بتانا نہیں۔ مگر تم نے شرارتاً ہمارے دوسروں کے سامنے کہ میں نے کیا تیر مارا ہے۔ ڈھنڈورا پیٹ کر دیا اس موہنی کی بھی کا۔ پھر موہنی کی پٹائی ہوئی تھی اور اس نے تم سے ایک ہفتہ بولنا بند رکھا تھا۔"

"یار خدا کی قسم مجھے کچھ یاد نہیں۔ خیر پھر کیا ہوا تھا؟"

"پھر تم نے اسے منایا تھا۔" وہ بولا۔ "اور وہ مان گئی تھی۔ یہ تو ایک واقعہ ہے۔ تمہیں موہنی سے منسوب اسنے کتنے واقعات یاد ہیں۔ ایک بار جب تم کسی پیڑ پر چڑھ رہے تھے کہ لیے پیڑ تو تمہارا نیکر پھٹ گیا تھا اور جب وہ ہنسنے لگی تو تم نے پیڑ سے ہی نیچے اتر کے اس کی ٹھکائی لگائی اور اس کی قمیص بھی پھاڑ دی۔ پھر اس نے تمہیں زرا لینے دینے کی کوشش کی کہ نیکر کے بدلے قمیص پھٹ۔ یا تو پھر یاد کیوں اور نیکر کیا میں نے پھاڑ دی تھی؟"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ "بچپن کا زمانہ بھی کیا خوب ہوتا ہے یار۔ آدمی کے بس میں ہو تو وہ ہمیشہ بچہ ہی رہے۔"

"یہ تم اب کہتے ہو۔ بچپن کے دور سے گزر کے جوان ہونے کا شوق کتنا ہوتا ہے۔ ہر بچہ چاہتا ہے کہ بس میں راتوں رات بڑا ہو جاؤں۔"

"تمہیں اپنا بچپن یاد نہیں آتا؟"

"کتنا یاد تو آتا ہے۔ لیکن میرے بچپن میں کچھ بھی نہیں تھا جس کا نقش آج تک گہرا ہو۔ میرا کسی موہنی سے کسی قسم کا تعلق نہیں رہا جیسے تمہارا رہا تھا۔ اب تم بھی تو کہتے ہو کہ مجھے یہ سب یاد نہیں۔ موہنی کو اس لیے یاد ہے کہ اس کے جذبات کے نقوش بہت پائیدار تھے اور گہرے تھے نہ مٹنے والے ___ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ کیسے یاد رکھ سکتی تھی کہ اسکول جاتے وقت تمہاری جیب میں ایک کنگھا ہوتا تھا جو نیلے رنگ کا تھا اور تم نے وہ کنگھا موہنی کو اس کی سالگرہ پہ تحفے میں دیا تھا۔ آج بیس سال کے بعد بھی وہ کنگھا اس کے پرس میں ہے۔ کیا تم یقین کرو گے؟"

میں بے یقینی اور شرمندگی کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ میں نے کہا "تو کوئی چیز... اس طرح سنبھال کے نہیں رکھی۔ کیا اس نے مجھے کچھ دیا تھا؟ دیا تو ہوگا۔"

"ہاں۔ اس نے ہمیشہ ہر وہ چیز تمہارے لیے بچا کے رکھی جو اسے

تمہیں اسے کہیں ملی؟" وہ بولا۔ "لیکن اس کی ایک بات [illegible] اسٹینڈ بائی کر دیا تھا کہ... کر لیے غصہ آگیا تھا تم [illegible] اور سکندر علی پر۔"

"وہ کیا بات تھی؟"

"تمہیں یاد ہو گا پتا ہے کچھ۔ فسادات کا زمانہ؟"

"ہاں۔ وہ سب زخم تو مندمل ہو گئے لیکن ان کے نشان ابھی میرے دل پر ہیں۔ میری ایک بہن نے عزت بچانے کو کنوئیں میں چھلانگ مار دی تھی اور..."

"مجھے معلوم ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اس کے بعد تم لوگ ادھر چلے گئے تھے۔ وہاں کچھ حالات بگڑے تو تم [illegible] موہنی کے کس ماما کے گھر تھے؟"

"ہاں۔ وہ بڑا خبیث تھا۔ میں اس کے پاس [illegible]"

"جب تم جا رہے تھے تو معلوم ہے موہنی نے کیا کیا؟"

"کیا... بہت روئی ہوگی..." میں نے کہا۔ [illegible] کی بات کر کے میں بھی چلا جاؤں گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یار سکندر! تم [illegible] بھی ہوا اور اتفاق بد قسمتی بھی۔ تم کو کتنی محبت تھی اور کیسے اپنے لوگ تھے..."

"لیکن میں نے ہر کچھ گنوایا۔" میں نے بد مزگی سے کہا۔

"ہاں... اس سے تو تمہاری بدقسمتی ثابت ہوتی ہے کہ ابھی تم کو اسی طرح ملی تھی۔ جیسے موہنی تھی کہ تم اسے بھول گئے مگر وہ تم کو نہیں بھولی تھی اور جب پھر ملی تو آپ نے تمہیں پھر اپنا لیا۔ اس کے باوجود کہ وہ شادی کر چکی تھی اور شوہر مرد کی ذات سے متنفر ہو چکی تھی۔ اس نے تمہیں دیکھا تو اس کی عورت پھر انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔ وہ جو صرف ایک [illegible] تھی، اپنے دل کے خلاف مقدمہ ہار گئی۔ وہ دل کو [illegible] نہ کر سکی اور تم بھی کہہ سکتے ہو کہ وہ آئی، اس نے دیکھا اور [illegible] کر لیا۔"

"ہاں۔ میں ایسا ہی کہہ سکتا ہوں۔"

"موہنی بدقسمت رہی کہ اسے تم تک پہنچنے میں دیر ہو گئی، پہلے ہی کسی کے ہو چکے تھے۔ ورنہ جہاں تک محبت کا [illegible] جذبات کی حدت کا تعلق ہے تو وہ رابعہ سے کم نہ تھی۔ شاید [illegible] ہی ہوگی اس کی چاہت۔ اگر کوئی ان دونوں کی محبت کو غیر جانب دار غیر جذباتی انداز میں کسی انصاف کی ترازو میں تول کے [illegible] ناممکن ہے۔ نہ ایسی کوئی ترازو ہے۔ نہ ایسی کوئی [illegible] کیا جا سکتا ہے۔ یہ میرا خیال ہے۔"

"میں تمہارے خیال کو غلط نہیں کہتا۔" میں نے کہا۔

[illegible] لیے علمی سے کہ رابعہ کی جگہ اسے [illegible] مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟ وہ لڑکی یہ بات سمجھتی کیوں نہیں؟"

"وہ بہت اچھی طرح سمجھتی ہے اور اسی لیے وہ تم سے کچھ نہیں [illegible] اس نے کسی قسم کی توقعات وابستہ نہیں کی۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن تم بھی خدا کے لیے کچھ تو مروت میں آ کر ایسی بے رخی مت برتو۔ اسے محبت نہ دو مگر نفرت سے تو مت دیکھو۔ اسے دشمن تو نہ سمجھو۔"

"بہت گڑبڑ کیا ہے اس نے۔" میں نے کہا۔ "تم وہ بات بھول گئے جب [illegible] بہت [illegible] آیا تھا۔"

"ہاں... موہنی نے اپنی ماں سے آٹھ آنے لیے۔ پھر آٹھ آنے باپ سے مانگے۔ الگ الگ وقت میں۔ چار آنے اس کے پاس وہ تھے جو اسے بھگوان کے مندر میں ملے تھے۔ اس نے سوا روپیہ ایک لال رنگ کے کپڑے میں سی کر تمہارے بازو پر امام ضامن باندھا تھا۔ یاد ہے کچھ یا بھول گئے؟ اس نے امام ضامن باندھا تھا۔"

"ہاں دوست۔ اس نے سب سے چوری چھپے یہ کام کیا تھا۔ [illegible] سوا روپیہ تمہاری رکھشا کریں۔ اس پر تم نے کہا تھا کہ ہمارے بھگوان کا امام ضامن سے کیا تعلق۔ وہ رونے لگی تھی کہ اچھا پھر کیا ہوا اور تم نے اسے سمجھایا تھا کہ امام ضامن باندھتے وقت کیا کہا جاتا ہے۔ اس نے وہی دہرا دیا تھا۔ تم سوچو ذرا کہ سوا روپیہ اس زمانے میں کیا تھا۔ شاید بیس روپے کے نوٹ سے بھی زیادہ۔ معلوم نہیں کیسے جوڑا ہوگا۔ اس نے یہ سرمایہ خرچ کیا صرف تمہیں تحفظ فراہم کر کے اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے۔ اور تم نے اسے کیا سمجھا؟"

"صرف سوا روپیہ۔" میں نے ندامت سے کہا۔ "میں نے اسے سنبھال کے نہیں رکھا۔ سچ تو یہ بھی نہیں کیا۔ اس کے ماما کے گھر میں جیب خرچ کر دیا۔ اس زمانے میں وہ سوا روپیہ میرے کام آیا۔ امام ضامن [illegible] کا اعتراف کرتا ہوں۔ وہ جذبات کا ایک خزانہ تھا جس کی اگر میں قدر کرتا۔ تو وہ امام ضامن آج بھی میرے پاس ہوتا۔ آخر ایک [illegible] کے مقابلے میں تو وہ ایسا ہی تھا جیسے چشمے بہتے ہیں [illegible] کے مقابلے میں ایک خوبصورت [illegible] لیکن [illegible] جذبات کا تھی۔ جو ایک طرف کچھ اور تھے اور دوسری طرف کچھ اور۔"

"اب یہ صورت حال اب بھی ہے۔" شیخ نے کہا۔

"اب میں اس سے انکار نہیں کرتا۔"

"مگر اب تم بچے نہیں ہو۔ تم جذبات کی قدر کرو۔ جذبات کی [illegible]" شیخ نے کہا۔ "بے سہارا [illegible] اختیار میں [illegible] نہ دو۔ اس کے ساتھ تمہارا رویہ [illegible] اور تم [illegible] اسے منظور ہے زیادہ

دکھی وہ اس بات پر ہے کہ تم ابھی تک عدم اعتماد کا شکار ہو۔ یہ سمجھتے ہو کہ وہ ایکٹنگ کرتی ہے۔ کیونکہ وہ ہندو تھی۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے وہ اب بھی ہو گئی؟"

"یہی تو زیادتی ہے تمہاری۔" شیخ گرم ہو گیا۔ "تم اعتماد کیوں نہیں کرتے اس کی بات پر۔ اس نے بتایا تو ہے کہ وہ اسلام قبول کر چکی ہے اور تم کہو گے تو وہ تمہارے سامنے پھر کرے گی۔ جہاں تم کہو گے جیسے تم کہو گے۔ تم اسے موہنی کیوں کہتے ہو؟"

"دراصل وہ یہ رضیہ سلطانہ والا نام۔ میں موہنی کے نام کی جگہ نہیں لے سکتا۔ وہ ایک مسلمان حکمران تھی۔"

"تاریخ کے حوالے سے بات کرتے ہو تو یہ بھی کہو کہ وہ کس کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی اور اس جرم الفت کی اسے کیا سزا ملی تھی۔ نام سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ نام خود عقیدت کے جذبات کا مظہر بن سکتا ہے۔ بہت پیارا نام ہے یہ بھی۔"

"اب پھر بات وہی جذبات کی آگئی۔ تم کو یہ نام اس لیے پیارا لگتا ہے کہ وہ تم کو پیاری لگتی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اس سے پیار کرتے ہو؟"

"پیار کرنا کیا ہوتا ہے۔ یہ تو ایک عجیب سی خلش ہے۔ یا جذبات کی فسوں کاری ہے۔ نظر کی کرشمہ سازی ہے یا دل کی وحشت ہے۔" وہ بولا۔

"او مائی گاڈ... فلسفی!" میں نے سر پیٹ لیا۔ "آج تک سنا تھا کہ محبت آدمی کو شاعر بنا دیتی ہے۔ آج دیکھ لیا کہ محبت نے ایک تھانیدار کو شاعر بنا دیا۔"

"بھاڑ میں گئی تھانیداری بھی اور شاعری بھی۔ جب حاصل کچھ نہیں۔" وہ بولا۔ "وہ تمہاری محبت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں خواہ تم اسے دھتکارتے رہو۔ ادھر میں ایک نمبر کا گدھا دن رات یہی سوچتا رہتا ہوں۔ خواب بھی دیکھتا ہوں تو اس کے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ یہ جنون بڑھا تو میں پاگل نہ ہو جاؤں۔"

"معاف کیجیے گا جناب۔ آپ پاگل تو ہو چکے ہیں لیکن ابھی خود یہ بات تسلیم نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "آثار دوسروں کو صاف نظر آتے ہیں۔"

"یار سکندر! میں کیا کروں؟ کچھ بتاؤ نا مجھے۔"

"میں کیا بتاؤں یار۔ میرے پاس کوئی گیدڑ سنگھی ہے۔ یا کسی باکمال جعلی پیر کا پتا ہے جو ملتی پر پڑے تعویذ دیتے ہیں اور جن کے دیواری اشتہاروں میں لکھا ہوا نظر آتا ہے کہ محبوب آپ کے قدموں میں۔" میں نے کہا۔ "کسی نے نہ محبت اور عاشقی کی سند دینے کے لیے کوئی یونیورسٹی کھول رکھی ہے کہ وہاں سے آپ فارغ التحصیل ہو کے نکلیں تو کلاس روم میں عاشقی کی پوسٹ آپ کو تفویض ہو جائے اور آپ جس پہ نظر ڈالیں، وہ آپ کی ہو جائے۔"

"تم اڑاتے رہو مذاق میرا۔ میں یہ تو کر نہیں سکتا کہ اپنے دل بات

www.paksociety.com

کا رخ بدل دوں۔" وہ بڑا مان گیا۔ "آئندہ تم سے اس موضوع پر بات نہیں کروں گا۔"
"پھر کس سے کرو گے۔ محسن اور غالب سے، وہ تو مجھ سے بھی بڑے بدمعاش ہیں۔" میں نے کہا۔ "الغرض بند کر دیں گے۔"
"ارے یار جو چاہیں بند کر لیں۔ میں بھی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ مایک شایک دن اسے اپنا بنا کے چھوڑوں گا تاکہ عورت ہے کوئی پتھر کی صورت تو نہیں ہے کب تک اثر نہیں ہو گا۔"
"مجھے بہت سے دردناک اشعار یاد آ رہے ہیں۔ جن میں کچھ یوں کہا گیا ہے کہ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔ اور مری نماز جنازہ پڑھائی غیروں نے مر رہے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے فلاں بدلائیں کے دیوان سے استفادہ کر دوں تو۔۔۔"
وہ میری بات نہیں سن رہا تھا بلکہ خاصا ناراض ہو چکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے مناتا اور کہتا کہ یار یہ سب مذاق ہے اور چلتا رہتا ہے۔ میں نے ایک بچے کو بہت مشتبہ انداز میں ڈرتے ڈرتے دروازے کے پاس آتے دیکھا۔ اور پرے اسے محسن دیکھ رہا تھا۔ وہ بارہ سال کا بچہ تھا جس کا خیال تھا کہ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے اس نے مٹھی میں کوئی چیز دبا رکھی تھی۔
چونکہ دونوں گھر ملے ہوئے تھے اس لیے میرے اور محسن کے درمیان مشکل سے دس فٹ کا فاصلہ تھا۔
"ہیلو!" محسن نے اوپر ہی سے کہا۔
بچہ بری طرح چونکا اور اس نے سر کو اوپر کیا۔ بیک وقت اس نے دو گھروں کی چھت پر سے چار آنکھوں کو نگراں پایا۔
"کیا بات ہے بیٹا؟" محسن نے انتہائی دوستانہ، شفیق اور نرم لہجے میں مسکرا کر کہا۔
"کوئی کام ہے؟" اس نے چند سیکنڈ کے وقفے سے پھر پوچھا۔ کیونکہ بچہ اچانک پہچانے جانے سے نروس ہو گیا تھا۔ وہ کبھی مجھے دیکھتا تھا کبھی محسن کو۔ غالباً وہ میری دلچسپی کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس نے بمشکل تمام اقرار میں سر ہلایا۔
"اچھا تو اندر آ جاؤ۔ شاباش۔ دروازہ کھلا ہوا ہے۔"
بچے نے انکار میں سر ہلایا۔ "ماما جی۔۔۔ آپ نیچے آ جائیں۔"
"ٹھیک ہے بھئی۔ ہم آ جاتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ میں بے نیازانہ انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ مجھے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں اور یہ محض اتفاق تھا کہ میں بھی گلی کا نظارہ کرنے میں مصروف تھا۔
میں نے محسن کے باہر نکلنے تک بچے کی صورت پر تذبذب کے آثار دیکھے۔ کیا وہ سوچ رہا ہے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے بھاگ جائے؟ اسے یقیناً کسی نے بھیجا تھا اور وہ لالچ میں آ گیا تھا۔ اسے بھیجنے والوں نے انعام دینے کا وعدہ کیا ہو گا یا ممکن ہے انعام پیشگی دے دیا ہو مگر ساتھ ہی کچھ ان کے بارے میں کچھ نہ بتانے کا وعدہ لیا ہو۔ کیونکہ وہ ایک کام کرنے کا معاوضہ وصول کر چکا تھا۔ غالباً اتنی سمجھ ضرور رکھتا تھا کہ یہ کام اس کے نزدیک کام تھا۔ غلط ہوتا تو وہ خود نہ کر لیتے۔
محسن کے رویے نے اس کا خوف کچھ کم کر دیا۔ پہلے تو وہ چوروں کی طرح پکڑے جانے سے ڈر رہا تھا۔
"ہاں۔ اب بتاؤ کیا کام ہے مجھ سے؟ کہ تم کون ہو؟" محسن اس کے قریب سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ "میں تو تمھیں جانتا نہیں۔"
"میں۔۔۔ یہیں رہتا ہوں۔" اس نے ہاتھ کو گھما کر ہلا کے کہا جس سے کوئی سمت واضح نہیں ہوتی تھی۔ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔
"یہ۔۔۔ دینا تھا آپ کو۔" اس نے مٹھی کھول کر محسن کے سامنے پھیلا دی۔
محسن نے تہہ کیا ہوا کاغذ لے لیا۔ لڑکا بھاگنے ہی کو تھا کہ محسن نے اسے پکڑ لیا۔
"یہ مجھے دینا تھا؟" محسن نے کہا۔ "کیوں؟ بیٹا میں تو تمھیں جانتا نہیں۔ کیا تم جانتے ہو مجھے؟"
لڑکے نے اقرار میں سر ہلایا۔
"کیسے جانتے ہو؟ میں تو آج ہی آیا ہوں یہاں۔ اچھا نام بتاؤ میرا؟" محسن نے کہا۔
"ماما جی۔۔۔ مجھے جانے دیں۔"
"بیٹا ڈرتے کیوں ہو؟" محسن نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "میں آدمی ہوں۔ تمھارے ابا جیسا۔"
"میرے ابا جیسے۔۔۔ وہ تو مر چکے ہیں۔"
محسن کی مثال غلط ہونے کا اثر الٹا ہو گیا تھا۔ "کیا مجھے معلوم نہیں تھا۔ میرا مطلب تھا کہ جیسے سب ہوتے ہیں۔ میں بھوت وغیرہ نہیں ہوں۔ جن نہیں ہوتے۔"
"آپ۔۔۔ بھوت نہیں ہیں؟" وہ بے یقینی سے بولا۔
محسن ہنسا۔ "تم تو لگتے سمجھ دار اور بہادر بچے ہو۔ کس کلاس میں پڑھتے ہو؟"
"جی۔۔۔ پانچویں میں۔۔۔ مجھے جانے دیں جناب۔"
"واہ۔۔۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں؟" محسن نے کہا۔ "تھا تم نے اپنا ٹھیکا۔۔۔ رفیق۔۔۔؟"

بچہ اس کے چکر میں آ گیا۔ "مگر میں نے تو نام نہیں بتایا تھا!"
"چھوڑو رفیق، نام کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ تم کو یہ رقعہ کس نے دیا تھا؟"
"میں۔۔۔ انھیں نہیں جانتا ماما جی۔۔۔ مجھے جانے دیں۔"
"بیٹھ جاؤ۔ میں ماروں گا تو نہیں تمھیں۔ تم نے ایک اچھا کام کیا ہے۔ تم کو تو انعام ملنا چاہیے۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس کا ایک نوٹ نکالا۔ "یہ لو تمھیں دوں تو تم کیا لاؤ گے؟"
"جوتے۔" وہ دس کے نوٹ کو دیکھنے لگا۔ "اور ایک بستہ۔ دونوں پھٹ گئے ہیں۔"
"انھوں نے بھی تو پیسے دیے ہوں گے جن کا تم رقعہ لائے ہو۔" محسن نے کہا۔ "ان کا کیا کرو گے؟"
"آپ۔۔۔ آپ کو کیسے معلوم؟" لڑکے کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "انھوں نے پچاس روپے دیے ہیں۔"
وہ معصوم تھا اور خوف نے اس کی عقل کو مفلوج کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ ان کی باتوں کا اقرار کر رہا تھا اور خود ہی وہ سب بتا رہا تھا جو بتانا نہیں چاہتا تھا۔
"پچاس روپے تو بہت ہوتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "کیا تم یہ بھی ماں کو دو گے؟"
اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ "اسکول کی فیس دوں گا اور پھر نام لکھواؤں گا۔ میرا نام کٹ گیا تھا۔"
"کیوں۔۔۔ ماں فیس نہیں دیتی تھی؟"
"کیسے دیتی۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔" وہ بولا۔
محسن نے کچھ سوچ کے کہا۔ "اور آئندہ پھر ایسا ہوا تو تم کیا کرو گے؟"
"اگلے سال سے میری فیس معاف ہو جائے گی۔" وہ بولا۔ "ماسٹر صاحب نے وعدہ کیا ہے۔ اب میں جاؤں؟"
"تم بالکل سمجھ دار بچے جیسے ہو۔ بالکل ایسے ہی بچے سے تمھاری صورت بھی اس سے بہت ملتی ہے۔" محسن نے بالکل نیا طریقہ اختیار کیا تھا۔ حالانکہ اس نے بچوں کی نفسیات پر کتاب کوئی نہیں پڑھی تھی۔
"اس کا کیا نام ہے جی؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔
"اس کا نام ہے۔۔۔ شید۔۔۔ محمد رشید۔" محسن نے کہا۔ "وہ اب یہاں نہیں آ سکے گا۔ تم آ سکتے ہو جب بھی موقع ملے۔ اگر تمھاری ماں اجازت دے تو تم ہمارے چھوٹے موٹے کام کر دینا۔ بس بازار سے روٹی لا دی، خط ڈال آئے۔ ہم برتن صاف نہیں کرائیں گے تم سے، جوتے پالش نہیں کرائیں گے۔
یہ سب تو ہم خود کر سکتے ہیں۔۔۔ پھر بھی بہت سے کام ہیں جن میں تم ہماری مدد کر سکتے ہو۔ اس کے ہم سو روپے ماہانہ دیں گے۔"
"سو روپے؟" لڑکے نے بے یقینی سے کہا۔
محسن نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "ہاں۔ دراصل میں چاہتا ہوں کہ تمھاری مدد کروں۔۔۔ بغیر کام کے سو روپے دوں گا تو تمھاری ماں منع کر دے گی۔ اور تم بھی نہیں لو گے۔ محنت کے بغیر پیسے ملیں تو وہ خیرات ہو جاتا ہے نا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم کیا کیا کر سکتے ہو؟"
"میں۔۔۔ سب کر سکتا ہوں جناب۔" لڑکا اب بے خوف ہو کے بولنے لگا۔ "چائے بھی بنا لیتا ہوں۔ اور برتن دھونے میں بھی کیا ہے۔ آپ دھو سکتے ہیں تو میں بھی دھو سکتا ہوں۔"
"تم یہاں ڈرو گے تو نہیں؟" محسن نے کہا۔ "لوگ تو کہتے ہیں کہ یہاں بھوت رہتے ہیں۔ مگر وہ بے وقوف لوگ ہیں۔ اب آخر ہم بھی تو آ گئے ہیں یہاں آج ہی۔ اور یہاں رہ گئے بھوت کا باپ بھی آیا تو مار مار کے الو بنا دیں گے۔"
لڑکا ہنسنے لگا۔ "میری ماں بھی کہتی ہے کہ بھوت وغیرہ کچھ نہیں ہوتے سب وہم کی بات ہے۔"
"تو گویا یہ ماں کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ اتنی جلدی قائل ہو گیا تھا۔" میں نے سوچا۔
"ان لوگوں نے یہ رقعہ دیتے وقت کہا ہو گا کہ ہمارے بارے میں کچھ نہ بتانا۔" محسن نے بچے کا اعتماد حاصل کر لینے کے بعد کہا۔ "کیا کہا تھا انھوں نے؟"
"انھوں نے۔۔۔ انھوں نے کہا تھا کہ یہ رقعہ اس گھر میں ڈال دو جس میں بھوت رہتے ہیں۔" وہ بولا۔ "یہ ذرا مشکل کام ہے مگر تم کر لو گے۔ اور ہم اس کام کے پچاس روپے دیں گے۔ میں نے پچاس روپے کی بات سنتے ہی ہامی بھر لی۔۔۔ انھوں نے کہا کہ ڈر کی کوئی بات نہیں۔ کرنا ہے بس دروازے کے نیچے سے رقعہ اندر کھسکا کے بھاگ جانا۔"
"بس۔۔۔ اور بھی کچھ کہا ہو گا؟"
"ماما جی۔۔۔ انھوں نے کہا تھا کہ۔۔۔ اگر کوئی نکل آئے تو کچھ مت بتانا ہمارے بارے میں۔ کہنا کہ ایک لمبے تڑنگے سوٹ والے آدمی نے دیا تھا۔"
"گویا انھوں نے کہا تھا کہ جھوٹ بول دینا؟"
"جی۔۔۔ وہ تو موٹے تازے تھے دونوں۔ ان میں سے ایک گاڑی میں بیٹھا رہا تھا دوسرا نیچے اترا تھا۔"
"گاڑی کیسی تھی۔ نئی یا پرانی؟"
"نئی ہی تھی کالی سی۔" وہ سوچ کے بولا۔

www.paksociety.com

"اور اس کا رنگ کیسا تھا؟"

"رنگ؟" لڑکا سوچ میں پڑ گیا۔ "کچھ کالا نیلا۔"

"سلیٹی تو نہیں تھا؟" محسن نے کہا۔

"ہاں جی... بالکل... سلیٹی تھا۔" لڑکا بولا۔ "مجھے یاد آ گیا۔"

"سلیٹی رنگ یاد آ گیا؟"

"ہاں جی... وہ کا ماسٹر نانگے دی چادر اُتے سلیٹی رنگ ماہیا... یہ میری کلاس کا ایک لڑکا سناتا ہے بہت اچھا گاتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ سلیٹی رنگ کیسا ہوتا ہے۔"

محسن بہت ذہانت سے تفتیش کر رہا تھا۔ اور بہت کامیاب تھا۔ اگر وہ بچے سے کار کا ماڈل یا نمبر پوچھتا تو شاید کچھ بھی معلوم نہ کر پاتا۔

"اچھا تم ان میں سے ایک کے بال ایسے تھے جیسے کہ گوالوں کے ہوتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اور اس نے کان میں کنے کی بالیاں پہن رکھی تھیں۔"

لڑکا بھونچکا رہ گیا۔ "کیا... آپ اوپر سے دیکھ رہے تھے؟"

"اوپر سے؟" محسن نے کہا۔ "اوپر سے میں کیسے دیکھ سکتا تھا۔ تم سے ان کی بات گلی میں تو نہیں ہوئی تھی؟"

"ہاں۔ بات تو ادھر موڑ سے بھی آگے دوسری گلی کے پیچھے ہوئی تھی۔" لڑکے نے اقرار کیا۔ "پھر آپ کو...؟"

"وہ بھی۔ ان کے ایک پیغام کا انتظار تھا مجھے۔" محسن نے کہا۔ "ان کے سوا کون آ سکتا تھا۔ خیر اب تم جاؤ۔ ڈرنا بالکل نہیں۔ سیدھے گھر جاؤ۔ اگر وہ پھر ملیں اور پوچھیں کہ رقعہ ڈال دیا تھا تو کہنا ڈال دیا تھا۔ اور بس۔"

"یہ نہ بتاؤں کہ آپ ملے تھے؟"

"کیا ضرورت ہے اس کی۔" محسن نے کہا۔ "وہ مطمئن ہو جائیں گے اس جواب سے۔ یہ لو دس روپے... اور اپنی ماں سے کہہ دینا کہ تم کو کام بھی مل گیا ہے۔ تم شام کو کام کرو گے اور دن میں پڑھو گے یہ بھی بتا دینا کہ کام کیا ہے... اور اسے پھر بھی شک ہو تو جا کے پاس لے آنا۔ ہم اسے مطمئن کر دیں گے۔ جاؤ اب شاباش۔"

جب وہ دروازہ بند کر کے اندر آیا تو ہم سب ایک دم چیخ پڑے۔ محسن کو باتیں کرتا دیکھ کے غالب اور اکرام شیخ بھی اوپر منڈیر سے لگ کے بیٹھ گئے تھے۔ میں نے انھیں سر نکال کر جھانکنے سے منع کر دیا تھا۔

"راستا پیڈرو کے ساتھ کوئی آیا تھا؟" محسن نے اعلان کیا۔ کیوں کہ وہ رقعہ پڑھ چکا تھا۔ "پیغام میرے اور سکندر کے نام ہے اور اس پر صرف اتنا لکھا ہے کہ ہم رات کو ٹھیک ... بجے اسٹیشن پر قلی نمبر تین سو دو سے ملیں۔ اور امید ہے ... یاد رہے گا۔"

"قلی نمبر تین سو دو؟"

"پیغام صرف ایک سطر کا ہے۔" محسن نے رقعہ ... بڑھا دیا۔

پنسل سے لکھی ہوئی ایک سطر سے کچھ ... اسکاٹ لینڈ یارڈ والے بھی اس ایک سطر سے ... نکلنے کی کوشش کرتے تو ناکام رہتے۔

"اب آپ دونوں جائیں اپنی اپنی ڈیوٹی پر۔" ... اکرام شیخ سے کہا۔ "شیخ تم ٹرک پر نگاہ رکھو۔ غالب تم بھی دیکھو اور شیخ پر بھی نظر رکھو۔ یہ کام ہم دونوں ... بات کر لیتے ہیں۔ پھر تمھیں بھی بتا دیں گے۔"

"معدے سے گئے آج تو۔" شیخ نے ... آنکھوں میں اتنا دم بھی نہیں رہا کہ قل ہو اللہ پڑھ سکیں۔"

"اور میرے پیٹ میں مروڑ سے اٹھنے والے ... سے بے ہوش ہو چکے ہیں۔" غالب نے اس کی تائید کی۔

"لیکن ڈیوٹی از ڈیوٹی۔" شیخ بولا۔

"چیف کا حکم از حکم۔" غالب نے کہا۔ پھر دونوں اوپر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی دروازے پر دستک ہوئی ... خادم شاہ نے ریوالور نکال لیے۔ "کون ہے؟"

"فقیر ہے بابا۔ اللہ کے نام پر کچھ دیتے جاؤ۔" ... آواز سنائی دی۔

محسن نے لپک کے دروازہ کھولا۔ "آ گئے آپ ... کمال کیا آپ نے۔ ہم تو مایوس ہو چلے تھے۔"

"مایوسی ..." میں نے کہا۔ "اس وقت ... فلانا ایک مبارک قول ہے۔"

چند منٹ بعد ہم فقیری دستر خوان سے شاہی ... نعمتیں لوٹ رہے تھے۔ رجب برات کی وجہ سے سب ... نے خیرات دی تھی۔ ایک چادر کی جھولی میں راجا نے ... کے حلوے جمع کیے تھے اور خیرات دینے والوں سے ... کے سب حلوہ جات کو الگ الگ رکھنے میں کامیاب ... کبھی محسن مجھ سے کہتا تھا۔ یار یہ چنے کی دال کا حلوہ ... ہے۔ کبھی میں غالب کو متوجہ کرتا تھا۔ یار ذرا یہ مونگ کی دال ... چکھو ذرا۔ ہندوستان ... ہر عورت کے ہاتھ میں الگ مزہ ...

"اور ہر عورت وہی کامیاب بیوی ... جو ... شوہر کو اچھا کھلانے کی کوشش کرتی ہے۔"

"سب مرد ایسے ہی شوہر ہوتے ہیں۔"

... بھی تو اگر یہ کہتے ہیں کہ مرد کے دل کا راستہ اس کے معدے سے ہو کر جاتا ہے۔"

"اتنے مخلص نہ ہوتے تو ہم ان کی تقلید کیوں کرتے!"

... بہت سے حلوے ... ان شوہروں کے حق میں ... کی قرارداد منظور کی گئی تھی کہ بیویاں ایسے بدمزہ حلوے ... حلوے کا یہ حال ہے تو پھر کھیر کریموں کا ذائقہ کتنا ... جو حلوہ پکاتی ہوں گی اور شوہر مظلوم کھاتے ہوں گے۔ بالآخر سب کے پیٹ اور سب کی نیت دونوں بھر گئے ... غالب نے کہا۔ "اب مجھ پر غنودگی کا غلبہ ہے جو حلوے کی وجہ سے ہے۔"

"پھر کیا کریں۔ حلوہ نکال لیں تمھاری اوجھڑی میں سے؟" میں نے کہا۔ "... کی اجازت تو ہم دے نہیں سکتے۔ چلو اوپر اپنی ڈیوٹی پر۔"

"اچھا سنگدل چیف کے تو۔" شیخ نے آہ بھر کے کہا۔ "... بدلہ لے گا۔"

"چلو۔ ایک دن تم عورت کی غلامی کرو گے۔ اس کے حکم پر سر کے بل کھڑے ہو کے سات سلام کرو گے۔ بندر کی طرح ناچو گے۔"

"اس کی جوتیاں اٹھاؤ گے بلکہ چاٹو گے۔" محسن بولا۔

"اب جانے دو یار۔" میں جھنجلا کے اٹھا۔

وہ دونوں بھاگ گئے۔

میں اور محسن آمنے سامنے ... ایک سگریٹ جلا کے لمبا کش لیا۔ "... سچی بات ہے۔"

"میرا خیال ہے آپ سب ... گھنٹے لیٹ جائیں۔ یہ سب کی ... کا کوئی طریقہ اختیار کرتا ہوں۔"

"حلوے ... مخاصمت ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ بتا چلے گی ... کیا ہے؟"

"ان ... کرنا ..." محسن بولا۔ "مجھے معلوم ہوتا ... مقامات میں ... نہ دیتا ... دونوں کو کسی کو نازو اور موتی کا خیال ... ایک ... کی فکر نہیں۔ دوسرے کو مجبور ...؟"

"... اب ہمیں ان کو لینے جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"قلی نمبر تین سو دو کہاں سے آ گیا بیچ میں؟"

"... کو ... تھا۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے کچھ شبہ ... جن کو ہم لائے تھے۔"

"... ان سے ایک بات بالکل ..."

... نے کہا۔

... نازو کو یا موتی کو۔

"یا اس گلی کے ذریعے نہیں؟"

"میرا خیال ہے انھوں نے نازو کو دیکھا اور یہاں تک آ پہنچے۔ اور جو معلومات انھیں... نازو سے حاصل ہوئیں۔"

محسن کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ "یہ کیسے ممکن ہے۔ نازو کچھ بتانے والی نہیں ہے۔"

"ہے تو ایک لڑکی ہی نا۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں ایک دوسری عورت کو بھی ذہن میں رکھتا ہوں۔ ممکن ہے موتی نے ایسا کیا ہو۔"

"مجھے اس سے بھی یہ امید نہیں..."

"پھر کیا انھیں فرشتے بتا گئے؟"

"دیکھو یار۔" انھوں نے صرف نازو کو دیکھ کر گاڑی کا تعاقب کیا اور شاید اس وقت دیکھنے والا ایک تھا کہ وہ سب کو ٹریس کر سکتا ... نہ لے جا سکا مگر اس نے جگہ دیکھ لی۔ اگر وہ طاقت میں زیادہ ہوتے تو اکرام شیخ کو بھی لے جاتے مگر وہ بیک وقت نازو، اس کے بھائی اور موتی کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ مار دھاڑ نہیں چاہتے تھے چنانچہ انھوں نے خاموشی سے موقع کا انتظار کیا۔ اب انھیں کیا ضرورت ہے یہاں آ کے محاذ آرائی کی۔ انھوں نے ہمیں طلب کر لیا ہے۔ اور انھیں یقین ہے کہ کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے۔" محسن نے کہا۔

"پھر بھی قلی نمبر تین سو دو کا معمّا تو ابھی تک حل نہیں ہوا۔"

"بھئی ان کے ایجنٹ تو ہر جگہ ہیں۔" محسن نے کہا۔ "کیا پتا وہ ان قلیوں میں شامل ہو جنھوں نے ٹرک کو لوڈ اَن لوڈ کیا۔ یا کوئی اور قلی ہے جس نے یہ بات سُنی اور اسے عجیب لگی۔ وہ ریلوے اسٹیشن پر ... اکبر بھائی اینڈ کمپنی کا مال آتا ... چڑھانے والا آدمی ہو گا۔ اس نے بات آگے پہنچا دی۔"

"خیر... جو ہو گا پتا چل جائے گا۔ یہ بتا اب ہم جائیں گے کیسے...؟"

"ویسے ہی جیسے۔" میں نے کہا۔ "کچے دھاگے سے بندھے۔"

"یار میرا مطلب تھا کہ... کیا کوئی ہمارے پیچھے آئے گا؟"

میں نے کہا۔ "یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم بالآخر کہاں پہنچتے ہیں۔"

"آنا تو چاہیے مگر وہ بھی دیکھ رہے ہوں گے کہ ہم اکیلے جاتے ہیں یا باڈی گارڈ لے کر۔ اکرام شیخ تجربہ کار آدمی ہے۔ وہ ہم پر نظر رکھ سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "راجا اپنا کام کرے یعنی ٹرک کی نگرانی کرے اور اگر کوئی آئے..."

"کوئی آیا تو وہ اکیلا کیا کرے گا؟" میں نے کہا۔ "شیخ کو اس کے ساتھ رہنے دو..." "بہتر ہو گا اگر وہ ٹرک کا پیچھا کرے اور دوسرا ٹھکانہ دریافت کرے۔ ہم اکیلے نہیں

www.paksociety.com

جاتے تو الگ الگ جاتے ہیں آگے پیچھے۔"
"انھوں نے دونوں کو بلایا ہے؟"
"ان کے بلانے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم ان کے باپ کے نوکر ہیں کہ ہر حکم مانتے جائیں۔" میں نے کہا۔ "میں اکیلا جا کے اس قابل تو ہوں کہ سو دو سے ملتا ہوں۔ تیسرے لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ... بیمار ہو گیا تھا... یا یہ کہ گھر پر تھا ہی نہیں۔ معلوم نہیں کہاں نکل گیا۔ چنانچہ میں حاضر ہوں تو یہ ہو سکتا ہے کہ باہر کسی ٹیکسی والے سے سواف طے کر لے اور باہر انتظار کرے۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ وہ مجھے کسی گاڑی میں لے جائیں گے اور ان کی گاڑی پارکنگ ایریا میں ہی ہوگی اور اگر ایسا نہ ہوا..."

"کیا مطلب؟ وہ تجھے پیدل لے جائیں گے؟" محسن بولا۔

"نہیں۔ ریلوے اسٹیشن کے پیچھے دوسری جانب جہاں ہمارا ٹھکانا تھا وہ ادھر سے بھی آ سکتے ہیں اور جا سکتے ہیں کیلے پل کی طرف سے جہاں مال اتارا جاتا ہے۔ ادھر سے ٹرک اندر آ جاتے ہیں تو گاڑی بھی آ سکتی ہے۔ وہ مجھے ریلوے لائن عبور کرا کے لے جائیں اور ادھر کا پارکنگ ایریا میں جھک مارتا رہ جائے۔"

"اچھا ابھی رات کو ہی طے کر لیں گے۔" محسن بولا۔

رات تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم نے وقفے وقفے سے راجا کی آواز سنی۔ وہ اپنا کام ہمیشہ دانہ مہارت کے ساتھ سر انجام دے رہا تھا۔ رات کا اندھیرا پھیلا تو ہمارا بھی چھت پر کوئی کام نہ رہا۔ کیونکہ اب ہم گلی میں دور سے آنے والے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔

مجھے عجیب سی سرسراہٹ اور خانہ ویرانی تھی۔ وہ مکان سچ مچ کا آسیب زدہ نظر آنے لگا تھا۔ اور یہ صرف اسی وجہ سے تھا کہ گھر سے گھر کی رونق چھن گئی تھی۔ نازو اور روشنی کی عدم موجودگی نے ہمیں گھر کے اندر بے گھر ہونے کے احساس کی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ عورت کے وجود سے گھر کی تکمیل ہوتی ہے اور اس کی فضا میں حسن سلیقہ اور تہذیب آتی ہے۔ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔ اس وجود کا رشتے سے کوئی تعلق نہیں وہ ماں، بہن یا بیٹی بھی ہو سکتی ہے جو ایک گھر میں رہنے والوں کے درمیان جذباتی رشتوں کو استحکام عطا کرتی ہے۔ گھر میں سکون و راحت کا اہتمام کرتی ہے اور اسے سرائے سے مختلف بناتی ہے۔ ایک ایسا حصار جس میں داخل ہو کے آدمی کو تحفظ کا احساس ملتا ہے اور اپنائیت کی خوشبو ملتی ہے۔

یہ خلش سب کے دل میں نوک خار کی طرح باعث آزار بنی ہوئی تھی کہ نازو اور روشنی ہماری ذرا سی غفلت کا شکار ہو گئیں، ہم نے ان کی حفاظت کے لیے کچھ نہیں کیا اور مطمئن ہو گئے کہ وہ اپنی خود محافظ ہیں۔ ہو جانے اور ... کا یہ احساس فطری ہے۔ ذہن میں آنے والا ... ہے کہ کاش ایسا نہ کیا ہوتا۔ یا ایسا کیا ہوتا۔

"یہ سب انھیں ساتھ لے جانے والوں ... ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ ... ساتھ جو کچھ کر چکے تھے وہ ہم بھولے نہیں تھے ... کی مدد خدا کرے۔ کہیں انھوں نے..."

"یارو... کچھ تو کچھ بولو۔" غالب مضطرب ... رات باقی ہے۔"

"کہنے سننے کو کچھ بھی تو نہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا ہم اس ویرانے میں ... فرشتہ حال ... بیٹھے ہوئے ... میں نظر نہیں آتے؟" شیخ بولا۔

"کم سے کم روشنی ہی کر دو۔" غالب بولا۔

"روشنی تو ہے۔ ایک بلب سے چراغاں ..." محسن نے کہا۔

"قصہ باغ و بہار کے چار درویش کچھ ایسے ... ملے جل رہے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "انھیں بھی رات ..."

"اگر یہ حادثہ نہ ہوتا تو اب تک ہم ..." میں نے کہا۔ "تھوڑا بہت سنبھالیے۔ کچھ سامان ... چولہا جاتا۔"

"اور ہر گھر کی طرح..." محسن بولا۔

"ہمارے اپنے پرانے بچپن کے گھروں کی طرح ... کی بات کاٹ دی۔ شب برات کا حلوا پکا ... مہک گھر میں بھر جاتی۔ جو کام ہم پانچ مرد نہیں کر ... عورت کر لیتی۔"

"ہم استاد ڈیڈی کی روح کو ایصال ثواب ... دیتے۔" محسن بولا۔

"اس کے لیے حلوا کیا ضروری ہے۔ آؤ اس ... اور اس کی مغفرت مانگیں۔" میں نے کہا۔ "وہ ہم میں ... اب نہیں ہے۔"

"اگلی شب برات پر ہم سب ..."

فاتحہ کے بعد ہم سب چپ ... رسم دنیا ہے کہ کسی کے سوگ میں ایک ... اختیار کی جاتی ہے۔ ہم نے رسماً کچھ نہیں کیا ... اسی کی یاد میں تھی۔ پھر ان سب کی یاد میں ... تھے۔ خون کے رشتوں سے باخلوص ... رشتوں سے دم تک راہ وفا میں ثابت قدم رہے۔ ان ... جو تصور کے پردے پر ابھرے۔ ایک بار میں ...

ساتھ قبرستان گیا تھا۔ وہ بھی شب برات تھی لوگ قبروں کے چاروں طرف بیٹھے تلاوت کر رہے تھے موم بتیاں جلا رہے تھے اور اگربتیاں سلگا رہے تھے۔ ابا نے بتایا تھا آج کی رات روحیں عالم بالا سے لوٹ کر آتی ہیں اور دیکھتی ہیں کہ ان کی یاد کس کس کے دل میں ہے اور یہ بھی دیکھتی ہیں کہ ان میں سے کون کون آئندہ سال بھلا دیے جانے والوں میں شامل ہوگا۔ آج مجھے پھر یوں لگا جیسے میں کسی قبرستان میں موجود ہوں اور میرے گرد روحوں کا اجتماع ہے اور عالم تمام حلقہ دام خیال ہے۔

ہمارے اس مراقبے کو دروازے پر راجا کی دستک نے ختم کیا۔ دستک کے ساتھ ہی سب اچھل کے کھڑے ہو گئے تھے اور چابی سے چلنے والے کھلونوں کی طرح سب نے ریوالور بھی نکال لیے تھے۔ پھر راجا کی آواز آئی۔

"ارے! کھولو۔ کیا بھوت بن گئے ہو سب۔"

"بھوتنی کے۔" محسن نے دروازہ کھول کے کہا۔ "تیری آواز کیوں بدلی ہوئی ہے؟ کیا ہوا؟"

"وہ ایک دم آ گیا۔" "یار... وہ آ گیا۔"

"کون... کوئی ٹرک لینے آ گیا؟" میں نے کہا۔

راجا نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ پچھلے پہر ... ابھی دو چار منٹ پہلے۔ میں نے اور کچھ نہیں دیکھا کہ کون تھا اور کیسا تھا۔"

"پھر تو پھر تم جاؤ۔ تم اور شیخ۔" میں نے کہا۔

"اسی حلیے میں؟"

"حلیے کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "جیسے ہی وہ ٹرک اسٹارٹ کرنے لگے اسے قابو کر لو۔" میں نے کہا۔ "اگر اس کا کوئی ساتھی آس پاس چھپا ہوا ہوگا تو ضرور سامنے آئے گا۔ اس سے تم نو دو گیارہ ہو جانا اور ... کا نام لے کر۔"

"بنیادی سوال یہ ہے۔ راز کو ہم ... کریں گے۔ یہی مطلب ہے نا تمھارا؟" راجا نے کہا۔

"یار یہ شیخ بہت زبردست پولیس والا ہے۔ یہ ایکشن فلم ڈائریکٹ کرے گا۔" محسن بولا۔ "تم اس کی ہدایات پر عمل کرنا اور بجائے اس کے کہ وہ تمھیں کہیں اپنی مرضی سے لے جائے تم انھیں وہاں لے جانا جہاں انھیں جانا تھا۔ یا کم سے کم وہ جگہ دیکھ لینا اور پھر لوٹ آنا۔ ٹرک اور ڈرائیور سمیت۔" غالب ...

"اجازت ہو تو چھت پر جا کے لیٹ جاؤں؟" وہ بولا۔ "مجھے بھوتوں سے ڈر لگتا ہے۔"

"وہ مذاق ہے۔ دراصل بھوتوں کی میں نے بہت دل آزاری کی ہے کہ انھیں کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اسرائیل کی طرح۔ آج اگر وہ جل کے آ کے خود کو تسلیم کرانے پر تل گئے تو ظاہر ہے صبح تک میں خود ان کے قبیلے میں شامل ہو جاؤں گا۔ مزید یہ کہ امکان روشن ہے۔ میں صبح یا واپسی پر آپ لوگوں کو بتا سکوں گا کہ رات تاروں کا توڑ کیسے کیا تھا۔"

"تم آزاد اور خود مختار ہو۔ آج کی رات بھوتوں سے لڑو یا گپ لڑاؤ۔ اختر شماری کرو یا آہ و زاری۔" میں نے کہا۔ "ہم سب تو جا رہے ہیں کام سے۔"

"... ہم بھی آ رہے تھے کام کے۔" غالب آہ بھر کے بولا۔

راجا اور شیخ تو فوراً چلے گئے۔ میں اور محسن کچھ دیر بعد اٹھے۔ ہم دونوں نے احتیاطاً دو ریوالور رکھے تھے کہ ایک جامہ تلاشی میں فوراً برآمد ہو جائے تو شاید دوسرا کام آ جائے۔ اگرچہ اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا پھر بھی دل کے خوش رکھنے کو یہ خیال اچھا تھا۔

"خوش فہمی کا فائدہ کوئی نہیں۔" محسن نے کہا۔ "وہ نئے شکاری نہیں ہیں کہ دھوکا کھا جائیں۔ ہر صورت میں وہ ہمیں پہچان لیں گے۔"

"صورت بدلنے کی بھی ضرورت نہیں۔ انھوں نے کب کہا ہے کہ ایک اپ کر کے آنا۔" میں نے تسلیم کیا۔ "اصل مسئلہ وہی ہے کہ تم مجھ پر کیسے نظر رکھو گے؟"

"یہ ہے کرو تو کام کا مسئلہ ہے۔" محسن بولا۔ "یہ قادر مولا کیا سوچے گا۔"

"میں ناقص العقل کچھ سمجھا نہیں آپ کی بات۔"

"کیوں نہ میں قلی قسم کا بن جاؤں؟"

"ایک ضابطہ فوجداری کی دفعہ قتل تو دوسری غیر ارادی قتل ... مجھے یہ نادر خیال پسند آیا نور چشم۔ آخر تم ہو کس کے شاگرد۔"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ کا نہیں۔" وہ بولا۔ "اب میں آگے چلتا ہوں۔ کسی قلی سے معاملہ طے کرنا پڑے گا نا۔"

"کیوں نہ پہلے آخری طعام کر لیں؟" میں نے کہا۔ "جو ہم کئی بار کر چکے ہیں۔"

اسٹیشن کے باہر ایک پُر ہجوم ایرانی ہوٹل کے فیملی روم میں بیٹھ کے ہم نے "انڈا گھوٹالا" اور "قیمہ مسالا" طلب کیا اور پھر اسے کھانے پر بھی مجبور ہوئے کیونکہ پیٹ میں ایندھن بھرنا ضروری تھا۔ کیا معلوم آگے سو پیاز اور سو جوتے کھانے پڑیں۔ اور روز کھانے پڑیں۔ چائے اور سگریٹ پی کے ہم گویا اپنے مشن پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

محسن نے مجھے آدھا گھنٹا بعد آنے کو کہا تھا۔ میں نے وہ آدھا گھنٹا چائے کے کپ کو گھورتے گزارا۔ چائے درحقیقت

www.paksociety.com

"دودھ تھی۔" چنانچہ اس کی سطح پر ایک جھلّی سی بننے لگی پھر اس میں جھریاں پڑنے لگیں۔ اس میں دو مکھیاں ڈوب کے مر گئیں۔ میرا سگریٹ کا پیکٹ خالی ہو گیا۔ ساتھ والے کیبن میں پیچ پیچ ایک "فیملی" آگئی جس میں صرف دو افراد تھے۔ ایک خریدار قسم کا شوہر اور دوسری بازار سے فروخت قسم کی بیوی۔ ان کے مکالمے مجھے صاف سنائی دے رہے تھے جو اتنے ہیجان انگیز تھے کہ مجھے اٹھنا پڑا۔

میں ٹہلتا ہوا ریلوے اسٹیشن کی طرف گیا۔ اس کے پہلے حصے میں درجہ سوم یعنی تھرڈ کلاس مسافروں کے لیے ٹکٹ گھر اور ویٹنگ روم وغیرہ تھے۔ اس حصے کو دیکھ کر آدمی کی بے بسی کا شدت سے احساس ہوتا تھا کہ وہ اگر نہیں سکتے کہ آدمی آخر ریلوے کا محتاج کیوں ہوتا اور ریلوے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتی جیسے وہ سفر کے لیے ٹکٹ خرید کر خوار ہونے آیا ہو۔

دوسرے حصے کے حالات قدرے بہتر تھے جہاں کاریں صف بستہ تھیں اور پولیس والے ٹیکسی ڈرائیوروں سے بھتا وصول کرنے میں بے حد مستعد تھے۔ تیسرے ٹیکسی والے مسافروں کو لوٹنے میں بے حد مستعدی دکھا رہے تھے اور یہ بھی مجبوری کی بات تھی جو اپنی کاروں کے مالک تھے انھیں کون لوٹ سکتا تھا۔ وہ تو خود گھوما کر لوٹنے والوں میں سے ہی ہوتے تھے۔

محسن نے بالکل میرے پیچھے آ کے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ "خیر سگال صاحب؟" جو بڑا مناسب سوال تھا اور برمحل کرتا تھا۔ مطلب اس کا کچھ یوں نکلتا تھا کہ خیر سگال جانے کے لیے تیار ہے مگر آپ کو برتھ یا سیٹ نہیں ملی ہے۔ کیوں کہ قطاروں میں لگ کے ٹکٹ لینے کا مظاہرہ کرنے والوں کو برتھ سیٹ کبھی نہیں ملتی۔ تو پروا نہیں! آ گئے ہم آپ کا مسئلہ حل کرنے میں۔ ریزرویشن کا ایک متبادل اور متوازی نظام ملی جلی ہے جو زیادہ فعال اور بہتر ہوتا ہے۔

میں نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔ "نہیں... مجھے نہیں جانا۔"

"نہیں کیسے صاحب، آپ ابھی جائیں گے خیر سگال پر۔"

پھر میں نے گھوم کے دیکھا۔ محسن قلی کی شکل و وردی میں تھا اور بہ آسانی سے شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"میرا نمبر ہے دو سو تین" وہ بولا اور واپس چلا گیا۔ ایسا ہی تھا جیسے کوئی بھی قلی کسی مسافر نظر آنے والے شخص کے پاس اپنا سوال لے کر جائے اور جواب پا کر منہ لٹکا کر لوٹ جائے۔

مگر تین سو دو کے بجائے دو سو تین کا ہندسہ میری زندگی میں ایٹم بم کے دوسرے دھماکے کی طرح گونجا۔ میری زندگی کا رخ بدل کے مجھے آلام و مصائب کی اس راہ پر ڈالنے کے ذمہ دار یہی دو نمبر تھے۔ اس کہانی کا آغاز اسی طرح ہوا تھا کہ

میں نمبر ا تین سو دو کے بجائے دو سو تین میں جانے کے بجائے تین سو دو میں گیا تھا۔ یہ بہت پرانی بات تھی جب میں انگلینڈ میں تھا جہاں مجھے فریا نجو نام کے ایک مخلص انسان نے سنگین خطرے کا سگنل دیا تھا اور مجھے میری سیف جری پر مطلع کیا تھا۔

قلی نمبر تین سو دو کا انتخاب تو ایک خاص مقصد کے لیے کیا گیا تھا اور ممکن ہے یہ نمبر بھی ایک وارننگ کا درجہ رکھتا ہو کہ ہمارے ساتھ ہوشیاری مت برتنا اور نتیجہ بُرا ہو گا۔ تمھارا راز تازہ اور جوں کا توں ہے۔ یا سب کا۔ مگر یہ قدر مشکل سے طریقہ تھی کہ محسن کو جس قلی کی وردی ملی اس کا نمبر دو سو تین تھا۔

پلیٹ فارم پر ریڈ شرٹ والے درجنوں افراد سامان اٹھانے پھر رہے تھے یا ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے۔ میں سب کے نمبر خاموشی سے دیکھتا گیا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی اور ملاقات کا کوئی وقت طے نہیں تھا چنانچہ میں کسی مدد کے بغیر بھی اسے تلاش کر سکتا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد جب خیر سگال جا چکی تھی اور پلیٹ فارم خالی ہو چکا تھا میں اپنی تلاش میں ناکام تھا۔ میں نے ان گنت نمبر پڑھے تھے جو ہر قلی کی آستین پر پیتل کے بیج کی صورت میں آگے اور پیچھے کالے رنگ سے لکھے ہوئے تھے۔ بعض نمبر میں نے کئی بار دیکھے اور کئی بار مجھ سے وہ سوال بھی پوچھا گیا جو ہر پریشان حال مجبور الحواس نظر آنے والے سے پوچھا جا رہا تھا جیسے گھر میرا کوئی۔ بالآخر میں نے ایک بینچ پر دراز قلی سے رجوع کیا جو ابھی فراغت سے لیٹا ہوا بیڑی پی رہا تھا۔ میں نے اپنا سوال دوسری بار دہرایا۔ تیسری مرتبہ جھنجلا کے پوچھا۔ اس پر ایک لمحہ وہ غور کرتا رہا۔

"یہ تو ڈھونڈ لیے گا۔ کیا بات ہے؟" وہ بولا۔

"مجھے معلوم یہ کرنا تھا بھائی کہ قلی نمبر تین سو دو کہاں ہے؟"

"تین سو دو کیا کام ہے؟" وہ ایک دم متوجہ ہو گیا۔

"کام تمھیں کیا بتاؤں" میں نے کہا۔

"آپ کا... کوئی سامان نشاندہی کرا دی گیا ہے؟"

"نہیں بھائی۔ سامان ہے کہاں جو گم ہوتا" میں نے کہا۔ "بس اس سے ملنا تھا۔"

"کیا نام ہے اس کا؟" وہ بولا۔

"نام... تو مجھے معلوم نہیں" میں نے کہا۔

وہ پھر شک میں مبتلا ہو گیا۔ اسے یقین آنے لگا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ حقیقت بھی یہی ہو گی کہ وہ میرا سوٹ کیس یا کوئی چیز لے کے چلتا بنا ہو۔ "جیز میں کھو گیا ہو گا۔ مجھے صرف نمبر یاد ہے اور نمبر اسی کا بتا دیتے ہیں۔"

کیا کرتے ہو بوں۔ "ایسے پتا نہیں چلتا جی" وہ دکھاوٹی سے جواب دے کر چھپا بنا۔

پہلی کی بار پیدا ہوا بالکل اسی طرح ہر قلی نے اپنے ہاتھی ہی لے جانے کے لیے مجھ سے تعاون نہیں کیا۔ میں پریشان ہو گیا کہ اب آخر میں اسے کہاں تلاش کروں جب کہ کوئی اس کا پتا بتانے کو تیار نہیں اور میرے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں کہ اسے خود ڈھونڈ نکالوں۔

اپنا مسئلہ میں نے قلی نمبر دو سو تین کے سامنے بھی رکھا جس نے مجھے کنگ رابرٹ بروس اور مکڑی..... والی کہانی کے حوالے سے "طوائف الملوکی" کہا اور ایک شعر سنا کے چلنا پڑا۔ ظاہر ہے اس میں کالی دینے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

فیصلہ میری شکل ایک شک میں مبتلا قسم کا فرشتہ بھیج کے آسمان کی۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں ایک کوہ ہاتھ سے منہ میں گھماتے ہوئے کہا۔

"میاں! وہ ادھر ہو گا۔ اس کی بات کر رہے ہو نا بڈھے کی کیا جلا سا نام ہے اس کا۔ ہاں۔ جا چکی ہو گی۔"

"بالکل جناب... جا چکے ہی ملتا ہے مجھے۔ لیکن ادھر کا مطلب ذرا واضح کر دیجیے۔"

"بلڈنگ نظر آنے والے اور گھر کو پانی ہیلا لیپ وغیرہ پینے کی نشینی کے طور پر استعمال کرنے والے فرشتے نے کہا۔ "ادھر پیچھے بجری بازار روم ہے۔ وہاں لیٹا ہو گا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کل سے۔"

"پھر کیا بات ہے کہ اس کے ساتھی قلی بھی اس کے بارے میں کچھ بتانے کو تیار نہیں ہیں؟"

"وہ... بس میاں، آدمی ایسا ہی ہے وہ سب سے الگ تھلگ پاگل اور پراسرار۔"

"پراسرار قلی؟"

"ہاں... یہ جو نمبر ہے نا اس کا، بس یوں سمجھو کہ ٹھیک ہی لا سے اسے کہتے ہیں کہ خود ٹھیکیدار نے دیا تھا یا اس نے لیا تھا اپنی مرضی سے کیوں کہ وہ قتل کی چودہ سال جیل کاٹ چکا ہے۔ بچے بڑے ہو گئے اور پھر ایک ہاتھ کٹنے کے لیے پلیٹ فارم کے کنارے دائرے بنے ہیں۔ کہاں کہ اب پیٹ کا سہارا ان کے کونے پر لٹکے بچے ہوتا تھا۔"

میں نے بیرک روم تلاش کیا اور سیدھا اندر چلا گیا۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ مختلف قسم کے کاٹھ کباڑ فرنیچر اور دیگر اسباب کے پیچھے ایک اور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس میں بھی جھانکا کہ ایک مناسب سمجھا۔

اندر ایک بینچ پڑی ہوئی تھی جس پر کوئی کروٹ لیے سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ بینچ کی پشت کی جانب تھا۔ میں ٹھٹک کے رکا۔ میں نے اسے متوجہ کرنے کے لیے کھنکھار کر پھر کھانس کے دیکھا۔ پھر اسے باقاعدہ "جا چو" کہہ کے مخاطب کیا مگر وہ نیند میں تھا۔ کیا اسے علم نہیں تھا کہ سکندر اعظم آج اسے تلاش کرتا ہوا آنے گا؟ میں نے سوچا اور آگے بڑھ کے اسے تھوڑا سا ہلایا۔

وہ بینچ کے بالکل کنارے پر تھا۔ میرے ہلاتے ہی وہ نیچے گر گیا اور میں بے اختیار پیچھے ہٹا کیوں کہ اس کا گرنا کسی زندہ انسان کے گرنے سے بالکل مختلف تھا۔ وہ ایک لاش کی طرح گرا تھا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش میں ہاتھ پیر تک نہیں ہلائے تھے۔ ایک خنجر اس کے پہلو میں پیوست تھا اور اس میں کوئی شک کی بات نہیں تھی کہ وہ مر چکا تھا لیکن اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اس کا جسم جب میں نے چھوا تو گرم تھا۔ شاید ابھی میں سے اسے کوئی مار گیا تھا جس سے میں اس کے بارے میں پوچھتا پھر رہا تھا۔

میں نے ایک دم پلٹ کے بھاگنے کا سوچا لیکن اتنی دیر میں کوئی اندر آ گیا تھا۔ یہ کوئی ریلوے کا ملازم تھا۔

"تم... کون ہو تم۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ بولا پھر اس کی نظر نیچے پڑی ہوئی لاش پر پڑی "یہ... یہ کیا ہوا۔ تم نے مار دیا اسے، قتل کر دیا؟"

"سنو، چاچا نہیں... میں نے نہیں مارا اسے۔"

"پھر کس نے مارا ہے... خون... خون... ارے کوئی ہے؟" وہ دروازے میں کھڑا ہو کے چیخنے لگا۔ چند سیکنڈ میں اس نے میرے لیے وضاحت اور فرار دونوں کو ناممکن بنا دیا۔ دروازے کے سامنے ایک مجمع لگ گیا پھر ریلوے پولیس آ گئی مجھے باقاعدہ گرفتار کر لیا گیا۔

میں نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی اور اس بات پر خدا کا شکر بھی ادا کیا کہ پبلک نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے خود مجھے سزا دینے کے مروجہ طریقے پر عمل نہیں کیا۔ نہ جانے کیوں مجھے پریشانی نہیں ہوئی۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ سب طے شدہ تھا اور یہ سب ڈراما ہے۔ قلی نمبر تین سو دو کچھ بھی نہیں تھا۔ فقط ایک نمبر تھا جیسے کسی شے کا نمبر یا ہوٹل کے کمرے کا نمبر۔ یہ اس سے زندگی میں کہیں بھی مل سکتا تھا۔ وہ جس وقت تھا اس کا انتخاب کر لیا تھا اور یہ نمبر تاعمر کو فراہم کر دیا تھا۔ انھوں نے یہ نمبر مجھے دے دیا اور اب میں اس نمبر کی بدولت قتل کے جرم میں پکڑا

www.paksociety.com

جا چکا تھا لیکن یہ سب مجھے بحفاظت لے جانے کا انتظام تھا اور اس لیے کیا گیا تھا کہ میری مدد کرنے والے مداخلت نہ کر سکیں۔ یہاں سے مجھے وہیں پہنچا دیا جائے گا جہاں نازو اور موہنی ہیں۔ یا تو پولیس کو خرید لیا جا چکا ہے یا پھر یہ پولیس بھی اسی کی ہے۔ لوگ تو صرف وردی دیکھتے ہیں۔ اب بظاہر وہ مجھے تھانے لے جا رہے تھے مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ انھوں نے لاش چھوڑ دی تھی۔

پولیس جب کہیں قتل کی واردات کے بعد تفتیش کے لیے جاتی ہے تو یہ طریقہ اختیار نہیں کرتی کہ صرف ملزم کو لے جائے اور باقی معاملات قدرت کے سپرد کر جائے۔ وہ جائے واردات کا نقشہ بناتے ہیں، سراغ تلاش کرتے ہیں اور فنگر پرنٹ وغیرہ حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ سب کے بیانات لے کر کسی نہ کسی کو مشتبہ افراد میں شامل بھی ضرور کرتے ہیں اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضرور بھجواتے ہیں۔

یہاں یہ سب نہیں ہوا تھا۔ دوسروں نے اس کوتاہی کو نوٹ کیا تھا یا نہیں؟ میں بہرحال سمجھ گیا تھا کہ اصل مقصد تو مجھے یہاں سے نکال کر لے جانا ہے اور یہی ہوا۔ ابھی ما سٹیشن سے باہر آتے ہی مجھے تھانے پہنچانے کے لیے گاڑی لائی گئی۔ مجھے ہتھکڑی تو لگائی گئی تھی جو اصل تھی مگر اس کا مقصد غالباً مجھے ہاتھوں کے استعمال سے روکنا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میرے ہاتھ ان کی ٹوپاشاری بندوق سے زیادہ ہلاکت خیز ہیں۔

لیکن گاڑی اصلی پولیس کی گاڑی نہیں تھی۔ مجھے اسی سفید رنگ کی ٹویوٹا کرولا میں بٹھا دیا گیا جسے میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میرے ساتھ باہر تک آنے والے دونوں پولیس مین وہیں سے رخصت ہو گئے۔ غالباً ان کا انعام انھیں پہلے ہی دیا جا چکا تھا یا حساب دوستاں در دل والی بات تھی کہ بندہ مل گیا تو انعام بھی ضرور ملے گا مگر شرط یہ ہے کہ گڑبڑ کوئی نہ ہو۔

گڑبڑ کوئی نہیں ہوئی تھی۔ ممکن ہے وہ واپس چلے گئے ہوں اور لاش کو اٹھوا کر مردہ خانے پہنچا دیا گیا ہو۔ لاوارث قرار دے کے کیس درج کیے بغیر فائل ہو جائے۔ پبلک کے سامنے تو قانون نے اپنا کردار صحیح ادا کیا تھا۔

اب میں دو افراد کے درمیان بیٹھا ہوا تھا جو میرے لیے اجنبی تھے۔ ان کے چہرے سخت اور مکروہ تھے اور وہ جیسے بدمعاش نظر آنے کی اچھی کوشش کر رہے تھے اور ڈرائیور کا چہرہ میں نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا لیکن ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو پہچان کے میرا خون کھولنے لگا

تھا کیوں کہ جتنی نفرت میں اس ایک شخص سے کرتا کسی اور سے نہیں کرتا تھا۔ یہ میرے لیے دنیا کی ہر برائی کا مادی روپ تھا اور مجھ پر دنیا کے سارے عذاب اسی کی ذات سے شروع ہوتے تھے۔ یہ استاد پیڈرو تھا۔

خلافِ معمول وہ چپ تھا۔ اس نے مجھے گالیاں نہیں دیں۔ ذلیل نہیں کیا اور مارا پیٹا نہیں۔ اس نے صرف پلٹ کے مجھے دیکھا تو میں نے اس کی آنکھوں میں اور نفرت کی آگ دیکھی اور بڑی مشکل سے اس خواہش پر قابو پایا۔ میں بہت بے بس تھا اور منزل سے پہلے ہی قتل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میرے سامنے طور پر ایک مشن تھا۔ نازو اور موہنی کو چھڑا لے جانے کا۔ کر سکوں گا یا نہیں اور کیا تو کیسے کروں گا۔ اس بارے میں تک میرے ذہن نے کوئی لائحہ عمل مرتب نہیں کیا تھا۔

چپ بھی میں چپ نہ رہ سکا۔ میں نے کہا۔ "آج تم نہیں دکھا رہے ہو؟"

پیڈرو نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔

"واقعی۔ کیا مجبوری ہے؟" میں نے کہا۔ "جس مالک کی خوشی کے لیے خود کتا دم ہلا کے بھونکتا ہے وہی اسے زبان مرضی سے نہیں ہلانے دیتا۔"

اب پیڈرو نے تڑپ کے مجھے دیکھا۔

"اگر تم چپ کر کے بیٹھو تو تمھارے اور ہمارے حق میں بہتر ہو گا۔" کار چلانے والے نے کہا۔ "بلاوجہ کی مار پیٹ یا کسی قسم کا خون خرابا ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہے لیکن اگر تم آنکھیں کرو گے تو معاملہ میرے بس کا بھی نہیں رہے گا۔"

اس کا بڑا اعتماد انداز ظاہر کرتا تھا کہ وہ حکم دینے والوں میں شامل ہے۔ تعمیل حکم کرنے والوں میں نہیں۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"ابھی کچھ دیر میں تم خود ہی جان لو گے۔" وہ بولا۔

"کم سے کم راستہ تو بتاتے جاؤ۔ میں ایک اجنبی ہوں۔"

"سڑکوں کے نام جان کے کیا کرو گے۔ اور اجنبی ہو کیسے کھو گے۔ میں سڑکوں کے نام ایجاد بھی کر سکتا ہوں۔"

"تم اپنا باپ ایجاد کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "میں مانتا ہوں مگر تمھیں جانتا نہیں۔ کیا ہم پہلے کبھی ملے ہیں؟ نہیں بتاتے؟ صورت بتاؤ، کیا یہ تو بتا دو کہ کیا تم قتل کر دو گے مجھے جہنم رسید کر دو۔ شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن۔"

"تم اکیلے کیوں آئے ہو؟"

"ہر شخص دنیا میں اکیلا ہی آتا ہے۔ تمھارے ساتھ

آیا تھا؟"

وہ خاموش رہا۔

"یہ جو تمھارے ساتھ بیٹھا ہے نا، یہ اکیلا نہیں آیا تھا۔ دنیا میں اس کے ساتھ شیطان بھی تھا۔ اس کے اندر۔" میں نے کہا۔ اس بار پیڈرو نے ہاتھ گھمایا مگر میں نے سر نیچے کر لیا۔ مکا ساتھ والے کو لگا۔ اس نے یا اس کے ساتھی نے میرے سر پر کوئی چیز ماری۔ غالباً ریوالور کا بٹ۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ وار اتنا سخت تھا کہ میں ایک دم تاریکی اور خاموشی کے سمندر میں ڈوب گیا۔

دوبارہ آنکھ کھولی تو دیکھتے ہی مجھے ایک بیڈروم دکھائی دیا۔ بیڈ پر میں لیٹا ہوا تھا اور میرے آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ منظر پہلے دھندلا تھا۔ آہستہ آہستہ صاف ہوتا گیا۔ مجھے دوسرا اسباب نظر آیا جس میں وارڈ روب، ڈریسنگ ٹیبل، قالین اور پردے سب شامل تھے۔ ہر چیز نئی اور قیمتی تھی لیکن سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ میرے ہاتھ آزاد تھے۔

اپنے سامنے مجھے ایک کلاک دکھائی دیا جو ٹنگا ہوا تھا۔ اس کی سوئیاں منطبق ہو کے بارہ بجا رہی تھیں۔ چاروں دیواروں پر پردے تھے۔ روشنی تیز لائٹس سے ہو رہی تھی۔ یہ پتا ضرور چلتا تھا کہ ابھی رات باقی ہے۔ میرے ہاتھ کی کلائی کی گھڑی بھی جامہ تلاشی میں اتار لی گئی تھی۔ دونوں ریوالور اور بٹوا پہلے ہی نکالے جا چکے ہوں گے۔

حساب کتاب کچھ غلط ہو گیا تھا۔ محسن شاید میرے تعاقب میں نہیں آ سکا تھا۔ یا آیا تھا تو معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ جگہ دیکھ کے لوٹ گیا۔ پکڑا گیا یا واپس کر دیا گیا مگر واپس کرنے کا کیا سوال۔ عجب کہ اسے بھی میرے ساتھ بلا لیا گیا تھا۔

میرے سر میں شدید درد تھا۔ یہ چوٹ کا اثر تھا۔ میں آہستہ سے بیڈ پر سے اترا اور ایک دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ دوسرا دروازہ بھی مجھے مقفل ملا۔ تیسرا دروازہ باتھ روم میں کھل گیا۔ اس میں تولیہ صابن اور ضرورت کا سارا سامان تھا۔ معلوم نہیں وہاں کس کے کپڑے لٹکے ہوئے تھے مگر ایک زنانہ جوڑے سے مجھے شبہ ہوا کہ وہ موہنی کا ہے۔

ابھی تک میں نے کسی سے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ اپنی حالت درست کرنے کے لیے میں نے غسل کا فیصلہ کیا۔ جب نہا کر ڈریسنگ ٹیبل میں خود کو دیکھ کر بال بنا رہا تھا تو میرے پیچھے والا دروازہ کھلا اور چودھری ولاور ایک قدم اندر آ گیا۔

"خیر سے بیٹا اب بہتر ہو۔ اپنے سکندر صاحب۔" وہ شخص اخلاق سے بولا۔ "میں جی!"

"نہیں میں ویسے ہی بہت ہینڈسم ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ موقع ہے تو غسل کر لوں۔ تم لوگوں کا کیا بھروسا، جو غسل کے بغیر تجہیز و تکفین کر دو۔ ویسے شہید کو ضرورت تو نہیں ہوتی۔"

"یار اپنے سکندر صاحب! تم ذرا نہیں بدلے۔ ویسے ہی ہو۔" وہ بولا۔

"تمھاری صورت اب سور سے زیادہ ملنے لگی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور باپ بیٹے کی صورت میں مشابہت تو فطری بات ہے۔"

"کمال ہے! ابھی تک تم نے کسی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ حالاں کہ وہ۔ کیا نام ہے ان کا؟ ہاں، رشید درانی صاحب وہ تو بڑا رولا ڈال رہے ہیں کہ لڑکیاں کہاں ہیں؟"

"اچھا۔ یعنی وہ لڑکیوں کے چکر میں پڑ گیا؟ حالاں کہ شادی ہو گئی ہے اس کی۔" میں نے کہا۔

"تم نہیں ملو گے ان سے؟" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اپنی نازو اور موہنی سے۔ وہ کیا کہتے ہیں اپنے سکندر صاحب۔ تم جو بڑے فنکار کیا جادو کرتے ہو لڑکیوں پر؟"

"انھی سے پوچھ لیتے۔ جہاں اتنی دوسری باتیں معلوم کر لی تھیں۔" میں نے کہا۔ "چودھری ولاور! تمھارے ساتھ سب سے بڑی زیادتی نام کی ہے۔ فارسی میں کہتے ہیں ایک بات۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے... تم بتا چکے ہو پہلے بھی۔" وہ بولا۔ "میرا نام بزدل خان ہونا چاہیے تھا۔ تمھارے حساب سے تمھاری بہادری تو ثابت ہے۔ لیکن آج اور دیکھ لیتے ہیں۔"

میں اپنی ظاہری بے نیازی کا اور بے فکری کا انداز برقرار رکھنے کی کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے۔ مجھے محسن، نازو اور موہنی تینوں کے بارے میں تشویش اندر سے کھا رہی تھی۔ ولاور کے ساتھ دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے مجھے موقع ملا تھا کہ میں آسانی سے اس کی گردن توڑ دیتا لیکن وہ جانتا تھا کہ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں اور اس کے اعتماد کو دیکھتے ہوئے میں اندازہ کر سکتا تھا کہ آزاد ہونے کے باوجود میں کس حد تک اسیر ہوں۔

اس نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اندر قدم رکھتے ہی مجھ پر بجلی سی گری جس نے مجھے مفلوج کر دیا۔ چودھری ولاور جیسا وہ ایسے ناٹک دینے کا عادی تھا، وہ کسی بھی صورت حال کو ڈرامائی رنگ دے کر ایک نفسیاتی برتری حاصل کر لیتا تھا۔

میرے بالکل سامنے ایک کرسی پر نواب خسرو جمشید بیٹھا ہوا مجھے گھور رہا تھا۔ پلک جھپکائے بغیر وہ پلک

www.paksociety.com

جب کہ ایسا بھی نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ وہ زندہ نہیں تھا۔ کرسی پر اس کی لاش بیٹھی ہوئی تھی۔

دلاور کے قہقہے پر میں چونکا۔ "کیوں جی۔ اپنے سکندر رضا صاحب کے تو ہوش گم ہو گئے ہیں۔"

"تو تم نے اسے مار ہی دیا۔" میں نے کہا۔ "مجھے اسی کا ڈر تھا، اور غدار ہونے والا بھی جانتا تھا۔"

"کیا جانتا تھا؟" دلاور نے کہا۔ "یہی نا کہ غدار کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔ پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"یعنی مجھے میرا حق کیوں دیا؟" میں نے کہا۔ "حالانکہ تم پہلے اس جگہ کے مالک تھے اور اب جہاں تم اسپتال بنوا کے سیاسی فوائد حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

"اس پر میرے سیاسی مستقبل کا انحصار تھا۔ اسے کیا حق حاصل تھا کہ وہ جگہ تمھیں دے؟"

"دلاور! یہ مت بھولو کہ تم نے وہ جگہ رہن رکھی تھی اور اس کے بدلے خسرو جمشید سے پیسہ لیا تھا..." میں نے کہا۔

"پیسہ اسے میں کسی بھی وقت دے سکتا تھا۔ اس نے کبھی مانگا ہی نہیں ــــ کاروبار کے نفع نقصان میں ہم برابر کے شریک تھے مگر سیاست میں ایک داؤ میں نے لگایا تھا جو اس مارِ آستین کی وجہ سے میں ہارا۔" وہ اب مشتعل ہو رہا تھا۔

"ابھی ہارے تو نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "جو پیسہ تم خسرو جمشید کو دیتے اب وہی پیسہ دوسری جگہ زمین خریدنے پر خرچ کر دو۔ اسپتال تو بن جائے گا خواہ کہیں اور بنے۔"

"پھر جب اس نے کہا اسے کیا ملا سیدھا ساتھ چھوڑ کر کیا تم اسے بچا سکے؟" وہ اشتعال میں بولتا گیا۔ "یہ تمھارے محفوظ قلعے کے تہ خانے میں چھپا بیٹھا تھا۔ بڑا سخت پہرا تھا وہاں اور وہ دونوں لونڈے اس نواب کی اولاد، وہ کیا سمجھتے تھے کہ ان کی مرضی کے بغیر میرا وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا! میں نے انھیں بھی کتے کے پلوں کی طرح مار دیا۔ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں، یہ انھیں اندازہ نہیں تھا اپنے سکندر رضا صاحب!"

جیکی اور جوجی مارے گئے! یہ اطلاع میرے لیے بڑی اندوہناک تھی۔ وہ نوجوان تھے، کھلنڈرے سے تھے، عیاش طبع امیر زادے تھے اور بڑے شوقین مزاج تھے۔ ان ساری خرابیوں میں مبتلا تھے جو دولت اور جوانی کے ایک ساتھ ہو جانے کا نتیجہ تھیں مگر وہ غدار اور وطن فروش نہیں تھے۔ وہ پاکیزگی کا دعوا نہیں رکھتے تھے مگر دل میں وطن کے لیے محبت کا وہ جذبہ رکھتے تھے کہ وہ بے خطر آتش نمرود میں بھی کود پڑتے۔ اگر وہ چاہتے تو آسانی سے مجھے شکاری کتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے اور میری خاطر کوئی خطرہ مول نہ لیتے لیکن ان جیالوں نے اس جگہ پر میرا ساتھ دیا اور جان کی بازی لگا دی۔

"شاید تمھیں یقین نہیں آ رہا ہو گا۔" دلاور بولا۔

"یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے دلاور!" میں نے کہا۔ "جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ خسرو جمشید کو اس کی موت وہاں لے گئی۔ جو ایک طرح سے اس کا اپنا ہی گھر تھا۔ اس میں تمھارے لمبے ہاتھوں کا نہیں اس عورت کا ہاتھ ہو گا جو خسرو جمشید کے باپ کی سوتیلی بیوی تھی۔ جیکی اور جوجی کی سوتیلی ماں۔ نواب سلطان کی بیوی جو پہلے صرف سیکرٹری یا داشتہ تھی اور بدقسمتی سے زیب النسا کی حقیقی ماں تھی۔"

"بہت درست معلومات ہیں تمھاری۔" دلاور نے کہا۔

"جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ پیڈرو کا داماد بننے جا رہا ہے اور وہ ایک متعلق پلاٹ کی خریداری کے لیے سلطان خان پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ تو میں سمجھ گیا تھا کہ اب اس کھیل کا خاتمہ یہ ہے کہ تم ہی اسے وہاں سے مستقل کر دو لیکن وقت گزر سکتا ہے۔ اور پھر خسرو جمشید کے تمام معاملات میں مزید کسی کے اندراج کی گنجائش بھی تو نہیں رہی تھی۔ قدرت کو یہ بے شمار جال ختم کرنا تھا۔"

دلاور ہنسا۔ "تم اپنی افلاطونی باتوں سے اسے شہید کا درجہ نہیں دے سکتے۔ ایسے لوگ اسی طرح کتے کی موت مارے جاتے ہیں۔"

"یہ تم اپنے انجام کی پیش گوئی کر رہے ہو؟"

"انجام کی کسے پروا ہوتی ہے اپنے سکندر رضا صاحب! جو آگ سے کھیلتے ہیں وہ جل جانے سے نہیں ڈرتے۔" وہ بولا۔

"ایک کھیل میں کھیل رہا ہوں تو دوسرا تم کھیل رہے ہو۔ اللہ کے نام سے کل تم مارے جاؤ اور دنیا کہے اللہ کو پیارا ہوا اور میں مارا جاؤں تو کہے جہنم رسید ہوا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے! تمھیں خسرو جمشید کو بھی ایک موقع ملا تھا۔ وہ چاہتا تو زندہ رہتا اور پھر ہمارے ساتھ آ جاتا تو ہم اس کی ایک غلطی کو بھول کر معاف کر دیتے۔ مگر اس نے وہ موقع گنوا دیا۔ تم سمجھ رہے ہو گے کہ اسے میں نے مارا ہے؟ نہیں، اسے خود زیب النسا کی ماں نے قتل کیا۔ اس نے صرف ایک شرط رکھی تھی خسرو جمشید سے۔ وہ شرط پوری کر دیتا تو کچھ نہ ہوتا۔ اس نے کہا تھا کہ زیب النسا کی شادی پیڈرو سے کر دو۔ زیب النسا اس کی کیا لگتی تھی؟ بھانجی بھی نہیں تھی۔ باپ کی سوتیلی بہن کی لڑکی تھی۔ وہ اس کا سوتیلا ماموں تھا۔ اس نے کہا ٹھیک ہے، میں خود زیب النسا سے بات کرتا ہوں۔ ویسے تو وہ ماننے کی نہیں۔

جیکی اور جوجی تو تہ خانے میں ہی مارے گئے تھے۔ پیڈرو کے بقول ان کا باپ صدمے سے مر گیا تھا۔ وہ پہلے ہی دل کا مریض تھا۔ اس کی موت کا الزام کسی پر نہیں آتا۔ زیب النسا کی اس تمام دولت اور جائیداد کی وارث ہو چکی تھی جو...... سلطان لوہار کی ملکیت تھی۔ اس میں وہ پلاٹ بھی شامل ہے جس کا سودا تم نے رکوا دیا تھا۔"

"بہت اچھا پلان تھا تمھارا۔" میں نے کہا۔ "تم نے تمام ثبوت گواہ سب تیار کر لیے ہوں گے جن سے ثابت ہو جاتا کہ جیکی اور جوجی کی قاتل یہ عورت ہے، زیب النسا کی ماں اور بالواسطہ طور پر شوہر کی موت کا بھی۔ پھر تم نے اس سے کہا ہو گا کہ کوئی بات نہیں، ہم تمھیں بچا لیں گے۔ پھانسی کا پھندا تمھارے گلے میں نہیں پڑے گا، دب جائے گا۔ حویلی کے اندر سارے گواہ اپنے ہیں اور سب ثبوت ابھی ہمارے قبضے میں ہیں۔ باہر کا کوئی آدمی کچھ نہیں جانتا کہ حویلی کے اندر کیا ہوا۔ لیکن زندگی منظور ہے تو ایک کام کرنا ہو گا۔ زیب النسا کی شادی پیڈرو سے کرانی ہو گی اور اس عورت نے جو تمام عمر زندہ رہنے کے لیے خود کو بھی فروخت کرتی رہی تھی، اس نے بیٹی کو بھی بیچ دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا لیکن میرا خیال ہے کہ اس بے وقوف عورت نے تمھاری چال کو نہیں سمجھا۔ ایک بار زیب النسا کی شادی استاد پیڈرو سے ہو جاتی تو وہ سب دولت جائیداد کسے ملتی؟ اصل وارث جیکی اور جوجی تھے۔ وہ قتل ہو گئے۔ باپ صدمے سے مر گیا۔ ماموں کو تم مروا دیتے اور پھر ماں کے خلاف ثبوت گواہ پیش کر کے اسے تختہ دار تک پہنچا دیتے۔ زیب النسا واحد وارث بچتی جو پیڈرو کی بیوی ہو جاتی۔ یہ اسکیم ناکام کیسے ہو گئی؟"

"اگرچہ میں تمھاری ذہانت کا اعتراف کرتا ہوں۔ بے شک تم نے تمام اندازوں کی حقیقت بیان کر دی۔" دلاور بولا۔ "یہ سب اسی طرح ہوا تھا، اور ہوتا۔ شاید خسرو جمشید بھی سمجھ چکا تھا کہ آگے کیا ہو گا۔ اس نے زندگی کو داؤ پر لگا کے ہم سے جھوٹ بولا۔ جب ہم نے اسے فون فراہم کر دیا تو اس نے زیب النسا سے بات کی، پہلے اسے بتاتا رہا کہ بالکل خیریت ہے۔ حکومت کرتا رہا پھر اپنی آواز میں اسے چیخ کر کہا، زیب النسا بھاگ جاؤ اس گھر سے۔ کبھی واپس نہ آنا ورنہ یہ تمھاری شادی پیڈرو سے کر دیں گے۔ ہم اگر کہتے رہ گئے... بس اتنا ہی کہا تھا اس نے کہ زیب النسا کی ماں نے اسے گولی مار دی۔"

"پھر خسرو جمشید نے زندگی میں ایک قربانی کی۔ خدا بڑا غفور الرحیم ہے، اس کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ اسی نیکی کے صدقے خسرو جمشید کی مغفرت ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "میں محسوس کرتا ہوں دلاور کہ بنیادی طور پر وہ برا آدمی نہیں تھا۔ عیاش ضرور تھا مگر وطن فروش اسے تم نے بنایا۔ وہ غلط لوگوں میں گھر گیا تھا اور دولت جو اس کی عیاشی کے لیے کم پڑنے لگی تھی، اسے تمھارے ساتھ رہنے سے پھر ملنے لگی۔"

"چھوڑو، ختم کرو اس ذکر کو اپنے سکندر رضا صاحب۔ جو مر گئے ان سے ہمیں کیا لینا دینا۔ ہے جی؟" دلاور نے کہا۔ "اب تو بات کرو اپنی۔ ان کی جو زندہ ہیں۔ نازو، رضیہ سلطانہ اور محسن کی۔ ان کی زندگی بچانا تمھارے اختیار میں ہے۔"

"نہیں، میں ایسا دعوا کروں تو کافر۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔ "مارنا یا بچانا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

"مجھے رابعہ کے نہ ملنے کا افسوس ہے۔ ورنہ تم سے سودا کرنا مشکل نہ ہوتا۔" وہ بولا۔

"تم ابھی تک مجھے سمجھے نہیں دلاور۔" میں نے کہا۔ "میں سودا کرنے والوں میں سے نہیں ہوں اور تم سے تو خیر جوتے پر بات بھی نہیں ہو سکتی۔"

"میرے مطالبات پورے کرنا تمھارے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔" دلاور نے میری بات کو نظر انداز کر دیا۔ "ایک تو مجھے بتا دو کہ زیب النسا کہاں ہے۔ دوسرے وہ ٹرک واپس کر دو، اس پر میرا سارا کاروبار داؤ پر لگا ہوا ہے۔ وہ سب نقصان مجھے پورا کرنا پڑا تو میں... قلاش ہو جاؤں گا۔"

میں خوشی سے مسکرایا۔ "کوئی بات نہیں۔ سیاست میں تو کوڑی پیچھے ہو، وزیر بھی ہو جاؤ گے۔"

"میری بات سنو۔" اس نے بڑی تیزی سے میرے سر پر نشانہ مارا جس کے لیے میں بالکل تیار تھا۔ میں نیچے گر گیا اور تیزی سے اٹھا لیکن وہ اپنی جگہ بدل چکا تھا۔

"وہیں کھڑے رہو۔" اس نے مجھے حکم دیا۔ "اور یہ مت سمجھو کہ میں اکیلا ہوں۔ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے وہ بہت سے لوگ سن رہے ہیں اور دیکھ رہے ہیں۔ یقین نہیں تو میری طرف ایک قدم بڑھا کے دیکھو۔"

لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ ایک ساتھ چاروں طرف کے دروازے کھلے اور چار افراد اندر آ گئے۔ ان میں سے دو مسلح تھے۔ سب کے چہروں پر ماسک تھے۔

انھیں دیکھ کر جو خیال بے اختیار میرے دل میں آیا وہ بھوتوں کا تھا کیوں کہ انھوں نے بہت ڈراؤنے ماسک پہن رکھے تھے۔ یہ بدصورت خون آشام کریہہ بھوتوں کے چہرے تھے جو گتے پر رنگ و روغن کر کے بنائے گئے تھے اور بازار میں عام ملتے تھے۔ ان سے بچے کھیلتے تھے اور انھیں پہنے

www.paksociety.com

کے سامنے بیٹھنے کے لیے صرف ایک ربربینڈ کام آتا تھا جو سر کے پیچھے سے گزرتا تھا اور ماسک کو اصل چہرے کے ساتھ چپکائے رکھتا تھا اوپر والے حصے کے دو سوراخوں میں سے آنکھوں کی پتلیاں متحرک نظر آتی تھیں لیکن ان کا باقی چہرہ چھپا ہوا تھا۔ انھوں نے سر تا پا ایک جیسا چست لباس پہن رکھا تھا جو بالکل سیاہ تھا۔

نہ جانے کیوں میرا ذہن اس آسیب زدہ مشہور ہو جانے والے گھر کی طرف چلا گیا جہاں سے نانداور موہنی کو اغوا کیا گیا تھا وہاں بھی لوگوں نے بھوت دیکھے تھے کہیں یہ وہی بھوت تو نہیں تھے!

دو مسلح افراد کے ہاتھوں میں سائلنسر والے ریوالور تھے۔ ان کا رخ میری طرف تھا۔ باقی دو فوجی اسٹائل کی باکسنگ یا جوڈو کراٹے کے چیمپئن معلوم ہوتے تھے کیوں کہ وہ خطرناک انداز میں دفاعی پوزیشن اختیار کیے میری طرف بڑھ رہے تھے۔

دلاور کے اشارے پر وہ رک گئے۔ اس کے دوسرے اشارے پر وہ واپس انھی دروازوں کے پیچھے غائب ہو گئے جن میں سے وہ اندر آئے تھے۔ یہ ایک ڈراماتی منظر تھا اور اس ڈرامے کا ہدایت کار چوہدری دلاور تھا جو ایسے مناظر پیش کرنے کا ماہر تھا۔

"میں تمھیں سوچنے کے لیے چوبیس گھنٹے کی مہلت دوں گا۔" وہ بولا۔ "امید ہے کہ اس وقفے میں تمھارا دماغ ٹھنڈا ہو جائے گا اور تم اپنے نفع نقصان کو بھی سمجھ لو گے میرے پہلے مطالبے کو پورا کرنے سے تمھارا کچھ نہیں جاتا صرف یہ بتا دو کہ زیب النساء کہاں ہے۔ وہ تمھارے ساتھیوں میں شامل نہیں تمھارے ایک سابق دشمن کی عزیزہ ہے۔"

"پہلی بات تو یہ اچھی چوہدری دلاور صاحب کہ دشمن کا کوئی عزیز میرا دشمن نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں تمھارے بیوی بچوں سے تمھارے بداعمال کا انتقام نہیں لے سکتا۔ دوسری بات یہ کہ جب دشمن دنیا سے ہی اٹھ جائے تو میں اس کا معاملہ یوم جزا پر چھوڑ دیتا ہوں اور اسے گالی تک دینا گوارا نہیں کرتا۔ تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ میں کسی بھی لڑکی کو کسی بھی شرط پر تمھارے حوالے نہیں کر سکتا۔ اگر زیب النساء کا پتا مجھے معلوم ہوتا یا وہ میرے پاس آجاتی تو یہ ناممکن تھا کہ تم اسے مجھ سے چھین سکو۔ اس کی اور رابعہ کی یا کسی بھی لڑکی کی عزت میرے لیے ایک سی ہے۔ اس معاملے کو تو بالکل بھول جاؤ۔"

وہ کچھ دیر ہاتھ باندھے ٹہلتا رہا۔ "اگر میں اس مطالبے سے دستبردار ہو جاؤں۔ ویسے تو اس سے صرف پیدا [illegible] ہی وابستہ نہیں۔ مگر میں رعایت دے سکتا ہوں تمھیں۔"

"تمھارا دوسرا مطالبہ بھی میرے لیے اتنا ہی ناقابل [illegible] ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اس ٹرک کو سمندر میں غرق کر چکا ہوں۔"

"تم جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟ پہلے تو تم [illegible] بات کرتے ہوئے نہیں گھبراتے تھے؟"

"میں اب بھی صاف بتا رہا ہوں تمھیں۔ آج کل میں تمھیں اس کا ثبوت مل جائے گا۔" میں نے کہا۔

"تم ٹرک ڈرائیور کی لاش کی بات کر رہے ہو؟"

"کیا وہ مل گئی ہے تمھیں؟"

"ہاں۔ مگر لاش نے یہ بات نہیں بتائی مجھے اپنے مظہر صاحب۔" وہ طنز سے بولا۔

"پھر تو تمھیں ٹرک بھی مل گیا ہوگا؟"

"ہاں۔ خالی ٹرک بھی قریب ہی سے ملا تھا مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ سارا اسلحہ تم سمندر میں پھینک چکے ہو۔" وہ بولا۔ "اسے تم نے کہیں منتقل کر دیا ہوگا۔"

"میں نے اسے سمندر کی تہ میں منتقل کر دیا ہے۔"

وہ میرے قریب آگیا۔ فکرمندی اس کی صورت سے عیاں تھی۔ وہ مجھے پہلی بار خوف زدہ بھی لگا۔

"کہاں؟" اس نے میرا کالر پکڑ کے مجھے جھنجوڑا۔ "کہاں پھینکا ہے تم نے وہ سب؟"

"بحیرۂ عرب میں۔" میں نے کہا اور ایک جھٹکے سے اسے الگ کر دیا۔ "کیا اب یہ بھی بتاؤں کہ بحیرۂ عرب کہاں ہے؟"

"بکواس بند کرو۔ جوکر کی اولاد۔" اس نے دہاڑ کر کہا۔ "تم مجھے وہ جگہ بتاؤ گے جہاں تم نے وہ سب اسباب ڈبویا۔ میں تم کو وہیں لے کر جاؤں گا اور تم نشاندہی کرو گے۔"

"کیسے؟" میں نے کہا۔ "سمندر پر نقشے کہاں کھینچے جا سکتے ہیں۔ [illegible] سمندر خاصا بڑا ہوتا ہے اور اس پر کوئی ایسی نشانی بھی نہیں ہوتی جیسی....."

"تم اندازے سے بتاؤ گے۔ وہ کون سا مقام تھا؟ وہ جگہ ساحل سے کتنی دور تھی؟" وہ بولا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں....."

"وعدے کو مارو گولی۔ یہ بتاؤ پہلے کہ جو اسلحہ تہ میں پڑا ہے وہ تمھارے کس کام کا؟ اس کے لیے اتنی پریشانی کس لیے؟ کیا کرو گے اسے نکال کے؟"

"تم... تم نہیں جانتے۔" وہ سر پیٹ [illegible]

اور میں نے دیکھا کہ اس کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ "تم کچھ نہیں جانتے۔ جب تم مجھے اتنا بتا دو [illegible] ہے اور سچ ہے تو مجھے وہاں لے چلو۔ میں اور کچھ نہیں [illegible] میں تم کو بھی چھوڑ دوں گا، تمھارے ساتھیوں کو بھی۔ یہ ذاتی نقصان کا معاملہ ہے۔ اس سے میں تباہ ہو جاؤں گا۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ چوہدری دلاور کو پہلے بھی بارہا ناکامی اور شکست کا سامنا ہوا تھا لیکن اس کی حالت ایسی کبھی نہ ہوئی تھی کہ وہ رونے پر آجائے اور منت سماجت کرنے لگے۔ ہم نے ان کے اسلحے کے متعدد ذخائر تباہ کیے تھے۔ وہاں کتنی ٹرک اسلحہ تھا لیکن اس سے دلاور اتنا متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے نقصان کو برداشت کیا تھا اور ہر بار پہلے سے زیادہ جوش کے ساتھ ہمارے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ یہ کچھ اور بات تھی۔ ذاتی نقصان تو وہ بھی تھا۔ پھر آج وہ کس ذاتی نقصان پر تباہ ہو جانے کی بات کر رہا تھا!

"دلاور۔" میں نے اچانک کہا۔ "اس ٹرک میں کیا تھا؟"

"اسلحہ... تم جانتے ہو۔" اس نے احتیاط سے [illegible] کہا۔

"اسلحے کے علاوہ کیا تھا؟ سونا؟"

وہ اچھلا تو نہیں لیکن اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا اور تیر نشانے پر لگا تھا۔

"کتنا سونا تھا اس میں۔ اور کیا وہ سب تمھارا تھا؟"

"میرا... میرا تو نہیں تھا مگر میں ذمے دار تھا... وہ مجھ سے وصول کر لیں گے۔ ذمے دار تو میں ہی تھا۔"

"اچھا تو اب تم نے وہاں سونا بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ اسلحہ سمگل ہوتا ہے، بھاری ہوتا ہے۔ جگہ گھیرتا ہے لیکن سونا ذرا سا ہوتا ہے۔ بین الاقوامی منڈی کی کرنسی۔" میں نے کہا۔ "مجھے [illegible] یہ سیدھی سی بات پہلے میرے دماغ [illegible] کرنسی بھی اسمگل کرتے [illegible] قریب کار [illegible]"

[illegible] پالا۔ دلاور بولا۔ [illegible] ڈالر اور پونڈ [illegible] شخص لندن کے راستے پہنچاتا تھا۔ [illegible] خسرو جمشید کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"اور [illegible] کے لیے اپنا ذاتی سامان رکھتا تھا۔" میں اس کا [illegible] ایک بیان موجود رہتا ہو گا۔ دوسرا [illegible] اصلی خسرو جمشید تو کبھی نقلی [illegible] بین الاقوامی مارکیٹ کے بھاؤ پر ہوتا [illegible]

دلاور نے تنگ میں سر ہلایا۔ "سونا کراچی سے اکبر بھائی کے ذریعے جاتا تھا۔ لانچ یا بحری جہاز سے لایا جاتا تھا اور دوسرے راستے سے آگے چلا جاتا تھا۔ سے جانے والے کراچی میں سے ڈیلیوری لیتے تھے۔"

"تم رضاکارانہ طور پر اپنے کاروباری معاملات کے راز افشا کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"یہ کوئی راز نہیں۔ تمھیں معلوم ہو بھی جائے تو تم کیا کر سکتے ہو؟ راستہ بند کرا سکتے ہو یا سپلائی رکوا سکتے ہو؟ تمھارے تو فرشتوں کو خبر نہیں تھی اب تک۔ لیکن میں تمھارے چکر میں آگیا تھا یوں کہ تم نے میرے کارخانے میں اسلحہ تیار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اب تو وہ کارخانہ بھی وہاں نہیں ہے۔ باقی معاملات تمھاری دسترس سے باہر ہیں۔"

"میں مانتا ہوں کہ ہم کچھ بھی نہیں۔ اور اب تک ہم نے جو کچھ کیا ناممکن نہیں تھا۔ ہم ان پورے سیٹ اپ کو ختم کیسے کر سکتے تھے۔ یہ تو ایک سیاسی سازش کا میدان جنگ ہے جس کا کوئی ایک محاذ اور کوئی ایک فریق نہیں۔ شاید ہم نے اس سازش کی ناکامی میں اتنا بھی نہیں کیا جتنا ایک چیونٹی کسی پہاڑ کو ہلانے کے لیے کر سکتی ہے۔ پھر بھی ہم مطمئن ہیں کہ ہم نے اپنا فرض ادا کیا اور اس میں کوتاہی نہیں کی۔ ہم نے پہلے بھی اعتراف کیا ہے کہ نہ ہم حکومت ہیں نہ فوج۔ نہ کوئی سیاسی تنظیم اور نہ کوئی آرگنائزیشن۔ ہم تو چند سرپھرے ایک مجبور وطن کے دشمنوں کے صرف ایک ٹولے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جیسے جنگ عظیم میں ایک بٹالین کا مقابلہ دشمن کی کسی دوسری بٹالین سے ہو۔ ایسی ہزاروں رجمنٹیں، بریگیڈ اور ڈویژن دنیا بھر میں سیکڑوں جگہ پھیلے ہوئے تھے اور سب برسرپیکار تھے۔ پھر بھی کوئی ایک چھوٹی سی بٹالین کا کسی چھوٹے سے مورچے پر جنگ کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔"

"بند کرو اپنا یہ... لیکچر۔" وہ چیخ کے بولا۔ "میری بات کا جواب دو۔ مجھ سے تعاون کرو گے یا نہیں۔ اس جنگ میں تم نے کیا تیر مارے ہیں مجھے اس سے غرض نہیں۔ مجھے پہلے بھی اپنے ذاتی منافع سے غرض تھی، اب بھی میں اپنا نقصان نہیں چاہتا۔ میں نے تم کو ہمیشہ اچھی سے اچھی آفر دی، تمھاری ہر بات ماننے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ تمھارا حق تمھیں پیش کرنا چاہا۔ صرف اس لیے کہ تم اپنے دل سے میری خلاف دشمنی کے جذبات کو نکال دو۔"

"یہ کیسے ممکن ہے دلاور۔ جب تم میرے وطن کے دشمن ہو تو میرے بھی دشمن ہو۔ ذاتی دشمنی تو میں بھول گیا تم

www.paksociety.com

میرے باپ کے قاتل تھے مگر قانون تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ یہ انصاف میں نے خدا پر چھوڑا۔ اب ہم سب ایک طرف ہیں۔ جو محب وطن ہیں۔ ان میں حکومت، فوج، سیاستدان..... مرد، عورتیں، بچے، سب پاکستانی شامل ہیں۔ دوسری طرف تم ہو اور تمہارے ضمیر فروش، وطن دشمن اور غدار ساتھی ہیں جو صرف پیسے کے لیے آزادی کا اور کروڑوں انسانوں کے جذبۂ حب الوطنی کا سودا کر رہے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تم کو معاف کر دوں! جب تک تم دوسری طرف ہو میں تمہارا دشمن نمبر ایک ہوں۔ ہاں تم ادھر آ جاؤ۔ ہماری طرف تو..."

"سکندر! میں آخری بار کہتا ہوں۔ میرے اعصاب اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتے۔" وہ دیوانہ وار چلانے لگا۔ "مجھے بتا دو وہ سونا تم نے سمندر میں کہاں ڈالا تھا؟"

"تم نے ابھی کہا تھا کہ سونا اکبر سیٹھ نے بھیجا تھا۔"

"یہ لانچ غلطی سے لاہور پہنچ گئی تھی۔ میں نے اسے واپس بھجوانے کی فرنٹ ڈیوٹی قبول کی تھی۔ حاجی عبداللہ کے تو صرف ٹرک ہیں۔ مال تو میں نے ہی منگوایا تھا۔" وہ بولا۔ "وہ ایک کروڑ مالیت کا سونا ہے۔ اتنے تو میرے سارے اثاثے بھی نہیں ہیں۔" دلاور نے کہا۔

"تمہارے کون سے اثاثے؟" میں نے کہا۔ "جو یہاں ہیں؟ یا وہ جو باہر ہیں... سوئٹزرلینڈ کے بینکوں میں؟"

یکلخت دلاور کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اس کی صورت پر ایک سفاک سی درندگی کی خونی چمک آ گئی۔

"تم بتاؤ گے سکندر! یہ کام تم نے کیسے نہیں کیا ہو گا۔ تم نہیں بتاؤ گے تو دوسرے تم کو مرتا دیکھ کے بتائیں گے یا تم انھیں مرتا دیکھ کے بتاؤ گے۔ تمہیں اس کے لیے وقت ملے گا۔ اتنا وقت ملے گا کہ تم سوچ سکو، سمجھ سکو، دیکھ سکو کہ موت کتنی بھیانک اذیت کے ساتھ آتی ہے۔"

میں مسکرا دیا۔ "تم پہلے بھی کئی بار اپنے سارے شیطانی حربے آزما چکے ہو اور ناکام رہے ہو۔"

اس نے تالی بجائی۔ وہی چاروں عجوبے نمودار ہو گئے۔ "وہ دوسری لاش بھی یہاں لا کے ڈال دو۔" دلاور نے حکم دیا۔ "دونوں کے کپڑے اتار کے الٹا لٹکا دو۔"

چاروں عجوبوں کے چہرے دیکھنے والے لوٹ گئے۔ ان کے ساتھ دلاور بھی نکل گیا۔ میں خسرو جنید کی اکڑی ہوئی لاش کے ساتھ یہ سوچتا رہ گیا کہ دلاور کی بات کا مطلب کیا ہو سکتا ہے، یہ دوسری لاش کس کی ہو گی اور مجھے الٹا لٹکانے کے کیا معنے

لاشوں کو الٹا لٹکانے کا چکر کیا ہے؟

عجوبے جب پھر آئے تو انھوں نے ٹرک ڈرائیور کی لاش اٹھا رکھی تھی۔ اس کے دونوں پیر چمڑے کے مضبوط تسمے سے باندھ دیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے رسی کا دوسرا سرا مہارت سے گھما کے اوپر پھینکا۔ یقیناً اس نے کافی مشق کی تھی پھر بھی پہلی ساتویں کوشش سے پہلے وہ رسی کو ان کنڈوں میں کامیاب نہ ہو سکا جو چھت میں پنکھا لٹکانے کے لیے نصب کیے گئے ہوں گے۔ رسی کا کنارا جیسے ہی اس میں سے نکل کے نیچے آیا انھوں نے پکڑ لیا اور زور لگا کے نیچے کی طرف کھینچنے لگے۔ یہ کر ڈرائیور کی بے لباس لاش کے پیر اوپر اٹھے پھر پورا جسم زمین سے بلند ہوا ۔۔۔ اس کی لاش خالی کمرے میں پانچ فٹ کی بلندی پر معلق ہو کے جھولنے لگی۔

آتی دیر میں دوسرے عجوبے نے خسرو جنید کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ اس کے لیے رسی وہ ہمراہ لایا تھا۔ اس نے پہلے خسرو کے سارے کپڑے اتار پھینکے۔ پھر اس کے ٹخنے باندھے اور پانچ منٹ بعد اسے بھی دوسرے کنڈے سے یوں لٹکا دیا جیسے قصائی کی دکان پر ذبح کیے ہوئے بکرے نظر آتے ہیں۔

دو مسلح عجوبے اس ساری کارروائی سے بے نیاز نشانہ لیے کھڑے رہے۔ یہ تھا تو کوئی شیطانی چکر لیکن میں ابھی تک دلاور کی اسکیم کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ لاشیں لٹکا کے وہ ذرا سی دیر کے لیے باہر گئے اور پھر لوٹے تو ان کے پاس بڑے بڑے بلب تھے۔ شاید پانچ سو یا ہزار واٹ کے۔ ایک رکوع کی حالت میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے جھکا، دوسرا اس پر چڑھا اور اس نے ایک وال لائٹ کا شیڈ اتارا۔ اس میں سو واٹ کا بلب تھا۔ اس کی جگہ بڑا بلب نصب کر کے ہی وہ اترا۔ باری باری اس نے چاروں دیواروں پر ہزار واٹ کے بلب روشن کیے۔ اب ان پر کوئی شیڈ نہیں تھا۔ کمرا چار ہزار واٹ کی چکا چوند پیدا کرنے والی روشنی میں نہا کر ایک بھیانک منظر پیش کر رہا تھا اور میں کسی نامعلوم خوف میں مبتلا ہونے لگا تھا کیوں کہ میں اس سارے انتظام کا مقصد سمجھنے لگا تھا۔

چار ہزار واٹ کے بلبوں کی صرف روشنی ہی تیز نہیں ہوتی، ان کی حرارت بھی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی ہزار واٹ کے ہیٹر والی کی۔ اس سے کمرے کا درجۂ حرارت بڑھ جانا لازمی تھا۔ چند گھنٹوں میں یہ حرارت بند کمرے کو اتنا گرم کر سکتی تھی کہ ہم پانی کی طرح جلنے لگتے۔ مگر دوسری طرف یہی حرارت لاشوں کے سڑنے کے عمل کو ہوا

میں پانی کی کمی ہو گی۔ پیاس سے میرا حلق خشک ہو جائے گا۔ ایک طرف یہ اذیت بڑھے گی تو دوسری طرف لاشوں کا تعفن بڑھے گا۔ جو جسم پھٹتے تو بہت ہوتے ہیں۔ شاید چھ آٹھ گھنٹے میں ہی لاشوں کی بو سے اور جسم میں پانی کی کمی سے میرا ذہنی بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔

باہر سے عجیب سا شور سنائی دیا۔ کوئی لوہے کی بھاری چیز کھینچ کر اندر لایا جا رہا تھا۔ ایک دروازہ کھلا اور وہی دونوں ایک آہنی پنجرہ کھینچتے ہوئے اندر آ گئے۔ یہ موٹی سلاخوں سے بنا ہوا پنجرہ چار فٹ اونچا تھا۔ اس کی چوڑائی ہر طرف سے ڈیڑھ دو فٹ ہو گی۔ میرا دل کانپنے لگا۔ کیا اس پنجرے میں وہ مجھے بند کریں گے؟ جس میں نہ بیٹھنا ممکن ہے نہ سیدھا کھڑا ہونا۔ وہ اب پنجرے کو ایک دروازے کی مضبوط چوکھٹ کے ساتھ زنجیر سے منسلک کر رہے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے چوکھٹ میں پہلے ہی کنڈے لگا رکھے تھے جو اب تک میں نے نہیں دیکھے تھے۔

ایک بار پھر وہ واپس گئے اور دوسرا پنجرہ لے آئے۔ کمرے کے چار دروازے تھے۔ انھوں نے ہر دروازے سے ایک پنجرہ باندھ دیا۔ اس پنجرے کی سلاخوں کو، زنجیر کو یا چوکھٹ کو صرف آرا ہی کاٹ سکتا تھا۔ وہ جو اس میں کسی جانور کی طرح بند ہو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

جب تو پنجرے انھوں نے مجھے اشارہ کیا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ وہ آگے بڑھے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ کسی چوہے کی طرح پنجرے میں بند ہونے نہیں جاؤں گا اور انھوں نے میرے تیور بھانپ لیے تھے۔ کسی پروفیشنل فائٹر کی طرح وہ میرے آگے پیچھے ایک دائرے میں گھومنے لگے اور ان کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ کئی بار انھوں نے حملہ کرنے کا دھوکا دیا مگر حملہ نہیں کیا۔ بالکل محسوس نہ ہونے والے طریقے پر وہ اپنا گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ دونوں مسلح افراد بھی اب قریب آ گئے تھے۔ مجھے چاروں طرف سے اپنا دفاع کرنا تھا جو چار پیشہ ور لوگوں کے سامنے ایک مشکل کام تھا۔

پھر جب ہوا کہ ان میں سے ایک نے مجھ پر ریوالور مارنے کے لیے جست لگائی مگر یہ صرف ایک ایکٹ تھا۔ اسی وقت دونوں افراد جو خالی ہاتھ تھے مجھ سے چمٹ گئے اور ان کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میری مزاحمت رائیگاں گئی۔ انھوں نے مجھے گھسیٹا اور سر جھکا کے پنجرے میں ڈال دیا۔ اس کے بعد بند ہوئی اور میں اندر مقفل ہو گیا۔

یہ سخت اذیت دہ پوزیشن تھی۔ میں دائیں بائیں بھی نہیں گھوم سکتا تھا۔ اونچا نہیں ہو سکتا تھا اور میرے گھٹنے یوں مڑ گئے تھے کہ سامنے کی سلاخوں سے جا لگے تھے مگر میں بیٹھنے سے قاصر تھا۔ اس پوزیشن میں میری گردن، کمر اور ٹانگیں صرف ایک گھنٹے میں مفلوج ہو سکتے تھے اور یہ ایک گھنٹا شدید درد کو برداشت کرنے کا تھا۔ ابھی تک میں نے حوصلہ نہیں ہارا تھا اور کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ صرف حکم کے غلام تھے اور میرا ان پر چیخنا چلانا یا ان کو گالیاں دینا اور ان سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرنا سب بے کار تھا۔ میری جان تو باقی تین خالی پنجروں کو دیکھ دیکھ کر نکلی جا رہی تھی کیونکہ اب مجھے کوئی شک نہیں تھا کہ ان میں کسے لا کے بند کیا جائے گا۔

سب سے پہلے وہ محسن کو لائے۔ اس نے مجھے دیکھا۔ ذرا سی دیر کے لیے رکا مگر پھر دھکے سے آگے گیا۔ وہ میرے دائیں ہاتھ والے پنجرے میں بند ہوا۔

"محسن! حوصلہ مت ہارنا۔" میں نے کہا۔

"ہماری تو کوئی بات نہیں یار!" وہ بولا مگر اس کا لہجہ انتہائی شکست خوردہ تھا۔ "مگر..." وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا کیوں کہ تیسرے پنجرے میں بند کرنے کے لیے وہ نازو کو لے آئے تھے۔

وہ چیخ چلا نہیں رہی تھی لیکن خود کو چھڑانے کے لیے سخت مزاحمت کر رہی تھی۔ اسے قابو میں رکھنا کسی جوان اور جنگلی شیرنی کو زندہ گرفتار کرنے سے زیادہ مشکل کام تھا مگر شکاری بھی نئے نہیں تھے۔ ہر شکار کے بارے میں ان کی معلومات مکمل تھیں اور اسی مناسبت سے انھیں تربیت بھی دی گئی ہو گی کہ اپنی تمام کوشش کے باوجود نازو خود کو رہا کرانے میں ناکام تھی۔

اس کمرے میں آتے ہی نازو نے پہلے مجھے اور پھر محسن کو دیکھا تو اس کی ساری مزاحمت ختم ہو گئی۔ اس کے اشتعال پر حیا غالب آ گئی۔ یہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ہم کبھی اسے یوں بھی دیکھیں گے۔ شکاری اسے بالآخر پنجرے میں ڈال کے تالا لگانے میں کامیاب ہو گئے۔

اب ہم سب کی پوزیشن بہت عجیب تھی۔ ہم ایک دوسرے سے بات کرنے کی تو کیسے کرتے۔ ہماری تو نظر بھی نہیں اٹھتی تھی۔ یہ جسمانی عذاب سے زیادہ ذہنی اذیت کا ایک انسانیت سوز تجربہ تھا۔ خود مجھے ایک بار یہ تجربہ ہو چکا تھا اور نازو بھی یہ تذلیل برداشت کر چکی تھی مگر محسن اور نازو کے ساتھ ایسا پہلی بار ہو رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کی عزت نفس کو ختم کرنے، اسے اپنی ہی نظر میں حقیر و ذلیل کرنے اور اس کی قوت مدافعت کو مفلوج کرنے کا یہ سب سے موثر نفسیاتی حربہ ہے ....

حقیر پن کے سامنے تھوڑی بہت مدافعت کی قوت باقی رہتی ہے

www.paksociety.com

گر سامنے اپنے ہی ہوں تو آدمی چاہتا ہے کہ مچھلی کے پانی بن جائے اور زمین میں جذب ہو جائے۔

موہنی نے سب سے زیادہ ہنگامہ کیا: اگر میں یہ کہوں کہ حالات نے اسے احساس شرم و حیا کو بحالت مجبوری بھلائے طاق رکھنا سکھا دیا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ اس نے میرے سامنے تسلیم کیا تھا کہ وہ جسم فروش تو نہیں ہے مگر حصول مقصد کے لیے اس نے اپنے جسم کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔

"میں نے کیا ہے سکندر یا محسن؟" اس نے پنجرے کو جھنجھوڑنا شروع کیا اور چیخ چیخ کر ہمیں مخاطب کرنے لگی۔ اس کی زور آزمائی سے لوہے کا پنجرہ زمین پر ڈولنے لگا مگر پنجرے نے اسے گرنے نہیں دیا۔ اس کے ہنگامے نے ہمارے احساس کے زخموں میں انگارے بھر دیے۔ میں نے خود کو بہت حقیر اور بے بس، شکست خوردہ اور کسی چڑیا گھر کے جانور سے بھی زیادہ تکلیف دہ حالت میں پایا۔

"موہنی!" میں نے بالآخر بہت سے کام لے کر اسے ڈانٹا۔ "یہ کیا کر رہی ہو، کیا ہوگا اس شور ہنگامے کا اثر؟ کیا وہ تمہیں چھوڑ دیں گے؟ انھیں ترس آ جائے گا تم پہ؟ یا تم سلاخیں توڑ کے نکل جاؤ گی؟"

"مگر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟" وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگی۔ "میرا قصور کیا ہے؟"

"تم صرف اپنے بارے میں سوچ رہی ہو؟" میں نے طنز سے کہا: "حالانکہ جو کچھ ہو رہا ہے سب کے ساتھ ہو رہا ہے۔ مگر تمہیں یہ خیال بھی ہے کہ تم نے سائڈ بدلنے کی غلطی کی۔ ہم تو ایک مقصد کے لیے سب برداشت کر رہے ہیں، تم بے مقصد مر رہی ہو۔"

"الیاس کس مقصد کے لیے... تم دوست کو تم جانتے ہو کہ میں نے اپنا مقصد تمہیں بنا لیا تھا۔ سائڈ بدلی تھی تو تمہارے لیے۔ میں تو زیادہ مظلوم ہوں۔ تمہیں اطمینان تو حاصل ہے۔ مجھے امید کا سہارا بھی نہیں۔ تمہیں میرا ذرا خیال نہیں۔ تم میرے بارے میں سوچتے تک نہیں۔ تم نفرت کرتے ہو مجھ سے۔" وہ شدید ہسٹیریا میں اپنا سر پنجرے پر مار رہی تھی۔

ولادر آہستہ سے اندر آ گیا۔ اس کے لبوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ تھی۔

"واہ جی واہ۔ اپنے سکندر صاحب!" وہ بولا۔ "کتنے اچھے لگ رہے ہو آپ اس ڈرائنگ روم میں۔ کوئی شکایت تو نہیں ہے نا؟"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تو اب کیا خیال ہے، میں آخری بار آیا ہوں۔" وہ بولا۔ "میں چلا گیا تو پھر آؤں گا کل۔ اس وقت تک تم کو سوچنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ اگر ذہنی کو جسمانی طور پر [illegible] الگ بات ہے۔"

"تم میرا جواب سن چکے ہو۔" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس کے بعد کیا ہو سکتا ہے؟" وہ بولا: "ابھی میرے جانے کے بعد ایک قصائی [illegible] وہ تمہارے سامنے ان دونوں کی کھال کھینچے گا۔ وہ اس کا کام ہے۔ تم نے بکرے ذبح کرنے والوں کو کھال اتارتے دیکھا ہوگا۔ یہ کام بھی ایسے ہی ہوگا۔ پوری کھال کھینچنے کے [illegible] گے۔ میں نے حکم دیا ہے کہ نواب صاحب کا سر [illegible] پنجرے میں باہر کی طرف لٹکا دیا جائے اور اس [illegible] خاتون کے سامنے کمرے کا اندر ڈال دیا جائے۔ میرے خیال میں یہ بہتر رہے گا۔" وہ بڑے کمینے شیطانی انداز میں ہنسا۔

اس نے ایک نظر ہم سب کا جائزہ لیا: "ایسا منظر تم نے کبھی دیکھا ہے چھوٹے سکندر صاحب؟ تم نے تو [illegible] ہے اور وہاں [illegible] بھی بہت دیکھی ہوں گی۔"

اس نے تالی بجائی۔ یہ محض ایک ڈرامائی حرکت تھی۔ وہ آواز دے کر بھی کسی کو بلا سکتا تھا۔ مگر اس طرح وہ اپنی [illegible] اور حاکمیت کا مظاہرہ کرتا تھا اور یہ تاثر دیتا تھا کہ کچھ ہوتا ہے اس کے اشارے پر ہوتا ہے۔ اس مرتبہ جو شخص اندر آیا اسے میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ کار چلا کے لایا تھا۔ اب اس کے کندھے پر ایک بوری کا تھیلا تھا۔

آہستہ آہستہ پنجرے کو [illegible] کرتے ہوئے اور نیم دائرے میں حرکت دیتے ہوئے اس نے وہ منظر [illegible] جس میں انسانیت کی تذلیل کا بدترین تماشا نظر آتا تھا [illegible] کس حد تک گر سکتا ہے اور گرایا جا سکتا ہے [illegible] کا ثبوت ہوگی۔

"تمہیں معلوم ہے یہ کھال اتروانے کا تجربہ میں کیوں کر رہا ہوں؟" ولادر بولا۔ "اس سے لاش جلد سڑنے [illegible] اندازہ کر سکتے ہو کہ جب یہ کمرا گرم ہو کے بھٹی بنے گا [illegible] ابھی سب کے سب صحیح آدمی لاشیں۔ لیکن مل گیا تو میں کھال [illegible] پھر دونوں کے یہاں رکھوا دوں گا [illegible] کو جلنے والی سزا کا تماشا دیکھیں گے۔ یہ لاشیں سڑنے [illegible] ان کے پیٹ پھٹ جائیں گے اور سارا [illegible] بھی کرے گا۔ اس کی بو بھی کمرے میں رہے گی [illegible] زیب النسا کمال ہے اور وہ [illegible] کو ابھی اسی وقت چھوڑ دوں گا اور تم یہاں [illegible] تم مجھے وہاں لے جاؤ گے جہاں تم نے میرا مال [illegible] رکھا ہے۔"

[illegible] ولادر بولا: "تم اتنے احمق ہو کہ میری بات کسی [illegible] کہ میں تم پر اعتبار کرنے والا ہوں؟" میں نے [illegible] کیا میں غلط جگہ بھی لے جا سکتا ہوں۔ یا نہیں لے جا سکتا؟ [illegible] تم سب کو پنجرے سے کیوں چھوڑ دیے جاؤ۔ اور اگر میں فرض کر لوں کہ مال برآمد ہو جانے کے بعد تم وعدے پر قائم رہو گے۔ تو مجھ سے بڑا بیوقوف کون ہوگا۔"

"میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ ابھی معاملات پر میرا اختیار ہے، سکندر اعظم صاحب۔" وہ بولا۔ "شام کو یا کل صبح میں آؤں گا تو میرے ساتھ دوسرے لوگ بھی آئیں گے۔ ان میں سے کچھ کو تم جانتے ہو، کچھ کو نہیں جانتے۔ پھر میری نہیں چلے گی۔"

"میں بتاتی ہوں۔ میں بتاؤں گی۔" موہنی نے چیختے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں سب بتا دوں گی۔"

ولادر نے ایک قہقہہ لگایا۔ "بے شرم بے غیرت۔ [illegible] مجھے کچھ معلوم ہی نہیں۔ تم بے وقوف بنانا [illegible] انھیں جو میرے ساتھ آئیں گے۔ تمہیں لے جانے کے لیے وہ تیرے اپنے لوگ ہوں گے جو تیری وفاداری سے بہت خوش ہیں۔"

موہنی نے ایک احمقانہ کوشش کی تھی۔ شاید اس نے سوچا ہوگا کہ جیسے وہ اب تک.... اپنا کام نکالتی آئی ہے ایسے ہی ولادر کو بھی رام کر لے گی۔ مگر ولادر کو وہ جہاں جاتی تھی کہ وہ کیا شے ہے۔

ولادر واپس چلا گیا۔ وہ کچھ مایوس نظر آتا تھا۔ اسے امید [illegible] ایسے وحشتناک حالات میں اور [illegible] کے حالات کا خیال [illegible] قوت مزاحمت کی شکست کے لیے کافی ہوگا۔ ایسا [illegible] اپنے شیطانی منصوبے کو آگے بڑھانے کا فیصلہ [illegible] مجبور ہو گئے۔

[illegible] ہوئے تھے اور ان کے کالے [illegible] تھے۔ ہدایات کے مطابق انھوں نے [illegible] آپس میں رگڑنا شروع کر دیا [illegible] کو موم پھر کے دیکھنے لگے [illegible] ایک وحشیانہ خوشی کا اظہار بھی کر [illegible] ایک بہت دل خوش کن تھے [illegible]

[illegible] ایک نازو کی طرف گیا۔ اس نے ایک [illegible] اور نازو کے جسم کی نازک کھال پہ [illegible] نازو نے ایک دل خراش چیخ ماری۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ اس نے کوئی خنجر کو نازو کی پسلیوں میں اتار دیا ہے۔ میں بے اختیار تڑپا اور میں نے اسے چیخ کے گالی دی۔ وہ قہقہہ مار کے میری طرف آیا۔

دوسرا کچھ موہنی سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا اور وہ بری طرح چلا رہی تھی۔ پنجرے کے اندر اچھل رہی تھی اور پنجرے کی گڑگڑاہٹ میں میرا اعصاب شکن چیخ پکار اور ان قصابوں کے قہقہے یہ سب ایک ناقابل بیان ڈراؤنے خواب کا حصہ لگتے تھے۔ اب محسن بھی چلا رہا تھا اور پنجرے کو یوں ہلا رہا تھا جیسے اسے توڑ دے گا۔ جنون اور پاگل پن کے ابتدائی آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ حالانکہ ابھی صرف ابتدا تھی کیونکہ ہم کھال اتارے جانے کا منظر دیکھ سکیں گے۔ اور اس کے بعد کے چند گھنٹوں کا عذاب جھیل سکیں گے جو بیک وقت جسمانی اور روحانی ہوگا؟

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں اپنے کان بند نہیں کر سکتا تھا ورنہ نازو اور موہنی کی دلخراش چیخوں سے بچ جاتا۔ میں اپنی ناک بند نہیں کر سکتا تھا کہ جب اس کمرے میں انسانی گوشت کے سڑنے کی بو بھر جائے اور لاش کے ڈی کمپوز ہونے سے پیدا ہونے والی عفونت بھر جائے تو میں اسے اپنی قوت شامہ پر اثر انداز ہونے سے روک سکوں۔

ان حالات میں خدا کے بعد دنیا میں کسی سے مدد حاصل ہونے کی امید تھی تو وہ شیخ اور راجانی ذات تھی۔ وہ دونوں ٹرک کے ساتھ نکل گئے ہوں گے۔ اب آگے کیا ہوا؟ ٹرک ڈرائیور انھیں لے گیا یا وہ ٹرک ڈرائیور کو؟ اس کا پتا نہیں چل سکتا تھا۔ ان امکانات کو یکسر رد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس ٹرک میں یہاں آ جائیں اور کچھ کر سکیں۔ تاہم یہ حالات کی روشن تصویر نہیں تھی۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ بھی ہماری طرح پنجروں میں قید ہو جائیں۔

کمرے میں اب مکمل سکوت تھا۔ نازو اور موہنی غالباً بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ان کے حق میں بے ہوشی ایک نعمت تھی۔ سارا عذاب تو احساس دیتا ہے۔ اب وہ کچھ نہیں دیکھیں گی، کچھ نہیں سنیں گی اور کچھ محسوس نہیں کریں گی۔ بے ہوشی ایک زیادہ گہری نیند ہے۔ نیند سے تو آدمی خود بھی جاگ اٹھتا ہے اور اسے جگایا بھی جا سکتا ہے مگر بے ہوشی کا حصار زیادہ مضبوط ہوتا ہے جو دماغ کو اور جسم کو زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرتا ہے۔ باہر ایک کار کا انجن غرایا۔ پھر کار چلی گئی۔ خاموشی اور گہری ہو گئی۔ میں ابھی تک ہوش میں تھا۔ شاید محسن بھی ہوش میں تھا اور میری طرح وہ

www.paksociety.com

بھی آنکھیں بند کیے سوچ رہا ہوں گا کہ ان حالات میں کیا ہو سکتا ہے؟ بفرضِ محال ہم دلاور کو وہ جگہ بتا دیتے جہاں ہم نے اس کا مال غرق کیا تھا تب بھی دوسری بات جس کا خود ہمیں علم نہ تھا کیسے بتائی جا سکتی تھی۔ زیب النسا یقیناً فرار ہو گئی تھی مگر فرار ہو کے کہاں گئی تھی؟ ہمارے لیے اس بارے میں قیاس آرائی کی بنیاد پر بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہیں تھا۔

وقت کا ایک ایک لمحہ اس پر بوجھ سے لگتا تا گزر رہا تھا اور میرے عذاب میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ میں ان آوازوں کو سن رہا تھا جو دونوں درندہ صفت قصاب کھال اتارتے ہوئے نکال رہے تھے۔ ان کا مقصد آوازوں کے ذریعے ہمارے دماغ میں وہ تصور قائم کرنا تھا جسے ہماری آنکھوں نے دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

پھر مجھے ایسا لگا جیسے میرے چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا ہے۔ شاید میں بے ہوش ہونے والا ہوں میں نے سوچا۔ مگر اسی وقت وہ دونوں قصائی چلانے لگے جیسے ہی ہم جنس کی کھال اتارتے ہوئے اتنی اذیت بھی محسوس نہیں کر رہے تھے جتنی بکروں کی کھال کھینچتے وقت محسوس کرتے ہوں گے۔

"ارے یہ کون ہے۔ کس نے آف کی ہے لائٹ؟"

"کیا فیوز اڑ گیا ہے۔" دوسرا چلایا۔

اور تب میں نے محسوس کیا کہ اندھیرا حقیقی ہے۔ ایک ساتھ وہ چاروں بلب بجھ گئے تھے جن کی چندھیا دینے والی روشنی اور حرارت برداشت سے باہر ہونے لگی تھی۔ صرف کچھ لمحے میں میرا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا اور پیاس سے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔

گھپ اندھیرے میں دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ کیا خدا نے ہماری سن لی تھی؟ کیا واقعی راجا اور شیخ ادھر آ گئے اور انھوں نے صورتِ حال کو سنبھال لیا؟ مگر یہ ناممکن تھا کہ اتنے کم وقت میں وہ سیدھے یہاں پہنچ جاتے۔ کوئی ان کا راستہ بھی نہ روکے۔

دونوں قصاب بدحواس ہو گئے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کے حلق سے نکلنے والی چیخ سنی۔ پھر کوئی جسم فرش پر بھری آواز کے ساتھ گرا۔ دوسرا چلانے لگا۔

"کون ہے؟ ارے تو کہاں سے، بولتا کیوں نہیں؟ کیا ہوا ہے تجھے؟ خود کو چھری مار لی ہے کیا؟" اس کی آواز بھی ایک دم بند ہو گئی۔ وہ بلبلایا اور میں نے تاریکی میں اس کے کالے وجود کو بھی فرش پر گرتے دیکھا۔ ان کے ساتھ کیا ہوا تھا اور کیوں ہوا تھا میں نے محسن کو آواز دی۔

"تو ٹھیک ہے نا محسن؟"

"ہاں۔ ابھی تک تو بہت خیریت ہے۔" وہ بولا۔ "یہ کیا تھا؟"

اندھیرے میں قدموں کی چاپ میرے نزدیک آئی۔ میرے پنجرے کے قفل کو ہاتھ لگا کے دیکھا۔ میری نظر ایک سائے پر ٹھہر گئی جو کوئی واضح شکل نہیں رکھتا تھا۔

"تم... کون ہو تم؟" میں نے کہا۔

"فرشتۂ غیبی۔" غالب نے سرگوشی میں کہا۔ "حکم سے اسی طرح آتا ہے۔"

میرا دل ایک بے پایاں خوشی سے بھر گیا۔ "مگر بہت کم کہ تم لوگ یہاں پہنچ جاؤ گے۔"

"میاں ہم تو پہلے ہی آ جاتے۔ مگر ہم دلاور کے جانے کا انتظار کرتے رہے۔" غالب نے کہا۔

"میں نے تم سے گھر بند کرنے کو کہا تھا۔"

"ہاں۔ مگر دل نہیں مانا۔" وہ بولا۔ "کبھی کبھی دل کا کہا ماننا اچھا ہوتا ہے۔ میں محسن کے پیچھے لگ گیا تھا۔"

"مگر تم اکیلے اندر آ پہنچے؟ کسی نے روکا نہیں؟"

"روکا تھا۔ ایک نے نہیں، دو نے۔" غالب بولا۔ "دونوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ دونوں کو مار دیا۔"

"میں نے تو کوئی آواز نہیں سنی۔"

"میں نے انھیں آواز نکالنے ہی نہیں دی۔" غالب بولا۔ "خیال ہے کہ اب اندر اور کوئی نہیں ہے۔"

"پہلے تالا تو توڑو یار۔ میرے گھٹنے، میری کمر اور گردن سب ٹیڑھے ہو رہے ہیں۔"

"چابی تو مجھے ملی نہیں۔" غالب نے کہا۔ "کیا خیال ہے؟ اڑا دوں؟"

"چابی نہیں ملی... اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ ساتھ لے گیا، پھر اندر کوئی اور بھی ہے۔"

"باہر دو بھوت پھر رہے تھے۔ انھیں میں نے دیکھتے ہی ناک آؤٹ کیا اور پھر ان کی گردن دبا دی۔ جو ریوالور تھے وہ اب میرے پاس ہیں۔"

"پھر کا ہے کا ڈر۔" میں نے کہا۔ "ایک ایک کو گولی مارو۔" اس کے بعد ہم دونوں منتظر رہے۔ غالب نے پنجرے کی سلاخوں میں ریوالور رکھ کر قفل کو گولی کا نشانہ بنایا۔ اس کی آواز بند کمرے میں گونجی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ پنجرے سے باہر آنا ایک نئی زندگی پانے سے کم نہیں تھا۔

مجھے پنجرے میں سیدھا کھڑا ہونے میں کچھ دیر لگی۔

"یہ لائٹ کیوں آف کی تھی تم نے؟"

"میں نے نہیں کی تھی۔" وہ بولا۔ "لائٹ تو خود ہی بند ہو گئی تھی۔ میرا خیال ہے اس علاقے کی بجلی چلی گئی ہے۔"

"پھر تو یہ شبے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ صرف اتفاق کا ہاتھ ہے۔" میں نے کہا۔

"میں ادھر آ رہا تھا کہ پہنچا تھا۔" وہ بولا۔ "پہلے میں نے چاروں طرف سے گھوم پھر کر دیکھا۔ پھر پچھلی طرف سے اندر آیا۔ اور ادھر چلا جا رہا تھا ان کی نظر بچا کے اور جگہ ڈھونڈنے کے لیے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کمرے میں کچھ ہو رہا ہے۔ میں نے ایک دروازے کی درز سے جھانک کے دیکھا... سب دیکھ لیا تھا میں نے۔"

"یہ اندھیرا غنیمت ہے۔" میں نے کہا۔ "چلو دوسروں کو بھی نکالیں۔"

ایک ایک گولی سے ہم نے باقی تین پنجروں کے تالے توڑ دیے۔ محسن سب سے پہلے باہر آیا اور غالب کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ جب وہ لوٹا تو اس نے ایک بھوت کا لباس پہن لیا تھا سوائے نقاب کے۔ اب ہم ایک سے تین ہو گئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ اس قید خانے میں اور کوئی نہیں ہے۔ جانے سے پہلے دلاور چار محافظ چھوڑ گیا تھا۔ ان میں سے دو نہتے تھے اور وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ چار اغوا کار اتنی جلدی آزاد ہو جائیں گے۔ اس نے تو ہمیں اس طرح بند کیا تھا کہ وہ کسی کو بھی چھوڑ کے نہ جاتا تب بھی ہمارا نکلنا ناممکن تھا۔

"یہ جگہ کون سی ہے مرزا جی؟" میں نے کہا۔

"مضافات کا علاقہ ہے۔ ایک الگ مکان ہے کسی پہاڑی پہ بنا ہوا۔" غالب نے کہا۔

"تم مونی کو اٹھاؤ۔" میں نے غالب سے کہا۔ "محسن اسے اٹھائے گا۔ نازو کو... میں تمھیں راستہ بتاتا ہوں۔"

"راستہ مجھے بھی معلوم ہے۔"

"گھر کے اندر ہی ایک بیڈ روم ہے۔ اس کے ساتھ والے باتھ روم میں ان لڑکیوں کے اپنے کپڑے موجود ہیں۔" میں نے کہا۔ "نازو کے کپڑے ... جائیں گے تو مونی کے کپڑے بھی مل جائیں گے۔"

"اس اندھیرے میں تو کچھ نظر نہیں آتا۔ ... اچھا ہے ..." غالب نے کہا۔

"اچھا ہے، ہم اندھیرے میں ہی نکل جائیں۔"

"... لڑکیوں کو ... یہ تو بے ہوش ہیں۔"

"ان کے ہوش میں آنے کا انتظار کریں۔" میں نے کہا۔ "ان کے ہوش میں آنے سے پہلے وہ آ گئے تو؟"

"نہیں، وہ چار پانچ گھنٹے سے پہلے نہیں آئیں گے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہم اطمینان سے..."

بجلی ایک دم آ گئی۔ ہم سب اس وقت کسی کمرے میں تھے۔ روشنی ہوتے ہی میں نے اس خواب گاہ کو پہچان لیا۔ دلاور اسی بیڈ روم میں میرے پاس آیا تھا۔ اس وقت صورتِ حال بڑی عجیب اور افسوس ناک تھی لیکن اب میں جو کچھ کر رہا تھا میں ہی کر رہا تھا۔ چنانچہ میں باتھ روم سے مونی کے کپڑے لایا۔ غالب ایک اور کمرے سے نازو کے کپڑے تلاش کر کے لایا۔ پھر ہم نے انھیں جیسے تیسے وہ کپڑے پہنا کے اور ایک ہی بیڈ پر لٹا دیا پھر ان کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔

"چچا غالب! تم نے آج ہمارا وہ کام سرانجام دیا ہے کہ یہ زندہ ہوتا تو میری زندگی کا۔" میں نے کہا۔ "اور میں ہوتا تاج برطانیہ کا مالک۔ تو تمھیں کوہ نور کا ہیرا دیتا۔"

"میں ہوتا تو وکٹوریہ تک دیتا کر اس الگ۔" محسن نے کہا۔

"وکٹوریہ میری وہ کلاس فیلو تھی جس پر میں تین بار عاشق ہوا تھا اور کسی کے حصے میں یہ اعزاز نہیں آیا کہ اس کو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ رقیب کو کہتے ہیں۔"

"یار عجیب اوکھلی میں دیا سر تو پھر موسل کا کیا ڈر۔" غالب نے کہا۔ "اب تو ہم یہاں قابض ہیں اور اتنے بے بس بھی نہیں ہیں کہ وہ اچانک آ جائیں تو ہم مقابلہ بھی نہ کر سکیں۔"

"پھر کیا چاہتے ہیں آپ؟"

"میں اور محسن فی الحال دشمن کے قلعے کا جائزہ لیتے ہیں۔" وہ بولا۔

"ہاں، یہ گھر ہے تو اس میں ایک کچن بھی ہوگا۔ اور کچن میں کم سے کم چائے بنانے کے آلات و اسباب ضرور ہوں گے۔ بھلا کس نے گھر کو فراموش کیا ہوگا۔ تو پھر کیا طرح کیا ہوگا۔" محسن بولا۔

"ٹھیک ہے، تم دونوں جاؤ۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک خانساماں ہوگا۔ دوسرا محافظ جو محافظ ہوگا اسے کچھ دوسرے کام بھی کرنا ہیں۔"

"چائے میں بنا کے لاتا ہوں۔ میں کچھ اور کرنے کے قابل نہیں ہوں۔" محسن نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں سیکیورٹی کے انتظامات مکمل کرتا ہوں۔" غالب نے کہا۔

وہ دونوں نکل گئے تو میں نے بیڈ روم کو چیک کیا۔ اس کے دروازے اندر سے کنڈی لگا کے بند کیے کھڑکی کے پٹ دیکھے اور پردے برابر کیے پھر سائیڈ ٹیبل کی درازوں کو کھولا۔ اس میں ایک طرف نیچے والے حصے میں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ اس کا تار بتا رہا تھا کس سمت سے آیا تھا کہ ابھی تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے

www.paksociety.com

اس کا ریسیور اٹھا کر نیچے رکھ دیا۔ اوپر والی دراز میں چند زیورات پڑے ہوئے تھے جو شاید موسیٰ کے تھے یا نازو کے۔ میں نے انھیں اٹھا کے دیکھا۔ ایک نیکلس، ایک جوڑی ٹاپس اور چار چوڑیاں نہ جانے کس کی تھیں اور کس کی تھیں وہ نہ جانے کس دنیا میں تھی اور کس حال میں تھی۔

دوسری طرف والی بیڈ سائیڈ ٹیبل کے نیچے والے خانے میں فحش تصاویر کا ایک البم تھا۔ اسے میں نے سرسری نظر سے دیکھا اور واپس وہیں رکھ دیا۔ اوپر والی دراز میں مجھے مطلوبہ اشیا مل گئیں۔ یہاں رہنے والے یا تفریح اور عیاشی کے لیے آنے والے قسم قسم کی ادویات کے عادی تھے۔ اس میں اسپرین سے لے کر خواب آور اور شباب آور ہر طرح کی گولیاں تھیں۔

غالب پلٹ کر لوٹ آیا۔ میں نے اس کمرے کو بند کر دیا تھا۔ وہ کرسی پر گر کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ "میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے اس منظر کو دیکھ کر۔"

"اگر یہ لڑکیاں دیکھ لیتیں تو کیا ہوتا؟" میں نے تشویش سے کہا۔ "ان کا بھرم ختم ہو جاتا اور پھر لاش بند ہو جانا اچھا ہوتا۔"

"یار... آدمی کی زندگی بھی کیا عجیب تماشا ہے۔" غالب نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ "یہ جو شخص آدھے جسم کی ادھڑی ہوئی کھال کے ساتھ الٹا لٹکا ہوا ہے، ایک نواب تھا... لاکھوں کروڑوں میں کھیلتا تھا۔ ایک سے ایک اچھی کار اور داشتہ رکھتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ جو لٹکا ہوا ہے، وہ فقط ایک ڈرائیور تھا۔ دونوں نے زندگی کا سفر کہاں سے شروع کیا، کس کس راہ سے گزرے اور ملے تو کہاں آ کے ملے اور کیسے ملے، کاش میں دنیا کو یہ عبرت دکھا سکتا۔ ان سب کو جو جیل و زنداں کی سلاخوں میں شراب و شباب کے پیمانے چھلکا رہے ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہیں اور دولت کو ہی زندگی کی طاقت سمجھتے اور عزت سمجھتے ہیں۔ کیا ان سے وہ مفلسی میں مرنے والا اچھا نہیں جس کا جنازہ اٹھا تو اسے رونے والے بیٹے، بہو، نواسے، پوتے، دوست اور محلے دار سبھی تھے۔ جس کو کفن بھی ملا اور دفن بھی۔ جس کے لیے دعا مانگنے والے بھی بہت تھے کہ خدا اس کی مغفرت کرے اور بعد میں اچھے لفظوں میں یاد کرنے والے بھی ہیں۔"

میں نے اسے بولنے دیا کیونکہ یہی اس کا علاج تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے ایک ہیبت ناک منظر دیکھ کے آیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ پُرسکون ہو گیا۔ پھر بھی میں نے دراز میں ملنے والی ادویات میں سے ویلیم ٹین کی ایک گولی اسے دی اور ایک خود نگل لی۔ یہی سب کچھ میں نے بھی دیکھا تھا اور میرے اعصاب کو بھی پُرسکون رکھنے کے لیے سکون آور دوا کی اتنی مقدار کم سے کم ضروری تھی۔

محسن چائے کی ٹرالی کو دھکیلتا ہوا لایا۔ اس میں چائے کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ کلاک نے رات کے دو بجائے [illegible] لے موسیٰ کو ہوش میں لانے کے لیے اور غالب نے ان کو بحال کرنے کے لیے ان کے چہروں پر چھینٹے مارے۔ ان کی کوششوں کی بجائے زور زور سے چانٹے مارے۔ آہستہ آہستہ جسم کانپنے لگا۔ اور وہ سسکیاں لینے لگی۔ جیسے جیسے ہوش قریب آئی اس کی بے چینی بڑھی۔ وہ سر کو تکیے پر ادھر ادھر جھٹکنے لگی۔ اور ہاتھ چلانے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ [illegible]

"چھوڑ دو... چھوڑ دو مجھے... مجھے سب منظور ہے جو تم کہو گے میں مانوں گی... دیکھو... دیکھو میں ایک عورت ہوں کوئی جانور نہیں ہوں... بھیڑ بکری نہیں ہوں... مجھے مت لٹکاؤ..." اس کی آواز بند ہو گئی۔ پھر اس نے [illegible] ماری اور آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا۔ وہ حسرت سے وہ مجھے تکتی کہ مجھے خود کو سنبھالنا دشوار ہو گیا۔

"رضیہ...!" میں نے پہلی بار اسے موسیٰ کہنے سے گریز [illegible] "میری طرف دیکھو رضیہ! تمھارے ساتھ ہم ہیں، تم پر اب کوئی خطرے کی اب کوئی بات نہیں رہی..." [illegible]

جب وہ بالآخر خود کو سنبھالنے کے قابل ہوئی اور [illegible] خود کو سنبھالا تو محسن کی ہنسی نے مجھے خفت میں مبتلا [illegible]

"آج تو عیش ہو گئے میری بھی، اپنے سکندر صاحب اور [illegible] تمھاری تو آنکھ کا پانی مر گیا ہے۔ دونوں کی آنکھوں کا [illegible] پٹی کیے بیٹھے آپ دونوں۔" اس نے البم کو جو کھینچ کے [illegible] دراز میں رکھا۔ نہ جانے کب اس نے البم نکالا تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا۔

"تم تو سالے ڈنر سے مزے لے رہے تھے۔ سکندر [illegible] اور تم؟" میں نے کہا۔

"حالانکہ شرافت کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ آنکھیں بند [illegible]" غالب نے کہا۔ "یہ کوئی رومانٹک سین نہیں تھا بلکہ [illegible]"

"جس میں کچھ بلکہ خاصے جذبات شامل ہو گئے تھے۔" بدتمیز ہنستا رہا۔ "بہت بدمعاش ہو تم دونوں۔ بلکہ [illegible] ڈرامہ کر رہے تھے۔"

نازو کو اور موسیٰ کو کچھ احساس ضرور تھا کہ انھوں نے [illegible] مگر وہ محسن کی بات سے زیادہ متاثر نظر نہیں آ رہی تھیں [illegible] بھی ان کے اعصاب پر سوار تھا اور وہ دہشت زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے خود کو یقین دلا رہی تھیں کہ یہ سب نہیں ہے۔ جیسا کہ خواب... وہ تو وہ انھوں نے دیکھا تھا [illegible] پہنچا اور دوا کھلائے

"باہر کا انتظام تو ٹھیک ہے نا؟" محسن بولا۔

"ہاں، اندر آنے کے لیے دو گیٹ تھے۔ ایک تو شاید ہمیشہ بند رہتا ہے۔ دوسرا میں نے بند کر دیا۔" غالب نے کہا۔ "اسی طرح گھر میں آنے کا ایک راستہ تو پیچھے کی طرف ہے۔ جو میں نے استعمال کیا تھا۔ دوسرا سامنے ہے۔ سامنے والا گیٹ مقفل ہے۔ کوئی پیچھے کی طرف سے آئے گا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔"

"وہ کیسے؟ کال بیل سے لگا دیا؟"

"وہ بیل کی طرح بجنے لگے گا۔" غالب نے کہا۔ "میں نے الیکٹرک وائر کا ایک سرا دروازے سے لگا دیا ہے۔ دروازہ فولادی پروف ہے یعنی اس میں لوہے کی جالی ہے۔ جو بھی ہاتھ لگائے گا کرنٹ نوش فرمائے گا۔ کیا جینئس ہوں میں بھی چیف کے ہوتے؟"

"میں اب جاننا چاہتا ہوں مرزا کہ تم فرشتۂ غیب بن کے کیسے نازل ہوئے؟" محسن نے کہا۔

"اور میں بحیثیت چیف کے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے حکم عدولی کیوں کی؟" میں نے کہا۔

"یار! میری مجبوری تھی..."

"مجبوری محسن میری ہے۔" میں نے اسے ٹوک دیا۔

"سالو یہ میری ہے۔ خیال رہے۔" محسن نے کہا۔

"اچھا اچھا۔ تو دوستو میری آنکھوں یعنی تم نے مجھے مجبور کیا کہ [illegible]" غالب نے کہا۔ "یہاں بیٹھ کے بھی [illegible] کو شرف ملاقات بخشنے سے کیا حاصل۔ سب سوالوں کا صفحہ جواب پہ لکھے ہوئے ہیں۔ اور تو یہاں بیٹھا ہے۔ لعنت ہے تجھ پہ۔"

"تیری ان آنکھوں نے میرے دل کی بات کہی ہے۔"

"بس میں نکل کھڑا ہوا۔" وہ بولا۔ "ایک خیال میرے دل میں آیا تھا کہ تم دونوں ہی پکڑے جاؤ گے اور اپنی حماقتوں کے چکر میں آ جاؤ گے۔ میں نے محسن کو بس قتل کے سین میں دیکھا۔ [illegible] سے تم نے گاڑی دیکھی۔ بیچی رنگ کی ٹویوٹا کرولا تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ انھوں نے پارکنگ لاٹ کا آخری حصہ منتخب کیا تھا جہاں نسبتاً تاریکی تھی۔ میں کار کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور موقع کا انتظار کرنے لگا۔ کار کا ڈرائیور [illegible] موجود تھا اور [illegible] نہیں تھا۔ لیکن وہ دو منٹ کے لیے کہیں گیا۔ سگریٹ پینے یا پان کھانے۔ [illegible] اتنی دیر میں [illegible] تار کے کنکشن کی مدد سے ڈگی کھول لی۔ [illegible] چکا تھا۔ ڈرائیور کے واپس آنے سے پہلے میں ڈگی کے اندر تھا اور ڈگی کو اندر سے بند کر چکا تھا۔"

"ہے عقلمند تو تمھیں کہا جا سکتا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا؟"

"[illegible] کا مسئلہ بہرحال نہیں تھا۔" غالب نے کہا۔ "کہ میں یہ تماشا شاید اب باہر رہتا۔"

"اگر وہ وہاں سے نکلتا تو؟"

"تو میں کچھ نہ کچھ ضرور کرتا۔" غالب نے کہا۔ "ٹیکسی لے کے پیچھا کرتا، جہاں موقع پاتا وہاں دونوں پیچھے والے ٹائر پہ [illegible] کر دیتا۔ مثلاً کسی پُرہجوم چوک کے ٹریفک سگنل پر۔"

"اور ٹیکسی نہ ملتی تب؟"

"میں اسے بھی برداشت کر دیتا۔ آدمی جب مایوسی کی انتہا پر پہنچ کے مرنے مارنے پر اتر آئے تو کچھ نہیں دیکھتا [illegible] میں ایک ایک کو مار دیتا۔ جو بھی میرا راستہ روکتا۔ لیکن مجھے پھر فکر یہ تھی کہ کار نہ نکل جائے۔ ایک بار اسے روک لیتا تو پھر جانے نہ دیتا۔ ڈگی میں بند ہو کے میں انھی کے ساتھ یہاں پہنچ گیا۔"

"آفرین ہے مرزا غالب کے بھتیجے! وہ کام کیا تو نے جو رستم سے نہ ہو گا۔" میں نے کہا۔ "تو واقعی ہم سے آگے ہوا۔"

نازو نے کہا۔ "کیا اب ہمیں رہنا ہے؟"

ہم نے چونک کے پیچھے دیکھا۔ "جو حکم ہو آپ کا۔" غالب سینے پہ ہاتھ رکھ کے بولا۔ "پھر پسند نہیں تو شیشے کا گھر بنوا دوں ساؤتھ [illegible] پہ [illegible] کا محل کھڑا کر دوں۔ بھلا کہاں کی بیتی ہیں؟"

"آج بدتمیزی معاف ہے۔" نازو کا رنگ گلابی ہو گیا۔

"صرف آج؟" غالب نے ایک پُرحسرت آہ بھری۔

"تمھاری طبیعت اب کیسی ہے رضیہ؟" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ "تم نے پوچھ لیا تو ٹھیک ہو گئی۔"

"آہم... یہ کیا غضب ہے کہ ان کے دیکھنے سے جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق۔" غالب نے کہا۔

"یار یہ بہت خوش ہے آج۔" محسن قہقہہ مار کے بولا۔ "اس سے کچھ کھانا پینا چاہیے۔"

"تم نے کیا پوچھا تھا؟" نازو نے گھبرا کے کہا۔ "اگر قسمت نے بچا لیا ہے..."

"بے بھائی! آج سے تیرا نام قسمت ہے۔" محسن بولا۔

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "بچایا تو غالب نے ہے بی بی۔"

"اور ہم دونوں کی زبان..." نازو چلا کے بولی۔ "مجھے گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔ میں کہتی ہوں یہاں سے نکل چلو اسی وقت۔"

"باہر اندھیری رات ہے۔ سنسان راستہ ہے۔ [illegible] اور [illegible] شہر یہاں سے دس میل دور ہے اور ہم کو مشرق مغرب کا پتا نہیں۔"

"تو باہر نکل کے چلے گا؟" نازو نے کہا۔ "اگر اس وقت جانا کوئی نہیں ہے تو وقت ضائع کرنے کا فائدہ؟"

"اب ہم مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

www.paksociety.com

"مگر بلا مقابلہ تسلی ہو جائیں تو اچھا ہے نا" نازو نے کہا اور بالآخر ہم سب کو قائل کر لیا۔ نازو اور میں جیسی نے بستروں کی چادریں یوں لپیٹ لیں، جیسے پردہ دار خواتین لپیٹتی ہیں۔ ہم سب پچھلی طرف سے باہر نکلے۔ محسن نے بے خیالی میں دروازے پر ہاتھ رکھا اور کہا، "واہ واہ..."

جب ہم سب نے ہنسنا شروع کیا تو اس نے تار کو دیکھا۔

"میں برقی صدمے سے فوت بھی ہو سکتا تھا۔ دانت نکالنے کی تو اس میں کوئی بات نہیں" وہ بولا۔

"غیرت مند تو ہر صدمے سے مر جاتے ہیں۔ وہ الیکٹرک ہو یا نہ ہو" میں نے کہا۔

"ہاں، مثلاً میں" غالب نے کہا "مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب۔ مثال تمہارے سامنے موجود ہے۔"

باہر ایک عجیب ویرانی تھی۔ ہم عقبی حصے کی ایک دیوار پھاند کر باہر آ گئے تو بہت دور تک کتے بھونک رہے تھے۔ کہیں ایک الو بھی بولا۔ جس پر غالب نے محسن سے پوچھا کہ اس نے کچھ کہا ہے؟

"ہاں، میں نے پوچھا تھا کہ کیا تم اسی کے پیچھے ہو؟" محسن بولا۔

یہ علاقہ شہر کا ویران تھا۔ مکان خالی خالی تھے اور نیم غیر آباد تھے۔ تعمیراتی کام ابھی جاری تھے۔ بجلی کے پول تھے مگر سٹریٹ لائٹ نہیں تھی۔ پولوں سے گھروں تک جانے والی لائن بھی کسی کسی کے گھر پر نظر آتی تھی۔ گلیاں بھی کچی تھیں اور سیوریج لائن ڈالنے کے لیے کھدائی ہو رہی تھی۔ آوارہ کتے ہر طرف پھر رہے تھے اور ان میں سے چند ایک واضح طور پر بھونکنے بھی۔ خواتین ڈر کے مارے آ ہی گئیں۔ ہم نے انھیں یاد دلایا کہ بھونکنے والے کتے نہیں کاٹتے۔ ڈرنا ہے تو ان سے ڈرو جو شرفا کی طرح چپ بیٹھے ہیں مگر ان کو اس بدتمیزی نے مطلق نہیں کیا۔ تھوڑی سی جستجو کے بعد ہم نے ایک سڑک دریافت کی۔

"معلوم نہیں یہ سڑک کدھر جاتی ہے" میں نے چلتے چلتے کہا۔

"اس معاملے میں استاد امام دین گجراتی کا ایک شعر ہے" غالب نے کہا۔ "جو انٹرنیشنل ہے اور ہر جگہ کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔

کدھر یہ سڑک — یہ سڑک سیدھی کراچی جاتی ہے

اور پھر واپس بھی لوٹ آتی ہے"

"یہ استاد نے جلال پور جٹاں کے بارے میں کہا تھا" محسن نے اس پر احتجاج کیا۔

"شعر بین الاقوامی ہے۔ آپ کسی بھی شہر کا نام فٹ کر سکتے ہیں" غالب نے کہا۔

نازو نے کہا "وہ ہے نا رینجرز اسٹار، قطبی ستارہ"

"وہ جو چمک رہا ہے" غالب قدرے ٹھٹھک کے بولا۔

"اور نظر بھی آ رہا ہے" محسن نے بھی ایک اختتامیہ سا شامل کیا۔ نازو نے ان کی بے ہودگی کو نظرانداز کر دیا۔ "سکندر بھائی! ادھر شمال ہے۔"

"کمال ہے، پہلے ادھر جنوب تھا، میرے دائیں ہاتھ پر" غالب نے سر ہلایا "ابھی کل کی بات ہے"

"یہ چار دن پہلے جیسا ہے" محسن نے اس کا ساتھ دیا۔ "کل میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ سویا تو مشرق الٹے ہاتھ پر، جاگا تو سیدھے ہاتھ پر"

"آوارہ" میں نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا "دھوکا تو ستارے بھی دیتے ہیں۔ اب یہ قطبی ستارہ ہے۔ کل جب ہم آ رہے تھے تو دائیں ہاتھ پر تھا۔ اب جا رہے ہیں تو بائیں طرف آ گیا ہے۔" جواباً نازو کا موڈ خراب ہو گیا۔ "سب ایک عقل کے پیچھے پڑے ہیں۔ کسی سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

موسم بہرحال خوشگوار تھا اور اس سے نازو کا مزاج [illegible]

"ان سے پوچھو کہ ان کے عقب پڑا کدھر ہے" وہ بولی۔

ہم چلتے جا رہے تھے اور کچھ معلوم نہیں تھا کہ کدھر جا رہے ہیں۔ ایک پر عذاب جہنم سے نکل کر ہم اپنے اعصاب پر چڑھنے والے بھوت کے اثرات سے اسی طرح نجات حاصل کر سکتے تھے کہ کچھ مذاق کریں۔ اور جو بیتا اس کی بات ہی ترک کریں۔ اگر ہم خاموش بیٹھے تو ہمارا دماغ سوچتا اور سوچتا رہتا ہر وقت کے آسیب کا سایہ ہونا کہ جس سے ہم ابھی گزر کے آئے تھے۔

"کیا ہم واپس وہاں جائیں گے؟" محسن نے اچانک کہا۔

"اور کہاں جا سکتے ہیں ہم؟" میں نے کہا۔

"اور وہاں پھر سے شکاری منتظر ملے تو؟"

"میری عقل کہتی ہے کہ وہ پھر وہاں نہیں آئیں گے" میں نے سوال کے جواب دیا۔ "ان کا خیال ہوگا کہ جہاں سے ہم ایک دفعہ بچ کر گئے تھے وہاں دوبارہ جانے کی غلطی نہیں کریں گے۔ ہم خوفزدہ ہو کے کہیں اور پناہ لیں گے۔"

"یہ ایک نفسیاتی فائدہ ہو سکتا ہے ہمیں" غالب نے کہا۔ "اس کے علاوہ دو دوست جو ٹرک کے ساتھ گئے تھے وہ بھی تو واپس آئیں گے۔ ہم کہیں اور چلے گئے تو ان کا ہم سے رابطہ کیسے ہوگا؟"

"میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اگر ہم وہاں قلعہ بند ہو جائیں تو یہ مشکل ہے کہ وہ باقاعدہ حملہ کر کے ہمیں گرفتار کر سکیں۔ انھیں سخت مقابلہ کرنا پڑے گا اور ہمارے لیے فرار کے راستے بھی کھلے ہوں گے"

[illegible line]

سے یا دائیں بائیں کسی گھر

سے" نازو نے کہا

شہ بالے اور کتنی دور تک پہنچ جاتا تھا۔ صبح کے ساڑھے تین بجے تھے یعنی ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے کسی قسم کی سواری ملنے کی امید ہی نہیں تھی، دیسی دودھ بیچنے والی گاڑی کے آنے کی اور [illegible] اخبار والے کی گاڑی کی۔ ادھر ابھی پولیس نے گشت شروع نہیں کیا تھا۔ آبادی کم ہونے کے سبب ایک چوکیدار کو اور پولیس کے اسٹاف [illegible] نے اپنی توجہ زیادہ خوشحال اور آباد علاقوں پر مرکوز کر رکھی تھی۔ جرائم کو یہاں بہ ضرورت کے تحت آتے جاتے لوگ بھی نہیں ملتے تھے جن کو آوارہ گردی یا بے جا پالن کی دھمکی دے کر ان سے کچھ نکلوایا جا سکے۔

ایک گھنٹے کے بعد سب کا یہ حال ہو گیا کہ ٹرک کے سوا [illegible] لینے کے سوا چارہ نہ رہا۔

"کون کہتا ہے کہ مارننگ واک اچھی چیز ہے" محسن بولا۔

"میرے گھٹنے کی چوڑیاں [illegible] سب ڈھیلی پڑ گئی ہیں" غالب بولا۔

"وہاں کی چوکیدار کے ساتھ ہی واپس کر دینا" نازو نے کہا۔

"مرزا یہ ہفتہ ہے تمہاری مردانگی پر [illegible] کہہ دیا" محسن نے اضافہ کیا۔

مگر غالب نے دانت نکال کے کہا "ہاں، سو ہوا [illegible]"

"اسے پوچھو کیا کہا ہے"

نازو کی بات الٹ کر اس پر آ گئی۔ اچھا ہوا کہ [illegible] نہیں تھا ایسے مواقع پر اس کی پوزیشن بڑی عجیب ہو جاتی تھی۔ اگر وہ فراخ دلی اور خلوص سے ہوتا تو اس قسم کے مذاق کا بھی برا مانتا۔ مگر اس نے ایک حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور مطمئن ہو چکا تھا۔

سڑک پر اس سمت سے ایک ہیڈ لائٹ نمودار ہوئی۔ کوئی کار ہماری طرف آ رہی تھی۔ وہ خیال جو ابھی تک مجھے نہیں آیا تھا، وحی کی طرح نازل ہوا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

"یہاں لوگ نہ ہوں" میں نے کہا۔

"کیا کرنا ہے پھر؟" محسن بولا۔ "راستہ روکنا ہے؟"

"نہیں، چھپ جاؤ سب لوگ" میں نے کہا۔

چند سیکنڈ میں ہم درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے گم ہو گئے۔ جب کار سامنے سے گزری تو اسے چلانے میں کسی کو دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ یہ [illegible] کی کار تھی۔ جب اس کی ٹیل لائٹ گم ہو گئی تو ہم اپنی پناہ گاہوں سے نکل آئے۔

"انسانی ہمدردی کا دعویٰ کرنے کی کوشش ضرور کی تھی [illegible]" محسن نے خواتین کی موجودگی کا احترام کرتے ہوئے ایک بے ضرر سے الفاظ پر اکتفا کیا۔

"یہ تو کہہ لیا تھا کہ صبح یا کل شام کو واپس آئے گا" محسن بولا۔

"یہ [illegible] صرف تین گھنٹے بعد واپس جا رہا ہے؟"

"اور اب ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں واپس بھی آ جائے گا۔"

"ایک اور شکست کا زخم لے کر" غالب نے کہا "اگر ہم اسی طرح صراطِ مستقیم پر چلتے رہے تو واہگے جا پہنچیں گے۔"

"خیر اب ہم اتنے بے وقوف بھی نہیں ہیں" محسن نے کہا۔

"پھر اب کیا کریں؟ پچھلے وقت اسی راہ پر خطرے [illegible] کے لوٹ جانے کا انتظار کریں؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ لوٹنے میں دیر نہیں کریں گے" محسن نے کہا۔ "ہم انتظار کر لیتے ہیں"

"وہ لوٹ کے کہاں جائیں گے؟" نازو نے کہا۔

"لوٹ کے بدھو کہاں جاتے ہیں؟" غالب بولا۔

"وہ بدھو نہیں ہیں تمہاری طرح" نازو نے جھلا کے کہا۔

"امید تو یہی ہے کہ وہ واپس اس جگہ نہیں جائیں گے۔ لیکن میں یہ چانس لینا نہیں چاہتا" میں نے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ وہ وہاں پہنچ جائیں، وہاں لالہ جی اور شیخ صاحب آ کے بیٹھے ہوں۔ وہ دھر لیے جائیں"

"پھر تو یہ ہے کہ ہمیں جلد از جلد واپس پہنچنا چاہیے"

ایک بار پھر ہم سڑک پر چلنے لگے۔ مگر اب ہم پیچھے کی بجائے جا رہے تھے۔ ابھی ہم نے آدھے میل کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ سڑک پر روشنی جھلملائی۔ ہم بے اختیار دائیں بائیں تقسیم ہو گئے۔

"یہ کار نہیں ہے" میں نے کہا۔ "کوئی ٹرک ہے یا بس ہے"

"ہاں، ہیڈ لائٹس کوئی اور ہی ہے..." محسن نے میرے خیال کی تائید کی...

"پھر کیا کرنا ہے، بولو... روکیں اسے؟"

"رسک ہے..."

"نو رسک نو گیم" میں نے سڑک کے درمیان آ کے کہا۔

اور قریب آتی ہوئی گاڑی کی تیز روشنی میں آ گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ ہلانا شروع کیا۔ یہ ایک ٹرک تھا جس نے آخری وقت تک رفتار کم نہیں کی۔ اگر میں اس سے زیادہ مستقل مزاجی دکھاتا تو جان بچانے کے لیے چھلانگ مار کے ایک طرف ہو جاتا اور پھر وہ ٹرک کے نیچے جاتا۔ لیکن اب اسے پوری قوت صرف کر کے بریک لگانے پڑے۔ یہ دودھ لے جانے والوں کا ٹرک تھا۔ ڈرائیور نے سر نکال کے مجھے لال لال آنکھیں دکھائیں۔

"او سٹے پاگل، مرن دی صلاح اے..."

"بھائی جی بڑی مہربانی" میں نے بھی پنجابی میں کہا۔ "ساڈی شہر نے چلنا۔ رستے وچ چھٹے دی کوئی ہور گڈی نئیں ملے گی۔ اسی تے [illegible] جانا اے۔ اسی تے کجھ وی نئیں لے"

"مگر بارہ [illegible] اے ساڈے کول، سب دودھ دے ڈبے"

"تمہارے ہوتے نے" وہ اب کچھ نرم پڑ گیا۔

"خیرا ہے" میں نے کہا۔ "ہم کہیں لوانگے گزارا" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

اور باقی سب کو آواز دی۔ "آجاؤ، سبھی آجاؤ۔"

عورتوں کو دیکھ کے وہ چونکا۔ "زنانیاں وی ہیں تو اڈے سے نکل، شیسہ ہو سکے تو آدمی۔ اینہاں کو تے بٹھاؤ گے تے دیہاڑی وڑ گئی۔"

وہ آدمی دل کا بُرا نہیں تھا۔ عورتوں کے لیے اس نے آگے جگہ بنائی اور اپنے اسسٹنٹ کو حکم دیا کہ وہ پیچھے جائے اور ہمارے ساتھ دودھ کے ڈرم پر تشریف رکھے۔

یہ ایک بہت مشکل سفر تھا۔ ڈرم کے بیچ میں بہت کم جگہ تھی۔ میرا ایک پیر ڈرم کے ایک طرف تھا تو دوسرا کسی دوسرے ڈرم کے پاس۔ ڈرم ہلتے تھے تو میری ٹانگیں بھی ہلتی تھیں۔ ہم ڈرم کے اوپر بیٹھ سکتے تھے، مگر یہ رزق کے اوپر بیٹھنا ہمیں منظور نہ تھا۔ خدا خدا کرکے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں تین چار رکشا کھڑے تھے۔ یہ کوئی بڑی آبادی تھی اور رکشا والے شاید وہیں رہتے تھے۔ وہ ہر روز کی طرح تلاشِ معاش کے لیے روانہ ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ ڈرائیور نے ہمیں وہاں اتار دیا اور ہمارے شکریے کے جواب میں حقے کی طرح گڑگڑایا۔ "ٹھیک اے، شکریے دا اے چنگا۔" وہ بولا پھر وہ ٹرک کو بھگا کے لے گیا۔

"اسے کیا ہو گیا؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں۔" نازو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ذرا تمیز سکھائی تھی اسے۔ اسی کا بُرا مان گیا تھا شاید۔"

"تم نے کہہ دیا تھا کہ ذرا ٹرک روک کے نیچے اترو اور پھر ہاتھ لگا کے دکھاؤ۔ میں بھی بولی مرد کے بچے ہو تو میرے سامنے پر بھوک کے دکھاؤ۔ پھر میں تم سے شادی کر لوں گی۔"

"تم بھی کیا میرا ایک ... " غالب خفا ہونے لگا۔

"مگر وہ ٹرک ... تھا۔ فری ... تھا ... " نازو نے بھی خفگی سے جواب دیا۔

"وہ انکار کر دیتا اور سمجھتے تو؟"

"پھر خود پیدل آ جاتا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو بدتمیزی کی کچھ سزا نہیں ملی، سزا بھی دیتا۔"

وہ رکشے والے سے محسن مذاکرات کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ بازار کے لیے جاتے قریب آگے کے ایک نے اضافی سواری کے لیے اضافی پانچ روپے مانگے تھے۔ فاصلے کا کرایہ دونوں نے ڈبل سے بھی زیادہ چارج کیا تھا اور ہمیں اس پر راضی ہونا پڑا تھا۔

"دن کا آغاز ہی بے ایمانی سے کرتے ہیں یہ لوگ۔" محسن نے کہا۔ جو اس دھاندلی پہ خوش نہیں تھا۔

"یہ کیا، سب موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ضرورت کی قیمت لیتے ہیں اور مجبوری کی۔"

ہم گھر سے دو فرلانگ دور اترے ... مگر ... گلیوں

میں، جب ہم ... تو ہم نے باقی مسافت پیدل طے کی۔ مین شاہراہ سے ہٹ کے ہم گلیوں میں چلتے رہے۔ سب اُفق پر صبح کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ پہلے میں نے اپنے ہمسائے الطاف خان کے گھر کی چھت سے اپنے گھر میں اترنے کی سوچا۔ پھر یہ ارادہ بدل دیا۔ الطاف خان سو رہا ہوگا اور جاگ گیا تب بھی شک میں پڑ جائے گا۔ بلا اجازت دروازے پہ دستک دینا اور آدھی رات کے آنے کے خلاف تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ دروازہ بھی چوکیدار کھولے اور کہے۔ "آہا جی! آپ سکندر صاحب! بسم اللہ، بس آپ کا ہی انتظار تھا۔ باقی اپنا بابا اور شیخ صاحب تو یوں سمجھو کہ تیار بیٹھے ہیں۔"

گلی میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دیوار کے پاس پر چڑھ کے صحن میں اترنے اور پھر چھت پہ جانے کا فیصلہ کیا۔ اوپر پہنچ کے مجھے اندازہ ہوا کہ صحن کا اور زینے کے درمیان ایک دروازہ بھی ہے جو مقفل ہے۔ تاہم قفل علامتی قسم کا تھا اور شریفوں کے لیے لگایا گیا تھا۔ چوروں کی طرح آنے والے کا راستہ ایک قفل کیسے روک سکتا تھا۔ مجھے غالب کے گھر کے صحن میں صرف ایک پتھر ملا۔ اس کی ایک ضرب نے قفل کو شکست دے دی۔ تاہم اس سے دھماکا خاصا بڑا ہوا۔ دروازہ اندر سے کھولتے ہی باقی سب بھی میرے پیچھے آگئے تھے۔ ہم زینے کے راستے چھت پر پہنچے اور پھر دیوار پھاند کے اپنی چھت پر ہم آواز بلند کر دی۔ میرا مقصد توجہ حاصل کرنا تھا۔ بابا اور شیخ جی جاگ گئے تو وہ بھی چونک کر اوپر آ گئے ... ہوگا تو ان کا خاندانہ تحقیق کے لیے پہنچے گا۔ محسن، غالب، نازو اور شیخ درمیانی دیوار کے اوپر سے جھانکتے رہے۔ میں نے خود کو پانی کی ٹنکی کے پیچھے چھپایا کیونکہ پیچھے سے کوئی دبے پاؤں اوپر آ رہا تھا۔ جو اس وقت تک سامنے نہیں آیا جب تک میں نے ... "کون ہے؟ شیخ صاحب! ہی نکلیں گے شاید۔"

"ہاں نہیں، اوزار تو ... تھا۔" شیخ نے کہا۔

"ہاتھ اٹھا لو اوپر۔" میں نے سائیڈ سے آواز بدل کے کہا۔

وہ دونوں چونکے اور ایک دم پلٹے۔

"ارے نہیں ... چھوڑ دو ... " ... "آہستہ اوپر اٹھا دو۔" میں نے کہا۔ "جس نے بھی جھڑپ کی ٹانگ توڑ دی تھی۔"

انھوں نے تعمیل کی۔ مجھے ان کی صورتیں دیکھ کے ہنسی روکنی مشکل ہو رہا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔ "اب بتاؤ، چھپا کس نے تھا اور اوزار کس نے؟"

میری اصل آواز سنتے ہی ان کی حالت اور بھی غیر ہوئی۔ میں نے سامنے آ کے ہنسنا شروع کیا اور دوسری طرف سے باقی سب کود کود کے آ گئے اور ہمیں گلے لگانے لگے۔

"شکر ہے اللہ کا ... اپنی توپ۔" نازو نے کہا۔ "جیسے کبھی کام

بیٹھ گیا۔"

"تو اس لڑکی کا خیال ہے کہ ہم کہیں پھنس گئے تھے۔" شیخ نے ہنس کے کہا۔

"ہاں، کیونکہ ہم بھی ذرا ہٹ کے چلے تھے۔" بابا نے اس کی تصدیق کی۔ "میں تھا جنیا دی اور ہم نے ڈرامہ بھی ... خواب نہیں ہوا آپ کا۔"

"آپ نے تقدیروں کو ... ماشاء اللہ تمہیں کچھ نہیں ہوا۔" راجا بولا۔ ... کہ انھوں نے میری ... تھی، لیکن اس خیال سے کہ ... انھوں نے ... سب ... ان کی حالت ... انھیں بولنے نہیں دیتے تھے۔

جب ہم نیچے پہنچ گئے تو دونوں لڑکیوں نے کچن کا رخ کیا۔ اکرام شیخ اور راجا نے ناشتے کی حد تک تمام ضروری سامان فراہم کر دیا تھا۔ ناشتا ہی سب سے اہم ضرورت تھا اور اس کے بعد آرام۔ ... شدید ترین ذہنی و جسمانی ... سے گزرے تھے اور پھر کئی ... پہلے ...

ناشتا تیار ہونے تک ہم نے اکرام شیخ اور راجا کو وہ سب بتا دیا جو ہمارے ساتھ ہوا تھا۔ اکرام شیخ دم بخود بیٹھا تھا مگر راجا ... خوف سے ... اس نے کہا ... کہانی آپ نے ... تفصیل سے ... اکرام شیخ تفصیل سے سب کچھ سننا چاہتا تھا۔ غالب بار بار ... جیسے کسی مشاعرے میں اسے ہر شعر پہ ... داد ... مل رہی تھی کہ اس نے حاضرِ دماغی اور ... جرات کا مظاہرہ کیا۔ ورنہ ہم اس بار ... نہیں آ سکتے تھے۔

"آپ نے ... " محسن نے کہا اور اس کی کمر پہ ... ہاتھ مارے۔

"... میں نے تو جانے کتنے لوگوں کو ... ایک ... والے شوہر ... دو بھائی ... کے دوست ... جو تجوریوں میں بند تھے اور ان کا ... یہ سب کتنے افراد ہو گئے؟"

"... شاباش ... " میں نے کہا۔

"... مر جائے گا بے چارہ ... " اس نے ... کہا۔

"... کوئی محسن ہے۔" میں نے کہا۔

"... کہ محسن ہے۔" اس نے ناشتا ...

بیٹھ گیا۔

"ابھی تو کہا ہے کہ مر جائے گا بے چارہ شوہر۔" میں نے کہا۔

"سکندر بھائی!" نازو نے ہونٹ کاٹ کے کہا۔ "یہ بات محسن کا تو تمھیں اسے بتانی کہ غلط سننا اور غلط کہنا ..."

"چلو چھوڑو، غلط ہے تو غلط سہی۔ کیا فرق ہے دونوں میں آخر غالب تو غالب ہی رہے گا۔" غالب نے کہا۔ "ناشتا کرو۔"

ناشتا بھیڑیوں کی طرح کیا گیا۔ اس دوران میں پیچیدہ اور والدہ کا ذکر بھی آیا ان کی بے رحمی کا بھی کہ انھوں نے اپنے ہی ایک ساتھی کو یوں مارا۔ پیچیدہ کی زیب النساء سے شادی کا ذکر بھی ہوا جس کی چالاکی سے انھوں نے سب کو اپنے راستے سے صاف کر دیا اور پھر بیگم اور چھوٹی کے باپ نواب سلطان محمد خان کی دولت و جائیداد پر ہاتھ صاف کرنے کا سوچا۔

"دولت کیا چیز ہے۔ اگر اس لڑکی زیب النساء کی زبردستی شادی کر دی جاتی ..." نازو نے کہا۔ "اس خطرناک مجرم اور سفاک شخص کے ساتھ تو کتنا ظلم ہوتا۔"

"میرا خیال ہے خسرو جمشید نے ہوشیاری سے کام نہیں لیا ورنہ وہ رضامندی کا اظہار کر دیتا۔" میں نے کہا۔ "زیب النساء ایسی لڑکی نہیں ہے کہ کوئی مرضی کے خلاف اس سے شادی کر سکے۔ وہ اچھی صفائی سے پیچیدہ کو جھکا دے لگا کر خود پیچیدہ کو بتا دے چلتا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" محسن بولا۔ "خسرو جمشید جذباتی ہو گیا ورنہ عقل سے کام لیتا تو جتنی خوشی سے ان کی تجویز کو قبول کرتا۔ اسے ضرور موقع مل جاتا کہ وہ خود پیچیدہ کو شوٹ کر سکے۔"

"بس وہ جذباتی ہو گیا۔ یہ لڑکی اس کی بیٹی تو نہیں تھی مگر اس نے زیب النساء کو بیٹی کی طرح پالا تھا۔ وہ عیاش اور بدکردار تھا مگر زیب النساء کے لیے نہیں۔ زیب النساء کو اس نے ... کی طرح رکھا تھا۔ پیچیدہ سے اس کی شادی کا ذکر سنتے ہی اس کا دماغ الٹ گیا۔ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن وہ سمجھتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ زیب النساء کو بچانے کے لیے وہ اپنی جان پہ کھیل گیا۔"

"سوال یہ ہے کہ وہ گئی کہاں؟"

"وہ بہت ہوشیار لڑکی ہے۔ وہ سمجھ گئی ہوگی کہ اس کی زندگی کو اس سے خطرہ لاحق ہوگا۔ اور وہ خطرہ کس قسم کا ہوگا۔ وہ ایسی جگہ جا چھپی ہوگی کہ چوہدری دلاور، پیچیدہ کیسی اور اس کے فرشتے بھی اسے تلاش نہ کر سکیں۔"

"ایک بات اور بتاؤں؟" محسن نے کہا۔ "ابھی شاید آپ سے معلوم ... جو کہ اس کے ماموں خسرو جمشید پہ کیا بیتی۔ جب ... سے معلوم ہوا کہ دلاور کے حکم پہ اس نے ... ان کی کہانی ... تھی اس

www.paksociety.com

روز وہ اپنی پناہ گاہ سے نکل آئے گی، یہ قسم کھا کے کہ اسے حساب برابر کرنا ہے۔ ان سب کو ویسے ہی مارنا ہے جیسے انھوں نے خسرو بخشید کو مارا تھا۔ تمہیں یاد ہو گا ایک بار اس نے... کچھ لوگوں سے بدلہ لیا تھا۔"

محسن نے خواتین کی موجودگی میں تفصیلات سے گریز کیا۔ مگر میں سمجھ گیا۔ یہ بات پرانی تھی۔ زیب النساء ایک رات قید خانے سے نکل بھاگی تھی اور پناہ لینے ایک ایسے گھر میں پہنچ گئی تھی، جہاں ایک عیاش سرکاری افسر اور اس کا دوست رہتے تھے۔ انھوں نے زیب النساء کی ایسی مدد کی تھی کہ اسے بے آبرو کر دیا تھا۔ بعد میں زیب النساء اسپتال سے فارغ ہو کر اپنے بھائی کے ساتھ دوبارہ وہیں پہنچی تھی اور انھیں قتل کر کے یوں واپس لوٹ آئی تھی کہ اسپتال والوں کو بھی اس کے آنے جانے کا علم نہیں ہوا تھا۔

"تم لوگ اس ٹرک کے ساتھ گئے تھے؟" محسن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہاں، وہ کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔" اکرام شیخ بولا۔ "وہ ماڑی پور کے ٹرک میں بیٹھا ہی تھا کہ میں کھٹولے سے کود کر پہنچ گیا۔" راجا نے کہا۔ "اس نے جان چھڑانے کے لیے ایک روپیہ دیا۔ میں نے کہا فقیر کا اصول ہے، پانچ کا نوٹ دو ورنہ پانچ منٹ میں تیرا خون خشک ہو جائے گا۔ اس نے مجھے ایک گالی دی جو میں بعد میں سنا دوں گا اور دھکا دیا۔ اتنی دیر میں تھانیدار صاحب دوسری طرف سے ٹرک میں سوار ہو گئے تھے۔"

"میں نے ریوالور اس کی گدی پر رکھ دیا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "اور اسے چلنے کو کہا۔ پہلے تو اس نے 'میں! ابھی تماشا...' کی، کہنے لگا کہاں چلوں۔ میں نے کہا، جہاں تم جا رہے تھے۔ وہ بولا، تمہیں کیا معلوم کہ میں کہاں جا رہا تھا۔ میں نے کہا، بیٹے ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ جو ایک ٹرک غائب کر سکتے ہیں وہ تمھیں بھی غائب کر سکتے ہیں۔ وہ کوئی بزدل آدمی تھا۔ اسے صرف ٹرک لانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ مجھے مجبور مت کرو۔ وہ مار ڈالیں گے مجھے۔ میں نے کہا کہ ہم بچا سکتے ہیں اگر تم تعاون کرو۔ تعاون نہ کیا تو ہم بھی مار ڈالیں گے۔ اس وقت میرا پرانا فن کام آیا۔ میں نے کہا کہ ہم پولیس والے بھی چھپ کر نگرانی کر رہے تھے۔ یہ فقیر بھی کوئی سی آئی ڈی کا انسپکٹر ہے اور تھانے دار اس نے بھی پیچھے کیے تھے تاکہ مجھے بلا کے دیکھے۔ اسے یقین آ گیا۔ وہ کہنے لگا اور تو میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے یہ ٹرک اور ... سے آگے ایک جگہ پہنچانا ہے۔ میں صرف وہیں تک جا سکتا ہوں لیکن پھر یہ واپس کیسے آئے گا۔ اور تم لوگ کیسے واپس آؤ گے۔ میں نے کہا کہ ہماری فکر مت کرو۔ ہم تعاقب بھی لے آئیں گے۔ وہ ماڑی پور روڈ پر گیا ... ایئرفورس بیس سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر اس نے ٹرک روک کے ایک گودام کی طرف اشارہ کیا کہ وہ جگہ ہے۔ پھر ایک دم بھاگ کھڑا ہوا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ گولی چلا دوں پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ واپس جا رہا تھا۔ اس نے بات ٹھیک کہی تھی مگر جانے اس دعوے پر اعتبار نہیں کیا تھا ... اس نے خود بھی اپنی جان بچانے کے لیے ... کہ ہم اب اسے کوئی نہیں پکڑ سکتے۔ میں نے سوچا ہماری اب کوئی ذمہ داری نہیں ... تو ٹرک میں نے وہیں چھوڑ دیا اور راجا کے ساتھ واپس آ گیا۔"

"راجا کہاں تھا؟"

"میں ٹرک کے پیچھے ... بیٹھا ہوا تھا۔" وہ بولا۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ اس ٹرک ڈرائیور نے ہمیں صحیح بتایا اور اصل گودام وہی ہو جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا؟"

"ہم تصدیق کر سکتے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"لیکن وہ کیا نتیجہ اخذ کریں گے اس سے؟" میں نے کہا۔ "ٹرک یہاں تک تو آیا اور پھر ٹرک چھوڑ کے غائب ہو گیا؟"

"اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے ... کے پیچھے تھا جو ... اغوا کر کے لے گئے۔" محسن بولا۔

"ان کا کچھ بھی غلط نہیں ہو گا کہ اب ہم ... اغوا کر کے لے گئے ہوں گے۔ اس سے تمام معلومات حاصل کر لیں گے۔" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے اس کے بعد یا تو وہ گودام خالی کر دیں گے یا فوری طور پر منتقل کر جائیں گے۔"

"اس امکان پر بھی نظر رکھو کہ جس ... کا موقع دیا، وہ تمہیں ... کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور اعتراف جرم کر لے۔"

"اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اور ابھی میں انجمن کے موڈ میں نہیں ہوں۔ معلوم نہیں اب تک کیوں جاگ رہا ہوں۔"

"ممکن ہے آپ نیند میں باتیں کر رہے ہوں۔" غالب ... "... لوگ نیند میں چلتے ہیں اور بہت کچھ کرتے بھی ہیں ... دیکھو، سونا ٹھیک نہیں، نیند اور بے آرامی ... بھی بُرا حال ہے۔" غالب نے کہا۔ "لیکن یہ جگہ کسی طرح بھی ... ہے...."

"پھر کہاں جاؤ گے؟ کسی ہوٹل میں؟"

"نہیں، فی الحال تو اپنے محسن کے پاس چلتے ہیں۔" غالب بولا۔

"بڑی مہربانی، اگر آپ میرے پاس تشریف نہ لائیں ... مرزا غالب صاحب!" محسن نے کہا۔

"میری مراد ان ڈاکٹر ججی والا سے تھی جس نے ... " غالب بولا۔ "اس نے یہی تو کہا تھا کہ اس کے پاس کوٹھی کار سب کچھ ہے، اس وقت میاں بیوی تو کہیں ... گئے ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟ اس کے گھر جا کے سو جائیں؟" محسن نے پوچھا۔ "کہا پہلے اسے فون کریں، پھر اس سے اجازت لیں اور اس کے گھر جائیں.... نا بھائی! اتنی ہمت نہیں ہے اب۔"

"تو پھر ہماری باری سب کو سونا ہے اور سب کو ہمراہ جانا ہے؟" میں نے کہا۔

"تم لوگ سو جاؤ۔" شیخ نے کہا۔ "میں اور راجا تو رات کو سو چکے تھے؟"

"... سوئے تھے۔" راجا نے کہا۔ "... اور اپنے پہ تھے جب آنکھیں بند کر کے خواب صورت نظر آنے لگے تھے۔"

"اچھا!" نازو نے دلچسپی سے کہا۔ "کیسے تھے؟ میرا مطلب ہے کہ کیا کوئی خوب صورت دیکھا؟"

"ایک تو صرف منظر تھا ... یعنی وہ جو اس علاقے پر فائز ہو گا ایک دن۔" وہ بولا۔ "مجھے خیال آتا تھا کہ راجا بیٹے راج پاٹ کی بات نہ کرو ... اگر تم نے پھر کسی بیٹی کو اغوا کرنے کا یا بھگا لے جانے کا سوچا۔"

"کیا آپ نے ایسا سوچا تھا؟" نازو متفکر ہو کے بولی۔

"اللہ مجھے ... " راجا بولا۔ "... سوچ کے رہ جاتا ہوں ... اور سوچنے کو تو میں ... ہم میں پکڑے نہ جائیں۔"

"تم لوگ کام کرو، بہت ہو گئے۔" غالب نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "ابھی ..."

"تم سو جاؤ ... کان بند کر کے۔" نازو نے اسے گھور کے کہا۔ "ہم ..."

"... سے کہوں کہ ... تم ... سے کرو؟"

"... مجھے بھی بہت ضروری معاملات طے کرنے ہیں۔"

... — چھت پر جا پہنچے تھے۔ چنانچہ غالب نے ... معاملات طے ... تو سو جانا ہے۔

پر ... کے جھے اور یہاں ... روشن ادھر کر لو۔"

"تو کر لیا۔" نازو خلاف توقع برہم نہیں ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں بھی سو چکا ہوں۔

"اب بولو، کہ غضب ہو گیا؟ تم دل کی بات کبھی نہیں کہتی؟"

نازو ہنسی۔ "میں نے محبت کی زبان نہیں سیکھی۔ سیکھی اردو کی... چینی کی..."

"میرا پاپا بھی ... رات گیا کہہ رہا تھا؟"

"کس بات کس وقت؟" وہ بولی۔

"کہہ رہا تھا کہ تمہارے بھائی سے بات کر لی ہے۔ تم نے کچھ کہا تھا؟"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ مذاق کر رہی ہیں سمجھے۔ سکندر جھوٹ بول رہا تھا۔" نازو نے کہا۔ "میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔"

"اچھا، تو پھر میں خود بات کر لوں؟" غالب بولا۔

میں آنکھیں بند کیے منظر دیکھ رہا تھا کہ اب نازو کے ہاتھوں غالب کی شامت آئی ہے۔ وہ ضرورت سے زیادہ رومانٹک ہو رہا تھا لیکن مجھے حیرت ہوئی جب نازو نے آہستہ سے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں جو بات کرنی ہے مجھ سے کرو اور ہمت نہیں ہے تو سو جاؤ۔"

"عشق زبان ہو لوں، مثلاً یہ کہ تمہاری مانگ کی افشاں کے لیے تارے توڑ کر لا سکتا ہوں اور آسمان کی خوب صورتی کا ستیاناس کر سکتا ہوں اور پہاڑ ... کو دکھا سکتا ہوں، بشرطیکہ پہاڑ چھ فٹ سے زیادہ اونچا نہ ہو۔"

نازو ہنسنے لگی۔ میں نے خراٹے لینے شروع کیے تاکہ وہ میری طرف سے مطمئن ہو جائیں۔

"نازو! میں تمہارے عشق کے سمندر میں اسی طرح غرق ہو چکا ہوں جیسے ایک بار سوئمنگ پول میں ڈوب گیا تھا۔ مجھے تیرنا نہیں آتا تھا۔ پھر کسی نے مجھے بچا لیا۔ مجھے محبت کرنا بھی نہیں آتا۔ اس بار تم بچا لو۔"

"محبت کرنا تو مجھے بھی نہیں آتا۔"

"تو پھر شادی کر لو مجھ سے۔" غالب نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

نازو ہنسی۔ "اور بھی غم ہیں زمانے میں...."

"مگر یہ غم والی نہیں ہیں ... ایک دن ... اور سکندر بھی اپنا گھر بسا لیں گے۔ اس صورت کو بھی پتا چل جائے گی۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ تمہارا بھائی بھی...!!"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ بولی۔

"تو پھر صرف ہم۔" غالب نے کہا۔ "یعنی میں اور تم..."

"پھر سب ہی اپنا گھر بسا لیں گے۔ اب سو جاؤ۔"

www.paksociety.com

غالب نے ایک چیخ ماری۔ وہ خوشی سے پاگل ہو گیا تھا اور خود کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ تب تو ہنگامہ برپا تھا۔ باقی سب بھی ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے۔ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد میں نے ازرو کو دیکھا جو خوفزدہ سی بن گئی تھی۔

"یہ کیا حرکت ہے بلکہ بے ہودہ حرکت ہے؟" محسن بولا۔

"میں نے ایک شاندار خواب دیکھا تھا۔" غالب بولا۔

"تم دوسرا ڈراؤنا خواب دیکھو ہاں اب کے چیخ ایک بھی مت مارو۔" محسن بھنا کے بولا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ میں تو سمجھا کہ کسی بھوت نے گلا دبا دیا۔"

"ویسے کیا خواب تھا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ایک... ایک بھوت تھی۔ زبردستی مجھے چڑیل بنی کر شادی کر رہی مجھ سے۔" اس نے چور نظروں سے ازرو کی طرف دیکھا۔ "عجیب بد شکل چیز تھی۔"

ازرو کے ماتھے پر بیک وقت کئی سلوٹیں بن رہی تھیں کہ وہ اندر ہی اندر کتنا پیچ و تاب کھا رہی ہے۔

"اچھا ہے تم کنوارے ہو۔" وہ بولی۔ "اب نظر آتے ہو، انکار مت کرنا، وہی ٹھیک ہے گی تمہارے لیے۔" وہ منہ پھیر کے سو گئی۔ بابا اور اکرم بھی چیخ پر بیدار ہو گئے تھے لیکن بات کچھ سمجھ نہیں آئی تھی اور بہت کچھ تھی، جو انھیں معلوم نہیں ہو سکی تھی۔

شام کے وقت جب میں سو کے اٹھا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ گھر میں سب سوائے محسن کے علاوہ صرف اکیلا ہے۔

"باقی لوگ کہاں ہیں؟" میں نے محسن سے کہا۔

"اور کے بارے میں تو مجھے بھی معلوم نہیں۔" وہ بولا۔ "اکرم، شیخ اور مرشی شاپنگ کے لیے گئے ہیں کالا سے کہہ کے۔"

"اور اپنے مزاجی دوست غالب؟"

"وہ بعد میں کہیں گئے لیکن کسی کو بتائے بغیر مجھے سے غائب ہو گئے ہیں۔ آزادی کی بات۔" محسن خفا ہو کے بولا۔ "میرا ایک مجنون قسم کا شخص ابھی تک نہیں سے وہ سوچ رہا ہوگا کہ ہجر و فراق کے دن رات کاٹ رہا ہے اور یہ لوگ عشق کے نام میں مبتلا ہیں۔ عزام کا ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا۔ وہ چار دن میں خود ہی ٹھیک ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں سب دیکھ رہا ہوں۔"

"تو اب دیکھنے کے سوا کیا کر سکتے ہو۔"

"میں شملا سے بات کر سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "کتنے دن ہو گئے یار! اس کی محبت کی داد دیتا ہوں جس کا کمال ہے! اور بڑی بہادری سے خوش بھی ہے، مطمئن بھی ہے۔ بڑا سیدھا بھی ہے غالب، مجھے اب ہو نہیں سکتا، مجھے اعتماد و عطا کرنے کے لیے وہ کچھ ظاہر ہونے نہیں ہو سکتی۔ سیدھا بھی اب تو فون نکال کرتا ہوگا!"

"تو ایسا کرو ایک چکر لگا کے لاہور کا۔"

"وہیں بار بار یہی سوچتا ہوں۔ اس کے بعد میری مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا اور شملا کی مشکلات میں بھی۔" وہ بولا۔

"اچھا تو چل فون پر بات کر لے اس سے۔" وہ... نام جانے مجھے تو لگتا ہے کہ اب وہ اس کی صورت دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے رہ رہ کر رضیہ اور شیخ کا خیال آرہا تھا۔ کوئی مقصد ہی نہیں تھی یہ کہ پہلے بھی تھیں، جا بجا بیٹھ کر پیٹنے سے کیا حاصل۔ اب سے راستے میں ملاقات ہو جائے اجازت... گھنٹے میں لوٹ آئے گا۔

"میں ذرا اپنا پتہ کر دیکھوں، آذر اور اس کے باپ کو ملا دوں کہ اب خطرے سے دن کی بات ہے۔" اس نے کہا۔

مجھے شدت سے رابعہ کی یاد آئی۔ کاش کسی طرح میں اس سے بات کر سکتا! مگر اس کا کوئی پتا ٹھکانا نہیں تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں اور محسن رہ گئے تو ہم نے پہلے کھانا کھانے کا فیصلہ کیا کیونکہ ابھی رات کا اندھیرا پھیلا نہیں تھا۔

کیفے گرینڈ ایک بہت خوبصورت اور پرسکون ریسٹورنٹ تھا جو میٹرو پولیٹن کی عظیم الشان عمارت کے اندر واقع تھا۔ اندر داخل ہو کے پہلے تو مکمل اندھیرا دکھائی دیا، سوائے ان مدھم روشنیوں کے جو چھت سے لٹک رہی تھیں اور دیواروں پر نصب تھیں۔ چند سیکنڈ میں ہماری آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں تو میں نے ریسٹورنٹ کا ڈیکوریشن دیکھا۔ اس کی دیواروں پر سرخ رنگ کا مخمل منڈھا تھا اور دیواروں پر آویزاں تھے۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے تو ماحول مزید طلسماتی لگا۔ ہر میز کے درمیان علیحدہ میزیں تھیں اور سب کے درمیان فاصلہ تھا۔ وہاں بیٹھنے والوں کو ایک پرسکون پرائیویسی کا احساس ہوتا تھا۔ خوبصورت فضا تھی جو میں نے لاہور کے کسی ریسٹورنٹ میں نہیں دیکھی تھی۔

اتنی کی چائے اور کنفیکشنری بھی بہت عمدہ تھی۔ ہم آدھا گھنٹہ بیٹھے رہے اور پھر باہر نکلے تو رات پوری طرح پر پھیلا چکی تھی۔ ہمارے بالکل سامنے میٹرو پولیٹن کی دکانوں میں ایک کال آفس تھا۔ وہ ایک کیبن میں...

"یہ کس کا نمبر ہے؟" ایک بوڑھے نے کہا۔

"ساری دنیا کو شک..."

"...بتا دیا تھا کہ یہ اسی طرح جیسے وہ ہماری گفتگو بھی ٹیپ کرتے ہیں۔ شملا نے کوئی بات نہیں کی تھی۔"

"بابا ٹھیک کہتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "آف... اسے بھی یہ کیا ہے کون... شملا روتے رہنے میں وقت گزار رہی کیا؟ بابا ٹھیک کہتا ہے۔ جب تو بیٹے تھے ایسا ہی تھا۔ اب وہ شملا کو مخاطب کیا۔"

"ساری رات وہ سرگوشی میں بولا۔ کیا وہ بھی ہے اس کی؟" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اس کی پھوپھی بیمار ہے۔"

فون پر وہ پھر خفیف سا چونکا۔ مگر اس نے نمبر ڈائل کیا۔ بالکل پہلے جیسا انتظار نہیں کیا۔ چند منٹ بعد وہ شرمیلی سی بیٹھا ہوگا۔ کال بہت ہی جلد کٹ گئی۔ ان کے بجائے جیب میں اتنے پیسے نہیں تھے۔ "بابا اگر ابھی کچھ نہ ہوا تو وہ کیا کرے گا۔ اس کی تسلی کے لیے میں نے سوچ کے دو فون کا ڈسٹر بھی ڈال دیے۔"

بالآخر محسن نے ریسیور مجھے تھمایا۔ میں نے دیکھا کہ محسن کتنا اداس ہے۔ اس نے خود کو بڑی مشکل سے رونے سے روکا تھا۔ خوشی اس کی آنکھوں میں باقی تھی۔ شملا سے میری بھی کئی بات ہوئی۔ اتفاق سے گھر پر اس کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ انکل بھی آنٹی کے ساتھ کہیں گئے ہوئے تھے۔

"ہم نے جو لال بیگ کو دی تھی، حصہ لیں؟" میں نے کہا۔

"انکل خود ملا تے ہیں۔ تمہیں بتا گئی تھی۔ وہ ڈاکٹر انکل کے گھر گئے ہیں۔"

"وہ خوب ہے۔ حالت کیسی ہے اس کی؟"

"کوئی خاص فرق نہیں، لیکن ڈاکٹر انکل کا کہنا ہے کہ ماں بننے کے بعد وہ ٹھیک ہو گی۔ بچے کو ٹھیک رہنا چاہیے۔ وہ خود ماما کو سنبھالے گا۔" وہ بولی۔

"کیا تمہیں معلوم ہے زیب النساء کے ساتھ کیا ہوا؟"

"مجھے معلوم ہے کیا ہوا۔ اس کا فون آیا تھا۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔"

"کس بات سے انکار کر دیا؟"

"وہ ملنا چاہتی تھی مجھ سے۔" شملا نے کہا۔

محسن نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "بابا جلنے میں کیا تھا، وہ کہاں تو دنیا کی نظروں..."

"چھوڑیں اس کی بات۔ مجھے تو اس کی تصویر دیکھ کے حیرت ہوا کرتی۔"

"اس کی تصویر، کس سلسلے میں؟"

"سکندر بھائی! وہ تو اسٹار بن گئی ہے۔ ایک پنجابی فلم میں آ رہی"

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ انھیں یقین ہے کہ..."

"یقین نہ کرنے کی کون سی بات ہے۔ اس کا نام اور تصویر ایک ساتھ شائع ہوئے تھے۔ فلم کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔ ایک بہت گھٹیا قسم بنانے والا پروڈیوسر ہے جس نے اسے سائن کیا ہے۔" شملا نے کہا۔ "میں اس سے کیوں ملتی؟"

جو کچھ شملا نے مجھے بتایا وہ میرے لیے قطعی ناقابلِ فہم تھا۔ مرحوم خسرو جنتہ نے مرنے سے پہلے اسے کہا تھا کہ بھاگ جاؤ ورنہ وہ تمہاری شادی کسی پیڈ روے سے کر دیں گے اور زیب النساء بھاگ گئی تھی۔

لیکن یہ کیا بن گیا ہوا... بھائی نے تو اسے دوپٹی ہو جانے کو کہا تھا اور وہ فلمی دنیا کے آسمان پر ستارا بن کے روشن ہو گئی۔ وہ کیا بھی رہتی خود کو غیر ثابت رکھ سکتی تھی، مگر فلم نگری میں کوئی کیسے گمنام رہ سکتا ہے۔ اس کو تو اسٹوڈیو کے دربان سے ڈائریکٹر تک اور شکر سے پروڈیوسر تک سب جانتے ہیں کہ وہ کب کس وقت اور کہاں ملے۔

"سکندر بھائی... وہ کہاں ہیں؟"

میں چونک کے ہنسا۔ "واہ۔ یہ ہوئی نا پرفیکشن والی ادا... وہ... ابے بچو وہ الو کا پٹھا کہاں ہے... میرا غلام نام لینے سے سنا ہے نکاح ٹوٹ جاتا ہے مگر ایسے تو پوچھ سکتی ہو؟"

وہ ہنسنے لگی اور میں نے کہا۔ "وہ ڈبل الو کا پٹھا کیسا ہے؟"

"یہ ڈبل اب آئی تو مجھے ایک...!"

"تمھیں کیا مطلب... بچی اور پتا ہے کس کے عشق میں مبتلا ہو گئے ہیں وہ ایک کا فرادا کے... وہ پہلے کافر تھی یعنی خاص ہندو اور برہمن زادی تھی۔"

"تو اس نے... شیخ صاحب کے لیے اسلام قبول کر لیا؟" شملا سخت حیران ہوئی۔

"بے نا اُلٹی گنگا بہتی تمہاری۔" میں نے کہا۔ "آخر شملا نکال لیا۔ بابا شیخ صاحب اس کے لیے دین ایمان عقل و ہوش سب گنوا بیٹھے۔"

"اچھا! تو آپ سرمنی کی بات کر رہے ہیں؟"

"کیا زبردست ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "جیسے ایک تھانیدار نے چوری کی بڑی واردات کے بارے میں تفتیش مکمل کرنے کے بعد کہا تھا کہ کام تو کسی چور کا لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

محسن نے ریسیور مجھ سے چھین لیا۔ "تمھے کا کیا حال ہے؟ کچھ باتیں کرتا ہے؟"

فون کا مالک سخت بد حواس اور پریشان بیٹھا ہوا تھا کہ کس قسم کی گفتگو ہو رہی ہے کس سے ہو رہی ہے اور کیوں ہو رہی ہے—

www.paksociety.com

[illegible] روپے پیش کیے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بیزار اور بے کار سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

محسن کا چہرہ اچانک یوں چمکنے لگا جیسے کم وولٹیج پہ چلنے والا بلب پوری روشنی سے جگمگانے لگے۔ وہ ایک روایتی خوشامدی کی طرح بولنے لگا اور اعتمادانہ آوازیں نکالنے لگا۔ [illegible] کی نقل اتار رہا ہو... یا مرغی کا جیسے مرغی کا دانہ پڑا ہو... اسے یقین تھا کہ اس کا اولین تحت چہرہ دوسری طرف کھلکھلا کے ہنسا ہوگا۔

پھر اس کا نشہ اتر گیا اور اس نے شہلا کو خدا حافظ کہہ کے ریسیور رکھ دیا۔ فون کے مالک نے حساب کتاب کی ریزگاری کی کوشش کی مگر میں نے کہا کہ حساب دوستاں دردل... باقی پھر کبھی آئے تو لے لیں گے اور یہ لیجے تو یہ سہی۔

"کیا ہوا۔ برخوردار کی بات سن کے تیری شکل سڑے ہوئے بینگن جیسی کیوں ہو گئی...؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں یار۔" وہ بولا۔

"کیا اس نے ڈانٹ دیا کہ فون پہ کیا بدتمیزی ہو رہی ہے؟ یا ماشاء اللہ فر فر گالیاں دینے لگا ہے۔"

"ابے اس نے دو چار لفظ ہی سیکھے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "مجھے لگا ہے ماں کو... ماما کہتا ہوگا انکل رشوی کو... [illegible]..."

"تجھے بھی ماما کہہ دیا۔" میں بے اختیار ہنسا۔

"یار جب پاپا یا ابا ساتھ ہوگا ہی نہیں تو وہ کہے گا کیسے۔" وہ جھینپ کر بولا۔ "سالا بار بار ماما جی... ماما جی کرتا رہا..."

"سالا... تو نے اسے سالا کہہ دیا...؟" میں نے ہنسی سے بے حال ہوتے ہوئے کہا۔ "اس نے تجھے ماموں کہہ دیا... اب ذرا سوچ کر کتنے رشتے گڑبڑ ہوں گے..."

"یار چھوڑ مذاق... یہ زیب النساء کے فلمی دنیا میں جانے کا کیا ذکر تھا...؟"

"وہ فلمی ہیروئن بن گئی ہے... بقول... شہلا نے اس کی تصویر دیکھی۔ فلم اور ڈائریکٹر کا نام اسے یاد نہیں آیا... مگر وہ سو فیصد یقین کے ساتھ کہہ رہی تھی..."

"بھائی نے جان کی بازی لگا کے اسے یہ شعور تو نہیں دیا تھا۔" محسن سوچ کے بولا۔

"وہ زندگی میں کبھی ایسا نہ ہونے دیتا... گولی مار دیتا اس کو کیونکہ اس سے بہتر فلمی دنیا میں عورت کے مقام کو کس نے سمجھا ہوگا جو خود ہوس کا شکار رہی تھی... [illegible] جبکہ ہمیں معلوم ہوا تھا اپنے چوہدری دلاور صاحب سے [illegible]

"اور چوہدری صاحب ہمیشہ سچ نہیں بولتے..." محسن فوراً قائل...

[illegible] جھوٹ بول رہے تھے...

"جھوٹ بول رہے ہیں۔ ان کے جھوٹ کی کوئی انتہا نہیں..."

"ہاں... یہ وجہ ہے اس نے ایسے [illegible] پہ کتنا انسانیت سوز تشدد کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "محسن وہ سب حقیقی تھا۔ نہ وہ لڑکی رابعہ تھی اور نہ اس کی وہ فرار کی [illegible]"

"اس سے تو کیا ثابت کرنا چاہتا ہے وہی جو ہم سمجھ رہے ہیں یا کچھ اور؟" محسن بولا۔

"تو کیا سمجھا ہے؟" میں نے آزمانے کے لیے پوچھا۔

"یہ کہ جس نواب خسرو جمشید کی لاش ہم نے دیکھی تھی وہ کوئی اور تھا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "آپ تو دلوں کے بھید جانتے ہیں بابا جی۔" میں نے عقیدت کے ساتھ کہا۔ "لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیں کہ پھر وہ کون تھا؟"

محسن نے میرے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے کہا "وہ نقلی نواب تھا بچہ... کیا تو نہیں جانتا کہ خسرو جمشید ہمیشہ اپنے ساتھ ایک ڈپلیکیٹ رکھتا تھا۔"

"مگر وہ تو ہمارے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔"

"میک اپ ایک آرٹ ہے۔ کیا تو نے ایسی فلمیں نہیں دیکھیں جن میں ایک ہیرو نے تین یا چار رول کیے... چوہدری دلاور کے لیے کیا مشکل ہے... وہ ایک نہیں دس خسرو جمشید بنا سکتا ہے۔"

مگر میں اب کچھ اور سوچ رہا تھا اور محسن کی بات کہنے کے پیچھے ذہن میں قدرتی طور پر یہ خیال آنا لازمی تھا کہ دلاور کی یہ اعصاب شکن ڈرامائی پیشکش جھوٹ پر مبنی تھی تو کیا خسرو جمشید اور جوانی زندہ ہیں۔ ان کا باپ نواب سلطان محمد خان زندہ ہے۔ زیب النساء کی ماں زندہ ہے اور کیا اصلی خسرو جمشید ابھی تک وہیں قید ہے جہاں ہم اسے چھوڑ کر آئے تھے؟

میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات سے محسن کو آگاہ کیا۔

"بات تو کر گئی بھی ہے اور نہیں بھی لگتی" وہ بولا۔

"یہ کیا بات ہوئی شیروانی صاحب؟"

"مطلب یہ کہ جو کچھ میری اور تمہاری ناقص عقل میں آیا ہے وہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔"

"مطلب کہاں سے اس بات میں؟" میں نے کہا۔ [illegible]

"نواب خسرو جمشید مر بھی سکتا ہے اور نہیں بھی مر سکتا... یہ سب جھوٹ بھی ہو سکتا ہے اور سچ بھی۔"

"سر دست یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے [illegible]" آہ بھر کے کہا۔ "یہ تصدیق طلب امور ہیں اور ابھی تو ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ جب فرصت ہوگی تو تصدیق بھی کر لیں گے کہ وہ..."

... پانی میں دودھ کتنا۔ جس کو کہتے ہیں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دینا۔ ابھی تو وہاں چلنے کی سوچو۔"

[illegible] میں سر ہلا دیا۔ باقی سب لوگ واپس آگئے تھے [illegible] کو دور سے بھول گئے۔

لیکن ہم واپس پہنچے تو کھیت میں صرف غالب اور نازو موجود تھے [illegible] کے درمیان جنگ بندی کے بعد والی کشیدگی موجود تھی۔

"باقی لوگ کہاں گئے؟" میں نے غور سے نازو اور غالب کی صورتوں کو دیکھ کے کہا۔

کسی نے بھی میری بات کا جواب نہیں دیا۔ "چلو کیا ہے؟ [illegible] دونوں بیک وقت بہرے ہو گئے ہو؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" دونوں نے بیک وقت کہا اور پھر ایک دوسرے کو خون آشام نظروں سے گھور کر خفیف ہو گئے۔

"[illegible] نہیں معلوم۔ یعنی یکا یک غائب ہو گئے سب؟"

"نہیں... مجھے نہیں معلوم بھائی سب کہاں ہیں۔" غالب نے [illegible] "اس سے پوچھ لو۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ "تم دونوں تو ایک ساتھ گئے تھے۔ کیا ساتھ واپس نہیں آئے تھے؟" محسن نے غالب کی طرف دیکھ کر کہا۔ "[illegible] ماشاء اللہ محبت کا دور ہے۔"

"بھاڑ میں گئی محبت۔ ایک تم سے کر لی وہی کافی ہے۔" غالب نے کہا۔ "میرے باپ کی توبہ۔ پھر کبھی نام بھی لوں محبت کا۔"

محسن نے قہقہہ مارا۔ "لگتا ہے آج پھر کچھ ہو گیا۔ وہی جو غالب نے کہا تھا۔ اصل غالب صاحب نے کیا کہا تھا؟"

"انھوں نے کہا تھا کہ..." میں نے سوچ کے کہا۔ "ہاں کیا خوب کہا تھا۔ [illegible] کا تیرہ نہ تھا۔"

"آہ ہم بھی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن۔" محسن نے [illegible] جیسے نزع کے عالم میں ہو۔

"[illegible] کون وہ؟ جس نے غالب کی چھوٹی پسلی ایک کر دی تھی؟" [illegible] کہا۔

"نام [illegible] اس کا غالب..." محسن نے سر کھجایا۔

"[illegible]" زیب نے کہا۔

"خبردار جو کسی نے میرا نام لیا۔" نازو نے بگڑ کے کہا۔

"تو اب کیا کرو گی۔ وہاں تو میں اکیلا تھا اور... [illegible]" غالب نے [illegible] کے کہا۔ [illegible]

"ہاں پھر نہیں [illegible] اس بار [illegible]" محسن بولا۔

"اور آج تھا کہ [illegible]" میں نے [illegible] سر ہلایا۔ "اب ہمت ہے تو کر کے دیکھو۔"

مگر ان دونوں کی سرد جنگ پھر گرم ہوگئی تھی اور وہ ہماری سنا کہا نہیں رہے تھے۔ ان کی یہ لڑائی بھی محبت کا انداز تھا کہ ہم سب آشنا تھے۔ غالب کی بھی وہی بات تھی کہ [illegible] وضاحت یوں ہوتی۔

"چلو میں سیز فائر۔" محسن نے بیچ میں آ کے کہا۔

"ہاں بتاؤ کیا ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"انھوں نے ایک بہت گھٹیا اور بازاری جملہ بولا تھا۔" نازو نے برہمی سے کہا۔

"وہ ایک مشہور بہت فلم کا ڈائیلاگ تھا۔" غالب نے بگڑ کے کہا۔ "محمد علی نے بولا تھا زیبا کے لیے۔"

"تم محمد علی نہیں ہو۔"

"تم بھی زیبا نہیں ہو۔ اس کی جوتیوں کی خاک بھی نہیں ہو۔" ایک بار پھر ان کی لڑائی بند ہوئی تو غالب نے کہا۔

"یار کوئی حد ہے شرافت کی بھی۔ اٹھایا اور پھینک دیا جیسے... جیسے میں آدمی نہیں، جوتا ہوں۔"

"جوتی جوتی۔ تم پاؤں کی جوتی ہو۔" محسن بولا۔

"وہ پھینکا تھا میں نے۔" نازو بولی۔ "پھینکتی تو [illegible] جاتے گرتے۔"

"پھینکا نہیں تھا تو... تو کیا پیار کیا تھا؟" غالب نے بگڑ کے کہا۔

"ذرا سا ہاتھ تو کیا لگا دیا۔"

"ذرا سا ہاتھ؟" غالب اچھلا۔ "مجھے زمین سے چھ فٹ اوپر تو اٹھا دیا تھا پتنگ کی طرح۔"

"تو اڑتے رہتے۔ کس نے کہا تھا پیچھے گرنے کو۔" محسن نے دخل اندازی کی۔

"گرنے سے کون سی ہڈی پسلی ٹوٹ گئی۔" نازو نے کہا۔ "بس ایک قلابازی وہ بھی سبزے پر..."

"خدا کے غضب سے ڈرو۔" غالب چراغ پا ہو کے بولا۔ "وہ ایک قلابازی تھی جیسے [illegible]"

"پھر کیا ہوا۔ کوئی خراش بھی آئی؟"

"خراش؟" غالب نے غضب سے کہا۔ "گھر کے اندر تو ہاتھ چھپتے تھے باہر بھی چھپنے لگے۔"

"تمہاری زبان چلنے لگی ہے پاگل قینچی کی طرح۔" محسن نے نازو کو چھیڑنے کے لیے کہا۔ "جس سے بی رکھی ہو۔"

"مگر پھر بھی یار [illegible] یہ بے عزتی؟" میں نے فوراً غالب کی طرفداری کی۔ "اتنی بے عزتی بھی نہیں ہے یار بھلا۔"

www.paksociety.com

"چل یار۔ تو سہارے جہانپز" محسن بولا۔
"ہاں بالکل، جیسے مساوا شوہر ملتے ہیں۔" میں نے کہا۔
"قسم خدا کی شمسا ہوتی نا..."
غالب نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ "وہ تو تمہیں ہے کیونکہ تم آپ کے مار دو، ایک جہانپسند۔"
"تمہیں میری قسم۔" نازو نے یک لخت لہجہ بدل لیا۔ "ضرور مارو اور ایک نہیں دو۔"
نازو کا قسم دینا غضب ہو گیا۔ غالب تک تو اسے جہانپز مارنے کے لیے اٹھا تھا [illegible] کشتی شروع ہو جاتی خواہ وہ [illegible] کشتی ہوتی۔
"آج تو بچ گیا [illegible] کی وجہ سے۔" غالب نے [illegible] ہوئے کہا۔
"لیکن اب تو وہ جہانپز [illegible] ایک دن ضرور ماروں گا۔"
"اسی دن جواب میں تم چار جہانپز کھاؤ گے۔" محسن نے [illegible] مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔
"اس کی پروا نہیں۔ تم دس مارنا مگر نازو کی قسم [illegible] بری لگتی ہے مجھے۔" غالب نے کہا۔ "کیوں نازو؟"
"چلو چھوڑو بھی۔" نازو نے ہنسی اور اسے کہا کہ [illegible] گیا۔
"معاف کر دو بے چارے کو میری خاطر۔"
وہ دونوں تو ایک ہو گئے تھے اور ستاروں کی چلتی پھرتی چھڑکنے والی سازش ناکام ہو گئی تھی جو ہم نے صرف تماشا دیکھنے کے لیے بنائی تھی۔ رات تک وہ تینوں جاں لے کے پیچھے [illegible] بنے رہے۔
پھر نصف شب سے کچھ دیر قبل سب تشویش میں مبتلا ہونے لگے۔ ابھی تک راجا واپس نہ آیا تھا اور شیخ جس کے ساتھ وہ گئی تھی [illegible] کی طرف سے [illegible] زیادہ پریشانی اس لیے نہیں ہوئی کہ وہ کسی خطرناک مقصد سے کسی غلط جگہ نہیں گیا تھا۔ وہ ابھی پری سے ملنے گیا تھا اور یہ ہو سکتا تھا کہ پری کی ساعت [illegible] نایاب [illegible] تمام رات [illegible] انتظار [illegible] پری کے [illegible] وعدۂ ملاقات کی [illegible] تمام رات کو [illegible] بسر کرے لیکن شیخ اور [illegible] دونوں کے لیے [illegible] ہر قدم پر خطرات [illegible]
نازو بالآخر سو گئی۔ محسن بھی اسے سوتا دیکھ کے اونگھنے لگا اور پھر لمبا لیٹ گیا۔
"تم بھی سو جاؤ، وہ اب نہیں آنے والے۔" محسن نے کہا۔ "صبح آ جائیں گے۔"
میں نے یا غالب نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا لیکن میرے دل میں ایک بات تھی جو کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے کہا۔
"مرزا جی! میرا خیال ہے کہ محسن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔"
"مگر وہ رات بھر کہاں رہیں گے؟" غالب بولا۔
"راجا کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے ٹھکانے [illegible]" میں نے کہا۔ "لیکن [illegible] وہ شیخ کو کہیں [illegible] گئے ہیں [illegible]"
"مثلاً جیل خانے؟"
"مثلاً کسی ہوٹل میں۔ ایک رات کے لیے۔" میں نے [illegible] کہا۔ "وہ اس [illegible] کی عورت ہے۔"
"ہو گی۔" غالب نے سوچ کے کہا۔ "مگر شیخ..."
"شیخ کے [illegible] عورت سے شعر یاد آ جاتے ہیں [illegible] مگر [illegible] بے شک [illegible] مضبوط [illegible]"
"تمہارا کیا مطلب ہے؟"
"عشق نے اس کو نکما کر دیا ورنہ وہ بھی آدمی تھا کام کا [illegible] شعر کو مناسب ترمیم کے ساتھ [illegible] پڑھا۔ جب عشق کا [illegible] ہو اور محبوب خود قدموں میں آ گرے۔ بالکل اسی طرح جیسے [illegible] اشتہار والے عامل دعوے کرتے ہیں۔ تو پھر کس کے ہوش سلامت رہ سکتے ہیں؟"
"لیکن وہ تم پر مرتی ہے۔"
"مرتی ہے۔" میں نے طنزیہ اور تلخ لہجے میں کہا۔ "اس کا [illegible] مجھ سے پیار کرتی ہے مگر اس کا جسم..."
"تم دونوں پر تہمت لگا رہے ہو۔"
"تہمت نہیں یار۔ قیاس آرائی کر رہا ہوں۔ [illegible] تھا۔ وہ ایسا کر سکتی ہے، مجھے چڑانے کے لیے، جلانے کے لیے [illegible] سب کا اپنا اپنا [illegible] کی بات ہے تو شیخ بھی بے بس ہے۔ وہ [illegible] ہے اور اگر [illegible] ایک بار بھی اشارہ کر دے تو وہ خود کو بھول [illegible] یہ عشق [illegible] ناممکن تو نہیں ہوتا۔"
"ہاں، تو صحیح تو درست ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں [illegible] اسے قبول نہیں کرتا۔" غالب نے کہا۔
"دل تو میرا بھی نہیں مانتا۔ میں دماغ کی بات کر رہا تھا۔"
"مجھے تو ڈر ہے کہ... وہ کسی مصیبت میں نہ پڑ گئے ہوں۔" غالب نے کہا۔
"یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن ہم ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں اور کیسے؟" میں نے کہا۔ "انہیں کہاں ڈھونڈنے جائیں؟"
"بس تو پھر سو جاؤ، صبح دیکھیں گے۔" غالب نے [illegible] سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ میں نے اس کی تقلید کی اور [illegible] طرح آنکھیں بند کرتے ہی دل کا دریچہ روشن ہو گیا [illegible] رابعہ کے رخ روشن کا جلوہ یوں نظر آیا تھا جیسے [illegible] چاند ہر شب کی طرح سونے سے پہلے میں نے ان کے [illegible] شکوے اور [illegible] فراق اور غم ہجر کی [illegible] اور مجبوری کے [illegible] عذاب کے [illegible] کی روشن [illegible] خیال [illegible] منسوب تھے۔
صبح محسن نے مجھے جھنجھوڑ کے جگایا۔ میں نے اٹھتے ہی آنکھیں ملتے ادھر ادھر دیکھا۔ دن یقیناً بہت پہلے نکل آیا تھا۔
"کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ لوگ آ گئے؟"
محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "صرف راجا آیا تھا۔ معلوم نہیں کب۔"
"ایسی خاموشی سے آ کے لوٹ گیا!" میں نے کہا۔
"ہاں۔ ایک [illegible] چھوڑ گیا ہے۔" غالب نے میری طرف ایک لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔
"اس میں سامنے آ کے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔" محسن نے خفگی سے کہا اور اسے ایک گالی بھی دی۔ نازو کہیں [illegible] میں مصروف تھی۔ چنانچہ [illegible] کی ضرورت پیش نہیں آئی۔
میں نے لفافے میں سے ایک خط نکالا۔ راجا نے لکھا تھا۔
"دوستو!
مجھے بہت شرمندگی ہے کہ میں فی الحال تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنی خود غرضی اور بزدلی [illegible] پر تم جو چاہو مجھے [illegible] کہو [illegible] ہے۔ تمہاری صحبت میں رہ کے میں نے بہت کچھ سیکھا تھا اور بہت کچھ پایا تھا۔ جو میں گم کر چکا تھا [illegible] خودی اور [illegible] داری۔ میں نے رشتوں کا احترام سیکھا اور محبت کے اعلیٰ ترین مفہوم سے آشنا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ محبت صرف ایک عورت کے لیے ایک مرد کی طلب کا نام ہی نہیں ہے [illegible] سب سچے۔ تم جو حقیقی خون کے رشتوں سے نہ بھائی [illegible] انسانیت سے محبت کرتے ہو اور ان اخلاقی قدروں سے محبت کرتے ہو جن کو اپنا کر انسان بھی فرشتہ بن سکتا ہے۔ تمہارے دلوں میں کھوٹ نہیں، نگاہوں میں شک نہیں اور زبانوں پر منافقت نہیں۔ تم سب ایک [illegible] ہو [illegible] انسان دوستی اور سرفروشی کے جذبات سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ میں نے تم سا بننے کی بھرپور کوشش ضرور کی تھی۔
افسوس یہ ہے کہ تمہاری طرح میں اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں کے جال سے نہ نکل سکا۔ صرف چاہنے سے آدمی کچھ نہیں بنتا، کچھ صلاحیت بھی تو ہونی چاہیے۔
مجھ میں یہ صلاحیت نہیں تھی تو قصور میری فطرت کا ہے۔ ہر شخص کی فطرت جدا ہوتی ہے۔ میں مصائب اور سخت حالات سے نہیں گھبراتا۔ جان دینے سے بھی نہیں ڈرتا۔ اپنے وطن سے محبت بھی کرتا ہوں اور اس کے دشمنوں کو نیست و نابود کرنے کی خواہش بھی۔ مجھ میں قوت عمل یا قوت ارادی کی کمی بھی نہیں اور میں اس عظیم مقصد کے لیے سب کچھ قربان کر سکتا تھا سوائے اپنی محبت کے۔ سوائے پری کے کوئی میری راہ میں حائل نہیں ہو سکتا تھا اور کوئی مجھے روک نہیں سکتا تھا۔
تم مجھے جتنی گالیاں چاہو دو لیکن اپنی اس کمزوری کا میں پہلے بھی اعتراف کر چکا ہوں۔ تم نے اس محبت میں میری دیوانگی دیکھی تھی۔ پری کے حصول کی خاطر میں نے اس کے باپ کی وہ شرط بھی منظور کر لی تھی جو میں کبھی پوری نہیں کر سکتا تھا لیکن میں نے اس کا بھی حل نکال لیا تھا جو کسی اور کے لیے ناممکن ہوتا۔ [illegible] ڈاکا ڈالتا اور ایک ہی بار میں دولت کا ڈھیر لگا دیتا لیکن اس کی مجھ میں ہمت نہیں تھی اور یہ بہرحال ایک جرم تھا جو میں نہیں کر سکتا تھا۔ اگر مجھے نوکری مل جاتی۔ میرا مطلب اس نوکری سے ہے جس میں آدمی سیکڑوں کی ماہانہ تنخواہ تو بطور زکوٰۃ لیتا ہے اور لاکھوں کما لیتا ہے۔ تب بھی شاید میں یہ کام کر سکتا۔ [illegible] میں نے جو طریقہ اختیار کیا ہے تم دیوانگی کہہ سکتے ہو لیکن میں اسے محبت کی مجبوری ہی کہوں گا ــــ
اب یہ بھی اس محبت کی مجبوری ہے جو مجھے تم سے جدا کر رہی ہے۔ کہنے کو وقتی طور پر شاید [illegible] لیکن [illegible] تمہارے لیے اس سے زیادہ کر سکوں جو میں نے آج تک کیا۔ کل شام جب میں پری سے ملنے کے لیے گیا تو مجھے پتا چلا کہ اس کے باپ پر دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ ہسپتال میں ہے۔ میں اسپتال گیا تو اس کی حالت سے ڈاکٹر بھی مایوس ہو چکے تھے۔ یوں سمجھ لو کہ اس کا بالکل آخری وقت تھا۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ میں ایسی [illegible] قسم کی صورت حال سے دوچار ہو جاؤں کہ اس نے مجھے دیکھا تو کہنے لگا کہ بیٹا تم کہاں تھے، کل سے میری آنکھیں تمہارا راستہ دیکھ رہی تھیں اور میرا دم اسی لیے اٹکا ہوا ہے کہ میں اپنی زندگی میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں اور تم سے ان سب زیادتیوں کی معافی بھی مانگ لوں جو میں نے تمہاری

www.paksociety.com

اور پروین کی محبت آزمانے کے لیے کی تھی میں بھونچکا رہ گیا۔ 'آزمانے کے لیے'

'ہاں بیٹا، زمانہ ہی ایسا ہے میں کیا کروں' وہ بولا۔ 'سب ہی محبت کے دعویدار بنے پھرتے ہیں اور پروین تو لاکھوں میں ایک ہے اور لاکھوں کی مالک بھی ہے حسن اور دولت دیکھ کر منڈلانے والے سب بوالہوس ثابت ہوئے سوائے تمہارے۔ تم نے مجھے یقین دلا دیا کہ تم پروین کو صرف اس کے لیے چاہتے ہو اور اس کے لیے سب کچھ کر سکتے ہو یہاں تک کہ فقیر بن کے بھیک بھی مانگ سکتے ہو'

میں پھر بھونچکا رہ گیا۔ 'یہ... آپ کو معلوم تھا'

وہ بڑی مشکل سے مسکرایا: 'جو بات سارے شہر میں مشہور ہو وہ مجھ سے کیسے چھپی رہ سکتی تھی بیوقوف'

'آپ یہ بھی جانتے تھے کہ میں ڈاکو نہیں ہوں'

'ہاں۔ مجھے سب پتا تھا' وہ بولا 'کہ تم کس طرح پری کی خاطر میری شرط پوری کرنے لگے ہو۔ بھیک مانگنا بہت مشکل کام ہے۔ چوری ڈکیتی سے بھی زیادہ مشکل۔ اس میں آدمی کو اپنی عزت نفس کچلنی پڑتی ہے اور بے عزت بن کے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے مگر تم نے تو حد کر دی۔ ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے۔ میں تو بہت پہلے قائل ہو چکا تھا کہ پری سے تمہاری محبت کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ تم بڑے وقت پر آگئے ورنہ آج میرا مرنا اور مشکل ہو جاتا'

بادل ناخواستہ میں نے کہا: 'خدا آپ کا سایہ سلامت رکھے'

وہ بولا 'اب کوئی فائدہ نہیں۔ پہلے ہی بہت دیر کر دی تھی میں نے۔ میں تم سے یہ بات بہت پہلے کہہ سکتا تھا لیکن تم تو میرے سامنے ہی نہیں آتے تھے۔ خیر اب فوراً جاؤ اور بارات لے آؤ'

میں تیسری بار بھونچکا رہ گیا 'بارات... یہاں!'

'بارات سے میری مراد ہے وہی دو گواہ اور دو وکیل، ایک قاضی اور تم خود' وہ بولا 'میں نے ڈاکٹروں سے بات کر لی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ دس بارہ منٹ کے لیے پانچ چھ افراد آ سکتے ہیں'

'آپ نے پروین سے بھی پوچھ لیا' میں نے کہا

'بے وقوف یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات تھی' وہ بولا۔

اس وقت میری پیاری دوسری جانب بیٹھی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کا رونا برحق تھا۔ ایک تو اس کی رخصتی ادھوری تھی دوسری اس کے باپ کی اور دونوں کی رخصتی کے حالات سخت ٹریجک تھے۔ میں نے اسے رونے دیا اور وہاں سے دوڑ کر گھنٹے میں بارات کو بلا لایا۔ ان میں چار تو میرے دوست تھے جو مجھے پرنس کے نام سے جانتے تھے۔ اتنی گاڑیاں تھیں جن میں ہم قاضی کو بھی بٹھا لائے حالانکہ وہ آ نہیں رہا تھا۔ اس نے بہت شور مچایا کہ وہ عصر اور مغرب کے درمیان ہی نکاح پڑھاتا ہے اور خود بھی دل کا مریض ہے اس لیے امراض قلب کے اسپتال میں نکاح پڑھنے نہیں جا سکتا۔ نہیں نکاح کے دوران میں لڑکی کا باپ مر گیا تو نکاح ادھورا رہ جائے گا اور وہ خود بھی فوت ہو جائے گا۔ ہم نے اسے پانچ سو روپے دیے مگر وہ نہیں مانا۔ ہزار روپے دیے تو اس نے اداکاری نکاح میں تبدیلی منظور کی اور وعدہ کیا کہ پورا نکاح پڑھانے سے پہلے مرنے والے کو کم از کم نہیں مرنے دے گا اور خود بھی فوت نہیں ہوگا۔

اب تم سوچ سکتے ہو کہ یہ کیسی شادی تھی۔ ایک طرف میلے کپڑوں میں ملبوس مختصر سا دولہا، شاید میں اٹھ نکل گیا۔ تیسرے ایک ایسی دلہن بیٹھی تھی جو جتنی زیادہ خوبصورت تھی۔ دوسری طرف ہونے والی اس دولہن کا منظر پر آبدیدہ بیٹھے تھے اور درمیان میں دولہا کا سسر سفر آخرت پر روانہ ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ خیر جی قاضی، گواہان، احباب، وکیل سب تھے۔ مجھے تو خوشی ہے کہ قاضی نے شارٹ ہینڈ میں نکاح پڑھا دیا۔ دعا مانگ کے ہم نے ہاتھ ملاتے ہی حالت بگڑ گئی قاضی سمیت ان میں سے کوئی بھی دوسری رخصتی بھی فرکت تک ٹھہرنے کو تیار نہ تھا۔ بہت سی نرسوں اور ڈاکٹروں نے یہ انوکھی شادی خاص دلچسپی سے دیکھی۔ مجھے افسوس رہا کہ ہم سب شریک تھا ہو گئے۔ کسی کا کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں گئے کا تو شاید نہیں لانے کی کوشش بھی کرتا۔

میرا سسر شادی کی تقریب کے ختم ہونے ہی فوت نہیں ہوا۔ اس نے بطور داماد میری تقرری کے بعد ایک مختصر مگر دردناک تقریر کی جس میں مجھے اس نے تفصیل سے کاروبار اور اپنے جائیدادوں کے بارے میں

چلا اور سارا پرینڈ اب تمہاری ہے تو سب تیرا ہے یہ مجھے پروین سے زیادہ کاروبار کا خیال کرنا ہوگا۔

میں تو سمجھا تھا کہ فی الحال اس نے مرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے لیکن رات گیارہ بجے تیسرا اور آخری جھٹکا پڑا اور وہ سچ مچ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ظاہر ہے مجھے اپنی دلہن کو بھی سنبھالنا پڑا اور میت کو بھی۔ ہم دونوں کو ایک ہی گاڑی میں گھر جانا پڑا اور صبح مجھے اپنے سسر کی تجہیز و تکفین کرنی ہوگی۔ اس کے سارے انتظامات ابھی باقی ہیں۔ تم خود سوچ سکتے ہو کہ شادی کے بعد میری پہلی رات کیسے گزری ہے گی۔ ابھی شاید سوگ کیا جلد تک اپنی شب عروسی منا سکے گر کوئی بات نہیں۔ پری اگر میری ہے تو اس کا ہر دکھ بھی میرا ہے اور میں صرف اپنی خوشی کو نہیں دیکھ سکتا جہاں انتظار اور آزمائش کے اتنے سال گزرے وہاں صبر سے یہ چند دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ رنہ مجھے ملیں کا پتا تھا نہ ڈیٹ شیٹ ملی تھی مگر میں نے عشق کا وہ امتحان پاس کر لیا ہے جس کے بعد کوئی امتحان نہیں۔ سمجھو کہ پی ایچ ڈی ہو گیا ہوں اچانک عشق کے مضمون میں۔

مدفین کے بعد بھی مجھے وہ سب کام کرنے ہوں گے جو مرحوم سسر صاحب میرے سپرد کر گئے ہیں۔ مجھے ان کے کاروبار کو جاری رکھنا ہوگا چیونٹی کے لیے جیسا کہ اس نے وصیت کرتے ہوئے کہا تھا...

وہ اچھا کیا تھا۔ ہم تو فقیر لوگ تھے فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔ دولت ہمارے لیے کیا تھی۔ فقط پری کا رشتہ مانگنے کا ذریعہ تب وہ مل گئی۔ ایسے میں تو مجھو ساری دولت مل گئی۔ جو دولت ہاتھ پھیلا کے مانگی تھی وہ اب اٹھ کا مشغلہ ہے لیکن پہلی تمہارے کام آ سکتا ہے۔ میں بیٹے اپنا سہرا کچھ چھوڑ کے تم سب سے ملے بغیر واپس جا رہا ہوں۔ تم سے ملتا تو تم روتے بھی اور بے ملنے بھی اور جھگڑتے بھی اور میرے پر پھوٹتے۔ کیا یہ ٹھیک نہیں جو ہے بیٹا لیکن میرے اس حقیر تحفے کو ضرور قبول کر لینا بے شک یہ خیرات ہے۔ ایک بھکاری راجا کا مال ہے لیکن اس میں میرا اخلاص اور پری کی محبت شامل ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ کوئی کروڑ پتی نہیں رو کروڑ کا چیک کاٹ کر دے تب بھی میرے اس دو لاکھ کے مقابلے میں کہا وہ بے قیمت ہے۔ بے قیمت ہے۔

ہمیشہ رہے گا۔ یہ پیسہ یقیناً میرے تعاون کا بدل نہیں ہے لیکن یوں سمجھو کہ جس محبت کی خاطر میں نے دن رات محنت کر کے یہ سرمایہ جمع کیا تھا وہ آج میں تم کو نذر کر رہا ہوں۔ یہ ایک مقصد کے لیے تھا مگر اب زیادہ عظیم مقصد کے لیے استعمال ہوگا تو مجھے خوشی ملے گی۔

میں تم سب کو ہر قسم کے خطرات سے دور رکھنا چاہتا ہوں اس لیے اپنا پتا چھوڑ کے نہیں جا رہا ہوں تاکہ تم جنازے یا تعزیت کے لیے آنا بھی چاہو تو نہ آ سکو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ سوئم کے بعد پری کا حق تم سے ملنے آئے گا۔ اپنی پری کے ساتھ۔

بھکاری راجا۔"

خط پڑھ کے میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مجھے یوں لگ جیسے راجا کا سسر نہیں مرا بلکہ میرا باپ مر گیا ہے۔ مجھے ایسے ہی جذبات میرے اس وقت بھی تھے جب مجھے ماسٹر ڈیڈی کی موت کی خبر ملی تھی مگر وہ ایسا صدمہ تھا جس نے میرے دل کا لہو کر دیا تھا۔ ڈیڈی نے بڑی بہادری کے ساتھ جام شہادت نوش کیا تھا۔ اس کے برعکس راجا نے بہت کمزوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے خودکشی کر لی تھی۔ مجھے اس پر فخر تھا۔

"آخر کا بچہ تھا۔ بھکاری کی اولاد" میں نے خط کو پھینک کے کہا "نہیں چاہیے ہمیں اس کا پیسہ"

"وہ قابل معافی ہے سکندر بھائی" نازو ناشتا لے کر اندر آئی۔

"کیسے نکر وہ قابل رحم ہے" غالب نے کہا۔

"سب فضول باتیں ہیں۔ وہ بزدل اور خود غرض..."

"نہیں یار" محسن نے میری بات کاٹ دی۔ "اسے خود غرض مت کہو۔ وہ مجبور تھا اور کمزور بھی۔ جس حد تک وہ ہمارا ساتھ دے سکتا تھا اس نے دیا۔ اب یہ توقع رکھنا تو غلط ہوگا کہ سب غالب یا محسن یا سکندر بخت ہوں گے۔ آگے جو بھی ملیں گے وہ ہمتے ہی ثابت قدم اور مستقل مزاج ہوں گے جیسے ہم ہیں۔ یا ڈیڈی تھا"

"چلیں غصہ تھوک دیں۔ ناشتا کریں" نازو نے کہا۔

"میرا موڈ نہیں ہے" میں نے کہا "مجھے ایک کپ چائے کا دے دو بغیر دودھ کے"

"چلو یار۔ اب غصہ ختم کرو جانے ہمارے ساتھ کون کب تک جائی گا ہے جب تک ساتھ دے سکا دیا۔ جب اس قابل نہیں رہا تو صاف اپنی کمزوری کا اعتراف کر لیا۔ کوئی حیلہ بہانہ نہیں کیا۔ جھوٹ کو سچ بنانے کے لیے جواز گھڑ لیے دلائل نہیں دیے لوگوں کی اپنی اپنی مجبوریاں ان کے راستے کی دیوار بن جاتی ہیں اور سب ان دیواروں کو گرانے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ تم نے راجا کو جو درد دکھا ہے وہ محسن نے شملا کو۔ تو ایسا سب تسلیم کر لیتے

www.paksociety.com

کس وقت آیا تھا؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "کسی کو پتا نہیں چلا۔"

"اور اس کے وہ خوابوں سے بھرے ہوئے گھڑے بھی دروازے کے باہر گلی میں رکھے ہوئے ملے۔" غالب نے کہا۔ "انھیں وہ اندر کیسے لاتا۔ خط تو آپ نے دروازے کے نیچے سے کھسکا دیا۔"

"تم نے ناشتا کیا؟"

"یہ کیا ناشتے کی رٹ لگا رکھی ہے۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "تم لوگوں کو اس کی کوئی فکر نہیں ہے؟"

"کیا فکر کرنے سے وہ آ جائیں گے؟" نازو نے کہا۔ "اگر آ سکتے ہیں تو چلو تم ناشتا کرو، میں فکر کرتی ہوں۔"

"کیا عجیب جذبات ہیں تمھارے بھی!" میں نے ہار کے کہا۔

"چیف کے تو وہ مرزا غالب کا سالا اب نہیں آنے والا۔" محسن بولا۔ "وہ نکل گیا اس مہم جو کافر کے ساتھ۔"

"اچھا کیا اگر نکل گیا تو۔ پہلے پولیس سے نکل گیا تھا اب ایم آر ایس سے بھی نکل گیا۔" غالب نے کہا۔

"تم اسے اچھا سمجھتے ہو تو تم بھی نکل جاؤ۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "لعنت بھیجو اس مشن پر۔"

"تم بھی نکل جاؤ رابعہ کے پیچھے۔" محسن بولا۔ "مسٹر سکندر اعظم۔"

"کل بھی۔ ہاں۔ کل تو نے شملہ سے بات کی مرزا جی بھی لگے تھے ایک دوا مانگ ایڈونچر پہ۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ایک وہ تھے انھوں نے کہا تھا اگر بیچ کہانیاں کھا کے بے مزہ ہو جائیں۔ غالب ثانی ہیں تو وار کھا کے بے مزہ نہیں ہوتے۔"

"چلو بس بھی کرو۔" نازو نے سب کو ڈانٹا۔ "صاف کیوں نہیں بتا دیتے سکندر بھائی کو۔ آخر کب تک چلے گا یہ مذاق؟"

میں نے غالب اور محسن کی طرف دیکھا جو نہایت ڈھٹائی سے کھی کھی کر رہے تھے۔

"وہ کل آئے تھے سکندر بھائی۔" نازو نے کہا۔ "جب ہم سب نکلے ہوئے تھے۔"

"پھر رکے کیوں نہیں؟"

"وہ جلدی میں تھے۔" نازو نے کہا۔ "سامنے والی خالہ نے انھیں دیکھا۔ بھیا ٹیکسی چلا رہے تھے اور مومی بھی ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ بات خالہ کو ذرا عجیب لگی۔ انھوں نے آواز دے کر مومی کو بلا لیا اور پہلے تو جھاڑا کہ تم دونوں کل بغیر بتائے کہاں نکل گئی تھیں۔ بچھوڑے پریشان پھر رہے تھے۔ مومی نے بتلایا تو کہنے لگیں کہ یہ کس کے ساتھ گھومتی پھر رہی ہو ٹیکسی میں۔"

"بڑی مشکل مزاج بڑھیا ہے۔ بالکل ایسی لگتی ہو جن گئی ہے" غالب

"یار دل کی لگی ہے یہ بچاری پرانے وقتوں کی چیز ہے۔ نام خیال رکھتی ہے تو صرف اس لیے کہ ہم نوادرات میں اس کے [illegible] کے مقابلے میں۔ چھوڑیے چھوڑیے یاں ایں۔" محسن ہنسنے لگا۔

"خیر آگے بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"میں بتا رہی ہوں۔ آپ ناشتا کر سکتے ہیں۔"

"بس یار اور نہیں کھایا جاتا۔" میں نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

"پھر مومی نے کیا کہا؟"

"اس نے... اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ خالہ ٹیکسی اپنی ہی ہے اور جس کے ساتھ بیٹھی ہوں وہ بھی اپنا ہی ہے۔" نازو بولی۔

"وہ تو صاف ہی کہہ سکتی تھی کہ میرا گھر والا ہے۔"

"اور کیا کہتی پھر وہ کہتی کہ [illegible] میرا ایک چاہنے والا ہے۔" محسن کھلکھلا کے بولا۔

"مگر وہ ٹیکسی۔ اس نے کہا تھا کہ اپنی ہے؟" میں نے حقیقت پر قابو پا کے کہا۔

"ہاں۔ ایسا لگتا ہے کہ اکرام بھیا نے پھر کوئی ٹیکسی لے لی ہے۔" نازو بولی۔ "ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ تو ان کے پاس پہلے سے تھا۔ ٹیکسی ڈرائیوروں کی برادری کے علاوہ وہ ٹریفک پولیس والے بھی انھیں جانتے پہچانتے ہیں۔ اس طرح وہ شہر میں زیادہ بے تعرفی سے پھر سکتے ہیں مومی کے ساتھ۔" میں نے کہا۔

"یار کیا ہو گیا ہے تجھے۔ مومی کیسے بن گئی ہے تیرا کمپلیکس؟ جہاں اس کا نام آیا اور تجھے شروع ہوئی تکلیف۔ ایسا کیا الرجی ہے اس سے کہ تیری سوچ تیری بات سب میں صرف تلخی اور نفرت آ جاتی ہے؟" غالب نے غصے سے کہا۔ "اب وہ پہلے سے ساتھ ہے۔ ہم سب سے ایک ہے۔ ہمیں تو نظر نہیں آئی اس کی شرافت میں کوئی کمی۔ تم سے ہے اس کا اور نازو کا رویہ ایک سا لگتا ہے۔ لیکن ہی بچے شملہ اور رابعہ بھی لگتی ہیں۔ پھر کیا قصور ہے اس کا؟"

"قصور اس کا یہ ہے کہ وہ سکندر اعظم کو فتح کرنے کی کوشش میں گھر بار اپنے پرائے دین دھرم اور اپنا شہر ملک چھوڑ آئی اور [illegible] کا دل شکستہ ہو کر بھی اس نے خودکشی نہیں کی۔" محسن نے تلخی سے کہا۔ "قصور اس کا یہ ہے کہ وہ ابھی اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکی۔ محبت تو وہ کی بات ہے۔ محبت تو وہ [illegible] بھی نہیں۔"

"آئی ایم سوری یار۔" میں نے کہا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم لوگوں کے یہ جذبات ہوں گے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے تم لوگ اسے قبول کرنے پر مجبور ہو جاؤ اور جب اس پر بھروسا کرنے لگو تو کوئی ناقابل تلافی نقصان ہو جائے جس کی ذمے داری مجھ پر آئے۔"

تمھارا بار بار اظہار ناپسندیدگی [illegible] سے ہم خیالات کے تابع سمجھتے ہیں۔ دوستی اور دشمنی اپنی جگہ لیکن تم غلط بات کو منوانے لگو گے تو ہم نہیں مانیں گے۔" غالب نے کہا۔ "ہمیں دل بھی خدا نے دیا ہے، عقل دی ہے، آنکھیں اور کان دیے ہیں۔ ہم اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور آدمی کی پہچان کر سکتے ہیں۔ مومی بھلا کسی کے حوالے سے ایم آر ایس میں شامل نہیں ہوئی۔ مومی سو فی صد میرٹ پر آئی ہے اور ہم سب آئے ہیں خوب پرکھ چکے ہیں۔ تم اس سے نفرت کرو تو یہ تمھارا ذاتی فعل ہے لیکن ہمیں یہ پسند نہیں اس کے ساتھ تمھارا رویہ ایسا ہو جیسے اس کی پوزیشن مشکوک ہے یا مشتبہ ہے۔"

میں نے غالب کے سخت لہجے اور محسن کی تند و ترش باتوں کا کوئی برا نہیں مانا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ انھوں نے کھل کر مجھ سے اختلاف کیا اور مومی کے جذبات یا مروت میں حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کی۔ انھوں نے ایک طرف مجھے میری کمزوری سے آگاہ کر دیا کہ مومی میرا کمپلیکس بن گئی ہے تو دوسری طرف میرے سر سے ذمے داری کا وہ بوجھ بھی اتار دیا جو مومی کی موجودگی کے باعث مجھے محسوس ہوتا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ یہاں ہمارے درمیان موجود ہے تو صرف میری وجہ سے۔

خاموشی کے ایک ناخوشگوار وقفے کو نازو نے ختم کیا۔ "مجھے یہ سب خالہ نے صبح بتایا۔ رات وہ ہمارا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھیں۔ انھیں عشا کی نماز کے بعد ہی سو جانے کی عادت ہے۔"

"اور کیا بتایا انھوں نے؟" میں نے لہجے میں بشاشت پیدا کی۔

"وہ ایک پیغام دے گئے تھے۔" نازو نے کہا۔

"کیسا پیغام؟" میں نے نازو کی خاموشی سے کوئی مطلب اخذ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

نازو نے غالب کی طرف دیکھا۔ "بتا دوں؟"

"اور کیا خبر پہنچانی ہے۔ ابھی سے؟" میں نے کہا۔ "وہ اجازت دے گئے تو بتاؤں گی؟" میں نے نازو کے لہجے میں اس کی نقل اتاری۔

محسن ہنس پڑا، نازو کا رنگ لال پڑ گیا۔

"چلو بتا دو۔" غالب نے یوں اکڑ کے کہا جیسے سچ مچ اس کی اجازت کے بغیر نازو کچھ نہیں بتانے کی۔ "بے چارہ کتنی منتیں کر رہا ہے۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم سب۔ مت بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"تمھاری مرضی ہے۔" محسن بولا۔ "پھر نہ کہنا کہیں خبر نہ ہوئی۔"

"ان کا کوئی تعلق ہے نہیں اس بات سے؟"

"اچھا کیا تم [illegible] تمھارا تعلق ہے کیا۔۔۔ کیا رابعہ... تم"

"جی! وہ رابعہ سے ملنے گئے ہیں۔" نازو بولی۔

"رابعہ سے ملنے گئے ہیں! مگر کہاں؟" میرا دل ایک دم تڑپا۔

کہہ سکتے تھے کہ جب ہم آئیں تو ہمیں بتا دیا جائے کہ رابعہ نے بلایا ہے اور وہ دوڑے دوڑے ادھر ہی جا رہے ہیں۔ ہم پریشان نہ ہوں۔"

"خالہ نے پوچھا نہیں کہ یہ رابعہ کون ہے؟"

"پوچھا تھا۔ بھیا نے کہا کہ میری پھوپھی زاد بہن ہے جو کراچی میں رہتی ہے۔" نازو ہنسنے لگی۔ "مومی نے خواہ مخواہ کہا کہ وہ میری بھی خالہ زاد بہن لگتی ہے۔ جیسے مجھ سے خالہ پوچھ رہی تھیں کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ اگر وہ دونوں میاں بیوی ہیں تو میں نے بڑی مشکل سے ٹالا کہ سگی خالہ زاد نہیں ہے۔"

رشتے میں کیا چکر تھا، یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آیا مگر رابعہ کے خیال سے وابستہ امید کا رشتہ یکلخت استوار ہو گیا۔ اس کے تصور کی ایک کرن ذہن کے اجلی دھوپ بن گئی۔ انھیں رابعہ نے بلایا تھا۔ واہ رے بدنصیبی، میں ہوتا تو شاید اکرام شیخ کی جگہ میں ہوتا۔ اس نے تو مجھے ہی بلایا ہو گا مگر میں تھا کہاں کہ پیغام مجھے ملتا۔ لیکن اکرام شیخ تک اس کا پیغام کیسے پہنچا؟"

میرے سوال کے جواب میں ان سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"ہمیں اور کچھ نہیں معلوم۔ جتنا اکرام شیخ بتا گیا تھا وہ یہی تھا۔ ہم بھی صرف قیاس آرائی ہی کر سکتے ہیں۔ پوری بات وہ خود بتائیں گے۔"

"عجیب احمق آدمی ہے۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "آدھی نامکمل بات کی۔ یہ بھی تو بتا سکتا تھا کہ رابعہ نے کہاں بلایا ہے اور کیوں؟"

"یہ سب خالہ کو بتاتا؟" محسن نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔

"زبانی نہ بتاتا، لکھ کے دے جاتا۔ چند سطریں لکھنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔" میں نے کہا۔

غالب نے کہا۔ "بات دیر کی شاید نہ ہو۔ راز داری کی ہو۔ میرے خیال میں تو اس نے ٹھیک ہی کیا جو تحریر نہیں چھوڑی۔"

"چھوڑ دیتا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی؟"

"تمھیں کیا معلوم قیامت ٹوٹتی کہ نہیں!" غالب نے کہا۔ "خالہ کو خود تو پڑھنا آتا نہیں ہو گا۔ وہ خط کسی کو پڑھنے دیتیں کہ ذرا پڑھ تو سہی اس میں کیا ہے۔ وہ بات کی ٹوہ میں رہنے والی تجسس سے بھرپور اور سنسنی خیز قسم کی بڑھیا ہے جسے آفت کی پڑیا بھی کہا جا سکتا ہے۔"

"دراصل سکندر کو غم ہے کہ شیخ کی جگہ وہ کیوں نہیں جا سکا۔" محسن نے میرے دل کی بات کہہ دی۔

"میرے دماغ میں جو بات آئی ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "وہ ہے تو ایک مفروضہ لیکن منطقی اعتبار سے اس میں کوئی خامی نہیں نکالی جا سکتی۔ ذرا سوچو۔ رابعہ کے پاس رابطے کا ذریعہ کیا ہے؟ ہو سکا اپنا دوست تھا۔ وہ خود تو جانڈ بھائی کے کسی محل میں قید ہے۔"

"یہ بھی ایک مفروضہ ہے۔" محسن نے دخل اندازی کی۔

www.paksociety.com

کہا۔ لیکن اس نے ہم سے دوست محمد کے ذریعے رابطہ پیدا کر لیا تھا۔"
"یہ بھی ایک معطر وقفہ ہے۔" محسن پھر بولا۔
"معطر وقفے کے پیچھے شکاری میں اس کا شغل کیا فرشتے چھوڑ کر گئے تھے؟" میں نے چڑ کے کہا۔ "اور بعد میں بھی دوست محمد ہی..."
"اچھا چلو مان لیا کہ اس نے پھر دوست محمد کے ذریعے پیغام بھیجا۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے جیف کے ٹوکرا سے ہمارا پتا ٹھکانا کیسے معلوم ہوا۔ یہ کیسے پتا چلا کہ شیخ صاحب کہاں ملیں گے، اور اگر وہ پیغام بھیج سکتی تھی تو اس نے تمہیں کیوں نہیں بھیجا؟"
"میں بتاتا ہوں۔ تم سنو تو سہی میری بات۔ حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ام رابعہ نے کسی خاص مقصد کے تحت ہمیں ساحل کی خریداری یا کسی بیگی ذریعے دوست سے متعارف کیا۔ یہ خاص مقصد کیا ہو سکتا ہے؟"
"بندرگاہ کی صورت حال کا جائزہ لینا، یہ دیکھنا کہ وہاں ہمارا جہاز ابھی ابھی کراچی تھر روانہ ہو گیا ہے یا ابھی تک لنگر انداز ہے۔" غالب نے کہا۔
"راشٹ ساب آپ نے کی ناعقل کی ایک بات۔ وہ اسی کا پتا چلانے بندرگاہ گیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اس بحری جہاز پر ملاح کے ساتھ جانے بھاگی کو دیکھ لیا تھا پھر وہ مشرق کا پسند دار کیا جانے والا تھا ہم نے غرق نا کر دیا۔ آپ اسے روانگی کے پروگرام ہیں ضرور دیر ہوگی۔"
"ملاح کے کہنے کے مطابق اس کھیپ میں اسلحہ اور مشینری زیادہ تھا جو ہم نے سمندر میں ڈبو دی۔" محسن بولا۔
"مگر ایک بحری جہاز صرف ایک ٹرک کا مال لے کر نہیں جاتا، اس پر سو پچاس ٹرک مال کے ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "سونا تو بہت تھوڑی جگہ لیتا ہے۔ صرف سونا ہوتا تو اللہ بھی بہت تھی، جو اتنا بڑا بحری جہاز آیا ہے۔ یہ تو خالی نہیں جانے کا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ راستے کا گودام ملا ہوا ہے تم لگے ہے۔"
"گودام کی موجودگی کا راز افشا ہو چکا ہے اور یہ بات ہمارے دشمنوں کو بھی معلوم ہو چکی ہے۔" غالب نے کہا۔
"راشٹ۔ ایسی صورت میں وہ گودام کو جلد از جلد خالی کر دیں گے بلکہ کر چکے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "نہیں جیسے ہی اپنا ٹرک گودام کے قریب خالی کھڑا ہوا ملا ہوگا وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ خطرہ ان سے کتنا نزدیک آ گیا ہے اور وہ بے وقوف نہیں ہیں کہ پھر بھی وہاں اطمینان سے بیٹھے رہیں۔ انھوں نے فوری طور پر اسلحہ منتقل کیا ہوگا، خواہ کسی دوسرے گودام میں یا جہاز پر۔ مجھے اس دوسرے امکان پر زیادہ کشش محسوس ہوتی ہے۔"
"تیرا مطلب ہے کہ رشید شیخ صاحب ہوا مچھے خاصے روانی کے موڈ میں غالب عزیزہ کے لیے روانہ ہوئے تھے، باہر نکلے تو سب بھول گئے اور دوسرے چکر میں بندرگاہ جا پہنچے۔"

کیا معلوم وہ کیا سوچ کے گیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ ممکن ہے مدعا کے پیچھے جنگ کی توقع نہیں، وہ راہ چلتے یا ٹیکسی چلاتے ہوئے بندرگاہ کے علاقے میں کسی سبب کی مہک کھا گیا ہو۔ مجھے یقین ہے مونچھی کو پھر ٹیکسی میں چھوڑ کے اندر گیا ہوگا۔ اکیلا موٹر سائیکل سوار ہر نظر اس کی طرف اٹھتی۔ ٹیکسی ڈرائیور کی وردی پہنا وہ سب کے ساتھ ہوتے بھی سب کی نظروں سے اوجھل رہا اور پھر دوست محمد کو دیکھا۔ اس نے اتفاق سے دوست محمد کو دیکھ لیا جو اسی علاقے میں رہتا ہے اور پیغام اُسے دوست محمد نے ہی دیا۔"
"اس مفروضے کے درست ہونے کے امکانات اٹھتر اعشاریہ پانچ فیصد ہیں۔" محسن نے کہا۔
"اور میں ہوں ایک سو اعشاریہ دو فیصد۔" غالب نے کہا۔
"ثابت کرو۔" محسن نے اسے گھور کے کہا۔ "میں نے تو حساب کر کے بتایا تھا۔"
"پہلے تم ثابت کرو کہ تم نے حساب لگا کے بتایا تھا۔" محسن کی نقل نہایت اشتعال انگیز پیرائے میں اتاری۔ "تم کیا اندازہ کرو، مجھے یہ معلوم نہیں کہ کون کون بیچ ہوتے ہیں اور فیصد۔"
"تمہیں معلوم ہے اپنا حساب۔ یہ تم حساب جیب جیب جاتے ہو۔ پڑیں گے، غائب یا لاتے ہو، اچھی کا دودھ۔"
"میں نے سات دن سے دودھ پینا شروع کیا تھا۔"
"پہلے چھ دن تک کیا تمہیں کا پانی پلایا گیا تھا؟" محسن بولا۔ "ابھی مزاج میں گرمی ہے اور بچے کی طرح بڑ بڑانے کی عادت ہے۔"
"اُف۔ بس کرو دونوں۔" ناز نے چڑ کے کہا۔ "کیا شور کرتے ہو خواہ مخواہ۔"
"سوری میڈم۔" غالب نے دانت نکال کے کہا۔ "ہم تو اب بھی نہیں ہیں۔ کیوں شیروانی صاحب؟"
"ہمارا شادی والا بڑا ہی ہے۔ ہم تو کب سے چپ بیٹھے ہیں۔ اب خاتون کے کان بج رہے ہیں۔" محسن نے بھی کہا۔
میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں جا رہا ہوں۔"
"اچھا بھیا۔ ہمارا تمہارا بس اتنا ہی ساتھ تھا۔" محسن نے گھور کے اٹھا دیکھ کہا۔ "خیر سے سدھارو۔"
"ہمارا تو ایک دن سب کو ہے۔" غالب نے آہ بھری۔
"اور وہ آج ہی کا دن ہے۔" میں نے دہاڑ کے کہا۔ "ہم سب جا رہے ہیں۔ آلا وہ اسی وقت۔ جو کچھ ادھر ہے اٹھاؤ۔"
"یس باس۔" محسن اٹھ کھڑا ہوا۔
غالب نے مجھے سیلوٹ کیا۔ "یس سر۔ آپ حکم کریں۔"
"حکم یہ ہے کہ اپنا ٹرک یہاں لاؤ۔" میں نے کہا۔ "اپنا بھی

چلو اب گھر چلیں۔ گھر کا باقی سامان ناز، سامان۔"
"کیا مطلب۔ یہاں سے بھی کوچ؟" ناز بولی۔
"ہاں۔ مجھے یہ جگہ اب بہت غیر محفوظ لگتی ہے۔ کیونکہ شکاری یہاں تک آ چکے تھے۔ وہ دوبارہ بھی آ سکتے ہیں۔"
"مگر۔ بیچارہ موتی آئے تو؟"
"ہم ان کے لیے پیغام چھوڑ جائیں گے۔ جیسے وہ ہمارے لیے چھوڑ گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "جب تک ان سے ہمارا رابطہ نہیں ہو جاتا۔ ہم میں سے کوئی رات گئے اور یہاں بھی آ سکتا ہے۔ وہ آج ملے تو کل ملیں گے۔"
"پیغام کس کے پاس چھوڑ دو گے۔ خالہ تو پہلے ہی شک میں مبتلا ہیں۔"
"پیغام براہ راست ملے گا۔" میں نے کہا۔ "تم چلنے کی تیاری کرو۔ ہم گودام دیکھنے جائیں گے پھر ٹرک کو فروخت کر لیں گے اور جا کے دیکھیں گے کہ کس حال میں ہے۔ اس کی گنتی تو اسی لیے بندرگاہ پہنچ جائیں گے اور دوست محمد کو تلاش کریں گے۔"
"اور اگر منظور ہوا تو فوراً پکڑے جائیں گے۔ کیونکہ ہماری شکلیں ہمارے دوستوں سے زیادہ دشمن پہچانتے ہیں۔" محسن بولا۔
"ہم یہاں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے نہیں رہ سکتے۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو ریب الضامن کے بارے میں بھی معلوم کرنا ہے کہ کیا اس کے کہا وہ کا وہ بولنے کی تجزیہ درست ہے اور اس میں کس حد تک صداقت ہے کہ چیکل اور جوڑی میں ہی مار جاتے ہیں... سلطان محمد خان کے علاوہ چیلا زمین پر سب قبول نہیں کرتا؟"
"ہم نے کب سے اخبار بھی تو نہیں اور دیکھا۔" محسن بولا۔
"اب دیکھ لیں گے لیکن پہلے یہاں سے نکلو۔ مشرقی پاکستان کے حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ کل رات ہم نے ایک جگہ لوگوں کی ساتھ تھا۔ ان نے خاصی تشویش ناک خبریں سنائی تھیں۔"
"بلا بلا ہی تو ہم نے بھی سنا تھا۔" غالب نے کہا۔
"لوگ بہت زیادہ سنتے تھے ہیں بی بی سی کی خبریں اور وہاں کا اردو بلند ترم۔" محسن بولا۔ "نہ وہ پہچنے ہر جگہ زیادہ اور پانی کی دکان پر بھی نظر آتا ہے، خبریں سننے والوں کا۔"
"اصل بات یہ ہے کہ لوگ سچ جاننا چاہتے ہیں اور اپنے ملکی ذرائع ابلاغ بہت حقیقت پسند، سرکاری پریس نوٹ سنا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ان حالات میں بی بی سی کی رپورٹ ہی مستند اور صحیح خبروں کی ذریعہ بن گئی ہے۔"
"ریڈیو پاکستان کے اور ٹی وی کے تبصرے پبلک کے لیے مذاق اخبار ہو گئے ہیں۔ کیا یہ بات وہ نہیں جانتے جو خبریں گھڑتے ہیں اور سنتے ہیں؟"
"سب جانتے ہیں لیکن وہ کیا کریں، وہ حکم کے غلام ہیں۔" میں نے کہا۔ "انھیں نوکری کرنی ہے۔"
"یہ سب حماقت ہی تو ہے۔ اب جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہو رہا ہے، اس پر کوئی کیسے حقائق کا پردہ ڈالا جا سکتا ہے؟" غالب بولا۔ "حقیقی خونریزی ہو رہی ہے۔ تعصب کے جذبات جس طرح بھڑکائے جا رہے ہیں اور بیرونی مداخلت سے جس طرح علیحدگی پسندی کے رجحانات کو ہوا دی جا رہی ہے، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ بھئی آپ نہیں بتائیں گے تو دنیا بتائے گی۔ ٹی وی پر تو مجبوری ہے کہ کسی دوسرے اسٹیشن کے پروگرام نہیں دیکھے جا سکتے۔"
"لاہور اور مضافات میں تو امرتسر دور درشن بہتا کام کر رہا ہے۔"
"وہ ایک محدود سے ہے، پر رائے عامہ کو بالکل مخالف سمت میں گمراہ کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر ریڈیو پر تو کچھ بھی سوئی گھما کے سب سن لیتا ہے۔ وائس آف امریکا، بی بی سی، ریڈیو جرمنی اور ان کے علاوہ ماسکو سب کے اسٹیشن ایک وقت میں ٹرانسمیٹر ہیں کہ یہاں کی نشریات تو ملک کے اندر بھی موصول نہیں ہوتیں، وہ دنیا بھر میں صاف سنائی دیتے ہیں۔ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ سب جھوٹے ہیں، غلط بیانی کرتے ہیں؟"
"یہ اسی کا منفی رد عمل ہے کہ اب عوام ان سے جھوٹ کو بھی سچ مان بیٹھے ہیں مگر اپنے سچ کو بھی سچ نہیں تسلیم کرتے۔"
باتیں کرتے ہوئے ہم سامان بھی لا کے دروازے کے قریب جمع کر رہے تھے۔ جب ضروری سامان آ گیا تو محسن ٹرک لینے چلا گیا۔ ناز خاصی مایوس، بیزار اور خفا تھی۔
"وہ بھی تو آئیں گے یہاں۔ پھر کیا اور جن؟" وہ بولی۔
"آئیں گے تو آنے دو۔" میں نے کہا۔ "خالہ کے پاس پیغام چھوڑ جائیں۔ ابھی فرصت سے ملنی ہوں گے ہم ملی لیں گے لیکن مس ناز لی بیگم بہتر ہوگا کہ تم رابعہ کا نام ادم آرائیں کے رجسٹر سے کاٹ دو۔ وہ تو بھی تو صرف معذرت کرنے آئے گا، وہ اب ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔ اس نے دوسرے روگ پال لیے ہیں۔"
"شادی کرنا روگ پالنا ہوتا ہے؟"
"اس سے کون انکار کر سکتا ہے آج تک۔ تم دیکھ لو کہ صرف محسن نے شادی کی غرض سے بیوی کو چھوڑ کر اپنا بیوی ایک ذلیل مالیاتی جال ہے اور رشتوں کی یہ زنجیر آدمی کو باندھ دیتی ہے۔ یہ شخص محسن کیا سمجھا کہ دل پھر کر لے اور ہر لڑکی شہلا نہیں ہوتی کہ یوں گزارا کر لے۔ پھر بھی اتنا فرق تو پڑ ہی گیا ہے کہ اب شہلا ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ شادی سے پہلے وہ بہت ایڈونچر تھی۔ جولی کو دیکھو، شادی کر کے اسے کیا ملا؟"
"آپ کا مطلب ہے کہ..."

www.paksociety.com

"نہیں، منگنی میں مست آؤ، شادی تو فرض ہے مگر اس فرض کے بعد جس سے ہم ابھی سبکدوش نہیں ہوئے۔" میں نے نازو کی بات کاٹ دی۔ "اصولی طور پر ایک بات مطلب ہے کہ ہم سب کو اس کام سے غرض ہے کہ اپنا اپنا گھر بسانے کے سوا کچھ نہیں کرنا ہے لیکن ایسا مت کرنا کہ کسی دن غالب بیچ جائے اور پکڑے گئے تو رہے جاؤ اور کر لو سول میرج۔"

نازو کا چہرہ غصے سے لال پڑ گیا۔ "میرا تو دماغ خراب نہیں ہے۔"

"پھر کتنا ہے؟" غالب نے اسے چھیڑا۔

"اور خراب تو وہ چیز ہوگی جو استعمال ہو۔" میں نے کہا۔

"جو چیز اپنے پاس ہی نہ ہو وہ استعمال بھی کیسے ہوگی؟" غالب نے مزید اشتعال انگیزی کی۔

نازو بہت جھنجھلائی اور کچھ کہنے والی تھی کہ ایک آواز آئی جیسے ٹیکسی پاس کھڑی ہو۔ یہ بات برداشت سے باہر تھی۔ نہیں، اسے سمجھانا ضروری تھا بعد میں رنگ (ROGUE یعنی بدمعاش) سوسائٹی ہے۔ "اس کے بعد اس کی آواز سنائی دی۔" غالب بہت خوش تھا کہ گزشتہ شام کی سب کوفت دور ہو گئی۔

جب ترک مدرسے سے ہٹ گیا اور ہم نے تمام اسباب رکھ دیا تو وہ باہر نکل اور آگے بیٹھنے ہی والی تھی کہ سامنے سے خالہ نے اسے آواز دے دی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ گلی محلے کی ہر وقت نگرانی کرنے والی خالہ کو ہماری نقل مکانی کی خبر نہ ہوتی۔ میں نے اتنی دیر میں صورت حال کا تعین کیا اور ایک کوئلے سے باہر کی دیوار کے صاف رنگ پر موٹے حروف میں لکھا۔ "۱۲، ۱۱ پی ایم، کے ٹو"

اگر چہ یہ پیغام ابہام سے مکمل طور پر واضح تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اکرام شیخ اس کو دیکھے تو صحیح مطلب نکال لے گا۔ باقی لوگوں کے لیے جو یہاں سے گزرتے ہوئے اسے دیکھیں گے یہ ایک بے معنی تحریر ہوگی۔ کسی بچے کی شرارت جو صرف دیوار کے صاف رنگ کو خراب کرنا چاہتا تھا۔

"یہ اچانک کوچ کا حکم صادر فرما دیا آپ نے۔" محسن بولا۔ "تو کچھ یہ بھی سوچا کہ اب کہاں بسیرا ہوگا؟"

"یہ سوچنے کے لیے دن پڑا ہے ابھی۔" میں نے کہا۔

"خوب کرکے سوچا پہلے شخصوں تک محدود تھا۔ اب ہم بھی ان میں شامل ہیں کہ پہلے تو سامان اٹھایا بعد میں سوچیں گے کہ کہاں جانا ہے۔ آخر ایسی کیا جلدی تھی؟"

"یار پہلے محسن خالہ کی خبر رسانی وغیرہ!" میں نے کہا۔ "یہی تو فضیحتی جس سے بچنا۔ کچھ اس کا اندازہ تھا کہ اب چلو۔ حیرت ہے کہ تیری سماعت جس سوئی تری ہے دروازہ کھولنے والوں کی ایک ہی آواز ہوتی ہے۔"

"اسی لیے تو میں اب تک خاموش تھا۔" محسن نے نازو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کچھ میرے سیرے لاتیں بھی ہلنے لگی تھیں!"

"لیکن ہم ایسے تو نہیں بچ سکتے تھا۔ دل دہل سے۔" کچھ کرتے ہیں ابھی۔" میں نے اسٹیئرنگ سے پا ہٹا کر ساتھی سے کہا۔ "جیسے بدل لیتے ہیں۔ مگر یہ علاقہ اتنی بھی پاس نہیں ہے۔" محسن بولا۔ "شیطان کا نام خالہ کی جس کی زندگی ہے۔" "ٹرک بھی اچھا خاصا چلتا پھرتا کمرا ہوتا ہے۔" غالب نے مجھے مطلع کیا۔

"اچھا!" محسن نے کہا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"ہمارے افراد اس کی عملی شان کے سو سکتے ہیں۔"

"اچھا!" محسن نے پھر حیرت کا اظہار کیا۔ "اور اس وقت جب ٹرک چلا۔ ہم وہاں ساکت ہو!"

غالب نے پھر اسے نظر انداز کر دیا۔ "ایک رات تو ہم اس میں بھی گزار سکتے ہیں۔"

"اچھا! کون سی رات؟"

"وہ کیا کہتے ہیں عقل مندوں نے کہ جواب جاہلاں باشد خموشی۔" غالب نے اس پسندی کا مظاہرہ جاری رکھا۔

"اچھا! پھر تم کہو کیا کہنے چلے جا رہے ہو۔" آخر پھر بولا۔ "میں خاموش ہوں۔" ایک لفظ بھی نکلا میری زبان سے؟" محسن بولا۔ "مگر اس کی شرارت آمیزی کا رخ کہیں غالب کی طرف لڑنے کے موڈ میں تھا۔"

"خدا تو فیض بیمے عورتوں کو اختصار کے ساتھ گفتگو کی۔" میں نے بیزار ہو کے کہا۔ "خالہ بیچاری دونوں ایسے الجھانے والے گفتگو کر رہی ہیں جیسے سب خیریت ہے اور فراغت ہی فراغت ہے۔"

"کیا خیال ہے؟ کان سے پکڑ کے لاؤں؟" محسن بولا۔

"کسے؟ خالہ کو؟" غالب نے کہا۔

"نہیں، شیطان کی خالہ کو!" محسن بولا۔

"یار مرد ہو تو جاؤ اور اسے کان پکڑ کے لے آؤ۔" غالب نے چیلنج کیا۔

"اگر لے آیا تو؟"

"ساتھ لکیریں نکالوں گا ناک سے فرش پر، وہ بھی سب کے سامنے۔" غالب نے کہا۔ "ہو گئی شرط۔"

"ہو گئی۔" محسن نے ہاتھ ملایا اور چل پڑا۔ "شاباش گوآسی۔"

"مارا گیا سالا۔ اس سے آسان کام تو جنگل کے شیر کو کان سے پکڑ کے لانا تھا۔" غالب بولا۔

لیکن میں محسن کو غالب سے زیادہ جانتا تھا۔ میرا خیال تھا وہ شرط جیت جائے گا۔ میں نے سوچا کہ محسن کی جگہ میں ہوتا تو کرتا اور پھر میں نے جو دیکھا وہ کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔

"ابھی آئے گا کو کرا ہنسا ہوا کہ پہلا شخص ہوئے۔ وہ تو شکے رکھ دے گی۔" غالب نے خود کو تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "لیکن باتوں کے انداز نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ خود بھی... لیکن اس کا دل... محسن نے ملی شرط کیسے نکالی جب کہ وہ نازو کو اچھی طرح جانتا ہے؟"

قریب پہنچ کے محسن نے تقریباً ایک منٹ تو خالہ سے بات کی۔ پھر اچانک نازو کا بایاں کان پکڑ لیا اور دیکھتے ہوئے آ گیا۔ جیسے شریر بچے کو سمت کی طرف کسی بیٹھی شرارت پر گرفتار کر کے لیتے ہیں۔ غالب کی حالت غیر ہو گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"مرزا تمہارے چاقو۔" میں نے قہقہہ لگا۔ "ناک گھسنے کے لیے؟"

"یار یہ سب سازش ہے میرے خلاف!" غالب نے بزدلی سے کہا۔ "دونوں مل گئے تھے۔ یہ سب جانتی ہے!"

"محسن نے وہ کر دکھایا جو کہا تھا!" مجھے اس کی صورت دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی۔ "مرزا جی! شرط لگانے سے پہلے سوچنا چاہیے۔ اب تمہاری عزت وہ جائے گی جب اسی کے سامنے زمین پر ناک رگڑو گے۔ ہم سب کل کو ہماری خدا بنو گے۔"

"شرط میں یہ نہیں تھا!" غالب نے جھنجھلا کے کہا۔

تاہم رہے وہ لوگوں والا نکتہ غالب نے اچھا نکالا تھا جب محسن نے قریب آ کے کہا۔ "چل بیٹا اٹھ، مرزا غالب کے بچے۔"

"ٹھیک ہے تم شرط جیت گئے۔" مرزا غالب نے سکون سے کہا۔ "مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ... وہ سب ابھی ہوگا۔"

"پھر کب ہوگا؟" محسن نے چلا کے کہا۔ "بے ایمان!"

"بے ایمان نہیں، کیونکہ وقت اور مقام کی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔" غالب نے اپنی عزت بچانے کا مسئلہ حل کر لیا تھا۔

"سکندر! اس کی بدمعاشی دیکھی؟"

"تم خدا کی قسم کھا کے کہو کیا بات ہوئی تھی؟" غالب نے فاتحانہ انداز میں مسکرا کے نازو کی طرف دیکھا۔ "یعنی ہم لکیریں نکالیں گے ناک سے۔ یہ تو ہم نے یہ اب وہی جگہ کی بات تو وہ ہم آپس میں طے کر سکتے تھے۔ یہ کام کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں ہو سکتا ہے جہاں وال ٹو وال کارپٹ ہو۔"

"بات نہیں ہوئی تھی؟"

"چلو ابھی سہی۔ اب وہ وقت تو میری فرصت پر منحصر ہے۔ جب مجھے فرصت ہوگی اور تمہیں آرام ہوگا، اس وقت سے مطلع کر دوں گا۔ تم آرام کرو۔"

"تم کر سکتے ہو یہ بے ایمانی اور پھر کہتے ہو۔" نازو نے اپنی سازش کا اثر کرتے کوئی فائدہ نہ ہوتے دیکھ کر کہا۔

"تم چپ کر دو جی۔ چھان بولے سو بولے، چھلنی کیا بولے جس میں بہتر سو چھید۔" غالب اب بہت خوش تھا کہ اس نے دونوں کی بدمعاشوں کو خاک میں ملا دیا۔ اب محسن کی نازو سے لڑائی شروع ہو جاتی مگر اسی وقت ایک ٹیکسی کمودار ہوئی۔ ٹیکسی ہمارے پاس آ کے رک گئی... حسب توقع اس میں شیخ اور مولوی تھے۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم مل گئے۔" شیخ نے کہا۔ "کہاں جا رہے تھے؟"

"جہاں سینگ سمائیں۔ مگر تم...؟"

"ہمیں چھوڑ کے جا رہے تھے؟ وہ بڑے کے بغیر۔"

"وہ تمہارے لیے پیغام!" میں نے کہا۔

"اچھا۔ بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تو یہ ہے کہ تم بہت ہی اچھا ہوا کہ تم مل گئے۔ ورنہ بالکل تعیب اور مدد کچھ وقت تو تیاری میں لگ جاتا۔" شیخ نے کہا۔

"لیکن جانا کہاں ہے؟" میں نے اسے روکا۔

"تم لوگ جاؤ ورنہ پیچھے کے جہاد گاہ کی طرف آ جاؤ!"

"اور تم کہاں جا رہے ہو؟"

"وہ لوگ گودام سے مال لے کر روانہ ہو چکے ہیں۔ کل رات ہی انہوں نے گودام خالی کر دیا تھا۔ ہم بھی ادھر ہی جا رہے ہیں۔"

"یہ سب تمہیں کس نے بتایا؟ رابطے نے؟" محسن نے پوچھا۔

"رابطہ بالکل تمہیں!" میں نے کہا۔

"نہیں، وہ تو نہیں ملی مگر اس کا ایک نمبر مل گیا تھا۔ اب یہاں سے نکلو پہلے۔ پھر سب بتا دوں گا۔" شیخ نے ٹیکسی کا دروازہ بند کیا اور روانہ ہو گیا۔ میں نے بھی ٹرک کو اسٹارٹ کیا۔ نازو میرے ساتھ بیٹھی۔ غالب اور محسن دونوں کے پیچھے جتنے میں سوار ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ خالہ صفت مشکوک نظروں سے ہمیں گھور رہی تھیں اور ان کا شک میں مبتلا ہو جانا جائز تھا۔ ہم جس طرح آئے تھے، عجیب انداز سے رہے تھے اور اب بھی عجلت میں جا رہے تھے وہ کسی طرح سے بھی سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ شرفا کے محلے میں شرفا یوں نہیں رہتے اور اس طرح "بی بجو" کرتے ہیں۔

غنیمت یہ تھا کہ ابھی تک ہم صرف خالہ کی نظروں میں مشتبہ ٹھہرے تھے۔ البتہ خالہ کو کچھ معلوم نہیں ہوا تھا اور آس پاس کے رہنے والوں نے بھی کچھ نہیں دیکھا تھا۔ چند دنوں میں کسی کو بھی ہمارے بارے میں کچھ معلوم ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ یہ غریب آباد علاقہ تھا اور یہاں کے رہنے والے سب ہی اپنے معروف تھے کہ صبح کے گئے رات کو لوٹتے تھے۔ اس لیے ہم محفوظ بھی رہے تب بھی جس شرط پہ ہنا تھا وہ منظر دیکھنے والا کوئی نہیں تھا سوائے ہمارے اور خالہ کے کسی اور جگہ یہ ممکن تھا کہ محسن اسے گھٹنوں کان سے پکڑ لاتا۔

تقریباً دو میل کے بعد ایک جگہ ایسی آئی جہاں شیخ نے ٹیکسی کو سائیڈ میں روک لیا۔ میں نے ٹرک کو اس کے پیچھے کھڑا کیا اور ہم سب اتر کر ٹیکسی میں گھس گئے۔ میں نے نازو کو مولوی کے ساتھ بٹھاتے ہوئے

www.paksociety.com

دیکھا اُس کے پیچے مونی کو جگہ خالی پڑی اور کھسک کر شیخ کی طرف جانا پڑا۔ وہ پیچھے مڑ کے کچھ بتانا چاہتا تھا چنانچہ وہ مونی کے اتنے قریب آجانے سے کچھ خفیف ہوا۔ وہ تقریباً ایک جان دو قالب ہو رہے تھے اور شیخ کو شرم آ رہی تھی کہ مونی کو بالکل شرم نہیں آ رہی تھی۔ وہ تو مجھے خاصی خوش لگی اور میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو مجھے وہ شعر یاد آیا۔ تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ۔ شیخ کو بھی خیال تھا کہ بس، ساتھ ہے چنانچہ وہ نیچے اُتر گیا۔

”کیا سب کا گھسنا ضروری تھا، ٹیکسی میں چار آدمی بیٹھتے ہیں۔“ وہ بولا اور پچھلی سیٹ پہ آ کے ساتھ گھس گیا۔

”ہو جن تجھے گنا ری آئی رات دے۔“ محسن نے اونچی بے سُری آواز میں گانا شروع کر دیا۔

میں نے اس کی پسلی میں کہنی ماری۔ ”بند کرو اپنا ریڈیو اسٹیشن۔“

”رابعہ کا پیغام مجھے دوست محمد نے دیا تھا۔“ شیخ نے خفت سے بچنے کے لیے فوراً بات شروع کر دی۔ ”ہم لوگ بست کے علاقے میں پھر رہے تھے۔“

”ہم گشت کر رہے تھے۔“ محسن بولا۔ ”ہم مستی کر رہے تھے۔“

”جھک مار رہے تھے۔“ شیخ بولا۔ ”پھر تمہیں کیا ہوا؟“

”آگے پولو، وہاں دوست محمد مل گیا۔“ میں نے کہا۔ ”پھر اس نے کیا کہا؟“

”اس نے کہا کہ تم لوگ کدھر ہے۔ ہم دو دن سے تم کو ڈھونڈتا پڑا ہے۔“ شیخ بولا۔ ”پھر اس نے رابعہ کا پیغام دیا۔ میں واپس آیا تو یہاں تم تھے ہی نہیں۔ سب جھک مارنے گئے ہوئے تھے۔“

”کیا پیغام میرے لیے تھا؟“

”اور کس کے لیے ہو سکتا تھا۔“ شیخ بولا۔ ”میں کہاں جاتا تم کو تلاش کرنے کے لیے۔ رات بارہ بجے کا وقت تھا ملاقات کے لیے۔“

”کہاں ملنے کے لیے کہا تھا اس نے؟“

”دوست محمد نے کہا تھا کہ وہ لے جائے گا۔“ شیخ بولا۔ ”اور ہم اس کی لانچ پر گئے تھے بہت چھوٹی سی لانچ تھی اور اسے وہ خود چلا رہا تھا۔ ہم منوڑہ کی طرف گئے تھے معلوم نہیں ساحل پر وہ کون سی جگہ تھی۔ لائٹ ہاؤس وہاں سے کافی دور تھا۔ وہاں ایک اور لانچ نے قریب آ کے سگنل دیا، پھر وہ چھوٹی سی لانچ ساتھ آ کے رکی اور ہم اتر کے اس میں گئے۔ مجھے تمہارے نہ ملنے کا بہت افسوس تھا مگر جب مجھے پتا چلا کہ رابعہ نہیں آ سکی۔“

”کیوں نہیں آ سکی؟“

”میں نے پوچھا تھا مگر دوسری لانچ لے کر آنے والے نے کہا کہ ہم کو بھی نہیں معلوم۔ مجھے رقعہ پہنچانے کے لیے دیا گیا تھا۔“ شیخ نے جیب سے ... کاغذ نکالا اسے مجھ سے پہلے نازو نے جھپٹ لیا۔ پھر محسن نے ... غصہ میں آ گئی۔

تحریر اسی کی تھی لیکن اس میں میرے لیے کچھ نہیں لکھا تھا۔ چند سطروں میں رابعہ نے خود ہی اطلاع دی تھی جو شیخ کے ذریعے مجھے پہنچی تھی۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ رابعہ نے اپنی خیریت کے بارے میں بھی کچھ نہیں لکھا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے اور اگر وہ نہیں آ سکتی تھی تو اس کا سبب کیا تھا۔ اس نے میرے نام اپنا سلام تک نہیں لکھا تھا۔

”تم نے اس رقعہ لانے والے شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا؟“ محسن نے پوچھا۔

”یہی بات تو ہے کہ صورت دیکھی ہوئی لگتی تھی مگر مجھے ابھی تک یاد نہیں آیا کہ کہاں اور کب دیکھی تھی۔“ شیخ نے کہا۔ ”اب تم لوگ اور سینے سے لگائے پھرو۔“

”لیکن اس ٹرک کا ہم کیا کریں؟“

”اسے رکھو۔ سنبھال کے جیب میں۔“ شیخ نے جھٹکے کہا۔ ”اور ٹرک کا نہیں پتا ہے۔“

”ٹرک تو ہو سکتا ہے۔“ غالب نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”تم خود فیصلہ کر لیں گے کہ کیا ساتھ رکھنا ہے اور کیا نہیں۔“

”یار یہ دوست محمد کا کردار عجیب پُراسرار سا نہیں ہے۔ یہ ایک طرف چاند بھائی جیسے خطرناک آدمی کا معتمد خاص ہے تو دوسری طرف رابعہ سے بھی رابطہ رکھتا ہے تو دوسری طرف وہ ہمارا بھی خیر خواہ ہے۔“

”تم نے کیسے جانا کہ چاند بھائی خطرناک آدمی ہے؟“ غالب نے سوال کیا۔ ”کم سے کم ہمارے لیے۔“

”کیا تم اسے شریف آدمی قرار دو گے؟“

”شریف آدمی کیا ہوتا ہے۔ کون کتنا شریف ہے۔ کم یا زیادہ، شرافت کا معیار کیا ہے۔ یہ سب جھگڑے والی باتیں ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کیا چاند بھائی سے ہمیں کوئی نقصان ہوا؟“

”کیا یہ کم ہے کہ اس نے رابعہ کو قید کر رکھا ہے؟“ میں نے غصے سے کہا۔

”کیا یہ قید ہے؟ جس میں وہ آزادانہ گفتگو کر رہی ہے تم سے اور تمہیں پیغامات ارسال کر رہی ہے؟“

”وہ آزاد ہوتی تو اس جیب سے کے ساتھ رہتی؟ یہ اس کی مجبوری اس کی اسیری کا ثبوت ہے۔“ میں نے کہا۔

”ابھی تک رابعہ نے اقرار نہیں کیا ہے کہ وہ کیوں قید ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”اس نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ خیریت سے ہے اور فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک بار اس نے یہ کہا تھا کہ اسے بے حد تکلیف دہ تھا لیکن بعد میں اس نے اشارے سے یہ وضاحت کر دی تھی کہ وہ ٹھیک نہیں تھا۔“

”مگر اس نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ وہ مجبور تھا۔“

”اس کے کہنے کی بات کرتے ہو۔ تمہارا دل کیا کہتا ہے؟“

”کیا پتا۔ بیا ہوا لڑکی ہے! وہ ہم نے ہم سب سے تاپنا ہے؟“

”تم لوگ ہی بھی ... جی بھر کے تعین کرتے رہنا۔“ شیخ نے ٹیکسی سے اترتے ہوئے جھٹکا۔

”پیچھا!“ نازو نے چلتے چلتے پلٹ کر لب کھولے۔ ”تم نے رابعہ کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا؟“

”وہ ... ٹھیک ہے۔ وہ خیریت سے نہیں تھا۔ کہاں ہے وہ؟“

”اپنی پرتی کے پاس۔ اگلے ماہ اس کی شادی ہو گئی۔“

شیخ چونک گیا۔ پہلے اس نے بے یقینی سے دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ مذاق کر رہی ہے مگر ہم سب کے چہروں کا ایک سا تاثر دیکھ کے اسے یقین آ گیا۔ ”یہ کب ہوا؟ تم لوگ کہاں گئے تھے؟“

”ہمیں بھی پتا نہیں۔ آج ہی ... کے خط سے پتا چلا۔“ نازو نے کہا۔ ”یہ ساتھ لے جاؤ اور راستے میں پڑھ لینا۔ سب معلوم ہو جائے گا۔“

ڈرائیور افسوس ناک لہجے میں ”کیا؟“ اس نے لفافہ لے لیا۔

”صرف آئی کو بتانے بلا کے ساتھ چھوڑ دیا۔“ نازو نے تلخی سے ہنستے ہوئے کہا۔

شیخ نے اسے ملامتی نظروں سے دیکھا۔ ”میں گاڑی چلاتا ہوں تم پڑھ کے سناؤ۔ ایسی کیا بات ہے۔“

جب ٹیکسی چلی گئی تو ہم بھی ٹرک کی طرف لوٹے اور روانگی سے پہلے ایک ہنگامی نوعیت کی کانفرنس کی جس میں بہت سے مسائل زیر غور آئے۔ بیشتر مسائل کا حل ہمارے پاس نہیں تھا۔ یہ فیصلہ وقت ہی کرتا کہ مستقبل میں ہمارا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔ پھر بھی ہم نے کچھ ضروری فیصلے کیے اور روانہ ہو گئے۔

لانچ کو آخری بار ہم نے کورنگی کریک سے کافی آگے ساحل چٹانوں کے درمیان رکھا تھا اور وہ مقام سمندری راستے کے وقت طے کیا تھا۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے ہماری یادداشت نے ہماری بہت سی نشانیاں سنگ میل بن گئیں۔ البتہ آخری حصے میں جہاں چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا صحیح سمت اور جگہ کا تعین کرنے میں ہمیں تھوڑی پریشانی ہوئی مگر اس کا حل یہ تھا کہ ٹرک کو ایک ٹیلے کی اوٹ میں کھڑا کر دیا جاتا۔ یہاں سے صرف پیدل کا راستہ ہی رکھا جا سکتا تھا۔

”تم اور محسن اب پیدل جا کے کسی بلند مقام سے دیکھتے ہیں کہ لانچ کہاں چھپی ہے۔“ میں نے کہا۔

”خالی ہاتھ مت جانا۔“ محسن نے کہا۔ ”کیونکہ وہ بات بالکل سچ ہے کہ سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔“

”کیوں بڑی بہت محنت سے نکالتے ہو۔“ نازو نے اسے ڈانٹا۔

”اُف! سکندر اعظم تھا۔ بہت پرانی بات ہے۔“ محسن بولا۔ ”لیکن کیا ان کا کوئی سکندر ہے اور یہ پرانی بات غلط نہیں ہو جاتی ہے؟“

دکھائے۔ ان میں سے ایک میں نے اندر چھپا لیا۔

”تم آگے چلو۔“ محسن نے کہا۔ ”میں پیچھے رہ کے تم پر نظر رکھتا ہوں۔“

”ہاں کوئی گڑبڑ ہوئی تو پہلے مجھے لگے گی۔“ میں نے کہا۔ ”آپ آگے ہوں شہزادی صاحب۔“

”دیکھیے، بندہ ایک شادی شدہ شوہر ہے۔ ایک عدد منکوحہ اور ایک عدد اولاد نرینہ رکھتا ہے۔“ محسن بولا۔

”جو تجھے مارتا ہے۔“ غالب نے پیچھے سے کہا۔

”تُو نے زندگی میں سب کچھ کر لیا۔ تیرا بھی کیا ہے۔“ میں نے محسن کو آگے دھکیلا۔

”اچھی زبردستی ہے کہ پہلے میں شہادت پاؤں۔“ وہ بولا اور آگے چل پڑا۔

”تم دونوں بھی کام کرنا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مت بیٹھے رہنا۔“ میں نے چلتے چلتے ہدایت کی کیونکہ واقعی آنکھیں چار کرنے میں مصروف تھے لیکن میری بات کا انھوں نے جانتے بوجھتے کوئی نوٹس نہیں لیا اور یوں دیکھتے رہے ایک دوسرے کو جیسے کسی فلم کے سین کی شوٹنگ میں مصروف ہوں جس میں ہیرو اور ہیروئن کی پہلی ملاقات کا منظر پیش کیا جا رہا ہو۔

ایک چٹان پر چڑھتے ہوئے جو ہمارے خیال میں واقع طور کا کام دے سکتی تھی محسن نے خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا مگر پھر ایک کونا اس کے وزن سے ٹوٹ گیا۔ اگرچہ اس نے اسے سنبھالا مگر نازو دیا پہنچا جہاں سے ہم چلے تھے اور اس کی ہڈی پسلی سلامت تھی۔ باقی راستہ ہم نے ساتھ طے کیا۔

اوپر پہنچنے کے بعد میں نے دونوں جانب نگاہ کی۔ ”یار، یہ تو خاصی گڑبڑ ہو گئی۔“

”ہاں۔ دونوں میں شرم و حیا نہیں رہی۔“ محسن بولا۔ ”اچھا موقع ملا ہے اور وہ بھی پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“ میں نے محسن کا سر پکڑ کر گھمایا کیونکہ وہ نیچے غالب اور نازو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”کبھی تمہاری اچھی سوچ کا سایہ ... میں مشرق کی بات کر رہا ہوں اور تم مغرب کی طرف دیکھ رہے ہو۔“

”مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔“ محسن نے آہ بھر کے کہا۔

نازو اور غالب کچھ بھی نہیں کر رہے تھے سوائے اس کے کہ نازو ٹرک کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور غالب ہاتھ باندھے کھڑا ہوا تھا اور اس سے نہ جانے کیا بات کر رہا تھا کہ وہ ہنس رہی تھی۔ یہ بھی ایک خوب صورت منظر تھا۔ اس کی طرح جو ہماری نظروں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ تاحدِ نگاہ سمندر موجزن تھا اور اس پر اجلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ دور کہیں

www.paksociety.com

کی نمی کے باعث ہمارے جسموں پر پسینے کے دھارے بہنے لگے تھے۔
"ارے یار۔ وہ ادھر دور کیا ہے۔" محسن نے اچانک کہا۔ میں نے اس کی انگلی کے اشارے سے سمت کا تعین کیا۔ "کیا ہے؟"
"یہاں میری جگہ آکے دیکھو۔"
میں نے محسن کی جگہ کھڑے ہو کے دیکھا تو مجھے بھی ایک چمک سی دکھائی دی۔ سورج کی روشنی کسی چمکیلی سطح سے منعکس ہو کر میری آنکھوں تک پہنچی تھی۔ یہ چمک ایک خاص زاویے سے ہی محسوس ہوتی تھی۔ تین فٹ کے فاصلے پر جہاں میں پہلے کھڑا ہوا تھا وہاں سے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ یہ چمک بھی رک رک کے وقفے سے نظر آتی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ روشنی کو منعکس کرنے والی سطح متحرک ہے۔
"یہ ہماری لانچ ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کا ایک ابھر کر نکلا ہوا کونا چمک رہا ہے۔"
"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ باقی لانچ چٹان کی اوٹ میں ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہمارا اندازہ زیادہ غلط نہیں ہوا۔"
"اندازاً بس دو میل کا فرق پڑا۔"
"دو میل؟" محسن بولا۔ "یہ دو فرلانگ کا فاصلہ ہوگا۔"
"ابھی پتا چل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "پہاڑی علاقوں میں اور صحرا میں فاصلے اسی طرح دھوکا دیتے ہیں۔"
فاصلے کی پیمائش تو ممکن ہی نہ تھی مگر جب ہم لانچ تک پہنچے تو ہماری حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے ہم نے دس میل کا سفر کیا ہو۔ اس کی ایک وجہ تو راستے کی ناہمواری تھی۔ دوسری وجہ دھوپ اور فضا میں سو فیصد سے بھی زیادہ نمی کا تناسب تھا۔ تاہم لانچ پر پہنچنے کے چند منٹ بعد ہماری تھکن دور ہو گئی۔
لانچ وہی تھی مگر اس کا ناخدا ہمارے استقبال کیلئے موجود نہ ہوتا تو ہم اسے شناخت نہ کر پاتے۔ ناخدا سے ہم پہلے بھی مل چکے تھے۔ اسے ہم نے پہچان لیا ورنہ لانچ کا سارا رنگ اب گہرا سرخ تھا جس پر پانی کے کنارے کے ساتھ ساتھ جامنی رنگ کی پٹی تھی۔ اس پر مستول اور بادبان بھی نصب کر دیے گئے تھے جس سے اس کی ابتدائی ساخت بالکل تبدیل ہو گئی تھی۔ دور سے دیکھنے والے کو یہ ایک بادبانی کشتی ہی نظر آتی جس کے عرشے پر جالوں کو پھیلائے بیٹھنے والے رسے پڑے تھے اور ماہی گیری کے جال تھے۔ کچھ نئے اور کچھ پرانے۔ اس انتظام کا مقصد لانچ کو مشکوک کرنا تھا۔ اس کے پیچھے بار بار ... پانی والے ... لانچ کے دونوں طرف لکھا ہوا نام بھی بدل کر سنہری جلپری کا رکھ دیا گیا تھا۔ آگے یہ نام پھر انگلش میں لکھا گیا تھا۔ گولڈن مرمیڈ۔ حالانکہ لانچ میں کہیں کوئی چیز گولڈن نہیں تھی۔ تاہم مرمیڈ یا جل پری کے تصور میں ایک رومانوی دلکشی تھی۔

کے بعد کہا۔ اس کے ہاتھ کھردرے اور فولادی گرفت رکھتے تھے۔ وہ چالیس سال کا پکے رنگ کا جوان اور جفاکش آدمی تھا۔
"ہاں... ہم صرف ایک بار آئے تھے پچھلے اس سیزن میں، پھر کیونکہ بھٹک گئے۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔
"وہ تو اچھا ہوا کہ ہم نے تمہیں پہچان لیا۔ ورنہ لانچ تو دور بھی ہے۔" محسن بولا۔
وہ ہنسا۔ "لانچ کا نقشہ بدل کر دیا ہے ایک دم۔ صاب لوگ آپ ہم کو کیسے پہچانا؟"
"ہم ایک بار تم سے مل چکے ہیں۔"
"وہ ہم نہیں تھا صاحب۔" لہٰذا ہماری غلط فہمی سے مختلف بھی تھا۔ "ہم تو ادھر آج ہی سویرے آیا تھا۔"
میں نے پریشانی سے کہا۔ "تو تم کیا کہہ رہے ہو؟"
"ہم ٹھیک بولتا ہے صاحب۔" ناخدا نے کہا۔ "وہ ہمارا بھائی تھا جو آپ سے ملا تھا۔ مگر وہ گونگا ہے۔ کیا آپ نے بات کیا تھا اس سے؟"
"نہیں... بات تو نہیں ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔
"اس غریب کا زبان کاٹ دیا ظالم نے۔ اللہ اس کا خانہ خراب کرے اور اس کے خاندان میں جو بچہ پیدا ہو گونگا ہو۔" وہ بولا۔
اتنی سفاکانہ بددعا نے میرا دل بھی دہلا دیا۔ "زبان کس نے کاٹ دی تھی؟"
"وہ تھا ایک حاجی بابا۔ ہمارا تو یہ کام ہے۔ ہم سب کی خدمت کرتا ہے، پیسہ لیتا ہے تو جان کا خطرہ بھی مول لیتا ہے اور پکڑا جاتا ہے تو جیل بھی جاتا ہے۔ ہم کسی کو دھوکا کیسے دے سکتا ہے وہ مخبری کرے گا تو بدنام ہو جائے گا۔ بچہ ہو گا تو وعدہ کیسے کرے گا؟ چپ چاپ کام کرتا ہے صاحب۔ کسی سے کچھ نہیں پوچھتا، نہیں اور کسی کو کچھ بتاتا نہیں۔ اس حاجی کا بیڑا غرق ہو۔ اس نے ہمارے بھائی پر جھوٹا الزام لگایا اور اس کا زبان کاٹ دیا۔ کسی دن ہم اس کا زبان کاٹے گا۔ ہم نے قسم اٹھایا ہے۔"
"تم حاجی عبداللہ کی بات کر رہے ہو؟" محسن بولا۔
"وہ جو موٹا تازہ سنڈا ہے۔ شیطان ہے مگر بات بات پر نام لیتا ہے اللہ کا۔ سبحان اللہ، ماشاء اللہ۔" میں نے کہا۔
اس نے زور زور سے اقرار میں سر ہلایا۔ "آپ جانتا ہے صاحب کو؟ ہم کو بتاؤ وہ کدھر ملے گا؟"
"کہیں دکھیں وہ تمہیں بھی پھر ملے گا... لیکن..." میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"
"کریم بلوچ۔" وہ بولا۔ "ہمارا بڑا بھائی رحیم بلوچ۔"

"کریم۔ ظالم اور شیطان جو قانون کی گرفت میں نہیں آتے ان کا اور اللہ کا معاملہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اسی دنیا میں۔ تم دیکھنا اللہ تعالیٰ انہیں ایسا پکڑے گا اور تم دیکھو گے کہ خدا اس کو زیادہ سخت سزا دے گا۔ تم جذباتی ہو اور تمہارا بھائی بھی۔ کریم بلوچ ہو۔ اگر کبھی تم نے کاٹ دیا تو تم کو تو پکڑ لیا جائے گا۔ نہیں۔ تم کو تمہارا بھائی ہے کہنا ہے تم ایسا نہیں کر سکتے۔"
کریم بلوچ نے سر جھکا لیا۔ "آپ ٹھیک بولا صاب۔ ہم کبھی کبھی غصے میں آ جاتا ہے تو ایسی بات کرتا ہے۔"
"اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ لانچ پر اور کیا ہے؟ سب کچھ بدلا گیا ہے؟" میں نے کہا۔
"اب ایک دم بدلی ہو گیا ہے صاحب۔ کاغذ واغذ۔ آپ سب دیکھو۔" وہ جلدی آگے آگے چلنے لگا۔
کاغذات وغیرہ دیکھنے کا یہ وقت نہیں تھا اور ہم تفصیلی معائنہ کرنے بھی نہیں آئے تھے مگر ہم نے محسوس کیا کہ ایک جدید ترین لانچ کو بادبانی کشتی بنانے تک کسی نے بہت محنت اور ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ کھلے سمندر میں خطرہ ہو تو لانچ پوری رفتار سے بھاگ سکتی تھی۔ اب دونوں انجنوں کی طاقت سے دوڑ سکتی تھی ورنہ انجن بند ہوں تو بادبان کھولے جا سکتے تھے اور کشتی ہوا کے زور پہ چلتی۔ آگے پیچھے دونوں حصوں میں بہت سے خفیہ خانے بنائے گئے تھے اور بہت کچھ ایسا بنایا گیا تھا جو ہمارے سفر کی ضروریات کے مطابق پورا کرتا تھا۔
"یہ سب کس نے کیا ہے کریم؟" میں نے خوش ہو کے پوچھا۔
"رحیم بلوچ نے صاحب۔ ہمارا بھائی نے۔"
"مگر اسے کس نے کہا تھا کہ لانچ کا حلیہ بدل دے؟"
"ہم کو نہیں معلوم صاحب۔" وہ بولا۔ "ہم نے اس سے پوچھا تھا، اس نے ہم کو بتایا نہیں۔"
"حیرت ہے۔" میں نے محسن کی طرف دیکھ کر کہا۔
"مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔" محسن بولا۔ "کیوں؟"
"کوئی شخص ہے جو پردے میں رہ کر نگرانی کر رہا ہے اور میں جانتا ہوں وہ کون ہے۔"
"تمہارا مطلب ہے...؟"
"ہاں۔ بس اس کا خیر دن پہ نکل نہ جائے کہیں راز دیکھنا۔"
"اچھا چلو۔ انہیں اپنا اپنا اسباب رکھنے دو۔" میں نے ہنس کے کہا۔
"ان کی دور تک ہم خود وہ جنگل سے پہنچے تھے۔ ساحل جہاں تک لے گئے تھے۔" محسن نے دبی آواز میں کہا۔
"اچھا تم یوں کرتے ہیں، ٹرک کو چلا کے یہاں تک لے آتے ہیں..." محسن نے کہا۔ "بلکہ اڑا کے لے آتے ہیں۔ یہاں اور بھی مشکل ہے تو پھر

سمندر کو کھینچ کر ادھر لے چلتے ہیں ذرا قریب۔"
"یہ وہی بات آپ کی اپنی کھوپڑی میں کیوں نہیں آئی آخر؟ کیا یہ لانچ ساحل کے ساتھ ساتھ وہاں نہیں پہنچ سکتی جہاں سے فاصلہ کم ہو، کم سے کم؟" محسن بولا۔
"یہ بات تو عام آدمی کی عقل میں بھی آ سکتی ہے۔" میں نے دانت نکال کے کہا۔ "چنانچہ مجھے سوجھ گئی۔ ہم اپنی خاص عقل خصوصی مواقع پر استعمال کرتے ہیں۔"
کریم بلوچ نے پہلے تو ہم سے ٹرک کا محل وقوع سمجھا کیونکہ ہم اسے ٹرک دکھا نہیں سکتے تھے۔ لیکن جغرافیے میں وہ کمزور تھا یا ہم جغرافیے کے ٹیچر اچھے نہیں تھے کہ بات اسے اپنے ساتھ لے جانا پڑی۔ آدھے راستے میں ایک جگہ سے اس نے ٹرک کی جھلک دیکھی اور پھر سر ہلانے لگا۔
"ہم نے دیکھ لیا۔" وہ بولا۔ "اب آپ جاؤ۔"
"ہاں ہاں۔ جانتے ہیں ہم۔" محسن بولا۔ "مگر تم..."
"ہم بھی آتے ہیں۔" کریم بلوچ نے کہا۔ "تم ادھر ہی ٹھہرنا۔ ہم سب لے آئیں گے۔"
پھر وہ واپس چلا گیا اور محسن نے کہا۔ "اللہ بڑا کارساز ہے۔"
"وہ تو ہے۔ مگر اب یہ کوئی نہیں تو کیا اس کا نام کون ہے جس نے بقول آپ کے، کیا ہے آج عجب دلنواز بندوبست؟" میں نے کہا۔
"اس کے سوا کون ہو سکتا ہے آخر یار۔" محسن میرے ساتھ چلنے لگا۔
"لیکن رابعہ اتنی بااختیار ہے تو پھر خود کو بے اختیار کیوں سمجھتی ہے؟" میں نے کہا۔
"یہ تو بہت مشکل سوال ہے۔" محسن سر کھجا کے بولا۔ "مگر میں کوشش کرتا ہوں جواب دینے کی۔ مجھے رابعہ کے دست حنائی کے پیچھے چاند بھائی کا فریبانہ کارنامہ لگتا ہے۔"
"چاند بھائی!" میرا دل بجھ سا گیا۔
"ہاں۔ جیسے حقائق تیرا رقیب ثابت کرتے ہیں۔ رو سیاہ تو وہ ہے نہیں۔ گورا چٹا آدمی ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ البتہ خاصے روسیاہ ہیں۔" محسن بولا۔
"تیرا مطلب ہے وہ رابعہ کی خاطر یہ سب کر رہا ہے؟"
"میں نے عرض کیا تاکہ بظاہر در پردہ یہ عشقی انتظام کسی اور کا بھی ہو سکتا ہے مثلاً دوست محمد کا۔"
"ہاں۔ آدمی تو وہ بھی مہربان ہو گیا ہے۔ عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔" میں نے ہاتھ سے پیچھے پھیلے ہوئے سمندر کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے اسرار و رموز کو سمجھتا ہے اور جانے

www.paksociety.com

سائل کو بھی جانتا ہے۔"

"جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟"

"کرو۔" میں نے کہا۔ "تمہاری جان ویسے بھی انکل رضوی کی امان میں ہے۔"

"یہ جو مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ صاحبہ، آپ کی محبوبۂ دلنواز ہیں نا، یہ کوئی ایسا کھیل کھیل رہی ہیں ہمارے ساتھ جس کی کوئی چال ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ ہم، تم اور چاند بھائی ایک طرف ہیں۔"

"ذرا سلیس اردو میں سمجھاؤ۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ رابعہ اسے بھی چکر دے رہی ہے۔ کوئی لمبا چکر۔ جیسا کہ الف لیلوی داستانوں میں سادہ لوح عاشقوں کو دیا جاتا تھا کہ عشق کو سچا ثابت کرو۔ انھیں کوئی آؤٹ آف کورس امتحانی پرچا تھما دیا جاتا تھا کہ ان سات سوالوں کے جواب لاؤ۔ حاتم طائی نے خاصی جھک ماری۔ فرہاد بیچارے کو پہاڑ کاٹنے کے لیے بھیج دیا اور دودھ کی نہر نکالنے کی شرط لگا دی۔ اور بھی بہت سے کیس ہیں۔"

"چاند بھائی کسی چکر میں پڑنے والا آدمی نہیں ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ اس سے بڑا چکر باز پیدا نہیں ہوا مگر برادر! دنیا کی تاریخ ایسے عبرتناک واقعات سے بھری پڑی ہے کہ بڑے بڑے تیس مار خاں کسی کی ایک نگاہِ کرم کے لیے گھن چکر بن گئے اور تباہ ہو گئے۔ سب کو چکر دینے والا چاند بھائی بھی بالآخر تقدیر کے ہاتھوں اس عشقِ بلاخیز کے چکر میں پڑا اور ایسا پڑا کہ اب رابعہ اس کو بندر کی طرح نچا رہی ہے اور ڈگڈگی کی طرح بجا رہی ہے اور شرط پر شرط عائد کرتی جا رہی ہے۔"

"کیسی شرط؟"

"یہی کہ مجھے جیتنا ہے تو پہلے یہ کرو۔ پھر وہ کرو۔ اور وہ گھن چکر سرِ تسلیم خم کرتا جا رہا ہے۔"

"وہ اتنا احمق نہیں ہے۔"

"ڈارلنگ۔ یہی تو وہ نکتہ ہے جو میں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ بدھو حضرت۔" محسن بولا۔ "سب سے بڑا افلاطون بھی جب اس چکر میں آ جاتا ہے تو اس کی عقل گھٹنوں میں اتر جاتی ہے پھر ٹخنوں میں آ جاتی ہے اور عقل کے ساتھ وہ خود بھی گھاس چرنے چلا جاتا ہے۔ چاند بھائی گھاس کھا رہا ہے کیونکہ رابعہ اسے گھاس ڈال رہی ہے۔ ڈالتی جا رہی ہے، ہمارے لیے۔ ہمارے فائدے کے لیے اسے استعمال کر رہی ہے اور وہ مجبور ہے۔ اس لیے کہ وہ بے بس ہے۔ عورت اس کے لیے آج تک 'رابعہ' کے ملنے سے پہلے ایک ایسی چیز ہوگی جو ہر جگہ، ہر وقت، ہر بھاؤ پر ملتی ہوگی۔ خریدی اور بیچی جا سکتی ہوگی، بدلی جا سکتی ہوگی، تحفے میں دی جاتی ہوگی۔ مگر پھر وہ عورت اچانک سامنے آئی جس نے اس کی ساری تمام خیالی دور کر دی۔ اور پتا چلا کہ عورت کیا ہوتی ہے۔ ایسا ہٹلر کے ساتھ ہوا، نپولین کے ساتھ ہوا۔ جہانگیر کے ساتھ ہوا جو شہنشاہِ ہند تھا۔ ایڈورڈ ہشتم کے ساتھ ہوا جو شاہِ برطانیہ تھا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "اگر میں اس نظریے کی صداقت تسلیم کر لوں تو بڑے بھائی، یہ کھیل کب تک چلے گا؟ انجام کیا ہوگا؟"

"چونکہ یہ فلمی اسٹوری نہیں ہے،" محسن بولا۔ "اور اس کا اسکرپٹ بھی میرا نہیں، اوپر والے کا ہے۔ اس لیے کیا عرض کیا دوں۔ انجام متوقع بھی ہو سکتا ہے اور غیر متوقع بھی۔ ممکن ہے کہ ایک دن رابعہ اس مجنوں سے کہے کہ میری خاطر کیا کر سکتے ہو۔ وہ کہے کہ قطب مینار پر سے کود سکتا ہوں۔ پھر رابعہ کہے کہ اچھا تو آؤ چلتے ہیں۔ اور وہ جائے۔ وہاں قطب مینار پر چڑھے اور بیچ کود جائے نیچے۔ رابعہ کہے ویری گڈ، تم واقعی سچے عاشق تھے۔ اور پھر اپنے خوبصورت عاشق [illegible] کرنے لوٹ گئے۔ خیر و عافیت۔ یا۔۔۔"

"یا کیا؟" میں نے کہا۔

"یا اس کے برعکس، دوسرا انجام بہت افسوسناک بھی ہو سکتا ہے۔ اور وہ کچھ یوں کہ کسی دن اچانک چاند بھائی کی عقل ٹخنوں سے پھر سے بالائی حصے میں پہنچ جائے اور اسے احساس ہو کہ عشق کے نام پر اس کے ساتھ رابعہ نے کیا سلوک کیا ہے۔ تو وہ انتقاماً۔۔۔"

"وہ سب گزر رہے جو اس کے دل میں ہو؟" میں نے [illegible] سے کہا۔ "تیرا دماغ خراب ہے۔"

"آپ نے بیچ میں کاٹ دیا۔" محسن بولا۔ "ابھی تو جملہ پورا نہیں ہوا تھا۔ مجھے خیال ہے آپ کے جذبات کا جنازہ [illegible] منظر کچھ ایسا ہو کہ جب رابعہ سارے راستے مسدود دیکھے اور دیکھے کہ [illegible] کو مزید اُلّو نہیں بنایا جا سکتا تو وہ ترپ کا آخری تیر استعمال کرے۔ جو یقیناً اس نے سنبھال کے رکھا ہوگا ایسی صورتِ حال کے لیے۔ رابعہ بھی ہے تو قاضی کے گھر کی [illegible] میرا مطلب ہے سیانی تو ہے۔ آگے سے کھیل رہی ہوگی تو اس کا خیال بھی ہوگا۔ وہ صاف بچ جائے گی۔ مرے یا مارے۔"

"میرا خیال ہے کہ تیرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "اس معاملے میں۔"

"تو مت کام میں نے دماغ سے۔ ہم جو اپنا دماغ [illegible] پر چلا رہے ہیں تیرے لیے۔ پھر تجھے فکر کرنے کی ضرورت [illegible]

میں تیری تسلی کے لیے نہیں، یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ رابعہ کے دور رہنے اور اس انداز تغافل میں یہاں تک کہ تیرے ساتھ ہونے والی گفتگو میں کوئی ایسی بات ہے جو ہم نہیں سمجھے اور وہ بھی نہیں چاہتی کہ ہماری سمجھ میں آ جائے جو ہم سے آ ملے گی۔ جب وہ دیکھے گی کہ اب وہ چاند بھائی کو مزید استعمال نہیں کر سکتی۔"

"چاند بھائی کے استعمال ہونے والی بات سو فیصد تو غلط نہیں ہو سکتی۔ لیکن ایک امکان اور بھی تو ہے!"

"وہ کیا؟"

"عرض کیے دیتا ہوں۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ چاند بھائی بظاہر ہمارا دشمن ہو لیکن سامنے آئے بغیر ہماری مدد کر رہا ہو جس کے بزنس پارٹنر رہی ہیں جو اصل شکاری ہیں۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی اور دوسرے اسمگلر۔ انھیں شک ہو جائے کہ چاند بھائی ہمارا مددگار بنا ہوا ہے تو نہ صرف یہ کہ چاند بھائی کا بزنس چوپٹ ہوگا بلکہ اس کی جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ چنانچہ وہ ایک ڈراما کر رہا ہے۔ اپنے چوہدری صاحب بہت بڑے ڈراما نویس، آرٹسٹ اور ڈائریکٹر ہیں۔ مگر وہ ان کا باپ ہے۔ جیسا کہ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا۔ سب سے زیادہ غور طلب بات یہ کہ چاند بھائی اسمگلر ہے لیکن غدار نہیں ہے۔ وہ مجرم ضرور ہے مگر قانون کا، ملک کا دشمن وہ بہر حال نہیں ہے۔ یہ اس نے واضح کر دیا تھا۔"

"اس نے تو یہ بھی کہا تھا کہ چوہدری دلاور سے اسے ایک قرض وصول کرنا ہے۔ خسرو جمشید کا۔" میں نے محسوس کیا کہ میرے دل پر لپٹ جانے والا مایوسی کا جالا ہٹ رہا ہے۔

"ہاں۔ اور خسرو جمشید مارا جا چکا ہے۔"

"تو یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ اصلی خسرو جمشید ہی تھا؟" میں نے کہا۔

"ایک منٹ کے لیے فرض کر لے کہ اسے چاند بھائی نے مارا۔ اس نے دلاور سے صاف بات کی کہ یہ مجرم میرے حوالے کر دو، پھر تمہارے اور میرے درمیان رنجش ہٹ جائے گی۔ یہی طریقہ اس نے دلاور کو اس بات کا یقین بھی دلا دیا کہ رابعہ اسی کی قید میں ہے اور وہ خود بھی ہمارے خون کا پیاسا ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہم نے چاند بھائی کو اور چوہدری دلاور کو اس بحری جہاز [illegible] سے اترتے دیکھا تھا ایک ساتھ۔ میرے نظریے سے اس کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔ فرض کرو [illegible] بات کرنے گیا تھا۔ دلاور نے اس کی بات مان لی ہو کیونکہ خسرو جمشید اس کے کام کا نہیں رہا تھا۔ بلکہ اس کے لیے بہت بڑے وقت آمیز نقصان کا سبب بن گیا تھا۔ مگر ان دنوں وہ اس کے قبضے میں تھا۔ اس نے خود مارنے کے بجائے خسرو جمشید کو چاند بھائی کے حوالے کر دیا۔ اس شرط پر کہ اسے مارنے کے بعد لاش واپس کر دی جائے۔ اپنے چوہدری صاحب کے لیے مردہ نواب خسرو جمشید بھی ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکتا تھا۔ ان کے ایک ڈرامے میں مؤثر کردار ادا کر سکتا تھا۔ اور ایسا ہی ہوا۔"

میں نے محسن کو زبردستی پکڑ کے گلے لگایا اور اس کا منہ چوما۔ "خدا تجھے نظرِ بد سے بچائے۔"

"پہلے تو خدا مجھے تجھ سے بچائے۔" وہ چلانے لگا۔

چونکہ اب ہم نازو اور غالب کے بہت قریب پہنچ چکے تھے اس لیے وہ ٹرک کی اوٹ سے دوڑتے ہوئے آئے۔

"کیا ہوا۔ اس بیچارے کو کیوں نچوڑ رہے ہو؟" غالب بولا۔

"میں نے ایک عقل کی بات کی تھی۔۔۔" محسن نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"غلطی سے کر دی ہوگی بیٹے۔ غلطی کی سزا تو ملتی ہی ہے۔" غالب نے کہا۔

"غلطی کے پیچھے۔" محسن نے کہا اور آگے بڑھا۔

"غلطی کے پیچھے تو ہم سب ہیں۔ بابا آدم کی غلطی کے۔" غالب فوراً نازو کے پیچھے ہو گیا۔

"یار! اپنے شیروانی اچکن صاحب۔" میں نے کہا۔ "بات تو آپ کی ادھوری ہی رہ گئی۔"

"ابھی زندگی ادھوری رہ جاتی۔ بھاڑ میں گئی بات۔" وہ بولا۔

"یہ خسرو جمشید آخر اپنے چوہدری دلاور صاحب کو کیسے ملا؟"

"جیسے شامتِ اعمال کے باعث ہم تم سے ملے۔" محسن نے کہا۔ "جہاں وہ قید تھا، وہاں اس کی ایک بدکردار، عاق شدہ سوتیلی بہن تھی۔ ان کے درمیان کوئی رشتہ نہ تھا۔ مگر پھر بھی ایک رشتہ تھا۔ زیب النسا کا۔ خسرو جمشید نے اسے پال کے بڑا کیا تھا اور یہ بہت بڑا احسان تھا۔ زیب النسا کی ماں نے خسرو جمشید کو قید میں دریافت کیا اور اسے رہائی عطا کر کے اپنا قرض چکا دیا۔ اب یہ اس کی حرماں نصیبی کہ وہ قید خانے سے نکلا تو سولی پر چڑھ گیا۔ ممکن ہے وہ دلاور سے مصالحت یا مفاہمت کی امید لے کر آیا ہو۔ اپنی مجبوری کا عذر پیش کر کے کاروباری تعلقات استوار رکھنا چاہتا ہو۔ مگر تقدیر کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔"

"یہ ہو سکتا ہے۔ بالکل ہو سکتا ہے!" میں نے کہا۔ "کہ باقی سب جھوٹ ہو۔ ہم ملتان فون کر کے معلوم کر لیں گے۔"

www.paksociety.com

"یہ تم دونوں کیا الف لیلیٰ سنا رہے ہو؟" غالب نے کہا۔

"تم اپنی مثنوی زہرِ عشق پڑھ رہے تھے تو ہم نے پوچھا تھا؟" محسن نے نازو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"وہ ہم نے بھی دیکھا ہے جناب!" پیچھے سے آواز آئی۔ بیک وقت سب نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ "تم؟"

"کیا دیکھا ہے تم نے کریم بلوچ؟" میں نے کہا۔

"فلم زہرِ عشق سات بار۔" وہ بولا۔ "ابھی پھر آئے گا تو آٹھ بار دیکھے گا۔" اس کا مطلب تھا آٹھویں بار۔

مگر کریم بلوچ کی بات پر نازو ہنس پڑی۔ "آٹھ بار دیکھو گے۔ ہر روز یا مسلسل آٹھ شو؟"

"وہ جی۔ سات بار ہو گیا۔ اب آٹھ بار۔" کریم بلوچ نے دانت نکوستے ہوئے کہا۔ "ایسا ظالم گانا اس کا صاب۔"

کریم بلوچ ایک زندہ دل آدمی تھا۔ اس نے اپنی زندگی بھی جفاکشی [illegible] دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سب ضروری سامان لانچ میں منتقل کر دیا۔ چاروں گھوڑے پہلے ہی چھوڑے جا چکے تھے۔ ہماری عدم موجودگی میں غالب اور نازو نے کام کو کھیل بنا لیا تھا۔ انھوں نے باری باری ایک گھوڑا جو راجا کی 'خون پسینے کی کمائی' سے بنا ہوا تھا، پچاس قدم کے فاصلے پر رکھا اور پھر اسے سنگسار کرتے رہے۔ گھوڑے ٹوٹ کے بکھر گئے اور نوٹ ہوا سے اڑنے لگے تو وہ انھیں تتلیوں کی طرح پکڑنے کے لیے پیچھے بھاگتے رہے اور بالآخر سب رقم اسی سوٹ کیس میں منتقل کرنے میں کامیاب ہو گئے جو پہلے پورا بھرا ہوا تھا مگر اب خالی ہو چکا تھا۔ یہ سوٹ کیس دشمن کے ایک ٹھکانے سے حاصل ہونے والا مالِ غنیمت تھا جو ہمارے بہت کام آیا تھا۔ اب اس میں پھر ہمارے اندازے کے مطابق تین چار لاکھ بھر گئے تھے۔

اسلحے میں سے ہم نے رش؟ ہم اپنے ساتھ رکھے اور ڈائنامائٹ سمندر میں غرق کر دیے۔ اسٹین گن اور سائیلنسر والا واحد ریوالور جو پہلے جیکب کی ملکیت تھا، میرے پاس رہتا تھا مگر میں نے غالب کے سپرد کر دیا۔ کیونکہ بے خطا نشانے میں اس کی ہمسری کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ جعلی دستاویزات سے پُر سوٹ کیس کا بوجھ بہت تھا۔ فی الحال ہم نے اسے ایسے ہی رکھ لیا اور طے کیا کہ بعد میں غیر ضروری اسباب کی چھانٹی کی جائے گی۔ اسٹین گن بھی ایک ہی تھی جسے ہم نے ایک مخفی خانے میں ڈال دیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں سے اس کو وقتِ ضرورت آسانی سے اور فوراً نکال کر استعمال کیا جا سکے۔

"اب اس ٹرک کا کیا بنے گا؟"

"پیچھے رہ جانے والوں کا کیا بنتا ہے؟" غالب نے بڑی فلسفیانہ بات کی۔ "تم کیوں اس کے غم میں جان گھلا رہے ہو؟"

"ہاں، مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔" میں نے کہا۔

"مالِ غنیمت کبھی مالِ حرام نہیں ہوتا۔" محسن بولا۔

"اس کو یہاں چھوڑ دینے میں حرج کیا ہے۔ فائدہ بھی ہے کچھ۔"

"وہ کیا؟"

"یہی کہ شکاری ہمارا سراغ لگاتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے تو غلط اندازے قائم کریں گے۔ مثلاً یہ کہ ہم سمندر کے راستے نکل گئے۔"

"اس کے اچھے خاصے پیسے مل سکتے ہیں۔" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔ "الزام [illegible] نے عقلمندی کی جو کار چھوڑ کر ٹیکسی لے لی۔"

"کار بیچ دی؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "بیچے گا کون؟"

"جو ہمیں نے بتایا۔" محسن بولا۔

"کام تو اچھا کیا۔ مگر۔ کار اس کے نام پر تو رجسٹرڈ نہیں تھی۔"

"پھر کس کے نام پر تھی؟" نازو بولی۔

"آغا سعادت علی خان گردیزی کے۔" میں نے کہا۔ "یعنی [illegible]"

"تو میاں خاکسار۔ اس نے تمھارے دستخط کر دیے ہوں گے۔ تم اگر آغا سعادت علی خان گردیزی بن سکتے ہو تو وہ کیوں نہیں بن سکتا؟" محسن بولا۔ "ڈیلر کرتے سب معاملات طے کروا دیے ہوں گے۔"

"ہاں۔ اسے تو دوہرا کمیشن ملا ہو گا۔" غالب نے کہا۔ "ایک تو کار بکوانے کا۔ دوسرے ٹیکسی دلوانے کا۔ ہر گاڑی صرف ایک انگلی پر فروخت ہوتی ہے۔ رجسٹر ہوتی ہے اور ٹرانسفر ہوتی ہے۔ دستخط ملنے چاہئیں۔"

"تھوڑا بہت فرق [illegible] سے مٹایا جا سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ وہ دونوں بس آوارہ گردی کرتے رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"انھوں نے خاصا کام کیا کل شام سے رات تک۔" [illegible]

"کل ہم نے تو کچھ نہیں کیا۔" محسن بولا۔

"میں نے بہت بڑا کام کیا۔" غالب بولا۔

"کوئی جوئے شیر نکالی؟" میں نے ہنس کے کہا۔ "کیا کیا؟"

"میں نے حسنِ بے پروا کو خود بینی و خود آرا کر دیا۔" غالب نے نازو کی طرف چوری چوری دیکھا جو ایک ...... آئینے میں خود کو دیکھ کر بال بنا رہی تھی۔ "کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا [illegible]"

"اور اس کے بعد؟" محسن بولا۔ "اس نے سارا [illegible]"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ حسرت موہانی کا شعر تو بہت حسبِ حال تھا مگر تیسرا مصرع محسن نے نہ جانے کس شاعر کا [illegible] تھا اور غالب کے رومانٹک موڈ کا ستیاناس کر دیا۔

"ابھی چلے گا صاب؟" کریم بلوچ نے کہا۔

"ہاں ابھی۔ بالکل ابھی چلے گا۔" میں نے کہا۔ "مگر کہاں چلے گا؟"

"جدھر آپ بولے گا صاب!" کریم بلوچ نے مستعدی سے کہا۔

"تمھاری یہ لانچ کہاں تک جا سکتی ہے؟" غالب نے ایک اہم سوال کیا۔

"لانچ ایک دم ٹنا ٹنٹ ہے صاب۔ آپ بولیں گا تو ہم سمندر پار دبئی لے جائیں گا۔ بمبئی۔ کولمبو۔ سنگاپور۔ بنکاک۔ جدھر بولیں۔"

"فی الحال تم کیماڑی چلو۔ دوست محمد کے پاس۔"

"دوست محمد!" وہ حیران ہو کے بولا۔ "وہ کون ہے؟"

"تم نہیں جانتے اسے؟" میں نے اسے غور سے دیکھا کیونکہ اس کی حیرانی مجھے اداکاری لگی تھی۔ "وہ جو لانچ ٹھیک کرتا ہے۔"

"مستری دوست محمد۔ ابھی آپ بولو، وہ کدھر ہو گا تو ادھر ہی چلیں گا۔" وہ بولا۔

یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ ہمارا ناخدا سب راستوں سے واقف تھا مگر اس کی لاعلمی کے انداز میں کچھ ایسی بات تھی [illegible]

"اچھا۔ تو پھر تم ساحل سے ذرا دور چلو۔ اس طرح کہ کوئی ہمیں دیکھ نہ سکے۔" میں نے کہا۔ "اور دیکھے تو پہچان نہ سکے۔"

"اس کا فکر مت کرو۔" وہ بولا۔ "لیکن آپ اپنا کچھ خیال کرو۔ اپنا حلیہ بدلو۔"

"تمھارے خیال میں یہ کیوں ضروری ہے؟ تم کیا جانتے ہمارے بارے میں؟" محسن نے کہا۔

"ہم کو بھائی رحیم بلوچ بولا صاب کہ وہ پاکستانی مجاہد ہے اور ادھر ملک میں خانہ خراب کا فراڈ لوگ اپنا [illegible] بنایا ہے تو ہم بولا صاب کہ ابھی ہم بھی چلے گا اور ادھر سب [illegible] کریں گا جو ہمارا ملک کا بیڑا غرق کرنے کے واسطے [illegible] ابھی ہم ان کو جانتا نہیں صاب لیکن اللہ کا قسم آپ [illegible] لوگ جائیں گا تو اس مردانی کا واسطے۔ ابن مسلمان [illegible] مرنے سے نہیں ڈرتا۔ بے شک تم [illegible] سب کو ایک وقت آنا ہے۔ پھر اچھا ہے نا اللہ [illegible] اور ہم جنت میں جاوے۔ ہم تو بہت [illegible] صاحب۔"

اس سادہ دل، سچے مسلمان، اچھے انسان اور سچے پاکستانی نوجوان کے جوشیلے جذبات نے ہم سب کو متاثر کیا۔

"تم تو بہت بہادر آدمی ہو کریم بلوچ!" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا۔

"کدھر صاب۔ ہم تو اپنی گھروالی سے بھی ڈرتا ہے۔" وہ بولا۔

"یہ بتاؤ کہ تم کیا کچھ کر سکتے ہو؟" محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہم سب کرتا ہے صاب۔ لانچ چلاتا ہے اور اس کو ٹھیک بھی کر لیتا ہے۔"

"نیوی گیشن۔ میرا مطلب ہے سمندری راستوں سے واقف ہو؟" میں نے کہا۔

"تھوڑا بہت۔ ادھر سے مسقط اور کولمبو کے راستے ہم مدراس بھی جا سکتا ہے۔ کلکتہ اور چاٹگام بھی۔ ہمارا استاد اسی راستے پہلے جاتا تھا ہم کو۔ صرف ایک بار وہ چٹی چلا گیا تھا ہم خود لانچ لے کر۔ استاد نے ہم کو گھما کرا دیا۔" وہ بولا۔

"ویری گڈ۔" میں نے کہا۔

"کیا ویری گڈ صاب۔ ہمارا سر ایک دم آلو جیسا ہو گیا تھا۔ سب اس پر چپت مارتا تھا۔" وہ بولا۔

"وہ... میں تعریف کر رہا تھا تمھاری کہ تم اس راستے پر ہمارے ساتھ چل سکتے ہو۔ اور جہاں ہمیں جانا ہو وہاں لے جا سکتے ہو۔" میں نے فوراً وضاحت کی۔

"مقصد تمھارے استادِ محترم کے اقدام کی توثیق نہیں تھا۔" اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ "کیا نہیں تھا؟"

غالب نے کہا۔ "کچھ نہیں۔ استاد کون تھے تمھارے؟"

"دوست محمد۔" وہ بولا۔

ہم سب کا چونکنا ایک فطری امر تھا۔ "ابھی تو ... تم ظاہر کر رہے تھے کہ تم کسی دوست محمد کو نہیں جانتے۔"

"ہم... ہم..." اس نے انگلیوں پر حساب لگا کے بتایا۔ "چار ... نہیں۔ پانچ دوست محمد کو جانتا صاب۔ اس میں باپ بھی ہے ہمارا۔"

"تو یہ کیسا ... وہی مستری دوست محمد ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے تائید میں سر ہلایا۔ "ہم اس کا شاگرد تھا۔ وہ کام کرتا تھا تو ہم مدد کرتا تھا۔ دیکھتا تھا۔ لانچ کا انجن بنانا ہم اس سے سیکھا۔ وہ بولتا تھا کریم بلوچ تیرا دماغ خراب ہو جائیں گا اگر تم نے پڑھنے کا کوشش کیا۔"

"تعلیم سے دماغ خراب ہوتا ہے؟" نازو بولی۔

"ہاں جی۔ تعلیم کے لیے دوسرا دماغ ہوتا ہے۔ ہمارا یہ

www.paksociety.com

دماغ نٹ بولٹ اور پیچوں والا تھا۔" اس نے ہمیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "جیسے ابھی گھوڑا ہوتا ہے۔ ریس کا گھوڑا اگر تانگے میں لگائیں گا تو خراب ہو جائیں گا نا۔"

اپنی سیدھی سادی مثال سے اس نے ہم کو اتنا وسیع اور رجحان کا نظریہ سمجھا دیا تھا۔

"تو گویا تم نے یہ لانچ کی دیکھ بھال اور مرمت کا کام جلد سیکھ لیا۔ اب تم سب کر سکتے ہو؟"

"ایک دم سارا انجن کا آپریشن کر سکتا ہے صاب۔" کریم بلوچ نے فخر سے کہا۔

"کیپٹن۔ نیوی گیٹر اور انجینئر۔ ان تینوں عہدوں کے لیے تمہارا تقرر کیا جاتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تم ہمارے لیے بہت کام کے آدمی ہو۔"

"آج سے خود کو ہمارا ساتھی سمجھو۔ ہم کو صاب نہیں 'یار' بولو کیونکہ ہم سب دوست ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا تمہارے یہاں کوئی ذاتی مسائل ہیں۔ بیوی بچوں کے۔ روپے پیسے کے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہمارا ماں باپ ہے۔ وہ اس کا خیال رکھتا ہے۔ ہم تو بس بچوں کا باپ ہے۔" اس نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"جب تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔ تو ہو سکتا ہے کافی عرصہ لوٹ کے گھر نہ جا سکو۔" میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے 'ہم واپس ہی نہ آئے۔" وہ بولا۔ "ہم سب سمجھتا ہے صاب۔۔۔ یار۔ ہم اور آپ ایک ہی کشتی میں سوار ہے۔"

"تم کو بندوق چلانی آتی ہے؟"

"کون سا بندوق؟" اس نے شلوار کے نیچے سے ہاتھ ڈال کے دیسی ساخت کا ایک ریوالور برآمد کیا۔ "یہ ہے اپنے پاس یار۔ مگر کسی کو بولنا مت۔ ہم ادھر پشاور گیا تھا۔ وہاں سے لایا تھا۔ ہمارا باپ تو جانتا ہے مگر ماں کو نہیں معلوم۔ اور بیوی کو بھی۔"

اس کی باتوں پر ہنسنے کی بہت گنجائش تھی مگر وہ جو کچھ کہہ رہا تھا طبیعی سادگی اور خلوص میں کہہ رہا تھا۔

میں نے ریوالور کا معائنہ کیا۔ یہ کولٹ کو ریوالور اعشاریہ اڑتیس کی بہترین نقل تھی۔ اور نقل اس حد تک اصل کے مطابق تھی کہ شاید کسی ماہر آتشیں اسلحہ کو آزمانے کے لیے دونوں پیش کیے جاتے تو ایک نظر میں کوئی فرق نہ بتا پاتا۔

"بہت عمدہ چیز ہے یہ۔" میں نے ریوالور محسن کے حوالے کیا۔ "اس کا استعمال کس حد تک جانتے ہو؟"

"چلاتا آتا ہے صاب۔۔۔ یار۔" وہ بولا۔

"وہ تو آتا ہو گا۔ مطلب یہ کہ نشانہ کیسا ہے تمہارا؟"

"نشانہ ایک دم فرسٹ کلاس۔ ایک دن ہم [illegible] کیا۔ دوسرے دن ایک پاگل کتے کو مار دیا۔ [illegible] جگہ۔ چھ فٹ کے فاصلے سے۔ بس تھوڑا سا فرق [illegible] ہم تو سر میں گولی مارا تھا۔ لگا پیٹ میں۔ [illegible]"

ہم سب کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "اس کا مطلب یہ ہے یار کہ تمہیں نشانے کی مشق کرانی ہو گی۔ بعض [illegible] سامنے سے گولی چلانی پڑتی ہے۔ اور چھ فٹ نہیں [illegible] یا سو فٹ کے فاصلے سے۔ فرق اتنا بھی نہیں [illegible] جتنا دونوں آنکھوں میں ہوتا ہے۔ کہ سیدھی آنکھ [illegible] جائے تو دوسری آنکھ کیا ناک پر بھی خراش نہ آئے [illegible]"

"یہ۔۔۔ یہ تو بہت مشکل ہو گا صاب مگر سیکھیں گے۔" کریم بلوچ نے کہا۔

"یہ ہے تمہارا استاد۔" میں نے کریم بلوچ کو غالب سے متعارف کرایا۔ "ایسا زبردست نشانہ ہے کہ اڑتی چڑیا کو گولی سے دو بار نشانہ بنا سکتا ہے۔"

کریم بلوچ اس بات کا مطلب کیا سمجھتا۔ وہ [illegible] حیرت آمیز احترام سے غالب کو دیکھتا رہا۔ پھر [illegible] کرنے کی ابتدائی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ [illegible] بھی اپنے اسباب اور ضروریات کا از سر نو جائزہ لیا۔

نازو نے پہلے نسوانی کپڑوں کا ایک انبار [illegible] جس میں چند نفاست سے بلوچی اور سندھی [illegible] والے کرتے تھے اور مضحکہ خیز گھیر والی شلوار [illegible] اور کچھ چنری۔ ان کو وہ کسی بھی قسم کا حلیہ اختیار کرنے [illegible] پہن سکتی تھی اور غالباً وہ اسی مسئلے پر سوچ بچار [illegible] کہ اسے مچھیرن بننے کے لیے کیا کچھ درکار ہو گا۔ [illegible] شہر میں ہم سب کے لیے اپنی اپنی صلاحیت کا مظاہرہ [illegible] ہوئے مچھیروں کی ایک عام غربت زدہ جاہل [illegible]

محسن اور غالب نے مجھ سے اتفاق کیا کہ [illegible] پہلا اور ابھی کا کام بعد پر چھوڑنا عقلمندی نہیں۔ [illegible] کیماڑی کے ساحل پر ہی پہچان کے دھر لیے جائیں [illegible] بھی ماہی گیروں کا لباس تلاش کیا۔ یقیناً یہ کسی کی [illegible] کا کرشمہ تھا کہ ہمیں وہاں سب کچھ مل گیا جو اپنا حلیہ [illegible] لیے ضروری تھا۔ یہاں تک کہ ایک کباڑ خانے میں [illegible] ملی۔ یہ سفید بالوں کی وگ کا پورا سیٹ تھا۔ داڑھی [illegible] چہرے اور حلیے تو ہم نے اتنی بار بدلے تھے

[illegible] میک اپ کے محتاج نہیں رہے تھے اور میک اپ کا سامان یہاں بطور خاص فراہم کیا گیا تھا۔ باقی سامان بھی [illegible] پیش نظر رکھا گیا تھا کہ کسی ماہی گیروں کے خاندان کی وہ کشتی نظر آئی جس پر وہ رہتے بھی ہوں۔ مچھلی پکڑنے کے جال سے [illegible] اور کھانے پینے کے برتنوں تک ہر چیز پرانی تھی [illegible] استعمال شدہ تھی۔ سونے کے لیے جو بستر تھے وہ گدڑیاں [illegible] جا سکتے تھے۔ معلوم نہیں یہ کس کا اسباب تھا جو یہاں جمع [illegible] میرا ذہن رہ رہ کے دوست محمد کی طرف ہی جاتا تھا [illegible] ایک ہوشیار آدمی تھا جو وسیع تعلقات اور وسائل پر [illegible] رکھتا تھا اور ہمارے حالات کے مطابق ہماری ضروریات [illegible] انھیں کو بہتر سمجھتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو کیپٹن عرف چیف صاحب؟" محسن نے [illegible] سامنے ایک پھٹی ہوئی مصنوعی لمبی کر کے کہا۔ "ہم تو یہ لباس [illegible] زیب تن فرما رہے ہیں۔"

میں نے مرزا غالب کو دیکھا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ اس نے [illegible] اوپر ایک پگڑی سی یوں باندھی تھی کہ سامنے بال غائب [illegible] تھے اور بدن پر ایک کالے رنگ کی ڈھیلی واسکٹ [illegible] ہی تھی۔ واسکٹ کے نیچے صرف نیلے رنگ کی خستہ حال [illegible] جس کو آزاد کے اس نے ٹخنوں سے کافی اونچا کر لیا [illegible] غالباً سب سے زیادہ دلچسپ حرکت اس نے تو یہ کی [illegible] کو تیل کی مدد سے چہرے، ہاتھوں اور گردن پر اور جسم کے سب نظر آنے والے حصوں پر پھیلا کے کی تھی۔ یہ رنگ [illegible] نہیں تھا تو اتنا کچا بھی نہیں تھا کہ پانی لگنے سے اتر جائے۔ ایک سیاہ فام ماہی گیر کے میک اپ میں اپنی مہارت [illegible] استعمال کرنے میں کامیاب تھا۔

محسن کا لباس بھی خاندانی ماہی گیروں کے ماحول اور حالات کے مطابق تھا۔

میں نے سفید بالوں کے وگ کا سیٹ استعمال کیا [illegible] مجھے آدھا گھنٹا لگ گیا۔ لانچ کا ناخدا کریم بلوچ [illegible] میں دو بار نیچے آیا اور ہمارے چہرے گری سے محفوظ [illegible] معلوم ہیبت کے باعث وہ لانچ کو اسٹارٹ نہیں [illegible] آخر اس نے ہمیں مطلع کیا کہ وہ جنرل چیک اپ [illegible] مصروف ہے۔

"اب صورت حال یوں ہے میرے بچو!" میں نے کسی [illegible] بوڑھے کی سی آواز میں کہا۔

"ہم کسی کو نہیں کہتے سور کے بچو!" محسن بولا۔

"ہم ایک ماہی گیر خاندان ہیں۔" میں نے کہا۔ "جس کا سربراہ میں ہوں۔ تم مجھے اپنا باپ دادا سسر قسم کی چیز مان سکتے ہو۔"

"میں اپنا قائم مقام سسر تسلیم کرتا ہوں۔" غالب نے کہا۔

"اور بیٹی نازو۔" میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "یہ کیا بدمعاشی ہے۔ آپ دونوں مل کے تنگ کرتے ہیں مجھے۔"

"بابا ایسے تو حقیقی بیوی بھی خفا نہیں ہوتی۔ یہ تو بس ڈراما ہے۔" غالب نے کہا۔ "تم چاہو تو کردار بدل لو۔ میں بن جاتا ہوں تمہاری گھر والی۔ صرف میک اپ ہی تو بدلنا پڑے گا۔"

"ویسے جنس بھی تو بدل جاتی ہے۔" محسن بولا۔ "میرا تو مشورہ ہے کہ تم حقیقی زندگی میں بھی گھر والی بن کے ٹھیک رہو گے کیونکہ تم نام کے تو غالب ہو مگر ہو مغلوب۔"

"شٹ اپ شٹ اپ اب لڑنا مت شروع کر دینا۔" میں نے کہا۔ "فرض کرو میں ضرورت پڑنے پر خود کو محسن کا باپ بتاؤں گا۔ تم میرے داماد۔ ہم سب محلے کے رہتے ہیں اور سو پشت سے ہے پیشہ آبا ماہی گیری۔"

"شعر وزن سے گر گیا۔" غالب نے اعتراض کیا۔

"وزن زیادہ ہو تو شاعر بھی گر جاتا ہے۔" محسن بولا۔

"شاعر تو ہاتھ لگنے سے بھی گر جاتا ہے۔" نازو بولی اور ہنسنے لگی۔

لانچ نے جھٹکا سا لیا اور ہچکولوں سے ہمیں اس کے متحرک ہونے کا یقین آیا۔

"ہم کوشش کریں گے کہ اس بحری جہاز کے جتنا قریب جا سکتے ہوں تو جائیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس طرح کہ انھیں شک نہ ہو۔ وہ دور دور سے دیکھتے رہتے ہوں گے کہ آس پاس کون سی کشتیاں اور لانچیں موجود رہتی ہیں۔"

"وہاں ہماری چیکنگ بھی ہو سکتی ہے۔ تم کاغذات وغیرہ دیکھ لو۔" محسن بولا۔

"یہ لانچ انجنوں کی طاقت سے آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔" غالب نے خاموشی پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی اس کا بادبانی کشتی نظر آنا ہی بہتر ہے۔ تھوڑے سے فاصلے کے لیے انجن چلانے کا خطرہ نہ مول لیا کریں۔" محسن نے کہا۔

"تم کیا سن رہی ہو یہ مردانہ باتیں۔" غالب نے نازو کو ڈانٹ کے کہا جو بہت زیادہ ڈھیلے اور بے ڈھنگے لباس کے ڈھیر

www.paksociety.com

میں اپنے نازک وجود کی ساری رعنائی کھو بیٹھی تھی۔
"بھیڑ لو بازیں!" محسن نے اس کی تعمیل کی۔
"تم جاؤ نازو، ذرا چولہا سنبھالو۔ دیکھو کھانے کو کیا ہے اور پینے کو کیا ہے۔" محسن بولا۔
"میرے لیے تو خیر یہی کافی ہے۔ خونِ دل پینے کو اور زخمِ جگر کھانے کو۔" غالب بولا۔ "مگر یہ باقی تو انسان ہیں۔"
نازو زیرِ لب بڑبڑاتی لانچ کے اس حصے میں چلی گئی جسے اسبابِ خانہ داری کے باعث کچن قرار دیا جا سکتا تھا۔ ہم نے اب کاغذات کی چھانٹی کی۔
اس باکس میں ہر قسم کی دستاویزات تھیں جن کے بارے میں یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ نقلی ہیں یا اصلی۔ مثلاً اس میں مختلف ملکوں کے خالی مگر دستخط شدہ اور مہر لگے ہوئے پاسپورٹ تھے۔ ہم نے اتفاقِ رائے سے سب کے لیے دو دو پاسپورٹ رکھے۔ ایک پاکستانی اور ایک بھارتی۔ یہ ضروری تھا کہ ہمارے پاکستانی پاسپورٹ یہیں مکمل کر لیے جائیں لیکن اس کے لیے تصاویر درکار تھیں۔ خوش قسمتی سے اس صندوق کی نچلی تہ سے ایک پولرائیڈ کیمرہ برآمد ہوا جو دس سیکنڈ میں تصویر بنا دیتا ہے۔ ایسے کیمرے تو اب بہت عام ہیں اور تفریحی مقامات پر پیشہ ور فوٹوگرافر لیے پھرتے ہیں کہ جو گھومتے پھرتے آئے اسے وہیں تصویر بنا کے دکھا دیں۔ نقصان صرف یہ ہوتا ہے کہ ایسے کیمرے براہِ راست فوٹو بناتے ہیں۔ ان کا نیگیٹو نہیں ہوتا کہ بعد میں مزید کاپیاں بنانا ممکن ہو۔
ہم نے ایک دوسرے کی دو دو تصاویر اتاریں اور اپنے اپنے پاسپورٹ پر کاٹ کے لگا دیں۔ اس میں پوری تصویر کی جگہ نہیں تھی، صرف چہرہ چسپاں کیا جا سکتا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ ہم تمام غیر ضروری سامان تلف کر دیں تاکہ کہیں کسی مرحلے پر تلاشی لینے والے آ جائیں تو انہیں ماہی گیری کی کشتی میں پولرائیڈ کیمرہ نہ ملے۔
"اب اسے بھی سپردِ آب کر دوں؟" غالب نے کہا۔ "میں نے آج تک سمندر میں کوئی کیمرہ نہیں پھینکا۔"
"میں نے بھی آج تک کوئی صحافی سمندر میں نہیں پھینکا۔" محسن نے کہا۔ "مگر پہلے تم اپنا شوق پورا کر لو۔"
"عقلمندو! ایک ایک اضافی تصویر تو رکھ لو۔ کیا پتا کہاں ضرورت پڑ جائے۔" نازو نے کہا۔
"یس۔ واشتہ آئیڈیا!" محسن نے تائید کی۔
"میں صرف بیوی کا قائل ہوں۔ یہ جو دوسری چیز ہے نا، تو یہ عیاشی اور بدمعاشی ہے۔ تم کو شرم آنی چاہیے۔"

بمشکل تمام ایک ایک اضافی تصویر اتاری گئی۔ نازو نے معلوم نہیں محسن کے کان میں کیا کہا۔
وہ چلانے لگا: "بتاؤں نازو کو؟"
"کیا بتاؤ گے؟ میں نے تو نازو کی بات بھی نہیں..." غالب بولا۔
"پھر کیا کہا تھا ابھی کہ...؟"
"میں نے کہا تھا کہ موسم ابر آلود ہے۔ یا شاید نہیں..." غالب نے اوپر آسمان کو دیکھ کر کہا۔ "کچھ موسم کا ذکر تھا۔"
صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ محسن نے بعد میں مجھے بتایا کہ اس نے نازو کے ساتھ ایک پوز میں تصویر بنوانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جو کرشمہ سے کہیں پاس نہ ہوتی۔
"یہ پاسپورٹ بعد میں مکمل کریں گے؟" غالب نے کہا۔
"بعد کا مطلب ہے کہ آج رات؟" محسن بولا۔
"ہاں۔ کیا پتا کل جانا پڑے۔" میں نے تائید کی۔
"پاکستانی پاسپورٹ پر انڈین ویزا آفس کی مہر وغیرہ سب موجود ہے۔ صرف تاریخ ڈالنی ہے۔ پھر شاید ہم پہنچتے تو انڈیا میں قانونی طور پر رہ سکتے ہیں۔"
"زیادہ قیام کی ضرورت پیش آ گئی تو؟"
"تو ظاہر ہے اس کی میعاد بڑھوانی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم بھارت میں ہیں تو اس کے لیے وزارتِ داخلہ سے رجوع کرنا ہو گا۔"
"وہ جعلی پاسپورٹ کو پہچان کے ہمیں پکڑ لیں گے۔" نے کہا۔ "اور پولیس ڈاک ارسال کر دیں گے۔"
"گویا انڈین ویزا آفس کی مہر بھی رکھیں؟" غالب
"نہیں۔ انڈیا میں اگر ویزے کی مدت ختم ہو گئی تو ہم وہاں بھی پکڑیں گے کسی ایجنٹ کو۔ ایجنٹ ہر جگہ ہیں اور وہ سب کام کرتے ہیں جو آپ خود نہ کر سکیں۔ پاکستان کا تو حال بھی ایک ہی ہے۔" میں نے کہا۔
"اور یہ بھارتی پاسپورٹ کس لیے ہیں؟" نازو بولی۔
"انہیں بھی سنبھال کے رکھو۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی کام آ سکتے ہیں اور مشرقی پاکستان میں بھی۔ جہاں پاکستان کے حامی ہوں وہاں ہم پاکستانی۔ جہاں بنگلہ دیش کا خواب دیکھنے والے ہوں وہاں ہم بھارتی۔"
"مجھے ڈر لگتا ہے یار کہ کہیں یہ خواب حقیقت نہ بن جائے۔" غالب نے کہا۔
"بعض اوقات یہ اندیشہ تو مجھے بھی پریشان کرتا ہے۔"

نے کہا: "اور اس کا سبب ہماری بیوروکریسی کا رویہ ہے جنھوں نے مشرقی پاکستان کو ایک غلام کالونی سمجھ کر دبا کے رکھا ہے۔ عوام کی بات مختلف ہے۔ وہ سب ایک ہیں مگر اربابِ اقتدار ہی ان میں کسی حد تک احساسِ محرومی پیدا کرنے کے ذمے دار ہیں۔"
"یہ زیادہ غلط بھی نہیں۔ اول تو یہ کہ بلحاظِ آبادی وہ بڑا صوبہ ہے۔ مگر اس کے حقوق زیادہ نہیں۔ انگریزی جو ہمارے سابق آقاؤں کی اور دورِ غلامی کی یادگار ہے، اسے تو قومی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ بچے کو پہلی سے بی اے تک لازماً پڑھائی جاتی ہے۔ پھر بنگالی زبان کیوں نہیں پڑھائی جاتی جبکہ بنگالی ادب کسی طرح بھی اردو ادب سے کم نہیں۔"
"ایک اعتبار سے تو وہ برتری کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ادب میں ملنے والا واحد نوبل پرائز ایک بنگالی شاعر ٹیگور کو ملا ہے۔ اس کی کتاب گیتانجلی پر۔" غالب نے کہا۔
"پھر یہ کہ اکثریت کی زبان کے علاوہ اکثریت کی حکومت میں کیا شرکت ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ شکایت کرتے ہیں تو جائز کرتے ہیں کہ سب کچھ تو مغربی پاکستان میں ہے۔ دارالحکومت، اسمبلی، سپریم کورٹ، تینوں افواج کے ہیڈ کوارٹرز، پی آئی اے اور بینکوں کے مرکزی دفاتر، سیکرٹریٹ۔ وہاں کیا ہے سوائے صوبائی اور علاقائی دفاتر کے۔"
"اس کے علاوہ یہ بیوروکریسی عوام کے ذہن میں بھی ایک بہت منفی رجحان کی ذمے دار ہے۔ مثلاً بنگالی بابو، بھوکا بنگالی، مچھلی بھات کھانے والا، یہ سب بڑے تحقیر آمیز انداز میں بولا جاتا ہے۔ انہیں ایک بزدل، کمزور اور نااہل، یہاں تک کہ غیر محبِ وطن کہہ دیا جاتا ہے۔ ان کی ثقافت کو ہندو ثقافت سمجھا جاتا ہے۔"
"حالانکہ یہاں کون سی مسلم ثقافت ہے؟" نازو بھی بولی۔
"بی بی! ثقافت کا مذہب سے نہیں، جغرافیائی حالات اور معاشرے سے تعلق ہوتا ہے۔ جب ہندو عورتیں پردہ کرتی تھیں یا ہندو گھرانے سب عید مناتے ہیں تو اس کا تعلق مذہب سے نہیں رہتا، اس ملک کی ثقافت سے اور تہذیب سے ہو جاتا ہے۔" غالب بولا۔
"پلیز چھوڑو یہ فضول بحث۔" نازو بولی۔
"یہ بحث فضول نہیں۔ حقائق ہیں جن کو ہم نظر انداز کرتے آئے ہیں۔ ان کو تسلیم کرنے میں سلامتی ہے ورنہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے ہم کب تک خوش فہمی میں مبتلا رہیں گے کہ خطرہ ٹل گیا۔ پھر بھی عزیزہ! تمہاری خواہش کے احترام میں ہم اس موضوع پر مزید بات نہیں کرتے۔" محسن نے کہا۔

"کیونکہ یہ بھی عقل کی باتیں!" غالب نے کہا۔
"تم نے مجھے یا عورت ہونے کی بنا پر ناقص العقل کہا تو میں تمہیں ناقص الجسم کر کے سمندر میں پھینک دوں گی۔" نازو برہمی سے بولی۔
"ضرور ضرور۔" محسن بولا۔ "نیک کام میں دیر کیسی۔"
نازو نے خلافِ توقع ایک دم پلٹ کے محسن کو اٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔ ظاہر ہے غالب کا دل باغ باغ ہو گیا اور اس نے بے اختیار ہنسنا شروع کیا۔
"آفرین ہے تم پر اے نازنین..."
بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ غالب بھی اڑتا نظر آیا اور سمندر میں محسن کے قریب جا گرا۔ وہ دونوں تیر کے لانچ پر پہنچے تو ایک دوسرے سے لڑائی جاری تھی۔
"اور ہنسو دوسروں پر!"
"تم نے ہی نیک کام کا مشورہ دیا تھا۔" غالب بولا۔ "لیکن ... تو خود گرو گے۔"
"تم بھی گرو گے اس میں۔" محسن بولا۔ "اور یہ گڑھا نہیں سمندر ہے جو میں نے نہیں کھودا۔"
"تم نے تو گڑھا ہی کھودا ہے تمام عمر۔"
میں اور نازو ان کے شرابور جسم اور پانی سے تر کپڑوں میں جھڑپ کا مزہ لیتے رہے۔ لانچ ہوا کے زور پر رواں رہی۔ ہم کیماڑی پہنچے تو شام ہو چلی تھی۔ سب غیر ضروری سامان ہم کھلے سمندر میں ڈال چکے تھے۔ کرنسی ابھی چھپا دی گئی تھی کہ شاید یہاں ضرورت پڑے۔ آگے کے لیے ہم نے یہی طے کیا تھا کہ جہاں بھی ہوں گے اپنے وسائل پیدا کر لیں گے۔ جب حالتِ جنگ میں ہوں گے اور دارالحرب میں تو جائز کیا اور ناجائز کیا۔
کشتی یا لانچ ابھی ساحل سے دور ہی تھی کہ ہمیں پہلے کسٹم حکام نے چیک کیا اور مطمئن ہو کے چلے گئے۔ پھر بحری پولیس والوں نے یہ معمول کی کارروائی کی۔ ہم جیسے لاتعداد مچھیروں کے گھر اور گھرانے سمندر کی دنیا میں آباد تھے اور ہم بھی اسی کا حصہ بن چکے تھے۔
کریم بلوچ کا تمام وقت کشتی کو صحیح سمت میں رواں رکھنے میں صرف ہوا تھا۔ شاید یہ جہاں کشتیوں اور لانچوں کا اژدہام تھا، اس سے کسی نے بلوچی میں کچھ کہا۔ مخاطب دوسری لانچ پر تھا مگر دونوں کے درمیان فاصلہ دو گز بھی نہ تھا۔ جواب میں کریم نے انکار کیا مگر پھر بھی بات ختم نہیں ہوئی۔
"آپ بتانا نہیں صاحب۔" وہ بولا۔ "تو ہم ایک کام کرے گا، تھوڑا فائدہ ہو گا ہمارا!"
"کیا کام ہے؟" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"اُدھر ایک جہاز پر سے کچھ مال اُترنا ہے۔" وہ بولا۔ "ہم تو وہ اس مال کو باہر نکالنے لگا، تب فکر مت کرو۔"

"کیا مال ہے؟ اسمگلنگ کا؟"

"اور کیا صاحب۔ ادھر کیا اگر بتی ملے گا۔" وہ بولا۔

"کتنا فائدہ ہوگا تمھارا؟"

"ہزار بھی ہو سکتا ہے۔"

"تم ہم سے ہزار لے لو لیکن کوئی خطرے کا اور غلط کام مت کرو۔"

"خطرہ کیسا صاحب! ایک دھندا ہے اپنا۔ دن کو جس کو موقع ملتا ہے کر لیتا ہے۔ ایسے ہم آپ سے ہزار کیا دو ہزار بھی لے لے گا تو... اچھی بات نہیں ہوگا۔"

"اور یہ اچھی بات ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا لیکن وہ اس کام کا عادی تھا اور جیسے شورت پینے والا جانتا ہی نہ جانا کہ صحت کے بارے میں سوچتا بھی نہیں ایسے ہی وہ بھی غلط کام کو مختلف مفہوم رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ صرف دھندا تھا۔

وہ مال بردار جہاز زیادہ بڑا نہیں تھا۔ جب لانچ اس کے قریب لنگر انداز ہوئی تو میں نے عرشے پر چند غیر ملکیوں کو ریلنگ کا سہارا لیے ساحل کا نظارہ کرتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں جام تھے اور وہ صرف نیکر پہنے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ جو خواتین تھیں وہ بھی مختصر لباس کے نام سے ہی ملبوس تھیں۔

"میں اس وقت چونکا جب ایک مرد نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہی وہ شخص ہے۔" وہ فرانسیسی بول رہا تھا۔

دوسرے نے فرنچ میں کہا۔ "کیا یہ بھروسے کے قابل ہوگا؟"

"اگر یہودی آدمی ہے۔" پہلے بھورے داڑھی والے شخص نے کریم بلوچ کو غور سے دیکھا۔

"اس کے ساتھ یہ کون بوڑھا شخص کون ہے؟ اس کا باپ؟" ایک ادھیڑ عمر عورت نے حقارت سے منہ بنا کے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" دوسرا ہنسا۔ "مگر وہ جو گدھے کے پٹھوں میں ایک عورت ہے، اس کے بارے میں یقیناً میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔"

"تم ہر جوان عورت کے بارے میں بہت کچھ کہہ سکتے ہو اپنی گندی زبان میں۔" نوجوان عورت نے افسوس سے کہا۔ "آخر اس معاملے میں تمھارا ذوق جنگلی کیوں ہو جاتا ہے؟"

"او ہو ڈیئر۔ حسد کی آنکھ سے مت دیکھو۔ اس کے میلے کپڑوں میں بھی دمکنے والے خوب صورت چہرے کو دیکھو۔ میں غیر جانبدار شخص کی حیثیت سے غیر جذباتی تبصرہ کر رہا ہوں۔"

"ایسا کرنے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے۔"

کریم بلوچ نے کشتی کو اب جہاز کے ساتھ ملا دیا تھا۔ بھورے داڑھی والے نے پلٹ کر کسی کو آواز دی۔ اندر سے ایک موٹا تازہ پوش نو ملازم برآمد ہوا۔

"سلام دو سلام۔" بھورے داڑھی والا خنکی سے بولا۔ "مگر اور تم ... نہیں ہونا چاہیے۔"

"جی... وہ ہم آ گئے۔" اس شخص نے کہا جس کا نام غالباً صمد تھا۔ عبدالصمد مگر وہ صمد میاں کہلاتا تھا۔ "ہمارے صاحب نماز پڑھ رہے تھے۔"

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

بھورے داڑھی والے نے کہا۔ "اس کا وہ بدبخت آقا اپنی عبادت میں مصروف ہے۔"

"ابھی سے؟ کیوں؟ ابھی شاید وہ رات کو اور سورج غروب ہونے کے بعد بھی وہ یا خدا سے جنت مانگتا ہوا شخص ہے۔"

"او وہ تو میں اتنا وقت نہیں دے سکتا۔" بھورے داڑھی والے نے کہا۔ "اسے جو دعا مانگنی ہے، مانگ لے ابھی۔"

ان الفاظ پر میرا اور محسن کا چونکنا ایک قدرتی ردعمل ہوگا۔ ہم اپنے اس کردار میں صرف لاعلمی اور حماقت کا مظاہرہ کر سکتے تھے اور یہ ظاہر کر سکتے تھے کہ ہم کچھ نہیں سمجھے۔

بدبخت آقا پانچ منٹ کے بعد نمودار ہوا تو میں اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مرچنٹ نیوی کی یونیفارم میں تھا لیکن چہرے مہرے سے پکا پاکستانی ہی لگتا تھا۔

"صمد میاں! تم جاؤ اندر۔" اس نے تحکمانہ انداز میں کہا اور وہ بنگالی پھر آگیا۔ صمد وہ سر ہلاتا رہا اور پھر اندر چلا گیا۔

"اس سے اردو میں بات کرو۔" بھورے داڑھی والا بولا جو شاید یہی زبان سمجھتا تھا۔

"سوری۔ میں عادتاً بولنے لگتا ہوں بنگالی۔" بدبخت آقا نے فرانسیسی میں کہا۔

"تم اپنی عادت بدلو۔" دوسرے نے فرنچ میں کہا۔ "تم کیا کر رہا تھا...؟"

"لعنت بھیجو اس پر جو تم کہہ رہے تھے۔" بھورے داڑھی والا بولا۔ "یہ اپنی فیملی کے ساتھ آیا ہے... تو نہیں ہے۔ اس سے بات کرو۔"

"اور مسٹر روپ کمار۔ یہ مت بھولنا کہ سب ... ہیں۔ سب تمھارے ہمارے ... تم اپنے ... سے ... ہمارے لیے نہیں۔"

"میں اپنی ذمے داری کو سمجھتا ہوں جناب۔" مرچنٹ نیوی کے اس افسر نے کہا جس کو روپ کمار کہہ کے مخاطب کیا گیا تھا۔

پھر وہ کریم بلوچ سے مخاطب ہو گیا۔

"اے... تم کیا مانگتا...؟"

"صاب! وہ سامان لینے کو آیا ہے ہم..."

"تو یہ سب لوگ کس کا واسطے لایا ہے؟" روپ کمار نے جتنے ہم سب کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ سب اپنے گھر والے ہیں صاب۔ اسی کشتی پر رہتے ہیں۔" کریم بلوچ نے عاجزی سے کہا۔ "ان کو کہاں چھوڑتا؟"

"ہم نہیں جانتا تم کو۔ بھاگ جاؤ ادھر سے۔"

"ہم نیم بلوچ کا چھوٹا بھائی ہے صاب۔" کریم بلوچ نے عاجزی سے کہا۔ "وہ بیمار پڑ گیا تو اس نے مجھ کو بھیج دیا۔"

"کیا ثبوت ہے کہ تم بھائی ہے اس کا؟"

"صاب اور کسی کو وہ بات کیسے معلوم ہو سکتی ہے جو صرف ہم کو معلوم ہے کہ جو کیا سے جاتا ہے اور کہاں سے جاتا ہے؟ اور اس کا معاوضہ کیا ہوگا۔" کریم بلوچ نے کہا۔ "لیکن یہ بات میں اور آگے نہیں کہہ سکتا ہوں۔ ان سب کے سامنے نہیں۔"

اس بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ روپ کمار نے بھورے داڑھی والے سے فرنچ میں بات شروع کی۔ "آدمی تو اپنا ہی ہے اور بھروسے کے قابل لگتا ہے۔ دوسرے کے ساتھ فیملی ہے، اس کی فکر نہیں۔ ہمیں بھی سامان کے متعلق کچھ نہیں معلوم۔ وہ کہتا ہے کہ اسے اوپر بلا کے تصدیق کر لی جائے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اسے بلاؤ اور پھر اس کے ساتھ ہی دفع ہو جاؤ۔" بھورے داڑھی والے نے کہا۔

اوپر سے ایک رسی کی سیڑھی لٹکا دی گئی جس کو پکڑ کے کریم بلوچ جہاز کے عرشے پر پہنچ گیا۔ دونوں خواتین جہاں بیٹھی تھیں یا ساتھ ہو بھی ہو سکتی تھیں اور کسی رشتے کے بغیر بھی، جوان اور بوڑھے مرد کی ہمسفر ساتھی بھی اب اندر جا چکی تھیں۔

"یار محسن! یہ معاملہ گڑبڑ ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ میں نے سب سنا۔" محسن بظاہر جال کو پھیلا کے اس کے پھندے چیک کر رہا تھا۔ "یہ روپ کمار کیا کر رہا ہے یہاں؟"

"فراڈ۔" میں نے کہا۔ "اس نے ہماری مرچنٹ نیوی کے لبادے کا ناجائز فائدہ اُٹھا رکھا ہے۔"

"اسے واقعی ماں سے پہلے سزائے موت ہو جانی چاہیے۔ یہی کتنا افسوس کا مقام ہے کہ ہم نے ہندو ہونے کے باوجود اس کے ساتھ بھیڑوں والا سلوک نہیں کیا، اچھے کیریئر کی راہ میں اس کے مذہب کو رکاوٹ نہیں بننے دیا اور سب کے ساتھ ترقی کرنے کے مواقع فراہم کیے۔ یہاں کی معاشرے میں عزت کے ساتھ رہا لیکن وقت بدلا تو اس نے نمک حرام ثابت کیا خود کو۔" محسن نے یہ ساری بات اپنی اداکاری کے ساتھ کی۔ بظاہر ہم یہی کرتے رہے کہ ہم جال کو چیک کر رہے ہیں اور ہماری گفتگو بھی اسی بارے میں ہے۔

غالب جو پہلے کچھ نہیں سمجھا تھا، ہماری بات پر چونکا ہوا اور ہمارے قریب آ کے یوں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا جیسے وہ بیمار جتنا بازی سے بیزار ہے۔ اس نے ایک بار سر اٹھایا اور چیخ کر نائلہ سے کہا۔

"اوپر عرشے دکھائی پھر رہی ہے سب کو چل نیچے۔"

اور نائلہ نے چیخ کے کہا۔ "تم نیچے چلی جاؤں تاکہ تو دیکھتا رہے اس نیم کو جسے شرم نہیں آتی نیکر پہنتے۔"

"جاتی ہے یا...؟" غالب جارحانہ انداز میں اٹھا اور نائلہ فوراً وہاں سے فرار ہوگئی۔ غالب پھر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ اس ایک ایکٹ کے مختصر ترین ڈرامے نے ہمارے کرداروں میں حقیقت کا رنگ بھر دیا۔ روپ کمار سے غیر ملکیوں کی گفتگو میں چند سیکنڈ کا وقفہ آ گیا تھا۔ روپ کمار مسکرایا۔ پھر اس نے میاں بیوی کے جھگڑے کا سبب بتایا تو عورتیں بھی کھلکھلا کے ہنس پڑیں۔

"ایسے ہی لڑتے رہتے ہیں یہ صاب۔ اس کا گھر والا بہت چرس کا نشہ کرتا ہے صاب۔" کریم بلوچ نے کہا۔

"اس سالے روپ کمار کو دیکھو کیسا فراڈ کر رہا ہے۔ داڑھی لگا رکھی ہے اس نے اور خود کو مسلمان ظاہر کرتا ہے۔" غالب سر اٹھائے بغیر بڑبڑایا۔ "ابھی نماز پڑھ رہا تھا۔"

"نام روپ کمار اور نماز!"

"اے یار! یہ غیر ملکی کیا جانیں ناموں کے فرق کو۔ کیا ہم انگلش ناموں سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ برطانوی ہے یا فرانسیسی یا امریکن۔ اور وہ رومن کیتھولک ہے یا پروٹسٹنٹ۔"

"یہ دونوں فرانسیسی کیا چکر چلا رہے ہیں؟" محسن بولا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "روپ کمار جائے گا تو ہمارے ساتھ ہی۔"

اسی وقت کریم بلوچ عرشے پر نمودار ہوا۔ اس نے چیخ کر ہمیں متوجہ کیا۔ "بابا! اوپر بھیج بھاری سامان ہے۔"

"میں نے غالب کو لات ماری۔ "اٹھ چرسی! کوئی کام کر۔"

غالب نے سر اٹھایا۔ "تو خود چلا جا، مجھے سونے دے۔"

"اچھا مرو۔" میں نے آگے کو جھکنے کے انداز میں گالی دیتے ہوئے کہا۔ "جو کرے گا تیرا بھائی کرے گا۔"

محسن نے میرے اشارے کا مطلب سمجھا اور رسی کی سیڑھی سے اوپر جانے کے لیے دھوتی کسنے لگا۔

"میں اس کو بہت ترجیح دوں گا اگر یہ بدبخت غدار آدمی

www.paksociety.com

واپس ہی نہ آسکے۔" بھوری داڑھی والا بولا۔ "اس کی کشتی ڈوب جائے۔"

"لیکن وہ واپس آئے گا۔" نوجوان بولا۔ "تم اُسے کیسے مارو گے؟"

"مارنے کے طریقے تمہیں نہیں آتے؟" بھوری داڑھی والا طنزیہ انداز میں بولا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے اس سودے میں ہمیں کتنا فائدہ ہوا؟"

"ہاں تم نے ہی بتایا تھا کہ ہمیں ہزاروں زیادہ وصول کرنے میں کامیاب رہے۔"

"لیکن کیا تم یہ جانتے ہو کہ اس شخص نے اتنا پیسہ کیسے دیا اور کیوں دیا؟"

"نہیں۔ مجھے کیا سروکار تو نہیں ہونا چاہیے ایسی باتوں سے مگر پھر بھی۔ کیا تم جانتے ہو؟"

"ہاں۔ ان کے ملک میں خانہ جنگی چل رہی ہے۔ ایک صوبے کی جنگ ہو رہی ہے دوسرے صوبے سے۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے۔"

"دونوں کے درمیان ایک دشمن ملک ہے جو اس جنگ سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا ہے۔"

"دشمن ہو گا تو فائدہ کیوں نہیں اٹھائے گا اور نقصان کیوں نہیں پہنچائے گا؟"

"دشمن ہے، یہ خود کو مسلمان ظاہر کرتا ہے مگر میں جانتا ہوں کہ مسلمان نہیں ہے بلکہ ہندو ہے۔" بھوری داڑھی والا بولا۔ "اس احمق کو سوچنا چاہیے تھا کہ جب میں ان کی زبان سے واقف ہوں تو تھوڑا بہت کچھ تو جانتا ہوں گا۔"

"تم کو اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہیے تھا۔ یہ خطرناک معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں نے زندگی میں زیادہ خطرناک کام کیے ہیں۔"

"کیے ہوں گے اور بچتے بھی رہے ہو گے اسی لیے تم میں یہ اعتماد پیدا ہوا کہ تم خطرات کو نظر انداز کرنے لگے ہو۔" جوان آدمی نسبتاً زیادہ دور اندیش تھا۔ "مگر یہ ایک ملک کا نہیں، عالمی سیاست کا مسئلہ ہے اور ہم خواہ مخواہ کسی ایک فریق کا ساتھ دینے کے مجرم بنے۔"

"مجرم وہ ہوتا ہے جو پکڑا جائے۔ ہم سامان تجارت لاتے رہتے ہیں۔ ہماری گزر بسر بہت اچھی ہے۔ مالک ہم پر اتنا بھروسہ کرتے ہیں کہ خدانخواستہ ہم پر الزام آئے تو وہ یقین نہیں کریں گے اور کیا ہمیں آزمائش کی بچائیں گے۔"

"مجھے ہیں ہزار ڈالر اتنے زیادہ نہیں لگے کہ میں اپنی زندگی کو داؤ پر لگاؤں۔"

"مجھے ہیں ہزار ڈالر کم نہیں لگتے۔ انسان کی ساری زندگی بہتر گزر سکتی ہے تم سوچ ہو تو۔" بھوری داڑھی والے نے نوجوان کا شستر

اُڑانے کے انداز میں کہا۔ "مگر مجھے معلوم ہے کہ تم کو بھی اچھے دنوں کے لیے پیسہ چاہیے۔"

کریم بلوچ کے ساتھ اسی وقت محسن ایک بھاری بنڈل اٹھائے نمودار ہوا۔ گتے کا ایک باکس تھا جس کے چاروں طرف ٹیپ سے تیرکی پیٹ دی گئی تھی۔ ڈبے پر مختلف نشانات تھے۔ کوئی نشان اس کے بیچ میں سے لکھے تھے۔ کیمرے کے پُرزہ جات کو بارش، دھوپ اور پانی سے بچانے کے لیے پیک کیا گیا تھا۔ کیمرہ نازک چیز ہوتا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ جانے والی چیز ہے۔ ڈبے پر کیمرہ استعمال نہ کرنے کی ہدایت بھی درج تھی۔ اتنا ہی بڑا باکس کریم بلوچ کے پاس تھا۔ صمد میاں دھوتی سنبھالے ہوئے دروازے تک آئے جو ان کے اپنے وزن سے ڈگمگا رہا تھا۔ وہ کسی شرابی کی طرح ڈگمگا رہے تھے۔ روپ کمار آخر میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا جس کو اس نے کلائی کے ساتھ ہتھکڑی کے ذریعے جوڑ رکھا تھا۔ اس نے باری باری ان دونوں سے ہاتھ ملایا جو عرشے پر کھڑے صرف دیکھ رہے تھے۔

"تم تو ایسے جا رہے ہو جیسے واپس نہیں آؤ گے۔" نوجوان بولا۔

"تب آؤں گا۔ ابھی وہ دشمن سمجھتے ہیں۔" وہ بولا۔ "بس میں چاہتا ہوں یہ ڈیلیوری میرے سامنے ہو جائے۔"

"خدا کرے ڈیلیوری کسی پریشانی کے بغیر ہو جائے۔" نوجوان شوخ لہجے میں بولا اور ہنسا۔

محسن اب بوٹ کی سیڑھی سے نیچے اتر آیا تھا۔ مجھے بھی مزدوری نہیں کرنی تھی لہٰذا اس بوجھ کو اٹھا کر لانے میں مجھے کچھ مشقت کرنا پڑی۔ صمد میاں آخری وقت میں تقریباً لڑھک گئے تھے مگر میں نے انہیں سنبھال لیا۔ اس کے بعد آنے والا روپ کمار بنگالی زبان میں چلانے لگا۔ مطلب تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ انداز سب کی طرح میں نے بھی کر لیا کہ وہ ہونے والے نقصان پر خفا ہو رہا تھا جو صمد میاں کے گرنے کی صورت میں ہوتا۔

"ابھی سامان نیچے رکھوا دو اور چلو۔" روپ کمار نے حکم دیا اور اکڑ کر آگے چلنے لگا۔ کریم بلوچ اور محسن پیچھے لے گئے۔ چند منٹ کے وقفے سے میں نے غالب کو اشارہ کیا اور وہ پیچھے اتر گیا۔ ایک قدم پیچھے گیا۔

"تم کیا دیکھتا ہے؟" روپ کمار نے غالب سے کہا۔

"اللہ کی قدرت کو۔" غالب نے کسی صوفی کی طرح کہا۔ پھر اس نے آنکھ بند کی اور پھر اس کا پنچ۔ باری باری اس کی نگاہ روپ کمار اور صمد میاں پہ گئی۔

"کیا بکواس کرتا ہے۔" روپ کمار کا پارہ چڑھ گیا۔

"چھوڑیں مولانا صاحب۔" میں نے کہا۔ "یہ نشے میں ہے۔"

"کس طرح؟"

"پوچھو! ہماری طرح۔ ہم نشے میں ہیں سب۔ بڈھا بھی، تم خود نشے میں۔ ہم سب نشے میں ہیں۔" میں نے کہا لیکن اس بار فرق یہ تھا کہ کسی کو شراب کا نشہ ہے، تو کسی کو دولت کا، اقتدار کا اور حسن کا۔ یا پھر چاپلوسی کا۔ مولوی روپ کمار..."

پیچھے وہ بجلی گرنے سے مفلوج ہو جانے والے شخص کی طرح کھڑا رہا۔ پھر اس نے داہنا ہاتھ کو تیزی سے حرکت دینی چاہی مگر بے کار تھا۔ پیچھے نازو کھڑی تھی۔

"ارے مولوی!" اس نے یک دم روپ کار کی کلائی پہ ہاتھ مار دیا۔ "پہلے دیہ اندر کے مال کو اندر۔ ہم خود نکال لیں گے سب۔"

روپ کمار بلبلا اُٹھا۔ اس کا روپ کی جیب میں ہاتھ پڑ چکا تھا۔ اس نے خود کو بچانے کی کوشش میں ہتھکڑی اور بریف کیس والے ہاتھ سے نازو پہ وار کرنا چاہا مگر نازو نے اس کی پنڈلی پر ایک لات رسید کی۔ اس کے دونوں قدم اکھڑ گئے اور وہ دروازے کی دہلیز کے قریب فرش پہ گرا۔

کریم بلوچ نے اسی وقت لانچ آگے بڑھا دی تھی اور اس کے دونوں انجن گرج رہے تھے۔ روپ کمار نے چلانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اپنا پاؤں جوتے سمیت اس کے منہ پر جما دیا۔ وہ تڑپا مگر اٹھ نہ سکا۔ نازو نے اس کی جیب سے نکالے ہوئے نوٹ ان کے سامنے دکھائے۔

"کیا ہے حوالگی؟ شہادت حاصل کرنے کا آلہ؟"

"دو دھوتی پوش ادھر ہے۔" مجھے اچانک صمد میاں کا خیال آیا۔

"وہ غائبانہ طور پہ بے ہوش ہو گیا ہے۔" محسن بولا۔

"خطرہ بھانپ کر اس کے سر پہ ڈنڈا مارا تھا۔" غالب نے آگے بتایا۔

"تم کریم بلوچ پہ نظر رکھو۔" میں نے محسن سے کہا۔ "کدھر جا رہے ہو؟"

"سامنے ہیں تو کچھ نہیں بتایا تھا۔" غالب بولا۔

وہ کیا بتاتا۔ تجربہ کار تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم نے بڑھاپے تک بہت فرق یکھ لی تھی۔ یہاں کون جانتا ہے فرق کیا ہے۔ لکھ پتی تو ہر شخص کو بتا سکتے تھے اس لیے صمد میاں سے گفتگو بے مصرف ہے۔ میں نے بیچ بتایا اور پیچھے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔

دونوں دشمن سے صاف نکل گئے تھے۔ اس کے سامنے والے دو انتظار میں تھے اور ناک سے خون جاری تھا۔

"تم... کر رہی ہے؟" وہ چیخ کر بولا۔

"پہلے آپ تعارف کرا دیں اپنا۔" غالب نے کہا۔ "خواب سے پہلے تو اپنا اسم بتائیں، اصل ولدیت کی بنیاد آپ کو خبر ہو۔"

وہ کچھ دیر کشمکش میں رہا اور خوف میں مبتلا کھڑا رہا۔

"پھر یہ بتائیں ان ڈبوں میں کیا ہے؟ کس کے لیے ہے؟"

"وغیرہ وغیرہ۔" غالب بولا۔

"اور یہ بریف کیس؟" نازو نے کہا۔

"اسی اندر ہو۔" غالب نے کسی مجذوب دیہاتی کی طرح چٹکلا سنا کر کہا۔ "چاہو تو اللہ بریف کیس کی چابی... وغیرہ کہ جانے ہے یہاں۔"

"تو کیا اپنے سر پہ مار کے کاٹ کر لے آئے؟" نازو نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

"اس کی ہاتھ کاٹوں گا اس کا بچہ رہے گا۔" غالب نے کہا۔ "یہ بریف کیس بھی تو ایسے ہی کھلے گا؟"

"دیکھو خدا کے لیے..." روپ کمار بولا۔

میرا ہاتھ اتنی تیزی سے گھوما کہ روپ کمار دیکھ بھی نہ سکا۔ وہ پھر تھپڑ کی آواز کے ساتھ ہی پیچھے گر گیا۔ اسی وقت لانچ کے انجن بند ہو گئے۔

"تم دو بار خدا کا لفظ استعمال کیا۔ بھگوان بہ آتا تو کچھ بھی کہو۔" میں نے کہا۔

وہ درمیان کا آدمی تھا جس کا مقصد کسی بھی سودے سے اپنا کمیشن وصول کرنا ہوتا ہے۔ اس کی پیشہ ورانہ جیالی کا جذبہ نہیں تھا اور جذباتی مزاحمت کی صلاحیت بھی نہیں تھی۔ اس نے ابھی پہلے نصف رقم بطور رشوت پیش کی اور مزید مار کھا کر سب جلد اس نے سب کچھ بتا دیا۔

ڈبے کے اندر لانگ میڈیم اور شارٹ رینج ٹرانسمیٹرز تھے۔ سائیکلو اسٹائل مشین تھی جس پر شرانگیز مواد چھاپ کے تقسیم کیا جاتا اور ڈی کوڈ کرنے والی مشین تھی جسے صرف سائفر ایکسپرٹ ہی آپریٹ کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ چھوٹے چھوٹے خطرناک آلات تھے جو باہر ہی سے اسمگل کیے جا سکتے تھے مثلاً ٹائم فیوز، پلاسٹک وائر، نالی خفیہ مقامات پر نصب ہونے والے مائیکروفون اور بگ کہتے ہیں۔ یہ سب ایک تیسرے ملک کی معرفت مشرقی پاکستان بھیجا گیا تھا لیکن اس کھیپ کو بھیجنے کے لیے پاکستان کی بندرگاہ استعمال کی جا رہی تھی اور اس کام میں مدد کرنے والے وہ غدار تھے جنہوں نے جیروں کی طرح کبھی اس ملک کے وجود اور اس کی نظریاتی اساس کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔

صمد میاں جب ہوش میں آیا تو مرغ بسمل کی طرح قدموں میں لوٹنے لگا۔ "ہم کو معاف کر دو غلطی کیا ہم۔ ہم سودہ جادو باپ..." کہتے۔

www.paksociety.com

کرتا ہے۔"

وہ ایک انسانیت گرا ہوا آدمی تھا جس میں خود غرضی نام کی چیز تھی ہی نہیں۔ اس کے نزدیک [illegible] کو اور ماں باپ کو گالیاں دینا اور ہاتھ پیر جھٹک کے جان بچانے کی کوشش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وہ ابھی اپنے اختیار میں تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کی حالت اور اس کی گریہ وزاری دیکھ کر پسیج جاتا مگر ہم نے تقریباً اس کو نازو کے سپرد کر دیا۔

نازو نے پہلے تو اسے اپنی مشاقی کے کرتب دکھا کے خاصا دہشت زدہ کیا پھر اس پر واضح کیا کہ وہ صمد میاں کا بھی اسی طرح چورا کر سکتی ہے جیسے خشک ہڈیوں کو مٹھی میں دبایا جائے تو وہ چور چور ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ اسے اوپر لے گئی تاکہ اس سے علیحدگی میں معلومات حاصل کر سکے۔

محسن نے باری باری ڈبے کھولنے شروع کیے۔ ان میں بیشتر اشیاء الیکٹرانکس اور جرمنی کی بنی ہوئی تھیں۔ میں نے [illegible] کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی ڈبے میں ایسا بم ہو جو کھولتے ہی پھٹ جائے۔

غالب واپس آیا تو ہنس رہا تھا۔ "اس صمد میاں کو دیکھ کے مجھے میاں خوجی کا کردار یاد آتا ہے۔"

"اپنا زمانہ بھی تو تھا استاد جی جب ہم مذاق میں میاں خوجی کہتے تھے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"نازو نے اسے بادبان والے مستول کے ساتھ الٹا لٹکا رکھا ہے۔ بالکل مردہ چوہے کی طرح جھول رہا ہے۔" غالب بولا۔

"اسے کرنے دو اپنا کام۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ ہم ہیں کہاں؟"

"ساحل سے کافی دور، میرا خیال ہے چار پانچ میل کے فاصلے پر۔ قریب میں کوئی جہاز یا لانچ نہیں ہے۔"

"کریم طوطے نے کیا بتایا؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" غالب نے کہا۔ "یہ کام اس کے بھائی نے لیا تھا مگر وہ اچانک بیمار ہو گیا۔ اس نے دوسرے ساتھی سے کہا کہ وہ کچھ کمانا چاہے تو موقع ہے لیکن کام آسان نہیں ہے۔ اس میں خطرہ بھی ہے۔ اس شخص نے پہلے تو ہامی بھر لی مگر بعد میں ڈر گیا اور ابھی جب تم آئے تھے تو اس نے کریم طوطے سے کہا کہ وہ رحیم طوطے کا کام نہیں کر سکتا۔ کریم کو کچھ معلوم نہیں تھا چنانچہ اس نے بلا جھجک یہ کام لیا ہے۔ دو ہزار روپے ملنے کی [illegible] کر کے وہ تیار ہو گیا۔"

"کہاں لے جانا تھا اسے یہ مال؟"

"اسے خود معلوم نہیں۔ یہ تو مال کے ساتھ جانے والا شخص بتاتا مگر جب ہم نے اسے پکڑ لیا تو کریم طوطا ٹھٹک گیا۔ اسے جہاز پر محسن نے بھی اشاروں میں سمجھا دیا تھا کہ [illegible] چنانچہ وہ اپنا کام کرے اور ہم کچھ بھی کریں، وہ خاموش رہے۔"

"لیکن کھلے سمندر میں وہ اب کدھر جا رہا ہے؟"

"کہیں نہیں۔ بس وہ بندرگاہ کے علاقے سے نکل آیا ہے اور احکامات کا منتظر ہے۔" غالب نے کہا۔

"اسے دو ہزار دلوا دو۔" محسن بولا۔ "اور [illegible] کشتی کو کہیں رکے۔ زیادہ دور بھی نہ جائے اور [illegible]"

"وہ میں نے سمجھا دیا ہے۔ وہ خود بھی سمجھدار ہے۔ [illegible] کہہ رہا تھا کہ بیگم صاحب کو بولو یہ تماشا جلدی کریں۔"

"بات تو ٹھیک تھی اس کی۔ دور سے بھی [illegible] دیکھ [illegible] اگر اس نے دور بین لگا رکھی ہو۔" محسن بولا۔ "تم نے سمجھا [illegible]"

"نہیں۔" غالب دانت نکال کے بولا۔ "[illegible] میں نیچے چلا جاؤں تو تم خود جا کے بات کرنا اور [illegible]"

"کیوں بیچارے کریم کو خواہ مخواہ چھوا ڈے۔" محسن بولا۔

روپ کمار اب ادھ موا ہو چکا تھا۔ اس لئے [illegible] اسے مالکن کے سپرد کرنا تھا۔

"دیکھو روپ کمار، پانچ منٹ میں فیصلہ کر لو [illegible] یہ سب کس کے لیے جا رہے تھے؟"

"مجھ سے ایک شخص نے بندرگاہ پر ملاقات کے [illegible]" وہ فرانسیسی میں بولا۔

"اس کا نام... حلیہ...؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ اس نے کہا تھا کہ وہ خود مجھے پہچان لے گا۔"

"بندرگاہ تو میلوں تک پھیلی ہوئی ہے!"

"اس نے روڈ نمبر بیس کے آفس کے پاس آنے کو کہا تھا۔"

میں نے ایک بار پھر پولیس اسٹائل میں [illegible] لگائی جس کے بعد وہ [illegible] ہونے کے قابل بھی نہیں رہا۔

"تم روڈ نمبر بیس سے بہت دور تھے اور تم نے کشتی والے سے کہا بھی نہیں تھا کہ روڈ نمبر بیس کی طرف جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم... تم نے مجھے موقع ہی کب دیا۔" وہ بولا۔

"کیا اب ہم روڈ نمبر بیس کے آفس کی طرف چلیں؟ [illegible]"

"ہم یہ حلیہ تبدیل کر لیتے ہیں۔ ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں [illegible] تم پر نظر رکھیں گے۔ ورنہ کا مطلب ہے چند گز کے فاصلے [illegible] وہاں ہم جیسے تو سیکڑوں پھر رہے ہوں گے۔ تم کو جانے والا آئے گا تو تم اس سے ہاتھ ملا کے صرف یہ کہنا [illegible] گیا ہے۔ باقی کام ہم کر لیں گے۔"

"وہ مجھے مار ڈالیں گے!"

"ہم بھی تمہیں مار ڈالیں گے۔" میں نے کہا۔ "[illegible] تو تھوڑا سا جینے کا موقع بھی دے دیں گے تمہیں [illegible]"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"تو ہم تمہیں ساحل سے پانچ میل دور لے جا کے پانی میں پھینک دیں گے۔ آگے جو تمہاری قسمت۔ تم تیر کر ساحل تک پہنچ جاؤ یا کوئی [illegible] دوسری صورت میں کوئی چانس نہیں ہے۔ ہم تمہیں [illegible]" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اس کشتی والے سے کہو روڈ نمبر بیس پر چلے۔" روپ کمار بولا۔

"بریف کیس ہمارے حوالے کر دو۔" محسن نے کہا۔

"یہ [illegible] غلط ہے۔ تمہارے اور ہمارے درمیان ایسی کوئی [illegible] نہیں ہوئی۔" وہ [illegible] "[illegible] خطرہ مول لیا ہے۔"

"کیا تم واقعی چاہتے ہو کہ ہم تمہاری کلائی کاٹ دیں؟" میں نے [illegible] کہا۔ محسن نے [illegible] کے قریب پڑی ہوئی چھری مجھے پکڑا دی۔

"کیا ہے اس میں؟ [illegible] بیس ہزار ڈالر؟" میں نے کہا۔ "روپ کمار [illegible] میں آخری موقع دیتا ہوں۔"

"اس کی چابی نہیں ہے میرے پاس۔" وہ چلانے لگا۔ "[illegible] کیا تم بھی ایسا کر سکتے ہو؟"

مجھے اس پر یقین آگیا۔ زنجیر کو کاٹنا مشکل کام تھا لیکن بریف کیس کو توڑنے کے لیے کسی سے کوئی بندوبست کرنے [illegible] محسن ایک سلاخ اٹھا کے لایا۔ عام بریف کیس [illegible] ٹوٹ جاتا مگر یہ ماہر کا بنا ہوا مضبوط [illegible] کا بریف کیس تھا [illegible] غالب نے [illegible] محسن نے بریف کیس کے تالے پہ وار کیے تو اس [illegible] پرخچے اڑ گئے پھر بریف کیس کھل گیا۔

اندر بیس ہزار ڈالر کے نوٹ نہیں تھے۔ پرانے اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی، جس کے گرد مضبوطی سے [illegible] اس پیکٹ کی موٹائی ایک بالشت [illegible] اور لمبائی چوڑائی بریف کیس کی اندرونی سطح کے برابر تھی اور یہ پیکٹ پلاسٹک کے لفافے میں رکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے اس احتیاط کا مقصد [illegible] کو نمی سے بچانا ہی ہو سکتا تھا [illegible] جب محسن نے وہ پیکٹ کھولا [illegible] پیکٹ تھے [illegible] دیکھنے [illegible] محسوس ہوتے تھے۔

روپ کمار کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اس کے ساتھ دھوکا ہوا [illegible] مشکل ہو رہا تھا [illegible] اس نے [illegible] بریف کیس لے لیا تھا [illegible] وعدے کے مطابق دی جانے والی رقم ہے۔ یہ ایک [illegible] سانحہ تھا جو قدرت نے اسے سکھایا۔ ایک قوم نے اس پہ اعتماد کیا تھا مگر اس نے قوم کو دھوکا دیا۔ دوسری قوم کے صرف چند افراد نے اس کے اعتماد کی ایسی تیسی کر دی۔ [illegible]

جب ہم نے [illegible] تو وہ [illegible] ہو گیا۔ [illegible] معاشرے کی گالیاں دینی شروع کر دیں جو ایک مہذب قوم کے افراد تھے اور ایمان داری، دیانت داری، اصول پرستی [illegible] جیسی چیزوں [illegible] تھے۔ اس معاشرے سے تعلق رکھتے تھے جہاں [illegible] سیلف سروس تھی اور [illegible] کوئی [illegible] نہیں کرتا تھا [illegible] اخبار لفافے میں ڈال لے خواہ کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو۔ جہاں اخبار فٹ پاتھ پہ رکھ دیے جاتے تھے اور لوگ پیسے رکھ کے اپنی مرضی کا اخبار اٹھا لیتے تھے۔ [illegible] کوئی پیسے اٹھائے یا اخبار مفت میں لے جائے۔ جہاں [illegible] کا تصور نہیں تھا اور کریڈٹ کارڈ، چیک، اُدھار سب نقدی کی طرح اعتماد کے ساتھ قبول کیے جاتے تھے۔

"اسے کہتے ہیں پیسے کو پیسا۔ روپ کمار، تم نے سب کو دھوکا دیا۔ ملک کو، قوم کو، مذہب کو اور خدا کو، اپنے [illegible] اپنے ضمیر کو اور تقدیر نے تمہیں کہاں لا کے دھوکا دیا۔ جہاں تم دھوکا دینے سے بھی بدتر ہو گئے۔ نہ تم ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ کیا کیا تم نے سب کچھ گنوا دیا؟"

غالب [illegible] "ہاں تم کچھ تلافی بہر حال کر سکتے ہو اگر ہم سے تعاون کرو۔"

"ہاں تم کسی کی زندگی بچا سکتے ہو۔" محسن نے کہا۔

"ان سے بدلہ لے سکتے ہو جنھوں نے تم کو دھوکا دیا اور اس کام میں ہم تمہاری مدد کریں گے کیونکہ وہ ہمارے بھی دشمن ثابت ہو چکے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ممکن ہے تمہیں ڈوبی ہوئی رقم مل جائے۔" غالب نے کہا۔

"پھر تم خود ڈوبنے سے بچ جاؤ اور کہیں چھپ چھپا کے نکل جاؤ۔"

"یہ چانس مفت میں پڑے گا تم کو روپ کمار۔"

"اور تم وعدہ کرتے ہو کہ مجھے مارو گے نہیں؟" وہ کچھ پُر امید نظر آنے لگا۔

"ہم اپنے ہاتھ تمہارے ناپاک غدار خون سے رنگنے کے بجائے تمہیں سمندر کے سپرد کر دیں گے۔ اب یہ سمندر کی مرضی کہ وہ تم کو نگل لے یا غلاظت سمجھ کے اگل دے۔" محسن نے کہا۔

"ہم وعدے کے مطابق تم کو پانچ میل دور سمندر میں زندہ سلامت پھینک دیں گے۔ شرط وہی ہے کہ تم اس شخص کی نشاندہی کر دو جس کے حوالے تمہیں یہ مال کرنا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔" وہ بولا۔

"کریم سے کہو واپس چلے۔" میں نے غالب کو اشارہ کیا۔ وہ

www.paksociety.com

پیشانی پھیلا کر اوپر سے نازو اچھل کر جاگ اٹھی۔

"کیا ہوا؟" غالب نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ خدا کرے کہ کچھ نہ ہو۔" وہ بولی۔

"صمد میاں...؟"

"وہ اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔" نازو نے یوں سرسری لہجے میں کہا جیسے یہ کوئی قابل ذکر بات ہی نہیں تھی۔

"یعنی اتنی آسانی سے مار دیا؟" غالب خفا ہونے لگا۔

"میں نے نہیں مارا۔ وہ خود مر گیا۔ اس کی قضا آگئی تھی۔"

"نازو کے ہاتھ میں۔" غالب بولا۔

"میں نے ذرا سے تھوڑا سا جھٹکا تھا۔" نازو بے بسی سے بولی۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کی گردن اتنی کمزوری سے جڑی ہوئی ہے۔"

"چلو جو ہوا سو ہوا۔ اب کہاں ہے وہ؟ وہ یہیں کہیں پڑا ہے؟" غالب نے پوچھا۔

نازو نے نفی میں سر ہلایا۔ "پھینک دیا سامنے سمندر میں۔"

یہ سب گفتگو سن کے روپ کمار کی حالت مزید غیر ہو گئی۔ اسے تب جب میں خود کو ہمت سے بیٹھنے کے لیے اوپر گیا کہ اب آتی لوٹ کر بندرگاہ کی طرف جانا ہے تو کشتی نے صمد میاں کو عرشے پر لیٹا ہوا دیکھا۔ نازو نے اس پر ایک ترپال ڈال دی تھی۔ ترپال کے نیچے وہ ایسے بندھا پڑا تھا کہ صرف سانس لے سکتا تھا مگر اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے روپ کمار کو نفسیاتی طور پر دہشت زدہ کرنے کے لیے اچھا ڈراما کیا تھا۔

جب کے کریم بورڈ کو ابھی پوری اسکیم سمجھائی۔ اس کے مطابق ہم تین نمبر برتھ کے قریب پہنچ میں نے اپنا مائک بیری والا لباس برقرار رکھا اور کریم بھوری نے جسے ایک چھوٹی سی کشتی میں منتقل کر دیا جس میں مشکل سے چار افراد کے لیے جگہ تھی کہ ہم اس کشتی کو چھوڑنی کی مدد سے چلا کے دو نمبر برتھ کی طرف لے گیا اور ایک ایسی جگہ کھڑا کر دیا جو دو بہت بڑی کشتیوں کے درمیان تھی مگر موجوں سے وہ کشتیاں آپس میں ٹکرا جاتیں تو اس ننھی کشتی کے ٹکڑے ہو جاتے۔

"اب تم آگے چلو۔" میں نے روپ کمار سے کہا۔ "اور یہ بات ذہن میں رکھو کہ تمہارا ایک غلط قدم تمہیں پولیس تک پہنچا دے گا۔ تم نے کوئی بھی ایسی حرکت کی جس پر مجھے شبہ ہوا کہ تم چالاکی سے کام لے رہے ہو اور تم نے کسی کو اشارہ کیا ہے تو کچھ لوگ شک بھی تمہاری موت کا سبب بن سکتا ہے۔"

"میں ان دونوں سُوروں کے بچوں کو سزا دیے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔" وہ بولا۔ "میں ان سب کو قتل کر دوں گا۔"

کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار وہ بھوری داڑھی والا انگریز بھی کر چکا تھا۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ دھوکے کا پتا چلتے ہی وہ

آگ بگولا ہو کے واپس آئے گا۔

دو نمبر برتھ کے آفس سے کچھ فاصلے پر ہم لوگ رک گئے۔ روپ کمار عرشے پر بیٹھ گیا۔ میں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میں جوں تُوں وہاں پہنچ کر جاگ اور افراتفری کی کیفیت تھی۔ غور کرتا کہ یہ بڈھا ماں کیوں بیٹھا ہے شاید میں مرچی کا آواز متوجہ نہ ہوتا چنانچہ میں اطمینان سے بیٹھ کے سگریٹ پینے لگا۔ محسن آفس کے پیچھے تھا اور ہم دونوں چار پانچ گز کے فاصلے سے روپ کمار پر نظر رکھے ہوئے تھے جو دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اب رات ہو چکی تھی لیکن آفس کے سامنے کوئی اندھیرا نہیں تھا۔

ابھی پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک معزز صورت شخص روپ کمار کی طرف بڑھا۔ اس نے سفید قمیص اور کالی پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ پچپن ساٹھ سال کا آدمی تھا جس کے سر کے بال غائب ہو چکے تھے۔

"یہ کیا مصیبت ہے۔" اس نے روپ کمار کو دیکھتے ہی کہا۔ "میں ایک گھنٹے سے تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں۔"

"انتظار تو کرنا پڑتا ہے ایسے معاملات میں۔" روپ کمار خفگی سے بولا۔ "وہ جہاز میرے باپ کا تھا۔"

"خیر چھوڑو۔ مال کہاں ہے؟"

"مال کشتی پر ہے۔" کشتی ادھر ہے۔" روپ کمار نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "تم رقم لائے ہو؟"

نو وارد نے سر ہلایا اور ایک لفافہ پکڑا دیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ بینک ڈرافٹ ہے کلکتہ کے ایک بینک کا۔ میں نقد نہیں لا سکتا تھا۔"

"اسے ڈاک سے بھجوا دو میرے گھر کے پتے پر۔" روپ کمار نے بینک ڈرافٹ دیکھا اور واپس کر دیا۔ "میری بیوی کیش کرا لے گی۔"

"مجھے تمہارے گھر کا پتا نہیں معلوم۔ مگر خیر میں معلوم کر لوں گا۔" نو وارد بولا۔ "اب چلو۔"

وہ دونوں جیسے ہی واپس ہوئے میں اور محسن ان کے پیچھے ہو لیے۔ نو وارد نے دو ایک بار پلٹ کے دیکھا مگر وہ بالکل نہ سمجھ سکا کہ ہم اس کے پیچھے آرہے ہیں۔ وہاں بہت لوگ ہمارے جیسے حلیے میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔

ٹھیک وقت پر جب روپ کمار نے اس بد صورت شخص نے اجنبی کے ساتھ کشتی میں قدم رکھا ہم بھی ساتھ ہو گئے۔ چھوٹی سی کشتی لہروں پہ ڈگمگانے لگی جس کے دونوں جانب بہت اونچی اونچی کشتیوں کی دیواریں تھیں۔

وزن بڑھنے لگا ہے۔

اس سے پہلے کہ اجنبی کچھ کرتا یا کہتا میں نے اسے ٹوکا اور یہ سوال و جواب یا مار دھاڑ کے لیے قطعی نامعقول جگہ تھی۔ وہاں چلانے کے لیے پکارنے لگتا تو ہر سمت سے لوگ جمع ہو جاتے اور ہمارا وہاں سے بھاگنا ناممکن ہو جاتا۔

میں نے پستول کو فوراً نکالا۔

"نکال رہا ہے صاحب!" کریم نے گھبراتے ہوئے پیچھے ہی کہا۔

"یہ زندہ ہے کہ مر گیا؟"

"اگر یہ مر بھی گیا تو قتل کا الزام تم پر نہیں آئے گا۔" محسن نے کہا اور بیٹھ کر نو وارد کی تلاشی لینے لگا۔ اس کے پاس سے صرف ایک ہی کاغذ نکلا یہ وہی بینک ڈرافٹ تھا۔

"وہ لاکھ روپیہ؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "روپ کمار تم تو پچاس کہتے تھے اور وہ دو لاکھ ادھر سے بھی مال چھوڑ رہے تھے اور ادھر سے بھی۔"

"دیکھو میرے قسم میری فیملی کو جانے دو۔" وہ منت کرتے ہوئے بولا۔ جواب میں نفی میں سر ہلایا۔ "یہ پاکستان کا پیسہ ہے اور مجھے کیا معلوم کہ تمہاری فیملی کہاں ہے گا تو وہ اس کا کیا کریں گے... اسے تو یہ کاروں کے پچھلے رہ گئے۔"

"وہ پیسے نہیں ہیں، انہیں کچھ نہیں معلوم۔"

"خاندان کا سربراہ غلطی کرتا ہے تو سزا خاندان ہی کو کاٹنی پڑتی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم تو کوئی کام کا آدمی نہ تو دنیا کے روپوش ہو جاتے ہیں تمہارا خاندان کو دنیا و عاقبت میں کیا ملتا ہے سوائے خانہ خرابی اور رسوائی کے۔"

میں نے وہ بینک ڈرافٹ پھاڑ کے پرزہ پرزہ کر دیا۔ روپ کمار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"اتنے کمزور ہو یار تم اس دھندے میں کیوں آ گئے تھے یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔" محسن بولا۔

"زندگی رہی تو ان کے لیے پھر کما لوگے لیکن ایسے مت کہنا جیسے پھینکتا ہے وہ کچھ نہیں بلکہ جان لے آ بہے لیتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب ہم کافی دور آ گئے ہیں کیوں نہ تم سے آخری سوال پوچھا جائے۔"

"نانا یہ کون تھا؟" میں نے کشتی میں اوندھے پڑے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تھا یہ بھی قطعاً مجھے کچھ بتا سکتا کہ ہم وطن ہوتے ہوئے اپنی بے عزتی محسوس کرتا ہوں یہ نسل کا تعلق تھا۔"

"محسن نے کہا تھا نا کہ یہ نہیں جانتا اسے۔"

شاہ نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا۔ اس نے جس شناسائی کا تعلق اور جو بات کی تھی وہ ہم نے سنی تھی۔

"تم نے اسے کہا تھا کہ رقم میرے گھر بھجوا دو۔ تم راہ چلتے کسی اجنبی سے ایسا کہو گے؟ یا ہم سے کہو گے ایسی بات! اگر معلوم ہو تمہیں کہ ہم تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

"اور جواب میں اس نے کہا تھا کہ میں معلوم کر لوں گا تمہاری بیوی کا پتا۔"

روپ کمار کا گال سوج گیا ہوا تھا کھڑا ہوا۔ "یہ ایک سرکاری قسم تھا۔ وزارت داخلہ کا ایک سیکشن آفیسر۔"

روپ کمار نے اس کا نام بھی بتایا تھا مگر سال میں عمداً اس کا ذکر نہیں کر رہا ہوں۔

"تھا کیا مطلب؟"

"اسے بتا دیا گیا تھا کیا تم جانتے نہیں کہ بنگالی افسران کو کلیدی عہدوں پہ نہ رکھنے کی پالیسی پر عمل ہو۔ اسے ٹاپ سیکرٹ فائلیں وغیرہ ان سے لے لی گئی ہیں۔"

"یہ ایک دانشمندانہ پالیسی ہے جب تک دوست دشمن اور اپنے پرائے کی پہچان نہ ہو جائے احتیاط بہتر ہے۔ خیر یہ بتاؤ کہ تم اسے کب سے جانتے ہو اور تمہارے درمیان رابطہ کیسے ہوا؟" میں نے کہا۔

"میں عوامی لیگ کا پرانا کارکن ہوں۔ مجھے اوپر سے حکم ملا تھا کہ کراچی جاؤں۔ یہ شخص مجھے اسی جگہ ملا تھا اور اسی نے مجھے یہ کام کرنے کو کہا تھا یعنی یہ مال لے جانے کی ذمہ داری میری تھی۔"

"اور تم یہ مال لے کر کیسے جاتے؟"

"ایک اور بحری جہاز جانے کے لیے تیار کھڑا ہے۔" وہ بولا۔

"اٹلس اینڈ کراچی تھرو؟" میں نے سر ہلایا۔

وہ ایک لمحے کے لیے پتھر ہو گیا۔ "یہ... تم کو...!"

"کسی نے نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں الہام ہوا ہے جیسا ابھی تم کہہ سکتے ہو کہ میری چھٹی حس بہت جاسوس بھی ہے۔"

"میری ساتویں حس اس کی پارٹنر ہے۔" محسن بولا۔

"اور میری آٹھویں حس بھی۔" غالب نے کہا۔

چونکہ تمام ضروری معلومات حاصل کی جا چکی تھیں، اسی لیے روپ کمار کا وجود ہمارے لیے بے مصرف ہو گیا تھا۔ ہم ابھی لانچ نما کشتی کے قریب بھی نہیں پہنچے تھے۔ میں اور محسن بے ہوش پڑے ہوئے شخص کو اٹھا کے اوپر لے گئے۔ غالب نے روپ کمار کو لانچ پر پہنچایا۔

"اری او نازو!" غالب نے گلا پھاڑ کے کہا۔ "دیکھ تو سہی کون آیا ہے۔"

نازو غصے میں بادبان پر آئی۔ "اٹھا لاؤ پھر میرے کسی سسر کو۔ گالب کے بچے۔"

"چپ کر نہیں تو..." غالب نے دہاڑ کے کہا۔

www.paksociety.com

"نہیں تو کیا۔ جب جاوے جسے اپنی مردار شکل والی کوئی چیز لے آتے ہے۔" وہ بیرو چھتی نیچے چلی گئی۔ یہ چھیڑ چھاڑ کے بہانے مستقبل کے ایک رول کی ریہرسل بھی تھی۔

"اب وقت آ گیا ہے مسٹر روپ بہروپ کمار کہ ہم تم سے کیا ہوا وعدہ پورا کریں۔" میں نے ہاتھ مل کے کہا۔ "یعنی تمھیں اس سمندر میں پھینک دیں۔"

"تم مجھے اس کشتی میں پہنچانے کی رعایت نہیں دو گے؟" وہ لجاجت سے بولا۔ "اس حالت میں میرے لیے تیرنا مشکل ہو گا۔"

"تو مت تیرنا۔ نیچے جا کے لیٹ جانا۔" غالب نے اسے مشورہ دیا۔

"ہم تو سب کچھ معاہدے کے مطابق کریں گے۔" میں نے کہا اور محسن کو اشارہ کیا۔ "ذرا ان کو پیک کرنے کے لیے کچھ لاؤ۔"

وہ اچھلا۔ "کیا... مجھے پیک کر دو گے تم!"

"ہاں۔ اس طرح تم پانی سے محفوظ ہو جاؤ گے۔ زنگ نہیں لگے گا تمھیں۔" میں نے کہا۔

"اور ویسے بھی آدمی مٹی کا پتلا ہے۔ کہیں تم مٹی کی طرح پانی میں گھل نہ جاؤ۔" غالب نے کہا۔

"تم مجھے مارنا چاہتے ہو۔ یہ بدعہدی ہے۔" وہ خوف سے اچھلنے لگا۔ اس نے دوڑ کر لانچ عبور کرنے کی کوشش کی مگر ہم سب مستعد تھے۔ محسن نے ٹانگ آگے بڑھائی اور وہ منہ کے بل گرا۔

"یہ ہے ان کا کفن۔ واٹر پروف۔" محسن نے پلاسٹک کی ایک بڑی سی تھیلی پیش کی۔ "گارنٹی قیامت تک۔"

روپ کمار دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ "خدا کے لیے مجھے بخش دو۔ جانے دو۔ میں نے تعاون کیا تمہارے ساتھ۔ تم نے تو وعدہ کیا تھا..."

میں نے اس کے ایک کک رسید کی۔ "ہم وعدے کے مطابق ہی تمھیں سمندر میں پھینک رہے ہیں اور خود قتل نہیں کر رہے ہیں۔ رہی بخشنے کی بات تو وہ ہم سے مت کہو۔ بخشنے والا کوئی اور ہے۔"

"اور یہ تو جنگ کی بات ہے۔ ہم اور تم دشمن تھے کوئی دوست یا بزنس پارٹنر نہیں۔" محسن نے فرنٹ جاری رکھی۔ "دغا تو تمھیں وہ بھی دے گئے جن سے تم نے بزنس کیا تھا۔"

"وہ چاکلیٹ بھی ساتھ ہی پیک کر دو۔" غالب بولا۔ "نیچے جا کے کھاتے رہیں گے یا وہیل کے پیٹ میں پہنچ کے کھا لیں گے۔"

"دشمن کے وعدے پر اعتبار کرنے والا سب سے بڑا احمق۔ ہم کسی دوست سے وعدہ کرتے تو جان دے کر نبھاتے۔ مگر یہ تو بس ایک جنگی حکمت عملی تھی جو ہم نے اختیار کی۔ جنگ کی حکمت عملی تھا دشمن کو دھوکے میں رکھنا اور اچانک ختم کر دینا عقلمندی اور ذہانت کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ اخلاقی جرم نہیں۔"

"تم دشمن ہو۔ غدار ہو۔" محسن بولا۔ "اور یہ دنیا کی عدالت نہیں ہے جہاں تم بے مصرف دلائل سے بچ سکو۔"

"یہ ایم آر ایس کی عدالت ہے جو تمھیں سزائے موت ... " میں نے کسی جج کی طرح فیصلہ سنا دیا۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے اسے جکڑا اور زور زبردستی پلاسٹک کی تھیلی میں ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ مزاحمت کرتا رہا، گالیاں دیتا رہا اور چیختا رہا۔ سمندر کے شور میں اس کی سننے والا سوا کون تھا۔ بالآخر ہم نے اسے باندھ کے تھیلی میں ڈالا اور تھیلی کا منہ بند کر دیا۔ اس کی آخری وحشت بھری نظریں مجھے آج تک یاد ہیں۔

"گڈ بائی مسٹر روپ کمار۔" میں نے کہا۔ "بون وویج!"

محسن اور غالب نے تھیلی کو کونوں سے پکڑ کے اٹھایا، جھلایا اور سمندر میں پھینک دیا۔ وہ لانچ سے کوئی چند گز دور پانی میں ایک چھپاکے سے گرا اور غائب ہو گیا۔

"مرزا محسن کم جہاں پاک۔" غالب بولا۔

اس کے بعد ہم نے وہ سب سامان توڑ پھوڑ کے سمندر میں ڈالا جو روپ کمار کی معرفت آگے جانے والا تھا۔ بھاری ... مشینیں اور وی ... مشین کے علاوہ وہ جدید ساز ... مشینیں ہمارے لیے بے کار تھے۔ چھوٹی چیزیں ہم نے سنبھال کے رکھ لیں جن میں دو واکی ٹاکی تھے اور وہ خفیہ طور پر نصب کیے جانے والے ایف ایم ... بھی جو ایک کلومیٹر کی رینج تک کام کر سکتے تھے۔

غالب کے بروقت دانش مندانہ مشورے سے اس پیکنگ کو محفوظ رکھا گیا اور اس میں ... بند کر دیا گیا کہ کسی کو شک نہ ہو۔ نازو نے ہماری ... موجودگی کا کھانا پکایا تھا، جب وہ کھانا سامنے آیا تو ہماری بھوک اڑ گئی۔

"یہ کیا ہے؟" غالب نے منہ بنا کے کہا۔

"تمھیں کیا نظر آ رہا ہے؟" نازو نے بھی منہ بنا کے کہا۔ "کھاؤ ورنہ بھوکے رہو۔"

"صبر کر بھائی۔" محسن بولا۔ "اللہ کا شکر کر کہ تیرے مقدر میں ... اور ... نہیں تھے۔ ورنہ وہ بھی کھانے پڑتے۔"

"یہ اس سے کم تو نہیں۔" غالب نے کہا۔ "یعنی دال بھات۔"

"بہت مزے کا ہے صاحب۔" کریم بلوچ نے کہا ... کی طرح چاولوں پر دال ڈالی، چاول اٹھایا اور ہاتھوں سے ان کے گولے بنا بنا کے حلق سے اتار رہا تھا۔

"شب ... روشن ہے اور ... " نازو نے کہا۔

"ہم ... کبھی ... لگا صاحب یہ چاول کے ساتھ کھانا تو بہت مزہ دے گا۔" کریم بلوچ نے کہا۔

"محترمہ نازو بیگم صاحبہ۔" غالب نے بڑے ادب اور خلوص کے ساتھ کہا۔ "اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو اس حقیر فقیر بندۂ بے تقصیر کو ... یہ طعام ... کیا جائے گا؟"

کریم بلوچ کا منہ کھلا رہ گیا۔ "یہ کون سا زبان ہے صاحب؟"

"یہ وہ زبان ہے دوست جو ہم بھول چکے ہیں۔" میں نے کہا۔

ظاہر ہے لانچ پر جو راشن تھا وہ سفر کے لیے ... نے ... پلاننگ کی تھی اس نے ... نازو نے بتایا کہ چاولوں کی تو ڈھائی من والی بوری ہے ... آدھی بوری ... نمک مرچ مصالحہ ... سب خشک چیزیں جن کو اسٹور کرنا آسان تھا۔

جانے پہچانے سے رکاوٹ دور ہوئی جو بد مزہ دال اور چاول کھا کے پیدا ہوئی تھی۔ دال چاول بری چیز نہیں اور بھوک میں تو سب ... نازو کا ... خصوصاً کھانا پکانے میں وہ صفر تھی۔

"آج تو خیر معاف کیا۔" غالب نے کھانے کے بعد پیٹ پکڑ کے اداکاری کی۔ "لیکن کل سے کچن میں قدم بھی رکھا تو..."

"تو کیا؟" نازو آستین چڑھا کے بولی۔

"تو کچھ نہیں۔" غالب نے کہا۔ "ہم سمجھ لیں گے عزیزم کہ یہ لانچ ... ہے اور تم ایک ظالم جیلر ہو۔"

"اچھا ہوتا اگر کھانے سے پہلے تم نے چاولوں کو تھوڑا سا پکا لیا ہوتا۔" محسن بولا۔

"تمھارا کیا مطلب ہے؟ پانی میں ڈال کے رکھ دیے تھے تمھارے سامنے؟"

"کچھ تو ایسا ہی ہے ... پیٹ میں پڑے ہیں۔ پانی ... " میں نے بھی کہا۔

"حرکت کرتے ہیں تو آواز نہیں آتی تمھیں۔ جیسے ... جھنجھنے میں کنکر۔"

"میں تو خود کو بالکل ایک بجنے والا جھنجھنا محسوس کر رہا ہوں۔"

نازو تنتنا کے اٹھی۔ "کل سے خود پکا کر کھانا، یا پھر کرو فاقے۔ بھاڑ میں جاؤ سب ... "

غالب ... ہنسا۔ "بھاڑ میں اتنے لوگوں کے لیے ... نہیں ہو گی۔ آپ تشریف لے جائیں تو..."

مگر نازو اپنے کیبن میں جا کر دروازہ دھڑ سے مار کے بند ہو گئی ... ہم سب کا ہنس ہنس کے برا حال تھا۔

کریم بلوچ نے اچانک کہا۔ "صاحب! یہ کشتی واپس کب کرنا ہے؟"

"پھر صاحب، تم سے کہا تھا کہ ہم یار ہیں۔" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "کشتی ابھی ایک گھنٹے میں واپس کرتے ہیں۔"

"ابھی کہیں جانا ہے؟" کریم بلوچ نے کہا۔

"ہاں۔ بس چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مرزا جی تم یہاں ٹھہرو۔"

"انھیں منا دو۔" محسن بولا۔ "بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔"

"وہ خود منائے گی مجھے۔ یہ زن مریدی جو تو کرتا ہے نا، یہ مجھے مت سکھا۔" غالب نے کہا۔

"زن مریدی بہتر ہے زن غلامی سے۔" محسن بولا۔ "کوئی زر خرید غلاموں کو بھی آج کل یوں نہیں مارتا۔"

"وہ اس کی محبت کا اپنا انداز ہے۔" غالب جھینپ کر بولا۔

"ہاں، ہر طرف سے ... اور ... کر دیا ہے۔ آدمی کم اور لوٹا زیادہ نظر آتا ہے۔ وہ بھی بیت الخلا کا۔"

"بیت الخلا جیسے ... دماغ میں ہے ... اولاد ... نے ماما جی کہہ دیا۔ باپ کہتے شرم آتی ہو گی اسے۔"

میں نے یہ جنگ بند کرانے کے بعد انھیں بتایا کہ اب ہمارے سفر کا مقصد کیا ہے۔ دس منٹ بعد ہم سب اس کے لیے پوری طرح تیار ہو کے نکلے کہ سب نے کپڑے اتار دیے اور لنگوٹ کس لیے تھے۔ نازو ہماری ... کے نکلی اور ہمیں مجبوروں کی طرح ... دیکھنے کے پہلے تو جھجک کے رکی پھر خود ہنسی پر قابو نہ رکھ سکی۔

"کیا سوئمنگ کا پروگرام ہے؟"

"ارے او ناجو کی بچی۔" غالب نے پھر اکڑ کے ... "کیا کھی کھی کر رہی ہے بے شرم۔ چل اندر، ہم جا رہے ہیں کہیں۔"

"تو واپس آ جانا گلاب کے پتے۔ پھر کھیر ... تیری۔" نازو نے جواب دیا اور پھر ہمیں عرشے پر سے کشتی میں جاتا دیکھتی رہی۔ میں نے اسے تاکید کی کہ اپنا خیال رکھے جو ایک فضول سی بے مقصد بات تھی۔ وہ ہر طرح سے اپنا خیال رکھنے کی اہل تھی۔ کشتی رات کی خاموشی میں آگے بڑھتی گئی۔ یہ ایک اندھیری رات تھی اور سمندر قدرے پرسکون تھا پھر بھی اس چھوٹی سی کشتی کے لیے سفر ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اس سے بھی زیادہ مشکل مرحلہ اپنی رازداری برقرار رکھنے کا تھا، اگر چاندنی ہوتی تو یہ ناممکن ہو جاتا۔

... بار ہم جہاز کے قریب پہنچے تو عرشے پر ... جل رہی تھی...

احتیاطاً ہم نے دوسری طرف بھی جا کے دیکھا۔ نیچے کسی کیبن میں سے موسیقی کا شور ... سرسراہٹ میں شامل ہو رہا تھا اور عورتوں کی ... ان کی موجودگی کی خبر دے رہی تھی۔ ہمارے

www.paksociety.com

قریب رکھوار میں دوسرے جہاز بھی تھے لیکن ایک دوسرے سے خاصے محفوظ فاصلے پر لنگر انداز تھے۔

کشتی جب جہاز کے ساتھ لگی تو ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ ہم سب سانس روکے منتظر رہے پھر کوئی عرشے پر آیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھنے کے بعد ہی چلا کے پوچھا ہو ”کون ہے؟“

میں نے اس آواز کو شناخت کر لیا۔ یہ بھوری داڑھی والا تھا۔ ہم اس کی متلاشی نظروں سے اس لیے محفوظ رہے کہ بحری جہاز بہت بڑا تھا اور اوپر ایک سائبان کی طرح پھیلا ہوا لگتا تھا۔ اس کے نیچے یہ چھوٹی سی کشتی اندھیرے کی پناہ میں آ گئی تھی۔

تقریباً دس منٹ کے بعد میں نے کشتی میں سے رسی کا پھندا بنایا اور اوپر پھینکا۔ مسلسل کئی بار کوشش میں ناکام رہنے کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری تھی لیکن پھر ہوا یہ کہ [illegible] ناکامی بہتری میں آ گیا۔

”ادھر دو صاحب۔“ وہ سرگوشی میں بولا۔ ”ہم کو دو۔“

”پھر صاحب بولا مجھے۔“ میں نے اسے بلا وجہ ڈانٹ کے منع کیا۔ اس وقت مجھے خاصی شرمندگی ہوئی جب کہ ہم جلدی سے [illegible] اس نے ایک جھٹکا دے کر رسی کی مضبوطی کو آزمایا اور نیچے بولا۔

”ابھی اللہ کا نام لے کر چڑھ جاؤ۔“

”ٹھیک ہے۔ جب ہم اوپر چڑھ جائیں تو تم بھی اللہ کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”آپ کو چھوڑ کر؟“

”ہاں۔ ہماری فکر مت کرو۔ ہم آ جائیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”تم یہ کشتی لے کر جلد از جلد دور چلے جاؤ۔“

باری باری میں اور محسن اور پھر غالب اوپر پہنچ گئے۔ جہاز کا عرشہ خالی پڑا تھا۔ ہم دبے پاؤں آگے بڑھے اور نیچے جانے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔ ریوالور ہم نے پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کے کمر کے ساتھ بیلٹ کی طرح باندھ لیے تھے۔ واحد اضافی چیز جو میرے پاس تھی وہ ایک دستی بم تھا۔

نیچے جانے والا راستہ تلاش کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ ایک تنگ سا آہنی زینہ تھا جس کے دونوں جانب دیوار تھی۔ مدھم روشنی میں ہمیں ایک راہداری سی نظر آ رہی تھی۔ میں اور محسن غالب کو وہیں چھوڑ کے آگے بڑھے۔ جہاں سے غالب دونوں جانب نگاہ رکھ سکتا تھا اوپر سے آنے والے راستے پر بھی اور راہداری پر بھی۔

[illegible] موسیقی اور شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی دیوانگی آمیز باتیں اب صاف سنائی دے رہی تھیں۔

”وہ... وہ کالا انڈین۔ واپس نہیں آیا۔“

بھوری داڑھی والا پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ ”اس [illegible] کا تو خود کر لیا۔ خود کو ہلاک کرنے کا۔“

”وہ صدمے سے مر گیا ہو گا۔“ ایک عورت نے کہا۔

”سو تو کیا برا ہو گا۔ جب اس نے بریف کیس کھولا [illegible]“ پھر وہ پیچ پیچ کر ہنسنے لگا۔ دوسرے اس کے ساتھ شامل [illegible] تک نے محسن کو اشارہ کیا اور ایک لات مار کے [illegible] کھول دیا۔ ہم دونوں جب ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تو بیٹھے کے بیٹھے وہ سب پتھر ہو گئے۔ انھوں نے [illegible] اور بلائے ناگہانی اور اپنے پوز کچھ بدلنے کی کوشش نہیں [illegible] کی خلوت میں یہ مخل ہو جانا ان کی تو چیز ہی ختم ہو گئی [illegible] ان کا نشہ ہرن ہو گیا۔

”تم... کون ہو تم؟“ بھوری داڑھی والا ہکلایا۔

”ہمیں روپ کمار کی روح نے بھیجا ہے حساب برابر کرنے کے لیے۔“ میں نے فرنچ میں کہا۔

”اس کا حساب تو تم نے برابر کر دیا۔“ محسن نے بھی فرنچ میں کہا۔ ”اب تمھاری باری ہے۔“

”تم نے تیس ہزار ڈالر تو ہتھیا لیے۔ اب خود کو کیسے بچاؤ گے؟“ میں نے کہا۔

ان کے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ آدھی رات کیا ننگ دھڑنگ ان کی خلوت گاہ میں گھس آنے والے اور بے حد خطرناک ڈاکو نظر آنے والے اجنبی کس زبان میں بات کریں گے۔ انگریزی جاننے والے تو یہاں بہت تھے مگر فرنچ [illegible] کی صورت پر حیرت کی تحریر اور خوف کے جذبات [illegible] سہ جانے والا نشہ [illegible] ایک عجیب نقشہ پیش کر رہے تھے۔

”لیکن ہمارا قصور؟“ بھوری داڑھی والا بولا۔

”تم نے غداروں کی مدد کی۔“ میں نے کہا۔ ”ہمارے ملک کے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کیے۔“

”اور یہ سب تم نے جانتے بوجھتے کیا۔“ محسن نے کہا۔

”اپنی آخری دعا مانگ لو۔“ میں نے کہا۔

عورتوں نے ہسٹریائی چیخیں ماریں۔ [illegible] کرنے آئے تھے۔

”مسیوری خواتین۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کو [illegible] سزا مل رہی ہے۔ اپنے گناہوں کی [illegible]“

”تمھارے لیے یہی جانے دو۔ [illegible] سے کوئی [illegible]“

نوجوان عورت چیخنے لگی۔

”کسی تعلق کے بغیر آپ ان کے ساتھ اکیلی؟“ [illegible] تھی خاتون!“ محسن نے طنز سے کہا۔ ”عجیب بات ہے کہ اچھے وقت میں کبھی برے وقت کی کوئی نہیں سوچتا جو بغیر بتائے آتا ہے۔“

”ہم ایک صورت ہو سکتی ہے۔“ میں نے کچھ سوچ کے کہا۔

”دیکھیں تم دہشت پسند معلوم ہوتے ہو مجھے۔“ بھوری داڑھی والا بولا۔

میں نے ریوالور محسن کو تھمایا اور اسے اپنے قریب بلا کے [illegible] بات کو غور سے دیکھو۔“ میں نے کہا۔ ”دہشت پسند اور حریت پسند میں کیا فرق ہوتا ہے۔“

”اوکے... اوکے۔“ میں نے غلط لفظ استعمال کیا۔ افسوس ہے مجھے۔“ انہوں نے اپنا اعتماد برقرار رکھنے میں کمی نہیں آنے دی۔ ”جو میرا مطلب تھا وہ کچھ اور تھا۔ میں تم کو بہت اچھی پیش کش کرنے والا تھا۔ تم کچھ بھی مانگ سکتے ہو۔“

میرا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔ میرا مکا اس کی ٹھوڑی کے نیچے یوں پڑا کہ اس کے دانت ہل گئے ہوں گے۔ وہ الٹ کے پیچھے گرا تو میں نے کالر کھینچ کے اسے پھر اٹھا لیا۔ اس نے سنبھلتے ہی مجھ پر میری ہی طرح وار کرنا [illegible] اور بلا شبہ میری ٹھوڑی کے نیچے پڑنے والا فولادی مکا کہا جا سکتا تھا۔ لیکن میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔

”[illegible] کے پیچھے“ محسن نے ایک ہوائی فائر کر دیا اور چھت تھی جس سے ایک فانوس معلق تھا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ گولی فانوس کو سہارا دینے والے حصے پر لگی۔ ادھر خواتین نے ایک دل خراش چیخ ماری ادھر فانوس نیچے آیا اور رجحان آدمی کے سر پہ گرا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کی [illegible] اور [illegible] عمر کی عورت کے کندھے سے چھٹ گئی۔

بھوری داڑھی والا جو پھر مجھ پر حملہ کرنے کی سوچ رہا تھا رک گیا۔ اس کی نظر اپنے ساتھی پر جم گئی۔

”میرا خیال ہے کہ تم نے اسے مار ڈالا ہے۔“ وہ بولا۔

”میں نے یا فانوس نے؟“ محسن تمسخر آمیز انداز میں بولا۔

”اس کی گردن ٹوٹ گئی ہے۔“ بھوری داڑھی والا بولا۔

”تم اپنی گردن بچاؤ۔“ محسن بولا۔

”تم نے ابھی ایک پیشکش کی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”بات یہ ہے کہ تجارت میں کھو لینا پسند نہیں کرتا۔ تمھارا معاوضہ تمھارے ساتھ [illegible] سکتا ہے لیکن اس کے لیے تم کو چند شرائط پوری کرنا ہوں گی۔“

”کیا شرائط ہیں؟“ وہ بولا۔ ”اگر تم اپنی تحریک کے [illegible] اسلحہ کچھ اور چاہیے تو بولو۔ ہم نے تمھارے دشمن ہیں۔ ان کے دوست بھی۔ جس کے خلاف تم لڑ رہے ہو [illegible] تمھارے لیے بھی وہی کر سکتے ہیں جو ان کے لیے کیا۔“

”تم بزنس کرنا چاہتے ہو لیکن یہ بزنس میں نہیں [illegible]“ کہا۔ ”میں تمھاری جان بخشی کر سکتا ہوں اگر تم چند سوالات کے جوابات بالکل ٹھیک دے سکو۔“

وہ متوقع نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔

”ایک تو یہ بتاؤ کہ آج سے پہلے تم کیا کچھ لاتے رہے ہو؟ کب سے لا رہے ہو؟ اور کس کے لیے؟“

”میں تیسری بار آیا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”ہر مرتبہ مجھے ایک نیا آدمی ملتا ہے جو کیش دیتا ہے۔“

”گزشتہ بار تم کس سے ملے تھے؟“

”ظاہر ہے انھوں نے خود کو متعارف نہیں کرایا تھا۔ دو کرایا بھی تھا تو ان کا تعارف درست نہیں ہو سکتا۔“ وہ بولا۔ ”...

”تاہم اتنا میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں بنگالی تاجر تھے اور کچھ تمھارے اپنے سرکاری محکموں کے حکام۔ ففتھ کالم کے لوگ۔“

”اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ففتھ کالم سے تعلق رکھتے ہیں تم نے ان سے بزنس کیا۔ ایک ملک کے عوام کی آزادی اور ملک کی سلامتی کے خلاف کام کرنے والوں کی مدد کی۔“

”مدد! یہ بزنس تھا۔“

”اگر کوئی تم سے کہے کہ میں ایک [illegible] کو قتل کرنا چاہتا ہوں کہ دشمن [illegible] پھینکنا چاہتا ہوں اور تم اس کام میں میری مدد کرو تو تم مدد کرو گے؟ پیسے لے کر اسے ہتھیار فراہم کر دو گے؟“ میں نے کہا۔

وہ خاموش کھڑا رہا۔ اس کی خاموشی ہی میرے سوال کا جواب تھی اور اعتراف جرم بھی۔ وہ بھی دوسرے معیاروں کی دنیا کا آدمی تھا۔ آزادیِ اظہار، احترامِ آدمیت، جمہوری عقائد و نظریات، انسانی اخوت اور ایسے ہی بہت سے خوش کن الفاظ اس وقت اپنے معنی کھو بیٹھتے ہیں جب ان کا اطلاق اپنے دشمنوں پر [illegible] اور مخالف و متصادم اصولوں پر ہو۔

”تم نے ایک جرم کا اقرار کیا کہ کسی بھی ملک کی بقا اور اس ملک کے عوام کی آزادی کے خلاف کام کرنے والوں کی مدد کرنا غداروں کا ساتھ دینے کے مترادف ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے یہ نہیں کہا۔“ اس نے احتجاج کیا۔

”تمھارے [illegible] جہاز پہ [illegible] آیا تھا؟“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اور جہاز [illegible] ہے؟“

”ہم اسلحہ بھی لاتے تھے۔“ بھوری داڑھی والے نے جھوٹ

www.paksociety.com

"گر بے فائدہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "وہ پہلے ہی جا چکا تھا۔ جہاز کے عملے کے باقی ارکان فرار ہو گئے ہیں۔"

"کچھ اسلحہ بھی چاہیے۔" میں نے کہا۔

"کس قسم کا؟" بھوری داڑھی والا بولا۔

"ہمارے پاس یہ ایک ہی دستی بم ہے۔" میں نے کہا۔

"سوری۔ اس وقت تو نہیں لیکن اگلے پھیرے میں تمہیں دستی بم وغیرہ فراہم کر دیے جائیں گے؟"

"اتنا وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"فوری طور پر تو میں کچھ خودکار رائفلیں اسٹین گن کے راؤنڈز۔"

"میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ہم خود بھی تلاشی لے کر سمیٹ لیں گے۔"

"میں ایک خاص ٹائم بم دے سکتا ہوں۔ ویری اسپیشل۔ جس کی بات ابھی چل رہی ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ کل تک وہ منہ مانگی قیمت دیں گے تاہم یہ مت سمجھنا کہ تم اسے آسانی سے تلاش کر لو گے۔"

"وہ کیا چیز ہے آخر؟"

"ٹائم بم جس میں ری ایکشن ڈرائنس کے ساتھ مقررہ وقت پر پہلا دھماکا ہوتا ہے پھر وقفے وقفے سے دوسرے چھ دھماکے ہوتے ہیں۔ درمیانی وقفہ تم خود سیٹ کر سکتے ہو جو پانچ سے پچپن منٹ تک ہو سکتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے جان بوجھ کے اپنی کم عقلی کا اظہار کیا۔

"فرض کرو تم کسی بڑی پرہاؤس عمارت میں یہ بم نصب کرتے ہو۔ اتنے فاصلے سے کہ پانچ یا دس منٹ میں مکمل طور پر تباہ ہو جائیں۔ اس کے لیے تم بارہ بجے کا وقت رکھتے ہو تو پہلا دھماکا بارہ بجے ہوگا۔ اس کے بعد کے وقت کو تقسیم کر لو۔ دھماکے پانچ پانچ منٹ بعد بھی ہو سکتے ہیں، دس دس منٹ بعد بھی۔" وہ بولا۔

"یہ اچھی چیز ہے۔ کیا تم ہمیں دکھا سکتے ہو؟"

"پہلے تم کو وعدہ کرنا ہوگا کہ اس کے بعد تم چلے جاؤ گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں کیسے اعتبار کر لوں؟"

"قرآن ہماری مقدس کتاب ہے۔ ہم اس کی قسم نہیں کھاتے اور کھا لیں تو پھر جان دے کر بھی قسم پوری کرتے ہیں۔ میں اس کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ یہ تحفہ لے کر اور تمہارا شکریہ ادا کر کے خاموشی سے لوٹ جاؤں گا۔"

اس نے سر ہلایا اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے باقی سب کو محسن کی نگرانی میں چھوڑا اور اس کے ساتھ ایک تہ خانے جیسی جگہ میں گیا۔ وہاں اس نے فرش کا ایک تختہ ہٹا کر کھولا۔ اس میں ڈالر اور پونڈ یوں بھرے ہوئے تھے جیسے کاغذ ٹھونس ٹھونس کے بھرے جاتے ہیں۔ اس دولت کی مجموعی مالیت کا اندازہ نہ کر سکا تھا جس سے لہو کی بو آتی تھی۔ ان گنت لوگوں کے لہو کی جیسے یہی لوگوں کی ہوس پر زمین پر مارے گئے۔

اس تہ خانے میں سے بھوری داڑھی والے نے گتے کا ایک ڈبا نکالا۔ پھر دوسرا نسبتاً چھوٹا ڈبا برآمد کیا۔

"یہ ٹائم بم دس لاکھ ڈالر دلوا سکتا تھا مجھے لیکن تمہاری زندگی بچانے کے لیے دس لاکھ چھوڑ رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"تم عقل مند آدمی ہو۔" تیاس نے طنز سے کہا۔

وہ دونوں ڈبے لے کر اوپر آیا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ انہیں کس طرح جوڑا جا سکتا ہے۔ یہ بہت آسان کام تھا اور یہ بات محسن نے بھی سمجھ لی تھی۔

"ٹھیک ہے میں وعدے کے مطابق جا رہا ہوں۔" تیاس نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "تمہیں قتل کیے بغیر۔"

"لیکن میں نہیں جا رہا ہوں۔" محسن بولا۔ اور اس نے آگے بڑھ کے دونوں ڈبے اٹھا لیے۔ "کیونکہ میں نے قسم کھائی تھی اور نہ تم سے کوئی وعدہ کیا تھا۔"

"تم... بدمعاش۔ دھوکے باز۔" بھوری داڑھی والا چلانے لگا۔

"تم نے قرآن کا ذکر کیا اور دین کا ذکر کیا۔ اپنے جہاز کو تم نے کیوں نظر انداز کر دیا؟" محسن بولا۔ "ہم اس کا تجربہ اسی جہاز پر کر لیں۔"

"میں تو جا رہا ہوں۔ میں قسم توڑنے کا گناہ نہیں کر سکتا اور صرف ایک لائف بوٹ لے کر جا رہا ہوں۔" تیاس نے کہا۔

"اب تم خود اٹلانٹک میں رضاکارانہ طور پر بند ہونا پسند کرو گے یا..." محسن نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

میں سیڑھی بجاتا ہوا اوپر آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب باقی کام محسن اور غالب کر لیں گے۔ جہاز کے عرشے کی ریلنگ سے لائف بوٹ بندھی ہوئی تھیں اور ان میں ہوا بھی بھری ہوئی تھی۔ تیاس نے ایک لائف بوٹ کھولی اور سمندر میں پھینک دی پھر میں نے بھی پانی میں چھلانگ لگا دی۔

چھوٹی لائف بوٹ کے کنارے پر بندھے ہوئے چپوؤں کی مدد سے لائف بوٹ کو تقریباً سو گز دور لے گیا۔ اب آگے زیادہ اندھیرا نہیں تھا۔ سمندر کے گرد روشن سیاہ آسمان اور کالے پانی کے صحرا پر ان گنت ستارے روشن تھے جن کا عکس نظر آ رہا تھا۔ یہ سب کچھ ... اور دور جہازوں کی روشنیاں تھیں۔

ہم کتنی ... تھا ... اس کا مجھے اندازہ نہیں ہو سکا تھا لیکن ...

پچھلی بات کی تھی کہ میری چال کامیاب رہی اور جہاز خود اپنے ... سمجھنے والے ... دولت کو ... جانے والے وقت کے کسی اندھے موڑ پر ... جان بیچ کر ... ہم تمام علاقہ دار انجان ہے۔

پہلا دھماکا پانچ منٹ بعد بھی نہیں ہوا تھا لیکن اس سے مجھے تشویش نہیں تھی۔ محسن کو دھماکوں کا سلسلہ بحری جہاز کے طول و عرض میں پھیلانا تھا اور اس طرح کہ جب ری ایکشن ختم ہو تو سب ختم ہو چکا ہو۔ اس کے لیے وہ جس جگہ کا انتخاب بھی کرے گا اور پورے جہاز کا گھوم پھر کر دیکھنے میں وقت تو لگتا ہی ہے۔

پانی میں چپو چلانے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ کریم بخش تھا جو ایک چھوٹی سی کشتی گھسیٹتا ہوا میرے قریب آ گیا تھا۔

"کون ہے؟" تیاس نے اس کے تاریک سائے کو دیکھ کر ریوالور کا رخ ادھر ہی کر دیا۔

"ہم کریم بخش ہے صاحب۔"

"کریم تم گئے نہیں؟" تیاس نے اس وقت کہا جب دونوں کشتیاں آ لگی تھیں۔

"نہیں صاحب۔ ہم سب طرف گھومتا تھا۔ دیکھتا تھا آپ کو۔" کریم بخش نے کہا۔ "دوسرا صاحب لوگ کدھر ہے؟"

اسی وقت پہلا زوردار دھماکا ہوا۔ کریم بخش اچھل پڑا۔ "یہ... یہ تو اسی جہاز پر!"

"ہاں کریم۔" تیاس نے کہا۔ "لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ بھی آتے ہی ہوں گے۔"

جہاز کے ایک حصے میں آگ بھڑک اٹھی تھی اور اس نے پہلے دھماکے پر جو ہچکولے کھائے تھے اس نے سمندر میں بھی تموج پیدا کر دیا تھا۔ سو گز کے فاصلے پر ہم نے ان لہروں کو کشتی سے ٹکراتے محسوس کیا۔ میری نگاہ اب درمیانی فاصلے پر تھی جس میں دو سیاہ متحرک دھبے سے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ غالب اور محسن تھے جو تیرتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔

دوسرا دھماکا پانچ منٹ بعد ہوا۔ جہاز کا کچھ اور حصہ آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس کی حرارت سے متاثر ہونے والے خودکار الارم بجنے لگے تھے۔

جیسے ہی وہ قریب آئے میں نے ہاتھ بڑھا کے محسن اور غالب کو اوپر کھینچ لیا۔ پھر تیسرا دھماکا ہوا اور یکلخت جیسے پورا جہاز بھڑک اٹھا۔ نارنجی شعلے بلند ہوئے تو ان کا عکس پانی میں اتر آیا۔

"اب فرار کا ٹھیک وقت یہی ہے۔" محسن نے کہا۔ "ورنہ ہم بھی شکار ہو جائیں گے۔ جیسے ہی پولیس اور پورٹ کا آگ بجھانے کا عملہ ہنگامی کے اعلان کے ساتھ ہی حرکت میں آ جائے گا۔"

غالب کو تیرنا نہیں آتا تھا چنانچہ اسے بھی محسن ہی کھینچ کر لایا تھا۔ ہاں لائف جیکٹ دونوں نے پہن لی تھیں اسی لیے وہ ڈوب نہیں سکتے تھے۔ جہاز کی طرف سے آنے والی لہریں بھی ان کو ہماری جانب دھکیلتی رہی تھیں۔

آدھے گھنٹے تک دونوں کشتیاں ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ کریم بخش نے وہ کشتی واپس کی جو اس نے کرائے پر لی تھی۔ ہم نے اس کا کرایہ سو روپے ادا کیا اور پھر لائف بوٹ میں کریم بخش کو لے کر ہم کشتی کولابا کی طرف روانہ ہو گئے۔

نازو عرشے پر سے جہاز کے جلنے کا منظر دیکھ رہی تھی اور بہت خوش تھی۔

"کاش میرے پاس مووی کیمرا ہوتا!" اس نے کہا۔

"پھر کیا ہوتا؟" غالب نے چڑ کے کہا۔

"ایسا منظر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"لیجیے کسی کی جان گئی آپ کی ہنسی ٹھہری۔" غالب نے کہا۔ "ہم مرتے مرتے بچے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے گئے تھے۔ اس کی کوئی بات ہی نہیں؟"

"کیا بات کروں اس کی۔ ٹھیک ٹھاک واپس آ گئے بس اللہ کا شکر ادا کرو۔" نازو نے کہا۔

"کیا ٹھیک ٹھاک واپس نہ آتا تو کیا ہوتا؟"

"میں تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرتی جیسے میں نے دو نفل پڑھ کے تمہاری سلامتی کے لیے دعا کی تھی۔"

"تم نے نفل پڑھے تھے میرے لیے؟" غالب نے ایک چیخ ماری۔ ایک قلابازی کھائی اور دوڑتا ہوا نیچے چلا گیا۔

"صرف تمہارے لیے نہیں۔ تم سب کے لیے۔" نازو نے چلا کے کہا مگر یہ بات غالب نے سنی ہی نہیں۔

ہم پھر لباس بدل کے اوپر پہنچے تو پورا آسمان سرخ ہو رہا تھا اور بندرگاہ کی طرف خاصی گہما گہمی دکھائی دیتی تھی لیکن یہ سب بے سود تھا۔ محسن نے ایک ماہر شکاری کی طرح دھماکوں کا جال پھیلا دیا تھا۔ چھ دھماکے ہو چکے تھے اور جہاز اب اپنی شعلہ فشانی کے ساتھ یوں سمندر میں غروب ہو رہا تھا کہ یہ منظر واقعی عمر بھر محفوظ کرنے کے قابل تھا۔ وہ ایک آتش فشاں تھا جسے بالآخر بحیرۂ عرب کی وسعت و گہرائی نے نگل لیا۔

ایک گھنٹے بعد رات کے اندھیرے کی حکمرانی پھر قائم ہو گئی۔ غالب اتنی دیر میں نازو کو خاصے مبالغے اور رنگ آمیزی کے ساتھ اپنی داستانِ شجاعت سنا چکا تھا اور اس کی بات سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ سب کچھ اس نے اکیلے ہی کیا ہے اور محسن تو بس آنکھوں کی

www.paksociety.com

طرح کھڑے ... ہے جیسے کم نے اسکے ... تھا ... [illegible]
آپ نے ہمیں کوئی نقصان نہیں ... تھا ... ایک ... [illegible]
... کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا کون نہیں کرتا۔
جب کھیل ختم ہو گیا تو مجھے نیند کا غلبہ محسوس ہوا۔ ہم دونوں یعنی میں اور محسن نیچے اتر گئے۔ وہ دونوں یعنی نازو اور غالب عرشے پر بیٹھے رہے۔

"یار وہ اپنے ساتھی تھا ہمارے ملاقات نہیں ہوئی" محسن نے میرے قریب والے تختے پر لیٹ کر کہا۔

"وہ آیا تو ہوگا مگر ہم کیسے ملتے" اس سے ذیشان نے کہا۔ "وقت کم تھا۔"

"کیا اس بحری جہاز کی تباہی سے وہ چوکنے نہیں ہو جائیں گے؟" محسن نے کہا۔

"وہ یقیناً سمجھ جائیں گے کہ جہاز تباہ کیوں ہوا اور کس نے تباہ کیا۔"

"پھر کیا اس کے بعد وہ حفاظتی اقدامات زیادہ سخت نہیں کریں گے؟" محسن نے کہا۔ "اور اس ایس کرائی تھنڈر کو جلد از جلد نکال کر لے جانے کی کوشش نہیں کریں گے؟"

"کیوں نہیں کریں گے مگر ابھی تو سو جاؤ نہیں اٹھ نہ سکو گے۔" میں نے جھلا کے کہا۔ "ابھی تو مجھے سونے دو۔"

"سو جا سو جا۔ جیسے خواب دیکھنا ہوگا" محسن نے کہا۔

"مجھے کس نے منع کیا ہے خواب دیکھنے سے۔"

"شریف شوہر ایسے خواب نہیں دیکھتے۔ جیسے تو دیکھے گا"

"خدا کو شریف ہے اور وہ شوہر تو جورو کا غلام ہے۔ اب بولے گا تو مار دوں گا۔" میں نے کہا۔

ظاہر ہے اس کے بعد محسن کو بولنے سے کون روک سکتا تھا۔ اس نے ایک بے سروپا تقریر کی جس کے دوران ہی کہاں نیند نے مجھے آ لیا معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا تھا کہ ایک دھماکے نے مجھے تختے سے نیچے لڑھکا دیا۔

میں نے گھپ اندھیرے میں اجنبی آوازیں سن کے محسن کو پکارا لیکن محسن وہاں نہیں تھا۔ میرے کانوں سے نازو کی چیخ ٹکرائی۔ میں دروازے کی طرف لپکا ہی تھا کہ میرے سر پر کوئی بھاری چیز لگی۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں مجھے دو مضبوط ہاتھوں نے دونوں طرف سے پکڑا اور گھسیٹ لیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میرے سر کے اندر بھی ہتھوڑے سے چل رہے تھے۔ اور باہر بھی۔ آہستہ آہستہ آوازوں کا فرق [illegible] ٹھونکنے کی تھیں اور میں اس لکڑی کے باکس کے اندر بند کیا [illegible] تھا۔

یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ [illegible]
صندوق میں کون بند کر سکتا ہے؟ کیا وہ شکاری تھے [illegible] نکالنے کا ٹیکہ لانچ پر کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے [illegible] سب کے ساتھ گرفتار کر لیا تھا اور اب جانے [illegible] میں بدتر سلوک ہونے والا تھا جو ہم نے [illegible] کے ساتھ تھا۔ اسے ہم نے پلاسٹک کی تھیلی میں پیک کر کے صندوق میں ڈالا تھا۔ میں باقاعدہ تابوت میں ڈال کر [illegible]
اس آخری خیال نے مجھے شک میں ڈال دیا [illegible] مقصود ہوتا تو وہ اتنی زحمت کیوں اٹھاتے۔ تابوت وغیرہ کا بالکل بے مقصد تھا۔ وہ [illegible] بے ہوشی میں [illegible] تو کافی تھا۔

میں اٹھ بیٹھا اور تب مجھے اس بات پر بھی حیرانی ہوئی کہ میں آزاد تھا۔ میرے ہاتھ پیر باندھے گئے تھے اور نہ میرا منہ بند کا بندوبست کیا گیا تھا۔ پھر یہ سب کیا تھا۔

میں نے کھڑا ہونے کی کوشش کی اور دھڑام سے گرا۔ مجھے چکر آ گیا تھا اور نقاہت کے باعث [illegible] فرش پر پایا تو [illegible] سکتا تھا۔ اس سے مجھے اتنا اندازہ ہو گیا کہ میں کسی لانچ یا جہاز پر ہوں۔

میں نے ادھر ادھر ہاتھ پھیلا کے دیکھا تو یہ بھی واضح ہوا کہ وہ باکس ہرگز نہیں تھا کوئی چھوٹا سا کیبن تھا اور ہتھوڑے سے ٹھونکنے پیٹنے کی ساری آوازیں اس کی بیرونی سطح سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

میں نے یاد کیا کہ اس کیبن میں پہنچنے سے پہلے میں کہاں تھا۔ ہاں... میں اور محسن لانچ میں نیچے سونے کے لیے آ گئے تھے غالب اور نازو کو اوپر عرشے ہی پر بیٹھا چھوڑ کے۔ پھر [illegible] سو گیا تھا اور ایک دھماکے سے جاگا تھا۔ میرے سر پر کوئی چیز لگی تھی۔

میں دوسری بار ہمت کر کے اٹھا اور کیبن کی دیوار کے ساتھ چلنے لگا۔ یہ مشکل سے چھ فٹ لمبا چوڑا اور اتنا ہی اونچا تھا۔ اس کی چھت میرے سر سے [illegible] اچانک میرے ہاتھوں نے دروازے کے قبضے کو محسوس کیا [illegible] میری گرفت میں آ گیا۔ میں نے اسے کھینچا تو دروازہ کھل گیا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا [illegible] دن کا اجالا تھا اور مجھ تک یہ روشنی اوپر سے آ رہی تھی [illegible] ساتھ ہی وہ آوازیں بھی سن سکتا تھا جو میرے [illegible]

[illegible] دلخراش چیخیں، سرگوشیاں اور خوفناک آوازیں تھیں۔

"آوازیں" سالار [illegible] غالب کی۔ پھر نازو کی ہنسی کی جلترنگ بجھ گئی اور میرے [illegible] سے پایاں مسرت کے احساس سے بھر گیا۔ [illegible] کے علاوہ میں اپنی ہی لانچ پر تھا اور اپنوں میں [illegible] اور گرمجوشی اور سے ٹوٹ رہے تھے۔

[illegible] خواب کا حوصلہ شکن آسیب ختم ہو چکا تھا۔ [illegible] سہارا لے کر میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اس [illegible] ایک چھوٹی زندگی رہتا ہے اور اس کی حفاظت کا [illegible] سے روال دواں رکھنے کی خواہش اور اس سے مستقبل [illegible] بھی فراہم کرتا ہے۔

[illegible] کے بالکل آخری حصے میں واقع مختصر سا اسٹور تھا۔ [illegible] نے اپنا بیڈروم بنا لیا تھا۔ اب میں دیوار پر [illegible] تصاویر بھی دیکھ سکتا تھا۔ اس [illegible] اور چند دوسری ذاتی استعمال کی چیزیں تھیں۔

[illegible] قدم رکھ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کی تو [illegible] میں نے دیوار کا سہارا لے کر محسن کو آواز دی۔ [illegible] بہت سے دوڑتے قدموں کی صدا سنی پھر [illegible] اوپر والے روشن حصے میں محسن کا ہیولا نمودار ہوا۔ [illegible] آیا۔ اس کے پیچھے غالب تھا۔

"اٹھ گیا [illegible]" محسن نے مجھے سہارا دے کر کہا۔ "کیا دیکھا خواب میں؟"

"یار... [illegible] خواب تھا۔" میں نے سر تھام کے کہا۔

"شادی سے پہلے تو [illegible] خواب نہیں آتے تھے۔" محسن نے [illegible] طرح سر ہلایا۔ "یہ شاید چوٹ کا اثر ہے۔"

"اسے اندیشہ ہے کہ شاید زیادہ ضرب لگی ہے۔" غالب بولا۔

"نہیں ابھی میں ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے اوپر... [illegible] لے چلو۔"

[illegible] آپ تو ہو جائے" محسن بولا۔ [illegible] تمہاری یادداشت تو گم نہیں ہوئی؟"

[illegible] باتیں شروع کر دی ہیں" نازو نے کہا۔

[illegible] فلموں میں چوٹ سے یادداشت [illegible] فلم کے آخر میں چوٹ سے واپس آتی ہے۔ [illegible] پھر...؟"

غالب نے مجھے دوسری طرف سے سہارا دیا۔ میں قدم [illegible] جہاں نازو کا روشن مسکراتا چہرہ ایک آفتاب تھا۔ [illegible]

[illegible] اس سے پہلے وہ [illegible]

مقصود ہے" محسن بولا۔

"کیوں نہ وہ میں تمہارے سر پر [illegible]" غالب بولا۔ "اگر تمہاری یادداشت گم ہو جائے، پھر تمہاری شکل گم ہو جائے۔"

عرشے پر پہنچ کے میں نے خود کو بہت بہتر محسوس کیا۔

"ہاں تو جیت کے تو؟" محسن نے مجھے آرام سے بٹھا کے کہا۔ "تم کو کچھ یاد ہے کہ تم پچھلے جنم میں کیا تھے؟"

"فلسفے سے پہلے نظر ٹیسٹ کر لو" غالب بولا۔ "ادھر اوپر دیکھیے لیجئے سکندر اعظم صاحب! یہ سورج ہے یا چاند، کچھ نظر آ رہا ہے؟"

"مجھے دن میں تارے نظر آ رہے ہیں۔" میں نے زبردستی مسکرا کے کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے چھیڑ کر ہنسنے کے لیے مذاق کر رہے تھے مگر نازو پہ یہ بھی گراں گزر رہا تھا۔

"آپ انہیں بولنے دیں۔ میں ابھی ٹیکہ کافی لے کر آتی ہوں" نازو نے کہا۔ وہ میرے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی صورت پہ تھکن کے آثار عیاں تھے جب وہ اٹھی تو میں نے اس کی آنکھوں کے حلقوں کو بھی دیکھا جو بے خوابی کا نتیجہ تھے اور میں نے ایک جھلک اس نمی کی بھی دیکھی جو ان آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ یہ آنکھوں تک آ کے لوٹ جانے والے آنسو وہ متضاد جذباتی کیفیات کی عکاسی کرتے تھے۔ ان میں احساس کا درد بھی تھا اور جذبات کی سرخوشی بھی۔ اس تصادم جذبات کے توازن کی قوت نے اشکوں کو چھلکنے نہیں دیا۔

محسن نے میرے قریب بیٹھ کے مجھے ایک سگریٹ پیش کی۔ غالب نے سگریٹ چھین کے پانی میں پھینک دی۔ "ہوش آیا نہیں ابھی اور نشہ پہلے شروع ہو گیا۔ دھواں دھار!"

"ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں" محسن نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "بندر کیا جانے ادرک کا سواد اور گدھا کیا جانے زعفران کا بھاؤ۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ غالب کیا جانے سگریٹ کا لطف۔"

"یار یہ ہوا کیا تھا آخر؟" میں نے ان کی لڑائی کو آغاز سے قبل ہی روک دیا۔

"کیسے کیا ہوا تھا اور کہاں کیا ہوا تھا؟" محسن بولا۔

"مجھے کیا ہوا تھا۔ ہماری لانچ میں وہ دھماکا کیا تھا؟" میں نے اس کے بائیکاٹ کے انداز کو نظر انداز کر دیا۔

"ایک ماہی گیری کا جہاز جس کی نظر خاصی کمزور تھی اور جو ٹیک لگائے بغیر آ گیا تھا" غالب نے کہا۔ "وہ ہمیں نہ دیکھ سکا۔"

"اس کی قریب کی اور دور کی نظر غالب سے بھی زیادہ کمزور تھی" محسن نے کہا۔

www.paksociety.com

"یا شاید اس کے انجن میں غلطی سے ڈیزل اور پٹرول کی بجائے شراب ڈال دی گئی تھی۔ وہ محسن کی طرح چل رہا تھا۔"
غالب نے فوراً جملہ کسا۔ "لیکن تصادم سے نقصان تو زیادہ نہیں ہوا۔ آواز واقعی ایسے آئی تھی جیسے بم کا دھماکا ہوا ہو۔"
"تم دونوں بلکہ تینوں اس وقت کہاں تھے؟ میرا مطلب ہے تمھیں کچھ نہیں ہوا؟"
"جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔" محسن بولا۔ "مجھے نیند نہیں آ رہی تھی چنانچہ میں ایک فلم دیکھنے چلا گیا۔"
"فلم دیکھنے آدھی رات کو؟" میں نے حیرانی سے کہا۔
"ہاں، پاکیزہ محبت کی لازوال کہانی کا نیا ایڈیشن۔ لیلیٰ مجنوں اور رومیو جولیٹ کے بعد پاکستان کا تاریخ ساز رومانس۔"
"یہ ایک بہت گھٹیا حرکت کی تھی آپ نے۔"
"ہاں، کی تھی۔ ہمت تھی تو کچھ بگاڑ لیجیے میرا۔" محسن نے ڈھٹائی سے کہا۔ "کمال ہے! الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔"
"چوری! ہم نے کی یا تم نے چوری چوری باتیں سنیں ہماری۔" غالب نے منہ بنا کے کہا۔
"تم ایسی باتیں کیوں کر رہے تھے جو میں چوری چوری سننے پر مجبور ہوا۔" محسن بدستور ڈھیٹ بنا رہا۔
"ہم ایسی کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔"
"تو پھر غصہ کس بات کا ہے؟ اگر میں نے کچھ سن لیا۔ کہو تو چند اقتباسات پیش کروں۔ چیئرمین سنسر بورڈ کے سامنے۔"
اسی وقت نازو کافی کے مگ لیے نمودار ہوئی۔
"ہاں، ہاں، ضرور پیش کرو۔" غالب نے کہا۔ "ہو جائے فیصلہ اسی وقت۔"
"کس بات کا فیصلہ؟" نازو نے کہا جسے نزاع کا سبب معلوم ہی نہیں تھا لیکن غالب کو کون روک سکتا تھا۔
"یہ دونوں اب چپ کیوں ہو گئے جیسے بھیگی بلیاں بن گئے ابھی شیر کی طرح غرا رہے تھے۔" غالب نے کہا۔
"اسے بھی! ہم دونوں سے تھوڑی سی شکایت ہے۔" محسن نے چالاکی سے کہا۔ "منہ پر صاف بات کہتے ہیں ہم۔ تو کہا تھا نا میں نے کہ تم کسی طرح بھی نازو کے لائق نہیں۔ کہاں تم کہاں وہ۔ تم گدھے اور وہ زعفران۔ تم بندر اور وہ ادرک۔"
"جھوٹ... جھوٹ۔" غالب نے شور مچایا۔ "یہ کہا تھا...؟"
"اس میں بنیادی چیز تم نے نازو کی فطرت کے بارے میں کہا تھا کہ صورت کوشش کیا کروں، عجب وہ بات بات پر چھینٹوں کی طرح شگفتہ ہوتی ہے اور روشنی پھیلاتی ہے کسی کی طرح..."
نازو نے غصے سے غالب کو دیکھا اور سخت برہمی کا اظہار کرتی ہوئی اٹھی۔ "یہ بات ہے؟"
"ارے نازو!" غالب اس کے پیچھے [illegible] "یہ بکواس کرتا ہے... قسم خدا کی۔"
"یہ بھی بتا دو کہ تم نے کہا تھا بعد میں گن گن کے بدلے لوں گا۔ پاؤں کی جوتی بنا کے رکھوں گا اور سرہانے [illegible] ہونے سے پہلے ہی اسے ہنسی آ گئی کیونکہ غالب [illegible] محسن کی غلط بیانی سے محظوظ تھی۔ اور غالب [illegible] نہیں بن رہی تھی۔"
"کبھی اسے دو ہاتھ مار کے سمندر میں پھینک [illegible] وصول ہو جائیں گی۔" محسن نے ہاتھ مل کے [illegible] سے کہا۔
میں نے کہا۔ "تو واقعی چھپ کے باتیں سننے [illegible] کی..."
"اب میں اتنا گرا ہوا بھی نہیں ہوں۔" محسن [illegible]
"وہ تو اتفاق ہے کہ میں اوپر جا رہا تھا۔ اب [illegible] سکتا تھا۔ اور یہ بھی نہیں پوچھ سکتا تھا کہ [illegible] جنٹلمین۔" وہ ہاتھ نچا کر بولا۔ "میں نے [illegible] کر بیٹھے دیکھ لوں۔ یہ دونوں تھے کہاں... اور [illegible] اسی وقت غالب اوپر سے نیچے آیا۔ اس کے پیچھے [illegible] آ رہی تھی۔ دراصل انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ کوئی جہاز سیدھا [illegible] طرف آ رہا ہے۔ یہ دونوں ہمیں بتانے کے لیے نیچے [illegible] نے پہلے مجھے دیکھ لیا اس وقت تو چپ رہا۔ بعد میں [illegible] بات جو غالب نے ابھی کی تھی۔"
"میں تو سوتے میں نیچے گرا اور اس وقت میری [illegible] ذہنی کیفیت تھی۔" میں نے کہا۔ "کچھ اجنبی آوازیں [illegible] اور میں نے دیکھا تو اندر اندھیرا گھپ [illegible]"
"ہاں، ہم نے سنی تھی آواز۔ میں اور غالب فوراً [illegible] تھے۔"
"میرے سر پہ نہ جانے کیا لگا تھا۔ [illegible] پہلے کوئی چیز گری تھی مگر نیند اور... اس ذہنی کیفیت [illegible] مجھے تو ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سر پہ وار کیا ہو [illegible] دونوں نے ہی مجھے سنبھالا تھا... تو میں سمجھا [illegible] تمھاری آ پہنچے۔"
"لانچ تو بس الٹتے الٹتے رہ گئی۔ حالانکہ تصادم تو [illegible] ہی تھا۔ تصادم ہوتا تو لانچ کے [illegible] مس کیا تھا۔ سامنے والے حصے کو چھوا تھا۔ اس کے [illegible] آخری وقت میں کوشش کی تھی ہمیں بچانے کی۔ [illegible] پر جو لوگ کھڑے ہوئے تھے وہ سب [illegible]

[illegible] لوگ تھے۔ انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ ٹکر ہوئی ہے۔ [illegible] اور پھر ایک دم کود پڑے سمندر میں اور [illegible] کے لیے آئے تھے کہ نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ [illegible] کوئی بات نہیں ہوئی۔ کریم بلوچ نے انھیں اپنی [illegible] خوب سنائیں اور ٹرالر کے ناخدا کو خود آ کے معافی [illegible] کریم بلوچ نقصانات کی تلافی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ وہ [illegible] ختم کر دی۔ چنانچہ معاملہ بڑھا نہیں اور وہ چلے گئے [illegible] اچھی بات یہ ہوئی کہ فشنگ ٹرالر پاکستانی نہیں تھا۔ [illegible]
"پہلے ہمارے سمندر میں؟"
"یہ تو ہوتا ہے۔ اجازت کے بغیر بھی بھارتی اور روسی مچھلی پکڑنے والے جہاز ہماری حدود میں آ جاتے ہیں۔ [illegible] پکڑے بھی جاتے ہیں۔ سمندر میں سب چلتا ہے۔ ممکن ہے ہمارے [illegible] ماہی گیر نکل جاتے ہوں۔"
"ہاں دونوں طرف پکڑ دھکڑ بھی ہوتی رہتی ہے۔ ایک دوسرے کی لانچیں ضبط کر لیتے ہیں۔ ماہی گیر بھی گرفتار ہو جاتے ہیں پھر ایسے ہی خاموشی سے تبادلہ بھی ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔
"اس روسی فشنگ ٹرالر کا کارکن [illegible] مقامی تھا۔ جو [illegible] بہت غلط بات ہے۔" محسن بولا۔ "[illegible] ان کی مدد کرتے ہیں بعض پیسے کی خاطر۔ جو کوئی غیر ملکی کے مشن پہ [illegible] آتے ہیں اور ہمارے دوست بھی نہیں ہوتے۔"
"یہ تو ہے۔" میں نے کہا۔ "سنا ہے ان فشنگ ٹرالرز کے ذریعے جاسوسی ہوتی ہے۔ ان پر حساس آلات نصب ہوتے ہیں۔"
"ہاں، اس کے خلاف باقاعدہ احتجاج بھی کیا گیا ہے۔ یہ [illegible] ماہی گیروں کی روزی بھی خراب کرتے ہیں کیونکہ ان کے [illegible] ماہی گیری کے جدید ترین طریقے ہیں۔ وہ سب مچھلیاں [illegible] لیتے ہیں اور ہمارے حصے میں کیا آتی ہیں۔"
"کیا ایسے ہی وہ فشنگ ٹرالر بلیک آؤٹ میں آ رہا تھا؟" [illegible] نے کہا۔
"ظاہر ہے پھر تو اندھیرے میں کیا آتا ہے۔" محسن بولا۔ "[illegible] صرف یہ ہوئی کہ ٹرالر پر جو ڈاکٹر تھا دیکھنے میں [illegible] لگتا تھا مگر اس نے فوراً مجھے دیکھ لیا اور اپنے [illegible] سے نکال کے کوئی انجکشن بھی لگا دیا۔ وہ لوگ [illegible] سے تھوڑا سا پریشان بھی ہو گئے تھے۔ [illegible] نے انھیں مزید [illegible] کیا۔ انھوں نے مجھے کہا یا کہ [illegible] ابھی [illegible] ہے۔"
"مجھے کہا یا کسی مترجم کے ذریعے؟"
"نہیں، مترجم کہاں سے آتا؟"
"تو پھر تو نے روسی کیسے سمجھ لی؟"
"یار عقل سے کام لے۔ وہ یہاں کے لوگوں سے کام لیتے ہیں اور جاسوسی وغیرہ بھی کرتے ہیں۔ یہ سب کام اس وقت تک کیسے ممکن ہیں جب تک وہ یہاں کی بولی سمجھتے نہ ہوں اور بولتے نہ ہوں۔ مجھے تو وہ سب ...... کے جی بی کے ٹرینڈ ایجنٹ لگے تھے۔ اس نے اردو میں بات کی۔ لہجہ تو صاف نہیں تھا مگر ان کی اردو خاصی رواں تھی۔ اس نے مجھے تسلی دینے کے لیے کچھ زیادہ ہی وضاحت کر دی کہ دیکھو دماغ ایک جھلی میں ہوتا ہے۔ بعض اوقات چوٹ سے جھٹکا [illegible] ہو جاتا ہے مگر اس کی علامات واضح ہوتی ہیں۔ یہ صدمے کا معمولی اثر ہے۔ اس میں جھلی کے اندر مغز ہل جاتا ہے۔ ممکن ہے ہوش آنے کے بعد بھی کچھ اثرات باقی رہیں۔ مثلاً بے وجہ آوازیں سنائی دیں یا شکل وغیرہ محسوس ہو تو فکر کی بات نہیں۔ یہ اثرات خود بخود زائل ہو جائیں گے۔ اس نے کافی مقدار میں دوائیں بھی دی تھیں۔"
"اور میں نے وہ روسی دوائیں کھائیں؟"
"ہاں، وہ پوچھ رہا تھا کہ انجکشن لگا سکتے ہیں۔ تب نازو نے کہا کہ میں تربیت یافتہ نرس ہوں۔" محسن بولا۔ "میں تو اس انکشاف سے بھونچکا رہ گیا۔ آج تک اس لڑکی نے ہمیں تو بتایا نہیں تھا۔ اس نے نازو کو سرنج دی اور انجکشن دیا کہ چھ گھنٹے بعد لگا دینا۔ اس نے صبح آٹھ بجے لگایا تھا۔ ابھی دو باقی ہیں۔"
"اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔"
"نازو کل ہی رات بھر جاگتی رہی اور تمھارے سرہانے بیٹھی رہی۔ حالانکہ ہم نے کہا تھا کہ باری باری جاگ لیں گے۔ کریم بلوچ نے کہا تھا کہ تمھیں آخری حصے میں شفٹ کر دینا چاہیے سامنے والے حصے میں کچھ مرمت کا مسئلہ تھا۔" محسن بولا۔
"اور معلوم ہے ابھی ہوش آنے پر میں کیا سمجھا؟ میں سمجھا کہ مجھے کسی صندوق میں بند کر دیا گیا ہے اور اس میں باہر سے کیلیں ٹھونکی جا رہی ہیں۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "لاؤ اب سگریٹ دو۔"
محسن نے دو سگریٹ جلائیں اور ایک مجھے دی۔ "یہ ہوش تو جناب کو صبح فجر کے وقت ہی آ گیا تھا کیا یہ بات جانتے ہیں آپ؟"
"نہیں!" میں نے حیرانی سے کہا۔
"آپ نے خاصی نامعقولیت کا ثبوت دیا۔ ڈاکٹر نے ٹھیک کہا تھا کہ آپ کو آوازیں سنائی دیں گی۔" محسن بولا۔ "آپ یکطرفہ گفتگو فرماتے رہے رابعہ سے۔ جیسے سیل فون پہ بات کر

www.paksociety.com

رہے ہوں۔ یہ مجھے نادرہ نے بتایا۔“ بڑے جذباتی انداز میں:
”اس میں نامعقولیت کیا ہے؟“
”نامعقولیت یہ ہے کہ آپ نادرہ کو الجھا کر اپنے عشق کا وہ بخار نکال رہے ہیں بلکہ بخارات نکال رہے ہیں جو آپ کے لاشعور دلیرو میں بھرے ہوئے تھے۔ نادرہ کچھ دار لڑکی ہے۔ وہ الجھن کے باوجود ٹریک میں بھی چکا دے گیا۔“ اس نے بتایا ہے؟“
”ہم خود سمجھتے ہیں۔ میں اور غالب۔“
”کمال ہے۔ مجھے احساس تو ضرور نہیں تھا، مگر یاد بھی نہیں آرہا ہے۔ خواب میں یاد تو آجاتا ہے کیا کچھ کہہ ڈالا تھا میں نے؟“
دوبارہ شوٹنگ کے لیے نادرہ کو بلا لیں۔“ محسن نے کہا۔
”وہ آرہی ہے شوٹنگ کے لیے۔ مجھے شوٹ کرے گی۔“
سب سے پہلے غالب نے قریب آکے کہا۔ اس کا سر سوجا ہوا تھا۔
”یار آپ نے برا تو نہیں مانا؟“ محسن نے کالم لکھتے میں کہا۔
”برا ماننے کی تو بات ہی ہے۔“
”بس کیا کریں۔ عادت سے مجبور ہیں۔ ہم بھی منہ سے خود بخود نکل جاتا ہے۔“ محسن بولا۔
ان کے درمیان تعلقات مزید کشیدہ ہوگئے۔ غالب نے جواب میں ایک فاصلہ ناقابلِ اشاعت بات کہی اور پھر وہاں سے اٹھ گیا۔ اور عرشے پر سے سمندر کو دیکھتا رہا۔
”مجھے ایک شک ہوتا ہے۔“ محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔
”کس بات پر غالب پر؟ کہ کہیں سمندر میں چھلانگ نہ مار دے۔“
”نہیں یار! اسے تیرنا کہاں آتا ہے۔“ محسن بولا۔ ”وہ تو خودکشی کا ڈراما بھی نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ دوسری بات تو یہ ہے کہ نادرہ اس کے پیچھے کود جائے گی اور اسے ایسے نکال لائے گی جیسے دودھ میں سے مکھی نکالتے ہیں۔“
”یہ نادرہ نے سوئمنگ کا کورس کب کیا؟“
”وہ کہتی ہے کہ کالج میں سوئمنگ میرا ایک مضمون تھا۔ میں کیا میرا ایک کورس تھا پھر دیکھو اب تک کیا پڑھا ہے۔“ محسن بولا۔
”شک کی کیا بات کر رہے تھے تم؟“
”شک مجھے یہ ہے کہ وہ شخص ٹرالر جانتے بوجھتے ہماری لانچ سے ٹکرایا تھا۔“ محسن نے کہا۔ ”آج کل کے جدید بحری جہازوں پر ہر چلانے کے لیے جو آلات نصب ہوتے ہیں“ وہ اندھیرے میں بھی اس طرح راستہ دکھاتے ہیں جس طرح طوفان میں۔“
میں نے تائید میں سر ہلایا۔ ”کیا وہ ہمیں غرق کرنا چاہتے تھے؟“
”یہ تو بہت آسان تھا۔“ محسن بولا۔ ”وہ ہم سے اوپر سے گزر کے جا سکتے تھے۔ اس ٹرالر کے مقابلے میں ہماری لانچ ایسے ہی تھی جیسے روڈ رولر کے مقابلے میں کسی بچے کی ٹرائی سائیکل۔“

”پھر کیا مقصد تھا ان کا؟“
”جاننے والے ہی اور تمام مشتبہ محسوس ہونے والی چیزوں کو جانچ لینا۔“ محسن نے کہا۔ ”اگر وہ ایسے … ہم کہاں آنے دیتے۔ شاید کوئی بھی اجازت نہیں … جہاز کی غرقابی کے بعد بھی … ماہوں سے الجھا خیال موجود تھے۔ ہمارے دشمن پریشان … چوری کی واردات میں تھا۔ جلا دیا کوئی کسی جہاز کو غرق … کسی حادثے کا تجربہ بھی نہیں تھی۔ مجھے بعد … تھے اور جا سکے واردات پر جانے بغیر نہ سمجھنے والے … کرنے تحریر کا سوال تھی۔“
”اور پھر وہ بیچارہ ری ایکشن …“ میں نے کہا۔ ”اس … تو ایک ہی پہلو سے جڑا ہوا تھا۔ کیا تم نے کوئی ایسی بات نوٹ کی تھی؟“
”ہاں! اس روسی ڈاکٹر کے ساتھ جو … تم جو کارروائی آئے تھے“ وہ روسی نہیں تھے۔ ان کے … لہجہ واضح طور پر جنوبی ہند کا تھا اور وہ صورت شکل کی غرض … انداز سے بھی … لگتا تھا۔ دوسرا غالباً بنگالی تھا اور چند منٹ کے لیے غائب ہوگیا تھا۔“
”تیرا مطلب ہے کہ وہ جعلی تھا؟“
”نہیں، وہ بہت چالاک آدمی تھا۔“ محسن نے کہا۔ ”گم سم اور روپوش رہنے والا۔ ایسا شخص جو کوشش کرتا ہے کہیں بھی نمایاں نہ ہو۔ اس کی موجودگی بالکل محسوس نہ ہو۔ اس کے حلیے میں یا بات چیت کے انداز میں کوئی بات … جو اسے کسی بھی طرح نمایاں کردے۔ انٹیلی جنس میں ایسے لوگ بہت کامیاب رہتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ انٹیلی جنس ہی کا آدمی تھا۔“
”کس ملک کی انٹیلی جنس کا؟“
”ظاہر ہے ہمارا نہیں ہوسکتا۔“ محسن بولا۔ ”وہ … تفتیش کر رہے تھے۔ ایک پولیس لانچ ہم سے ملنے پوچھ گچھ آئی تھی۔“
”کس وقت؟“
”ابھی کوئی دو گھنٹے قبل۔“ محسن بولا۔ ”تم … کو ہی کسر لیا تھا۔ میں نے اپنے شبہے کا اظہار ان … کے بعد ہی کر دیا تھا کیونکہ وہ جو حاضر غائب شخص تھا … رستے ہی میں کھسک گیا تھا۔ اس وقت وہ … لگا رہا تھا اور ہم سب اس کی طرف متوجہ تھے … غائب ہوا اور غالباً نیچے کا چکر لگا آیا۔ میں نے جب …“

… فوراً غالب کو متوجہ کیا۔ غالب نے … سے نہیں دیکھا تھا۔ … تہہ خانے میں گیا اور بس اتنی دیر میں وہ پھر آگیا۔ میں نے پوچھا کہ تم کہاں چلے گئے تھے تو صاف مکر گیا کہ میں تو یہیں تھا۔“
”یہ بات خطرناک بھی ثابت ہوسکتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا اس شخص کے رویے سے یا صورت سے کسی قسم کے شک کا اظہار ہوتا تھا؟“
”اگر ایسا ہوتا تو کامیاب ایجنٹ بن سکتا تھا؟ تاہم ایک بات ہے میرے اطمینان کے لیے۔“ محسن بولا۔ ”اگر انھیں ذرا بھی شک ہوتا تو وہ آپ کو مہلت نہ دیتے۔ ہم تیار تھے ان سے نمٹنے کے لیے … کر بھی تو نہیں آئے۔ صاحب تو ہم تم چار گھنٹے۔“
میں نے تائید میں سر ہلایا۔ ”کریم بلوچ کا بندوبست اچھا تھا۔ وہ بیچارہ بھی گھیر ہی لیتے … پھر بھی کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ لانچ جو کل سے اسی جگہ موجود ہے“ وہ چار روز دس کلو میٹر … ان تو یہاں نظر آئے۔“
”اب لانچ کہاں جائے گی؟“ محسن بولا۔ ”ہم تو یہیں یوں سمجھ لے کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ چلنے کو یہاں سب تیار بیٹھے ہیں۔“
”ہمیں ہر صورت معلوم کرنا ہے کہ درانی کا ٹھکانہ کہاں ہے اور اگر وقت ہو تو اپنے پیارے اکرام شیخ کا اور موہنی کا سراغ بھی لگانا ہے۔“
”دونوں کام مشکل ہیں۔ نہیں کون بتائے گا کہ … وہ تو اچانک خاموشی سے اور راز داری کے ساتھ نکلنے کی کوشش کریں گے۔“
”اس کے لیے تو رات ہی کا وقت موزوں ترین ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔
”پھر ایسا کرتے ہیں کہ لانچ کو کریم بلوچ کے حوالے کرتے ہیں۔ وہ آج ہی … کے ایک … اور کچھ مچھلیاں وغیرہ لائے۔ اپنے ساتھ … کو دے جائے اور پھر سے سمندر کی سیر کرا لائے۔ میں اور تم چلتے ہیں ساحل کی طرف۔“
”اکیلے ہیں؟“
”کیا ترجمہ ہے یہ … کا حلیہ ہے؟“ محسن بولا۔ ”مزید بولی سب کا۔“
غالب نے ہماری تجویز کو جزوی طور پر قبول کیا۔ اس نے کہا۔ ”تم چلے جاؤ تو اچھا ہے۔ مگر میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔“
”پھر نادرہ کیا اکیلی رہے گی لانچ پر؟“
”اکیلی رہے گی تو کیا اسے شارک اور وہیل کھا جائیں گی؟ … کوئی سمندری بلا چمٹ جائے گی اس سے۔ وہ تو خود … اور شارک وہیل کے تو دو ہاتھ …“

قوان کے جبڑے حلق سے اتار لیتے ہے۔“
یہ سب کچھ نادرہ کو ستانے کے لیے تھا جو ظاہری بے نیازی سے دوسری جانب کھڑی ہوئی سمندر کو دیکھ رہی تھی۔
”بے شک وہ اپنی حفاظت کرسکتی ہے۔ مگر تم کو کیا اعتراض ہے اس کے ساتھ جانے میں؟“ میں نے کہا۔
”یہ خود اپنی حفاظت جو نہیں کرسکتا۔ ڈرتا ہے سالا کوئی بچانے والا بھی نہیں ہوگا۔“ محسن نے اسے طیش دلانے کے لیے کہا۔ ”میں کہتا ہوں تم ایسی بات ہی مت کرنا۔ بلکہ بہتر ہے یہ بات ہی مت کرنا ورنہ جانا پڑے گا اس کنارے پر جو شمال کی طرف منہ کرکے …“
”مگر میں جانا ہی نہیں چاہتا۔“
”میرزا! یہ تم دل سے کہہ رہے ہو؟ اور نادرہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اور قسم کھا کے کہو۔“ محسن بولا۔
نادرہ کے سر پر ہاتھ رکھنا … کا کام … سے زیادہ مشکل کام تھا۔ ”مقتول کچھ اس مت کرو۔“ میں نے کہہ دیا تاکہ تمہارے ساتھ جاؤں گا۔“
”دیکھتا ہوں تم کیسے جاتے ہو۔“
”چلو نادرہ سے پوچھ لیتے ہیں۔“
”میں کچھ نہیں سن رہی ہوں۔“ اس نے ہماری طرف دیکھے بغیر کہا۔
”پتہ کہہ رہی ہو تاکہ تم کچھ نہیں سن رہی ہو۔“ غالب نے کہا۔
”پھر ٹھیک ہے۔ میں آپ لوگوں کے بے حد اصرار پر چلا جاتا ہوں ورنہ کفن باندھ کے … یوں بھی دوستوں کا دل توڑنا اچھا نہیں لگتا مجھے۔ تمہارا کیا خیال ہے نادرہ! ہم ان کے ساتھ چلے جائیں؟“
”میں اب بھی کچھ نہیں سن رہی ہوں۔“
میں اور محسن ہنس پڑے۔ ”… دراصل یہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جس کے لیے سب کا ایک ساتھ جانا ضروری ہو۔ میں اور محسن بندرگاہ کے علاقے کا ایک چکر لگا کے اور کچھ سن گن لے کر آتے ہیں۔ مغرب تک تم بھی لوٹ آنا۔“
”اس بھروسے پہ مت رہنا۔ ہمارا کیا پتا۔ لوٹ کر ہی نہ آئیں کیوں بیگم نادرہ؟“ غالب نے پھر کہا۔
”کتنی بار کہوں کہ میں کچھ نہیں سن رہی ہوں۔“ اس نے اب بھی ہماری طرف نہیں دیکھا۔ مگر اسے جو کہنا تھا وہ ہم نے سمجھ لیا تھا۔
کریم بلوچ اس تمام عرصے میں نہ جانے کہاں غائب رہا تھا۔ غالب نے اس کو تلاش کے بعد ایک گمنام گوشے میں دریافت کیا۔ جہاں وہ کانٹا لپیٹ کے ایک اندھیرے میں سو رہا تھا۔ یہ تو اس کو جگانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ نشے میں ہے۔ وہ مدہوش نہیں تھا اور بات سن کے سمجھنے اور جواب دینے کے قابل بھی تھا مگر وہ سیدھا کھڑا

www.paksociety.com

نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے پیروں کے نیچے زمین ہل رہا ہو۔ بے شک سمندر کے سینے پر تلاطم ایک مسلسل عمل ہے اور حرکت جو زمین پر محسوس ہوتا ہے اس کا تو اب پہ کوئی تصور نہیں۔ بلکہ وہ سمندر کا عادی تھا اور ایک مختصر عرصے میں اگر ہم اس حرکت کے عادی ہونے لگے تھے۔ تو کریم بوٹ کے لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

غالب نے اسے میرے سامنے ایک ملزم کی طرح بٹھا دیا۔

"تم پیتے ہو کریم! کیا پیتے ہو؟"

"اپن کیا... کیا پیتی گا صاحب... وسکی مسکی تو کبھی مقدر سے مل جاتا ہے۔ ورنہ تاڑی شراب ہے۔" وہ چہک کے بولا۔ "آپ نہیں پی سکتا۔"

میرا اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کو جی ہو گیا! "شرم آنی چاہیے تمہیں خود کو مسلمان کہتے ہوئے نہیں۔"

اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا: "اپن بہت گناہ گار ہے صاحب، پر مسلمان ہے!"

"کیسے مسلمان ہو؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ یہ چیز ہم پر حرام کر دی گئی ہے۔"

"معلوم ہے... معلوم ہے صاحب... پر کیا کرے...؟"

"اگر معلوم ہے اور پھر بھی پیتے ہو تو بہتر ہے کہ سب حرام چیزوں کو حلال کر لو۔ ہم خنزیر بھی کھاؤ لیکن خود کو مسلمان کہنا چھوڑ دو ورنہ ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ ہم ایک بند ہ پاس بھی غیر مسلم کو نا قابل سکتے ہیں اور اس کی پینے کی عادت کو قبول کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں کر سکتے کہ کوئی خود کو ہمارا ہم مذہب بھی کہے اور پھر وہ کام بھی کرے جس کی ممانعت ہے تو ہم اسے کچھ نہ کہیں۔"

وہ سر جھکا کے سنتا رہا۔ "آپ حق بولتا صاحب! بالکل سچا بات کرتا ہنگ... ہم بہت لاچار اور مجبور ہے۔ ادھر سمندر میں آدمی کا اندر سے خالی ہو جاتا۔ اس کا سینے میں پانی بھر جاتا اور پیٹ میں مچھیں۔"

"خوب! تو یہ تم دوا کے طور پر استعمال کرتے ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔ "تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم پیو گے نہیں تو مر جاؤ گے؟"

"بالکل مر جائے گا صاحب! ایک دم مر جائے گا۔"

"اچھا۔ ہم دیکھیں گے۔" میں نے کہا۔ "نہ تم مرو گے نہ ہم تم کو اور نہ شراب پینے دیں گے۔"

"آپ ہم کو مار دو صاحب۔ ہم کو بند کر دو کمرا میں! ہاتھ باندھ کے ڈال دو۔" وہ بولا۔ "ہمارا باپ بھی ایسا کرتا تھا۔ آپ بہت اچھا کرے گا صاحب۔ مگر ہمارا یہ خبیث عادت چھوڑ دیں گا۔"

"جاؤ رفع ہو جاؤ۔ تم کو بلایا تھا کام کے لیے۔ مگر تم تو کسی کام کے نہیں۔"

"ہم کو آپ بولو صاحب، کام ہم کرے گا۔" وہ جھینپ کر ہاتھ ملا کے بولا۔

"خاک کام کرے گا، بیڑا غرق کرے گا۔" میں نے کہا۔ "نشے کی حالت میں کشتی چلا سکتے ہو تم؟"

"کیوں نہیں صاحب! ایسا کیا بات ہے۔ ہم تو جب بھی کرتا ہے... ہم بھی اور دوسرا سب لوگ بھی بشمول سائنس کے ذہان کا جانے ابھی ہم نے زیادہ کہاں پیا ہے۔ زیادہ پئے گا تو سب گا، پھر ہم بھی کو نشہ نہیں ہوئے گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے اس نے خوب پی ہو گی مگر یہ عادت بن گئی ہو۔ اب یہ علامت اس کی مجبوری تھی اور ضرورت بھی۔ شراب اس کے جسمانی نظام کا ایک حصہ بن چکی تھی اور اعصاب کو کنٹرول کرنے لگی تھی۔ اس کے بغیر وہ ناکارہ ہو جاتا تھا۔ ایسا میں نے ٹرک ڈرائیوروں کے بارے میں سنا تھا کہ وہ ٹرک ڈرائیو کرتے وقت بے پناہ نشے سے زیادہ کرتے ہیں اور ان کے ایک بار ساتھ ... کرتے ہیں ... کو ایک مسکن اعصاب دوا کے طور پر استعمال کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

"تم لانچ چلاؤ گے؟" میں نے کہا۔

"آپ فکر نہ کرو صاحب! بولو تو سوئی کے ناکے سے لانچ گھما کے دکھائے۔" وہ بولا۔ "کریم بوٹ کا لانچ ایک دم مچک..."

میں نے غالب کی طرف دیکھا۔ "کیوں، کیا مرضی ہے؟"

"ہم جو کچھ دیکھے ہیں تم کو بھی نے کو دیتے ہیں۔" اس نے ناخدا کی طرف دیکھ کے کریم بوٹ سے بات کی: "اور بقول اپنے خاطر سے عجب پیار کیا تو کیا بگڑ گیا!"

ناخدا نے اس بار پچکار کے الفاظ کا اظہار کیا جیسے وہ کچھ سمجھ نہیں رہا ہے۔

کریم بوٹ نے اپنے پیشہ ورانہ دعوے کو سچ ثابت کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے بڑی مہارت کے ساتھ لانچ کو بندرگاہ کے علاقے میں ایک ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں سے قریب ترین کا علاقہ دور نہیں تھا۔ لیکن یہاں سمندری ٹریفک کسی نظم و ضبط کا پابند نہیں تھی۔ اور اس جگہ چھوٹی بڑی ماہی گیری کی کشتیاں اتنی ہی تھیں جن کی تعداد کا کوئی شمار نہ تھا۔ جہاز جہاں سے ... اس علاقے کا اگر موازنہ کیا جاتا تو جو فرق ... سمندر کی ٹریفک ... چاکیواڑہ کی ٹریفک میں محسوس کیا جا سکتا تھا ... وہی بندرگاہ ... باہر کے علاقے میں بھی نمایاں تھا۔

"ہم گیارہ بجے کے بعد لانچ لے کر اسی جگہ پہنچ گئے تھے۔"

... ہے کی نا یہ جگہ؟" غالب نے کہا۔
... تو نہیں سکے۔ مگر تم واپسی مت بھول جانا۔" محسن بولا۔
جب لانچ واپس چلی گئی تو ہم ہجوم میں شامل ہو گئے۔ بھیڑ ... منتشر اور غلط بے لحاظ اور منتشر ... قوت تھی ہر سمت ... ادھر ادھر ... مصروف عمل۔ اچانک کسی نے پلٹ کے کچھ کہا اور ... ہاتھ پکڑ کے بلا دیا۔
... نے اٹھا لیا ہے؟"
میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ کوسٹ گارڈ کا آدمی تھا۔
"کیا ہے؟" میں نے کہا اور اس کی بیلٹ کی طرف دیکھا ... کیا ہوا تھا۔
"کیا ہے! تجھے کیا مزدوری کرنا ہے۔ میرا کام یہ سوال کرنا؟" وہ ... غصے اس نے گالی بھی بک دی۔
محسن نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا: "کالی پھیر ... صاحب مجھے یہ کیا مزدوری کی بات تو پہلے بتاؤ اجرت کیا ملے گی؟"
"اجرت؟" وہ صدمے اور غصے سے اس کا برا حال ہو گیا۔ "جبری ... اجرت کریم سے مزدوری مانگتا ہے۔ اسے معلوم ہے یہ کیا ہے ... اس کا مال ہے۔ مجسٹریٹ صاحب کی گاڑی کھڑی ہے باہر۔"
"مجسٹریٹ شریف ہے کہ کام کرانے سے پہلے مزدور سے اس کی اجرت طے کر لو۔" میں نے کہا۔ "اس کو اٹھا کر باہر لے جانے کے روپے ہوں گے۔ باہر مجسٹریٹ صاحب کی گاڑی تک اور ... صاحب کی ... گاڑی تک۔"
اس کی آنکھوں میں غصہ اتر آیا تھا مگر نہ جانے کیوں وہ چپ ... بڑبڑا کر بک گیا۔ اس نے محسن سے رجوع کیا۔
"یہ نیا لگتا ہے ... چل تو اٹھا۔"
"کیا یہ خراب کا کریٹ ہے؟" محسن نے کہا۔
"بات والی ... خراب ہے۔ ذرا سنبھال کے اٹھانا۔"
محسن نے مجھے آنکھ ماری اور کریٹ اٹھا لیا۔ دو قدم چلا ... اس نے دیکھا کہ سامان اٹھوانے والا مطمئن ہو کے آگے بڑھ گیا ہے تو اس نے کریٹ کو اٹھایا اور زمین پر دے مارا۔ بوتلوں کے ٹوٹنے کی چھوٹے دھماکے ہوئے جو مل کر ایک بڑا دھماکا ... کوسٹ گارڈ کا سپاہی ایسے اچھلا جیسے اس کے پیچھے کسی نے ... لگا دی ہو۔
... اور محسن بھاگنے ... دوسرے سے ٹکراتا ... تعاقب میں دوڑا۔ ... سامنے تماشا بنانے کے لیے کسی اور کو چیت کیا۔ اتنی دیر میں ... کے سپاہی نے اپنے کسی دوسرے ساتھی کو بھی ... اور مجسٹریٹ ہمارے پیچھے بھاگتے چلے آ رہے تھے۔

وہ مسلح نہیں تھے اور اس علاقے میں ان کی مدد کے لیے پولیس بھی نہیں تھی۔ مگر انھیں وردی ... کے اختیار پر غرور تھا۔ وہ ... سے بھی چلا چلا کے بھی بچ نکلنے کا کہہ رہے تھے۔ مگر آزل تو یہاں شور میں ان کی سنتا ہی کوئی نہیں تھا۔ جس نے سنی اور ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی اسے ہم نے ادھر ادھر جھٹک دیا۔

ایک فرلانگ کی دوڑ ایک نسبتاً ویران علاقے میں ختم ہوئی۔ ہم ایک گودام نما بیرک میں گھس گئے۔ جس میں فرش سے چھت تک بوریاں بھری پڑی تھیں۔ یہ بوریاں تعداد میں رکھی گئی تھیں جیسا کہ گودام کے اندر گلیاں سی بن گئی تھیں۔

"ادھر... تو ادھر دیکھ، میں ادھر سے جاتا ہوں۔" پیچھے سے آنے والے نے کہا۔ "سالے بچ کر جائیں گے کہاں۔ اتنا نقصان کر دیا میں جواب کیا دوں گا مجسٹریٹ صاحب کو۔ وہ تو مجھ کو ہی ڈنک دے دیں گے۔" وہ اکیلا ہی غصے میں بڑبڑاتا چلا آ رہا تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا۔ اس کی آواز بند ہو گئی۔ اس کے کان کے ذرا نیچے ہاتھ مار کے میں نے اسے بے حس کر دیا۔

"اب تو اسے سنبھال۔" میں نے کہا۔ "میں دوسرے کو پکڑتا ہوں۔"

دوسرا ایک منٹ کے بعد میرے ہاتھ آ گیا۔ وہ بوریوں کی دیواروں سے بنی ہوئی گلیوں میں بھٹکتا ہوا آ رہا تھا جو ... وہ نقصان کے لیے مجسٹریٹ صاحب کو جواب دہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ زیادہ مستعد بھی نہیں تھا۔

"یار، یہ اپنے بس گودام کا والی وارث کوئی نہیں ہے؟" محسن نے کوسٹ گارڈ کی وردی میں ملبوس ہو کے کہا۔

"تم نے چھانی ماری تو بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے بھی قاعدہ شرفا کا ورکنگ ٹائم ... کا ہے؟"

"اور ٹنک ... میں نے ایک بوری پر۔" محسن بولا۔ "معاف کیجیے گا۔ یہ وردی آپ کو تو نہ کا سائز دیکھ کر سینی چاہیے تھی۔"

"معلوم ایسی لگتی ... سائز ... غالب حرام کا شریف بارک ... میں نے ڈھیل شرٹ کو ٹائٹ باندھتے ہوئے کہا۔

"کوئی چوکیدار قاعدے قانون کے مطابق یہاں رکھا ضرور گیا ہو گا۔"

"اس ملک رواج اور فیشن کے مطابق وہ چائے پینے چلا گیا ہو گا یا کسی افسر کے کام سے گیا ہو گا۔ اس کے گھر پہ بچے کھلا رہا ہو گا! ممکن ہے کہیں دری بچھا کے ریڈیو پہ گانے سن رہا ہو۔"

"اس میں کیا ہے جو کوئی لے جائے گا۔ ان بوریوں میں چاول ہیں۔ سو اور من کی بوری کون کیسے لے کے جا سکتا ہے۔"

"بات یہ ہے کہ قوم کو بڑی ... ہوتی جا رہی ہے۔ جرائم ...

www.paksociety.com

"اور کام چوری سے۔" میں نے کہا۔ "جب تک اوپر کوئی دیکھنے والا نہ ہو کام نہیں ہوتا۔"

"اور پھر نگرانی کرنے والے پر ایک اور نگران رکھنا پڑتا ہے۔" محسن نے مجھ سے اتفاق کیا۔ "وہ بھی فرض پورا نہیں کرتے۔ بس وقت نبھاتے ہیں۔"

"اور میں نے تو ایسے ایسے باکمال لوگ دیکھے ہیں کہ بیک وقت دو جگہ نوکری کرتے ہیں۔ دونوں جگہ سے تنخواہ لیتے ہیں مگر کام ایک کا بھی پورا نہیں کرتے۔"

ہم دونوں گودام کے عقبی راستے سے باہر نکل رہے تھے کہ ہمیں کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔۔۔۔ وہ ادھر ہی آ رہے تھے چنانچہ میں اور محسن دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔

"آپ نمونہ بے شک دیکھ لیں۔ اصل کرنل باسمتی ہوگا۔ اور ایکسپورٹ کوالٹی۔"

دوسرا شخص پیچھے پیچھے اندر آ گیا۔ "پچھلی بار بھی تم نے یہی بولا تھا۔"

"میں نے۔۔۔ بات میں نے کی تھی لیکن قسم کو سپلائی میں نے نہیں دی تھی۔" پہلا شخص غالباً چوکیدار تھا۔ "تمہارا مال کتنے بجے آئے گا؟"

"وہ ساڑھے نو بجے کے بعد۔ میں خود بھی آؤں گا ساتھ اور پیسے بھی اسی وقت دوں گا۔"

"یہ غلط ہے۔ آدھی رقم ابھی دو۔ بوری پر اپنا نشان لگا دو اور نشان دیکھ کے لے جاؤ۔ میں نہیں ہوں گا۔"

"کیوں؟ رات تک ڈیوٹی ادا کرو گے؟"

"دیکھو سیٹھ صاحب، بڑا سست مانا۔ میں تو مر وار رہا تھا کبھی پارکس نے۔۔۔ میں آپ کا کام نہیں لیتا لیکن کر لی۔۔۔ اپنا مال تو دیکھ کے گیا اور بیچ میں دس بوریاں چپکے سے کم ہی رکھ گیا سو بوری بلی میں۔"

"میں بے ایمانی کا کام نہیں کرتا۔ تم دیکھ لینا، سب میں دس ہی جوشی چاول ہوگا۔"

"جوشی کا حیلہ۔"

"ہاں ہاں، وہی تھا میرا مطلب۔ نوٹ سارا ہوگا مگر صاف۔" سیٹھ نے جیب سے نوٹ نکالے۔ "یہ لو ابھی دو سو رکھو۔"

"اور باقی قیمت؟"

"رات کو مال لگنے کے بعد۔" سیٹھ نے جیب میں سے ایک موٹا سا مارکر نکالا۔ ایک ہلکی سی چھری نما چیز پہلے ہی اس کے ہاتھ میں تھی۔ یہ چھری اس نے ایک بوری میں گھونپ دی۔ اس کی نوکیلی تیز دھار شیب میں کچھ چاول آ گئے۔ سیٹھ نے انھیں ہتھیلی پر ڈال کے رگڑا۔ چھوٹا لگا اور سونگھ کے سر ہلایا۔ پھر اس نے بوری پر ایک خاص نشان ایسی جگہ لگا دیا جہاں وہ ایک نظر میں دیکھا جا سکتا تھا۔

"اب دوسرا لاٹ آ گئے والا لو۔ سب ایک جگہ کا ہوگا۔ اٹھاؤ۔" چوکیدار نے کہا۔ وہ آگے بڑھ گئے۔

ہم باہر نکل آئے۔ ابھی ابھی ہم نے ایک شب اور دیکھا تھا۔ چھوٹے والوں کو ملک کی عزت لوٹتے دیکھا تھا۔ گر کے تاجر کی ساکھ لوٹتے دیکھا تھا۔ اور اس کا خزانہ لوٹتے دیکھا۔ یہ سب باہر بھیجا جانے والا اعلیٰ قسم کا چاول تھا اور ایک معمولی چوکیدار نے کس بیوپاری کے ساتھ مل کر پانچ سو روپے کی خاطر ایمان سب کچھ بیچ دیا تھا۔ اس اعلیٰ قسم کے باسمتی چاول کی بوریاں جو ہزاروں بوریوں پر مشتمل تھی، سو بوریاں تبدیل کی جا رہی تھیں۔ ان کی جگہ گھٹیا قسم کے موٹے چاول رکھے جا رہے تھے۔ مال خریدار کا چیک کر نہیں سکے گا۔ پھر بھی سب کو پتا ہوگا کہ دس فیصد وہ نہیں جو پاس کی گئی تھی۔ مال کسی جہاز میں لادا جائے گا، جب بیرونی ملک کسی امپورٹر کے پاس جائے گا تو وہ اس سے پوری پاکستانی قوم کو بے ایمان سمجھے گا۔ پوری تاجر برادری کو رسوا کرے گا۔ یہ نقصان تو برداشت کرے گا مگر اپنی زبان سے نہیں ملک کی ساکھ کو اور تجارت کو کتنا نقصان پہنچا سکے گا۔ دو فرد سو بوری خراب چاول لے کر تباہ نہیں ہوں گے مگر پاکستان کے ہاتھ چاول کی مارکیٹ کو تباہ کرنے کے لیے یہ مثال دنیا بھر کے دالوں کے سامنے رکھے گا کہ اپنے بہتر چاول کو بیچ کر دیں گے؟ باہر بھیجتے ہیں آسکتے ہیں ملک کے بیوپاری نہیں مگر عمل ایک فرد کرتا ہے تو سزا پوری قوم کو بھگتنی پڑتی ہے۔

"تو تم نے دیکھا اور سنا؟" محسن نے کافی دور جا کے کہا۔

"ہاں، اور مجھے اپنی بے بسی پر افسوس ہوا۔ میں نے کیا کیا؟ ان کو پکڑ نہ سکے۔"

"پکڑ لیتے تو ان کا کیا بگاڑ لیتے۔ وہ صاف مکر جاتے کہ ایسی کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔" محسن بولا۔

"پانچ سو چوکیدار کو ملے تو چاول بدلنے والے کو پانچ ہزار تو ملیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور ایسے کاروبار میں تو بڑے بڑے لنگوٹی والی بات ہے۔ پانچ سو لے کر چوکیدار بنا ہے۔ کاروبار میں اپنا ایمان بیچ گیا۔"

"ایک چوکیدار پانچ سو روز کماتا ہوگا۔"

"نہیں، شاید سے یہاں بہت ملتے ہوں۔ اس میں سے سب کو ان کا حصہ پہنچتا ہوگا۔ چوکیدار کی جو جتنا بڑا عہدہ رکھتا ہے اتنا ہی بڑا حصہ وصول کرتا ہے۔"

"اس لیے پرواہ نہیں ہوتا۔ اگر کبھی پکڑا جائے گا تو یہی سب سے نیچے والا۔"

"جبھی یار! اسی لیے میں نے ان سے معاف کر دیا۔" میں نے کہا۔ "اپنے رفقا کا تھا مجھے کہ ان دونوں کو ٹھکانے لگا دوں۔ یہ بھی تو ملک کے دشمن تھے۔ ان کا جرم بھی تو غداری سے کم نہیں تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ یہ میرے مشن کا حصہ نہیں اور مجھے ایک وقت میں ایک ہی کام رکھنا چاہیے۔ یہ تو یہاں سب کر رہے ہیں اور ہر روز کر رہے ہیں۔ میں انھیں سزائے موت دیتا تو جائز ہوتا مگر اس سے فرق کیا پڑتا؟"

"اب فرق پڑتا، چوکیدار کے خاندان کو۔ اس کے بیوی بچوں کو ایک کمانے کی آمدنی کا ذریعہ ختم ہو جاتا۔ ایک عورت کا شوہر نہ رہتا، چند بچوں کا باپ نہ رہتا۔ خرابی اپنی جگہ رہتی۔ اس کی جگہ دوسرا کون سا فرشتہ آتا؟"

"یہ تو میرے نزدیک بیمار ذہن کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے والی بات ہے۔ اور برائی کو خود کتا کیا برائی نہیں ہوتی، جس برائی کو ہم نے دیکھا نہیں، اس کی تو ہم پر اخلاقی فرض ذمہ داری بھی عائد نہیں ہوتی۔ مگر جیسے ہم لوگ چلتے ہیں سڑک پہ پتھر پڑے دیکھتے ہیں تو ہٹا دیتے ہیں پھر آگے چل پڑتے تھے۔"

"تیرا مطلب ہے انھیں سزا ہونی چاہیے؟"

"ہاں، سزا تو ہر مجرم کو ہونی چاہیے۔ خصوصاً ان کو جو کسی قانون کی گرفت میں نہیں آتے ہیں کیونکہ قانون کے سامنے ان کو لے جانے کے لیے ثبوت، شہادت، گواہ کچھ نہیں تھا۔ لیکن جو اپنی آنکھوں سے جرم سرزد ہوتا دیکھے اسے تو تامل نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں شک کی تو بات ہی نہیں تھی کہ وہ بھی خدا اور وطن دشمن تھے۔"

"ہاں، مجھے تو سہی۔"

"رہی ان کے خاندان کی بات، تو جہاں کیا وہ نہیں جانتے کہ جس رات وہ گرفت میں آ گئے تو نقصان کس کا ہوگا؟ سزا تو ہر جرم کا اور قاتل کے خاندان کو ملتی ہے۔ ہر طرح، وہ دو شواہد ہوتے ہیں۔ ان کے بھی چھلے ہیں اور ان کا انجام باعث عبرت بھی ہوتا ہے۔ مگر کیا ایسا نہیں ہونا چاہیے؟ ایسا ضرور ہونا چاہیے۔ اس کے لیے رحم دلی اور درگزر کے جذبات رکھنا غلط ہوگا۔ جب ایک خاندان اپنے سربراہ کی غلطی سے تباہ ہوتا ہے تو دوسرے خاندان کا نسلے زندہ دیکھتا ہے اور سوچتا بھی ہے۔"

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہم انھیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیں گے۔ جس رات کا یہ جرم کے وقت اور سب کچھ دہرایا جائے گا۔ گرفتاری، مقدمے کی سماعت، فیصلہ اور سزا پر عمل درآمد۔ ابھی تو ہم کوسٹ گارڈ کی وردی میں ایک ... اس لیے منصف نہیں بن سکتے۔"

"بہرحال یہ بتاؤ کہ کیا ہم جہاز پر جا سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "اس وردی کے ساتھ ہم اتنے بااختیار ہیں؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ ہم سے زیادہ بااختیار ہیں۔ اگر وہ روک دیں تو ہم زبردستی جہاز پر قدم رنجہ نہیں فرما سکتے۔ اور پھر ان کے تو تعلقات بھی اوپر والوں سے ہوں گے۔ جانے افسران سے۔"

"پھر یہ وردی کیا صرف دکھاوے کے لیے ہے؟"

"نہیں، ہم اس وردی کے ساتھ بہت سے مقامات ممنوعہ تک جا سکتے ہیں۔ اور وہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں جو ایک عام آدمی یا مزدور حاصل نہیں کر سکتا۔ زیادہ آسانی سے اور اعتماد کے ساتھ گھوم پھر سکتے ہیں۔ اندر باہر آتے جاتے کوئی ہمیں چیک نہیں کرے گا۔"

"تو چل پھر باہر چلتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور تھا، اس کا پتا کرتے ہیں۔"

"کس سے پتا کرتے ہیں؟"

"ان کے ہم پیشہ لوگوں سے۔" میں نے کہا۔ "ٹیکسی والے جو کسی مخصوص علاقے میں نظر آتے ہیں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

باہر ایک قطار میں چھ ٹیکسیاں موجود تھیں۔ ان میں سے دو کے ڈرائیور بھی سیٹ پر موجود تھے مگر وہ شیخ کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے۔ باقی ایک ایرانی ہوٹل میں روٹی پر کھانا کھاتے ہوئے ملے۔ ہوٹل کے اندر قدم رکھتے ہی جب کھانوں کی خوشبو نے یلغار کی تو ہماری بھوک بھی ایک دم جاگ اٹھی۔ میں اور محسن ایک ایسی ٹیبل پر بیٹھ گئے جہاں دو ٹیکسی ڈرائیور نظر آنے والے پہلے سے موجود تھے۔ ہم نے اخلاقاً بھی ان سے اجازت نہیں لی۔ ایرانی ہوٹلوں میں ایک ٹیبل پر ایک آدمی کا اصول نہیں چلتا، خصوصاً اس وقت جب رش ہو۔ دونوں ٹیکسی والوں نے ایک نظر ہماری وردی کو دیکھا۔ یوں ان کی وردی سے زیادہ مختلف نہیں تھی اور پھر کھانے میں اور پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

کھانے کا آرڈر محسن نے دیا۔ میں بظاہر دوسری طرف دیکھتا رہا لیکن میرے کان ان کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے جن کے بارے میں ہمارا خیال تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور ہیں۔ ہمارا خیال درست تھا۔

"یار، ان سے یہ پوچھیں؟" میں نے یہ آواز بلند کہا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے چونک کے مجھے دیکھا۔

"یار، آپ لوگ ٹیکسی چلاتے ہو؟" محسن بولا۔

"ہاں، چلاتے ہیں، پھر؟" ایک نے بڑے جارحانہ انداز میں پوچھا۔ غالباً اسے شک ہو گیا تھا کہ ہم بھی پولیس کی طرح ان سے غلط قسم کی توقعات وابستہ کر بیٹھے ہیں۔

www.paksociety.com

"پھر پوچھ کر ہمیں ایک دوست کے بارے میں بتاؤ۔ وہ بھی ٹیکسی چلاتا ہے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"کس کا دوست، تمہارا کہ ہمارا؟"

"اگر ہمارا دوست ہوگا تو کیا تمہارا دشمن ہوگا؟" محسن بولا۔ "تمہارا ساتھی ڈرائیور ہے آخر وہ بھی۔"

"نام کیا ہے اس کا؟" جارحانہ لہجہ رکھنے والا نرم پڑ گیا۔

میں نے کرم شیخ کا نام بتایا۔ تو وہ دونوں نظروں میں سر ہلانے لگے۔

"شیر یار ہے ٹیکسی کا۔" دوسرا ڈرائیور بولا۔

"شیر۔ پہلے تو یار تھا۔" میں نے سر کھجا کے کہا۔ "مگر ابھی حال ہی میں اس نے نئی ٹیکسی لی ہے جو اسی علاقے میں رہتا ہے۔"

"نئی ٹیکسی۔۔۔ ابھی کل پرسوں؟" پہلا ڈرائیور چونکا۔

"ہاں کل پرسوں ہی کی بات ہے۔" محسن بولا۔

"اس کے ساتھ شاید ایک لڑکی بھی دیکھی ہو تم نے؟" میں نے کہا۔

وہ دونوں مسکرائے اور پھر ہنسنے لگے۔ "لڑکی کی بات پہلے کرتے نا۔ تم کیا سب بتا دیتے۔ بڑا ظالم ہاتھ مارا ہے۔"

"بالکل نیلو ہے نیلو۔ ساتھ لیے پھرتا ہے سب کو جلانے کے لیے۔" دوسرا بولا۔ "مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وہ پکڑا نہ گیا ہو۔"

"کیوں پکڑا گیا ہو؟" میں نے کہا۔

"پکڑا تو جاتا ہی ہے کہیں نہ کہیں! اچھے گھر کی لڑکی اغوا کر لایا ہے اور لگتا ہے یار نے شادی بھی کر لی ہے اس سے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ اپنی بیوی کو بھگا کے لایا ہے اغوا کر کے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ماننے والی بات نہیں ہے بھیا۔ وہ الگ ہی چیز ہے۔ اوپر کا مال ہے اوپر کا۔"

"صاحب جی تو اترا اترا پھر رہا ہے۔ سب کے سامنے ورشے والے تماشے کرتا ہے۔" دوسرے نے یوں کہا کہ اس کے لہجے سے حسد کا سب زہر چھلکنے لگا۔ "بیوی کوئی پری ہو تب بھی ایسے کون لاتا ہے ہر جگہ اپنے ساتھ۔"

"اور کیا۔ آخر ہماری بھی گھر والی ہے۔ قسم اللہ کی ہم اس بیچاری کو یہاں لے کے عاشق نہیں تھے جو صاحب جی کو لونڈوں کی طرح ساتھ لیے پھریں۔" پہلے والے نے اتفاق کیا۔

"یار چھوڑو تم کیا بات لے بیٹھے۔ وہ تو میرا یار ہے۔ لڑکی نے اسے پسند کر لیا تھا۔ باپ نے بڑا زور لگایا۔ پیسے کا لالچ بھی دیا مگر ہمارا یار بھی نہیں مانا۔ اور وہ بھی جان دینے پر تل گئی۔"

"تم کو اتنا معلوم ہے مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ تمہارا یار کہاں رہتا ہے؟" پہلے ڈرائیور نے کہا۔

"گھر بدل لیا ہے اس نے۔ پہلے اکیلا تھا تو ایک کمرے میں کسی کے ساتھ رہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب پتا نہیں کہاں گھر لیا ہے۔ ہم تو باہر تھے۔"

"کراچی سے باہر ٹولی لگ گئی تھی؟" محسن نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"کل تو وہ شام کو بھی آیا تھا۔ رات کو بھی۔" پہلے والے نے سوچ کے کہا۔ "اس کے بعد میں نے نہیں دیکھا۔"

"میں نے دیکھا تھا آج صبح۔" دوسرا بولا۔ "اور اکیلے کے ساتھ نہیں، دو کے ساتھ۔"

"دو کے ساتھ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ ایک تو گھر والی ہے، دوسری یار کی گھر والی، اس کی سالی۔" دوسرا آنکھ مار کے بولا۔

"کوئی اور لڑکی بھی ساتھ تھی؟" میں نے شدید حیرت سے ردِعمل کو چھپا کے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے سنا کہ بڑی خوب عیش ہو رہی ہے۔ بیوی اور دو دو۔ تو کہنے لگا یہ سالی ہے میری۔ میں نے کہا کہ وہ تو آدھی گھر والی ہوتی ہے۔ بس اس بات پہ گرم ہو گیا حالانکہ یہ تو مذاق کی بات تھی۔ اور کون سی میری اپنی بات تھی۔ دنیا کہتی ہے وہ ہم نے بھی کہہ دیا۔"

"پھر کہاں چلا گیا وہ؟"

"یہ نہیں معلوم، کس چکر میں ہے۔ وہ ذکر کرتا نہیں۔ گھوم پھر کے یہاں کیوں آ گیا ہے؟" پہلے والا ڈرائیور بولا۔ "نئی شادی کی ہے اور فرض کرو سالی بھی ساتھ ہے۔ تو سالی یہ کون سی سیر کرنے کی جگہ ہے۔ اُدھر چلے جاتے کلفٹن کی طرف یا پارک۔"

"وہاں بھی جاتا ہوگا۔" میں نے اس کا شک رفع کرنے کی کوشش کی۔

"یہاں وہ کسی سیر اور سیری کے چکر میں ہے۔" دوسرے ڈرائیور نے کہا۔ "کوئی معاملہ ہے ضرور۔"

"کیسا معاملہ؟"

"یہی مال والا کام۔ یہاں اور کیا ہوتا ہے۔ وہ آ لگا ہے یہاں بہانہ ہے ایک چکر لگانے کے لیے۔ سواری تو یہاں ملتی نہیں۔ جیسے آتا ہے ویسے ہی لوٹ جاتا ہے۔"

"اچھا، ہم اب جاتے ہیں۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "وہ پھر نظر آئے تو اس سے کہنا کہ تمہارا دوست کرم خان تم کو تلاش کر رہا تھا۔"

"کون... کیا نام بتایا؟"

"کرم خان۔ میرا نام ہے۔" میں نے کہا۔

"عجیب نام ہے۔"

"ماں باپ نے رکھ دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "نام تو نام ہے کیسا بھی ہو۔"

"کرم تو ایک پہاڑ ہے۔"

"ہاں، پہاڑ ہے ملک کی سب سے بلند چوٹی۔" میں نے اس کے دماغ میں بٹھانے کے لیے کہا۔

"اسے تو کے ٹو بھی کہتے ہیں۔" پھر دوسرا ڈرائیور بولا۔

"ہاں، مگر میں پہاڑ نہیں بندہ ہوں۔" میں نے مذاق میں کہا۔ اور ہم سب تقریباً ایک ساتھ باہر آ گئے۔ دونوں ٹیکسی ڈرائیور ہم سے پہلے کھانے سے فارغ ہو چکے تھے لیکن جب بات شروع ہوئی تو وہ بھی بیٹھے رہے۔

"یہ کرم خان کی خوب سوجھی۔" محسن بولا۔

"بس ایسے ہی خیال آ گیا کہ تم لوگ مذاق میں حقیقت سے دور نہیں ہو۔ شیخ سمجھ جائے گا کہ اصل نام تو کرم ہی ہے۔"

"شیخ سمجھ جائے گا؟" محسن نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں، بالکل سمجھ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "شیخ بیچارا! تو بڑے پیار سے گھر والی کا معاملہ سمجھا۔"

"وہ تو میں خود نہیں کہتا۔ اس سالے شیخ نے ایک سالی کہاں سے پیدا کر لی؟" محسن سوچ کے بولا۔ "کون ہے وہ؟"

"مریم کی بہن تو کوئی ہے ہی نہیں اور ہوتی بھی تو یہاں کیوں آتی؟" میں نے کہا۔ "اور پھر تو کوئی لڑکی بیٹھ نہیں سکتی۔ وہ غفلت سے ٹیکسی والے سے جس ٹیکسی میں پہلے ہی ایک خوبصورت لڑکی موجود ہو..."

"یار، وہ جن کی پری، مگر وہ اکیلی کیوں آئے گی۔ اگر ساتھ ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ وہ ملنے آئے ہوں گے۔"

"آئے تو وہ ہم سے ہی ملنے کے لیے تھے۔ شیخ صرف ہمارے پیچھے لگا رہا ہے اور اپنی پوزیشن مشتبہ بنا رہا ہے۔"

"اگر یہ فرض کر لیا کہ اس نے کسی لڑکی کو پریشان دیکھا اور ٹیکسی میں بٹھا لیا۔ تو بھی بات نہیں بنتی۔ وہ لڑکی یہاں کیوں آتی۔ شیخ کہہ سکتا تھا کہ یہ سالی ہے۔ اس نے سالی کہا اور گھر والی کے حوالے پہ گرم ہو گیا۔"

"رابعہ... رابعہ بھی تو ہو سکتی ہے۔"

میرا دل میرے قدموں کے ساتھ رک گیا۔ "میں یہ بات نہیں کہہ رہا تھا۔ لیکن تم کیوں یہ سوچ رہے تھے؟"

"میں سوچ رہا تھا کہ کہیں تم یہ سن کے بے ہوش نہ ہو جاؤ۔"

"وہ رابعہ نہیں ہو سکتی۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکتی؟" محسن نے کہا۔ "ہونے کو دنیا میں کیا نہیں ہوتا؟"

"محسن! وہ رابعہ نہیں ہو سکتی۔ وہ... وہ کیسے آ سکتی ہے یہاں۔ آ جائے تو پھر یہاں سے کیسے جا سکتی ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ میں یہاں ہوں۔ وہ رابعہ نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا اچھا۔ چلو مت... وہ رابعہ نہیں ہوگی۔" محسن گھبرا کے بولا۔ "تو بتا دے مجھے کہ وہ کون تھی۔"

"ایسے فرض کرنے کو ہم فرض کر سکتے ہیں کہ وہ بھی زیب النسا تھی۔"

محسن نے ایک دم میرا کندھا پکڑ لیا۔ "ہاں، یہ ممکن ہے۔ یہی ممکن ہے کہ وہ زیب النسا ہو۔"

میں ہنس پڑا۔ "پاگل ہوا ہے۔ وہ لاپتا ہے اور اب ایک فلم اسٹار ہے۔ ملاقات کو اگر وہ ملی تو معلوم ہو جائے گا، ابھی تو ہم..."

ایک موٹا کالا چیچک رو شخص اچانک ہمارے سامنے آ گیا۔

"اے، ادھر آؤ۔" اس نے نہایت بدتمیزی سے کہا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"مجسٹریٹ صاحب بلا رہے ہیں گاڑی میں۔" وہ غرا کے بولا۔

"اس کا کریٹ کہاں ہے؟"

"مجسٹریٹ صاحب کا کریٹ؟ وہ کریٹ میں رہتے ہیں۔ دیکھو اس بند کرو۔ تم کو وصولی کا کریٹ تمہیں ملا، ایک گھنٹا پہلے بتا گیا تھا۔"

"کیا بتا گیا تھا؟" محسن نے نرمی سے کہا۔

"تمہارے بارے میں۔ ادھر اور کون ہے کوسٹ گارڈ کا آدمی تمہارے سوا؟"

"وہ تو میں نے بھی دیکھے تھے۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے سوچ کے کہا۔ "کسی گاڑی میں۔ ہاں، اس کی گاڑی تھی۔ بگڑا لال رنگ تھا اس کا۔ اس میں دو لمبی لمبی مونچھوں والے بیٹھے تھے۔"

"کیا؟ وہ چلا گیا؟ کسی اور کو بھیج دیا۔ تم چلو مجسٹریٹ صاحب کو بتا دو۔ ان دونوں کو بند کرا دیا جائے گا۔"

"چھوڑ دو ہاتھ، چھوڑو میرا۔ تمہارے مجسٹریٹ صاحب کے باپ کا نوکر نہیں ہوں میں۔" میں نے درشتی سے کہا اور محسن کو اپنے ساتھ کھینچ کے لے گیا۔ یہ سارا ایک غلط سنگین صورت اختیار کرنے والا تھا۔ کالا چیچک رو شخص جتنی دیر میں مجسٹریٹ کو خبر کرنے گیا، ہم بھیڑ میں شامل ہو کے اندر پہنچ گئے۔

www.paksociety.com

ولاور کو پہلے میں نے دیکھا۔ اگر ہم فوراً ہی نہ رک جاتے تو شاید اس کے سامنے نکل جاتے۔ وہ بڑی تیزی سے کہیں جا رہا تھا۔ اور اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایس پی سراج بھی تھا جو سادہ کپڑوں میں تھا۔ اسے ہم نے بہت عرصے کے بعد دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ موٹا ہو گیا تھا اور اس کی صورت پر خباثت بھی پہلے سے زیادہ برسنے لگی تھی۔

"یہ سراج یہاں کیسے؟" محسن نے ان کے گزر جانے کے بعد کہا۔

"اس کا آنا بے مقصد نہیں ہو سکتا۔"

"مقصد بھی معلوم کر لیں گے جیسے اپنے شیخ صاحب کے بارے میں معلوم کر لیا۔"

"وہ ہماری تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں پہنچا ہوگا۔ ممکن ہے وہاں جا پہنچے، جہاں ہم اپنی ایک نشانی لاوارث فوکس چھوڑ آئے ہیں کہ اگر کوئی ہماری اگلی منزل کا سراغ لگانا چاہے تو آگے بس تاحد نگاہ سمندر کے سوا کچھ نہ ملے۔"

ولاور اور سراج کسی معاملے پر بحث میں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے اور بظاہر اختلاف رائے کا شکار تھے۔ وہ زور زور سے نفی میں گردن ہلاتے تھے اور ہاتھ ہلا کے اصرار یا انکار کرتے تھے تو اس سے ان کی برہمی ظاہر ہوتی تھی۔ وہ بہت تیز بھی چل رہے تھے۔ ہم اگر ان کے نزدیک ہو جاتے تو گفتگو سن سکتے تھے۔ مگر اس میں خطرہ زیادہ تھا کیونکہ وہ بھی محتاط تھے اور ان کی نظریں ہر سمت میں دیکھ رہی تھیں۔ وہ تھے بھی عیاری اور چالاکی میں شیطان سے دو قدم آگے۔ ساحل پر ان کی نگاہ ہر آشنا نا آشنا کو دیکھ رہی تھی۔ ایک نادیدہ سی دوست دشمن کا فرق بتلانے والی حس جاگ اٹھی تھی۔ دونوں کے درمیان عداوت کا رشتہ اتنا پرانا ہو گیا تھا کہ اب ظاہری روپ کچھ بھی ہو، ہم ایک دوسرے کو پہچان سکتے تھے۔

تقریباً آدھے میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی کوئی شبہ نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

"اسے ایس پی کراچی تھرڈ ... میں سو گز کے فاصلے سے نظر آ گیا تھا۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔" محسن نے مایوسی سے کہا۔ "یہ جہاز پر چڑھ جائیں گے۔ ہم بیچ کھڑے رہ جائیں گے احمقوں کی طرح۔"

"پھر دانش مندی کا ثبوت یوں دیتے ہیں کہ ہم بھی چپ چاپ بیٹھ جائیں ان کے پیچھے۔ آرام سے عمل کر لیں گے۔" میں نے کہا۔

"اور انکل غفور شہید ہو جاتے ہیں۔ نیک کام میں دیر کیسی؟"

محسن بولا: "یا پھر یہیں سے لوٹ جاتے ہیں؟"

"کیا ہم کسی بہانے سے اوپر نہیں جا سکتے؟"

"جا تو سکتے ہیں، واپس نہیں آ سکتے۔" محسن بولا۔

"مجھے سوچ بار کیا ساری عقل شفا کے پاس بھجوا کے آیا تھا۔ تھوڑی بہت گزارے کے لیے اپنے پاس بھی رکھ لی ہوگی۔"

سراج اور ولاور ایک کشتی میں جا کر بیٹھ گئے۔ چھوٹی سی کشتی آگے گہرے سمندر کی سمت چل دی۔ جس جہاز کے نیچے پہنچ کر انہوں نے وہ سیڑھی پکڑ لی جو اوپر سے نیچے کی طرف لٹک رہی تھی اور آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگے۔ اوپر انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے ایک فرنچ کٹ داڑھی والا بھاری جسم کا شخص موجود تھا۔ جس نے سفید وردی پہن رکھی تھی۔

ہم دور سے دیکھتے رہنے کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے۔ کسی عام جہاز پر ہم کسی بھی بہانے چڑھ جاتے تو معذرت کرکے اتر آتے یا دھکے کھاتے۔ مگر یہاں تو صاف موت کے منہ میں جانے والی بات تھی۔ یہ موت کا جال تھا اور وہ موت کے فرشتے تھے جو موت کا ساز و سامان ذخیرہ کر رہے تھے۔ نادانستگی میں بھی ان کے قریب جانے کی غلطی کرنے والا لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔

"کم از کم ایک دوربین ہی ہوتی ہمارے پاس۔" محسن بولا۔

"اور کوئی ایسا آلہ ہوتا جس سے ہم ان کے درمیان ہونے والی باتوں کو اس خوبصورتی سے الگ کرکے سن سکتے۔" میں نے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ یہ انتظامات پر آخری نگاہ ڈالنے آئے ہوں گے۔"

"سراج اس نقصان کی اطلاع پا کے آیا ہوگا جو ایک بڑے جہاز پر آتش زدگی کے نتیجے میں ہوا۔ پہلی پشت انھیں اس بار اس میں انھم ازمیں ای کا فرما نظر آتی ہوگی۔ سراج ہے پولیس کا آدمی بلکہ اعلیٰ افسر۔ تفتیش کرنے کے لیے لاہور سے یہاں آنا اس کے لیے مشکل نہیں۔ وہ خود کو کسی بھی خصوصی ٹیم کا سربراہ بنوا سکتا ہے جو کسی خاص مجرم کی تلاش میں کراچی آئے اور تفتیش کے نام پر دو چار دن گزارے۔ یہاں اس کے ساتھی پولیس افسر ہوں گے۔ وہ ان پر دباؤ ڈال سکتا ہے کہ سارا ٹیک جہاز پر اسرار مجرمانہ سرگرمیوں کی جانب منتقل کر دے۔ انھیں یقین دلائے کہ یہ جہاز بھی گروہ ہے جو بندرگاہ کے علاقے میں موجود ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ پولیس اپنے سارے وسائل بروئے کار لا کے انھیں تلاش کرے۔"

محسن میری بات بھی سن رہا تھا اور ان تینوں کو بھی دیکھ رہا تھا جو ابھی تک عرشے پر کھڑے بحث کر رہے تھے۔

"ملیے اِدھر دیکھیے۔" محسن نے اچانک کہا۔

میں نے دیکھا تو سفید وردی والا گر پڑا تھا۔ سراج اس کو سنبھال رہا تھا مگر صاف ظاہر تھا کہ وہ بے ہوش ہے۔

"اسے کیا ہوا؟"

"سراج نے ہاتھ مارا تھا۔" محسن نے کہا۔

"خالی ہاتھ؟" میں نے کہا۔

"ہاں... لیکن بہت اچانک وار کیا تھا اور بہت سخت۔"

میں نے کہا: "تو نے نہیں دیکھا مگر میں دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال ہے سراج نے اسے مار دیا۔"

"کیا مطلب... وہ بے ہوش نہیں ہے؟"

"میرا اندازہ اتنی دور سے غلط بھی ہو سکتا ہے لیکن اگر کوئی میری گردن پر یوں ہاتھ مار دیتا۔ بالکل ٹھیک جگہ، تو میری گردن ضرور ٹوٹ جاتی۔" محسن بولا۔

"گردن پہ... کہاں وار کیا تھا؟"

"سامنے... بالکل سامنے جیسے ایسے ماری تھی۔" محسن نے بغلی کو سینے حلق پہ چھری کی طرح رکھ کے بتایا۔

"پھر تو بے ہوش ہوگا۔" میں نے کہا۔

وہ کشتی جس میں ولاور اور سراج بیٹھ کر گئے تھے، ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ اس کو چلانے والا پندرہ سولہ سال کا لڑکا صرف بچ بچنے ہوتے تھا۔ اور اس نے کشتی کو جہاز کے ایک کھمبے سے باندھ دیا تھا کہ لہریں اسے دور نہ لے جائیں۔ وہ واضح احکامات کے تحت ان کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

سراج اور ولاور نے بے ہوش نظر آنے والے بھاری بھرکم شخص کو اوپر سے نیچے لانے کے لیے ایک اور شخص کی مدد حاصل کی جو اچانک دوڑتا ہوا آیا۔ غالباً وہ بھی سفید وردی میں تھا مگر یا تو عملے کا رکن نظر آتا تھا۔ شاید اس نے بھی اتنا ہی دیکھا تھا جتنا ہم نے۔ اس نے سراج کو قلادہ قتل کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ظاہر ہے اسے مطمئن کرنا مشکل نہیں تھا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ معلوم نہیں کیا ہوا۔ باتیں کرتے کرتے اچانک حالت بگڑ گئی۔ غالباً ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔ ایک عام فہم وجہ بتائی گئی۔

وہ لوگ بے ہوش شخص کو کشتی میں اتار لائے اور کشتی فوراً ساحل کی طرف روانہ ہو گئی۔ کشتی چلانے والا لڑکا خاصا پریشان لگتا تھا اور بار بار پیچھے مڑ کے دیکھتا تھا۔ عملے کا وہ رکن جو ساتھ آیا تھا کچھ فرسٹ ایڈ وغیرہ دینے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"یہ کرائم پہ شک ہے یار؟"

"کوئی ایسا شخص جو نااہل یا کوتاہ اندیش ثابت ہوا یا جس نے اتحاد کو دھوکا دیا۔" میں نے کہا۔ "اور نقصان کا موجب ہوا۔"

"کشتی تو آگے جا رہی ہے؟"

"ہم ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

مگر ساحل کے ساتھ ساتھ چلنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے گھاٹ، چھوٹی بڑی کشتیاں حائل تھیں جن کی اوٹ میں وہ کشتی بار بار نظر سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ جبکہ ہمارا راستہ روکنے والے بھی کم نہ تھے۔ ہم منہ سمندر کی طرف کرکے چلتے تھے تو سامنے سے ہمیں کوئی ٹکر مار دیتا تھا۔ یا ہم کسی میں گھس جاتے تھے اور اگر ہم کو سٹ لگا... وردی میں نہ ہوتے تو صرف باتیں سنتے، گالیاں بھی سنتے۔ کشتی کو نگاہ میں رکھنے کی اس کوشش میں ہی محسن نے ایک خوانچہ الٹ دیا۔ جس میں کوئی اُبلے ہوئے چھولے پر نمک، مرچ اور پیاز چھڑک کر بیچ رہا تھا۔ اس نے دو گالی تو یوں دی جیسے وہ ہمیشہ کے لیے اقتصادی طور پر دیوالیہ ہو گیا۔ مگر اسے پچاس کا ایک نوٹ مل گیا تو اس نے کہا: "اللہ آپ کا بھلا کرے!" اور بکھرے ہوئے چھولوں کو پھر سمیٹنے لگا۔ جو دیکھ رہے تھے وہ نہیں خرید سکتے تو نہ خریدیں۔ وہ دوسرے آ جائیں گے جو اس خاک میں مل جانے والے چھولوں کو شرف قبولیت عطا کریں گے۔ وہ دل میں ضرور کہہ رہا ہوگا کہ یوں نقصان کو ٹھوکر مار کے پچاس کا نوٹ دے جانے والے روز آئیں تو تقدیر نہ بدل جائے۔

"یار یہ اس کو کہاں لے جا رہے ہیں؟" محسن نے چلتے چلتے پوچھا۔

"انہی سے پوچھ لے جا کے۔" میں نے کہا۔ "میں تو خود انہی کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

اسی وقت کشتی نے رخ بدلا اور گہرے پانی سے ساحل کی طرف آنے لگی۔ میں اور محسن ایک دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑے ہو گئے۔ جہاں سے ہم کشتی پر نظر رکھ سکتے تھے مگر وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہاں رش کچھ کم تھا۔ ذرا آگے ایسی عمارات دکھائی دے رہی تھیں جن پر دفتر ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ درمیان میں لوہے کا جنگلا تھا اور ایک خستہ حال پل سی سڑک تھی۔

کشتی ساحل کے قریب جنگلے سے پندرہ گز کے فاصلے پر رکی اور سراج ہی سب سے پہلے اترا۔

"جلدی کرو۔ تم کو معلوم ہوگا کہ فون کہاں ہے؟" وہ بولا۔

"فون کسے کرنا ہے؟"

"بے وقوف! ایمبولینس بلاؤ، ہسپتال فون کرو۔"

"ایمبولینس یہاں کیسے آ سکتی ہے؟" جواب دینے والا وہی ماتحت عملے کا رکن تھا۔ "فون کرنے کا فائدہ؟"

"فائدے سے بچے! اسٹریچر تو لے آ۔ کیا لگتے وہ؟" سراج کے بجائے اب ولاور نے برہمی سے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں اس کی۔ وہ سامنے ہسپتال ہے، میں انھیں خود اٹھا کے لے جاتا ہوں۔"

ایک وقت سراج اور ولاور کی صورت پر مایوسی اور

www.paksociety.com

جھنجلاہٹ کے آثار عیاں ہو رہے تھے۔ شاید وہ اس صورت حالت کی امید نہیں رکھتے تھے کہ ایک وفادار ان کو خاطر میں نہیں لائے گا اور اپنے افسر کی طرف سے اتنی تشویش میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔ معلوم نہیں ولادر اور سراج کے دل میں کیا تھا۔ وہ اس شخص کو اس کے سنسان میں گرا دیتے۔ لیکن ایک شخص نے دیکھ لیا۔ اس نے سامنے والے ہاتھ کو نہیں دیکھا تھا لیکن اسے شک ہو گیا تھا یا کوئی اور بات تھی کہ سنبھلنے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ بھی بڑھا دیا۔ اگر وہ ساتھ نہ آتا تو کیا ہوتا؟ ممکن ہے ولادر اور سراج اسے اسپتال پہنچانے کے بجائے عدم آباد پہنچا دیتے۔ ان کی کوفت سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ انھیں اپنی اسکیم اس ردعمل رد معقولات کے باعث فیل ہو جانے کا افسوس ہے۔

بہت سے لوگ ایک بے ہوش شخص کے بارے میں تو اتنا کے تجسس کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ کون ہے کیسے بے ہوش ہوا؟ بے ہوش ہے یا مر گیا ہے۔ حالت نازک تو نہیں ہے؟ سراج نے ان سب کو خالص پولیس اسٹائل کی ڈانٹ پلا کے ہجوم ہٹایا۔ ولادر اور سراج اس شخص کے ساتھ کے جوشیلی امداد کی حیثیت لوگوں کو یقینی بنانے میں جیتی ہوئی تھی۔ وہ آگے چل نہیں رہا تھا تقریباً دوڑ رہا تھا۔ سراج اور ولادر کافی پیچھے سرگوشی سے کچھ راز دارانہ مشورہ کرتے ہوئے چل رہے تھے۔

جب وہ کافی دور نکل گئے تو میں نے محسن کو اشارہ کیا "اگر تم نے ٹھیک دیکھا تھا اور سامنے والا سراج ہی تھا تو میرا خیال ہے کہ وہ اسپتال نہیں جائیں گے۔"

"مگر وہ اسپتال جا رہے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"وہ اسپتال کی طرف جا رہے ہیں۔" میں نے تصحیح کی۔ "اندر پہنچ کے یا دروازے کے باہر ہی سے وہ لوٹ جائیں گے۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ ایسا کرنے کی صورت میں وہ اپنی پوزیشن کو مشکوک بنا لیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ کسی ڈاکٹر کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ڈاکٹر فوراً بتا دے گا کہ اٹیک کہاں ہوا ہے؟"

"اور تمہارا کیا خیال ہے؟"

"اور کس بارے میں؟" میں نے کہا۔

"ڈاکٹر اسے بچا لیں گے یا نہیں؟"

"ڈاکٹر کا تو کام ہی جان بچانا ہوتا ہے۔ اب یہ نصیب کہ اسے کون ملتا ہے۔ ڈاکٹر یا اسی نام کا قاتل۔"

"اسپتالوں میں قاتل نہیں ہوتے۔"

"قاتل ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ بیوی اور طوائف دونوں کے روپ کے نام میں۔ لاکھوں میں ایک بیوی اسی طرح طوائف ثابت ہوتی ہے جیسے لاکھوں میں ایک طوائف وفادار بیوی ثابت ہوتی ہے۔ کبھی زمانے کے قاتل بھی جان بچا لیتے ہیں اور..."

"اور کبھی جان بچانے والے کرائے کے قاتل بن جاتے ہیں۔ تیری دلیل نے مجھے لاجواب کیا۔" محسن بولا۔

وہ سب لوگ سڑک پار کر کے ایک ور... عمارت میں داخل ہو گئے تھے جس کے باہر اسپتال ہونے کی کوئی ظاہری علامت نہ تھی۔ نہ اس پر اسپتال کا نام تھا اور نہ ریڈ کراس کا نشان نہ باہر کوئی ایمبولینس موجود تھی اور نہ بیماروں کا ہجوم تھا۔

"یہ کوئی لوکل اسپتال ہے۔" محسن بولا۔ "کسی خاص محلے کا یا علاقے کا۔"

"یہاں طبی سہولیات بھی محدود ہوں گی۔" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔ "علاج بھی کم ہوگا۔"

ہم نے دروازے سے اندر جھانک کے دیکھا تو مریض کو ایک اسٹریچر پر لٹایا جا چکا تھا۔ ایک نیلی وردی اور بیزار صورت والا اٹینڈنٹ اسے بادل ناخواستہ دھکیلنے لگا۔ اس نے ماتحت کو روکنے کی وجہ بھی ناکام کوشش بھی کی۔

"وہ دونوں کہاں گئے؟" محسن بولا۔

"ادھر سے داخل ہوئے اور ادھر سے نکل گئے۔" میں نے کہا مگر میری بات کی تردید فوراً ہو گئی جب سراج اور ولادر بائیں جانب کے ایک کمرے سے برآمد ہوئے اور بالکل سامنے والے دروازے کو کھول کے اندر چلے گئے۔ ان کے بالکل پیچھے ایک دبلا پتلا اور معروف سے لے کر طویل قامت شخص آیا جو اپنے گاؤن اور اسٹیتھو سکوپ سے ڈاکٹر سمجھا جا سکتا تھا۔

یہ موقع اچھا تھا۔ میں اور محسن لپک کے اندر چلے گئے اور سوچے سمجھے بغیر اس کمرے میں گھس گئے جس میں سے ڈاکٹر نکلا تھا۔ اس کمرے کے اسباب سے بھی یہی ثابت ہوتا تھا کہ یہ کسی ڈاکٹر کا ہے۔ ایک میز پر بلڈ پریشر کی پیمائش کرنے والا آلہ اور اسپرٹ والی روئی میں تھرمامیٹر رکھا ہوا تھا۔ گھومنے والی کرسی کے پیچھے ایک پرانا رنگین چارٹ تھا جس میں انسانی ڈھانچے کو ایک شفاف انسان کی صورت میں پیش کیا گیا تھا تاکہ اس کے اندرونی اور بیرونی اعضا مختلف رنگوں میں واضح نظر آئیں۔

باہر کسی نے چلانا شروع کیا۔ وہ انگریزی میں خفا ہو رہا تھا۔ "کون ہے یہاں قسمت والا؟ ڈاکٹر ہے یا نہیں؟"

میں نے اس ماتحت کی آواز پہچان لی جو بے ہوش افسر کو خود کندھوں پر ڈال کے دوڑتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ اب شاید مریض کو دیکھنے کوئی نہیں پہنچا تھا تو وہ تاخیر پر مشتعل تھا۔

"میں ڈاکٹر ہوں لیکن تم کون ہو؟"

"میں اس مریض کے ساتھ ہوں۔"

"مریض کے ساتھ کسی کو آنے کی اجازت نہیں۔ تم جانتے نہیں اسپتال ہے۔ ایسے چلا رہے ہو۔" ڈاکٹر نے چلا کے کہا۔

"تم اندر کیا کر رہے ہو اور تم ڈاکٹر ہو تو یہاں کیوں چھپے بیٹھے ہو۔ جا کے اسے دیکھتے کیوں نہیں ہو؟"

"میں یہاں چھپا بیٹھا ہوں۔" ڈاکٹر بھڑک پڑا۔ "آؤٹ گیٹ آؤٹ ورنہ میں دوسرا طریقہ اختیار کروں گا تمھیں نکلوانے کا۔ مجھے اپنا کام معلوم ہے۔ یہاں صرف ایک ہی مریض نہیں ہے۔ ویسے تم بھی مجھے ذہنی مریض لگتے ہو۔"

"یہ ایک ایمرجنسی کا کیس ہے۔"

"یہ فیصلہ کرنا میرا کام ہے کہ کسے ایمرجنسی میں امداد کی ضرورت ہے اور کسے پہلے دیکھنا چاہیے۔" ڈاکٹر کی آواز کرخت اور تیلی تھی جیسے غصے میں چلا رہے ہوں۔ "... اب خیریت سے باہر چلے جاؤ۔"

"اوکے... لیکن میں باہر موجود ہوں اور اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوئی..."

"مت دھمکی دو مجھے۔" ڈاکٹر نے دھاڑ کے کہا۔ پھر خاموشی چھا گئی اور ایک دروازہ بند ہوا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکٹر کو غصہ کیوں آ رہا ہے۔"

"میری ساتویں حس فرماتی ہے کہ ڈاکٹر بک چکا ہے۔ بہت بھاری قیمت پر۔" محسن نے کہا۔

"اب وہ اطمینان سے اپنا پرائیویٹ کلینک کھولے گا اور اس سرکاری نوکری پر لعنت بھیجے گا جہاں کوئی پرائیویٹ مریض نہیں آتا۔ تنخواہ کم ملتی ہے چنانچہ دوائیں بیچنا پڑتی ہیں۔ بوگس بل سائن کرنا پڑتے ہیں۔ ہر روز تھوڑا تھوڑا ضمیر بیچنے سے بہتر ہے کہ ایک ہی دن بھاری قیمت پر لے کے انسانیت کی دکان سے اٹھا کے شیطان کے ہاتھ بیچ دیا جائے۔"

"پھر ہم جاتے ہیں۔" میں نے سراج کی آواز سنی۔ "اور اپنے ڈاکٹر صاحب! باتیں آپ نے دو ہی یاد رکھنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ نے کبھی بھی اس شخص کو نہیں دیکھا۔ وہ یہاں آیا ہی نہیں اور دوسری..."

"میں سمجھ گیا۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔"

"اور ہم نے اپنی فکر تو آپ کو دے دی ہے۔ اپنے ڈاکٹر صاحب!" ولادر بولا۔ "بس خیال ہے کہ لینے دینے کے چکر میں نہ پڑ جائیں۔ آپ کو پتا ہے۔" ولادر کی آواز ختم ہو گئی۔

میں نے محسن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا اور ہم نے ایک ساتھ اپنے اپنے ریوالور نکال لیے۔ پھر ہم ایک وقت باہر آ گئے۔ بائیں جانب والے دروازے سے سراج اور ولادر نکلے ہی تھے اور ڈاکٹر اپنے گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بائیں طرف جا رہا تھا۔ آہٹ پر وہ پلٹا اور اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔

"کون ہو تم لوگ؟" اس نے بہ مشکل تمام کہا۔

"پہلے تم بتاؤ۔" میں نے قریب جا کے کہا۔ "کہ تم کون ہو؟ ڈاکٹر یا قاتل؟"

"اور کیا بننا چاہو گے؟ مقتول و مرحوم یا...؟" محسن نے کہا۔

"کیا بکواس ہے یہ؟" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہم مذاق کر رہے تھے۔" میں نے کہا اور ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ "ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ اب ایک سیکنڈ بھی ضائع کیے بغیر اس کیس کو دیکھ لیں۔"

محسن نے بھی اپنا ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ "جسے آپ ایمرجنسی سمجھنے پر تیار نہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ وہ ایمرجنسی کا کیس ہے۔"

"اس پر قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے ایک بار۔" میں نے کہا۔

"دوسرا حملہ ایک ڈاکٹر کی طرف سے نہیں ہونا چاہیے۔" محسن بولا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "شٹ اپ۔"

میں نے اسے ایک دم پکڑ لیا اور گھسیٹ کر کمرے میں لے گیا۔ میں نے اس کا ایک ہاتھ موڑا تو وہ خود ہی چت لیٹ گیا تھا۔ دوسرا ہاتھ میں نے پیچھے سے... اس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ محسن نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "کتنے پیسوں میں سودا کیا ہے اس قتل کا؟" میں نے کہا۔

"تم... تم لوگوں کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ ہکلا کے بولا۔ "میں ڈاکٹر ہوں۔"

"ہم بھی چاہتے ہیں کہ تم ڈاکٹر ہی رہو۔" محسن بولا۔ "کیونکہ اگر وہ آدمی مر گیا تو تم بھی زندہ نہیں رہ سکو گے۔"

"ذرا اس کی تلاشی تو لو۔" میں نے کہا۔ "جلدی کرو۔"

"تلاشی... لیکن کیوں؟"

"سوالات میں وقت ضائع مت کرو۔" میں نے اسے پھر کھڑا کر دیا۔ اور اس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ "یہ ریوالور تو دکھانے کے تھے اصل موت تو تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ خالی ہاتھوں میں؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" ڈاکٹر اب سخت خوف زدہ تھا۔

"محسن یہ کرسی اٹھا کے لا۔" میں نے تلاشی لینے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اور بالآخر اندر کی جیب سے ایک انجکشن نکالتے

www.paksociety.com

میں کامیاب رہا۔ اس پر ایک لاکھ کی رقم بھی ہوتی تھی۔
ڈاکٹر کو بینک لون ہو گیا ہے... انھوں نے بھی تردید نہیں کی تھی۔ انھوں نے کہا..."

"کم تم نے اسے مروایا تو ہم تمھیں مار دیں گے۔ ورنہ یہ لو ایک لاکھ اور سب کچھ بھول جاؤ۔ سمجھ لو کہ وہ یہاں آئے تھے۔"

محسن نے مجھے کرسی پیش کی۔ میں نے اسے تول کے اٹھایا۔ اور کہا میں اچھال کر کسی جیب میں پہنچا آ رہی تھی تو میں نے اس پر ہاتھ مارا۔ لکڑی کی کرسی کے ٹکڑے ہو گئے۔

"اب تم خود کو اس کرسی کی جگہ فرض کر کے جواب دو کہ کیا کرو گے۔ موت تو برحق ہے۔ یہ چیک بھی جھوٹا نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے... میں وعدہ کرتا ہوں... اسے بچا لوں گا۔" ڈاکٹر نے کانپتے ہوئے کہا۔

"بس تو پھر چلو۔ ایک آدمی جسے تم نے ابھی باہر نکال دیا تھا اسے بھی بلا لو۔" محسن نے کہا۔ "کرسی کی قیمت ہم ادا کر دیں گے۔"

میں نے چیک کو پرزے پرزے کر دیا۔ "جب وہ پھر آئیں تو تم ان سے یہ سب کہہ دینا۔ اول تو وہ پوچھیں گے نہیں۔ مگر پوچھیں تو ہمارا نام بھی بتا دینا۔ سکندر اور محسن۔ پھر وہ تم کو کچھ نہیں کہیں گے۔ تم پر یقین بھی یقین لیں گے۔ اب چلو۔"

ڈاکٹر ہمیں اپنے ساتھ لے گیا۔ اس مختصر سے ویران اسپتال میں ایک وارڈ بھی تھا لیکن مریض کوئی نہیں تھا۔ اس کے ایک بیڈ پر وہ شخص بدستور بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا باقاعدہ معائنہ شروع کیا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" وہ عادتاً ایک لمحے بعد بولا۔

"پریشانی اگر ہوگی تو تمھیں۔ یہ بات ذہن میں رکھو۔" میں نے کہا۔

"نہیں... وہ... میں ابھی انجکشن لگاتا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں یہ آپ کے ساتھ جانے کے قابل ہو جائیں گے۔" وہ بولا۔

محسن اس کے ماتحت کے ساتھ اندر آیا۔

"میرا نام شاہد جمیل ہے۔" وہ بولا۔ "میں اس شپ پر نیا ہوں۔"

"آپ کچھ بتا سکتے ہیں... یہ سب کیوں ہوا؟" میں نے کہا۔

"جی، میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ مجھے تو انھوں نے بتایا کہ ان کو مارنے کی کوشش کی گئی تھی اور آپ لوگ اتفاق سے وہاں موجود تھے۔" شاہد جمیل بولا۔

"مگر ابھی ہم دونوں بس ایسے ہی ڈیوٹی پر گشت کر رہے تھے۔ میرے ساتھی کی نظر پڑ گئی۔" میں نے کہا۔

"اتنی دور سے؟ کمال ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن میں بالکل نہیں بتا سکتا کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو کیوں؟"

"کیا آپ ان دونوں کو نہیں جانتے؟"

شاہد جمیل نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ جانتے ہیں؟"

"جانتے تو ہم بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن آپ کا چہرہ دیکھتے ہوئے ہم صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ ان کی جان کو خطرہ لاحق رہے گا۔ یہاں سے جانے کے بعد بھی۔ آج تو آپ نے انھیں بچا لیا لیکن آئندہ خدا ہی بچا سکتا ہے۔"

"آج بھی خدا نے ہی بچایا۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔"

"آپ نے یہ کیا کہ ساتھ آ گئے ورنہ انھیں یہاں پہنچنا بھی نصیب نہ ہوتا۔" میں نے کہا۔ "اب آپ ان کو ساتھ لیے بغیر نہیں جائیں گے اور ہر وقت ان پر نظر رکھیں گے۔ یہ کون ہیں ویسے؟"

"یہ جہاز کے فرسٹ آفیسر قدیر الدین ہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگ مجھ سے زیادہ ان کے بارے میں کیسے جانتے ہیں کہ ان کی جان کو خطرہ لاحق ہے۔ نام تو آپ لوگوں کو معلوم نہیں، مگر اور بہت کچھ معلوم ہے۔ مجھے تو شک ہے کہ آپ انھیں بھی جانتے ہیں۔"

"میرا تو خیال تھا کہ تم ہمارا نام سنتے ہی اچھل پڑو گے۔ تم نے تو ہمیں بہت مایوس کیا۔"

"اس نام میں ایسی کیا بات ہے؟"

"چھوڑو۔ جیسے تم کو دنیا کی خبر ہی نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم آدمی فرض شناس ہو اور وفادار ہو۔ اس جہاز پر کیسے آ گئے؟"

"یہ بھی عجیب سوال ہے۔" وہ بولا۔ "کیا اس شخص کو یہاں نہیں آنا چاہیے جس کی ذات میں یہ خرابیاں ہوں۔"

"شاید میرا سوال غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ایک غیر ملکی جہاز ہے اور تم پاکستانی ہو۔"

"بہت سے پاکستانی غیر ملکی جہازوں پر، غیر ملکی اداروں میں یہاں تک کہ غیر ممالک میں کام کرتے ہیں۔" وہ بولا۔

"یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔"

"مزید یہ کہ میں پاکستانی نہیں ہوں۔ میں انڈین نیشنل ہوں۔ بھارت کا رہنے والا مسلمان۔ جیسے شاہد جمیل صاحب ہیں۔"

میں چکرا گیا۔ "مگر تم یہ جانتے تھے کہ یہاں ایک اسپتال ہے۔ حالانکہ یہ بات عام طور پر سب کو معلوم نہیں۔ یہاں کہیں لکھا ہوا بھی نہیں ہے کہ یہ اسپتال ہے۔"

"اور در حقیقت اسے اسپتال کہنا بھی زیادتی ہے۔" محسن نے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر کہا جو انجکشن لگا کے ہم کو گھور رہا تھا۔

"یہ ایک بہترین جگہ ہے۔"

"یہ ایک خیراتی اسپتال ہے۔" ڈاکٹر نے تنک کے کہا۔

"[illegible] ٹرسٹ سے چلتا تھا۔ ٹرسٹ کو چلانے والے اصل میں [illegible] کے چلتے تھے۔ اب جو ہے تمھارے سامنے ہے۔ [illegible] تنخواہ ادا ہوتی ہے۔"

"[illegible] تم بھی یہاں بیٹھے ہو کہ آئے کوئی تو آ جائے اور قسمت سے [illegible] کر دے۔" میں نے طنز سے کہا۔

"جیسے کہ آج آ گیا تھا۔" محسن بولا۔

"مجھے ایک بات بتاؤ کیا تم واقعی سند یافتہ ڈاکٹر ہو؟" میں نے اس کی صورت پر بسنے والی [illegible] جرم کی تحریر کو پڑھنے کی کوشش کی۔

"[illegible] پہلے یہاں مریض بھی آتے تھے۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"[illegible] پہلے میں ڈسپنسر تھا۔" وہ بولا۔ "مجھے انھوں نے [illegible] تنخواہ وہی ملے گی جو ڈاکٹر لیتا تھا۔ وہ تو پہلے ہی [illegible] جو مجھے جانتے تھے وہ مجھ سے علاج کیوں [illegible] اور کہیں مجھے اتنی تنخواہ نہیں ملتی۔"

"[illegible] تم بھی [illegible] میں شریک ہو گئے کہ غریب اسپتال [illegible] ہے۔ [illegible] کاغذ کی حد تک چلتا تھا تو کاغذی اسپتال کیسے [illegible] مگر تم حسابات پورے رکھتے ہو گے۔ یہ دکھاتے [illegible] کہ سیکڑوں مریض صحت یاب ہو کر جاتے ہیں۔ وارڈ بھرا رہتا ہے [illegible] کے لیے دوائیں مہیا نہیں۔ خوراک، بستر، چادر [illegible] یہ سب اخراجات ہوتے ہیں۔ کوئی [illegible] ثابت نہیں کر سکتا۔ تم غیر قانونی کام بھی کرتے ہو گے۔ [illegible] سے منشیات [illegible] نسخہ لکھ کر [illegible] کے لیے اسپتال [illegible] اور [illegible] استعمال کرتے ہو گے۔ [illegible] میڈیکل سرٹیفکیٹ [illegible] کرتے ہو گے۔ شاید [illegible] کے خواہش مندوں کو اسپتال [illegible] دکھاتے ہو گے اور... لیکن [illegible] جعلی سرٹیفکیٹ [illegible] کی رقم وصول کرنے کے لیے اور قتل [illegible] ان بچوں کو جن کا وجود ہی معاشرے سے زیادہ [illegible] کا ناسور بن چکا ہے۔" میں اب سخت مشتعل ہو چکا تھا۔

"تمھاری خاموشی ظاہر کرتی ہے کہ تم نے یہ سب کیا ہے۔" محسن نے نفرت سے کہا۔ "آج تم اس آخری حد سے بھی [illegible] گئے ہو۔"

"[illegible] مجبوری کو نہیں سمجھ سکتے۔"

[illegible] نے اس کے ایک تھپڑ دیا۔ "لالچ کو تم نام دیتے ہو [illegible] ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے نہیں [illegible] کی کمائی کے لیے۔ جو تمھیں جائز ذرائع سے نہیں ملتی [illegible]"

احساسِ ذلت سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ "اور سب کیا کر رہے ہیں۔ تم خود کیا کر رہے ہو؟ پولیس والوں سے کر اسپتالوں میں مار پیٹ کرنے اور قانون کو ہاتھ میں لینے کا حق کس نے دیا ہے تمھیں؟"

"یہ حق خود ہم نے حاصل کیا ہے۔ اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔"

"ہونہہ۔" وہ بولا۔ "تم خدمتِ خلق کے لیے بدمعاشی کرتے ہو گے۔ ڈاکہ ڈالتے ہو گے تو زکوٰۃ دینے کے لیے۔ تمھیں حساب دینے والا کوئی نہیں ملا ابھی تک۔ اس لیے تم خدائی فوجدار بن گئے ہو۔"

"ہمارا حساب صاف ہے۔" میں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ "اور اسی نے ہمیں خدائی فوجدار بننے کی جرأت دی۔ اب تم تھوڑا سا حساب اور دو۔ ان دونوں کو تم کب سے جانتے تھے اور کیسے جانتے تھے؟"

"میں... نہیں... کون دونوں؟ کس کی بات کر رہے ہو تم؟" وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

"انھوں نے تو تمھیں بڑی اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ تمھیں جو تم مجھے انکار کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "مگر تم اچھی طرح جانتے ہو میں کس کی بات کر رہا ہوں۔"

"وہ... وہ پہلی بار آئے تھے۔"

میں نے اس کے دوسرا تھپڑ مارا۔ "اور تم نے ان سے چیک لے لیا۔ اتنا اعتبار تھا تمھیں ان پر۔"

صورت حال اس ماتحت کے لیے بہت پریشان کن ہو گئی تھی جو اپنے فرسٹ آفیسر کی جان بچانے میں پیش پیش تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ دونوں کون تھے جن پر ہم نے قاتلانہ حملے کا الزام لگایا تھا۔ ہم کوسٹ گارڈ کی وردی میں تھے لیکن ہمارا رویہ دہشت پسندانہ تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے آخر؟" اس نے اچانک درمیان میں آ کے کہا۔ "کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

"ابھی میں یہ چاہتا ہوں کہ تم ایک طرف ہٹ جاؤ۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"مگر میں چاہتا ہوں کہ تم اس معاملے کو ختم کرو اور جاؤ۔ میں تمھاری مدد کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔

"تمھیں کچھ معلوم نہیں۔"

"میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔ تم کوئی بہت غلط قسم کے آدمی ہو۔ مگر میں جھگڑے میں نہیں پڑوں گا۔ بہتر ہوگا اگر تم چلے جاؤ۔"

"ورنہ تم کیا کرو گے؟"

"میں پولیس کو بلا لوں گا اور تمھیں ان کے حوالے کر دوں گا۔ جو کچھ میں نے سنا ہے اور دیکھا ہے سب بتا دوں گا۔" وہ قد اور جسامت میں مجھ سے زیادہ تھا۔ اس لیے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔

www.paksociety.com

مگر اسے کوئی نقصان نہ پہنچاتا۔ زیادہ سے زیادہ میں اس کو کچھ فاصلے پر پھینک دیتا اور محسن سے کہتا کہ اسے قریب نہ آنے دے۔ وہ جانتا تھا کہ ہم مسلح ہیں اور اس قسم کا ردعمل خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے مگر وہ خود کو غیر محفوظ ہونے کے بجائے سفارتی تحفظ میں محسوس کرتا تھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ سفارتی عملے کے ساتھ مار پیٹ کی جرأت ہم کبھی نہیں کر سکتے۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں یہ غلطی دور کرتا، ڈاکٹروں کے روپ میں دنیا کو دھوکا دینے والے اس بے ضمیر مجرم اور قاتل نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اپنی تذلیل کا بدلہ لینے کی کوشش کی۔ اس نے بڑی تیزی سے گھوم کر اپنے پیچھے سے کوئی چیز اٹھا لی۔ اور مجھ پر پلٹ کر حملہ کیا۔

یہ صرف پاگل پن تھا۔ انتہائی ذلت کے احساس اور اشتعال نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ کچھ ضرور کرے۔ اس کو معلوم تھا کہ میز یا دروازے کے پیچھے کوئی لوہے کا پائپ پڑا ہوا ہے۔ اس نے پائپ کو لاٹھی کی طرح گھمایا مگر اس کی حرکت کو سب سے پہلے محسن نے اور پھر میں نے نوٹ کر لیا تھا۔

محسن نے دو قدم پیچھے ہٹ کے ریوالور نکال لیا اور میں بھی غوطہ مار گیا لیکن میرے سامنے کھڑا ہوا شخص کچھ تذبذب کا [illegible] اور پائپ کا بھرپور وار اپنی متحرک قوت کے ساتھ اس کے سر پر لگا۔ اس کی کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ پھر وہ نیچے گر گیا۔ اور [illegible] میرے سامنے آ گیا۔ وہ چھ فٹ لمبے پائپ کو پھر دوبارہ اٹھا سکا۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ٹھوکر ماری اور اس کی کلائی کی ہڈی ضرور ٹوٹ گئی ہوگی کہ وہ چلایا اور پائپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا۔ میں نے اسے دوسری لات پیٹ پر رسید کی۔ اور جب وہ جھکا تو اگلی ٹھوکر اس کی گردن پر لگی۔ اس نے ہاتھ پھیلا کے ایک بار تڑپ کے سانس لینے کی ناکام کوشش کی۔ پھر وہ سیدھا منہ کے بل آیا۔ اور فرش پر گر کر ساکت ہو گیا۔

میں نے اب اس شخص کو دیکھا جس نے مجھ پر کیے جانے والے وار کی سزا قبول کی تھی۔ خون اور اس کے سر کا مغز فرش پر بہہ رہے تھے اور وہ کھلی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ یوں جیسے اب بھی کہہ رہا ہو کہ دیکھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا تھا نا تم بہت غلط قسم کے آدمی ہو۔

میری طرح محسن بھی اس غیر متوقع خونی ڈرامے سے کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ ہم ابھی سکتے کے عالم میں کھڑے ہوئے تھے کہ باہر سے اچانک اندر آ جانے والے نرسنگ اردلی نے چیخ کر کہا۔

"کھولو... اسے کوئی اور [illegible]"

محسن نے لپک کے اسے پکڑا اور اندر کھینچ کر دروازہ بند کر دیا۔

مگر اس وقت میں نے اپنے پیچھے سے آواز [illegible] "چھوڑ دو اسے۔ اور سب سہمے کھڑے رہو [illegible] کہ میرے ہاتھ میں ریوالور ہے اور میری انگلی ٹریگر پر [illegible]"

"مسٹر شاہد جمیل!" میں نے بے خبری [illegible] رہے۔ اس میں جانے والے کو دشمن تھا [illegible]

"مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں" وہ بولا۔ "میں نے اپنے کانوں سے سنا اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھا [illegible] کیا دیکھا؟ یہی کہ تم نے دونوں کو مارا ہے"

"ہم سے ایک کو تو تم نے ضرور مارا ہے [illegible]"

"اپنے دفاع میں... یہ کوئی جرم نہیں"

"میں نہ قبول جرم [illegible] کر رہا ہوں۔ مجھے اس [illegible]" وہ بولا "میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم ہاتھ اٹھا کے [illegible] چلتے ہوئے دیوار تک جاؤ اور پھر اطمینان سے منہ میری طرف کر کے کھڑے ہو جاؤ"

"آپ ہم سے [illegible] کو نہیں سمجھ رہے [illegible]" محسن بولا۔

"نہیں۔ ہاتھ پیچھے مت لاؤ ورنہ مجھے غلط فہمی ہو جائے گی۔ تم ریوالور کے نشانے میں ہو [illegible] تیزی اور مہارت [illegible] نشانہ بنانا جانتا ہوں اور [illegible] بلا سبب دو خون کر کے [illegible] میں ہوں" شاہد جمیل نے کہا۔

"یہ ایک معقول بات ہے" میں نے کہا اور محسن کی طرف دیکھا۔ ہم نے ویسا ہی کیا جیسا کہا گیا تھا۔

"اب مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا حماقت ہے" وہ بولا "[illegible] ان معاملات میں دخل در معقولات کا مقصد کیا ہے؟"

"آپ نے ان سے پوچھا تھا" میں نے [illegible] "کون ہیں جو آپ کے جہاز پر چڑھ گئے تھے کسی قانونی [illegible] بغیر۔ دیکھیے [illegible] کسی بھی غیر ملکی جہاز پر جانے کی [illegible] نہیں دی جا سکتی"

"اور آپ کو تو ڈپلومیٹک امیونٹی حاصل ہوگی [illegible]" محسن بولا۔ "آپ اسے [illegible] فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی"

"آپ کو فوراً پولیس کو طلب کر کے رپورٹ دینا چاہیے [illegible] واردات کی" میں نے کہا "اپنے سفارت خانے کو مطلع [illegible] اور ان دونوں بدمعاشوں کا نام بھی بتا دینا چاہیے"

"یہ کیا بکواس ہے؟ کون بدمعاش؟ [illegible] نہیں کیا" وہ بالآخر ہم دونوں سے مخاطب ہوا۔

"[illegible] ہماری نظر نے غلط دیکھا ہو؟"

"[illegible] ہو جاتا ہے آدمی کو" محسن نے میری تائید کی۔

"[illegible] فاصلے سے سارا منظر دیکھا تھا؟"

"[illegible] فلم کو سب سے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھے [illegible]"

"[illegible] نہیں بچی کی یار! تم نے غلط مثال دی"

"[illegible]" محسن نے اعتراض کیا۔ "وہ ایکسٹرا بھی اچھے تھے"

"[illegible] شاہد جمیل صاحب بھی اچھے ہیں" میں نے کیا خیال [illegible] میں کہا۔

"[illegible] آپ" اس نے چلا کے کہا "[illegible] میرا ایک [illegible] دوسرے کو موقع ہی نہیں دیتے۔ کیا [illegible]"

"[illegible] نے دو افراد کو دیکھا تھا۔ وہ ایک کشتی میں سوار ہو کے جہاز پر گئے۔ وہ بالکل آپ کی شکل و صورت کا ایک [illegible] کیا بحث کر رہے ہیں [illegible] یہاں وار کیا"

"[illegible] ہوں" [illegible] محسن بولا۔

"[illegible] ٹھیک بتا رہا ہوں" میں نے [illegible] ڈانٹ کے کہا۔

"[illegible] کا فرق نہیں"

"[illegible] یہاں ہاتھ مارا تھا" اس نے میری گردن پر ہاتھ مارا۔ "یہاں مارا تھا" میں نے جوابی کارروائی کی۔

"[illegible] پاگل ہو تم دونوں یا مجھے پاگل کرنا چاہتے ہو" شاہد جمیل نے اپنا سر پکڑ لیا اور بستر پر بیٹھ گیا۔

"[illegible] بیٹھ جائیں" میں نے معصومیت سے کہا۔

"[illegible] لیٹ جائیں ان کے ساتھ" محسن نے کہا۔

"خدا کے لیے مجھے تنگ مت کرو۔ یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور ان دونوں [illegible] جانتے ہو؟"

"[illegible]" میں نے [illegible] کے محسن کی طرف دیکھا۔

"[illegible] ہیں" محسن بولا۔

"[illegible] کے بارے میں..."

"[illegible] سراج اور اس کے باپ ملادر کے [illegible] ہوں۔ اب ٹھیک ہے" شاہد جمیل نے دونوں [illegible] کے کہا۔

"اچھا [illegible]" میں نے [illegible] جیسا سر ہلایا "تو آپ [illegible] نے آپ کو قتل کرنا چاہا تھا"

"[illegible] ہیں کہ ہم ہاتھ نیچے کر لیں"

[illegible] سر ہلایا اور [illegible] تا رہا۔

"میرا خیال اور مشورہ ہے" میں نے کہا "کہ اب ہم کو یہاں سے چلے ہی جانا چاہیے"

"اور اس ڈسپنسر کو کیسے ڈسپنس کریں" محسن بولا "جو ڈسپنسر مردہ سامنے [illegible] پر بیٹھا ہوا تھا اپنا ڈرامہ ختم کر چکا"

"اب اسپتال میں تو ڈسپنسر کی کوئی ضرورت ہی نہیں کیونکہ وہ جو [illegible] والے رہے"

"وہ خود ڈسپنسر تھے" محسن بولا "لیکن مجبوراً ڈاکٹر بنے تھے۔ یہ شخص بھی شاید اسپتال کا چپڑاسی [illegible] ہوگا جو مجبوراً ڈسپنسر بنا بیٹھا ہے"

"اس کی بھی [illegible] کریں" میں نے کہا "پانسہ پلٹ [illegible] سب ختم۔ یہ اسپتال [illegible] ڈاکٹر [illegible]"

"خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ مجھے مت مارو۔ میں [illegible] گم ہو گئے" وہ زار و قطار رونے لگا "کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میری زبان کاٹ دینا اگر ایک لفظ بھی نکلے"

"مگر وہ کاٹنا زیادہ آسان رہتا ہے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ زبان ساتھ ہی آ جاتی ہے" محسن نے کہا۔

وہ پھر دہشت زدہ ہو کے چلایا اور ہمارے قدموں میں لوٹنے لگا تو میں نے لات مار کے اسے دور پھینکا۔

"تم اپنی جان بچانے کے لیے کیا کر سکتے ہو؟ ہمارے [illegible] ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"آپ حکم کریں۔ جو نہ مانے وہ کتا اس کا باپ کتا"

"بس بس زیادہ بھونکنے کی ضرورت نہیں" محسن بولا "ہم نے تمہاری ولدیت نہیں پوچھی"

"یہ بتاؤ کہ اسپتال میں [illegible] تو ہوں گی [illegible] اور نرسوں کے استعمال کی"

"ہاں جی۔ گودام میں سب بھرا پڑا ہے"

"تم دو سفید وردیاں [illegible] نرسنگ کی" میں نے کہا "[illegible] کے لیے اور دو حضرات کے لیے۔ جاؤ"

محسن نے میری بات سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا اور اسے ساتھ لے گیا۔

"اب جناب شاہد جمیل صاحب!" میں نے کہا "آپ مختصراً یہ بتائیں کہ سراج اور ملادر سے آپ کو کیا اختلاف تھا۔ اور [illegible] غلط بیانی کریں گے تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔ اس بحری جہاز ایس ایس کراچی [illegible] پر جو کچھ ہوا سب مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ آپ اس پر فرسٹ آفیسر کی حیثیت سے آئے ہیں؟"

"ہاں۔ اور مجھے جس [illegible] لوگوں کی مخالفت کے باوجود یہاں بھیجا گیا"

www.paksociety.com

"مخالفت کرنے والے کون لوگ تھے؟" میں نے کہا۔
"مجھے نہیں معلوم۔ بس مجھے پہلے فون پر کہا گیا کہ میں انکار کر دوں مگر میں نے مجبوری کا اظہار کیا۔ ایک تو مشکل سے روزگار ملا تھا۔ یہ نئی نوکری میں کیسے چھوڑ دیتا۔ پھر یہ کہ مفت ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ وہ چاہتے تو مجھے دوسرے جہاز پر بھیج دیتا۔ انھوں نے کہا کہ یہ سب چھوڑ دو۔ تم انکار کر دو۔ تمھیں دوسری نوکری مل جائے گی اور اس سے بہتر۔ میں نے کہا کہ یہ کیا فضول بات ہے۔ تم فون پر بات کر رہے ہو۔ مجھے کیا معلوم کہ مذاق کرتے ہو یا مجھ سے دشمنی۔ بات کرنی ہے تو سامنے آکر کرو۔ مجھے بتاؤ کہ وہ دوسری نوکری کہاں ہے اور کس طرح بہتر ہے۔ مگر یہ وہ تھا جسے نقطۂ نظر سے بہتر جو میں قبول نہ کر لیتا۔ وہ بولا کہ نوکری میں آدمی کیا دیکھتا ہے؟ تنخواہ اور مراعات۔ تم کو ڈبل تنخواہ ملے گی۔ میں نے کہا کس بات کی؟ اگر اسمگلنگ کرنے کی ملے گی تو میں وہ آفر ایسی پر بھی لعنت بھیج دوں گا۔ اور یہی سچ ہے کہ تب میں دوں گا۔ اس پر فون بند ہو گیا۔ پھر کوئی میرے گھر پر ہی خط ڈال گیا۔ اس میں پھر وہی مطالبہ تھا اور دھمکی بھی تھی کہ میرے خاندان کو میری ضد کا خمیازہ بھگتنا پڑا تو اسے میری ہی حماقت کے باعث ہوگا۔ میں نے سیٹھ کو بتا دیا جو شپنگ کمپنی کا مالک ہے۔ اس نے پولیس کو مطلع کر دیا۔ اور مجھے کہا کہ تم جاؤ۔ دیکھو یہ سب نظر آگیا ہے۔ سالا کون ہے جو اپنا جہاز پر اپنا آدمی کو ایسے ترقی دیتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنی فیملی کو تو ایک ایسی جگہ بھیج دیا۔ جہاں وہ محفوظ رہیں گے اور خود جہاز پر آگیا۔ اس پر کچھ عجیب اور پُراسرار واقعات ضرور پیش آئے لیکن میں نے غیر ضروری تجسس کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ویسے وارنٹی تو سب کپتان کی ہوتی ہے۔ مگر ابھی چند دن پہلے خود کپتان نے مجھے بلایا اور کہا کہ وہ میرے خاندان کی ایک بات کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہاں سے کچھ مال جائے گا۔ اس کا ریکارڈ کوئی نہیں ہوگا۔ معاوضہ تم کو ملے گا اور جانے بھی پاس رہے گا۔"

"اور تم نے پھر انکار کر دیا ہوگا؟" میں نے کہا۔
"میں اس قسم کی بے ایمانی میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ وہ مال کس قسم کا ہوگا۔ کپتان مجھے اسمگلنگ کے معاملے میں شریک جرم بنانا چاہتا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ جو جہاز پکڑا گیا۔ غلط چیز لے جاتا اور مجھے بتا دیتا۔ جہاز کے عملے کے کسی بھی فرد کے بارے میں آپ فرض نہیں کر سکتے کہ جو کچھ جہاز پر ہو گا وہ اس سے بے خبر ہے گا۔ کپتان نے مجھے بتایا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ہر جہاز پر کچھ مال ادھر سے آتا ہے اور کچھ ادھر سے جاتا ہے۔ جو باقاعدہ امپورٹ ایکسپورٹ کے ضوابط کے مطابق نہیں بھیجا جاتا۔ اس کا معاوضہ ہی اصل تنخواہ ہے۔ ورنہ

پہلی نوکری کی تنخواہ سے کیا ہوتا ہے۔ سب اس منافع میں اپنی حیثیت کے مطابق شریک ہوتے ہیں۔ مطلب یہ نہیں ہوتا کیونکہ مرتبہ سب کا برابر نہیں اور نہ سب کا رسک برابر نہیں۔ قصہ مختصر، وہ مجھے رسیلا... پھر ششیشے پر آ کے رک گیا۔ اس نے واضح کیا کہ یہ... ساڑھے سات لاکھ ہوں گے۔ میں سوچ لوں اور پھر... لیکن یہ سمجھ لوں کہ انکار کی صورت میں میرے لیے... مسائل بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس دھمکی نے مجھے... جو دھمکیاں مجھے پہلے دی گئی تھیں، وہ میرے ذہن میں... میں سمجھ گیا کہ کپتان اور جہاز کا عملہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں اور ایک ہی گروہ کے آلۂ کار ہیں۔ میں... تو معاملہ بگڑ جاتا۔ چنانچہ میں نے رات بھر کی مہلت مانگی... کہہ دیا کہ ساڑھے سات تو ٹھیک ہے، دس لاکھ ہوں تو مجھے منظور ہے۔ خبیث شاید پہلے سے یہ جانتا تھا کہ میرا جواب کیا ہوگا۔ وہ دس... میں آتی ہی جنت تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ تم پندرہ پر آؤ گے اور بارہ پر مان جاؤ گے۔ خیر دس لاکھ میری طرف سے... خوشی کا اظہار کیا۔ میرا اصل مقصد کچھ اور تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جو میرے جیسے بے وقعت آدمی کو بیچ کی ہی پھیرے میں صرف خاموشی کی قیمت کے طور پر... دے سکتے ہیں۔ وہ یقیناً بہت بڑے اسمگلر ہوں گے۔ اگر ایک کروڑ کی رشوت دے کر مال بھیجتے ہوں گے تو کم سے کم دو کروڑ خود بھی کماتے ہوں گے اور جس مال پر وہ کروڑوں لٹا رہے ہیں وہ کتنی مالیت کا ہوگا۔ ویسے تو جہاز پر ہر قسم کا تجارتی سامان آتا جاتا... کم قیمت بھی اور بیش قیمت بھی۔ لیکن جو اسمگلنگ یہ کروڑوں کی کرتے ہوں، وہ کیا مال بھیجتے ہیں؟ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا۔ کپتان کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے اس کے سامنے... کہ کہیں مالکوں کو معلوم نہ ہو جائے۔ میری نئی نوکری ہے۔ بس کپتان ہنسنے لگا۔ پھر کہنے لگا کہ یار تمھارے بال سفید ہونے کے قریب ہیں۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ بارہ برس... کیا جہاز چھوڑ دیں گے۔ میں پوچھتا ہوں کہ بارہ برس سمندر میں... کیا جھک ماری جاتی ہے بابا۔ یہ سیٹھ لوگ سب پہلے اپنا... اسی کام میں تھے۔ جو کچھ آگئے وہ باقی سب نکلے ہیں۔ انھیں... نہیں ہوگا تو اور کسے معلوم ہوگا۔ یہ ہم سے بھی پہلے اسی... میں پڑے تھے اور عمر گزار دی۔ ہم کھاتے اور... کام کرتے تب کہیں جا کے اپنی شپنگ کمپنی کے مالک بنے... جہاز کوئی کاروبار کر کے نہیں خریدے۔ جائز ناجائز کے چکر... پڑے رہتے تو اپنا بیڑا خود غرق کر لیتے۔ آج وہ... سے...

...وہ کام کرتے ہیں۔ کل کو ہم بھی ایک جہاز خرید لیں گے اور... کمپنی کی بنیاد ڈال دیں گے۔ پھر ایک سے دو اور دو سے... نہیں تھی۔ اس کے بعد میں ان کے لیے قابلِ اعتبار... خواہ نے مجھے وہاں سے اور سراج سے ملوایا۔"
"...سے تعارف کرایا تھا؟"
"...نے مجھے بتایا کہ چوہدری والا ور بہت بڑے صنعت کار... سراج صاحب پولیس کے اعلیٰ افسر ہیں۔"
"...کے علاوہ بھی کوئی آیا کبھی جہاز پر؟"
"ہاں، ایک بہت بڑا بوڑھا تازہ سیٹھ تھا۔ حاجی عبداللہ... شخص جو سب سے زیادہ خوش صورت کا تھا۔ وہ استاد... کے نام سے مشہور تھا۔ جو سب سے زیادہ اسمارٹ آدمی... چاند بھائی تھا۔"
"وہ بھی آتا ہے جہاز پر؟"
"ہاں، ایک بار تو اکیلا آیا تھا۔ دوسری بار ایک بہت خوب صورت... کے ساتھ آیا تھا۔" شاہد جمیل نے کہا۔
"چاند بھائی... کسی عورت کے ساتھ...!" میں نے یک لخت... میں اضطراب کی لہر اٹھتی محسوس کی۔ "کچھ اس کا... بتاؤ۔"
"حلیہ...؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔
"حلیہ یا نام اگر تم نے سنا ہو۔" میں نے کہا۔
"نام تو اس نے نہیں لیا۔ بس ڈارلنگ ڈارلنگ کہہ کے... مخاطب کرتا رہا۔" شاہد جمیل نے کہا۔ "اس عورت نے خاصی... بیزاری کا اظہار کیا۔ چاند بھائی نے کہا کہ تم دس منٹ بیٹھو، کوئی... ابھی آتا ہوں۔ وہ کپتان کے کیبن میں بیٹھی رہی۔ اس عرصے... کپتان اور چاند بھائی کی میٹنگ ہوتی رہی۔"
"میں اس عورت کا حلیہ جاننا چاہتا ہوں۔"
"حلیہ... وہ تھی تو اٹھائیس سال کی... میرا مطلب ہے کہ... زیادہ نہیں تھی۔ دیکھنے میں ضرور کم عمر لگتی تھی۔ مگر اس کے انداز... میں ایک نزاکت بھی تھی... اور کچھ شہزادیوں جیسی بات تھی۔... تمھارے ذہن میں ایک خاص اشارہ ہے۔"
"زریا؟" میں نے سانس روک کے کہا۔
اس کی صورت پر حیرانی کے آثار نمودار ہوئے۔ "ہاں زریا... اس کی بہت زیادہ مشابہت تھی اس کی صورت میں..."
"اس... وہ زریا ہی تھی۔ اس کا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ میں... نے جان لیا۔ بہت پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ دل کے آئینے میں... تصویر اتار کے آئینے کو ساحل پر رکھ دیا۔ اب میں یہ بھی بتا سکتا... اس کے لب و رخسار پر کسی شاعر نے غزل میں کیا کہا ہے اور سایۂ گیسو نے شبِ تاب پر کسی شاعر نے نظم لکھی ہے۔ اس کی چال کی وارفتگی میں کیا ہے اور خیال کی وابستگی میں کیا نہیں ہے جس سے روشن ہے دل کی انجمن..."
"تم اسے بھی جانتے ہو؟" شاہد جمیل نے کہا۔
اور میں نے کہا۔ "نہیں، میں رابعہ کو نہیں جانتا۔"
"کون رابعہ؟" وہ بولا۔ "میں نے تو کسی رابعہ کا نام نہیں لیا۔"
میں نے فوراً خود کو سنبھال لیا کیونکہ اب محسن بھی اس شخص کے ساتھ واپس آگیا تھا اور اس نے بہت سا اسباب اٹھا رکھا تھا۔
"خیر، بات تھی اس اختلاف کی جو تمھارے اور ان لوگوں کے درمیان پیدا ہوا۔"
"ہاں صاحب مجھے سب معلوم ہو گیا..."
"کیا معلوم ہو گیا؟" میں نے کہا۔ "یہ کہ سامان کیا ہے؟"
"ہاں یہی معلوم ہوتا باقی تھا۔"
"کیا سامان تھا؟" میں نے پوچھا۔
"یہ میں تم کو کیسے بتا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔
"چلو، میں بتا دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ اسلحہ تھا ہر قسم کا۔ ملکی و غیر ملکی۔ ریوالور اور مشین گن، بندوقیں اور راکٹ بم اور ڈائنا مائٹ۔"
اس کا رنگ اڑ گیا۔ "تم...؟"
"ابھی میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ہم سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ ہم بہت عرصے سے ان لوگوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کی سب نقل و حرکت دیکھ رہے تھے۔"
"کیا تم خفیہ پولیس کے آدمی ہو؟"
"ایسے بہت سے ملکی و غیر ملکی بین الاقوامی ادارے ہیں۔" میں نے گول مول بات کی۔ "تم ہمارے وسائل اور ہماری پہنچ کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس مرتبہ ہم اپنا دائرہ بہت تنگ کر چکے تھے۔ اس لیے کوئی بھی نظر سے نکل نہیں سکتا تھا۔"
"دیکھو، میں نے سب بتا دیا کہ میں اس گروہ میں شامل نہیں ہوں۔ بلکہ الٹا ان سے میری خواہ مخواہ کی دشمنی ہو گئی تھی۔" وہ بولا۔
"ہم نے ایک خاص مقصد کے تحت ان کو ساتھ رہنا منظور کیا تھا۔"
"اور جب تمھیں معلوم ہو گیا کہ وہ کون لوگ ہیں اور کیا کرتے ہیں، پھر تم نے کیا کیا؟" میں نے کہا۔
"میں نے کراچی میں کونسلیٹ آفس سے رابطہ قائم کیا اور وہاں کسی ذمے دار افسر سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں اپنی آمد کو خفیہ رکھنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ مجھے تحفظ فراہم کیا جائے۔ انھوں نے اس کا وعدہ کیا اور یہ بولے

www.paksociety.com

شام کو ایک کار مجھے بامبے کے قونصلیٹ آفس لے گئی۔ وہاں انھوں نے شناخت کے بعد مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ ایک شخص نے خود کو سین گپتا کے نام سے متعارف کرایا۔ اور کہا کہ میں اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اسے سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ مجھے اپنی شناخت کرا دیں تو مجھے ڈر ہے کہ میں نے غلط آدمی کو کچھ نہیں بتایا ہے۔ سین گپتا نے کہا کہ کیا میرا قونصلیٹ جنرل کے آفس میں ہونا کافی نہیں۔ اور اگر اس کے باوجود مطمئن نہیں تو مجھ پر کوئی پابندی نہیں۔ میں اپنی مرضی سے آیا تھا، اپنی مرضی سے جا بھی سکتا ہوں۔ مجبوراً میں نے اسے سب بتا دیا۔ یہ بھی کہ اسلحہ غالباً مشرقی بنگال کی خانہ جنگی میں استعمال ہوگا اور یہ بہت خطرناک سیاسی معاملہ ہے جس میں بھارت کی حکومت کے ملوث ہونے کا نتیجہ بدنامی اور کشیدگی کی صورت میں نکل سکتا ہے اور حزب اختلاف اس مسئلے پر حکومت کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

سین گپتا نام کے اس شخص نے میری پوری بات سنی لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ اس کی خاموشی میں کوئی معنی پنہاں ہیں۔ وہ میری سن رہا ہے تو صرف اس لیے کہ وہ انکار نہیں کر سکتا۔ مجھے اس کے ہونٹوں پر ایک بے معنی قسم کی مسکراہٹ کا شبہ بھی ہوا تاہم اس نے ساری بات سننے کے بعد مجھ سے اتفاق کیا کہ یہ معاملہ بہت سنگین ہے اور وہ اسلام آباد میں سفیر سے رابطہ قائم کر کے ہدایات حاصل کرے گا۔ اور اب مجھے بالکل فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اسی رات جب میں واپس جہاز پر پہنچا تو کپتان کا رویہ مجھے بدلا ہوا لگا۔ اس نے پہلے تو سختی سے پوچھا کہ میں اس سے طلب کیے بغیر کہاں گیا تھا۔ لیکن جب میں نے یہی کہا کہ میں تو بندرگاہ کی حدود سے ہی نہیں نکلا تو وہ مجھے گھورتا رہا اور چپ ہو گیا۔ کل صبح اس نے مجھے اپنے کیبن میں طلب کیا۔ میں وہاں گیا تو مجھے انڈین آرمی کا ایک لیفٹیننٹ کرنل ملا۔ اس نے میرے ساتھ سخت نامناسب رویہ اختیار کیا۔ پہلے تو اس نے کہا کہ وہ میرا دماغ درست کرنے آیا ہے۔ جب میں نے کہا کہ مسٹر لیفٹیننٹ کرنل اس شپ پر میں فرسٹ آفیسر ہوں۔ اس لیے حفظ مراتب کے مطابق بات کرو۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ مجھے سیاسی معاملات میں دخل اندازی سے گریز کرنا چاہیے اور اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ غلط ہو رہا ہے یا اچھا ہو رہا ہے تو میری مرضی سے نہیں ہو رہا ہے۔ بالآخر اس نے کھل کے کہا اس نے واضح کیا کہ مجھے وہی کرنا ہوگا جو کپتان کہے گا۔ جاسوس اور نام نہاد کا میں ذمے دار نہیں ہوں۔ جب بات بڑھی تو اس نے کہا کہ جہاز پر اسلحہ جائے یا سبزی، اور یہ اسلحہ مشرقی بنگال جائے یا قطب جنوبی، میں اپنا منہ بند رکھوں ورنہ۔۔۔ اس نے ورنہ کے بعد کچھ نہیں کہا اور جہاز کے کیبن سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میری سمجھ میں سب آ گیا اور میں مار پیٹ بہت ہونے کے بعد بھی اسے صاف بتا دیا کہ میں باقاعدہ لکھ کر رپورٹ ضرور کروں گا۔ یہاں نہ کر سکا تو پاکستان کی وزارت خارجہ کے حکام کو۔ اور اس نے کہا کہ وہاں ضرور کرنا۔ جاؤ۔ میں نے کہا کہ ابھی تو مجھے شہر جانا ہے۔ اس نے مجھے بیٹھنے سے انکار کیا تو میں نے کہا کہ میرا کام مختلف ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم میرا راستہ کیسے روک سکتے ہو۔ اس کی کیفیت میں کہا کہ جاؤ جاؤ انڈین قونصلیٹ کے دفتر بھی ضرور جاؤ۔ وہاں مسٹر سین گپتا تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ اس کی بات سن کر پھر میں شک میں پڑ گیا تھا لیکن مجھے دوبارہ بھی بات درست لگی۔ میں خاصا مایوس ہو گیا اور مایوسی ہی کا عالم تھا۔ کوئی بھی اس نام کا افسر نہیں تھا بلکہ مجھے گیٹ پر روک کر بتایا گیا۔ شاید میں اندر جا سکتا تو اسے تلاش بھی کر لیتا۔ لیتا تو پہچان بھی جاتا کہ سین گپتا بن کے مجھ سے کون ملا تھا کیونکہ وہ بہرحال اندر ہی کا آدمی تھا۔

میں واپس آیا تو کپتان نے پھر مجھے خاصا ذلیل کیا اور پریشان ہو کر کہا کیا ہوا۔ گپتا صاحب نے کیا کہا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ملے ہی نہیں ہوں گے۔ دروازے پر سے ہی ٹال دیا ہوگا۔ ایسے پاگلوں کے پیچھے روز آ پہنچ جائیں اور وقت ضائع کرنے لگیں تو کام کیسے ہو۔ مجھے اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ کپتان کا قونصلیٹ سے رابطہ ہے اور بالواسطہ طور پر وہ اس غیر قانونی کام میں شامل ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ دونوں آ گئے۔ یہ سب باتیں انھیں بھی معلوم ہو گئی تھیں۔ اور وہ خاصے پریشان تھے۔ میں نے انھیں جہاز پر آنے جانے کی اجازت دینے سے بھی منع کر دیا تھا کیونکہ کپتان نشے میں دھت اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ اس انکار کا جو نتیجہ نکلا وہ تم نے بھی دیکھا۔"

خاموشی کا ایک طویل محسوس ہونے والا مختصر وقفہ آیا۔ پھر میں نے کہا۔

"مسٹر شاہد جمیل! کیا اسلحہ جہاز پر موجود ہے؟"

"ہاں، اسلحہ میری عدم موجودگی میں لوڈ کر دیا گیا تھا۔"

"اور یہ جہاز کب روانہ ہوگا؟"

"شاید آج ہی رات۔ بارہ بجے کے بعد کسی وقت۔"

"آپ کے علاوہ عملے کے دیگر ارکان کی تعداد کیا ہے؟"

"ابھی میں سب سے نہیں ملا۔ کچھ سات افراد ہوں گے۔" شاہد جمیل نے کہا۔ "وہ سب ماتحت عملے میں نچلے درجے کے کام کرنے والے لوگ ہیں۔ اور جو افسران ہیں وہ بہت

پابند ہیں کہ ان کی آمد و رفت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔"

"کیا یہاں آتے جاتے رہتے ہیں وہ لوگ؟"

"میں کیسے بتا سکتا ہوں؟" شاہد جمیل بولا۔ "شہر اتنا بڑا ہے انسان کا تعاقب تو نہیں کرتا۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے۔۔۔"

"کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے اس کے اچانک خاموش ہو جانے پر کہا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بولا۔ "بس شک ہے میرا کہ وہ بھی وہیں گئے ہوں گے۔ جہاں سے ملنے والے آتے ہیں۔ مجھے تو سب ہی بہت پراسرار اور خطرناک قسم کے لوگ لگتے ہیں۔"

"اچھا۔۔۔ اب آپ ایسا کریں۔" میں نے سوچ کے کہا۔ "کہ واپس جہاز پر لوٹ جائیں۔"

"مگر وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ "ایک بار وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو گئے تھے کیونکہ آپ لوگ اچانک پہنچ گئے تھے۔ دوسری بار۔۔۔"

"آپ اگر واپس نہیں جائیں گے تو کیا کریں گے؟"

"میں۔۔۔ میں روپوش ہو جاؤں گا۔" وہ بولا۔

"کیا مطلب؟ لوٹ کر بھی نہیں جائیں گے؟" محسن بولا۔

"آپ کے بیوی بچے وہیں ہیں، آپ دشمن کے قبضے میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کب تک چھپے رہ سکتے ہیں؟"

"میں ان کو بھی بلا لوں گا۔" وہ بولا۔ "میرے وسائل بھی ہیں اور تعلقات بھی۔"

"کیسے لائیں گے آخر؟"

"بہت راستے ہیں۔ یہ بھی ایک کاروبار ہے جو ہر جگہ جاری ہے۔ لوگوں کو سرحد پار کرانے کا۔" وہ بولا۔ "ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچانے کا۔ دنیا بھر میں ایسے منظم گروہ ہیں جو آپ کو کہیں بھی پہنچا سکتے ہیں۔"

"لیکن اس سے پہلے ہی۔۔۔"

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ "اتنی جلدی ان کا سراغ لگانا مشکل ہے۔ میں نے بتا دیا تھا بیوی کو کہ مجھے کس قسم کی دھمکیاں موصول ہو رہی ہیں اور یہ معاملات ایسے ہیں جن میں پولیس یا قانون عموماً بے بس ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے اسے تنبیہ کر دی ہے کہ وہ خود روپوش ہو جائے۔ میری بیوی بہت سمجھدار اور ہمت والی ہے۔ وہ نکل آئے گی جیسے ہی اس کو میرا پیغام ملے گا وہ کوئی راستہ بنا لے گی۔ اس کے مددگار بھی ہیں، میرے دوست احباب ہیں۔"

"اور اس کے بعد آپ یہیں رہیں گے؟"

"ہاں، میں پاکستان کی شہریت لے لوں گا۔ ظاہر ہے یہ کام بھی مجھے راز داری سے کرنا ہوگا۔ ورنہ بہت سے لوگ دشمن ہو جائیں گے۔ وہ یہاں بھی مجھے تلاش کر کے مار دیں گے۔ ان کی نظر میں میرا جرم غداری ہوگا جس کی ایک ہی سزا ہوتی ہے۔ یہاں بھی میں چھپ کے اور شخصیت بدل کے ہی رہ سکتا ہوں اور یہاں سے آگے نکل سکتا ہوں۔ اب تک بھارت میں انٹیلی جنس نے میری فائل کھول دی ہوگی کہ میں بھروسے کے قابل نہیں رہا۔ اور میرا وجود قومی سلامتی کے مفاد میں نہیں۔"

"یہ تو بہت گمبھیر مسئلہ ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے ایک بات تو بتائیں۔ یہ سیاسی اختلافات اپنی جگہ۔ آپ نہیں چاہتے کہ آپ کا ملک پاکستان کے داخلی انتشار سے فائدہ اٹھائے اور اس علیحدگی پسندی کی تحریک میں باغی قوتوں کا ساتھ دے یا ان کی حوصلہ افزائی کرے۔ آپ جیسے کروڑوں ہوں گے مگر وہ سب اس اختلاف کی بنا پر ترک وطن نہیں کر بیٹھے۔ اپنی قومیت نہیں بدل لیں گے۔"

"قومیت؟" وہ بولا۔ "شہریت اور قومیت کو ایک ہی تو نہیں سمجھا جا سکتا۔ پاکستان کی بنیاد ہے دو قومی نظریہ۔ جو یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور ہندو الگ۔ میں بھارتی شہری ضرور ہوں لیکن میں مسلمان قوم کا فرد ہوں۔"

"اس دو قومی نظریے کو تم آج تسلیم کرتے ہو؟" محسن نے طنز سے کہا۔ "جب ترک وطن اور ہجرت کا وقت تھا تو تم نے وہیں رہنے کو ترجیح دی۔ تم نے مسلمان قوم کے لیے وطن کو قبول نہیں کیا۔ آج بیس پچیس سال بعد حالات نے تمھیں مجبور کر دیا ہے کہ تم اس دو قومی نظریے کی پناہ میں جلاوطنی اختیار کرو۔ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔ اب تو تمھاری اگلی نسل جوان ہوگی۔ کیا وہ دھوبی کے کتے نہیں ہو گئے؟"

"ہاں، تم سب کچھ کہہ سکتے ہو۔" وہ تلخی سے بولا۔ "کیونکہ تم یہاں عزت نفس کے ساتھ زندہ ہو اور یہاں حاکم ہو۔ ہم وہاں محکوم ہیں۔ دوسرے درجے کے شہری ہیں۔ معاشرے میں قانون تو ہمیں برابر کے حقوق دیتا ہے کہ بھارتی آئین سیکولر ہے مگر آئین اور قانون کتابیں ہیں۔ معاشرہ ان کتابوں سے نہیں، روایات سے اور صدیوں کے جاہلانہ تعصبات سے اور تہذیبی اقدار سے اور مذہبی ترجیحات سے چلتا ہے۔ قانون اور آئین سے تو حکومت چلتی ہے اور عدالتی نظام چلتا ہے۔ گلی محلے میں اور گھروں میں آئین اور قانون کی نہیں، معاشرے کے ٹھیکیداروں کی حکومت ہوتی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو معاف نہیں کیا۔"

"کس بات پہ؟ کیا جرم ہے مسلمانوں کا؟"

www.paksociety.com

"اس سے بڑا جرم کیا ہو سکتا ہے کہ وہ صدیوں حاکم رہے۔ ہندو تو انھیں غاصب اور حملہ آور کہتے ہیں جو افغانستان اور ایران سے آئے۔ اور انھوں نے اس ملک پر انگریزوں کی طرح تسلط حاصل کر لیا۔ ہندو تو دونوں کے محکوم رہے اور انگریز کے دور میں بھی مسلمان ہی تھے جن کے جذبۂ حریت پسندی میں کمی نہیں آئی۔ جنھوں نے غلامی کو کبھی ذہنی طور پر تسلیم نہیں کیا۔ انگریز بھی انھی کو خطرناک اور باغی سمجھتے تھے۔ آج ہندو حاکم ہے تو مسلمان سے تاریخ کا انتقام لینا چاہتا ہے۔"

"کاش یہ بات تم نے پہلے سمجھ لی ہوتی۔"

"تم اسے انسانی اندازوں کی غلطی کہہ سکتے ہو۔" وہ بولا۔ "بے وقوفی سمجھ سکتے ہو کہ وہ ہندو ذہنیت کا اندازہ نہ کر سکے۔ ان کی میٹھی میٹھی باتوں میں آ گئے۔ ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے کے فریب میں آ گئے۔ اور جب احساس ہوا کہ ہندوؤں نے انھیں گھر کا چھوڑا ہے نہ گھاٹ کا تو واقعی بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب سرحدیں بند ہیں۔ ہم ادھر آنا بھی چاہیں تو نہیں آ سکتے اور ہماری اگلی نسل بے وطن ہے۔ ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جہاں دونوں راستوں کی منزل کوئی نہیں۔ جائیں تو کہاں جائیں؟"

"تم سب مسلمانوں پر وہی الزام عائد کرتے ہو جو وہاں زبانِ خلق عائد کرتی ہے کہ مسلمان تو دل سے پاکستان کا حامی ہے۔ وہ بھارت میں پاکستان کا ففتھ کالم ہے جس کی جذباتی وابستگی مسلمانوں کے ساتھ ہے جو وقت پڑنے پر بھارت کے خلاف لڑے گا۔"

"نہیں، میں نے یہ نہیں کہا۔ میں ایک صورت حال کو بیان کر رہا ہوں۔ اس میں مجھ جیسے لوگوں کے لیے کون سا راستہ رہ جاتا ہے جو میں زندہ رہنے کے لیے عزت نفس کے ساتھ جینے کے لیے اختیار کر سکوں۔ اب تو پاکستان میں بھی ہمارے لیے جگہ نہیں رہی۔ یہاں ہر نظر میں طنز کی وہی بات ہوتی ہے جو تمہاری زبان پر ہے۔ سب منہ سے نہ کہیں، دل میں تو کہیں گے ناکہ تیسرے سے پچھتو کو آئے۔ پہلے کیوں نہ آ گئے ہم جب گئے تھے؟ اس لیے کہ قربانی دینا پڑتی یا ہجرت کے مصائب جھیلنے پڑتے۔ رشتے ناتے بدلنے پڑتے۔ نئے وطن کی تعمیر میں خون پسینہ ایک کرنا پڑتا۔ اب ہم خود غرض اور مطلبی سمجھے جائیں گے کہ پہلے جان وہاں بچا کے بیٹھے رہے۔ جب یہاں سب ٹھیک ہو گیا۔ مسلمانوں کا یہ ملک جس کے بارے میں ہندو پریس اور سیاستدان سب یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ پاکستان قائم نہیں رہ سکتا۔ آزمائش اور ابتلا کے دور سے گزر کے خوشحالی اور استحکام کی راہ پہ گامزن ہو گیا۔ یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی تو اب پہلے آ سکتے تھے، کہیں بھی جگہ نہ ہو۔ جو ٹیسٹ وقت میں ساتھ نہ دے وہ اچھے وقت میں ساتھی بننا چاہے تو عجیب سا لگتا ہے۔"

"خیر! تم کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو۔ پاکستان کے مسلمان ایسے تنگ نظر نہیں ہیں۔ وہ آج بھی تم کو گلے لگا لیں گے اور دل میں جگہ دیں گے کیونکہ ملک چھوڑ کے بس جانے کا ولولہ ختم ہو چکا ہے۔ تمام گھر آباد ہو گئے ہیں، ... دیر آید درست آید۔"

"میں بہت پہلے فیصلہ کر چکا تھا۔" وہ بولا۔ "میں بھی یہاں نہیں رہتا۔ میں پاکستان نہ جا سکا تو برطانیہ یا امریکہ کہیں چلا جاؤں گا۔ میرے بچے اب جوان ہو چکے ہیں۔ وہاں ایک طرف کامیابی کے مواقع ہیں ... وہ اقلیت کے احساس کمتری میں مبتلا کر دیے گئے ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ ہم مان لیتے ہیں کہ تم اب ہجرت کے لیے تیار تھے مگر اس میں جو خطرات تمہارے لیے پہلے سے موجود ہیں ان سے تم کیسے نمٹو گے؟" محسن نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا کوئی جذباتی فیصلہ تمہارے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بہتر ہو گا کہ تم عقل سے کام لو۔ صاف صاف بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟"

"تم واپس جاؤ۔ جہاز پر تمہیں پھر وہی لوگ ملیں گے۔ سب سے پہلے تو کپتان ہو گا۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"مصرا۔ آر آر مصرا۔"

"آر آر سے کیا بنتا ہے؟" محسن نے کہا۔

"رگھوبت رائے۔"

"وہ تم کو زندہ پا کے بہت حیران اور مشتعل ہو گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب تم کو کیا کھیل کا منظر پورا کرنا ہے۔ اس کو یہ بات اور یقین دلانا ہے کہ تمہارا دماغ درست ہو گیا ہے۔ تم ڈر گئے ہو۔ موت کی منزل تک جا کے لوٹ آنے کے بعد زندگی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا ہے اور تم جینا چاہتے ہو۔ اس کے لیے تم سب کچھ کرو گے۔ وہ سمجھا تھا کہ جذباتی حماقت کی کہ تم نے اصول کی بنیاد پر ردعمل ... معقولات کیا... اور کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ تم معافی مانگو گے اور شرمندگی کا اظہار کرو گے۔ وہ بہت چالاک لوگ ہیں۔ انھیں آسانی سے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے لیے تم کو بہت اچھی اداکاری کرنا ہو گی۔ اور معقول جواز فراہم کرنا ہو گا۔ جواز تمہارے پاس ہے۔ تمہارا خاندان۔ آدمی اکیلا ہو تو سب سے بے پروا ہوتا ہے مگر رشتوں کی زنجیر میں بندھا ہوا آدمی بہت بے بس ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ وہ جس عذاب سے ڈرتا ہے وہ اپنے پیاروں کا عذاب ہے۔ انھیں وہ ... دینا چاہتا ہے ... نہیں۔ ... وہ اپنے لیے قبول کر سکتا ہے۔ یہی کمزوری کی بنیاد بن سکتی ہے جو اور ان سے وہ مجبور ہو سکتے ہیں۔ بیوی بچوں کو کچھ نہیں ہونا چاہیے خواہ تم ان کے لیے کچھ کر دو۔ اسی خیال نے تمہیں پچھتاوے پر مجبور کیا اور تم نے سوچا کہ خود کو اپنے اصولوں کو اور اپنے ضمیر کو سب کو قربان کر کے تم واپس لوٹ آئے ہو۔"

اس نے کچھ دیر کے بعد سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ مگر اس کے بعد؟"

"اس کے بعد تم ہماری مدد کرو گے۔" میں نے کہا۔

"تمہاری میں کیا مدد کر سکتا ہوں اور کیسے؟" وہ بولا۔ "اب یہ معاملہ صاف ہو چکا ہے اور تم سے کوئی پردہ نہیں رہا۔ تو میں بھی بتا دیتا ہوں کہ... میں نے تمہیں پہچان لیا تھا... میں جانتا ہوں کہ تم ... ہو، تم سکندر اور محسن ہو۔"

"تم نے تو جھوٹ بولا تھا مگر ہم نے سچ نہیں کہا تھا۔ ممکن ہے کہ دوست اور دشمن سب ہمیں پہچانتے ہیں۔ ہم کسی سے واقف ہیں۔ ہمارا سایہ بھی ان کے لیے اجنبی نہیں۔ ... یہ ممکن ہے کہ تمہیں خبر تک نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"ہمارے بارے میں تو شاید ایک ... کام کرنا ہو گا۔" محسن ... "جس کا کام ہمارے بارے میں ہر اطلاع اکٹھی کر کے سب کا ریکارڈ رکھنا ہے۔ ہمارے سب ساتھیوں کے بارے میں تفصیلی معلومات، ہمارے سابقہ حلیے، موجودہ تصاویر، جرائم کی فہرست، خرابی کی فہرست، ماضی کے کرتوت، کارناموں کی تمام تفصیلات۔ انھوں نے تو ہماری آوازوں کے ٹیپ تک محفوظ کر لیے ہیں۔ تاکہ انھیں ملائیں تو آواز سے پہچانے جائیں۔"

"میں نے پہلے تمہیں آواز سے ہی شناخت کیا تھا۔" ... نے اعتراف کیا۔

"کیا یہاں بہت دیر ہو گئی ہے؟" محسن بولا۔

"ہاں لیکن ہم یہاں محفوظ بھی ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا یہاں کسی کے آنے کا امکان نہیں؟"

"اس حصے میں اور کوئی نہیں آتا۔ کیپٹن مصرا نے ... اطلاع دی۔"

"یہ جھوٹ ہے یا سچ؟"

"جھوٹ ہوا تو سب سے پہلے گولی تمہارے مغز کے پرخچے اڑائے گی۔" محسن نے کہا۔ "دوسرے اور ہم سب بعد کے نشانے ہوں گے۔"

"... تصدیق کرنے کے لیے مصروف آدمی لگے ... کام ہوا یا نہیں۔" میں نے کہا۔

"بہتر ہو گا اگر تم مزید وقت ضائع کیے بغیر جہاز پر پہنچ جاؤ۔ تاکہ وہ ادھر آ نہیں۔" محسن نے مشورہ دیا۔ "تم کہہ دینا کہ ڈاکٹر تمہارے ہاتھوں نہیں مارا گیا۔ اسے جہاز کے ہی ایک آدمی نے مارا جو تمہارے ساتھ آیا تھا۔ اور جسے شک ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس نے بعد میں ڈاکٹر سے سختی کے ساتھ پوچھا۔ اور پھر ڈاکٹر کو مار ڈالا۔ اسی مقابلے میں وہ خود بھی ہلاک ہوا۔"

"پھر بھی وہ کہیں گے کہ تمہاری واپسی میں اتنی دیر کیوں ہوئی؟" شاہ ... نے کہا۔

"اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارا ماتحت تمہارے ہوش میں آنے کا منتظر تھا۔ تمہیں دیر سے ہوش آیا اور ہوش میں آنے کے بعد ہی تم نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ تمہاری جان کو خطرہ لاحق ہے۔ اور تمہیں یہاں قتل کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ تمہارے ماتحت اور ڈاکٹر میں تلخ کلامی ہوئی اور پھر لڑائی۔ تم نے اپنے ماتحت کا ساتھ دیا۔ لیکن یہ دوسری زندگی پا کے تم کو موت کا خوف آیا۔ تم نے ان دونوں کو مرتے دیکھا اور یہ موت اتنی بھیانک تھی کہ تمہارے خیالات میں ایک انقلاب آ گیا۔ تم نے سوچا کہ اب ان دونوں کے خاندانوں کا کیا ہو گا۔ پھر تم نے اپنے خاندان کے بارے میں سوچا کہ یہاں تمہاری لاش پڑی ہوتی تو ان پر کیا بیتتی اور اسی خیال نے تمہارے دل و دماغ کو ہلا دیا۔ تم اب ہر قسم کا تعاون کرنے کو تیار ہو۔"

"یہ بہت خطرناک کام ہے۔" اس نے ... کہا کہ "میں کوئی ضرورت نہیں تمہارے تعاون کی۔ تعاون کرنے والے اور بہت ہیں پھر میں کیا کروں گا؟"

"یہ کام تو تم کو کرنا ہے شاہ ... اس کے بغیر تمہارے لیے کوئی بچاؤ کا راستہ نہیں۔ ابھی تم ادھر نہیں ہو۔ بعد میں تم ادھر بھی نہیں آ سکو گے۔ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔ تم کو ہر صورت اپنے عہد وفاداری کی تجدید کرنا ہے۔ اب شام ہو گئی ہے۔ کچھ دیر میں اندھیرا پھیل جائے گا۔ رات کو ہم جہاز پر پہنچ جائیں گے۔"

"تم... تم کیسے آؤ گے؟"

"یہ تم بتاؤ۔ ہم کس طرف سے آئیں، کب آئیں اور کیسے آئیں؟"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ "یہ ناممکن ہے۔ بالکل ناممکن ہے جب تک جہاز یہاں کھڑا ہوا ہے۔"

"اچھا اگر ہم جہاز کی روانگی کے بعد آنا چاہیں؟"

"بعد میں کہاں؟ بیچ سمندر میں؟" وہ بولا۔

"نہیں، فرض کرو، ہم راستے میں سوار ہونا چاہیں۔" میں نے کہا۔

"تم بحری راستوں سے واقف ہو؟"

www.paksociety.com

"نہیں، مگر تم سمجھ سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "کہ جہاز کا راستہ کیا ہے اور کس وقت جہاز کہاں ہوگا؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "اگر جہاز آج رات لنگر اٹھا دیتا ہے جس کا خاصا امکان ہے۔ تو صبح تین اور چار بجے کے درمیان ہم کھلے سمندر میں شاید سو میل دور ہوں گے۔ تم میں کوئی بھی تو نیوی گیٹر نہیں، ورنہ میں بالکل صحیح جگہ بتا دیتا خیر۔"

"تم نقشہ بنا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

"ہاں، نقشے پہ بتا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "دو چار میل ادھر اُدھر۔ اس وقت ہم کہاں ہوں گے۔"

"تو نقشہ بنا دو۔"

"اسے سمجھو گے کیسے؟" وہ بولا۔

"سمجھنے والے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم جہاز تک پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد تم ہماری کیا مدد کر سکتے ہو کہ ہم جہاز کے اوپر پہنچ جائیں۔"

"یہ صریحاً خودکشی ہوگی، اوپر آ کے۔"

"ہمارا کام ہم پہ چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔

"میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں۔۔۔ تو صرف یہ کہ ایک سیڑھی لٹکا دوں۔ ایسی جگہ پہ جہاں کسی کی نظر نہ پڑے اور تم اوپر چڑھ سکو۔ اور پھر تمہیں کوئی شخص نہ ملے یا پیچھے نہ پہنچ سکے تم پہنچ جاؤ۔ تو۔۔۔"

"تم نقشہ بنا دو۔" میں نے ڈاکٹر کی میز سے ایک کاغذ پنسل اٹھا کے اسے تھمائی۔

جو نقشہ اس نے بنایا وہ واقعی ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس میں خطوط ایک دوسرے کو کراس کرتے تھے۔ زاویے ظاہر کرنے والی ڈگریوں کی علامتیں تھیں اور سمت بتانے والے نشانات تھے کراس اور تیر تھے۔ وقت بتانے والی سوئیاں بھی تیر کی طرح تھیں۔

"یہ لو۔ اگر کوئی اس کو پڑھ لے گا تو اس کے لیے جہاز کی پوزیشن کو لوکیٹ کرنا مشکل نہیں ہوگا۔" وہ بولا۔ "لیکن میں ایک بات واضح کر دوں۔ جہاز پہ حفاظتی انتظامات بہت سخت ہیں۔ تم دونوں ایسے پکڑے جاؤ گے۔۔۔"

"جیسے چوہے دان میں بلی پکڑی جاتی ہے۔"

"یہ مذاق کی بات نہیں۔ خود کار الارم اور خود متحرک ہو جانے والے ٹریپ۔ اور بہت کچھ ہے جو خود مجھے بھی معلوم نہیں۔"

"ہمارا معاملہ ہم پہ اور ہماری قسمت پہ چھوڑ دو۔ تاہم یہ سمجھ لو کہ ہم دو نہیں ہوں گے۔"

"پھر کیا فوج لے کر آؤ گے؟"

"کم سے کم چار آدمی ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"چار؟" وہ بولا۔ "چالیس ہوں تو شاید کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ چار تو خودکشی ہی کر سکتے ہیں۔"

"اور بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"

"مثلاً؟ ابھی تک تو میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ جہاز پہ پہنچ کر تم کیا کرو گے! تم کسی بحری جہاز کو ہائی جیک تو نہیں کر سکتے۔"

"اسے غرق تو کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ مبہوت ہو کے دیکھتا رہ گیا۔ "تم اسے تباہ کرو گے؟"

"ہاں، تمہیں معلوم نہیں کہ ایک جہاز کو ہم پہلے بھی ڈبو چکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس پہ بھی اسلحہ تھا۔"

"وہ اتفاق سے ہو گیا، کسی کو اندیشہ نہیں تھا کہ سمندر میں ایسی واردات ممکن ہے۔ اب وہ پوری طرح تیار ہیں۔" شاہد جمیل بولا۔

"ہم بھی زیادہ تیار ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس بار کوئی اندازہ نہیں ہوگا۔ ایک پلان ہوگا جس کے تحت ساری کارروائی ہوگی۔"

وہ انکار میں سر ہلانے لگا۔ "کوئی پلان کامیاب کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ جہاز ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ ہے!"

"اس میں ایک شگاف پڑ چکا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تم جانتے ہو ایک شگاف پورے قلعے کے حصار کو توڑ دیتا ہے۔ اگر اندر داخل ہونے کا راستہ مل جائے تو آدھی فتح حاصل ہو جاتی ہے۔"

"دیکھو، میرا ایک مشورہ ہے۔" وہ کچھ سوچ کے بولا۔ "اگر کوئی لڑکی ہو تمہارے ساتھ۔ کوئی عورت جو نرس کا کام کر سکتی ہو۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "اگر ہو تو؟"

"جہاز پہ ڈاکٹر بھنڈاری ہے۔ اصل نام تو بھنڈاری ہے مگر اس کی چھیڑ ہے بھنڈی۔" شاہد جمیل نے کہا۔ "اس کے ساتھ جو نرس آئی تھی وہ بھاگ گئی ہے۔"

"بھاگ گئی ہے، کہاں؟"

"پتا نہیں۔ سنا ہے یہاں کسی کے ساتھ اس کی دوستی ہو گئی۔ پھر وہ دوستی ایک ملاقات کے بعد عشق بن گئی۔ وہ یہاں سے جا نہیں سکتا تھا۔ کسی ایسے محکمے میں ملازم تھا کہ پاسپورٹ اور ویزا نہ ملتا۔ چنانچہ وہ آ گئی اور غائب ہے۔ اب وہ دونوں ہی غائب ہو گئے۔ کپتان بہت خفا تھا۔ ڈاکٹر کہہ رہا ہے یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ تم خود اپنی مرضی سے لے کر آئے تھے۔ اب خود ہی بھگتو۔ میں نرس کہاں سے لاؤں۔"

"فرض کرو۔ ہم کسی نرس کو بھیج دیں تو؟"

"وہ اتنی آسانی سے نہیں رکھ لیں گے۔ پاکستانی نرس ہو تو یہ شاید رکھ سکتے ہیں۔"

"اگر وہ انڈین نرس ہو۔ میرا مطلب ہے انڈین نیشنل یعنی بھارت کی مستند شہری۔ بھارتی پاسپورٹ رکھنے والی۔"

"پھر... پھر ممکن ہے وہ کونسلیٹ سے پوچھیں، لیکن وہ بھنڈاری کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو یہ ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر کی مشکل آسان ہو جائے۔ وہ کپتان سے کہے کہ میں نے انتظام کر لیا ہے دوسری نرس کا اور اس کی ذمہ داری ڈاکٹر لے لے۔ ڈاکٹر کے معاملے میں کپتان اپنی اتھارٹی زیادہ استعمال نہیں کرتا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ جہاز کے مالک کا چھوٹا بھائی ہے۔"

"بس تو پھر سمجھو کہ ایک نرس آج پہنچ جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ کوئی شوہر ہو۔ اس کا شوہر ہو تو پھر؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"شوہر بھی بھارتی شہری ہو۔ وہ بھی بیوی کے ساتھ جہاز پہ رہ کے نوکری کرنا چاہے۔ گھٹیا سے گھٹیا کام بھی کرے گا۔"

"میں یقین کے ساتھ کیا کہوں۔ ممکن ہے اس کا کام بھی بن جائے۔ اس کا چانس بھی ہے کہ دونوں تصدیق پہ پکڑے جائیں۔"

"یہ چانس تو لینا ہی پڑے گا۔ تم صرف اتنا کرو کہ ڈاکٹر بھنڈاری سے ذکر کر دو کہ کوئی نرس آئے گی اپنے شوہر کے ساتھ۔ وہ بھارتی شہری ہیں۔"

"ہندو ہیں کہ مسلمان؟"

"کرسچین۔" میں نے کہا۔ "وہ بھارت سے آئے تھے۔ یہاں ان کو نوکری دلانا تھا کسی ایجنٹ نے۔ چکر میں پڑ گئے اور سب لٹا بیٹھے۔ ویزے کی مدت گزر گئی۔ اب قانونی طور پہ واپس جانے کا راستہ کوئی نہیں۔ پہلے یہاں کی گورنمنٹ پکڑ کے بند کر دے گی پھر واپس گئے تو بھارت کی جیل میں۔ ان کی مدد کی جا سکتی ہے۔"

"ڈاکٹر پوچھے گا کہ تمہیں کیوں دلچسپی ہے؟"

"تم بتا سکتے ہو کہ نرس بہت دلچسپ ہے اور خود ڈاکٹر کے لیے خاص دلچسپی کے اسباب رکھتی ہے۔ وہ آدمی کیسا ہے؟"

"آدمی... میرے تمہارے جیسا۔ کچھ زیادہ شوقین مزاج تو ہوگا ایک پیسے والا۔"

"بس تو یہ چکر چل جائے گا۔ وہ خود ڈاکٹر کو چکر میں ڈال دے گی۔" میں نے کہا۔

"مجھے نام تو بتا دو ان کے۔"

"لڑکی کا نام ہے الزبتھ۔ لز کہتے ہیں سب اور شوہر کا نام ہے چارلس۔ عرف چارلی۔" میں نے کہا۔

"میں کوشش کرتا ہوں۔ اسے رات بارہ بجے سے پہلے پہلے پہنچا دو۔ رسک ان کا اپنا۔"

"رسک یقیناً ان کا۔ اگر وہ جہاز پہ پہنچ گئے تو پھر جتنا رسک بھی ان کا۔ وہ سب کر لیں گے تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" میں نے کہا۔

اب شام گزر چکی تھی۔ باہر اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں نے شاہد جمیل سے کہا کہ وہ جائے۔ اس نے جاتے وقت ہم سے ہاتھ ملا کے گڈ لک کہا مگر خود اپنی گڈ لک کے بارے میں وہ مشکوک تھا۔

ہم نے اس کے جانے کے بعد اپنے لباس بدلے۔ کوٹ کا رنگ اور وردی ہمیں مشکلات میں مبتلا کر سکتی تھی۔ سیل زمین بوٹ کی وردی میں ہمارا حلیہ بدل گیا۔ پھر ہم نے اس پلان میں تھوڑی سی ترمیم کی اور خود ڈاکٹر بن گیا۔ ڈاکٹر بننے کے لیے مجھے کسی ایم بی بی ایس کی ڈگری کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں نے گلے میں ایک اسٹیتھسکوپ ڈال لیا اور ہاتھ میں بلڈ پریشر چیک کرنے والا آلہ اٹھا لیا۔ میں نے سفید کوٹ کی جگہ کوئی ہسپتال کے سابق ڈسپنسر ڈاکٹر نے پہن رکھی تھی۔ خود کو زیادہ چھپانے کے لیے ہم نے منہ پہ وہ رومال نما کپڑا بھی باندھ لیا جو عموماً ڈاکٹر آپریشن تھیٹر میں باندھتے ہیں۔

پرائیویٹ نما ہسپتال میں اب ویرانی، تاریکی اور خاموشی کا راج تھا اور دروازے بند تھے جو باطور وقت کے بٹے ہوئے مہروں کی طرح پڑی تھیں۔ کیا ڈاکٹر محسن نے تجربہ کیا اور والد صاحب کو کیا کہا تھا۔ چپ چاپ پڑا امید اور خوف دونوں نظروں سے ہماری تیاری کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک اسے یقین نہ تھا کہ ہم اسے بخش چکے ہیں۔

"تم ہمارے ساتھ چلو گے۔" میں نے اپنی تیاری مکمل ہونے کے بعد کہا۔

"میں... مگر کہاں؟"

"ہمیں ایک مریض کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو کچھ دیر رول کرنا ہوگا۔ ہم تمہارا آپریشن نہیں کریں گے۔"

"پوسٹ مارٹم بھی نہیں کریں گے۔" محسن نے اسے یقین دلایا۔ ظاہر ہے وہ آسانی سے ماننے والا نہیں تھا۔ جب اس نے احتجاج اور مزاحمت کی تو ہمیں اس کو اصل مریض بنانے کے لیے ناک آؤٹ کرنا پڑا۔ پھر ہم نے اسے اسٹریچر پہ ڈال کے چادر سے ڈھک دیا۔ ہم نے اس کی چادر کے نیچے ایک ٹیوب لگا دی جس کا دوسرا سرا گلوکوز کی بوتل سے ملا ہوا تھا۔ دوسری طرف سے خون دینے کے لیے ہم سرخ روشنائی کو پانی میں حل کر کے کام چلانا پڑا۔ رات کے وقت کون تھا جو پانی یا خون کے

www.paksociety.com

فرق کو دیکھ سکتا۔ ایک جانب سے محسن نے خون کی بوتل تھام لی دوسری طرف سے میں نے گلوکوز کی تھیلی پکڑ لی۔

جب ہم اسٹریچر کو آہستہ آہستہ دھکیلتے ہوئے نکلے تو یہ منظر بہت حقیقی اور دردناک ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی مریض کو آپریشن تھیٹر سے نازک حالت میں کہیں منتقل کیا جا رہا ہو۔ لوگ چاہتے ہوئے خود راستہ چھوڑ دیتے تھے۔

"یار اس طنبورے کو کہاں لے جانا ہے؟" محسن نے منہ بند کرنے والے کپڑے کے نیچے سے گنگنا کے کہا۔

"ابھی تو اسے ساتھ ہی رکھنا پڑے گا۔" میں نے اسی طرح جواب دیا۔ "ورنہ طنبورے نے بجنا شروع کر دیا تو سب کچھ بتا دے گا۔"

"ہاں ہم سے غلطی ہوئی۔ طنبورے کے سامنے ساری بات کرتے رہے۔ طنبورہ سب جانتا ہے۔" محسن بولا۔ "سب سے اچھا ہوتا کہ طنبورے کو وہیں لٹا دیتے۔ جہاں تابوت لیٹا ہوا ہے۔"

تابوت سے محسن کی مراد اس جعلی ڈاکٹر سے تھی۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔ "جب تک ہمارا مشن پورا نہ ہو جائے طنبورے کو ساتھ ہی رکھنا پڑے گا۔"

"یہ تو مشکل ہو جائے گا کیوں نہ اسے بھی ٹھنڈا کر دیں" منہ میں محسن بولا۔ "جیسے تعزیے ٹھنڈے کرتے ہیں۔"

"یہ طنبورہ ہے، تعزیہ نہیں۔"

طنبورہ جو سب کچھ سن رہا تھا تھوڑا سا تڑپا۔ اس کا مقصد احتجاج کرنا تھا یا فریاد کرنا تھا۔ لیکن ہم نے اسے مریض کا ایسا حال بنایا تھا کہ وہ چاہتا بھی تو نہ خود حرکت کر سکتا تھا اور نہ لبوں کو حرکت دے سکتا تھا۔

ہم اسٹریچر سمیت باہر آ گئے۔ اس وقت رات کے آٹھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ ہم نے اکرام شیخ کے لیے ایک پیغام چھوڑا تھا مگر اس میں وقتِ ملاقات دس بجے رکھا تھا۔ لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ شیخ کو وہ پیغام ہی نہ ملے۔

"اب یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ ان ٹیکسی ڈرائیوروں سے اکرام شیخ کی ملاقات ہوئی یا نہیں۔" محسن بولا۔

"ملاقات تو ہو چکی ہوگی۔ وہ دن میں تین تین چکر لگا رہا تھا" میں نے کہا۔ "تو جا کے دیکھ، معلوم کر۔"

"کیا دیکھوں؟ اور کیا معلوم کروں؟" محسن بولا۔ "وہ دونوں ٹیکسی ڈرائیور ابھی تک وہیں ہوں گے کیا؟"

"کسی اور سے پوچھ، ٹیکسی نمبر کا حوالہ دے کر۔"

"یار الٹا ایسا ہم کچھ اور پھنس گئے۔ اب کچھ اور کیا یہ بات شک نہ پیدا کر دے؟"

"یار تو پیدا ہونے دے شک۔" میں نے جھلا کے کہا۔ "نہیں تو اس مریض کے ساتھ تو ٹھہر نہیں جاتا ہوں۔ پھر زیادہ عجیب ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب ٹیکسی ڈرائیوروں سے گپ لگانے پہنچ گئے اور کمپاؤنڈر مریض سے ایک طرف کھڑا ہے۔"

"اچھا بھائی۔ یہاں بھی آپ ہی باس۔" محسن جلتے بھنتے بولا۔ "مجھے معلوم ہوتا تو میں ڈاکٹر کی وردی پہن لیتا۔"

"وردی کی بات نہیں، صورت کا مسئلہ بھی ہے۔ ... روز آئینہ دیکھتے ہو؟"

"میں نہیں دیکھتا۔"

"ہاں اس لیے نہیں دیکھتے کہ تم کو اپنے مقابل ایک اور زیادہ بدشکل چہرہ دکھائی دیتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جن میرے جیسا خوبصورت چہرہ ہوتا تمہارا بھی تو..."

مگر وہ میری بات سنے بغیر جا چکا تھا۔ میں ایک درخت کے سائے میں جہاں نسبتاً اندھیرا تھا اور لوگوں کی آمد و رفت زیادہ نہیں تھی، اسٹریچر کے ساتھ کھڑا رہا۔ طنبورہ میری طرف انتہائی زہریلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے ... پر لگا ہوا ٹیپ ہٹا دیا لیکن اسے خبردار کرنے کے بعد کہ چیخ یا مدد کی پکار نہ نکلے ورنہ اس سے پہلے کہ کوئی مدد کے لیے پہنچے وہ اللہ کو پیارا ہو چکا ہوگا اور میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے سب کو مطمئن کر دوں گا کہ مریض نے عالمِ نزع میں آخری ہچکی لی تھی۔ اس کی حالت بھی ایسی تھی۔

"میں... میں وعدہ کر چکا ہوں۔ پھر تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" طنبورے نے دردناک لہجے میں کہا۔ "میرے بیوی بچے پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"ان سے زیادہ پریشان ہم ہو رہے ہیں۔ اگر ہم نے تمہیں آزاد چھوڑ دیا۔ ہم جیتی ہوئی بازی ہارنے کا رسک نہیں لے سکتے۔"

اچانک ایک ٹیکسی زوم سے میرے قریب آ کے رکی۔ میں نے فوراً طنبورے کو سیل کر دیا۔ ٹیکسی کے رکنے سے پہلے میری نظر نے شیخ کو دیکھا اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے محسن کو۔

"تم دونوں..." شیخ نے ایک طویل قصیدے کا آغاز کر کے اسے بغیر ... کر دیا جس میں کئی مختلف ناپاک اور ناپسندیدہ ... سے منسوب کیا گیا تھا اور غیر پارلیمانی زبان میں خطاب کیا گیا تھا۔

"کمپاؤنڈر! مریض کو ٹیکسی میں شفٹ کرو۔" میں نے کہا۔

"زندہ یا مردہ؟" محسن نے کہا۔ "یہ پوچھ رہا تھا۔"

"جیسے تمہارا دل چاہے۔ جگہ نہ ہو تو پیر ڈال دو ڈکی میں۔" ... میں نے کہا۔

"یار ہم کو شرم آنا چاہیے۔"

"ہاں یار۔" شیخ نے آہ بھر کے کہا۔ "مگر کیا کریں نہیں

تو نہ آتا ہے؟"

"میں نے کہا ہے، خواہ مخواہ پریشان ہو۔ تمہارے کام کی بات نہیں ہے۔"

"جھوٹ بولتا ہے۔ تھا بہانہ کرنے کے لیے۔ یہ سب کو معلوم ہے۔"

"... یہ شہد ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک تو ... دوسری کہاں سے آ گئی؟ وہ بھی اندر سے مجھے معلوم ہے ... کے ساتھ۔ آدمی شادیاں چار کر سکتا ہے۔ ایک وقت دو ... نہیں کر سکتا۔"

وہ امانت رکھنے لگا۔ "اب تو ایک بھی نہیں۔ وہ دوسری امانت تھی کسی کی۔"

"امانت تھی! کس کی امانت تھی؟"

"اپنے ایک دوست تھے۔ بیچارے عرب ملک میں ... جن میں سر سے کفن باندھ کے نکلتی تھی میرا مطلب ہے ... کے۔"

"شیخ! کون تھی وہ؟ زیب النساء؟"

"سبحان اللہ گویا آپ کو یہ خوش فہمی بھی ہے کہ زیب النساء آپ پر مرتی ہے۔ اور آپ کے لیے مر سکتی ہے۔" شیخ ہنسا۔

"بھیجا تھا یار! جیسے بھائی، میرے باپ، میرے ساتھ ... ان کے علاوہ کون تھی؟"

"رابعہ۔" شیخ بولا۔

مجھے پھر یوں لگا جیسے شیخ نے اچانک ریوالور کان کے بہرے کان میں فائر کر دیا ہو۔ دھماکے سے میرا دماغ بھنا گیا اور کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ پھر ٹیکسی نے اس کو کہ دھوئیں کے ... جھٹکا لیا۔

"رابعہ آئی تھی۔ جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے میرے ساتھ۔ کہاں ہے وہ؟" میں نے مضطرب ہو کے پوچھا۔

"وہ چلی گئی واپس۔" شیخ نے سنجیدہ ہو کے کہا۔ "مگر خود کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اسے ایک موقع ملا تھا۔ اس نے ایک ملازمہ ... کیا۔ ملازمہ نے اپنی ماں کو بلا لیا۔ وہ جس وقت ... رابعہ چونکہ نکل آئی۔"

"نکل آئی؟ کہاں سے نکل آئی۔ کیا وہ کسی قید خانے میں تھی؟"

"قید خانہ وہ ہے جس سے باہر نہیں ہے۔" شیخ نے کہا۔ "مگر یہ بات ... کہ اس کے فرار کا راز افشا ہو گیا تو اس سے بھی بہت نقصان ہوگا۔"

"کس قسم کا نقصان؟"

"نقصان تو نقصان ہی ہوتا ہے۔ جیسا بھی ہو۔ اور رابعہ کیا ... کیا تم نہیں جانتے اس لفظ کا مطلب؟"

"یار تو وہ واپس کیوں چلی گئی۔ تم نے جانے کیوں دیا اسے؟" میں نے شیخ کو جھنجھوڑ کے کہا۔

"بھیا! میرے کندھے مت ہلا، جوڑ نکل گئے تو ٹیکسی کون چلائے گا۔" شیخ نے کہا۔ "رابعہ کے پاس صرف دو گھنٹے تھے جو اس نے میری اور پھر تیری تلاش میں صرف کر دیے۔"

"دو گھنٹے کے لیے کیوں آئی تھی وہ؟"

"اس سے زیادہ وقت نہیں تھا اس کے پاس۔" شیخ نے کہا۔ "اس نے اپنی مجبوری بتا دی تھی اور ہم سمجھ گئے۔"

"میں نہیں مانتا کسی مجبوری کو۔"

"مت مانو لیکن حقیقت اس سے نہیں بدلے گی۔ اس نے یہی کہا تھا کہ فی الحال وہ جہاں ہے وہیں رہے گی۔ اور اس کا وہاں رہنا ہمارے بہترین مفاد میں ہے۔ اسے ہم سب کی خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے۔ اور تمہیں بھی اس کی طرف سے بالکل بے فکر رہنا چاہیے۔ تمہارے لیے خصوصی پیغام تھا کہ آزمائش کے اس مختصر دور میں وہی وظیفہ آپ کی مشکل کشائی کرے گا جو پہلے ... ہے کہ... خدا نہیں آج اگر ہم تو کل ہم بھول گئے ہیں۔"

"کل؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "کس نے دیکھی ہے کل اور ہم تو تب بھولے جب ہم بھولنے لگے۔"

"اس کا جواب بھی کسی نے دیا ہے۔ کہ ہم نہ بھول گئے کوئی ہم سا ہوگا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا یار کہ اس نے چلتے ساتھ یہ کیا کھیل شروع کر دیا ہے اور کیوں؟ اس کا فائدہ؟"

"فائدہ وہ یقیناً سمجھتی ہے۔"

"خود ہی سمجھتی ہے۔ مجھے تمہیں ہم سب کو بھی تو سمجھائے۔"

"وہ کہتی ہے کہ تم کو خود سمجھ لینا چاہیے اور ابھی نہیں سمجھے تو وقت سمجھا دے گا کہ میری مجبوری کوئی تقدیر نہیں اور یہ تقدیر کوئی مجبوری نہیں۔ اب اسے میں تیری بدقسمتی کہوں یا یہ کہوں کہ ہوگی اس میں بھی کوئی پوشیدہ مصلحت تقدیر کی کہ دوبارہ وہ تجھ سے ملنے آئی اور ملاتے ہیں۔"

"ایسی باتیں مجھے بہت مایوس کرتی ہیں یار۔ نارسائی اگر اپنی تقدیر ہو اور نہ امید ہو نہ انتظار۔ تو پھر آدمی دوسرے سہارے دوسری پناہیں تلاش کر لیتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جبر کا فلسفہ اختیار کرتا ہے اور تقدیر کے سامنے تدبیر کی بے چارگی کو تسلیم کر لیتا ہے۔ دل کو بہلاتا ہے کہ ہوگی اس میں بھی کوئی خدا کی مصلحت۔ مگر جب تقدیر یہ کھیل شروع کر دے، واپس امید ہاتھ آ کے اور نکل جائے اور دل میں اگلی ملاقات کا آنے والے وقت کے کسی موڑ پر ملنے کا اور آتشِ شوق کا فروزاں رہنے کا یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے اور نہ ...."

www.paksociety.com

"بس بس، زیادہ لمبی چوڑی باتوں کا وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔" شیخ نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔ "خواہ مخواہ ہم پر بھی رقت طاری ہو رہی ہے۔ تیری وہ کافر ادا کا نرو کہاں ہے؟"

"اسے ساتھ لیے پھرنا تھا تو سب کو مشکل تھی، میں نے اسے ایک گھر میں ڈال دیا۔"

"یہ کہہ کر اپنے گھر میں ڈال لیا ہوگا۔" محسن نے بڑی جرأت کے ساتھ کہا۔ اور اپنی غیر موجود داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ گھر کہاں ہے؟" شیخ نے کہا۔

"ابھی تو ڈاکٹر جھنگی والا کے گھر چھوڑ دیا ہے۔ وہاں وہ محفوظ رہے گی۔ پھر ان کے خدمت خلق والے کام میں ہاتھ بٹانے لگی تو خود کو اکیلا بھی محسوس نہیں کرے گی۔"

میں نے اسٹریچر کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ اور ایک وردی برآمد کی۔ "یہ اسے ملے گی ورنہ نرس کی وردی پہن لے گی تو..."

شیخ احمقوں کی طرح دیکھنے لگا "یہ... وردی، کیا تمہیں کسی نے بتا دیا تھا؟"

"نہیں، میں ہم نے کشف و کرامت کی طاقت سے جان لیا تھا بیٹے شیخ صاحب۔" محسن بولا۔

"تم نے یہ کیا سوانگ رچایا ہے۔ ایک ڈاکٹر بنا ہوا ہے تو دوسرا کمپاؤنڈر۔ ایک مریض اٹھا لائے ہو اور میرے سر پر ڈال دیا ہے۔ یہ سب کیا ہے آخر۔ تم کسی اسپتال میں جا گھسے تھے؟" شیخ نے خاصے یقین کے ساتھ کہا۔

محسن نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "تیری عقل میں آ ہی گئی یہ بات۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تو ابھی تک آدمی ہے۔ ٹھیک ٹھاک۔"

"پہلے کیا گدھا تھا۔" شیخ نے کہا۔

"معلوم نہیں، ہم نے تو جب دیکھا تو تھانیدار تھا پھر ہماری صحبت میں رہ کے آدمی بن گیا تھا۔ اس کے بعد عاشق ہو گیا تھا۔"

"ابھی فضول باتوں کا وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ ہم ایک اسپتال لوٹ لائے ہیں۔ یہ مریض بھی وہیں بنایا۔ اب اسے کہیں باحفاظت رکھنا ہے۔"

"باحفاظت رکھنا ہے؟" شیخ پریشان ہو کے بولا۔ "کب تک۔ اور کہاں رکھوں گا میں اسے؟"

"یہ سوچنا تیرا کام ہے۔" محسن بولا۔ "زمین کے اوپر جگہ نہ ملے تو کوئی حرج نہیں، زمین کے نیچے گاڑ دینا۔ ہماری طرف سے کوئی اعتراض نہیں۔ یا پھر اس وقت تک رکھو جب تک اخبار میں اس کی لانچ سمندر میں غرق ہونے کی خبر نہ آ جائے۔"

"ایسی خبریں کون دیتا ہے اخبار میں؟"

"بھئی تو جہاں بندرگاہ کے علاقے سے فون ہوا کسی کشتی کے پیندے میں سوراخ ہونے کی خبر آتی ہے۔ خلیج میں بحری جہاز کی غرقابی کا معاملہ ہے جو دھوکے سے تباہ ہوگا۔ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی جیسے ہی یہ معلوم ہو ڈسچارج کر دینا کہ جہاں جانا ہے چلے جائے۔"

"ویسے ایک گھر ہے اس کا۔" شیخ نے کہا۔ "اگر تم کہو تو وہاں پیغام بھجوا دیتا کہ طبیعت خیر، پہلے سے بہتر ہے۔"

"طبیعت؟"

"ہاں بھئی، ہم اس کے پیچھے سے ڈسٹ کے لیے بیٹھ گئے تو مشن فیل ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"کیا تم لوگ جا رہے ہو؟ آج ہی؟"

"آج بھی جا سکتے ہیں، ورنہ کل۔" محسن بولا۔ "اب تو دیکھو شرفا کے طریقے اختیار کر رہے ہیں، دیکھو شرعی طریقے سے نکاح پڑھوا لیا اور پھر گھر میں ڈال لا۔ عاقبت کی فکر کرو جتنی عاقبت ہے۔"

"بات سنو، وہ نازو کہاں ہے؟" شیخ بولا۔

"وہ ٹھیک ہے۔ ہمارے ساتھ جا رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر ذرا لاہور فون کرتے رہنا۔ اپنے یار منظر کو اور انکل رضوی کے گھر۔"

"میں نے لاہور فون کیا تھا زیب النسا کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے۔" شیخ چلتے چلتے رک گیا۔

"پھر... کیا معلوم ہوا؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ وہ سب جھوٹ بھی تھا اور سچ بھی۔" شیخ نے کہا۔

"پہلے جھوٹ اور سچ کی تعریف بتائیے۔" محسن بولا۔

"پتا یہ چلا کہ خسرو جمشید کے ساتھ وہی ہوا جو ہمیں بتایا تھا۔ وہ نواب سلطان محمد خان کی حویلی میں دریافت ہو گیا۔ دریافت کرنے والی ناسی کی بہن تھی۔"

"سوتیلی بہن، زیب النسا کی ماں۔" محسن نے تصحیح کی۔

"مجھے معلوم ہے۔" شیخ نے کہا۔ "وہ بیگم ... مار ڈالتے لیکن سلطان محمد خان بیچ میں پڑ گئے تعلق تو کوئی نہ تھا، بھائی بہن کے درمیان۔ مگر خسرو جمشید نے ایک واسطہ دیا کہ میں نے تمہاری بیٹی کو زندگی دی۔ تم اس کے بدلے مجھے زندہ رہنے کا موقع دو۔"

"گویا ہمارا خیال ٹھیک ہی تھا۔"

"بس وہاں سے نکلنے کے بعد خسرو جمشید کہاں گیا کوئی نہیں جانتا۔ ہم بھی قیاس آرائی ہی کر سکتے ہیں کہ وہ ملا کے پاس گیا تو ملا نے اسے معاف نہیں کیا۔ تاہم وہ بات..."

"یہ نہیں چلا۔ زیب النسا کے فلم اسٹار بننے کی؟"

"اس میں بھی یہی ہے کہ یہ ساری ... تھا نیاز ... پر چھوڑ کر"

میں نے کہا۔

"اسے میں نے ابھی قتل کر دیا تو اس طبیعت کو کون سے ہاتھ"

بولا۔ "پھر کبھی سہی۔"

"ایری جگہ پر کا تصور نہیں ہے اس میں۔ وہ زیب النسا بڑی چالاک ہے اس نے کسی فرضی رپورٹر کے ذریعے خبریں اور انٹرویو سب شائع کرائے تھے اور اس رسالے نے شائع کرنے کا معاوضہ بھی ادا کیا تھا جتنا اشتہار دینے کا ہوتا ہے۔ صفحے کا انٹرویو تھا۔ مگر درحقیقت زیب النسا نے ایک پیسے اپنا اشتہار خود دینے کے لیے اور جو کچھ شائع ہوا اس کے آخر میں لکھ بھی دیا کہ اشتہار۔ مگر یہ آخری لفظ کسی نے پڑھا نہیں۔ ایڈیٹر کی اللہ اللہ ہو گیا۔ اشتہار میں کوئی کیا لکھتا ہے اور کیا بتاتا ہے یہ اس کی ذمے داری نہیں خود اشتہار دینے والے کی ذمے داری ہوتی ہے۔"

"لیکن زیب النسا نے ایسا کیوں کیا؟"

"یہی اسے کہتے ہیں آنکھوں میں دھول جھونکنا۔ سب ایک طرف کر دی۔ تلاش کرنے والے اسے نگار خانوں اور فلمی دنیا کے مراکز میں تلاش کرتے رہے۔ نامہ نگار روزانہ ہدایت کاروں تک سے پوچھتے رہے۔"

"اور جس رسالے میں وہ انٹرویو چھپا تھا۔"

"اس کے ایڈیٹر نے تو صاف بتا دیا کہ لڑکی خود آئی تھی اور ساتھ کوئی رپورٹر تھا۔ وہ اپنا اشتہار خود دینا چاہتی تھی تو لے لیا۔"

"یہ سب تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"شہلا سے۔" شیخ نے کہا۔

"اسے کیوں فون کیا تھا؟" محسن دبا کر بولا۔ "پرانی محبت نکلتا ہے۔ آہ کیا بات۔"

"کیا اسے تو بس یہ پوچھنا تھا کہ تمہارا نام نہاد شوہر کہاں ہے مگر کچھ خبر ہے کہ زندہ ہے تو کہاں روپوش ہے۔ ظاہر ہے عمر نہیں بتائی۔ اس نے کہا کہ ابھی تو فون کیا تھا ان دونوں اور وہ ہوئے۔ اس سے مزید بات ہوئی تو پتا چلا کہ... زیب النسا آ گئی تھی۔ انکل رضوی کے گھر۔"

"انکل رضوی کے گھر؟ وہ کس لیے؟"

"شہلا سے ملنا ہی تھا ایک مقصد۔ جاننے یا جانے میں معلوم نہ ہو سکا۔ شہلا نے وہی کہا جو حقیقت تھی کہ معلوم نہیں۔ وہ خود فون کر لیتے ہیں۔ اس نے سمجھا کہ شہلا نالہ کر رہی ہے۔ پھر شہلا نے پوچھا کہ اسے ہم سے کیا کام پڑ گیا تو... زیب النسا نے سب بتا دیا۔ یہ کہ کر وہ کراچی پہنچ جائے تو اچھا تھا۔ شہلا نے کہا کہ پھر کسی نے رابطہ قائم کیا تو پوچھ لوں گی۔"

"پھر تم نے بتایا؟"

"ہاں، میں نے ڈاکٹر جھنگی والا کا نام بتا دیا تھا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" محسن بولا۔

"کل کی... کل دوپہر کی۔ تمہارا جانا بھی ٹھیک تھا۔"

"میرا جانا بھی؟"

"ہاں، وہ الو کا پٹھا تجھے بھی مل سکتا ہے۔" شیخ نے کہا۔

محسن کو سخت خفت اٹھانا پڑی۔ ہمارے سر سے ایک بار تو ٹل گیا تھا۔ اب بھی رات گیارہ بجے سے پہلے غالب اور نازو کو ڈاکٹر جھنگی والا عرف جھنڈی کے پاس بھیجنا تھا۔ لیکن اس سے پہلے بھی ایک چھوٹا سا کام تھا جو ہمیں دس بجے نمٹانا تھا۔ ابھی ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ میں نے محسن سے مشورہ کیا اور ہم شیخ کے ساتھ ہی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

وقت کم تھا چنانچہ ہم نے ایک اعلیٰ درجے کے ریستوران میں کھانا کھاتے ہوئے اور پھر جلدی جلدی کافی حلق میں انڈیلتے ہوئے اکرام شیخ کو ان واقعات سے آگاہ کیا جو ہمارے ساتھ پیش آئے تھے۔ پھر وہ ٹیکسی واپس چھوڑ گیا۔

رات کے دس بجنے کر پانچ منٹ پر ہم پھر اسی گودام میں داخل ہوئے جہاں سے ہم کوسٹ گارڈز کی وردیاں پہن کر گئے تھے اور انھیں بے وردی چھوڑ گئے تھے جو ان کے مالک تھے۔

ہماری عدم موجودگی میں اگر کوئی کارروائی ہوئی تھی تو وہ ختم ہو چکی تھی۔ ان دونوں کو ایک دو گھنٹے کے بعد ہوش آیا ہوگا تو وہ اپنی حالت دیکھ کر شرمائے ہوں گے مگر شرمانے کے بعد چیخے چلائے بھی ہوں گے اور انھوں نے لازماً پولیس کو رپورٹ بھی کی ہوگی۔ ہماری یہ چند مقصد پولیس نے شیطان کی کارروائی کی ہو گی اور اپنی تفتیش بھی جس کے نتیجے میں کچھ معلوم نہیں ہوا ہوگا۔

گودام میں داخل ہوتے وقت میرے اور محسن کے حلیے تقریباً ایک سے تھے۔

"یہاں تو اب بھی کوئی نہیں۔" محسن نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔

"ہاں ہے تو سہی دکھائی نہیں دے رہا ہے.... جو دن کے اجالے میں نظر نہیں آیا تھا وہ رات کے اندھیرے میں کیسے نظر آئے گا۔"

"کہیں پولیس نے اندھیرے میں کوئی جال تو نہیں پھیلا رکھا ہوگا۔" محسن بولا۔

www.paksociety.com

ہم دونوں چھت تک رکھی ہوئی بوریوں کی دیوار کے پیچھے ٹھہر گئے تھے۔ میں نے جیب سے وہ پین ٹارچ نکالی جو ہم واپسی تک خرید کے لائے تھے۔

"مجھے تو صرف چاول نظر آ رہے ہیں یا گندم ہو سکتی ہے۔ چاول تو کوئی سنہیں ہے؟" میں نے کہا اور محسن کے ساتھ ان بوریوں کو تلاش کرنے لگا جن پر ایک چور سیٹھ نے ایک چور چوکیدار کے سامنے دستخط کیے تھے۔ ساری بوریاں ایک جگہ پر موجود تھیں جس کا مطلب تھا کہ ابھی تک گاہک اور خریدار نہیں آئے تھے۔

ان کا انتظار ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنا پڑا۔ جس کے اس حصے کی طرف جدھر سے ہم اندر گئے تھے، تیز روشنی اندر آئی اور گودام سے نکل گئی، بالکل کسی گردش کرنے والی سرچ لائٹ کی طرح۔ اس کے ساتھ ٹرک کے انجن کی آواز قریب آنے لگی۔ میں نے تھوڑا سا سر نکال کے دیکھا تو ٹرک الٹا آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی ہیڈ لائٹس بھی اب بند کر دی گئی تھیں۔

ٹرک کو گودام کے پلیٹ فارم جیسے کنارے سے ملا دیا گیا۔ عقبی حصے میں چند قدم پیچھے چوکیدار تھا جو ٹرک ڈرائیور کو ہدایات دے رہا تھا۔

"آنے دو اور پیچھے، بالکل ملا دو... اور پیچھے۔"

ٹرک ڈرائیور نے اپنے کیبن کی کھڑکی سے منہ نکال کے ان ہدایات سے زیادہ اپنی عقل اور مہارت پر اعتماد کرتے ہوئے ٹرک کو ریورس گیئر میں تھوڑی تیزی سے لانے کی کوشش کی۔ بالآخر جب ٹرک بند ہو گیا تو آگے والے حصے سے خریدار اُتر کے آیا۔ پچھلے حصے کو کھول کے چار مزدور بھی باہر نکل آئے۔

"فاسٹ کام کرو سیٹھ صاحب،" چوکیدار بولا۔

"جلدی جلدی، فاسٹ کام ختم کرو،" سیٹھ صاحب نے ہدایات کو حکم کے انداز میں مزدوروں تک پہنچا دیا۔

"آپ بوریاں چیک کر لیں؟"

"چیک کیے بغیر میں ایک بھی بوری نہیں اٹھاؤں گا،" سیٹھ نے کہا۔

مزدور صرف حکم کے غلام تھے۔ انھوں نے ایک ایک بوری اٹھا کے گودام میں رکھی اور پہلے سے نشان زدہ بوریاں اٹھانے لگ گئے۔ ٹرک وہیں رہا، جہاں سے ایک بوری چاول اٹھا کے گئے وہیں دوسری بوری آ گئی۔ جو فرق چاولوں کی کوالٹی میں آیا وہ نظر آنے والا نہیں تھا۔

"اب کیا کرنا ہے؟ یہ تو سات آدمی ہو گئے،" محسن نے سرگوشی کی۔ "چار مزدور، ایک ڈرائیور۔"

"مجرم تو وہ بھی ہیں، مگر ان کے جرم کی سنگینی اس لیے کم ہو جاتی ہے کہ وہ مجبور ہیں،" میں نے کہا۔ "ان کو جانے دو۔"

"جانے دیں چوری کے مال کے ساتھ؟"

"ہاں، مجرم تو تب ہی بنے گا جب مال چوری کا ثابت ہو اور گودام سے نکل جائے گا،" میں نے کہا۔

"مگر مال کے ساتھ ہی مجرم بھی نکل جائیں گے!"

"ہم انھیں نہیں نکلنے دیں گے،" میں نے کہا۔

ایک ایک کر کے انھوں نے سب بوریاں تبدیل کر دیں۔ اس کام میں انھوں نے حیرت انگیز پھرتی دکھائی اور جلد ہی اس سے فارغ ہو گئے۔ چاروں مزدوروں نے ٹرک کے پچھلے حصے کو بند کرنے والا تختہ اٹھایا۔ اور ٹرک ڈرائیور اپنی جگہ جا بیٹھا۔ چوکیدار اور سیٹھ حساب کتاب برابر کرنے کے لیے اندر ایک دیوار کی اوٹ ہو گئے۔

"محسن! موقع کو چلے ہی گئے تھے۔"

"ہاں، دو سو اور..."

چوکیدار نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے اس کا … پیچھے وہاں کے ریوالور اس کی گدی پر رکھ دیا۔ یہی محسن نے اس … کے ساتھ کیا۔

"ٹرک ڈرائیور سے کہو جائے،" محسن نے کہا۔

سیٹھ کا چہرہ میری طرف تھا۔ میں نے کہا۔ "تم … بولو، کیا سے ہے ہوتا؟ یہ اصل ہے؟"

"اور یہ اس سے بھی زیادہ اصل ہے،" محسن نے ریوالور کو دبا کے کہا۔ "گولی بھی اصل ہے۔"

"میری گولی تمہاری پیشانی میں سوراخ کرے گی۔"

"اور میری گولی گردن میں،" محسن بولا۔

"اگر تم اپنے ساتھ پانچ دوسرے افراد کو بھی موت کی دعوت دینا چاہتے ہو تو انھیں مدد کے لیے بلا لینا ورنہ صرف اتنا کہنا کہ وہ جائیں، تم بعد میں آ جاؤ گے۔"

"حساب کتاب کر کے،" محسن نے کہا۔

سیٹھ صرف سیٹھ تھا۔ اس کے پاس یقیناً بہت پیسہ ہو گا مگر ہر مجرم کی طرح وہ گرفتار ہوتے ہی کانپنے لگا تھا کیونکہ اس میں نہ اخلاقی جرأت تھی، نہ مقابلے کی ہمت۔ محسن نے جب اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا تو میں نے اپنا ریوالور اس کے … اس نے بڑی مشکل سے حلق میں پھنسی ہوئی آواز نکالی۔

"کیا ہوتا ہے سیٹھ؟" ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کرنے کے بعد کہا۔

"میں... کہہ رہا ہوں کہ تم جاؤ۔ میں آ جاؤں گا۔"

"کیسے آئے گا؟"

"ٹیکسی میں آ جاؤں گا۔ تم سب چلو۔"

"اچھا سیٹھ، تمہاری مرضی۔ ٹیکسی کا پی آ ڈی ٹکٹ میں،" ڈرائیور نے کہا اور اس کے ساتھ ہی انجن کو گیئر میں ڈال دیا۔ انجن غرایا اور ٹیل لائٹس روشن ہوئیں۔ پھر اس کا گودام سے فاصلہ بڑھنے لگا اور آواز کم ہوتی گئی۔

میں نے چوکیدار کو گھما کے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔

"تم... کون ہو تم لوگ؟" چوکیدار نے جرأت کر کے کہا۔

"اچھا سوال ہے،" میں نے سر ہلایا۔ "انھیں بتاؤ محسن کہ ہم کون ہیں؟"

"ہم خدائی فوجدار ہیں،" محسن نے کہا۔

"انھیں یہ بھی بتا دو کہ یہ کون ہیں،" میں نے کہا۔

"تم دونوں چور ہی نہیں، ملک اور قوم کے دشمن بھی ہو،" محسن نے کہا۔ "ہم نے تمہاری ساری کارروائی خود دیکھی، شروع سے آخر تک۔ ہم اس واردات کے چشم دید گواہ ہیں۔"

"تم... کس کارروائی کی بات کرتے ہو؟" سیٹھ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیا ثبوت ہے؟"

میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ اس کا سر دیوار سے لگا۔

"جب آدمی خود دیکھتا ہے تو اسے یقین کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں پڑتی،" میں نے کہا۔ "پھر تم بھی جانتے ہو کہ تمہارا جرم کیا ہے۔ ہم نے تمہیں رات میں بوریوں پر نشان لگاتے ہوئے اور یہاں سودے بطور رشوت دانش لیتے بھی دیکھا تھا۔"

"اور باقی کارروائی آنکھوں کے سامنے ہوئی،" محسن بولا۔

"اب تم خود کو ہماری عدالتِ انصاف کے کٹہرے میں ایک مجرم سمجھو، تم پر مقدمے کی سماعت شروع کی جاتی ہے۔"

"کیسی عدالت؟" چوکیدار بولا۔

"تم کون ہوتے ہو مقدمہ چلانے والے؟"

"یہ ایم آر ایس کی عدالت ہے جو ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث لوگوں کو سزا دینے کے خصوصی اختیارات رکھتی ہے،" محسن نے کہا۔

"ایم آر ایس... کیا تم پاگل ہو؟"

"ایم آر ایس کی عدالت تم کو ملک و قوم کا دشمن اور غدار ثابت کر چکی ہے۔ تم نے ذاتی منفعت کے لیے ملک کی تجارتی ساکھ کو داؤ پر لگایا… پاکستان کی معیشت کو نقصان پہنچایا۔ کاروباری دنیا میں پاکستان کو بدنام کیا۔ چوری اور غبن کیا،" محسن نے کہا۔

"کون کہتا ہے؟" سیٹھ کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"یہ ہم جانتے ہیں اور تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس عدالت میں تم خود ملزم بھی ہو، خود گواہ، خود وکیل، استغاثہ اور منصف۔ یہ دنیا کی عدالت نہیں ہے جہاں سب الگ ہوتے ہیں اور وہ مستحق ذہن سے تو مجرم بھی بچ جاتے ہیں۔"

"ہم جلاد بھی ہیں اور سزا پر عملدرآمد کرنے والے بھی،" محسن نے اضافہ کیا۔

"یہ عدالت تم کو سزائے موت دیتی ہے۔ اس فیصلے کے خلاف یوم حشر سے پہلے کہیں کوئی اپیل نہیں۔ ٹھیک تین سیکنڈ کے بعد سزائے موت پر عملدرآمد ہو گا۔ اس وقفے میں تم کلمہ پڑھ سکتے ہو۔ توبہ کا وقت تو گزر چکا۔ آخری وقت میں کی جانے والی توبہ ویسے بھی قبول نہیں ہوتی۔"

"نہیں،" سیٹھ اور چوکیدار ایک ساتھ چلائے۔

"تم... تم قتل کرنا چاہتے ہو مجھے،" سیٹھ کی آواز لرزنے لگی۔ وہ خود بھی بے ہوش ہونے کے قریب ہو گیا۔

"اگر تم نے کوئی ایسا سنگین جرم کیا ہوتا تو بلاشبہ یہ قتل ہوتا،" محسن نے کہا۔ "لیکن تم مجرم ہو۔"

"سزا دینا عدالت کا کام ہے۔ ہر شخص..."

"ہم اصولی قانون کے مطابق انصاف کرتے ہیں،" میں نے کہا۔ "اصول یہ ہے کہ دس مجرم اگر ناکافی ثبوت اور گواہی نہ ملنے کے باعث سزا سے بچ جائیں تو یہ بہتر ہے لیکن کسی ایک بے گناہ کو غلط ثبوت اور جھوٹی گواہی پر سزا ملے، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہم اپنے ضمیر اور یقین کے مطابق تمھیں وہی سزا دے رہے ہیں جس کے تم مستحق ہو۔ جو قانون ہی تمھارے جیسے ہر مجرم کے لیے درست بھی ہے۔"

"بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ قانون کی عدالت تک تم کو نہیں لے جایا جا سکتا،" محسن بولا۔ "اگر ہم ایسی غلطی کرتے تو انصاف کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ گویا تم کو بچ نکلنے کا موقع فراہم کرنے کے مترادف ہوتا۔ تم اپنے اس چوری کے مال سے کوئی بہت بڑا وکیل کر لو گے۔ جو اپنی قانونی موشگافیوں سے عدالت میں تمہارے جرم کو تمہاری بے گناہی میں بدل دے گا۔ تم گواہ خرید سکتے ہو اور ثبوت مٹا سکتے ہو۔ یہاں تک کہ گواہوں کو اور ان کے پورے خاندانوں کو مٹا سکتے ہو۔ اس لیے تمہارا فیصلہ یہاں ہوا تو بالکل ٹھیک ہوا۔"

اب چوکیدار چلانے لگا۔ خدا رسول کے واسطے دے کر جان بخشی کے لیے ہاتھ پاؤں جوڑنے لگا۔

"تمہاری رحم کی اپیل مسترد کی جاتی ہے،" میں نے کہا۔ "اگر تم پیشہ ور مجرم ہوتے تو تم کو رعایت دی جا سکتی تھی مگر

www.paksociety.com

تم چوکیدار تھے، بنگلوں کے محافظ تھے۔ تم ہی چور بن گئے۔ اگر ایسا ہونے لگے کہ جس پر اعتماد کیا جائے وہی دغاباز ثابت ہو تو پھر دنیا کا کاروبار کیسے چلے؟"

"مجھے... بامجبوری بیوی کی شہہ تھی۔"

"ہاں، ایسے موقع پر ہمیشہ بیوی بچے یاد آتے ہیں۔ اس وقت کے اچانک آجانے سے پہلے تو صرف یہ یاد رہتا ہے کہ کتنا مال اپنی جیب میں آسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ یاد نہیں آتا کہ اگر کبھی وہ شامت ہی درپیش ہوئی جس پر تشویش تھا تو وہ کہاں جائیں گے اور ان کا کیا بنے گا۔"

"خیر تم ان کی فکر مت کرو۔ جتنا مال جمع کرلیا ہوگا تم نے، تھا تو وہ حرام کا مال جو حرام ہی جاتا ہے۔ مگر اپنی جان کی قربانی دے کر تم اسے ان کے لیے حلال بتا گئے۔ ظاہر ہے ان کا تو اس میں قصور نہیں تھا۔" محسن بولا۔

"تمہاری بیوی کا قصور بڑا بہت قصور ہے۔ اسے یقیناً علم ہوگا کہ تمہاری اصل آمدنی کیا ہے۔ وہ آمدنی سے زیادہ خرچ کرتے وقت تم سے سوال کرتی تھی نہ اپنے آپ سے کہ یہ آیا کہاں سے اور کیسے آیا۔ ظاہر ہے کہ وہ جواب جانتی تھی مگر کیا کبھی اس نے تم کو روکا؟ نہیں ٹوکا ہوگا۔ عورت کی ذات میں نمود و نمائش کا جذبہ بڑا ہے۔ دوسروں سے حسد زیادہ ہے۔ اسے اچھے کپڑے ملیں، زیورات ملنے لگے تو اس نے انجام کے بارے میں سوچنے سے بھی گریز کیا ہوگا۔ سزا کی مستحق وہ بھی ہے کیونکہ وہ چاہتی تو پہلے ہی دن تمہیں روک سکتی تھی، کہہ سکتی تھی کہ جائز آمدنی کی روکھی سوکھی منظور ہے۔ بیوی یا کوئی بھی عورت، مرد کو جیسا چاہے بنا سکتی ہے۔"

"اس لیے اب ان کا معاملہ خدا پر چھوڑ دو۔ وہ سب کو رزق دینے والا ہے۔ زندہ رکھنا اور مارنا اسی کے اختیار کی بات ہے۔ تم بیوی بچوں کو خدا کی امان میں دو۔"

میں نے محسوس کیا کہ ان کے لیے موت کے انتظار کی اذیت کا وقفہ غیر ضروری طور پر طویل ہوگیا ہے۔ خود ہمارے پاس وقت کم تھا چنانچہ میں نے اچانک گولی کو آزاد کردیا۔ تقریباً اسی کے ساتھ ہی محسن نے بھی فائر کیا۔ گولیاں ان کے سروں میں اتر گئیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے گرے اور تڑپنے لگے۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ اب انہیں کوئی اذیت نہیں۔ اذیت تو احساس سے ہوتی ہے۔ احساس رکھنے والا دماغ پہلے ہی ختم ہوچکا تھا۔

دھماکوں کی اس ہیبت میں ایسی گونج تھی کہ ہمارے کانوں میں بھی بازگشت کی سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ لیکن ہم نے اپنا کام ختم کرنے کے بعد فرار ہونے میں دیر نہیں کی۔ ہم مخالف سمت کے دروازے سے باہر آگئے اور ایک سائبان کے پیچھے تاریک گوشے میں کھڑے ہوگئے۔

فائر کی آواز پر نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ نکل کے ہوٹل کی جانب آرہے تھے۔ ہم نے چند منٹ انتظار کیا اور پھر انہی لوگوں میں شامل ہوگئے جو ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کیسا دھماکا تھا، فائر کہاں ہوئے تھے۔ جب وہاں کافی لوگ پہنچ گئے تو ہم اطمینان سے چلتے ہوئے نکل گئے۔ کسی نے بھی کمپاؤنڈر اور دوسرے ڈاکٹر نظر آنے والے شخص کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ ایسے بھی بہت تھے جو اپنے کام سے کام رکھتے تھے اور کسی سنسنی خیز قسم کی واردات میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔

جائے واردات سے فرار ہونے کے بعد ہمارے لیے فوری مسئلہ اپنی لانچ پر پہنچنے کا تھا۔ میں اور محسن پیچھے سمت پر چلتے گئے۔ ہم اب اس علاقے کے جغرافیے سے کافی حد تک واقف ہوچکے ہیں۔

"اس ملک میں ابھی کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔" محسن نے چلتے چلتے افسوس سے سر ہلایا۔ "لوگوں نے ایک ٹرسٹ کے تحت چلنے والے اسپتال کو بھی نہیں بخشا۔ جس نے ٹرسٹ قائم کیا تھا اور اس کی آمدنی کو اسپتال کے لیے وقف کیا تھا، اس نے تو صدقہ جاریہ کا ثواب کمایا تھا۔ لوٹنے والے یہ بھی نہیں سوچتے کہ وہ کسے لوٹ رہے ہیں۔"

"ہاں، یہی تو المیہ ہے۔ لٹیرے بھائی لوٹنا ہے تو کسی جوئے خانے یا شراب خانے کو لوٹو، کسی اسمگلر کے مال حرام سے بھرے گودام کو لوٹو۔ ایک ٹرسٹ کا پیسہ خورد برد کرنا تو گناہ بھی ہے، جرم بھی۔"

"اور وہاں ڈاکٹر کی جگہ کمپاؤنڈر کام کر رہا تھا۔"

"غلط کام کر رہا تھا۔ ڈاکٹر تو انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ وہ انسانیت کش شخص تو ڈاکٹری کے پیشے کو بدنام کرنے والوں میں شامل تھا۔" میں نے کہا۔

"یہاں گودام لوٹنے والے کون ہیں؟ وہی جو اس کی حفاظت پر مامور تھے۔" محسن سخت جذباتی ہو رہا تھا۔

"اور ان کا ایمان خریدنے والے ہیں سیٹھ بیوپاری، جن کے پاس مال حرام پہلے ہی کم نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی کیا نفسیاتی مسئلہ ہے یار۔ آدمی اچھی اچھی چیزیں جمع کرتا ہے، بری چیزوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ تماشا کرتے ہیں۔ مال حرام اکٹھا کرتے ہیں۔ ایک تو ہوتی ہے ضرورت جو آدمی سے سب کچھ کراتی ہے، مرد سے چوری اور عورت سے پیشہ۔ مگر ایک بار مجبوری کے تحت چوری کرنے کے

بعد آدمی پچھتانے لگے تو اسے کوشش کرنا چاہیے کہ وہ پھر جرم نہ کرے۔ جو مل گیا ہے اس سے چھوٹا موٹا کام کرلے۔ مگر نہیں، وہ مسلسل چوریاں کرتا ہے، پھر ڈاکے ڈالنے لگتا ہے، بنک لوٹنے لگتا ہے۔"

"یہی تو ساری خرابی ہے۔ لوگ رشوت لیتے ہیں۔ جتنی ایک کوٹھی بن گئی، ایک عالی شان کار آگئی، ایک لاکھ بنک میں جمع ہیں۔ اب تو بس کرو۔ اس کے بعد تو ایمانداری سے کام کرو۔ زندگی میں ایک بار غلطی کی تھی یا جرم سرزد ہوا۔ باقی عمر تو اس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے کوئی نیکی کا کام بھی تو کرلو۔ شاید اسی کے طفیل تم بخشے جاؤ۔"

"نہیں یار، یہاں تو یہاں کسی کو بھی بخشنا ہی نہیں۔ اگر کروڑ پتی ہے تو ارب پتی بننا چاہتا ہے۔ ایک کروڑ سے دو کروڑ بنانا ہے مگر اس میں سے ایک لاکھ کسی اسپتال یا اسکول کو نہیں دیتا۔ کسی مستحق کو دینے کا سوچتا تک نہیں۔"

"بعض اوقات دل دکھی ہوتا ہے ایسی باتوں سے۔ اگر میں سب کے سامنے یہ بات کہوں تو پتا نہیں کیا ہو۔ مجھ پر غدار ہونے کا الزام آجائے۔ مجھے کافر قرار دے دیا جائے۔ مگر بعض اوقات مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ ملک کسی کا نہیں، نہ میرا نہ تیرا۔ قائداعظم اور لیاقت علی نے تو اسے ایسا نہیں چھوڑا تھا جیسا یہ آج ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے مالک نہیں ہیں۔ مالک کوئی اور ہے جو ہم میں سے نہیں، بلکہ ہمارا دشمن ہے۔ ہم انتقاماً اسے نقصان پہنچا کے تسکین حاصل کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یار، یہی وہ جگہ ہے نا جہاں لانچ کو موجود ہونا چاہیے؟" محسن نے کچھ دیر بعد اچانک رک کے کہا۔

میں نے غور سے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی۔ "ہاں خیال تو میرا بھی یہی ہے مگر ایسی کوئی نشانی میرے ذہن میں نہیں رہی۔"

محسن نے تائید میں سر ہلایا۔ "ہر جگہ ایک سی لگتی ہے۔" ہمارے سامنے تاریک سمندر کے سینے پر ساحل کے ساتھ ساتھ سیکڑوں چھوٹی بڑی کشتیاں موجود تھیں۔ ان میں سے بیشتر اندھیرے میں صرف ایک تاریک سایہ لگتی تھیں لیکن کسی کسی کشتی پر چراغ کا برائے نام سا اجالا نظر آرہا تھا۔ پس منظر میں سمندر کا پانی بھی کالا محسوس ہوتا تھا اور آسمان قدرے روشن نظر آتا تھا۔

"ہوسکتا ہے کہ یہ وہ جگہ نہ ہو۔"

"تھوڑا سا آگے اور چل کے دیکھ لیتے ہیں۔" محسن بولا۔ "ممکن ہے واپس یہ وہ جگہ انھیں خالی نہ ملی ہو۔ پیچھے تو ہم نے دیکھ لیا ہے۔"

"آخر وہ بھی تو ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے۔ ہم انھیں نہ دیکھ پائے تو وہ دیکھ لیں گے۔"

اسی وقت میری کمر پر ایک پتھر آ کے لگا۔ میں نے بے اختیار گھوم کے دیکھا۔ پتھر کے گرنے سے جو آواز پیدا ہوئی اس نے محسن کو بھی متوجہ کیا۔

"پتا نہیں کون خبیث تھا۔" میں نے کہا۔

"وہی ہوگا مرزا غالب کا بھتیجا اور کون..." محسن نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا لیکن ہمارے سامنے تاحد نگاہ سمندر تھا جس کے متلاطم پانی میں رات کی سیاہی گھل گئی تھی۔ اور دھندلا آسمان تھا جس کے ستارے اوجھل تھے۔ نیچے ساحل کے ساتھ ساتھ سیکڑوں چھوٹی بڑی کشتیاں ساکت نظر آرہی تھیں۔ بیشتر کشتیوں پر اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا لیکن چند کشتیوں پر چراغوں کا مدھم اجالا یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس کشتی کے سمندری گھر میں کسی خاندان کا بسیرا ہے۔ ہماری لانچ انہی کے درمیان کہیں موجود تھی مگر غالب اور نادرہ نے اسے یوں کیموفلاج کردیا تھا کہ ہم اسے تلاش نہ کرسکے۔

جو پتھر مجھے مارا گیا تھا وہ بہت چھوٹا تھا اور لگا بھی میری کمر پر تھا چنانچہ مجھے چوٹ نہیں آئی تھی لیکن دوسرا پتھر جو محسن کے سر پر لگا زیادہ بڑا تھا۔ اس نے بے اختیار گالی دی۔

"ابے... سامنے آ کمبخت کہیں کے۔"

"تو ہی ہٹ جا درمیان میں سے۔ کیوں کھڑا ہے ہمارے نشانے کی راہ میں؟" کسی نے ڈانٹ کر کہا تو معقول ہے لیکن اس نے لہجہ اور آواز بدل کے بات کی تھی مگر میں نے سر اٹھا کے دیکھا تو مرزا غالب خاصی بلندی پر تشریف فرما تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ اوپر تلے کنکری کے خالی کریٹ رکھے گئے تھے۔ ان میں کیا تھا اور کون لایا تھا، جو کچھ لایا گیا تھا وہ کہاں گیا اور یہ خالی کریٹ یہاں کیسے رہ گئے، ان سوالات کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ کریٹ کسی کی ملکیت نہیں تھے۔ راستہ صاف اور کھلا رکھنے کے لیے انھیں دیوار کے ساتھ ڈھیر کردیا گیا تھا۔ غالب انہی کے اوپر دراز تھا اور حلوے کی لگن سے سمائے اپنے ہاتھ سر کے نیچے رکھے تیسرا پتھر ہاتھ میں تول رہا تھا۔

"زوال، اوپر تشریف نہیں لے جاسکتے آپ؟" محسن نے بھنا کے کہا۔ "یا میں پہنچاؤں آپ کو؟" اس نے ایک کریٹ کو تھوڑا سا ہلایا۔

www.paksociety.com

"دیکھو، ایسے تو میں کروں گا تجھ پر اور تو جلے گا وہاں۔"
غالب نے کہا۔ "ڈالنے پتی کے کمیں، ہم خود آجاتے ہیں عرش سے فرش پہ۔"

"یہ نہایت گری ہوئی حرکت تھی۔" محسن بولا۔ "اور پھر شرفا کو سنگسار کرنا۔"

"وہ یار..." غالب تپے ہاتھ سے بولا۔ "اول تو تم شرفا نہیں، دوسرے یہ کہ قصور میرا نہیں۔ معلوم نہیں وہاں کس نے پتھر رکھے تھے اور کیوں رکھے تھے؟"

"وہ پتھر نہیں، ڈبے تھے۔" محسن نے کہا۔ "اور تو نے ان کا ناجائز استعمال کیا۔ جا اپنے ناپاک ہاتھ دھو۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی کیونکہ غالب سخت خفیف ہوا تھا۔ وہ پتھر رکھے تھے، ڈبے نہیں تھے، مگر اس نے غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھوں کو یوں دیکھا تھا جیسے وہ واقعی ناپاک ہو گئے تھا...

"تم لوگوں نے بہت دیر کی۔"

"اب مزید دیر کی گنجائش نہیں۔" میں نے کہا۔ "لانچ کہاں ہے؟"

"نازو کی تحویل میں ہے، اُدھر۔" غالب نے اشارہ کیا۔ "یہاں پارکنگ کی جگہ نہیں تھی۔ تم لوگوں نے یہ کیا حلیہ بدل رکھا ہے؟"

"سب بتا دیں گے، بیٹھ بیٹھائیں۔" میں نے کہا۔ "ابھی وقت بہت کم ہے۔ تم دونوں کو جانا ہے۔"

غالب چلتے چلتے رُک گیا۔ "مجھے... اور محسن کو؟"

"نہیں، تمہیں اور نازو کو۔" میں نے اسے آگے کھینچ لیا۔

"اب کہاں جانا ہے؟ سارا دن تو جھک مارتے رہے ہیں۔"

"یہ تو کہہ رہا ہے۔" محسن نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ "ہم نے تو ایک شاندار موقع فراہم کیا تھا تجھے۔ سمندر میں پکنک منانے اور رومانس کے لیے پورا دن تھا۔ تو ایک ہی دن میں بیزار ہو گیا؟"

"لعنت تم پر مرزا غالب! اس کے ساتھ پوری زندگی کیسے گزارو گے؟" میں نے اسے مزید شرمندہ کیا۔

"یار، تم لوگ سمجھے نہیں، بالکل غلط سمجھے۔ دن تو بڑا اچھا اور خوبصورت تھا۔" غالب نے سر کھجا کے کہا۔ "اور تم سب کی طرف سے بے فکری ہوتی تو یادگار ہو جاتا، مگر اس کے اور میرے دماغ میں تم سب کا خیال لگا ہوا تھا اور لعنت ہے تمہاری سلامتی کا خیال سوار تھا۔ رومانس کے موڈ کی تو ایسی کی تیسی ہو گئی۔ الٹا شرمندگی کا احساس غالب رہا کہ تم سب تو خطرات اور اندیشوں سے دوچار ہو اور ہم کر رہے ہیں عشق۔"

"کیا عشق کیا جاتا ہے؟"

"بالکل کیا جاتا ہے۔ سوچ سمجھ کے اور باقاعدہ منصوبہ بندی سے کیا جاتا ہے۔" غالب نے کہا۔ "تم دیکھنا کہ فرصت کا ایک آدھ دو سال سے گر ملی تو ہم تمہیں عشق کر کے دکھائیں گے۔ لیلیٰ مجنوں ڈینا دنگ رہ جائے گی۔ کوئی عشق بھی اس کے مقابلے بازیچۂ اطفال نظر آئے گا۔ اور پھر تم جیسے کم بخت، کم عقل، ناہنجار رشک اور حسد سے جل کے مر جائیں گے کہ کاش ہم نے بھی یوں عشق کیا ہوتا۔"

"چُپ سالے۔ عاشق آپ آج تک پیدا نہیں ہوا اور عشق کرنے لگے کل۔" محسن نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"کسی پہ عاشق ہونا اور اس سے عشق کرنا الگ الگ کام ہیں۔ ایک کے لیے مقام اور وقت کی شرط نہیں۔ دوسرے کام میں عقل و نظر، دل و دماغ، جسم اور روح سب کام آتے ہیں..."

"یار لانچ کہاں ہے؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"وہ سامنے... کیا تمہیں نازو دکھائی نہیں دیتی؟" غالب نے کہا۔ "اُدھر دیکھو۔"

"مجھے تو ایک مستول سا دکھائی دیتا ہے۔"

"وہ مجھے روشنی کے مینار کی طرح نظر آ رہا ہے۔ صبح کے ستارے کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔ میری نظر سے دیکھو، اور اندھے ہو تو میرے پیچھے آؤ۔" اس نے ایک کشتی پہ چھلانگ لگائی، پھر دوسری پہ۔ کچھ مختلف کشتیوں سے گزر کے ہم بالآخر لانچ پہ پہنچے تو نازو کہیں نہ تھی۔

"کہاں ہے وہ تیرا روشنی کا مینار؟" محسن نے غالب کے لات رسید کی۔ "صبح کا ستارا تو بنا رہا تھا ابھی۔"

"یار، تم واقعی اندھے ہو۔" غالب نے کیبن کے پیچھے جا کے کہا۔ "وہ دیکھو لیٹی ہے، کیسے مزے سے سو رہی ہے۔ کس ادائے ناز سے..."

وہ اسی وقت اٹھ بیٹھی۔ شاید اس نے ہماری گفتگو کرنے کی آواز سن لی تھی۔ فرمودۂ غالب پھر غلط ہو گیا۔

"واقعی تمہاری نظر سے دیکھتے ہم تو..." محسن نے پھر اس کے لات رسید کرنے کی کوشش کی، مگر غالب بچ گیا۔

"فتور تمہاری عقل میں بھی ہے، نگاہ میں بھی۔ چنانچہ نظر میں تم جو دیکھتے ہو وہ بھی غلط ہو جاتا ہے۔" میں نے بغض سے کہا۔

"آ گئے آپ لوگ خیریت سے۔" نازو نے کہا۔

"ہم تو خیر آ گئے، مگر اب تم سدھار رہی ہو پیا سنگ۔" محسن نے کہا۔

"یہ تم کو کیا ہو گیا ہے؟ جیسے گئے تھے تو..."

"مریض تھے۔ مرضِ عشق میں مبتلا تھے۔" محسن نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اب مسیحا نظر آتے ہیں۔ یہ کیا پل پل رنگ بدلتی دنیا ہے عزیزم!"

میں نے اسے دو فقروں میں صورتِ حال بتائی۔ "جاؤ تم بھی وہاں ہو آؤ۔ جو جیب میں تمہیں نظر آتی ہے نا، یہ پہن لو۔"

"نہیں، مجھے کچھ نہیں آتا۔" وہ بگڑ کے بولی۔ "اور یہ وردی میں اس وقت تک نہیں پہنوں گی جب تک مجھے بتاؤ گے نہیں کہ کیا ڈراما ہے۔"

"ڈراما بہت زبردست ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو نرس بن کر اس جہاز پہ جانا ہے۔"

"اس ایسی کر اتنی تم ٹھیک پہ۔" محسن نے کہا۔

"اکیلے جانا ہے؟"

"نہیں۔ یہ دوسری وردی غالب کے لیے ہے جو ابھی اسمانا پُرزے کے جسم پہ چڑھ رہی ہے۔" محسن بولا۔ "یہ سیری اترتی جان کے تمہارے ساتھ جائے گا۔"

"چلو چلو، میں نہیں جا رہی ہوں کہیں بھی اور غالب کے ساتھ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" نازو نے کہا۔

"عزیزہ! مانا کہ تم شرم و حیا کی پتلی ہو اور ڈبل پتلی بھی ہو۔" محسن اسے چھیڑنے کے موڈ میں تھا۔ "اور ہماری مشرقی تہذیب کی اخلاقی روایات میں کسی نامحرم کے ساتھ رہنا سخت معیوب ہے، بلکہ گناہ کبیرہ ہے، مگر تمہیں جانا پڑے گا، تم دونوں میاں بیوی کو۔"

"محسن تمہارا ڈریکی لگانے کو دل چاہ رہا ہے۔" نازو نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے پیچھے آ گیا۔

"نازو پلیز۔" میں نے کہا۔ "یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ تم کو ایسے ہی جانا ہے، میاں بیوی بن کے۔ پہلے میری بات سنو، جہاز پہ ایک ڈاکٹر ہے، ڈاکٹر جیشاری..."

"اسے کبھی غلطی سے بھی ڈاکٹر مت کہنا۔" محسن بولا۔ "یہ اس کی چڑ بن گئی ہے، لیڈی ڈاکٹر۔"

"ڈاکٹر جیشاری کے ساتھ ایک نرس آئی تھی، لیکن وہ یہاں آ کے روپوش ہو گئی۔ سنا ہے وہ کسی سے شادی کے لیے ہی فرار ہو کے آئی تھی۔"

"اب تم اس کے برعکس کرو، یعنی شادی کر کے یہاں سے فرار ہو جاؤ اور جہاز پہ پہنچ جاؤ۔" محسن بولا۔

"تم مت بولو بیچ میں۔" نازو نے کہا۔ "بات میں نے شروع کی تھی، سکندر بیچ میں بول رہا ہے۔"

"یار وقت کم ہے پہلے ہی۔ انھیں بارہ بجے پہنچنا تھا اور بارہ بج گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "نازو، ہم سارا کی بات کر کے آئے ہیں۔ اس جہاز پہ ایک مسلمان افسر ہے... شاہد جمیل۔ ہم نے آج اس کی جان بچائی۔ یہ جیسے بدلے اس کے بدلے وہ ہماری مدد کرے گا۔ تم کو جہاز پہ پہنچنے کے بعد تحفظ بھی فراہم کرے گا۔ تم جا کے یہ کپڑے بدلو۔ میں اور محسن تمہارے لیے پاسپورٹ بنا لیتے ہیں۔ تم بھارتی شہری بن کے جاؤ گے۔"

"ہندو بن کے؟"

"نہیں، تمہارا نام الزبتھ عرف لزا... غالب کا نام ہوگا چارلس، لیکن تم اسے پیار سے چارلی ڈارلنگ۔" محسن نے ان تو آواز بنا کے کہا۔ "کیسے کہو گی بھلا؟ ایک بار کہہ کے دیکھو تو۔"

"کیا یہ سب بہت ضروری ہے؟" نازو اب سنجیدہ تھی اور محسن کی شوخی پہ خفا ہونا بھی بھول گئی تھی۔

"تمہیں خود کو ایک بہت خطرناک مشن کے لیے تیار کر لینا چاہیے۔" محسن بولا۔ "ہم سب طے کر آئے ہیں۔"

"سب طے کر لیا، مجھ سے پوچھے بغیر...؟"

"کیا ہمیں اب اتنا اختیار بھی حاصل نہیں...؟" میں نے کہا۔ "یہ تو ایک امتحان ہے آزمائش کا، اداکاری کا اور بہادری کا۔ تم دشمن کے حصار میں داخل ہو کے خود کو کیسے بچاتی ہو، پھر کیسے ان کا اعتماد حاصل کرتی ہو، کیسے اپنا دفاع کرتی ہو؟ تم یہ سب کر سکتی ہو نازو! اسی لیے ہم نے تم سے نہیں پوچھا۔"

"کیا ہم خالی ہاتھ جائیں گے؟" نازو نے کہا۔

"نہیں، توپ تم اٹھانا، بم غالب کے سر پہ رکھ دینا۔" محسن نے کہا۔

"ظاہر ہے تم لوگ اسلحہ نہیں لے جا سکتے۔" میں نے محسن کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ "وہ تمہاری تلاشی لیں گے۔ لیکن بعد میں تمہارے لیے اسلحہ حاصل کرنا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ اس جہاز میں اسلحے کے سوا ہے کیا؟"

"اچھا، اگر ہم جہاز پہ پہنچ گئے، پھر؟"

"پھر تم کو انتظار کرنا ہوگا جہاز کی روانگی کا۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھنا ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "آج کی رات تو کچھ نہیں ہو سکتا، مگر جہاز اچانک لنگر اٹھا لے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کل رات کو ہمارا انتظار کرنا۔"

"چار بجے کے بعد..."

www.paksociety.com

"ہاں۔ ہمیں معلوم ہے کہ چوبیس گھنٹے بعد جہاز کہاں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہم کسی بھی وقت تم سے دور نہیں ہو جائیں گے۔ بے شک ہمارے درمیان اتنا فاصلہ ضرور ہوگا کہ جہاز پر سے کوئی بھی ہمیں نہ دیکھ سکے۔ دوربین لگا کے بھی۔ ہم اپنی پوزیشن بدلتے ہوئے تمہارے دائیں بائیں یا آگے پیچھے چلتے رہیں گے دس بیس میل کے فرق سے۔ اور کل رات ٹھیک بارہ بجے جہاز پر آ پہنچیں گے۔"

"ضروری تو نہیں کہ ٹھیک بارہ بجے جہاز تمہیں کھڑا ملے۔" نازو نے کہا۔

"جہاز چل رہا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "لنگر آدھی رات کو یا اس کے بعد اندھیرے میں ہم کو دیکھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ہم جہاز کے جتنا قریب پہنچ سکے پہنچنے کی کوشش کریں گے اور رسی کی مدد سے اوپر چڑھنے کی بھی کوشش کریں گے۔ اب ہم اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں اس کا انحصار آگے کے حالات پر ہوگا اور تقدیر کی یاوری پر۔ ہمارا پورا مشن ناکامی کی نذر بھی ہو سکتا ہے۔ اور ایسی صورت میں ابتدا الٹی بھی ہو سکتی ہے کہ تم جہاز پر قدم رکھو تو حالات یکسر مختلف ہوں۔ تمہارا استقبال ہتھکڑیاں کریں۔ میں بالکل واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم دونوں کو یہ کام کرنا ہے صرف اپنی ذمے داری پر اور خدا کے بھروسے پر۔ اس میں کامیابی اور ناکامی کے بعد امکانات برابر ہیں۔ چنانچہ تمہیں اختیار ہے کہ انکار کر دو۔"

"میں سرا اختیار سے دستبردار ہو چکا ہوں۔" غالب نے نازو کی طرف دیکھ کے کہا۔

"پھر میں انکار کیسے کر سکتی ہوں؟" نازو نے کہا۔

صرف بیس منٹ میں محسن نے غالب کے لیے ایک مصدقہ جعلی پاسپورٹ بنا دیا۔ اس پر غالب کی تصویر لگانے سے ویزا سٹیمپ لگانے تک کے سارے مرحلے اس لیے آسان ہو گئے کہ تمام اسباب ضرورت پہلے سے ہمارے پاس موجود تھا۔ اتنی ہی دیر میں نازو کے لیے میں نے دوسرا پاسپورٹ بنا دیا۔ اندراجات کے مطابق نازو اب الزبتھ ٹیلر تھی۔ جیسے غیر ارادی طور پر میں نے اس کا پورا نام الزبتھ ٹیلر لکھ دیا ویسے ہی محسن نے غالب کا پورا نام چارلس ڈارون لکھنے کی غلطی کی۔ یہ دو مشہور نام تھے اور ہمارے ذہن میں محفوظ تھے۔ ضرورت پڑی تو کسی شعوری کوشش کے بغیر یہی نام نوکِ قلم پر آ گئے۔

"یہ ٹھیک نہیں رہا۔" میں نے کہا۔

"نازو تو الزبتھ ٹیلر لگتی ہے۔" محسن بولا۔ "غلط کیا ہے؟"

"غالب تو چارلس ڈارون نہیں لگتا نا۔" میں نے کہا۔ "بہرحال خیر۔۔۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں۔ نام مشہور ہے تو کیا۔ کسی کا نام ہٹلر رجسٹری کرانا ممنوع تو نہیں۔" محسن بولا۔ "کوئی پوچھے گا کہ یہ کیا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ ماں باپ کی غلطی یا خواہش۔ نام ہم نے خود تو نہیں رکھا۔"

نازو اور غالب پوری تیاری کے ساتھ یوں نمودار ہوئے کہ ایک لمحے کے لیے تو میری نظر بھی ان پر ٹھہر گئی۔ صورت حال کی مناسبت نہیں تھی۔ اس دوران میں انہوں نے اپنے درمیان وہ ذہنی ہم آہنگی بھی پیدا کر لی جو اس مشن کی تکمیل کے لیے ضروری تھی۔ جذباتی طور پر وہ ایک جان دو قالب تھے۔ اس میں تو کسی کو شک نہ تھا مگر اب وہ غیر جذباتی انداز میں ایک دوسرے کے لیے ہمارے لیے اس مرحلے سے گزرنے کو تیار تھے جو طلبگار جان کا تھا اور تقاضائے آزمائش بھی کر رہا تھا۔

میں نے ان سے کچھ بھی نہیں کہا۔ یہ بھی نہیں کہ امانت میں رکھنا۔ اور ہمارے لیے زندہ لوٹ آنا۔ یہ بھی نہیں کہ جاؤ تمہیں خدا کو سونپا۔ یہ بھی نہیں کہ جا تو رہے ہو پھر لوٹو گے کب۔ اس جہاں میں یا عرصۂ محشر میں۔

سخت بوجھل جذباتی فضا میں لانچ انھیں لے کر روانہ ہوئی۔ کریم بلوچ نے خلاف معمول آج نشہ نہیں کیا تھا اور شاید اسی لیے آنکھیں کھولے گھٹنوں پر سر رکھے افق کو گھور رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ نیند میں ہوگا۔

"اسے سب بات تم خود ہی سمجھا دینا۔" میں نے غالب سے کہا۔ غالب نے سر ہلایا۔ "سمجھا دوں گا۔"

میں اور محسن نیچے اتر گئے اور لانچ ہماری نظروں سے دور ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ کریم بلوچ نے اسے بادبانی کشتی کی طرح چلاتے ہوئے اس سمندری جنگل سے نکالا جس میں بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ دس منٹ بعد لانچ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں اور محسن ساحل پر خاموش کھڑے رہ گئے۔

میرا دل کسی نامعلوم خوف کی خبر دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ چھٹی حس کی بات محسن سے کر دوں اور پوچھوں کہ اس کی چھٹی حس کیا کہتی ہے۔ مگر میں ڈر گیا کہ کہیں وہ میرے خوف کی بنیاد کی تائید نہ کر دے۔

جب کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونک کر پلٹا اور پھر اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔

سامنے حاجی عبداللہ کا وہی بے ہنگم وجود کسی دیو ہیکل مکڑی کی طرح پھیلا ہوا تھا اس کے چہرے پر وہی بامعنی قسم کی پُر خباثت مسکراہٹ بھی پھیلی ہوئی تھی جس کے ہزار مطلب نکالے جا سکتے تھے۔

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔" اس نے عادتاً قرأت کے انداز میں کہا اور اپنا دوسرا ہاتھ میری طرف مصافحے کے لیے آگے بڑھایا جس میں تسبیح اس نے تھام رکھی تھی۔

میں نے اس کا وہ ہاتھ بھی کندھے پر سے جھٹک دیا جو کسی بچھو کے ڈنک کی طرح تھا۔ بدذائقہ، کھردرا اور کرخت۔

"میں تمہیں جواب میں لعنت بھیجتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"خیر یہ اور اختلاف تو ایک فعلِ قبیح ہے میاں کہ تم پر ایک مسلمان کی سلامتی بھیجے اور تم اس پر لعنت بھیجو۔" اس نے اپنی ندامت کو نفرت کے پردے میں چھپا لیا۔

"اگر تم کو مسلمان سمجھتا تو ایسا ہرگز نہ کرتا۔" میں نے کہا۔

"اللہ تمہیں معاف کرے۔" اس نے خاصے افسوس کے ساتھ سر ہلایا۔

"اور اللہ تمہیں معاف نہ کرے۔" محسن نے کہا۔ "تمہارا انجام دنیا و آخرت میں خراب ہو۔ یہ ہمارے دلی جذبات ہیں۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہم منافق نہیں ہیں۔ اس لیے دل میں جو ہوتا ہے وہی کہتے ہیں۔ خیر۔۔۔ تم بتاؤ۔۔۔"

"ہم جانتے ہیں۔" وہ مسکرایا اور اس کی انگلیاں زیادہ تیزی سے موتی دانوں والی تسبیح پر حرکت کرنے لگیں۔ "ارے میاں بتانا تو تمہیں ہے بہت کچھ۔ پھر کیا خیال ہے چلیں؟"

"کہاں چلیں اور کیوں چلیں؟" محسن بولا۔

"دیکھو برخوردار، حقائق سے چشم پوشی ان حالات میں حماقت ہوگی۔" اس نے گاڑھے لہجے میں اردو کے الفاظ کو بھی عربی تلفظ کے ساتھ ادا کیا۔ "اب تم ماشاء اللہ ذہین ہو۔ اتنا تو سمجھتے ہو گے کہ ہم یہاں تک آ گئے دعوت دینے تو تمہیں ساتھ لے کر ہی جائیں گے۔ دوا علاج کے سوا ہماری لگاوٹ کو جس نے تمہیں اتنے عرصے بعد اس لباس اور حلیے میں شناخت کیا۔"

"یہ بدبختی ہے ہماری۔ تمہاری نظر کا کمال نہیں۔" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے دائیں جانب دس قدم کے فاصلے پر ایک سایہ سا دکھائی دیا جو دراز قد اور تاریکی کا ایک حصہ لگتا تھا۔ اس نے کیل کانٹے سے لیس کسی نگہبان کی طرح اس کا چہرہ بھی سامنے نہیں تھا لیکن اس کا انداز واضح طور پر تشویشناک تھا۔ جب میں اس کی طرف متوجہ تھا تو اس نے بغل میں سے کوئی گنا اور باریک سا گن جیسی پستول قسم کی چیز نکالی جس کی نال مجھے پیچھے ہی لگی تھی۔

شاید اس کے اوپر سائلنسر لگایا گیا تھا۔ اس ہلکے ہتھیار کی نے مجھے صرف ایک جھلک دکھائی تھی پھر اس کا ہاتھ بغل میں غائب ہو گیا۔

دوسرا شخص قدرے احمق تھا کہ نمایاں طور پر جارحانہ انداز اختیار کیے بائیں ہاتھ کی جانب کھڑا ہوا تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تو اس نے پیر پھیلا کے اپنے بازو سینے پر باندھے اور چند سیکنڈ مجھے گھورتا رہا۔ پھر اس نے موچھوں پر دو انگلیاں پھیریں کے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال لیا۔ ریوالور کو اس نے کاؤبوائے سٹائل میں اوپر اچھالا اور گھومنے ہوئے ہوا ہی میں اس طرح پکڑ لیا کہ نال کا رخ پھر میرے سینے کی جانب رہا۔ اپنی اس مہارت کے مظاہرے نے اسے بہت خوش کیا۔ اس نے یہ کمال دوسری بار دکھانے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ ریوالور نیچے گرا، اس نے فوراً اسے اٹھایا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہو میاں صاحبزادے۔" عبداللہ نے کھنکھار کے کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ آپ کی دعوت کو مسترد کر دیا جائے۔" میں نے کہا۔

"اس سے کیا ہوگا؟" وہ مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ انشاء اللہ۔" محسن نے اس کی نقل اتارنے کی کوشش کی۔ "تمہارا انتقال پُرملال۔ پھر سوئم، چہلم۔"

"مشکل ہے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ان کے لیے تو وہی ہوگا کہ مر گئے مردود۔ ان کی نہ فاتحہ نہ درود۔"

"چلو تم اپنا دل خوش رکھو۔" حاجی نے تسبیح گھماتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا۔ "لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ ہم یہاں تک صرف تمہارے لطیفوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ اچھا ہوگا اگر تم جلسی خوشی چلو۔ اور میاں سچی بات یہ ہے کہ ہم بھی تم کو خوب جان گئے ہیں۔ تم جوان اور جوشیلے آدمی ہو۔ ہمارا تم سے کوئی مقابلہ نہیں۔ چنانچہ مقابلے کے لیے ہم تم جیسے ہی دو چار آدمی لے آئے ہیں۔ وہ ہر طرف موجود ہیں۔"

"میں دیکھ رہا ہوں ان کو۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی اپنے اسلحے کی طاقت مجھے دکھا چکے ہیں۔ مگر حاجی کیا وہ تمہیں بچا سکتے ہیں؟ اگر میں ایک ہاتھ مار کے تمہاری یہ جنگلی سور جیسی گردن توڑ دوں تو وہ کیا کر لیں گے؟ میرے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیں گے؟ اس سے تمہاری نازک گردن کیا پھر جڑ جائے گی؟"

"تم کوشش کر کے دیکھو۔" حاجی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ مجھ سے خاصے محفوظ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا اور میری طرف سے انتہائی محتاط بھی تھا۔ ایک بار میں تھوڑا سا آگے بڑھا تھا تو وہ اتنا ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ میرے قریب آنے کا خطرہ مول لینے

www.paksociety.com

ہوئے ڈر رہا تھا۔ معلوم نہیں اب اس نے کیا اشارہ کیا کہ ایک گولی میرے پیروں سے چند انچ کے فاصلے پر فرش سے ٹکرائی۔ میں نے فائر کی کوئی آواز نہیں سنی تھی لیکن میں نے دائیں جانب دیکھا تو وہ شخص جو سامنے ہی تھا، اب روشنی میں آ کے مسکرا رہا تھا۔ جہاں گولی فرش سے ٹکرائی تھی وہاں سے سمنٹ اکھڑ گیا تھا اور ایک ننھا سا گڑھا نمودار ہو گیا تھا۔

"دیکھو میاں برخوردار۔ ہمارے آنے کا مقصد یاد رکھو تو بہتر نہیں ہے کہ ہم کچھ بات کرنا چاہتے ہیں جس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے۔"

"ہمارے مفادات مشترک کیسے ہو سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہو سکتے ہیں۔ مثلاً زندہ رہنا ہم دونوں کے مفاد میں ہے۔" حاجی عبداللہ نے کہا۔ "تم چلو تو سہی۔ ایسا نہ ہو کہ وقت گزر جائے۔"

"وقت تو گزر ہی رہا ہے۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ دراصل میں گرد و پیش کا اور حالات کا جائزہ لے رہا تھا اور کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ بظاہر عبداللہ کو بد بھاری تھی اتفاق اس نے میرے لیے ہر طرف اپنا جال پھیلا دیا تھا۔ اس کا براہ راست ہم تک آ جانا ہی یہ ثابت کرتا تھا کہ اسے کوئی ڈر نہیں اور کسی کی ذات سے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ نہ جانے وہ کب سے ہمارے تعاقب میں تھا اور ہمیں محصور کرنے کے لیے مناسب وقت کے انتظار میں تھا۔

حاجی نے میری بات پر تفہیم میں سر ہلایا۔ "اسے بھائی تمہارا انتظار کر رہے ہیں کوئی۔" وہ مسخر انداز میں ہنسا۔

میں چونکا۔ "کون انتظار کر رہا ہے؟"

"مجھ سے یہ سوال کیوں کرتے ہو۔ تمہارے دل کو جواب معلوم ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو تم یوں نہ چونکتے۔" وہ بولا۔

"حاجی! کیا تم رابعہ کے نامہ بر بن کے آئے ہو؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "تم بچھڑے ہوئے دو محبت کرنے والوں کو ملانے کا نیک کام کرنا چاہتے ہو۔ جزاک اللہ۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تم یقین نہیں کرو گے۔"

"تم اتنا احمق تو نہیں سمجھتے مجھے۔ تم جانتے ہو کہ میری جگہ دنیا کا سب سے بڑا گدھا بھی ہوتا تو تمہارے ایسے مذاق..."

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی جیسے ایک آتشیں سوئی میری گردن میں پیوست ہو گئی۔ اس کی چبھن بچھو کے ڈنک سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ بے اختیار میرا ہاتھ اپنی گردن کی طرف بڑھا مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میرے شانوں میں دم نہ رہا۔ میرا اوپر کا دھڑ چند سیکنڈ میں ساکت ہو گیا تھا۔ ہاتھ اوپر اٹھا اور بے جان ہو کے گرا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے لیے سانس لینا بھی ممکن نہیں رہا۔ بے اختیار میرا منہ کھل گیا اور میری کوشش کے باوجود بند نہ ہوا۔

میرے جسم کا اوپری حصہ یکلخت بے وجود ہو گیا تھا۔

یہ بہت عجیب کیفیت تھی۔ میں سوچ سکتا تھا اور سمجھ سکتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے لیکن جو خیال میرے دماغ میں آ رہا تھا وہ بہت خوفناک تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرا جسم اوپر سے نچلی طرف تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ میرا چہرہ اور دھڑ غائب ہو گئے ہیں اور صرف میری آنکھیں باقی ہیں۔ جیسے کوئی برف کا آدمی اوپر سے پگھلنے لگے ایسے میں اوپر سے نیچے کی طرف غائب ہو رہا تھا۔

آخری وقت میں میری آنکھوں نے دائیں جانب سے موصول ہونے والے حکم کی تعمیل میں حرکت کی کوشش کی مگر میں انتہائی بے بسی سے لڑکھڑا کے آگے بڑھا اور گر گیا۔ میرا سر پختہ فرش سے ٹکرایا لیکن چوٹ یا درد کا احساس مفقود رہا۔ میری آنکھیں ابھی تک کھلی تھیں۔ اپنے قریب ہی میں نے محسن کو دراز پایا۔ اس کی گردن میں ایک تیر پیوست تھا۔

یہ بہت چھوٹا سا تیر تھا۔ مشکل سے آٹھ انچ لمبا اور سوئی کی طرح پتلا، چمکتا ہوا اور نازک۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کیفیت میں بھی جب اپنی مرضی سے میں پلک تک نہیں جھپک سکتا تھا، میرے دماغ کی سوچنے، حالات کا تجزیہ کرنے اور سمجھنے کی صلاحیت برقرار تھی۔ یقیناً یہ اسی تیر کا اثر تھا کہ میرا جسم بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ اسی تیر سے محسن کو بھی شکار کیا گیا تھا۔ تیر کی نوک پر کوئی سریع الاثر زہر تھا جس نے جسم کی حرکت پذیری کو ختم کر دیا تھا۔ باقی دیگر اس سے متاثرہ بے کار ہو گئی تھیں اور اگرچہ دماغ اب بھی حکم دینے کی پوزیشن میں تھا لیکن تعمیل کرنے والے اعضا مفلوج ہو گئے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کار کے پہیوں کو حرکت دینے والی شافٹ ٹوٹ جائے تو انجن کتنا بھی زور لگائے مگر پہیے متحرک نہ ہوں اور گاڑی رکی رہے۔

میرے ذہن میں یہ خواہش بھی موجود تھی کہ میں محسن کی گردن میں پیوست تیر کو نکال دوں تو محسن بھی اس شہزادی کی طرح جاگ اٹھے جسے الف لیلوی داستانوں کے جادوگر نے طلسماتی عمل سے کوئی کانٹا چبھو کر سلا دیا تھا اور پھر کوئی شہزادہ ادھر آ نکلا تو اس نے کانٹا کھینچ لیا اور شہزادی جاگ اٹھی۔ یہ ایک فضول سا خیال تھا مگر خیال کو روکا تو نہیں جا سکتا۔ ایسا ہی ایک کانٹا میرے اپنے وجود میں بھی پیوست تھا مگر میں اسے نکالنے سے قاصر تھا۔

میں نے ہر طرف سے لوگوں کو آتے دیکھا۔ وہ میرے ہمدرد اور مددگار نہیں تھے۔ وہ سب انہی کے لوگ تھے۔ ان میں سے شکاری بھی تھے جنہوں نے دیکھ لیے تھے مگر باقی میرے گرد و نواح میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ جال وہ بہت دیر سے پھیلائے بیٹھے ہوں گے مگر موقع ملتے ہی اور اشارہ پاتے ہی انہوں نے ہمیں ایسے ہی شکار کر لیا جیسے جنگل میں خطرناک جانوروں کو گولی مار کے ہلاک کیے بغیر پکڑا جاتا ہے۔

چند غیر متعلقہ افراد نے بھی قریب آ کر جاننا چاہا کہ دو اچھے خاصے صحت مند جوان آدمی کس طرح ایک ساتھ بے ہوش ہو گئے یا اب دیکھنا یہ تھا کہ بیک وقت دو افراد پر مرگی یا دل کا دورہ پڑنے یا دونوں پر آسیب کا اثر ہو جائے۔ ان غیر متعلقہ افراد کو دور ہی ہٹا کر دیا گیا۔

"پھر بھی ہوا کیا؟" کسی نے بلند آواز میں کہا۔

"کہا نا کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔" کوئی غرا کے بولا۔

"دونوں بیٹھے بیٹھے کھڑے ہو کر لیٹ گئے۔ تم کہتے ہو کچھ بھی نہیں ہوا" تو وہ شخص ایسے قائل ہونے والا نہیں تھا۔

"او بھائی! دونوں جھک کے کچھ اٹھا رہے تھے۔ سر ٹکرا گئے آپس میں۔ معمولی سی چوٹ کا اثر ہے۔" کوئی اور بولا۔ "ہم بھی ان کے ساتھی ہیں۔"

"یہ تمہارے ساتھ ہیں؟"

"ہاں۔ ہم اسپتال لے جا رہے ہیں۔ چلو بھئی راستہ تو چھوڑو، لیٹ ہو جائیں گے۔"

میں سب کچھ سن رہا تھا اور دیکھ بھی رہا تھا لیکن نظر میں رکھ سکتا تھا اور نہ منظر بدل سکتا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ کسی نے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور پلکوں کو بند کر دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے نزع کے کرب سے گزر جانے والے کی بے جان آنکھوں کو بند کیا جاتا ہے۔ پھر میں تھا اور آنکھیں کھولنا میرے اختیار میں نہ تھا۔

ایک شخص نے مجھے کندھے پر اٹھا لیا اور میں سوچتا رہا جیسے بے ہوش ہوں حالانکہ میں پوری طرح ہوش میں تھا۔ ہوش اصل ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے جس میں آدمی گرد و پیش سے باخبر رہتا ہے تو میرے حواس پوری طرح کام کر رہے تھے۔ میں محض ایک معذور جیسا بن گیا تھا مگر کسی اندھے معذور کی طرح بے خبر نہیں تھا۔

وہ چند منٹ کا وقفہ تھا جس میں مجھے سب سے پہلے کسی گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ پھر میرے اوپر ہی محسن کو پھینک دیا گیا۔ راستے میں بہت سے لوگوں نے سوال کیا کہ ہمیں کیا ہوا ہے اور ان کو مختصر سا جواب دیا گیا کہ ہمیں دورہ پڑ گیا ہے۔ جواب دینے والوں کو ہماری طرف سے فکر نہیں تھی، نہ خطرہ تھا کہ ہم ان کی تردید کر سکتے ہیں یا ہنگامہ برپا کر سکتے ہیں۔

وہ کوئی خاصی بڑی گاڑی تھی جس کی پچھلی سیٹ پر ہم دونوں اوپر تلے پڑے ہوئے تھے۔ ایک تو میں سوار تھا، میرے اوپر محسن کا وزن مجھے بے بس کر رہا تھا اور میرے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا مگر مجھ میں بس نہ تھا کہ میں اسے اپنے اوپر سے ہٹا سکتا۔

جب گاڑی چلی تو قدرت نے میری مدد کی۔ محسن کا جسم پہلے جھٹکے سے لڑھک گیا اور شاید آگے پیچھے کی سیٹوں کے درمیان گاڑی کے فرش پر منتقل ہو گیا۔ کار میں کم سے کم تین آدمی تھے۔ ان میں سے ایک ڈرائیور تھا۔ ان میں حاجی عبداللہ شامل نہیں تھا۔ اس کی آواز کو میں پہچانتا تھا۔

جب گاڑی روانہ ہوئی تو اس کے انجن کی آواز نے خود بتایا کہ وہ ماڈرن تھی۔ فاکس ویگن کی مخصوص آواز سب سے پچھلی سیٹ پر واضح سنائی دیتی تھی کیونکہ اس کے پیچھے پندرہ سو سی سی کا طاقتور انجن تھا جو گاڑی کو آگے دھکیلتا تھا۔ یہ تین سیٹوں والی گاڑی تھی اور اس اعتبار سے محفوظ بھی تھی کہ دونوں سلائیڈ کرنے والے دروازے ہم سے کافی آگے تھے۔ درمیان میں سیٹوں کی دو قطاریں تھیں جن پر شاید وہ لوگ پہرے داروں کی طرح پھیلے بیٹھے ہوں گے کہ بفرض محال ہم ہوش میں آ کے فرار کی کوشش کریں تو ہم الٹے پاؤں پکڑے جائیں اور گرفتار ہم ہوئے والی پوزیشن ہو۔

اچانک ایک دھماکا ہوا۔ میں نے شیشہ ٹوٹ کے بکھرنے کی آواز سنی۔

"ٹکرا گئے... یا اندھا ہے۔" ایک شخص نے چیخ کر ڈرائیور کو گالی دی۔ "اندھا ہو گیا ہے...؟"

"اس کھوتے کے بچے نے کام خراب کر دیا ہے۔" دوسرا کچھ پریشان ہو کے بولا۔

"میں اس کو چھوڑوں گا نہیں۔" پہلے والے نے پھر گالی دی۔ "پہلے ذرا ان بندوں سے نمٹ لیں۔"

"تم ان سے نمٹو۔ میں اندر جا رہا ہوں۔"

"اندر مت آنے دینا کسی کو۔" پہلے نے کہا۔ "کوئی زبردستی تو سیل دے تو اس کی..." وہ اپنی مادری زبان میں ہدایات دے کر اتر گیا۔

باہر خاصا شور مچا ہوا تھا۔ یقیناً گاڑی کسی دوسری گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔ اس میں کون قصور وار تھا، ایک جذباتی اور احمقانہ دعویٰ تھا کہ کوئی حادثہ کسی ایک فریق کی غلطی سے نہیں ہوتا۔ بعض اوقات غلطی سو فیصد دوسرے فریق کی ہوتی ہے۔ انتہائی محتاط اور ماہر ڈرائیور بھی اس اناڑی اور عجم جدید روڈ سینس کے سارے اصولوں کی پرواہ نہ کرنے والے کسی ڈرائیور سے خود کو کیسے بچا سکتا ہے جو نشے میں ہو یا سگنل توڑ کے نکلنے کو بہادری سمجھتا ہو یا ون وے ٹریفک کے خلاف گاڑی چلا کر نمودار ہو جائے۔

"کون ہے گاڑی کا مالک؟" کسی شخص نے چلا کے کہا۔ "نیچے آؤ۔ نواب کی اولاد۔"

"جو کہنا ہے ڈرائیور سے کہو۔" دوسرے شخص نے ایک منطقی جواب دیا۔ "گاڑی میں نہیں چلا رہا تھا۔"

مگر وہاں منطق کا نہیں، آتش گیر جذبات کا دخل تھا۔ "اس سے پوچھیں جو کچھ پوچھنا ہو، نہیں؟ گاڑی سے تو پوچھ لیں!"

"یہ ٹھیک ہے۔ مگر تو گاڑی نے ماری ہے۔" یہ بات کسی

www.paksociety.com

تماشائی نے مزہ لیتے ہوئے کہی۔

"تم پیچھے آؤ۔ دیکھو کیا حشر ہوا ہے میری کار کا۔" وہ شخص مزید مشتعل ہو کے بولا۔

"اندر مت آؤ۔" دوسرا شخص گرم ہو کے بولا۔ "جو کہنا ہے باہر سے کہو۔ جس کی گاڑی ہے وہ باہر موجود ہے۔"

باہر بہت سے لوگوں کے درمیان اس شخص کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی جو پہلے گاڑی کے اندر موجود تھا۔ غالباً وہ ایک سائیڈ سے اترا اور دوسری طرف سے کوئی اور اگلی نشست پر اندر تھا۔

اب ایک زبردست جنگ شروع ہوئی۔ گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ کار میں کم سے کم چار افراد تھے۔ ان میں سے ایک گاڑی چلا رہا تھا اور حادثہ اسی کی غلطی سے ہوا تھا لیکن وہ دھونس دھاندلی اور جھوٹ سے گڑگئے کو ہمدرد یا الزام ٹھہرانے پر بضد تھے۔ جڑی بنے مضبوط باڈی والی مائکرو بس کا کچھ نہیں بگڑا تھا کیونکہ اس کے سامنے والے حصے میں کچھ بھی نہیں تھا مگر دوسری ایک جاپانی کار تھی۔ اس کا بونٹ پچک گیا تھا۔ مڈگارڈ ٹوٹ گئے تھے۔ دونوں طرف کی لائٹس چور چور ہو گئی تھیں۔ اسٹیئرنگ وہیل کی کی۔ "قیمتی" نیز ٹیڑھی ہوئی تھی اور انجن تو محفوظ رہا تھا مگر بیٹری اکھڑ کے بیٹھا ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے۔ اس حالت میں گاڑی کو چلا کے نہیں ٹو کر کے لے جایا جا سکتا تھا۔ نقصان کا تخمینہ بہت زیادہ تھا اور کار والے بااثر لوگ تھے۔ ان میں سے ایک کسی ڈی ایس پی کا بھائی تھا۔ وہی گاڑی چلا رہا تھا اور زخمی بھی ہوا تھا چنانچہ سب سے زیادہ بدمعاشی بھی وہی دکھا رہا تھا۔ وہ اعلان کر چکا تھا کہ مائکرو بس کا ڈرائیور اور گاڑی دونوں تھانے جائیں گے اور جب تک مالک کار کو اصل حالت میں لانے کے اخراجات کی رقم پیشگی ادا نہیں کرے گا وہ سب بند رہیں گے۔

یہ صورت حال غیر متوقع اور ان کے لیے انتہائی پریشان کن ثابت ہونے لگی تھی۔ غلطی ان کی تھی کہ وہ اکڑ گئے اور بدمعاشی میں مار پیٹ پر اتر آئے۔ نتیجہ یہ کہ وہ خاصے پٹے۔ مجمع کو انھوں نے غلط طرز عمل سے اپنے خلاف کر لیا تھا۔

گاڑی سے اترنے والے پہلے شخص نے دیکھا کہ صورت حال ان کے خلاف ہونے لگی ہے تو اس نے ریوالور نکال لیا اور ایک ایک کو گولی مار دینے کی دھمکی دی۔

"بدمعاشی دکھاتے ہو۔" وہ چیخ کے بولا۔ "جب میں نے کہا ہے کہ سب نقصان پورا کردوں گا۔"

"سب ایسا ہی کہتے ہیں۔" مخالف نے کہا۔ "مقصد تو ہوتا ہے جائے واردات سے فرار۔"

"ہاں۔ تاکہ بعد میں سب جھٹلا دیا جائے۔" دوسرے مخالف نے کہا۔ "ہم کہاں ثابت کرتے پھریں گے۔"

"اور یہ سب گواہ تو ابھی ادھر ادھر ہو جائیں گے۔" تیسرے مخالف نے کہا۔ "بعد میں کون آئے گا؟"

"سیدھی بات یہ ہے کہ فیصلہ اسی جگہ ہو گا۔"

"یہاں کیسے فیصلہ ہو گا؟" پہلی گاڑی چلانے والا بولا۔

"ہو جائے گا اگر تم چاہو گے۔" کار ڈرائیور بولا۔ "... ہوٹل ٹیکسی اور ڈینٹر پینٹر کو بھی۔"

"اس وقت کون آئے گا؟"

"تم فکر مت کرو۔ میں لاؤں گا مگر جو وہ کہے گا وہ تم کو دینا پڑے گا نقد۔ ایک پیسہ کم نہیں لوں گا میں۔" کار والے نے کہا۔

"وہ تمھارا آدمی ہو گا۔ وہ کچھ بھی بتائے گا۔"

"چار بتائے یا دس۔ ادائیگی کیے بغیر تم جا نہیں سکتے۔"

"میں نہیں دوں گا تو کیا کر لو گے تم؟"

"میں... میں یہ کروں گا پہلے تو۔" کار والے نے ناپاک کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ "پھر تو میری..."

اس کے بعد مار پیٹ ہوئی جو لوگوں کے بیچ میں آ جانے سے فوراً ختم بھی ہو گئی۔

"سب کو بند کرا دوں گا۔" کار والا چیخ چیخ کر کہا لپیٹتے ہوئے بولا۔ "ڈی ایس پی اسلامات کا بھائی ہوں میں۔"

"ابے جا۔ ڈی ایس پی میرے باپ کے سامنے ہیں..."

"پتا چلے گا بیٹا۔ جب گاڑی کے ساتھ تم بھی تھانے بند ہو جاؤ گے۔" کار کا مالک چیخ کر بولا۔ "ریوالور اندر والے کو دو، پیچھے۔ ان کی تو..."

"میں کہتا ہوں رک جاؤ... اور گاڑی پیچھے ہٹاؤ سامنے سے۔ پہلے گھیرو ان کو خطرناک لیجے میں۔ پیچھے ہٹو سب ورنہ میں گولی مار دوں گا جو بھی قریب ہے۔"

"ریوالور۔ ریوالور نکالتا ہے گولی مارنے کی دھمکی دیتا ہے۔" ڈی ایس پی کا بھائی آتش فشاں کی طرح گرجنے لگا۔ "چلا گولی اگر ہمت ہے تو پہلے مجھے مار۔ پھر ان سب کو۔ کس کس کو شوٹ کرے گا اور پھر جائے گا کہاں بچ کے؟"

ریوالور نکالنا ایک فاش غلطی ثابت ہوا۔ کسی بھی شخص کے لیے جس کے گرد ایک مجمع حصار بنائے کھڑا ہو یہ ناممکن ہے کہ وہ راستہ بنا لے۔ ان لوگوں کے لیے اضافی مسئلہ گاڑی کو نکالنے کا حالات کو تابو سے باہر ہوتا دیکھ کے وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا۔ اس میں پریشانی سے زیادہ خوف کا دخل تھا۔ حاجی عبداللہ نے انھیں قابل اعتماد سمجھتے ہوئے دو زندہ لاشوں کو لانے کی تحویل میں دے دیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے اور محسن کو اس حالت میں کہیں بھی لے جانے میں نہ کوئی خطرہ تھا اور نہ کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑتا۔ نہ صرف وہ نئے تھے بلکہ تجربہ کار بھی مگر تقدیر کے شکار کی راہ میں نہیں آتے تھے۔ ان کے لیے راستے میں جال پھیلا رکھا تھا۔ ہوشیاری سے انھیں تو بچ کے نکل سکتے تھے۔ اگلے صرف نقصانات ہی پورے کرنے تھے جو چار پانچ ہزار سے زیادہ نہ ہوتے مگر خواہ مخواہ کی بدمعاشی میں انھوں نے معاملے کو الجھا لیا اور خود بھی اس میں الجھ گئے۔ کار والوں کی صورت حال ان کی مزید بدقسمتی کہ فریق ثانی کمزور نہیں تھا۔ کسی ڈی ایس پی کا بھائی ہونا تو گویا ہر قسم کی بدمعاشی کا اجازت نامہ رکھنے کے مترادف تھا۔

تاہم یہ سب کچھ جو ہو رہا تھا میری دلی خواہش کے عین مطابق تھا اور میری دعاؤں کا اثر تھا یا محسن کی دعاؤں کا لیکن اب بند اور تاریک سرنگ کے آخری کنارے سے پہلی امید کی روشنی ضرور نظر آنے لگی تھی۔ اگر ہم اس بے حسی اور بے چارگی کی زنجیر سے نجات پا سکتے تو پھر عقل و ہوش کے ساتھ آگے پیش آنے والے مسائل سے نمٹنے کی امید ہو سکتی ہے۔

اچانک گاڑی کے قریب ہنگامہ ہوا۔ یہ شاید گاڑی کو قبضہ کرنے والوں اور مزاحمت کرنے والوں کے درمیان دست بدست جنگ کا نتیجہ تھا کہ خاص مرچ کا تیوں کے ساتھ ہاتھا پائی کا دوسرا راؤنڈ ہوا۔ گاڑی کا دروازہ دو بار کھولا اور بند کیا گیا اور ہم جانے والوں اس سے ٹکرایا۔ بالآخر ایک فائر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی چیخ و پکار رک گئی۔ معلوم نہیں گاڑی کے اندر سے ہوائی فائر کیا گیا تھا یا کسی پر براہ راست گولی چلائی گئی تھی۔ پکڑو۔ مارو کے شور میں کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ غالب کون ہے اور مغلوب کون۔ عام طور پر ہوائی فائر بھی مجمع کو منتشر کر دیتا ہے اور صرف تماشا دیکھنے والے تو ہوائیاں بغل میں دبا کے یا دیکھ چھوڑ کے بھاگ جاتے ہیں مگر یہ لوگ جو کار کے مالک اور مسافر تھے ہر قیمت پر اپنی غلطی کی سزا دوسرے کو دینے کا اختیار رکھتے تھے اور ایک ڈی ایس پی کی پشت پناہی نے ان کو دلاوری تھما دی تھی جس کے زور پر وہ کسی بھی ایمبولینس والے کے ساتھ تھانے لے جا سکتے تھے۔ آگے تھانہ تو ان کی سلطنت تھا۔

یہ سب مشکل سے دس منٹ کا ایک ڈرامہ تھا جس نے پورا کر دیا تھا جس کا انجام ہمارے دشمنوں کے حق میں برا ہوا۔ وہ نہتے کر دیے گئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ ہر چند یہ گرفتاری بذریعہ پولیس باضابطہ نہ ہوئی تھی لیکن ان کا مرحلہ گرفتار ہونے تک ضابطہ فوجداری اور جرم کا ارتکاب کو بہن تھا۔

جو لوگ اندر آئے ان میں سے کسی نے ہمیں بھی دیکھا۔

"اللہ... یہ دو زخمی تو پیچھے پڑے ہیں۔"

"ان کے ساتھ تھی...؟"

"اور کون ہوں گے۔ سارے کیسے مرنے سے لٹے میں۔ مت لیٹے ہوئے ہیں۔" کوئی ہمارے بہت قریب آ کے بولا۔

"یہ نشے میں تو نہیں لگتے۔" کسی عقلمند نے سوچ کے کہا۔

"پھر کیا مر چکے ہیں۔" شیخ ظریف بولا۔

"نبض دیکھو۔ آنکھیں کھول کے دیکھو۔" عقلمند نے کہا۔ "شاید ہوش میں دیکھتا ہوں۔"

ایک ہاتھ میرے ماتھے پر آیا اور انگوٹھے نے میری پلکوں کو اٹھایا۔ ایک آنکھ سے میں نے اپنے مقابل کسی دبلے پتلے گھنی مونچھوں اور عینک والے شخص کو دیکھا۔ میری ایک آنکھ کھلی دیکھ کر اس نے قدرے حیران ہو کے میری دوسری آنکھ کھولی۔ اب میں اس کے علاوہ دوسرے تین افراد کو بھی دیکھ سکتا جو سیٹ کے اوپر جھکے ہوئے مجھ پر غور کر رہے تھے۔ ان کے بال پریشان تھے اور کپڑے پھٹے ہوئے۔ ان کے چہروں پر خراشوں نیز نیل کے نشان بھی تھے۔ یہ جنگ و جدل کا شاخسانہ تھا۔

"یہ نہ نشے میں ہے۔ نہ بے ہوش۔" عینک والے نے میری نبض تھام لی۔

"پھر کیا ہے یار؟" ایک موٹے تازے شخص نے کہا۔ "ڈاکٹر تم ہو یا ہم ہیں؟"

"ان کو فوراً اسپتال لے جانا ضروری ہے۔" ڈاکٹر نے محسن کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "بڑی عجیب سی بات ہے..."

"کیا عجیب بات ہے...؟"

"غالباً انھیں... زہر دیا گیا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"زہر! کون سا زہر؟" بیک وقت دو افراد نے کہا۔ ڈاکٹر نے انھیں شرمندہ کرنے والی نظر سے دیکھا۔ "یہ میں ابھی کیسے بتا دوں؟ صرف صورت دیکھ کر ہمارے ٹیسٹ ہوں گے۔ پھر پتا چلے گا۔"

"یہ تو مر جائیں گے۔" تیسرے نے اظہار خیال کیا۔

"نہیں۔ مریں گے نہیں۔" ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی خطرناک زہر نہیں لگتا مجھے۔ نبض نارمل ہے۔ بس یہ لوگ سن پڑ گئے جیسے انستھیزیا دیا ہوا ہو۔"

"چلو ان سے تم نمٹو۔ ہم انھیں لے جاتے ہیں۔ کوئی لمبا چکر معلوم ہوتا ہے یہ۔" ایک شخص نے باہر کا رخ کیا۔

"وارداتی قسم کے لوگ ہیں۔" دوسرے نے اتفاق میں سر ہلایا۔ "تھانے میں سب پتا چل جائے گا۔"

"میں یہی گاڑی اسپتال لے جاؤں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"ہاں ہاں۔ لے جاؤ۔ تم سول اسپتال ہی جاؤ گے نا۔ پولیس ہو گی وہاں۔" پہلے والے نے کہا۔ "ان کو بتا دینا سب۔ پھر وہ جانیں۔"

www.paksociety.com

www.paksociety.com

یہ بڑی عجیب صورت حال ہوگئی تھی۔ آسمان سے گر کے کھجور میں اٹکنا اسی کو کہتے ہیں۔ پھر بھی کھجور میں اٹکنا بہتر تھا۔ آسمان سے سیدھے زمین پر گرتے تو بچنے کی امید نہ ہوتی۔ کھجور سے تو کسی نہ کسی صورت اترا جاسکتا تھا۔ اگر تقدیر مداخلت نہ کرتی تو حاجی کی تدبیر کامیاب ہوتی اور ہمارا انجام نہ جانے کیا ہوتا۔ انجام اب بھی غیر یقینی تھا۔ پولیس کو خود ہماری جستجو تھی لیکن ان کے ساتھ معاملہ طے ہو جاتا ہے۔ وہ اتنے چالاک اور عیار بھی نہیں ہوتے جتنا حاجی تھا۔ انھیں دھوکا بھی دیا جاسکتا تھا اور پیسہ بھی۔ اسپتال میں معمولی حیثیت کے پولیس والے بیگار کاٹتے ہیں اور مجرموں کی نگرانی کے سوا کچھ نہیں کرسکتے۔ تفتیش کرنے والے بعد میں آتے ہیں، جب مجرم ٹھیک ہو جاتے ہیں اور وہی اصل لین دین کرتے ہیں۔ معاملہ تھوڑی بہت رد و بدل دینے کا معاوضہ وصول کرلیتے ہیں۔

لیکن زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ حاجی عبداللہ سول اسپتال پہنچے اور ہمارا پتا چلا لے۔ جیسے ہی اس کو حادثے کا علم ہو جاتا لازمی تھا۔ اس نے مجھے اور محسن کو دو جانبازوں کے سپرد کردیا تھا اور خود مطمئن ہوکے چلا گیا تھا۔ اس نے آگے دلاور یا سراج کو بھی بتا دیا ہوگا کہ دونوں جانباز پکڑے گئے اور اب لاپتا ہیں۔ وہ انتظار کریں گے مگر کتنی دیر؟ بالآخر وہ تشویش میں مبتلا ہوں گے اور خود جائیں گے یا کسی کو خبر لینے کے لیے روانہ کریں گے۔ ان کے جانباز تو تھانے میں مل ہی جائیں گے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم آر ایس کے مجاہد کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ پھر ان کا کام آسان ہو جائے گا۔ اسپتال کے اندر تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ نچلے درجے کے ملازمین سے لے کر ڈاکٹروں کی سطح تک سو فیصد فرشتے نہیں ہوتے۔ یہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کو ضرور معلوم ہوگا کہ اس اسپتال میں کس کا ضمیر پہلے بھی خریدا گیا تھا اور اب کون ہے جو پیسوں کے روپ میں قاتل بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر یا نرس کے بھیس میں کوئی بھی کسی وارڈ میں جائے اور اعتماد کے ساتھ کسی بھی مریض کو ایک انجکشن لگا دے جو مریض لب نہ ہلا سکتے ہوں ان سے تو ڈرنا ہی فضول بات ہے —— بعد میں تفتیش ہوتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا اور کیوں ہوا؟

گرنگا ڈرائیور اور اس کے دونوں ساتھی نے جانے چلے گئے تھے۔ میرے کانوں میں اب ان کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ شاید لوگ بھی تماشا ختم ہو جانے کے بعد منتشر ہوگئے تھے۔ معلوم نہیں وہ کیا جگہ تھی جہاں آدھی رات کے بعد بھی حادثہ ہوتے ہی مجمع لگ گیا تھا۔ گاڑی ایک دفعہ پھر اسٹارٹ ہوئی۔ ہم بہ دستور اپنی جگہ پڑے ہوئے تھے۔ فرق صرف یہ پڑا تھا کہ اب ہماری منزل بدل گئی تھی اور ہماری تقدیر نے ہمارے ساتھ یہ سنگین مذاق کیا تھا کہ ہمیں نا امیدی

کے [illegible] ہم بھاگ نہیں جا سکتے تھے تو اب بھی میں اور یہ نہیں جانتے تھے کہ [illegible] جگہ بدل گئی تھی۔

سول اسپتال میں مجھے اور محسن کو الگ الگ کمروں میں رکھا گیا۔ اس کے لیے ڈاکٹر کو خاصی پریشانی سے گزرنا پڑا۔ پہلے تو پولیس والا اس کی بات سمجھنے سے قاصر ہے۔

"آپ کہتے ہیں حادثہ ہوا تھا، لیکن یہ بندہ تو زخمی بالکل نہیں ہے اور خیر سے آپ بھی بھلے چنگے لگتے ہو۔" ایک بیزار نظر آنے والے اور بیزار کرنے والے انسپکٹر نے بیزاری سے کہا۔

"ہاں حادثہ تو ہوا تھا مگر اب یہ ضروری نہیں کہ آدمی کا [illegible]"

"اچھا اچھا... اندرونی چوٹ ہے۔ دونوں کے سر میں؟"

"او نہیں بابا۔ اندر باہر کی چوٹ نہیں ہے۔"

"پھر یہ کیا ہے؟ بندے تو لگتا ہے فوت ہوچکے ہیں۔ یہ حرکت نہیں کر رہے ہیں؟" انسپکٹر نے مجھے غور سے دیکھا۔

"انسپکٹر! یہ... ایک زہر کا اثر ہے۔"

"زہر!" انسپکٹر نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "اسے زہر دیا ہے کس نے؟ یہ بات تم کہتے ہو کہ میں ڈاکٹر ہوں۔ مجھے تو تم پاگل لگتے ہو۔ یہ کیسی ٹکر ہے... یہ حادثہ ہوا ہے تو بھی اقدام قتل۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ یہ تمھاری سمجھ میں آنے والا کیس نہیں ہے کیونکہ تم قانون [illegible]" ڈاکٹر گرم ہو کے بولا۔ "میں ان کو ایمرجنسی شفٹ کر رہا ہوں۔ تم کو اپنا آدمی بٹھانا ہے وہاں تو بٹھا دو۔"

"او میاں! تمھارا جہاں دل چاہے لے جاؤ۔ ہم تو پیسے فیس کے درج کرنے کے لیے۔ اگر بچتا ہے تو بولو ورنہ جان چھوڑو ہمارا۔ حادثہ ہے تو خودکشی اور ورنہ اقدام قتل تو پھر ہمیں کیا اپنے گھر لے جاؤ تم۔" انسپکٹر نے تڑاق سے بولتے ہوئے کہا۔

"تم انھیں لے کے چلو ایمرجنسی میں۔" ڈاکٹر نے اسٹریچر کے ساتھ منتظر کھڑے ہوئے نرسنگ اسٹاف سے کہا۔

"کیا یہ ایمرجنسی کا کیس ہے؟" میڈیکل آفیسر نے کہا۔

"میرا تو یہی خیال ہے۔" ہمیں لانے والے نے طنز سے کہا۔ "تم خود بھی دیکھ سکتے ہو۔"

"میں سمجھتا ہوں ان کے فوری طور پر مر جانے کا کوئی امکان نہیں۔" میڈیکل آفیسر نے کہا۔ "جنرل میڈیکل وارڈ میں رکھا جاسکتا ہے۔"

"یہ ایک دلچسپ کیس ہے۔" ہمارے ساتھ آنے والا بولا۔ "اور خصوصی توجہ کا مستحق..."

ان کے درمیان ایک خالص علمی نوعیت کی بحث شروع ہوئی جس کا کچھ حصہ میری سمجھ میں بھی آیا۔ میڈیکل آفیسر کا خیال تھا

کہ کوئی نئی قسم کا [illegible] جس کا اثر [illegible] ہے۔ ساتھ آنے والا اسے قائل کرنے میں ناکام رہا کہ یہ کسی زہریلی زہر کا اثر ہے۔

"اوکے۔ اگر تم کو دلچسپی نہیں..."

"دلچسپی!" میڈیکل آفیسر نے تلخی سے کہا۔ "یہاں کون الو کا پٹھا دلچسپی لینے کے لیے بیٹھا ہے۔ مجھے کون سی ریسرچ اور پی ایچ ڈی کرنی ہے۔ یہ تو نوکری ہے جس کی تنخواہ ملتی ہے۔ اب رات بھر ڈیوٹی دینی پڑتی ہے تو نوکری بھی بیگار بن جاتی ہے۔ تمھارا اپنا اسپتال ہے۔"

"تو میں انھیں لے جاؤں۔ تمھیں کوئی اعتراض نہیں؟"

"مجھے اعتراض کیوں ہونے لگا۔" میڈیکل آفیسر نے کہا۔ "یہاں ایسے کیس بہت آتے ہیں۔ اتفاق ہے کہ تم سے اتنی بات کرنے کی فرصت مل گئی ورنہ ایک کے پیچھے دو آتے ہیں۔ ایک کو کسی نے زہر دیا ہے، دوسرے کو کسی نے گولی ماردی ہے۔ تیسرا گاڑی کے نیچے آگیا ہے۔ سب کو ایک دم دیکھو اور پھر ایسا معجزہ دکھاؤ کہ [illegible] تقدیر کا مارا ہو اور ورثا مطمئن اور ورثا اٹھ لیے [illegible] ایک سرکاری ڈاکٹر کا سر پھاڑ دیتے ہیں جو بے حس اور سنگدل ہے کیونکہ اپنا فرض ادا نہیں کرتا۔ ذرا احساس نہیں کہ یہ کتنا سیریس کیس ہے۔ بھاڑ میں جاؤ یار، ہمارے لیے تو سب کیس سیریس ہیں اور اگر [illegible] کے لیے رونے پیٹنے لگیں تو احمقوں کے ساتھ تو... تم تو اپنا اسپتال چلا رہے ہو مزے سے..."

"بہت مت بولو کسی دن تم بھی..."

"بکواس، یہ سب پیسے کے کھیل ہیں۔ ہمارے مقدر میں تو سرکاری نوکری ہے۔ کبھی یہاں تو کبھی کسی تحصیل اسپتال میں۔" وہ جھنجھلا کے بولا۔

"وہ سب میں نے سمجھ لیا تھا۔ اس مقام تک میں ایک دن [illegible] دس سال بعد اس قابل ہوا تھا میں۔ خیر میں چلتا ہوں۔ [illegible] کوئی قانونی الجھن تو نہیں رہی نا؟"

"تمھارے لیے اب کیسی الجھن۔ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ [illegible] دلچسپی نہیں لی تو یہ ان کی مرضی۔"

"تمھارا بہت شکریہ [illegible]"

"[illegible] پولیس کے ریکارڈ پر کچھ نہیں تو [illegible] کسی کے ساتھ۔" میڈیکل آفیسر نے کہا۔ "[illegible]"

ایک بار پھر ہمیں باہر لایا گیا۔ باہر جانے کے لیے دوسرا [illegible] نرسنگ اسٹاف کو اپنی جیب سے [illegible] اسٹریچر اٹھا کے چلنا پڑا تھا اور وہ بھی

رات کے آخری پہر میں [illegible] تھکن [illegible] تھا۔

مجھے اس وقت تھوڑا سا تعجب ہوا جب ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔"

"کون سی بات جناب؟" ایک نرسنگ اردلی بولا۔

"یہی کہ میں دو کیس لایا تھا اور پھر واپس لے گیا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "تمھارے میڈیکل آفیسر..."

"ان کی بات کرتے تھی ہم نے۔ آپ بے فکر ہو جائیے۔ ہم کو کیا پڑی ہے کہ خلاف بیان دیں۔" ایک نے کہا۔

"ویسے تو پولیس اور میڈیکل افسر کی بات ہی مانی جاتی ہے ہم سے کون پوچھے گا۔" دوسرا بولا۔

"اور پوچھے بھی تو ہمیں کیا کہ آپ کا نام ایسا اور حلیہ ایسا کچھ بتا دیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم ایک ٹیکسی لاؤ۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اچھا تم ٹھہرو، میں خود کسی سے بات کرتا ہوں۔ رات کے وقت یہ لوگ بھی تو بلیک میل کرتے ہیں ضرورت مند کو۔"

اس کی بات سن کے میں چونک کے رہ گیا۔ وہ ہمیں اس ماڈل ولیج میں لے جا سکتا تھا جس میں سے کر آیا تھا لیکن وہ اس گاڑی کو وہیں چھوڑ کے جا رہا تھا۔ وہ ٹیکسی میں خود بیٹھ گیا تھا۔ شاید وہ کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ ہمیں کہاں لے گیا۔ اس نے نرسنگ اسٹاف کو بھی خاموشی کا پابند کر دیا تھا اور اس سے پہلے میڈیکل آفیسر کو بھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ سرکاری اجازت نامہ مل چکا تھا کہ وہ ہمارے کیس میں جتنی دلچسپی چاہے لے۔ سرکار کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا مگر وہ رازداری کا اہتمام کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ ہمارے آنے اور جانے کی کسی کو بھی خبر نہ ہو۔ آخر کیوں؟

اس سوال کا جواب ایک امید تھی۔ بے بسی کے صحرا میں ایک سراب۔ لاشعور کی سرگوشی تھی جو دل کی دھڑکن میں سنی جاسکتی تھی کہ شاید پھر [illegible] ہے جس کا شکریہ ادا [illegible] کے حسن اخلاق ہے ہمارے [illegible] تحفظ کے اسباب پیدا کر دیئے۔ ناامیدی بھی کیا کیا خواب دکھاتی ہے۔ کیسی کیسی امیدیں، تسلی سے۔ وہ ٹیکسی لے کر آیا تو ہم دونوں کو پچھلی سیٹ پر پھر بیجے کی طرح ڈال دیا گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کچھ پریشان ہوگیا۔

"خیر کیا ہے یارا؟" وہ مجھے غور سے دیکھ کر بولا۔

"کچھ نہیں خان۔ یہ دونوں نشے میں ہیں۔"

"خو نشہ کرلیا ہے۔" اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کے توبہ کی۔ "خانہ خراب کا بچہ۔ کتنا گناہ کیا ہے!"

"بھائی جی دونوں کو" ڈاکٹر نے کہا۔ "اسپتال میں بٹھا دیا تھا لوگوں نے۔ یہاں پولیس کے چکر میں آ جاتے تو وہ آگے جیل پہنچا دیتے۔ وقت پہ بچا لیا۔"

"تو یار۔ پوا نشیں مالو۔ ایسا خانہ خراب بھائی ہا ایہ دیکھو
اس کو پولیس کا حوالے کرے کہا اس کو چھتر مارو۔ اس کا چمڑی اتار دو
مار مار کے۔ تم اس کو بچا لائے۔" وہ ٹیکسی چلاتے ہوئے بولا۔

"کیا کریں خان۔ یہ بھی مجبوری ہے۔" ڈاکٹر نے ایک سرد آہ بھری۔

"کسی روز یہ مر جائیں گا تو ادا پھر رو دیں گا تم۔ ابھی ہم تم کو بتاتا اے۔ ادا ہمارا بھی بھائی تھا۔ پھر خانہ خراب مارفین کا عادت پڑ گیا۔ انجکشن لگواتا تھا۔ ہم بہت مارا۔ بہت روکا اس کو۔ ایک ہی بھائی تھا امارا۔ ہم باپ تھا اس کا۔ سال بھی ہم تھا۔ جب اس کو پولیس پکڑا۔ ہم بولا کہ ابھی اس کو ایسا مار لگا کہ یہ سب نشہ بھول جائے"

"کیا نشے کے لیے تم پیسہ دیتے تھے؟ وہ کہاں سے لاتا تھا پھر؟"

"او صاب۔ ام بہت الو ہے۔ امارا عقل میں نہ آیا۔ ام اس کو پیسہ دیتا تھا۔ بتلاو مانگتا تھا۔ یہ غلطی ضرور کیا ام۔ مگر ام کو کیا معلوم تھا۔ ام سمجھا بچہ کا یار دوست ہے، خرچہ پرچہ تو کرنا پڑتا ہے اور دوست کا ساتھ جا کے چائے پیتا ہے اور کھاتا ہے۔ کتابوں کا اور کپڑا لتا کا خرچہ کرتا ہے۔ ام بہت بے وقوفی کیا۔ وہ پیسہ سے نشہ کرتا تھا۔ جب ام پیسہ دینا بند کیا۔ تو اس خانہ خراب نے سب بیچ دیا۔ اپنا کتاب۔ کپڑا۔ گھڑی۔ گھر کا سامان لے گیا وہ ایک دن ام سے بولا کہ چور آیا ہوگا۔ چور وہ خود تھا۔ ادھر ادھر سے چوری کرنے لگا تو پکڑا گیا۔ ام سوچا کہ جیل میں ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کو چھ مہینہ جیل ہوا لیکن صاب۔ ادھر تو زیادہ ملتا تھا۔ اب ام کیا بولے۔ ام کو بہت شرم آتا ہے۔ وہ نشہ کے لیے اپنا سب کچھ بیچ دیا۔ غیرت، ایمان، شرم سب مر گیا۔ وہ خانہ خراب چھوڑ کے رہا۔ باہر نکلا تو پکا بدمعاش بن گیا نشہ بازوں کا ساتھ ہو گیا۔ ام کو چھوڑ کر چلا گیا۔ ابھی ام کو نہیں معلوم کدھر اے۔ زندہ ہے کہ مر گیا۔ ام کس سے پوچھے۔ کس سے فریاد کرے کہ امارا بیٹا امارا بھائی ام کو دے دو۔" وہ سخت جذباتی ہو گیا تھا۔

"خدا کرے وہ راہ راست پر آ جائے اور تمہیں مل جائے۔"
ڈاکٹر نے رسمی اخلاق کے ساتھ ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔

"اپنا بھائی کو بچاؤ صاب۔ بند کر دو اس کو کمرہ میں تالا لگا کے۔ کسی کو مت جانے دو اس کا پاس۔ اس کا یار دوست آئیں گا۔ سب کو بولو وہ نہیں ہے۔ بھاگ گیا۔ مر گیا۔ کچھ بھی بولو۔ ورنہ وہ اس کو پھر نشہ۔۔"

"تم فکر مت کرو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔
"اب تک مجھے پتا معلوم نہیں تھا۔ اب تو میں ان کو باندھ کر رکھا کے ڈال دوں گا۔ خواہ چھ مہینے باندھ کے رکھنا پڑے یا سال بھر۔ یا مجھے شہر چھوڑ کے جانا پڑے۔"

"ایک دم ٹھیک صاب۔ ان کو لے کر بھاگ جاؤ۔ کسی کو مت بتاؤ تم کدھر جاتا ہے۔" پٹھان فوراً ہی مطمئن ہو گیا۔

"اچھا دیکھو۔ ادھر سے بائیں ہاتھ پہ۔۔"

اس نے پلٹ کے دیکھا۔ "بائیں ہاتھ پہ؟ آپ تو بولا تھا۔۔"

"وہ۔۔۔ دراصل میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی ان کو گھر نہ لے جاؤں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ تو ہو کہ وہ پہنچ جائیں جو ان کی تباہی کے ذمے دار ہیں۔"

جب ٹیکسی رکی تو ڈاکٹر نے اسے پچاس روپے دیے۔ ڈرائیور نے مجھے اور محسن کو اتار کے اندر پہنچانے میں ڈاکٹر کی مدد کی۔ یہ کوئی ایسا علاقہ تھا جہاں سب کوٹھیاں تھیں اور شاندار تھیں۔ جس کوٹھی میں ہمیں لایا گیا تھا اس کے پورچ کی لائٹس جل رہی تھیں اور جب مجھے اندر لے جایا جا رہا تھا تو میں نے وہاں ایک بہت قیمتی کار بھی کھڑی ہوئی دیکھی۔ کوٹھی کے اندر مکمل خاموشی تھی۔

"خان! اب میں تم سے درخواست کروں گا کہ۔۔"

"آپ بے فکر ہو جاؤ۔ ام کسی کو نہیں بتائے گا۔" ٹیکسی والے نے ڈاکٹر کی بات کاٹ کے کہا۔

"یہ ہو سکتا ہے کہ سول اسپتال کے باہر کسی نے تمہاری ٹیکسی کا نمبر نوٹ کر لیا ہو۔ وہ تم کو تلاش کریں اور تم سے معلوم کرنا چاہیں کہ انہیں تم کہاں لے گئے تھے۔" ڈاکٹر نے میری طرف اشارہ کیا۔

"ام ادھر نہیں جائے گا صاحب۔ اور کوئی آ گیا تو ام مر جائے گا مگر ادھر کا پتا نہیں بتائے گا۔"

"تم صاف انکار کر دینا کہ تم کسی کو نہیں لے گئے تھے۔"

"ام قسم کھا کے بولے گا صاحب۔ اللہ ہم کو معاف کرے گا۔ اگر ہم جھوٹی قسم کھائے گا۔ کسی کا جان بچانے کا واسطے سب جائز ہے۔ وہ غفور الرحیم سب جانتا ہے۔ اچھا۔" اس نے ہاتھ بڑھا کے مصافحہ کیا۔ "امارا بھائی کا واسطے دعا کرنا۔"

ٹیکسی ڈرائیور کے جاتے ہی ڈاکٹر مستعد ہو گیا۔ میں نے اسے باہر جھانکتے دیکھا۔ شاید وہ ٹیکسی کے نکل جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے اب اس کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ کسی خاص مقصد کے تحت وہ ہمیں پولیس سے بچا لایا ہے۔ یہ مقصد ابھی تک واضح نہیں تھا لیکن میرا دل کہتا تھا کہ وہ ہماری مدد کر رہا ہے۔ حیرت کی بات صرف یہ تھی کہ اس نے یہ فیصلہ اتنی دیر سے کیوں کیا۔ ورنہ ہمیں اسپتال سے جانے کا پابند نہیں تھا۔ گاڑی اس کے ہاتھ میں تھی اور اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ راستے سے بھی واقف تھا

چند منٹ کے بعد ہم پھر سفر کر رہے تھے۔ اس بار ڈاکٹر کی قیمتی کار میں جو مجھے پورچ میں کھڑی ہوئی نظر آئی تھی۔ صبح کاذب کا اجالا غالب آ رہا تھا جب ہم دوسری جگہ پہنچے۔

میں کراچی کے سارے علاقوں سے ایسا واقف نہیں تھا کہ دیکھتے ہی جگہ کو پہچان جاتا اور وہ بھی رات کے اندھیرے میں

نیم بے ہوشی کی حالت میں کہ میری نظر صرف سامنے دیکھ سکتی تھی اور دماغ اس وقت جب مجھے اٹھایا جا رہا تھا درد میں مشکل بند تھے

غلامی بھی تمام رستے آوازیں سنتا رہتا تھا۔

یہ جگہ بھی پہلے والی جگہ سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی فرق صرف یہ تھا کہ یہاں بھی بڑی کوٹھیاں تھیں مگر وہ پرانے۔ شاید پندرہ بیس سال پہلے بنائی گئی تھیں۔ ان کی تعمیر میں قدامت کا رنگ بہت نمایاں تھا۔ مجھے ایک بیڈ روم میں پہنچانے کے بعد ڈاکٹر نے محسن کو بھی میرے ساتھ ہی ایک بہت بڑے بیڈ پر منتقل کر دیا۔ یہ بیڈ روم ایسا تھا جیسے کوئی گھر ہو رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس نے کچھ دوا دی تھی

"میں تھوڑی سی دیر کے لیے جا رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے ہم دونوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "تم لوگ بول نہیں سکتے ہو لیکن میری بات سمجھ سکتے ہو۔ تمہاری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں اور آنکھوں میں تمہارے خیالات اور جذبات کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اس سے میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ تم دیکھنے اور سننے کے ساتھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوئے ہو۔ جب یہ دوا اپنا اثر کھو دے گی پھر تم سے بات ہوگی۔ جب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ یہ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔"

وہ جانے کے لیے پلٹا اور پھر رک گیا۔ "ہاں! ایک بات اور یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔ مجھے اپنا دشمن نہیں دوست سمجھنا۔ میں دروازے کو لاک کر کے جاؤں گا۔ یہ میری اپنی کوٹھی ہے اور اتفاق سے ان دنوں خالی تھی۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ مجھے یہ کام بھی وہیں کرنا پڑا ہوگا کہ کسی کو کچھ معلوم نہ ہو۔ میں تقریباً دو گھنٹے بعد آؤں گا۔ لا میرے بڑے بھائی کا گھر ہے۔ آج کل میں وہیں مقیم ہوں کیونکہ میری بیوی اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ میں بھائی اور بھابی کے ساتھ ناشتا کروں گا۔ تاکہ انہیں بالکل شک نہ ہو۔ وہ سمجھیں کہ میں تو اپنے کمرے میں ہی سو رہا تھا۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ ایک بار پھر قدرت کے مہربان ہاتھوں نے ہمارا وقت پر دشمنوں کی چال بدل ڈالی تھی۔ شکاری حاجی جو بڑے اہتمام کے ساتھ ناقابل شکست بن کر اور اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے سب سامان کر کے آیا تھا کسی نامعلوم مقام پر کوفت اور جھنجلاہٹ میں مبتلا ہوگا۔ اپنی فطرت کے تحت اپنے ماتحتوں پر برس رہا ہوگا اور ان سب کو گالیاں دے رہا ہوگا جن کی غلطی سے حاجی عبداللہ کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ وہ اپنے آدمی تو پولیس کی تحویل سے نکال کر لے جائے گا مگر اس کے بعد انہیں معاف نہیں کرے گا جن کی کوتاہی سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔

حاجی عبداللہ اب کیا کرے گا؟ کیا وہ معلوم کرے گا کہ حادثے کے بعد ڈاکٹر ہمیں کون لے گیا تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ ڈی ایس پی اپنا بھائی جو حادثے کے وقت ڈیوٹی پر تھا ٹیکسی ڈرائیور اور اس کے ذریعے

ساتھیوں کو مقصد نے بھیجا تھا خود ہی بتا دے گا کہ ایک ڈاکٹر ہمیں نکال کر سول اسپتال لے گیا تھا کیونکہ اس میں دو افراد تشویش ناک حالت میں پہنچے ہوئے تھے۔

اس کے بعد حاجی عبداللہ سول اسپتال سے بہت کچھ معلوم کرے گا۔ جب اسے ڈاکٹر وسیم وہاں سے ملے گی تو شک کی کوئی بات ہی نہیں رہے گی کہ ہمیں وہاں لایا گیا تھا۔ وہ عقلیا آدمی ہے اور اس کے لیے حقیقت کا کھوج لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ وہ پتا چلا لے گا کہ ہمیں وہاں کون لایا تھا اور پھر اس ڈاکٹر کا سراغ مل جائے گا تو وہ کسی دشواری کے بغیر ہم تک آ پہنچے گا۔ ڈاکٹر ابھی حاجی عبداللہ۔ چوہدری دلاور سے مراسم اور اس جیسے کسی شکاری سے واقف نہیں اس لیے وہ مطمئن ہے مگر درحقیقت اس نے خود کو ان کا نشانہ بنا لیا ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ میری اعصابی بے حسی میں کچھ کمی آگئی ہے۔ پلکیں تو میں بہت پہلے جھپکنے لگا تھا۔ اب تھوڑی سی کوشش سے میں نے نظر کو دائیں بائیں دیکھنے کے قابل کر لیا۔ پھر اتنا ہوا کہ میں سر کو تکیے پر دائیں طرف گھمانے میں کامیاب رہا۔ جدھر محسن دراز تھا۔ وہ مجھ سے بہتر پوزیشن میں تھا۔ وہ میری طرف دیکھنے کے علاوہ مسکرا بھی رہا تھا۔ یہ مسکراہٹ بہت خفیف تھی۔ ہونٹوں کی معمولی سی حرکت۔ لیکن اس مسکراہٹ میں امید کا بھرپور اجالا تھا اور عزم تھا حوصلہ نہ ہارنے کا۔ یقین تھا اور شکر گزاری کے جذبات تھے اس ذات والا صفات کے لیے جس کے تحفظ کی چھتری ہماری ذات پر سایہ فگن رہتی تھی۔ ہر وقت اور ہر جگہ۔

سوال اب صرف وقت کا تھا۔ حاجی کتنی دیر میں معلوم کرتا ہے کہ اس کا پلان کس کی مداخلت کے باعث ناکامی سے دوچار ہوا اور وہ یہاں تک پہنچنے میں کتنا وقت لیتا ہے؟ ڈاکٹر نے دو گھنٹے بعد آنے کو کہا تھا۔ دو گھنٹے تو بہت زیادہ ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنی چارہ گری سے ہمارے جسم کو اور اعصاب کو ذہن کی سوچ کے مطابق حرکت پذیری کی صلاحیت دے گا اور تب ہی ہم اس قابل ہوں گے کہ سب تمام خطرات کا مقابلہ کر سکیں۔ اس نے یقیناً ہمیں پہچان لیا تھا۔ وہ ہمارا مددگار بھی آمادہ تھا لیکن وہ ہمارے تعاقب میں بھٹکنے والے کسی شکاریوں کی سفاکی، بے ضمیری اور خون آشامی سے واقف نہ تھا۔

ڈاکٹر کی واپسی کا انتظار ایک طویل تر عذاب اور صبر آزما عمل تھا۔ ہم مجبوری کی کیفیت میں پڑے رہنے اور ماضی و حال اور مستقبل کے اندیشوں سے الجھتے رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے بار بار اور غالب کا خیال بھی آیا۔ معلوم نہیں وہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب رہے۔ وہ جہاز پر پہنچے تو اپنی شناخت چھپا کے دشمنوں کا اعتماد حاصل کر سکے یا نہیں۔ ان کا مشن جان لیوا مرحلوں سے عبارت

www.paksociety.com

تھا اور کامیابی صرف تقدیر کی یاوری پر منحصر تھی۔

جب باہر کا دروازہ کھلا تو میں چونک اٹھا۔ بالکل غیر …

ہر میں نے سر کو دوسری طرف گھما لیا۔ یہ شعور میں جاگزیں ایک خوف کا ردعمل بھی تھا کہ پھر فضل گل آئی یا اجل آئی کیونکہ در بند کھلتا ہے۔ آنے والا کوئی بھی ہو سکتا تھا ابلیس و عزرائیل کا نمائندہ عبداللہ بھی اور دوستی کا نامہ بر سجاد بھی۔

وہ اندر آیا تو ڈاکٹر کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر میرا اطمینان بحال ہوا۔

"تم بہت بہتر ہو" وہ خوش دلی سے بولا "میں بھی ایک گھنٹے پہلے ہی لوٹ آیا۔ بھائی کو تو خیر خاک بھی پتا نہیں چلا وہ سوتے پڑے رہے۔ بھابی کو شک ہوا تھا انھوں نے پوچھا بھی کہ صبح صبح کار لے کر کہاں گئے تھے۔ میں نے کہا کہ تم نے خواب دیکھا ہوگا۔ کار اپنی جگہ پر موجود۔ میں اپنے کمرے میں موجود۔ مگر وہ بہت چالاک عورت ہے۔ کہنے لگی کہ ہاں اب تو موجود ہو تم بھی مگر بیچ میں نہ کار تھی نہ تم تھے۔ کس سے ملنے گئے تھے۔ شرم نہیں آتی۔ چار دن کے لیے بیوی گئی ہے میکے اور تم ہو گئے پھر شتر بے مہار۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس الزام کو قبول کر لوں۔ ناشائستہ ہی سہی۔ یا کر ایک ایمرجنسی آپریشن ہے بھابی لے اس کا بھی یقین نہیں کیا ہوگا" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

وہ اب شیو کر کے اور کپڑے بدل کے آیا تھا چنانچہ بہت بہتر لگ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹروں کا روایتی بیگ بھی تھا۔ ہمارے قریب بیٹھ کے اس نے پہلے سرسری سا معائنہ کیا پھر میری انگلی میں سوئی چبھو کے خون کا ایک قطرہ شیشے کے ٹکڑے پر اتار لیا۔ اس نے تین مختلف قسم کے بے رنگ محلول نکالے اور باری باری ایک ایک قطرہ ڈال کے خون کا معائنہ کرتا رہا۔ اس کے لیے وہ بیگ میں ایک چھوٹا سا مائکرو اسکوپ بھی لایا تھا۔

اس مختصر ٹیسٹ سے فارغ ہوتے ہی اس نے پراطمینان انداز میں سر ہلایا۔ "میرا اندازہ درست تھا" وہ بولا "تم دونوں کے خون کا ردعمل ایک ہی ہوگا"

ایک بیگ میں سے اس نے اپنی دوائیں نکالیں اور پہلا انجکشن مجھے لگا دیا۔ دوسرا انجکشن محسن کو لگا کے اس نے گولی بھی دی۔

شاید خود ڈاکٹر کو بھی خطرے کا احساس تھا کہ اندر آتے ہی اس نے دروازہ مقفل کر دیا تھا۔ اب اس نے ایک اور حرکت کی۔ وہ کھڑکی کھول کے باہر کود گیا۔ چند منٹ کے بعد میں نے سامنے والے دروازے پر کھٹ پٹ سنی پھر وہ کھڑکی کے راستے ہی لوٹ آیا۔

"میں نے سامنے سے آنا چاہا تو قفل لگا دیکھا …" اس نے ہاتھ سے قفل کی جسامت ظاہر کی۔

کھڑکی اندر سے بند کرنے کے بعد اس نے پردے برابر کیے۔ "میرا خیال ہے کہ اب کسی کو یہاں تمھاری موجودگی کا شک نہیں ہو سکتا۔ میں ذرا دوسرے دروازے اور کھڑکیاں چیک کر لوں اور چائے بھی بنا لاؤں۔ … بھی تیار ہوگی۔ دیکھتا ہوں فریج میں کیا ہے۔ آدھے گھنٹے میں تم کو ٹھیک ہو جانا چاہیے"

ڈاکٹر کی عمر تجربے کو دیکھتے ہوئے پینتیس سال سے کم نہیں ہو سکتی تھی لیکن وہ اپنی جسمانی ساخت اور لباس کی وجہ سے چوبیس پچیس سال کا نوجوان نظر آتا تھا۔ وہ خوش رہنے والا یار باش اور باتونی انسان تھا۔ آدھی رات کے بعد وہ اپنے دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی میں مصروف تھا اسے پیسے کی کمی نہ تھی چنانچہ صحبت بھی اسے عیش پسندوں کی ملی تھی۔

آہستہ آہستہ میرا جسم زندگی کی حرکت پذیری سے آشنا ہونے لگا۔ یہ کیفیت بھی بہت عجیب تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میری رگوں میں لہو پھر دوڑنے لگا ہے۔ کبھی ایک ہی پوزیشن میں رہنے سے ہاتھ یا پیر سو جاتے ہیں تو دوران خون بحال ہونے پر بھی ایک سنسناہٹ اور چبھن کا احساس ہوتا ہے۔ یہی حال میرے پورے بدن کا تھا۔

سب سے پہلے میں سر کو اور پھر ہاتھوں کو حرکت دینے کے قابل ہوا۔ میں نے ہاتھوں کے سہارے جسم اٹھانے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ محسن نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے شانے پر رکھا تو میں چونکا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ بے بسی کی قید سے رہائی کی اس گھڑی کی اس دوستانہ لمس نے جادو دکھایا۔ جواب میں میرا ہاتھ اس کی طرف بڑھا اور ہمارے ہاتھوں نے ایک دوسرے کی انگلیوں کے ساتھ تعلق قائم کر لیا۔ محبت، اعتماد اور رفاقت کے رشتوں کی استواری کا احساس وہ طاقت بن گیا جس نے ہمیشہ طاقت سے برسر پیکار ہونے کا یقین دیا تھا۔ اور … کو شکن بنا دینے کی خواہش کو زندہ رکھا تھا۔

جب ڈاکٹر چائے کی ٹرے لے کر آیا تو ہم … قابل ہو گئے تھے کہ اٹھ کے بیٹھ جائیں۔ ہمارے ہاتھوں اور جسمانی اعضا کی حرکت میں ابھی مستعدی نہیں آئی تھی … سلو موشن میں ہر کام خاصی محنت سے کر رہے تھے … نے بولنا چاہا تو میری زبان لڑکھڑائی۔ یہی اور میرے حلق سے

عجیب سی ناقابل فہم آواز نکلی۔

"ویری گڈ … ویری گڈ …" ڈاکٹر نے بشاشت سے کہا اور ٹرے کو ایک میز پر رکھ دیا۔ "میری تشخیص درست تھی اب پانچ دس منٹ میں تم دونوں مجھ سے زیادہ چاق و چوبند ہو جاؤ گے"

اس نے اپنے میڈیکل بیگ میں سے دوسرا انجکشن نکالا "عام طور پر دوا میں جادو کا اثر نہیں ہوتا مگر زندہ رہنے کی خواہش اور عزم … ہو تو تاثیر یقیناً بڑھ جاتی ہے۔ یہ تم دونوں کی قوت ارادی کا کرشمہ ہے کہ صرف بیس منٹ میں تمھاری حالت اتنی بہتر ہو گئی۔ اب یہ دوسرا انجکشن عام طور پر ایک گھنٹے کے بعد لگایا جاتا ہے۔ یہ نظام اعصاب کو فوراً فعال بنا دیتا ہے"

باری باری اس نے ہم دونوں کو وہ انٹراوینس انجکشن لگایا اور پھر کرسی کھینچ کر چائے کے قریب بیٹھ گیا۔

"یہ اچھا ہوا جو میری بیوی یہاں نہیں ہے" وہ سگریٹ جلا کے بولا۔ "وہ بہت شکی مزاج عورت ہے۔ ویسے تو ہر عورت ہوتی ہے، مگر وہ ہے ایک پولیس افسر کی بیٹی۔ کراس ایگزامن کر ڈالتی اگر تم پڑھ لیتے تو کیا ہوتا ہے!" وہ ہنسا۔

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جانے حق میں یہ اچھا نہ ہوتا اگر وہ پولیس افسر کی بیٹی ہمیں دیکھتے ہی سوال کرتی کہ یہ کون ہیں۔ انھیں اسپتال کیوں نہیں لے گئے گھر پر کیوں اٹھا لائے ہو؟ اور ڈاکٹر صاحب کا جواب اسے مطمئن نہ کرتا یا وہ مطمئن ہی نظر آتی تو وہ فوراً ریسیور اٹھا کر ابا حضور کو مطلع کرتی کہ میرے گھر میں دو مشکوک افراد موجود ہیں جو صورت سے ہی جرائم پیشہ لگتے ہیں اور ابا حضور آ جاتے اپنے … تفتیش کرنے تو؟

"آ … آپ … آپ کا … یہ … بہت … شکر … شکریہ" یہ بات محسن نے کی تھی۔ اس کی زبان تھوڑا سا اٹک رہی تھی مگر وہ بولنے لگا تھا۔

"آ … آپ … نے … بچا لیا … ہمیں" میں نے بھی کوشش کی۔ مگر … ادا کرنے میں کامیاب رہا۔

اس کے بعد ڈاکٹر کی پیشین گوئی کے مطابق ہماری استعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ پانچ منٹ کے بعد ڈاکٹر نے تھرماس میں سے چائے انڈیل کر پیش کی تو ہمارے ہاتھوں کی گرفت مستحکم رہی۔ ایک ٹوسٹ کے لیے … گزشتہ … ذہن کی

قوت کو ہاتھوں کی طاقت پر مرتکز کر دیا۔

چائے کا پہلا گھونٹ پیتے ہی جیسے میری زبان کی اینٹھن بھی ختم ہو گئی۔ ڈاکٹر نے چائے کے ساتھ بسکٹ کا ڈبہ بھی کھول دیا تھا۔ اس نے معذرت کی کہ گھر میں اور کچھ نہیں تھا۔ انڈے، ڈبل روٹی سب ختم ہو چکے تھے۔

میں نے پنیر کے دو ٹکڑے کھائے اور چار بسکٹ اور پھر چائے کا دوسرا کپ ختم کیا۔ ایک بار پھر میں نے خود کو زندہ، صحت مند اور چاق و چوبند محسوس کیا۔ مجھے وہ درمیانی وقفہ جب میں نہ زندوں میں تھا نہ مردوں میں، نہ بے ہوش تھا اور نہ ہوش میں، بہت عجیب سا تجربہ لگا۔ کسی سائنس فکشن کے سین کی طرح جس میں انسانوں پر کوئی خلائی مخلوق حاوی آ جاتی ہے تو انھیں روبوٹ کی طرح ذہنی و جسمانی طور پر مفلوج کر دیتی ہے۔

"کیا سگریٹ مل سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، میں خود تو نہیں پیتا، مگر مہمانوں کے لیے رکھتا ہوں" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"یار سکندر، یہاں نہیں رکنا چاہیے ہمیں" محسن نے موقع پاتے ہی کہا۔ "وہ لوگ آ سکتے ہیں یہاں"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہم اس سے پہلے ہی نکل جائیں گے"

ڈاکٹر ایک سگریٹ باکس لے کر نمودار ہوا۔ "یہ ڈرائنگ روم میں رکھا رہتا ہے۔ بالکل تازہ تو نہیں ہیں"

"ڈاکٹر صاحب، سب سے بڑا احسان تو آپ کا یہی ہے کہ ہمیں اپنی زندگی اور اپنی آزادی پھر مل گئی" میں نے ایک سگریٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ خطرہ کیوں مول لیا آپ نے؟"

"خطرات سے کس کی زندگی خالی ہے؟ اگر ہے تو وہ کیا زندگی ہے" ڈاکٹر نے کہا۔

"کیا آپ نے پہچان لیا تھا ہمیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں، مگر فوراً نہیں۔ جب میں نے تمھیں پہلے … پر دیکھا تھا تو وہاں اندھیرا تھا۔ اور میں نے تمھاری صورت … غور کیا تھا" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہسپتال جاتے ہوئے مجھے خیال ضرور آیا تھا کہ تمھاری صورت دیکھی ہوئی کیوں لگتی ہے۔ سوال کا جواب کہیں میرے لاشعور میں محفوظ تھا اور فوراً سامنے نہیں آیا۔ سول اسپتال میں جب میں اس پولیس انسپکٹر سے بات کر رہا تھا تو یکلخت مجھے سب یاد آ گیا جو میں نے تمھارے بارے میں سن رکھا تھا۔ اس وقت

www.paksociety.com

میں بہت پشیمان ہوا اور بہت گھبرایا کہ اب تم کو واپس کیسے لے جاؤں۔ بس قسمت مہربان تھی کہ دوسروں نے تمھیں شناخت نہیں کیا اور تمھیں امیر معتمی کہیں بھی نہیں سمجھا۔ مجھ سے دیر تو ہوئی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس دیر سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ وہ کون لوگ تھے جو تمھیں لے جا رہے تھے؟"

"ظاہر ہے وہ ہمارے اور اس ملک کے دشمن تھے۔ اور اب آپ کے بھی اتنے ہی خطرناک دشمن ہو گئے ہیں۔" محسن بولا۔

"آپ نے کوئی عقلمندی نہیں کی، وہ گاڑی وہاں چھوڑ کے۔" میں نے کہا: "اس گاڑی سے ہی وہ سب پتا چلا لیں گے کہ ہمیں کون لایا تھا اور کون لے گیا۔ یہ بھی معلوم کر لیں گے کہ کہاں لے گیا ہے۔"

"میں اور کیا کرتا... اس گاڑی کو یہاں کیسے لاتا۔ ٹیکسی میرے نزدیک زیادہ محفوظ ذریعہ تھی۔" وہ کچھ متفکر ہو کر بولا۔

"آپ نے بہت بڑا رسک لیا۔"

"ہول اسپتال میں انھیں کوئی کچھ نہیں بتلائے گا۔" وہ بولا۔

"یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ وہ خطرناک شکاری کتے ہیں جو کسی کی بو پا لیں تو اسے کھوجتے ہوئے پاتال تک اور آکاش تک پہنچ سکتے ہیں۔ میرا مشورہ مانیں تو یہاں سے فوراً نکل جائیں اور کم از کم دو چار ہفتے روپوش رہیں۔"

"دو چار ہفتے!" وہ تلخی سے بولا۔ "میں دو چار دن کے لیے بھی کہیں نہیں جا سکتا۔ میرا اسپتال ہے اور میری ذمے داریاں ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنے سسر کو بتا دوں کہ مجھے کچھ لوگوں سے خطرہ ہے۔ وہ مجھے پولیس گارڈ فراہم کر دیں گے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا: "پولیس کیا اس گولی کا راستہ روک سکتی ہے جو کوئی کسی کی جان لینے کے لیے طویل فاصلے سے بھی چلا سکتا ہے؟" میں نے کہا: "تم ان کے مجرم ہو کیونکہ تم نے دخل در معقولات سے ان کا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا ہے۔"

"میں کیا کرتا اس کے سوا۔ یہ تو ناممکن تھا کہ میں تمھیں چھوڑ کے بھاگ آتا۔ اپنی جان بچا لیتا اور تمھاری جان کی پروا نہ کرتا۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" وہ بولا۔

"آپ نے اپنا نام ابھی تک نہیں بتایا۔" محسن نے کہا

"اور ہم نے بھی نہیں پوچھا۔"

ڈاکٹر کو جواب دینے کے لیے مہلت نہیں ملی۔ باہر ایک گاڑی آ کے رکی۔ اس کے انجن کی آواز بند ہونے سے پہلے ہی میرے شکوک نے یقین کی صورت اختیار کر لی۔ گاڑی کا سلائیڈنگ ڈور بڑی آواز کے ساتھ بند ہوا اور کوٹھی کے اندر کی ہوئی کال بیل مسلسل بجنے لگی۔

میں نے تیزی سے کھڑکی تک جا کے پردہ ہٹایا اور باہر پھاٹک سے دیکھا۔ یہ وہی مائیکرو ویگن تھی جو اگرچہ مجھے ہول اسپتال کے باہر چھوڑ آئے تھے۔ ہمارے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔ شکاری اس مائیکرو ویگن کو بہت جلد تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے یہاں پہنچنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب!" میں نے پلٹ کے کہا: "آپ کے پاس کوئی اسلحہ ہے؟ ریوالور یا پستول...؟"

ڈاکٹر کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا: "مجھے کبھی ضرورت نہیں پڑی۔"

"اچھا اب آپ دروازہ کھولیں۔" میں نے دیوار کے ساتھ پشت سے لگ کے کہا۔

"کتنے آدمی ہیں باہر؟" محسن نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر لوہے کی ایک راڈ اٹھالی جس کے درمیان میں بہت سخت اسپرنگ تھا۔ یہ ورزش میں کام آنے والی چیز تھی اور اسے دونوں ہاتھوں میں کناروں سے تھام کر موڑنا اور آہستہ آہستہ سیدھا کرنا بازوؤں کے پٹھوں کو قوت دیتا تھا۔

"سامنے ایک تو جا رہا ہے۔ چار اس کے علاوہ پیچھے کی طرف گئے ہیں۔" میں نے باہر جھانکتے ہوئے رننگ کمنٹری کی۔ "گویا چھ مسلح افراد ہیں۔ دو وہی ہیں جو کہ ہمارے ساتھ تھے۔ ان کا ساتواں وہ گورنگا ڈرائیور ہے۔"

گھنٹی پھر بجی۔ کسی نے دروازے پر لات ماری یا کوئی اور چیز۔ یہ سیشم کی لکڑی کے مضبوط فریم والا دروازہ تھا۔ اگر شیشہ ہوتا تو وہ لوگ توڑ کے خود ہی اندر سے کنڈی بھی کھول لیتے اور لاک بھی۔

"آپ ظاہر کریں کہ آپ سو رہے تھے۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"کون ہے بھائی صبح صبح؟" ڈاکٹر نے نیند سے جاگنے والے کی طرح بیزار لہجے میں کہا۔

جواب میں پورچ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا شیشہ ایک چھناکے سے بکھر گیا۔ ڈاکٹر کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا۔

"وہ... ادھر سے نہیں آ سکتے۔ کھڑکی میں لوہے کی گرل ہے۔" ڈاکٹر نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"جاؤ، دروازہ کھول دو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا اور اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔ "ہمت سے کام لو۔" لیکن ڈاکٹر کی تسلی باتوں سے نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے احساس تھا کہ وہ محصور ہو گیا ہے اور سات افراد جو خطرناک عزائم رکھتے ہیں اسلحے سے لیس ہو کے اس کے گھر پر حملہ آور ہو گئے ہیں۔

"میں... میں پولیس..." وہ پلٹ کے بھاگا اور فون کی طرف لپکا۔ اسی وقت ایک اور کھڑکی کے کئی شیشے ٹوٹے۔ وہاں پیش گن یا ریوالور کے بٹ مار رہے تھے۔ اندر کی جانب گرل نہ ہوتی تو اتنی دیر میں وہ سب کود چکے ہوتے۔

"تم دروازہ کھولو، ایسے باہر نہیں آئے گا کوئی بھی۔" یہ آواز حاجی کی تھی جو ٹوٹے ہوئے شیشوں سے گزر کے ہم تک پہنچی۔

"ہیلو... ہیلو..." ڈاکٹر نے بدحواسی میں بار بار ٹیلیفون ریسیور ہلا کے کہا۔

دوسرے کمرے میں ایک فائر کی آواز گونجی۔ پھر ایک زبردست دھماکا ہوا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے کوئی بہت بڑا شیشے کا بنا ہوا فانوس چھت سے فرش پر گر کے پاش پاش ہو گیا ہے۔ مگر یہ آواز ٹی وی کی ٹیوب پھٹنے سے پیدا ہوئی تھی۔ ان میں سے کسی نے گرل کے اندر ہاتھ ڈال کے ٹی وی کا نشانہ لیا تھا۔

"یہ... یہ تو کام نہیں کر رہا ہے۔" ڈاکٹر نے بدحواس ہو کے کہا۔ "فون کاٹ دیا ہے ان بدمعاشوں نے۔"

"فون کام کر رہا ہوتا تب بھی کیا پولیس آ جاتی۔ ایسے تو صرف الٰہ دین کے چراغ کا جن ہی آ سکتا ہے۔" میں نے کہا: "اب خود کو بچاؤ۔ وہ ہر طرف سے اندر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

دروازہ ایک زبردست دھماکے سے ہلا۔ اس دھماکے نے دیواروں کو بھی مرتعش کر دیا۔ ڈاکٹر نے وحشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا: "تم... تم کیا کرو گے؟"

"اس الماری کے پیچھے جاؤ، بے وقوف۔ ورنہ وہ اندر داخل ہوتے ہی گولی مار دیں گے۔" میں نے دانت پیس کے کہا۔ "مجھے جو کرنا ہے میں کر لوں گا۔ تم کیوں مرتے ہو میری خاطر۔" محسن نے اس کو بازو سے پکڑ کے کھینچا اور الماری کی اوٹ میں شوکیس کے پٹ برابر کر دیے۔ وہ خوف سے مفلوج ہو گیا تھا اور محسن اس کی مدد نہ کرتا تو وہ وہیں کھڑا کانپتا رہتا یا بے ہوش ہو کے گر جاتا۔

"اتنی دیر ایک دروازہ کھولنے میں...؟" حاجی نے سخت طیش میں کہا: "میں نے کہا تھا خواہ مخواہ گولی مت چلانا۔ اب تم کیا دیکھ رہے ہو۔ اس تالے کو نہیں توڑ سکتے گولی مار کے احمق۔ آس پاس والے سب سن چکے ہوں گے پہلے فائر کی آواز۔ کوئی بھی فون کر دے گا پولیس کو۔"

ایک اور زوردار دھماکے نے کمرے کو ہلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا اور ایک شخص تیزی سے اندر آیا۔ سیدھا جانے کے بجائے وہ دروازے کی طرف پلٹا۔ یہ حاجی کی ہدایت ہوں گی کہ بیل کی طرح مت گھسنا۔ خیال رکھنا کہ وہ دروازے کے پیچھے سے نہ دبوچ لیں۔

میں ایک دم خطرناک سے نکلا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اس گولی کا آسان ہدف بنتا جو مجھ سے چند فٹ کے فاصلے سے چلائی گئی تھی۔ گولی چلانے والے نے مجھے پردے کے پیچھے چھپا ہوا دیکھ لیا تھا۔ میرے بوٹ پردے کے نیچے سے صاف نظر آ رہے تھے۔

میں نے سر جھکا کے پیش قدمی کی اور اس شخص کی بیلٹ پر ہاتھ ڈال دیا جو دوسرا فائر کرنے کی پوزیشن لے رہا تھا۔ ایک جھٹکے سے وہ آگے آیا اور میری ڈھال بن گیا۔ دوسرا شخص اس کے پیچھے اسی لیے رکھا گیا تھا کہ غیر متوقع جوابی کارروائی کی صورت میں اسے بچا سکے۔ اس نے لمبی چھلانگ لگا کے دوسرے زاویے سے میرا نشانہ لیا مگر میں گھوم گیا اور اس کی چلائی ہوئی گولی میری گرفت میں جدوجہد کرنے والے کی پیٹھ میں اترنے کے قریب لگی۔ اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور اچھل کر نیچے گرا۔

میں اس کے ساتھ ہی گرا۔ اس کا ریوالور فضا میں بلند ہوا اور چھت کے پنکھے سے ٹکرا کے واپس آیا۔ میری ساری توجہ اس ریوالور کے حصول کی طرف تھی کیونکہ اب میں خود کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرا دوسرا حریف خاصے فاصلے پر تھا اور مجھ پر دوسرا فائر کرنے کے لیے آزاد تھا۔ ساکت اور منجمد پڑے رہنے کی صورت میں اگلی گولی سے بچنے کے امکانات صفر ہو جاتے تھے۔ میں نے جھپٹ کے ریوالور کو پکڑنا چاہا مگر پنکھے سے ٹکرا کے ریوالور صوفے کے پیچھے چلا گیا۔ میں نے بھی جست لگائی اور صوفے کے پیچھے کود گیا۔

ریوالور اٹھاتے ہی میں نے رخ بدلا۔ اور اپنے دوسرے حریف کو فرش پر چت دیکھا۔ میرے بچ جانے کا سبب میری پھرتی نہیں تھی۔ عین اس وقت جب دوسرا شکاری

www.paksociety.com

سے مجھے شکار کرنے والا تھا۔ محسن نے پیچھے سے اس کے سر پر اسپرنگ والی وہ موٹی لاٹھی ماری جس کے دونوں کناروں پر ربڑ جیسی منظم شے چڑھی ہوئی تھی۔ اس کا سر پھٹا تو نہیں مگر ضرب کی شدت نے اسے وہیں ناک آؤٹ کر دیا۔

اب محسن بھی خالی ہاتھ نہیں رہا تھا۔ اس نے دو کمروں کے درمیان دروازے کی دہلیز پر مورچہ بندی کر لی تھی۔ باہر سے حاجی اب اپنے بھتیجے کا لال حرام خوروں کو زیادہ ثقیل گالیوں سے نواز رہا تھا۔

محسن نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کے دیکھا اور ایک فائر کیا۔ جوابی حملہ آور جو شاید کھڑکی کے سامنے تھا، نشانہ بن گیا۔ اس کی چیخ پر محسن نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کے انگوٹھا بلند کیا۔ تین انگلیاں اٹھا کے میں نے آدھی جنگ جیت لینے کا مشورہ واضح کیا۔ چھ میں سے تین شکاری مارے جا چکے تھے۔

پھر صورت حال ڈرامائی طور پر بدل گئی۔ کوئی بم اندر کی طرف دھماکا ہوا۔ محسن نے وہ مورچہ چھوڑ دیا اور ایک فاش غلطی کی۔ جانے کیوں یہی بہتر تھا کہ ہم انھیں سامنے آنے کا موقع دیتے۔ محسن سے پہلے اور میں نے محسن کو پوری طرح کور کر رکھا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ اس کمرے میں داخل ہوئے بغیر ہمیں زندہ یا مردہ گرفتار کر سکتے۔ یہ مقابلہ تادیر جاری بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ گرد و نواح میں سب کوٹھیاں آباد تھیں اور صبح کے نو بجے بیشتر لوگ بیدار ہو چکے تھے مگر گھروں سے نکلے نہیں تھے۔ یہاں دولت مند کاروباری لوگ رہتے تھے جو دفتری بابو نہیں ہوتے کہ سات بجے حاضری لگانے پہنچ جائیں۔ وہ سب جان چکے ہوں گے کہ ایک کوٹھی میں کیا خوفناک ڈراما ہو رہا ہے۔

لیکن محسن نے کامیابی کی توقعات کو اور امکانات کو ختم کر دیا۔ میں اسے قصور وار نہیں سمجھتا کہ اس کا عمل غیر ارادی اور فطری تھا۔ وہ سامنے جانا نہیں چاہتا تھا مگر شکاری جو کچن کی طرف سے داخل ہوئے تھے، اسے دو طرف سے [illegible]

"یہ کھلونا نیچے پھینک...." کسی نے ساتھ والے کمرے میں آ کے کہا۔ "تم ہماری گولی ... سے روک کے کھڑے ہو۔"

"تم مقابلہ نہیں کر سکتے۔" کسی اور نے کہا۔ "مقابلے کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ ہم تمہیں اسی طرح پکڑ سکتے ہیں جیسے کل پکڑا تھا۔"

میں نے اندازہ کرنا چاہا کہ محسن کی پوزیشن کیا ہے اور اگر میں صوفے کے پیچھے سے رینگ کر نکلوں تو کیا اس کی مدد کر سکتا ہوں مگر سب کچھ ہو رہا تھا دوسرے کمرے میں ہو رہا تھا۔ اگر میں اس جگہ کو چھوڑ دیتا تو عین ممکن تھا کہ محسن کی طرح ٹریپ ہو جاتا۔

"چلو میاں، ضد چھوڑ دو۔ ماشاء اللہ بہت بہادر ہو تم۔" یہ حاجی عبداللہ کی تمسخر اڑانے والی آواز تھی۔ "ہم نے تو تم سے کل رات بھی کہا تھا کہ ہم خدانخواستہ دشمن نہیں ہیں تمہاری جان کے۔ ہمارا مقصد تھا کچھ معاملات کو بات چیت سے طے کرنا۔"

"میری زندگی کا بھی ایک مقصد یہ ہے کہ میں تیرا پیٹ جیسا پیٹ پھاڑ دوں جس میں حرام کا مال ... کی طرح بھرا ہوا ہے اور تیری یہ زبان.... آ.... آہ۔"

محسن کی آہ نے مجھے تڑپا دیا۔ فائر کوئی نہیں ہوا تھا چنانچہ میں نے سمجھا کہ اس کو پھر اسی زہر بجھے تیر کا نشانہ بنایا گیا ہو گا مگر چند لمحے بعد میں نے محسن کی زبان سے ایک فلک شگاف گالی سنی۔ حاجی کی ہنسی نے واضح کیا کہ گالی اس کے لیے تھی۔

میں صوفے کی پشت سے تھوڑا سا سر اٹھا کے دیکھ رہا تھا جب محسن دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کے بالکل پیچھے کوئی کرائے کا گوریلا تھا جس نے محسن کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کے اس کے بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور اب محسن کو ڈھال بنا کے آگے دھکیل رہا تھا۔ محسن کی پیشانی زخمی تھی اور خون کی ایک لکیر اس کے رخسار تک آ گئی تھی۔

"چلو اب تم بھی سامنے آ جاؤ میاں شہزادے۔" حاجی نے مجھے مخاطب کیا۔ "ہم تمہیں ایک موقع دیتے ہیں۔"

"تم مجھے ایک موقع دو۔" محسن بولا۔ اس کے بعد محسن نے جو کچھ کہا وہ ناقابل اشاعت ہے۔

محسن دروازے کے فریم میں بے بس کھڑا ہوا تھا۔ جو شخص اس کے پیچھے تھا وہ میرے نشانے سے محفوظ تھا۔ محسن کی مزاحمت کا اس گوریلے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جسمانی طاقت میں بھی وہ محسن پر بھاری تھا اور وہ اس طاقت کے استعمال کا فن بھی جانتا تھا۔ اپنی تمام کوشش کے باوجود محسن خود کو چھڑا سکا اور نہ اسے آگے لا سکا۔

پھر دروازے کی اوٹ سے ایک ہاتھ نمودار ہوا جس ہاتھ میں ایک تیز چمکیلی دھار والا خنجر تھا۔ خنجر کی نوک سے اس جگہ کو چھوا جہاں سے محسن کا خون رس رہا تھا۔ محسن نے سر کو پیچھے کرنا چاہا۔ اس کی یہ حرکت خود اس کو مہنگی پڑ جاتی اگر خنجر کی دھار آزمانے والا ہاتھ پیچھے ....

"کیا تمہیں اس لہو کا نظارہ اچھا لگا؟ تمہارے دوست کا تو سفید نہیں ہے۔ شاید تمہارا خون سفید ہو گیا ہے۔ زیادہ انتظار نہیں کر سکتے برخوردار۔ تم ہمارا صبر آزما رہے ہو۔ ہم تماشا دیکھتے رہے۔"

خنجر کی نوک نے ایک دم محسن کی پیشانی پر دوسری خراش ڈال دی۔ زخم گہرا نہیں تھا مگر کھال کے کٹ جانے سے بھی لہو پھوٹ کر بہنے لگا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ آنکھیں دیکھوں اور دل کو مضبوط رکھوں لیکن نہ جانے کیا ہوا میرے جسم پر ایک کمزوری سی غالب آنے لگی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں عجیب سی ٹھنڈک اترنے لگی جس سے بدن کانپنے لگا۔ پسینہ میرے ماتھے پر قطرے بن کے نمودار ہوا۔

"محسن!" میں نے کراہ کے کہا اور صوفے کی پشت کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے ایک چکر سا آیا۔ میں نے سر جھکا کے آنکھیں بند کر لیں۔ ریوالور نیچے گر گیا۔ صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ دوسرے لمحے نے مجھے اپنا اسیر کر دیا۔ انھوں نے مجھے اسی طرح اپنی گرفت میں لے لیا جیسے گزشتہ شب لیا تھا۔ اس بار انھوں نے زہر بجھا ہوا تیر استعمال نہیں کیا۔ انھوں نے میرے حواس اور اعصاب کو جنگ سے شکست دی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یہی وہ خون ہے جس کے ہر قطرے کو میں اپنی زندگی کے اثاثے سے عزیز تر جانتا ہوں۔

چند گھنٹوں کے فرق سے حالات کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے ستم ظریف تقدیر کی دخل اندازی سے ٹوٹا تھا۔ جیسے چلتے چلتے فلم ٹوٹ جاتی ہے۔ آزادی اور خوش فہمیوں کے طلسم کا یہ وقفہ آٹھ دس گھنٹے سے زیادہ نہ تھا۔ اگر ہم چاہتے تو اس مہلت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے۔ ہم جانتے تھے کہ شکاری گھات میں ہیں۔ اس کے باوجود رات اس جگہ اپنے قیام کو بے سبب طول دیا۔ تم پر الزام [illegible] جسم کی کارکردگی کی طمانیت بخش ہوئی تھی۔ ہم یہاں سے فرار ہو جاتے۔ چائے ناشتا اور ڈاکٹر سے گفتگو کرنے میں جو وقت ضائع ہوا وہ ہمیں تحفظ کی سرحد تک پہنچا سکتا تھا۔

اس بار واپسی میں مجھے اور محسن کو الگ الگ بٹھایا گیا۔ جب گاڑی روانہ ہونے لگی تو میں نے ڈاکٹر کو دو نرسوں کے ساتھ باہر آتے اور اس [illegible] کو دیکھا جو اس [illegible] سے ٹھہرا رہی تھی۔

[illegible] نے ایک حافظ نے [illegible] تھا کہ حاجی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "اب کوئی ضرورت نہیں۔ خون ناحق ہمارا شیوہ نہیں ہے۔"

"وہ پولیس کو فون کرے گا۔"

"کرنے دو میاں۔ آخر اس کا خسر اتنا بڑا پولیس افسر ہے۔" حاجی نے طنز اور تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

محسن کے ہاتھ پیر انھوں نے پہلے ہی باندھ دیے تھے اور اب ایک شخص وہی خنجر اس کے حلق پر آہستہ آہستہ پھیر رہا تھا۔ یوں جیسے اس کی دھار تیز کر رہا ہو۔ وہ بار بار میری طرف دیکھ کے مسکراتا تھا اور اس کی مسکراہٹ چیخ چیخ کر کہتی تھی کہ ہمت ہے تو کچھ کر کے دکھاؤ۔ تم تو خالی ہاتھ بھی گنتوں کے پٹھے لگ سکتے ہو۔

حاجی میرے سامنے دوسری سیٹ پر براجمان تھا۔ ہم دونوں آگے پیچھے کی سیٹوں پر تھے۔ ایک سیٹ مخالف سمت میں کھڑکی کے ساتھ تھی۔ اس پر دوسرا شخص ایک نقل نظر آنے والا پستول لیے بیٹھا ہوا تھا مگر مجھے اس کی نال میں گولی کی جگہ وہی مفلوج کر دینے والا تیر دکھائی دے رہا تھا۔ چنانچہ میں مزاحمت بھول کے بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

"اب تم ماشاء اللہ اتنے سمجھ دار ہو۔" حاجی نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "تمہیں شکر بجا لانا چاہیے اس رب کریم کا کہ اس نے تم کو عقل و شعور عطا کیا اور تم پر اپنا فضل و کرم رکھا۔ ورنہ آج یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تمہیں وہ اخوان الشیاطین لے جاتے۔ دلاور اور سراج۔"

"تم بھی تو انھی میں سے ہو۔" میں نے کہا۔ "یا تم کوئی نیا ڈراما کرنا چاہتے ہو مجھے یقین دلانے کے لیے کہ تمہارا اور ان کا تعلق باقی نہیں رہا۔"

"لعنت اللہ علی الکاذبین۔" اس نے بڑی قرأت کے ساتھ کہا۔ "ہم دروغ گوئی سے کام نہیں لیں گے۔ وہ ایک کاروباری تعلق ہے۔ دنیاوی معاملات میں افہام و تفہیم سے کام لینا پڑتا ہے۔ دین اور مسلک میں ان کے اور ہمارے درمیان بعد قطبین ہے۔ مگر تم سے بھی ایک کاروباری معاملے میں مفاہمت چاہتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر تم دور اندیش اور دانش مند ہو برخوردار تو ہم سے معاملہ کر کے فائدے میں رہو گے۔"

"تم جیسے ابلیس سے معاملہ کرنے والا فائدے میں کیسے رہ سکتا ہے؟" محسن نے نفرت سے کہا۔

گاڑی ایک بہت وسیع اور صاف ستھری شاہراہ پر

www.paksociety.com

سے گزر رہی تھی۔ میری نظر نے سڑک کے کنارے لگے ہوئے روڈ سائن پر شہید ملت روڈ پڑھا۔ اس سڑک پر صرف گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ پھر ایک بہت بڑا چوک آگیا جس پر ہر سمت سے پانچ چھ سڑکیں ملتی تھیں۔ اس چوک کے گرد گھوم کر گاڑی دوسری سڑک پر آئی تو مجھے سینٹرل جیل کی بلند دیوار اور واچ ٹاور نظر آئے۔ جیل کی دیوار کچھ دور ساتھ رہی پھر گاڑی ایک اور چوراہے سے سیدھے ہاتھ کی طرف گھوم گئی۔ میں نے چوک سے گزرتے ہی اپنے مقابل تھانہ نیو ٹاؤن کا بورڈ دیکھا۔ سیدھے ہاتھ پر مجھے چند کوٹھیاں دکھائی دیں۔ پھر لیاقت نیشنل لائبریری کی وسیع و عریض مگر ویران سی عمارت گزری اور اچانک ٹی وی اسٹیشن آگیا۔

"اس راستے کو پہچان لو۔" حاجی نے کہا۔ "ہم تم کو موقع فراہم کر رہے ہیں۔"

احمد کے ہاتھ میں ایک تھرماس تھا۔ اس نے ڈبل کپ والے تھرماس کو کھولا۔ "برخوردار سکندر اعظم! یہ حقیقت ہے کہ ہمارا ارادہ تم کو نقصان پہنچانے کا بالکل نہیں ہے۔ حالانکہ تمہاری ذات سے کئی بار نقصان پہنچا۔ دلاور، سراج اور نواب خسرو جمشید سے تمہاری دشمنی کی نوعیت ذاتی اور سیاسی تھی۔ ہم سے تمہاری عداوت فی سبیل اللہ رہی۔ میاں! ہم کسی کی برائی بھلائی میں نہیں۔ اُدھر کا مال اِدھر کرتے ہیں، اِدھر کا اُدھر۔ سالے خطرات مول لیتے ہیں لیکن سوال کوئی نہیں کرتے ہیں۔"

اس منافق، دروغ گو اور دوغلے شخص کی مکاری پر میرا خون کھول رہا تھا۔ کتنی ڈھٹائی سے وہ خود کو تمام معاملات سے بے تعلق ثابت کر رہا تھا اور معصوم بن رہا تھا۔ اس شخص کی طرح جو دوست قاتل میں خنجر تھمائے اور پھر کہے کہ بھئی قتل سے اور قاتل یا مقتول کے معاملات سے ہمیں کیا کہ کس نے کسے مارا اور کیوں مارا۔ ہم تو کسی کی برائی بھلائی میں نہیں ہیں۔

گاڑی ایک کوٹھی کے کھلے پھاٹک سے اندر چلی گئی۔ گونگے ڈرائیور نے [illegible] نیچے اترا اور گیراج کے شٹر میں پڑے ہوئے قفل کو کھولنے لگا۔ تھرماس رکھ کے حاجی نے اپنے چغے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک پاکٹ سائز قرآن مجید نکال لیا۔ "لو میاں! ہمارے اور تمہارے بیچ اللہ کی یہ ضمانت۔" اس نے قرآن مجید کو دونوں ہاتھوں میں سنبھال کے چوما۔ "ہم اس کو گواہ بناتے ہیں کہ تمہارے اور ہمارے درمیان ایک بات اصولی طور پر طے ہو گئی تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ نہ تمہارے بارے میں کسی کو کچھ بتائیں گے۔ اور تم کو آزاد کر دیں گے کہ تم جہاں چاہو جاؤ۔" اس نے قرآن کو واپس جیب میں رکھ لیا اور تھرموز اٹھا لیا۔

"یہ لو، چائے پیو۔" اس نے پہلا بڑا مگ بھر کے پینے کے لیے نکالا اور دوسرا مگ مجھے تھما دیا۔ یہ تھکن اور نقاہت بھی تھی اور میرے خیالات میں رونما ہونے والی تبدیلی بھی جس نے مجھے وہ کپ لینے پر مجبور کر دیا۔ حاجی نے قرآن اٹھا کے ایک عہد کیا تھا۔ وہ لاکھ عیار اور بے ضمیر سہی، کوئی بھی مسلمان خواہ اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو، عملاً قرآن کو ہاتھ میں لے کر جھوٹ بولتے ہوئے ڈرتا ہے۔ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ حاجی کس معاملے پر بات کرنے کا خواہش مند ہے۔ عقل کا تقاضا تھا کہ میں اس کی بات ضرور سنوں۔ بات کو ماننے یا مسترد کرنے کا اختیار کلی طور پر میرا اپنا تھا۔ اس طرح مجھے مہلت بھی مل رہی تھی اور وقت ہی میری سب سے بڑی ضرورت تھا۔ وقت مل جائے تو میں کچھ سوچ سکتا ہوں، کچھ کر سکتا ہوں۔

"بات بہت مختصر اور واضح ہے برخوردار۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے اسمگلروں کے سونے سے بھرے ہوئے ٹرک کو سمندر میں غرق کر دیا۔ چوہدری دلاور بھی تم سے یہ معلوم کرنے میں ناکام رہا کہ سونا کہاں ہے۔ تم ہمیں وہ جگہ بتا دو۔ اگر سونا وہاں سے مل گیا تو ہم تمہیں اس بات کی ضمانت دیں گے کہ تمہیں اور تمہارے دوست محسن کو بحفاظت کہیں بھی پہنچا دیا جائے۔ ہم جو حلف اٹھا چکے ہیں اس پر قائم رہیں گے۔ بشرطیکہ تم ہمارے ساتھ وفاداری کرو۔"

گونگے نے گیراج کا شٹر اوپر اٹھا دیا تھا۔ وہ مائیکروبس کو سیدھا اندر لے گیا۔ گیراج کی لمبائی اتنی تھی کہ اس میں دو گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی کی جا سکتی تھیں۔ دوسری گاڑی پہلے ہی اس میں موجود تھی۔ مائیکروبس کو پیچھے لگا کے گونگا پھر اترا اور اس نے شٹر گرا کے قفل اندر کی جانب لگا دیا۔ گیراج [illegible] اندھیرا ہو جاتا۔ حاجی نے چائے ختم کر لی تھی لیکن وہ [illegible] جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے محافظ [illegible] طرح مستعد تھے۔ یہ اہتمام صاف ظاہر کر رہا تھا کہ [illegible] کو اسی گیراج میں چھوڑ دیا جائے گا کہ سال [illegible] کراچی کی ساری پولیس مل کے بھی اسے تلاش نہ کر سکے گی۔ آگے ہم جہاں ابھی جا رہے ہیں [illegible] دوسری [illegible] میں جا سکے۔

حاجی کے حکم پر محسن کے زخموں کی مرہم پٹی بھی کر دی گئی تھی اور اس کے ہاتھ پیر بھی کھول دیے گئے تھے۔ محسن کو بطور ضمانت مجھ پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ماں پر قابو پانے کے لیے اس کے کمزور شیر خوار بچے کو قبضے میں کر لے۔ میرے مقابلے میں محسن اس لیے کمزور تھا کہ وہ خالی ہاتھوں سے اپنا دفاع کرنا نہیں جانتا تھا اور میرے خالی ہاتھ اس لیے بے مصرف ہو گئے تھے کہ محسن میری جذباتی کمزوری تھا۔

میں نے چائے کا خالی مگ حاجی کے سامنے رکھ دیا۔ فیصلہ میں فوراً بھی سنا سکتا تھا مگر میں نے ظاہر کیا کہ ابھی میں سوچ رہا ہوں۔ حاجی نے مجھے اس کا موقع فراہم کیا اور میرے خالی کیے ہوئے کپ میں تھرماس کی چائے انڈیل کر محسن کی طرف بڑھا دی۔ پھر اس نے مجھے سگریٹ اور لائٹر پیش کیے۔

"یہ کوئی بڑی قیمت نہیں ہوگی تمہاری زندگی اور آزادی کی۔" حاجی نے اپنی کامیابی کے امکانات روشن دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ بات ہمارے اور تمہارے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوگی۔"

"دلاور کو بھی نہیں؟" میں نے سگریٹ کی پیشکش کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ [illegible] میں کوئی نشہ آور چیز نہ ڈال رکھی ہو۔ چائے تو حاجی نے اسی تھرماس میں سے خود بھی ہمارے ساتھ پی تھی۔

"ہم سیدھی صاف بات سننا چاہتے ہیں۔" وہ بولا۔

"سیدھی صاف بات یہ ہے میاں حاجی!" میں نے اسی کے لہجے میں کہا۔ "کہ تم کیا تمہارا سارا خاندان، تمہارے آبا و اجداد اور تمہاری آنے والی نسلیں سب ہزار بار قرآن پر حلف اٹھا کے تمہارے قول کی ضامن ہوں تب بھی میں تم پر اعتبار کرنے والا نہیں۔ لیکن بفرض محال یہ ممکن ہوتا تب بھی تمہارے مطالبے پر کسی قسم کی مفاہمت کرنا میرے لیے ناممکن ہوتا۔ چونکہ تمہارا اس کاروبار سے تائب ہو کے اپنا سب کچھ ملک و قوم کے لیے وقف کر دینا [illegible] اس شخص کو چھوڑ کے تمہارے کاروبار وطن فروشی میں شریک ہو جاؤں؟"

حاجی کا چہرہ حقارت اور غصے سے سرخ ہو گیا۔ "ہم جانتے تھے میاں کہ تم [illegible] کی قوم ہو۔ ہم نے کب کہا تھا کہ [illegible] تم کرتے ہو۔ اس سونے کی کسی کو [illegible] ہمیں صرف وہ جگہ دکھا دیتے۔"

"حاجی! تم واقعی چالاک احمق ہو۔" میں نے کہا۔ "کیا تم واقعی مجھ سے یہ توقع رکھتے تھے کہ میں وہ سونا تمہارے حوالے کر دوں گا اور اس کے بدلے تم سے اپنی زندگی کا سودا کروں گا۔ ہماری تو ایک جان ہے۔ اس سونے کی ہلاکت خیزی تو کسی ایٹم بم سے بھی زیادہ ہے۔ وہ سونا تمہارے ذریعے علیحدگی پسندوں، باغیوں اور تخریب کاروں تک پہنچے گا تو اس سے ہزاروں نہتے، بے گناہ اور محب وطن پاکستانی نوجوانوں، عورتوں اور بچوں کے لیے موت کا سامان بن جائے گا۔ وہ طاقت بن جائے گا جو دنیا کے بازار میں اسمگل ہو کر [illegible] ہے۔ ایک اسمگلر [illegible] کرتی ہے جس کے بدلے بم، گولیاں اور بم، بارودی سرنگیں اور راکٹ لانچر، آگ اگلنے والے ڈائنامائیٹ اور [illegible] سب مل جائیں گے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے ہی ہم وطنوں کی موت کا یہ بلینک چیک تمہارے حوالے کر دوں۔ ان کو بچانے کی جدوجہد چھوڑ کے میں ان کے بے گناہ لہو کی تجارت کرنے لگوں؟"

حاجی نے میرے منہ پر الٹے ہاتھ کا چانٹا مارا۔ "بدبخت! ابھی تیرے جذبات کی سرکشی باقی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے ایک مصحف اٹھا لیا تھا۔"

"ملعون حاجی!" میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ "اللہ کی مقدس کتاب کو تو بخش دیتا۔"

اس نے کندھے پر پڑے ہوئے سفید رومال سے چہرہ صاف کیا اور بولا۔ "کس کافر نے قرآن پر حلف اٹھایا تھا۔ یہ دیکھو، یہ بھی تو وہ کتاب ہے۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے وہی کتاب نکالی جس کو میں نے قرآن مجید مان لیا تھا۔ وہ درحقیقت گہرے سبز رنگ کی جلد والی ایک ڈائری تھی جس کے اوپر سنہرے حروف میں عربی رسم الخط میں ناشر کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کے زریں حاشیے کے وسط میں جو طغرہ سا بنا ہوا تھا اس میں بھی نیا سال مبارک اس طرح لکھا ہوا تھا کہ نقش و نگار سے مدغم تھے اور عبارت ایک نظر میں پڑھی نہیں جا سکتی تھی۔ بلاشبہ اس ڈائری کو قرآن کے جلد سے مشابہ بنانے والے کی شیطانی ذہانت افسوس ناک تھی۔ شاید خود حاجی نے اس ڈائری کو اپنے شیطانی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ بنانے والے نے تو ایک خوب صورت ڈائری ڈیزائن کی تھی۔ اور اس کے ذہن میں دور دور تک یہ خیال نہ ہوگا کہ وہ کسی گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔ نہ اس نے سوچا ہوگا کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی حاجی کہلانے والا ایسا حاجی بے حیا بھی ہوگا جو اس ڈائری کا ناجائز استعمال یوں کرے [illegible]

www.paksociety.com

کرے گا۔

"جزاب بار لعنت ہو تم پر کہ تم نے اس کتاب مقدس کے نام پر دُنیا کے سامنے جزاب بار حلف اٹھایا۔ اسے اپنا اعتبار قائم کرنے کے لیے استعمال کیا اور بدعہدی کرنے کے بعد خود کو یہ دھوکا دیا کہ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔" میں نے ڈانٹ اس کے منہ پر کھینچ ماری۔

محسن بالکل خاموش تھا۔ شاید اسے شدت سے یہ احساس تھا کہ اس کی وجہ سے میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا اور یہ اس کی کمزوری تھی جو میری کمزوری بنی ہوئی ہے۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے ٹیوب لائٹس کی روشنی مدھم پڑ گئی ہے۔ اندھیرے میں ہر چیز دھندلا گئی۔ میں نے سر کو جھٹکا۔ روشنی ذرا سی دیر کے لیے پھر آئی۔ میں نے حاجی کے خباثت سے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔ وہ چہرہ ساکت نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ ایک دائرے میں حرکت کرنے لگا تھا۔ پھر ایک چہرے کے کئی چہرے بن گئے۔ سب اس دائرے میں گھومنے لگے۔ میں آگے جھکا اور میرے کانوں نے حاجی کا بھیانک قہقہہ سنا۔ میں نے سر اٹھانا چاہا مگر سر کسی چٹان کی طرح بھاری تھا جو مجھے نیچے کھینچ رہی تھی۔

میرے ذہن تک آنے والا آخری خیال یہ تھا کہ حاجی نے دوبارہ مجھے زہر دے دیا ہے۔ اور یہ زہر یقیناً چائے میں تھا۔ بے شک اس نے میرے لیے اسی تھرماس میں سے چائے انڈیلی تھی مگر کپ جدا تھے اور زہر شاید میرے والے کپ کی سطح پر تھا جو چائے میں حل ہو گیا تھا۔

بے ہوشی کا یہ وقفہ کب ختم ہوا اور کتنی دیر جاری رہا اس کا اندازہ بھی میرے لیے مشکل ثابت ہوا۔ جہاں میں نے آنکھ کھولی وہاں رات کا اندھیرا تھا۔ متحرک اور زیر و زبر ہوتا اندھیرا۔ میں اس اندھیرے کے دریا کی سی تلاطم موجوں میں بہہ رہا تھا اور اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ جانے کس سمت میں رواں تھا۔ میں نے کئی بار آنکھیں کھولیں اور پھر بند کر لیں یہ سمجھ کر کہ تلاطم کا یہ فریب میرے حواس کی پیداوار ہے اور ابھی تک میں پوری طرح ہوش میں نہیں آیا ہوں۔

لیکن یہ سراب نہیں حقیقت تھی۔ میں ایک تاریک [illegible] بیٹھا ہوا تھا جیسے اندھیرے میں میری نگاہ کچھ نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس میں شک کی کوئی بات نہیں تھی کہ یہ کسی بحری جہاز یا لانچ پر ہوں اور سمندر میں رواں ہے۔

میں نے آہستہ سے محسن کو پکارا۔ "محسن ..." جواب صرف میری خاموشی نے دیا۔ یہ عجیب بات تھی کہ سمندر میں ہونے کے باوجود میں سمندر کی آواز سننے سے قاصر تھا اور وہ شور بھی مفقود تھا جو کسی لانچ یا بحری جہاز کے انجن سے پیدا ہوتا ہے۔

فرش پر ہاتھ پھیلا کے میں نے اندازہ کرنا چاہا کہ اس قید خانے میں محسن ہے یا نہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اس پر بے ہوشی ابھی باقی ہو۔ آہستہ آہستہ میں نے گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے اور ہاتھوں کو اندھیرے میں پھیلاتے ہوئے اپنے زنداں کی وسعت کو دیکھا۔ پھر مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے جسم پر کوئی لباس نہیں۔ اس کمرے یا کیبن میں میرے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی چاروں دیواریں سپاٹ تھیں اور ایک دیوار سے دوسری دیوار تک میرے اندازے کے مطابق آٹھ دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ ڈولتے ہوئے فرش کی سطح پر کھڑا ہونا آسان نہ تھا مگر میں نے ایک دیوار کو تھام لیا۔ اور اپنا ہاتھ سر سے اوپر اٹھایا۔ چھت بھی میری دسترس میں تھی۔ فرش سے آٹھ فٹ اوپر۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ لکڑی کے اس کیبن کی چھت شیشے جیسی تھی۔ اس کی چاروں دیواروں پر بنانی ووڈ کے پینل تھے۔ لمبی افقی لکیروں والے۔ اس کا فرش بھی لکڑی کا تھا۔ عموماً لانچوں اور بحری جہازوں میں لوہے سے زیادہ لکڑی کا استعمال کیا جاتا ہے خصوصاً اندرونی حصوں کی دیواروں کو موسمی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے۔ پرانی، سال خوردہ سمندر کے پانی کی برداشت کر جانے والی لکڑی جو نمی کے زنگ اور دیمک وغیرہ سے متاثر نہیں ہوتی اور لوہے کے مقابلے میں ہلکی بھی ہوتی ہے۔

محسن اس قید خانے میں میرے ساتھ نہیں تھا۔ ہمیں الگ رکھنے کی مصلحت وہی جانیں جو ہمیں یہاں لائے تھے۔ اور اب نہ جانے کہاں لیے جا رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ الیس الیس کراچی تو نہیں۔ ناممکن کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن میں حاجی عبداللہ کے مطالبہ زر کو [illegible] تو یہ بات کچھ [illegible] تھی۔

ہم نے [illegible] سے گھبرا [illegible] ٹرک کو [illegible] کے قریب سمندر میں غرق کیا تھا [illegible] والا [illegible] کو تقریباً پاگل کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ [illegible] ہو جانے گا۔ اب حاجی عبداللہ بھی [illegible] طور پر اس سونے کی بازیابی چاہتا تھا۔ اور [illegible] سراغ لگانے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔ ہمارا اعتماد [illegible] ایک کوشش [illegible] ناکامی کے بعد [illegible] ہو گیا تھا۔ اتنا بڑا کھیل وہ اتنی جلدی کیسے ختم کر دیتا۔ وہ [illegible] پر خاصا بھاری قیمتے کا [illegible] نہ جانے کب [illegible] دیکھ رہا تھا۔ اس کی تجربہ [illegible] سمجھتے تھے اور شاید اس [illegible] اور اپنے کیبن کو بے خبر رکھتے ہوئے اپنے شکاری [illegible] تعاقب میں چھوڑ دیا تھا کہ جیسے ہی ممکن ہوا [illegible] اور دیکھو خبردار ان کو زندہ و سلامت پکڑ [illegible] کیونکہ وہی اس گمشدہ خزانے کی کلید ہیں [illegible] سے اس کاروبار میں کوئی کسی کا یار نہیں تھا اور [illegible] کے درمیان کوئی اخلاقی یا اصولی معاہدہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

کیبن کے اندر نہ سردی تھی اور نہ گرمی۔ اس میں کہیں ہوا کے اخراج کا انتظام بھی پوشیدہ تھا۔ اور تازہ ہوا کے لیے بھی کوئی راستہ ضرور تھا۔ شاید اس لکڑی کی دیوار [illegible] میں ہوا کی نالیاں ہوں یا کسی گوشے میں جالیاں ہوں۔ ہوا اوپر سے آتی ہو۔

مگر اوپر تو چکنی سطح تھی سخت اور پالش کی ہوئی۔ میں نے اسے دوبارہ چھو کر دیکھنا چاہا۔ چھت میں سنگ مرمر یا شیشہ جیسی سختی وارد۔ چھت میرے ہاتھوں کی پہنچ سے چند انچ دور تھی۔ میں نے ایڑیوں پر بلند ہو کے اسے چھو لیا۔ اس بار مجھے قطعی شک نہ رہا کہ چھت میں شیشہ لگا ہوا ہے۔

میں اندھیرے کی پناہ میں تھا اور تنہا تھا۔ چنانچہ مجھے اپنے بے لباس ہونے کا احساس زیادہ پریشان نہیں کر رہا تھا۔ یہ ہمیشہ سے اسیر رکھنے والوں کا وتیرہ رہا ہے کہ اسیروں کو خود اپنی نظر سے گرا دو۔ ان کو جسمانی اذیت سے زیادہ ذہنی عذاب دو اور ان کو نفسیاتی طور پر شکست کا احساس کرنے سے دوچار رکھو۔ لباس ہر مہذب آدمی کے لیے عزت نفس کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہ لباس سے بھی اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے اور اس کی ذات کی تکمیل لباس کے بغیر نہیں ہوتی۔ خلوت میں بھی وہ خود کو ادھورا سمجھتا ہے [illegible] اسیر [illegible] تو اس سے زیادہ ذلت کا تصور کیسے [illegible] صدی کے معاشرے میں انسانوں کو کسی [illegible] طرح پیش کر دیا جائے۔

[illegible] کہ جب اس کیبن میں اچانک روشنی نے [illegible] تو میں چونک پڑا۔ اور پھر ایسے سمٹ گیا جیسے کسی نے میرے غسل کے دوران میں لات مار کے غسل خانے کا دروازہ توڑ دیا ہو۔ میں بے اختیار گھٹنوں میں سر دیے اور دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ روشنی اوپر سے آتی تھی۔ اسی شیشے کی چھت سے جسے میں نے محض چھت سمجھا تھا۔ اب وہ روشنی کا ایک مستطیل بن گئی تھی۔

آہستہ آہستہ میں نے سر اوپر اٹھا کے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے کوندا سا لپکا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بہت زیادہ قوت رکھنے والی بجلی کا جھٹکا میرے دماغ کو مفلوج کر گیا ہے۔ شاید پاگل خانے میں ان ذہنی مریضوں کو ایسی ہی اذیت ہوتی ہوگی .... جن کو سزا یا علاج کے لیے بجلی کے [illegible] جھٹکے دیے جاتے ہیں۔

ڈرتے ڈرتے میں نے پھر آنکھیں کھولیں اور اس بار خوف اور دہشت کے ساتھ شدت جذبات کی دیوانگی نے مجھے مغلوب کر لیا۔ میں دیوانہ وار چلایا۔ "رابعہ!"

شیشے کی شفاف روشن چھت کے اوپر ایک اتنے ہی بڑے کمرے میں رابعہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے بیڈ تھا اور دائیں جانب مختصر سی سنگھار میز۔ اس نے پیروں کو بیڈ تک پھیلا لیا تھا۔ اور بہ ظاہر اطمینان سے گود میں رکھی ہوئی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ کمرے میں ایک دروازہ باہر جانے کے لیے تھا۔ جو بند تھا۔ دوسرا دروازہ چھوٹا سا کھلا ہوا تھا اور شاید باتھ روم کا دروازہ تھا۔ رابعہ کے سیدھے ہاتھ پر سنگھار میز تھی جس کے اوپر ایک پورٹیبل ٹرانسسٹر ریڈیو بھی رکھا ہوا تھا۔ وہ کچھ کھا رہی تھی۔ پھر وہ کتاب رکھ کے اٹھی۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے ریڈیو کو بند کیا۔ یا شاید اس کی آواز کم زیادہ کی۔ میں تو صرف مکمل خاموشی میں اس کو اور اس کی حرکات و سکنات کو ایسے دیکھ سکتا تھا جیسے سینما کے روشن پردے پر خاموش فلم چل رہی ہو۔ کوئی آواز میرے کانوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔

رابعہ نے باتھ روم کا دروازہ بند کیا جو [illegible] کی مسلسل حرکت کے باعث جھول رہا تھا۔ اور بار بار کھل جاتا تھا۔ اس نے ایک بار اسے آہستہ سے اور پھر زیادہ قوت سے اپنی طرف کھینچ کے بند کیا۔ دروازے کے پٹ چوکھٹ سے ٹکرانے کی آواز کم نہ ہوگی مگر میں نے آہٹ تک نہ سنی۔ دروازے کی کنڈی شاید ٹوٹی ہوئی تھی کہ رابعہ نے دروازے کو اس کے حال پر چھوڑا اور منہ بناتی واپس آئی۔ کتاب درمیان سے کھلی ہوئی بیڈ پر الٹی رکھی تھی۔ پھر [illegible]

www.paksociety.com

پر بیٹھ کے اس نے کتاب اٹھائی اور مطالعے میں مصروف ہو گئی۔ اس کا دایاں ہاتھ بار بار کسی پلیٹ کی جانب جاتا تھا۔ شہد جانے وہ کیا چیز تھی جس کو وہ دانہ دانہ کر کے منہ میں ڈالتی جا رہی تھی۔

میں گردن اٹھائے محویت اور بے خودی کے عالم میں اسے گھورتا رہا۔ فراق کی کتنی پُرخار راہوں کی مسافت طے کر کے، تجربے کے کتنے دکھوں کے انگاروں پر چل کے، جدائی کی کتنی کٹھن ساعتوں کو جھیل کے میں یہاں تک آ گیا تھا۔ صحرا صحرا بھٹکنے والے شہزادے نے بالآخر آنکھ کھولی تو خود کو اس جادو کے محل میں پایا جہاں اس کے خوابوں کی شہزادی خوابیدہ تھی۔ اب وہ اسے دیکھ رہا تھا لیکن اس کا وجود پتھر ہو گیا تھا۔ وہ ایک قدم آگے نہیں جا سکتا تھا۔

وہ میرے سامنے تھی۔ میرے اور اس کے درمیان دس فٹ کا فاصلہ بھی نہیں تھا۔ دس ماہ کی دوری میرے لیے دس صدیوں کے عذاب پر محیط تھی مگر اب اس کے اور میرے درمیان زندان کی بے حس دیواریں حائل ہو گئی تھیں۔ میرے پیروں میں مجبوری کی زنجیر تھی۔ ایسی حالت پر خیالات اور شرمساری تھی جس نے مجھے دیوانگی کا پیکر بنا رکھا تھا۔

یہ ایک خواب کا منظر تھا۔ ایسے بہت سے خواب میری یادوں کی البم میں سجے ہوئے تھے، جب اس نے اپنی دید سے میری ترسی ہوئی آنکھوں کی پیاس بجھائی تھی۔ آج پھر میں اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ حقیقی رابعہ تھی۔ آرزو کے خواب کا پیکر نہیں تھی مگر اس میں اور نقشِ خیال میں کیا فرق تھا۔ نہ یہ میرے اختیار میں، نہ وہ خواہشوں کے حصار میں۔ میں صرف اس کے قرب کی آرزو کر سکتا تھا۔ اسے چھونا، اس کے وجود کی مہک کو سمیٹنا اور اس کے پیار کی ٹھنڈک میں ڈوب کے اس آگ کو سرد کرنا جو میرے تن کے ویرانے میں بھڑک رہی تھی، ناممکن تھا۔

وہ آج بھی پہلے کی طرح تھی۔ نہیں، یہ تو وہ تصویر تھی جو دل کے آئینے میں ماہ و سال کی رنگ آمیزی سے محفوظ پڑی تھی۔ حقیقت کا عکس زیادہ دلنظر نواز تھا۔ دس ماہ میں اس کے حسن کی تابکاری اتنی ہی بڑھ گئی تھی جتنی دس دن میں نئے چاند کی روشنی بڑھ جاتی ہے۔ اس کے سراپا کی رعنائی میں نئی بہار کی روشنی جھلکتی تھی۔ جیسے ہر لمحہ گزرتے ہوئے اس کے حسن کو نکھارتے گیا ہو۔ وہ ہلکے نسواری رنگ کی قمیص پہنے ہوئے تھی جس کے گول گلے سے اس کی گردن کی نازکی اور جلد کی سنہری رنگت عیاں تھی۔ آدھی آستین والی قمیص سے اس کے گداز بھرے بازو اس کی پشت پر تیرتے سے لہراتے گیسو اور اس کی زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں جھلملاتا ہوا آویزہ۔

اس کے جلوۂ تاب نے شوقِ دیدار کو بالآخر تمنا کی اس منزل تک پہنچا دیا جہاں اسے پانے کی دیوانگی میری عقل پر غالب آ گئی۔ اب میں چاہتا تھا کہ اس شفاف سطح کو توڑ کے اس تک پہنچ جاؤں۔ شیشے کی اس اٹل دیوار کو ریزہ ریزہ کر کے اسے یوں چھین لوں کہ وہ خود بخود میری بانہوں میں آ گرے۔ میں اس کی آواز سننا چاہتا تھا۔ اس سے وہ سب کہنا چاہتا تھا جو میرے دل میں غبار بن کے بھر گیا تھا۔ اب اسے دیکھا تو یہ غبار چھٹنے لگا۔ میرے سینے میں اس غبار کو آندھی کا دباؤ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ساری طنابیں ٹوٹ گئیں۔ صبر احساس مٹ گیا۔ سوائے اس کے عشق کی وارفتگی کے۔

"رابعہ!" میں نے کھڑے ہو کر اور چیخ کر کہا۔ "رابعہ ادھر دیکھو، میری طرف دیکھو رابعہ! تم سن رہی ہو میری آواز! کیوں نہیں سن رہی ہو؟ تمہارا دل تم سے کچھ نہیں کہتا کہ شیشے کوئی ہے جو اندر سے پکارتا ہے؟ دل کی دھڑکن بولتا ہے۔ رابعہ، یہ میں بول رہا ہوں، تمہارا سکندر... رابعہ...! رابعہ... رابعہ...!!"

میں پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ اسی سکون سے کتاب پر نظر جمائے کرسی کی پشت کا سہارا لیے بیٹھی رہی۔ دیواروں نے میری آواز کو بھی قید کر لیا تھا۔ اس کے انداز بے نیازی نے میرے شوق کی دیوانگی کو اور بڑھا دیا۔ میں اوپر کی جانب اچھلنے لگا۔ میں اپنے اور اس کے درمیان اس بے وجود فصیل کو گرا دینا چاہتا تھا جو مجھے اس کے جمال شعلہ ساماں کی تابانی تو دکھاتی تھی مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں اس شیشے کی شفاف چھت کو توڑنے کی کوشش میں اپنے خالی ہاتھوں کی لاٹ کو استعمال کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنے ہاتھوں کی ضرب کاری پر بھروسا تھا۔ شیشہ کیا اگر اس کی جگہ اینٹ چونے کی دیوار بھی ہوتی تو میں اسے گرا دیتا۔ میرے شوق کی وحشت نے مجھے اس سے کہیں زیادہ طاقت عطا کر دی تھی لیکن وائے بدنصیبی، نارسائی۔ میرے ہاتھ مشکل لب بام تک پہنچتے تھے۔

میں نے دھر اُدھر دوڑ کے دیواروں پر قدم جمانے کی چھت تک پہنچ کے شیشے پر گھونسے مارنے چاہے، لیکن میری ساری کوشش رائیگاں گئی۔ میں اس جگہ تک بھی پہنچا جہاں وہ بیٹھی تھی اور میں اس کے پیروں کے گلابی تلووں سے صاف دیکھ سکتا تھا۔ میں نے جست لگائی مگر صرف ان قدموں کے نیچے کی سطح کو چھو سکا۔ میں اسے متوجہ کرنے کے لیے اپنا ہاتھ یا اپنا سر اس شیشے کی دیوار سے نہ ٹکرا سکا۔

بالآخر میں تھک کر گر گیا اور فرش پر گر کے ہانپنے لگا۔ میری آواز بیٹھ گئی تھی۔ اور میں پسینے میں شرابور تھا لیکن میری نظریں اسی پہ جمی ہوئی تھیں۔ اور میں اب بڑی اداسی کے عالم سے پکار رہا تھا۔ کانوں سے شرمندہ احساس سے زمیری آواز کو پہچانو، میرے قریب آؤ... جذبات کی زبان ہی تو کچھ کہاں ہیں وہ سب جو کہتے ہیں کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ نیلی چھتی اور خیالوں کی فریکوئنسی کے ایک ہونے کی باتیں کرنے والے۔ جو سمجھتے ہوں ہزاروں میل کی دوری سے احساس کی ہم آہنگی پیدا ہو جانے کے معجزوں پر یقین رکھتے ہیں۔ یہاں میں اس کے اتنے قریب ہوں اور میرے وجود کا ذرہ ذرہ اسے پکارتا ہے مگر وہ نہیں سنتی۔ آخر کیوں؟ میرا عشق خام ہے یا اس کا دل ابھی تک دس ماہ کے ہجر کی مسافت پر احساس سے بیگانہ ہے!

پھر مجھے خیال آیا کہ وہ اس شیشے کی زمین پر نظر کیوں نہیں ڈالتی جس پر اس کا نقش استوار ہے۔ یہ مانا کہ وہ روشنی میں ہے اور میں اندھیرے تہ خانے میں مقید ہوں، مگر پھر بھی کیا اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ تھوڑی سی بہت روشنی تو اس کے قدموں کے نیچے بھی ہے۔ وہ مجھے واضح طور پر نہ سہی، میرا سایہ تو متحرک دیکھ سکتی ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ جہاں وہ ہے اس کے نیچے تہ خانہ موجود نہیں، ایک خلا ہے۔ ہاں یہی بات ہو گی۔ وہ صرف اوپر اور دائیں بائیں دیکھ سکتی ہے۔ اس کی حد نگاہ دیواروں تک ہے اور شیشہ جو مجھے شفاف نظر آتا ہے اسے ایک ٹھوس سنگ کی طرح لگتا ہو گا۔

اس شیشے میں روشنی کا گزر یک طرفہ ہو گا۔ یہ پولرائزڈ گلاس ہو گا۔ وہ شیشہ جس میں سے ایک ہی رخ سے صرف ایک طرف دکھتا ہے۔ دوسری طرف سے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسا شیشہ بہت سی عمارات کی بیرونی ساخت میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض کھڑکیوں میں جو باہر کی طرف کھلتی ہیں اور سیاہ کوٹوں میں۔ ڈالٹن ہوپ اور ٹاپ ریسٹورنٹ جہاں سے ہر طرف کا نظارہ کیا جا سکتا ہے اور یہاں ایسے شیشوں کی دیواریں تحفظ کا کام کرتی ہیں۔ یہ احساس دلاتی ہیں کہ باہر کی دنیا کی نظریں تمہیں نہیں دیکھ سکتیں، تو دنیا کے درمیان رہ کے بھی اپنی خلوت برقرار رکھتا چاہتے ہو؟

یہ بڑا مایوس کن خیال تھا۔ پاگل کرنے والے جذبات کا پہلا طوفانی ریلا گزر چکا تھا۔ اب میں نے پھر خود کو سنبھالا اور صورت حالات کا جائزہ لیا۔ روشنی میں کمرے کے خد و خال بھی زیادہ واضح ہو گئے تھے۔ بظاہر دیواریں ایک سی تھیں اور کوئی جوڑ کسی دروازے کی نشاندہی نہیں کرتا تھا مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میرا وجود کسی راستے کے بغیر اس زندان میں پہنچ گیا ہو۔

میں نے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پلائی ووڈ کے ہر تختے کی لکیر کو غور سے دیکھا جو فرش سے چھت تک ایک دوسرے کے متوازی تھیں اور ان میں کہیں کوئی فرق نہیں تھا۔ اتنا تو میں نے معلوم کر لیا کہ انہی جھریوں میں وہ مسام ہیں جو تازہ ہوا کی فراہمی کے ضامن ہیں۔ پھر ایک جگہ مجھے لکڑی کی جھری نسبتاً چوڑی اور ناہموار سی محسوس ہوئی۔ میں نے اس تختے کو دبا کے دیکھا۔ تختہ نیچے سے اوپر تک ہل گیا۔ یہ ایک کونا تھا جس میں فرش سے چھت تک دو فٹ چوڑا دروازہ بڑی مہارت سے بنایا گیا تھا مگر مسلسل استعمال کے بعد تھوڑا سا فرق پڑ جانا تو لازمی تھا۔

اس دریافت نے مجھے کچھ خود اعتمادی عطا کی۔ میں نے دروازے پر زور زور سے ہاتھ مار کے چلانا شروع کیا۔ "ہاہا... اکو کے بچے، سور کے بچے، کتے کی اولاد!" میں نے کوئی جواب نہ پا کے دروازے پر زیادہ قوت سے ٹکریں ماریں اور اسے زیادہ شرمناک گالیاں دیں، مگر میری یہ کوشش بھی لاحاصل رہی۔ ان لکڑی کی دیواروں کے پیچھے فولادی چادریں تھیں۔ لکڑی نے بدصورتی کو چھپایا تھا اور یہ آرائش کی تھی۔

ایک بار پھر میں تھک کے لیٹ گیا۔ میرے سر کے اوپر وہی جادوئی منظر تھا۔ رابعہ کسی شہزادی کی طرح محو استراحت تھی۔ اس نے ایک تکیہ دہرا کر کے اپنے سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔ وہ اب کوئی کتاب نہیں پڑھ رہی تھی بلکہ صرف موسیقی سن رہی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس کے پیروں کی حرکت سے ہوا۔ وہ غیر ارادی طور پر کسی گیت کی لے اور تال کا ساتھ دے رہی تھی۔ رابعہ کا بیڈ ایک کنارے پر تھا۔ چنانچہ مخالف سمت کے گوشے سے ہی میں اس کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ زیادہ قریب ہونے سے وہ آؤٹ آف فوکس ہونے لگتی تھی۔ ٹھیک اس کے بیڈ کے نیچے مجھے کچھ نہ دکھائی دیتا۔ چنانچہ میں دور سے اس کو گھورتا رہا۔ حیوانوں سے بدتر حالت میں... ایک حیوان ناطق ہونے کا دعویدار، جو رابعہ کا پرستار تھا، اس مختصر کمرے میں کسی پاگل

www.paksociety.com

کُتے کی طرح بند کردیا گیا تھا۔

مجھے رابعہ کو دیکھ دیکھ کر طیش آنے لگا۔ کیسی بے فکری سے بیٹھی گانے سن رہی ہے۔ اُلّو کی پٹھی ذرا اثر نہیں اس پر مجھ سے جُدائی کا کوئی غم نہیں، میرا کوئی فکر نہیں کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ چہرے پر کیا بشاشت اور تازگی ہے۔ جیسے تقدیر سے کوئی شکوہ نہیں۔ دن عید ہیں تو راتیں شب برات اور راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

مجھے وہ وقت بھی یاد آیا جب رابعہ نے مجھے صاف بتا دیا تھا کہ وہ آزمائشوں کے اس سفر میں اور زیادہ ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔ اور اپنی تمام عمر ایک خواب کی تعبیر کے سراب کا تعاقب کرتے نہیں گزار سکتی۔ کون جانے وہ دن آئے نہ آئے، جب ناامیدی اور خوف کے سایوں کی رات ڈھلے اور اُجالوں کی صبح کا سورج نکلے۔ اس نے مجھے صاف کہہ دیا تھا کہ میں اسے بھول جاؤں۔

بے شک اس کے بعد یہ وضاحت بھی کردی تھی کہ وہ سب ایک ضرورت کے تحت اور جانے نا جانے کے لیے کیا گیا تھا مگر اس کے بعد کیا ہوا؟ کیا اس نے مجھ سے ملنے کی کوئی کوشش کی۔ اس کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں تھا کیونکہ وہ کسی کی قید میں نہیں تھی۔ وہ میرا سراغ بھی لگا سکتی تھی لیکن وہ کچھ بے علم ہم سب سے دور رہی۔ اپنی مجبوری کو عذر بنا کے پیش کرتی رہی۔ حالانکہ ایسی کوئی مجبوری تھی ہی نہیں۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ وہ کیا مجبوری تھی۔ یہ پُرسکون عیش کی زندگی اس کی مجبوری بن گئی تھی۔ اسے کیا پڑی تھی کہ جانتے ساتھ در بدر ہو، خطرات میں شریک ہے اور زندگی کا سب سے خوبصورت دور اس جدوجہد کی نذر کردے جس کا حاصل محض پریشانی اور خانہ خرابی ہو۔

دروازہ آہستہ سے کھلا تو میرے اشتعال انگیز خیالات کی رَو ٹوٹ گئی۔ یہ خیالات بھی مایوسی کی انتہا کا ردعمل تھے۔ اگر رابعہ مجھے [illegible] سامنے گلے شکوے بھول جاتا۔ میرے ذہن میں انتشار پیدا کرنے والا کوئی خیال ہی نہ آتا۔

اس وقت میں ذہنی عدم توازن کا شکار تھا جب خاموشی سے عبداللہ اندر آگیا۔ میں اسے دیکھتے ہی گالیاں بکتا ہوا اٹھا اور کسی باؤلے کُتے کی طرح اس پر حملہ آور ہوا۔ اس کے ساتھ آنے والے دو ہٹے کٹے مشٹنڈے ملازموں نے مجھے دھکیل کر دور پھینک دیا۔ میں دیوار سے ٹکرا کے واپس آیا۔

"آؤ سب سامنے آؤ۔ ایک ایک کو چن چن کر دوں تو میرا نام بھی سکندر حیات نہیں۔" میں نے جوانوں کی پیشہ ورانہ مہارت کو بروئے کار لانے کی تیاری کرلی۔

"سکندر، کیا تم رابعہ سے ملوگے؟" حاجی نے نرمی سے کہا۔ میری نظر ایک دم اوپر گئی۔ رابعہ نے بال کھول لیے تھے اور وہ لباس بدلنے کی تیاری کررہی تھی۔ حاجی کے سوال نے یکلخت میری ذہنی رَو کو پلٹ دیا تھا۔ کسی وحشی خونخوار حیوان سے میں ایک دم پالتو جانور بن گیا۔ میری تمام سرکشی کافور ہوگئی۔

"حاجی صاحب، آپ کو اللہ رسول کا واسطہ" میں نے لجاجت سے کہا۔

"نہ میاں نہ" حاجی نے تسبیح گھماتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔ "یہ دُنیاوی معاملات ہیں۔ اللہ رسول کو ان سے دور رکھو۔ یہاں نقد سودا ہوتا ہے۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔"

"اچھا آپ جو کہیں گے میں کروں گا۔ بس رابعہ مجھے دے دیں" میں نے اس کی منت کرتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب" حاجی نے طنز سے کہا۔ "اگر میں کہوں اپنا مسلک اور دین چھوڑ دو، اپنے اصول اور عقائد، نظریات اور وفاداریاں بدل لو؟"

"میں یہ سب کروں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔"

"رہنے دو میاں۔ تم ابھی دیوانے نہیں ہوئے ہو۔ تم دیوانگی کا کھیل خوب کھیلتے ہو" حاجی نے طنز سے کہا۔ "وہ کیا کہتے ہیں [illegible] زندگی میں کہ دیوانہ بکار خویش ہوشیار۔ تو تم بڑے ہوشیار ہو مگر ہم بھی اتنے گاؤدی نہیں ہیں جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ سیدھی صاف بات کرو۔ ہم تمہیں رابعہ سے ملوا دیں تو تم بتاؤ گے کہ وہ سونا کہاں ہے؟"

"میں بتاؤں گا" میں نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ تمہارے اس عہد کو ہم بیعانہ سمجھ لیتے ہیں" حاجی نے کہا۔ [illegible] کو تم بیعانہ سمجھو۔ بعد میں تم نے بدعہدی کی تو سودا منسوخ۔ تم پھر کبھی اس سے نہیں مل سکو گے لیکن تم نے صحیح نشاندہی کی اور وہاں سے سونا مل گیا تو رابعہ کو تمہارے حوالے کردیا جائے گا اور تم کو آزادی ہوگی کہ جہاں چاہو جاؤ۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو کہ تمہیں رابعہ کو جیتنا ہے یا ہارنا ہے۔ تمہارے لیے کس کی قیمت زیادہ ہے۔ رابعہ کی یا اس سونے کی؟"

میری ذہنی مزاحمت بہت پہلے ختم ہوچکی تھی۔ حاجی کی بات کا ایک ایک لفظ میرے دل پر نقش ہوگیا۔ اس وقت میرا کچھ بھی نہیں تھا سوائے اس سکندر کے جس کے لیے ساری کائنات کا محور ایک رابعہ کی ذات تھی۔ اور ساری دُنیا کو چھوڑ کے مجھے اس کی محبت مل جاتی تو میں سمجھتا کہ خدائی مل گئی۔

"میں تمہارا احسان مند رہوں گا۔ اس احسان کا بدلہ چکانے کے لیے جو وعدہ کروں گا پورا کروں گا۔ تم مجھ سے قسم لے لو، حلف اٹھوا لو" میں نے کہا۔

"رابعہ کی قسم کھا سکتے ہو؟"

"میں رابعہ کے سر کی قسم کھا کے کہتا ہوں۔"

"رابعہ کی اور اپنی محبت کی قسم کھا کے کہو" وہ بولا۔

"میں اس محبت کی قسم کھاتا ہوں جو مجھے رابعہ سے ہے۔"

"اچھا فی الحال ہم اتنا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ تم اس ساتھ والے کمرے میں جاکے لباس بدل لو اور انتظار کرو۔"

میں نے بے یقینی کے ساتھ قدم بڑھائے۔ دروازے سے گزرتے ہی میں نے خود کو ایک نسبتاً روشن اور بہتر طور پر آراستہ کمرے میں پایا۔ اس میں آمنے سامنے کی دیواروں کے ساتھ دو دو فولڈنگ تختے تھے جن کو کھول کے بیڈ بنایا جاسکتا تھا۔ سرہانے کی طرف چار شیلف تھے اور ان کے نیچے دراز نما خانے۔ ہر شیلف پر ذاتی استعمال کی اشیاء بھی ہوئی تھیں۔ شیونگ کا سامان، ٹوتھ برش اور کنگھے وغیرہ۔ خانوں میں نیچے کے خانوں میں انہی چار افراد کے کپڑے ہوں گے جو اس کمرے میں رہتے تھے۔ یہ ان کا سلیپنگ کوارٹر تھا۔

کچھ استعمال شدہ کپڑے کھونٹیوں پر بھی آویزاں تھے۔ میں نے ایک قمیص اتاری اور پہن لی۔ وہ مجھے تنگ تھی۔ بغل میں سے اس کی آستینوں کے ٹانکے ادھڑ گئے مگر میں نے [illegible] کی خاکی پتلون مجھے فٹ آگئی۔ میں نے اطمینان اور سکون کا گہرا سانس [illegible] لیتے ہی میرے جذبات میں نمایاں تبدیلی آئی۔ میں نے خود کو پھر حیوان سے انسان کے روپ میں دیکھا تو میرے ذہن کا انتشار ختم ہونے لگا۔ میری عقل جو وقتی دیوانگی کے تحت گم ہوگئی تھی پھر میری رہنما ہوئی تو میں نے اپنی خود اعتمادی حاصل کرنے کی جدوجہد کی۔

وہ سب ابھی تک دوسرے کمرے میں موجود تھے جہاں مجھے کسی جنگلی جانور کی طرح محبوس رکھا گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ وہاں کیا کررہے تھے۔ جلدی جلدی میں نے ان درازوں کو کھول کے دیکھا۔ ان میں صرف کپڑے تھے۔ میں نے کپڑوں کے نیچے ہاتھ مار کر شاید کہیں کوئی خنجر یا ریوالور دبا ہوا ہو۔ مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ اس کمرے میں اگر کوئی چیز خطرناک بن سکتی تھی تو وہ بیلٹ تھے مگر بیلٹ سے آتشیں اسلحے کو ناکارہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میرے پیچھے آخری حصے کی دیوار میں ایک گول شیشے والا روشندان تھا جس میں سے سمندر، جھاگ اڑاتی موجیں، دن کا اجالا اور سلیٹی آسمان دکھائی دیتا تھا۔ شیشہ پانی کے مسلسل بہتے دھاروں سے دھندلا چکا تھا۔ میں نے اس میں سے باہر کا منظر دیکھنا چاہا مگر میں کچھ نہ دیکھ سکا۔

پھر میں نے ساتھ والے کمرے کے کھلے دروازے سے جھانکا۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ یا مظہر العجائب! میں نے آنکھیں مل کے دیکھا۔ وہ تھے تو انسان ہی کے روپ میں مگر کیا وہ بھوت تھے کہ یوں غائب ہوگئے۔ حاجی عبداللہ جادوگر بھی ہے کہ سلیمانی ٹوپی سر پر رکھ کے نکل گیا۔ مجھے تو بڑی جستجو کے بعد ایک [illegible] ملا تھا۔ مگر اب صاف ظاہر تھا کہ اس خانے میں دوسرا دروازہ بھی تھا اور وہ سب اس میں سے گزر گئے۔

میری نظر نے اوپر دیکھا۔ وہ منظر بھی بجھ گیا تھا جس میں رابعہ کے حسن کا ماہتاب روشن تھا۔ اب اوپر نیچے ایک سا اندھیرا تھا۔ میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا جس میں اب مجھے رابعہ سے ملاقات کا انتظار تھا۔ کیا وہ سچ مچ مجھ سے ملے گی؟ اس سے پہلے بھی بارہا ایسا ہوا تھا کہ میں نے اس کی صرف آواز سنی اور اس کا تصور کیا یا وہ مجھ سے ملنے آئی اور مجھے تقدیر کی نارسائی نے ساعت دیدار سے محروم رکھا۔ پھر آج میں نے اسے یوں دیکھا جیسے میرا خواب مجسم ہوگیا ہو یا میرے تصور کو زندگی مل گئی ہو۔ خواب اور حقیقت کے درمیان ایک شفاف پردہ ہی تو حائل تھا۔

[illegible] الجھنا چاہا مگر اب دل یوں بہلنے والا نہ تھا۔ اس کی ہر دھڑکن رابعہ کی پکار بن گئی تھی۔ اشتیاق و اضطراب میں میرے لمحات اتنے کشیدہ ہو چکے تھے کہ میرا وجود چٹخنے لگا تھا۔ میں نے ہر طرف سے بند کمرے کی دیواروں سے کان لگا کے کسی آہٹ کا انتظار کیا۔ واحد بند دروازے پر دستک دی۔ میں مایوس ہونے لگا تھا اور حاجی عبداللہ کی طرف سے میری بدگمانی میں ہر لحظہ اضافہ ہورہا تھا۔ اس شیطان

www.paksociety.com

لعین نے میرے ساتھ ایک جان لیوا مذاق کیا ہے۔ مجھے رابعہ کی ایک جھلک دکھا کے دیوانہ بنا دیا۔ اپنے جھوٹ کے جال میں گرفتار کر لیا۔ اس کا مقصد بھی میرا جذباتی استحصال تھا۔ ابھی وہ میری آتش شوق کو کچھ اور بھڑکائے گا۔ مجھے اور تڑپائے گا۔ مجھے امید اور ناامیدی کے عالم میں رکھے گا۔۔۔ یہاں تک کہ میں سچ مچ پاگل ہو جاؤں گا اور کٹھ پتلی کی طرح اس کے اشاروں پر دم ہلانے لگوں گا۔

اچانک دروازہ کھلا اور رابعہ اندر آ گئی۔ اس نے دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا۔ میں پتھر کے بت کی طرح کھڑا رہا اور پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ اس نے اب سرتاپا سفید ریشم جیسے کپڑے کی ساری باندھ رکھی تھی جس میں تارے سے جھلملاتے تھے۔ یہ لطیف اور ریشمیں بادلوں اور دھوپ کی کرنوں سے بنا ہوا ملبوس تھا جس میں وہ بکھرے ہوئے سیاہ بالوں کے ساتھ کوئی آسمانی مخلوق لگتی تھی۔ یہ سب فریب نظر تھا۔ وہ فقط ایک نقش خیال تھی جیسے بادل کا غبار۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو سکندر؟" بالآخر اس نے پلکیں جھپکا کے کہا اور آہستہ آہستہ آگے آ گئی۔

"تم... وہی ہو، میرے خیال کا طلسم... میرے خواب کا عکس۔" میں نے کہا۔ "ابھی میں آنکھیں بند کر لوں گا تو تم غائب ہو جاؤ گی۔ ایسا کیوں کرتی ہو میرے ساتھ؟"

"سکندر!" رابعہ نے گلوگیر لہجے میں کہا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک کر میرے ہاتھ پر گرے۔ دو جلتے ہوئے انگارے، پگھلے ہوئے ستارے۔ یکلخت میں بے یقینی کے طلسم سے نکل آیا۔ حقیقت نے میرے حواس کو تہس نہس کر دیا۔ میں نے بے اختیار اسے کھینچ لیا۔ اور اپنے قریب کر لیا۔ شدت جذبات میں اپنی زبان سے میں اس کے نام کا ورد کرنے کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے اس کے ہاتھوں، اس کے بالوں اور اس کی آنکھوں میں رابعہ کو دیکھا۔ اس کی مہک کو تلاش کیا اور اس کے وجود کی ساری نرمی اور حلاوت اور مٹھاس اور لذت کو اپنے وجود میں سمو لیا۔

"سکندر... سکندر! ہوش میں آؤ۔" اس نے کانپتے ہوئے اور روتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میرے چہرے کو اور میرے بالوں کو اپنے لمس سے سیراب کر رہے تھے۔ "دیکھو ایسے کیوں رو رہے ہو۔ اتنے کم ہمت تو نہیں تھے تم... یہ کیا پاگل پن ہے۔ میں تو تمہارے پاس ہی تھی۔ دور کب تھی تم سے۔ دن رات کے کون سے لمحے کو تم جدائی کا لمحہ کہتے ہو۔ میری کون سی سانس کو اپنے خیال سے الگ جانتے ہو...؟"

میں نے کچھ نہیں کہا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ زبان خاموش تھی تو کیا۔ دل کی آواز تو اس دنیا میں، اس کائنات میں گونج رہی تھی جس میں اور کچھ نہیں تھا میرے اور اس کے سوا۔ اور میں نے کہا۔ "رابعہ! میں مر جانا چاہتا ہوں اسی وقت، اسی جگہ، تمہاری باہوں میں..."

رابعہ نے میرا چہرہ اٹھا کے کہا۔ "یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو سکندر! کیا ہم مرنے کے لیے جی رہے تھے۔ وہ طویل آزمائش کی مسافت جو ہم نے ایک ساتھ طے کی تھی..."

"مگر تم نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ تم پھر چھوڑ جاؤ گی..... اور تمہارے بغیر مجھے یہ زندگی قبول نہیں۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ "ایسا کیوں کیا تھا تم نے رابعہ؟ بولو، کیا قصور تھا میرا؟ کیوں تم نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا؟ کبھی سوچا تم نے کہ اگر اس دوری کا عذاب میری موت کا سبب بن جاتا؟"

اس نے میرا منہ اپنے ہاتھ سے بند کر دیا۔ "ایسے ہی مر جاتے۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا۔ میں بھی اسی امید پہ زندہ تھی جس نے تمہیں راستہ دکھایا اور حوصلہ دیا یہاں تک آنے کا۔"

"مگر اب میں صرف امید پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔ تمہاری رفاقت چاہیے۔ میں خوابوں کے آسرے پر اب تمہیں جی سکتا۔ تمہارے خیالوں کے ساتھ اور تمہارے تصور کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی مجبوری کو قبول نہیں کر سکتا۔ تمہیں کیا معلوم کہ وقت کے بے رحم لمحے کی زنجیر میں نے کس طرح کاٹی۔ دل کو کتنے فریب دیے۔ کتنی جھوٹی امیدوں سے سمجھوتا کیا۔"

"تم یہ سب مجھے بتا رہے ہو؟"

"ہاں۔ کیونکہ تم نے ہی مجھے مرنے بھی نہیں دیا۔ یہ تمہاری آرزو بھی تھی جس نے مجھے زندہ رکھا۔ کیا ملا تمہیں مجھ سے جدا ہو کے؟ کیوں قبول کیا تم نے یہ بن باس۔ مجھے اکیلا کیوں رکھا؟"

"وہ سب ایک مجبوری تھی سکندر... میں کیا بتاؤں۔" وہ ایک سرد آہ بھر کے بولی۔

"جھوٹ کوئی ایسی مجبوری نہیں ہوتی..."

"میں جھوٹ بول سکتی ہوں تم سے؟" اس نے [illegible] پلکیں اٹھا کے کہا۔ کالی آنکھوں میں بھرے ہوئے جیسے موتی چننے لگے۔ "مرنا تو بہت آسان ہوتا میرے لیے مگر جینا بہت مشکل تھا۔ پھر بھی مجھے تمہارے لیے اور... تم سب کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میں نے اس مجبوری کو، سختی حالات کو اور قید تنہائی کو صرف اس لیے قبول کیا کہ... تم سب زندگی اور کامیابی کے راستوں پر چلتے رہو۔"

"تم چاند بھائی کی قید میں تھیں؟" میں نے اس کی پلکوں سے آنسو چن لیے۔

رابعہ نے بلاؤز کے گلے میں سے ایک کاغذ کا پرچہ برآمد کیا اور خاموشی سے میرے سامنے کر دیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ "وہ سب سن رہے ہیں۔ باتیں کرتے رہو یہ پھر میں پڑھ لینا۔"

"ہاں... تم تو جانتے ہو وہ کس قماش کا آدمی ہے۔ وہ ایک ذہنی مریض ہے۔ ساری دنیا کے خلاف انتقامی ردعمل میں مبتلا۔" اس نے کاغذ کو میری جیب میں ڈال دیا۔

"پھر تم یہاں کیسے آ گئیں؟" میں نے کہا۔

"مجھے حاجی عبداللہ نے رہائی دلائی۔ ایک شرط پہ۔ صرف تم پوری کر سکتے ہو۔" رابعہ نے کہا۔

"کون سی شرط؟"

"تم اس کی مدد کرو گے۔ میں نے اسے یقین دلا دیا تھا سکندر کہ تم میری خاطر سب کچھ کر سکتے ہو۔"

"تمہاری خاطر میں وطن کے دشمنوں کا ساتھ تو کبھی نہیں دوں گا۔ یہ تم جانتی ہو۔" میں نے ترشی سے کہا۔

رابعہ نے گھبرا کے ہونٹوں پہ انگلی رکھی۔ پھر اس نے سرگوشی میں کہا۔ "کسی بات سے انکار مت کرنا۔ تم میرا مان بھی نہیں رکھو گے۔ مجھے نہیں معلوم وہ تم سے کس قسم کی مدد چاہتا ہے مگر میں نے کہا تھا کہ تم مجھے انکار نہیں کر سکتے۔"

"دیکھو رابعہ! وہ چاہتا ہے کہ میں اسے وہ جگہ بتا دوں جہاں دلاور کا میں نے کئی من سونا غرق کیا تھا۔ ایک پورا ٹرک تھا جس میں اوپر اسلحہ تھا۔ ہم نے تو اسلحہ سمجھ کے ڈبویا تھا مگر یہ معلوم ہوتا کہ نیچے سونا بھی ہے تو ہم نہ رکھ لیتے۔ کام آتا وہ خزانہ۔ مگر خیر۔"

"حاجی عبداللہ اس سونے کو مشرقی پاکستان تو نہیں بھجوائے گا۔ اس سے وطن کے دشمنوں کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ جو دلاور کرنا چاہتا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"دیکھو، مجھے معلوم ہے۔ عبداللہ صرف ایک ٹرانسپورٹر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ دلاور کا مال بھی بھجوا رہا ہے۔ معلوم نہیں تھا کہ دلاور اینڈ کمپنی وہاں تخریب کاروں کو اسلحہ فراہم کرتی ہے لیکن معلوم ہوتا تب بھی اسے براہ راست وطن دشمن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ اپنا بزنس کیسے تباہ کرتا۔ اور پھر دلاور جیسے لوگوں سے دشمنی مول لینا بھی تو خطرے کی بات تھی۔"

"تم اس کی وکالت کر رہی ہو؟"

"میں تم کو سیدھی صاف بات سمجھا رہی ہوں کہ حاجی کی مدد کرنے سے تمہارے مشن کو نقصان نہیں ہو گا۔ نہ اس سے تمہارے دشمنوں کی مدد ہوتی ہے۔ حاجی تو اسے اپنی تحویل میں رکھے گا۔ یہ اس کی ذاتی ملکیت ہو گا۔ دلاور کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے۔ ورنہ وہ حاجی کا دشمن ہو جائے گا۔ اپنے نقصان پر وہ پہلے ہی زخم خوردہ ناگ کی طرح تلملا رہا ہے۔"

"اچھا!" میں نے بہ حالت مجبوری ہتھیار ڈالنے والے کی طرح کہا۔ "میں اب تم سے کیا کہوں کہ تم نے اچھا کیا یا برا۔ تم کہتی ہو اس سے دشمنوں کی مدد نہیں ہو گی لیکن کیا حاجی میرا دشمن نہیں ہے؟ تم نے کیوں مجھے اس کی مدد کا پابند کر دیا؟"

"تم انکار کرو ورنہ میں واپس چلی جاؤں گی۔ مجھے جانا ہی پڑے گا۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "اور یہ تو قسمت نے ایک سبب بنا دیا تھا۔ ورنہ کیا میں اس شخص کی قید سے نکل سکتی تھی جو مجھ سے شادی کرنے کے لیے وقت اور حالات کے بدل جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے صاف کہا تھا مجھ سے کہ میں زبردستی نہیں کروں گا۔ ایک دن تقدیر خود تمہیں میرے حوالے کر دے گی۔ تمہارا وہ بانکا ہیرو جو سکندر اعظم بنا پھرتا ہے، اس کی زندگی کتنی ہو گی۔ خوش قسمتی پہ انحصار کرتا ہوا وہ کہاں تک چلے گا۔ ایک دن آئے گا جب قدرت کی طرف سے ملنے والا خوش بختی کا کوٹا پورا ہو جائے گا۔ پھر اس کے ساتھ وہی ہو گا جو سکندر اعظم کے ساتھ ہوا تھا۔ کہتے ہیں اسے ایک مچھر نے شکست دے دی تھی۔ وہ دنیا فتح کرتا گیا لیکن اسے ملیریا ہو گیا۔ اور جسے کوئی غنیم جیت نہ سکا تھا، کوئی سورما اور جنگجو جیت نہ سکا تھا، اسے ایک مچھر نے

www.paksociety.com

جیت کر دیا۔ پھر غم کیا کرو گی؟ اس کے سوگ میں کتنے دن آنسو بہاؤ گی؟ جب شیر افگن مارا گیا تھا تو نور جہاں نے بھی بہت رونا دھونا کیا تھا۔ اور شہنشاہِ ہند کی محبت کے خلاف تین سال تک مزاحمت کرتی رہی تھی۔ جہانگیر نے بھی کوئی زبردستی نہیں کی تھی۔ اس کی محبت نے بالآخر نور جہاں کی محبت کو جیت لیا تھا۔ ایسے ہی تم بھی ایک نہ ایک دن جیت لوں گا تمہیں۔ اب تک میں عورت کو حاصل کرتا آیا ہوں۔ خریدتا آیا ہوں اور چھینتا آیا ہوں مگر تمہاری بات مختلف ہے۔ تمہیں میں اپنی محبت سے جیت کر دکھاؤں گا۔"

یہ سب رابعہ نے اس وقت کہا جب میں اس کا دیا ہوا رقعہ جیب سے نکال کے پڑھ رہا تھا۔ وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی اور بولتی گئی۔

رقعے میں جو رابعہ اپنے ساتھ لائی تھی، لکھا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ یہ سب میں تمہیں زبانی نہیں بتا سکوں گی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا جائے گا۔ حاجی ایک کمینہ اور ناقابلِ اعتبار شخص ہے۔ اس نے مجھے عملاً خرید لیا ہے۔ اس نے چاند بھائی سے وعدہ کیا ہے کہ جتنا سونا سمندر کی تہ سے برآمد ہوگا اس کا نصف اسے دے گا۔ وہ مجھے اسی مقصد کے تحت لایا ہے کہ میرے ذریعے تم پر نفسیاتی دباؤ ڈالا جائے۔ چاند بھائی کو اس پر بالکل اعتبار نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ حاجی اپنی بات پر قائم رہنے والا آدمی نہیں ہے چنانچہ اس نے پورا بندوبست کر لیا ہے کہ وہ سونا حاجی کے ہاتھ نہ لگے۔ یہ ایک خطرناک کام ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ خزانہ ہاتھ لگتے ہی حاجی تم کو اور تمہارے ساتھ مجھے بھی ٹھکانے لگانے کی کوشش کرے۔ لیکن چاند بھائی نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ ہماری حفاظت کرے گا۔ اور اس مقصد کے لیے حاجی سے مقابلہ کرنا پڑا تو کرے گا۔

چاند بھائی کے دلاور سے پرانے کاروباری مراسم ہیں۔ [illegible] مگر وہ بعد میں چاند بھائی کے لیے مارِ آستین ثابت ہوا اور دلاور سے مل گیا۔ اس کا انجام تو تم نے دیکھ لیا۔ (مجھے چاند بھائی نے بتایا تھا) چاند بھائی سب کچھ ہے مگر ملک دشمن غداروں اور وطن کی سالمیت کو نقصان پہنچانے والوں کے ساتھ نہیں ہے۔ وہ دلاور اینڈ کمپنی کے اس کاروبار میں شامل نہیں۔ وہ اس کا مخالف ہے اور تمہارا محافظ و مددگار ہے۔ مشکل یہ ہے کہ وہ کھل کر سامنے نہیں آسکتا اور دلاور کی دشمنی مول نہیں لے سکتا۔ اس طرح اسے دُہرا نقصان ہو سکتا ہے۔ مالی نقصان بھی اور جانی نقصان بھی۔ ایک طرف اس کا کاروبار تباہ ہوگا تو دوسری طرف وہ ایم آر ایس کے لیے کچھ نہ کر پائے گا۔ اس نے دلاور کو یہی تاثر دیا ہے کہ ان کے درمیان مکمل اتحاد ہے اور وہ خود بھی سکندر کا دشمن ہے۔ چنانچہ اس نے مجھے قید کر رکھا ہے۔ اس کا مقصد میرے ذریعے تم تک پہنچنا ہے۔

اسے دلاور سے بہت کچھ معلوم ہوتا رہا ہے جو اس نے مجھے بتایا۔ اس کی معرفت مجھے تمہارے متعلق مفصل رپورٹ ملتی رہی ہے۔ جو کچھ میں نے کیا وہ ایک پالیسی کا حصہ تھا۔ دل سے چاند بھائی تمہارے ساتھ ہے۔ یہ بات شاید تمہیں ناقابلِ یقین لگے کہ اس جیسا چالاک، عیار اور زمانہ ساز شخص جو دنیا بھر میں اپنی دھاک بٹھا چکا ہے اور بڑے بڑے بدمعاشوں سے بڑا بدمعاش ہے ایک کارِ خیر میں کیوں شریک ہے مگر یہ حقیقت ہے۔ ہمارے ساتھ اس ملک کے عوام ہیں۔ ان میں امیر، غریب، جاہل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ، شریف اور بدمعاش سب ہیں۔ بدمعاش بھی قانون کا مجرم ہے مگر خود کو پاکستانی سمجھتا اور کہلوانا چاہتا ہے۔ وہ بھارت یا اسرائیل کا حامی نہیں ہو سکتا۔ اس کا مذہب اور اس کی قومیت کے جذبات ایک ہی رہتے ہیں۔

چاند بھائی میری حفاظت تمہاری امانت کی طرح کر رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اپنے لیے تو میں نے وہ سب کچھ جو دل میں آیا کیا۔ اب یہ دل کہتا ہے کہ اس مجاہد کے لیے کچھ کر جو وطن کے دشمنوں کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے۔ صرف اپنے عزم اور حوصلے، یقین اور جذبے کے ساتھ وسائل نہ ہونے کے باوجود۔ تم نہیں جانتے مگر متعدد مواقع ایسے آئے جب تم چاند بھائی کی [illegible] کے باعث مشکل میں نہیں پڑے۔ اس نے کئی بار تمہاری حفاظت کے لیے دلاور کو گمراہ کیا۔ اسے غلط اطلاعات فراہم کر دیں یا اس کے آدمیوں کو خود ٹھکانے لگوا دیا مگر نام تمہارا ہوا۔ مشکل یہی ہے کہ وہ سامنے آئے تو نقصان ہمارا بھی ہوتا ہے۔ ابھی تک وہ دلاور اینڈ کمپنی کو یقین دلانے میں کامیاب ہے کہ رابعہ جب تک اس کے قبضے میں ہے سکندر کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک نہ ایک دن ہم اس کے ذریعے ایم آر ایس کو ختم کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ ایک سیکرٹ مشن ہے۔ میرے عبداللہ کے ساتھ آنے کی دلاور کو خبر نہیں۔ اس لیے مجھے واپس جانا ہوگا چاند بھائی کے پاس۔ عبداللہ تو دلاور کی جیب میں بے خبر گھوم رہا ہے مگر اسے معلوم نہیں کہ [illegible]۔ چاند بھائی نے اس کا انتظام کر لیا ہے اور خدا نے چاہا تو تمہاری مدد سے سونا نکالنے کا یہ کام مکمل ہوتے ہی حاجی عبداللہ کا کام تمام ہو جائے گا۔ وہ اسی طرح غائب ہو جائے گا جیسے ٹرک سونے کا غائب ہو گیا تھا۔ نہ دلاور کو اس کا پتا چل سکا تھا نہ حاجی کے بارے میں معلوم ہوگا۔ یہ خطرناک کام ہے۔ اس میں فریقین کے درمیان [illegible] خطرناک جنگ بھی ممکن ہے۔ اپنی حفاظت کرنا اور میری طرف سے بے فکر رہنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

اس کاغذ کو غائب کر دینا۔ ممکن ہوا تو میں پھر تم سے رابطہ قائم کروں گی اور ہاں محسن اسی لانچ پر ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔ میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں مگر میں نے اسے دور سے دیکھا تھا۔ وہ کمرے میں بیٹھا ہوا [illegible] کر رہا تھا۔۔۔"

شاید اور لکھنے کی اسے مہلت نہیں مل سکی تھی۔ میں نے کاغذ کو مٹھی میں دبا لیا تھا۔ میں رابعہ سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اب نہیں کہہ سکتا تھا۔

"تم... اس چاند بھائی، تمام رابطے سے کہہ دینا کہ میں کبھی نہیں آئے گا۔" میں نے رابعہ کی بات ختم ہوتے ہی بد دیانت جیسے کہا۔ "میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں۔ خدا تمہارے لیے کہ مروں گا۔"

"خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ تم کیا سمجھتے ہو اس کی امیدیں پوری ہونے تک زندہ رہوں گی! تمہارے بعد تو میں مر جاؤں گی؟ ہم میں سے کون ہے جو تنہا زندگی گزار سکتا ہے لیکن ابھی مجبوری ہے۔ مجھے واپس جانا ہی پڑے گا۔"

"میں تو نہیں جانے دوں گا رابعہ!"

"مجھے پانے کے لیے تم کو کچھ کرنا ہوگا سکندر۔ بتاؤ کرو گے؟"

"کروں گا۔ میں تمہاری قسم کھا کے کہتا ہوں کہ کر دوں گا۔ تم اس کمینے حاجی کو میری طرف سے یقین دلا دینا کہ وہ خود تو مجھے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اب میں مجبور ہوں۔" میں نے کہا اور ادھر اُدھر دیکھا کہ اس کاغذ کے پرزے کو کہاں ضائع کر دوں۔ مگر وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی، نہ کھڑکی، نہ روشن دان، نہ ٹائلٹ کا فلش۔ میں اسے پرزے پرزے کرتا تب بھی حاجی کو شک ہو جاتا۔ اسے جلاتا تو وہ اس کی راکھ دیکھ لیتا۔ رابعہ کے راز کو راز رکھنے اور اسے افشائے راز کے عذاب سے بچانے کے لیے میں نے اس کاغذ کے گولے کو منہ میں ڈال لیا اور دانتوں سے چبانے لگا۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا!" رابعہ نے کہا۔

"ہاں۔ کر دیا ہے تم نے۔" میں نے کاغذ کو لعابِ دہن کے ساتھ ملا کے چباتے ہوئے کہا۔

مجھے اس سے اور بھی سوالات کرنے تھے جو کسی بھی طرح براہِ راست نہیں کیے جا سکتے تھے۔ نہ تو رابعہ کو معلوم ہو سکتا تھا اور نہ مجھے کہ دیواروں کے کان کہاں ہیں اور کتنے حساس ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہم کسی پوشیدہ مائیکروفون کے سامنے کھڑے ہوئے ہوں اور ہماری سرگوشی بھی سنی جا سکتی ہو۔

ادھر اُدھر دیکھنے سے مجھے ان چار افراد کے ذاتی اسباب کا خیال آیا جو شیلف پر تھا اور الماریوں میں بند تھا۔ اس میں کوئی پنسل، قلم یا بال پوائنٹ ضرور ہوگا۔ اور میرا خیال درست تھا۔ مجھے ایک شیلف پر سے پنسل اور نوٹ بک دونوں مل گئے۔ میں نے نوٹ بک کا ایک صفحہ پھاڑ کے لکھا۔

"کیا تم مجھے یا محسن کو کسی قسم کا اسلحہ فراہم کر سکتی ہو؟"

رابعہ نے اسے پڑھا اور نفی میں جواب دینے کے لیے سر ہلاتے ہوئے کاغذ کی گولی بنا کے مٹھی میں بند کر لی۔

میں نے دوسرے کاغذ پر لکھا۔ "ہر سوال پر ایک کاغذ کا گولا کھانے سے ہاضمہ خراب ہوگا۔ بہتر ہوگا اگر تم یہ پاکٹ سائز ڈائری مجھے کھانے دو۔ مجھے ویسے بھی بھوک لگی ہوئی ہے اور بھوک میں نوٹ بک کیا رجسٹر تک کھایا جا سکتا ہے؟"

وہ تحریر کو پڑھ کے مسکرائی۔

پھر میں نے لکھا۔ "حاجی اور اس کے ساتھیوں کے پاس تو اسلحہ یقیناً ہوگا۔ مگر ہے تو کیا وہ تمہارے ہاتھ نہیں لگ سکتا؟"

اس نے پھر نفی میں سر کو دائیں بائیں ہلایا۔

میں نے پوچھا۔ "اس لانچ پر کل کتنے افراد ہیں؟"

رابعہ نے مجھ سے پنسل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پھر اشاروں کی زبان میں جواب دینے کو ترجیح دی۔ اس نے پہلے دونوں

www.paksociety.com

ہاتھوں کی دس انگلیاں دکھائیں۔

"یہ تو پوری فوج ہے۔" میں نے لکھا۔ "کیا یہ سب مسلح اور خطرناک لوگ ہیں؟"

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

"کیا لانچ حاجی کی ہے اور کیا یہ اسمگلنگ میں استعمال ہوتی ہے؟"

رابعہ نے پھر اثبات میں جواب دیا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں۔ اور کب سے سفر کر رہے ہیں؟"

اس بات کا جواب دینے کے لیے رابعہ نے مجھ سے پنسل اور نوٹ بک لے لی اور انتہائی شکستہ خط میں لکھا۔

"ہم ساحلِ مکران کے قریب ہیں لیکن اب واپس جا رہے ہیں۔" اس نے نوٹ بک مجھے تھما دی۔

میں نے صفحے کی پشت پر لکھا۔ "تمہیں کچھ معلوم ہے کہ میں کب سے یہاں ہوں اور بے ہوش پڑا تھا؟"

رابعہ نے لکھا۔ "کل سے۔ تم یہاں دوپہر کے وقت لائے گئے تھے۔ تم سو رہے تھے۔ خواب آور دوا کے اثر سے۔"

میں نے لکھا۔ "اس وقت کیا بجا ہے؟"

رابعہ نے لکھ کر جواب دیا۔ "صبح کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔"

میں نے صفحہ پھاڑا اور اس کی گیند بنالی۔ اس تمام عرصے میں میرے جذبے رابعہ کے خط کو چیختے... معروف ہوتے تھے اور اب کا عذاب اتنا نرم ہو گیا تھا کہ میں اسے کسی مجنون کی طرح نگل سکتا تھا۔ غالباً کسی عاشق نے اپنی محبوبہ کے نامۂ الفت کو اتنی رغبت اور محنت سے پہلے نوش نہیں فرمایا ہوگا۔

یہ معجونِ الفت میرے حلق میں پھنس گئی۔ میں نے تو ایک گھونٹ پینے پر مارا اور گردن کو کئی بار جھٹکا۔ نارِ محبت میرے معدے میں اتر گیا۔ میں نے کامیابی اور فخر سے آنکھیں جھپکا کے رابعہ پر واضح کیا کہ اس کا راز ہمیشہ کے لیے میرے سینے میں بلکہ اس سے بھی نیچے دفن ہو گیا۔ پھر میں نے معجونِ الفت کی دوسری گولی کھائی۔

پنسل میرے ہاتھ میں تھی اور میں اگلا سوال لکھنے ہی والا تھا کہ دروازہ دھڑام سے کھلا اور حاجی عبداللہ اندر آ گیا۔ اس وقت مجھے گفتگو میں سرزد ہونے والی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ ہم تحریری گفتگو میں اتنے محو تھے کہ زبانی گفتگو بھول گئے تھے اور یہ خاموشی کا وقفہ شاید دو بچھڑے ہوئے محبت کرنے والوں کی ملاقات کا ریڈیو ڈراما سننے والوں کو غلط لگا تھا۔ ان کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا ہوگا کہ ہم باتیں نہیں کر رہے تو پھر خاموشی سے کیا کر رہے ہیں؟

حاجی نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا مگر میں نے اپنی اعلیٰ اداکاری سے اس کے شکوک کی بنیاد کمزور کر دی۔

میں نے رابعہ سے کہا۔ "میں تمہیں محسن کے نام پر قصہ سنا رہا ہوں۔"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "اوّل تو مجھے یقین نہیں کہ وہ مجھ سے لاپتہ ہے۔ اور ہوتا تب بھی..." پھر وہ خاموش ہو گئی۔

"خیر سے بڑی دیر بعد بولے۔" حاجی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"جی۔ ہمارا یہ ہے کہ کم بولتے ہیں۔ عقلمندوں کی طرح۔ مشہور ہے کہ انگریز قوم کے نزدیک دانائی کا مظہر ہے۔ رات کو بھی بھوک زیادہ ہے، مگر ہے تبھی ہر وقت بھونکتے رہتے ہیں۔ اور ناظر جانا چاہیے۔" میں نے اس کو چکر دینے کے لیے کہا۔

"ماشاءاللہ۔ زبان پھر چلنے لگی ہے قینچی کی طرح۔ پہلے گم ہو گیا تھا۔ کیوں چپ تھے؟" وہ بولا۔

"اب کیا عرض کروں حاجی صاحب۔ آپ تو ماشاءاللہ سے خود دنیا دار سمجھ دار بزرگ وار ہیں۔" میں نے کہا۔ "الیٰ خلوت اب کب ملتی تو آپ کیا کریں گے۔ صرف باتیں؟ اور وہ بھی اپنی... شریکِ حیات سے۔"

"تم چلو باہر۔" حاجی نے رابعہ کو حکم دیا اور مجھ سے نوٹ بک لے لی۔ اس نے کاغذ کو دوشنی کے رخ کر کے دیکھا۔ پنسل کے دباؤ سے نیچے والے کاغذ پر بھی کچھ نقش بن گئے تھے مگر انھیں پڑھا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ کام کسی فنگر پرنٹ لیبارٹری میں ممکن تھا۔ اس نے نوٹ بک کو خاصی ناگواری سے ایک طرف پھینک دیا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ ہم نے اس کے انتظامات کے باوجود پیغام رسانی کا ذریعہ پیدا کر لیا تھا۔

رابعہ کو حاجی کے ہر کاب رہنے والے دو حکم کے غلام باہر لے گئے۔ ان کی جگہ دو نئے غلام آ گئے۔ یہ سب غلام ایک سے کپڑے پہنتے تھے۔ سر سے پیر تک خاکی لباس۔ لیکپ اور سیاہ چشمہ۔ قد و قامت میں بھی وہ ایک سے تھے۔ شکل کی یکسانی ان کی مشینی مستعدی خاصی تربیت اور ڈسپلن کی سختی کا نتیجہ لگتی تھی۔ وہ ایک سا اسلحہ رکھتے تھے اور ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ اور یہ نیچے ہوتی گنتی کے جھکولوں سے میرا ڈولنا ایک قدرتی امر تھا۔ ان کی انگلی ٹریگر پر رہتی تھی اور خفیف سا جھٹکا لگنے سے میرا جھٹکا ہو سکتا تھا۔

"ہم نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ الحمدللہ۔" حاجی عبداللہ نے تسبیح گھماتے ہوئے کہا۔ "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"آدمی کے ارادے سے کیا ہوتا ہے حاجی صاحب۔" میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔"

"پھر بھی کچھ تو سوچا ہوگا تم نے؟"

"جی۔ سوچا تو یہ ہے کہ بعد مقدا اپنی منکوحہ کے ساتھ سعادتِ بیت اللہ حاصل کروں۔ آپ کیا جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہاری یہ خواہش بھی ہم پوری کر دیں گے۔" حاجی نے ضبط سے کام لیا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ تم تعاون کرو گے ہم سے یا تمہیں بتانے کے لیے سوچنے کے لیے پورا دن پڑا ہے۔ رات تک ہم اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں تم نے سیکڑوں من سونا غرق کر دیا تھا۔ اگر تم نے یہ مقام کی نشاندہی کر دی تو صبح ہونے سے پہلے تم کو ایک لانف بوٹ فراہم کر دی جائے گی۔ تم اپنے دوست محسن اور رابعہ کے ساتھ چلے گئے۔"

"اور اگر میں نے ایسا نہ کیا۔ یا مجھ سے غلطی ہو گئی اس مقام کو پہچاننے میں۔ یا وہ سونا نہ ملا؟"

"سونا ہوگا تو ضرور ملے گا۔"

"دیکھیں نا جی۔ یہ سمندر کا پانی ہے۔ اس میں تو سالم بحری جہاز نگل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سمندری مخلوق ہے۔ شارک اور وہیل ہیں۔ وہ سب کچھ کھا جاتی ہیں۔ آپ سیکڑوں من سونا ہضم کر سکتے ہو تو کیا وہیل نہیں کر سکتی؟"

"ہم تمہاری بذلہ سنجی سے محظوظ ہوتے۔ لیکن برخوردار ہم اس وقت تمہاری شوخ نشانی دیکھیں گے جب عدم تعاون کے نتائج سامنے آئیں گے۔ ہم رابعہ کو واپس بھیج دیں گے اور محسن کو شوربا کے تمہارے حوالے کر دیں گے کہ اب اس کا مزار جہاں چاہو بناؤ۔ وہیں تمہارا مزار بھی بنا دیا جائے گا اور ہم رابعہ کو تمہارا مزار کی پروا اور فاتحہ خوانی کے لیے لائیں گے۔"

ایک لمحے کے لیے میرا دل خوف سے بھر گیا۔ الفاظ کہتے اکا بھڑتے کیوں نہ ہوں، اپنا مفہوم رکھتے ہیں اور تاثر رکھتے ہیں۔ بچے نہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن وہ اپنے المیہ اثر سے دلوں کو بوجھل اور خواتین کو اشکبار کر دیتی ہیں۔ تصور نے مجھے اپنے ساتھ ایک تصویر دکھائی جو حقیقی نہیں تھی لیکن اس سے مجھ کو وقتی طور پر دہشت زدہ کیا۔

"قبلہ حاجی صاحب!" میں نے کہا۔ "وقت بڑا بے رحم شاعر ہے۔ اولادِ آدم کی تقدیر حال سے آگے نہیں دیکھتی۔ اسی لیے فارسی میں کہا جاتا ہے کہ تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ اور اردو میں ایک شاعر نے ایک لاف آنی قسم کے انتہائی فضول شعر میں اسی خیال کو یوں باندھا ہے کہ آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو کیا معلوم کہ کل کیا ہو جائے۔ ممکن ہے یہ سب ایسے ہی ہو، مگر دوارہ دل جانیں۔ مزار آپ کا بنے اور ہم ہر سال عرس پر قوالی کریں۔"

حاجی کا چہرہ بگڑ گیا۔ اس کی آنکھیں انگارہ ہو گئیں اور وہ یوں اپنا سر جھٹکا رہے تھے۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنی حالت پر قابو پا لیا۔ "آگ لگے منہ کے۔" اپنے غلاموں سے کہا۔ "اسے ایک تیسر..."

میں لے جاؤ۔" اور خود واک آؤٹ کر گیا۔

"یہ ایک نمبر کیا ہے بھئی۔ فرسٹ کلاس؟" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "بحری جہاز پر ہوتے ہیں فرسٹ کلاس مسافر۔"

"چلو۔" ایک حکم کے غلام نے غرا کے کہا۔

"اگر میں کہوں کہ ٹھیک ہے۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔ دوسرے حکم کے غلام نے جیب میں سے وہی چھوٹا سا پستول نکالا جس سے بے حس کرنے والے زہریلے تیر فائر کیے جاتے تھے۔ اس نے ایک نیم رنگ کے پستول کا رخ میری طرف کیا۔

"اچھا بھائی۔ میں چلتا ہوں۔ مگر یہ فاؤل ہے۔" میں نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ انھوں نے مجھے ایسا کوئی موقع فراہم نہیں کیا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ان کا تیا پانچا کر سکتا یا ان سے ہتھیار چھین سکتا۔ حاجی عبداللہ نے اپنے حکم کے غلاموں کو میرے بارے میں بہت اچھی طرح بریفنگ کی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ میری تباہ کاری کی صلاحیت کیا ہے۔

ایک نمبر خود حاجی عبداللہ کا کیبن تھا اور جیسا کہ ایک کروڑ پتی اسمگلر اور لانچ کے مالک کے ذاتی استعمال کا کمرا ہونا چاہیے، یہ وسیع کمرا پُرشوکت تھا۔ بہترین قالینوں اور پردوں سے آراستہ ایئر کنڈیشنڈ پُرتکلف اور کشادہ۔ ایک کنارے پر خوبصورت اور آرام دہ ڈبل بیڈ تھا جس کے بالکل سامنے والی دیوار پر ٹی وی نصب تھا۔ کمرے کے چاروں کونوں میں رنگین شیڈ والے چار لیمپ روشن تھے جن سے سبز رنگ کا خنک خواب ناک اجالا کمرے میں پھیلا تھا۔

دوسرے گوشے میں گول قالین پر صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا اور وہیں ماربل ٹاپ والی گول میز پر میرے لیے ناشتا تیار تھا۔ الجھن میں اس خاطر مدارات اور اس حسنِ سلوک کے بارے میں حاجی کا شکریہ ارسال کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ دونوں حکم کے غلام اباؤٹ ٹرن ہو کے واپس ہو گئے۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو اسی دروازے سے رابعہ مسکراتی ہوئی اندر آ رہی تھی۔

"اس عنایتِ خسروانہ کا مطلب؟" میں نے کہا۔ "آخری خواہش کی تکمیل؟"

"حاجی کے ذہن میں تو یہی ہوگا۔" رابعہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم پہلے غسل کرو گے؟"

"پہلے اور بعد میں کیا مطلب؟" میں نے کہا۔ "یہ کوئی حجلۂ عروسی تو نہیں ہے تمہارا۔"

رابعہ کا رنگ لال پڑ گیا۔ "تم مجھے چڑا رہے ہو؟"

"بی بی رابعہ! یہ حاجی چاہتا ہے۔ کیا یہ واقعی میری آخری خواہش پوری کر سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"کیا ہوگی وہ خواہش؟ بدتمیزی مت کرنا۔"

www.paksociety.com

"لاحول ولا قوۃ۔ میں ایک شریف النفس، نجیب الطرفین، رقیق القلب قسم کا آدمی ہوں۔ آدمی کیا عاشق ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ وہ ذرا سی دیر کے لیے حاجی سے مولوی بن جائے۔ چار بندے پکڑ لائے۔ دو گواہ اور دو وکیل۔ نکاح پڑھانا تو آتا ہوگا اسے۔ نہیں تو میں خود پڑھ لوں گا۔ ملیٹ سروس۔"

"آپ بولتے بہت ہیں۔ میں نے یہ کافی بنا کے رکھ دی ہے۔ اور یہ دیکھیے۔ میں ناشتا بھی شروع کر رہی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "کافی! مجھے تو سچ مچ ایسا لگ رہا ہے جیسے کل صبح سزائے موت ہونے والی ہے۔ مجھے مدت سے یہ منظر میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ کافی، سلائس، مکھن، آملیٹ، سگریٹ۔ اور تم۔ میرے اتنے قریب۔"

"تم بہت کمزور ہو گئے ہو۔" رابعہ نے کہا۔

"اور تم بہت زیادہ خوبصورت ہو گئی ہو۔ یہ ایک غیر جانب دارانہ غیر جذباتی اظہار حقیقت ہے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تمھاری زندگی خاصی فراغت میں گزری۔ تفکرات بھی چہروں پر اپنی تحریر چھوڑ جاتے ہیں لیکن تمھیں افزائش حسن کے تمام مواقع حاصل رہے۔ چاند بھائی نے تو تمھارے لیے پرسنل بیوٹی پارلر قائم کر دیا ہوگا۔"

رابعہ آزردہ ہو گئی۔ "تم طعنے دے رہے ہو جیسے یا طنز کر رہے ہو کچھ بھی۔"

"تم سے لڑنے کو دل چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی تک تو خیر میں جذباتی ہو کر انتقام سے مل کر لیکن وجہ بات ابھی باقی ہے۔"

"کون سی بات؟ وہ تنگ کر لو۔"

"یہ جو تم نے خود اختیاری ہجر و فراق..."

"میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ میں بتا چکی ہوں۔ میں کل بھی اتنی ہی مجبور تھی جتنی آج ہوں۔"

"یہ غلط ہے۔ تم وہ جان سے اتر کے آ سکتی ہو تو کسی چھت سے اتر کے بھی فرار ہو سکتی ہو۔" میں نے سیٹ پر مکا مار کے کہا۔ "اور تم میرے خوابوں میں آ سکتی ہو بغیر پوچھے۔"

"ناشتا کرو چپ چاپ۔" وہ بولی۔

محسن کوئی آہٹ کیے بغیر اندر آ گیا۔ "ہیلو! کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟"

"محسن!" میں نے بڑے جوش و خروش سے اس کی طرف دوڑ لگائی۔ "یار بس تیری ہی کمی تھی۔ آ میرے ساتھ آخری طعام کر۔"

"یہ سب کیا سلسلہ ہے؟" محسن نے کہا۔ "رابعہ! کیا تم حاجی صاحب کی چوتھی بیوی بن چکی ہو؟"

"یہ کیا گھٹیا مذاق ہے۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"میں نے تم کو کئی بار دیکھا۔ آتے جاتے۔ آزادانہ گھومتے پھرتے۔ اچھے سے اچھے کپڑوں میں۔ حاجی صاحب سے گفتگو کرتے اور سمندر کے سفر سے لطف اندوز ہوتے۔" محسن نے کہا۔

"اس کا یہ مطلب نکلتا ہے؟"

"حاجی جیسا پاجی کسی پر بے سبب مہربان نہیں ہوگا اور اگر یہ وی آئی پی ٹریٹمنٹ مل رہا ہے تو آخر کس لیے؟" محسن کا لہجہ بہت تلخ تھا۔

"تم نے کون سے دکھ جھیلے ہیں بھائی...؟"

"شاید یہ رعایت بھی تمھارے طفیل ملی ہوگی۔ تم نے کہا تھا کہ حاجی صاحب سے کہ یہ میرے پرانے شناسا ہیں۔"

رابعہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم میری تذلیل کر رہے ہو۔"

"ہم بھی بہت ذلیل ہو چکے ہیں خاتون۔" محسن نے کہا۔

"ارے۔ تم سچ مچ لڑنے لگے۔" میں نے رابعہ کو ہاتھ پکڑ کے بٹھا دیا۔ "محسن! ہمارے اور حاجی کے درمیان سمجھوتہ ہو چکا ہے۔"

"یعنی ہم آ رہے اب ولاد رینڈ کمپنی میں ضم ہو گئے جاوید۔"

"فضول بکواس مت کرو۔ سمجھوتہ صرف ایک مسئلے پر ہوا ہے جس کا تعلق ہماری آزادی سے ہے۔ ہم اپنی آزادی خرید لیں گے۔ حاجی نے اس کی ایک قیمت طلب کی تھی۔ میں نے وہ قیمت ادا کرنا منظور کر لیا۔"

"اور یہ قیمت کیا تھی؟" محسن کا لہجہ بدستور تلخ رہا۔

"ہم وہ سونا حاجی کے سپرد کر دیں گے جو ہم نے ولاد رینڈ کمپنی کا اسلحہ سمجھ کے سمندر میں غرق کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ سونا اب کہاں...؟"

"وہیں جہاں ہونا چاہیے۔ مجھے معلوم ہے وہ جگہ۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ حکومت نے کب کا نکال لیا ہوگا۔ ہم نے کوسٹ گارڈز کو اطلاع دے دی تھی..."

میں نے اسے آنکھ ماری۔ "انھیں کسی نے اطلاع نہیں دی تھی اور یہ بات آج رات ثابت ہو جائے گی۔ کل صبح ہم آزاد ہوں گے، میں تم اور رابعہ۔"

"کہاں۔ عدم آباد جانے کے لیے؟"

"نہیں۔ حاجی نے وعدہ کیا ہے کہ ہمیں ایک لانچ پر فرار کر دیا جائے گا۔" میں نے بڑے جوش سے کہا۔

"تو... پاگل ہو گیا ہے۔ اس پر اعتبار کر رہا ہے جو مجھ سے زیادہ ناقابل اعتبار ہے۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔

"میں یہ چانس لوں گا۔" میں نے کہا۔ "اگر آزادی نہ ملی تو موت ملے گی۔ ایک ساتھ مر جانا اچھا ہے۔"

"تو مر جا رابعہ کے ساتھ۔ میرے بیوی بچے ہیں۔ میں ان کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"تو ان کے پاس جا بھی نہیں سکتا۔ اور وہ تیرے پاس نہیں آ سکتے۔ میرے یا تیرے اختیار میں کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ تو اب تم ہی سمجھنا چاہیے۔ غالب اور نازو بھی نہیں رہے۔ الیاس نے ساتھ چھوڑ دیا۔ ٹیڈی مر گیا۔ ہم تین ہی قید میں ہیں۔ زندان جانے کل اس قید سے چھوٹیں گے یا قید حیات سے۔"

ہمارے درمیان یہ فرضی لڑائی دوپہر تک جاری رہی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد حاجی نے ہم سب کو الگ کر دیا۔ رات تک میں ایک ایسے کمرے میں بند رہا جس میں صرف ایک بیڈ تھا۔ مگر وہ بہ دست زندہ۔ میں اس قید تنہائی پر احتجاج بھی نہیں کر سکتا تھا اور یہ مطالبہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مجھے رابعہ کے ساتھ رکھا جائے یا محسن کے ساتھ۔ اسے اندیشہ تھا کہ ہم تینوں مل کے کوئی [illegible] سے انتظامات درہم برہم ہو جائیں اور اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ ابھی تک وہ میری طرف سے تو مطمئن تھا کہ میں رابعہ کی خاطر اس سے تعاون کر رہا ہوں مگر محسن پر اس کا کوئی دباؤ نہیں تھا۔

میں نے اس فرصت میں نازو اور غالب کے بارے میں سوچا۔ معلوم نہیں ان پر اس جہاز کے اندر پہنچنے کے بعد کیا بیتی۔ جو کسی طرح بھی دشمن کے قلعے سے کم نہ تھا۔ اگر وہ جہاز پر قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے تو اب کہاں ہیں؟ کیا الیاس کراچی چھوڑ روانہ ہو گیا۔ ہم نے تو کہا تھا کہ مقررہ وقت پر اور شاہد تنہا بھٹکے ہوئے نقشے کے مطابق ہم ان سے آملیں گے۔ انھوں نے ہمارا انتظار کیا ہوگا۔ اور ہمارے [illegible] نہ ہوئی ہوگی۔ ان کو ہر قسم کے اندیشوں نے پریشان کر دیا ہوگا۔ اب ہم ان سے کیسے ملیں گے۔ اور کہاں ملیں گے!

اندیشہ مجھے آنے والی رات سے بھی تھا۔ اس رات کے دوران میں بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ محسن نے ٹھیک کہا تھا۔ سونا تو اب وہاں نہیں ہوگا۔ ہم نے متعلقہ حکام کو بہت اطلاع پہنچانے کا بندوبست کر لیا تھا۔ کسٹم والے یا ملٹری انٹیلی جنس والے وہ تمام ٹرک اور اسلحہ اور سونا سب لے جا چکے ہوں گے۔

حاجی کو عین وقت پر مایوسی ہوگی تو وہ کیا کرے گا! یہ ہو سکتا ہے کہ شدید اشتعال کی کیفیت میں وہ ہم سب کو شوٹ کر دے۔ کوئی سوال کیے بغیر اور وضاحت کا موقع دیے بغیر۔ یہ بھی ممکن ہے کہ [illegible] حاجی کی فوج کا مقابلہ کریں تو اس میں سب مارے جائیں۔ یہ کھلے سمندر کی جنگ تھی۔ اس کے خطرات اور مضمرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کاش کوئی ایسی صورت ہوتی کہ ہم لڑے بھڑے بغیر نکل جاتے۔

لیکن حاجی کوئی چانس نہیں لے رہا تھا۔ اس کے حفاظتی انتظامات ایسے تھے کہ مجھے ابھی تک کسی کی غفلت یا غلطی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ حالانکہ میری کوشش تھی کہ صرف ایک مسلح غلام کو قابو کر لوں اور اس سے ہتھیار چھین لوں۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اسی صورت میں قابو کیا جا سکتا تھا کہ میرے پاس بھی کچھ ہو۔

مجھے وقت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اس کمرے میں ایک لائٹ نہ ہوتی تو مکمل اندھیرا ہوتا۔ لانچ اب کس سمت میں رواں تھی یہ بھی میں نہیں جانتا تھا۔ میں نے کچھ وقت سو کے بھی گزارا اور اس وقت اٹھا جب حاجی نے مجھے بیدار کیا۔

"کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"رات کے ساڑھے نو بجے ہیں اور ہم تقریباً اس علاقے میں ہیں [illegible] تھا۔"

"یہ تمھیں کیا معلوم؟"

"وہ تھا کراچی کا ساحل اور کورنگی کریک کا علاقہ۔ ہم دس پندرہ میل کی پٹی کو کھنگال سکتے ہیں۔" وہ بولا۔ "بلکہ کھنگال چکے ہیں۔ ہمارے پاس سمندر کی تہ میں معدنیات کا پتا چلانے والے آلات ہیں اور اندھیرے میں فوٹوگرافی کا سامان بھی ہے۔ ساحل کے قریب تو ہمیں کچھ نہیں ملا تھا۔ زیادہ گہرے سمندر میں ہم گئے نہیں تھے کیونکہ اس وقت ہمارے پاس وہ ساز و سامان نہیں تھا جو ہم آج لائے ہیں۔"

"آج تم گہرے سمندر میں اترو گے۔ ویسے تو تمھارا ذاتی وزن بھی کافی ہے تمھیں تہ میں بٹھانے کے لیے۔ لیکن تم پیروں میں بیگ کے پاٹ باندھ لو تو۔"

"یہ کام تم کرو گے برخوردار۔ غوطہ خوری کا لباس پہن کے۔" حاجی مسکرایا۔ "تم ہو گے تو ہم تمہاری کے پاٹ بھی فراہم کر دیں گے۔ کیمرہ تمھارے پاس ہوگا اور اس کی تصویر ہم اوپر دیکھیں گے۔ اگر ہمیں سونا نظر آ گیا تو ہم تمھیں نکال لیں گے۔"

"ورنہ؟" میں نے کہا۔ "آپ بھی آ جائیں گے؟"

"ورنہ یہ کہ جب صور اسرافیل پھونکا جائے گا تو تم اسی سمندر کی تہ سے اٹھ کے آ جاؤ گے۔" حاجی نے کہا۔

"ویری گڈ۔ میں نہا دھو کے پہنچوں گا میدان حشر میں۔ مگر حاجی صاحب! میں اکیلا اتروں گا؟ سنا ہے نیچے سمندری مخلوق بھی ہوتی ہے۔ اگر میں کسی وہیل کے پیٹ میں چلا گیا تو آپ بھی [illegible] ممکن ہے کہ مجھے کوئی [illegible] لے جائے۔"

"فکر مت کرو۔ ہم محسن کو تمھارے ساتھ بھیج رہے ہیں۔ تم بچپن سے ساتھ ہونا۔ کبھی جدا نہیں ہوئے۔" حاجی نے کہا۔

اسی وقت ایک زبردست دھماکا ہوا اور مجھے یوں محسوس

www.paksociety.com

ہوا جیسے لانچ کسی چٹان سے ٹکرا گئی ہے۔

حاجی میرے ساتھ ہی فرش کے بل گرا۔ میں نے باہر عجیب سا شور سُنا۔ بہت سے لوگ بیک وقت چلا رہے تھے۔ گرنے سے پہلے میرا سر سامنے والی دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اس صدمے نے وقتی طور پر مجھے چکرا دیا۔ اگر میں سنبھل سکتا تو اس موقع سے پورا فائدہ اٹھاتا مگر مجھے اٹھنے میں دیر ہوئی۔ حاجی مجھ سے پہلے کھڑا ہو گیا تھا اور اس کے دونوں محافظ بھی اپنے قدم جما چکے تھے۔

"تم اس کا خیال رکھو۔" حاجی نے رومال سے چہرہ صاف کیا "ہم دیکھتے ہیں کیا شور ہے۔"

وہ پلٹا تو اس کے پیچھے کھڑے ہوئے دونوں مسلح محافظوں نے اسے راستہ دیا۔ یہ پہلی غلطی تھی جو حاجی سے میرے معاملے میں سرزد ہوئی۔ اگر وہ چاہتا تو محافظوں کو اپنے ساتھ ہی لے جاتا اور دروازہ پہلے کی طرح باہر سے مقفل کر دیتا مگر اس کا ارادہ فوراً واپس آنے کا تھا۔

عین اس وقت جب وہ دونوں محافظوں کے درمیان اور کھلے دروازے کی سیدھ میں تھا، میں نے اس پر جست لگائی۔ فلائنگ کِک کا اس سے بہتر اور بھرپور استعمال میں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اس کِک نے حاجی کو دروازے سے یوں باہر پھینکا کہ وہ توپ سے نکلے ہوئے گولے کی رفتار سے گیا اور عرشے کے بل گرنے کے بعد بھی گھسٹتا ہوا چند گز کا فاصلہ طے کر کے ایک دیوار سے ٹکرا گیا۔

اندر دونوں محافظ بوکھلا گئے تھے۔ میں نے فلائنگ کِک مارنے سے پہلے ان کی پوزیشن کا بھی صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ اس وقت پھیلے ہوئے تھے جب میرے پاؤں حاجی کی پشت سے ٹکرائے۔ دونوں محافظ میرے جہاز کے پروں کی طرح پھیلے ہوئے بازوؤں سے نہ بچ سکے۔ جب میں گرا تو وہ بھی دیوار سے ٹکرا کے گر چکے تھے۔

موقع ملتے ہی میری حیوانی جبلت، جسمانی صلاحیت اور پیشہ ورانہ مہارت ایک سپر فطری قوت بن گئے۔ میں بجلی کی طرح اٹھا اور ابھی ایک محافظ سنبھلا بھی نہ تھا کہ میں نے پوری قوت کے ساتھ اس کی گردن پر لگ ماری۔ پھر اس کی طرف دیکھے بغیر میں تیزی سے پلٹا اور دوسرے کو گردن سے پکڑ کے کھینچ لیا۔ دو گھٹنوں کے بل بیٹھے کے میرا نشانہ سیدھا تھا۔ جب میں نے اسے گھما کے فرش پر مارا تو اس کی گردن پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ خود اپنے جسم کے وزن کی حرکی قوت نے اس کی گردن توڑ دی۔

اب میں پہلے والے محافظ کی طرف متوجہ ہوا۔ میری کِک اس کے نرخرے پر پڑی تھی۔ اس کی آواز ہی بند نہیں ہوئی تھی، سانس بھی رک گئی تھی۔ یہ مشکل سے تیس سیکنڈ کا عمل تھا جس نے حاجی کو ناک آؤٹ کیا اور اس کے دونوں محافظوں کو ان کے فرائض سے ہی نہیں بلکہ زندگی سے بھی سبکدوش کر دیا۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو حاجی عبداللہ احمد کے فرار ہو رہا تھا۔ اس کا حلیہ بہت مضحکہ خیز تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے خوب پی رکھی ہے۔ وہ چلا کے محافظوں کو پکار رہا تھا۔

میں نے دونوں مُردہ محافظوں کے ہتھیار قبضے میں کیے۔ دو آٹومیٹک ریوالور روسی ساخت کے تھے۔ ریوالور مائی قسم کے گرویں ترین اور ریوالور رائفل کیپٹن کا عطیہ۔ ان میں سے ایک میں نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ ایک محافظ کے پاس سے مجھے زہر بجھے تیروں والا پستول بھی ملا۔ اس کی واسکٹ نما شرٹ کی اوپر والی جیب سے دو تیر بھی برآمد ہوئے جو میں نے اپنی جیب میں رکھ لیے۔

حاجی میری نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ میں گھٹنے دروازے سے باہر آیا اور اس مختصر سی راہداری سے گزرا جس میں حاجی کچھ دیر پہلے پڑا تھا۔ بائیں طرف اوپر جانے کا راستہ تھا اور عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ میں نے حاجی کو دیوانہ وار گالیاں بکتے سنا۔ پھر اوپر سے پانی کا ایک ریلا آیا جس نے مجھے سر سے پیر تک بھگو دیا۔ میں نے رابعہ کے چیخنے کی آواز بھی سنی۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔ لانچ میں گھپ اندھیرا پھیل گیا تھا اور اوپر پہنچنے کے بعد بھی مجھے کچھ سجھائی نہ دیا۔ میں یہی اتنا اندازہ کر سکا کہ لانچ غرق ہو رہی ہے۔

"محسن!" میں نے چلا کے کہا "رابعہ!"

"ادھر سکندر! ادھر آؤ!" رابعہ کی نسوانی دہشت میں ڈوبی ہوئی چیخ نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ میں ادھر لپکا جہاں سے یہ آواز آ رہی تھی۔ کسی نے مجھ پر فائر کیا۔ میں نے پسٹل سے گولی چلائی۔ ایک آدمی لانچ کے کنارے سے چیخ مار کے اچھلا اور پانی میں کود گیا۔ وہ آخری آدمی تھا جو وہاں موجود تھا۔ باقی سب سمندر میں چھلانگ لگا چکے تھے یا لائف بوٹ میں نکل گئے تھے۔

وہ ایک بند دروازہ تھا جس کا نصف سے زیادہ حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں تک جاتے ہوئے خود میں سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کی یلغار میں آ گیا۔ اندر سے رابعہ چیخ رہی تھی۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سمندر کا نمکین پانی میرے منہ، آنکھوں اور میری ناک میں بھر گیا تھا۔

"دروازہ کھولو سکندر!" رابعہ نے چلا کے کہا۔ میں نے پورا زور لگا کے ہینڈل گھمایا اور دروازے کو پانی کے دباؤ کے خلاف دھکیلا۔

"رابعہ!" میں نے چلا کے کہا "کہاں ہو تم؟ باہر آؤ۔ ادھر میں نے دروازہ پکڑ رکھا ہے۔"

آواز سنتے ہوئے دروازے میں اس کا ہاتھ آگے آیا۔ میں نے اسے گھٹنے سے دبایا اور اسے باہر کھینچا۔ ایک زبردست ریلے نے تقریباً غرق کر دیا مگر دروازہ اس تھپیڑے سے بند ہوا اور رابعہ ایک دم باہر آ گئی مگر وہ اب بے ہوش تھی۔ یہ تختہ ہٹایا تو دروازہ پانی کی قوت سے بند ہوا اور میں لڑکھڑا گیا۔ ایک ریلا پانی کے ساتھ رابعہ بھی میرے اوپر تھی۔ میں نے ایک پُر مشقت کی اور پانی سے باہر آ گیا۔

رابعہ کے وجود کو ایک ہاتھ سے کندھے پر سنبھال کے میں کنارے کی طرف چلنا شروع کیا۔ یہ لانچ کا وہ حصہ تھا جو اوپر اٹھا ہوا اور پانی سے باہر رہ گیا تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ لانچ کسی چٹان پر چڑھ گئی تھی اور الٹ چکی تھی۔ کوئی بڑی لہر کسی وقت اس کو چٹان کے کنارے سے لڑھکا سکتی تھی۔ ایسی صورت میں ہم دونوں لانچ کے نیچے دب جاتے اور شاید ہمیں اوپر آنے کا راستہ بھی نہ ملتا۔

رابعہ کا اور میرا مشترکہ وزن ڈھائی سو پونڈ سے بھی زیادہ بنتا تھا۔ لانچ ایسے زاویے سے چٹان پر اٹکی ہوئی تھی کہ ہر لہر اسے ہلا رہی تھی۔ مجھے بھی اسی طرف جانا تھا۔ اگر میں آخری حصے تک جا پاتا تو چٹان پر اترنے کی کوشش کر سکتا تھا مگر یہ بہت غیر یقینی تھا۔ یہ لگتا تھا کہ آخری کنارا اتنا وزن برداشت نہ کر پائے گا اور لانچ ہمارے ساتھ ہی الٹ جائے گی۔

چٹان سے لہروں کے ٹکرانے کا شور اتنا زیادہ تھا کہ میں نے محسن کی آواز بہت دیر سے سنی۔ پہلے مجھے شک ہوا کہ میرے کان بج رہے ہیں۔ پھر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ نیچے گہرے پانی میں ایک سیاہ نقطہ سا نظر آ رہا تھا۔ یہ محسن تھا جو لہروں سے بھی ابھر رہا تھا اور ڈوب رہا تھا۔ وہ ہاتھ ہلا کے متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ بھی میری قوتِ سماعت کا کمال تھا کہ اندر کہ میں نے محسن کی بات سمجھ لی۔ وہ مجھے اس طرف جانے سے روک رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کنارے تک پہنچنے کی کوشش کرنا خودکشی کی کوشش کے مترادف تھا۔ لانچ اوپر اٹھی ہوئی تھی اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم کسی دوسری چٹان پر گرتے اور پھر لانچ کے نیچے ہماری ہڈیوں کا بھی سرمہ ہو جاتا۔

اندھیرا زیادہ گہرا نہیں تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے چہرے کو صاف کیا اور آنکھیں پھاڑ کے دیکھا۔ میری آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی لیکن میں ان کو کھلا رکھنے پر مجبور تھا۔ محسن کا ہاتھ مجھے اپنی جانب بلا رہا تھا۔ میں نے گھٹنوں سے اوپر پانی میں لانچ کا کنارہ تلاش کیا۔ رابعہ کو مضبوطی سے کندھے پر سنبھالا اور پانی میں کود گیا۔

میں اس جگہ سے بہت دور گرا جہاں محسن موجود تھا لیکن ملنے کے بعد میں دیکھا۔ اس سے پہلے میں نے لانچ کو ایک اور دھماکے کے ساتھ پانی میں الٹتے دیکھا۔ میں نے جب اس کے کنارے پر قدم جما کے چھلانگ لگائی تھی تو اس کا توازن جھٹکے سے بگڑا تھا اور اس کا آخری حصہ چٹان پر سے پھسل گیا تھا۔

لانچ کے پانی میں گرنے سے ایک زبردست لہر اٹھی جس نے مجھے دور اچھال دیا۔ میں نے جب پھر سطحِ آب پر آ کے دیکھا تو محسن مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ مجھے اب اپنی نہیں رابعہ کی فکر تھی۔ اس نے بے ہوشی کے عالم میں سمندر کی یلغار کا مقابلہ کیا تھا۔ معلوم نہیں کتنا پانی اس کی ناک اور اس کے منہ کے راستے پیٹ میں اتر چکا تھا۔ اسے ہوش میں لانے کے لیے جلد از جلد خشکی پر پہنچنا ضروری تھا۔ محسن نے میرا ہاتھ پکڑ کے ساحل کی طرف تیرنا شروع کیا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" محسن نے چیخ کر پوچھا۔

"یہ بے ہوش ہے ابھی تو!" میں نے ہانپتے ہوئے بڑی مشکل سے جواب دیا۔ "حاجی کہاں گیا؟"

"بھاگ گیا شاید۔" محسن نے اونچی آواز میں کہا۔ "میں نے اس کی لائف بوٹ پر فائر کیا تھا۔ اس میں سوراخ ہو گیا تھا۔ ان سب کا اسلحہ... بھیگ کر بے کار ہو چکا تھا... ورنہ وہ مجھے مار ڈالتے۔"

"دو کو میں نے مار دیا تھا۔ لیکن تین کو؟" میں نے کہا۔

"ایک میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ باقی سب نکل گئے حاجی کے ساتھ۔" وہ بولا۔

ساحل تک پہنچتے پہنچتے مجھ پر بھی تقریباً بے ہوشی طاری ہونے لگی تھی مگر محسن نے میری مدد کی۔ آخری چند گز میں نے قوتِ ارادی کے سہارے طے کیے۔ پانی کا زور اب ٹوٹ گیا تھا اور ساحل تک پہنچنے والی لہریں پیار سے تھپکی دیتی محسوس ہوتی تھیں۔

میں نے رابعہ کو ریت پر لٹا دیا اور خود اس کے برابر ہی لیٹ گیا۔ چند لمحے اور گہرے سانس لے کر جب میری توانائی کچھ بحال ہوئی تو میں نے رابعہ کو دیکھا۔ اس کی نبض کچھ سست تھی لیکن یہ تشویش کی بات نہیں تھی۔ بے ہوشی میں سانس اور نبض دونوں کی رفتار دھیمی پڑ جاتی ہے۔

"اس کے پیٹ میں پانی تو نہیں گیا؟" محسن نے سوال کیا۔

"گیا ہو گا، مجھے معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہیں آتا ہے وہ عمل پیٹ سے پانی نکالنے کا؟"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا اور رابعہ کو الٹا لٹا کے اس کی کمر پر دباؤ ڈالنے لگا۔ میں نے اس کی ہدایات کے مطابق رابعہ کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا مگر اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ رابعہ کے پیٹ میں غالباً اتنا پانی نہیں تھا کہ واپس نکل سکتا۔ محسن نے

www.paksociety.com

اُسے پھر سیدھا لٹا دیا اور ہم نے اس کے پیروں کے تلوے اور ہاتھ رگڑنے شروع کیے۔

دس منٹ کے بعد ہماری محنت رنگ لائی اور رابعہ نے ہوں ہاں کر کے تھوڑی سی حرکت کی۔ پھر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی اور بے چینی سے ہاتھ پیر مارنے لگی۔ اس کی بے ہوشی میں خوف کا عنصر شامل تھا۔ جب وہ لانچ کے اس کیبن میں بند ہو گئی تھی تو اُسے چڑھتا پانی ایک اژدھا، بے رحم اور ناقابلِ شکست قوت محسوس ہوا ہوگا۔ سمندر کی ہلاکت خیز قوت کے مقابلے میں وہ تنہا تھی اور محصور تھی۔ اس کی فریاد و فغاں سے فرشتۂ اجل کی پیش قدمی رک جائے گی، اُس کا یقین ہر لمحے کے ساتھ ختم ہو رہا تھا۔ اور اسی بے بسی کی موت کا خوف اس کو بے ہوشی کی آغوش میں لے گیا تھا۔

اب ہوش کی منزل کی طرف لوٹتے ہوئے اس نے لاشعور کے نہاں خانوں میں دبکے ہوئے خوف کو پھر دیکھا اور اُسے اپنے وجود سے خارج کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئی۔ اُس نے چلانا اور مجھے پکارنا شروع کیا۔

"سکندر... سکندر! مجھے بچاؤ... میں ڈوب جاؤں گی۔ مجھے نکالو..." اس نے چلانا شروع کیا۔

میں نے اُسے زور زور سے جھنجھوڑا۔ اس کے گالوں پر تھپڑ مارے۔ "رابعہ... جانِ من... دیکھو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ رابعہ ہوش میں آؤ... تم بالکل محفوظ ہو۔ میرے پاس ہو۔"

رابعہ نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور آنکھیں کھول کے کمزور لہجے میں کہا۔ "تم... تم آ گئے سکندر۔" پھر اُس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "مجھے چھوڑ کے مت جانا سمندر میں..."

"جان... میری طرف دیکھو... ادھر دیکھو۔ یہ محسن ہے... ہم ساحل پر ہیں... سمندر بہت دور ہے۔"

"نہیں... دیکھو سمندر کیسے پھنکار رہا ہے۔ یہ مجھے اور تمہیں نگل لے گا۔" وہ کانپتے ہوئے بولی۔ "وہ ذلیل حاجی ہمیں لے جائے گا۔"

"وہ غرق ہو گیا رابعہ۔ جہنم رسید ہوا۔ وہ اپنی لانچ کے ساتھ ہی ڈوب گیا۔" میں نے کہا۔ "اس سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں رہی۔ خدا نے ہم سب کو بچا لیا ہے اور پھر ملا دیا ہے۔"

اُس نے باری باری مجھے اور محسن کو دیکھا اور ایک گہری لمبی پُراطمینان سانس لی۔ پھر اُس نے آنکھیں بند کر کے خود کو نیند کے سپرد کر دیا۔

"یار محسن یہ سب کیسے ہوا؟ لانچ کا ناخدا اُس چٹان کو دیکھ نہیں سکا؟" میں نے کہا۔ "مجھے ایک معجزہ ہی لگتا ہے جیسے قدرت کو ہمیں بچانا منظور تھا۔ اُس نے ناخدا کو اندھا کر دیا یا اُس کی راہ میں چٹان کھڑی کر دی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوئی سنت کبیر۔" محسن بولا۔

"پھر... کیا کسی دوسری لانچ نے ٹکر مار دی... میں سمجھ گیا۔ یہ چاند بھائی کا کام ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اس کے آدمی..."

"اگر وہ آتے تو اس وقت آتے جب حاجی عبداللہ سونا سنبھالنے میں مصروف ہو جاتا۔" محسن نے میری بات کاٹ دی۔ "کیا تجھے معلوم ہے کہ حاجی نے ہم دونوں کو سمندر میں پھینکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم تو پیچھے ہی رہ جاتے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ کارنامہ میں نے سر انجام دیا۔" محسن فخر سے بولا۔

"تم نے؟ تنہا؟"

"کون سا کارنامہ... جو کیا لانچ کو تو نے چٹان پر چڑھا دیا تھا؟" میں نے کہا۔ "تیرے پاس کوئی پُراسرار قوت آ گئی تھی؟"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اسے پُراسرار قوت ہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر وہ طاقت میرے ہاتھ میں رابعہ نے دی تھی۔"

"رابعہ کے پاس ایسی کون سی قوت تھی؟"

"مجھے نہیں معلوم اُس نے کہاں سے اور کیسے ایک چھوٹی سی شیشی کسی زہریلے سفوف کی حاصل کر لی تھی۔ وہ بہت مؤثر زہر تھا۔ میرا خیال ہے وہی ان مقتول کر دینے والے تیروں کی نوک پر لگایا جاتا ہوگا۔"

"ممکن ہے اسے شیشی کہیں پڑی مل گئی ہو۔ وہ کسی سے زہر چھین تو نہیں سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

"ہاں، یہ تو اب رابعہ ہی بتا سکتی ہے۔ حاجی کے نمک خواروں میں کسی نمک حرام کی موجودگی کو بھی خارج از امکان تو نہیں سمجھا جا سکتا۔" محسن بولا۔

"وہ ہماری مدد بھی کر سکتا تھا۔"

"مگر رابعہ ہم سے بہتر پوزیشن میں تھی۔ ہم قیدی تھے اور حاجی نے ہمیں بہت خطرناک قرار دیا ہوگا۔" محسن بولا۔ "... رابعہ سے کیا بعید! اُس نے بے وقوف بنایا ہو کسی کو۔ بھائی، ان لڑکیوں کے پاس عشوہ و غمزہ و ادا کا جادو بھی تو ہوتا ہے۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے کہا۔ "خیر۔"

"اس نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ اس کے کمرے میں

زرات وغیرہ رکھے ہوں گے۔ وہ کیلوں کا ایک گچھا لے کر میری طرف بڑھی۔ دروازے پر ایک محافظ کھڑا تھا۔ اُس نے رابعہ کو روکا۔ رابعہ نے کہا کہ حاجی صاحب نے یہ کیلے دیے ہیں اندر لے جانے کے لیے۔ تم دے دو۔ شک کی کیا بات ہے۔ چاہو تو چکھ لو میری۔ وہ خود ایک کیلا کھا رہی تھی۔ ایک اُس نے پیش کر دیا۔ لو تم بھی کھاؤ۔ وہ میری طرف دروازے سے اچھال دیے۔ اور آگے چلی گئی۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اتنی دیر میں محافظ نے کیلا چھیلا اور دو منہ مار کے نگل گیا۔ چھلکا اُس نے سمندر میں اچھال دیا۔ میں نے چار کیلے اُٹھائے تو درمیان میں چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ دکھائی دیا۔ اس پر لکھا تھا۔ "محافظ نے کیلے میں زہر کھا لیا ہے۔ دوسرے کیلے میں شیشی ہے۔" میں نے فوراً شیشی مٹھی میں چھپا لی اور ایک کیلا چھیلا۔ ان میں سے ایک کے درمیان وہ شیشی چھپی ہوئی تھی۔ میں نے محافظ سے کہا، لو۔ ایک اور کھاؤ۔ غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے باقی زہر دوسری شیشی میں انڈیل دیا تھا۔ وہ اندر آتے آتے رک گیا۔ غالباً اسے خیال آ گیا تھا کہ ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔ کہیں یہ میری چال نہ ہو۔ محافظ بے چارے سخت ڈیوٹی دیتے ہیں اور یہ فروٹ وغیرہ ان کو کہاں ملتے ہیں۔ ایک کیلا تو اس نے وہیں کھڑے کھڑے آسانی سے نگلا تھا کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ اندر آیا اور چکر کھا کے گر گیا۔ میں نے ایک دم دروازہ بند کر دیا۔ تین منٹ سے پہلے ہی زہر نے اثر دکھا دیا تھا۔ میں نے اُسے باتھ روم میں ڈالا۔ اس کے کپڑے پہنے اور اس کا اسلحہ لے کر نکل آیا۔ میں نے سیدھا ناخدا کے کیبن کا رخ کیا۔ وہ مجھے پہلی نظر میں پہچاننے سے قاصر رہا۔ میں نے دو کیلے اس کے سامنے رکھ دیے اور واپس لوٹا۔ وہ دونوں کیلوں کو ندیدوں کی طرح نگل گیا۔ اس نے چلا کے پوچھا بھی کہ یہ کہاں سے آئے تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا کہ حاجی صاحب نے دیے ہیں۔ صرف تین منٹ بعد وہ ہوا جو ایک حادثہ سمجھا گیا۔ ایک لاش اگر ناخدا کے فرائض سنبھالنے لگی تو پھر یہی ہوگا۔ میں بالکل تیار تھا۔ حادثہ ہوتے ہی میں نے رابعہ کو تلاش کیا۔ دو محافظ میرے ہاتھوں مارے گئے۔"

رابعہ نے کہا۔ "اب ہم کہاں ہیں؟"

میں نے اور محسن نے چونک کے اُسے دیکھا۔ "اُن سے بہت دور اور محفوظ۔" میں نے کہا۔

"تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے... سکندر، اب ہم یہاں سے نکل جائیں۔"

"تم چل سکتی ہو؟" میں نے کہا۔ اور اُسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔

مجھے تھوڑا سا اندازہ تھا کہ ہم آبادی سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔ اگر ہم اسی سمت میں چلتے رہے تو کسی نہ کسی گوٹھ تک ضرور جا پہنچیں گے۔ رابعہ اس خیال سے بہت خوفزدہ تھی کہ کہیں وہ لوگ بھی ساحل پر ہمارے تعاقب میں نہ پہنچ جائیں۔ ہمارے کپڑے بالکل بھیگے ہوئے تھے۔ میں نے بے مصرف ہو جانے والے ریوالور نکال کے پھینکے۔ زہریلے تیروں والا ریوالور بھی پھینکنے ہی والا تھا کہ ایک خیال نے مجھے روک لیا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ پانی میں بھیگنے سے زہر میں بجھے تیروں کی صلاحیت میں فرق نہ آیا ہو۔ ضرورت پڑنے پر یہ چیز اپنی افادیت کسی ریوالور سے زیادہ ثابت کر سکتی تھی۔

ایک آبادی تک پہنچتے پہنچتے ہماری حالت تھکن سے مزید خراب ہو گئی۔ ریت اور ناہموار راستوں پر چلنا بہت مشکل کام تھا۔ وہ کوئی چھوٹا سا گوٹھ تھا جس میں بیشتر گھر کچے تھے اور ان میں مزدور یا ماہی گیر ہی آباد ہو سکتے تھے۔

"اگر کسی نے پوچھا تو ہم کیا کہیں گے؟" محسن بولا۔

"ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری لانچ ڈوب گئی۔ وہ اگر چاہیں تو تصدیق کر لیں۔" میں نے کہا۔ "ایک عورت ہمارے ساتھ ہے۔ انہیں شک نہیں ہو سکتا۔"

گاؤں میں کتے بھونک رہے تھے۔ ہم تنگ اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں چلتے گئے۔ بالآخر ایک سفیدی کیا ہوا پکا مکان نظر آیا۔ اس کے ایک روشندان میں سے روشنی بھی باہر آ رہی تھی۔ میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ دستک دے۔ اندر سے کوئی ضرور پوچھے گا کہ اتنی رات گئے آنے والا کون ہے اور جواب مرد کی آواز میں ملا تو ممکن ہے وہ سمجھیں کہ ڈاکو آ گئے۔

تیسری دستک پر کوئی دروازے کے قریب آیا۔ کنڈی کھولنے سے پہلے کسی مرد نے کہا۔ "کون ہے بھائی؟"

"ہم ہیں جی مسافر۔" رابعہ نے عاجزی سے کہا۔ "کشتی ڈوب گئی ہماری۔"

وہ دروازہ کھول کے باہر آیا۔ لالٹین اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اُس نے روشنی میں ہم سب کے چہرے غور سے دیکھے۔ "کشتی ڈوب گئی تمہاری، کہاں... تم مچھیرے تو نہیں لگتے۔" اُس نے کہا۔

"ہم ماہی گیر نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور کشتی نہیں وہ لانچ تھی ہماری۔"

"لانچ؟" وہ چونکا۔ "تم... اسمگلر ہو؟"

"نہیں بھائی، ہم تو صرف رات گزارنا چاہتے ہیں یہاں۔ ہم بڑی مشکل سے ساحل تک پہنچے ہیں۔ کچھ کھایا پیا بھی نہیں

www.paksociety.com

ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔۔۔ اچھا آجاؤ۔ کیا تمہیں معلوم ہے یہ کس کا گھر ہے؟"

وہ بولا۔

میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ بھاری بھرکم جسم کرخت چہرے اور گھنی مونچھوں والا شخص تھا۔ "اس سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے بھائی۔" رابعہ نے کہا۔ "ہماری مدد کوئی بھی کرے۔"

"مدد تو نہیں کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "لیکن میرے ساتھ کوئی جلد بازی مت کرنا۔ میں بہت خطرناک آدمی ہوں۔ تم نے نام ضرور سنا ہوگا میرا۔ شیش ناگ۔ ڈاکو شیش ناگ۔"

رابعہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گئی مگر میں نے آگے بڑھ کے کہا۔ "ہمارے لیے تو تم صرف ایک محسن ہو۔"

وہ راستے سے ہٹ گیا۔ رابعہ ڈرتے ڈرتے اس کے پاس سے گزری۔ پھر محسن اندر گیا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ مجھے اپنے پیچھے آوازیں سنائی دیں۔

"یہ بھی تمہارے ساتھی ہیں؟" شیش ناگ نے سوال کیا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ حاجی عبداللہ اپنے چار مسلح غلاموں کے ساتھ اسی گھر کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔

"نہیں" یہ میرے ساتھی نہیں ہیں۔" میں نے اندر گھستے ہوئے کہا۔ "یہ دشمن ہیں ہمارے۔ ان کو اندر مت آنے دینا۔"

"یہ کیا چکر ہے؟" شیش ناگ غرا کے بولا۔

"کوئی چکر نہیں۔ ہم سب بتا دیں گے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "لیکن دیکھو، ابھی تم بچا لو ہمیں۔"

"ہاں بھائی، آخر ہم پہلے تمہارے پاس آ گئے تھے۔ اب ہم تمہاری چھت کے نیچے ہیں۔ تمہاری پناہ میں ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"تم اتنے بزدل تو نہیں ہو سکتے کہ اپنے مہمانوں کو ان کے دشمنوں کے حوالے کر دو۔ یا وہ تمہارے گھر میں گھس کے انھیں مار جائیں۔" محسن نے کہا۔

اس کو دلیلوں سے قائل نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کے ساتھ زبردستی کرنا ایک اور خطرناک دشمن پیدا کرنے کے مترادف تھا جو دوسرے خطرناک دشمن کے ساتھ مل جاتا تو ہم کہیں کے نہ رہتے۔ جذباتی اپیل اپنا کام کر گئی۔

"اسے کیسی کی ماں نے جنا ہے ایسا لال جو شیش ناگ کے گھر میں قدم بھی رکھ سکے اس کی مرضی کے بغیر۔ تم چلو اندر۔" وہ پھنکار کے بولا۔

"خیال رکھنا یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔" میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ لیکن میں اس دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر صحن میں ٹھہر گیا۔ یہ دالان ایک خوبصورت کا تھا جس کے دائیں بائیں کمرے تھے۔ اور پھر صحن کے چاروں طرف بھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے شیش ناگ کی آواز سنی۔

"میرا نام حاجی عبداللہ ہے۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔" عادت کے مطابق حاجی نے قرأت کے ساتھ کہا۔

"وعلیکم السلام۔ حاجی صاحب حکم کرو۔"

"ابھی ہم نے یہاں تین افراد کو آتے دیکھا ہے۔ دو مرد ہیں اور ان کے ساتھ ایک خاتون۔"

"ضرور دیکھا ہوگا۔ آگے حکم کرو۔"

"وہ ہمارے مجرم ہیں۔ ہمارے ملازم ہیں۔"

"کبھی مجرم کبھی ملازم۔۔۔ تم خود کیا ہو؟" شیش ناگ نے کہا۔

"میں ایک تاجر ہوں اور وہ میرے ملازم ہی تھے۔ مگر وہ نجانے کیسے فرار ہو گئے ہیں۔" حاجی نے وضاحت کی۔

"وہ فرار ہو کے یہاں کیسے آ گئے اور تم ان کا پیچھا کرتے ہوئے سیدھے یہاں آ پہنچے۔ تم تو پولیس کے بھی باپ ہو۔" وہ مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ "بڑے زبردست جاسوس ہو۔"

"دیکھو، بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم ایک لانچ میں سفر کر رہے تھے کہ حادثہ پیش آ گیا۔ ان تینوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور تجوری میں سے سب کچھ نکال کے فرار ہو گئے۔ یہ حادثہ ساحل کے بہت قریب پیش آیا تھا۔" حاجی نے کہا۔

"اچھا، تم ادھر ہی ٹھہرو۔ میں ان سے پوچھ لوں۔ کتنا مال تھا تمہارا؟" شیش ناگ نے کہا۔

"وہ سب کچھ ہوگا جو تجوری میں تھا۔ نقد روپیہ اور کچھ زیورات۔ میرے جواہرات۔" حاجی نے کہا۔ "لیکن وہ تمہارے سامنے قبول نہیں کریں گے۔ انھیں میرے حوالے کر دو۔ میں جانتا ہوں ایسے لوگوں سے پوچھ گچھ کا طریقہ۔"

"اب یہ حاجی تو ہمارے گھر کے بندوں پر الزام لگاتا ہے اور یہی بولتا ہے کہ ہم گستے ہیں تو اسے پہلے ہی تو بہت بڑا عقلمند ہے۔ ہم تفتیش نہیں کر سکتے اور تو کر سکتا ہے؟" شیش ناگ نے بڑی لے سے کہا۔ "شیش ناگ ہے میرا نام۔"

"دیکھو، تم شیش ناگ ہو یا کوبرا۔ ہم تمہیں یہ بتا دیں کہ وہ بہت خطرناک مجرم ہیں۔ انھوں نے چار آدمی بھی مار دیے ہمارے جو ان کو روکنا چاہتے تھے اور وہ لوٹے ہوئے احسان فراموش ہیں کہ تم انھیں پناہ دے کر پچھتاؤ گے۔ وہ تمہیں بھی مار جائیں گے۔" حاجی کی جھنجلاہٹ اب اشتعال کی کیفیت میں بدل رہی تھی۔

"ہوشیار! وہ تیرے ہوا تو۔" یہ صدا غالباً شیش ناگ نے اندر کی طرف منہ کرکے دی تھی۔ "ادھر آؤ، ذرا میرے شیرو۔"

میں نے تقریباً ہر دروازے سے ایک شخص کو رائفل کے ساتھ باہر آتے دیکھا۔ ان میں سے دو جو شیش ناگ کی طرف جاتے ہوئے میرے سامنے سے گزرے۔ وہ سب ہی بھیانک شکل کے سیاہ داڑھیوں اور بکھرے بالوں والے خونخوار لوگ تھے۔ ان میں سے ایک نے رک کر میری صورت کو غور سے دیکھا پھر اس نے عجیب انداز سے سر ہلایا اور آگے چلا گیا۔

"خیر ہو گئی سردار؟"

"آؤ شیرو، ادھر خیال کرو۔ یہ ہمارے دہلیز سے آگے آئیں میرے واپس آنے تک۔" شیش ناگ نے کہا۔

اس کے چار دوسرے ساتھی دائیں بائیں سے چھت پر چڑھ گئے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے کوئی زینہ استعمال نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنے قریب سے اوپر جانے والے دو افراد کی کارروائی کا دلچسپ مشاہدہ کیا۔ انھوں نے پہلے۔۔۔۔ تو اپنی اپنی رائفلیں چھت پر پھینک دیں۔ پھر ایک نیچے جھکا اور دوسرا اس کے کندھوں پر چڑھ گیا۔ اس نے اطمینان سے اپنے ساتھی کے کاندھے پر قدم جمائے اور چھت پر ہاتھ ڈال کے اوپر پہنچ گیا۔ اوپر سے اس نے ایک کپڑا لٹکایا جو اس کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ دوسرے نے اسے پکڑا اور دیوار پر قدم رکھ کے اوپر کی طرف چلا گیا۔ یہ خیشو ور ڈاکوؤں کا گروہ تھا اور وہ کسی بھی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کی تربیت تجربہ اور صلاحیت رکھتے تھے۔ اوپر جانے والے چاروں افراد نے چھت کے کناروں پر مورچے سنبھال لیے ہوں گے اور دشمن ان کی زد میں ہوگا۔

شیش ناگ میرے سامنے نمودار ہوا۔ "تم نے سنا وہ کیا بول رہا ہے؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ تم ہماری تلاشی لے سکتے ہو۔ ہمارے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے۔"

"ہاں میں تلاشی لوں گا۔" وہ بولا۔ "اس عورت کی بھی۔ کیا لگتی ہے وہ تمہاری؟"

"میری بیوی ہے وہ۔" میں نے کہا۔ "دوسرا میرا سالا ہے۔ لیکن سردار، ایک عورت کی تلاشی؟"

"یہ کام ایک عورت ہی کرے گی۔" وہ بولا۔ "چلو میرے ساتھ، خبردار جو کوئی الٹی سیدھی حرکت کی۔ تمہاری لاشیں بھی باہر نہیں جائیں گی۔ اسی احاطے میں دفن کرا دوں گا میں سب کو۔"

میں نے سر ہلایا اور اس کے پیچھے چلتا ہوا ساتھ والے کمرے میں گیا۔ جہاں رابعہ اور محسن پریشانی کے عالم میں کھڑے تھے۔ اس خالی کمرے میں بان کی ایک کھری چارپائی تھی اور دیوار پر طاقچے میں لالٹین بھی ہوئی تھی۔ طاقچے کے اوپر کا حصہ بالکل کالا پڑ چکا تھا۔ ہیٹالی دیوار سے ان تینوں اور رابعہ کی پرچھائیاں بھی ساکت تھیں۔

شیش ناگ نے پہلے میری اور پھر محسن کی جامہ تلاشی لی۔ ہم نے قطعی مزاحمت نہیں کی اور اپنا رویہ تبدیلی کی حد تک شریفانہ رکھا۔ اس مشکل صورت حال سے نکلنے کا سب سے آسان راستہ خود حاجی عبداللہ کے جھوٹ نے پیدا کر دیا تھا۔ اب حاجی کو بدنیت اور جھوٹا ثابت کرکے ہم اپنے میزبانوں کی مکمل حمایت حاصل کر سکتے تھے۔

رابعہ کی باری آئی تو اس نے دروازے میں سے ہانک لگائی۔ "ناگ منی، او ناگ منی!"

"واہ" میں نے دل میں کہا۔ "کیا نام ہیں اور کیا جوڑی ہے۔ ایک شیش ناگ، دوسری ناگ منی۔ تو ما چاند میں تری چاندنی۔ کیا فلمی سچویشن ہے۔ ہیرو اور ہیروئن ایک سمندری طوفان اور تندی باد مخالف سے لڑتے ہوئے ساحل تک پہنچتے ہیں تو ڈاکوؤں کے گروہ میں پھنس جاتے ہیں جہاں ڈاکو شیش ناگ اور اس کی بیوی۔۔۔ یا محبوبہ۔۔۔ ہے ناگ منی۔"

ناگ منی چھم سے اندر آ گئی۔ چھم سے اس لیے کہ اس نے پیروں میں چاندی کی پازیب پہن رکھی تھی۔ اس کا لباس دو حصوں پر مشتمل تھا۔ اوپر ایک چولی جو کھال سے چپکی ہوئی تھی اور اس کی کمر کے بالائی حصے پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ پھر پیٹ سے کالی نیچے کا حصہ تھا جسے منی اسکرٹ سے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔ یہ گھگرا اس کی پنڈلیوں کے نصف حصے تک پہنچتا تھا۔ ماڈرن شارٹ کے نیچے سے ڈیڑھ دو فٹ کاٹ دیا جائے تو کچھ ایسی ہی چیز بنے گی۔ یہ لباس شاید ارکان عملہ سنسر بورڈ کے نزدیک غیر شرعی ہو

www.paksociety.com

مگر یہ غیر روایتی نہیں تھا۔

وہ دلکش نقوش والی قد سے فربہی کی طرف مائل اور خاصے بے باک انداز و اطوار رکھنے والی گوری چٹی عورت تھی۔ اس کی چولی اور لہنگے کا سرخ رنگ، انگلیوں میں پھنسی ہوئی سونے کی انگوٹھیاں، ہیرے کی لونگ اور شوخ رنگ کی لپ اسٹک اسے کوئی شریف عورت نہیں ثابت کرتے تھے۔ ممکن ہے وہ پہلے طوائف رہی ہو یا کسی طوائف کے ذریعے پہنچ کر اور شیش ناگ کے ساتھ بھاگ آئی ہو۔ طوائف اور ڈاکو ہمارے معاشرے کے دو بدنام، پُر اسرار اور متنازعہ کردار ہیں جو فلسازوں اور دانشوروں کے لیے دلچسپ مواد فراہم کرتے ہیں، جرم و گناہ کے معاشرتی اور نفسیاتی عوامل کا تجزیہ کرنے کے لیے۔

"وہ ہمیں اس عورت کو ساتھ لے جا۔ اس کی تلاشی لے کر بتا مجھے، کیا مال ہے اس کے پاس۔"

ناگ منی نے رابعہ کو شانے سے پکڑ کے دھکیلا۔

"اندر چل۔"

"ارے ایسے نہیں، یہ مہمان ہیں۔" شیش ناگ نے اسے ڈانٹا مگر بلا شدت سے۔

"یہ کیا طریقہ ہے؟" باہر سے حاجی نے چیخ کر کہا۔ "تم مجھے جانتے نہیں ابھی۔ میں اثر و رسوخ والا آدمی ہوں۔"

"چپ کر بکواس مت کر۔" کسی نے کرخت لہجے میں جواب دیا۔ "خبردار آگے مت آنا۔" یہ دھمکی غالباً کسی نے چھت پر سے دی تھی۔ "کھوپڑی اڑا دوں گا۔ اثر و رسوخ کی اولاد۔"

"سب سیدھے کھڑے رہو الف کی طرح۔" یہ دوسری آواز بھی اوپر سے آئی تھی۔ اس کے بعد خاموشی ہو گئی۔ غالباً حاجی پر واضح ہو گیا تھا کہ وہ سامنے سے ہی نہیں بلکہ اوپر نیچے دائیں بائیں ہر طرف سے ڈاکوؤں میں گھر چکا ہے۔

ناگ منی پانچ منٹ بعد ہنکارا کرتی ہوئی آئی۔ اس کے پیچھے رابعہ تھی۔ قدرے مضمحل اور ناراض۔ غالباً اسے ناگ منی کا تلاشی لینے کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔

"اس کے پاس مال ہے یہ۔" ناگ منی نے حقارت آمیز طنز کے ساتھ ایک انگوٹھی شیش ناگ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ "بس... اچھی طرح دیکھا؟"

"میں نے تو دیکھ لیا۔ اب تو خود دیکھ لے۔" وہ بولی۔

شیش ناگ نے انگوٹھی کو میری طرف اچھال دیا۔

"چلو تم جاؤ، آرام کرو۔ ناگ منی! ان کا خیال رکھنا، یہ ہمارا [illegible] جانتے ہیں۔"

"تم لوگ چلو، میں آتا ہوں۔" میں نے کہا اور دلاور کی اوپٹ تک ڈاکوؤں کے سردار کے ساتھ گیا۔

"بڈھے خبیث، داڑھی رکھ کے جھوٹ بولتا ہے۔ میں کہتا ہوں دفع ہو جا۔ چلا جا میرے دروازے کے سامنے سے۔" شیش ناگ نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

"خیریت چاہتے ہو تو انھیں میرے حوالے کر دو ورنہ..." یہ حاجی کی آواز تھی۔ اس کا جملہ ایک فائر کی آواز نے کاٹ دیا۔ کوئی دردناک آواز میں چلایا۔ اور زور زور سے کراہنے لگا۔

"اگر باقی تین کی بھی لاشیں لے جانی ہیں تو رہ جا۔ ورنہ ابھی وقت ہے، واپس لوٹ جا۔" شیش ناگ نے کہا۔

"جاتا ہوں لیکن یہ سمجھ لو کہ میں پھر آؤں گا۔ تمھارا تو میں اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔" حاجی نے دہاڑ کے کہا۔

"تنہا جا، جبوت کے سالے۔ یہ افیمیوں کی نہیں سیمنٹ کے بلاکوں کی دیواریں ہیں۔" شیش ناگ نے دو جملوں میں حاجی کو دو درشت گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ "پھر ادھر کا رخ کیا تو دونوں ٹانگیں توڑ کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ شیش ناگ ہے میرا نام۔"

اس کے ساتھیوں نے شاید انھیں مزید خوفزدہ کرنے کے لیے ہوائی فائر کیے۔ پھر وہ اوپر سے دھم دھم کودے۔

"جاؤ ان کو رخصت کر کے آؤ۔" شیش ناگ نے کہا۔ چار ایک سی گھنی سیاہ داڑھیوں اور پگڑیوں والے باہر نکل گئے۔

"آؤ میرے ساتھ۔" شیش ناگ نے [illegible] بلا کے کہا۔ "میرے شیر اب ان کو بہت دور چھوڑ کے آئیں گے۔"

"تمھاری بہت مہربانی سردار۔" میں نے کہا۔ "یہ لوگ ہمیں پکڑ لیتے تو جان سے مار دیتے۔"

وہ مجھے آخری حصے کے ایک کمرے میں لے گیا۔ یہ ان کا مہمان خانہ معلوم ہوتا تھا۔ یہاں کھری چارپائیوں کے بجائے اسپرنگ کے گدوں والے پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ چار دیواری کونوں میں چار پلنگ تھے۔ دو دو پلنگوں کے درمیان ایک میز تھی۔ اور درمیان میں دری بچھی ہوئی تھی۔ ایک پلنگ پر محسن بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے گیلے اور پھٹے ہوئے خاکی رنگ کے کپڑے اتار دیے تھے۔ اب وہ گہرے جامنی رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کرتے اور بہت زیادہ گھیر والی

شلوار میں ملبوس تھا۔ یہ شیش ناگ کے کسی ساتھی کے کپڑے ہو سکتے تھے۔

محسن اس لباس میں خاصا مطمئن تھا۔ پوزیشن رابعہ کی تھی۔ اس کو ناگ منی نے اپنے کپڑے دیے تھے۔ یہ اسے پسند تھا یا شیش ناگ کو۔ ورنہ اس کے شلوار قمیص یا ساڑی ہوتی تو رابعہ کو چولی لہنگا پہننا پڑتا۔ ناگ منی شاید گہرے رنگ اس لیے استعمال کرتی تھی کہ خود اس کا رنگ صاف تھا جو ان تیکھے رنگوں میں دمکتا تھا۔ رابعہ کا رنگ اس سے بھی زیادہ اجلا تھا۔ مختصر لباس میں جہاں جہاں سے اس کے بدن کا غیر ڈھکا حصہ دکھائی دیتا تھا، وہاں روشنی سی محسوس ہوتی تھی۔ رابعہ کے اس روپ نے میری نظروں کو خیرہ اور مجھے مبہوت کر دیا۔

وہ بہت سمٹی سمٹائی گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی ہوئی تھی جیسے اپنی طرف متوجہ پا کے وہ اور شرمائی۔ اگر سمندر کے دریا کے تھپیڑوں میں اور ساحل تک پہنچنے کی جدوجہد میں اس کے کپڑے تار تار نہ ہوتے تو وہ اس لباس کو قبول نہ کرتی۔

"اب تم لوگ آرام کرو۔" شیش ناگ نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے رابعہ کو گھورا۔ "لیکن پہلے کچھ کھا پی لو۔ یہ کوئی ڈھابہ نہیں ہے۔ تمھاری پسند کی چیز تو مل نہیں سکتی۔"

"مولانا، کیوں شرمندہ کرتے ہو ہمیں۔" میں نے کہا۔ "صرف سر چھپانے کو جگہ مل جاتی تو کافی تھا۔"

"کھانا ابھی ملے گی۔ ناگ منی مہمانوں کی خاطر کرنا جانتی ہے۔" شیش ناگ نے کہا۔

"یہ ناگ منی... تمھاری...؟"

"بہن ہے میری۔" شیش ناگ نے کہا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے منہ سے کوئی غلط بات نہیں نکلی۔

"لیکن وہ صرف عورت نہیں، میرے بعد اس گروہ میں سب سے زیادہ خطرناک چیز ہے۔ میرا دایاں ہاتھ ہے اور میں سب سے زیادہ اس پر بھروسا کرتا ہوں۔ اس کی صورت پر مت جانا۔ وہ بڑے بڑے سورماؤں کا پانی بھرا دیتی ہے۔ یہ جو میرے دوسرے ساتھی ہیں نا، یہ [illegible] سے ڈرتے ہیں جیسے [illegible] لیکن ناگ منی کے پاس [illegible] سب سے زیادہ۔ اس کا نشانہ بھی خطا نہیں ہوتا۔ [illegible] وہ اس گروہ کی سردار بن سکتی ہے۔"

اپنی اس کے بارے میں وہ فخر اور غرور سے بات کر رہا تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے وہ محسن کو اور مجھے خبردار کر رہا ہے کہ اس عورت کے بارے میں برا خیال بھی دل میں لانے سے گریز کریں۔ میں نے رابعہ کو دیکھا تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ شاید میں ضرورت سے زیادہ حیران، متجسس اور مرعوب نظر آ رہا تھا۔

"چلو تم بھی اتنی دیر میں کپڑے بدل لو۔ یہ تو ابھی تک بھیگے ہوئے ہیں اور پھٹ بھی گئے ہیں۔" شیش ناگ نے کہا۔ "تم سے صبح بات ہو گی۔ لیکن دیکھو، مہمان بن کے آئے ہو تو مہمان بن کے ہی رہنا۔ میرے ساتھ کوئی چکر مت چلانا۔ شیش ناگ ہے میرا نام۔"

یہ اس کا تکیہ کلام معلوم ہوتا تھا۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے نام اور اس نام سے منسوب کارناموں پر کتنا غرور رکھتا ہے۔ معلوم نہیں شیش ناگ ڈاکو کے گروہ کی کتنی دہشت تھی اور کہاں تک تھی۔ میں نے کبھی اس کا نام نہیں سنا تھا مگر میں نے مدت سے اخبار ہی کہاں دیکھا تھا۔ پہلے میں انگلستان میں تھا تو یہاں کے حالات سے صرف سیاست کی حد تک باخبر تھا۔ واپسی پر اپنے معاملات میں الجھ گیا اور اس عرصے میں اخبار دیکھا بھی تو صرف ان خبروں کی تلاش میں جن کا تعلق ہم سے یا ہمارے دشمنوں سے تھا۔ ڈاکے، چوری اور سنسنی خیز جرائم کی خبروں میں آنے والے ناموں پر کبھی میں نے توجہ نہیں دی۔

تاہم شیش ناگ اور ناگ منی دلچسپ کردار تھے۔ ان کا ماضی کیا تھا؟ اس بارے میں بہت کچھ قیاس آرائی کی جا سکتی تھی۔ میرے ذہن میں بہت سی فلموں، بہت سی داستانوں اور روایتوں کے کردار تھے۔ کچھ حقیقی کچھ الف لیلوی۔

جب میں کپڑے بدل کے آیا تو ناگ منی جسے اشتعال سے دیوار کا سہارا لیے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے کھڑی ہوئی تھی۔ کھانا درمیان میں بچھی ہوئی دری پر رکھا تھا اور وہ رابعہ کا جائزہ لے رہی تھی۔

"تم مجھے پڑھی لکھی لگتی ہو۔ کسی اچھے گھر کی ہو؟"

"ہاں، تمھارے بارے میں بھی میرا یہی خیال ہے۔" رابعہ نے کہا۔ اب وہ زیادہ پُر اعتماد نظر آ رہی تھی اور پلنگ کے کنارے پر بیٹھی ہوئی اپنی ٹانگیں جھلا رہی تھی۔ "کیا تم ڈاکٹر ہو؟"

"میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔" ناگ منی کا چہرہ اس سوال پر ذرا سی دیر کے لیے دھندلا گیا۔ "تمھیں یہ خیال کیسے آیا؟"

www.paksociety.com

"تمھارا یہ لباس دیکھ کر۔۔"

ٹانگ منی ہنس پڑی۔ "یہ تو ہمارا لباس ہے۔ ہمارے علاقے کا اور قبیلے کا۔ سب عورتیں پہنتی ہیں۔"

"میری بیوی پر یہ لباس کیسا لگ رہا ہے؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے مجھے گھور کے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔

"تمھاری بیوی بہت خوبصورت ہے۔" اس نے کہا۔

"اس کو اسکرٹ پہننا چاہیے۔ جیسا کہ میں پہنتی ہوں۔ ورنہ یہ بھی اچھا ہے۔"

رابعہ کا چہرہ گلابی پڑنے لگا۔ "خوبصورت تو تم بھی ہو۔"

"ہاں، مجھے معلوم ہے۔" وہ بولی۔ "مگر تمھارے برابر تو نہیں۔ یہ تمھارا شوہر کیا کرتا ہے؟"

"شوہر کیا کرتے ہیں؟" میں نے درمیان میں آلتی پالتی مار کے بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔ "مگر تمھیں کیا معلوم۔"

"میرا مطلب تھا کہ تم کام کیا کرتے ہو؟" وہ بولی۔

محسن میرے پاس آ بیٹھا۔ "آپا جی! کب تک وہاں بیٹھی شرماتی رہوگی۔ دیکھو تمھارے بغیر یہ بھی لقمہ نہیں توڑ رہا ہے۔"

"میرے حلق سے کہاں اترے گا۔" میں نے سچے عاشق کی طرح کہا۔ "آجاؤ بیوی۔۔"

رابعہ اندر ہی اندر کھولتی ہوئی اٹھی اور ہمارے درمیان آ بیٹھی۔

"بچے کتنے ہیں تمھارے؟" ٹانگ منی بولی۔

رابعہ کا رنگ اس کی آنکھیں گلابی چولی جیسا ہونے لگا۔

"سات۔" میں نے کھانا نگلتے ہوئے کہا۔ "ابھی کچھ بچے شمار بھی ہو سکتے ہیں۔"

ٹانگ منی ہنسنے لگی۔ "مجھے لگتا ہے کہ تمھاری شادی ہی نہیں ہوئی ابھی۔ تم اس کے ساتھ بھاگ کے آئے ہو۔"

"یہ۔۔ تم نے کیسے اندازہ کیا؟" میں نے کہا۔

"تمھاری صورت دیکھ کر۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ یہ تمھاری بیوی ہوتی تو ایسی باتوں پر خفا نہ ہوتی اور ایسے نہ شرماتی۔" ٹانگ منی نے بڑی صفائی سے ہم دونوں کے تعلق کی حقیقت واضح کر دی۔ وہ واقعی ذہین لگتی۔ اس کی مردم شناسی اور قوت مشاہدہ قابل تعریف تھی۔ مگر مجھے ایک شعر یاد آیا جو اسی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔ غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا، میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا۔ یہ رابعہ کا غمزۂ غماز تھا جس نے رابعہ کا راز افشا کر دیا۔

"وہ داڑھی والا جو رات کو بندوق لے کر تمھارے پیچھے آیا تھا، اس کا باپ ہوگا؟" ٹانگ منی نے اپنے ذہن سے واقعات کی مدد سے ایک فلمی کہانی کا اسکرپٹ تیار کر لیا۔ اس سے پہلے کہ میں ٹانگ منی کے خیال کی تائید کرتا، رابعہ نے کہا۔ "میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"وہ میرا ماموں کم سسر تھا۔" میں نے فوراً دوسرا رشتہ ایجاد کر لیا۔ "وہ تو چاہتا ہے ہم سب کو وہاں ہے گولی مار دے۔ حالانکہ خود اس نے یہی حرکت کی تھی جوانی میں۔ پہلے اپنی ہونے والی ساس کو لے بھاگا۔"

"بیٹی کو چھوڑ کے۔۔۔ ماں کے ساتھ؟"

"ماں سوتیلی تھی۔۔" میں نے وضاحت کی۔

"اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔" محسن بولا۔

ٹانگ منی نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ "کیوں، لڑکی میں کیا خرابی تھی؟"

"خرابی یہ تھی کہ۔۔۔ اس میں کوئی خوبی نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "اور سوتیلی ماں مجسمۂ حسن و خوبی تھی۔ بیٹی کی مثال یوں سمجھو جیسے کوئی جوان اور صحت مند بھینس۔ اور ماں نے انتخاب کر لیا ٹھیک رقابت میں بیٹی کا تو کیا غلط کیا۔"

"وہ ماں ہی ہے؟" ٹانگ منی کی دلچسپی بڑھ گئی۔

"ہاں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اب یہ بھی کیا ہے تو دیکھو کیسا جانی دشمن ہو رہا ہے میرا۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب۔۔۔ تمھارا رشتہ بھی اس کی بیٹی سے ہونے والا تھا؟" ٹانگ منی دم بخود رہ گئی۔

میں نے فقط اقرار میں سر ہلایا۔ اور رابعہ کو مخاطب کیا۔ کیونکہ وہ اجنبی کھانا چھوڑ کے اٹھ رہی تھی۔ "اسے وہ نہیں آسکتا یہاں۔ ڈرتی کیوں ہو، کھانا کھاؤ۔"

"بہت کھا لیا میں نے۔" رابعہ تلخ لہجے میں بولی اور ہاتھ جھٹک کے بیڈ پہ جا بیٹھی۔

"تم نے اتنی جلدی یہ سب کچھ کیسے پکا لیا۔" محسن نے دسترخوان پر چنے ہوئے کھانے کو دیکھ کر تعریفی لہجے میں کہا۔ "جادو ہے تمھارے ہاتھوں میں۔ تو اور ذائقہ بھی کیا غضب کا ہے۔"

ٹانگ منی پھر ہنسی۔ "ابھی نہیں بنایا۔ شام کو تیار کیا تھا۔ آج دعوت تھی سب کی یہاں۔"

"کس خوشی میں؟" میں نے کہا۔ "کوئی بڑا ہاتھ مارا تھا؟"

"تم کیوں پوچھتے ہو؟" وہ محتاط ہو گئی۔ "تم مخبر تو نہیں ہو پولیس کے؟"

"کیا ہم صورت سے مخبر یا پولیس والے لگتے ہیں؟" محسن نے کہا۔

ٹانگ منی نے کچھ سوچ کے نفی میں سر ہلایا۔ "ایسا ہوتا تو شیش ناگ کے مہمان نہ ہوتے۔ میرا بھائی بے وقوف نہیں ہے۔ شیش ناگ ہے اس کا نام۔"

"تم بھی یاد دلاتی رہا کرو۔ ٹانگ منی ہے میرا نام۔" محسن بولا۔

ٹانگ منی مسکرائی۔ "یہ عادت ہے اس کی۔"

"تم نے کہا تھا کہ تم کا اسٹریٹ چاہتی تھیں پھر یہ خیال اس نے چھوڑ دیا؟" محسن نے کہا۔

"اب تم پوچھو گے کہ میں نے یہ کیا پیشہ اختیار کر لیا۔ میری جیسی لڑکی نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟" دیکھتے دیکھتے ہی بولی۔

"ہاں، یہ دوسری بات زیادہ اہم ہے۔" محسن بولا۔ "تم کر لو گے مجھ سے شادی؟" وہ ہنسی اور پرانی ہنسنے لگی۔ "اگر تم کو اعتراض نہ ہو تو بات کروں تمھارے بھائی سے؟"

رابعہ نے سر اٹھا کے محسن کو ملامت آمیز نظروں سے دیکھا۔

"صبح کر لینا۔" ٹانگ منی نے جاتے جاتے کہا۔ "یہاں جتنے ایسے سب ہی یہ چاہتے تھے مگر سب نااہل ثابت ہوئے۔ کوئی بھی اس کی شرط پوری نہیں کر سکا ابھی تک۔"

جب وہ چلی گئی تو محسن نے کہا۔ "باپ رے باپ، نہ کیا شرط ہوگی اس کی۔ الہ دین کا چراغ لانے کے لیے؟"

"ہوگی کوئی ایسی بات کہ۔۔۔ شاہ جنات کا سر کاٹ کے پیش کرو۔ چوبیس گھنٹے میں یا کشمیر فتح کر کے دکھاؤ۔"

"محسن، شرم آنی چاہیے تمھیں۔" رابعہ نے کہا۔

"پہلے آتی تھی اب نہیں آتی۔" محسن بولا۔ "اور جب تم کو اتنی شرم آتی ہے تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے، بھلا شرمانے کی؟"

"میں بھی تو بہت شرمیلا ہوں۔" میں نے شرما کے کہا۔ "اب بھلا ایسا لباس میں پہن سکتا ہوں، پھولوں والا؟"

رابعہ نے تکیہ سر کے اوپر رکھا اور سو گئی۔ جب ٹانگ منی چائے لے کر آئی تو وہ بظاہر گہری نیند میں تھی۔

"بات سنو، وہ شرط تو یقیناً بہت مشکل ہوگی۔" محسن نے کہا۔ "تم ایسے ہی بھاگ چلو میرے ساتھ۔"

ٹانگ منی نے خلاف توقع برہمی کا اظہار نہیں کیا۔ میں تھا کہ کوارا کسی مرد نے؟ وہ ہنسی کے بول اور گھونگھرو کے باہر نکل گئی۔

رابعہ نے سر اٹھا کے قہقہہ مارا۔ مجھے بھی بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"الو کی پٹھی۔" محسن نے نفرت سے کہا۔ "بے حیا۔"

"بس بھیا، وہ ایک شعلہ ہی تھی۔ بے وقوف، تمھیں نے تمھیں مان لیا شوہر تو رابعہ سے بدلہ لینے کے لیے وار کیا۔ دیکھا آئینہ دکھایا۔ آج ان کے اب تمھارا ان سے کہو، یہ جو تمھارے یار غار ہیں، ایم آر ایس کے کما نڈر، انسپکٹر سکندر، اعظم حنیف کے ٹو یہ بھی ٹانگ منی کے سوئمبر میں شریک ہو جائیں۔ اس کی ایک ہی تو شرط ہے، پوری کر دکھاؤ۔ وہ جو آخری بات تھی۔"

"میاں محسن خاں شیروانی!" میں نے کہا۔ "آپ کی غیرت کو کیا ہوا۔ سب سن رہے ہیں آپ۔"

"خاتون آپ سے مخاطب ہیں۔" محسن بولا۔ "ہم نے اپنی غیرت وغیرہ سب حق مہر میں لکھ دی تھی۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔"

شیش ناگ اچانک اندر آیا اور ہمیں ہنستا دیکھ کر حیران ہوا۔ پھر اس نے کہا۔ "ان کو میرے جوان شیر دل دور چھوڑ کے آئے ہیں۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ شیش ناگ ہے میرا نام۔"

"سردار، میں نہیں چاہتا کہ تم بے خبری میں ہماری وجہ سے کسی مصیبت میں پڑ جاؤ۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ "ان کی طرف سے صرف اس لیے بے فکر ہونا غلطی ہوگی کہ انھیں تم نے دو میل دور چھوڑ دیا ہے۔ وہ ایسے خطرناک لوگ ہیں کہ دو سو میل سے بھی دو گھنٹے میں واپس آسکتے ہیں۔ میں تمھاری اور تمھارے شیروں کی بہادری پر شک نہیں کرتا لیکن جو تم کو دھمکی دے کے گئے ہیں، وہ بھیڑیے کی طرح سفاک اور عیار ہیں اور ان کی قوت بہت زیادہ ہے۔ ابھی تو انھیں ترک انتقال پڑی لیکن اس کا مطلب یہ مت لینا کہ وہ ڈر کے بھاگ گئے۔"

"اچھا۔۔۔" سردار نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کون لوگ ہیں وہ۔۔۔ اسمگلر؟"

"یہ بات تو بہت لمبی ہے لیکن میں مختصراً بیان کرتا ہوں کہ وہ ملک کے دشمن ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور دشمنوں کے ساتھ مل کے انھیں اسلحہ فراہم کرتے ہیں جو پاکستان کے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔ تمھیں تو معلوم ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ "یہ وہاں اسلحہ تقسیم کرتے ہیں؟"

"نہیں، یہ اسلحہ بھیجتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "باہر سے اسمگل کرتے ہیں۔ کچھ ہمارے دشمن ملکوں سے حاصل کرتے

www.paksociety.com

ہیں اور یہ اسلحہ باغیوں، تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں کے ہاتھ بیچتے ہیں۔ انھیں اسلحے کی ضرورت ہے اور یہ ان سے منہ مانگی قیمت وصول کر کے اپنے خزانے بھرتے ہیں۔ انھیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ باغی وہ اسلحہ کس کے خلاف استعمال کریں گے۔ ظاہر ہے وہ ہماری فوج سے لڑ رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں تباہی پھیلا رہے ہیں۔ پل، بجلی گھر اور اہم تنصیبات تباہ کر رہے ہیں۔ اور انھیں مار رہے ہیں جو پاکستان کی سالمیت پر یقین رکھتے ہیں۔ جو پاکستان کو متحد رکھنا چاہتے ہیں۔ سا ب یوں سمجھو کہ مغربی پاکستان میں ایسے غداروں سے حکومت بھی غافل رہی ہے۔ ان کے ٹھکانوں کا پتا چلتا ہے تو پولیس، مخبری اور خفیہ والے سب چھاپے مارتے ہیں۔ ایک ایسا ہی گروہ ہے جس میں یہ حاجی شامل ہے۔ نام بھی اس کا عبداللہ ہے یعنی اللہ کا بندہ۔"

"شریف نام رکھنے سے تو کوئی بھی شریف نہیں ہوتا۔" ستیش ناگ نے ایک فلسفیانہ بات کی۔ "مگر اس طرح تم نے یہ واضح کر دیا کہ کم سے کم حاجی کے معاملے میں وہ ہمارا ہم خیال ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے سردار۔ اس حاجی کے کچھ اور بھی ساتھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ سب ہماری جان کے دشمن ہو رہے ہیں کیونکہ ہم نے انھیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ان کے کاروبار کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ اسلحے کے بہت بڑے بڑے ذخیرے تباہ کر دیے ہیں اور ایسے بہت سے غدار، دشمن کے ایجنٹ اور اسمگلر قتل بھی کر دیے ہیں۔"

"تم تینوں نے مل کر؟" ستیش ناگ نے حیرانی اور بے یقینی سے پہلے محسن کو اور پھر رابعہ کو دیکھا جو اب پھر سوتی بن گئی تھی یا واقعی سو چکی تھی۔

"ہم تین ہی نہیں، اور بھی ساتھی ہیں ہمارے۔ پورے ملک میں ہر جگہ ہمارے حامی اور مددگار ہیں جن کی مدد کے باعث ہم اب تک زندہ ہیں اور جدوجہد کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کل اسلحے سے بھرا ہوا ایک بحری جہاز کراچی کی بندرگاہ سے روانہ ہونے والا تھا۔ ہمارے دو ساتھی اس پر چڑھ گئے۔ رات کو ہم بھی پہنچ جاتے اور جہاز کو لے کر سمندر میں ہی ڈبو دیتے لیکن ہمیں ان لوگوں نے پکڑ لیا۔ ہمیں گرفتار کر کے لے جا رہے تھے کہ راستے میں حادثے کا شکار ہو گئی۔ آگے آپ جانتے ہیں۔"

ستیش ناگ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے ایک بار زور سے "ہوں" کہا اور کئی بار سر ہلایا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ "کیا یہ ڈاکو ہماری مدد کریں گے؟ کیا ڈاکو بھی محب وطن ہو سکتے ہیں؟ کیوں نہیں ہو سکتے۔" میں نے خود کو دلیل دی۔ "جانے بھائی ایک اسمگلر ہے۔ وہ قانون کا مجرم ضرور ہے لیکن ملک کا دشمن نہیں ہے۔ وہ تو ان وطن دشمنوں کا بھی دشمن ہے۔ کوئی بھی مجرم، وہ چور، ڈاکو ہو یا قاتل، پاکستانی تو پیدائشی طور پر ہے، لاشعوری طور پر۔ جیسے پہلے ہم سب انسان ہیں پھر مختلف ملکوں، نسلوں اور عقیدوں سے تعلق رکھنے والے۔ حالات نے کچھ لوگوں کو قانون شکن بنا دیا لیکن ان کا یہ احساس کیسے مٹ سکتا ہے کہ وہ پاکستانی ہیں۔ جو چور، ڈاکو اور قاتل ہو، وہ وطن سے اتنی ہی محبت کر سکتا ہے جتنی اپنی ماں سے۔"

"اچھا بھئی اب تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ ہم تو ٹھہرے ڈاکو اور شریف آدمی بن نہیں سکتے۔ شریفوں کی بستی میں نہیں رہ سکتے اس لیے چھپ کر رہتے ہیں۔" ستیش ناگ نے کہا۔ "ہم اگر کچھ مدد کر سکتے ہیں تمھاری تو بتاؤ۔ ادھر آ جا تو بھی۔"

یہ آخری جملہ اس نے ناگ منی کو مخاطب کر کے کہا تھا جو شہر جانے کے لیے دروازے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

"بھیا، یہ جو گٹھاری مونچھوں والا ہے نا؟" ناگ منی نے محسن کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میرے سے بیاہ کر لے یا میرے ساتھ بھاگ چل۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ خود محسن کا رنگ ایک لمحے کے لیے اڑ گیا۔ بات مذاق کی تھی مگر مذاق جان لیوا ثابت ہوگا، یہ کس نے سوچا تھا۔ میں نے دیکھا کہ رابعہ بھی آنکھیں کھولے ڈاکو ستیش ناگ کے ردعمل کو دیکھ رہی تھی۔

جب وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر ہنسا تو میری جان میں جان آئی۔ "باز نہیں آئی تو پھر ایک سے چھیڑ خانی کیے بغیر۔"

"اسے بھیا، قسم لے لو..."

"چل چھوڑ یہ باتیں، یہ مجاہد لوگ ہیں۔ جب ہم ڈاکو گھر نہیں بسا سکتے تو یہ کہاں سوچ سکتے ہیں بیاہ رچانے کی۔" وہ سنجیدہ ہو کے بولا۔ "وہ تو اچھا ہوا کہ ادھر آ گئے۔ ورنہ دشمن انھیں مار ڈالتے۔ یہ بتا پہرے پر کون ہے؟"

"دو جوان شیر ہیں۔" ناگ منی نے کہا۔

ستیش ناگ نے [illegible] سے کہا۔

"ان سے کہنا ہوشیار رہیں۔ وہ واپس نہ آ جائیں اور دوسروں کو بھی سمجھا دینا یہ بات۔"

ناگ منی نے محسن کو مسکرا کے دیکھا اور باہر چلی گئی۔ محسن نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ ایک ڈاکو کے ہاتھوں مقتول نہیں ہو سکے۔ بات مذاق میں ٹل گئی۔ شاید اس لیے بھی کہ میں اپنے بارے میں وضاحتی بیان جاری کر چکا تھا۔ ورنہ ڈاکو بھائی کی محبت جاگ اٹھتی تو شوقِ شہادت دھرا رہ جاتا۔ مرنا پڑتا ایک ڈاکو حسینہ سے مذاق کر کے۔

"اچھا بھئی شیر جوانو!" ستیش ناگ بولا۔ "کیا چاہیے تمھیں، روپیہ پیسہ، لاکھ دو لاکھ تو ڈیرے پر ہوگا، زیادہ کی ضرورت ہے تو..."

"نہیں سردار، پیسہ ہمارے کس کام کا؟" میں نے کہا۔

"اچھا تو اسلحہ چاہیے؟" وہ بولا۔

"ہاں، اگر ایک ایک ریوالور مل جائے۔" میں نے کہا۔ "تو ہم اپنی کچھ حفاظت کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

"سب گولی چلا سکتے ہو، یہ شیرنی بھی؟" اس نے رابعہ کی طرف دیکھ کے کہا۔ وہ ہر بہادر مرد کو شیر اور عورت کو شیرنی کہنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

"ہاں سردار، گولی کیا توپ کا گولہ چلا سکتے ہیں سب۔"

"اور نشانہ کیسا ہے؟ خیر اچھا ہی ہوگا۔" وہ بولا۔ "صبح دیکھ لیں گے۔ ریوالور میں ابھی بھجواتا ہوں۔ تم نے اچھا کیا جو سب بتا دیا۔ اب ادھر آئے ہو تو آرام سے رہو۔ ستیش ناگ ہے میرا نام۔"

جب وہ چلا گیا تو رابعہ اٹھ بیٹھی۔ "سوا روپے کی نیاز دو اور آئندہ کے لیے توبہ کرو۔" اس نے محسن کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ "مذاق کیا تھا۔ بیوہ تو نہ ہوتی، کیا مزے سے کہہ دیا تھا بھاگ چلو میرے ساتھ۔ اگر وہ مان جاتی تو؟"

"مان جاتی تو... کیا تھا۔ ہم شرعی چار کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد بھی دو آسامیاں خالی ہوتیں۔" محسن نے ڈھٹائی سے کہا۔

"ہاں مگر اس کم بخت نے شرط لگا دی کہ بیاہ کروں گی تو کسی مرد سے۔" رابعہ نے پھر ہنسنا شروع کیا۔ "مردوں کی حالت دیکھ لی، ابھی کیا ہو رہی تھی۔"

"عزیزہ! تم یہ بار بار سونے جاگنے کا ڈراما کیوں کر رہی ہو؟" میں نے کہا۔ "میرا موڈ ویسے ہی رومانٹک ہو رہا ہے۔ کیا خیال ہے، سمندر کی طرف چلیں۔ کوئی کشتی [illegible]

[illegible] شیلو کا تھا۔"

"بس تو پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ جائیے اور شیلو کے ساتھ ہی رقص فرمائیے۔" رابعہ نے کہا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

ستیش ناگ جب آخری بار آیا تو اس کے پاس تین ریوالور تھے — تینوں سروس ریوالور تھے — جو مسلح افواج یا پولیس کے پاس ہی ہوتے ہیں...... کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ اسے یہ کیسے ملے۔ یا تو خود پولیس نے اسے دیے ہوں گے اپنے مال خانے سے۔ وہ عموماً ڈاکوؤں سے بھرپور تعاون کرتے ہیں۔ یا ستیش ناگ نے پولیس سے چھینے ہوں گے۔ اس نے ہمیں اضافی راؤنڈ بھی فراہم کیے..... اور جب ہم نے انھیں لوڈ کیا تو وہ بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔

"ایک بات بتاؤ سردار۔" میں نے کہا۔ "اس بستی میں کون لوگ رہتے ہیں؟"

"یہی معمولی حیثیت کے غریب لوگ ہیں بھلے۔"

"بستی میں اتنا ہنگامہ ہوا، فائر بھی ہوئے، کوئی نکلا نہیں اپنے گھر سے۔"

"کوئی نہیں نکلتا۔ سب اپنی جان بچاتے ہیں گولی سے اور گولی والے بھی۔ ستیش ناگ ہے میرا نام۔ سب جانتے ہیں۔"

"اور تم اس کے باوجود یہاں بے خوفی سے رہتے ہو؟"

"ہاں، ان میں سے کس کی مجال ہے کہ کوئی میرے خلاف مخبری کرے۔" ستیش ناگ بولا۔ "پولیس اس وقت بھاگ جاتی ہے جب ہم انھیں بتا دیتے ہیں کہ ہم جا رہے ہیں۔"

"یہ مکان کس کا ہے؟"

"یہ ایک پرائمری اسکول ہے۔ نہ کوئی پڑھنے والا ہے نہ کوئی پڑھانے والا۔ اپنے ایسے ہی ٹھکانے ہیں ہر جگہ۔"

مجھے تھوڑا سا دکھ ہوا۔ اس قوم کے مستقبل سے کوئی کیسے خوش آئند امیدیں وابستہ کرے جہاں علم و آگہی کے ٹھکانے اتنے ویران ہوں کہ وہاں ڈاکوؤں کے اڈے بن جائیں۔ اس چمن گلشن میں بہاریں کیوں آنے لگیں جہاں ویرانوں کے باسی الو بولتے ہوں۔ وطن کے وہ نونہال کہاں ہیں جن کو کل بہت بڑے چیلنج درپیش ہوں گے، بہت بڑی بڑی ذمہ داریوں کا سامنا ہوگا۔ ان کے پاس علم کی روشنی نہیں ہوگی تو وہ اندھیروں میں بھٹکتے رہ جائیں گے۔ آج وہ کہیں ہوٹلوں میں اور ورکشاپوں پر کام کر رہے ہیں۔ کاریں صاف کر رہے ہیں اور بھیک مانگ رہے ہیں۔

کچھ لیٹنے کے بعد عجیب سی ویرانگی اور مایوسی کا شکار رہا۔ رشوت، بے ایمانی، غداری، وطن دشمنی، حاجی اور عبداللہ

www.paksociety.com

جیسے نام رکھنے والوں کی منافقت اور ریاکاری، بے اصولی سیاست، بے آئین مملکت، بے مقصد فوجی حکومت — تعصب اور نفرت۔ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے کیا زمانے میں پہنچنے کی یہی باتیں تھیں؟ مجھ سے شاعر مشرق نے سوال کیا۔

جواب میں کیا دیتا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ ان کے پاس جنھوں نے قائداعظم اور قائد ملت کے بعد ملک کا نظم و نسق سنبھالا اور اس کو تباہی کے اس کنارے تک پہنچا دیا جہاں اس کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا ہے۔ انھی خیالات کے گرداب میں ڈوبتا ابھرتا میں نہ جانے کب سو گیا۔ گہری نیند ایک ذہنی و جسمانی ضرورت تھی، تاکہ تھکن اور انتشار کی کیفیت ختم ہو جائے لیکن ذہن پر گرد و پیش کے حالات کے کچھ آسیب سائے محیط تھے۔ ایک طرف تانو اور غالب کی پریشانی کا احساس تھا۔ تو دوسری طرف حاجی عبداللہ کا خوف اعصاب پر سوار تھا۔ اسے دوسری ناکامی کا صدمہ اٹھانا پڑا تھا۔ لالچ میں اس نے دلاور کو دغا دینے کی کوشش کی تھی اور جانمبھائی سے رابعہ کو لے آیا تھا، تاکہ مجھ سے سودا کر سکے۔ حاصل اسے کچھ نہ ہوا۔ اس کے منصوبوں پر قدرت نے پانی پھیر دیا۔ وہ بھی سمندر کا نمک ملا ہوا۔ اس کی لالچ بھی غرق ہوئی۔ اس کے جانثار بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور وہ سشیش ناگ جیسے ڈاکو کے ہاتھوں ذلت اٹھا کے رہ گیا ہوا۔ اتنے صدموں کے زخم اسے تب تک چین نہ لینے دیں گے جب تک کہ وہ اپنی ناکامی اور شکست کا انتقام نہیں لے گا۔

یہ میری چھٹی حس تھی یا اپنے حالات کے آئینے میں مستقبل کا عکس دیکھنے کی صلاحیت کہ میں خطرے کو قریب محسوس کرتا تھا اور یہ مطمئن نہیں تھا کہ اب مجھے تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔ اسی احساس نے میرے ذہن کو نیند میں بھی مکمل بے خبری اور سکون سے دور رکھا یا یوں کہیے کہ میرا لاشعور جاگتا رہا۔ نتیجہ یہ کہ میں نے ڈراؤنے خوابوں کے ٹکڑے دیکھے اور کئی بار چونک کے اٹھا۔

رات باقی تھی ابھی جب میرے کانوں نے باہر سے آنے والی آوازوں میں خطرے کا اعلان سنا۔

سشیش ناگ گرج رہا تھا: "اٹھو! شاباش میرے جوانو، شیرو، کچا چبا جاؤ ان گیدڑوں کو۔ ڈٹ جاؤ مقابلے پر، کسی کو نزدیک مت آنے دو۔"

میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ بے اختیار میرا ہاتھ اپنے ریوالور کی طرف گیا۔ اسی وقت پہلا فائر ہوا۔

رابعہ ایک چیخ مار کے اٹھ بیٹھی: "یہ... کیا ہو رہا ہے؟"

محسن نسبتاً پرسکون رہا: "میرا خیال ہے حاجی صاحب قبلہ مجھے دولھا بنانے کے لیے بارات لے کر آ گئے ہیں۔ ان کی خوشی میں بس یہ پٹاخے چھوڑے جا رہے ہیں۔ شاید ناگ منی مان گئی ہے۔"

"تم یہ اپنے پاس رکھو۔" میں نے ایک ریوالور رابعہ کے ہاتھ میں دیا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"میں... بارات کا استقبال کرنے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"میں ساتھ چلوں گی تمھارے۔" رابعہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں ساتھ چلو گی؟" میں نے کہا: "میں تو یہیں ہوں، ذرا باہر جا کے..."

میرا جملہ ایک زبردست دھماکے میں دب گیا۔ ذرا کی دیر کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس پرائمری اسکول کے صحن میں کوئی بہت بڑا بم پھٹا ہے۔ دھماکے نے میرے کانوں کو سن کر دیا تھا۔ زمین کا ارتعاش اتنا شدید تھا کہ عمارت کے در و دیوار بھی لرزنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی عمارت کے منہدم ہونے کا شور اٹھا۔ رابعہ مجھ سے چمٹ گئی میں نے اسے خود سے الگ کیا۔ پھر میں نے دروازے سے باہر جھانک کے دیکھا۔

صحن میں گرد و غبار اور دھوئیں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ چھت کے اوپر سے باہر کی طرف فائر کیے جا رہے تھے۔ اور باہر والے ان کا جواب دے رہے تھے۔ بستی کے مکین سخت دہشت کے عالم میں چیخ رہے تھے۔ اور شاید جان بچانے کے لیے فرار ہو رہے تھے۔

عمارت کا وہ حصہ جو میرے بائیں ہاتھ پر تھا مسمار ہو گیا تھا۔ حاجی نے فتح کو فوری اور یقینی بنانے کے لیے جنگ کی صحیح حکمت عملی اختیار کی تھی۔ یہ پرائمری اسکول ایک قلعے کی طرح محفوظ تھا جس پر حملہ کرنے والے کو شدید جانی نقصان اٹھانا پڑتا کیونکہ اندر والے محفوظ مورچوں میں تھے۔ اس نے پہلے حصار کو توڑا تاکہ وہ مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اندر داخل ہو جائیں۔ اس کے لیے حاجی نے دستی بم استعمال کیا تھا یا ڈائنامائیٹ۔ اب ان کے لیے ایک راستہ کھل گیا تھا۔ لیکن ان کا حریف بدستور محصور تھا۔

میں نے ایک شخص کو مشین گن کے ساتھ دیوار کے ملبے پر نمودار ہوتے دیکھا [illegible]

پہلی تھی کہ میں نے اس کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ وہ ہوا میں بھی ہاتھ پھیلا کے اچھلا۔ اس کی مشین گن اڑ کر دور گئی اور شاید ملبے کے ڈھیر پر گری۔ میں اندھیرے میں صاف نہ دیکھ سکا۔

محسن نے کمرے کے عقبی حصے کی کھڑکی کھول لی تھی۔ اس میں شیشے اس وقت ضرور لگائے گئے ہوں گے جب عمارت نئی ہوگی مگر اب عمارت کی زبوں حالی پکار رہی تھی کہ تب ہوں اپنی شکست کی آواز خالی پٹ کسی دھنسی ہوئی قبر کی طرح نظر آتے تھے۔ کھڑکیاں مدت سے بند تھیں اور سمندری ہوا نے قبضوں اور چٹخنیوں کو بھی زنگ چاٹ رہا تھا۔ کھڑکی کو کھولنا ناممکن تھا چنانچہ محسن نے کھڑکی کے پٹوں کو کھینچ کر توڑ دیا تھا۔ گلے ہوئے قبضے نکل جانے سے دونوں پٹ چوکھٹ سے نکل گئے تھے۔

"تم اس طرف سے نکل جاؤ۔" محسن نے رابعہ کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔

"چھوڑو مجھے۔" رابعہ نے برہمی سے کہا: "میں اکیلے نہیں جاؤں گی۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔" میں نے برہمی سے کہا: "ہم بھی آ رہے ہیں لیکن بعد میں۔ یہ ریوالور ہم نے اس لیے نہیں رکھے تھے کہ جب ضرورت پیش آئے تو ہم مقابلہ کیے بغیر فرار ہو جائیں۔"

"تم ان کا مقابلہ کرو گے... کیسے؟"

"جیسے سشیش ناگ اور اس کے ساتھی کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور ناگ منی کر رہی ہے۔" محسن بولا۔

"لیکن وہ ڈاکو ہیں۔ ہم ان کی خاطر..."

"فضول باتیں مت کرو۔" میں نے رابعہ کو اٹھا کے کھڑکی سے باہر کر دیا: "انھوں نے ہماری جان بچائی تھی۔ اب ہماری وجہ سے ان پر مصیبت آئی ہے تو ہم کچھ نہ کریں۔ تم جاؤ۔ دیکھو وہ سامنے جو کھجور کا درخت نظر آ رہا ہے اس کی سیدھ میں بھاگتی جاؤ۔ ہم آ جائیں گے۔ رکنا مت، جتنا دور نکل سکو، نکل جانا۔"

"خدا کے لیے سکندر..." رابعہ نے روتے ہوئے کہا۔

"تمھیں میری قسم، جاؤ۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا اور پلٹ کے دروازے کی طرف گیا۔ محسن مجھ سے پہلے نکل کر ساتھ والے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور دوڑ کر صحن کو عبور کر گیا۔ معلوم نہیں کس [illegible] ان آئیں جو میرے دائیں بائیں اور

آگے پیچھے سے گزریں۔ میرا رخ اس کمرے کی طرف تھا جہاں رابعہ کو تلاشی کے لیے جانا پڑا تھا۔ وہ ناگ منی کا کمرہ ہی ہو سکتا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ناگ منی پیچھے والی کھڑکی میں مورچہ بنا کے بیٹھی ہوئی تھی اور کھڑکی کے نیچے کی تین فٹ اونچی دیوار اور دونوں جانب کی دیواروں کی پناہ لیتے ہوئے فائر کر رہی تھی۔

میرے ایک دھکے سے دروازہ ٹوٹا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ ناگ منی ایک دم پلٹی۔

"ناگ منی!" میں نے چلا کے کہا: "گولی مت چلانا۔"

"تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

"میں تمھیں لینے آیا ہوں۔" میں نے کہا: "تمھارا بھائی کہاں ہے؟"

"تم سمجھتے ہو میں اسے چھوڑ کے چلی جاؤں گی؟" اس نے نفرت اور حقارت سے کہا: "میں اس کے ساتھ جیوں مروں گی۔"

باہر سے سشیش ناگ نے چلا کے کہا: "شاباش ہے شیرو، کچا چبا جاؤ ان کو۔"

"سردار!" کسی نے چیخ کر کہا: "ہمیں نکل جانا چاہیے۔ تین شیر مارے جا چکے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟ میں تو زندہ ہوں۔ سشیش ناگ ہے میرا نام۔" وہ چھت کے اوپر سے دہاڑا۔

ایک بار پھر گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ نہ جانے کون چیخ مار کے راہی ملک عدم ہوا۔ وقفے وقفے سے جوابی فائر بھی باہر کوئی بڑے کرب میں چلایا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ اندھیرے میں ایک پرچھائیں سی متحرک دکھائی دی۔ میں نے نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ وہ شخص گھوم کے آگے آیا اور چند قدم دوڑ کے گرا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مشین گن تھی۔ میں نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی اور مشین گن اٹھانے لپکا۔

"ارے پاگل، بچو!" اوپر سے سردار نے چیخ کر کہا: "اندر چلو۔" مگر میں مشین گن اٹھا چکا تھا جب میں نے ناگ منی کی چیخ سنی۔ اس نے اپنے بھائی کو آواز دی تھی۔ اوپر سے ایک گولی آئی جو شاید میرے کانوں کو چھوتی ہوئی گزری مگر اس کا نشانہ میں نہیں تھا۔ میرے پیچھے نمودار ہو جانے والا دشمن تھا جس کو ناگ منی نے دیکھ لیا تھا۔ سشیش ناگ نے اسے نشانہ نہ بنایا ہوتا تو وہ مجھے مار دیتا۔ یہ سب میں نے مشین گن اٹھانے کے بعد دیکھا تھا۔ اندھیرے میں

www.paksociety.com

کون کہاں چھپا ہوا تھا۔" یہ میں نے نہیں دیکھا۔ میں نے تو شین گن کا رخ دشمنوں کی طرف کیا اور ایک نصف دائرے میں پورا راؤنڈ چلا دیا۔ کم سے کم ایک آدمی اس اندھا دھند فائرنگ سے مارا گیا۔

قریب جا کے میں نے ناگ منی کا ہاتھ پکڑا اور اسے باہر کھینچ لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مزاحمت کرے گی چنانچہ میں نے خاصی قوت صرف کر کے جھٹکا دیا تھا۔ وہ قدم اکھڑتے ہی کھڑکی سے یوں باہر آ گئی جیسے اس کو کسی نے پیچھے سے اٹھا کے دھکیلا ہو۔ وہ نیچی زمین پہ گرتی لیکن میں نے اسے پھر پیروں پہ کھڑا کر دیا۔

"اوپر... چلو اوپر جانا ہے۔" میں نے کہا اور اسے دیوار کے ساتھ لگا کے کھڑا کر دیا۔ وہ کچھ نہ سمجھی کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ ایک عورت ہے میں نے اس کے ایک شانے پہ پاؤں رکھا اور اپنے وزن کو جھٹکا دے کر اوپر اٹھایا۔ میرا ہاتھ بلند ہوا اور چھت کی منڈیر پہ جم گیا۔ تاہم میری اس کامیابی میں ناگ منی کی ثابت قدمی کو بہت دخل تھا۔ اگر اس کا توازن بگڑ جاتا تو میرا ہاتھ کہیں اور پڑتا اور میں خود کو سنبھال نہ پاتا۔ ناگ منی نے میرے ایک سو باسٹھ پونڈ وزن کو بھی برداشت کیا اور اس جھٹکے کو بھی جب میں نے اوپر کی جانب جست لگائی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک سخت جان، مضبوط جسم، غیر معمولی ہمت اور فولادی اعصاب رکھنے والی عورت تھی۔

چھت پہ پہنچتے ہی میں نے الٹا لیٹ کر ہاتھ نیچے کیا۔ ناگ منی نے اچھل کر میرا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ میں اپنی قمیص اتار کر نیچے لٹکانے ہی والا تھا کہ وہ کھڑکی پہ پہنچ گئی۔ اس نے چوکھٹ پہ قدم جما کے ہاتھ اوپر بڑھایا اور میں نے اس کی کلائی تھام لی۔ یہ انتہائی خطرناک کام تھا کیونکہ جب وہ چوکھٹ پہ کھڑی تھی تو دشمن کا بہترین ہدف تھی۔ کسی بھی سمت سے اس کا نشانہ لینا بہت آسان ہوتا۔

جب میں نے اسے کھینچا تو وہ تھوڑا سا جھولی۔ وہ صرف ایک ہاتھ کے سہارے پہ معلق تھی۔ پھر اس نے پیروں کو اوپر پھینکا۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میں سر کے بل نیچے جاتے جاتے رہ گیا۔ اب ناگ منی نے دوسرے ہاتھ سے میری کلائی کو تھام لیا۔ میں نے اوپر کی جانب زور لگایا۔ اور ناگ منی نے دونوں پیر دیوار پر جما دیے۔ میں پیچھے کھسک گیا اور وہ اوپر چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں نے چھت کا کنارہ تھام لیا۔

یہ سب دو منٹ کا کھیل بھی نہیں تھا مگر دو منٹ کے ایک سو بیس سیکنڈ زندگی اور موت کی بے یقینی کے صحرا میں پھیلے ہوئے سراب تھے۔ آنے والا کون سا لمحہ وسعت اجل کے تصرف میں ہے۔ چالیسواں، سترواں یا ایک سو بیسواں۔ میں نہیں جانتا تھا اور ناگ منی بھی نہیں جانتی تھی لیکن میری طرح وہ بھی جو آ پھنسی آن تھی اور ہار سے ڈر کے ہمت ہار جانے والی نہیں تھی۔

ایک اور دھماکے نے مجھے اور ناگ منی کو تقریباً اوندھے منہ گرا دیا تھا مگر میں جھکا اور سنبھل کے اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا آگے بڑھا۔ گرد اور دھوئیں کا دوسرا بادل اوپر اٹھا۔ میں نے بارود کی بو کے ساتھ ایک کراہت انگیز اور اعصاب شکن بو کو محسوس کیا۔ یہ گوشت کے جلنے کی بو تھی۔ اس دستی بم کے ساتھ ہی کوئی انسانی وجود پرزہ پرزہ ہو کے جل گیا تھا۔

عمارت اب دو طرف سے کھنڈر بن چکی تھی۔ انگریزی حرف ایل کی شکل کا وہ حصہ ابھی سلامت تھا جس پر ہم موجود تھے مگر اس کی سلامتی بھی غیر یقینی ہو گئی تھی۔ ایک میری نظر اس ملبے کی طرف اٹھی جو اب گرد و غبار میں ایک بے ہنگم ڈھیر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اُدھر سے بچ نکلنے کی راہ نکل گئی تھی مگر اسے نکالنے والا محسن وہی تھا جو اسے چھوڑ کے ناگ منی کی طرف دوڑا تھا۔

"ناگ منی! تو جا نکل جا۔" ششین ناگ چلایا۔

"بھیا! تم زخمی ہو۔" ناگ منی اس سے لپٹ گئی۔

"نہیں... یہ تو ایسے ہی معمولی سی خراش ہے۔ مگر تو جا۔" ششین ناگ نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "گولی تمہاری ٹانگ میں لگی ہے۔ چلو تم بھی۔"

"ارے نہیں، میں نے چوڑی اندھی لی ہے۔" ششین ناگ نے کہا۔ "میں ابھی نہیں جا سکتا۔"

"پھر کب جاؤ گے۔ سب تو مارے گئے۔" ناگ منی نے کہا۔ "تم اکیلے وقت برباد کرو گے۔"

"ہاں ہاں، کروں گا۔" وہ چیخ کر بولا۔ "ششین ناگ ہے میرا نام۔"

"تو میں بھی ناگ منی ہوں۔ تمہارا اور میرا خون ایک ہے کیونکہ ایک ہی ماں کا دودھ پیا ہے ہم نے۔" وہ بے خوفی سے بولی۔

"ناگ منی، کیا میرے سب شیر... مارے گئے؟" ششین ناگ بڑے دکھی اور رنجیدہ [illegible]

رستانی نہیں آتی۔"

"سردار، بھیے... یہ سب ہماری وجہ سے ہوا۔ میری ضد تھی۔" "تم کچھ نہ کر سکے تمہارے لیے۔"

اس نے سر کو اوپر نیچے ہلایا۔ "کر سکتے ہو تو یہ کرو کہ اس جگہ سے باہر نکل جاؤ یہاں سے۔ ابھی موقع ہے۔ میں ان کو روکوں گا۔ تم بچ سکتے ہو۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔"

"جا! پیارے گو تجھے ناگ منی، میری شیرنی، شاباش... تو پریشان کیوں ہوتی ہے۔ میں بہت جلد پہنچ جاؤں گا تیرے پاس۔" ششین ناگ نے کہا۔ "صبح ہونے والی ہے۔ پیارے ہو جائیں۔"

"تم بھی چلو گے میرے ساتھ۔" ناگ منی اڑ گئی۔

"ضد مت کرو۔ میں ان کا راستہ روکوں گا۔" وہ بولا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ "ادھر... وہ کھجور کا درخت نظر آ رہا ہے نا؟ ادھر سے نکل جانا۔ سیدھے جانا ساحل کی طرف۔ وہاں جہاں کشتیاں ہیں، وہاں لانچ ہے ہماری۔ ناگ منی کو معلوم ہے۔ دشمن پیچھے ہوتے ہیں۔ شاید ہماری خاموشی کو ہماری چال سمجھ رہے ہوں گے۔ ایسا تو ہوتا رہتا ہے۔ پہلے بھی میں اکیلا رہ گیا تھا۔ صرف ناگ منی کو بچا لیا تھا میں نے۔ پھر ہم نے دوسرا گروہ بنا لیا۔ جب تک تم وہاں پہنچو گے، میں بھی پہنچ جاؤں گا۔ ہم نکل جائیں گے۔ میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں۔ ششین ناگ ہے میرا نام!"

میں نے ناگ منی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "چلو۔"

اس نے میرے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔ "چھوڑو مجھے... نہ جاؤ۔"

"جاؤ... لے جاؤ اسے۔ زبردستی لے جاؤ اسے۔" ششین ناگ چلایا۔

ناگ منی نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی اور ریوالور اٹھایا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ایک مار دی۔ وہ زور سے چلائی اور ریوالور اس کے ہاتھ سے اڑ کے نیچے چلا گیا۔

"کمینے، ذلیل کتے..." وہ مجھ پر حملہ آور ہوئی مگر میں نے اسے بازو سے پکڑا اور گرنے سے پہلے سنبھال لیا۔

"اب میں نیچے جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم اسے اوپر سے پھینک دو اور پھر خود بھی کود جاؤ۔ میں سنبھال لوں گا۔"

ششین ناگ نے سر ہلایا اور میں نے چھت کے کنارے سے... کر چھلانگ لگائی۔ سیدھے پیروں پر کچی مٹی کی

زمین پر سے ٹکرائے۔ میں نے ششین ناگ کے سامنے کو منڈیر پر نمودار ہوتے دیکھا۔ اس کی ٹانگ میں لگنے والی گولی نے یقیناً اس کی پنڈلی کی ہڈی کو توڑ دیا تھا اور اس کا کافی خون ضائع ہو چکا تھا۔ وہ پھر بھی سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ناگ منی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر اس نے یہ بوجھ یوں میری طرف پھینک دیا جیسے اپنی امانت میرے سپرد کر دی ہو۔ میں نے ناگ منی کو دونوں بازوؤں میں جھیل لیا۔ وہ بے ہوش تھی اور بہرحال ایک جوان عورت تھی۔ کوشش کے باوجود میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ ہم دونوں گرے مگر چوٹ کسی کو نہیں آئی۔

"جلدی کرو سردار!" میں نے ہاتھ پھیلا کے کہا۔ "آ جاؤ تم بھی۔"

"تم لے کے جاؤ۔" وہ بولا۔ "میں اوپر سے تمہاری حفاظت کروں گا جب تک تم نکل نہیں جاتے۔ میں تمہارے راستے پہ نظر رکھوں گا۔ بس تم بستی سے نکل جاؤ۔ اس کے بعد خطرہ نہیں۔ پھر میں بھی آ رہا ہوں۔ جاؤ۔"

میں نے ناگ منی کو اٹھایا اور کندھے پر ڈال لیا۔

"اپنا نام تو بتاتے جاؤ۔" ششین ناگ نے کہا۔

"سکندر۔" میں نے پلٹ کر کہا مگر اور کچھ نہ بول سکا۔

میں نے ناگ منی کے بوجھ کے ساتھ دوڑنا شروع کیا۔ ابھی بمشکل سے پچاس قدم گیا تھا کہ میں نے ایک فائر کی آواز سنی۔ میرے پیچھے کوئی بلبلا کے چیخا۔ میں نے ششین ناگ کا قہقہہ سنا۔ وہ شتر بے مہار ہو گیا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ وہ جان بچا کے نہیں نکل سکتا۔

"ششین ناگ ہے میرا نام!" وہ چلایا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا اور اسی وقت دوسرا فائر ہوا۔ چھت کی منڈیر پہ کھڑا ہوا ششین ناگ دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے سرنگوں ہوا اور فضا میں تیرتا ہوا نیچے آیا۔ صبح کاذب کے اجالے میں اس کی آخری آواز کی صرف بازگشت رہ گئی۔ ششین ناگ ہے میرا نام!

میں پھر اجنبی راستوں پہ دوڑنے لگا۔ کھجور کا وہ درخت جیسے میرا راہ نما بن گیا تھا۔ یہ ایک گمنام اور لاوارث بستی تھی جہاں نہ قانون کی عمل داری تھی اور نہ سماجی اخلاق کے خود ساختہ ٹھیکے داروں کی۔ ورنہ میں پکڑا جاتا کہ اس وقت اور اس حالت میں ایک جوان عورت کو یوں اٹھا کے کہاں لے جا رہے ہو۔ آگے صرف سمندر تھا جس کی لہروں کی صدا زمین اور آسمان کے درمیان ایک شور بن کے گونج رہی تھی۔

www.paksociety.com

ساحلِ سمندر کی وجہ سے اندھیرا ابھی دھندلکے کی طرح تھا اور میں کسی حد تک راستوں کے نشیب و فراز کو دیکھ سکتا تھا۔ پھر بھی میرے لیے رُک رُک کے دوڑنا ناممکن تھا۔ میں بُری طرح ہانپنے لگا تھا اور ایک ساتھ بہت سے اندیشوں کے عفریت میرے تعاقب میں تھے۔ میں نے کئی بار پلٹ کر بھی دیکھا کہ کہیں عبداللہ اور اس کا خونی لشکر میرے تعاقب میں تو نہیں ہے۔ خوف اس طرح میرے اعصاب پر سوار تھا کہ مجھے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں یا شاید تک میرے کانوں میں دھماکے ہو رہے تھے اور میں اس شخص کی آواز سن رہا تھا جو ڈاکو ضرور تھا مگر غدار نہیں تھا۔ اس نے بھی مجھ پہ جان کا قرض چھوڑا تھا۔

آگے مجھے دونوں جانب چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری آنکھیں رابعہ کو تلاش کر رہی تھیں جسے میں نے بہت پہلے اسی سمت میں آنے کو کہا تھا۔ میں نے اُسے کئی جگہ رُک رُک کر پکارا۔ اتنی بلند آواز میں کہ وہ سو میٹر کے دائرے میں کہیں بھی ہوتی تو میری پکار سن سکتی تھی۔

میں کھجور کے درخت کے نیچے پہنچ کر میں نے ناگ منی کو نیچے لٹا دیا۔ اب سمندر زیادہ دور نہیں تھا۔ میرے قدموں کے نیچے ٹھنڈی ریت تھی اور ناگ منی اسی ریت کے نرم بستر پہ بے سُدھ پڑی ہوئی تھی۔

"رابعہ!" میں نے منہ کے سامنے ہاتھ رکھ کے ہر سمت میں آواز دی۔ خاموشی اور سناٹے میں صرف سمندر کی پُرہیبت سرسراہٹ کا جواب آیا۔ میں عجیب صورتِ حال سے دوچار ہو گیا تھا۔ گزشتہ شب ہم سب کی مشترکہ جدوجہد آزادی کی نوید بنی تھی۔ رابعہ نے بڑی حاضر دماغی سے کام لیا تھا اور محسن نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا کہ لانچ پہ قبضہ کر لیا تھا۔ ایک حادثے کے باوجود ہم بچ کر ساحل تک پہنچنے میں کامیاب رہے تھے۔ شیش ناگ جیسے ڈاکو نے بھی ہمیں پناہ دے دی تھی مگر وہ سب تو جیسے رات کی بات تھی۔ رات گئی بات گئی۔ خواب تھا جو کچھ ہم نے دیکھا۔

مگر رابعہ کا یوں مل کے بچھڑنا خواب نہیں تھا کہ میں اتنی آسانی سے فراموش کر دیتا۔ پھر ریت پہ لیٹی ہوئی ناگ منی خواب نہیں تھی اور فرشتۂ اجل کا امر بن کے پہنچنے والا عبداللہ خواب نہیں تھا۔ شیش ناگ کا مارا جانا خواب نہیں تھا۔

بہت دور اُفق پہ نمودار ہونے والی سفیدی نے آمدِ سحر کا اعلان کیا۔ پرندوں نے آشیانوں میں چہچہانا شروع کیا۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا نمی سے بوجھل ہو گئی۔

"اب میں کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟" محسن ساتھ ہوتا تو اُسے یہاں ناگ منی کے پاس چھوڑتا اور خود رابعہ کی تلاش میں جاتا۔ اُن دونوں کے بارے میں کچھ تو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کہاں ہیں۔ کیا محسن یا رابعہ تو شاید نکل گئی ہو۔ محسن۔۔۔ اس کا کیا بنا؟ وہ تو ہی مقابلہ کر رہا تھا مگر یہ حصہ دوسرے [illegible] کیا اس سے پہلے محسن وہاں سے نکل چکا تھا یا وہ بھی [illegible] یا زخمی حالت میں حاجی کے ہاتھ لگ گیا؟ میرا دل اندیشوں سے لرزنے لگا۔

"محسن!" میں نے دونوں ہاتھ منہ پہ رکھ کے گلا پھاڑ کے آواز دی۔ "محسن!"

"کیا بات ہے؟" کسی نے یوں ڈانٹ کر کہا کہ میں اچھل پڑا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جواب محسن کے سوا کون دے سکتا تھا مگر وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے باوجود میرے سارے حوصلہ شکن خیالات اب بے وجود ہو گئے تھے اور اس آواز نے ہی مجھے نئی زندگی عطا کر دی تھی۔

"سامنے آ۔۔۔ بھوت کے بچے!" میں نے چلا کر کہا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کسی کے آرام کا بھی خیال نہیں۔" محسن نے قریب کے ایک درخت پہ سے کہا۔ "چڑیاں کوّے اور بھوت سب ابھی سو رہے ہیں۔"

میں نے درخت کے نیچے جا کر دیکھا تو وہ ایک شاخ پہ توازن قائم کیے دونوں پیر پھیلائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی پشت اس تنے سے لگی ہوئی تھی جس سے شاخ نکلی تھی۔

"اُلو کے پٹھے! میں کب سے پریشان ہو رہا ہوں۔"

"تقریباً سترہ منٹ سے۔" محسن نے گھڑی دیکھ کے کہا۔ "جب آپ سرپٹ بھاگتے ہوئے پہنچے تھے بڑا دلفریب منظر تھا۔"

میں نے ایک نیچے جھکی ہوئی شاخ کو پکڑ کے زور سے ہلایا۔ محسن نے سنبھل کے شاخ کو پکڑا اور پھر بندر کی طرح نیچے لٹک گیا۔

"تو کب سے یہاں معلق تھا؟" میں نے کہا۔

"چار بج کر چونتیس منٹ۔۔۔ یعنی تقریباً چالیس منٹ سے۔" وہ پھر گھڑی دیکھ کر بولا۔

"گویا تو محاذِ جنگ سے فرار ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں اتنی دیر سے یہ سوچ سوچ کر دہل رہا ہوں کہ۔۔۔"

"کہ میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔" محسن ہنسا۔ "ابے ہم بہت ڈھیٹ چیز ہیں۔ میں نہایت بے جگری سے دادِ شجاعت دے رہا تھا اور کشتوں کے پشتے لگا دیتا۔۔۔!"

"مگر پھر [illegible] گھبرا گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"یار! اپنا لباس بدلنے چلا آیا۔ بھیگ گیا ہے۔"

"نہیں یار۔ وہ تیری نورِ چشم مجھے بھگا کے لے گئی۔ جب تو نکلا تھا تیری طرح، تو لوٹ کر وہ پھر اندر آ گئی۔ کہنے لگی میں بھی جاتی ہوں۔ بہت مُصر تھی کہ آخر یہ ناگ منی نے کون سا منتر پڑھ کے پھونک دیا کہ میرا محبوب اس نئی لیلیٰ کی خاطر جان بکف ہو گیا۔ عورت کی ذات کا تجھے پتا ہے کتنی شکی مزاج اور حاسد ہوتی ہے۔ خیر میں نے روکا اور اُسے زبردستی باہر لے گیا۔ میں نے کہا کہ دفع کرو سکندر کو۔ جان ہے تو جہان ہے اور بہت سکندر مل جائیں گے۔ یہاں تو ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔"

"بکواس بند کر اور یہ بتا کہ وہ اب کہاں ہے؟"

"وہ! میں نے تو کھینچ کر سمندر کے کنارے پہنچا دیا تھا اور یہ کہہ بھی دیا تھا کہ خبردار جو اِدھر اُدھر ہوئیں۔ جہاں بیٹھی ہو اسی جگہ بیٹھی رہنا۔ اب معلوم نہیں کہ وہ حسد اور رقابت میں پاگل ہو کے سمندر میں نہ آ گئی ہو۔ پھر میں تو آ گیا تھا تیری تلاش میں۔" محسن نے کہا۔ "اس پہ ہسٹریا کا اثر تھا۔ میں نے دو چھانپڑ مارے تھے آپ کی اجازت کے بغیر۔ اس کا دماغ درست ہو گیا تھا۔ دو آپ کے بھی مار دوں؟"

"چل اُسے اُٹھا۔" میں نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔ "بڑے شوق سے کہا تھا نا کہ میرے ساتھ بھاگ چلو میں لے آیا ہوں اُسے بھگا کے۔ یہاں تک لانے میں میری جان کو بھی ہو گئی۔"

"اچھا ہوں یار۔ مگر میں نے تو نیکی کی تھی تیرے ساتھ۔" محسن نے فریادی لہجے میں کہا۔ "اس کا یہ صلہ؟ شیش ناگ تو مجھے چھوڑے گا نہیں۔"

"وہ اب کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" میں نے افسوس سے سر ہلاتے کہا۔ "اس کا بھی کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"وہ مارا گیا؟" محسن نے ناگ منی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اللہ مغفرت کرے اس کی۔"

"یہ ہمارے ساتھ نیکی کرنے کی سزا ملی اُسے۔" میں نے کہا۔

"بہت سبز قدم ہیں ہم لوگ۔" محسن بولا۔ "اس کے ساتھی؟"

"سب کام آ گئے۔" میں نے کہا۔ "وہ خبیث عبداللہ خدا کا قہر بن کے نازل ہوا تھا۔ اُسے اپنی ذلت اور شکست کا بڑا صدمہ تھا اور اُن سب نقصانات کا بھی جو اُسے ہماری وجہ سے اٹھانے پڑے۔ وہ ہمیں نہیں پا سکا تو شیش ناگ کو تباہ کرنے آ [illegible] کی وجہ سے اس کی کامیابی عین وقت پہ ناکامی بن گئی تھی۔ ہمیں تو وہ پھر سے جاتا تو خزانے کا پتا پوچھنے کے لیے مگر ہم نکل آئے۔ اس کے بعد میں دوسرا دستی بم پھینکا تھا۔"

"اتنا اسلحہ اور لڑنے آدمی وہ کہاں سے لے آیا؟"

"اسلحے کی اُسے کیا کمی، شہر تک آنے جانے میں اُس کے تین چار گھنٹے صرف ہوئے۔ مجھے تو یقین تھا کہ وہ لوٹ کر آئے گا مگر اس یقین سے کیا ملا۔ بہتر ہوتا اگر ہم راتوں رات نکل آتے اور شیش ناگ کو بھی مجبور کر دیتے کہ اپنے سب ساتھیوں کے ساتھ نکل جائے۔"

"یہ تقدیر کے لکھے کی بات تھی۔ ایسا ہونا تھا۔ ہم تو حقیقت سے واقف ہیں۔ جو صبح تفتیش کے لیے آئیں گے وہ اس جنگ کو کس نظر سے دیکھیں گے؟ اخبار والے کیا بتائیں گے؟ یہی کہ خطرناک ڈاکو شیش ناگ اور اس کے ساتھی کسی دوسرے گروہ سے تصادم میں ہلاک ہو گئے۔ خبریں تو بنانے والے بنائیں گے۔ ممکن ہے اس واقعے کو یوں پیش کیا جائے کہ ڈاکو شیش ناگ اور اس کے ساتھی پولیس مقابلے میں مارے گئے۔ سارا کریڈٹ پولیس لے لے۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "بالکل یہی ہوگا۔ کسی بڑے افسر کے خوشامدی انسپکٹر کو میڈل ملے گا اور ترقی ملے گی جس نے یہ خبر ملنے پر کہ ڈاکو شیش ناگ آج رات ڈاکا ڈالنے آئے گا، اس کا محاصرہ کیا یا اس کا بڑی بہادری سے تعاقب کیا اور ایک خونریز مقابلے کے بعد گروہ کا خاتمہ کر دیا۔ حاجی کے جو ساتھی وہاں مارے گئے وہ بھی شیش ناگ کے ساتھی شمار ہوں گے اگر جاتے وقت حاجی اُن کی لاشیں سمیٹ کر نہ لے گیا۔"

سمندر اب میرے سامنے تھا۔ پانی کی متلاطم سطح میں شفق کا رنگ متحرک نظر آنے لگا تھا۔ سورج کا سنہرا گولا ابھی ابھی پانی سے اُبھرا تھا۔ آسمان پر آبی پرندوں کی قطاریں اُڑتی جا رہی تھیں۔ بہت دور میں نے ایک لانچ اور ایک بادبانی کشتی دیکھی اور اس کے بہت پیچھے اُفق کی لکیر کے پاس بڑے بحری جہازوں کا سایہ سا نظر آنے لگا جو سب ساکت سے لگتے تھے۔

دائیں اور بائیں جانب چٹانوں کا طویل سلسلہ تھا یا انہی چٹانوں پہ کہیں رات کے اندھیرے میں وہ لانچ چڑھ گئی تھی جس کا ناخدا حادثے سے پہلے ہی مر چکا تھا مگر یہ بات حاجی کو بھی معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ میری نظریں رابعہ کو تلاش کر رہی تھیں۔

"یار! کہاں ہے وہ؟"

www.paksociety.com

"میرا خیال ہے کہ آیا تو میں صحیح سمت میں ہوں۔" محسن نے کہا اور ناگ منی کو ایک چٹان کے سامنے ہی ریت پر بٹھا دیا۔ پھر اُس نے کھجور کے درخت کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ یوں پھیلائے جیسے وہ گھڑی کی سوئیاں ہوں۔ یہ سمت کے تعین کا سب سے آسان اور صحیح طریقہ ہے۔ اُس نے کھجور کے درخت کو بارہ کا ہندسہ فرض کر لیا تھا۔

"بارہ بج کے بیس منٹ۔" اُس نے کہا۔ "جاتے وقت، واپسی میں میری سمت تھی۔ جب بجے میں دس منٹ، پانچ پچاس، بارہ بیس۔ بالکل ٹھیک آیا ہوں میں۔"

"پھر رابعہ کہاں گئی؟"

"یہ تو رابعہ ہی بتا سکتی ہے۔" وہ بولا۔ "ہم اُسے تلاش کر سکتے ہیں اور نہ ملے تو پولیس کے پاس جا کے گمشدگی کی رپورٹ بہرحال لکھوا سکتے ہیں۔"

میں نے اُسے ہاتھ مارنے کی کوشش کی۔ "تیرے ہوش و حواس کی گمشدگی ہو جائے گی۔"

"یار ایسی بھی کیا دیوانگی۔ سچا عشق سچا ہے تو اُسے دل سے پکارو۔ کچے دھاگے سے چلی آئے گی سرکار بندھی۔ کیا کہتے ہیں وہ ظالم سماج کی دیواریں گرا کے سب زنجیریں توڑ کے، بہر طلبات میں گھوڑے دوڑاتی یا خود دوڑتی ہوئی۔"

"رابعہ ہو!" میں نے اُسے آواز دی۔

وہ ایک چٹان پر یوں نمودار ہوئی جیسے واقعی میری آواز پہ آئی ہو، حالانکہ میری آواز تو سمندر کے شور میں گم ہو گئی تھی اور اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی مگر محسن کی بات کے جواب میں اُسے محبت کا کرشمہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ وہ خاصا خفیف ہوا۔

"دیکھو سالے زن مرید، وہ آ گئی۔" میں نے کہا۔ "وہ کوہ قاف پر اپنے گھر میں ہوتی تو وہاں سے بھی پہنچ جاتی میری پکار پر۔"

"بجا ارشاد۔ اب تو سارے دعوے سچے آپ کے۔ بس ہم جھوٹے۔" محسن نے کہا۔

"تم نے بہت دیر کی۔" رابعہ نے میرے قریب آ کے کہا۔ اُس نے اپنے آنسو روک لیے تھے مگر سیل گریہ اس کی آنکھوں تک آیا ہوا تھا۔ اور بوجھل پلکوں کے پیچھے کالی آنکھوں میں آدھی کا جل گھرا ہو گیا تھا۔

"ہمیں تو آتے ہوئے ہو گیا ایک گھنٹا۔" محسن نے اُسے ڈانٹنا شروع کیا۔ "دو گھنٹے سے تمہیں تلاش کر رہے ہیں کہاں چلی گئی تھیں تم۔ بھائی ہمارا پاگل ہو گیا۔"

"میں ادھر تھی، اس چٹان کے پیچھے۔ فجر کے وقت میں نے نماز پڑھی اور سورج کا انتظار کرتی رہی۔"

"یہ سورج کون ہے؟" محسن نے شکی مزاج شوہر کی طرح کہا۔

"امی کہتی تھیں کہ صبح نماز پڑھ کے جب سورج نکلے تو خدا سے شکر کرو خدا آج کا دن تیری عطا ہے۔ اب مجھے اپنی امان میں رکھنا تاکہ میں کل کا دن دیکھوں۔ اور خدا اُن کی بیٹی سنا ہے تم زندگی کے معمولات اور دنیا کے کام شروع کرنے سے پہلے اس کی امان مانگتے ہیں لیکن معلوم ہے آج میں نے خدا سے کیا کہا؟ میں نے کہا کہ اے خدا! سکندر کو اپنی امان میں رکھنا اسے پھر میرے پاس لے آنا میری طاقت تیری ذات پر اعتماد ہے اور پھر میری محبت ہے۔" وہ محسن کی پروا کیے بغیر بولتی گئی۔

سنہرے آسمان کے اور سمندر کی شفق سے روشن افق کے پس منظر میں وہ اپنی سرخ چمکیلی جھلملاتی پوشاک کے حسن کی تابناکی کے ساتھ اس دنیا کی مخلوق نہیں لگتی تھی۔ وہ ابھی تک محبت کے الہامی جذبات کے طلسم میں گرفتار تھی اور صبح دم ساحل سمندر پہ اس کا اور میرا وجود کسی ناممکن خواب کا ایک حصہ لگتا تھا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے۔" محسن نے سر ہلا کے کہا۔ "کہ سارا کریڈٹ خود لے لیا۔ حالانکہ جان ہتھیلی پر رکھ کے میں گیا میدان کارزار میں، جہاں وہ تاوان کو لے کے چل رہے تھے اور فرشتہ اجل مجھے پوچھتا پھر رہا تھا۔ تمہارے اس بالم ہرجائی کو میں ایسے نکال لایا جیسے جادوگر بوتل میں سے جن نکالتے ہیں۔ میرا مطلب ہے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر۔ اب تم پوچھو کہ یہ بالم ہرجائی کیسے ہو گیا؟"

رابعہ مسکرائی۔ "تمہارا دوست ہے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔"

"میرا لو۔ شکریہ وغیرہ کچھ نہیں، الٹا الزام۔" محسن بولا۔ "ارے بابا ادھر جا کے دیکھو، وہ تو میں پہنچ گیا وقت پر ورنہ اب تک تم سر پکڑ کے روتیں۔ یہ نکل گیا تھا اس جادوگرنی کے سنہری رنگے ہاتھوں پکڑا اسے ناگ منی کے ساتھ فرار ہوتا اور گرفتار کر کے یہاں لے آیا۔"

"ناگ منی کے ساتھ؟ کیا وہ بھی آئی ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "کہاں ہے؟"

"دیکھا، سوت کا نام آتے ہی کیسی بے قراری۔"

"یہ تو میں بتاؤں گی شہلا کو کہ تم نے اس سے کیا کہا تھا۔" رابعہ نے میرے ساتھ چلتے چلتے کہا۔

میں نے کہا۔ "یہ میں ... ذکی احواب"

کہا تھا۔"

ناگ منی آنکھیں کھولے آسمان کو تک رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔

"تم کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟" اُس نے ایک دم میری بین کو گریبان سے تھام لیا۔ "بھائی کہاں ہے میرا؟"

میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ "اُس نے ہی کہا تھا کہ ناگ منی کو لے جاؤ۔ میں بعد میں آؤں گا۔"

"پھر وہ آیا کیوں نہیں؟ تم سب نے اسے اکیلا چھوڑ دیا۔" اس نے مجھے، محسن اور رابعہ کو نفرت سے دیکھا۔ "تمہاری ہی خاطر تو اس نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا تھا۔"

"یہ اُس کا احسان ہے ہم پہ جو ہم کبھی نہ اتار پائیں گے۔ وہ بہادر آدمی تھا۔"

"تھا؟" ناگ منی چلائی اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ لیکن کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح زبان سے نکل جانے والا لفظ واپس نہیں آتا۔

ہم تینوں ایک مجرمانہ خاموشی کے ساتھ سرنگوں ہو گئے۔

"بولو۔ بولتے کیوں نہیں اب؟" ناگ منی چیخنے لگی۔ "وہ مر گیا ہے نا۔ اور تم سب نامرد، بزدل بیٹھے اس کی لاش کو بے گور و کفن چھوڑ کے بھاگ آئے۔"

میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے ورنہ وہ میلا شدہ تو وہ باقی بالبرے کپڑے پھاڑ دیتی۔ اس کو قابو میں رکھنا کسی وحشی اور خونی آشام شیرنی کو زیر دام لانے سے زیادہ مشکل تھا۔ میں نے اپنی گرفت انتہائی سخت رکھی۔ اُس کی سب چوڑیاں چور چور ہو گئیں اور اُس کی کلائی میں کانچ کے ٹکڑے چبھ گئے۔ اُس نے میرے ہاتھوں پر کاٹنے کی کوشش کی، مجھے لاتیں ماریں اور ایسی گالیاں دیں جو عام حالات میں کوئی عورت نہیں دے سکتی لیکن ایک تو وہ ہوش میں نہیں تھی، دوسرے وہ ایسی گالیوں کو روز تو گفتگو میں سنتے رہنے کی عادی ہو چکی تھی۔

میں نے اُسے کسی طرح جھنجھوڑا۔ "ناگ منی! ہوش میں آؤ۔" اُس نے مجھے مزید گندی گالیاں دیں۔ مشکل یہ تھی کہ اگر رابعہ کے ہمدردی کرتا تو وہ رابعہ کو اٹھا کے پٹخ دیتی۔ خود محسن کو شاید اس سے باقاعدہ کشتی لڑنی پڑتی۔ اور ایسی مکسڈ ڈبل کشتی کا انجام اچھا نہ ہوتا۔ محسن کے ساتھ خود ناگ منی کے کپڑے پھٹ جاتے۔ اس کا وجود وہ لباس ہی کسی حد تک ناکافی تھا۔ یہ بھی نہ رہتا تو ہم اسے کیسے ساتھ رکھتے۔ سر دست ہمارے پاس ذکوں مردانہ جوڑا تھا تو تھا اور نہ زنانہ۔

"میاں کبیر خان ہو ہی رہا ہے علاج کرو اس کا۔" محسن نے مشورہ دیا۔ "جو میں نے کیا تھا۔ دو تھپڑ!"

رابعہ نے محسن کو غصیلی نظروں سے دیکھا لیکن بولی نہیں۔

میں نے مجبوری میں ایک ہاتھ چھوڑ کے ناگ منی کے گال پر ایک چانٹا مارا۔ اُس کو جھٹکا سا لگا اور اُس نے مجھے شعلہ فشاں نظروں سے دیکھا۔ میں نے اس کے دوسرے گال پر بھی چانٹا مارا۔ محسن کا تجویز کردہ نسخہ کام کر گیا۔ اس کی ہیجانی کیفیت ختم ہو گئی لیکن پھر ایک دلچسپ بات ہوئی۔

محسن نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "ناگ منی! دیکھو تم اکیلی نہیں ہو۔" اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ ایک دم پلٹی اور روتی ہوئی محسن سے چمٹ گئی۔ اُس نے محسن کے کندھے سے لگ کے رونا شروع کیا۔ "نہیں، میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ اس کے سوا کوئی سہارا نہیں تھا میرا۔ وہ میرا محافظ بھی تھا۔ اب تم محافظ ہو گے میرے؟ تم سہارا دو گے مجھے؟ بولو، چپ کیوں ہو؟ صاف کیوں نہیں کہتے کہ ناگ منی تو ایک بدمعاش عورت ہے۔"

مجھے محسن کی قابل رحم حالت پر بہت ہنسی آ رہی تھی لیکن میں ضبط کرنے پر مجبور تھا۔

"ناگ منی! ایسی باتیں مت کرو۔" محسن نے عقل سے کام لیتے ہوئے ایک بہت مشکل جذباتی منظر میں اپنا رول بڑی خوبی سے نبھایا۔ "تم ہمارے ساتھ رہو گی۔ تم تو ایک بہادر عورت ہو۔ زندہ رہنا آتا ہے تمہیں۔ تم خود اپنا سہارا ہو۔ جو ہمارے دشمن تھے وہی اب تمہارے بھی دشمن ہیں۔ کیا تم ان سے بدلہ نہیں لو گی اپنے بھائی کے خون کا؟"

"میں انھیں چھوڑوں گی نہیں... ہاں..." اُس نے محسن کے کندھے پر سے سر اٹھا کے چند گالیاں عبداللہ اینڈ سنز کو دیں جو نہایت مردانہ فصاحت و بلاغت کا نمونہ تھیں۔

محسن نے فوراً خود کو اس آتش فشاں قسم کی خطرناک عورت سے الگ کیا اور ایک گہری سانس لی۔ "چلو اب ہمیں بتاؤ کہ تمہاری لانچ کہاں ہے؟"

"پہلے میں اپنے بھائی کو دیکھوں گی۔" اُس نے آنسو پونچھ کر اپنے ہاتھوں کی کلائیوں کو دیکھا اور چٹکی سے پکڑ کے کانچ کا ٹکڑا کھینچ لیا۔ خون کا ایک اور قطرہ اس کی اجلی جلد پر چمکنے لگا۔ "کیا کرو گی اُسے دیکھ کر۔ تمہیں اور دکھ ہو گا؟"

"نہیں اس کو اپنے ساتھ لاؤں گی۔" اُس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "تم میری مدد نہیں کرو گے۔ دیکھو مجھے اس کو دفن کرنا ہے۔ میں اس کی لاش کو ایسے ہی چھوڑ کے نہیں جا سکتی۔ اُس نے سب کچھ کیا میرے لیے۔ میں اتنا بھی نہ کروں اُس کے

www.paksociety.com

ایک قبر بن جائے۔ سال کے سال میں پھول چڑھا سکوں۔"

"دیکھو ناگ منی! تمھاری اپنے بھائی کے لیے محبت اور عقیدت کے جذبات بہت قابلِ قدر ہیں۔ مگر جو تم چاہتی ہو وہ ممکن نہیں۔ اب تک بستی والے جو رات بھر گھروں میں دبکے رہے تھے، وہاں جمع ہو چکے ہوں گے۔ ممکن ہے پولیس آ چکی ہو یا آنے والی ہو یا اس خونی حاجی کے قاتل وہاں موجود ہوں۔ بہر صورت وہ لاش تم کو نہیں مل سکتی۔ اس کے برعکس یہ ہو سکتا ہے کہ تم پکڑی جاؤ۔ تمھارے ساتھ ہم بھی پکڑے جائیں، مارے جائیں۔ اس کے بعد قاتل تو بے فکر ہو جائیں گے کہ اب بدلہ لینے والا بھی کوئی نہیں رہا۔ کیا تمھارے بھائی کی روح تمھاری اس غلطی پر خوش ہو گی؟ نہیں، اس کو زیادہ تسکین تب ملے گی جب تمھارے ہاتھوں اس کا قاتل جہنم رسید ہو گا۔ قبر تو اسے ضرور ملے گی۔ یہاں تمھارے ہاتھوں نہ ملی تو سرکاری اہلکار اسے دفن کر دیں گے۔ مٹی تو مٹی ہے۔ جسم کی مٹی کسی بھی زمین میں ملے، مٹی کو فرق کیا پڑتا ہے۔ رہی یاد، تو وہ دل میں رہتی ہے۔ یاد کبھی مٹی نہیں ہوتی۔ تم سال کے سال کیا، ہر روز یاد پر پھول چڑھاؤ۔ اس سے بھی بڑھ کر کچھ کرنا چاہو تو اس کے لیے دعا کرو کہ خدا اس کے گناہوں کو معاف کرے اور اس پر آخرت آسان کرے۔ تم اسے ایصالِ ثواب کر سکتی ہو۔ اس کے بہت طریقے ہیں۔ عمرہ کراؤ یا صدقۂ جاریہ کے لیے کچھ کرو۔ ایک یتیم کی پرورش، ایک مسجد کی تعمیر، ایک بستی میں کنواں، ایک گھر میں روشنی۔ نیکی کے یہ سارے کام تمھاری دسترس میں ہیں۔"

ناگ منی غور سے سنتی رہی۔ ایسی باتیں اس سے پہلے کس نے کی ہوں گی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ متاثر ہوئی ہے۔ محسن نے پھر اپنی ذہانت کا ثبوت دیا تھا اور جذبات کے اندھے صحرا میں اکیلی بے سمت بھٹکنے والی بے بس لڑکی کا ہمدرد بن کے اس کی دستگیری کی تھی اور آگے وہ راہ دکھائی تھی جو اس کے لیے امن و سکون اور عاقبت کی منزل کا نشان تھی۔

"کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟" محسن نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

ناگ منی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے محسن کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "تم ساتھ دو گے میرا؟ مجھے ان سے بدلہ لینا ہے اور مجھے وہ سب کرنا ہے جو تم نے کہا۔"

میری طرف ناگ منی کی پشت تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر میں نے ہنسی کو دبا لیا اور رابعہ کے کان میں کہا "مارا گیا یہ سالا۔"

کمبل چمٹ گیا ہے اب اس سے۔"

"ابتدا بھی تو خود اسی کی طرف سے ہوئی تھی۔" رابعہ نے متفکر ہو کے کہا۔ "ایک عورت ہونے کے ناتے غالباً وہ شمسہ کے مرکزی کردار کے مقابل سائڈ ہیروئن کو برداشت نہ کر سکی تھی۔" "ایسا مذاق بھی نہیں کرنا چاہیے۔"

"اب مذاق کہاں رہا ہے۔ بھائی محسن خاں انجلی کے لیے تو وہ شعر یاد آتا ہے کہ عشق کہے میرے پیچھے ہے کیسا میرے آگے۔" میں نے کہا۔ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟"

محسن نے گول گول آنکھیں گھما کے پہلے گھورا اور دعا کے ہاتھ اٹھا لیے۔ "ہم سب تمھارے ساتھ ہیں۔ اب چلو، کہیں ایسا نہ ہو کر مراغرسال یا قاتل ہمیں تلاش کرتے ہوئے آ جائیں۔ ہم کو نکل جانا چاہیے۔ رابعہ! تم چلو ناگ منی کے ساتھ۔" محسن نے اپنی گلو خلاصی کرا لی۔

ناگ منی نے رابعہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایک جیسے لباس میں ایک ساتھ چلتی ہوئی وہ سگی بہنوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔

"تو نے ایک بات دیکھی؟" محسن بولا۔

"میری گنہگار آنکھیں تو بہت کچھ دیکھ رہی ہیں۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"رابعہ اور ناگ منی کی صورت میں بھی کتنی مماثلت ہے۔" محسن نے کہا۔

میں ٹھٹک کر رک گیا۔ "واقعی، تو نے بھی غور کیا؟"

"اس کا مطلب ہے آپ پہلے ہی غور فرما چکے ہیں۔" محسن بولا۔

"ہاں، میں تو اسی وقت چونکا تھا جب میں نے رابعہ کو اس لباس میں دیکھا تھا اور جب ناگ منی کھانا لے کر آئی تھی۔" میں نے کہا۔

"پھر تو میری مدد کر سکتا ہے۔ اسے بھی بھرتی کر لے ایک محبوبہ، ایک ایڈیشنل محبوبہ یا قائم مقام محبوبہ، جیسے ہر محکمے میں سیکرٹری کے ساتھ ایڈیشنل سیکرٹری ہوتا ہے۔ آفس فرائض کی انجام دہی کے لیے اور جب سیکرٹری نہ ہو تو کام چلاتا ہے۔ اب یہ رابعہ تو ادھر ادھر ہوتی رہتی ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں ناگ منی تیرے دردِ فرقت..."

"پہلے رابعہ کے لیے ایک ایڈیشنل شوہر کا انتظام کر دے۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "بلکہ اس سے بھی پہلے شمسہ کے لیے ایک قائم مقام شوہر کا، اپنے جیسا، جو تیری عدم موجودگی میں..."

"یار، یہ کیا مصیبت پڑ گئی میرے گلے۔ ایک تو میں ہوں اتنا ہینڈسم اور مردانہ وجاہت کا ایک بیسٹ کوالٹی نمونہ۔" محسن

نے کہا۔

"بس تو اسے بھی خدا کی دین سمجھ۔" میں نے کہا۔

"مجھے سخت اندیشہ لاحق ہے کہ یہ لڑکی میرے عشق میں مبتلا ہو جائے گی۔ شاید ہو چکی ہے۔ لو عشق ہے ناقابلِ علاج مرض۔ میں اسے کیسے سمجھاؤں گا کہ میں باقاعدہ شوہر ہوں، بیوی بچے والا۔"

"بیوی تو خیر وہ ہے مگر بچے کی فکر کر۔ وہ تجھ کو سرِعام ماما جی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یار، میں ایک بزدل آدمی ہوں، تیری طرح مقابلہ نہیں کر سکتا ہر سمت سے یلغار کا۔ تو نے نازنین کے عشق کو لپیٹ کیا اور اس طوفان کو غالب کی طرف موڑ دیا۔ پھر مومنی پاگل بگولے کی طرح نازل ہوئی تھی۔ اس کی لپیٹ میں شیخ صاحب آ گئے۔ خوش قسمتی یہ رہی کہ رابعہ کبھی بدگمان نہیں ہوئی۔ ہو بھی نہیں سکتی۔ اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے۔"

"تھی، مگر اب ہماری محبت بدگمانیوں سے بالاتر ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر شمسہ تو ایسی نہیں ہے۔ تاہم وہ عام سی لڑکی اور عام سی بیوی ہے۔ اس کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی..."

"اسے کچھ پتا نہیں چل سکتا۔ ابھی تو یہ ایک ضرورت کا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس لڑکی کو بے یار و مددگار تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ سب سے پہلے تو وہ پولیس کو مطلوب ہو گی اور ان کے ساتھ پولیس کے ہوس پرست سفاک بھیڑیے کس قسم کا سلوک کریں گے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اگر اپنی ماضی کی زندگی میں وہ مجرم تھی تو ظاہر ہے اسے بھی مجبوری حالات نے غلط راستوں پر ڈالا۔ وہ شوقیہ ڈکیت نہیں بنی ہو گی۔ پولیس کے ہاتھوں میں پڑ کر تو وہ ڈکیتی ہی نہیں عصمت فروشی بھی کرنے لگے گی۔ ان کا طریقہ ہی ایسا ہے کہ وہ چھوٹے مجرم کو بڑا مجرم بنا دیتے ہیں۔"

"ہم اسے ساتھ رکھیں گے؟"

"اگر ضروری ہوا یا اگر اس نے چاہا تو۔" میں نے کہا۔ "زبردستی ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ جانا چاہے گی تو اسے کون روکے گا لیکن میرا خیال ہے کہ..."

"یہ ہے ہماری لانچ۔" ناگ منی نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ "کیا تجھے کوئی لانچ نظر آ رہی ہے؟"

"ذرا نیچے تشریف لائیے۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے اور محسن نے چٹان کے اوپر سے چھلانگ لگائی اور نیچے ریت پر آ اترے۔ پھر میں نے وہ لانچ دیکھی جو چٹان کے عین نیچے سائے میں پوشیدہ تھی۔ اسے لانچ کہنا بھی غلط تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی موٹر بوٹ تھی جس میں یاماہا کا فرینل انجن لگا ہوا تھا۔ وہ انجن جو اسٹینڈ کے پتوار کے ساتھ کشتی کے کنارے پر رکھ دیا جاتا ہے اور پھر اٹھا لیا جاتا ہے۔

"کیا یہ چلتی بھی ہے؟" میں نے کہا۔ میرا مقصد ہرگز اس کا مذاق اڑانا نہیں تھا۔ موٹر بوٹ کی خستہ حالی سے ایسا ہی لگتا تھا کہ مدت سے وہیں کھڑی ہوئی ہے۔

"مجھے کیا معلوم؟ چلانے والے چلاتے ہی تھے۔" ناگ منی نے خفگی سے کہا۔

"اس کی کوئی چابی وغیرہ؟" میں نے سر کھجا کے کہا۔

"میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"اچھا، میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا اور چھلانگ مار کے ایک اور چٹان پر گیا۔ پانی کی ایک لہر پتھر سے ٹکرائی اور اچھال میرے چہرے تک آئی۔ محسن میرے پیچھے آیا اور ہم دونوں پانی میں اتر گئے۔ چند منٹ کا فاصلہ ہم نے ایک دوسرے کو تھامتے ہوئے اور چٹانوں کا سہارا لے کر طے کیا۔ ہم موٹر بوٹ میں اترے تو اوپر کر لینے کے باوجود ہماری شلواروں کے پائنچے اور قمیصوں کے دامن پانی سے بھیگ چکے تھے۔

"کیا آپ اسے اسٹارٹ کر لیں گے؟" محسن نے کہا۔ "اور اسٹارٹ کر لیا تو چلا لیں گے؟ اور چلا لیا تو..."

"کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔"

"بہت کچھ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کتے کی دم سیدھی نہیں ہو سکتی اور اونٹ کی کوئی کل۔" محسن بولا۔

"پہلے تو چیک کرو ڈیزل ہے یا نہیں۔ پھر آئل وغیرہ۔" میں نے کسی ماہر مکینک کی طرح کہا۔ "میں اس کے انجن پر غور کرتا ہوں کہ اسے بھی کار کے انجن کی طرح 'ہاٹ وائر' کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ڈائریکٹ اگنیشن۔"

محسن نے اور میں نے صرف دس منٹ میں ثابت کیا کہ عقل واقعی بھینس سے بڑی ہوتی ہے۔ اس کی اور میری مشترکہ کوشش سے انجن اسٹارٹ ہو گیا۔

"کم آن لیڈیز۔ ایس ایس ناگ منی اپنے بحری سفر پر روانہ ہونے والا ہے۔" محسن نے اعلان کیا۔ خواتین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ساحل کی طرف اور اپنے ملبوس کی طرف دیکھا۔ پانی میں قدم رکھے بغیر وہ موٹر بوٹ تک نہیں آ سکتی تھیں اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے پائنچے ازار سے بھی اوپر

www.paksociety.com

اٹھائیں یا پھر خود کو ہماری تحویل میں دے دیں اور ہم انھیں ڈھونڈ کر کشتی تک لائیں۔ انھوں نے دوسری صورت حال کے حق میں فیصلہ کیا۔ ایک بار پھر محسن کے لیے جذباتی خلفشار کے اسباب پیدا ہوئے جب ناگ منی اس پر پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہو گئی۔ اس نے محسن کے کندھے پر سواری کی۔ اس طرح کہ دونوں پاؤں لٹکے رہیں اور وہ محسن کا سر تھامے رہے۔ درحقیقت اس نے دونوں بازو محسن کی گردن میں حمائل رکھے۔ میں نے رابعہ کو خاصے شریفانہ طریقے سے گود میں اٹھایا تھا۔ پھر بھی وہ شرمائی۔ اس کے برعکس ناگ منی سے زیادہ محسن شرمایا۔ ناگ منی کو کشتی میں اتارنے کے بعد اس نے زیرِ لب کہا۔ "لعنت ہے۔"

"کیا کہا؟" میں نے دور سے کہا۔ "پھر کہنا۔۔۔ ذرا۔"

"جی کچھ نہیں۔ کہتے تو وہ الو کے پٹھے شاعر قسم کے لوگ ہیں کہ گل بدن، تنگ پیرہن۔۔۔ غنچہ دہن، شیریں سخن، ناگ منی میں یہ سب صفات ہیں۔" محسن واضح طور سے رابعہ سے مخاطب ہو گیا۔ ناگ منی کچھ فاصلے پر بیٹھ کے اپنے ہاتھ دھو رہی تھی۔

"اب میں ناخدا کے فرائض سنبھالتا ہوں۔ تم خدا کو یاد کرو۔" میں نے کہا اور محسن کو اشارہ کیا کہ کشتی کھول دے۔ محسن نے اس رسّی کو کھول دیا جو ایک چٹان کے نوکیلے کونے سے لپٹی ہوئی تھی۔

موٹر بوٹ چلانے کا کچھ تجربہ بہت پرانا تھا۔ اپنے قیام انگلستان کے دوران میں ہم ایک ٹیم تھے جو انگلش چینل میں کشتی رانی کے مقابلوں میں شریک ہوتے تھے۔ صرف ایک بار ہم تیسرے نمبر پر رہے تھے ورنہ عموماً پیچھے سے ہمارا نمبر دوسرا تیسرا رہتا تھا۔ اس میں ہر قسم کی کشتی سے واسطہ پڑتا تھا۔ اصل مقصد ہمیشہ کچھ اور ہوتا تھا۔ ترتیب کچھ تو ہم ملاقات چاہیے ہر ریس میں ہماری پارٹنر بدل جاتی تھی۔ ہمارا مقصد ہمیشہ انگریزوں کی ریس خراب کرنا رہا۔ ریس جیتنا نہیں۔

یہ تجربہ حالیہ واقعات کا نتیجہ تھا۔ میں نے کریم بلوچ کو لانچ چلاتے دیکھا تھا اور اس سے فطری تجسس کے باعث سوالات بھی کیے تھے۔ اب میں نے پوری گیئر سنبھالی تو تھوڑا میں مجھ سے وہی غلطیاں سرزد ہوئیں جو اناڑی ڈرائیور کرتا ہے لیکن میں نے موٹر بوٹ کا توازن قائم رکھا۔ چٹانوں سے دور آ کے میں نے رفتار میں اضافہ کیا تو موٹر بوٹ لہرا کے بے قابو ہونے لگی۔

"میں ڈرگ ریگ بھی چلا سکتا ہوں۔" میں نے رفتار کم کرنے کے بعد دانت نکال کے محسن سے کہا۔

"اچھا؟" محسن نے طنزاً کہا۔ "خوف کتنا گہرا ہو سکتا ہے آپ موٹر بوٹ کے ساتھ؟"

"میری حسِ ملاحی کہتی ہے کہ ہم صحیح سمت میں جا رہے ہیں اور اگر کسی وھیل نے ہمیں نوش نہ کیا یا سمندری طوفان یا بادلوں نے منہ بگاڑا تو ہم کیماڑی میں اپنی لانچ تک پہنچ جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"امکانات تو لامحدود ہیں۔ ابھی حاجی عبداللہ ایک ایٹمی آبدوز کے ساتھ نمودار ہو اور ہم پر میزائل مارے یا جانم بھائی آ جائیں کہ بچتی خوب ملے۔ کہاں تھے رات؟ اور یہ کہ آپ ہمیں سمندر کے نیچے کی طلسماتی دنیا دکھانے لے جائیں۔" محسن نے کہا۔

"محسن، ذرا ادھر آؤ۔" ناگ منی نے آواز دے کر کہا۔

محسن اچھل پڑا۔ "نام بھی معلوم ہو گیا میرا۔"

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"یہ سب تیری کبھی نہ ہونے والی بہو کی شرارت ہے۔" محسن بولا اور ناگ منی کے پاس چلا گیا۔ ناگ منی نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے پاس بٹھا لیا۔ رابعہ ہنستی ہوئی میرے پاس آ گئی۔

"تم نے اس سے بھی پوچھا نام؟" میں نے کہا

"ہاں، ابھی تک تو تعارف کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی یا یوں سمجھو کہ موقع نہیں ملا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"میرا اپنا وسیب کا نام پتا، ولدیت سب درست بتا دیے نا؟"

"جب وہ ساتھ ہے تو اس سے کچھ چھپانے کا فائدہ؟" رابعہ نے چیں بجبیں ہو کے کہا۔

"اس سے بھی کچھ پوچھا؟ اصلی نام؟"

"بس نام ہی بتایا ہے ابھی تو۔" رابعہ بولی۔ "ریشمیں ناگ...... تو گویا تخلص تھا۔" رابعہ نے کہا۔ "جیسے شاعری کے پیشے میں ہوتا ہے۔ بھائی کا نام مراد بخش تھا، خود اس کا نام گل بانو۔" وہ ہنسی۔ "محسن کے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ ابھی تک اس کی شادی کیوں نہیں ہوئی۔ میں نے کہہ دیا کہ کیسے ہوتی۔ تم جیسی کوئی لڑکی جو نہیں مل سکی۔"

"اف، مروا دیا اس غریب کو۔" میں نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ "بھس میں چنگاری پھینک دی۔"

"معلوم ہے تمہارے بارے میں کیا کہہ رہی تھی؟" وہ پھر ہنسی۔

"حقیر کو سخت اشتیاق ہے مس ناگ منی کے تبصرے کا۔"

"کہتی تھی کہ یہ مرد جو مونچھیں بھی صاف کر دیتے ہیں ان کو شرم نہیں آتی۔ مونچھیں تو زیور ہوتی ہیں مرد کا۔"

"تو پھر اس کی شادی مونچھوں والے سے کیوں کہا تھا کہ میں تو شادی کروں گی کسی مرد سے۔" میں نے جل بھن کے کہا۔

"محسن کو دیکھو، کتنا مظلوم نظر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔" رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یعنی یہ بھی نہیں؟" میں نے کہا۔ "تمہاری یہ مس ناگ منی کب اسی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی آج کے دن تک اور یہ بھی خوب ہے کہ ابھی آدھے گھنٹے پہلے آپ کس قدر جذباتی ہو رہی تھیں اپنے بھیا کے بارے میں۔ اتنی سی دیر میں موڈ بدل کر رومانٹک بھی ہو گیا۔"

"خیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔ وہ بے چاری اپنے آپ کو ہمارے درمیان ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔" رابعہ بولی۔ "اسے سہارے کی ضرورت تو ہے نا۔۔۔ اور عورت بے چاری۔۔۔"

"آہا۔۔۔ بے چاری!" میں نے کہا۔

"ویسے یہ بہت ہمت والی لڑکی ہے۔ اتنا بڑا سانحہ گزر گیا اس پر۔ میں نے پوچھا تھا کہ تمہارے دوست، عزیز، رشتے دار کوئی تو ہوں گے۔ کہنے لگی ڈکیت کا دوست کون ہوتا ہے، سب ہی دشمن ہوتے ہیں۔ رشتے دار ہوتے تو میں بھائی کے ساتھ زمانے میں کیوں خوار پھرتی۔ اس کو دوہرا غم تھا۔ ایک یہ کہ میرا گھر آباد نہ ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ میری شادی ہو کسی شریف آدمی سے جہاں میں گھر کی چار دیواری میں شرافت کی زندگی گزاروں اور محفوظ رہوں مگر شریف آدمی ڈھونڈتے ہیں شریف زادی۔ میں نے کہا کہ پیسہ تو کم نہیں ہو گا اس کے پاس، شریف آدمی خرید کیوں نہیں لیا اس نے۔ ناگ منی کہنے لگی، ہاں، اچھے لڑکے بکاؤ بھی ہوتے ہیں مگر کسی ڈاکو کی بہن کے لیے نہیں۔ پھر تو نام کو بٹا لگانے کے ساتھ جان کی بازی لگانے والی بات ہو جاتی ہے۔ دوسرا غم یہ تھا اسے کہ بعد میں میرا کیا بنے گا۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ ڈاکو کی زندگی تو ادھار پہ چلتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ وہ تقدیر سے ایک ایک دن ادھار لیتا جاتا ہے اور آنے والے دن پہ بھروسا نہیں کرتا۔ اس کے سب ساتھی ڈاکو تھے۔ ان پہ وہ بالکل اعتماد نہیں کرتا تھا۔ معلوم ہے جب حملہ ہوا تو اس نے بہن سے کیا کہا تھا؟"

میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

رابعہ نے کہا۔ "اس نے کہا تھا کہ ناگ منی مجھے کچھ ہو جائے تو ان کے ساتھ نکل جانا۔ یہ کام کچھ بھی کرتے ہوں، لیکن یہ ہیں شریف اور خاندانی لوگ۔ شرافت تو چہروں پر نظر آ جاتی ہے۔ یہ تیری حفاظت کر سکتے ہیں۔"

مجھے اس کی موت کا منظر یاد آیا۔ شاید اسی لیے وہ بہت بے چین تھا اور مُصر تھا کہ ہم نکل جائیں۔ وہ خود بھی اگر چاہتا تو ہمارے ساتھ آ سکتا تھا مگر اس نے ہمارے سب خطرات مول لے لیے تھے اور اس راستے کی آخری وقت تک نگرانی کرتا رہا جس پر چل کے بہن کو عافیت اور تحفظ کی ضمانت ملتی تھی۔ وہ مطمئن تھا اور پُر اعتماد تھا۔

"کیا ہم اسی طرح سب کے سامنے جائیں گے؟" رابعہ نے اچانک سوال کر دیا۔

"اس طرح کا مطلب؟" میں نے بے خیالی میں کہا۔

"یعنی۔۔۔ میرا مطلب ہے دوپٹہ تک نہیں۔"

"یہ سب احساس کی بات ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے خود کو میم فرض کر لو۔" میں نے کہا۔ "جب وہ ہم کالے انگریز بن کے دیسی لوگوں کے درمیان ہوتی ہیں تو انھیں سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتے ہیں، بھوکی نظروں سے اور بے شرمی سے۔ مگر وہ اس سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں۔ ایکسپوز تو وہ خود ہوتے ہیں۔"

"تم باہر باہر سے چلو نا۔ تاکہ کوئی نہ دیکھے۔۔۔"

"مجھے کون سا شوق ہے تمہاری نمائش کا۔" میں نے کہا اور کیماڑی کے ساحل کو دیکھنے لگا۔ "اب ذرا تم ناگ منی کی دل جوئی اور اشک شوئی کرو۔ محسن کو یہاں بھیج دو تاکہ میری کچھ مدد کرے۔ مجھے اندازہ نہیں ہو رہا ہے کہ ہم کس سمت سے داخل ہو سکتے ہیں۔"

محسن روتا بسورتا آیا۔ "یار! یہ رابعہ نے مروا دیا مجھے۔"

میں نے اسے ڈانٹا۔ "کیا ہو گیا ہے تجھے۔ اب بھول گیا وہ وقت جب ہفتے کے سات دن سات مختلف لڑکیوں کو ڈیٹ دیتے تھے ہم۔ اب ایک لڑکی نہیں سنبھالی جاتی۔ اگر تو اس کو جذباتی سہارا فراہم کرنے کے لیے اور اس میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے تھوڑا سا ناٹک کرے گا تو کون سا تیری وفا پر حرف آ جائے گا۔ اسے محبت کی ضرورت ہے، پیار کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت پوری کرنا ایک جان بچانے کے مترادف ہے۔ اس کا اجر ہے۔"

"مگر وہ بہت خطرناک چیز ہے۔ نازو کا زیادہ خونخوار اور بے باک ایڈیشن۔ وہ غالب کے ساتھ دل لگی میں دھول دھپا کر لیتی ہے۔۔۔ بتا رہی تھی کہ اب تک سات قتل کر چکی ہے۔ وہ آٹھواں بھی کر سکتی ہے کل۔ جب معلوم ہو گا کہ میں اسے محبت کے نام پر دھوکا دے رہا تھا۔" محسن بولا۔

"یہ کل کی کل دیکھی جائے گی۔" میں نے کہا۔ "گزرتے

www.paksociety.com

میں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔ قتل بھی مرد ہی ہوتے ہیں لیکن تو بالکل فکر مت کرے۔ اس نے شہلا کو بیوہ کیا تو میں اسے بیوہ کردوں گا جب بھی یہ بیوی بنی۔"

"یعنی میں چڑھ جاؤں سولی ابھی تو . . . رام بھلی کریں گے۔" محسن نے جل کے کہا۔

"مجھے کچھ مشورہ دے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اسی موٹر بوٹ میں چکر لگا کے اپنی لانچ کو تلاش کریں یا کہیں لنگر انداز ہو جائیں پھر ہم میں سے ایک جائے۔" میں نے کہا۔

"ہم سب نہیں جا سکتے؟" محسن سوچ کے بولا۔

"نہیں۔ سب کی توجہ کا مرکز بن جائیں گے۔ خواتین نہ صرف یہ کہ خوب صورت ہیں بلکہ ان کا حسن جامے سے باہر ہوا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر کچھ کرنسی ہاتھ میں ہوتی تو کوئی دوسری کشتی کرائے پر حاصل کر لیتے۔ یا ان کے لیے ملفوف ہونے کا بندوبست کرتے۔"

"یہ بھی تو معلوم نہیں کہ اب ہماری لانچ کہاں ہے؟"

"سارا بندرگاہ کا علاقہ دیکھنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں، کریم بلوچ احمق نہیں ہے کہ بیچ میں گھس کے کھڑا ہو جائے۔" محسن بولا۔ "وہ اس طرف نہیں تو پھر دوسری طرف ہوگا۔"

"چل پھر اللہ پہ بھروسا کرتے ہیں۔ اسی موٹر بوٹ میں جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہاں کوئی ایسی چیز نہیں۔ کوئی میلا کپڑا یا دری وغیرہ؟"

"ایک بستر لپٹا ہوا پڑا ہے شاید چادر ہو اس میں۔" محسن نے کہا۔

"بس تو یار ان کو لپیٹ دے کسی طرح۔ چادر نہ ملے تو بستر میں سے روئی نکال دے۔ اوپر نیچے کا حصہ الگ کر اور انھیں دے کر اوڑھ کر بیٹھ جائیں۔ منہ سر لپیٹ کر لیٹ جائیں اس طرح کہ کوئی نہ دیکھے۔ ہم تو اس لباس میں بالکل غیر نمایاں ہیں۔" میں نے کہا۔

محسن نے خواتین کے حسن و شباب کو بہت جلد بدنمائی کے پردے میں چھپا دیا۔ وہ تابانیِ جمال جس پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی یوں دھندلا گئی، جیسے کوئی ایک خوب صورت تصویر کو اخبار کی کاغذ میں لپیٹ دے۔ محسن کی ہدایات کے مطابق وہ بڑے بڑے چار خانے والے بستر کے میلے کپڑے اوڑھ کر لیٹ گئیں۔

اب میں نے آہستہ آہستہ چلانا شروع کیا۔ میری ساری توجہ موٹر بوٹ کو بحفاظت اس علاقے کی سمندری ٹریفک سے گزارنے پر مرکوز تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی دوسری کشتی یا لانچ سے تصادم ہو تو ہنگامہ بڑھے اور کوئی قانونی پیچیدگی پیدا ہو۔ میری پوزیشن شہر کے رش میں ایک مسروقہ کار چلانے والے سے مختلف نہیں تھی۔

محسن نے بحری جہازوں، اسٹیمروں، لانچوں، فشنگ ٹرالروں اور کشتیوں کے جمِ غفیر پر نظر رکھی۔ اس دوران بہت سی کشتیاں اور موٹر بوٹس میرے قریب سے گزریں لیکن کسی نے بھی مجھے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ وہاں کسی کو بھی فرصت نہ تھی کہ آتے جاتے لوگوں کے چہرے دیکھے۔ یہ سب چہرے تھے بھی ایک سے اور ان کے معمولات بھی مختلف نہ تھے۔ ایک کشتی لہراتی ہوئی میرے اتنے قریب سے گزری کہ دونوں کے درمیان چند انچ کا فاصلہ بھی نہیں رہا۔

"او ولی محمد! کچھ خیال کرو بابا!" میں نے چلا کر کہا۔ دوسری کشتی والا جو بوتل منہ سے لگا کے دیسی شراب پی رہا تھا، قہقہہ مار کے ہنسا۔ "اڑے ہم کو ولی محمد بولتا ہے سالا نشے میں ہے۔ ہم کو میرا باپ بناتا ہے تی۔" اس نے ایک ہچکی لی۔ کشتی تھوڑا سا لہرائی مگر گزر گئی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"یار وہ جہاز تو شاید نکل گیا۔" مجھے محسن نے مایوس لہجے میں مطلع کیا۔ "جہاں پہلے لنگر انداز تھا وہاں تو ہے نہیں۔"

"یہ تو برا ہوا۔" میں نے کہا۔ "کل رات غالب اور نازو نے انتظار کیا ہوگا ہمارا۔"

"نکل کے کتنی دور گیا ہوگا؟" محسن بولا۔ "کیا ہم اب اسے نہیں پکڑ سکتے؟"

"پکڑ تو سکتے ہیں لیکن پکڑے بھی جا سکتے ہیں۔ کل تو یہ معلوم تھا کہ کس وقت جہاز کہاں ملے گا۔ آج کیا خبر اور پھر جہاز پہ پہنچنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اوپر سے کوئی ہماری مدد نہ کرے۔" میں نے کہا۔

"اچھا، دیکھتے ہیں کہ اب ان بدلے ہوئے حالات میں کیا ہو سکتا ہے . . . وہ . . . وہ رہی ہماری لانچ۔" محسن نے انگلی اٹھا کے کہا۔

مجھے وہی خوشی ہوئی جو بھٹکے ہوئے مسافر کو منزل کا نشان مل جانے سے ہوتی ہے۔ چند منٹ بعد ہم لانچ کے قریب جا پہنچے۔ بالکل ساتھ ساتھ لگانے کی کوشش میں موٹر بوٹ نے لانچ کی سائیڈ سے رگڑ کھائی۔

کریم بلوچ غصے میں بکتا جھکتا اوپر آیا۔ "او تیرے الو کا پٹھا اندھا ہے کہ کانا۔" پھر اس نے غور سے دیکھا اور ہمیں پہچان لیا۔ "صاحب! آپ آ گیا۔ ہم سے غلطی ہوا صاحب! آپ کو الو کا پٹھا بولا۔ اندھا اور کانا بولا۔ ہم الو کا پٹھا، ہم اندھا . . ."

"بس بس کریم بلوچ!" میں نے انجن کا تار الگ کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی نقصان نہیں ہوا۔"

"تم پھر پی رہے تھے؟" محسن نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔

"ابھی کیا کرے صاحب۔ ہم کو فکر اندیشہ کھاتا تھا اتنا دیکھا کا ایک،" وہ بولا۔ "ہم اتنا غم کیا۔ رات کو الو کا مافک جاگتا تھا۔ سوچتا تھا صاحب لوگ کو بھوت لے گیا یا عزرائیل صاحب۔"

"تو غم غلط کرنے کے لیے پی رہے تھے تم!" میں نے اس کی بات پہ ہنس کے کہا۔ "چلو اب بند کرو یہ شغلِ جام و مینا۔"

"کیا؟ کیا بند کرے صاحب؟" کریم بلوچ بوکھلا گیا۔

"کچھ نہیں۔ زبان بند کرو اور ان دو خواتین کو لے جاؤ۔" میں نے کہا۔

کریم بلوچ نے آنکھیں مل کے دیکھا۔ "کون . . . کدھر ہے خواتین صاحب۔ آپ دو بولتا۔ ہم کو ایک بھی نظر نہیں آتا۔"

اس کی نگاہ میری طرف تھی جب رابعہ اور ناگ منی چادر ہٹا کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ محسن نے ان سے کہا تھا کہ خطرہ گزر گیا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہاری نظر کو کریم؟" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

اس نے پھر دیکھا تو اسے ایک سی دو خواتین نظر آئیں۔ اس نے پھر آنکھیں ملیں، زیرِ لب بڑبڑایا۔ "مغز پھر گیا ہے اپنا صاحب۔ ایک کا دو نظر آتا ہے۔ کل ہم فلم دیکھا تھا ٹیلو کا۔ ابھی ہم کو وہ ٹیلو دکھائی پڑتا ہے۔ ایک دم وہی۔ آپ ٹھیک بولا۔ ہم تو بہت نشے میں ہے۔"

محسن نے باری باری رابعہ اور ناگ منی کو ہاتھ پکڑ کے موٹر بوٹ سے لانچ پہ اترنے میں مدد دی۔

"ان کو نیچے نازو بی بی کے کیبن میں لے جاؤ۔" میں نے چھت پہ کھڑے ہوئے کریم بلوچ سے کہا۔ پھر میں رابعہ سے مخاطب ہو گیا۔

"وہاں نازو کے کپڑے ہوں گے۔ یہ لباس ویسے تو بہت نظر نواز ہے مگر کہیں نظر نہ لگ جائے زمانے کی۔" میں نے کہا۔

ناگ منی یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رات بھر کی بے خوابی، تکان اور رنج و غم کے اثر سے بوجھل اور سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ خوف زدہ بھی تھی اور بے اطمینانی کا شکار بھی۔ ایک رات نے اس کی زندگی کا رخ بدل دیا تھا اور اس کی قوتِ فیصلہ مفلوج ہو گئی تھی۔ وہ طے کرنے سے قاصر تھی کہ ان لوگوں کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کرے اور خود کو کلی طور پر ان کے رحم و کرم پر چھوڑ کے اس نے اچھا کیا یا برا، جو کسی حد تک اس کے بھائی کی موت کے ذمے دار تھے۔ فیصلہ کا جھکاؤ کسی حد تک ہمارے حق میں تھا تو صرف اس لیے کہ ہم نے قاتلوں کے خلاف اس کا دفاع کیا تھا۔ اسے بچانے کی پوری کوشش کی تھی اور ہم اپنے رویے سے بدنیت یا بدکردار نظر نہیں آتے تھے۔

میں نے اور محسن نے عرشے پر بیٹھ کے ہی کریم بلوچ کا مختصر انٹرویو لیا۔ اس نے بتایا کہ نازو بی بی اور غالب صاحب تو جہاز پہ چلے گئے تھے اور اس کے بعد وہ بہت دیر تک ان کی واپسی کا انتظار کرتا رہا تھا مگر وہ صبح تک لوٹ کر نہیں آئے۔ انھوں نے سمجھا تو دیا تھا کہ وہ جائے مگر وہ کچھ خوف زدہ اور پریشان تھا اور ان کی طرف سے متفکر تھا۔

"وہ جہاز تو چلا گیا۔"

"کدھر چلا گیا صاحب؟" کریم بلوچ نے کہا۔ "ہم نے کل صبح میں دیکھا۔ دوپہر کو دیکھا تو معاملہ کچھ گڑبڑ تھا۔"

"کیا گڑبڑ معاملہ تھا؟"

"کوئی خرابی تھی اس میں۔ انجینئر لوگ آیا۔ اُن کا ساتھ وہ بھی تھا، دوست محمد۔ وہ سب سارا دن کام کیا۔ پھر جہاز کو ادھر ورکشاپ میں لے گیا۔ ہم دوست محمد سے پوچھا، وہ بولا کہ دو انجن کا پسٹن ٹوٹ گیا۔ پتا نہیں کیسے ایک ساتھ ٹوٹ گیا۔ پسٹن ٹوٹنے والا چیز نہیں ہے۔ ابھی لمبا کام ہے۔ ادھر بمبئی سے کمپنی کا انجینئر آئیں گا۔ پسٹن ساتھ لے کر۔ لیکن صاحب، ہم ایک اور بات معلوم کیا۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "دوست محمد سے نہیں، ادھر شپ یارڈ میں اپنا سسر ہے۔"

"تمھاری تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔ یہ سسر کہاں سے پیدا ہو گیا؟" میں نے کہا۔

"پیدا تو بہت پہلے ہوا تھا صاحب۔ پھر اس کا چھوکری پیدا ہوا۔" کریم بلوچ نے کہا۔ "ایک دم پٹاخہ۔ اپن دیکھتا تو ایک بوتل کا نشہ ہوتا۔ اس کا ساتھ اپن کو شادی بنانے کو مانگتا۔ وہ بڈھا نہیں مانتا مگر ہم اس کو اتنا ماریں گا کہ اس کا تو باپ بھی مانیں گا۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ "مار مار کے اسے سسر بناؤ گے؟"

"اور کیا کریں گا صاحب۔ ایسے نہیں مانتا وہ۔"

"اچھا تم کوئی خاص بات بتا رہے تھے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں صاحب، وہ ہمارا سسر حوالدار ہے نا۔"

"کریم! تم کیا بک رہے ہو؟ اپنے سسر کے داماد تو خود تم ہو گئے۔"

کریم بلوچ نے نفی میں سر ہلا کے تردید کی۔ "نمبر ون وہ ہے صاحب۔ ہم نمبر دو ہو جائے گا۔ اس کا ایک نمبر لڑکی کا ایک نمبر خصم۔ وہ یار ہو گیا اپنا۔ ہم بہت رویا اس کے سامنے تو وہ بولا کہ کریم تیرا شادی میں کرائیں گا۔ تو پیسہ جمع کر اور پیسے کو دے تاکہ میں بڈھا کو خوش کروں۔ ابھی صاحب، ہم اس کو

www.paksociety.com

بوڑھا دیتا ہو مہینے کبھی ہر ہفتے۔"

"تم اسے پیسہ دے رہے ہو؟ کتنا دے چکے ہو اب تک؟"

"ہم سب لکھا ہے صاب، اپنا ڈائری میں۔" اس نے جیب میں سے پھٹے ہوئے اوراق والی نوٹ بک نکالی۔ "تم بھی دیکھو۔ ہم بے وقوف نہیں ہے۔"

"تین ہزار سات سو پچاس۔" میں نے کئی صفحات پر نمبر وار لکھے ہوئے اندراجات کا آخری ٹوٹل دیکھا۔ "تم ایک نمبر کے بے وقوف اور گدھے ہو کریم۔ وہ ٹھگ رہا ہے تم کو۔ یہ سب تو خود تم نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ اسے یہ رقم دی ہے تم نے؟"

"یار، کام کی بات تو کرنے دو۔" محسن جھنجلا کے بولا۔

"ہم بے وقوف ہے، گدھا ہے۔" کریم بلوچ کا چہرہ اتر گیا۔ "ایسا مت بولو صاب۔ ہم اس کو ڈال دے گا اس مشین میں، جس میں وہ گنا ڈالتا ہے اور رس نکالتا ہے۔ اس کا جوس پی جائے گا ہم۔"

"ہاں ہاں، پی جانا۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ پہلے کہ تم نے کیا خاص بات معلوم کی تھی؟"

"ابھی ایک اور جہاز بمبئی سے آئیں گا صاب، آج ادھر آئیں گا۔" کریم نے کہا۔ "ابھی یہ کنڈم جہاز کا سب مال اس پہ جائیں گا۔"

میں نے فرطِ مسرت سے کریم بلوچ کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "واہ استاد، کیا زبردست خبر دی ہے تم نے، ساری فکریں دور کر دیں۔ چلو اب اسی بات پہ آج سے تم اس بحری جہاز کے کپتان، کپتان کریم۔"

"کپتان کریم!" کریم بلوچ دم بخود رہ گیا۔

"اور وہ جو تمہارا سسر ہے، اس کی تو ایسی تیسی، ہم اسے راضی کریں گے انشاءاللہ۔ جو پیسہ تم برباد کر چکے ہو، وہ بھی دلوائیں گے تمہیں واپس۔" محسن نے اس کے دوسرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "لیکن پہلے یہ بتاؤ کرنا کیا ہے۔ ساڑھے تین منٹ بعد میرا دم نکل جانے کا خطرہ ہے۔"

"ساڑھے چار منٹ کے بعد میرا۔" میں نے کہا۔

کریم بلوچ نے فوری طور پر نیچے جا کر رابعہ کو کیبن اور اسٹور سے متعارف کرایا اور پھر خود کھانے پینے کا سامان لینے کے لیے بھاگ گیا۔ اس کے واپس آنے تک ہم چائے کے دو دو کپ پی چکے تھے اور لیٹے لیٹے ہوئے سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے۔ مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا جب ناگ منی نے بھی ہم سے لے کر سگریٹ جلائی اور کش لگانے لگی۔

ناگ منی ذرا دبلی پتلی تھی۔ اس کے کپڑے صاف دونوں کے خاصے پھنس کر آئے تھے۔ کہیں کہیں سے سلائی بھی ادھڑی

رابعہ نے تو دو پڑھے لکھے کی حیثیت کو برابر کر لیا مگر ناگ منی ناری بے پرواہی سے پھرتی رہی۔ وہ جس قسم کے ماحول میں بڑی ہوئی تھی اس میں تہذیب و شائستگی اور نسوانیت کے ادب و آداب کا گزر نہ تھا۔ بھائی اس کی عزت کا محافظ ضرور تھا مگر وہ اس کو ماحول کے اثرات سے کیسے بچا سکتا تھا۔ اس کے کردار کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کرنا قبل از وقت ہوتا۔ مردانہ انداز میں سگریٹ نوشی کے علاوہ غصے میں گندی گالیاں بکنا، نسوانیت کی شرم و حیا اور ستر پوشی کے انداز کو اہمیت نہ دینا، بے باک گفتگو اور جارحانہ تیور سب اُن جرائم پیشہ افراد کی صحبت کا نتیجہ تھے۔ یہ اطوار ایک دن کیا ایک ہفتے میں بھی نہیں بدل سکتے تھے۔ اسے شرمندہ یا مطعون کرنے کا اثر الٹا ہوتا اور پند و نصائح کے دفتر کھول دیے جاتے تو وہ ہماری صورتوں سے بھی بیزار ہو جاتی۔ یہ سب آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر بھی دوا کی مقدار کا تعین مرض کی نوعیت اور مریض کی حالت دیکھ کر ہی کرتے ہیں۔ سب دواؤں کا ڈھیر اس کے حلق میں انڈیل دیا جائے تو ایک دن میں مرض ختم نہیں ہوگا، مریض ختم ہو جائے گا۔

مجھے نہ جانے کیوں اس لڑکی کے مستقبل سے تھوڑی سی دلچسپی ہو گئی تھی۔ جب میں نے اس کی جان بچائی تھی تو یہ صرف اس کے بھائی کے احسان کا بدلہ ادا کرنے کی ایک کوشش تھی مگر بعد میں شیش ناگ نے جس اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے میرے ساتھ روانہ کر دیا تھا، وہ میرے لیے ذمے داری کا ایک بوجھ بن گیا تھا۔ مجھے ناگ منی کی گفتگو سے اندازہ ہو گیا تھا کہ بھائی نے اسے انتہائی مجبوری میں ساتھ رکھا تھا۔ کیونکہ دنیا میں اس کے لیے واقعی کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ اب یہ میرے لیے ممکن نہ تھا کہ میں ناگ منی کو اسی بے رحم دنیا کے رحم و کرم پہ چھوڑ دوں جس کو ناگ منی کا بھائی لوٹتا رہا۔ کیا موقع ملتے ہی دنیا اس کا بدلہ ناگ منی کو لوٹ کر نہیں لے گی، اور لٹانے کے لیے اس کے پاس کیا ہے! وہی عزت جو عورت کی متاعِ حیات ہے۔ میں یہ کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا کہ ناگ منی اپنے ماضی سے کٹ جائے اور اپنے مستقبل کے لیے وہ راستہ اختیار کرے جو عزت و آبرو اور تحفظ یا ... کا راستہ ہو۔ ایسا وہ ہمارے ساتھ رہ کے بھی کر سکتی تھی اور ہماری زندگی کے اطوار اپنا کے بھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہم ناگ منی کو اپنائیں، اسے یقین اور اطمینان دیں کہ وہ ہمیں اپنا سمجھنے پر مجبور ہو اور پھر گھل مل جائے۔

کریم بلوچ آدھے گھنٹے میں لوٹ آیا۔ رابعہ نے اس سے ڈبل روٹی، انڈے اور مکھن لے کر ناشتا تیار کیا جو ہم نے ساڑھے گیارہ بجے لنچ کے طور پر کھایا۔ ناگ منی شدید ہیجانی کیفیت کی شکار تھی۔ میں نے اسے دو خواب آور گولیاں دیں جو اس نے کوئی سوال کیے بغیر کھا لیں۔ میں نے رابعہ کو سمجھا دیا کہ اس کا خیال رکھے اور محسن کو سمجھایا کہ وہ دونوں کا خیال رکھے۔

"میں کریم بلوچ کے ساتھ جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ معلوم کرنے کے لیے کہ نازو اور غالب کیا کر رہے ہیں؟"

"یہ کیسے معلوم ہوگا؟"

"اللہ کوئی سبیل پیدا کرے گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے تصدیق ہو جائے کہ کیا واقعی ایس ایس کرانتی تھری سفر کے قابل نہیں رہا اور اس کی جگہ دوسرا جہاز یہ اسباب لے جائے گا۔"

"ایسی باتیں کون بتائے گا تجھے؟"

"ایسی باتیں چھپی نہیں رہتیں۔ بندرگاہ کے علاقے میں بہت سے لوگ جانتے ہوں گے، صرف اسباب کی نوعیت کو راز میں رکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ایک بحری جہاز کا سامان رازداری سے دوسرے جہاز پر منتقل ہو جائے۔"

لانچ پر سے میں نے دو ریوالور لیے۔ ایک کو میں نے قمیص کے نیچے شلوار کے نیفے سے باندھا اور دوسرے کو جو نسبتاً چھوٹا تھا، جراب میں اڑس لیا۔ جراب کے ساتھ مجھے بوٹ بھی پہننے پڑے۔ دوسری جراب میں سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی اڑسنے کے بعد میں نے اپنا حلیہ مخصوص سا بدلا۔ کریم بلوچ کے سستے اور گھٹیا پلاسٹک کے بنے ہوئے دھوپ کے چشمے اور اس کی بڑی سندھی وضع کی ٹوپی کے ساتھ اجرک اوڑھتے ہی میں ایک نظر میں پہچانے جانے کے خوف سے آزاد ہو گیا۔

"بیٹا کریم!" میں نے کہا۔ "سوری، کیپٹن کریم! یہ جو تمہارا ہم زلف ہے۔"

"کیا چیز صاب؟" وہ سمجھا کہ میں اس سے حلیہ بدلنے کے لیے کچھ اور طلب کر رہا ہوں۔

"ارے یار... وہ تمہارے سسر کا جوائی، اس کی بیٹی نمبر ایک کا خصم نمبر ایک، اس کا نام کیا ہے؟"

"وہ... موشن میاں۔"

"کیا؟ موشن؟" میں نے کہا۔ "یعنی حرکت، یعنی جلاب؟"

کریم ہڑبڑا سا گیا۔ "یہی نام ہے اس کا صاب، موشن میاں۔"

"اس کے باپ کا نام جانتے ہو؟" محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں صاب، اپن کو سارا فیملی کا نام تو نہیں معلوم۔" کریم بلوچ نے ہماری ہنسی پر خفگی سے کہا۔

"اچھا، کیا وہ بنگالی ہے؟" میں نے سوچتے کہا۔

"جی صاب۔ اس کا گھر والی بھی بنگالی ہے، بانسری۔"

"بانسری؟" میں نے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ شب شین تھے، موشن اور بانسری۔ یا بگڑے بانسری تو کوئی نام نہ ہوا۔"

"معاف کرنا صاحب، ہم بھول گیا۔ اس کا نام تھا مرلی، ہم اس کا مطلب پوچھا تھا۔"

"اوہ، مرلی تو خیر بانسری ہوتی ہے مگر کیا وہ ہندو ہے؟" میں نے کہا۔ "تمہارے سسر کا نام کیا ہے؟ وہ شالا شکار ہے کیا؟ اور اس کی وہ بیاہتا لڑکی نمبر دو، وہ حنا رشی ہوگی۔"

کریم بلوچ اس مذاق کو نہیں سمجھا۔ "نہیں صاب، مرلی کا باپ جگندر اور دوسری جو میری گھر والی ہوگی اس کو بولتا ہے مستری، جس کو آپ مکینک بولتا۔"

میں نے سر پہ ہاتھ مارا۔ "کریم! تم نے سین شین سے سب کا بیڑا غرق کر دیا۔ بابا وہ ہوگی مستری اور تمہارے سسر کا نام غالباً جوگندر یا جگندر۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اس موشن میاں سے مرلی کا ملاپ کیسے ہو گیا؟ موشن میاں تو گویا محسن میاں ہو گئے۔ وہ مسلمان ہوگا؟"

"ایک دم کلمہ گو، داڑھی وار، پانچ وقت کا نمازی ہے وہ صاب۔" کریم نے کہا۔ "مرلی کو بولا کلمہ پڑھو، پھر نکاح پڑھا۔"

"سبحان اللہ، کیا دیندار آدمی ہے۔ عاشق ہوا ایک کافر کی بیٹی پہ۔ تم کو ٹھگ لیا۔ مجھے یہ موشن میاں مشکوک آدمی لگتا ہے۔ چلو آج اس سے مل لیں، اچھا موشن میاں۔ ہم جاتے ہیں۔" محسن سخت تحقیق ہوا۔ اس کے نام کی تو مٹی پلید بھی نہیں ہوئی تھی۔

کریم بلوچ نے موٹر بوٹ کو یوں دیکھا جیسے موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے والا سائیکل کو دیکھے۔ اس نے ڈیزل اور آئل وغیرہ چیک کیا۔ ڈیزل کچھ کم تھا۔ وہ لانچ پر گیا اور وہاں سے دو گیلن کا ایک ڈبا اٹھا لایا۔ پھر وہ موٹر بوٹ کو ریس کار کی طرح دوڑاتا ہوا لے گیا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ ہلکی پھلکی کشتی اس رفتار پہ اڑ جائے گی۔ اس کا انجن بے حد شور کر رہا تھا اور موٹر بوٹ لہروں کے ساتھ اچھلتی تھی تو ہوا میں تیرتی محسوس ہوتی تھی۔ کریم بہت ترنگ میں تھا اور بار بار قہقہے لگا رہا تھا کسی وجہ کے بغیر۔

شپ یارڈ کے علاقے میں اس نے مجھے دور سے ایس ایس کرانتی تھری کے گرد ایک جگہ دیا۔ مجھے شک ہوا کہ عرشے پہ نازو موجود ہے مگر دوربین کے بغیر میں اسے صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"کیپٹن کریم! مجھے اچانک ایک بہت اچھی دوربین کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"ادھر سب ملتا ہے صاب۔ باہر کا سب چیز۔ پہلے ادھر

www.paksociety.com

ہی تو آتا ہے۔" وہ بولا۔

"...بہت اچھی دوربین ہے۔"

"ابھی کیا بتا دے صاب، ہم لے آوے گا۔ آپ کو پسند آوے تو... اور پیسہ دینا۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے، یہ تم بھی فیصلہ کر سکتے ہو کہ اچھی دوربین کیسی ہوتی ہے۔" میں نے اُسے پانچ سو روپے دیے۔ "خود سودا کر لینا اور دوربین یہاں لا کے رکھ دینا۔"

موٹر بوٹ کو اُس نے ایک زنگ آلود لوہے کی سیڑھی کے ساتھ باندھ دیا۔ اسی کے ساتھ تین اور موٹر بوٹس بھی بندھی ہوئی تھیں۔ لہروں کے زور سے ڈولنے والی کشتیوں کو آپس میں ٹکرانے سے روکنے کے لیے ایک ساتھ ہی جوڑ کے باندھ دیا گیا تھا۔ یہ انتظام سنا پر ماہی گیری کی ایک روایت تھا جس کے لیے کوئی کسی سے اجازت نہیں لیتا تھا۔ جسے جانا ہوتا اپنی کشتی کھول کے الگ کرتے اور لے جاتے۔

موشن میاں کی گنے کا رس نکالنے والی مشین بڑی معروف جگہ پر لگی ہوئی تھی۔ اس کے لیے این او سی پولیس نے یا کسی چھتہ بردار کے ایجنٹ نے جاری کیا ہوگا، ورنہ اس علاقے میں راستہ روک کے کون بیٹھ سکتا تھا اور براہ راست پول سے بجلی کا کنکشن کیسے لے سکتا تھا۔ موشن میاں ایک عیار اور مکار شخص تھا چنانچہ مجھے اس کی صورت بھی لومڑی جیسی لگی۔ وہ بے حد مختصر اور پورٹیبل قسم کی چیز تھا۔ چکی بکرا برانڈ داڑھی اور چنائی کی گول ٹوپی پہنے۔ میلے بنیان کے نیچے لال چار خانہ لنگی باندھے وہ بڑی بے چارگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اُس نے چار گلاس بھرے گاہکوں کو پکڑائے۔ دو نے پیسے دیے۔ اُن کے خالی ہو جانے والے گلاس بالٹی کے گندے پانی میں ڈبو کے نکالے، "برت گرو" لگانے والے مدقوق چھوکرے کے ایک ہاتھ بھی رسید کیا۔

کریم بلوچ کو دیکھتے ہی وہ اُچھلا۔ "شالا، تم پھر آ گیا، ابھی تم کو بولتے کر دھندا کے ٹیم میں مت آؤ۔ ہم بولتے کہ مستری کا باپ پیشہ مانگتا پیسہ..."

"کتنا پیسہ اور چاہیے محسن میاں؟" میں نے اُس کے ساتھ لگ کر کہا۔ میرے اشارے پر کریم وہاں سے کھسک گیا۔ وہ چونکا۔ "تم... ادھر سے ہٹو، ادھر جاؤ ادھر... ہٹو۔"

"میں نے پوچھا ہے کہ اور کتنا مال چاہیے؟" میں نے مشین کی اوٹ میں رہتے ہوئے قمیص کو اوپر اٹھایا۔ "تمھاری یہ سالی تو بہت مہنگی پڑ رہی ہے۔ بے چارے کریم بلوچ کو پورے چار ہزار تو دے چکے۔"

"کیا؟ کیا بولتا؟ ہم پورے چار ہزار لیا۔" موشن میاں پٹاخے کی طرح اُچھلا۔

"وہاں، یہ مستری آخر ہے کتنے کی؟ کتنے میں بیچو گے؟" میں نے اطمینان سے ریوالور کو اوپر کھسکایا۔

وہ گاہکوں سے نمٹنے میں مصروف تھا اس لیے میری حرکت کو نہ دیکھ سکا۔ "ہم... ہم بیچتا چھوکری لوگ کو؟ والا نہ بولا تم ہم کو، شالا؟"

"تم ایسا کرو، مرلی دے دو اسے۔ سیکنڈ ہینڈ چیز ہے۔ پورے چار میں۔"

اب اُس کا شو کیا اشارہ جو دو تہ تھر کا پینے لگا تھا مگر اسی وقت موشن میاں کی نظر نے میرے ہاتھ کی طرف اور پھر چلانے کی طرف دیکھا۔ ایک دم اس کی موشن رک گئی اور وہ جام ہو گیا۔ اس کی زبان بھی رک گئی۔

"آواز مت نکالنا۔" میں نے اس کے کان میں کہا۔ "نہ میں گولی مار کے نکل جاؤں گا۔ تم ذرا ادھر آؤ۔" میں نے اُسے کچھ دور نکال لیا۔

"ک... ک... کو... کون ہے تم؟"

"میں کریم بلوچ کا ماموں ہوں۔ قتل کے الزام میں جیل گیا ہوا تھا۔ دو دن پہلے باہر آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی جا سکتا ہوں، اپنا تو آنا جانا لگا رہتا ہے۔"

"ہم... خدا پاک کا قسم ہے... ہم ایک پیسہ نہیں لیا، وہ شالا... مستری کا باپ چکندر..." اس نے چکندر کا نام ایسے لیا کہ چقندر ہی سنائی دیا۔ "اس کو دیا۔"

"اچھا، چکندر کہاں ملے گا؟" میں نے کہا۔ "پیسہ تو مجھے آج ہی وصول کرنا ہے، اُس سے یا تم سے، ورنہ ایک کو کرش کرنا ہے۔"

"کیا کرتا ہے؟" وہ بلبلایا۔ "کرش... کیا؟"

"اوئی ہوں... کرش۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شام تک مستری کا معاملہ طے ہو جائے کہ اس کی شادی کب ہو گی کریم بلوچ کے ساتھ، تاریخ چاہیے مجھے۔"

وہ زور زور سے سر ہلانے لگا۔ "بتائے گا، بتائے گا، ابھی ہم کو گیا۔ ہم سادی بنائے گا، چکندر کو بولیں گا۔"

"بالکل بولو۔ نہیں بولیں گا تو ہم تمھارا بھی رس نکالیں گا ادھر گنے کے ساتھ۔ مشین میں ڈالیں گا، پھر نکالیں گا، پھر ڈالیں گا۔ اور تمھارا جوس کریم بلوچ کا کتا پیے گا۔" میں نے کہا۔

اس نے ایک دہشت زدہ چیخ ماری۔ "ہم خدا پاک... کا قسم کھاتا ہے، چکندر مانیں گا۔ نہیں مانیں گا تو ہم اس..."

"تم اس کو پورے چار ہزار دو گے۔"

"ہم... ہم بولیں گا کہ مرلی کو بھی لے جاؤ۔ ہم اس کو بھی طلاق بولے۔ پھر وہ ڈر جائیں گا۔" موشن میاں نے بیک میلنگ کے ذریعے اپنے [illegible]

مستری کو کریم بلوچ کے نکاح میں دو، ورنہ پہلی بیٹی کو بھی لے جاؤ۔ مگر اس نے پورے چار ہزار کی بات نہیں کی۔

"اور وہ پورے چار ہزار، وہ واپس کرو گے؟" میں نے ریوالور پہ ہاتھ رکھا۔ "اچھا چھوڑو۔ جو میں کہتا ہوں وہ سن لو۔ مستری اور کریم کا رشتہ پکا کرا دو یا سب رقم واپس کر دو، ورنہ... ورنہ... کرش۔ اور دیکھو کسی سے بات کی میرے بارے میں تو مجھے پتا چل جائے گا۔ پھر مرلی بھی کرش... تمھارے..."

[illegible]

اسسٹنٹ چھوڑ کر ایک وقت گنے لگانے اور جوس فروخت کرنے کی کوشش میں ناکام تھا۔ وہاں شائقین کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔ ... پھر کسی نے چلا کے کہا۔ "اوئے گالی۔" تو اس نے گالی کے ساتھ توقیت کو جوڑ دیا۔ "ادھر چل۔"

میں نے اُسے غور سے دیکھا اور موشن میاں کو اشارہ کیا۔ وہ جانے لگا مگر میں خود بھی اس کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ بنگالی کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے، اس نے جلدی جلدی میں ایک گلاس توڑا، ماتحت کے ایک ہاتھ کس کے مارا۔ "شالا کام چور، جو اسسٹنٹ کام نہیں چلا سکتا۔" پھر بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ "اب کیا جاتے ہو، میری جان کیوں نہیں چھوڑتے؟" لیکن میری دلچسپی اس شخص میں تھی جو سفید وردی میں تھا۔ [illegible] وہ چھ فٹ قد کا بھاری بھرکم آدمی تھا۔ سب مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ بارہ گلاس ایک ڈول جیسے تھرماس میں ڈلوانے کے لیے ساتھ لایا تھا۔

"اے بھیا! باری سے، باری سے۔" ایک وردی والے نے کہا جس کے کندھے پر پانی کا تھرماس لٹکا ہوا تھا۔

"ایسی کی تیسی باری سے لینے والے کی۔" اس نے فوراً اسے ایک خطرناک ہتھیار کی طرح لہرایا۔

"ایسی کی تیسی تمھاری، ہم سب لوگ فالتو میں جو پیچھے سے کھڑے ہیں۔" ایک باہمت شخص نے دو جواب اس کے گال پر دے کر کھڑی ادا کیا۔ وہ بھی چھ فٹ قد کا کراچی کا تھا۔ اُس نے حریف کی طرح ہٹا کٹا نہیں تھا۔ "چل پیچھے..." پیچھے والے شخص نے تھرماس تھمایا، کراچی نے تھرماس کو پکڑ کر کھینچا۔ اس کا تسمہ ٹوٹ گیا۔ کراچی نے تھرماس کو زمین پر پٹخ دیا۔ تھرماس ایک دھماکے سے پھٹا اور اندر شیشے کے ٹکڑوں کا چورا ہو گیا۔ پہلے شخص نے پیشہ ور باکسر کی طرح کراچی کے لیفٹ پنچ مارنے کی کوشش کی۔ کراچی کا طریقہ جنگ قدرے مختلف تھا۔ اس نے بیل کی طرح سر سے ٹکر کا تحفہ دے کر اپنے حریف کو الٹ دیا۔ گنے کا رس پینے والے بھاگے، کچھ گلاس [illegible] ان کو پھیلانے والے دو دو

پسند تھے۔ ایک کی عینک ناک پر سے کھسکنے سے ٹوٹی۔ دوسرا گھٹنا اس وقت زمین میں آ گیا جب کراچی دوسری بار ٹکر مار رہا تھا۔ اس کے اعضائے رئیسہ کو خاصا نقصان پہنچا ہوگا۔

موشن میاں کو اب بیچ بچاؤ کے موشن لگ گئے تھے۔ وہ دھوتی پکڑ کے اچھل رہا تھا۔ "ارے چھوڑو، بدماش... پکڑو... مارو... پولیس۔" یہ معلوم نہیں وہ کس کا حامی تھا اور کس کا مخالف۔ دونوں فریق اب بری طرح لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے تھے۔ پھر ایک دم نہ جانے کدھر سے پولیس آ گئی۔ ایک سب انسپکٹر نے گزرتے گزرتے موٹر سائیکل روک لی۔

"اوئے... خبردار... چھوڑو۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "دونوں کو گولی مار دوں گا میں۔" اس وارننگ میں پولیس کی عادی زبان کے استعارے بھی شامل تھے۔ دونوں لڑنے والے الگ ہو گئے۔ ان کی ناک سے اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا اور ان کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔

"چلو دونوں..." انسپکٹر نے دونوں کو آگے دھکیلا۔ "خبردار،" سفید وردی والا غرایا۔ "میں خاص سیکیورٹی والا ہوں۔ مجھے ہاتھ مت لگانا۔ میں بھارتی شہری ہوں۔"

انسپکٹر نے اس کے ایک جھانپڑ مارا۔ "یہ سب اودھر جیل کے بتانا۔ تیری شہ... کی ماں..."

"تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔" وہ چیخ کر بولا۔ "میں اس جہاز پر ہوں، میرے کپتان سے بات کرو، قونصلیٹ سے بات کرو۔"

"کل سب کو بلا لیں گے تھانے میں۔ رات بھر تو مہمان رہو ہمارے، شیر جوان۔" سب انسپکٹر نے ایک ٹیکسی روکی اور نقص امن کے دونوں مجرموں کو اس میں بٹھا دیا۔

"میں موٹر سائیکل پر پیچھے آ رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔"

ٹیکسی چلی گئی لیکن میں اس جہاز کو دیکھتا رہا جس کی طرف سفید وردی والے نے اشارہ کیا تھا۔ وہ "ایم ایس کرانتی بھرتی" کا ملازم تھا۔ جال سب انسپکٹر نے اس پر اپنی لاقانونیت کا ہاتھ اٹھا کے اچھا نہیں کیا تھا۔ وہ معطل بھی ہو سکتا تھا مگر ابھی تو اس کی تھانیداری تھی۔ کل بھی جب جہاز کا کپتان تھانے جائے گا تو وہ ڈھیٹ بن کر معافی مانگ لے گا کہ "غلط فہمی" ہو گئی۔

لیکن ابھی میں اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی سوچ رہا تھا۔ میں نے قسمت کو کوستے روتے دھوتے اور بک بک کرتے موشن میاں کو نقصانات کا تخمینہ لگاتے دیکھا۔

www.paksociety.com

اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے میں نے کہا۔ ”معاف کرنا موشن میاں! یہ سب نقصان میری وجہ سے ہوا۔ میں پورا کروں گا۔“

اس کی آنکھیں مجھ پہ جم گئیں۔ ایک دشمنِ جاں کی طرف سے اس ہمدردانہ پیش کش کے پیچھے کیا ہے؟ جو شخص بات بات پر کڑپ کرنے کی دھمکی دے رہا تھا اور پہلے چار ہزار کے بدلے جان لینے پر آمادہ تھا، وہ اچانک اتنا شریف کیوں ہو گیا۔

”کتنا نقصان ہوا ہے تمہارا؟“ میں نے سو کا ایک نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ”چلو یہ رکھ لو۔“

پہلے اس نے نوٹ کو جھپٹ لیا، پھر اس نے مجھے مسکرا کے دیکھا۔

”یہ سفید وردی والا کون تھا؟“ میں نے کہا۔

”ہم نہیں جانتا... ہم نے کیا پوچھتا۔“

”اس نے تمہیں گالی دے کر بلایا تھا۔ تمہارا یار معلوم ہوتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ اتنا بے تکلف کیوں ہوتا۔“

”ہم... بس یہ جانتا... کہ وہ خلاصی ہے... ایشورداس نام ہے اس کا۔“ موشن میاں نے میرے دوسرے ہاتھ کی حرکت سے متاثر ہو کے کہا۔

”اچھا موشن میاں! تم ہمارا ایک کام کرو گے؟ اس کے ہم تم کو پانچ سو روپے دیں گے۔ پورے پانچ سو۔“ میں نے اسے پانچ نوٹ دکھا کے کہا۔

اس لالچی آدمی کی آنکھیں حرص سے چمکنے لگیں۔ ”کیسا کام؟“ میرا خیال تھا کہ وہ پہلے کام کی نوعیت پوچھے گا مگر وہ بیک وقت خوف اور لالچ کے جذبات کے دباؤ میں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ انکار تو ممکن ہی نہیں۔ پھر پانچ سو روپے کیوں چھوڑے جائیں۔

”تم ابھی جہاز پہ جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”ہم کو... کون جانے دے گا... وہ فارن جہاز۔“

”تم یہ ڈول بھر کے لے جاؤ۔“ میں نے گنے کے رس کو جمع کرنے والا ڈول اٹھا کے کہا جو مشین کے نیچے لگا ہوا تھا۔ جتنا رس نکلتا تھا وہ ایک دھار کی صورت میں ڈول میں گرتا تھا۔ ”یہ بھر کے لے جاؤ اور بولو چارلی نے منگوایا ہے۔“

”چارلی کون ہے؟ ہم نہیں جانتا۔“

”جان لو گے۔“ میں نے کہا۔ ”جب کوئی تم کو روکے تو بولنا کہ ہم کو صاحب سے بات کرنی ہے جو جہاز کا کپتان ہے۔ اسے بتا دینا کہ یہاں کیا جھگڑا ہوا تھا اور کس بات پہ ہوا تھا۔ ایشورداس کی بوتل ٹوٹ گئی اور اسے پولیس لے گئی۔ میں چارلی صاحب کے لیے گنے کا رس لایا ہوں اور یہ اطلاع دینے بھی۔“

”کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گی؟“ وہ بولا۔

”کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔ جہاز کا کپتان اور چارلی اور دوسرے سب کہیں گے کہ تم نے بہت اچھا کام کیا۔ تم نے بروقت کپتان کو اطلاع کر دی۔ تمہاری وجہ سے ایشورداس جلد چھوٹ جائے گا اور تم واپس آؤ گے تو پانچ سو کا انعام تمہارا۔“

وہ کائیاں شخص سمجھ گیا کہ میں اپنا کام نکلوانے کے لیے اسے استعمال کر رہا ہوں۔ ”پیشگی لے گا۔“

”یہ لو۔“ میں نے نوٹ اسے پکڑا دیے۔ ”مگر دیکھو، تم کو چارلی سے ضرور ملنا ہے۔“

”وہ ہم کو اندر جانے دے گا؟“

”ہاں، تم کہنا کہ مجھے ڈول بھی واپس لانا ہے، اپنے ساتھ دو تین گلاس بھی لے جانا۔“ میں نے کہا۔

میں نے ایک خطرناک جوا کھیلا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ گنے کا رس جہاز پہ کس نے منگوایا تھا۔ اگر خود مصرا نے منگوایا ہو گا پھر تو بنگالی کا جھوٹ نہیں چلے گا۔ اسے اندر جانے کا موقع نہیں ملے گا۔ کوئی ماتحت اس سے ڈول لے کر اس کا پیغام مصرا کو پہنچا دے گا اور مصرا فوری پیچھے گا تو خود باہر آ جائے گا یا بنگالی کو اپنے کیبن میں بلوا لے گا۔ لیکن اس کا امکان کم ہی تھا کہ مصرا نے گنے کا رس پیے۔ وہ بیئر پینے والا آدمی ہے۔ ایسی صورت میں موشن میاں کو چارلی یعنی غالب تک پہنچنے کا موقع مل جائے گا۔ یہ چنے بیچنے والے، اخبار فروش اور موشن میاں جیسے لوگ اتنے بے ضرر سمجھے جاتے ہیں کہ ان کی آمد و رفت پہ سیکیورٹی کے قوانین لاگو نہیں ہوتے اور ان کو شناخت کا مسئلہ بھی درپیش نہیں ہوتا۔ یہ وردی نظر آتے ہیں جو گیا۔

”چارلی صاحب کو کیا بولنے کا ہے؟“ موشن میاں نے میری خاموشی سے اکتا کے کہا۔

”کچھ نہیں۔ اس کو بس گنے کا رس پہنچانا ہے اور ایک دو چیزیں ہیں۔ کے ٹو سگریٹ کا ایک پیکٹ۔ اور سیون او کلاک بلیڈ کا ایک پیکٹ۔ اور... بس اپنا نام بتا دینا۔ وہ سامنے ایک پان سگریٹ کی دکان نظر آ رہی ہے، جب تم اس لڑکے کو بھیجو۔ وہ دونوں چیزیں لے آئے گا۔“

جب موشن میاں کا اسسٹنٹ چلا گیا تو اس نے کہا۔ ”جہاز پہ فارن سگریٹ اور بلیڈ...“

”ہاں۔ مگر چارلی کو یہی کے ٹو سگریٹ پسند ہیں اور سیون او کلاک بلیڈ۔“ میں نے کہا۔ ”تم زیادہ سوچو نہیں۔ کسی کو دے دینا کہ چارلی کو پہنچا دے۔ اور اسے بتانا کہ سب چیزیں موشن میاں نے بھیجی ہیں۔“

موشن میاں دس منٹ بعد چلا گیا۔ میں نے اس کو سمجھا دیا تھا کہ میرا حوالہ بھی کسی کو نہ دے۔ ورنہ کڑپ اور وعدہ کیا تھا کہ میں اس کی عدم موجودگی میں اس کے بزنس کو بطریق احسن چلاؤں گا۔ بنگالی بڑی تیزی سے جہاز کی طرف بڑھ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ غالب میرے پیغام کو سمجھے گا یا نہیں؟ مجھے اس کی ذہانت میں کوئی شبہ نہ تھا۔ کے ٹو سگریٹ کوئی اعلیٰ درجے کے سگریٹ شمار نہیں ہوتے تھے کہ کسی کو تحفے میں بھیجے جائیں۔ غالب نے کبھی یہ سگریٹ پیے تھے اور نہ پی سکتا تھا۔ کے ٹو سگریٹ کا پیکٹ وصول کرتے ہی اس کا چونک جانا لازمی تھا۔ اس کے ذہن میں فوراً میرا نام آئے گا۔ کیپٹن خان کو یہ لوگ بہت عرصے سے کے ٹو میں بدل چکے تھے اور اکثر مجھے چیف کے ٹو کہتے تھے۔ اگر اس نے سگریٹ کے پیکٹ سے یہ مطلب سمجھ لیا کہ بھیجنے والا میں ہوں تو سیون او کلاک بلیڈ سے بھی یہ ضرور جان لے گا کہ میں نے اسے سات بجے بلایا ہے۔ آخری چیز ہے گنے کا رس۔ موشن میاں کے نام سے وہ سمجھے گا کہ محسن میاں نے کہیں گنے کا رس نکالنے کی ریڑھی لگا لی ہے یا کسی ریڑھی پر ملازمت کر لی ہے۔

اگر موشن میاں کو جہاز کے اندر جانے دیا گیا تب بھی ایک خفیہ پیغام غالب کو مل جائے گا اور مجھے خاصا یقین تھا کہ وہ اپنی ذہانت سے اس کوڈ کو ڈی کوڈ کر لے گا۔ شام سات بجے وہ جہاز سے نکل سکا تو محسن کی جستجو کرتا ہوا آئے گا اور یہ سمجھے گا کہ محسن کہیں قریب ہی ریڑھی پہ گنے کا رس فروخت کرتا ہوا نظر آ جائے گا۔ مگر یہ نہ ہوا تو تازہ گنے کا رس ڈول میں کیسے بھجوا آ۔

موشن میاں کا اسسٹنٹ بڑے جوش و خروش سے گنے نکال رہا تھا اور میں وہ کام کر رہا تھا جو شاید تو نہیں تھا مگر مجھ میں نے کرنے کا سوچا تک نہیں تھا۔ میں نے یہ کام آسانی سے کر لیا کیونکہ اس میں کسی فنی مہارت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اسسٹنٹ جو صرف گالیاں اور تھپڑ کھانے کا عادی تھا، میرے حوصلہ افزا رویے اور بہتر سلوک سے بہت خوش تھا۔ میں نے اسے پانچ روپے انعام میں دینے چاہے مگر اس نے ڈر کے اور مایوسی سے سر ہلا کے انکار کر دیا۔ موشن میاں ہر رات اس کی جامہ تلاشی لیتا تھا اور وہ ایک روپیہ بھی چھپا لے تو برآمد ہو جاتا تھا۔ پھر موشن میاں اس کو چوری کے جرم میں گنے سے مارتے تھے، پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دیتے تھے اور بے روزگار کر دینے سے ڈراتے تھے۔

موشن میاں کی واپسی کے انتظار میں آدھا گھنٹہ میں نے ... ارا۔ ایک دعا یہ تھی کہ موشن میاں براہ راست غالب کے پاس پہنچ جائیں۔ دوسری دعا یہ تھی کہ غالب کی عقل گم اس چیز نے نہ چلی جائے اور وہ میرا پیغام سمجھ لے۔ تیسری دعا یہ تھی کہ موشن میاں خیریت سے لوٹ آئیں اور ان کے ساتھ کوئی نہ آئے۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے جہاز پر سے ایک شخص کو بڑی تیزی سے نیچے آتے دیکھا۔ اس کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے جو اس کے ماتحت لگتے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ آگے والا شخص جہاز کا کپتان آر آر مصرا ہے جو اپنے خلاصی ایشورداس کی رہائی کے لیے پولیس اسٹیشن جا رہا ہے۔ وہ خاصا برہم دکھائی دے رہا تھا۔

یہ ایک اچھی علامت تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ موشن میاں کا مشن کامیاب رہا۔ اگر اسے جہاز کے اندر نہ جانے دیا جاتا تو وہ اتنی دیر بھی نہ لگاتا۔ اب مجھے شدت سے اس کی واپسی کا انتظار تھا۔

بالآخر وہ خالی ڈول ہلاتا نمودار ہوا۔ میرے قریب آ کے اس نے ڈول پٹخ دیا۔ ”سالا۔ بے ایمان لوگ۔“

”کیا ہوا موشن میاں؟“ میں نے کہا۔ ”چارلی ملا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم کو بیٹھنے نہیں دیا۔“

میں نے کہا۔ ”پیسے مجھ سے لے لو۔ مگر یہ بتاؤ کہ چارلی کیوں نہیں ملا؟ کیا تم کو روک لیا گیا تھا؟“

”ہاں۔ اُدھر ایک خلاصی فرش صاف کرتا۔ ہم کو بولا کہ کون چارلی؟ ہم بولا وہ چارلی جو یہ شب منگایا۔ وہ سالا ہم کو ڈنڈا والا ٹھیک سے مارتا کہ تم سالا چور۔ اندر آنے کو مانگتا۔ اندر کوئی چارلی نہیں ہے... آہ... بہت موٹا ڈنڈا تھا۔“ اس نے ایک پسلی دبا کے کہا۔

”پھر کیا ہوا؟“

”پھر شب رس گر گیا۔ ہم بھی گر گیا۔ ڈول ہمارا شر پہ لگا۔“ موشن میاں نے کہا۔ ”اللہ پاک اور رسول نے بچایا۔ اُدھر ایک لیڈی آگئی۔ وہ بولا ہم چارلی کا وائف، تم کون؟ ہم اس کو شب بتایا۔ وہ شب سنا۔ سگریٹ اور بلیڈ لے لیا۔ ہم سے اور اس خلاصی کو بہت غصہ کیا۔ ہم بولا کہ ہم تو چارلی صاحب کا واسطے رس لایا۔ وہ بولا کہ ابھی جاؤ۔ ہم اس کو بول دے گا اور یہ شب سگریٹ، بلیڈ دے گا... آہ... آہ۔“

”لیکن نرس نے سب چیزیں پہنچانے کا وعدہ کیا۔“ میں نے مطمئن ہو کے کہا۔ ”اس نے تمہارا نام پوچھا؟“

”ہاں، ہم بتایا۔ وہ سالا نرس ہم کو آنکھ مارا اور بولا کہ چلو تم جاؤ۔ تم بہت چالاک ہے۔“ موشن میاں جب بھی دایاں ہاتھ اوپر اٹھاتے تھے تو ان کی پسلی کی چوٹ انھیں کراہنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

www.paksociety.com

مدھوش نے آنکھ بھی ماری تم کو؟" میں نے کہا۔ خلاصی نے برش مارا۔ "نرس نے آنکھ ماری۔ مجھے خراب لوگ ہیں عزیب اور کمزور دیکھ کر سب مارنے لگتے ہیں۔ خیر یہ بتاؤ کہ مصرا سے کیا بات ہوئی؟"

"مصرا صاحب بعد میں ملا جب نرس چلا گیا تھا۔ ہم خلاصی کو بولا کہ ابھی ہم مصرا صاحب سے ملنے کو مانگتا۔ تمہارا انقلاب کریں گا۔ وہ پھر برش مارا: ادھر ہمارا سر ہیں۔۔۔ آہ۔۔۔ بولا مصرا سے ملنے کا سنا لاچو۔ چلو بھاگو ادھر سے ورنہ دو روپے گا بیوی بچہ۔ اُدھر سے ایک اور صاحب آیا۔ وہ ہمارا بات سُنا۔ اور مصرا صاحب کے پاس لے گیا ہم کو۔ ہم پھر سب بتایا۔

وہ اچھا آدمی ہے۔ ہم کو دس روپیہ دیا انعام۔ تھوڑی بولا۔"

"ہم بھی تھوڑی بولتا تم کو۔" میں نے کہا۔ "پانچ سو رکھو مگر یہ بات بھی یاد رکھو کہ کسی کے سامنے میرے بارے میں ایک لفظ بولے گا تو گڑبڑ۔ یہ سمجھو کہ ہم ادھر آیا ہی نہیں۔"

اُس نے اقرار میں سر ہلایا: "ہم چپ رہے گا۔"

"اب میں جاتا ہوں۔ تم کریم کی شادی کی بات فکر کر لینا۔"

"فکر نہ کرو جی۔" وہ سوٹ جلے جھٹکے لہجے میں بولا۔ مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔

"سمجھدار آدمی ہو تم۔" میں نے کہا اور بدمعاشوں کی طرح اکڑ کے چلتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میرا مشن بے حد کامیاب رہا تھا۔ میں نے نائب سے رابطے کی صورت پیدا کر لی تھی اور کسی قسم کا خطرہ مول لیے بغیر۔ مجھے یقین تھا کہ موشن میاں جو ایک انتہائی کمینہ اور بزدل آدمی تھا، گرفتار ہونے کے خوف سے لب نہیں کھولے گا۔ وہ صرف پیسے سے پیار کرتا تھا۔ پیسے کی خاطر اُس نے میرا کام کیا تھا، پیسے کے لیے وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے پر تیار تھا کیونکہ دوسری صورت میں اُسے کریم بلوچ کو پورے چار ہزار روپے واپس کرنے پڑتے جو وہ ہڑپ چکا تھا اور ہضم بھی کر چکا تھا۔ شاید پیسے کی خاطر ہی اُس نے ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی ہوگی۔ یہ ذرا غور طلب مسئلہ تھا کہ اُس ہندو نے موشن میاں میں کیا دیکھا کہ اپنی لڑکی اُسے دے دی۔ موشن میاں ایسے جوان رعنا بھی نہیں تھے کہ لڑکی اُن پر فریفتہ ہو گئی ہو۔ اس کی وضاحت کریم بلوچ بہتر طور پر کر سکتا تھا۔

وہ مجھے موٹر بوٹ کے پاس دوربین سے کائنات کی سیر کرتا نظر آیا۔ سطح سمندر پر تاحد نگاہ اور کنارا ختم پر وہ پہلے ہی غور کر چکا تھا اور اب دوربین کا رخ آسمان کی طرف تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اُچھلا۔

"آپ آ گیا صاحب؟"

"ہاں، تم کو کیا دن میں تارے نظر آ رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"نہیں صاحب، مگر ابھی آپ دیکھو یہ جو چھوٹا جہاز اور چیل کوا اُڑتا پڑا ہے جو سارنگ کا مالک لگتا ہے۔" اُس نے دوربین مجھے تھما کے کہا۔ "ہم بہت دور تک دیکھا صاحب، آپ بھی دیکھو۔ ادھر وہ ایک لانچ ہے۔ اس پر صاحب اور میم صاحب لوگ کیا کرتا پڑا ہے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"چھوڑو کریم، کسی کی پرائیویسی میں نہیں جھانکتے۔" میں نے کہا۔

"پھر کیا بولا صاحب؟"

"کچھ نہیں، یہ بتاؤ کتنے میں ملی؟"

"بس صاحب مل گیا۔ یہ لو باقی پیسہ۔" اُس نے چار سو بیس پکڑا دیے۔

"صرف سو روپے؟ یہ دوربین تو بہت اعلیٰ قسم کی لگتی ہے۔" میں نے کہا۔ "چوری کا مال تو نہیں ہے؟"

"ہو گی صاحب۔" وہ موٹر بوٹ میں اتر گیا۔ "ہم نے تو کچھ چوری نہیں کیا۔ وہ ہم سے بولا سو روپیہ، ہم دے دیا۔ اب وہ چور تھا تو اللہ اُس کو سزا دیوے۔"

"تم کو معلوم تھا کہ وہ چور ہے۔" میں نے کہا۔ "تم پہلے بھی سامان خریدتے رہے ہو اس سے؟"

اُس نے موٹر بوٹ کو اسٹارٹ کیا: "ابھی صاحب ادھر تو سب ملتا ہے۔ ادھر جو شپ آتا ہے اس کا مال بھی ایسے ہی نکلتا ہے۔ ہم نہیں لے گا تو کوئی دوسرا لے گا۔ شیر شاہ میں جا کے دیکھو سارا شپ کا سامان۔"

جب موٹر بوٹ باہر نکل آئی تو میں نے دوربین سے اس جہاز کو دیکھا جس پر مجھے نازو کے نظر آنے کا شبہ ہوا تھا۔ اُس کے عرشے پر دو آدمی ٹہل رہے تھے۔ ان دونوں کے پاس خوفناک قسم کی رائفلیں تھیں۔ میں نے جہاز کے نام کو فوکس کیا۔ ایس ایس کراسنی تھرٹو میرے سامنے آ گیا۔ دوربین کو آہستہ آہستہ گھماتے ہوئے میں نے جہاز کا تفصیلی جائزہ لیا۔

"صاحب ادھر موشن میاں کیا بولا؟"

میں نے دوربین ہٹا کے دیکھا: "تم اب شادی کی تیاری کرو۔ میں نے بات پکی کر لی ہے۔"

"سچ صاحب!" کریم بلوچ نے خوشی سے چیخ ماری۔ "کب؟"

"میں نے تو ایک ہفتہ دیا ہے لیکن یہ تو گڑبڑ ہوگئی۔ ملنے پھر بعد تم ہمارے ساتھ نہ جانے کہاں ہو گے۔ ہمیں تو شاید کل پرسوں جانا پڑے۔"

"تو صاحب، ہم مشتری کو بھی لے چلے گا ہنی مون!"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "ہنی مون، تم جانتے ہو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟"

"کیوں نہیں صاحب، ہم لوگ شادی بناتا تو میرا واسطے جاتا۔ ہم انگریز لوگ کا نوکری کیا۔ ہمارا باپ بھی نوکری کیا اور زیادہ بکیں۔" وہ بولا۔

"نہیں کریم۔" میں نے کہا۔ "یہ سفر کسی بھی طرح تمہارے ہنی مون کے لیے موزوں نہیں۔ یہ ایک خطرناک سفر ہو گا اور اس میں تمہاری نئی نویلی دلہن کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔"

"کیوں نہیں صاحب۔ وہ آپ کا خادم۔ سب کا خادم۔ آپ کا واسطے کھانا پکائے گا۔ چائے بنائے گا۔ برتن دھوئے گا اور سب کام کرے گا۔ ہمیں کرے گا تو ہم اسے کھانا کھائی لگتے گا۔"

میں ہنس پڑا: "ابھی سے یہ ارادے ہیں؟ نہیں کریم، وہ تمہاری بیوی ہوگی۔ نوکرانی نہیں لا رہے ہو تم۔ وہ تمہاری خدمت کرے تو یہ دوسری بات ہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری مشتری کیسی ہے؟"

"ایک دم ہیپاٹ صاحب۔" ہم بولا۔۔۔

"اور اس کی بہن قمری؟" میں نے کہا۔ "کیا وہ بدصورت ہے؟"

"نہیں صاحب، وہ دونوں بہن ہے سگا والا؟"

"پھر کیا اس کی عمر زیادہ تھی؟ یا کوئی نقص تھا۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔"

"ہم سمجھ گیا صاحب۔۔۔ آپ کو ہم کیا بولے۔ سب مولا کی مرضی۔ اُس کا دماغ خراب نہ ہوتا تو اس چڑی مار موشن میاں کا شادی اس سے ہوتا۔"

"اُس کا دماغ خراب ہے؟ پاگل ہے؟"

"ایک دم پاگل تو نہیں ہے صاحب۔ کبھی اُس پر دورہ پڑتا ہے تو گھر سے بھاگ جاتا ہے۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا۔ "دو چار روز موشن میاں پاگل پھرتا ہے اُس کا پیچھے۔ پھر وہ خود ہی آ جاتا ہے۔ کچھ نہیں بولتا کدھر رہا۔ دن کدھر گزارا، رات کدھر۔ موشن میاں اُس کو خوب مارتا۔ زنجیر سے باندھ کے رکھتا۔"

"تمہارے خیال میں وہ کہاں جاتی ہے؟"

"ادھر کوئی لے جاوے۔ پاگل کو کیا پتا صاحب۔" وہ بولا۔ "ادھر کون شریف ہے کہ اُسے خود گھر چھوڑ جاوے۔ اللہ معاف کرے اُس کا تو ہر سب کا ڈرائن الگ۔۔۔ موشن میاں۔۔۔"

"چھوڑو کریم، بڑے دکھ کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ خبیث موشن میاں اس عورت کو طلاق دینے کی بات کر رہا تھا۔ اُس کے باپ کو بلیک میل کرنے کے لیے پھونکنے لگا تھا۔"

لانچ پر محسن اکیلا جاگ رہا تھا۔ کھانا رابعہ نے تیار کیا تھا اور نہیں بجے تک میری واپسی کا انتظار بھی کرتی رہی تھی۔ پھر محسن نے اس کے ساتھ کھانا کھا لیا تھا اور رابعہ بھی اب نائٹ کے ساتھ سو رہی تھی۔ کریم بلوچ کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے میں نے اسے شپ یارڈ میں پیش آنے والے واقعات تفصیل سے بتائے۔ وہ غور سے سنتا رہا اور دوربین سے گردو پیش کو دیکھتا رہا۔

"یہ بہت کام کی چیز لے آیا تو۔" وہ بولا۔

"اب سات بجے میں نہیں جا سکوں گا۔" میں نے کہا۔

"ڈر لگتا ہے موشن میاں سے، کہ پکڑوا نہ دے؟"

"ہاں، اس کا کیا بھروسا۔ ویسے تو میں نے گڑبڑ کرنے کی ایسی دھمکی دی ہے کہ وہ جرأت نہیں کر سکتا۔ پھر بھی خطرہ مول لینے سے کیا فائدہ۔" میں نے کہا۔ "غالب اگر آیا تو اسے بھی موشن میاں کی جستجو ہوگی۔ موشن میاں کی رشتے کے پاس اگر۔۔۔ محسن خان شیروانی کھڑے ہوں گے تو مسئلہ کوئی نہیں ہوگا کسی کے لیے بھی۔"

"میرا یہ حلیہ تو بالکل مناسب نہیں۔" محسن بولا۔

"ایک بات کریم۔" میں نے کہا۔ "تم سب کچھ پیدا کر سکتے ہو۔"

"ہم۔۔۔ ہم کیسے صاحب؟" کریم بلوچ کا منہ کھلا رہ گیا۔

"میرا مطلب تھا کہ لا سکتے ہو۔ ہمیں کچھ کپڑے لا دو۔ پرانی یونیفارم شپ کے مال سے۔" میں نے کہا۔

"نیلی رنگ کی ڈانگری، خاکی وردی، یا لینیا کی؟" محسن بولا۔

"کریم نے اس مطالبے پر غور کیا؟ پرانا ملے گا؟"

"پرانا ہی چاہیے یار۔" میں نے کہا۔ "یہ لو دو سو روپے رکھوا لیجیے پاس۔ اگر ٹوپی وغیرہ ملے تو وہ بھی لا دینا صاحب کو۔"

"پانچ بجنے والے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "سات بجے تم مجھے وہاں لے کر بھی جاؤ گے۔ دو گھنٹے میں یہ کام کر لو۔"

"آپ فکر مت کرو صاحب۔ ہم ابھی جاتا ہے۔ ابھی تو پانچ ہے۔" وہ پلیٹ بجا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "لیکن صاحب، ہم اس کو ساتھ لے جائے گا اپنا والف کو۔"

"اچھا دیکھیں گے۔" میں نے ہنس کے کہا۔

کھانا کھاتے ہی مجھ پر غنودگی کا غلبہ ہوا۔ میں جہاں بیٹھا ہوا تھا وہیں سو گیا۔ جب میں جاگا تو رات ہو چکی تھی۔ میں نے رابعہ اور نائٹ کو عرشے پر آمنے سامنے بیٹھے دیکھا۔ اُن کی باتیں چھپ کے سننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ غالباً وہ اپنے مستقبل کا پروگرام طے کر رہے تھے۔ میں نیچے آخری حصے میں واقع انجن تک گیا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ انجن میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ میں نے چار گیس سلنڈر بھی دیکھے۔ اُن میں سے ایک

www.paksociety.com

سے دیتے ہولئے سے ملا ہوا تھا۔ سٹیم باتھ کا ذخیرہ ایک تار کول کے ڈرم میں کیا گیا تھا جیسا ایک گیلن کا ڈرم تقریباً نصف جو تھائی بھرا ہوا تھا۔ تھوڑی سی جستجو کے بعد میں سب لوازمات اکٹھے کرنے میں کامیاب رہا جو چائے بنانے کے عمل کا حصہ تھے چائے لے کر میں اوپر پہنچا۔

"چائے کا وقفہ ہو گیا" میں نے خوشدلی سے کہا۔

رابعہ اور نانگ منی اپنی گفتگو میں اتنی محو تھیں کہ میری آواز پر دونوں اچھل پڑیں۔ میں نے چائے کی ٹرے درمیان میں رکھ دی۔

"تم جاگے ہوئے تھے؟" رابعہ نے کہا۔ "یہ کارروائی ہو رہی تھی۔"

"ہاں، میں نے سوچا کچھ آپ لوگوں کی خاطر تواضع ہو جائے" میں نے آلتی پالتی مار کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ رابعہ چائے بنانے لگی۔

نانگ منی نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "یہ کام بھی کر لیتے ہو؟"

"کیا کریں" میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "لڑکیوں نے وہ سب کام شروع کر دیے ہیں جو مرد کرتے تھے۔"

"مثلاً ڈاکے ڈالنا" وہ خفگی سے بولی "طعنے دیتے ہو۔"

"لاحول ولا قوۃ" میں نے کہا۔ "میں نے مذاق کیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ابھی تم سب سے ملی نہیں ہو۔ یہ جو تمہارے سامنے مسکین صورت لیے بیٹھی ہیں، یہ بڑی نامور وکیل رہی ہیں۔ چھکے چھڑا دیتی تھیں عدالت میں۔ اس کے بعد بھی انہوں نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے، کبھی انہی سے سننا۔ اور ایک نازلی بیگم عرف نازو ہیں۔ اس کے بارے میں غالب سے پوچھنا کہ وہ کیا ہے۔"

"مجھے رابعہ باجی نے سب بتا دیا ہے۔"

"باجی!" میں دم بخود رہ گیا۔ "تم نے بھی باجی بنا لیا اتنی جلدی۔ وہ تو خطرہ بنا ہی ہے؟ مگر خیر بس نانگ منی۔"

رابعہ نے چائے کا کپ میرے سامنے رکھا۔ "اب یہ گل بانو ہے، وہ نام اب ختم ہوا؟"

"وہ بھی پورا نام نہیں تھا۔" میں نے کہا اور جیب سے پیکٹ نکال کے گل بانو کو سگریٹ پیش کی۔ اس نے میرے ہاتھ سے پیکٹ چھینا اور مٹھی میں مروڑ کر کے دور پھینک دیا۔

"جب میں چھوڑ سکتی ہوں تو تم بھی چھوڑ سکتے ہو۔ کیا ہے اس سالے نشے میں؟" وہ بولی۔

"پھر... پھر گالی؟" رابعہ نے اسے ٹوکا۔

گل بانو شرمندہ نظر آنے لگی "کیا کروں۔ وہاں سب ایسے ہی بولتے تھے۔ میں بھی بولنے لگی۔ احساس تک نہیں ہوتا اور گالی نکل جاتی ہے منہ سے۔ تم ٹوکتی رہو۔ بلکہ جب بھی گالی دوں، میرے منہ پہ ایک تھپڑ مارو۔ خود چھوٹ جائے گی یہ عادت۔"

"ویری گڈ بھئی" میں نے کہا "تو تربیتی کورس اور اصلاحی پروگرام شروع بھی ہو گیا۔ میں ابھی حاضر ہوا۔"

میں اٹھ کر اس پیکٹ تک گیا جو عرشے پر پڑا رہ گیا تھا۔ اس میں سے سگریٹوں کے تین ٹکڑے ایسے برآمد ہوئے جو اب بھی قابل استعمال تھے۔ میں نے بڑی مہارت سے ان کی تعمیر نو کر کے سیدھی کی اور ایک کو جلانے لگا۔

"تم نے کبھی منع نہیں کیا؟" گل بانو نے کہا۔

"یہ اپنا برا بھلا خود نہیں سمجھتے۔" رابعہ نے کسی جلی بھنی بیوی کی طرح کہا جس کا شوہر پر بس نہ چلتا ہو۔

"یہ ایک مثبت رویہ ہے۔" میں نے کہا "بیویاں یہ بات چاہتی ہیں کہ ان کے شوہر فرشتے ہو جائیں۔ ان کے سوا سب کو چھوڑ دیں۔ چائے، سگریٹ، دوست احباب، سیر و تفریح، شکار اور جوانی کی سب عادتیں جو شادی سے پہلے تھیں۔"

"کیا وہ غلط کرتی ہیں، اگر اچھا چاہتی ہیں؟"

"سو فیصد اچھا شوہر کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو فرشتہ ہی ہوگا۔ فرشتہ دنیا میں کیوں آنے لگا۔ آ بھی گیا تو کسی عورت سے شادی کیوں کرنے لگا جس میں سو فیصد اچھائی نہ ہو، چنانچہ مس گل بانو..."

"یہ سب جھکی ہیں۔ ان سے بحث کرنا فضول ہے۔" رابعہ نے مسکرا کے کہا۔

"مرد، خصوصاً شوہر" میں نے کش لے کر دھواں فضا میں منتشر کیا۔ "ایک آئیڈیل شوہر ہونا بھی چاہتا تو اس پر اثر نہیں ہوتا اور ہوتا ہے تو الٹا۔ وہ فرار کا وہ چور دروازہ تلاش کر لیتا ہے جو بیوی کو دھوکا دینے لگتا ہے۔ پارسائی کا ڈراما کرتا ہے گھر کے اندر، باہر عیش کرتا ہے۔" گل نے کہا۔

"یہ تم نے ٹھیک کہا وہ... میری ہی غلطی تھی... کہ وہ مجھے چھوڑ گیا۔" گل بانو نے بے خیالی میں کہا۔

"کون چھوڑ گیا؟" رابعہ نے کہا۔

"میرا شوہر" گل بانو نے کہا اور اس کی آنکھیں ماضی کے خواب آلود منظر میں کھوئی رہیں۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دسویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

پسندیدہ رسائل و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں
عمران لائبریری

احمد ضیاء کے قلم سے

تماشہ ہے کہ ان شوریدہ سروں کی روداد جو گزرگاہِ وقت ... سے گزر گئے

... نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز ...

بستی میں گزر رہے تھے

... آتش و خوف ...

... شیریں خواب۔

"تم بھی شادی کر چکی ہو؟" رابعہ نے کہا۔ "بھی" کا لفظ اس نے بلا ارادہ استعمال کر لیا تھا مگر وہ محسوس کر سکتی تھی کہ اس غیر شعوری عمل کے پس منظر میں کیسے جذبات کارفرما ہوں گے۔

"ہاں... ایک بار ایسا بھی ہوا تھا۔ پانچ سال ہو گئے اس بات کو مگر کبھی یہ کل کی بات لگتی ہے، کبھی میرے پچھلے جنم کی۔" وہ بولی۔

"کون تھا وہ؟" رابعہ نے ایک فطری تجسس میں مبتلا ہو کے کہا۔

"تھا ایک شریف آدمی۔ ڈاکو نہیں تھا۔" وہ بولی۔ "رشتہ میرے والدین نے کیا تھا۔ اس وقت میں انٹر کا امتحان دے چکی تھی اور نتیجہ آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ سوچا تو میں نے بھی تھا کہ میں بی اے، ایم اے کروں گی۔ خوب پڑھوں گی اور پھر پڑھاؤں گی۔ میں اپنے ساتھ کی لڑکیوں سے ذرا مختلف انداز میں سوچتی تھی۔ وہ سب تو ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھتی تھیں۔ یہ ایک فیشن تھا یا جذباتی انداز فکر۔ جسے ماں باپ اور دوسرے لوگوں کی طرف سے حوصلہ افزائی ملتی تھی مگر میں ٹیچر بننا چاہتی تھی۔ جاننے سے ہو سکتا کہ دنیا میں تو سب اچھا ہوتا۔ دنیا میں خوشحالی ہوتی اور امن ہوتا۔ کوئی کسی کا دشمن نہ ہوتا اور کوئی غریب نہ ہوتا۔ کوئی لٹیرا یا ڈاکو نہ ہوتا۔" وہ چپ ہو گئی۔

"پھر کیا تم نے انٹر کر لیا تھا؟" رابعہ نے اس کی بات جاری رکھنے کے لیے موقع فراہم کیا۔

"معلوم نہیں کر لیا ہوگا۔" وہ بولی۔ "تفصیل میں کبھی پہنچ ہی نہیں سکی، میں نے رزلٹ دیکھا ہی نہیں۔ ہم اس زمانے میں پونچھ روڈ پر رہتے تھے۔ وہیں میرا کالج بھی تھا۔ ایک بار ہم کسی شادی کی تقریب میں مدعو ہو کر گئے۔ جس کی شادی تھی وہ میرے ابا کے پرانے دوست کا بیٹا تھا۔ وہ ایک متمول کاروباری گھرانا تھا اور ان کے بہت سے کاروبار تھے جو چھ سات بھائی مل کر سنبھالتے تھے۔ ان کے گھر میں لاہور سے ایک مہمان آ کے ٹھہرا تھا۔ لڑکوں کا کوئی دوست تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور میرے پیچھے پڑ گیا۔ میں ایک نادان اور کم عمر جذباتی لڑکی تھی۔ اس کی باتوں سے اور شخصیت کے رکھ رکھاؤ سے متاثر ہو گئی۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد ہی اس نے پیغام بھجوا دیا۔ وہ لوگ درمیان میں تھے جن سے ابا کے پرانے مراسم تھے چنانچہ کوئی تحقیق تفتیش نہیں ہوئی۔ لڑکے نے کہا کہ اس کے دور کے رشتے کے چچا، ماموں وغیرہ ہیں۔ وہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کی بڑی بہن دبئی میں ہے اور بڑا بھائی کینیڈا میں۔ ان میں سے کوئی بھی شادی طے کرانے کے لیے اتنی دور سے نہیں آئے گا۔ ویسے بھی ان سے بس نام کا رشتہ رہ گیا ہے۔ سب اپنے اپنے معاملات اور کاروبار میں مصروف ہیں۔ اس کی صاف گوئی نے سب کو قائل کر لیا اور شادی ہو گئی۔ دو

www.paksociety.com

صرف ایک مہینے کے لیے پاکستان آیا تھا اور اسی عرصے میں سب کچھ ہوا تھا۔ جب وہ واپس گیا تو مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔"

"کہاں؟ لندن؟" میں نے کہا۔ "تم لندن میں رہ چکی ہو؟"

"ہاں۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔ "مگر بہت کم عرصہ۔

تقریباً دو ہفتے۔ وہاں سے ہم پیرس چلے گئے۔ دو ہفتے بعد دبئی پہنچے جہاں وہ ایک بزنس مین سے ملا۔ پھر کینیڈا، وہاں اس کا بھائی تھا۔ میں خوش تھی کہ وہ مجھے ملوانے کے بہانے اس کے تعلقات تو استوار ہو رہے ہیں اور ساتھ ہی دنیا کی سیر بھی ہو رہی ہے۔ ٹھہرتے ہم ہوٹلوں میں تھے۔ یہ مجھے عجیب سا لگتا تھا کہ جہاں بھائی اور بہن کے گھر ہوں وہاں بھی ہم ہوٹلوں میں رہیں لیکن باہر ایسے ہی چلتا ہے۔ گھر میں جگہ ہو تب بھی دلوں میں گنجائش نہیں ہوتی کہ کوئی مہمانوں کی خاطر خود بے آرام ہو۔ ہم دوسری طرح کے لوگ ہیں۔ مہمان آجائیں تو نیچے زمین پر سو جاتے ہیں۔ خود چاہے نہ کھائیں ان کو اچھے سے اچھا کھلاتے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ دو مہینے بعد ہم واپس پاکستان پہنچے۔ ابھی تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے شوہر کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ میں نے اسے کوئی کام کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ خرچ شاہانہ طریقے سے کرتا تھا۔ ہر جگہ ہم فور اسٹار قسم کے ہوٹلوں میں ٹھہرتے تھے۔ وہ ٹیکسی میں سفر پسند نہیں کرتا تھا۔ جتنا عرصہ کہیں قیام کا ہوا اتنے عرصے کے لیے کار کرائے پر حاصل کر لیتا تھا۔ میں نے خود بھی بہت شاپنگ کی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پیسہ تو ایک بہتے دریا کا پانی ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا اور جس کے بارے میں نہ کوئی سوچتا ہے اور نہ جانتا ہے کہ کہاں سے آرہا ہے۔ میں نے کبھی روکا ٹوکا بھی تو اس نے کہا جانِ من! بے فکر رہو میرے لیے چھوڑو۔ پھر پاکستان آنے کے بعد ہم نے الگ گھر لیا اور وہاں میرے شوہر نے مجھے پہلی بار بتایا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ایک تو وہ میری خوب صورتی سے متاثر ہوا تھا مگر ظاہری خوب صورتی بہت عام ہے۔ یورپ بھرا پڑا ہے۔ کسی بھی ماڈل گرل کو دیکھ لو۔ اس بات سے مجھے تھوڑا سا صدمہ بھی ہوا کہ کیا یورپ کی ایک معمولی ماڈل گرل جو برائے نام کپڑوں یا کپڑوں کے بغیر کسی اشتہار میں نظر آتی ہے مجھ سے بہتر ہے مگر حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے نا۔ اس نے کہا کہ میرا اثاثہ ہے میری ذہانت اور جرأت۔ شادی سے پہلے کچھ واقعات ایسے ہوئے تھے کہ اس نے میری ان صفات کو نوٹ کیا تھا۔ پھر اس نے واضح کیا کہ دو ماہ کا یہ ہنی مون بھی ایک ٹیسٹ تھا جس میں میں خوش قسمتی سے سو فیصد کے پاس ہوئی۔ اس ٹیسٹ کی تفصیل سن کے مجھے پسینے آگئے۔ اس نے مجھے بتایا کہ لندن سے میری وہاں سے دبئی اور پھر کینیڈا جاتے ہوئے میں کیا کچھ لے کر کسٹم سے گزر گئی اور میں نے نہ کبھی شک کا اظہار کیا اور نہ بزدلی کا۔ میں نے اسے کہا کہ یہ تم نے کیا کیا۔ تم میرے اعتماد کو دھوکا دیتے رہے۔ وہ بولا کہ نہیں میں تو تمہارا اعتماد حاصل کرتا رہا اور جو اعتماد اب مجھے تم پر ہے وہ کسی شوہر کو اپنی بیوی پر نہیں ہوگا۔ میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتی۔ ایک بار لندن میں دو آوارہ گرد گورے مجھے پریشان کر رہے تھے۔ میں نے سرِعام ان کی پٹائی کی۔ مار بھی کھائی مگر ان میں سے ایک کو بلی کی طرح چمٹ گئی۔ میرے کپڑے پھٹ گئے اور مجھے چوٹیں بھی آئیں کیونکہ وہ بہرحال ایک طاقتور مرد تھا مگر پولیس کے آنے تک میں نے اسے چھوڑا نہیں۔ وہاں پولیس کو آنے میں گھنٹے نہیں لگتے، منٹ لگتے ہیں۔

دوسرا واقعہ دبئی میں پیش آیا تھا۔ میں کمرے میں اکیلی تھی کہ ایک سکھ میرے کمرے میں گھس آیا۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ میں نے اس کو باتھ روم میں بلا لیا، جیسے پیار سے اور وہ آکر کا بیٹھا۔ ۔ ۔"

"پھر کیا ہوا؟" رابعہ نے اسے ٹوکا۔

"سوری باجی،" گل بانو نے کہا۔ "وہ سمجھا کہ میں پٹ گئی۔ یہ جانا ہی کہ اس وقت میں باتھ روم میں تھی جیسے ہی وہ میرے پیچھے آیا میں نے اسے دھکا دیا اور خود باہر آکے کنڈی لگا دی۔ پھر منیجر کو فون کیا اور اس نے پولیس کو بلا لیا۔ دس منٹ بعد وہ باتھ روم سے حوالات میں منتقل کر دیا گیا۔ میرے شوہر نے میری ہمت اور ذہانت کو سراہا اور کہا کہ تم نے تو کمال کر دیا۔ پاکستانی لڑکیاں تو اتنی بزدل اور بے وقوف ہوتی ہیں کہ کاکروچ دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ تو میں بھی ہو جاتی ہوں۔ خیر، اس نے مجھ سے پاکستان پہنچنے کے بعد کہا کہ میں پی آئی اے میں ایئر ہوسٹس بھرتی ہو جاؤں۔ وہ میری مدد کرے گا اور اس کے اونچے تعلقات ہیں۔ میرے مسترد کیے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ شادی شدہ عورتوں کو کہاں لیتے ہیں۔ میرا شوہر کہنے لگا کہ کیا ضرورت ہے انہیں یہ بتانے کی کہ تم شادی شدہ ہو۔ ہم ملتے رہیں گے، تم جہاں جہاں ہم وہاں وہاں۔ ان پر یہ پابندی تو نہیں ہوتی نا کہ وہ کسی مرد سے بھی نہ ملیں۔ کوئی چاہے فرینڈ رکھیں۔ کزن تو سب ہی بنا کے رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے بھی وہ ہوٹلوں یا ہوسٹلوں میں ہیں۔ میں نے کہا کہ تم کو شرم نہیں آئے گی بیوی سے ناجائز تعلقات رکھتے ہوئے اور جب تمہارا بزنس اچھا خاصا چل رہا ہے، پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے ملازمت کی۔ عورت کی کمائی

کھانا تو مرد کی غیرت کبھی گوارا نہیں کرتی۔ تو وہ بہت ڈھیٹ بن کے ہنسا۔ کہنے لگا یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ میاں بیوی اگر ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں تو دونوں پر برابر بوجھ ہونا چاہیے اور دونوں کو برابر چلنا چاہیے ساتھ ساتھ۔ پیسہ زمین سے اگتا جب بھی اس کے لیے ہل چلانا پڑتا۔ کھانے کے لیے محنت مزدوری کرنی پڑتی ہے اور ہم دونوں ایک بہترین ٹیم بن سکتے ہیں۔ ہوائی جہاز کے عملے کے لیے ہر ایئرپورٹ پر الگ راستہ ہوتا ہے۔ ان کی چیکنگ بھی عموماً نہیں ہوتی۔ ہم ایک ہی جہاز سے سفر کر سکتے ہیں صرف ایئرپورٹ پر ہم جدا ہوں گے اور وہ بھی ذرا سی دیر کے لیے، باہر ہم پھر مل جائیں گے۔ اس کی اسکیم تو بہت لمبی تھی۔ مختصر یہ کہ میں نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ میں نے شادی کی ہے تو صرف بیوی رہوں گی اور گھر کے اندر سب کچھ کروں گی۔ گھر کے باہر کی ذمے داریاں تمہاری ہیں۔ میں ان میں شریک نہیں ہو سکتی۔ اس سے اختلاف بڑھا۔ وہ مجھے سمجھاتا رہا۔ میں اسے سمجھاتی رہی کہ جتنا پیسہ اب ہے اسی سے کوئی کاروبار کر لو یہاں۔ بہت زیادہ دولت کس کام کی اگر سر پر ہمیشہ قانون کی تلوار لٹکتی رہے۔ ہر وقت احساسِ جرم ذہن پر مسلط رہے اور یہ زندگی ایک مسلسل فرار ہو۔ اس نے میری نہیں مانی اور نہ میں نے اس کی۔ وہ مجھے والدین کے گھر چھوڑ کے چلا گیا۔ دو ماہ بعد پھر آیا۔ اس نے کہا کہ اب بھی وقت ہے۔ میں سوچ لوں ورنہ وہ مجھے طلاق دے کر چلا جائے گا۔ میں نے کہا کہ جاؤ گے کہاں تم۔ سب کچھ تو تم نے بتا دیا ہے یا مجھے معلوم ہے۔ تم تو مجھے چھوڑ دو گے مگر میں کب چھوڑوں گی تمہیں۔ ایک ایک ٹھکانے کا علم ہے مجھے۔ بس وہ آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد نہیں دیکھا میں نے اسے۔"

"تم نے اسے تلاش بھی نہیں کیا؟"

"بہت تلاش کیا۔ میری ساری خوش فہمی دور ہو گئی۔ جو شخص انٹرپول کے ہاتھ نہ لگا ہو اسے میں کیسے پکڑ سکتی تھی۔ پتا نہیں اس کے کتنے نام ہوں گے اور کتنے ٹھکانے اور کتنے مددگار ہوں گے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ مجھ پر آنچ نہیں آئی۔ اس نے خود ہی مجھے معاف کر دیا ہوگا کہ بے وقوف عورت ذات ہے۔ پرانی تعلیم و تربیت کے خول سے نہیں نکل سکتی ورنہ وہ مجھے اٹھوا سکتا تھا، قتل بھی کروا سکتا تھا۔"

"اس نے تمہیں آزاد بھی نہیں کیا تھا؟" رابعہ نے کہا۔

"نہیں۔ قانونی طور پر میں آج بھی اس کی بیوی ہوں۔"

وہ بولی۔

"اور اس کی گمشدگی کو کتنے سال ہو گئے؟"

"پانچ سال،" گل بانو نے کہا۔

"اس تمام عرصے میں وہ بالکل لاپتا رہا؟ تم سے کسی قسم کا رابطہ نہیں ہوا؟" رابعہ وکیل بن کے کیس کی قانونی نوعیت کا جائزہ لے رہی تھی۔

گل بانو نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایک بات نہیں پوچھی تم نے کہ میرے بچے کیوں نہیں ہیں۔ کم سے کم ایک تو ہوتا۔"

میں نے دخل در معقولات سے گریز کیا تھا ورنہ یہ سوال بہت دیر سے میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

"بعض اوقات بچے دیر سے ہوتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"وہ تو خدا کی مرضی کی بات ہے باجی۔ یہاں تو میرے شوہر کی مرضی کو دخل تھا۔" گل بانو نے کہا۔ "وہ نہیں چاہتا تھا کہ پہلے سال میں ہی میں ماں بن جاؤں۔ مجھ سے تو وہ کہتا تھا کہ ساری عمر پڑی ہے بچے پیدا کرنے کے لیے۔ ابھی سے ان جھمیلوں میں پڑ گئے تو لائف کو خاک انجوائے کریں گے۔ میں اسے کیسے بتاتی کہ عورت کے لیے تخلیق کے عمل سے گزرنا سب سے بڑی انجوائے منٹ ہے۔ اس کے بعد وہ مامتا کے جذبات کو انجوائے کرتی ہے۔ یہ سب مرد نہیں سمجھ سکتا کیونکہ اس کا کام تو ختم ہو جاتا ہے نا۔ عورت ہی کو سب کچھ کرنا ہوتا ہے بعد میں، اکیلے۔"

رابعہ تھوڑی سی جھینپی، لیکن گل بانو نے صرف حقیقت بیان کی تھی۔

"اصل مقصد تو اس کا کچھ اور تھا۔ میں ماں بنتی تو وہ مجھے غیر شادی شدہ لکھوا کے پی آئی اے میں ایئر ہوسٹس کیسے بھرتی کراتا،" گل بانو نے کہا۔

"میرے خیال میں تم نے وہی کیا جو تمہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر تمہاری جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو یہی کرتی۔" رابعہ بولی۔

گل بانو نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے جلد بازی کی اور جذبات سے کام لیا۔ عقل سے کام لیتی تو اس کو ڈرانے دھمکانے اور طاقت سے راہِ راست پر لانے کی کوشش نہ کرتی بلکہ یہ کام آہستہ آہستہ کرتی۔ کچھ مہلت لیتی اس سے، کچھ شرائط عائد کرتی۔ مثلاً یہی کہ ایئر ہوسٹس بننے کے بعد میں بچوں کی ماں بنوں گی۔ میں تمہاری بات مانتی ہوں، تم میری بات مانو۔ شادی کو ایک سال چھپایا جا سکتا ہے تو بچے کو بھی چھپایا جا سکتا ہے اور ایک بچے کی ماں کو دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ یہ سب ہو جاتا، اسے میری اشد ضرورت تھی۔ ایک سال بعد جب وہ باپ بن جاتا تو اس کے پیروں میں ایک اور زنجیر پڑ جاتی۔ پھر اس عرصے میں ایک عورت بن کے میں اس سے کچھ بھی منوا سکتی تھی۔ عورت

www.paksociety.com

اگر چاہے تو اس کا جادو مرد کے سر چڑھ کر بولے۔ مگر یہ جادو اس کی کمزوری میں ہے، شہ زوری میں نہیں۔ یہ بات اگر میں سمجھ لیتی تو میرے لیے کچھ بھی ناممکن نہ ہوتا۔ عورتوں نے تو ملکوں پر حکمرانی کی ہے۔ جو عورت امریکی صدر کینیڈی کے دل پر حکومت کرتی تھی اُس نے یونانی ارب پتی تاجر اوناسس کو بھی فتح کیا۔ الزبتھ ٹیلر نے کتنے مرد فتح کیے۔ اُن بادشاہوں کی طرح جو ملک فتح کرتے ہیں مگر ان عورتوں نے طاقت سے نہیں محبت سے فتح حاصل کی۔"

میں احمقوں کی طرح اس عورت کا فلسفہ سن رہا تھا۔ گل محمد ناگ منی تھی ایک خطرناک ڈاکو کی خطرناک بہن۔ آج وہ گل بانو بن کے زندگی کی ایک فلسفیانہ گتھیاں سلجھا رہی تھی۔ مجھے بتا رہی تھی کہ وہ لندن پیرس گھوم چکی ہے۔ اس کے اندر کی حقیقی عورت کا یہ روپ ناقابل یقین تھا۔ یہ مجھے دہری شخصیت کا کیس لگتا تھا۔ ناگ منی اور گل بانو میں قطبین کی دوری تھی، آکاش اور پاتال کا فرق تھا۔

"تمہارے بھائی اور تمہارے والدین نے تمہاری مدد نہیں کی؟" رابعہ نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

"مدد تو سب نے کی تھی مگر حاصل کچھ نہیں ہوا۔" گل بانو نے کہا۔ "تھانہ پولیس میں رپورٹ کرنے سے ہمارے لیے مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ وہ رات دن تفتیش کے لیے آتے تھے، ہمیں بلواتے تھے۔ انھوں نے میرے الزامات پر بہت سے تفصیلی بیانات لیے۔ کیس ایف آئی اے نے لے لیا۔ معاملہ ایک اسمگلر کا تھا اور میں اُس کی شریک حیات کی حیثیت سے انکشافات کر رہی تھی۔ یہ اچھا ہوا کہ میں نے شریک جرم ہونے کا اعتراف نہیں کیا ورنہ میں تو اندر ہو ہی جاتی۔ پھر ایک بہت سمجھدار افسر نے جو ایف آئی اے میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھا، ہمیں سمجھایا کہ یہ سب بے کار ہے۔ ہم لوگوں کو آگ سے کھیلتے ہوئے ڈرنا چاہیے جو نقصان ہونا تھا ہو گیا مگر آگے جانے سے زیادہ نقصان ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ وہ خود کسی کے ہاتھ نہیں آتے۔ ہمارے خاندان اور محلے میں بہت بدنامی ہو چکی تھی۔ لوگ ہر طرح کی باتیں کر کے مزہ لیتے تھے۔ ہم کس کس کو جھوٹا کہتے اور کہاں کہاں جا کے تردید کرتے۔ میرے ابا نے یہی مناسب سمجھا کہ اس ہمدرد بن کے آنے والے افسر کے مشورے پر عمل کیا جائے۔ ہم نے وہ محلہ ہی چھوڑ دیا۔ شہر چھوڑ دیا۔ پھر خاص سندھ میں ہماری کچھ زمین تھی۔ وہ زمین آم کی فصل کے لیے بہت زرخیز تھی۔ ابا نے یہی فیصلہ کیا کہ ان زمینوں کو آباد کریں۔ مگر یہ کسے معلوم تھا کہ ہم سے تقدیر نے ایک اور غلط فیصلے پر دستخط کرا لیے ہیں۔ تدبیر کیا کرے گی جہاں تقدیر ہی خلاف ہو۔

پہلا سال بہت اچھا گزرا۔ میرے بھائی نے آم کے ایک باغ کا ٹھیکہ لے لیا۔ وہ اس کام کا تجربہ حاصل کر چکا تھا اور اس کاروبار کی اونچ نیچ کو سمجھتا تھا۔ اس ٹھیکے سے پہلے ہی سال پچاس ہزار کا فائدہ ہوا جو اس وقت کے اعتبار سے بہت بڑی رقم تھی۔ اس علاقے میں سرحد پار کے ڈاکو بہت سرگرم تھے۔ وہ گرد و نواح کے علاقوں میں حملے کرتے تھے اور عموماً ہندو سیٹھوں کو لوٹتے تھے۔ اندرون سندھ ہندو ساہوکار آزادی کے بیس سال بعد بھی معاشی طور پر بہت مستحکم تھے۔ لیکن ڈاکو کو کسی کے مذہب سے کیا تعلق۔ اُن کے بیچ ڈاکو اُدھر بھی تھے اور وہ بھی مسلمانوں سے رعایت نہیں کرتے تھے۔ جس دن میرا بھائی ٹھیکے کی نیلامی سے ملنے والی رقم لے کر گھر آیا اُسی رات ڈاکو آ گئے۔"

"کسی نے مخبری کی تھی؟" رابعہ نے کہا۔

"مخبری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ خیال یہی ہے سب کے ساتھ وہ بھی ہوں گے۔ کسی کی صورت پہ تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ ڈاکو ہے۔ میرا بھائی بھی اس خطرے سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ رقم گھر لایا مگر پھر کہیں اور لے گیا۔ دن کا وقت ہوتا تو وہ بینک میں جمع کراتا۔ رات کے وقت اُس نے سب پیسہ ایک تھیلی میں ڈال کے زمین میں دبا دیا۔ شاید کسی نے اسے دیکھ لیا یا کوئی پہلے سے اس تاک میں تھا۔ وہ گھر آیا اور رات کو ڈاکو آ پہنچے۔ انھوں نے مجھے، میری دو بہنوں کو اور ماں کو قبضے میں کر لیا اور پچاس ہزار روپے مانگے۔ میرا بھائی اُن کے سردار کو وہاں لے گیا جہاں اُس نے رقم چھپائی تھی مگر وہاں اُس کو خالی گڑھا ملا۔ کوئی پہلے ہی خزانہ ہتھیا چکا تھا۔ ڈاکو ہم سب کو ساتھ لے گئے۔ میرا باپ بندوق لے کر پیچھے دوڑا اور اُن کی جوابی فائرنگ سے مارا گیا۔ ڈاکو جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ رقم کا بندوبست ہو جائے تو اپنی عورتیں لے جانا۔ وہ سرحد پار کے کسی علاقے سے آئے تھے۔ رات بھر چلنے کے بعد وہ کسی غیر آباد مقام پہ پہنچے جہاں انھوں نے ہم سب کو الگ الگ رکھا۔ انھیں ڈر تھا کہ یہ مسلمان عورتیں ہیں جو اپنی عزت پہ جان قربان کرنا معمولی بات سمجھتی ہیں، کہیں بڑھیا اپنی تینوں بیٹیوں کا گلا نہ دبا دے۔ ایک بار پھر میری عقل اور ہمت کام آئی۔ میں نے سردار سے کہا کہ تم مجھے بیچ دو۔ میرے پچاس ہزار تو مل ہی جائیں گے کسی بردہ فروش سے۔ باقی سب کو جانے دو۔ وہ بہت حیران ہوا۔ کہنے لگا کہ تیری باقی دو بہنوں کو بھی بیچ دوں۔ ڈیڑھ لاکھ تو مل جائیں گے۔ میں نے کہا کہ اول تو یہ اصول کے خلاف ہو گا۔ تم نے کبھی ایسا نہیں کیا ہو گا کہ مانگے پچاس اور وصول کیا ڈیڑھ لاکھ۔ دوسری بات یہ کہ میری بہنیں بہت غیرت والی ہیں وہ خودکشی کر لیں گی۔ ڈاکو ہنسنے لگا کہ اچھا وہ غیرت مند ہیں اور تو بے غیرت ہے۔ میں نے کہا کہ ہوں تو میں بھی بہت غیرت مند مگر یہاں سوال اپنی جان بچانے کا نہیں دوسروں کی عزت اور جان بچانے کا ہے۔ کسی کو تو قربانی دینی پڑے گی سو میں اپنی زندگی قربان کر رہی ہوں۔ دو کی عزت اور تین کی جان بچ جائے تو میرے نزدیک یہ سودا برا نہیں۔ ڈاکو چکر میں آ گیا۔ کہنے لگا کہ اچھا اگر میں تجھے رکھ لوں خود؟ میں نے کہا کہ وہ تمہاری مرضی۔ تم رکھ سکتے ہو کسی کو بھی پچاس روپے کی عورت یا پچاس ہزار کی عورت۔ آخر شہر کے لوگ بھی گاڑیاں رکھتے ہیں۔ کوئی دس ہزار کی رکھتا ہے اور کوئی ایک لاکھ کی۔ شوق اور حیثیت کی بات ہے۔ بس جناب، ڈاکو تو ایک دم مر مٹا میری اس ادا پہ۔ رات کو میں نے اس کا کام تمام کیا۔ اس سے ریوالور چھینا اور اسے گولی مار دی۔ یہی بنیادی غلطی ہوئی مجھ سے۔ میں اُسے گلا گھونٹ کے تو نہیں مار سکتی تھی۔ وہ ایک طاقتور مرد تھا۔ مجھے زہر وغیرہ بھی نہیں مل سکتا تھا مگر یہ ہو سکتا تھا کہ میں اس کے سر پہ کچھ مارتی۔ وہی ریوالور یا خنجر سے اس کا گلا کاٹ دیتی۔ یہ سب میں نے بعد میں سیکھا اور کیا مگر اس وقت تجربہ نہیں تھا۔ صرف حوصلہ تھا۔ گولی چلنے کی آواز نے ڈیرے میں کھلبلی مچا دی۔ باقی ڈاکو اسلحہ لے کر آئے لیکن میرے سامنے آ کے دو مارے گئے تو باقی فرار ہو گئے۔ جاتے وقت میری ماں کو بھی لے گئے اور دونوں بہنوں کو بھی۔ میں اکیلی رہ گئی اور یہ مت پوچھو کہ کس طرح گھوڑے پہ سوار ہو کے پوری رات سفر کرتی ہوئی سرحد پار کر گئی۔ مجھے صرف سمت کا اندازہ تھا۔ یہ معلوم نہ تھا کہ سرحد کتنی دور ہو گی۔ میں نے کبھی گھوڑے پہ سواری بھی نہیں کی تھی۔ اس دن کر لی۔ گھوڑا بہت سمجھدار جانور ہوتا ہے۔ میں دو بار گری مگر گھوڑا بھاگا نہیں۔ اس نے میرا ساتھ دیا اور اس رات وہی میرا دوست، ہمدرد تھا اور معاون تھا۔ اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں یا اتفاق کہ مجھے کسی سرحد پہ کوئی گشت کرنے والا نہیں ملا۔ اُدھر بی ایس ایف والے مل سکتے تھے، اِدھر رینجرز۔ صبح ہونے سے پہلے ہی میں ایک گاؤں میں پہنچی تو مجھے پتا چلا کہ گاؤں پاکستان کی سرحد میں ہے۔ وہاں میں مسجد کے دروازے پہ گر پڑی اور جو لوگ صبح نماز پڑھنے آئے انھوں نے مجھے سنبھالا۔ میری بپتا سنی اور مجھے پولیس کے ذریعے میرے بھائی تک پہنچایا۔ میرا بھائی تقریباً پاگل ہو گیا تھا۔ وہ ڈاکوؤں سے رابطے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اُس نے کھڑے کھڑے آموں کا باغ اور مختصر زمینیں سب پچاس ہزار میں فروخت کر دیے تھے حالانکہ وہ کسی بھی طرح ستر پچھتر ہزار سے کم کے نہ تھے مگر اُسے جلدی تھی اور وہ ہوش میں کہاں تھا کہ نفع اور نقصان کو سمجھتا۔ اُسے تو بس پچاس ہزار دے کر ماں اور بہنوں کو واپس لانے کے خیال نے پاگل کر دیا تھا۔ جب میں پہنچی اور میں نے اُسے ساری کہانی سنائی۔ لیکن اس کہانی میں سے میں نے بہت سا سچ نکال دیا ورنہ وہ اتنا پاگل ہو جاتا کہ مجھے بھی قتل کر دیتا۔ میں نے اپنی بے وقوفی کی بات اُسے نہیں بتائی۔ میں نے کہا کہ ڈاکوؤں نے مجھے چھوڑ دیا ہے کہ یہ پیغام پہنچا دے کہ پچاس ہزار کا انتظام رکھو ہم خود آئیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہیں آئے۔ میرا بھائی پچاس ہزار لے کر پھرتا رہا۔ اُس کی مایوسی بڑھتی گئی۔ پولیس اُس کی مدد کرنے سے قاصر تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ڈاکو سرحد پار سے آئے تھے۔ میرے بھائی کا انتقامی جنون اتنا بڑھ گیا کہ اُس نے اپنے دو قابل اعتبار ساتھیوں کو ساتھ لیا اور مجھے ساتھ لیا۔ ہم رات کی تاریکی میں سرحد پار کر جاتے تھے اور اُن ٹھکانوں کو تلاش کرتے تھے جہاں وہ ڈاکو مل سکتے تھے مگر میرا خیال ہے کہ اُن کا گروہ ٹوٹ گیا تھا۔ اُن کا سردار مارا گیا تھا اور دو ساتھی بھی مارے گئے تھے۔ باقی سب اِدھر اُدھر ہو گئے اور...

اُن کے ساتھ وہ بھی اِدھر اُدھر ہو گئیں، میری ماں اور بہنیں۔ ماں کو تو شاید مار دیا ہو گا انھوں نے یا کہیں ریگستان میں چھوڑ دیا ہو گا۔ بہنوں کا پتا نہیں وہ کس کے حصے میں آئیں، زندہ رہیں یا مر گئیں۔ چار چھ مہینوں میں ہم نے کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔ میرے بھائی نے مجھے اس لیے ساتھ رکھا کہ میں اُس جگہ کی نشاندہی کر سکتی تھی جہاں ہمیں رکھا گیا تھا اور انھیں پہچانتی بھی تھی۔ اس عرصے میں ہمارا سامنا متعدد بار سرحدی پولیس سے ہوا۔ ہم بھائی بہن تو بچ گئے مگر اس کے دونوں دوست ایک ایک کر کے مارے گئے۔ اُس کا اشتعال اور بڑھ گیا۔ اب اُس نے باقاعدہ گروہ بنا لیا اور سرحدی دیہات میں ڈاکے ڈالنے لگا۔ اس کی تمام سرگرمیاں پاکستان کی سرحد کے اُس پار تک محدود رہیں۔ میں اس کے ساتھ برابر کی شریک تھی۔ ویسی ہی انتقام کی آگ میرے خون میں بھی دہک رہی تھی۔ مجھے کوئی ملال نہیں ہوتا تھا، جب میرے بھائی کے گروہ کی بربریت کا شکار عورتیں، بچے، بوڑھے اور بے گناہ

www.paksociety.com

لوگ ہوتے تھے تو میں سمجھتی تھی کہ یہ تو حساب برابر ہو رہا ہے۔ ہم نے کئی بار عورتوں، بچوں کے عوض پچاس پچاس ہزار روپے کا تاوان وصول کیا۔ کبھی تاوان نہیں ملا تو ان عورتوں کو میرے بھائی نے منڈی میں ایسے بیچ دیا جیسے وہ بھیڑ بکریاں ہوں۔ جب وہاں دونوں طرف سے پولیس اور سرحدی حفاظتی فوج کا دائرہ ہمارے گرد تنگ ہونے لگا تو ہم نے سرحد بدل دی۔ ہم میرپور خاص کے علاقے سے ساہو نگر چلے گئے۔ وہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ وہاں سے ہم واہگہ کی سرحد پر پہنچے اور اب حال ہی میں پھر تھر پارکر، کھوکھراپار اور نگر پارکر کے علاقے میں واردات کرنے لگے تھے۔"

"کبھی . . . اتنے طویل عرصے میں تمھیں خیال نہیں آیا کہ انتقام کی کوئی حد بھی ہوتی ہے . . . اور کیا یہ واقعی انتقام تھا؟" میں نے کہا۔ "یا محض لوٹ مار اور جرائم کی زندگی گزارنے کی عادت؟"

وہ کچھ دیر خاموشی سے اپنے انگوٹھے کو دباتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ "اب انتقام کا خیال تو نہیں آتا تھا۔ ہم بھول چکے تھے اُن کو . . . . . . کبھی یاد کرتے تھے تو ایسے جیسے وہ مر چکے ہوں اور وہ ہمارے لیے واقعی مر چکے . . . زندہ ہوں تب بھی کیسے مل سکتے ہیں۔"

"تم نے کتنے قتل کیے ہوں گے اب تک اپنے ہاتھوں سے؟" میں نے کہا۔

"تم اعترافِ جرم کرانا چاہتے ہو؟" وہ بھڑک گئی۔

"نہیں، ایسے تو ہم نے بھی بہت لوگ مارے ہیں مگر ہم اس کو قتل نہیں سمجھتے۔ یہ جنگ تھی۔ اس میں ہم بھی مارے جا سکتے تھے اور ہمارے ساتھی بھی مارے گئے۔ تمھاری جنگ کا مقصد مختلف تھا اور تمھارے دشمن مختلف تھے۔ تم نے اپنے دفاع میں گولی چلائی ہوگی۔ قتل وہ ہوتا ہے جو آدمی سوچ سمجھ کے ایک پلان کے مطابق ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"مارے تو نہ جانے کتنے گئے میرے ہاتھوں مگر ایسے کسی کو نہیں مارا میں نے جیسے تم [illegible] ہو۔" وہ بولی۔ "وہاں ایک لڑکی نے مجھ سے کہا [illegible] دوستی کی تھی کہ آ کے مار دوں اس کے س[illegible] بڑی بہن [illegible] اُسے میں نے مارا تو نہیں مگر [illegible] کے بعد میں نے اپنی رشتہ داری بتائی کہ جب ہم جوان عورتیں

آ میں تو انھیں اپنے ساتھ اپنی نگرانی میں رکھوں۔"

خاموشی نے ایک اور طویل وقفے کے بعد میں نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ تمھارے پاس بھی حالات کا جواز ہے مگر کیا تم سنجیدہ تھیں اپنی اس زندگی سے؟ ایک عمر ایسے گزار سکتی تھیں؟"

"میرے لیے انتخاب کہاں تھا۔ میرا کوئی مستقبل بھی تب ہوتا جب میرا ایک شریف ماضی ہوتا۔ بھائی کے ہاتھوں دو اپنے ہی ساتھی اس لیے مارے گئے تھے کہ انھوں نے مجھ پر بری نگاہ ڈالی تھی اور ایک نے تو دست درازی کی بھی کوشش کی تھی۔ اس وقت میرے ڈاکو بھائی نے یہ نہیں سوچا کہ اب میری زندگی کا ساتھی کوئی ڈاکو ہی ہو سکتا ہے۔ شریف آدمی کہاں سے آئے گا اور کیوں آئے گا میرا ہاتھ مانگنے ادھر بھی میں شادی شدہ تھی۔"

"اتنا خیال تھا تمھیں؟" میں نے نرمی سے کہا۔

"دو سال کے بعد تم تنسیخِ نکاح کی درخواست دے سکتی ہو۔" رابعہ نے فوراً قانونی مشورہ دے کر بات بنائی۔ "قانوناً سات سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے کسی کو لاپتا قرار دینے کے لیے مگر ایک بات تو بتاؤ، وہ جو تمھارا شوہر بنا تھا، اس کا نام کیا تھا؟"

"عبداللہ۔" گل بانو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

مجھ پر اس نام کا ردعمل شدید ہوا یا رابعہ چونک پڑی تو یہ ایک قدرتی بات تھی۔ میرے ذہن میں فوراً حاجی عبداللہ کا خیال آیا۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا۔ دنیا میں ہزاروں عبداللہ ہوں گے۔ اُن میں بدمعاش، اسمگلر، چور، ڈاکو، قاتل بھی ہوں گے۔ ضروری تو نہیں کہ یہ وہی عبداللہ ہو مگر ایسا بعید از قیاس بھی نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں عبداللہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرتا میں نے محسن کو اور اس سے چند قدم پیچھے کریم بلوچ کو آتا دیکھا۔ وہ شاید موٹر بوٹ کہیں اور چھوڑ کے آئے تھے۔

کریم بلوچ نے سر پر ایک ٹوکری اٹھا رکھی تھی۔ اس کا وزن بھی کافی معلوم ہوتا تھا۔ لانچ پر آنے کے بعد اس کے لیے توازن برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اور ٹوکری نیچے لے جانے میں مدد دی۔ ٹوکری میں [illegible] سب تھا جو میں نے منگوایا تھا مگر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ کپڑوں کے نیچے ایک ایف ایم ہینڈ ریسیور تھا اور ایک شارٹ ویو ٹرانسمیٹر، بیٹری اور متعلقہ سامان۔ سب سے اوپر کھانے پینے کا سامان۔ ایک شاہانہ ضیافت

کا پورا اہتمام۔

میں جب پھر اوپر آیا تو محسن خان میری جگہ آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے اور گل بانو ہنس رہی تھی۔ معلوم نہیں کس بات پر۔ اس کے مقابلے میں محسن نہایت سنجیدگی سے شرما رہا تھا۔

"کیا ہوا، چارلی بلا؟" میں نے اس کی خوفناک نقلی مونچھیں ہلا کے کہا۔ "یہ مردوں کا زیور کہاں سے لیا؟"

رابعہ کھلکھلا کے ہنسی۔ "یہی تو میں نے بھی پوچھا تھا۔"

"اب میں مونچھوں کے بارے میں عرض کروں یا چارلی چپلن کے متعلق بتاؤں؟" محسن جھلا کے بولا۔ "سب بھی بھی کر رہے ہیں جیسے مونچھیں نہیں، گدھے کے سینگ ہیں۔ تم مس ناگ منی . . ."

"اے، خبردار جو میری بہن کو پھر اس نام سے پکارا۔ گل بانو ہے اس کا نام۔" رابعہ نے اسے ڈانٹا۔

محسن بھونچکا رہ گیا۔ "بہن! گل بانو . . . یہ کیا ڈراما ہے خاتونِ اول؟"

"بعد میں پتا چلے گا۔" میں نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ غالب ملا؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "اُس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔"

"تو پھر اتنی دیر رات کے دس بجے تک آپ کہاں جھک مارتے رہے؟" رابعہ نے کہا۔

"کیا وہ آیا ہی نہیں؟" میں نے کہا۔

"آیا تو تھا ٹھیک وقت پر۔" محسن بولا۔ "مگر میرے پاس نہ رکا نہیں۔ غالباً اس کو اندیشہ تھا کہ اسے دیکھا جا رہا ہے، کوئی اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہا ہے چنانچہ وہ میرے قریب سے بھی نہیں گزرا۔ خاصے فاصلے پر تھا وہ جب اس نے وہ کے ٹو کی خالی ڈبیا نکال کر ایک طرف پھینک دی تو میں سمجھ گیا کہ دال میں خاصا کالا ہے۔ میں نے اسے جانے دیا اور اس خالی ڈبیا پر نظر جمائے کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد میں ٹہلتا ہوا آگے بڑھا۔ اسی وقت ایک بھوارن نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں تھی جھاڑو اور کمر پر ٹوکری۔ اس نے وہ ڈبیا اٹھائی اور ٹوکری میں ڈال لی۔ اب میں اس کے پیچھے تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کو کیسے روکوں اور اس سے وہ خالی ڈبیا کیسے مانگوں۔ یہ امید تھی کہ کہیں تو کہیں وہ کوڑا پھینکے گی۔ اس کے پیچھے پیچھے کافی

خوار ہونا پڑا۔"

"کتنی کیسی؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

گل بانو بے اختیار ہنسی۔ محسن بگڑ گیا۔

"تم لوگ سیریس نہیں ہو۔ وہ سال تھی پچاس پیسے کی گڑھیا۔"

"نکالی نہیں؟" گل بانو نے انگلی کے اشارے سے کہا۔

محسن ایک بار پھر بھنا کا رہ گیا۔ "یا مظہر العجائب . . . یہ کیا ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا۔"

"پھر وہ ڈبیا ملی؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"ہاں ملی آدھے گھنٹے بعد کوڑے کے ڈھیر سے۔" محسن بولا۔ "میں نے اسے غور سے دیکھا اور پھر کھول کے پھاڑا۔ اس کے اندر غالب نے لکھا تھا۔ لو تم بھی دیکھ لو۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے گتے کا وہ ٹکڑا نکالا جس کے پیچھے کے ٹو کی تصویر تھی۔ اس پر لکھا تھا۔

"زیرو اوور۔ ایف ایم ون ڈبل زیرو۔"

میں نے پیغام کا مطلب فوراً سمجھ لیا۔ "پھر تو بازار سجا گیا؟"

"نہیں۔ میں نے کریم بلوچ سے کہا۔ اس نے مجھے ایک بندے سے ملوایا جو پورٹ کے علاقے میں چوری کے مال کا سب سے بڑا بیوپاری ہے۔ جہاز کے بے ایمان ملازم جو کچھ پار کر سکتے ہیں اسے آدھے پونے بیچ جاتے ہیں۔ آگے اُن سے مال خریدنے والے بہت ہیں، کیونکہ جہازوں پر سب فارن آئٹم ہوتے ہیں۔ اسی کی معرفت یہ شارٹ ویو ٹرانسمیٹر اور بیٹری وغیرہ ملے۔"

"کھانا بھی فارن ہے۔ اسی سے ملا؟" محسن نے کہا۔

"ہاں، کھا کے دیکھو مس ناگ منی! سوری گل بانو۔ یہ دونوں تو ہیں میری جان کے دشمن، تم ہی پوچھ لو کھانے کو۔ ظاہر ہے تم نے بھی میرے بغیر کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ جا کے دیکھو میں تمھارے لیے کیا کچھ لایا ہوں۔"

ناگ منی کا چہرہ دمک اٹھا۔ آج محسن سے ایسی نیاز مندی اور ایسی محبت بھرے ڈائیلاگ سننے کی امید نہیں تھی۔ وہ ایک دم اٹھی اور نیچے چلی گئی۔

"یہ تم اوور ہو گئے۔" میں نے کہا۔ "حد سے بڑھ گئے۔"

"تب مجھے بتاؤ غالب نے کیا کہا؟ پیغام کیا تھا اُس کا؟"

بالو تو خیریت سے ہے؟" رابعہ نے کہا۔

"یہ سب تو معلوم ہو گا۔ لیکن آدھی رات کے بعد۔ ڈیڈ آور کا مطلب ہے رات بارہ بجے۔" میں نے اُس سگریٹ کے پیکٹ کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ایف ایم بینڈ پر میگاہرٹز پر ہم اُس سے بات کر سکتے ہیں۔"

"براہِ راست؟" رابعہ نے مسرت سے کہا۔ "مگر کیسے؟"

"یہ سائنسی سوال ہے۔ قانون کی کتابوں میں اس کا جواب ہوتا تو ہم بتاتے۔" محسن بولا۔ "آپ کی زنانہ عقل کی ریچ اتنی زیادہ نہیں ہے۔"

"تم جیسے مرد ہی جب لاجواب ہوں یا بات کو ٹالنا چاہیں تو انھیں عورت کو ناقص العقل قرار دینے کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"مجھے بھی کچھ نہیں سوجھ رہا ہے چکن اور بریانی کے سوا، جو میں ساتھ لایا ہوں۔ لو، وہ آ گئی گل بہار لے کے سامانِ بہار۔"

"گل بانو۔" میں نے تصحیح کی۔

کھانا بہت مدت کے بعد مل بیٹھ کے اور سکون سے میسر ہوا تھا چنانچہ سب کی بھوک چمک اٹھی تھی۔

میں نے کھاتے کھاتے کہا۔ "یار، یہ تو سب اسپیشل ڈشز ہیں۔"

محسن نے کہا۔ "ہاں، انتخاب بھی کریم بلوچ کا ہے۔ اس نے ہی بتایا تھا کہ کیا کہاں سے لینا ہے اور پھر سب خود ہی لیا۔ آج کی دعوت کریم کی طرف سے ہے۔"

"وہ کس خوشی میں؟" رابعہ نے کہا۔

"اس کی شادی جو ہو رہی ہے۔" محسن نے کہا۔

"دولہا ابھی بنا نہیں، ولیمہ پہلے کھا لیا۔" میں نے کہا۔

"وہ بھی ہو جائیں گا صاحب۔ ولیمہ بھی ہو جائیں گا۔" وہ واثق انداز میں بولا۔ "آپ کا مہربانی سے ہمارا سب پیسہ وصول ہو گیا۔ ورنہ وہ تو ہم کو لوٹ لیا تھا۔"

"تمھاری اپنے خسرِ محترم سے بات پکی ہو گئی؟"

"کیسے نہ ہوتا صاحب۔ آپ موشی میاں کو بولا تھا کہ ایک ہفتے میں شادی بناؤ ورنہ کورٹ چلو۔" کریم نے کہا۔ "وہ بڈھا کو بولا کہ اگر تم مشترن کا رشتہ کریم سے نہیں کرے گا تو سب کورٹ چلو۔"

"کورٹ؟" ... نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور بڈھا بولا کورٹ کیا؟ تو موشی میاں بولا کہ جب تم اور ہم سب کورٹ ہو جائیں گا تو پتا چل جائے گا۔ کریم کا ماما آیا تھا اور وہ میں بولتا تھا کہ سب کو کورٹ کریں گا۔ بولتا تھا سارا آدمی کورٹ کر چکا ہے۔ بس بڈھا تو ایسا کانپتا تھا صاحب، جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ اُس کا حال خراب ہو گیا۔ بولا کہ بابا میرے کو منظور۔ میرے باپ کو منظور۔ ہزار بار منظور۔ تم ابھی لے جاؤ کل لے جاؤ۔ ہم بولا کہ ایسا کیسے لے جاوے۔ بکرا منڈی سے بکرا خریدنے آیا ہے ہم کہ تم کان پکڑ کے ہمارے حوالے کرتا۔ پہلے مشتری کا مہر جہیز کا مسئلہ ہو گیں گا، پھر ہم بارات والا لائیں گا، باجا گاجا کے ساتھ اور پھر ہمارا سو پارا کھائیں گا۔ پھر کورٹ کریں گا۔" "وہ کیا..." "کورٹ شادی کریں گا۔"

ہنستے ہنستے ہم سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رات کے گیارہ بجے محسن نے مواصلاتی رابطے کا اسباب جمع کیا۔ اس نے ٹرانسمیٹر کو بیٹری سے جوڑا۔ اس کے بارے میں وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کی رینج کیا ہو گی۔ اس نے لانچ کے سب سے بلند حصے پر ایک بانس کے ساتھ ایریل کا تار باندھا اور مجھے بتایا کہ ایریل جتنا بلند ہو گا اتنی ہی دور تک آواز سنی جائے گی اور صاف بھی ہو گی۔

"یہ نہ ہو کہ دوسرے جہازوں پر بھی سنی جائے؟"

"سنی تو جائے گی۔" محسن بولا۔ "یہ ریڈیو کی لہریں ہیں، ان کو فضا میں پھیلنے سے کیسے روکا جا سکتا ہے۔ لیکن ہزار میں ایک چانس بھی نہیں کہ عین اس وقت کوئی اپنے ریسیور کو بالکل اسی فریکوئنسی پر ٹیون کیے بیٹھا ہو جس پر ہم بات کر رہے ہوں۔ ہر جہاز پر ریڈیو سگنل ایک الگ فریکوئنسی پر موصول ہوتے ہیں، وہ اسی کو ٹیون کیے بیٹھے رہتے ہیں۔ اسے چھوڑنے کا مطلب ہو گا کہ جو پیغام اُن کے لیے ہیں وہ انھیں نہیں ملیں گے۔ یوں سمجھ لو کہ ریڈیو پر دنیا بھر کے اسٹیشن آتے ہیں، جسے جو سننا ہے وہ سوئی کو ایک ہی جگہ رکھے گا۔ بلانے کا تو بہت کچھ سننے کا شوقین ہو گا اپنا اسٹیشن نہیں سن سکے گا۔"

"اچھا اچھا۔ مجھے کوئی شوق نہیں ریڈیو انجینئر بننے کا۔ تو یہ بتا کہ غالب نے وہاں کیا چکر چلایا ہو گا۔ میرا مطلب ہے کہ اس جہاز پر اسے وائرلیس کے آلات حاصل کرنے کا موقع کیسے ملا۔ ریڈیو ریسیور اور ٹرانسمیٹر وہ کہاں سے لایا اور چھپ کر کیسے استعمال کرے گا؟"

"یہ سوالات تو مجھ سے کیوں کر رہا ہے؟ اسی سے پوچھنا۔"

"کیا گفتگو خواتین کی موجودگی میں ہو گی؟" میں نے کہا۔

"کیا حرج ہے، ہم سب تو ایک ہیں۔ اجنبی تو صرف

ڈاکو کی بیٹی ہے۔"

"اُس کا باپ ایک شریف آدمی تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر ڈوب جائے تو اُس کو ڈاکو کی بیوی کہہ سکتا ہے۔"

"بیوی! میرا خیال تھا کہ وہ مس تانگ ٹنی... مودی، مس گل بانو ہے۔" محسن نے کہا۔

"وہ مسز عبداللہ ہے۔" میں نے کہا۔

محسن نے میری طرف یوں دیکھا جیسے وہ اس مذاق کو سمجھنے سے قاصر رہا ہو۔ پھر مجھے سیریس دیکھ کر اُس نے کہا۔ "مسز عبداللہ! کون عبداللہ؟"

"عبداللہ کے معنی ہیں اللہ کا بندہ۔" میں نے کہا۔ "ابھی یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے کہ وہ کون عبداللہ ہے۔ ہم فی الحال اپنے حاجی صاحب کو خارج از امکان نہیں سمجھتے۔ بلحاظ صفات گل بانو کا سابق شوہر، جو عرصہ پانچ سال سے لاپتا ہے، ایسا ہی تھا جیسا حاجی۔ یہ معاملہ تصدیق طلب ہے۔ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔"

"ہاں، بارہ بجنے والے ہیں۔" محسن بولا۔ "میں ان آلات کو چیک کر لوں۔"

اُس نے ٹرانسمیٹر اور ریسیور کو باہم منسلک کیا۔ الیکٹرانکس میں وہ شروع سے گہری دلچسپی رکھتا تھا اور ہمارے ساتھ آنے سے پہلے اپنی فیلڈ میں تجربات کرنے کے مواقع بھی بہت ملے تھے۔ یہ اُس کے لیے بہت معمولی کام تھا۔

ایف ایم بینڈ پر ادھر اُدھر کے بہت سے سگنل موصول ہو رہے تھے۔ بیشتر سگنل مورس کوڈ میں تھے لیکن کہیں کہیں دو ریڈیو آپریٹرز کی گفتگو بھی سنائی دے جاتی تھی جس کا تعلق بحری جہاز کے اپنے مسائل سے ہوتا تھا۔ موسمیاتی رپورٹ، سمندر کا حال، تجارتی خبریں۔ قریب کی آواز صاف اور واضح سنائی دیتی تھی۔ جو لہریں دور سے آتی تھیں مشکل سے سنا جاتا تھا۔ صرف ایک جگہ دلچسپ گفتگو سننے کو ملی۔ یہ بالکل ٹیلی فون پر سنائی دینے والی کراس ٹاک کی طرح تھی۔

"تم نے اُلّو بنایا مجھے چپ بیٹھنے تک۔"

"میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔"

"تم تھاری ہی ہو خود کو۔ کیا ہے اُس کالے چیرمچ کے پاس تمھیں دینے کے لیے ... گندا ... بگ ... ہے۔"

"تم بھی تو ٹھیک لگتے ہو لو اور جو کچھ وہ دے رہا ہے مجھے۔ تم ان چیزوں کے خواب دیکھ سکتے ہو۔ تم ایک ہزار کماتے ہو، اُس کی آمدنی دس گنا ہے، کار ہے، اس کے پاس کوٹھی ہے۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ایک طوائف ہو۔"

"کیا کوئی عورت ہے جو یہ سب نہ مانگتی ہو؟ ایسے تو ہر عورت طوائف ہو گئی اور مرد کیا ان چیزوں کے پیچھے نہیں بھاگتے۔ کیوں زیادہ پیسہ کمانے کے لیے چوری، اسمگلنگ اور رشوت کا راستہ اختیار کرتے ہیں؟"

"تم بھی سچے اور وہ بھی سچی۔" محسن نے بآوازِ بلند کہا۔ "اب تو لیلیٰ بھی مجنوں کا گریڈ پوچھتی ہے اور مجنوں معلوم کرتا ہے کہ لیلیٰ کو جہیز میں کیا ملے گا۔ محبت الگ مسئلہ، شادی الگ مسئلہ۔"

"یہ کون ہے؟ بدتمیز۔" عورت نے کہا۔

"کوئی سن رہا تھا مسٹر۔ میں اب زمانے کو سناؤں گا اور تم بھی سن لو کہ اب میں بھی بہاؤ کے فروخت ہوں۔ میں اس ٹھیکے دار کی موٹی کالی بھینس سے شادی کروں گا۔"

"شاباش بیٹے۔ عقل آ گئی تمھیں۔" محسن بولا۔

"چل یار، چھوڑ انھیں۔" میں نے کہا۔ "بارہ بجنے والے ہیں، دو منٹ رہ گئے ہیں۔"

محسن نے ایف ایم بینڈ پر سو میگاہرٹز کے قریب ٹیوننگ کی کوشش جاری رکھی۔ صحیح فریکوئنسی معلوم نہ ہونے کے باعث وہ اٹھانوے اور ایک سو دو میگاہرٹز کے درمیان بھٹکتے ہوئے غالب کی آواز سننے کے لیے کان لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اب رابعہ اور گل بانو بھی آ گئی تھیں اور میں نے انگلی کے اشارے سے انھیں خاموش بٹھا دیا تھا۔ رابعہ کے چہرے پر امید، اشتیاق اور فکرمندی کے جذبات کا ہر رنگ بہت واضح تھا۔

میں نے بے چینی سے گھڑی دیکھی۔ بارہ بج کے ساڑھے تین منٹ ہو گئے تھے۔ محسن بڑے انہماک سے غالب کی آواز کو اجنبی آوازوں میں تلاش کر رہا تھا۔ اور وہ سوچ میرے دل میں مایوسی کے ساتھ احساسِ عدم تحفظ پیدا کر رہے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ رابطہ قائم کرتے ہوئے پکڑا جائے۔ دشمن کے قلعے کے اندر بیٹھ کر جاسوسی کرنا آسان نہ تھا۔ موافق و مناسب ہونے کے بعد بھی ایسی کوشش ناکام کے نتائج تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ دونوں مصیبت اور عذاب میں گرفتار ہو جائیں گے بلکہ یہ ہمارے پورے مشن کے حق میں برا ہو گا۔ تفتیش کرنے والے ان سے سب اگلوا لیں گے...

paksociety.com

"چارلی..." میں نے ایک لفظ سنا اور خیالات کا تسلسل ایک جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ یہ آواز غالب کی تھی۔

محسن کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس نے پھر وہیں ٹیون کیا
"ہیلو سے۔ ٹو... چارلی ہیئر... ڈو یو ریڈ...؟"

"راجر!" کسی نے کہا۔ "لاؤڈ اینڈ کلیئر... چارلی ڈو یو ریڈ می؟"

"لاؤڈ اینڈ کلیئر" غالب کی آواز آئی۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم محفوظ ہو؟" محسن نے کہا۔

"کوئی تمہیں دیکھ یا سن تو نہیں رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ جہاں تک مجھے یقین ہے۔" غالب نے کہا۔

"نازو از او کے؟" رابعہ نے کہا۔

"تم؟" غالب شاید رابعہ کی آواز پہچان کر سخت حیران ہوا تھا۔

"ہاں میں۔" رابعہ نے ہنس کے کہا۔ "نازو سے بات ہو سکتی ہے؟"

"نہیں، میرے پاس بھی وقت کم ہے۔" غالب نے کہا۔

"تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی تھی؟"

"نہیں سب پلان کے مطابق رہا۔ تم گئے تھے؟"

"نہیں، ہم گرفتار ہو گئے تھے۔" محسن نے کہا۔ "بلال کا نام حاجی عبداللہ۔"

"لیکن وہ سب قدرت کی طرف سے ایک انتظام تھا رابعہ کو پھر ہم سے ملوانے کا۔" میں نے کہا۔ "واپسی پر معلوم ہوا کہ جہاز کی روانگی ملتوی ہو گئی۔"

"ہاں جہاز میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔"

"سنا ہے خرابی کسی تخریب کاری کا نتیجہ تھی۔"

"میں نے تو نہیں سنا۔" غالب نے کہا۔

"یہ بھی سنا تھا کہ بمبئی سے دوسرا جہاز آئے گا اور اسباب اس پر منتقل کیا جائے گا۔"

"یہ افواہیں پھیلائی گئی ہوں گی۔"

"پھر... کیا اب یہی جہاز جائے گا؟" میں نے کہا۔
غالب نے جواب دیا۔ "ظاہر ہے۔ خرابی معمولی تھی، دور ہو گئی۔"

"روانگی کا اب کیا پروگرام ہو گا؟"

"کل رات کسی وقت۔"

"تم سے پھر رابطہ ہو گا؟" میں نے کہا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چانس ملنے پر ہے۔" وہ بولا۔

"یہ چانس کیسے ملا؟"

"نازو کی بدمعاشی سے۔" غالب نے کہا۔

"کیا؟ کیسی بدمعاشی... مار دھاڑ... زبردستی..."

"نہیں یار۔ ریڈیو روم کے عملے میں تین افراد ہیں۔ ایک ریڈیو آفیسر اور دو ماتحت۔" غالب نے کہا۔ "اس نے ریڈیو آفیسر کو پھنسا لیا ہے۔ ماتحت تو شہر گئے ہوئے تھے۔ کام جو نہیں ہے آج کل۔"

"ریڈیو آفیسر کون ہے؟"

"ہے ایک اُلو کا پٹھا، کاٹھ کا اُلو۔" غالب نے خفگی سے کہا۔ "اس وقت بھی نازو اسی کے ساتھ ہے۔ اسی کے کمرے میں کافی پی رہی ہے۔"

"لگتا ہے تم خاصے پریشان ہو۔" محسن بولا۔ "ارے بھائی اس عورت ذات کا کوئی بھروسا نہیں۔ کھیل ہی کھیل میں تمہارا پتّا نہ کٹ جائے۔ تمہارا یہ رقیب روسیاہ۔"

"وہ تو گورا چٹّا لونڈا ہے۔ ہیرو ٹائپ بلکہ ہیروئن ٹائپ۔" غالب نے کہا۔ "سالا البتہ خبطی ہو گیا اور نازو ایک بدمعاش۔ اس کو ڈال دیا چکر میں۔ کہنے لگی کہ سنا ہے تم کافی بہت اچھی بناتے ہو۔ پلاؤ گے نہیں؟ آج یہ بولا تو اس نے کہا تم شرف میزبانی تو دو۔ چنانچہ وہ مہمان بن کے گئی ہے۔ ایسی بے شرمی کا مظاہرہ کیا ہے۔"

"میزبان پر اللہ رحم کرے۔" رابعہ نے کہا۔

"وہ اپنی حفاظت کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم فکر مت کرو۔ یہ بے شرمی وغیرہ سب کچھ نہیں، صرف اداکاری ہو گی اس کی۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" غالب نے کہا۔ "جب جہاز روانہ ہو گا تو ایک آپریٹر ڈیوٹی پر رہے گا۔ پھر دیکھو موقع کب ملتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے ڈاکٹر جھنجھلانی اور اس ریڈیو آفیسر میں سے ایک رہے گا۔ دونوں کو اس نے ہزار جان سے فریفتہ کر لیا ہے۔"

"گویا دو ہزار جان سے۔" محسن بولا۔

"اچھا اب سنو میری بات۔" غالب نے کہا۔ "مجھے ایک کارآمد بات معلوم ہوئی ہے۔ آج رات کو لانچ سے کچھ اور مال پہنچ رہا ہے جو یہاں لوڈ ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ جہاز کی خرابی بہانہ تھی۔ اسی لیے افواہیں پھیلائی گئی ہوں گی۔ یہ سامان دوسرے راستے سے اندر آئے گا اور کل جہاز

میں جہاز پر چڑھایا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم نگاہ رکھیں گے۔" میں نے کہا۔

"تم لوگ جہاز کے زیادہ قریب مت آنا۔" غالب نے کہا۔ "اس کے عرشے پر تاریکی میں دیکھنے والے تصویریں اُتار لینے والے کیمرے ہیں۔ محافظوں کے پاس جو رائفلیں ہیں ان پر بھی اندھیرے میں نشانہ لینے کے لیے دوربین ہے۔"

"فکر مت کرو۔ ہم دور رہیں گے۔"

"اسی جگہ اپنا ریسیور آن رکھنا۔ مگر صرف سنتے رہنا۔ تمہیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ بس بولنے کی غلطی مت کرنا ورنہ انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کسی نے اس فریکوئنسی کو پکڑ لیا ہے۔ وہ فریکوئنسی بدل دیں گے۔"

"ہم چار آدمی ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"چار کون؟ تم دونوں، رابعہ اور کریم؟"

"ہاں... تین بھی ہو سکتے ہیں اور پانچ بھی۔ مگر تم ہمیں یہ تو بتاؤ کہ ہم کس طرف سے آئیں؟"

"کون ہے اندر؟" کسی نے بلند آواز میں کہا اور ہم نے ایک دھماکا سنا جو دروازہ اچانک کھولنے کی وجہ تھی۔ پھر اسی آواز نے کہا "تم... یہاں...! او وہ مائی لارڈ۔ یہ سیٹ بھی آن ہے۔ یو فول! مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے ورنہ میں گولی مار دوں گا تمہیں۔"

اس کے ساتھ ہی ہمارے ریسیور میں سناٹا رہ گیا۔
دوسری جانب سے ٹرانسمیٹر آف کر دیا گیا تھا۔ ہم سب ایسے بیٹھے رہ گئے جیسے ہم سب چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔ چشم تصور سے ہم نے غالب کو لاجواب اور بے بس، اعتراف جرم پر مجبور اور پریشان دیکھا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔" بالآخر رابعہ نے کہا۔

"اتنی لمبی بات ہو گئی تھی۔ یہ غلطی ہم نے بھی کی۔" محسن نے کہا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "صرف کام کی بات کی جا سکتی تھی۔ غالب نے رسک لیا۔"

"کیا یہ ریڈیو آفیسر خود تھا؟" رابعہ نے پوچھا۔

"ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "جہاز کا کپتان بھی ہو سکتا ہے جو آ دھمکا۔"

"غالب کا کیا ہو گا؟" رابعہ نے [illegible] کہا۔

"کیا کرے گا؟" میں نے کہا۔ "ہم ہوتے تو کیا کرتے؟ [illegible] کے لیے خدا اسے بچائے تو بچائے۔"

رات کا باقی حصہ میں نے سونے کی کوشش میں کروٹیں بدلتے ہوئے گزارا۔ رابعہ اور گل بانو بھی آنکھیں بند کیے ہوئے پڑی تھیں۔ پھر میرے ساتھ لیٹا ہوا محسن اٹھا اور عرشے پر چلا گیا۔ ہم نے بہت دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کی تھیں اور بہت سے سوالات پوچھے تھے جو سب کے ذہن میں تھے مگر ان کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ پھر خاموشی کا ایک طویل عرصہ آیا تھا جس میں سب نے فرض کیا تھا کہ دوسرے سو رہے ہیں۔

محسن کے جانے کے چند منٹ بعد گل بانو اٹھی اور دبے پاؤں اوپر چلی گئی۔ میں اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ کیا یہ لڑکی کل تک اپنی زندگی میں آنے والے اتنے بڑے انقلاب کی خواہش بھی کر سکتی تھی لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ تبدیلی چاہتی تھی، بہتری کی آرزومند تھی اور اپنی زندگی کے ان معمولات سے فرار کی تمنائی تھی جس میں قتل و خونریزی، ڈاکے اور اغوا، قانون شکنی اور سزا کے خوف سے مسلسل بھاگتے رہنا شامل تھا۔ کون عورت ہے جو ایک گھر نہیں مانگتی، خصوصاً اس عمر میں اور ایسے حالات میں اور اس حسن و شباب کی ملکیت کے ساتھ۔ گھر، شوہر اور بچے مل کر اس حصار کے تین اضلاع ہوتے ہیں جس میں عورت کی ساری خوشیاں آباد ہوتی ہیں لیکن اس حصار کی تکمیل وہ خود چوتھا ضلع بن کے کرتی ہے اور پھر اسی حصار میں ہنسی خوشی عمر گزار لیتی ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ گل بانو نے بہت جلد اپنے ماضی کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ اس میں یقیناً اسی لاشعور کی خواہش کو بھی دخل تھا۔ چنانچہ جب موقع ملا تو اس نے مستقبل کے لیے وہی راستہ اختیار کرنے میں دیر نہیں کی جو حادثات وقت کی آندھی میں کھو گیا تھا۔ اس نے بھائی کا غم بھی بھلا دیا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ ایسا کبھی نہ کبھی تو ہونا ہی تھا کیونکہ یہ سلامتی کا راستہ کبھی نہ تھا۔ وہ... خوش قسمت تھی کہ بدقسمتی سے زندہ رہی مگر سب سے بچھڑ کر۔ ماں باپ، بھائی بہن مر گئے۔ اس نے سب غم سمیٹے۔

"سکندر!" رابعہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ میرے قریب دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھی ہوئی تھی۔

میں اٹھ بیٹھا۔ "تمہیں بھی نیند نہیں آ رہی ہے؟"

"نیند کسے آ رہی ہے؟" وہ بولی۔ "وہ دونوں اوپر بیٹھے ہیں۔"

"ہاں، محسن پھر چلا گیا تنہائی میں۔"

"گل بانو سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔" وہ بولی۔

www.paksociety.com

"جب اُسے حقیقت کا علم ہوگا تو کیا یہ چیز باقی ماندہ اس کے اعتماد کی بنیاد کو نہیں ہلا دے گا؟ وہ اعتماد جو اُس نے ہم پر کیا کہ ہم اُسے باعزت مستقبل دیں گے۔ ہم نے بھی اُسے سب سے پہلے دھوکا دیا۔"

"تم کیا چاہتی ہو؟ ہم اُسے ابھی اسی وقت بتا دیں کہ محسن سے سہارے کی اُمید نہ رکھے؟" میں نے کہا۔ "محسن سے کہیں کہ وہ گل بانو کا ہاتھ جھٹک دے اور اُسے کہہ دے کہ میں تو شادی شدہ ہوں، مجھے معاف رکھو۔ نہیں رابعہ! ابھی یہ ممکن نہیں۔ بعض اوقات جھوٹ بھی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتا ہے اور سچ بولنا جرم ہو جاتا ہے۔ ہم پہلے اسے ماضی کی دلدل سے نکال کے اس قابل بنائیں گے کہ وہ اعتماد کے ساتھ قدم جما کے اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے۔ کسی سہارے کے بغیر یہ ناممکن ہے اور اگر آج وہ محسن سے سہارا مانگتی ہے تو محسن کا فرض بنتا ہے کہ اس کی دستگیری کرے۔"

"کیا وہ ہمارے ساتھ جائے گی؟"

"مجھے تو تمھارے بارے میں بھی سوچنا پڑے گا۔"

"کیا سوچنا پڑے گا؟" وہ برہمی سے بولی۔

"یہ ایسا سفر نہیں ہوگا جس میں خواتین کو ساتھ رکھا جائے۔ اس سے ہماری ذمے داری اور مشکلات میں اضافہ ہوگا۔ یہ ایک انتہائی پُرخطر مہم ہے۔ اس میں تم ہماری کوئی مدد نہ کر سکو گی۔ تم دونوں کو ہم اکرام شیخ اور موہنی کے سپرد کر کے جا سکتے ہیں۔ وہ نہ ملے تو ڈاکٹر انوار احمد خان بھی ملنے والا ہے۔ تم واپس لاہور جا کے شہلا کے ساتھ یا منظر کے گھر میں رہ سکتی ہو۔"

اُس نے اندھیرے میں میرا ہاتھ تھام لیا۔ "سکندر! پلیز، ایسا مت کرنا۔ میں تم کو چھوڑ کے کہیں نہیں جا سکتی۔" رابعہ کا نرم اور گداز ہاتھ بالکل سرد تھا۔ میں نے اُسے اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان رکھ لیا۔ "رابعہ! میری جان، سمجھنے کی کوشش کرو، عقل سے کام لو۔"

"عقل سے کام لیتی تو تمھارا ساتھ ہی کیوں دیتی؟"

"تم میری خاطر بھی یہ نہیں کرو گی۔ اگر میں کہوں کہ یہ میری خواہش ہے، میری درخواست ہے یا میرا حکم ہے تب بھی انکار کرو گی تم؟"

وہ کچھ نہیں بولی، مگر شدتِ جذبات سے سلگتے اور آتش سوزِ غم سے دہکتے ایک قطرۂ اشک نے میرے ہاتھوں کو چھوا۔ میں نے اُس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا اور آہستہ آہستہ اُس کے بالوں کو سہلاتا رہا۔ آنسو اب میرے شانے پر اُترنے لگے۔

"تم کیا چاہتے ہو سکندر؟ یہ کہ ایک دن انتظار کی طویل صدیوں کا عذاب کاٹنے کے بعد مجھے تم سے ملا ہو کر تم نے میری ساری زندگی کو ایک لاحاصل پشیمانی کے سوا کچھ نہیں دیا؟ تمھیں احساس ہو کہ رابعہ بزدل اور بے وفا تھی کہ انتظار بھی نہ کر سکی۔ تمھارے آنے سے پہلے ہی موت آگئی۔۔۔"

"تم پر ڈیپریشن کا دورہ پڑا ہے۔" میں نے کہا۔

"ایسے ہی کسی دورے میں اگر میں نے خود کو ہی ختم کر لیا تو مجھ سے گلہ مت کرنا۔ تمھارے ساتھ رہ کے میں حالات کا مقابلہ بھی کر سکتی ہوں اور خطرات کا بھی۔ مرنا ہوگا تو ساتھ مر جائیں گے لیکن میں تمھیں اس کی اجازت نہیں دوں گی کہ تم مجھے اکیلے جینے کی سزا دو اور یہ بھی نہیں سوچ سکتی کہ تم اکیلے رہ جاؤ۔"

"یہ اچھی زبردستی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہے زبردستی۔" وہ بولی۔ "تمھیں معلوم ہے یہ گل بانو، جو کل ہمارے ساتھ آئی ہے، وہ بھی تیار نہیں اکیلی رہنے کو۔"

"تم نے کہا تھا اس سے؟"

"پوچھا تھا کہ تم کہاں رہو گی، ہم تو شاید چلے جائیں۔ وہ کہنے لگی کہ میں ساتھ آئی ہوں تو ساتھ ہی رہوں گی۔ میرا کون بیٹھا ہے یہاں۔ میں نے سمجھایا تھا کہ ہمارا کام بہت خطرناک ہے تو کہنے لگی کہ کیا مجھ سے زیادہ خطرات دیکھے ہیں تم نے؟ تم خود کو کیا بہادر سمجھتی ہو۔ کیا میں ڈرتی ہوں موت سے؟"

"یہ تو بہت مشکل ہو جائے گی۔" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ محسن سے یہی بات منوانے گئی ہے۔" رابعہ نے کہا۔

اوپر سے گل بانو کے چیخنے کی آواز آئی۔ "چھوڑ دو، چھوڑ دو مجھے۔ کمینے، کتے کے بچے۔" وہ پھر اپنی پرانی زبان استعمال کر رہی تھی۔ میں گھبرا کے اٹھا اور اوپر کی جانب لپکا۔

"گل بانو!" محسن نے چلا کے کہا۔ "میری بات سنو۔"

جواب میں گل بانو نے چلا کے کہا۔ "ناگ منی ہے میرا نام۔" اُس نے محسن کو ایک اور گالی دی۔

رابعہ کے ساتھ جب میں اوپر پہنچا تو مجھے محسن لانچ کے آخری کنارے پر بے بس کھڑا دکھائی دیا۔ گل بانو نے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے محسن اس کے پیچھے کود گیا۔

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "یہ کیا ڈراما ہو رہا ہے؟" اور ریلنگ پر چڑھ گیا۔

رابعہ نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟ محسن اُسے نکال لائے گا۔"

"پاگل ہو رہی ہو۔ محسن کو تیرنا کہاں آتا ہے؟" میں نے کہا۔ "چھوڑو میرا ہاتھ۔ وہ دونوں ڈوب جائیں گے۔" رابعہ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور اجازت کے انداز میں سر ہلایا۔

دس بارہ فٹ کی بلندی سے میں پستہ قد کے تیل جلے ہوئے کالے کیچڑ جیسے بدبودار پانی میں گرا۔ مجھ سے پہلے ساتھ والی کشتی پر سے کوئی سمندر میں چھلانگ مار چکا تھا، شاید یہ سمجھتے ہوئے کہ لانچ پر سے کوئی پانی میں گر گیا ہے۔ دس پندرہ منٹ کی جدوجہد کے بعد میں اور کریم بلوچ مل کے محسن اور گل بانو کو واپس لانچ پر لانے میں کامیاب ہوئے۔ محسن ہوش میں تھا مگر گل بانو بے ہوش تھی تاہم خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔

مجھے رابعہ کی مدد کی ضرورت تھی مگر رابعہ اب وہاں نہیں تھی جہاں میں اُسے چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے اُسے آواز دی، پھر پیچھے جا کے دیکھا لیکن رابعہ کہیں بھی نہیں ملی۔ میں نے اسٹور، کیبن، باتھ روم، ہر جگہ دیکھ لی۔ میں نے اُسے آوازیں دیں۔ محسن اور کریم بلوچ میرے ساتھ ساتھ اوپر نیچے دوڑتے رہے اور رابعہ کو پکارتے رہے مگر وہ لانچ پر ہوتی تو ملتی۔ میں دیوانوں کی طرح اوپر گیا۔ "وہ ضرور سمندر میں کود گئی ہوگی، میرے پیچھے۔" میں نے کہا اور پھر ریلنگ پر چڑھ گیا۔

محسن نے مجھے نیچے کھینچ لیا۔ "پاگل مت بنو۔ وہ سمندر میں گرتی تو ہم سب نہ دیکھتے اور بھی لوگ دیکھ رہے تھے۔"

میں نے سمندر کی سطح پر نگاہ ڈالی۔ "وہ اور کہاں جا سکتی ہے؟ وہ ڈوب گئی ہوگی محسن۔"

"اُسے تیرنا آتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اوّل تو وہ ایسی حرکت کر ہی نہیں سکتی۔ اور اگر وہ اس پانی میں کودی بھی تو اب تک ضرور نکل آتی۔ یہاں کون سی لہریں ہیں۔"

کریم بلوچ نیچے سے سرچ لائٹ لے آیا۔ اُس نے تیس چالیس گز کے دائرے میں روشنی پھیلا دی۔ میں اب متلاطم پانی کی سطح پر گھاس پھوس، کیچڑ، لکڑی کے ٹکڑے اور کالے رنگ کا تیل دیکھ سکتا تھا۔ ہماری لانچ اور ایک ماہی گیری کی بہت بڑی کشتی کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ پندرہ بیس گز پانی کی اس مختصر پٹی میں رابعہ غائب نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر کریم بلوچ نے سرچ لائٹ سے عرشے کا جائزہ لیا۔ روشنی گیلے کپڑوں میں بے ہوش پڑی ہوئی گل بانو پر سے گزر کے اس مقام تک پہنچی جہاں رابعہ صرف پندرہ منٹ پہلے موجود تھی۔ جہاں اُس نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ میرے سمجھانے پر وہ مان گئی تھی۔ اُس نے مجھے اجازت دے دی تھی کہ میں محسن اور گل بانو کو بچاؤں۔ وہ بالکل ہوش میں تھی۔ اب میں یہ فرض کرنے سے قاصر تھا کہ وہ دیوانگی کی کیفیت میں خود بھی چھلانگ مار دے گی۔

پھر میری نگاہ اس چمکتے ہوئے سفید کاغذ کے پرزے پر گئی جو عین اسی جگہ پڑا ہوا تھا۔ روشنی میں وہ کاغذ کا پرزہ اور نمایاں ہو گیا۔ میں شرط لگا کے کہہ سکتا تھا کہ وہ پرزہ پہلے وہاں نہیں تھا۔

میں نے کاغذ اٹھایا تو وہ ایک کھلا ہوا سفید لیٹر لفافہ ثابت ہوا۔ اس کے اندر سے ہوائی جہاز کا ایک غیر استعمال شدہ ٹکٹ برآمد ہوا جو منسوخ ہو چکا تھا لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس پر رابعہ تاری ایڈووکیٹ کا نام تھا۔ یہ ٹکٹ چھ ماہ قبل خریدا گیا تھا اور اس پر بکنگ آج ہی کے دن کی تاریخ کے لیے کرائی گئی تھی مگر بعد میں سیٹ کنفرم نہیں کرائی گئی تھی۔

میں نے ٹکٹ کو الٹ پلٹ کے دیکھا کہ شاید اس پر کہیں کوئی تحریری پیغام ملے مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ لفافے کے اوپر یا اندر کسی قسم کی کوئی تحریر نہیں تھی۔

"یہ کیا ہے محسن؟" میں نے پریشان ہو کے کہا۔ "رابعہ کے نام پر یہ بمبئی کے لیے ایئر ٹکٹ؟"

محسن نے بھی ٹکٹ کا بغور مطالعہ کیا۔ "یہ تو منسوخ ہو چکا ہے۔"

"وہ تو میں نے بھی دیکھ لیا ہے مگر اس ٹکٹ کی یہاں موجودگی کا کیا مطلب ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا وہ بمبئی چلی گئی؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"پھر رابعہ کہاں گئی؟ اور یہ ٹکٹ کہاں سے آیا؟" محسن نے کہا۔ "اس پر آج ہی کے دن کی تاریخ ہے۔ یہ سب عجیب

www.paksociety.com

بتانے کا مقصد؟"

"مقصد کیا ہوگا؟" محسن نے بے خیالی میں کہا۔

"یہ ایک پیغام ہے سمجھنے والوں کے لیے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ رابعہ کو آج بمبئی جانا تھا لیکن وہ پروگرام میں قدرت کی دخل اندازی کے باعث ہم تک پہنچ گئی۔" میں نے شکستہ دلی سے کہا۔ "حاجی عبداللہ اُسے ایک خاص مقصد کے تحت چاند بھائی کے قبضے سے چھڑا لایا تھا۔ اگر وہ مقصد پورا ہو جاتا تو چاند بھائی عین وقت پر اپنی پوری قوت کے ساتھ حملہ کرتا، حاجی عبداللہ سے سب سونا چھین لیتا اور رابعہ کو بھی واپس لے جاتا۔"

"اُس نے رابعہ سے کہا تھا کہ نصف سونا ہمارے مشن کی تکمیل کے لیے دے گا۔"

"لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ تم کو بھی اُن کے ساتھ جانے کی آزادی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "آخر یہ چاند بھائی رابعہ کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے کیوں اتنا بے چین اور مستعد ہے؟"

"رابعہ بتا چکی ہے کہ وہ دلاور کو اپنے خلاف کرنا نہیں چاہتا۔" محسن بولا۔ "اُسے یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ رابعہ قید میں ہے اور در پردہ وہ ہماری مدد کرنا چاہتا ہے۔"

"یہ سب جھوٹ ہے، بکواس ہے۔ یہ اُس نے رابعہ کو بے وقوف بنانے کے لیے کہا ہوگا۔" میں نے طیش میں چلا کے کہا۔ "اصل بات وہی ہے۔ وہ رابعہ کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہے مگر جانتا ہے کہ اُسے حاصل کرنا اتنا آسان نہیں۔ وہ رابعہ کو دھوکا دے رہا ہے، یہ اُس کے شاطر ذہن کی چال ہے۔ نہیں چاہیے ہمیں ایسی مدد۔"

"اچھا... چیخنے چلانے سے کیا ہوگا؟" محسن بولا۔ "چل یہ گیلے کپڑے بدل لے۔"

میں چلاتا رہا۔ "ہم نے اُس کی لانچ دیکھی تھی۔ وہ حرامزادہ رابعہ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اُس نے ہماری عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا لیا۔"

محسن کی نظر اب گل بادل کی طرف تھی جو اسی طرح تر بتر کپڑوں میں ملبوس بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔

"اس کے کپڑے کون بدلے گا؟" محسن نے جیسے خود سے سوال کیا اور پھر کریم سے مخاطب ہوا۔ "تم کرو یہ کام۔"

"نہیں... صاب ہم کیسے کرے گا... زنانہ لوگ کا کپڑا ہم کبھی بدلی نہیں کیا۔" کریم بلوچ نے گھبرا کے کہا۔

"چلو آرام کرو۔ سمجھو کہ تم ایک ڈاکٹر ہو جیسے ایک مریضہ کی جان بچانی ہے۔ اس کے کپڑے نہ بدلے گئے تو اسے ٹھنڈ لگ جائے گی۔" محسن نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ "اس کی جگہ بیوی ہوتی تمہاری تو؟"

"اچھا صاب۔ یہ بہت مشکل کام بولا آپ۔ ہم کو خیر ہم اپنا آنکھ بند کرے گا۔ پر وہ آنکھ کا ہوتا ہے؟" وہ بولتے جاتے بڑبڑا رہا تھا۔ "وہ پڑا بہن ہے ہمارا مگر... اللہ معاف کر دیوے ہم کو۔"

نیچے جانے کے بعد میں نے لباس بدلا اور سر کو تولیے سے رگڑ کے خشک کیا۔ میرے ذہن میں ایک طرف مایوسی لپٹے ہوئے اذیت پہنچنے کا ڈر رہی تھی تو دوسری طرف حسد کی آگ تھی جو میرے احساس کو جھلسا رہی تھی۔ میرا خون بھی چاند بھائی کے خلاف ایک آتش فشاں کھول رہا تھا۔ آخر وہ کون ہوتا ہے ہمارے معاملات کو اپنے طریقے سے طے کرنے والا۔ اُسے دلاور کی مخالفت سے نقصان کا ڈر ہے اس لیے وہ رابعہ کو اسیر رکھے ہوئے کہ ایک طرف دلاور کو دھوکا دے کا بلکہ دوسری طرف وہ رابعہ کو دھوکا دے رہا ہے۔ دونوں کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ دونوں سے حقیقت کو چھپا رہا ہے۔ کاروباری مفاد بھی عزیز ہے اور رابعہ بھی۔ چاہتا ہے کہ نہ مال ہاتھ سے جائے نہ رابعہ۔ رابعہ کی خوشنودی کے لیے تھوڑی بہت مدد اس نے ہماری جب کر دی تو یہ مدد نہیں رشوت ہوگی۔ مدد بے غرض کی جاتی ہے۔ اگر اُس نے دس بیس لاکھ بھی دیے تو اس کا مقصد رابعہ کو اور مجھے اس بات کا یقین دلانے کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ ہمارا ہمدرد ہے۔ لعنت اس جیسے ہمدرد پر۔ اس کے دل میں کچھ اور ہے۔ پیسہ اس کے لیے گندے ہاتھ کا میل ہے اور اس سے وہ رابعہ کو اور اس کے اعتماد کو خریدنا چاہتا ہے۔ رابعہ پر ظاہر کرتا ہے کہ وہ کتنا محب وطن ہے۔ کتنا فیاض ہے اور کتنا شریف النفس ہے کہ اُس کو تحفظ بھی فراہم کرتا ہے۔ حالانکہ زبردستی رابعہ کو حاصل کرنا ہر وقت اُس کے اختیار میں تھا اور ہے۔ وہ تو جوا کھیل رہا ہے۔ ننانوے فیصد یقین کے ساتھ کہ بالآخر میں مارا جاؤں گا۔ میرا مشن تو موت کا مشن ہے اور خودکشی کے مترادف ہے۔ بکرے کی ماں خیر منائے گی تو کب تک۔ بہرحال میں ایک فیصد بچ بھی گیا تو وہ خود مجھے ختم کرا دے گا۔

محسن جب دوبارہ میرے پاس آیا تو میں بے حد آزردہ، دل شکستہ اور پریشان تھا۔ میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

محسن نے گرم کافی کے دو مگ درمیان میں رکھ کے میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "رابعہ کسی سازش کا شکار ہوئی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے تو نہیں جا سکتی۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہی سؤر کا بچہ چاند بھائی لے گیا اُسے۔"

محسن نے کہا۔ "ہاں، میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ میرا ذہن بھی یہ بات قبول نہیں کرتا کہ کسی طے شدہ پروگرام کے تحت اُس نے اچانک بمبئی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ پاگل ہو جاتی تب بھی ایسا نہ کرتی۔"

"یار، اس ٹکٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ رابعہ کا پروگرام تھا لیکن بیچ میں گڑبڑ ہو گئی اور وہ ہمارے ساتھ آ گئی۔" میں نے کہا۔ "مگر اُس کو ذکر تو کرنا چاہیے تھا ہم سے۔"

"وہ ذکر کرتی اگر اُسے معلوم ہوتا۔" محسن نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ "ایسا تو چاند بھائی نے سوچا ہوگا۔ رابعہ کو اس نے کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ مجھے تعجب ضرور ہے کہ وہ اتنی خاموشی سے رابعہ کو کیسے لے گیا۔ ہم نہیں دیکھ رہے تھے تو کیا رابعہ کو بھی پتا نہیں چلا، وہ لانچ تک آیا کیسے، کسی موٹر بوٹ میں؟ کیا وہ رابعہ کو بے ہوش کر کے اٹھا لے گیا۔ رابعہ آواز تک نہ دے سکی کسی کو۔"

"یار محسن، میں اس چاند بھائی کے ٹکڑے کر دوں گا۔ وہ کیوں اتنی دلچسپی لے رہا ہے رابعہ میں، کیوں اُسے زبردستی ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی نیت خراب لگتی ہے مجھے۔"

"تو پاگل ہو رہا ہے۔"

"ہاں میں پاگل ہو رہا ہوں۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "میں کب پاگل نہیں تھا رابعہ کے خیال سے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا محسن۔"

"یار عقل سے کام لے کیا رابعہ پر بھروسا نہیں تجھے؟"

"اس بھروسے کا میں کیا کروں۔ مجھے رابعہ چاہیے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ میری ہے۔ اُسے میرے ساتھ، میرے پاس ہونا چاہیے۔ کوئی مصلحت کوئی ضرورت ایسی نہیں جس کی خاطر میں رابعہ کی دوری کا عذاب قبول کر سکوں۔ وہ مجھ سے رابعہ کو چھین لینا چاہتا ہے محسن۔"

"رابعہ کو تجھ سے کون چھین سکتا ہے۔" محسن نے پُرخلوص، پُریقین اور پُراُمید لہجے میں کہا۔

"چھین سکتا ہے وہ۔" میں نے چاند بھائی کو ایک اور غلیظ گالی دی۔ "وہ بہت عیار اور مکار ہے۔ ذہنی مریض ہے۔ رابعہ کے سامنے جھوٹ کو سچ بنا سکتا ہے۔ کسی دن وہ رابعہ کو یقین دلا دے گا کہ سکندر قلات جنگ میں مارا گیا۔ اُس کا ذہن جھوٹے سچے قصے گھڑنے میں ماہر ہے۔ وہ تو ایک دن کا جعلی اخبار تک چھاپ سکتا ہے۔ پاکستان ٹائمز یا دہلی اسٹیٹسمین کی چند کاپیاں چھاپنے میں لاکھوں خرچ نہیں ہوتے۔ پورا اخبار وہی ہوگا۔ صفحہ اوّل کی کسی ایک خبر کو نکال کے وہ میری تصویر اور میرے مارے جانے کی جھوٹی خبر اے پی پی یا پریس ٹرسٹ آف انڈیا کی جاری کردہ، لگوا سکتا ہے۔ رابعہ کیا جانے ان چکروں کو، وہ یقین کرے گی۔"

"رابعہ کبھی یقین نہیں کرے گی۔" محسن کے یقین میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ "وہ چاند بھائی کو بھی جانتی ہے بلکہ اس کے قریب رہ کے زیادہ بہتر طور پر جان چکی ہوگی اور ایسے تمام چکروں سے بھی واقف ہو چکی ہوگی۔ تو کیوں بھول جاتا ہے کہ وہ ایک نامور وکیل بھی اور ہر قسم کے فراڈ، دھوکے بازی، جعلسازی کے واقعات دیکھے ہوئے ہے اور مجھے ایک بات دل پہ ہاتھ رکھ کے بتا، فرض کر، خدانخواستہ... خدانخواستہ... تو سچ مچ مارا جائے تو کیا رابعہ اسے قبول کرنے پر مر جانے کو ترجیح نہیں دے گی؟ سال دو سال کیا ایک عمر بھی گزر جائے انتظار کرتے، تو کیا وہ تیری واپسی کا انتظار نہیں کرے گی؟"

محسن نے مجھے لاجواب کر دیا۔ میں اُس کی بات کے جواب میں ہاں بھی نہیں کہہ سکتا تھا، نہیں کہنا زیادہ دشوار تھا۔ میں اُفق کے تاریک منظر کو گھورتا رہا جس میں ایک بھی ستارہ روشن نہیں تھا۔ ایک لامتناہی، بیکراں، بے پناہ قوت سے زیر و زبر ہونے والا، تڑپتا، پھنکارتا، پُراسرار، پُرآسیب اور پُرہیبت سمندر تھا جس کی گونج زمین اور آسمان کے درمیان ایک بے رحم ہنسی کی صدا لیے بازگشت لگتی تھی۔ ہنسی جو میری تیرہ بختی کا نوحہ تھی۔ ساتھ جینے اور مرنے کے سب عہد و پیماں، سارے دعوے اور تمام وعدے فقط خود فریبی کا جال تھے۔ اتنی طویل مسافت ہجراں کے بعد رفاقت کی منزل کا پڑاؤ فقط ایک شب کا تھا۔

"اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔" محسن نے میرے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ "خبر کیسی ہی بری ہو بے خبری سے بہتر ہے۔ اگر وہ بالواسطہ طور پر اتنا پیغام بھی دے دیتے کہ رابعہ بمبئی چلی گئی ہے..."

"یار، ابھی وہ گئی تو نہیں ہوگی؟" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"پھر تُو کیا اُسے ایئرپورٹ پہ جا کے جہاز سے اُتار لائے گا؟ کیا تجھے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس ایئر لائن کی کون سی فلائٹ سے کب جائے گی؟" محسن بولا۔ "چاند بھائی جیسے شخص کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔"

"لیکن رابعہ اُس کے ساتھ گئی تو ایک بات بہرحال واضح ہو جائے گی کہ وہ خود بھی رضامند تھی۔ کسی کو اغوا کر کے زبردستی ہوائی جہاز میں نہیں لے جایا جا سکتا۔ رابعہ کوئی دودھ پیتی بچی، بزدل یا نادان نہیں ہے۔"

"ارے بھائی، عورت ذات تو ہے اور کمزور بھی ہے کیونکہ اُسے تیری زندگی اور اپنی محبت کے نام پہ بلیک میل بھی کیا جا سکتا ہے۔ فرض کر آج شکاری مجھے گرفتار کر لیں اور پھر شہلا سے کہیں کہ محسن کی خاطر قربانی دو، ورنہ ہم اُسے گلے میں پٹا ڈال کر کتوں کی طرح رکھیں گے کسی اندھی کوٹھری میں، روز اُسے کوڑے مارے جائیں گے اور کھانے کو دی جائے گی غلاظت۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ مر جائے گا، گنتی جانے کتنے کوڑے اور کتنا کوڑا کھا کے۔ بصورتِ دیگر وہ آرام سے رہے گا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ شہلا وہ عورت ہے جو ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہو گی۔ اُسے کہیں گے نوکرانی بن کے رہو، جیسے ماتھو پہ بیٹھو، وہ سب کرے گی۔"

میں محسن کو دیکھتا رہا۔ اُس کا تجزیہ بے یقین کن حد تک مکمل اور ناقابلِ شکست تھا اور کتنا حقیقت پسندانہ تھا۔

"تُو ٹھیک کہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے صبر کرنا ہی پڑے گا۔ اس کو پھر پانے کے لیے جھوٹی اُمید کا سہارا قبول کرنا ہی ہو گا۔ کاش ایسا ہو سکتا محسن کہ میں بالکل پاگل ہو جاتا۔ مجھے یقین آ جاتا کہ اب اس دنیا میں، اس زندگی میں پھر اس سے ملاقات کا ایک فیصد امکان بھی نہیں رہا۔ تو پھر زندہ رہنا میرے اختیار میں ہو جاتا۔ میرے لیے مرنا کتنا آسان ہو جاتا۔"

"میں ذرا ناگ منی کو دیکھ آؤں۔" وہ بولا۔

اس کی غیر حاضری کے مختصر وقفے میں میرے خیالوں نے مجھے پھر پریشان کیا۔ مجھے وہ مدوجزر سا مناظر دکھلائے جو میری رگوں میں لہو کو منجمد کرتے تھے۔ چشمِ تصور سے میں نے رابعہ کو دیکھا۔ وہ کسی ایئر لائن کی فرسٹ کلاس میں چاند بھائی کے ساتھ بیٹھی ہے۔ وہ ایک چمکتی دمکتی شاندار لیموزین میں بیٹھی پیرس کی سیر کر رہی ہے، جو ہو کے ساحل پر، تاج محل یا میرین ڈرائیو پر۔ وہ شاپنگ کر رہی ہے جیولری شاپس میں، سپر اسٹورز میں، مسٹر اینڈ مسز چاند بھائی۔ وہ ظلم اور دہشت کا ایک بڑا نام ہے۔ سکندر بخت ایک بھولا بسرا نام۔۔۔ محسن آباد کا وہ گورستان پڑا ہے جس کو سکندر اور رابعہ نے پھر سے آباد کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ وزیر خان کی روح اس میں تنہا بھٹکتی پھرتی ہے مگر اُس کی پکار سننے والا کوئی نہیں۔

محسن میرے قریب آ کے بیٹھا اور اس نے مجھے میرے کندھے پکڑ کے جھنجھوڑا تو میں بُری طرح چونکا۔

"یہ کیا ہے، تُو پاگل ہو جائے گا سچ مچ۔" محسن نے کہا۔ "چل جیسے، میں شراب اور گولیاں دیتا ہوں تجھے۔ کچھ دیر سو جا۔ تجھے نیند کی ضرورت ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں سونا نہیں چاہتا۔ گل بانو کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ پہلے کافی پلا دی تھی اور ڈسپرین بھی دے دی تھی اور اب اُسے بھی نیند کی گولیاں زبردستی کھلا کے آیا ہوں۔" وہ بولا۔

"مجھے ایک سگریٹ دے دے۔" میں نے کہا۔

"اُسے کیا ہوا تھا کہ پانی میں کود گئی تھی؟"

"اے یار، مصیبت گلے پڑ گئی ہے میرے۔" محسن نے مجھے ایک سگریٹ سلگا کے دی۔ "کہہ رہی تھی کہ تم لوگوں کے ساتھ میں بھی چلوں گی۔ میں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ عورتوں کا اس مشن میں کیا کام۔ وہ بولی کہ رابعہ کیا مجھ سے زیادہ مضبوط ہے؟ میں نے تو مردوں کے ساتھ جانے کتنے ڈاکے ڈالے ہیں۔ مجھے بتا دیکھیں اُس نے مردوں کے ساتھ مردوں کے کوئی تیر مارا ہے؟ میں تو اپنے بھائی کے ساتھ جب بھی جاتی تھی، مردانہ لباس میں، پگڑی باندھ کے اور ایسی ہی مردانہ شلوار قمیص پہن کے جیسی تم نے پہن رکھی ہے۔ ایک بار تو میں نے بال بھی کٹوائے تھے، کیپ لگا کے اور پتلون قمیص پہن کے پھرتی تھی۔ گاڑی لے کر نکل جاتی تھی، سگریٹ پیتی تھی۔ بھیا اُن دنوں روپوش تھے، ہر کام میرے سپرد تھا۔ میری زنانہ آواز پہ لوگ مسکراتے ضرور تھے مگر یہ کون سی غیر معمولی بات ہے، بہت سے مردوں کی آواز میں نسوانیت ہوتی ہے اور بہت سی عورتیں مردانہ آواز میں بات کرتی ہیں۔ شک کبھی کسی نے نہیں کیا۔ میں اب بھی اسی طرح تمہارے ساتھ جا سکتی ہوں۔"

"پھر تُو نے کیا کہا؟ انکار کر دیا؟"

"اقرار کیسے کر لیتا؟" محسن بولا۔ "ابھی تو رابعہ کے بارے میں بھی طے نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ جائے گی یا امام شیخ کے پاس رہے گی لیکن بھائی! اس گل بانو سے خدا بچائے۔ میری ایک سننے پہ تیار نہیں تھی۔ کہنے لگی کہ مجھے ایسی ویسی مت سمجھنا۔ ڈاکوؤں کے درمیان رہتی تھی، اپنے ہاتھ سے دو کو میں نے خنجر گھونپ کے مار ڈالا جو مجھ پہ بُری نظر رکھتے تھے۔ ایک حد سے بڑھ گیا تھا، اُس کی تو میں نے آنکھیں نکال دی تھیں۔ غصے نے پاگل کر دیا تھا مجھے۔ بعد میں مجھے اس پہ ترس آیا کہ ایسے وہ کیسے جیئے گا۔ میں نے اُسے مار دیا اور ویسے جو وارداتوں میں مقابلہ کرتے ہوئے یا فرار ہوتے ہوئے اپنی جان بچانے کے لیے میری گولی کا نشانہ بنے اُن کی تعداد کا مجھے علم نہیں۔ تمہاری رابعہ کر سکتی ہے یہ سب کچھ؟ بس مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا کہ اپنا اور رابعہ کا مقابلہ مت کرو۔ وہ ایک نامور وکیل تھی، ایک باعزت اور شریف عورت تھی۔ بس اس بات پہ وہ چلانے لگی کہ اچھا میں بے عزت ہوں، مجرم ہوں، ڈاکو ہوں تو مجھے مر جانے دو، ساتھ کیوں لائے تھے مجھے، پولیس کے حوالے کر دیتے اور پھر پانی میں کود گئی۔ عجیب طوفانی چیز ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کا کیا ہو گا؟"

"ہمارے سامنے دو ہی صورتیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "یا تو اُسے قانون کے حوالے کر دیں یا۔۔۔"

"نہ، اس کے حق میں نہیں ہوں۔ وہ اپنی مرضی سے مجرم نہیں بنی تھی اور اُسے ایک موقع ملنا چاہیے۔" محسن نے احتجاج کیا۔

میں نے کہا۔ "تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اُسے بھی ساتھ لے جائیں۔ اس کی زندگی کا راستہ بدل جائے گا۔ تخریب کی صلاحیت تعمیر میں کام آئے گی تو اس کے وجود میں دبی ہوئی نیکی کا جذبہ پھر زندہ ہو گا۔ صرف نام بدلنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ناگ منی کو گل بانو بننے کے لیے اپنے ماضی کے دامن سے ہر داغ کو مٹانا ہو گا۔"

"میں اسے پسند تو نہیں کرتا لیکن مخالفت بھی نہیں کر سکتا کہ اُسے یہاں حالات کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا جائے۔" محسن بولا۔ "بس مجھے شہلا کے خیال سے خوف آتا ہے کہ وہ کتنے صبر و شکر کے ساتھ اپنی قیدِ تنہائی کاٹ رہی ہے۔ زندگی سے اکیلی لڑ رہی ہے جب کہ مجھے اُس کا ساتھ دینے کے لیے اُس کے ساتھ ہونا چاہیے۔ مجھے ہر بات اُس کا خیال آتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ کیا اس وقت وہ بھی مجھے یاد کر رہی ہو گی؟ بیٹے سے کہہ رہی ہو گی کہ بیٹا شہلا شہزادے ہاتھ اُٹھا کے دعا کرو، اللہ میاں، ابو کی عمر دراز کر، انھیں دشمنوں کے خلاف جہاد میں کامیاب کر، اُن کی حفاظت کر، انھیں جلد ہمارے پاس لے آ۔ دن تو کٹ ہی جاتا ہے یار، رات بڑے خوف اور اندیشے اور اُمیدوں کے خواب لے کر آتی ہے۔"

"تو ایسا کر، کل اُن سے بات کر لے۔" میں نے اُسے جذباتی ہوتے دیکھ کر کہا۔

"نہیں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس قربانی کا صلہ شہلا کو ایسی خبر کی صورت میں تو نہیں ملنا چاہیے کہ اُس کا مجازی خدا، اُس کا شریکِ زندگی، اس سے چاہت کے عہد و پیمان رکھنے والا محسن کسی اور سے دل لگا بیٹھا ہے۔ عورت ذات تو ہے وفا کی خوشبو کو پہچانتی ہے۔ خواہ بات کتنی بے بنیاد کیوں نہ ہو، وہ بات سچ ہی نہیں سکتی جس سے اُس کی محبت کی اہانت ہوتی ہو یا اُس کے حقِ ملکیت پر زد آتی ہو۔"

"مجھے معلوم ہے، یہ سب میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کے ساتھ ہی میں شہلا کو بھی جانتا ہوں۔ میں اُسے سمجھا سکتا ہوں، رابعہ، غالب اور نازو، ہم سب بتا سکتے ہیں کہ حقیقت کیا تھی۔"

"حقیقت!" محسن مسکرایا۔ "کون سی حقیقت؟ تم عقل سے کام لو گے اور وہ جذبات کی کسوٹی پہ پرکھ کر انھیں مسترد کر دے گی۔ تم پر بھی جانبداری کا الزام آ جائے گا کہ تم طرفدار ہو غالب کے حق میں نہیں۔"

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ عورت کا دل نہ جانے کون سا شیشہ ہوتا ہے کہ کبھی تھوڑے سے پیار بھرے جذبات کی حدت سے پگھل جاتا ہے، کبھی حقیقت کے سمندر کی سرکش لہروں کے مقابل ہو تو پتھر کی ناقابلِ تسخیر چٹان بن جاتا ہے، وزنِ مروت اور سختیٔ ایام کے شدید ترین صدمات جھیل سکتا ہے مگر شک کی بادِ سموم کے خفیف سے جھونکے کی تاب نہ لا کے تڑخ جاتا ہے۔

محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "دیکھ یار سکندر، میری مان تھوڑا سا آرام کر لے۔ یوں سوچتے رہنے سے تو کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ دن میں بہت سے کام ہوں گے اور رات کا کچھ پتا نہیں کہاں گزرے، کیسی گزرے، ہم دو جانے کہاں ہوں۔"

میں نے اب اس کے اصرار پہ سرِ تسلیم خم کر دیا اور ہم نیچے آ گئے۔ رابعہ کے کیبن میں اس کی جگہ خالی پڑی تھی، ہمارے تختے پر گل بانو مدہوشی و بے ہوشی کی نیند میں بے سدھ پڑی تھی

www.paksociety.com

تھی۔ میں پل بھر کے لیے کیبن کے دروازے میں رکا کیونکہ
رابعہ کی خوشبو دامن گیر ہو گئی تھی۔ پھر محسن نے مجھے کھینچ لیا۔
اس نے مجھے دو خواب آور گولیاں دیں اور اس وقت تک میرے سر پر سوار رہا جب تک میں نے انھیں حلق سے نیچے اتار لیا۔ پھر خود اس نے بھی ایک گولی کھائی اور ہم آمنے سامنے دیواروں کے ساتھ بنے ہوئے تختوں پر لیٹ گئے۔ آہستہ آہستہ میرے جذبات کا آتش فشاں سرد پڑنے لگا تھا۔ یہ بات تسلیم کر لینے کے بعد کہ رابعہ کو صرف چاند بھائی ہی لے جا سکتا تھا، میرے دل کو کچھ قرار آ گیا تھا۔ اگر میرے لیے ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں تو پھر یونہی سہی۔ مصلحت یا مجبوری کے تحت اسے بھیجنا پڑا تو یہ وقت کی ایک چھوٹی سی تجلی ہے۔ راستے الگ ہو گئے تو کیا، منزل تو وہی ہے اپنی۔ یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں۔
آنکھیں بند کرتے ہوئے رابعہ کے خیال سے دل سے کہا: "میں تو تم کو کراچی میں ڈاکٹر خفگی والا یا اکرام شیخ کے پاس چھوڑ کے جانا چاہتا تھا، تم پہلے ہی مجھے چھوڑ گئیں۔"
اس نے کہا: "پاگل ہو تم بھی۔ تمھارے پاس ہی تو ہوں میں۔ مجبوری کو دوری کیوں سمجھتے ہو۔ میں نے اسی لیے اپنے خط میں وضاحت کر دی تھی۔"
میں نے کہا: "کون سے خط میں۔۔۔"
"اس خط میں جسے تم چیونگم کی طرح کھا گئے تھے۔"
وہ ہنسی اور غائب ہو گئی۔
"واقعی" میں نے خود سے کہا "سب کچھ تو سمجھا دیا تھا اس نے۔ چاند بھائی کو میں نے رقیب بنا لیا ہے جو تمھارا زوال اپنا۔ رابعہ سے وفا کیا جب اس کے میرے درمیان میں فاصلے خیال کے وہ خیال بے وجود ہے۔ لہروں کی سرگوشی ایک گیت بن گئی کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں۔ صد شکر کراچی کی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں۔"
یہ گیت سکون بن کے میرے رگ و پے میں اتر گیا۔
دن کے جانے کے ساتھ بہت سی مانوس آوازوں نے مجھے بیدار کیا۔ میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو مجھے احساس ہوا کہ میں آٹھ گھنٹے کی نیند پوری کر چکا ہوں۔ اب ساڑھے گیارہ بج رہے تھے گویا دوپہر ہونے والی تھی۔ مجھے رابعہ کا خیال آیا کہ وہ اس وقت بمبئی میں ہو گی۔ چاند بھائی کے ساتھ تاج محل کے کسی سوئٹ میں! اس شاہانہ تصور نے میرے دماغ میں رشک اور حسد کے جذبات نے پھر میرے دل کو جلایا مگر میں نے ان فضول خیالوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔ مشکل یہ تھی کہ دل کے جذبات کو عقل کی دلیل راس نہ آتی تھی اور جذبات پر قدغن لگانا ہوا کو زنجیر پہنانے سے زیادہ مشکل کام تھا۔
اوپر آ کے میں نے گل بانو کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ کل رات کی سمندر کے غلیظ پانی میں ڈوب کے نکلنے والی اور میرے سامنے موجود گل بانو میں اتنا ہی فرق تھا جتنا خزاں کی شام اور بہار کی صبح میں ہوتا ہے۔ جو شجر میں سوکھ جانے والے پتے اور موسم گل کے پہلے شگوفے میں نظر آتا ہے۔ اب وہ بہت پُرسکون تھی۔ اس نے منہ دھو کے کپڑے بدلے تھے۔ رنگت رخسار پر ہلکا سا غازے کا غبار، ہونٹوں پر لپ اسٹک کا گلابی رنگ شانوں تک ترشے ہوئے ہوا کے ساتھ لہرا کے اڑتے ہوئے سنہرے مائل بھورے بال جو پہلے میل سے چپکے ہوئے تھے اب دھل کے ریشم کی طرح ہو گئے تھے۔ انھیں اس نے ایک گلابی ربن میں یوں قید کیا تھا کہ وہ چہرے پر نہ آئیں۔ اس کی قدرے سبز اور بھوری آنکھوں میں غرور حسن کی شوخی تھی اور اداؤں میں بیا بانکپن۔
اس نے رابعہ کے کپڑے پہنے تھے، جالی کی آستینوں والی سیاہ قمیص، سیاہ و سفید دھاری دار کپڑے کی شلوار اور دوپٹہ۔ اس نے میک اپ کا سب سامان بھی رابعہ ہی کا استعمال کیا تھا۔ راتوں رات وہ ایک مکمل عورت بن گئی تھی۔ وہ جو ناگ منی تھی ان ناگن سے زیادہ خطرناک تھی۔ جو ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شامل تھی، فراٹے سے گالیاں بکتی تھی اور مردوں کی طرح سگریٹ بھی پیتی تھی، جسے یہ احساس نہیں تھا کہ وہ کتنی حسین ہے۔ اس نے تمی ہی کے سارے حسن کو اپنا لیا تھا اور اس کا یہ نیا تابناک روپ محسن کی نگاہوں کو بھی خیرہ کر رہا تھا۔ مطمئن اور مسرور نظر آنے کے باوجود وہ مضطرب تھا۔ اس خیال سے کہ گل بانو نے برائیوں کی ترتیب تسخیر آزمانے کے لیے سب تیاری کی تھی۔
میرے قدموں کی آہٹ پر انھوں نے پلٹ کر دیکھا۔ گل بانو کی نظر نے از خود مجھ سے پوچھا: "بتاؤ میں کیسی لگ رہی ہوں؟"
میں نے کہا: "گل بانو! رات بھر ڈاکہ ڈالا تھا؟"
اس کی مسکراہٹ کی شوخی کافور ہو گئی۔
"راتوں رات یہ کس کے حسن کا خزانہ لوٹ لائی ہو؟" میں نے ستائش میں پرستش کا انداز نمایاں کر کے کہا۔

وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ دل کے اندر سے پھوٹنے والی سچی خوشی سے بھرپور ہنسی اور کھنکتی ہنسی۔ "تم سو کے اٹھے ہو نا۔ محسن کو تو ایسی کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔"
یہ شکایت کا ایک بھولا بھالا انداز تھا جس نے محسن کو زیر کر دیا۔ میں نے کہا: "پھر یہ کمالات کس سے سیکھا ہے تم نے، نظر بد سے بچانے کے لیے؟"
"یہ۔۔۔ یہ تو کل سے" وہ پھر ہنسی اور اس نے یوں گال پر انگلی رکھی کہ مجھے محسن پر ترس آنے لگا۔ آخر وہ کب تک بچتا اور کیسے بچتا کہ حسن اور ادائے حسن کی اس پر پیش قدمی ہے۔"
"ہاں، یہ بالکل رابعہ نہیں لگتی۔" محسن نے کہا: "اگر بال اتنے ہی لمبے ہوتے۔"
"وہ تو میں نے بتایا تھا نا کہ ایک بار کٹوانے پڑے تھے۔" وہ اڑتے بالوں کو نازک انگلیوں سے سمیٹ کر چلی۔
"رابعہ۔۔۔ ہاں، لگتی ہے" میں نے گل بانو کا دل رکھنے کے لیے کہا۔ میں حیران بھی ہوا کہ مجھے وہ رابعہ جیسی کیوں نہیں لگتی جو محسن کو اسی کی طرح نظر آتی ہے۔ یہ بات وہ پہلے بھی کہہ چکا تھا، شاید اس لیے کہ وہ اسے جذبات کے بغیر دیکھتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے رابعہ کے حسن میں اپنے جذبات کا بھی رنگ نظر آتا ہے جو اس کے حسن کو سب سے جدا، سب سے منفرد اور بے مثال کر دیتا ہے۔ کوئی اور مجھے رابعہ جیسی کس طرح نظر آ سکتی ہے جب کہ وہ رابعہ نہیں۔
ناشتے سے فراغت کے بعد میں نے اور محسن نے اپنا لباس بدلا اور کیپٹن کریم بلوچ کے لائے ہوئے کپڑے پہن لیے۔ معلوم نہیں کس نے لیکن پرانی وردیاں لیں یہ کیا وردی تھی کالر پر سارے بیج اور مونوگرام بھی لگے رہ گئے تھے۔ وردیاں میلی تھیں اور استری کے بغیر تھیں لیکن کچھ زیادہ پرانی نہیں تھیں۔ میں اور محسن کسی غیر ملکی جہاز کے نچلے درجے کے ملازم نظر آنے لگے تھے۔ یہ نیلے رنگ کی وردیاں تھیں اور ان کے شولڈرز پر پیتل کے حروف میں سی فاکس لکھا ہوا تھا جس کا مطلب "سمندری لومڑی" ہوتا تھا۔ یہ کوئی انگلش یا امریکن جہاز بھی ہو سکتا تھا، کینیڈا، آسٹریلیا، ہندوستان، پاکستان میں اور جہاں بھی انگریزی بولی جاتی تھی یہ نام استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہ تعین کرنا ناممکن تھا کہ سمندری لومڑی کوئی چھوٹی تجارتی لانچ تھی یا کوئی بڑا تجارتی جہاز۔ وردی کی جیب پر جھلمل چمکنے والا نام کا بیج لگا تھا ہے صرف پن لگی رہ گئی تھی۔ مگر وردی پہننے کے بعد آستینوں کی آدھا انچ چوڑی اور دو ڈھائی انچ لمبی پٹیاں بھی جیب میں سے برآمد ہوئیں۔
"یہ وردی تو ہے کسی موصوف یا مرحوم جل دیپ آرمیڈیلا کی ہے۔" میں نے کہا: "یہ کس خطے کا نام ہے جل دیپ؟"
"جل دیپ اور مینڈس" محسن نے کہا: "یہ تو سری لنکا، مالدیپ پر اٹھ نام ہے اور بڑا کسار ہوا ابو یوسف ہو یہ یا پورا بیوت" اس نے اپنا نام پڑھا۔ میں نے محسن سے اتفاق کیا کہ یہ انڈونیشیا، ملائشیا کا بھی نام ہے۔
"جل دیپ کوئی ہندو ہو سکتا ہے یا کرسچین اور ابو یوسف تو شاید مسلمان ہو" میں نے کہا: "لیکن فرض کر لو وہ دونوں حضرات ہمیں کہیں مل جائیں۔"
"اپنی وردی تلاش کرتے ہوئے" محسن بولا "کیا بیت انھوں نے خود ہی وردی کی چوری کی ہو۔ یہ کیپ تو مجھے ابو یوسف پورا ہو گی نہیں لگتی، کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔"
میں نے اپنی کیپ اس کے سر پر رکھ دی: "یہ مجھے ذرا تنگ تھی اور اس طرح ہم ٹوپی بدل بھائی ہو گئے ہیں، دوپٹہ بدل بہنوں کی طرح۔"
"ٹوپی کو مردانہ دوپٹہ کہا جا سکتا ہے" محسن بولا "دونوں سر ڈھانپنے کے کام آتے ہیں۔ کیا خیال ہے اب چلیں؟"
محسن نے اقرار میں سر ہلایا: "کیپٹن کریم بلوچ! ہماری واپسی تک شادی، خودکشی سے کشتی کو بچا کر رکھنا۔"
"کم سے کم ایک آنکھ کھلی رکھنا مگر اس سے چاروں طرف دیکھتے رہنا، پھر تم پر تو صاف خوشی رات" میں نے کہا۔
کریم بلوچ کا منہ کھل گیا: "کیا بولتے آپ صاحب؟"
"مطلب یہ کہ چاند سی جواب تمہارے حوالے" محسن بولا۔
"چاند سی بانو؟" میں نے تعجب کی اور گل بانو کا چہرہ دمک اٹھا۔
"لوٹ کر کب آؤ گے؟" اس نے محسن کی طرف دیکھا۔
محسن نے عاشقانہ انداز میں سینے پہ ہاتھ رکھا اور آگے جھک گیا: "جب بھی تم بلاؤ گی۔"
"نہیں کیوں، ظاہر ہے لگی" گل بانو شرم کے ہنسی "تم تو کبھی بھول جاتے ہی کیوں، کوئی"
معلوم نہیں محسن کے دل پر کیا بیتی۔ مجھے تو اس پنچھی نے متوجہ کر لیا تھا جو چھلانگ مار کے لانچ پر آ گیا تھا۔ وہ بارہ تیرہ سال کا غریب اور غلیظ بچہ تھا۔ میلی جھونپڑا جیسے

کپڑوں اور میلے بالوں والا۔ وہ بچہ جس کا لاوارث بچپن دنیا کی ٹھوکروں میں رہتا ہے۔ جسے نہ کسی گھر کی چھت کا سایہ ملتا ہے اور نہ کسی سے پیار کا تحفظ۔ وہ مزدور، پیشہ ور گداگر کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

"اے، کون ہو تم؟" میں نے محتاط ہو کے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"ہم چٹھی لایا ہے۔" اس نے ایک براؤن رنگ کا لفافہ بڑھا کے کہا۔

"کس کے لیے؟" میں نے کہا۔

"اپن نام نہیں جانتا۔ دس روپیہ دو اور چٹھی لے لو۔" وہ بولا۔

میں نے جیب میں سے دس کا نوٹ نکالا۔ "اچھا بھئی، یہ لو۔" میں نے نوٹ بڑھا کے کہا۔ وہ خاصی بے خوفی سے آگے آیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے لفافہ آگے بڑھایا اور دوسرے سے نوٹ لینے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی کلائی کو گرفت میں لے لیا۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کے لیے واجبی سا زور لگایا۔ پھر مزاحمت ترک کر دی۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، مت دو دس روپیہ۔ یہ لو اپنا چٹھی، ابھی جانے دو ہمیں۔" وہ بولا۔

"نہیں، ایسے نہیں بیٹے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ جس نے بھی تم کو چٹھی دی ہوگی اس نے تمہیں اس کام کا معاوضہ بھی دیا ہوگا۔ تم چالاکی سے دس روپے اور اینٹھنا چاہتے تھے۔ دس روپے کی کوئی بات نہیں۔ میں اپنی خوشی سے تم کو انعام میں دے سکتا ہوں لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ لفافہ کس نے دیا تھا؟"

"ہم نہیں جانتا صاحب۔ ماں قسم ہم کبھی نہیں دیکھا اس کو۔" لڑکے نے عاجزی سے کہا۔ "ہم ادھر کھڑا تھا۔ وہ ہم کو دس روپیہ دیا اور بولا کہ وہ ادھر سامنے لانچ پر چٹھی دے کر آؤ۔"

"کس کو؟" میں نے لفافہ چھین کے دیکھا مگر اس پر کوئی بھی نام یا پتا نہیں تھا۔

"بس وہ بولا کہ اس لانچ پر دے آؤ۔" لڑکا اب کچھ خوف زدہ نظر آنے لگا تھا۔ اس نے اپنی عمر سے زیادہ چالاک بننے کی کوشش کرتے ہوئے ہم سے دس روپے جھٹکنے چاہے تھے مگر اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ دس روپے بھی مہنگے پڑ جائیں جو ایڈوانس معاوضے کے طور پر کسی نامعلوم شخص نے دیے تھے۔

میں نے لفافہ محسن کو دیا کہ کھول کر دیکھے مگر احتیاط کے ساتھ۔ سائنس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ نامہ اجل مقتول کے لیے ڈاک سے بھی ارسال کروایا جاتا ہے۔ کھولتے ہی دھماکا ہوتا ہے یا کسی مہلک گیس کا اخراج اور ختمت بالخیر۔

محسن نے خاصے بڑے لفافے میں سے ایک اتنا چھوٹا سا پرزہ برآمد کیا کہ مجھے "کھودا پہاڑ نکلا چوہا" والی کہاوت یاد آئی۔ محسن نے پرزے کو بغور ملاحظہ کیا اور اس پر مزید غور فرمانے کے بعد اس فلسفی کی طرح سر ہلایا جس نے اپنی عقل و دانش سے کائنات کی کسی پیچیدہ گتھی کو سلجھا لیا ہو۔

"ڈیئر عامر!" محسن نے پرچہ مجھے تھما کے کہا۔ "تم اس کا حلیہ تو بتا سکتے ہو جس نے یہ خط دیا تھا!"

لڑکے نے سر ہلایا اور کچھ سوچ کے بولا۔ "کوئی مچھیرا تھا، بلوچی میں بات کیا۔ آپ سے تھوڑا کم لمبا۔ ہم سے غلطی ہوا تو ہم کو معاف کرو۔ وہ چٹھی دے کر بھاگ گیا۔ بولتا تھا، صاب نہیں ہو دیں گا تو ایک میم صاب ہو دیں گا۔ ایک دم بنگلو کا مالک، خوب صورت۔" اس نے ناگ مٹی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کو دے دینا چٹھی۔"

میں نے اسے دس کا نوٹ دیا۔ "یہ لو، شاباش، تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ پھر کبھی کوئی کام ہو یا کسی چیز کی ضرورت ہو تو آجانا اور وہ آدمی پھر نظر آئے تو بتانا۔"

"نام کیا ہے تمہارا، کہاں رہتے ہو؟" گل بانو نے کہا۔

"اللہ بھلا کرے آپ کا صاب۔" اس نے دس کا نوٹ جیب میں رکھ کے پیشہ ور گداگروں کے لہجے میں کہا۔ "اللہ سکھی رکھے آپ کو میم صاب... اللہ آپ کا ہر مراد پورا کرے۔"

میں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اگر محسن اس کے پیچھے نہ ہوتا تو وہ گل بانو کے سوال کا جواب گول کر کے بھاگ جاتا۔

لڑکے نے کہا۔ "اپن جھوٹ بولا صاب... اپن ادھر ہی رہتا ہے۔ ابھی اپن جاتا ہے۔" وہ تیزی سے پلٹا اور محسن کے ہاتھ کے نیچے سے نکل گیا۔ پلک جھپکتے میں وہ لانچ پر سے ایک کشتی میں کودا اور غائب ہو گیا۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کے نہیں دیکھا۔

"اب ہم بھی چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا تھا اس خط میں؟ مجھے نہیں بتاؤ گے؟" گل بانو نے کہا۔

میں نے وہ پرزہ اس کی طرف بڑھا دیا جس پر لکھا ہوا

تھا۔ "ایل ای ڈبل سیون ڈبل فور زیرو۔" اور اس کے بعد "ڈی ای پی ۔۔۔ ایچ ڈی ڈبل ون تھری زیرو۔"

"یہ کیا؟ کیا مطلب ہے اس کا؟" گل بانو حیران ہو کے بولی۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ "تم کچھ سمجھا؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "شاید کسی نے مذاق کیا ہے۔"

"اور تم نے خوش ہو کے دس روپے دے دیے۔ مذاق تم کو پسند آیا؟" گل بانو نے خفگی سے کہا۔ "صاف کیوں نہیں کہتے کہ بتانا نہیں چاہتے۔"

"کمال ہے بھئی۔ چھپانا ہوتا تو تمہیں یہ پرچی کیوں دکھاتے؟" میں نے کہا۔

"خواہ مخواہ کی بدگمانی اچھی بات نہیں ہے۔" محسن نے میری تائید کی۔ "اگر تم کچھ مطلب نکال سکتی ہو تو ہمیں بھی بتاؤ۔"

ہم نے اسے خاموش تو کر دیا مگر وہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے روانہ ہونے تک اس کا چہرہ بجھا بجھا سا رہا۔ پھر محسن نے نفسیاتی داؤ آزمایا۔

"مسکرا کے رخصت نہیں کرو گی تو یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہوگا۔ معلوم نہیں پھر کیا گزرے۔" محسن نے آہ بھر کے کہا۔

گل بانو کی خفگی دور ہو گئی۔ "جلدی آجانا۔" وہ مسکرا کے بولی۔

"تم بھی ذرا محتاط رہنا۔ زمانے کی نظر نہ لگ جائے۔" محسن بولا۔

میرے کندھے پر بیگ تھا۔ اس میں ایک تو دوربین تھی۔ دوسرا وہی ڈائریکٹ کنکشن والا پورٹیبل فون تھا جس کا استعمال ہم نے عرصے سے نہیں کیا تھا۔ باقی الم غلم صرف بیگ بھرنے کے لیے تھا مثلاً اس میں نوٹ بک اور قلم، کنگھا، برش، شیونگ کا سامان اور سلیپر تھے۔ یہ سب اس لیے تھا کہ کوئی ہم سے کہیں بھی بیگ دکھانے کو کہے تو اس میں کوئی چیز قابل اعتراض نہ ملے۔ سیکیورٹی والے بعض مقامات پر زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ بیگ میں تین سو روپے پاکستانی کرنسی میں اور تین سو ڈالر بھی صرف اس لیے رکھے تھے کہ کوئی بطور رشوت وصول کرنا چاہے تو رکھ لے۔ ہم مفلس نہ ہوں گے۔ پھر اصل اسباب ہمارے پاس محفوظ رہے گا۔ ایک ایک ریوالور جسے ہم نے لباس کے نیچے اور پتلون کی بیلٹ کے بھی نیچے چھپایا تھا۔ ایک ایک ہزار روپے پاکستانی کرنسی میں جو ایک پیر کی جراب میں تھے اور پانچ پانچ سو ڈالر دوسرے پیر کی جراب میں۔ ڈالر ہم نے آج پہلی بار نکالے تھے۔ اب تک وہ ساری کرنسی جو ہمیں ایک سوٹ کیس میں بھری ہوئی ملی تھی، لانچ کے خفیہ خانوں میں محفوظ پڑی ہوئی تھی۔

"تو تم نے وہ معما حل کر لیا تھا؟" میں نے بندرگاہ کے علاقے سے گزرتے ہوئے فرنچ میں بات کرنا مناسب سمجھا۔

"کسی حد تک۔" محسن بولا۔ "ایک ٹرک جس کا نمبر ایل ای سیون سیون فور فور زیرو ہے۔ یہ لاہور کا نمبر ہے۔"

"نمبر کسی گاڑی کا ہے۔ تو تم نے ٹرک کیوں فرض کر لیا؟"

"ہمارا واسطہ ٹرکوں سے ہی پڑتا ہے۔" محسن نے سر کھجا کے کہا۔ "آگے ڈی ای پی کا مطلب تو خیر ڈیپارچر ہوا، یعنی روانگی۔ اس کے بعد کیا ہے؟ کچھ آپ بھی ارشاد فرمائیے۔"

"آگے احقر کی ناقص عقل میں یہ آتا ہے کہ روانگی کا وقت اور مقام بھی بتایا گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایچ ڈی کو میں حیدرآباد فرض کر لوں تو ڈبل ون تھری زیرو، گیارہ تیس۔"

"آفریں۔" محسن نے چہک کے کہا اور میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ بہت سے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔

میں نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا۔ "یہ کیا بے ہودگی ہے۔" میں نے کہا مگر اس کے بعد میں بھول گیا کہ مجھے کیا کہنا تھا۔ میں نے ایک مکروہ صورت والے سٹنڈے کو دیکھا جو بڑی بے رحمی سے ایک بچے کو مار رہا تھا۔ یہ وہی بچہ تھا جو خط لے کر ہمارے پاس آیا تھا۔

میں بے اختیار اس کی طرف دوڑا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ آس پاس کھڑے ہوئے درجن بھر افراد خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ محسن نے مجھے روکنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

"دیکھو یار دوست بولنا۔" محسن نے میرا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

کچھ پوچھے بغیر میں نے اس غنڈے کے ایک مکا رسید کیا اور بچے کو اپنے پیچھے کر لیا۔

"بدمعاش، قصائی، اس کو قتل کرنا چاہتے ہو؟" میں نے فرانسیسی میں غل مچایا۔ "آؤ میرا مقابلہ کرو۔"

غنڈہ میرے ہاتھ کے اشارے کو سمجھ گیا اور ایک غلیظ گالی دے کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اس کے دوسرا مکا زیادہ زور سے مارا۔ وہ لڑکھڑا کے پیچھے گرا۔ اب دوسرے تماشا دیکھنے والے بھی مستعد ہوئے۔ انھوں نے درمیان میں حائل ہو کے اس بدمعاش کو مزید مار کھانے سے بچا لیا۔ سہما

www.paksociety.com

ہوا بچہ ہماری صورت دیکھ کر حیران ہو کر ہم وہی ہیں یا کوئی اور۔ کیونکہ اب ہم ایک بالکل مختلف زبان بول رہے تھے۔ معاملہ کیا ہے؟ یہ تو ہم سمجھ گئے تھے۔ وہ بچہ بھیک مانگنے پر مامور تھا اور وہ غنڈہ اس سے پیسہ پیسہ وصول کر لیتا تھا۔ بچے نے ناسمجھی کر کے ہمیں روپے کما تو لیے تھے مگر اُن کو چھپانے میں ناکام رہا تھا۔ گداگری کا ٹھیکیدار اس کے ٹھکانے چوری چھپے کر رہا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ یہ رقم اس نے کتنے عرصے میں جمع کی اور باقی رقم کہاں ہے؟ ہم اعجاز بھائی کے بچے کو بچاتے رہے۔ پھر ٹھیکیدار اس کا باپ بن گیا اور اُسے اپنے ساتھ لے جانے پر بضد رہا۔ ایک انگریزی داں نے ہمیں سمجھایا کہ اس جھگڑے میں نہ ہی پڑیں تو اچھا ہے کیونکہ یہ ٹھیکیدار بہت بدمعاش لوگ ہوتے ہیں اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ کل پھر یہ لڑکا یہاں ہو گا یا کہیں اور ہو گا۔

مشکل یہ تھی کہ بچہ ہم سے چمٹ گیا تھا اور مسلسل رو رو کے کہہ رہا تھا کہ وہ اس ظالم شخص کے ساتھ نہیں جائے گا۔ وہ ہمارے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ ہمیں خدا رسولؐ کے واسطے دے رہا تھا۔

"اب کیا ہو گا جناب؟" محسن خفا ہو کے بولا۔ "دیکھ لیا دخل در معقولات کا انجام!"

"جو اس بچے کے ساتھ ہو رہا تھا اُسے معقولات نہیں سمجھا جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "اور یہ ناممکن تھا کہ میں آنکھ بند کر کے گزر جاتا۔ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

"کیا اس بچے کو ساتھ لے جانا ہے؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ہمارے گرد ایک مجمع اکٹھا ہو گیا تھا اور اس صورتِ حال نے غنڈے کو پریشان کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ ہم غیر ملکی تھے بلکہ جسمانی طور پر بھی اس پر بھاری پڑتے تھے۔ رائے عامہ بھی اس کے خلاف تھی اور خود بچہ بھی بغاوت کر چکا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ یہ ظالم اس کا باپ نہیں ہے۔ یہ اس کو روز مارتا ہے۔ اس سے بھیک منگواتا ہے اور اس کے پاس ایسے کئی بچے ہیں۔ ہم گداگری کے نظام کی اصلاح یا اس لعنت کا خاتمہ کرنے کی قسم کھا کر تو نہیں نکلے تھے لیکن اب بھڑوں کے اس چھتے میں ہاتھ ڈال چکے تھے۔

اچانک مجمع میں سے ایک خاکی ٹوپی والا نمودار ہوا۔ اس نے خاکی وردی بھی پہن رکھی تھی۔ "چلو جی! پولیس اسٹیشن چلو۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میں اس کی آواز پر اچھل پڑا۔ وہ اکرام شیخ تھا۔ ہم اس جگہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے جہاں ٹیکسی اسٹینڈ تھا اور وہ ہوٹل تھا جس میں ٹیکسی ڈرائیور بیٹھتے تھے۔ شاید وہ ہماری ہی جستجو میں سرگرداں تھا۔ ہم اُسے تلاش کرنے نکلے تھے مگر ایک حادثے نے اُسے ہم تک پہنچا دیا۔ وہ مجمع دیکھ کر آیا ہو گا پھر اُس نے ہمیں پہچان لیا۔

"میں نہیں جاؤں گا تھانے۔" غنڈہ اب بھاگنے پر آمادہ تھا لیکن میں نے اُسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ کچھ لوگ اس فری اسٹائل کشتی کے داؤ سے محظوظ ہوتے۔

"آج شکر گیا کوئی بندہ بخش۔" کسی نے کہا۔ "سالے لوگ تے بس دیکھدے رہندے نے۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ "بھیا کون پڑتا ہے کسی کے پھڈے میں۔"

"یہ بھی تو ہمارے جیسے بندے ہیں۔" پہلے شخص نے کہا۔ "حکمران کے دل میں درد ہے۔ ہم تو بے حس ہو گئے ہیں۔"

اکرام شیخ اپنی ٹیکسی لے آیا تھا۔ میں نے اُس غنڈے کو دروازے سے اندر پھینکا۔ اُس نے تھوڑی سی مزاحمت کی مگر میں نے اتنی دیر میں ریوالور نکال لیا تھا۔ اُس کی ساری اکڑفوں غائب ہو گئی۔ محسن اور میں اُس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔

"ارے بھائی ڈرائیور! یار بابا، خدائی فوجداروں کو سمجھا کر اپنا راستہ لیں۔" غنڈے نے اکرام شیخ سے بات شروع کی۔ "ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہم بہت خطرناک لوگ ہیں، پولیس ہماری اپنی ہے۔"

"ابے جو کہنا ہے لینے ابھی پولیس والوں سے کہیو۔" اکرام شیخ نے اُسے ڈانٹ کر کہا پھر بچے کو آگے بٹھایا اور ٹیکسی چلا دی۔

اکرام شیخ اب کراچی کے راستوں سے اسی طرح واقف تھا جیسے پہلے کبھی لاہور کے گلی کوچوں سے آشنا تھا۔ بہت جلد وہ ٹیکسی کو ایک ویران علاقے میں لے گیا۔ غیر بدمعاش نے یہ سمجھنے کے بعد کہ ہم پر منت سماجت، دھمکی یا لالچ کے حربے کارگر نہیں ہوں گے، خاموشی اختیار کر لی تھی اور شاید اب اس کی آخری اُمید پولیس کے تعاون پر زندہ تھی۔ اُسے اچانک احساس ہوا کہ ٹیکسی کسی بھی تھانے کی طرف نہیں جا رہی ہے۔

اُس نے شور مچایا۔ "او تے یہ کدھر لے جا رہے ہو تم لوگ مجھے۔ کون ہو تم سب؟"

میں نے ریوالور کی نالی اُس کی پسلیوں میں گھسا دی۔ "ہم ملک الموت کے ایجنٹ زیرو زیرو سیون ہیں۔"

محسن نے اُسے دوسری طرف سے دبایا۔ "اور میں منکر نکیر اینڈ کمپنی کا نمائندہ ہوں۔ تم سے کچھ سوال کرنے آیا ہوں۔"

وہ پریشان ہو کے کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف دیکھتا تھا۔ "تم۔۔۔ تم کوئی دھوکے باز ہو۔ کس نے بھیجا ہے تم کو؟"

"تمہاری شامت اعمال نے۔" اکرام شیخ بولا۔

"اب ہم تم کو ایک منافع بخش فقیر بنائیں گے۔ ہم نے بزنس نیا شروع کیا ہے اور ہمیں ابھی کوالٹی کے فقیر ریڈی میڈ نہیں ملے تھے۔ ایسے فقیر جن کی حالت زار دیکھتے ہی پتھر دل آدمی کا ہاتھ بھی جیب میں جائے تو خالی واپس نہ آئے۔" میں نے کہا۔ "ہمارا بزنس ہے۔ ہم انٹرنیشنل فقیر بنائیں گے اور ایکسپورٹ بھی کریں گے۔ تم اس فیلڈ کے آدمی ہو۔ تمہارا تجربہ ہمارے کام آئے گا۔"

"خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔" وہ چلانے لگا۔

"ہم ایسے بھی لوگ نہیں۔ تم جو اب تک یہ کام کراتے رہے ہیں۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اب وہ خود کریں گے بھیک مانگنے کا کام تمہارے جیسے ٹھیکیدار سب اچھے فقیر ثابت ہوں گے ہماری کوشش سے۔ ہم اُن کے ہاتھ پیر سائنٹیفک طریقے سے توڑیں گے یا موڑیں گے۔ اعضا کو بدنما بنائیں گے، کاٹیں گے اور ناکارہ کریں گے۔ اس طرح لنگڑے لولے اپاہج، کانے اور اندھے، کٹے پھٹے اور ٹوٹے پھوٹے فقیر تیار ہوں گے جو شاید بول سکیں گے نہ اس قابل ہوں گے کہ لکھ کر کسی سے کچھ کہیں۔ مگر اُن کی عبرت انگیز حالت سب سے سوال کرے گی۔"

وہ دہشت زدہ ہو کے بُری طرح چلایا اور اس نے پاگل پن میں ایک عجیب حرکت کی۔ حالانکہ وہ دروازے سے دور تھا مگر اس نے ہینڈل پر ہاتھ مارا۔ اتفاق سے ہاتھ صحیح جگہ پڑا اور دروازہ کھل گیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا، وہ مجھے عبور کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ ظاہر ہے یہ ایسی چھلانگ نہیں تھی کہ وہ سنبھل سکتا۔ وہ تو مجھے بھی ساتھ لے گیا تھا مگر محسن نے میرا بازو پکڑ لیا اور میں باہر گرنے سے بال بال بچا۔

وہ نہایت بے ڈھنگے طریقے سے کنکریٹ کی سڑک پر گرا۔ اس وقت ٹیکسی کی رفتار بھی کافی تھی۔ ایک دم کھلنے جانے والا دروازہ بھی ایک جھٹکے سے واپس آیا تو اس سے ٹکرایا۔ نتیجہ یہ کہ گرنے کے بعد اُس نے کئی بار قلابازی کھائی اور سڑک پر گھسٹتا ہوا آگیا۔ مخالف سمت سے ایک جیپ خالی سڑک پر بہت تیز رفتاری کے ساتھ آ رہی تھی۔ اس کی راہ میں یہ رکاوٹ بہت غیر متوقع ثابت ہوئی۔ ڈرائیور نے رفتار کم کرنے اور سڑک پر گرنے والے کو بچانے کی سرتوڑ کوشش ضرور کی ہوگی مگر وہ اس کوشش میں ناکام رہا۔ جیپ اس سے ٹکرائی، گھوم کر سڑک سے اتری اور ایک بجلی کے پول سے ٹکرا کر الٹ گئی۔

اکرام شیخ نے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کر لیا تھا۔ اُس نے رفتار ایک دم بڑھا دی اور کئی موڑ کاٹنے کے بعد ٹیکسی کو ایک کمپاؤنڈ میں لے گیا جہاں کوئی موٹر گیراج قائم تھا۔

ایک ادھیڑ عمر مستری اس کی طرف لپکا۔ "کیا حال ہے استاد؟"

"ابے دیکھ! اس کے بریک ٹائٹ کر، واشنگ پالش کرا اور بریک شو بھی۔" اکرام شیخ نے پچاس کا ایک نوٹ نکالا۔ "کوئی پوچھنے آئے تو کہنا کہ گاڑی صبح سے یہیں کھڑی ہے۔"

لڑکے نے ادھر اُدھر دیکھا۔ "کون آئے گا استاد؟"

"ابے کوئی نہیں آئے گا، ڈرتا کیوں ہے۔"

"مروا مت دینا استاد۔" لڑکے نے نوٹ اُچک لیا۔

"ہم جانتے چائے پی رہے ہیں۔" شیخ نے کہا۔

ایک خاصے غلیظ ایرانی ہوٹل کے آخری کونے میں بیٹھ کے میں نے اس لڑکے سے کہا۔ "بیٹا چھوٹو! ڈرنے کی اب کوئی بات نہیں۔ ظالم کا انجام تم نے دیکھ لیا۔ اب تم اِن کے ساتھ رہو گے، انہی کے گھر میں، اِن کے بیٹوں کی طرح عزت کے ساتھ اور بہت آرام سے۔"

لڑکا اتنا سہما ہوا تھا کہ وہ فقط گردن ہلاتا رہا۔

"یہ تم نے کیا مجمع لگا رکھا تھا؟" اکرام شیخ نے ہمیں ڈانٹنا شروع کیا۔ "جیسے میں نے دیکھ لیا تھا، ایسے کیا کوئی اور نہیں دیکھ سکتا تھا؟"

"اسی مجمع کے طفیل آپ کی ہم تک رسائی ہوئی۔" میں نے کہا۔

"آپ تو شوقیہ فن کار ہیں نا۔" محسن بولا۔ "بچپن سے سڑک کے کنارے جہاں کوئی باتصویر مطلب دیکھا کھڑے ہو گئے۔"

"سوال یہ ہے کہ تم وہاں کیسے پہنچا؟" میں نے کہا۔ "کام

www.paksociety.com

کا بچہ کوئی نہیں؟"

"میرا کام کیا رہ گیا ہے سوائے تمہاری تلاش میں جھک مارنے کے" شیخ نے کہا۔ "آج تین دن ہو گئے۔ دن میں تین بار یہاں ٹیکسی لا کے کھڑی کر دیتا ہوں۔ سب سے کہہ رکھا ہے کہ مجھے کوئی پوچھتا ہوا آئے تو بتا دینا کہ میں کس وقت یہاں ملتا ہوں۔ کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ کہاں ہو، زندہ ہو کہ مر گئے۔"

"برادرِ عزیز سابق ڈی ایس پی شیخ" میں نے کہا "آپ سے ملنا ایک نیک فال ہے۔ شام کو ہم فارغ ہیں۔ آپ پورا پیریڈ لیکچر دے سکتے ہیں اور نہیں جتنا چاہیں جھاڑ سکتے ہیں۔ ابھی تو ایک اہم مسئلہ درپیش ہے۔"

"ڈیڑھ مسئلہ" محسن بولا۔ "آدھا آپ کے سامنے موجود ہے۔" اُس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کس کا بچہ ہے؟"

"یہ قوم کا بچہ ہے، کسی ماں کی آنکھ کا نور ہے کسی باپ کے دل کا سرور ہے" میں نے کہا۔ "لیکن بہت مجبور ہے، معتوب ہے اور مقہور ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور اس کے سر پر دستِ شفقت رکھو۔ تفصیل سے یہ خود بتائے گا۔ ابھی ہم جاتے ہیں، پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ فقط والسلام۔"

"ارے۔۔۔ بات تو سنو۔۔۔ تم کہاں رہتے ہو؟"

اکرام شیخ ہمیں اٹھتے دیکھ کر بولا۔ "چلو میں چھوڑ آؤں۔"

"تم اس بچے کو لے جاؤ۔ ہم خود جا سکتے ہیں اور تمہارے حق میں ویسے بھی یہی بہتر ہے کہ فی الحال خود کو اہم آدمیوں کے معاملات سے الگ رکھو۔ اس طرح تم ہماری زیادہ مدد کر سکو گے" میں نے کہا۔

"ویسے آج کل تمہارا ایڈریس کیا ہے۔۔۔ میرا مطلب تمہارا غریب کدہ کہاں ہے؟" محسن بولا۔ "تمہاری ٹیکسی ڈرائیوری پر لوگ سخت رشک اور حسد کا شکار ہیں کہ یک شد دو شد۔"

"کیا کریں، وہ بھی بے چارے۔ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی" میں نے کہا۔ "آج وہ تیرے ساتھ نہیں ہیں۔"

"تم ایک تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔ ایسی بھی کیا آفت آ رہی ہے کہ دس منٹ نہیں رک سکتے" اکرام شیخ بگڑ کے بولا۔ "بہت خود غرضی۔۔۔ اور اہم باتیں تھیں، خبریں تھیں۔"

"ابھی تو مختصر خیال پڑھ دو" میں نے کہا۔ "تفصیل پھر سنیں گے۔"

"انکل رضوی کا انتقال ہو گیا ہے" اُس نے کہا۔

میں اور محسن اس المیے پر کچھ دیر تو دہشت اور دکھ کے جذبات کی یلغار میں اسی طرح کھڑے رہے جیسے زلزلے کا پہلا جھٹکا محسوس کرنے والا کچھ دیر خوف اور دہشت سے مفلوج اور منجمد کھڑا رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس دل فگار خبر کی شدت نے احساس میں درد بھر دیا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے مگر بے یقینی پر یقین غالب آ گیا۔ جو ہونا ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ ہم سب فانی انسان ہیں۔ خدا کی عطا کردہ مہلت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ چنانچہ طمانیت اور تحفظ کے ساتھ کاروبارِ حیات کی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ بے فکری کے ساتھ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے جاتے ہیں۔ خوابوں کی تعبیریں ڈھونڈتے منصوبے بناتے کامیابیوں کی جستجو کرتے اور مستقبل کو لامحدود تصور کرتے ہوئے زندگی کی ہر خواہش کو اپنے اختیار میں جانتے ہوئے۔

"وہ دونوں لاہور چلی گئی ہیں" اکرام شیخ نے خاموشی کے ایک سوگوار وقفے کا ماتمی سناٹا ختم کیا۔

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ایک ہفتہ ہو گیا۔ مجھے بھی دیر سے اطلاع ملی۔ میں نے منظر کو فون کیا تھا۔ اُس نے بتایا۔ تمہارا پوچھا۔ میں نے کہا کہ کیا معلوم کہاں ہوں گے۔ ملیں گے تو بتا دوں گا۔ سوئم بھی ہو چکا تھا مگر میں نے ان دونوں کو بھیج دیا۔ شمع کو اور آنٹی کو کچھ تو تسلی ملے گی۔ الفاظ کی ہمدردی کو وہ کیا کریں گی۔ سب نے ہی کہے ہوں گے۔ اپنوں کی ضرورت تھی انھیں۔"

میں نے سر ہلایا۔ "اُن کا بھی کون تھا۔ نہ ماں باپ نہ بھائی بہن۔ ہم تھے تو ہمارا ہونا نہ ہونا برابر۔ بس دُکھ دیتے رہے انھیں۔ سکھ دینے والا تو وہی تھا جو چلا گیا انھیں بیوہ کر کے اور ہم بدبخت اس وقت بھی اُن کے پاس نہیں۔"

"یہ سب کیسے ہوا یار اکرام؟" محسن بولا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہا تھا۔

"بس، ہونے والی بات تھی، ہارٹ فیل ہو گیا۔ کوئی کچھ نہ کر سکا" اکرام شیخ نے کہا۔

"اب خیال آتا ہے کہ اس جنتی آدمی نے اصول اور ایمان کے راستے پر چل کر کیا پایا؟ فرض شناسی کا کیا صلہ ملا؟ ایک اپنا مکان تک وہ بنا نہیں سکے تھے۔ یہ گھر بھی ہم سب نے کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیا ورنہ وہ نکالے جاتے یہاں سے بھی، جیسے نوکری سے نکالے گئے" میں نے تلخی سے کہا۔

"اس مکان کا بھی وہ تو کرایہ دیتے تھے۔ انھیں کہاں معلوم تھا کہ ہم نے کیا چکر چلا کے اُسے خرید لیا تھا" محسن بولا۔ "ورنہ وہ ہمارا احسان لینا گوارا کرتے؟"

"جیسا وہ درویش صفت شوہر تھا، ویسی ہی اُسے شریکِ حیات ملی۔ صابر و شاکر اور باہمت۔ کبھی نہیں کہا اس نے کہ تمہارے مرتبے کے افسروں کی چار چار کوٹھیاں ہیں لاہور کراچی اور مری میں۔ وہ ہر سال شاندار کاریں بدلتے ہیں۔ اُن کے بیوی بچے یورپ سے مشرقِ بعید تک شاپنگ کے لیے جاتے ہیں۔ میں نے تو نہیں دیکھا کوئی انسپکٹر بھی جو ان کا بھی فقیر ہو۔ وہ تو ایسے ہی تھے" محسن نے کہا۔

"اب دیکھو، ایک اسکول چلا رہے تھے میاں بیوی۔ خدا کا شکر ہے کہ بیوی با صلاحیت ہے اور اسکول اچھا چل رہا ہے۔ آمدنی کا مسئلہ نہیں ہوگا" اکرام شیخ بولا۔ "سو بھی تو خیر نہیں مانی تھی۔ زیب النساء سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہیں رہے۔ وہ اور شملہ دونوں اسکول چلانے میں مدد کریں آنٹی کی۔ زیب النساء ذرا ڈر رہی تھی۔ میں نے کہا کہ جب تک ہم لاہور میں تھے اور ضامن رضوی ایس پی تھے، اُن کا گھر غیر محفوظ تھا۔ اب وہ بات پرانی ہو گئی۔ سب بھول چکے انھیں۔ اس گمنام گھر کی دیواروں میں تم بھی محفوظ رہو گی۔ جانا ہو تو نام بدل کے وہیں ٹھہر جانا۔ انھیں سہارا ہو گا۔"

"یہ تو نے اچھا کیا" محسن آنسو پونچھ کے بولا۔

میں نے کہا۔ "بڑی حوصلہ شکن خبر سنائی تو نے۔ کاش وہ کچھ دن اور جی لیتے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے کہ ہم اپنی جدوجہد میں کامران ہوئے۔ مالک کے اور ہمارے دشمن ایک تھے۔ مجرم ہم نہیں، وہ تھے۔"

"یہ تو جانتے تھے وہ۔ پہلے ہی سمجھ گئے تھے" محسن بولا۔ "ان کے پاس عقل اور دیانت تھی اور اتنا طویل تجربہ تھا۔ حالات کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ اپنے یقین کا کھل کے اظہار کرتے۔"

"منظر نے یہ بھی بتایا کہ اس زمین کا قبضہ حاصل ہو گیا ہے جس پر وزیر اینڈ کمپنی اور پھر ایم ٹیلیوڈی کمپلیکس تھے۔ وزیر خان ہاسپٹل کے پروجیکٹ کی تکمیل کی راہ میں اب کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ وزیر خان چیریٹیبل ٹرسٹ کا نگران خود جہاں الودود منتظر ہے۔ رابعہ کی لیگل فرم بھی اُس نے سنبھال رکھی ہے۔ منظر اینڈ قادری کے نام سے اچھا بزنس کر رہی ہے" اکرام شیخ نے کہا۔ "انکل رضوی نے اس کی بہت مدد کی تھی۔"

میں نے گھڑی دیکھی، ڈیڑھ بجنے والا تھا۔

"اگر ایک ٹرک ساڑھے گیارہ بجے حیدرآباد سے چلے" میں نے کہا۔ "تو کتنی دیر میں کراچی پہنچے گا؟"

"ٹرک ہے؟۔۔۔ ڈھائی تین گھنٹے تو ضرور لگ جاتے ہیں۔ ایک تو ٹرک زیادہ رفتار سے نہیں چل سکتے، سڑک خراب ہے، کئی جگہ سے بن رہی ہے، میلوں کچا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔"

"بس پھر ٹھیک ہے" میں نے اُس سے ہاتھ ملایا۔ "ہم اب چلتے ہیں ورنہ دیر ہو گئی تو اُس کی محنت بھی اکارت جائے گی جس نے یہ اطلاع ہم تک پہنچائی۔"

"وہ کون ہے؟"

"تب کوئی نادیدہ مہربان۔ ہم قیاس کر سکتے ہیں مگر یقین کے ساتھ اس کا نام نہیں لے سکتے" میں نے کہا۔

"دیکھ لو، کہیں یہ جال نہ ہو۔ غیر مصدقہ اطلاعات پر یوں دوڑے چلے جانا کوئی دانش مندی نہیں" اکرام شیخ بولا۔

"فکر مت کر ہماری۔ مار گزیدہ اتنا رسی سے نہیں ڈرتا جتنے ہم مردم گزیدہ انسان کے بھیس میں پھرنے والے شکاری حیوانوں سے ڈرنا سیکھ گئے ہیں۔ اسی نے ہمیں محتاط رہنا اور تاریک پہلو پر پہلے غور کرنا سکھا دیا ہے" میں نے کہا۔ "وقت اور عمر نے وفا کی تو شام سے پہلے پھر یہیں ملیں گے۔"

ہم اکٹھے نکلے اور سڑک پر پیدل چلتے گئے۔ ایک فرلانگ کے اس راستے پر ہمیں سامنے سے آنے والی دو گاڑیاں ملیں۔ پیچھے سے آنے والی تین گاڑیوں میں سے دو ہمارے اشارے کو نظرانداز کرتے ہوئے گولی کی طرح گزر گئیں۔ تیسری کار ایک فاکس ویگن تھی جسے ایک عورت چلا رہی تھی۔ خلافِ توقع اُس نے کار روک لی اور ہمیں پیچھے بیٹھنے کا موقع عطا کیا۔

کار کے ونڈ اسکرین پر ریڈ کراس کا نشان تھا اور اس کے نیچے ڈاکٹر کے الفاظ درج تھے۔ وہ تیس سال سے زائد عمر کی قبول صورت اور خوش اخلاق عورت تھی۔ مجھے اس خیال سے شرمندگی ہوئی کہ ہم اس کی نیکی کے بدلے اُس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اور اس سے کار چھین کر اس کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا کرنے والے تھے۔ بے شک ہم کوئی نقصان نہیں پہنچانے والے تھے مگر پھر بھی ایک عورت کے لیے گھر کے راستے کو چھوڑ کر دو اجنبی افراد کے ساتھ

www.paksociety.com

کسی خطرناک قسم ہو جاتا بہت سے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے گھر والے، شوہر اور بچے سب اس کی گمشدگی سے پریشان ہوں گے۔ خود اس کا جذباتی ردِعمل نہ جانے کیا ہو۔ آئندہ تو شاید وہ راہ چلتے کسی کو مرتا بھی دیکھے گی تو گاڑی نہیں روکے گی۔

میں نے اچانک آگے جھک کر کہا: ”بس یہاں اتار دیں بیبی۔“

عورت تھوڑی سی متعجب ہوئی: ”اتنا فاصلہ تم کو پیدل طے کرنے کی عادت ہونی چاہیے۔ جوان آدمی ہو۔“

”یس میڈم۔“ میں نے اترنے کے بعد کہا۔ ”آپ سے بھی ایک گزارش ہے۔ راہ چلتے ہر اجنبی کو یوں لفٹ مت دیجیے۔ خصوصاً غیر آباد سڑکوں پر۔“

وہ مسکرائی: ”میں ڈاکٹر ہوں۔ بیمار ذہن رکھنے والوں کے چہروں پر مجرمانہ خیالات کا عکس دیکھ لیتی ہوں۔“

”کبھی کبھی چہرے دھوکا بھی دے جاتے ہیں ڈاکٹر صاحبہ!“ محسن بولا۔

وہ ہنسی: ”مجھے کوئی دھوکا نہیں ہوا تھا۔ میں نے تم دونوں کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ تم سکندر اور محسن ہو۔“

اس کی بات نے مجھے اور محسن کو ایک ساتھ حیران پریشان کر دیا۔

”مجھے افسوس ہے کہ اس سے زیادہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گی۔“ وہ بولی: ”میری کچھ مجبوریاں ہیں چنانچہ

گڈ لک ٹو یو بوتھ، خدا حافظ!“

بیک وقت ہم دونوں نے سیلیوٹ کے انداز میں ہاتھ اٹھائے۔

”خدا حافظ!“ محسن نے کہا: ”اینڈ تھینک یو۔“

”ہمیں سب سے زیادہ نیک خواہشات کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

جب کار چلی گئی تو میں نے ایک گہری سانس لی۔

”یہ اچھا کیا تو نے۔“ محسن بولا: ”خود مجھے پشیمانی ہو رہی تھی اسے روکنے کے لیے۔“

”چلو ۔۔۔ اچھا ہی ہوا ۔۔۔ جاتے جاتے وہ تو دے گئی۔ یہ احساس تو دے گئی کہ دشمنوں کے مقابلے میں دوست بھی ہیں۔“ میں نے کہا: ”مجھے اب یقین آنے لگا ہے کہ راہ چلتے سیکڑوں ہزاروں لوگ ہمیں پہچان لیتے ہوں گے لیکن وہ کسی ذاتی مجبوری کے باعث یا ہماری پریشانی کے خیال سے سامنے آ کے شناخت کا اظہار نہیں کرتے۔ اس یقین کے ساتھ کتنی طاقت ملتی ہے۔ راہ چلتے ہوئے سڑک اور بازار میں، ہوٹل ریسٹورنٹ میں، صبح سے شام تک ہمارا بیشتر وقت ایسے ہی پسِ پردہ رہنے والے دوستوں، مددگاروں اور بہی خواہوں ۔۔۔۔۔۔ کے درمیان گزرتا ہے۔ لاکھوں میں ایک شکاری ہے تو ہزاروں محافظ۔“

میں نے پلٹ کے دیکھا: ”لے بھئی، ہمارے مطلب کی گاڑی بھیج دی اللہ میاں نے۔“

”اللہ کرے رک بھی جائے۔“ محسن بولا۔

وہ گاڑی جو ایک چلتا پھرتا ڈبا تھی کسی بیکری کی ڈبل روٹیاں دکانوں پر پہنچاتی تھی۔ ڈبل روٹی کا ایک سستی چیز اشتہار اس کے پچھلے باکس نما حصے کی تینوں دیواروں پر نقش تھا۔ اس میں ایک حسینہ سوئمنگ کے لباس میں بڑی نزاکت سے ایک سلائس کھا رہی تھی نیچے ”بیوٹی بریڈ“ کا نام لکھنے والے نے زبانِ انگریزی سے ناواقفیت کی بنا پر بریڈ میں اے کی جگہ ڈبل ای ای لکھ دیا تھا۔ اس عجیب غلطی نے بریڈ کو بریڈ کر دیا تھا جس کا مطلب ہوتا ہے ”نسل“۔

”حسن کی نسل“ مارکہ ڈبل روٹی کے تقسیم کار نے گاڑی روک کے اپنا منہ باہر نکالا جس کے اوپر بیچ اور چاروں طرف بجو سے بالوں کی گھنی باڑھ تھی۔ وہ چہرہ ایک ناریل سے مشابہ تھا جس کو ابھی چھیلا نہ گیا ہو۔

”کہاں جاؤ گے پوپائی دی سیلر؟“ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ یہ کارٹون سیریل ان دنوں خاصا مقبول تھا۔

ہم جواب دیے بغیر آگے جا کر بیٹھ گئے۔ ”جہاں تم لے جاؤ گے۔“ میں نے کہا۔

”دو دو روپے لوں گا۔ نہیں منظور تو اتر جاؤ گاڑی سے۔“ وہ بولا۔

میں نے اسے پانچ روپے دیے اور کہا: ”ہم ڈھائی ڈھائی دیں گے، یہ تو منظور ہے؟“

اس نے دانت نکال کر کہا: ”پیٹرول بہت مہنگا ہو گیا ہے۔“

”تمہاری بیکری کا ۔۔۔ میرا مطلب ہے گاڑی کا [illegible] پہیہ بیٹھ گیا۔“ میں نے گاڑی کے روانہ ہوتے ہی کہا۔

اس نے گاڑی فوراً روک دی اور اتر کے پیچھے گیا۔ دوسری طرف سے میں اترا۔ میں نے محسن کو آگے جھک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا اشارہ کیا۔

ڈرائیور نے باری باری دونوں ٹائروں پر ٹھوکر مار کے کہا: ”ہوا تو ٹھیک ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے گاڑی کے پیچھے والے دروازے کے دونوں پٹ کھول کے کہا: ”زمانہ ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ میری حرکت پر حیران بھی نہ ہو پایا تھا کہ میں نے اسے اندر اچھال دیا اور پھر خود بھی چھلانگ مار کے اندر پہنچ گیا۔ اس کے فرش پر گر کے اٹھنے سے پہلے ہی میں نے دروازہ اندر کھینچ کے بند کر لیا اور محسن نے گاڑی چلا دی۔ اندر خاصا اندھیرا تھا اور ڈبل روٹیوں کی مخصوص مہک تھی۔ اندر سے ڈبے کی ساخت بھی کسی بہت بڑی ڈبل روٹی جیسی تھی۔

”حسن کی نسل“ ڈبل روٹی کا تقسیم کار کسی آتش فشاں کی طرح گڑگڑا کر دھواں دینے لگا: ”بدمعاشی، غنڈہ گردی۔ ابھی تم کو پولیس کے حوالے کروں گا۔ میرے ماموں سسر ڈی ایس پی ہیں۔“

”پانچ روپے نکالو۔“ میں نے اس کے ایک ایسا چھانپڑ مارا کہ وہ پھر پیچھے جا گرا۔

”کون ہو تم لوگ؟ کیا چاہتے ہو؟“ وہ کانپتی آواز میں بولا۔ اس نے پانچ کا نوٹ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ریوالور نکال لیا: ”تم کیا چاہتے ہو؟“ میں نے پانچ کا نوٹ جیب میں رکھ کے کہا: ”ہم تمہاری لاش یہیں پھینک جائیں؟“

وہ چلانے لگا: ”خدا کے لیے مجھے مت مارو۔ چار عورتوں کو بیوہ کرنے کا گناہ مت کرو۔“

”کون چار عورتیں؟“ میں نے کہا۔

”میری بیویاں۔ ان سب کا ایک ہی شوہر ہوں میں۔“

”اچھا!“ میں نے دلچسپی سے کہا: ”اکلوتے شوہر ہو تم مجموعی ہو اور کتنی ہے؟“

اس نے فخر سے سر ہلایا: ”اللہ نے اولاد دی ہوتی تو دوسری بھی کیوں کرتا۔“ وہ ایک سرد آہ بھر کے بولا۔

”پھر اب کیا کرو گے، بیویوں کی تو گنجائش ہی نہیں۔“

”ان سب کو طلاق دے دوں گا۔“ وہ بولا: ”شرعی حق ہے میرا ۔۔۔“

”واہ، کیا شرع کا استعمال ہے۔ ان چاروں کو طلاق دو پھر مزید چار کرو۔ ان سے بھی کچھ نہ ہو تو سمجھو اللہ کی مرضی اور انہیں بھی نکال باہر کرو۔ سلسلے تا ریل کی لوکل۔ اس سے بہتر ہو گا کہ میں ان چاروں کو آزاد کر دوں ایک گولی سے تاکہ وہ اپنی مرضی سے پھر شادی کر سکیں۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ چاروں بچے والی ہوں گی۔“

میں نے ریوالور اٹھایا تو وہ بلبلانے لگا: ”اللہ رسول کا واسطہ تم کو۔ مجھ سے جتنا پیسہ چاہو لے لو۔“

میں نے ریوالور رکھ لیا: ”ہم ڈاکو نہیں ہیں، فقیر لوگ ہیں۔ پیسہ ہاتھ کا میل ہے ہمارے لیے۔ تمہاری جان بخشی کی صرف ایک شرط ہے۔ تم چپ چاپ بیٹھو اور کوئی سوال نہ کرو۔ شام کو تم گھر جا سکو گے۔ لیکن بعد میں اگر ۔۔۔ تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا ہمارے بارے میں تو ہم آ جائیں گے۔“

”میری توبہ، میرے باپ کی توبہ!“ وہ کان پکڑ کے بولا۔

اس کے باوجود میں نے اس پر اعتبار کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو اولاد کے لیے شرع کے مفہوم کو بھی غلط بیان کر سکتا تھا۔ ایسا شخص دنیاوی معاملات میں ضمیر کی پروا کہاں کرتا ہو گا۔ میں نے اسے گاڑی کے اندر ہی باندھ کے ڈال دیا۔ اس کے ہاتھ پیر باندھنے کے لیے مجھے ایک رسی مل گئی تھی۔ منہ بند کرنے کے لیے بنیان اس کی قمیص پھاڑی اور کپڑا اس کے حلق میں ٹھونس دیا۔ ایک پٹی میں نے اس کی آنکھوں پر بھی باندھی۔

محسن نے یہ وقت مسلسل ڈرائیونگ میں صرف کیا۔ اس نے خاصی رفتار سے گاڑی چلائی۔ اس کا اندازہ مجھے پچھلے حصے میں جھولوں اور جھٹکوں سے ہوتا رہا۔ سڑک واقعی بہت خراب تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد گاڑی ٹھہر گئی۔

میں نے نیچے اتر کے دیکھا تو محسن بھی باہر آ چکا تھا۔ ”ہم کراچی سے تقریباً تیس چالیس میل دور ہیں۔“ محسن نے کہا۔

”یہاں گاڑی کیوں روکی ہے؟“

محسن نے سڑک کے دائیں جانب اشارہ کیا۔ ایک چھوٹی سی سڑک کو لکڑی کے ایک تختے سے بند کر دیا گیا تھا۔ یہ تختہ تقریباً ایک فٹ چوڑا اور بیس فٹ کے قریب لمبا تھا۔ اس پر سفیدی کے سرخ حروف میں لکھا گیا تھا۔ ”ہر قسم کی ٹریفک کے لیے بند ہے۔“ اس کے وسط میں ٹین کا گول دائرہ نما حفظ خطرے کی علامت ایک انسانی کھوپڑی

www.paksociety.com

اور دو بتیاں بنی ہوئی تھیں۔

"ابھی ہم جس راستے سے آئے ہیں اس پر جگہ جگہ ایسے بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر لکھا ہوا تھا "متبادل راستہ" اور ایک تیر کا نشان تھا۔" محسن نے کہا۔ "مثلاً وہ دیکھو، ابھی ہم ایک متبادل راستے سے گزرے تھے۔"

تقریباً سو گز پیچھے ایک متبادل راستے کا سائن بورڈ نظر آیا۔ سڑک جہاں سے بنی تھی وہاں ٹریفک کو روک دیا گیا تھا۔ ہائی وے ڈیپارٹمنٹ والے سڑک کی مرمت کر رہے تھے چنانچہ ٹریفک کے لیے سڑک سے ہٹ کر ایک عارضی راستہ فراہم کیا گیا تھا۔ چونکہ پوری سڑک ایک بار میں ٹریفک کے لیے بند نہیں کی جا سکتی تھی اس لیے صرف مرمت والے حصے پر "متبادل راستے" کے سائن بورڈ لگا دیے گئے تھے اور مرمت کا کام پورا ہونے تک ٹریفک کو دائیں یا بائیں سڑک سے نیچے کچے راستے پر ڈال دیا جاتا تھا۔

"میں سارا راستہ اسی اسکیم پر غور کرتا آیا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "اور یہاں پہنچنے کے بعد گویا اسکیم فائنل ہو گئی ہے۔"

"تم نے سامنے سے آنے والی گاڑیوں کے نمبروں پر بھی غور کیا؟" میں نے کہا۔

"میں وہ بھی دیکھ رہا تھا۔" محسن بولا۔ "لیکن ابھی تک لاہور سے آنے والی صرف تین گاڑیاں گزری ہیں۔"

"اچھا اسکیم کیا ہے آپ کی مسٹر شیکسپیئر؟" میں نے کہا۔

"اگر کچھ ایسا ہو سکے..." محسن سوچتے ہوئے بولا۔ "کہ تم گاڑی لے کر آگے چلے جاؤ۔ تم دیکھ رہے ہو سامنے نظر آ رہا ہے، دو فرلانگ کے بعد ایک موڑ ہے۔ سڑک تھوڑا سا دائیں جانب گھوم گئی ہے اور یہ موڑ آیا ہے ایک ٹیلے کی وجہ سے۔"

میں نے اس جغرافیے کو غور سے دیکھا۔ واقعی ٹیلے کے پیچھے سے آنے والی گاڑی موڑ کاٹنے سے پہلے دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔

"تم اس ٹیلے کے پیچھے کسی جگہ اپنی گاڑی روک کر سڑک پر نظر رکھو۔ تیرے پاس دوربین ہے۔ تم آدھے پونے میل تک ہر آنے والی گاڑی کو دیکھ سکو گے۔ اس کا نمبر بھی دو فرلانگ سے پڑھا جا سکے گا۔"

"میں سمجھ گیا۔ میں وہاں آبزرویشن پوسٹ بنا کے بیٹھ جاتا ہوں اور جیسے ہی کوئی گاڑی آتی ہے جس پر ظاہر ہے شبیر ہو، میں دوڑ کے آتا ہوں اور..."

"نہیں، دوڑ کر آنے کی ضرورت نہیں۔ تو وہیں سے مجھے سگنل دے سکتا ہے گاڑی کا ہارن بجا کے۔"

"ہارن تو ادھر سے آنے والی ہر گاڑی بجاتی ہے۔"

"تو وقفے وقفے سے تین بار ہارن بجا سکتا ہے۔" محسن بولا۔

"اتنے فاصلے سے ہارن کی آواز سنائی دے گی؟" میں نے کہا۔ "اچھا فرض کرو میں نے ہارن سگنل دیا کہ ٹرک آ رہا ہے تو پھر؟"

"پھر یہ کہ میں یہاں اپنی کارروائی کروں گا۔ ٹرک کا راستہ بدل دوں گا۔" محسن نے کہا۔ "میں وہ متبادل راستے کا سائن بورڈ اٹھا کے لاتا ہوں۔ میں بالکل تیار رہوں گا۔ ادھر تیرا سگنل ملا ادھر میں نے 'متبادل راستے' کا یہ سائن بورڈ ادھر رکھا جہاں لکھا ہوا ہے کہ یہ راستہ ہر قسم کی ٹریفک کے لیے بند ہے۔ اس سائن بورڈ کو ہٹا کے میں یہاں سڑک کے بیچ میں لگا دوں گا۔"

"تو اکیلا کرے گا یہ کام؟" میں نے اسکیم کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

"متبادل راستے کا سائن بورڈ میں ابھی لے آتا ہوں اور ایک طرف رکھ کے انتظار کرتا ہوں۔ پھر وہ سڑک بند کرنے والا بورڈ مجھے گھسیٹ کر ادھر لانا ہے اور متبادل راستے کا بورڈ ادھر رکھنا ہے۔ یہ صرف پانچ سات منٹ کا کام ہے۔" محسن نے کہا۔

"پلان تو زبردست ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر دوست! پہلی بات تو یہ کہ ٹرک کو غلط سمت میں موڑنے سے کیا ہوگا؟"

"میرا خیال ہے کہ آگے سڑک پر کوئی کمزور پل ہوگا۔ عموماً اس قسم کے غیر محفوظ پل جو زیادہ وزن نہیں برداشت کر سکتے، پہلے بھاری گاڑیوں کے لیے ممنوع قرار دیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر قسم کی گاڑیوں کے لیے بند کر دیے جاتے ہیں۔ میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا کہ آگے کیا ہے مگر سائن بورڈ پر خطرے کا نشان ہے تو خطرہ ضرور ہوگا۔"

"دوسری بات یہ کہ اس ٹرک کے ساتھ آگے یا پیچھے کوئی اور گاڑی ہوئی تو؟"

"خدا کرے کہ نہ ہو۔ ہوئی تو اسے روکنے کی اور صحیح سمت میں بھیجنے کی کوئی صورت کریں گے۔" محسن نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے گھڑی دیکھ کے کہا۔ "میں آگے جاتا ہوں۔ دوربین کی مدد سے میں ٹرک کو کافی فاصلے سے دیکھ سکوں گا۔ جیسے ہی مجھے شبیر نظر آیا تو میں ایک ہوائی فائر کروں گا۔"

"فائر پر وہ چوکنے نہ ہو جائیں؟"

"اس ویرانے میں انہیں کیا نظر آئے گا۔ بیوٹی برینڈ کی اس گاڑی پر تو وہ شک کرنے سے رہے۔ فائر کرتے ہی میں بھی چل پڑوں گا اور کوشش کروں گا کہ کسی دوسری گاڑی کو اس کے ساتھ نہ آنے دوں۔" میں نے کہا۔

میں نے محسن کو واپس جاتے دیکھا۔ وہ 'متبادل راستے' کا روڈ سائن اٹھانے جا رہا تھا۔ سڑک کے اس حصے کی مرمت کا کام ختم ہو چکا تھا۔ مگر ہائی وے ڈیپارٹمنٹ کے ٹھیکے دار نے ابھی تمام اسباب نہیں اٹھایا تھا۔ شاید اس کا ارادہ سب سامان ایک ہی بار میں سمیٹنے کا ہو گا جب کام کہیں بھی قریب ہے۔

میں محسن کی نسل مارکہ ڈبل روٹی گاڑی لے کر آگے چل پڑا۔ دو فرلانگ کے بعد میں نے موڑ کاٹا تو مجھے سڑک تا حد نگاہ سیدھی اور سپاٹ نظر آئی۔ دوپہر کے وقت ٹریفک بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ دوربین لگا کے دیکھنے سے مجھے کافی فاصلے پر سڑک کی مرمت کرنے والے مصروف دکھائی دیے۔ وہاں سے ایک بس گزری تو اس نے سڑک چھوڑ کر متبادل راستہ اختیار کیا۔ اور گرد کا بگولا سا اٹھا۔ بس جب پھر پکی سڑک پر آئی تو میں نے اس کا نمبر پڑھنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس بہت طاقتور دوربین کی مدد سے میں نے نمبر صاف پڑھ لیا۔ حالانکہ بس ابھی آدھا میل دور تھی۔

میں نے بیوٹی برینڈ کی گاڑی کا رخ واپس کراچی کی طرف کیا اور جب بس گزر گئی تو پیچھے کے دونوں شیشے کھول کے اندر چار بیویوں کے اکلوتے، بے اولاد شوہر کو دیکھا۔ وہ خبیث جھکتا ہوا دروازے تک آ پہنچا تھا حالانکہ اس کے ہاتھ اور پیر بندھے ہوئے تھے۔ شاید اس کا ارادہ لاتیں مار کے دروازہ کھولنے کا ہو گا۔ اس طرح وہ گزرنے والوں کو متوجہ کر سکتا تھا۔

"تم کیوں چار بیویوں کا سہاگ اجاڑنے پر تلے ہوئے ہو؟" میں نے اسے گھسیٹ کر پھر پیچھے پھینکا۔ اس کا سر ٹن سے سائڈ میں لگا اور اس چوٹ نے وقتی طور پر اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ میں نے اس کے مکر کو آزمانے کے لیے جلتی سگریٹ اس کے بازو پر لگائی۔ اس نے حرکت تو کی مگر وہ اچھلا نہیں۔

میں مطمئن ہو کے باہر آ گیا اور موقع محل دیکھ کے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ وہ جگہ بہترین آبزرویشن پوسٹ ثابت ہوئی۔ میں وہاں پتوں میں چھپا ہوا کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا لیکن سڑک پر دور تک کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ بیوٹی برینڈ کی گاڑی سڑک کے ایک کنارے کھڑی ہوئی تھی۔ کوئی بھی دیکھنے والا اس سے یہی سمجھ سکتا تھا کہ گاڑی خراب ہے۔ ایک اتفاقی فائدہ یہ تھا کہ درخت کے اوپر سے فائر کرنے میں آواز پھیل کر سنائی دے گی۔ کوئی یہ نہیں سمجھے گا کہ فائر بیوٹی برینڈ کی گاڑی سے کیا گیا ہے۔

آدھے گھنٹے تک میں ایک شاخ پر نیم دراز سگریٹ پیتا رہا اور وقفے وقفے سے دوربین لگا کے دیکھتا رہا۔ اس عرصے میں دس گاڑیاں گزریں۔ ان میں سے تین مسافر بسیں تھیں، پانچ ٹرک تھے اور دو پرائیویٹ کاریں۔ گھڑی میں اب پونے تین ہو رہے تھے گویا ٹرک کو حیدرآباد سے روانہ ہوئے سوا تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ ابھی کراچی تک مزید ایک گھنٹے کی مسافت تھی۔ کیا ٹرک سوا چار گھنٹے میں پہنچے گا؟ نہیں، راستہ تو ڈھائی تین گھنٹے کا ہے۔ کہیں ٹرک گزر تو نہیں گیا؟ لیکن محسن خاصے یقین کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ وہ سارے راستے دیکھتا آیا تھا۔ ممکن ہے ٹرک کی روانگی دیر سے ہوئی ہو یا راستے میں کوئی خرابی ہو گئی ہو۔ میرا ذہن دونوں طرح کے دلائل دیتا رہا۔ تاخیر کے حق میں بھی اور اس کے خلاف بھی۔ میری جھنجھلاہٹ اور مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے رہ رہ کے خیال آ رہا تھا کہ ٹرک پہلے ہی نہ نکل گیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو قصور میرا ہو گا۔ میں نے اس فقیر ٹھیکیدار کے معاملے میں ٹائم اڑا کے کم سے کم آدھا گھنٹا گنوا دیا تھا۔ پھر ہم نے اکرام شیخ سے بھی آدھا گھنٹا باتیں کی تھیں۔ حالانکہ ہم چاہتے تو اس وقت ملاقات کو مختصر کر دیتے۔

ٹرک اچانک نمودار ہوا۔ میں نے دوربین سے دیکھا تو اس کا نمبر فوکس کرتے ہی واضح ہو گیا۔ یہ ایک آئل ٹینکر تھا جو ایک عجیب بات تھی۔ میں کسی مال بردار ٹرک کی توقع لیے بیٹھا تھا۔ ٹرک ابھی آدھا میل دور تھا مگر

www.paksociety.com

ایک گرد بیٹھی کراس کے آگے آگے ایک پرائیویٹ کار آ رہی تھی۔ اُسے روکنا ضروری تھا۔

وقت کم تھا چنانچہ میں نے فائر کیا اور درخت پر سے چھلانگ لگا دی۔ دو منٹ بعد میں ہیوٹی بریڈ کی گاڑی کو آہستہ آہستہ چلاتا ہوا واپس کراچی کی طرف رواں تھا۔ کار جب میرے قریب سے گزرنے لگی تو میں ایک دم سڑک کے درمیان میں آ گیا۔ کار ڈرائیور نے ایک دم بریک لگائے اور کار کو انتہائی بائیں جانب موڑ کے تصادم سے بچا لیا۔ میں پھر سائڈ میں ہو گیا مگر کار ڈرائیور بے حد مشتعل تھا۔ اُس نے کار روک لی تھی۔

"نشے میں ہے؟" اُس نے مجھے گالی دے کر کہا۔

"اندھے . . ."

میں نے اپنی گاڑی اس کے سامنے روکی اور نیچے اُتر آیا۔

"گالی کیوں دی؟" میں نے اُسے کالر سے پکڑ کے باہر کھینچ لیا۔

"چھوڑو میرا کالر۔ تم جانتے نہیں میں کون ہوں۔" اس نے میرا ہاتھ جھٹکنے کی ناکام کوشش کی۔

"تم ٹھنڈے لاٹ کے چھچھورے ہو۔" میں نے کہا۔ "یا طرم خاں کے ماموں ہو۔ میں تم کو بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں۔"

اس نے میرے سر پہ مکا مارا۔ میں نے جواب میں اس کو دوبار پٹخنی دی۔ ایک بار دھوبی پٹخے کے انداز میں اور دوسری بار تنگڑی مار کے۔ وہ طاقتور آدمی تھا مگر پروفیشنل نہیں تھا۔ دوسری پٹخنی کے بعد وہ ملبا لیٹ گیا۔ میں نے اُسے اُٹھا کے کار میں واپس اپنی جگہ بٹھا دیا۔

"سڑک پر کار سے کرتب کرتے ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم نے سڑک خرید لی ہے۔" میں نے کہا۔ "امید ہے کہ آئندہ تم پہلے تولو گے پھر بولو گے۔ غلطی اگر میری تھی تو تم مجھے معذرت کرنے کا موقع تو دیتے۔ غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے اور غیر ارادی بھی ہو سکتی ہے۔"

وہ مجھے خون آشام نظروں سے گھورتا رہا اور ہانپتا رہا۔

"میں دیکھ لوں گا۔ تم مجھے جانتے نہیں۔"

"گالی بکنے سے پہلے تم بھی مجھے نہیں جانتے تھے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم نے دو منٹ میں وہ دیکھ لیا جو اتنی زندگی گزار کے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آئندہ کیا دیکھو گے یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے۔"

ٹرک اتنی دیر میں میرے قریب سے گزر چکا تھا اور میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ ٹرک میں بیٹھے ہوئے کسی شخص نے میرا چہرہ نہیں دیکھا تھا کیونکہ اُن کی طرف میری پشت تھی۔

"میں نے خیال رکھا تھا کہ تمہیں زیادہ چوٹ نہ آئے۔" میں نے اس کی گاڑی سے چابی نکال کے کہا۔ "پھر بھی . . . آئی ایم سوری۔"

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" وہ پریشان ہو کے بولا۔

میں نے اندر ہاتھ ڈال کے اس کا بونٹ کھولا اور ڈسٹری بیوٹر کیپ کے تار ایک جھٹکے سے کھینچ کر الگ کیے اور بونٹ بند کر کے چابی واپس اُسے تھما دی۔ "میری گاڑی کا نمبر نوٹ کر لو۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے اجازت دو۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کرو۔" وہ چلایا۔ "میں گاڑی کیسے لے جاؤں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

لیکن میں نے ہیوٹی بریڈ والوں کی گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اب وہ کسی سے لفٹ لے یا بس میں بیٹھے اور کراچی جائے۔ وہاں آٹو پارٹس مارکیٹ سے ڈسٹری بیوٹر کیپ وائر کا سیٹ لائے اور پھر گاڑی لے جائے۔ جو قانونی یا غیر قانونی کارروائی کرنا چاہے کرے۔ چار بیویوں کا اکلوتا بے اولاد شوہر اُسے کیا بتا سکے گا کہ وہ کون تھے جو اس کی گاڑی چلا رہے تھے۔

مار پیٹ ہوتے صرف ٹرک والوں نے دیکھی تھی۔ بعد میں جو بس گزری تھی اُس کے مسافروں نے مجھے کار والے سے باتیں کرتے ضرور دیکھا تھا لیکن اس وقت میں کار کی کھڑکی سے لگا بہت پُرسکون کھڑا ہوا تھا۔ پھر بھی یہ اندیشہ ضرور تھا کہ وہ کسی کار کو روک کر لفٹ لے اور میرے تعاقب میں آ جائے۔

محسن نے دور سے ہی مجھے آتا دیکھا تو میری طرف لپکا۔

"کیا ہوا؟" میں نے اس کے قریب آتے ہی کہا۔ "ٹرک کدھر گیا؟"

محسن دروازہ کھول کے میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ "اُسی طرف جدھر ہم بھیجنا چاہتے تھے۔ مگر یار وہ تو آئل ٹینکر تھا۔"

"ہاں۔ جگہ تو آئل ٹینکر میں بھی بہت ہوتی ہے اور اس میں اگر اوپر تک تیل بھر دیا جائے تو نیچے کا مال نظر بھی

نہیں آتا۔" میں نے کہا۔ "بعد میں ایک بس بھی آئی تھی؟"

"ہاں۔ لیکن اس وقت تک میں روڈ سائن بدل چکا تھا۔" محسن نے کہا۔ "تو نے دیر کیوں کی؟"

اس کی بات کا جواب دینے کا موقع مجھے نہیں ملا۔ ہمارے بائیں جانب ایک ایسا قیامت خیز دھماکا ہوا جس نے زمین ہلا دی۔ اس پہلے دھماکے سے ہی میرے کان سُن ہو گئے اور میں نے ونڈ اسکرین کا شیشہ بکھرتے دیکھا۔ میرے ہاتھوں میں گاڑی لہرائی اور میں اسے خاصی کوشش سے سنبھال کے پھر سڑک پر لانے میں کامیاب ہوا۔

محسن نے غیر ارادی طور پر دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کے سر کو گھٹنوں کے بیچ میں کر لیا تھا۔ اب میرے ساتھ اس نے بھی سر اٹھا کے دیکھا تو بائیں ہاتھ پہ ہمیں گرد و غبار کا ایک بہت بڑا بادل سا آسمان تک اٹھتا دکھائی دیا۔ اس غبار میں پتھر اور چٹانوں کے ٹکڑے بھی تھے۔ ٹرک کے جلتے ہوئے ٹکڑے بھی اور شاید ان کے اعضا کے ٹکڑے بھی جو ٹرک چلا رہے تھے۔ پہلے بڑے دھماکے کے بعد متعدد چھوٹے دھماکے ہوئے اور ہر بار فضا میں نیا بگولا اٹھا۔ یہ منظر کسی آتش فشاں کے پھٹنے کا منظر لگتا تھا جس کے دہانے سے بار بار لاوا سیکڑوں فٹ کی بلندی تک اچھل رہا ہو۔

گاڑی کا ونڈ اسکرین کسی چیز کے لگنے سے نہیں ٹوٹا تھا اسے دھماکے سے پیدا ہونے والی شاک ویو نے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیشے کے ذرات اُڑ کر ہمارے چہرے پہ نہیں آئے۔ ورنہ ہم اندھے بھی ہو سکتے تھے۔ تھوڑا سا تحفظ ہمیں دھوپ کے چشموں سے بھی ملا جو ہم نے تو بھیس بدلنے کے لیے لگائے تھے مگر اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ڈھال بن گئے۔ ہماری آنکھیں گرد و غبار سے محفوظ رہیں۔ گاڑی کے بے قابو ہونے کی وجہ بھی شاک ویو ہی تھی۔ میں نے سُنا تھا کہ جب کہیں کوئی بڑا دھماکا ہوتا ہے تو وہاں خلا پیدا ہو جاتا ہے اور اس خلا کو پُر کرنے کے لیے ہوا شدید دباؤ کے تحت حرکت میں آتی ہے۔ اس سے ایک زبردست طاقت رکھنے والی لہر پیدا ہوتی ہے جس سے دُور کی عمارات کے شیشے ٹوٹ جاتے ہیں اور قریب کی عمارات گر بھی جاتی ہیں۔

میں نے اب گاڑی کو ایک کنارے پہ روک لیا تھا مجھے یقین تھا کہ ہمارے پیچھے آنے والی ٹریفک بھی خوف اور وحشت سے جام ہو چکی ہو گی۔ یہ نظارہ ایسا تھا کہ اسے سڑک پر آتے جاتے کسی نے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔ چونکہ مشرقی پاکستان میں تخریبی عناصر سرگرم عمل تھے اور یہ افواہیں بھی عام تھیں کہ انتہا پسند مغربی پاکستان کو بھی نشانہ بنانے والے ہیں۔ اس لیے لوگوں کا خوف و ہراس میں مبتلا ہونا ایک فطری بات تھی۔

میرے اندازے کے مطابق اس آئل ٹینکر کو ایک میل جانے سے پہلے ہی حادثہ پیش آ گیا تھا۔ اب یہ تصدیق کرنے کی نہ گنجائش تھی نہ ضرورت کہ حادثہ کیوں پیش آیا۔ کیا واقعی محسن کی تھیوری کے مطابق اُدھر کوئی گڑھا یا ڈپ تھا جو ٹرک کا وزن نہ برداشت کر سکا یا کسی پہاڑی نالے کا پہلے سے ٹوٹا ہوا پُل تھا جسے ڈرائیور بروقت نہ دیکھ سکا۔ تاہم ایک بات ثابت ہو گئی کہ اس آئل ٹینکر میں بہت بڑی مقدار میں آتش گیر مادہ، ٹی این ٹی بم، بارودی سرنگ یا ڈائنامائیٹ کی شکل میں بھرا ہوا تھا۔ ایک معمولی چنگاری نے آئل ٹینکر کو ایک بہت بڑے متحرک بم کی طرح اُڑا دیا۔ کوئی بھی گاڑی جب الٹتی ہے تو تاروں کے شارٹ ہونے سے بھی آگ لگ جاتی ہے۔

میں اور محسن ابھی تک بے خودی کے عالم میں اس غبار کو دیکھ رہے تھے جو آہستہ آہستہ بیٹھ رہا تھا۔ دھواں الگ ہو کے منتشر ہو رہا تھا اور بہت بلندی پر چیلیں کوّے دائروں میں چکر کاٹنے لگے تھے۔

"ہُرّا!" میں نے محسن کے کندھے پہ ہاتھ مار کے نعرہ لگایا۔ "وہ مارا پاپڑ والے کو۔"

محسن نے قہقہہ مار کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "ایم آر ایس کے لیے ایک اور تحفۂ ذہانت۔ ایک اور فتح۔"

"دلاور اینڈ کمپنی کے لیے متبادل راستہ۔" میں نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ "سیدھا جہنم کی طرف۔"

واپس شہر کی طرف آتے ہوئے ہم دونوں بہت خوش تھے۔ یہ ہم دونوں کی مشترکہ کوشش تھی۔ بلاشبہ اس میں ہماری ذہانت اور ہمت کا بڑا ہاتھ تھا لیکن اصل ہاتھ اُس کا تھا جو ہمیں طاقت دیتا تھا، راستہ دکھاتا تھا اور محفوظ رکھتا تھا۔ میرا دل اُس خدا کے لیے شکر گزاری کے جذبات سے معمور تھا جس نے ہم بے وسیلہ لوگوں کو اتنے بڑے کام کا وسیلہ بنایا اور ہمیں توفیق عطا کی۔

ساڑھے چار بجے ہم نے ہیوٹی بریڈ کی گاڑی کو نیشنل اسٹیڈیم کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا۔

www.paksociety.com

"فی امان اللہ!" میں نے پیچھے کا دروازہ کھول کے چار بیویوں کے اکلوتے بے اولاد شوہر سے کہا۔ "اب ہم جاتے ہیں۔ تمہاری گاڑی کا تھوڑا سا نقصان ہوا ہے لیکن اس میں ہماری غلطی نہیں۔"

"دشمن نے ایٹم بم گرا دیا تھا!" محسن بولا۔ "گھر پہنچ جاؤ تو چاروں بیویوں سے کہنا کہ شکرانے کے نفل پڑھیں، نیاز دلوائیں۔"

کے ڈی اے اسکیم نمبر ون سے کارساز جانے والی سڑک پر آتے ہی ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ اس ٹیکسی نے ہمیں ڈرگ روڈ کے راستے ترسری پر اتارا۔ وہاں سے ہم نے دوسری ٹیکسی پکڑی تو صدر پہنچے۔ بھوک اور تھکن سے ہم دونوں کا برا حال تھا۔ شام کے پانچ بجے لنچ کا کوئی وقت نہ تھا۔ سینٹرل کافی ہاؤس میں ہمیں سینڈوچ اور گرم سموسے ملے جو ہم نے کافی کے ساتھ کھائے۔ کافی بھی بہت عمدہ تھی۔ ایک بہت بڑی کامیابی کے بعد پیٹ میں گیا تو بے سرور محسوس ہوا۔ چونکہ میں اور محسن فرنچ میں گفتگو کر رہے تھے اس لیے ہمیں غیر ملکی جہاز کا ملاح سمجھا گیا۔ صدر کے علاقے میں اجنبی ملکوں کے سیلرز اکثر شاپنگ کرتے دکھائی دیے جاتے تھے۔

"اب یہ ضروری ہے کہ ہم یہ وردی اتار دیں!" محسن نے دوسرا سگریٹ جلانے کے بعد کہا۔ "ہمیں فورٹ کرنڈ کے علاقے میں جانا ہے جہاں صبح ہم نے ہنگامہ کر کے چھپے تھے۔"

"فقیروں کے ٹھیکیدار کو ہماری تلاش ضرور ہوگی!" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

"وہ ٹھیکیدار تو اللہ کو پیارا ہوا۔"

"ایسے لوگ جہنم رسید ہوتے ہیں، اللہ کو پیارے نہیں ہو سکتے!" میں نے کہا۔

"اس کے وارث دوسرے ٹھیکیدار یا وہ بڑے بدمعاش ضرور پوچھتے پھر رہے ہوں گے کہ وہ غیر ملکی کون تھے اور کس جہاز سے آئے تھے۔" محسن بولا۔

"نام تو پوچھ لیا ہوگا وہاں بہت سے لوگوں نے۔ ہماری وردی کے کندھے پر جہاز کا نام تھا!" میں نے کہا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے نام نوٹ کر لیے گئے ہوں!"

"جس نے نوٹ کیے وہ سامنے کیوں نہیں آیا؟"

"یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ہمارے راستے میں مزاحم ہوتا۔ وہاں باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی!" میں نے کہا۔ "لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس علاقے میں دوسرے فقیروں کے اور دوسرے ایجنٹ بھی ہوں گے۔ ان کی پیشہ ورانہ رقابت الگ چیز ہے۔ گداگری کے مخالفین کے سامنے ان کے مشترکہ مفادات ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ مطمئن ہوں گے کہ ہم پولیس اسٹیشن ہی کو جا رہے ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ بھی انہی کے سرپرست ہوتے ہیں۔"

"لیکن اب تک انہیں معلوم ہو چکا ہوگا کہ ہم نے اس گداگری کے ٹھیکیدار کو مار کے پھینک دیا ہے۔ یہ حقائق کے خلاف بات ہے مگر واقعات کی شہادت تو ایسا ہی ثابت کرے گی۔ جب اس کی لاش کچلی ہوئی حالت میں سڑک پر پڑی ملے گی۔"

"وہ جیب والا تو یقیناً بھاگ گیا ہوگا!" میں نے محسن کے خیال کی تائید کی۔ "میرا خیال ہے اب تک دوسرے گداگروں تک یہ خبر پہنچ چکی ہوگی۔ ایسی صورت میں ہمارے نام کی اور ہمارے جہاز کے نام کی تلاش جاری ہوگی!"

محسن ہنسا۔ "ڈھونڈتے رہیں سالے۔ معلوم نہیں وہ جہاز کہاں گیا اور وہ کہاں گئے جن کی وردیاں ہم پہنے پھر رہے ہیں۔ ناکامی انہیں مزید مشتعل کرے گی!"

خود کو غیر ملکی ثابت کرنے کے لیے میں نے بل کی ادائیگی کے لیے دس ڈالر کا نوٹ نکالا۔ ویٹر کچھ دیر سر کھجاتا رہا۔ پھر نوٹ اٹھا کے کاؤنٹر پر گیا جہاں مالک یا منیجر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خود ہمارے پاس آیا۔

"یو آر انگلش؟ تمہیں انگریزی آتی ہے؟"

ہم نے مسکرا کے نفی میں سر ہلایا۔

اس نے اپنی جیب سے دس کا نوٹ نکالا اور دس ڈالر کے نوٹ کے ساتھ میز پر رکھا۔ "دس!" اس نے دس روپے کے نوٹ پر انگلی رکھی اور سر کو اوپر نیچے ہلایا۔ "لیس!" پھر اس نے دس ڈالر پر انگلی رکھی اور سر کو نفی میں حرکت دی۔ "نو!"

میں نے اس سے دس ڈالر کا نوٹ لے لیا اور احمقوں کی طرح اس کی شکل دیکھنے لگا۔ سوال میری صورت پر تحریر تھا کہ بتاؤ اب ہم کیا کریں؟ وہ منیجر تھا یا مالک مگر اس نے بڑی خوش اخلاقی اور فیاضی سے ہمارے شانے پر تھپکی دی۔

"اٹ از آل رائٹ!" "کوئی بات نہیں!" "یو آر مائی گیسٹ۔" "تم میرے مہمان ہو!" "سو لانگ اینڈ یو آر ان پاکستان!" "جب تک تم پاکستان میں ہو۔"

اس شخص کی مہمان نوازی اور وطن دوستی نے مجھے خوش بھی کیا اور شرمندہ بھی۔ شرمندہ اس لیے کہ میں نے بے سبب خود کو غیر ملکی ظاہر کیا جبکہ میں پاکستانی تھا۔ میرے پاس پاکستانی کرنسی تھی مگر میں کھانے کی ادائیگی کیے بغیر جانے پر مجبور تھا۔ مجھے ایسی صورت حال پیدا ہونے کی توقع بالکل نہ تھی ورنہ میں ایسا ہرگز نہ کرتا۔

آس پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے بہت سے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک قدرے منیجر سے ترجمان بننے کے لیے اٹھا۔ جو کچھ اس نے مضحکہ خیز فرانسیسی میں کہا، اس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ وہ ابھی فرنچ سیکھ رہا ہے اور شام کے وقت 'الائنس فرانسس' سے فرنچ لینگویج کا کورس کر رہا ہے۔ اس نے سینٹرل کافی ہاؤس کے مالک یا منیجر کے جذبات کی عکاسی کی۔ میں نے بھی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا اور دو بار اپنے سینے پر بھی ہاتھ مار کے کہا کہ ہم پاکستانی قوم ہیں اور مہمان نوازی ہماری تہذیبی روایات کا حصہ ہے جیتا ہے وہ ہماری طرف سے ادائیگی کرنا چاہتا ہے۔

اب کافی ہاؤس کے اس مالک یا منیجر اور ہمارے نئے جوشیلے میزبان کے درمیان مکالمہ شروع ہوا جس میں بالآخر کافی ہاؤس والا جیت گیا اور جوشیلے نوجوان کو خاصی مایوسی کے ساتھ واپس اپنی سیٹ پر جانا پڑا۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور کاؤنٹر تک گئے تاکہ میزبان کا شکریہ ادا کریں۔

میں نے اس سے مصافحہ کر کے فرانسیسی میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر محسن نے اس سے ہاتھ ملایا مگر مجھے یوں لگا جیسے ہمارا میزبان ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہے اور منتظر ہے۔ ہم باہر نکلے ہی تھے کہ ایک ویٹر نے ہمارے ہاتھ میں وہ بل تھما دیا جس کی ادائیگی ہم فارن ایکسچینج میں نہیں کر سکے تھے۔ بل پیش کرنے والا ویٹر بھی وہی تھا۔

"یہ کیا! سب کے سامنے ڈراما ہو رہا تھا؟" میں نے محسن سے کہا۔

"خبیث، بڑا مہمان نواز اور فراخ دل بن رہا تھا!" محسن بولا۔

لیکن پھر میں نے بل کو دیکھا تو اس کی پشت پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ "مسٹر سکندر! اس ویٹر کے ساتھ آ جائیے۔"

میں نے وہ رقعہ محسن کی طرف بڑھایا۔ محسن کی صورت پر بارہ بج گئے۔ ویٹر خاموش اور منتظر کھڑا ہوا تھا اور میں عجیب مشکل میں پڑ گیا تھا۔ میں ویٹر سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتا تھا کہ رقعہ کس نے دیا ہے۔ ویٹر فرنچ نہیں جانتا تھا۔ میں اردو بولتا تو اس کے سامنے شرمندہ ہوتا کہ میں نے بل نہ دینے کے لیے سب سوانگ رچایا تھا۔ محسن میری طرف دیکھ رہا تھا اور مجسم سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔

فیصلے سے پہلے سوچ بچار میں گنوانے کے لیے وقت تھا ہی نہیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور محسن نے سر ہلا کے اس فیصلے کی توثیق کی۔ دوست یا دشمن ہر جگہ تھے مگر تجربہ بتاتا تھا کہ دشمن ایک ہے تو دوست ہزار۔ اور یہ شخص جو کراچی کے ایک معروف علاقے میں اپنا شریفانہ کاروبار چلا رہا ہے، دلاور یا حاجی عبداللہ جیسے بدمعاش لوگوں کا ساتھی کیسے ہو سکتا ہے۔

ویٹر ہمیں فرید چمبر کی طرف سے اندر لے گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس منزلہ عمارت میں بہت سی چوڑی ڈگریوں والے اسپیشلسٹ ڈاکٹر ہر فلور پر موجود ہیں۔ ان سب کے ناموں کی تختیاں ایسے لگی ہوئی تھیں جن پر ان کا روم نمبر اور اوقات مطب بھی لکھے ہوئے تھے۔ گزرتے گزرتے میں نے ایک نام دیکھا: "رندھاوا!" بہت سی ڈگریوں کے بعد لکھا ہوا تھا: سائیکو سول سرجن۔ اس سے مجھے کچھ یاد آیا۔ شاید میں نے کسی اخبار میں کوئی خبر پڑھی تھی کہ کسی ڈاکٹر رندھاوا پر پولیس نے رشوت ستانی کا جھوٹا کیس بنانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ پھر مجھے شک ہوا کہ بات کچھ اور تھی۔ اچانک محسن نے کہا۔ "یار وہ جو صبح خاتون ہمیں ملی تھیں..."

"ہاں، وہ مسز ڈاکٹر رندھاوا تھیں۔" میں نے کہا۔ اس نے بھی پہچان لیا تھا۔

"وہ خود ڈاکٹر تھی... یا اس ڈاکٹر رندھاوا کی بیوی تھی!"

"تو نے کیسے جانا کہ وہ مسز رندھاوا تھی...؟" میں نے کہا۔

"پچھلی گاڑی میں بہت سے لفافے وغیرہ پڑے تھے۔ ان سب پر ایک ہی نام تھا!" محسن نے کہا۔

ویٹر نے ایک کمرے کے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور پھر ہینڈل گھما کے اندر چلا گیا۔ اندر وہی شخص موجود تھا جس سے ہم چند منٹ پہلے کاؤنٹر پر ہاتھ ملا کے آئے تھے۔ ہم نے

www.paksociety.com

اُس کے سامنے اداکاری کی تھی مگر وہ ہم سے بازی لے گیا تھا۔

"آئیے مسٹر سکندر۔" اُس نے پھر ہم سے ہاتھ ملایا اور اب اردو میں بات کی۔ "کیا یہ آپ کے ساتھی ہیں محسن فاروقی؟"

"پہلے تو میں بل ادا کر دوں گا۔" میں نے کہا، شرمندگی کے ساتھ۔

وہ ہنسا۔ "بل آپ ریسٹورنٹ میں دے سکتے تھے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ مہمان ہیں میرے۔"

"لیکن میں اور آپ دونوں پاکستانی ہیں۔"

"پھر کیا ہوا۔ کیا پاکستان میں لوگ ایک دوسرے کے مہمان نہیں ہوتے۔" وہ بولا۔ "شرمندگی کیسی۔ مجھے تو خوشی ہے کہ اس طرح مجھے آپ لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ میں ہر گاہک کی صورت پر غور نہیں کرتا لیکن میں آپ کی ٹیبل پر آیا تو میں نے فوراً پہچان لیا آپ کو۔"

"یہ مسئلہ بہت تشویشناک ہوتا جا رہا ہے۔ آج صبح ایک لیڈی ڈاکٹر نے ہمیں پہچان لیا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں نے آپ لوگوں کو اسی لیے بلایا ہے کہ آپ کو کچھ سمجھا دوں۔" وہ بولا۔ "ویسے تو آپ مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ کیا آپ چند منٹ تشریف رکھیں گے؟"

"رکو دیں گے۔" میں نے کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ "لیکن وقت کم ہے ہمارے پاس۔"

"میں نے کافی منگوائی ہے۔" وہ بولا اور ہمارے مقابل دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ درمیان میں بہت خوبصورت کاشانی قالین تھا اور گلاس ٹاپ ٹیبل تھی۔ وہ کمرا ذوق، نفاست اور شائستہ امارت میں توازن کا آئینہ دار تھا اور مجموعی طور پر بہت پُرآسائش تھا۔ اس میں ایک طرف بیڈ تھا۔ اسی کے ساتھ ایک ہی ڈیزائن کی ڈریسنگ ٹیبل اور وارڈ روب ایستادہ تھیں۔

"میں ایک ریسٹورنٹ چلاتا ہوں۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "صبح سے شام تک یہاں سیکڑوں لوگ آتے ہیں۔ سب اپنی اپنی باتیں کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ کوئی کسی دوسرے کی بات نہیں سنتا اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کی بات بھی کوئی نہیں سنے گا۔ لیکن میں سب کی سنتا رہتا ہوں۔ بولتا نہیں مگر کان کیسے بند کر سکتا ہوں۔"

ویٹر نے دروازے کو آہستہ سے ناک کیا اور پھر کافی کی ٹرے کے ساتھ اندر آگیا۔ اس نے برتن خاموشی سے میز پر رکھے اور سوالیہ نظروں سے مالک کی طرف دیکھ کر اور کوئی حکم؟

مجھے اچانک یاد آگیا کہ میرے پاس سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔ میں نے ویٹر کو دس کا ایک نوٹ دینا چاہا مگر ہمارے میزبان نے مجھے روک دیا۔

"بجٹ آنے والا ہے اور ان حالات میں بہت زیادہ ٹیکس لگ جانے کی اُمید ہے۔" وہ بولا۔ "بازار سے اچھے سگریٹ غائب ہو گئے ہیں لیکن میں منگوا دیتا ہوں۔"

اُس نے ویٹر کو سو کا نوٹ دیا اور کہا کہ چوہدری سے دو کارٹن لے آئے۔ ویٹر نے سر ہلایا اور غائب ہو گیا۔

"تو میں عرض کر رہا تھا کہ یہاں بیٹھ کے جو کچھ میں دن میں سُن لیتا ہوں وہ دس اخباروں کے برابر ہوتا ہے۔ جھوٹ سچ افواہیں اور خبریں۔ مجھے رائے عامہ کا بالکل صحیح اندازہ رہتا ہے۔ بیشتر لوگ کاروباری باتیں کرتے ہیں یا پھر سیاسی باتیں۔"

"حالانکہ آپ نے لکھ دیا ہے کہ سیاسی گفتگو سے احتراز کریں۔"

"وہ تو مجبوری ہے۔ ایک مارشل لا کو پہلے بھگت چکے ہیں۔ یہ دوسرا مارشل لا اُس کی ناجائز اولاد ہے۔" وہ بڑی تلخی سے بولا۔ "ایک جنرل جاتے جاتے یہ ملک دوسرے جنرل کو تحفے میں دے گیا کہ عیش کرو۔ لوگ خود نالاں ہیں۔ دبے ہوئے جذبات اظہار کا راستہ مانگتے ہیں مگر ہم جو بزنس کر رہے ہیں، ریسٹورنٹ کو سیاسی اکھاڑہ نہیں بنا سکتے۔ اختلافِ رائے بڑھ جائے تو جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔ بُردباری اور تحمل تو یہاں کا مزاج ہی نہیں۔ اب میں جانتا ہوں کہ رائے عامہ کس طرح بٹی ہوئی ہے۔ اکثریت شیخ مجیب کی مخالف ہے اور اُسے غدار سمجھتی ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ اُسے سرِعام پھانسی پہ لٹکا دیا جائے مگر سیاست میں غداری اور حب الوطنی کے لیبل بدلتے رہتے ہیں۔ دوسرا گروہ پیپلز پارٹی کا حامی ہے۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ اس نئی جماعت نے بہت جلد کتنی عوامی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ پھر ایک طبقہ سابق صدر ایوب خان کا حامی بھی ہے۔ ڈر رہتا ہے کہ ایک میز پر ہونے والی بحث ہی خانہ جنگی کا سبب نہ بن جائے۔"

میں نے کافی پیتے ہوئے کلائی کی گھڑی کو دیکھا۔

وہ میرا مطلب سمجھ گیا۔ "مجھے صرف یہ کہنا تھا کہ میں نے بار بار لوگوں سے آپ کا ذکر سنا ہے۔ نوجوان خاص طور پر آپ کے کارناموں کو زیادہ سراہتے ہیں۔"

"ہم نے تو کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔" میں نے کہا۔

"یہ کسرِ نفسی ہو سکتی ہے حقیقت نہیں۔" وہ بولا۔ "سب اخبارات میں آ چکا ہے۔"

"ہمارے مخالف اور دشمن بھی تو آتے ہوں گے۔ وہ کیا کہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں آپ کو اسی سے خبردار کرنا چاہتا تھا۔ آپ کو اس طرح صدر جیسی جگہ پر ایسے نہیں پھرنا چاہیے۔" وہ بولا۔ "جیسے میں نے آپ کو پہچان لیا ہے آپ کے بدخواہ اور اس ملک کے دشمن بھی آپ کو پہچان کر نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ آپ اتنے غیر معروف اور گمنام نہیں رہے۔ یا پھر آپ کم سے کم چہرہ بدل لیں۔ ایسا میک اپ کرالیں کہ کوئی بھی شناخت نہ کر سکے، نہ دوست نہ دشمن۔"

"کہاں سے کرالیں؟" میں نے کہا۔ "یہاں تو ہم کسی کو بھی نہیں جانتے جو ہماری مدد کر سکے۔"

"اچھا، آپ یوں کریں۔" وہ بولا۔ "بالکل پیچھے والی سڑک ایلفنسٹن اسٹریٹ ہے۔ وہاں ایک ہی ائرکنڈیشنڈ ہیئر ڈریسنگ سیلون ہے، ماڈرن۔ وہ بہت اچھا آرٹسٹ ہے اور بہت اچھا آدمی۔"

"کیا مطلب؟ ہم اس کے پاس جا کے کہیں کہ دیکھو بھئی میں سکندر رحمت ہوں۔ تم مجھے میک اپ سے وحید مراد بنا دو اور یہ محسن ہے اسے ندیم۔"

وہ مسکرایا۔ "آپ میرا کارڈ لے جائیں اس کے پاس۔" اس نے بھی جیب سے اپنا کارڈ نکال کے دیا۔ "میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ یہاں آپ کے مخالف کون لوگ آتے ہیں۔ ایک تو پولیس والے ہیں، سامنے ایف آئی اے کا دفتر ہے۔ سی آئی اے ہیڈکوارٹر بھی صدر میں ہے۔ ہم تو انھیں صورت سے بھی پہچان لیتے ہیں، ویسے وہ اپنا تعارف خود کرا دیتے ہیں۔ تعارف کا مقصد اور کچھ نہیں ہوتا اس کے سوا کہ خبردار جو ہمیں بل بھیجنے کی غلطی کی۔"

"آپ انھیں بھی مفت کھلاتے ہیں؟ اس طرح تو ہم اور وہ برابر ہو گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ کتے سے تو چور بھی ڈرتے ہیں۔ ہم تو شریف آدمی ہیں۔ ہمارے پاس خرفاٹے آتے ہیں ہم کتے کو بھونکنے اور کاٹنے سے اسی طرح روک سکتے ہیں کہ اسے ہڈی ڈال دیں۔" وہ بولا۔ "گزشتہ دنوں لاہور سے کوئی ایس پی آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ یہاں تین ایف آئی اے کے آدمی بھی آئے تھے۔ وہ آپ ہی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔"

"کیا نام تھا اس ایس پی کا؟ سراج؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نام تو معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ لوگ ایس پی صاحب کہہ کے مخاطب کر رہے تھے۔"

"ایف آئی اے کے تینوں آدمی مقامی تھے؟ ان کو جانتے ہو تم؟" میں نے کہا۔

اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ آتے رہتے ہیں۔ جب آپ آئے تھے اُس وقت وہ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔"

مجھے پریشانی لاحق ہونے لگی۔ "انھوں نے بھی دیکھ لیا ہوگا؟"

"آپ لوگوں کی قسمت اچھی ہے۔" وہ بولا۔ "کہ ادھر سے آپ آئے اور وہ اٹھ کے دوسری طرف سے نکل گئے۔ ان کے علاوہ ایک ٹولی ہے سرکاری ملازمین کی۔ ان میں دو افسر ہیں۔ کلاس ون اور دو ماتحت ہیں۔ سب الگ الگ محکموں کے آدمی ہیں۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ سامنے پاک سیکرٹریٹ ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "پاکستان سیکرٹریٹ کا صرف نام سنا ہے۔"

"سب سرکاری دفاتر ہیں۔" وہ بولا۔ "مرکزی حکومت کے جو دفاتر اسلام آباد منتقل نہیں ہوئے وہ سب یہیں ہیں۔ ان دفاتر کا تھوڑا سا تعلق بھی ہے جو منتقل کیے جا چکے ہیں۔ سو، سوا سو بیرکس ہیں جو ادھر مسجد خضرا اور چیف کورٹ سے لے کر عقب میں اسمبلی بلڈنگ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان دفتروں میں آدھے بنگالی کام کرتے ہیں۔"

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا۔ "وہ چاروں بھی بنگالی ہیں؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ بنگالی میں بات کرتے ہیں۔ میں خود تو بنگالی نہیں سمجھتا لیکن ایک ویٹر ہے میرے پاس، جو بہت عرصہ مشرقی پاکستان میں رہا ہیرا پھیری کرتا تھا۔ جیل گیا اور جیل سے بھاگا تو یہاں آ گیا۔ اب سُدھر گیا ہے۔ اس نے ایک دن مجھے بتایا کہ چاروں آدمی ٹھیک نہیں ہیں۔ میں نے تفصیل پوچھی تو اس نے کہا کہ یہ غداری کر رہے ہیں۔ دفتروں سے فائلیں لاتے

www.paksociety.com

ہیں اور فوٹو اسٹیٹ کرا لیتے ہیں۔ آخر کیا کرتے ہوں گے یہ فائلوں کی فوٹو اسٹیٹ نقول۔ ہوا کہ اس بات پر میں ٹھٹک گیا۔ میں نے اس ویٹر سے کہا کہ یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ آئندہ وہ جب بھی آئیں ان کی باتیں سنو اور پھر کسی ایک کے پیچھے لگ جاؤ۔ دیکھو وہ باہر نکل کے کہاں جاتے ہیں۔ الگ الگ جائیں تو اس کا پیچھا کرو جو ان کا سرغنہ ہو۔ وہ حکم چلانے کا عادی ہوگا۔ باقی سب اس کی مانتے ہوں گے۔ اس ویٹر نے یہی کیا۔ تیسرے دن وہ پھر آ گئے اور ویٹر نے اپنی وردی اتار دی۔ وہ ان کے پیچھے والے کیبن میں جا بیٹھا۔ عام لوگوں کی طرح چائے پیتا رہا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کیبن الگ الگ نہیں ہیں۔ بس ہر میز کو تین فٹ اونچی پارٹیشن سے الگ کر دیا گیا ہے۔ جو بیٹھے ہوں ان کے چہرے ایک دوسرے کو نظر نہیں آتے۔ ایک میز پر چار آدمی بیٹھتے ہیں آمنے سامنے دو دو۔ دونوں جانب پشت پر شیشے کی پارٹیشن کے پیچھے دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے کہا۔

"جب وہ لوگ اٹھے تو میرا وہ جاسوس بھی اٹھا اور اس نے دو اہم باتیں معلوم کر لیں۔ ایک تو یہ کہ فائلیں وہ کہاں فوٹو اسٹیٹ ہونے کے لیے دیتے ہیں۔ وہ جگہ یہاں سے قریب ہی تھی۔ جتنی دیر میں دستاویزات کی نقلیں بنتی تھیں وہ یہاں بیٹھ کے چائے پیتے تھے پھر گھنٹا بھر بعد جاتے تھے تو راستے میں ایک جگہ پان کھاتے تھے۔ اسی سڑک پر آگے آئیڈیل لائف انشورنس کا دفتر ہے۔ اس کے نیچے فوٹو اسٹیٹ شاپ ہے۔ سامنے پان والا ہے۔ فوٹو اسٹیٹ مشین بھی ایک بنگالی نے لگا رکھی ہے اور پان شاپ بھی اسی کی ہے۔ اس کا بھائی بیٹھتا ہے۔ وہ فائلوں کو سامنے پہنچا دیتا ہے۔ اس کی فوٹو کاپیاں خود رکھتا ہوگا۔ وہ یہاں کی دکان سے فائلیں لیتے ہیں اور اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ اگلے دن صبح آفس جاتے ہوں گے تو فائلیں ساتھ لے جاتے ہوں گے اور کسی کو خبر تک نہیں ہوتی ہوگی کہ فائلیں غائب ہوئی تھیں۔"

"اوہ مائی گاڈ ... یہ تو بہت خطرناک کام ہو رہا ہے۔ تم کب سے دیکھ رہے ہو؟"

"تقریباً ایک مہینے سے۔"

"اور ابھی تک تم نے کچھ بھی نہیں کیا؟" میں نے کہا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں اور کیسے کر سکتا ہوں۔ اس کام میں تو بہت سے قانونی مرحلے ہیں۔" وہ بولا۔ "اول تو پولیس کو یقین دلانا ہی مشکل کام ہے کہ اس طرح اہم ملکی رازوں پر مشتمل دستاویزات نکالی جا رہی ہیں۔ میرے پاس ثبوت کوئی نہیں ہے۔ پھر یہ کیسے پتا چلے گا کہ دستاویزات اہم ہیں یا کہ نہیں اور کہاں جا رہی ہیں۔ مجھے تو پولیس پر بالکل اعتماد نہیں۔ یا تو وہ مجھے ہی پریشان کریں گے یا ان غداروں کو پکڑا بھی تو مال بٹورنے کے چکر میں پکڑیں گے۔ انھیں تو خدا موقع دے۔ بعد میں وہ مجھے جوتے ماریں گے کہ شرفا پر جھوٹے الزامات لگاتے ہو۔ بس شرفا ان کے دشمن ہوں گے اور ظاہر ہے اپنا ٹھکانا بدل دیں گے۔ ویٹر ان میں سے دو کے گھر دیکھ آیا ہے۔ دونوں افسر یہاں جیکب لائن کے سرکاری بنگلوں میں رہتے ہیں۔"

"نام پتے معلوم ہیں تمھیں؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور جیب میں سے ایک نوٹ بک نکالی۔ اس میں سے ایک صفحہ پھاڑ کے چند سطریں لکھیں۔ "ایک افسر رہتا ہے مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کی مسجد کے پیچھے نمبر سی تین میں اور دوسرا بندو خان کے پیچھے نمبر سی اٹھارہ میں۔ دونوں ماشاءاللہ سگے بھائی ہیں اور کلیٹن کوارٹرز میں رہتے ہیں۔ آپ نے جیکب لائن جہانگیر روڈ کے کوارٹرز دیکھے ہیں؟" میں نے اس بے باک اور نڈر صحافی کو یاد کیا جس نے اپنی جان ہم پر اور وطن پر قربان کر دی تھی۔

"بس وہیں۔ آپ نیو ٹاؤن مسجد کی طرف سے جائیں اس کے پیچھے سڑک جا رہی ہے کوارٹر نمبر ٹی سولہ۔"

"یہ نیو ٹاؤن مسجد کہاں ہے؟" محسن بولا۔

"گرومندر سے سیدھے ہاتھ والی سڑک ... کیا میں آپ کو پہنچا دوں اپنی گاڑی میں؟"

"نہیں شکریہ۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے پاس آج وقت نہیں ہوگا ورنہ ہم ان سے بھی نمٹ لیتے۔" میں نے کہا۔ "سب معلوم کر لیجیے۔ تم ایسا کرو کہ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہو۔ ہم ایک شخص کو بھیج دیں گے۔ وہ ہمارے حوالے سے ہی کاشف کا تذکرہ لے کر آئے گا۔ وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے اور اس کا نام ہے اکرام شیخ۔"

"ٹھیک ہے۔ میں انھیں بتا دوں گا۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے خطوط یا پیغامات بھی تمھاری معرفت وصول ہو جائیں؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی بات ہی نہیں تو نہیں لیکن میرے اس کمرے کا نمبر اور یہاں کا ٹیلی فون نمبر کارڈ پر ہے۔" وہ بولا۔ "اگر یہ آپ کے کام آ سکے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

ویٹر پھر اندر آیا۔ اس نے سگریٹوں کے دو کارٹن اور باقی پیسے میز پر رکھے اور لوٹ گیا۔

"کیا یہی وہ ویٹر ہے؟" میں نے کہا۔

"آپ نے خوب پہچانا۔" وہ خوش ہو کے بولا۔

"میرا اندازہ تھا کہ تم کسی اور پر اعتبار کا رسک نہیں لو گے۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی ایک مشکل کام تھا۔" میں نے سگریٹوں کے کارٹن کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے لیے شکریہ۔ اب ایک اور مشکل کام ہے جس میں آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ ہمیں دو ریڈی میڈ سوٹ چاہئیں۔ کوٹ پتلون ٹراپیکل۔"

"تیار آپ کے سائز کے؟" اس نے مایوسی سے انکار میں سر ہلایا۔ "یہاں کون پہنتا ہے سوٹ اس موسم میں۔ ریڈی میڈ ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں ارجنٹ چوبیس گھنٹے میں تیار ہو جائے گا۔"

"چوبیس گھنٹے نہیں ہیں ہمارے پاس۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ہیں۔" محسن بولا۔

"پھر ... آپ ایسا کریں کہ لائٹ ہاؤس چلے جائیے۔"

"لائٹ ہاؤس، یعنی روشنی کے مینار پر؟" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔ "یہ بندر روڈ پر ایک سینما ہے۔ اس کے ساتھ لنڈا بازار ہے۔ امریکن اور یورپ کا ہر سائز اور ہر فٹ کا کوٹ بھی مل جائے گا۔ پتلون بھی ملے گی۔ شاید سوٹ بھی نکل آئے۔"

یہ ایک اچھی تجویز تھی۔ میرے ذہن میں لاہور کا لنڈا بازار بھی تھا جو سب کی ضرورت پوری کرتا تھا۔ ان کی بھی جو کسی کمپلیکس کے بغیر لباس کے مسئلے کو کم آمدنی میں حل کرتے تھے اور ان کی بھی جو لنڈے کی کمپلیکس کے ساتھ گاڑیاں دور روک کے جاتے تھے اور نئے فیشن کے لیڈیز کوٹ، کارڈیگن اور سوئٹر یوں چھپا کے لاتے تھے جیسے چوری کا مال ہو۔ اور بعد میں انھیں گفٹ پیک میں سب کے سامنے امریکا میں مقیم کسی کزن یا ماموں کا تحفہ بتا کے پیش کرتے تھے۔

"بس تو آپ ہمیں وہیں پہنچا دیں۔ اگر آپ کے پاس گاڑی ہے تو ہمارا وقت کا مسئلہ حل ہو جائے گا؟" میں نے کہا۔

"میں آپ لوگوں کو گاڑی دے دیتا ہوں۔" اس نے کہا اور پتلون کی جیب میں سے چابی نکال کے ہمارے سامنے ڈال دی۔ "ساتھ والی گلی میں کھڑی ہے ہنی کرولا۔ ایک ہزار سی سی والا ماڈل آپ لوگوں نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ لائٹ بلیو کلر میں ہے۔"

"تھینک یو ویری مچ۔" میں نے کہا۔ "کوئی حرج تو نہیں اگر ہم کار رات آٹھ بجے کہیں چھوڑ دیں اور آپ کو فون کر دیں؟"

"کوئی حرج نہیں۔ میں منگوا لوں گا۔" وہ بولا۔

ہم ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلے تو شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔ صدر کے علاقے میں بہت رش تھا اور خوش باش لوگوں کے ہجوم ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ہمیں کار تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی لیکن لائٹ ہاؤس کا راستہ ہمیں پوچھنا پڑا۔

لنڈا بازار ایک بند گلی تھی جس میں زیادہ رش نہیں تھا۔ کار کو ہم نے لائٹ ہاؤس سینما کے سامنے پارک کیا اور آدھے گھنٹے میں اپنی مرضی کے پرانے کوٹ پتلون بھی خرید لائے۔ دو پرانے ہیٹ بھی، جوتے بھی اور ٹائیاں بھی۔ یہ سب خریداری دو سو روپے میں مکمل ہو گئی۔ کپڑوں میں سے بو آ رہی تھی لیکن ہم وردیوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پہلے میں لائٹ ہاؤس سینما کے ٹائلٹ میں گیا اور وہاں سے کپڑے بدل کے نکلا۔ اس وردی کو میں نے بنڈل بنا کے بغل میں دبا لیا تھا۔ یہی حرکت محسن نے کی۔ ہیٹ لگا کے ہم دونوں مضحکہ خیز نظر آنے لگے۔ کیونکہ ہمارے آس پاس کوئی بھی پتلون کے ساتھ کوٹ پہن کے نہیں پھر رہا تھا۔ کچھ لوگ ہم پر ہنسے مگر ہم انھیں نظر انداز کرتے ہوئے کار میں نکل گئے۔ اگلا مرحلہ اس ہیئر ڈریسر سے میک اپ کرانے کا تھا۔ ہمارا یہ لباس صرف بندرگاہ کے علاقے سے گزرنے کے لیے تھا۔ آگے ہمیں ماہی گیر بن کے سفر کرنا تھا چنانچہ محسن نے مجھے مشورہ دیا کہ ہم صرف داڑھی کا اضافہ کر لیں تو ہمارے چہرے بے پہچانے ہو سکتے ہیں۔

محسن کی بات معقول تھی۔ سمندری سفر میں سوٹ بوٹ ہمارے لیے بے کار تھا۔ پھر بھی یہ کپڑے پھینکے نہیں جا سکتے تھے۔ آگے نہ جانے کہاں کس بھیس میں کس کا بھیس بنانا پڑے۔

www.paksociety.com

"اب اکرام شیخ سے ملنے کا تو کوئی چانس نہیں رہا!" محسن نے گھڑی دیکھ کے کہا۔

"ہاں۔ مل جاتا تو اچھا تھا۔ اس سے رابطے کی بات کر لیتے کہ آئندہ کہاں ہوگا اور کیسے ہوگا۔"

"دیکھو شاید وہ انتظار کرے۔" محسن بولا۔ "ہم سے وہ بھی ملنا چاہے گا یہ جاننے کے لیے کہ ہمارے مشن کا کیا بنا؟"

الفنسٹن میں داخل ہونے کے لیے ہمیں چکر لگا کے آنا پڑا۔ ہم وکٹوریہ روڈ سے سیدھے گئے اور پھر گھوم کے واپس آئے۔ اس ہیئر ڈریسنگ سیلون کو تلاش کرنا مشکل ثابت نہ ہوا۔ لیکن وہاں کار پارکنگ کے لیے جگہ پانا مسئلہ بن گیا۔ بالآخر ایک گاڑی وہاں سے نکلی تو ہم نے فوراً اس کی جگہ سنبھالی۔

سیلون ائیر کنڈیشنڈ تھا اور اندر سے پورا آئینہ خانہ تھا۔ چاروں طرف دیوار گیر آئینوں میں ہمیں اپنے ان گنت عکس دائیں اور بائیں متحرک دکھائی دیے۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک ہی قطار میں ایک سے لوگ ایک سا لباس پہنے کھڑے ہیں اور ایک مشین ان سب کی نقل و حرکت کو کنٹرول کرتی ہے۔ صف بستہ فوجیوں کی ڈرل اور پریڈ میں بھی اتنی ہم آہنگی نہیں ہوتی۔

تین سرپھوں افراد نے جو خاصے فارغ البال تھے اور باقی ماندہ بالوں کو فیشن اور اسٹائل سے سر کا گنج چھپانے کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے، ہمیں حیرانی سے دیکھا۔ شیو بناتے بناتے ایک کاریگر کا ہاتھ رک گیا۔ ان کے نزدیک ہم کارٹون تھے یا بے حد مضحکہ خیز نمونے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ لباس تو ہمیں غیر معمولی طور پر توجہ کا مرکز بنا رہا ہے۔ کراچی میں اس موسم میں لوگ سوٹ پہنتے ہیں تو کسی اعلا درجے کے ہوٹل میں یا ائیر کنڈیشنڈ کاروں میں۔ لیکن وہ بھی عموماً بڑے بیوروکریٹ ہوتے ہیں اور ایسے انداز اور کپڑوں میں نہیں ہوتے۔

میں نے استقبال کے لیے آنے والے ہیئر ڈریسر سے فرنچ میں کہا: "تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟" اور کافی ہاؤس کے مالک باشیر کا دیا ہوا کارڈ اسے تھما دیا۔

شیو بنوانے والا شخص ایک دم اچھلا: "تم فرنچ ہو؟" اس نے رواں فرانسیسی میں کہا اور مسکراتے ہوئے شیو کے صابن سمیت ہم سے گلے ملنے دوڑا۔ "میری ماں بھی فرنچ تھی، باپ پاکستانی ہے۔"

میں چونک کر رہ گیا۔ کسے معلوم تھا کہ اچانک فرانسیسی جاننے والا یوں مل جائے گا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے باربر سے کوئی غلط بات نہیں کی تھی۔

"میں یہیں پیدا ہوا تھا، پھر میری ماں مر گئی۔ میں باپ کے ساتھ آ گیا۔ دوبارہ تعلیم کے لیے گیا۔ اب آیا تھا کیونکہ میرا باپ بیمار تھا۔ وہ بھی مر گیا۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اور تم یہ کیا حلیہ بنائے ہوئے ہو؟ یہاں یہ سب نہیں چلتا۔" اس شخص نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

بالآخر مجھے بھی بولنے کا موقع ملا۔ "میں فرنچ نہیں ہوں۔" میں نے عزرا سے کہا۔ "لیبیا کا رہنے والا ہوں۔" مجھے اس کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ واپس اپنی جگہ جا بیٹھا۔ فرنچ ہونے کے باوجود میں نے خود کو اس کا دشمن قرار دے دیا تھا۔ ہیئر ڈریسر اب ہمیں ایک پارلر میں لے گیا۔

"میں انتظار کر رہا تھا آپ لوگوں کا۔ مجھے فون آیا تھا آپ کے دوست کا۔" اس نے کارڈ لوٹاتے کہا۔ "انھوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ آپ لوگ لانچ ہو گئے ہیں۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "پھر تو وضاحت کی ضرورت بھی نہیں۔"

"بتائیے میں آپ لوگوں کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" وہ بولا۔

ہم نے اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ اس نے ہماری صورتوں کا غور سے جائزہ لیا اور پھر ہمیں دو کرسیوں پر بٹھا کے دونوں کا باری باری میک اپ کیا۔ اس نے ہمارے بالوں کو عجیب طرح سے پھیلا دیا۔ اس طرح کہ ہمارے بال سیدھے اور لمبے ہو گئے مگر سامنے سے پیشانی پر آ گئے۔ ایک اسپرے سے ان کا رنگ بھورا ہو گیا۔ اس نے کہا یہ بھورا رنگ پندرہ بیس دن رہے گا۔ پھر رفتہ رفتہ اڑ جائے گا۔ اس نے بالوں سے میچ کرتی ہوئی داڑھی بھی فراہم کی جو بالکل اصلی لگتی تھی۔ اس حلیے میں ہم پاگل ہپی نظر آنے لگے تھے مگر اسی وضع قطع کے ساتھ ہم لباس بدل کے لنگی باندھ لیتے اور بنیان پہن لیتے یا شلوار کے ساتھ واسکٹ استعمال کرتے تب بھی فرق نہ پڑتا۔

ہم اس وطن دوست شخص کی خدمات کے اعتراف میں شکریے کے سوا اسے کچھ نہ دے سکے۔ اس نے معاوضہ لینے سے انکار کر دیا اور یہ بھی کہا کہ آئندہ بھی

جب اس کی خدمات کی ضرورت ہو اور ہم خود نہ آ سکتے ہوں تو فون سے بلوا لیں۔ مخصوص امریکن ہپی لوگوں کی طرح جو ان دنوں پاکستان میں ہر جگہ اپنی ہیئت کذائی میں سڑکوں پر اور بازاروں میں گھومتے نظر آتے تھے، ہم بھی تماشا بنے مگر دیکھنے والوں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اتفاق سے عین اسی چوراہے کے موڑ پر ایک ہپی اپنا ہیٹ زمین پر رکھے گٹار بجا رہا تھا اور لوگ اس کے ہیٹ میں سکے اور نوٹ ڈالتے جا رہے تھے۔ دیار غیر جیسے جہاں نہ کوئی جانتا ہو نہ پہچانتا ہو، شرم و حیا اور بے عزتی کا احساس بے معنی ہو جاتا ہے اور یہ ہپی جو تن کے ایک جوڑے میں دنیا دیکھنے نکل کھڑے ہوتے ہیں اس بات کی بالکل پروا نہیں کرتے کہ دنیا انھیں دیکھ رہی ہے۔ ان کے لیے مانگ کے کھانا یا فٹ پاتھ پر فقیروں کی طرح سو جانا بھی اس ایڈونچر کا ایک حصہ تھا۔ تاہم کچھ عرصے سے اخبارات کے باریک بیں صحافی ان آوارہ گرد نظر آنے والوں کی تعداد میں تشویشناک اضافے پر قومی سلامتی کے نقطہ نظر سے اظہار خیال کر رہے تھے۔ کچھ ہپی حساس نوعیت کے اداروں کے قریب اور ممنوعہ علاقوں کے آس پاس منڈلاتے بھی دیکھے گئے تھے اور ان کی پراسرار سرگرمیاں قیاس آرائی کا سبب بن رہی تھیں۔

کار میں بندرگاہ کی طرف جاتے ہوئے میں نے محسن سے کہا: "کیا تو نے غور کیا کہ آج دن بھر میں ہم نے کتنے ہپی دیکھے ہوں گے؟"

"ان کی اچانک یلغار کا کیا مطلب نکالا جا سکتا ہے؟" محسن نے جواباً سوال کیا۔

"میرا خیال تو یہی ہے کہ . . . یہ لوگ جاسوسی کرتے ہیں۔ سیاح بن کے آتے ہیں چنانچہ مراعات حاصل کر لیتے ہیں۔ غلط مقام پر بھی پکڑے جائیں تو یہ لاعلمی کا اعتراف کر کے معصوم بن جاتے ہیں اور ڈھیٹ بن کے ہر غلط کام کرنے سے ٹھہرتے بھی نہیں۔ تم نے اس ہپی کو دیکھا جو گٹار بجا رہا تھا؟"

"اسے میں نے بندرگاہ کے علاقے میں بھی دیکھا تھا۔" محسن نے کہا۔ "اسی طرح ہیٹ سامنے رکھے خاموش بیٹھا تھا۔ بظاہر گٹار بجانے میں مگن تھا لیکن اس کی نظریں ہر سمت میں بھٹک رہی تھیں۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے آ کے ایک رقعہ لا کے دیا۔ اس نے رقعہ پڑھا اور ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ چلا گیا، ٹیکسی میں بیٹھ کے۔"

گاڑی نے چلتے چلتے جھٹکے لینے شروع کیے۔ میں نے فیول میٹر پر نظر ڈالی تو سوئی ای کے نشان سے بھی نیچے کی طرف مائل تھی۔

"پٹرول ختم ہو گیا؟" محسن بولا۔

"ہاں۔ دھیان ہی نہیں رہا اس کا۔" میں نے کہا۔ گاڑی کے انجن نے چند ہچکیاں لیں اور خاموش ہو گیا۔

"اب پٹرول پمپ تک دھکا لگا کے جانا ہوگا۔" محسن بولا۔

پٹرول پمپ کا روشن سائن بورڈ تین چار فرلانگ کے فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ "مارے گئے پھر تو۔" میں نے کوٹ اتار کے کار میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "تم پیچھے آؤ شہزادے۔"

"یار کسی سے پٹرول کی بھیک مانگتے ہیں۔ آخر ہم بھی ہپی ہیں۔" محسن بولا۔ "اللہ کے نام پہ ایک روپے کا پٹرول دے جا بابا۔"

"وہ تو ایک لیٹر بھی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

"پٹرول پمپ تک تو پہنچ جائیں گے۔" محسن بولا۔ "کوشش کرتے ہیں، شاید کوئی درد مند دل رکھنے والا رک جائے۔"

لیکن اس کی کوشش ناکام رہی۔ ایک گاڑی والا رکا تو اس نے معذرت کی۔ اس کے پاس کار میں سے پٹرول نکالنے کے لیے نہ پائپ تھا نہ ڈبا۔ تاہم اس نے ہماری کار کو ایک موٹی رسی نکال کے اپنی کار کے پیچھے باندھ لیا اور کھینچ کر پٹرول پمپ تک پہنچا دیا۔ پٹرول بھروا کے پھر روانہ ہونے میں مزید آدھا گھنٹا ضائع ہو گیا۔ جب ہم بندرگاہ کے علاقے میں پہنچے تو رات کے نو بج چکے تھے۔

کار کو ہم نے بہت دور چھوڑا اور اپنے اسباب کے پیکٹ اٹھا کے چل پڑے۔ ٹیکسی اسٹینڈ پر چھ سات ٹیکسیاں آڑی ترچھی کھڑی ہوئی تھیں لیکن ڈرائیور ایک بھی نہیں تھا۔ میں نے قریب سے سب کے نمبر دیکھے۔ ان میں اکرام شیخ کی ٹیکسی نہیں تھی۔ مجھے اس کی توقع بھی کم تھی، پھر بھی مجھے مایوسی ہوئی۔

"میرا خیال تھا کہ وہ انتظار کرے گا۔" محسن بولا۔

"معلوم نہیں بعد میں کیا حالات ہوئے۔ کہیں گداگری کے مخبر اس کے خلاف تو نہیں ہو گئے

www.paksociety.com

باہر تو نہیں گئے؟" میں نے کہا۔ "وہی بیٹھ بیٹھ تھا پولیس اسٹیشن جانے کے معاملے میں۔"

ہم آگے روانہ ہونے ہی والے تھے کہ ایک ٹیکسی پیچھے سے آئی اور تقریباً ہمیں چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے خود کو تیزی سے الگ نہ کیا ہوتا تو شاید اس سے ٹکرا کے گر جاتا۔

"اُلّو کا پٹھا۔ نشے میں ہے کیا؟" میں نے کہا۔

محسن نے کہا۔ "تو نے کچھ اور بھی دیکھا؟ اس ٹیکسی میں کون تھا؟"

"کون تھا؟" میں نے اس کی سنجیدگی پر حیران ہو کے کہا۔

"وہی ہپی۔ جو ابھی ایک گھنٹا پہلے ایلفنسٹن اسٹریٹ کے چوراہے پر گٹار بجا رہا تھا، خیرات اکٹھی کر رہا تھا۔" محسن بولا۔ اور اس نے مجھے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ اتنے اسباب کے ساتھ دوڑنا ایک مشکل کام تھا لیکن ٹیکسی ابھی رکی ہی تھی کہ ہم پہنچ گئے۔ اس ہپی نے بڑی بے نیازی سے ٹیکسی ڈرائیور کو چند نوٹ دیے اور باقی رقم لیے بغیر چل پڑا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک براؤن پیپر کا تھیلے جیسا لفافہ بھی تھا۔ وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

میں نے اپنا سامان محسن کے حوالے کیا: "میں اس کے پیچھے جاتا ہوں۔ آخر یہ ہپی یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

"یہ کچھ لینے آیا ہے" محسن بولا۔ "مگر بھائی یہ سب بنڈل میں کیسے لے جاؤں گا؟"

"جیسے چاہے لے جا!" میں نے کہا۔ "میری چھٹی حس اچانک مجھے اس پُراسرار ہپی کے بارے میں خطرے کا سگنل دینے لگی ہے۔"

"میری ساتویں حس نے یہ سگنل پہلے دیا تھا۔" محسن بولا۔ "اس کا پیچھا کرتے ہوئے امریکا مت چلے جانا۔"

"اگر میں لانچ پر نہ آؤں تو . . . پھر مجھے اسی جگہ ملنا جہاں ہماری کار کھڑی ہوئی ہے۔" میں نے کہا اور نگاہ اس ہپی پر رکھی جو اب ہم سے چالیس قدم آگے خاصے اطمینان سے سگریٹ کا دھواں اڑاتا جا رہا تھا۔

"کتنے بجے تک انتظار کروں میں؟"

"دس بجے تک۔" میں نے کہا۔

محسن نے کہا۔ "آج رات شاید ہمیں روانگی بھی ملتوی کرنی پڑے۔"

محسن نے سر ہلایا: "ہم آدھی رات کے بعد ہی نکلیں گے تاکہ کریم بلوچ سے کہنا ہماری پوری ہو سکے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ شاید ایس ایس کراچی تھرڈ آج بھی نہ جا سکے۔ اُن کو جس ٹرک کا سامان لے جانا تھا وہ ابھی تک نہیں پہنچا ہے اور ظاہر ہے پہنچے گا بھی نہیں۔ یہ لوگ اُس کا انتظار کریں گے۔ سمجھیں گے لاہور سے ہی روانگی دیر سے ہوئی یا راستے میں خرابی ہوئی ہے۔ صحیح صورت حال اُن کو صبح تک ہی معلوم ہوگی۔"

"مگر پہلے پتا چل گیا تو ہو سکتا ہے جہاز فوراً لنگر اٹھا دے کسی تخریبی کارروائی سے بچنے کے لیے۔" محسن بولا۔ "یہ لوگ بھی تو ڈر جائیں گے۔"

"ہاں مگر امکان کم ہے کہ اتنی جلدی . . . اچھا میں اُدھر اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔" میں نے اس ہپی کو دائیں جانب جاتے دیکھ کر کہا۔ محسن کے اور میرے راستے جدا ہو گئے۔ میں نے محسن کو سگریٹوں کے کارٹن، [illegible] کے بنڈل اور کپڑوں کے پیکٹ وغیرہ دونوں ہاتھوں میں اُٹھائے اُس سمت میں جاتے دیکھا جدھر ہماری لانچ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ ہپی کہاں جا رہا تھا ابھی اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ مسلسل چلتا جا رہا تھا اور گرد و پیش سے بے خبر دکھائی دے رہا تھا۔ اس علاقے میں غیر ملکی جہازوں کے ساتھ لیے آوارہ گرد اکثر نظر آ جاتے تھے۔ یہ لوگ کسی بھی مال بردار جہاز کے عملے کی مدد سے چھپ کر سفر کرتے تھے۔ بحری جہاز کے کرائے ہوائی جہاز سے بہت کم ہوتے ہیں مگر یہ ہپی وہ چار سو ڈالر میں اپنا کام نکالتے تھے اور سامان کے ساتھ اسمگل ہو جاتے تھے۔ بحری جہاز کے کسی بھی جگہ لنگر انداز ہونے کے بعد انھیں باہر نکلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

مجھے اس ہپی کا تعاقب کرتے ہوئے صرف یہ اندیشہ لاحق تھا کہ وہ کہیں پلٹ کے نہ دیکھ لے اور اپنے پیچھے ایک اور شخص کو اتنا قریب پائے تو چوکنا نہ ہو جائے۔ چنانچہ میں بہت محتاط تھا اور خاصے فاصلے سے اس پر نگاہ رکھے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ کبھی میں کسی کھمبے کی اوٹ میں ہو جاتا تھا تو کبھی اسباب کے کسی ڈھیر کے پیچھے۔ رات کے وقت بھی وہاں دن جیسی چہل پہل تھی لیکن سورج کی روشنی کے مقابلے میں مصنوعی روشنی اندھیرے کو بالکل ختم نہیں کر سکتی تھی۔

مجھے نیم روشن اور تاریک حصوں میں چھپ کر آگے بڑھنے کے مواقع بھی حاصل رہے۔

آدھے گھنٹے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہپی کا رخ شپ یارڈ کی طرف ہے۔ اتنی دور آنے کے لیے اس نے پیدل چلنا منظور کیا۔ اگر وہ چاہتا تو ٹیکسی کو شپ یارڈ تک لے جا سکتا تھا لیکن شناخت کے بغیر وہ شپ یارڈ کے کسی گیٹ سے نہیں گزر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے دوسرا مشکل راستہ اختیار کیا۔ اب وہ سمندر کے کھلے حصے کی طرف سے داخل ہوگا۔ یہ بات میرے ذہن میں مزید شکوک پیدا کرنے کا سبب بنی۔ ایک بات تو یہی غور طلب تھی کہ اُسے یہ راستہ کس نے بتایا۔ اگر خود اس نے دریافت کیا تو کیوں؟ گھومنے پھرنے کے لیے آنے والے کسی ہپی کا بطور خاص ٹیکسی میں بیٹھ کے یہاں پہنچنا اور شپ یارڈ میں داخلے کے لیے رات کے وقت ایسا پیچیدہ راستہ اختیار کرنا غلط عزائم کی نشاندہی کرتا تھا۔

ہپی کا خیال تھا کہ اس پر کسی نے شک نہیں کیا ہوگا چنانچہ وہ مطمئن تھا کہ اس کے پیچھے کوئی نہیں آ سکتا۔ اُسے کیا معلوم کہ سب سے پہلے محسن اس کو دیکھ چکا تھا جب وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کے کہیں گیا تھا۔ آج پھر وہ ٹیکسی میں آیا تھا۔ کیا یہ وہی ٹیکسی تھی؟ میں نے سوچا لیکن مجھے کوشش کے باوجود اس کا نمبر یاد نہ آیا حالانکہ میں نے اس کا نمبر دیکھا تھا۔ شاید محسن کو یاد رہ جائے اور ہم اسے تلاش کر لیں۔

ایک جگہ پہنچ کے میں رک گیا۔ اب میری نظریں ہپی کو آگے بڑھتا دیکھ رہی تھیں۔ میں موشن میاں کی گنے کا رس نکالنے والی ریڑھی کے قریب کھڑا ہو گیا تھا۔ شاید ریڑھی اور مشین اس وقت بند تھیں۔ شپ یارڈ میں جہازوں کی مرمت اور دیکھ بھال کی خدمات سرانجام دینے والے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور میں متعدد [illegible] ول کے روشن حصوں میں چلتے پھرتے افراد کو دیکھ سکتا تھا۔ کئی جگہ ویلڈنگ کرنے والے تیز نیلی روشنی کی چکا چوند پیدا کر رہے تھے۔ ایسی ہی خیرہ کن روشنی "ایس ایس کراچی تھرڈ" کے عرشے کو بھی منور کر رہی تھی۔

میری حیرت زدہ نظروں کے سامنے وہ ہپی سیدھا ایس ایس کراچی تھرڈ کی طرف گیا اور ایک سیڑھی کے ذریعے اوپر چڑھا۔ اوپر سے کسی نے اس پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ پھر وہ عرشے پر پہنچ گیا۔ وہاں تین افراد پہلے سے موجود تھے۔ میں نے دوربین نکالی اور ایک ایسے حصے میں چلا گیا جہاں بہت سا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ لکڑی کے ایک خالی کنٹینر کے پیچھے سے میں نے دوربین کو فوکس کیا۔ ویلڈنگ ٹارچ کی تیز روشنی نے میری مدد کی اور میں نے اُن چاروں میں سے تین کو شناخت کر لیا۔

ان میں سے ایک وہی خلاصی تھا جس کی موشن میاں کی ریڑھی پر گنے کا رس پیتے ہوئے مار پیٹ ہوئی تھی۔ اس کا مدمقابل کے پی ٹی کا غریب ملازم شاید ابھی تک تھانے میں بند تھا۔ دوسرا شاہد جمیل تھا اور تیسرا وہ ہپی۔ چوتھے کے بارے میں میرے پاس یقین کے خاصے اسباب تھے کہ وہ جہاز کا کپتان آرتھر مصرا ہوگا۔ اس کو میں نے اپنے محلے کے ایک فرد کی گرفتاری کی خبر پا کے فوراً روانہ ہوتے دیکھا تھا۔

مصرا اس براؤن لفافے کے اندر سے کاغذات نکال کے دیکھ رہا تھا جو ہپی نے اسے لا کے دیا تھا۔ معلوم نہیں عرشے پر پھیلی نیم روشنی میں اس نے کیا دیکھا مگر کچھ دیر کے بعد اس نے مطمئن ہو جانے کے انداز میں سر کو جنبش دی اور پلٹ کے غائب ہو گیا۔

میں اپنی کمین گاہ سے نکلا اور آہستہ آہستہ جہاز کی طرف بڑھنے لگا اس طرح کہ کسی کو بھی میری کسی جہاز میں دلچسپی اور بڑھتے قدموں کا احساس نہ ہو۔ پھر میں نے ایک کرین کے پیچھے سے دوربین کو اس وقت دوبارہ فوکس کیا جب درمیانی فاصلہ سو گز سے کم رہ گیا تھا۔ اب میں نے خلاصی کے ہاتھ میں خودکار مشین گن جیسی کوئی چیز دیکھی۔

اچانک کسی نے میرے پیچھے آ کے کہا: "اے . . . تم! واٹ آر یو ڈوئنگ ہیئر؟ (تم یہاں کیا کر رہے ہو؟)"

وہ کے پی ٹی کی وردی میں کوئی افسر تھا۔ میں چونک کر اس کی طرف پلٹا اور مسکرانے لگا۔

"میرا دوست اس شپ پر کسی کام سے گیا ہے۔" میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور فرانسیسی میں کہا۔

"کانٹ یو اسپیک انگلش؟ (کیا تم انگریزی نہیں بول سکتے؟)"

میں نے نفی میں سر ہلایا: "نو انگلش۔" اور پھر جہاز کی طرف اشارہ کیا: "می . . . فرینڈ . . . ویٹنگ . . . یو سی۔" میں نے دوربین اُس کی طرف بڑھا دی۔

وہ کچھ سمجھ گیا۔ اس نے دوربین لے کر جہاز پر دیکھا

www.paksociety.com

تو اُسے میرے جیسا ہی دوسرا آدمی دکھائی دیا ہوگا۔
"میں... ویٹ... پلیز" میں نے یوں کہا جیسے میرے لیے انگریزی کے الفاظ یاد کرنا ایک امتحان سے کم نہیں۔
"اچھا اچھا، تم اس کی واپسی کا انتظار کر رہے ہو؟" اس نے انگریزی میں کہا۔ دو قدم میں مجھے تنہائی اور واپس چلا گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ رسیدہ بود بلائے... اگر وہ مجھ سے شناخت کے کاغذات مانگ بیٹھتا تو میں کیا کرتا؟
میں نے پھر دوربین آنکھوں سے لگالی۔ وہ ابھی ایک سفید لفافہ اپنے کوٹ کے اندر چھپا رہا تھا۔ ڈرٹی بلڈی باسٹرڈ! میں نے خالص امریکی لہجے میں گالی دی۔ یہ غدار دشمن کی مدد کر رہا ہے۔ ان کے لیے رابطہ فراہم کر رہا ہے جو ملکی راز دشمنوں کو بیچتے ہیں۔ صرف پیسے کے لیے۔ یہ سوچے بغیر کہ ایسا کرنا اخلاقی اور قانوناً کتنا سنگین جرم ہے مگر یہ ایسی اخلاقیات سے تو خیر دور کا واسطہ نہیں رکھتے۔ لڑکے لڑکیاں مشترکہ میاں بیوی بن کے ساتھ رہتے ہیں، نشے کے اتنے عادی ہوتے ہیں کہ چرس کے ایک سگریٹ کی خاطر عزت بیچ دیتے ہیں۔ انھیں کیا غرض کسی ملک کی سلامتی سے۔
رینی اب واپس آ رہا تھا۔ حسبِ توقع اس نے واپس جانے کے لیے بھی سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا۔ میں نے دوربین کو واپس بیگ میں ڈالا اور اس کے پیچھے سائے کی طرح لگ گیا۔ اب میں زیادہ بے خوف تھا۔ میں اسے کہیں بھی دبوچ سکتا تھا اور اسے گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ کہیں بھی لے جا سکتا تھا مگر اس کو گم کر دینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے برعکس وہ کچھ خوف زدہ تھا۔ اس لیے کہ پہلے اس کے ہاتھ میں بے مصرف کاغذات تھے لیکن اب اس کو اپنی پُرخطر غیر قانونی خدمات کا صلہ مل چکا تھا جو شاید سیکڑوں ڈالر ہوگا۔ وہ اس دولت کے لٹ جانے کے ڈر سے ہر طرف دیکھتا ہوا جا رہا تھا کہ کہیں کوئی چور اچکا تو اس کے تعاقب میں نہیں ہے۔
جب اس نے پہلی بار مجھے دیکھا تو وہ چونکا۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے پھر دیکھا تو تذبذب ہو گیا۔ وہ رک گیا اور اس نے مجھے قریب آنے کا موقع دیا۔
"ہیلو!" اس نے ایک بدتمیز ہندوستانی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "یو فرام امریکا؟" تم امریکا سے آئے ہو؟"
میں نے نفی میں سر ہلا کے مصافحہ کیا۔ "آئی ایم فرام یو کے، ساؤتھ آف لندن۔" (میرا تعلق برطانیہ سے ہے، لندن کے جنوبی حصے سے۔)
ہم دونوں ساتھ چلنے لگے۔ اس نے مجھے اپنا نام بتایا اور مجھ سے پوچھا کہ میں کب سے پاکستان میں ہوں۔ میں نے کہا کہ اب تک ہم نیپال میں تھے مگر وہیں کالے چوروں نے لوٹ لیا۔ پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں نکلنا پڑا۔ جو لڑکی میرے ساتھ آئی تھی وہ یہاں کسی جہاز پر آئی تھی۔ اسے پچاس ڈالر ملنے کی امید تھی لیکن وہ واپس نہیں آئی۔ چنانچہ میں اس کے بارے میں متفکر ہوں۔ اس نے یہ بالکل نہیں پوچھا کہ وہ لڑکی پچاس ڈالر کیسے لائے گی۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکیاں سخت حالات میں کیا روزگار پیدا کر سکتی ہیں۔ میں نے اس اندیشے کا اظہار بھی کیا کہ وہ کمینی مجھے چھوڑ کر جہاز پر ہی نہ نکل گئی ہو۔
وہ ہنسنے لگا۔ "آج ایک جہاز پر تو میں بھی گیا تھا۔ اس کی روانگی کل پر ملتوی ہو گئی ہے۔ اس پہ معلوم کرنا ہو تو کر لو۔"
"تم کس جہاز کی بات کر رہے ہو؟"
"وہ ایک انڈین شپ ہے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "اس کا کپتان میرا دوست ہے۔"
"شٹ اپ!" میں نے سخت برہمی کے ساتھ کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم لندن کے گھٹیا اور گرے ہوئے ہیں۔ صرف پچاس ڈالر کے لیے میری گرل فرینڈ کسی بلڈی بلیک انڈین کے پاس جائے گی۔ وہ کسی فرنچ ویسل پر ہے۔ تمام مہذب سیلر اس کو لینے گئے تھے۔"
اس نے فوراً معذرت کر لی۔ "پھر تو تمھیں خود ہی معلوم کرنا پڑے گا۔ یہاں آج کل میں نہ جانے کتنے برٹش، فرنچ اور دوسرے یورپین جہاز آئیں گے اور جائیں گے۔"
اب ہم باہر آ گئے تھے۔ اس نے مجھے بائی بائی کہنا چاہا مگر میں نے کہا۔ "میرے پاس گاڑی ہے۔ میں تم کو کہاں چھوڑ سکتا ہوں؟ کم آن!"
وہ حیران نظر آنے لگا۔ "یو گاٹ اے کار؟"
"میری اپنی نہیں، کرائے کی ہے۔" میں نے وضاحت کی۔ وہ مطمئن نظر آنے لگا اور پھر میرے ساتھ ہو لیا۔
"تمھارے پاس کرائے کی کار کے لیے پیسے ہیں، ماشاء اللہ تمھاری گرل فرینڈ پچاس ڈالر کمانے گئی ہے۔" وہ

طنز سے بولا۔
"بے شک ہم کچھ فضول خرچ بھی ہیں۔" میں نے تسلیم کیا۔ "تم کہاں ٹھہرے ہو؟"
"وائی ایم سی اے۔ میں کسی کو ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتا، خصوصاً لڑکیوں کو۔" وہ بولا۔ "تم تو ہوٹل میں ٹھہرے ہوگے مسٹر فضول خرچ!"
میں اسے عمداً چکر دے کر اس طرف سے لے گیا تھا جدھر سے محسن کے آنے کا امکان تھا۔ اب ساڑھے دس بج چکے تھے اور میں نے اسے دس بجے کا وقت دیا تھا۔ اتنے میں میں نے اکرام شیخ کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھا ہوا دیکھا۔ ٹیکسی بھی اسٹینڈ سے کافی دور اس کار کے قریب کھڑی ہوئی تھی جس میں مجھے اور اس ہپی کو جانا تھا۔ ہمیں ایک ساتھ واپس آتے دیکھ کر محسن نے سمجھ لیا ہوگا کہ اب کیسی صورتِ حال ہوگی اور اسے کیا کرنا پڑے گا۔
میں نے کار کا دروازہ چابی سے کھولا اور بیٹھتے ہی آگے پیچھے کے دونوں گیٹ ان لاک کر دیے۔ وہ اگلے دروازے سے میرے ساتھ بیٹھا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور پیچھے دیکھا۔ محسن نے سر ہلا کے مجھے چلتے رہنے کا اشارہ کیا۔ میں نے رفتار میں تھوڑا سا اضافہ کیا ہی تھا کہ محسن نے دوڑتے ہوئے پیچھے والا دروازہ کھولا اور بیٹھ کر گرتے ہی بند کر لیا۔
ہپی نے چونک کر پیچھے دیکھا مگر جو کچھ اسے نظر آیا وہ اس کے حواس گم کرنے کے لیے کافی تھا۔
"یہ... یہ کیا ہے؟... کون ہو تم...؟" وہ ہکلایا۔
"پلیز بی کوائٹ۔" محسن نے کہا۔ "چپ کر کے بیٹھے رہو۔"
"تم لوگ اغوا کر رہے ہو مجھے... کیوں؟"
"معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "تم یہ کیوں بھول گئے تھے کہ ہم کالے ضرور ہیں مگر ہماری آنکھیں اسی طرح دیکھتی ہیں، ہمارے کان اسی طرح سنتے ہیں اور ہمارا دماغ اسی طرح کام کرتا ہے جیسے تمھارے ملک میں ایف بی آئی کے ایجنٹوں کا۔"
"تم... تم... سرکاری کارندے ہو؟" اس کی حالت غیر ہو گئی۔
"ہمارے ملک میں اسے ایف آئی اے کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور کارکردگی کے اعتبار سے ہمارا معیار کیا ہے، اس کا تم کو بخوبی اندازہ ہو چکا ہے۔ تم بہت مطمئن تھے کہ کوئی تمھیں نہیں دیکھ رہا ہے۔ تم نے دستاویزات اس انڈین شپ پر پہنچانے کا کیا معاوضہ وصول کیا؟"
"میں... میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔"
"تم ایک براؤن لفافہ لے کر گئے تھے جو تم نے آر از مصرا کے حوالے کیا۔" میں نے کہا۔ "ایس ایس کرانتی تھرڈ کا فرسٹ آفیسر شاہد جمیل بھی اس موقع پر موجود تھا اور ایک سیکیورٹی گارڈ جو گن لیے کھڑا تھا۔ وہاں ویڈیو فلم بن رہی تھی۔ اس لیے ہمیں فلیش گن کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہم نے بہت سی تصویریں بنائی ہیں۔ ویسے ہمارے پاس الٹرا ریڈ کیمرہ تھا۔ اس کی ایک تصویر میں تم مصرا سے ایک سفید لفافہ وصول کرتے نظر آ رہے ہو۔ دوسری تصویر اس وقت لی گئی جب تم نے وہ لفافہ اپنے کوٹ میں چھپایا۔ اس میں کتنی رقم ہے مسٹر؟"
"مسٹر واٹ؟..." محسن نے کہا۔ "اپنا پاسپورٹ میرے حوالے کر دو۔"
"نہیں۔ کیا ثبوت ہے تمھارے پاس۔ پہلے مجھے اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ۔" اس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم لٹیرے لگتے ہو۔"
پلک جھپکتے میں اس نے گیٹ کھول کر باہر کودنے کی کوشش کی۔ کار کی رفتار بہت زیادہ تھی مگر اس سے بھی زیادہ برق رفتاری کا مظاہرہ محسن نے کیا۔ اس نے ہپی کے سر پر ریوالور مارا اور میں نے اسے بائیں ہاتھ سے واپس کھینچ لیا ورنہ وہ کھلے دروازے سے اچھل کر باہر جا گرتا تو اتنی رفتار سے سڑک پر گرتے ہی اس کی گردن بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ اب میں نے رفتار کم کی اور محسن نے آگے جھک کر کھلا ہوا دروازہ کھینچ کر بند کر دیا۔
اکرام شیخ کی ٹیکسی ہمارے پیچھے تھی۔ میں نے اُسے روانہ ہوتے ہی بیک ویو مرر میں دیکھ لیا تھا۔ اب وہ ہمارے برابر آ گیا۔
"سب ٹھیک ہے نا؟" وہ بولا۔
میں نے مسکرا کے اسے انگوٹھا دکھایا جس کا مطلب تھا فاتح۔
"اب تم آگے ہو جاؤ شیخ صاحب! تمھارے غریب خانے میں قدم رنجہ فرمانا ہے اور ماحضر تناول فرمانا ہے۔" میں نے کہا۔
اکرام شیخ نے کہا۔ "غریب تو حاضر ہے۔ غریب خانہ

www.paksociety.com

کوئی نہیں ہے فی الحال۔"
"کیوں، پھر اس لڑکے جھوٹو کو کہاں چھوڑ آئے ہو تم نے؟"
"وہ ڈاکو مچھلی والا کے پاس۔" اکرام شیخ بولا۔
میں اپنی کار کو اس کی ٹیکسی کے متوازی چلا رہا تھا۔ "اچھا تم ایسا کرو، آگے کہیں ٹیکسی روک لو جہاں تنہائی ہو۔"
شیخ نے ٹیکسی آگے بڑھا دی تو میں نے اس زمین کی طرف دیکھا جو اب میرے قدموں میں مرگھٹ کی طرح پڑا ہوا تھا۔ ایک ڈیڑھ میل کے بعد شیخ نے اشارہ کیا اور ٹیکسی کو ایک سائڈ پر کھڑا کر دیا۔ میں نے کار بھی اس کے متوازی لگا دی۔ محسن کی زبانی شیخ کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ میں کسی مہم کے تعاقب میں گیا ہوں، اس کے بعد کیا ہوا تھا یہ جاننے کے لیے محسن بھی بے چین تھا۔ میں نے انھیں مختصر الفاظ میں ساری بات سنا دی۔
"پھر اب کیا کرنا ہے؟" محسن بولا۔
"میری ایک تجویز ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن شیخ صاحب، پہلے یہ فرمائیے کہ آپ سب گھر کیوں نہیں۔ یہ کیا چکر ہے؟"
"یار بڑا چکر ہے۔ اب میں جہاں رہتا تھا وہاں بھی وہی شک اور تجسس کے مارے ہوئے لوگ تھے۔ انھیں سخت پریشانی لاحق تھی کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور کے گھر میں دو جوان اور خوب صورت عورتیں کیوں ہیں جو کسی طرح بھی اس کی بیویاں نظر نہیں آتی تھیں۔ خواتین کو موہنی نے مطمئن کیا یہ بتا کے کہ وہ میری بیوی ہے اور زیب النساء میری بہن ہے لیکن اسی دن ایک بیان میں نے جاری کر دیا جس کی رو سے موہنی تو خیر میری بیوی ہی تھی مگر زیب النساء کو میں نے سالی کہہ دیا یعنی موہنی کی بہن۔ ایک گھر میں میاں بیوی کے درمیان اختلاف رائے ہوا تو بات پھیلی اور کچھ حضرات پر مشتمل کمیٹی بنائی گئی جو تصدیق کے لیے میرے پاس آئی۔ میں نے بیان کو قابل قبول بتا دیا کہ دونوں باتیں درست ہیں۔ بیوی میری خالہ کی لڑکی تھی سو اب اس کی بہن سے دوہرا رشتہ ہو گیا تو کیا غلط بات ہے اس میں، خالہ زاد بھی بہن ہی ہوتی ہے اور سالی بھی ہے مگر اس کے بعد بھی کچھ شر پسند عناصر مطمئن نہیں ہوئے۔ معلوم نہیں کیسے ایک نوجوان کو لاہور کا پرانا رسالہ مل گیا جس میں زیب النساء کی تصویر چھپی تھی اور ایک بوگس انٹرویو چھپا تھا کہ وہ فلاں فلاں فلم میں کام کر رہی ہے۔ لو صاحب محلے میں تو سنسنی پھیل گئی۔ فلم ایکٹریس ہے تو پھر ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ کیوں ہے؟ ضرور بھاگ کے آئی ہے۔ معلوم کرنا چاہیے ورنہ یہ کون ہے۔ ایک بار پھر تصدیق و تفتیش کے لیے مجھے بلایا گیا تو میں نے اس نوجوان کو پکڑ لیا۔ سخت مشتعل ہو کر اس نے میری بہن کو فلم ایکٹریس کہنے کی جرأت کیسے کی۔ اگر کسی سے صورت ملتی ہے اس کی تو کیا وہ ایکٹریس ہو گئی؟ لاحول ولا قوۃ۔"
"کتنے افسوس کی بات ہے یار۔" میں نے کہا۔ "فلم اداکارہ کو ہمارے معاشرے میں کیا مقام دیا گیا ہے کہ اس کا نام بھی گالی بن کے رہ گیا ہے حالانکہ اداکاری کو اب فنون لطیفہ کا درجہ حاصل ہے۔ کتنی عزت ہے دوسرے ممالک میں اداکاروں کی۔ ہمارے پڑوسی ملک میں پرتھوی راج، نرگس اور دلیپ کمار نہ جانے کتنے اداکار اسمبلی میں گئے اور کتنی عزت پائی۔ خود امریکا۔۔۔"
"ابے یار اب یہ کیا قصہ لے بیٹھے۔" محسن جھنجھلا کے بولا۔ "بات ختم کرو۔ پھر کیا ہوا؟"
"پھر یہ کہ انھیں لاہور جانا پڑا تو میں نے وہی کیا جو پہلے کرتا آیا ہوں۔ بوریا بستر سمیٹ لیا۔ ابھی اسباب اپنے ہی ایک ہم پیشہ ٹیکسی ڈرائیور کے گھر میں پڑا ہے۔"
"اچھا، میں اس پیچیدہ جاسوسی کو ٹیکسی کی ڈکی میں ڈال رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کار اس کے مالک کو واپس کر دینی چاہیے، اس کے بعد ہم کہیں کھانا کھائیں گے۔ ہم میں سے ایک واپس لانچ پر جائے گا یعنی محسن۔"
"قرعہ فال میں میرا ہی نام کیوں؟" محسن نے احتجاج کیا۔
"حکم ہے میرا۔ بحیثیت چیف۔۔۔"
"بھاڑ میں گیا چیف مع حکم۔"
"تو ڈرتا ہے اس سے؟" میں نے کہا۔ "وہ کھا جائے گی تجھے؟"
"ضرورت کیا ہے کسی کو واپس جانے کی؟"
"وہ اکیلی ہے اور یہ کام دو آدمی ہی کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔
"دوسری جگہ ہم ہوں گے تو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ کریم بلوچ ہے۔" محسن نے فیصلہ سنایا۔ "میں اسے بتا کے آیا تھا کہ شاید واپسی میں دیر ہو جائے، صبح جاتے تو فکر نہ کرے۔"
مجھے مجبوراً اس کی بات ماننی پڑی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ گل بانو کے ساتھ تنہائی کے خیال سے گریزاں تھا۔ آسیہ نے بیٹی کی مدد سے بہن کو ایسے باندھا کہ وہ حرکت بھی نہ

کر سکے۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ مدد کے لیے کسی کو پکارنا چاہے تو اس کی آواز بھی نہ نکلے۔
پندرہ بیس منٹ کے بعد ایک ایک سگریٹ پھونک کر ہم اس ترتیب سے روانہ ہوئے کہ میں اکیلا کار میں آگے چلا رہا، ٹیکسی میں شیخ کے ساتھ محسن بیٹھ گیا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جب صدر سے گزر کے جانا ہے تو کار کو پھر وہیں کیوں نہ چھوڑ دوں جہاں سے میں نے لی تھی۔ رات کے سوا گیارہ بجے بازار کی رونق ماند پڑ چکی تھی۔ صرف ریسٹورنٹ اور شراب خانے آباد رہ گئے تھے۔ پیراڈائز سینما کے سامنے بھی مجھے ایک عام قسم کا شراب خانہ نظر آیا جس میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ کراچی کے سوا میں نے پاکستان کے کسی شہر میں ایسے بار نہیں دیکھے تھے جہاں صلائے عام ہو۔ پہلے میں بہت حیران ہوا تھا کیونکہ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں شراب کے عام ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب مجھے صدمہ ہوتا تھا۔ آخر اس ملک کے ارباب اقتدار و اختیار کو ابھی تک احساس کیوں نہیں ہوا کہ اسلام کے نام پر حاصل کیے جانے والے اس ملک میں یہ شراب خانے ہمارے قومی کردار پہ بدنما داغ ہیں۔ کون ہے جو اختلاف کرے گا کہ یہ کاروبار غیر اخلاقی اور حرام ہے۔ پھر انھیں لائسنس کیوں ملے ہوئے ہیں کہ بلا تخصیص اور بلا روک ٹوک مے فروشی کریں۔
کار کو میں نے عین اسی جگہ پارک کر دیا۔ دن کا وقت ہوتا تو مجھے یہ جگہ خالی نہ ملتی۔ پھر میں نے اکرام شیخ سے کہا کہ وہ کافی ہاؤس جائے اور چابی کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کو دے دے۔
"وہ کون ہے، مالک یا منیجر؟"
"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ سینٹرل کافی ہاؤس دیکھا ہے نا؟"
"ہاں ہاں، کچھ اور کہنا ہے اس سے؟" شیخ نے اپنی ٹیکسی سے اترتے ہوئے کہا۔
"کچھ نہیں، شکریہ ادا کر دینا اور کھانا بھی لیتے آنا۔ مگر نہیں، وہ پھر پیسے نہیں لے گا۔" میں نے کہا اور ٹیکسی میں محسن کے ساتھ جا کے بیٹھ گیا۔
"تو نے اپنی اس گل بانو کو تسلی دے دی تھی نا؟"
"وہ بھی عجیب چیز ہے یار۔ قمیص پتلون پہنے پھر رہی تھی، سر کے بال تو ویسے ہی ترشے ہوئے ہیں۔ انھیں کیپ میں چھپا لیا تھا۔ میں تو سمجھا کہ یہ کپتان کریم بلوچ ہے۔ میں نے پیچھے سے ہاتھ مار دیا کہ واہ استاد۔ اور بس جب اس نے پلٹ کے چیخ ماری نا تو میرے ہاتھوں کے کبوتر اڑ گئے۔ جیسے انارکلی کے ہاتھ سے اڑ گئے تھے۔"
"یہ الٹا کیس ہو گیا۔ کبوتر شہزادے کے ہاتھ سے اڑ گئے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ڈر گئی ہو گی؟"
"ڈری تو تھی مگر اس سے زیادہ ناراض تھی کہ تم نے توڑ دیا۔" محسن بولا۔ "حالانکہ میں نے کوئی بہت زیادہ قوت سے ہاتھ نہیں مارا تھا۔ کریم بلوچ سمجھ کے دوستانہ بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ تو میرے پیچھے پڑ گئی کہ کریم بلوچ کے بھی اتنا ہاتھ رسید کرنا کون سی اچھی بات ہے۔ بلند تھی کر دیکھو۔۔۔ کیسا لال نشان پڑ گیا ہے پانچوں انگلیوں کا۔"
"پھر۔۔۔ تو نے دیکھا خطرے کا لال نشان؟" میں نے کہا۔
"ابے جا، سالی خواہ مخواہ۔۔۔ زبردستی گلے پڑ رہی ہے۔" وہ جھینپ کر بولا۔ "نخرے دکھاتی ہے کہ تم بڑے بے رحم ہو، اتنا زور سے ہاتھ مار دیا۔ اب اخلاقاً سہلا بھی دو وعدہ ہو گئی ہے۔"
مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "اس وقت تیری یہ حالت ہو رہی ہے تو گل بانو کے سامنے کیا ہوتی ہوگی۔ ٹھیک ہی تو کہا تھا اس نے کہ مجھے شادی کرنی ہے کسی مرد سے۔"
"بھائی آپ مرد بن جائیں نا۔" محسن جھنجھلا کے بولا۔ "مجھے کیوں قربانی کا بکرا بنا کے جھٹکا کراتے ہیں۔" میرا اکرام شیخ آیا تو ہم پھر روانہ ہوئے۔ میں نے اسے محسن کے ساتھ گل بانو کی "زیادتی" کا حال سنایا تو وہ بھی بہت ہنسا۔ محسن کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ٹیکسی بندر روڈ پہ آنے کے لیے زیلن کافی ہاؤس کے سامنے سے گزری تو ایک دم میری بھوک جاگ اٹھی۔ اکرام شیخ نے مجھے مطلع کیا کہ اس وقت ہم بندو خان کے مہمان ہوں گے۔
"کون بندو خان؟" محسن نے کہا۔
"کسی کراچی والے کے سامنے ایسی جہالت کی بات کرے گا تو مار کھائے گا۔" شیخ نے کہا۔
"شیخ صاحب!" میں نے اسے روک کے کہا۔ "مانا کہ استاد بندو خان عظیم سارنگی نواز کا ثانی نہیں، لیکن خالی پیٹ

www.paksociety.com

موسیقی۔۔۔"

"یہ بندو خاں سارنگی نہیں بجاتے۔ مگر پڑاشا کیا سب بنانے میں وہی کمال دکھاتے ہیں۔" شیخ نے کہا۔

اُس نے ٹھیک کہا تھا۔ رات کے بارہ بجے بھی ان کی دکان کے سامنے کاروں کی قطاریں اُن کی مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ چھ فٹ سے بھی زائد قد والے بندو خاں شاندار سفید طرہ دستار کے ساتھ سب کو خوش آمدید کہہ رہے تھے اور سب کے درمیان گھوم پھر کے دیکھ رہے تھے کہ کسی کو کوئی شکایت تو نہیں۔ جب ہم پیٹ بھر کے روانہ ہونے تو شیخ نے اُن سے مصافحہ کیا اور تیز میں کہا "بہت عمدہ"

شیخ نے اس کا ترجمہ کیا اور بتایا کہ ہم غیر ملکی مہمان ہیں۔ اُن کا جذبۂ مہمان نوازی ایک دم بیدار ہو گیا۔ وہ ہمیں مدعو کرنے پر مُصر تھے مگر ہم شکریہ ادا کر کے بھاگ آئے۔

شیخ نے اپنی ٹیکسی عام جگہ سے دور کھڑی کی تھی تاکہ کسی وقت ہمارا قیدی ہوش میں آجائے تو کسی کو متوجہ نہ کر سکے حالانکہ ہماری احتیاطی پیش بندی کے باعث اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ شیخ نے ڈکی کھول کے دیکھیں تو مجنی کی آنکھیں کھلی دکھائی دیں۔

میں نے جیب میں سے وہ کاغذ نکالا جس پر جیکب لائن کے وہ اور کلیٹن کوارٹرز کا ایک نمبر لکھا ہوا تھا۔ "یہاں جانا ہے۔"

"یہاں کون رہتا ہے؟" شیخ نے ڈکی بند کر کے مجھ سے وہ پرچہ لے لیا اور ٹیکسی اسٹارٹ کی۔

"دو کوارٹر تو جیکب لائن میں ہیں" میں نے کہا۔

"جیکب لائن پیچھے کا سب علاقہ ہے۔" شیخ نے کہا۔

"یہ غداروں کا ایک ٹولا ہے جس میں چار افراد شامل ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے شک ہے کہ اس قیدی کا انھی سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے جو اہم سرکاری راز چرا کے دشمنوں تک پہنچا رہے ہیں۔ یہ چار بنگالی قماش کے لوگ ہیں جو اس قسم کی صورت حال میں ملک کے اندر رہتے ہوئے ملک کی سلامتی کے خلاف سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔ یہ چاروں بھی علیحدگی پسند عناصر کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں یا پھر لالچ میں غداری کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ ان کی رسائی اب سیکرٹ انفارمیشن تک بھی ہے یہ لوگ آگے پاس کر رہے ہیں۔ یہ مجنی بھی ایسے ہی کاروبار میں ملوث تھا۔ کیوں نہ اسے اور انھیں آمنے سامنے بٹھا کے پوچھیں؟"

آدھی رات کے بعد کوارٹروں کے نمبر پڑھنا دشوار کام تھا۔ نمبر مٹ گئے تھے۔ سفیدی کرانے والوں نے دوبارہ یہ نمبر لکھنے یا لکھوانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ایک کوارٹر میں روشنی دیکھ کر شیخ نے کال بیل بجائی۔ اس نے یہ ظاہر کیا کہ سی ٹیمن میں رہنے والوں کے مہمان لسٹ بائی ہم ٹیکسی سے باہر ہی نہیں آئے۔ شیخ چند منٹ کے بعد آیا اور ٹیکسی کو گھما کے پیچھے لے گیا۔

سی ٹیمن خاصا بڑا بیرک نما کوارٹر تھا جس کے ایک حصے میں لائٹ نظر آرہی تھی۔ میں اور محسن ٹیکسی سے اتر کے ایک طرف اندھیرے میں کھڑے ہو گئے۔ شیخ کی دستک کے ساتھ ہی اندر جلنے والی وہ لائٹ بجھ گئی جو کھڑکی کے شیشوں سے باہر بھی پہنچ رہی تھی۔ دو تین منٹ کے بعد کوئی دھوتی پہنے باہر آیا۔

"شیخ مطیع الرحمان صاحب ادھر رہتے ہیں؟" شیخ نے بالکل ٹیکسی ڈرائیوروں کی طرح پوچھا۔

"وہ رہتا ہے۔ اِنھیں رہتا ہے؟ تم کیا مانگتا؟" اس بنگالی نے تند لہجے میں کہا۔

"ہم کیا مانگتا؟" شیخ نے کہا۔ "ہم یہ پتا مانگتا ہے۔ کوارٹر میں کون رہتا ہے؟"

بنگالی نے وہ رقعہ لے لیا۔ "مطیع الرحمن؟" پھر اسے احساس ہوا کہ نام لے کر اُس نے غلطی کی ہے۔ "بابا ادھر کیوں آتا ہے؟ وہ کوارٹر ادھر ہے۔ ہمارا نیند خراب کرتا۔ سالا مغز خراب ہے۔"

اس سے زیادہ بولنے کا موقع ہم نے نہیں دیا۔ وہ واپس جانے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ میں تیزی سے نکلا۔ اور میں نے اُسے یوں دبوچ لیا جیسے چھپکلی کسی مچھر کو دبوچتی ہے۔ وہ پھڑپھڑایا مگر نہ وہ خود کو چھڑا سکا اور نہ حلق سے آواز نکال سکا۔ یہ سب کارروائی بیرونی برآمدے میں ہو رہی تھی۔ مگر اتنی رات کو وہاں دیکھنے والا کون تھا۔

میں اُسے گھسیٹ کر اندر لے گیا۔ محسن ہاتھ میں ریوالور لیے میرے پیچھے آیا۔ اکرام شیخ اپنی ٹیکسی کو اس کوارٹر کے سامنے سے ہٹا کے دور کھڑی کرنے کے لیے جانا چاہتا تھا مگر شاید اُسے خیال آگیا کہ اس میں مشغلے

کا ایک اہم گواہ موجود ہے۔"

اندر اچانک بھگدڑ مچ گئی تھی۔ میں نے ایک کمرے سے دو افراد کو نکل کر صحن کی طرف بھاگتے دیکھا۔

"دیکھو کوئی نکلنے نہ پائے۔" میں نے محسن کو خبردار کیا۔ محسن کمرے کے دروازے سے سیدھا نکل گیا۔ "خبردار! میں گولی مار دوں گا۔" محسن نے کہا۔ دونوں سامنے دیوار کے ساتھ منجمد ہو گئے۔

اکرام شیخ نے ادھر اُدھر دیکھا اور سوئچ بورڈ کا بٹن ہاتھ بڑھا کے لائٹ آن کر دی۔ میں نے مطیع الرحمن کو دھکا دے کر دیوار کی طرف پھینکا۔ اُس کا سر دیوار سے یوں ٹکرایا کہ ناک سے خون بہنے لگا۔ وہ چکرا کے وہیں بیٹھ گیا۔

محسن ان دونوں کو اندر اسی کمرے میں لے آیا۔

"اور کون ہے ادھر؟" میں نے شیخ سے کہا۔ "جو بھی ملے اُسے یہاں لاؤ۔ ذرا بھی گڑبڑ کرے تو اُسے گولی مار دو۔"

محسن نے فرار کی کوشش میں ناکام ہونے والے دونوں بنگالیوں کو دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کر دیا اور اُن کی تلاشی لی۔ وہ مجرم نہ ہوتے تو ہماری اس کارروائی پر مشتعل ضرور ہوتے لیکن اُن کی تو حالت ہی اتنی غیر ہو رہی تھی کہ اُن سے اعتراف جرم کرانا بے مقصد تھا۔

شیخ دو خشک چھوارے جیسے مریل جوان لڑکوں کو گردن سے پکڑ کے لایا۔ "یہ دونوں چارپائی کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ تیسرے کمرے میں عورتیں اور بچے سو رہے ہیں۔"

"سونے دو انھیں۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ ہم سے تعاون کرتے رہے تو اُن کی نیند خراب نہیں ہوگی ورنہ۔" میں نے تھوڑا سا توقف کر کے کہا۔ "ورنہ انھیں ہم سلائیں گے۔"

"تم کون لوگ ہو؟" مطیع الرحمن اب ہمت کر کے کھڑا ہو گیا۔ "جانتا نہیں ہم گورنمنٹ کا افسر ہے؟"

"ہم تو سب کچھ جانتے ہیں تمھارے بارے میں اور جو نہیں جانتے وہ معلوم کر لیں گے مگر تم ہمیں نہیں جانتے۔" میں نے کہا۔

"تم اندر آیا۔ وارنٹ کا بغیر۔ آرڈر دکھاؤ ہم کو۔" مطیع الرحمن نے کہا۔ "شریف لوگ کے گھر میں گھستا ہے رات کو۔"

میں نے اُس کے ایک جھانپڑ مارا۔ وہ نیچے گر گیا۔

"یہ رہا آرڈر، وارنٹ یہ ہے۔" میں نے ریوالور دکھا کے کہا۔ "اس میں جہنم کے چھ پاسپورٹ ہیں۔ تم سب شریف آدمی اتنی رات کو اکٹھے ہو کے کیا کر رہے تھے اور جب ہم نے دستک دی تو اس کمرے کی لائٹ کیوں آف کر دی گئی تھی یہاں دونوں نے بھاگنے کی کوشش کیوں کی تھی؟"

شیخ نے کہا۔ "ان کو وہیں لے چلو، جہاں سب ثبوت ہیں۔ ان کے تمام جرائم کی خبر دینے کیلئے بڑی پارٹی ہے۔"

"اچھا! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "تم ان میں سے ایک کو اندر لاؤ۔ لیکن پہلے ان کے خلاف وعدہ معاف گواہ کو تو لے آؤ۔"

وہ سب بزدل اور کم ہمت لوگ تھے۔ اُن میں سے دو تو ایسے کانپ رہے تھے جیسے سچ مچ انھیں جاڑا بخار چڑھنے والا ہو۔ یہ وہی دو نوجوان تھے۔ جو چارپائی کے نیچے چھپ گئے تھے باقی دو جو فرار نہ ہو سکے تھے، مجرم بنے خاموش کھڑے تھے۔ اُن کے لیے انکار کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ جو کچھ ہوا اچانک ہوا اور ایسے وقت میں ہوا تھا کہ وہ سب ایک ہی جگہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ انھیں اندازہ تو ہو گا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے مگر ہر مجرم جب تک پکڑا نہ جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا اور خوش قسمتی سے اپنی اُمیدیں وابستہ رکھتا ہے۔

شیخ اور محسن نے مجنی کو ایک گٹھڑی کی صورت میں سب کے درمیان رکھ دیا۔ اس وقت میں مجنی کی طرف نہیں، ایک سیدھی صف میں کھڑے ہوئے غداروں کی صورتیں دیکھ رہا تھا۔ مطیع الرحمن کی صورت پر صدمے کا رد عمل اتنا شدید تھا کہ مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ یقیناً اس مجنی کو جانتا تھا۔ باقی چاروں کے چہرے سپاٹ رہے اور انھوں نے مطیع الرحمن کی طرف دیکھا بھی تو نگاہوں سے یہی سوال کیا کہ "یہ کون ہے؟"

ایک چارپائی کی رسی کھول کے محسن نے چاروں ملزموں کے ہاتھ ان کی کمر کے پیچھے باندھ دیے۔ ان میں سے ایک چھوٹے بچے جیسے رونے اور معافی مانگنے لگا۔ "ہم سے غلطی ہو ا۔"

"چپ۔ غلطی کا بچہ۔" محسن نے اس کے سر پر تھپڑ مار کے کہا۔ "غلطی کر کے روتا ہے۔ ابھی تو سزا باقی ہے۔" اس نے سب کو دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔ اور ان پر واضح کر دیا کہ جس کے حلق سے مرضی کے خلاف ذرا بھی آواز نکلی اُسے وہ مرغا بنا دے گا اور پھر اُسے انڈے دینے پڑ

w w w p a k s o c i e t y c o m

مجبور کرے گا۔

مطیع الرحمٰن کو میں گردن سے پکڑ کے دھکیلتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں وہ سب ہمارے آنے سے پہلے جمع تھے۔ اس نسبتاً وسیع ہال جیسے کمرے کی ایک دیوار پر شیخ مجیب الرحمٰن کی بہت بڑی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ دوسری تصویر بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی تھی۔ مقابل کی دیوار پر ایک فریم میں مجیب کے چند نکات لکھے ہوئے تھے۔ میں بنگالی زبان سے ناواقف تھا مگر میں نے اندازہ کر لیا کہ چھ مختصر پیراگراف جن پر نمبر لگے تھے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔

"یہ شیخ مجیب کے چھ نکات ہیں؟" میں نے تصدیق کے لیے مطیع الرحمٰن سے پوچھا۔ اس نے بولے بنا اثبات میں سر ہلایا۔

"اس کے ساتھ والے دوسرے فریم میں کیا ہے؟"

"بنگلہ دیش کا قومی گیت۔"

میں نے پلٹ کے اس کے منہ پر اتنی قوت سے الٹا ہاتھ مارا کہ وہ گھوم کے دیوار سے جا لگا۔

"میرے سامنے یہ لفظ پھر استعمال مت کرنا۔ ابھی تک وہ مشرقی پاکستان ہے۔" میں نے کہا۔ "ساری دنیا کے لیے۔ اب بتاؤ یہ کیا ہے؟"

"ٹیگور کا گیت۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

اب میں نے کمرے میں پھیلی ہوئی دوسری چیزوں کا جائزہ لیا۔ ایک سادہ قسم کے ریک میں مختلف کتابچے رکھے تھے۔ میں نے ایک کتابچہ اٹھایا: "مجیب کے چھ نکات — حقیقت کے آئینے میں۔" یہی کتابچہ انگلش میں بھی موجود تھا۔ لکڑی کے تختوں کے شیلف میں جو کتابچے، پمفلٹ اور پوسٹر بھرے ہوئے تھے، وہ ابھرے شائع ہو کے آئے تھے۔ "دو قومی نظریہ — ایک سراب — پاکستان ایک غیر فطری ریاست — استحصال کی کہانی — بنگالی کیوں غریب ہے؟ — ہم کماتے ہیں تم اڑاتے ہو — بڑے صوبے میں کچھ نہیں — اقلیتی صوبہ حاکم ہے — کیا ہم اب بھی غلام ہیں؟ — بنگلہ دیش ہماری منزل —" یہ چند عنوانات تھے۔

"یہ زہر پھیلا رہے ہو تم یہاں؟" میں نے کہا۔

"جسے تم زہر کہتے ہو، وہی ہمارے لیے آب حیات ہے۔" اس نے رواں انگریزی میں کہا۔ میں اس کی بے خوفی پر حیران رہ گیا۔ یکلخت وہ پر اعتماد اور نڈر ہو گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اب وہ انجام سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ جب تک پکڑے جانے کا ڈر تھا، وہ چھپ چھپ کے ہر کام کرتا رہا اور اپنے جرائم کی پردہ پوشی میں مصروف رہا مگر اب وہ ہر شریک جرم کے ساتھ، ثبوت اور شہادتوں کے ساتھ عین ارتکاب جرم کی حالت میں پکڑا گیا تھا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب سزا ناگزیر ہے۔ اس احساس نے اسے بولنے کی جرأت عطا کی۔ پکڑے جانے اور سزا پانے کی صورت میں اس کے ہم خیال طبقے میں وہ بنتا، قوم پرست مظلوم اور بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے لیے استعمار پسندوں کے ہاتھوں مصائب جھیلنے والا مجاہد بن جاتا تھا۔

"یہ آب حیات کہاں سے آتا ہے؟" میں نے طنز کرتے ہوئے سارے کتابچوں کو نیچے گرا کر استفسار کیا۔

"بنگلہ دیش سے۔ اب تم میری زبان کاٹے بغیر مجھے اس مقدس نام کے استعمال سے نہیں روک سکتے ..." وہ بولا۔

"زبان کاٹنے کا وقت تو بعد میں آئے گا۔ پہلے زبان کھلوانے کا مرحلہ آئے گا۔"

"تم مجھ سے کچھ نہیں معلوم کر سکو گے۔" وہ بولا۔ "تم سمجھے ہو کہ میں اپنے ہی ساتھیوں سے غداری کروں گا؟ ان کے نام اور پتے تمھیں بتاؤں گا؟" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

میں نے سارے کتابچے فرش پر گرا دیے۔ "میرا خیال ہے کہ تم زیادہ مزاحمت نہیں کر سکو گے اور اس کے علاوہ تمھارے دوسرے شریک جرم بھی تو ہیں، کیا وہ سب اتنے ہی بہادر ہیں؟ لیکن پہلے ہم انھیں کیوں نہ دیکھ لیں... محسن!" میں نے آواز دے کر کہا۔

محسن دروازے میں نمودار ہوا۔ "یس باس!"

"دیکھو دوسرے کمرے میں جہاں عورتیں موجود ہیں، وہاں کتنے بچے اور کتنی عورتیں ہیں؟"

"دو عورتیں ہیں، ایک بوڑھی اور ایک جوان، تین بچے ہیں!" محسن نے کہا۔

"سو رہے ہیں سب؟"

"عورتیں جاگ اٹھی ہیں۔ میں نے ان کو خاموش رہنے کو کہا ہے اور سمجھا دیا ہے کہ انھوں نے تعاون کیا تو کچھ نہیں ہوگا۔"

"ان دونوں کو یہاں لے آؤ۔" میں نے کہا۔ "پہلے

ان کے ہاتھ پیچھے باندھ دینا۔ آنچل کے ازار بند سے۔ اور منہ بند کر دینا، انھی کے کپڑوں سے۔"

"تم... عورتوں کے ساتھ... ایسا سلوک کرو گے؟" وہ مشتعل ہو کے چلانے لگا۔ "اتنا گر گیا ہے تمھارا اخلاق؟"

میں نے اس کو بڑی بے رحمی سے مارا۔ مسلسل لاتوں اور مکوں سے۔ میں نے اس کو ادھ موا کر دیا۔ میں نے کئی بار اسے اٹھا اٹھا کے دیوار پر پھینکا اور فرش پر پٹخا۔

"وہاں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے کارکن اور غنڈے ہر روز سیکڑوں عورتوں کی عزت سے کھیل رہے ہیں کیونکہ وہ پاکستان اور دو قومی نظریے کے حامی ہیں۔ وہ مجرم یا باغی نہیں ہیں، محب وطن ہیں جن کے لہو سے تم سرخرو ہو رہے ہو۔ تم ہندوؤں کے زر خرید کتے، اپنے بھائیوں کی لاشوں کے تاجر، تم مجھے اخلاق سکھا رہے ہو... جو کچھ دوسروں کے ساتھ کرتے آئے ہو، دیکھو کہ اب وہی تمھارے ساتھ ہوگا۔ تم خود یہ عذاب جھیل کے دیکھو۔"

محسن دونوں بڑبڑاتی کپکپاتی عورتوں کو دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔

"اب تم بتاؤ گے یا میں ان سے پوچھوں؟" میں نے کہا۔ "کس کے ایجنٹ ہو تم؟ اور یہ لٹریچر کہاں سے آتا ہے؟"

"نہیں... کچھ معلوم نہیں۔" وہ بولا۔

"پہلے سب یہی کہتے ہیں۔" میں نے سر ہلایا۔ "ہمارے تفتیشی مرکز میں بہت کچھ ہے۔ تربیت یافتہ کتے ہیں، چوہے ہیں، جن کے دانت بہت تیز ہوتے ہیں اور جو ہمیشہ بھوکے رہتے ہیں۔ آٹھ دس چوہوں کو ہم کسی مرد یا عورت کے ساتھ شیشے کے باکس میں ڈال دیتے ہیں تو وہ منظر بڑا دلچسپ ہوتا ہے جب آدم خور چوہے اپنی بھوک مٹاتے ہیں اور آدھے گھنٹے میں جیتے جاگتے آدمی کی جگہ ہڈیوں کا پنجر رہ جاتا ہے۔ ان سے لڑنا اور ان کے دانتوں سے خود کو بچانا ناممکن ہوتا ہے۔ کوئی کتنا بھی چیخے چلائے باہر اس کی آواز بالکل سنائی نہیں دیتی لیکن اس کی جدوجہد آخری سانس تک صاف نظر آتی ہے۔"

بوڑھی عورت ایک دم بے جان ہو کے فرش پر گری اور ساکت ہو گئی۔ دہشت سے اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔

"تربیت یافتہ کتے صرف مجرم عورتوں پر چھوڑے جاتے ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں، اس کی کچھ تفصیلیں بھی بتا دی ہیں ہم نے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہاں ہم خالی ہاتھ آ گئے تھے۔ تفتیش سے کچھ معلوم نہ ہوا تو ہم وقت ضائع نہیں کریں گے۔ جاتے وقت ہم عورتوں کو لے جائیں گے۔ باقی سب کی لاشیں اسی تخریبی کار لٹریچر کی چتا پر آگ لگا کے چھوڑ جائیں گے۔"

"تم ہمیں مار سکتے ہو، ہمارے جذبے کو نہیں مار سکتے۔" مطیع الرحمٰن نے کہا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک جنونی شخص ہے۔ جنون عشق کا ہو، مذہب کا یا سیاست کا، انسان کو موت کے خوف سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور وہ جان دینے کو مقصد حیات سمجھنے لگتا ہے۔ اس سے کچھ معلوم ہونے کی امید نہیں تھی۔ میں نے دوسرے مجرموں کو بلانے کا فیصلہ کیا۔

پہلا مجرم قدرے ہمت والا تھا۔ اس نے کمرے کا نقشہ دیکھا اور سمجھ گیا کہ صورت حال کتنی سنگین ہو چکی ہے۔

"میں تم سے تین سوال کروں گا۔" میں نے کہا۔ "اور ہر سوال پر غور کرنے کے لیے تم کو ایک منٹ دوں گا۔"

حیرت انگیز طور پر اس نے بھی رواں انگریزی میں کہا۔ "اور اس کے بعد؟ اگر میں نے جواب نہ دیا تو؟"

"تم سزائے موت پانے والے پہلے غدار ہو گے۔" میں نے کہا۔

"نہیں... اور ہم سب شہید ہوں گے۔" مطیع الرحمٰن نے کہا۔

"پہلا سوال... یہ سب لٹریچر کہاں سے آتا ہے؟" میں نے کہا۔

دوسرا مجرم چپ کھڑا رہا۔ دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی سوئی آگے بڑھتی رہی۔ ایک منٹ پورا ہو گیا۔ مطیع الرحمٰن کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"دوسرا سوال... تم سب لوگ کن کن سرکاری محکموں کے نام سے کس قسم کی دستاویزات چراتے ہو؟"

ایک بار پھر سب کی نظر کلاک پر گئی۔ ایک گمبھیر سناٹے میں سیکنڈ کی سوئی کے چلنے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی رہی۔ وہ دوسرا منٹ زیادہ اعصاب شکن سکوت میں ختم ہوا۔ مطیع الرحمٰن کی مسکراہٹ میں میرے لیے نفرت کا زہر اور تحقیر کا انداز شامل ہو گیا۔

"تیسرا سوال... وہ دستاویزات تم کسے ارسال کرتے رہے ہو؟ اس کا مکمل نام اور پتا۔"

www.paksociety.com

اب میں نے مجرم کے قریب جا کے بائیں ہاتھ کی کلائی کی ٹھوڑی پر نظر رکھتے ہوئے دایاں ہاتھ ایک ضرب کاری کے لیے اٹھایا۔ اس نے مجرم کو دہشت زدہ کیا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ اسے گولی ماری جائے گی اور وہ پرامید تھا کہ ہم ایسی غلطی نہیں کریں گے۔ فائر کی آواز تو سارے سونے والوں کو جگا دے گی۔

سیکنڈ کی سوئی ابھی گیارہ کے ہندسے کو کراس کر کے آگے بڑھی ہی تھی کہ میرا ہاتھ حرکت میں آ گیا۔ اس بچارے کے ساتھ ایسی ہلاکت خیزی کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جب اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹی تو یہ عجیب آواز خستہ ڈال کی طرح سب نے سنی۔ وہ کھڑے کھڑے گرا۔ سیدھا الٹے آنا کچوں پر جو فرش پر ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ عورت مچل اور اس نے محسن کی گرفت سے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مجھے اس کی دہشت زدہ آنکھوں میں التجا نظر آئی۔ مطیع الرحمٰن بے یقینی سے اس شخص کو دیکھتا رہا جو ٹھیک تین منٹ پورے ہوتے ہی مر گیا تھا۔ اسے ایک سیکنڈ کی مہلت نہیں ملی تھی۔ گرنے کے بعد اس کا جسم پھانسی پانے والے کی طرح تڑپتا رہا تھا اور نزع کے کرب میں اینٹھتا بل کھاتا رہا تھا۔ محسن نے بہت حاضر دماغی کا ثبوت دیا اور دوسرے مجرم کو سنبھال لیا تاکہ وہ بھی ایک مجرم کو مرتا ہوا دیکھ سکے۔ میں نے اس وقفے میں عورت کو ہٹتے دیکھا۔

"میں نے اس سے تین سوال پوچھے تھے۔" میں نے کہا۔ "اور ہر سوال کے بعد ایک منٹ سوچنے کے لیے دیا تھا۔"

"ہم کچھ نہیں جانتا۔ ہم اللہ پاک، رسول کا قسم کھاتا ہے۔" وہ چلانے لگا۔ "ہم کو معاف کر دو۔"

محسن نے اس کا منہ دبا لیا۔ میں نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تم تین منٹ کی مہلت بھی نہیں چاہتے۔ تمہاری مرضی۔"

ایک اور گردن کی ہڈی چٹخنے کی آواز کے ساتھ ہی وہ نیم جوان عورت بھی بے ہوش ہو کے گر گئی جس کو محسن نے ایک ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔ پہلے میرے دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھا جو اب میں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ مطیع الرحمٰن اب مجھے خالی ہاتھ دیکھ کے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے میرے جیسے سرد خون والے ٹھنڈے مزاج والے اور حقیقی پیشہ ور قاتل پہلے نہیں دیکھے ہوں گے۔ اب وہ بھی نروس ہو چکا تھا۔ اس کی مٹھیاں سختی سے بند تھیں اور دانت یوں دبے ہوئے تھے کہ جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔

تیسرا ملزم اندر آتے ہی پاگلوں کی طرح ہاتھ پیر چلانے لگا۔ اس نے ایک لاش کو سرد ہوتے اور دوسری لاش کو پھڑکتے دیکھا۔ وہ دونوں ایڑیاں رگڑتے ہوئے بہت کراہتے اور بےبسی سے فرش پر پھیلاتے اور پچھاڑتے رہے تھے۔

اس نے میرے ایک سوال کا ہی جواب دیا یعنی مجھے یہ بتایا کہ ان چاروں کا تعلق کس کس محکمے سے تھا اور وہ کس قسم کی ٹاپ سیکرٹ انفارمیشن اکٹھی کر کے لاتے تھے۔ باقی دو سوالوں کا جواب اسے نہیں معلوم تھا۔ مطیع الرحمٰن نے اسے بنگالی میں کچھ کہا جو میں نے انداز سے سمجھا۔ وہ اپنے ساتھی کو بزدلی اور غداری پر شرمسار کر رہا تھا لیکن موت کو سامنے دیکھ کر تیسرے مجرم کا سارا جذبہ جہاد ہوا ہو گیا تھا اور اس کی دھوتی کو گیلا کر گیا تھا۔ چند منٹ بعد وہ بھی کیفر کردار کو پہنچا۔ مطیع الرحمٰن کی کیفیت کسی پاگل کتے جیسی ہو گئی۔ وہ مجھ پر دیوانہ وار حملہ آور ہوا۔ میں نے پہلے اس سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے اس کی کلائی کو گرفت میں لے لیا اور اس کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ وہ درد کی شدت سے دہرا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے دوسرا گھٹنا مارا تو اس کی جیسے سانس رک گئی اور اس نے پورا منہ کھول دیا۔ جب میں نے اس کے ہاتھ کو مروڑا تو وہ خود ہی گھوم کر میرے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ کو کمر سے لگا کے میں نے اسے آگے دھکیلا اور دیوار سے لگا دیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ کو پکڑ کے میں نے گھٹنا کمر پر رکھا اور دبایا تو اس نے کراہنا شروع کیا۔ اس کی سانس رکنے لگی۔

"تم نے میرے تین سوال کتنی بار سنے ہیں؟ اب تو یقیناً تمہیں ازبر ہو گئے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "تم تینوں ان کا جواب نہ دے سکے۔ کیا تم۔۔۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر۔" وہ چلایا۔ "مجھے مار ڈالو مگر میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"ان سب کی موت آسان تھی۔ گردن ٹوٹتے ہی دماغ کا جسم سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ بے شک جسم تھوڑی دیر تڑپتا ہے مگر درد و کرب کے احساس کا تعلق دماغ سے ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہاری موت بہت پرعذاب ہوگی۔"

"تم جو چاہو کر لو۔"

"او کے مسٹر مطیع الرحمٰن۔" میں نے اس کے سیدھے ہاتھ کی ایک انگلی کو اپنی دو انگلیوں میں پھنسا کے دبایا۔

انگلی ایک جھٹکے کے پاس سے ایسے ٹوٹ گئی جیسے پنسل ٹوٹتی ہے۔ وہ بلبلایا مگر میں نے اس کا منہ دبا لیا۔ وہ کچھ دیر اس ہاتھ کو جھٹکتا رہا اور میرے گھٹنے کے دباؤ اور دیوار کے درمیان بل کھاتا رہا۔

پھر میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا کے کہا "تم چیخنا چاہو تو چیخ سکتے ہو۔ کسی کو مدد کے لیے بلانا چاہو تو میری طرف سے اجازت ہے لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ سونے والے تمہاری پکار سن بھی لیں گے تو نکلیں گے نہیں اور نکلے تو ہم انہیں لوٹا دیں گے یہ بتا کے کہ شیخ الرحمٰن گر گئے یا اپینڈکس کے درد سے تڑپ رہا ہے۔ اب پھر وہی سوال کہ تم کچھ بتاؤ گے۔۔۔ یا۔۔۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دوسری انگلی بھی توڑ دی۔ ہر بار میں نے اسے دو منٹ کا وقفہ دیا۔ ایک ایک کر کے دس منٹ میں اس کی پانچ انگلیاں ایسے لٹکنے لگیں جیسے ان کے درمیان میں ہڈی ہی نہیں ہے۔

وہ اب چلا رہا تھا اور تڑپ رہا تھا۔ میں نے اس کا منہ دیوار سے لگا دیا تھا اس طرح کہ وہ چہرہ [illegible] کرتا تھا تو اس کے ہونٹ اور ناک دیوار پر رگڑ کھاتے تھے۔ میرے لیے اس کو سنبھالنا مشکل ہوتا جا رہا تھا چنانچہ میں نے محسن سے کہا کہ وہ آخری آدمی کو لے آئے اور اس رسی سے مطیع الرحمٰن کو باندھ دے جس سے پہلے چار افراد باندھے گئے تھے۔

"اس بیٹی کو اور اکرام شیخ کو بھی یہیں بلا لوں؟"

"ہاں۔ انہیں دوسرے کمرے میں رکھنا اب بے مقصد ہے۔" میں نے کہا۔

بیٹی نے اندر آتے ہی پانچ لاشیں دیکھیں۔ ان دو عورتوں کو بھی وہ مردہ ہی سمجھا جو درحقیقت بے ہوش تھیں۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اکرام شیخ نے اسے ایک کونے میں بٹھا دیا۔ مجیب تھا بنگالی جو اب رسی سے بندھا ہوا اس بکرے کی طرح ممیا رہا تھا جسے قصائی چھری پھیرنے کے لیے جا رہا ہو۔ اس منظر کو دیکھتے ہی خوف سے مفلوج ہو گیا۔ وہ کچھ دیر جھومتا رہا اور پھر منہ کے بل گر گیا۔

لیکن یہ اس کی مکاری تھی۔ محسن نے اس کے جلتی ہوئی سگریٹ لگائی تو وہ جھلا کے تڑپا۔ محسن نے اسے سیدھا بٹھا دیا۔

اب مطیع سمیت دونوں محسن کے ریوالور کی زد میں تھے۔ اکرام شیخ نے میری ہدایات کے مطابق مطیع الرحمٰن کو باندھ دیا۔

میں نے پھر مطیع الرحمٰن کی قوت برداشت اور مزاحمت آزمانے کا تماشا شروع کر دیا۔ وہ ایک سخت اور حیرت انگیز حوصلہ رکھنے والا شخص تھا۔ میں نے اس کے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں بھی توڑ دیں۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا لیکن آخری ملزم سچ مچ بے ہوش ہو گیا۔

میرے کہنے پر محسن نے بیٹی کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا اور پھر بولا "یہ۔۔۔ بہت ظلم ہے۔"

"ہاں ہم جانتے ہیں کہ یہ ظلم ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم ظلم کے جواب میں ظلم کر رہے ہیں اور ظالموں کو ان کی سزا دے رہے ہیں۔"

"سزا دیتے ہوئے بھی انسان کو رحم دل ہونا چاہیے۔ مارنا ہے تو فوراً مار دو۔"

محسن نے اس کے بال پکڑ کے سر کو پیچھے دیوار سے ٹکرایا۔ "مسٹر رحم دل، تم مشرقی پاکستان جا کے دیکھو۔ کس طرح ان علیحدگی پسندوں کے بھوکے بھیڑیے سرعام ہوس کا ننگا کھیل کھیلتے انسانیت سوز طریقے پر کھیلتے ہیں۔ تم نے دہشت و بربریت کا ذکر تاریخ میں چنگیز خان اور ہلاکو سے منسوب کر کے پڑھا ہے۔ خون ریزی کی ان پرتشدد فلموں میں دیکھا ہے۔ مگر مشرقی پاکستان جا کے دیکھو۔ وہاں عورتوں کو کیسے حیا سوز طریقے پر سربازار اذیت دے دے کر ہلاک کیا جاتا ہے۔ بچوں کے ٹکڑے کس طرح [illegible] کے نیزوں پر نظر آتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن اس کا جواب۔۔۔"

"ہمارے مذہب اور تمہاری تعلیمات میں فرق ہے۔ تم کہتے ضرور ہو کہ کوئی ایک گال پر طمانچہ مارے تو اپنا دوسرا پیش کر دو لیکن عملاً ایسا نہیں کر پاتے۔ یہ گاندھی کے اہنسا کے فلسفے کے خاصا قریب ہے۔ مگر کیا ہندو بھی باپو کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں؟ تقسیم کے وقت وہ باپو کو بھول گئے تھے اور خون کی ہولی کھیلنے میں مصروف تھے۔ ہم مسلمان منافق نہیں ہیں اور نہ ہماری تعلیمات میں منافقت ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ قصاص کیا ہے۔ خون کا بدلہ خون، آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان۔ جو کچھ میں کر رہا ہوں یہ عین انصاف ہے اور میں اس لیے کر رہا ہوں کہ

انصاف کے ہاتھ ان کی گردن تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان ہاتھوں کو نظامِ انصاف کے پیچ در پیچ مرحلے اور قانونی موشگافیاں روک لیتی ہیں۔"

محسن کی کوشش سے چوتھا ملزم ابھی ہوش میں آگیا مگر وہ دیوانہ ہونے کے قریب تھا۔ وہ ان میں سب سے کمزور دل کا مالک تھا۔ باقی سب کے لیے سزائے موت تو پہلے سے طے تھی لیکن وہ پہلے آجاتا تو اُس سے اعترافِ جرم اور اپنے تاریک اعمال کے سارے گناہوں کی روداد سنتے اور مرنے سے پہلے اس اذیت سے بھی گزرتے کہ غداروں کے ساتھ بھی کسی نے غداری کی۔

چوتھا ملزم رو رہا تھا اور کانپ رہا تھا اور وعدہ معاف گواہ کے طور پر سب کچھ بتا دینے کی پیش کش کر رہا تھا مگر میں مطیع الرحمٰن کا غرور توڑنا بھی ضروری سمجھتا تھا۔ جسمانی اذیت اس کی ضد کو شکست نہیں دے سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے دوسرا حربہ آزمانے کا فیصلہ کیا۔

"محسن! ان عورتوں کو ہوش میں لانے کا بندوبست کرو۔" میں نے کہا۔ "ابھی کافی وقت ہے۔"

"دو بجنے والے ہیں۔" محسن بولا۔ "زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے ہیں ہمیں سب کام نمٹا کے واپس جانا ہے۔"

"فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "یہاں اب صرف آدھے پون گھنٹے کی مصروفیت ہے۔ جب یہ عورتیں ہوش میں آجائیں تو ان سے کہنا کہ چائے وغیرہ بنائیں۔ ان کو یہیں بلانا۔ بہتر ہوگا کہ ان کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ تاکہ یہ ہوش میں آئیں تو میدانِ کارزار نہ دیکھیں۔ میں اتنی دیر میں مسٹر ہیچی سے بات کرتا ہوں۔"

محسن دونوں عورتوں کو واپس اسی کے کمرے میں لے گیا۔

میں نے ہیچی سے کہا۔ "اب تم بتاؤ۔"

"میں سب کچھ بتا دوں گا کیونکہ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں سوائے مالی نقصان کے۔" وہ بولا۔ "میں نہ تمہارا دشمن ہوں اور نہ ان کا دوست۔ میں صرف پیسے کے لیے کام کرتا ہوں۔"

"یہ لوگ کس کام کا معاوضہ دیتے تھے؟"

"دستاویزات لے جانے کا۔ تم نے دیکھا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کی کیا اہمیت تھی اور اس لفافے میں کیا تھا۔" وہ بولا۔ "وہ سربمہر لفافہ تھا اس لیے میں صرف اندازہ کر سکتا تھا کہ اس میں کاغذات ہیں۔"

"کب سے کر رہے ہو یہ کام؟" ہیچی نے سگریٹ جلا کے ایک کش لیا اور ایک اسٹول پر ٹک گیا۔

"یہ دوسرا پھیرا تھا۔" وہ بولا۔

"پہلی بار بھی دستاویزات لے گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، شاید اس میں کچھ تصویریں بھی تھیں۔" وہ بولا۔

"اور اس کام کا معاوضہ کیا ملا تھا؟" میں نے کہا۔

"ایک ہزار ڈالر۔" اُس نے کہا۔

"کس نے ادا کیا تھا۔ ائیر شپ کے کپتان نے؟"

ہیچی نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ صرف رسید دیتا تھا اور کوئی لفافہ جو میں ان کو دے دیتا تھا۔"

"وہ لفافہ کہاں ہے جو تمہیں آج ملا ہے؟" میں نے ہاتھ بڑھا کے چٹکی سے اشارہ کیا۔

اس نے کوٹ کے اندر سے سفید لفافہ نکالا اور مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اُسے کھول کے دیکھا۔ اس کے اندر ایک ہزار ڈالر تھے۔ میں نے رقم نکالے بغیر لفافہ قریب رکھ لیا۔

"کیا تم واقعی نہیں جانتے کہ اس میں کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "جانتا تو بتا دیتا۔ میں نے تو لفافہ بھی تمہیں دے دیا ہے۔"

"یہ لفافہ تم کسے واپس لا کے دیتے تھے اور کہاں؟"

"یہاں۔ اِس کو۔" ہیچی نے مطیع الرحمٰن کی طرف اشارہ کیا۔

مطیع الرحمٰن اُسے گالیاں دینے لگا۔ "تم بے غیرت کتے۔ نمک حرام۔"

"لفافہ دینے کے بعد کیا ہوتا تھا؟" میں نے کہا۔

"مجھے اس کمرے میں بٹھا دیا جاتا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد رقم مل جاتی تھی۔" وہ بولا۔

"تم کسی فوٹو اسٹیٹ شاپ سے واقف ہو؟"

اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "لفافہ مجھے وہیں تیار ملتا تھا۔ اس کو یہ شخص چلاتا تھا۔" اُس نے پہلے ملزم کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاں پان کی ایک دکان بھی تھی؟" میں نے کہا۔ "سگریٹ شاپ؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

"تمہیں کچھ معلوم ہے کہ یہ سب کہاں سے آتا تھا؟"

میں نے کہا۔

اُس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ "یہ لوگ بنگالی میں بات کرتے تھے اور میں بنگالی نہیں سمجھتا۔"

"پہلی بار تمہارا ان سے کیسے رابطہ ہوا تھا؟"

"میں قلاش ہو چکا تھا۔" وہ بولا۔ "مجھے صرف ایک کام آتا ہے۔ میں ایک اچھا اسمگلر ہوں۔ ایک گروپ میں بھی رہا ہوں۔ سیٹانز ڈسپل SATAN'S DISCIPLE۔ شیطان کے چیلے۔ یہی نام تھا اس گروپ کا۔"

میں نے طنز سے کہا۔ "سب شیطانی کام ہی کرتے ہوں گے۔"

"ہم نے میامی اور ٹیکساس میں کامیاب شو کیے۔ یہ دو لڑکیوں اور چار لڑکوں کا گروپ تھا۔ ہم ایک کامن فیملی تھے۔"

"سب کے شوہر سب۔ سب کی بیویاں مشترک۔ بچے کس کے کہلائے جاتے تھے؟"

"ہمارے بچے نہیں تھے۔ ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ ہوتے تو ہم مار ڈالتے۔ میں بھی ایک سنگر تھا۔ یہاں میں نے گٹار کے ساتھ گانے گائے اور بہت پیسہ اکٹھا کیا۔ تمہاری قوم کے افراد بہت زیادہ رحمدل ہیں، فراخ دل یا بے وقوف۔"

"سب کچھ ہیں لیکن بے غیرت اور بے ضمیر نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہاری شناختی دستاویزات کہاں ہیں؟"

اُس نے بیک پاکٹ میں سے ایک پلاسٹک میں لپٹا ہوا بکلٹ سا نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ اس پاسپورٹ کا پورا نام، پتا اور اس کے بارے میں تفصیلی معلومات درج تھیں۔

"میرا خیال ہے کہ اب یقیناً ان کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟ ان کے بغیر میں واپس کیسے جاؤں گا؟"

"سب کو ایک دن جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور وہاں کے لیے پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ درکار نہیں ہوتا۔"

"کیا۔۔۔ تم مجھے۔۔۔ لیکن میں نے تم سے پورا تعاون کیا اور میں۔۔۔ دشمن بھی نہیں تمہارا۔۔۔" وہ چلانے لگا۔

"دشمنی تو کی تم نے۔"

"وہ مجبوری تھی میری۔"

"میں بھی مجبور ہوں۔" میں نے اس کے پاسپورٹ کے ٹکڑے کرتے ہوئے کہا۔ "میرے دشمنوں کا ساتھ دینے والے بہرحال میرے دشمن ہیں تاہم میں تم کو وہ رعایت دوں گا جو تم ان کے لیے بانٹ رہے تھے۔ میں تمہاری موت کو بہت آسان بنا دوں گا اور تمہیں آخری دعا کے لیے موقع بھی دوں گا۔۔۔ ایک منٹ۔"

"تم۔۔۔ یہ نہیں کر سکتے۔۔۔ میرے ساتھ۔۔۔ میں تم کو قتل کر دوں گا۔ یو باسٹرڈ۔" وہ ایک دم اُٹھ کے مجھ پر حملہ آور ہوا۔

میں یہی چاہتا تھا۔ جیسے ہی وہ میرے قریب آیا میں نے اس کے ایک بھرپور ہاتھ رسید کیا۔ اُس نے ایک جھٹکا لیا۔ اُس کے حلق سے ڈکرانے کی آواز نکلی اور اس کے ہاتھ اپنی گردن کی طرف بڑھے۔ میں نے دوسرا ہاتھ مارا تو وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح گر گیا۔

"مطیع الرحمٰن! تم نے ہمارے نظامِ انصاف کو دیکھا۔ اس میں کسی مجرم کے بچ نکلنے کا ایک فیصد امکان بھی نہیں۔ لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو گے گناہ گاروں کے اعمال کا خمیازہ انھیں بھی بھگتنا پڑ جاتا ہے جو عرفِ عام میں لواحقین کہلاتے ہیں۔۔۔ محسن!" میں نے آواز دے کر کہا۔

"دو منٹ باس۔" محسن نے کہا۔ "چائے تقریباً تیار ہے۔"

"اب میں وہ کروں گا جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن تم نے مجھے اس انتہا تک پہنچا دیا۔" میں نے مطیع الرحمٰن سے کہا۔ "اب ان دونوں عورتوں کے سامنے غالباً ایک تمہاری بیوی ہے اور دوسری اس کی ماں یا تمہاری ماں۔ ان کے سامنے باری باری تینوں بچے پہلے اندھے کیے جائیں گے گرم سلاخوں سے۔"

"نہیں۔" مطیع الرحمٰن چلایا۔ "کیا تم حیوان ہو گئے ہو؟"

"تم انسان بن کے انھیں بچا سکتے ہو۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "ورنہ میرے لیے جنگ میں سب جائز ہے۔ جب دشمن کہیں بم گراتا ہے تو کیا اس سے بچے ہلاک اور زخمی نہیں ہوتے، معذور نہیں ہوتے؟ یہاں تک کہ جو ماؤں کے پیٹ میں ہوں، انھیں بھی مرنا پڑتا ہے۔ امریکا کے ایٹم بم نے تو آنے والی نسلوں تک کو ذہنی جسمانی طور پر معذور اور بانجھ کر دیا تھا۔ چنانچہ دوسرے مرحلے میں ان کو آری سے چیر دیا جائے گا۔ آری ہم لائے ہیں۔ درمیان سے ان کے دو کر دیے جائیں گے ان کی ماؤں کے سامنے۔ اس کے بعد

www.paksociety.com

عورتوں کی باری آئے گی اور آدھے گھنٹے میں ہم سب لاشیں اس کوڑے پر ڈال کے آگ لگا دیں گے۔ پیٹرول بھی ہے ہمارے پاس۔ اس وقت کون آئے گا بچانے تمھیں بلائیں تو کسی کو بلانے سے پہلے ہی قتل ہو جاؤ گی اور جب تک آگ پھیل کر اس گھر کو اپنی لپیٹ میں لے گی اور فائر بریگیڈ پہنچے گا تب تک سب ختم ہو جائے گا۔ یہاں کچھ نہیں بچے گا۔ کوئی کسی کو بتانے والا نہیں ہو گا کہ یہ سب کیسے ہوا تھا۔"

میں مطیع الرحمٰن کے چہرے کی بدلتی ہوئی حالت دیکھ رہا تھا جب محسن جائزہ لے کر آیا تو مجھے اپنی کامیابی کا خاصا یقین ہو چلا تھا۔

"دونوں عورتوں کو لے آؤ اور سامنے لٹا دو۔ ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دو۔" میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ "اور سب سے چھوٹے بچے کو لے آؤ۔"

مطیع الرحمٰن دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ "تم کو خدا رسول کا واسطہ۔ ایسا ظلم مت کرو۔ مجھے اندھا کر دو، مجھے جیل..."

میں اطمینان سے چائے پیتا رہا۔ محسن دونوں عورتوں کو گھسیٹ کر وہاں لے آیا۔ وہ چلتی پھرتی لاشوں کی طرح تھیں۔

اکرام شیخ ایک چھ سات سال کے بچے کو اٹھا کر لایا۔ وہ نیند سے پوری طرح جاگا بھی نہیں تھا اور کچی نیند سے جگائے جانے پر رو رو کر ٹھنک رہا تھا۔ کمرے کے اندر آ کے بھی وہ معصومیت سے ہم سب کو دیکھتا رہا۔ اس کے نزدیک یہ کوئی دہشت زدہ کرنے والا منظر نہیں تھا۔ اس نے فرش پر پڑے ہوئے افراد کے بارے میں فرض کیا ہو گا کہ وہ سب سو رہے ہیں۔ وہ بے اختیار ماں کی طرف لپکا۔

اکرام شیخ نے اسے پکڑ لیا۔ جوان عورت بری طرح تڑپنے اور بل کھانے لگی۔ مطیع الرحمٰن اپنے ٹوٹی ہوئی انگلیوں والے ہاتھ جوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

"کچن میں کوئی سلاخ ہو تو بہتر ہے ورنہ کوئی نوکیلی چھری ضرور ہو گی۔ اسے چولہے پر خوب گرم کر لاؤ۔" میں نے کہا۔

مطیع الرحمٰن کی مزاحمت دم توڑ رہی تھی۔ اس نے مرنا بہت آسان جانا تھا۔ یہ موت سے شدید تر عذاب تھا جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ تاہم ابھی تک وہ فرض اور محبت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ایک طرف اس کا عہد اور مشن تھا۔ اس کے نظریات اور عقائد تھے جو قربانی مانگتے تھے۔ اس نے کسی جذباتی لمحے میں یقیناً جان و مال کی قربانی دینے سے دریغ نہ کرنے کے عزم کا اعلان کیا ہو گا اور آج تک شاید اس کے ایمان میں خلل نہ پڑا ہو گا لیکن اب ایک باپ اور ایک شوہر کے جذبات اس کو رسوا کن شکست دے رہے تھے۔ ایک ایسی شکست جس کے بعد وہ خودکشی بھی کر سکتا تھا کیونکہ وہ وقت آنے پر بزدل ثابت ہوا تھا۔

محسن ایک نوکیلی سلاخ کے ساتھ اندر آیا۔ اس سلاخ سے شاید ڈرین یا پائپ وغیرہ کھولے جاتے ہوں گے۔ سلاخ دہک کر لال تو نہیں ہوئی تھی مگر اس پر سے دہشت زدہ کر دینے والا دھواں اٹھ رہا تھا۔

"آخری موقع مطیع الرحمٰن!" میں نے کہا۔ "میں دس تک گنوں گا۔ اس کے بعد یہ معصوم بچہ تمھاری سیاست پر قربان ہو گا۔ اس کی ایک آنکھ بے نور ہو جائے گی۔ ایک منٹ کے بعد دوسری۔"

ابھی محسن آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک کے بعد دوسری عورت کا سب تڑپنا مچلنا ختم ہو گیا۔ مطیع الرحمٰن پاگلوں کی طرح بلبلانے لگا۔

"نہیں... نہیں بتاؤں گا... میں سب بتاؤں گا... اس کو چھوڑ دو۔" وہ سر کو ادھر ادھر پٹخنے لگا۔ محسن پیچھے ہٹ گیا۔

"بولو... کہاں سے آتا ہے یہ سب لٹریچر؟"

"کہیں سے نہیں۔ ہم خود چھاپتے ہیں۔" وہ بولا۔ "یہ دو آدمی رائٹر ہیں۔ ایک ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات کا پروفیسر ہے۔ سیوو چکرورتی۔ دوسرا کلکتہ سے آیا ہے۔ لاجپت رائے۔ یہ انگلش کے ایک مشہور اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ عوامی لیگ کے پبلسٹی سیل برائے مغربی پاکستان کا مشیر ہو گیا۔"

اس نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ ان دونوں ایجنٹوں کو کیسے ادائیگی ہوتی تھی۔ اس نے اپنے ایسے ہی اور دوسرے ساتھی کے بارے میں بتایا کہ وہ سیکشن افسر ہیں اور فوجی نقل و حرکت کے بارے میں اور اہم تنصیبات کے بارے میں فوجی ساز و سامان کی نوعیت کے بارے میں اور اہم شخصیات خصوصاً جنرلوں کے بارے میں مفصل معلومات آگے فراہم کرتے تھے۔ تمام سرکاری دفاتر میں ہم خیال لوگوں سے رابطہ رکھتے تھے اور انھیں یہ لٹریچر فراہم کرتے تھے۔ ان کی میٹنگز مختلف مقامات پر ہوتی تھیں جن میں سب سے عہد لیا جاتا تھا کہ وہ بنگلہ دیش بنانے کے لیے جان و مال

کی قربانی دیں گے اور جس دن ان کی جدوجہد کامیاب ہوئی وہ مغربی پاکستان کے آقاؤں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا کے نکل جائیں گے۔ اس نے ہندوستانی فوج کے بڑوں سے رابطے کا ذکر بھی کیا اور بھارتی خفیہ پولیس "را" کا بھی جو انھیں فنڈ اور اسلحہ فراہم کرتی تھی۔ تاہم وہ کسی کے نام سے واقف نہیں تھا۔

چوتھے ملزم کا بیان ہم نے الگ لیا اور اس سے تصدیق ہوئی کہ مطیع الرحمٰن نے غلط بیانی نہیں کی تھی اور اسے جو کچھ معلوم تھا وہ سب بتا دیا تھا۔ اس کا بھائی پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ وہ دونوں حساس نوعیت کے ایک ادارے میں ٹائپسٹ اور اسٹینو گرافر تھے چنانچہ ہر قسم کی رپورٹ جو انھیں ٹائپ کرنے کے لیے دی جاتی تھی، اس کی ایک اضافی کاپی بنا لیتے تھے۔

میں نے چوتھے ملزم کا قصہ بھی پاک کیا اور محسن سے کہا۔ "اب ہمیں جلد از جلد نکل جانا چاہیے۔ مطیع الرحمٰن کو باہر ٹیکسی میں ڈالو۔"

"اور ان عورتوں بچوں کو؟"

"انھیں جاتے وقت باہر نکال دیں گے۔" میں نے کہا۔ "شیخ سے کہو ٹیکسی قریب لے آئے۔ اس میں سے کچھ پٹرول نکالا جا سکتا ہے؟"

"کچن میں مٹی کا تیل خاصی مقدار میں موجود ہے۔" محسن نے کہا۔

"بس پھر پٹرول کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اسے لے جاؤ اور ڈکی میں ڈال دو۔"

محسن نے اپنا کام بہت خوبی سے کیا۔ میں نے اور شیخ نے اسی وقفے میں کچن سے مٹی کا تیل لا کے اس لٹریچر اور لاشوں پر ڈال دیا۔ دوسرے کمروں سے ہر آگ پکڑنے والی چیز ان کے اوپر ڈھیر کر دی جس میں بستر، فرنیچر، کپڑے وغیرہ شامل تھے۔ آخری وقت میں ہم نے دونوں عورتوں کو باہر سامنے والے کوارٹر کے برآمدے میں لٹا دیا۔ آدھی رات کے بعد ہر طرف اندھیرا اور سناٹا تھا چنانچہ ہماری اس کارروائی کا مشاہدہ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک بچہ پہلے سے جاگ رہا تھا۔ باقی دو کو ہم نے جھنجھوڑ کر جگایا تھا اور ان کو ڈانٹ کر کہا کہ وہ اپنی ماں کے پاس چپ کر کے بیٹھیں ورنہ ہم ان کے گلے کاٹ دیں گے کیونکہ ہم ڈاکو ہیں۔ دونوں بڑے بچے نسبتاً سمجھ دار تھے۔ انھوں نے چھوٹے والے کو بھی خاموش کر لیا۔

جب ہم اس تخریب کاری کے ایک اڈے کو اور اپنے دشمنوں کی لاشوں کو آگ دکھا کے فرار ہوئے تو ہماری ٹیکسی کے روانہ ہونے سے قبل ہی بچوں نے چیخنا شروع کر دیا تھا اور آگ کے شعلے کھڑکیوں سے باہر اور صحن کی طرف سے صاف نظر آنے لگے تھے۔ ہم نے ٹیکسی کی رفتار کو کم رکھا اور ایک بلاک کا چکر کاٹ کے پھر ہو کر گزرے تو گرد و نواح میں افراتفری پھیل چکی تھی۔ گھر کی چھت کے نیچے بھی پرانی لکڑی کے شہتیر تھے اور لکڑی کی چھت تھی جو اوپر سے کوئی چھت کی بدنمائی کو بھی چھپاتی تھی اور گرمی کے اثر کو بھی کم کرتی تھی۔ ہر چیز آگ پکڑ چکی تھی اور شعلے چھت سے اوپر تک بلند ہو چکے تھے۔ کراچی میں مغرب کی جانب سے مسلسل چلنے والی تیز ہوا اس آگ کو بھڑکا رہی تھی۔

مطیع الرحمٰن کو ہم نے کافی دور آ کے ڈکی سے نیم بے ہوشی کی حالت میں برآمد کیا۔ محسن نے اسے پچھلی سیٹ پر ڈالا تو وہ شکستہ انگلیوں والے ہاتھ کی اذیت سے بے حال تھا اور بری طرح کراہ رہا تھا۔

"تم... تم نے جھوٹ بولا۔ دھوکے باز... تم نے ان عورتوں بچوں کو مار دیا۔" وہ بولا اور اس کے آنسو بے اختیار بہہ نکلے۔

"جھوٹ، بدعہدی اور بے ایمانی سب کچھ تمھارے ساتھ جائز ہو گا کیونکہ ہم اور تم دشمن ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم ہر حال میں جنگ کے وہ اخلاقی اصول نبھاتے ہیں جو ہمیں ہادیٔ برحق، خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ نے سکھائے تھے۔ اور جن کو فتح مکہ اور اس کے بعد ہر عسکری فتح کے موقع پر مسلمانوں نے کبھی پامال کرنے کی جرأت نہیں کی۔ عورتوں اور بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کو ہمیشہ امان حاصل رہی اور ان پر ہاتھ اٹھانا آج بھی ہمارا شیوہ نہیں۔ تمھارے بیوی بچے بالکل محفوظ ہیں۔"

"میں جب تک انھیں دیکھ نہیں لوں گا، یقین نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ واپسی میں تم ان کو دیکھ سکو گے۔" میں نے کہا اور پھر باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آخری بار پہلے یہ بتاؤ کہ تمھاری فوٹو اسٹیٹ مشین غائب کدھر ہے؟" محسن نے سب کچھ جلاتے ہوئے بھی کہا۔

"وہ... دفتر میں... لیکن اس کی چابی... اسی کے پاس تھی۔" وہ بولا۔ "جس کو تم نے مار دیا۔"

www.paksociety.com

مجھے اس پر غصہ آیا بحیثیت وہاں نہیں بولا۔ مگر قصور میرا بھی تھا کہ میں نے اس سے وہاں نہیں پوچھا تھا۔ اب تک تو اس کی چتا بھی ٹھنڈی ہو رہی ہوگی جبکہ ایک خود تو اسٹنٹ مشین سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔ جو لوگ جاسوسی کے اس ایکٹ میں شامل تھے وہ تو سب اپنے انجام کو پہنچے۔

"چلو اس پولیس کا راستہ بتاؤ جہاں تمھارا لٹریچر چھپایا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

میں اس کی ہدایت کے مطابق چلتا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ ہماری صحیح راہنمائی نہیں کر رہا ہے اور یہ شک مجھے ایک چوک سے دوسری بار گزرنے کے بعد ہوا۔ میری جگہ اکرام شیخ ہوتا تو بہت پہلے تاڑ جاتا مگر وہ پیچھے مطیع الرحمٰن کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور میں ابھی کراچی کی سڑکوں سے اتنا زیادہ آشنا نہیں ہوا تھا۔

میں نے ٹیکسی روک کے شیخ کو آگے بلا لیا۔ "اکرام تم چلاؤ، یہ سور کا بچہ چکر دے رہا ہے۔"

"اچھا! میں نے غور نہیں کیا ورنہ اسے جلیبی کی طرح سیدھا کر دیتا۔" شیخ نے میری جگہ بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہاں بھئی، یہاں سے مجھے بتاؤ کدھر جانا ہے؟" وہ مطیع الرحمٰن سے مخاطب ہوا۔

"گاڑی میں پیٹرول بھی ختم ہونے والا ہے۔" میں نے کہا۔

"راستے میں لے لیں گے۔" شیخ نے کہا۔ "بول بھئی مسٹر مطیع ورلڈ بردار۔"

اس نے کہا "میں کچھ بھول گیا۔"

"ٹھیک ہے، تمھاری یادداشت ہم فلمی فارمولے کے مطابق بحال کریں گے۔ ایک صدمے سے گئی، دوسرے صدمے سے واپس آگئی۔ چلو بھئی واپس چلیں۔ اس کی فیملی کو بھی ساتھ ہی لے لیں۔"

"مسٹر چکرم، تم یہ مت سمجھو کہ اب وہ ہماری دسترس میں نہیں رہے۔" محسن نے کہا۔ "ہمارے پاس تمھارے ساتھیوں کے تین بچے اور بھی ہیں۔ ہم نے ان کی فیملی کو معاف کر دیا تھا کیونکہ ان سے ہمیں کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ تمھارے بیوی بچے کل یہیں اسی گھر میں ملیں گے یا ان کے ذریعے معلوم ضرور ہو جائے گا کہ وہ کہاں گئے۔ پھر تم وہی دیکھو گے جو آج... تم نے نہیں دیکھا اور تمھارا کیا ہے، ان عورتوں کا کیا حال ہوگا جب..."

"چلو... میں بتاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کے بعد تم مجھے بھی مار ڈالو گے۔ میں اپنے بیوی بچوں کو تمھاری سفاکی سے بچانے کے لیے غداری کے الزام کا بوجھ اپنے ضمیر پر اپنے ساتھ لے جاؤں گا مگر کیا تم کسی طرح یقین دلا سکتے ہو کہ... انھیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"تم کو کس طرح یقین آ سکتا ہے؟" محسن بولا۔

"میں خدا کی اور اس کے رسول کی قسم کھا سکتا ہوں اور اس کے بعد اپنے ضمیر کی قسم کو سب سے بڑی قسم سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

اب اس نے شیخ کو پتا سمجھایا۔ شیخ کچھ دیر چلاتا رہا اور پھر ٹیکسی کو واپس موڑ لیا۔ رات کے ساڑھے تین بجے ہر سڑک سنسان تھی لیکن کہیں کہیں ریسٹورنٹ اب بھی کھلے ہوئے تھے۔ ہم ٹیلی ویژن اسٹیشن کے سامنے سے گزرے اور ایک پیٹرول پمپ پر ذرا سی دیر کے لیے رکے۔ محسن نے بنگالی کے منہ کو دبا کے رکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا اور یہ ایک ایسی غلطی تھی جس نے ہمارے لیے پریشانی پیدا کی۔ وہ اچانک چلانے لگا "مرڈر... مرڈر... بچاؤ..."

پیٹرول پمپ کا ملازم جو موٹر بائیک کو واپس پمپ لگا رہا تھا، ایک دم چونکا۔ پیٹرول پمپ پر اونگھتے ہوئے دونوں پولیس مین ہڑبڑا کے اٹھے تو ان میں سے ایک کی رائفل گر گئی۔ میں نے فوراً صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کر لیا۔ پیٹرول پمپ کے ساتھ ہی نیو ٹاؤن کا پولیس اسٹیشن تھا۔ میں نے حسبِ عادت ٹیکسی کا انجن بھی بند کر دیا تھا اور اپنے موزے میں سے پیسے نکال رہا تھا جب ایک پولیس مین "خبردار... خبردار!" کرتا ہوا میری طرف لپکا۔ اب میرے سامنے ایک راستہ تو یہ تھا کہ میں انجن اسٹارٹ کروں اور فرار ہو جاؤں لیکن اس میں خطرات زیادہ تھے۔ وہ پیچھے سے فائر کر سکتے تھے۔ اُن کی ڈبل بیرل اور دقیانوسی رائفلوں کو ڈاکو عموماً خاطر میں نہیں لاتے لیکن پچاس فی صد امکانات یہی ہوتے ہیں کہ گولی نہیں نکلے گی۔ پھر اونگھتے ہوئے محافظوں کا نشانہ خطا ہونے کے امکانات بھی ففٹی ففٹی تھے۔ پھر بھی رسک اپنی جگہ تھا چنانچہ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

میں اطمینان سے باہر نکلا اور ہاتھ اٹھا کے کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے سنتری صاحب؟ ہم کون بھاگے جا رہے ہیں؟"

"یہ کون ہے؟ کون چلا رہا ہے؟"

"چھوٹا بھائی ہے ہمارا۔ دماغی مریض ہے۔" میں نے کہا۔ "علاج سب کرا چکے۔ اب گڈو بندر لے جا رہے ہیں۔"

میں تھوڑا دور ہٹتا گیا اور وہ میرے ساتھ اتنے فاصلے پر آ گئے کہ ان کے لیے سودا کرنا آسان ہو گیا۔ وہ یہ بات سمجھ لیتے ہیں اور مان لیتے ہیں بشرطیکہ سمجھانے والا سمجھدار ہو۔ اندھیرے کی اوٹ میں رہ کے میں نے سو کا ایک نوٹ انھیں پیش کیا۔

"بدمعاش! گڈو بندر رات کو جا رہے تھے؟" ان میں سے ایک نے کہا۔

"کیا کریں جی، دنیا سے بھی تو چھپانا پڑتا ہے مگر اب آپ سے کیا پردہ۔" میں نے کہا۔

"اچھا، اچھا جاؤ۔" ان میں سے ایک نے نوٹ کو بڑی صفائی سے ٹوپی کے نیچے رکھ لیا۔ شیخ نے اتنی دیر میں ٹیکسی بڑھا دی تھی۔ میں پھر اس میں بیٹھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک بہت بڑی مصیبت سر سے ٹل گئی۔ محسن نے اتنی دیر میں مطیع الرحمٰن کے منہ میں وہ میلا کپڑا ٹھونس دیا تھا جو ٹیکسی کو صاف کرنے کے لیے سیٹ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ یہ کپڑا اسے شیخ نے فراہم کیا تھا۔ پیٹرول پمپ کا ملازم معاملات کو قانون کے دائرۂ اختیار میں دیکھ کے دور چلا گیا تھا تاکہ اس پر قانونِ شہادت کا اطلاق بھی نہ ہو۔

جب ہم نیشنل اسٹیڈیم کے پاس سے سیدھے گزر گئے تو محسن نے مطیع الرحمٰن کو پھر قوتِ گویائی دی۔

"اب بول..." محسن نے اس کے سر اور منہ پر مکے مارتے ہوئے کہا۔ "حرامزادے، مرڈر کر دوں... اسی جگہ؟"

"اچھا خیال ہے۔" میں نے تائید کی۔ "پتا سمجھ لیا ہے نا تم نے، ہم اس کے بغیر بھی پہنچ سکتے ہیں؟"

شیخ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "بس پہنچ گئے سمجھو۔" اس نے ٹیکسی کو اندھیرے جنگل جیسے علاقے میں اچانک دائیں طرف موڑ لیا۔ ہیڈلائٹس میں ایک خستہ حال پتلی سی سڑک دکھائی دے رہی تھی جس پر شاید اب ٹریفک دن کے وقت بھی نہ چلتی ہو۔ ایک میل کے بعد وہ سڑک گھوم کے ایک شکستہ چار دیواری پر ختم ہو گئی۔ شیخ نے ٹیکسی روک دی اور لائٹس بجھا دیں۔

میں ایک طرف سے باہر نکلا اور محسن دوسری طرف سے۔ پھر مطیع الرحمٰن باہر آیا۔ ایک فوری خیال کے تحت جس کو میں اپنی چھٹی حس کا معجزہ بھی قرار دے سکتا تھا، میں نے پلٹ کے اس کو دبوچ لیا۔ عین اس وقت جب وہ چیخنے والا تھا، اس کی آواز میرے ہاتھ کے دباؤ سے گھٹ کے رہ گئی۔

معلوم نہیں وہ گولی کس سمت سے آئی تھی اور کس نے چلائی تھی لیکن یہ مقصد نہ ہوتا تو مطیع الرحمٰن مارا جاتا۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی۔ محسن یا اکرام شیخ میں سے کسی نے جوابی فائر کیا اور اس کے ساتھ ہی تین طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ نصف شب کے سکوت میں گونجنے والی گولیوں کی آوازیں کسی محاذِ جنگ کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ اندھیرے میں ہمارے حریف کوئی نشانہ لیے بغیر فائرنگ کر رہے تھے جس سے ان کی بوکھلاہٹ کا اندازہ ہوتا تھا۔

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ غافل نہیں تھے اور انھیں ہمارے آنے کا پتا چل گیا تھا۔ مطیع الرحمٰن اب بے ہوش ہو گیا تھا اور مجھے اس کی جان بچنے کی امید نظر نہ آتی تھی۔ وہ پہلے ہی نیم جان تھا اور گولی لگنے کے بعد اس کے زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا مگر اسے روکنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔

مزاحمت کرنے والوں کی قوت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ ابھی تک انھوں نے صرف ریوالور سے گولیاں چلائی تھیں مگر ان کے پاس مشین گن یا دستی بم بھی ہو سکتے تھے جب کہ ہمارے پاس بہت محدود اسلحہ تھا۔ ہم تینوں کے ریوالور اندھادھند فائرنگ میں بہت جلد خالی ہو سکتے تھے۔

میں نے اشارے سے محسن کو قریب بلا کے اپنا پلان سمجھایا۔ اس نے ایک درخت کی اوٹ سے منہ کے سامنے ہاتھ رکھ کے اعلان شروع کیا۔

"میں تم کو دس منٹ دیتا ہوں۔ مقابلہ بند کر دو اور خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ تم کو پولیس نے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ تمھارا سرغنہ مطیع الرحمٰن ہمارے قبضے میں ہے۔ اس کے باقی ساتھی جگہ جگہ گرفتار کیے جا چکے ہیں۔ وہ سارا لٹریچر پکڑا جا چکا ہے جو تمھارے ساتھی تقسیم کرتے تھے جنھوں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم لوگ مقابلہ کرو گے تو مارے جاؤ گے۔"

محسن آواز کو بہت بھاری بھرکم اور پاٹ دار بنا کے بول رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اعلان کا ایک ایک لفظ غور سے سنیں گے۔ عام طور پر پولیس محاصرہ کرنے کے بعد محصور مجرموں کو اسی قسم کی وارننگ دیتی ہے۔ اگر وہ لوگ ہوشیاری سے جائیں تو ایسے

www.paksociety.com

اعلانات میگا فون پر نشر کرتے ہیں مگر عام حالات میں کوئی فوجی دستہ افسر خود ہی میگا فون بن جاتا ہے۔

مجھے اور اکرام شیخ کو پیچھے پہنچ کر پوزیشن سنبھالنے کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ محسن کی آواز ہم تک بھی بالکل صاف پہنچ رہی تھی۔ مجرم جو درمیان میں تھے اسے زیادہ واضح طور پر سن رہے ہوں گے۔ میرے اور اکرام شیخ کے درمیان تیس گز کا فاصلہ ضرور ہوگا۔ اس طرح اب ہم تینوں ایک ایسی مثلث کے تین کونوں پر بیٹھے ہوئے تھے جس کے تینوں اضلاع تقریباً برابر تھے اور ہم اپنے دائیں بائیں اتنی دور تک دیکھ سکتے تھے کہ چاروں طرف سے کوئی بھی اس حصار کو توڑ کے نہیں نکل سکتا تھا۔

چند منٹ کے وقفے سے محسن نے اپنا اعلان دہرایا اور اس بار زیادہ تفصیل کے ساتھ۔ اس نے مطیع الرحمان کے ساتھیوں کے نام اور پتے ٹھکانے بھی بتائے۔ یہ بھی بتایا کہ ان دونوں بھائیوں نے وعدہ معاف گواہ بننا قبول کر لیا ہے جن میں سے ایک سرکاری دستاویزات کی فوٹو اسٹیٹ نقلیں بناتا تھا اور دوسرا پان کی دکان چلاتا تھا، جہاں سے ایک انگریز جیکی گرین کے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔

اس دوسرے اعلان نے مفرور مجرموں کا رہا سہا حوصلہ بھی ختم کر دیا ہوگا کہ انھوں نے عقبی راستے سے نکل کر رات کے اندھیرے اور جنگل میں گم ہو جانے کی کوشش کی۔ میں نے ایک وقت چار افراد کو دبے پاؤں اپنے اور شیخ کے درمیان سے گزر کے فرار ہوتے دیکھا۔

میں نے نشانہ لے کر دو فائر کیے اور آگے دوڑنے والے دونوں مجرم ایک چیخ مار کے زمین پر تڑپنے لگے۔ باقی دو رک گئے اور انھوں نے رضاکارانہ طور پر ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

"خبردار جو کسی نے ہلنے کی ذرا بھی کوشش کی۔" میں نے گرج کے کہا۔

شیخ میری نظر سے اوجھل تھا جب اس کی طرف سے ایک فائر ہوا اور گولی کا نشانہ بننے والے کی بھیانک چیخ سنائی دی تو میں سمجھ گیا کہ فرار ہونے والے دو گروہوں میں بٹ کے دو مختلف سمتوں سے نکلنا چاہتے تھے۔

"ہاتھ اوپر..." اکرام شیخ نے دہاڑ کر گالی دی۔ "اور پیچھے آیا تو اگلا سانس نہیں آنے گا۔"

دس منٹ کا وقفہ پورا ہونے سے پہلے ہی ہم ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کر چکے تھے۔ وہ کل پانچ آدمی تھے جو ہاتھ سر پر رکھے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ارتکاب جرم کے وقت مجرم بڑی بے خوفی کا اور حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتا ہے اور اسے امید ہی مجرم کیوں نہ ہو اسے یوں دوام رکھتی ہے مگر جیسے ہی وہ پکڑا جاتا ہے سزا کا خوف اس کے اعصاب پر سوار ہو جاتا ہے۔

یہ پانچوں اب مقابلے سے بھی دستبردار ہو چکے تھے۔ خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ چکے تھے۔ میں نے ان کے رہتے ہوئے انھیں آگے بڑھنے کو کہا۔ دائیں جانب سے اور نے اور بائیں جانب سے شیخ بے حد قاتلانہ انداز میں انھیں کی زد پر لیے رہا۔

وہ مذبح خانے کی جانب ہانکے جانے والے بکروں کی طرح میاتے ہوئے آگے پیچھے چلنے لگے اور ہمیں اس علاقے تک لے گئے جہاں سے ایک زینہ نیچے جا رہا تھا۔ زینہ ... فوٹو گرافر کے ڈارک روم کا سماں تھا۔ مکمل اندھیرے میں زیرو واٹ کے کسی سرخ بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے پرچھائیاں زیادہ پُر اسرار نظر آتی تھیں۔

زینے کے آخر میں پھر ایک دروازہ تھا۔ میں نے اندازہ کیا کہ یہ سب حفاظتی انتظام تھا جو ضرورت کے تحت بعد میں کیا گیا تھا چنانچہ اسٹرکچر کی تشکیل پر وقت اور سرمایہ ضائع نہیں کیا گیا تھا۔ اس جگہ تہ خانے کی موجودگی کا کوئی جواز نہ تھا۔ اگر یہ محل ہوتا یا قدیم عمارت ہوتی تو اس کے تہ خانے کو بھی پلاسٹک سے مزین کیا جاتا اور بجلی کی تاریں بھی ایسے کھلی ہوئی چھوڑی جاتیں۔

نیچے والا دروازہ کھلتے ہی میں نے اپنے سامنے ایک ہال دیکھا۔ اس کے ایک حصے میں پرنٹنگ پریس تھا۔ دیواروں کے ساتھ شیلف مطبوعہ مواد اور طباعت میں کام آنے والے کاغذ بھرے پڑے تھے۔ وہیں دوسری طرف کمپوزیشن سیکشن تھا۔ یہاں اپنا سارا لٹریچر انگلش میں چھاپتے تھے۔ ہال کا ایک حصہ کٹنگ بائنڈنگ کے کاموں کے لیے مختص تھا۔ ایک الگ حصہ ... اور پروسیس کرنے کا تھا۔ جتنی دیر میں اکرام شیخ اور محسن نے مجرموں کی تلاشی لی اور ان کے ہاتھ باندھے تھا اتنی دیر میں میں نے اشاعتی ادارے کا جائزہ لے لیا۔ کہتے ہیں کہ آدھی فتح پروپیگنڈے سے حاصل کی جاتی ہے۔ اسلحہ صرف محاذِ جنگ پر کام آتا ہے۔ سیاسی پر برائے عامہ کی حمایت حاصل کرنے اور بین الاقوامی سطح پر ہمدردی حاصل کرنے کے لیے تحریر و تقریر کا ذریعہ ہی موثر ثابت ہوتا ہے۔

مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندی کے رجحان کو ہوا دینے والوں کے بھی دو محاذ تھے۔ ایک محاذ پر وہ ... جو مدد گار تھی اور وہ ملکی و غیر ملکی کو کمزور کر رہے تھے۔ دوسرا محاذ جس کا یہ نام نہاد دانشور ... تھے جو اس تحریک کو احساسِ محرومی کا رد عمل بنگلہ دیش کی تحریک کو آزادی ...

ذیلیں کو جائز قرار دے رہے تھے۔ جو استحصال کا فرو نگا کے مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹ کے اور جھوٹے اعداد و شمار پیش کر کے عوام کو اور عالمی برادری کو گمراہ کرنے میں اپنی تمام تر ذہنی استعداد صرف کر رہے تھے۔ میں نے تمام سے مطبوعہ کتابچے دیکھے۔ زیر تصنیف کتابوں کے مسودے دیکھے اور وہ سب اخبار و رسائل دیکھے جن میں یہ مواد شائع ہو چکا تھا۔ میں یہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا کہ علیحدگی پسندی کی اس تحریک کے پیچھے کتنے قابل، شاطر دماغ کام کر رہے ہیں۔ یہ دماغ اگر ذرا یک جہتی کو فروغ دیتے تو حالات مختلف ہوتے مگر ان کی صلاحیت کو خرید لیا گیا تھا۔ ... بین الاقوامی سیاست کا ... تھا کہ ایک قوم کا شعور، چونکہ تاریخ اور حقائق سے منکر ہو گیا تھا۔ فکر اور سوچ کو جلا دینے والی یہ جنگ اسلحے کی اور طاقت کی جنگ سے کہیں زیادہ مزید ہمال اور خطرناک تھی۔ ایک گولی اگر ایک دشمن کو ہلاک کرتی ہے تو ایک سچ نظر آنے والے جھوٹ پر مبنی پوسٹر دس ذہنوں کو مسموم کر کے انھیں صف دشمناں میں شامل کر دیتا ہے۔ بم اگر ایک گھر تباہ کرتا ہے تو موثر انداز میں لکھے جانے والے ایک پمفلٹ سے ایک آبادی میں نفرت پھیلتی ہے۔

پکڑے جانے والے سب غدار مشرقی پاکستان کے رہنے والے نہیں تھے۔ ان میں دو مغربی پاکستان کے رہنے والے بھی تھے۔

ان میں ایک سرخ و سپید چہرے والا جوان آدمی بھی تھا جس نے سنہرے فریم والی عینک لگا رکھی تھی۔

"اس نے کہا: تم سکندر بخت ہو نا؟ خدائی فوجدار۔"

میں نے کہا: "مجھے خوشی ہے کہ اس نام کی وحشت تم جیسے ہر غدار پر قائم ہے۔ تم صورت سے تعلیم یافتہ اور آسودہ حال لگتے ہو۔ تم کس مجبوری کے تحت ان وطن دشمن عناصر کے ساتھ مل گئے۔ صرف پیسے کی خاطر؟ یہ تو مشکل ہے کہ تم نظریاتی طور پر ان کے ساتھ اتفاق کرتے ہو۔"

"نظریات کچھ نہیں ہوتے۔ کتابی باتیں اور اصول۔ سب آدمی کو فرار کرتے ہیں۔" وہ تلخی سے بولا۔ "زندگی کو صرف پیسہ آسان بناتا ہے۔"

"تمھارے پیسے نے ایک یہ مشکل بھی پیدا کی ہے کہ آج میں تم کو غدار کہلانے کے لوگوں اور غداروں کی صف میں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ تلخی سے مسکرایا۔ "جب میں نے سب وطن اور اصول پر بہت بنا تھا تب بھی کیا ہوا تھا؟ جو سلوک تم آج میرے ساتھ کر رہے ہو وہی پہلے بھی ہوا تھا۔ اگر مجھے حب الوطنی کی سند مل جاتی تو میں اسے بھی کافی سمجھتا اور مطمئن ہو جاتا لیکن مجھے اس کا بہت نقصان ہوا تھا۔ آج میں دنیا کو کیا نہیں؟ ... جیسے ان گنت تعلیم یافتہ اور باشعور لوگ ایسے ہیں جو تمام اقدار سے منحرف ہو چکے ہیں۔ وہ جمہوری حقوق، نظامِ انصاف، چارٹر آف ہیومن رائٹس، آئین جو ان مردوں حق گوئی و بے باکی اور اقبالؒ کے فلسفۂ خودی سے لے کر قائد اعظمؒ کے فرمودات تک سب کو منسوخ شدہ نوٹ کی طرح بے کار اور بے قدر سمجھتے ہیں۔ سکۂ رائج الوقت کچھ اور ہے جس نے مجھے خرید لیا۔ یہ ساری عمر کے فلسفے کو اور میرے نظریات کو خرید لیا۔ اب تم مجھے جو سزا چاہے دو۔ مجھے مرنے کا بھی افسوس نہیں ہوگا کیونکہ میرے بعد میرے اہل خانہ کے لیے زندہ رہنے کے وسائل بہت ہیں۔"

مجھے اس شخص کی ذہنی شکست اور بغاوت پر افسوس ہوا۔ معلوم نہیں کس حادثے نے اس کی سوچ کی راہیں بدل دی تھیں۔

"تمھارے ساتھ جو کچھ ہوا کیا اس کے ذمے دار عوام تھے؟ یہ ملک تھا؟" میں نے کہا۔

"عوام!" وہ زہر بھرے لہجے میں بولا۔ "کہاں ہیں وہ عوام جن کو تم اس ملک کا شہری کہتے ہو اور وہ ملک کہاں ہے جس کا ذکر آئین میں تھا۔ قرار داد مقاصد میں تھا۔ جو قائد اعظمؒ نے بنایا تھا اور علامہ اقبالؒ کے خواب کی تعبیر تھا؟"

"مجھے حیرت ہے کہ تم سا باشعور آدمی..."

"رہنے دو یہ طفل تسلیاں۔ مجھے بہت ملال ہے اپنے باشعور ہونے کا۔ کاش میں بے شعور ہوتا۔ پھر یہ غلط تو نہ سمجھتا اور میرا شعور بیت جیسے بار ندامت تو نہ ہوتا۔" وہ نفرت سے بولا۔ "تم نے کچھ نہیں دیکھا مسٹر سکندر بخت۔ تم نے تو قانون اپنے ہاتھ میں ... ہے۔"

محسن اور شیخ بھی سب سن رہے تھے۔ ان کی طرح میں بھی پہچان گیا کہ یہ زہر بجھے پر مجبور تھا۔ بے شک حالات کچھ لوگوں کو مجرم بنا دیتے ہیں۔ سب سقراط نہیں ہوتے کہ خوشی خوشی زہر کا پیالہ پی لیں۔ رشتوں کی جذباتی زنجیر میں جکڑا ہوا آدمی تو بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ پروفیسر بے رحم ضرور تھا۔ اس کے جرم کی سنگینی ان حالات کے تناظر میں کم ضرور ہو جاتی تھی ختم نہیں ہوتی تھی۔

"مجھے افسوس ہے پروفیسر صاحب! کہ تم ہار گئے۔ تم نے اپنی اخلاقی شکست تسلیم کر لی۔" میں نے کہا۔ "تو اب کچھ نہیں ہوں؟ تم خود فیصلہ کرو کہ تم مجرم آج ہو یا پہلے تھے؟ وقت کو مورخ کو اور نظامِ انصاف کو چھوڑو۔ اپنے ضمیر سے پوچھ کے مجھے بتاؤ۔"

"میرا کوئی ضمیر نہیں۔ اسے میں بہت پہلے قتل کر کے اس کی لاش بھی بیچ چکا ہوں۔" وہ بولا۔ "اور فیصلے تو ہمیشہ تاریخ کرتے ہیں۔ افراد کے، اقوام کے اور تاریخ کے فیصلے انھی کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔"

"دوسروں کو الزام مت دو۔" میں نے کہا۔ "آج کے دن

www.paksociety.com

کا فیصلہ خود تم نے اس وقت تحریر کر لیا تھا جب تم نے اپنی شکست قبول کی تھی۔ پھر بھی جیسے عدالت کسی مجرم کو سزا دیتے ہوئے حالات سے صرف نظر نہیں کرتی ایسے ہی میں بھی تمہیں فوراً سزائے موت نہیں دے رہا ہوں۔ تمہارے کیس پر ہم سب غور کریں گے۔ تم ادھر آ جاؤ۔"

پروفیسر نے کسی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اس کے باقی چاروں ساتھی اسے کینہ بھری اور حاسد نظروں سے گھور رہے تھے۔ مغربی پاکستان کا دوسرا باشی البتہ کچھ پرامید نظر آنے لگا تھا۔

"عرض یہ ہے۔" اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا۔ "کہ عرض فدوی کی بھی سن لی جائے۔"

"یہ سالا فدوی کون ہے؟" میں نے کہا۔

"جی... وہ... میں..." اس نے گڑبڑا کے کہا۔ "میں... کہنا یہ چاہتا تھا کہ آپ رحمدلی اور عفو و درگزر سے کام لیں۔ دراصل یہ حالات ہی ایسے ہوتے ہیں..."

وہ ایک چالاک آدمی تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ پروفیسر نے کس طرح اپنے حالات کا جواز پیدا کر کے ہم سے رعایت حاصل کر لی تھی اور شاید اتنی دیر تک وہ بھی اپنے لیے مناسب حالات گھڑنے میں مصروف رہا تھا۔ اس نے خاصے رقت انگیز پیرائے میں ایک دردبھری کہانی سنائی جس کا مرکزی خیال کسی حد تک پروفیسر کی سرگزشت سے ملتا جلتا تھا۔ بس اس نے اپنا پیشہ بدل دیا۔

اس نے کہا۔ "جناب! میں پولیس افسر تھا۔ میرا قصور یہ تھا جناب کہ میں رشوت نہیں لیتا تھا اور دوسروں کو بھی حرام کھانے سے روکتا تھا کیونکہ جناب آخر ہم مسلمان ہیں اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو منہ بھی دکھانا ہے مگر جناب زمانہ ایسا ہے کہ نیکی کرنے والا ہی برا بن جاتا ہے۔ چنانچہ مجھے ہی بدخواہوں نے مجرم بنا دیا۔ میرے خلاف پورا محکمہ ہو گیا جناب مگر ہر درخواست انھوں نے پبلک سے دلوائی کہ یہ شخص رشوت خور ہے۔ میں اور رشوت! نعوذ باللہ! لیکن اس دھاندلی کے دور میں شریف آدمی کی شنوائی کہاں ہوتی تھی جناب! مجھے تحقیقات کے بغیر ہی برطرف کر دیا گیا۔ میرا قصور یہ بھی تھا کہ میں نوکرشاہی کے ظالمانہ رویے کی حمایت نہیں کرتا تھا۔ مجرموں کی پشت پناہی نہیں کرتا تھا اور بے گناہوں کو جیل میں نہیں ٹھونستا تھا۔ کئی بار میں نے نہتے جلوسوں پر لاٹھی چارج کرنے سے انکار کیا۔ کیونکہ جناب عوام کی آواز کو طاقت سے نہیں دبایا جا سکتا اور جو کام پیار محبت کے سلوک سے ہو جائے، اس میں تشدد سے کام لینا کوئی اچھی بات تو نہیں جناب۔"

"بالکل بالکل جناب۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔ "تم یہ کرتے ہوگے کہ جب کوئی چور پکڑا جاتا ہوگا تو تھانے میں اس کی خاطر تواضع چائے اور کیک سے کرنے کے بعد پوچھتے ہوگے کہ بیٹا سچ سچ بتا دو کہ تم نے چوری کی ہے؟ اور جب وہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے سچ بول دیتا ہوگا کہ میں نے فلاں فلاں واردات کی تھی تو آپ پیار سے اس کے چپت لگا کے کہتے ہوں گے جناب کہ چلو بھاگو۔ آئندہ مت کرنا ایسی حرکت۔ چوری کرنا بری بات ہے۔"

"اور جناب! کوئی قتل کا مجرم لایا جاتا ہوگا؟" محسن نے بات آگے بڑھائی۔ "تو آپ اسے لنچ میں چکن بریانی اور قورمہ کھلانے کے بعد اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہتے ہوں گے کہ چلو اب مجھے بتا دو کہ تم نے اپنی بیوی کو کیوں قتل کیا اور کیسے کیا۔ اور جناب جب وہ اعتراف جرم کر لیتا ہوگا تو آپ اسے بھی نصیحت کر کے رخصت کر دیتے ہوں گے کہ پھر مت کرنا ایسی حرکت۔ جاؤ دوسری شادی کی تیاری کرو۔"

وہ محسن کی طرف ہکا بکا کھڑا دیکھ رہا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ اس کا جھوٹ نہیں چلا۔ میں نے اسے اچانک آڑے ہاتھوں لے لیا۔ میں نے اسے بڑی بے دردی سے مارا۔ گھونسے مار مار کے میں نے اس کا چہرہ بگاڑ دیا۔ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے اور ناک سے خون بہنے لگا۔ وہ بہت چلایا کہ جناب مجھے معاف کر دیں۔ مگر میں نے اسے اٹھا اٹھا کے دیوار پہ مارا۔ فرش پہ پٹخا اور اس کو ٹھوکریں مار مار کے اس کی ہڈی پسلی ایک کر دی۔ اس کا چیخنا چلانا، بلبلانا، منت سماجت کرنا اور گالی گلوچ کرنا سب رائیگاں گیا۔ چند منٹ میں وہ آدمی کی جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا، خستہ حال اور لہولہان نیم جان لاشہ رہ گیا۔

پروفیسر نے میرے ردعمل کو خاصی حیرانی اور ناپسندیدگی سے دیکھا لیکن وہ خاموش کھڑا رہا۔ تینوں بنگالیوں کی حالت اتنی ابتر ہو گئی کہ ان میں سے ایک تو بیٹھ گیا۔ وہ لرز رہا تھا اور اپنے انجام سے اتنا خائف تھا کہ اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ اس نے اپنے کپڑے ہی خراب نہیں کیے تھے، فرش پہ بھی غلاظت پھیلا دی تھی۔

میں نے محسن سے کہا۔ "جناب کو باہر لے جاؤ۔ دیکھو مطیع الرحمان زندہ ہے یا مر گیا۔ زندہ ہو تو جناب کے کندھوں پہ اٹھا لاؤ۔"

محسن نے جناب کو ایک جھٹکے سے پیروں پر کھڑا کر دیا اور گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔

میں نے باقی تین بنگالیوں میں سے پہلے کو مخاطب کر کے

کہا۔ "تم میں سے جو زیادہ تعاون کرے گا، وہ رعایت کا مستحق ہوگا۔ پروفیسر نے سچ بولا تھا، اسے رعایت مل گئی لیکن دوسرا شخص جھوٹ بول کر ہمیں بے وقوف بنانا چاہتا تھا۔ اسے ہم نہیں دفن کر جائیں گے۔ سچ بولنے والے کے لیے ففٹی ففٹی چانس ہے کہ اسے نکل جانے کا ایک موقع عطا کر دیا جائے۔"

"ہم... ہم بتائے گا... جو ہم جانتا ہے۔" وہ بولا۔ اس کے ساتھی نے بنگالی میں بولنا شروع کیا۔ اس کے لہجے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے ساتھی کو اس کی بزدلی پر اور خودغرضی پر شرمندہ کر رہا ہے۔ ایک غدار کا ایمان کچھ نہیں ہوتا۔ وہ لالچ میں وطن کا غدار بن سکتا ہے تو خوف کے تحت اپنے ساتھیوں سے بھی غداری کر سکتا ہے۔ وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے۔ یہ اس کا مسلک نہیں ہوتا۔

جب محسن اندر آیا تو جناب نے مطیع الرحمان کو کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ مگر اس بوجھ کے ساتھ چلنا بھی جناب کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ وہ مطیع الرحمان کے ساتھ ہی فرش پہ گرا مگر پھر اٹھ کے دو زانو بیٹھ گیا۔ میں نے کوئی سوال کیے بغیر مطیع الرحمان کے سر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ وہ بے ہوشی میں ہی تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ دراصل مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ مطیع الرحمان اب تھوڑی دیر کا مہمان ہے۔ میں نے اسے مار کے ایک نفسیاتی فائدہ حاصل کیا۔ اس کے دماغ سے اڑنے والے خون اور مغز کے چھینٹے جناب پر پڑے اور وہ دہشت سے پاگل ہو کے بھاگا۔ میں نے اس کا بھی نشانہ لیا اور اگلے لمحے وہ دیوار سے ٹکرا کے گرا اور فرش پر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ یہ دونوں قتل میں نے بڑے سکون سے کیے تھے۔ کسی تیاری اور تذبذب کے بغیر۔

آپس میں جھگڑنے والے بنگالی سہم کر خاموش ہو گئے تھے۔ پروفیسر کی نظروں میں خوف سے زیادہ نفرت کے جذبات نمایاں تھے۔

"ہاں۔ تو تم کیا جانتے ہو؟" میں نے بنگالی سے مخاطب ہو کے کہا۔

اس نے بہت مفید معلومات فراہم کرنے کے علاوہ ہماری راہنمائی بھی کی۔ مثلاً اس نے تہ خانے میں ایک خفیہ راستہ دکھایا جس کا ہم سراغ نہیں لگا سکے تھے۔ اس میں ایک بالشت [illegible] نصب تھا۔ اس کے اندر دیوار میں نصب الماری کرنسی نوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس بنگالی نے ہی ہمیں تجوری والے تالے کو کھولنے کا طریقہ بتایا۔ الماری میں پاکستانی اور انڈین کرنسی کے ساتھ ڈالر بھی تھے اور یہ رقم ان سب کو ادائیگی کے لیے مخصوص تھی جو نظریاتی محاذ پر اس علیحدگی پسندی کی تحریک میں شامل تھے۔ ڈالر تو غیر ملکی کرنسی تھی، پاکستان کے دونوں حصوں میں ہر قسم

کی وطن دشمن سرگرمیوں میں ملوث افراد کو پاکستانی کرنسی میں ادائیگی ہوتی تھی اور انڈین کرنسی کی ہر جگہ موجودگی یہ ثابت کرتی تھی کہ مغربی بنگال کا بنگالی علیحدگی پسندی کے اس رجحان کی حوصلہ افزائی میں کس حد تک پیش پیش ہے۔ مجھے چالیس چیک ایسے ملے جو کلکتہ کے مختلف بینکوں کے تھے۔ پانچ ہزار سے پچاس ہزار تک کی مالیت کے یہ چیک دستخط شدہ تھے مگر ان پر تاریخ نہیں ڈالی گئی تھی۔ یہ سب بیئرر چیک تھے اور کسی کو بھی دیے جا سکتے تھے کہ وہ نقد رقم لیتے ہوئے ڈرتا ہو تو یہ کاغذ کا پرزہ لے کر کلکتہ چلا جائے اور کیش حاصل کر لے۔

مجھے ایک ڈائری بھی ملی جس کے سب اندراجات بنگالی زبان میں تھے۔ اس میں ناموں اور پتوں کی ایک طویل فہرست تھی۔ اس کے علاوہ ادائیگیوں کا حساب تھا۔ بنگالی نے بتایا کہ یہ ان لوگوں کے نام ہیں جو مغربی پاکستان، بھارت اور مشرقی پاکستان میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ پناہ فراہم کر سکتے ہیں اور تحریک کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان سب ناموں اور پتوں کو اردو یا انگریزی میں منتقل کرنا ایک لمبا کام تھا چنانچہ میں نے ڈائری کو بحفاظت اپنی جیب میں رکھ لیا۔

اب صبح قریب تھی۔ ہمارے لیے یہاں زیادہ وقت گزارنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ باہمی مشورے سے ہم نے ایک لائحہ عمل مرتب کر لیا۔ تینوں بنگالیوں کے لیے سزائے موت پر ہم سب کا اتفاق تھا۔ اگر ہمارے پاس پرنٹنگ پریس اور تفریح گھر کو تباہ کرنے کے لیے کچھ ہوتا تو ہم اسے ایک دھماکے سے اڑا دیتے۔ سب دشمن جو اندر اور باہر تھے ساتھ ہی فنا ہو جاتے۔

اکرام شیخ نے ایک زیادہ مؤثر اور مفید طریقہ بتایا۔ "کیوں نہ یہ مال غنیمت حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے؟"

"وہ کیسے؟" محسن نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"بھئی ایک فون کر کے شیروانی صاحب..." میں نے کہا۔ "گمنام رہ کے ہم پہلے بھی نیک کام کرتے رہے ہیں اور فون کرنے کا آلہ ہمارے پاس ہے۔"

"فون نمبر کس کا ملائیں گے آپ؟" محسن نے کہا۔ "آئی جی صاحب کے گھر کا۔ وہ اس وقت خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوں گے۔"

"تو پکڑا جائے گا کسی دن۔" اکرام شیخ نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ "آئی جی صاحب کو خرگوش کہتا ہے؟"

"کوتوال شہر پر الزام لگاتا ہے نابکار کہ وہ سو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"اتنے بڑے افسر کو کم سے کم اونٹ کے برابر تو سمجھا ہی

www.paksociety.com

چاہیے۔ آپ خواب ختم کر سکتے تھے۔" اکرام شیخ بولا۔ "یا گولی نکال دیتے۔ خواب ختم کر دیتے۔ خاصا بڑا ہوتا ہے گدھا۔"

"کسی اور سے بڑا ہوتا ہو، تم سے بڑا یقیناً ہوتا ہے۔" محسن چڑ کے بولا۔ "جو کرنا ہے کرو۔"

"چلو ڈرائیور۔ تم یہ ہاتھ کا میل دھو۔ جس کا جوتا اسی کا سر۔" میں نے کہا۔ "انھی کے خلاف کام آئے گا ان کا پیسہ۔"

مطیع الرحمان اور جناب کی لاشیں اپنی بے بسی کی زبان میں کہتی تھیں۔ سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔ جو ابھی زندہ تھے، وہ زندگی کی آخری سانسوں کا شمار کر رہے تھے۔ امید اور خوف کے درمیان عذاب کے پل صراط پر کھڑے لرزہ براندام تھے۔ اکرام شیخ نے ساری کرنسی اپنی ٹیکسی میں منتقل کی۔ اس کی مجموعی مالیت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ لاکھوں روپے پاکستانی کرنسی میں تھے اور واتنے ہی انڈین کرنسی میں۔ ڈالر تھے اور پاؤنڈ اسٹرلنگ۔

میں نے آخر میں تینوں بنگالیوں کو ایک ساتھ کھڑا کیا اور ان کی فرد جرم انھیں پڑھ کے سنائی جس میں ان پر ملک اور قوم سے غداری، ملکی سالمیت کے خلاف سازش اور تخریب کاری جیسے سنگین الزامات شامل تھے۔

"تم کو اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟" میں نے کسی جج کی طرح سوال کیا۔

"یہ... تم کیا کر رہے ہو؟" پروفیسر نے پیش آنے والے واقعات کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہم انصاف کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم قتل کر رہے ہو انصاف کے نام پر۔ کس نے دیا ہے تم کو یہ عدالتی اختیار؟" پروفیسر نے کہا۔ "اگر تم اصول کی بات کرتے ہو اور اصول کی جنگ لڑ رہے ہو تو پھر یہ بے اصولی کیوں؟ ان کو قانون کے حوالے کرو۔ ثبوت شہادت سب موجود ہے۔"

میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا۔ "اپنی احمقانہ نظریاتی اور کتابی باتیں میرے سامنے مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جیسے لوگوں نے قانون کو کتنا کھوکھلا اور بے مصرف کر دیا ہے۔ پورا نظام انصاف ایک تماشا بن گیا ہے۔ انصاف کے نام پر ایک ڈراما جس میں فلمی فارمولے کے مطابق حق کی فتح اور باطل کی شکست نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید ہمیں کچھ بھی تو نہ کرنا پڑتا۔ وہ سب جو ہم کر رہے ہیں۔"

"اور اگر ہم نے فیصلہ اسی وقت نہ کیا۔" محسن نے کہا۔ "تو یہ لوگ اور ان کی پشت پناہی کرنے والے ہاتھ سارے نظام انصاف کو خرید لیں گے۔ ناکارہ بنا دیں گے۔"

پروفیسر کچھ نہیں بولا۔ وہ اچانک دہشت زدہ نظر آنے لگا تھا جیسے اس عدالت انصاف میں اگلی پیشی خود اس کی ہو۔

"یہ ایم آر ایس کی عدالت ہے جس کا فیصلہ حتمی، قطعی طور پر منصفانہ، شک و شبے سے بالاتر اور کامل یقین کی بنیاد پر ہوتا ہے۔"

"ایم آر ایس؟"

"مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔ یہ ہماری تنظیم کا نام ہے جو طاقت کے زور پر صرف وہی کام کرتی ہے جو ضروری ہیں اور صحیح ہیں۔ قانونی، اخلاقی اور معاشرتی یا مذہبی اصولوں کے عین مطابق ہیں۔" میں نے کہا اور پھر بنگالیوں سے مخاطب ہو گیا۔

"تم لوگ اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہو؟"

ایک بنگالی چیخنے لگا۔ "ہم... کوئی جرم نہیں کیا شالا گنڈے... تم قاتل ہے۔ بنگالی قوم کا قاتل ہے...!"

میری گولی نے اس کے حلق میں سوراخ کر دیا۔ اس کی آواز ایک آخری بھیانک چیخ اور پھر ایک کریہہ غراہٹ میں ڈھل گئی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے گلے پر جم گیا مگر اس طرح وہ اپنے لہو کو ابلنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ خون جو سرچشمۂ حیات تھا اور جسم کا روح سے رشتہ استوار رکھتا تھا فرش پر اقبال جرم کی تحریر بن گیا تھا۔ اس کی روح پر شاید گناہ بھی زیادہ تھا کہ اسے نکلنا مشکل ہوا۔

باقی دو اس کے نزع کا کرب دیکھ کر اپنے آخری وقت کا تصور کر رہے تھے۔ انھوں نے نیم دیوانگی کے عالم میں ہاتھ جوڑ کے رونا دھونا اور گڑگڑانا شروع کیا۔ وہ زمین پر لوٹ رہے تھے اور میرے پاؤں پکڑنا چاہتے تھے۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ ایک ایک گولی سے میں نے ان کو بھی قید حیات سے آزاد کیا۔ ہمیشہ کی طرح یہ احساس میرے لیے باعث تقویت بنا کہ ان غداروں کے ختم ہو جانے سے میرے وطن کے دشمنوں کی قوت کچھ کم ہو گئی۔

پھر ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ پروفیسر نے ایک جست لگائی اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کرتا، وہ بجلی کی طرح لپکا اور باہر نکل گیا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا۔

"تم لوگ باہر آ جاؤ۔" میں نے جاتے جاتے چیخ کر کہا۔

پروفیسر تہ خانے سے بھی نکل چکا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ آخری دروازے پر تھا۔ میں نے اسے آواز دی اور پھر گولی چلائی۔ اس نے اوپر سے ایک بھاری پتھر لڑھکا دیا جو کئی من وزنی چٹان کا ٹکڑا تھا اور شاید برسوں سے دروازے کے قریب ہی موجود تھا۔ پروفیسر کو فوراً نظر آ گیا۔ زندگی کے دفاع

کے لیے اس کے جسم کی ہر حیوانی جبلت بیدار ہو چکی تھی۔ قتل و خونریزی کے بیہودہ منظر جو اس نے دیکھے حقیقی تھے۔ کسی فلم کا حصہ نہیں تھے۔ اس کے اعصاب پر خوف غالب آ گیا۔ ہم نے تو اسے وقتی طور پر زیر غور کر دیا تھا مگر نہ جانے کیسے اسے شک ہو گیا کہ ہم معاف کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔

بھاری پتھر بڑی آواز کے ساتھ سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ میں کوئی سپرمین یا ٹارزن ہوتا تو اس کی متحرک قوت کو اپنے زور بازو سے ختم کر دیتا اور پتھر کو روک کر ایک کنکر کی طرح باہر اچھال دیتا۔ وہ ایک سیکنڈ یا اس سے بھی کم وقت تھا جس میں خدا نے مجھے عقل کی رہنمائی دی۔ میں ایک دم پلٹ کے بھاگا۔ ایک ساتھ میں دو دو تین تین سیڑھیاں چھلانگ کے نیچے پہنچا تو وہ چٹان میرے تعاقب میں تھی۔

میں نے چلا کے محسن اور اکرام شیخ کو خبردار کیا لیکن وہ پہلے ہی شور سے ہوشیار ہو گئے تھے۔ محسن نے ایک جھٹکے سے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ اسی وقت دھماکا ہوا اور وہ چٹان کا ٹکڑا جو اتنا بڑا تھا کہ میرے دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ میں نہ آتا، فرش پر گرا اور اپنے ہی زور میں آگے نکل گیا۔ اس کی شکل ایک بے ہنگم گولے جیسی ہو گئی تھی مگر اس کے کنارے تھے تو وہ نشیب کی جانب سفر میں ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ یہ بھاری بھرکم پتھر مطیع الرحمان اور جناب کی لاشوں کو کچلنے کے بعد ساکت ہو گیا۔

صرف ایک لمحے کے لیے میں نے وہ بھیانک منظر دیکھا۔ دونوں لاشوں کی جگہ اب گوشت پوست کے لوتھڑے سے رہ گئے تھے۔ ایک لاش کا صرف ایک ہاتھ سلامت رہا تھا۔ دوسری لاش کا سر بچ گیا تھا۔ باقی سب پس گیا تھا۔ خوف کی ایک سرد لہر نے مجھے مفلوج سا کر دیا۔ اگر مجھ سے سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر ہو جاتی اور میں ایک قدم بھی آگے بڑھ جاتا تو اس وقت میرا اپنا جسم سیڑھیوں پر ایسے ہی ریشہ ریشہ بوٹی بوٹی ہو چکا ہوتا۔

محسن کو ابکائی آئی تو میں چونکا۔ اب اوپر سے کوئی پتھر نہیں آ رہا تھا۔ شاید پروفیسر وہ چٹان لڑھکانے کے بعد فرار ہو گیا تھا۔ میں نے محسن کو اوپر کی جانب کھینچ لیا۔

"چل حوصلے سے کام لے۔ باہر تازہ ہوا میں تیری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"شیخ! تم اسے لے کر ٹیکسی تک چلو۔" میں نے آگے نکلتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا اس پروفیسر سے نمٹ لوں۔"

باہر خاصا اجالا تھا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ لیکن پروفیسر اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے نکل گیا تھا۔ میرے چاروں طرف جھاڑیاں تھیں اور پتھریلی چٹانوں والی زمین تھی۔

یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کہیں چھپ گیا ہو۔ میں نے محتاط ہوتے ہوئے زمین پر اس کے قدموں کے نشان تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں ایک نہیں سیکڑوں نقش قدم تھے۔ کوئی پیشہ ور کھوجی ہی کسی ایک نقش قدم سے کسی سمت کا تعین کر سکتا تھا۔

اطمینان کی بات یہ تھی کہ پروفیسر اب مسلح نہیں تھا ورنہ وہ کسی بھی طرف سے مجھے گولی کا نشانہ بنا دیتا۔ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ میں اس ویرانے کو چھان ماروں مگر خود پروفیسر اپنے خوف کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ریوالور دیکھا جو میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ چنانچہ اس کی نظر میں میرا وجود فرشتۂ اجل کی طرح تھا جس نے اسے دیکھ لیا تو فوراً اس کی روح قبض کر لے گا۔ وہ پاگل ہو چکا تھا۔ اس نے فرشتۂ اجل کو مار ڈالنے کا سوچا۔

توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح ایک پتھر آیا اور پشت کی جانب سے میرے شانے پر لگا۔ چند انچ کے فرق سے پروفیسر کا نشانہ خطا ہو گیا اور مجھے خدا نے گویا نئی زندگی دی۔ ورنہ وہ پتھر میرے سر کے پچھلے حصے پر لگتا تو میرا کام تمام کر دیتا۔

درد کی شدت نے مجھے بے اختیار چلانے پر مجبور کر دیا۔ میں تڑپ کے پلٹا اور اگرچہ ضرب سے میرا بازو مفلوج ہو رہا تھا مگر میں نے اس سمت میں فائر جھونک دیا جدھر سے پتھر آیا تھا۔ اس کا یہ فائدہ بھی ہوا کہ دوسرا پتھر مجھے چھوئے بغیر دو فٹ کی دوری سے گزرا۔ پھر میں بازو کی تکلیف کو بھول کے دوڑا۔ میں نے سخت غصے میں پروفیسر کو ایک اتنی ہی بڑی گالی دی جتنی بڑی چٹان اس نے مجھ پر لڑھکائی تھی۔

پروفیسر ایسے بھاگا جیسے جھاڑی میں سے اچانک خرگوش نکل کے بھاگتا ہے۔ وہ اب رعایت کا مستحق بھی نہیں رہا تھا اور خود میری ذہنی کیفیت کسی حد تک انتقامی ہو رہی تھی۔ میں نے نشانہ لے کر فائر کیا۔ وہ بھاگتے بھاگتے دو فٹ اوپر اچھلا اور پھر منہ کے بل ایک جھاڑی میں گر گیا۔ اس کا جسم جھاڑیوں میں غائب ہو گیا اور نہ جانے کیسے اس کی دونوں ٹانگیں تھوڑی سی اوپر اٹھی رہ گئیں۔ وہ ٹانگیں کچھ دیر یوں ہلتی رہیں جیسے وہ..... سر کے بل کھڑا رہ کے ہوا میں سائیکل چلا رہا ہو۔ شاید بچپن میں کوئی کرتب تھا جس میں پروفیسر الٹا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ ان ٹانگوں کی حرکت سست پڑنے لگی۔ پھر گھٹنوں کے پاس سے اس کے پاؤں ڈھلک گئے۔

میں واپس آیا تو محسن اگلی سیٹ پر سر کو پیچھے ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوا تھا۔ اکرام شیخ نے ٹیکسی اسٹارٹ

www.paksociety.com

کر دی تھی۔
"کیا ہوا؟" اکرام نے شاید میری صورت سے ان ہونی کا اندازہ کر لیا جو میں برداشت کر رہا تھا۔
"کچھ نہیں۔ حرامزادے نے پیچھے سے پتھر کھینچ مارا،" میں نے کہا اور ریوالور پچھلی سیٹ پر پھینک کے خود بھی گر گیا۔
محسن نے سر گھما کے مجھے دیکھا۔ "اچھر کر سانس لو۔"
"ٹھیک ہے یار۔ ہڈی نہیں ٹوٹی،" میں نے کہا۔
"ہڈی کی بات کرتا ہے،" اکرام نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔ "شکر کر کھوپڑی بچ گئی۔ خالی ناریل ٹوٹ جاتا۔"
"یار محسن — یہیں سے فون کر لے۔ میں نواب مجھے پر نہیں چڑھ سکتا،" میں نے شانے کو دباتے ہوئے کہا۔
"آگے تو آبادی شروع ہو جائے گی۔"
"آبادی تو یہاں بھی ہے لیکن صبح صبح شاید وہی اٹھتے ہوں گے جن کو حکیم نسخے میں لکھتا ہو گا کہ نہار منہ دوا کھانی ہے۔"
"نہار منہ — نہاری — آہ،" محسن بولا۔ "ناشتے میں نہاری۔ اس خیال سے میری بھوک جاگ اٹھی ہے۔ میرا پیٹ چوہوں کا ریس کورس بن گیا ہے۔"
"بھول جا پاپی پیٹ کو،" اکرام شیخ نے ٹیکسی کو ایک کنارے پر روک دیا۔ "اس بجلی فون کے کھمبے کو دیکھ۔ اوپر جا کے تازہ ہوا کھا۔ دماغ کو فرحت حاصل ہو گی۔"
"اور — مشرق سے نکلتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھو،" میں نے کہا۔ "یہ حکم شاعر مشرق نے دیا ہے۔ تیری آنکھیں روشن ہوں گی۔"
"چڑھ جا بیٹا سولی پر رام بھلی کریں گے،" اکرام شیخ نے کہا۔
"میں ایک فاقہ زدہ مصیبت کا مارا نحیف اور نازک جسم ہوں،" محسن نے رونی شکل بنا کے کھمبے کو یوں دیکھا جیسے وہ ایفل ٹاور ہو۔ "کیوں مجھے سولی چڑھاتے ہو۔ میرا خون تمہاری گردن پر ہو گا۔ اگر میں آدھے راستے میں ہی اللہ کو پیارا ہو گیا اور پھر گروں گا تیرے۔"
"کوئی بات نہیں۔ بس خیال رکھنا کہ کھمبا نہ گرے۔ سرکاری پراپرٹی ہے،" اکرام شیخ نے کہا۔
محسن نے کھمبے پر چڑھنا شروع کیا۔ میں اسے نیچے سے ہدایات دیتا رہا۔ "دیکھو پہلے انکوائری سے نمبر مانگ لینا۔ کمشنر سے یا ڈی آئی جی سے بات کر لینا۔ انھیں بتا دینا..."
محسن اوپر تک پہنچا اور پھر نیچے اتر آیا۔
"کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "فون کیوں نہیں کیا؟"
"کیا ضرورت ہے صاحب؟" وہ خفگی سے بولا۔ "تم ایسے چلا چلا کے

بات کر رہے تھے کمشنر اور گورنر کے کانوں تک تمہاری آواز پہنچ گئی ہو گی۔ کیا سمجھا ہے آخر تو نے مجھے؟ لٹل چیپ بولنا آتی ہے... ہدایات نشر ہو رہی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکم چلانے کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے؟"
"تم جیسے ٹٹو کے ایک ادنیٰ ماتحت ہو،" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "حکم عدولی کی سزا معلوم ہے؟"
"ہاں۔ ناشتے میں نہاری نہیں ملے گی،" اکرام شیخ نے کہا۔ "دیر سے جانے والوں کو خالی دیگ ملتی ہے۔"
بالآخر وہ پھر کھمبے پر چڑھا اس شرط کے ساتھ کہ اب کوئی نہیں بولے گا۔ معلوم نہیں اس نے کسے فون کیا اور کیا کہا تاہم مجھے پورا بھروسا تھا کہ اس نے وہی کیا ہو گا جو میں کرتا۔ وہ محض انتہائی کشیدگی کا نتیجہ تھا کہ میں اس کو ہدایت دینے لگا تھا اور وہ بھی برا مان گیا تھا۔
دس منٹ کے بعد وہ اتر آیا۔ "آج بہت عرصے کے بعد صبح کا سورج دیکھا۔ بالکل انڈے کے جیسا ہے۔"
"بکس کے جیسا،" میں نے کہا۔
"شہلا کے چہرے جیسا،" وہ آگے بیٹھ کے بولا۔
"یہ کیا گڑبڑ ہے،" میں نے احتجاج کیا۔ "کل چاند جیسا تھا تو آج سورج کے جیسا کیوں ہو گیا اور کیسے ہو گیا؟ آخر مجھے بھی تو رابعہ کے لیے کوئی تشبیہ استعمال کرنی ہے۔"
"اوکے اوکے،" محسن بولا۔ "میں ترمیم کر دیتا ہوں اپنے بیان میں۔ رابعہ کے چہرے جیسا تھا مگر آج کے بعد بھی رابعہ کے چہرے کو چودھویں کا چاند مت کہنا ورنہ پچھتاؤ گے۔"
"ابھی پچھتا نہیں ہوں میں کہ ابھی تیرا سوگ چاند کا انگ آ رہا سورج کا مالک،" میں نے کہا۔ "مگر ایک بات تم ضرور بولیں گے کہ چاند کی اپنی روشنی نہیں ہوتی۔ وہ سورج کی لائٹ سے چمکتا ہے۔ یعنی واقف کا چہرہ اصلی نہیں ہے۔ بس رابعہ کا ہیولا ہے اس میں..."
یہ گفتگو نہاری شاپ تک چلی۔ جب ہم پرانے والی نالی کی نہاری سے پیٹ بھر کے روانہ ہوئے تو سب کا ایک سا حال تھا۔ کوئی بھی صبح سویرے اتنی مرچیں کھانے کا عادی نہ تھا۔
"شاید اس کا نام نہاری ہے شیفتہ — کہ آگ سی ہے پیٹ کے اندر لگی ہوئی،" میں نے کہا۔
"ابھی میرے منہ سے شعلے نکلیں گے،" محسن نے کہا۔ "جیسے جادوگر نکالتے ہیں۔"
"میں خود کو کسی اسٹیم انجن کے بائلر کی طرح محسوس کر رہا ہوں،" اکرام شیخ نے اتفاق کیا۔ "سیٹی بجانے کو دل چاہتا ہے۔"
"جو سیٹیاں میرے کانوں میں بج رہی ہیں،" میں نے کہا۔ "

کیوں مار رہے ہیں؟..."
چائے کی فوری طلب مٹانے کے لیے ہم مسکیلو روڈ کے ایک نیم صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں رک گئے اور وہ چائے پی جو کراچی میں اسپیشل کہلاتی ہے۔ اس میں چائے کے سب اجزا الگ الگ پیش کیے جاتے ہیں۔ ورنہ صرف چائے کا مطلب ہوتا ہے "یعنی سیاہ ورد پتی کا انسباپ پاوڈر کا گاڑھا شربت جس میں ہر چیز زیادہ ڈال دی جاتی ہے۔"
"ان کی بیٹی بہت پریشان ہو گی،" محسن نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ "کہیں ہم اسے چھوڑ کے بھاگ تو نہیں گئے۔"
"ہمارے بھاگ جانے سے وہ پریشان نہیں ہو گی،" میں نے کہا۔ "شکر ہے صرف تیری ہو گی جس کے ساتھ گزاری ہوئی رات دے۔"
"یار تم لوگ زبردستی اس کا اور میرا عشق مت کراؤ،" محسن بگڑ کے بولا۔ "اس کا دل رکھنے کے لیے میں کچھ نہیں کہتا لیکن تم حد سے بڑھے یا وہ حد سے بڑھی تو میں سب کی ایسی تیسی کر دوں گا۔"
"مگر اس کا دل آ گیا ہے تجھ پر تو اس کا کیا ہوگا، کیا قصور ہے،" میں نے کہا۔ "اسے کون روک سکتا ہے؟"
"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت..." اکرام نے کہا۔
"کیا فائدہ؟ بعد میں اس کی دل شکنی ہو گی،" محسن بولا۔
"نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ بددل ہو کے اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ جائے۔ ہم اسے نئی زندگی کی طرف لے جا رہے ہیں اور وہ تیرا ہاتھ تھام کے آگے بڑھنا چاہتی ہے تو تجھے اپنا ہاتھ نہیں چھڑانا چاہیے،" میں نے کہا۔ "وہ لڑکی بری نہیں ہے۔"
"یہ میں نے کب کہا ہے،" محسن خاموش ہو گیا۔
"حالات نے اسے برا بنا رکھا تھا۔ ہم اس کے حالات سنوار دیں گے۔ جب وہ سنبھل جائے گی تو اس سچ سے بھی اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ... یہ ایک کھیل تھا یا وہ جھوٹ تھا جو کسی کی جان بچانے کے لیے بولنا پڑتا ہے..."
ساڑھے آٹھ بجے ہم پھر بندرگاہ کے اس علاقے میں تھے جہاں سے میں نے اس رکشا کا تعاقب شروع کیا تھا اور پھر یہ تعاقب ایک رات میں کہاں سے کہاں لے گیا تھا۔ بندرگاہ کی چہل پہل اور گہما گہمی دوپہر تک... کاروبار حیات اور زندگی کے معمولات اسی طرح جاری تھے۔ زندہ اور مصروف انسانوں کو نہ خبر تھی اور نہ سروکار تھا کہ اس شب کا قہر بستے تک کس کس کی زندگی کا چراغ گل ہوا اور حیات مستعار کس کس کو... زیادہ ہو گئے اور کتنے تجربے ہوتی کا... کراچی کی فٹ پاتھوں پر سٹہ کھیلنے والوں تک کتنے جواری سب کچھ ہار کے کنگال ہو گئے اور کتنے جیت کے دولت مند ہو گئے۔ نیویارک کی حصص مارکیٹ سے کلکتہ کے قحبہ خانوں تک

کتنے سودے ہو گئے۔
میں اور محسن اس جگہ سے کافی فاصلے پر اتر گئے تھے جہاں اکرام اپنی ٹیکسی کھڑی کرتا تھا۔ وہاں اس وقت بھی تین ٹیکسیاں ایک قطار میں موجود تھیں۔ ہم پیدل چلتے ہوئے گزرے تو ہم نے اکرام شیخ کو اپنے ہم پیشہ ڈرائیوروں کے ساتھ ایک میز پر گپ لگاتے دیکھا۔ کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ رات بھر کہاں رہا۔ صبح وہ ان سب کی طرح ٹیکسی لے کر نکل کھڑا ہوا تھا جو رات بھر آرام سے اپنے اپنے گھروں میں سوتے تھے۔
اپنے حلیے سے ہم غیر ملکی سیاح نظر آتے تھے اور آس پاس لگی گل فروش میں کر رہتے تھے۔ اس کے باوجود امیگریشن کے عملے کے ایک افسر نے ہمیں پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ایک ماتحت بھی تھا۔
"پاسپورٹ پلیز،" وہ ہاتھ پھیلا کے بولا۔
میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کو احمقوں کی طرح دیکھا اور نفی میں سر ہلا کے کہا، "نو انگلش۔"
"یہ فرنچ کچھ پبلک کے کچھ نہیں ہے،" محسن نے مسکرا کے فرنچ میں کہا۔
"یہاں سب کچھ نہ کچھ پیدا کرنے کے چکر میں ہیں،" میں نے بھی مسکرا کے اقرار کیا۔
"فرنچ؟" وہ سر کھجا کے بولا پھر اس نے ہمیں ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور ماتحت سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو خان صاحب ہیں یا چلے گئے۔ ان کو فرنچ آتی ہے۔"
"لے مروا دیا۔ یہ کون فرنچ جاننے والا نکل آیا؟" محسن بولا۔ "اب کیا ہو گا؟"
"کچھ نہیں ہو گا،" میں نے کہا۔ "جب سب بگڑے کام بنتا ہے تو دیکھو تماشا۔"
بڑی رازداری کے ساتھ میں نے اس کے کان کے قریب جھک کر کہا۔ "ٹین ڈالرز۔"
وہ چونکا اور پھر زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔
میں نے انگلی اٹھا کے کہا، "تو ٹھیک،" یہ گویا آخری بات تھی۔
"ففٹی —" اس نے ہم دونوں پر انگلی رکھ کے کہا۔ یعنی دو کا سو ہے۔ "جتنے ڈالر تمہیں دو اور جاؤ، قانون کو خرید لو۔"
"تو ٹھیک فائیو،" محسن نے کہا اور ہم دونوں اطمینان سے یوں ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے جیسے اب کسی کو کچھ نہیں کہنا ہے۔ اور آگے بات خان صاحب کے آنے پر ہی ہو گی۔
"ہاں ٹھیک ہے پچاس اور بات پکی،" محسن بولا۔ "ورنہ اس کا باپ آ جائے گا تو کیک ورشہ... معاملہ بہت لمبا ہو جائے گا۔"
"اسے تو میں بتا دوں گا کہ کاغذات شپ پر رہ گئے ہیں اور ہم

www.paksociety.com

لینے جا رہے ہیں مگر تمہارا یہ ساتھی رشوت مانگ رہا ہے۔ پانچ سو ڈالر۔ ہم پولیس کے پاس جانا پسند کریں گے اور اس بدمعاش کی رپورٹ کونسلیٹ کو بھی دیں گے۔ دیکھنا اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "نوکری کے لالے پڑ جائیں گے۔"

میرے مقابل کھڑا ہوا شخص دو الفاظ پر چونکا۔ ایک پولیس کے نام پر اور دوسرا کونسلیٹ کے ذکر پر۔ پھر جیسے دور سے اس کا ماتحت ایک اور شخص کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔

"او کے۔ تو تین سو ڈالر۔" وہ جلدی سے بولا۔

میں نے ایک تجاہل میں سے ڈالر نکالے اور اسے پانچ پانچ ڈالر کے پانچ نوٹ تھما دیے تو اس نے بڑی صفائی سے جیب میں ڈالے اور اس عمل میں اتنی پھرتی دکھائی کہ زمان صاحب کو قریب آجانے کے باوجود خاک پتہ نہ چلا۔

"کیا ہو گیا بھئی؟" اس شخص نے قریب آکے کہا جو فرنچ جانتا تھا اور زمان صاحب کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

"کچھ نہیں۔ یہ فرانسیسی سیاح ہیں۔ کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے شاید ہوٹلوں کے بارے میں۔" رشوت خور نے بات ختم کرنے کے لیے مسئلہ ہی بدل دیا لیکن زمان صاحب بھی اسی تالاب کی مچھلی تھے اور اتنی آسانی سے نہیں ٹل سکتے تھے۔

"اس شخص نے آپ لوگوں کو پریشان تو نہیں کیا؟" زمان صاحب نے فرانسیسی میں سوال کیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔ "اس شریف آدمی نے تو ہماری مدد کے لیے آپ کو بلایا ہے۔"

"آپ بتائیں کہ ہم کراچی کے کس ہوٹل میں قیام کریں جہاں ہمیں فرنچ شراب اور لڑکی آسانی سے اور سستی مل جائے۔" محسن نے کہا۔ زمان صاحب خاصے مایوس ہو گئے۔

"میں کوئی ہوٹل گائیڈ نہیں ہوں۔" وہ بے رخی سے بولا۔ "اور تم جیسے شریف آدمی کس سے ہو؟ یہ ایک شہر کا حرام خور ہے تم نہ جانے کیسے پہنچ گئے اور یہ تو اپنے باپ کو نہ بخشے۔"

"کوشش تو اس نے کی تھی مگر ہمارے پاس تمام دستاویزات ہیں اور ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔

اچانک میں نے لوگوں کے رواں دواں ہجوم میں ایک آشنا چہرہ دیکھا۔ یہ دوست محمد کا چہرہ تھا جو ایک پراسرار شخصیت رکھتا تھا۔ اس کو رابعہ نے اپنا محافظ اور مددگار قرار دیا تھا۔ مگر وہ چاند بھائی کا خاص آدمی تھا۔ چاند بھائی کی شخصیت بھی مشتبہ تھی۔ میں ابھی تک یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ وہ رابعہ کو اپنی تحویل میں رکھنے پر کیوں بضد ہے۔ اس لیے کہ وہ رابعہ کی چاہت میں گرفتار ہو گیا ہے؟ یا پھر والو اور ایجنسی کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ رابعہ اس کی قید میں ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ہمارا ساتھی ہے یا ظاہر دوست ہے یا رقیب۔ اس نے سامنے آئے بغیر ہماری مدد کی تھی تو اس کا مقصد کیا تھا۔ یہ مقصد نیک نیتی پر مبنی تھا یا اس کے پیچھے ذاتی مفاد تھا۔ اگر وہ ہمارے مقاصد سے اختلاف نہیں رکھتا تو پھر لالو جیسے شخص کے ساتھ کاروباری مراسم کیوں رکھتا تھا۔ یہ ایک ایسا تضاد تھا جس کا جیسے میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا لیکن محسن کی موت اور زندگی کا جذبہ دیکھ کر میں اپنے خیالات بدلنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اگر ایک ڈاکو محب وطن ہو سکتا ہے تو ایک اسمگلر کیوں نہیں ہو سکتا۔ اب مجھے یہ ناممکن نظر نہیں آتا تھا کہ چاند بھائی کے کاروباری تعلقات والو سے ہوں لیکن وہ والو کے ملک دشمن جرائم میں شریک نہ ہو۔

دوست محمد ایک کرسی کی پشت پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ آتے جاتے بہت سے لوگ اس سے دعا سلام کر جاتے تھے۔ نصف صدی انہی لوگوں میں گزارنے کے بعد وہ ماہی گیروں، ملاحوں، ہر قسم کے جہازیوں یا لانچوں کے عملے اور بندرگاہ کے علاقے میں کام کرنے والوں کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔

میں نے زمان صاحب اور ان کے ساتھی کو جاتے دیکھا اور اس وقت تک انتظار کیا جب تک کہ وہ ایک عمارت میں جا کے غائب نہیں ہو گئے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہمیں دوست محمد سے بات کرتا دیکھیں اور پھر بعد میں دوست محمد کے پیچھے پڑ جائیں کہ وہ فرنچ سیاحوں سے کیا بات کر رہا تھا۔ میں نے دوست محمد پر نگاہ رکھی کہ کہیں وہ اچانک نظر سے نہ چلا جائے۔

دوست محمد ایک سے حلیوں والے دو افراد کو اپنے مقابل دیکھ کے حیران ہوا جو غیر ملکی نظر آتے تھے۔ دوست محمد کے پاس کھڑا ہوا ایک نوجوان لڑکا ہنسنے لگا۔

"استاد! ابھی یہ کیسا کارٹون آ ٹپکا ہے باہر سے۔"

"یہ ہپی ہیں۔" دوست محمد نے اسے سمجھایا۔

"ایک مانگ، مجبورا داڑھی، اتنا لمبا بال، یہ فقیر لوگ ہے استاد یا حجامت کا پیسہ نہیں ہے؟" لڑکا بولا۔ "سالا کیسا بدمعاش لگتا ہے دونوں۔ انگریزی میں بات کرے گا۔"

"دوست محمد!" میں نے آرام سے کہا۔ "کیا حال ہے؟"

دوست محمد تو خیر چونکا مگر وہ لڑکا اس طرح اچھل پڑا جیسے اس کو بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ کچھ کہے بغیر وہ رفو چکر ہو گیا۔

"تم ... سکندر ہے؟" دوست محمد نے تھوڑا سا غور کرنے کے بعد کہا اور پھر محسن کی طرف دیکھا۔

"ہاں میں محسن ہوں۔ تم نے کیسے پہچانا؟"

"تمہارا آواز سے۔" دوست محمد بولا۔ "ہم سمندر کا لوگ مردوں کو بھی آواز سے پہچانتا ہے، طوفانوں کو بھی۔ آواز سنتا ہے اور بتاتا ہے کہ انجن میں خرابی کیا ہے۔ آواز سے ہم سمندر کا سب مخلوق کو پہچانتا ہے۔ تم تو انسان ہے بابا!"

"چاند بھائی کہاں ہے دوست محمد؟" محسن نے اس کی خوشامد کو نظر انداز کر کے کہا۔

"ابھی یہ کیسا سوال ہے۔ تم کیا چاند بھائی کا سیکریٹری ہے؟"

"ہم سیکریٹری سے زیادہ ہو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم اس کے دوست ہو۔"

"چھوڑو بابا! ادھر کون کس کا دوست ہے۔ سب یار مطلب کا ہوتا ہے ... چاند بھائی، سورج بھائی ..." وہ بات بے بنسی پر اتر آیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ اس پر تھوڑا سا نشہ غالب ہے۔ اس نے شراب یا چرس بھری سگریٹ پی رکھی تھی۔ مجھے وہ کچھ بیمار اور کمزور بھی لگا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ سفید بال اس کے کرخت نقوش والے سیاہ چہرے پر بد نما لگتے تھے۔

"دوست محمد! اگر تم شرافت سے نہیں بتاؤ گے ..."

"ارے بابا! بڑا شرافت مرافت کا بات کرتا ہے۔" وہ چلانے لگا۔ "ہم سالا بڑا شریف ہے!"

وہی لڑکا نہ جانے کدھر سے دوڑتا ہوا آیا۔ "اٹھ استاد! ابھی چلو میرا ساتھ۔ ایک کام ہے۔"

"نہیں ادھر سے ..." دوست محمد نے اسے گالی دی۔ "ہم سے کو کام بات کرے گا تو تیرا فوٹو بنا کے دے دیا گا، سالا ..."

"استاد! کام نہیں کرے گا تو ... گزارا کیسے ہو گا؟" لڑکا رکھائی لہجے میں بولا۔ "آخر کب تک نہیں کرے گا کام؟ یہ نشہ مشہ بھی کیسے ہو گا؟ کھائے گا کدھر سے؟"

"تیرے کو کا ہے کا فکر ہے ..." دوست محمد نے اسے ایک موٹی گالی دے کر کہا۔

"استاد! ہم کو فکر ہے۔ کب سے کام نہیں کیا تم ... تمہارا بہت نقصان ہو گیا۔ دوسرا لوگ تمہارا کام لے لیا۔ ابھی جو کام ملتا ہے تم نہیں کرتا۔ وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ پھر کوئی نہیں پوچھے گا تم کو۔ اپنا ہاتھ مجبور کر دیا کاروبار تمہارے بغیر نہیں چلیں گا۔ سب چلتا ہے استاد۔ کام نہیں کرے گا تو کسی کام کا ہے تم کیا کرے گا؟ بھیک مانگے گا؟"

دوست محمد مشتعل ہو کے اٹھا۔ "تیری ..." وہ بہک کے بولا۔ "تم کو بڑا فکر ہے کام کا! تم کون ہے سالا؟"

"ہم بیٹا ہے تمہارا، تم خود بولا۔"

"بھاگ جا ... دفع ہو جا ..." دوست محمد اسے مارنے دوڑا۔ "سالا اپنا باپ بنا نہیں پھر کو کیسے بولتا ہے کہ میرا بیٹا ہے۔" اس نے ایک پتھر اٹھا کے مارا مگر وہ لڑکا پھرتی سے فرار ہو گیا۔ مجھے دوست محمد کی یہ حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کتنا اچھا ملاح ہے اپنی مہارت اور تجربے سے فائدہ اٹھا کر وہ بہت کما رہا تھا لیکن اب شاید نشے کی حالت میں وہ خود کو تباہ کر رہا تھا۔

"سیٹھ سکندر! ابھی ہم تم کو ایک بات بتائے گا۔" وہ پھر اس تھڑے پر بیٹھ گیا۔ "تمہارا مطلب کا بات ہے مگر ایسے نہیں بتائیں گا۔ پیسہ دیں گا تو بتائیں گا۔"

"کتنا پیسہ چاہیے تمہیں دوست محمد؟" میں نے کہا۔

"کتنا ہے تمہارے پاس ... پانچ سو دے دو ..." وہ بولا۔

"صرف سو!" میں نے حیرانی سے کہا اور اسے سو کا نوٹ تھما دیا۔ "بات بتاؤ۔" وہ مجھے ایک ویران گوشے میں لے گیا۔

"تمہارا وہ دلبر جانی ہے نا، رابعہ ... وہ ہم کو ملا تھا۔" دوست محمد نے نوٹ کو بتی بنا کے کان میں دیتے ہوئے کہا۔

میرا دل سینے میں اچھلا۔ "رابعہ ... رابعہ ملی تھی تم کو ... کہاں ... کب؟"

"کل ... نہیں ... پرسوں ... ہاں پرسوں۔" وہ سوچ کے بولا۔ دو خستہ دیواروں کے درمیان کھڑا ہوا وہ مجھے ایک بدروح لگا۔

"یہاں ... یہاں آئی تھی وہ؟"

"نہیں ..." وہ نفی میں سر ہلا کے بولا۔ "یہ ہم نہیں بتائیں گا کہ وہ کدھر ملا تھا ... لیکن ادھر نہیں ..."

"اکیلی آئی تھی وہ ...؟" بے صبری سے میرا پیمانہ چھلکنے لگا۔

"نہیں ... چاند بھائی تھا اس کا ساتھ اور وہ بولا کہ دوست محمد ہم تیرے کو ایک بات بولتا۔ سکندر ملے تو اس کو بولنا اب ہم بمبئی میں ملے گا۔ وہ بمبئی چلا گیا۔"

"بمبئی میں کہاں ملے گا وہ؟" میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ "خبیث! پوری بات کیوں نہیں کرتا؟"

"بتاتا ہے ... بتاتا ہے۔" وہ خود کو چھڑا کے بولا۔ "تم مار دیں گا ہم کو تو ہم مر جائیں گا۔ ابھی گردن دبا کے پوچھیں گا تو ہم کیسے بتائیں گا۔" وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

"اچھا اچھا ... غلطی ہو گئی مجھ سے۔" میں نے کہا۔

"ایسے زبردستی مت کر یار۔" محسن نے کہا۔ "دیکھتا نہیں اس کی حالت کیا ہو رہی ہے۔"

"بمبئی میں کہاں گیا ہے؟" دوست محمد نے میلی قمیص کی جیب میں سے ایک مڑی تڑی سگریٹ نکال کے سیدھی کی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اس نے سگریٹ جلا کے ایک لمبا کش لیا۔ "ادھر حاجی علی صاحب کا درگاہ ہے سمندر میں۔ وہ ادھر ملے گا تم کو جمعرات والا دن۔"

"کون سی جمعرات؟ ایک جمعرات تو کل ہے۔"

www.paksociety.com

"ابھی نہیں معلوم... کون سا جعرات کو کوئی بھی نمبرات ہوگا بابا۔ جا کے دیکھو، اور ہم کچھ نہیں جانتا۔" اس نے ایک طویل کش لے کر بدبودار دھواں خارج کیا۔

میں خوشی، بے یقینی، اضطراب اور اشتیاق کے ساتھ درد کی اس کیفیت کو بھی محسوس کر رہا تھا جو امید کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ نااُمیدی کے اندھیرے آسمان میں رابعہ کا خیال کسی ستارے کی طرح چمک رہا تھا مگر اس خبر کے ساتھ جیسے وہ چاند بدلی سے طلوع ہوگئی اور اس کے تصور کی روشنی میرے وجود پہ چھا گئی تھی۔ اس کو میں نے پھر اپنے اتنا قریب محسوس کیا کہ ایک مہربان آشنا خوشبو سے فضا بھر گئی اور پھر کے راستے پہ بچھے ہوئے آزار کے کانٹے امید کے رنگ بھرے پھول بن کے مسکرانے لگے۔

اور ابھی جب ان آنکھوں اور شایاب "ابھی واپس لا" اور جانفزا خبر سنانے کے لیے دوست محمد نے صرف سو روپے مانگے تھے۔ وہ ہزار، دس ہزار، دس لاکھ یا دس کروڑ کی شرط رکھتا تب بھی میں رابعہ کا پتا پوچھنے کے لیے فراہم کرتا خواہ اس کے لیے مجھے اپنے آپ کو بیچنا پڑتا۔ میں بلیک میلر یا مجبوریوں کا خریدار نہیں تھا۔ اسے بس سو ہی روپے درکار تھے جو اس نے آج کی ضرورت پوری کرنے کے لیے مانگ لیے تھے۔ وہ اب گھٹنوں میں سر دیے چپ بیٹھا ہوا تھا۔ محسن نے مجھے کہنی مار کے متوجہ کیا۔ دوست محمد کے پیچھے اس سے کچھ فاصلے پر وہی لڑکا کھڑا ہوا تھا جس کا شانہ سے بلا رہا تھا جسے دوست محمد نے گالیاں دے کر بھگا دیا تھا۔

"یہ کیا ہوا ہے دوست محمد کو؟" میں نے اس کے قریب جا کے کہا۔ "یہ تو بہت محنت والا محنتی اور زندہ دل آدمی تھا۔"

"بتا صاحب! بس ختم ہو گیا ہے۔" لڑکا افسوس کے ساتھ سر ہلانے لگا۔ "ایسا ہانکے رہے گا تو تھوڑے دن میں مر جائیں گا۔ دشمن کا مراد پورا ہوگا۔"

"دوست محمد کا دشمن کون ہے؟" میں نے کہا۔

"صاحب جس کا دوست بہت ہوتا صاحب! اس کا دشمن بھی کم نہیں ہوتا۔" لڑکے نے ایک فلسفیانہ بات کہی۔ "سب اسی کو بلاتا تھا دوسرا آدمی کو اس وقت بلاتا تھا جب دوست محمد نہیں ملتا تھا۔ لیکن دوست کو ہزار دیتا تھا تو دوسرا آدمی کو سو۔ کبھی کوئی شور کرتا تھا تو سب لوگ بولتا تھا کہ بابا ہم ادھر سے دوست محمد کا برابر کرتا۔ وہ ہے اصلی مستری اپنا بہت نامسٹری۔ ایسا بات سب کو برا لگتا۔ صاحب وہ لوگ جل کے ایسا کیا کر اس کو چرس پلا یا اور اس کا عادت ڈال دیا۔ ابھی اس کو کچھ نہیں کرتا ہم سمجھتا اس کو اندر سے کھوکھلا کر رہا ہے۔ پھر اس کا بیٹا لوگ اس کو چھوڑ گیا ہے۔ باقی سب تو پہلے ہی بھاگ گیا تھا۔ اپنا مرضی کا شادی بنا کے کوئی ولایت چلا گیا تھا کوئی ڈبئی۔ ایک لڑکا تھا وہ خیال کرتا تھا باپ کا۔ اُستاد سب اس کو دیتا تھا۔ ہزار یا ہزار صاحب! لاکھوں بنتا تو سب اسی کو دیتا۔ وہ غصہ کرتا مگر اس کا بیٹی ... اس کا مرد وہ خراب کرے۔ وہ کہتا تھا اس بیٹا کو اور حرمت ... وہ خراب لڑکی تھا صاحب۔ اس کو اُستاد بولا کہ جتنا پیسہ اور جو مانگو، میرا ہے۔ تو ہم کو دے گا تو ہم تیرے کو شوٹ کر دے گا۔" وہ چپ ہو گیا۔

"شوٹ کیا...؟" میں نے سانس روک کے پوچھا۔

"نہیں صاحب! استاد تو بس غصے میں بولتا تھا۔ وہ کیسے فیر کر سکتا تھا اپنے بیٹے کا گھر والی کو۔ کیسے مار سکتا تھا۔ مگر صاحب! وہ عورت اس کو پھانسی ہو رہے تو ہم بیان لائے گا۔ اس نے اُستاد کا بیٹا کو زہر دیا۔ بولا کھانے میں خرابی تھا۔ لیکن اُستاد بے وقوف نہیں ہے۔ اس نے پولیس کو بولا کہ لاش نکالو اور اس کا پوسٹ مارٹم کرو۔ صاحب پھر جب لاش نکالا تو پتا چل گیا۔ اس عورت نے پولیس کو رشوت دیا۔ سب الزام کا پیسہ تھا۔ وہ نکل گیا جہاز میں بیٹھ کے۔ پتا نہیں کدھر بھاگ گیا کس یار کے ساتھ۔ ابھی استاد بولتا ہم کچھ نہیں کرے گا۔ صاحب! آپ ہم کو معاف کرو ہم آپ کو گورا سمجھا غلط بات کیا۔"

میں نے اس کے کندھے پہ تھپکی دی۔ "دیکھو کوئی بات نہیں۔ بتاؤ کہ تمہارے استاد کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"آپ کیا کرے گا صاحب! جب وہ خود کچھ نہیں کرتا!"

"میرا مطلب ہے... پیسہ چاہیے؟ اس نے تو صرف سو روپے مانگے تھے۔ ہمارے پاس اب وقت نہیں ہے ورنہ ہم کچھ اور بھی کرتے۔ ابھی یہ کر سکتے ہیں کہ مالی مدد کر جائیں۔ دس بیس ہزار بلکہ ایک لاکھ ہم دے سکتے ہیں اگر استاد کہیں ورکشاپ کرنا چاہے یا اس کو علاج کے لیے درکار ہو۔"

"نہیں صاحب! پیسہ کیا کرے گا... پیسہ تو بہت ہے اس کا پاس بینک میں پڑے لاکھوں کا، پیسے یوں وہ تو بس اِدھر اُدھر ... ان سے سو روپے مانگ لیا اس سے لیا ... ابھی تو کوئی دیتا ہے مگر کب تک دے گا۔ آپ تو اس کا نشہ چھڑا دو۔"

"ہم نشہ چھڑا دیں... وہ کیسے؟ میرا مطلب ہے کہ یہ تو لمبا ہے۔ علاج وغیرہ کرنا پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں صاحب! آپ ساتھ لے جاؤ اسے... آپ کا ساتھ ہوگا تو ادھر سے نشہ کر نہیں سکے گا... پھر جب ٹھیک ہوگا تو بھیج دینا ادھر اسے۔"

میں نے شرمندگی اور دکھ کے ساتھ نفی میں سر ہلا کے کہا۔

"افسوس کہ ہم یہ نہیں کر سکتے۔ ہماری بھی مجبوریاں ہیں کچھ۔"

"بس تو پھر جاؤ صاحب!" لڑکے نے مایوسی کی تلخی سے کہا۔ ایک دم پلٹ کے روانہ ہو گیا۔

"زندگی بھی کبھی کتنی بے رحم ہو جاتی ہے۔" محسن بولا۔

"ہاں اور پھر کچھ لوگ جیسے ہمیں صرف اپنے لیے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "وہ اپنی زندگی دوسروں کو بنانے کے لیے سمجھتے اس کا ایک فیصد بھی نہیں۔"

محسن نے ایک دم مجھے بازو سے پکڑ کے پیچھے کھینچ لیا۔ یہ گیراج یہاں کا ایک موبائل اسٹال تھا جو کسی کار یا ٹرک پر کیبن کی صورت میں بنایا گیا تھا۔ ابھی اس کے چاروں طرف سے کھل جانے والے پٹ مقفل تھے۔ جیسے اس نے پناہ فراہم کی ورنہ وہاں کھڑے ہوئے تمام لوگوں سے الگ دکھائی دیتے تھے۔ ایک شخص جو ابھی ابھی ہمارے قریب سے گزرا تھا، جس کی ہم نے صرف پشت دیکھی تھی اب دوست محمد کے پاس جا کے کھڑا ہو گیا تھا۔

"مجھے اس کی صورت دیکھی ہوئی لگتی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ پہلے والا دولی کا رشتہ والا تھا۔" محسن نے کہا۔ "پھر غائب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد حاجی عبداللہ کے ٹرک پر نظر آیا تھا۔"

"یہاں سے ان کی باتیں سننا مشکل ہے۔"

"لیکن ہم قریب کیسے جا سکتے ہیں؟" محسن بولا۔

"اس ریڑھی کو تھوڑا تھوڑا کھسکا کے جا سکتے ہیں۔ اس طرح کہ حرکت محسوس نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم دو تین فٹ قریب ہو جائیں گے۔"

"کسی نے دیکھ لیا تو؟"

"انشاء اللہ ہے دیکھنے والوں کو بھی دیکھ لیا جائے گا۔" میں نے کہا اور بہانہ میں پہ اس سے پشت لگا کے کھڑا ہو گیا مگر آہستہ آہستہ میں نے ریڑھی کو دھکیلنا شروع کر دیا۔ محسن نے گرد و پیش پہ نگاہ رکھی اور مجھ سے باتیں بھی کرتا رہا۔

"یہ دوست محمد کو سگریٹ کا پیکٹ دے رہا ہے۔ میرا خیال ہے چرس والے سگریٹ ہوں گے لیکن اپنے سکندر صاحب! یہ بندہ تو غائب ہے ایسے چھوٹے کام بھلا کیوں کرے گا؟"

"بھائی! رشتہ داری بھی بہت کچھ کرتی ہے..."

"ابھی دوسری بات تو بس کہتی ہے کہ دوست محمد سے ولادو کے ایجنٹ کا رابطہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ چرس کے سگریٹ تو ویسے کہاں ملتے ہوں گے اور پھر دوست محمد جیسے شخص کو کیا نہیں مل سکتا؟"

اچانک دوست محمد چلانے لگا۔ "او بابا! خدا کا واسطے ہم نہیں جانتا کسی کو۔"

"دوست محمد! تم مجھے نہیں جانتے!" دوسرے شخص نے زہر ناک لہجے میں کہا۔ "میرے ساتھ چالبازی مت کرو۔ تم سے تو بیچ میں ایسے بڑے کو جانتا ہے..."

"مجھ سے کوئی گستاخی مت دے ... کالا، پتا چاچا تو او میرا بیٹا بچہ کے بجائے،" دوست محمد نے کہا۔ "مرنے سے ابھی ہم کیا ڈرے گا...؟"

"دوست محمد! تمہارے مرنے جینے کی بات نہیں تم کو اپنا فائدہ دیکھنا چاہیے۔" دھمکی دینے والے کا لہجہ بدل گیا۔

"فائدہ... ! بہت فائدہ دیکھا، سارا عمر فائدہ ہی فائدہ دیکھا۔ آخر تک کیا ملا؟ صرف نقصان۔" وہ تلخی سے بولا۔

"میں تم کو ایک موقع اور دیتا ہوں اگر وہ دونوں یہاں نظر آئیں تو مجھ کو بتا دینا کہ ان کا حلیہ کیا ہے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ کراچی میں دونا ماتے پھر رہے ہیں۔ انھوں نے اس علاقے میں کہیں ڈیرا جما رکھا ہے مگر وہ ابھی تک سامنے نہیں آئے مگر وہ تمہارے پاس ضرور آئیں گے۔"

"بابا کون آئے گا کیوں آئے گا، یہ بھی تو بولو۔" دوست محمد نے جھلا کے کہا۔

"رابعہ کا یار آئے گا تیرے پاس رابعہ کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے۔" وہ شخص مشتعل ہو کے بولا۔ "تو جانتا ہے نا رابعہ کو یا اسے بھی نہیں دیکھا کبھی؟ وہ تیرے باپ جیسا بھائی کے پاس ہے آج کل۔" اس نے رابعہ کے نام سے ایک ایسی بات کہی کہ میرا خون کھولنے لگا۔

"اگر تو نے کہا نا کہ تیرا چاند بھائی سے واقف نہیں تو میں تیرا سر توڑ دوں گا ابھی۔" اس نے دوست محمد کے سر پہ ریوالور کا دستہ بجا کے کہا۔ "اور تیرا بھیجا نکال کے فراڈ کروں گا اور پھر معلوم ہے کیسے کھلاؤں گا؟ تیری ایک چیز ہے ہمارے پاس۔ وہ تیرا بیٹا تھا جسے اس کی بیوی نے اپنے یار کے ساتھ مل کے مار دیا تھا اور خود بھاگ گئی تھی۔ وہ جاتے وقت اپنی اولاد کو بھی چھوڑ گئی تھی۔ ہم نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا دوست محمد!"

"نہیں یہ جھوٹ ہے... بکتے ہو تم..." دوست محمد چیخنے لگا۔ "میرا پوتا...!"

"ہاں تمہارا پوتا۔ تم سمجھ گئے اسے؟ ملنا چاہتے ہو اس سے؟" وہ بڑی سفاکی سے بولا۔ "ہم اس کو تمہارے حوالے کر دیں گے مگر اس وقت جب تم ہمارا کام کر دو گے۔ اگر انکار کرو گے تو وہی ہوگا جو میں نے کہا۔ اس سے بھی برا ہو سکتا ہے... یہ ہو سکتا ہے کہ ہم تمہارے سامنے تمہارے بیٹے کی نشانی کو ذبح کر دیں پھر اس کا گوشت ... اور فرائی کر کے تم کو کھلائیں۔" اس نے ایک مکروہ شیطانی قہقہہ لگایا۔

دوست محمد پہ دیوانگی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے ایک دم گالیاں دے کر اپنے مقابل کھڑے ہوئے شخص کو ٹکر ماری لیکن حریف جوان اور طاقتور تھا۔ اس نے دوست محمد کو اٹھا کے نیچے پھینک دیا۔ میں ایک دم آگے بڑھا مگر محسن نے میرا بازو پکڑ کے مجھے کھینچ لیا۔

دوست محمد اب اس کے پیروں میں لوٹ رہا تھا۔ "ہم بتا... ابھی بتائے گا لیکن تم کو پتا اس کا قسم پھر تم اس کو دے گا نا؟ اس

www.paksociety.com

"معصوم کو چھوڑ دو۔ میری جان لے لو۔" وہ بڑے افسوس ناک طریقے پر رو رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے میری قوت برداشت جواب دے رہی تھی مگر محسن نے زیادہ ہوش مندی کا ثبوت دیا۔

"تمہارا پوتا ہم تمہارے حوالے کر دیں گے۔"

"دیکھو! ابھی وہ آیا تھا۔" دوست محمد نے دونوں جانب دیکھ کے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "وہ دونوں آیا تھا۔ انگریز کا جیسا بنا ہوا ہے۔ بہادر … بال … ہم سے بات نہیں ہوا۔"

"فکر مت کرو۔ یہ ہولناک کام کی بات۔ شام تک اسی جگہ بیٹھ کے ان کا انتظار کرو۔ وہ پھر آئیں گے اور اس مرتبہ ہم بھی دیکھ لیں گے۔ ہمارا کام ختم۔ تم اپنے پوتے کو لے کر جہاں چاہو چلے جانا۔ ہمارے مددگار بہت ہیں لیکن اس بچے کی مدد صرف تم کر سکتے ہو۔ اور ان کو روک کے رکھنا۔ کہنا کہ وہ بچے کے پاس جانا چاہتا ہے تو انتظار کرو۔ دو آدمی آئیں گے تمہیں اس کے پاس لے جانے کے لیے پھر ہم آ جائیں گے۔ دو آدمی۔" وہ بولا۔

محسن نے مجھے نکلنے کا اشارہ کیا اور ہم بڑی عجلت میں وہاں سے فرار ہو گئے۔ ہمارا مقصد اس وقت خود کو روپوش رکھنے کے علاوہ دوست محمد کے اس ایجنٹ کا تعاقب کرنا اور اس کا سراغ لگانا تھا کہ واپسی پر وہ کس کو رپورٹ کرتا ہے۔ اگر ہم خود اس کے پیچھے جاتے تو پتا ممکن تھا کہ اسے پتا نہ چلے۔ ابھی ابھی دوست محمد نے اسے ہمارا حلیہ بتایا تھا۔ وہ ہمیں دور سے بھی دیکھ لیتا تو پہچان جاتا۔ یہ کام اکرام شیخ بہتر طور پر کر سکتا تھا۔

اکرام شیخ کو اسی ریسٹورنٹ میں موجود پا کے مجھے تھوڑی سی خوشی ہوئی۔

"تم ابھی تک یہیں بیٹھے ہو؟ نقد پر انتظار ہے؟"

"اور کیا کروں؟" وہ بولا۔ "تم لوگ کچھ بتا کے نہیں گئے تھے کہ کب تک لوٹو گے اور وہ سب مال تو میری جیب میں ہی پڑا ہے۔"

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ "ہم بھی کیا ولیٹ لوگ ہیں بار بار اتنی دولت کو بھول گئے۔"

"شیخ جی! دھیان سے ایک بات سنو۔ … کو حاضر کرو اور مگر کسی او ایک … آ رہا ہے۔" محسن نے کہا۔

"مجھ سے ملنے؟"

"وہ ایک شکاری ہے … خصوصی … ابھی وہ دوست محمد سے ہم دونوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ کیا پوچھ رہا تھا یہ ہم فرصت ملنے پر بتائیں گے۔" میں نے کہا۔ "دوست محمد نے ایک مجبوری کے باعث ہمارا اسرار … زمانہ … کیا حلیہ ہے؟"

"مجبوری کیا تھی دوست محمد کی؟"

"یہ بھی ہم بعد میں فرصت ملنے پر بتائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"اس کے پاس ریوالور بھی ہے۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس لیے ہوشیار رہنا۔ جیسے ہی وہ باہر آئے تم ٹیکسی لے کر سائے کی طرح پیچھے جانا۔ اگر وہ کسی گاڑی میں ہوگا تو گاڑی کا نمبر دیکھ لینا … امکانات خاصے روشن ہوں گے کہ وہ تمہیں … تشریف فرما ہوگا پھر تو اسے شرافت سے ایک ٹھکانے پر پہنچا … لیکن کرایہ مت چھوڑنا۔ واپس آ کے ہمیں بتانا۔ ہم لانچ پر ملیں گے۔ فی امان اللہ۔"

"لیکن میں اسے پہچانوں گا کیسے؟"

"جیسے ہمارے چہروں پر شرافت و نجابت کا نور ہے ایسے ہی اس کی خباثت چہرے سے عیاں ہے۔" محسن بولا۔ "لیکن تمہاری سہولت کے لیے … گہرے نیلے رنگ کی پتلون، سفید اور نیلی دھاری والی قمیص، بڑی بڑی مونچھیں … رنگ، لمبا قد۔"

"بس اتنا کافی ہے … میں جاتا ہوں۔" اکرام شیخ نے ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد کہا۔

بہت دور سے ہم نے اسے گیٹ نمبر دو سے آتے دیکھا۔ اگر اس کی اپنی گاڑی پارکنگ ایریا میں ہوتی تو وہ گیٹ نمبر ایک سے نکلتا۔ جب وہ اکرام شیخ کی ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔

"کیا ہم دوست محمد کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟" محسن نے واپس میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "مثلاً یہ کہ کیا ہم اس کا پوتا اسے واپس دلوا سکتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ ان کے پاس دوست محمد کا پوتا کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"کیا بچے اغوا نہیں کیے جاتے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ دوست محمد کو بلیک میل کر رہے تھے۔ شکاری اور کسی طریقے سے اس کو تعاون پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس کے بیٹے کو … بیوی نے قتل کیا یا کرایا اور ملک سے فرار ہو گئی۔ ابھی سب … آ رہی جانتی ہیں کہ عورت نے آشنا کے ساتھ مل کر شوہر کو مروا دیا۔ یہ بات میری عقل میں نہیں آئی کہ جب عورت نے یہ سب کچھ باقاعدہ منصوبے کے تحت کیا …"

"یہ باقاعدہ منصوبے کے بارے میں آپ نے کیسے جانا؟" محسن بولا۔

"شیروانی صاحب! وہ اس ملک سے ہی نکل گئی … کے انتظامات پہلے سے کیے ہوں گے۔ اس نے پاسپورٹ بنوایا ہوگا۔ کہیں کا ویزا حاصل کیا ہوگا۔ اس نے ٹکٹ لے کر کسی ایک کے لیے سیٹ کنفرم کرائی ہوگی۔ اس نے جو کچھ کیا اچانک نہیں کیا۔ ایسی عورت بچے کو لاوارث چھوڑ کے جا سکتی ہے؟ اس کا … بچہ تھا۔ اول تو یہ کسی بھی ماں کے لیے ممکن نہیں کہ وہ خود تو فرار ہو کے بھاگ جائے اور اولاد کو دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ وہ خود گئی تھی تو بیٹے کو بھی لے جا سکتی تھی اور اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا تو وہ بیٹے کو کسی محفوظ جگہ ضرور پہنچا دیتی۔ اگر ماں باپ کا گھر تھا تو وہاں یا کسی بہن یا بھائی کے پاس …"

"میری ناقص عقل میں یہ بات آ گئی۔" محسن بولا۔ "لیکن یہ سوال خود دوست محمد نے کیوں نہیں پوچھا اس حرامزادے سے جو بار بار عزت … کرنے کی دھمکی دے کے اسے دہشت زدہ کر رہا تھا۔"

"یار وہ اپنے حواس میں کہاں ہے ورنہ ضرور پوچھتا کہ میرا پوتا تمہارے ہاتھ کیسے لگ گیا۔"

دوست محمد ابھی تک وہیں بیٹھا ہوا تھا اور اس کی حالت قابل رحم ہو رہی تھی۔ یہ جگہ بالکل الگ تھلگ تھی۔ آثار بتاتے تھے کہ پہلے یہ عمارت کا آخری کونا تھا جہاں دو دیواریں ملتی تھیں۔ کسی موقع شناس … نے اس کمرے … کی دو بیرونی … دیوار اٹھا کے اور … ریسٹورنٹ کا افتتاح کر دیا۔ معمولی سے کچھ نمونوں اور تحریروں سے بھی ثابت ہوتا تھا۔ معلوم نہیں ریسٹورنٹ کو کس کی نظر لگی کہ اب صرف … دیواریں رہ گئی تھیں۔ چھت کی بھی ایک ہی شیٹ بچی تھی۔

باہر کی دیوار پر … سے واضح طور پر لکھی ہوئی … کو گرفتار کیا جائے گا اور اب … کرنے والے کو … مخاطب کر کے بھی بہت کچھ کہا گیا تھا مگر … یہ جگہ … اور آزادی و قوم کے مہذب افراد نے … دیوار کو … ثابت کر دیا تھا کہ وہ … سے نہیں ڈرتے۔

"بھلا کیا ہم دوست محمد کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟ یہ بیچارہ … تو مر جائے گا اور … مار دیا جائے گا۔ کل جب شکاری … واپس جائیں گے تو جاتے ہوئے اپنی ناکامی کا سارا غصہ اس شخص کو مار کر اتاریں گے جو یوں سمجھ لو لاش ہے۔" محسن نے دوست محمد کے قریب بیٹھ کے کہا۔

میں نے اس سے نظر ملائے بغیر کہا۔ "کاش اسے ساتھ لے جانا ممکن ہوتا۔"

"اسے ساتھ لے جانا کیوں ممکن نہیں یار؟" محسن نے کہا۔ "یہ بہت کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے ہمارے لیے۔ اس کا تجربہ …"

"… حال میں …"

"ہم اس کا یہ … چھڑا سکتے ہیں۔ ہم سب مل کر اس کی مدد کر سکتے ہیں … ہم اس کے کام … ہمارے ساتھ یہ محفوظ ہوگا۔ ہم زندہ ہیں …" محسن بولا۔

"چلو پھر اٹھاؤ اسے۔" میں نے کہا۔

"ایسے نہیں۔ دوست محمد کو پہچاننے والے بہت ہیں۔ وہ پوچھیں گے کہ اسے کہاں لے جا رہے ہو اور پوچھنے والوں کو بتا نہیں سکتے کہ دوست محمد کو ہم کہاں لے کر گئے۔ شاید یہ کام اس لڑکے کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ کہاں ملے گا … چل دیکھتے ہیں۔"

شاید دوست محمد کی تقدیر یاور تھی کہ وہ لڑکا جو اپنے استاد کے ساتھ خلوص کا رشتہ رکھتا تھا، ہمیں آسانی سے مل گیا۔ ہم نے ایک شخص سے اس کے بارے میں پوچھا اور وہ چند منٹ میں اسے پکڑ لایا۔ ہم نے اسے مختصراً اپنے ارادے سے آگاہ کیا کہ ہم دوست محمد کو ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔

"اپنے ساتھ لے جائیں گے کہاں؟"

"شاید ولایت۔" میں نے کہا۔ "اس کا علاج بھی ہو جائے گا۔ جب واپس آئے گا تو بالکل صحت مند ہوگا پہلے کی طرح۔"

"یہ واپس آئے گا؟" لڑکے نے مشکوک سے لہجے میں بے یقینی اور اندیشے سے مغلوب ہو کے کہا۔

"تم تو جانتے ہو کہ اس کے کچھ دشمن ہیں۔ وہ ہمارے دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ہم ذرا بزدل لوگ ہیں اس لیے خود اسے اٹھا کے نہیں لے جا سکتے۔ یہ کام تم کر سکتے ہو کہ اپنے استاد کو ہماری لانچ پر پہنچا دو۔"

"آپ کی … اپنی لانچ ہے؟ کیا نام ہے؟"

"سمر ہیٹ۔ انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم آگے جاتے ہیں۔ تم اس کو اٹھا کے چلو۔"

اب وہ دوپہر ہونے کو تھی۔ بندرگاہ کے علاقے میں گہما گہمی اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ میں اور محسن جب لانچ کے قریب پہنچے تو دوست محمد کو لانے والا نوجوان بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ میں اسے نہیں دیکھ سکتا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ ہم پر نگاہ رکھے گا اور لانچ کو بھی تلاش کر لے گا۔

لانچ کے عرشے پر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اور محسن نیچے اترنے لگے تو آخری حصے کے کیبن سے کریم بخش کراہتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے چہرے، سر، ہاتھوں اور ٹانگوں پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ سر کے گرد لپٹی ہوئی پٹی پر خون کا ایک داغ پھیل گیا تھا۔ اس کے چہرے پر آنکھوں کے گرد بڑے بڑے نیل تھے اور ناک سوج گئی تھی۔

"کریم بخش!" میں نے چلا کے کہا۔

لیکن … سے پہلے چیخ مار چکا تھا۔ "صاحب … یہ آپ ہے … آپ ہے صاحب؟" وہ اپنی تکلیف بھول کے ہماری طرف دوڑا ہوا آیا۔ "ابھی ہم آپ کو بھوت کر نہیں دیکھتے پڑا ہے صاحب۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں کریم بخش؟" محسن نے اسے کندھے سے

www.paksociety.com

پھر لڑکے کہا۔ "ہم بھوت نظر آ رہے ہیں تمہیں؟"

"اوہ... آہ... ایسا مت بولو صاحب، سارا چوکی گنگ ہو جائیں گا۔ ایک دم چوڑا ہو گیا ہے۔" وہ چلانے لگا۔ "ہم اندھا ہے... آپ ایک دم زندہ ہے، آپ مرا نہیں ہے؟ ہم مرنے والا ہے صاحب، مگر بی بی صاحب ہم کو یہی بولا کر آپ مر گیا۔"

"کیا فضول بکواس کر رہے ہو، کس بی بی صاحب نے ایسی بات کہی ہے تم سے؟" میں نے کہا۔

"گل بی بی صاحب نے... وہ ہم کو بولا کریم بلوچ تمہارا صاحب خلاص، ایک دم خلاص۔ اس کو ایک لڑکی نے قتل کر دیا۔ وہ بولو بہت رونا مچائے..."

کیا گل بانو کا دماغ چل گیا تھا یا اس نے بھی پاگل پن ہی تھا سے ساتھ یا محسن نے بھڑک کے کہا۔ "کہاں ہے وہ؟"

"سو گیا ہے صاحب۔" کریم بلوچ بولا۔ "آپ ابھی دیکھو اس نے گولی ہولی تو نہیں کھایا... بات بڑا ایسا تھا صاحب۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "کس نے کہا تھا؟ کہاں سے سنی تھی یہ خبر کہ میں مر گیا اور یقین کیسے کر لیا تم دونوں نے، یار محسن تو جا کے دیکھ اس پاگل کو۔"

محسن نے اس کیبن کا دروازہ بجایا جس میں رابعہ کے ساتھ گل بانو کو جگہ ملی تھی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔

"توڑ دو دروازے کو۔" میں نے چلا کے کہا۔ "وہ سچ مچ ہی خواب آور گولیاں کھا کے نہ لیٹ گئی ہو۔"

محسن نے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کے دروازے سے اپنا شانہ ٹکرایا۔ دروازہ جھٹکے سے ہلا جس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ چٹخنی صرف اوپر سے لگائی گئی ہے۔ دوسری ٹکر میں اوپر کی چٹخنی کے اسکرو نکل گئے۔ دروازہ کھلتے ہی میں نے گل بانو کو اپنے بیڈ پر دراز دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ساکت و صامت پڑی ہوئی تھی۔

محسن نے اس کا ہاتھ تھام کے نبض دیکھی اور پھر پلکیں اٹھا کے آنکھوں میں جھانکا۔ میں نے اس کے سانس کی رفتار دیکھی۔

"میرے خیال میں تو کوئی تشویش کی بات نہیں۔" میں نے نیچے پڑی ہوئی دوا کی خالی شیشی اٹھا کے محسن کو دکھائی۔

"اس میں تین گولیاں ہوتی ہیں۔" محسن بولا۔

"ہاں، سات ملی گرام کوئی خطرناک بات نہیں۔ ایک بار ڈاکٹر نے رابعہ کو دس ملی گرام کی چھ گولیاں ایک ساتھ دی تھیں اور میری پریشانی پر کہا تھا کہ شدید بے خوابی اور اعصابی دباؤ کی صورت میں اتنی ڈوز نارمل ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ تین گولیاں بھی اتنی کے برابر ہیں، خدا کا شکر ہے کہ باقی دو ابھی منتقل نہیں۔"

عرشے پر کسی نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ "ابھی کون ہے، باہر آؤ۔"

یہ اسی لڑکے کی آواز تھی جو دوست محمد کو اٹھا کے لایا تھا۔

"کریم بلوچ!" میں نے کہا۔ "دیکھو باہر ایک لڑکا آیا ہے۔ دوست کو لے کر۔"

"کون دوست محمد؟"

"تم نہیں جانتے؟" میں نے جھلا کے کہا۔ "ہو سکتا ہے صورت کو پہچان لو، اسے اپنے کیبن میں لے جاؤ، آرام سے لٹا دو۔"

کریم بلوچ کراہتا ہوا لنگڑاتا ہوا اور بڑبڑاتا ہوا اوپر گیا۔

"یہ کیا معاملہ ہے یار؟" محسن نے گل بانو کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد کہا۔ "گل بانو اتنی بے وقوف تو نہیں ہے کہ کسی سنائی ہوئی بات پر یقین کر لے۔"

"یہ تو انتہا ہے یقین کی، اپنی جان لینے کی کوشش کرنا۔" میں نے وہیں فرش پر بیٹھ کے کہا۔ "بے سبب نہیں ہو سکتی یہ حماقت۔"

"اور اس کریم بلوچ کے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

"ابھی پوچھ لیتے ہیں، پہلے تو جاؤ اور کافی بنا کے لاؤ، اس کا تو یہی علاج ہے۔" میں نے گل بانو کی طرف اشارہ کیا۔ "بلیک کافی۔"

"ڈاکٹر کی ضرورت نہیں؟" محسن نے متذبذب لہجے میں کہا اور اٹھا۔

"نہیں یار، دو کپ اس کے حلق سے اتریں گے تو غنودگی کا اثر زائل ہونے لگے گا۔" میں نے کہا۔ "پریشان مت ہو، میں ذرا دوست محمد کو دیکھ لوں، کہیں وہ ہوش میں آتے ہی ہنگامہ کھڑا نہ کر دے۔"

دوست محمد کو لانچ پر لانے والا نوجوان جا چکا تھا، اب اس کے پاس کریم بلوچ بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ... یہ تو اپنا استاد ہے صاحب۔" وہ بولا۔ "کیا ہوا ہے اس کو؟"

"کچھ نہیں، نشے میں ہے۔ تم پیتے ہو شراب اور یہ پیتا ہے چرس۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔" میں نے کہا۔ "جیسا استاد ویسا شاگرد۔ تم بتاؤ تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی؟"

"وہ سالا موڑ والا، ہم کو بہت مارا صاحب۔ ہم ادھر تمہارا ... کرنے کو واسطے گیا تھا۔" وہ کراہنے لگا۔

"کس الو کے پٹھے نے یہ مشورہ دیا تھا تمہیں؟" میں نے بھڑک کے کہا۔ "سب معاملہ ہم نے ٹھیک کر لیا تو تم نے خود جا کے لگا دیا نا؟ وہاں پہنچ گیا اپنی تاریخ لینے۔ تاریخ وفات مل جاتی تمہیں تو اچھا تھا۔"

"ہم سے غلطی ہو گیا صاحب۔ وہ موڑ والا بیٹا..."

"تم جیسے لوگوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے اور ہونا چاہیے جو اپنی عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں۔ پہلے وہ تم کو لوٹتا رہا اور اب کوٹ دیا۔"

بیش کر رہے، بگڑو، بدلہ اور بیوٹی بھی کھاؤ، سچے عاشق ہونا۔ میرا خیال تھا ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔

لیکن بیچ میں دوست محمد بول پڑا۔ "اوئے بابا، میرے کو ادھر کیوں لایا، میرے کو جانے دو۔"

"دوست محمد، دیکھو مجھے پہچانو۔" میں نے نرم لہجہ اختیار کر کے کہا۔ "میں سکندر بخت ہوں، میں لایا ہوں تم کو یہاں، اب تم اسی جگہ رہو گے ہمارے ساتھ۔"

اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور نفی میں سر ہلانے لگا۔ "ہم... ہم ادھر نہیں رہ سکتا... وہ... وہ بولا تھا۔"

میں نے کہا۔ "وہ بکواس کرتا تھا، تمہارا ابو اب ان کے پاس نہیں ہے۔ اسے اس کی ماں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔"

"ماں لے گیا تھا، تم... تم کو معلوم ہے؟" اس کی آنکھوں میں بے یقینی کے ساتھ تھوڑا سا اطمینان اتر آیا۔

"میں نے معلوم کر لیا ہے۔ جب وہ تم سے باتیں کر رہا تھا تو میں اُن کا پیچھا کر رہا تھا، پھر میں اس کے پیچھے گیا تھا۔ اس نے مان لیا کہ وہ سب جھوٹ تھا۔ وہ تم کو ڈرانے کے لیے تھا کہ تم اس کو میرے بارے میں بتا دو۔ میں اور محسن دونوں سامنے پہنچ گئے اچانک اور پوچھا کہ کیا بات ہے، کیوں تلاش کر رہے ہو؟ اس کی حالت خراب ہو گئی۔ پھر ہم اس کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اب فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں، وہ پھر کبھی نہیں آئے گا۔" میں نے ایک بہت لمبا جھوٹ بولا۔

"کبھی نہیں آئے گا..." دوست محمد نے اپنی جیب ٹٹول کے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ "تم مار دیا اس کو؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

"لیکن... وہ اکیلا نہیں ہے۔" دوست محمد لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ جلانے لگا۔ لمبا لمبا... میں نے اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ پر سکون رہے۔

"تم کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔" میں نے کہا۔

"تم... سچ بولتا ہے نا... اچھی طرح معلوم کر لیا ہے کہ وہ... بلانچ ان کا پاس نہیں ہے، وہ لوگ بہت ظالم لوگ ہے، وہ عورت بھی بہت ظالم ہے۔ بلا بیچ لے لیا... جب اس کا بیٹا بولتا ہو میں گا تو بھیجے گا ہم اس کو مار دے گا اور پھر پوچھے گا ابھی بتاؤ تمہارا دل کیا پھٹ گیا ہے؟ بلاول کا ماں کب۔" اس نے زور زور سے سینے پر ہاتھ مارا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے کریم بلوچ کو ہدایت کی کہ اس کا خیال رکھے اور واپس اسی کیبن میں لوٹ آیا جس میں گل بانو کسی طرح محو خواب تھی۔ اس نے سر واپس کپڑے پہن رکھے تھے لیکن اس لباس میں کہاں تھا اپنے حسن کو چھپا سکتی تھی، نہ شباب کو۔ اس کے بال تکیے پر بکھر گئے تھے اور اس کے چہرے پر آ رہے تھے۔

وہ آٹھ فٹ لمبا اور چھ فٹ چوڑا کیبن تھا جس کی دو دیواروں کے ساتھ ٹرین کی برتھ کی طرح ڈھائی فٹ چوڑے فولڈ ہو جانے والے تختے جوڑ دیے گئے تھے۔ دونوں تختوں کو اوپر اٹھا کے دیوار کے ساتھ ملا دیا جا سکتا تھا۔ مقابل کی ایک دیوار پر کپڑوں کے لیے الماری تھی اور وہ دروازہ تھا جو باہر کھلتا تھا۔ دوسری دیوار پر ڈریسنگ کیبنٹ تھی، ایک بہت والی دو فٹ چوڑی اور تین فٹ اونچی کیبنٹ جس کے باہر والے حصے پر آئینہ تھا۔ اس کیبنٹ کے ساتھ ہی واش بیسن لگا تھا۔

درمیانی حصے میں ایک فولڈ ہو جانے والی اسٹیل کی میز اور دو کرسیاں رکھی جا سکتی تھیں اور پھر تہہ کر کے دیوار کے ساتھ کھڑی کی جا سکتی تھیں۔ جگہ کی کمی کے باعث لانچوں اور بحری جہازوں میں چھت سے فرش تک کی جگہ کے ایک ایک انچ کو ضرورت کے مطابق اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔

محسن کافی لے کر آیا تو میں نے فولڈنگ میز کو درمیان میں پھیلایا اور خود ایک کرسی کھول کے بیٹھ گیا۔ محسن دوسرے خالی تختے پر آلتی پالتی مار کے بیٹھا۔ اس کا چہرہ متفکر تھا اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اسے کریم بلوچ کے ساتھ ہونے والے سلوک کا ذکر کیا تب بھی وہ نہیں مسکرایا۔

"یار سکندر، کیا عجیب لڑکی ہے یہ بھی۔" اس نے گل بانو کی طرف دیکھ کر یوں کہا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔

"سب لڑکیاں عجیب ہوتی ہیں بلکہ عجوبہ ہوتی ہیں، کبھی حسن کا، کبھی عشق کا، اور کبھی مجسم حماقت کا۔" میں نے ایک فلسفیانہ خیال پیش کیا۔

محسن نے اقرار کا اظہار سر ہلا کے کیا۔ "اب اسی کو دیکھو۔"

"تم دیکھو بھائی، میں ذرا کافی بنا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ناگ سی تھی۔ ایک ڈکیت سے دوار... میں خوف... راتوں کو اندھیرے جنگلوں میں میلوں گھوڑے پر سفر کرنے والی اور خطرناک ڈاکوؤں کا ساتھ دینے والی۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے نہ ڈرنے والی... اور ان جرائم پیشہ اخلاق و تہذیب سے نا آشنا لوگوں کے درمیان ایسے رہنے والی۔"

"جیسے رہتی ہے زبان بتیس دانتوں کے درمیان۔ ایسا ہی کچھ فرمایا ہے کسی شاعر نے۔" میں نے کہا۔ "شاید یہ کافی پیالہ اور گنوطی نہ ہو۔ جب وقت آتا ہے تو قدرت کی جانب سے ایسے ہی معجزے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی کے انقلاب کا وسیلہ ہم بنے۔ ہم اس پر فخر کر سکتے ہیں۔"

"خدا سے یہ نئی زندگی کتنی مہنگی پڑی۔"

"کچھ پانے کے لیے کچھ تو دینا ہی پڑتا ہے اور اسے بھی خدا کا ایک لا محدود... سنگ کا ردِ عمل قبول نہیں ہوا۔ یہی تو ہو سکتا تھا کہ اپنے بھائی کی موت کا صدمہ وہ بھی گہری اور انتقامی جذبات

www.paksociety.com

سے مغلوب ہو کے وہی کرتی جو اس کے جنات نے کہا تھا۔" میں نے کافی کے ساتھ باسی ڈبل روٹی کو ٹیک لگا کے کھا لیا۔
ایک ہنگامہ برپا ہونے سے خواب زدہ رات کا مسئلہ حل ہو گیا۔ آنکھوں کو بھاری سر کی صورت میں ملا۔ اس کا علاج نیند کی گولی صرف دو چمچے ہی کی طرح ملنے تو میں سوچتا رہا اور تازہ دم ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی ایک جھپکنے کی مہلت ملی بھی مشکل تھا۔ گل بانو کا مسئلہ سرِفہرست تھا۔ پھر کریم بوٹ کی بخیریت واپسی کی فکر بھی تھی۔ اس کے بعد یہ معلوم کرنا تھا کہ اس ایک رات میں غالب اور تارو پر کیا گزری۔ دشمنوں کے حصار میں ان کی پوزیشن سب سے زیادہ نازک تھی۔ اتفاق سے یہ لوگ ڈرائنگ ان کے اعصاب پر سوار ہو گا۔ ہم سے رابطہ نہ ہونے کا احساس ان کو زیادہ بے بس اور تنہا کرتا ہو گا۔ اگر جبار نے اچانک لشکر اٹھا دیا تو ہمیں خبر ہونے تک وہ نہ جانے کتنی دور پہنچ جائیں گے.....

ان حالات میں محسن کے خیالات بھی مختلف نہیں ہو سکتے تھے۔ اس نے اچانک کہا۔ "یار! اس کریم بوٹ کی عقل پر کس حد تک بھروسا کیا جا سکتا ہے؟"
"صرف عشق کے معاملے میں اس کی مت ماری جاتی ہے۔ جو سب کی ہی ماری جاتی ہے۔" میں نے کہا۔
"اگر اسے ہم جاسوسی کے لیے بھیج دیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ایس ایس کرانتی ... میں موجود ہے یا نکل گیا؟" محسن نے کہا۔
"کام تو مشکل نہیں۔ تم نے کہا ہے تو کرے گا۔ مگر موٹر سائیکل سے ... کہے ورنہ جس حالت میں جائے گا اس سے بدتر حالت میں واپس آئے گا۔ بشرطیکہ زندگی نے دغا نہ کیا۔"
"تم اسے اچھی طرح بریف کر کے روانہ کرو۔ میں اس فتنۂ محشر کو جگاتا ہوں؟"
"اچھا... اگر آپ کو بے حد دلچسپی ہے اس کا رخصت اور آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے رخصت ہو کے تخلیہ فراہم کروں تو میں دفع ہو جاتا ہوں۔" میں نے نخرے سے کہا۔ "ویسے یہ کام تو میں بھی کر سکتا تھا۔"
محسن جھینپ کے مسکرایا۔ "میں ایک شادی شدہ شخص ہوں۔ لہٰذا زیادہ قابلِ اعتماد ہوتا ہے۔"
"اچھا... میرا خیال اس کے برعکس تھا۔"
جب میں کریم بوٹ کو مفصل ہدایات کے ساتھ جاسوسی کے مشن پر روانہ کرنے کے بعد واپس آیا تو محسن اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد گل بانو کے منہ پر ہلکے ہلکے تھپڑ مارے تھے کہ اس کے گال گلابی ہو رہے تھے۔ وہ جاگ گئی تھی اور اب محسن کی پوزیشن یہ تھی کہ اس نے ایک ہاتھ گل بانو کی کمر میں ڈال کے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ گل بانو اس کے اوپر لیٹی ہوئی تھی کہ اس کا سر محسن کے شانے پر تھا اور محسن دوسرے ہاتھ سے

کافی کا مگ تھامنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ خود بھی کافی پی لے۔
"گل! آنکھیں کھولو۔ شاباش!" اس نے کافی کا مگ گل بانو کے ہونٹوں سے لگایا۔ "پیو..."
گل بانو غنودگی میں گنگنائی۔ "آں... یہ... یہ تو... کڑوی ہے..."
"تھوڑی سی پی لو گل۔ اس سے تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے مگ ہونٹوں سے لگایا اور اسے ایک دو گھونٹ نگلنے پر مجبور کر دیا۔
گل بانو نے بُرا سا منہ بنایا۔ "کیا... یہ کیا کر رہے ہو؟ مجھے سونے دو... مر لینے دو مجھے..."
"نہیں، میں نہیں مرنے دوں گا تمہیں۔ تم کو زندہ رہنا ہے اور تم زندہ رہو گی۔ یہ لو۔" اس نے مزید کافی گل بانو کے حلق میں انڈیل دی۔ "تم کیوں سوچتی تھیں مرنے کی؟ میرا بھی خیال نہیں آیا تمہیں۔ پھر کیا کرتا...؟"
میں نے محسن کی کوشش کو دل ہی دل میں سراہا۔ وہ کسی عاشق صادق کا رول کرنے پر مجبور تھا اور یہ کام بہت حوصلہ طلب تھا۔ کچھ لوگ تو پیشہ ور عاشق ہوتے ہیں اور کسی کو بھی چاہت کا یقین دلانا ان کے لیے محض دل لگی ہوتی ہے۔ مگر محسن جیسے شخص کے لیے جس نے کبھی کسی کو چاہنے کا بھی دھوکا نہ دیا ہو، یہ اداکاری بہت مشکل تھی۔ تاہم وہ فرض نبھا رہا تھا۔
بالآخر گل بانو نے آنکھیں کھول کے اسے دیکھا اور کچھ دیر پلک جھپکائے بغیر یوں دیکھتی رہی جیسے ذہن سے کسی گم گشتہ یاد کو کرید کر نکال رہی ہو اور پہچان کے حوالے تلاش کر رہی ہو۔ آہستہ آہستہ اس کی نظر محسن سے ہٹ کر کمرے پر فوکس ہو گئی۔ پھر اس نے ایک چیخ ماری اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ محسن نے گرم کافی کو گرنے اور بکھرنے سے بچانے کے لیے مگ ہٹا لیا۔ اس نے گل بانو کا سر سینے پر رکھ دیا اور نرمی سے اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔
"گل! ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ دیکھو میں ہوں تمہارے پاس اور یہ سکندر ہے۔"
گل بانو نے ڈرتے ڈرتے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے۔ ان کی آنکھوں میں ابھی تک خوف کے آسیب کا عکس نظر آ رہا تھا۔
"تم... نہیں... یہ خواب ہے... دھوکا ہے میری نظر کا۔" وہ بولی اور آنسو اس کی آنکھوں کے گوشوں سے اتر کے تکیے میں جذب ہونے لگے۔ رونا ایک اچھی علامت تھی۔ اس کا احساس بیدار ہو گیا تھا۔
"تم کو کس نے بتایا تھا گل؟" محسن نے اس پر جھک کے کہا۔ "تم نے کیسے یقین کر لیا تھا اس خبر پر؟ دیکھو، ہم زندہ ہیں۔ تمہارے قریب موجود ہیں۔ دیکھو یہ میرا ہاتھ ہے۔"
گل بانو نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کے اپنے گالوں سے لگا

لیا۔ "محسن، معلوم نہیں... کیسا ڈراؤنا خواب تھا وہ... میں نے دیکھا کہ اخبار میں ایک خبر چھپی ہے... کوئی لڑکی موہنی نام کی تھی... اس کی تصویر کے ساتھ۔"
"موہنی کی تصویر!" میرے دماغ کو جیسے برقی جھٹکا لگا۔
"ہاں... مجھے یاد ہے... اسی کا بیان تھا یہ..."
"گل بانو! کہاں ہے وہ اخبار؟" میں نے اسے جھنجوڑ کے کہا۔ "وہ خواب نہیں تھا... تم نے اخبار میں کچھ دیکھا تھا۔ کہاں سے آیا تھا وہ اخبار؟ کہاں رکھا تھا پڑھنے کے بعد... یاد کرو۔"
"مجھے ایسے مت دیکھو... میں نے کچھ نہیں کیا... کریم لایا تھا ناشتہ... وہ اخبار بھی لے آیا تھا..." وہ اب پوری طرح ہوش میں آ گئی تھی۔ "اس نے کہا تھا کہ میں بدروح ہی بن جاؤں..."
"یہ سب مت بتاؤ مجھے۔ اخبار کہاں ہے؟" میں نے اس کے بستر کے اوپر بچھی گدی اور چادر کو ہٹا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ اخبار مجھے تکیے کے نیچے دبا ہوا ملا۔ میں نے اس کے دونوں صفحے الگ کیے۔ محسن نے ایک صفحہ مجھ سے لے لیا۔
"یہ... یہ موہنی کی تصویر ہے۔" محسن نے کہا۔
میں نے وہ صفحہ چھین لیا اور چند سیکنڈ موہنی کی صورت پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ پھر میری نگاہ خبر کی سرخی پر جم گئی۔ "پولیس کی تحویل میں بھارتی جاسوس حسینہ کی پراسرار ہلاکت۔" اگرچہ الفاظ میری آنکھوں کے سامنے دھندلا رہے تھے مگر میں نے خبر کا متن پڑھنا شروع کیا۔
"ایک حسین اور نوجوان لڑکی نے کل شام اس وقت سنسنی پھیلا دی جب اچانک پولیس اسٹیشن پہنچ کے اس نے خود کو قانون کے حوالے کیا اور کہا کہ اسے تحفظ فراہم کیا جائے کیونکہ چند نامعلوم افراد اس کی جان لینا چاہتے ہیں۔ اس لڑکی نے اپنا نام موہنی بتاتے ہوئے اعتراف کیا کہ وہ بھارت سے آنے والے تخریب کاروں کے ایک گروہ میں شامل تھی اور اس سلسلے میں انتہائی اہم انکشافات کر سکتی ہے۔ اسے انچارج اور حاضر ڈیوٹی افسر نے کام لیتے ہوئے فوری طور پر اس عورت کو گرفتار کیا اور سخت پہرے میں حوالات کے ساتھ الگ کمرے میں بند کرنے کے بعد اس واقعے کی اطلاع اپنے اعلیٰ افسران کو دی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی دوران دو مشتبہ افراد نے اس عورت سے قریبی تعلق ظاہر کرتے ہوئے اسے اپنے ہمراہ لے جانے کی بھی کوشش کی۔ ان میں سے ایک نے موہنی کا شوہر اور دوسرے نے بھائی ہونے کا دعویٰ کیا اور یہ بھی کہا کہ اس کا اصل نام رضیہ ہے اور وہ ذہنی طور پر نارمل نہیں ہے۔ تاہم انھوں نے اپنی گرفتاری کی کوشش ناکام بنا دی اور خودکار ہتھیاروں سے فائرنگ کرتے ہوئے ایک جیپ میں بیٹھ کر فرار ہو گئے جو انھوں نے تھانے کے باہر ہی کھڑی کی تھی۔ فائرنگ سے ایک سب انسپکٹر شدید زخمی ہو گیا جسے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ ہمارے نامہ نگار کی اطلاع کے مطابق بھارتی جاسوس حسینہ موہنی نے اصرار کیا کہ وہ مجسٹریٹ درجہ اول کے کسی ذمے دار فرد کی موجودگی میں بیان دینا چاہتی ہے لیکن بھارتی کونسلیٹ نے اس الزام کو مسترد کرتے ہوئے مبینہ جاسوس عورت کو بھارتی شہری تسلیم کرنے سے بھی انکار کیا اور کہا کہ اس عورت کو جبر یا لالچ کے ذریعے ایک بے بنیاد بیان دینے کے لیے تیار کیا گیا ہے جبکہ درحقیقت وہ پاکستانی عورت ہے جس کا نام رضیہ ہے۔ پولیس کے اعلیٰ حکام، وزارت خارجہ کے ایک افسر اور مجسٹریٹ کی موجودگی میں اس عورت نے جو بیان دیا اس سے اخبار نویسوں کو بے خبر رکھا گیا اور ان کے کسی سوال کا جواب دینے سے صاف انکار کیا۔ کوئی وجہ بھی نہیں بتائی گئی۔ پولیس نے صحافیوں کو پولیس اسٹیشن کی حدود میں بھی داخل ہونے سے روکا۔ اس بات سے بھی انکار کیا گیا کہ موہنی نام کی اس جاسوس حسینہ کو کسی نے زبردستی لے جانے کی کوشش کی تھی جب کہ عینی شاہدوں کے مطابق دو افراد تھانے سے فائرنگ کرتے ہوئے ایک جیپ میں بیٹھ کر فرار ہوئے تھے۔ پولیس نے ایسے کسی واقعے سے لاعلمی کا اظہار کر کے ایک سب انسپکٹر کے زخمی ہونے کو حادثہ قرار دیا جو ایک سپاہی سے اتفاقیہ گولی چل جانے کے باعث پیش آیا تھا لیکن تھانے کے عملے کے کسی فرد کو غفلت کے الزام میں معطل کیا گیا ہے اور نہ کسی کے خلاف زیر دفعہ [illegible] مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ رات گئے ملنے والی اطلاعات کے مطابق مبینہ جاسوس حسینہ اپنا بیان دینے کے کچھ دیر بعد پراسرار طور پر ہلاک ہو گئی۔ پولیس کے ایک اعلیٰ ذریعے نے جس نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی درخواست کی ہے، یہ بتایا ہے کہ اس پر پوچھ گچھ کے سلسلے میں کسی قسم کا جسمانی تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ وہ عورت خودکشی کا مصمم ارادہ کرنے کے بعد بیان دینے آئی تھی کیونکہ اسے اپنے قتل کا یقین تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ پولیس کی تحویل میں بھی اس کی جان قطعی غیر محفوظ ہے۔ بیان پر دستخط کرنے کے بعد اس نے کسی زود اثر زہر سے اپنا خاتمہ کر لیا جو اس کے دانتوں کے درمیان کسی خلا میں ایسے ہی وقت کے لیے بھرا ہوا تھا۔ اس واقعے سے پولیس کے اعلیٰ افسران کی نااہلی بھی ثابت ہوتی ہے جو ایسے کسی امکان سے بے خبر رہے حالانکہ دنیا میں ایسے واقعات کی کمی نہیں جب انتہائی مایوسی کی حالت میں جاسوسوں اور سزائے موت پانے والوں نے اسی طرح پوٹاشیم سائنائیڈ نگل

www.paksociety.com

کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا اور تفتیش کرنے والوں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ یہ لازمی تھا کہ اس خطرناک جاسوس عورت کو اس وقت تک زیرِ حراست رکھنے کے لیے خصوصی اقدامات کیے جاتے جب تک کہ مکمل تفتیش کے نتائج سامنے نہ آ جاتے۔ صحافت سے تعلق رکھنے والے تمام حلقوں نے پولیس کے رویے اور حقائق کی پردہ پوشی کی کوشش کی سخت مذمت کی ہے تاہم اخباری نمائندوں کو پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار تھا۔

مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔"

اس کے ساتھ ہی دوسری سرخی تھی۔ بھارتی جاسوس حسینہ کے سنسنی خیز انکشافات۔ اخبارات کے نام دستخط شدہ بیان۔ خود اس نے پولیس کا استعمال جانے سے پہلے جاری کیا۔ اس خبر کے مطابق موہنی کا بیان جو کئی صفحات پر مشتمل تھا، اس نے بتایا تھا کہ وہ کہاں پیدا ہوئی، کس قسم کے حالات کا شکار ہوئی اور پھر کیسے پاکستان پہنچی۔ موہنی کے بیان کا یہ حصہ سو فیصد سچ پہ مبنی تھا۔ اس نے میرا نام بھی لکھا تھا، میرے والد کا بھی اور اپنے بھائی کا بھی۔ یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ وہ میری محبت کو حصول نہیں سکی تھی اور صرف میری خاطر اس نے ہر قسم کی ذلت قبول کی مگر بالآخر خود کو ان افراد کے ایک گروہ میں شامل کرانے میں کامیاب ہو گئی جو خفیہ طور پر پاکستان میں علیحدگی پسندوں اور تخریب کاروں کو مدد اور تربیت دینے کے لیے سرحد عبور کر کے آئے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اس طرح وہ مجھ سے مل سکے گی کیونکہ میرا اور میرے ساتھیوں کا براہِ راست ٹکراؤ ایسے ہی لوگوں سے تھا۔

اپنے بیان میں موہنی نے متعدد مقامات اور لوگوں کے حوالے دیے تھے جو سب درست تھے۔ اس نے تسلیم کیا تھا کہ وہ کئی ماہ کے بعد مجھ تک پہنچنے میں کامیاب رہی تھی اور اس نے کچھ وقت میرے ساتھ بھی گزارا تھا مگر وہ میرا اعتماد حاصل نہ کر سکی تھی جس سے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ موہنی نے میرے ساتھیوں کی نشاندہی بھی کی تھی جو دہشت گردوں کے خلاف "ایم آر ایس" کے نام سے تحریک چلا رہے تھے اور ہماری متعدد کامیابیوں کا ذکر بھی کیا تھا۔ مگر اس نے ہمارے کسی بھی دشمن کا نام نہیں لیا تھا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ اس طرح ہماری مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔

جھوٹ اس نے آخر میں بولا تھا کہ اب سے ایک ہفتے قبل میرے اور سکندر کے درمیان تلخ کلامی ہوئی۔ اس نے مجھے ناشکرا اور بے ضمیر کہا، دشمن اور ناقابلِ اعتبار قرار دیا اور کہا کہ وہ مجھ پر تھوکنا بھی نہیں چاہتا لیکن بچپن کے تعلق اور سابقہ احسانات کے باعث اس نے ابھی تک مجھے شوٹ نہیں کیا۔ وہ رابعہ نام کی کسی لڑکی کو چاہتا ہے اور اس کے مقابلے میں میری وہی اوقات ہے جو کسی عبادت گاہ کے مقابلے میں کسی قحبہ خانے کی۔ اس تذلیل نے مجھے اتنا مشتعل کیا کہ میں نے اسے سزا دینے اور خود بھی سزا قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں طے کر چکی تھی کہ اگر کبیر خان میرا نہ ہوا تو رابعہ کا بھی نہ ہوگا۔ میں نے اس کے بارے میں اپنے ساتھیوں کو اطلاع دے دی، جن کا ساتھ میں چھوڑ چکی تھی۔ انھوں نے ایک رات کبیر خان کے ٹھکانے پر حملہ کیا اور وہ بچ نکلا لیکن کبیر خان کے ساتھ اس کے کئی ساتھی بھی مارے گئے۔ جن میں نامور کا ایک سابق صحافی، ایک سابق سب انسپکٹر پولیس اکرم شیخ، ایک لڑکی نازو جو اکرم شیخ کی بہن ہے اور چند دیگر افراد شامل تھے۔ میرے کئی پرانے ساتھیوں نے مجھے پہچان لیا اور رہنے نہیں دیا۔ وہ مجھ کو اپنے ساتھ کسی نامعلوم مقام پر لے گئے جہاں مجھ سے پوچھ گچھ کی گئی۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرا اس مشن پر آنے کا مقصد صرف سکندر بخت تک رسائی حاصل کرنا تھا۔ میں اسے پہچانتی تھی اور اس کی تنظیم "ایم آر ایس" کو نیست و نابود کرنے کے بعد میرا یہ مقصد پورا ہو گیا ہے۔ تاہم میری بات نے انھیں مطمئن نہیں کیا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ اتنا عرصہ میں دشمن کی قید میں رہی، میں نے اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھا اور یہ کیسے ممکن ہے کہ انھوں نے کوئی تفتیش نہ کی ہو اور میں نے انھیں کچھ نہ بتایا ہو۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ کبیر خان سے میرا ایک دیرینہ تعلق تھا لیکن یہ ماننے پر تیار نہ تھے کہ "ایم آر ایس" جیسی تنظیم کے سربراہ نے ایک عورت سے جذباتی تعلق کی بنا پر اس کی قومیت اور مذہب کے فرق اور سیاسی وابستگی کو نظرانداز کر دیا ہو۔ میری حالت … سے بدتر ہو گئی تھی۔ میں سکندر کا اعتماد حاصل نہ کر سکی تھی۔ حالانکہ اس کی خاطر میں نے اپنا مذہب تک بدل لیا تھا۔ اپنے ملک کو چھوڑ دیا تھا اور ماضی سے سارے رشتے منقطع کر لیے تھے بلکہ برس کی عمر یاد نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ وہ مجھے بھول چکا تھا۔ یہ میری بھول تھی کہ اس کی خاطر میں نے زندگی تج دی۔ دوسری طرف مجھ پر اپنوں کے دروازے بند کیے جا رہے تھے۔ میں اپنوں کی نظر میں بھی ناقابلِ اعتبار ٹھہری تھی اور وہ میری وفاداری پر شبہ کر رہے تھے اور مجرم گردان رہے تھے۔ ان حالات میں میرے لیے نجات کا یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ میں اپنی بے مصرف، بے آبرو اور بے حرمت زندگی کا سفر اسی دوراہے پر ختم کر دوں جہاں سے ایک راستہ میرے ماضی کی طرف جاتا ہے تو دوسرا میرے مستقبل کی جانب۔ ماضی ایک بیابان ہے اور مستقبل ایک سراب۔ حال ایک عذاب جسے میں اور نہیں جھیل سکتی۔ میں نے محبت کو بچپن کی معصوم رفاقت سے جوانی کی امنگوں تک پروان چڑھتے … بائیس برس گزار دیے۔ یہ میری حماقت تھی۔ یہاں کوئی … جانے والوں کو یاد نہیں کرتا اور سب یادیں گزرتے ہوئے وقت کی گرد میں دفن ہو جاتی ہیں۔ میں اس ذلت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی جو بائیس برس کے بعد مجھے خود اپنے محبوب و مقصود سے ملی۔ یہاں مجھے

غالب کا ایک شعر یاد آتا ہے۔ تو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے۔ یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں۔ سکندر نے مجھے صرف ٹھکرایا ہی نہیں، میری اپنی نگاہوں میں بھی بے عزت کیا۔ اس نے رابعہ کی محبت کو جتا کر مقام دیا۔ مجھے اتنا نیچا دکھایا اور کہا عرش کو فرش سے کیا نسبت۔ اس کے دل میں رقابت اور حسد کے جذبات پیدا کرنے کے لیے میں نے اپنے جذبات کا رخ اکرم شیخ کی جانب کر لیا۔ میں اس پر واضح کرنا چاہتی تھی کہ میں اتنی گئی گزری عورت نہیں ہوں۔ میری قوتِ تسخیر کے سامنے آج بھی کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ اور اس کے بے وقعت کرنے سے میں بے وقعت نہیں ہوئی۔ لیکن افسوس! اس پتھر پر خراش تک نہ آئی۔ میں اپنا سر پٹخ کے رہ گئی اور اس سے میرا احساسِ ذلت اور بڑھ گیا۔ میرا ردِعمل کسی زخم خوردہ ناگن کی طرح ہو گیا۔ میں نے اس سے انتقام لیا اور یہی وہ اذیت ہے جو اب مجھے جینے نہیں دیتی۔ خود میرا دل میرا دشمن ہے۔ یہ ہر وقت پوچھتا ہے کہ موہنی! کیا یہی تھی وہ محبت جس کی تو نے بائیس سال حفاظت کی، پرورش کی، اپنی تاریک گلی کی وہ شاخ جس پر تو نے آشیاں بنایا تھا۔ ایک صدمے نے اس محبت کی بنیاد ہلا دی اور اسے زمین بوس کر دیا۔ نہیں، یہ محبت نہیں تھی، جسم کی طلب تھی، ہوس تھی۔ محبت ہوتی تو نفرت میں نہ بدلتی۔ سرحد پار میرے ساتھی بھی … سکندر کو رابعہ کی رفاقت پانے کے لیے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ چنانچہ موقع پاتے ہی میں یہاں سے نکل جاؤں گی اور ان تمام واقعات و حالات کی تحریر چھوڑ کے اس دنیا سے وہاں چلی جاؤں گی جہاں سکندر کے ساتھ رابعہ نہیں جا سکتی ہے۔ وہاں جسم نہیں جاتا۔ اس کی اور میری روح شاید مل جائے… (نامکمل)"

اخبار میرے ہاتھ سے گر گیا، میں کچھ دیر تک خود سے بیگانہ ہو گیا اور میرا سر گھومنے لگا۔ موہنی مر گئی تھی۔ وہ عورت مر گئی تھی جو بائیس برس تک سراب کے تعاقب میں رہی۔ میری محبت کو ایک امانت کی طرح سنبھالے زمانے کی دستبرد سے بچائے اور دنیا سے چھپائے اپنے ساتھ رکھا لیکن سفر تمام ہوا تو اس کے کاندھے پر اپنی محبت کی لاش تھی۔ اس کی وفا کو میری بے وفائی نے کچل ڈالا۔ مجھے گناہ گاروں کے … کسی مجرم نے گناہ کے مرتکب کو سنگسار کرتے دیکھا۔ اس نے نارسائی کو اپنی تقدیر جان لیا، مگر دیوانوں کے کاسے میں پھینکے۔ ننگ، الزام اور تہمت تمام سب سمیٹ لیے اور ایک … کو پیار اور زندگی کا قرض چھوڑ گئی۔ ایک بار جب خوانین کے پیادے میرے … پر آ پہنچے تھے اس نے مجھے اپنے گھر تک پہنچایا اور پناہ میں رکھا تھا۔ آج پھر وہ مجھے اپنی زندگی دے کر وہی تحفظ فراہم کر گئی۔ اس نے خود کو بھرے بازار سے ہٹا لیا اور میرے راستے کے پتھر کی طرح ہٹا لیا۔ اپنے مرتے دم جھوٹ بولنے کو نیکی سمجھ کے قبول کیا اور وہ بیان دے گئی جو وقتی طور پر میرے خون کے پیاسے ہر شکاری کی پیش قدمی کو روک دے گا اور مجھے سب خطرات سے مامون کر دے گا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں رو رہا تھا۔ وہ سب ستم جو میں نے روا رکھے، سب زیادتیاں جو میں نے اس کے ساتھ کیں، ہر زخم جو اس کے دل کو دیا، اب مجھے لہولہان کر رہا تھا۔ بس ایک سوگ، تحفۂ وفا پانے والا موہنی کا مسکراتا چہرہ میرے تصور میں رہا، جو خیالوں کی بازگشت پکار رہی تھی۔ عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا، گر جیت گئے تو کیا کہنے، ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔ موہنی جیت گئی تھی اور میں اپنی ہار کے احساس میں جہنم میں جل رہا تھا۔

ایک ماتم، دوپہر ڈھل گئی۔ پہلے محسن نے میرے ساتھ موہنی کی یادوں کے مدفن پر اپنے اشکوں کے پھول چڑھائے، پھر اس کے ساتھ اکرم شیخ شریک ہو گیا۔ ہم بڑی دیر تک … کرتے رہے۔ شرمندہ ہوتے رہے۔ موہنی کی لاش کسی نامعلوم اسپتال کے مردہ خانے کے سرد فرش پر پڑی ہے۔ کیا پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی ہے؟ وہ ہندو تھی کہ مسلمان؟ اس کے دل میں کتنی محبت تھی؟ کیسی تھی یہ محبت؟ شاہ جہاں کی ممتاز جیسی… آخری بار کی مانند … یہ دل بھی ایک ڈولتا ہے۔ محبت بھی سیاست ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موہنی تھی یا رضیہ؟ اس کا جنازہ پڑھا جائے گا یا چتا جلائی جائے گی؟ وہ سہاگن مری ہوئی یا جنم رسید؟ غور طلب مسئلہ ہے۔

"کیا یہ سب ایسے ہی ہوا ہو گا؟" محسن نے ایک سوگوار وقفے کے بعد کہا۔

"ہاں، شاید کسی سبب سے باعزت موت ہو سکتی تھی۔ یقیناً کچھ لوگ اس کی جان کے درپے تھے۔"

"کون لوگ؟"

"اپنے یا پرائے، اب کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو شکاری ہی لگتے ہیں جو شکار کر گئے۔"

"لیکن میں نے سنا ہے جو چھپا تھا، انگلی دشمنی کے پاس…." زیب النساء کے ساتھ، اکرم شیخ بولا۔

"معلوم نہیں کہ زیب النساء بھی وہاں پہنچی یا نہیں!" میں نے اس مسئلے کی سنگینی کا نئے پہلو سے جائزہ لیا۔

"کیا یہ ہو سکتا ہے کہ…؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ناممکن ہے۔ زیب النساء ایسی لڑکی نہیں ہے۔"

"میں اس پر کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں کہ اس نے موہنی کی مخبری کی اور اسے شکاری کتوں کے حوالے کر دیا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جو زیب النساء کو تلاش کر رہے ہوں انھوں نے موہنی کو اس کے ساتھ دیکھ کر پہچان لیا ہو۔" اکرم شیخ نے کہا۔

"زیب النساء کا ایسا کون سا دشمن تھا؟"

"وہی تو اس کی وجہ سے وہ روپوش تھی۔ جو ہمارے دشمن ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔" محسن نے کہا۔

"اس کے جانے نے ہی مرنے سے پہلے اسے کہا تھا کہ بھاگ جاؤ اور وہ خطرے کی بو محسوس کرتے ہی غائب ہو گئی تھی۔ پہلے غلط دنیا میں قدم رکھنے کی غرض سے خبر شائع کرا دی اور شکاری دھر گئے تو وہ پہنچ گئی۔ چالاک لڑکی تھی۔"

"تمھارا کیا مطلب ہے؟" محسن چونکا۔

"مر جانے کیوں... مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس کے لیے ہمیں ماضی کا صیغہ ہی استعمال کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"اخبار میں تو کچھ نہیں۔"

"میں لاہور فون کر کے معلوم کرتا ہوں۔" محسن اٹھا اور باہر نکل گیا۔

"میرا خیال ہے سکندر کہ موہنی نے یہ فیصلہ اچانک نہیں کیا۔" اکرام شیخ بولا۔ "یہ بیان اس نے پہلے سے تیار کر لیا تھا۔ اس نے لاہور جاتے ہوئے ٹرین میں یہ چھ صفحات نہیں لکھے اور پھر ان کی نقلیں تیار کرتا، اخبار کے دفتر پہنچاتا اور خود پولیس کے پاس جاتا۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میں بھی قیاس آرائی کر سکتا ہوں۔ شاید وہ لاہور پہنچ کے یہ سب کرتی۔" میں نے کہا۔ "وہ دشمن اور آشتی سے ملنا چاہتی ہوگی۔ میرا گھر دیکھنا چاہتی ہوگی۔ میرا اور دلدار کا گھر۔ ان سب مقامات اور سب لوگوں سے تعلق کا رشتہ استوار کرنا چاہتی ہوگی جن کو ہم یاد کرتے تھے۔ مرنے سے پہلے آدمی ایسی ہی جذباتی تیاری کرتا ہے لیکن پھر راہ میں کچھ بات ہوئی کہ اسے لوٹ کر آنا پڑا۔ وہ جان بچا کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ مرنے سے نہیں ڈرتی تھی مار سے فکر ہوگی کہ کہیں اس کا پروگرام چوپٹ نہ ہو جائے۔ وقت آخر اس نے پوری جدوجہد کی اور اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔ وہ بہت مطمئن ہوگی جان دیتے وقت۔ بہت اچھی چال چل گئی وہ۔ ابھی کچھ عرصہ تو شکاری اپنے جال سمیٹ کر رکھ دیں گے کہ چلو قصہ ہی پاک ہوا لیکن یہی مہلت ہمارے کام آئے گی۔"

"یہ شخص تو مجھے چکما دے کر نکل گیا تھا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "کہا تو تھا اس نے کہ صدر چلو۔ صدر میں ایک جگہ ٹریفک سگنل پر اتر کے بھاگ گیا۔ میرے اترنے اور شور مچانے سے پہلے ہی وہ کاروں کے بیچ میں سے گزر کے ایک گلی میں غائب ہو گیا۔ میں ٹیکسی کو وہاں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ لائٹ گرین ہو گئی تھی۔"

"کیا اسے شک ہو گیا تھا؟"

"اگر شک نہیں ہوا تھا تو پھر وہ کسی کو دیکھ کے بھاگا ہوگا۔"

"بہتر ہوگا کہ ہم اسے یہیں دھر لیں۔ شرابی کیا معلوم کرے گا وہ ہمارے بارے میں اور کس سے معلوم کرے گا؟" میں نے کہا۔

گل بانو اس عرصے میں بے ہوش ہو گئی تھی جو ہم نے موہنی کو یاد کرتے گزارا تھا۔ اب اس نے آنکھیں کھولنے کے ساتھ انگلیاں ہلائیں اور بار بار ہم دونوں کو دیکھا پھر اسے کچھ یاد آیا۔

"وہ اخبار تمھیں مل گیا تھا؟"

"ہاں لیکن وہ خبر بے بنیاد تھی۔" میں نے کہا۔

"اخبار والے کیا پاگل ہیں کہ تصدیق کیے بغیر چھاپ دیتے ہیں؟" وہ بولی۔ "کچھ تو ہوگا..."

"تم دیکھ لو کہ ہم زندہ سلامت بیٹھے ہیں۔ یہ کسی نے شرارت کی ہے۔" اکرام شیخ بولا۔

"شرارت یا سازش؟" میں نے کہا۔ "سازشی ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ پیسہ دے کر خبر چھپوا سکتے ہیں اور لگوا سکتے ہیں۔"

"مگر اس میں ایک تھانے کا ذکر ہے اور تمھاری زبان سے بار بار موہنی کا ذکر سنا ہے۔" گل بانو آسانی سے ٹلنے والی نہیں تھی۔

"ہاں سنا ہوگا۔ موہنی کی حد تک یہ خبر درست ہو لیکن ہمارے بارے میں شک کی کیا گنجائش ہے کہ ہم نہیں مرے۔"

"میں سمجھ گئی۔ اس نے تمھیں بچانے اور محفوظ رکھنے کے لیے ایسا بیان دیا۔ کون تھی وہ مجھے بتاؤ؟"

"ابھی محسن آئے گا اس سے پوچھ لینا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا دیکھتا ہوں کہ کریم بخش کیوں واپس نہیں آیا ابھی تک۔"

کریم بخش کو گئے ہوئے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ سیدھا جاتا اور ہمارا گودام دیکھ کے لوٹ آتا تو یہ ایک گھنٹے کا کام بھی نہیں تھا۔ میں نے پہلے خود جا کے دیکھنے کا ارادہ کیا مگر پھر اسے خلاف احتیاط سمجھتے ہوئے بدل دیا۔ اس حلیے میں میرا اجالے سے دور ہی رہنا بہتر تھا۔

میں نے نیچے جا کے دوست محمد کو دیکھا۔ وہ ایک سگریٹ ختم کر رہا تھا اور نشے کی ترنگ میں جھوم رہا تھا۔

"دوست محمد! تم نے کچھ کھایا پیا ہے؟"

اس نے لال لال آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا۔ "اپنی قسم کھا کے اب یہ پیکٹ ہے۔" اس نے سگریٹ کو لہرا کے آخری کش لیا۔

"یہ سب نہیں چلے گا یہاں۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔"

"تم سالا کون ہوتا ہے یہ فیصلہ کرنے والا۔ ہم کہیں نہیں جائے گا اور تم ہم کو روک نہیں سکتا۔ ہم شراب بھی پیئے گا، چرس بھی پیئے گا..."

"نشے والی سگریٹوں کا یہ آخری پیکٹ ہے۔ اس کے بعد تم کو سمندر کا پانی پلاؤں گا اور تم کو یہاں باندھ کے ڈال دوں گا۔ جتنا بھی چاہے شور کرنا، گالیاں دینا، مجھے یا مرنے کی دھمکی دینا، میں ایک نہیں سنوں گا۔ میں دیکھوں گا کہ تم کیسے زندہ نہیں رہتے ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

وہ تھوڑا سا ڈر گیا۔ "تم ابھی تھوڑا مہربانی کرو۔ یہ میرے کو ادھر چھوڑ دو۔ میں کچھ نہیں کر سکتی تمھارے واسطے۔"

"ابھی تو تمھیں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ بعد میں تم وہ سب کرو گے جو چاہا کرتے تھے۔ یہاں رہو گے تو وہ تم کو مار دیں گے جو تم سے میرے بارے میں پوچھ رہے تھے۔"

"تم... قسم کھاتے کہ ہمارا بچہ... ہمارا بیٹا کا بیٹا... ان کا پاس نہیں ہے؟" وہ بولا۔

"ہم قسم کھانے والوں کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ پھر بھی اگر تمھاری تسلی ہو سکتی ہے تو میں قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ تمھارے بیٹے کو تمھاری بہو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔"

"تم نے یہ کیسے معلوم کیا؟"

"تم جانتے ہو کہ میرے لیے ناممکن کچھ نہیں۔ میرے تعلقات بہت وسیع ہیں اور وسائل لامحدود ہیں۔ میرے ساتھی ہر جگہ ہیں اور معلومات حاصل کرنے کے لیے پیسہ سب سے زیادہ کام آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا، تو ایک مہربانی کرو۔ یہ بھی معلوم کرو کہ وہ کنجری، ہمارا بیٹے کا خون پینے والا چڑیل، کس یار کے ساتھ گیا ہے؟ کون تھا وہ؟ جس کے لیے اس نے اپنا خاوند کو مارا۔ اصل مجرم وہ ہے جس نے عورت کو بہکایا، اس کو قابو کیا اور اس کو لے کر بھاگ گیا۔" وہ خلا میں گھورتا رہا۔

"نہیں... میں معلوم کر کے بتا دوں گا۔" میں نے کہا۔

"تمھارا احسان ہوگا جسے ہم کبھی نہیں بھولے گا۔ سارا عمر تمھارا غلام رہے گا۔ جو تم کہے گا وہ کرے گا۔" وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔

میں نے اسے تھپکی دی۔ "دوست محمد! یہ میرا وعدہ ہے کہ ایک دن میں تمھارے بیٹے کے قاتل کو تمھارے حوالے کر دوں گا لیکن یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا کہ وہ دن کب آئے گا۔ اس کے لیے تم کو انتظار کرنا پڑے گا اور زندہ رہنا ہوگا۔"

"ہم... زندہ رہے گا... اس کا خون پینے کا واسطے زندہ رہے گا۔ ہم اس کا پیٹ پھاڑیں گا، دل نکال کے چبائیں گا تو ہمارا دل کو قرار آئے گا۔" وہ چلانے لگا۔ "ورنہ ہم قبر میں بھی تڑپے گا۔"

یہ وقت ایسا تھا کہ میں دوست محمد کو عفو و درگزر کی تلقین نہیں کر سکتا تھا۔ یہ نہیں سمجھا سکتا تھا کہ وہ قاتل کے حساب کو یوم حساب پہ چھوڑ دے۔ قدرت کے نظام انصاف پر بھروسا کرے کیونکہ دیر ممکن ہے اندھیر ممکن نہیں۔

میں نے کہا۔ "دوست محمد اکرم کو کسی پر شک ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "پولیس بھی یہ پوچھتا تھا۔" پھر بولا۔ "کہ بابا شک سے کیا ہوتا ہے۔ ہم کیا بتاتا ہے اور وہ کس سے ملتا تھا۔ ہم کو بتا کے تو نہیں ملتا تھا۔"

"تمھاری بہو... کیا بہت دولت مند تھی؟" میں نے کہا۔

"دولت بہت تھا اس کے پاس لیکن سب ہمارا بچہ کا۔ وہ سب کچھ ہم دیا اس کو۔" وہ سینے پر دو ہتھ مار کے بولا۔ "روپیہ پیسہ... زیور... کپڑا... ہم بہت کمایا مگر بابا! ہم اپنے واسطے نہیں کمایا۔ کیا کریں گا ہم یہ سب؟ اپنے ساتھ لے جائیں گا قبر میں؟ قبر اپنا کدھر ہوئیں گا۔ ابھی دو بار بچ گیا، تیسرا بار ڈوب جائیں گا اس سمندر۔"

"کیا وہ بہت خوب صورت بھی تھی؟"

"ہاں، ادھر ڈانس ماسٹر کرتا تھا نیپیئر روڈ پہ۔ ہمارا بیٹا کا دل آ گیا۔ ہم بھی بولا اور سب لوگ بولا کہ کنجری لوگ کسی کا نہیں ہوتا۔ مگر وہ بولا کہ ہم شادی کریں گا تو ایک کنجری کم ہو جائیں گا۔ ایک عورت ٹھیک راستے پر آئیں گا تو یہ... ثواب والا کام ہے کہ نہیں۔ شریف لڑکی تو سب مانگتا ہے بیوی بنانے کا واسطے۔ وہ ہم کو ایسا لیکچر دیا کہ ہم مان گیا۔"

وہ نیپیئر روڈ کی طوائف تھی۔ اس انکشاف نے کچھ پس امکانات کے کئی روشن دروازے کھول دیے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کہیں بھی نہ گئی ہو۔ وہ واپس اسی کوٹھے کے ڈھیر پر پہنچ گئی ہو، جہاں اس نے عشوہ گری، جسم فروشی اور زر پرستی سیکھی تھی۔ ایسے ایک احمق ملا تھا جس کے پاس دولت تھی مگر وہ اس کی اپنی کمائی نہیں تھی۔ اسے باپ کی دولت بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے مل رہی تھی۔ چنانچہ وہ اس کی قدر کرنا نہیں جانتا تھا۔ جتنی آسانی سے وہ دولت ملی تھی اتنی ہی آسانی سے اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ جان اس نے مفت میں گنوائی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ طوائف واقعی شمع محفل کی حیثیت چھوڑ کے چراغ خانہ بننے کی آرزو رکھتی ہو مگر سب کچھ آرزو کی بات تو نہیں۔ اس کے محافظ اور نگران، اس کی کمائی کھانے والے مردار خور گدھ، اس کو زبردستی واپس لے گئے ہوں۔ انھوں نے بنائے فساد کو ہی ختم کر دیا ہوگا اور مجرم اس عورت کو بنا دیا ہوگا تاکہ وہ پھر کبھی ان کی جیل سے نکل بھاگنے کی کوشش کرے تو پھانسی کا پھندا سامنے آ جائے۔ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ کتابی باتوں، اصولوں اور نظریات کی دنیا بڑی اچھی ہے مگر ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ حقائق کی دنیا میں ایسا انڈر گراؤنڈ

www.paksociety.com

ورنہ یہ محبت ہے جس میں کوئی قانون، اصول اور ضابطہ نہیں چلتا۔ پولیس کو دوست محمد سے کیا لینا دینا۔ انھوں نے اُسے قاتل کے فرار کا جھوٹا بہانہ بنا کے ٹال دیا۔

"کیا نام تھا اس طوائف کا؟" میں نے خاموشی کے اس طویل وقفے کو ختم کیا۔

دوست محمد چونکا۔ "پہلے تو گوری تھا۔ ابھی شادی کا بعد ثمر لیلاں ہو گیا تھا۔"

گولی سے، ریوالور کی، بندوق کی، مشین گن کی یا بازار حسن کی، آدمی کی جان اسی طرح جاتی ہے۔ اس کا نام شریف النساء یا انار کلی رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آہستہ آہستہ میرا یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ عورت تلاش کرنے پر اُن ہوں کی کسی بستی میں ضرور مل جائے گی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ابھی اس کو کراچی سے کہیں اور بھیج دیا گیا ہو اور پولیس کو مال غنیمت سے اتنا حصہ دیا گیا ہو کہ حسب سابق ان کے مشترکہ مفادات کا معاہدہ برقرار رہے۔

میں دوست محمد کو تسلی دے کر لوٹا تو کریم بلوچ بدستور غائب تھا اور یہ بات خاصی تشویش کی تھی۔ کیبن میں گل بانو اور اکرام شیخ اپنے اپنے خیالوں میں گم چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ شیخ کی ذہنی کیفیت کیا ہو گی۔ اُسے موہنی نے دوسرا زخم دیا تھا۔ ایک جدائی کا اور دوسرا یہ انکشاف کر کے کہ اس کا التفات ایک فریب تھا۔ وہ جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا تھا وہ اس کے جذبات کا انتقامی انداز تھا۔ انتقام وہ مجھ سے لینا چاہتی تھی اور اس نے شیخ کو آلۂ کار بنا لیا تھا۔

گل بانو نے شاید اکرام شیخ سے موہنی کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا تھا اور اب افسردہ بیٹھی تھی۔ وہ بھی ایک عورت تھی اور موہنی کی محبت کے انجام نے اس کی نظر میں مجھے قاتل بنا دیا ہوگا۔ اس کی نظروں میں میرے لیے ملامت تھی لیکن میں نے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا۔ وہ انصاف کر سکتی تو شاید مجھے سب سے زیادہ مظلوم مان لیتی۔ ظلم تو مجھ پر موہنی نے کیا تھا۔

"کریم بلوچ نہیں آیا؟" میں نے اعصاب کو متاثر کرنے والی خاموشی سے گھبرا کے کہا۔

"میں دیکھ کے آتا ہوں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

میں اور گل بانو تنہا رہ گئے۔ اس نے کہا۔ "تم موہنی کو بچا سکتے تھے۔"

"میں تو ہی نہیں، ہم سب نے پوری کوشش کی تھی۔" میں نے بجھ کے کہا۔ "ہم سب چاہتے تھے کہ وہ زندہ رہے اور خوش رہے مگر وہ کچھ اور چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس سے محبت کروں جو میرے اختیار میں نہ تھا۔ اختیار کی بات ہوتی تو وہ اکرام شیخ کی محبت کا جواب محبت سے دے سکتی تھی۔ ظلم تو اُس نے اکرام شیخ پر بھی کیا کہ اُسے محبت کا فریب دیتی رہی اور وہ ہم سب کی طرح اسے محبت سمجھتا رہا۔"

"تم نے استفادہ نہیں کیا اس پر۔۔۔"

"یہ غلط ہے۔ اب ایسا نہیں تھا۔ شروع شروع میں ہم اعتبار کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہ تخریب کاری کے ایک ٹھکانے سے پکڑی گئی تھی۔ ہندو تھی اور بھارتی شہری تھی۔ ان سب باتوں کو میں نے نظر انداز کر دیا۔ بچپن کے تعلق کو آج کی سیاست سے کیا تعلق۔ بہت سے میرے جاننے والے گروہ سب آج میرے دوست نہیں ہیں۔ میں کیسے مان لیتا کہ بائیس سال بعد وہ ایک ناقابل یقین قسم کے غائبانہ عشق میں مبتلا تھی۔ میں نے اسے افسانہ سمجھا تو میرا کیا قصور؟ حقیقی دنیا میں کبھی دیکھا نہیں تھا۔ بعد میں اُس نے سب کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ ہم اسے اپنا ہی سمجھتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی اس حقیقت کی تلخی کو قبول کر چکی ہے کہ میں اسے رابعہ کی جگہ مرنے کے بعد بھی نہیں دے سکتا۔ کسے معلوم تھا کہ دیوانگی میں وہ اس حد تک بڑھ جائے گی۔ وہ مجھ پر ہی نہیں، رابعہ پر بھی ندامت کا وہ داغ چھوڑ گئی ہے جسے ہم ساری عمر چھپانے کی کوشش کرتے رہیں گے لیکن اُس کے لہو کے جو چھینٹے میرے دامن پر آئے ہیں اُن سے میں کیسے نظر چرا لوں گا؟"

اس وقت گل بانو نے ایک عجیب حرکت کی۔ اُس نے نیچے میرے پاس بیٹھ کر میرا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ "چلو چھوڑو، اتنا دکھی مت کرو اپنے آپ کو۔" اُس نے میرے سر کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تم مجبور تھے میرے ویر۔" مجھے یوں لگا جیسے میں اپنی بڑی بہن کی پُرخلوص، بے غرض محبت کی ٹھنڈی چھاؤں میں پہنچ گیا ہوں۔ اس شفقت اور غمگساری نے میرے دل کو وہ سکون دیا کہ خود بخود میرے آنسو بہنے لگے۔ وہ مجھے تسلی دیتی رہی۔

"مرد ہو کے روتے ہو۔ یہی تو زندگی ہے۔ دیکھو اُس نے کس طرح مجھ سے سب کچھ چھینا اور پھر کیا دے دیا۔ جو میرے بھائی کو نہ مل سکا وہ مجھے مل گیا۔" اُس نے اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو صاف کیے۔ "وہ سب رشتے اب میرے ہیں جن سے کبھی میں ناآشنا تھی۔"

میں نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ "پھر تم نے یہ کیا حماقت کی تھی؟"

"میں ڈر گئی تھی بھائی۔ میں سمجھی۔۔ کہ میں پھر اکیلی ہو گئی ہوں۔" وہ بولی۔

"کیا وہ زندہ نہیں رہتے جو اکیلے ہو جاتے ہیں؟ اور پھر تم ایک زندان میں تھیں۔" میں نے کہا۔ "جو بہت بڑا ہے۔ اس میں حسرت ہی نہیں محبت بھی ہے۔ اکرام شیخ، غالب اور نائلہ، شملا اور اُس کا بیٹا، دوست محمد اور کریم بلوچ، یہ چند نام ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں جن سے تم واقف نہیں ہو لیکن وہ سب بھی تم سے وہی رشتے رکھتے ہیں، انسانیت، شرافت، محبت اور خلوص، اعتماد اور سچائی کے رشتے۔"

"کیسے عجیب نام ہیں ان رشتوں کے۔" وہ بولی۔

"وعدہ کرو آئندہ ان رشتوں کو تم نہیں جھٹلاؤ گی۔" میں نے کہا۔ "تقدیر کے فیصلے تو قبول کرنے ہی پڑتے ہیں لیکن تدبیر پر تو اپنا اختیار رہتا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کا سہارا ہیں۔ ایک دوسرے کی طاقت ہیں جیسے نظام شمسی کے سیارے ہیں۔ کشش کے توازن پر قائم ہیں اور گردش کر رہے ہیں۔"

"تم بہت عالم فاضل ہو۔ کہیں پروفیسر ہونا چاہیے تھا تم کو۔" وہ مسکرائی۔

"میں نے کیا کہا ہے؟ وعدہ کرو نہیں تو پٹائی کر دوں گا۔" میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔

"وعدہ سر، وعدہ۔" وہ کان پکڑ کے بولی۔ "آئندہ میں خودکشی کروں تو مجھے جان سے مار دینا۔"

"چلو اب جا کے نہا دھو لو، کچھ طبیعت ہلکی ہو جائے گی اور کپڑے۔۔۔ خیر۔۔۔ رہو گی تم گل بانو، خواہ نام اپنا گل خان رکھ لو اور عقیدہ گل محمد کا بنا لو۔" میں نے کہا۔

"گل خان، یہ ٹھیک ہے۔" وہ ہنس پڑی۔ "جب تک میں گل بانو نہیں بن جاتی۔۔ گل خان۔"

"لیکن محسن تو اوپر کا نقطہ نیچے لگا کے بولے گا۔ اس نے گڑبڑ پھیلا رکھی ہے وہ۔" میں نے کہا۔

وہ ذرا دیر سے سمجھی کہ اس طرح وہ گل جان ہو جائے گی۔ پھر اچانک اس کے رخسار دہک اٹھے اور میں نے پلٹ کے دیکھا تو محسن دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔ شاید اس نے کچھ گفتگو سن لی تھی۔ گل بانو باتھ روم کا دروازہ کھول کے غائب ہو گئی تو وہ آگے آیا۔

"یہ تو اچھا نہیں کر رہا ہے یار۔" وہ سنجیدہ ہو کے بولا۔ "اس آگ کو ہوا مت دو جو تمہاری پھینکی ہوئی چنگاری سے لگی ہے۔"

"یہ حالات کا تقاضا ہے۔"

"کل اگر پھر کوئی موہنی حالات کے تقاضوں پہ قربان ہو جائے تو مجھے الزام مت دینا۔" وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ "تم لوگ مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں اس خطرناک کھیل میں فریق بن جاؤں جس کے نتائج سب کے حق میں خطرناک ہوں گے، میرے لیے بھی، شملا کے بیٹے اور گل کے لیے بھی۔"

"میں تجھے مجبور نہیں کر رہا ہوں، تو انکار کر سکتا ہے۔ آج بھی اُس نے خودکشی کی ناکام کوشش کی تھی، کل یہ کوشش کامیاب ہو جائے گی، اللہ اللہ خیر سلّا۔" میں نے کہا۔ "اوّل مرنا آخر مرنا۔ اُسے مرنا ہی ہے تو جینے کا موقع فراہم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"شاید تیرے لیے یہ کام آسان ہو۔"

"ہاں! میں یہ کر سکتا تھا بشرطیکہ اس نے مجھ سے جینے کا سہارا مانگا ہوتا۔" میں نے کہا۔ "اور میں رابعہ کو بھی بتا دیتا۔ شاید تب بھی کسی اندیشے کا شکار نہ ہوتا اس لیے کہ میں رابعہ کو سمجھتا ہوں اور اتنا ہی وہ مجھے سمجھتی ہے۔ وہ میرا ساتھ دیتی۔ کسی کو زندگی کی طرف لے جانا تو کارِ ثواب ہے۔ پھر یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ جب اُسے جینا آ جائے گا تو وہ خود اپنے سہارے پر بھی چلنے لگے گی جیسے بچہ پہلے واکر کے سہارے چلتا ہے، پھر واکر کے بغیر چلنے لگتا ہے۔"

"زیب النساء اور یاں نہیں ہے بھی۔" محسن نے منہ دوسری جانب پھیر کے کہا۔ وہ گل بانو کے موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"نہیں پہنچی؟" میں نے کہا۔ "کسی سے بات ہوئی؟"

"شملا سے اور آتی ہے۔" وہ بولا۔

اُس کے جذبات میں منفی خیالات کی رَو کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔ "یہ تو کوئی لمبا چکر ہو گیا۔"

"اکرام شیخ نے غلطی کی۔ وہ لاہور سے بھاگ کے کراچی آئی تھی تو اسے واپس بھیج دیا۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ دونوں ہی آدھے راستے سے لوٹ آئیں۔" محسن بولا۔

"مگر انھیں نہ جانا ہوتا تو وہ شیخ کے سامنے انکار کر سکتی تھیں۔ شیخ انھیں زبردستی تو نہ بھیجتا۔" میں نے کہا۔ "اُس نے اپنی طرف سے ٹھیک کیا تھا۔ اب غلط ہو گیا تو الزام اُسے دینے سے کیا فائدہ۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں اب۔"

"ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ پولیس کو اس کی گمشدگی کی رپورٹ تک نہیں دے سکتے۔" محسن نے تلخی سے کہا۔ "میں نے شملا سے کہا ہے کہ اخبارات دیکھے، حادثات کی خبروں اور پُراسرار جرائم کی خبروں اور کچھ نہ ملے تو منتظر کو بتا دے۔ وہ بھی کیا کر سکتا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "اُس کے پاس کیا اختیار ہے کہ وہ ایک اجنبی لڑکی کے بارے میں کسی سے کچھ کہے۔ لاہور کے کالج کی ایک لڑکی کراچی سے لاہور جانے کے لیے سوار ہوئی مگر لاہور نہیں پہنچی۔ آئی بھی لاہور سے ہی تھی وہ۔ لاہور کا شہر اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ لاہور میں روپوش بھی ہو سکتی تھی۔ پھر روپوش ہو

www.paksociety.com

سکتی ہے۔ اس کا والی وارث کوئی ہے نہیں۔ وہ خوب صورت ہے اور پڑھی لکھی ہے، بالغ ہے، اکیلی سفر کر رہی تھی۔ راستے میں بھی اُتر سکتی ہے، کوئی کہاں تلاش کرنے جائے اُسے اور کیوں جائے؟ خود ہمیں کہاں فرصت ہے۔"

میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا لیکن یہ میرے ہی خیالات نہیں تھے۔ محسن کی سوچ بھی مختلف نہیں ہو سکتی تھی۔

"اکرام شیخ کے سپرد کر جائیں گے یہ معاملہ۔" محسن بولا۔

"ہاں، وہ بھی رہ جائے گا پیچھے، اکیلا۔" میں نے کہا۔

"ہمارا اس سے رابطہ کیسے رہے گا؟"

"ٹھہرو، پرائیویٹ چینل۔ ہم شملا کو یا عبدالودود منظر کو باخبر رکھیں گے اور اسی کے ذریعے خبریں حاصل کرتے رہیں گے۔"

کریم بلوچ اسی وقت عرشے پر نمودار ہوا۔

"کہاں مر گئے تھے تم؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "ایک معمولی سا کام تھا۔"

"ابھی صاحب، کام تو چھوٹا تھا پر لین کیا کرے، وہ سالا موشن میاں۔۔۔"

"موشن میاں، تم پھر موشن میاں کے پاس گئے تھے؟" میں نے ڈانٹ کے اس کی بات کاٹ دی۔ "شادی کی تاریخ لینے۔۔۔"

"نہیں صاحب! ایسی بات نہیں، ہم خود نہیں گیا، وہ مل گیا ہم کو۔ ہم کیا کرتا صاحب۔ ہم اس کو قتل کیا، اس واسطے تھوڑا ٹیم لگ گیا۔" اس نے معذرت آمیز انداز میں کہا۔

میں نے محسن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "کیا تو نے بھی وہی سنا جو میں نے سنا؟"

"کس لیے دیر ہوئی واپسی میں؟ کیا کہا تھا تم نے؟"

"ہم ٹھیک بولا صاحب۔ ہم اس سالا موشن میاں کو۔۔۔ وہ۔۔۔ کیا بولتا آپ۔۔۔ کرنچ۔۔۔ کر دیا۔" وہ بولا اور اس نے نیفے میں اڑسا ہوا خنجر نکالا۔ "آپ فکر مت کرو۔ کوئی نہیں دیکھا ہم کو۔"

"کریم! تم نشے میں ہو؟ یہ کیا بکواس ہے؟" میں نے اسے غور سے دیکھ کے کہا۔ اس کی آنکھیں مجھے کچھ عجیب نظر آئیں۔ ان آنکھوں میں وحشت کے سائے بہت نمایاں تھے، وہ شاید پہلے بھی اور دیر سے کریم پاگل ہو رہا تھا۔

"ابھی یہ کیسے ہم آپ کو بولا صاحب۔۔۔ آپ کو سچ بولتا ہم اس کو بکرا کا طرح ذبح کر دیا۔" اس نے خنجر میری طرف بڑھایا۔ "آپ دیکھو، واسطے ہم صاف کر دیا ہے اس کو۔"

محسن نے ہاتھ سے پکڑ کے اندر کھینچ لیا۔ "تم قتل کر کے آئے ہو، کیا بات ہے تم پاگل ہو گئے تھے؟ کیوں مارا تم نے اسے؟"

"ہم ایک دم پاگل ہو گیا صاحب! وہ سالا۔۔۔ وہ ہم کو بولا کہ میرا ساتھ چل، تیرے کو ایک بات بولے گا۔۔۔۔۔۔ ملینہ! بولا کہ چل سالا، تو کچھ پاوے گا، مگر اب تیری خیر نہیں، میرا بابا آ گیا ہے۔ وہ بولا کہ نہیں کریم، ہم تیرے ساتھ ایک ماڑا بات کریگا۔"

"یہ گفتگو کہاں ہو رہی تھی؟"

"ادھر ہی۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "وہ ہم کو راستے میں مل گیا۔ بولا ہم تیرے کو تلاش کرتا پڑا تھا۔ تیرا بولے چار ہزار روپیہ اپنا بابا کس ہے یہ لے اور جا۔ ہم بولا کہ کدھر جاوے؟ ہم یہ پیسہ تیرے کو شادی بنانے کے واسطے دیا۔ ہم مستری کو ساتھ لے کر جائے گا۔ وہ بولا کریم! ابھی تیرا شادی مادی نہیں ہو سکتا۔ میں پوچھا کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا اس کا باپ کا مرضی نہیں ہے۔ وہ بولا کہ ایسا ہی بات ہے۔ اس کو شادی ہو گیا۔ بس صاحب میرا دماغ خراب ہو گیا۔ وہ بولا کہ مستری کا شادی ہو گیا اب وہ تیرے ساتھ کیسے شادی کر سکتا ہے۔ میں پوچھا کہ کیسے ہوا تو وہ بولا کہ بچارا بابی بھاگ گیا۔ ہم آپ کو بتایا تھا صاحب کہ اس کا بابی پاگل ہے۔ مستری کا بڑا بھائی مر گیا، جب موقع ملتا ہے گھر سے نکل جاتا ہے۔ موشن میاں کا بات پر ہم بولا کہ تیرا بابی تو روز بھاگ جاتا ہے اور پھر آ جاتا ہے۔ وہ بولا کہ نہیں، ابھی وہ نہیں آئے گا۔ ہم اس کا کام کر دیا اور اس کو ایک فقیر لے گیا، پانچ سو روپیہ میں۔ میں نے کہا کہ تو نے فقیر کو بیچ دیا؟ صرف پانچ سو روپیہ میں؟ تو وہ بولا کہ ہم نے چار سو میں لیا تھا۔ سو روپیہ بچ گیا اور ہمارا جان چھوٹ گیا ———— میں نے کہا کہ تیرے پر لعنت اور مرلی پر بھی لعنت۔ تیرا بابا پاگل کیا بات کا، مستری کا شادی سے کیا تعلق؟ میرا شادی اس سے کیوں نہیں ہو سکتا۔ وہ بولا کہ اس سے میں شادی بنا لیا۔ تو چل، میرا ماما کا پیسہ واپس کرے گا۔ تو صاحب! اس وقت ہم سب بھول گیا۔ ہم کو کس کام واسطے بھیجا تھا۔۔۔ ہم فیصلہ کیا کہ اب اس کو چھوڑے گا۔ ادھر ہم اس کو چپ بولا۔ ہم اس کو مبارک دیا۔ اور بولا کہ ہمارا قسمت میں مستری نہیں تھا۔ ہم کسی اور سے شادی بنائے گا۔ تو صاحب وہ ہم کو گھر لے گیا۔ ادھر مستری بھی تھا۔ وہ بہت رو رہا تھا صاحب۔ ہم بولا کہ ابھی مت رو۔ تیرا ساتھ یہ زبردستی شادی کیا۔ وہ بولا کہ میرا باپ کو اس نے جوا دیا۔ موشن میاں اندر گیا اور چھری لے کے نکلا۔ تب ہم اندر گیا اور بس اس کو ادھر ہی کاٹ دیا۔"

"مستری کے سامنے؟ اور تم کہتے ہو کسی نے نہیں دیکھا؟" محسن نے سر پکڑ کے کہا۔

"نہیں صاحب، وہ چلا گیا تھا اپنا باپ کا گھر۔ ہم بولا کہ تم جاؤ، ابھی تم بیوہ ہو گیا۔ جب ہم واپس آئے گا تو تم سے شادی بنائے گا۔ ابھی چار مہینہ دس دن تم اپنا گھر میں بیٹھو۔"

"اُف، یہ بے وقوف، پولیس سب سے پہلے اسے پکڑے گی۔ ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "اسے قتل کر کے تو خیر تم نے ٹھیک کیا۔"

"وہ شیطان اسی سزا کا مستحق تھا مگر اب مستری کا کیا ہو گا؟" میں نے تشویش مندی سے کہا۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے کہ اسے لے آؤ، ابھی اسی وقت۔ اس سے پہلے کہ پولیس اس تک پہنچے، تم اسے نکال لاؤ۔"

"ہم جائے گا صاحب! آپ بولے گا تو ہم لائے گا۔ ہم جانتا تھا آپ ہم کو بچائے گا۔ آپ مستری کو بھی بچائے گا۔ ہم آپ کا غلامی کرے گا صاحب!"

"باتیں مت کرو اور جاؤ، جلدی جاؤ۔"

وہ پلٹا ہی تھا کہ مجھے اصل بات یاد آئی۔ "ارے! تو جس کام سے گیا تھا تو اس کا کیا بنا؟"

"وہ۔۔۔ ہاں صاحب! ہم معلوم کیا۔ وہ جہاز چلا گیا کل رات۔ ابھی ادھر نہیں ہے۔" کریم بلوچ نے کہا اور پلٹ کے روانہ ہو گیا۔

میں نے دوڑ کر اسے پکڑا۔ "جہاز چلا گیا؟ کس وقت؟"

"رات دو بجے۔" وہ بولا۔ "ہم سب معلوم کیا۔"

"یہ تو معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔" محسن نے سمندر کی وسعت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب تک تو وہ نہ جانے کتنی دور نکل گیا ہو گا۔"

"بدقسمتی ہماری۔ ہم نے بہت وقت گنوا دیا۔ ہم جیسے ہی بندرگاہ کے علاقے میں پہنچے، سب سے پہلے ہمیں جہاز کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے تھا لیکن ہم دوست محمد کے چکر میں پڑ گئے، پھر گل بے بی نے ہمیں چکر میں ڈال دیا۔"

اس سے زیادہ میں کچھ نہ کہہ سکا۔ جو وقت ہم نے موسیٰ کو یاد کرنے میں گزار دیا تھا وہ اس کا حق تھا۔ ہم نے اس کے لیے کچھ بھی تو نہیں کیا تھا۔ ابھی اس کی لاوارث لاش کسی سرد خانے ہی میں پڑی تھی اور ہم اس سے بے تعلق ہو گئے تھے۔ ہم اس کی آخری رسوم کسی بھی عقیدے کے مطابق ادا نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ یادیں تھیں جن پر ہم نے آنسوؤں کے دیے روشن کیے تھے۔ میں کیسے کہہ سکتا تھا کہ اس میں بھی وقت ضائع ہوا۔

"مجذوب کیا کرتا ہے؟" محسن بولا۔

"ہم اب مزید تاخیر نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔ "جیسے ہی کریم واپس آئے کوچ کی تیاری کرتے ہیں۔ وہ سارا حساب کتاب تو غلط ہو گیا۔"

"کون سا حساب کتاب؟"

"شاہ جیلانی نے ایک نقشہ بنا کے دیا تھا کہ کس وقت وہ کہاں ہو گا۔ چوبیس گھنٹے کا فرق پڑ گیا ہے اور ابھی شام کے چھ بجے سے پہلے تو ہم نکل بھی نہیں سکتے۔" میں نے کہا۔

"وہ نقشہ دوست محمد کو دکھانا چاہیے۔ ممکن ہے وہ اس سے مدد لے کر ہماری راہنمائی کر سکے۔" محسن بولا۔ "تیاری تو سب ہے۔ ہم دو گھنٹے بھی کیوں ضائع کریں؟"

اسی وقت میری نگاہ بندرگاہ کے ہجوم میں اکرام شیخ پر گئی۔ وہ واپس آ رہا تھا مگر اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ مسلح پولیس تھی جس نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال رکھی تھی۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے پریشانی کے ساتھ محسن سے کہا جو اب میرے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ "شیخ کس چکر میں پھنس گیا؟"

"یہ تو کریم بلوچ کا پتا چلانے گیا تھا۔" محسن نے تشویش سے کہا۔ "کیا وہاں کسی سے جھگڑا ہو گیا؟"

اس وقت اچانک میرے ذہن میں وہ خیال آیا جو کسی الہامی کیفیت میں نازل ہونے والی وحی کی طرح تھا اور میری عقل نے اس خیال کی روشنی میں اصل حقیقت کو دیکھا اور کہا۔ اگر اکرام شیخ کا کسی سے جھگڑا ہوتا تو وہ اکیلا ہی زنجیر بدست یوں نظر آتا؟ پولیس تو نقص امن کے الزام میں انھیں بھی سمیٹ کر لے جاتی ہے جو قیام امن کے لیے کوشاں ہوں یا محض تماشائی ہوں۔ گواہ، ملزم اور مدعا علیہ تعداد میں جتنے زیادہ ہوتے ہیں تھانیدار صاحب کو خصوصی اختیارات کے تحت معاف کرنے کا نذرانہ بھی اتنا ہی زیادہ ملتا ہے۔

اب اگر اکرام شیخ اکیلا پکڑا گیا تھا تو اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی کہ شامت اعمال اسے جائے واردات پر لے گئی تھی۔ محتاط ہونے کے باوجود وہ غلط وقت پر موشن میاں کے گھر جا پہنچا اور بدقسمتی نے اسے گرفتار کرا دیا۔

"اب کیا کرنا چاہیے؟" محسن نے کہا۔

"ہم اکرام شیخ کو ایسے چھوڑ کے نہیں جا سکتے۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ تھانے پہنچ گیا تو معاملہ لمبا ہو جائے گا۔ یہ الو کا پٹھا کریم کہاں جا کے مر گیا؟"

"لعنت بھیجو کریم پر۔۔۔ فیصلہ کرو کہ شیخ کو اس مصیبت سے کیسے بچایا جائے؟"

"فیصلہ کیا کروں میں؟" میں نے جھنجلاہٹ میں کہا۔ "پتا کیجیے کہ معاملہ کیا ہے؟ شیخ کو چھڑانے کے بس دو ہی طریقے ہیں، زر یا زور۔ یا تدبیر یا بندوق و زر۔"

"طاقت کا استعمال ابھی اکرام شیخ کے لیے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔" محسن بولا۔ "وہ حراست جانے کے بعد پکڑا گیا تو اس کے الزامات کی فہرست بہت لمبی ہو جائے گی اور اسی وقت وہ اکیلا ہو گا۔"

"پہلے تو کچھ سودا کر لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "الزامات کے عائد ہونے سے پہلے ہی الزام لگانے والوں کو خرید لیتے ہیں۔ یہ

www.paksociety.com

نسبتاً کم قیمت لوگ ہیں اور تعداد میں بھی کم ہیں۔"
محسن نے تائید میں سر ہلایا۔ "اگر وہ ہماری توقع سے باہر نکلے تو کیا ہوگا؟"
"ان کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ شیخ کو ہم بہرحال لے آئیں گے۔ تو فٹافٹ نال لے آ۔" میں نے کہا۔
جب وہ پیچھے کیبن میں جانے کے لیے غائب ہو گیا تو میں نے گل بانو کو دیکھا جو بڑے ٹاٹھ کے پوز میں کمر پہ ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔
"یہ اچانک کیا پروگرام بن گیا ہے؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کے بولی اور میرے سامنے اتنے قریب آ گئی کہ مجھے ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ گل بانو کے انداز و اطوار میں ابھی کم سے کم پرانے وقتوں کی خود اختیاری اور بے باکی کا جارحانہ انداز باقی تھا۔ لیکن اس کے حالات اور ماحول کے پس منظر سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ ایسے ماحول میں اگر وہ نسوانیت کے آداب سے بے بہرہ رہی تو قصور اس کا نہیں۔ اس کے لیے روایتی قسم کی شرم و حیا کا مظاہرہ کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس وقت وہ مردانہ کپڑوں میں نہیں تھی۔ زنانہ لباس بھی اس نے خاصی بے تکلفی اور بے پروائی سے پہنا تھا لیکن اسے بالکل برہنہ نہیں تھا کہ رسمی ستر پوشی کے اس انداز میں بے حجابانہ نمائش کے کتنے اسباب نظر آتے ہیں۔ ایک اجنبی اسے بے شرم و بے حیا بھی قرار دے سکتا تھا۔
"ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟ کوئی غلط سوال کیا ہے میں نے؟" وہ بولی۔
"نہیں..." میں نے چونک کر کہا۔ "وہ دراصل ہم جا رہے ہیں اکرام شیخ کو چھڑانے کے لیے۔"
"اور تم خود دھر لیے گئے تو پھر؟"
"تمہارے اندیشے اپنی جگہ درست ہیں بی بی! یہ بھی تو نہیں ہو سکتا نا کہ ہم اپنے دوست کو اس کی تقدیر کے سپرد کر کے نکل جائیں۔" میں نے کہا۔
"میں کب کہہ رہی ہوں کہ اس کے لیے کچھ مت کرو، لیکن یہ بھی تو سوچو کہ پولیس نے تمہیں پہچان لیا تو پھر کیا ہوگا؟ میں کیا اکیلی جاؤں گی غالب اور نازو کی مدد کے لیے۔ تم اور محسن ہی جانتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ تمہیں یہ رسک نہیں لینا چاہیے اس وقت۔"
"پھر کیا کرنا چاہیے؟" میں نے طنز اور غصے کے ساتھ کہا۔ "ہم دونوں کو یہاں چھپ کے بیٹھ جانا چاہیے۔ شیخ کو چھڑانے کے لیے تم جاؤ گی؟"
"اچھا ہوا تم جلدی سمجھ گئے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
میں بھونچکا رہ گیا۔ "تم سیریس ہو؟"
"کیا تم مذاق کر رہے تھے؟"

"مگر یہ... یعنی کیا تم بہت آسان سمجھتی ہو اس کام کو؟"
"ہاں، اور اسی لیے چاہتی ہوں کہ یہ کام صرف میں کروں۔ یہ ایسا کام ہے نا جسے کر لینے دو۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "اب تک سارے مشکل کام تم کرتے آئے ہو۔ آئندہ بھی کرو گے۔ تم مرد ہو اور بد قسمتی سے میں عورت ہوں۔"
"تم غلط سمجھ رہی ہو گل۔" میں نے کہا۔
"نہیں، میں تم کو بالکل صحیح سمجھ رہی ہوں۔ تم عام مردوں کی طرح یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ جو کام تم کر سکتے ہو وہ کوئی عورت بھی کر سکتی ہے۔ حالانکہ جس طرح رابعہ نے تمہارا ساتھ دیا اور اب جس طرح نازو غالب کے ساتھ چلی گئی ہے انجام کی پروا کیے بغیر، اس کے بعد تمہیں تو یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا۔ مجھے دیکھو، تم اس وقت جب میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ انہی کے ایک رکن کی حیثیت سے جانی جاتی تھی، سردار میرا بھائی تھا تو کیا؟ وہ میرا ان لوگوں کے تو میرے ساتھ نہیں رہتا تھا۔"
"ٹھیک ہے۔ میں مان لیتا ہوں کہ تم کسی سے کم نہیں ہو، مگر مجھے بتاؤ کہ تم یہ کام کیسے کرو گی؟"
"یہ تم مجھ پہ چھوڑ دو۔" وہ بولی۔ "یا تو میں اکرام کو واپس لے آؤں گی چھڑا کے، یا ہنگامے سے بچ کے آؤں گی ورنہ واپس نہیں آؤں گی۔"
"تمہارے واپس نہ آنے سے مسائل دگنے ہو جائیں گے گل۔" محسن نے کہا جو تیار ہو کے آ گیا تھا۔ "حل نہیں ہوں گے۔"
"پلیز محسن! مجھے جانے دو۔ تم لوگ بھروسا کر کے تو دیکھو ہم پہ۔" وہ محسن کے گلے میں بانہیں ڈال کے کھڑی ہو گئی کہ اس کا چہرہ محسن کے مقابل آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ محسن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن محسن میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے نظر ملاتا۔
اس نے گل بانو کے ہاتھوں کو ایک جھٹکے سے الگ کر دیا۔
"یہ بازاری طریقے مت اختیار کیا کرو اپنی بات منوانے کے لیے۔ تم آخر کیا سمجھتی ہو...؟"
وہ محسن کے الفاظ کی پروا کیے بغیر میری طرف پلٹ گئی۔ "خدا کے لیے تم لوگ مت جاؤ..."
جانے اس کی آنکھوں میں التجا تھی کہ وہ کون سا جادو تھا جس نے مجھے موم کر دیا۔
میں نے سر ہلا کے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ہم اکرام شیخ کی زندگی کو داؤ پر لگا کے جوا کھیلنے کا یہ جوکھم کسی صورت تسلیم نہیں کر سکتے۔ دوسری کوشش ہم خود کریں گے اور پھر کامیابی کی جو بھی قیمت ادا کرنا پڑی... وہ ہم کریں گے اور جانے سے ساتھ تم بھی چلی جاؤ گی... محسن... اسے دے دو سب رقم۔"

"تو پاگل ہو گئی ہے..." محسن نے احتجاج کیا مگر اب اس میں شدت نہیں تھی۔
"بچھو بہت، ہم سب پاگل نہیں تو اور کیا ہیں؟"
محسن نے ایک رومال میں لپٹی ہوئی رقم گل بانو کو تھما دی۔ "یہ پورے ایک لاکھ ہیں۔ ہم پڑ جائیں تو فکر مت کرنا۔ سودا کر لینا ادھار پر اور واپس آ کے دے جانا۔ میرا خیال ہے کہ اتنی رقم بہت ہوگی۔"
گل بانو مسکرائی۔ اس نے ایک نظر اپنے لباس کو دیکھا۔ اگرچہ میرے نقطۂ نظر سے معیوب تھا مگر اس نے ایک دوپٹے کا اضافہ کر لینے کے سوا کچھ نہیں کیا۔
"خدا حافظ اور گڈ لک۔" میں نے کہا۔
"تم بھی کچھ کہہ دو، مسکرا ہی دو۔" اس نے محسن کے گال پہ چٹکی لے کر کہا۔ "ارے بھلا کیوں گھبراتے ہو؟" اور اس سے پہلے کہ محسن گال دبا کے، وہ پلٹ کے لانچ کے آخری حصے میں پہنچ گئی۔ آخری بار اس نے ہماری طرف دیکھ کے ہاتھ ہلایا۔ میں نے جواب میں ہاتھ ہلایا۔ آخری حرکت گل بانو نے یہ کی کہ اپنی دو انگلیاں ہونٹوں پہ رکھ کے فاسق و فاجرانہ نقش کی اسٹائل میں ایک ہوائی بوسہ محسن کی طرف ارسال کر دیا۔
"لڑکی پگلی!" محسن نے دانت پیس کے کہا۔ "واپس آ جائے پھر میں اس کا دماغ درست کر دوں گا۔"
"تو کسی الہڑ مٹیار کی طرح شرم و حیا سے لال گلابی ہو رہا ہے۔" مجھے محسن کی حالت پہ بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "اور وہ بے تکلف دست درازی پر اتر آئی ہے...... بازاری عورت۔"
محسن اسے ہجوم میں گم ہوتا دیکھتا رہا۔ "عجیب ڈھیٹ سے پالا پڑا ہے۔ کوئی اور ہوتی تو میرے منہ پر تھپڑ مارتی۔"
"ہے کوئی کالا کلوٹا تو وہ چپ رہتی ہے۔ وہ عورت کیوں تھپڑ مارے گی جسے یقین ہو کہ بیٹھے میں دی جانے والی گالی کے سوا کچھ نہیں۔ گالی کا مقصد تو ہو سکتا ہے مطلب کچھ نہیں ہوتا۔"
"میں تو دیکھ رہا ہوں کہ تو اس کی طرف داری میں حد سے بڑھتا جا رہا ہے۔" محسن ابھی تک خفا تھا۔ "ایسے غلط فیصلے مہنگے پڑ جاتے ہیں۔"
"کیا غلط فیصلہ کیا میں نے؟"
"اس کی بات مان کر۔ بھلا یہ عورتوں سے سنبھلنے والے معاملات ہیں۔ اس نے کہا کہ میں مردوں سے کم نہیں اور آپ نے کہا کہ جب ارشاد۔ کیا ہوگا اگر معاملہ اور بگڑ گیا؟"
"پھر ہم جائیں گے۔"
"ایک نہیں، دو دو معاملے نمٹانے۔" محسن بولا۔ "بعد از خرابی بسیار فائدہ کیا ہوگا...؟"

"آئندہ وہ کبھی نہیں کہہ سکے گی کہ میں کسی طرح بھی تم سے کم نہیں ہوں۔" میں نے برا مانے بغیر نرمی سے کہا۔ "کچھ باتیں کہنے سے سمجھ میں نہیں آتیں، تجربہ سکھاتا ہے۔"
"ڈاکہ ڈالنا ہوتا تو میں بھی کہتا کہ خاتون چلیے آپ کا تجربہ زیادہ ہے۔ ہم آپ کے تابعدار ہیں لیکن یہ معاملہ تھا مختلف قسم کا۔" محسن نے کہا۔ "کسی اور موقع پر وہ ثابت کر سکتی تھی اپنی برابری کے دعوے کو۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی کہ اس نے تھوڑا سا جذباتی ڈراما کیا اور آپ کی عقل اڑ گئی بخارات بن کے۔"
"کیا کروں اپنے شیروانی صاحب۔ بقول شاعر مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے۔" میں نے ایک سرد آہ بھری۔ "ہم تو خود اڑ جاتے تھے بخارات بن کے۔ شاید آپ کو یاد ہوگا ولایت کا زمانہ۔ یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا۔ دل تو نابکار اب بھی وہی ہے۔"
محسن کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ میری بات سن ہی نہیں رہا۔
اچانک اس نے کہا۔ "سکندر! میں جا رہا ہوں۔"
"کہاں؟ یعنی اتنی کم دیر میں... دل کا یہ حال؟"
"بکواس مت کر۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "اسے ڈھونڈ کر پکڑے جائیں گے۔ مجھے خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ بھی گرفتار ہو سکتی ہے۔ اس کے بھائی خیشی ناگ کے گروہ کا خاتمہ ہو گیا مگر کیا پولیس کو پتا نہیں چل گیا ہوگا کہ ناگ بہن نکل گئی تھی۔ اور کیا انہیں یہ اندیشہ نہیں ہوگا کہ اب بھائی کا بدلہ لینے کے لیے ناگ بہن ڈاکوؤں کا نیا گروہ بنائے گی۔ ریکارڈ پر سب کچھ ہوگا۔ سارے ڈاکوؤں کی تصویریں بھی ہوں گی۔ ناگ بہن تو شاید ویسے بھی مشہور ہوگی کہ کیا دو دھاری تلوار ہے۔ مال و زر کے ساتھ عقل و ہوش بھی لوٹ لیتی ہے۔"
میں جتنا محسن کے دلائل سے قائل ہوتا تھا اتنا ہی اپنے غلط فیصلے پر پشیمانی اور پریشانی کا احساس زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ شاید میں نے بہت عجلت سے کام لیا۔ اس کی ہمت اور ذہانت آزمانے کا یہ تو ایک موقع نہ تھا۔
میں نے کہا۔ "تو ٹھیک ہے، غلطی میری تھی تو..."
محسن نے مجھے خونخوار نظروں سے دیکھا اور بات چھوڑ کے نکل گیا۔ میری بات پھر غلط ہو گئی تھی۔ اس کا ہرگز مقصد یہ نہیں تھا کہ میں اپنی غلطی کا اعتراف خود دہرا کروں۔ غلط فیصلہ کسی سے بھی ہو جانا کوئی جرم نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑتا تو کوئی کسی کو الزام نہ دیتا۔ سوال اس وقت فوری طور پر کچھ کرنے کا تھا۔ یہ سب سوچنے کا نہیں کہ کیسے کرنا ہے۔

www.paksociety.com

میں محسن کے پیچھے دوڑا۔ "تیرے پاس..."

محسن نے میری بات سمجھتے ہوئے پلٹ کے اقرار میں سر ہلایا اور ساحل پہ کود گیا۔ اس نے ایک پاؤں پہ ہاتھ مار کے واضح کر دیا تھا کہ ریوالور کو اس نے اپنی جراب میں چھپا رکھا ہے۔

اسی وقت مخالف سمت سے کریم بلوچ بدحواسی کے عالم میں نہایت مضحکہ خیز طریقے پہ چلتا اور تھوڑا بہت دوڑتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کی چال اور اس کے حال کی خرابی کا سبب وہ بوجھ تھا جو اس نے سر پہ اٹھا رکھا تھا۔ کریم کوئی بہت کڑیل قسم کا جوان نہیں تھا۔ وہ بیچنے عاشق کی طرح ظالم سماج کے ہاتھوں پٹ بھی چکا تھا اور پیار کی اس مار کے باعث ابھی تک لنگڑانے پہ مجبور تھا۔

اس کے سر پہ جو بوری تھی اسے رسی سے یوں باندھا گیا تھا کہ شکل و صورت میں اندر کی چیز باہر نہ آ جائے۔ اس کے اندر کیا چیز ہو سکتی تھی، یہ اس خیال نے ہی مجھے دم بخود کر دیا۔

"ہائے... ارے صاحب، ہم مر گیا۔" وہ لانچ پہ آتے ہی ہانپتے اور کانپتے ہوئے بولا۔ "ارے بابا! ہم کتنی بار بولے گا تیرے کو کہ ابھی ایسا ہیل ہجت مت کر۔ ہاں قسم، دھڑ پھینک دیوے گا تو... آہ..."

"کریم! کیا ہے اس میں؟ تمہاری وہ محبوبہ منکوحہ؟"

"نہیں صاحب..." کریم میرے پاس سے گزر گیا۔ "اس میں تو اپنا لالی ہے، مشتری۔ اُف... ہم مر گیا صاحب۔"

"ابھی سے کریم! ابھی تو ذمے داریوں کا بوجھ اٹھایا ہی ہے تم نے۔" میں نے ہنستے ہوئے اس کے پیچھے چلنا شروع کیا۔ "ابھی سے گھبرا گئے ہو؟"

"ارے صاحب... ہاں قسم ہم کو معلوم نہیں تھا یہ سالی پھولا کا جیسا نظر آتی ہے۔ اس کا وزن چٹان کے برابر ہووے گا۔ مگر ہم اس کو ٹھیک کرے گا... ایک دم ہلکا پھلکا کرے گا۔"

اس نے بالآخر بوری کو خاصی احتیاط سے نیچے رکھا اور اطمینان کی گہری سانس لے کر پسینہ اپنی آستین سے صاف کرنے لگا۔

"تم نے ڈاکٹنگ کرانے کا بہت گرام بنا لیا۔ پہلے اسے نکالو تو سہی، ایسا نہ ہو کہ دم گھٹ جائے۔" میں نے کہا۔

گٹھڑی میں حرکت ہوئی۔ "ارے نکالو مجھے باہر ناہنجار... کیا مارنے لگے تھے؟" اندر سے آواز آئی۔

کریم بلوچ نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ارے ہم تو خود مر گئے تیرے پیچھے۔" اس نے بوری کے منہ پہ بندھی ہوئی رسی کھولتے ہوئے کہا۔

وہ ایسے باہر آ گئی جیسے محاورے کے مطابق جادوگر کے تھیلے سے بلی باہر آتی ہے۔ اور وہ بھی ایک تنتنی خوبصورت سی، دبلی پتلی اور سانولے رنگ کی تیکھے نقوش والی لڑکی جس کی آواز میں بانسری کے اونچے سُر محسوس ہوتے تھے۔ اس کی زبان تاہم قینچی کی طرح چلتی تھی تو ہاتھ یوں ساتھ دیتے تھے جیسے قینچی کے ساتھ کنگھا۔

"ارے کم بخت، تیرا ستیاناس ہو۔" اس نے ہاتھ ہلا ہلا کے کہنا شروع کیا۔ "یہ ہے تیری وہ ڈولی جس میں تو مجھے دلہن بنا کے لانا چاہتا تھا۔ اس منحوس بوری میں ڈال کے لے آیا اس کباڑ خانے میں۔ یہ ہے تیرا وہ گھر جس پہ میں راج کروں گی؟"

"صاحب... یہ... مشتری ہے۔" کریم بلوچ نے کھسیا کے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "ذرا بولتی زیادہ ہے۔"

"ہائے ہائے کیوں نہ بولوں۔" وہ کریم بلوچ کے سامنے آ گئی۔ "بولی، چوٹ لگا بولتا تھا جیسے ڈائیلاگ یاد کر کے آتا تھا۔ اب بول... موئے خدائی خوار... ساری ہڈیاں الٹ پلٹ کے رکھ دیں میری۔ آرام سے اٹھا کے نہیں لا سکتا تھا اور کیسی بے دردی سے یہاں لا کے پھینکا مجھے ظالم۔ تیرا خانہ خراب ہو۔"

کریم بلوچ کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جس مشتری کے عشق میں وہ پاگل پن کی اس انتہا تک پہنچ گیا تھا کہ اس نے ایک رقیب کی جان بھی اتنی ہی آسانی سے لے لی تھی، جس آسانی سے شاید وہ اپنی جان دے دیتا۔ وہ مشتری تو کریم بلوچ جیسے سیدھے سادے احمق نما آدمی کے مقابلے میں ایک طوفان بلا خیز تھی۔ شاعر کی زبان میں فتنہ بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات۔ عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا۔ وہ حسن میں غارت گر تھی اور ناز و ادا میں ہوش ربا۔ اس کے سامنے کریم بلوچ ایک گریڈ مسکین بنا کھڑا ہوا تھا اور میں حیران تھا کہ یہ اگر عشق ہے تو کیا عشق ہے مگر عشق تو بس عشق ہے۔

مجھے اس صورت حال پہ ہنسی بھی آ رہی تھی اور غصہ بھی۔ ابھی مشتری نے مجھے بھی کوئی لفٹ نہیں دی تھی اور پہلی بار میرے سامنے آتے ہوئے بھی اس نے آداب و اخلاق کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ میں بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ مشتری جیسی عورت کے ساتھ کریم بلوچ کی زندگی اسی طرح گزرے گی جیسے شور مچاتی جھاگ اڑاتی لہروں کے ساتھ خاموش ساحل کی بسر ہوتی ہے اور دندناتی ٹرین کے ساتھ چپ چاپ بچھی رہنے والی پٹری کی گزر ہوتی ہے۔ وہ کریم بلوچ کو بے موقع ڈانٹتی رہے گی، اس پہ گرجتی برستی رہے گی اور حکم چلاتی رہے گی۔ کریم بلوچ سب سہے گا اور حسن کے جبر پہ چپ رہے گا مگر اس کی خاموشی یہی کہے گی کہ عشق نے ہم کو نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔

"آپ ناراض مت ہو صاحب۔" کریم نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "مشتری سب کو بولتا۔ ہم آپ سے معافی مانگتا۔"

"ارے چھوڑو کریم۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "اب یہ سب زندگی بھر کا ہے تم کو، ہم لوگ ہر وقت معافی ہی مانگتے رہو گے۔ ہم بُرا نہیں مانتے ایسی باتوں کا۔ عادت ہوتی ہے اپنی اپنی۔"

میرا مقصد مشتری کو تھوڑا سا شرمندہ کرنا تھا۔ حالانکہ دل تو میرا بھی یہی چاہتا تھا کہ گربہ کشتن روز اول کے فارمولے پہ عمل کر کے ہونے والی مشتری بیگم کو ایک ڈانٹ لگا دوں کہ یہ کیا تو تڑ لگا رکھی ہے؟ خبردار جو پھر کبھی میرے سامنے کریم کو کچھ کہا۔ لیکن یہ بدمزگی شکست کو آبچت والی بات ہوتی اور شاید کریم کے عشق کی تذلیل بھی۔ کریم کی یہ بے زبانی اور نیاز مندی، محکومی و اطاعت گزاری اس کے لیے رسم عاشقی تھی جس کا وہ پابند تھا۔

مشتری نے مجھے غور سے دیکھا۔ "تو کون ہے رے؟"

کریم نے گھبرا کے کہا۔ "ارے یہ بڑا والا صاحب ہے۔ سب سے بڑا والا سکندر صاحب۔"

مشتری نے ایک ہاتھ کمر پہ رکھ کے اسے گھورا۔ "پہلے نہیں پھوٹ سکتا تھا منہ سے۔ اب ہوش آیا ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو گئی۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی صاحب جی۔ معافی دے دو۔ مگر میں کیا کروں جی۔ ایک تو آپ اتنے بڑے صاحب نہیں مگر ہو، اوپر سے کریم ہے بے وقوف۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" میں نے مسکرا کے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "بے وقوف نہ ہوتا تو تمہارے لیے جان کی بازی کیوں لگاتا اور کسی کی جان کیوں لیتا۔ پکڑا جاتا تو پھانسی لگ جاتا۔ پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں پڑتا۔ تم کو قدر کرنا چاہیے اس کی۔"

کریم کی آنکھیں جذبہ احسان مندی سے نمناک ہو گئیں۔

"قدر کرتی صاحب جی، تو ایسے آتی ہی کیوں؟" مشتری نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ "بڑے بڑے گبرو پھر رہے تھے میرے پیچھے تو..."

"اچھا اچھا، چلو تم نیچے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "مجھے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں کریم سے۔"

اس نے بادل ناخواستہ کریم کی اجازت کو قبول کیا اور نہایت رعونت سے ادھر ادھر جھانکتی ہوئی چل گئی۔ قانوناً وہ ایک بیوہ تھی اور موشن میاں کے قتل سے اتنی بے تعلق بھی تھی مگر اسے خوف تھا اور نہ کسی قسم کی پریشانی۔

"ابھی چار ماہ دس دن تمہاری بیوی نہیں ہو گی کریم بلوچ!" میں نے کہا۔ "اگر تم نے عدت کا عرصہ گزار لیا اور پھر بھی شادی کر لی تو ماننا پڑے گا کہ تم فرہاد اور مجنوں سب کے باپ ہو۔"

کریم بلوچ نے اپنے دانتوں کی نمائش کی۔ "ابھی صاحب اگر ہم باپ بنے گا تو یہی نام رکھے گا جو آپ بولا۔"

"یہ بتاؤ کریم، تم نے آتے جاتے کہیں اکرم شیخ کو دیکھا تھا؟" میں نے کہا۔ "وہ تمہارے پیچھے گیا تھا۔"

"کیوں صاحب...؟"

"اس لیے کہ تم نے بہت دیر کر دی تھی۔ ہم سب پریشان ہو گئے تھے۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "اب تم آ گئے ہو اور اسے پولیس نے پکڑ لیا ہے۔"

کریم کا رنگ فق ہو گیا۔ "پولیس نے... آپ کیا بولتا صاحب! کدھر سے پکڑا؟ ابھی کیا ہو ویں گا؟"

"محسن گیا ہے اور گل بانو گئی ہے اسے چھڑانے کے لیے اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ کیا کر رہے تھے آخر تم؟"

"ہم صاحب... ابھی ہم مشتری کو کیسے لاتا... اس کا سالا باپ اُدھر اندر ہوتا۔ وہ مست ہو گیا تو بڑا ٹائم لگا۔ مشتری ہم کو بولا کہ بڈھا ادھر گیا ہے۔ ابھی اس کو معلوم ہو جائیں گا کہ موشن میاں ایک دم جنازہ بن گیا ہے تو وہ تیرے کو دفن کر دیں گا۔ ہم بولا کہ ابھی چل میرا ساتھ، کوئی بھیج مرتیع ہے تو میرے کو بھی دے۔ مگر صاحب بس ایک بوری ملا تو ہم مشتری کو اندر ڈالا اور سر پہ اٹھا کر لایا۔ ڈولی ہم کدھر سے لاتا صاحب۔ ایسا بچہ یا عورت کیسا بات کرتا۔ ابھی تو ہم اس کا خاوند صاحب بھی نہیں بنا..."

"خدا کے لیے کریم۔" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "تم دونوں کی بک بک نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ میں پہلے ہی کم پریشان نہیں ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تیاری کیسی ہے؟"

"ایک دم ریڈی ہے صاحب۔"

"اگر محسن اور گل بانو کے آتے ہی ہمیں روانگی اختیار کرنا پڑے تو... کتنی دیر میں ہم سفر شروع کرنے کے قابل ہو جائیں گے؟"

"آپ جب بولے گا صاحب، تھوڑا کھانے کے واسطے کچھ ہوئیں گا تو ہم لائیں گا۔ ابھی چیک کر کے آپ کو بتاتا ہے۔" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

"سنو۔" میں نے اسے روک کے کہا۔ "یہ جو تمہاری مشتری بیگم ہیں نا، ان کو سب سمجھا دو اور بتا دو کہ یہاں اس کو سب کام کرنا ہو گا۔ کھانے پکانے کا اور صفائی کا۔ اس شرط پہ ہم اسے ساتھ لے جائیں گے۔ کیا تم نے اسے بتا دیا ہے کہ اس سفر میں خطرہ بھی بہت ہے؟"

"خطرہ تو اس کا واسطے اُدھر بھی ہے۔" کریم بلوچ نے ہاتھ سے ساحل کی طرف اشارہ کیا۔ "ابھی اس کو پولیس کا کیا فائدہ صاحب! سب مریں گا تو وہ بھی مر جائیں گا۔"

"تم نے کیا کہا ہے کہ کہاں جا رہے ہیں ہم؟"

www.paksociety.com

"ہم بولا کہ جیسی جا رہا ہے؟" کریم نے سر کھجا کے کہا۔ "غلط تو نہیں بولا صاب؟"

"اسے کھانا پکانا کیسا آتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ابھی دیکھے گا صاب، ہم سمجھتا ہے کہ آپ تعریف کرو۔"

لیکن یہ خیال زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا کہ مشتری نے کھانے پکانے میں کریم کی شاگردی اختیار کی اور اولین تجربات کا تختۂ مشق ہمیں بنایا تو ایک طرف سمندری سفر میں یوں ہی نظام ہضم کا بیڑا غرق ہوتا ہے، مشکل ہی سے مدد کی جائے گی۔

جب کریم بلوچ چلا گیا تو میں نے تا حد افق پھیلے ہوئے سمندر کی وسعت پر نگاہ کی اور ایس ایس کرانچی جزیرے کا تصور کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ہر لمحہ گزرنے کے ساتھ وہ فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا جو غالب اور نازو کے اور ہمارے درمیان حائل ہو چکا تھا۔ وہ اس یقین پر دشمن کے حصار میں سربکف جا پہنچے تھے کہ ہم ایک لمحے کے لیے بھی ان کے خیال سے غافل نہ ہوں گے۔ اور ہم سے وابستہ امیدوں نے ہی انھیں یہ عزم سفر دیا تھا لیکن یہاں ہم ساحل پر اپنے ہی مسائل کی زنجیروں میں الجھے ہوئے تھے۔

آدھے گھنٹے میں شاید میں نے احساس کی اذیت کی آدھی صدی گزار دی۔ رہ رہ کر مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ آخر کیا ضرورت تھی مجھے کریم بلوچ کو بھیجنے کی کہ وہ جائے اور اس مصیبت کو اٹھا لائے۔ عشق اسے تھا، بھگتنا ہم سب نے۔ نہ آتی مشتری تو کیا وہ مر جاتا؟ چند دن میں سب عشق کا بخار اتر جاتا اور وہ اس کے ساتھ ہی پھانسی چڑھنے کے لیے تیار ہو جاتا، تب بھی کیا فرق پڑتا ہمیں۔ ہمارے ساتھ دوست محمد بھی تھا جو کریم سے کہیں زیادہ تجربہ کار ملاح تھا۔

میری سوچ میں خود غرضی کا عنصر ذہنی انتشار کی پیداوار تھا لیکن یہ کریم بلوچ کے لیے ضرورت سے زیادہ خلوص کے جذبے کا مظاہرہ ہی تھا جس نے اکرام شیخ کو حالات کے گرداب میں پھنسا دیا اور اسے بچانے کی کوشش میں کل ہم تو بھی ڈوب سکتی تھی۔ سب سمٹ کر اپنے مفروضات اور خوش آئند امکانات پر تکیہ کرنے والے غالب اور نازو انتظار ہی کرتے رہ جاتے۔ ابھی دنیا میں نا امیدی کا کہ شکست کے اور اکیلے پن کے احساس کی اذیت جھیلتے اور خود اپنی دیوانگی سے سوال کرتے کہ ان کی اور ہم سب کی نجوم آزادی کا عنوان مجھے مشتری کا حاصل ہوا اور اس کار زیاں سے ثابت کیا ہوا یہی کہ اس رزم گاہ خیر و شر میں اب تائید حق بھی جرم ہے۔ اور تاریخ بھی بانی کے ساتھ ہے جو مفرور سے بڑھ کر خدائی کے دعوے رکھتے ہیں۔

لانچ کے پچھلے حصے میں اچانک شور اٹھا۔ اس میں دوست محمد کی آواز نمایاں تھی لیکن کریم بلوچ کی زبان بھی شامل تھی۔ وہ آواز اس کے مستقبل کی مالک مشتری کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تیز سیٹی جیسی آواز میں زنانہ لغت کی منتخب گالیاں کوسنے دے رہی تھی۔ مگر یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ مخاطب کون ہے۔ میں لپک کر جائے واردات پر پہنچا تو وہاں عجیب نقشہ تھا۔ دوست محمد ایک عالم دہشت میں کریم بلوچ سے چمٹا ہوا تھا اور اسے اپنے سر سے ٹکریں مار مار کے گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "ابھی میں بولتا تیرے کو... سالا حرامی... ہٹ جا میرے راستے سے... جانے دے میرے کو بابا۔"

کریم بلوچ جسمانی طور پر کمزور تھا لیکن اس کی قوت ارادی کو شکست دینا آسان نہ تھا۔ وہ زخمی تھا اور تھکا ہوا بھی تھا لیکن اس نے دوست محمد کو روک لیا تھا اور کسی صورت اسے راستہ دینے پر تیار نہ تھا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے جاتا تھا اور پھر پلٹ کے آ کر گرتا تھا تو ایسے اٹھ کھڑا ہوتا تھا جیسے کسی اسپرنگ پر گرا ہو۔ پھر وہ دوست محمد کی ٹانگ سے لپٹ جاتا تھا تو کبھی کمر سے۔

"ارے ہم مر جائے گا... لیکن تیرے کو جانے نہیں دے گا استاد... صاب ہم کو مار ڈالے گا۔ ابھی ہم صاحب کو بولتا ہے صاب خدا کا واسطہ،" وہ مجھے چلا چلا کے پکارنے لگا۔ "اے صاب! بچا لو استاد اپنا مطلب کر دیا۔ آہ... کیسا بیل کا مافک کھڑا ہے۔ واللہ قسم استاد، ہم بھی بہت حرامی ہے۔ تم بے شک ہمارا سر پھوڑ دو، ہمارا دل توڑ دو، ہڈیاں توڑ دو، پیٹ پھاڑ دو مگر صاب بولا ہے تو ہم جانے نہیں دے گا..."

درمیان میں مشتری ایسے ہدایات دے رہی تھی جیسے وہ کوئی اسسٹنٹ فلم کی فائٹ انسٹرکٹر ہو۔

"ارے کریم کم بخت... یہاں پکڑ... ادھر تھام... ہائے ماں، ہاتھ مروڑ... ارے تو تو مار کھاتے چلا جا رہا ہے... ہاں... ایسے... اب ٹانگ مت چھوڑیو... ہاں اور کھینچ لے ٹانگ اور اسے منہ کے بل گرا دے... ارے تیرا ستیاناس ہو... کیا اچھا موقع تھا... میں کہتی ہوں کاٹ... کاٹ لے اس کے..."

یہ سب کچھ میں نے چند سیکنڈ میں دیکھا اور سنا۔ پھر میں نے درمیان میں آ کے دوست محمد کو کریم بلوچ سے جدا کیا اور گرج کے کہا: "آخر کیا ہو رہا ہے یہ؟" میں نے ایک ہاتھ سے کریم کو جھٹک دیا۔ وہ سیدھا پیچھے ریلنگ کی طرف گیا اور اس کے ساتھ دیوار پر معلق ہو گیا۔

"دوست محمد!" میں نے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کے جھنجوڑا۔ "کیا ہنگامہ ہے یہ؟"

اس نے خود کو چھڑانے کے لیے مزاحمت جاری رکھی۔

"ابھی جانے دو ہم کو بابا۔ ہم ادھر نہیں رہے گا۔ اپنا کوئی کام نہیں ہے ادھر۔ تم نے کیوں قید کیا ہے ہم کو... ہم مر جائیں گا۔"

"کیوں جانا چاہتے ہو تم یہاں سے، نشہ کرنے کے لیے؟ تم کو چرس کی طلب نے پاگل کر رکھا ہے دوست محمد!" میں نے اسے ایک بار لاک سے قابو کر لیا۔ "مگر تم آخری سگریٹ پی چکے ہو۔ اب تم جیو یا مرو، تمھارا اس دنیا میں واپس جانا ناممکن ہے جہاں تمھارے دشمن تمھیں ہیروئن فراہم کرتے ہیں۔ تمھیں اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے وہ تمھاری جان لینا چاہتے ہیں مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ راستہ ضرور صاف ملے گا انھیں لیکن تمھاری جان نہیں جائے گی۔ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے زندہ رہنے کے لیے اور زندگی کی طرف ہماری رہنمائی کے لیے۔"

وہ چنگھاڑا اور گالیاں دیتا رہا۔ "تم سالا کیا باپ ہے میرا؟ تم کون ہوتا ہے میرے کو روکنے والا؟ اپن سب کچھ کریں گا۔ ڈکیتی کریں گا، قتل بھی کریں گا، خودکشی بھی کریں گا۔"

میں نے اسے کئی بار بڑی بے رحمی سے پیچھے پھینکا۔ اس کی مزاحمت بہت جلد ختم ہو گئی۔ نشہ نہ ملنے کی وجہ سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا اور وہ بھوکا رہنے کی وجہ سے کمزوری کا بھی شکار تھا۔ آخری بار وہ پیچھے گرا تو پھر نہ اٹھ سکا۔ وہ فرش پر کسی پاگل ہو جانے والے کتے کی طرح پڑا ہانپتا رہا۔ کانپتا رہا اور سسکیوں جیسی آوازیں نکالتا رہا۔ اس کا رونا دھونا، منت سماجت کرنا سب رائیگاں گیا۔ میں نے اسے صاف بتا دیا کہ وہ واپس نہیں جا سکتا۔ اسے چرس والی ایک سگریٹ بھی نہیں دی جا سکتی اور اگر اس نے زیادہ دیوانگی کا مظاہرہ کیا تو میں اسے باندھ کے ڈال دوں گا۔

میں نے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی۔ کریم بلوچ کے ساتھ مشتری اب کچھ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس نے میرے زور بازو اور جاہ و جلال کا پہلا نمونہ دیکھا تھا۔ میں نے دوست محمد کے ساتھ محبت آمیز سختی برتی تھی۔ میرا ارادہ اسے نقصان پہنچانے کا نہیں، نقصان سے محفوظ رکھنے کا تھا۔ دوست محمد کی جگہ کوئی دشمن شکاری ہوتا تو میں اپنی جارحانہ قوت اور پھر ہلاکت خیز قوت کا استعمال کرتا۔ تاہم اس فعل کا بھی مشتری پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔

"تو دیکھا صاب کو کیسا آملیٹ بنا دیا سالے کا... ابھی تو کچھ نہیں..." کریم نے کہا۔

"چل چل، مجھے کیا سمجھا رہا ہے۔ تو خود سیدھا ہو جا۔ میں تو اچھی طرح جانتی ہوں تجھے۔ شیخی کی دم ہے بالکل،" مشتری نے ہاتھ ہلا کے کہا۔

اسی وقت دوست محمد نے دروازے کو ٹکر ماری۔ "سالا سکندر کا بچہ! بیڑا غرق ہو وے تیرا! چھوڑ میرے کو..." پھر اس نے پھر دروازے سے سر ٹکرایا اور مجھے گالی دی۔

"صاب جی! آپ تو باندھ ہی دو اسے۔ یہ تو پاگل ہو رہا ہے،" مشتری نے کہا۔ "دروازہ توڑ دے گا۔"

"دروازہ نہیں ٹوٹ سکتا،" کریم بلوچ نے پورے یقین سے کہا۔

مشتری نے اسے گھور کے دیکھا۔ "تجھ سے تو پاپڑ بھی نہ ٹوٹے ہے۔"

میں نے کہا: "جاؤ کوئی رسی لے کر آؤ۔ ایسے تو دوست محمد خود کو ہلاک کر لے گا۔"

میں نے بادل ناخواستہ دوست محمد کو بے بس کر کے اس کمرے کے ایک کونے میں ڈال دیا۔ اس کی یہ کیفیت وقتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھلنے لگے گی۔ جسم جو زہر سے لذت کشید کرنے کا عادی تھا، محرومی کے آزار سے گزر جانے کے بعد پھر جینے کی خواہش سے توانائی حاصل کرے گا اور سرچشمۂ حیات سے پھر پاک صاف، بے آلائش و بے نجاست، پُرعزم اور پُرمسرت زندگی کا دھارا بہنے لگے گا۔

دوست محمد سے نمٹنے کی جدوجہد میں بیس منٹ صرف ہو گئے تھے جو انتظار اور اندیشوں کی یلغار میں کاٹنے شدنی تھے۔ اب میں نے پھر گھڑی دیکھی۔ گل کے بعد سے تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ پانچ منٹ بعد مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ یوں بے کار بیٹھ کے انتظار کی بے عملی ندامت میں مبتلا رہنا کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔

میرے لیے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ میں ان تینوں یعنی شیخ، نگی اور محسن کو بھول کر یہ سمندری مہم سر کرنے کے لیے اکیلا ہی لانچ لے کر روانہ ہو جاؤں اور یہ بھی ناممکن تھا کہ غالب اور نازو کے خیال کو بھول کر اس مہم سے ہی تائب ہو جاؤں۔ مجھے ایک خالص عقلی اور غیر جذباتی فیصلہ کرنا تھا۔ میرے سامنے وہ سوال تھا جو ریاضی کے اصولوں کے مطابق ہی حل کیا جا سکتا تھا۔ ایک طرف میرے دو ساتھی تھے جو ایک بحری جہاز پر دشمنوں کی قید میں تھے اور وہ جہاز ایک ایسا قلعہ تھا جس پر حفاظتی انتظامات بھی انتہائی سخت تھے۔ دوسری جانب میرے تین ساتھی دوسرے دشمن کی قید میں تھے۔

میرے پکڑے جانے کے امکانات دونوں طرف برابر تھے۔ ہر صورت میں ایم آر ایس کا مقدس مشن ناکام ہو جانا تمام رہتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ بفرض محال میں غالب اور نازو کی مدد سے ایس ایس کرانچی جزیرے کو غرق کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو کم از کم

www.paksociety.com

اپنی آزادی سے اور کامیابی سے باقی ان ساتھیوں کو تو مدد نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اس وقت تک وہ بے رحم قانون کی ان گنت زنجیروں میں جکڑے ہوئے کسی نامعلوم زنداں کی بلند و ناقابلِ تسخیر دیواروں کے پیچھے پہنچ جاتے اور ہمارے لیے ان کو منزل وار مدد پہنچانا فقط آرزو اور فریبِ آرزو کی بات ہو جاتی۔

لیکن دوسری جانب بفرضِ محال میں پولیس کے قبضے سے گل محسن اور شیخ تینوں کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا تو یکایک ہماری ٹیم کو پھر اپنی مہم کے لیے جادو جگا سکتی تھی۔ اور ہم اپنی منظم قوت کے ساتھ طے شدہ پروگرام کے مطابق اور بروقت کارروائی کر کے غالب اور نادر کو بھی بازیاب کر سکتے تھے اور اس سے ایم آر ایس کی اسٹرائیکنگ فورس یعنی ضرب کاری لگانے کی قوت بحال ہو جاتی تھی۔

ایک اسلحہ لے جانے والے بحری جہاز کے مقابلے میں ایک تھانے پر حملہ اس لیے بھی قابلِ عمل تھا کہ تھانہ میرے لیے کوئی اجنبی جگہ نہ تھی۔ میرے ذہن میں ہر تھانے کا وہی ایک نقشہ تھا جو میں نے بار بار دیکھا تھا۔ دو چار بھاری پیٹ والے غیر مستعد سب انسپکٹر قسم کے افسر کرسیوں میں دھنسے ہوئے یا چھپتے ہوئے کچھ کھاتے پیتے یا محکوم و مجبور عوام پر اپنی فرعونیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔ چند حوالاتی اونگھتے محرر، حوالدار وغیرہ اور کچھ جاگتے کچھ سوتے کانسٹیبل جنھیں ایک فوری اور مؤثر کمانڈو ایکشن کے ذریعے قابو کرنا ایک بحری جہاز کے عملے کو قابو کرنے سے کہیں زیادہ آسان تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی ازکار رفتہ رائفلیں اٹھانے کے لیے اٹھیں یا اختیار کی علامت کے طور پر آویزاں ریوالور کی جانب ہاتھ بڑھائیں انھیں لائن حاضر کیا جا سکتا تھا۔

پانچ منٹ بعد میں تیار تھا۔ میں نے ایک خودکار ریوالور اپنے ایک جوتے کی جراب میں ڈال لیا تھا۔ تو دوسرا میری جیب میں تھا۔ مجھے ابھی معلوم نہیں تھا کہ بندرگاہ کی حدود سے نکل کے میں کس سمت میں جاؤں گا اور کس سے [illegible] اکرام شیخ کو کہاں [illegible] جیسے جرم پر [illegible] کرتا ہے۔ چنانچہ میں بندرگاہ سے نکلا تو [illegible] تھانے جا کے صورتِ حالات دیکھ سکتا تھا [illegible] ان کی آزادی کی قیمت نقد چکانے میں [illegible] موقع محل کے مطابق مجھے طاقت کا جبر [illegible] استعمال [illegible]

[illegible] سی والا تھا تاکہ اسے بتا سکوں [illegible] کہ میں [illegible] اصل اور اگر میرے [illegible]

جاتے ہی گل یا محسن آ جائیں تو انھیں کچھ نہ بتائے۔ میں [illegible] ابھی لوٹ آؤں گا لیکن ہم میں سے کوئی بھی نہ آئے تو وہ دوست محمد کے ذریعے چاند بھائی سے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ بات اس تک پہنچا دے پھر اسے جو کرنا ہو گا وہ خود کرے گا۔ معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس حد تک ہمارا طرف دار ہے۔

کریم بلوچ لانچ کے مختصر سے کچن میں مشتری کو امورِ خانہ داری سمجھانے کی سر کھپت رہا تھا۔ شاید اس نے مشتری سے پوچھنا چاہا تھا کہ وہ کیا کچھ پکا سکتی ہے اور اب جواب میں مشتری کی زبان ہوٹلوں کے ویٹر کی زبان سے زیادہ تیز چل رہی تھی جو ایک سانس میں پورا مینو پڑھ جاتے ہیں اور گاہک بے چارہ ہکا بکا بیٹھا رہ جاتا ہے۔ مشتری کو اس لحاظ سے فوقیت حاصل تھی کہ اس نے مغلئی، انگلش، چینی کے علاوہ اپنی فہرست میں ایسے کھانے بھی شامل کر لیے تھے جو ہم نہیں کھا سکتے تھے۔ شاید افریقہ کے آدم خور بھی نہیں کھا سکتے تھے۔

میری دخل اندازی سے پہلے ہی ایک دھماکے سے لانچ ہل گئی اور میں نے پلٹ کر بلا ارادہ ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر پھر میں نے محسن کو دیکھا جس نے شرافت سے اترنے کے بجائے لانگ جمپ ماری تھی اور اندازے کی غلطی کے باعث سیدھا عرشے پر لینڈ کر سکا تھا۔ گل بانو اس کے پیچھے ہنستی ہوئی آئی اور محسن کو اٹھانے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا رہی تھی۔ سخت خفت زدہ محسن اپنی چوٹ کو چھپانے کے لیے زبردستی مسکراتا ہوا خود اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے یہ منظر دور سے دیکھا اور اطمینان کا [illegible] سانس لیا۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے مسکراتے چہروں پر کامیابی کی خوشی کے دمکتے قوسِ قزح رنگ سب بتا رہے تھے کہ ان کا خطرناک مشن بخیر و خوبی پورا ہوا۔

"خوش آمدید گل و بلبل۔" میں نے اوپر جا کے کہا۔

گل [illegible] "میرا تو خیر یہی نام ہے مگر [illegible]"

"کیونکہ صورت سے الو نظر آتا ہوں میں۔" محسن نے کہا۔

"تم سے کم [illegible] شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے اپنی عقل کو استعمال کر کے تمھیں بھی بچا لیا۔"

"اونہہ۔۔۔ آخر میں آ گئے جب کوئی کام نہیں [illegible] ورنہ تو لولنگ کے شہیدوں میں شامل ہو گئے۔" وہ اچھل کے بولی۔

"اچھا جی، ابھی میں بتا دوں گا ساری بات۔"

"بتا دو، میں بھی بتا دوں گی ساری بات۔" گل نے [illegible] کی بات کاٹ کے [illegible]

"اچھا اچھا [illegible]" محسن گھبرا کے بولا۔ "تم چائے [illegible]"

[illegible] میں بات کرتا ہوں سکندر سے۔"

"[illegible] وہ کریم اور اس کی بیوہ آ گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جا [illegible] وہ بڑی دلچسپ باتیں کرتی ہے۔"

جب گل چلی گئی تو محسن نے مجھے مختصراً اس کی بے شرمی کا احوال سنایا۔ گل نے خود کو شیخ کی بیوی ظاہر کیا تھا اور اسے گرفتار کر کے لے جانے والے سپاہیوں کے سامنے دیدہ و دانستہ ایسا رویہ اختیار کیا تھا کہ وہ گل کو ایک آبرو باختہ عورت سمجھے تھے تو ٹھیک سمجھے تھے۔ جب معاملے کی بات چلی تو گل نے پھر ایک غلط پیش کش کر دی۔ وہ سمجھے کہ مال کے ساتھ وہ اپنے آپ کو بھی پیش کر رہی ہے۔

شیخ نے دیکھ لیا تھا کہ گل پیچھے آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ جو پولیس مین تھے وہ انتظار کر رہے تھے کہ کوئی ٹیکسی ملے تو ملزم کو تھانے لے جائیں۔ اتفاق یا خوش قسمتی کہ وہاں صرف شیخ کی خالی ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ شیخ نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ وہ دوسری چابی کہاں رکھتا ہے۔ میں سیدھا ٹیکسی کی طرف گیا اور اگلے پہیے کے قریب چیسس کے ساتھ بندھی ہوئی وہ چابی نکال لی۔ میں نے دور ہی سے گل کو پولیس والوں کے پاس جاتے دیکھا مگر خود ٹیکسی سے دور کھڑا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بیگ میں پکڑا جاؤں۔ گل ان سے کیا بات کر رہی ہے اس کا اندازہ میں اتنی دور سے نہیں کر سکتا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد جب انھیں ٹیکسی ملی اور سب اس میں بیٹھ گئے تو میں شیخ کی ٹیکسی لے کر تعاقب میں چل پڑا۔ گل کی کامیابی کا مجھے اس وقت یقین آیا جب میں نے دیکھا کہ پولیس والے ملزم کو لے کر تھانے نہیں جا رہے تھے۔ میں ان کے اور اپنے درمیان فاصلہ رکھتے ہوئے چل رہا تھا۔ میں قریب رہتے ہوئے بھی پیچھا کرتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کہیں انھیں شک نہ ہو جائے۔ مجرم سب ہی ضرورت سے زیادہ محتاط ہوتے ہیں۔ زیادہ فاصلے کا نقصان یہ ہو سکتا تھا کہ کہیں وہ دائیں بائیں مڑ جاتے اور میں نہ دیکھ پاتا تو ان کو کہاں سے ڈھونڈتا۔ ابھی وہ بندرگاہ کے علاقے سے باہر نکلے تھے کہ اچانک ٹیکسی رک گئی۔ انھوں نے اکرام شیخ کو باہر دھکا دے کر گرا دیا۔ [illegible] چلتی گاڑی سے [illegible] لڑھکا دیا۔ اب تو خود سوچ کہ اس وقت میں پیچھے نہ ہوتا تو کیا [illegible] شیخ کو [illegible] کرتے ہی ٹیکسی پھر روانہ ہو گئی تھی۔ میں نے پہلے تو [illegible] سوچا لیکن پھر اس خیال سے رک گیا [illegible] ہوئے انھوں نے [illegible] ضرور دیکھا ہو گا [illegible] ٹیکسی نظر آئی ہو گی مگر انھوں نے ٹیکسی کو اہمیت نہ دی [illegible] مسافروں کے ساتھ کوئی ٹیکسی ڈرائیور رہا ہو گا۔

راستہ چھوٹے مجرموں کے پیچھے نہیں دوڑتا خواہ وہ کتنا ہی سنگین جرم ہوتا کیوں نہ دیکھیے۔ اوّل تو یہاں رضاکارانہ طور پر قانون کی مدد کرنے کا جذبہ ہے ہی نہیں۔ لوگ جانتے ہیں کہ اس قسم کے معاملات میں انصاف کی مدد کرنے والے کتنی ناانصافی کا شکار ہوتے ہیں۔ جرم کرنے والے تو بچ جاتے ہیں، جرم کے گواہ بننے والے سزا کاٹتے ہیں۔ پھر یہ ٹیکسی ڈرائیور تو ویسے بھی۔۔۔ بدولت پولیس کی معتوب رعایا میں شمار ہوتے ہیں۔ انھیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ پیچھے آنے والی ٹیکسی خالی ہے۔ انھوں نے تو فرض کیا ہو گا کہ اس میں جو دو چار مسافر ہوں گے وہ اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی میں ہوں گے۔ چنانچہ ٹیکسی ڈرائیور کے مجاہدانہ جذبات میں ابال آیا بھی تو وہ اس کو کچھ نہیں کرنے دیں گے اور کہیں گے کہ یہاں چھوڑ اس چکر کو، پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت۔ تھانے نہیں جانا۔ یہ سب سوچ کے میں نے رفتار کم کی اور اکرام شیخ کے قریب جا کے اس سے کہا کہ دروازہ کھول کے بیٹھ جائے۔ میں ٹیکسی والا [illegible] نہیں۔ اکرام شیخ سخت مشتعل تھا اور پولیس والوں کو اسی کی زبان میں گالیاں دے رہا تھا۔ آخر تھا تو اسی خاک سے اٹھا ہوا۔ خیر، کیا کہا ہے وہ چچا غالب نے۔ گھر والے نہیں پر وال سے لگائے ہوئے تو [illegible] میں نے اس کو کچھ ٹھنڈا کیا تو اس نے بتایا کہ پولیس والے گل کو کسی کوارٹر میں لے جانا چاہتے ہیں۔ گل نے تو انھیں معاوضے کی پیش کش کی تھی مگر انھوں نے گل کو ہی معاوضہ سمجھ لیا۔ جب کچھ ملزم کو آزاد کر کے ٹیکسی سے خارج کر دیا گیا۔ وہ کباب میں ہڈی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ تینوں بدمعاش نہ صرف یہ کہ گل کی عزت لوٹ لیں گے بلکہ بعد میں اس سے وہ سب رقم بھی چھین لیں گے جو ہم نے گل کو شیخ کی رہائی کی قیمت چکانے کے لیے دی تھی۔ میں نے ٹیکسی کا نمبر تو پہلے ہی نوٹ کر لیا تھا اور برابر اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شیخ نے اتنی دیر میں ایک کمال دکھایا۔ اس نے پیچھے والی سیٹ کی پشت [illegible] تو جانتا ہے کہ اس کے پیچھے خلا ہوتا ہے جس میں ڈکی نظر آتی ہے اور بوقتِ ضرورت اس چھوٹے دروازے سے ڈکی میں داخل ہونا بھی کوئی مشکل کام نہیں۔ شیخ نے اس کے اندر ہاتھ ڈال کے ایک پیکٹ نکالا جو پلاسٹک میں لپٹا ہوا تھا۔ پیکٹ میں اس کی پرانی سب انسپکٹری کے دور کی وردی محفوظ تھی جو ابھی تک قابلِ استعمال بلکہ بہترین حالت میں تھی۔ شیخ نے چلتی ہوئی ٹیکسی ہی میں کپڑے اتارے اور وہ وردی پہن لی۔ اتنی دیر میں آگے جانے والی ٹیکسی ایک کوارٹر کے سامنے ٹھہر گئی تھی۔ وہ غیر آباد رہائشی علاقہ تھا اور کوارٹر [illegible] کے تھے [illegible] گورنمنٹ کے چھوٹے چھوٹے کوارٹر۔ وہ تین بدمعاش تھے میں نے

www.paksociety.com

انھیں گل کو زبردستی گھسیٹ کر اندر لے جاتے دیکھا۔ مجھے اس ٹیکسی ڈرائیور کی کم ہمتی اور بے غیرتی پر طیش آنے لگا جو یہ سب کچھ دیکھ کے بھی خاموش تھا۔ ظاہر ہے اس نے بہت کچھ سنا بھی ہوگا۔ گل آسانی سے قابو آنے والی لڑکی تو نہیں ہے۔ اس نے شور مچایا ہوگا اور مزاحمت کی ہوگی لیکن ٹیکسی ڈرائیور نے اس کی مدد کرنے کے بجائے بزدلی دکھائی اور بزدلی کے کھوٹے مقولے پر عمل کیا اور اپنی جان بچا کے نکل جانے کا سوچ کے خاموش ہو گیا۔ اب جیسے ہی وہ ٹیکسی واپس ہوئی تو اسے شیخ صاحب نے روک لیا کہ سواری کہاں سے آ رہی ہے؟ مجرم تو وہ تھا ہی، پولیس کو دیکھ کے اور بدحواس ہوا۔

"سواریاں چھوڑنے آیا تھا جناب...!" وہ بولا۔

"کیسی سواریاں؟" شیخ نے کہا۔ "زنانہ یا مردانہ؟"

"جی... وہ ایک عورت تھی..."

"کہاں سے لے کر آئے تھے انھیں؟" شیخ نے سخت لہجے میں کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے شیخ کو غور سے دیکھا ہی نہیں تھا اور دیکھا بھی ہوتا تو اسے کیسے شک ہو سکتا تھا کہ یہ وہی خاتون سواری ہے جسے راستے میں ڈراپ کر دیا گیا تھا۔ کسی تھانیدار کی تھانیداری پہ شک کرنا کسی بچھو کے ڈنک کو چھو کر تصدیق کرنے سے کم خطرناک تو نہیں کہ وہ بچھو ہے یا کاکروچ۔

ٹیکسی ڈرائیور کی حالت غیر ہو گئی۔ "سرکار، میرا کوئی قصور نہیں... وہ آپ کے ہی ساتھی تھے۔"

شیخ نے اس کے ایک زبردست تھپڑ رسید کیا جس کی آواز کے ساتھ ہی اس کا گال سرخ ہو گیا اور وہ لڑکھڑا گیا۔ چند مغلظ قسم کی گالیاں دینے کے بعد شیخ نے کہا۔ "میرے ساتھی تھے وہ؟"

"وہ... میرا مطلب ہے... جناب! وہ پولیس کی وردی میں تھے۔" ڈرائیور نے کہا۔

"وہ اغوا کر کے لائے تھے کسی لڑکی کو؟"

"جی... ایسا ہی لگتا تھا..." ڈرائیور جو اپنی جان بچا کے فرار ہونے میں تقریباً کامیاب ہو گیا تھا، یوں پکڑے جانے پر سخت پریشان تھا۔ اب وہ بھی شریک جرم بن گیا تھا۔

"لگتا تھا کیا مطلب! سیدھی صاف بات کر..." شیخ نے اس کے سر پر مکا مارا۔

"جی... جی ہاں جناب... وہ کسی کی بیوی کو اغوا کر کے لائے تھے..." ڈرائیور کی آواز لرزنے لگی۔ "انھوں نے شوہر کو ہتھکڑی لگا رکھی تھی۔ مگر پھر سودا ہو گیا۔"

"کیا ہو گیا؟"

"سودا ہو گیا جناب... لڑکی نے کہا کہ اس کے شوہر کو چھوڑ دیا جائے تو وہ ان کا جی خوش کر دے گی۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ چھوڑ کیسے دیں۔ قتل کا الزام ہے۔ یہ دیکھا ہے کہ یہ جائے واردات سے پکڑا گیا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ مرنے والے اب کہاں ہیں کہ تم ڈرتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم ملزم پکڑ کر لے آئے ہیں اور اپنا ایک بندہ وہاں چھوڑ آئے ہیں کہ کسی کو لاش کے پاس نہ آنے دے۔ ہم تھانے سے لاش اٹھوانے کا بندوبست کرا آئیں گے کسی افسر کے ساتھ۔ لڑکی کہنے لگی کہ تم کو کیا خوف ہے واپس جانے کی، تھانے جو ساتھی ہے اسے بھی بتا دو کہ وہاں سے نکل آئے یا لاش اٹھوا کے کسی اور جگہ ڈلوا دو، دوسرے تھانے کے علاقے میں۔ تم لوگ تو الزام کسی کو بھی لگا سکتے ہو۔ یہ دوسری تجویز ان کو پسند آئی مگر انھوں نے کہا اچھا اگر ہم تمھارے گھر والے کو چھوڑ دیں تو تم کیا دو گی؟ عورت نے کہا کہ جو مانگو گے۔ بس جناب! اس کے بعد انھوں نے ملزم کی ہتھکڑی کھولی اور اسے وہیں چلتی گاڑی سے سڑک پر گرا دیا۔ عورت چلانے لگی کہ یہ تم نے کیا کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے تمھاری بات مان لی اور ملزم کو چھوڑ دیا۔ پہلے نے کہا اب تم اپنا وعدہ پورا کرو۔ ہم اب تم کو مانگتے ہیں۔ ہمارا کیا قصور ہے۔ عورت نے جب شور مچایا تو ان دونوں نے اس کا منہ بند کر دیا... اور..."

"اور تم الو کے پٹھوں کی طرح سب دیکھتے رہے؟" شیخ نے اس ٹیکسی والے کے دوسرا تھپڑ مارا۔

"میں کیا کر سکتا تھا جناب... ان کے پاس ریوالور تھا اور پولیس سے ہم کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں؟"

شیخ نے اسے سپرے کے حوالے کیا اور کہا کہ اگر یہ بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے گولی مار دو۔ ٹیکسی کوارٹر کی سائیڈ میں روک دی تھی جو اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ایک طرف تو ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ دوسری طرف کوارٹر کے بند دروازے کی جھریوں سے اندر جھانک رہا تھا۔ وہ دونوں پولیس والے گل کے ساتھ فری اسٹائل کشتی لڑ رہے تھے۔ گل کو باقاعدہ لڑنا تو نہیں آتا تھا مگر اس نے بے قاعدہ مقابلے میں بھی ان کا حال خراب کر رکھا تھا۔ انھوں نے کئی بار گل کو پکڑنے کی کوشش میں لات کھائی تھی۔ گل ان کی گرفت سے مچھلی کی طرح تڑپ کر نکل گئی اور پلٹ کے کسی کو ہاتھ مار دیا، کسی کو کاٹ لیا۔ وہ ایک جھپٹی ہوئی بلی کی طرح مقابلہ کر رہی تھی۔ مجھے حیرانی تھی کہ انھوں نے شوہر کو بلانے کا کیوں نہیں سوچا۔ شاید وہ ان دونوں پہ مسلط تھا۔

ہمت کی چاہتی تھی کہ جیسے وہ کوئی عام قسم کی کمزور عورت کو دبوچ بیٹھے تھے وہ جگ سنی ہے۔ اگر وہ اپنا نام بتا دیتی تو ان کے ویسے چھکے چھوٹ جاتے۔ اپنی بار بار کی ناکامی انھیں شرمندہ بھی کر رہی تھی اور آتش شوق کے ساتھ آتش غضب کو بھی بھڑکا رہی تھی۔ شیخ نے محسوس کیا کہ معاملہ حد سے بڑھ گیا تو وہ ٹانگ سے کو ریوالور کا دستہ مار کے ناک آؤٹ کر دیں گے۔ اس وقت وہ قانون کے محافظ نہیں تھے۔ ہوس کے مارے ہوئے بھوکے بھیڑیے بن چکے تھے۔ گل کے کپڑے بھی اس جد و جہد میں پھٹے تھے اور اس کے جسم پر بھی خراشیں آئی تھیں مگر پولیس والوں کی تو وردی پھٹ گئی تھی اور ان کے چہروں اور ہاتھوں پر خراشوں کے نیل پڑ گئے تھے اور گل کے دانتوں سے کاٹے جانے والے لہو آلود نشانات الگ۔

جب اکرام شیخ نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو سپرے کی تحویل میں دیا تو میں نے ریوالور نکال لیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو سمجھا دیا کہ اب وہ قانون کا ساتھ دے کر ہی بچ سکتا ہے۔

"جناب... مجھے معاف کر دیں... مجھ غریب ٹیکسی چلانے والا... کسی گواہی میں نہیں پڑ سکتا ہے۔"

اب میں نے اس کے ہاتھ رسید کیا۔ "غریب! اب غریب بن گیا تیری تو... تو ساتھی ہے مجرموں کا۔ سب کے ساتھ ہی کے تو بھی اغوا میں شریک تھا... تو نے اپنی ٹیکسی واردات میں استعمال کی۔ اب تو ایک ہی صورت ہے تیرے بچنے کی۔ تو سرکاری گواہ بن جا ورنہ ان کے ساتھ تو بھی کم سے کم سات سال کے لیے اندر ہو گا۔"

جب اکرام شیخ نے دروازے پہ دستک دی تو اندر سے آنے والی سب آوازیں یک دم معدوم ہو گئیں۔ جیسا کہ بعد میں گل نے بتایا "ان دونوں پر تو سکتہ طاری ہو گیا تھا۔" گل نے بجلی کی طرح لپک کے کنڈی کھول دی۔ میں اور اکرام شیخ اس ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ اندر داخل ہوئے تو دونوں کانسٹیبل خود اپنے جرم کی تصویر بنے ہوئے کھڑے تھے۔ انھیں ایک لمحے کے لیے بھی شک نہیں ہوا کہ اچانک اندر آ جانے والا اے ایس پی انسپکٹر درحقیقت وہ ملزم بھی ہو سکتا ہے جسے وہ ہتھکڑی ڈال کے لائے تھے اور ابھی بمشکل دس منٹ پہلے سڑک پر پھینک چکے تھے۔

"سیدھے کھڑے ہو جاؤ، ہاتھ اوپر اٹھا کے۔" شیخ نے گرج کے کہا۔ "بے غیرتو... بے ضمیرو... کتو... کون ہے یہ عورت؟"

اس وقت گل نے خوب اداکاری کی۔ وہ ایک دم شیخ کے پاؤں پڑ گئی اور رونے لگی۔ "تھانیدار صاحب! یہ مجھے اور میرے شوہر کو گھر سے چوری کے الزام میں پکڑ لائے تھے۔"

"جھوٹ... جھوٹ بکتی ہے یہ..." ایک نے ہکلا کے کہا۔

"اپنی بکواس بند رکھو۔" شیخ نے گرج کے کہا۔ "میں اندر آنے سے پہلے سب دیکھ چکا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

"انھوں نے میرے شوہر کو راستے میں مار کے پھینک دیا حضور!" گل نے زار و قطار رونے کی کوشش کی اور ناکام رہی۔ "اس کی لاش چلتی گاڑی سے گرا دی..."

"جی صاحب! اول نمبر کی جھوٹی ہے یہ... خرانٹ مکار عورت۔" دوسرا پولیس مین دانت پیس کے بولا۔ "وہ تو خود ہی چلتی گاڑی سے کود گیا تھا۔"

"اور تم اس کے تعاقب میں جانے کے بجائے اس عورت کو یہاں لے آئے؟" شیخ نے خالص پولیس اسٹائل میں اس کو بہترین گالیوں سے نواز کے ایک ہاتھ مارا۔ "کیوں؟... کیا تمھیں تھانے کا راستہ معلوم نہیں تھا؟"

دونوں پولیس والے صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے منت سماجت پر اتر آئے۔ ان کے لیے اپنے جرم سے انکار کرنا عملاً ناممکن ہو گیا تھا۔

"سر! ہمیں معاف کر دیں... ہم..."

"اپنی [illegible]" شیخ نے ان کی بات کاٹ دی۔ "تمھارے خلاف بہت سنگین چارج ہیں۔ اغوا، اقدام قتل، ... مجرمانہ حملے کی سازش۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور گواہ ہے تمھارے سب جرائم کا... چلو چلو... دیر مت کرو... پیٹی اتار کے میرے حوالے کر دو۔"

انھوں نے آخری بار ہاتھ جوڑنے اور پاؤں پڑنے کی کوشش کی مگر شیخ کے سخت رویے کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اپنی اپنی پیٹی اتار کے مجھے تھما دی۔

"یہ ریوالور کہاں سے آیا تمھارے پاس؟" شیخ نے ریوالور لے کے ریوالور کو غور سے دیکھ کر کہا۔ "تم ریوالور رکھنے کے مجاز نہیں۔ اور یہ تو سرکاری ریوالور بھی نہیں ہے۔ گویا تم پر ناجائز اسلحہ رکھنے کا الزام بھی بنتا ہے اور ڈکیتی کی وارداتیں کی ہوں گی تم نے اس سے۔"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ان دونوں کو ہتھکڑی ڈال دو۔ دونوں کے سیدھے ہاتھ ایک ساتھ باندھ دو، ایک ہی ہتھکڑی سے۔ پھر تم خاتون کو لے کر پولیس ہیڈ آفس چلو۔"

ہیڈ آفس کے نام پر وہ پھر چلانے لگے۔ ان کا خیال ہوگا کہ یہ معاملہ سب انسپکٹر جو پراسرار طور پہ نمودار ہو کے بلائے جان کی طرح جھپٹ گیا ہے، ان کے اپنے تھانے تک پہنچ کے ٹھیک ہو جائے گا اور اپنے تھانہ انچارج صاحب کچھ نہ کچھ مدد کر ہی دیں گے۔

www.paksociety.com

تاکہ مقابلے کی نیت نہ کی پر حملہ نہ کر سکے۔
"تم کو تو میں براہ راست ڈی آئی جی کرائمز کے سامنے پیش کروں گا۔" شیخ نے اعلان کیا۔ "تاکہ تمھیں صحیح سزا ملے۔ کوئی پھر دخل اندازی کر کے دیکھے۔"
ابھی تک ان دونوں اُلو کے پٹھوں نے یہ نہیں سوچا تھا یا سوچا تھا تو پوچھا نہیں تھا کہ آخر یہ سب انسپکٹر جیب سے کیسے پیش آگئی؟ پولیس کو رپورٹ کس نے دی؟ اور یہ.....
سب انسپکٹر کیا اب سے نارمل ہو گیا۔ جہیز شش نے شیخ کی ہدایات کے مطابق انھیں ایک ساتھ مقفل کیا اور زنجیر شیخ کو تھما دی۔ ان کی جیبوں میں سے شناختی کارڈ اور کچھ مال غنیمت بھی برآمد ہوا تھا جو شیخ نے اپنی تحویل میں لے لیا۔
"تم جیب لے کر جاؤ۔" شیخ نے کہا۔ "میں اسی ٹیکسی میں پہنچا ہوں۔ جیب وہیں چھوڑ دینا۔"
جیب کے حوالے نے انھیں چپت کر دیا۔ انھوں نے فرض کر لیا ہو گا کہ راستے میں جیب گل نے شور کیا تھا۔ "اس وقت یا جب انھوں نے ملزم کو ٹیکسی سے خارج کیا تھا تو پیچھے سب انسپکٹر جیب میں آ رہا تھا اور وہ ٹیکسی سے پیچھے لگ گیا۔ آدمی کی جب شامت آتی ہے تو بلائیں آسمان سے بھی نازل ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد میں تو گل کے ساتھ باہر آ گیا۔ وہاں شیخ کی ٹیکسی موجود تھی۔ ہم اس میں بیٹھ کے بھاگ آئے۔"
محسن کی بات ختم ہونے تک میں نے کہیں مداخلت نہیں کی تھی اور اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا لیکن اب مجھے پوچھنا پڑا۔
"وہ شیخ صاحب اب کہاں ہیں؟"
"مجھے کیا معلوم۔" محسن نے کہا۔ "اس کی ٹیکسی کو ہم نے وہیں کھڑا کر دیا تھا جہاں پہلے تھی۔ وہ آئے گا تو لے جائے گا۔"
"یعنی کس قدر عقلمندی کی بات کی ہے آپ نے۔ بھائی میں پوچھ رہا ہوں کہ ان دونوں پولیس والوں کو لے کر وہ کہاں گیا؟ کچھ بتایا تھا اس نے؟"
محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "سب کے سامنے کیسے بتا سکتا تھا لیکن یہ وہ امی کا باپ۔ ان سے نمٹنا جانتا ہے۔"
"وہ پھنس کیسے گیا تھا؟"
"آپ نے اس کی عقل کو گھاس چرنے بھیجا تھا۔" محسن بولا۔ "اس کو حکم دیا تھا کہ میاں جاؤ، پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑاؤ۔ وہ سالا کھجول کا پٹھا کریم، خود تو آگیا خیریت سے، شیخ صاحب اس کو تلاش کرتے کرتے جا پہنچے سیدھے مقتول تک، جہاں ان کا گمشدہ ستم ظریف مجازی مقتول پڑا ہوا تھا۔"
"میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ جائے واردات پر رپورٹ کرو اور پکڑے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "کریم نہیں ملا تھا تو واپس آجاتا۔"
"کیسے آجاتا۔ پولیس والا ہے نا، جرم کا سراغ لگ گیا تو سیدھا وہاں جا پہنچا کریم کے گھر جانے والے نے ... ابھی ادھر گیا ہے روشن میاں کے ساتھ۔ وہ پہلے کی بات کر رہا تھا جب کریم اسے قتل کرنے گیا تھا۔ شیخ سمجھا کہ وہ بے وقوف روشن میاں کے گھر جا پہنچا ہے اور معلوم نہیں کیا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ اندر گیا تھا کریم کو لانے کے لیے مگر باہر نکلنا خود اس کو نصیب نہ ہوا۔ اچانک دو افراد اندر آگئے۔ ان میں ایک تو تھا روشن میاں کا خسر جس کی اس علاقے پر توسیع ہو چکی تھی۔ دوسرا کوئی نوکر یا ... کا قرض خواہ تھا۔ انھوں نے ان کو پکڑ لیا اور شور مچا دیا۔ ارد گرد کی جھگیوں اور کوارٹروں سے لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح نکل آئے اور سب دیکھتے کوئی آدمی پولیس والوں کو بلا لایا جو ڈیوٹی پر ... لوٹ رہے تھے۔ آگے آپ جانتے ہیں۔ تفصیلات کے لیے انتظار فرمائیے۔ اگر ام شیخ صاحب خود آپ کو بریف کریں گے۔"
"اسے ساتھ لے کر آنا تھا یار۔" میں نے کہا۔ "اب یہ انتظار، آخر وہ کیا کرے گا ان کے ساتھ؟"
"وہی جو سکندر نے پورس کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ وہ ان کا ... بنا کے چھوڑ آئے گا۔ یا بہت غصے میں ہوا تو کریم کی زبان میں ان کا جنازہ بنا کے بھاگ آئے گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ شیخ کو ... کرنے والا نہیں ہے۔"
محسن کی بات کچھ دیر بعد صحیح ثابت ہو گئی۔ شیخ اسی ... سب انسپکٹر کی وردی میں بڑے وقار کے ساتھ چلتا ہوا سیدھا ... پر آ گیا۔ ہم دونوں اسے گھورتے رہے۔
"گل کہاں ہے؟" اس نے ہاتھ ہلا کر پوچھا۔ "مجھے اس کا شکریہ ادا کرنا ہے... اور اسے بہادری کی سند بھی دینا ہے۔"
"پہلے آپ مجھ سے سند حماقت تو وصول کریں۔" محسن نے ہاتھ گھما کے کہا۔ مگر شیخ غوطہ مار گیا۔
"یار تم لوگوں کی خفگی بجا۔ مگر یہ سمجھو کہ میں اپنی خوشی سے نہیں گیا تھا۔ مجھے بھیجا گیا تھا اور اگر میں پھنس گیا تھا تو اس مصیبت سے نکل بھی آیا اپنی پرائیویٹ لیاقت و ذہانت سے اور ... کام لے کر۔" شیخ نے دانت نکال کے کہا۔ "تم نے کیا کیا؟"
"میں نے کچھ نہیں کیا۔" محسن چراغ پا ہو کے بولا۔
"تم نے صرف میری ٹیکسی چرائی۔" شیخ نے اسے ڈانٹا۔
"اور سب تو گل نے کیا۔ اس نے بات کی پولیس والوں سے، ان کا مقابلہ کیا اور بالکل اکیلی ہونے کے باوجود ان کے ... آئی۔ کسی کو مدد کے لیے نہیں بلایا ایسا تھے..."

میں نے پلٹ کے دیکھا تو گل کا چہرہ خوشی سے دمکتا نظر آیا۔ بتا بھی گئی کہ اتنی تعریف شیخ اسے ستانے کے لیے کر رہا تھا۔
"یہ لوگ ماننے والے نہیں ہیں بھائی جی۔" گل نے قریب کے ... "ان کی کھوپڑی میں تو یہی ایک بات ہے کہ عورت ذات کچھ نہیں کر سکتی۔ ناقص العقل ہوتی ہے۔ ناقص ہی سہی عقل تو ہوتی ہے اس کے پاس۔"
"اچھا بابا، تم دونوں عقل مند، ہم اُلو کے پٹھے۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "اب یہ بتا کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟"
"وہیں اسی کوارٹر میں۔" شیخ نے قہقہہ مارا۔ "میں نے ان دونوں کی زنجیر کھول کے کہا کہ چلو۔ وہ ابھی ایک قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ میں نے پیچھے سے دونوں کی کھوپڑی پر تاک کے ریوالور مارا۔ وہ وہیں لیٹ گئے۔"
"اس ٹیکسی ڈرائیور کے سامنے؟"
"نہیں... وہ میں بتانا بھول گیا۔" شیخ نے سر کھجایا۔ "اسے میں نے پہلے ہی چلتا کر دیا تھا۔ خوب ڈانٹ ڈپٹ کے بعد کہ جاؤ، ان ... کے قصے میں چھوڑ رہا ہوں لیکن ان دونوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ کسی سے کچھ کہو گے تو خود پھنسو گے۔ انھیں تو میں صرف ناجائز اسلحہ رکھنے کے الزام میں اور مار پیٹ کے جرم میں اندر کر دوں گا۔ اغوا کا کیس بنایا تو وہ بیچارے میاں بیوی خواہ مخواہ لپیٹ میں آئیں گے۔ ٹیکسی ڈرائیور تو میرے ہاتھ چوم کے بھاگ گیا تھا۔ وہ دونوں کچھ مایوس ہو گئے تھے کہ شاید اب ڈانٹ پھٹکار کے بعد میں انھیں بھی چھوڑ دوں گا اور شاید میں نے ڈرائیور کو اسی لیے دوڑا دیا ہے کہ اس کے سامنے ملزموں کو رعایت دینا ایک پولیس افسر کے لیے مناسب نہ ہوتا۔ انھوں نے بعد میں کہا بھی کہ سر کچھ لے دے کے ... کر لیں۔ میں نے ان کو مزید ذلیل کیا کہ تم بہت اچھا خیال رکھتے ہو گے ... ان میں سے ایک کہنے لگا کہ اب آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ ہم نے کوئی جرم کیا ہے۔ دوسرا بولا کہ آپ آئے کدھر سے تھے اور اب آپ اکیلے ہمیں کیسے لے جائیں گے۔ میں نے کہا کہ میں تو اتفاق سے آ گیا تھا۔ اپنی جیب میں ہیڈ کوارٹر واپس جا رہا تھا کہ میں نے ٹیکسی سے ایک آدمی کو باہر گرتے دیکھا اور ٹیکسی کے پیچھے لگ گیا۔ ... آئی جی صاحب کے ساتھ ہوں اور اسی لیے تم کو بتا رہا ہوں کہ تم ... وہاں ثبوت وغیرہ ہم خود بنا لیں گے ... تم جانتے ہو۔ فی الحال یہ تیرا ... ریوالور ... اور یہ حلیہ ہی تمھارے جرم کا واضح ثبوت ہے۔ ... کہ تم نے ایک دوسرے کو مارا اور اگر میں اتفاق سے وقت پر نہ پہنچ جاتا تو ایک مزید مارا جاتا۔ لے جاؤں گا میں ... کی صورت میں، تاکہ خلق خدا بھی تماشا دیکھے اس کے بعد وہ مایوس ہو گئے تھے۔ انھیں ناک آؤٹ کرنے کے بعد میں نے ان کے کپڑے یعنی یونیفارم، جوتے وغیرہ سب اتار لیے تھے اور ان کو اچھی طرح باندھ کے اور سیل کر کے ڈال دیا تھا۔"
"کس کا تھا وہ کوارٹر؟"
"معلوم نہیں۔ لگتا تو کسی کا بھی نہیں تھا۔" شیخ نے ...
"وہاں کوئی نہ آیا تو... وہ مر جائیں گے۔"
"مر جانے دو۔ ... شیخ بولا۔ "ویسے میرا خیال ہے کہ کوارٹر کو کھلا پا کے کوئی جھانکے گا ضرور۔ آج نہیں تو کل۔"
"اچھا میاں تھانیدار، اب تم خیر سے سدھارو۔" محسن نے کہا۔ "ہم بھی چلے پردیس۔ آج لنگر اٹھا ہے۔"
"ہاں تم پہلے ہی بہت لیٹ ہو گئے ہو۔ تم ہماری عدم موجودگی میں ہوشیار رہنا۔" میں نے کہا۔ "اس علاقے میں اگر ٹیکسی نہ لے کر آؤ تو بہتر ہے۔"
"فی الحال تو میں ہفتہ دس دن روپوش رہوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ ٹیکسی کو کہیں بند کر کے لاہور چلا جاؤں۔ جب وہ دونوں کانسٹیبل ہوش میں آئیں گے اور رہائی پائیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ ان کے ساتھ کیسا شرمناک ڈراما ہو گیا۔ سب انسپکٹر جعلی تھا جو ٹیکسی کے ساتھ آ ... گیا۔ ظاہر ہے وہ میری ہی نہیں، گل کی اور محسن کی تلاش بھی کریں گے۔ تم دونوں تو محفوظ رہو گے۔ ہفتہ دس دن بعد میرے لیے بھی خطرہ کم ہو جائے گا۔ پھر بھی میں ٹیکسی اس طرف نہیں لاؤں گا۔"
میں نے کہا۔ "کیا انھیں معلوم ہے کہ تم ایک ٹیکسی ڈرائیور بھی ہو؟"
شیخ نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی تفتیش کہاں شروع ہوئی تھی۔ اب وہ جائیں گے روشن میاں مرڈر کیس کی تفتیش کے لیے تو انھیں بہت سے حقائق کے علم معلوم ہوں گے مثلاً کریم بلوچ اور اس کی خوش جبینہ، کیا نام ہے اس کا؟"
"مشتری۔ وہ پہنچ گئی ہے یہاں ہمارا سر کھانے اور ہمیں اپنا پکا ہوا کھلانے کے لیے۔" میں نے کہا۔ "ملو گے؟"
"ذرا بلاؤ اسے یار۔ ... سی دل لگی ہو جائے۔" شیخ بولا۔
"اور ہاں، ذرا کریم کو بھی بھیج دینا کہ ساتھ ہو آئے۔ امتحان بن جائے گا۔"
محسن نے چند قدم کا فاصلہ طے کر کے سیڑھی کی طرف کیا اور ہانک لگائی۔ "ارے مشتری، مشتری! ذرا اوپر آ، پولیس آئی ہے۔" نیچے سے ایک ایسی چیخ سنائی دی جو اسٹیم انجن کی سیٹی محسوس ہوئی تھی۔ چند منٹ انتظار کرنے کے بعد محسن خود نیچے گیا اور اسے پکڑ لایا۔ کریم اس کے پیچھے تھا۔
"چل ادھر جواب دے تھانیدار صاحب کو۔"
مشتری تھر تھر کانپ رہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے ابھی

www.paksociety.com

لڑنے بھوکے پیٹ سے گر کر مر جائے گی۔

"سیدھی کھڑی ہو، کیا نام ہے تیرا؟" شیخ نے کہا۔ "تو بیوی ہے ناموشن میاں کی؟"

"ہائے ہائے تھا تھانیدار صاحب اللہ کا عذاب نازل ہوا اس پر وہ کہاں سے ہو گیا میرا خصم۔" مشتری نے ہاتھ اٹھا کے دہائی دی۔ "وہ تو کرلی کا میاں تھا... ہے... میری بہن کو پاگل کر دیا سے تک کھا گیا اب مجھ پہ نظر تھی اس کی۔ ارے کریم! امر لو۔ تو بھی تو کچھ بول، بتا انھیں کہ وہ بڈھا چوہڑ کیا وہ میرے لائق تھا؟ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا تھا۔"

"اور تم نے اسے قبر میں دھکا دے دیا، قتل کر دیا۔"

مشتری نے ایک چیخ ماری۔ "ہمیں نے... ہائے قسمت لو تھا تھانیدار صاحب... توبہ... ناراض ہوا ہے۔ وہ تو خود مر گیا ہوگا۔ کسی اور کی اسے آ گئی ہوگی۔ ارے ناس پیٹے کریم، بتا کیوں نہیں کہ تو لایا ہے مجھے بیاہ کرنے کے لیے۔"

"ابھی میرے کو کیوں پھنساتی ہے۔" کریم منمنایا۔ "تو خود بولا میرے کو کہ کریم مجھ سے شادی بنا۔ میرے کو بھگا کے لے چل۔"

"ارے بے حیا، بے غیرت۔" مشتری کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ "میں نے کہا تھا تجھ سے؟ ارے میں تو تیرے ساتھ ہی بھاگ لی تھی... نہیں نہیں... پرسوں سے... کیوں صاحب جی؟ ذرا آپ ہی بتاؤ تھانیدار صاحب کو۔"

"بھئی میں تو اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا۔" میں نے کہا۔

"ارے تو کیا اب مجھ بیوہ کو... پھانسی ہوگی؟" وہ چلانے لگی تھی۔

"بیوہ؟ ابھی شادی ہوئی نہیں تیری، بیوہ کیسے ہو گئی تو؟" شیخ نے کہا۔ "مان لیا کہ موشن میاں تیرا گھر والا تھا۔"

مشتری نے ایک دم ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ گل سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ اس کے ساتھ ہی محسن ہنسنے لگا۔ مشتری نے حیران ہو کے کریم کی طرف دیکھا۔

"چل اب پیچھے جا۔ ابھی تیرے کو صاف کر دیا ہے اپنے اس تھانیدار نے۔" کریم نے بھی گل کی طرح ہنستے ہوئے کہا۔

مشتری سمجھ گئی کہ کریم کا ہنسنا بے سبب نہیں ہو سکتا۔ اس کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ کریم اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کے بھاگا۔ وہ کریم کے پیچھے لپکی۔ "ارے خدائی خوار، ستیاناس ہو تیرا۔ مجھے تو ڈرا رہا تھا... مجھے پھانسی چڑھا رہا تھا..." مشتری چلا رہی تھی۔ "تجھے پھانسی لگے... مجھے کہتا ہے... ٹھینگے کے نازل ہوں تجھ پہ۔"

ہم سب کا ہنستے ہنستے بہت برا حال ہو گیا۔ مشتری کو غصہ ہم سب پر آیا ہوگا مگر اس کا نشانہ بنا کریم بے چارہ۔ ہم سے اسے جو

کہنا تھا۔" وہ سب کریم کو سننا پڑا۔ ان کی چیخ و پکار بہت دیر تک پولیس اسٹیشن سے سنائی دیتی رہی۔

"دونوں عجیب چیز تھے۔" میں نے کہا۔

"رب نے ملائی جوڑی۔" گل نے کہا اور یوں ہنس کر بولی جیسے بوجھ ہٹ گیا ہو۔ کیا خیال ہے؟ اچھا اور بہت ہی ... تک اس کے جذبات کو ... انداز پذیرائی ایک طرح فطری تھا۔ ان حالات کا جن سے گزر کے وہ پھر گل بانو بنی تھی۔ عمر کے اس سفر کا آغاز بھی ایسا ہی تھا۔ معصوم خواہشات اور انوکھی خوشیاں، وہ دور جب چاہت بھی بہت تھی اور چاہنے والے بھی بہت۔ شفقت، محبت اور تحفظ سب حاصل تھا۔ پھر وہ تنگ سی ایک زہر بھرے نیم تاریک نفرت بھرے راستوں پر سرگرداں رہی۔ اور یہ عمر تھی جس میں رنگ، خوشبو اور خوشیوں کے جادوگر خواب دکھانے والے بھی گنگنانے آتے ہیں۔ جذبات کے سات رنگ ... دل میں ایک روشنی کو جگا دیتے ہیں۔ آنکھیں انتظار کرتی ہیں، دل کسی کے نام پہ دھڑکنا چاہتا ہے۔ مگر یہ مسافت گولیوں کی بوچھار، موت کے خوف، اندھیروں کے آزار اور تنہائی کے عذاب سے لڑتے گزر رہی تھی کہ اچانک ہم نے اسے اپنا لیا اور ہم نے اسے پھر گل بانو بنا کے اس پرانی حویلی کے بند دریچے وا کر دیے جو ناگ سنی کے لیے شجر ممنوعہ ہو چکے تھے۔ اب اس کے اور ان دریچوں کو بند کرنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

اچانک شیخ نے کہا۔ "تو اب ہم کیا چلیں؟"

اور خاموشی کی وہ بوجھل چٹان جس کا بار ہم سب آنے والے لمحے اور پھر اس کے بعد والے لمحے کو منتقل کرتے جا رہے تھے یکلخت ہمارے اوپر آ گری۔

"ہاں..." میں نے کہا اور دوسری جانب دیکھنے لگا جہاں سمندر بھی وقت کی طرح ناقابل تصور حد تک پھیلا ہوا تھا۔

"میاں اکیلا رہ کے میں کیا کروں گا یار۔" شیخ نے افسردہ انداز میں کہا۔

"تم یہاں کی ذمہ داریاں سنبھالو گے۔" محسن بولا۔ "یہاں کے حالات اور مسائل سے ہمیں باخبر رکھو گے۔"

"یہاں مجھے نہیں، تم کو رکنا چاہیے۔ تمھارے بیوی بچے، ان کو تمھاری زیادہ ضرورت ہے۔" شیخ نے کہا۔

"ویسے تو ہم سب ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔" محسن بولا۔ "مگر میں سکندر کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ شعلہ کا خیال بھی ہے لیکن وہ بہت محفوظ ہے اس کے ساتھ رہ کر میں بھلا کیا کر چلوں۔ میری ذات اسے قربت کے احساس کی خوشی تو دے سکتی ہے اس سے زیادہ تحفظ فراہم نہیں کر سکتی جو اسے پہلے ہی حاصل

...تم یہاں ہو۔"

"بس اب ان خیالات کو رکھنا اور محتاط رہنا۔" میں نے کہا۔ "دعا کرتے رہنا کہ ہم زندگی کی آخری سرحد تک ساتھ چلتے رہیں اور یہ جو فاصلے آج درمیان میں آ گئے ہیں ختم ہوں۔"

"مگر رابطہ کھو گئے تو؟" وہ اب اداس ہو رہا تھا۔

"بالکل، مگر ہم فون کرتے رہنا۔ شعلہ اور سکندر کے ذریعے تمھیں ہماری خیریت معلوم ہوتی رہے گی۔ ہم جہاں بھی ہوں گے تمھیں ہمارا پتا ملے گا کسی نہ کسی ذریعے سے۔"

"مجھے نازو کی فکر ہے۔" وہ بولا۔ "آج کئی دن سے اس کے خیال نے سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے میرا تعاقب شروع کر دیا ہے اور اس خیال سے اندیشوں کا تعلق ہے۔ خوف میرے تصورات میں شامل ہے اور میرا دشمن ہے۔ مجھے شرمندگی ہوتی ہے کہ ایک بھائی کی حیثیت سے شیخ ناگ نے اپنی بہن کے لیے بہت زیادہ کیا، یہاں تک کہ اپنی زندگی بھی اسے دے دی۔ میں نے کیا کیا؟"

"ایسی غیرت کی باتیں مت کرو۔ وہ ہماری ذمے داری بھی ہے۔ شعلہ وقت ملا ہے لیکن کبھی ایسا ہوا کہ مجھے رابعہ اور نازو میں سے کسی ایک کو بچانے کی آزمائش سے گزرنا پڑا تو میں یہ جانتا ہوں کہ رابعہ کے لیے میں کچھ نہ کر سکوں گا۔ خود رابعہ مجھے برا کہے گی اور کہے گی کہ نازو کو لے جاؤ ورنہ ہماری محبت پہ خود غرضی کا الزام آ جائے گا۔"

"ہم میں سے کون ہے جو ایسے الزام کے ساتھ زندگی سے سمجھوتا کر سکے؟" محسن بولا۔ "ہم سب کچھ ہیں مگر خود غرض نہیں ہیں۔ صرف اپنے لیے جینے کا سوچنا نہیں چاہتے۔ مجھے پورا اعتماد ہے کہ تم شعلہ کی حفاظت مجھ سے بہتر طور پہ کر سکتے ہو اور ایسی ہی صورت حال سے تم کو دوچار ہونا پڑے تو تم مجھے اور سکندر کو، غالب کو، نازو اور گل کو، یہاں تک کہ کریم اور مشتری کو سب سے پہلے بچاؤ گے...۔"

اکرام شیخ چپ کھڑا رہا، پھر اس نے کہا۔ "نازو کے ساتھ غالب بھی تو ہے۔ وہ اکیلی نہیں ہے۔ تم جیسے ہی پہنچو گے تو رابعہ بھی آ جائے گی۔ تم سب اکٹھے ہو جاؤ تو مجھے بلا لینا۔ میں شعلہ کے ساتھ آ جاؤں گا۔"

"شعلہ کے ساتھ؟" محسن نے کہا۔ "اس کا وہاں کیا کام؟ نہ تم اسے اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو نہ الگ...۔"

"یہاں بھی تو ہمارے ساتھ نہیں ہے وہ۔ اس کے رہنے کا انتظام وہاں کیوں نہیں ہو سکتا... بمبئی اتنا بڑا شہر ہے، ہر نسل، قوم اور مذہب کے لوگ رہتے ہیں۔ انھی میں شعلہ بھی رہ سکتی ہے...۔"

"لیکن اس کا فائدہ؟" محسن نے چڑ کے کہا۔

"فائدہ یہ کہ ہم سب ایک ہی سرحد میں ہوں گے۔ سرحد ہمارے درمیان حائل نہیں ہوگی تو ہم ملتے بھی رہیں گے..." شیخ نے کہا۔

"اچھا... دیکھیں گے بعد میں۔ ابھی سے کیا کہہ سکتے ہیں کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ تم جاؤ تو..." محسن نے کہا۔ "خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" میں نے کہا۔ "ہم کامیابی کے ساتھ واپس جا رہے ہیں تو ہمیں دکھی دل کے ساتھ رخصت مت کرو۔"

شیخ چلا گیا۔ ہم سے گلے مل کے اور بہت جلد پھر ملنے کی امید دے کر۔ وہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا چنانچہ اس نے کہیں بھی افسردگی نہ دکھائی... گل نے تو اتنا رو کے الوداعی منظر کو المناک بنا دیا۔ اس کی ہم سب سے وابستگی کی عمر زیادہ نہ تھی مگر اس کی زندگی کے تجربے کا یہ نیا تجربہ پرانی گل بانو پر چڑھی ہوئی بے حسی، نفرت اور مایوسی کی گرد کو صاف کرتا جا رہا تھا اور اس کے وجود سے لپٹی ہوئی تاریکی کو مٹاتا جا رہا تھا جس کے نیچے اس کی شخصیت کا سارا اجلا پن تھا۔ ڈاکو ناگ سنی کے اندر کی عورت تو گل بانو تھی جو کسی طرح بھی رابعہ، شعلہ یا نازو سے مختلف نہ تھی۔ جب وہ ہماری بے غرض دوستی، ہماری بے ریا زندگی اور بے پایاں محبتوں کے جذبات کو دیکھتی تھی تو اپنے جذبات پہ قابو رکھنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ یہی اس کی زندگی کے بچھڑے ہوئے خواب تھے۔

دوپہر کا کھانا بہت دیر سے کھایا گیا اور ... گیا۔ اس سے مسماۃ مشتری کی خاص دل لگی ہوئی جس ... وقت میں وہ عرب مطبخ کی حیثیت سے کچھ ذمے داریاں سنبھال لی تھیں اور بہت اچھا مینو پیش کیا تھا۔

"صاحب جی! کیا کھانا اچھا نہیں پکا تھا؟" اس نے برتن سمیٹتے ہوئے بچ جانے والے کھانے کی وافر مقدار کو مایوسی سے دیکھا۔

"کھانا تو اچھا تھا، ہم کھاتے ہی کم ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہم دوسری چیزیں بہت کھاتے ہیں جیسے قسم قسم کا غم، دھکے، زخم جگر، دل پر چوٹ... وغیرہ۔" محسن نے غور و فکر کے سمندر سے سر نکال کے کہا۔ وہ ٹرانسمیٹر اور دوسرے مواصلاتی نظام کی کارکردگی کو بہتر اور موثر بنانے میں مصروف تھا۔

"اتنا کھانا ضائع گیا۔" مشتری نے دکھ سے کہا۔

میں نے کہا۔ "یہ کوئی ہوٹل یا ریستوراں نہیں ہے۔ جو کھانا بچے اسے سنبھال کے رکھو۔ شام کو کھایا جائے گا۔"

"اور پھر بھی بچ گیا تو بطور سزا لنگر کے تحت رات بارہ بجے سے پہلے سب کھانا پڑے گا۔" محسن بولا۔

"لو... انعام کی بات کوئی نہیں سزا پہلے..." مشتری نے احتجاج

paksociety.com

کیا۔ "میں کیوں کھاؤں گی۔۔۔؟"

"اس لیے کہ اندازے میں آئی غلطی ناقابلِ معافی ہے اور یہ تمہاری ذمے داری ہے کہ ضرورت کے مطابق کفایت شعاری اختیار کرو۔ ہم کوئی چیز ضائع نہیں کر سکتے۔" میں نے اسے سمجھایا۔

کریم بوچ ایک گھنٹے کے لیے بازار گیا تھا اور دو گھنٹے بعد واپس آیا تو ایک جلوس کی قیادت کر رہا تھا۔ جلوس میں وہ مزدور شامل تھے جو بوریاں، کنستر، ڈبے اور ڈرم اٹھائے ہوئے تھے۔ اس نے سفر کی ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے شاپنگ کی تھی اور چونکہ اس عرصے میں وہ ہماری عادات سے بھی واقف ہو چکا تھا، چنانچہ وہ سگریٹ اور کافی بھی لے آیا تھا۔

میں نے اس وقفے میں گل بانو کے ساتھ بیٹھ کے دیگر انتظامات کو آخری شکل دی۔ وہ سب جعلی دستاویزات بنانے کا سامان جو میں تخریب کاروں کے ایک کیمپ کو تباہ کر لینے کے بعد لایا تھا، ابھی تک ہمارے پاس محفوظ تھا۔ میں نے گل بانو کو اس کی ڈرائی تعریف سے مختصر استعارت کرانے کے بعد یہ بتایا کہ نادر اور غالب اس جہاز پر الزبتھ اور چارلس کے ناموں والے پاسپورٹ کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔

وہ ہنسی۔ "میرے لیے بھی کوئی پاسپورٹ بناؤ گے تم؟"

"ہاں، اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ بین الاقوامی سمندر میں اور پھر آگے بھارت سے گزرتے ہوئے کہیں کوئی بھی چیک کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "سوال یہ ہے کہ تمہاری تصویر کا کیا بنے گا؟"

"تصویر تو نہیں ہے میرے پاس۔" وہ بولی۔

"ہمارے پاس پولورائڈ کیمرہ ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا ہوتا ہے؟" وہ دلچسپی سے بولی۔

"وہ کیمرہ جس سے تصویر کھینچی اور چند سیکنڈ بعد نکال لی۔ بالکل تیار۔" میں نے کہا۔ "لیکن میرا سوال کچھ اور تھا عزیزہ! تمہارے نام میں نقطہ اوپر ہوگا یا نیچے؟"

وہ ذرا سی دیر کے لیے گڑبڑا گئی۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم گل جان ہو گی یا گل خان۔ ویسے تو جیم دو دو تمہارے تعلیمیں جو بتایا ہے محبوب بنایا ہے۔ اسے بگاڑنا اچھا نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ حیران، کچھ خوش ہوئی۔ "لیکن میں گل خان بن کے تمہارا ساتھ دوں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ مجھے محسن کا ساتھ گل جان بن کے دینا ہے۔" میں نے کہا، اور لانچ کے خفیہ خانے سے پولورائڈ کیمرہ نکال لیا۔ سب سے پہلے گل بانو کو صحیح سرو لگانا اور گیٹ اپ میں لانے کے لیے خاصی محنت کرنا پڑی۔ بکھروں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر اس کی نسوانیت کو چھپانا مشکل کام تھا۔ میں نے تصویر کھینچنے سے پہلے اس کے بال ذرا ترتیب دیے، پھر سیاہی سے مونچھیں بنائیں جو تصویر میں بالکل اصلی نظر آ رہی تھیں۔ سیاہی کئی بار صابن اور گرم پانی سے دھونے کے بعد بھی باقی رہتی اور محسن اسے شیو بنا کر کھڑے کے چھپانا تیار ہوں گی۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی علامات واضح بنانے کی مردانگی کے جوہر دکھائے تاکہ اس رول میں فٹ ہو سکے۔ مونچھوں کی کوئی بات نہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیٹے تھیں، بعد میں منڈوا دیں۔ کچھ لوگ شرط ہار کے بھی ایسا کرتے ہیں۔

"جیسے ہمارے چیف کو کرنا پڑا۔" محسن بولا۔ "یہ مجھ سے شرط لگا بیٹھے تھے ایک دن۔ پوچھو شرط کس بات پر لگی تھی؟"

"کس بات پر لگی تھی؟"

"جب ہم لندن میں تھے تو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہمارے لیے گوری چمڑی پر ناز کرنے والوں کی تحقیر ہوتا تھا۔" محسن نے کہا۔ "وہ ایک تنگ نظر اور متعصب قوم ہے۔ ہم بھی کم نہ تھے، ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا رکھا تھا۔ لڑکیاں اکثر ہم پر جان دیتی تھیں۔ ہم تو یہ کام ایک پلان کے تحت کرتے تھے کہ فلاں کی جو گرل فرینڈ ہے اسے ملتفت کرو تو بات ہے۔ پھر ہم جان کی بازی لگا دیتے تھے اور دل کے ایسا چکر چلاتے تھے کہ وہ لڑکی اپنے گورے بوائے فرینڈ سے بدظن ہو جاتی تھی اور ہم دونوں میں سے کسی ایک کو ڈیٹ دے دیتی تھی۔ اکثر تو ایسی ہی شرطیں ہوتی تھیں۔ جس نے کسی کو ملتفت کر لیا، چیلنج دے کر، وہ جیت گیا تھا۔ ایک بار معاملہ زیادہ سنگین ہو گیا۔"

گل ہنسنے لگی۔ "کیا چیف نے اس بات پر شرط لگا لی تھی؟"

"نہیں، یہ ایک دن کسی سے الجھ گیا۔ وہ ایک اسٹیج ایکٹر تھا جو خود کو شیکسپیئر سے منسوب کرتا تھا کہ وہ میرے نانا کے دادا کے سسر کے والد ثانی تھے۔۔۔ کچھ ایسا ہی رشتہ بتاتا تھا۔ چنانچہ وہ ڈرامے پر اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھتا تھا۔ سکندر سے کہنے لگا کہ تم جاہل انڈین، سپیروں کی اولاد اور ہاتھیوں کی ناک صاف کرنے والے، تم کیا جانو اداکاری کو۔ ہمارا فلاں اداکار ایسا ہے کہ تمہارا فلاں ہیرو اس کی جوتیاں صاف کرے۔ سکندر نے کہا کہ اصل کو تم لوگ اداکار مانتے ہو، ہمارے گھٹنوں میں ہو تو جوتیاں سیدھی۔ اس نے کہا کہ ہمارا سر لارنس اولیویر۔ سکندر نے کہا کہ ہمارے دلیپ کمار سے اس کا کیا مقابلہ؟ خیر خوب جھگڑا ہوا۔ یہ جب آیا تو سخت مشتعل تھا۔ کہنے لگا کہ اس سالے نے میری غیرت کو للکارا ہے۔ کہتا ہے کہ تم کیا جانو اداکاری کس جانور کا نام ہے۔ اب مجھے ثابت کرنا ہے کہ میں اس سے بڑا ایکٹر ہوں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ بھائی یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے یہاں۔ اگر تو اسے ہندوستانی فلموں میں لے جائے تو الگ بات ہے۔ اس نے کہا کہ نہیں، میں اس کو اسٹیج پر شکست فاش دوں گا۔ اداکاری سے اس کے مقابل مرکزی کردار ادا کروں گا اور اس کی ہار کو ہمارا دلائل بناؤں گا۔ میں بہت ہنسا۔ میں نے کہا کہ تو جیتے، تمہیں مرکزی کردار کیا اس کے مقابل کسی ڈرامے میں چپراسی کا کردار تک کوئی نہیں دے گا۔ بس ہمارے سکندرِ اعظم جوش میں آ گئے۔ انہوں نے رقیبوں پتا دے کے کہا کہ میاں محسن! ایسا نہ ہوا تو ہم یہ مونچھیں منڈوا دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان کو مونچھیں منڈوانا پڑیں۔"

گل بہت ہنسی۔ میں اس پرانی بات کو یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔ یہ کیا بات تھے۔

"پھر وہاں ایک نیا ڈرامہ اسٹیج ہونے والا تھا۔" محسن نے کہا۔ "سکندر صاحب پہنچ گئے آڈیشن اور اداکاری کا ٹیسٹ دینے کے لیے۔ اسکرپٹ کے ایسے کرداروں کا ٹیسٹ پہلے لے لیا جاتا ہے اور پھر جو جس رول کے لیے موزوں ہو اسے طلب کر لیا جاتا ہے۔ وہ شیکسپیئر کا اپنا مرکزی رول دینے والا بھی مقابلے پر تھا۔ وہ پرانا سمجھا ہوا آرٹسٹ تھا اور اس کے منتخب ہو جانے کا یقین تھا۔ ہمارے سکندرِ اعظم نے ہدایت کار کے سامنے زبردست پرفارمنس دی۔ فائنل سلیکشن ہوا تو اس نے سکندر سے کہا کہ تم کو جنگی کے بچے کا رول دیا جا رہا ہے اور اس کے حریف کو لارڈ میئر کے بیٹے کا رول۔ بس جناب! سکندر نے ایک اشتعال انگیز جذباتی تقریر کی کہ تم انگریز کمینے ہو اور ایسی کی تیسی لارڈ کے بیٹے کا رول کرنے والے کی۔ اس ہدایت کار کی شہہ پر بات آگے گئی اور دوسرے دن مونچھیں منڈوا دیں۔"

"لیکن۔۔۔ جنگی کے بچے کا رول تو مل گیا تھا؟" گل نے ہنستے ہنستے بے حال ہو کے کہا۔

"یہی تو کلائمکس ہے عزیزہ!" محسن آہ بھر کے بولا۔ "اس کے بعد انکشاف ہوا کہ اس ڈرامے میں مرکزی کردار جنگی کے بچے کا ہی تھا جو اپنی ذہانت اور صلاحیت کی بنا پر لندن کا لارڈ میئر منتخب ہوتا ہے۔ ہدایت کار نے بعد میں یہ رول سکندر کے حریف کو دیا اور وہ ڈرامہ حد کامیاب رہا۔ لارڈ میئر کے بیٹے کا کردار تو برائے نام تھا اور ثانوی نوعیت کا تھا۔"

"اب فضول باتیں بند کرو اور چلنے کی تیاری کرو۔ بیٹری اور ٹرانسمیٹر وغیرہ چیک کر لو۔" میں نے کہا۔

"ٹرانسمیٹر، ریسیور سب ٹھیک ہیں۔" محسن نے اعلان کیا۔ "بیٹری میں ابھی جان ہے۔ جب انجن چلے گا تو چارج ہو جائے گی۔"

"میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیا اس لانچ سے ہم اس بحری جہاز کو پکڑ لیں گے جو چودہ گھنٹے پہلے سفر کا آغاز کر چکا ہے؟"

"سمندری جہاز نسبتاً سست رفتار ہوتے ہیں۔" محسن بولا۔ "اگر کوئی زیادہ طاقتور لانچ ہوتی تو زیادہ تیز رفتار ہوتی۔"

میں نے کہا۔

"ہونے کو کیا ہے؟" محسن بولا۔ "ہمارے پاس جیٹ ہیلی کاپٹر ہوتا تو ہم سیدھے اس جہاز پر جا اترتے۔ وہ نیچے سے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کرتے مگر جیسا کہ فلموں میں ہوتا ہے، ایک گولی بھی چھو کے بھی نہ گزرتی اور ہم پیراشوٹ کے بغیر جہاز پر کودتے، ڈز۔۔۔ ڈز۔۔۔ ڈز۔۔۔ مشین گن سے سب کو بھون ڈالتے اور پھر جہاز پر قبضہ کر لیتے مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔"

"اس لانچ سے کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے محسن کی بات کا برا مانے بغیر کہا۔ "یہ کریم بوچ بتا دے گا مگر ایک مسئلہ اور ہے۔ اس بحری جہاز کا صحیح سمت میں تعاقب۔ صحرائی جہاز تو نقشِ قدم چھوڑ جاتا ہے۔ بحری جہاز کے تعاقب پر آب کا نشان نہیں ملتا۔"

"ایک چیز ہوتی ہے قطب نما۔ عرف کمپاس۔۔۔"

"مگر اس کا استعمال کرنا کسے آتا ہے؟ سوائے دوست محمد کے۔" میں نے کہا۔ "اور دوست محمد فی الحال اپنی عقل اور تجربے سے ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ اس کی ذہنی و جسمانی حالت ایسی نہیں ہے۔"

"اس کی یہ حالت کب تک رہے گی؟"

"نشہ چھڑانے کے بعد چند دن بہت صبر آزما ہوتے ہیں۔ جب طلب دیوانہ کر دیتی ہے پھر آدمی سنبھل جاتا ہے اور کوشش کرے تو چند دن میں عام لوگوں کی طرح زندگی کے معمولات سرانجام دینے لگتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مشکل تو یہی ہے کہ ہمارے پاس چند دن نہیں ہیں۔"

"ہاں، جمعرات کو آپ کی ڈیڈ لائن ہے۔" محسن بولا۔

"اگر دوست محمد کی زندگی کو خطرہ لاحق نہ ہوتا تو ہم اسے ساتھ بھی نہ لے جاتے۔ ہمارے تو کسی کام نہیں آ سکتا وہ۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"ہم اس کے علاج کو مؤخر کر دیں، چند دن کے لیے۔ اس سے نشے کی یہ لت چھڑانے والا کام فرصت سے بھی کیا جا سکتا ہے، جب کہ اس کی پیشہ ورانہ مہارت کی فوری ضرورت ہو تو چند دن سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"تیرا مطلب ہے۔۔۔ کہ ہم اسے نشہ فراہم کر دیں؟"

"ہاں، اگر اسے کارآمد بنانا ہے تو یہی کرنا پڑے گا۔ اس کی حالت فوراً سنبھل جائے گی۔" محسن نے کہا۔ "بلاشبہ یہ زہر ہے لیکن ابھی دوا کا کام کرے گا۔ وہ چار دن میں وہ مر نہیں جائے گا۔ مر جائے کہ کب سے یہ زہر پی رہا ہے۔"

www.paksociety.com

میں کچھ قائل ہونے لگا تھا۔ "لیکن جیب کے سگریٹ کہاں سے لائیں گے ہم؟"
"کریم سے بات کرتے ہیں۔"
"اس کا یوں گھومنا پھرنا ٹھیک نہیں۔ مجھے معلوم ہو جاتا تو میں اسے سامان لانے کے لیے بھی بازار نہ جانے دیتا۔" میں نے کہا۔ "موشن میاں کے قتل اور مشتری کے غائب ہونے کی سنسنی خیز کہانی اس علاقے میں سب نے سن لی ہوگی۔ سب جانتے تھے کہ کریم ہی ایک امیدوار تھا مشتری کا اور اس نے اپنے عشق کا ڈھنڈورا بھی خوب پیٹ رکھا تھا۔ وہ پکڑا گیا تو ہمارے لیے بھی مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔"
"وہ ہوشیار لڑکا ہے۔ باتوں سے اور صورت سے بیوقوف ضرور لگتا ہے لیکن مجھے اس کی عیاری اور ذہانت میں کوئی شبہ نہیں۔" محسن بولا۔ "کتنی آسانی سے اس نے موشن میاں کا کام تمام کر دیا۔ پھر مشتری کو نکال لایا۔ اور اب خود بازار ہو کے آیا ہے۔ ظاہر ہے وہ اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں تھا۔ وہ چھپ کر جاتا، وہ چور دروازوں سے واقف ہے۔"
"یہ تو میں جانتا ہوں سارے چوروں کا اور چور بازاری کرنے والوں کا بھی علم ہے۔" میں نے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں وہ کیا کر رہا ہے۔"
میرا خیال تھا کہ وہ اسٹور یا کچن میں ملے گا اور سفر کے انتظامات کو آخری شکل دینے میں مصروف ہوگا لیکن وہاں مشتری کی شکل سے چل رہی تھی۔
"کیا کہا تم نے... کیا بدل گیا؟"
"جنس بدل گئی ہے میری۔" گل بانو نے کہا۔ "عورت سے مرد بن گیا ہوں میں۔ اسی لیے گل خان نام رکھا ہے میں نے۔"
"ارے چلو، نام بدلا رکھنے سے کوے کی خصلت بدلتی ہے کہیں۔ لو اور سنو، یہ کوئی اپنے اختیار کی بات ہے؟"
"ہاں! دنیا میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔" گل نے کہا۔ "تم چاہو تو کریم بھی لڑکی بن سکتا ہے۔"
"ہائے ہائے، عقل کے ناخن لو..."
"ناخون... وہ کہاں ملتے ہیں؟ اور ان میں کیا خرابی ہے؟" گل نے ہاتھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
میں آگے نکل گیا۔ اب صرف ایک ہی جگہ دیکھنے کو رہ گئی تھی جہاں کریم کو ملنا ممکن تھا اور یہ آخری کیبن تھا جس میں دوست محمد قید تھا۔ میں کوئی آہٹ کیے بغیر اور دستک دیے بغیر دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا تو کریم گھٹنوں کے بل دوست محمد کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بری طرح چونکا اور ایک دم پلٹا۔ نیم تاریکی میں مجھے سگریٹ کے دھوئیں کا غبار نظر آیا اور چرس کی مخصوص بو محسوس ہوئی۔ دوست محمد اسی طرح دست و پا بستہ پڑا ہوا تھا لیکن دھواں اس کے نتھنوں سے خارج ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔
جلتی ہوئی آدھی سگریٹ کریم بلوچ کے ہاتھ میں تھی جسے وہ خود اپنے ہاتھوں سے دوست محمد کو کش لگوا رہا تھا۔
"یہ تم کیا کر رہے ہو کریم؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ بے خبری میں پکڑے جانے کی دہشت نے اس کو بدحواس بنا رکھا تھا۔ میری بات پر اس نے سلگتی ہوئی سگریٹ پھینک دی۔ "غلطی ہو گیا..."
میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ "بات غلطی کی نہیں۔ تم نے غداری کی۔ وہ کام کیا جس کی تمہیں اجازت نہیں دی تھی۔"
"ہم کیا کرے صاب... وہ ہمارا استاد... بہت تکلیف میں تھا۔ اس کا حالت بہت خراب تھا صاب۔" کریم بلوچ گڑگڑانے لگا۔ "ہم کو سوچنا مارو... وہاں میں تمام ہو۔"
میرے لیے سیریس رہنا مشکل ہو گیا۔ "دو دن میں کیا بگڑ گیا؟ پیچ و تاب کیوں نہیں؟" میں نے کہا۔ "کریم! اس لالچ پہ میں شکنجہ ہو تو مرغی نہیں چلا سکتا۔ تم کو یہ نیکی کرنا تھی تو اپنے استاد کے ساتھ مجھ سے پوچھ کر کرتے۔ ایسے تو بالکل ٹھیک نہیں رہے گا۔ تم پر کیسے اعتبار کروں گا کہ تم وہی کرو گے جو تم سے کہا جائے؟"
"ابھی مالی قسم یہ بات ہمارا کھوپڑی میں ایک دم بیٹھ گیا ہے صاب، پھر ایسا غلطی کرے تو حرامی۔"
"چلو، دوست محمد کو کھول دو۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "اس سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔ مجھے اس کی حالت کافی بہتر لگ رہی ہے۔"
"دم لگایا صاب تو دم آیا۔" کریم نے خوش ہو کے کہا اور دوست محمد کے ہاتھوں پیروں سے لپٹی ہوئی رسی کھولنے لگا۔
"یہ باقی سگریٹ بھی دے دو اسے۔" میں نے کہا۔
کریم بلوچ نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ "اچھا، پھر بگڑ گیا؟"
"ہاں ہاں، میں اجازت دے رہا ہوں تم کو۔ کہاں سے لائے تھے یہ سگریٹ اور کب؟"
"ابھی ہم مارکیٹ گیا صاب... سامان لایا تو... پیکٹ... نہیں... ہم جھوٹ بولا۔ تین پیکٹ اس کا واسطے لایا صاب۔"
"کہاں ہیں وہ تینوں پیکٹ؟" میں نے کہا۔ "مجھے دو۔ دیکھو اب کیا دیر ہے؟"
"کوئی دیر نہیں صاب۔ آپ بولو تو ہم ابھی چلا لوگے۔" باہر جاتے جاتے رک گیا۔
میں نے کہا۔ "تمھارا کیا خیال ہے، ہم اس بحری جہاز کو...

سمجھے بیٹا؟"
"ایک دم پکڑا لے گا صاب، نکل کے کدھر جاوے گا سالا۔" کریم نے جوش سے کہا۔ "ابھی الیاس پکڑ لے گا۔"
"وہ جہاز بہت آگے نکل گیا ہے۔ اسے روانہ ہوئے چودہ گھنٹے ہو چکے ہیں۔" میں نے کہا۔
"پھر کیا ہوا صاب، ابھی استاد ہم کو راستہ بتا دے تو ہم اس کو بالکل پکڑ لے گا۔" کریم نے کہا۔ "رات کا ٹائم میں تھوڑا کام تیز ہو جاتا ہے اپنا۔"
"یہاں تیز ہو جاتا ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا اور پھر اس کا مطلب سمجھ کے ہنس پڑا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ تم کنفیوژ ہو جاتے ہو۔ خیر کوئی بات نہیں، استاد راستہ بتلائے گا۔ انجن تو دھوکا نہیں دے گا راستے میں؟"
"کیسے دھوکا دے گا صاب، انجن کا باپ تو بیٹھا ہے ادھر۔" اس نے دوست محمد کی طرف اشارہ کیا۔ "ایسا بڑا بڑا جہاز بنایا استاد، یہ تو ایک دم کھلونا ہے۔"
وہ نکل گیا تو میں دوست محمد کے پاس بیٹھ گیا جو اب اپنے ہاتھوں پیروں کو مل رہا تھا۔
"دوست محمد! میں تمہارے ساتھ یہ سلوک کرنا نہیں چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجبوری تھی۔"
"اللہ بابا! مجبور تو ہم ہے۔" وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ "اس کا بغیر جی نہیں سکتا، مر بھی نہیں سکتا۔ ہم جانتا ہے تم اچھا آدمی ہے لیکن ہم ابھی کسی کام نہیں رہ گیا ہے۔ تم ہمارا ساتھ کیوں نیکی خلاص کرتا ہے؟"
"ہمیں تمہاری ضرورت ہے دوست محمد اور ہمیشہ رہے گی۔ تم کبھی کسی کام نہیں ہو سکتے۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم تم کو یہاں چھوڑ جاتے تو ہمارے اور تمہارے دشمن مل کے تمہیں مار ڈالتے۔"
"پھر کیا ہوتا، ہم مر جاتا۔"
"نہیں، تم کو جینا ہے۔ اپنے لیے اور ہمارے لیے اور ہم تمہیں زندہ رکھیں گے۔ تم ہم سب سے بڑے ہو، عمر میں بھی اور تجربے میں بھی۔ ہم تمہارے بچوں کی طرح ہیں۔"
"مت بولو ایسا بات۔" وہ چلانے لگا۔ "میرا بچہ لوگ سب ایسا کہتا ہوئے۔ ابھی سالا ہم کچھ نہیں کر سکتا ورنہ ہم بولتا۔ ہم کسی کا باپ نہیں ہے مگر ہم جانتا ہے کہ ان کا باپ تم ہے۔ تمہارا جیسا ہوتا وہ... تو ہم اتنا فکر کیوں اٹھاتا، ایسا ملک خوار کیوں ہوتا؟"
میں نے دیکھا کہ میرے ایک غلط جملے نے اس کے زخموں کو ناسور کی طرح کھرچ دیا تھا اور درد کی ٹیس نے اس کی آنکھوں میں رکے ہوئے آنسوؤں کو بہنے پر مجبور کر دیا تھا۔
"تم سمجھو کہ ہم ہی تمہارے بچے ہیں۔ ہم خدمت کریں گے تمہاری جب تک زندگی نے مہلت دی۔ یہ مت سمجھنا کہ آج تمہاری ضرورت ہے تو میں تمہیں بہلا رہا ہوں۔ آنے والا وقت خود بتا دے گا کہ اس خاندان میں جس میں ہم سب شامل ہیں، تمہاری حیثیت بزرگ کی ہے یا نہیں۔"
اس کی آنکھوں میں پھیلی ہوئی ناامیدی، بے حسی اور دل شکستگی کے ویرانے میں امید کا ایک دیا روشن ہوا اور بجھ گیا۔ میں نے اپنی کوشش جاری رکھی اور اسے بالآخر یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ ہمارے خلوص میں خود غرضی کو دخل نہیں اور ہم ان میں سے نہیں جو ضرورت کے وقت گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں۔
اس نے کہا۔ "ہم... یہ چھوڑ دے گا اس لعنتی عادت کو۔ ایک دم نہیں چھوڑ سکتا... تھوڑا تھوڑا... مگر کرے گا... تم ہمارا مدد کرے گا، پھر ہم ٹھیک ہو جائے گا۔"
اسی وقت کریم نے انجن اسٹارٹ کیا۔ دوست محمد چونکا اور غور سے کچھ سننے لگا۔ پھر وہ ایک دم اٹھا۔ "سالا پاگل کا بچہ، انجن کا بیڑا غرق کرے گا۔ آئل کم جاتا ہے تو انجن چلاتا ہے۔ بابا آئل دو، اکرم بہرا ہو گیا ہے۔" باہر اس نے باہر جا کے چلانا شروع کیا۔
"او بے وقوف، بند کر انجن کو، آئل کا لائن بند پڑا ہے۔ ابھی انجن خلاص ہو جائے گا۔"
میں اس کے پیچھے گیا۔ میرے پہنچنے تک وہ کریم کے ایک چھانپڑ مار چکا تھا اور انجن بند کر کے سہلانے کس پرزے کو کھول رہا تھا اور دھیمے دھیمے بڑبڑا رہا تھا۔ محسن اور گل نے ایک نالائق شاگرد کو پٹتے دیکھا تھا اور میری طرح خوش ہوئے تھے۔ دوست محمد نے اپنی استادی کا ثبوت بھی دے دیا تھا اور ہماری سرپرستی بھی قبول کر لی تھی۔ اس کی دلچسپی ایک خوشگوار تبدیلی کی آئینہ دار تھی۔
صرف مشتری کو کریم پہ تاؤ آ رہا تھا جو مار کھا کے شرمندہ ہونے کے بجائے بڑی ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا اور اپنا گال سہلا رہا تھا۔
"ارے کیسے زور سے چھانٹا مارتا ہے ظالم نے... اور اسے دیکھو بے غیرت کو... ہنس رہا ہے مسٹنڈا... پلٹ کے منہ توڑ دے اس بڈھے کھوسٹ کا۔" مشتری نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔
"معلوم ہے یہ بڈھا کھوسٹ کون ہے؟" میں نے کہا۔
"تم کو ڈرنا چاہیے اس سے۔" محسن بولا۔
"صاب جی، ڈرتی ہے میری جوتی۔" مشتری نے ہاتھ نچا کے کہا۔

www.paksociety.com

"تین قتل کر چکا ہے۔" میں نے راز دارانہ لہجے میں بتایا۔ "ایک اپنے سسر کا، ایک داماد کا اور ایک بہو کا، اور یہ جو کریم کا باپ ہے یہ تمہارا ہونے والا سسر۔"

مشتری کا رنگ فق ہو گیا۔ "مگر کریم... اس نے تو کہا تھا کہ اس کا کوئی باپ نہیں ہے۔"

"تو بغیر باپ کے بھی کوئی ہوا ہے؟" محسن بولا۔ "دراصل اس نے باپ کو عاق کر رکھا تھا۔ اس کی انہی حرکتوں کی وجہ سے کریم کو بھی ایک دن شادی کو کرنا پڑی تھی۔ تم سے شادی ہوتی کسی چڑیل سے ہوتی۔ بڈھا اسے بھی مار ڈالتا۔"

مشتری کا موڈ خراب ہو گیا۔ "صاحب جی پھر تو کسی چڑیل سے ہی کرا دو اس کا بیاہ۔ تو میں کیا ایسی گئی گزری ہوں۔ خود کریم پہ بھوت کا بچہ جو میری جان کو چمٹ گیا۔ ایک سے ایک گبھرو بانکے جوان میرے پیچھے پھر رہے تھے۔"

میں نے ایک سرد عاشقانہ آہ بھری۔ "ان میں ہمارا نام بھی شامل ہے یا نہیں؟"

"بالکل ہوگا۔" محسن بولا۔ "ہم بھی بانکے سجیلے چھیل چھبیلے گبھرو جوان ہیں اور اس کے پیچھے پھرتے ہی رہتے ہیں۔"

مشتری سمجھ گئی کہ ہم اسے بے وقوف بنا رہے ہیں اور غصے میں پاؤں پٹختی واپس چلی گئی۔

دوست محمد نے انجن اسٹارٹ کیا اور چند سیکنڈ اس کی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے انجن کو پیار سے تھپکی دی۔ "ہاں ابھی ایسا ٹھیک چلے گا، خراب ہو میں گا تو بابا دوست محمد جو ادھر خیال رکھتا... ہاں۔" وہ انجن سے باتیں کر رہا تھا۔ پھر وہ کریم کی طرف پلٹا۔ "ابھی سن دونوں کان کھول کے اس کا آواز سن۔ تیرے کو فرق لگتا ہے کہ نہیں؟ پہلے اس کا ایسا مالک آواز تھا جیسے... بچہ روتا ہے بھوک میں... ابھی کیسا ہنستا پڑا ہے۔ ہنستا ہے نا؟"

کریم نے زبردستی اقرار میں سر ہلایا ورنہ اس کو ایک اور جھانپڑ کھانا پڑتا۔ آواز میں کوئی مبہم محسوس نہ ہونے والا فرق پڑا تھا تو ہمارے کان اسے کیسے محسوس کر سکتے تھے۔ پورے گانے کے بولوں میں ایک غلط سُر لگ جائے تو صرف کسی موسیقار کے کان ہی اسے نوٹ کر سکتے ہیں۔ یہ مشینی موسیقی تھی جس کو دوست محمد کے کان تیس چالیس سال سے سن رہے تھے۔ وہی کسی ایک پرزے کی آواز کے فرق کو محسوس کرنے پر قادر تھا۔

"ابھی کیا حکم ہے استاد؟"

"حکم کا بچہ!" دوست محمد نے بڑی سے کہا۔ "ابھی تیرے کو کیا سمجھایا تھا سکندر صاحب اڈ سیلوں مانگتا۔ ادھر جہاز پر کپتان کا حکم چلتا ہے اور کسی کا نہیں۔ ہمارا باپ بھی ہوتا تو ہم اس کو بھی یہی بولتا۔"

"غلطی ہوا استاد۔" کریم نے کہا اور بڈھے کو واپس ہوتے دیکھتا رہا۔ دوست محمد خشک مزاج اور سخت گیر تھا۔ شاید اسی لیے مشینوں کے ساتھ اس کی زیادہ بنتی تھی کہ انسانوں کے مقابلے میں زیادہ نظم و ضبط، اصول اور ڈسپلن کے مطابق چلتی تھیں اور اسی کے کنٹرول میں رہتی تھیں۔

"اگر سب ٹھیک ہے کریم تو پھر چلو۔ بسم اللہ کرو۔" ... نے کہا۔ "مزید دیر کی گنجائش نہیں۔"

کریم ایک دم قبلہ رو ہو گیا۔ سورج اب مغرب کی طرف ڈھل گیا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کے بلند آواز میں کہا۔ "اے رب العالمین! تیرا بہت مہربان ہے کریم... اپنا فضل کر یا مولا علی مشکل کشا۔ ابھی ہمارا خاص مدد فرما تیرے اپنے رسول کا واسطہ پاک پروردگار۔ جیسا مانگ تو ... کی کشتی کو بچایا ایسا ہمارا چھوٹا سا لانچ کا بیڑا پار ... اس کے خشوع و خضوع اور استغراق کی کیفیت ... کا اعتراف تھا، عجز تھا، خلوص تھا۔ اس کے الفاظ ... صدق دل کے ترجمان تھے۔ میں نے کئی بار زیر لب ... محسن کے ساتھ گل کو بھی دیکھا جو اس دعا کی الہامی کیفیت ... طرح ڈوبے ہوئے تھے۔ شاید وہ ہر بار سمندری سفر ... سے پہلے ایسے ہی دعا مانگتا ہوگا اور یہ رسم خود اس نے ... کی ہوگی۔ یہ شیوۂ ایمانی تھا۔ اس نے آباؤ اجداد کو بھی ... کے ساتھ خدا کے سامنے دست بدعا دیکھا ہوگا۔ ... کمزور ہے۔ وہ خود کو ... کا پتلا اپنا ... کرتا ہے لیکن اس حقیقت کا ادراک تب ہوتا ہے جب اس کے قدموں کے نیچے کچھ بھی ہو... اور آسمانوں سے آگ برستی ہے تو بستیاں خاک ... آتش فشاں سرد نہیں ہوتے اور سمندر میں طوفان ... تو فولادی قلعے جیسے جہاز بھی تنکوں کی ناؤ کی طرح ...

کریم بلوچ کی دعا اس کی سادگی کی مظہر تھی ... میں بھی حقیقت پسندی کا شعور تھا۔ جب اس نے ...

"ہاں تم پروردگار! ہم کو مگر مچھ سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ہم کو شارک کا پیٹ میں جانے سے بھی بچا... ابھی یہ بہت ... لانچ ہے۔ اس کا راستہ کلیئر کر... طوفان کو دشمن کا طرف ... ہم وعدہ کرتا اگر تو ہمارے کو ایک دم ٹھیک ٹھاک ... لائے گا تو ہم بھی حرام نہیں پیئے گا۔ ہم سالا مشتری ...

مگر تیرے سے بہت ڈر لگتا اپن کو..."

میں اور محسن مسکراتے بھی رہے اور آمین بھی کہتے رہے۔

بالآخر اس نے منہ پر ہاتھ پھیرا اور ایک نعرہ لگا کے لانچ کو کھولنے لگا۔ میں نے وطن کے ساحل کو دیکھا۔ کیا میں پھر لوٹ کے اس مٹی کی طرف آؤں گا؟ میں نہیں جانتا۔ آدمی کی مٹی اسے وہاں لے جاتی ہے جہاں وہ سفر ختم کرتا ہے مگر میں یقین اور امید کے زادِ راہ پہ تکیہ کرتا ہوں کہ دیارِ غیر اور اجنبی دیس کے راستوں کے خطرات سے بچا کے اور دشمنوں کے حصار سے مجھے حفاظت کے ساتھ واپس لانے والا خدا میرے ساتھ ہے۔

ساحل دور ہونے لگا تھا۔ افق کا آخری کنارہ پھیل گیا تھا۔ نامعلوم مسافتوں سے تنگ کہیں رابعہ ایک خیال کی روشنی بن گئی ہے۔ جیسے آب پہ اس کا عکس قائم نہیں رہتا، میرے تصور کا آئینہ بار بار دھندلا جاتا ہے۔ مضطرب سمندر کی موجیں جھاگ اڑا رہی تھیں۔ یہ ہوا کی ڈھلتی سہ پہر ہے۔ ابھی کچھ دیر میں سورج کا آتشیں گولا پانی میں بجھ جائے گا۔ تو سمندر کی پر ہیبت ویران رات پر مسلط ہو گی۔ اس رات کے بعد بھی دن، رات آئیں گی۔ جمعرات کو بابا جی علی کی درگاہ پہ میرا انتظار کرتا۔ میں آؤں گا۔ زندگی نے وفا کی تو میرا خیال آئے گا۔ جیسے تمہارا خیال رہتا ہے مجھے تسلی دینے کے لیے۔ اور رابعہ ایک موج آب کے دوش پہ تیرتی ہوئی قریب آکے پیش... تمہارا خیال تو اس وقت بھی میرے ساتھ ہے۔ میں نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پونے پانچ بج رہے تھے۔ ٹھیک ہے میں پوچھوں گا وہاں آکے۔

گل نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ "بھائی جی! تم تو رابعہ کے خیال میں گم ہو۔ یہ محسن کس کی یاد میں ڈوبا ہوا ہے؟"

میں نے چونک کے اسے دیکھا اور زبردستی مسکرایا۔ "ڈوبا ہوا ہے تو نکال لو، کہیں بالکل ہی نہ ڈوب جائے۔" میں نے بات بنائی۔ میں جانتا تھا کہ وہ شہلا اور اپنے بچے سے دوری کے دکھ کو تنہا سہتا ہے۔ اس وقت وہ ہمارے ساتھ نہیں تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے اپنے خیالوں کی خلوت گاہ سے باہر لا کے تصورات سے ملنے والی جذباتی آسودگی سے بھی محروم کر دوں۔

"تم کو اپنے... بھائی کی یاد نہیں آرہی اس وقت؟" میں نے گل کو دیکھ کر کہا۔

"یاد تو کیا تھا میں نے اسے، مگر اس نے کہا کہ گل! تو ہمارے بھائی کی بہادر بیٹی ہے، کہیں مجھے شرمندہ مت کرنا۔ میں نے زندگی میں کوئی نیکی ضرور کی ہوگی جس کے صلے میں قدرت نے مجھے اپنوں میں پہنچا دیا۔ پہلے تو میرے سوا کون تھا میرا؟ لیکن اب لگتا ہے بہت سے پیار کے رشتے ہیں۔"

"یہ سب اس نے کہا تم سے؟"

"ہاں! تم ہنسو گے مجھ پر۔" وہ بولی۔ "اس کی آواز میں نے ایسے ہی سنی تھی... جیسے وہ میرے سامنے ہو۔ اور میں بھی تھی کہ تم بھی سن لو گے۔"

ہم سب کے ساتھ اپنے اپنے خیالوں کی بازگشت تھی! میں اسے کیسے بتاتا کہ جیسے میں نے رابعہ کو دیکھا تھا اور اس کی آواز سنی تھی، اس سے باتیں کی تھیں، ایسے ہی اس وقت محسن بھی شہلا سے اور اپنے بچے کے خیال سے ہم کلام تھا۔

گل اسے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ "بھائی جی! ایک بات پوچھوں؟ سچ سچ بتاؤ گے؟"

"پہلے تم سے جھوٹ کب بولا ہے میں نے؟" اس کے سوال کی نوعیت کا مجھے اندازہ ضرور ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے گول مول بات کی۔

"محسن کو محبت ہے کسی سے؟"

میں ایسے ہی سوال کی توقع رکھتا تھا اور جواب کے لیے تیار تھا۔ "ہاں، دنیا میں محبت کے بغیر کون جی سکتا ہے۔"

"نا دوست مجھے۔" وہ بولی۔ "میں اس محبت کی بات کر رہی ہوں جو تم رابعہ سے کرتے ہو۔ جو نازو کو غالب سے ہے۔"

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔" میں نے ریلنگ پہ جھک کر متلاطم پانی میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تمہارا دل کیا کہتا ہے؟"

"میرا دل... میرا دل کہتا ہے... تم اسے بتاؤ گے تو نہیں...؟"

"اب تمہیں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"میرا دل کہتا ہے کہ محسن کبھی میرا نہیں ہوگا۔" گل نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"تم... تم چاہتی ہو کہ وہ تمہارا ہو جائے؟" میں اس کے بے باک اعتراف محبت کے لیے ذہنی طور پہ تیار نہ تھا۔

"ہاں مگر چاہنے سے سب کچھ کہاں ملتا ہے۔ میں اتنی خوش قسمت کبھی نہیں تھی۔ میری تقدیر تو اب بھی دکھ ہے۔"

"تقدیر کے بارے میں کون جانتا ہے کہ کب زندگی کے راستے بدل دے گی۔" میں نے کہا۔ "تم اپنی ہی مثال لو۔ تم پہلے گل بانو تھیں، پھر ناگ سی ہو گئیں اور اس رات ہمارے آنے سے پہلے کیا تم سوچ بھی سکتی تھیں کہ تمہاری زندگی میں اتنا بڑا انقلاب آنے والا ہے؟"

"تم پوچھو گے نہیں کہ میں محسن کو کیوں چاہتی ہوں؟"

"نہیں، اس سوال کا جواب تو میں بھی نہیں دے سکتا۔ کوئی بھی نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔ "میری طرح تم بھی

بے اختیار ہو۔ جیسے خدا کے معاملے میں بندہ بے اختیار ہے۔ اس تک رسائی ہو نہ ہو، وہی معبود رہے گا۔ دل کا سودا بھی کسی شرطِ وصل پہ نہیں ہوتا۔"

گل مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے میری بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ اور پلٹ کے نیچے چلی گئی۔ میں سوچتا رہ گیا کہ اس کی خاموشی میرے خیال کی تردید کر گئی تھی یا تائید؟

پھر محسن نے سر گھما کے مجھے دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آ کے بیٹھ گیا۔

"تو نے سچ کیوں نہیں بولا؟ یہ موقع کیوں گنوا دیا؟ جب وہ حقیقت جاننا چاہتی تھی اور سب کچھ سن سکتی تھی۔"

"میں نے کوئی جھوٹ بھی تو نہیں بولا اس سے۔" میں نے کہا۔

"مگر تو نے جانتے بوجھتے سچ سے گریز کیا۔" محسن نے برہمی سے کہا۔ "مجھے اس آزمائش میں مت ڈال سکندر۔ میں اس جھوٹ کو نبھانے میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

"ٹھیک ہے، جا اور اسے شہلا کے بارے میں خود ہی بتا دے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "آج تو مجھ میں ہمت نہیں باقی۔"

"ایک نہ ایک دن اسے سب معلوم ہو ہی جائے گا۔"

"ہاں، مگر اس سے پہلے حالات و واقعات خود اسے اندازے قائم کرنے پہ مجبور کر دیں گے۔ آہستہ آہستہ اس کے شکوک کی بنیادیں جب استوار ہوں گی تو یقین کی دیوار اٹھے گی۔ جو وہ عقلی اور منطقی نتائج کی مدد سے سچ کو سمجھ لے گی اور مان لے گی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی خود کو ذہنی طور پہ کسی سانحے کا صدمہ اٹھانے کے لیے تیار کرتا ہے۔ ناقابلِ علاج مرض میں مبتلا کسی بھی مریض کے لواحقین اپنے احساس سے سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ انہیں حوصلہ مجتمع کرنے کی مہلت مل جاتی ہے لیکن گھر سے معمول کے مطابق خوش و خرم اسکول یا آفس جانے والے کی کچلی ہوئی لاش اچانک گھر پہنچتی ہے تو یہ صدمہ جان لیوا بھی ثابت ہوتا ہے۔"

"میں دونوں طرف سے احساسِ پشیمانی کا شکار ہوں۔ میں شہلا کے اعتبار کو دھوکا دینے کا مرتکب بھی ہو رہا ہوں اور گل کے جذبات سے بھی کھیل رہا ہوں۔" محسن نے بے بسی سے کہا۔

"تم تو صرف کھیل کے تماشائی ہو اور جب گل کو معلوم ہو گا۔"

"تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" میں نے محسن کی بات کاٹ دی۔ "اگر تیرا خیال ہے کہ وہ پاگل ہو جائے گی یا خودکشی کر لے گی تو میری بات لکھ لے، نہ وہ مجھ سے شکوہ کرے گی اور نہ مجھے الزام دے گی۔"

محسن نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ "تو کیسے جانتا ہے؟"

"میں جانتا ہوں کہ اس کی محبت میری طلب سے مشروط نہیں ہے۔ بالکل ویسی ہی کی طرح۔ جو اچھی طرح جانتی تھی کہ رابعہ سے مجھے کتنی محبت ہے اور میں اس کے لیے کتنا دیوانہ ہوں لیکن اس نے رابعہ کے خلاف اپنی رقابت کے جذبات کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ یہ بھی ویسی ہی محبت ہے جو ثابت کے جذبوں سے بے تعلق رہتی ہے۔ ساری دنیا اس کے محبوب کو چاہے تو کوئی فرق اسے نہیں پڑتا۔ اسے اپنی محبت کے سوا کسی سے سروکار نہیں ہوتا۔"

"تیرا یہ فلسفہ... مانا نظریہ عشق..."

"میں نے کہا نا کہ میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔ تو آج ہی آزمانا چاہے تو جا گل کو بتا دے کہ شہلا میری بیوی ہے اور میں ایک بچے کا باپ بھی ہوں۔ پھر دیکھ کیا اس کی محبت نفرت میں بدلتی ہے؟ لیکن اچھا ہے اگر تو اسے حقیقت کو قبول کرنے کے لیے کچھ وقت دے۔"

محسن خاموش ہو گیا اور دور افق پر گم ہونے والے ساحل کو دیکھنے لگا۔ لانچ خاصی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ دائیں بائیں بڑے بڑے بحری جہازوں کے قریب سے گزر رہی تھی جو گہرے سمندر کے متلاطم سینے پہ قلعوں کی طرح قائم تھے۔ آسمان اب بھی روشن تھا اور کراچی کی بندرگاہ پہ کھڑی ہوئی بھاری بھرکم کرینوں کے فولادی بازوؤں کی آڑی ترچھی لکیروں کو دیکھ سکتا تھا۔ ساحل کے پانی کی وہ بو جس میں تیل اور کوڑا کرکٹ اور دھواں سب کچھ شامل تھا اب باقی نہیں رہی تھی۔ اب تازہ مرطوب ہوا میں ایک نمکین مہک تھی۔ اور آبی پرندے محوِ پرواز تھے اور نیچے سمندر آسمان کی طرح ویران ہونے لگا تھا۔

گل پھر اوپر آئی۔ "بھئی سب چنگاری ڈال کے یہاں کھڑے ہو دونوں؟"

میں نے کہا۔ "بھئی... یہاں ہے بھئی!"

"بھوسا ہو سکتا ہے۔" محسن بولا۔ "مستری کی کھوپڑی کا تو یقین ہے... آپ ذرا چیک کرا لیں۔"

"اسے کہہ دیا کر دوست محمد تمہارا سسر ہے اور تمہیں ... کر چکا ہے۔" گل نے جھٹکے سے کہا۔ وہ کریم کی ایک سننے کو تیار نہیں ... ہم نیچے گئے تو صورت حال اس حد تک سنگین ہو چکی تھی۔ مستری اور کریم بلوچ ایک دوسرے کی طرف چڑھتے ہوئے ... اور "میں باز آیا محبت سے اٹھا لو پاندان اپنا..." قسم کی کیفیت

تھی۔ اور اس سے پہلے کہ ہم دخل در معقولات کرتے، دوست محمد نے کریم کو ڈیوٹی پر طلب کر لیا۔ ہم نے مستری سے کہا کہ وہ چائے کے دو کپ بھجوائے اور اس نے قسم لیمن آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ "اچھا صاحب جی، مگر ایک فیصلہ کر جاؤ۔ یہاں اب میں رہوں گی یا کریم رہے گا۔"

"اوہ... یہ تو مشکل فیصلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "گویا ایک کو سمندر میں پھینکنا پڑے گا۔"

"اور اس کے لیے دیکھنا پڑے گا کہ بھاری کون اور کس کو سامان میں شمار کیا جا سکتا ہے۔" محسن بولا۔ "پہلے تولیں گے پھر پھینکیں گے۔"

"جب تم جانے لگو تو تم زندہ بھی ٹانگ لو اور کریم کو بھی۔" میں نے کہا۔

اپنے کیبن میں پہنچ کے میں نے محسن سے کہا۔ "رات ہونے سے پہلے پہلے ہمیں اپنے ضروری کام نمٹا دینے چاہئیں۔ سب سے پہلے تو ضروری ہو گا کہ ہم دوست محمد کو وہ نقشہ دکھا دیں جو شاہد نے بنا کے دیا تھا تاکہ وہ صحیح سمت متعین کر لے۔"

"کیا وہ اب بھی کارآمد ہو گا؟"

"ظاہر ہے جہاز اپنے مقررہ راستے پہ ہی سفر کرے گا۔ دبئی سے روانہ ہونے سے مدت تو نہیں بدل سکتا۔" میں نے کہا۔

"دوست محمد ہی بتا سکتا ہے کہ ہم اس بحری جہاز کے نزدیک کب پہنچ سکتے ہیں۔ آج رات تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن کل کی رات سب سے موزوں ہے۔ اگر ہم سارا دن چلتے رہے اور کوئی گڑبڑ نہ ہوئی تو چوبیس گھنٹے بہت ہوتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ لانچ مسلسل سفر نہیں کر سکتی۔ چھوٹا انجن ہے تا اسے وقفہ دینا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "دوست محمد کچھ ایسا بندوبست کرے کہ ہم پرسوں یعنی بدھ کی رات تک جہاز کے قریب ہوں۔ اور اسی رات کے دوران ہم جہاز پہ پہنچنے کی کوشش کر لیں۔ کامیابی کا انحصار نادر اور غالب سے رابطے پہ ہے۔"

"بدھ کی رات ٹھیک ہے۔ جمعرات کی صبح یا زیادہ سے زیادہ دوپہر تک ہم عمان کے ساحل پہ ہوں گے۔ تو نادر اور رابعہ کی ملاقات کیسے ہو گی؟ شہر میں داخل ہونے اور پھر حاجی علی کی بندرگاہ تک پہنچنے کے لیے بھی وقت درکار ہو گا۔ ہم وہاں اجنبی ہوں گے اور ہمارے سامنے ایک نہیں دس مسئلے ہوں گے۔" محسن نے کہا۔

اسی وقت دوست محمد اندر آ گیا اور اس کے پیچھے مستری چائے کی ٹرے لیے آئی۔ دوست محمد کی شان پہلے بھی قلندرانہ تھی۔ رنگ کالا تھا اور سر کے سخت کھردرے بالوں میں سفیدی غالب تھی۔ جب سے وہ نشہ کرنے لگا تھا اس نے شیو بنانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس کے چہرے پہ بھی بال اگ آئے تھے۔ لال چار خانے والی میلی قمیص اور بوسیدہ خاکی پتلون شاید اس نے کئی ہفتے سے پہن رکھی تھی۔ رہی سہی کسر اس کے بدن پہ میل کی تہ نے پوری کر دی تھی۔ مستری نے چائے کے برتن رکھتے ہوئے ناک پہ دوپٹے کا پلو رکھا اور زیرِ لب کہا۔ "مواچرسی... کوڑے کی بوٹی۔"

"کیا تم نے دوست محمد سے کچھ کہا؟" محسن بولا۔ "یہ بھی تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہے۔"

"ہاں ہاں، جو پوچھنا ہے سامنے پوچھ لو۔" میں نے کہا۔ "میں نے غلط نہیں بتایا تھا۔ سب سے پہلے قصہ پاک کیا سسر کا یوں۔" میں نے گلے پہ ہاتھ کو چھری کی طرح پھیرا۔ "پھر داماد۔" میں نے ہاتھ سے سینے میں خیالی خنجر گھونپا۔ "اور آخر میں بہو۔" میں نے ایک ہاتھ کی انگلی سے ریوالور بنا کے ٹریگر دبایا۔ دراصل میں نے دیکھ لیا تھا کہ دوست محمد نے پھسکڑا مار کے زمین پر بیٹھتے ہی آنکھیں بند کر لی تھیں اور ذہنی طور پہ وہ غیر حاضر تھا لیکن بیچاری مستری کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔

"کیوں بھئی دوست محمد؟" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "یہ ٹھیک بولا نا میں نے؟"

دوست محمد بیزاری سے بولا۔ "او بابا، سب ٹھیک ہے۔" مستری پہلے ہی بدحواس ہو گئی تھی۔ دوست محمد کا جواب سنتے ہی اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ ایک دم بھاگی... ٹھوکر کھا کے گری۔ چیخ مار کے اٹھی اور غائب ہو گئی۔

دوست محمد نے اسے غور سے دیکھا۔ "اس لڑکی کا دماغ میرے کو خراب لگتا ہے۔"

"ہاں، پاگل ہے بیچاری۔" محسن بولا۔ "لیکن خطرناک نہیں ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟" دوست محمد نے ہمدردی سے کہا۔

"نام تو... پتا نہیں... کریم پیار سے باولی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "برا نہیں مانتی۔"

"کریم پیار سے بولتا... اس کا کون ہے یہ پاگل؟"

"تمہیں نہیں معلوم؟" محسن نے کہا۔ "بیوی ہے اس کی۔"

"اچھا... سالا حرامی... شادی بنایا اور ہم کو نہیں بتایا۔ ہم کو استاد بولتا اور ہم سے استادی کرتا۔" وہ خفا ہو کے بولا۔

"چلو چھوڑو استاد، یہ نقشہ دیکھو۔" میں نے کہا۔

دوست محمد نے کاغذ کو پھیلا کے نظر ڈالنے کی کوشش کی۔ پھر آنکھیں مل کے دیکھا۔ اس کی صورت پہ جھنجلاہٹ کے آثار نظر آنے لگے۔

"ابھی ایک سگریٹ دو ہم کو۔" وہ التجا آمیز بے بسی سے بولا۔

www.paksociety.com

پھیلا کے بولا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا اور اسے ایک سگریٹ نکال کے دے دی۔ "اب رات کو سونے سے پہلے تمھیں سگریٹ نہیں ملے گی۔"

اس نے میری بات اَن سنی کر دی اور سگریٹ جلا کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ میں اور محسن چائے پیتے رہے اور دوست محمد کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتے رہے۔

بالآخر اس نے آنکھیں کھول کے نقشہ دیکھا۔ اس کے ماتھے پر غور و فکر کی لکیروں کا جال گہرا ہونے لگا۔ اس نے دو بار سر ہلایا کے نزدیک "ہوں" کہا۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے ایک انگلی سے ہوا میں فرضی لکیریں بناتا رہا۔ وہ اپنے تجربے کی روشنی میں کچھ حساب لگا رہا تھا اور اندازے قائم کر رہا تھا۔

"یہ تو تم جانتے ہو کہ ہم ایک بحری جہاز کے تعاقب میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس کا نام ہے ایس ایس کراچی ایکسپریس۔ وہ جہاز کل آدھی رات کے بعد کراچی کی بندرگاہ سے بمبئی کے لیے چلا تھا۔"

دوست محمد نے سر ہلایا۔ "ابھی یہ نقشہ کس پاگل کا بچہ نے بنایا ہے؟"

"میں نے... کیا یہ غلط ہے؟" میں نے کہا۔

"کوئی کام کا نہیں۔" وہ نقشے پر غور کرتے ہوئے بولا۔ "ہم اس کو ٹھیک کر کے بنائیں گا۔"

وہ کوئی نیوی گیشن انجینئر نہیں تھا۔ اس کے پاس کسی یونیورسٹی کی کسی فنی ادارے کی کوئی سند نہیں تھی، لیکن چالیس برس کا تجربہ اس کی سب سے بڑی سند تھا۔ میں نے اسے کورے کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں بناتے اور آنکھیں بند کر کے بڑبڑاتے دیکھا۔ وہ کسی پہیلی جیسے نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاہد جیل کے نقشے میں جو تفصیلات درج تھیں، وہ انھیں مکمل کرنے میں مصروف ہے۔

بالآخر اس نے کہا۔ "ابھی کیا کرنے کو مانگتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "پہلے تو یہ بتاؤ ہم اس جہاز تک کب پہنچ سکتے ہیں۔ کیا کل رات تک یہ ممکن ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "کل رات مشکل ہے بابا۔ ابھی جو فرق ہے... تو چھتیس گھنٹا۔ اس میں کچھ گھنٹا ملاؤ۔ لانچ چلنے میں کچھ گھنٹا، پھر ایک گھنٹا تیل بھرنے میں لگے گا۔"

"چالیس گھنٹے... یعنی پرسوں صبح دو بجے۔" میں نے کہا

"اگر کوئی گڑبڑ نہ ہوا۔" دوست محمد بولا۔

"گڑبڑ کس قسم کی ہو سکتی ہے؟" محسن بولا۔

"کیسا بات کرتا ہے تم... یہ سمندر ہے۔ کراچی کا سمندر یہ بھی بہت کچھ ہو جاتا ہے ادھر تم کو ڈیل کر جاتا ہے پھر راوات

کو تم پہنچ جاوے، کسی چٹان شٹان پہ... پھر... انجن خراب ہو جاوے، پھر؟"

"انجن تو تمھارے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔"

"ارے بابا! بات سمجھو کا ہے۔ تھوڑا وقت تو لگے گا۔" وہ چڑ کے بولا۔ "ہم وہ جہاز دیکھا ہے۔ اس کا سپیڈ بھی معلوم ہے ہم کو۔ لیکن راستہ خراب ہے۔ شام ہو سکتا ہے۔"

"شام تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "کوشش کرنا کہ جہاز کے پہنچنے تک ان کی نظر میں نہ آئیں۔"

اس نے سر ہلایا۔ "ابھی یہ بولو کہ تم پکڑا گیا تو کیا کرے گا؟"

"اس کا بندوبست ہم کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم سب کے فرضی نام ہوں گے اور جعلی پاسپورٹ۔ جعلی سے مطلب ہے پاکستانی نہیں ہوں گے۔ انڈین نام ہوں گے تو انڈین پاسپورٹ۔"

"یہ تو بہت خطرناک ہے بابا..."

"تم فکر مت کرو۔ اگر کوئی چیک کرنے آئے تو تم آنکھیں بند کر کے سو جاؤ۔ ہم بتا دیں گے کہ... بابا نشے میں ہے۔ کوئی تم سے لاکھ پوچھے جواب مت دینا۔ ویسے ہم بتا دیتے ہیں تمھیں کہ آپس میں ہمارا رشتہ کیا ہے۔ میں اور محسن بھائی ہیں۔ گل خاصے دوست ہے محسن کا، اور ہم دونوں تمھارے بیٹے ہیں۔"

"اور وہ پاگل؟"

"تمھارا مطلب ہے بادلی؟" میں نے اسے گھور کے کہا۔

"وہ تو ہے ہی کریم کی بیوی۔ کریم ہمارے ساتھ کام کرتا ہے۔ ہم سب ماہی گیر ہیں۔"

"جو تمھارا مرضی ہو لو بابا۔ ہم اپنا کام کرے گا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "رات کو ہماری باری ڈیوٹی دے گا تم۔ ایک آدمی ہمارا ساتھ ہو گا۔ ایک کریم کا ساتھ۔"

"کریم تمھاری مدد کے بغیر ٹھیک تو نہیں جائے گا؟"

"ہم اس کا سفر میں سیدھا راستہ ڈالیں گا۔ پھر کیسے بھولیں گا راستہ وہ... اور ہم بھی ادھر ہے۔ لیکن ہم اکیلا سارا رات نہیں جاگ سکتا۔" اس نے باہر جاتے جاتے کہا۔

اس کے جانے کے بعد مجھے گل کا خیال آیا۔ "اس نے چائے بھی نہیں پی ہمارے ساتھ۔"

"سو رہی ہو گی۔" محسن نے کہا۔ "میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

جب وہ دونوں آئے تو گل کے چہرے پر بڑی شگفتہ سی مسکراہٹ تھی۔ دلہن کے نکھار اور معصومیت کے انداز سے روشن، فتح مندی کے غرور سے معمور اور مخمور۔ معلوم نہیں محسن نے کیا کہہ دیا تھا۔ اس نے کیا کہہ دیا تھا کہ اداس اور غمگین گل... کی شوخی عود کر آئی تھی

"کہاں تھیں تم؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

"پہنچنے تو کریم اور مشتری کا ڈراما دیکھ رہی تھی۔ تم نے بنا شو شہ چھوڑ دینا چاہیے،" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "اب وہ کریم کی قسم پر بھی شہر جانے کو تیار نہیں۔ کہتی ہے تمھارا باپ مجھے بھی قتل کر دے گا۔ اس کے بعد سورج کو ڈوبتا دیکھتی رہی۔ بڑا اچھا لگتا ہے۔"

"ابھی سفر شروع ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "صبح پوچھیں گے تم سے تمھارا حال کہ اب کیسا لگتا ہے۔"

"کیوں؟ صبح کیا ہو گا؟" وہ بولی۔

"سمندر پیٹ میں طوفان اٹھائے گا۔ چکر، متلی اور قے ہو گی جسے ہم کلینیکلی... کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تھوڑی بہت سب کی حالت خراب ہو گی۔ بہتر ہے اس سے پہلے ہی ضروری کام کر لیں۔"

کیبن کی لالٹین جلا کے میں نے محسن کی مدد سے چار پاسپورٹ تیار کیے۔ پہلا پاسپورٹ میرا تھا، دوسرا محسن کا۔

"عجیب بات ہے ہماری قومیت اور شہریت بدلے گی تو نام بھی نہیں بدلیں گے۔" میں نے کہا۔ بہت غور و فکر کے بعد میں نے اپنا نام امیر چند ولد دھرمی لال اور تیرا نام ظفر چند ولد دھرمی لال لکھا ہے۔"

گل ابھی تک محسن نے احتجاج کیا۔ "کیوں یہ کافروں کے نام رکھ کے اپنی اور میری عاقبت خراب کرتا ہے؟"

"نقل کفر کفر نباشد۔" میں نے کہا۔ "ہماری اصلیت و ولدیت بدل نہیں سکتی۔ اس سے ہمارے ایمان میں خلل پڑنے کا کوئی سوال ہے اور نہ امکان ہے۔"

"پھر بھی ضرورت کیا ہے امیر چند ولد دھرمی لال بننے کی؟ آخر ہندوستان میں مسلمان بھی رہتے ہیں۔" محسن بولا۔

"ہاں رہتے ہیں لیکن انھیں وہ تحفظات اور مراعات حاصل نہیں جو ہندوؤں کو حاصل ہیں۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے مسلمان کی حیثیت سے ہم ہر جگہ اپنے لیے جگہ نہ پا سکیں۔ مشکوک سمجھے جائیں، تعصب کا شکار ہو جائیں۔ ویسے عام لوگوں کے درمیان رہنا ہے اور کون جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننی ہے۔"

"تم قائل ہو گئے ہو، میں تمھاری بات مان سکتا ہوں بشرطیکہ میرا نام امیر چند ہو۔ میرے شاہانہ عادات اور شاہانہ اطوار کے زیادہ شایان شان ہے۔" محسن نے کہا۔

"بات صورت کی ہے عزیزم! اگر تم ظفر جانباز کہلانے پر غور کرو تو تمھاری شکل کنگلوں والی ہے۔ آدمی دیکھے تو خواہ مخواہ ترس کھائے، خیرات دینے کی سوچتا ہے۔ ظفر چند کا میل تمھاری صورت پر بہت ٹھیک بیٹھتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ معاملہ نہیں چلے گی۔ ثالث کو فیصلہ کرنے دو۔"

"اور ثالث گل ہو گی۔" میں نے کہا۔ "پچر کا گواہ کرکٹ، تم

دونوں تو ایک ہو۔ تمھیں کہے گی مسٹر پاکستان اور تم اسے بنا دو گے مس یونیورس، تمھیں پھر دیتا ہے ٹھیک ہے بھگتو۔"

"اچھا ٹاس کر لو، ورنہ تمھارے تبصرے نگلنے لگ جائیں گے۔"

میں نے سکہ نکالا اور اوپر اچھالا۔ گل نے اسے کیچ کر کے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا۔ محسن نے چاند تارا مانگا۔

"اب بولو۔" وہ دونوں ہتھیلیوں کے درمیان جھانک کے ہنسی۔ "کون سا ہاتھ سامنے کروں، دایاں یا بایاں؟"

"بایاں۔" میں نے کہا۔

"نہیں دایاں۔" محسن نے شور مچایا اور گل نے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی سامنے کر دی۔

میں نے قہقہہ مارا۔ "دیکھا! اسے کہتے ہیں تقدیر کا فیصلہ۔" اور وہ سکہ فوراً گل سے لے کر جیب میں ڈال لیا جس کے دونوں جانب چاند تارا ہی تھا۔ محسن کو یاد نہیں آیا کہ ٹاس جیتنے کے لیے ایسے خصوصی سکے ہم کتنی محنت سے بناتے تھے اور سنبھال کے رکھتے تھے۔ گل نے یہ بات یقیناً نوٹ کی ہو گی مگر اس نے میرا راز افشا نہیں کیا۔

"گلاب کو جس نام سے چاہو پکارو، وہ گلاب ہی رہتا ہے۔" محسن نے ڈھٹائی سے کہا۔

"یہ تو ہے۔" میں نے اتفاق کیا۔ "مثلاً اپنی گل پاسپورٹ میں گل خانم ہے، تم اسے گل جان کہو تب بھی رہے گی یہ گل بانو۔"

"او گل جان! کیا خوب شے۔" محسن نے نعرہ لگایا۔ "وی قربان۔"

میں نے گل کو گل لالہ بنتے دیکھا اور سر جھکا کے پاسپورٹ کے اندراجات مکمل کرنے لگا۔ یہ بہت احتیاط اور جانفشانی کا کام تھا۔ محسن نے میری مدد کی اور آدھے گھنٹے میں ہم فارغ ہو گئے۔ ہمارے پاس جو مہریں تھیں وہ اصلی تھیں کیونکہ یہ مہریں ہماری ایجنسیوں کو خود حکومت نے فراہم کی تھیں۔ بیشک پاسپورٹ بھی جعلی نہیں تھے۔ اب وہ لوگ بھی زندہ نہ تھے جو ان کی گمشدگی کی رپورٹ لکھواتے۔ چنانچہ نقل ہر طرح سے اصل کے مطابق تھی۔ غور و تصدیق کرنے والے ہم پر شک نہیں کر سکتے تھے اور یہ دستاویز ہمارے تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت تھی۔

"کیا ہم یہ پاسپورٹ ہر جگہ ہر وقت پیش کریں گے۔ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو؟" محسن نے کہا۔

"نہیں، جب تک کوئی ہماری شناخت کا ثبوت نہ مانگے اور ثبوت لے کر بھی ملنے پہ آمادہ نہ ہو۔ پاسپورٹ نکالنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ پاسپورٹ بھارت سے گزرتے ہوئے یا مشرقی پاکستان کی سرحد عبور کرتے وقت زیادہ کارآمد ثابت ہوں گے۔ ابھی تو ہم سمندر میں ہیں۔ پکڑے گئے تو کہہ دیں گے کہ غلطی سے آگے نکل آئے۔ پاکستان اور بھارت دونوں ہی اپنی

www.paksociety.com

سمندری حدود میں گھس آنے والے ماہی گیروں کی لانچیں پکڑتے رہتے ہیں لیکن ان کے خلاف قانونی کارروائی نہیں ہوتی بس دو چار دن رکھتے ہیں۔ کچھ مال بناتے ہیں، مال مل گیا تو ٹھیک ورنہ کے چھترول سے تھوڑی سی خاطر تواضع کرتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں۔ چونکہ ہم نذرانہ پیش کرنے کی پوزیشن میں ہیں، ادھر بھی اور اُدھر بھی، اس لیے فوری طور پر ہمیں قانون سے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔"

"پھر اتنی جلدی کیا تھی پاسپورٹ بنانے کی؟" گل نے کہا۔

"اچھا سوال کیا ہے تم نے گل خان۔" میں نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ دورانِ سفر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی حادثہ ایسا پیش آسکتا ہے جو ہم سب کو جدا کر دے۔ کسی بھی نوعیت کی ہنگامی صورتِ حال کے بارے میں ہم سب کو پہلے سے معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری کیا تیاری ہے۔"

"کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اس بریفنگ کے سامعین میں مسماۃ مشتری اور ان کے مجنوں میاں کریم کو بھی شامل کر لیا جائے؟" محسن نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اس بریفنگ کی زیادہ ضرورت انھی کو ہوگی۔" شگفتہ نے کہا۔ "دوست محمد کو چھوڑ دو۔ وہ ہم سے زیادہ جانتا ہے سمندر کو۔"

محسن واپس لوٹا تو اس کے ساتھ صرف مشتری تھی۔ اس کا بھی منہ سوجا ہوا تھا اور وہ ایسے آئی جیسے غلط ایل بی ڈبلیو قرار دیا جانے والا کھلاڑی پویلین لوٹ آتا ہے۔

"نصف بہتر تو آگئی۔" میں نے کہا۔ "نصف بدتر کہاں ہے؟"

"اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہے۔" محسن بولا۔ "استاد نے شاگرد کو مرغا بنا رکھا ہے۔"

"کس جرم میں؟"

"جرم... بھئی ایک شاعر نے کہا ہے کہ جرمِ اُلفت پہ ہمیں لوگ سزا دیتے ہیں۔" محسن بولا۔ "دوست محمد اس ظالم سماج کا نمائندہ بن گیا ہے۔ میری سفارش سے وہ پیرول پر رہا ہو کے آرہا ہے۔ جب واپس جائے گا تو باقی سزا کاٹے گا۔"

کریم آہ و بکا کرتا اور ٹھمکتا اندر آیا۔ "اللہ کا قسم ہم ایک دم مر گیا صاحب۔ آپ بہت ظلم کیا کریم بلوچ پر۔ استاد کو بول دیا کہ ہم چوری چوری شادی بنایا۔ اس کو نہیں بلایا۔ ہم بولا کہ استاد اب کیا بولتا ہے۔ تم تو قاضی کو ہی مت آنے دے تو شادی ہوئے گا لیکن تم نہیں آئیں گا تو کریم بلوچ والا نہیں بولیں گا۔"

"پھر استاد نے تمھیں کیوں پھینٹ دیا؟"

"کیا صاحب! لیکن اکیلا بولتا کہ اچھا تو شادی نہیں بنایا ہے تو میرے سامنے وعدہ کرو کہ اس پاگل سے ملنا نہیں بناؤ گی۔ ایسے بولا کہ پاگل استاد! تو صاحب.... وہ مشتری کا نام لیا۔ اب تم اس کو جینے نہ دے کہ یہ پاگل ہے، بتا۔"

"اے ہے۔ اس منحوس تبدھے پہ خدا کی مار۔ مجھے پاگل کہتا ہے۔" مشتری نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ "وہ خود پاگل.... اور تو کیوں سنتا ہے جا کے یہ بات اسے؟"

"کبھی کبھی ہم استاد سے جھوٹ بولتا ہے مشتری۔ اللہ ہم کو مافی دیوے، لیکن اتنا بڑا جھوٹ کیسے بولے۔"

"کیا مطلب؟" مشتری نے چمک کے کہا۔ "یہ جھوٹ ہے کہ وہ مجھے کہتا ہے۔ جیسے یا سمجھا تیرا اپنا دماغ ٹھکانے ہے...."

"ارے اپنا پاس کدھر ہے لی دماغ۔ لیکن تو فکر مت کر ہم ایسا بات نہیں بولیں گا۔ ہم ساری رات مرغا بنیں گا مگر جب صبح اذان دے گا، تو تیرا نام لیں گا.... آؤ اپنا گھر کا ذکر نہ بتا ہو گیا...." وہ جھوم کے فرش پہ بیٹھ گیا۔

اس کی باتوں پہ ہنسی آنا لازمی تھی، لیکن میں نے سنجیدہ رہ کے کہا۔ "اس وقت تمھیں بلانے کا مقصد یہ ہے کہ کچھ ضروری باتیں تمھیں پہلے سے بتا دی جائیں۔ اتنا تو تم جانتے ہو گے کہ ہمارے اس سفر کا مقصد کیا ہے۔ ہمارے سامنے خطرات ہی خطرات ہیں لیکن ہم خدا پہ بھروسا رکھتے ہیں کہ جیسے اس نے آج تک ہماری حفاظت کی ہے آئندہ بھی کرے گا۔ احتیاط اپنا کام لازم ہے۔ ایک بات تم دھیان سے سن لو۔ اب ہم وہ نہیں ہیں جو روانگی کے وقت تھے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ یہ سفر بھیس بدل کے اور اپنی اصلیت کو پوشیدہ رکھتے ہوئے کریں۔ ہم سب نے اپنے نام بدل لیے ہیں اور آج کے بعد ہم انھی ناموں کے ساتھ سفر کریں گے۔ ہمارے یہ نام واپسی تک یہی رہیں گے۔ اگر شروع سے ہم نے ایک دوسرے کو ان ناموں سے پکارنا شروع نہ کیا تو عادت نہیں ہوگی اور کہیں کسی غلط موقع پر پرانا اصلی نام ہمارے منہ سے نکلا تو سب پھنس جائیں گے۔ یاد رکھو میرا نام ہے امیر چند، محسن کا نام ہے فقیر چند اور یہ گل بانو جو مردانہ لباس اور حلیے میں بیٹھی ہے، یہ گل خان ہے۔ یہ عورت نہیں ہے۔ امیر چند اور فقیر چند بھائی بھائی ہیں اور ان کے باپ کا نام ہے دمڑی لال۔"

"صاحب جی! یہ تو بہت مشکل نام ہیں۔" مشتری نے کہا۔ وہ میری باتوں پہ بے حد حیران اور پریشان تھی۔

"فکر مت کرو، میں تیرے کو سمجھا دوں گا۔" کریم نے کہا۔

"مگر صاحب یہ دمڑی لال کون ہے؟"

"تمھارا استاد۔ ہم یہ ظاہر کریں گے کہ وہ ہمارا باپ ہے سیٹھ اور محسن کا۔" میں نے کہا۔ "گل خان ہمارا ساتھی ہے اور ہم سب ماہی گیر ہیں۔ مچھلی پکڑتے ہیں اور کل صبح سے ہم یہ کام شروع بھی کر دیں گے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔"

"ہمارا بھی کوئی اچھا نام رکھو صاحب۔" کریم نے کہا۔ "یہ مشتری بھی ہم کو اچھا نہیں لگتی۔"

"ارے کھوتے! میں اچھی نہیں لگتی تجھے؟" مشتری نے چمک کے کہا۔ "کون اچھی لگے ہے پھر تجھے، بتا...."

"ارے بابا! ہم نام کو بولتا۔ مشتری تو وہ ہوتا جیسے اپنا منا ...کینک۔" کریم نے اسے سمجھایا۔ "پہلے اس کو سب مستری صاحب بولتا۔ ابھی وہ استاد ہے۔"

"چلو تم خود اپنے لیے اور مستری صاحب کے لیے وہ نام تجویز کرو جو تمھیں اچھا لگتا ہے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"طبلہ اور سارنگی پیارا رہے گا۔ ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ سنگت کرتے رہتے ہو۔" محسن نے کہا۔

"ایک دم ٹھیک صاحب۔" کریم خوش ہو کے بولا۔

"ارے چل نامراد، تو تو ہی جا طبلہ۔ میں مشتری ہی بھلی۔" مشتری نے بل کھا کے کہا۔ "مجھے تو وہ بدمعاش طبلے کی طرح بجاتا پھرے ہے۔"

"چلو چھوڑو، وہ تمھارے یہی نام ٹھیک تھا۔" میں نے کہا۔ "کریم صرف کریم اور یہ تمھاری گھر والی بیگم مسز کریم۔"

"دیکھ.... اصاحب جی اچھے تو سالا ہی رکھو...."

"اچھا.... گویا تمھیں کریم کی شریکِ حیات کہلانا بھی منظور نہیں۔ مسماۃ مشتری۔" میں نے کہا۔ "میں بھی مجبور ہوں، محسن کے لیے تمھارا یہ شکل نہیں۔ چلو ہم فی الحال تمھیں دوست محمد کی زوجیت میں دیتے ہیں، عارضی طور پر۔"

"ہائے، ہوگیا کریم جو دوست محمد کی بیوی؟" محسن نے کہا۔ "اور یہ فیصلہ بدلا نہیں جا سکتا۔ کریم کے علاوہ اس پوسٹ کے لیے کوئی دستیاب ہے؟"

"اچھا جی.... تو پھر کریم ہی ٹھیک ہے۔" مشتری نے مری لہجے میں کہا۔ "لیکن اسے سمجھا دینا۔"

"بھئی یہ تو کاغذی کارروائی ہے۔ اس نے تمھارا شوہر بننے کی کوشش کی، تو ہم پھر بیوہ کر دیں گے تمھیں۔" میں نے کہا۔

"اب ذرا توجہ سے میری بات سنو۔ ہم تینوں کے پاسپورٹ تو گئے۔ چوتھا پاسپورٹ ہم کریم کے لیے بنا دیں گے۔ مشتری کا اور دوست محمد عرف دمڑی لال کا کوئی پاسپورٹ نہیں ہوگا۔ کبھی کسی نے چیک کیا تو چار افراد کی چیکنگ کافی ہوگی۔ سب کے پاسپورٹ نکال کے چیک کیے تو یہ بھی شک پیدا کرنے والی بات ہوگی۔ کریم کہہ سکتا ہے کہ اس نے نئی شادی کی ہے، بیوی کا پاسپورٹ ابھی نہیں بنوایا۔ دمڑی لال کے لیے میں اور محسن کہہ دیں گے کہ اس کو بھولنے کی لت ہے۔ پاسپورٹ تھا مگر نہ جانے کہاں گم ہو گیا ہے.... جن کے پاسپورٹ ہیں وہ انھیں اس وقت تک پیش نہیں کریں گے جب تک میں نہ کہوں لیکن ان کو اپنے پاس رکھیں گے ہر وقت۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ ایک پلاسٹک میں پاسپورٹ کے ساتھ انڈین کرنسی اور پاکستانی کرنسی ہوگی۔ کریم کو دو ہزار پاکستانی روپے اور دو ہزار بھارتی روپے دیے جائیں گے۔ ہم سب کے پاس پانچ پانچ ہزار ہوں گے۔ اس رقم کو استعمال ہنگامی ضرورت کے لیے محفوظ رکھنا ہوگا۔ اگر طوفانی بارش اور حادثے کے باعث لانچ غرق ہو جائے تو ہم سب لائف جیکٹ کی مدد سے ڈوبنے سے بچ جائیں گے۔ یہ ایسا راستہ ہے کہ ادھر سے بحری جہاز اور لانچیں گزرتی رہتی ہیں۔ کوئی نہ کوئی سب کو بچا لے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم بچھڑ جائیں اور الگ الگ لانچوں یا بحری جہازوں پر پہنچ جائیں۔ اس قسم کے حالات میں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مدد کرنے والے کچھ نہیں پوچھتے، ان سے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ہماری لانچ ڈوب گئی ہے۔ وہ بمبئی کی طرف جارہے ہوں گے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ کراچی کی جانب جارہے ہوں گے تو ایسی صورت میں ان سے درخواست کی جا سکتی ہے کہ وہ تمھیں بمبئی جانے والے جہاز پر منتقل کر دیں۔ تھوڑا آگے پیچھے سب بمبئی پہنچ جائیں گے۔"

"اگر اس سے پہلے ہی کسی وہیل کے یا شارک کے ناشتہ بن پہنچے تو؟" محسن بولا۔

مشتری نے ایک چیخ ماری۔ "کیسی باتیں کرو ہو صاحب جی۔"

"تمھیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی قریب آئے تو ایسے ہی ڈانٹ کر بھگا دینا۔ جیسے کریم کو ڈانٹتی ہو۔" محسن بولا۔

"آرڈر.... آرڈر...." میں نے میز پر مکا مار کے کہا۔ "میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ بمبئی پہنچ جانے کے بعد ممکن ہے شناخت کا مسئلہ درپیش ہو۔ اول تو کچھ دے دلا کر نکلنے کی کوشش کرنا۔ بندرگاہ کسی کے لیے نئی جگہ نہیں، کراچی اور بمبئی کی بندرگاہ میں کوئی فرق نہیں ملے گا۔ ویسے ہی لوگ ہوں گے، وہی سب دھندے۔ ہیرا پھیری کرنے والے اور چور دروازے بتانے والے۔ وہ تمھیں باہر نکال دیں گے۔ براہِ راست پولیس یا کسٹم والوں سے واسطہ پڑ جائے تو پھر اپنے پاسپورٹ پیش کر دینا۔"

"میرے پاس تو وہ بھی نہیں ہے۔" مشتری نے کہا۔

"تمھارا پاسپورٹ یہ ہے۔" میں نے کریم کی طرف اشارہ کیا۔ "بتا دینا کہ سمندر میں گر گیا تھا۔ ملنا ہوگا تو مل جائے گا۔ بمبئی میں بھی ہزاروں کشتیاں اور لانچیں ہوں گی اور مچھلی بندر بھی ہوگا۔"

www.paksociety.com

جہاں ہم آئی جی سے ملیں گے۔ اپنے کراچی کی فش ہاربر کی طرح۔ وہ علاقہ زیادہ محفوظ ہوگا۔ اور تم نے اور صبح سے نکلنے کی کوشش کی تو پوچھ گچھ کوئی نہیں کرے گا۔ ہزاروں افراد کے ہجوم میں شامل ہونا اس لیے مشکل نہیں کہ وہ سب ہمارے جیسے ہی ہوں گے۔ رنگ، نسل اور زبان یا لباس کا کوئی فرق نہیں کہ ہم الگ نظر آئیں۔ تھوڑی سی عقل استعمال کرتے ہوئے بندرگاہ سے باہر آجانا کوئی مسئلہ نہیں۔ ضرورت اعتماد کی ہوگی۔ یہ سمجھ لینا کہ ہم بمبئی میں نہیں کراچی میں ہیں۔ باہر نکلنے کے بعد اپنے محفوظ ٹھکانے کو استعمال کرتے ہوئے سب اپنے لیے لباس وغیرہ خرید سکتے ہیں۔ ابھی کسی کو بھی بمبئی کا جغرافیہ نہیں معلوم۔ میں نے بھی ایک ہی جگہ کا نام سنا ہے۔"

محسن نے کہا "میں نے کئی نام سنے ہیں۔ ماہیم، دادر، چوپاٹی۔"

"یہ سب علاقے ہیں۔" میں نے کہا۔ "حاجی علی کی درگاہ ایک جگہ ہے۔ سب وہیں پہنچ جائیں گے تو پھر اکٹھے ہو جائیں گے۔ اس کے لیے میرا مشورہ ہے کہ شام کا ایک وقت مقرر کر لیا جائے۔ مثلاً یہ کہ روز شام کو چھ بجے۔ ابھی تو ہم سب ساتھ ہیں۔ راستے میں جو بھی ہوگا اس سے ہم نمٹ لیں گے۔ رات کو باری باری دوست محمد اور کریم لانچ چلاتے رہیں گے۔ مشتری اور گل کو سونے کی اجازت ہے۔ میں اور محسن باری باری جاگ کر پہرا دیں گے۔"

"میں تو اب جاؤں صاحب جی" مشتری نے اٹھ کے کہا۔ "ابھی سب کھانے کو مانگو گے۔"

میں نے اجازت دی اور وہ اٹھی تو کریم بھی اس کے ساتھ جانے کے لیے اٹھا۔

میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "تم کیا مرغا بننے جا رہے ہو بچے؟"

"وہ... نہیں صاحب... مرغی ذبح کرنے" وہ بولا۔ "عورت ذات کو اللہ نے بولا کہ تیرے کو یہ کام منع ہے۔"

"اچھا ایک منٹ ٹھہرو" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کبھی گولی چلائی ہے کسی بندوق سے یا ریوالور سے؟"

اس نے جھجکتے ہوئے کہا "اپنا پاس ایک ریوالور تھا صاب ولایتی۔ اس کا لائسنس نہیں تھا۔ ہم ایک گورا کو شراب کا بوتل دے کر لیا تھا۔ ایک سال ہمارا پاس رہا۔ ہم بہت فائر مار کیا۔ پھر ہم بیتا ادھر سب کچھ خلاص کیا۔ ایک بکرا ابھی مارا غلطی سے ہم صاب مانتے ہیں ہم کچھ سمجھا اندھیرا بھی تھا ادھر۔ اس کا مالک بہت شور کیا کہ ہم قربانی کا واسطے لایا تھا۔ تم شہید کیا اس کو۔ ہم بولا کہ بابا تیرا قربانی ہو گیا مگر وہ بولا کہ نہیں ابھی ہم کو دوسرا بکرا مانگتا ورنہ ہم تیرے کو حلال کریں گا شہید ہوا۔"

ہم سب کی آنکھوں میں ہنستے ہنستے آنسو آگئے۔ "پھر کیا ہوا؟"

"پھر صاب... ہم بکرا لا کے دیا... اللہ معافی دیوے خریدنے کا واسطے پیسہ نہیں تھا تو گورا ہم کو دیا گیا۔ ہم اس سا بکرا لے آیا اور اس کو دیا۔ وہ بہت خوش ہو گیا۔ اس کا بکرا تو ایک دم پتلا سوکھا تھا۔ ہم دیا موٹا تازہ گھسے کا برابر۔"

"اچھا چھوڑو یہ بات" میں نے ہنسی پر قابو پا کے کہا۔ "تمہارا وہ ریوالور ہے تمہارے پاس؟"

"کدھر صاب۔ ہم بھی ایک بوتل شراب لیا اور دے دیا۔ گورا کو ولایتی شراب تھا۔"

"نشانہ تو ٹھیک ہے نا تمہارا؟" محسن نے ہنستے ہنستے پوچھا۔

"ایک دم ادھر گولی مارتا تھا ہم صاب" اس نے اپنی پیشانی کے وسط پر انگلی رکھ کے کہا۔ "سالا گنتی ایک بار چاول کرنے کو خلاص..."

"ہم تمہیں رات کو ریوالور دے دیں گے" میں نے کہا۔ "اسے سنبھال کے رکھنا اور دیکھ بھال کے استعمال کرنا۔ یہاں کسٹم اور کیرج میں نہیں، ایسا نہ ہو کہ ہم ہی مارے جائیں۔ خدا نخواستہ کسی دشمن سے واسطہ پڑ جائے تو دیکھ لینا اس کی نال کدھر ہے۔"

وہ دانت نکالتا ہوا چلا گیا۔ تو میں بھی محسن اور گل کے ساتھ شامل ہو گیا جو انگلیاں جس کے لیے جانب جا رہے تھے۔

"کیا مسخرہ ہے یہ کریم بھی" گل نے ہنستے ہنستے کہا۔

"بڑی سادگی سے سچی بات کہہ دیتا ہے۔ لوگ ہنستے ہیں۔" میں نے کہا۔

کھانا تیار ہونے تک ہم نے فارغ بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے محسن اور گل بانو کو بریف کیس کے ساتھ پانچ ہزار پاکستانی کرنسی میں اور پانچ ہزار انڈین کرنسی میں دیے باقی میں ڈالر اور پاؤنڈ بھی تھے چنانچہ میں نے اس رقم میں ایک ڈالر بھی ڈال دیے۔ پلاسٹک کے تھیلے کچن سے مشتری نے فراہم کیے۔ ہم نے باری باری... باتھ روم میں جا کے کپڑے کی ایک جیب سی بنائی جیب کے اندر پلاسٹک میں لپٹا ہوا پاسپورٹ اور رقم اس طرح رکھی کہ ہنگامی صورت حال میں سمندر کا پانی بھی اس کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ کپڑے کی بیلٹ ہمارے کپڑوں کے نیچے محسوس بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

میرا اور محسن کا حلیہ ایک سا تھا۔ ہم دونوں کے سر کے بال الجھے ہوئے بالوں کی رنگت تھی اور ہمارے چہروں پر داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ ہم لنڈا بازار کی بہت پرانی اور خستہ حال پتلونوں کے بے ہنگم قمیصیں پہنے ہوئے تھے جو ہمارے سائز سے بڑی تھیں اور ان کا ایک بھی بٹن سلامت نہ تھا۔ مفلس اور مفلسی کی حیثیت سے یہ لباس ہماری ضروریات کے عین مطابق تھا۔

پتہ سمندر والوں میں رہنے والے اور مچھلیاں پکڑنے والے ڈھنگ کے صاف ستھرے کپڑے پہن ہی نہیں سکتے تھے۔

مسئلہ گل نے پیدا کیا۔ ایک تو اس کا رنگ روپ بہت صاف تھا۔ پھر اس کے چہرے کی جلد میں جو ملائمت تھی وہ مچھلی پکڑنے والوں کی سخت زندگی کے حالات سے مطابقت نہیں رکھتی تھی اور مرد تو کیا وہ ماہی گیروں کے خاندان کی عورت بھی نظر نہیں آتی تھی۔

"ابھی یہ نہیں چلے گا" میں نے کہا۔ "مس گل بانو بمبئی پہنچ جانے کے بعد اگر تم گل خان بنو تو بہتر ہے۔"

"کیوں اب کیا ہے؟"

"ابھی اندیشہ ہے کہ تمہاری مردانگی کا راز فاش ہو جائے گا۔ تم نے کبھی دیکھا ہے ماہی گیروں کے خاندان میں ایسا نرم و نازک اور دلکش نقوش والا جوان۔ اور پٹھان تو ماہی گیر ہوتے بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اب تم ہی بتاؤ تمہیں گل خان کیسے بنائیں؟"

"میں کیا بتاؤں؟" گل بانو کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"ابھی تو ہمارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے، میک اپ سے تمہارا چہرہ بدصورت بنانے کے لیے" میں نے کہا۔

"عام طور پر میک اپ سے چہرے زیادہ خوبصورت بنائے جاتے ہیں" محسن بولا۔ "تمہیں تو خیر وہ کیا کہا ہے شاعر نے، نہیں محتاج میک اپ کا جسے خوبی خدا نے دی۔"

"میرا خیال ہے کہ تم فی الحال زنانہ رول ہی قبول کرو۔ کسی مچھیرے کی بیوی کا خوبصورت ہونا باعث رشک و حسد ہو سکتا ہے مگر ناقابل یقین نہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فقیر چند ولد بڑی لال کی بیوی اگر دولت حسن سے مالا مال ہے تو بھگوان کی اچھا۔"

"اور فقیر چند کی خوش قسمتی" محسن بولا۔

"اب تم یہ شعر مارنا چھوڑو" میں نے کہا۔ "مشتری خانم سے بات کرو کہ اپنا سب سے واہیات جوڑا تمہیں بخش دے۔ کپڑے تو اس کے بھی پھٹے ہوئے ہیں مگر ان سے معاملہ زیادہ گمبھیر ہو جائے گا۔"

"کیا اب میں بالکل اچھی نہیں لگتی؟" گل نے مایوسی سے کہا۔

"ارے نہیں بابا! تمہارے حسن میں چار چاند لگ جائیں گے۔ ایک بد صورت چہرہ مل کے پانچ چاند ہو جائیں گے۔" محسن بولا۔ "کیا سمجھتے ہیں ہم کسی کو کہ اچھے چاند کے کر کہاں جا رہے ہیں؟"

گل ہنسی اور خوشی کی جھنکار بکھیرتی باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد دوست محمد اندر آگیا۔

"اماں گل نے مرغی پکایا ہے اور کھیر بہت مزے کا ہے"

دوست محمد بولا۔ "لیکن تم مت کھانا۔"

"تم نے کھا لیا اور ہم نہ کھائیں؟" محسن نے کہا۔

"بابا! ہم تمہارے فائدے کا بات بولتا ہے۔ کھائیں گا تو حالت خراب ہو جائیں گا۔ سب باہر نکال دیں گا۔" دوست محمد نے ہمیں سی سکنیس سے بچنے کے لیے خالی پیٹ رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ "اپن کو عادت ہے" وہ بولا۔

"اب تو بہت مشکل ہے استاد" محسن نے کہا۔ "ایک تو بھوک سے برا حال ہے، پھر ایسا کھانا بہت عرصے بعد نصیب ہوگا۔ نہ کھایا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ تمہاری بہو کا۔"

"اللہ مالک ہے۔ ابھی تو کھا لیتے ہیں۔ نکلنا ہوگا تو نکل جائے گا بعد میں۔" محسن بولا۔

"کھاؤ بابا، اپن کو کیا۔ لاؤ ایک سگریٹ دو ابھی۔"

"دوست محمد! اگر اس وقت میں تم کو سگریٹ نہ دوں تو تم اور کتنی دیر برداشت کرو گے؟" محسن نے کہا۔

"بابا ہم بہت دیر سے برداشت کر رہا ہے۔ ابھی تم بولا تھا کھانے کا بعد دے گا..." وہ بھنکنے لگا۔

"ہاں ہاں! میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ شاید تم نے اسی لیے کھانا پہلے کھا لیا" میں نے کہا۔ "کوشش کر کے دیکھو آج رات۔"

"سکندر صاب! ہم آپ کو بولا ہے کہ یہ عادت ہم ضرور چھوڑ دے گا" دوست محمد نے کہا۔ "کوئی اور بولتا تو ہم اس کو گالی دیتا کہ سالا جاؤ تم کیا ہمارا باپ ہے۔ لیکن تم اچھا لوگ ہے۔ تم نے ہم کو باپ کا مافک بولا۔ ابھی بہت شرم کا بات ہے کہ اگر باپ ایسا خراب عادت والا ہو اور بیٹا لوگ اس کا اتنا خیال کرے۔ لیکن ابھی ہم کو کچھ مت بولو۔ جلد اسٹر شراب ہوئیں گا تو ہم لانچ کا خیال کیسے رکھیں گا۔ ہمارا آنکھ کان ناک سب ٹھیک ہونا چاہیے..."

میں نے اسے پیکٹ میں سے سگریٹ دے دیا۔ جب وہ سگریٹ سلگا رہا تھا تو اس کے ہاتھوں میں مجھے لرزش محسوس ہوئی۔

"اس راستے پر تم نے پہلے بھی سفر کیا ہوگا؟" محسن نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ایک کش لیا اور اس کے سرور میں کھو گیا۔

"رات کو طوفان وغیرہ کا اندیشہ تو نہیں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ طوفان کا موسم نہیں ہے۔"

"اندازاً ہم کتنی دور آ چکے ہیں؟"

"دو سو میل سے اوپر" وہ بولا۔ "شاید ڈھائی سو۔"

"یہاں کوئی پکڑ سکتا ہے ہمیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، پولیس" وہ بولا۔ "انٹرپول والا دیکھتا ہے لیکن جب تک اسے رپورٹ نہ ملے وہ کسی کو روکتا نہیں۔"

www.paksociety.com

"خیر! انھیں کچھ نہیں ملے گا ہماری لاش پر۔" میں نے کہا۔ "اور بھلا کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟"

وہ ہنسا "کیسا بات بول سکتا صاب۔ خطرہ کدھر نہیں ہوتا۔ گھر میں، سڑک پہ، آسمان میں۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔" پھر وہ پلٹا اور گشت لگاتا ہوا غائب ہو گیا۔

جب مشتری نے کھانے کا اعلان کیا تو میں اور محسن عرشے پر کھڑے ہوئے تھے۔

"ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔" میں نے کہا۔

"کیوں صاحب جی، اتنی محنت کی ہے میں نے۔" مشتری نے مایوسی سے کہا۔

"تمہارے کمشنر نے منع کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کھانا کھا کے آیا تھا میرے پاس۔ کہتا تھا کہ ایسے کھانے سے روکنا۔"

"کیوں؟ کیا خرابی نظر آئی اس بڈھے منحوس کو؟ اتنا اچھا تو پکا ہوا ہے۔" مشتری بگڑ گئی۔

"ارے ایسا اقدام خودکشی مت کرنا۔" میں نے کہا۔ "ایک تو وہ شخص ایسے پھرنے میں بھی ہے۔ کہیں جو بھی قتل نہ کر دے۔"

"آپ مذاق کرتے ہو مجھ سے صاحب جی۔" مشتری نے کھانا پیچھے رکھ دیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے... میں قتل۔"

"یار مجھے بھوک لگی ہے۔" محسن نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تجھے سوجھ رہی ہے کیا آ گیا ہے۔"

"دیکھو میری بات سن۔ واقعی دوست محمد نے منع کیا تھا۔ حالت خراب ہو جائے گی اگر پیٹ بھرا ہوا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "رات بھر پہرے داری کریں گے یا تمہاری داری؟"

"فاقہ زدہ ہو لگے تو کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔" محسن نے کہا۔ "اور سمندری سفر سے تو کچھ ہوتا ہے نا اس کا علاج ہے میرے پاس۔ میں نے کریم سے کہہ دیا تھا کہ دوا علاج کا بندوبست بھی رکھے ورنہ سب ایسے تڑپتے رہیں گے۔ پہلے کھانا کھائیں گے پھر دوا کھائیں گے۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر بسم اللہ۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ گل کہاں ہے؟"

"اس کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ میں نے دوا دے دی ہے۔ اس کا آرام کرنا ہی بہتر ہے۔" محسن بولا۔ "طبیعت سنبھلے گی تو کچھ کھا لے گی۔ [illegible]"

"ہم پہ کیوں اثر نہیں ہوا اب تک؟" میں نے کہا۔

"یہ سب ماشاء اللہ ہے۔" محسن اوپر انگلی اٹھا کے بولا۔

"وہ جانتا تھا کہ ہم کیکڑے روسٹ کھائیں گے خوب ڈٹ کے۔ سبحان اللہ، یہ مشتری کی بنانا چاہتی ہے کہ تھیں... میرا مطلب ہے تمہارے ہاتھ

ابھی تو ہم بول ابھی تو... کچھ بھی کیا پتا [illegible]"

"کدو کی کھیر ہے صاحب جی۔" مشتری نے خوش ہو کے کہا۔

"مگر کریم کے تو مزے ہو گئے۔ کبھی کدو کی کھیر، کبھی گوبھی کا حلوا تو کبھی بینگن کا۔" محسن نے کھاتے کھاتے کہا۔ "لگتا ہے یہ سب پکا لیتی ہو تم؟"

"آپ بہت مذاق کیے ہو صاحب جی۔" مشتری نے کہا۔

"مذاق کیسے؟ یہ اصلی سچ ہے۔" محسن نے مرغی کی ٹانگ [illegible]

"آپ نے سنا شیروانی صاحب؟ آپ کو جوکر [illegible] آپ کے خاندان کی نامور ماں پر حملہ ہو [illegible] پیٹ کا دوزخ بھر رہے ہیں۔ کیا ہوا آپ کی غیرت کو؟"

"مقتل میں ایک بے غیرت کے ساتھ۔" محسن نے مسکرا کے کہا۔ "ویسے ابھی روسٹ کھاتے ہوئے [illegible] چڑھ جاتا ہے اور سفید ہی ہو جاتا ہے۔"

"صاحب جی، ایک بات پوچھوں؟ کریم تو کہتا ہے کہ [illegible] باپ نہیں ہے۔" مشتری نے کہا۔

"باپ نہیں تو پھر کیا ہے... ہاں ہے۔" میں نے کہا۔

مشتری ہنسی۔ "آپ نے [illegible] قتل کیے کیسے؟ مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

"جب وہ تمہیں قتل کرے گا تو تمہیں بھی یقین آ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "جیسا کہ میں نے بتایا تھا، سب سے پہلا مقتول تو بدنصیب سسر، اس کا جرم تو خیر چھا ہے۔ آخر اس نے پیدا کیا تھا دوست محمد کی بیوی جیسی افسوسناک چیز کو۔ اس کو سزا ملی اسے۔ پھر وہ داماد... جو گھر داماد تھا۔ اچھا آدمی تھا۔ غلام ابن غلام بس فرماں برداری پروگرام میں مارا گیا۔"

"فرماں برداری پروگرام؟" مشتری نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں بیٹی کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا دوست محمد۔ ایک دن فرمائش کی۔ ابا آپ شکاری تھے، کیا مارا؟ بیٹا کی خیر، چیتے، ہاتھی۔ اب تو [illegible] ماں کے دکھاؤ۔ وہ بولا ہے اور باپ نے بندوق تانی، داغ دی۔ سامنے بیٹا تھا داماد۔ بے شک بیٹی نے اشارہ دوسری طرف کیا تھا مگر اس نے دیکھا نہیں۔ جو آنکھ کو نظر آیا مار دیا۔"

"اور بیوی؟" مشتری اب خوب [illegible]

"یہ سب مذاق کے سوا کچھ نہیں۔ [illegible] محسوس کیا تھا کہ چڑچڑا پن ایک غلط ماحول کی گھٹن اور فرسٹریشن کا نتیجہ ہے۔ ایسی زندگی کا [illegible] بچپن سے جوانی تک [illegible] سوا کچھ نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ [illegible] سانس لینے کی عادی ہو گی اور اپنی زندگی گزار کے اپنے انداز کا اختیار

گی تو اس کے مزاج کی تندی اور اس کا چڑچڑا پن سب ختم ہو جائے گا۔

"اب یہ بھی بتا دو صاحب جی کہ بیوی کا کیا قصور تھا؟" وہ مجھے ناراضی سے دیکھ کے بولی۔

"وہ... اس بیچاری کا قصور کوئی نہیں تھا۔" میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "دیا لعنت، وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ بیوی نے کہا کہ میری زندگی میں تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ باپ نے کہا پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ٹھکانے لگو، مار دی اسے۔ لیکن تم فکر مت کرو، اگر ایسے ہی مزے مزے کے کھانے پکاتی رہو گی تو تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ کوئی انگلی نہیں اٹھا سکے گا تم پہ۔"

"کسی جھگڑے نے بھی [illegible] نفرت سے دیکھا تو ہم اس کو کا تو ضرور کرا لیں گے۔" محسن بولا۔

جب وہ برتن سمیٹ کر منتی ہوئی چلی گئی تو میں نے سگریٹ پیتے ہوئے تسلی سی محسوس کی۔ محسن فوراً [illegible] آنے اور دوا کے اندر جانے سے پہلے ہی کیبن کے دروازے تک آ گئی۔ جتنا کیا جا سکتا تھا سب لگ گیا اور تین دو گھنٹے کے عرشے پر سو ہوا۔ ایک بار محسن نے اس طرح سے ہی [illegible] کے اندر تمام شک پیدا کرنے والی چیزوں کو چھپا دیا تھا اس طرح کہ کوئی اچانک تلاشی لینے آ جائے تو اسے کچھ نہ ملے۔ گل نے بھی اپنا لباس بدل لیا تھا اور اگرچہ اس نے پٹھانی ہی کپڑے پہنے تھے مگر اس کے باوجود وہ چھپی نہیں گئی تھی۔ اگر ایسا نازک بدن ساتھ ہو تو کیا ان کا مسئلہ بھی ہوتا۔ [illegible] گھروں میں حسن کی کمی نہیں لیکن ان کے رنگ [illegible] نرم و نازک نہیں رہتے۔ گل نے بھی سخت زندگی ضرور گزاری تھی مگر دبانے کیا بات تھی کہ اس کی نازکی میں فرق نہیں پڑا تھا۔

محسن نے سب کو ضرورت کے مطابق اسلحہ دیا لیکن سختی سے تاکید کی کہ اپنے پاس کچھ نہیں رکھنا ہے جو تلاشی میں برآمد ہو جائے۔ اسلحہ قریب رہنا چاہیے جہاں سے ایک دم نکالا جا سکے۔

گل نے اور محسن نے [illegible] اسباب کے درمیان چھپائے۔ وہ ایسی جگہ تھی کہ [illegible] ناممکن [illegible] اور محسن نے ایک [illegible]

"اگر ہم کسی دشمن کی [illegible] تو اپنی طرف آ مائل کریں گے۔" میں نے کہا۔ "تو ہم پہلے سے

یہاں بیٹھ جائیں گے۔ تم گل تک [illegible] محسن کو ذہن میں رکھو۔"

"مجھے یاد ہے۔ ہم ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر آمنے سامنے بیٹھ کے جال کو گھٹنوں پر پھیلا لیں گے اور اس کی مرمت میں مصروف ہو جائیں گے۔ مزاحمت بالکل نہیں کریں گے اور اپنے رویے سے خود کو غریب اور بے سہارا ماہی گیر ثابت کریں گے۔ گالی گلوچ یا ایک آدھ تھپڑ کھا لینے کی حد تک برداشت کا مظاہرہ کرنے سے کوئی ٹل جائے تو اچھا ہے۔"

"ورنہ تکلف برطرف۔" میں نے کہا۔

"ہم بہت کم ایک کے [illegible] کے پاس دستی بم بھی ہونا چاہیے۔" محسن نے کہا۔ کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے میں نے اس سے اتفاق کیا اور یہ دونوں چیزیں بھی قریب رکھ لیں۔ جس کے بروقت استعمال تک پہنچنے کا امکان کم تھا۔ خواتین کی نصف آبادی صرف زبان چلا سکتی تھی۔ ریوالور یا اسٹین گن چلانے والی گل تھی اور محسن یا مکمل شکست سے دوچار ہونے کی صورت میں وہ ہماری فتح کے لیے ایسا ہی خفیہ ہتھیار ثابت ہو سکتی تھی جیسا کہ دوسری جنگ عظیم میں ایٹم بم ثابت ہوا تھا۔ خدانخواستہ کوئی بم پھٹتا ہوا پایا تو عورتوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکانے کی کوشش کرتا اور ایسے میں گل ان کو حیران ہونے کا موقع دیے بغیر خلاص کر سکتی تھی۔

گل کی طبیعت سنبھل چکی تھی۔ اس نے کہا کہ زنان خانے تک کوئی پہنچ کے تو دیکھے۔ گل خان نے چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔

"صاحب، مشتری، فرض کرو دشمن نے حملہ کر دیا تو تم کیا کرو گی؟" محسن نے مشتری سے پوچھا۔

"کون دشمن صاحب جی؟" وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"دشمن بہت ہیں ہمارے۔" محسن نے ڈانٹ کے کہا۔ "دشمن پالنے کے سوا آج تک ہم نے کیا کیا ہے؟"

"مشتری درد دے سکتی ہے، کوسنے دے سکتی ہے اور اگر ضرورت پڑے تو بے ہوش بھی ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ نفسیاتی جنگ کی حکمت عملی بھی جا سکتی ہے جو بعض اوقات کامیاب بھی ہوتی ہے لیکن یہ سب اس صورت میں ہوگا جب ہم پر براہ راست حملہ ہو۔" میں نے کہا۔ "چیکنگ کرنے والوں سے تو درگزر کرنا ہوگا۔ وہ جیسے چاہیں تلاشی لیں۔ یہ سب کچھ میں کریم اور دوست محمد کو بھی سمجھا دیتا ہوں۔ آپ لوگ اب سو جائیں۔"

"میرا خیال ہے کہ تو بھی سو جا۔" محسن نے کہا۔

"اس وقت [illegible] ہیں۔" میں نے کہا۔ "تین گھنٹے بعد میری ڈیوٹی ہوگی، مجھے جگا دینا۔"

مشتری اور گل اب اپنی کیبن میں تھیں جس میں پہلے والہ

www.paksociety.com

کے ساتھ ہو چکی تھی۔ دوسرے کیبن کے ایک تختے پر میں بہت دیر تک سونے کی کوشش میں آنکھیں بند کیے لیٹا رہا لیکن ذہن اور اعصاب پر اندیشے سوار تھے۔ ماحول اجنبی تھا اور رات کے سناٹے میں بے رحمت سمندر کی پرہیبت گونج تھی۔ میں اس لیے تنہائی سے بھاگتا تھا کہ اکیلا ہوتے ہی وہ سب خیال جو مصروفیت کے ہجوم میں پیچھے ہٹ جاتے تھے مجھے گھیر لیتے تھے۔ رابعہ کا تصور ایک زندہ حقیقت کی طرح سامنے آجاتا تھا۔ پھر نازو اور غالب کے مایوس اور افسردہ چہرے تھے جو شکوہ کرتے تھے کہ ہم کس سے شکایت کریں۔ آنے والے وقت کے خدشات تھے جو الگ عذاب رکھتے تھے۔

ابھی میں سویا بھی نہ تھا کہ محسن نے مجھے اٹھا دیا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے ساڑھے چار بجے تھے۔ میں نے ایک چکر لانچ کے اس حصے کا لگایا جہاں اب کریم ڈیوٹی پر تھا۔ اور اس کا استاد قریب ہی بہت کم جگہ پر سمٹا ہوا سو رہا تھا۔ پھر میں عرشے پر آگیا اور سمندر کی وسعت کو تصور میں سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ اتنا ہی ناممکن تھا جتنا خلا کی گہرائی کا تصور کرنا۔ آخری رات کا دھندلا سا چاند سمندر پر غبار سا پھیلا رہا تھا کراچی بہت پیچھے رہ گیا تھا ابھی بہت آگے تھا۔ یہ لانچ ایک چھوٹا سا عافیت کا جزیرہ تھی ورنہ ہر طرف لامحدود گہرائی میں کھینچ لینے والا گونجتا گرجتا، بپھرتا اور بل کھاتا سمندر تھا۔ ایک مکعب فٹ پانی کا وزن باسٹھ پونڈ ہوتا ہے۔ لاکھوں مکعب میل سمندر کے پانی کا وزن کیا ہوگا؟ میں نے سوچا۔ ایسے ان گنت سوال ہیں جو اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مثلاً اس وقت میں کیسے جان سکتا ہوں کہ رابعہ کہاں ہے۔ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے اور سو رہی ہے تو کیا خواب دیکھ رہی ہے؟

وہ ایک تجارتی جہاز تھا جو کسی متحرک روشن قلعے کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے پیچھے بھی ایسے ہی روشن دھبے سے تھے جن کی حرکت کو محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لانچ کے انجن کی آواز یکلخت بند ہوگئی۔ اس کی رفتار میں نمایاں کمی واقع ہوئی لیکن سطح آب پر اس کا توازن برقرار رہا۔ انجن کیوں بند ہوگیا؟ دوست محمد نے کہا تو تھا کہ چند گھنٹے بعد انجن کو بند کرنا پڑے گا۔ اس وقت مجھے یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ بیچ سمندر میں ہم لانچ کو روک کے کیسے کھڑے رہیں گے۔ کیا اس طرح توازن کو برقرار رکھا جاسکے گا؟

میں نے لانچ کے اس حصے کا رخ کیا جہاں اب دوست محمد کی ناخدائی تھی۔

"یہ کیا ہوا دوست محمد! انجن کیوں بند ہوگیا؟"

"گرم ہوگیا تھا بابا، بند تو ہوئیں گا۔ ہم خود روکا ہے۔" اس نے بے پروا لہجے میں کہا۔ "تم کاہے کو پریشان ہوتا؟"

"لانچ کیا... ایسے ہی ڈولتی رہے گی؟"

اس نے ایک ہاتھ پیچھے کیا اور جھٹکے سے اوپر کھینچا۔ انجن اسٹارٹ ہوگیا لیکن اب اس کی آواز بدل چکی تھی۔ لانچ نے ایک جھٹکا لیا اور پھر آگے بڑھنے لگی۔

"یہ دوسرا انجن ہے۔" دوست محمد نے کہا۔

"یہ دوسرا انجن کہاں سے آگیا بابا؟" میں نے حیران ہوکے کہا۔

"ادھر لانچ میں ہی تھا سکندر صاحب۔ آپ تو نہیں مگر ہم دیکھا تھا۔" وہ بولا۔ "پتا نہیں کون کام کرکے ڈالا تھا۔ ہم بنا کے چالو کیا۔"

میں بے وقوفوں کی طرح کھڑا رہا۔ "اگر یہ دوسرا انجن نہ ہوتا۔"

"کیسے نہ ہوتا۔ پھر ہم بوٹ کر لاؤ۔" دوست محمد مسکرایا تو "بوہت خرچا مرچا ہوتا۔ ابھی دیکھو کیسا ٹھاٹ سے چلتا ہے۔"

"یہ تو تم نے کمال کردیا۔ ہمیں واقعی خیال نہیں تھا۔ کیوں؟ کریم کو معلوم نہیں تھی؟" میں نے کہا۔

"وہ ابھی بچہ ہے بابا۔" دوست محمد بولا۔ "لمبا سفر کبھی کیا، اس کا واسطے تجربہ نہیں تھا۔ ہم چار گھنٹا میں انجن فٹ کیا وہ کیا کرتا۔"

"شاید ہمیں یہیں غرق کردیتا۔" میں نے کہا۔

دوست محمد ہنسا۔ "نہیں نہیں۔ وہ بولتا کہ دوسرا انجن لوڈ والا لیکن ابھی وہ انجن بنا نہیں سکتا۔ خراب ہوجاتا تو اس کا باپ بھی اس کو چالو نہیں کرسکتا۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم دوست محمد کو ساتھ لے آئے۔ سوچا تو یہ تھا اس کی زندگی کو بچانے کا تھا مگر یہاں اس نے ہم سب کی زندگی۔ خدا جسے چاہے وسیلہ بنادے اور جسے چاہے سبب بنادے۔ افق پر ستارۂ صبح روشن ہوچکا تھا لیکن سمندر پر ہنوز رات کی حکمرانی تھی۔ یہ اندھیرا چاند کی بجائے نام روشنی سے گہرا ہوتے سمندر کا منظر آتا تھا۔

اچانک میں نے ایک تیز روشنی دیکھی۔ ایک جھلک دکھا کے روشنی غائب ہوگئی پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد وہ جھلملائی۔ یہ گھومتی ہوئی سرچ لائٹ تھی۔

"ابھی آپ تھوڑا ہوشیار ہوجاؤ۔" دوست محمد نے کہا۔

"کیا ہے یہ؟" میں نے کہا۔

"پولیس کا لانچ بھی ہوسکتا ہے۔" دوست محمد نے کہا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ سوا پانچ بجے تھے۔ ابھی محسن سو رہا تھا نہیں تھا کہ میں نے اسے جھنجھوڑ کے اٹھا دیا۔ "محسن...!"

"کیا بات ہے؟" وہ پریشان ہوکے بولا۔

"کوئی لانچ آرہی ہے ہماری طرف۔" میں نے کہا۔ "دوست محمد کا خیال ہے کہ انٹرپول والے نہ ہوں۔"

محسن اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیا انھیں بھی چکمہ دیں گے؟"

محسن کی بردلی اور سستی سے تھی۔ کیا نام وہ ہم بحث لیتے ہیں ان سے۔ وہ کیا کریں گے سوال جواب۔ اچھا پیسہ دے کر دکھا دیں گے ان کو اگر انھوں نے مانگے۔ چلو اوپر چلتے ہیں۔"

محسن نے سر ہلایا اور میرے ساتھ عرشے پر آگیا۔ اب گھوم نہیں رہی تھی۔ اس کا رخ ہماری جانب تھا اور رفتار میں تیز تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی رفتار کم نہیں ہوگی۔ بین الاقوامی سمندروں میں ہر قسم کے مجرموں سے نمٹنے والی پولیس ہمارے ملک کی پولیس نہیں ہوتی ان کا تجربہ، مستعدی اور برق رفتاری ہی انھیں اس قابل بناتی ہے کہ وہ مجرموں کو فرار نہ ہونے دیں۔

"دوست محمد نے کہا تھا کہ یہ لوگ بلاوجہ پریشان نہیں کرتے۔"

محسن نے کہا۔ "اگر کوئی مخبری کردے تو اور بات ہے لیکن مخبری انھی کی ہوتی ہے جو اسمگلنگ میں مصروف ہوں۔"

"ان ماہی گیروں سے انھیں کیا؟" میں نے قریب آتی ہوئی لانچ پر نگاہ جما کے کہا۔ "وہ تو دنیا بھر کے سمندروں میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔"

"اگر یہ پولیس نہ ہوئی؟" محسن نے کہا۔

"پولیس ہوگی تو وردی میں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "شناختی کارڈ وغیرہ ہوں گے ان کے پاس۔ سمندری قزاق تو ہونے سے رہے۔"

"میں نے سنا تو نہیں کہ سمندر میں ڈاکا پڑا ہو یا کسی نے بحری جہاز ہائی جیک کرلیا ہو۔" محسن بولا۔ "پھر ماہی گیری کی چھوٹی سی لانچ پر کسی کو کیا ملے گا؟"

"ملنے کو تو بہت کچھ مل سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "انھی لانچوں کے ذریعے ہیرے جواہرات، سونا، منشیات اور نوادرات یہاں اسمگل ہوتے اور عورتوں اور بچوں کو اسمگل کیا جاتا ہے۔ دنیا کی منڈی میں سب بکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"فرض کرو انھوں نے سرسری تلاشی لی یا سرسری وضاحت سے مطمئن نہ ہوئے یا جان گئے کہ ہم ماہی گیر نہیں ہیں۔" محسن نے کہا۔ "آخر پہلے اور پچھلے کیا لوگ بولنے لگے ہیں۔"

لانچ اب اتنی قریب آچکی تھی کہ اس کے طاقتور انجن کی گونج سمندر کے شور پر غالب آگئی تھی۔

"کیا ہم خود کو بالکل جاہل ظاہر کرلیں گے؟" محسن بولا۔

"یہ لوگ بات تو انگریزی میں ہی کریں گے۔" میں نے کہا۔ "دوست محمد بولنا۔ میں ٹوٹی پھوٹی انگلش سے کام چلانے کی کوشش کروں گا۔"

لانچ ہمارے بالکل قریب آکے متوازی ہوگئی۔ ابھی تک سرچ لائٹ نے ہمیں اندھا کر رکھا تھا۔ اب بیک وقت دو تین لائٹس ہم پر پڑیں۔ دوست محمد نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے لانچ کی رفتار بہت کم کردی تھی تاکہ انھیں شک بھی نہ ہو کہ ہم فرار کا ارادہ رکھتے ہیں۔

"کون ہو تم لوگ؟" کسی نے بہت صاف آواز میں چلا کے انگریزی میں کہا۔ لانچ کا درمیانی فاصلہ اب چند گز سے بھی کم ہوگیا تھا۔ بات کرنے والا میگا فون استعمال کررہا تھا۔

"فشرمین۔" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے جواب دیا۔

"ہم لانچ پر آکے دیکھیں گے۔" اسی شخص نے میگا فون پہ کہا۔ اب میں نے لانچ پر کھڑے ہوئے تین افراد کو دیکھا۔ وہ سب وردی میں تھے۔ ان میں سے ایک نے میگا فون اٹھا رکھا تھا۔ باقی دو اس کے پیچھے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے میں ریوالور۔ بات کرنے والا افسر معلوم ہوتا تھا۔ اس کا انگریزی بولنے کا لہجہ مجھے غیر مانوس نہیں لگا۔ وہ پاکستان، بھارت یا اسی علاقے کے کسی ملک کا باشندہ ہوسکتا تھا۔

لانچ بالآخر اتنے قریب آگئی کہ درمیانی فاصلہ ختم ہوگیا۔ یہ دونوں لانچوں کو چلانے والوں کی مہارت تھی کہ اتنے کم فاصلے کے باوجود لانچیں ٹکرائی نہیں۔ تینوں پولیس مین جست لگا کے ہماری لانچ پر آگئے۔ اس سے پہلے میں نے انٹرپول کا صرف نام ہی سنا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے دائرہ اختیار میں کیا ہے۔ وہ کیا کرسکتے ہیں اور کیا نہیں کرسکتے۔ شک کرتے ہیں، ان کی وردی کیسی ہوتی ہے اور ان سے شناختی ثبوت مانگنا کتنی بڑا جرم تو شمار نہیں ہوتا۔

"تم فشرمین ہو، دونوں بھائی ہو؟"

"یس سر۔" میں نے کہا۔ "امیر چند، فقیر چند۔" میں نے اپنے سینے پر اور محسن پر انگلی رکھ کے کہا۔ "فادر دھرمی لال۔"

"تم ہندو ہو، کس ملک کے شہری ہو؟"

"بھارت سر۔" میں نے کہا۔

"تمھارے ساتھ اور کون ہے؟"

"دوسی فقیر چند۔ یو وانٹ؟" میں نے کہا۔ "سلیپنگ، وان فرینڈ کریم اینڈ وائف۔"

اپنی خبر گیری کی تفتیش سے میں نے لانچ پر موجود سارے ارکان کے بارے میں بتادیا مگر اس کی تشفی نہیں ہوئی۔ وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے گھورتا رہا۔

"ان کو لاؤ میرے سامنے پیش کرو۔" وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا "سلیپنگ، نو..." یعنی وہ بیمار ہے اور سو رہی ہے۔ پھر میں نے ہمت کرکے کہا۔

"یوسف نعیم ؟"

"کیا نام پوچھتے ہے میرا ؟" وہ تیز لہجے میں بولا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اینڈ کارڈ ؟"

اس کا چہرہ ویسے ہی بگڑ گیا جیسے میرا شناختی کارڈ دیکھنا چاہتے ہوں۔ "ابھی بتاتا ہوں میں تجھے۔" اس نے دونوں ماتحتوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اندر لے جاؤ اسے گھسیٹ کر لاؤ۔"

"ہوش تو ہے؟" میں نے احتجاج کیا۔ "واقعی؟"

"ابھی معلوم ہو جائے گا کہ تم بردہ فروش ہو یا بالکل بے گناہ لڑکیاں اغوا کر کے لے جاتے ہو اور پہنچ جاتے ہو۔" اس نے کہا اور یہ وہاں نیا ... پر جگہ پر بیٹھے ... اختیار سے کر گئیں گولی مار دو۔ وہ شک تو بیچارے اس کے لہجے سے ... ہے یقین کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس خطے کا رہنے والا ہے پھر وہ اس خطے کے ایک باہر ملک کے ساتھ انگریزی کیوں بول رہا تھا وہ مجھ سے اردو میں بات کر سکتا تھا۔ عام حالات میں دو افراد کسی اجنبی زبان کا سہارا کیوں لیں گے جب کہ ان کے بچے وہ ایک مشترک زبان پر قادر ہوں اور خصوصاً اس وقت جب ایک فریق اجنبی زبان سے ناواقف ہو۔ مگر یہ شخص ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اردو سمجھتا ہے اور بول سکتا ہے۔ اس کے دو مقاصد ہو سکتے تھے کہ وہ اپنی افسری کی شان بگھارنے کے لیے یا مجھے مرعوب کرنے کے لیے انگریزی کی سطح سے نیچے آنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر میرے ذہن میں ایک تیسرا مقصد واضح ہونے لگا تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کے گھر میں کیا مال ہے؟ میں نہیں ہوں کہ آپ کو سب بردہ فروش نظر آتے ہیں؟ آپ خود کرتے ہو یہ کام ؟"

یہ بات میں نے خوش مزاجی سے کی تھی اور اپنے چہرے کے تاثرات کو یکسر مختلف رکھا تھا۔ میں نے اسے گالی دی تھی مگر میرے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اگر وہ میری بات نہ سمجھتا تو زخم خوردہ ناگ کی طرح کیوں پھنکارتا۔

"باسٹرڈ" میری ... "تمہاری یہ مجال!" اس نے دہاڑ کر کہا اور ہاتھ گھما کے میرے سر پر تھپڑ مارا۔

محسن نے مجھے روک لیا۔ "جانے دو بھائی۔ افسر لوگ ہیں! جب کوئی ایسی بات ہی نہیں تو پھر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

حجم کمانے میں نے خوف کے سوا کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے جی۔ لیکن پہلے بتلایا تو نگا دیں ہم بغیر ہتک کے تلاشی لیں۔ عورتوں کے کمرے میں ایسے جانا ... "

"ارے تو جانی ان کو بولو نا۔ تم ہی بتلنے ہو انگریزی۔"

محسن نے کہا۔

"... آئی گو ... فرسٹ۔" میں نے کہا۔ "وہ ٹن ہوگا پھر ... آئی اوکے ... "

مطلب یہ تھا کہ میں پہلے خواتین کو جگا دوں۔

افسر نے غصے کے باوجود اجازت دینے کے انداز میں ہلایا۔ اس کی پتلون کی بیلٹ سے ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی لٹکا ہوا تھا جس کا انٹینا ایک مختصر سا تار تھا۔ یہ وہ یا تو کسی سیل سے چلنے والا ... ٹرانسمیٹر ... سیٹ تھا جس کے اس سے ہیڈ فون یا ... جا سکتا تھا ... جا سکتی تھی مگر اس کے سائز سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ طویل فاصلے کے مواصلاتی رابطے میں کام نہیں آ سکتا۔ اس کی رینج ... کلومیٹر کے اندر ہو سکتی تھی یا اس سے بھی کم۔ دستی بوائز تھا۔ اپنی لانچ پر موجود کسی فرد سے بات کرنے کے لیے وہ اس کو ... دیکھے آن کرتا۔ شاید وہ ٹین سامنے ہی تھا۔

اس نے ریما ئب مجھے ایک ہاتھ سے آگے دھکیلا۔ "چلو" اور ہاتھ کی اس حرکت کے نتیجے میں واکی ٹاکی آن ہو گیا۔ یہ ایک غیر ارادی عمل تھا۔ اس کا ہاتھ ... اور ... کے ... نے کام شروع کر دیا۔

چند سیکنڈ کے لیے اسپیکر نے دوسری لانچ میں ہونے والی گفتگو نشر کی۔ لانچ میں شور تھا۔ کچھ انجن کا کچھ سمندر کا مگر اس کے باوجود میں نے ایک قہقہہ صاف سنا پھر کسی نے کہا۔

"دونوں کی ... " لیکن اس سے زیادہ میں کچھ نہ سن سکا۔ اس شخص نے فوراً واکی ٹاکی بند کر دیا۔ میں نے سخت کوشش کی اور اپنے رد عمل کو ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن اب مجھے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اس ہنسی کے انداز سے بخوبی واقف تھا اور وہ آواز بھی میرے لیے اجنبی نہیں تھی جس نے صرف دو لفظ ادا کیے تھے۔ ذکر ہم دونوں کا تھا یا دونوں عورتوں کا اور دوسرے لفظوں نے کوئی غلیظ گالی دی تھی یا یہ کہا تھا کہ دونوں کو لے جانا ... کے لیے ... سمندر کو بدن بنا دیں گے۔ یا کوئی ملتی جلتی بات ... سے ان کے عزائم کا اظہار ہوتا تھا پوری بات سننے کے باوجود میں نے سمجھ لیا۔

مجھے یقین تھا کہ میری طرح محسن کے حواس بھی مستعد ہوں گے اور اس نے بھی آوازوں کو اور ارادوں کو پہچاننے کے بعد کچھ لیا ہوگا کہ ان حالات میں وہ سب نہیں ہو سکتا جو ہم نے سوچا تھا۔ یہ غیر متوقع صورت حال تھی اور باہمی مشورہ کے بغیر صرف اس یقین پر کہ ہماری سوچ اور ہمارے خیالات ... ایک ساتھ چلتے ہیں ہم ایک متفقہ فیصلے پر عمل کر سکتے تھے۔

ہمارے ذہن ایک سے منطقی نتائج اخذ کریں گے تو ہم دونوں کی حکمت عملی میں بھی فرق نہیں ہوگا۔ یہی سوچنے کے بعد میں نے قدم آگے بڑھایا۔ وہ شخص مجھ سے ایک قدم پیچھے ہوا اور میری گردن پر رکھ کے چلنے لگا۔ دوسرے شخص نے محسن کو بالکل اسی طرح دھکیلا۔ "بھیا۔ عورتوں کی تو کوئی بات نہیں یہ تو ایسے ہی چلتے چلتے اپنے پیچھے آنے والے محسن کو مخاطب کیا۔ "لیکن یہ پیسنجر کے کیبن سے باہر کرتے ہیں نہ چلے جائیں جہاں ہم سوتے ہیں۔"

"وہاں تو یہ ضرور جائیں گے بھائی!" محسن نے سخت تشویش لہجے میں کہا۔

اس کا نتیجہ ہماری خواہش کے عین مطابق رہا۔ مجھے آگے لے جانے والے افسر نے اپنے ماتحت سے کہا۔ "تم جا کے عورتوں کے کمرے کی تلاشی لو اور انہیں باہر لے آؤ۔ میں اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں۔"

"وہی ہیں سر ... " میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ افسر لنگڑے والے نے تیار کیا سے زیر لب مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ "تم دونوں کہاں سوتے ہو الگ کیبن ہے کوئی تمہارا ؟"

میں نے خوف زدہ نظر آتے ہوئے زبان ہونٹوں پر پھیر کے کہا۔ "نو۔"

اس نے سیدھے ہاتھ والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس دروازے کو کھولو ... "

"سر، اسٹوریج ... تو تنگ ہے سر ... " میں نے کہا۔

اس نے میری کمر پر ہاتھ مارا۔ یہ جیسے مجھے دھکا دیا گیا۔ میں دروازے سے ٹکرایا اور اندر جا گرا۔ دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے تھے۔ میں یہی چاہتا تھا۔ وہ میرے پیچھے اندر آیا اور ریوالور کا رخ میری جانب کرتے ہوئے اس نے اپنی ایک ٹانگ پیچھے گھما کے دونوں پٹ ملا دیے۔ کم رفتار سے چلنے والی لانچ زیادہ ہچکولے لے رہی تھی اور مجھے ہر لحظہ اندیشہ تھا کہ میری کنپٹی کے پیچھے ریوالور سے گولی نہ چل جائے۔ وہ یہاں تحقیق کرنے ہی آئے تھے لیکن وہ پہلے دیکھنا چاہتے تھے کہ لانچ پر اور کون ہے۔ اب انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ہمارے علاوہ لانچ پر دو عورتیں بھی تھیں۔ ان کو اصل خطرہ مجھ سے تھا چنانچہ وہ ان میں سب سے ہوشیار شکاری تھا۔ وہ مجھے گھیر کے سب سے الگ کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

اب فرش پر گرتے ہی میں نے پلٹ کے دیکھا تو مجھے اس کے ہاتھ میں دوسرا ریوالور دکھائی دیا۔ اس کی نالی کے آگے سائلنسر لگا ہوا تھا۔ اور جب اس نے فائر کیا تو اس کی آواز آتی ہی ہوتی جتنی میرا سر لکڑی کے فرش پر ٹکرانے سے ہوئی تھی۔

انداز ہ کے فرق نے اس وقت میری جان بچالی یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میرے لیے قدرت کی عطا کردہ مہلت ابھی تمام نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ ابھی تک میری جان کو گزند پہنچانے والے ناکامی سے دو چار ہوتے آئے تھے۔

لیکن یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس پر تکیہ کر کے میں جدوجہد ترک نہیں کر سکتا تھا اور جسے تسلیم کر لینے کے بعد دشمن بھی اپنے قاتلانہ عزائم سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ فوری طور پر ہم پر تھا کی جنگ اپنی حیوانی جبلت کے تقاضوں کے مطابق لڑ رہے تھے۔ میں نے گرتے ہی کروٹ لے کر چیتا اور اچھلنے میں اتنی دیر بھی نہیں لگائی جتنی دیر میں ریوالور سے نکلنے والی گولی نے درمیانی فاصلہ طے کیا۔ میری جان لینے کی کوشش کرنے والے نے بھی کچھ دیر کی۔ تاخیر کا یہ وقفہ سیکنڈ کے دسویں یا سوویں حصے کے برابر تھا یا اس سے بھی کم، لیکن یہی زندگی اور موت کے درمیان احساس کا وہ فاصلہ تھا جو ابد تک پھیلا ہوا تھا۔ احساس کے فنا ہو جانے کی صورت میں یہ فرق بے کراں تنہائی بنتے صور اسرافیل کا لامحدود نے وجود اور ناقابل فہم انتظار بن سکتا تھا۔

گولی میری جگہ پہنچی تو میں وہاں نہ تھا مگر نشانے سے چند انچ دور کچھ اوپر اٹھ چکا تھا۔ میرے حریف کو نہ مجھ سے ایسی پھرتی کی توقع تھی اور نہ اتنے کم فاصلے سے اپنا نشانہ خطا جانے کی غلطی کوئی امید۔ وہ حیرانی اور بے یقینی کی کیفیت سے گزر کے کامیابی کی خاطر دوسری کوشش کے لیے پوری طرح مستعد ہو چکا تھا جب میں نے اسے جا لیا۔

اس کے ریوالور کا رخ نیچے کی جانب ہی تھا چنانچہ میں اٹھ کر کھڑا ہوتا تو دوسری گولی کا نشانہ ضرور بن جاتا۔ میں نے تقریباً بیٹھے بیٹھے ہوئے ایسے جست لگائی جیسے کبھی کھیل کھیل میں پہلو بدلتے ہوئے تھوڑا سا اٹھنے کا مظاہرہ کر لیتے ہیں ایک لمبی جست کی صورت میں۔

اس کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ میں نے اس کے ایک پنڈلی پر گھٹنوں سے اوپر وار کیا۔ پنڈلی کے نیچے والے حصے کی ... ضرب ... لگتی تو ہڈی ٹوٹ جاتی۔ ... چوٹ تو ... اس نے پلٹ کے چہرہ اٹھایا ہی تھا کہ میں نے دوسری ٹانگ کو دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے کر جھٹکا دیا۔

وہ سر کے بل پیچھے کی طرف گرا اور اس کے دونوں ہاتھ بے ساختہ غیر موجود سہارے کے لیے پھیل گئے۔ اگلے لمحے میں اس کے اوپر سوار تھا جیسے ہاتھوں نے اس کی گردن کو دبوچ لیا۔ اس کے دونوں بازو میرے گھٹنوں سے دبے ہوئے تھے اور

www.paksociety.com

وہ مجھ پر فائر کرتا یا ہاتھوں کو بھی اپنے دفاع کے لیے استعمال کرتا۔ اب وہ صرف اپنی ٹانگیں چلا سکتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھ پر جوابی وار ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ورنہ میں اس کی گردن توڑ دیتا یا اس کی سانس رک جانے تک اس کا گلا نہ چھوڑتا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال موجود تھا کہ ایک پولیس مین کو قتل نہیں کرنا چاہیے۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگی تھیں اور زبان حلق سے باہر نکل آئی ہے۔

میں نے دباؤ کو تھوڑا سا کم کیا اور کہا۔ "تم زندہ رہنا چاہتے ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلا کے اپنی آنکھوں سے رحم کی التجا کی۔

"میرے لیے تم کو مار کے سمندر میں پھینک دینا بہت آسان ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہارے ساتھ آنے والے دونوں ماتحت بھی تم کو نہیں بچا سکتے۔ وہ شاید تم سے زیادہ بے بس ہو جائیں گے۔ تمہاری لانچ پر جو لوگ رہ گئے ہیں انہیں مار کے ہم آسانی سے تمہاری لانچ پر قبضہ کر سکتے ہیں اور اسے غرق بھی کر سکتے ہیں لیکن ہم قانون کے محافظوں کے دشمن نہیں ہیں۔"

اس کے ہاتھ سے ریوالور لے کر میں نے اسے آزاد کر دیا اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانے کی اجازت دی۔ وہ مجھے شعلہ فشاں نظروں سے گھورتا رہا۔ ایک رعایت کا یقین آتے ہی اس کا رویہ پھر بدل گیا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا سکندر بخت۔" وہ بولا۔ "تم نے اپنے جرائم کی طویل فہرست میں ایک اور جرم کا اضافہ کر لیا ہے۔ تم اب بھی خود کو قانون کے حوالے کر دو تو بچ جاؤ گے۔"

"یہ ضمانت تم کیسے دے سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "اگر تم میرے جرائم کی طویل فہرست سے پہلے ہی باخبر ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ میرے خلاف کتنے مقدمات عدالتوں میں زیر سماعت ہیں۔"

"میرا مطلب تھا... کہ تم بین الاقوامی مجرم بننے سے بچ سکتے ہو۔" وہ بولا۔ "ہم تمہاری مزاحمت کے معاملے کو نظر انداز کر سکتے ہیں کہ تم نے پُرامن طور پر خود کو قانون کے حوالے کیا۔ تم کو رعایت مل سکتی ہے..."

"مگر میں نے ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ تمہیں کیا رعایت دوں۔" میں نے کہا۔

"تم بے وقوف نہیں ہو سکندر بخت۔" وہ بولا۔ "تم کو سمجھنا چاہیے کہ ہم بین الاقوامی تنظیم کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ تم مجھے مار دو یا ہم سب کو لانچ کے ساتھ ہی ختم کر دو تو اس سے تمہارے لیے فرار کے راستے کھل نہیں سکتے۔ تم بہت جلد محصور کر لیے جاؤ گے۔ یہ کھلا سمندر ہے یہاں چھپنے چھپانے کی کوئی جگہ نہیں۔ جیسے ہی ہمارا دوسروں سے مواصلاتی رابطہ منقطع ہو گا، ہماری تلاش شروع ہو جائے گی۔ سب جانتے تھے کہ ہم کہاں ہیں اور ہم نے آخری رابطہ کب قائم کیا تھا اور کس سلسلے میں قائم کیا تھا۔"

"تمہیں یہ سب اطلاعات کس نے فراہم کی ہیں۔ میرے نام اور مجھ پر عائد الزامات کے بارے میں؟"

"تمہاری حکومت نے۔" وہ بولا۔

"حکومت پاکستان نے؟" میں نے کہا۔ "میں نہیں مان سکتا۔"

"اس سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

"تم... خود کون ہو؟" میں نے کہا۔ "انگریزی بولنے کے بعد تم نے مجھے یہ دھوکا دینے کی کوشش کیوں کی تھی کہ تم اُردو جانتے ہی نہیں ہو۔ تمہارا تعلق اسی برصغیر سے ہے یا جنوب مشرقی ایشیا کے کسی علاقے سے۔ ہر جگہ ٹوٹی پھوٹی اُردو بولی ضرور جاتی ہے۔"

"تمہیں میری قومیت سے سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ انٹرپول کا عملہ صرف میرٹ پر منتخب کیا جاتا ہے اور ہر ملک کی پولیس سے لیا جاتا ہے۔"

"درست۔ پھر تمہیں اپنی قومیت بتانے سے انکار کیوں ہے؟ اگر تم پاکستانی ہو تب بھی میں تم سے رعایت طلب کرنے کا حق نہیں رکھتا اور یہ تمہاری فرض شناسی کا تقاضا ہے کہ کوئی مجرم قومیت کے حوالے سے رعایت مانگے تو تم اسے بالکل معاف نہ کرو۔ تاکہ انٹرپول میں پاکستان کی پولیس کا نام روشن ہو۔" میں نے کہا۔

"میرا وقت ضائع مت کرو..."

"او کے۔ میں براہ راست کچھ سوالات کرتا ہوں۔ ہمارے بارے میں تمہیں کس نے اطلاع دی تھی کہ ہم بردہ فروش ہیں؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا..."

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کے منہ پر اُلٹے ہاتھ کا طمانچہ مارا۔ "یہی بات تمہارے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔ میری حکومت کی جانب سے اگر میرے خلاف الزامات کی کوئی فہرست جاری کی جائے گی تو اس میں سب کچھ ہو گا مگر دو الزامات میرے بدترین دشمنوں کی سازش کے باوجود اس میں شامل نہیں ہو سکتے۔ ایک منشیات کے کاروبار میں ملوث ہونے کا، دوسرا بردہ فروشی کا۔ یہ خدا کی مجھ پر خاص مہربانی ہے کہ میرے بڑے اور جانی دشمن بھی مجھے ضمیر فروش نہیں سمجھتے۔"

"پکڑے جانے والے الزام لگاتے وقت کچھ نہیں سوچتے۔"

"او کے انسپکٹر۔ تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "مجھے تمہاری شناخت معلوم کرنے کا قانونی حق حاصل ہے۔"

"شناختی کارڈ میری جیب میں ہے۔"

"اپنا منہ دیوار کی طرف کر لو اور ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" میں نے

کہا۔ "میں خود دیکھ لوں گا۔"

اس کا ریوالور اب میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ انتہائی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے تھوڑا سا گھوما لیکن یہ اس کی اداکاری تھی۔ وہ اس ایک لمحے کی مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا جب اپنا اعتماد ہونے کے باعث میں اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں۔ وہ ایک دم پلٹا اور اس نے بیک وقت گھٹنا اٹھا کے میرے پیٹ سے ذرا نیچے مارا اور دونوں ہاتھوں کی کہنیوں سے میری پسلیوں پر بھرپور وار کیا۔

حملہ اتنا شدید اور فوری تھا کہ ذرا سی دیر کے لیے میری سانس رک گئی اور میرے قدم اکھڑ گئے۔ اس نے بڑی پھرتی سے اپنا ہاتھ قمیص کے اندر ڈالنے کی کوشش کی۔ میرا آدھا دھڑ تکلیف سے مفلوج تھا لیکن ذہن پوری طرح مستعد تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ دوسرا ریوالور نکالے گا۔ اس یقین نے میرے ہاتھوں کو متحرک کیا۔ اس بار میرے عزائم کی راہ میں یہ خیال حائل نہیں تھا کہ میرے ہاتھوں کوئی پولیس مین نہ مارا جائے۔ مجھے یقین آ چکا تھا کہ پولیس کی وردی پہن لینے والا کوئی قانونی اختیار نہیں رکھتا۔ اور یہ وردی صرف بھیس بدلنے کے لیے استعمال کی گئی ہے۔

میرے بائیں ہاتھ کی ضرب اس کی کنپٹی پر پڑی۔ وہ گردن کی ہڈی چٹخنے پر بھی چلایا مگر یہ صرف ایک کراہ تھی جو گردن کے ٹوٹ جانے سے ادھوری رہ گئی۔ وہ جہاں کھڑا تھا وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اب میں نے جھک کر اسے سیدھا کیا اور اس کی شرٹ کے اندر ہاتھ ڈالا۔ اعشاریہ بائیس بور کا چھوٹا سا آٹومیٹک ریوالور خود بخود میرے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے دوسرے حفاظتی انتظام کو کارآمد بنانے کے لیے اس ریوالور کو اپنی آسان دسترس میں رکھا تھا لیکن اس کی تقدیر نے وفا نہ کی۔ اس کو طاقت پر غرور میں مبتلا کیا اور وہاں پہنچا دیا جہاں اس کا حریف نہیں بلکہ اجل کا لمحہ تھا۔

شناختی کارڈ مجھے باہر والی جیب سے ملا لیکن اسے کھول کر دیکھتے ہی میں چونک پڑا۔ اس پر تصویر بھی کسی اور کی تھی جو صورت سے کوریا، فلپائن یا جاپان کا رہنے والا ہو سکتا تھا یا اسی خطے میں آباد کسی قوم کا باشندہ۔ جو ویت نام، چین اور برما، ملائیشیا سب اپنے مخصوص نسلی خد و خال کی بنا پر پہچانی جاتی ہے ان علاقوں کے باشندے ایک سے لگتے ہیں۔

اہم بات یہ تھی کہ شناختی کارڈ اصلی تھا۔ ابھی تک اس مجرم کو جس کی لاش خود اعتراف جرم کی تفسیر بنی پڑی تھی، یہ موقع نہیں ملا تھا کہ وہ اس تصویر کی جگہ اپنی تصویر لگا سکے اور ریکارڈ بدل سکے یا برا نام بھی لکھ لے۔ غالباً وردی پہن لینے کے بعد سے اسے فرصت نہیں ملی تھی۔

اس کے ساتھ ہی یہ خیال آنا لازمی تھا کہ انٹرپول کی وردی اور لانچ صرف ہمارے خلاف کارروائی کے لیے حاصل کی گئی تھی۔ اور وہ اس حد تک ضرور کامیاب ہو گئے تھے کہ بے خوف و خطر ہماری لانچ پر پہنچ گئے تھے لیکن انھوں نے یہ سب کیسے کیا؟ انٹرپول کی لانچ پر قبضہ کرنا آسان کام تو نہیں اور پھر وہ شخص کون تھا اور اب کہاں ہے جس کی وردی لاش کے جسم پر تھی۔

باہر مکمل خاموشی تھی۔ دونوں لانچوں کے انجن آپس میں ہمکلام معلوم ہوتے تھے۔ دونوں کی آوازوں میں نمایاں فرق تھا۔ ہماری لانچ کے انجن پر تھکن اور بڑھاپا غالب محسوس ہوتا تھا۔ دوسری لانچ کے انجن میں طاقت اور سرکشی کی غراہٹ تھی۔ کیا انٹرپول کی یہ نئی زیادہ تیز رفتار لانچ اب ہمارے کام نہیں آ سکتی؟ اگر وہ شکاری بھیس بدل سکتے ہیں جو ہمارے تعاقب میں آئے تھے تو ہم بھی ان سے چھپ سکتے ہیں۔ لانچ کا جو عملہ ایک بار بدلا تھا وہ پھر بدل سکتا ہے۔

زیادہ سوچنے اور غور کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ نتائج کی پروا کیے بغیر میں نے اس منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تو پھر مجھے اپنے پیچھے لاش کو ہٹانے اور اس کی وردی خود پہننے میں چند منٹ لگے۔ میں نے اس کی بیلٹ کے ساتھ لٹکے ہوئے واکی ٹاکی کو دیکھا تو مجھے اس میں صرف دو ہی بٹن نظر آئے۔ ایک سامنے تھا جس پر "پاور" لکھا ہوا تھا۔ یہ درمیانی پوزیشن میں تھا اور آف تھا۔ نشانات سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اوپر کرنے سے آواز سنی جا سکتی ہے اور نیچے کر کے اپنی آواز سنائی جا سکتی ہے۔ یعنی اوپر کا کنکشن ریسیور سے تھا اور نیچے کا ٹرانسمیٹر سے۔

میں نے بٹن کو دبا کے اوپر کیا۔ ایک دم اس کا اسپیکر آوازوں سے بھر گیا۔ والیوم کا بٹن اس چھ انچ لمبے چار انچ چوڑے سیٹ کی سائڈ پر تھا۔

"کیا بات ہے... تم کب تک کھڑے رہو گے..." کسی نے کہا۔ پس منظر میں مجھے لانچ کا شور سنائی دیا۔

جواب نسبتاً بلند اور واضح آواز میں آیا۔ "اور میں کیا کروں؟ میں اکیلا ہوں... اس کی مرضی کے خلاف بات ہو تو وہ گرم ہو جاتا ہے۔"

"اور یار... تم وہ بھی..." دوسری آواز نے کہا۔

"وہ کیسے یار! انسپکٹر اوپر کھڑا ہوا ہے۔ وہاں بھی تو ہونا چاہیے کسی کو۔" قریب سے بات کرنے والے کی آواز آئی۔ "یہ ہوتا تو میں کہتا کہ قیدیوں کو باندھ دے یا ان کے ریوالور دے کر کھڑا کر دیتا۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ گفتگو دوسری لانچ اور ہماری لانچ کے کیبن میں موجود دو شکاری آپس میں کر رہے ہیں اور ان میں سے ایک

www.paksociety.com

نے محسن کے ساتھ گل اور مشتری کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ غالباً ان کے ساتھ آنے والے تیسرے شخص کے پاس ہوا کی گن نہیں تھا چنانچہ وہ عرشے پر صورت حالات سے بے خبر مطمئن کھڑا ہوا تھا۔ کیپ درست کرکے اور ریوالور ہاتھ میں پکڑ کے میں باہر نکلا اور سیدھا سامنے والے کیبن میں داخل ہوگیا۔ اس کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ ایک انچ کی جھری سے مجھے اندر کے منظر کی ایک جھلک نظر آگئی تھی۔

جو شخص محسن کے ساتھ دونوں عورتوں کو لائن اپ کیے کھڑا تھا وہ ایک دم پلٹا۔ قدرتی طور پر اس نے پہلے وردی کو دیکھا اور ذرا سی دیر کے لیے مطمئن ہوگیا۔ اس کا ریوالور جو میری طرف اٹھا تھا پھر اپنے اسیروں کی جانب ہوگیا جو اپنی ناک کیبن کی دیوار سے لگائے سیدھے کھڑے رہنے پر مجبور تھے اور اپنے پیچھے کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ورنہ محسن ضرور اس مہلت سے فائدہ اٹھاتا جب ریوالور کی نال کا رُخ ان کی طرف نہیں تھا۔ شاید وہ میری صورت بھی اپنے حریف کی نگاہ پڑنے سے پہلے دیکھ لیتا۔

وردی پہن کے خود کو انٹرپول کا نمائندہ ظاہر کرنے والے اس ادھیڑ عمر جعلساز شکاری نے بھی صورت کی تبدیلی کو دوسری نظر میں محسوس کیا۔ ظاہر ہے اسے صدمے سے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا لیکن مجھے اس کو ناک آؤٹ کرنے میں کوئی وقت نہیں لگا۔ میں سیدھا اس کی طرف گیا۔ درمیانی فاصلہ اتنا کم تھا کہ وہ چاہتا بھی تو نہ سکا۔ میری گرفت میں آجانے کے بعد اس نے مزاحمت کا آغاز کیا مگر اس وقت تک بہت دیر ہوچکی تھی۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ میرے ایک ہاتھ کے وار سے ناکارہ ہوگیا اور اس میں اتنی طاقت بھی نہ رہی کہ ریوالور تھام سکے۔

ریوالور نیچے گرا اور اس کے ساتھ ہی محسن نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ میں نے اپنے حریف کی گردن کو بائیں بازو کے شکنجے میں اس طرح کس لیا تھا کہ اس کے نرخرے پر پورا دباؤ تھا۔ وہ نتھنوں سے سانس لینے کی کوشش میں تڑپ رہا تھا اور رالیں بہا رہا تھا۔ میں نے دوسرا ہاتھ استعمال کرتے ہوئے اس کے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ ایک ہچکی کے ساتھ وہ سجدے میں گر گیا اور پھر ایک عجیب سے منظر کی تصویر میں ساکت ہوگیا۔

اتنی دیر میں محسن ریوالور اٹھا چکا تھا اور دونوں عورتوں کو بھی معلوم ہوگیا تھا کہ پانسہ پلٹ گیا ہے۔ مشتری تو وہاں سے ایسے فرار ہوئی کہ ایک بار تو مجھ سے ٹکرائی پھر دروازے میں سے گزرتے ہوئے ٹھوکر کھائی تو لڑکھڑاتے گرتے بچی۔ وہ پیچھے دیکھ رہی تھی جیسے ڈر ہو کہ وہ لاش پھر اٹھ کھڑی ہوگی۔ گل نے پہلے بھی کشت و خون دیکھا تھا۔ وہ پُرسکون رہی۔

"اب کیا کرنا ہے؟" محسن نے کہا۔

"تمہیں بھی یہ لباس بدلنا ہے۔" میں نے کہا۔ "عرشے پر کوئی ہے... یہ سرچ لائٹ ذرا دوسری طرف کرلو۔"

"کون سی سرچ لائٹ؟" وہ حیران ہوکے بولی۔

"اپنے ذہن کی روشنی کی۔" میں نے کہا۔

گل مسکرائے بغیر شہزادی کی طرح کھڑی ہوگئی۔ جتنی دیر میں نے لاش کے بدن سے یونیفارم الگ کی، اپنے کپڑے اتار کے اسے پہنے اور پھر لاش کو اپنے کپڑے پہنائے وہ ہماری طرف پیٹھ کیے کھڑی رہی۔

میں نے اتنی دیر میں صورت حال کی وضاحت کی۔ "یہ لوگ ہیں انھوں نے تاتا اچھے کو مار کے انٹرپول کی لانچ کا نام اور دھوکا دینے کے لیے یہ بھیس بدلا۔ اصل آدمی کوئی چینی یا جاپانی نسل کا تھا۔ اس کا شناختی کارڈ جیب سے برآمد ہوا۔ اس شخص کی جیب میں بھی کوئی کارڈ ضرور ہونا چاہیے۔"

"بالکل ہے۔" محسن نے کارڈ نکال کے مجھے دکھایا۔ "یہ نام بھی اسی قسم کی چیز تھی۔ یہ اصلی ہے..."

"چھوڑو نام کو۔ یہ اسی دشمن کے لوگ ہیں۔ ممکن ہے ان میں بھی علاقائی سمندروں کی انٹرنیشنل تنظیم ہو۔ ہم وہی کریں گے جو بھیڑیے کرتے آئے ہیں۔"

"انگریزی محاورے کے مطابق بھیڑ کی کھال میں۔" محسن اپنے کپڑے لاش کو پہنا کے بولا۔ "آپ ملاحظہ فرما سکتی ہیں کہ میں کتنا ہینڈسم اور اسمارٹ لگ رہا ہوں۔"

گل نے پلٹ کے دیکھا اور محسن نے تو مذاق کیا تھا مگر وہ مسحور سی کھڑی رہی۔ یہ وردی واقعی اس کے جسم پر سج رہی تھی۔ میں نے چٹکی بجا کے اسے متوجہ کیا۔ "اِدھر... خود فریبی کے لیے میری بات سنیے۔ یہ شغل فرصت میں دیکھیے گا۔ تو میں عرض کر رہا تھا کہ اب ہم انھی کے بھیس میں وہی کریں گے جو انھوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔ ان کے ساتھی واپسی میں دیر ہو جانے کی وجہ سے پریشان تھے۔ میں نے ان کی گفتگو سنی تھی۔"

"تم نے کسی کی آواز پہچانی تھی؟" محسن بولا۔

"ہاں، تو نے بھی سنی ہوگی جب پہلی بار غلطی سے وائرلیس آن ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "شک مجھے اسی وقت ہوگیا تھا۔"

"ان کا ایک ساتھی ابھی عرشے پر موجود ہے۔" محسن بولا۔

"میں اسے بلاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ پہچان جائے گا۔" محسن نے کہا۔

"فکر مت کرو، میں اسے موقع نہیں دوں گا۔"

"بس تم کو اس کی وردی ملے گی۔ لباس بدلنے اور میک اپ کے لیے

تم کو صرف پانچ منٹ دیے جائیں گے۔"

"اور پانچ منٹ کا مطلب ہوگا کہ ہم نے پانچ منٹ ضائع نہیں کیے۔" محسن نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "جب کہ عورتوں کی عادت ہوتی ہے، میدان حشر میں جانے سے پہلے بھی لپ اسٹک ضرور ٹھیک کرلیں گی۔"

"میں ساڑھے چار منٹ میں تیار ہوسکتی ہوں۔" گل نے کہا۔

میں باہر آیا اور واپس آگیا۔ مجھے اوپر پہرا دینے والے کی جھلک نظر آگئی۔ وہ بڑی بے قراری سے ایک محدود دائرے پر گردش کر رہا تھا۔ میں چند قدم دوڑا تو وہ چونکا اور ایک دم پلٹا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرا چہرہ دیکھتا میں نے ہانپتے ہوئے اس کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور دبی ہوئی آواز میں پکار کے کہا۔ "جلدی آؤ بے وقوف۔" پھر میں واپس بھاگا۔ چنانچہ وہ سمجھا اس کا ساتھی مشکل میں گرفتار ہے اور اسے مدد کے لیے بلا رہا ہے۔ میں اونچی آواز میں بولتا تو وہ آواز کے فرق کو بھی نوٹ کرتا۔ اس نے فرض کیا ہوگا کہ آواز کو دبا کے بات کرنا اسی خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری تھا۔

وہ میرے پیچھے دوڑتا آیا۔ میں کیبن میں داخل ہوتے ہی دروازے کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ وہ جیسے ہی اندر آیا میں نے اسے دبوچ لیا۔ چند منٹ میں اس کا بھی وہی انجام ہوا جو اس کے دو ساتھیوں کا ہوچکا تھا۔ ایک بار پھر محسن نے ہی اس کی وردی اتاری اور گل کی طرف پھینک دی جو دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

"تو اب تم کو ٹھیک ساڑھے چار منٹ دیے جاتے ہیں۔ گل جان سے گل خان بننے کے لیے۔" وہ بولا۔ "اور یہ چار منٹ پورے ہوتے ہی ہم پھر اندر ہوں گے۔ آدھا منٹ گزر چکا ہے۔"

"چلو چلو بے ایمان۔" گل نے اسے باہر دھکیل دیا۔ میں نے اس مہلت سے فائدہ اٹھایا اور دوست محمد کے پاس جا پہنچا۔ وہ کسی حد تک صورت حال کو سمجھ چکا تھا لیکن مشتری نے اپنی بدحواسی سے اس کو کنفیوز کر دیا تھا۔ وہ اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا۔

"ٹھیک بولتا صاب تیرے کو، پاگل ہے تو..."

"قسم اللہ کی میں ٹھیک کہہ رہی ہوں..." مشتری نے ہانپتے کانپتے کہا۔ "ارے کم بخت بدذات... پانی ہی پلا دے... اس نے پکڑ لیا جیسے دھوکے باز... اُف... اور انھوں نے ایک جھٹکے سے گردن ایسے توڑ دی جیسے... موئی گردن نہ ہو ککڑی ہو۔"

"اُف اے بابا کون کس کا گردن توڑا...؟"

میں نے اسے مختصراً ساری بات بتائی اور یہ بھی سمجھا دیا کہ اب ہم دوسری لانچ پر قبضہ کرنے جا رہے ہیں مگر وہ اپنا کام کرتا رہے اور لانچ کو سنبھالے۔ اس کا کام ہماری کامیابی کے بعد شروع ہوگا۔

"اور صاب... ہم کیا کرے؟" گریس نے کہا۔

"تم اپنی اس ڈرپوک نار کو سنبھالو۔" محسن نے مشتری کی طرف اشارہ کیا اور واپس چل پڑا۔

جب میں کیبن میں داخل ہوا تو گل اپنے بالوں کو سمیٹ کر کیپ میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

"آدمی کو وعدہ کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے۔" محسن نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "ساڑھے چار منٹ..."

"ایک منٹ گھڑی آگے کی تم نے..." گل چلا کے بولی۔ پھر اس نے مجھے دیکھا اور خاموش ہوگئی۔

"میں مدد کروں؟" محسن نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ سکندر بھائی! آپ ذرا یہ... " وہ بولی اور میں نے اس کی ناراضی کے باوجود اس کے تراشیدہ بالوں کو اکٹھا کرکے ٹوپی میں قید کر دیا۔ اس کے ملبوس کے انداز نے مجھے دم بخود کر دیا تھا۔ یہ وہی آگ سی تھی جو گفتگو کرتے ہوئے مردانہ انداز کی گالیاں بک جاتی تھی اور اسے احساس نہیں ہوتا تھا۔

"جوتے تو ڈھیلے ہیں۔" گل نے تسمے باندھتے ہوئے کہا۔

"تم پرانی چپل کی طرح چل سکتی ہو۔" محسن نے کہا۔

"یہ لو اپنا ریوالور۔" میں نے کہا۔ "ریڈی فار ایکشن؟"

"یس سر!" گل نے مجھے سیلوٹ مارا۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟"

"ٹنے ون۔" میں نے کہا۔ پھر میں اور محسن آگے پیچھے باہر نکلے۔ عرشے پر ابھی اندھیرا ہی تھا۔ یہ صبح کاذب کا دھندلکا غائب ہونے کے بعد ذرا سی دیر کے لیے پھر اپنا تسلط قائم کرنے والی تاریکی تھی جس نے ہمیں اضافی مدد دی۔

"تم یہیں ٹھہرو۔" میں نے گل سے مخاطب ہوکے کہا۔ "اور اسی طرح پہرا دیتی رہو جیسے وہ دے رہا تھا جب تک ہم واپس نہ آجائیں تم ادھر مت آنا۔"

"میرے ہونے والے بچوں کی خیریت کے لیے دعا کرتی رہنا۔" محسن بولا۔ گل کیسے سمجھ سکتی تھی کہ یہ پیار بھری شرارت نہیں ہے۔ محسن کے الفاظ کا مفہوم میرے لیے کچھ اور تھا اور گل کے لیے کچھ اور حالانکہ الفاظ وہی تھے۔ وہ مسکرا کے رہ گئی اور شاید شرمائی بھی ہوگی۔ مجھے محسن کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا جذباتی استحصال ہو رہا ہے۔ جو حالات کی ضرورت تھا۔ مگر گل کو حالات کی ضرورت بتانا غلط تھا۔

ایک لانچ سے دوسری لانچ پر پہنچنا مشکل نہ تھا۔ آگے پیچھے ہم دوسری لانچ کے عرشے پر کودے تو عرشے پر نہ جانے کہاں سے ایک شخص نمودار ہوگیا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔

www.paksociety.com

"کیا ہوا...؟" اس نے قریب آ کے کہا پھر اسے معاملہ گڑبڑ نظر آیا۔ میں نے اسے گاؤ دوکانے کی مہلت نہیں دی۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں اس کی لاش سمندر کی لہروں میں گم ہو گئی۔

اب میں نے لانچ کا جائزہ لیا۔ یہ بھاری لانچ کے مقابلے میں بہت بڑی اور صاف ستھری تھی۔ بائیں جانب ایک کھلا ہوا روشن دان سا نظر آ رہا تھا۔ یہ نیچے جانے والا راستہ تھا۔ میں نے محسن کو چند قدم پیچھے رہنے کی تاکید کی اور دبے پاؤں آگے بڑھا لیکن بھاری جوتوں کے ساتھ آہٹ پیدا کیے بغیر چلنا ممکن نہیں تھا چنانچہ جوتے اتار کے میں نے ایک طرف رکھ دیے اور پھر نیم روشن فولادی زینے کے پہلے تختے پر قدم رکھا۔

کم سے کم تین افراد نیچے موجود تھے۔ ان میں سے دو کسی بات پر آپس میں جھگڑ رہے تھے اور کچھ فاصلے پر تھے۔ تیسرے کی آواز بہت نزدیک سے آ رہی تھی۔ وہ مسلسل واکی ٹاکی یا وائرلیس پر اپنے ان ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں مصروف تھا جو دوسری لانچ پر پہنچنے کے بعد لاپتا ہو گئے تھے۔

"ہیلو... ہیلو... نمبر ون... تم بولتے کیوں نہیں.....

نمبر ٹو... کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟ دیکھو تمہارے واکی ٹاکی صحیح کام کر رہے ہیں یا نہیں؟ جواب دینے کے لیے بٹن کو صحیح پوزیشن میں رکھو... ہیلو... ارے کیا مصیبت ہے یار...

جلدی کرو اپنی جو اس اسٹور میں چھپا کھلا ہے..."

یہ آخری بات اس نے ان دونوں کو مخاطب کر کے کہی تھی جن کی تکرار سے مواصلاتی رابطے میں خلل پڑ رہا تھا۔ دونوں لڑنے والوں کی آواز ایسے مدھم پڑ گئی جیسے انھوں نے بیچ کا کوئی دروازہ بند کر دیا ہو۔ وہ اپنے اختلافی مسائل کو التوا میں رکھنے پر تیار نہیں تھے۔

اب آپریٹر کی ڈیوٹی پر مامور شخص نے پھر چلانا شروع کیا۔ میں نے اس وقت کو مناسب سمجھتے ہوئے پیش قدمی کی اور بلی کی طرح پنجوں کے بل چلتا ہوا وائرلیس آپریٹر کے سر پر جا پہنچا جو اب کانوں پر ہیڈ فون چڑھانے میں مصروف تھا۔

اپنی گردن کی جلد پر ریوالور کی نال کا لمس محسوس کرتے ہی وہ ساکت ہو گیا۔ اس کی سالہا سال زندگی کے تجربات نے اسے بتا دیا کہ یہ موت کا لمس ہے۔ اس کی جگہ کوئی اناڑی ہوتا تو ضرور پلٹ کے دیکھتا اور شاید چیخ بھی مارتا۔

"کون... تم لوگ؟" اس نے سیدھا سامنے دیکھتے ہوئے کہا اور ہیڈ فون کو آتا ہستہ نیچے رکھ دیا۔

"تم وہ نہیں ہو جن سے تم رابطہ قائم کرنا چاہتے تھے۔" میں نے کہا۔ "ان کی روح وائرلیس پر جواب نہیں دے سکتی۔"

"دیکھو... مجھے مت مارنا... تم جو کہو گے..." وہ عاجزی سے بولا۔ اس کے لہجے سے گھبراہٹ یا خوف کا پتا نہیں چلتا تھا۔ یہ کچھ عجیب سی بات تھی یا تو وہ بہت ہی ڈھیٹ تھا یا حالات کے یکلخت پلٹ جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس کے سامنے ایک لمبی سی میز پر مختلف آلات رکھے تھے۔

"اپنا کام جاری رکھو۔" میں نے کہا۔ "تاکہ کسی کو کچھ بھی شبہ نہ ہو۔ اپنے دائیں جانب دیکھو تمہارے بعد میرا ایک اور ساتھی ہے اور تمہارا سر اس کی گولی کا ہدف ہے۔ اسے صرف کھوپڑی میں سوراخ کرنے کا شوق ہے۔ تم نے ذرا بھی غلط حرکت کی تو تمہارا بھیجا بھی جل جائے گا۔ اپنی کھوپڑی بچانی ہے تو..."

اس نے مردہ آواز میں کہنا شروع کیا۔ "ہیلو... ہیلو...

جواب دو... نمبر ٹو..."

میں اس کے سامنے والی میز کے نیچے دُبک کر بیٹھ گیا۔ اس طرح کر میرے لاکوئی بھی فرد ادھر آ نکلتا تو مجھے دیکھ نہ پاتا۔ آپریٹر کو اپنے کام میں مصروف دیکھتا تو اسے کسی قسم کا احساس بھی نہ ہوتا۔ میں نے اپنے سائلنسر والے ریوالور کا رخ اس کی جانب رکھا۔

"تمہارے علاوہ اس لانچ پر کتنے افراد ہیں؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

اس نے میز کے نیچے مجھ پر نگاہ ڈالے بغیر کہا۔ "ایک تو میں ہوں گا اور ایک... دوسرا سیکنڈ انچارج ہے... کیا وہ تمہارے ساتھی ہیں؟"

"نہیں، تمہارے دو ساتھی ان کے ساتھ ہیں۔"

"ساتھ ہیں یا ان کے سر پر سوار ہیں؟"

"میں تمہارے قدموں میں پڑا ہوا ہوں۔ پھر بھی تم نے جھوٹ بولا۔ ان کے نام بتاؤ گے؟"

"وہ چھ یا سات نمبر ہیں۔"

"وہاں تو صرف دو لانچ پر گئے تھے۔ نمبر چار اور پانچ؟"

"نمبر پانچ میں ہوں۔"

"اچھا نمبر پانچ! تم اپنے کام کے ماہر معلوم ہوتے ہو۔ تم بتاؤ اصل آپریٹر کے سر پر ریوالور لیے کھڑے ہو... آدمی کہاں ہے اس دنیا میں یا...؟"

"وہ تمہارے پاس پڑا ہوا ہے... بائیں جانب۔"

میں نے بائیں جانب دیکھا۔ اب میری آنکھیں کچھ دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ وہاں مجھے پردوں کے پیچھے کوئی گٹھری سی نظر آئی۔ میں نے اسے چھو کر دیکھا۔ ایک لمبا سا جسم سرد پڑ چکا تھا۔ عجلت میں اسے وہیں ڈال دیا گیا تھا۔

ٹھونس دیا گیا تھا۔

"اس کے علاوہ کتنے افراد کی لاشیں دستیاب ہیں؟" میں نے کہا۔

"تین لاشیں ہم نے سمندر میں پھینک دی تھیں۔" وہ بولا۔

"یہی کی وردیاں وہ پہنے ہوئے تھے؟ تمہارے کمانڈو اور اب مجھے نہیں لگتی ہیں؟" میں نے کہا۔ "ابھی تک مجھے تم سمندر میں نہیں پھینکا ہے لیکن حساب برابر تو کرنا پڑے گا۔ نمبر ۲ اور ۳ کے بارے میں بتاؤ، وہ کون تھے؟ نمبر آٹھ اور نو؟"

"ان کا کوئی نمبر نہیں تھا۔ یہ نمبر انھوں نے دیے تھے اور کہا تھا کہ کوئی ایک دوسرے کو نام سے مخاطب نہیں کرے گا۔ ہمیں اپنے اپنے کام سے مطلب رکھنے کو کہا گیا تھا۔ کسی کو بھی کسی کا نام معلوم ہی نہیں تھا۔"

"تم سب پرانے ساتھی ہو؟"

"نہیں، ہمیں صرف اس کام کے لیے لایا گیا تھا۔ اس سے پہلے ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ آپریٹر رضا کا رازطور پر تمام اطلاعات فراہم کر رہا تھا۔"

"تمھیں کام کی نوعیت کے بارے میں کچھ بتایا گیا تھا؟"

"مجھے صرف یہ کام کرنے کو کہا گیا تھا جو میں کر رہا ہوں۔ شاید سب اتنا ہی جانتے تھے جتنا انھیں کرنا تھا۔" وہ بولا۔

"تم مجھے جانتے ہو اور میرے ساتھی کو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں کیسے جان سکتا ہوں۔"

"تم نے کبھی سکندر کا، محسن کا یا ایم آر ایس کا نام تو سنا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ایم آر ایس کا نام سنا ہے..."

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہارے تین ساتھی جو ہمارے ہاتھوں مارے گئے، سکندر اور محسن کے نام سے واقف تھے۔"

"انھیں نام بتائے گئے ہوں گے۔ مجھے نہیں بتائے گئے تھے صرف اتنا کہا گیا تھا کہ ایم آر ایس ایک غیر قانونی اور خطرناک تنظیم ہے اور ہمارا کام ہے اس کے وجود کو ختم کرنا۔ زیادہ سوال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کل رات بتایا گیا کہ ہمیں فوری طور پر روانہ ہونا ہے اور ایم آر ایس کی ایک لانچ کو غرق کر کے واپس آنا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"تمھیں یہ سب بتانے والے کون تھے؟"

"ٹنکا دونوں۔" اس نے ایک بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ان کے کچھ نام تو ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"ایک چیف کہلاتا ہے، دوسرا باس۔ وہی سب کو کنٹرول

تھے اور سب کو لانے میں وہی تھے۔"

"تم انھیں کہاں ملے تھے؟"

"میں ... روڈ وال کا رہنے والا ہوں۔ شاہ دین میرا نام ہے۔" غریب ہوں مگر شاہ جی۔ بڑی دور سے آئے اس کام کے لیے۔ ...ہی کا بھی سوچا تھا کہ کیسے ہوگی؟" میں نے کہا۔ "اسمگلنگ یا اغوا کے کیس میں یا چارکنہ ڈھول بجا اور ہوگی بھی یا نہیں۔ غداروں کا ساتھ دینے سے پہلے انجام پر نظر رکھنا چاہیے۔ مگر تم نے صرف پیسہ دیکھا ہوگا۔"

"غداروں کا ساتھ دینے والوں پر لعنت۔" وہ بولا۔ "انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ کچھ لوگ ساحلی علاقوں میں ڈاکے ڈالتے ہیں اور وہاں سے لڑکیاں اٹھا کے لے جاتے ہیں انھیں آگے جا کے بیچ دیتے ہیں۔"

"کس نے کہی تھی یہ بات؟"

"تارو وال کا ہی ایک پولیس انسپکٹر ہے۔ اس نے مجھے بلا کے سب سمجھایا تھا اور کہا تھا کہ پاؤ تم نے نیک راستے پر چلنے کا ایک موقع دیا ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ۔" شاہ دین بولا۔ "اس کے پاس چیف بیٹھا ہوا تھا۔"

"اس پولیس انسپکٹر نے تمھیں ہی کیوں منتخب کیا؟ کیا تارو وال میں تمہاری بہادری کے چرچے تھے؟"

شاہ دین نے سر جھکا لیا۔ "وہ جی، میں پہلے تو ایک معمولی چور تھا۔ ایک بار پکڑا گیا۔ ۲ سال جیل کاٹی۔ اس کے بعد پولیس نے ہر واردات میں پکڑنا شروع کر دیا۔ چوری میرے گھر سے چالیس کوس پر ہو اور میرے گواہ فرشتے ہوں تب بھی وہ مجھے اٹھا لے جاتے تھے اور تفتیش کے بہانے گت لگاتے تھے۔ انھوں نے مجھے مجبور کر دیا۔ میں پولیس کا مخبر اور خاص آدمی بن گیا۔ ایک پورا گروہ تھا جی ان کا۔ اس میں دو کانسٹیبل تھے اور ایک نائب، گشتی پولیس کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ رات کو جہاں موقع پاتے تھے ڈاکا ڈالتے تھے۔ اطلاع ان کو میں دیتا تھا کہ فلاں گھر سے مال ملے گا۔ دو سال میں آٹھ وارداتیں ان کے ساتھ ... کبھی کوئی نہیں پکڑا گیا۔ پکڑا بھی کیسے جاتا خود ... ساتھ ہوتے تھے۔ علاقے میں گشت کرنے والی پولیس کا حصہ لے کر الگ ہو جاتی تھی۔ آدھا تھانیدار رکھتا تھا۔ باقی آدھا ... سب بانٹ لیتے تھے۔ ایک لاکھ میں سے میرے دس ہزار ہی ہوتے تھے۔ جگر میں چھنا ہوا تھا۔ پولیس نے مجھے سیدھی نیت جو بنا رہی تھی صرف اپنے کام کے لیے۔ ... نے بلا کے کہا کہ تم ... جاؤ۔ ایک ہفتے میں واپس آ جاؤ گے تمہارے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ ایک لاکھ ملیں گے نقد۔ اس سے کوئی شریفانہ کام دھندا

www.paksociety.com

کرلیتا۔ اب اس وقت میں کیا بولتا جناب۔ اس اجنبی کے سامنے کیسے کہتا کہ آپ ۔ جیتے ہوتے تو ٹھیک ہی نہیں۔ جناب نے سوچ لیا تھی... چپ نہیں رہوں گا۔ ایک ناکہ میں اپنا یہ چلاؤں گا آپ پر؟

"گویا اس ہجوم تھا پہاڑ نے مجھے فتح کیا تھا... اس شخص کو فرام کی ٹیپ جو جیت گیا ہے۔ ضرور تھانیدار نے بھی اس سے اپنا کلیجن وصول کیا ہوگا؟"

"مجھے تو نہیں معلوم جی..." آپ نے تلاوت کے ساتھ اس نے مجھے آرہے کی دلوائے ہوں گے۔

"یہ چیف اس تھانیدار کے پاس تھے... آپ نے اسے پہلے کبھی دیکھا تھا؟" عجمت نے کہا۔

"نہیں جناب وہ... وہ اس کو دیتے وہاں ہوا تھا... پہچان جاتا۔ وہ تو بیچارہ بول ہی نہیں سکتا تھا۔ شاہ دین نے "مجھے اسے کسی وقت پولیس افسر نے بھیجا تھا۔ تھانیدار نے میرے سامنے ہی بیٹھے پر ہاتھ رکھ کے بہت خوشامدانہ انداز میں کہا تھا کہ سراج صاحب کو ہمارا سلام کہنا ہم تو آپ کا نام کئی ان کے ایس ایچ او... اس بار لاہور میں... تھا جانتے تو ہم ہر وقت وہیں حاضر ہیں ان کی سرپرستی کے بیچ۔"

بہت عرصے بعد انسپکٹر سراج کا نام سن کے میرے کان دو دن میں یادوں کی ... کھل گئی۔ سارا قصہ اب میرے ذہن میں آگیا تھا۔ اس ٹیم کے ارکان کا انتخاب کرنے والا ... سراج تھا۔ ... مدد مانگی ہوئی والا وہ ... عبداللہ نے کئی بیتے لوگ... دو جو بھروسے کے قابل ہو سکتے انھیں چاہتا کوئی نہ ہوا۔ انھوں نے بہت سوچ کچھ کے اپنے علاقے کے جانے پہچانے تھانیداروں سے رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے ایک ایک آدھ ... سب لوگ ایک دوسرے سے بالکل ناواقف تھے۔ سب پولیس ریکارڈ کے مطابق قابل اعتماد تھے اور ... کے قابو میں تھے وہ ... شہادت کر سکتے تھے۔ جیسے اللہ ... عبداللہ کا ان تھانیداروں کو بھی ملا اور ان کے حکم کے مطابق کو بھی۔

جو نقشہ اس طرح میرے ذہن میں بنتا تھا وہ کسی اور کے ذہن میں نہیں تھا۔ یہ علم کے غلام زندہ انسانوں کی منڈی سے اٹھائے گئے تھے۔ ان کو زبان کے جال میں پھنسا کے گھروں سے دور لایا گیا تھا۔ انسانی پُراسرار طریقے پر ان کو خبر دیے گئے تھے اور کوئی مجبوری یعنی کمائی کی تنخواہ تھی جیب اور باس اس مشن کے ترکاں تھے اور کامیابی کا انعام شاید انھی کے لیے تھا۔ باقی سب کے لیے ہر صورت میں موت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ناکامی کا

خمیازہ چار افراد بھگت چکے تھے اور ان کی لاشوں کو تیرہ ہزار میل کی سمندری مخلوق کا لقمہ تر بننا تھا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتے تب بھی ایک لاکھ کے خواب کی تعبیر انھیں نہ ملتی۔ ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی انھیں عرشے پر کھڑا کر کے پشت پر گولی مار دی جاتی تاکہ وہ براہ راست اپنے مدفن آب میں گر جائیں لیکن ان کے خون کا ایک قطرہ بھی لانچ پر نہ گرنے ہے۔ یہ ایسے لوگ تھے جن کی کسی کو بالکل ضرورت نہیں تھی۔ ان کی واپسی شروع ہونے سے قبل تو خون کا رشتہ رکھنے والے چند افراد کو ہو لیکن تشہیر کا سامنا لینے والے بہت ہوتے کہ بلیوں کم جو بالا پاک۔ شاید وہ پتہ پالا آخر کیسے کہ بیان جھوٹی۔ کسی ہسٹری شیٹر کا اپنے علاقے سے غائب ہو جانا کسی کو شک میں مبتلا نہیں کرتا اور ان کے اوپر کے لیے کوئی کوشش کرے تو اس کی مدد کرنے والا کوئی نہ ہو تا ہے مختلف علاقوں کے وہ تیرہ سخت لوگ تھے جن کی ہسٹری شیٹ بہت جلد بند ہونے والی تھی۔ ایک لاکھ کے بے پناہ لالچ نے ان کی زندگی بچی ہوئی تھی اور بیک جانے والے ایک لاکھ لیتا خواب دیکھ رہے تھے۔

"مشش..." محسن نے پہلی بولنے کیسے... اشارہ کیا اور اوپر ہلا کے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ بیچارہ وہاں حیرت کو بنتے چیک گیا تھا اور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر کی دیدہ اشیر ہے گھسا ہوا میں کیا کر رہا ہوں۔ صبح کا اُجالا اب محسن کے پیچھے کے آسمان پر صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے اس کشتی پر تب اور دن گزار دیا تھا تو اس کا بھی ایک مقصد تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ وزیر جو پاسٹ اور نیوی گیٹر کے ساتھ میں اور گن پوائنٹ پر ان کی مرضی کے مطابق کام لے رہے ہیں اپنی جگہ چھوڑ کے نہیں آئے اپنے ساتھیوں کی واپسی کا انتظار کرنے والے دیکھا چھ افراد تھے۔ ان میں سے ایک اوپر مارا جا چکا تھا۔ دوسرے کو میں نے قابو کیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسی صورت میں چیف اور باس کو بھی بالآخر باہر آکے صورت حالات کا جائزہ لینا تھا۔ خود چل کے ان کے پاس جانے سے گریز کر رہا تھا تو جب کے لیے کہ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ جب تک وہ خود چل کے میرے پاس آئیں گے اور اس وقت ... آسانی سے انھیں شکار کر لیں گے۔

میں نے جواب میں ہاتھ ہلا کے محسن کو صبر کرنے کا کہا اور پھر شاہ دین سے مخاطب ہو گیا۔

"شاہ جی! ایک لاکھ وصول کر چکے ہو تم یا ابھی ملنے ہیں؟"

"ہاں جی! اسی لیے تو میں راضی ہو گیا تھا... کراچی پہنچتے ہی مل گئے تھے۔"

"اور تم نے اس رقم سے کیا خریدا شاہ جی؟"

"ایک ٹیکسی لی۔ ایک کرائے کا مکان لیا... بس باقی پاس ہے۔"

"جہیز کے لیے ... بھی ماں کا سامان بھی ساتھ لے آتے تو اچھا تھا۔" میں نے وصیت کرا دے کہ کسی فلاں کو پہنچا دی جائے۔ بیوی بچے یا بہن بھائی کسی کو فائدہ تو پہنچتا تمھاری موت سے، زندگی سے تو نہیں ملا۔"

"کیا... کیا مطلب... تم مار ڈالو گے مجھے... دیکھو... میں نے سب کچھ بتا دیا تم کو۔" اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔

"اس تھانیدار کا نام نہیں بتایا۔"

"ملک شیر... میں باقی سب کے نام بھی بتا دوں گا۔ خدا کے واسطے مجھے مت مارو..." وہ ہاتھ جوڑ کے گڑگڑانے لگا۔ "میں سرکاری گواہ بن جاؤں گا۔"

"تم بھی کتنے بھولے ہو شاہ جی۔ واپس جاؤ گے تو وعدہ معاف گواہ ہو گے۔" میں نے کہا۔ "واپسی کا ٹکٹ تمھارے پاس تھا ہی نہیں۔ تم کو صرف یہاں تک آنا تھا۔ جانا اس سے بھی آگے تھا۔ تمھاری گواہی اب میدان حشر میں ہو گی۔ تمھیں لانے والے تو یہ بات پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے کہ جب کام تمام ہو جائے تو تمھارا بھی کام تمام کر دیا جائے۔ یہ ایسے کام ہیں کہ کوئی گواہ رکھنے کی حماقت نہیں کرتا۔"

"تم... یہ تم کیسے جانتے ہو، تم غلط کہتے ہو۔" وہ چلانے لگا۔

"مجھے معلوم ہے شاہ جی!" میں نے کہا۔ "اپنی آواز کم رکھو۔"

میں میز کے نیچے تقریباً مڑا ہوا تھا اور بہت تھک گیا تھا۔ انتظار اب میرے لیے برداشت سے باہر ہونے لگا تھا۔ چیف اور باس آخر باہر نکل کے معلوم کیوں نہیں کرتے کہ ان کے ہوا باز کے لوٹ کر کیوں نہیں آئے۔ یہ سب تفتیش تو ایسے بھی کی جا سکتی تھی لیکن میں نے وقت سے فائدہ اٹھایا اور شاہ دین کو اپنی جگہ پر بولنے بٹھائے رکھا۔ جیسے شیر کا شکار کرنے والے شکاری خود مچان پر بیٹھے ہیں اور کسی قربانی کے بکرے کو وہاں باندھ رکھتے ہیں جہاں شیر کے آنے کی امید ہوتی ہے۔

ابھی میں کچھ وقت اور گزار سکتا تھا اور پوچھ سکتا تھا۔ انھوں نے اندرون کی ... کیسے حاصل کی تھی لیکن ... قریب اور یکے بعد دیگرے متعدد واقعات پیش آئے جو تفتیش کو ملتوی اور مؤخر کرنے کا سبب بنے۔

ایک طرف تو محسن کے پیچھے کل نمودار ہوئی۔ میرے احکامات اور ہدایات کے خلاف ورزی کرتے ہوئے اور ڈسپلن کو اپنے جذبات کے ماتحت کرتے ہوئے وہ اپنی جگہ چھوڑ کے آگئی۔ میں نے محسن کو سر پہ ہاتھ مار کے دانت پیسے اور کچھ بڑبڑائے... اس نے شاہد سے گل کو منع ہو جانے کے لیے بھی کہا مگر گل نے واضح انداز میں سر ہلا کے کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ ایک روشن آسمان کے پس منظر میں میں نے ان کی حرکات و سکنات صاف نظر آرہی تھیں۔

ان کے ساتھ ہی سامنے والے کیبن کا دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر آگیا۔ شاہ جی کی آواز کچھ زیادہ ہی بلند ہو گئی تھی کہ وہ سیدھا ادھر ہی آیا۔

"کیا بات ہے شیر ایچ؟" وہ قریب آکے بولا۔

میز کے نیچے سے میں نے شیر ایچ کو خاموش رہنے کا سگنل دیا مگر شیر ایچ کا نروس بریک ڈاؤن ہو چکا تھا۔ اس نے ایک دم چلانا شروع کر دیا۔ "باس..."

اس نے انگلی سے میز کے نیچے کی جانب اشارہ ہی کیا تھا کہ میں نے اسے شوٹ کر دیا۔ گولی اس کی پیشانی پر لگی اور وہ کرسی سمیت الٹ کے باس کہلانے والے پر گرا جو عین اس کے پیچھے اکھڑا ہوا تھا۔ اس سے مجھے تھوڑا سا فائدہ ہوا۔ میرا راستہ صاف ہو گیا اور مجھے میز کے نیچے سے نکل آنے کی مہلت بھی مل گئی۔

فائر کی آواز تو بہت کم ہوئی تھی مگر باس جیسے لوگ جو پرانے شکاری ہوں، زندگی کی آہٹ اور موت کی چاپ میں فرق کی شناخت میں دیر نہیں کرتے اور خطرات سے اپنی حیوانی جبلت کے مطابق نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے بڑی پھرتی سے اپنا ریوالور نکال لیا۔ فائر کی آواز لانچ پر بم کا دھماکا بن کے ابھری مگر اس دھماکے کے ساتھ ہی باس اچھلا اور فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے سر سے اور گردن سے خون اُبل رہا تھا۔

"اُوئی چھٹی..." میں نے اٹھتے ہی بے اختیار گل کو گالی دی۔ جس نے یہ خوفناک دھماکا کیا تھا ایک لمحے کے لیے بھی میں نے یہ نہیں سمجھا تھا کہ باس کے ریوالور کی گولی سامنے سے نکلنے کے بجائے پیچھے سے نکل کے اسے لگ گئی۔ محسن سے ایسی حماقت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی اور اس نے بالکل ٹھیک کیا تھا کہ ایک دم نیچے اتر آیا تھا اور باس نے دیکھ بھی لیا تھا کہ وہ دوسری جانب سے براہ راست نشانہ بن سکتا ہے مگر اس کا ریوالور اٹھانے والا ہاتھ نیچے آنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ گل نے اس سے پہلے ہی فائر داغ دیا۔ جو کام خاموشی سے کیا جا سکتا تھا اس کے لیے اعلان جنگ غیر ضروری تھا۔

"محسن واپس بھاگ..." میں نے چلا کے کہا اور خود اپنے اطلاع نے کے۔ طارق ادھر بھاگا جہاں دو افراد نے لانچ کے عملے کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ ریوالور کے فائر کی آواز کے ساتھ ہی کیبن کے دروازے کا شیشہ ٹوٹا۔ سامنے آنے والے بشیر چیف نے مشین گن کا ایک

www.paksociety.com

پوسٹ مارا۔ اس وقت تک میں اس حصے میں پہنچ چکا تھا جہاں انجن نصب تھا۔ فائر کی آواز سے اور مشین گن کا راؤنڈ چلنے سے وہاں موجود سب لوگ سمجھ گئے تھے کہ جنگ اسی لانچ پر شروع ہو چکی ہے۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ گل اور محسن اب کہاں ہیں۔

”چلو!“ کسی شخص نے چیخ کر کہا۔ ”لانچ کو یہاں سے نکالو۔“

میں نے دروازے سے کان لگا کے سننے کی کوشش کی مگر جواب میری سمجھ میں نہ آیا۔ لانچ اب حرکت کرنے لگی تھی۔

”یہ کیا ہے؟ اس کی رفتار بڑھاؤ۔“ اب یہ حکم کسی اور نے دیا تھا۔

”رفتار ایک دم نہیں بڑھ سکتی۔“ یہ جواب انگریزی میں دیا گیا تھا۔ ”اور جہاں تک میرا خیال ہے اس لانچ کے ساتھ دوسری لانچ اٹک گئی ہے یا اٹکا دی گئی ہے۔ اس کا انجن دو لانچوں کو نہیں کھینچ سکتا۔“

”میں دیکھتا ہوں۔“ دوسرے شخص نے کہا جو نسبتاً پرسکون تھا اور انگریزی میں بات کر سکتا تھا۔ ”تم دونوں کو سنبھالو۔“

میرے لیے دونوں لانچوں کا اکٹھا ہو جانا ایک اچھی خبر تھی۔ معلوم نہیں ایسا کس نے کیا تھا شاید دوست محمد نے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو تجربے کے ساتھ عقل سے کام لینا جانتا تھا۔

”باہر مت آنا۔“ میرے پیچھے سے کوئی چلایا۔

لیکن یہ حکم دیر سے جاری ہوا۔ اس وقت تک ایک شخص اندر سے باہر آنے کے لیے دروازہ کھول چکا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا پھر بڑی عجلت میں پیچھے ہٹنے کی کوشش کی۔ میں نے دروازے کو ایک ٹھوکر ماری۔ وہ شخص دو دونوں پٹ لگنے سے پیچھے گرا۔ اسٹین ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے فائر کیا اور میں نے غوطہ مارا۔

مجھے احساس تھا کہ یہاں ایک اور شخص بھی ہے جو مجھے بغیر وارننگ کے شوٹ کر سکتا ہے لیکن میں بیک وقت دونوں طرف سے آنے والی گولیوں سے نہیں بچ سکتا تھا۔ میں نے پہلے والے شخص پر جست لگا کے اسے اٹھنے سے پہلے بوٹ کی ٹھوکر مار کے گرا دیا۔ اس کی زبان شاید دونوں جبڑوں کے درمیان آگئی تھی کہ اس کے منہ سے خون نکلا۔ میں نے پھر اس کے لات ماری۔ یہ لات اس کے سینے پر تھوڑا سا بائیں جانب پوری قوت کے ساتھ تھی۔ وہ بلبلایا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔

میری دائیں جانب اتنی دیر میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ حملے کے پروگرام سے ہٹ کر پائلٹ شاہ اور نوجی گیٹر نے حاضر دماغی سے اور جرأت سے کام نہ لیا ہوتا تو گل پہلی لانچ مارنے سے پہلے ہی مارا جاتا۔ جیسے ہی انھوں نے اپنے

پیچھے ہٹ کر مر سنا اور اس شخص کو میری طرف ریوالور اٹھاتے دیکھ کر جو ابھی تک ان کا تماشا دیکھتا ہوا کھڑا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک نے جست لگائی اور اسے نیچے گرا دیا۔ اسے گرنے میں لانچ کو لگنے والے زبردست جھٹکے کا بھی دخل تھا۔ یہ صرف میری کوشش نہیں باقی دو افراد کی کوششوں کا مشترکہ نتیجہ تھا کہ میدان کا رخ بدلا۔

یہ انسانی فیصلہ کن جنگ چند منٹ سے زیادہ جاری نہ رہی لیکن ان چند منٹوں میں فیصلہ کسی بھی فریق کے حق میں ہو سکتا تھا۔ دشمن بہتر اور مستحکم پوزیشن میں تھا۔ اس غنیم کی طرح جو کسی قلعے کے اندر اسلحے سے پوری طرح لیس مورچا بند بیٹھا ہو۔ تعداد میں بھی ان کی قوت دگنی تھی۔ محسن میرے ساتھ ہوتا اور ہم مسلح ہوتے تو مقابلہ برابر کا سمجھا جا سکتا تھا۔ ایک فائدہ جو ہمیں حاصل رہا وہ اندر سے حاصل ہونے والی حمایت تھی۔

جب ہم دونوں دشمنوں کو زیر کر چکے۔ میں نے ایک کو اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے اور ان کے حملے نے دوسرے کو بے دست و پا کر دیا۔ تو ہم تھوڑی دیر ایک دوسرے کو شکر گزاری اور فتح مندی کے احساس سے ملی والی مسرت اور اعتماد کے جذبات کے ساتھ دیکھا۔ ہم آپس میں اجنبی تھے مگر ایک دوسرے کی زندگی کے تحفظ کے لیے لڑی جانے والی جنگ کے اتحادی تھے۔

”ٹھیک ہو؟ ویری گڈ۔“ ان میں سے ایک نے مجھ سے انگریزی میں کہا۔ وہ گورا چٹا صحت مند جوان آدمی تھا۔ ”تم نے ہماری جان خطرے میں ڈال کے ہمیں بچا لیا۔“

دوسرے نے فقط مسکرا کے ہاتھ ملایا اور زیر لب کچھ کہا جو میں نہ سمجھ سکا تاہم اس کے جذبات کا اظہار اس کی آنکھوں سے ہو رہا تھا۔ یقیناً اس نے اپنے ساتھی کی بات ہی دہرائی ہوگی۔

”یہ انگریزی نہیں بول سکتا کیونکہ یہ سپین کا رہنے والا ہے۔“ پہلے شخص نے کہا۔ ”میرا نام راجندر سنگھ ہے اور میں انڈیا کا باشندہ تھا بلکہ تھا اب تو میں بین الاقوامی شہری ہوں۔“

”ان کا ایک ساتھی جو گروہ کا سرغنہ ہے ابھی باہر ہے۔“ میں نے فوری طور پر تعارف سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ ایک خطرناک آدمی ہے اور اس کے پاس سب مشین گن ہے۔“

”اوہ، میں تو سمجھا تھا کہ سب مشین گن کے ساتھ تم نے حملہ کیا ہے۔“

وہ تشویش اور مایوسی سے بولا۔

”تم حوصلہ رکھو۔ ہم اس پر بھی قابو پا لیں گے۔“ میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ”وہ تو لانچ کو بھی غرق کر دے گا... ہم سب ڈوب جائیں گے۔“

”ہمارے ساتھ کیا وہ خود نہیں ڈوب جائے گا؟“ میں نے کہا۔ ”اور پھر دوسری لانچ بھی تو ہے۔“

”اس کے ساتھ اب کتنے لوگ ہیں؟“

”میرا خیال ہے کہ اب وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ اس کے چند ساتھی مقابلے میں ہلاک ہو چکے۔ دو یہاں تمھاری قید میں ہیں۔“

”تم بھی اکیلے ہو؟“ راجندر سنگھ نے کہا۔

”نہیں، میرے ساتھی دوسری لانچ پر ہیں اور ہمارے لیے تشویش کی کوئی بات نہیں۔ ایک مشین گن سے وہ مقابلہ جاری نہیں رکھ سکتا۔“ میں نے کہا۔

”سکندر! باہر آ جاؤ ورنہ کب تک اندر چھپے رہو گے؟“ باہر سے کسی نے چیخ کر کہا۔ اور وہ شک جو مجھے پہلی بار اتفاق سے صرف دو لفظ سن کے ہوا تھا میرا یقین بن گیا۔ لانچ پر سب سے پہلے آنے والے کو ہاتھ لگنے سے جب واکی ٹاکی آن ہو گیا تھا تو میں نے دو ہزار کی گفتگو اور ہنسی کی آواز سنی تھی صرف ایک سیکنڈ کے لیے اور ان میں سے ایک نے اتنا ہی کہا تھا ”ان دونوں کو کی...“ پھر واکی ٹاکی آف کر دیا گیا تھا لیکن میرے اور محسن کے کان اس آواز پر کھڑے ہو گئے تھے۔ ہم دونوں نے استاد پیڈرو کی آواز کو پہچان لیا تھا۔

اب وہ چیف کی حیثیت سے ہمیں خوفزدہ کرنے کی احمقانہ کوشش میں مصروف تھا۔ بار بار سامنے لشکر آتے تھے تو بڑی ذہانت سے جنگی حکمت عملی تیار کرنے والا اعصاب بھی نفسیاتی حربے کو دشمن کے آخری تیر کی طرح استعمال کرتا ہے۔ طاقت استعمال کر کے بازی ہارنے والے کے پاس مکر و فریب سے جھوٹی امیدیں وابستہ کرنے کا سہارا تو رہتا ہے۔

”میں تم کو اندر ہی چوہوں کے ساتھ دفن کر دوں گا سکندر۔“ پیڈرو نے پھر چلا کے کہا۔ ”میرے ہاتھ میں دستی بم ہے۔“ اس نے ایک سانس میں مجھے ماں بہن کی گالیاں دے کر میرے اس خیال کو تقویت پہنچائی کہ وہ ذہنی طور پر اشتعال، بے بسی اور خوف کے ملے جلے جذبات سے کتنا مغلوب ہے۔

میں نے خاموش رہ کے اس پر اعصابی دباؤ بڑھانا بہتر سمجھا۔

”میں دس تک گنوں گا...“ غالباً اس نے ایک گالی دے کر کہا۔ ”پھر میں بم پھینک دوں گا۔ تمھارے چیتھڑے اڑ جائیں گے لانچ کے ساتھ۔“

میں نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ وہ فرش پر لیٹ جائیں۔ کوئی سوال کیے بغیر انھوں نے تعمیل کی۔ میں نے ان کا ساتھ دیا۔ یہ سول ڈیفنس کی ٹریننگ کا ایک ابتدائی اصول ہے کہ بم کے دھماکے سے زد کو کم کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے دستی بم والی بات محض ایک دھمکی محسوس ہوئی تھی لیکن میں امکانات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس احتیاط سے مجھے فائدہ ہوا۔

باہر پیڈرو چیخ رہا تھا۔ ”... تین... چار... پانچ اور...“

جیسے جیسے گنتی آگے بڑھ رہی تھی درمیانی وقفہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ تین کے بعد چار کہنے میں دو سیکنڈ لگے تو پانچ تک پہنچنے میں مزید تین سیکنڈ گزر گئے۔ چھ اس نے پانچ سیکنڈ کے بعد کہا۔

اندر فرش پر الٹا لیٹے ہوئے اور کہنیوں کے بل رینگتے ہوئے کانوں کو ہاتھ سے بند کرنے کے بعد میں نے انگلیوں کو سر کے پیچھے ملایا تھا۔ میرا ذہن کسی ایسی مشین کی طرح چل رہا تھا جس کے اندر مختلف گراریاں الگ الگ سمت میں تیزی سے حرکت کر رہی ہوں۔ میں بیک وقت بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ کیا واقعی پیڈرو بم پھینک دے گا؟ محسن آخر کیا کر رہا ہے۔ کہیں وہ اور گل پہلے ہی حملے میں تو نہیں مارے گئے۔ ایسی صورت میں کیا دوست محمد اور کریم کچھ کر سکتے ہیں؟ جب دس تک گننے کے بعد پیڈرو نے بم نہ پھینکا تو پھر وہ کیا کرے گا؟

پیڈرو نے دس تک گنتی پوری ہوتے ہی مشین گن کا برسٹ مارا۔ گولیاں کیبن کے دروازے میں سوراخ کرتی ہوئی ہمارے اوپر سے گزر گئیں۔ میں نے اپنے ساتھ لیٹے ہوئے دونوں افراد کو دیکھا وہ بھی محفوظ تھے۔

راجندر سنگھ نے اپنی مادری زبان میں پیڈرو کا شجرہ نسب غلط کرتے ہوئے کہا۔ ”دستی بم دا پتر۔“ اور بولا میرے اس خیال کی تائید ہو گئی کہ پیڈرو کے پاس مشین گن کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ورنہ وہ اپنی دھمکی پر عمل ضرور کرتا۔

”ڈٹے رہو سردار جی۔“ میں نے سر ہلا کے کہا۔

”بول واہگورو دی۔ میں نے اس کے ٹکڑے نہ کیے تو میرا بھی نام راجندر سنگھ نہیں۔ اور یہ دونوں ان کا تو میں اپنی کرپان سے قیمہ کروں گا۔“ اس نے دونوں قیدیوں پر غرا کے اعلان کیا۔

”ایک پولیس مین کو قانون کے مطابق کارروائی کرنا چاہیے سردار جی!“ میں نے کہا۔

جواب میں اس نے وہی کہا جو عام طور پر کہا جاتا تھا کہ کیسا قانون اور کہاں کا قانون۔ دنیا میں قانون کس نے اپنے ہاتھ میں نہیں لے رکھا ہے اور جو زبردست ہے وہی قانون بناتا ہے اور توڑتا ہے۔ ساری دنیا میں یہی ہو رہا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ وہ ایک طرح سے ایم آر اے کے اغراض و مقاصد کی تائید کر رہا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ لاقانونیت کی وبا ایک بین الاقوامی ساتھی تھی۔ ایم آر اے یعنی مائٹ از رائٹ سوسائٹی کے

www.paksociety.com

باقاعدہ ارکین ہم چند سرپھرے تھے۔ مگر درحقیقت اس کے حامی اور اس کے نظریات سے اتفاق کرنے والے اس دنیا کے وہ سب مظلوم اور مجبور عوام تھے جو اکثریت میں تھے۔

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ میرے لیے نئے خدشات اور خطرات کا احساس لے کر آیا۔ اب پیڈرو کیا کر رہا ہے؟ کیا اس کے پاس مشین گن کے راؤنڈ بھی ختم ہو گئے ہیں؟ یا وہ آخری داؤ کی ناکامی کے بعد میدان چھوڑ گیا۔ فرار کے راستے اس کے لیے کھلے ہوئے تو ہیں۔ وہ لائف جیکٹ پہن کے کھلے سمندر میں کود سکتا ہے مگر اسے ایک طرف دوسری لانچ سے کیے جانے والے فائر کا سامنا ہوگا تو دوسری طرف بچ نکلنے کی صورت میں ہر طرف پھیلے ہوئے سمندر کا۔ ساحل سے سیکڑوں میل دور وہ کسی بحری جہاز یا لانچ پر پہنچ جانے کی توقع رکھ سکتا ہے مگر اس کا امکان بہت کم ہوتا ہے کہ سمندر کے شور میں کسی شخص کی چیخ و پکار کوئی سن سکے یا موجوں کی دست و خیز میں تیرتے ہوئے ایک آدمی پر کسی کی نظر پڑے۔

سردار جی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ زخمی قیدیوں میں سے ایک دم توڑ رہا تھا۔ اس کے سارے اعضائے رئیسہ میری لاتوں اور ٹھوکروں سے پاش پاش ہو چکے تھے۔ دوسرے کو سردار جی اور اس کے ساتھی نے مل کر باندھ دیا تھا مگر وہ ہوش میں تھا۔

"یہ... مر جائے گا...!" وہ دہشت زدہ ہو کے بولا۔

سردار جی نے اس کے منہ پر مکا مارا۔ "سور دا تخم... اوئے مرنے تو سارے ہی جانا ہے، اپنی فکر کر۔"

اچانک باہر سے میگافون پر محسن کا اعلان سنائی دیا جو میرے لیے اتنا ہی اطمینان بخش اور حوصلہ افزا ثابت ہوا جتنا ہوائی حملے کے بعد خطرہ ٹل جانے کا سائرن خندق میں پناہ لینے والوں کے لیے ہوتا ہے۔

"پیڈرو! مقابلہ مت کرو۔ تمہارے سب ساتھی مارے جا چکے ہیں۔" محسن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ "ہم تمہاری لانچ پر قبضہ کر چکے ہیں۔ تمہارے لیے اب بھاگ جانے کا کوئی راستہ بھی نہیں رہا۔"

یہ وہی میگافون تھا جو اسٹریول کا تماشہ بن کے آنے والا پہلا شخص استعمال کر رہا تھا۔ اس کے اعلان نے ہمیں ہراساں نہیں کیا تھا صرف تشویش میں مبتلا کیا تھا لیکن اب اسی میگافون سے نشر ہونے والا اعلان اکیلے رہ جانے والے استاد پیڈرو کو کتنا دہشت زدہ کر رہا ہوگا یہ سوچ کے مجھے خوشی ہوئی۔ میرے دل کے سارے دشمن ایک سے مجرم تھے مگر پیڈرو کے خلاف میرے جذبات میں ذاتی عداوت کا پہلو بھی تھا کیونکہ وہ میرے باپ کا قاتل ثابت ہو چکا تھا۔ بعض اوقات میں سوچتا تھا کہ وہ میرے سامنے ایک مجرم کی طرح آیا اور مجھے اس کو انصاف کے مطابق موت کی سزا دینے کا اختیار حاصل ہوا تو میں کس طرح اس کو زیادہ سے زیادہ اذیت دے کر جہنم رسید کروں گا ورنہ انتقام کی آگ تو شاید کسی طرح بھی سرد نہ ہوگی۔

جب محسن نے اپنا اعلان دہرایا تو میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ میں نے اس کیبن میں گولی سے ہو جانے والے سوراخ پر آنکھ رکھ کے باہر جھانکا۔ وہ باہر کی مختصر راہداری میں جیسے تھا اس کے بیچ وہ میز بھی دیکھ سکتا تھا جس پر وائرلیس سیٹ وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے قریب الٹی ہوئی کرسی اور شاہ دین کی لاش بھی نظر آ رہی تھی لیکن آگے کا منظر میری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ یہ اعلان عرشے کے اوپر والے اس حصے سے کیا جا رہا تھا جہاں سے نیچے آنے والا زینہ شروع ہوتا تھا۔

میں نے سردار جی کو اشارہ کیا۔ "آجاؤ، باہر کوئی نہیں ہے۔" راجندر سنگھ کے ساتھ اس کا ساتھی بھی کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہوا اور انھوں نے باری باری سوراخ سے جھانک کے اطمینان کیا۔ استاد پیڈرو نے محسن کے اعلان کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ غالباً اب وہ کسی محفوظ مقام پر مورچا بند ہو گیا تھا جہاں سے قریب آنے والا ہر شخص اس کی بندوق کی زد میں ہو سکتا اور کوئی اسے دیکھے بغیر نشانہ نہ بنا سکے۔

میں نے سردار جی سے مشورہ کیا۔ "ذرا مجھے لقمہ سمجھاؤ، اگر وہ خبیث کہیں چھپ گیا ہے تو اسے کس طرح باہر نکالا جا سکتا ہے؟"

"تمہارا یہ بندہ اوپر سے بول رہا تھا۔" راجندر سنگھ نے کہا۔

"ہاں اوپر سے تو وہ ہر طرف دیکھ سکتا ہے۔ بچ نکلنے کے لیے یہ ناممکن ہے کہ سمندر میں کود کے نکل جائے۔" میں نے کہا۔

"تیرے پیچھے ایک تو وہی کپتان کا کمرہ ہے۔" راجندر سنگھ نے کہا۔ "پھر اس کے ساتھ اسٹور ہے، ادھر سیڑھی کے ہاتھ پر انجن روم اور اس کے پیچھے ٹائلٹ۔"

محسن نے تیسری بار پیڈرو کو مخاطب کیا۔ "پیڈرو! تم خود کو ختم کرنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ لانچ ڈوب جانے سے کیا ہوگا؟ ہم اپنی لانچ میں بالکل محفوظ ہوں گے۔ تمہارا باپ تمہاری مدد کر سکتا ہے اور نہ اس کا باپ سراج۔ تم اکیلے ہو۔ اب تو جان رہی ہے اور سب حساب برابر کرنا ہے۔ ہمت ہے تو خود ہی چھلانگ لگا دو۔ ہم تمہارا پیچھا کر لیں گے اس وقت تک جب تک کہ تم کسی شارک کا لقمہ نہیں بن جاتے۔ ہم تمہیں گولی نہیں ماریں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ تم کہاں تک تیر کے جا سکتے ہو۔"

راجندر سنگھ نے اتنی دیر میں مجھے سمجھا دیا تھا کہ پیڈرو کہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس نے متبادل راستے بتائے تھے جو محفوظ تھے۔ ہم سامنے سے جانے کے بجائے یہ کر سکتے تھے کہ پانی میں اتر جائیں اور پچھلی طرف سے شیشہ توڑ کے پیڈرو پر فائرنگ کریں اور وہ ادھر سے جواب دے تو سامنے سے محسن دروازہ توڑ دے۔ پیڈرو ایک وقت میں ایک ہی طرف کے حملے کا جواب دے سکتا تھا۔ غالب امکان یہ تھا کہ اس کے پاس مشین گن کا ایمونیشن نہیں تھا چنانچہ وہ ریوالور سے مقابلہ کرے گا۔ ایک ریوالور خالی ہو جانے کے بعد وہ دوسرا استعمال کر سکتا تھا مگر خالی ہو جانے کے بعد وہ عقبی عرشے تک جانے کا راستہ نہیں روک پاتا۔ سمندر کی طرف کھڑکی کے گول سوراخ سے گردن نکالے بغیر وہ ہمیں نشانہ نہیں بنا سکتا تھا مگر ہم پانی میں رہ کر اسے دھوکا دے سکتے تھے اور جیسے ہی اس کا سر نظر آتا فائر کر سکتے تھے۔

اس پورے پلان میں بہت سی خامیاں بھی تھیں اور خطرات بھی تھے۔ ایسے امکانات بھی تھے جو ہمارے خلاف بھی جا سکتے تھے لیکن مجموعی طور پر یہ قابل غور اور قابل عمل تھا۔ پیڈرو جب کمین گاہ میں ہمارے ساتھ بلی چوہے کا کھیل کھیل رہا تھا۔ یہ عقل کی اور اعصاب کی جنگ تھی جس میں نفسیاتی فوائد ہمیں حاصل تھے۔ ہم تعداد میں زیادہ تھے اور قوت میں کہیں۔ ہم محفوظ بھی تھے اور نقل و حرکت کے لیے آزاد بھی۔ اکیلا پیڈرو کہیں عارضی طور پر مورچا بند ہو گیا تھا۔ اب بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور تھا کہ بات صرف وقت کی ہے ورنہ جنگ تو ختم ہوئی اور اس کے لیے فتح کی امید رکھنا کسی معجزے کی امید رکھنے سے بھی زیادہ بعید از قیاس ہے۔ ہم صرف انتظار کر کے بھی جیت سکتے تھے۔ پیڈرو وہاں کھانے پینے کے بغیر یا اپنے موجودہ اسٹاک کے ساتھ کب تک ایک کمرے میں بند رہ سکتا تھا۔ بالآخر اس کو باہر آنا پڑتا مگر یہ سلسلہ دنوں پر محیط ہو سکتا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ محسن کو میری فکر بھی ہوگی۔ اسے نہیں معلوم کہ میں راہداری کے دوسری جانب موجود ہوں اور میرے ساتھ دو مددگار بھی ہیں۔

میں نے چلا کے کہا۔ "محسن! وہ حرامزادہ ایسے نہیں نکلے گا۔"

محسن نے میگافون پر کہا۔ "تو خیریت سے ہے نا؟"

"ہاں! انجلے کے دو افراد میرے ساتھ ہیں۔ پیڈرو کے دو ساتھی اندر تھے، ایک شاید مر گیا ہے ایک زندہ ہے۔" میں نے کہا۔ "عرشے پر کون ہے؟"

"ہم سب لوگ، وہ نکل کے جا نہیں سکتا۔"

"اس کے لیے میں نے دوسرا بندوبست کیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "سامنے سے آتا، وہ فائر کر دے گا...۔"

اسی وقت شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔

راجندر سنگھ نے کہا۔ "نکل گیا وہ حرامزادہ سمندر میں کود گیا۔"

محسن ایک دم واپس بھاگا۔ میں نے زینے پر اس کے قدموں کی آواز سنی۔ سردار جی کی بات میں اتنا یقین تھا کہ میں بھی باہر جانے کے لیے لپکا لیکن پھر ایک خیال نے مجھے روک لیا۔ میرے پیچھے دوڑنے والے سردار جی مجھ سے ٹکرا گئے۔

"کی ہو گیا ہے بادشاہو؟" انھوں نے ناک کو ذرا چڑھا کے کہا۔

"سردار جی! کون سا سچ زیادہ قابل اعتماد ہوتا ہے؟ جو آدمی اپنے کانوں سے سنے یا وہ جو آنکھوں سے دیکھے؟"

"جو اس کی آنکھوں سے؟" سردار جی نے ایک منطقی سوال کیا۔

"مگر میں نے کہا۔ "یہ بہت موٹی سی بات ہے۔ ہم نے صرف شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنی ہے۔ بندے کو فرار ہوتے نہیں دیکھا، اور یہ بندہ کوئی احمق نہیں ہے۔ انتہائی عیار آدمی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے راستہ صاف کرنے کے لیے دھوکا دیا ہو یا کسی کو سامنے بلا کے مارنے کے لیے یہ چال چلی ہو۔"

"پھر کیا کرنا چاہیے؟" وہ سر کھجا کے بولا۔

"انتظار۔" میں نے کہا۔ "محسن اوپر گیا ہے۔ عرشے پر جو دوسرے لوگ موجود ہیں ان سے بچ کے پیڈرو کے نکلنے کا سوال ہی نہیں، اسے وہ پانی میں نظر آتے ہی شکار کر لیں گے۔ وہ مجھ سے ماہر شکاری ہیں۔"

"یہ استاد پیڈرو کون ہے؟"

"یہ بھی شکاری ہے۔" میں نے کہا۔

"عجیب بات ہے۔ تم بھی شکاری ہو، وہ بھی شکاری اور شکار کرتے ہو ایک دوسرے کا۔"

"سردار جی! دنیا جب سے وجود میں آئی ہے ایسا ہی ہو رہا ہے۔ شاید اس سے بھی پہلے، ہمارے عقیدے کے مطابق... شیطان نے جنت میں باوا آدم کو شکار کیا۔ شیطان آج بھی انسان کا شکاری ہے۔ چنانچہ کیا سیاست، کیا تجارت، ہر جگہ چھوٹے اور بڑے شکاری ہیں، سامنے بھی اور پردے کے پیچھے بھی۔ بلی بھی شکاری ہے اور چوہا بھی۔"

"بلے بلے... کیا سوہنی بات کی ہے بادشاہو آپ نے۔" سردار جی نے بے حد متاثر ہو کے کہا۔

عرشے کے اوپر سے مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اگر پیڈرو نے سمندر میں چھلانگ ماری تھی تو اب تک اس

www.paksociety.com

پر کسی نے فائر کیوں نہیں کیا؟ اب تو سورج اتنا بلند ہو چکا ہے کہ پیڈرو چھپا نہیں رہ سکتا۔ کہیں وہ پانی کے نیچے ہی نیچے نہ نکل جائے۔ مگر یہ ساکت پانی نہیں ہے۔ لہریں شور والے اُچھال دے رہی ہیں اور تیر کر وہ کتنی دور جا سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ وہ یہاں تک۔ سمندری لہروں سے لڑنا کوئی آسان کام ہے۔ پھر یہ خاموشی کیسی؟ اگر کریم بلوچ اور دوست محمد بھی ہیں تو ان کو کچھ کرنا چاہیے۔ ایسے احمقوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتے رہے تو وہ نکل جائے گا۔ محسن خود چھلانگ مار دے، دوست محمد کود جائے، کسی کو تو نیچے جا کے دیکھنا چاہیے۔

میرا تردد ہر لمحہ ڈاؤن ہونے لگا۔ ایک طرف یہ خیال تھا کہ پیڈرو نے شیشہ توڑ کے ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی ہو گی، چنانچہ مجھے اس محفوظ پناہ گاہ سے نکل کے اس کا نشانہ نہیں بننا چاہیے۔ دوسری طرف محسن کی طرف سے پیڈرو کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملنے سے مجھ پر جھنجلاہٹ سوار تھی۔

بالآخر انتظار میری قوتِ برداشت سے باہر ہو گیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر دوڑ لگائی اور درمیانی راستے سے سیدھا آ گیا۔ ہر قدم پہ مجھے کسی گولی کا انتظار رہا لیکن اس سے میری رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مخالف سمت کے زینے سے محسن نیچے آ رہا تھا۔ گن اس کے ہاتھ میں تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں۔ وہ نظر ہی نہیں آیا۔" محسن بولا۔

"تم صرف ایک طرف دیکھتے رہے ہو گے۔" میں نے کہا۔ "وہ چالاک آدمی لانچ کے نیچے سے گزر کے دوسری جانب نکل گیا ہو گا۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایک طرف میں تھا۔ دوسری طرف گل بتی اور سمندر میں چھپنے کی تو کوئی جگہ ہے نہیں۔"

"وہ دونوں لانچوں کے درمیان نہ ہو...؟"

"اب دونوں لانچوں کے درمیان پچاس گز کا فاصلہ ہے۔" محسن نے کہا۔ "پہلے دوست محمد نے لوہے کے رسّے کا ہک باندھ دیا تھا مگر پھر وہ رسّا ٹوٹ گیا جب آگے والی لانچ چل پڑی۔"

"اچھا وہ جھٹکا اسی کا تھا۔" میں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ "مگر یار یہ کیسے ممکن ہے؟"

"یہ تو ممکن ہے کہ وہ اندر ہی ہو۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ سمندر میں ہوتا تو ہم اسے دیکھ لیتے۔ بیک وقت چار افراد کی نظریں اسے تلاش کر رہی تھیں۔"

"چار کون؟" میں نے کہا۔

"دوست محمد اور کریم بلوچ بھی تو تھے۔ دوست محمد کو تو [illegible] کریم بلوچ کا نشانہ کیسا بھی ہو، نگاہ تو ٹھیک ہے۔ اگر وہ کچھ دیکھتا تو شور ضرور مچا دیتا۔ گولی ضرور چلاتا۔ لیکن جس کے ساتھ دھوکا نہیں ہوا۔ اتنی دیر تک وہ پانی کی گہرائی میں چھپ کے بھی سفر نہیں کر سکتا تھا کہ گھبرا کر اوپر [illegible] نکلے۔ آخر وہ آدمی ہے، آبی جانور نہیں۔ میں نے تو اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک لانچ کے نیچے کوئی کونا پکڑ کر چھپا ہو اور سر پانی سے نکال کے روپوش رہے۔ وقفے وقفے سے ناک باہر نکال کے سانس لیتا [illegible] لانچ کے نیچے موجود ہے، مگر ایسا بھی نہیں ہے۔ دوست محمد نے اور پھر میں نے دوربین سے کونا کونا دیکھ لیا ہے۔"

"مگر وہ اندر بھی تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو نے کیسے جانا؟" محسن بولا۔

"وہ اندر ہوتا تو مجھ پہ فائر کرتا۔ میں سامنے سے گزر کے آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس کے فائر نہ کرنے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ وہ اندر نہیں ہے۔ ممکن ہے اس نے ایسا محسوس کیا ہو۔ اس کے پاس خالی ریوالور رہ گیا ہو۔ سو امکانات ہیں۔"

"تو نے ٹھیک کہا۔" میں نے ایک دم چونک کر کہا۔ "اس نے دھوکا دیا ہے محسن! ایک بار نہیں دو بار۔ پہلے اس نے شیشہ توڑ کر یہ ظاہر کیا کہ وہ نکل گیا تا کہ ہم اسے تلاش کرنے اوپر دوڑیں لیکن وہ اندر ہی چھپا رہا۔ مجھے شک ہوا تھا کہ وہ ہوشیار آدمی ایسا کر سکتا ہے چنانچہ میں نے سامنے سے گزرنے کا رسک نہیں لیا۔ اس نے ہمیں بے وقوف بنا کے مہلت حاصل کر لی۔ اب وہ اندر نہیں ہو گا۔ واقعی نہیں ہو گا۔"

میں واپس دوڑا۔ میرے پیچھے سردار جی اور ان کے ساتھی بھی آ گئے تھے مگر ہماری گفتگو میں مخل نہیں ہوئے تھے۔

اب سردار جی نے مجھے روکا۔ "کدھر چلے ہو بادشاہو؟"

میں نے کہا۔ "تم بھی آؤ میرے ساتھ۔ ممکن ہے دروازہ توڑنا پڑے۔"

"لیکن... ایسے... ذرا احتیاط سے..." سردار جی نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "گولی بڑی ظالم ہوتی ہے۔"

"دوست، اب کچھ نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "گولی کون چلائے گا جب اندر کوئی بھی نہیں ہو گا؟"

سردار جی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ "جب بندہ اندر بھی نہیں اور باہر بھی نہیں، یہ بندہ ہے کہ بھوت؟ [illegible]..."

میں نے دروازے کو لات ماری۔ دروازہ میری توقع کے برعکس بند تھا۔ محسن کی طرف میں نے اس وقت دیکھا [illegible]

"[illegible] دماغ خراب ہے۔" میں نے چیخ کے کہا۔ "اوپر... تم دونوں جاؤ، وہ اوپر نکل گیا ہو گا۔ وہ یہی تو چاہتا تھا۔"

بات تو محسن کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ واپس دوڑا۔ اس کے پیچھے [illegible] اپنے سائز سے بڑے جوتوں کے ساتھ اس کا [illegible] مضحکہ خیز منظر پیش کرتا تھا۔ میرے ساتھ سردار جی نے ایک [illegible] کے شانہ ملایا۔

"اب ذرا پیچھے ہٹ کے ایک ساتھ۔ واہگورو کا خالصہ!"

"[illegible]" میں نے بھی جوابی نعرہ لگایا۔ ہم دونوں ایک ساتھ دروازے سے ٹکرائے۔ دروازہ کچھ کمزور ثابت ہوا۔ میں تو [illegible] گیا مگر سردار جی سیدھے اندر گئے اور پھر بیڈ کے [illegible]

"او تیری ماں نوں [illegible]" انھوں نے گھٹنے سہلاتے ہوئے [illegible] کہا۔

"نکل گیا ہو گا۔" میں نے مایوسی سے خالی کیبن کو دیکھا۔

"میں ادھر دیکھتا ہوں۔" سردار جی لنگڑاتے ہوئے دوسرے [illegible] کی طرف گئے مگر صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ [illegible] لانچ سے باہر اتر گیا ہے۔ مجھے عقبی دیوار کے [illegible] وہ رسی بھی بندھی ہوئی نظر آ گئی جو [illegible] پانی میں ڈوب گئی تھی۔

اب مجھے اپنی عقل پہ ماتم کرتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی۔ [illegible] اس نے راستہ بنایا۔ وہ صرف عقل کی مدد سے [illegible] ہونے کے باوجود آزاد ہو گیا [illegible] ادھر [illegible] کے گھوڑے [illegible] ظلمات میں دوڑاتے رہ گئے اور خود [illegible] کی طرح دوڑتے پھرے۔ اس نے شیشہ توڑنے کے بعد انتظار کیا۔ وہ اوپر سے آنے والی سب آوازوں کو سنتا رہا۔ یقیناً [illegible] دوست محمد اور کریم سب چلا چلا کے ایک دوسرے کو ہدایات دیتے رہے ہوں گے۔ تم ادھر دیکھو، تم ادھر جاؤ۔ وہ [illegible] نکل جائے۔ استاد کریم، تم کیا کر رہے ہو [illegible] بھاگو۔

جب یہ شور تھم گیا اور اس نے اپنے کانوں سے سن لیا کہ [illegible] اور [illegible] وہ باہر نکلا [illegible] اور اسے [illegible] سنائی دینے والی آوازوں میں سنائی نہ دی

ہو گئی، میری آواز کو وہ سب سے الگ شناخت کر سکتا تھا۔ پھر کسی نے مجھے میرا نام لے کر بھی ضرور پکارا ہو گا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا تا کہ اسے توڑنے میں بھی کچھ وقت لگے۔ میں اس کی گولی کا نشانہ بن جاتا۔ ایک طرف [illegible] دوسری طرف سے تلاش کرنے والے لوٹ آتے۔ یہی وقت تھا جب استاد پیڈرو باہر گیا۔

"اچھا تو سردار جی، اب کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "اوپر چل کے دیکھتے ہیں۔"

"ہاں جی، یہ تو بڑی عجیب بات ہو گئی۔"

اوپر محسن اور اس کے ساتھ باقی سب لوگ بھی پریشان ہو گئے تھے۔ محسن دوربین لگائے دور دور تک دیکھ رہا تھا۔

"اسے کم سے کم دس پندرہ منٹ مل گئے۔" میں نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔

"دس پندرہ منٹ میں وہ دس پندرہ میل تو جا نہیں سکتا بادشاہو۔" سردار جی نے کہا۔ "آخر بندہ بشر ہے۔"

انھوں نے پہلی بار عقلمندی کی بات کی تھی۔ "آپ نے ٹھیک کہا۔ ہم اسے تلاش کر لیں گے۔ محسن تم استاد کے ساتھ اپنی لانچ پر جاؤ۔"

"تم بھی زیادہ دور مت جانا۔" محسن نے دوربین مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

"ایک میل کے دائرے میں۔ ایک میل قطر کے دائرے میں ہم مخالف سمتوں سے چلیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہم کلاک وائز جائیں گے، تم دوسری طرف سے یعنی اینٹی کلاک وائز جاؤ گے۔ ہم ایک دوسرے کو کراس کر لیں گے اور اپنا اپنا چکر پورا کر لیں گے۔ اس طرح ایک راؤنڈ میں دو مرتبہ دیکھیں گے۔ پھر دائرہ تھوڑا سا وسیع کر لیں گے۔ تقریباً دو فرلانگ، جس کا مطلب ہے کہ ہم ڈیڑھ میل قطر میں اسے تلاش کر لیں گے لیکن یہ صحیح ہے اس سے آگے وہ نہیں جا سکتا۔"

"آئے آئے سر۔" محسن نے فوجی سیلوٹ کے انداز میں یس سر کہا اور دوست محمد کو اشارہ کیا کہ لانچ قریب لائے۔

"سردار جی، آپ بھی گڈی اسٹارٹ کریں۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں، ابھی لو۔" سردار جی نے کہا۔

محسن نے گل کو ڈانٹا۔ "یہ تم کیا سر ادھر جھلا رہی ہو؟"

"کیا کروں، پھر بیٹھ [illegible]" گل جھلا کے بولی۔ "اور کسی کی وجہ ہی نہیں۔"

سردار جی [illegible] گئے تھے۔ "اوئے بادشاہو، ایسے [illegible]" انھوں نے گل کی بات پہ غور فرما کے کہا۔ "زنانہ [illegible]"

www.paksociety.com

انٹرپول نے؟
مجھے گل کے جواب نے محظوظ کیا۔ ان حالات میں جب ہم سخت اعصابی کشیدگی کا شکار تھے، ایک مسکراہٹ کسی سکون آور دوائی گولی سے زیادہ موثر ثابت ہوئی۔ گل اب اسی لانچ پر رک گئی تھی، اور تھوڑی دیر تک محسن سے نالاں تھی جب دوست محمد اپنی لانچ لے آیا تو میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا لیکن وضاحت کے لیے وقت نہیں تھا۔

چنانچہ میں نے محسن سے کہا "تم یہیں ٹھہرو، دوست محمد کے ساتھ میں جاؤں گا۔"

محسن نے کچھ کہنا چاہا لیکن [illegible] فوری تبدیلی کی [illegible] گل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں آپ کے ساتھ چلوں گی" [illegible] مخاطب ہوتے [illegible] اپنی لانچ پہ چلی گئی۔

میں نے دوست محمد کو سمجھایا کہ ہمیں اب کیا کرنا ہے۔

"ہم سمجھ گیا بابا، پر ابھی اپن کو ایک سگریٹ تو دو، سویرا ہو گیا۔" وہ بولا۔

"سگریٹ؟" میں نے کہا۔ "وہ تو میں لاتا ہوں۔ تم لانچ کا راستہ کریم کو بتاؤ اور میرے ساتھ ساتھ آؤ۔"

میں نیچے جانے لگا تو گل نے کہا "میں کیا کروں؟"

"تم آنکھیں کھلی رکھو اور چاروں طرف دیکھو۔ پانی میں جو چیز نظر آئے اسے گولی مار دو۔" میں نے کہا۔ "میں ذرا لاشیں ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔"

جن لاشوں کے جسم پر میرے کپڑے تھے ان کو الٹ پلٹ کے میں نے جیبوں کو دیکھا۔ دوست محمد کے اسپیشل سگریٹ اس کی اندر والی جیب میں محفوظ تھے۔ اسے ایک سگریٹ دے کر باقی میں نے اپنی تحویل میں لیے۔ [illegible] کریم بلوچ نے لانچ کو اپنے استاد کی ہدایت کے مطابق چلانا شروع کر دیا تھا۔

میں نے ایک لاش کو اٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔ "استاد ایک بات غور سے سنو۔" میں نے کہا۔ "یہ بات میں گل اور محسن کے سامنے کہنا نہیں چاہتا تھا۔"

استاد نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر سر ہلایا۔ "بولو۔"

"جب یہ تلاش کا کام ختم ہو جائے گا" میں نے دوسری لاش کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ لانچ لے کر واپس چلے جاؤ گے۔"

"واپس؟ کدھر، کراچی؟"

"ہاں، واپس کراچی۔" میں نے کہا اور تیسری لاش کی طرف چل پڑا۔

"اور تم... کیا کرے گا؟"

"ہم بمبئی میں گل اور محسن، ہم اس انٹرپول کی لانچ پر جائیں گے۔" میں نے تیسری لاش کو بھی سپرد آب کر دیا۔

"ابھی اپن کو سمجھ نہیں پڑا۔" دوست محمد نے کہا۔

"دیکھو استاد! دشمن کا ایک بہت خطرناک آدمی [illegible] نکل گیا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو یہ بات یقینی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح بمبئی پہنچ جائے گا۔ اسے ہماری منزل کا علم ہو گیا ہے۔ [illegible] لانچ کو بھی دیکھ لیا ہے۔ ہم اس لانچ میں گئے تو ایسے سمجھو جیسے چوہے [illegible] سیدھا آ گئے [illegible] ان کو بمبئی میں انتظار کرنے دو۔ تم واپس کراچی جا کے [illegible] اکرام شیخ کو جانتے ہو، اس کی ایجنسی کا نمبر [illegible] تمہاری مدد کرے گا۔"

"کاہے کا واسطے، اپن کو مدد نہیں مانگتا بابا۔" دوست محمد نے خفگی سے کہا۔

"تمہاری نہیں بلکہ کریم بلوچ کی مدد کرے گا وہ [illegible] گل اور محسن کو پہنچائے گا..." میں نے کہا۔

"ان کو ہم پہنچا سکتا ہے... اپنا کو کسی [illegible] شیخ کا [illegible] نہیں ہے۔ لیکن یہ جو تم بولا، یہ ایک دم غلط بولا۔"

"کیا غلط بات کہی ہے میں نے استاد؟" میں نے [illegible] کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ارے بابا، تم لوگ خالی ایسا بات بولتا کہ [illegible] کو باپ کا مانگ جانا؟" دوست محمد نے کہا۔ "ابھی باپ کو چھوڑ کے جاؤ۔ ادھر جاؤ، جدھر تمہارا دشمن [illegible] ہے۔ وہ [illegible] کو مارتا ہے... تو مارے۔ کریم اور اس کا بالکل [illegible]"

مجھے سخت شرمندگی ہوئی۔ "یہ تم نے کیسے سمجھ لیا [illegible] تمہاری زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ [illegible] کر میں نے لانچ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ہم تو بچ بھی جائیں گے [illegible] تمہاری لانچ بمبئی میں پکڑی جائے گی اور [illegible]"

"ارے بابا! کاہے کو ایسا بولتا کہ لانچ پکڑا جائے گا... سالا دوست محمد اپنا زندگی ایسا [illegible] کبھی ادھر [illegible] بمبئی، کلکتہ، مدراس سب اپنا واسطے کراچی کا جیسا ہے [illegible] کتنا بار گیا، کوئی پاسپورٹ نہیں مانگا [illegible] ادھر اپنا سب یار ہے [illegible] اپنا برادری [illegible] پاس آتا ہے۔ ہم ان کو [illegible] رکھتا ہے۔ [illegible] سیدھا بندرگاہ جاوے اور [illegible] بمبئی کو گولی مارو، اپنا اور [illegible] ادھر سے لانچ چھوڑ کے بمبئی... تم بولو کدھر آنے کا ہے؟"

"تم ساحل پر کہیں دور اتر کے آ جاؤ گے؟" میں نے کہا۔ "یہ بات [illegible] کوئی بات نہیں، لیکن تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گے [illegible] ہماری لانچ کے ساتھ، پھر تم کہاں ملو گے اور کب؟"

"ابھی تم بتاؤ، ہم سارا بمبئی دیکھا ہے۔"

"اچھا... تو پھر جمعرات کی رات، حاجی علی درگاہ پر [illegible]" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، اپنی لانچ کو سیدھا ادھر لاوے گا۔ درگاہ شریف سمندر میں ہے۔" دوست محمد نے کہا۔

"سمندر میں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "کوئی جزیرہ ہے؟"

دوست محمد نے اقرار میں سر ہلایا۔ "بہت بڑا درگاہ شریف ہے، ادھر سب آتا ہے، ہندو، پارسی، عیسائی اور مسلمان۔"

اوپر سے فائر کی آواز سن کے میں اچھل پڑا۔ گولی یقیناً گل نے چلائی تھی اور اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ اس نے [illegible] کو دیکھ لیا ہے۔ میں تیزی سے اوپر پہنچا۔ گل ہاتھ میں ریوالور لیے خفت سے مسکرا رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ کسے مار دیا؟" میں نے کہا۔

گل نے پانی کی طرف اشارہ کیا۔ ایک جگہ مجھے سطح آب پر [illegible] کی نشان دہی کرتی تھی۔ لیکن وہ ایک خاصی بڑی مچھلی تھی۔

"تم مچھلی کا شکار کرنے آئی ہو؟" میں نے کہا۔

"وہ... دراصل میں سمجھی تھی کوئی آدمی ہے۔"

"آدمی کی دو ٹانگیں ہوتی ہیں اور دو ہاتھ۔ اور سر گول ہوتا ہے، وہ مچھلی کی طرح اچھلتا بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس فرق کو ذہن میں رکھنا۔"

"تم نے کہا تھا کہ پانی میں جو چیز نظر آئے اسے گولی مار دینا۔ لہٰذا آئندہ میں محتاط رہوں گی۔ پہلے پوچھ لوں گی کہ آپ استاد [illegible] ہیں اور جواب ہاں میں ملا تو فائر کروں گی، ٹھیک؟"

میں نے [illegible] کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تم مشرق کی مدد کرو اور [illegible] کا پیٹ بھرنے کی تحریک میں حصہ لو۔ دس بج چکے ہیں [illegible] نصیب نہیں ہوئی ہے۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو۔"

ان کے جانے کے بعد میں نے اور دوست محمد نے [illegible] سمندر کے پانی کو اپنی نظروں سے کھنگالنے کا عمل جاری رکھا۔ [illegible] دھوپ میں سمندر کا منظر دور دور تک بالکل واضح تھا۔ سطح آب سے اٹھنے والے بخارات نے ابھی تک حد نگاہ کو [illegible] کیا تھا۔ [illegible] لانچ کے دونوں جانب دو فرلانگ [illegible] تک کوئی چھوٹی سی مچھلی بھی اچھلتی تو دکھائی دیتی تھی۔

محسن جس لانچ پر تھا وہ نسبتاً تیز رفتاری کے ساتھ اپنا چکر پورا کر رہی تھی اور ابھی ہم نے ایک تہائی فاصلہ طے کیا تھا کہ وہ دائرے کا دو تہائی حصہ مکمل کر چکی تھی جب وہ میرے قریب سے گزرنے لگی تو میں نے اس سے رفتار کم رکھنے کو کہا تاکہ یہ فرق ختم ہو اور وہ چکر ہم بھی پورے کر لیں۔ انٹرپول کی اس لانچ کی رفتار ہماری پرانی لانچ کے مقابلے میں دگنی تھی۔

ایک راؤنڈ ختم ہو جانے کے بعد رپورٹ منفی تھی۔ کسی نے پانی میں مچھلیوں کے سوا کوئی چیز متحرک نہیں دیکھی تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق دوسرے راؤنڈ میں ہم نے دائرے کو بڑھا لیا۔ ناکامی میرے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ میں جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔ [illegible] آدمی تھا کوئی چھلاوا نہیں کہ یوں سمندر میں غائب ہو گیا۔ [illegible] اس کا سراغ لانچ کے اندر ملا [illegible] آخری امکان جسے میرا ذہن قبول نہیں کرتا تھا، یہ تھا کہ وہ بے دست و پا ہونے کے بعد ڈوب گیا۔

میں نے دوسرے چکر کے اختتام سے پہلے دوربین لگا کے مشرقی افق کی جانب دیکھا تو مجھے سطح آب پر ایک سیاہ دھبہ سا دکھائی دیا۔ میں نے دوربین کو پھر فوکس کیا۔ دھبہ واضح ہوا اور پھر غائب ہو گیا۔

میں نے دوربین دوست محمد کو دی۔ "تم دیکھو، تھوڑا سا شمال مشرق کی جانب۔ وہ کالی کالی چیز کیا ہے؟"

دوست محمد نے کہا۔ "تم کیا سمجھتا ہے اس کو؟"

"وہ کسی آدمی کا سر بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

دوست محمد نے دوربین کو گھما پھرا کے دیکھا اور تائید کے انداز میں سر ہلایا۔ میری مایوسی ایک دم [illegible] امید کی سرخوشی میں تبدیل ہو گئی۔

"لانچ کو ادھر موڑ لو۔" میں نے کہا۔ "ہم اس کو پکڑ لیں گے، فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔"

"ابھی ہم خود لانچ کو چلا دے گا۔" دوست محمد نیچے اتر گیا۔

چند منٹ میں لانچ نے رخ بدل لیا۔ کریم اوپر آ گیا۔ میں نے اسے دوربین دی۔

"تم بھی دیکھو، کیا ادھر کوئی آدمی ہے؟" میں نے کہا۔

کریم نے اپنی نظر کے مطابق دوربین کو فوکس کیا۔ "ہاں قسم سے آدمی کا کھوپڑی ہے۔" اس نے چلا کر کہا۔ "ابھی سالا بچ کے کدھر جائیں گا؟"

میں نے پھر دوربین اس سے چھین لی۔ میرے دل کی دھڑکن اور لہو کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ لانچ کی رفتار میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور ہم اس شخص کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔

www.paksociety.com

دور بین کے پردے سے میں مسلسل اس ڈوبتی ابھرتی کالی سی
چیز پر نظر رکھے ہوئے تھا جب فاصلہ دو ڈھائی سو گز سے کچھ
کم رہ گیا تو میرے لیے شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ وہ
کوئی آدمی تھا جو سمندر کی موجوں سے لڑتا ہوا تیر رہا تھا اور ہم سے
دور جانے کی سخت جدوجہد میں مصروف تھا۔

"بس استاد پیڈرو" میں نے شدت جذبات میں دانت پیس کے کہا۔ "انتہا نہیں ... سمجھتے تھے تم اس ... سے بھاگ رہے ہو جب تم نے میرے والد وزیر خان کو قتل کیا تھا پھر ... کو قتل کیا تھا اور تم نے بھاگتے ہوئے بھی ان گنت خون کیے تھے مگر بالآخر تمہارا اپنا وقت آ گیا ہے۔ تم اب تک وحشی انسانوں کے جنگل میں روپوش ہونے میں کامیاب رہتے تھے لیکن یہ سمندر تمہارے لیے اب کوئی جائے پناہ نہیں۔ ہاں تمہاری لاش کے لیے یہ ایک قبرستان ہے۔ . ."

کریم بلوچ میری خود کلامی پہ حیران تھا۔ اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ صاحب کا دماغ چل گیا ہے۔ لیکن وہ میرے جذبات کا اندازہ کیسے کر سکتا تھا۔ ایک بہت بڑا اپنے تجربے، اپنی فریب کاری اور اپنی طاقت پر مغرور رہنے والا شکاری دامِ اجل میں آ گیا تھا۔

میں نے اس پر نشانہ لیے بغیر فائر کیا۔ اتنی دور سے میری گولی ایک ایسے ہدف کو کیسے نشانہ بنا سکتی تھی جو بہت چھوٹا تھا اور لہروں کے ساتھ متحرک تھا۔ خود میں لانچ پر کھڑا ہوا تلاطم کے ساتھ حرکت کر رہا تھا لیکن میں اسے وحشت زدہ کرنا چاہتا تھا۔ دو بار فائر کر کے میں نے ایک قہقہہ لگایا۔

"پیڈرو . . . ! بھاگ . . . میں تجھے موقع دیتا ہوں!" میں نے چلا کے کہا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سمندر کے شور میں میری آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اب میں دوربین کے بغیر بھی اس کے ہاتھوں کی دیوانہ وار جدوجہد کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ بار بار پانی میں غائب ہو جاتا تھا پھر ابھر آتا تھا اور آگے بڑھنے کے لیے سمندر سے لڑنے لگتا تھا۔ یہ زندگی کی محبت تھی اور موت کا خوف تھا جو اسے شکست تسلیم نہ کرنے پہ مجبور کرتا تھا ورنہ اب مقابلہ بے سود تھا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ کتنا تھکا ہوا ہوگا۔ وہ لانچ کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ پاگلوں کی طرح بھاگ رہا تھا۔ وہ ہمارے ہاتھوں مرنے کے عذاب سے وحشت زدہ تھا۔

میں نے اس پر دو گولیاں اور چلائیں۔ میں اس پوزیشن میں تھا کہ کوشش کرتا تو اس کو نشانہ بنا لیتا مگر میں اسے اتنی آسانی سے مرنے کی اجازت دینے کے حق میں نہیں تھا۔ میں اسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔

محسن نے یہ دیکھتے ہوئے کہ میں اپنی لانچ کے ساتھ دائرے سے نکل کے سیدھا جا رہا ہوں تو انھوں نے اپنی لانچ کا رخ میری طرف کر دیا۔ لیکن وہ ابھی بہت پیچھے تھے۔

اچانک ہماری لانچ نے ایک جھٹکا لیا۔ اس کا انجن کھانسا اور بند ہو گیا۔

میں نے کریم کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"دیکھتے صاحب۔ ابھی استاد . . . کام تو ٹھیک کر دیں گے" وہ بولا اور وہاں سے بھاگ گیا۔

گل ایک جھٹکے کے ساتھ میرے قریب آئی۔ "کیا ہو گیا ہے؟ پھر کیا یہ بہت بدحواس تھا؟"

میں نے ہنس کے کہا۔ "ہاں۔ وہ دیکھو۔ وہ ہے استاد پیڈرو۔ میرے باپ کا قاتل اور مجھے قتل کے جرم میں پھانسی کے پھندے کی طرف لے جانے کی سازش کرنے والا شکاری . . . موت اسے کہاں لے آئی؟"

"تم نے تین بار فائر کی آواز سنی تھی؟" وہ بولی۔ "کیا وہ ابھی تک زندہ ہے؟"

"پہلے گرفتار تو کر لیں اسے" میں نے کہا۔

"اچھا تو چائے پیو" گل نے کہا۔ "ناشتا بھی کر لو۔"

میں نے صرف چائے کا مگ اٹھا لیا۔ میری نظر ... پر جمی ہوئی تھی جو اب چھ سو گز دور چلا گیا تھا۔ لانچ کا انجن بند تھا مگر مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ ایک میل آگے بھی نکل جاتا تو فرق نہ پڑتا۔ سمندر کی بیکراں وسعت کو عبور کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔

محسن کی لانچ قریب آئی اور ہماری لانچ کے متوازی ہو گئی۔ محسن چھلانگ مار کے آیا اور اس نے دوربین مجھ سے لی۔

"یہ وہی ہے؟" محسن نے کہا۔

"اور کون ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "کوئی اور ہوتا تو بھاگتا کیوں۔ الٹا ہماری طرف آتا اور خدا کا شکر ادا کرتا کہ جان بچانے والے پہنچ گئے۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ٹھیک کیوں رکے تم لوگ؟"

"انجن بند ہو گیا ہے" میں نے کہا۔ "چلتے ہیں ہم ناشتا وغیرہ کر لیں۔"

"ناشتا" محسن چلایا۔ "آہ۔ . . تم نے یاد دلایا۔ مجھے اب تک تو مجھے احساس نہیں تھا لیکن اب تو شاید میں بھوک سے فوت ہو جاؤں۔"

"ہو جاؤ شوق سے" گل نے کہا۔ "تمہارے لیے ناشتا نہیں بنایا ہے۔ اپنے لیے اور سکندر بھائی کے لیے بنایا ہے۔"

"ویسی کی تیسی تمہارے سکندر بھائی کی" محسن نے چائے کا مگ بھرتے چھین لیا اور پھر پرچے میں سے ایک ساتھ چار سلائس اٹھا لیے۔ "یہ تو اپنے پیٹ کا سوال ہے بابا۔ اس میں نہ کوئی کسی کا بھائی نہ یار۔ اور بہت خیال ہے اپنے سکندر بھائی کا تو انھیں اپنے حصے کا ناشتا دے دو۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے فی الحال" میں نے چائے کا دوسرا گھونٹ لیا۔

"یہ اور بھی اچھا ہے۔ دیکھے یار . . . یہ گل ہے بڑی اچھی لڑکی۔ برا تو کسی بات کا مانتی ہی نہیں" محسن مجھ سے مخاطب رہا۔ "اور واہ واہ کیا ذائقہ ہے چائے کا۔ کیا لذت ہے سلائس میں ... سبحان اللہ۔ جیتی رہیے ... کے گھر جائے گی . . . "

گل نے احتجاجی انداز میں واک آؤٹ کیا مگر مسکراتے ہوئے۔ "سارہ گر بھر دے تو وہ اپنا سر پکڑ کر" محسن نے بلند آواز میں کہا۔ گل کا موڈ پھر آف ہو گیا۔

"کیا خیال ہے۔ دوسری لانچ میں چلیں؟" محسن بولا۔

"نہیں . . . انھیں بھی کھا کر کھانے دیں۔ جائیں تو یہاں آ جائیں یا ناشتا وہیں لے جائیں" میں نے کہا۔ "گل اور مشتری بی کے کام کر رہی ہیں۔"

"یار وہ کیا ہے؟" محسن نے ایک جھٹکے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ "یہ . . . کوئی ایسی ہی لانچ ہے جو ایک دم کہاں سے نمودار ہو گئی ہے؟"

"ایک دم تو نہیں آ سکتی۔ ہم ادھر دیکھ ہی نہیں رہے تھے" محسن نے کہا۔

میں نے دوربین لگا کے دیکھی۔ "یہ تو ادھر ہی آ رہی ہے۔ لیکن ابھی بہت دور ہے۔ تین چار میل یا اس سے بھی زیادہ۔ سمندر میں ایسے فاصلے بھی کم لگتے ہیں۔"

لانچ کا انجن دوبارہ اسٹارٹ ہو کے بند ہوا اور تیسری کوشش میں چل پڑا۔ محسن نے واپس اپنی لانچ پر چھلانگ لگائی۔

"تم ست آنا ادھر" میں نے کہا۔ "انٹرپول کی یہ لانچ کسی ... آ جائے تو اچھا ہے۔ ہمیں اسی میں آگے جانا ہے۔"

ایک بار پھر لانچ کی رفتار میں اضافہ ہوا۔ اب میری نگاہ بیک وقت استاد پیڈرو پر اور قریب آنے والی لانچ پر تھی تاہم ... میری تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ یہ ... پیڈرو کو بچا ... پوری کوشش کرے گا کہ انھیں متوجہ کر لے۔

... ریوالور نکال کے پوری طرح مستعد ہو گیا۔ جو لانچ بہت دور لگتی تھی وہ اب صاف نظر آنے لگی تھی۔ ادھر میرے اور پیڈرو کے درمیان فاصلہ سو گز سے بھی کم رہ گیا تھا۔ میں نے احتیاط سے نشانہ لے کر فائر کیا۔ پیڈرو کا سر اوپر اٹھا اور غائب ہو گیا۔ میں انتظار کرتا رہا۔ وہ دوبارہ سطح آب پر آیا تو میں نے بیک وقت دو فائر کیے۔ پچاس گز کے فاصلے سے میں اس کی کھوپڑی ... سکتا تھا لیکن میرا نشانہ خطا گیا۔ لہریں پیڈرو کو اچھال رہی تھیں اور میرے لیے توازن قائم رکھنا مشکل سے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

سخت مشتعل ہو کے میں نے پھر نشانہ لیا اور گولی چلائی۔ وہ اب اتنے کم فاصلے پر تھا کہ میں نے اس کے چلانے کی آواز صاف سنی۔ وہ آخری بار ابھرا اور غائب ہو گیا۔ جب لانچ اس جگہ پہنچی جہاں پیڈرو میری گولی کا نشانہ بنا تھا تو وہاں مجھے پانی میں تازہ خون کے دھارے نظر آئے۔ خوشی کی ایک بے قابو کر دینے والی لہر نے میرے وجود میں سنسنی پھیلا دی۔ پیڈرو کا میرے ہاتھوں قتل ہونا میری ایک بہت پرانی خواہش کی تکمیل تھی۔ اسے میں دنیا میں اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ پیڈرو کا لہو میں دن رات دہکنے والی انتقام کی آتش سوزاں کو ... کب سرد کرے گا۔ یہ انتظار بالآخر یہاں تمام ہوا۔ میں نے محسوس کیا جیسے ابھی ابھی میں نے جلاد کے ہاتھوں کی طرح لیور کھینچا ہے اور قتل کے جرم میں عدالت انصاف سے موت کی سزا پانے والے پیڈرو کا جسم سمندر میں غائب نہیں ہوا، پھانسی گھاٹ کے اندھے کنویں میں پہنچ گیا ہے۔

اب میں نے اس لانچ کو دیکھا جو مشکل سے تین چار فرلانگ دور تھی۔ یہ کوئی مسافر بردار لانچ تھی۔ مجھے فوراً اس وردی کا خیال آیا جو میرے جسم پر تھی۔ یہ وردی شک پیدا کر سکتی تھی کہ انٹرپول والے ایسی چھوٹی اور پرائیویٹ لانچ پر کیوں ہیں۔ میں نے کسی ناخوشگوار صورت حال سے نمٹنے کے لیے خود روپوشی اختیار کر لینا بہتر سمجھا۔

میں نے پیچھے جا کے دوست محمد کو ساری بات سمجھائی۔ "تم اوپر جاؤ استاد، اور کریم سے کہو کہ چار گز ہٹ کے ... ایک لانچ ادھر آ رہی ہے۔ اس کا راستہ کاٹنے کی کوشش کرے۔ میں اور گل اس وقت ... اوپر نہیں جا سکتے۔" میں نے کہا۔ "سمجھ رہے ہو نا میری بات کو؟"

"سمجھ گیا بابا۔ ابھی تم فکر نہ کرو۔ ابھی سب ٹھیک کر لیں گا" دوست محمد نے مجھے تسلی دی۔ "یہ سمندر اپنا شہر ہے۔ اپنا وطن ہے۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے فائر کی آواز سنی ہو . . ." میں نے کہا اور دوست محمد کو اوپر جاتا دیکھتا رہا۔ ہماری لانچ ابھی

www.paksociety.com

تک آگے بڑھ رہی تھی پھر اس کا رخ تھوڑا سا بدلا۔ دوسری لانچ کی آواز بہت قریب سے آئی۔
اور پھر کریم بلوچ نے چلا کے کسی سے کچھ کہا۔ اس کا دوسری لانچ پر سے کیا جواب دیا گیا، یہ میں نہ سن سکا لیکن دوست محمد

نے قہقہہ مارا تو مجھے اطمینان ہوا۔ میں گل کے کمرے میں گھس گیا۔ وہ جوتے اور ٹوپی اتار کے بڑی بے تکلفی سے پلنگ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جھڑپ کے اٹھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھر گئے۔

"بیٹھو بیٹھو۔" میں نے سگریٹ جلا کے سامنے والی برتھ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مشتری کہاں ہے؟"

"لیٹ اور میرے لیے ناشتا بنانے گئی تھی۔ تم بہت خوش ہو؟"

"یہ میری زندگی کا ایک اہم دن ہے۔" میں نے کہا۔ "آج تک میں نے وہ قرض تو چکا دیا ہے جو ایک بیٹے کی حیثیت سے مجھ پر واجب تھا۔ تمھیں کیا معلوم کہ میں نے کتنی مشکل سے انتقام کی آگ کو دبا رکھا تھا۔ خود کو قائل کیا تھا کہ میری ذاتی دشمنی کے جذبات میرے اس مشن سے زیادہ اہم نہیں جس کا مقصد چند غداروں کو بے نقاب کرنا اور انھیں کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔ لیکن جب یہ شخص میرے سامنے آتا تھا تو میرے زخم تازہ ہو جاتے تھے۔ میری نظروں میں میرے والد کا چہرہ آ جاتا تھا جو انصاف مانگتا تھا۔ تم کو معلوم ہو گا کہ انھیں کیسے رسوا کن اور قابل صد ملامت طریقے سے بے کسی بے بسی کا عذاب دے کر مارا گیا تھا اور مارنے والے بھی نمک حرام تھے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" گل نے کہا۔

"پاکستان میں میرے مصائب و آلام کی داستان کا حرف اول یہی شخص تھا۔" میں نے کہا۔ "آج اس کی اپنی داستان تمام ہوئی۔ کاش یہ تماشائے عبرت میں ان سب کو دکھا سکتا۔۔۔"

"چلو چھوڑو سکندر بھائی۔ اسے اپنے اعمال کی سزا اس دنیا میں تو مل گئی۔" گل نے کہا۔ "ابھی آخرت کی سزا باقی ہے جو زیادہ سخت ہو گی۔"

مشتری بڑبڑاتی اندر آ گئی۔ "لو صاحب جی، اچھا ہوا کہ میں نے کچھ زیادہ ناشتا بنا لیا۔ میں تیسری بار تو بنا چکی ہوں۔"

"مگر میں نے تو ایک بار بھی ناشتا نہیں کیا اور نہ گل نے۔"

"پھر کیوں بنا رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"ابھی وہ آپ کا چہیتا کریم۔ اس کے پیٹ کا دوزخ تو خدا ہی بھرے۔ ایک بار دونوں کے لیے ناشتا بنا کے لے گئی۔ اس کے لیے اور استاد کے لیے۔۔۔ وہ سب چٹ کر گیا۔ پھر آپ کے لیے اور استاد کے لیے بنایا۔ اس میں بھی شامل ہو گیا۔ بس اب بندی نے کہا لو فرزند وہ پھر آ جائے گا۔ قسم اللہ کی صاحب مجھ کو ایسے آدمی چلنے کا چار دن بھی۔" مشتری نے جاتے جاتے جھوٹے زبان کا استعمال جاری رکھا۔

"شادی کے بعد کیا ہو گا مشتری؟" میں نے کہا۔ "تم … سے شام تک پکاتی رہو گی اور وہ کھاتا رہے گا۔ در اصل اس کے پیٹ میں جن ہے۔ وہ بے چارہ بھی کیا کرے؟"

"پیٹ میں جن ہے؟" مشتری کے ہاتھ میں چمچہ لرز کے رہ گیا۔

"ہاں، کئی سال سے ہے۔" میں نے بے نیازی سے لہجے کو برقرار رکھا۔ "بہت جتن کیے۔ بڑے زبردست عامل آئے مگر اسے نکال نہ سکے۔ پھر ایک بہت بڑے جلالی قسم کے پیر صاحب کے پاس لے گئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ جن کیا جن کے باپ کو بھی نکال دوں میں۔ ابھی شاہ جنات کو حکم دوں تو وہ اندر ہی اسے کان سے پکڑ لائیں۔ مگر یہ سمجھ لو کہ گھر کا جن ہے گھر سے جانے کا نہیں۔ ابھی تو بوتل میں بند ہے۔۔۔"

"بوتل میں۔۔۔ کون سی بوتل میں؟" مشتری کو اس انکشاف نے بدحواس کر دیا تھا۔ "اس کے پیٹ میں کوئی بوتل بھی ہے؟"

"نہیں بھئی۔ انھوں نے کریم کو ایک بوتل سے تشبیہ دی تھی ہر طرف سے بند جو ہے۔" میں نے کہا۔ "اب جن باہر آتا تو کسی پر آتا۔ ظاہر ہے اس کی بیوی پر۔"

"بیوی پر کیوں صاحب جی؟" مشتری کی حالت غیر ہو گئی۔

"جن تو عورتوں پر ہی آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور کریم کے گھر میں بیوی کے سوا کون عورت ہو گی۔ چنانچہ کریم نے کہا کہ بھئی اپنی گزارا کریں گا جن کے ساتھ۔ ویسے خاصا بے ضرر سا جن ہے۔ ہاں کھانے کو کچھ نہ ملے تو پھر۔۔۔" میں نے دونوں کانوں کو … کے انداز میں چھوا۔

"پھر کیا ہوتا ہے؟" مشتری کانپتے ہوئے بولی۔

"بھئی سب کچھ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "آخر وہ جن ہے۔ کلیجہ چبا جائے، خون پی جائے۔ کریم کا دل توڑ دے۔ بس تم خیال کرنا کریم کو نہیں، جن کو۔ مزے مزے کے کھانے کھلا کے خوش رکھنا، تمھیں کچھ نہیں ہو گا۔"

مشتری کے جاتے ہی گل نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اب تک وہ بڑی مشکل میں تھی اور اسے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"آپ بھی حد کرتے ہیں سکندر بھائی۔ خواہ مخواہ اسے ڈرا دیا۔" گل نے کہا۔

"انگریز کہتے ہیں کہ مرد کے دل کا راستہ اس کے پیٹ سے گزرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے مشتری کو کامیاب ازدواجی زندگی کا گر سکھا دیا ہے۔ وہ جب پیٹ کے جن کو قابو میں رکھے گی تو کریم اس کے قابو میں رہے گا۔"

اوپر سے دوست محمد نے مجھے آواز دی۔ "ابھی آ جاؤ۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

میں نے اوپر جا کے دیکھا تو وہ لانچ کافی دور جا چکی تھی۔

اور ہم اپنی دوسری لانچ کے قریب پہنچ چکے تھے۔

"کون لوگ تھے اس لانچ میں۔ ادھر کیوں آ گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"ادھر اپن سے ملنے کا واسطے نہیں آیا تھا۔ اپنا راستہ پر جا رہا تھا۔" وہ بولا۔ "اپنا کراچی کا لوگ تھا۔"

"یہ لانچ کراچی جا رہی تھی؟ تم پہچانتے تھے کسی کو؟"

"ہاں بابا۔ سب سیر سپاٹا بیوپاری والا لوگ تھا۔" دوست محمد نے کہا۔ "ادھر کا آدمی ادھر جاتا۔ مسلمان لوگ کو ادھر سے پاکستان جانے کا ویزا نہیں ملتا۔ بہوت پریشانی سے ملتا ہے۔ اب کسی کو ایک دم جانے کو ہے۔ اس کا ماں مر گیا ہے ادھر یا شادی ماڈی ہے۔ کسی کا نوکری لگ گیا ہے۔ وہ کیسے آوے گا۔ سب مجبور لوگ ہے۔ آدھا خاندان انڈیا میں، آدھا پاکستان میں۔"

"یہ تو بہت غلط ہو رہا ہے دوست محمد۔"

"سب جگہ ہوتا ہے سکندر صاحب! ادھر ولایت میں بھی ہوتا ہے۔ سارا دنیا سے لوگ ادھر ادھر جاتا ہے۔" دوست محمد نے کہا۔ "امریکا جاتا ہے اور سارا یورپ جاتا ہے۔ کیا پکڑا جاتا ہے؟ نہیں پکڑا جاتا۔ انڈیا کا مسلمان لوگ کیا کرے۔ ادھر بہوت تنگ ہے۔ ابھی جس کو موقع ملتا ہے آ جاتا ہے۔"

ایک بار پھر دونوں لانچوں کے قریب آتے ہی ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ دوست محمد کو میں پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ جب اس نے اعلان کیا کہ ہم واپس جا رہے ہیں تو کریم بلوچ کا چہرہ اتر گیا۔

"تم یہ کیا بولتا استاد۔۔۔ ہم کیسے واپس جائیں گا؟"

"اس لانچ میں جائے گا جیسے آیا تھا۔"

"لیکن استاد۔ خیال کرو مشتری کا۔۔۔"

"اس کا کیا خیال کریں گا؟" دوست محمد نے کہا۔ "ابھی تو خیال کر اس کو کیا بیٹی سے جا کر نظام ہیوٹ بنانے کا تھا۔ سالا پتر یاد۔"

میں نے سب کی نظر بچا کے کریم کو آنکھ ماری۔ "استاد ٹھیک کہتا ہے کریم۔ اپنی اماں تمھارا واپس چلے جانا ہی ٹھیک ہے۔"

"اماں آپ لوگ۔۔۔" کریم سر کھجا کے بولا۔

"ہم آ جائیں گے بعد میں۔" میں نے کہا۔

اس کے بعد وہ معاملات عمل اختیار میں گھرا میں، منظور حسن کے اپنے تین سوٹ کیس اور … لانچ پر منتقل کیے۔ کپڑے صرف ایک … تھے جو میں نے سردار جی کو ان کا شک دور کرنے کے لیے کھول کے دکھا دیا۔

سردار جی سخت تشویش میں تھے۔ ابھی تک ان کو ہمارے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا تھا اور وہ ہمارے ساتھ تھے

تو صرف ایک جذبۂ احسان مندی کا اظہار کرنے کے لیے کہ ہم نے انھیں بروقت مدد کر کے بچا لیا تھا ورنہ معلوم نہیں ان کا کیا ہوتا۔ جیسے ان کے باقی ساتھی مارے گئے تھے ویسے ہی وہ بھی مارے جاتے۔ ابھی تک مقابلے کا آخری داؤ … چل رہا تھا مگر چند روز کے مارے جانے کے بعد حملہ آوروں کا تو صفایا ہو گیا تھا۔ ان کا ایک ساتھی زندہ بچا لیا گیا تھا جو تفتیش کے لیے محفوظ پڑا تھا۔ سردار جی کے پیشہ ورانہ فرائض کا تقاضا تھا کہ وہ اس واردات کی اطلاع فوراً اپنے مرکز کو یا دوسرے ساتھیوں کو دیں۔ لیکن عملی صورت حال یہ تھی کہ وہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئے تھے۔ پہلے ایک خطرناک مجرموں کے گروہ نے انھیں یرغمال بنا لیا تھا۔ اب ہم انھیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر رہے تھے۔ ہم نے ان کی وردیاں بھی لے لی تھیں اور ہمارے پاس انھی کا اسلحہ تھا۔ ہم ان کے میگا فون اور ان کے وائرلیس ایسے استعمال کر رہے تھے جیسے ہمارا نام بھی ٹریبیول کے عملے میں لکھا جا چکا ہے۔

لیکن جب سردار جی اور ان کے برمی ساتھی کے درمیان کسی قسم کی گفتگو ہوئی ہو، جس میں انھوں نے ایک دوسرے پر اپنی تشویش ظاہر کی ہو لیکن ذریعۂ اظہار ان کے درمیان کیا تھا، زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم۔ سردار جی پنجابی اور ہندی اور تلوگو کی زبان کے علاوہ انگریزی پر قادر تھے۔ ان کا ساتھی برمی میں کچھ کہتا تھا تو معلوم نہیں سردار جی کیا سمجھتے تھے اور کیا نہیں سمجھتے تھے۔ اگر وہ تھوڑی بہت برمی سیکھ گئے تھے تو انھوں نے یہ بات ظاہر نہیں کی تھی۔ ایک دوسرے کی بات سمجھنے کا مسئلہ تو اس سے پہلے بھی ہو گا جب عملے کے سب ارکان ایک ہی لانچ پر دن رات ساتھ رہتے تھے لیکن اصل بات یہ ہے کہ زبان ایک مؤثر ذریعہ ضرور ہے مگر ابلاغ کے لیے ناگزیر نہیں ہے۔ انسان کی زبان جانور بھی سمجھ جاتے ہیں اور وہ جو کوئی زبان بول ہی نہیں سکتے اور گونگے کہلاتے ہیں، وہ بھی دل کی بات جان لیتے ہیں۔

محسن جب دوسرا سوٹ کیس اٹھا کے لایا تو گل اس کے ساتھ تھی۔ پیچھے کریم نے تیسرا سوٹ کیس سر پر اٹھا رکھا تھا اور

www.paksociety.com

یہ دونوں صورتیں کیس خطرناک اسباب سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک میں گولہ بارود اور اسلحہ تھا تو دوسرے میں کرنسی تھی اور جعلی دستاویزات تیار کرنے کا سامان تھا جو کپڑوں کے نیچے چھپا دیا گیا تھا۔

سردار جی نے کہا: ”بھئی یہ کیا ہو رہا ہے گڑیا؟“

اور گل نے بڑی معصومیت سے جواب دیا: ”جی۔۔۔ ان میں زنانہ کپڑے ہیں میرے۔ آپ کو دکھا دوں؟“

سردار جی نے کہا: ”نہیں۔۔۔ یہ بات نہیں۔۔۔“

گل نے مسکرا کے اور بل کھا کے ایک ادائے ناز سے تھینک یو کہا اور آگے بڑھ گئی۔

سردار جی اب مجھ سے مخاطب ہوئے: ”بھئی یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ تمہارا سامان ادھر کیوں آ رہا ہے؟“

میں نے کہا: ”کیا محسن نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟“

سردار جی نے نفی میں سر ہلایا: ”مجھے تو نہیں بتایا۔“

”ہو سکتا ہے آپ کے دوسرے ساتھی کو بتایا ہو۔“ میں نے بات کو طول دینے کی غرض سے کہا۔

”لو جی، اس نے کیا بتانا تھا۔۔۔“

”اچھا۔۔۔ میں پوچھتا ہوں محسن سے۔“ میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔ میرا مقصد اس کام کی تکمیل تک اپنے عزائم کے بارے میں کچھ نہ بتانا تھا۔

اپنی لانچ پر پہنچ کے میں نے دوست محمد سے کہا: ”اب دیر مت کرو۔ بس بھاگ جاؤ فوراً۔ ایسا نہ ہو سردار جی اڑ جائیں اور ہمیں ان کے ساتھ بھی زبردستی کرنی پڑ جائے۔“

”زبردستی کرنی پڑے گی۔“ محسن بولا۔ ”ابھی نہ سہی بعد میں سہی۔ وہ آسانی سے ہماری بات کیسے مان سکتے ہیں؟“

میں نے اور محسن نے واپس انٹرپول کی لانچ پر چھلانگ ماری ہی تھی کہ ہماری لانچ روانہ ہو گئی۔

”یہ۔۔۔ یہ کیا ہوا۔ تمہاری لانچ تو جا رہی ہے۔“ سردار جی نے کہا۔ ”تم۔۔۔ کیوں نہیں گئے؟“ وہ اب انگریزی میں بات کر رہے تھے۔

”ہم آپ کے ساتھ رہنے پر مجبور ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس لانچ میں کچھ ایسی خرابی ہو گئی ہے کہ وہ سفر کے قابل نہیں رہی۔ وہ کراچی چلی جائے گی اور ہمیں بمبئی جانا ہے۔“

”لیکن ہم تو بمبئی نہیں جا رہے ہیں۔“ سردار جی نے کہا۔ ”ہم ایک خاص علاقے میں پہریداری کی ڈیوٹی کرتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اب ہماری بھی مجبوری ہے۔ بیچ سمندر میں ہم کیا کریں؟“ میں نے کہا۔ ”اور آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اگر ہم مداخلت نہ کرتے تو وہ حملہ آور اس وقت بھی آپ پر قابض ہوتے۔ رات سے وہ آپ کو گن پوائنٹ پر لے جا رہے تھے۔ وہ آپ کو زبردستی قطب شمالی یا جنوبی افریقہ بھی لے جا سکتے تھے۔ آپ کو مار کے لانچ پر قبضہ بھی کر سکتے تھے اور بعد میں لانچ کو غرق بھی کر سکتے تھے۔“

”اور تم۔۔۔ تم کیا کرو گے؟“ سردار جی نے کہا۔

”ہم آپ سے صرف درخواست کریں گے کہ ہماری مدد کریں۔“ میں نے کہا۔ ”اور یہ کام کوئی ناممکن۔۔۔ یا غیر قانونی نہیں۔۔۔“

”غیر قانونی تو ہے۔“ سردار جی نے کہا۔ ”ہم اس علاقے کی نگرانی پر مامور ہیں۔ یہ ہمارا کام نہیں ہے کہ ادھر ادھر سے مسافر اٹھاتے پھریں۔“

”میں نے مدد کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اگر آپ کسی کو ڈوبتا دیکھیں گے یا کسی جگہ مسافروں کو لے جانے والی کشتی، لانچ یا بحری جہاز سے ایس او ایس موصول کریں گے تو کیا مسافروں کو اُن کی منزل تک نہیں پہنچائیں گے؟“ میں نے کہا۔

”ہم انہیں دوسرے بحری جہاز پر منتقل کریں گے۔۔۔ لیکن تمہارا تو کیس ہی مختلف ہے جو ابھی تک میں سمجھا ہی نہیں۔“

”تو پھر یہ بہتر ہو گا کہ آپ اس صورت حال کو اچھی طرح سمجھ لیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا خیال ہے اگر ہم آپ کے کیبن میں بیٹھ کے بات کریں اور ود اے کپ آف ٹی؟“

”مجھے چائے بنانی نہیں آتی۔“ سردار جی نے کہا۔

”آپ کو ایک بہترین ہاؤس میڈ کی خدمات حاصل ہیں۔ اس نے چوہدری کی جیسی پہن رکھی ہے اسے نظر انداز کر دیں۔ وہ ایک سلیقہ مند اور باکمال عورت ہے۔“

”باکمال تو تم سب ہی ہو۔“ سردار جی نے کہا۔ انگریزی میں اتنی سنجیدگی سے بات کرتے ہوئے ان کی شخصیت بالکل بدل گئی تھی اور اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس صورت حالات سے ناخوش ہیں۔

سردار جی کا کیبن وہی تھا جس میں کچھ دیر پہلے استاد دینا بند نے قید حیات سے نجات پانے سے پہلے اسیری کے آخری لمحات گزارے تھے۔ اس کا سامان مختصر مگر پُر تکلف تھا۔ اب سے پہلے کیبن میں گل نے اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا اور اس کا حلیہ ابھی تک نیم مردانہ نیم زنانہ تھا۔ اس نے مردانہ پتلون پہن رکھی تھی مگر ٹوپی ہٹ جانے سے اس کے شانوں تک لہراتے ہوئے بال آزاد ہو گئے تھے اور بڑی شوخ ادا کے ساتھ چہرے پر سایہ فگن تھے۔

”بچی، ذرا دیکھو تو کچن کہاں ہے۔ کچن میں کیا ہے جو تم ایک اجنبی کی طرح یہیں بیٹھی رہ سکتی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”شاباش چلے جاؤ۔“

”مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں کسی لمبے چکر میں پڑ گیا ہوں۔“ سردار جی نے کہا۔ ”تم لوگوں نے جان تو بچائی ہے میری۔ مگر ساتھ ہی مصیبت میں ڈال دی ہے اور یہ بھی تم نے کسی ذاتی مفاد ہی کی خاطر کیا تھا۔“

”میں ابھی سب بتا دیتا ہوں۔ اس سے آپ کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔“

”غلط فہمی یا خوش فہمی؟“ سردار جی نے طنز سے کہا۔

”ہم شریف لوگ ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا گواہ ہمارا رویہ ہی ہے۔ کیا ہم آپ کے ساتھ اسی طرح پیش آئے ہیں جیسے وہ لوگ پیش آئے تھے۔ وہ جرائم پیشہ اور غیر مہذب لوگ تھے۔ ہم مہذب اور تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ کیا اس فرق کو آپ نظر انداز کر دیں گے؟ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ ہم اپنے اور آپ کے دشمنوں سے لڑنے میں طاقت کے استعمال میں کم نہیں تھے ورنہ ان پر غالب نہیں آ سکتے تھے۔ اس کے باوجود ہم آپ کے خلاف جارحانہ رویہ نہیں رکھتے۔ آپ کو دلیل سے قائل کرنے کے بجائے ہم طاقت سے مجبور بھی کر سکتے ہیں مگر ہم ایسا نہیں کریں گے۔“

سردار جی کے لبوں پر اطمینان کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”یار تُو بڑا سیانا بندہ ایں۔“ پھر وہ پنجابی پر آ گئے۔ ”چل چھیتی گل کر۔“

”بات لمبی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مناسب ہو گا کہ آپ اپنے ساتھی کو پہلے یہ سمجھا دیں کہ ہم بمبئی کی طرف جا رہے ہیں مگر جلدی جانا ضروری نہیں ہے۔ راستے میں کسی جگہ ہم آپ سے کہیں گے کہ لنگر ڈال دیں۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔“

یہ بات بھی سردار جی کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن انہوں نے کہا: ”اچھا جی۔۔۔ جو کرنے کرتار۔“ اور اپنے برمی ساتھی کو مختصر بات پرائمری کلاس کی انگلش میں سمجھائی۔ اس قسم کی زبان کمار دو بچے والے استعمال کرتے ہیں۔

انہوں نے کہا: ”وی گو۔۔۔ بمبئی۔“

”بمبئی؟“ برمی نے حیران ہو کے کہا اور سوال اس کی آنکھوں میں اتر آیا۔

سردار جی نے اس کے شانے پر تھپکی دے کر اسے مطمئن رہنے کو کہا اور واپس چلے گئے۔ محسن اُن کے کیبن کا ٹوٹا ہوا دروازہ مرمت کرنے کی کوشش میں مصروف تھا چنانچہ ہم نے دوسرے کیبن کو استعمال کیا۔

”سردار امریندر سنگھ“ میں نے بیٹھنے کے بعد کہا۔ ”سب سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہاری لانچ کیسے ہائی جیک ہو گئی تھی۔ کیا میں سگریٹ پی سکتا ہوں؟“

”پیو بادشاہو۔ اپن بھی تھوڑی سی پی لیں۔“ اس نے ایک سائڈ ریک سے شراب کی بوتل نکالی۔

”آپ کس قسم کے سکھ ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”وہ سب کہاں ہیں کیس، کڑا، کرپان، کنگھا اور کچھا۔ آپ کے پانچ ککے۔“

”صرف کیس ملے ہیں۔ نوکری کی مجبوری ہے۔ باقی دل کی گرہ پاٹے سب ہے۔“ سردار جی نے کہا۔

”آپ پر تو شاید سگریٹ بھی حرام ہے۔“

”وہ تو آپ لوگوں پر بھی شراب حرام ہے۔ مگر کیا مسلمان شراب نہیں پیتے جنہیں میں نے خود کراچی میں بار دیکھے ہیں۔“ وہ خفا ہونے لگا۔

”میرا مطلب آپ کی دل آزاری نہیں تھا اور ان سوالات کا تعلق ذاتیات سے نہیں تھا۔ خیر۔۔۔ آپ فرمائیں۔“

”او بھائی جی! بس بندہ مارا جاتا ہے نیکی کر کے۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے۔“ سردار جی نے فریاد کے انداز میں کہا۔ ”یہ کچھ لوگ ایک کشتی میں تھے۔ ہمیں دور سے دیکھ کے انہوں نے رومال اور کپڑے ہلانے شروع کیے۔ ہم تو سیدھے گزر جاتے لیکن یہ سمجھ کر کہ ان پر کوئی مصیبت آ گئی ہے۔ ہم نے رخ بدلا اور اُن کی کشتی کے قریب چلے گئے۔“

”یہ واقعہ کہاں پیش آیا تھا میرا مطلب ہے۔۔۔“

”میں سمجھ گیا۔ وہ علاقہ پاکستان کی سمندری حدود سے زیادہ قریب تھا۔“ سردار جی نے کہا۔ ”وہ کشتی بھی بادبانی تھی اور عموماً گہرے سمندروں میں نظر نہیں آتی۔ خیر ہم نے جب نزدیک جا کے پوچھا تو ایک شخص چلانے لگا کہ ہم لٹ گئے۔ برباد ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ ماہی گیر ہیں۔ ساحل سے بہت دور نکل آئے تھے اور طوفان میں پھنس گئے تھے۔ ڈوبتے ڈوبتے بچ گئے مگر کھانے پینے کو کچھ نہیں رہا۔ انہوں نے کھانے کا تو کر لیا۔ سمندر سے مچھلی پکڑی اور کھالی۔ مچھیرے کچی مچھلی کھا لیتے ہیں۔ پینے کو کچھ نہیں تھا۔ اتفاق سے ناریل جیسی کوئی چیز بہتی ہوئی گزری انہوں نے اسے پکڑا اور توڑا تو اندر ناریل جیسا پانی بھی تھا۔ وہ تھوڑا تھوڑا سب نے پیا۔ شروع میں پینے والے زیادہ پی گئے تھے۔ باقی کو قطروں کے حساب سے ملا مگر اس کے بعد ان کی حالت زیادہ بگڑ گئی جو دوسروں کا حصہ لے گئے تھے۔ ایک تو مر چکا تھا۔ باقی دو مرنے والے تھے۔ انہیں فوری طبی امداد کی ضرورت تھی اور خوراک کی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان سب کو لانچ پر منتقل کریں۔ اب کیا پتا چلتا ہے بادشاہو کہ بندہ مکر کر رہا ہے یا سچ مچ مر گیا ہے۔ لو جی لانچ پر پہنچتے ہی مُردہ تو کھڑا ہو گیا۔ اس سے

www.paksociety.com

پہلے وہ اکٹھا ہوا تھا لاش کی طرح اور ساتھی بھی رو کے پڑا تھا۔ باقی دو کا بھی ایسا ہی لگتا تھا کہ بس فوت ہونے والے ہیں۔ لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے اور ہانپنے کر رہے تھے۔ وہ سارے ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے ریوالور نکال کے۔ ہمارے بندے تو ہل بھی نہ سکے۔ اس کے بعد جیسا انھوں نے کہا، ہم نے کیا۔"

"پھر وہ سب لوگ کیوں مارے گئے، جب وہ تعاون کر رہے تھے؟"

"بس جی، موت آئی تھی ان کی۔" سردار جی نے اداس ہو کے کہا۔ "میں نے تو منع کر دیا تھا کہ کوئی لڑائی جھگڑا نہ کرے اور کسی نے مزاحمت بھی نہیں کی لیکن وہ بڑے . . . " سردار جی نے چند گالیوں سے پیڈرو کے ساتھیوں کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا۔ "انھوں نے کہا کہ یہ تو بڑا مشکل ہے کہ ایک بندے پر ایک بندہ کھڑا رہے۔ نفری کم کرو۔ کسی وجہ کے بغیر انھوں نے نفری کم کر دی۔ یہ ریڈیو آپریٹر سب سے پہلے مارا گیا تھا۔ ان کو ڈر تھا کہ کسی کو اطلاع نہ کر دے۔ وہ اپنا ریڈیو آپریٹر لائے تھے جس کو تم نے مار دیا۔ اچھا کیا۔ ان کے باقی ساتھیوں کی لاشیں کہاں ہیں؟"

"اوہ وہ تو اس لانچ پر ہی چلی گئیں۔" میں نے کہا۔ "خیر وہ ٹھکانے لگا دیں گے۔"

"وہ بندے آدھے پورے ہوتے ہیں۔"

"ہاں، مگر زیادہ کام کا وہ بندہ ہے جو ابھی زندہ ہے اور بہت کچھ بتا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لاشوں کو ہم سمندر میں پھینک دیں گے۔"

"میں اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتا ہوں۔" سردار جی پھر انگریزی پر آ گئے۔ "میرے ہی کہنے پر لانچ ان بدمعاشوں کی مدد کے لیے گئی تھی۔"

"آپ کو معلوم تو نہیں تھا کہ وہ بدمعاش ہیں۔ آپ کی جگہ میں بھی ہوتا تو یہی کرتا۔" میں نے تسلی دی۔

"اب میں کسی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ مجھے ایک نہیں، دو نہیں، جرمانے بھرنے پڑیں گے۔ یہ میرا فرض تھا کہ اس غاصبانہ قبضے کی فوراً رپورٹ کرتا۔ میں تو ایک لاش بھی واپس نہیں لے جا سکتا۔"

"آپ فرض کر لیں کہ قبضہ ابھی ختم نہیں ہوا۔"

"ہم آپس میں بھی رابطہ رکھتے ہیں۔ بہت دیر سے ہم نے نہ کسی کو پیغام دیا ہے، نہ کسی کا پیغام وصول کیا ہے۔ یہ بہت خطرناک بات ہے۔ ہمارے ساتھی تشویش میں مبتلا ہو

گئے تو ہمیں لاپتا قرار دے دیں گے۔ بہ طریقہ ہماری ... ہو جائے گی۔ اور تلاش میں ہیلی کاپٹر بھی شامل ہو سکتے ہیں۔"

"یہ تو واقعی خطرناک بات ہے۔" میں نے کہا۔ "اس طرح میں ہمارے لیے بھی پریشانی پیدا ہو جائے گی۔ لیکن اس کا ایک حل بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"آپ اپنا پیغام دیں کہ آپ کے ساتھی یقیناً ... ہوں گے۔ ایک تو آپ اپنی پوزیشن غلط بتائیں تا کہ ادھر نہ آئیں۔ پھر آپ یہ کہیں کہ لانچ خطرناک قسم کے مجرموں کے قبضے میں ہے اور انھوں نے دھمکی دی ہے کہ کوئی قریب آیا تو لانچ کو دھماکے سے اڑا دیں گے۔ ایک ایک ... کو ... گے۔ آپ ان سے کہیں کہ وہ دور رہیں۔ آپ کی مدد ... بھی نہ کریں۔"

"آخر یہ سب میں کیوں کروں؟" سردار جی نے ایک ... سوال کیا۔

"ہم نے بھی آپ کی مدد کی تھی۔" میں نے کہا۔ "فرض کریں میں آپ سے اس نیکی کے بدلے ایک نیکی مانگتا ہوں۔"

"تم نے مدد کی تھی انٹرپول کی۔ جو ایک قانونی تنظیم ہے اور ایسے کسی بھی ادارے کی مدد کرتے ہیں کسی کے لیے رسک نہ ہوتا۔ پھر ایک بات اور ہے۔ بڑا ... مانتا۔ تم نے اپنے ... کے خلاف اپنا دفاع کیا تھا۔ تمھارے درمیان جھگڑا کیا تھا؟ یہ کاروباری مخاصمت تھی۔ ذاتی عداوت یا ... رقابت، یہ نہیں جانتا لیکن اس قسم کے مقابلے میں دیکھتا رہتا ہوں ... مجرموں کے گروہ بھی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں۔ حملہ تم پر ہوا تھا مگر تمھاری خوش قسمتی سے ساتھی اور تم نے انھیں نیست و نابود کر دیا۔ تم بطور خاص ... کے مشن پر نہیں آئے تھے۔ میں نے تم کو ... ہمیں بچاؤ۔ تم بچ گئے تو ہم بھی بچ گئے۔ لیکن اب تم نے ... کر دیا ہے اس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے کہ کہیں میں ... قسم کے لوگوں کی مدد کر کے شریک جرم تو نہیں ہو جاؤں گا؟"

میں نے اس کی پوری بات صبر سے سنی۔ پھر میں نے کہا۔ "آپ کی تشویش بجا ہے سردار راجندر سنگھ جی، لیکن ابھی ... کہا تھا کہ کیا ہم بھی آپ کو اتنے ہی بھلے لگتے ہیں۔ آپ کو؟ آپ کا ... کیا کہتا ہے؟"

"دل کی کیا بات کرتے ہو بادشاہو۔ . . دل تو میرا ... ساتھ ہے مگر یہ جو لوہے کی منزل میں تھوڑی بہت عقل ہے ... وجود کے بارے میں شک ساری جاتی ہے۔" وہ اچھی بات پر ہنسا۔

اپنے بھی ہار جیتنے والے ہیں۔"

"ابھی ساڑھے گیارہ ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ غور کریں سردار جی! کیا ہم آپ کو زبردستی نہیں لے جا سکتے؟" ریوالور دکھا کے میں نے پتلون اٹھا کے جراب میں سے ریوالور نکالا اور واپس رکھ لیا۔ "ہم سب مسلح ہیں مگر پھر بھی میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔"

"او بھلے آدمی۔ مجھے کچھ تو بتاؤ یہ معاملہ کیا ہے، کون ہو تم لوگ آخر؟" سردار جی نے کہا۔ "چنگے بھلے جوان پڑھے لکھے اور معقول لگتے ہو۔ سو ہنی شکل دی ہے واہ گورو نے۔ پھر یہ کیا کرتے پھر رہے ہو تم سمندر میں؟ تم نے انٹرپول کی وردی پہن لی ہے ایک وہ گڑبڑی جو معلوم نہیں تمھاری کیا ہے۔ وہ بھی وردی کی بے پناہ ٹھاٹھ گولیاں چلاتی ہے۔ . . گھر بار کوئی نہیں تم سب کا۔ تمھیں پوچھنے والا کوئی نہیں کہ تم کس چکر میں ہو؟"

"اس سوال کے جواب میں سچ اور صرف سچ بولنا تو بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے میرے لیے۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "میں آپ کو سچ کے اقتباسات سناتا ہوں۔ اس میں جھوٹ بالکل نہیں ہوگا لیکن ایک خطرہ ہے آپ جو کچھ سنو گے اس کو بھول جاؤ گے۔ جب ہم آپ کو خدا حافظ کہیں گے تو ہمیں ایک دوسرے کو اپنی اپنی نیکی کے حوالے سے یاد رکھیں گے۔ نیکی کا یہ ہے کہ نیکی کر سمندر میں ڈال۔ آپ کے کسی ساتھی کو ہم نے نہیں مارا۔ ایک بندہ آپ کی تحویل میں ہے اس سے جو تفتیش کر سکو کر لینا۔ ہمارا نام لینے کی ضرورت بھی نہیں۔ انھوں نے حملہ کیا۔ آپ لوگوں نے مقابلہ کیا۔ کچھ لوگ ان کے مارے گئے۔ کچھ آپ کے۔ ایک آدمی زندہ ہاتھ آیا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے، یہ میرا کام ہے کیا بیان دوں اور کیا نہ دوں۔" سردار جی نے کہا۔ "پہلے تم مجھے قائل کرو۔"

"سردار جی! میں ایک صنعت کار کا بیٹا ہوں۔ جب میں لندن میں زیر تعلیم تھا تو کچھ نمک حراموں نے میرے والد کے کاروبار پر قبضہ کر لیا اور انھیں مار دیا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں پاکستان پہنچ گیا۔"

"تم پاکستانی ہو؟" سردار جی چونکے۔

"ہاں خالص پاکستانی۔" میں نے کہا۔ "پاکستان میں وہ ... میرے بھی دشمن ہو گئے۔ انھوں نے پولیس کے ساتھ مل کر کچھ اپنی بدمعاشی کے زور پر اور کچھ دولت کی مدد سے مجھ پر بیسیوں مقدمات بنوا دیے۔ ان میں قتل کے جھوٹے مقدمات بھی شامل تھے۔ میں نے قانونی جنگ لڑنے کی بہت کوشش کی مگر پتا چلا یہ لوگ وہ پاکستان میں مافیا جیسا طاقتور گروہ تھے۔ ان کے سامنے قانون بھی بے بس تھا اور پھر آپ جانتے ہیں کہ قانون میں کتنے سقم اور ... ہیں گواہوں کے اور ثبوت کے۔ جرم کرنے والے ثبوت نہیں چھوڑتے۔ الٹا اپنی بے گناہی کے گواہ لے آتے ہیں۔"

"وہ سب میں جانتا ہوں۔" سردار جی نے ایک آہ بھری۔

"بس تو اس کے بعد میں نے کہا کہ اب اپنے معاملات میں خود طے کروں گا۔ میرا خدا جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں اور میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا ہوں۔ ہاں ایک بات اور بتا دوں۔ ان بدمعاشوں نے جو میرے والد کے قاتل تھے، مجھے ایک بڑی پیش کش کی تھی کہ میں ان کے ناجائز کاروبار میں شریک ہو جاؤں۔ میرے والد بھی اسی لیے قتل کیے گئے تھے کہ انھوں نے انکار کیا تھا۔ شاید دھمکی دے دی تھی کہ وہ اس کاروبار میں ملوث افراد کو قانون کے حوالے کر دیں گے۔ وہ قانون کی طاقت پر اپنے یقین کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اب آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے جو غلط ہے مگر میری مجبوری ہے اور ضرورت ہے۔ یہ وہ شخص تھا جس کو میں نے ابھی ابھی تہیا کر کے مارا۔ استاد پیڈرو اس کا نام تھا۔ یہ بہت بڑا بدمعاش شمار ہوتا تھا۔ اسی نے میرے والد کا قتل کیا تھا۔ مگر قانون اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکا تھا کیونکہ ساری بات ثبوت اور شہادت کی تھی۔ میرے لیے ان بدمعاشوں سے صلح کر لینا اور ان کے کاروبار میں شریک ہونا بہت منافع بخش سودا ہوتا۔ میں لاکھوں کیا کروڑوں بنا لیتا اور محفوظ بھی رہتا۔ ورنہ بدنام بھی نہ ہوتا مگر آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرا دماغ خراب ہے۔ وزیر خان میرا باپ تھا۔ آباؤ اجداد سب خالص پٹھان تھے۔ غیرت و حمیت اور عزت و آبرو کے معاملے میں ہم جب اڑ جاتے ہیں تو پھر جان جانا معمولی بات ہے۔ یہی میں نے کیا۔ بعد میں وہ بدمعاش میری منگیتر کو اٹھا کے لے گئے۔ اسے وہ بمبئی سے جا رہے ہیں اور میں اسے واپس لانا چاہتا ہوں۔"

"بلے بلے۔ . . ہیرو۔" سردار جی نے کہا۔ "خیر سے اس کا کیا نام ہے۔ . . ہیروئن کا۔ . .؟"

"رابعہ۔" میں نے کہا۔ "بہت زبردست اور کامیاب وکیل تھی وہ۔ اور میری وجہ سے اس نے بھی بہت دکھ اٹھائے۔ یہ جنگ ابھی جاری ہے اور اس کا ایک سین آپ نے دیکھا۔ مجھے خدا پر بھروسا ہے۔ میرے مددگار میرے دوست ہیں۔ جیسے یہ دونوں میاں بیوی جو میرے ساتھ ہیں۔ . . سوری۔ . . میں

www.paksociety.com

نے کہا تھا کہ میں جھوٹ بالکل نہیں بولوں گا۔ یہ میاں بیوی نہیں ہیں۔"

سردار جی منہ پھاڑ کے ہنسے: "عاشق معشوق ہیں؟ واہ! ہم تو سمجھ گئے تھے جی۔ خیر واہ گورو کرے گا تو میاں بیوی بھی بن جائیں گے۔"

"یہ تھی میری زندگی کی فلمی اسٹوری۔" میں نے کہا۔ "اب مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ رابعہ کو اغوا کرنے والے اسے ایک بحری جہاز میں لے کر گئے ہیں۔ ہم انہی کے تعاقب میں نکلے کہ یہ بدمعاش ہمارے پیچھے لگ گئے۔ یہ ہمارا راستہ روکنا چاہتے تھے۔ معلوم نہیں انھوں نے کیسے ہمارا سراغ لگا لیا۔ ہم بہت رازداری سے جیل سے نکلے تھے۔ اگر آپ نے ہمیں پہلے دیکھا ہوتا تو ہمارا حلیہ ہی مختلف نظر آتا۔ ہم داڑھی مونچھ بڑھائے ہوئے تھے۔ پولیس کی وردی میں تھے۔ انھوں نے بھی یہ وردی پہن کے ہمیں دھوکا دینا چاہا تھا۔ جب یہی کام ہم کر رہے تھے تو ہم نے تو انھیں پہچان لیا تھا ان کی بے وقوفی کے باعث۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم پہچانے جاتے ہیں یا نہیں۔"

"اب کس کے سامنے جانے کا خیال ہے اوئے بس شکر کرو کہ جان بچ گئی۔ گھر واپس جاؤ۔" سردار جی نے کہا۔

"آپ نے یہ بات ٹھیک بارہ بجے کہی ہے اس لیے میں معاف کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

سردار جی چونکے۔ "بارہ بج گئے؟"

"جی... اسی لیے آپ ساری بات بھول گئے۔" میں نے کہا۔ "واپسی کا اب کیا سوال۔ مجھے رابعہ کو واپس ساتھ لے کر آنا ہے اور یہی جان بچانے کی بات۔ تو اب تک خدا نے بچایا ہے تو آگے بھی وہی بچائے گا اور نہیں بچائے گا تو میری کوشش سے کیا ہوگا۔ رابعہ جس جہاز پر ہے وہ ابھی بمبئی نہیں پہنچا۔ میں اسے راستے میں ہی پکڑ لینا چاہتا ہوں۔"

"کیسے پکڑنا ہے؟ جال ڈال کے یا کانٹے سے؟"

"آپ مذاق کر لیں، یہ میرا کام ہے۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ کیسے کرنا ہے۔ آپ سے صرف اتنی مدد کی درخواست ہے کہ مجھے اس جہاز تک پہنچا دیں۔ جب ہم اس جہاز پر پہنچ جائیں گے تو آپ کا کام ختم۔ آپ واپس آ جائیں اور جو کارروائی چاہیں کریں۔ اگر ہمارا کام بغیر کارروائی کے نکل جائے تو اچھا ہے ورنہ جہاں میرا ... سوا سیر۔ آپ کہہ دیں کہ سکندر اور محسن کے ساتھ کیا ہوا۔ پھر انھوں نے دیا گیا۔ ہم نے کیسے مقابلہ کیا۔ کتنے بندے مارے اور آپ کی کیا مدد کی۔ یہ سب بتا دینے سے آپ کو کوئی خاص نقصان نہیں ہوگا۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ ہمارے بمبئی پہنچنے کی خبر کسی کو نہ ہو۔ سامنے بیچ میں سے اگر آپ یہ آخری پیچ نکال دیں کہ آپ نے ہمیں جہاز تک پہنچایا تو اس میں آپ پر بھی کوئی الزام نہیں آئے گا۔ ہم چلے جاتے ہیں اور نیکی کا فرض بھی ادا ہو جائے گا۔ ایک چھوٹا سا جھوٹ بولنا ہے کہ وہ اپنی لانچ میں بھاگ گئے تھے۔"

"چھوٹا سا جھوٹ۔ سچا واہ گورو معاف کرے۔ بڑے بڑے جھوٹ بولے ہیں۔" سردار راجندر سنگھ نے ... "پھر یہ جھوٹ کیوں نہیں بولوں گا؟ میں جو ... اس لیے کہ یہ نیکی والا جھوٹ ہے۔ وہی والا..."

"آپ جو باتیں ہو رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اور اپنے ساتھی سے بھی مشورہ کر لیں۔ اگر وہ آپ کے ... سے متفق نہ ہوا... بالکل جانے کے لیے ... تو ..." محسن بھی آ گیا۔

"او نہیں یار۔ وہ بڑا سیانا بندہ ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ کیسے سب دیکھتا رہتا ہے اور اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ افسوس مجھے صرف یہ ہے کہ جن کی امانت تھی ان تک نہیں پہنچی... جو مر گئے ان کے پیارے انھیں دیکھ بھی نہ سکے۔ خیر دیکھنے سے دکھ بڑھتا ہی ہے۔ اب صبر کر لیں گے۔"

"میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا... رابعہ کو بتاؤں گا آپ کے بارے میں۔" میں نے کہا۔ گل پیچھے بیٹھ کے بتانے لگی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اپنے رانجھا صاحب ... بتاؤ مجھے۔ اگر تمھیں اپنی ہیر مل ... اور دشمنوں نے تمھاری ... تو تمھاری واپسی کیسے ہوگی؟"

"واپسی پھر کہاں ہوگی سردار جی؟" میں نے کہا۔

"یہ اطلاع غلط بھی تو ہو سکتی ہے کہ تمھاری ہیر اس جہاز پر ہے۔"

"اطلاع سو فی صد درست ہے۔" میں نے کہا۔ "اور غلط ہوتی تب بھی میں جاتا۔"

سردار جی نے ایک آہ بھری۔ "بڑا مشکل کام ہے عشق بھی اور پھر آج کل کے زمانے میں... توبہ توبہ۔"

"آپ نے کسی سے عشق کیا ہے؟" گل نے کہا۔

"ہاں، جوانی میں ڈیڑھ عشق کیا تھا۔ ایک آدھا... پورا... اس کے بعد اپنا باجا بج گیا۔"

"باجا بج گیا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں یار۔ اپنے کو پتا چلا تو اس نے کہا چل بیٹھ ... پھر بینڈ باجا آ گیا اور ... بالکل سواد نہیں آیا۔ نہ کوئی ولن نہ ظالم سماج۔ نہ ماں باپ ... ہے تو خیر سے سال ہو گیا شادی کو۔ ہر چھ ماہ میں ایک بچے کا اوسط ہے۔"

مجھے بہت ہنسی آئی۔ "ہر چھ ماہ کے بعد کیسے؟ کیا یہ بھی ..."

"اوپر والے کی فضل ہے۔ کچھ ایسا ہی ہے۔ اکٹھے دو ہو گئے تو اوسط کیا آیا حساب کر لو آدھے سے۔"

"اور آدھے عشق کا قصہ کیا ہے؟" محسن بولا۔

"وہ... پہلا عشق تھا... سچا مگر کچا... اس میں بھی سردار راجندر سنگھ کا ہی باجا بجا۔ پہلے تو ایک بڑا ظالم رقیب آ گیا۔ اس نے بہت پیار سے سمجھایا اور دھمکی بھی دی۔ ... اس نے ... بنا دیا اور ڈنڈے سے بجایا اور ... کروا دی۔ عشق بھی کیا تو کس سے۔ میں نے سچے عاشق کی طرح کہا کہ عشق نہ پوچھے ذات۔ وہ بھنگن ہے تو کیا۔ دل جس پہ آ جائے وہی لیلیٰ۔ سچا عشق تھا تا جی، ایسے کون ختم کر سکتا تھا۔ ایک دن ہم جذبات کے گھوڑے پر سوار تھے، گھوڑا بے قابو ہو گیا۔ پھر ... نے ... اور اس کے سامنے ناک سے زمین پر لکیریں نکالنی پڑیں۔"

میں نے اور محسن نے تو ہنسی پر کچھ قابو پا لیا مگر گل کو ہنسی آ گئی تو روکے نہیں رکتی تھی۔

"یہ تو پورا عشق ہوا سردار جی، آپ آدھا کہتے ہیں۔"

"آدھا ہی تھا یار۔ ویسے ٹھیک تھی نا... وہ بھی ... تو میں ... سامنے۔ امرتسر کی کسی سڑک پہ جھاڑو دے رہا ہوتا۔" سردار جی نے ہنس کے کہا۔ "اچھا ہی ہوا نا کہ آدھا رہا۔" انھوں نے جیب میں سے ایک پرس نکالا اور اس میں لگی ہوئی تصویر کو دیدار عام کے لیے پیش کیا۔ "ہے نا آفت؟"

مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ ایک بھدی موٹی سی لڑکی تھی ... سے اس کی بھنڈی کھڑی ہوئی تھی۔ تاہم سردار جی کے کہنے کے مطابق جس پہ دل آ جائے وہی لیلیٰ ہے اور لیلیٰ کے لیے تو بہت پہلے کہا گیا ہے کہ اسے مجنوں کی آنکھ سے دیکھو۔ چنانچہ ہم سب نے اتفاق رائے سے اس کو آفت قرار دیا۔ سردار جی کو جیوری کے فیصلے سے بے حد خوشی ہوئی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد جو گل نے ایجاد کیا تھا اور محسن کے خیال میں اس خوراک سے بہرحال بہتر تھا جو ہم گناہ گاروں کو دوزخ میں کھلانے کو ... میں ہو گیا۔ گل اور محسن کے تعلقات بھی ... ہو گئے تھے۔ گل ایک کیبن میں بند ہو گئی اور محسن نے ... کام کے شغل ... اس نے وائرلیس آپریٹری اور ریڈار کی ... اٹھا لیا۔ جو شخص اندر بندھا ہوا مر گیا تھا اسے بھی سمندر کے سپرد کیا۔ پھر وہ سردار جی کے ساتھ واحد زندہ قیدی سے تفتیش کرتا رہا۔

اپنی بدقسمتی کے باعث زندہ گرفتار ہونے والا بھی اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکا جو مجھے وائرلیس آپریٹر شاہ دین نے بتایا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ شیخوپورہ کا رہنے والا تھا۔ اسے بھی ایس پی سراج نے پیڈرو کے ذریعے حاصل کیا تھا۔ وہ شیخوپورہ کا ہسٹری شیٹر تھا اور پولیس نے اسے پیڈرو کے ساتھ بھیجتے وقت وہی کہا تھا جو شاہ دین سے نارووال کے تھانے دار ملک شیر نے کہا تھا۔ وہ پیڈرو کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس نے صرف ایک نئی بات بتائی کہ پاس کے نام سے سفر کرنے والا کسی چوہدری دلاور کا ڈرائیور تھا اور وہی باقی سب لوگوں کو ایک کار میں کراچی تک لایا تھا۔

جب میں سو کر اٹھا تو شام ڈھل چکی تھی اور سورج مغرب میں بہت نیچے آ گیا تھا۔ لانچ بڑی تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی لیکن چاروں طرف جہاں تک نگاہ جاتی تھی سمندر ایک ویران صحرا کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ زمین اور آسمان کے درمیان صرف سمندر کی گونج تھی یا لانچ کے انجن کی آواز۔ افق کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ایک خلا تھا جس میں زندگی کے آثار مفقود تھے۔ نہ کہیں کوئی پرندہ تھا نہ کوئی پودا یا درخت۔ ایک ہوائی جہاز اوپر سے گزرا تو اپنے جیسے زندہ انسانوں کا تصور ذرا سی دیر کے لیے قائم ہوا۔ جہاز اوجھل ہوا تو تنہائی کا جمود پھر مسلط ہو گیا۔

محسن نے مجھے بتایا کہ اس نے تفتیش سے کیا مفید معلومات حاصل کی ہیں۔ پھر وہ سونے چلا گیا۔ گو مختصر رات میں ہم نیند پوری نہ کر سکے تھے اور آنے والی رات کے بارے میں یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ خود سردار جی بھی سوئے پڑے تھے۔ صرف وہ بدھو تھا جو ایک پراسرار قسم کی شخصیت رکھتا تھا۔ خاموش اور بظاہر تمام معاملات سے بے تعلق نظر آنے والا اور اپنی ذات کے خول میں بند رہنے والا۔ لیکن ہر وقت مستعد اور ہوشیار۔ کھلی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھتا تھا مگر کوئی اسے دیکھے تو وہ انجان بن جاتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ مسلسل ایک ہی جگہ بیٹھے وائرلیس اور ریڈار کے کام میں مصروف ہے مگر ابھی تک تھکن کا شکار نظر نہیں آتا۔

میں نے اس سے دوستانہ مراسم استوار کرنے کی کوشش کی اور کچھ دیر اس سے اشاروں کی زبان میں گفتگو کرنے کے بعد میں نے لانچ چلانے کی خواہش کا اظہار کیا اور اس نے مسکراتے ہوئے مجھے اس کا موقع دیا۔ یہ میرے لیے ایک مشکل کام ثابت ہوا۔ اگر وہ مسلسل نگرانی نہ کر رہا ہوتا تو میں عملاً بیڑا غرق کر دیتا۔ پھر میں نے

www.paksociety.com

اُس نے پوچھا۔ "ہاں۔" اور اس نے مسکرا کے اقرار میں سر ہلایا۔
چائے کی طلب مجھے بھی تھی چنانچہ میں نے گن کے کیبن میں جھانک کے کہا۔ "ہے کوئی اللہ کا بندہ جاگ رہا ہے یہاں؟"
گن نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔ "یہاں کوئی اللہ کا بندہ نہیں ایک بندی ہے جو سو رہی ہے۔"
"اس بندی سے اللہ کے نام پر ایک پیالی چائے کا سوال ہے۔"
"بلیک ملے گی۔ انعام کیا ملے گا؟" وہ اٹھ بیٹھی۔
"انعام۔۔۔ میں تم کو غروبِ آفتاب کا بے حد خوب صورت منظر بالکل مفت دکھاؤں گا۔ چائے لے کر عرشے پر آجانا۔" میں نے کہا۔
وہ ہنس پڑی اور میں نے عرشے کا رخ کیا۔ میں سگریٹ سلگا کے ٹہلتا رہا اور بہت سے ایسے سوالات پر غور کرتا رہا جو اب میرے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ ایک سوال یہ تھا کہ مسلسل کئی گھنٹے کا یہ سفر اب تک کس سمت میں ہوا ہے۔ ہم اس بات کا یقین کیسے کر سکتے ہیں کہ ہمارا اور ایس ایس کراچی تھرٹی کا ایک ہی راستہ ہے اور ہمارے درمیان فاصلہ کتنا کم ہوا ہے؟ اندازے کا معمولی سا فرق بڑھتے بڑھتے سیکڑوں میل کا فرق بن جاتا ہے۔ ہم نے سردار جی سے بمبئی والے راستے پر چین کے ایس ایس کراچی تھرٹی تک پہنچنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ کیا لانچ اسی راستے پر جا رہی تھی اور کیا پانی پر نظر نہ آنے والا یہ راستہ ایک ہی تھا؟ جن کے پاس جو کچھ معلومات رکھتا تھا اس کے مطابق خشکی پر بنی ہوئی سڑکوں کی طرح فضا میں ہوائی جہازوں کے لیے راستے متعین ہیں اور سمندر میں بحری جہازوں کے لیے۔ اگر یہ بات درست تھی تو پھر تشویش بے جا تھی مگر درمیانی فاصلے کے بارے میں بے یقینی کا اضطراب اپنی جگہ تھا۔ ہم اس بحری جہاز کے قریب بھی ہو سکتے تھے لیکن اس سے بہت دور بھی۔ تعلی یہ معلوم نہیں تھا کہ اس بحری جہاز نے کتنی رفتار سے سفر کیا تھا اور لانچ کی تیز رفتاری کے باعث ہم نے وقت کے فاصلے کو کم کیا تو ہم اس بحری جہاز تک آج رات پہنچنے میں کامیاب ہوں گے یا نہیں؟
دوسرے زیادہ پریشان کن سوال کا تعلق اُن واقعات سے تھا جو ہماری لانچ پر حملے اور پیڈرو کی ہلاکت کے دوران میں پیش آئے تھے۔ ہم نے سفر کا اہتمام انتہائی رازداری سے کیا تھا مگر یہ ہماری خوش فہمی تھی کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔
چودھری دلاور اینڈ کمپنی کو سب معلوم تھا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور نہ جانے کب سے دیکھ رہے تھے۔ جب ہم نے ایس ایس کراچی تھرٹی کا تعاقب شروع کیا تو انھوں نے اپنے آدمی ہمارے تعاقب میں روانہ کر دیے۔ انھوں نے بھی اس کے لیے کس پلاننگ کی تھی۔ سوال یہ تھا کہ وہ اتنا عرصہ دور دور رہ کر ہماری تیاری کو کیسے دیکھتے رہے اور کیوں دیکھتے رہے؟ اُن کو روانگی کے وقت کا علم کیسے ہوا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ان کو پہلے سے کچھ معلوم نہ ہو مگر ہمارے روانہ ہوتے ہی کسی نے انھیں مطلع کر دیا ہو کہ محسن اور سکندر کس لانچ پر ... نکلے ہیں۔ یہ اطلاع انھیں کس نے فراہم کی؟ ... دوست محمد؟ کیا ان تینوں میں سے کوئی ... نہیں۔ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ ہم تینوں سے کسی نے مخبر ہونے کا ثبوت دیا ہو۔ ہمارے علاوہ کون ہو سکتا ہے؟
جب گن چائے لے کر آئی تو میں ریلنگ پر جھکا ہوا لانچ کے چلنے سے اٹھنے والی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔
"کہاں ہے میرا انعام؟" گن مجھے چائے کا کپ تھما کے بولی۔
میں نے تاریک ہوتے اُفق کو دیکھا۔ "اب سورج تو غروب ہو گیا۔ خیر تم طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھ لینا۔ فرق صرف سمت کا ہوگا، منظر بالکل ایک سا ہوتا ہے۔"
وہ چائے کا مگ لے کر قریب رکھی ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ "بھائی۔ یہ بتاؤ کہ کھانا کیسا پکاتی ہوں میں؟"
میں نے کہا۔ "کمال ... جب تم پکاؤ گی مزے ... جائیں گے۔"
"کیوں، دن میں کیا کھایا تھا؟" وہ بگڑ کر بولی۔
"وہ ... اچھا وہ کھانا تھا، پھر تو بھئی سبحان اللہ ماشاء اللہ وغیرہ ... کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔
وہ اداس ہو گئی۔ "مجھے پکانا آتا نہیں۔ آتا کیسے؟ ... مائیں سکھاتی ہیں یا لڑکیاں گھروں میں سیکھتی ہیں۔ میرا نہ کوئی گھر تھا اور نہ ماں تھی۔ میں نے جو کچھ سیکھا ..."
"ارے پاگل ... میں تو مذاق کر رہا تھا۔ کیا مجھے معلوم ..."
میں نے کہا۔ "لیکن تم میں سیکھنے کی اور خود کو بدل لینے کی زبردست صلاحیت ہے، صرف صلاحیت ہی نہیں ہے، ہمت بھی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جب تم امورِ خانہ داری ... تو سب کو ... کر دو گی، رابعہ کو بھی اور ... نازو کو بھی۔" میرے منہ سے نام نکلنے والا تھا۔ بے وقت میری زبان پر نازو کا نام آ گیا۔
"امورِ خانہ داری!" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "... مشقت کا کام ہے یہ ڈکیتی سے۔ کچھ عرصے پہلے کوئی ایسی بات ... سامنے کرتا ہی نہیں تھا۔ میرا گھر کہاں ہوگا؟ میں نے کبھی ... سوچا تھا اور میں تصور تک نہیں کر سکتی تھی کہ کسی شہر ... شام تک میں وہ سب کروں گی جو عورت اپنے گھر میں کرتی ..."

... سمجھ گیا کہ اب اس کے جذبات کا دھارا کس سمت بہنے لگا ہے۔ یہ خواب دیکھنے کا اور سننے کا وقت نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔ "تم نے اس بڑی کو جانتے ہو ... بتا ..."
"نہیں، تم نے کب کہا تھا؟"
میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ "میں اس سے کہہ چکا تھا، خیر ... دو۔"
گن کے جاتے ہی میں نے اس قیدی کو تلاش کیا۔ وہ مجھے ... میں بند ملا۔ محسن نے اُس سے خاصی سخت تفتیش کی تھی۔ ... تشدد کے نشانات کی صورت میں عیاں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں دہشت اُتر آئی۔ وہ رسیوں سے بندھا ہوا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ الگ الگ اوپر اٹھے ہوئے تھے اور وہ دیوار سے لگ کے سیدھا کھڑا رہنے پر مجبور تھا۔ رسیوں کے دوسرے سرے کو چھت کے قریب ہک سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ وہ اچھلتا تو پیر زمین پر لگتے ہی اس کے سارے جسم کو جھٹکا لگتا۔ نہ وہ دائیں بائیں ہو سکتا تھا اور نہ جھک سکتا تھا۔ بیٹھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
وہ سخت اذیت میں تھا اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کی قوتِ برداشت بہت جلد جواب دینے والی ہے۔
میں نے اس کے قریب جا کے کہا۔ "میں تم کو آزاد کر سکتا ہوں اگر تم میرے چند سوالات کا جواب دے سکو۔"
"نہیں ... میں سب بتا چکا ہوں۔" وہ کراہنے لگا۔
"نہیں، ایک بات تم سے کسی نے نہیں پوچھی۔" میں نے کہا۔ "تم نے بتایا ہے کہ جو باس تھا وہ چودھری دلاور کا ڈرائیور تھا۔ تم نے چودھری دلاور کا نام کہاں سے سنا؟"
"باس ... کی زبان سے ..."
"تمھارا مطلب ہے تو اس نے تمھیں یہ بات بتائی؟" میں نے کہا اور جلتی ہوئی سگریٹ اُس کی گردن پر لگا دی۔ "جھوٹ مت بولو۔ جو لوگ تم کو اتنی دور سے الگ الگ مقامات سے لائے تھے، وہ اتنے بے وقوف نہیں ہو سکتے۔ اگر رازداری مقصود نہ ہوتی تو وہ جانتے ... کے لوگ جمع نہ کرتے۔ ان کے اپنے پاس بہت سے ... غلام تھے۔"
وہ بری طرح تڑپا تھا لیکن اپنی جگہ تھم کے رہ گیا تھا۔
"ایک بار پھر سوچ لو۔" میں نے کہا۔
"وہ ... وہ کراچی میں ملے تھے ... ہم سب کو لینے آئے تھے اور کار چودھری دلاور کی تھی۔" وہ بولا۔
"تم کو کیسے معلوم ہوا؟"
"مجھے موقع مل گیا تھا راستے میں ایک جگہ ... ڈرائیور اُتر کے سگریٹ لینے گیا تھا۔ میں نے ڈیش بورڈ کا کمپارٹمنٹ کھول کے دیکھا ... اس میں کاغذات تھے۔ گاڑی کے مالک کا نام چودھری دلاور لکھا ہوا تھا۔"
میں نے سر ہلایا۔ "یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ اب آگے بولو۔"
"چودھری دلاور صاحب ... اور چیف ... دونوں ہوائی جہاز سے کراچی پہنچے تھے۔" اس نے کہا۔ "وہ جب یہاں سے گئے تو ڈرائیور اُن کو چودھری صاحب کہہ رہا تھا۔"
"یہ چیف کون تھا؟ اس کا نام تمھیں معلوم ہے؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کالا سا آدمی تھا، موٹے ... گھونگر والے بالوں والا۔ اس کے کانوں میں مندریاں تھیں ... اس نے سب کو ادائیگی کی تھی، ڈرائیور کے سوا۔ باس نے اس سے کہا تھا کہ تمھیں خود چودھری صاحب انعام دیں گے جب تم واپس آؤ گے۔ وہ کہنے لگا کہ ... کیا مجھے نہیں جانا ہے؟ ... میں تو ڈرائیور ہوں ان کا۔ انھوں نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ باس نے کہا کہ چلو اب میں کہہ رہا ہوں، تم ساتھ جاؤ گے ان کے، ورنہ ... انھیں کون لے جائے گا۔ اس وقت تک باس نے نہیں بتایا تھا ... کہ وہ خود بھی ہمارے ساتھ ہوگا۔ وہ ہمیں رات کو کشتی پر سوار ہونے کے بعد نظر آیا جب کشتی روانہ ہو چکی تھی۔"
"اچھا، کشتی کس کی تھی؟"
"مجھے نہیں معلوم ..."
"تم لوگ کس وقت چلے تھے؟" میں نے کہا۔
"رات آٹھ بجے۔ اس وقت کشتی کوئی اور چلا رہا تھا۔ کوئی غریب سا ماہی گیر تھا۔ اس کی بیوی تھی اور ایک بیٹی ... اُن سے چیف نے کہا تھا کہ ہم سمندر کی سیر کریں گے۔ رات دس بجے تک کے پانچ سو روپے دیں گے۔ ایک گھنٹا جانے کا، ایک گھنٹا واپس آنے کا ... لیکن ان میں سے کوئی بھی واپس نہیں گیا۔"
"سب کو مار دیا تم نے؟"
"میں نے نہیں ... اُن دونوں نے ... جو باس اور چیف کہلاتے تھے۔ باس نے پہلے بڈھے کو دھکا دیا۔ وہ سمندر میں گر گیا تو اس کی بیوی چلانے لگی، اسے چیف نے پانی میں پھینک دیا ... یہ رات تو ساڑھے نو بجے کی بات ہے ... اس کے بعد انھوں نے لڑکی کو پکڑ لیا ... وہ بہت چیخی چلائی ..."
"اور تم بے غیرت ... دیکھتے رہے؟" میں نے اس کے سر پر مکا مارا۔ اس کا سر لٹک گیا۔
"ایک نے ہمت کی تھی ... لڑکی نے اُسے مدد کے لیے بلایا تھا ... اس نے اُسے شوٹ کر دیا ... اور ہم سے کہا کہ یہ تم سب کے لیے سبق ہے۔" وہ بڑی مشکل سے سر اٹھا

www.paksociety.com

کے پلادا" اس کے بعد کسی نے۔۔۔ دخل نہیں دیا۔ انھوں نے
۔۔۔ حرامیوں نے۔۔۔ لڑکی کو زبردستی شراب پلائی۔۔۔ پھر
اُس کے ساتھ زبردستی کی۔۔۔ انھوں نے ہم سے بھی کہا۔۔۔
مگر کسی نے بھی ہمت نہیں کی۔۔۔ معلوم نہیں وہ بے ہوش تھی۔۔۔
یا مر چکی تھی۔۔۔ جب انھوں نے اس کو بھی سمندر میں ڈال دیا۔"

میرا خون آہستہ آہستہ کھولنے لگا تھا مگر وہ جن کو میں موت سے سخت تر سزا دے سکتا تھا اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے۔ اس دنیا میں اُن کی بربریت اور شیطانی ہوس کا شکار ہونے والی وہ آخری لڑکی تھی جسے میں نہیں جانتا تھا مگر اس کے آخری وقت کے سارے کرب کو محسوس کر سکتا تھا۔ جب بھوکے ننگے بھیڑیوں نے اس کی نظروں کے سامنے پہلے باپ کو اور پھر اس کی ماں کو مار ڈالا تھا اور ابھی پہلی کے زخم سے بے ... ہی زیادہ تھا کہ وہ بھیڑیے اس پر پل پڑے اور اُسے نوچنے کھسوٹنے لگے تھے۔ یقیناً اُس نے موت کی آرزو کی ہوگی۔ اس کی یہ آرزو پوری تو ہوئی مگر کتنی بار مرنے کے بعد۔

"اب۔۔۔ خدا کے لیے مجھے کھول دو۔۔۔ چند منٹ کے لیے بیٹھنے دو۔۔۔" وہ چلایا۔

"کاش میرے بیٹے تم کو اس لڑکی سے زیادہ بے آبرو کر کے مارنا ممکن ہوتا" میں نے کہا۔ "مجھے تو افسوس ہے کہ باقی سب اتنی آسان موت کیوں مر گئے۔"

وہ چلاتا رہ گیا اور میں باہر نکل آیا۔ دروازے کے پاس گل انتہائی وحشت زدہ کھڑی تھی۔ شاید اُس نے بھی وہ سب سن لیا تھا جو میں نے سنا تھا۔ کچھ کہے بغیر وہ میرے ساتھ عرشے پر آ گئی۔ میں ذہنی طور پر بہت پریشان تھا۔ اس تفتیش کے نتیجے میں مجھے ایک ایسی بات معلوم ہو گئی تھی جس نے میرے اعصاب کو متاثر کیا تھا۔ میرے کان ایک مجبور لڑکی کی چیخوں سے سنسنا رہے تھے جو کمزور اور بے بس تھی اور اس کے مقابل ہوس کے شکاری تھے۔ بے ضمیر، ننگِ انسانیت اور درندہ صفت۔

"سکندر بھائی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" گل نے کہا۔

میں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اسے قریب کر لیا۔ "تم تو کہتی تھیں کہ تمھیں کسی سے ڈر نہیں لگتا۔"

"ایسا میں نے۔۔۔ کبھی نہیں سنا۔۔۔ کبھی نہیں دیکھا۔۔۔ ہم یہاں لوٹتے تھے۔۔۔ ہم تو ڈاکو تھے سکندر بھائی!" اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "کوئی ہماری جان لینے کی نیت سے سامنے آتا تھا تو مارا بھی جاتا تھا۔۔۔ مگر ہم نے کسی عورت سے کبھی کوئی بدسلوکی نہیں ... تھی۔ کسی گاؤں کی عزت نہیں لوٹی تھی۔ ڈاکو تو ڈاکو ہوتے ہیں۔ کون روک سکتا ہے ان کو۔۔۔ لیکن ہم لوگوں نے کبھی نہیں کیا تھا جو ان شیطانوں نے کیا۔"

"تم کیوں رو رہی ہو گل؟ اس لڑکی کے لیے جسے تم نے دیکھا تک نہیں تھا؟"

"وہ لڑکی میں بھی تو ہو سکتی تھی سکندر بھائی۔۔۔ کہ خطرناک لوگوں میں گھری ہوئی تھی میں۔۔۔ میرا ایک ... کیا بگاڑ لیتا اُن کا۔ اگر اُن پر بھی شیطان سوار ہو جاتا۔ ... ناقابلِ تصور تھا میرے لیے۔۔۔ نامکمل تھا ان ..."

اُس کا بدن لرزنے لگا تھا۔

"یہی وجہ ہے گل۔۔۔ کہ میں اُن کو سخت ترین ... کے ساتھ مارنا چاہتا ہوں۔ ان کے مقابلے میں ڈاکو تو واقعی ... آدمی نظر آتے ہیں۔۔۔"

سردار جی جمائیاں لیتے ہوئے نمودار ہوئے تو گل نے آنسو صاف کر لیے۔

"جلتے جلتے رات ہو گئی۔ میں تو سمجھا تھا اپنے معمول پر ہیں" انھوں نے دانت نکالے۔

"کون معمول؟" گل نے معصومیت سے سوال کیا۔

"لو جی، کڑی کی بھی کیسی بھول ہے۔ اور جی سوچتی ... یہ ہو گئے میرا اشتہار" سردار جی نے میری طرف اشارہ کیا۔ "... ہو سکتا ہے سوہنی معمول۔۔۔"

گل سوال کر کے پچھتائی۔ "میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔" اس نے جاتے ہوئے کہا اور سردار جی ... کر بیٹھے۔ وہ کچھ ترنگ میں تھے۔

میں نے کہا "سردار جی! آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ ... وقت کہاں ہیں؟"

"ہاں، ہم لانچ میں ہیں اور لانچ سمندر میں ہے۔"

"مذاق کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ ہم نے کتنا فاصلہ طے کر لیا ہے اور ہم اس جہاز تک کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے؟"

"دیس جہاز نظر آ جائے پھر میں بتا دوں گا کہ ہم کتنی ... پہنچ سکتے ہیں" سردار جی نے کہا اور پھر ایک دم ... گئے۔ "اوئے بے وقوف، مجھے کیا معلوم جہاز ... میں کہاں ہوگا؟"

"فرض کریں، میں آپ کو ایک نقشہ بنا دوں ..." کہا۔ "یادداشت کی مدد سے۔"

"کیسا نقشہ؟"

"ایک نقشہ تھا۔ افسوس کہ مجھے لینا یاد نہیں رہا ... بڈھے کے پاس رہ گیا جو ہماری لانچ سے ... گیا ہے۔ میں ہی اس کو سمجھتا تھا مگر میں نے وہ اتنی بار دیکھا تھا کہ میرے ذہن میں ہے۔"

"اچھا! اندر آ کے نقشہ بناؤ۔" سردار جی نے کہا۔ "میں تم کو کاغذ پنسل دیتا ہوں۔"

میں ذہن پر زور دیتے ہوئے اس نقشے کو تصور کی مدد سے کاغذ پر منتقل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد بالآخر میں نے اپنے اطمینان کی حد تک نقشے کی تمام ضروری تفصیلات درج کر دیں۔ سردار جی نے چائے نوش فرماتے ہوئے گل سے کہا "واہ واہ!" اور ... لگے۔

"اس میں ایک دو چیزیں کم ہیں۔۔۔ لیکن کوئی حرج نہیں۔۔۔ میں خالی جگہ مکمل کر سکتا ہوں۔۔۔" پھر انھوں نے کہا "اور اس نقشے کے مطابق۔۔۔ مگر ایک بات تو میں نے پوچھی ہی نہیں وہ بحری جہاز کتنا بڑا ہے۔۔۔ کتنے ٹن کا ہوگا؟"

"وہ۔۔۔ میں نے تولا تو نہیں۔۔۔ مگر اندازاً ..."

میں نے اندازے کی بنیاد پر جہاز کا طول و عرض بیان کیا۔

"ہوں" سردار جی نے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ اس کی رفتار زیادہ نہیں ہو سکتی۔ میں ذرا حساب لگا لوں۔"

سردار جی نے نقشے کو سمجھ لیا تھا اور ان تمام عوامل کو بھی جو سمندری سفر میں وسیلۂ ظفر ثابت ہو سکتے تھے اور جو ہم جیسے ناتجربہ کار لوگوں کی نگاہ میں آ ہی نہیں سکتے تھے۔ کسی بھی مقصد کے حصول کے لیے محض ارادہ کافی نہیں ہوتا۔ کامیابی کے لیے سازگار حالات میسر آنے کی شرط ہے۔ تاہم نیت میں کھوٹ نہ ہو تو اسباب اور وسائل قدرت فراہم کرتی ہے۔

سردار جی کے بیٹے ہم اور ہمارے لیے سردار جی فرشتہ ثابت ہوئے تھے۔ عام حالات میں وہ کسی بھی واردات کے بعد وقت ضائع کیے بغیر اس کی رپورٹ کرتے۔ ان کے بہت سے ساتھی مارے گئے تھے اور حملہ آوروں نے انھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ نوعیت کے اعتبار سے وہ بہت ... معاملہ تھا لیکن ایک مشکل وقت میں مدد کرنے والوں نے ان کو دوسری مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک طرف اخلاقی احسان مندی کا جذبہ تھا تو دوسری طرف مجبوری بھی تھی اور معلوم نہیں، انھوں نے میری بات سن کے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم مظلوم ہیں اور شریف لوگ ہیں۔ بیچارے ہمدردی کے مستحق ہیں یا کوئی اور بات تھی۔ بہرحال اب وہ ہماری مدد کر رہے تھے اور ہمارے درمیان کسی قسم کی رنجش یا کشیدگی نہیں تھی۔

"پھر بولو سردار جی؟" میں نے کہا۔ "کچھ بات بنی؟"

"ہاں، بات کیسے نہیں بنے گی؟" سردار جی نے کہا۔ "اچھی اتنی عمر سمندر میں گزر گئی جھک مارتے۔"

"کتنی عمر گزر گئی؟" میں نے کہا۔

"اوئے یار تو زندگی میں بڑے مشکل سوال کر دیتا ہے ... حساب لگا کے بتاتا ہوں۔" وہ بولے۔ "یہ ہو گئے ... چالیس سال۔۔۔ اور۔۔۔ ہاں۔۔۔ تیرہ مہینے۔۔۔ تے اٹھائیس دن۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ "پانچ سال دو مہینے بھی تو کم کیے ہیں آپ نے۔"

"اچھا۔۔۔ ہاں یار۔۔۔" وہ جھینپ کر مسکرانے لگے۔

"خیر تو مطلب یہ تھا کاکا کہ اب ہم کام بھی ایسا ہی کر رہے ہیں۔ سراغ لگاتے ہیں کہ کون کدھر ہے، کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے تو پھر ایک سالم جہاز کا سراغ لگانا کیا مشکل ہے۔ ... اندازہ کر لیا ہے میں نے۔"

"یہ تو بہت ہی اچھی خبر ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کا خیال ہے ہم کب تک اس جہاز کو پکڑ لیں گے؟"

"میرے اندازے کے مطابق۔ بارہ سے چودہ گھنٹے لگ جائیں گے۔"

"یعنی آج رات کوئی امکان نہیں؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"امکان کیوں نہیں؟" انھوں نے ایک ہچکی لے کر کہا۔ "... رفتار سے ... سیدھے تیری طرف گئے ... ہچکی۔۔۔ تو آنکھ کھلے۔۔۔" انھوں نے ہچکی لی "او ... ہچکی ..."

"کیا ہوا سردار جی! کیسے کہہ رہے ہیں؟" گل نے حیرانی سے ادھر ادھر دیکھا۔

"او یار۔۔۔ تیری خیر جائے۔۔۔ ہمیشہ بڑے غلط موقع پر یاد ... ہچکی آ کرتی ہے۔"

"اس لیے ہچکی لگ گئی آپ کو؟" میں نے کہا۔

"اور کیا ... بات ہے کہ اس وقت ... ہچکی۔۔۔ آج بدھ وار ہے نا۔۔۔ ہاں۔۔۔ بدھ وار کو وہ گڑ والے میٹھے چاول پکاتی ہے۔۔۔ بڑی واہ کیا سواد والے ہوتے ہیں۔ ... جاتا ہے۔۔۔" اس نے کہا ...

"... زندگی ..." نے کہا۔

"چند ... ہے نا وہ ... تمام ہے میرا" سردار جی نے سینے پر ہاتھ ... "ہاں۔۔۔ اب ٹھیک ہے دیکھا ہچکی رک گئی ہے۔ اب وہ بھی چاولوں کے کھانے میں لگ گئی ہے۔۔۔ کچھ پتا ہے یار کہ رات کو کھانے میں کیا ملے گا؟" انھوں نے ... انداز میں پوچھا۔

"رات کو۔۔۔ کیا خیال ہے گڑ والے میٹھے چاول ..."

نے کہا۔

"اوئے بچے بچے۔" انھوں نے میرے بازو پر ہاتھ مارا۔ "دل خوش کیا اس وقت تو نے۔"

گل ہم سے خاصے فاصلے پر اکیلی کھڑی سمندر کی رات کو دیکھ رہی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ ہمارے دوپہر کے رویے پر ابھی تک برہم ہے۔ محسن بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔

"گل۔۔۔ والے گل بانو۔" میں نے چلا کے کہا۔ "ادھر آؤ۔"

اس نے سر گھما کے دیکھا اور آہستہ آہستہ قریب آ گئی۔

"کیا ہے؟"

"سردار تقید سنگھ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لو سردار جی۔ گل ایسی جنس ہے کہ کسی بات کا برا مانے، اور محبت سے تو پتھر بھی موم ہو جاتا ہے۔"

"وہ ہجنی گل۔" سردار جی نے کہا۔ "یہ تو ذرا عجیب سی بات ہے، اپنا دل نامراد۔۔۔ ایسا ہی ہے لیں۔"

"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت۔" میں نے کہا۔

"ہاں ۔۔۔ ناراض مت ہونا۔۔۔ دل اس وقت اچانک مچل گیا۔۔۔"

گل نے پہلے مجھے گھورا اور پھر سردار جی کو۔

"کہہ دیں سردار جی۔ دل کی بات کہتے ہوئے ڈرنا نہیں چاہیے۔ آپ کہیں تو میں ہٹ جاؤں۔" میں نے کہا۔ "اکیلے میں۔۔۔"

"سکندر بھائی یہ کیا ہے جو وہ مذاق ہے۔" گل جھنجھلا کے بولی۔

"نہیں گل، سردار جی بھی آخر انسان ہیں۔ ان کے بھی کچھ ارمان ہیں اور دل پہ کسے اختیار ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو دیکھتے ہی۔۔۔"

"کیا۔۔۔ سردار جی اس وقت بھی بارہ بجے ہوئے ہیں آپ کے۔" گل نے مشتعل ہو کے کہا۔

"او بھئی گل۔" سردار جی نے بوکھلا کے کہا۔ "تم کو دیکھ کے میں نے سوچا۔۔۔" وہ میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔

"کیا سمجھا ہے آخر آپ نے مجھے؟" گل چراغ پا ہو کے بولی۔

"او بھئی کاکی، غصہ کیا۔ گڑ کے چاول پکانا کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں۔" سردار جی نے کہا۔ "تم کو دیکھا تو میں نے کہا پوچھ لیتے ہیں، تم کو پکانا نہیں آتا تو سیکھ لو۔"

خفت سے گل پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ "گڑ کے چاول۔۔۔"

"اور کیا۔" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا۔ "تم تو ایسے لال پیلی ہو رہی تھیں جیسے سردار جی تم کو پروپوز کرنے والے تھے۔"

"کیا کرنے والے تھے؟" وہ سمجھی نہیں تھی کہ پروپوز کرنا پیغام دینے کو کہتے ہیں۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" سردار جی نے گھبرا کے کہا۔ "اوئے گل کے ہاتھوں میرا جھٹکا کرانا ہے؟ گولی مارو گڑ کے چاولوں کو۔"

"سردار جی، گڑ یہاں کہاں، ورنہ میں ضرور پکا دیتی آپ کو ایسے گڑ کے چاول۔" گل نے کہا۔

"چلو پھر جاؤ۔ یہاں وقت کیوں ضائع کر رہی ہو۔" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "غضب خدا کا! لڑکیاں ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے لگی ہیں۔ جاؤ جا کے ہانڈی چولہا کرو۔۔۔ کھانا پکاؤ۔"

"نوکر نہیں ہوں میں کسی کی۔" وہ جھلا کے پیر پٹختی ہوئی جانے کے لیے پلٹی۔

"نوکرانی تو ہو۔ نوکر نہ سہی۔" محسن نے سامنے سے آ کے کہا۔

"خود اپنا پکاؤ اور کھاؤ۔ احسان فراموش لوگ ہو تم۔ دن میں اتنی محنت کی میں نے اور جناب کو کچھ پسند ہی نہیں آیا۔" گل نے کہا۔

"اب یہ تو بہت مشکل ہے عزیزہ۔" محسن بولا۔ "کہ ہم روتے میں وہ سب جان لیوا مرکبات کھا لیں جو تم ایجاد کرتی ہو اور پھر تمھارا شکریہ بھی ادا کریں۔ ہم خود بہترین کک ہیں۔"

رات تو یہ کہ میں نے اور محسن نے خود کو بہترین کک ثابت کرنے کا عملی مظاہرہ شروع کیا۔ متعدد اختلافی مسائل ہم نے اس کر کے طے کیے، مثلاً یہ کہ آٹا کون گوندھے گا، پیاز کون کاٹے گا۔ جب محسن زار و قطار روتے ہوئے پیاز کاٹ رہا تھا تو میں آٹا گوندھنے کے تجربے سے دوچار تھا۔ کبھی اس میں پانی زیادہ ہو جاتا تو آٹے کی لئی سی بن جاتی تھی، مزید آٹا ڈالنے سے آٹا سخت ہو جاتا تھا۔

"یار محسن!" میں نے آٹے میں لتھڑی ہوئی انگلیاں جھٹک کے کہا۔ "آخر یہ عورتیں کیا چکر چلاتی ہیں۔ آٹا گوندھنے کے بعد ہاتھ صاف، برتن صاف۔ ایسی صفائی سے آٹے کو سمیٹتی ہیں اٹھاتی ہیں اور پختی ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ان کے ہاتھوں سے کوئی ایسی طاقت خارج ہوتی ہے۔" محسن نے قمیص کی آستین سے اپنی ناک اور آنکھوں کی رطوبت صاف کرتے ہوئے ایک سائنسی نظریہ پیش کیا۔ "جو آٹے کو چپکنے نہیں دیتی۔ اس کیمیکل سے تو روٹیاں بھی بنانے لگا ہے۔"

"اللہ بڑا کارساز ہے۔" میں نے کہا۔ "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ۔ گھبرائیں کیا، دوست۔"

"یار کیا بات ہے، جو آنسو گیس ہوتی ہے اس میں پیاز کا عرق استعمال ہوتا ہے۔" محسن بولا۔

"کتنی دیر ہے کھانے میں؟" ادھر سے گل نے چلا کے کہا۔

"بس جی، بریانی دم ہو رہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "شامی کباب بھی تیار ہیں۔"

"یہ سب تیری وجہ سے ہوا۔ کیا تھا اگر دن میں اس کی تعریف کر دیتا۔" محسن بولا۔ اس وقت وہ آٹا پھینٹ رہا تھا۔

"آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی۔" میں نے کہا۔ "یہ بیلنا بیکار ہے، جس سے گول دائرے بناتے ہیں؟"

"اسے بیکار نہیں بیلن کہتے ہیں جس سے گول روٹیاں بنائی جاتی ہیں۔" محسن نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ بھی کوئی زنانہ ٹریک ہے، آخر وہی بیلن میں بھی تو استعمال کر رہا ہوں۔"

ایک گھنٹے بعد پھر گل نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "آخر کیا ہوا؟ کوئی ہے یہ۔ رات کا کھانا کیا ناشتے میں پیش کیا جائے گا؟"

"بس جناب، یہ شامی ٹکڑے بھی ہو گئے۔" میں نے کہا۔

بالآخر ہم ایک بڑے سے تھال کو اندر سے اٹھا کے عرشے پر نمودار ہوئے۔ گل کے ساتھ سردار جی تھے اور اسے اپنی داستانِ حیات سے کوئی اقتباس جو غالباً بیٹی سے متعلق تھا سنا رہے تھے، گل مسلسل کھی کھی کر رہی تھی۔

"او وہ ڈنر آ گیا۔" سردار جی نے خوش ہو کے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "بچے بچے جوانو۔ بریانی، شامی کباب اور شاہی ٹکڑے۔"

"آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ ہم کسی کی دھونس میں آنے والے نہیں ہیں۔" محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اپنا کام خود کرتے ہیں۔" میں نے اس کی تائید کی۔

مگر ڈش سے کپڑا ہٹاتے ہی سردار جی نے وہ آملیٹ دیکھا جس کا موجد محسن تھا اور میری صنعت گری کی شاہکار روٹیوں کو دیکھا تو ان کی صورت پہ واقعی بارہ بج گئے۔ گل کا ہنس ہنس کے برا حال ہو گیا۔

"کھائیں سردار جی۔ یہ دیکھیں کیسا صحیح نقشہ بنا ہے برِاعظم آسٹریلیا کا۔ یہاں کنگارو بھی ہوتے ہیں اس شکل کے۔" اس نے دوسری روٹی اٹھا کے کہا۔

"اوئے تو اڈا بیڑا غرق۔" سردار جی نے پہلے نقشے کو نگلتے ہوئے کہا۔ "الگ الگ سے آتے ساری چیزیں، پانی میں آملیٹ گھول کے پا لیتے اور آٹے پھینٹ کے پی لیتے۔ پھر بیٹھ جاتے چولہے پر۔"

"بھئی واہ، اپنے سکندر صاحب کیا لطف ہے اس ساؤتھ امریکن آملیٹ کا۔" محسن بولا۔

"اور کیا ڈھانس سے بہتر ہے۔ صحت بخش روٹیاں ہیں مگر افسوس لوگ صورت کو دیکھتے ہیں۔"

"اور صورت پر اتراتے ہیں۔ سیرت کی قدر نہیں رہی۔"

"ہائے ہائے، ادھر وہ کہاں بھی ہو گی گڑ کے میٹھے چاول، الائچی کی خوشبو والے۔" سردار جی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "یا ادھر سردار راجندر سنگھ کی جان پہ بنی ہوئی ہے۔ او سُوار، ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ لو گل سے۔"

ہم نے اپنی خودی کو بلند رکھتے ہوئے اس آخری مشورے کو نظر انداز کیا اور اگرچہ آملیٹ میں مرچوں کا تناسب بھی اتنا ہی زیادہ تھا جتنا نمک کا، مگر ہم مسکراتے ہوئے ڈنر میں مصروف رہے اور ایک دوسرے کو مبارکباد بھی دیتے رہے۔ ہم پر آج اپنی قابلِ رشک صلاحیتوں کا انکشاف ہوا کہ ہم اتنا اچھا پکا بھی سکتے ہیں اور پھر اسے کھا بھی سکتے ہیں۔

بعد میں میرے اور محسن کے درمیان ایک شدید قسم کی جھڑپ ہوئی جس میں اس نے مجھے اور میں نے اسے موردِ الزام ٹھہرایا۔ سردار جی نے رات بھر کے لیے لانچ کی کمان سنبھال لی تھی اور یونی جو حد درجہ صابر و شاکر قسم کا ماتحت تھا، ہمارے تیار کردہ ڈنر کو خاموشی سے کھا کے سو گیا۔

آدھی رات سے کچھ پہلے ہی ہماری گل سے صلح ہو گئی اور وہ ہمارے لیے کافی بنا کے لائی تو ہم عرشے پہ نیم روشن تکتے آسمان کے نیچے بیٹھے ہوئے سمندر کی نمی سے بوجھل ہوا کی ٹھنڈک کو محسوس کر رہے تھے۔

"اگر آج رات کسی وقت اچانک ایس ایس کرانتی تھرڈ ہمارے سامنے آ گیا تو کیا ہو گا؟" محسن بولا۔

"کیا ہو گا؟" میں نے کہا۔ "ہم خدا کا نام لے کر چڑھ جائیں گے اور یہ ہمارا پروگرام بھی تھا۔"

"ٹھیک ہے، وہ ہمیں روکنے کی کوشش بھی نہیں کریں گے، لیکن اس کے بعد لانچ واپس چلی جائے گی۔ کیا یہ بات شک پیدا نہیں کرے گی کہ لانچ نے عملے کو واپس لے جانے کے لیے انتظار کیوں نہیں کیا؟"

"یہ نکتہ غور طلب ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں سردار جی سے یہ درخواست کرنا ہو گی کہ وہ ہمیں چھوڑ کے فوراً واپس نہ جائیں لیکن اس قسم کی درخواست وہ کیوں مانیں گے؟"

"ابھی تو ہم انھیں ساتھ لے آئے ہیں۔ بعد میں ان کو روکنے والا کون ہو گا؟" محسن نے کہا۔ "اور پھر یہ بھی تو بالکل غیر یقینی ہے کہ اس جہاز پر ہمارا قیام کب تک ہو گا۔ پھر اس مشن کے بارے میں ابھی خود ہم بھی نہیں جانتے کہ اس میں ہمیں کامیابی ہو گی یا ناکامی ۔۔۔ اور کامیابی کے لیے مواقع کب ملیں گے۔"

"مزید غور کرنے پر میری عقلِ سلیم میں وہ سب آ گئے

www.Paksociety.com

ہم بھیڑ بکریوں کے باڑے اور گلّے سمیت اٹھالے گئے ہوں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ ان سے مطلب کی بات کریں۔ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟" شاہد جمیل نے مشورہ دیا۔ "اور بہتر ہوگا اگر انھیں اپنے ساتھ لے جائیں۔"

"کہاں لے جاؤں؟"

"اپنے کمرے میں کوئی ایسی ویسی بات غلط ... آسانی سے کی جاسکتی ہے۔" شاہد جمیل نے کہا۔

"یہ تو معلوم کرلیں ان سے کہ یہ کون ہیں؟" پیڈرو بولا۔

شاہد جمیل نے اسے شرمندہ کرنے والی نظروں سے دیکھا۔ "کیا یہ بھی پوچھنے والی بات ہے؟"

"ہاں! صرف انٹرپول کمیشن کا ایک ..." پیڈرو نے کہا۔ "اور یہ وردیاں ہمارے خیال میں کوئی بھی پہن سکتا ہے اور جس لانچ میں یہ لوگ آئے تھے کیا وہ بھی انٹرپول کی لانچ نہیں تھی؟" شاہد جمیل نے برہمی سے کہا۔

شاہد جمیل بہت خوبصورتی سے ہمارا دفاع کررہا تھا اور ہمیں ناخوشگوار صورت حال سے بچانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس کے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ ایک یہ کہ ہمیں شناخت کرلینے کے مسئلے کا فوری سامنا نہ ہو جس سے ہمارا راز فاش ہونے کا خطرہ ٹل جائے۔ دوسرے یہ کہ ہم اس مہلت سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہیں تو حالات سازگار رہیں۔ جب میں نے اسے آنکھ ماری تھی تو وہ کچھ حیران ہوا تھا مگر ذہین تھا اس لیے فوراً سمجھ گیا تھا کہ شعور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔

"آپ نے ٹھیک کہا۔" مصرا نے شاہد جمیل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سہارا لیا۔ "ان لوگوں سے بگاڑ ٹھیک نہیں۔ انھیں ٹال دینا چاہیے۔ تھوڑی بہت خاطر مدارات، تھوڑی سی رشوت اور تھوڑی سی فرماں برداری اور کچھ جی حضوری۔ اور کیا مانگتا ہے بھلا تھانیدار۔ یہ سالے سمندری تھانیدار ہیں۔"

"رشوت کی بات ذرا سوچ سمجھ کر کیجیے۔" شاہد جمیل نے اپنے افسر کو سمجھایا۔ "یہ ذرا مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ یار کیا میں الو ہوں۔ وہ کیا ... اپنی ساری زندگی گزری ہے اسی صحرا کے ... زم میں۔"

"وحشت کی ستیا ... میں۔" شاہد جمیل نے تصحیح کی۔

"ایک ہی بات ہے۔ ایک ہی بات ہے۔ ان کے کمرے میں پہلے ان سب کے کھو کر جائیں سب اپنا توپ خانہ ... کرکے آگئے ہیں جب ... "کیا ہو کیا بولا؟" سینڈاری نے ... "ابھی تم ... سب

کا سامنے ہمارا انسلٹ کرنا ہے؟" مصرا ... بعد میں ... ہم نشے میں تھا۔"

"نشے میں تو ہے نا یار۔" شاہد جمیل نے ... کے آہستہ سے کہا۔ "جب تم جانتے ہو تو خواہ مخواہ ... سے فائدہ؟"

"میں کہتا ہوں ان کے کاغذات اچھا ..." پیڈرو نے اصرار کیا۔

"شٹ اپ۔ یہ حکم دینے والے تم کون ہو ... میں ہوں۔" مصرا نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ "تم ... اور آئندہ جب تک میں نہ کہوں میرے سامنے ... تم جو بھی ہو..."

"تمھیں معلوم ہے اچھی طرح کہ میں کون ہوں ..."

"ہاں ہاں معلوم ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں ... باپ مت سمجھو۔ یہاں میں تمھارا باپ ہوں۔" مصرا نے کہا۔ "میرے حکم کی خلاف ورزی کی تو ... گا اور سمندر میں پھینکوا دوں گا۔"

صورت حال خطرناک حد تک کشیدہ ہوگئی ... کے ذہن میں کوئی شک پیدا کرنے والی بات تھی ... سب کے سامنے کرنا نہیں چاہتا تھا اور ... تذبذب میں مبتلا تھا مگر مصرا کے اشتعال انگیز ... بعید نہیں ممکن تھا کہ وہ کچھ کر بیٹھتا۔ ریوالور ... وہ مصرا کی کپتانی کی پروا کیے بغیر باغیانہ سرکشی ... خون خرابے تک پہنچ جاتی جس میں کوئی بھی مارا جاتا ... یا ہم۔

ان کی آپس کی چپقلش سے مجھے وہ موقع فراہم ... کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے ایک سیکنڈ کی حرکت میں ... کے جراب میں سے ریوالور نکال لیا۔ میرا اشارہ پاتے ... بھی ایسا ہی کیا اور جیب تک پیڈرو کا ہاتھ جارہا ... ہوتا ہم نے اپنے آٹومیٹک ریوالور دو مختلف سمتوں ... لیے۔ میرا نشانہ مصرا تھا اور محسن کی زد میں استاد پیڈرو ... کے پیچھے گل نے پوزیشن سنبھال لی تھی۔

"شاید تم لوگوں کی سمجھ میں میری بات نہیں ..." نے فرنچ میں کہا۔ "ہم بلاوجہ خون خرابا نہیں کرتے ... ہیں مگر کوئی کھیلنے کا حق رکھتے ہیں اور قانونی فرائض ... میں رکاوٹ ڈالنے والوں سے نمٹ سکتے ہیں۔"

محسن نے ... انگریزی میں میری بات ...

مصرا نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ...

... کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ہم قانون کا احترام کرنے والے لوگ ہیں اور مجھے افسوس ہے کہ ایسی غلط فہمی پیدا ہوئی۔ آپ کی تشریف آوری کا مقصد کچھ بھی ہو کیپٹن آزاد مصرا آف ایس ایس کراسٹی تھرڈ آپ کو خوش آمدید کہتا ہے اور آپ کو مکمل تعاون کا یقین دلاتا ہے۔"

محسن نے جو کچھ فرنچ میں کہا یہ تھا کہ "یہ حرامزادہ جو ایک بار سے بچ گیا یا جہنم سے لوٹا دیا گیا" دوسری بار زیادہ عذاب کی موت کے لیے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اسے ہمارے جہاز کا پتا چل گیا ہے۔ ہم میں سے ایک کو اس پر نگاہ رکھنی ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "ابھی سے جنگ چھیڑ دینا مناسب نہیں۔ پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ غالب اور ستارہ کہاں ہیں۔"

محسن نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ "کیپٹن مصرا کا مثبت رویہ ایک نیک فال ہے۔ ہم ضابطے کے مطابق کارروائی کررہے ہیں۔ اگر جہاز بھی معمول کے تجارتی سفر پر رواں ہے تو کسی کو ہم سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔"

مصرا نے کہا۔ "آپ لوگ میرے ساتھ آئیں جو بات بھی ہوگی میرے کیبن میں ہوجائے گی۔"

میں نے محسن کی معرفت جواب دیا۔ "ہم بیٹھنے کے لیے نہیں آئے ہیں اور نہ ہمیں کسی سے یہ بات کرنی ہے۔"

مصرا نے کہا۔ "مہمانوں کے لیے ایک جام یا کافی کا ایک کپ پیش کرنا اگر رشوت شمار نہ ہو..."

محسن نے کہا۔ "ہم ایک نظر جہاز کو دیکھیں گے اور واپس جائیں گے۔"

مصرا نے واپس جانے والی لانچ کی طرف دیکھ کر "واپس کیسے جائیں گے؟"

محسن نے خود ہی جواب دیا۔ "لانچ واپس آئے گی۔"

"پھر تو بہت وقت ہے۔" مصرا نے کہا۔ "شاہد! تم اس شخص کو لے جاؤ میری نظر کے سامنے سے۔ اس کی اسٹوری یہاں نہیں چلے گی۔ یہ کسی کا نمائندہ ہے مگر میرا افسر بنا کے نہیں بھیجا گیا ہے۔"

"میں ان لوگوں کے مفاد کے خلاف کوئی کام نہیں کرنے والا کہ ... کا میں نمائندہ ہوں۔" پیڈرو نے اسی سرکشی سے کہا۔

"ان کے مفاد سے میرا مفاد بھی وابستہ ہے لیکن میں اپنے جہاز پر مفادات کے تحفظ کی ذمے داری کسی اور کو نہیں سونپ سکتا۔ نفع نقصان کے لیے جواب دہ میں ہوں۔" مصرا نے ... چلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کسی مشیر کی ضرورت

نہیں۔ اگر کوئی شخص کا بچہ مجھ پر مسلط ہونے کی کوشش کرے گا تو..."

"آپ چلیں مصرا۔" شاہد جمیل نے اسے سمجھاتے ہوئے نرمی سے کہا۔ پھر وہ پیڈرو سے مخاطب ہوگیا۔ "تم اس جہاز کے عملے سے یہ توقع کبھی مت رکھنا کہ وہ مصرا کی جگہ تمھارا حکم ماننے پر تیار ہوجائیں گے، خواہ وہ کتنے ہی مجبور کیوں نہ ہوں۔ تم جہاز پر قبضہ کرلو تب بھی کپتان کی جگہ نہیں لے سکتے۔"

"خاموش رہو۔ اپنی ہر بات منوالیتا ہے شاہد۔ ... بھی میں چاہتا تو..."

"خوش فہمی ہے تمھاری۔ تم زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے تھے کہ مصرا کو مار دیتے۔ مجھے بھی مار دیتے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا۔ جہاز کے عملے کا آخری فرد بھی مرجاتا مگر تمھارے حکم کی تعمیل نہ کرتا کیوں کہ تم باہر کے آدمی ہو۔ ہمارے پاس ایک ضابطہ ہے کہ ایک نہ رہے تو اس کی جگہ لینے والا دوسرا کون ہوگا۔ تم اس فہرست کے آخری آدمی بھی نہیں ہو۔ اس لیے بھول جاؤ یہ بات کہ تم اپنی بدمعاشی یہاں بھی چلا سکتے ہو۔"

مصرا اس کی بات سے خوش ہوا۔ "بالکل ٹھیک کہا تم نے شاہد۔ میں بھی یہی سمجھا رہا تھا اس کو اور اگر یہ باتوں سے سمجھتا تو لاتوں سے کام لیتا۔ کچھ بھوت ہوتے ہی ایسے..."

پیڈرو نے ایک کالی شے کے ریوالور اٹھایا ہی تھا کہ شاہد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "پاگل مت بنو۔"

پیچھے سے گل نے رعب دار آواز میں کہا۔ "ہاتھ اوپر اٹھالو۔"

گل کی آواز کا رعب تو کیا قائم ہوتا لیکن یہ وار ٹھیک کام کرگئی۔ پیڈرو خاموشی سے واپس ہوگیا۔ جھنڈا کبھی کا ... جا چکا تھا۔ ہم نے بھی ریوالور جیب میں ڈالے اور مصرا کے ساتھ چل پڑے۔ اس نے محسن کی معرفت اپنے عملے کے ایک جاہل اور غیر ذمے دار شخص کے رویے پر معافی مانگی اور ایک عجیب بات کہی۔ اس نے پیڈرو کے بارے میں کہا کہ وہ نشے میں تھا۔ جب کہ نشے میں خود کپتان صاحب تھے۔

"تم کس قسم کے کپتان ہو آخر؟" محسن نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "تمھارا عملہ تمھارے سامنے سرکشی سے بات کرتا ہے۔ شراب کے نشے میں تم دھت رہتے ہو اور حد یہ ہے کہ تمھارے منع کرنے کے باوجود اسلحہ نکال لیتا ہے۔ وہ بھی کیا اللہ کا پولیس ہے؟"

"دراصل ... وہ عملے میں شامل نہیں ہے..."

www.paksociety.com

"کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ کوئی مسافر ہے؟ ایک مال بردار جہاز پر کسی مسافر کی موجودگی کا کیا جواز ہے؟" محسن نے کہا۔ "کیا تم ناجائز طور پر لوگوں کو ایک ملک سے دوسرے ملک کے ساحل پر اتارنے کا کام بھی کرتے ہو؟ کتنا معاوضہ لیتے ہو ایک ایسے مسافر سے اور... اس کے علاوہ کتنے لوگوں کو لے جا رہے ہو؟"

مصرا گھبرا گیا۔ "آپ ادھر آئیے۔ یہ ہے میرا کیبن۔ میں ابھی سب وضاحت کر دیتا ہوں۔"

محسن نے میری طرف دیکھا اور فرنچ میں کہا۔ "یہ سالا پھنس گیا! ایک بات کہہ کر اب ہم مطالبہ کر سکتے ہیں کہ اس شخص کو پیش کیا جائے۔ اس کی سفری دستاویزات دکھائی جائیں اور مزید ناجائز سفر کرنے والوں کا پتا چلانے کے لیے ہم جہاز کی تلاشی بھی لے سکتے ہیں۔"

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے ساری بات کا علم مجھے اب ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے زیادہ برہمی کا مظاہرہ کیا۔ "یار مجھے غالب اور نازو کی زیادہ فکر ہے۔ وہ دکھائی نہیں دیے۔" میں نے فرنچ میں کہا۔

مصرا نے ایک بٹن دبا کے کسی کو طلب کیا اور پھر پوچھا کہ "ہم کیا پسند کریں گے؟ ویٹ اسٹر سے بلیک ڈاگ تک سب دستیاب ہے۔" اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "لانگ جان یا روز گالا..."

"گویا تم ایک انڈین شپ پر غیر ملکی شراب کی موجودگی کے جرم کا اعتراف بھی کر رہے ہو۔" محسن بولا۔ "اسمگلنگ کا اور کیا کیا سامان ہے؟"

مصرا پریشان ہونے لگا۔ "وہ تو میں اپنے طور پر... مہمان نوازی کے لیے تھوڑی بہت رکھتا ہوں۔ اسمگلنگ کرنے والے پر لعنت۔"

"ہم ڈیوٹی پر ہوں تو پی نہیں سکتے۔" محسن نے رکھائی سے کہا۔

"او کے۔ کافی یا چائے؟ آپ سے پہلے..."

"کچھ نہیں۔" محسن نے کہا۔ "اس آدمی کو لاؤ۔ کون ہے وہ؟"

"وہ... دراصل ایک تجارتی کمپنی کا نمائندہ ہے۔ ہمارا کچھ سامان لے جا رہے ہیں۔" مصرا نے کہا۔

"کس قسم کا سامان۔ اس کی تفصیل تو ہو گی؟ اور جس کمپنی کا یہ بدتمیز بلکہ غنڈہ نمائندہ ہے اس کا دھندا کیا ہے؟ اس بدمعاش کے پاس سفری دستاویزات ہیں یا نہیں؟" محسن نے ایک ہی سانس میں کہا۔ "تمہارے ساتھ اس کے رویے نے مجھے اور ہم سب کو شکوک میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مالک ہے جہاز کا اور تم اس کے معمولی ملازم ہو جس کی کوئی عزت نہیں۔"

مصرا اس ذلت کو پی گیا۔ وہ مجبور تھا ورنہ اتنی بےعزتی کبھی برداشت نہ کرتا۔ جب محسن اس سے بات کر رہا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ کپتان سے حقیقت کیسے اگلوائی جائے۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جب پیڈرو کو ہم اپنی دانست میں ٹھکانے لگا کے یہاں سے بہت دور سمندر میں غرق کر چکے تھے تو وہ کس طرح بچ نکلا تھا اور پھر اس جہاز تک پہنچنے میں کیسے کامیاب ہوا تھا؟

میں نے یہ بات محسن سے کی تو اس نے بھی تسلیم کیا کہ یہ مسئلہ آسانی سے حل نہیں ہوگا۔ یعنی سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنا مشکل ہوگا۔ مصرا سے براہ راست پوچھا گیا تو وہ صاف انکار کر دے گا اور شک میں بھی پڑ جائے گا کہ ہمیں پیڈرو کے بارے میں یہ سب کس نے بتایا۔ جہاں اس پر فائرنگ ہوئی تھی وہاں صرف وہ لانچیں تھیں اور عینی شاہد وہی تھے جو ان لانچوں پر موجود تھے۔ ایک لانچ واپس چلی گئی تھی اور دوسری پر ہم آ گئے تھے۔ خود پیڈرو جانتا تھا کہ ہم وہ نہیں جو نظر آتے ہیں۔ ہم نے اسی کے ساتھیوں کو مار کے یہ لانچ چھینی تھی اور اسے معلوم تھا کہ اس وردی میں محسن اور سکندر نہ تھے۔ پھر یہ بات اس نے مصرا کو کیوں نہیں بتائی تھی؟ محسن کا خیال تھا کہ وہ اپنے اس جرم کی پردہ پوشی پر مجبور تھا۔ وہ مصرا کو نہیں بتا سکتا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے انٹرپول کی لانچ پر قبضہ کر کے اور عملے کے افراد کو مار کے ایک بین الاقوامی نوعیت کے سنگین ترین جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس معاملے سے آگاہ ہوتے ہی مصرا اسے خود پولیس کے حوالے کر دیتا۔ وہ غیر قانونی طور پر مال تجارت کو ادھر سے ادھر پہنچانے کے کاروبار میں ضرور ملوث تھا لیکن اس کام میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس جیسے سیکڑوں ہزاروں تھے جو بین الاقوامی طور پر اس دھندے میں غیر قانونی تجارت کے فروغ میں معاونت کے مجرم تھے۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ اس کی حیثیت صرف ایک ملازم کی ہے اور کمپنی میں اس جیسے ملازم ہر حکم بجا لانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن اس نے ہمیشہ بین الاقوامی اصولوں اور اداروں کی حیثیت کو تسلیم کیا ہوگا ورنہ وہ کسی بحری راستے پر سفر نہیں کر سکتا تھا۔ انٹرپول کی لانچ پر قبضہ کرنے اور عملے کے افراد کو ہلاک کرنے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ کوئی بھی ایسی واردات کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس کے بعد دنیا میں جائے پناہ کہیں بھی نہ رہے۔ خلاف قانون نقل و حرکت کرنے والے

ناجائز دھندے کرنے والے مفاہمت کے عالمی اصولوں پہ کام چلاتے ہیں یا پھر سیاسی بنیادوں پر راستے کھلے رکھتے ہیں۔

محسن کے دلائل اور خود میری عقل نے مجھے قائل کیا کہ پیڈرو مجبور تھا ورنہ ہمارا بھانڈا پھوڑ دیتا۔ اسے اپنے جرم کے افشا ہونے کا ڈر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس بارے میں ایک لفظ بھی کہتا تو ہم اس کے پورے گروہ کی قتل و غارت گری کی روداد سنا دیتے اور مصرا ہمارے ساتھ تعاون کرتا سو کرتا، پیڈرو کو گرفتار کرا دیتا اور وہ مزاحمت کرتا تو اسے گولی مار دیتا۔ اسے قطعی ضرورت نہ تھی کہ وہ کسی بین الاقوامی مجرم اور قاتل کو پناہ دے کر خود بھی شریک جرم بنے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پیڈرو اب کیا کرے گا؟ وہ خاموش رہ کے کوئی خطرہ کیسے مول لے سکتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہوگا کہ ہم اس جہاز پر کیا عزائم لے کر آئے ہیں۔ اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ یا وہ ذاتی خطرہ مول لے کر مصرا کو قائل کرے کہ خود اس کی اور جہاز کی سلامتی خطرے میں ہے یا جو کرنا ہے خود کرے۔ اگر اسے شاہ جمیل نے نہ روکا ہوتا تو وہ سارے معاملات کو اپنے کنٹرول میں لینے کے فیصلے پر عمل درآمد کر چکا ہوتا۔ شاہ جمیل نے اسے بروقت سمجھا دیا کہ بہ ظاہر ایک مصرا کا نہیں جہاز کا سب عملہ اس کے خلاف صف آرا ہو جائے گا اور یہی بات پیڈرو کی خاموشی کا باعث بنی تھی۔

پھر بھی وہ کب تک دم سادھ سکے گا۔ کیا اُسے معلوم نہیں کہ ہمیں ملنے والی مہلت کا ہر لمحہ تباہی کو قریب سے قریب تر کرتا جا رہا ہے۔ جہاز کسی بھی کمپنی کا ہو، وہ خود ڈیلاویئر اینڈ کمپنی کے مال کا نگراں اور محافظ ہے اور ایسا کبھی نہیں ہونے دے گا کہ جہاز کے ساتھ کروڑوں کا مال ڈوب جائے۔ وہ کسی کپتان کو خاطر میں نہیں لائے گا اگر یہ دیکھے گا کہ اس کی نااہلیت یا حماقت کی بنا پر جہاز کے پرخچے اڑ سکتے ہیں۔ اس کے لیے اس کے ساتھیوں کی موت نے ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ اس کا مشن ناکامی کی نظر ہو جاتا تو وہ ہم سب کو مار کے یا زندہ گرفتار کر کے اسی لانچ [illegible] جس میں ہم پہنچے تھے۔ اس کے سب ساتھی ہوتے تو کام بہت آسان ہوتا۔ انہیں اس کرانتی تعداد پر قبضہ کر لینے اور مصرا کا سارا کپتانی دھرا رہ جاتی۔ عملاً خود پیڈرو کپتان ہوتا اور وہ جو حکم چلاتا وہ مانا جاتا۔

اب صورت حال یکسر پلٹ گئی تھی۔ وہ خود بڑی مشکل سے جان بچا کے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ یہ ابھی تک ایک ناقابل فہم اور پُراسرار معما تھا کہ آخر وہ کسی گولی کا نشانہ کیوں نہیں بنا اور پھر غائب ہونے کے بعد ہم سے پہلے اس جہاز پر کیسے پہنچ گیا۔ جس جہاز پر اس کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ قبضہ کرنا تھا اس پر ہم پہنچ چکے تھے۔ ہم مسلح تھے اور ابھی تک اس نے ہم تین کو دیکھا تھا۔ اسے یہ علم تھا کہ قبضہ گروپ کے دو لوگ غالب اور نازو بھی جولنا اور جارلی کے نام سے جہاز پر سفر کر رہے ہیں۔ مجموعی طور پر ہم اس پوزیشن میں تھے کہ جہاز پر آسانی سے قبضہ کر سکتے تھے۔ پیڈرو کے مشن کے پہلے حصے کی ناکامی نے اسے دوسرے مرحلے کی ناکامی کے خطرات سے دوچار کر دیا تھا۔ ممکن ہے جہاز پر خیریت کے ساتھ پہنچ جانے کے بعد اس نے مصرا سے کپتانی کا چارج لینے کا ارادہ ترک کر دیا ہو اور ممبئی تک وہ کچھ نہ کرنا چاہتا ہو مگر ہم اس کے تعاقب میں فرشتۂ اجل کی طرح پہنچ گئے تھے۔ اب اکیلا ہونے کے باوجود اس جیسے عیار اور خطرناک مجرم کے لیے اس مشکل کا کوئی حل تلاش کرنا ناممکن نہیں تھا۔ اس کا شیطانی ذہن یقیناً کسی منصوبے پر عمل پیرا ہوگا۔ یہ احساس مجھے فکرمند کر رہا تھا۔

جب کافی آ گئی تو میں نے محسن سے کہا۔ "وقت ضائع مت کرو۔ مجھے اس حرام زادے کی طرف سے تشویش ہو رہی ہے۔"

"میرا ارادہ کافی پینے کا نہیں ہے۔" محسن بولا۔ "اس کے بعد اس سے ملنا بہت آسان ہوگا۔ کافی کے تلخ ذائقے کا پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"پھر تو میٹھا کیوں ہے؟" میں نے کہا۔

"یس، ویٹ اینڈ سی۔ یعنی انتظار کرو اور دیکھو۔ اسی مقولے پر عمل کر رہا ہوں۔ شکاری کو نفسیاتی اور اعصابی جنگ کا ماہر بھی ہونا چاہیے۔ یہ ایک دلچسپ مقابلہ ہے جس میں تین فریق ہیں۔ صرف ایک فریق کا اصلی چہرہ سامنے ہے اور وہ نہیں جانتا کہ اس کی نظروں کے سامنے دو خطرناک شکاری کس قسم کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ جو ایک دوسرے سے بھی واقف ہیں اور ایک دوسرے کے خونی عزائم کو بھی جانتے ہیں مگر ابھی اپنی اپنی مجبوریوں کے باعث کھل کر سامنے آنے سے گریز کر رہے ہیں۔"

"لیکن ایسا کھیل چل نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر گزرے ہمیں اس مہلت سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔"

مصرا نے کافی بنا کے گل کی طرف بڑھائی۔ وہ گل کو خاصی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور گل اپنے دفاع میں محتاط

www.paksociety.com

ہونے کے باوجود وہ گفتگو سمجھنے سے قاصر تھی۔ جو ہم فریج میں کر رہے تھے۔

اس نے کافی کا مگ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پھر میری طرف دیکھا۔ میری نظر کا مطلب بہت واضح تھا۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"کیا بات ہے؟ تمھیں کافی پسند نہیں؟" معراج نے کہا۔

"چائے..."

"مزہ کافی نہ چائے" میں نے صاف اُردو میں کہا۔ "یہ کھیل ختم سمجھو معراج۔" اور اپنا ریوالور نکال لیا۔

معراج کے ہاتھ سے مگ چھوٹ گیا۔ "تم..."

"اپنے لیے کافی بناؤ" میں نے کہا۔ "یہ سوال بعد میں کرنا کہ ہم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟"

معراج نے خود کو ہر سمت سے محصور پایا اور... بیک وقت تین اصلی ریوالور دیکھے جن کا رُخ اس کے سینے یا سر کی جانب تھا۔ اس نے اچانک فریج سے اُردو میں آجانے والوں کے چہروں کے جذبات بھی بدلتے دیکھے اور بہت جلد سمجھ لیا کہ پیڈرو ہم پر شک کرنے میں کس حد تک حق بجانب تھا۔ غلطی خود معراج نے عقل سے کام نہ لے کر کی تھی۔ پیڈرو کی غلطی صرف یہ تھی کہ اس نے معراج کو حقیقت حال سے بے خبر رکھا تھا اور جو فوراً بتا دینا ضروری تھا اُسے مؤخر کر دیا تھا تاہم دشمن ایسی غلطی نہ کرتا تو اس کے حریف یعنی ہم کیسے کہتے کہ ہمیں تائید غیبی ہمیشہ حاصل رہی۔

"تم نے سمجھا نہیں کافی بناؤ اور پیو" میں نے کہا۔

"میں؟... اکیلا پیوں؟" معراج نے خوف پر قابو پا کے حیرانی سے کہا۔ "کیا تمھیں ڈر ہے کہ اس میں زہر ہوگا؟"

"یہ احتیاط ہم لازمی سمجھتے ہیں" میں نے کہا۔

معراج ہنس پڑا۔ "تم جو بھی ہو خبطی ہو" اور اپنے لیے کافی کا دوسرا مگ بنانے لگا۔ "ویسے یہ چکر کیا ہے آخر۔ تم اگر بھارتی یا پاکستانی ہو اور انٹرپول میں ہو تو کوئی پھر اچھے ہی بندے ہو۔ خواہ مخواہ فرانسیسی بولنے کا ڈراما کیوں رچا رہے تھے؟"

"بہت سے ڈرامے سمجھ میں نہیں آتے۔ مثلاً علامتی قسم کے ڈرامے" میں نے کہا اور اسے کافی پیتے دیکھتا رہا۔ "اسٹیج پر ہر کردار وہ نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے اور جو کچھ وہ کرتا ہے یا کہتا ہے اس کا اصل مطلب بھی کچھ اور ہوتا ہے۔"

"کافی میں زہر ہونا حد ہوگئی" معراج نے کہا۔ "یہ بھی کوئی جاسوسی ناول یا فلم ہے۔"

"مسٹر معراج! استاد پیڈرو تمھارے جہاز پر کیسے پہنچا؟" میرے الفاظ پر ایک بار پھر اس کے ہاتھ سے مگ گر گیا۔ وہ زیادہ عمر کا آدمی تو نہیں تھا مگر شراب نے اس کے اعصاب کو تباہ کر دیا تھا۔

"تم اسے جانتے ہو؟" معراج کا چہرہ خوف سے پیلا پڑنے لگا۔ "ہے بھگوان! کیا ہوگیا ہے میری عقل کو، مجھے پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ تمھیں دیکھ کر اس پر جنون کا دورہ کیوں پڑ گیا تھا۔"

"بہت دیر سے سمجھا نا تم نے" میں نے کہا۔ "اب میرے سوال کا جواب..."

"وہ ایک لانچ پر پہنچا تھا" معراج نے کہا۔ "لانچ ڈوب گئی تھی اور سمندر میں ریسرچ کرنے والے دو یا تین بڈھے اس پر سوار تھے۔ انھوں نے پیڈرو کو ڈوبنے سے بچایا تھا۔"

"اور پیڈرو نے تمھیں کیا بتایا تھا؟" میں نے کہا۔

"اس نے کہا تھا کہ جس لانچ میں وہ بمبئی جا رہا تھا وہ شرمیں شگاف پڑ جانے کے بعد غرق ہوگئی تھی۔ اسے جہاز کے ساتھ ہی جانا تھا مگر نہ جانے کیوں وہ کراچی سے روانگی کے وقت پہنچ نہیں سکا تھا۔ اس کا پیغام ملا تھا کہ وہ بمبئی میں ہمارا انتظار کرے گا۔ میں سمجھا تھا کہ وہ ہوائی جہاز سے گیا ہوگا۔"

"کیا لانچ پر وہ اکیلا تھا؟" میں نے پیڈرو کی کہانی سے دل ہی دل میں لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں، مگر اسے اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا کہ ڈوب گئے یا بچ گئے۔ وہ خود اس لیے بچ گیا تھا کہ اسے لائف جیکٹ پہننے کی مہلت مل گئی تھی۔"

"حادثے کے بعد وہ کتنی دیر تک تیرتا رہا تھا؟"

"تقریباً آدھے گھنٹے تک، پھر وہ ریسرچ لانچ آگئی جو ادھر ہی جا رہی تھی۔ انھوں نے پیڈرو کو ہمارے جہاز پر پہنچا دیا" معراج نے کہا پھر بمشکل اس نے خود کو سنبھالا۔ "یہ کیا ہوا تھا؟"

"کیا ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"جہاز... اور یہ لاش... کیا ہو رہا ہے یہ آخر؟" معراج نے گھبرا کے کہا اور اپنا ہاتھ ایک سوئچ کی طرف بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "جو کچھ ہو رہا ہے چلنے دو؟ رہا ہے؟"

"مجھے کیا۔ میرا خیال ہے کہ... اُف... کیا تم نے دوا لینے کی اجازت... کبھی نہیں دو گے" وہ چلایا "یہ ہے... دیکھو شپ کے ڈاکٹر کو... بلاؤ" جملہ پورا ہونے سے پہلے وہ گر گیا۔ اس کا سانس رُکنے لگا تھا مگر یہ ہارٹ اٹیک نہیں تھا۔ یہ زہر ملی ہوئی کافی کا اثر تھا۔ معراج کا آخری وقت آگیا تھا۔ شکیلہ اُسے دہشت سے دیکھ رہی تھی اور شاید یہ سوچ رہی تھی کہ میں اُسے کافی لینے سے نہ روکتا یا ہم سب کافی پی لیتے تو یہ منظر کتنا مختلف ہوتا۔

"تم... بچ گئے... میں بے وقوف مارا گیا... میری تم سے کوئی... کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"پھر کیا سوچ کے تم نے اس جنگ میں قدم رکھا تھا معراج؟" میں نے کہا۔ "جنگ میں دشمن کا ساتھی بھی دشمن ہی سمجھا جاتا ہے اور مارے وہ بھی جاتے ہیں جو کسی کے ساتھی نہیں ہوتے۔"

"میری... ایک خواہش ہے" اس نے مُنہ سے جھاگ اُگلتے ہوئے بڑی مشکل سے سر اٹھایا۔

"میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا" میں نے کہا۔

"اس... کو مت چھوڑنا" معراج نے پیڈرو کے لیے ایک گالی استعمال کی۔ "یہ اسی نے... کیا..."

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "آدمی خود اپنی قبر کھودتا ہے مگر الزام ہمیشہ دنیا کو دیتا ہے یا تقدیر کو دیتا ہے... تم نے لالچ میں یہ راستہ اختیار کیا۔ بہت پیسہ ملا ہوگا تم کو لیکن اس وقت وہ پیسہ تمھاری جان نہیں بچا سکتا۔ پیسہ دینے والے ہاتھ بھی جان لے سکتے ہیں یہ تم نے نہیں سوچا ہوگا۔"

"وہ... بلیک میلر... مجھے اس نے مجبور کر دیا..."

وہ اب سانس بھی مشکل سے لے رہا تھا۔ "ایک لاکھ... تم میری فیملی کو..." یہ آخری الفاظ اس کے لبوں پر ٹوٹ گئے۔ اس کا جسم تشنج کے آخری جھٹکے کے بعد ساکت ہوگیا۔

میں نے فوراً اس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اندازہ ٹھیک تھا۔ ایک پرس تھا جسے میں نے کھول کر دیکھے بغیر اپنی جیب میں منتقل کر لیا۔ اندر کی دوسری جیب میں ریوالور تھا۔ اسے میں نے بے مصرف جانتے ہوئے چھوڑ دیا۔

باہر سے سنائی دینے والی آوازوں پر میرے کان کھڑے ہوگئے۔

"شیر دلاور! گولی ماردوں گا" یہ آواز پیڈرو کی تھی۔ پھر گولی چلنے کی آواز آئی۔ کوئی بڑے کرب میں چلایا۔

"تم نے دیکھ لیا؟" پیڈرو دھاڑ کے بولا۔ "جو میرا حکم نہیں مانے گا اس کا یہی انجام ہوگا۔ چلو باقی سب لوگ... ٹھیک جاؤ۔"

"یہ کون ہوتا ہے تم کو حکم دینے والا" یہ آواز شاہد جمیل کی تھی۔ "تم کو شرم آنی چاہیے... اس جہاز کا کپتان..."

"کپتان مر چکا ہوگا اب تک" پیڈرو نے قہقہہ مارا۔ "یقین نہیں تو جا کے دیکھ لو۔ اس کی لاش اٹھا کے یہاں لے آؤ اور رو لو وہ شاہد جمیل صاحب کو؟"

"جب تک تم مجھے بھی نہیں مار دیتے اس جہاز کے عملے کو مجبور نہیں کر سکتے..." شاہد جمیل اپنی بات پر قائم رہا۔ شاید اسے افسوس ہو رہا تھا کہ جہاز کا عملہ وفاداری اور فرض شناسی کے پہلے امتحان سے بھی نہ گزر سکا۔ اسے اپنے اعتماد کی شکست کا دکھ تھا۔

"تمھیں مارنا کوئی مشکل کام نہیں لیکن میں بلاوجہ خون پسند نہیں کرتا" پیڈرو بولا۔ "اور پھر یہ سب لوگ بزدل ہیں۔ موت سے ڈرنے والے۔ ان سب کو اپنی زندگی سے پیار ہے۔ نہ یہ تمھارا حکم مانیں گے اور نہ تم کو بچائیں گے۔"

"تم سب چپ کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟" شاہد جمیل نے چلا کے کہا۔ "اس کی تردید کیوں نہیں کرتے۔ اسے بتاتے کیوں نہیں کہ تم نمک حرام نہیں ہو۔ تم سب اپنی جان دے سکتے ہو..."

"میں مرنا نہیں چاہتا" ایک شخص نے کہا۔

"میں مجبور ہوں۔ بچے ہیں" دوسرے نمک حرام کی آواز تھی۔

"لعنت ہو تم سب پر" شاہد جمیل چلایا۔ "اگر تم سب مل کے مقابلہ کرتے تو ایک آدمی تمھارا کیا بگاڑ سکتا تھا۔"

"ایک آدمی" پیڈرو نے پھر قہقہہ مارا۔ "شاہد جمیل یہ سب میرے آدمی ہیں۔ انھیں میں نے زیادہ بولی لگا کے خرید لیا ہے۔ میری بولی اتنی اونچی تھی کہ یہ سب ایک ساتھ بک گئے۔ دنیا میں یہی ہوتا ہے شاہد جمیل۔ اصول اور ایمان، ضمیر اور انسانیت سب جنس بازار ہیں۔ خریدار کا حوصلہ کم نہ ہو تو دنیا کیا وہ تو آخرت کو خرید لے۔ خدا کی خدائی کو خرید لے۔"

پیڈرو طاقت کے نشے میں کفر بک رہا تھا اور وہی دعوے کرنے لگا تھا جو نمرود اور فرعون جیسے لوگ پہلے بھی کر چکے تھے لیکن وہ ان کے انجام کو بھولا ہوا تھا۔

میں دروازے کا پٹ تھوڑا سا وا کیے ساری گفتگو سن رہا تھا جو مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ہو رہی تھی مگر میں باتیں کرنے والوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ سکندر نادر گل میرے پیچھے تھے۔

"اب کیا ہوگا شیروانی صاحب" میں نے کہا۔ "پیڈرو اکیلا نہیں رہا۔"

"ہم بھی اکیلے کہاں ہیں" محسن بولا۔

"ہمارا خدا ابھی ہمارے ساتھ ہے" گل نے یوں کہا کہ میں اپنی ہی بات پر شرمندہ ہوگیا۔

"یہ لوگ اب ادھر آ رہے ہیں" میں نے کہا۔ "ہم صرف چار بندے ہو کے ان کا مقابلہ زیادہ دیر جاری نہیں رکھ سکتے۔"

www.paksociety.com

"پھر کیا ہتھیار ڈال دیں؟"

میں نے کہا: "ایمان کے بعد سب سے بڑی طاقت عقل کی ہے۔ ہم اسی پر انحصار کر سکتے ہیں۔ کیوں نہ ہم سب مر جائیں؟"

"کیا... آپ کا مطلب ہے... خودکشی کر لیں؟" گل نے پریشان ہو کے کہا۔

"میں نے حرام موت کی بات نہیں کی تھی۔" میں نے کہا۔ "چلو جلدی کرو۔ گل تم وہیں لیٹ جاؤ۔ معرا کو دیکھو یہ نیچے پڑا ہے۔"

گل نے میری بات سمجھ لی۔ وہ اس مگ کے پاس لیٹ گئی جو پہلے معرا کے ہاتھ سے گرا تھا۔ محسن جہاں تھا وہیں آنکھ لیٹ گیا اور میں نے دروازے کے قریب ایک جگہ پسند کی۔

شاہد جمیل نے شکست قبول نہیں کی تھی مگر مزاحمت ترک کر دی تھی۔ نہ جانے کب سے وہ اپنے اعتماد کے رشتے کا تصور لیے پرانا یقین رکھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایک جہاز کا عملہ ایک خاندان ہوتا ہے جس کا سربراہ کپتان ہو۔ اس کے لیے عقائد و نظریات کو آزمائش کی کسوٹی پر پرکھنے کا وقت کبھی نہیں آیا تھا اور اس نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ہو گی کہ "وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے" کے مقولے کی صداقت پر شک کرے اور اس خاندان کے افراد سے جس کا وہ خود بھی ایک رکن تھا یہ پوچھے کہ کبھی ان پر برا وقت آیا تو اچھے وقت کی طرح وہ سب ساتھ ہوں گے یا نہیں۔ جو اس نے سوچا ہو گا کہ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے!

مگر خوش فہمیوں کے طلسم میں اسیر رہنے والا آدمی بدلتے وقت کی حقیقت کو خود دیکھے اور تسلیم نہ کرے تو ایسی ہی شکست کا صدمہ اٹھاتا ہے۔ پیڈرو اب اسے سمجھا رہا تھا کہ وہ ضد نہ کرے۔ اس بحری جہاز کا سارا عملہ اپنی وفاداریاں تبدیل کر چکا ہے اور مزید باقی دلائل سے وہ لوگ وفادار نہیں ہو سکتے جو دولت کی طاقت کے سامنے سر جھکا چکے ہوں۔

"خدا اور ضمیر کی بات چھوڑو۔ بمبئی پہنچ کے تم مالکوں سے کیا کہو گے؟" شاہد جمیل نے کہا۔

"کچھ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ نہ جہاز نے اپنی منزل بدلی ہے نہ کوئی بات خلافِ معمول ہوئی ہے۔ جہاز کا کپتان مر گیا ہے۔ وہ شراب بہت پیتا تھا اور دل کا مریض تھا۔ اس کا مر جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہو گی۔ ہم اسے سمندر میں ڈال دیں گے تو یہ بھی خلافِ قاعدہ نہیں۔"

"مگر تم نے اسے کیوں مارا؟" شاہد جمیل بڑے دکھ سے بولا۔

"ایک تو وہ شک بہت کرتا تھا۔ پھر اس کی نظر میں میری وقعت ایک کتے جتنی بھی نہیں تھی۔" پیڈرو نے کہا۔ "کام سے میں نے ایک لاکھ میں سودا کیا تھا اور جو شخص پانچ لاکھ دیتا ہے وہ نوکر نہیں ہوتا، مالک اور آقا ہوتا ہے۔ اس کی بات ماننی پڑتی ہے اور عزت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن وہ مجھے ذلیل کرتا تھا اور اپنی کپتانی کی دھمکی دیتا تھا۔"

"کیا اسے مار کے تم نے عزت حاصل کر لی؟ تمہارے لہجے میں زہر تھا اور نفرت کی آگ تھی۔ تمہارے پانچ لاکھ بھی بچ گئے۔ جو تم نے ان گھٹیا نسل کے چھوٹے آدمیوں کے سامنے ڈال دیے۔ اب تم آقا اور مالک بن گئے ہو۔"

"اصل بات یہ نہیں ہے۔" پیڈرو نے کہا۔ "وہ مجھے بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا مطالبہ نامعقول حد تک بڑھا کے پانچ لاکھ کر دیا تھا۔ ورنہ پانچ لاکھ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر وہ مجھے دھمکی دے رہا تھا کہ میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ جہاز کو بمبئی میں رکوا دے گا اور سارا سامان ضبط کرا دے گا یا وہ کسی دوسری پارٹی سے ڈیل کرے گا۔ انٹرپول والوں کو بتا دے گا۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس...؟"

"ثبوت اس کے کمرے میں جا کے دیکھ لو۔ اس کے باوجود اس نے انٹرپول والوں کو شپ پہ آنے کی اجازت دی۔ ان سے شناخت چھپا رکھی۔ ان کے سامنے میری ایک نہیں چلنے دی اور مجھے ذلیل کیا۔ اس طرح وہ مجھے دبانا چاہتا تھا۔ وہ جتانا چاہتا تھا کہ اس نے اپنی دھمکی پہ عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چاہتا تھا کہ میں ڈر جاؤں اور اس سے بات کروں۔ اس سے کہوں کہ مجھے پانچ لاکھ دینے منظور ہیں۔ کیا سمجھا تھا اس نے استاد پیڈرو کو۔ اس جیسے دس معرا میں دس مرتبہ بیچ کے کھا جاؤں۔ کیا ملا اسے استاد پیڈرو سے جھگڑا کر کے؟ اللہ کے گھر گئے اور جان مفت میں گئی۔ میں کچی گولیاں کھیلنے والا نہیں۔ میں نے پکا انتظام کر رکھا تھا۔ میں گولی سے مرنے والے کو زہر دینے کا قائل ہوں اور زہر میں ہمیشہ پاس رکھتا ہوں۔ بس موقع کا انتظار تھا۔ جاؤ اور وہ ساری لاشیں دیکھ لو جو پیڈرو کی استادی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اور پھر مجھے سوچ کے بتاؤ شاہد جمیل کہ تم کس کے ساتھ جاؤ گے۔ ان لاشوں کے ساتھ یا ہمارے ساتھ؟"

"سوچنے کو اب کیا رہا ہے؟" شاہد جمیل نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "اس حمام میں سب ننگے ہیں تو مجھے بھی اپنے کپڑے اتار ہی دینے چاہئیں۔"

"تم نے صحیح وقت پہ صحیح فیصلہ کر لیا۔ اب تم

جہاز کے کپتان ہو اور اسے بمبئی کے ساحل تک سلامتی سے پہنچانے کے ذمے دار ہو۔ تمہارے کام میں کوئی دخل نہیں دے گا جب تک تم معرا بننے کی کوشش نہیں کرو گے۔ عملہ بھی تمہارا ساتھ دے گا۔ وہ سب حکم کے غلام ہیں۔"

"ہوس کے غلام کہو۔" شاہد نے کہا۔

"غلامی کسی کی ہو، غلامی ہے۔" پیڈرو بولا۔ "چلو اب آ گئے۔"

یہ سب گفتگو میں نے دروازے کے قریب لیٹے لیٹے سنی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا چنانچہ میں ایک ایک لفظ صاف سن سکتا تھا۔ اب میں نے قدموں کی آواز قریب آتے سنی تو میں نے محسن اور گل کو اشارہ دیا اور خود بھی اچھی طرح سے مر گیا۔

پہلے میرا ارادہ تھا کہ پیڈرو کو اندر قدم رکھتے ہی قابو کر لوں گا پھر باقی معاملات آسان ہوں گے۔ گل اور محسن کے ساتھ جب شاہد جمیل بھی شامل ہو گا تو "ایس ایس کراچی" کے غدار، ٹھگ، حرام خور اور خود فروش عملے کے لیے مقابلہ ناممکن ہو جائے گا اور بعد میں ان کو ایم آر ایس کی عدالت میں مقدمہ چلا کے باقاعدہ موت کی سزا دی جا سکے گی۔

لیکن پیڈرو نے ثابت کیا کہ وہ بے وقوف نہیں ہے۔ وہ خود اندر نہیں آیا۔ اندر آنے والوں میں سب سے آگے شاہد جمیل تھا۔ میں نے ایک آنکھ کو تھوڑا سا کھول کے دیکھا۔ وہ تصویرِ غم بنا چاروں لاشوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ عملے کے تین ارکان تھے۔ وہ سب خفت زدہ اور گھبرائے ہوئے نظر آتے تھے۔

"یہ سب تو ہیں پیڈرو۔" شاہد جمیل نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے سر کہو۔ اور اگر یہ تمہارے لیے مشکل ہے تو پھر استاد پیڈرو کہہ کے مخاطب کرو۔" پیڈرو نے کمرے کے باہر سے کہا۔

"یس سر!" شاہد جمیل نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کیا حکم ہے ان لاشوں کے بارے میں؟"

"تمہیں یقین ہے کہ یہ لاشیں ہیں؟" پیڈرو نے عیاری سے کہا۔

"کیا آپ کا یقین اس کے برعکس ہے سر؟" شاہد جمیل نے طنز سے کہا۔ "آپ کہتے ہیں کہ یہ زندہ ہیں تو میں مان لیتا ہوں۔"

"خود دیکھو، خود یقین کرو۔" پیڈرو نے کہا۔ "انسان کی نظر اسے دھوکا بھی دے سکتی ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں پیڈرو کو اس کی ہوشیاری پہ داد دینے کے بجائے گالی دی۔ شاہد جمیل کے رویے نے مجھے تھوڑا سا مایوس کیا تھا۔ اس کا ایک ماتحت اسی کے سامنے مردانہ وار مارا گیا تھا۔ اس نے پیڈرو کی اطاعت پر اور غداری کے الزام پر موت کو ترجیح دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاہد جمیل حقیقی معنوں میں ایک فرض شناس ماتحت کا مثالی افسر ہو گا مگر ثابت یہ ہوا کہ جو باتیں کرتے ہیں وہ صرف باتیں کر سکتے ہیں۔ شاہد جمیل اس جہاز پہ پیڈرو کی ایک ضرورت تھا۔ پیڈرو اسے نہیں مار سکتا تھا لیکن موت کے مقابل ہوتے ہی شاہد جمیل کے سارے زبانی دعوے نقش بر آب ہو گئے۔ اب وہ پیڈرو جیسے شہدے بدمعاش اور ہسٹری شیٹر جرائم پیشہ کو سر کہہ رہا تھا۔ لہجہ تلخ سہی۔ اس نے معرا کی جگہ پیڈرو کو باس مان لیا تھا۔ اس شکست کو طنز اور تلخ احتجاجی انداز اختیار کر کے چھپانے کی کوشش خود اپنا مذاق اڑانے کے مترادف تھی۔

"میں سب کی موت کی تصدیق کرتا ہوں اور یہ تصدیق بھی کر سکتا ہوں کہ ان سب کی موت زہریلی کافی پینے سے واقع ہوئی ہے۔" شاہد جمیل نے کہا۔ "آپ ڈاکٹر جبلاری کو پوسٹ مارٹم کے لیے بلوا سکتے ہیں۔ اگر میری بات پر اعتبار نہیں۔"

"کافی میں ایک خطرناک زہر تھا۔" پیڈرو بولا۔

"کیوں نہ ان لاشوں کو یہیں چھوڑ دیا جائے؟" شاہد جمیل بولا۔ اس کی بات نے جتنا مجھے حیران کیا اتنا ہی پیڈرو کو کیا۔

"یہاں؟ کیا احمقانہ تجویز ہے مسٹر شاہد جمیل! یہ کپتان کا کمرا ہے جس میں اب میں رہوں گا۔ سوری! اب تم رہو گے۔ کیا تم لاشوں کے ساتھ رہنا چاہو گے؟"

"لاشوں کا کیا ہے؟ کہیں بھی پڑی رہیں۔" شاہد جمیل نے بے نیازی سے کہا۔ "مجھے ان سے ڈر نہیں لگتا۔"

"انہیں یہاں سے اٹھاؤ اور میرے کمرے کے ساتھ والے اسٹور میں پہنچا دو۔" پیڈرو نے کہا۔ "چلو تم دونوں پہلے معرا صاحب کی ارتھی اٹھاؤ۔ رام نام ست ہے۔" وہ اپنے مذاق پر خود ہی قہقہہ مار کے ہنسا۔ مجھے اس کے اندر نہ آنے سے مایوسی ہوئی تھی اور اب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اپنا پلان بدلنا پڑے گا۔

پیڈرو کی باتوں سے اور اس کی احتیاط سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جہاز کے معاملے میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے پر تیار نہیں۔ اگر اس وقت میں اور محسن اٹھ کھڑے ہوتے تو صرف انہی کو مار سکتے تھے جو پہلے ہی مجبوری کے مارے ہوئے تھے۔ باہر مسلح کھڑا ہوا پیڈرو بالکل محفوظ رہتا اور ہم باہر نکلتے تو اس کی گولی کا نشانہ بن جاتے۔ اندر رہتے تو بے بسی کی قید کاٹتے۔

"ڈاکٹر شاہد جمیل!" پیڈرو نے اچانک کہا۔ "تم باقی سب کی موت کا سرٹیفکیٹ بھی جاری کر سکتے ہو؟"

www.paksociety.com

میرا دل ڈوبنے لگا۔ پیڈرو نے بندوق شاہد جمیل کے کندھے پر رکھ دی تھی۔ اب شاہد جمیل کیا کرے گا؟ ایک زندہ آدمی کے لیے خود کو مردہ ثابت کرنا بھی اتنا ہی ناممکن ہوتا ہے جتنا کسی مردے کے لیے خود کو زندہ ثابت کرنا۔ ہمارے جسم زندگی کی حرارت سے معمور تھے اور نبض زندگی کی حرکت پذیری اور توانائی کا اعلان کر رہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ہم جسم کو اکڑا کے ایک منٹ کے لیے سانس روک سکتے تھے لیکن ایسی طفلانہ کوشش سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اب میرے آئندہ اقدام کا انحصار شاہد جمیل کے جواب پر تھا۔

جب شاہد جمیل نے میرے قریب بیٹھ کے میرا ہاتھ پکڑا اور میری نبض پر اپنی انگلی رکھی تو میں نے اسے آنکھیں کھول کے دیکھا اور زبان سے کچھ کہے بغیر اس سے ایک التجا کی۔ معلوم نہیں کیسے شاہد جمیل نے میری التجا کو سمجھ لیا۔ کیا خیالات کا عکس آنکھوں میں آ جاتا ہے؟ اور اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ عکس ایک تحریر کیسے بن جاتی ہے اور وہ تحریر [illegible] میں [illegible] صرف وہی اس کا مطلب کیوں سمجھتے ہیں [illegible] کے جذبات اور احساسات میں ذہنی مطابقت ایک [illegible] میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ ایسا ہوتا ہے اور اس وقت بھی ہوا۔

شاہد جمیل نے کہا: "مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب ایک ساتھ وہی زہریلی کافی پی کر مرے ہے۔"

"گویا خطرے کی بات کوئی نہیں؟" پیڈرو بولا۔

"اب کیسا خطرہ؟"

"یہی کہ کہیں مردہ پھر زندہ نہ ہو جائے۔ کبھی کبھی اخبار میں ایسی خبر آ جاتی ہے۔" پیڈرو نے کہا۔

مجھے اس کی بات سن کے یقین آ گیا کہ پیڈرو کو آسانی سے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا اور شاہد جمیل نے ہماری خاطر اتنا بڑا جھوٹ بول کے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ اس کے بارے میں میری رائے بدل گئی۔ وہ بزدل نہیں تھا۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ وہ پیڈرو کے سامنے اپنی شکست کا اظہار کرے۔ اسے اپنا آپ تسلیم کرے اور سر کٹے۔ وہ بہادری نہیں بے وقوفی ہوتی اگر شاہد جمیل حق گوئی و بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مارا جاتا اور پیڈرو صاف بچ جاتا۔ زندہ رہ کے ہی اسے مارنے کی کوئی صورت نکالی جا سکتی تھی اور شاہد جمیل نے جان کی بازی لگا کے یہ صورت نکالنے کی کوشش کا آغاز کر دیا تھا۔

مصر کی لاش اٹھا کر لے جانے والے لوٹ آئے تھے۔

"کپتان صاحب کو عزت و آرام کے ساتھ لٹا دینا چاہیے نا؟"

پیڈرو نے کہا اور ہنسا۔ "چلو اب ایک وردی والے کو بھی اٹھا کر پہلے اسے لے جاؤ۔ وہ جو چھوکری کا باپ ہے۔ [illegible] صورت سالو تھا۔" اس نے ایک خشک قہقہہ لگایا۔

"کیا ایک لاش میں اٹھواؤں؟" شاہد جمیل بولا۔

"نہیں، تم اندر ہی رہو۔" پیڈرو نے باہر سے [illegible] لاش کے ساتھ تین آدمی جا رہے تھے۔ وہ واپس آ گئے۔ [illegible] وہیں ٹرک کے [illegible] گا اور وہ تیسرا شخص اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے [illegible] اور لاشوں پر نظر رکھے گا۔"

"کہیں کوئی لاش فرار نہ ہو جائے؟" شاہد جمیل بولا۔

"ہاں، اگر ایک لاش بھی کم ملی تو اس کی جگہ حافظ [illegible] سے گنتی پورا کیا جائے گا۔" پیڈرو بولا۔ "تم ... [illegible]"

"میں ... میرے پاس ریوالور نہیں ہے۔" [illegible] مخاطب کیے جانے والے نے [illegible] کہا۔

"کپتان صاحب کی جیب میں ہو گا۔ ان سب کی جیب میں کہیں نہ کہیں ایک ریوالور ہو گا۔ کچھ عقل سے کام لو۔ [illegible]" پیڈرو نے کہا۔

جب باری آنے پر مجھے اٹھایا گیا تو جسم اکڑانے اور سانس روکنے کے باوجود مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں لاشیں ڈھونے والے میرے مکر کو تاڑ نہ جائیں لیکن وہ استاد پیڈرو نہیں تھے۔ وہ بے چارے اور پریشان بھی تھے چنانچہ انھوں نے ڈپٹتے ہوئے میری ایک ساتھ [illegible] لاش کو اس مردہ خانے تک پہنچا دیا جہاں ایک اصطبل نما کمرے کے ساتھ دو درجن خود ساختہ لاشیں پہلے ہی پڑی ہوئی تھیں۔ راستے میں ایک جگہ انھوں نے مجھے تقریباً گرا دیا تھا۔ وہ بہت تھک گئے تھے اور جہاز کے ہچکولے [illegible] تھے جس کی وجہ سے وہ توازن قائم رکھنے میں ناکام تھے۔ یہ غنیمت ہوا کہ مجھے ٹانگوں سے پکڑ کے اٹھانے والے نے چھوڑا۔ اگر میرا سر فرش پر لگتا تو میری لاش کے حلق سے آہ یا ہائے ضرور نکل جاتی۔

پیڈرو کے بارے میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔ میں آخری مردہ تھا اور میرا جنازہ اٹھانے والوں کے ساتھ شاہد جمیل اور استاد پیڈرو بھی [illegible] سے روانہ ہو گئے تھے اس طرح کہ پیڈرو سب سے پیچھے تھا۔ مردہ خانے میں جب مجھے فرش پر سیدھا رکھ دیا گیا تو مجھے احساس ہوا کہ میری کمر کے نیچے کوئی نوکیلی چیز چبھ رہی ہے۔ جب تک میں حرکت میں تھا یہ میرے لیے محسوس نہ ہونے والی [illegible] پھر سانس لینا ممکن تھا۔ [illegible] قدموں سے لاش ڈھونے والوں کے لیے اس خفیف سی حرکت کو نوٹ کرنا [illegible] لیکن اب اچانک میرے لیے آزمائش سخت ہو گئی۔

ایک طرف وہ کیل تھی جو میری کمر میں پیوست ہوتی جا رہی تھی [illegible] میرے لیے حرکت نہ کرنا سخت ترین قوت برداشت کا کام تھا۔ دوسری طرف سانس کی آمد و رفت کو بلند ہونا [illegible] سے زیادہ مشکل کام تھا۔ چند سیکنڈ میں یہ ڈراما فلاپ ہو سکتا تھا۔

اچانک پیڈرو نے کہا [illegible] "باقی سب لوگ باہر جاؤ [illegible] میرے پاس رہو۔ بالکل تیار۔ شاہد جمیل تم یہ دروازہ [illegible] اور پھر سامنے آ جاؤ اور لاشوں کے ساتھ لیٹ جاؤ۔"

"لاشوں کے ساتھ؟" شاہد جمیل کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"ہاں، کیا ڈرتے ہو؟" پیڈرو ہنسا۔ "ابھی خود تم نے کہا تھا [illegible] لاشوں سے ڈر نہیں لگتا۔"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" شاہد جمیل نے تند لہجے میں کہا۔

"[illegible] ایک تماشا دکھانا [illegible] کبھی نہ دیکھا ہو گا۔" پیڈرو بولا۔ "فرض کرو میں ان مردوں کو زندہ [illegible]"

اب میرے لیے اپنی اداکاری کو جاری رکھنا بے مقصد [illegible] مشکل ہو گیا تھا۔ [illegible] پیڈرو مجھے مشین گن کے [illegible] نظر آ رہا۔

"[illegible] پیڈرو۔" میں نے کہا۔ "میرا ڈنڈہ بھی تم جیت گئے۔" [illegible] "تم خود ایک زندہ ہو جانے والے [illegible]"

پیڈرو نے ایک قہقہہ مارا۔ "تم نے دیکھا شاہد جمیل [illegible] موت کا سرٹیفکیٹ جاری کر چکے تھے۔ وہ صرف [illegible] تھے یا تم نے بوگس سرٹیفکیٹ دیا تھا۔"

"میں ... شاید غلط سمجھا تھا۔" شاہد جمیل نے کہا۔

"[illegible] بند کرو۔" پیڈرو نے مشین گن کا دستہ شاہد جمیل [illegible] "تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔" شاہد جمیل پیچھے گر گیا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور [illegible] اس کی گردن پر بہنے لگی تھی۔

"یہ سب احمق الو کے پٹھے ہیں۔" پیڈرو نے [illegible] روپ میں آتے ہی گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ "[illegible] کو بھی اپنی پیشانی پر [illegible] یہ نہیں جانتے [illegible] پیڈرو کیا چیز ہے۔ ایسے ہی استاد پیڈرو نہیں بنتا [illegible] کو دھوکا دینا آسان نہیں ہے۔ وہ اڑتی چڑیا کے [illegible] کے جیسے سات پردوں میں تالے [illegible] ہے۔ ہر بات سمجھ لیتا تو اس وقت [illegible] کیسی [illegible] کی لاش۔"

"جھوٹ تو تم ویسے بھی [illegible]" میں نے سر ہلا کے کہا۔

"اور کہتے ہیں کہ جھوٹ بکنے والے [illegible] نہیں بچ سکتے۔" محسن بولا۔

"یہ ویسے [illegible] ہے۔"

"مگر اس وقت [illegible] آ رہا ہوا ہے۔" [illegible] بولا۔

"بہت خوب۔ بہت [illegible]"

پھر کیا ہے۔" پیڈرو نے کہا۔ "کیا تمھیں [illegible] مذاق ہے؟"

"تم کو رونا چاہیے اپنی قسمت پر [illegible]"

"اور اپنی صورت پر۔" محسن بولا۔ "[illegible] سیاہی ہے۔"

"بہت جلد معلوم ہو جائے گا [illegible]"

پیڈرو تلخ لہجے میں بولا۔ [illegible] وہ حضرت [illegible] اور کیا [illegible] ہو گا کبھی [illegible] ہاتھوں سے دنیا کو [illegible] ہنسا اور ہنستا رہا۔

پھر اچانک ہنسی کو روک کے اس [illegible] ایک راؤنڈ فائر کیا۔ سب گولیاں ہمارے [illegible] اور میرے سے گزر کے دیوار میں پیوست ہو گئیں۔ [illegible] چیخ ماری۔

پیڈرو نے چونک کر اسے دیکھا اور [illegible] مسکرایا۔ "اچھا، یہ بھی ہے ایک ڈراما۔ تمھارے [illegible] ایڈووکیٹ نے اپنی جنس بدل لی ہے۔ باہر سے تو [illegible] یہ اندر سے ... دیکھنا پڑے گا الٹ پلٹ کے۔"

میں نے اپنے ردعمل کو ظاہر نہیں ہونے دیا [illegible] میرے لیے حیرانی کا باعث تھی کہ پیڈرو نے گل کو رابعہ [illegible] اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ پیڈرو نے عرصہ دراز سے [illegible] کو دیکھا نہیں تھا اور گل کو وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کی [illegible] بھی ہو سکتی تھی مگر مجھے استاد پیڈرو کے طرز عمل میں رونما ہونے والی تبدیلی بہت فطری لگی۔ اس کی بات نے میرے خیالات کی رو کو ایک نئی سمت دے دی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا واقعی پیڈرو نے گل کو رابعہ سمجھا ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو اس کا ایک مطلب یہ نکلتا ہے کہ اسے رابعہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں اور شاید اس تمام عرصے میں جب رابعہ ہمارے ساتھ تھی پیڈرو نے اسے ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا ورنہ وہ رابعہ کی صورت کو کیسے بھول سکتا تھا اور گل کو رابعہ کیسے سمجھ سکتا تھا۔ یہ ایک منطقی نتیجہ تھا جو اس کے ذہن نے خود بخود اخذ کر لیا تھا کہ میرے ساتھ [illegible] جیسی [illegible] کے لیے خطرناک مشن پر آنے والی لڑکی صرف

www.paksociety.com

رابعہ بھی ہو سکتی ہے۔ شہلا کا خیال اسے یوں نہیں آیا ہو گا کہ شہلا مدت سے لاہور میں رضوی صاحب کے گھر تھی اور یہ سب ہی جانتے ہوں گے کہ شادی کے بعد وہ ایک بچے کی ماں بھی بن چکی تھی۔

رابعہ کو دلاور نے یقیناً دیکھا تھا اور دلاور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ چاند بھائی کی تحویل میں ہے۔ پھر اس نے اپنے افسر پرکاش یا استاد پیڈرو کو یہ بات کیوں نہیں بتائی؟ فوری طور پر اس سوال کا جواب تلاش کرنا ممکن نہیں تھا۔ میرے لیے اس میں ایک پہلو اطمینان کا تھا کہ رابعہ کے بارے میں پیڈرو غلط فہمی کا شکار ہے۔ اس سے رابعہ کسی حد تک محفوظ ہو جاتی تھی مگر اس کے بجائے کا عذاب گل پر ٹوٹنے کے آثار پیدا ہونے سے میری پریشانی بڑھ گئی تھی۔

پیڈرو نے آواز دے کر دو افراد کو اندر بلا لیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے گل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "عورت یا مرد؟"

"ہے تو مرد۔" ایک نے مسکرا کے کہا۔

"بے وقوف! کبھی حلیہ دیکھ کے متاثر نہیں ہونا چاہیے، اچھی طرح دیکھ کے بتاؤ۔" پیڈرو نے کہا۔

"خبردار جو کسی نے... ایسی جرأت کی۔" میں نے کہا۔

"اگر تم نے اپنی جگہ سے حرکت بھی کی تو فی الحال یہ گولی تمہاری ٹانگ میں ماری جائے گی۔" پیڈرو نے کہا۔ "ایک برسٹ میں تم دونوں کی ایک ایک ٹانگ کا آپریشن ہو جائے گا۔ تم کھیل ترک کرو۔ ادھر لاؤ اس باسٹرڈ کو۔ اس کا پول ابھی کھل جائے گا۔"

وہ دونوں پھر آگے بڑھے۔ گل ان کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی ٹوپی اتار کے پھینک دی۔

"ٹھیک ہے۔ میں رابعہ ہوں۔" گل نے بے خوفی سے کہا۔ اس کے تراشیدہ بال اس کے شانوں پر پھیل گئے۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہ بوجھ میری روح پر پڑتا جا رہا تھا اور میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ گل کو بچانے کے لیے پیڈرو کو بتا دینا چاہیے کہ یہ رابعہ نہیں ہے یا اس کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھانے کے لیے خاموش رہنا چاہیے۔ پیڈرو کو نام سے کیا فرق پڑے گا۔ وہ رابعہ ہو یا گل۔ اگر اس کے ذہن میں کوئی ناپاک شیطانی خیال ہوگا تو اظہار حقیقت سے میں اس کے خیال کو بدل نہیں سکوں گا۔ گل نے میری مشکل اپنی جرأت کے مظاہرے سے آسان کر دی۔

"تم کچھ بدلی ہوئی لگتی ہو۔" پیڈرو نے لبوں پر زبان پھیر کے اسے پُرہوس نظروں سے دیکھا۔ "شاید بال کٹوا کے زیادہ خوب صورت ہو گئی ہو۔ اب تم خود ہی ادھر آ جاؤ ورنہ ان سے کہوں کہ تمہیں زبردستی کھینچ لائیں۔"

میرے منع کرنے کے باوجود گل آگے بڑھ گئی۔ [illegible] نے میری طرف دیکھ کے افسوس سے [illegible] کیا ہونے والا تھا۔

"اس کی تلاشی لو۔" پیڈرو نے حکم دیا۔

گل نے رضاکارانہ طور پر ہاتھ [illegible]

[illegible] نے خاصی تفصیل سے اس کی تلاشی لی۔ [illegible] جانے اپنے سفلی جذبات کی تسکین [illegible] کر رہے تھے۔ گل کا چہرہ [illegible] اور شرم سے [illegible] نے مزاحمت نہیں کی اور زبان سے بھی کچھ نہیں کہا۔ [illegible] روکے ہتھیار [illegible] گل کی وردی کی جیب سے [illegible] اس کا ریوالور بھی لے لیا گیا تھا مگر وہ بیلٹ محفوظ [illegible] جو گل کی کمر کے ساتھ بندھی ہوئی تھی اور جس میں اس کا [illegible] تھا اور ہنگامی حالات کے لیے محفوظ رقم تھی۔ [illegible] والوں کے ہاتھ کمر کے علاوہ ہر جگہ پہنچے۔ [illegible] کہیں زیادہ دیکھا تھا جو رابعہ کے ساتھ ہوا تھا۔ [illegible] باوجود میرے حواس کی حدت بڑھ رہی تھی کیوں کہ [illegible] کی اس اذیت میں برابر کا شریک تھا جو گل جھیل رہی تھی۔ ایک بار میری اور گل کی نظریں ملیں تو میں نے اس کی [illegible] کا اشارہ صاف دیکھا۔ وہ مجھے کچھ نہ کرنے اور ضبط سے [illegible] لینے کا کہہ رہی تھی۔

پیڈرو کے حکم پر گل کو ایک رسی سے اس طرح [illegible] دیا گیا کہ اس کے دونوں ہاتھ اوپر سے [illegible] سوا ایک روشن دان کی سلاخ سے گزار کے واپس [illegible] گیا۔ اس رسی کا باقی حصہ گل کے دونوں پاؤں [illegible] باندھنے میں کام آیا۔

میں اس تمام کارروائی کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ [illegible] سے تفتیش کرنا چاہتا تھا اور اس کا آغاز [illegible] ہماری کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی [illegible] وہ خوش تھا کہ رابعہ اس کے ہاتھ لگ گئی اور [illegible] سمجھتا تھا کہ اگر اس نے گل کے ساتھ کوئی شرمناک [illegible] کی یا اس پر تشدد کا کوئی انسانیت سوز طریقہ [illegible] گل کو بچانے کے لیے سب کچھ کروں گا۔ [illegible] پیڈرو تنہا جس نے سب مشکلیں [illegible] نشانہ خطا نہیں ہو سکتا تھا [illegible] اور پیڈرو میرے ہاتھ لگ جاتا تو [illegible] باقی سب حکم کے غلام تھے اور انھیں [illegible]

[illegible] سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

پیڈرو کی دھمکی نے ہی مجھے تھوڑا سا خوف زدہ کر [illegible] گولی مار کے مجھے ختم کرنے کی بات کرتا تب [illegible] کرخت یا تکلیف [illegible] میں نہیں مارا گیا تو [illegible] جانے کا لیکن اس نے میری ٹانگ اڑا دینے کی [illegible] دھمکی دی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھے قتل کرنا نہیں [illegible] ایک پوری اور ایک آدھی ٹانگ کے ساتھ معذوری [illegible] بے بسی سے پیڈرو کا قیدی بن جانا ایک بڑا اذیت [illegible] تصور تھا۔

"پیڈرو! تم کو جو کچھ پوچھنا ہے مجھ سے پوچھو۔" میں [illegible] اطمینان سے پوچھو۔"

"تم لوگ بہت بدل گئے ہو۔" پیڈرو بولا۔ "پہلے تو تم بھی [illegible] کچھ نہیں بتاتے تھے۔ بزدل ہو گئے ہو تم؟"

"حالات بھی بہت بدل گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا؟ مجھے معلوم نہیں تھا۔" پیڈرو نے [illegible] "ایک بات میں بھی بتا دوں تمہیں۔ مجھے حالات [illegible] پہلے کے مقابلے میں زیادہ سخت دل اور بے رحم بنا دیا ہے۔ اور یہ بھی سکھا دیا ہے کہ سانپ بچھو پر اعتبار [illegible] نہیں۔ تم ایسے ہی مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے [illegible] جانتا ہوں کہ وقت کی مار کھا کے تم اب پہلے [illegible] سخت جان ہو گئے ہو اور اب تم سے سچ اگلوانا [illegible] مشکل ہوگا لیکن تجربہ میں نے بھی حاصل کیا ہے۔ اب [illegible] کر سکتا ہوں جو پہلے نہیں کر سکتا تھا اور جس کا تم تصور [illegible] نہیں کر سکتے۔"

"کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ تشدد کے سامنے ہم سر جھکا دیں [illegible]" میں نے کہا۔ "اگر ہم کچھ نہ بتانے پر تل گئے تو پھر تم [illegible] دہشت و بربریت کا مظاہرہ اور جتنا چاہے تشدد [illegible] کر کے ہار جاؤ گے۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوگا پہلے بھی تم [illegible] وقت ضائع کرتے رہے ہو۔"

"پھر اس تعاون کا ڈرامہ کیوں ہو رہا ہے؟" وہ [illegible] "کیا اولاد! رابعہ کے لیے؟"

"رابعہ بہت کچھ دیکھ چکی ہے اور جھیل چکی ہے۔ تم [illegible] اس سے کیا فرق پڑتا؟ میں پھر تیار ہوں۔ رابعہ سے [illegible] اس کوشش میں تھا کہ اتنا وقت [illegible] کو پھر کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ [illegible] آ جانے کا آخری ہم یہ امید لے کر بیٹھے کہ جہاز غرق [illegible] نکل جائیں گے۔ اب جہاز کے ساتھ ہی ڈوبنے [illegible] اندازے غلط بھی ہو جاتے ہیں اور یہ سارا کھیل ہی موت کا کھیل ہے۔"

پیڈرو کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ "جہاز کیسے ڈوب جائے گا؟"

میں ہنسا۔ "بعد میں جہاز کی غرقابی کے اسباب معلوم کرنے کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن بنایا جائے گا۔ اگر اس میں ماہر ہوں گے تو پتا چلا لیں گے۔"

محسن نے گھڑی دیکھی۔ "یا تم خود پتا چلا لو۔ ابھی وقت ہے۔"

"ہاں! تین چار گھنٹے میں جہاز کا ذرہ ذرہ دیکھ لو اوپر سے اور نیچے سے، اندر سے اور باہر سے۔" میں نے کہا۔

پیڈرو کی صورت کا تاثر بدل گیا۔ "تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ جہاز کے کسی بہت مشکل اور پوشیدہ مقام پر تم نے کوئی تباہ کن بم وغیرہ نصب کر دیا ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ جادو سے جنگ جیتنا تم نے کس سے سیکھا؟ جہاز پر قدم رنجہ فرمانے کے بعد تم ایک لمحے کے لیے بھی ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے لیکن اپنا کام بھی کر گئے۔"

"یہ جادو نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

پیڈرو ہنسا۔ "پھر کوئی ہمزاد ہوگا تمہارے ساتھ وہ سب کچھ کر گیا اور کسی کو کچھ نظر نہیں آیا۔"

"یہ کام ہمارے ساتھی گزشتہ رات ہی کر چکے تھے استاد پیڈرو۔" میں نے کہا۔

"اور وہ ساتھی سلیمانی ٹوپی اوڑھ کے آئے تھے کہ کسی کو دکھائی نہیں دیے؟"

"آدھا کام انھوں نے کراچی کی بندرگاہ میں ہی کر لیا تھا اور باقی جہاز کے روانہ ہونے کے بعد۔ کیا تم اتنا تو جانتے ہو گے کہ کسی بھی ٹائم بم کو بارہ گھنٹے سے زیادہ عرصے کے لیے سیٹ نہیں کیا جا سکتا۔ گھڑی کی سوئیاں بارہ گھنٹے کے بعد پھر ایک گھنٹے پر آ جاتی ہیں۔ جہاز کے بارے میں یہ معلوم ہونے تک کہ اس کی روانگی کب ہوگی یہ کام ناممکن تھا۔ اور سلیمانی ٹوپی تو آنکھ پر پڑ جانے والا پردہ ہوتی ہے۔ اندھیرا بھی سلیمانی ٹوپی ہے جس میں آنکھ کچھ نہیں دیکھ سکتی اور لاعلمی بھی سلیمانی ٹوپی ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ یہاں تمہارا ساتھی کون تھا اور ہمارے ساتھ کون ملا ہوا تھا۔ یہ سارا کھیل پیسے کا یا جذبات کا۔ تم نے آج جہاز کے عملے کی وفاداری خرید لی ہے تو بہت مطمئن ہو گئے۔ تمہیں یہ خیال نہیں آتا کہ تم سے پہلے بھی ان کو خریدنا ممکن تھا؟"

"ہاں۔ جو چیز بازار میں برائے فروخت ہو اسے کوئی بھی خرید سکتا ہے جو پہلے پہنچ جائے۔" محسن بولا۔ "اور یہ بھی مت بھولو کہ انسان جو ایک بار بکتا ہے وہ دوسری بار

www.paksociety.com

بھی بک سکتا ہے اور سب سے زیادہ ناقابلِ اعتبار وہی ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پیسہ تم سے لے کر ساتھ تمھارا خود سے۔"

"صرف وہی ناقابلِ اعتبار ہوتا ہے جو یقین یا ایمان کے جذبے کو نہ سمجھتا ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم جہاں سے بے خوفی سے یہاں آئے تھے تو آخر کس کے بھروسے پر؟۔۔۔ خدا کے بعد ہم ان کی مدد پر تکیہ کرتے ہیں جو اصولی طور پر ہمارے ساتھی ہیں۔ زرخرید نہیں ہیں۔ اور اگر سب تم کو زرخرید محسوس ہوتے ہیں تو یہ دھوکا ہے تمھاری نظر کا۔"

پیڈرو سوچ میں پڑ گیا۔ "جھوٹ بکتے ہو تم، یہ سب میرے ساتھ ہیں۔ ان سے میرا معاملہ پہلے ہی طے ہو گیا تھا۔ جہاز جب کراچی کی بندرگاہ میں تھا تو وہیں ساری بات ہو گئی تھی۔ مگر۔۔۔ یہ ہو سکتا ہے۔۔۔ کہ ان میں سے کوئی دغاباز بھی ہو۔ میں معلوم کروں گا۔ مجھے تو اب معمرا پر بھی شک ہے ضرور وہ تم سے ملا ہوا تھا ورنہ۔۔۔ ورنہ میری بات ضرور سنتا۔"

میں نے مسکرا کے محسن کی طرف دیکھا۔ "شک کی کیا بات ہے۔ معمرا ہماری مدد نہ کرتا تو ہم کیا کر سکتے تھے؟ تم نے اسے بیس لاکھ دینے کا وعدہ کیا تھا نا؟"

پیڈرو چونکا۔ "یہ تم کیسے جانتے ہو؟"

"ہم تو یہ بھی جانتے ہیں کہ معمرا کو اس دھندے میں تم زبردستی کھینچ لائے تھے۔ تم نے اسے بلیک میل کر کے مجبور کر دیا تھا۔" محسن بولا۔

"اور جس معاملے میں تم نے اسے بلیک میل کیا وہ ایسا تھا کہ اس کی جگہ میں بھی ہوتا تو تمھاری بات مانتا لیکن پھر میں بھی وہی کرتا جو معمرا نے کیا۔ میں اسی طرح تمھاری پیٹھ میں خنجر گھونپ دیتا۔"

پیڈرو کے اعتماد کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا۔ اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے محسن کو گھورنے کے بعد کہا۔ "یہی دو آدمی تھے۔۔۔ انھی سے خطرہ تھا۔ چوہدری صاحب کو بھی" وہ اپنے آپ سے مخاطب تھا۔

"چوہدری دلاور ایک ذہین آدمی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے اندازے درست تھے۔ مگر تم ان دونوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ معمرا تنگ دست تھا جس نے اسے دھمکی پر تم جیتی کی تو اس نے کہا کہ پیڈرو تم اس کے بیوی بچوں کو لو ہی ہٹا دی جائے۔ اسے تم پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ تمھارے لیے ایک لاکھ ادا کرنے سے زیادہ آسان ایک گولی چلانا ہے۔ تم اسے قتل کر دو گے اور تمھارا فائدہ

حاصل کر لو گے۔ تمھارے ایک لاکھ بھی بچ جائیں گے اور تمھیں افشائے راز کا بھی خطرہ نہیں رہے گا۔"

پیڈرو نے مشین گن کا رخ شاہد جمیل کی طرف کر دیا۔ "ایک کو تو اس کے کیے کی سزا مل گئی۔"

"ٹھہرو۔" میں نے چلا کے کہا۔ "اسے بھی مار دو گے تو تمھیں ہم بھی نہیں بچا سکیں گے۔ معمرا کے بیٹے کو کسی نے کافی میں زہر دے دیا تھا اور اس الزام میں کچن کے ملازموں کو گرفتار کرا سکتے ہو جو فرسٹ آفیسر کو ڈالو گے تو بمبئی پہنچ جانے کے بعد حکام کو کیا جواب دو گے اور کمپنی سے کیا کہو گے؟"

"انھوں نے تمھیں جہاز کی اور عملے کی خدمات سونپ دی تھیں۔ ان کی زندگی کا سودا نہیں کیا تھا۔ جہاز یا عملے کے کسی فرد کو تمھارے ہاتھوں نقصان پہنچا تو وہ تم کو معاف نہیں کریں گے۔ وہ تمھیں گرفتار اور تمھارے مال کو ضبط کر دیں گے۔"

پیڈرو رک گیا۔ شاہد جمیل نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا چہرہ جو دہشت سے پیلا پڑ گیا تھا، مسکراہٹ سے کھل اٹھا۔ اس نے ممنونیت کے جذبات کے ساتھ مجھے دیکھا۔

"شاہد جمیل! کیا تم ان کو حفاظت سے بمبئی پہنچا کر انھیں معاہدے کے مطابق اپنا مال اتارنے کے وقت تحفظ دینے کی ضمانت دے سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اور اس کے بدلے کیا مجھے اور میرے عملے کو سلامتی کی ضمانت ملے گی؟" شاہد جمیل نے میری بات پر غور کر کے کہا۔

"پیڈرو کی طرف سے میں کوئی ضمانت نہیں دے سکتا لیکن یہ ضمانت تمھیں بہرحال حاصل ہے۔ کیوں پیڈرو؟"

پیڈرو نے بادلِ ناخواستہ اقرار میں سر ہلا دیا۔ صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلے پیڈرو کے ذہن میں شکوک پیدا کیے تھے پھر اس پر ایک طرح سے غلبہ حاصل کر لیا تھا اور اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ عقل سے سوچے۔ اس طرح پیڈرو کی قوتِ فیصلہ مفلوج تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ایک دوسرے سے تعاون باہمی کے لیے ضروری ہے۔

"تم اپنے عملے کو بھی سمجھا سکتے ہو کہ معمرا کی ایک حادثاتی یا طبعی موت تھی۔ اس کا ارسٹ ..." میں نے شاہد جمیل سے کہا۔

"ہے۔۔۔ تو ٹھیک ہے لیکن اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔" شاہد جمیل نے کہا۔ "مجھے جہاز کے بارے کچھ معلوم نہیں۔"

"کیا معلوم نہیں؟" پیڈرو غرا کے بولا۔

"یہی۔۔۔ کہ معمرا صاحب نے آتش گیر اور تباہ کن مادہ کہاں کہاں چھپایا تھا۔" شاہد جمیل نے ترپ کا جوابی پتا پھینکا۔

"وہ معمرا نے مرنے سے پہلے ہمیں بتا دیا تھا۔" میں نے سکون سے کہا۔

شاہد جمیل کی چال کامیاب رہی تھی۔ جیسے ہم نے اس کے لیے تحفظ کی ضمانت فراہم کی تھی تو اب اس نے ہمیں موقع دیا تھا کہ ہم اپنے دماغ کو یقینی بنا لیں۔ پیڈرو بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹ رہا تھا اور سخت مشتعل تھا۔ ہماری مدد کے بغیر وہ جہاز کو غرقابی سے نہیں بچا سکتا تھا اور ادھر شاہد جمیل کی مدد کے بغیر خود کو ان قانونی الجھنوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا جو اس کے مشن کو منزل پر پہنچنے کے بعد ناکامی سے دوچار کر سکتی تھیں۔

پیڈرو نے اپنے دو ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ شاہد جمیل کو لے جائیں۔ "اس کو انجن روم میں قید رکھو۔ یہ تم دونوں کی ذمے داری ہے کہ نہ یہ اس کمرے سے نکلے اور نہ کوئی اس کے پاس جائے۔"

"عملے کو میری ہدایات کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔" شاہد جمیل نے کہا۔

"سب ہدایات میری موجودگی میں دی جائیں گی۔"

باہر سے بلائے جانے والے دو افراد نے پیڈرو کے حکم پر گل کو آزاد کر دیا۔ جواب سخت [illegible] جس طرح باندھا گیا تھا وہ [illegible] تھا۔

وہ پنجوں کے بل زمین پر کھڑی رہ سکتی تھی اور قدم جمانے کی کوشش ہونے کی صورت میں اوپر بندھے ہوئے ہاتھوں، شانوں اور بازوؤں پر جسم کا سارا بوجھ پڑ جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر دورانِ خون کے متاثر ہونے سے بھی اکڑ گئے تھے لیکن ابھی تک وہ قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب تھی۔ جب اسے کھولا گیا تو وہ فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

جب وہ اسے گھسیٹ کر لے جا رہے تھے تو گل نے چلا کے مجھ سے کہا۔ "سکندر! میری فکر مت کرنا۔ میں مر جاؤں گی مگر انھیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

وہ ہمیشہ مجھے سکندر بھائی کہتی تھی۔ اس وقت سکندر کہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ رابعہ کا کردار نباہنے پر کمربستہ ہے۔ اسے کیا خبر تھی کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ جو عذاب اس نے تھوڑی سی دیر برداشت کیا تھا وہ بہت معمولی تھا۔ رابعہ پر یہاں سے ہزار گنا مظالم توڑے گئے تھے اور وہ ثابت قدم رہی تھی۔ ایک عورت جب بے ضمیر شیطان صفت جلادوں کے ہاتھوں میں ہو تو اس پر کیسے کیسے اندازِ ستم آزمائے جا سکتے ہیں۔ گل کو اس کا اندازہ نہ تھا۔ مگر میں اسے منع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ رابعہ نہیں ہے۔ ایک عذاب جسمانی اذیت کا ہو گا جو وہ اکیلی بھگتے گی۔ دوسرا عذاب میری ذہنی اذیت کا ہو گا اور ہم دونوں بے بس ہوں گے۔

"یہ ٹھیک ہے پیڈرو کہ ہم ایک دوسرے کو زندہ نہیں دیکھ سکتے۔" میں نے کہا۔ "اور جب موقع ملے گا تو ایک دوسرے کی جان لے کر دلی تسکین حاصل کریں گے لیکن اس وقت صورتِ حال مختلف ہے۔ یہ ایک ساتھ خودکشی کر لینے والی بات ہے۔ اس طرح نہ تمھارے لیے جیت کی خوشی ہے اور نہ میرے لیے کامیابی کی۔ تم نے بروقت فیصلہ کر لیا۔ یہ بازی ڈرا ہو گئی ہے۔"

پیڈرو نے حقارت سے کہا۔ "ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ میں اگلی چال سوچ رہا ہوں۔"

"اب کوئی چال باقی نہیں رہی۔" میں نے کہا۔ "شطرنج کے کھیل میں بھی ایسا ہو جاتا ہے تو مہرے پھر سے لگانے پڑتے ہیں۔"

وہ ہنسا۔ "بازی ابھی ختم نہیں ہوئی سکندر اعظم! تم کیا جانو کہ میں کون سا مہرہ آگے چل کے تمھیں مات دے سکتا ہوں۔"

گل کو لے جانے والے لوٹ آئے تھے۔ پیڈرو نے کہا۔ "اپنا منہ دیوار کی طرف کر لو اور ہاتھ اوپر رکھو۔ اگر تم نے مزاحمت کی یا تلاشی لینے والوں کو یرغمال بنایا تو تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میرے لیے ان دونوں کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ بے شک تم جوڈو کراٹے کے ماہر ہو مگر میرے ہاتھ میں مشین گن ہے۔ میں بتا چکا ہوں کہ تم دونوں کی ٹانگیں گھٹنوں کے پاس سے الگ کرنے میں مجھے چند سیکنڈ لگیں گے۔"

میرا فوری طور پر کسی جوابی کارروائی کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ مجھے تھوڑی سی مہلت مل گئی تھی اور جہاں جدوجہد کے سب راستے بند ہو جائیں وہاں وقت کی مشکل کشائی پر اور دستِ قدرت کی ناگہانی پر انحصار کرنے کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے پیڈرو کے احکامات کی لفظ بہ لفظ تعمیل کی تھی مگر شاید وہ میری طرف سے عدمِ اطمینان کا شکار تھا۔ تلاشی لینے والوں نے بغیر کوشش دیے اور بے سبب میرے سر پر ریوالور کا دستہ مارا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میں دیوار کے ساتھ پھسلتا ہوا نیچے گیا۔ مگر مجھے اپنے فرش پر گرنے کا پتا بھی نہ چلا۔ غالباً ایسا ہی محسن کے ساتھ ہوا۔

ہوش آنے پر میں نے خود کو بہت عجیب حالت

میں دیکھا میرے پیروں پر میرا جسم رکوع کی حالت میں قائم تھا لیکن اس طرح کہ میں دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ میرا سر ایک گول شگاف سے گزارا گیا تھا جو درمیانی دیوار میں بڑی مہارت سے بنایا گیا تھا۔ یہ شگاف میری گردن کے سائز سے کچھ ہی بڑا تھا۔ اتنے چھوٹے سوراخ سے میرا سر نہیں گزر سکتا تھا چنانچہ سوراخ بڑا رکھا گیا تھا مگر سر نکالنے کے بعد گردن پر اوپر نیچے لوہے کی سلاخیں فٹ کر دی گئی تھیں۔ گردن سے نیچے میرے بازو، دھڑ اور ٹانگیں دوسرے کمرے میں رہ گئے تھے۔

میں نے سر کو دائیں بائیں گھما کے دیکھا۔ سیدھے ہاتھ کی طرف محسن کا سر لکڑی کی دیوار میں ایسے لگا ہوا تھا جیسے شکار کیے ہوئے جانوروں کے بھس بھرے سر دیواروں پر لگے نظر آتے ہیں۔ میں اپنی گردن کو تھوڑا بہت آگے پیچھے کر سکتا تھا مگر اس سوراخ سے اپنا سر نہیں نکال سکتا تھا۔ اسی طرح میں رکوع کی حالت میں رہتے ہوئے جسم کو حرکت تو دے سکتا تھا لیکن صرف اس حد تک کہ ٹانگوں کو تھوڑا سا آگے پیچھے کر سکوں۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف ابھی قابل برداشت تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اسی طرح میں ایک گھنٹا بھی نہیں گزار سکتا۔

دوسرے کمرے میں جو آٹھ فٹ چوڑا اور لمبا تھا، پیڈرو اُسلا کھڑا ہوا تھا۔ کمرے کی خالی دیواریں سفیدی کی بنی ہوئی تھیں اور بالکل سامنے والی دیوار میں ایک بند دروازے کے سوا باہر آنے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کمرے کی چھت میں ایک بلب روشن تھا۔

پیڈرو آہستہ آہستہ میرے قریب آیا۔ اس کے لبوں پر بڑی پراسرار خباثت شیطانی مسکراہٹ تھی۔

"کیا خیال ہے شاطر اعظم۔ بازی کیسی جا رہی ہے؟" اس نے میرے منہ پر ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

میرا چہرہ سنسنانے لگا۔ "تم بچ نہیں سکتے پیڈرو۔"

اس نے میرے دوسرے گال پر تھپڑ مارا۔ "بچ تو میں اس وقت بھی گیا تھا جب تم مجھ پر گولیاں برسا رہے تھے اور میں سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔"

میرے سر کو ایک جھٹکا لگا۔ اوپر نیچے سے لوہے کی سلاخیں میری گردن میں گڑ رہی تھیں اور دائیں بائیں لکڑی کے کھردرے کنارے تھے۔ نہ میں سلاخیں توڑ سکتا تھا اور نہ لکڑی کی دیوار میں تو پیڈرو کو چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے ہاتھ پیر جو میری طاقت تھے دوسرے کمرے میں قید تھے۔

"معراب نے کیا بتایا تھا تمھیں؟" پیڈرو نے محسن کے سامنے جا کے کہا۔

"اس نے بتایا تھا کہ پیڈرو کے تین باپ تھے۔" محسن بولا۔

پیڈرو نے اس کے منہ پر تین تھپڑ مارے۔ ہر تھپڑ بھرپور تھا اور اس کی آواز خالی کمرے میں پٹاخے کی طرح سنائی دی۔

وہ پھر میری طرف لوٹ آیا۔ "یہی سوال میں تم سے کرتا ہوں۔"

"مجھے تو معراب نے بتایا تھا کہ یہ تمھاری خاندانی روایت ہے۔ سب کے تین باپ ہوتے رہے۔" میں نے کہا۔

پیڈرو نے مجھے تین تھپڑ نہیں مارے۔ وہ پیچھے ہٹ کے کہنے لگا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم اپنی ضد پر قائم رہو گے۔ ہمیشہ کی طرح سو پیاز اور سو جوتے کھاؤ گے۔ تمھاری مرضی۔" اس نے باری باری ہم دونوں کو دیکھا اور دروازہ کھول کے کمرے سے نکل گیا۔

"محسن کیا تمھیں اندازہ ہے کہ اب کیا ہوگا؟"

"ہاں، اب وہ گل کو لائے گا۔" محسن نے کہا۔ "اور اس کے ساتھ..."

"محسن میں اسے بتا دوں گا کہ یہ زلیخا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اس سے کیا فائدہ ہوگا۔" محسن نے بڑی مشکل سے میری طرف گردن گھمائی۔ "وہ ہر صورت میں وہی کرے گا جو اسے کرنا ہوگا۔"

"گل اپنی جان بچا سکتی تھی۔" میں نے افسوس سے کہا۔ "اگر وہ چاہتی... مگر اس نے کوشش ہی نہیں کی۔"

"وہ ہمارا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ زیادہ اچھی بات ہے اور... حوصلے کی بات ہے۔"

"ہم بُرے پھنسے..." میں نے کہا۔ "اور یہ سب جذبات کا نقصان ہوا ہے۔ جہاز پر آتے ہی ہمیں اچھا موقع ملا تھا۔ ہم وہیں سب کو ٹھکانے لگا سکتے تھے۔ سب ادھر تھے وہاں۔"

"ہاں، ضرورت سے زیادہ احتیاط بھی اچھی نہیں۔ ہم نازو اور غالب کی طرف سے فکر مند تھے کہ کہیں وہ مشکل میں نہ پڑ جائیں۔ اب یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ جہاز پر ہی ہیں یا نہیں۔"

میری گردن درد سے اینٹھ رہی تھی اور میرے لیے یہ کمر کا درد ناقابل برداشت ہونے لگا تھا۔ میں مجبور تھا کہ اپنے دھڑ کے بوجھ کو ٹانگوں پر اٹھائے رکھوں۔ اس سے میری ٹانگوں کے پٹھے بھی اکڑ رہے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ کچھ دیر بعد ہم

لیے خود کو سنبھالنا بالکل ناممکن ہو جائے گا۔ بے ہوشی میں پورا جسم لٹک جائے گا اور اس کا سارا بوجھ گردن پر آئے گا جو سلاخوں کے درمیان پھنسی ہوئی ہے۔ اگر میں گردن ٹوٹنے سے بچ گیا تو سانس رکنے سے ضرور مر جاؤں گا۔ اور یہ مہلت کتنی ہوگی؟ ایک گھنٹا، زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے یا تین گھنٹے۔ میرے ذہن پر مایوسی کے جالے پھیلنے لگے۔ [illegible]

دروازہ کھلا تو میں چونکا۔ گل اندر آئی اور ایک دم اس کی نظر میرے اور محسن کے چہرے پر گئی جو سامنے سے دیکھنے پر دیوار میں جڑے ہوئے نظر آتے ہوں گے۔ اس کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اندر آ جانے والے پیڈرو نے اسے دھکا دیا تو وہ منہ کے بل گری۔

پیڈرو میرے سامنے آ گیا۔ "تم سمجھ تو گئے ہو گے کہ اب میں کیا کروں گا؟"

"ہاں، مجھے معلوم ہے۔" میں نے سکون سے کہا۔ "اور یہ بھی جانتی ہے۔ تم اسے بے آبرو کرو گے۔ اس کی نسوانیت کی بھرپور تذلیل کرو گے اور مجھے مجبور کرو گے کہ میں سب دیکھوں۔"

"اور تم اس کے لیے تیار ہو؟"

"اور میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں اپنی آنکھیں بند رکھ سکتا ہوں، کان کیسے بند رکھوں گا۔ میں تمھارا ابھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہاں ایک کام ضرور کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔

وہ میرے اتنا قریب تھا کہ تھوک اس کی آنکھوں میں گیا۔

"اب دیکھو کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔" پیڈرو نے مجھے چیخ کر گالی دی اور پھر جیب میں سے کچھ نکالا۔ یہ ایک چھوٹا سا چمڑے کا ٹکڑا تھا۔ تقریباً ایک بالشت لمبا۔ اس کی شکل جوتے کے سول جیسی تھی۔ اس نے نچلے کم چوڑے حصے کو ہاتھ میں پکڑ کے وہ چمڑے کا ٹکڑا میرے منہ پر مارا۔ اس کی آواز پٹاخے کی طرح سنائی دی اور مجھے یوں لگا جیسے میرے ایک گال پر انگارے دہکنے لگے ہیں۔ جلن سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے چمڑے کے ساتھ میری کھال بھی اتر گئی ہو۔ گل نے تھوڑا سا سر اٹھا کے دہشت سے کانپ رہی تھی اور روتی تھی ایک چیخ ماری۔ پیڈرو نے میرے دوسرے گال پر وار کیا۔ پھر پہلے گال پر۔ ہر ضرب کے ساتھ میرا سر جھٹکے کھاتا رہا۔

"یہ دیکھو۔" پیڈرو نے اس چمڑے کے ٹکڑے کو میرے سامنے کیا۔ "یہ تمھارا خون ہے۔"

میں نے کراہتے ہوئے چمڑے پر نظر آنے والے سرخ داغ کو دیکھا۔ یقیناً میرے چہرے کی کھال پھٹ گئی تھی۔

"جانتے ہو..." پیڈرو چلایا اور اس نے سول جیسے چمڑے کو میرے منہ پر رگڑ دیا۔ خون کا ایک قطرہ رخسار سے بہہ کر ٹھوڑی تک پہنچا اور نیچے ٹپک گیا۔

"اب بتاؤ۔ تم نے جھوٹ بولا تھا یا سچ؟" اس نے میرے بال پکڑ کے سر کو جھٹکا دیا۔

"محسن کے بارے میں؟..." میں نے کہا۔

"معراب نے تمھیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ سب تمھارے دماغ کی اختراع تھی۔"

"تمھیں... جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا..." میں نے کہا۔

"وہ جھوٹ تھا یا سچ؟" پیڈرو چلایا۔

"وہ سب سچ تھا۔" میں نے کہا۔

پیڈرو نے دوسری جیب میں سے ایک شیشی نکالی۔ اس میں کوئی بے رنگ محلول تھا۔ یہ محلول اس نے میری کھال پر ٹپکا دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ تیزاب ہوگا لیکن وہ نمک کا پانی تھا۔ یہ پانی میرے رخساروں کی پھٹی ہوئی کھال تک پہنچا تو میرا چہرہ جیسے آگ میں جلنے لگا۔

"بولو، وہ جھوٹ تھا..."

"وہ... سچ تھا..." میں نے درد سے تڑپتے ہوئے کہا۔ مشکل یہ تھی کہ میں سر کو ذرا سا بھی ہلاتا تھا تو خود اپنی ہی گردن زخمی کرتا تھا۔

گل اب زار و قطار رو رہی تھی۔ اس نے ایک بار پیڈرو پر حملہ بھی کیا مگر پیڈرو نے ایک جھٹکے سے اسے پھر دور پھینک دیا۔ میرے بعد محسن کی باری آئی۔ اس کا چہرہ بھی لہولہان ہو گیا۔ مگر پیڈرو اس سے یہ تسلیم نہ کرا سکا کہ ہم نے معراب کے بارے میں جو کہانی سنائی تھی، اس کی بنیاد جھوٹ پر تھی۔

بالآخر اسے یقین آ گیا کہ معراب نے ہمارا ساتھ دیتے ہوئے بحری جہاز میں کہیں آتش گیر مادہ چھپایا تھا اور ہمیں مطلع کر دیا تھا چنانچہ ہم صرف بارود کو چنگاری دکھانے کے لیے پہنچے تھے۔ اگر پیڈرو کا یقین اس کے برعکس ہوتا تو اس کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہ ہوتی۔ اب اسے احساس ہوتا تھا کہ معراب تو مر گیا لیکن معلوم نہیں جہاز پر اس کے علاوہ کون ہمارا ساتھی ہے۔ وقت کم تھا اور وہ اتنے بڑے بحری جہاز کی تلاشی نہیں لے سکتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جہاز

www.paksociety.com

کو تباہ کرنے کا سامان کیا ہے۔ ویسے تو خود اسلحے سے لدا ہوا جہاز ایک چلتا پھرتا بم تھا لیکن اس میں دھماکا کرنے کے لیے ٹائم بم رکھا گیا ہوگا۔ ڈائنا مائیٹ لگایا گیا ہوگا یا آگ لگانے کا بندوبست کیا گیا ہوگا۔ یہ معراج جانتا تھا یا پیڈرو کے یقین کے مطابق ہم جانتے تھے۔

وہ سمجھتا تھا کہ ہم موت سے ڈرنے والوں میں نہیں ہیں اور روز اول سے سر بکف جان ہتھیلی پر لیے کفن بردوش پھرتے ہیں۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے لائف بوٹ میں فرار ہو سکتا تھا مگر اس کا مسئلہ جہاز پر لدے ہوئے سامان کو بچانے کا تھا جو اس کے بیان کے مطابق کروڑوں کا تھا۔ ظاہر ہے اس مال کی قیمت ولاور اینڈ کمپنی وصول کر چکی تھی اور اب یہ ان کی ذمے داری تھی کہ مال خریدار تک پہنچے۔ جہاز غرق ہو جانے کی صورت میں ولاور اینڈ کمپنی کو نقصانات کی تلافی کرنی پڑتی اور ان کی ساکھ بھی متاثر ہوتی۔ اس جہاز پر پیڈرو مال سپلائی کرنے والوں کا نمائندہ تھا اور ہم نے اس کے لیے بہت بڑی پریشانی پیدا کر دی تھی۔

"دیکھو سکندر!" اس نے کچھ دیر تک کمرے میں چکر لگانے کے بعد کہا۔ "میں بہت برا آدمی ہوں۔"

"آدمی کا نام بدنام مت کرو۔ کہو کہ میں بدترین شیطان ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں تم کو ایک چانس دوں گا۔" اس نے کہا۔ "اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو گے تو میں تم کو بحفاظت نکل جانے کا موقع دوں گا۔ تم صرف یہ بتا دو کہ جہاز کو تباہ کرنے کے لیے معراج نے کچھ رکھا ہے تو کہاں رکھا ہے۔"

"یہاں سے ہم بحفاظت کیسے جائیں گے؟" میں نے کہا۔ "اس کا طریقہ بھی مجھے سمجھا دو۔ کوئی ہیلی کاپٹر لے جائے گا ہمیں یا اقوام متحدہ کی امن فوج آئے گی؟"

"ایک بار اعتبار کر کے دیکھو مجھ پر۔"

"یعنی ایک بار بے وقوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مر کے دیکھوں۔ پہلے تم کو بتا دوں کہ ٹائم بم...؟"

"سکندر!" محسن نے چلا کے مجھے یوں ٹوکا جیسے میں نے غلطی سے ٹائم بم کا حوالہ دے کر راز کو راز نہیں رہنے دیا تھا۔

میں نے شرمندگی سے اس کی طرف دیکھا۔ "سوری یار!"

"کیا ضرورت ہے کوئی جواب دینے کی۔" محسن نے برہمی سے کہا۔ "اس کتے کو بھونکنے دو۔ اب مرنا ہے تو ایک بار ہی مریں گے سب کے ساتھ۔"

"تو ٹائم بم نصب کیا گیا ہے۔" پیڈرو نے کچھ دیر بعد خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"ہاں! اتنا تو تمھیں معلوم ہو ہی گیا۔ باقی تم خود معلوم کر لو۔" میں نے کہا۔ "مجھ سے کوئی توقع مت رکھو اعتبار کی۔ تمھیں معلوم ہے کہ تمھارا اور میرا صرف دشمنی کا رشتہ ہے۔"

"سکندر! میں رابعہ کی عزت و آبرو کے بخیے ادھیڑ دوں گا۔ تمھارے سامنے اس کی کھال کھینچ لوں گا۔ میرے پاس جانور ہیں اور انسان ہیں جو جانوروں سے بدتر ہیں۔ وہ رابعہ کا گوشت پوست سب نوچ کھائیں گے۔ کیوں تم آسان طریقے سے جان بچانے کے بجائے مشکل طریقے سے مرنا چاہتے ہو۔ تم نہیں جانتے میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم دیکھ سکو گے نہ برداشت کر سکو گے۔ مجھے بتا دو تم کیا چاہتے ہو؟"

"جو میں چاہتا ہوں وہ اپنے وقت پر خود ہی ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اس سے تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔" وہ چیخ کر بولا۔

"مجھے شہادت نصیب ہوگی۔ جو خسارے کا سودا نہیں میرے لیے۔ ہاں تم بہت گھاٹے میں رہو گے۔" میں نے کہا۔

پیڈرو کے ضبط کا حوصلہ ختم ہو رہا تھا اور اس پر دیوانگی طاری ہونے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں وحشی کبوتر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور وہ سانس لیتے ہوئے کسی خونخوار درندے کی طرح پھنکار رہا تھا۔

"دیکھو! ایک آخری تجویز ہے میری۔" وہ میرے سامنے آ کے بولا۔ "فرض کرو میں تمھیں محسن کو اور رابعہ کو ایک لائف بوٹ میں کہیں بھجوا دوں۔ میں خود تمھیں اس جہاز سے دور لے جاؤں اور تم کو کسی دوسرے جہاز یا کسی لانچ پر چھوڑ دوں تو تم مجھے بتا دو گے کہ وہ ٹائم بم کہاں اور کس وقت پھٹے گا؟"

"اور جب میں تم کو یہ بات بتا دوں گا تو تم مجھے گولی مار کے لوٹ آؤ گے؟"

"نہیں نہیں! کسی کے پاس اسلحہ نہیں ہوگا۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں۔" پیڈرو نے کہا۔ "تم میری تلاشی لے لینا۔"

"پھر تم واپس کیسے آؤ گے؟" میں نے اس کی الجھن اور بدحواسی پر دل ہی دل میں لطف لیتے ہوئے کہا۔

"میں... میں ایک اور لائف بوٹ میں......"

"ٹھیک ہے۔ فرض کرو ہم ایک لائف بوٹ میں جاتے ہیں... آدھے گھنٹے بعد دوسری لائف بوٹ لے کر کوئی اور اسی سمت میں آ جاتا ہے اور ایک گھنٹے بعد مجھے واپس لے آتا ہے۔ ایک گھنٹے میں تم کافی دور نکل جاؤ گے۔ تمھارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو پیڈرو۔ تمھارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "خطرہ مجھے نہیں تم کو ہے۔ فرض کرو میں نے تم کو غلط بتا دیا۔ واپس آ کے تم نے مجھے وہاں نہ پایا پھر؟ اس کے علاوہ جب تم خالی ہاتھ میرے پاس آ جاؤ گے تو تمھاری واپسی ہوگی ہی نہیں۔ میں تمھاری گردن توڑ کے تمھیں ٹھنڈا کر دوں گا۔"

پیڈرو کا دماغ الٹ گیا۔ اس نے مجھے ایک سے ایک گندی گالی دی اور میرے منہ پر تابڑ توڑ مکے مارے۔ گل نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ تھامنے کی بے سود کوشش کی۔ مگر ایک بپھرے ہوئے وحشی درندے کی قوت کے سامنے وہ کیسے ٹھہر سکتی تھی۔ پیڈرو نے اس کے کپڑے تار تار کر دیے۔ اسے بالوں سے پکڑ کے گھسیٹا اور اس کا سر کئی بار دیوار سے ٹکرایا۔ ایک طرف پیڈرو کی دیوانگی تھی دوسری جانب گل کی ہسٹیریا۔ بالآخر گل فرش پر پڑی رہ گئی۔ پیڈرو اسے ٹھوکر مار کے باہر نکل گیا۔

"گل!" میں نے بمشکل تمام کہا۔ خون میرے ہونٹوں سے بہہ رہا تھا اور میری ناک سے ٹپک رہا تھا اور اس کا ذائقہ مجھے اپنی زبان پر محسوس ہو رہا تھا۔ "میری طرف دیکھو گل۔"

"رابعہ ہے میرا نام۔" گل نے سر اٹھا کے کہا۔

"ملامت کرو گل۔ مجھ پر پہلے ہی بہت سے لوگوں کے قرض کا بار ہے۔ اپنی جان بچاؤ۔ ان سے کہہ دو کہ تم... ہمارے ساتھ نہیں ہو۔ ہم تمھیں دھوکے سے لے آئے تھے... کچھ بھی کہہ دو۔"

"تم رابعہ سے یہ توقع رکھتے ہو۔ کیا رابعہ ایسا کر سکتی تھی؟ تم اس سے یہ سب کہہ سکتے تھے؟" وہ روتے روتے بولی۔ "میری تذلیل کیوں کرتے ہو؟ تم نے ناگ بستی کی گل بانو کو گناہ سے بچا دیا۔ کیا میں اپنی مرضی سے رابعہ بھی نہیں بن سکتی؟"

دروازہ پھر کھلا اور اس بار پیڈرو کے ساتھ دو حبشی کمرے میں داخل ہوئے۔ انھیں پہلے سے معلوم تھا کہ ان کا کیا کام ہے۔ کچھ کہے سنے اور انتظار کے بغیر انھوں نے گل کو اٹھایا۔ وہ تنو مند کرخت نقوش والے اجڈ لوگ تھے۔ ان کے سامنے گل کی ساری مزاحمت بے کار تھی — میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ ذہنی و جسمانی اذیت کا ہر لمحہ تاریک سا اندھیرا تھا۔ میں جب آنکھیں کچھ دیکھنے سے قاصر تھیں تو تصور نے مجھے جھنجھوڑنا شروع کیا۔

میں نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ گل کے ہاتھ اس کی پشت پیچھے باندھ دیے گئے تھے اور رسی کا ایک سرا اس کے سر پر بندھا ہوا تھا۔ وہ گٹھڑی سی بنی فرش پر اکیلی پڑی ہوئی تھی۔ پھر انھی دو منکوں کے غلاموں میں سے ایک اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈول سا تھا۔ اس ڈول میں ہاتھ ڈال کے اس نے کوئی لیس دار چیز نکالی اور گل کے جسم پر ملنے لگا۔ میری ناک سونگھنے کے قابل نہیں رہی تھی پھر بھی سینے کی دھڑکن کے ساتھ میں نے شہد کی خوشبو کو محسوس کر لیا۔

اس کے جسم پر شہد ملنے والے کے جذبات برانگیختہ تھے اور وہ بے خودی میں حد سے گزرنے لگا تھا کہ پیڈرو پھر آ گیا۔ اس کے ساتھ دوسرے شخص نے لکڑی کا ایک ڈبا اٹھا رکھا تھا۔ پہلا شخص فوراً وہاں سے نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے ایک ہوس بھری حسرت بھری نظر سے گل کو دیکھا جس کے شباب کی تازگی میں شہد کی چاشنی بھی شامل ہو گئی تھی اور وہ گیا تو اپنے ہونٹ چاٹ رہا تھا۔

پیڈرو کے اشارے پر دوسرا شخص وہ ڈبا زمین پر رکھ کر رخصت ہو گیا۔ گل کی سہمی ہوئی نظریں اس بند ڈبے پر جم کر رہ گئی تھیں — یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اس ڈبے میں کیا ہوگا۔ پیڈرو نے ڈھکن کھولا اور ڈبے کو الٹ دیا۔ چھوٹے چھوٹے لال چیونٹوں کا ایک خونی لشکر شہد کی خوشبو پر گل کے جسم کی طرف لپکا۔ پہلے چیونٹے نے اس کے بدن پر اپنے زہریلے ڈنک کا زہر اتارا تو گل نے چیخ ماری اور کروٹ لے کر پلٹ گئی۔ لیکن اتنی دیر میں کچھ اور چیونٹے آگے بڑھ گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے شفاف مرمریں بدن کی جلد پر لال چیونٹے بدنما داغوں کی طرح نظر آنے لگے۔ گل ان سے بچنے کے لیے کروٹیں لیتی ہوئی بھاگ رہی تھی مگر اس کمرے کی دیواروں کے درمیان جگہ کہاں تھی۔ پھر وہ لال رنگ کے چیونٹے اتنی تیزی سے حملہ آور ہو رہے تھے کہ اگر گل کے ہاتھ آزاد کھلے ہوتے تب بھی وہ ان کی یلغار سے محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔

چیونٹے اب شہد چاٹ رہے تھے اور گل کے جسم کو کاٹ رہے تھے۔ گل کی دلخراش چیخوں کے ساتھ ساتھ پیڈرو کے فحش اور بدتر خباثت حیوانی قہقہے گونج رہے تھے اور میں اذیت سے سر پٹخ رہا تھا۔ گالیاں بک رہا تھا اور دھمکیاں دے رہا تھا جو میرے پاگل پن کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہی محسن کر رہا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسی دیوانگی کے مظاہرے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

"بتا دو سکندر اعظم۔ ابھی وقت ہے۔" پیڈرو نے میرے پاس آ کے میرے بال کھینچ کر کئی جھٹکے دیے۔ "نہیں بولو گے تو رابعہ کی طرف ہڈیاں رہ جائیں گی۔ یہ گوشت خور چیونٹے زیادہ

یہ جسم پر ایک ایک ریشہ چن لیتے ہیں۔"
"سکندر!" گل نے چلا کے کہا۔ "خدا کے لیے
پیڈرو! میں بتاؤں گا۔" میں نے محسوس کیا کہ گل کی پکار میرے دل میں انگارے کی طرح اتر گئی ہے۔
"نہیں، نہیں، تم کو رابعہ کی قسم۔" گل نے چلا کے کہا۔ "تم کچھ نہیں بتاؤ گے۔ تم کو اس محبت کی قسم جو تمہیں رابعہ سے ہے، تم ہار نہیں مانو گے۔۔۔"
میرا لہو رگوں میں سر پٹخنے لگا۔ منجمد ہونے لگا۔ گل نے مجھے وہ قسم دے دی تھی جسے میں نہیں توڑ سکتا تھا۔ اور یہ قسم بھی اس نے اتنی ہوشیاری سے دی تھی کہ پیڈرو کو کچھ معلوم نہ ہوا۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ مجھے تو رابعہ نے اپنی قسم دی ہے۔
گل اب ہر طرف لوٹ رہی تھی۔ وہ پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرتی تھی اور گر جاتی تھی۔ کچھ چیونٹے اس کے جسم کے نیچے دب جاتے تھے۔ باقی پھر اس سے چمٹ جاتے تھے۔ اس کا سارا بدن لال چیونٹوں سے بھر گیا تھا۔ وہ سب اسے کاٹ رہے تھے اور وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ اس کی اذیت میرے لیے ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔
اچانک میں نے اپنے پیچھے کچھ آوازیں سنیں۔ کسی کے ہاتھ میرے جسم کو ٹٹول رہے تھے۔
"اچھی طرح دیکھ چارلی!" کسی نے کہا۔ "ان کے پاس کہیں وہ بیلٹ ہوگی جس میں پاسپورٹ تھا اور پیسہ تھا۔"
"دیکھ تو رہا ہوں۔" چارلی نے کہا اور اس آواز کو سنتے ہی میری ساری اذیت دور ہو گئی اور میری تمام مایوسی ختم ہو گئی۔ یہ غالب کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ زندہ تھا، آزاد تھا اور میرے اتنے قریب آنے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ وہ کچھ نہ کرے۔
"ایسے مت دیکھ، ان کے کپڑے اتار لے۔ چل ہٹ میں اتارتا ہوں کپڑے۔ تو سالا شرماتا ہے چھوکریوں کی طرح۔" دوسرے شخص نے کہا اور چند منٹ میں میری پتلون کھینچ لی گئی۔ میرے پیروں کو ایک جھٹکا لگا۔ "دیکھا تو نے؟" وہ خوش ہو کے بولا۔ "یہ رہی بیلٹ۔ اب اس کو دیکھ۔" پھر بولنے والے کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ میں نے ایک ایسی آواز سنی جیسے کوئی کٹ کے گر گیا ہو۔
"سکندر!" غالب نے آہستہ سے کہا۔ "بس تھوڑی سی دیر اور۔۔۔ حوصلہ مت ہارنا۔"
میرا وجود جو مایوسی کے گھپ اندھیرے میں معلق تھا، یکلخت سکون اور امید بخشنے والے اجالے میں اتر گیا۔
فرط جذبات سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ [illegible] آزمائش کی گھڑی میں تنہا نہیں چھوڑتا اور میرا حوصلہ [illegible] ہے۔ میں نے شکر گزاری کے جذبات سے مغلوب ہو کر سوچا۔ غالب کی آواز تمام رات بے سمت صحرا میں بھٹکنے والوں کے لیے صبح کے اجالے کی نوید کے ساتھ [illegible] آواز اذان سے کم نہ تھی۔
محسن نے سر گھما کے میری طرف دیکھا اور اذیت [illegible] کے باوجود ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے وہ سب کہہ دیا جو الفاظ کا محتاج نہ تھا۔ گل اب بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کا جسم ایک حد تک ہی مزاحمت کر سکتا تھا اور تکلیف برداشت کر سکتا تھا۔ احساس کے فنا ہو جانے کے بعد وہ دکھ درد سے بے نیاز تھی۔ جس دم حرکت [illegible] اور وہ آدم خور خونی چیونٹے جو اس کے جسم سے گوشت [illegible] نوچ نوچ کھانے کے لیے اپنے تیز دھار والے دانتوں کا بھرپور استعمال کر رہے تھے اب بھی اپنے کام میں مصروف تھے۔
آہستہ آہستہ چیونٹوں کی بھیڑ چھٹنے لگی تھی۔ کچھ چیونٹے شکم سیر ہو کے الگ ہو گئے۔ پھر کچھ اور چیونٹے نیچے اتر گئے۔
کسی کے ہاتھ نے میرا چھوٹتا ہوا ہاتھ تھام لیا [illegible] "پکڑ اور سنبھال کے رکھ۔ اسے ریوالور کہتے ہیں۔" غالب نے لکڑی کی دیوار کے پیچھے سے سرگوشی کی۔ اس کے لبوں اور میرے کانوں کے درمیان ایک ڈیڑھ انچ موٹے تختے کی دیوار حائل تھی۔ چنانچہ میں اس کی سرگوشی کو [illegible] لیکن اس کی صورت کا صرف تصور ممکن تھا۔ ریوالور کو میں نے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اس طاقت کے ساتھ میرے وجود میں پھر وطن دشمنوں کے خلاف نفرت اور عداوت کا آتش فشاں بھڑک اٹھا۔
میری نظروں نے گل کو دیکھا۔ اس مقدس جنگ میں آج تک ہمارے ساتھ لڑنے والوں کا شوق شہادت، جذبہ سرفروشی ہمیشہ قابل رشک رہا تھا کہ جان ہتھیلی پر [illegible] گل اس رزم گاہ میں تو وارد ہوئی تھی [illegible] بھی رابعہ کی طرح ثابت کیا تھا کہ اس کا عزم [illegible] ہے اور شکاری اس کے جسم کو شکار کر سکتے ہیں [illegible] لیکن اس کے ایمان کو نہیں مار سکتے۔
چیونٹے اب اس کے جسم پر سے اترتے جا رہے تھے۔ [illegible] گل کا خون پی کے اور اس کے نازک بدن کا گوشت کھا کے بھر گئے تھے۔ اب وہ اپنے خونی پنجے [illegible]

تھے اور اپنے لبوں پر دکھائی نہ دینے والے لہو کو چاٹ رہے تھے۔ گل کا جسم خون رنگ ہو گیا تھا۔ اس کا اپنا خون اس کے بدن پر ایسے پھیلا ہوا تھا جیسے کسی نے کچھ سے شروع کر کے لال رنگ کے برش سے اسے پینٹ کیا ہو۔
اس تمام کارروائی سے بے خبر چوبی دیوار کے پیچھے جاری تھی۔ استاد پیڈرو ایک فاتحانہ شان کے ساتھ اپنے ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا تھا اور میری طرف دیکھ کے مسکرا رہا تھا۔
"پیڈرو! خدا کے لیے رابعہ کو بخش دو۔" میں نے بے حد مغموم ہو کے اور شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "اس کی جگہ مجھے [illegible]"
"تمہاری باری بھی آئے گی۔ آئے گی کیوں نہیں۔" وہ بولا۔
محسن نے چلا کے کہا۔ "باری تیری بھی آئے گی۔۔" اس نے پیڈرو کو فحش ترین گالیوں سے نوازنا شروع کیا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی قوت برداشت جواب دینے لگی ہے اور گل کی اذیت کے احساس نے اسے پاگل کر دیا ہے۔
پیڈرو میرے سامنے آ گیا۔ "وقت کم ہے سکندر! تم لیڈر بنے ہوئے ہو۔ پہلے تم صلح کی بات کر رہے تھے۔ اب میں تم کو دوسرا موقع دے رہا ہوں کہ اس بازی کو برابر سمجھو۔ تم صرف مجھے بتا دو کہ وہ تم کہاں ہے۔۔۔ کسی بھی طرح مجھ سے ضمانت لے لو کہ میں تم کو نکل جانے کا موقع دوں گا۔ اس بار کوئی جیتا، کوئی ہارا، زندگی رہی تو پھر کھیلیں گے۔ مگر یہ تب ممکن ہے جب تم زندگی کے مواقع ضائع نہ کرو۔ آخری فتح یا آخری شکست سے پہلے ہی خودکشی کیوں کر رہے ہو؟"
اس کے انداز گفتگو میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ اب وہ تکبر سے نہیں دوستانہ عاجزی سے کام لے رہا تھا۔ مجھے لالچ سے قائل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں اسے باتوں میں الجھاتا اور جھوٹ کے جال میں گرفتار رکھنا چاہتا تھا لیکن میرے ذہن میں ایسی کوئی ترکیب نہیں آ رہی تھی جس سے گل اپنے لیے آزادی اور تحفظ کو یقینی بنا سکوں۔ میرے مقابل کوئی عام آدمی نہیں، پیڈرو تھا جو استاد کہلاتا تھا۔ اسے بے وقوف بنانا آسان نہ تھا۔
"میں تم کو ایک موقع اور دوں گا۔"
"ایک اور موقع۔۔ کا؟" محسن نے حیران ہو کے کہا۔
"ہاں، ابھی تو پہلا راؤنڈ ختم ہوا ہے۔" وہ بولا۔ "یہ بہت تھوڑے سے چیونٹے تھے اور ان کا پیٹ بھی شہد سے بھر گیا تھا۔ خون اور گوشت کو ان چیونٹوں نے صرف چکھا ہے۔"
"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ رابعہ مر چکی ہے۔" میں نے کہا۔
"نہیں، زخم بہت معمولی ہیں۔ خون زیادہ بہہ گیا ہے اس لیے تم کو ایسا محسوس ہوتا ہے۔" پیڈرو نے کہا۔ "اگر تم اتنی سی بات کر دو تو میں نرس کو اور ڈاکٹر کو بلوا سکتا ہوں۔ وہ اس کے زخم صاف کر دیں گے۔ جسم پر لوشن لگا دیں گے اور آدھے گھنٹے یا ایک گھنٹے میں رابعہ تم سے بات کر سکے گی۔ بے شک زخم فوراً مندمل نہیں ہو سکتے لیکن چند دن کے علاج سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
اس کی بات میں امید کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ گل کے بدن پر پھیلے ہوئے زخموں کے لالہ زار کا نظارہ کتنا ہی روح فرسا کیوں نہ ہو، اس کی حالت تشویشناک نہیں۔ دوسرے یہ کہ میرے اقرار کی صورت میں نرس کے روپ میں نارو بھی ڈاکٹر کے ساتھ آ جائے گی۔ لیکن پیڈرو کو میں کیا بتاؤں کہ ہم کہاں ہے جب کہ ہم کہیں بھی نہیں ہے۔ جب تک اسے طائم نہیں ملے گا وہ ہمیں کوئی رعایت نہیں دے گا۔ اگر طائم ہم ہی ہوتا اور میں اسے صحیح جگہ لے جاتا تو پھر اسے رعایت دینے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ وہ کوئی با اصول اور وعدے پر قائم رہنے والا آدمی ہوتا تو استاد پیڈرو کیوں کہلاتا۔
"جلدی بولو، کیا سوچا ہے تم نے؟ ورنہ۔۔۔" اس نے دھمکی کو نامکمل چھوڑ دیا۔
"ورنہ تم رابعہ کو مار ڈالو گے؟" میں نے کہا۔ "مار ڈالو، تاکہ اس کی جان اس عذاب سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے۔"
"ایسے نہیں سکندر اعظم۔ رابعہ اور تم ایک ساتھ مرو گے مگر بہت زیادہ دکھ اٹھا کے۔" پیڈرو مشتعل ہو کے بولا۔ "ابھی بہت دم خم ہے تم میں۔ اگلا راؤنڈ رابعہ دیکھے گی۔ جب یہی چیونٹے تمہارے جسم کو چاٹیں گے اور وہ بھی اتنی ہی ہوں گی جتنے تم ہو۔ میرے پاس دوسرے راؤنڈ کے لیے چیونٹوں کی دوسری فوج ہے۔"
"میں اس کے لیے تیار ہوں۔۔۔" میں نے اسے چیخ کر ایک گالی دی۔
دراصل میں فوری طور پر اس عذاب سے نجات چاہتا تھا جس میں میرے ساتھ محسن بھی گرفتار تھا۔ میرا اور اس کا دھڑ الٹا یا معکوس ہو چکا تھا۔ میری گردن درد سے اکڑ گئی تھی اور تختے کے کھردرے کناروں نے میری گردن کی کھال کو ادھیڑ دیا تھا۔ گردن سے نیچے میری ریڑھ کی ہڈی اب میرے جسم کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ رہی تھی اور میرے پیروں کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ چنانچہ میں بار بار نیچے جھکنے لگا تھا۔ ہر بار جھٹکا میری گردن میں آتا تھا اور میری تھوڑی ہو [illegible]

www.paksociety.com

سے ٹکرائی تھی تو میں پیچھے ہاتھوں کو گھسیٹ کر آگے لاتا تھا اور رکوع کی حالت میں توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا تھا۔

آہستہ آہستہ میرے لیے اس حالت میں قید رہنا ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ جب تک میرے ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا، میں ان ہاتھوں کو دیوار پر پھیلا سکتا تھا لیکن دیوار پر سہارے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ میرے ہاتھ سپاٹ دیوار پر سے پھسل جاتے تھے۔ اب میں نے ہاتھوں میں ریوالور دبوچ رکھا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے میں اس کی طاقت کو آزما لوں۔ یہ نہ ہو کہ غالب کچھ کرنے سے پہلے ہی ریوالور استعمال کرنے کے قابل نہ رہوں۔

پیڈرو نے دوسرے راؤنڈ میں میرے جسم کی قوت برداشت آزمانے کا ذکر کر دیا تو میرے لیے اسے مشتعل کرنا ضروری ہو گیا تاکہ وہ مجھے اس شکنجے سے نکالے اور اس دوران میں غالب یا نازو کا پلان بھی میرے سامنے آ جائے تو ہم سب مل کے کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ غالب کا کچھ پتا نہ تھا کہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے!

پیڈرو نے دروازہ کھول کے چلانا شروع کیا "اندر آؤ لڑکی... تو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟" اس نے نازو کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ وہ ایک جھٹکے سے اندر آ گری۔

"وہ ... آپ نے ہی کہا تھا کہ... تیار رہنا" نازو نے خوف کی بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا۔

"اور وہ کہاں ہے، تیرا خصم، جارلی؟"

"مجھے... نہیں معلوم سر" نازو کانپتے ہوئے بولی۔

"چل جا اب... ڈاکٹر بھنڈاری کو بلا کے لا اور دیکھ اس عورت کو آدھے گھنٹے کے اندر اندر ٹھیک ہو جانا چاہیے" پیڈرو نے کہا۔

نازو نے سخت دہشت کے عالم میں ان چیونٹوں کو جھاڑ دیا جو اس کے کپڑوں پر چڑھ گئے تھے اور اب پورے کیبن میں بکھر رہے تھے۔ اس نے فرش پر لہولہان پڑی ہوئی گل کی طرف دوسری بار دیکھنے کی جرأت نہیں کی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ مجھے تعجب بھی ہوا اور غصہ بھی آیا کہ اتنی مہلت ملنے کے باوجود نازو بجلی بن کے آستانہ پیڈرو پر نہیں گری۔ ابھی تک وہ ایک بزدل اور بے وقوف ترین کے کردار کو مناسب موقع کے انتظار میں نبھا رہی تھی اور شاید وہ مناسب وقت ابھی نہیں آیا تھا جس کا اسے بھی غالب سے زیادہ انتظار تھا۔

"بات سنو" پیڈرو نے غصے سے دروازے میں کھڑی نازو کو [illegible] لیا اور [illegible] چیونٹوں کو پیر جھٹک کے پھینک دیا جو اس کے جوتے پر چڑھ گئے تھے "جارلی کو بولنا کہ اسپرے لائے اور ان سب کو صاف کر دے۔"

"جی... جی سر" نازو نے کیبن کے فرش پر بکھرنے والے اور دیواروں پر چڑھنے والے چیونٹوں پر نظر ڈالی۔ ایک سیکنڈ کے لیے اس کی اور میری نظر ملی۔ وہ ایک نظر جو بظاہر نگاہ سے کم تھی بہت کچھ کہہ گئی۔ میں نے اس کے لبوں کی بے نام مسکراہٹ میں امید کی روشنی جھلملاتی دیکھی اور غیرارادی طور پر مسکرانے لگا۔

پیڈرو نے مجھے دیکھا اور پھر پلٹ کے دیکھا تو نازو غائب ہو چکی تھی۔ ایک چیونٹا میرے قریب آیا اور میری گردن پر چڑھ گیا۔ اس کے پیچھے میری کھال کی خراشوں میں سوئی کی طرح چبھنے لگے۔ پھر دوسرا چیونٹا کان کی طرف سے آیا۔ اس نے میرے گال پر کاٹا۔ تکلیف اتنی نہیں تھی جتنی [illegible] نے ماری۔ پیڈرو کے ہونٹوں پر ایک پرلطف مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔

"مجھے اندازہ ہوا کہ رابعہ نے کتنی تکلیف برداشت کی ہوگی۔ یہ مانتا ہوں میں کہ وہ بہادر عورت ہے" پیڈرو [illegible] "ساتھ دیتی تو..."

"مجھے وہ رابعہ نہ ہوتی" میں نے کہا "رابعہ تو نام ہے اس طاقت کا، محبت کی طاقت کا جس نے مجھے تمہارے مقابلے میں سکندر اعظم بنا دیا۔"

"ابھی کچھ دیر میں تم دیکھو گے کہ [illegible] چیونٹوں کی فوج کے مقابلے میں سکندر اعظم کتنا کمزور اور نحیف ہے۔ یہ ہاتھی نہیں معمولی چیونٹے ہیں، جو [illegible] جائیں گے۔ تمہارا خون، گوشت سب چٹ کر جائیں گے!"

"آخری [illegible] ہوگا جب تم دونوں ایک ساتھ مرو گے۔ [illegible] اس لشکر کا مقابلہ ناممکن ہوگا جس میں ہزاروں بھوکے چیونٹے [illegible]"

میں سمجھ گیا تھا کہ ان باتوں سے وہ صرف مجھے خوف زدہ کر رہا ہے اور میرا حوصلہ توڑنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے [illegible] کا موقع دیا۔ شاید غالب اور نازو کو ابھی مزید مہلت درکار تھی۔

"تمہیں کیا معلوم پیڈرو کہ تمہارے پاس کتنا وقت ہے" میں نے کہا "میرے مارنے سے پہلے ہی جانے کیا ہو سکتے ہیں"

"ارے وہ؟" پیڈرو نے ظاہری بے پروائی سے [illegible] "ہم ایک ساتھ ہی مر گئے تمہارے مقابلے میں میرے [illegible] تھوڑا سا چانس ہے کہ میں بچ جاؤں کیوں کہ میں آزاد ہوں"

شکنجے میں جکڑے ہوئے ڈوب جاؤ گے۔ [illegible] میں دیکھ سکتا ہوں کہ کسی شکنجے کا سہارا لیا۔ شکنجے کا سہارا بھی [illegible] تو تیر کی طرح نکل جاؤں..."

نازو کے اندر آنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ نازو کے ساتھ دو افراد اسٹریچر لیے اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک جارلی کے روپ میں غالب تھا، دوسرا ڈاکٹر بھنڈاری۔ ان دونوں نے گل کو اٹھا کے اسٹریچر پر ڈالا اور دروازے سے باہر لے گئے۔ پیڈرو اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے [illegible] نازو کی بے عملی اب مجھے مشتعل کرنے لگی تھی۔ میں جھنجھلاہٹ اور مایوسی کا شکار ہو رہا تھا۔ کیوں کہ میرے لیے اپنی جسمانی اذیت سے نجات کے انتظار کا وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔

محسن کی خاموشی ظاہر کرتی تھی کہ وہ اپنے ہوش و حواس برقرار رکھنے کی جدوجہد میں ناکام ہو گیا ہے۔ اب مجھے اس کی طرف سے بھی فکر لاحق ہو گئی کہ کہیں جسم کے وزن کو برداشت کرنے والی گردن پر دباؤ اتنا نہ بڑھ جائے کہ سانس کی آمدورفت رک جائے۔

اچانک باہر سے کسی کی چیخ سنائی دی۔ پھر ایک فائر ہوا۔ پیڈرو جیسے ہی چونکا، [illegible] ریوالور ہاتھ میں تھامے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازے کو تھوڑا سا کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر اب مکمل خاموشی تھی لیکن پیڈرو کی صورت پر تشویش کے آثار نمایاں تھے۔

"جارلی!" پیڈرو نے چلا کے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

اس کی بات کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ دوسری بار اس نے بھنڈاری کو پکارا۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔ انتظار کا ایک طویل اعصاب شکن وقفہ آیا جس میں میرے کان ہر آہٹ پر لگے رہے اور میرا دل بے قراری سے دھڑکتا رہا۔

بالآخر میں نے اپنے پیچھے آوازیں سنیں لیکن میری مایوسی کی انتہا نہ رہی جب میں نے پیڈرو کو حکم دیتے سنا۔ حکم کی تعمیل کرنے والوں نے مجھے اس شکنجے سے نکالنے کی کارروائی شروع کی۔ انھوں نے میری گردن کے اوپر فٹ آ جانے والے ایک تختے کو ہٹانے کے لیے وہ پیچ کھولے جن سے تختہ دیوار پر نصب تھا۔

میرے لیے نئی پریشانی اپنے ریوالور کو چھپانے کی تھی۔ ابھی تک پیڈرو نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ لٹکے تھے اور ایک ہاتھ سے میں نے ریوالور کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ تختہ ہٹتے ہی میرا آزاد ہو کر پیڈرو کے روبرو ہونا اور [illegible] سے ریوالور کا برآمد ہونا لازمی تھا۔ مجھے فوری طور پر فیصلہ کرنا تھا کہ میں اس ریوالور کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے ان سب کو وہیں ٹھکانے لگا دوں جو مجھے اپنے سامنے نظر آئیں یا صبر سے کام لیتے ہوئے انتظار کروں۔ عین وقت پر مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔

تختہ جیسے ہی میری گردن سے جدا ہوا، میں نیچے گر گیا۔ یوں جیسے میں بے ہوش ہوں اور میرے جسم کی قوت برداشت پہلے ہی جواب دے گئی تھی۔ اس سے مجھے فائدہ ہوا۔

"اسے چھوڑ دو" پیڈرو نے حکم دیا "اس دوسرے کو نکال لو پہلے۔ وہ بھی نہ مر جائے کہیں"

حکم کے غلام دوسری طرف چلے گئے۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت پیڈرو کی توجہ بھی محسن کی طرف ہوگی۔ کوئی حرکت کیے بغیر میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ہلایا جو میرے جسم کے وزن سے دبے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ ایک ہاتھ کو میں اپنے گریبان تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ ریوالور کو میں نے قمیص کے اندر ڈال دیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

پانچ دس منٹ بعد مجھے دو افراد نے بغلوں کے نیچے ہاتھ دے کر ایسے گھسیٹنا شروع کیا جیسے میں زندہ انسان نہیں ایک لاش ہوں۔ میرے پیر پھیلے ہوئے تھے اور فرش پر رگڑتے جا رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ چار افراد تھے جو مجھے اور محسن کو لے جانے کے لیے آئے تھے۔ ان کی قیادت خود پیڈرو کر رہا تھا۔ ایک آنکھ کو تھوڑا سا کھول کر دیکھنے پر میرا خیال درست نکلا۔ ہم اب ایک تنگ راہداری سے گزر رہے تھے۔ سب سے آگے مجھے گھسیٹنے والے تھے، پھر محسن کو گھسیٹنے والے۔ پیڈرو ہاتھ میں ریوالور لیے سب کے پیچھے تھا، مگر انتہائی مستعد تھا۔

ریوالور کی موجودگی کا ابھی تک کسی کو علم نہیں ہو سکا تھا جو میرے پیٹ اور بیلٹ کے درمیان قمیص کے نیچے پوشیدہ تھا۔ غالباً محسن کے پاس کچھ نہیں تھا۔ غالب اسے کیسے منتقل کر سکتا تھا جب کہ وہ ہوش میں ہی نہیں تھا۔

جب مجھے فرش پر ڈال دیا گیا تو ایک آنکھ کو تھوڑا سا کھول کر دیکھنے پر مجھے مقابل کی دیوار میں چھ انچ قطر کے دو سوراخ نظر آئے۔ ابھی کچھ دیر پہلے انھی دو سوراخوں میں سے میرے اور محسن کے سر باہر نکلے ہوئے تھے۔ شاید ہمیں نکالنے کے بعد دیوار کے پیچھے وہ تختے پھر نصب کر دیے گئے تھے جن میں ہماری گردنیں پھنسی ہوئی تھیں۔ یہ قبری عقوبت خانہ تھا جس میں کچھ دیر پہلے گل کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

www.paksociety.com

چلے ہم تماشائی تھے مگر اب تماشا بننے والے تھے۔ شک کی کوئی بات نہ تھی کہ اب میرے ساتھ بھی وہ سب ہوگا جو گل کے ساتھ ہوا تھا۔ مجھے بے لباس کر کے میرے جسم پر بھی شہد ملا جائے گا، پھر وہ بھڑ کے چھتے لائے جائیں گے اور گل کو لایا جائے گا کہ یہ سب دیکھے۔

اس خیال نے میرا دماغ الٹ دیا۔ میرے لیے ممکن ہی نہ رہا کہ میں صبر اور ضبط کا مظاہرہ کرتا رہوں اور کچھ نہ کرنے کی پاداش میں اس موقع سے بھی محروم ہو جاؤں جو غالب نے جان ہتھیلی پر رکھ کے مجھے فراہم کیا تھا۔ ان کا کیا پلان تھا، کوئی پلان تھا یا نہیں تھا، یہ میں کیسے جان سکتا تھا۔ ممکن ہے غالب اور نازو اس انتظار میں ہوں کہ ہم کچھ کریں۔ نازو جانتی تھی کہ خالی ہاتھوں سے بھی میں اپنا دفاع کر سکتا ہوں، کم بھی تو اسلحے کی جو غالب نے فراہم کر دیا تھا۔ پھر اب انتظار کیسا؟ خوف کیسا اور تذبذب کیوں۔

دو افراد پیڈرو کے حکم پر میرے کپڑے اتارنے کے لیے جیسے ہی جھکے تھے کہ میں ترکیب کے مطابق جنگ کا پورا نقشہ میرے ذہن میں تھا اور میں طے کر چکا تھا کہ میری حرکت کیا ہوگی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتے یا پیڈرو کچھ سمجھتا میں نے ایک کی گردن دبوچ کے جھٹکا دیا اور دوسرے کو تھوڑا سا گھوم کے لات ماری۔ وہ میرے اندازے کے عین مطابق سیدھا پیڈرو کی طرف گیا اور اس سے ٹکرا گیا۔

پہلے شخص کو میں نے بلا تاخیر اوپر اٹھایا اور ان دونوں کی طرف اچھال دیا جو محسن پر جھکے ہوئے تھے۔ پہلا فائر پیڈرو نے کیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے ہی سنبھل گیا تھا۔ اس کی گولی نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ یہ گولی اس کے اوپر گرنے والے نے اپنے جسم پر روک لی۔ اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور ایک عجیب حرکت یہ کی کہ پیڈرو سے چمٹ گیا۔

محسن بدستور ساکت پڑا ہوا تھا۔ اس کو اندر لانے والے اس اچانک حملے سے بوکھلا گئے تھے۔ جب انھی کا ایک ساتھی اڑتا ہوا آیا اور ان سے ٹکرایا تو ذرا سی دیر کے لیے وہ آپس میں الجھ گئے۔ جس شخص کو میں نے پھینکا تھا وہ گردن ٹوٹ جانے کے باعث پہلے ہی مر چکا تھا۔ باقی دو کے اٹھنے سے پہلے ہی دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور نازو اندر آ گئی۔

پیڈرو نے بھی یہ اشارہ لیا تھا اور اگر نازو اسی وقت نازل نہ ہوتی تو میرے لیے خود کو پیڈرو کی چلائی ہوئی گولی سے بچانا ممکن نہ ہوتا۔ اس کے اور میرے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا اور وہ ریوالور اٹھا چکا تھا۔ میں نے ایک دم غوطہ مارا اور

اسی وقت پیڈرو کی توجہ دروازے کی طرف ہو گئی۔ میں نے فائر کی آواز تو سنی لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ گولی کدھر گئی۔ محسن کے قریب کھڑے ہوئے دونوں شکرے غلام مسلح نہیں تھے۔ پیڈرو نے ان سے ہتھیار لے لیے تھے اور اپنے ہاتھ میں ایک ریوالور کو کسی بھی غیر متوقع صورت حال کے لیے کافی سمجھتا تھا۔ ابھی تک کسی کو اندازہ نہ تھا کہ نرس کی یونیفارم میں انتہائی بے ضرر اور کمزور نظر آنے والی لڑکی درحقیقت ایک طوفان بلاخیز ہے اور فتنۂ محشر ہے۔

وہ بے حد تندرست و توانا اور لمبے تڑنگے مرد اپنے مقابل پا کے یقیناً محظوظ ہوتے ہوں گے۔ دل ہی دل میں ہنستے ہوں گے کہ وہ بالشت بھر کی چھوکری ... کتنی ترحم ... ایک اشارۂ ابرو پر سو بار جان دیتے مگر کیا لطیفہ ہے کہ وہ بیک وقت دو مردوں کو قوت بازو سے زیر کرنا چاہتی ہے۔

میں نے ان شہ زور مردوں کا خانہ خراب ہوتے نہیں دیکھا کیونکہ میں پیڈرو کی طرف متوجہ تھا۔ پیڈرو کو اچانک احساس ہوا کہ وہ محصور ہو گیا ہے اور بیک جنبش یہ بازی پلٹ گئی ہے۔ اس نے نرس کے بھیس میں نازو کو بھی شناخت کر لیا۔ اس کی وجہ بعد میں نازو نے بتائی کہ ہمارے پہنچنے کے بعد وہ اور غالب آپس میں جب بھی بات کرتے تھے تو آواز بدل کے، رفتہ رفتہ یہ ان کی عادت ہو گئی تھی۔

اب اچانک نازو نے اپنی اصل آواز میں مجھ سے کہا ”سکندر، تم استاد کو سنبھالو، شاگردوں سے میں نمٹ لوں گی۔“ اور اس کے ساتھ ہی نازو کے ہاتھوں کی نزاکت کے جوہر کھلے تو پیڈرو کی ساری خوش فہمی کافور ہو گئی۔ اس نے بچ کر فرار ہونے کے لیے دروازے کی جانب جست لگائی۔ اگر میں چاہتا تو بآسانی اسے شوٹ کر سکتا تھا کیونکہ اتنی دیر میں مجھے قمیص کے اندر سے ریوالور نکالنے کی مہلت مل گئی تھی لیکن میں اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ میری اس خواہش کو نازو نے یوں پورا کیا کہ اچانک اسے ٹانگ اڑا کے فرش پر چت کر دیا۔

میں نے آگے بڑھتے ہوئے پیڈرو کی پشت پر اپنا ایک پیر رکھ دیا۔ اس نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی تو میں نے ایک جھٹکے سے اپنا پیر ... اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔ اس کا سر فرش پر ... اس کے سامنے والے دانت ٹوٹ گئے ... اٹھنا چاہا اور میں نے اس کی پسلیوں میں ... مسلسل ٹھوکریں ماریں۔ یوں جیسے وہ کوئی فٹ بال ہو ... فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا کمرے کی دوسری دیوار تک گیا ...

... بے ہوش ہو گیا۔

اس کے اوپر بیٹھ کر میں نے اس کی جامہ تلاشی لی۔ جو ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا وہ اب محسن کے قریب پڑا تھا۔ نقد رقم سے مجھے سروکار نہ تھا۔ ایک جیب سے سگریٹ اور لائٹر برآمد کر کے مجھے خوشی ہوئی۔

میرے وزن کے نیچے پیڈرو دھونکنی کی طرح ہانپ رہا تھا اور کراہ رہا تھا لیکن میں اس پر بڑی فراغت سے پیر پھیلا کے بیٹھ گیا۔ اپنی پشت دیوار سے لگا کے میں نے ایک سگریٹ جلائی۔ پیڈرو نے پھر اٹھنے کی کوشش کی۔

میں نے اس کے سر پر مکا مارا۔ ”دیکھتے نہیں میں سگریٹ جلا رہا ہوں، آرام سے پڑے رہو۔“ میں نے کہا اور نازو کی دست بدست جنگ کا عجیب منظر دیکھنے لگا۔ نازو نے اپنے حریف طاقت ور مردوں کا سارا کس بل نکال دیا تھا اور وہ ادھ موئے ہو رہے تھے۔

”اٹھو بھئی ... شاباش۔“ نازو نے ایک کا ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا۔ ”یہ تو کوئی مقابلہ نہ ہوا۔“

اس نے ہاتھ چھڑا کے نازو کو گھونسا مارنے کی کوشش کی۔ نازو نے اس کا ہاتھ کلائی پر سے پکڑ لیا اور اسے اپنے ہی زور میں پورا چکر دے کر چھوڑ دیا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کے ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھی نے نازو پر پیچھے سے سوار ہونے کے لیے جست لگائی۔ نازو نے آگے جھک کے اسے فرش پر الٹ دیا۔ وہ پلٹ کے اٹھا اور پاگل ہو جانے والے بیل کی طرح ٹکر مارنے کے لیے آگے بڑھا۔ نازو پہلے سے تیار تھی۔ اس نے بڑی آسانی سے ایک گھٹنا اوپر اٹھا دیا۔ ایک ہاتھ اس کی گردن پر مارا اور اسے تھوڑا سا اٹھا کے سیدھا گرا دیا۔ وہ بے قابو ہو جانے والے جہاز کی طرح دیوار سے ٹکرایا اور وہیں گر گیا۔

”ویری گڈ، نازو بی بی! ہم خوش ہوئے یہ دیکھ کر کہ تم آؤٹ آف پریکٹس نہیں ہو۔“ میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا۔

نازو ہاتھ جھاڑ کے ہنسی۔ ”پریکٹس تو میں کرتی رہتی تھی۔ اور یہ مشق تم آج اس بدبخت پر جاری ہوئی جو اچھا خاصا معقول تھا۔“

میں نے آہ بھر کے کہا۔ ”ہم سے ملا تو شکاری نہ رہا، تم سے ملا تو آدمی نہ رہا، مجنوں ہو گیا۔ اب مسئلہ ہے کسی لڑاکا شوہر جیسا بیچارا کون ہے؟“

”کمال ہے کہ تم اتنے سکون سے بیٹھے سگریٹ کے کش پہ کش لے رہے ہو جیسے اور کچھ نہیں رہا کرنے کو۔“

”اور کیا کرنا ہے؟“ میں نے سوچ کے کہا۔

”بھئی یہ شیروانی صاحب ہیں اور اپنے استاد پیڈرو۔ کیا یہ ایسے ہی پڑے رہیں گے؟“ نازو نے انگلیوں سے اپنے بال سنوارے۔

”اور یہ خاموشی کیسی ہے؟“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا وہ خصم عزیز جارج چیلن کہاں ہے، کس لڑا؟“

”وہ ہیرا ٹھیک رہا ہے اور انتظار کر رہا ہے...“

”کس کا ... ؟ اور کس بات کا؟“ میں نے کہا۔

”جہاز یاتی اس کی تحویل میں ہے۔“ نازو بولی۔ ”اور وہ ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ جہاز کی کپتانی شاہد جمیل نے سنبھال لی ہے، صورت حال پوری طرح قابو میں ہے۔“

”یہ بتاؤ گل کہاں ہے؟“ میں نے کہا۔

”گل ...؟“ نازو ہنسی۔ ”اچھا ... تو وہ گل ہے؟ یہ تازہ گل کھلایا ہے آپ نے۔ گل بہت اچھی ہے جناب۔“

میری نظر پیڈرو کی طرف گئی۔ ”میں کے رہنا اس سے وہ تاگ میں ہے ... اس کا مایا نہیں مانگ ... مثلاً اپنے استاد پیڈرو ابھی تک اسے رابعہ سمجھ رہے تھے۔“

پیڈرو کے چہرے پر اس انکشاف کا ذکر پشیمانی کا احساس بن گیا جیسے وہ رابعہ سمجھا تھا وہ رابعہ نہیں تھی۔

”پانی تو تم نے بھی نہیں مانگا ابھی تک۔“ نازو مسکرائی۔

”پانی کیا، اب چائے یا کافی بھی ہے لیکن ذرا اس کو ٹھکانے کو سیٹ لیں۔“ میں نے کہا۔ ”تمھارے حکم کے غلام کتنے ہیں علاوہ غالب کے؟“

”شاہد جمیل کا وہ سب عملہ جس نے فروخت ہونے سے انکار کر دیا تھا صرف تین افراد پر مشتمل ہے۔“ نازو نے کہا۔ ”چار افراد جن میں کپتان مصر بھی شامل ہے، مارے گئے تھے۔ ڈاکٹر بھنڈاری کے علاوہ وہ دو افراد ہیں جو ہمارے ساتھ ہیں۔“

”یہ ریوالور اٹھا کے لے جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”اور ان دو کو بھی باقیوں کے ساتھ قید کر دو۔ ان سے بعد میں نمٹ لیں گے۔ غالب کو میرے پاس بھیج دو اور ڈاکٹر بھنڈاری سے کہو کہ محسن کو ہوش میں لانے کی ترکیب کرے۔“

نازو نے محسن کے قریب پڑا ہوا ریوالور اٹھا لیا۔ پھر وہ میری طرف پلٹی۔ ”سکندر، ایک بات تو پوچھی ہی نہیں میں نے۔“

”یہ کہ اکرام شیخ کیسا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”ابھی بہن ہو۔“ نازو کچھ شرمندہ سی نظر آنے لگی۔

”کیا بھیا یاد کر رہے تھے؟“

مجھے نہیں معلوم کہ ایک بھائی کے جذبات کیا ہوتے ہیں مگر میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ رشتوں کی راہ میں فاصلے حائل

www.paksociety.com

نہیں ہوتے۔ یہ سوال تم کو اپنے آپ سے کرنا چاہیے۔ اگر تمہیں یاد کر آ رہی ہو تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہارا خیال نہ آیا ہو۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمارے ساتھ آنے پر بضد تھا۔"

"مومنی نے مدد کیا ہو گا۔" نازو نے کہا۔

"مومنی!" میرے دل میں دکھ کا ایک کانٹا اتر گیا۔ "یہی نازو، وہ رو رہنے والی تھی۔ اور ہنسنے والی۔ وہ چلی گئی۔"

"کہاں چلی گئی ہو واپس... ؟"

"یہی سمجھو۔" میں نے ایک سرد آہ بھری۔ "ہمارے عقیدے کے مطابق ہم سب کو لوٹ کر وہیں جانا ہے۔"

"وہ... وہ مر گئی... کیسے... اور کب؟" نازو کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

"فرصت میں کریں گے یہ سب باتیں یوں سمجھ لو کہ شیخ کو ہم پیچھے چھوڑ آئے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں کچھ ایسے معاملات تجو سے سنبھالنے ہوں گے۔"

نازو نے سر ہلایا اور پھر ان دونوں کو اشارہ کیا جو ایک لڑکی سے پٹ جانے کے بعد اتنے شرمسار تھے کہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا کندھا اتر گیا تھا اور دوسرے کا بازو ٹوٹا تھا۔ ان کے لیے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا بھی آسان نہ تھا مگر نازو نے ریوالور کا رخ ان کی طرف کیا تو وہ اٹھنے کا جتن کرنے لگے۔ انھیں اب اپنے یا نازو کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ رہی تھی جو لڑکی خالی ہاتھوں سے ان کے انجر پنجر ڈھیلے کر سکتی تھی وہ ریوالور سے ان کو چھلنی بھی کر سکتی تھی۔

جب نازو انھیں باہر لے گئی تو میں نے پیڈرو سے کہا۔ "آپ کا کیا خیال ہے دوسرے راؤنڈ کے بارے میں؟"

"میں تمھیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" پیڈرو نے کہا۔

"مجھے کچھ پوچھنا بھی نہیں ہے اور نہ کوئی اعتراف جرم حاصل کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے افسوس صرف اس بات کا ہے کہ تم اکیلے ہو۔ گل کے ساتھ جو کچھ تم نے کیا، اسے دیکھنے کی اذیت میں نے اور محسن نے برداشت کی۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ تمھارا تماشا بھی ایسے ہی کوئی دیکھتا اور کوئی نہ سمجھ سکتا۔ اپنے چوہدری والا وہ صاحب بھی آ سکتے۔"

غالب اندر آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ "ابے ہم تو مایوس ہو گئے تھے۔ سمجھے تھے کہ اب کوئی نہیں آئے گا۔"

میں نے اس کو دور دھکیلا۔ "الو کے پٹھے۔ ایسا ہو سکتا ہے! یہ خیال ہی کیسے آیا تم دونوں کے ذہن میں۔"

غالب کے ساتھ آنے والے دو افراد اسٹریچر لائے تھے۔ وہ محسن کو اٹھا کے لے گئے۔ غالب نے غور سے مجھے دیکھا اور اطمینان کا اظہار سر ہلا کے کیا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بتا شمیلا کا کیا حال ہے اور شیخ..."

"یہ سب باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے اس کام سے فارغ ہو لیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ ہم نیکی سے کتنی دور ہیں۔"

"شاہد جمیل نے تو اپنا سمندری حساب لگا کے کنفیوز کیا تھا لیکن یوں سمجھ لے کہ ڈیڑھ دو سو کلومیٹر فاصلہ باقی ہے۔ شام تک چلتے رہے تو بھی پہنچ جائیں گے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہم کئی گھنٹے جہاز پر رک سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کام بھی بہت ہے اور..."

"دونوں کام ایک ساتھ کیسے جا سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "مگر چل پہلے کچھ تازہ دم ہو جا۔ نہا دھو لے۔ اس جہاز پر دنیا کی ہر نعمت تیرے استعمال کے لیے ہے۔ چاہے کوئی سینڈوچ، برگر، کسٹرڈ۔"

"شکریہ۔ میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے مسافروں کی حفاظت کا بندوبست کر۔"

"مگر اس کا نام کون ہے تو ان... عجیب چیز ہے۔"

"وہ ایم آر اس کی انتہائی قابل اعتماد ٹیم ہے۔ اور یہ اس کے لیے پہلی آزمائش تھی۔" میں نے کہا۔ "ہم ان کے ہوش میں آنے کا انتظار نہیں کر سکتے ورنہ اس کے لیے یہ باعث تسکین ہوتا۔ جواب ہو گا۔ وہ جواب آپ خود..."

مجھے وضاحت کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ غالب نے میری بات سمجھ لی اور چند منٹ کے لیے باہر گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں دو ڈبے تھے۔ پیڈرو کی حالت ان ڈبوں کو دیکھتے ہی غیر ہو گئی۔

"دیکھو... خدا کے لیے یہ سب مت کرو۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"ہم یہ سب خدا کے لیے نہیں کر رہے ہیں۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ "اور خدا میں ہم جہاد کر رہے ہیں اور بہت سے نیک کام کر رہے ہیں۔"

"میں تم کو بہت سی باتیں بتا سکتا ہوں۔" پیڈرو نے کہا۔

میں نے اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔ "بعد میں بتانا۔ پہلے تم خود تیار ہو گے یا..."

وہ مجھے گالیاں دینے لگا اور اس نے آنے والے عذاب سے محفوظ رہنے کی دیوانہ وار...

میں نے آسانی سے اس پر قابو پا لیا۔ مزاحمت کے باعث اس کے کپڑے تار تار ہو گئے اور مجھے اس کو باندھنے کے لیے اس کے ہی کپڑوں کی پٹیاں بنانی پڑیں۔

غالب نے شہد کا ڈبا اس پر الٹ دیا۔ آہستہ آہستہ شہد اس کے جسم پر پھیلتا گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان چیونٹوں کو دیکھتا رہا جو تجربے کے اندر بھوک سے بے قرار پھر رہے تھے۔ ڈبے کا سامنے والا حصہ شیشے کا تھا جس کے پیچھے لال چیونٹوں کا شکاری لشکر صاف نظر آتا تھا۔ رونے اور چیخنے کا نقصان خود پیڈرو کو ہوا۔ اس کے سارے جسم پر شہد کی تہ جم گئی۔

جب میں نے چیونٹوں کو آزاد کیا تو پیڈرو نے ایک بھیانک چیخ ماری۔ چیونٹے بڑی بے تابی سے شہد چاٹنے کے لیے لپکے اور دیکھتے ہی دیکھتے پیڈرو کے جسم پر قابض ہو گئے۔ وہ پیڈرو کی دلخراش چیخوں سے اتنے ہی بے نیاز تھے جتنے گل کے نازک جسم کو بے دردی سے کاٹنے والے چیونٹے۔

"اس پہلے راؤنڈ کو ختم ہونے دو۔" میں نے کہا۔ "پھر ہم تمھیں بتائیں گے کہ ہمارا دوسرا راؤنڈ کیا ہے۔"

میں نے دروازہ باہر سے بند کیا اور غالب کے ساتھ چل پڑا۔ پیڈرو کے وحشیانہ انداز میں چیخنے کی آواز باہر بھی سنائی دے رہی تھی لیکن میرے دل کے لیے اس میں صرف سکون کا سامان تھا۔ ذاتی سطح پر وہ میرا بدترین دشمن تھا اور مجھے اس سے اتنے انتقام لینے تھے کہ اس کی ایک زندگی مجھے ناکافی لگتی تھی۔

باہر نکل آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ہم جہاز کی نچلی منزل پر کسی تہ خانے یا اسٹور میں تھے۔ اوپر جانے والے راستے پر بعض سیڑھیوں کے درمیان ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ ایک اور لاش مجھے اس کمرے کے دروازے پر نظر آئی جہاں نازو پہرہ دے رہی تھی۔ لاش کے آس پاس کہیں خون نہ تھا اور اس کے جسم پر مجھے زخم کا بھی کوئی نشان نظر نہ آیا۔

"یہ خودکشی کا کیس ہے۔" نازو نے مجھے مطلع کیا۔

"حوالات میں کوئی قیدی تشدد سے ہلاک ہو جائے تو تھانہ انچارج بھی یہی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ بدبخت تھانہ انچارج پر فریفتہ ہو گیا تھا۔" غالب نے کہا۔ "نازو کو لڑکی سمجھ کے۔"

"کیا میں لڑکی نہیں ہوں؟" نازو نے غالب کی بات کاٹ کے کہا۔ "سمجھنے کا کیا مطلب؟ تم کیا سمجھتے ہو مجھے؟"

"تم ہو بلا ہو جو کچھ ہو۔" غالب نے کہا۔ "اب یہ بھی پوچھو گی کہ ہم تمھیں کیا سمجھتے ہیں۔"

دونوں قیدی حوالات میں پہنچا دیے گئے۔ یہ ایک کمرا تھا جس پر آرتھوپیڈک یعنی ہڈیوں کے وارڈ کا گمان ہوتا تھا۔ ایک شخص کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اور وہ اپنا ایک ٹوٹا ہوا بازو گھٹنے پر رکھے بلبلا رہا تھا۔ دوسرا فرش پر ڈھیر پڑا پسلیوں کو دبائے کراہ رہا تھا۔ تیسرا چت لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کا منہ سوجا ہوا تھا اور آنکھوں کے پاس گومڑے نیل تھے۔ چوتھا بے ہوش تھا! چنانچہ بظاہر سالم نظر آتا تھا لیکن وہی سب سے زیادہ شکستہ تھا۔ یہ سب توڑ پھوڑ نازو نے کی تھی۔ یہ سب ایسے مرتبے جنھوں نے نازو کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ ان سب کو ایک بے وقوف نظر آنے والی مگر بے حد حسین اور کمزور دکھائی دینے والی مگر ان سے زیادہ طاقت ور لڑکی نے وہ "چھینٹی" لگائی تھی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تازہ وارد جو والے اس وارڈ میں داخل ہوئے تو بہت سی نظریں ان کی طرف اٹھیں۔ ان سب میں ایک ہی سوال تھا۔ کیا تم بھی اسی جیتی جاگتی قیامت کے شکار ہوئے؟ اور خاموشی سے سر جھکانے والوں کی شرمندگی ان کا جواب بھی تھی کہ "ہاں یارو، یہ شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ نصف درجن جری مرد ایک لڑکی کے ہاتھوں تہس نہس ہو گئے۔"

سب سے پہلے میں نے شاہد جمیل سے ملاقات کی۔ "میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی مدد کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔" میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔

اس نے میرے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا۔ "کیا خوب صلہ دیا ہے آپ لوگوں نے میری نیکی کا؟"

"آپ کی یہ ناراضگی میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے اپنا ہاتھ خفت سے پیچھے ہٹا لیا۔ "ایسا کیا قصور کیا ہے ہم نے؟"

"کیا آپ مجھ سے پوچھتے ہیں؟" شاہد جمیل پھٹ پڑا۔ "مجھے معلوم ہوتا کہ آپ لوگ اتنا کشت و خون کریں گے اور جہاز کے عملے کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک ہو گا تو میں آپ لوگوں کو جہاز پر قدم بھی نہ رکھنے دیتا۔ میں صرف ان کے خلاف تھا جو اس جہاز کو ناجائز اور غیر قانونی طور پر استعمال کر رہے تھے۔ انھیں پکڑا جا سکتا تھا اور قانون کے حوالے کیا جا سکتا تھا۔ وہ مزاحمت کرتے تو ان کے ساتھ آپ لوگ کچھ بھی کرتے مجھے اعتراض نہ ہوتا مگر آپ لوگ تو خود بحری قزاق ہیں۔ آپ لوگوں نے میرے عملے کے کتنے بے گناہ لوگوں کو مار ڈالا۔"

"وہ سب مجرموں کے ساتھی تھے اور ہمارے دشمن کا

ساتھ ڈبونے والا ہمارا کبھی دشمن ہوگا؟" میں نے کہا۔

"وہ کسی سے دشمن نہیں تھے اور کسی جرم کے ساتھی نہیں تھے۔" شاہد جمیل نے غصے سے کہا۔ "انھوں نے نہ صرف جہاز پر قبضہ کرنے والوں کے خلاف مزاحمت کی تھی اور یہ ان کا فرض تھا کہ وہ جہاز کی حفاظت کریں۔ مصرا اور اس کے ساتھی اگر چور تھے تو آپ لوگ ڈاکو ہیں۔ کس نے دیا ہے یہ حق تمھیں کہ اس طرح تم ایک بحری جہاز پر قابض ہو جاؤ؟"

"میں بحث نہیں کرنا چاہتا مسٹر شاہد جمیل! ہم تمھیں ناسمجھی کی باتیں کرتے ہوئے کیا۔ پورس نے سکندر سے پوچھا تھا کہ تمھیں دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھنے کا حق کس نے دیا ہے؟ کسی نے محمود غزنوی سے یا انگریز قوم سے پوچھا تھا کہ تمھیں ہندوستان کو فتح کرنے کا حق کس نے دیا؟ یہ حق ہر فاتح خود حاصل کرتا ہے اور اس کی فتح ہی اس کے برحق ہونے کا جواز بن جاتی ہے۔ ہم کیا اقوام متحدہ سے یہ حق مانگتے؟ عالمی عدالت انصاف سے حق کا دعویٰ تسلیم کراتے؟ کسی کو آج تک مانگنے سے حق ملا ہے؟"

"مسٹر سکندر، یہ فلسفے اور سیاست کی منطق میرے کس کام کی؟ یہ جہاز کسی حکومت کی ملکیت نہیں، ایک کمپنی کا ہے جس نے مجھے بھی ملازم رکھا تھا اور مصرا کو بھی۔ مصرا مارا گیا۔ جہاز کا سارا عملہ یا تمھاری قید میں ہے یا مارا جا چکا ہے۔ شاید تم جہاز کو بھی غرق کر دو گے۔ مجھے بتاؤ میرا قصور کیا تھا جس کی تم مجھے سزا دے رہے ہو۔ میں کیا کروں گا، کہاں جاؤں گا، میری نوکری، زندگی سب خطرے میں ڈال دی ہے تم نے۔"

"یہ ٹھیک ہے شاہد جمیل کہ ہم اس جہاز کو غرق کر دیں گے لیکن ہم تمھیں بحفاظت نکل جانے کا موقع دیں گے اور اس بات کی پوری ضمانت فراہم کریں گے۔"

"کوئی فائدہ نہیں تمھاری ضمانت کا۔ میرے جہاز کا عملہ جانتا ہے کہ میں نے ہی تمھاری مدد کی تھی۔" شاہد جمیل بولا۔ "وہ میرے خلاف گواہی دیں گے۔ مجھ پر مقدمہ چلایا جائے گا اگر اس سے پہلے ہی تمھارے دشمنوں نے مجھے سزائے موت نہ دی۔ جو فلسفہ تمھارا ہے، وہی ان کا بھی ہوگا کہ ہمارے دشمنوں کا ساتھی ہمارا دشمن۔"

"لیکن اب تمھارے خلاف گواہی دینے والا کون بچا ہے؟" میں نے کچھ سوچ کے کہا۔ "ایک ڈاکٹر بھنڈاری ہے۔ اس کے علاوہ دو افراد؟"

"صرف تین آدمی بچے ہیں!" شاہد جمیل نے افسوس سے سر ہلایا۔ "عملے کے ستائیس ارکان تھے۔"

اس وقت اگر میں شاہد جمیل کو بتاتا کہ چھ افراد ابھی زندہ ہیں تو کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اٹھارہ افراد کے مارے جانے کا صدمہ کم نہ ہوتا۔ الٹا یہ اندیشہ بڑھ جاتا کہ ان کے خلاف گواہی دینے والے نو افراد موجود ہیں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ تم سب کا ایک ہی مسئلہ ہوگا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ تمھارے اور ڈاکٹر بھنڈاری کے علاوہ دو افراد نے ہم سے پورا تعاون کیا۔ بچ جانے والے یہ سمجھ رہے ہیں کہ جہاز کی تباہی کے بعد باقی سب لوگوں پر کیا بیتی، یہ انھیں نہیں معلوم۔ بس قدرت نے انھیں بچا لیا۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ بحری جہاز کی غرقابی میں سو فیصد لوگ نہیں مرتے جو جہاز پر ہوں اور بچنے والے لوگ ہوائی جہاز گر کر تباہ ہو جانے کے بعد بھی بچ جاتے ہیں۔ تمھارے ساتھ زندہ سلامت ساحل تک پہنچ جانے والے ایک دوسرے کے خلاف کیسے بیان دے سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں، ایک جرم میں شریک ہو جانے کے بعد جھوٹ کا سہارا لے سکتے ہیں۔" شاہد جمیل نے کہا۔ "پھر بھی تفتیش تو ہوگی اور سب سوالات ہم سے ہی کیے جائیں گے۔"

"شاہد جمیل، تم بلاوجہ پریشان ہو۔ کیا تم جانتے نہیں تھے کہ جہاز پر کتنا اسلحہ تھا؟" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر بھنڈاری اور باقی دو زندہ بچ جانے والے اگر کچھ نہیں جانتے تو میں ان کو سب بتا دوں گا۔ کیا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی یقین نہیں کریں گے؟ جہاز کی تباہی کے اسباب متعین کرنے والے خود ہی سمجھ لیں گے کہ اسلحے کے ڈھیر میں آگ لگ جانے سے جہاز تباہ ہوا۔ آگ لگنے کے اسباب ایک سو ایک ہو سکتے ہیں۔ یہ شارٹ سرکٹ سے تخریب کاری تک اور یہ روانی میں جلتی ہوئی سگریٹ پھینک دینے تک۔ تمھارا صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ تمھیں دھماکے نے سمندر میں اچھال دیا تھا۔ اس سے زیادہ تم کچھ نہیں جانتے اور تم کسی پر شک بھی نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے پھر جہاز کی تباہی کو صرف ایک حادثہ سمجھا جائے گا۔"

شاہد جمیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اسے اپنے خیالوں میں کھویا ہوا چھوڑ کے باہر آ گیا۔ یہ سب شاہد جمیل کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی اور اس کا احساس جرم میں مبتلا ہونا بھی ایک مختلف زاویے سے جائز تھا۔ لیکن اس جنگ میں زیادتی سب کے ساتھ ہو رہی تھی۔ مارے وہ بھی جا رہے تھے جو حق پر تھے اور مظلوم تھے۔ ہم اور ہمارے ساتھی سب امن پسند اور محب وطن۔ وہ سب جو علیحدگی پسندوں کے خلاف صف آرا تھے۔ مشرقی پاکستان کے محب وطن عوام لیکن

عورتیں اور معصوم بچے سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہر روز میرے وطن کے دشمنوں کی سازش کا شکار ہو رہے تھے اور وہ غدار وطن کے ہاتھوں زندگی سے ہاتھ دھو رہے تھے۔ ایسے حالات میں اگر چند افراد کے ساتھ ہم سے بھی زیادتی ہو جائے اور کچھ اپنے حامی و مددگار بھی جہاز کی کارروائی کے دوران مارے جائیں تو ہم افسوس کر سکتے ہیں کہ ہم ایسا نہیں چاہتے تھے لیکن مجبور تھے۔ جب دشمن کے طیارے اپنے ملک کی حدود میں داخل ہو جائیں تو ان کے خلاف کارروائی سے اپنے ہی ملک کے عوام کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ فوج کبھی دشمن کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے اپنے ہی پل اڑا دیتی ہے۔ بم اپنے ہی علاقے میں بھی گر جاتے ہیں۔

عرشے سے سمندر کا نظارہ دل کش تھا۔ تاحد نگاہ پھیلا ہوا سمندر، ٹھہری ہوئی بے قرار موجیں، ساکت آسمان اور سمندر کا شور۔ تاہم ایک لانچ کے مقابلے میں اس بحری جہاز پر تحفظ کا زیادہ احساس ہوتا تھا۔ غالب میرے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔

"چل میرے، پہلے اپنی حالت درست کر لے۔" غالب نے کہا۔ "نازو ایک تربیت یافتہ نرس کی طرح تیری مرہم پٹی کرنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔" وہ میرے ساتھ چل پڑا۔

"محسن کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا۔

"تو خود پوچھ لے۔" غالب نے میرے ساتھ چلتے چلتے کہا۔ "نازو نے اسے باقاعدہ اسپتال میں داخل کر دیا تھا۔ اس کو جہاز پر پہنچ کے اس کے کپڑے بھی بدل دیے تھے۔ ہوش میں آتے ہی اس نے بالکل فلمی سوال کیا۔ میں کہاں ہوں۔ کسی نے کہا کہ جنت کی کسی کلاس میں۔"

"یار میں گل کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

غالب نے ایک آہ بھری۔ "دیکھو بھائی، ضرور دیکھو۔ یہ دیکھنے کی چیز ہے، اسے بار بار دیکھو۔ دریافت یہ گل ہے کس گلستان کا اور کب قلمرو میں کیسے آیا؟"

"ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں۔ پس یہی اس جستجو کا حاصل ہے۔" میں نے کہا۔ "اور ایک دلچسپ بات بتاؤں، وہ محسن کے عشق میں مبتلا ہے۔ ناقابل علاج قسم کا عشق ہے جس کی دوا ایجاد نہیں ہوئی۔"

"دوا تو ہے، شربت وصل۔" غالب نے کہا۔

"اور وہ جو شربت وصل کی ایک بوتل لاہور میں رکھی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی گل کو اس کی خبر نہیں ہے۔"

"کیا کہا؟" غالب نے شور مچانا شروع کیا۔ "میں تو سمجھا تھا اس لڑکی کے دماغ میں فتور ہوگا۔ مگر یہ تو کوئی کا کیس ہے۔ بھلا کوئی ہوش و حواس والی لڑکی کیسے عاشق ہو سکتی ہے محسن جیسے پالتو شوہر پر۔ میں اسے بتاتا ہوں۔"

"دیکھو مرزا غالب کے بچے، ایسا ہرگز مت کرنا۔ ہم جو بھی کرتے ہیں سوچ سمجھ کے کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "فی الحال اس کو خوش کے وجود سے بے خبر رکھنا ضروری ہے۔ نازو کو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھا دینا۔"

"پہلے تم اچھی طرح سمجھ لو میری بات۔" نازو نے اچانک سامنے آ کے کہا۔ "باقی سب کام بعد میں ہوں گے۔"

"مثلاً نکاح، ولیمہ وغیرہ؟" غالب نے کہا۔ "جیسی تمھاری مرضی بھی۔ سر تسلیم خم ہے۔"

"سکندر بھائی، تمھارا کام دیکھ کے ان کی زبان بہکنے لگتی ہے۔" نازو نے کہا۔ "اتنے دن سے چپ تھے۔"

"ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں، ورنہ کیا بات کرنی نہیں آتی۔" غالب نے تسلیم بجا لا کے کہا۔ "آداب عرض۔"

"سکندر بھائی! آپ گرم پانی سے نہا لیں۔ کپڑے بدلیں۔ میں اتنی دیر میں کافی وغیرہ بناتی ہوں۔ پھر آپ کی ڈریسنگ کروں گی۔" نازو نے کہا اور مجھے بازو سے پکڑ کے اندر لے گئی۔

"ارے بھائی، میں گل کو تو دیکھ لوں۔"

"ابھی اسے نہیں دیکھ سکتے آپ۔ چلیں اندر۔" اس نے مجھے باتھ روم میں دھکیل دیا۔

وہ شاید مصرا کے کمرے سے متصل باتھ روم تھا۔ اس میں ضرورت کے سب اسباب شاہانہ تھے۔ میں نے گرم پانی ٹب میں بھرا۔ اس میں ڈیٹول ڈالی اور پھر آدھے گھنٹے تک اپنی ساری تھکن اتارتا رہا۔ بالآخر نازو نے دروازہ بجانا شروع کیا تو میں لباس بدل کے باہر آیا۔ نازو پہلے میری گردن کی خراشوں پر مرہم لگانا چاہتی تھی مگر میں نے کسی ضدی بچے کی طرح صاف انکار کر دیا۔

"گردن کی خراشوں سے میرے فوت ہونے کا کوئی امکان نہیں۔" میں نے کہا۔ "بھوک سے مر گیا تو میرا خون تمھاری گردن پر ہوگا۔ میرے پیٹ کے خلا میں راکٹ گردش کر رہے ہیں۔"

"پہلے بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑتے تھے۔ پرانے وقتوں کی بات ہے۔" غالب نے کہا۔ "محسن بھی آدھے گھنٹے سے اعلان کر رہا ہے کہ میں دس سیکنڈ میں فاقے سے ہلاک ہو جاؤں گا۔"

محسن کو صحت مند اور پوری طرح مستعد دیکھ کے مجھے خوشی ہوئی۔ ہم تینوں اب سابق کپتان مصرا کے کمرے میں اس کے بیڈ پر التی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ نازو نے

بہترین میزبانی کے فرائض سرانجام دیے۔ ہر عورت ہر مرد کی ہر ضرورت محسوس کر سکتی ہے اور پھر اپنی فطری صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اسے وہ اسباب فراہم کر سکتی ہے جو آرام و آسائش، تحفظ اور طمانیت، سکون اور مسرت کے اور اپنائیت کی شکر گزاری کے جذبات کی صورت میں اس کا انعام بن جاتے ہیں اور اس کے وجود کی اہمیت کو تسلیم کراتے ہیں۔

اپنی پسند کی ہر چیز ختم کر لینے کے بعد میں نے نازو سے کہا۔ "نازو بی بی! آپ گریٹ۔" محسن نے تائید میں سر ہلایا۔

غالب نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "تھینک یو۔"

"تم کس بات پر شکریہ ادا کر رہے ہو؟" محسن نے کہا۔

"میری پسند کو پسند کرنے کا شکریہ۔" غالب نے کہا۔

نازو کا چہرہ ایک اندرونی خوشی سے دمکنے لگا۔ عورت بیک وقت اپنے بھائی، اپنے شوہر، اپنے باپ اور اپنے بیٹے کو خوش کر کے کتنی بے غرض خوشی حاصل کر سکتی ہے۔ مختلف رشتوں کے حوالے اس کے جذبات کی نوعیت پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ مرد شاید محبت کو رشتوں کے خانوں میں اتنی ایمانداری سے تقسیم نہیں کر سکتے۔ شمالیہ سے موہنجو داڑو تک اور مالابار سے ناگ منی تک، عورت کی ذات ایک سائبان ہے، آسمان کی طرح جو سب کے لیے وہی ہے۔

"اب تم گل سے مل سکتے ہو۔" نازو نے کہا۔ "لیکن دیکھو اسے آرام کی ضرورت ہے۔"

"کبھی اپنے کفش برداروں کی ضرورت کا خیال بھی آتا ہے؟" غالب نے کہا اور دوڑ کے آگے نکل گیا۔

"یہ کفش بردار کیا ہوتا ہے۔ اس لفظ کا مطلب بھی معلوم ہے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں، جوتیاں اٹھانے والا۔" غالب نے کہا۔ "پہلے جب شوہر ہوتے تھے، نکاح کے بعد کہتے تھے کہ بیوی آنکھیں کھولو، میں تمہارا غلام، تمہاری جوتیاں اٹھاؤں گا، میں بھی کہوں گا۔"

"وہ پرانے شوہر بعد میں اسی بیوی کو پاؤں کی جوتی بھی سمجھتے تھے۔" محسن نے طنز سے کہا۔

"میں بھی سمجھوں گا۔" غالب نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

گل صاف ستھرے بستر پہ چادر اوڑھے چپ لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے ہمت نہ ہوئی کہ چادر ہٹا کے دیکھ سکوں۔

"کیا حال ہے گل؟" میں نے اس کے ماتھے پہ پیار سے ہاتھ رکھ کے کہا۔

"ٹھیک ہوں بھائی سکندر۔" وہ مسکرائی۔ "تم نہیں پوچھو گے؟" اس نے محسن سے مخاطب ہو کے کہا۔

"گل تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔" محسن نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"نازو نے مجھے دوا دی ہے۔ اس سے درد کا احساس بالکل ختم ہو گیا ہے۔" گل نے کہا۔ "زخم گہرے نہیں ہیں۔"

"تم بہت بہادر لڑکی ہو گل۔ ناگ منی سے کہیں زیادہ ہمت ہے تم میں۔" میں نے کہا۔ "ہم سب فخر کر سکتے ہیں تم پر۔"

"وہ... بدمعاش... استاد پیڈرو۔" گل نے نظریں جھکا کر کہا۔ "کیا تم نے مار دیا اسے؟"

"نہیں، ابھی اس کی سزا شروع ہوئی ہے۔ جو سزا اس نے تم کو دی تھی، اسی سے اب خود گزر رہا ہے۔ میری خواہش تھی کہ تم دیکھو گی۔"

"میں دیکھوں گی۔" گل کی آنکھوں میں نفرت اور انتقام کی آگ دہکنے لگی۔ اس نے چادر کو ہاتھ مار کے ہٹا دیا۔ نیچے اس نے صرف ایک گاؤن پہن رکھا تھا۔ جسم کے بیشتر حصوں پر نازو نے پٹیاں باندھی تھیں یا مرہم لگا کے ٹیپ لگا دیا تھا۔ ایسی حالت میں وہ ڈھیلا ڈھالا اسرافی سا لباس پہن سکتی تھی لیکن چلنے پھرنے اور حرکت کرنے سے اس کے زخموں سے ٹکرا... پھوٹ جانے کی تکلیف بھی بہت زیادہ ہو سکتی تھی۔ سوچے سمجھے بغیر میں نے بھی اس کو کندھے سے پکڑ کے پھر بستر پہ لٹا دیا۔ وہ کراہنے لگی۔

"مجھے لے چلو... میں چل سکتی ہوں۔ اس کمینے کی آنکھیں نکال کے چبا سکتی ہوں میں..." اس کا جسم کانپ رہا تھا اور وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ خوف اور دہشت کے ختم ہوتے ہی آنسو امڈ آئے تھے اور جذبات کا آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ میں نے نازو کو آواز دے کر بلایا اور اس نے گل کو سنبھالا۔

"یہ کسی صورت مناسب نہیں ہے کہ وہ پھر پیڈرو کو دیکھے۔" میں نے کہا۔ "اور اس حالت میں۔"

"یار سکندر، ہم گل کو اپنے ساتھ کیسے لے جائیں گے؟" محسن نے میرے ساتھ ہی باہر آ کے کہا۔ "جہاز کو غرق کرنے سے پہلے ہم کسی لائف بوٹ میں جائیں گے۔ گل اس میں کیسے رہے گی؟"

"لائف بوٹ کے سوا کیا ہے ہمارے پاس؟" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ ہم سب ایک ہی لائف بوٹ پہ نہ جائیں۔ گل کو ایک الگ لائف بوٹ میں رکھیں۔ ہم میں سے ایک اس کے ساتھ رہے۔"

"پھر بھی ہم اسے سمندر کے پانی سے تو نہیں بچا سکتے۔

سمندر کا نمکین پانی اس کے زخموں پہ لگے گا۔"

"ہاں۔ گل کو اس آزمائش کا سامنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ہم اسے درد کا احساس ختم کرنے والی دوا کی دوگنا یا تین گنا خوراک دے سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "اس کے جسم پر اچھی پیکنگ اور جلد کو سن کرنے والی کریم کا لیپ کیا جا سکتا ہے۔"

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ ہم اسے چھوڑ کے بہر حال نہیں جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب ہمیں جہاز سے روانہ ہونے کے آخری مرحلے کی تیاری شروع کر دینی چاہیے۔"

"ان سب کا کیا ہوگا جو ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟" محسن نے کہا۔ "مثلاً استاد پیڈرو، شاہد جمیل۔"

"استاد پیڈرو کا کیس الگ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس پر ہم انڈیا کی عدالت میں اس کے تمام جرائم پر مقدمہ چلایا جائے۔ شاہد جمیل اور اس کے ساتھی ہمارے ساتھی نہیں ہیں لیکن انہوں نے ہماری مدد کی تھی۔ ان کو ہمارا تعاون حاصل رہے گا۔ وہ جہاز سے جو کچھ بھی لے جانا چاہیں انہیں اجازت ہوگی۔ جہاز پر چار لائف بوٹس ہیں۔ ایک وہ استعمال کر سکتے ہیں۔"

"اور ان کے باقی ساتھی؟"

"میں نے شاہد جمیل کو ان کے بارے میں بھی بتایا ہے۔ سب مارے گئے سوائے ان تین افراد کے جو ہماری مدد کرتے رہے۔ انہیں ہم جہاز پر ہی چھوڑ جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"وہ ہمارے دشمن ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ان سب کی قضا جو ہلاک ہو چکے ہیں۔ وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔"

معراج کے کمرے میں ہم نے ایک مختصر اجلاس کیا جس میں خواتین کی عدم موجودگی کو سب نے محسوس کیا لیکن گل اس حال میں تھی اور نازو اس کے معالج و تیماردار کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ غالب اور نازو نے اپنے اسپورٹ جہاز پر پہنچنے کے بعد ایک محفوظ مقام پر چھپا دیے تھے۔ انھوں نے سلیمانی رنگ میں اپنے لیے اسلحہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ جہاز پر وہ ڈاکٹر بھنڈاری کے اسسٹنٹ سمجھے جاتے تھے جو خود بلا روک ٹوک ہر جگہ آ جا سکتے تھے۔ چارلی یعنی غالب سب کا خادم تھا اور اس سے سب خوش تھے کیونکہ وہ کسی بات کا برا نہیں مانتا تھا۔ لوگ اس سے مذاق کرتے تھے۔ نازو کے حوالے سے اشتعال انگیز سوالات پوچھے جاتے تو وہ ہنس کے ٹال جاتا تھا۔ اسے ایک احمق شخص سمجھا جاتا تھا اور محلے کے نچلے درجے کے لوگ بھی اس پہ حکم چلاتے تھے۔ "چارلی! یہ لے جاؤ، ادھر آؤ، میرے شو پالش کرو، چارلی میرے بوٹ پالش کرو۔" وہ ہر کام خوشی خوشی کرتا تھا۔ چنانچہ کسی بھی جگہ اس کی موجودگی پہ کسی کو شک نہیں ہوتا تھا۔ غالب نے خاصی محنت، ذہانت اور برداشت سے یہ تاثر پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی کہ وہ ایک بے ضرر اور بے عقل شخص ہے۔ ان بدبخت لوگوں کی طرح جو ذلت اٹھانے، ظلم سہنے اور غلامی کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔

دوسری طرف نازو نے ہوس پیشہ ڈاکٹر بھنڈاری کو پوری طرح قابو کر لیا تھا۔ اس نے بیک وقت انتہائی سادگی و ہوشیاری سے اس کی آتش شوق کو ہوا دی تھی لیکن ایسا کوئی موقع نہیں آنے دیا تھا کہ وہ نازو پہ دست درازی کر سکتا۔ وہ شراب کا رسیا تھا اور نازو اسے اپنے ہاتھوں سے پلاتی تھی تو اس کا نشہ دو چند ہو جاتا تھا مگر اس بے وقوف کو یہ کبھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ شراب میں خواب آور دوا کی خفیف سی مقدار بھی شامل ہے۔ الکحل کے ساتھ سکون آور دوا کے اثرات بھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ خواب آور دوا کی زیادہ مقدار مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ نازو کا مقصد اسے مارنا ہوتا تو اس کے مواقع کم نہ تھے مگر ڈاکٹر بھنڈاری مر جاتا تو شکوک پیدا ہوتے اور تفتیش کا نقطۂ آغاز خود نازو ہوتی۔ وہ ڈاکٹر بھنڈاری کو کم سے کم وقت میں مدہوش کر دیتی تھی۔ بعد میں بھنڈاری تاسف سے ہاتھ ملتا تھا کہ شراب نے اسے ناک آؤٹ کر دیا ورنہ نازو کی طرف سے وعدۂ وصل جھوٹا نہ تھا۔ اسے کبھی شک نہیں ہوا کہ ساقی نے کچھ ملا دیا ہو شراب میں۔

نازو بعد میں اس کے پاس رہنے والی خطرناک ادویات کی الماری کی چابی لے کر اپنی ضرورت کی کوئی بھی چیز نکال لیتی تھی مگر اس طرح کہ ڈاکٹر بھنڈاری کو خورد برد کا احساس نہ ہونے پائے۔ اس نے ایک شیشی کلوروفارم کی غائب کی۔ کلوروفارم کو کھانسی کے شربت کی خالی شیشی میں ڈالا اور کلوروفارم کی جگہ پانی بھر کے پھر اصل شیشی واپس اپنی جگہ رکھ دی۔ خواب آور گولیوں کی کمی کو اس نے اسپرین کی گولیوں سے پورا کیا اور ایک خطرناک زہر کی جگہ آٹا بھر دیا۔ یہ کیمیائی ہتھیار اس نے موقع محل دیکھ کے استعمال کیے۔ ایک رات شور مچا کہ کوئی ملاح سمندر میں گر گیا ہے۔ اسے نازو نے بے ہوش کیا تھا اور سمندر میں پھینک دیا تھا۔ یوں جیلا ریوالور اس کے ہاتھ لگا تھا۔ وہ ریوالور غالب نے مجھے فراہم کیا تھا۔

اب ہم نے معراج کے کمرے کی تلاشی لی تو مختلف نوعیت کا بہت سا سامان الماریوں کے خفیہ خانوں سے

www.paksociety.com

برآمد ہوا۔ ان میں دستاویزات بھی تھیں جن میں مصر اگر اسلحے کی خریداری کے معاملے میں ضروری احکامات و اختیارات دیے گئے تھے۔ یہ سب ہمارے لیے بیکار تھا۔ اسی کمرے سے ایک بار پھر ہمیں انڈین، پاکستانی اور بین الاقوامی کرنسی میں خطیر رقم دستیاب ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی میری، محسن اور گل کی وہ بیلٹ بھی مل گئی جس میں ہم نے اپنے پاسپورٹ کے ساتھ ہنگامی ضرورت کے لیے کچھ رقم محفوظ کی تھی۔

باہمی صلاح مشورے سے ہم نے صرف دو سوٹ کیس پیک کرنے کا فیصلہ کیا جو ہم لائف بوٹ میں اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔ ایک میں کرنسی بھری گئی اور دوسرے میں منتخب اسلحہ۔ ہر سوٹ کیس کو اوپر تک زنانہ اور مردانہ کپڑوں سے بھر دیا گیا اور اسلحے کے ساتھ نقد رقم کو بھی واٹر پروف بنانے کے لیے پلاسٹک کے تھیلے استعمال کیے گئے۔ میں نے محسن اور غالب کی رائے سے اتفاق کیا کہ بمبئی سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر جہاز ڈوب جائے تو ہمارے لیے ساحل تک پہنچنا مشکل نہ ہوگا لیکن ہم کوشش کریں گے کہ کسی غیر آباد ساحل پر اُتریں اور اوّلین فرصت میں دونوں سوٹ کیس دفن کر دیں اور اگر اس سے پہلے ہی چیکنگ کا خطرہ پیدا ہو جائے تو دونوں سوٹ کیس سمندر میں پھینک دیں۔ جو رقم ہمارے پاس بیلٹ میں محفوظ ہوگی وہ ہماری کفالت کرے گی اور اس کے بعد ہم اپنے وسائل خود پیدا کر لیں گے۔

نازو نے ڈاکٹر بھنڈاری کے مشورے سے گل کو مارفیا دے کر سُلا دیا تھا۔ غالب مجھے اسلحے خانے میں لے گیا۔ جہاز کے زیریں حصے میں تین گودام تھے۔ ایک گودام میں نیچے سے اوپر تک لکڑی کے کریٹ رکھے ہوئے تھے۔ سامنے کی پہلی قطار کے کریٹ عام اشیائے ضرورت سے بھرے ہوئے تھے۔ مثلاً گھی کے ڈبے، ٹرانسسٹر ریڈیو، کمبلوں کا سامان، بجلی کے میٹر، فیوز اور سوئچ گیئر، [illegible] اور فولاد سے ڈھلنے والا فرنیچر۔ اسلحہ پیچھے تھا۔ وہ سیکڑوں کریٹ تھے جن میں ریوالور سے مشین گن تک اور راکٹ سے طیارہ شکن اور ٹینک شکن توپ کی بھاری گولیاں تک بھری ہوئی تھیں۔ دوسرے گودام میں آگے چاول اور چینی کی بوریاں تھیں۔ پیچھے والی بوریوں میں رائفلیں، اسٹین گنیں اور ہر قسم کے ریوالور تھے۔ ان سب کو کھول کے چیک کرنا ناممکن تھا۔ اس کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ غالب نے مجھے بتایا کہ چند بوریوں میں بارود بھی ہے۔ تیسرا گودام بارودی سرنگوں، دستی بموں، ڈائنامائٹ اور ٹائم بموں کے لیے مخصوص تھا اور یہ حصہ تقریباً جہاز کی سطح میں تھا۔

اسلحے کی اس کثیر مقدار نے جو میرے علم … جذبۂ اخوت اور حب الوطنی کو شدید کرنے کے لیے … جا رہی تھی، مجھے مشرقی پاکستان کے تخریب کار عناصر … بے پناہ قوت اور ان کے لامحدود وسائل کے بارے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یہ صرف ایک کھیپ تھی۔ اس سے ہلاکت خیزی کا کتنا سامان مشرقی پاکستان پہنچایا جا چکا … اور اس جہاز کے علاوہ اور کتنے ذرائع سے یہ اسلحہ … عناصر تک پہنچانے کا بندوبست کیا جا چکا ہے … کہنا محال تھا۔ یہ صرف ایک چھوٹی سی … تھی جو اس موت کے کاروبار میں مال و زر سمیٹ رہی تھی۔ عالمی سیاست کی بساط پر نہ جانے کتنے مہرے تھے جو اسی کی طرح خریدے جا چکے تھے اور ان ہاتھوں میں کھیل رہے تھے جو بہت بڑے شاطروں کے نظر نہ آنے والے ہاتھ …

"کس سوچ میں پڑ گیا تو؟" محسن نے کہا۔

میں چونکا۔ "کچھ نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب اسلحہ مشرقی پاکستان پہنچ جاتا تو کیا ہوتا؟"

"اگر ہم یہی سوچتے رہے تو رات ہو جائے گی۔ شام تک ہمیں جہاز سے اتنی دور نکل جانا چاہیے کہ دھماکے سے ہمارے لیے خطرہ لاحق نہ ہو۔" محسن نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم دیکھو کہ یہ کتنی دیر کا کام ہے۔" … کہا۔ "اس وقت پانچ بجے ہیں۔"

"کیا میں چھ بجے کا ٹائم سیٹ کر دوں؟" محسن بولا۔

"کیا ہم آدھے گھنٹے میں نکل جا سکتے ہیں اور نکل بھی گئے تو زیادہ دور نہیں جا پائیں گے۔" غالب نے کہا۔

"ساڑھے چھ کا وقت رکھ لو۔" میں نے کہا۔ "… گھنٹے میں ایک لائف بوٹ اتار دو۔ اس میں گل کو لٹا دو … کے ساتھ نازو رہے گی اور محسن ہوگا۔ دوسری لائف بوٹ میں غالب اور میں ہوں گے اور یہ سامان ہوگا۔ تھوڑا بہت کھانے کا سامان اور پانی دونوں لائف بوٹس میں رکھ دو۔"

"یہ سب تو ہو جائے گا۔ شاہد جمیل اور اس کے … کیا آخری وقت تک ہمارے ساتھ رہیں گے؟" محسن بولا۔

"اور سیٹھ … دوسرے قیدی؟" غالب نے کہا۔

"یار تو اتنی سی بات پر … ہر کام ایک پلان کے مطابق ہوگا۔ چل محسن تو اپنا کام شروع کر۔ ٹائم بم … نا؟" میں نے کہا۔

"دو چار منٹ کا فرق پڑ سکتا ہے ڈیڑھ گھنٹے میں۔ کیوں کہ ہر ٹائم بم کے ساتھ ایک گھڑی ہوتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "میں ایک ایک بم تینوں گوداموں میں نصب کر دیتا ہوں۔"

"اس کام سے فارغ ہونے میں کتنا وقت لگ جائے گا؟"

"زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ۔" محسن نے کہا۔

"اس کے بعد تم نازو اور گل کو لے کر نکل جاؤ۔ میں نازو سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ تیار ہو جائے اور گل کو بھی تیار کر لے۔ غالب … لائف بوٹ کو سمندر میں اتارنا ایک آدمی کا کام نہیں ہے۔ میں دوسرے معاملات سے نمٹتا ہوں۔ میں اور غالب آخر میں روانہ ہوں گے۔"

محسن کو وہیں مصروف چھوڑ کے میں اور غالب اوپر آ گئے۔ غالب نے میری ہدایات نازو تک پہنچانے کے لیے اس کمرے کا رخ کیا جہاں گل لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر بھنڈاری کو اس کے دونوں ساتھیوں سمیت عرشے پر طلب کر لیا۔

"کیا بولا؟ ہم سالا اتنا بڑا جہاز چھوڑ کے لائف بوٹ پر جائے گا؟" ڈاکٹر بھنڈاری نے واویلا شروع کیا۔

"مجبوری ہے ڈاکٹر بھنڈاری۔" میں نے کہا۔ "یہ جہاز غرق ہونے والا ہے۔"

وہ اچھل پڑا۔ "غرق ہونے کو ہے۔ کیسا بات بولتا… زیادہ بے وقوف سمجھتا ہم کو۔ ہم نہیں جائے گا۔"

میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "میں تم کو پندرہ منٹ دوں گا۔ تم اس جہاز پر سے کچھ بھی لے جا سکتے ہو۔ پندرہ منٹ گزر جانے کے بعد میں تم کو زندہ یا مردہ سمندر میں پھینک دوں گا۔ لائف بوٹ میں تم آسانی سے ساحل تک پہنچ سکتے ہو۔"

"او وہ سائیں گاڈ! ابھی ہم کیا کرے۔ اچھا۔ ہم اپنا نرس کو ساتھ لے جائے گا۔" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے اس کے دوسرا جھانپڑ مارا۔ "تمہارے ساتھ یہ دونوں ہوں گے۔ اور شاہد جمیل ہوگا۔"

باقی دو چپ کھڑے تھے مگر ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ یہ صورت حال ان کے لیے اچانک پیدا ہوئی تھی جس کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ صرف پندرہ منٹ کی مہلت نے ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بھی مفلوج کر دیا تھا۔

"ہم سے وعدہ کیا گیا تھا… کہ تعاون کرنے پر … گا۔" بالآخر ایک نے انگریزی میں کہا۔ "اب تم ہمیں خالی ہاتھ سمندر میں پھینک رہے ہو۔ ہمارا کوئی مستقبل بھی نہیں ہے۔"

"اگر تم سمجھتے ہو کہ مستقبل صرف دولت سے محفوظ ہوتا ہے تو یہ رہا تمہارا انعام۔" میں نے اس سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا جس میں بہت سی کرنسی بھری تھی۔

"اس میں کیا ہے؟" وہ خوف زدہ ہو کے بولا۔

"ڈرو نہیں۔ اس میں دولت ہے۔" میں نے کہا۔ "… مال غنیمت ہے۔ ہم اس کے بغیر بھی گزارہ کر سکتے ہیں۔ ویسے میں نے شاہد جمیل کو سمجھا دیا ہے کہ اسے کیا بیان دینا چاہیے۔ وہ تم کو سمجھا دے گا۔ تم جہاز کی تباہی کو ایک حادثہ یا تخریبی کارروائی قرار دے سکتے ہو جس میں تمہارے سب ساتھی ہلاک ہو گئے۔ بچ جانے والے خوش قسمت تم چار ہی ہو۔ تم سب کا ایک بیان ہوگا تو کسی پر آنچ نہیں آئے گی۔"

اس نے سر ہلایا اور سوٹ کیس کو کھول کر دیکھنے لگا۔ کپڑوں کے نیچے دولت کے ڈھیر کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر رونق آ گئی۔ اس کے دوسرے ساتھی نے حریص نظروں سے اس تمام کرنسی کو دیکھا جو کپڑوں کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ پھر اس نے رضامندی میں سر ہلایا اور مسکرانے لگا۔ غالباً وہ ہندی یا انگریزی بھی نہیں بول سکتا تھا۔

"یہ کپڑے سب نکال دو۔ اور جا کے لائف بوٹ اتارنے کی تیاری کرو۔" میں نے کہا۔ "ایک بات یاد رکھنا۔ یہ سب تم چاروں کے لیے ہے۔ اس کی تقسیم تم آپس میں اپنی مرضی سے کر سکتے ہو۔"

"ہاں! ابھی میرے کو ایڈیٹ مت سمجھنا۔" ڈاکٹر بھنڈاری نے کہا۔ "اپن برابر حصہ لے گا۔ کیا ہم شراب کا بوتل لے جا سکتا ہے اپنا ساتھ؟"

"ضرور لے جاؤ۔ دو چار بوتلیں پیٹ میں ڈال کے بھی لے جاؤ۔" میں نے کہا۔

شام ساڑھے پانچ بجے پہلی لائف بوٹ سمندر میں اتاری گئی تو سورج مغرب کی طرف جھک گیا تھا۔ لہروں کا تلاطم کم ہو گیا تھا اور آسمان پر اُڑنے والے آبی پرندے خبر دیتے تھے کہ زمین کا ساحل اب زیادہ دور نہیں ہے۔ پہلی لائف بوٹ میں پروگرام کے مطابق نازو کے ساتھ گل اور محسن تھے۔ نازو نے بڑی عقل مندی سے گل کو ایک پلاسٹک شیٹ میں لپیٹ کر یوں لٹا دیا تھا کہ وہ آسانی سے سانس لے سکتی تھی مگر سمندری پانی کی زخموں میں آگ لگانے والی یلغار سے محفوظ تھی۔ محسن کا ساتھ گل کے نفسیاتی اطمینان اور سکون کے لیے ضروری تھا۔

روانگی سے پہلے محسن نے کہا۔ "بمبئی میں ہم کہاں ملیں گے؟"

"حاجی علی کی درگاہ پر اور کہاں۔" میں نے کہا۔ "اس لائف بوٹ کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ کب کنارے پہنچے گی اور کہاں پہنچے گی۔"

"میرا اندازہ ہے کہ رات کے وقت سفر کیا تو …

www.paksociety.com

گھنٹے لگ جائیں گے۔" محسن نے کہا۔ "بشرطیکہ ہم صحیح سمت کی جانب رہے۔"

"اس سے زیادہ وقت بھی صرف ہو جائے تو پریشانی کی کون سی بات ہے۔ ضرورت کا سامان تو ہے نا؟"

"ہاں۔ نازو نے تو سب کچھ ہی لے لیا ہے جیسے پکنک پر جا رہے ہیں ہم۔" محسن بولا۔

"صبح تک تم بہرحال ساحل کے قریب پہنچ جاؤ گے۔ کوئی لانچ ماہی گیروں کی کشتی یا موٹر بوٹ تم کو سمندر سے نکال لے گی۔ تم ان سے کہہ سکتے ہو کہ ایک بحری جہاز کو حاجی علی کی درگاہ پر لے جانے کے لیے چلے تھے۔"

"لانچ پولیس کی ہوئی تو انھیں مطمئن کرنا دشوار ہوگا۔" محسن نے کہا۔

"کیوں دشوار ہوگا۔ تیرا اپنا پاسپورٹ ہے۔ نازو کا بنام گل کا پاسپورٹ دکھانا ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"کیا گڑبڑ ہو جائے گی؟" نازو نے کہا۔

"بھئی اس کا نام گل خان لکھا ہوا ہے۔ اور تصویر بھی مردانہ لباس میں ہے۔" میں نے کہا۔ "آگے اس کا رول حسب ضرورت زنانہ بھی ہو سکتا ہے لیکن مردانہ رول میں وہ زیادہ کامیاب ثابت ہوگی۔ کیوں اور کیسے کا جواب تم آج رات کے سفر میں محسن سے پوچھنا۔"

"تم لوگ کب پہنچو گے؟" نازو نے کہا۔

"یہ سب مقدر کے کھیل ہیں نازو۔" محسن بولا۔ "کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے اور اس کے برعکس گیدڑ کی شامت آئے تو وہ شہر پہنچ جائے جو جہاں سے چلے وہیں پہنچ جائے یا کوئے یار سے نکلیں سوئے دار پہنچ جائے۔ بقول شاعر...۔"

"بھاڑ میں گیا شاعر۔" نازو نے جھنجھلا کے کہا۔

"کون سا شاعر؟ وہ؟" اس نے غالب کی طرف اشارہ کیا جو اوپر سے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ "اس کے ساتھ تم بھی جاؤ گی نا؟"

"یاد ہے نا کل جمعرات بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "کمال ہو گیا۔"

"ہر بدھ کے بعد جمعرات ہی آتی ہے۔" نازو نے کہا۔ "کمال کی کیا بات ہے۔"

"مگر رابعہ ہر جمعرات کو نہیں آتی۔" محسن بولا۔ "اور یہ بات بھی وضاحت طلب ہے اس لیے دوران سفر بتا دوں گا کہ ہم نے جمعرات کی شام سے پہلے حاجی علی کی درگاہ پہنچنے کا کیا پلان کیا تھا۔"

"کل مغرب کے وقت رابعہ بھی وہاں پہنچ جائے گی۔" میں نے کہا۔

"اچھا!" نازو نے خوش ہو کے کہا۔ "تمھیں یقین ہے؟"

"ہاں جب میں پہنچ جاؤں گا سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے اور ہر آزمائش سے گزر کے تو وہ کیوں نہیں [illegible] اس کو آنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اچھا اب جاؤ۔ خدا حافظ۔"

محسن رسی کی سیڑھی کے سہارے اوپر چڑھ گیا۔ [illegible] غالب سخت بیزار اور برہم کھڑا ہوا تھا۔

"یہ کیا الوداعی تقریبات میں آدھا گھنٹا گزار دیا۔" [illegible] نے گھڑی دیکھ کے کہا۔ "چھ بجنے والے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ دوسری پارٹی کو روانہ کر دیتے ہیں۔" میں نے کہا اور دور جاتی ہوئی لائف بوٹ کو متلاطم لہروں سے نبرد آزما ہوتے اور اپنا راستہ بناتے دیکھتا رہا۔

"شاہد جمیل نے ان تینوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔"

"ہمارے ساتھ کیوں؟" میں نے کہا۔

"اسے جہاز کو بھی تو رواں رکھنا ہے۔" غالب [illegible] اس دلیل نے مجھے قائل کیا۔ آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر اور اس کے دو ساتھی ہم سے ہاتھ ملا کے اور ہمارا شکریہ ادا کر کے دوسری لائف بوٹ میں روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر جھنڈاری خاصے نشے میں دھت تھا اور اسے بڑی مشکل سے لائف بوٹ میں ڈالا گیا۔ لائف بوٹ کے روانہ ہوتے ہی میرے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ ابھی وہ مشکل سے سو گز دور گئے ہوں گے کہ ڈاکٹر جھنڈاری کو سمندر میں پھینک دیا گیا۔ یہ پہلے کا لالچ تھا جس نے باقی دو کو ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ اب وہ ساری دولت آپس میں آدھی آدھی تقسیم کر سکتے تھے۔ مجھے اس میں بھی شک تھا۔ مجھے بچپن میں پڑھی ہوئی [illegible] یاد آ رہی تھی جس میں اچانک خزانہ پا لینے والے [illegible] نے ایسے ہی لالچ کے جذبات سے مغلوب ہو کے ایک دوسرے کو قتل کر دیا تھا۔ ایک کھانا لینے شہر گیا تھا۔ [illegible] کھانے میں زہر ملا دیا تھا۔ باقی دو نے اس کی عدم موجودگی میں اسے قتل کر کے ایک حصے دار کم کرنے کی قرارداد پاس کر لی تھی۔ اس پر عملدرآمد کے بعد انھوں نے آخری طعام نوش کیا اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ [illegible]

جہاز پر اب شام کا سایہ گہرا ہونے لگا تھا اور [illegible] احساس کا آسیب ماحول پر مسلط تھا۔ [illegible] جو اوپر نیچے ہر جگہ نظر آتی تھیں ایک بند کمرے میں [illegible] بے خبر پڑے تھے جو گھڑی کی سوئیاں [illegible]

ساتھ ساتھ ان کی جانب بڑھتی آ رہی تھی۔ ایسی مایوس کن لاتعلقی میں بھی اپنے انجام سے بے خبر آگے بڑھتا جا رہا تھا اس لیے کی جانب جو سمندر کی وسعت میں ایک جگہ موت کا جال پھیلائے کھڑا تھا۔ جہاں اس پُرشکوہ متحرک فولادی قلعے کو ہمیشہ کے لیے بحیرۂ عرب کی گہرائی میں کھو جانا تھا۔

تیسری لائف بوٹ میں بیس منٹ کے اندر اندر ہمارا روانہ ہو جانا لازمی تھا۔

"غالب! تم جا کے شاہد جمیل کو لے آؤ۔" میں نے کہا۔ "میں پیڈرو کو لاتا ہوں۔"

"پیڈرو... کیا وہ بھی ہمارے ساتھ جائے گا؟" غالب نے برہمی سے کہا۔ "یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے۔ مرنے دو اسے بھی۔"

"ایسے نہیں مرزا۔ کم سے کم اتنا تو ہو کہ میں اسے خود جانچ سکوں۔" میں نے کہا۔ "اس کے مرنے سے مجھے اطمینان تو حاصل ہو کہ میں نے اپنے باپ کے قاتل کو سزا دی۔"

غالب کو مجھ سے اتفاق نہیں تھا مگر اس نے اختلاف کا اظہار بھی نہیں کیا اور شاہد جمیل سے بات کرنے چلا گیا۔ میں پلٹ کر نیچے اس تہ خانے میں پہنچا جہاں میں نے پیڈرو کو لال چیونٹوں کے ساتھ چھوڑا تھا۔

تہ خانے کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ میں نے فوراً ریوالور نکال لیا اور ایک دم اندر داخل ہو گیا مگر اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں چوٹ کے بھاگا۔ یہ میری بے وقوفی تھی کہ بغیر سوچے سمجھے اندر گھس گیا تھا۔ سامنے والی دیوار کے کسی بھی سوراخ سے وہ مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔

غالب مجھے سامنے سے آتا ہوا ملا۔ "کیا ہوا؟"

"یار! وہ پیڈرو... وہ نکل گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کیسے۔" میں نے کہا اور وہ دروازہ کھولا جس میں چھ افراد قید تھے۔ وہ سب موجود تھے۔ ان میں سے ایک مر گیا تھا اور باقی کی حالت غیر تھی۔

"سکندر! یار وہ شاہد جمیل بھی نہیں ہے۔" غالب نے کہا۔

میں ایک دم پلٹا۔ "کیا؟ شاہد جمیل بھی؟"

غالب نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں نے اسے ہر جگہ دیکھ لیا ہے۔ اتنی سی دیر میں وہ کہاں جا سکتا ہے؟"

میں نے اچانک خود کو انتہائی غیر محفوظ اور خطرے میں گھرا ہوا محسوس کیا۔ بیک وقت شاہد جمیل کا اور پیڈرو کا غائب ہو جانا متعدد خدشات کو جنم دیتا تھا۔ کیا پیڈرو نے شاہد جمیل کو مار کے سمندر میں پھینک دیا؟ اس وقت جب ہم لائف بوٹس کو رخصت کر رہے تھے؟ یا معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ شاہد جمیل جہاز کی تباہی کے معاملے میں ہم سے اختلاف رکھتا تھا۔ ہر کپتان کی طرح اسے بھی جہاز کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم جہاز کے عملے کے بعد جہاز کو بھی تباہ کر دیں۔ عملے کے افراد اس خاندان کی طرح تھے جس کا وہ خود سربراہ تھا۔ یہ جہاز ان کے لیے گھر تھا جس میں وہ آباد تھے۔ ہم نے اس کے خاندان کو قتل کر دیا تھا اور اب اس کے گھر کو ملیامیٹ کرنے والے تھے۔ ممکن ہے اس نے پیڈرو کو اس وعدے پر آزاد کر دیا ہو کہ وہ جہاز کو بہ حفاظت بندرگاہ تک پہنچائے گا۔ ظاہر ہے پیڈرو خود بھی یہی چاہتا تھا اور اس کی ضمانت دے سکتا تھا۔

اب وہ اسی جہاز میں کہیں روپوش تھے اور ہمارے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اتنے کم وقت میں انھیں تلاش کریں۔ میں اس وقت میں اضافہ بھی نہیں کر سکتا تھا جو صرف محسن جانتا تھا کہ ٹائم بم کہاں ہیں اور وہ جا چکا تھا۔ اگر ہم فوری طور پر لائف بوٹ میں فرار ہونے کی کوشش کرتے تو یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ پیڈرو جو کہیں چھپ کر سب دیکھ رہا ہوگا، ہم پر مشین گن کا منہ کھول دے گا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ شاہد جمیل یا پیڈرو نے مل کے ٹائم بم تلاش کر لیے ہوں اور انھیں ناکارہ کر دیا ہو۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں اور ابھی تک میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔

مجھے اپنے پیچھے ایک جنون خیز قہقہہ سنائی دیا جس میں ایک ایسی پُرآسیب کیفیت تھی کہ یہ ویران سمندر میں اجل گرفتہ آوازوں کی بازگشت محسوس ہوتی تھی۔

میں چونک کے پلٹا تو مجھے اپنے مقابل شاہد جمیل دکھائی دیا۔ اس کی صورت پر عیاں وحشت کے آثار نے مجھے بتا دیا کہ وہ اپنے ذہنی توازن سے محروم ہو چکا ہے۔ وقت کے بے رحم فیصلوں اور اپنے غلط اندازوں نے اس کے سب خوابوں کو چکنا چور کر دیا تھا اور اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ ماضی حال اور مستقبل سے محروم احساس کے خلا کی بے پایاں وسعت میں سرگرداں ایک بے وجود جسم کا عکس رہ گیا تھا۔

یکلخت وہ بے گھر ہو گیا تھا اور لاوارث رہ گیا تھا۔ ایک گھر وہ تھا جس کی حسرت تعمیر میں وہ سالوں سے در بہ در بھٹکتا رہا اور دولت سمیٹ کر اپنے بیوی بچوں کو دیتا رہا تاکہ وہ دنیا کے بازار سے اپنے لیے ساری آرزوئیں اور سب

www.paksociety.com

خوشیاں خریدلیں۔ اس گھر سے اس کی جذباتی وابستگی میں خون کا رشتہ تھا۔

دوسرا گھر یہ جہاز تھا جس میں اب وہ تنہا رہ گیا تھا۔ اس کے عملے کا ہر فرد جس کو وہ اپنے خاندان میں شامل سمجھتا تھا، بے مروت یا بے وفا ثابت ہوا تھا اور اسے چھوڑ کے جا چکا تھا۔ اب ہم رہ گئے تھے جو اس گھر کے وجود کو بھی پرزہ پرزہ کر کے سمندر میں بکھیر دینا چاہتے تھے۔

اور شاہد جمیل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ گھر والے نہیں رہے تو کیا، گھر تو ابھی ہے اور وہ مرتے دم تک اس کی حفاظت کرے گا اور اس کے ساتھ موت میں بھی وہ تعلق برقرار رکھے گا جو زندگی میں تھا۔ میں اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا کیونکہ میں نے جہازوں کے ساتھ کپتانوں کے تعلق کی وہ سب کہانیاں سنی تھیں جن میں ایسا ہی ہوا تھا۔

شاہد جمیل کے ہاتھ میں ایک مشین گن تھی لیکن میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس کا رخ ہماری طرف نہیں تھا ورنہ اس سے کوئی بلا ارادہ بھی چل جاتی۔ جہاز کے ہچکولے یہ ظاہر کرتے تھے کہ اب یہ سفینہ کسی ناخدا کے بغیر موت کے ساحل کی سمت خود ہی رواں ہے۔ اسے وسعتِ اجل نے منزل تک لے جانے کے لیے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

"شاہد جمیل!" میں نے سکون سے کہا۔ "کیا تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گے؟"

"نہیں۔ تم مجھے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔" اس نے پھر بے وجہ قہقہہ مارا۔ "تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔ کوئی زبردستی نہیں کر سکتے میرے ساتھ۔ اگر تم نے اس کی کوشش کی تو خود بھی نہ جا سکو گے۔"

"شاہد صاحب! جہاز ڈوبنے والا ہے۔"

"جہاز۔ کون سا جہاز؟" وہ بولا۔ "میرا گھر ڈوبنے والا ہے۔ دیکھو، کیسا طوفان آیا ہے۔ میری زندگی گزر گئی ایسے طوفانوں کا مقابلہ کرتے۔ میں اسے بچا لوں گا۔ جیسے پہلے کئی بار بچایا تھا۔ مگر تم جاؤ۔ تمہارا گھر تو نہیں ہے یہ۔"

اس سے بحث کرنا فضول تھا کہ وہ اپنا فیصلہ بدل دے۔ اس کے لیے وقت بھی نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ "ہمارا ایک قیدی تھا۔ استاد پیڈرو۔"

"وہ بھی گیا۔ میں نے کہا کہ جاؤ میرے گھر سے۔ تم سلامتی کے ساتھ جا سکتے ہو۔ تم نے جو کیا اچھا نہیں کیا۔ میں نے بھی جو کیا اچھا نہیں کیا۔ مجھے میرے اعمال کی سزا ملی۔ تم کو سزا دینے والا میں کون ہوتا ہوں۔ خدا کا عذاب نازل ہو گا تم سب پر۔ کہ تم نے میرا گھر تباہ کیا۔ کاش اس وقت مجھے مہلت دیتا کہ میں بھی اسی طرح تمہارے گھر تباہ کر سکتا۔" وہ اب رو رہا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے اس کے پُروحشت چہرے پر بہہ رہے تھے۔

"وہ۔ کب گیا۔ اور کیسے۔۔۔؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ چلایا اور اس نے اچانک مشین گن اٹھا لی۔ "جاؤ تم بھی۔ میں تم کو قتل کرنا نہیں چاہتا گھر میں۔ حالانکہ تم بھی قاتل ہو میرے گھر کے۔ میرے جہاز کے۔ مگر اپنے آخری وقت میں اس کے وجود کو میں کسی کے خون سے داغدار نہیں دیکھ سکتا۔"

میں نے غالب کو اشارہ کیا۔ "لائف بوٹ اتار دو۔"

"لیکن وہ۔۔" غالب نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔ "وہ اندر ہی ہے۔"

"ہے تب بھی ہم کیا کر سکتے ہیں۔" میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ "صرف دس منٹ باقی ہیں۔"

کچھ سوچنے سمجھنے کے لیے وقت نہیں رہا تھا۔ میں نے اور غالب نے لائف بوٹ کو سمندر میں پھینک دیا۔ میں نے ایک آخری نگاہ شاہد جمیل پر ڈالی جو اب مشین گن پھینک چکا تھا اور مغرب میں غروب ہوتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اپنی زندگی کی آخری روشنی دیکھ رہی تھیں مگر وہ خود شاید وسعتِ افلاک اور حدِ امکان سے آگے ابد کے ساحل پر اتر چکا تھا۔

پہلے غالب نے اور پھر میں نے متلاطم سمندر میں چھلانگ لگائی۔ اس وقت میں بالکل تیار تھا کہ کسی بھی سمت سے آنے والی گولیوں کی بوچھاڑ مجھے ہوا میں ہی چھلنی کر دے۔ اتنے کم وقت میں استاد پیڈرو کا فرار ہو جانا بعید از قیاس تھا۔ اس کی حالت بھی ایسی نہ تھی کہ وہ سمندر کی موجوں سے لڑ کے اور ایک بار پھر دستِ قدرت کی یاوری پہ انحصار کرتے ہوئے اس وقت تک تیرتا رہے جب تک کہیں سے غیبی امداد نہ پہنچ جائے۔ ایسا ایک بار ہو چکا تھا۔ امید رکھنے والے کو خلق قائل نہیں کر سکتی کہ خوشگوار اتفاقات بار بار پیش نہیں آتے۔

پیڈرو یقیناً اندر ہی تھا اور شاید اس نے جہاز کے اس کے لیے اسلحے کے ذخیرے کو تباہی سے بچانے کی کوئی صورت نہیں رہی تھی چنانچہ اس نے اپنی زندگی بچانے کا فیصلہ کیا ہو گا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہ وقت تلاش کرنے میں صرف کرتا۔ میں جہاز کے آخری حصے میں چلا جاتا جہاں سے میں دھماکے کے بعد سمندر میں کسی تختے کے سہارے تیر کر دور نکل جانے کی امید کر سکتا تھا۔

لیکن میرے لیے یہ خطرہ اپنی جگہ پوری اہمیت رکھتا تھا کہ پیڈرو عرشے کے آخری حصے پر موجود ہوا تو وہ ہمیں

زندہ سلامت نکل جانے کا موقع نہیں دے گا۔ وہ کوشش ضرور کرے گا کہ ہماری لاشیں اس جہاز سے پہلے غرقاب ہو جائیں۔

اور میرا اندازہ اس وقت درست ثابت ہوا جب بحری جہاز کی بلندی سے اترتا ہوا میں سمندر کی متلاطم آغوش میں گرا۔ پانی میں گرتے ہی لائف بوٹ میں ہوا بھر گئی تھی اور اس کے ربڑ کے بیضوی کنارے پھولوں کے گاؤ تکیے کی طرح ہو گئے تھے۔ یہ چاروں سمت میں ایک حفاظتی حصار کا کام بھی دیتا تھا۔

جب میں نے لہروں کے شور میں فائرنگ کی آواز سنی تو مجھے اپنی بے اختیاری کا احساس ہوا۔ اس لمحے پر اگر اختیار رہتا تو صرف نوشتۂ تقدیر میرے سامنے بقا و فنا کے فیصلے تحریر کرنے والی ذات کو۔ اور یہ فیصلہ مجھے معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اسی لمحے میرے سفرِ حیات کی آخری منزل آ جاتی تو اوپر سے نیچے تک آتے ہوئے ایک خاص بلندی پر وہ گولی میرے جسم سے ضرور گزرتی جس پر دستِ قدرت کی تحریر میں میرا نام لکھا ہوتا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں پانی میں گرا اور ایک مختصر فاصلہ میں نے تیر کر طے کیا۔ مجھے صرف اتنا احساس تھا کہ لہروں کی گھن گرج سے الگ بھی ایک آواز ہے جو اس ماحول کا حصہ نہیں۔ یہ گولیوں کی آواز تھی۔ گولیاں نہ جانے کس سمت سے آ رہی تھیں اور کہاں جا رہی تھیں۔ نہ میں دیکھنا چاہتا تھا اور نہ دیکھ سکتا تھا۔ میری ساری جدوجہد لائف بوٹ میں سوار ہونے اور اس کے بعد جلد از جلد دور نکل جانے کے لیے تھی۔

ایسے میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔ اتفاق، خوش قسمتی، تائید ایزدی، شاید سب کا ایک ہی مفہوم ہو گا لیکن میں ہرگز دعویٰ نہیں رکھتا کہ جان بچ جانے میں ہماری خواہش کے ساتھ کوشش کا دخل بھی تھا۔ وہ کوئی اور ہی ہاتھ تھا، بچانے والا ہاتھ، جس نے سمندر کو متلاطم رکھا تاکہ مارنے والا ہوش کھو بیٹھے، جس نے نشانے کی زد میں آئی ہوئی چھوٹی سی لائف بوٹ اور اس کے دو عاجز مسافروں کو محفوظ کر دیا۔ اس کشتی میں ایک بال کے برابر سوراخ ہو جاتا تو اس کی سب ہوا نکل جاتی۔ ایک محفوظ ترین حصے میں پناہ لے لی تھی۔ وہ جہاز کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا تھا کہ اس کے کس حصے میں کیا ہے۔ مشین گن کی اگلی ہوئی ان گنت گولیاں تو ایک پورا فلیٹ ڈبو سکتی تھیں لیکن لائف بوٹ کو کسی گولی نے نہیں چھوا۔ بعد میں جب میں نے غور کیا تو میرے ذہن نے بہت سے سوال تلاش کر لیے۔ مثلاً یہ کہ پیڈرو زخمی تھا۔ وہ شاید سیدھا کھڑا بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ ہچکولے کھاتے جہاز پر وہ مشین گن اٹھا کے کشتی میں کیسے نشانہ لے سکتا تھا۔ پھر نشانہ بھی ساکت کہاں تھا۔ لہروں کا تلاطم ہر لمحہ اسے زیر و زبر کر رہا تھا۔

لیکن اس وقت صرف یہ ہوا کہ غالب نے ہاتھ بڑھا کے مجھے اوپر کھینچ لیا۔ میرے کپڑے پانی میں شرابور تھے اور میں ہانپ رہا تھا۔ کچھ کہے بغیر غالب نے میرے ہاتھ میں ایک چپو پکڑا دیا۔ یہ تقریباً آٹھ فٹ لمبا بہت ہلکا مگر مضبوط ڈنڈا تھا جس کے دونوں کنارے بیضوی شکل کے اور چپٹے تھے۔

میں نے اور غالب نے بحری جہاز سے دور ہونے کی ایک دیوانہ وار جدوجہد کا آغاز کیا تب بھی ہمیں معلوم نہ تھا کہ زندگی اور موت کی سرحد ہم سے کتنی دور ہے اور ہم یہ حد عبور کر لیں گے یا اس سے پہلے ہی قضا آ جائے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ پیڈرو فائر کر رہا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ٹائم بم کے پھٹنے کا وقت ہو گیا ہے۔ نہیں ہوا تو شاید چند منٹ باقی ہوں گے۔ دو گھڑیاں آپس میں ملتی نہیں۔ دھماکا دو چار منٹ پہلے بھی ہو سکتا تھا اور دو چار منٹ کی تاخیر سے بھی۔ پہلا دھماکا حرفِ آغاز تھا۔ اس سے جہاز پر لدے ہوئے کروڑوں روپے مالیت کے اسلحے کی تباہی کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا۔ ہر گودام کا آتش گیر مادہ ایک الگ دھماکا کرے گا۔ مگر یہ سب مسلسل ہو گا۔

میں اس وقت غالب کو بھولا ہوا تھا اور غالب مجھے۔ ہم دونوں کو قطعی احساس نہ تھا کہ ہمارے بازو شل ہو رہے ہیں۔ ہم سمندر سے لڑ رہے تھے۔ زندگی کی چاہت، امید اور آرزو ایک ہیجانی جدوجہد بن گئی تھی۔ ہمیں آخری وقت تک شکست تسلیم نہ کرنے کا جذبہ تھا جو ہماری توانائی بن گیا تھا، دعا بن گیا تھا اور یقین بن گیا تھا۔

معلوم نہیں کتنی صدیوں پر محیط لمحوں، سیکنڈوں اور منٹوں کا سفر تھا جو یکلخت تمام ہوا۔ اچانک ہوا کی آواز تھم گئی۔ سمندر ساکت ہو گیا۔ اس سکوت نے فضا کو خوف سے بھر دیا۔ ہوا تھم گئی۔ ہمارے دل کو دھڑکنا یاد نہ رہا۔ ہمارے ہاتھوں کی حرکت ختم ہو گئی۔ جدوجہد کی مہلت تمام ہو گئی۔

دھماکا ہوا تو میری نظر جہاز پر ٹھہر گئی۔ جہاز کتنی دور تھا معلوم نہیں۔ فاصلے کی اہمیت ہی کہاں تھی۔ کیا ہم محفوظ فاصلے تک پہنچ چکے تھے؟ معلوم نہیں۔ ایک گز، ایک فرلانگ، ایک میل سب اس وقت برابر تھے۔ ہم پل صراط پر سے گزر رہے تھے۔

میرے کانوں اور آنکھوں نے دھماکا ہوتے ہی جیسے پوری کائنات کو مرتعش ہوتے اور منتشر ہوتے دیکھا، سنا اور محسوس کیا۔ وہ ایک شورِ محشر تھا جس نے زمین اور آسمان کو دہلا دیا۔ سورج کا آتشیں گولا مغرب کے افق پر آتشیں اجالا پھیلا رہا تھا۔ یکلخت یہ شفق جہاز کے اوپر آ گئی۔ بجلی مسلسل چمکی اور گھن گرج کے ساتھ طوفانی ہوائیں چلنے لگیں۔

www.paksociety.com

سمندر ایک دم مشتعل ہو کے اٹھا۔ ایک لہر نے لائف بوٹ کو اوپر اٹھا لیا — میں نے غالب کا ہاتھ تھام لیا اور ہم لائف بوٹ سے چمٹ گئے۔ سرجانے کتنی بلندی پر لے جا کے لہر نے ہمیں اچھال دیا۔ دوسری لہر نے لائف بوٹ کو کھینچ لیا اور آگے پھینک دیا۔ ہر دھماکا خواہ وہ کسی بم کا ہو یا ایٹم بم کا، فضا میں ایک خلا پیدا کرتا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے ہوا ایک بگولے کی طرح دوڑتی ہے۔ ہوا کی یہ لہر جو شاک ویو کہلاتی ہے، انسانوں کو اور کھمبوں کو، درختوں کو اور عمارتوں کو گرا دیتی ہے۔ سمندر میں اس موجِ ہوا نے لہروں میں وہ تلاطم پیدا کیا جس نے ہمیں تنکے کی طرح آگے پھینکا۔ دوسرے دھماکے سے دوسری لہر آئی جو پہلی لہر کے بالکل پیچھے اس کے تعاقب میں تھی۔

ہوا سے بھری ہوئی کشتی الٹ نہیں سکتی تھی۔ پانی کے جان لیوا تھپیڑوں نے کئی بار کوشش کی مگر میں نے غالب کو چھوڑا اور نہ کشتی کو۔ بالآخر لہریں آپس میں ٹکرا کے ٹوٹ گئیں۔

میں نے خود کو سنبھالا اور سر اٹھا کے دیکھا تو میرے منہ پر نمکین پانی کی بوچھاڑ آئی۔ نمک کا ذائقہ میرے لبوں کو کاٹ رہا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں مسکرا رہا ہوں۔ یہ اندر کی خوشی تھی جو میرے وجود سے پھوٹ رہی تھی اور خود بخود لبوں تک آ گئی تھی۔

دھوئیں کا ایک مرغولہ اوپر اٹھ کے بادل سا بنتا جا رہا تھا۔ اس کے وسط میں آگ تھی جس کے شعلوں کی زبانیں اوپر لپک رہی تھیں۔ "ایس ایس کراچی تھرڈ" ایک آتش فشاں پہاڑ بن گیا تھا جو لاوا اگل رہا ہو۔ جہاز کے جسم کے سیکڑوں چھوٹے بڑے فولادی اور لکڑی کے ٹکڑے، اسباب کے پرزے اور آتشیں اسلحے کے اجزا سیکڑوں فٹ کی بلندی تک اڑتے جاتے تھے۔ یہ کسی آتش بازی کے منظر سے کم دلکش نظارہ نہ تھا۔ شعلوں کے ٹکڑے اور دہکتے انگارے تاریک آسمان کے پس منظر میں زیادہ نمایاں دکھائی دیتے تھے جو شہابِ ثاقب کی طرح ایک قوس کی صورت میں لہراتے آتے تھے اور سمندر میں گم ہو جاتے تھے۔ آسمان تک اٹھنے والے شعلوں کے نارنجی رنگ نے لہروں میں بھی آگ سی لگا دی تھی۔

یہ ایسا مسحور کن اور دلکش نظارہ تھا کہ میں گرد و پیش سے بے خبر اس میں گم رہا۔

اچانک غالب نے کہا۔ "یہ کتنا دل خوش کن منظر ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔"

میں بے اختیار ہنسنے لگا۔ "یہ ہماری فتح کے جشن کی خوشی میں آتش بازی کا منظر ہے۔"

"کیا اس منظر کو وہ سور کا بچہ بھی دیکھ رہا ہوگا؟" غالب نے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ پیڈرو کی طرف ہے۔ "خدا کرے کہ دیکھ رہا ہو۔ اس کی اذیت کا احساس مجھے تسکین دیتا ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مر گیا ہو۔"

"نہیں یار! ایسے بے غیرت یوں نہیں مرتے۔ وہ بچ گیا ہوگا اور میری تو خواہش ہے کہ وہ ابھی نہ مرے!" میں نے کہا۔

غالب نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ "تو اس کی درازیٔ عمر کی دعا کر رہا ہے۔"

"ہاں — اس لیے کہ میں اس کے لیے بہادری اور آبرومندی کی موت نہیں چاہتا۔ میری آرزو ہے کہ وہ پھر میرے مقابل آئے ایک مجرم کی حیثیت سے۔ جب انصاف کی کرسی پہ بیٹھ کے میں اس کی فردِ جرم پڑھوں اور پھر اسے اتنی ہی ذلت آمیز موت ملے جتنی ذلت آمیز اس کی زندگی تھی۔"

"اگر وہ بچ گیا ہوگا تو ہمارے اور اس کے راستے پھر کہیں نہ کہیں ملیں گے۔" غالب نے کہا۔

"مجھے شاہد جمیل کے مرنے کا رنج ہے۔ حالانکہ یہ بڑی باعزت اور قابلِ فخر موت تھی۔" میں نے کہا۔ "اور میرا دل اس خیال سے بھی بوجھل ہے کہ اس کے بچے یتیم ہو گئے۔"

"وہ بہادر اور عالی ظرف آدمی تھا۔ اس نے اپنے لیے خود موت قبول کی مگر ہمیں معاف کر دیا۔" غالب نے کہا۔

اب رات کا تاریک سایہ سمندر پہ پھیل چکا تھا۔ بحری جہاز کے جلتے ہوئے ملبے سے ہم ایک میل یا شاید زیادہ دور تھے اور لہروں کے ساتھ ہمارا بے سمت سفر جاری تھا۔ جہاز کا روشن ہیولا اب کسی الاؤ کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سب شعلے اور انگارے ڈوب چکے تھے جو آسمان کی کالی چادر پہ اڑتے رہے تھے۔

میں نے اور غالب نے پھر چپو سنبھالے جو ہمارے جسم کے بوجھ سے دبے ہوئے لائف بوٹ میں پڑے رہے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ ہم اپنی سمت کو اندازے کی حد تک درست رکھیں۔ ابھی سورج ہماری نظروں کے سامنے غروب ہوا تھا۔ چنانچہ ہم سمت کا تعین کر سکتے تھے۔ "ایس ایس کراچی تھرڈ" کی تباہی سے بھی ایک نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ شمال کدھر ہوگا۔ ہمیں جنوب کی طرف جانا تھا اور صاف ہوا ایک حوصلہ افزا علامت تھی۔ ہم رات کو قطبی ستارے سے مدد لے سکتے تھے۔

ایک گھنٹے بعد جب ہم مزید ایک میل دور جا چکے تھے، "ایس ایس کراچی تھرڈ" جو پہلے ایک آتش فشاں تھا، صرف ایک شعلہ رہ گیا تھا۔ میں اور غالب اس پر نظر جمائے بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ یہ شعلہ فقط ایک چنگاری رہ گیا۔ پھر یہ چنگاری بھی غائب ہو گئی۔ رات کا بے رحم اندھیرا اور سمندر کا شور رہ گیا۔ ہم نے دشمن کے ایک قلعے کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ وہ سب اسلحہ غرقِ آب کر دیا تھا جو میرے ہم وطنوں کے خلاف استعمال ہو سکتا تھا۔

اس فتح کے احساس میں بیک وقت فخر و مسرت کے ساتھ شکرگزاری اور اطمینانِ قلب کے جذبات شامل تھے۔ بلاشبہ یہ خدا کی ذات ہی تھی جس نے مجھے توفیق، استقامت اور جرأت عطا کی تھی اور میری کامیابی کے اسباب مہیا کیے تھے۔ سب سے بڑی طمانیت دینے والا خیال یہ تھا کہ میں نے ہزاروں مسلمان، ہم وطن پاکستانیوں کو ان کے گھروں کو اور اہل و عیال کو تباہی سے اور موت سے بچا لیا۔ بچانے اور مارنے والا تو ایک ہی ہے لیکن میں نے اتنا ضرور کیا کہ اس موت کے سامان کو ضمیر فروش اور غداروں تک نہیں پہنچنے دیا۔ اگر یہ سارا اسلحہ تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں کے ہاتھ لگ جاتا تو کتنا نقصان ہوتا! اس کا صحیح اندازہ کرنا محال تھا۔ بس مجھے خوشی تھی کہ وہ سب خون نہیں بہا۔ وہ سب گھر پیوندِ خاک نہیں ہوئے۔ ان سب عورتوں کا سہاگ نہیں اجڑا اور وہ سب بچے یتیم نہیں ہوئے جو اس تمام اسلحے کی تباہ کن قوت سے ہو سکتے تھے۔

یہ الگ بات ہے کہ ایسے نہ جانے کتنے جہاز پہلے بھی جا چکے ہیں اور آئندہ بھی نکل جائیں گے۔ زمین کے راستوں سے اور خشکی کے راستوں سے۔ انسانیت اور شرافت کا خون کرنے والوں کے درمیان تجارت جاری تھی۔ مگر پھر بھی مجھے ان گنت بے حد شکرگزار نظر آتے تھے۔ ان بوڑھوں، بچوں، جوانوں اور عورتوں کے جن سے میرا کوئی رشتہ تھا تو اخلاق کا، مذہب کا، انسانیت کا اور وطن کا۔ جن کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور جو مجھے بالکل نہیں جانتے تھے لیکن جو میری کوشش سے محفوظ رہے تھے۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ... یہ سب ہو گیا۔" غالب نے اچانک اپنے آپ سے کہا۔

میں چونک پڑا۔ "ہاں۔ سب سے دشوار یہی کام ثابت ہوا۔ بعض اوقات تو میں مایوس ہو جاتا تھا!"

"میں خود بے یقینی کا شکار تھا۔ وقت اور حالات پر کسی کا اختیار نہ تھا۔ سارے اندازے غلط ہوتے جا رہے تھے۔ ہم کیا سوچتے تھے اور ہو جاتا تھا کچھ اور۔" غالب نے کہا۔ "ہم بلاوجہ محسوس کرتے تھے کہ شاید کراچی تھرڈ پر ہم [illegible] نہیں دیا اور ہماری یعنی ہم سب کی حکمتِ عملی غلط تھی۔ کہیں یہ ہمارا واٹرلو یا لینن گراڈ کا معرکہ ثابت نہ ہو۔"

"تم دونوں نے وہ کام کیا جو شاید میں نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی اور بھی نہ کرتا۔" میں نے کہا۔ "تم نے اپنی جان کی بازی لگا دی۔"

"اب بڑا عجیب لگتا ہے۔ وہ سب وقت جو ہم نے جہاز کے اندر گزارا، اداکاری کرتے، ڈرتے، سوچتے، امیدیں باندھتے اور توڑتے۔ جہاز کا پروگرام روز بدل جاتا تھا اور نئے اسباب پیدا ہو جاتے تھے پریشانی کے۔ تمہاری طرف سے کوئی صورت نہیں تھی رابطے کی اور یقین دہانی کی کہ تم سب وقت پر ضرور پہنچ جاؤ گے۔"

"واقعی۔ اس محاصرے نے بہت طول کھینچا اور اس دوران کیا کچھ نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔

"یار! مجھے سردی لگنے لگی ہے۔" غالب نے کہا۔

"ابھی سے؟ ابھی تو پوری رات باقی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہاں تو گیلے کپڑے گیلے ہی رہیں گے۔"

"مجھے بھوک بھی لگنے لگی ہے۔" غالب نے کہا۔

"اور بہت کچھ لگے گا۔ پیاس لگے گی، ڈر لگے گا لیکن اس سفر میں ہمارا زادِ راہ صرف ہمارا حوصلہ ہے اور عزم ہے۔" میں نے کہا۔

"کھانا، چائے، کافی کچھ نہیں۔" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "میرا جسم ٹوٹ رہا ہے سمندر کے تھپیڑوں سے۔"

"میں بھی تھک گیا ہوں لیکن میں آرام کا صرف تصور کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ آج تجربہ ہوگا کہ آتی ہے یا نہیں۔"

غالب نے کہا۔ "کیا ہم صحیح سمت میں جا رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے، ابھی سے سمت کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی تو چلے ہیں۔ چلتے جائیں گے، جب تک امید اور یقین کا سہارا حاصل رہے گا۔" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں، ہم ساحل سے کتنی دور ہوں گے۔"

"پچاس ساٹھ میل۔ سو میل بھی ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

غالب چپ ہو گیا۔ ہم دونوں کے ہاتھ ایک میکانکی انداز میں چپو چلا رہے تھے۔ تاحدِ نگاہ ایک پُرشور تاریک ویرانہ تھا جس میں اربوں کھربوں سال پرانے سمندر کے پانی کا تلاطم تھا۔ ہمارے دائیں بائیں سمندر کی اتھاہ گہرائی تک ہزاروں اقسام کی سمندری مخلوق تھی لیکن وہ ہماری تنہائی کے احساس میں شریک نہ تھی۔ اس بے کنار و بے پایاں سمندر کی وسعت میں صرف ہم دو انسان تھے۔ جو باقی سب انسانوں کا تصور کر سکتے تھے جو کہیں بھی موجود تھے جہاں تک ہمارے تصور کی رسائی تھی۔ کسی بھی حال میں تھے اور کچھ بھی کر رہے تھے۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ہم کون ہیں اور کہاں ہیں۔ اور وہ ہمارا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس دنیا میں کوئی اتنا اکیلا بھی ہو سکتا ہے، یہ میرے لیے

www.paksociety.com

ایک بھیانک تجربہ تھا۔

"معلوم نہیں! وہ کہاں ہوں گے؟" غالب پھر بولا۔ وہ مجھ سے بات نہیں کر رہا تھا۔ اس کے خیالات کسی ارادے کے بغیر الفاظ کا روپ دھار کے لبوں تک آ جاتے تھے۔

"کہیں تو ہوں گے؟" میں نے چونک کے کہا۔ "میں کیا بتاؤں؟"

"ہیں — ایسے ہی سوچ رہا تھا؟"

"میں سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ یہ خیال مجھے خوفزدہ ہی کرے گا۔"

میں نے کہا۔ "اپنے آپ کو مایوسی سے دور رکھنے کے لیے سوچ کے عذاب سے دور رہنا پڑے گا۔ تجھے بھی اور مجھے بھی۔ پہلے سے مت سوچ کہ کیا ہوگا، جب کہ ہمارے اختیار میں کچھ نہیں، جو ہونا ہے ہو جائے گا۔"

یہ عجیب سفر تھا۔ جب تک ہم پر ہمارا خیال بھی بار تھا۔ خالی بوٹ میں پانی کی لہروں کا مقابلہ کرتے رہنے اور وقت کا خیال رکھنے کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ کشتی میں ایک ننھا سا سوراخ ہو سکتا تھا جو سارے سفر کو ختم کرنے کے لیے کافی تھا۔ ہم ایسے گم ہوتے کہ تا حشر ہمارا سراغ نہ ملتا۔ ہم پر کوئی شارک یا وھیل حملہ کر سکتی تھی۔ ہماری جسمانی توانائی ختم ہو سکتی تھی جس کے بعد ہم اس لائف بوٹ کو سمندر کی لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے لیے مجبور ہو جاتے اور بیٹھے بیٹھے کسی حسنِ اتفاق سے سلامتی کے ساحل تک پہنچ جاتے تو آگے سفر کی اگلی منزل کا ارادہ کرتے۔ ورنہ ارادہ کیا اور آرزو کیا۔ آگے کوئی بھنور بھی فنا کی آغوش میں کھینچ سکتا تھا۔

وسوسے اور اندیشے، خطرات اور حادثات کا ڈر، امید کی کرن کو روشن رکھنے کی جدوجہد۔ ایمان اور یقین کا سہارا، جینے کی آرزو۔ سب کے ساتھ سفر جاری تھا۔ اندھیرے میں خواب روشن ہوتے تھے۔ یادوں کے عکس جھلملاتے تھے۔ چہرے فروزاں ہوتے تھے۔ آشنا مہرباں، دلدار چہرے، محبتوں کے امین چہرے، رفاقتوں کے سفیر چہرے۔ وہ جو ساتھ تھے اور نہ رہے۔ اور وہ جو کل پھر روبرو ہوں گے۔ رابعہ، شملہ، موتی، استاد فیدی اور انکل فوزی سب مجھے یاد آئے۔ سب نے میری دلجوئی کی اور میرے احساسِ تنہائی کے ڈپریشن کو ختم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔

وہ سفر کی اور آزمائش کی، قوتِ برداشت اور یقین کے امتحان کی سخت ترین رات تھی اور شاید وہی ایک رات تھی جو میرے اعصاب کو شکست دے سکتی تھی۔ مجھ سے بدتر حال غالب کا تھا۔ ہم خاموش تھے اور بولتے تھے تو ایک دوسرے کو رفاقت فراہم کرنے کے لیے نہیں، اپنی بیزاری اور بے بسی کا بوجھ اتارنے کے لیے، اپنی فرسٹریشن کو منتقل کرنے کے لیے۔ ہم اپنے مزاج کی ساری شگفتگی اور خوش گفتاری، نرم خوئی اور عاجزی کھو بیٹھے تھے۔ اگر یہ کیفیت صبح تک رہتی تو شاید پاگل پن کے دورے میں ہم ایک دوسرے سے لڑتے، جھگڑتے، ایک دوسرے کو مارتے اور انسانوں کی سطح سے گر کر وہ وحشی جانور بن جاتے جن کے احساس کو بھوک، تشنگی، خوف اور عدم اعتماد نے شکست دے دی ہو۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ رات کے کسی حصے میں جب ہم ہار چکے تھے اور لائف بوٹ میں نڈھال پڑے تھے، ہم نہیں جانتے تھے کہ سمندر کی لہروں پہ ڈولتی ہوئی لائف بوٹ کس سمت میں رواں ہے۔ ہماری ساری کوشش خود کو کسی موج کے تھپیڑے سے سمندر میں گرنے سے بچانے کے لیے وقف تھی۔ میں نے ایک روشنی دیکھی۔ یوں تو پہلے بھی میں نے متعدد بحری جہازوں کو دیکھا تھا جو بہت دور سے گزر گئے تھے اور ان کی ساکت نظر آنے والی مدھم روشنیاں تاریکی میں کھو گئی تھیں لیکن یہ روشنی بہت واضح تھی اور میں نے اسے دوسری بار دیکھا تو پہلے کی نسبت زیادہ قریب آ چکی تھی۔ سمندر کے پانی کی مسلسل مار سے میرا بدن سن ہو رہا تھا لیکن میں نے غالب کے پاس جا کے اسے نزدیک آنے والی روشنی کی طرف متوجہ کیا۔

"یہ... کیا ہے۔ کوئی لانچ؟" غالب نے کہا۔

"لانچ یا موٹر بوٹ۔"

"مگر کس کی؟" غالب نے کہا۔ پھر اسے اپنے سوال کے احمقانہ ہونے کا احساس ہوا۔ "خیر ہمیں اس سے کیا؟" غالب بولا۔ "وہ ہمیں بچا لیں گے۔ یہی کافی ہے۔"

"لیکن کیا انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے؟"

"دیکھا نہ ہوتا تو وہ سیدھے ادھر کیوں آتے؟" غالب بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم انہیں اتنے فاصلے سے کیسے نظر آ سکتے ہیں۔ دن کے وقت تو شاید وہ دیکھ لیتے۔"

غالب کے لہجے میں مایوسی اتر آئی۔ "تو نے ٹھیک کہا۔ اتنے بڑے سمندر میں ہم ایک تنکے کی طرح ہیں اور وہ کسی تنکے کو تلاش نہیں کر رہے ہیں۔"

"ہم ان کو ایس او ایس دیتے تب بھی اندھیرے میں ان کے لیے ہمارا سراغ لگانا دشوار ہوتا۔" میں نے کہا۔

"کیا ہم کسی طرح بھی ان کو متوجہ نہیں کر سکتے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "دن میں ہم کوئی کپڑا لہراتے، اپنی قمیص اتار کے بھی لہراتے تو شاید وہ دیکھ لیتے۔ رات کے وقت تو لائٹ سگنل ہی کام کرتا ہے۔ ہمارے پاس ٹارچ ہوتی تو شاید..."

روشنی کا رخ اب تک ہماری سمت میں تھا۔ یہ کسی لانچ کی ہیڈ لائٹ جیسی روشنی تھی۔ تیز اور ایک جگہ مرتکز۔ اور اس روشنی کے تیز تر ہونے سے ہی فاصلے میں کمی کا اندازہ ہوتا تھا۔ بظاہر یوں لگتا تھا کہ وہ لانچ یا موٹر بوٹ سیدھی اسی طرف آ رہی تھی جیسے ہم کسی غیبی امداد کے آسرے پر اپنی زندگی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

"وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔" غالب نے مسرت سے چلا کے کہا۔

میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ وہ صرف پچاس گز کے فاصلے سے گزر جائیں اور ہمیں نہ دیکھ پائیں۔"

"رات کے اندھیرے میں دیکھنے والی دوربینیں بھی ہوتی ہیں۔"

"ہوتی ہیں مگر اس وقت کون ہوگا۔ جو دوربین سے دیکھے گا اور کیا دیکھے گا یہاں؟" میں نے کہا۔

"ہیلو۔" غالب نے چیخ کر کہا۔ "ادھر دیکھو، ادھر ہم ہیں۔ ہیلو۔"

"غالب۔" میں نے کہا۔ "کیا ہو گیا ہے تجھے۔ وہ تیری آواز کیسے سن سکتے ہیں اس شور میں۔"

لیکن غالب ہاتھ اٹھا کے چلاتا رہا۔ "ہیلو۔ ہماری مدد کرو۔ ادھر آؤ۔"

غالب کے مقابلے میں میرے دماغ کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بہتر طور پر کام کر رہی تھی۔ اس لانچ یا موٹر بوٹ میں تجربہ کار افراد ہوں گے۔ ان میں سے بیشتر سو رہے ہوں گے۔ ایک دو ڈیوٹی پر ہوں گے تو اپنے پہلے سے متعین راستے پر رواں رہنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں کر رہے ہوں گے۔ موسم اچھا ہے اور راستہ صاف ہے۔ کسی دشواری کے بغیر ان کی لانچ چلتی جائے گی۔ وہ اطمینان سے گپ لگاتے رہیں گے یا سگریٹ، چائے، کافی پیتے رہیں گے۔ ان کو کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوگی کہ وہ کسی وجہ کے بغیر دوربین سے سمندر پر نظر رکھیں۔

لیکن میری اس منطقی سوچ کی نفی وہ روشنی کر رہی تھی جو لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں اب انجن کی آواز کو لہروں کے شور سے الگ سن سکتا تھا۔

میں نے غالب کو دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کے چیخ رہا تھا اور لانچ میں آنے والوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حالانکہ ان کے کانوں تک یہ آواز پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ لانچ کے کسی بند کیبن میں تھے۔ اندر انجن کے چلنے کی آواز تھی اور باہر سمندر کی لہروں کا شور تھا۔ اس کے باوجود نجانے کیا ہوا کہ میں نے بھی غالب کے ساتھ چلانا شروع کر دیا۔ میں اپنے دونوں ہاتھ ہلا رہا تھا اور انگریزی کے علاوہ فرنچ میں مدد کے لیے پکار رہا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ روشنی رخ بدلے بغیر ہم سے سو دو سو گز تک آئی اور دور ہونے لگی۔ وہ کوئی لانچ تھی جس کے کیبن کی کھڑکی میں بھی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے سیدھے راستے پہ چلی جا رہی تھی اور یہ سیدھا راستہ ہماری سمت میں تھا مگر کچھ فاصلے سے گزر رہا تھا۔

چلاتے چلاتے ہمارا گلا درد کرنے لگا مگر لانچ کا رخ نہیں بدلا۔ ہم نے اسے بہت قریب آ کے دور ہوتے دیکھا۔ اس کے انجن کی آواز کا شور مدھم پڑنے لگا اور روشنی پھر تاریکی کے سمندر میں کھو گئی۔

شدید مایوسی نے ہم دونوں کو مغلوب کر لیا۔ ہم تھک کے لائف بوٹ میں گر گئے۔ بے رحم رات پھر ہمارے اعصاب پر سوار ہو گئی۔ ہم بے بسی سے اس سمت میں دیکھتے رہے جدھر وہ لانچ گئی تھی۔

"صبح تک کچھ نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔

"کیا صبح ہوگی؟" غالب نے تلخ ناامید لہجے میں کہا۔

اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا۔ تھوڑا بہت سفر کا سامان، مثلاً کچھ کھانے پینے کے لیے۔ ایک کمبل، ترپال یا پلاسٹک شیٹ تو حالات اتنے خراب نہ ہوتے۔ ہماری جسمانی توانائی کا گراف اتنا نہ گرتا اور ہم جیتے جاگتے رہتے۔ گرم چائے یا کافی سے بھرا ہوا تھرماس بھی ہوتا تو بہت تھا۔ سگریٹ ماچس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پانی کی مسلسل بوچھاڑ میں دونوں استعمال کے قابل نہ رہتے۔ ہاں ٹارچ ہوتی تو بہت کارآمد ثابت ہوتی۔ ہم روشنی کو جلا بجھا کے ہر طرف سگنل دے سکتے تھے۔ شاید یہ اشارہ کسی کو متوجہ کر لیتا۔ مگر ہم بالکل خالی ہاتھ تھے۔ روانگی سے پہلے ہمیں اسبابِ سفر ساتھ لینے کی جو مہلت مل سکتی تھی وہ پینڈرو کی اور شاہد جمیل کی تلاش میں صرف ہو گئی تھی۔ ہم بڑی افراتفری اور عجلت میں روانہ ہوئے تھے چنانچہ کچھ بھی ساتھ نہیں لائے تھے۔

باقی رات کیسے گزری، یہ خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ میں نقاہت کا شکار تھا اور نیم بے ہوشی کے عالم میں آنکھیں بند کیے پڑا ہوا تھا۔ میرا تصور مجھے دھوکا دینے لگا تھا۔ کبھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں اڑ رہا ہوں اور لائف بوٹ ایک انجن والا ہوائی جہاز بن گئی ہے۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کشتی ساکت ہے اور مجھ پر اجلی تیز دھوپ پڑ رہی ہے۔ اس کی زندگی بخش تمازت میرے جسم میں پھیل چکی ہے۔ آنکھیں کھول کے دیکھنے پر میں نے اسی تاریک اندھیرے سمندر کو اور مہیب رات کو دیکھا۔

یہ نیند نہ تھی۔ یہ بے ہوشی بھی نہیں تھی۔ یہ صرف انتظار تھا۔ سفر کے ختم ہونے کا یا رات کے ختم ہونے کا۔ سفر یوں بھی تمام ہو سکتا تھا کہ اچانک لائف بوٹ جواب دے جاتی۔ ایسی صورت میں ہم کسی قسم کی جدوجہد کے بغیر ڈوب جاتے۔ غالب کو تیرنا آتا ہی نہیں تھا اور میں اس قابل نہ تھا کہ تیر سکوں۔ ایک بار میں نے کسی شارک کو بھی دیکھا جو ہماری لائف بوٹ کے

www.paksociety.com

ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ میرے ذہن میں وہ سب قصے تھے اور روایات تھیں جو ڈوب جانے والی کشتیوں اور جہازوں سے منسوب تھیں۔ یہ مشہور تھا کہ شارک مچھلیاں پہلے سے جان لیتی ہیں کہ سمندر کے سفر میں کون قضا کا نشانہ ہوگا اور وہ اپنے لقمۂ تر کے انتظار میں اس کے پیچھے چلتی جاتی ہیں۔

میں دہشت زدہ ہو کے اٹھ بیٹھا۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ہر طرف دیکھنے کی بے سود کوشش کی۔ مگر سوائے جھاگ اڑاتی موجوں کے میں کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ اوپر آسمان بھی تاریک تھا۔ ستارے کہیں کہیں جھلملاتے نظر آ جاتے تھے لیکن مجھے ان میں قطبی ستارہ دکھائی نہ دیا جس سے میں سفر کی سمت کا تعین کر سکتا تھا۔ لائف بوٹ حیرت انگیز طور پر لہروں کے سہارے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے اندر بھی پانی بھر گیا تھا اور ہم اس تالاب میں نصف ڈوبے ہوئے تھے۔ یہ لائف بوٹ کی ہوا کا دباؤ تھا جس کی وجہ سے وہ ڈوب نہیں سکتی تھی۔

ایک بار میں نے غالب کو ہاتھ لگا کے دیکھا۔ وہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اور اس کا جسم سرد تھا۔

"ابھی مرا نہیں ہوں میں۔" غالب نے کمزور لہجے میں کہا۔

"میں بھی زندہ ہوں۔" میں نے اسے اطلاع دی۔

"وقت کیا ہوا ہے؟"

"معلوم نہیں۔ گھڑی میں شاید پانی چلا گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اندھیرے میں سوئیوں کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔"

"چل چھوڑ۔ وقت معلوم ہو بھی گیا تو کیا ہوگا۔"

پھر نہ جانے کب مجھے ایسا لگا جیسے لائف بوٹ کو جھٹکا لگا ہے۔ میں نے انسانی آوازیں سنیں اور آنکھیں کھول کے دیکھا۔ لائف بوٹ کو ایک بادبانی کشتی نے روک رکھا تھا۔ اس میں جو لوگ تھے وہ سب کنارے پر جھک کے ہمیں دیکھ رہے تھے۔

"کون ہیں یہ؟" کسی نے انگریزی میں کہا۔ "بے ہوش ہیں صرف یا مر گئے ہیں؟" یہ کسی عورت کی آواز تھی۔

"ان کو اوپر کھینچو۔ ایسے نہیں بے وقوف" مرد نے ڈانٹ کر کہا۔ "دیکھو چوٹ نہ لگے۔"

"یہ آدمی نہیں لگتے ہیں" عورت نے کہا۔

"مجھے تو یہ انسان لگتے ہیں۔" مرد نے طنزیہ انداز میں عورت کی بات کا جواب دیا۔ "کیا قومیت اور مذہب، پیشہ اور حسب نسب اور بیوی بچوں کے بارے میں پہلے معلوم کروں؟"

"اتنے تلخ کیوں ہو جاتے ہو تم۔ کیا بات بھی نہ کروں میں؟"

"میں تو تم کو بے وقوفی کی باتیں کرنے سے بھی نہیں روک سکتا لیکن اس کا کوئی وقت ہونا چاہیے۔" مرد نے کہا۔

جب مجھے ایک رسی کی بغل میں سے گزار کے اوپر کھینچا جا رہا تھا تو یہ سب وہ گفتگو تھی جو میرے کانوں نے سنی۔ مجھ میں سر اٹھا کے اوپر دیکھنے کی ہمت بھی نہیں تھی لیکن مجھے احساس ضرور تھا کہ میرے ہوش سلامت ہیں۔

"اندر لے جاؤ انہیں۔" مرد نے کہا۔ اس کا لہجہ تحکمانہ تھا جس سے دوسروں کے ماتحت ہونے کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ انگریزی بول رہا تھا لیکن اس کا لہجہ امریکی یا انگلش نہیں تھا۔ وہ اطالوی یا فرانسیسی بھی ہو سکتا تھا اور ترک یا اسپینی بھی۔ دنیا میں ایسے ملکوں کی تعداد کافی ہے جو "ڈی" اور "ٹی" کے لیے "ڈی اور ق" استعمال کرتے ہیں۔

"پہلے ان کو کمبل میں لپیٹ دو۔ ابھی کپڑے مت اتارو۔" اس مرد نے کہا۔ "تم کیا کھڑی تماشا دیکھ رہی ہو؟"

"تمہارے خیال میں یہ سب مجھے کرنا چاہیے؟" عورت نے کہا۔

"اس کے علاوہ بھی کرنے کو بہت کچھ ہے۔ ان کے لیے کافی لاؤ۔ گرم اور سیاہ۔ جیسی کہ تم ہو۔" مرد بولا۔

پانی سے نکالے جانے کے دس منٹ بعد میرا جسم اپنی حرارت سے کمبل کے اندر اتنی توانائی حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گیا کہ میں نے آنکھیں کھول کے غور سے دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے اندھیرے کے سوا کچھ محسوس نہ ہوا۔ شاید ابھی میں اس قابل نہیں ہوا کہ کچھ دیکھ سکوں۔ میں نے سوچا۔ مگر اسی وقت میرے چہرے پر سے کمبل ہٹا دیا گیا۔ میری آنکھیں کم روشنی میں بھی خیرہ ہونے لگیں۔

"ہیلو۔" مجھ پر جھکے ہوئے بھوری داڑھی اور سفید رنگت والے ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ "تم تو جلدی ہی ہوش میں آ گئے ہو۔"

میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ "میں بالکل ہوش میں ہوں۔ میرے ساتھی کا کیا حال ہے؟"

وہ ہنسا اور اس نے فرنچ میں ایک جملہ کہا جس کا مطلب کچھ یہ ہوتا تھا کہ اپنی خبر نہیں، فکر دوسروں کی ہے۔

اس وقت میں نے سوچا کہ فرنچ بول کے اس کے ساتھ ہم زبان ہونے کا رشتہ استوار کر لوں لیکن پھر میں نے اس ارادے کو ملتوی کر دیا۔ ابھی میں نہیں جانتا تھا کہ یہ بھوری داڑھی والا کون ہے اور کسی شریفانہ ارادے کے ساتھ نکلا ہوا ہے یا کوئی اسمگلر قسم کی چیز ہے۔ اگر اس کا تعلق کسی خطرناک پیشے سے ہوا تو وہ ایک دم محتاط ہو جائے گا اور اپنی حقیقت کو مجھ سے چھپائے گا۔ بصورت دیگر یہ امکان باقی رہتا تھا کہ مجھے کچھ پوچھے بغیر ہی بہت کچھ معلوم ہو جائے۔

وہ ایک پر تکلف بیڈ روم تھا۔ بیڈ آخری دو دیواروں کے ساتھ لگا ہوا تھا اور تقریباً چار فٹ چوڑا تھا۔ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر کلاک ریڈیو تھا۔ دیواروں میں سے ایک پر [illegible]

تھے ہوئے تھے۔ دوسری پر فلم اسٹار یا ماڈلز کے لائف سائز پورٹریٹ تھے جو پوسٹر پر لگائے گئے تھے اور پردہ ہلتا تھا لگتا تھا جیسے وہ متحرک تصویریں نہیں جیتی جاگتی عورت ہے۔ لوگ لباس سے بے نیاز تصاویر کو دیکھنے کے عادی چنانچہ وہ ہمیں دیکھ رہے تھے۔

ہم قالین پر کفن میں لپیٹے ہوئے مُردوں کی طرح تھے اور دیکھنے والوں میں سے دو میرے جیسے دیسی لوگ اپنی چہرے کے نقوش اور سانولی رنگت والے۔ وہ چست خاکی پتلونوں کے ساتھ بنیان میں تھے۔ دونوں بنیان بھی تنگ تھے۔ چنانچہ ان کے چوڑے سینے اور ابھرے ہوئے بازو زیادہ نمایاں تھے۔ ایک کے بنیان پر جیسی دوسرے کے بنیان پر خطرے کی علامت کھوپڑی اور ہڈیاں کراس کی شکل میں یہ ظاہر کرتی تھیں کہ وہ خود کو خطرناک ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

پھر وہ عورت آئی جس کو بھوری داڑھی والے نے گرم اور سیاہ کافی کہا تھا اور ٹھیک کہا تھا۔ اس نے منی اسکرٹ پہن رکھا تھا اور اس کی سڈول مضبوط ٹانگوں پر اسکن کلر کی اسٹاکنگ "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے" کی عملی تفسیر تھی۔ بے حد جوان عورت تھی جس کے لیے اپنی جوانی کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بڑے طمطراق سے کافی لے کر آئی اور جب اسے رکھنے کے لیے جھکی تو دامن کے چاک اور گریبان کے چاک میں کوئی فاصلہ نہ رہا۔ اس کے بال سخت اور یوں بنے ہوئے تھے کہ شاید سیدھے نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اس نے [illegible] کا اسٹائل اپنا لیا تھا۔ جب وہ مسکرائی تو اس کے لپ اسٹک لگے ہونٹوں کے درمیان موتیوں جیسے دانت جھلملائے۔

"ہیلو۔ کیسا حال ہے؟" اس نے اردو میں کہا مگر یہ [illegible] زبان کے گوراشاہی لہجے والی اردو تھی۔

"اچھا ہے میم صاحب۔" میں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میم صاحب کہلا کے وہ بے حد خوش ہوئی۔ "ڈونٹ موو" اس نے کہا اور پھر مجھے اپنے ایک بازو کو گردن کے نیچے رکھ کے یوں سہارا دیا کہ مجھے تقریباً اپنی آغوش میں لے کر [illegible] لگا لیا۔ یہ بالکل غیر ارادی حرکت تھی اور [illegible] مقصد نہیں تھا مگر میں نے اس کے گداز ہوتے ہوئے بدن [illegible] کی خوشبو کی مہک سونگھی تو میں ایک دم ہوش [illegible]

"[illegible] لو۔" میں نے اپنے ہاتھوں کی مدد سے پیچھے [illegible] دیوار کا سہارا لے لیا۔

بھوری داڑھی والا ہنسا۔ "گرمی تو دے دی اسے۔ اب کافی بھی دے دو۔ بلیک روز۔"

"شٹ اپ۔" اس نے برا مانے بغیر کہا اور کافی کا مگ مجھے تھما دیا۔ "یہ لو۔" اس نے دو گولیاں میری ہتھیلی پر رکھ دیں۔ "اسپرین ہے۔" پھر وہ غالب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

میں نے اسپرین کو کافی کے ساتھ نگلنے کے بعد ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر کے خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے پھر زندہ رہنے کے مواقع فراہم کیے۔ پھر میں سوچنے لگا کہ مسٹر براؤن اور بلیک روز کو اپنے بارے میں کیا بتانا مناسب ہوگا۔ غنیمت تھا کہ ابھی تک انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جو کچھ کہوں غالب کے ہوش میں آنے سے پہلے نہ کہوں تاکہ اس کے اور میرے بیان میں فرق کا اندیشہ بھی نہ رہے۔

مسٹر براؤن نے یہ سوال بروقت داغ دیا۔ "کون ہو تم لوگ؟ انگریزی تو سمجھتے ہو؟"

"یس سر۔" میں نے کہا۔ "میرا نام امیر چند ہے اور یہ میرا بھائی ہے فقیر چند۔ باپ کا نام ہے ذہری لال۔"

بلیک روز نے پلٹ کے کہا۔ "دونوں تمہارے بھائی لگتے ہیں حلیے سے تو۔" یہ بات اس نے فرنچ میں کہی تھی۔ "دیکھ لو ایسی ہی بھوری داڑھی ہے جیسی تمہاری۔ بے نام"

جو کچھ جواب میں اس نے کہا وہ ایک فحش بات تھی اور اس کا مطلب کسی حد تک یہ تھا کہ اسے اب ایک کی جگہ تین چاہنے والے ملیں گے چنانچہ اسے اپنی فکر کرنی چاہیے۔

"آپ ... کون لوگ ہیں؟" میں نے بڑی سادگی سے کہا۔

"میرا نام ...؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے ایک فرنچ نام بتایا جو نام ہرگز نہیں تھا۔ اس لفظ کا مطلب ہوتا تھا بغیر باپ کا۔ مختصراً حرامی۔ اس نے یہ نام بڑی سنجیدگی سے بتایا تھا۔ چنانچہ میں سمجھ گیا کہ وہ اصل نام بتانا نہیں چاہتا اور شریف آدمی بہرحال نہیں ہے۔

بلیک روز نے غالب کو کافی پلاتے ہوئے ہنس کے کہا۔ "کم سے کم ایک باپ کا نام تو بتا دیتے۔"

"تم مجھے جان کہہ سکتے ہو۔" وہ بلیک روز کی بات کو نظر انداز کر کے بولا۔ "میں ایک بزنس مین ہوں۔ اب یہ مت پوچھنا مجھ سے کہ میرا بزنس کیا ہے۔"

"میں بتا دوں گی۔" بلیک روز نے پھر دخل دیا۔

"کالی کتیا۔ اپنی زبان بند رکھ۔ ورنہ میں سب کے سامنے ..." جان نے آگ بگولا ہو کے کہا۔

"تم کیا کر سکتے ہو۔ کیا بگاڑ سکتے ہو میرا؟" وہ اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے نفرت اور حقارت سے بولی۔ "جب تک تم مجھے میرا حصہ نہیں دو گے خطرہ باقی رہے گا تمہارے لیے۔"

www.paksociety.com

جان ایک دم نرم پڑ گیا۔ "بلیک روز! یہ ہماری آپس کی بات ہے۔ سب کے سامنے جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں وضاحت کر چکا ہوں ایک بار کہ یہ بے ایمان آدمی نہیں ہیں۔"

"تم آدمی ہی نہیں ہو شیطان ہو۔ اور مجھے کوئی غرض نہیں تمہارے نفع و نقصان سے۔ نہ میں وضاحت چاہتی ہوں۔ میں تو اپنا پورا حصہ چاہتی ہوں اور بس۔"

"او کے۔ او کے۔ ہم ایک بار پھر بات کریں گے لیکن ابھی نہیں۔" جان نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "پہلے ہم ان سے نمٹ لیں۔"

میں نے کافی ختم کر کے مگ اسے تھمایا۔ "تھینک یو۔ کیا ایک سگریٹ مل سکتا ہے مجھے؟"

"میں سگریٹ نہیں پیتا۔" وہ بولا۔

بلیک روز نے نہ جانے کہاں سے ایک پیکٹ برآمد کیا اور میری طرف اچھال دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کسی تربیت یافتہ نرس کی طرح غالب کو اسپرین دے رہی تھی اور اسے پہلے سے کافی پلا رہی تھی۔

"وسیا... مجھے خشک کپڑے مل سکتے ہیں؟" میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر سکون اور راحت کے اندرونی احساس کے ساتھ کہا۔ "مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

"مل جائے گا۔"

"اور ہم نے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ کل سے۔" میں نے کہا۔

"فکر مت کرو۔ اب تم ہمارے ہاتھوں میں ہو تو سردی اور بھوک سے نہیں مرو گے۔" وہ بولا۔ "ویسے تمہاری مرضی۔"

کیا اس بات کا یہ مطلب لیا جا سکتا تھا کہ ہم نے کسی بھی معاملے میں غیر ضروری تجسس کا مظاہرہ کیا اور دخل در معقولات کیا تو ممکن ہے ہمیں مرنا پڑے۔ میں نے سوچا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس کو فوری طور پر سوال جواب کی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ غالب کی حالت بہتر ہو رہی تھی اور مجھے امید تھی کہ میرے کپڑے بدل کے واپس آنے تک وہ پوری طرح ہوش میں آچکا ہوگا۔

مجھے اٹھتا دیکھ کر جان نے اپنے گھر کے ایک غلام سے کہا۔ "اس کو پہننے کے لیے کچھ دو۔ مگر..." اس نے دونوں کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ "یہ تو بڑے آدمی ہیں۔"

وہ دونوں جو خود کو تارزن یا کنگ کانگ سمجھتے تھے اور ڈیل ڈول میں مجھ سے دگنے تھے، اسے اپنی تعریف سمجھ کے مسکرانے لگے۔

"میرے کپڑوں میں سے دیکھو۔ جو پرانے کپڑے میں مسترد کر چکا ہوں، ان میں سے ان کا سائز نکل آنا چاہیے۔" جان نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "لیکن جوتے نہیں ہیں میرے پاس۔"

"کوئی بات نہیں۔ ابھی جوتوں سے کام چل جائے گا جب یہ خشک ہو جائیں گے۔" میں نے اپنے بھیگے ہوئے جوتوں کو دیکھ کر کہا۔

میٹنے بڑے جسیم والنسر کو سنڈ مردانگی کے طور پر کھولنے والے نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"فارچیون سیک۔" جان نے سر پر ہاتھ مار کے کہا۔ "میرے قالین کا ناس تو مت کرو۔"

"سوری۔" میں نے کہا اور دونوں جوتے اتار کے ہاتھ میں اٹھا لیے۔ ابھی تک قالین اس لیے محفوظ تھا کہ ہم کیبن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب میں کھڑا ہوا تو پانی جوتوں میں سے بہنے لگا۔ انگلش پیر و سیاہی مسخرے کا کردار ادا کرنے والے کی طرح میں کمرے سے یوں باہر گیا جیسے وہ سیاہی کسی ایوان صدر کی خوابگاہ سے نکل رہا ہو۔ بلیک روز کھلکھلا کے ہنسی۔ اس کی ہنسی بڑی دلکش تھی۔ اس خوشبو کی طرح جو اس نے لگائی تھی کیونکہ قدرت نے انسانوں کو سیاہ و سفید کے تعصب میں مبتلا نہیں کیا تھا۔ یہ تفریق سفید رنگ کو وجہ امتیاز بنانے والوں نے پیدا کی۔ بلیک روز اگر وائٹ روز ہوتی تو قیامت کہلاتی۔ اس کے تمام دلکش خدوخال، سارے خطوط قاتل اور سب ادائیں نظر نواز تھیں مگر بد قسمتی کے باعث وہ سیاہ نسل کی عورت تھی۔

جو سوٹ جان کہلانے والے نے مسترد کیے تھے، ایسے تھے کہ ہمارے ملک کے لنڈے بازاروں میں پہنچنے سے قبل ہی امیر زادوں کے ہاتھ لگ جاتے تو وہ فخر کے ساتھ پہنتے۔ مگر میں نے جو سوٹ منتخب کیا، وہ بھی بہترین حالت میں تھا۔ جب میں نے اس کے ساتھ میچ کرنے والی ٹائی مانگی تو مجھے ڈریسنگ روم تک لانے والے کا چہرہ بگڑ گیا۔

"سالے امیر چند۔ دو ٹکے کی اولاد۔ پورا دولہا بن کے جائے گا؟ خیرات بھی اپنی مرضی سے لے گا۔"

اسے اردو میں بات کرتے سن کے میں نے شدید حیرت کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے متانت سے کہا۔ "میرے ساتھ پھر اس لہجے میں بات مت کرنا۔ میں اس جیسے دس کو خرید سکتا ہوں جس کے اشارے پر تم دم ہلاتے پھرتے ہو، سمجھے!"

اس کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ "سوری سر! میں معافی چاہتا ہوں آپ سے۔ پلیز مسٹر فروش سے شکایت مت کیجیے گا۔"

مجھے جان کا اصل نام معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے اپنے لبوں پر زبان پھیری۔ "میں نے غلطی سے ایک نام بتا دیا۔ یہ بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"اگر تم اپنا نام نہیں بتاؤ گے تو میں تمہاری شکایت کر دوں گا۔" میں نے کہا۔ "اور اپنے دوسرے ساتھی کا نام نہیں بتاؤ گے تو مسٹر جان کو بتا دوں گا۔"

"تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟"

"ہاں۔ وائٹ میل تمہارا باس ہے۔ اس کے ساتھ ایک بلیک میل ہے۔" میں نے کہا۔ "چنانچہ بلیک میل تم ہی ہو سکتے ہو۔"

وہ میری بات سے محظوظ نہیں ہوا۔ ٹائی تلاش کرتے ہوئے وہ سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔

بالآخر اس نے کہا۔ "میرا نام ہے سوہن اور دوسرا ہے میرا بھائی موہن۔ کیا خیال ہے۔ ٹھیک ہیں یہ نام؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ ہمارے ناموں کی مماثلت اور ہمارے رشتوں کے بارے میں اپنے شکوک کا اظہار کر رہا ہے اور بالواسطہ طور پر یہ بتانا چاہتا ہے کہ ہم اگر فقیر چند اور امیر چند ہو سکتے ہیں تو وہ موہن اور سوہن کیوں نہیں ہو سکتے۔ میں اس کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا کہ یہ اس کا اصل نام نہیں ہے اور جان کے سامنے اگر میں انہیں سوہن موہن کہتا تو اس کے لیے تشویش کی کوئی بات نہ ہوتی۔

میں نے سر ہلا کے کہا۔ "اچھے نام ہیں۔ چلیں گے۔"

"کیا اب ہم بھی چلیں؟" وہ بولا۔

"چلو۔" میں نے ٹائی کی ناٹ درست کر کے کہا اور اس سے آگے ہو گیا۔ اپنے ڈیل ڈول کے باوجود وہ ایک بزدل اور غلام آدمی تھا۔ اس نے مجھے بھی اپنا آقا تسلیم کرنے میں دیر نہیں کی۔

غالب ہوش میں آچکا تھا اور خاموش بیٹھا دیوار کو گھور رہا تھا۔ مجھے یہ صورت حال کچھ عجیب لگی۔

"کیا بات ہے؟ تمہارا یہ بھائی بولتا نہیں ہے؟" جان یعنی اس نیم براؤن داڑھی والے نے کہا جس کا اصل نام فروش تھا۔ یہ نام بھی بہت عجیب تھا اور اس سے پتا نہیں چلتا تھا کہ اس کی قومیت کیا ہے۔

"یہ انگریزی نہیں سمجھتا۔" میں نے کہا۔ "اور کچھ اونچا بھی سنتا ہے۔" اس کی خاموشی سے میں سمجھ گیا تھا کہ میری عدم موجودگی میں غالب نے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے گریز کیا ہوگا۔

"خوب خوب۔ کیا نام بتائے تھے تم نے؟"

"میں امیر چند۔ یہ فقیر چند۔" میں نے کہا۔

"کیا حادثہ پیش آیا تھا تمہارے ساتھ؟"

"کچھ لوگ ہماری لانچ چھین کر لے گئے۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمیں مار ڈالتے لیکن ان کو رحم آگیا شاید۔ انہوں نے ہمیں سمندر میں نکل جانے کی اجازت دے دی۔"

"وہ لانچ تھی یا بحری جہاز تھا؟" فروش نے کہا۔ "اس کا نام لائف بوٹ پر ہے۔"

"ایک بہت بڑی لانچ یا ایک چھوٹا بحری جہاز تم کچھ بھی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔

"تم مالک تھے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم نے کرائے پر لیا تھا۔"

"کس لیے؟"

"بزنس کے لیے اور فارچیون سیک۔ یہ مت پوچھنا کہ ہمارا بزنس کیا تھا۔" میں نے کہا۔

یہ اس کے الفاظ تھے۔ وہ ہنسنے لگا۔ "میں سمجھ گیا۔ خیر یہ بتاؤ کہ تم سے وہ لانچ چھیننے والے کون تھے۔ یہ کام اتنا آسان تو نہیں ہوتا۔"

"میرا خیال ہے کہ زیادہ مشکل بھی نہیں ہوتا۔"

"اگر تم ہوشیار ہو، دشمنوں کو پہچانتے ہو اور کوئی ایسا موقع نہیں آنے دیتے..."

"موقع بن بلائے آتا ہے۔ جیسے حادثہ ہوتا ہے سڑک پر۔ یا آدمی کو عشق ہو جاتا ہے اچانک۔" میں نے کہا۔

وہ پھر ہنسنے لگا۔ "کیا عجیب بات ہے۔"

"میرا مطلب تھا کہ آدمی کی شامت آتی ہے تو وہ دشمن پر اعتبار کر لیتا ہے یا دوست ہی دشمن ہو جاتے ہیں مگر وہ ان کو پہچاننے سے قاصر رہتا ہے۔ خوش فہمی میں مارا جاتا ہے۔ مثلاً اب تم ہو۔ کیا تم مجھ سے توقع رکھتے ہو کہ میں... جیسے ایک گھنٹے قبل تم جانتے ہی نہیں تھے اور نہ تم نے سوچا تھا کہ کوئی اس وقت سمندر میں پڑا ہوا مل جائے گا جس کو تم انسانی ہمدردی کی بنیاد پر نکالنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ کیا تم توقع کر سکتے ہو کہ میں لانچ پر قابض ہو جاؤں گا؟"

اس کے ایک ہاتھ میں شراب کا جام تھا۔ وہ اتنا ہنسا کہ جام چھلکنے لگا۔ میری بات اتنی مضحکہ خیز نہیں تھی مگر اس پر نشے کا اثر تھا۔ "کیا تم ایسا کر سکتے ہو... فقیر چند؟"

"میں امیر چند ہوں۔" میں نے کہا۔ "کسی کی ہو گی یہ خوش فہمی مسٹر جان۔"

"پھر کیا مجھے تم کو واپس سمندر میں پھینک دینا چاہیے، اپنا دشمن سمجھ کر؟" وہ بولا۔

"یہ ہوگی سب سے بڑی غلطی۔" میں نے کہا۔

"تم کو اپنے نقصان کا پورا اندازہ ہے؟" وہ بولا۔

"ہاں۔ تقریباً دس ملین ڈالر کے جواہر ہیں لیکن اچھی بات یہ ہے کہ کوئی نہیں ڈوبا۔" میں نے کہا۔ "قانونی طور پر تو میں دس لاکھ میں سے دس بھی وصول نہیں کر سکتا۔ ہاں اپنے طور پر میں دس لاکھ وصول کر لوں گا ان سے۔"

اس نے تعریف اور تائید کے انداز میں سر ہلایا۔ "یہی طریقہ ہونا چاہیے۔ قانون کے بارے میں احمق یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ وہ کمزور کی حفاظت کے لیے بنایا جاتا ہے۔ طاقت ور کو تو قانون کی ضرورت

www.paksociety.com

نہیں بچاتی۔"

"ہاں، وہ خود اپنا قانون ہوتا ہے اور وہ قوانین جو ملک میں نافذ کیے جاتے ہیں، مثلاً سسٹم کے قوانین نہ ہوں کہ ظلم والے کسی کو کیسے پکڑیں۔ ٹریفک کے قوانین نہ ہوں تو۔ ۔ ۔"

"میں سمجھتا ہوں یہ سب۔ مجھے بتاؤ کہ وہ کون لوگ تھے جو تم جیسے ہوشیار آدمی کے ساتھ ایسی بدمعاشی کر گئے۔ ضرور وہ بے وقوف ہوں گے کہ انھوں نے تم کو مار کے سمندر میں نہیں ڈالا اور زندہ نکل جانے دیا۔ کیا انھیں اندیشہ نہیں تھا کہ تم ان کے لیے خطرہ بن جاؤ گے؟"

"ان کو اندازہ نہیں تھا کہ تم مجھے بچا لو گے۔" میں نے کہا۔

"وہ لانچ کہاں کہاں لے گئے ہوں گے؟"

"ہاں وہ کہیں بھی لے جائیں۔ لوٹ کر تو یہیں آئیں گے اور وہاں میں ان کے استقبال کے لیے موجود ہوں گا۔" میں نے کہا۔

"بمبئی کیسے جاؤ گے تم؟" وہ سوچ کے بولا۔

"ابھی تک سوچا نہیں تھا میں نے۔ اب آ گیا ہوں تو سوچ رہا ہوں کہ تم سے درخواست کروں۔" میں نے کہا۔

"مجھ سے۔ ۔ ۔ دیکھو میں تو جا رہا ہوں دبئی کی طرف یعنی بالکل مخالف سمت میں۔" وہ بولا۔ "میں تم کو کراچی اتار سکتا ہوں۔ وہاں سے تم خود واپسی کا انتظام کر لینا۔"

"کیا میں کراچی سے تیر کے سمندر کے راستے بمبئی تک جاؤں؟ کرایہ میرے پاس نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک اجنبی ملک میں پاسپورٹ اور امیگریشن کے قانونی مسائل ہوں گے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم مجھے بمبئی پہنچا دو؟"

"یہ بالکل ناممکن ہے۔"

"میں تم کو خدمات کا معاوضہ... انعام... جو چاہو سب کچھ دے سکتا ہوں۔"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ضرورت اس بات کی اہم ہے کہ میں وقت پر اپنی کاروباری کمٹمنٹ کو پورا کروں۔ میری پارٹی سے سیری ڈیل ہے، وہ میری انسانی ہمدردی کے اقدام کا عذر قبول نہیں کرے گی مسٹر تیمور جنید۔"

"امیر جنید۔" میں نے تصحیح کی۔

"میں تم کو بمبئی کی طرف جانے والے کسی جہاز یا کسی لانچ پر سوار کرا سکتا ہوں۔ تم ان کو جو اسٹوری چاہو سنا دو۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔" وہ بولا۔

"میں اس سے زیادہ باتیں نہیں کر سکتا۔ میں بتا چکا ہوں کہ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔"

"کل سے؟ کل یہ واردات کس وقت ہوئی تھی؟"

"رات ہوتے ہی۔" میں نے کہا۔ "سات ساڑھے سات بجے ہوں گے اب صبح کے ساڑھے تین بجے ہیں۔ تقریباً سات گھنٹے تم سمندر میں رہے۔"

"تمھارا ایمانی کپڑے سے بدل کے آ جائے تو کھانا بھی آ جائے گا۔ بلیک روز کچھ انتظام کر رہی ہوگی۔" وہ بولا۔

"بلیک روز اس کا اصل نام ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں کہتا ہوں اس کو۔"

"بلیک روز بہت نایاب ہوتا ہے۔ وہ تمھاری۔ ۔ ۔"

فروش ہنسنے لگا۔ "کچھ نہیں۔ کاروبار میں میری مددگار ہے اور عورت بہرحال ہے۔ اس کے رنگ کو مجھے نظرانداز کرنا پڑتا ہے [illegible] کیسی بھی۔ وہ میری ہے کاروبار کے معاملے میں۔"

"کس کاروبار کی بات کر رہے ہو؟"

"چالاک مت بنو۔ ہم ایک دوسرے کے کاروبار کے بارے میں کوئی سوال نہیں کریں گے۔" وہ بولا۔

غالب کے ساتھ بلیک روز اندر آئی۔ غالب کو [illegible] پہننا پڑا تھا کیونکہ فروش کے پاس صرف سوٹ تھے [illegible] حساب سے جو اس کے باتھ روم سے ملحق ڈریسنگ روم [illegible] بھرے پڑے تھے۔ لباس کے معاملے میں وہ [illegible] تھا۔ یہ شوق کی انتہا تھی کہ ایک لانچ پر سفر کرنے والا [illegible] بدلتا ہو۔ شاید لانچ ہی اس کا گھر ہو اور سفر کے دوران بھی [illegible] میں ہی رہتا ہو۔

بلیک روز نے ٹرے کو ایک گلاس ٹاپ ٹیبل پر رکھا [illegible] بار بی کیو کے گلاب کی خوشبو نے مجھے ڈسٹرب کیا اور مجھے [illegible] طرف کرنا پڑی۔ میں اور غالب آمنے سامنے بیٹھ کے اس [illegible] کو صاف کرنے لگے جس پر سب کچھ تھا۔ ابلے ہوئے [illegible] سینڈوچ، پنیر اور گوشت کے نمکین ٹکڑے اور کافی کا [illegible]

"کیا تم دونوں آپس میں بھی بات نہیں کرتے؟" فروش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے چلانا پڑتا ہے کیونکہ یہ اونچا سنتا ہے۔" میں نے [illegible]

"ویسے بھی اس وقت ہم مصروف ہیں۔"

بلیک روز نے کہا۔ "یہ وقت معاملات کو طے کرنے کے لیے مناسب ہے۔" اس نے فرنچ میں بات کی تھی۔

"تم کو جلدی کیا ہے؟" فروش نے کہا۔

"تم ان کو کیوں رکھنا چاہتے ہو؟" بلیک روز نے کہا۔ [illegible] بہانا ضروری [illegible] سمجھتی ہوں کہ مجھے تمھاری بے ایمانی کا [illegible] علم بہت پہلے سے ہے لیکن میں نظرانداز کر رہی تھی اب [illegible] سے بڑھ رہے ہو۔"

"بیٹھے کیا بیماری کی تم کو ہے؟"

"گزشتہ بار تم نے ایک سو میں سے ایک ہزار ڈالر [illegible] مگر مجھے ساڑھے سات سو بتائے۔"

"یہ کس نے کہا ہے تم سے؟"

"تم نے اس پارٹی کے ایک بے ایمان شخص کو مجبور کیا کہ وہ جھوٹ بولے۔" بلیک روز نے برافروختہ ہو کے کہا۔ "مجھے وہی قیمت بتائی گئی جو تم نے بتائی ہے۔ ڈھائی سو ڈالر تم دونوں نے آپس میں تقسیم کر لیے۔ اس بار تم پانچ سو ڈالر ہتھیانا چاہتے ہو۔"

"مارکیٹ ڈاؤن ہے ڈیئر۔ تم جانتی ہو کہ سپلائی میں کتنا اضافہ ہو گیا ہے اس خانہ جنگی کی وجہ سے۔ اب ہم ہی نہیں ہیں اور بھی بہت سی پارٹیاں ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ اگلی لاٹ چار سو یا تین سو میں نکالنی پڑے۔ بائی دی وے، تم کو میرے خلاف اکسانے والا کون تھا؟ میں اندازہ تو کر سکتا ہوں، مگر اس کا نام جاننا چاہتا ہوں۔"

بلیک روز تلخی سے مسکرائی۔ "اب بھی وقت ہے کہ مجھے احمق سمجھنا چھوڑ دو۔"

"احمق تو نہیں، تم خطرناک ہو گئی ہو میرے لیے۔"

"میں خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہوں۔ تم ایسے آدمی ہو کہ نقصان کا ڈر ہو تو مجھے راستے سے ہٹا دو گے لیکن میں تم کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ تم بھی راستے ہی غیر محفوظ ہو۔ اب مجھے صاف بتا دو کہ میرا حصہ کیا ہو گا۔ ایک ہزار ڈالر میں سے ڈھائی سو مجھے ملنے چاہییں۔ اس کے بعد تمھاری مرضی۔ تم ساڑھے سات سو نکلوا یا [illegible] میں گزشتہ حساب پر بھی لعنت بھیجتی ہوں۔"

"اگر میں ایسا کرنے سے انکار کر دوں ڈیئر۔ ۔ ؟"

"تو تم مجھے مجبور کرو گے کہ میں وہ کروں جو میں کرنا نہیں چاہتی۔" بلیک روز نے کہا اور باہر نکل گئی۔

اس ساری گفتگو میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو میری سمجھ میں نہ آتی، سوائے ایک بات کے۔ ہزار ڈالر کا ایک میں کیا چیز تھی؟ فروش نے خانہ جنگی کا ذکر کیا تھا۔ وہ کس ملک کے حوالے سے یہ بات کر رہا تھا اور خانہ جنگی کے باعث کس چیز کی سپلائی بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے قیمت گر گئی تھی۔ کیا فروش بھی اسلحہ فروش تھا، مگر اسلحے کی سپلائی میں نہیں طلب میں اضافہ ہوا تھا اور اس کی قیمت زیادہ ہو گئی تھی۔ پھر وہ کیا چیز تھی جس کی [illegible] فروش اور بلیک روز کے ساتھ بے ایمانی کا مرتکب ہو رہا تھا۔

فروش کے انداز و اطوار سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ٹھنڈے مزاج کا انتہائی خطرناک آدمی ہے۔ اس کے مقابلے میں بلیک روز نہ صرف یہ کہ عورت تھی اور کمزور تھی بلکہ وہ جذباتی اور بے وقوف بھی تھی۔ اس نے کاروباری اختلافات کو ذاتی دشمنی بنا لیا تھا اور اعلان بھی کر دیا تھا کہ وہ کیا کرے گی جبکہ میرا خیال تھا وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس فروش وہ آدمی تھا جو زبان سے کچھ کہے بغیر سب کچھ کر سکتا تھا۔

میں فوراً طے نہیں کر سکتا تھا کہ فروش اور بلیک روز کے معاملات میں مجھے کس حد تک مداخلت کرنی چاہیے اور کس کا ساتھ دینا چاہیے۔ ظالم اور مظلوم تو ہر جگہ ہوتے ہیں لیکن میں کوئی خدائی فوجدار نہیں ہوں کہ ہر جگہ غیر ضروری طور پر مظلوم کی حمایت میں کھڑا ہو جاؤں۔ سب سے پہلے تو مجھے کاروبار کی نوعیت معلوم ہونی چاہیے پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ میرا مسئلہ کون حل کر سکتا ہے۔ اس لانچ پر پہنچ جانے کے بعد یہ مشکل تھا کہ میں اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاؤں۔

ہمارے پاس وقت کم تھا اور حالات کے پیش نظر یہ طے ہو گیا تھا کہ ہم اس لانچ کو بمبئی کے ساحل تک لے جائیں۔ [illegible] نے فروش کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔ اس کے بعد زبردستی کے سوا چارہ نہ تھا۔

خاموش رہ کے ہم نے بہت کچھ جان لیا تھا۔ اگر میں اپنی فرنچ بگھارنے لگتا تو فروش اور بلیک روز کی ساری گفتگو سننے سے محروم رہتا اور مجھے ان کے اختلافات کا بھی علم نہ ہوتا جو اب دشمنی کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ سیاسی حکمت عملی کا تقاضا تھا کہ ہم فروش کے مقابلے میں بلیک روز کا ساتھ دیں۔ وہ کمزور تھی، خود کو غیر محفوظ سمجھتی تھی اور اس کے ساتھ زیادتی بھی ہوئی تھی لیکن ابھی مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم اس کی کس طرح مدد کر سکتے ہیں؟

دونوں عملے کے غلام فروش کے باڈی گارڈ لگتے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں آزما چکا تھا۔ دوسرے کے بارے میں بھی فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ عموماً ایسے نمونے دکھانے کے لیے ہوتے ہیں کہ ان کی لمبائی چوڑائی کے سامنے عام آدمی سر نہ اٹھا سکے۔ جسمانی طاقت کا اندازہ یوں نہیں ہوتا۔ بفرض محال وہ جوڈو کراٹے اور فری اسٹائل کشتی یا باکسنگ کے چیمپئن تھے تب بھی وہ اپنے آقا کو بچا نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے مجھے ایک سرمایہ دار فرض کر لیا تھا جس کے پاس پیسے کی طاقت تو ہوتی ہے اور وہ لڑوا سکتا ہے یا مروا سکتا ہے مگر لڑ نہیں سکتا اور مار نہیں سکتا۔ ایک کو اچانک بے خبری کے عالم میں ناک آؤٹ کیا جا سکتا تھا تو دوسرے کو مقابلے سے پہلے۔ اس مرحلے میں غالب [illegible] مسٹر فروش کو سنبھال سکتا تھا جس کے ریوالور اس کی بیلٹ کے اندر ابھی تک بالکل محفوظ تھے جو ہماری کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھی اور جس میں ہم نے اپنے پاسپورٹ کے ساتھ ہنگامی ضرورت کے لیے نقد رقم بھی رکھی تھی۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" فروش نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں [illegible] اور سونے کی سوچ رہا تھا۔"

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ ۔ جاؤ۔ ۔ ۔ سو جاؤ۔" اس نے دوسرے عملے کے غلام کو اشارہ کیا۔ "ان کو اسٹوڈیو میں لے جاؤ۔"

دوسرا غلام وہ تھا جس کے بنیان پر کھوپڑی کے ساتھ دو ہڈیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے چل دیا۔

بھر سے آگے تھا۔ اچانک میں نے راہداری کے آخری دروازے سے بلیک روز کو باہر آتے اور پھر فلیٹ کے اندر جاتے دیکھا۔ شاید وہ ہمیں دیکھ کر واپس ہو گئی تھی مگر اس طرح مجھے معلوم ہو گیا کہ اُس کا کیبن کون سا ہے۔ میں نے اُسی دروازے میں داخل ہونے کی کوشش کی۔

مگر کے غلام نے مجھے گردن سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ "ادھر رو۔" اُس نے مخالف سمت کے دروازے کو کھولتے ہوئے مجھے اندر دھکیلتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھا تھا۔۔۔ کراس نے بلایا ہے مجھے۔" میں نے گردن کو ملتے ہوئے خفت سے دانت نکال کے کہا۔

"اتنے حسین نہیں ہو تم۔" وہ بولا۔ غیر ارادی طور پر میں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا۔

"کیوں۔۔۔ تمہاری والدہ ہیں وہ؟" میں نے کہا۔

وہ مرکھنے سانڈ کی طرح پھنکارتا ہوا آیا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ اُس کا رخ میری طرف تھا۔ اُس نے غالب کو نہیں دیکھا تھا جو دروازے کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ غالب نے ٹانگ اڑائی تو وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے اسے اُٹھنے کا موقع نہیں دیا اور اس کی کمر پر سوار ہو گیا۔ پھر میں نے اُس کے دونوں ہاتھ پیچھے موڑ کے لاک کر دیے اور اس کے لیے حرکت کرنا بھی ممکن نہ رہا۔

"یہ۔۔۔ کیا مقصد ہے اس حرکت کا؟" وہ سر کو اُٹھاتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کا سر نیچے دبا دیا۔ "ہاتھی کی سواری۔" میں نے کہا اور غالب کو اشارہ کیا۔ اُس نے ہاتھی کی پتلون کی جیب سے ریوالور نکال کے مجھے تھما دیا۔

"باس تم کو مار ڈالے گا۔۔۔ تم اُسے جانتے نہیں۔"

"تم بھلا کہیں نہیں جانتے۔" میں نے کہا۔ "مرتے وقت تم کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ تم کب فوت ہوئے اور کس کے ہاتھوں۔" میں نے ریوالور اُس کی گدی سے لگا دیا۔

"مجھ سے کیا چاہتے ہو تم۔۔۔؟" وہ بڑی مشکل سے سر اٹھا کے بولا۔

"چند سوالات کے جواب۔" میں نے کہا۔ "جواب غلط ہوگا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمہارے باس کی بھوری داڑھی اصلی ہے یا نقلی؟"

وہ شاید سوال کے بے تکے پن پر حیران ہوا مگر اس نے کہا۔ "اصلی ہے۔"

"اس کا نام کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"جان۔۔۔ وہ تمہیں خود بتا چکا ہے۔"

میں نے ایک ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ وہ بلبلایا کیونکہ اس کا ہاتھ کندھے کے پاس سے اُکھڑ گیا تھا۔ "اس کا نام فروش ہے۔ اصل نام پوچھا تھا میں نے۔ دوسرے سوال کا غلط جواب مت دینا ورنہ گردن توڑ دوں گا۔ یہ فروش کیا بلا ہے۔ ضمیر فروش تو وہ ہے اس کے علاوہ کیا بیچتا ہے؟"

"وہ ایک اسمگلر ہے۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "ہر چیز ادھر سے اُدھر کرتا ہے۔ اطالوی شراب لاتا ہے۔"

"کیا وہ اطالوی ہے؟"

"وہ گوا کا رہنے والا ہے۔" وہ بولا۔ "کلکتہ میں بزنس کرتا ہے۔"

"کلکتہ سے کیا لے جاتا ہے؟"

"نوادرات۔" وہ بولا۔ "تاریخی چیزیں۔۔۔ اور لڑکیاں۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "وہ بردہ فروش ہے؟"

"ہاں۔۔۔ عورتوں کا مال آسانی سے مل رہا ہے۔"

"ایک ہزار ڈالر ایک پیس کے۔ تم نے ڈھائی سو ڈالر سمجھا ہے؟" میرے ذہن میں بلیک روز کے الفاظ گونجنے لگے "مارکیٹ ڈاؤن ہے خانہ جنگی کے باعث۔" فروش نے کہا تھا اور وہ لڑکیوں کی بات کر رہے تھے جو مالی منڈی میں بیچی جا رہی تھیں۔ میرے دماغ کا شبہ یکایک اتنا زیادہ ہو گیا کہ عقل کا فیوز اُڑ گیا۔ ایک ہاتھ مار کے میں نے ہاتھی کی گردن توڑ دی جس پر میں سوار تھا گو کہ یہ کام میں نے عجلت میں کیا مگر اس بدذات انکشاف کے بعد میرے لیے ممکن ہی نہ رہا تھا کہ میں کسی کو رعایت دیتا۔

"مرا یا تم ٹھہرو میاں۔ اگر کوئی ادھر آئے تو کم سے کم پوچھے بغیر گولی مار دو۔" میں نے کہا اور راہداری عبور کر کے بلیک روز کے کمرے میں گھس گیا۔

وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ قد آدم آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے جسم پر کوئی کریم مل رہی تھی۔ مجھے ہاتھ میں ریوالور لیے اندر آتا دیکھ کے اس نے چیخ مارنے کی کوشش کی مگر آواز خوف سے اس کے حلق میں پھنس گئی۔

"بلیک روز! مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اس بردہ فروش کی ساتھی ہو۔"

میری روانی فرانسیسی نے اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے۔ اُس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور مسکرا کے خوش آمدید کہنے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کا چمکتا ہوا آبنوسی جسم جیسے ہرن کا کانپنے لگا۔

"اب تک کتنی لڑکیاں بیچ چکے ہو تم لوگ؟" میں نے سرد سپاٹ لہجے میں کہا۔

"مجھے۔۔۔ نہیں معلوم۔۔۔ تعداد۔۔۔ لیکن یہ میرا کسب ہے۔" وہ ہکلا کے بولی۔

"اس وقت۔۔۔ اس لانچ میں بھی۔۔۔ او مائی گاڈ۔۔۔! کتنی لڑکیاں ہیں۔۔۔ کہاں سے لاؤ گے، ہائے میں

بیچ رہا ہے۔

"تقریباً اسّی۔ سب کلکتہ سے سوار ہوئی تھیں۔"

"اور اس سے پہلے؟" میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرہ گرم ہو رہا ہے۔ میرے جسم کا سارا خون سر کی طرف کھنچ آیا تھا۔

"پہلی دفعہ۔۔۔ اڑتالیس۔۔۔ دو مہینے قبل۔۔۔ پھر ایک مہینے پہلے ساٹھ۔۔۔" وہ لرزتے ہوئے بولی۔ کیونکہ اُس کو میری آنکھوں میں اترا ہوا خون صاف نظر آ رہا تھا۔ "مگر دیکھو۔۔۔"

"بلیک روز! اب تم۔۔۔" میں نے سختی سے کہا۔

وہ متوقع نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی میرے سامنے آ گئی۔ شاید اسے ایک چھوٹی امید کا سہارا ابھی غنیمت محسوس ہوا ہوگا کہ اس کا جوان بھرپور جسم اپنی قربت کی آنچ سے میرے دل کو پگھلا دے۔ میں نے اس کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

"پھر تم نے اپنی قیمت کا اندازہ کیا؟ کسی نے کالے گلاب کی بولی لگائی۔۔۔ کالا گوشت پسند کرنے والے گدھ اور بھیڑیے بھی تو ہوں گے دنیا کے بازار میں؟"

"تمہارے لیے کوئی قیمت نہیں۔ ویسے میں برائے فروخت نہیں ہوں۔" وہ بولی اور اپنی شہوانی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ پھیلا کے آگے بڑھی۔

میں پیچھے ہٹ گیا۔ "کاش میرے پاس اتنا وقت ہوتا۔۔۔"

"وقت تو ہے۔" وہ میری بات کا غلط مطلب نکالتے ہوئے بولی۔

"مگر میں تم کو ایک فرانک نہیں دے سکتا۔۔۔ تو وہ فرانک میرے کام آتا۔ لیکن تم بے مصرف ہو میرے لیے۔" میں نے کہا اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے ہاتھ مارا۔ وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح گری اور ساکت ہو گئی۔ میں غصّے میں اندھے کسی تنور کی طرح دہک رہا تھا مگر میرے پاس وقت کم تھا۔ ایک طرف لانچ مخالف سمت میں بڑھتی جا رہی تھی تو دوسری طرف رات تیزی سے صبح کی جانب رواں تھی۔

میں سب سے پہلے اپنے کام کو چھوڑ کر اس گروہ کی سرکوبی کے لیے سوچنے کا سوال تو پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان جیسے درندے کتنے تھے جو دنیا بھر میں عورت کی حرمت کی سوداگری میں اپنا منہ کالا کر رہے تھے اور نامۂ اعمال کو سیاہ کر رہے تھے مگر ان کے خلاف میں معذور تھا اور وہ خوش تھے۔ ان سے بدتر گناہ دھکے کا روبار میں لاکھوں قرش تھے مگر مجھے ان سے سروکار نہ تھا۔ میرا واحد مقصد اس لانچ کو لے کر مقررہ منزل پہنچنا تھا۔ اگر فروش ایک بردہ فروش نہ ہوتا کوئی شریف آدمی ہوتا تب بھی میں اس مقصد سے کنارہ کش نہ ہوتا لیکن ایسے کاروبار کا شیطانی چہرہ اور اس کے کاروبار کا گھناؤنا پہلو سامنے آ جانے کے بعد تذبذب کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ سب ایک جیسی سزا کے مستحق تھے جو موت سے کم ہو سکتی تھی۔

میری آواز نے یا بلیک روز کی چیخ نے جو اس کے حلق سے نکلنے والی آخری آواز تھی فروش کو چوکنا کر دیا ہوگا۔ مجرم کی فطرت کو پہچاننے والی چھٹی حس یوں بھی بہت تیز ہو جاتی ہے۔ میں بلیک روز کے کمرے سے نکلا ہی تھا کہ فروش کے کمرے میں سے دوسرا بھوری ویسٹ غلام نکلا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی اس کی حیوانی جبلت جاگ اٹھی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب ہم میں سے ایک ضرور مارا جائے گا۔

فرق سیکنڈ کے ہزارویں حصے کا تھا یا اس سے بھی کم مگر وہ مجھ سے پہلے فائر کے لیے ہاتھ اٹھا چکا تھا۔ اس وقت میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ فاصلہ بہت کم تھا۔ نہ اس کا نشانہ خطا ہونے کا کوئی امکان تھا اور نہ میرے لیے اس کی چلائی ہوئی گولی کے راستے سے ہٹ جانا ممکن تھا۔ فائر میں نے بھی کیا مگر بعد میں۔

یہ غالب تھا جس نے اسے بروقت نشانہ بنایا۔ اس کمرے کے دروازے کی اوٹ سے جس میں فروش کے پہلے باڈی گارڈ کی لاش پڑی ہوئی تھی، غالب راہداری پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ یقیناً اس وقت تک غالب کو بھی اندازہ ہو چکا ہوگا کہ راہداری میں اچانک سامنے آ جانے کے بعد میرے لیے خود اپنے دفاع میں کچھ کرنا ممکن نہیں رہا۔

میرے حریف کی چلائی ہوئی گولی شاید میرے اوپر سے گزری اور جو گولی میں نے چلائی تھی وہ بھی نشانے پر نہیں لگی۔ غالب کی گولی لگتے ہی وہ اچھلا اور پیچھے کی طرف گر گیا۔ اب انتظار میں وقت گزارنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ فائر ایک کے بعد ایک ہوئے تھے چنانچہ لانچ کے عملے سے فروش تک ہر شخص سمجھ گیا ہوگا کہ ان کو سنگین خطرات کا سامنا ہے۔

وہ سنگین خطرات میں سفر کرنے کے عادی تھے اور ہر قسم کی گڑبڑ سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اب ایک کھلی جنگ ہوگی۔ خونریز، مختصر اور فیصلہ کن۔ میں نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر آگے جست لگائی۔ فروش اپنے کیبن سے مشین گن لے کر نکل رہا تھا کہ میں اُس سے ٹکرا گیا۔

ہم دونوں اندر جا گرے۔ اس کے پیچھے کوئی چیز آ گئی تھی جس نے اُسے سنبھلنے نہ دیا۔ وہ سر کے بل گرا تو مشین گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں فروش سے ٹکرانے کے بعد گھوم گیا تھا اور دہلیز سے ٹھوکر کھا کے گرا تھا چنانچہ میں اوپر رہا تھا۔ اُس اسٹول کے اوپر سے گزر کے میں فروش کو دبوچنے میں کامیاب رہا۔ اس کا ہاتھ پھر مشین گن کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میں نے اس کی کلائی پر ہتھیلی ماری۔ اس نے بڑی پھرتی سے مجھے دونوں ٹانگوں پر اٹھا کے پیچھے اچھال دیا۔ چونکہ کیبن مختصر تھا اس لیے میں چھت اور دیوار سے ٹکرا کے واپس آیا تو پھر فروش کے اوپر گرا۔ فروش نے

wwwpaksociety

میری گردن کو ایک ہاتھ کے شکنجے میں کسنے کی کوشش کی مگر میں نے اُسے پلٹ دیا۔ اب اُس کی گردن میری بغل میں آ گئی۔ میں نے دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں اُس کی آنکھوں میں گھونپ دیں۔ وہ درد سے چلایا لیکن اب وہ وقتی طور پر اندھا ہو چکا تھا اور پوری طرح میری گرفت میں تھا۔

"مسٹر فرزش! تم نے دیکھا کہ جب شامت آتی ہے تو آدمی اپنے دشمن کو پہچاننے میں کیسے غلطی کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور تقدیر کیسے دھوکا دیتی ہے۔"

"تم... تم فرینچ جانتے ہو؟ کون ہو تم؟ کس نے بھیجا تھا تمھیں؟" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

"کسی نے نہیں۔ تم خود آئے تھے اپنی موت کی طرف۔ ہم نے کوئی ایس او ایس نہیں دیا تھا تمھیں۔" میں نے اُسے جھٹکا دے کر کھڑا کر دیا۔ "تم دینا چاہو گے کوئی آخری پیغام؟"

"مجھے معلوم ہے... تم کس کے آدمی ہو؟"

میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے بحث کرنا بے مقصد سمجھا۔

"چلو اچھا ہے اگر تم کو معلوم ہے۔ اب آگے چلو اور دو باتیں ذہن میں رکھو۔" میں نے کہا۔ "ایک یہ کہ میرے ہاتھ میں ریوالور ہے، دوسری یہ کہ ریوالور کے نہ ہونے سے بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمھاری گردن توڑ دوں گا۔"

"تم کیا چاہتے ہو... سودا کر لو مجھ سے..."

میں نے اُسے آگے دھکا دیا۔ "سودے کی بات بعد میں۔ پہلے مجھے بتاؤ کہ وہ سب بدبخت عورتیں کہاں ہیں اور اپنے عملے کو یہ بات بھی سمجھا دو کہ اب مالک ہم ہیں اور انھیں ہمارے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے بلا چون و چرا۔"

لانچ کے زیریں حصے میں جہاں ابھی تک خاموشی تھی اب چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ میں فرزش کی رہنمائی کے بغیر بھی اس قید خانے تک جا سکتا تھا جس میں اسّی لڑکیاں مالِ تجارت کی طرح رکھی گئی تھیں مگر میں اُن سب کے سامنے فرزش کو ایک مجرم کی طرح پیش کرنا چاہتا تھا۔ شاید فائرنگ کی آواز سننے کے بعد نیچے بھی خوف و ہراس پھیلا تھا یا اُن کے محافظوں نے عورتوں کے گوداموں میں ہنگامی صورتِ حال کے مطابق کارروائی کی تھی۔

غالب نے اس عرصے میں بڑی عقل مندی سے کام لیتے ہوئے لانچ چلانے والے عملے کو بھی سمجھا دیا تھا کہ تختہ اُلٹا جا چکا ہے مگر انھیں کوئی فرق نہیں پڑے گا، اگر وہ حسبِ سابق احکامات کی تعمیل کرتے رہے۔ انھوں نے مزاحمت کے بغیر ہی تسلیم کر لیا تھا اور اب لانچ کا رخ بمبئی کی طرف موڑ دیا تھا کیونکہ ہماری طاقت وہ گولی تھی جو ریوالور کی نال کے ذریعے ان کو خبردار کر رہی تھی کہ وہ خود کشی سے گریز کریں۔

لانچ کے بالکل پچھلے والے حصے میں سے آنے والا راستہ ایک ایسے تہ خانے میں کھلتا تھا جو تقریباً لانچ کی مجموعی لمبائی اور چوڑائی کے برابر ہوگا لیکن اس کی بلندی کہیں بھی پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھی اور ایسا لگتا تھا کہ یہ زیریں منزل جو پہلے ایک ماہی گیر لانچ کا اسٹور تھی بطورِ خاص کشادہ کی گئی تھی۔

اس میں دوہرے دروازوں سے داخل ہونے کا نظام تھا۔ پہلے دروازے کے باہر ایک کرسی پڑی ہوئی تھی لیکن اس پر بیٹھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ اس وقت اندر گیا ہوا تھا اور قیدیوں کے جھگڑے اور شور کو ختم کر کے انھیں خاموش رکھنے کی کوشش میں اپنے دوسرے ساتھی کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

اس دروازے سے گزرنے کے بعد قید خانے کا دوسرا دروازہ تھا جو بند تھا اور جس کے پیچھے سے عورتوں کی دلخراش چیخوں کے ساتھ اُن کے محافظوں کے دہاڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر انھیں غلیظ گالیاں دے رہے تھے۔ دونوں دروازوں کے درمیان چھ فٹ کا فاصلہ تھا اور اس میں بوریاں، کنستر اور کریٹ اس طرح رکھے ہوئے تھے کہ پانچ فٹ کی بلندی تک بنی ہوئی دیواروں کے بیچ میں مشکل سے دو فٹ چوڑا راستہ رہ گیا تھا۔

میں نے ریوالور کو فرزش کی پشت سے لگا رکھا تھا اور بار بار اس کی نال سے فرزش کو دھکیل کر یہ احساس دلا رہا تھا کہ وہ مجھے غافل نہ سمجھے۔ فرزش سر جھکائے آگے چلتا گیا۔ پھر اس نے دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہو گیا کیونکہ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔

جو منظر میں نے اندر دیکھا اُس نے میرے لہو کو منجمد کر دیا یا ایسا حیا سوز، عبرتناک اور انسانیت کو رسوا کرنے والا نظارہ تھا جس کا میں... بیسویں صدی کے مہذب معاشرے کا شہری آج کے دور میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور اگر کوئی مجھ سے کہتا کہ آج بھی جب کہ ہم انسان کی عزتِ نفس، آزادی، جمہوریت اور اقوامِ عالم کے منشورِ انسانی کی باتیں کرتے ہیں، غلامی کا وہ عہد ختم نہیں ہوا جب گھوڑوں گدھوں کی طرح مشقت اور تشدد جھیلنے والے غلام انسان سرِ بازار فروخت ہوتے تھے اور عورتیں اپنے جسم اور گوشت کے بھاؤ پر بکتی تھیں تو میں اسے مبالغہ یا جھوٹ سمجھتے ہوئے کبھی تسلیم نہ کرتا۔

لیکن اس وقت میرے سامنے جو سین تھا اس نے میرے ذہن میں دورِ غلامی کی یاد تازہ کر دی۔ میں نے بہت سی فلمیں دیکھی تھیں جن میں غلاموں کی جانوروں سے بدتر زندگی اور اُن پر توڑے جانے والے وحشیانہ مظالم دکھائے گئے تھے مثلاً مصر زمینِ فرعون — (LAND OF PHARAOS) لیکن اس وقت میرے پیشِ نظر ان سب فلموں کے مناظر سے زیادہ لرزہ خیز اور

دہشت زدہ کر دینے والا منظر تھا۔

تقریباً بیس فٹ لمبے اور چودہ فٹ چوڑے تہ خانے میں اسّی زر خرید عورتیں انتہائی بے بسی کے عالم میں برہنہ کھڑی ہوئی تھیں، گھٹنوں میں سر دیے دُبکی بیٹھی تھیں یا فرش پر پڑی چلا رہی تھیں۔ سب چودہ سے بیس سال کی عمر کی عورتیں تھیں لیکن اُن کے چہروں پر غربت و افلاس اور زندگی کے مصائب کے باعث پہلے ہی اُن میں جوانی کی شادابی و شگفتگی، رعنائی و دلکشی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ ایک نفرت انگیز اور کراہت پیدا کر دینے والا منظر تھا۔ اس قید خانے میں اشرف المخلوقات کی ماں کہلانے والی عورت کو ذلت کی انتہائی پستی میں دیکھتے ہوئے مجھے اپنے انسان کہلانے پر [illegible] لگی۔

دو سفاک درندہ صفت افراد ہاتھوں میں بید کی لمبی لمبی چھڑیاں لیے انھیں بے دردی سے مار رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں کی حرکت سے سائیں سائیں کی آواز آتی تھی پھر اُن کے منہ سے غلیظ گالیاں نکلتی تھیں اور عورتیں ضرب کی شدت سے تڑپ کے چیخ مارتی تھیں تو وہ ہنستے تھے۔ میں نے اُن عورتوں کے جسم پر جا بجا نیل دیکھے اور وہ زخم دیکھے جو رِس رہے تھے، بالکل ہو کے سیاہ داغ بن گئے تھے۔ بکھرے بالوں اور دہشت زدہ آنکھوں والی ان عورتوں کے اس غول کو دیکھ کر مجھے طیش آ گیا۔ آخر غلامی انسان کو بزدل کیوں بنا دیتی ہے؟ اس سے اپنی طاقت کا اجتماعی احساس کیوں چھین لیتی ہے۔ اگر ایک یا دو عورتوں کا کسی مرد کی جسمانی طاقت کے مقابلے میں ٹھہرنا مشکل ہوتا ہے مگر یہاں اسّی عورتیں تھیں اور سب جوان۔ کیا وہ ایک ساتھ ان دو بھیڑیوں پر حملہ نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ ایک دو کو مار گراتے، ریوالور سے فائر کر کے وہ ایک ساتھ اسّی عورتوں کو ہلاک نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ دروازہ بند کر کے ان دونوں سے چمٹ جاتیں تو ان کے جسم کا گوشت نوچ کھاتیں۔ اُن کے ناخن اور دانت کسی سے کم نہیں تھے۔ ایک سو ساٹھ ہاتھوں اور انگلیوں کے ناخنوں کی یلغار کے سامنے وہ دونوں بھیڑیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ دو افراد حاکمیت کا غرور اور آزادی کا احساس رکھتے تھے۔ اسّی عورتیں ذہنی طور پر بھی غلامی کے احساس سے مغلوب تھیں اور اکٹھی ہونے کے باوجود تنہا تھیں۔ اُن میں اجتماعی قوت کا شعور تھا مگر اُسے بیدار کرنے اور منظم کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

مجھے دیکھتے ہی ذرا دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ بید برسانے والے ہاتھ رک گئے۔ جسموں پر تشدد جھیلنے والی عورتوں کی کراہیں اور زخموں کے درد سے تڑپنے والی عورتوں کی آہیں اور سسکیاں رک گئیں۔ ان کی آنکھوں نے خوف اور دہشت کے عکس آمیز چہرے ہٹا کے دیکھا اور ایک لمحے کے لیے اُن کی نظر میری نظر سے ملی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نفرت کا زہر میری ریڑھ کی ہڈی میں آگ بن کے اتر رہا ہے۔ اُن سب کا مجھے ملامت کرنا اور مطعون کرنا بجا تھا کیونکہ میں بھی ایک مرد تھا اور یہ مردوں کی دنیا تھی جس میں مرد ایک طرف کہہ رہے تھے کہ اے ماؤ، بہنو، بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے، جنت تمھارے قدموں کے نیچے ہے۔ اور دوسری طرف اُن کی عزتوں کو اور ان کے جسموں کی پاکیزگی کو خود ہی کتوں کے آگے ڈال رہے تھے۔

خاموشی کا وہ لمحہ بڑا اذیت دینے والا تھا جس میں ہزار سوال تھے اور بے یقینی کے امکان تھے اور آرزو کے بہت سراب طلوع کے قریب کا عکس تھا۔ جب یہ لمحہ گزر گیا تو میں نے ریوالور اُٹھایا اور اُن دونوں کے سر میں ایک ایک گولی ماری جو بید ہاتھ میں لیے گو مگو کی کیفیت میں کھڑے ہوئے تھے۔ وہ گرے تو ان کے سر سے پھوٹنے والا خون ہر طرف پھیل گیا۔ ایک بار پھر فضا چیخوں سے بھر گئی۔ میں نے اُن عورتوں کو اپنے جسم پر پڑنے والے گندے خون کے چھینٹے دیوانہ وار صاف کرتے دیکھا جو قریب تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے لہو کے ہر چھینٹے کو صاف کر رہی تھیں اور پھر ہاتھوں کو دیوار پر رگڑ رہی تھیں اور فرش سے صاف کر رہی تھیں۔ دو عورتیں تو گھبرا کے گر پڑیں اور بے ہوش ہو گئیں۔ جو سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی تھیں یا فرش پر بے حس پڑی تھیں انھوں نے خون میں لت پت ان درندوں کو دم توڑتے دیکھا جو اُن کی ساری ذلت و اذیت کے ذمے دار تھے اور اس منظر کو یوں دیکھتی رہیں جیسے یہ بھی خواہشوں کا سراب ہے ورنہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کچھ عورتوں نے ہسٹریائی دیوانگی میں دیوانہ وار ہنسنا شروع کیا۔

"میری بہنو!" میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "مجھے معاف کر دو کہ میں بہت دیر سے آیا اور تم کو اس حال میں دیکھنے پر مجبور ہوا۔ خدا نے چاہا تو میں تم سب کو عزت آبرو کے ساتھ واپس اپنے اپنے گھر پہنچاؤں گا۔ شاید میں ہر ایک کے ساتھ نہ جا سکوں مگر آج ہی تم سب کو آزادی ملے گی اور ایک موقع ملے گا کہ تم اپنی اپنی ہمت سے کام لے کر واپس وہیں جا سکو جہاں سے تم کو لایا گیا تھا۔ کیا تم جانا چاہتی ہو؟"

بیشتر عورتوں نے اقرار میں سر ہلایا۔

"اس کے لیے موقع میں فراہم کر رہا ہوں اور بھی جو کچھ تم کو میں دے سکا ضرور دوں گا لیکن اصل چیز تمھاری اپنی ہمت ہے جو تمھارے کام آئے گی۔ ان درندوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نہ تمھارا تعاقب کریں گے اور نہ پھر کبھی تم پر ہاتھ ڈالیں گے۔ ہم نے دُنیا کو ان کے ناپاک وجود سے نجات دلا دی ہے۔"

www.paksociety.com

میرا خیال ہے کہ وہ بہت کم اردو سمجھتی تھیں۔ بہرحال جو کچھ میں کہہ رہا تھا، وہ واضح تھا۔ میرے عمل سے ثابت ہو چکا تھا۔

"اصل مجرم یہ ہے۔" میں نے فروش کو دھکا دے کر منہ کے بل گرا دیا۔ "اس کو میں بھی سزا دے سکتا تھا لیکن اسے میں تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ سب مل کے اس پر ٹوٹ پڑو کیونکہ تم سب کو اس سے اپنی اپنی رسوائی کا انتقام لینا ہے۔ ڈرو نہیں، یہ خالی ہاتھ ہے اور میں یہاں موجود ہوں۔"

فروش چلایا۔ "یہ . . . یہ تم کیا کر رہے ہو؟" اور اٹھ کے میری طرف لپکا۔ میرے ایک مکے نے اسے چت کر دیا۔

"شاباش . . . ہمت سے کام لو، تمہیں ہمت کی ضرورت ہے۔ ہر دشمن کے خلاف خود تم کو لڑنا ہے خواہ تمہاری دشمن اپنی ہی تقدیر کیوں نہ ہو۔ جب تک تم خود کچھ نہیں کرو گی، خدا بھی تمہاری مدد نہیں کرے گا۔"

معلوم نہیں میرا یہ فلسفہ کس حد تک انھیں قائل کر سکا اور اس کا کتنا حصہ ان کے دماغ میں بیٹھا۔ لیکن میرے اشارے نے انھیں خوف سے نجات دلا دی۔ کچھ خوشی کے بستر پر ابھر بیٹھ گئی تھیں مگر کم سے کم نصف تعداد اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں نفرت کی اور انتقام کی آگ دہکنے لگی تھی اور اس کے شعلے بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے تھے۔

وہ کسی آدم خور چڑیلوں کے غول کی طرح اپنے پنجے پھیلا کے اور دانت تیز کر کے آگے بڑھیں۔ فروش نے اٹھ کر بھاگنے کی آخری بے سود کوشش کی۔ میں نے ایک اور مکا مار کے اُسے اُن عورتوں کے درمیان پھینک دیا۔

پھر میں نے وہ منظر دیکھا جو نہ میں نے کسی فلم میں دیکھا تھا اور نہ کسی دہشت ناک خواب میں۔ جو کسی فلم میں دکھایا جاتا تو ہال میں بیٹھے ہوئے کمزور دل لوگ بے ہوش ہو جاتے۔ اس سے ملتا جلتا سین میں نے گزشتہ روز بھی دیکھا تھا جب گل کے جسم کو لال چیونٹے چاٹ رہے تھے۔

اب گل کی جگہ فروش پڑا ہوا تھا اور لال چیونٹوں کی جگہ وہ عورتیں تھیں جو اپنے جسم کی بے لباسی، اپنی ساری ذلت و رسوائی کے احساس کو بھول کر اپنے بدترین دشمن کو وحشیانہ جذبے کے ساتھ انتہائی اذیت دے کر ہلاک کرنا چاہتی تھیں۔ وہ تہ خانہ اب فروش کی چیخوں سے اور ان عورتوں کی ہذیانی ہنسی سے گونج رہا تھا۔ وہ فروش کو دانتوں سے اُدھیڑ رہی تھیں اور ناخنوں سے نوچ رہی تھیں۔ فروش کا خون بہہ رہا تھا۔ ان کے ہونٹ خون سے لال ہو رہے تھے اور ہاتھ خون سے بھر گئے تھے۔ دیوانگی میں وہ اپنے ہونٹ چاٹ رہی تھیں اور ہاتھوں کو چاٹ رہی تھیں۔

دس منٹ بعد یہ خونریز کھیل ختم ہو گیا۔ کچھ عورتیں احساس کے ردِعمل سے بے ہوش ہو گئیں۔ باقی دور کھڑی ہو کر اپنے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگیں جن پر خون جم رہا تھا۔ درمیان میں فروش کی لاش پڑی رہ گئی۔ گوشت کے اُدھڑے ہوئے ٹکڑے بکھری ہوئی کھال، لہو آلودہ اور شکستہ۔ اس کی آنکھیں بھی ان خونخوار عورتوں نے نکال دی تھیں اور اس کے چہرے پر سے [illegible] بہت سی عورتیں اُبکائی لے رہی تھیں۔ خود میں نے متلی محسوس کی اور اوپر بھاگا۔

میں نے کئی بار منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ لانچ کے عرشے پر لیٹ کر لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ ٹھنڈی ہوا نے میری طبیعت کو کسی حد تک بحال کر دیا۔ جب مجھے احساس ہوا تھا کہ میں نے انھیں سمندر کے عذاب ناک سفر کی صعوبت اور بے چارگی کی موت سے بچا لیا تھا تو میں نے کتنا اطمینان محسوس کیا تھا اور اب یہ احساس تھا کہ میری روح کا آزار بن گیا تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا کیا اسے میں تمام عمر فراموش کر سکوں گا؟ یہ میری زندگی کے بدترین تجربات میں سے ایک تھا۔

اچانک میں نے کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ پھر کوئی عورت چیخ مار کے رونے لگی۔ میں نے آنکھیں کھول کے سر اٹھایا اور بجلی کی طرح لپک کے اٹھا مگر مجھے دیر ہو گئی۔ ایک عورت کے جسم کا ہیولا سا فضا میں لہرایا اور غائب ہو گیا۔ اُس نے عرشے کے کنارے سے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی۔ دوسری عورت جو اس کے پیچھے آئی تھی ابھی سکتے کے عالم میں کھڑی تھی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے بھی خود کو سمندر کے حوالے کر دیا۔

میں نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی مگر لانچ بہت پیچھے چھوڑ کے آگے جا چکی تھی۔ یہ وہ عورتیں تھیں جنھوں نے [illegible] سے ہی موت کو گلے لگانے کو ترجیح دی تھی۔ زندگی کی [illegible] تھیں اور ضرورت مگر وہ جینے پر مجبور تھیں۔ اُن کے لیے واپسی کے راستے مسدود ہو گئے یا پھر وہ اپنی آنکھوں میں بے آبروئی کا اعتراف لے کر اُن گھروں میں داخل ہونا نہیں چاہتی ہوں گی جو آبرو کے حصار تھے۔

میں نے انھیں بچانے کی کوشش کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ انھیں بچانا ممکن ہوتا تب بھی بے مقصد ہوتا۔ زندگی تو اس کی ہے جو جینا چاہے۔ زبردستی کسی کو ماہ و سال کی زنجیروں میں جکڑے رکھنا اور ایک عمر کو قید بامشقت کی طرح کاٹنے پر مجبور کرنا بھی تو ظلم ہے۔

میرے پاس وقت بھی نہیں تھا۔ مجھے احساس تھا کہ لانچ میں چند ایسی ضرور ہوں گی جو واپس جا کے خوش نہیں ہوں گی کیونکہ وہ مفلسی اور فاقہ کشی، ہر خواہش کے احساسِ محرومی سے سمجھوتہ کرنے کی مجبوری اور ناامیدی کی زندگی سے نکل گئی ہیں [illegible]

ہر ان کے لیے سارے پرانے عذاب تھے۔ اُن کا سرمایہ ایک جسم تھا جو یہاں بھی پامال ہوتا۔ باہر جسم کے عوض کچھ خوابوں کی تعبیر ملتی۔ بہت سی ایسی ہوں گی جو عزت دار گھرانوں میں پاس سے پہلے قبول نہیں کی جائیں گی کہ ان کا وجود ایک بدنما داغِ ندامت بن چکا ہے۔ میں ان سب کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سب کے ساتھ اپنی تقدیر ہے اور میری تدبیر اسے بدل نہیں سکتی۔

اب صبحِ کاذب کا اجالا پھیل رہا تھا۔ صبح قریب تھی اور غالباً چند گھنٹوں میں ہماری منزل آنے والی تھی۔ میں نے ایک سگریٹ جلا کے اعصاب کو سکون دینے کے لیے چند کش لیے پھر میں غالب کے پاس گیا۔ اُسے مختصراً ان بدبخت عورتوں کے بارے میں بتا کے واپس لوٹ آیا۔ غالب کے لیے لانچ چلانے والوں کے سر پر سوار رہنا ضروری تھا۔

لانچ کے سر کیبن سے مجھے چند کپڑے، بہت سی چادریں اور تولیے، فروش کے کوٹ اور دوسرے لوگوں کی قمیصیں اور پتلونیں ملیں۔ وہ سب میں نے نیچے اُن عورتوں تک پہنچا دیں جو پہلے ستر پوشی کے احساس سے ہی بے نیاز تھیں مگر اب سمٹی بیٹھی تھیں۔ اُن میں سے مجھے چار لڑکیاں ایسی ملیں جو اردو بھی سمجھتی تھیں اور بولتی بھی تھیں۔ وہ سب تعلیم یافتہ تھیں اور ان بردہ فروشوں کے گروہ نے انھیں بیرونِ ملک لے جا کے اعلیٰ ملازمتوں کے سبز باغ دکھائے تھے۔

میں نے انھیں کہا کہ وہ لانچ پر سے کھانے پینے کا سارا سامان لے جائیں۔ جو پکا ہوا ہے پکا لیں۔ سب کو کھلائیں اور خود بھی کھائیں۔ اس لانچ پر جو کچھ ہے وہ سب ان کا ہے۔ میرے اس اعلان نے جیسے مُردوں میں زندگی کی روح پھونک دی۔ ایک دم لانچ کا گوشہ گوشہ آباد ہو گیا۔ [illegible] پہنے ادھر ادھر پھرتی ہوئی عورتیں مضحکہ خیز ضرور لگ رہی تھیں مگر وہ خوش تھیں، ہنس رہی تھیں اور شرما رہی تھیں۔ مجھے ان کو دیکھنے سے جو خوشی حاصل ہو رہی تھی وہ دنیا کی سب سے انمول [illegible] اور بھرپور خوشی تھی۔

ایک لڑکی نے ڈرتے ڈرتے میرے قریب آ کے پوچھا۔ "سر! آپ کچھ نہیں لیں گے؟ چائے یا کافی؟"

"تمہارا بہت شکریہ۔ اگر تم لا دو گی تو ضرور پیوں گا اور دیکھو میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرا ایک اور ساتھی بھی ہے۔ کیا تم کافی بنا سکتی ہو؟"

"یس سر! آپ دیکھیں گے کہ میں کتنی اچھی کافی بناتی ہوں۔" اس کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا۔ "شکریہ کی کوئی بات نہیں۔ جو کچھ آپ نے ہم سب کے لیے کیا، اس کے بدلے میں یہ کچھ بھی نہیں [illegible] احسان . . ."

[illegible] سے مجھے دکھ ہو رہا ہے۔ جاؤ کافی بناؤ۔" میں نے کہا اور عرشے کی ریلنگ کا سہارا لے کر صبح صادق کے آثار کو مشرق کے افق پر نمایاں ہوتے دیکھتا رہا۔ اب میرا ذہن پہلے کے مقابلے میں بہت پرسکون تھا اور میرے تھکے ہوئے اعصاب ایک رات کے ایڈونچر کو سر کر لینے کے بعد کم کشیدہ تھے تاہم نیند کی کمی اور تھکن مجھ پر اثرانداز ہو رہی تھی لیکن اب سونے کا وقت گزر چکا تھا۔

جب وہ لڑکی کافی لے کر آئی تو میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے تسلیم کیا کہ اس سے بہتر کافی کا ذائقہ میں نے پہلے نہیں چکھا۔ حالانکہ اس کافی میں بنانے والے کی مہارت کا دخل ہی نہیں تھا۔ یہ انسٹنٹ کافی تھی جو گرم پانی میں حل ہو جاتی تھی جس میں دودھ اختیاری۔ میری تعریف سے خوش ہو کے وہ مزید کچھ باتیں کرنے کے موڈ میں تھی اور مجھے اپنے بارے میں بتانا چاہتی تھی کہ کس طرح وہ ان بردہ فروشوں کے شکنجے میں پھنس گئی تھی اور شاید اس کے بعد مجھ سے سوال کرتی کہ ہم کون ہیں جو مصیبت زدگان کی مدد کسی غرض کے بغیر کرنے کے لیے یوں نازل ہو گئے تھے لیکن میں اتنی عورتوں کی بدبختی کی کہانیاں سن کے مزید دکھی ہونا اور سب کی سنتا تو [illegible] پاتا۔ پھر مجھ سے اپنے بارے میں سچ بتانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ میں نے جھوٹ بولنا بھی غیر ضروری جانتے ہوئے اُسے ٹال دیا۔

اس کی دل شکنی تو ہوئی مگر میرا ذہن اپنے مسائل کے بارے میں سوچنے کے لیے آزاد رہا۔ میں کافی کا مگ لے کر وہاں چلا گیا جہاں غالب اور لانچ کے عملے کے درمیان سرد جنگ کی خاموشی تھی۔ ماتحت عملہ قیدی عورتوں کو آزادانہ گھومتا پھرتا دیکھ کے اور اُن کے ہنسنے بولنے کی آوازیں سن کے یقین کر چکا تھا کہ تختہ واقعی اُلٹ چکا ہے اور اب واپسی کا مطلب ہے قانونی کارروائی، عمر قید، بردہ فروشی سے حاصل ہونے والی دولت کی عیاشی ختم اور وہ عذاب شروع جس کا ڈر تھا۔

غالب اکیلا تھا چنانچہ اُن کی جامہ تلاشی نہ لے سکا تھا۔ کافی ختم کرنے کے بعد میں نے باری باری ان دونوں کی ہر جیب خالی کی۔ ایک نے تو ناسمجھی میں مجھے حال بتا کے غالب سے ہتھیار رکھوانے کی مختصر سی جدوجہد کی۔ میرے ہاتھوں پٹ کر وہ [illegible] ہوئی ناک، پھٹے ہوئے ہونٹ اور ایک ٹوٹے ہوئے بازو کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اُس کے جسم کی چولیں دو منٹ میں ڈھیلی ہو گئیں چنانچہ وہ بری طرح کراہ رہا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی وقت پر عبرت پکڑ کے بچ گیا۔

اب ہم دونوں زیادہ بے فکری کے ساتھ بیٹھ گئے۔ میں نے غالب کو فروش کی موت کا واقعہ صرف اس لیے تفصیل سے سنایا کہ وہ دونوں سنیں جو شعلے کے پسماندگان میں سے تھے۔

"کیا تم ہمیں بھی مار ڈالو گے؟" اُن میں سے [illegible]

www.paksociety.com

جانے والا بولا۔
"اس کا انحصار۔ ۔ ۔ حالات اور تمہارے رویے پر ہے۔"
میں نے گول مول جواب دیا۔
"میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن آپ مجھے ایک موقع دیں۔ میں آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔" وہ بولا۔ "میں ان کا ساتھ چھوڑ دوں گا۔ اگر آپ نے مجھے پولیس کے حوالے کیا تو بہت برا ہوگا۔"
"برائی کا نتیجہ تو برا ہی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا اس بیہودہ سادوی تجارت پر تم نے کبھی غور نہیں کیا تھا؟"
"میں لالچ میں اندھا ہو گیا تھا۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ "بڑا گناہگار ہوں میں۔ ۔ ۔"
"کب سے شریک ہو تم ان کے کاروبار میں؟"
"تین سال سے۔" وہ بولا۔
"اس گروہ میں اور کتنے لوگ شامل ہیں؟"
"بس یہی لوگ تھے، باقی تو ایجنٹ ہیں جو ہر جگہ سے مال لا کے سب ہمیں دیتے ہیں۔" وہ آنسو پونچھ کے بولا۔
"بے غیرت لوگ۔ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کا خیال نہیں آتا تھا ان کے دل میں، کہاں سے لاتے تھے یہ مال؟"
"پورے آندھرا سے۔ ۔ ۔ زیادہ بمبئی اور کلکتے سے۔ اب ڈھاکا سے۔ ۔ ۔"
"کیسے، زبردستی اغوا کر کے۔ ۔ ۔؟"
"اغوا بھی کرتے ہوں گے۔ بمبئی میں تو زیادہ تر وہی آتی تھیں جو گھروں سے فلمی ہیروئن بننے نکلتی تھیں مگر ایکسٹرا بھی نہیں بن پاتی تھیں تو یہ ایجنٹ انہیں باہر اچھی جگہ رکھوانے کا سبز باغ دکھا کے لے آتے تھے۔ باقی پیشہ ور عاشقوں کے جال میں پھنس کے آتی تھیں۔"
"پیشہ ور عاشق؟"
اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کچھ کالج کے لڑکے ہیں جن کی شکل صورت اچھی ہے اور جو باتیں کرنا جانتے ہیں لیکن ہیں غریب۔ ان کو اسی کام کا معاوضہ دیا جاتا ہے ہر ماہ۔ وہ شہزادوں کی طرح رہتے ہیں، تحفے تحائف دیتے ہیں اور اپنا جال پھیلاتے پھرتے ہیں ہر جگہ۔ جو لڑکی پھنسی وہ بالآخر ہمارے پاس پہنچی۔ سب اپنے کام کے ماہر ہیں۔"
"کاش میرے پاس وقت ہوتا تو میں ان سب پیشہ ور عاشقوں کے نام پتے تم سے پوچھتا اور پھر ایک ایک کو ٹھکوا دیتا۔" میں نے افسوس کے ساتھ کہا۔ "سب کالج کے لڑکے ہیں؟"
"سب تو نہیں، زیادہ تر، باقی انہی کے جیسے کلرک وغیرہ ہیں۔ ان کے لیے تو یہ کام نہیں عیاشی ہے، پیسہ الگ ملتا ہے نئی نئی لڑکیاں الگ ملتی ہیں۔ غریب لڑکیاں ہوتی ہیں، اس لیے بہت جلد خوابوں کی اسیر ہو جاتی ہیں۔" وہ بولا۔
"سبحان اللہ! کیا مشاہدہ اور تجزیہ ہے اور کیا شستہ زبان ہے۔" میں نے کہا۔ "اہل زبان ہو تم تو!"
"میں نے اردو میں آنرز کیا ہے۔" وہ بولا۔
مجھے سخت صدمہ ہوا۔ "کاش تم نے کیا ہوتا۔ پڑھے لکھوں کی لٹیا ڈبو دی تم نے۔ ہمیں بھی اب شرم آنے لگی ہے خود کو تعلیم یافتہ کہتے۔ تم میٹرک فیل ہوتے تو مجھے افسوس نہ ہوتا، کم از کم ادب نہ پڑھا ہوتا تم نے۔"
غالب نے کہا۔ "تم ملازم تھے یا پارٹنر؟"
"سب حصے دار تھے۔ فروش کا پچاس فیصد تھا، اس میں سے وہ بلیک لارڈ کو بھی دیتا تھا۔" وہ بولا۔ "باقی سب کو کیا ملتا تھا؟"
"بلیک لارڈ کا اس کاروبار میں کیا کردار تھا؟"
"وہ باہر کی ایجنٹ تھی، سپلائی کے آرڈر لیتی تھی اور مال لینے والے تلاش کرتی تھی۔ وہ کالی ضرور تھی مگر اس کے کالے جادو کا توڑ نہیں تھا۔ بڑے بڑے اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے اور اسی کی مدد سے وہ تعلقات کا دائرہ وسیع کرتی جاتی تھی۔ اس پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا اور اس کی وجہ سے ہم محفوظ رہتے تھے۔"
یہ سب کچھ جان لینے کے بعد فیصلہ آسان ہو گیا تھا۔ اگر مجبوری کا عذر پیش کرتے کہ وہ غربت کی مجبوری یا جان کے خوف سے اس مذموم کاروبار میں شریک تھے تو مجھے سوچنا پڑتا لیکن اب اس عالم فاضل نے خود ہی اعتراف کر لیا تھا کہ وہ رضاکارانہ طور پر اس دھندے میں شریک تھے اور ان کی حیثیت ملازم کی نہیں پارٹنر کی تھی۔ ان کا وہی انجام ہونا لازمی تھا جو دوسرے پارٹنر کا ہوا۔ وہ ایک چالاک آدمی تھا۔ اس نے سچ بول کے اور تمام معلومات فراہم کر کے وہی رعایت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جو وعدہ معاف گواہ کو مل جاتی ہے لیکن ایم آر ایس اس قانون کو نہیں مانتی تھی جس کو مجرم بھی قانون نہیں مانتے تھے، چنانچہ ہم ایم آر ایس کے نظام انصاف کے مطابق سزا دینے میں حق بجانب تھے اور ہمارے لیے اطمینان کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ آج تک ہم نے انصاف کے نام پر کسی بے گناہ کو سزا نہیں دی تھی، سزا صرف وہی پاتے تھے جو مجرم تھے اور اس خوش فہمی میں رہتے تھے کہ وہ قانون کو خرید سکتے ہیں اور بدل سکتے ہیں، قانون سے کھیل سکتے ہیں، قانون کے ہاتھ کو معطل کر سکتے ہیں اور بے بس کر سکتے ہیں اور اسے تماشا بنا سکتے ہیں اور قانون ان کے تابع ہے، وہ قانون کے تابع نہیں ہیں۔ ایسے سب مجرموں کے لیے ایم آر ایس کے نظام انصاف کی گرفت میں آ جانے کے بعد بچ جانا ناممکن ثابت ہوا تھا۔ ثبوت مٹانے، شہادت غلط کرنے

۔۔۔وں سے مہلت حاصل کرنے کی یہاں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سارے فیصلے جائے واردات پر ہو رہے ہوتے تھے جہاں زبانِ خنجر چپ رہتی تھی اور آستین کا لہو۔
"صبح ہو گئی۔" غالب نے اچانک کہا۔
میں نے چونک کر سورج کو دیکھا جو سمندر سے ابھی ابھی ابھرا تھا۔ اس کا زرد گولا بجھا بجھا سا لگتا تھا۔
"آج جمعرات ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم پہنچ گئے۔"
غالب مسکرانے لگا۔ "ہاں شام سے پہلے پہنچ گئے۔"
"خدا کرے وہ بھی خیریت سے پہنچ گئے ہوں۔" میں نے نازو اور محسن کا نام لیے بغیر کہا۔ "معلوم نہیں ان کا سفر کیسا گزرا۔"
"ان کے پاس اسباب ضرورت تھا۔"
"سفر کی سختی تو وہی تھی اور ہم دونوں کے مقابلے میں صرف محسن کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اتنی ہی قوت برداشت رکھتا تھا۔"
"نازو، محسن سے زیادہ سخت جان ہے۔" غالب نے کہا۔ "مگر ہاں کمی کی طرف سے مجھے بھی تشویش ہے۔"
کمی اور نازو کے نام پر لانچ چلانے والے نے بھی چونک کر دیکھا لیکن میں نے اہمیت نہیں دی۔ اس کے سامنے ہم کھل کے بات کر سکتے تھے۔ اب اس سے یہ خطرہ نہیں رہا تھا کہ وہ ہمارا راز افشا کر سکے گا کیونکہ اس کی زندگی کا سفر بھی اس سفر کے ساتھ ہی تمام ہونے کو تھا۔
"تم بمبئی کے ساحل سے کس حد تک واقف ہو؟" میں نے لانچ چلانے والے سے کہا۔
"میں پورے ساحل سے واقف ہوں، بمبئی سے مدراس، کنیا کماری اور اڑیسہ کے ساحل سے کلکتے تک۔" وہ فخر سے بولا۔
"ہوں۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "بمبئی کے ساحل پر یا اس کے قریب کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم بحفاظت اتر سکیں اور کوئی ہمیں اترتے نہ دیکھے؟"
اسے اب یقین ہو چلا تھا کہ اپنی افادیت ثابت کر کے شاید وہ ہمارے ساتھی کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ "میں سمجھ گیا۔ ہم خود ایسے ہی مقامات تلاش کرتے رہتے ہیں، ہر بار ایک ہی جگہ استعمال نہیں ہوتی۔" وہ بولا۔
"ایلیفنٹا کے پاس ہی کہیں لانچ کو ایسی جگہ لے چلو جو بمبئی سے نزدیک ہو تو کوئی حرج نہیں مگر اس جگہ کو عام طور پر کوئی بھی استعمال نہ کرتا ہو۔" غالب نے کہا۔
"وہاں کنارے جانے میں صرف بندرگاہ استعمال ہوتی ہے۔ تمام ساحل اس وقت ویران ہوں گے۔ پولیس اور چھاپے مارنے والے سب تو شہر میں سو رہے ہوں گے۔ ویسے آپ کو جانا کہاں ہے؟" وہ بولا۔
"ہمیں کہاں جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "جانا ان بد نصیب عورتوں کو ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کو بھی ان کی واپسی کی خبر ہو ورنہ یہ پھر پکڑی جائیں گی۔" میں نے کہا۔
"اس کے بعد ہم تو ظاہر ہے بمبئی ہی جائیں گے۔" غالب نے کہا۔
"تمہارے خیال میں اب کتنی مسافت باقی ہے؟" میں نے کہا۔
اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "دو گھنٹے، زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے میں ہم ساحل پر ہوں گے۔"
میں نے اسے غالب کی نگرانی میں چھوڑا اور باہر آ گیا۔ رہائی پانے والی زیادہ تر عورتیں عرشے پر کھڑی سمندر کا نظارہ کر رہی تھیں، وہ سب شریف عورتیں نہیں تھیں۔ ان میں سے چار عورتیں ناکافی لباس کے باوجود بے فکری سے گھوم رہی تھیں اور سگریٹیں پی رہی تھیں۔ ان سب کو کھانے پینے کا وافر سامان مل گیا تھا۔ سگریٹ اور شراب جو پہلے لانچ کے مالک چھپاتے تھے اب ان کے تصرف میں تھی اور وہ چاروں عرشے کے کٹہرے پر جھکی قہقہے لگا رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں بوتلیں تھیں اور لبوں میں سلگتے ہوئے سگریٹ۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ ایک سی خصلت رکھنے والی چاروں اوباش عورتوں کی منڈلی سب سے الگ ہو گئی تھی۔ باقی عورتوں میں سے کچھ مطمئن انداز میں ٹہل رہی تھیں، کچھ مستقبل کے اندیشوں میں گرفتار تھیں اور شاید یہ سوچ رہی تھیں کہ معاشرے نے ان کو واپس قبول نہ کیا تو وہ کہاں جائیں گی، چند ایک ابھی تک لٹے پٹے قید خانے سے ہی برآمد نہیں ہوئی تھیں۔
میں نے اس لڑکی کو بلایا جو میرے لیے کافی لے کر آئی تھی۔ وہ لپک کر آئی۔
"ان سب نے اچھی طرح کھانا کھا لیا ہے؟"
"یس سر۔ آپ دیکھ رہے ہیں ان کی حالت میں تبدیلی۔"
میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ ان کو آگے جا کے کتنی گھنٹے بھوکے پیاسے گزارنے پڑیں۔ کیا یہ سب واپس جانے کے خیال سے خوش ہیں؟"
"سب کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں میں؟" وہ بولی۔ "خوش ہونا تو چاہیے انہیں، لیکن وہ چاروں بے حیا طوائفیں ہیں، وہ یہاں بھی خوش تھیں۔"
"تم خوش ہو؟"
"یقیناً خوش ہوں میں۔" اس نے ممنونیت کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"کہاں رہتی ہو تم؟ بمبئی میں؟ کیا کرتی ہو؟"
"میں نرسنگ کے آخری سال میں تھی۔ آپ نے میرا

www.paksociety.com

کیریئر تباہ ہونے سے بچا لیا۔ میں واپس پہنچ کر کورس پورا کرلوں گی۔ چند دن کی غیر حاضری کا کسی کو احساس بھی نہیں ہوگا۔" وہ بولی۔ "تو شیروال نرسنگ ہوم کے ہوسٹل نمبر ایک میں رہتی ہوں۔"

"والدین ہیں؟"

"نہیں مگر دونوں سوتیلے۔ پہلے ماں مرگئی تھی تو باپ نے دوسری شادی کی۔ پھر باپ مرگیا تو ماں نے۔ ان سے میرا کوئی تعلق نہیں۔"

"ان کے چکر میں کیسے پڑ گئیں؟"

"لمبی کہانی ہے سر۔ یوں سمجھ لیں قسمت نہیں عقل خراب تھی۔ میرا منگیتر ایک ڈاکٹر ہے جو اعلا تعلیم کے لیے باہر گیا ہے۔ بہت اچھا اور نیک آدمی ہے۔ بس وہ بدصورت ہے۔ میں نے اس لیے قبول کیا تھا کہ ایک ڈاکٹر کی بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ میں کوالیفائڈ نرس بن کے اس کی مدد کرسکوں گی اور ہم اپنا کلینک قائم کرلیں گے تو کامیاب رہیں گے۔ بعد میں ایک جو نس میرے پیچھے پڑ گیا۔ وہ بے حد دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے مجھ پر ایسا جادو کیا کہ میں اپنے منگیتر کو بھول گئی۔ میرے لیے مزاحمت ناممکن ہوجاتی تھی۔ کوئی ایسی بات تھی اس میں کہ وہ عورتوں کو ایسے کھینچ لیتا تھا جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتا ہے۔ یہ میں نے کئی بار دیکھا اور میں خود اس کی مثال تھی۔ جب اس نے مجھ سے شادی کے لیے کہا تو میں خوشی سے پاگل ہوگئی۔ جو اس نے کہا میں نے مان لیا۔ ہم نے سول میرج کی۔ ایک ہفتے بعد وہ مجھے اس لانچ پر چھوڑ کے غائب ہوگیا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میرے علاوہ بھی اس کی دو بیویاں اسی لانچ پر ہیں۔ وہ ایک ہی آدمی تھا جس کی تصویر ہم سب کے پاس تھی لیکن ہم تینوں اس کو مختلف ناموں سے اپنا اپنا شوہر مانتی تھیں۔"

"کیا تم سہولت سے تلاش کرو گی؟"

"کیا فائدہ اس سے۔ وہ اسی کا آدمی تھا اور ظاہر ہے اس کا کوئی نام اصل نام نہیں ہوگا۔ باقی دو کا تو مجھے پتا نہیں مگر میں تو اس سے دور ہی رہنا چاہتی ہوں، ورنہ اسے مجھ سے خطرہ لاحق ہوا تو وہ مجھے اغوا کرا لے گا یا قتل کرا دے گا۔ اس کو فی الحال اطمینان حاصل رہنا چاہیے کہ میں اس کے خلاف کوئی انتقامی جذبہ نہیں رکھتی۔ اس سے کوئی تعلق بھی رکھنا نہیں چاہتی۔"

"لیکن تم انتقام لوگی اس سے؟"

"ہاں... ابھی نہیں... سال دو سال... چار سال بعد جب میری شادی اس ڈاکٹر سے ہوجائے گی تو میں بدلہ ضرور لوں گی۔ کسی دن موقع ملتے ہی میں اس کو ایسا انجکشن لگا دوں گی کہ وہ پاگل ہو جائے گا یا مر جانے کا تڑپ تڑپ کے۔"

"ایسا ضرور کرنا... اور اگر ہوسکے تو ان سب کو جو انتقام لینا چاہتی ہیں یہ سمجھانا کہ ان کو بردہ فروش کے فروخت کر دینے والے عاشق ہی اصل مجرم ہیں۔ ان کے ساتھ عفو و درگزر کا ایسا ہی ہے جیسے خطرناک سانپ یا پاگل کتے کو نہ مارنا۔ معاشرے میں ہر سب کا فرض بنتا ہے کہ ایسے لوگوں کو ختم کیا جائے تاکہ ان سے دوسری لڑکیاں اور شریف عورتیں محفوظ رہیں۔ یہ کام قانون نہیں کرتا، کر بھی نہیں سکتا۔ اپنے مجرم کو خود سزا دو۔ اپنی مظلومیت کی تشہیر سے صرف رسوائی ملتی ہے — لاٹھی ٹوٹ جاتی ہے سانپ نہیں مرتا۔"

وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی اور میری بات سنتی رہی۔ "آپ نے ٹھیک کہا سر۔ لیکن اتنی جرأت سب میں نہیں ہوتی کہ قتل کریں اور پھانسی چڑھ جائیں۔"

"حوصلہ ہونا چاہیے۔ اب وہ شخص جس نے تمہیں دھوکا دیا تھا تم سے پہلے نہ جانے کتنی لڑکیوں کو ایسی ہی لانچوں پر روانہ کر چکا ہوگا اور زندہ رہے گا تو آئندہ نہ جانے کتنی اور تم جیسی لڑکیاں جلاوطن ہوکے دنیا کے بازار میں بکیں گی۔ کیا یہ احساس تمہارے لیے باعث اطمینان نہیں ہوگا کہ تم نے ایک شیطان کو ختم کر دیا۔ ایک برائی کو مٹا دیا اور بہت سی لڑکیوں کی عزت بچالی۔ اگر ہر لڑکی جو کسی بھی عزت کے بیوپاری کے ہاتھوں جنسی بازار میں پہنچی تھی ایک خرابی کے سبب کو ختم کردے تو سوچو کتنی خرابیاں ختم ہوجائیں گی۔ یہ ضروری تو نہیں کہ سب پکڑی جائیں۔"

"آپ سب کو قاتل بنانا چاہتے ہیں؟"

"میں سب کو اپنے مقدمے کا مدعی اور منصف خود بنانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "عدالت سے فریاد کرنے اور حاکم کے آگے رونے پیٹنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ شکایت کرنا بھی سزا بن جاتا ہے۔ ہر ظلم کو برداشت کرنے کی عادت ظالم کو شہ دیتی ہے۔ جاؤ اور ان سب کو بھی سمجھا دو۔ ان سب سے کہو کہ ساحل پر پہنچنے کے بعد بھی جب تک ہم نہ کہیں کوئی باہر نہ آئے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں کوشش کرتی ہوں کہ وہ میری بات سن لیں۔"

"ان سب کے پاس نقد رقم ہے؟ پہلا سوال یہ تھا۔"

"بہت کچھ ملا تھا سر۔ سب نے آپس میں تقسیم کرلیا ہے بلکہ میں نے تین لڑکیوں کی مدد سے برابر تقسیم کیا ہے ورنہ تو فساد شروع ہوجاتا۔ ہر لڑکی کو پچاس پچاس ڈالر مل گئے ہیں اور پانچ سو روپے۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے۔ سفر میں پیسہ بھی کام آئے گا۔ ہم انھیں بتا کے ساحل سے رخصت کردیں گے۔" میں نے کہا۔

وہ ایک سمجھدار اور ذہین لڑکی تھی۔ صرف وقت گزارنے

کے لیے میں نے اس کی کہانی سن لی۔ مجھے اندازہ تھا کہ باقی سب کی کہانیاں بھی مختلف نہیں ہوں گی۔ بس کرداروں کے نام اور مقامات کا فرق ہوگا۔ میں نے اس کو ظالم کے خلاف جہاد کا وہ فلسفہ بھی پڑھا دیا تھا جو ایم آر ایس کا فلسفہ تھا۔ مائٹ از رائٹ۔ آگے سب کی اپنی اپنی مرضی اور اپنی اپنی تقدیر ہے جہاں چاہے لے جائے۔

اب ہمارے چاروں طرف کشتیوں اور لانچوں کے ساتھ بحری جہازوں کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی لیکن ساحل کا ہیولا دور دور تک نہ تھا۔ صاف آسمان پر سورج خاصا بلند ہوگیا تھا اور کچھ دم پرواز کرنے والے آبی پرندوں کی قطاریں بھی اب دکھائی دینے لگی تھیں۔ سمندر اس سفر کے دوران پرسکون رہا تھا اور ہوا بھی تیز نہیں تھی ورنہ جیسا کہ میں نے سنا تھا سمندروں کا موڈ بڑا... سائیکلون اور طوفانی گرداب بڑے بڑے بحری جہازوں کو ڈبو دیتے ہیں۔

عرشے پر ٹہلنے والی عورتیں اب سمٹ کر واپس نیچے جا رہی تھیں۔ جس لڑکی سے میری بات ہوئی تھی وہ ایک اچھی منتظم تھی۔ اس نے تین دوسری عورتوں کی مدد سے اس مردم گزیدہ بکھرے ہوئے اور لاوارث ہجوم کو سمجھا بجھا کے قائل کرلیا تھا کہ یہ وقتی پابندی انھی کے مفاد میں ہے اور پابندی لگانے والے انھی کے ہمدرد ہیں۔

وہ چار عورتیں جو بے خبری کی حد تک بے باک تھیں، بوتل سے منہ لگا کے پی رہی تھیں اور نشے سے مغلوب تھیں۔ انھوں نے اس حکم کی تعمیل سے صاف انکار کردیا۔ ان میں سے تین اپنی اپنی خالی بوتلیں سمندر میں اچھال چکی تھیں مگر چوتھی نے آخری گھونٹ لے کر بوتل سے اس لڑکی پر وار کیا تو میرے لیے دور کھڑے ہو کر تماشا دیکھنا مشکل ہوگیا۔ اس نے میرا مقابلہ کرنے کی کوشش بھی کی اور مجھے وہ سب گالیاں بھی سنا ڈالیں جو وہ حقیقت فروش کے لیے تھیں مگر اسے دی نہیں گئی تھیں۔ بالآخر میں اس کو گھسیٹ کر لے گیا اور ہتھ خانے میں پھینک دیا۔ باقی دو کا نشہ ہرن ہوگیا اور وہ خاموشی سے نیچے اتر گئیں۔ آخری عورت جاتے جاتے میرے سامنے ٹھہر گئی۔ اس نے چٹلون پر صرف کوٹ پہن رکھا تھا اور اسے بھی بند نہیں کیا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر دیوانگی کے انداز میں ہنسنے لگی۔ "تم... سالے مرد... سب ایک جیسے ہوتے ہو... وہ گھٹیا نسل کے... کتے تھے... تم... اچھی نسل کے ہو... مگر کتے ہو... مجھے معلوم ہے... تم بھی وہی کرو گے... جو سب مرد کرتے ہیں... پھر ڈرتے کیوں ہو... آؤ میرے ساتھ... میں کچھ نہیں ڈرتی..."

میں نے بلا ارادہ اس کے تھپڑ مار دیا۔ یہ سوچے بغیر کہ ایک فاحشہ جب شراب کے نشے میں ہوگی تو نیکی اور شرافت کی باتیں نہیں کرے گی۔ وہ گری اور چند سیکنڈ ساکت پڑی رہی۔

"بسٹرڈ... یہ چپڑی نہیں ہے... تمھارے پاس؟... تمام تو ہوگیا ہے..." وہ بولی۔ پھر اس نے کوٹ اتار کے پھینک دیا اور سجدہ کرنے کے انداز میں جھک گئی۔ اس کی کمر پر آڑی ترچھی سیاہی مائل نیلی لکیروں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اپنا منہ دوسری طرف کرلیا اور دو عورتوں سے کہا کہ اسے اٹھا کے لے جائیں۔ اس کی بے زبانی بہت دیر تک میرے احساس پر کوڑے برساتی رہی۔ یہ میں کس عذاب میں پڑ گیا میرے خدا۔ میں نے کہا۔ جسم کی اذیت ہی بہتر تھی اس سے تو۔ میں نے عرشے کی ریلنگ پر سر رکھ کے سوچا۔

ساحل کی لکیر جب کے پونے نو بجے نمودار ہوئی۔ میں اس لکیر کو آنکھ سے ساحل بننے کے واضح صورت اختیار کرتے دیکھتا رہا۔ صورت مجھے کچھ بھی نہیں کرنا تھا۔ لانچ کی سمت کو ملاح نے بدل دیا اور بظاہر سب ٹھیک تھا۔ جدھر ہم جا رہے تھے ادھر بہت کم سمندری ٹریفک تھا۔ یہ ظاہر کرتا تھا کہ ہم بمبئی کی اصل بندرگاہ سے آگے نکل گئے ہیں۔ کئی میل پیچھے نظر آنے والی موٹر بوٹس اور کشتیاں، لانچیں اور بحری جہاز ایک مخصوص علاقے میں رواں دواں تھے۔

ساڑھے نو بجے میں نے پام کے درختوں اور اونچی نیچی پہاڑیوں والے ساحل کو اپنے سامنے پایا۔ لانچ کی رفتار اب کم ہوگئی تھی اور یہ سفر بالآخر ختم ہونے والا تھا۔ اس پاس کہیں کوئی دوسری لانچ دکھائی نہ دی۔ جو لائحہ عمل میرے ذہن میں تھا اس کے مطابق سب سے پہلے ان بدقسمت عورتوں کو روانہ کرنا ضروری تھا۔ مگر کیا وہ اس ویران ساحل پر اتر کے روانہ ہوجائیں گی؟ وہ پوچھیں گی نہیں کہ یہ ہمیں کہاں لا کے چھوڑ دیا؟ اس حالت میں ایک ساتھ اتنی عورتوں کا ہجوم جہاں بھی جائے گا شکوک پیدا کرے گا۔ خیر ہماری صحت پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ جو وہ کچھ بھی کہیں اور ہمارے بارے میں جو چاہیں بتائیں لیکن انھوں نے جانے سے انکار کردیا تو پھر — پھر ترکیب میری سمجھ میں آ گئی۔

لانچ اب پتھریلی چٹانوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ لانچ کو چلانے والا خفیہ پناہ گاہوں کے جغرافیے کو سمجھتا تھا اور ہمیں محفوظ مقام پر پہنچانے کا وعدہ اس امید میں پورا کر رہا تھا کہ اس طرح وہ ہم سے رعایت کا مستحق ہوجائے گا۔ یہ اس کی خام خیالی تھی۔ یہ اس کی موت تھی جو اسے گھیر کر یہاں لائی تھی۔

میں نے اس لڑکی کو بلایا جو اب تک عورتوں کے معاملات کو سنبھالنے میں میری مددگار ثابت ہوئی تھی۔ میں نے اسے تاکید کی وہ باہر آنے سے پہلے دروازے کو بند کرا لے۔ لانچ

www.paksociety.com

دو چٹانوں کے درمیان رُک چکی تھی۔ تیسری چٹان سمندر کی جانب تھی چنانچہ لانچ کے نظر آ جانے کا اندیشہ نہیں رہا تھا۔ چوتھی جانب سمندر کا ساحل تھا جو اب بھی پچاس گز دور تھا۔ لانچ اگر اس سے آگے جاتی تو خشکی پر چڑھ جاتی۔

"آپ نے بلایا تھا سر؟"

میں نے کہا "ہاں، تم نے بتایا تھا کہ تم نرسنگ کورس کر رہی ہو۔ اس کے علاوہ کیا کر سکتی ہو؟"

وہ میرے سوال کی نوعیت پر حیران ہوئی۔ "وہ ... سب کچھ جو ایک لڑکی کر سکتی ہے ... سر۔"

"گولی چلا سکتی ہو؟"

وہ خوفزدہ ہو گئی۔ "نہیں ... نہیں سر۔"

"مگر وہ نہیں، مجھے معلوم ہے کہ تمہارا پیشہ تم کو زخم سینا اور ان پر مرہم رکھنا سکھاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حالات کے تقاضے ... وہ سب کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں جو آدمی نہیں کرنا چاہتا ... مجھ پر بھی ایسے وقت آئے جب میرا خیال تھا کہ میں کوئی کام نہیں کر سکوں گا لیکن میں نے کیا ..."

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں سر، صاف کہیے۔"

میں نے جیب سے ریوالور نکالا۔ "یہ لو ... پکڑو۔"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "کیا ... کسی کو قتل کرانا چاہتے ہیں آپ مجھ سے ... ؟ میں نہیں کروں گی یہ کام ... جو کرنا ہے خود کرو۔"

"پہلے میری بات سن لو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "نہ تم کو قتل کرنا ہے کسی کو اور نہ میں اتنا گیا گزرا ہوں کہ تم سے ایسا کام کراؤں۔ کیا تم نے دیکھا نہیں تھا کہ میں نے ہی ان کو گھٹنے کی موت مارا تھا ... تو پکڑو اسے یہ خود بخود نہیں چلتا۔"

اس نے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور ریوالور لے لیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کے اسے ریوالور کو صحیح طرح پکڑنے کا طریقہ بتایا۔

"یہ دیکھو یہ سیفٹی کیچ ہے۔ یوں سمجھو کہ اس کا لاک ہے جب تک یہ اس پوزیشن میں ہے کارتوس غلطی سے بھی نہیں چل سکتا۔ اس کو ہٹانے کے بعد۔" میں نے کہا "یہ دیکھو اس کا رخ سامنے کی طرف رکھو ..."

"نہیں ... نہیں نہیں چلا سکتی اسے ..."

میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ "میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔" میں نے کہا۔ "بس تم اسے ایک ہی رخ میں رکھنا۔ جو تمہارے سامنے ہوگا وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکے گا۔ اس کی دہشت ہی کافی ہوتی ہے۔ اب دھیان سے میری بات سنو۔ میں اور میرا ساتھی یہاں اتر جائیں گے۔ تم اور باقی سب لڑکیاں اسی لانچ سے بمبئی کی بندرگاہ جاؤ گی۔ وہاں پہنچنے کے بعد تمہاری مرضی، اگر چاہو تو اس کو گولی مار دینا۔ ایسے زخمی کر دینا۔ اتنے قریب سے نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ یا پھر اسے پولیس کے حوالے کر دینا۔ پولیس تو آ ہی جائے گی۔ اگر تم اپنی جان پولیس کے چکروں سے چھڑانا چاہو تو اسے گولی مار کے فرار ہو جانا۔ اتنی لڑکیوں کو ایک لانچ سے ایسے عجیب لباس میں اترتے دیکھ کے مجمع تو اکٹھا ہوگا اور پوچھا بھی جائے گا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ تم سب کو جھوٹ بولنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ جو ہوا وہ سب کو بتا دینا۔ اب آؤ میرے ساتھ۔"

بادلِ ناخواستہ وہ میرے ساتھ چل پڑی۔ غالب لانچ کے رُک جانے کے بعد میرے انتظار میں مستعد [illegible] غالب کو اس ناخوشگوار فریضے سے نجات دلا دی جس پر وہ ایک لمحے کے لیے غافل ہونے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

"تم اس بچے کو ساتھ لے جاؤ۔" میں نے لانچ چلانے والے کے دوسرے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ "اور میرا انتظار کرو۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" وہ سرکش لہجے میں بولا۔

"جاؤ گے کیسے نہیں، تمہارا تو باپ بھی جائے گا۔" غالب نے کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ کس طرح جانا چاہتے ہو؟ اپنے پیروں پر چل کر سالم ایک پیس کی صورت میں یا آملیٹ بن کے؟"

"مجھے گولی مارنی ہے تو ابھی یہیں مار دو۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔

"یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے۔" میں نے کہا۔ "او کے میں گنتا ہوں پانچ تک۔ پانچ سیکنڈ بعد تمہاری خواہش پوری ہو جائے گی۔" میں نے صحیح وقفے کے ساتھ پانچ تک گنا۔ وہ نہیں اٹھا تو میرے لیے اس کو شوٹ کر دینا ضروری ہو گیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو خود اپنی نظر میں گر جاتا اور میں خود سب کے سامنے ایک بات کہہ کے اس پر عمل نہ کر سکتا تھا۔ سزائے موت ویسے بھی اس کا مقدر ہو چکی تھی اور شاید وہ بھی یہ بات سمجھ گیا تھا۔

اس کی موت نے میرے ساتھ آنے والی لڑکی کو خوفزدہ بھی کیا تھا مگر اس کے اعتماد میں اضافہ بھی کیا تھا۔ مجبوری کے ساتھ میں نے پریکٹیکل کر کے بتا دیا تھا کہ دشمن کو گولی مارنا کتنا آسان ہوتا ہے۔ اس کے واحد زندہ بچ جانے والے ساتھی کی نظریں پہلے لاش پر مرتکز رہیں۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے سر؟" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔ "میں نے کوئی حکم عدولی نہیں کی۔ آپ سے پورا تعاون کیا۔"

"پہلے تو ہم نے یہی کیا تھا کہ تمہارا انجام بھی مختلف نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم زندہ رہنے کی رعایت حاصل کرنے میں تقریباً کامیاب ہو گئے ہو۔ بس تھوڑا سا کام باقی ہے۔

اب ہم جا رہے ہیں۔ تم ان سب لڑکیوں کو بمبئی کی بندرگاہ پر لے جاؤ گے اور خود کو پولیس کے حوالے کر دو گے۔"

اس کا رنگ فق ہو گیا۔ "پولیس ... ؟"

"ہاں، یہ بات یقینی ہے کہ تم کو سزائے موت نہیں ہوگی۔ تم پولیس کو وہ سب کچھ بتا سکتے ہو جو تم نے کیا، دیکھا یا سنا۔ اعتراف کی صورت میں قانون تمہیں رعایت ضرور دے گا۔ تم کو سات سال شاید جیل میں گزارنے پڑیں گے مگر تم زندہ رہو گے۔ تم مجبوری کا عذر بھی پیش کر سکتے ہو۔ میری طرف سے اجازت ہے کہ خود بھی وعدہ معاف گواہ بن جاؤ۔ یہ کہو کہ تم ان کے ساتھی نہیں تھے اور تم نے ہی ایک غیرت مند انسان ہونے کی وجہ سے بردہ فروشوں کو مار دیا اور لانچ لے کر ساحل پر آ گئے۔ تم لانچ پر کیسے پہنچے تھے اس بارے میں قابلِ یقین اسٹوری خود بنا لو یا سات سال کی جیل قبول کر کے سابقہ زندگی کا کفارہ ادا کرو۔ یہی سال بھی گزر جائیں گے کہ تم کو پھر زندگی گزارنے کا اختیار حاصل ہوگا۔"

"نہیں ... یہی کروں گا۔" وہ بولا۔

"یہ لڑکی بمبئی تک تمہاری نگرانی کرے گی۔" میں نے کہا۔ "اس کو عام لڑکی سمجھنے کی غلطی مت کرنا۔ میں نے اتنی لڑکیوں میں سے اس کو چنا ہے تو اس کی وجوہات ہیں۔ تربیت یافتہ نرس مگر ہے یہ لیڈی کمانڈو اور اس کا نشانہ بھی میں نے دیکھا ہے۔ اگر منہ کھولو تو یہ بیس فٹ کے فاصلے سے تمہاری دائیں آنکھ ..."

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔

"بس تو پھر تم جاؤ۔" میں نے کہا اور لڑکی کے شانے پر تھپکی دی۔ میری تعریف نے اس کو کسی حد تک بے خوف کر دیا تھا۔ وہ ریوالور لے کر وہیں بیٹھ گئی جہاں پہلے غالب بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے پانی میں اتر کر ساحل کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ لہریں میرے گھٹنوں سے اوپر تک آ رہی تھیں اور چٹانوں کے درمیان عجیب جھاگ بن کے ٹوٹ رہی تھیں۔ لانچ آہستہ آہستہ گھوم کے واپس ہوئی۔ میرے خشکی پر قدم رکھنے تک لانچ پھر سمندر میں رواں ہو چکی تھی اور بمبئی کی بندرگاہ کی سمت جا رہی تھی۔

"خوش آمدید!" غالب نے کہا اور ہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ اجنبی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔

"یہ بھی ناممکن ہی لگتا تھا جو ممکن ہو گیا۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں سوٹ اور ٹائی میں تھے مگر ہماری پتلونیں بھیگ چکی تھیں اور جوتوں میں پانی بھر گیا تھا۔ ساحل سے کچھ فاصلے پر کھجور یا ناریل کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ ان کے آگے کچھ جھاڑیاں تھیں اور کچھ دیر آرام کرنے کے لیے وہ جگہ بہتر تھی۔ ہم نے جوتے اتار کے سوکھنے کے لیے ڈال دیے اور خود ریت پر دراز ہو گئے۔ فضا ساکت تھی۔ دور دور تک سمندر کے شور کے سوا کوئی صدا نہ تھی۔ تحفظ اور عافیت کا احساس، سورج کی تمازت سے حاصل ہونے والی راحت اور اعصاب کی کشیدگی کے یکلخت ختم ہو جانے سے ہم اپنے لئے گہرے سکون اور سرور میں ڈوب گئے۔ میں نے نیلے آسمان کو دیکھا اور سوچا کہ سگریٹ نکال کے جلاؤں مگر اس سے پہلے رابعہ کے تصور نے آ لیا۔ وہ ایک خواب تھا جو نیند کی آغوش میں پہنچتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ بعد میں غالب نے بھی اعتراف کیا تھا کہ وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا سب کے بارے میں باری باری مگر اس کے خواب نازو تک محدود ہو گئے تھے۔

میں نے کہا۔ "تم نے دیکھا رابعہ، میں آ گیا ہوں۔"

وہ ہنسی۔ "سونے کے لیے آئے ہو کیا؟ شام تو یہیں ہو جائے گی۔"

میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اس کی بس ایک جھلک ہی تھی جس کا تصور ہنوز قائم تھا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی جس کا مطلب تھا کہ میں کم سے کم تین گھنٹے سوتا رہا تھا۔ ریت پر گرتے ہی مجھے نیند آ گئی تھی جو اتنی گہری تھی کہ بے ہوشی سے کم نہ تھی۔ خواب گہری نیند میں نہیں آتے چنانچہ میں نے تین گھنٹے بعد اس وقت رابعہ کو دیکھا جب شعور خوابیدہ تھا مگر لاشعور بیدار ہو چکا تھا۔

رابعہ کے تصور نے مجھے اتنا بے قرار کیا کہ میں نے غالب کو جھنجھوڑ کے جگا دیا۔ "اٹھو مرشد۔ آنکھیں کھولو۔"

"کیا ہے۔ کیا مصیبت آ گئی اب؟" وہ اٹھ کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "سونے کے لیے آئے ہو کیا؟ شام تو یہیں ہو جائے گی۔"

غالب چونکا۔ "یہ ... کیا کہا تو نے ... پھر کہنا۔"

"کیوں؟ اتنا حیران کیوں ہو رہا ہے؟"

"کمال ہے یار۔ بالکل یہی نازو نے کہا تھا۔ ابھی ابھی تو نہ جگاتا مجھے تو کوئی بات اور بھی ہوتی۔"

حیران ہونے کی اب میری باری تھی۔ "نازو نے کہا تھا؟ تجھے یقین ہے کہ ... بالکل یہی الفاظ تھے۔ میں نے تو جانتے بوجھتے دہرائے تھے۔" میں نے کہا۔

"دہرائے تھے کیا مطلب؟"

"مجھ سے یہ بات رابعہ نے کی تھی۔ میں بھی ذرا ابھی جاگا ہوں۔ وہ خواب میں آئی تھی۔"

غالب مجھے بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا۔ "کیسی عجیب بات ہے۔ کیا تو توجیہ کرے گا کوئی اس کی؟ کہ ایک ہی وقت میں تو نے رابعہ کو خواب میں دیکھا اور میں نے نازو کو۔ اور ایک ہی بات کی دونوں نے ہم سے۔"

"یہ سائیکالوجی اور پیراسائیکالوجی کے ماہرین کے لیے

www.paksociety.com

ایک دلچسپ کیس ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سوتے وقت ہم دونوں کے ذہن میں، بلکہ ہمارے لاشعور میں یہ خوف پنہاں تھا کہ کہیں ہم شام تک سوتے نہ رہ جائیں۔" اس کے ساتھ ہی میرے خیالوں میں رابعہ تھی اور تمھارے خیالوں میں نازو۔"

غالب اٹھ کھڑا ہوا۔ "ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں نے ایک جیسے الفاظ بھی استعمال کیے۔" اس نے اپنی پتلون کو جھاڑ کر پہنتے ہوئے کہا۔ "نازو ایسے بات کہاں کرتی ہے۔"

"پھر کیسے بات کرتی ہے؟"

"اپنی اسی ڈھولی وچھے کی تھانیدارانہ زبان میں۔ مزہ آتا اگر وہ ہاتھ پکڑ کے اٹھاتی، جھنجھوڑ دیتی۔ گھماتی اور الٹ پلٹ کے سیدھا کھڑا کرکے کہتی کہ ہوش آیا، نیند اڑ گئی یا پھر اور اڑاؤں نیند؟" میں ہنس پڑا۔ "تم بھی مجنوں سے کم نہیں ہو۔ بلا کے حال پہ اس کی ہر بات منگوا سی اور پر مرتے ہو اس کی۔"

"یہ تو ہے۔ جیا نے خوب دل سے وہ نازو ہی کیا!"

میری پتلون بھی خشک ہو چکی تھی۔ جوتے خشک ہو کے اکڑ گئے تھے مگر انھیں پہنے بنا چارہ نہ تھا۔ سوٹ کے واش اینڈ ویئر کپڑے کو بھیگنے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا چنانچہ ہم ان بیش قیمت سوٹوں میں خاصے متعریف اور معزز نظر آتے تھے۔

"معلوم نہیں وقت کیا ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

غالب نے اپنے کوٹ کی جیب سے دو بیش قیمت گھڑیاں برآمد کرتے ہوئے ایک مجھے پیش کی۔ "مسٹر فروش کی ایک نشانی۔"

"اور یہ دوسری؟"

"اس ہاتھی کی جس پر تم نے سواری کی تھی۔ دونوں ایک سی ہی چیز ہیں۔" غالب نے کہا۔

"یہ نیک کام کب کیا تم نے؟"

"جب تو اس نرس کو... کیا نام تھا اس کا... یہ لیکچر دے رہا تھا کہ لانچ کو بمبئی لے جانے کے لیے اسلحہ کیسے استعمال کرنا ہے۔"

"اور بھی کچھ ملا ہے؟"

"ہاں۔ مال و زر تو سب انھوں نے لوٹ لیا تھا، جن کو تم نے کھلی چھٹی دے دی تھی کہ لانچ میں جو کچھ ہے تمھارا ہے۔ یہ دو ریوالور بھی ہیں۔" غالب نے اندر ہاتھ ڈال کے دو بہت کارآمد آٹومیٹک ریوالور برآمد کیے۔ پھر ایک سائلنسر جو دونوں پر فٹ ہو جاتا تھا۔ بیک روز کی ایک بہت خوب صورت رسٹ واچ تھی جس کے ڈائل پر ہیروں کے نگینے جڑے ہوئے تھے۔

"یہ چوری کا مال تحفے میں دے گا نازو کو۔ تھانیدار کی بہن ہے۔ پوچھے گی کہ کہاں سے لی؟"

"پہلے تو آپ نوٹ فرمائیں کہ مالِ غنیمت کو چوری کا نہیں کہا جاتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسے مسلمانوں میں جائز تصور کیا جاتا تھا۔ میں نے اسی روایت پر عمل کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس تحفے کی حیثیت ایک سوونیئر کی ہے۔ جب تک یہ چیز پاس رہے گی یادگار ہوگی۔"

"افسوس کہ یہ خیال ذرا دیر سے آیا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ ہم سوکے کی کوئی نشانی رکھتے۔ بعد میں ہمارا ذاتی میوزیم ہوتا جس میں یہ سب چیزیں رکھی جا سکتی تھیں۔ میرے خیال میں اب چلنا چاہیے۔"

"ہم اب دشمن کی سرزمین پر ہیں۔" غالب نے کہا۔ "کیا ہمیں پاسپورٹ وغیرہ نہیں نکال لینے چاہئیں؟"

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "نقد رقم بھی ہماری جیب میں ہونی چاہیے۔"

کمر کے گرد لپٹی ہوئی بیلٹ کھولنے کے لیے ہمیں کوٹ اور قمیص اتارنے پڑے۔ پلاسٹک کور نے ہر چیز کو محفوظ رکھا تھا۔ پاسپورٹ اور نقد رقم میں سے پانچ ہزار روپے کی انڈین کرنسی ہم نے اندر کی جیب میں ڈال لی۔ پانچ ہزار ڈالر ایک بوٹ کی جراب میں اور ریوالور کو دوسری جیب میں چھپا کے ہم نے پھر کپڑے پہنے۔ ہم دونوں کے پاس اب دو دو ریوالور تھے۔ ایک وہ جو ہم اپنے ساتھ بیلٹ میں باندھ کر لائے تھے اور دوسرے وہ جو غالب لانچ پر مرنے والوں کی جیب سے نکال لایا تھا۔

"کیا تم اندازہ کر سکتے ہو مرزا کہ بمبئی کا شہر کس سمت میں ہوگا؟"

"ہاں۔ لانچ اسی سمت میں گئی تھی۔ اس کے علاوہ یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ دور جانے کے بعد ہمیں کوئی سڑک مل جائے یا ٹرک چلانے والا مل جائے۔ ہم بمبئی سے چالیس پچاس میل بھی دور ہوئے تو زیادہ دور نہیں۔ ایک بڑے شہر کے مضافات کا پچیس تیس میل تک تو آبادی پھیل جاتی ہے۔ اس کے بعد بھی ویرانہ نہیں ہوتا۔ ڈیری فارم، پولٹری فارم اور کارخانوں وغیرہ کا سلسلہ چلتا ہے پھر چھوٹے چھوٹے گاؤں آجاتے ہیں۔"

"بس تو پھر چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "نیند نے کافی تازہ دم کر دیا ہے۔"

"لیکن بھوک غالب پر غالب ہے۔ جی چاہتا ہے کہ چڑھ جاؤں ان درختوں پر اور کچے ناریل توڑ کے کھا جاؤں۔"

"بسم اللہ... پھر انتظار کیسا؟"

"درخت پر چڑھنا کہاں آتا ہے مجھے!" غالب نے کہا۔

تقریباً ایک میل کا فاصلہ ہم نے ریت پر طے کیا جو رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ درخت بھی کم گھنے ہو گئے۔ بائیں ہاتھ پر بہت دور ہمیں ایک فیکٹری کی دھواں اگلنے والی چمنی دکھائی دی۔

ایک کچا راستہ نمودار ہو گیا جس پر سائیکل کے پہیوں کے نشانات تھے۔ پہلا سائیکل والا ہمیں بیس منٹ تک اسی راستے پر چلنے کے بعد ملا۔ وہ ہمارے اشارے پر رک گیا لیکن شہر جانے والے راستے کے بارے میں جو کچھ اس نے ہمیں بتایا وہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے باوجود ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور آگے چل پڑے۔

"یہ کون سی زبان تھی، عبرانی؟" غالب نے کہا۔

"گجراتی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"گجراتی سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس میں تو ہمیں پٹام ڈم ڈم گڑبڑ دھم ترڑ کے سوا کچھ نہیں تھا۔"

"ہو سکتا ہے مدراسی ہو۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "کراچی کی طرح بمبئی بھی کوسموپولیٹن سٹی ہے۔ ہر ملک اور قوم کے لوگ رہتے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔"

ایک سڑک اچانک سامنے آگئی۔ یہ کوئی شاہراہ نہیں تھی لیکن وقفے وقفے سے کوئی کار یا بس گزرتی دکھائی دے جاتی تھی۔ کاریں سب ایک جیسی تھیں۔ فرق تھا تو ان کے رنگ میں۔ غالباً یہ فیئٹ کار کا انیس سو تریسٹھ کا ماڈل تھا جس کو سات سال بعد بھی کفایت شعاری کے قومی جذبے کے تحت تیار کیا جا رہا تھا۔ اس طرح جہاں کار والوں کو "ماڈل کمپلیکس" نہیں ہوتا تھا وہاں یہ آسانی بھی حاصل رہتی تھی کہ پورے ہندوستان میں ان گاڑیوں کے پارٹس با افراط دستیاب رہتے تھے۔ ایکسیڈنٹ میں ٹوٹ پھوٹ جانے والی اور اسکریپ ہو جانے والی گاڑیوں کے پرزے بھی ضائع نہیں ہوتے تھے اور میکینک ایک ہی ماڈل کی مرمت کرتے کرتے اس کے ماہر ہو جاتے تھے۔ انھیں ہر سال ایک نئی کار اور ہر کار کے نئے ماڈل کے انجن کو سمجھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

سب بسوں کے اور ٹرکوں کے سامنے مجھے "ٹاٹا" کا نشان ہاتھی کی صورت میں نظر آیا۔ بسیں پرانی اور بھدی شکل کی تھیں۔ نگرانی کی دیکھ بھال کی گئی تھی۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ ان میں مسافروں کو ٹھونس ٹھونس کر اور کوٹ کوٹ کر نہیں بھرا گیا تھا۔ اوور لوڈنگ پر پابندی کا قانون تو ہمارے ملک میں بھی تھا مگر یہاں ہم نے اس پر عمل ہوتے بھی دیکھا۔

"کیا خیال ہے کسی بس کو رکنے کا اشارہ کریں؟" غالب نے کہا۔ "یوں کب تک چلتے جائیں گے؟"

"بسیں تو دونوں طرف سے آجا رہی ہیں۔" میں نے کہا۔

"بمبئی شہر ادھر ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "ہم ناک کی سیدھ میں چلتے رہے تو شام تک پیدل بھی پہنچ جائیں گے۔"

"اگر سمت غلط ہوئی تو دنیا گول ہے۔ ہم چلتے چلتے بالآخر بمبئی پہنچ جائیں گے۔ ایک چکر مکمل کرنے کے بعد۔" میں نے کہا۔

"ابھی سے ایسے دھندوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں ورنہ آتے ہی نیک نامی کا چرچا ہونے لگے گا۔" غالب نے کہا۔ "فلاحی بھی نہیں ملے گا یہاں۔"

سڑک کے کنارے ایک کار کھڑی ہوئی تھی اور اس کا بونٹ اٹھا ہوا تھا۔ ایک عورت کو بونٹ پر جھکا ہوا دیکھ کر ہم رک گئے۔ غالب نے مجھے آنکھ ماری جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ ہم اس کی مدد کرتے ہیں اور اگر ہماری کوشش سے گاڑی اسٹارٹ ہو جاتی ہے تو پھر دیکھتے ہیں خاتون اخلاقاً ہم سے پوچھتی ہیں یا نہیں کہ ہم کہاں جائیں گے۔

میں نے کھنکار کے کہا۔ "کیا ہو گیا گاڑی کو؟"

وہ پہلے ہی متوقع نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ دبلی پتلی نوجوان عورت تھی۔ اٹھائیس تیس سال کی اور شادی شدہ ہی نظر آتی تھی۔ لیکن اس نے بہت شوخ میک اپ کر رکھا تھا اور میرے نزدیک اس کا لباس بھی قابلِ اعتراض تھا۔ اس کے اسکرٹ کو کچھ نیچا اور بلاؤز کے گلے کو کچھ اونچا ہونا چاہیے تھا۔

"گاڑی رک گئی ہے۔" اس نے تقریباً رو کر کہا۔

میں نے غالب کی طرف دیکھ کر اس حیرت انگیز انکشاف پر سر ہلایا۔ "کتنے افسوس کی بات ہے۔"

"لیکن کیوں رک گئی ہے، یہ پوچھا... میرا مطلب ہے دیکھا آپ نے؟" غالب نے کہا۔ "ذرا سیلف گھمائیے۔"

"سیلف بھی نہیں گھومتا!" خاتون نے اسی لہجے میں کہا۔

"او ہو ہو۔ سیلف بھی نہیں گھومتا! کیوں نہیں گھومتا؟"

"پہلے گھومتا تھا مگر..." خاتون نے اعتراف کیا۔ "اسی کوشش میں۔ بیٹری بیٹھ گئی ہے۔"

"اچھا آپ بھی بیٹھ جائیں۔ میں دیکھتا ہوں۔" میں نے اپنا کوٹ اتار کے غالب کو پکڑا دیا۔ تھوڑا سا غور کرنے پر میں نے خرابی کو پکڑ لیا۔ کوائل کے ایک تار کا کنکشن ڈسٹری بیوٹر سے الگ ہو گیا تھا۔ مزید یہ کہ خاتون نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی مسلسل کوشش میں ایک طرف بیٹری ڈسچارج کر لی تھی تو دوسری طرف کاربوریٹر میں پٹرول زیادہ کر دیا تھا۔ تار تو میں نے فوراً جوڑ دیا مگر زائد پٹرول کو خشک کرنے کے لیے مجھے ایئر کلینر ہٹانا پڑا اور رومال کے کونے سے پٹرول خشک کرنے کے بعد واپس لگانا پڑا۔

اب گاڑی دھکے سے اسٹارٹ ہو سکتی تھی۔ ہاتھ صاف کرکے کوٹ پہن لینے کے بعد میں نے خاتون سے کہا کہ وہ ایک بار کوشش کرے۔ شاید گاڑی اسٹارٹ ہو جائے لیکن بیٹری بالکل ہی ڈیڈ تھی۔ سیلف کسی افیونی کی طرح ہلا اور ساکت ہو گیا۔

"آؤ بھائی فقیر چند۔" میں نے کہا۔ "اپنی جان ناتواں..."

www.paksociety.com

ساتھ۔ اللہ اجر دے گا اس نیکی کا۔"

"اللہ نہیں، مجنون۔" غالب نے سرگوشی میں مجھے ڈانٹا، اور میرے ساتھ دھکا لگانے لگا۔ خاتون کی پہلی کوشش ناکام رہی۔

"ایک بار اور بھائی فقیر جنید۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"اب ہم لفٹ کے حق دار تو ہو ہی چکے ہیں بھائی امیر جنید۔" غالب بولا۔

میری ہدایات کے مطابق دوسری بار خاتون نے گاڑی کا گیئر اس وقت چھوڑا جب اس کی رفتار اتنی تیز ہو گئی تھی کہ ہم اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ خاتون اتنی عقل مند تھیں کہ انھوں نے دوسرے ہی سے ایکسیلیٹر کو دبا رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی ایک جست لگا کے بھاگی اور میں اور غالب منہ کے بل سڑک پر گرے۔ قریب سے گزرنے والی ایک بس کے مسافر اس منظر پر خوش ہو کے ہنسے۔

خاتون نے کار کو روک لیا تھا۔ انھوں نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا۔ "تھینک یو۔ پیسے کتنے ہوئے؟"

میرا غصے سے برا حال ہو گیا۔ "بہت افسوس کی بات ہے۔"

"او کے... یہ لو، پورے پچاس۔" عورت نے تنک کے کہا۔ "یہی تو مصیبت ہے تم بھکاری لوگوں کے ساتھ، مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہو۔"

میں نے پیچھے والا دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"ہمیں بمبئی جانا ہے۔ سو روپے دیں گے۔"

"کیا... اسے ٹیکسی سمجھا ہے تم نے؟" وہ چیخ کے بولی۔

"آپ نے ہمیں بھکاری کیسے سمجھ لیا؟" میں نے کہا اور غالب کے لیے دوسرا دروازہ کھول دیا۔

"ہم آپ کی یہ کار یہیں کھڑے کھڑے نقد خرید سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "بولیے کیا قیمت لیں گی؟"

"میں سیٹھ امیر جنید ہوں اور یہ میرا بھائی فقیر جنید۔ مشہور پروڈیوسر۔" میں نے کہا۔

بمبئی ہندوستان کی فلم نگری ہے۔ میں نے سنا تھا کہ یہاں ہر تیسری عورت ایکٹریس، ہر چوتھا مرد ایکٹر، ہر پانچواں آدمی پروڈیوسر اور ہر چھٹا ڈائریکٹر ہو سکتا ہے۔ باقی بھی فلم کے کسی نہ کسی شعبے سے متعلق ہوں گے خواہ وہ اسکرپٹ رائٹر ہوں یا فوٹو گرافر، ساؤنڈ ریکارڈسٹ ہوں یا میوزک ڈائریکٹر۔

وہ بڑی عجیب نظروں سے ہمیں دیکھتی رہی۔ اس کے لبوں کی معنی خیز مسکراہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم اسے بلف کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

"آئی ایم سوری۔" اس نے بالآخر نوٹ کو واپس اپنے بیگ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے غلطی ہوئی۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "کسی کی صورت پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کیا ہے۔"

گاڑی کچھ دیر خاموشی سے دوڑتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ "آج کل آپ کون سی فلم پروڈیوس کر رہے ہیں؟"

"جی... وہ ابھی اس کا نام طے نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔

"آئی سی... کاسٹ تو فائنل کر لی ہو گی؟"

"کاسٹ... ابھی زیرِ غور ہے ابھی۔" میں نے کہا اور خدا کا شکر ادا کیا جب اس نے اگلا سوال نہیں کیا۔ خود کو فلمی پروڈیوسر کہنا ایک غلطی ثابت ہو سکتا تھا۔ بمبئی میں قدم رکھنے سے پہلے ہم اس فلم نگری کے بارے میں بہت کم معلومات رکھتے تھے اور اس عورت کی باتیں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ اس کا فلمی دنیا سے کوئی تعلق ضرور ہے۔

اب تک اس سے تمام گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوتا کہ وہ اردو نہیں جانتی۔

غالب نے میرے کان میں کہا۔ "خود کو فلم پروڈیوسر کہنے کا پنگا لینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں نے کب فلم پروڈیوسر کہا تھا۔ فلم کا تو نام بھی نہیں لیا تھا میں نے۔ صرف پروڈیوسر کہا تھا۔" میں نے کہا۔

"اور کیا مطلب ہوتا ہے پروڈیوسر کا؟"

"پروڈیوسر کا مطلب ہے پیدا کرنے والا۔ کسان بھی پروڈیوسر ہے جو اناج پیدا کرتا ہے۔ صنعت کار بھی۔ اور گیارہ بچوں کا باپ ایک زبردست پروڈیوسر ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر اس نے پوچھ لیا کہ پہلے کون سی فلمیں بنائی ہیں تو کہہ دینا مغلِ اعظم، مدر انڈیا یا شعلے۔ بہت مشہور فلمیں ہیں۔" غالب نے جتا کے کہا۔

ہم بہت آہستہ باتیں کر رہے تھے اور ساٹھ ستر میل فی گھنٹا کی رفتار سے گاڑی چلانے والی عورت ہماری طرف متوجہ بھی نہیں تھی۔

میں نے کہا۔ "آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا ابھی تک۔"

وہ مسکرا کے بولی۔ "میں فلم ایکٹریس ہوں۔"

"جی... کیا نام ہے آپ کا؟" میں نے کہا۔

"شرمیلا ٹیگور۔" وہ بولی۔ "کمال ہے آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟"

صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے کہا۔ "آپ ہرگز شرمیلا ٹیگور نہیں ہیں۔"

وہ ہنسی۔ "آپ بھی تو فلم پروڈیوسر امیر جنید یا فقیر جنید نہیں ہیں۔"

صورتِ حال اچانک خراب ہو گئی تھی مگر میں نے نروس ہوئے بغیر کہا۔ "پھر آپ کے خیال میں ہم کون ہیں؟"

"دو بہروپیے۔" وہ بولی۔ "جو اپنا چہرہ بدل کے پھر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں۔"

"یہ آپ نے کیسے جانا؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں بھی یہی کام کرتی ہوں۔ روپ بہروپ بدلنے کا۔ یہاں پر میک اپ آرٹسٹ کہا جاتا ہے۔" وہ بولی۔ "میں آر کے اسٹوڈیو میں بیس سال سے ہوں۔ سورگباشی پرتھوی راج نے کہا تھا کہ..."

"یہ شک کیسے ہو گیا آپ کو... کہ..."

"پہلے تو میں نے غور نہیں کیا تھا لیکن جب آپ نے خود کو فلم پروڈیوسر کہا تو میں نے غور سے دیکھا۔ میں بمبئی کے سب مشہور پروڈیوسروں کو جانتی ہوں۔ آپ لوگ جو بھورے بالوں کی وگ اور مصنوعی داڑھی لگا کے پھر رہے ہیں، اسے عام آدمی اصل سمجھے گا مگر میرا تو یہ پیشہ ہے۔ میں نے تو ایک نظر میں دیکھ لیا تھا۔" وہ بولی۔

غالب نے میری طرف اور میں نے غالب کی طرف دیکھا۔ کوئی غلطی کی گنجائش نہ تھی۔ وہ ہوشیار عورت تھی اور خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ ابھی تک ہم نے زبردستی کار میں بیٹھنے کے علاوہ کوئی زیادتی نہیں کی تھی لیکن کوئی وجہ نہ تھی کہ شہر پہنچنے کے بعد وہ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیتی۔ ہم نے اس کی مدد کی تھی اور اجرت کے طور پر لفٹ لے لی تھی۔ حساب برابر۔ مگر عورت کے شکی ذہن کا کیا بھروسا۔ جس نے یہ تاڑ لیا تھا کہ ہم بہروپ بنائے پھر رہے ہیں، وہ ہماری اصلیت جاننے کی خواہش مند ہو گی۔

"تم چپ ہو۔" وہ بولی۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں۔" میں نے کہا۔ "جو آپ کا خیال ہے، ہم کون ہیں؟"

"چہرہ چھپانے والے دو ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یا مجرم اور گناہ گار۔" وہ بولی۔ "یا بزدل اور شریف آدمی جن کو دشمنوں سے جان کا ڈر ہو۔"

"بہت منطقی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "اپنے اس معیار سے دیکھنے پر ہم کیسے لوگ نظر آتے ہیں۔ پہلی قسم کے یا دوسری قسم کے؟"

"فی الحال میں اپنی رائے محفوظ رکھوں گی۔" وہ بولی۔ "ابھی تمھارا میرے ساتھ رویہ شریفانہ ہے چنانچہ تمھیں بھی مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"آپ کو تو ڈرنا چاہیے۔ آدمی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔" غالب نے کہا۔

"کیا لو گے تم مجھ سے؟ مشکل سے دو ہزار روپے ہوں گے میرے پاس۔ ایک یہ انگوٹھی ہے اور ایک رسٹ واچ۔ یہ تم کو لینے ہوتے تو پہلے ہی لے لیتے۔ اس کے لیے گاڑی ٹھیک کرنے اور اسے دھکا لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں کون تھا جو میری مدد کے لیے آتا۔"

"تھینک یو میڈم کہ آپ نے ہمارے بارے میں غلط رائے قائم نہیں کی۔ عام عورت سوچے سمجھے بغیر بدحواس ہو کے اپنے لیے بھی پریشانیاں پیدا کر لیتی۔ اور ہمارے لیے بھی۔"

"آپ کی طرح ہمیں بھی صرف مدد کی ضرورت تھی۔" غالب نے کہا۔ "کوئی لفٹ دینے کو تیار نہیں تھا۔"

"ایسی جگہ پر کوئی کسی کے لیے نہیں رکتا۔ میری تو گاڑی ہی رک گئی تھی۔" وہ بولی۔

"آپ نے نام نہیں بتایا ابھی تک اپنا..."

"میں للی ہوں۔ پہلے للی فیروز تھی۔ چار سال للی راج رہی۔ اب پھر للی فیروز ہوں۔ اپنے پیشے میں صرف للی۔" وہ بے تکلف پُراعتماد لہجے میں بولنے والی عورت تھی۔ "دادر میں رہتی ہوں۔ آر کے اسٹوڈیو میں آ کے کسی کو بھی بولو کہ للی سے ملنا ہے، کوئی نہیں روکے گا تم کو۔ اگر روکے گا تو راج کپور اس کی ایسی تیسی کر دے گا۔" اس نے چٹکی بجا کے کہا۔ "اپنے فادر کی وجہ سے بہت لحاظ کرتا ہے میرا۔"

"آپ... اس کے والد پرتھوی راج کے زمانے سے یہ کام کر رہی ہیں۔ تو کیا پانچ سال کی عمر سے لوگوں کے چہرے بنانا اور بگاڑنا شروع کر دیے تھے؟" میں نے کہا۔

"ونانی بولنے۔ میری عمر پینتالیس سال ہے۔" وہ ہنسی۔

"کیا زبردست میک اپ کیا ہے آپ نے۔ چوبیس کی لگتی ہیں۔"

اس نے پلٹ کر مجھے غور سے دیکھا۔ "یہ تعریف ہے، خوشامد یا بے وقوف بنانے کی کوشش؟"

"لاحول ولا..." میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "مجھے کیا ضرورت ہے... مگر ہے یہ کمال کی بات۔ میں نے اب دیکھ لیا ہے کہ آپ نے کوئی میک اپ نہیں کیا۔"

"اب ایک بات میں بھی پوچھ لوں؟" وہ مسکرائی۔ "تم یہ میک اپ کر کے وہاں کیوں جھک مار رہے تھے؟"

"کیا ادھر فلم کی شوٹنگ کے لیے بھی کوئی نہیں جاتا؟"

"جاتے ہیں، مگر یہ لوکیشن پر شوٹ ہوتا ہے۔ لیکن تم لوگ تو ایسا لگتا تھا کہ سمندر میں سے نکل کے آئے تھے۔"

میں چونکا۔ "یہ... کیسے اندازہ کیا آپ نے؟"

"ایک تو کپڑوں سے جو بھیگ کر خشک ہوئے ہیں، پھر جوتوں سے۔ اور اس کے بعد چہرے سے۔ شاید پہلے یہ میک اپ ٹھیک ہو گا، پانی سے سب خراب ہو گیا ہے۔" وہ بولی۔

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور ہمارا ساتھ بہت مختصر۔ شاید یقین بھی نہ کریں آپ۔"

"تمھارے یہ نام کیا اصلی ہیں؟ فقیر جنید اور امیر جنید؟" وہ بولی۔

"اگر میں کہوں کہ ہمارے باپ کا نام دمڑی لال تھا تو آپ کو یہ سب نام زیادہ مضحکہ خیز لگیں گے۔" میں نے کہا۔ "لیکن

www.paksociety.com

اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ آپ میرا پاسپورٹ دیکھیے اور میرے بھائی کا بھی۔"

"نہیں نہیں... میں یقین کرتی ہوں۔" اس نے کار کو اچانک ایک روڈ سائیڈ ریسٹورنٹ کے احاطے میں روک لیا۔

عین اسی وقت ایک پرانے ماڈل کی کھلی سیڈان نے بہت غلط طریقے پر سامنے سے آتے ہوئے موڑ کاٹا۔ لی نے بڑی مہارت سے اپنی گاڑی کو بچا لیا۔ اس میں کچھ شائبہ خوبیِ تقدیر کا بھی تھا۔ وہ پہلے ہی طے کر چکی تھی کہ اسے گاڑی کو ریسٹورنٹ کی جانب موڑنا ہے۔ اگر یہ ارادہ وہ سامنے سے آنے والی گاڑی کو دیکھنے کے بعد کرتی تو حادثے سے بچنا ناممکن ہوتا۔ وہ گاڑی لی کی کار کو سامنے سے ٹکر مارتی اور شاید ہم کار کے ساتھ تین چار قلابازیاں کھاتے تو اندر ہی چرمُر ہو جاتے۔ اس لمبی چوڑی بھاری قسم کی گاڑی کا کچھ نہ بگڑتا کیوں کہ اس کا سامنے والا بمپر ہی بہت خوف ناک تھا۔

غیر ارادی طور پر لی نے کار کو روکتے ہی پلٹ کے دیکھا اور زیرِ لب ان لوفر ٹائپ لڑکوں کو گالی دی جو شاید نشے میں تھے۔ مگر جواب میں انھوں نے چیخ کر جو کچھ کہا وہ ہم نے بھی سنا اور پتی نے بھی اور ریسٹورنٹ کے باہر کھلی جگہ میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی۔ لی کا چہرہ شرم اور غصے سے سرخ ہو گیا۔ سیاہ سیڈان جس طوفانی رفتار سے آئی تھی اسی رفتار سے دھول اڑاتی غائب ہو چکی تھی۔

میں نے نرمی سے لی فیوز سے کہا۔ "جانے دیں۔ ایسے گھٹیے تو ہر جگہ ہی رہتے ہیں۔"

غالب نے کہا۔ "آپ کی کسی نیکی نے ہمیں بچا لیا۔ چلیے بھول جائیے اس بات کو اور مسکرا دیجیے۔"

لی نے ایک گہری سانس لے کر سر ہلایا اور کار سے اتر آئی۔ ہم ایک ٹیبل پر جا بیٹھے۔

"میں صرف چائے پیوں گی۔" لی نے کہا۔

"ہم کھانا کھائیں گے۔" میں نے کہا۔

"کھانا تو اس وقت نہیں ہے۔" ویٹر نے کہا۔ "ختم ہو گیا۔"

"تو پھر چائے کے ساتھ جو کچھ بھی لا سکتے ہو، سب لے آؤ۔ ہم کھانا سمجھ کے کھا لیں گے۔" میں نے کہا۔

"ان کے کلب سینڈوچ اور شامی کباب اچھے ہوتے ہیں۔ اگر پیٹ بھرنا ہے تو وہی منگوا لو۔" لی نے کہا۔

"ایسی صورت میں ہمارے لیے چائے نہیں کافی۔" میں نے آرڈر میں ترمیم کرتے ہوئے کہا۔ "ویری بلیک، ویری اسٹرانگ۔"

"تم لوگ کہاں جاؤ گے؟... میں..."

"آپ ہمیں اپنے راستے میں کہیں بھی اتار دیں۔ وہاں سے ہم خود چلے جائیں گے حاجی علی کے مزار۔" غالب نے کہا۔

"میں بھی وہاں ہر جمعرات کو جاتی ہوں۔" وہ بڑی فراخ دلی سے بولی۔ "ساتھ چلو۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ "بہت خوشی ہوتی ہمیں یہ پیش کش قبول کر کے لیکن افسوس کہ ایسا ممکن نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم آپ کے ساتھ نہیں جا سکتے۔"

"تمھیں کہیں اور جانا ہو گا یا کسی اور کے ساتھ جانا ہو گا۔" وہ بولی۔ "ویسے بھی میں تو مغرب کے بعد جاتی ہوں۔"

اس کے بعد خاموشی کا ایک وقفہ آیا جس میں لی نے چائے پی اور ہم نے بہت ضبط کرتے ہوئے کلب سینڈوچ کی پلیٹ صاف کرنے میں ندیدے پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تاہم میرے لیے دوسری پلیٹ نہ منگوانا مشکل ہو گیا۔

"کب سے بھوکے ہو تم لوگ؟" لی نے ہنس کے کہا۔

"اب تم سے کیا پردہ۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔" جب بل کی ادائیگی کا وقت آیا تو لی نے بل کو دی پہلے ویٹر کو روک لیا۔ لی کا دیا ہوا نوٹ ہٹا کے میں نے جیب میں سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور اس میں سے ایک نوٹ پلیٹ میں ڈال دیا۔

"تم لوگ واقعی میری کار خرید سکتے تھے۔" لی نے طنزیہ کہا۔ میں شرمندہ ہو گیا۔ "میرا مقصد تمھیں یہ بتانا نہیں تھا مگر یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ حضرات کی موجودگی میں خواتین ادائیگی کریں۔"

وہ ہنس پڑی۔ "میں اپنی کیفیت کو بھول گئی تھی۔ تم مجھے بمبئی کے رہنے والے نہیں لگتے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے کہا۔

"بمبئی کے رہنے والوں کا کوئی برانڈ یا ٹریڈ مارک ہے؟" غالب نے کہا۔

"یہاں ہر شہر کا ایک برانڈ ہوتا ہے۔ آدمی اسی سے پہچانا جاتا ہے کہ کہاں کا رہنے والا ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "لیکن اس برانڈ کو وہی پہچانتا ہے جو بمبئی میں پیدا ہوا ہو۔ یوپی والا اور ڈھاکہ والا اور لکھنؤ والا سب اپنے اپنے برانڈ رکھتے ہیں۔"

"تم ایک حیرت انگیز عورت ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم واقعی یہاں اجنبی ہیں۔ تاہم یہ مت سمجھنا کہ ہم جیل کے مفرور مجرم ہیں اس لیے بھیس بدل کر پھر رہے ہیں۔"

"مجھے کچھ سمجھنے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ بولی۔ "جب تم کچھ نہیں بتانا چاہتے۔ مطمئن رہو، میں کسی سے اس ملاقات کا تذکرہ بھی نہیں کروں گی۔"

"شکریہ، ہم ضرور یاد کریں گے۔" میں نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کہا۔ "اور بہت اچھے الفاظ میں۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ابھی ہم سڑک پر آئے ہی تھے کہ میں نے اپنے پیچھے اسی سیاہ سیڈان کو آتے دیکھا۔ وہ شاید کہیں سائیڈ میں رک کے ہماری روانگی کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈرائیور کے علاوہ میں نے تین

افراد کو دیکھا۔ ان میں سے ایک آگے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بالکل گنجا اور غنڈہ ہی ٹائپ شخص تھا۔ اس کے ساتھ والا بھی گنجا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ انھوں نے اپنے اپنے سر استروں سے صاف کرائے تھے۔ دونوں پیچھے بیٹھے ہوئے بدمعاشوں کو میں صاف نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن ان سب کے عزائم کی حقیقت بالکل واضح تھی۔

"مس لی!" میں نے کہا۔

"یس۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ وہ بدمعاش پیچھے آ رہے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں ان سے کہ کیا بات ہے۔ کیا غلطی میں نے کی تھی؟"

"نہیں۔ آپ چلتی جائیں۔ یہ بات اب ہم ان سے پوچھیں گے۔" میں نے کہا۔

"دیکھو... جھگڑا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں..."

"وہ جھگڑا چاہتے ہیں مس لی۔ آپ کے نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ آپ بس گاڑی کو جتنا دور لے جا سکتی ہیں لے جائیں اور ان کو موقع دیں ہمارا راستہ روکنے کا۔" میں نے کہا۔

شاید لی نے میرے منصوبے کو سمجھ لیا۔ اس نے ایک دم رفتار بڑھائی۔ تعاقب میں آنے والی سیڈان ابھی تک فاصلے سے چل رہی تھی۔ وہ لوگ ریسٹورنٹ کے قریب بدمعاشی کے مظاہرے سے گریز کر رہے تھے۔ ہمیں فرار ہوتا دیکھ کر انھوں نے بھی گاڑی کو اندھا دھند دوڑانا شروع کر دیا۔

گنجا ڈرائیور بڑے زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کا ساتھی سیٹ پر تقریباً کھڑا ہوا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بھی جو دو افراد بیٹھے ہوئے تھے، وہ شوخ لباسوں کے علاوہ اپنے رویّے سے بھی خود کو بدمعاش ثابت کرنے میں کوشاں تھے اور معلوم نہیں کیا چلا رہے تھے۔

لی نے بڑے صحیح وقت پر ان کو آگے نکل کے راستہ بند کرنے کا موقع دیا۔ ان کی لمبی چوڑی کار بریک جام ہونے سے گھوم کر سامنے آ گئی۔ پہیوں کی رگڑ سے گرد کا بگولا اٹھا۔

"تم بالکل باہر مت آنا خواہ کچھ بھی ہو جائے۔" میں نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "اور موقع ملے تو بھاگ جانا۔"

"ہماری فکر مت کرنا۔" غالب نے کہا۔

خلافِ توقع وہ اترتے ہی ہم پر حملہ آور نہیں ہوئے۔ ان میں سے ایک جو چیونگ گم چبا رہا تھا اور بیل کی طرح جبڑے ہلا رہا تھا، آگے آیا۔ میرے سامنے آ کے اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور پیر پھیلا کے کھڑا ہو گیا۔ باقی تین ایک نصف دائرے کی صورت میں اس سے ایک قدم پیچھے رہے۔

"تم ہی ہو وہ حرامی جس نے ذوشی کو اور ہمارے دوستوں کو مارا تھا؟" وہ بولا۔ پھر اس نے چیونگ گم میرے منہ پر تھوک دی۔ میں نے معاملہ سمجھنے کے بعد ضبط سے کام لیا۔ "ان سب گھٹیوں کو مارنے کا نیک کام مجھے ہی کرنا پڑا۔" میں نے چہرہ صاف کر کے کہا۔

"وہ ہمارے دوست تھے۔" پیچھے سے ایک مونچھوں والے نے غرا کے کہا۔

"تم نے ہمارے کاروبار میں بھی ٹانگ اڑائی ہے۔" دوسرا بولا۔ "اب تم اس کی قیمت چکاؤ گے۔" تیسرے نے کہا۔

"ویری گڈ۔ تم سب اپنی اپنی کہہ چکے۔" میں نے کہا۔ "اب میں بھی کچھ کہوں؟"

اس کے ساتھ ہی میں نے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں مکا مارا۔ وہ پیٹ پکڑ کے جھکا اور دہرا ہو گیا۔ میں نے ایک کہنی سے اس کی گدی پر وار کیا اور آگے بڑھ آنے والے دوسرے غنڈے کے لات ماری جو اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان لگی۔ اس نے چیخ کر مجھے ایک مغلظ گالی بکی۔ باقی پیچھے سے مجھ سے چمٹ گئے تھے۔ ایک نے میرے سر پر مکا مارا جس نے ذرا سی دیر کے لیے مجھے چکرا دیا۔ پھر میں نے گھوم کر اس کے نرخرے پر بائیں ہاتھ کی الٹی ہتھیلی ماری۔ اس کا سانس رک گیا اور وہ ہاتھ پھیلا کے پیچھے گرا۔

غالب کو میں نے منع کر دیا تھا کہ وہ گولی چلانے سے گریز کرے اور جب تک ناگزیر نہ ہو جائے ریوالور نہ نکالے۔ وہ گاڑی کے پیچھے تھا اور مناسب محفوظ فاصلے سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ لی کار کے اندر دہشت زدہ بیٹھی چلا چلا کر سب سے لڑائی بند کرنے کی اپیل کر رہی تھی مگر وہ نہ اس نیت سے آئے تھے کہ شرافت سے بات کر کے چلے جائیں اور نہ ہم انھیں سبق سکھائے بغیر واپس بھیجنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

میرے تینوں حریف اب ایک ساتھ مجھ پر حملہ آور تھے۔ ایک کو میں نے ڈاج کیا اور وہ مجھے ٹکر مارنے کے شوق میں سیدھا گیا اور گاڑی سے ٹکرا گیا۔ دوسرے کو میں نے دھوبی پٹکے کے انداز میں پیچھے سے آگے لا کے زمین پر دے مارا لیکن تیسرا مجھے پیچھے گرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ہاتھوں سے میرے گلے کو دبانا شروع کیا۔ اس کے ہاتھ بڑے بڑے اور سخت تھے۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ ایک جھٹکا دے کر میں نے اسے گرانے کی کوشش کی مگر وہ بڑی مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ پھر میری گردن پر دباؤ بڑھانے کے لیے وہ آگے جھکا اور مجھے اس کی آنکھوں میں انگلیاں گھسیڑنے کا موقع مل گیا۔ وہ درد سے چیختا ہوا دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کے زمین پر لوٹنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی ایک آنکھ ضرور پھوٹ گئی تھی کیوں کہ میری ایک انگلی خون میں بھر گئی تھی۔

ابھی میں اٹھا بھی نہ تھا کہ دوسرے غنڈے نے بڑی آواز کے ساتھ کھلنے والا کمانی دار چاقو نکال لیا۔ اس نے مجھ پر وار کرنے کے لیے جست لگائی اور میں نے اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھتے

www.paksociety.com

ہوئے اس کی کلائی پر ہاتھ مارا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ اپنے ہی زور میں منہ کے بل گرا۔ میں نے غالب کو ریوالور کے ساتھ آگے آتا دیکھ لیا تھا مگر چاقو سے حملہ ناکام رہا تو وہ پھر رک گیا۔

میں نے نیچے پڑے ہوئے شخص کو پے در پے ٹھوکریں ماریں لیکن صورتِ حال اس وقت اچانک ہی بدل گئی جب چوتھے شخص نے غالب پر حملہ کیا۔ وہ کار سے ٹکرانے کے بعد ذرا سی دیر کے لیے بے ہوش ہو گیا تھا یا محض اس کی اداکاری کر رہا تھا۔ اس نے غالب کو سامنے دیکھا تو اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

جب اس نے چیخ کر کہا "بس کرو، ورنہ میں اس عورت کو گولی مار دوں گا" تو میں اپنا ہاتھ روکنے پر مجبور ہو گیا۔ ان چاروں کے پاس اسلحہ نہیں تھا اور غالب کا ریوالور انھیں نظر آتا تو وہ زیادہ دیر تک مقابلہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ صرف جسمانی طاقت کے بل پر ہمیں زیر کرنے آئے تھے اور ہمارے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے ورنہ خالی ہاتھ نہ آتے۔

صاف ظاہر تھا کہ جب اسمگلی برائے فروخت لڑکیوں سے بھری ہوئی لانچ سامانِ تجارت سمیت واپس پہنچی ہو گی تو ان سب کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ان کے نقصان کے ذمے دار کون تھے۔ انھوں نے فروخت کی امید اس کے درتوں باتوں گاڑوں کی لاشیں بھی دیکھ لی ہوں گی اور شاید انہی لڑکیوں میں سے کسی نے ان کو تفصیل سے سب کچھ بتا دیا ہو گا کہ ہم لانچ سے کس جگہ اترے تھے۔ انھیں تلاش کے لیے روانہ ہونے میں یقیناً کچھ وقت لگا ہو گا۔ اگر ہم ساحل پر اترنے کے بعد آرام کے لیے نہ رکتے تو ان کے وہاں پہنچنے تک بمبئی پہنچ جاتے اور پھر ان کے ہاتھ نہ آتے۔ ہم دیر تک سوتے رہے اور پھر للی کی گاڑی ٹھیک کرتے رہے۔ اس دوران میں انھوں نے پورا ساحل چھان مارا ہو گا۔ ہم درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپے ہوئے تھے اس لیے انھیں فوراً دکھائی نہ دیے، ورنہ ہوتا یہ کہ ہم آنکھ کھولتے اور خود کو ان کی تحویل میں پاتے۔

لیکن للی کے ساتھ روانہ ہو جانے کے بعد ہم ان کی نظر میں آ گئے۔ وہ بھی سڑک پر سرگرداں تھے کہ اچانک انھوں نے ہمیں دیکھا۔ اس وقت ہم ریسٹورنٹ میں داخل ہو رہے تھے چنانچہ انھوں نے چھپ کر انتظار کیا۔

ریسٹورنٹ کی طرف سے آنے والی دو گاڑیاں دور ہی رک گئی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی بدمعاشوں کی اس لڑائی میں نہ فریق بننا چاہتا تھا نہ گواہ۔

"اس کو چھوڑ دو" میں نے کہا۔ "یہ عورت ہمارے ساتھ نہیں تھی۔"

"اچھا، تم اس کے ساتھ تھے مگر یہ تمھارے ساتھ نہیں تھی" للی کی کنپٹی پر ریوالور رکھ کر ٹھوکنے والا بولا۔

"اس نے لفٹ دی تھی ہمیں" میں نے کہا۔

"اور چائے بھی پلائی تھی۔ سینڈوچ بھی کھلائے ہوں گے۔ ایسی لفٹ کبھی ہمیں نہیں ملی" وہ بولا۔ "چلو اب آرام سے گاڑی میں بیٹھو۔"

ان کے باقی تین ساتھی بھی اب شیر ہو گئے تھے اور ہمیں ریوالور نکالنے کی مہلت بھی نہ دی تھی۔ میں خاموشی سے کار کے ساتھ جا بیٹھا۔ ریوالور والا میرے پیچھے بیٹھ گیا۔

"آئی ایم سوری" میں نے بڑی مشکل سے للی سے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں" اس نے مجھے تھپکی دی۔ "یہ بدمعاش تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ افسوس تو مجھے ہے کہ دھیرے سے تم مجبور ہو گئے۔ بہادر آدمی ہو تم اسیر جنید۔"

"چلو اب گاڑی چلاؤ، میم صاحب" پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے ریوالور لہرا کے کہا۔ "ورنہ اس کی ساری بہادری نکال دوں گا سر میں ایک سوراخ کر کے۔"

للی چلائی "یسوع کے واسطے ایسا مت کرنا۔"

میں نے دیکھا کہ غالب کو باقی دو نے اپنی کار میں بٹھا لیا ہے۔ ڈرائیونگ بھی غالب کے سپرد کر دی گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ ایک ڈرائیور کے فرائض انجام دیتا تو غالب کے مقابلے پر ایک رہ جاتا۔ انھوں نے یہ رسک نہیں لیا تھا لیکن ان کے خیال کے برعکس میرا خیال یہ تھا کہ اس طرح انھوں نے زیادہ بڑا رسک لیا تھا۔ سیاہ سیڈان آگے روانہ ہوئی اور اس نے اپنی کار اس کے پیچھے رکھی۔ تقریباً پانچ چھ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب بمبئی شہر کے مضافات کی آبادی شروع ہو چکی تھی، سیاہ کار بائیں جانب مڑی۔ للی نے بھی اپنی کار کا رخ موڑ لیا۔

اس کچے راستے پر کچھ دور چلنے کے بعد وہی گودام جیسا بنگلہ نظر آیا۔

کسی وجہ کے بغیر غالب نے ایک اور بریک لگائے اور اچانک گاڑی روک دی تھی۔

میں نے اسے تیزی سے واپس آتے دیکھا۔ غالب نے حاضر دماغی کا بہترین مظاہرہ کیا تھا جس سے دونوں ساتھ بیٹھے ہوئے بدمعاش بری طرح مستعد ہونے کے باوجود دھوکا کھا گئے۔ وہ اوسط سے زیادہ ذہانت کے مالک تھے اور یہ اندازہ کیسے کر سکتے تھے کہ ادل بدل اپنی تصویر نظر کرنے والا غالب غالب ایسی حرکت بھی کر گزرے گا۔ وہ جھٹکے سے آگے کو جھکے اور اگلی سیٹ سے ٹکرائے۔ ایک کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا ہو گا تو دوسرے کا سیٹ کی پشت سے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے غالب نے ریورس گیئر لگا کے پوری رفتار سے پیچھے دبا دیا ہو گا۔ ظاہر ہے سب سے پہلے اس کے ذہن میں آیا ہو گا کہ

گاڑی نے اچانک رکتے اور جھٹکے کے ساتھ تیزی سے واپس آنے کا عمل پانچ سیکنڈ سے بھی کم وقت میں پورا ہو گیا۔

دونوں گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ بیس تیس گز ہی ہو گا۔ جب آگے والی گاڑی رکی تو للی کا پاؤں غیر ارادی طور پر پہلے بریک پر گیا مگر اتنی دیر میں گاڑی بیس گز آگے جا چکی تھی اور مخالف سمت سے آنے والی گاڑی بھی دس گز کا فاصلہ ضرور طے کر چکی تھی۔ تصادم کو بچانا شاید میرے لیے بھی ناممکن ہوتا مگر میں نے دیکھا کہ للی نے آخری وقت میں پاؤں بریک سے ہٹا کے پھر ایکسیلیٹر پر رکھ دیا تھا۔ شاید اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ غالب کی نیت کیا ہے اور حیرت انگیز تو تب فیصلے کے ساتھ غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے بھی گاڑی کو ٹکرا دیا۔

میں آگے تھا اور سب دیکھ رہا تھا چنانچہ چند سیکنڈ کی ملنے والی مہلت میرے لیے کافی ثابت ہوئی۔ دونوں گاڑیوں کے ٹکرانے سے ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ میں آگے بیٹھے کے آگے گیا اور ردِعمل کے انداز میں دونوں پیروں کی قوت سے واپس آیا۔ یوں پیچھے میرے سر میں اسپرنگ ہیں۔ اپنے ہاتھوں کی مدد سے میں نے جسم کو واپس دھکیل دیا تھا۔

میں سیٹ کے اوپر سے گزر کے پیچھے والے دونوں بدمعاشوں پر گرا۔ وہ گڈمڈ ہوئے اپنے بچنے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں نے انھیں اندر ہی دبا دیا۔ ایک کے سر پر میں نے اپنی کہنی مار کر اس کی کنپٹی دروازے سے ٹکرا دی۔ ریوالور اس کے پاس تھا جو کہیں نیچے گر گیا تھا۔ دوسرا سر اٹھانا چاہتا تھا کہ میں نے پشت سے اس کی گردن پر ہاتھ مارا جو اشتعال کی بے اختیاری کے باعث زیادہ قوت سے پڑ گیا اور جب میں نے اس کی گردن کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز سنی تو مجھے ذرا سا افسوس ہوا۔ جانتا تھا اگر دو بدمعاشوں کے گروہ سے لڑائی میں کوئی مارا بھی جائے تو پولیس کے نزدیک یہ کوئی خاص بات نہیں ہوتی مگر کوئی مارا جائے تو قانون کو حرکت میں آنا ہی پڑتا ہے۔

ریوالور والا گینڈے جیسا شخص اب بے سدھ اپنی جگہ پڑا ہوا تھا۔ غالب اپنی طرف سے دروازہ کھول کے باہر نکلا تو وہ بھی باہر جا گرا۔ تھوڑی کار روشنی اندر پہنچی تو مجھے فرش پر پڑا ہوا ریوالور نظر آ گیا۔ میں نے جھپٹ کے اسے اپنے قبضے میں لیا اور پھر للی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خون سے بھرا ہوا تھا مگر وہ ہوش میں تھی اور مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

"ایڈوانس بولی" تم میری فکر مت کرو۔"

"بس تم... آر یو شیور... کہ تم ٹھیک ہو؟" میں نے غالب کی طرف دیکھتے کہا۔ غالب اپنے دونوں اغوا کنندگان سے فری اسٹائل مار رہا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ پٹ رہا تھا مگر حسبِ توقع اور بیہودہ انداز میں۔ کیونکہ عادی تھا۔ وہ دو پیشہ ور لوگ تھے چنانچہ ان کے ہاتھوں کو کوئی داد نہیں چاہتا تھا مگر مرزا غالب جو بلحاظِ پیشہ منافی لطیفہ شاعر اور مزاج کے اعتبار سے عاشق تھے، دو ہاتھ چلانے کے لیے

تھے تو ایک کسی کے لگ بھی جاتا تھا اور قطعی بے ضرر ثابت ہوتا تھا۔ تاہم کمال اس کی چھری کا تھا جس کی وجہ سے ابھی تک وہ دونوں اسے قابو نہیں کر پائے تھے۔

میرے میدانِ جنگ میں کودتے ہی طاقت کا توازن غالب کے حق میں ہو گیا۔ اس کے ایک حریف کو میں نے پے در پے گھونسے مار کے چت کر دیا۔ وہ چکرا کے گرنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے سنبھال لیا۔ وہ کسی نشے میں بدمست شرابی کی طرح ڈولتا رہا۔

"کیسے... دیکھو... چیونگم کھاؤ گے؟" میں نے اس کے گالوں پر چپت مار کے کہا۔ یہ وہی موٹا تھا جو چیونگم کھا کے بیل کی طرح جگالی کر رہا تھا۔ اس کے جبڑے نہ صرف یہ کہ ساکت تھے بلکہ غلاف ڈھیلے پڑ کے لٹک گئے تھے۔

اس نے بے جگری سے ہر قسم کا تصور ملنے کی فضول سی کوشش کے بعد ہاتھ گھمایا جو اس طرح گھما جیسے کار کے انجن کا پنکھا بجلی کا بٹن بند ہو جانے کے بعد گھومتا ہے۔ میں نے آخری ضرب مجاہد سے اس کی ناک کو افسوس ناک بنا دیا اور پھر اسے لالہ زمین پر ڈال دیا جیسے بقرعید پر قصاب چھری پھیرتے ہی بکرے کو وہیں ڈال کے دوسرے بکرے کی جانب لپکتے ہیں۔

دوسرا بکرا اپنی پچھتر فیصد افواج کی تصویرِ عبرت دیکھ کے بھاگنے لگا تھا کہ مرزا غالب اس کے پاؤں پڑ گئے۔

"جانتے ہو کس طرف کو کدھر کا خیال ہے؟" غالب نے اس کو منہ کے بل گراتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کو قمیص کا کالر پکڑ کے اوپر اٹھایا۔ "ذرا اکیلے کیوں چلتے ہو۔ ہم بھی چلیں گے تمھارے ساتھ۔"

"ہمیں ہی لینے آئے تھے نا تم؟" غالب نے کہا۔ "اب اپنے مردے چھوڑ کے بھاگنا چاہتے ہو۔ پہلے تم ان کو دفنا دو، پھر ہم تمھیں دفنا دیں گے۔ بنا معاوضہ۔"

وہ ہاتھ پیر جوڑنے لگا "مجھے... جانے دو... میں ان کا ساتھی نہیں ہوں... یہ تو مجھے... ساتھ لے آئے تھے۔"

میں نے اسے زمین پر رکھ دیا۔ وہ چھوٹے قد کا آدمی تھا چنانچہ اس کے پیر زمین سے اوپر اٹھے ہوئے تھے اور وہ مضحکہ خیز انداز میں آگے چل رہا تھا۔

"تم ان کے ساتھ آئے تھے مگر ساتھی نہیں ہو ان کے۔ کیسی عجیب بات ہے" میں نے کہا۔

"انھوں نے... دو سو روپے دیے تھے...."

"اچھا اچھا... گویا کرائے پر چلنے والی چیز ہو تم۔ چلو یہ اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی بتا دیا۔ اب ہم تمھیں دو سو روپے دیں گے، تم ہمارے ساتھ وہیں چلو جہاں یہ جا رہے تھے" میں نے کہا۔ "اب کم ہماری طرف سے لڑو گے۔"

www.paksociety.com

"آنٹی ہی ہماری کے ساتھ ہے۔" غالب نے طنز سے کہا۔
"مجھے... نہیں معلوم... ان کو کہاں جانا تھا..." وہ بولا۔
"شاید تم کو یاد نہیں آرہا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ ذہنی صدمے کا خاصی اثر ہے۔" میں نے کہا۔ "جب چھٹی کا دودھ یاد آئے گا اور نانی یاد آئے گی تو یہ بھی یاد آجائے گا کہ صرف دو سو روپے میں تمھاری زندگی کو اپنی بازی کے لیے داؤ پر لگانے والا کون تھا؟"
میں نے اسے تقریباً اٹھا کے بلیک سیڈان کے کھلے دروازے سے اندر پھینک دیا۔
غالب نے میرے قریب آکے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ "یہ بڑے بدمعاش بنتے تھے۔ غالب کو اکیلا سمجھ کے دونوں کے دونوں اتر آئے تھے مقابلے پر۔ اچھا ہوا تم بیچ میں آگئے۔"
"ورنہ تم ان کے بیچ میں آجاتے۔" میں نے کہا۔ "اور سینڈوچ ہوجاتے اخلاقاً... یہ لو توپ..." میں نے اسے ریوالور تھما کے کہا۔ "اس کرائے کے گوریلے کو سنبھال کے رکھو۔ کرائے کی یہ چیز ہے خراب یا ضائع نہ ہو۔"
للی کی ہنسی پر میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کار سے باہر نکل آئی تھی اور ٹشو پیپر سے چہرہ صاف کر رہی تھی۔
"تم دونوں بہت... پُراسرار ہو..." وہ بولی۔ "کیا فائٹ دی ہے تم نے! یہ فائٹ کسی فلم میں آجاتا تو لوگ تالیاں پیٹ پیٹ کے پاگل ہوجاتے۔ رئیل فائٹ کہاں ہوتی ہے فلموں میں۔"
"مس للی! تمھارے چہرے پر کھرچے... تم تو ٹھیک ہو نا؟" میں نے کہا۔
"نہیں، خراشیں ہیں معمولی۔" وہ بولی۔
"مجھے اب واقعی افسوس ہو رہا ہے... تمھاری گاڑی کی حالت دیکھ کر بھی..."
"یہ وقت ایسی باتوں میں ضائع کرو گے تو تمھیں زیادہ افسوس ہوگا۔" وہ بولی۔ "بس اب نکل چلو یہاں سے۔"
"تم بیٹھو اس گاڑی میں۔" میں نے کہا۔ "میں باقی سب کو سمیٹ لوں۔ ان کو یہاں چھوڑ کے تو نہیں جاسکتے۔"
"اور میں اپنی گاڑی چھوڑ جاؤں؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔
"گاڑی ہم بعد میں لے جائیں گے۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"بعد میں کب؟"
"ہم پہلے ان چاروں کو کہیں پہنچادیں۔" میں نے کہا۔ "غالباً ایک تو جائے گا سرکاری مردہ خانے... باقی تین..."
"کیا ایک کو قتل کردیا ہے تم نے؟" وہ خوفزدہ ہوکے بولی۔
"قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا میرا۔ مگر وہ قتل ہونے کے لیے آیا تھا۔ مجھے اس کی خواہش پوری کرنی پڑی۔" میں نے کہا۔ "تم فکر مت کرو۔ تم نے نہ کچھ دیکھا نہ سنا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔" وہ بولی۔ "میری گاڑی کی یہ حالت ہے، نہیں بھی چلے۔ کیا پولیس نہیں پوچھے گی مجھ سے؟"
"مس للی! تم بہت نڈر ہو۔ حالانکہ گولیاں چلتے وقت تم نے خاصی جرأت دکھائی تھی۔" میں نے کہا۔ "یہ سب خرابی ہماری وجہ سے ہوئی۔ ہم وقت پر مستقولات کرتے۔ تم کو ان معاملات میں ملوث ہونا پڑتا۔ مگر کوئی بات نہیں۔ ہم سب ٹھیک بھی کردیں گے۔ تم آگے بیٹھو۔ میں ان سب کو ڈکی میں ڈال آتا ہوں۔"
"میں اپنی گاڑی یہاں نہیں چھوڑوں گی۔"
"اوکے... اوکے... اسے بھی لے چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ اس قابل نہیں ہے کہ تم اسے چلا کے لے جاسکو۔ ہم اسے ٹو کر کے لے جاتے ہیں۔"
"لیکن..."
"پلیز..." میں نے سخت لہجے میں کہا اور اس کو بازو سے پکڑ کے بلیک سیڈان کی اگلی سیٹ پر بٹھادیا۔ "یہاں بحث مت کرو۔ بعد میں راستے میں سب سمجھادوں گا۔"
وہ میری درشتی سے سہم گئی اور اس کے اندر جمع ہوجانے والے خوف کے طوفان کی جو لہر سے بہا کرلے جانے والی تھی وہ رک گئی۔ میں نے اٹھا کے لاش کو بلیک سیڈان کی ڈکی میں ڈالا جو اتنی بڑی تھی کہ ایک ڈبل بیڈ اس میں آسانی سے سما جاتے۔ باقی دو بے ہوش تھے اور اس بات کا ڈر تھا کہ وہ کسی بھی وقت ہوش میں آکے راستے میں ایک اور ہنگامہ کھڑا کردیں گے۔ احتیاطاً میں نے ان کو ڈکی میں ڈالنے کے بعد نائلون کے ان ٹکڑوں سے باندھ دیا جو ڈکی کے ڈھکنے تھے اور ٹیل لائٹس تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ شاید زیادہ مضبوط نہیں تھے لیکن وہاں اور کچھ دستیاب بھی نہ تھا۔ ڈکی میں ایک ہی مضبوط رسی تھی جس کی مجھے للی کی گاڑی کو ٹو کرنے کے لیے ضرورت تھی۔
للی کی گاڑی کا سامنے والا حصہ تباہ ہوگیا تھا۔ اس کا بونٹ اندر چلا گیا تھا۔ ریڈی ایٹر کا بکھرا تو سب سے پہلے ہوا ہوگا۔ پھر گاڑی درمیان سے اندر گھسا تھا۔ شاید اس سے گاڑی کا ریڈی ایٹر ٹوٹ کر سب پانی نیچے بہہ گیا تھا۔ بونٹ کو کھولے بغیر میں اندازہ کرسکتا تھا، ریڈی ایٹر لیک بھی ٹوٹا ہوگا اور اس حالت میں انجن اسٹارٹ ہوبھی جاتا تو کار کو چلایا نہیں جاسکتا تھا۔
بلیک سیڈان لمبی اور اونچی گاڑی تھی چنانچہ اس کا صرف وہ حصہ تباہ ہوا تھا جس میں ٹیل لائٹس تھیں اور ڈکی کا پچھلا حصہ۔ انجن محفوظ تھا چنانچہ ہم للی کی کار کو اس سے کھینچ کر لے جاسکتے تھے۔ آہستہ آہستہ پورا پلان میرے ذہن میں واضح ہوتا جارہا تھا۔ مجھے فکر تھی تو صرف للی کی۔ ان بدمعاشوں نے اس کی کار کو دیکھ لیا تھا۔ ہم تو غائب ہوجائیں گے مگر للی کہاں جائے گی۔ ان سے بچ کر کہاں جائے گی۔ وہ کوئی گمنام عورت نہیں تھی۔ کار کے نمبر سے اس کا پتا ٹھکانا معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔

پتا لیا جائے گا کہ ہم کون تھے اور کہاں گئے؟
لیکن ان سب سوالات کا جواب فوراً تلاش کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ میں نے اگنیشن کی چابیاں نکال کے للی کی کار کی ڈکی کھولی تو اس میں مجھے دوسری رسی مل گئی۔ ہر سمجھدار کار ڈرائیور یا پرانی کار کا مالک یہ رکھتا ہے، ہو تو برے وقت سے بچنے کے اسباب پہلے سے مہیا ہوتے ہیں۔ گاڑی کسی ویرانے میں ٹھہر جائے اور چلنے پر کسی صورت رضامند نہ ہو تو ایک رسی بہت کام آتی ہے۔ کوئی نہ کوئی رحمدل کار والا اپنی گاڑی کے پیچھے باندھ کے گھر یا مکینک کے دروازے تک چھوڑ ہی جاتا ہے۔
اس دوسری رسی نے میرا پہلا مسئلہ حل کردیا۔ میں نے ان دونوں کو جو بے ہوش تھے انھی کی رسی سے ایک ساتھ یوں باندھا کہ وہ سیدھے ہوگئے۔ دونوں کی پشت مل گئی اور چہرے مختلف سمتوں میں ہوگئے۔ ہاتھوں کو پیروں کے ساتھ کرکے میں نے پوری رسی نیچے سے اوپر تک لپیٹ دی۔ وہ ایک لکڑی کے لٹھے کی طرح ہوگئے تھے، ہل بھی نہیں سکتے تھے۔ اگر وہ زندہ تھے تو ہماری بار کی ایک مرحلے سے گزرتے۔ جو پہلے چھتڑے گاڑی کو صاف کرنے کے لیے رکھے ہوئے تھے وہ ان کی آوازیں بند کرنے کے کام آئے۔
یہ سب کام میں نے بڑی پھرتی سے پانچ منٹ میں ختم کر لیا۔ پھر ہجرت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اس کے لیے میں نے للی کی خستہ گاڑی کو ہمارے جیسی بلیک سیڈان کے ساتھ ایسے باندھا جیسے ہندوؤں کی شادی میں پھیرے کی رسم کے وقت دلہا کے ساتھ دلہن باندھا جاتا ہے۔
"اب ہم واپسی کے سفر کے لیے تیار ہیں۔" میں نے مرزا غالب سے کہا۔ "اور یہ توپ مجھے دے دو۔"
"پہلے میں اسے شوٹ کروں گا۔" غالب نے کسی ضدی بچے کی طرح ٹھنک کر کہا۔
"کر لینا شہنشاہ۔" میں نے اسے ایک شفیق باپ کی طرح ڈانٹ کر سمجھایا۔ "چلو شاباش! اس گاڑی میں۔"
غالب کو پیچھے والی کار میں بٹھا کے اسٹیئرنگ سنبھالنا اور ضرورت کے وقت بریک لگا کے دونوں کاروں کا درمیانی فاصلہ برقرار رکھنا تھا۔ اس سے کوئی فرق تو نہیں پڑتا تھا کیونکہ اب دونوں بھی گلے مل جاتیں تو نقصان جہاں سیر تھا وہاں سوا سیر ہوجاتا۔ لیکن للی اپنی گاڑی کے بارے میں بہت فکرمند نظر آتی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اسے اپنی زندگی کو لاحق خطرات کا خیال نہ تھا۔ ایک عورت کے متعصب ذہن سے سوچتے ہوئے میں نے سوچا، عورت ذات اتنی دور کا کیسے سوچ سکتی ہے۔ اسے تو بس سامنے کا نقصان دکھائی دے رہا ہے۔
"مس للی! کیا تم یہ شپ چلا سکتی ہو؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ چلا سکتی ہوں۔ اس میں وہ سب چیزیں ہیں نا؟ کلچ، بریک، ایکسیلیٹر وغیرہ۔" وہ مسکرائی اور ڈرائیونگ کی نشست پر کھسک گئی۔ بائیں سے اگنیشن میں لگی چابی تلاش کی اور اسے آن کرکے میری طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔
میں نے اقرار میں سر ہلایا اور دروازہ بند کرکے اپنا رخ پیچھے کی طرف کرلیا۔ "مس للی! گاڑی کو بڑھیا گاڑی سمجھ کے چلانا۔ ورنہ اس کا انجن بے قابو ہوگیا تو تمھارے لیے دونوں گاڑیوں کو سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔ بالکل بائیں جانب رہنا..."
"ول یو پلیز شٹ اپ۔" وہ جھنجھلا کے بولی۔ "میرے ڈرائیونگ انسٹرکٹر بننے کی کوشش مت کرو۔ میں کئی بار ایسی گاڑیاں کھینچ کر لے جاچکی ہوں جن کے مقابلے میں میری گاڑی بالکل نئی سمجھی جاسکتی ہے۔ اور یہ بھی پہلا موقع نہیں ہے کہ میری گاڑی ٹو کی جارہی ہے۔ آخری بات تمھاری اطلاع کے لیے یہ ہے کہ میں لانچ بھی چلاتی ہوں اور چھوٹا جہاز اڑانے کا لائسنس بھی رکھتی ہوں۔ جو فلائنگ نہ کرنے کی وجہ سے رنیو نہ ہوسکا ورنہ..."
"میں امپریس ہوگیا۔" میں نے کہا۔ "لیکن دیکھو، ایسے جھٹکے لگا انجن تو جھٹکے سے وہ نازک رشتہ ٹوٹ جائے گا جو اس پرانی اور تمھاری بالکل نئی گاڑی کے درمیان قائم ہے۔ پھر میرا دوست اور تمھاری گاڑی... دونوں پیچھے رہ جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائیں گے۔"
وہ ہنسی۔ "نئی بہن۔ تمھارا بھائی اب تمھارا دوست ہوگیا؟"
"سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔" میں نے متانت سے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔
"وہ بھی تمھارے بھائی ہیں جو ڈکی میں لیٹے ہوئے ہیں؟" وہ ہنسی۔ "کیا رشتہ اخوت ہے!"
کار اتنی دیر میں ایک لمبا چکر کاٹ کے نیم دائرہ بناتی ہوئی واپس بڑی سڑک پر آگئی تھی۔ وہ سب کارروائی جو ویران کچی سڑک پر ہوئی تھی کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ ایک تو بڑی سڑک بھی بہت بڑی نہیں تھی اور اس پر ٹریفک برائے نام رہتی تھی۔ پھر یہ کہ ہمارے اور سڑک کے درمیان درخت اور جھاڑیوں کی دیوار سی حائل رہی تھی۔
"یہ بھی میرا بھائی ہے۔" میں نے پچھلی سیٹ پر پڑے ہوئے شخص کے سر کو ریوالور کی نال سے دبا کے کہا۔ "ایک سگا بھائی ہوتا ہے، ایک سوتیلا۔ کوئی رشتے کا اور کوئی نام کا۔ یہ بڑا خبیث بھائی ہے۔ ہے نا؟"
اس نے مجبوراً اقرار میں سر ہلایا۔
"اس کی یادداشت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے اندر کا کوئی پرزہ ٹوٹ گیا ہے یا ڈھیلا ہوگیا ہے۔" میں نے کہا۔ "کھوپڑی کو کھول کر دیکھنا پڑے گا۔ بیچارے کو نام تک یاد نہیں رہا اپنا۔ کیا ہے بھئی تیرا نام؟"

www.paksociety.com

وہ چپ رہا اور مجھے التجا کرنے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔

"معلوم نہیں کون اس کو لینے پر چلا آ رہا۔ وہ سو روپے دے کر مرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ کون ہے وہ بدمعاش؟" میں نے کہا۔

"دیکھو... میں تم کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ تم چاہو تو مار ڈالو مجھے لیکن جس بات کا مجھے علم ہی نہیں وہ میں کیسے بتاؤں۔ مجھے ان میں سے ایک نے بلایا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے آ جاؤ، ایک چھوٹا سا کام ہے۔ میں آ گیا۔ اس نے مجھے دو سو روپے دیے اور کہا کہ چلو ذرا صفدر تک ڈرائیو کرتے ہیں۔ یہاں آ جانے کے بعد اس نے بتایا کہ ایک آدمی کو ساتھ لے جانا ہے۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ کہاں اور کیوں۔"

"یہ تو بتایا ہوگا کہ وہ آدمی کون ہے؟"

"بس یہ کہا تھا کہ ایک... ہے۔" اس نے میرے بارے میں خاصی فحش گالی استعمال کی۔ "خواہ مخواہ ٹانگ اڑا کے ہمارا کام خراب کیا۔ سیٹھ نے کہا ہے کہ اسے سامنے لاؤ ذرا۔"

"اور یہ سیٹھ کون ہے؟"

"سیٹھ ہم... سیٹھ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ جو پیسہ دے وہ سیٹھ۔" وہ بولا۔ "ہم نہیں پوچھتے نا تو باتیں۔ اور کوئی نام بتاتا بھی نہیں۔"

"یہ سیٹھ کا آدمی کون تھا جس نے تمہیں بلایا تھا؟" میں نے محسوس کیا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

"وہی... جس کو مار دیا تم نے۔ دادا تو نہیں تھا مگر اپنے کو شیامو دادا بولتا تھا۔" اس نے کہا۔ "باقی دو کو بھی اسی نے بلوایا تھا۔ ایسے چھوٹے موٹے کام ہوں تو کام کرنے والے بہت ہوتے ہیں۔ اسی لیے دام بھی کم ملتے ہیں۔"

"دو افراد کا اغوا چھوٹا کام ہے؟"

"ہاں۔ شیامو نے بولا تھا کہ بس ان کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالنا ہے۔ سیٹھ کے پاس میں خود لے جاؤں گا۔ یہ گاڑی بھی اسی کی ہے۔" وہ بولا۔

"بڑا کام کیا ہوتا ہے؟"

"بڑے کام بہت ہیں۔ اپنا نے کبھی کیے نہیں۔ جو لوگ کرتے ہیں بڑا مال کماتے ہیں۔ شراب کی اسمگلنگ۔ جوئے کا اڈا، عورت کا دھندا جیسا یہ شیامو کرتا تھا۔ قتل اور ڈاکا سب بڑے کام ہیں۔"

"تم باقی دو کو نہیں جانتے؟"

"نام نہیں معلوم۔ دیکھا پہلے بھی تھا۔ ایک ہی دنیا ہے اپنی اس لیے ملتے رہتے ہیں۔" وہ بولا۔ "ان کو بھی دو دو سو روپے ملے ہوں گے۔"

"اور شیامو دادا کو؟"

"پتا نہیں۔ اپنا خیال ہے کہ اس نے سیٹھ سے دو ہزار تو ضرور لیے ہوں گے۔ تم اس سے معلوم کر سکتے تھے کہ وہ سیٹھ کون ہے جس نے تمہیں بلوایا تھا۔"

"اس نے ایک آدمی کا کہا تھا۔"

"ہاں۔ شاید خود شیامو کو بھی پتا نہیں تھا کہ آدمی کون ہے؟" وہ بولا۔

"اور وہ بھی جلیبی کی طرح سیدھے نہیں بول گے۔ یہ معلوم ہوتا اسے تو وہ اسے چھوٹا کام نہ سمجھتا۔ دو لاکھ میں بھی اپنی گردن کٹوانے کون جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

ہم اب شہر کے قریب تھے چنانچہ جگہ جگہ ٹریفک پولیس کے سارجنٹ نظر آنے لگے تھے۔ سڑکوں پر گاڑیوں اور بسوں کے ساتھ سائیکلوں اور اسکوٹروں کی آمدورفت بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک چوراہے پر للی نے دائیں طرف دیکھے بغیر گزرنے کی کوشش کی اور ادھر سے آنے والی کار کے ڈرائیور نے زبردست بریک لگائے۔

"پہلے گزرنے کا حق بائیں طرف سے آنے والے کا ہوتا ہے مس للی۔" میں نے کہا۔ "کیا تم کو یہ بات معلوم ہے؟"

"مجھے یہ معلوم ہے کہ ٹریفک سارجنٹ پیچھے آ رہا ہے۔" وہ عقب نما آئینے میں دیکھ کر بولی۔

"یاد رکھو۔ ہم مکینک ہیں۔ تم نے ہمیں بلایا تھا گاڑی ٹھیک کرنے کے لیے مگر تمہاری اپنی غلطی کی وجہ سے جب گاڑی ٹھیک ہو گئی تو ہماری گاڑی سے ٹکرا گئی۔ جب تم نے گاڑی اسٹارٹ کی تو تم کو اندازہ نہیں تھا کہ بریک بھی فیل ہو چکے ہیں۔ ہم اب گاڑی اپنے ورکشاپ لے جا رہے ہیں۔ شکایت درج کروانے [illegible] نہیں۔ تم خود ڈری ہوئی ہو اس لیے چوک میں بے احتیاطی ہو گئی۔ رائٹ؟"

"رائٹ۔ میرے کاغذات پورے ہیں۔ مگر تم..."

"تم جیسا لوگ کسی مکینک سے منہ نہیں لگتے۔ اس کے علاوہ مس للی بعض اوقات خوبصورت عورت کی ایک مسکراہٹ وہ کام کر جاتی ہے جو بندوق کی یا جلاب کی گولی نہیں کر پاتی۔" میں نے کہا۔ "تم سیدھے اور خاموش بیٹھنا پسند کرو گے [illegible]..."

"میں... وہی کہوں گا جو تم نے کہا... اگر کسی نے پوچھا۔"

سارجنٹ نے سائرن بجا کے ہمیں متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے للی سے کہا کہ وہ پروا نہ کرے اور چلتی رہے۔

"اس سے وہ مشتعل ہوگا۔ ہمارا جرم زیادہ سنگین بھی ہو جائے گا۔" وہ پریشان ہو کے بولی۔

"سائیکالوجی مس للی!" میں نے کہا۔ "ہم یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ ہمیں تو احساس بھی نہیں کہ ہم سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ خود سوچو کہ ہم نے کچھ نہ کیا ہوتا تو یہ کیوں سمجھتے کہ پولیس ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔ سڑک پہ اور گاڑیاں بھی تو ہیں۔"

سارجنٹ نے اتنی دیر میں ہمیں اوورٹیک کرتے ہوئے اپنی موٹر سائیکل کو بالکل سامنے لا کے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ہم گاڑی کو ایک کنارے پہ روک لیں۔

حسب توقع اس نے پولیس کی روایتی بداخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے غرا کے پوچھا۔ "کیا تم لوگ بہرے ہو، سائرن سن کے گاڑی نہیں روکی؟" اس کے لہجے میں جتنی ہو سکتی کرختگی تھی۔

"نہیں جناب۔ ہو سکتا تھا کہ سائرن میرے لیے ہے؟" للی نے کہا۔

میں نے اس کی تائید کی۔ "سائرن کوئی لاؤڈ اسپیکر نہیں ہوتا کہ نام لے کر پکارے۔ ویسے بات کیا ہے؟"

"تم اپنا منہ اس وقت تک بند رکھو جب تک کہ میں تم سے کوئی سوال نہ کروں۔" وہ میری انگریزی سن کے کچھ دب گیا۔ "خاتون آپ نے بہت غلط طریقے پہ چوک کو کراس کیا تھا۔ ایک حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔"

"سوری آفیسر!" للی نے ایک دلکش مسکراہٹ میں اداکاری شامل کر کے کہا۔ "میں اپنی طرف سے تو محتاط تھی۔"

"میں ڈرائیونگ لائسنس دیکھ سکتا ہوں آپ کا؟" وہ کسی قدر نرم پڑتے ہوئے بولا۔

"ضرور۔ وہ میری گاڑی میں ہے۔" للی نے انگوٹھے سے پیچھے کی طرف اشارہ کیا اور نیچے اتر گئی۔

"کیا ہوا تھا آپ کی کار کو؟" وہ بولا۔

"کچھ نہیں... ہونے والی بات تھی۔ اور بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ بھی میری ہی غلطی تھی..." للی نے کہا۔ [illegible]

"کیا آپ غلطی اکثر کرتی ہیں۔ ایسی ہی خطرناک قسم کی...؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"او... نہیں... دراصل اسی کی وجہ سے میں کچھ نروس تھی۔" للی نے اسے پیچھے لے جا کے اپنی اسٹوری سنائی۔ کاغذات اصلی گاڑی [illegible] میں تھے جو للی نے [illegible] انداز دلربائی کے ساتھ پیش کیے۔

وہ میری طرف آیا۔ "تم لوگ مکینک ہو [illegible]"

[illegible]

"میرے ذہن میں الجھن تھی اور بائیں جانب مجھے چوٹ آ گئی تھی۔" اسی نازک [illegible] نے للی کو [illegible] چہرے پر [illegible] کہا۔

"ورکشاپ کہاں ہے تمہارا؟"

میں اس سوال کے لیے بالکل تیار نہ تھا لیکن میں نے کہہ دیا۔ "ملیر میں۔"

"اچھا، یہ لو میرا کارڈ۔" اس نے مجھے ایک کارڈ تھما کے کہا۔ "کسی وقت میری گاڑی کو چیک کر لینا۔ [illegible]"

[illegible] میں نے مکینک حضرات کے مخصوص انداز میں فیصلہ صادر کر دیا۔

"ضرور ہو تو کچھ لینا۔" وہ بولا اور موٹر سائیکل کو کک مارنے لگا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ [illegible] اس جنگلی ذہنیت کا بھی شکر گزار تھا جس کی [illegible] نے مجھے زیادہ بڑی مشکل [illegible] تو مجھے اس کو بھی [illegible] کرنا پڑتا اور پھر پولیس سارجنٹ سے نمٹنے کے [illegible] صرف [illegible]۔ لیکن وہ خود ایک مجرم تھا۔ مجرموں کا قانون [illegible] تھا وہ اسی کی دنیا کا باسی تھا۔ وہ بولتا تو اپنا راز کھولتا مگر ہم بچ جاتے کیونکہ اس کے خیال میں ہم مجرم نہیں تھے۔ ہم نے مجرموں کے ایک گروہ کو کافی نقصان پہنچایا تھا چنانچہ وہ ہمارے دشمن ہو گئے تھے۔ یہ بالواسطہ طور پر پولیس کی مدد تھی اور اس سے ہم قانون کے طرفدار ثابت ہوتے تھے۔ صرف یہ کہ وہ خود اغوا کی واردات میں شامل تھا۔ اغوا کیے جانے والے ہم تھے چنانچہ قانون کا ہمارا طرفدار ثابت ہوتا۔

یہ سب کچھ سوچ کے اس نے بھی پولیس کے دفع ہو جانے پر شکر ادا کیا ہوگا کہ آسمان سے گر کے کھجور میں اٹکنے کی نوبت نہیں آئی۔

سارجنٹ کے کارڈ کو میں نے دیکھے بغیر جیب میں ڈال لیا تھا۔ جب وہ واپس چلا گیا اور ہم آگے نکل آئے تو میں نے کارڈ نکال کے دیکھا۔ اس پر نام پتا سب ہندی میں لکھا ہوا تھا اور میں للی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مجھے اس رسم الخط کی سمجھ نہیں آتی۔

"مس للی! گاڑی کو یہاں روکو۔" میں نے کارڈ واپس رکھ کے کہا۔ جس جگہ کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا وہ ایک پرانی بستی [illegible] تیز رفتاری سے [illegible] بستی کی [illegible] مستقل ٹھکانا [illegible] نہیں۔ [illegible] لوگ بستی میں ہر طرف [illegible] کے فٹ پاتھ پر [illegible] کے نیچے اپنا بسیرا کرتے ہیں۔ [illegible] جہاں بھی آدمی کے [illegible] جگہ [illegible] وہ [illegible] آدمی [illegible] خدا کی زمین اور آسمان کی چھت [illegible] ان کے لیے [illegible] گزار [illegible] زندگی کے [illegible]

ریلوے لائن تک [illegible] بیٹھے ہوئے [illegible] کے [illegible] بڑے بھیڑیے اور [illegible] تھے۔ [illegible] کرشن چندر کے ناول میں بستی کا جو نقشہ میں نے دیکھا تھا وہ میرے ذہن میں تھا اور جو تصویر میرے سامنے تھی وہ اس سے مختلف نہ تھی چنانچہ میں نے للی کے سامنے کسی حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے رک گئیں۔ غالب اتر کے آگے آیا۔

"کیا آپ یہاں رہتی ہیں؟" اس نے بستیوں اور کھنڈروں کی قطار کی سمت میں اشارہ کر کے کہا۔

للی ہنسی۔ "پہلے رہتی تھی۔ بہت پہلے۔ ایسی ہی جگہ تھی وہ بھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب میرے پاس خوش قسمتی کے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے اپنا ایک گھر ہے۔"

"مس للی کی گاڑی کو الگ کر لو۔" میں نے کہا۔ "اور مس للی! آپ اپنی اس گاڑی میں سے سب کچھ نکال لیں۔ کوئی بھی ایسی چیز نہ چھوڑیں جس سے بعد میں آپ کا سراغ ملے۔"

"کیا مطلب؟ اس گاڑی کو میں یہاں ہمیشہ کے لیے چھوڑ جاؤں گی؟" وہ بگڑ کے بولی۔

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی۔۔۔" میں نے کہا۔ "ہم اسے بعد میں لے جائیں گے۔"

وہ کچھ شرمندہ ہوئی۔ "سوری۔ میں اس کی مرمت پر دو چار ہزار خرچ کر سکتی ہوں۔ دوسری گاڑی افورڈ نہیں کر سکتی۔"

غالب دونوں گاڑیوں سے بندھی ہوئی مضبوط نائلون کی رسّی کو کھولنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ کھینچنے سے گانٹھیں اتنی سخت ہو گئی تھیں کہ اب آسانی سے کھلنے والی نہیں تھیں۔ للی کار کے دروازے میں آدھی گھسی ہوئی اندر سے اپنے کاغذات نکالنے میں مصروف تھی۔

میں نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو باہر آنے کا حکم دیا۔ وہ کچھ وحشت زدہ سا اتر آیا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ ہم اس ویران اور الگ تھلگ جگہ پر گاڑی کے ساتھ اس کی لاش بھی چھوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

"تم اب جا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "ایک شرط پر۔"

وہ کچھ ہچکچا کر رہ گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد جب اس نے اپنی حیرانی پر قابو پا لیا اور اسے میرے الفاظ کا یقین آ گیا تو اس کے چہرے کی رونق لوٹ آئی۔ "کیا شرط ہے۔۔۔؟"

"تنیا وڈوالے کے ٹھکانے کا تم کو ضرور علم ہوگا۔ جب وہ تم کو بلاتا تھا تو تم کہاں رپورٹ کرتے تھے؟" میں نے کہا۔

"بار بار۔" وہ بولا۔

"سو بار یا ہزار بار۔ کہاں پہنچتے تھے تم؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"اس جگہ کا نام ہے بار بار۔ وہ ایک تھرڈ کلاس بار ہے بھنڈی بازار میں۔" وہ بولا۔ "اس پر سائن بورڈ کوئی نہیں ہے۔ مگر وہ مشہور۔۔۔ میرا مطلب ہے بدنام جگہ ہے۔ تم کسی سے بھی پوچھ لینا۔ ہر شریف آدمی نفرت سے بتائے گا۔ بار کی مالک ایک عورت بار بار ہے۔ اس کے نام میں دو مرتبہ بار کا لفظ آتا ہے۔"

"یہ فلسفیانہ نکتہ میری سمجھ شریف میں آ گیا۔" میں نے کہا۔ "تم آگے بولو۔ کس تماش کی عورت ہے؟"

"پولیس ہی جیسی کو ہونی چاہیے اس کاروبار میں۔ وہ بار کے علاوہ قحبہ خانہ چلاتی ہے۔ اس کے مراسم پولیس اور بدمعاشوں سے ایک جیسے کاروباری ہیں۔ وہ اس کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ بار والی ان کو دونوں چیزیں فری فراہم کرتی ہے جو اس کے پاس اور دوسرے عام لوگوں کو قیمت ادا کر کے ملتی ہیں۔"

"پھر تو وہاں خاک کرتی ہوگی۔ سارے شہر کے بدمعاشوں اور پوری بمبئی کی پولیس کا اجتماع رہتا ہوگا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "صرف اپنے علاقے کے دادا اور اپنے علاقے کی پولیس۔ علاقے سے باہر کوئی نہیں جاتا۔ کیا اب میں جاؤں؟"

"ضرور جاؤ۔ اور یہ سب بھول جاؤ جو تم نے دیکھا یا سنا۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے ورنہ تم دیکھ ہی چکے ہو کہ ہم کیسے لوگ ہیں۔ ہم آ جائیں گے تم کو تلاش کرتے ہوئے۔ دنیا ہمارے لیے چھوٹی سی جگہ ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے سر ہلایا اور پلٹ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا غائب ہو گیا۔ للی اپنی گاڑی سے سب کاغذات وغیرہ نکال کر لے آئی تھی اور غالب نے بھی رسّی کاٹ کے الگ کر دی تھی۔ ڈرائیونگ اب میں نے سنبھالی اور للی سے کہا کہ وہ ہمیں راستہ بتاتی جائے۔

دو میل آگے جانے کے بعد مجھے پھر ایک ایسی جگہ نظر آئی جہاں کار روک کے میں نے ڈکی کھولی۔ بندھے ہوئے افراد میں سے ایک کو ہوش آ گیا تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر باہر نکالا اور سڑک کے کنارے پر پھینک دیا۔ اس میں فوراً اٹھنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ گاڑی چلانے کے بعد میں نے آئینے میں دیکھا تو وہ کھڑا ہو چکا تھا۔ پھر ہم نے موڑ کاٹا اور میں نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ دوسرا شخص اس وقت بھی بے ہوش تھا جب میں نے اسے سڑک کے کنارے ایک بنچ پر لٹا دیا۔

"تمہارا فلیٹ اب کتنی دور ہے؟" میں نے پھر گاڑی بڑھا کے کہا۔

"ابھی پانچ چھ میل کا فاصلہ تو ہوگا۔" للی نے کہا۔ "کیوں؟"

"میں تم کو اس شاہی چھکڑے میں ہی گھر کے دروازے پر ڈراپ کروں گا تو تمہاری پوزیشن مشتبہ ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

"کیا تم گاڑی کو ایسے ہی چھوڑ دو گے۔ لاوارث؟"

"یہ گاڑی نہیں، میت گاڑی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس میں جو لاش ہے وہ بھی لاوارث ہے۔"

گاڑی کو میں نے دو میل آگے جا کے روک دیا۔ ہم پیدل ہی آگے روانہ ہو گئے۔ ایک فرلانگ چلنے کے بعد میں نے ٹیکسی روکنے کا خیال ظاہر کیا۔

"اب تم جاؤ۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب! اکیلی جاؤں؟"

"تم اس ویرانے میں کار سے اکیلی پھر رہی تھیں۔ پھر تنہا شہر

میں ڈرنے کی کون سی بات ہے؟"

"تم نے ہی ادا کرتے وقت ایٹی کیٹس کی بات کی تھی۔ کیا یہ ایٹی کیٹس کے خلاف نہیں کہ تم مجھے چھوڑنے جاؤ۔ اور پھر شب تم کو کم سے کم ایک کپ چائے کے لیے ضرور کہوں۔ اور تم اخلاقاً اس دعوت کو مسترد نہ کر دو۔"

میں ہنس پڑا۔ "ہم ایٹی کیٹس کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

للی نے خود ہی میرا مسئلہ حل کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ جاؤں اور اسے بہت سی باتیں سمجھاؤں جو شاید اس کے ذہن میں نہیں تھیں لیکن میں زبردستی اس کے ساتھ کیل نہیں ہونا چاہتا تھا۔

للی کا فلیٹ ایک پرانی پانچ منزلہ عمارت کے تیسرے مالے پر تھا یعنی تیسری منزل پر۔ دو مختصر کمروں اور مختصر ترین کچن اور باتھ پر مشتمل فلیٹ کا مجموعی رقبہ شاید چار سو اسکوائر فٹ ہوگا لیکن نئی نکیلی رہتی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کا بھی ایسا شاندار میک اپ کیا تھا کہ وہ معمولی فلیٹ اس معمولی لڑکی کی طرح قیامت خیز طور پر خوبصورت نظر آنے لگا تھا جیسے ماہرین آرائش نے دلہن بنا دیا ہو۔ ڈرائنگ روم میں ہر چیز اتنی صاف ستھری چمکتی دمکتی اور قرینے سے رکھی ہوئی تھی کہ ہمیں قالین پر اپنے گھسے ہوئے جوتوں کے ساتھ چلتے ہوئے جھجک محسوس ہوئی۔ یہی حال بیڈ روم کا بھی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ فلیٹ صرف ایک شو پیس ہے۔ اس میں رہتا کوئی نہیں اور اسے صرف فلیٹ بنانے والے اپنی اشتہاری فلموں کی شوٹنگ میں استعمال کرتے رہے ہوں گے۔

"کہتے ہیں گھر مکین کی خوبصورتی کا آئینہ ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بات سچ ہے۔"

"آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اور یہ مت سوچو کہ میں یہاں تم کو صرف چائے کا ایک کپ پلانے کے لیے نہیں لائی ہوں۔" وہ بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم اپنا حلیہ ٹھیک کر لو۔ اس میک اپ کو بدل ڈالو۔ اگر میک اپ کے پیچھے رہنا ضروری ہے تو میں تمہاری مدد کروں گی۔ لیکن اس میک اپ میں فنی خرابی ہی نہیں، خطرہ بھی ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ پہلے تم نہا دھو کے یہ میک اپ اتارو گے یا پہلے چائے پیو گے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس وقت تو ہم صرف ایک کپ چائے کا ہی پئیں گے۔" میں نے گھڑی پر نگاہ ڈال کے کہا جس میں شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ "ہمارے لیے تمہاری تشویش کے جذبات یقیناً قابل قدر ہیں۔ اور چونکہ تم سے کوئی پردہ نہیں رہا اس لیے میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس میک اپ کے ساتھ پھرنے میں واقعی ہمارے لیے خطرات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہمارا اصل چہرہ پھر بھی دیکھنا جب ہم تمہارے فنکار ہاتھوں سے اپنا چہرہ بدلوانے آئیں گے۔"

"آخر کس بات کی جلدی ہے؟" وہ مایوسی سے بولی۔

"مجھے کوئی جلدی نہیں۔" غالب نے مسکرا کے کہا۔ "لیکن اس کو کہیں پہنچنا ہے۔ ایک ایسا کام جو ٹالا نہیں جا سکتا۔۔۔"

"تو اسے جانے دو۔" وہ بولی۔ "میں نہیں پوچھتی کام کیا ہے مگر اس طرح یہ لوٹ کر تو آئے گا؟"

غالب نے کہا۔ "ہم میں سے کوئی کہیں اکیلا نہیں گیا۔ ہم ایک دوسرے کا سایہ ہیں۔ شاید جہنم میں بھی اکٹھے جائیں گے۔"

"جاؤ تم اپنا ہاتھ منہ دھو لو اور ڈریسنگ کر لو۔ چہرے پر خراشوں کے نشان نہ رہ جائیں کہیں۔" میں نے کہا۔

وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی لیکن اس کی آنکھوں کی ویرانی سے میں نے اندازہ کر لیا کہ درحقیقت وہ کچھ اور دیکھ رہی ہے جو نہ میرے سامنے ہے اور نہ اس کے سامنے بلکہ صرف اس کے خیالوں میں ہے اور اس کے ماضی کا حصہ ہے یا مستقبل کا خواب ہے۔ پھر اس نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "کون دیکھتا ہے یہ داغ۔ ان سے گہرے تو دل کے داغ ہیں۔"

پھر اچانک اس نے اپنی بات پر ہنسنا ضروری سمجھا لیکن یہ ہنسی مصنوعی تھی۔ جیسے کوئی دیوار کی بدنمائی کو چھپانے کے لیے اس پر خوبصورت رنگوں والا ریشمی پردہ ڈال دے۔ وہ ایک دم پلٹ کے اندر غائب ہو گئی کہ کہیں ہم اس سے کچھ پوچھ نہ لیں۔ یہ کہ اب کتنی جگہ ہے تمہارے دل زار میں۔ اور جو داغ دل کے ہیں کس کی عطا ہیں۔ چارہ گر ورا!

"ایک دکھی عورت ہی ایسے کسی کا دکھ بانٹنے کو ترستی ہے۔" غالب نے کہا۔ "اور لوگ اتنے خود غرض اور بے رحم ہیں کہ اپنے دکھ میں بھی کسی کو شریک نہیں کرتے۔"

"جیسے کہ تم۔" میں نے کہا۔ "ہم کب چاہیں گے کہ وہ ہمارے دکھوں میں شامل ہو۔ سکھ سے تو ہمارے دل کا دامن بھی خالی ہے۔"

"ہم سکھ کے خواب تو دیکھتے ہیں۔ کیا اس کے پاس خواب بھی نہیں؟" غالب نے کہا۔

"کیا پتا اس کے دل میں ٹوٹے ہوئے خوابوں ہی کے داغ ہوں۔" میں نے کہا۔

"پھر وہ کیوں ایسے اعتماد کر لیتی ہے۔ ہر اجنبی پر۔۔۔ جیسے کہ ہم۔ کیا اسے خوف محسوس نہیں ہوتا کہ چہرہ بدل کے پھرنے والے لوگ بے اعتماد ہوتے ہیں۔" غالب اب باقاعدہ فلسفی ہو رہا تھا۔

"یہ سب تقدیر کا کھیل ہے۔" میں نے صوفے پر نیم دراز ہو کے سگریٹ نکالی۔ "ورنہ ہم کیا اس سے ملنے کے لیے بمبئی آئے تھے لیکن میں نے یہ طے کیا ہے کہ ہم یہاں لوٹ کر نہیں آئیں گے۔"

"یہ تو۔۔۔ بڑی خود غرضی ہوگی۔۔۔ اگر ہم اس کے لیے کچھ نہ کر سکے۔۔۔ اس پر کوئی مصیبت آ گئی تو۔۔۔ ہماری وجہ سے آئے گی۔"

"یہ تو میں نے بھی سوچا تھا۔" میں نے سگریٹ کو انگلیوں میں گھماتے

ہوئے کہا۔ "مگر مرزا! ہمارا اس کے ساتھ تعلق بھی تو کسی خطرے سے کم خطرناک نہیں۔۔۔"

للی کے آ جانے سے ہماری بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے چہرہ دھو کے صاف کر لیا تھا اور بالوں کو برش کر لیا تھا لیکن کسی قسم کا میک اپ نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود للی کا چہرہ اجلا اور نکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے چائے کی ٹرے میز پر رکھ دی۔

"کس سوچ میں گم ہو؟" وہ مجھے دیکھ کے مسکرائی۔

"سوچ رہا تھا کہ اس سگریٹ کو جلاؤں یا نہ جلاؤں۔" میں نے کہا۔

"بیک وقت اتنے بے تکلف بھی ہو اور تکلف بھی، اجازت لینے لگے مجھ سے۔" وہ بولی۔

"اجازت تو دے دو گی تم۔ مجھے ہی کچھ عجیب سا لگتا ہے اس صاف ستھرے ماحول میں دھواں اور تمباکو کی بو شامل کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے بے داغ چادر پر ان جوتوں سمیت چڑھ جاؤں۔" میں نے کہا۔

اس نے کہا۔ "اچھا تم چائے بناؤ۔ سگریٹ میں جلا دیتی ہوں۔" اور ایک سائیڈ ٹیبل پر سے نازک تھیں اور سنہرے رنگ کا سگریٹ کیس اٹھا لیا۔ "یہ لیجئے۔ سگریٹ پئیں اگر تم پینا چاہو تو۔۔۔" اس نے ویسے ہی لائٹر سے اپنی سگریٹ جلا لی۔ غالب چائے بنانے لگا۔

میں نے لائٹر اٹھا کے تعریفی انداز میں دیکھا اور اپنی سگریٹ سلگا کے کہا۔ "تم نے مجھے احساس جرم سے بچا لیا۔"

"اچھا؟ کمال ہے؟" وہ بولی۔ "دن میں کتنی بار احساس جرم میں مبتلا ہوتے ہو تم؟ زندگی میں تو ہر قدم پر کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔۔۔ ایسا کون ہے جو کوئی غلطی نہ کرے۔ گناہ نہ کرے اور جرم نہ کرے۔ ایسے تو شاید زمین پر چلنا بھی گناہ ہو کہ پیروں کے نیچے کوئی چیونٹی بے گناہ مر جائے گی۔ سانس لینا بھی سزا ہو۔۔۔"

"بس للی۔۔۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔۔۔ یہ فیصلہ کرنا کہ کون مجرم ہے اور کون گناہ گار۔" میں نے کہا۔ "اور ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے جو صرف خدا ہی منصف ہو سکتا ہے انسان نہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے وہ سب کیوں کیا جو بالکل ضروری نہیں تھا جب تم نے سمجھ لیا تھا کہ ہمارے چہرے نقلی ہیں۔ یہ دیکھ لیا تھا کہ ہمارے پیچھے بدمعاش رہتے ہیں۔ تمہارا بہت نقصان بھی کر دیا ہم نے۔ تو پھر تم نے ہمیں پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا؟ تمہیں یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ ہم دھوکے باز، جعل ساز، جیل سے بھاگے ہوئے قیدی کچھ بھی ہو سکتے ہیں؟"

"پہلے مجھے یہ خیال آیا تھا۔ مگر بعد میں بدل گیا۔۔۔"

"پھر۔۔۔ کیا ضرورت تھی ہمیں یہاں لانے کی؟ اتنی ہمدردی کے اور مہمان نوازی کے انتظام سے کی؟"

"کیا میں نے کوئی غلطی کی؟ تم کو اپنا مہمان جان کے اور تم پر بھروسا کر کے؟" وہ حیران ہو کے بولی۔

"ہاں۔ بہت سخت غلطی کی۔ تم پر مصیبت بھی آ سکتی ہے ہماری وجہ سے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ وہ گاڑی تمہارے نام پر ہے یا اس کے پتے پر؟"

اس نے کچھ سوچ کے کہا۔ "نام۔۔۔ نہیں۔۔۔ اس پر ابھی تک وہی نام چل رہا ہے۔ جو اب کہیں نہیں، سوائے اس بنگلے کے؟" وہ اپنے دل پر انگلی رکھ کے بولی۔ "اور ایک سنگ مرمر کے کتبے کے جو ایک قبر کے سرہانے نصب ہے۔ یہ دل بھی ایک پتھر ہے۔ وہ قبر بھی اور نام ابھی تک لیمرو زندہ ہے۔"

"آئی ایم سوری۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا۔ کیا وہ شوہر تھا تمہارا؟"

للی نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہاں! اسی نے یہ گاڑی خرید کے دی تھی مجھے۔ بہت خیال تھا اسے میرا اور اب بھی ہے۔ وہ مجھے ایسے محسوس۔۔۔ آج بھی اسی کے نام کی وجہ سے محفوظ ہوں میں۔ وہ اگر گاڑی کی رجسٹریشن دیکھ کے میرا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے تو ان کو مایوسی ہوگی۔ وہ پتا بھی اب تک کاغذات میں چل رہا ہے۔"

"تمہاری اس کار سے ایک جذباتی وابستگی ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر میں یہ کہوں کہ اسے بھول جاؤ۔ تو تمہارے لیے مشکل ہوگا؟"

"مشکل تو ہوگا۔" اس نے غالب سے چائے کا کپ لے کر کہا۔

"مگر ناممکن نہیں۔" میں نے کہا۔

"ناممکن کچھ ہوتا تو میں لیمرو کے بغیر زندہ کیسے رہتی۔ آخر اسے بھی تو بھلا دیا میں نے۔ اب ایسے ہی اس کا ذکر آ جاتا ہے کبھی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ زندگی گزر رہی ہے۔ تم چائے پیو اور یہ بسکٹ لو۔ اس وقت یہی تھے۔"

میں سخت جذباتی کشمکش میں گرفتار ہو گیا تھا۔ لیکن للی کے رویے نے مجھے حوصلہ دیا۔ "مسز للی! تم کو یہ صدمہ بھی برداشت کرنا ہوگا۔ مجھے لگا کہ تمہارے شوہر کی ایک خوبصورت نشانی تھی۔ آج وہ بھی کھو گئی۔ قصور وار ہم ہیں۔ صرف سوری کہنے سے زیادہ شرمندگی ہوگی۔"

"پھر کیا کرو گے؟" وہ مسکرائی۔ "ہمارا دل رکھنے کے لیے؟"

"جو میں کہوں گا مانو گی؟" میں نے کہا۔ "صاف بات یہ ہے مسز للی کہ تمہارے اور ہمارے درمیان ابھی تک کوئی جذباتی رشتہ ہے ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری وجہ سے تم کو بہت نقصان ہوا اور شاید آئندہ بھی ہو۔ اس لیے میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں مزید نقصانات سے بچانے کے لیے۔ اگر تم نے انکار کیا تو میرے دل پر ایک بوجھ ہمیشہ رہے گا۔ کچھ میرے لیے اس کار کا مسئلہ ہو جائے گا۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ بہت اچھی بات ہے مسز للی کہ تم حقیقت پسند بھی ہو۔ کوئی بھی چیز ہمیشہ ساتھ نہیں دیتی۔ اس کار کو تم کب تک رکھ سکتی تھیں۔ وہ اتنی پرانی ہو گئی تھی کہ دو چار سال میں جواب دے جاتی۔ اس کے

بعد تو اسے اپنے ذاتی میوزیم میں سنبھال کے تو رکھ نہیں سکتی تھیں۔ وہ پیچھے گیراج میں کھڑی رہتی۔ اس کی سیٹ پھٹ جاتی۔ تم نے کبھی کباڑیے کو دیکھا ہے۔ بہت آہستہ آہستہ ٹی بی کے لاعلاج مریض کی طرح۔ ایسے ہی وہ بھی مر جاتی۔ اس کی لاش بھی تمہارے دروازے پر پڑی رہتی تو کتنے دن؟ بالآخر لوگ اعتراض کرنے لگتے کہ اسے ہٹاؤ۔ گلی تنگ ہے اور ہمارا راستہ روک رہی ہے تمہارے مرحوم شوہر کی یہ نشانی۔ کباڑی لے جاتے۔ یہ سب کہنے میں اچھے نہیں لگتے۔ رفاقت کی سب نشانیوں کو سمیٹ کر رکھنا ممکن ہی نہیں۔ تم مجھے سنگدل کہو یا سفاک۔ مگر میں وہی کہوں گا جو مجھے کہنا چاہیے۔ اس گاڑی کو بھول جاؤ۔"

وہ کچھ دیر خاموشی سے سگریٹ کے کش لگاتی رہی۔ "ہاں۔۔۔ ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہی تھا۔ خود مجھے کئی بار خیال آیا کہ اس گاڑی کو اب بدل دینا چاہیے۔ جو لوگ مذاق نہیں اڑاتے تھے وہ بھی میرا دل رکھتے ہیں۔۔۔ ورنہ اس کے کتنے نام رکھے ہیں دوسروں نے۔ یہ مجھے معلوم ہے لیکن۔۔۔ اس کار کا کیا بنے گا؟"

میں نے کہا۔ "کچھ نہیں۔ وہ وہاں لاوارث کھڑی رہے گی۔ جو لاوارث لوگ وہاں ہوتے ہیں ان میں سے کچھ کا بھلا ہو جائے گا۔ ایک ایک کر کے وہ اس کے کارآمد پرزے نکالتے جائیں گے اور بیچ کر کھاتے جائیں گے۔ کوئی اس کی سیٹ نکال لے گا۔ اپنا بچھونا بنانے کے لیے۔ یا ممکن ہے کوئی اس میں رہنے لگے۔ تم دوسری لے آؤ گی تو یہ بالکل بھول جاؤ گی اور زندگی پہلے کی طرح گزرتی جائے گی۔"

"دوسری؟ میں نے تم کو بتایا تھا کہ میں دوسری کار ابھی نہیں لے سکتی۔ کیا تم نے اس پر یقین نہیں کیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "دوسری کار ہم لائیں گے تمہارے لیے۔"

وہ ایک دم برہم ہو گئی۔ "تم۔۔۔ تم کیوں لاؤ گے؟ تم کو کیا حق پہنچتا ہے؟"

"حق پہنچتا ہے۔ اس لیے کہ ہماری وجہ سے ہی تمہاری کار گئی۔ تم کو ہم سے نقصانات کی تلافی کا مطالبہ کرنے کا حق ہے۔ ... مگر نہ تم نے ایسا کیا ... ہم سے کچھ وصول کرنے ... ہمارے دل میں یہ احساس پیدا کیا ہے ... ہماری اخلاقی ذمہ داری ہے۔ اس کار کے بدلے ... ضرور ملے گی۔"

... "بالکل نئی مرسڈیز؟" ... تحفہ ...

"میں کسی اجنبی سے تحفہ قبول نہیں کر سکتی۔ یہ بھی بے عزتی ہے۔۔۔"

"ہم اب اجنبی نہیں رہے۔" غالب نے کہا۔

"اور یہ تحفہ نہیں تلافی ہے۔ تم کو ویسی ہی کار ملے گی۔ بالکل نئی شاید نہ ہو مگر ہم اسے اچھی سے اچھی لانے کی کوشش کریں گے۔"

"پھر یہ تلافی تو نہ ہوئی۔۔۔ تم کو تو زیادہ سے زیادہ وہ قیمت لانی چاہیے جو مجھے مل سکتی تھی۔" للی نے کہا۔

"اس میں اپنی پریشانی کا معاوضہ بھی شامل کر دو۔" میں نے کہا۔ "اس کے ذمے دار بھی ہم ہی تھے۔ پھر چونکہ مدد تم نے کی اور آئندہ کرو گی، اس کا ہماری طرف سے کوئی صلہ، نذرانہ، انعام کچھ تو ہوگا۔ بس اس سے ایک تقریباً نئی گاڑی آ جائے گی۔"

وہ ہنس پڑی۔ "تم بہت چالاک آدمی ہو۔ لیکن مسٹر بلاک، میں نے کسی صلے یا انعام کی خاطر تمہاری مدد نہیں کی تھی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ شاید میں نے غلط الفاظ استعمال کیے۔ تم یوں کر لو کہ ہم اس نیکی کے جواب میں ایک معمولی سی نیکی کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے۔۔۔"

"دیکھو، یہ بہت مشکل ہے میرے لیے۔ میں بہرحال یہ کہہ سکتی ہوں کہ ابھی دس سال بعد لوں گی نئی گاڑی۔ ویسے تو وہ سب میری اتنی عزت کرتے ہیں۔ ... کے سب لوگ۔ کہ آج میں ان سے کہوں تو کئی مجھے ... پرانی گاڑی کا ... دے۔ میں ... بھی لے سکتی ہوں۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہاری خودداری مجروح ہوگی اس سے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر تم نے ہمیں بھی انکار کیا تو ہم آج کے بعد لوٹ کر یہاں نہیں آئیں گے۔ حالانکہ ہمیں تمہاری مدد کی اور پناہ کی ضرورت ہے۔ اپنا چہرہ بدلوانے کے لیے۔"

"ابھی سے دھمکی دے رہے ہو؟"

"ظاہر ہے جب تم انکار کرو گی تو تعلق خود ہی ختم ہو جائے گا۔" غالب نے کہا۔ "اور تم ہمارے جذبات کی قدر کرو گی تو پھر ہم خود آئیں گے اور تم ہمارا اصل چہرہ بھی دیکھو گی۔"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ "معلوم نہیں کیوں میں تمہاری ہر بات ماننے پر مجبور ہوں۔ تم مجھے ایسی ویسی عورت مت سمجھنا جیسی کہ بستی میں تمام ہیں۔ میں نے کسی مرد کو اتنی لفٹ نہیں دی کبھی۔"

"وجہ تمہیں ضرور معلوم ہوگی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "یا معلوم ہو جائے گی کہ اس ملاقات کو تم نے تعلق کی بنیاد کیوں بنا لیا۔ اور وہ بھی کچھ جانے بغیر۔ تم نے تو ابھی تک ہمارا نام بھی نہیں پوچھا۔ ہمارا اصل نام۔"

"تم خود ہی بتا دو گے۔" اس نے اپنی اداسی کو بشاشت میں بدلنے کی کوشش کی۔ "مجھے جلدی نہیں ہے۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا لیکن وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے تذبذب کے بعد فیصلہ کیا۔ "نام میں کیا

www.paksociety.com

رکھا ہے۔ اصل اہمیت تو جذبات کی ہے اور نیت کے خلوص کی ہے۔"

میں نے کہا: "ہاں۔ یہ ٹھیک کہا تم نے۔ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا۔ لیکن ابھی ہمارے نام ڈائری میں جو ہمارے پاسپورٹ میں لکھے ہوئے ہیں۔ میں امیر چند ولد دھڑی لال۔ یہ میرا بھائی تقدیر چند ولد دھڑی لال۔ سوری گیا شی۔"

لَلی کو بے اختیار ہنسی آ گئی: "ایک بھائی امیر اور ایک فقیر۔"

غالب نے ایک سرد آہ بھری: "جو چھوٹے ہوں ان کے ساتھ انصاف کہاں ہوتا ہے بس لَلی۔ میں چھوٹا تھا ورنہ آپ خود فیصلہ کریں۔ صورت سے کون بھک منگا نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا: "بس لَلی، ایک بات پوچھوں؟ ذاتی سی ہے۔"

"میری ذات کے بارے میں بھی کوئی بات ذاتی نہیں۔"

"میں نے دیکھا تھا کہ تم اچھی اداکاری کر لیتی ہو۔ اس پولیس سارجنٹ کو تم نے اداکاری سے ہی مات دی تھی۔" میں نے کہا۔ "بلکہ میک اپ کے بغیر بھی تم خوبصورت ہو۔۔۔"

"یہ تم تیسری بار مجھے خوبصورت کہہ رہے ہو۔" اس نے ہنس کے کہا۔ "کیا بات ہے۔ میرے چکر میں تو نہیں پڑ گئے ہو؟"

اس کی بے باکی میں بھی بڑی معصومیت تھی۔ میں نے کہا۔ "ضرور پڑ جاتا اگر پہلے نہ ہوتا۔ اب اگلے جنم میں دیکھوں گا۔"

"گویا شادی کر چکے ہو۔ کیا وہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ مجھ سے بھی زیادہ؟" لَلی نے کہا۔

"شاید سب کو تم لگتی ہے۔ کسی اور کو نہ لگے تو قصور میرا نہیں۔" میں نے کہا۔

"بچے کتنے ہیں؟"

"پتا نہیں۔" میں نے افسردہ شکل بنا کے کہا۔

وہ بولی: "پتا نہیں سے کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جب ہوں گے تب ہی پتا چلے گا نا۔ مقدر میں کتنے ہیں۔ یہ اس نے کسی جوتشی سے بھی نہیں پوچھا۔" غالب نے جواب دیا۔

"تم نے اس سوال کا جواب گول کر دیا۔ تم نے اداکارہ بننا کیوں منظور نہیں کیا جبکہ تمہیں اس کے بہترین مواقع حاصل تھے۔ کون نہیں جانتا کہ راج کپور فیملی اسٹار بناتی ہے۔ اور یہ وہ خواب ہے جو بمبئی آنے والی ہر لڑکی دیکھتی ہے۔ اس خواب کو تعبیر مل جائے تو عزت، شہرت، دولت سب مل جاتا ہے۔ تمہاری دسترس میں تھا یہ سب کچھ۔" میں نے کہا۔

وہ جیسے پھر اپنے خیالوں میں گم ہو گئی: "ہاں۔ مگر بعض اوقات اپنے خوابوں سے بھی دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ زیادہ بڑی خوشیوں کے لیے یا کسی اور کی خاطر۔ کم سے کم تین لڑکیاں ایسی ہیں جن کے لیے میں نے دل سے کہا۔ راج کپور سے۔ اور ان میں سے ایک تو ٹاپ کی ہیروئن ہے آج۔"

"تم سے نہیں کہا انھوں نے۔ راج کپور یا ششی کپور نے؟"

"سب نے کہا۔ مگر میں نے ہی انکار کیا۔ سمجھا زیادتی ہے۔ دنیا کی سو فیصد عورتیں اداکارہ بن کے شہرت، عزت اور دولت حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ایسی کوئی عورت نہیں ہوتی جسے یہ سب زندگی میں خوشی حاصل کرنے کے لیے ضروری محسوس نہ ہوتا ہو۔"

میں اس کے سوال پر حیران اور خفت زدہ ہو کے سر کھجانے لگا: "نہیں۔۔۔ ایسا تو نہیں۔ میں عام بات کر رہا تھا۔ سو فیصد کی نہیں۔ دو چار یا دس بیس فیصد ایسی ضرور ہوتی ہوں گی جو راج کپور کی فلم میں لیڈ رول قبول کرنے سے بھی انکار کر دیں۔"

"بس تو سمجھو کہ میں انہی دو چار یا دس بیس فیصد میں شامل ہوں۔" وہ ہنسی۔ "بے حد بے وقوف ہوتی ہیں نا۔"

میں نے احتجاج کیا: "میں نے یہ نہیں کہا بس لَلی۔"

غالب نے گھڑی کی طرف دیکھ کے کہا: "یہاں سے حاجی علی کی درگاہ تک ہم کتنی دیر میں پہنچ سکتے ہیں؟"

"کس طرح؟ پیدل یا کسی چیز پر سوار ہو کے مثلاً جہاز؟"

"فرض کرو ہم اپنی استطاعت کے مطابق ایک ٹیکسی لے لیں۔"

"ایک گھنٹا تو لازمی ہے۔ احتیاطاً ڈیڑھ گھنٹا سمجھو۔ راستے میں ٹریفک جام ہو یا ٹیکسی خراب ہو جائے۔۔۔"

"پھر تو ہمیں دیر ہو گئی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کل آؤ گے نا؟"

"انشاءاللہ۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا جبکہ مجھے کہنا چاہیے تھا بھگوان نے چاہا تو۔ غالب نے چھپی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھور کے دیکھا اور ملامت بھی کی مگر لَلی نے اپنے رویے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا یا اسے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں لگی۔ بہت سے الفاظ ہماری معاشرت میں داخل ہیں اور ہندو مسلمان بلا تفریق استعمال کر جاتے ہیں مثلاً خود ہمارے پاکستانی معاشرے میں "رام رام جپنا پرایا مال اپنا" جو اسی طرح استعمال ہو رہا ہے حالانکہ "اللہ اللہ کرنا پرایا مال اپنا" بھی استعمال ہو سکتا ہے اور ایسے بہت سے محاورے خالص ہندوستانی تہذیب کے آئینہ دار ہیں جن کو مسلمان صرف عادتاً استعمال کرتے ہیں۔

دروازے پر پہنچ کر میں نے کہا: "بس لَلی! کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم کچھ عرصہ باہر گزار لو۔ کم سے کم دو چار دن اس فلیٹ میں نہ رہو۔"

"میں کہیں بھی رہ سکتی ہوں۔ لیکن ضرورت کیا ہے اس کی؟"

"بس ایسے ہی۔ احتیاطاً۔" میں نے کہا۔ "اگر اس عرصے میں کوئی تم کو تلاش کرتا ہوا آیا تو پاس پڑوس سے ضرور معلوم کرے گا۔ اور تمہیں پتا چل جائے گا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟ دو چار دن بعد وہ پھر آ جائے گا۔"

"دو چار دن بعد کیا ہوتا ہے، یہ بعد میں دیکھیں گے۔ ہم بھی اتنے بے وقوف تو نہیں ہیں بس لَلی۔ ہم معلوم کر لیں گے کہ کون آیا تھا اور کس نیت سے آیا تھا۔ تم یہ کرو کہ اپنے دونوں ہمسایوں کو بتا

دے جاؤ کہ جو بھی تمہیں پوچھتا ہوا آئے اس کا نام ضرور پوچھ لیں اور پتا ہو تو نوٹ کر لیں۔"

"ان سے میں کیا کہوں گی۔ کہ کہاں جا رہی ہوں؟"

"کمال ہے بھئی کچھ بھی کہہ دو۔ کام زیادہ ہے یا لوکیشن پر جانا ہے۔ جانا تو پڑتا ہوگا تمہیں کبھی نہ کبھی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا: "میں نہیں گئی کبھی۔ مگر خیر میں کہہ دوں گی۔"

"یہ بھی کہہ دینا کہ تمہارا ایک اہم پیغام آئے گا۔ یا کوئی اہم ملاقاتی آئے گا اس لیے نام وغیرہ نوٹ کر کے رکھیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ واپس آنے کے بعد تم تصدیق کر سکو گی۔" میں نے کہا۔

"یعنی کوئی مجھے قتل کرنے کی نیت سے آیا ہوگا تو اس سے پوچھ سکوں گی کہ کیا آپ تشریف لائے تھے؟"

"یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "جو غلط نیت سے آئے گا وہ اپنا اصل نام بتا کے نہیں جائے گا۔ کسی بھی اجنبی نام سے تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے آنے کا کیا مقصد ہوگا لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمہارے کسی شناسا کا نام بتا جائے۔ جن سے پوچھو گے وہ تو کہہ دیں گے کہ ہاں ہم آئے تھے لیکن جو کوئی نہیں آیا ہوگا وہ انکار کر دے گا۔ اور اس کا مطلب ہوگا کہ دال میں کالا ہے۔"

"تم تو شرلاک ہومز بھی ہو۔" وہ ہنسی۔ "جاؤ میری فکر مت کرو۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

"بس لَلی! کم سے کم آج کی رات۔ پلیز۔"

"اوکے۔ یہ سب مجھے بہت افسانوی اور فلمی سسپنس لگتا ہے مگر میں تمہاری بات مان لیتی ہوں۔" وہ بولی۔ "آج رات میں ایک فرینڈ کے گھر گزار لوں گی۔ صبح وہیں سے اسٹوڈیو چلی جاؤں گی۔ تم ادھر ہی آ جانا۔"

"کوئی فون نمبر۔ یہاں یا وہاں رابطے کے لیے؟"

"کیوں نہیں۔ میں کارڈ دینا بھول گئی۔" اس نے واپس جا کے ایک دراز میں سے کارڈ نکالا اور مجھے تھما دیا۔ اس پر للی فیروز کے نام کے ساتھ اسٹوڈیو کا اور اس کے فلیٹ کا فون نمبر ہی نہیں پتا بھی تھا۔

نیچے اتر جانے کے بعد ہم نے بلڈنگ اور گلی کے نقشے کو ذہن نشین کیا اور سڑک پر آ جانے کے بعد ایک ٹیکسی کو روکا۔ جب ٹیکسی روانہ ہو گئی تو بلکہ صبح سے اب تک کے واقعات میرے ذہن سے گزر گئے۔ اس وقت کا تصور ابھر آیا جب میں دل کی وہی روح تھی۔ اور آنکھوں سے میں سوچ رہے ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہاتھ۔ کیا ایسا ہوگا؟ کیا سچ مچ ایسا ہو جائے گا کہ یہ آخری مسافت ہجراں تمام ہوگی اور پھر سفر حیات میں فرقت کا صحرا کبھی نہ آئے گا۔ صرف ان کی رفاقت سے مسکراتا راستہ ہوگا اور محبت کے روشن رنگوں والے پھولوں کی راہ میں درد جدائی کے پر آزار کانٹے نہ ہوں گے۔

غالب نے اس کے خیال کا عکس یوں منتشر کر دیا جیسے شفاف جھیل میں پھینکے والا پتھر ساکت سطح آب کے ہر عکس کو منتشر کر دیتا ہے۔ "کیا تو نے غور کیا کہ للی نے اس ملاقات کو عشق کی بنیاد کیوں بنا لیا؟" غالب نے کہا۔

میں چونک پڑا: "میں نے تو پوچھا تھا اس سے۔"

"ہاں۔ مگر اس نے کہا تھا کہ مجھے اس کی وجہ نہیں معلوم۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھ کے سر ہلایا: "اور کیا کہتی وہ؟"

"اس نے جھوٹ بولا تھا۔" غالب نے کہا۔

"جھوٹ بولا تھا؟ کیا مطلب؟۔۔۔"

"مطلب یہ ہے کہ اسے وجہ معلوم تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے کیوں کر رہی ہے۔" غالب نے کہا۔ "اور وہ وجہ نہ ہوتی تو پروا نہ کرتی ہم اس وقت ہوتے حوالات میں۔ وہ موقع ملتے ہی ہمیں پولیس کے حوالے کر دیتی کہ معلوم نہیں یہ کون بدمعاش ہیں۔ زبردستی میری کار میں بیٹھ گئے تھے۔ ان کی بدمعاشوں سے مار پیٹ ہوئی جس میں ایک قتل بھی کر دیا انھوں نے اور میری گاڑی کا بھی بیڑا غرق کر دیا۔ اسے یہ موقع ملا بھی تھا جب ایک پولیس سارجنٹ آیا تھا اور وہ اس کے ساتھ اکیلی بیٹھی اپنی گاڑی تک گئی تھی۔ وہاں میں خالی ہاتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پولیس کو صرف اتنا کہہ سکتی تھی کہ تیسرے بیٹھے اس آدمی کا چہرہ نقلی ہے۔ باقی سب وہ خود معلوم کر لیتے۔ مگر اس نے جھوٹ بولا۔ خود کو خطرے میں ڈالا۔ اپنا نقصان برداشت کیا اور ہمیں گھر لے گئی۔ آخر کیوں؟ خود اس کا دعویٰ ہے کہ آج تک کوئی مرد اس سے یہ رعایت حاصل نہیں کر سکا۔ اور میں اس کے دعوے کو غلط نہیں کہتا۔ بلاشبہ وہ ایک مضبوط کردار کی مالک ہے۔"

میں حیرت سے غالب کی صورت کو دیکھتا رہا۔ "یہ سب مجھے بھی عجیب ضرور لگا تھا۔ مگر اس کی وجہ۔۔ کوئی جذباتی وجہ ہی ہو سکتی ہے۔"

"صحیح فرمایا آپ نے۔ اور یہ جذباتی وجہ کیا تھی؟ یہ اس نے جاننے کے باوجود چھپا لیا۔ غالباً میں اس امکان کو بالکل نظر انداز نہیں کروں گا کہ شاید ابھی وہ خود اس حقیقت سے بے خبر ہو۔ بعض اوقات لاشعور کی راہ میں الجھنوں کا سایہ رہتا ہے۔ چنانچہ شعور میں وہ بات واضح نہیں ہوتی۔"

"یہ تو میں سمجھ گیا۔ لیکن ایسی کون سی وجہ آپ نے معلوم کر لی وہاں بیٹھے بیٹھے؟" میں نے کہا۔ "آپ کب سے صاحب کشف و کرامات ہو گئے؟"

"وہ تو خیر ہم گناہگار ہو ہی نہیں سکتے۔ مگر وجہ سامنے تھی عقل کا اندھا نہ ہو تو اور بات ہے۔ آپ کی آنکھوں نے دیکھا نہیں دیکھا تو میرا کیا قصور ہے۔" غالب نے کہا۔ "اس کے بیڈ روم میں سرہانے کی طرف ایک تصویر رکھی ہوئی تھی۔ سڈل فریم والا شیشہ

تھا اور اس میں ایک تصویر تو خود للّی کی تھی۔ دوسری تصویر میں آپ مسکرا رہے تھے۔"

"سبحان اللہ، یہ تو کمال ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں للّی کا مرحوم شوہر بھی ہوں، یہ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا۔ لیکن کسی دن اچانک پتا چلے گا کہ میں آپ کا دادا بھی ہوں یا آپ میرے سسر بھی رہے ہیں۔ بس، پچھلے جنم میں۔"

"بکواس کی کیا ضرورت ہے۔ صاف مان لے کہ تو نے وہ تصویر ہی نہیں دیکھی جو میں نے دیکھی۔ جہاں تو بیٹھا ہوا تھا وہاں سے شاید نظر بھی نہیں آئی ہوگی۔ بہرحال' میں نے اس پر غور کیا تو یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔"

"مرزا جی! آپ ہوش کے ناخن لیں۔ میرا یہ چہرہ اصلی نہیں ہے۔ یہ پاؤڈر، پان اور میک اپ والوں کی [illegible]..."

"اس تصویر میں ایک ایسا ہی شخص تھا۔" غالب نے میری بات کاٹ دی۔ "اور میں غالب یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ للّی کو اس کا احساس تھا۔ ممکن ہے یہ احساس وقتی ہوا ہو۔ مگر تھا کچھ ایسا ہی معاملہ کہ تیری صورت میں اسے ایک آشنا چہرہ ملا جس سے اس کی زندگی کی یادیں وابستہ رہی ہیں۔ اور تو نے دیکھا کہ وہ کتنی جذباتی عورت ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "یار غالب! اگر ایسا ہی ہوا تو پھر اسے میرا یہی چہرہ عزیز ہونا چاہیے۔ جب یہ چہرہ اپنے اصلی روپ میں سامنے آئے گا تو اس کے جذبات بدل جائیں گے۔"

"میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ وہ تیرا چہرہ نہیں بدلنے دے گی۔" غالب نے کہا۔ "وہ میرا میک اپ ضرور بدل دے گی لیکن تیرے میک اپ کو [illegible] ٹھیک کر دے گی۔ اور جہاں ضرورت ہوگی بالکل اس نقش کو مطابق اصل کر جائے گی۔"

"اگر تیار ہی کر دیا ہوا تو تنہائی خود سامنے آ جائے گی۔" میں نے متفکر ہو کے کہا۔ "مگر یہ بہت بڑا فریب ہوگا اور بہت بڑی تنہائی ہوگی۔ میں اس فریب کے کھیل میں شریک ہونا پسند نہیں کروں گا۔"

"اور شریک ہونا پڑا تو؟" غالب مسکرایا۔

"تو کیا؟... کیا دل پہ ہونا چاہیے میرا۔ میری سمجھ تو نہیں آتا کیا کرتا؟" میں نے گڑبڑا کے کہا۔

"معلوم نہیں کیا کرتا؟" غالب نے ماہرانہ انداز میں سوچتے ہوئے کہا۔ "تو نے اچھا کیا جو اس کو پیار کرنے والے شہزادے کا اصل نام نہیں بتایا۔ وہ پہلے ہی اس پوزیشن میں ہے کہ نہیں... یعنی تجھے بلیک میل کر سکے۔"

"وہ ایسی عورت نہیں ہے..."

"وہ ایک عورت ہے۔ جوان اور خوبصورت عورت جس نے خود کو آج تک وفاداری کے زندان میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس نے جذبات پر بہت بند باندھ رکھے تھے اور شاید اپنے جسم کی آواز کو دبانے میں کامیاب بھی تھی۔ مگر کیا ایسا ممکن ہے کہ کوئی عورت بھوک سے نجات پالے یا محبوب کے احساس کو دل میں [illegible] کر رکھے۔ دنیا اور تسکین کے خیال سے گریزاں رہتی ہیں۔ مگر کیا ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتی ہے بلا کی بنیادی طلب۔ یہ جوان جسم اور ہر جوانی جگمگا اٹھتا ہے۔"

"للّی نے آج تک اچھی زندگی گزاری ہے..."

"ہاں۔ مگر وہ ابھی زندہ ہے۔ اور مرنا بھی نہیں چاہتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اپنے آپ سے لڑتے ہوئے اسے کتنا وقت گزرا ہے۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ یہ جنگ تا عمر جاری نہیں رہ سکتی۔ وہ ہار جائے گی اور ہار سے پہلے فرسٹریشن کا شکار ہوگی۔ ڈپریشن میں ہوگی۔ نروس بریک ڈاؤن ہو سکتا ہے۔ پاگل پن۔ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے للّی کے ساتھ بھی۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "یار کیوں مجھے پاگل کرتا ہے۔ ایسا کرنا ممکن ہے کہ میں اس کے شوہر کی جگہ لے لوں؟"

"مجھ کو تو فال ہے۔ اب یہ مرضی ہے تیری۔" کہہ کے غالب ہنسنے لگا۔

"دماغ خراب ہے تیرا۔ اس خالی جگہ کو پُر کرنا ہے تو اپنی صورت بنانے پہ [illegible]۔ وہ اگر آتی ہے تو عقل ہے کہ نیو یارک جیسی صورت والے کسی بھی شخص کو قبول کر سکتی ہے۔ آج تک کیوں فارغ بیٹھی تھی۔ خود میک اپ آرٹسٹ ہے۔ بنا لیتی دوسرا [illegible]۔ ایسے بھی کوئی ڈھونڈ رکھا ہے طلاق کو۔"

غالب صرف مسکراتا رہا۔ "کہتے ہیں جس کو عشق' خلل ہے دماغ کا۔"

"یہ صرف دماغ کا خلل ہے۔ اوّل تو میرا خیال ہے کہ یہ تیرے دماغ کا خلل ہے۔ لیکن تیری بات کو درست مان لیا جائے تو پھر میرے لیے اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ میں لوٹ کر ہی نہ جاؤں۔ یا [illegible] جاتی ہی اپنا قرض ادا کر دوں۔ گاڑی اس کے سپرد کر کے واپس کر [illegible]۔ تمہیں سمجھا اب اگلے جنم میں ملیں گے۔"

"جلدی مت کرو یعنی آواگون کے فلسفے میں یہ ضمانت نہیں ہوگی کہ جو اس جنم میں جیسا ہے ویسا ہی اگلے جنم میں بھی ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگلے جنم میں وہ ہو ایک لومڑی اور آپ ہوں الو کے گیدڑ۔ یا الٹا بھی۔ تو ہر صورت میں ملاپ مشکل ہوگا۔ ویسے یار آج رات وہ کسی فرینڈ کے پاس رہے گی۔ مگر یقیناً تم نہیں چلا کر وہ [illegible] ہے یا [illegible]۔"

"جانے دے یار۔ گیا فرینڈ کا چکر۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "کوئی اور بات کر۔"

غالب اس صورت حال سے بہت لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن میں سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ عقل کی کسوٹی پر غالب کی بات میں ایک فیصد بھی صداقت دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے جو بتایا تھا اس [illegible]

[illegible] سی تھے اور اس کا تجزیہ سو فیصد درست معلوم ہوتا تھا۔

ٹیکسی رک گئی تو میرے خیالات کی پرواز بھی رک گئی۔ میں نے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور حاجی علی کی درگاہ کو جانے والے عقیدت مندوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ یہ بڑی عجیب فضا تھی۔ سب عقیدت مند بلا تفریق ایک ہی سمت رواں تھے۔ ان میں ہم جیسے نقلی چہرے والے بھی تھے۔ [illegible] اصل نہیں تھے۔ اور اگر ایمانداری سے دیکھا جاتا تو بات بھی وہ نہیں تھے جو دوسرے [illegible] لوگوں کے تھے۔ ہم حاجی علی کی درگاہ پر نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے نہیں آئے تھے۔ شاید اس ہجوم میں ہم جیسے دو چار [illegible] جن کے ظاہر و باطن میں [illegible] ہوگا۔ مجھے اس خیال پر شرم آ گئی۔

درگاہ [illegible] میں واقع تھی اور یہ بڑا دلکش نظارہ تھا۔ درگاہ کی جانب بڑھنے والوں سے الگ ہو کے دیکھا تو میرا [illegible] ہونے لگا۔ اس ہجوم میں اعتقاد [illegible] وسیع علاقے میں [illegible] سا لگا۔ شاید یہی غالب سوچ رہا تھا کہ [illegible] جن کو یہاں پہنچا تھا۔ نذر و ادب کے علاوہ [illegible] جس نے بھی جمعرات کی شام کو حاجی علی کی درگاہ پہ ملنے کی بات کی تھی۔

باہر [illegible] ایک بہت شاندار مسجد نظر آ رہی تھی۔ اس کے سامنے وہ بازار تھا جس کی ساری رونق زائرین کے دم سے تھی۔ ان میں سے ایک دکان پھولوں کے گجروں کی تھی جس کے سامنے [illegible] ہوئے تھے۔

"کیا خیال ہے؟ اس سے پوچھیں؟" غالب نے کہا۔

"کیا پوچھنا ہے گا؟" میں نے کہا۔

"یہ حاجی صاحب پاکستانی ہے، اور سوات کا رہنے والا ہے۔" [illegible] میں نے دو افراد کو اس سے باتیں کرتے سنا۔ [illegible] پاکستان سے آئے ہوئے تھے۔ حاجی بڑے تپاک سے ملا تھا۔"

"[illegible] ہم بھی [illegible]؟" میں نے کہا۔ "آدمی نیک لگتا ہے [illegible]۔ کیا خیال ہے تیرا؟ ہم اسے بتا دیں کہ ہم [illegible] ہیں۔ ہمارا نام کیا ہے؟ اعلان کا کیا ہے؟"

"[illegible] دیکھ [illegible] آدمی بھروسے کے قابل ہے [illegible] نام بھی بتا دیں گے۔ اور نام کے چلنے میں آپ یہ بار بار [illegible] بھول جاتے ہیں [illegible] چند نہیں ہوا۔ ہر گز [illegible] والا مرزا [illegible]۔"

[illegible] "یار یہ تو بڑی بھول ہو گئی۔ [illegible] کسی نے ثبوت نہیں مانگا۔ وہ اصل میں [illegible] کے ساتھ ملا کے یہ نام ایسا زبان پہ چڑھا کہ اب بے خیالی میں منہ سے نکل جاتا ہے۔"

"ایسے تو کسی جگہ پھنس جائیں گے۔ پہلے نام کی جگہ نئے نام ہی استعمال کرنے چاہئیں سب کو۔ اس کے بغیر [illegible] ہوگی۔"

"مجھے [illegible] مت ڈالو۔ تم خود بھی نام کو [illegible] نہیں کہتے۔" میں نے کہا۔

"جب میں تھری جہاز پر اس کے ساتھ تھا تو کسی کے سامنے کیا تنہائی میں بھی ایک دوسرے کا اصلی نام لینے کی غلطی نہیں کی۔ تم اس سے نہ جانے [illegible]۔"

"یہ ایک ہی بات [illegible] رہتے۔ تنہائی کب کہاں اور کیسے میسر آئی تھی اور یار تنہائی کی تعریف..."

"تنہائی میں ہم عشق کرتے تھے اور وہ سب کرتے تھے جو عشق میں ہوتا ہے۔ یا نہیں ہوتا۔" غالب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہیں کیا؟"

"ہاں بھائی' ہمیں کیا۔" میں نے سرد آہ کھینچ کے کہا۔ "تم وہاں کر رہتے ہو جہاں ناک کٹوانے پہ..."

غالب نے مجھے حاجی صاحب کی دکان کی طرف کھینچ لیا۔ اس کی دکان کے مشروبات زائرین میں خاصے مقبول نظر آتے تھے۔ اپنے وطن میں بھی ہم [illegible] سیب، انار یا گنے کا جوس اکثر پیتا تھا مگر حاجی صاحب جوس کا اسپیشلسٹ تھے اور مختلف اقسام کے جوس کی کاک ٹیل بڑے کمال سے بناتے تھے۔ ایک دو یا تین پھلوں کا جوس ملا کے یا ان کے تناسب میں کمی بیشی کر کے وہ ایک نیا ذائقہ پیدا کر لیتے تھے۔

ہم جیسے ناتجربہ کار کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ ترجیح کس کاک ٹیل کو دیں۔ بالآخر ہم نے فیصلہ آرڈر لینے والے چھوکرے پر چھوڑ دیا۔

"فیصلہ تمھارے حسن انتخاب پہ چھوڑا نور چشم!"

"نور چشم کوئی آرڈر نہیں ہے۔" چھوکرے نے [illegible] کہا۔ "ابھی جلدی بولو۔ [illegible] لاوے۔"

"واہ واہ! ایک دم [illegible] لاؤ۔" میں نے کہا۔

چھوکرا ہماری فارسی آمیز اردو نہیں سمجھا تھا مگر اس جملے پر حاجی صاحب نے پلٹ کر دیکھا اور ہمارے قریب آ گئے۔

"ماشاء اللہ سے آپ اتنی اچھی اردو بولتا ہے' لکھنؤ کے تو نہیں لگتے ہو آپ؟" انھوں نے [illegible] کہا۔

"آپ تو مجھے پاکستانی لگتے ہیں حاجی صاحب؟" میں نے کہا۔

حاجی صاحب کا چہرہ کھل اٹھا۔ "الحمدللہ ہم پاکستانی ہیں۔"

"[illegible] بتا [illegible] کہ آپ سوات یا [illegible] سے تعلق [illegible]۔" غالب نے کہا۔

حاجی صاحب ہماری چالاکی کو کیسے سمجھ سکتے تھے کہ یہ تمام معلومات تو ہمیں ابھی ابھی حاصل ہوئی ہیں۔

www.paksociety.com

"سچ بولے آپ۔ سبحان اللہ۔" وہ ہمارے پاس بیٹھ گئے۔
"لیکن ابھی بس ادھر کا ہو گئے۔ جو ہمارا خدا کو منظور۔"
"آپ مستقل یہاں آ گئے ہیں؟ کیوں حاجی صاحب! کیا وطن سے اچھی ہے یہ جگہ۔ پاکستان اتنی خراب جگہ ہے؟"

"استغفر اللہ۔ ایسا مت بولو۔" انھوں نے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔ "پاکستان پر ہمارا جان قربان۔ سو بار ہزار بار قربان۔ اپنا وطن کا کتا بھی عزیز ہم کو۔ لیکن ہم ادھر سے کیسے جاوے۔ اتنا سال ہو گیا۔ بچہ لوگ ادھر بڑا ہوا۔ اپنا سوات جاتا ہے کبھی تو دیکھتا ہے اپنا لوگ کوئی نہیں۔ سب باہر چلا گیا یا مر گیا۔ نیا لوگ ہم کو نہیں پہچانتے۔ بڑا افسوس ہوتا ہے ان کا حالت دیکھ کر۔ ابھی تک غریب ہے اور جاہل ہے۔ چھوٹا چھوٹا بات پر قتل کرتا ہے۔ دشمنی کرتا ہے۔ باپ کے بعد بیٹا۔ پھر اس کا بیٹا۔ ہمارا دل بہت دکھی ہوتا۔ آپ پاکستان سے آئے ہو؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "عارضی ویزا پر آئے تھے پندرہ دن کے لیے۔ دہلی گئے اور اجمیر شریف۔"

"ماشاء اللہ۔ اجمیر شریف گیا آپ۔ خواجہ صاحبؒ کی درگاہ پر حاضری دیا! بہت خوش نصیب ہے آپ۔" حاجی صاحب نے کہا۔ "ہم بھی کئی بار گیا۔ یہ سب خواجہ صاحبؒ کا برکت ہے جو آپ دیکھتے ہو اور الحمدللہ۔ خدا کا خاص مہربانی ہے ہم پر۔"

"کاروبار تو خوب چل رہا ہے آپ کا۔"

"روز دو ہزار کا آمدنی ہو جاتا ہے ماشاء اللہ۔" حاجی صاحب نے خوش ہو کے بتایا۔

"روز دو ہزار کی آمدنی تو واقعی بہت اچھی ہے۔" میں نے کہا۔

"اللہ دیتا ہے۔ ہم اللہ کے واسطے خرچ کرتا ہے۔ آپ ادھر مسجد دیکھتے ہو۔" حاجی صاحب نے کہا۔ "وہ ہم بنایا۔ اس کا سارا خرچ ہم کرتا الحمدللہ۔ مسافر لوگ کے واسطے کھلا رہتا ہے چوبیس گھنٹے۔ سب ہمارا مہمان ہوتا۔ ہندو مسلمان سکھ عیسائی جو بھی آوے۔ اللہ کا گھر ہے۔ ہمارا نہیں۔ ہم تو خدمت گار ہے اللہ کا اور سب کا میزبان ہے۔"

میں نے حیرانی سے اس اللہ کے خدمت گزار انسانیت کے نام لیوا ایمانی شرافت کے نمونے کو دیکھا جس کو اپنے پاکستانی ہونے پر فخر تھا اور جو صاحب ثروت ہونے کے باوجود عجز و انکسار کا پیکر تھا۔

"آپ کا مہمان خانہ تو ہر وقت بھرا رہتا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"الحمدللہ۔" وہ اوپر انگلی اٹھا کے بولا۔ "ہم تو خادم ہے۔ مہمان خانہ اللہ کا ہے۔"

"میرا مطلب تھا کہ یہاں جب سونے اور کھانے کا انتظام ہے تو وہ سب بھی آ جاتے ہوں گے جو مسافر نہیں ہیں۔"

انھوں نے مسکرا کے نفی میں سر ہلایا۔ "اللہ عقل دیا ہم کو۔ ہم جنت بے ایمان کو نہیں گھسنے دیتا۔ سب دیکھتا کہ کون مسافر ہے۔ ہاں یہ ضرور دیکھتا اگر کوئی پاکستان سے آتا۔ آپ بھی ادھر ٹھہرو۔"

"نہیں حاجی صاحب۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "ہم بمبئی میں اور آپ کی دعا سے ایک دوست کے گھر ٹھہرے ہیں۔"

"کدھر سے آیا آپ صاحبان؟"

"میں کیمبر خان پشاور سے آیا ہوں۔ یہ میرا دوست ہے۔ مگر یہ راولپنڈی سے آیا ہے۔" میں نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔ "ہمارا ایک تیسرا ساتھی گل خان تھا۔ وہ بھی پشاور سے ساتھ چلا تھا ہم سے بچھڑ گیا۔ آج ہم سب کو یہاں حاضر ہونا تھا۔"

"گل خان۔ ماشاء اللہ سے نوجوان ہے؟ بہت اچھا خوبصورت لڑکا؟" حاجی صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔

گل ... میرا سینہ اچھل کر پھٹنے لگا اور حلق میں گھونٹ ... آ رہا تھا وہ سینے میں اٹک گیا۔ "جی ... بالکل ..." میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "کیا وہ آیا تھا یہاں؟"

"ابھی یہ تو پتا نہیں وہ کدھر گیا۔ آتا بھی بھاگ جاتا ہے۔ پھر آئے گا تو ہم لے لے گا اس کو۔" حاجی صاحب نے کہا۔

میرا دل پھر مایوسی میں ڈوب گیا۔ "اس نے اپنا کوئی پتا نہیں دیا ... وہ اکیلا تھا؟"

"نہیں ہم سوچتا۔ ایک اور جوان آدمی تھا اس کا ساتھ ... اپنا نام بولا ... کیا بولا؟" انھوں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے سوچا۔ "ہاں۔ خان شیروانی ... نہیں۔ شیروانی خان۔"

"بالکل ٹھیک حاجی صاحب۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی ادھر سے آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "آپ کے پاس کیسے آ گئے تھے وہ؟"

"جیسے آپ آیا۔ ادھر پاکستان سے جو آتا وہ حاجی کے یہاں ضرور آتا الحمدللہ۔" حاجی صاحب نے کہا۔ "کوئی اس کو بولا حاجی کا دکان پر جاؤ۔ وہ تم کو تلاش کرتا تھا۔"

"ان کو چاہیے تھا کہ پیغام چھوڑ جاتے۔ کہ وہ کہاں ہوں گے۔ وہ دوبارہ یہاں آ سکتے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہم ان کو بولا مغرب کا بعد آ جاؤ۔ رات کو آ جاؤ۔ عشا کا نماز کے بعد۔ ہم تمہارا دوست کو بتا دے گا ان شاء اللہ۔"

"آپ نے کہا تھا ان سے؟" غالب خوش ہو کے بولا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ آج ہی نہ ملے تو یہاں ضرور مل جائیں گے۔ آپ انھیں ادھر ہی روک لیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔"

"مہربانی کیسا بھائی۔ ہم خادم ہے۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔

"حاجی صاحب! کیا انھوں نے ہمارا نام بتایا تھا آپ کو؟" میں نے کہا۔

"تمہارا نام بولا۔ کیمبر خان۔ اس کا نام نہیں بولا۔" حاجی صاحب نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میرے منہ سے غلط نام نہیں نکلا اور محسن نے میرا وہی نام لیا جو غیر معروف تھا۔ ایک بار پھر میں نے اپنے اور محسن کے خیالات کی ہم آہنگی اور ہم سوچ کی کرامات کو مان لیا۔ ایسے لاتعداد مواقع ہمارے حساب میں تھے جب اس نے اور میں نے الگ الگ ہونے کے باوجود ایک ہی لائحہ عمل اختیار کیا۔ ایک سے نتائج اخذ کیے اور ایک نے وہی کیا جو دوسرا کرتا۔ یہ پیدائش کے دن سے اب تک کی دوستی اور ذہنی رفاقت کا کرشمہ تھا۔ من تو شدم تو من شدی۔

پہلے میرا خیال تھا کہ میں حاجی صاحب کو دہلی کے گھر کا فون نمبر دے دوں گا۔ لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی ان کو ہم نے رات کہیں اور گزارنے کا مشورہ دیا تھا۔ محسن اگر فون کرتا تو اسے کوئی جواب ہی نہ ملتا۔ تاہم اس فون نمبر کی مدد سے وہ ہمیں بمبئی میں تلاش کر سکتا تھا۔ بلاشبہ خدا کی حاجی صاحب پر خاص مہربانی تھی کہ اسے نیکی کرنے کی توفیق دی۔ مسجد تو کوئی بھی پیسے والا کھڑی کر دیتا ہے مگر وہ اللہ کا خدمت گزار اور اس کی مخلوق کا خادم نہیں بنتا۔ حاجی مسافروں کی خدمت کر رہا تھا اور بلا امتیاز کر رہا تھا۔ وہ بچھڑے ہوئے لوگوں کو ملا رہا تھا اور دیار غیر میں ہم جیسے غریب الوطن لوگوں کو کھانا کھلا کے خوش کر رہا تھا اور شرافت سکھا رہا تھا اور انسانیت کا درس دے رہا تھا۔ اتنی ساری نیکیاں اور اتنے بہت سے لوگوں کی دعائیں سمیٹنے والے کے بارے میں کون شک کر سکتا تھا کہ وہ جنتی نہیں ہے۔

جب لوٹنے لگے تو حاجی صاحب نے ہم سے اسپیشل جوس کے پیسے نہیں لیے۔ اس کا ذائقہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں نے حاجی صاحب سے پوچھا ہوتا کہ انھوں نے اس میں کتنے پھلوں کا جوس کس تناسب سے شامل کیا تھا تو شاید کبھی زندگی میں پھر میں خود وہ کاک ٹیل تیار کرتا اور اس جنتی شربت کے ذائقے سے پھر لطف اندوز ہوتا مگر ایسا نہ ہوا اور اب فقط اس کی یاد باقی ہے۔

باہر آتے ہی میں نے غالب سے ہاتھ ملایا۔ "اللہ بہت بڑا مسبب الاسباب ہے۔"

"خدا کے بعد تجھے میرا شکر گزار بھی ہونا چاہیے کہ جب تو بوکھلایا ہوا کھڑا ہوا اس مجمع کو گھور رہا تھا تو میں نے حاجی صاحب کو دوستی کی تھیں۔" غالب نے کہا۔

"یار! گل خان والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کیسے؟ اتنی ناقص اور ناکارہ ہو گئی ہے تیری سمجھ۔" میں نے کہا۔ "گل زخمی تھی۔ ذرا سی دیر وہ ٹھیک نہیں ہو گی؟ اس کی حالت ایسی نہیں ہو سکتی کہ یہاں محسن کے ساتھ آ جاتی۔"

غالب نے کہا۔ "وہ تازو ہو گی۔"

میں اچھل پڑا اور بے اختیار میں نے غالب کے شانے پر ہاتھ مارا۔ "واہ سبحان اللہ۔ کمال کر دیا۔ ماشاء اللہ سے کیا تیر چلایا ہے اندھیرے میں عقل کے اندھے نے ... اور وہ نشانے پر جا لگا۔"

"میری ذہانت کی داد نہ دینا آپ کی کم ظرفی ہے چوہدری کے پوت۔" غالب نے کہا۔

"لیکن تازو ... مردانہ لباس میں ...؟"

"سودا کا شعر ترمیم کے ساتھ یوں ہو گا کہ ... غالب جو مرا حال ہے ایسا تو نہیں وہ۔ کیا جانیے میں نے اسے کس حال میں دیکھا ... تو ہالینڈ میں اس گل پیرہن کو ہر انداز میں دیکھ چکا ہوں۔"

"اس کے غلط معنی لیے جائیں تو کرام تیغ تجھے شہید الفت کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"جو غلط معنی نکالے میں اسے پہلے جہنم رسید کر دوں۔" غالب نے بگڑ کے کہا۔ "تازو کے ہاتھوں ... وہ مردانہ لباس میں جہاز پر بھی پہنچی رہی ہے۔ میرے ساتھ اس نے بھی جہاز کے اندر گھوم پھر کے سب معلوم کیا تھا کہ کون سی چیز کہاں ہے۔ اس نے ایک وردی حاصل کر لی تھی۔ اس کے باوجود ممنوعہ علاقوں میں جانا خطرناک تو تھا۔ وہ محافظوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہی۔ یہ خوش قسمتی تھی اس کی۔"

"اسے اپنی قوت بازو پر بھی بھروسا ہو گا۔ کوئی اسے پکڑ لیتا تو گویا موت کو پکڑ لیتا۔" میں نے کہا۔

"صرف تین بار اس نے جاسوسی کی۔ پھر میں نے اسے منع کر دیا۔"

"اور وہ مان گئی؟"

"ہاں ... قسم جو دے دی تھی میں نے۔ اپنی۔" غالب نے کچھ شرما کے کہا۔

میں ہنس پڑا۔ "یہ ترغیب کا ردعمل ہوتا ہے۔"

"مگر اس نے کہا ... کہ آئندہ قسم مت دینا اپنی۔ ورنہ ... قسم تو خیر نہیں توڑوں گی لیکن دانت توڑ دوں گی تمہارے۔" غالب نے خفت سے کہا۔

"استغفر اللہ۔ صاحب ابھی وقت ہے مرزا۔ باز آ جا اس کے عشق سے ورنہ بنی نوع انسان ختم ہونے سے پہلے وہ تیرے جسم کے سارے قابل شکست حصے توڑ پھوڑ دے گی اور تجھے اسٹریچر پہ ڈال کے نمونے کے طور پر ساتھ لیے پھرے گی کہ دیکھو یہ ہے وہ ناقص العقل جس نے میرا شوہر بننا قبول کیا تھا۔"

"ابھی میں عاشق کا رول کر رہا ہوں۔ جب شوہر کا رول شروع ہو گا تو دیکھنا۔ پاؤں کی جوتی بنا کے رکھوں گا اور ابتدا کروں گا پہلوان میں ایک جل کے مترادف ہے۔" غالب نے کہا۔

"تیرے خیالات بہت نیک ہیں۔ میں تازو تک پہنچا دوں گا۔"

ہم اب مرزا تک جلنے والی سیڑھیوں کے قریب کھڑے ہوئے تھے اور آتے جاتے لوگوں کے چہروں کو دیکھتے جا رہے تھے۔ سورج مغرب کے سمندر میں ڈوب رہا تھا اور شام کا گہرا سایہ

www.paksociety.com

درگاہ کے اندر اندھیرا بن کے پھیل چکا تھا۔ سیکڑوں چراغوں کی روشنی ہزاروں امیدوں کے ساتھ آنے والوں کے یقین کی علامت تھی۔ یقین کا مذہب کیا ہوگا۔ یقین تو خود ایک مذہب ہے۔ ایک ماورائی انفرادیت۔ سب سے عظیم۔ ازل سے ابد تک پھیلا ہوا رشتہ جو خالق و مخلوق کی ذات جو انسانوں کی تقدیر پر اختیار رکھتی ہے۔ جس کے وسیع امکان میں وہ سب کچھ ہے جو انسان مانگ سکتا ہے چاہے وہ ناممکن ہے۔

"کیا خیال ہے ہم بھی اندر چلیں، فاتحہ کے لیے ہاتھ ہی اٹھا لیں اور کوئی دعا ہی مانگ لیں" میں نے کہا۔

"ہاں۔ دعائیں تو بہت سی مانگی جا سکتی ہیں۔"

"میں صرف ایک دعا مانگوں گا" میں نے کہا۔

"میں بھی" غالب نے کہا۔

ہم نے ایک دوسرے سے سوال نہیں کیا کہ وہ ایک دعا کیا ہوگی۔ ہم جانتے تھے کہ ہماری دعا ایک ہی ہوگی۔ زائرین کے ریلے نے ہمیں بالآخر اندر پہنچا دیا۔ اندر درگاہوں کی مخصوص فضا تھی، بہت تقلید پر مجبور کر دینے والی۔ بڑا مجمع، خود رو بال اور اگر بتی کے سلگتے تنکوں کے دھوئیں سے بھری ہوئی۔ حاجی علی کی قبر کے گرد مردوں اور عورتوں کا اژدحام تھا۔ ہم بڑی مشکل سے مزار تک پہنچے۔ اس پر سبز، سرخ اور سفید رنگ کی گوٹا لگی چادریں تہ در تہ پڑی تھیں اور ڈھیروں گلاب تھے۔

دعا سے فارغ ہو کے میں نے ہجوم کو دیکھا۔ حیرت انگیز طور پر عقیدت مندوں کی اس بھیڑ میں مجھے ہر قسم کے لوگ نظر آئے جو اپنے حلیے سے واضح طور پر مسلمان، ہندو یا سکھ لگتے تھے۔ ان میں پارسی یا عیسائی تھے تو الگ نہیں پہچانے جا سکتے تھے۔ لباس کے اعتبار سے وہاں سب عورتوں نے اسکرٹ پہن رکھے تھے یا ساڑیاں باندھ رکھی تھیں۔

اچانک میرے کانوں نے اذان سنی۔ اور نہ جانے کیوں اس وقت مجھ کو کیا سوجھا کہ دل میں خیال آیا کہ آج خدا کے حضور بھی حاضری دے دوں۔ بندہ بڑا خود غرض اور کمینہ ہے۔ خدا کو صرف اس وقت یاد کرتا ہے جب اپنی زندگی کے مسائل کے مقابل خود کو بے بس پاتا ہے، اپنی تدبیر کو بے اثر اور اپنی عقل کو بے تدبیر پاتا ہے۔

غالب نہ جانے کہاں رہ گیا تھا۔ بھیڑ میں ہم خود ہی الگ ہو گئے تھے لیکن یہ پریشانی کی بات نہیں تھی۔ وہ درگاہ کے باہر مل سکتا تھا یا حاجی علی کی دکان پر۔ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا میں درگاہ سے نکل آیا۔ اپنے جوتے تلاش کر کے پہنے تو غالب کے جوتے نظر نہ آئے۔ وہاں رکنا بے مقصد محسوس ہوا اور میں مسجد کی طرف چل پڑا۔ حاجی صاحب کی غزالی ہوئی مسجد وہاں شاندار تھی۔ اس کا اندازہ دنیا کی عظیم اور خوبصورت ترین مساجد سے کرنا غلط ہوتا —

تاہم یہ تسلسل وہ جذبہ تھا جس نے اس جگہ ایسی مسجد کی تعمیر کے لیے سوات کے رہنے والے حاجی صاحب کو توفیق دی۔ سلطنت مغلیہ نے دی اور ایک ایسے ملک میں جہاں اسلام کے نام لیوا اقلیت میں تھے اور ایک ایسے شہر میں جہاں مذہب نے معاشی جدوجہد کے مقابلے میں ثانوی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ یہ جذبہ ایک رشتہ تھا۔ اندر نمازی صف بستہ ہو رہے تھے جب میں جلدی جلدی وضو کر کے نماز میں شامل ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یک لخت خشوع و خضوع کے وہ جذبات میرے دل میں کیسے پیدا ہو گئے جن سے میں بیگانہ ناآشنا تھا۔ جب نماز ختم ہوئی اور لوگ جانے لگے تو میں وہیں دو زانو بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ مرکزی صف میں بیٹھے لوگ اٹھ گئے۔ اس وقت میں نے غالب کو دیکھا جو مجھ سے آگے چوتھی صف میں بیٹھا دعا مانگ رہا تھا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ کیا یہ اتفاق تھا یا اس ماحول کا اثر تھا کچھ اور کہ بیک وقت میرے اور غالب کے دل میں ایک ہی خیال آیا جو پہلے کبھی نہیں آیا تھا اور ہم نے ایک ہی سمت کا رخ کیا۔ شاید یہ حاجی علی کی کرامات کا اثر تھا۔ اللہ کے برگزیدہ عقیدت مندوں کو متعجب کر سکتے ہیں۔

غالب نے میرے قریب آ کے کہا "کیسی عجیب بات ہے!"

میں نے کہا "ہاں۔ کیسی عجیب بات ہے۔"

ہم مسجد سے نکل آئے۔ باہر رات پھیل چکی تھی۔ حاجی علی کی درگاہ پر حاضری دینے والے واپس جا رہے تھے۔ میں اور غالب چلتے گئے اور اپنی نظروں سے ہر سمت دیکھتے گئے کہ گزرنے والوں کی صورتوں میں کوئی آشنا صورت ملے۔ مایوسی ہر قدم پر غالب آنے لگی تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ملاقات کے لیے جگہ کا تعین کرتے ہوئے ہم نے لاعلمی کے باعث کسی ایک مقام کا انتخاب نہیں کیا۔ ہم ایک سمت ہی مقرر کر لیتے۔ شفق وہ سمت جدھر سے چاند طلوع ہو رہا تھا۔ چودھویں شب کا پورا چاند۔ اس کا اجالا بھی مدھم تھا۔

میرے دل کی بے قراری کا عجب عالم تھا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ میرے قریب ہے۔ اسی جگہ کہیں۔ اس کی نگاہیں بھی مجھے تلاش کر رہی ہیں مگر کہاں؟ سیکڑوں سال کی مسافت طے کر کے اور صدیوں سے راہ طلب میں حائل ہونے والی سب مشکلات سے نمٹ کے بالآخر میں وہاں پہنچا تھا جہاں اس نے مجھے طلب کیا تھا مگر ہنوز بارگاہ حسن میں باریابی کا اذن نہیں آیا تھا۔

بار بار میں اس خیال کو رد کر دیتا تھا کہ شاید وہ آئی نہ ہو۔ وہ نہیں آئی ہو مگر صرف چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کی مالک ہوتی تو مجھے پہچاننے میں ہی کیوں آتی۔ اسے یہاں لانے والے تھے، بیدرد تھے مگر وہ پردہ داری کر رہے تھے۔ یا پھر وہ کسی

رشتے داری کے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ چاند بھائی کی نیت ابھی تک میرے لیے ایک معما تھی۔ وہ صورتاً بھی ایک نفسیاتی مریض لگتے۔ ایک خطرناک کردار، ایک کردار دوسرے کو جاننے سے اس کا دشمن۔ مجھے لگتا تھا اور میرے رشتے میں گرفتار ہے مگر ابھی اس سے انکار کر رہی تھی۔ بھائی کا خاندانی حریف ثابت ہو سکتا تھا لیکن ابھی تک اس کی جرأت سامنے نہیں آیا تھا۔

نازو نے آج رات یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا تو اس میں بھی چاند بھائی کی مرضی کو دخل تھا۔ وہی اسے یہاں لے کر آیا تھا۔ سب میرے ناممکن کے لیے ہے لیکن جذبات کے تقاضے ایسے متفاوت کے برعکس تھے۔ اور میں اس بات سے خائف تھا کہ کیا مجھ سے وہ اور چاند بھائی ملے گا مگر کس طرح میرے یا اس کے مفاد میں ہو سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ میں یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ بہت ہی پیشانی خیال ہوں گے نازو نے اور گل نے بھی تو حالات کو برداشت کیا، یا پھر ان سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

"کیا اب بھی یہی خیال ہے کہ وہ نہیں آئی؟" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ جب اس نے وعدہ کیا تھا۔"

"وہ اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے آزاد نہیں ہے۔"

"کیا یہ بات وہ نہیں جانتی تھی؟" میں نے کہا۔ "کیا ضرورت تھی جھوٹے وعدے کرنے کی؟"

"اس نے چاند بھائی پر اعتبار کیا ہوگا۔ چاند بھائی نے کہا ہوگا کہ تم کو وہاں پہنچا دے گی... نازو نے ہی بات کی ہوگی اس سے..." غالب نے کہا۔

"وہ آئے گی" میں نے برہم ہو کے اور جھلا کے کہا۔ "اسے آنا ہی ہوگا..."

"آ گئی؟" غالب نے کہا۔

... میں نے گہری سانس لے کر غالب سے کہا۔

... اور مجھ سے لپٹ گیا۔

... میری آنکھیں جواب دے گئیں۔ آنکھیں خراب ... میری کمر پہ مار

کے کہا۔

"تیری آنکھیں واقعی خراب ہو گئی ہیں" غالب نے کہا۔ "جانِ جہاں۔ آخر کون ہے تو؟ ہم تو نہیں جانتے تجھے۔"

اب محسن نے پلٹ کے اسے دیکھا۔ "اسے تو شاعری کا مرض ہے۔ مجنوں کی اولاد۔ صحافی کے گھوڑے۔" وہ مجھے چھوڑ کے غالب کو چمٹ گیا اور وہ ایک دوسرے کو دبانے اور مکے مارنے لگے۔ ان کے درمیان زیادہ ناقابل اشاعت گالیوں کا تبادلہ بھی دیر تک جاری رہا۔ بالآخر میں نے انہیں الگ کیا۔

"بس کرو یار۔ یہ کیا دیوانگی ہے؟ لوگ دیکھ رہے ہیں" میں نے کہا۔

"لوگوں کی ..." غالب نے کہا۔ "ان کو کیا معلوم کہ یہاں ہم کیسے اکٹھے ہوئے ہیں۔"

"میں تو سمجھا تھا کہ تو ہو گیا غرق" محسن نے کہا۔

"ابے یہ تو ایک چھوٹا سا سمندر تھا۔ میں سمندر تو کیا لوگوں کو تیر کے پار کر لیتا۔ تو ظلمات میں گھوڑے دوڑا کے آتا۔ تیرا بیڑا غرق نہیں ہوا" غالب بولا۔

"گل اور نازو کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔ "گل کے بارے میں اور تیرے بارے میں تو حاجی صاحب نے بتا دیا تھا۔"

"تم لوگ مل چکے ہو ان سے" محسن بولا۔ "میں نے اپنے نام بتا دیے تھے کہ تمہیں اندازہ کرنے میں دشواری نہ ہو۔"

"حاجی صاحب کے پاس جانے کا خیال کیسے آ گیا تھا تمہیں؟"

"مل گیا تھا ایک خدا کا نیک دل بندہ۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ حاجی صاحب کی دکان کہاں ہے۔ میں نے کہا کون حاجی۔ یہاں نہ جانے کتنے حاجی ہوں گے۔ وہ کہنے لگا کہ حاجی صاحب سوات والے جن کی یہاں جوس کی مشہور دکان ہے۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ یہ اپنا ہم وطن حاجی صاحب ہماری کیا مدد کر سکتا ہے۔ میں نازو کے ساتھ گیا۔ وہ بڑا فرشتہ صفت آدمی ثابت ہوا۔"

"کہاں ہے؟ ابھی مل کے ہم یہیں گئے تھے" غالب نے کہا۔

"یہ بتا گل کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ بالکل ٹھیک ہے" محسن نے کہا۔

"اور نازو؟ وہ تیرے ساتھ تھی تو اب کہاں ہے؟" غالب نے کہا۔

"وہ گل کے پاس ہے۔ اسی فائیو اسٹار ہوٹل میں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں" محسن بولا۔

"فائیو اسٹار ہوٹل؟ یہاں؟"

محسن ہنسا۔ "ایک چائے خانہ ہے۔ ... ہوگا۔ ... خوبصورت ہوٹل ہے..."

"لیکن یہاں سے بھیا بمبئی میں تو دنیا نے بھی نہیں چھوڑے انسانوں نے۔ قبرستان اور قبرستان تک نہیں چھوڑے جہاں پر صورت ..."

www.paksociety.com

وہ سکیں۔ اس میں بھی ایک نہیں چار خاندان آباد تھے۔ بڑے ٹھاٹ سے رہتے ہیں اور بہت خوش ہیں کہ ساحل سمندر پر ایسی رہائش مل گئی ہے۔"

"وہ بھی بالکل مفت۔۔۔"

"مفت یہاں موت بھی نہیں ملتی۔ فی خاندان پانچ سو روپے ادا کرتے ہیں کسی کو۔" محسن نے کہا "ایک خاندان نے ہمیں عارضی رہائش کے لیے ایک کوریڈور میں جگہ دے دی۔ اس کے پانچ سو لیے مگر وہ بہت محفوظ جگہ ہے۔ صبح میں ایک ڈاکٹر لے گیا تھا۔ اس نے کوئی جلد اثر دوا دی زخموں پر لگانے کے لیے۔ اور کھانے کے لیے۔ بعد میں میں ہال فیملی کی کوئی مہربان خاتون حاجی علی کی درگاہ کی مٹی گھول کر لے آئی کہ یہ پیو اور اس کو زخموں پر لگاؤ۔ اور اب میں ان دو پاگل میں سے کسی کو قائل نہیں کر سکتا کہ یہ حاجی علی کی کرامت نہیں ہے۔"

"ہمیں دو گھنٹے ہو گئے بھٹکتے ہوئے۔۔۔"

"رابعہ نہیں ملی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ابھی تک تو نہیں ملی۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ ملی تو کہاں سے ملے گی اور کس وقت ملے گی؟ ملے گی یا نہیں۔"

"ملے گی یار۔ مایوس مت ہو۔" غالب نے کہا "جب تک وہ ملے گی نہیں ہم یہاں سے جائیں گے نہیں۔"

"تلاش تو میں بھی کر رہا تھا لیکن مسئلہ وہی ہے کہ اس پورے جزیرے پر کوئی ایک جگہ ہوتی تو ہم وہاں پہنچ جاتے۔"

"اس سے درگاہ کہا تھا۔" میں نے کہا۔

"درگاہ سے لوگ واپس جا رہے ہیں۔" محسن بولا "اور درگاہ بھی چھوٹی جگہ تو نہیں ہے۔ اس کے آگے پیچھے سمندر۔ ہم ہر طرف نگاہ رکھیں گے۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ وہ دیر سے آئے۔ جب یہ بھیڑ ختم ہو جائے۔" غالب نے کہا "یہ مشکل تو اسے بھی ہو گی کہ کہاں دیکھے۔"

"یار وہ اکیلی تو نہیں آ سکتی۔ وہ خبیث چاند بھائی ضرور اس کے ساتھ ہو گا۔" میں نے کہا "مردود خدائی فوجدار۔ زبردستی رابعہ کا باپ بنا ہوا ہے۔ اس کے دو سرے حکم کے غلام بھی ساتھ آ سکتے ہیں۔"

"ہمارا کیا نقصان ہے اس میں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم انھیں نہ دیکھ پائیں مگر وہ ہمیں تلاش کر لیں۔" غالب نے کہا۔

"اس بار کچھ بھی ہو جائے۔ بس ایک بار مل جائے رابعہ تو پھر اسی کی تیسی چاند بھائی کی۔ یا وہ نہیں یا میں نہیں۔ میں رابعہ کو واپس نہیں جانے دوں گا۔" میں نے کہا۔

"خواہ مخواہ اپنا خون مت جلا۔ ابھی تک چاند بھائی نے کوئی دشمنی نہیں کی ہے ہمارے ساتھ۔" محسن بولا "وہ دوست اور مددگار بھی رہا ہے۔"

"نہیں چاہیے مجھے اس کی دوستی اور مدد۔" میں نے چلا کے

کہا۔ "میں نے بتا دیا ہے کہ رابعہ ہمارے ساتھ رہے گی بھی جاؤ جہنم میں۔ اگر رابعہ ساتھ نہیں ہو گی تو میں نہیں جاؤں گا ساتھ۔"

"اچھا اچھا۔ یہ مت سمجھ کہ ہم تیرے مقابلے میں چاند بھائی کی حمایت کر رہے ہیں۔" محسن نے کہا "میرے ذہن میں ایک پلان ہے ہم ایک ساتھ رہنے کے بجائے الگ الگ ہو جاتے ہیں چاروں طرف دیکھتے رہیں گے۔ ایک طرف میں۔ دوسری طرف غالب۔ تیسری جانب نانو اور چوتھی طرف آپ خود۔"

"لیکن نانو ہے کہاں؟" غالب نے کہا۔

"اور ہمارا آپس میں رابطہ کیسے رہے گا؟" میں نے کہا۔

"نانو بس آتی ہی ہو گی۔ وہ ایک چیز لینے گئی تھی جو ہم نے تین سو ڈالر میں خریدلی تھی۔ اس خیال سے کہ کام آئے گی ایک شخص چوری چھپے بڑے مشتبہ انداز میں بیچ رہا تھا۔" محسن نے کہا۔

"ایسی کیا چیز ہے۔۔۔؟"

"دو واکی ٹاکی ہیں۔ بہت چھوٹے موبائل فون ریسیور جیسے۔ ایک کلو میٹر کی رینج ہے۔" محسن نے کہا "جنیشل ٹارچ سیل سے چلتے ہیں۔"

"کہاں گئی وہ؟"

محسن ہنسا "سبحان باطن کی آنکھ سے نہیں ظاہر کی آنکھ سے دیکھ۔"

اچانک میں نے بھی نانو کو دیکھ لیا۔ ہم چلتے چلتے چھوٹی دکانوں کی قطار تک آ گئے تھے جس کے آخر میں حاجی صاحب کا جنرل سینٹر تھا۔ نانو بڑے اطمینان سے ایک کھمبے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی ہوئی تھی اور ہم اس سے بہت کم فاصلے پر دس منٹ سے باتیں کر رہے تھے۔ یقیناً ہماری نظر نے کئی بار بجلی کے کھمبے کو اور اس کے نیچے واسکٹ قمیص اور پتلون میں ملبوس دبلے پتلے شخص کو دیکھا ہو گا مگر کسی نے بھی اسے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ ہم سب ذہنی طور پر نانو کو اس حلیے میں قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور ہمارے خیالات کا محور بھی رابعہ کی ذات تھی چنانچہ نانو کو روشنی میں ہونے کے باوجود کسی نے نہیں پہچانا۔

غالب سخت خفیف ہو کے اس کی طرف بڑھا۔

"کون ہے بے تو؟" نانو نے غرا کے کہا اور ایک قدم آگے آ گیا۔

"ابے یار۔۔۔ یہاں بھی؟" غالب بے اختیار پیچھے ہٹ گیا "یہ کوئی جگہ ہے بدمعاشی جتانے کی؟"

"کس کو بولا بدمعاش؟" نانو اور آگے آ گئی۔

میں فوراً درمیان میں آ گیا "بھئی نانو، معاف کر دو اسے بھی اور ہمیں بھی۔ ہم سب دھوکا کھا گئے۔"

نانو ہنسنے لگی "خوب نظر ہے آپ دونوں کی۔ جانے کتنی بار دیکھا ہو گا مجھے۔ ایسے ہی دیکھ رہے ہوں گے آپ ہم

جو بھی ہو۔"

"تم ریڈیو لائی ہو؟" محسن نے کہا۔

"دو واکی ٹاکی ہیں۔ تو چار افراد کے درمیان رابطہ کیسے رہے گا؟" میں نے کہا۔

"اس مسئلے کا ایک آسان حل ہے۔" غالب نے کہا "ایک نانو کو دے دو۔ دوسرا تم اور محسن رکھو۔"

محسن ہنس پڑا "تمھیں واکی ٹاکی کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ بھی کچھ غلط نہیں کہا آپ نے۔" غالب بولا "ہم واک بھی رہتے ہیں۔ اور ٹاک بھی۔"

"ہاں بھئی۔" محسن نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا "یہ سب تمھارے لیے ہی تو ہے۔ یہ ہوا یہ رات یہ چاندنی۔ چلو جاؤ تم دونوں سامنے رہنا نظر میں۔ مگر بچھو نظر سے اوجھل مت ہونا۔ اور مفرور ہونے کی بات مت کرنا۔"

چونکہ نانو مردانہ لباس میں تھی اس لیے غالب نے بڑی بے تکلفی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور پھر کمر میں ہاتھ ڈال کے کہا "چل یار گل خان۔" دوسرے لمحے وہ زمین پر لمبا لیٹا ہوا نظر آیا۔

"ساتھ چلنا ہے تو مجھ سے اتنی دور رہو کہ پھر یہ نوبت نہ آئے۔" نانو نے کہا "تم کو سوچنا چاہیے۔۔۔"

غالب نکلا اور اس کے ساتھ چل پڑا "مجھے تو ڈوب مرنا چاہیے اس سمندر میں۔"

میں اور محسن ہنستے ہوئے آگے چل پڑے۔ پھر ایک جگہ ہم نے اپنے اپنے راستے پر الگ ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ واکی ٹاکی بہت کارآمد ثابت ہوا۔ میں اور محسن اطمینان سے باتیں کرتے رہے۔ کسی بھی جگہ ہمارے درمیان یہ فاصلہ ایک کلو میٹر سے زیادہ نہیں ہوا۔ میری نظر درگاہ کے قریب دیوار میں ہر شخص پر تھی۔ رات کے ساتھ ساتھ رونق ماند پڑتی جا رہی تھی اور درگاہ سے نکلنے والے بہت کم رہ گئے تھے۔

مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ ان دو افراد نے کہاں سے اور کب میرا تعاقب شروع کیا۔ وہ تو اچانک میرے دائیں بائیں آ گئے اور پھر مجھ سے قدم ملا کے چلنے لگے۔ ان میں سے ایک کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ انھی میں سے ایک تھا جو مجھے اور غالب کو اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک مارا گیا تھا اور دو بڑی مشکل سے بھاگ گیا تھا کہ وہ کسی سے کچھ نہیں کہے لیکن باقی دو اس کے مقابلے میں اپنے آقا کے زیادہ وفادار ثابت ہوئے تھے۔

"تم پھر آ گئے؟" میں نے خود کو پرسکون رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ ابھی سیدھے چلتے جاؤ۔" ایک نے میری پسلیوں کے ساتھ ریوالور لگا کے کہا "تم نہیں جاؤ گے تو تمھاری جان جائے گی۔"

"کیا یہ بات تم نے آج ہی صبح نہیں کہی تھی؟" میں نے کہا "مگر جان میری نہیں تمھارے ساتھی کی گئی۔"

"تمھارا کیا خیال تھا کہ ہم اتنی آسانی سے چھوڑ دیں گے تمھیں؟" دوسرے نے بھی ریوالور کو دبا کے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ کچھ لوگ آسان موت قبول نہیں کرتے۔"

میرے اطمینان کی وجہ ایک تو یہی تھی کہ ریوالور سے مسلح ہونے کے باوجود میرے حریف بڑا اعتماد نہیں تھے ان میں سے ایک کی بہادری میں دیکھ چکا تھا۔ نیا چہرہ اپنی بدمعاشی کا اشتہار بننے میں کامیاب ضرور تھا لیکن وہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ وہ سب اتنے خطرناک بدمعاش نہیں تھے جتنا خود کو ظاہر کرتے تھے۔

زیادہ بھروسا مجھے اس واکی ٹاکی پر تھا جو میری شرٹ کی اوپری جیب میں تھا جیسے ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ مجھے دونوں طرف سے محصور کر لیا گیا ہے میں نے بڑی صفائی سے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے واکی ٹاکی کے ایک بٹن کو اوپر کھسکا دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ بٹن بالکل نیچے دائیں طرف ہے جو جیب کے باہر ہی سے اس کے ابھار کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اپنا کام کر لیا تھا۔

بٹن جب اوپر والی پوزیشن میں ہوتا تھا تو واکی ٹاکی ٹرانسمیٹر بن جاتا تھا اور میں محسن سے بات کر سکتا تھا۔ درمیانی پوزیشن میں بٹن سے ریسیور آن ہوتا تھا اور میں محسن کی آواز سن سکتا تھا۔ بٹن کو بالکل نیچے کرنے سے واکی ٹاکی آف رہتا تھا۔

اب مجھے یقین تھا کہ ہماری سب گفتگو محسن کے کانوں تک پہنچ رہی ہو گی لہٰذا مجھے کسی سے مدد کی درخواست کرنے کی ضرورت نہیں۔ محسن فوراً غالب اور نانو کو بتا دے گا کہ میں گرفتار ہوں اور وہ میرے کچھ کرنے سے پہلے ہی ان دونوں دلاوروں کو گھیر لیں گے جو ریوالور کی طاقت سے تھوڑی دیر فتح کا احساس کر کے بہت اکڑ رہے تھے۔ خالی ہاتھوں سے میں اب ان کی فتح کو شکست میں بدلنے پر قادر تھا لیکن میں نے خطرہ مول لینا بے سود سمجھا۔

"سیدھے کہاں چلے جا رہے ہو؟" دائیں طرف والے نے مجھے ڈانٹ کر کہا "ادھر چلو۔"

"آدمی کو سیدھے راستے پر چلنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔" میں نے کہا "ویسے تم کہو تو میں ٹیڑھا ترچھا چل کے بھی دکھا سکتا ہوں لڑکھڑا کے شرابی کی طرح۔۔۔ ایسے۔۔۔ اور شرابی کی طرح جھومتا ہوا۔۔۔ ایسے۔"

"بس بس۔۔۔ ہم تمھارا اسکرین ٹیسٹ لینے نہیں آئے۔" دوسرے نے دہشت لہجے میں کہا میری چال کے عملی مظاہرے نے انھیں پریشان کر دیا تھا۔

www.paksociety.com

"مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے لینے آئے ہو لیکن اتنا تو بتا دو کہ آئے کیسے ہو؟" میں نے کہا۔ مطلب یہ تھا کہ پہلے آئے ہوئے [illegible] اور [illegible] ... پوچھا یہ تھا کہ میرا پاس نے بتا دیا تم کو؟"

"ہم صورت سے شناسا ہے وقت نظر آتے ہو ..."

"شاید کہا، نہ تو نظر آتے ہو" ڈن نے کہا۔

"لیکن تم [illegible] نہیں [illegible] سکتے" دوسری طرف والے نے بگڑ کر کہا۔ "تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم تمہیں تلاش کر لیں گے۔"

"کیا تم مجھے چیلنج کر رہے ہو؟" ڈن نے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو ایک [illegible] دے کر دیکھو!"

[illegible] چلنے والے نے ریوالور کی نال کو میری پسلیوں میں دبا کے مجھے ایک گالی دی۔

میں چلایا۔ "آہ ... آہ ... ادھر میرا دل ہے۔ دل ٹوٹ جائے گا تو ..." اور پھر [illegible] تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ ہم آبادی سے دور آ چکے تھے اور ساحل کے اس حصے میں تاریکی تھی۔ [illegible] میری [illegible] کے بعد صورت حال کی وضاحت [illegible] ہو جاتی تھی۔ [illegible] ایک اور خیال آیا کہ [illegible] بات [illegible] وقت دونوں بات کرنے کی کوشش کریں گے تو وہ میری آواز سن سکے گا اور [illegible] سنوں گا۔ [illegible] پھر [illegible] آواز [illegible] کی آواز کو [illegible] دیں۔

اس خیال کے آتے ہی میں مستعد ہو گیا۔ اب جو کچھ کرنا تھا مجھے ہی کرنا تھا۔ [illegible] کی آواز سنتا تو مجھے اس کو آن کرنا تھا۔ [illegible] اور میرا ہاتھ [illegible] جاتا تو وہ دونوں [illegible] ریوالور [illegible] چاہتا تھا۔ [illegible] واکی ٹاکی [illegible] لیا جاتا اور شاید وہ فیصلہ کر لیتے کہ مجرم [illegible] کو جاسوس [illegible] سمجھے، [illegible] ہوا لوئی، [illegible] اور [illegible] تم سے محروم [illegible] ہوتا۔ اسی [illegible] سب آشنا اور دشمن [illegible] بھی [illegible] کا ڈر تھا۔

یہ سب سوچ کر میں نے ان دونوں [illegible] جانے کا فیصلہ کیا۔ جہاں آگے [illegible] ان کی مدد کا [illegible] کسی کی مداخلت کا اندیشہ تھا۔ میں چلتے چلتے ایک دم رک گیا۔ انھوں نے ایک ساتھ مجھے آگے دھکیلا مگر میں [illegible] کی طرح قدم جما کے کھڑا رہا۔

"میری ایک بات سن لو پہلے" ڈن نے کہا۔

"جو کہنا ہے وہاں جا کے کہنا" ان میں سے ایک نے

"ایسا نہیں [illegible]" اس نے کہا۔

"یہاں میری بات سن لینے میں تمہارا فائدہ ہے" ڈن نے کہا۔

"ہم تمہارے فائدے کی نہیں، اپنے نقصان کی [illegible]"

"جب تک میں اپنا [illegible] نہیں [illegible] یہاں سے [illegible] نہیں ہٹوں گا" میں نے کہا اور [illegible] پر گر گیا۔

انھوں نے مشتعل ہو کے ریوالور اٹھایا اور میرے سر پر وار کرنے کی کوشش کی۔ جب اس نے دیکھا کہ میں ساکت بیٹھا ہوں اور میری اس حرکت کا مقصد انھیں دھوکا دے کر فرار [illegible] تو اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے قتل کے [illegible] ہو چکے ہیں۔ قتل کرنا ہوتا تو [illegible] [illegible] اپنا کام ختم کر کے [illegible] ہو گئے۔ حکم دیا گیا تھا کہ مجھے زندہ گرفتار کر کے لے جائیں۔

"وہ [illegible] بولو گے؟" اس نے [illegible] لہجے میں کہا۔

"ابھی تک تم نے اپنا تعارف [illegible] ہے" ڈن نے کہا۔

"ایک ..."

"اور میرا خیال ہے کہ جو بھی مجھ سے ملنا چاہتا ہے اس سے ملاقات کر کے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا" ڈن نے کہا۔

"[illegible] ..." اس نے خاصے وقفے کے بعد کہا۔

"آخر تم اتنا ڈرتے کیوں ہو؟ ایک بات سن لینے میں کیا ہے۔ [illegible] اختیار [illegible]" میں نے کہا۔

اس کے دوسرے ساتھی نے [illegible] [illegible] [illegible] سے پوچھا۔ "[illegible]" [illegible] "ابھی بات کرنا اور [illegible] کوشش مت کرنا۔"

"ایک [illegible] جو کہنا ہے" [illegible] والے نے [illegible] مگر [illegible] محبت [illegible]۔

"ہم [illegible] جو تمہارا مقصد ہے [illegible] اس سے [illegible] سکتا ہوں" میں نے لیٹے لیٹے کہا۔

"[illegible] بولو ..." [illegible]

"[illegible] ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے" میں نے کہا۔

"دیکھو [illegible] تمہیں [illegible] ملنا چاہتا ہے۔"

"یاس [illegible] یہاں بھی کوئی پاس ہے [illegible]" اس نے کہا۔ "[illegible] ایک [illegible] ہو جاتا ہے [illegible]"

"[illegible]" وہ مشتعل ہو کے بولا۔ [illegible] تھا کہ وہ ساتھ [illegible] ہو تو [illegible] کوئی [illegible] کو [illegible] مت ڈالنا۔ [illegible]

"[illegible]" کہا۔ "تم [illegible] ہو کیسا [illegible] [illegible] تھی [illegible]

"[illegible] ساتھی [illegible] کے مزار میں داخل ہوا اور واپس [illegible] کے پر [illegible] میں گھس کے نکل گیا۔"

"[illegible] کوئی معاوضہ کی بات نہیں ہے۔ [illegible] [illegible] قبولیت پسند تھا۔"

"[illegible] بات ہے؟"

"[illegible] قبول کر لیتے ہیں وہ پولیس کے سپرد [illegible] اور ہمارا [illegible] [illegible] وقت نہیں ہوتا کہ آج آسانی سے [illegible]"

"[illegible] اس جگہ کوئی اور، مجھے کیا ضرورت ہے [illegible] اور اس کے ہاتھوں قتل ہونے کی؟" [illegible]

"[illegible] تمہیں قتل کر کے اس کا مقصد [illegible] حاصل [illegible] اور [illegible] تمہیں [illegible] [illegible] مجھے [illegible] ہوئے [illegible] چلنے والے نے [illegible] میری پسلیوں [illegible]"

"[illegible] ..."

[illegible] کے بعد میں الجھن [illegible] دونوں [illegible] [illegible] شدید [illegible] ان [illegible] دوسرے [illegible] [illegible] اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے [illegible]

[illegible] سنبھلنے کی کوشش [illegible] جھٹکے کے ساتھ میں نے [illegible] [illegible] نے اوپر سے [illegible] میری گرفت [illegible] [illegible] دونوں [illegible] ہاتھ کا [illegible] دونوں ہاتھوں سے [illegible] دوسرے شخص پر [illegible] ریوالور کی نال [illegible] سامنے [illegible] [illegible] کہ وہ دونوں ریوالور استعمال [illegible]

لیکن [illegible] ہی روعمل نے اس لمحے پر میری گرفت ختم [illegible] فیصلہ [illegible] اپنی توجہ [illegible] رکھنے کی صلاحیت [illegible] طاری ہو گئی۔ یہ سب [illegible] اور [illegible]

[illegible] کہ میری [illegible] شکست میں بدل گئی۔ اس میں قصور میرا نہیں رابعہ کا تھا۔

جیسے ہی دوسرا شخص مجھے دبوچنے کے لیے میرے اوپر گرا اس نے [illegible] ہاتھ [illegible] سے واکی ٹاکی [illegible] غیر [illegible] اوپر [illegible] تھا [illegible] بالکل نیچے [illegible] واکی ٹاکی کا [illegible] جاگ اٹھا اور میرے کانوں نے رابعہ کی آواز سنی۔

"... [illegible] انتظار کرتے رہو گے ..."

"[illegible] محسن [illegible] بھی کیا ہے قراری ..."

اس سے زیادہ میں نے کچھ نہیں سنا۔ رابعہ کی آواز سنتے ہی میرے ذہن کو جیسے [illegible] دولت کی قوت کا بوجھ [illegible] گا۔ وہ صرف چار الفاظ تھے جو اس کی آواز میں اضطراب اور اشتیاق کے [illegible] [illegible] سے [illegible] تھی اور اس پر [illegible] کا ترپ اٹھا [illegible] بات [illegible]

جواب میں [illegible] [illegible] کی آواز [illegible] کانوں تک پہنچی [illegible] [illegible] رابعہ کی آواز [illegible] اور اسی لیے [illegible] [illegible] میرے [illegible] پھسل ہوا اندھیرا [illegible] رابعہ کی آواز [illegible] جانے والے [illegible] [illegible] اور حسرت [illegible]

[illegible] [illegible] بولنے لگے ... [illegible] ... آخر کب تک ... [illegible] تم بھی [illegible] ... جواب کوئی [illegible] ... یہاں کب تک [illegible] ...!

[illegible] واپس جانا چاہتا تھا۔ رابعہ آگئی تھی اور میری [illegible] [illegible] سے [illegible] پریشان کر رہا تھا ... اب [illegible] بھی کیا بے قراری ... وہ مسلسل مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں مصروف تھی مگر [illegible] اس کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی اور نہ میری طرف سے کوئی جواب مل رہا تھا۔ رابعہ کے اعصاب [illegible] انتظار کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس نے [illegible] صدیوں کا سفر اسی ایک لمحے کے انتظار میں کیا تھا۔ وہ [illegible] کو [illegible] رہی تھی۔ ... چلو ... [illegible] ادھر ہی کیا ہے [illegible] ... ہم چلے [illegible] ..." اور اس کی آواز کا ایک [illegible] ... [illegible] کا ایک بول ...

www.paksociety.com

نظر ساز کا ایک شخص مجھے بلانے آگیا تھا۔ . . یہ بتانے آگیا تھا کہ چلو۔ تم کو جس کا انتظار تھا۔ اب وہ تمہارے لیے محوِ انتظار ہے۔ . . .

لیکن اب میں اس سمندر کے ساحل پر نہیں تھا۔ میں ایک سجے سجائے کمرے کے قالین پر پڑا ہوا تھا۔ جلتی بجھتی روشنیاں اور متحرک دیوار و در مجھ پر خندہ زن تھے۔ نامانوس چہروں پر تمسخر اُڑانے والی مسکراہٹ تھی اور میں اپنی بے بسی کے حصار میں تنہا رہ گیا تھا۔

آہستہ آہستہ میں اس قابل ہو گیا تھا کہ تقدیر کے اس بے رحم مذاق کو سمجھ سکوں۔ وہ سب انتظامات جو ہم نے آپس میں رابطہ قائم رکھنے کے لیے کیے تھے، بے فائدہ ثابت ہوئے تھے۔ غالب اور محسن دانا میں سے کوئی بھی میری مدد کے لیے نہ پہنچ سکا تھا اور وعدے کے مطابق مجھ سے ملنے کے لیے پہنچ جانے والی رابعہ مجھے پکارتی رہ گئی تھی۔

میرے سامنے صوفے پر ایک پستہ قد بھدے جسم والا گنجا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے اور گردن کی جلد پر برص کی سفیدی تھی جو بڑے بڑے دھبوں کی صورت میں ہاتھوں پر بھی پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں کہیں کہیں اس کے گندمی رنگ کے داغ رہ گئے تھے جو بدنمائی اور کراہیت کا احساس پیدا کرتے تھے۔ کمرے کی ہر دیوار پر دو لائٹس تھیں جن پر جھلمل کرتی شیشے کے موتیوں والی جھالریں تھیں۔ ایسی ہی جھالروں والی دس لائٹوں سے بنا ہوا فانوس درمیان میں روشن تھا۔ باقی کمرا بھی بیش قیمت سامان آرائش سے بھرا ہوا تھا۔

صوفے پر بیٹھے ہوئے پستہ قد شخص کا سر بھی ایک گلوب کی طرح چمک رہا تھا۔ اس نے بہت قیمتی کپڑے کا سوٹ پہن رکھا تھا، لیکن اس کا جسم اتنا بے ہنگم تھا کہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود کوئی درزی سوٹ کو اس کے جسم کی ساخت کے مطابق نہیں بنا سکا تھا چنانچہ وہ سوٹ میں بھی کارٹون نظر آتا تھا۔ اس نے رات کے وقت بھی کالے رنگ کی عینک لگا رکھی تھی۔ صرف اس کی اکڑی ہوئی گردن کے خم اور ناک کی سمت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے ہی گھور رہا تھا۔

عین صوفے کے پیچھے وہ شخص اٹینشن کھڑا ہوا تھا جس نے مجھے ایک دو گن کر کے گولی مار دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی مقابل کی دیوار سے لگا ہوا میرے پیچھے موجود تھا۔ دو ایسے ہی حکم کے غلام دائیں اور بائیں جانب بھی باادب باملاحظہ ہوشیار نظر آ رہے تھے۔ وہ سب خونخوار شکاری کتوں کی طرح اپنے آقا کے ایک اشارے کے منتظر تھے اور شکار کو یعنی مجھے بے تاثر دیکھنے میں مصروف تھے کہ بس اب کوئی دم کی بات ہے چنانچہ مجھے کلمۂ شہادت ضرور پڑھ لینا چاہیے۔

"بیٹھ جاؤ امیر چند ولد دھرمی لال۔" برص زدہ گنجے ہوئے باس نے اپنی بھاری مصنوعی آواز میں کہا۔ میرے باپ کی ولدیت کے ساتھ مجھے مخاطب کرنے میں تمسخر کا انداز تھا مگر اس کا لہجہ بے جان اور چہرہ سپاٹ رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ لبوں کے سوا اس کے پورے ساکت وجود میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوتی تھی اور وہ مجھے انسان سے زیادہ کوئی روبوٹ لگا۔ اس کے اور میرے درمیان سب گفتگو انگریزی میں ہوئی۔

میں چند قدم پیچھے ہٹ کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مجھے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ تلاشی لینے والوں نے مجھے ریوالور، پرس اور نقد رقم سے محروم کر دیا ہے۔ کمر سے لپٹی ہوئی بیلٹ ٹٹولنے کے لیے انھوں نے میرے کپڑے ضرور اُلٹے ہوں گے تاہم یہ کپڑے مجھے پہنا دیے گئے تھے۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے میرا پاسپورٹ دیکھ لیا۔" میں نے سر کو تھوڑا سا جھٹک کے کہا۔

"وہ سب جعلی کام ہے۔" روبوٹ نے کہا۔

"جعلی تو مجھے تم بھی لگتے ہو۔" میں نے کہا۔ "نیچے سے اوپر تک تمہاری یہ شخصیت جعلسازی کا نمونہ ہے۔"

اس نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ "کس کے لیے کام کرتے ہو تم؟"

میں نے درد کرتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے دبا کے کہا۔ "میں کسی کے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔"

اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ "میرا بھی یہی خیال تھا۔ میں نے پہلے تمھیں کبھی نہیں دیکھا۔"

میں نے خوشدلی سے کہا۔ "کمال ہے! میں نے بھی پہلے تمھیں کبھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ تم تو دیکھنے کی چیز ہو۔"

"تم ایک بہادر آدمی ہو۔" اس نے مجھ سے بغیر اپنے انداز کی بے حسی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا یہاں مجھے بہادری کا کوئی میڈل دیا جائے گا؟"

"میرے لیے کام کرو گے تم؟" اس کا لہجہ جذبات سے عاری سپاٹ تھا۔ وہ شخص اپنے ہر طرح کے ردعمل پر مکمل کنٹرول رکھتا تھا چنانچہ میری انتہائی کوشش کے باوجود ابھی تک مشتعل نہیں ہوا تھا۔ حکم کے غلام میری بدتمیزی پر تاؤ کھاتے نظر آتے تھے مگر خاموش تھے۔ شاید وہ جانتے تھے کہ باس کو دخل در معقولات پسند نہیں۔ ان کی برہمی کا اندازہ صرف ان کی آنکھوں سے ہوتا تھا۔

"ابھی تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "تمہارے سر پر کھڑے ہونے والے گستاخ شخص کو بھی نہیں مار سکتا۔"

جیسے پہرے دار کا ہاتھ دوڑ اس کے گلے کی طرف بڑھا ارادہ کیا تھا ایسے ہی اس کا ہاتھ اوپر نہیں اٹھا۔ میری توقع کے برعکس اس نے اپنے سر کی شفاف سطح پر پھیلنے والی کھجلی تلاش نہیں کی۔

"ابھی ان مارنے والوں کی ضرورت بھی نہیں ہے مجھے۔ میں بات کر رہا تھا۔" اس نے کہا۔

"میرے لیے بات کرنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم بعد میں بات کریں گے۔" اس نے کہا اور اتنا کہتے ہی محفل برخاست ہو گئی۔

پیچھے پوری دیوار پر پھیلا ہوا سرخ ریشمی پردہ ہٹا اور ایک لڑکی سنہری رنگ کی منقش ٹرالی کو بے آواز قدموں کے ساتھ دھکیلتی ہوئی اندر آئی۔ وہ خوبصورت، نازک اور سنہری تھی اور اس کے آدھے سے زیادہ چہرہ چھپا جانے والے بال بھی سنہرے تھے۔

میں دلفریب انداز نقش پا دیکھتا رہا۔ سوچ خرام ناز کے انداز کا مفہوم آج میری سمجھ میں آیا۔ اس کے نازک پاؤں قالین کے پھولوں پر یوں پڑ رہے تھے جیسے اس کے قدموں میں جان نہ ہو اور گلاب کے تازہ پھولوں کا فرش ہے۔ ٹرالی کی حرکت بھی بے آواز تھی۔ یہ جھلملاتا منظر گویا کسی اشارے کا منتظر تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے یہاں سب کچھ باس کے اشارے پر ہوتا ہے۔ جب اس نے چشم نمائی کی تو یہ ناممکن تھا کہ اس کے اشارے کے بغیر وہ ٹرالی کے ساتھ نمودار ہوتی۔ حکم کے غلام بت بنے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ بھی اس کی مرضی کے بغیر نہ ہل سکتے تھے، نہ مسکرا سکتے تھے اور نہ کوئی بات کر سکتے تھے۔ وہ میری ناشائستہ بے تکلفی پر برہم تھے تو اپنی برہمی کا اظہار کرنے سے قاصر تھے۔ بلا اجازت وہ اپنی نیازمندی اور جاں نثاری کا مظاہرہ بھی کرتے تو شاید یہ ان کا جرم شمار ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ باس کے اس قصر عالیشان میں مجال ہے کہ پرندہ بھی اپنی مرضی سے پر مار سکتا۔ جو لوگ اس کے اشاروں پر چلتے تھے، ان کا ہنسنا رونا، کھانا پینا، یہاں تک کہ جینا مرنا بھی شاید ان سب کے اپنے اختیار کی بات نہیں تھی۔

خود اس کا رویہ ناقابل یقین حد تک غیر جذباتی تھا۔ وہ کم سے کم الفاظ استعمال کرتا تھا اور کم سے کم حرکت کرتا تھا۔ مفہوم کچھ بھی ہو، اس کا لہجہ یکساں اور اس کی آواز اسی سطح پر رہتی تھی۔ پھر وہ جو کہتا تھا یوں کہتا تھا جیسے مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ جیسے اس کی ہر بات حرف آخر ہے جس میں نہ غلطی کی گنجائش ہے نہ اختلاف کی۔ مثلاً جب اس نے کہا تھا کہ "وہ سب جعلی ہے" تو یہ گویا قطعی فیصلہ تھا جو اس نے اپنی حاصل کردہ معلومات پر کامل یقین کے ساتھ کیا تھا چنانچہ میرے انکار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی یقین کے ساتھ اس نے مان لیا تھا کہ میں کسی کے لیے کام نہیں کرتا کیونکہ اسے تفتیش کے نتائج معلوم ہو گئے تھے اور یہ ناممکن ہے کہ اسے کوئی بات معلوم نہ ہو۔

چائے کی ٹرالی میں وہ سب کچھ موجود تھا جس کی میں خواہش کر سکتا تھا۔ ساقی گری کے فرائض انجام دینے والی نے جب ایک ہاتھ سے زلفیں ہٹا کے اپنا چہرہ میری طرف کر کے پوچھا "کریمی؟" تو میں نے اس کے ساتھ ایک برا سا مذاق دہرایا کہ مٹھاس تو ان ہاتھوں کی بھی بہت ہوگی مگر وہ بالکل نہیں مسکرائی۔ غالباً وہ باس کی نظر کا اشارہ سمجھ کے واپس ہو گئی۔ ایک ایک کر کے چاروں حکم کے غلام بھی پردوں کے پیچھے روپوش ہو گئے۔ یہ طے کرنا مشکل تھا کہ وہ سچ مچ چلے گئے ہیں یا چھت سے فرش تک آویزاں پوری پوری دیوار پر محیط ساٹن کے بھاری پردوں کی شکنوں کے درمیان موجود ہیں۔

میں نے خود ہی بلیک کافی کے مگ میں دو چمچ چینی کے ڈالے اور نفیس کام والے چاندی کے چمچے، نازک انگلش کراکری اور بھری ہوئی ٹرالی کی خوب صورتی سے متاثر ہوا۔ اس رعب دار ماحول میں حسن ذوق کی آئینہ داری تھی۔ برازیل کی اعلیٰ ترین کافی کی بھرپور مہک اور کلب سینڈوچ دیکھ کے مجھے بے اختیار محسن دانا یاد آیا جو کھانے پینے کے معاملے میں میرا ہم ذوق تھا۔ مجھے اس پر تاؤ بھی آیا۔ اگر وہ شخص رابعہ کو تنگ کرنے کے بجائے دیر نہ کرتا اور رابطہ قائم ہونے کی صورت میں فوراً آ جاتا تو صورت حالات مختلف ہوتی اور اس کے بالکل برعکس ہوتی جو اب درپیش تھی۔ ہم ان دونوں کو لے جاتے جو مجھے یہاں لے آئے تھے۔ میں باس بن کے بیٹھتا اور ان دونوں سے پوچھتا . . .

"ایک شخص تم سے ملنا چاہتا ہے۔" باس نے اچانک کہا۔

میں اس وقت تک اپنا پیٹ بھر چکا تھا۔ کافی کا دوسرا مگ پی رہا تھا۔ ان سب اشیائے خورونوش کو حسرت سے دیکھ رہا تھا جن کے لیے میرے پیٹ میں جگہ نہیں رہی تھی اور سوچ رہا تھا کہ ہم سب ہوتے تو یہ ٹرالی خالی کر سکتے تھے۔

"بہت سے لوگ ملنا چاہتے ہیں مجھ سے۔" میں نے درمیان میں رکھے ہوئے باکس میں سے ہوانا سگار منتخب کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں ایک مصروف آدمی ہوں۔ اپائنٹمنٹ کے بغیر نہیں ملتا۔"

وہ بڑے میکانکی انداز میں اٹھا۔ میں نے اسے نپے تلے قدموں سے چل کر ایک دیوار کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ مشکل سے پانچ فٹ قد کا آدمی تھا۔ تین انچ کا اضافہ اس نے اونچی ایڑی والے جوتے پہن کے کیا تھا اور یہ اسپیشل آرڈر پر بنے ہوئے جوتے تھے جن میں آدھی ایڑی کو مہارت سے چھپا دیا گیا تھا۔ اس طرح وہ اوسط قد کا آدمی نظر آتا، اگر وہ اپنی چوڑائی میں ڈرم کی طرح نہ ہوتا۔

ایک ڈوری کھینچ کے اس نے پردہ ہٹا دیا۔ درمیان میں ایک شفاف چوکھٹا سا نمودار ہو گیا اور اس شیشے کی پارٹیشن کے

www.paksociety.com

پہلے دوسرے کمرے کا منظر بالکل ایسے روشن ہو گیا جیسے سنیما ہال کی تاریکی میں اسکرین پر فلم کا منظر آ جاتا ہے۔

وہ کمرا بھی انداز آرائش میں شاندار امارت کا مظہر تھا لیکن اس وقت میں نے کمرے کو نہیں اس شخص کو دیکھا جو مجھ سے ملاقات کا مشتاق تھا اور ایک دم مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے ہموار سڑک پر چلتے چلتے میں ٹھوکر کھا کر گر گیا ہوں یا کسی گہرے کنویں میں جا پڑا ہوں، جیسے کسی نے میرے سر پر ہتھوڑا مار دیا ہو یا جیسے پتھر کا مجسمہ بنا دیا گیا ہو کیونکہ میرے دل کی دھڑکن رک گئی تھی، سانس رکی ہوئی تھی اور ذہن بند ہو گیا تھا، میری آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں اور میں جہاں کا تہاں ساکت اور مبہوت ہو گیا تھا۔ میرا سلگتا ہوا سگار میرے ہونٹوں میں دبا رہ گیا تھا اور میرے ہوش و حواس جواب دے گئے تھے۔

ولپوٹ سلیوٹ کر کے باہر چلا گیا اور وہ شخص جو چوڑے پر بیٹھا تھا اسی جگہ بیٹھا رہا جہاں سے وہ اٹھا تھا [illegible] کیونکہ مجھ پر سکتہ طاری تھا۔ جو میرے سامنے بیٹھا تھا وہ چوہدری ولاور تھا۔ یہ سب ایک ناقابل یقین ڈراؤنا خواب تھا۔ ایک ایسی سنگین حقیقت جس کو تسلیم کرتے ہوئے میرا وجود دہشت کی سرد ہوا میں خزاں کے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے! چوہدری ولاور ― یہاں ― ؟

"کیا تم اس سے ملنا چاہو گے؟" ولپوٹ نے کہا۔

میں بجلی کی طرح چونکا۔ سگار میرے ہاتھ سے گر گیا۔ ولپوٹ مجھے گھور رہا تھا۔

"کیا یہ میرا شکار ہے؟" میں نے پوچھا۔ وہ بولا تمہارا استقبال کرنے کی بجائے اس نے تھوڑا اونچا ہوتے ہوئے سگار کو اٹھا کے جلانا شروع کیا۔

ہاں اگر تم نہیں چاہتے تو میں اسے واپس کر دیتا ہوں حالانکہ میں اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔" ولپوٹ نے کہا۔ "اس نے مجھے بہت معقول رقم پیش کی ہے۔"

"کس قسم کی پیشکش؟" میں نے [illegible] کہا۔ "کیا قیمت لگائی ہے اس نے میری زندگی کی؟"

"قیمت کی بات ابھی نہیں ہوئی لیکن وہ بہت زیادہ دینے پر تیار تھا۔ تمہاری زندگی کی اس کے نزدیک معمولی قیمت نہیں ہو سکتی۔ کون ہے یہ شخص؟"

سوال اس نے اچانک کیا تھا اور میں بے خبر مشغول تھا۔ میں نے کہا۔ "کیا مطلب ... تو اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

ولپوٹ نے کہا۔ "بالکل نہیں بتایا۔"

"اپنا نام تو بتایا ہو گا؟" میں نے کہا۔ "جو کچھ ہو سکتا ہے کہ جو شخص تمہارے اس محل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہے، اس سے مجھے ملاقات ہو جائے۔ آپ کے ہاتھ سے تو کم از کم مجھ سے تو بات ہو چکی ہو گی۔"

ولپوٹ نے کہا۔ "آپ نے تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا اور کرسی چھوڑ دی۔ ولپوٹ کا سامنا کرتے ہوئے میں نے بڑی حقارت سے کہا۔ "یہ ہمارے ملک کا ایک بڑا افسر ہے، اس کا تعلق ... پولیس کا محکمہ ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے بچا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں کہ جب میں کوئی بری قوت برداشت کر رہا ہوں۔ اس نے مجھ پر ... دلا دیا اور ایک جھلک دکھا کے ایک بڑا دھوکا دیا اور ... اب وہ اپنی ہر چال سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ آخر میں نے اس حالت پر قابو پایا [illegible]

عجیب صورت حال ہے [illegible]

میرے اس شخص کے [illegible] سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ ممکن ہے تمہیں سب کچھ معلوم ہو لیکن میں پوچھنا نہ چاہتے ہو ... واقعی ابھی مجھے معلوم ہو جائے گا کہ وہ شخص ہمیں بہت سے اسرار سے بھرپور لگتا ہے۔ بہرحال اس کا چہرہ مجھے ہمیشہ یاد رہتا اور حقیقی زندگی کا ایسا کردار بنا دیتا ہے جیسے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن ... بہت بڑا بزنس مین ہے اور اتنا ہی بڑا دھوکے باز، جعل ساز اور ضمیر فروش بھی ہے۔ آپ کی دنیا کے سوال کے پیچھے اسی کی ان چالوں سے واقف ہونا ہے اور ضروری بھی ہے۔"

"میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ تم بھی اس کے ہی ہم پلہ ہو۔" میں نے کہا۔ "جو فرشتہ نہیں ہو سکتا ہے۔"

"اب کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"کہا نا ... کیا بتاؤں؟ مختصر یہ کہ میرا سوال یہ ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ میرا جانی دشمن ہے ― شاید تم سمجھ گئے ہو مگر ابھی تک میرے اور تمہارے درمیان دشمنی کا آغاز نہیں ہوا ہے۔ میں اس شخص کا بہرحال ایک دشمن ہوں۔ وہ سب سے زیادہ خطرناک ہے جس کے ہاتھوں ... مخالف سب قانون کے کھوکھلے اور قانون کا احترام کرنے والے ہیں ایک خطرناک دشمن ہوں جس سے وہ زیادہ ڈرتا ہے۔ آج تک میں اس سے ڈرتا رہا ہوں۔ ہمارے دشمنی کے رشتے کا پہلو زوال پذیر ہے۔ میں اسے [illegible] اب کا قاتل ہوں وہ جانتا ہے کہ میرے باپ کے بعد مجھے ختم کرنا ہے۔ سب کچھ جو اب میرے پاس ہے وہ پہلا تماشا ہے۔"

"کیا وہ تمہارا بھائی ہے؟"

"نہیں۔ میں کیسے بتاؤں ... وہ طوفان کا بھائی ... مگر اس کا ضمیر ... " میں نے کہا۔ "میرے بارے میں ...

پہنچ بھی ناممکن ہے۔"

"یہ وہ تمہارے باپ کا قاتل ہے یہ کیا کہتا ہے؟"

"وہ ان کا بزنس پارٹنر تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی بدنام تھا۔ میرے والد کو اس نے مروا دیا ... مگر وہ دوسرے کئی قتل کے پیچھے اس کا ہاتھ ہے ... اس کا خاص آدمی ... یہ سب سے بڑا فن کار ہے جو تم انہیں نہیں سنا سکتے ... اب میں صرف بیانات تم کو بتا سکتا ہوں۔ خواہ تم مجھے اس کے حوالے کر دو یا خود موت کے گھاٹ اتار دو۔ یا پولیس کے ہاتھوں یا تشدد کے سارے طریقے آزما سکتے ہو، اور دیکھ سکتے ہو کہ میں کتنی قوت برداشت رکھتا ہوں۔ تم چاہو تو مجھے ... بھی فروخت کر کے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہو۔"

"میرا فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ بہت کچھ حالات پر منحصر ہے اور حقائق پر۔"

"کیا مجھے بھی چند سوالات کی اجازت ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے سر کی خفیف سی جنبش سے رضا مندی کا اظہار کیا۔

"سب سے پہلے تو میں یہ جاننا چاہوں گا کہ اس شخص کا تم سے کیسے رابطہ ہوا جو دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوا ہے؟"

اس نے کہا۔ "وہ چند گھنٹے پہلے ملا تھا، میں پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے، جو جہانوستی کو واپس لانے گیا ہے؟"

"جہانوستی کون خاتون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جہانوستی اس لانچ کا نام ہے جس کا کپتان فرحان تھا۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ "کیا ... وہ تمہاری لانچ تھی؟"

"ہاں۔ جب وہ لانچ واپس نہیں آئی اور وہ سب لڑکیاں جو ڈوبی تھیں آزاد ہو گئیں تو بندرگاہ کے علاقے میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ ان لڑکیوں کے اغوا اور قتل کا مقدمہ اٹھا ہو گیا اور پولیس کمشنر کو خود وہاں جا کے صورت حال کو کنٹرول کرنا پڑا۔ اخبارات والے شور مچاتے رہے تھے۔ افسران نے بہت سوالوں سے بہت کچھ پوچھا۔ اس کے نتیجے میں ساری کہانی معلوم ہو گئی۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی تھے جو تم کو تلاش کر رہے تھے۔ انہی میں یہ شخص بھی شامل تھا۔"

"اور تمہارے آدمی بھی تھے؟"

"میرے آدمی تمہیں تلاش نہیں کر رہے تھے۔" وہ بولا۔ "لیکن جہانوستی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے گئے تھے۔ انہیں اس کا پتا چل گیا۔ اس نے کہا کہ وہ جہانوستی کو واپس لانے والے سے واقف ہے مگر یہ بات پولیس کو بتا سکتا ہے اور نہ کسی آدمی کو۔ وہ کسی ذمہ دار شخص سے بات کرنے پر تیار تھا۔ چنانچہ میرے آدمی اس کو یہاں لے آئے۔ اس وقت تک

نہیں تھے۔ اپنے آدمی تمہیں لانے کے لیے بھیج چکے تھے۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور جو لوگ اس لانچ کو واپس لائے ہیں انہیں وہ کیسے جانتا ہے۔ اس نے کہا کہ ان میں صرف ایک آدمی کو پہچانتا ہے۔ وہ پیشہ ور قاتل ہے۔ اگر جہانوستی کے ذمہ دار افراد کو اس کے حوالے کر دیا جائے تو وہ نقد رقم بھی ادا کر سکتا ہے۔ یہاں ملا ہر کسی بھی ملک کے کاروبار میں یہ کارروائی فائدہ پہنچا سکتا ہے، خواہ وہ ملکی سطح پر ہو یا بین الاقوامی سطح پر۔ وہ ایک بزنس مین ہے اور اس کے وسائل لامحدود ہیں۔ میرے اطمینان کے لیے وہ بہت قابل اعتماد اور معتبر ریفرنس بھی پیش کرنے کو تیار ہے۔ جو اس کے شناسا ہوں گے لیکن جب تک وہ سب لوگ اس کے حوالے نہیں کیے جائیں گے جو اس کے کہنے کے مطابق دہشت گرد ہیں۔ ان گنت افراد کو قتل کر چکے ہیں۔ انسان کا خون ان کا شیوہ ہے کیونکہ انہوں نے کروڑوں روپے مالیت کے ایک جہاز کو بھی جو سامان تجارت سمیت غرق کرایا ہے۔ اس وقت تک بات نہیں ہو گی۔"

"تم نے اس سے سامان تجارت کے بارے میں معلومات نہیں کیں، جہاز کا نام نہیں پوچھا؟"

"میں سب کچھ معلوم کر سکتا تھا اور یہ ناممکن تھا کہ وہ مجھے بتائے بغیر جا سکتا۔" وہ بولا۔ "یہ میری اس گھر کا حفاظتی نظام ایک فرشتہ کو بھی فرار ہونے کا موقع نہیں دیتا بلکہ میرا بہترین ہے۔ الٹا کوئی یہاں کوئی آ نہیں سکتا اور جو آ جائے وہ اپنی مرضی سے جا نہیں سکتا لیکن میں نے اس سے کہا کہ اچھا تم ابھی یہاں آرام کرو۔ مجھے معلوم کرنا ہے۔ میں نے خود بھی دلچسپی نہیں لی کیونکہ مجھے اس کی دلچسپی کا اندازہ ہو گیا تھا۔"

"اس نے تم کو فائدہ پہنچانے کی بات کی تھی؟"

"وہ کیا فائدہ پہنچائے گا مجھے؟ اپنے مفادات کی نگرانی میں خود کر لیتا ہوں اور مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ مسئلہ تمہارا ہے۔ ہاں اس کے پیچھے اور کئی لوگ ہیں جو میری مدد کے طلب گار ہیں۔ کے آ جانے کے بعد۔" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "میری ذات میں تمہیں کیا دلچسپی تھی؟"

"تمہیں معلوم ہو جائے گا۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "اس وقت تو میں اپنے آدمی تمہیں حفاظت سے یہاں لانے کے لیے بھیج چکا تھا۔"

"حفاظت؟" میں نے کہا۔ "انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی مجھے مارنے میں۔"

"لیکن تم نے ان کو مارا، ایک کو تو جان سے مار دیا۔"

"وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ اپنے دفاع میں جو کچھ میں نے کیا ٹھیک کیا۔" میں نے کہا۔

"جو کچھ انھوں نے کیا اور تم نے کیا، غلط تھا۔ وہ ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔" وہ بولا۔

www.paksociety.com

"غلط فہمی ۔ یعنی وہ مجھے قتل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور میں نے ان کے عزائم کو سمجھنے میں غلطی کی تھی؟ کیا تم اتنا بے وقوف سمجھتے ہو مجھے؟" میں نے بگڑ کے کہا۔

"جس شخص کی بے وقوفی سے غلط فہمی پیدا کی تھی، وہ پہلے ہی مارا جا چکا ہے۔ باقی تینوں اس کا حکم ماننے کے پابند تھے اگر وہ بھی چاہتا تو اس غلطی کی سزا مجھ سے ہوا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے تمہاری حفاظت کے لیے ان کو بھیجا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تمہارے اصل دشمن پہلے نہ پہنچ جائیں۔ یہ کوئی بہت بڑا کام نہیں تھا لیکن جسے میں نے بھیجا تھا وہ احمق ثابت ہوا۔ اس نے غلط افراد کا انتخاب کیا اور غلط طریقہ اختیار کیا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب وہ تم سے ملے تھے تو نشے میں تھے۔"

میں اس کی باتیں حیرانی سے سن رہا تھا اور ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اس کی کس بات کا یقین کروں اور کس کا نہ کروں؟

"میرے اصل دشمن آخر کون ہیں؟"

"جن کو تمہاری وجہ سے نقصان ہوا۔" وہ بولا۔ "کیا تمہاری ان سے کوئی کاروباری رقابت تھی؟"

"کن سے...؟"

"جن کی لانچ تھی، بھائی دوست۔"

میرے تن بدن میں آگ بھر گئی۔ "کاروباری رقابت ان سے جو بردہ فروش ہیں؟ اس کا مطلب ہے تم مجھے بردہ فروش کہہ رہے ہو؟ بردہ فروش نظر آتا ہوں میں صورت سے؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"چلا دوست، یہ صورت کون سی اصلی ہے تمہاری۔" وہ بولا۔ "اور اگر یہ کاروباری جھگڑا نہیں تھا تو پھر تم نے یہ حماقت کیوں کی؟"

"کیسی حماقت؟ میں سمجھتا ہوں، یہ خوش قسمتی ہے میری۔ مجھے فخر کرنا چاہیے اور غرور کرنا چاہیے اس بات پر کہ میں نے انسانیت فروشوں کی ایک کوشش بہر حال ناکام بنا دی۔ میں ساری دنیا کی عورتوں کو نہیں بچا سکتا اور سارے بردہ فروشوں کو ختم رسید نہیں کر سکتا لیکن مجھے بے حد خوشی ہے کہ کچھ عورتوں کی زندگی میری وجہ سے بچ گئی۔"

وہ پہلی بار مسکرایا۔ "تم ایک جذباتی احمق ہو۔ تم نے بلاوجہ ٹانگ اڑائی تھی اس معاملے میں۔ نہ تمہارے لیے کوئی فخر کی بات ہے اس میں اور نہ خوشی کی۔ تم نے کسی کی زندگی نہیں بچائی۔ وہ سب آج رات پولیس کی تحویل میں ہیں۔ کل انھیں بے سہارا عورتوں کے آشرم میں بھیج دیا جائے گا، پھر تحقیقات شروع ہوں گی اور ختم ہو جائیں گی۔ ان سب کو پولیس پھر انھی کے پاس پہنچا دے گی جو انھیں اسمگل کر رہے تھے کیونکہ اخلاقی طور پر پولیس اس کی پابند ہے۔"

"اخلاقی طور پر؟" میں دم بخود رہ گیا۔

"ہاں، کیونکہ اپنا حصہ وہ پہلے ہی وصول کر چکے تھے۔ اب ان لڑکیوں کو دو دو چار چار کر کے الگ الگ جہاز میں بھیجا جائے گا۔"

صدمے اور احساس شکست سے میرا دل ٹوٹنے لگا۔ "مگر ان کے والی وارث... کیا وہ معلوم نہیں کریں گے...؟ کیسے معلوم کریں گے؟"

"اخبارات میں ان کے نام، تصویریں... سب شائع ہونے کے بعد..."

اس نے کہا۔ "تم واقعی بے وقوف ہو۔ ان میں سے بعض تو اپنی مرضی سے جا رہی تھیں۔ باقی دور دراز کے علاقوں سے لائی گئی تھیں۔ اخبار کتنے لوگ پڑھتے ہیں اور بمبئی کے اخبارات کلکتہ، آسام، بہار یا ڈھاکہ کب جاتے ہیں۔ یہ خبر بمبئی تک محدود رہے گی۔ اس کے علاوہ تصویریں صرف ان کی شائع ہوں گی جو اپنی مرضی سے جا رہی تھیں، انھیں واپس لے جانے والا کوئی نہیں۔ باقی کے نام پتے شائع ہوں گے تو وہ غلط ہوں گے۔ کیونکہ سب معلومات پولیس ہی فراہم کرے گی۔ تفتیش کے مکمل ہونے تک ان کے بارے میں خبریں شائع ہوتی رہیں گی کہ آج مزید چار لڑکیاں فلاں آشرم سے فرار ہو گئیں۔ آشرم کوئی جیل نہیں ہے کہ ان پر ذمے داری عائد کی جا سکے۔ دو چار مہینے بعد کوئی مدعی ہو گا نہ ملزم اور نہ گواہ۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ تم نے ایک جذباتی حماقت کی تھی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا تھا ٹھیک کیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے اس کی مجھ پر کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوتی۔ میں دنیا میں اس انسان فروشی کے کاروبار کو ختم نہیں کر سکتا تو یہ میری بد قسمتی۔ میں نے فروش اور اس کے ساتھیوں کو مار دیا، بڑی نیکی کا کام کیا۔"

"یہ نیکی تم کو بہت مہنگی پڑی۔ معلوم نہیں کیسے تم ان کی نظر میں نہیں آئے جو فوراً ہی تم کو ساحل پر تلاش کرتے چلے گئے تھے۔"

"شاید وہ ہی نیکی میرے کام آ گئی۔" میں نے کہا۔

"وہ تمہیں حاجی علی کی درگاہ پر بھی تلاش کر رہے تھے۔ تم وہاں کیوں گئے تھے؟" اس نے کہا۔

"وہاں میرے علاوہ بھی ہزاروں لوگ تھے۔ وہاں کیوں جاتے ہیں لوگ؟" میں نے کہا۔

"سوال کے جواب میں سوال مت کرو۔" اس نے کہا۔ "وہاں دو قسم کے لوگ جاتے ہیں، حاجت مند یا اسمگلر... تم کیا ہو؟"

"نہیں... حاجت مند... ہر گز نہ تھا اور شاید ... "

"اگر تمہارے آدمی بیچ میں ذرا کود پڑتے۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ "آپ کی وجہ سے میرے اندرونی دکھ کی غماز تھی۔

"انھی کی وجہ سے تم بچ گئے..."

"میں اس جھوٹ کا مقصد نہیں سمجھ سکا۔ اگر وہ میرے ہمدرد تھے تو انھوں نے میری جان لینے کی کوشش کیوں کی تھی؟" میں مشتعل ہو کے کہا۔ "علاوہ اس کے جو ابھی یہاں بیٹھ سکیں سا کھڑا ہوا تھا، اس خبیث کے بچے نے مجھے تقریباً گولی مار دی تھی۔ یہ تو ایک ذرا تین تک گنوں گا اور اس کے بعد کیا ہوا، میرے بچے یہ دیکھو۔" میں نے اپنا سر جھکایا۔ سر کے پچھلے حصے میں ایک جراحت نمایاں تھا۔

"ایسا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ تم ان کا چہرہ ہی حشر کر رہے تھے جو ان پر چکے تھے۔" وہ بولا۔ "گولی مارنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ انھوں نے خود کو بچایا اور تمہیں اٹھا لائے۔"

"وہ مجھ سے شرافت سے درخواست بھی کر سکتے تھے۔"

"نہ وہ شریف آدمی تھے اور نہ انھیں تمہاری شرافت کا یقین تھا۔ کیا تم ان کی درخواست قبول کر لیتے؟"

میں نے کہا۔ "ایمانداری کی بات یہ ہے کہ نہیں۔ ایک بار ان کا سامنا ہو چکا تھا۔ دوسری بار میں کیسے ان کے ساتھ چل پڑتا؟ خواہ مجھے جنت میں لے جانے کے لیے آتے۔ مگر انھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں اس وقت حاجی علی کی درگاہ پر ملوں گا؟"

"انھیں ملی نے بتا دیا تھا۔" وہ بولا۔

"ملی نے... نہیں، میں نہیں مان سکتا..."

"وہ مانو نہیں، تمہیں مجبور تو نہیں کر رہا ہوں، مانتے ہو یا نہیں لیکن ملی کا ایک ذریعہ تھی تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا۔ تم اسی کے ساتھ تھے۔"

ایک نئے دہشت زدہ کر دینے والے خیال نے میرے دل و دماغ کو گرفت میں لے لیا۔ یہ شریف لوگ نہیں تھے اور ملی پر مجھے بھروسا تھا کہ وہ دغا دینے والی عورت نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ دشمن ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اس سے ہمارے بارے میں معلومات حاصل کرنا آسان کام نہیں تھا۔ انھوں نے یقیناً کوئی طریقہ اختیار کیا ہو گا۔

"کیا... طریقہ اختیار کیا تھا انھوں نے؟" میں نے چلا کر کہا۔ "انھوں نے ضرور تشدد کیا ہو گا اس پر۔"

"کیا ہو گا، مجھے نہیں معلوم..."

اس کے لبوں سے الفاظ نکلے ہی تھے کہ میں نے ایک جست لگائی اور اس کے اوپر جا گرا۔ میں نے اس کی موٹی گردن کو دبا لیا۔

"معلوم کرو، مجھ سور کے بچے... پوچھو ان کتوں سے کہ انھوں نے ملی کے ساتھ کیا کیا... ورنہ..."

اس نے بڑی پھرتی سے اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔ "ہٹ جاؤ، میں تم کو مارنا نہیں چاہتا۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے ایک جھٹکے سے پیچھے کھینچ لیا اور اسی صوفے پر پھینک دیا جہاں سے میں نے اشتعال کی بلندی میں چھلانگ لگائی تھی۔ صوفے پر گرتے ہی میں پھر اٹھا تھا مگر مجھے اپنے مقابل وہی دونوں نظر آئے جو مجھے یہاں لائے تھے۔ ان دونوں نے ریوالور سے میرے سر اور سینے کو نشانہ بنا رکھا تھا۔

روبوٹ نے اپنی ٹائی کی ناٹ درست کی اور ریوالور جیب میں ڈال کے پھر قوں بیٹھ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"ملی کے پاس تم دونوں گئے تھے؟"

"یس سر۔" ان دونوں نے بیک زبان کہا۔

"وہاں کیا ہوا تھا؟ تم بولو۔"

جس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا وہ فر فر بولنے لگا۔ "وہ پتا بتانے پر آمادہ نہ تھی۔ اس نے کہا کہ تم کس کی بات کر رہے ہو۔ میں نے کہا، اسی کی جو تمہارے شوہر کا ہم شکل تھا اور جسے تم شوہر بنانے کے لیے یہاں کھینچ لائی تھیں۔"

"میرا خون کھولنے لگا۔ "تم نے یوں نہیں کہا ہو گا، میں جانتا ہوں تمہارے جیسے لوگوں کو..."

"پہلے پوری بات سن لو۔" روبوٹ نے کہا۔ "پھر کیا تم نے مارا اسے؟"

"نہیں سر، اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔" وہ بولا۔ "ہم نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ ہم نے کہا کہ خود کو خراب مت کرو۔ پولیس تم کو اٹھا کر لے جائے گی رات بھر میں، تم سے وہ دس شوہروں کے نام پتے پوچھ لیں گے۔ وہ پھر بھی خوفزدہ نہیں ہوئی اور ہم پر چلانے لگی کہ جاؤ پولیس کے پاس اور جو تمہارا جی چاہے کر لو، کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں ابھی راج کو فون کرتی ہوں۔ ہم نے کہا، راج صاحب سے یہ بھی کہنا کہ تمہارے حضرتی قبرستان میں جعلی شوہر کی قبر پر پہرا لگوا دیں دن رات، سارا سال کے لیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چور ڈاکو تمہارے شوہر کا ڈھانچا نکال کر لے جائیں۔ ڈھانچے بڑے مہنگے فروخت ہوتے ہیں۔ میڈیکل کے طالب علم خرید لیتے ہیں۔ ڈاکٹ فیڈ اور فامیفیٹ بنانے والے بھی لے لیتے ہیں۔ بس یہ ملی کا بریک ڈاؤن ہو گیا۔ وہ چیخ چلائی، ہم کو مارنے کاٹنے دوڑی۔ لیکن ہم نے اس کو اور کچھ نہیں کہا، بس ایک تھپڑ ضرور مارا تھا تاکہ وہ ہوش میں آ جائے۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے بتا دیا کہ حاجی علی کی درگاہ پر جا کے دیکھو۔ ہم نے کہا کہ دیکھ لیتے ہیں مگر یہ جھوٹ ہوا تو ہم پھر آئیں گے۔ آج یا کل

www.paksociety.com

ایک جلتے بعد ایک پیچھے کے بعد ... جا سکے کے لیے کر تجھ وزک ... تم کو وہ سکے ... [illegible] ... کر دیا ہے اور ... تو اب یک خارش زدہ کتا مرا پڑا ہے۔"

میرا دل دکھ کے احساس کی بھاری چٹان کے نیچے دب کر کراہ چکا تھا۔ ہم خود تو جیسے مقدر کے سکندر تھے کہ اپنے سب سے بچھڑ کر ... دوستوں سے دشمنی کا جب زمانہ ... لیکن ابھی تو جوانی کے ساتھ ہم نے علی کی زندگی میں قدم رکھا تو اس کو بھی اندھیروں میں دھکیل دیا۔ وہ علی جیسا النفس اور ... دوست تھی لیکن جیسے کوئی قلعہ ناقابل تسخیر نہیں ہوتا ایسے ہی کوئی انسان بھی ناقابل شکست نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی پہلو سے اس کی ذات کا حصار توڑا جا سکتا ہے۔ کبھی نہ کبھی کوئی مجبوری ہی اس کی کمزوری بن جاتی ہے۔ میں نے علی کو قطعی معصوم الوجود نہیں سمجھا۔

"... اس کے بعد سب بتا دیا اس نے ..."

یہ الفاظ ... تھے جو میں نے اجنبی طور پر کہے ... کے بعد تھے ... درمیان میں ... کہ اس نے ادا کیے ... پہلے اتنا اہم بھی نہ تھا۔

"اب تم مطمئن ہو؟" رابرٹ نے کہا۔

"مطمئن ... کیسا عجیب سوال ... مجھ بے بسی سے نظر سے کہا۔ "جو کچھ تم نے علی کے ساتھ کیا ... مجھے تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے؟"

"... مجھے تم سے کیا اس پر ... شکر گزار ہونا چاہیے۔" وہ بولا۔ "... آسانی سے ہو جانے کے لیے ... [illegible] ... ایک عورت کو ... یقیناً آسان کام ہے۔" میں نے کہا۔

"... ضمانت ... ایک بڑا اعتماد تھی۔" وہ بولا۔ "میری کوئی ... نہیں ... ذات سے تم کو اتنی دلچسپی کیوں ہو گئی تھی؟ میں نے اتنا کہا اس کے لیے ... نے اپنے ایک ... کو مروایا اور ... ناکامی کے بعد اپنے اندر کی دوسری ... تم میرے اغوا کی ... بھی اپنا اتنا نقصان کیا؟"

"نقصان ... ایک بے وقوفی کے باعث ہوا جو مارا گیا۔ کمار بھی اس کی ... تھی۔" رابرٹ بولا۔ "اگر وہ بیچ میں نہ ہوتا تو خواہ مخواہ کسی سے جھڑپ ... نہ کرتا۔ پہلے تم کو پیغام پہنچاتا اور تم انکار کرتے تو پھر زبردستی لاتا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے تم کو ہی غلط ... اختیار کیا تھا۔ مگر خیر ... وہ میرا آدمی نہیں تھا۔ ایسے کام تک کسی بھی ... کے ... کر دیتا ہوں اور ... کسی ... کی تعداد میں ہیں جو کسی کے ملازم نہیں۔ جو سیدھے سے اس کا ہر کام کر سکتے ہیں۔ تمہاری ذات میں میری دلچسپی کا سبب ایک تو تمہاری نیک ... ہے۔ تمہارے کارنامے کی شہرت تم سے پہلے ... کہ بیگم کی ... تم نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے فروش

جیسے بدمعاش کو مار دیا اور اس کی لاش ... ہو جانے سے وہ اپنے واپس ... لے آئے۔ تمہارے ساتھی نے ... کیا تھا۔ یہ تمہارا اکیلے کا کام تھا۔ ہتھیاروں سے مسلح دو ... مجھے شام کو ملی۔ تم نے چار کا مقابلہ کیا اور ان پر غالب رہے۔ اس کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے ہر قیمت پر تمہاری خدمات حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دینا چاہیے۔"

"مگر کس مقصد کے لیے؟"

"مجھے تم جیسے ہی کسی آدمی کی اشد ضرورت تھی اپنا ... باڈی گارڈ رکھنے کے لیے۔" وہ بولا۔ "اپنا ذاتی محافظ بنانے کے لیے جو ہر وقت ہر جگہ میرے ساتھ رہے۔"

"تم اتنا غیر محفوظ سمجھتے ہو کیوں؟"

"میرے دشمن بہت ہیں اور خطرناک بھی ... میں اپنے دشمنوں میں ... [illegible] ... اب جو گروہ ... دشمن ہو گیا ہے اس نے تمہارا ... میرے ساتھ ... ہے ... تم میری حفاظت کرو گے تو ... میرے ... میں رہو گے۔ میرے کسی ... پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں۔"

فرید ... کا آغاز ... ہے ... مسترد کر دوں ... ایک ... تھا ... کہ اس کے ... سے ... جو اوقات بھی ... کر ... طور پر ... کا ... تھا ... اور غالب ... رابطہ ... تھے اور ... کے لیے میرے ... تھے قطع نظر اس کے رابرٹ کا ... کیا تھا ... ان کی حفاظت کی حیثیت سے میرے ... کی نوعیت کیا تھی۔ میرے لیے انکار کی ... گنجائش نہ تھی۔ پھر وہ مجھے ... کے حوالے کر دیتا جو خوش قسمتی سے مجھے ... ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ اب اس کے اور میرے درمیان ایک دیوار حائل تھی۔ اس ... کے پیچھے ... ہمدردی ... تھا ... انسان ہی اتنا خاکسار رہتا کر ... کے اور اسے بتائے کہ ... تم ایک ... ہے ... اور یہ ... نہیں ہے جہاں ... کی ... کا ... تھا۔ یہاں ایک ایک بڑا بدمعاش ہے جو اس کا باپ ہے ... کھلاتا ہے۔ مجھے ... طاقت کی پشت پناہی حاصل ہو تو ... سے ... کے حوصلے یقیناً پست ہو جائیں گے ... مجھے ... نقصان نہیں پہنچا سکے گا ... میرے ... ہو گی۔

"جب ... کے ... نے کہا ... مجھے ... تمہارا ..."

کا پتا ہے اور ... کام کا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اپنی جان پر کھیل کر تم ... جان ... کا بدلہ کیا ہو گا ... ؟"

"یہ سب تمہیں بتا دیا جائے گا۔"

"اس کے علاوہ ابھی تک مجھے ایک ... معلوم ہوا ہے ... بہادری سے متاثر ہوئے ... دوسرا سبب کیا ہے؟"

"دوسرا سبب بھی تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "کیا تم نے ... سے ... [illegible] ... کر لیا ہے؟"

"... تم جہاں ... ہو تم جیسا کوئی ... پہلے سے ... کہ مجھے معلوم نہ ہوتا ... ہے ... لوگوں سے ... [illegible]"

"... ایک ... ہے ... جو ساحل پر ... [illegible] ... کا ... نے کہا۔"

"... اس کو تلاش کر لیا جائے گا۔"

"... میں ... کے کہا "میرے لیے ... تم اس شخص کو جواب دے دو ... اس نے ... ہاتھ ... دیکھ ... ہو ... کا ... اس سے کہو کہ جا ... اس کا ... تم ... کر ... سے ... اس ... کو ... دیا۔ ... سے تمہارا ... معلوم ہے تو وہ ... کا ... [illegible] ... کا ... ایک ... ڈرائیور پر ... معلوم نہیں ... ملتا ہے ... آج یہاں ہوں ... نہیں ... یہاں ... ایک ... کانوں ... سے ... ہو سکتا ہوں اور ... عام ... نہیں ... کے نیچے ... جانے ... ہو سکتا ہے ... کے ... نکل ... پہنچ جاؤں ... ہر جگہ میرے اپنے ... رہتے ہیں۔"

"ایسا کیا کام کرتے ہو تم ... ؟ تمہیں اتنے ... خطرات اور ایسے ... کی ضرورت پڑ گئی ہے؟" میں نے کہا۔

"میں ... کاروبار ... نہیں کرتا۔ تم میرے ساتھ ... کام ... اور ... آنکھیں کھلی رکھو گے تو خود ہی سمجھ لو گے مگر ... کہ تمہارے لب بند رہیں ... تم صرف ... کے ... انجام دو گے ... میں کیا کرتا ہوں اور کیوں کرتا ... میں تم ... سے ... کہ ... اپنا ... چلا

میں تو سب سمجھتا ہوں اس لیے اپنے فیصلے خود ہی کرتا ہوں۔ تم کبھی مجھے کوئی مشورہ نہیں دو گے۔ معاوضہ ... تمہاری ضرورت پوری ہو گی۔ تم جو مانگو گے ... جائے گا۔ ... کام ... کوئی نہیں جب تم کو بلایا جائے گا تم آؤ گے ... جہاں جانا ہو جاؤ۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ... تمہارا ... اب تم جاؤ۔" اس نے ... کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "رات ... میں ... کھا ... اور آرام کرو۔"

اس نے ... بجائی اور ایک ... پردے کے پیچھے ... وہ ... آئی جو اس سے پہلے ... کر لائی تھی۔

"آپ میرے ساتھ آئیں سر۔" اس نے ... بال ... ہٹاتے کہا۔

میں ... کھڑا ہوا ... سے کہ ... تو بتا دیجیے۔"

"تمہارا ... سے ... کام ..." اس نے ... اور ... کے ... سے ... وہ ... کے ... غائب ہو گیا ... کی ... میرے کانوں سے ... رہی ... کیا ... تمہارے لیے میرا ... ہے ... سکتا ... انسان ... تمہیں ... سب جانتا تھا ... مجھے ... وقت ... ایک ... سے ... [illegible]

... کر ... [illegible] ... اور ... کی ... نہ ... [illegible] ... کے عادی ... انسان ... مشکل ... ایک ... ہیں ... جو ... ہاتھ ... جن کے ... اور ... وہ ... ہیں جو ... کے اندھیرے میں ... پیچھے ہیں اور ... ساون کے اندھے کو ... نظر آتا ہے ... سیاہ بخت ... تو ... بھی ... کا ... رنگ ... ساری کائنات کا سب سے حسین رنگ ... سا ... روشن ... [illegible] ... بیا۔

میں اس کمرے کی دیواروں کے درمیان اتنی ہی اذیت محسوس کر رہا تھا جتنی کسی جیل کی ... میں ... فرش پر بیٹھا ... ہوا قیدی ... کرتا ہے حالانکہ اس ... انداز ... رکھنے والے بیڈروم میں عیش و عشرت کے تمام

WWW.PAKSOCIETY.COM

لازم موجود تھے۔ میں تقدیر کے اس انوکھے مذاق پر بیک وقت ہنسنا اور رونا چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں بہت سے اگر، تھے جو سانپوں کی طرح پھنکار رہے تھے۔ اگر میں نے لانچ پر پہنچنے کے بعد عقل سے کام لیا ہوتا۔ اگر میں جذباتی ہو کے اپنے مقصد کو فراموش نہ کرتا۔ وقت کے تقاضوں کو قبول کرتے ہوئے تھوڑی سی بے حسی، تھوڑی سی خود غرضی اور تھوڑی سی شرمندگی کو قبول کر لیتا۔ یہ سمجھ لیتا کہ مجھے اپنی آنکھیں بند رکھتے ہوئے اس راستے سے بھٹکنا نہیں ہے جو منزل کا راستہ ہے خواہ میرے دائیں بائیں اور آگے پیچھے کچھ بھی ہو جائے۔ اگر میں جہاز و کشتی کے سامان تجارت کو جاننے کی کوشش ہی نہ کرتا۔ اگر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بردہ فروشوں کا گروہ ہے تو میں ان کے خلاف اعلان جنگ نہ کرتا۔ حالانکہ یہ ناممکن سی بات تھی۔ فرض کرو مجھے کسی بھی کمزوری جہاز کے سپرد کر دیتا اور میں خاموشی سے بمبئی پہنچ جاتا۔

پیڈرو نے شاید دلاور کو مطلع کر دیا تھا کہ ہم جہاز کو تباہ کر کے بمبئی پہنچنے والے ہیں چنانچہ دلاور پہلے سے ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اگر ہم خاموشی سے پہنچتے تو وہ ہمیں تلاش کرتا رہ جاتا مگر اتنی بڑی بمبئی کی آبادی میں ہمارا سراغ نہ لگا پاتا لیکن ہم تو پہنچے ہی بڑی ہنگامہ آرائی کے بعد، یوں کہ بندرگاہ کے علاقے میں شور مچ گیا۔ اگر اس کے بعد بھی ہم روپوش ہو جاتے اور علی کے ساتھ نہ جاتے تو ہمیں کوئی کیسے تلاش کرتا۔ علی ہی ایک ذریعہ بن گئی اور اس بدمعاش نے بڑی آسانی سے میرا سراغ لگا لیا جس نے مجھے اپنا باڈی گارڈ مقرر کیا تھا اور دلاور سیدھا اس کے پاس آ گیا۔

یہ سب جھوٹ تھا۔ کوئی ایسا ڈراما تھا جسے میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ میری بہادری سے متاثر ہونے والی بات فقط زیب داستان کے لیے تھی۔ وہ مجھ سے کچھ اور کام لے گا یا وہ دلاور سے میرا سودا کرے گا۔ ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہو رہا تھا یا کوئی خطرناک قسم کا گٹھ جوڑ ہونے والا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی جیسے لوگ تھے۔ ان کے کاروبار کے اصول اور مقاصد ایک تھے۔ ان کے درمیان اشتراک ممکن تھا۔ مدبوٹ مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہے یا میرے بدلے میں دلاور سے زیادہ سے زیادہ وصول کرنے کی فکر میں ہے۔ بہرصورت میں اس قصر عالیشان میں قید تھا اور اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مدبوٹ نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن مجھے جھوٹ کے جال میں اسیر کر لیا تھا۔ اس طرح کہ مجھے اسیری کا احساس بھی نہ ہو۔

اب حقیقی صورت حال یہ تھی کہ میں محسن اور غالب سے بچھڑ چکا تھا۔ نالیہ کا صرف تصور کر سکتا تھا۔ وہ میرے اتنے قریب آ چکی تھی کہ میں اس کی آواز سن سکتا تھا اور پھر میں خود کسی کو کچھ بتائے بغیر غائب ہو گیا۔ اب کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور میرے پاس ان سے پھر رابطہ قائم کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ بے شک رابطے کی ایک جگہ تو علی کا گھر ہی تھا۔ دوسری جگہ حاجی صاحب کا جوس سینٹر تھا مگر وہاں میرا پہنچنا ایک ہی صورت میں ممکن تھا کہ میں اس محل کی قید سے فرار ہو جاؤں۔ یہ کام اتنا ہی مشکل تھا جتنا میرے ساتھیوں میں سے کسی کا اندر پہنچ جانا۔ معلوم نہیں بعد میں ان سب پر کیا بیتی۔۔۔ کہیں وہ بھی۔۔۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ مدبوٹ کے کہنے کے مطابق اس کے آدمی علی سے میرے بارے میں معلومات حاصل کر کے حاجی علی کی درگاہ پہنچے تھے۔ دلاور کے آدمی وہاں کیسے پہنچے؟ علی نے تو زیادہ سے زیادہ میرے اور غالب کے بارے میں بتایا ہوگا۔ وہ محسن، نازو اور گل سے تو واقف ہی نہیں تھی۔ لیکن دلاور کے آدمی گل کے سوا سب کو پہچانتے ہوں گے۔ پھر کیا انھوں نے باقی لوگوں کو چھوڑ دیا ہوگا؟ گل شاید محفوظ رہی ہو کیونکہ وہ ساحل پر موجود تھی مگر باقی سب پہ کیا بیتی؟ جو مجھے گرفتار نہ کر سکے تھے کیا وہ ناکام لوٹ گئے ہوں گے؟ نہیں، انھوں نے تلاش جاری رکھی ہوگی اور اس وقت جب کہ زائرین بھی بہت کم رہ گئے تھے، رابعہ کے ساتھ محسن اور غالب کے ساتھ نازو انھیں ضرور مل گئے ہوں گے۔ پھر کیا ہوا؟ کیا ان کے درمیان مقابلہ ہوا؟ بلا مقابلہ ہتھیار ڈالنے والے تو وہ لوگ بھی نہیں تھے۔

اب جس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا وہ ایک ہی تھا کہ دلاور کے آدمی میری تلاش میں وہاں کیسے پہنچ گئے؟ کیا انھوں نے بھی علی سے ہی سب کچھ معلوم کیا ہوگا؟ اس کے سوا تو کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ہم یہاں مل سکتے ہیں اور علی کی کار کے نمبر نے ان کا مسئلہ حل کر دیا ہوگا۔ یہ ہماری خوش فہمی تھی کہ گاڑی کی رجسٹریشن اس کے شوہر کے نام پر ہے جو مر چکا ہے اور جہاں کبھی جانا ہے اس لیے علی تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ علی فیروز اتنی گمنام بھی نہ تھی۔ اس کے پاس ٹیلی فون بھی تھا اور ٹیلی فون کا نمبر ڈائریکٹری میں ہوگا۔ نمبر کے ساتھ اس کا پورا پتا درج ہوگا۔

میں ٹہلتے ٹہلتے اور سوچتے سوچتے تھک چکا تھا مگر یہ بات کچھ نہیں سمجھ پایا تھا کہ میں کہاں ہوں، کس کے ساتھ ہوں اور میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ مجھے اپنے نئے پُراسرار باس کے باڈی گارڈ کی حیثیت سے کیا کرنا ہوگا اور اگر دلاور کے ساتھ جانا پڑا تو کیا ہوگا؟ میری حالت اس راہ گم کردہ مسافر کی سی تھی جو تیرہ و تاریک گلیوں میں بھٹک رہا ہو مگر ہر گلی آگے جا کے بند ہو جاتی ہو۔ میرے سب خیالوں کے راستے بھی ایک جگہ پہنچ کے خلا میں گم ہو جاتے تھے۔

بالآخر میں نے طے کیا کہ فوری طور پر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میری کوششوں کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار آنے والے وقت کے فیصلوں پر ہوگا۔ تھکن اور جسمانی تکان بہرحال ذہن کو متاثر کرتی

ہے۔ منہ دھو کر پیٹ بھرنے اور سکون سے رات بسر ہونے کے بعد یقیناً میری قوت فیصلہ بہتر ہوگی اور میں آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ یہی سوچ کے میں نے باتھ روم کا رخ کیا۔

ایسے باتھ روم میں نے فلموں میں دیکھے تھے۔ بادشاہوں کے محلات تو اب تاریخی عمارات بن چکے تھے مگر جدید دنیا کے دولت مندوں کی شان و شوکت کے افسانے عام تھے۔ یہ بھی ایک ایسا ہی باتھ روم تھا جس کی تزئین و آرائش پر بلامبالغہ لاکھوں روپیہ صرف کیا گیا ہوگا۔ اس وقت مجھے خاصی خفت اٹھانی پڑی جب میں نے ایک سوئچ دبانے کا تجربہ کیا۔ سوئچ پر 'مددگار' لکھا ہوا تھا۔ چند سیکنڈ کے بعد وہی لڑکی اندر آ گئی جو مجھے اس خواب گاہ تک لائی تھی اور اس نے بڑی دلنشیں مسکراہٹ کے ساتھ جب غسل میں میری مدد کا ارادہ ظاہر کیا تو میں گھبرا گیا۔ اپنی اماں کے ہاتھوں کے سوا جنھوں نے مجھے نو دس سال کی عمر تک نہلایا تھا، آج تک میں نے اپنے ہاتھوں سے خود ہی غسل کیا تھا۔

"کیا بات ہے، یہاں اندر گھسی چلی آ رہی ہو!" میں نے خفگی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔ "عجیب بے شرم لڑکی ہو۔ دیکھ نہیں رہیں میں نہا رہا ہوں؟"

"لیکن آپ نے ہی مجھے طلب کیا تھا سر!" وہ میری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔ "آپ کی مدد کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔"

"بھاڑ میں گئے فرائض، تم جاؤ یہاں سے۔" میں نے شرمندہ غرق ہو کے اپنی ستر پوشی کا اہتمام کیا۔

'لاحول ولاقوۃ۔' میں نے اس حسین مددگار کے واپس لوٹ جانے کے بعد کہا۔ یہ انجام ہوتا ہے سوچے سمجھے بغیر کچھ کرنے کا۔ جب اس سوئچ پر صاف لکھا ہوا تھا 'مددگار'، تو مجھے اُسے دبا کر پنگا لینے کی کیا ضرورت تھی۔ اس عیاشانہ باتھ روم میں تو ایسی ہی مددگار آ سکتی تھی۔ یہ سب دولت مندوں کے عیش پرستی کے انداز ہیں جن میں بنیادی ضرورت کو ثانوی سمجھا جاتا ہے۔ نہانا تو صرف بہانہ ہوتا ہے۔ اس خیال کی تصدیق میرے چاروں طرف دیواروں پر محیط آئینے بھی کر رہے تھے جن میں دو ہوں تو آٹھ نظر آتے ہیں اور اکیلا آدمی بھی ایک حمام والے محاورے پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

آدھے گھنٹے تک میں نے اسٹیم باتھ لیا اور جسم کی ساری تھکن کو خوشبودار جھاگ سے بھرے ہوئے گرم پانی کے ٹب میں دھو ڈالا۔ ڈریسنگ روم میں ہر سائز اور ہر ضرورت کے لیے مردانہ اور زنانہ کپڑے موجود تھے۔ میں نے سمندر کے پانی میں بھیگے ہوئے کپڑے وہیں چھوڑے۔ پہلے اپنے لیے شب خوابی کا لباس منتخب کیا مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ بظاہر حال اگر مجھے یہاں سے نکلنے کا موقع ملا تو وہ نائٹ سوٹ بدلنے میں وقت ضائع ہوگا۔

ایک آدھی آستین والی زرد قمیص اور گہرے رنگ کی پتلون مجھے فٹ آ گئی۔ دو خانوں میں بھرے ہوئے جوتوں میں سے کاف لیدر کے دو جوڑے بہت قیمتی تھے مگر میں نے جاگنگ شوز کا انتخاب کیا جو دوڑ لگانے کے لیے بہترین ہوتے ہیں۔

باہر نکلتے ہی مجھے ایک اور صورت سے دوچار ہونا پڑا۔ کمرے میں ایک ہی کنگ سائز بیڈ تھا۔ آٹھ فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا۔ اس کے ساتھ ہی گول کشمیری قالین پر اخروٹ کی لکڑی اور ہاتھی دانت کے کام والی گول سینٹر ٹیبل تھی اور ٹیبل کے گرد چار کشن چیئرز تھیں۔ ان میں سے ایک کرسی پر ایک لڑکی فلم فیئر کا تازہ شمارہ دیکھ رہی تھی۔

اس کا چہرہ رسالے کے پیچھے تھا۔ ڈریسنگ روم کا دروازہ کھلا تو اس نے رسالہ ہٹایا اور میں نے اپنے سامنے ایک اشتعال انگیز عورت کو دیکھا۔ یہ اس نرس کی معاون و مددگار بنی تھی جس نے اپنے حسن انتظام سے سب عورتوں کو کنٹرول کیا تھا۔ لانچ پر میں نے اسے بہت مستعد دیکھا تھا اور میں اس کا شاکر بھی ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہاں وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن مجھے اس سے براہ راست بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

"تم؟ یہاں؟" میں ہکا بکا رہ گیا۔

وہ آہستہ سے مسکرائی اور اس نے رسالہ پیچھے رکھ دیا۔ "اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟"

"میں تو سمجھا تھا کہ وہ سپنا ختم ہو گیا لیکن ابھی تک میں اسی لانچ پر ہوں۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

وہ ہنس پڑی۔ "دیکھ لو کہیں یہ تو خواب نہیں ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کے میرے بازو پر چٹکی لی۔

میں نے بازو پر نمودار ہو جانے والے لال نشان کو دیکھا جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ "خواب میں تم نے چٹکی لینے کے بہانے مجھے نوچ لیا ہے۔ بہت تیز ناخن ہیں تمھارے۔"

وہ پھر ہنسی اور میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ اب ایک بالکل مختلف لڑکی تھی۔ اس نے میرون کلر کے جارجٹ کی ساڑی باندھ رکھی تھی اور ایسا بلاؤز پہن رکھا تھا جو کسی ماہر فن درزی نے اس کے جسم کی ایک ایک شکن، قوس اور خم کو ذہن میں رکھ کے سیا تھا اور اس کے بھرپور بدن کو ریشمی کپڑے کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔

"میں تمھارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کہ تم نے مجھے بچا لیا۔" وہ پلکیں جھکا کے بولی۔ "ورنہ معلوم نہیں کیا ہوتا۔"

"جو سب کے ساتھ ہوتا۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے تو بتایا گیا ہے کہ میں نے جھک ماری، غلطی کی اور نام اڑا کے ہوگا اب بھی وہی جو پہلے ہونا تھا ان سب کے ساتھ۔"

www.paksociety.com

"میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "دوسروں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن جو کچھ تم نے کیا اُسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔ میرے نانا یا اُن کی بیٹی جن کو اُن کی مرضی کے خلاف اغوا کر کے لے جایا جا رہا تھا۔"

"مجھے تو یہ سب کچھ غیر حقیقی لگتا ہے۔ میرا اس بلڈنگ میں پہنچنا پھر یہاں لایا جانا۔ اور اب تم سے ملنا۔" میں نے حاجی علی کی درگاہ تک پہنچنے کے واقعات کو بالکل گول کر دیا۔

"اس میں کیا غیر حقیقی ہے۔ میں پھر تمہارے سامنے ہوں۔"

"لیکن کیسے؟ تم یہاں کیسے آئیں؟ کس نے بتایا تمہیں کہ میں اس وقت کہاں ملوں گا؟" میں نے کہا۔

"چلو پہلے کچھ کھا پی لو۔" اس نے الماری کی کھڑکی سے [illegible] ہوئی نفیس [illegible] ٹیبل کی دو سائیڈ کو کھول کر پھیلا دیا۔ اس کے قریب ہی کھڑی ہوئی ٹرالی کے اوپر والے شیلف میں تین ڈونگے ڈھکے ہوئے رکھے تھے۔ نیچے والے شیلف میں چائے [illegible] کا سامان تھا۔

"میری بھوک ایک دم اُڑ گئی ہے۔ تمہیں دیکھ کر۔" میں نے کہا۔ "اسے ابتدائے عشق کی علامت سمجھنا۔"

"کیوں؟ میں اس قابل نہیں ہوں کیا؟" وہ مسکرائی۔

"میں اس قابل نہیں ہوں بس . . ." میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"کھاؤ . . . کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے . . ." وہ بولی اور میں نے اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے بالوں تک جھک کر تازہ پھولوں کی خوشبو کو سونگھا۔ [illegible] سامنے سے اُن بالوں کو ملک [illegible] کملا کا رنگ سانولا تھا۔ مگر جب میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا تو وہ ایک پریشان حال، بے خبر اور بے حال [illegible] کی تھی۔ یہاں وہ بہت نکھری ہوئی اور تر و تازہ لگ رہی تھی۔ اُس کا سانولا رنگ [illegible] گندمی ہو گیا تھا اور اُس کے چہرے کی شادابی نے اُس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔

"میں صرف چائے پیوں گا اور بسکٹ بھی کھاؤں گا۔" اس کے اصرار پر میں نے کہا۔ "لیکن مس کملا! کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ یہ سب کیا ہے؟ میں کس طلسم خانے میں ہوں؟ میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات میرا گورکھ دھندا ہیں جسے سمجھنے کی کوشش میں میرا دماغ خراب ہونے لگا ہے۔ سب سے پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"مجھے نہیں جانتے [illegible] تمہارے پاس [illegible]" وہ بولی۔

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "کملا دیوی! میں نے تم کو اس [illegible] پر دیکھا تھا۔ اب اچانک آدھی رات کو تم یہاں کیسے نازل ہو گئیں؟"

"نازل ہونا کیا معنی . . . میں رہتی ہوں یہاں۔ [illegible]"

"یعنی تمہارا دل چاہتا ہے [illegible] اور میرا [illegible] مطلب سمجھاؤ۔ کیا تم بھی اس [illegible] کی ایک کنیز ہو۔ کیا تم کو بھی [illegible] خدمت پر مامور کیا گیا ہے [illegible] کی طرح [illegible] تھی [illegible] . . ."

"وہ [illegible] نہیں آتا۔"

"تم ہو آخر کون؟" میں نے کہا۔ "تم کون ہو آخر؟"

"میں اُس کی بیٹی ہوں جسے تم نے [illegible] شیخ [illegible] کہا ہے۔ اُس کی سب سے چھوٹی اور اکلوتی بیٹی۔"

"اوہ!" میں نے سر تھام [illegible] لیتا ہوں۔ ویسے میرے لیے بہت مشکل ہے اس بات کا یقین کرنا کہ وہ تمہارا باپ ہو سکتا ہے۔ کیا تمہاری ماں بہت حسین تھی؟"

"ہاں!" اس نے چائے بنا کے کپ میرے سامنے رکھ دیا۔ "وہ واقعی بہت حسین تھی۔ اتنی حسین [illegible] بھی کچھ [illegible] تھی۔ وہ [illegible] نہیں۔ انتہائی [illegible] تھی۔ چنانچہ اس نے [illegible] جس کو [illegible] لیا۔ اس کا [illegible] صاف کیا اور وہ سب کچھ [illegible] کر لیا [illegible] تھا۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔ "اور بس . . ."

"بس کیا؟"

"بس یہ کہ جو اُس نے ایک عورت کے ساتھ کیا تھا۔ دوسری عورت نے میری ماں کے ساتھ کیا۔ یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ لیکن میں محفوظ ہوں۔ پہلی بیوی کے دو بیٹے تھے۔ [illegible] مجھ سے بڑے [illegible] بھائی ہیں۔ مگر مجھے بھائیوں سے [illegible]"

"مگر تم لوگ اور کیا کرتے [illegible] اس [illegible] کے علاوہ [illegible] کیا کرتے ہیں؟ [illegible]"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "شاید کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگا۔ وہ کیا کرتے ہیں۔ [illegible] جاننے کی کوشش کرنا کوئی فائدہ نہیں ہوگا تمہیں۔"

"نقصان کیا ہوگا؟"

"نقصان تمہارے خیال میں بہت بڑا کیا ہے۔ [illegible] تم یہاں ہو۔ کل کہاں ہوگے اس کا [illegible]"

"کیا تم اپنی مرضی سے کہیں جا سکتی ہو؟" میں نے [illegible] کہا۔ "میرے خیال میں تم [illegible] جان [illegible] اگر یہ [illegible] بات ہوئی تو [illegible] رات [illegible] یہاں [illegible]"

"اچھا، چائے پیو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" اس نے کہا۔

[illegible] چائے کا کپ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ "کیا . . . یہ ممکن ہے؟"

اس نے جھلانے سے [illegible] ہوئے کپ کو دیکھا۔ [illegible]

[illegible] نے جب [illegible] دیکھا تھا تو تم بہت [illegible] لگ رہی تھیں۔ [illegible] اور حیرت انگیز حوصلہ رکھنے والی۔ اب کیا ہو گیا ہے تم کو؟"

"آئی ایم سوری . . . ایک کپ چائے اور بنا دو مجھے [illegible]" [illegible] نے ایک گہری سانس لے کر اپنے آپ کو پُرسکون [illegible] [illegible] تمہارا یہاں آنا اور میری کھانا کہیں نہیں [illegible] کے لیے آزاد ہوں۔ یہ سب میرے لیے انتہائی حیرت انگیز [illegible] [illegible] ہے . . . میں بے حد پریشان تھا اور بہت [illegible] تھا۔ تمہارے ڈیڈی نے جو باتیں کی تھیں مجھ سے . . ."

"وہ سب میں نے سن لی تھیں۔" وہ بولی۔

"کمال کی لڑکی ہو تم۔ [illegible] اپنا آپ [illegible] وہ [illegible] تھا [illegible]" میں نے کہا۔ "تم نے کہاں سے سنی وہ سب گفتگو؟"

"یہاں جو کچھ کہا جاتا ہے [illegible] کر دیا جاتا ہے۔ [illegible] دیواروں کے کان ہوتے ہیں نا۔ یہاں [illegible] دیواروں کے اندر اور چھت [illegible] ہیں [illegible] کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے اور اس کا [illegible] کوئی شخص جو اس [illegible] سمجھتا ہو۔ [illegible] کر سکتا ہے [illegible] سکتا ہے کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ اندر ہر جگہ میرے [illegible] لیکن دیکھنے اور سننے کے لیے [illegible] کا کمرہ [illegible]"

"مگر تم یہ سب کیوں سنتی ہو؟"

"میں یہ سب تو نہیں جانتی۔ جتنا ہوں اُن کی۔" وہ [illegible] [illegible] کر آتی ہوں۔ یہاں سے بہت سی [illegible] سمجھتے ہیں بہت کچھ بھول چکا ہوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے اور یہاں کے [illegible] نہیں سکتی۔ محمد بادشاہ [illegible] غلط فہمی میں [illegible] جاتے ہیں کہ [illegible] کیا چاہا۔ آخر تم اُن کے باپ ہیں مگر [illegible] سے [illegible] اپنی [illegible] نسل سے بہت آگے رہتی ہے۔ [illegible] تو منع کر سکتی ہے [illegible] کر رہے ہیں؟ کیوں کر رہے ہیں؟ اور اب کیا مخالفت ہے جس کے [illegible] دولت کے انبار لگے ہیں۔ مگر میں سب جانتی ہوں کہ یہ دولت کہاں سے آتی ہے اور کیسے آتی ہے۔ میں بھگوان سے [illegible] کرتی رہتی ہوں کہ اُن کی [illegible]"

"کیا بھگوان ایسے لوگوں کی [illegible] کرتا ہے؟" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں۔ یہ بھگوان ہی جانتا ہے۔" وہ گلو گیر لہجے میں بولی۔ "[illegible] تو مل جاتی ہے۔ میں نے تم کو دیکھ لیا تھا۔ اس وقت میں ڈیڈی کے کمرے میں تھی۔ اُن کے بیڈ کے [illegible] ایک کیبنٹ ہے۔ اُس کی خاص چابی ہے جو صرف [illegible] کھلا رہتا ہے۔ مگر میں نے ایک دن اس کی ڈپلی کیٹ [illegible] لی تھی۔"

"اگر ڈیڈی اچانک آ جاتے تو کیا ہوتا؟"

"اچانک وہ کیسے آ سکتے تھے؟ جیسے ہی وہ اٹھتے تم دیکھ لیتیں؟ اُن کی باتوں سے اندازہ کر لیتی کہ اب وہ آ سکتے ہیں۔ کیبنٹ بند کر کے خاموشی سے باہر . . . کیبنٹ خود لاک ہو جاتا ہے۔"

"اور یہ سب گفتگو جو تم اس وقت کر رہی ہو کیا یہ تمہارے ڈیڈی نہیں سن رہے؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا اور بیڈ کے سرہانے کی طرف لگے ہوئے سوئچ بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ دونوں سوئچ آف ہیں۔ ایک سے کیمرا آن ہوتا ہے۔" اُس نے چھت سے [illegible] کی طرف اشارہ کیا۔ "اور دوسرے سے مائیکروفون۔"

میں اُسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ "اور فرض کرو ڈیڈی تمہیں دیکھنے کے لیے تمہارے کمرے میں چلے آتے ہیں؟"

"اوّل تو یہ ممکن نہیں۔ ڈیڈی جب آتے ہیں اُن کے قدموں کی آواز سن لوں گی۔" اُس نے ایک سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "نہیں، نہیں رہنے دو۔ اگر وہ اتنی اونچی آواز میں کہتے ہیں تو بڑی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اب یہ بتاؤ کہ اُن کی اور میری گفتگو سن کے تم نے کیا نتیجہ نکالا تھا۔ یقیناً تم کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ میں اسی وقت ایک اور شکار بھی یہاں موجود تھا جس کا اپنا شکار ہونے کے لیے جانا چاہتا تھا۔"

"ہاں، تم جو پوچھ رہے تھے اُس لڑکی کی بات کر رہے ہو نا؟"

میں پھر چونک کر رہ گیا۔ "تم بھی جانتی ہو اُس کا نام؟"

"میں سب جانتی ہوں۔" اُس نے بڑے فخر سے اور شرارت سے اعلان کیا۔ "جو کچھ یہاں ہوتا ہے۔"

"پھر یہ بتاؤ کہ میرا کیا ہوگا؟ تمہارے ڈیڈی کا ارادہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "وہ کیا کریں گے آخر؟ مجھے اپنے ساتھ باڈی گارڈ بنا کے رکھیں گے؟"

"باڈی گارڈ؟" وہ ہنسی۔ "اُن کو کسی باڈی گارڈ کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ تو بس تم کو مطمئن کرنے کے لیے تھا تاکہ تم کسی قسم کا گڑبڑ نہ کر دو۔"

"کیا کچھ بھی کہنا مشکل ہے؟ انہوں نے اپنی طرف سے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ تم نے تو سنا ہوگا؟"

"ہاں! اُس سے تم بتایا تھا کہ تمہارا اور تمہارے چند ساتھیوں کا یہ کہنا تھا کہ تم نے کارروائی کی ہے اس کا بڑا مرکز بہت بڑا تھا۔ کل ہی تم نے اُس کو کوئی جہاز ڈبو دیا جس پر لاکھوں کا سامان تجارت تھا۔ جہاز کے ڈوبنے سے سب کچھ تباہ ہو گیا۔ اُس کو کروڑوں کا نقصان ہوا ہے۔ وہ ہر قیمت پر تمہیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

"قیمت کیا لگائی تھی اُس نے میری؟"

"وہ نقد بھی دینے کو تیار تھا مگر ڈیڈی اُس کے ساتھ بزنس [illegible]"

www.paksociety.com

پارٹنر بننے کو ترجیح دے رہے تھے۔" کملا نے کہا۔ "اُس نے اپنے کاروبار میں ڈیڈی کو برابر کا شریک بنانے کی پیش کش کی تھی لیکن تم سے بات کرنے کے بعد ڈیڈی شک میں پڑ گئے۔ تم نے کہا تھا کہ یہ شخص پہلے ہی اپنے دو بزنس پارٹنرز کو ٹھکانے لگا چکا ہے جس میں ایک تمہارے پتا جی تھے۔ ایسے شخص کا بزنس پارٹنر بننے میں خطرہ تھا۔ ظاہر ہے ڈیڈی بھی سوچے بغیر فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے دلاور کو ٹال دیا کہ وہ عجلت میں فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔ پھر جب وہ چلا گیا تو میں نے ڈیڈی کو پکڑ لیا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ جس شخص نے میری زندگی بچائی اُس کے احسان کا یہ بدلہ دیں گے؟ ڈیڈی نے کہا کہ اس کے احسان کو نہیں مانتا۔ ہاں اگر میں اُسے بھیجتا کہ جاؤ فلاں لانچ پر سے کملا کو بچا لاؤ اور وہ تمھیں لے آتا تو احسان مجھ پر ہوتا۔ یہ تو اُس نے جو کچھ کیا تھا اپنے لیے کیا تھا۔ ڈیڈی کی اس بات پر میرا بہت جھگڑا ہوا اُن سے کہ یہ تو آپ جان بوجھ کے خود کو بہلا رہے ہیں ورنہ احسان تو ہے۔ آخر کس کی وجہ سے میں واپس آئی اور وہ شخص اگر اپنی جان پر کھیل کے بچا نہ لیتا تو دیس نہ لاتا تو میں کہاں ہوتی۔ کچھ اندازہ ہے آپ کو کہ مجھے کون خریدتا اور میں کس کے حرم کی زینت بنتی؟ کیا آپ کے سارے وسائل، آپ کی ساری دولت اور اثر و رسوخ، سب مجھے تلاش کرنے میں کام آ سکتے تھے؟... کہاں سے واپس لاتے آپ مجھے...؟"

"ایک بات بتاؤ۔" میں نے درمیان میں اس کی بات کاٹ کے کہا۔ "آخر تمہارے ڈیڈی جیسے شخص کی بیٹی کو اغوا کر کے لے جانے کی ہمت کس نے کی؟"

"ان کے دشمن بھی بہت ہیں اور سب کمینے ہیں۔ چھپ کر وار کرنے والے۔ بھلا لڑکیوں کو اٹھانا بھی کوئی بدمعاشی ہے؟"

"تمہارے ڈیڈی ایسے نہیں ہیں؟"

اُس نے کچھ تامل کے بعد کہا۔ "اب نہیں ہیں۔"

"کیا اس کا مطلب ہے کہ پہلے تھے؟" میں نے کہا۔

اُس نے نظر جھکائی۔ "ہاں۔ جو کچھ میں نے بھگتا، ڈیڈی کے اعمال کا ہی خمیازہ تھا۔ کبھی انھوں نے کسی کی بیٹی اٹھائی ہوگی۔ وہ وقت گزر گیا اور میں جوان ہو گئی۔ کوئی انتظار کرتا رہا مناسب وقت کا۔ پھر کفارہ میں نے ادا کیا۔ کیسی عجیب بات ہے۔ جرم باپ کرتے ہیں سزا اولاد کو ملتی ہے۔ مجھے بھی ملی تو قصور کس کا تھا؟"

"کیا تمہارے ڈیڈی جانتے ہیں اُسے؟"

"اب جان گئے ہیں۔" وہ بولی۔ "میں نے کہا کہ اب دشمنوں کے بجائے معصوموں کو سزا دیں گے۔ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی اور اگر ایسا ہوا تو سوگند ہے مجھے اپنی ماتا کی، میں خودکشی کر لوں گی۔ بس اس کے بعد ڈیڈی کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ شراب کے نشے میں تھے۔ انھوں نے مجھے گالیاں دیں کہ جا تو بھی چلی جا اپنے یار کے ساتھ۔ دفع ہو جاؤ دونوں۔ میں دونوں کی صورت نہیں دیکھوں گا دوبارہ۔ مگر یہ سب نشے کی بات تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ انھوں نے تم کو میرے حوالے کر دیا تھا۔"

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے ایک نیکی کا صلہ عطا کرنے میں دیر نہیں کی۔

"گویا میں بال بال بچ گیا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، دلاور کی قید میں جانے سے تو بچ گئے۔" وہ شوخی سے مسکرا کے بولی۔ "مگر اب میری قید میں ہو جیسے سزائے موت ہو جائے اُس کی رحم کی درخواست پر کیا فیصلہ ہوتا ہے؟"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ "کیا فیصلہ ہوتا ہے؟"

"سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا جاتا ہے۔" وہ بولی۔ "تم کو عمر قید کاٹنا ہوگی اب... میرے ساتھ۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ "لیکن... تم نے تو کہا تھا..."

"میں نے کہا تھا کہ چائے پی لو، پھر چلتے ہیں۔" وہ بولی۔ "یہ بھی کہا تھا نا؟"

"مگر... تمہارے ساتھ...؟"

"اکیلے جا سکتے ہو تم؟ ذرا جا کے دکھاؤ۔" وہ ہنسی۔ "باہر نکلنا تو دور کی بات ہے، اس کمرے سے باہر کہاں تک جا سکتے ہو کوشش کر دیکھو۔"

"تم میرے ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟" میں نے دل کو مضبوط کر کے کہا۔

"جہاں تک تم لے چلو گے۔" وہ بولی۔ "یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ ہم میں سے کوئی بھی اکیلا نہیں رہ سکتا۔ نہ میں نہ تم۔ شرط یہی ہے..."

"میں اس شرط کو نہیں مان سکتا۔ میں رہ سکتا ہوں تمہارے بغیر بھی۔" میں نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

"لیکن میں بہرحال نہیں رہ سکتی۔" اس نے تحمل کے لہجے میں کہا۔ "یہ میں نے ڈیڈی کو بھی بتا دیا تھا۔"

"کیا بتا دیا تھا، تمہارا دماغ..."

"دماغ تو اسی وقت خراب ہو گیا تھا جب میں نے تمھیں دیکھا تھا لیکن میں اُس وقت مجبور تھی۔ تمھیں حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ اب تم مجبور ہو..."

"میں بالکل مجبور نہیں ہوں۔ یہ خیال نکال دو اپنے دماغ سے کملا دیوی کہ تم مجھے عمر بھر کے لیے قید کر سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ ناممکن ہے۔"

"کیوں ناممکن ہے؟"

"اس لیے... کہ تم ہندو ہو اور بے شک پاسپورٹ پر میرا نام امیر چند ولد موتی لال لکھا ہوا ہے لیکن درحقیقت میں سکندر بخت ہوں، مرحوم وزیر خان کا بیٹا۔ میں ایک مسلمان ہوں۔"

"پھر کیا ہوا، عشق کا کون سا مذہب ہوتا ہے۔ نرگس نے سنیل دت سے شادی کی تھی یا نہیں اور مدھو بالا نے جن کا اصل نام ممتاز بیگم تھا کشور کمار سے۔ مینا کماری نے کمال امروہوی سے..."

"بس بس، یہ فلمی دنیا کے کیس ہیں اور حقیقی دنیا میں بھی ایسے کیس ہیں تو مجھے کیا۔" میں نے کہا۔ "جس کام کو تم آسان سمجھتی ہو میرے لیے ناممکن ہے۔"

"پریشان کیوں ہوتے ہو، میں مسلمان ہو جاؤں گی۔ پھر تو کوئی اعتراض کی بات نہیں رہے گی نا۔"

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "کملا! خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کرو۔ زندگی بھر ساتھ نبھانے کے فیصلے یوں نہیں کیے جاتے اور جو ایسے فیصلے کرتے ہیں وہ تمام عمر پچھتاتے ہیں۔"

"میں نہیں پچھتاؤں گی۔"

"کملا! میں کسی اور کو چاہتا ہوں۔ میں تم سے محبت نہیں کر سکتا۔" میں نے رو دینے کے انداز میں کہا۔ "پھر شادی کا کیا سوال؟"

"تم مسلمان تو دو شادیاں بھی کر لیتے ہو...؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ کیا غلط پروپیگنڈا ہے یہ بھی۔ ارے بابا وہ کوئی فرض نہیں ہے۔ مجبوری کے تحت انتہائی سخت شرائط کے ساتھ مخصوص حالات میں اس کی اجازت ہے۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "میں محبت کی بات کر رہا تھا، مجبوری کی نہیں۔ مجھے کوئی مجبوری نہیں اور محبت میں صرف ایک سے کر سکتا ہوں۔ وہ مجھے رابعہ سے ہے۔ جب تک رابعہ کی محبت میرے دل میں ہے کسی اور سے محبت کرنا میرے لیے اتنا ہی ناممکن ہے جتنا بیک وقت زندہ رہنا اور مر جانا۔"

"چلو تم محبت نہیں کر سکتے مجھ سے، مت کرو۔ محبت تمھیں اُس رابعہ سے ہے تو اسی سے رکھو مگر مجھے کیوں روک سکتے ہو؟ اگر میں تم کو محبت کرنے سے نہیں روک سکتی تو کیا تم روک سکتے ہو مجھے؟ میری بھی تو مجبوری ہے۔ اسے سمجھو۔ تم رابعہ سے محبت کرو، میں تم سے کرتی رہوں گی۔ اس میں تو کسی کا نقصان نہیں ہے۔ ہم تینوں خوش رہ سکتے ہیں..."

"کملا! تم پاگل ہو گئی ہو۔" میں نے دھاڑ کے کہا۔ "جو ناممکن ہے... وہ ناممکن ہے۔ نہ تم میرے ساتھ جاؤ گی نہ میں تمہارے ساتھ جانا پسند کروں گا۔ میں دلاور کے ہاتھوں مرنا قبول کر لوں گا۔"

اُسی وقت دروازہ کھلا اور چوہدری دلاور کے ساتھ کملا کا باپ اندر آ گیا۔ اُس کی آنکھوں کو میں اب بھی سیاہ شیشوں والی عینک کے پیچھے نہیں دیکھ سکتا تھا مگر نفرت کی آگ کی تپش میں دور سے بھی محسوس کر سکتا تھا جو اُس کے وجود کو جلا رہی تھی۔ میں نے اس کی بیٹی کو ٹھکرا کے اُس کی انا کو ٹھوکر ماری تھی۔

"میں نے کیا کہا تھا... جی جی۔" چوہدری دلاور نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کے کہا۔ "اپنے سکندر اعظم صاحب بالکل وہ ہیں، کیا کہتے ہیں اسے کتے کی دُم... سیدھے ہونے والے نہیں ہیں۔"

کملا کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے رخساروں پر بہنے والے آنسوؤں کی اوٹ سے میری طرف دیکھا پھر اپنے باپ کی طرف جو زخم خوردہ سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ اس کی ہر سانس میں زہر بھرا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ اوپر اٹھا۔

خیال تھا کہ اب وہ چٹکی بجائے گا اور جیسے چراغ کو رگڑتے ہی الہ دین کے سامنے جن کورنش بجا لاتا تھا ایسے ہی کوئی حکم کا غلام فوراً حاضر ہو گا یا پھر اچانک کسی جادوگر کی طرح اس کے ہاتھ میں ریوالور آ جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

غالباً ترلوچن نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ عمر رسیدہ چالاک اور عیار آدمی تھا جس کی حس خطرے کی بُو سونگھنے میں کتے کی حس کو مات کرتی تھی اور اس کی آنکھیں کالے چشمے کے پیچھے سے تاڑ لیتی تھیں کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ شاید اسے سفید دکھائی ہی نہ دیتا ہو۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے تو کالے دھندوں سے کالا دھن بنانے والوں کو کالا ہی کالا نظر آ سکتا ہے۔

ترلوچن کی بیٹی کو بھی یہ صفات ورثے میں ملی تھیں۔ فرق صرف ان کی عمر اور تجربے کا تھا تاہم باپ کے معاملے میں وہ دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے کا مطلب یوں سمجھ لیا جیسے ہوشیار لوگ خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔

"یہ نہیں ہوگا ڈیڈ۔" اس نے میرے سامنے آ کے کہا۔

"ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔" ڈیڈ نے کہا۔

"مجھے آپ کی نیت پر شک پہلے بھی تھا۔ آپ مجھے ٹریپ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔"

"تم خود ٹریپ ہو جاؤ گی، یہ معلوم نہیں تھا مجھے۔" اس نے کہا۔ "یو آر اے فول۔"

"آپ اس شخص کو کیوں لائے ہیں یہاں؟" کملا نے دلاور کی طرف انگلی اٹھا کے کہا۔

"تم خود کیوں آئی ہو یہاں؟"

"آپ کے حکم کی تعمیل کرنے۔" وہ طنز سے بولی۔

"اچھا تو پھر میں حکم دیتا ہوں کہ اب واپس اپنے کمرے میں جاؤ۔" ترلوچن نے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" کملا اڑ گئی۔

"کملا! مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں..." ترلوچن نے لہجہ بدل کے کہا۔

"باتیں آپ میری موجودگی میں بھی کر سکتے ہیں..."

www.paksociety.com

"فضول ضد مت کرو۔ میں زبردستی بھی کر سکتا ہوں۔ یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔" بیٹی کے سامنے ترلوچنی کے لیے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

کملا نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ ایسی غلطی نہیں کریں گے ڈیڈ جس پر آپ کو پچھتانا پڑے۔ آپ ایسا کوئی کام کر سکتے ہی نہیں جس کی وجہ سے پچھتانے کی نوبت آئے۔ میں بھی تو آپ کی ہی بیٹی ہوں۔ آپ کو اتنا ہی سمجھتی ہوں جتنا آپ مجھے سمجھتے ہیں۔"

میں خاموش تماشائی بنا رہا۔ [illegible] کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کملا کی حمایت نے فوری طور پر مجھے اتنا تحفظ عطا کر دیا تھا کہ ترلوچنی یا اس کا کوئی غلام میرے نزدیک نہیں آ سکتا تھا اور مجھ پر گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ اس سے یہ ضمانت ہرگز حاصل نہیں ہوئی تھی کہ میرے لیے خطرے کی بات ہی نہیں رہی اور میں کملا کی مدد سے آزادی بھی حاصل کر سکتا ہوں۔ اگر ترلوچنی طاقت کے بل پر مجھے مغلوب کرنے کی کوشش کرتا تو میں کملا کو ڈھال کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ یہ موقع مجھے خود کملا نے فراہم کیا تھا اور ابھی تو وہ رضاکارانہ طور پر ڈھال بنی ہوئی تھی۔

چودھری ولاور بھی باپ بیٹی کے مکالمے سننے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی صورت پر گہری مایوسی کا سایہ نظر آتا تھا۔ اس غیر متوقع صورت حال نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ جو اس شکار [illegible] کے [illegible] کر [illegible] خطا ہو جانے کے [illegible] پڑتا ہے لیکن جو شخص [illegible] جاتا ہے۔ ایسے تو یقین ہو جاتا ہے کہ [illegible] ہاتھ سے [illegible] کو واپس کر اس کے حوالے کر دے گا۔

خاموشی کا ایک بہت [illegible] وقفہ آیا جس میں میری نگاہ ولاور کی نظر سے ملی اور میں اپنے لبوں کی تمسخر اڑانے والی مسکراہٹ سے اس کی مایوسی میں اضافہ کرنے میں کامیاب رہا۔ ولاور کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ماتھے پر شکنوں کی تعداد بڑھ گئی اور اس کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

ترلوچنی سیاہ چشمے کے پیچھے سے اپنی نالائق بیٹی کے ساتھ ساتھ مجھے بھی گھور رہا ہوگا۔ اس کی آنکھوں کی حرکت نظر ہی نہیں آتی تھی اور گردن گھما کے کیا وہ تاک رہا ہے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ کسی بے جان مجسمے کی طرح ساکت تھا مگر اس کے روشن گوب نما سر کے اندر عقل کا کمپیوٹر پوری طرح فعال و متحرک تھا۔

اچانک کملا نے صورت حال کو مزید خراب کر دیا مگر صرف اپنے والد صاحب کے لیے اور ان کے مہمان کے لیے۔ اس نے اپنے بلاؤز کے زنانہ سیفٹی بٹوے میں ہاتھ ڈالا اور ایک ننھا سا خوب صورت ریوالور نکال لیا۔ یہ اعشاریہ بائیس کا لیڈیز پستول کہلاتا تھا جس کے سفید ہاتھی دانت والے دستے پر

چلے ولاور جب نقش و نگار تھے۔ قتل کا سامان کرنے والے بھی کیا کمال کرتے ہیں۔ نگاہ ناز اور ادائے حسن سے کبھی نہ ہو جائے تو ہاتھوں میں آتشیں لیا اور دیکھنے کی تمنا کرنے لگے۔

"کملا پاگل ہو گئی ہو کیا؟"

"ابھی میں بدقسمتی سے بالکل پاگل ہو گئی ہوں۔" کملا نے کہا۔ "لگتا ہے آپ ہوش میں نہیں۔ اگر آپ نے کوئی سودا کر لیا ہے تو اسے منسوخ کر دیں اور جائیں۔" اس خریدار کو بھی رخصت کر دیں۔"

ولاور جلبلا اٹھا۔ "بھئی واہ۔ یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں آخر۔ میری تو اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔"

"وہ کیا ہے اپنے چودھری صاحب؟" میں نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔ "بات تو بڑی معمولی سی ہے۔ یہ جو بیٹی ہے اپنے ترلوچنی صاحب کی نورِ چشم ثابت ہو رہی ہے۔ اس وقت مرنے مارنے پر کمربستہ ہے اور یہ جو آپ قتل اس کے ہاتھ میں دیکھ رہے ہیں وہ بلیڈ کا اصلی ہے۔ مجھے نہیں معلوم اس کا نشانہ کیسا ہے۔ اگر اتنے قریب سے آپ کے مرنے کی بھی نہیں!"

"خوب۔ اگر آپ بھی غصے سے آگئے اپنی بیٹی کی بربادی کے لیے تو... ابھی آپ کو دوسرا ہوش نہیں ہے۔ جان دار کی چودھری صاحب کا چوغہ نکال لی!"

"وہ ایسا ہے اپنے چودھری صاحب کہ [illegible] بالکل۔ اب آپ چلے ہی جائیں تو اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ "بہت کم معاملات ہیں۔ ہاتھوں سے [illegible] ہاتھوں میں آ جائیں۔"

"ڈولاور" ترلوچنی نے کہا۔ "تم سمجھ رہے ہو بات کہاں تک پہنچی ہے۔ کاش تم دوبارہ اس سے کہو۔

کتنی بات دوبارہ ہو گئی؟"

"مجھے... کچھ سوچنا پڑے گا۔" ترلوچنی نے کہا۔

"اتنے بڑے کاروبار کے مالک ہوتے ہوئے بھی سوچو گے۔" ولاور نے تلخ لہجے میں کہا۔ "یہی ہے تمہاری قوتِ فیصلہ؟"

"فیصلے حالات کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور حالات اگر فیصلے بدل دیں تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔" ترلوچنی نے کہا۔

"تم اپنے گھر میں اپنی بیٹی کے سامنے اتنے مجبور اور اتنے بے بس ہو..."

"کیا تمہاری کوئی بیٹی ہے؟ آج ہی بڑی۔ اکھڑ، سرکش اور ضدی؟" ترلوچنی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ نہیں ہے۔ اس لیے تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔ کملا نے اگر سودا منسوخ کر دیا ہے تو اسے منسوخ ہی سمجھو فی الحال۔ کل پھر کوئی بات بن جائے تو میں نہیں کہہ سکتا۔ میں کوشش کروں گا۔"

"کوئی فائدہ نہیں ڈیڈ۔ آپ اس آدمی کو چلتا کریں اور اسے اپنے گھر کی حدود سے باہر نکال دیں۔ میں کسی قیمت پر بات نہیں کروں گی۔" کملا نے کہا۔

"تمہارا سودا ادھورا ہے۔" ترلوچنی نے کہا۔ "ابھی کوئی خاص نقصان نہیں ہوا ہے اور ہوا ہے تو میں اس کی تلافی کے لیے تیار ہوں۔ مگر بعد میں ایسا نہ ہو کہ یہ پاگل لڑکی کچھ اور مانگ بیٹھے۔ تمہاری بات میں اسے انکار کیسے کروں گا۔ آج تک اس نے کوئی بات غلط نہیں کی۔"

"اتنی زیادہ اوور ایکٹنگ مت کریں ڈیڈ۔" کملا نے کہا۔ "میں اچھی طرح سمجھتی ہوں آپ کے الفاظ کو اور مطلب کو۔ صرف مجھے مطمئن کرنے کے لیے ایسی بات کہہ رہے ہیں آپ۔ کیونکہ آپ سمجھتے ہیں یہ میرا ہسٹیریا ہے اور اس دورے کی شدت کو اسی طرح کم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے ڈیڈ۔ میں بالکل پرسکون اور نارمل ہوں۔"

ڈیڈ نے سر ہلایا۔ "اچھا..." جو نہ سوال تھا اور نہ یقین کا اظہار۔ نہ حیرت تھی اور نہ حقیقت کو تسلیم کرنے کا انداز۔ ولاور کی مایوسی البتہ قابلِ دید تھی۔ وہ اچھا کھلاڑی تھا اور عموماً اپنے حقیقی جذبات کو چھپا لیتا تھا مگر اس وقت جو کچھ ہوا اس کی توقعات کے بالکل برعکس تھا چنانچہ وہ اپنے جذباتی ردعمل پر قابو پانے سے قاصر رہا۔ یہ بالکل لبِ بام سے دو چار ہاتھ دور رہ جانے والی بات تھی۔ تقدیر نے اس کے ساتھ بہت ظالمانہ مذاق کیا تھا۔ وہ مدت سے میری تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس کے شکاری کتے میری بو سونگھتے پھر رہے تھے مگر اس کو آج تک جتنی خبریں ملی تھیں ناکامیوں کی ملی تھیں اور ان نقصانات کی ملی تھیں جو اسے اٹھانے پڑے تھے۔ پھر اچانک ایک حادثے نے اسے میرا سراغ دے دیا۔ یہ حادثہ بھابھو جی کی واپسی تھی جس نے مجھے پہلے میری تیک نامی کا چرچا کر دیا۔ مجھے تو حالات نے بھابھو جی کے معاملے میں دخل در معقولات پر مجبور کیا تھا لیکن اس معاملے نے میرا راز افشا کر دیا۔ جو مجھے کسی قیمت پر منظور نہ تھا وہ ہو گیا یعنی پھر ولاور کو میرا پتا مل گیا۔

ایسے حالات میں ولاور کا ناکام و نامراد واپس جانا اس کے لیے ایک دلی صدمہ تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ترلوچنی کس حد تک قابلِ اعتبار ہے۔ وہ سودا کر کے فیصلہ واقعی منسوخ کرنے پر مجبور ہے یا صرف بیٹی کے سامنے ایسا ظاہر کر رہا ہے۔ اس کا احتجاج اور غصہ سب بے کار تھا۔ نہ یہ اس کا شہر تھا اور نہ گھر جہاں اس کی بدمعاشی چلتی تھی۔

جب وہ واپس جا رہا تھا تو شاید اسی خیال سے افسردہ بھی تھا کہ کہیں سچ مچ اسے کملا کی خواہش کے مطابق اس گھر کی حدود سے باہر نکال دیا گیا تو وہ کیا کرے گا۔ دوبارہ مجھ تک کیسے پہنچے گا؟ میرے بارے میں اس کو خوش فہمی کبھی نہیں تھی تو اب نہیں تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں اس بار دام سے نکل گیا تو پھر اس کے

خیال کی رسائی [illegible] میں دور نکل جاؤں گا۔ میں اپنا [illegible] بتا بھی [illegible] بدل لوں گا۔

جاتے ہوئے دروازے میں رک کے اس [illegible] پر جو نگاہ کی وہ اس کے دلی جذبات کی ترجمان تھی۔ [illegible] اس کی جھنجلاہٹ، بے بسی، غصے اور نفرت کے [illegible] کا ہر رنگ تھا۔ دھمکی تھی کہ اپنے سکندرِ اعظم ہونے کا زعم تم زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں کہ ایک احمق لڑکی تم پر فریفتہ ہو گئی تو تم نے یہ بازی جیت لی۔ دیکھو کہ ولاور کی اگلی چال کب بھلی جاتی اور کیا ہوتی ہے۔

"ڈیڈ! ایک بات اور سن لیں۔" کملا نے کہا۔

ترلوچنی نے پلٹ کر اسے دیکھا اور زبان خاموشی میں پوچھا کیا؟

"میرے ساتھ دھوکا کیا گیا۔ اور آپ نے کوئی چکر چلایا... تو... یہ جو اس نے ریوالور کو کنپٹی پر رکھ کے [illegible] دبا دیا۔

"کملا... ڈ" مشینی انسان کی طرح بے حس [illegible] کرنے والا، چلنے اور بولنے والا روبوٹ باپ بن کے چلایا۔

کملا ہنس پڑی۔ "ابھی نہیں ڈیڈ۔ مجھے معلوم تھا کہ ریوالور پر سیفٹی کیچ ہے۔ مگر میں سیفٹی کیچ ہٹا بھی سکتی ہوں۔ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن مجھے سیفٹی کیچ ہٹا کے ٹریگر دبانے سے نہیں روک سکتے ہیں۔ گزشتہ بار آپ جیت گئے تھے۔ اس بار نے مجھے اپنی نظر سے گرا دیا تھا۔ میں دوسری بار اپنی شکست قبول نہیں کروں گی۔ اس بار آپ ہار جائیں گے۔ اور تب آپ کو احساس ہوگا کہ ہار کیا ہوتی ہے۔ آپ ہر بار جیت کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہار ہمیشہ دوسروں کی ہوتی ہے تو آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس بار آپ کو شکست ہو جائے۔ آپ کو اس کا تجربہ نہیں ہے۔ آپ کو احتیاط سے کام لینا ہوگا ورنہ آپ خود اپنے لیے عذاب مول لیں گے۔"

"بس یا کچھ اور..." ترلوچنی پھر روبوٹ بن گیا۔ احساس سے عاری، غیر جذباتی مشینی انسان۔

دروازہ بند ہو جانے کے بعد بھی چند سیکنڈ سکوت کی کیفیت میں گزر گئے۔ پھر کملا نے پلٹ کے مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ بے اختیار میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس سے پہلے جب تک ترلوچنی اور ولاور ایک چیلنج بن کر میرے سامنے تھے کملا میرے سامنے میرے اتنے قریب تھی کہ اس کی پشت سے میں بہت کچھ دیکھ اور محسوس کر سکتا تھا۔ مشکی بالوں کے ریشم سے بھوٹنے والی مہک کو اور ان کی دھندلی سی سنہری چمک کو۔ اس کے شانوں اور گولائی سے نیچے بتدریج کم ہونے والی کمر کے خم کو اور کمر سے اوپر جاتے

www.paksociety.com

کے نصف دائرے میں روشن چلا گیو۔ وہ تقریباً مجھ سے الگ کھڑی ہوئی تھی مگر مجھے اس سے ڈر نہیں لگا تھا۔ اب مجھے یوں لگا جیسے میں نے مدافعت نہ کی تو اسی جذباتی لمحے کی طاقت سے وہ مجھ پر غالب آجائے گی۔ یہ احساس اس کو تقویت دے گا کہ محبت میں جان دینے کا دعویٰ کیے بغیر اس نے ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ میری خاطر کیا کچھ کر سکتی ہے۔

"کیا مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے؟" میں نے کہا۔

"مجھے کھوکھلے الفاظ کی ضرورت ہی نہیں۔" وہ بولی اور اپنے ریوالور کو بڑی مہارت سے تھوڑا سا اچھال کے پھر کیچ کرنے لگی۔ "جو کچھ کیا میں نے اپنی مرضی سے کیا۔"

"کافی مشق ہے تمہیں اس کھیل کی۔" میں نے اسے ریوالور کو ہوا میں دو تین بار گھما کے بالکل صحیح پوزیشن میں پکڑتے دیکھا۔

"ہاں۔ کھلونا اچھا ہے یہ۔" وہ بولی۔ "ڈیڈی بھی جانتے ہیں کہ میں جان پر کھیل جاتی۔ بہت ضدی لڑکی ہوں میں۔"

میں بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔ "ایک بار تم ہار چکی ہو۔ جیتنے سے ہارنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ پھر کہیں یہ احساس کیوں تھا کہ تم اپنی نظر سے گر گئی ہو؟"

وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ "یہ بات تو بہت پرانی ہو گئی ہے مگر مجھے کل کی بات لگتی ہے۔ ایک مہینہ دس دن بعد پورے چار سال ہو جائیں گے۔ اس وقت میں بی اے کے فائنل ائیر میں تھی اور ایسی نہیں تھی جیسی اب ہوں۔ میں بہت خوبصورت تھی۔"

"تم اب بھی خوبصورت ہو۔"

وہ تلخی سے ہنسی۔ "اور کیا کہہ سکتے ہو تم۔ سب یہی کہتے ہیں میرے منہ پر۔ مگر میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ بس واقعی بہت حسین تھی سی اس وقت تم نے مجھے دیکھا ہوتا تو۔۔۔"

"تو کیا؟" میں نے اس سے نظر چرا کے کہا۔

"تو مجھے یوں مسترد نہیں کر سکتے تھے۔" وہ بولی۔ "تم آرزو کرتے میری۔ مجھے چاہنے کی، جینے اور سب کرتے تھے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھ سے ایک مسکراہٹ کا نذرانہ پانے والے خود کو کتنا خوش نصیب جانتے تھے۔ ٹھہرو میں تمہیں ایک تصویر دکھاتی ہوں۔"

اس نے گلے میں پڑا ہوا لاکٹ میرے سامنے کیا اور پھر ایک چٹکی سے اسے کھول دیا۔ دل کی شکل کا لاکٹ کسی کتاب کی طرح کھل گیا۔ اس کے ایک حصے میں خود کملا کا مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ دوسرے حصے میں ایک نوجوان کا جس کی آنکھوں بڑی عجیب سی پرکشش اداسی تھی۔ تصویر دیکھ کے مجھے کملا کے سچ کا احساس ہوا۔ بلاشبہ وہ پہلے قیامت تھی۔ اس کا حسن پہلے اگر شعلہ تھا تو اب ایک بجھتی ہوئی چنگاری۔ صرف چار سال میں اس کا آفتابِ حسن گہن میں آگیا تھا۔ وہ اب بھی پرکشش تھی لیکن وہ فرق بہت نمایاں تھا جو چار سالوں میں پڑ گیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے کہا حالانکہ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ کیوں ہوا۔ اس عمر میں جب حسن کے ماہِ کامل پر شباب کا سمندر چڑھتا ہے۔ اس کی تابانی اور کشش کو کیا ہوا۔

"یہ میری بدصورتی کا فاتح وارث ہے۔" کملا نے کہا۔ "یہ بھی ایک سکندر تھا جس نے مجھے فتح کیا۔ پہلی بار کسی کی کشش کے تیر۔ اس سے پہلے جتنے آئے منہ کی کھا کر گئے۔ بڑے خوبرو نوجوان۔ ذہین اور باصلاحیت۔ شریف زادے اور باکردار لوگ۔ انھیں مجھ سے ایسی محبت ہوئی کہ وہ تقریباً پاگل ہو گئے۔ وہ رسوا ہوئے اور خوار ہوئے مگر میں کیا کرتی؟ مجھے ان سے محبت نہیں ہوئی۔ بہت افسوس ہوا مجھے ان کے حال پر اور ان کے ساتھ اپنے رویے پر۔ لیکن میں زبردستی نہیں کر سکتی تھی اپنے ساتھ۔ ان سب کی بددعائیں لگی ہیں۔ میں اس شخص کی محبت میں گرفتار ہو گئی جو ایک معمولی آدمی تھا۔ بالکل گمنام سا شخص تھا جو ایک بار کسی شو کے سلسلے میں میرے پاس آیا تھا۔ میں کالج کی ہیروئن تھی۔ ہر ڈرامے میں حصہ لیتی تھی۔ اور بہت کامیاب تھی۔ میری کامیابی کے دو اسباب واضح تھے۔ ایک تو میرے مقابلے پر کوئی بھی نہیں تھا۔ اداکاری کیسی ہے، یہ بعد میں دیکھتے ہیں لوگ۔ پہلے اداکارہ کو دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ میری وجہ سے ڈرامے کرنے والوں کو ہزاروں کے چیک ملتے تھے میرے ڈیڈی کی طرف سے۔

جب وہ میرے سامنے آیا تو میرا خیال تھا کہ میں اس پر برس پڑوں گی کہ آخر کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے؟ میں کوئی ایکسٹرا ہوں جو بمبئی میں خوار پھرتی ہیں چانس کے لیے۔ میں ہیروئن بننا چاہتی تو میرا باپ خود فلم پروڈیوس کر سکتا تھا میرے لیے۔ اور شو کے لیے پیسہ چاہیے تو ان کے پاس جاؤ۔ مگر جب میں نے اسے دیکھا تو۔۔۔ بس دیکھتی رہ گئی۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس کی سنتی رہی۔ اس نے کہا کہ وہ ایک اسٹیج آرٹسٹ ہے اور ویسے تو بہت سے کھیل کر چکا ہے مگر ان دنوں ایک چیریٹی شو کے انتظام میں مصروف ہے جو ماضی کے ایک نامور اداکار کی مدد کے لیے ہوگا۔ بمبئی میں یہ ہوتا رہتا ہے۔ اپنے وقت کے بہت سے کامیاب لوگ جو فلمی دنیا کے جگمگاتے افق پر روشن ستارے تھے فٹ پاتھ کی دھول میں پڑے دکھائی دیتے ہیں اور کوئی نہ انھیں جانتا ہے نہ پہچانتا ہے۔ کبھی اچانک کسی کے دل میں ہمدردی کی لہر اٹھتی ہے اور وہ کسی ایسے ہی بھولے بسرے دور کے فنکار کی خاطر چیریٹی شو کا اسٹنٹ چلا دیتا ہے۔ جو ملتا

ہے جیب میں ڈالتا ہے اور بھاگ جاتا ہے۔ مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ ایسے خیراتی شو سے واقعی کسی کو خیرات ملی ہو۔ خیر! جب اس نے یہ باتیں بتائیں تو میں جواب میں اسے بتا سکتی تھی کہ یہ سب ڈھونگ ہے۔ اول تو وہ مدد کے مستحق نہیں جو کبھی اتنے دولتمند تھے کہ دنیا ان پر رشک کرتی تھی۔ اب دنیا ان کی حالت سے عبرت پکڑتی ہے تو عبرت کے ایسے نمونوں کو اسی حال میں رہنے دو تاکہ آج کے بڑے فنکار اپنا آنے والا کل دیکھ سکیں۔ پھر یہ کہ وہ فنکار تمہارا کیا لگتا ہے؟ تم کیوں پریشان ہو اس کے لیے؟ کیا اسٹیج سے جو پیسہ مل رہا ہے وہ کم ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ مگر میں نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا اور آخر میں جب اس نے پوچھا کہ کیا آپ کام کریں گی؟ تو میں نے کہا کام کی بات تو بعد میں ہوگی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ عطیہ کتنا دوں؟ وہ حیران رہ گیا۔ اس نے کہا کہ آپ کا تعاون ہی سب سے بڑا عطیہ ہے۔ مگر میں نے اسے پانچ ہزار کا چیک دیا اور کہا کہ میں مزید عطیات بھی دلوا سکتی ہوں اور خود بھی کاسٹ میں شامل ہو سکتی ہوں بشرطیکہ میرے ساتھ وہ خود بھی ہو۔ اس کا چہرہ اتر گیا کیونکہ مرکزی کردار تو کوئی اور کر رہا تھا۔ میں نے ابھی تک نام نہیں بتایا اس کا۔ اصل نام تو جانے کیا تھا مگر اسٹیج پر وہ جانی کے نام سے کام کرتا تھا۔ میری کوشش سے جانی کو مرکزی کردار مل گیا۔ اور بس۔ وہیں سے تقدیر کا چکر شروع ہوا۔ میں اس سے ملنے لگی۔ صبح دوپہر شام۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اس کے دو بچے ہیں اور وہ مسلمان ہے۔ میں نے پروا نہیں کی اور اس سے کہا کہ سب کو چھوڑ دو میرے لیے۔ اس نے کہا کہ تم سب کو چھوڑ سکتی ہو میرے لیے؟ میں نے عملاً یہ کر کے دکھا دیا۔ پیسے کی مجھے کمی نہ تھی۔ میں نے اپنے لیے اور اس کے لیے الگ فلیٹ لے لیا۔ میرے ڈیڈی کی بہت بدنامی ہوئی۔ وہ بہت چیخے چلائے مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ اب میں زندہ رہوں گی تو صرف جانی کے لیے ورنہ مر جاؤں گی۔ میرے ڈیڈی نے اسے بری دھمکی دی اور مجھے اٹھوا لیا۔ مرنا کون سا مشکل کام ہے۔ میں نے واپس آتے ہی خودکشی کی کوشش کی جو تقریباً کامیاب ہو گئی تھی۔ لیکن بڑے بڑے ڈاکٹروں نے مل کے مجھے بچا لیا۔ جانی کی بیوی نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ اسے بھی جانی کے اور میرے مراسم کا علم ہو گیا تھا۔ جانی میرے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن یہ آزادی اسے راس نہ آئی۔ ایک رات ڈیڈی نے اسے بلایا۔ انھوں نے ظاہر کیا کہ وہ میری ضد کے سامنے ہار گئے ہیں اور اب یہ چاہتے ہیں کہ جانی مجھ سے شادی کر لے مگر شادی سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ معاشرے میں اپنا کوئی مقام بنا لے جو ان کی بیٹی کے داماد کے شایانِ شان ہو۔ انھوں نے جانی کو اپنے کاروبار میں شریک کر لیا اور اسے اہم ذمے داریاں سونپ دیں۔ وہ باہر کے دورے کرنے لگا اور بے حد مصروف ہو گیا۔

صرف چھ مہینے میں اس کا رہن سہن اور اس کے انداز بدل گئے۔ وہ دولتمند ہو گیا اور اس نے دولت مندوں والے سب شوق اختیار کر لیے۔ مجھے یہ سب بعد میں معلوم ہوا۔ میرے ڈیڈی نے اسے آزمایا تھا۔ انھوں نے اسے دولت فراہم کی اور آزاد چھوڑ دیا یہ دیکھنے کے لیے کہ دولت آجانے کے بعد اس کے دل میں کتنی محبت رہتی ہے۔ وہ اس آزمائش میں پورا نہیں اترا۔ جوا، شراب اور عورت اس کے شوق بن گئے۔ میرے لیے وہ بالکل فکرمند نہیں تھا۔ میں تو اس کے لیے گھر کی مرغی تھی۔ دال برابر۔"

"اور یہ سب کچھ تمہیں کیوں معلوم نہیں ہوا؟" میں نے کہا۔

"مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا؟" وہ بولی۔ "میں تو اندھے اعتماد میں آنکھیں بند کیے بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی کامیابی پر بہت خوش تھی اور اس خیال پر نازاں تھی کہ میں نے سب کو شکست دے کر جسے چاہا اسے حاصل کر لیا۔ میں نے اپنے ان گنت طلبگاروں کو شکست دی جو اپنی قوتِ خرید یا قوتِ تسخیر سے مجھے حاصل کر لینے کے یقین میں مبتلا تھے۔ میں نے جانی کے غرور کو شکست دی۔ اس کی بیوی بچوں کے ساتھ وابستگی اور ان کے حقوقِ ملکیت کو شکست دی اور۔۔۔ یہ میرا خیال تھا۔۔۔ کہ میں نے اپنے ڈیڈی۔۔۔ ناقابلِ شکست ہٹ دھرمی کو بھی شکست دی۔ اور ایسے ہی بہت سے باطل خیالات تھے جو میرے ذہن پر حاوی تھے۔ میں نے کئی بار ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اپنے عشق کا تجزیہ کیا اور یہ سوچا کہ آخر جانی میں ایسی کیا بات ہے جس نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔ عقل کی کسوٹی پر پرکھنے سے جانی ایک بہت معمولی صلاحیت رکھنے والا اوسط سے بھی کم ذہن، نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والا بے نام و نسب لاوارث نوجوان تھا جس کا مقابلہ میرے کسی بھی پرستار یا طلبگار سے کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ بس مجھے اس میں ایک عجیب سی بے بس کر دینے والی مقناطیسی یا حیوانی کشش محسوس ہوتی تھی جس کے خلاف مزاحمت ناممکن تھی۔ اور جس کے بغیر میں اپنی زندگی کا تصور کرتی تھی تو ڈر جاتی تھی۔ اس پاگل پن کو محبت کا نام دینا غلط تو نہ تھا؟"

میں نے کہا۔ "یہ نام تو بہت پہلے دیا جا چکا ہے۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ یہ سچ ہے۔"

"میں بھی یہی کہتی تھی۔ اور بھی بہت سی باتوں پر یقین تھا میرا۔ مثلاً یہ کہ دونوں طرف سے آگ برابر لگی ہوئی۔۔۔ اور اگر جذبۂ عشق سلامت ہو تو محبوب کچے دھاگے سے بندھا چلا آتا ہے اور عشق سچا ہو تو پتھر کو بھی موم کر دیتا ہے۔ یہ افسانوی فلمی تصورات ہیں

نے کالج کے زمانے میں قائم کیے تھے۔"

"تم بھی بہت یاد رہے ہوں گے۔۔۔"

"ہاں، بیت بازی اور مباحثوں میں کام آتے تھے۔ مجھے خبط تھا کہ میں سب کچھ کروں اور ایسے کروں کہ سب دنگ رہ جائیں۔ کوئی یہ نہ کہے کہ خدا نے بس صورت ہی دی۔ دولت بن مانگے مل گئی۔ اوپر کا خانہ تو خالی پڑا ہے۔ عورت ذات ہونے کے ناتے ناقص العقل تو طے شدہ طور پر تھی۔ بعد میں سارے تصورات غلط ہو گئے۔ ایک کڑوا سچ باقی رہا جس کو میرے جہاندیدہ، تجربہ کار اور قابلِ رشک عقل رکھنے والے ڈیڈی جانتے تھے اور مانتے تھے۔ ان کی نظر نے سچ کا یہ روپ پہلے ہی دیکھ لیا تھا مگر انھوں نے اس سچ کو مجھ سے تسلیم کرانے کے لیے کوئی لیکچر نہیں دیا اور کسی سقراط کا حوالہ نہیں دیا۔ انھوں نے تھوڑا سا پیسہ خرچ کیا۔ لاکھوں کی رقم ان کے لیے تھوڑا سا پیسہ تھی۔ یہ پیسہ انھوں نے جانی کو دیا اور سچ کو جمع کرتے گئے۔ سچ سننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سچ دیکھنے اور سچ کے تجربے سے گزرنے میں جو عملی سبق ملتا ہے وہی قائل بھی کرتا ہے۔ یہ سچ اچانک میرے سامنے آ گیا۔ اپنی تمام کڑواہٹ اور بدخلقی کے ساتھ۔ کچھ ماہ کے بعد ڈیڈ نے مجھے بلایا اور کہا کہ 'جانی کے بارے میں اب میرا کیا خیال ہے؟' میں نے کہا کہ 'خیال کوئی بدل جانے والی چیز ہے؟' وہ مسکرائے اور انھوں نے کہا کہ 'ہاں، خیال بدل جاتا ہے۔ تمھارا خیال بھی بدل جائے گا جب تم اپنے جانی کا اصل چہرہ دیکھو گی۔ آدمی کی فطرت کو حالات کے آئینے میں دیکھنا چاہیے۔ اگر آئینہ بدل جانے کے باوجود فطرت نہ بدلے تو یہ ہے کمال کی بات۔ مگر ایسا آدمی ملتا نہیں۔ ملے تو پھر وہ فرشتہ ہی ہوتا ہے۔ غربت میں خودداری اور قناعت کا فلسفہ بگھارنے والے کو دولتمندی سے روشناس کرا کے دیکھو۔ مزدور اور محنت کی عظمت کا پرچار کرنے والے سوشلسٹ شاعر کو سرمایہ دار بنا کے دیکھو۔ رشوت اور بدعنوانی کے خلاف وعظ کرنے والے کو عیش و عشرت کی زندگی کے مواقع فراہم کر کے دیکھو۔ محبت اور وفاداری کے دعوے کرنے والے کو اپنے جال میں لے جا کر دیکھو۔ سارا بھید کھل جائے گا۔ اصل فطرت سامنے آ جائے گی۔' ڈیڈی کا یہ بھاشن سن کے میں نے کہا کہ 'بیشک آپ نے ایسی ہی دنیا دیکھی ہے۔ یہ آپ کے تجربات ہیں لیکن آپ نے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان سے میرا اتفاق کرنا ضروری نہیں۔' انھوں نے کہا کہ 'چلو تم بھی یہ دنیا دیکھ لو اور دیکھو کہ کیا میرا تجربہ غلط تھا؟' اس کے بعد انھوں نے جانی کی زندگی کی ایک فلم دکھائی جو انھوں نے بڑی محنت سے تیار کروائی تھی۔ اس میں کوئی کیمرہ ٹرک نہیں تھی مگر میں نے اس پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔"

"کیا تمھارے ڈیڈی کے کیمرہ مین سائے کی طرح اس کے پیچھے لگے رہتے تھے؟" میں نے کہا۔ "آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہر جگہ پہنچ گئے اور شوٹنگ کرتے رہے؟"

وہ ہنس پڑی۔ "وہ کوئی حقیقی فلم نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے سینما فلم نہیں تھی۔ وہ تو میں اصطلاحاً کہہ رہی تھی۔ جو کچھ میں نے دیکھا وہ اس کی زندگی کا عکس تھا۔ وہ زندگی جو میرا جانی دولتمند بن جانے کے بعد گزار رہا تھا۔ فلم بھی تو ایک عکس ہی ہوتی ہے۔ فلم میں کیمرہ ٹرک چل جاتی ہے۔ جو کچھ میں نے دیکھا اس میں کیمرہ ضرور استعمال ہوا تھا مگر ٹرک کوئی نہیں تھی۔ گزشتہ تین ماہ میں میرے ڈیڈی نے اپنے نظریے کی صداقت آزمانے کا جو تجربہ کیا تھا وہ کامیاب رہا تھا۔ انھوں نے جانی کو وافر پیسہ دیا جسے وہ اپنی مرضی سے خرچ کر سکتا تھا اور جس کا حساب دینا ضروری نہیں تھا۔ یوں سمجھو کہ ڈیڈی نے اسے عیش اور فراڈ کرنے کے مواقع فراہم کیے اور اس نے میرے ڈیڈی کو مایوس نہیں کیا۔ وہ چھ سات ایسے ہوٹلوں میں رہا جو جیسے رنگینی میں ہیں۔ ظاہر ہے اسے بھیجا گیا تھا۔ یہ پیسہ اس نے کہاں صرف کیا، اس کا ثبوت تصویروں کی صورت میں موجود تھا۔ یہ تصویریں کچھ تو باہر لی گئی تھیں مگر پھر ہوٹلوں کے اندر اتاری گئی تھیں۔ وہ کس بار میں، کس نائٹ کلب میں یا جوئے خانے میں گیا۔ کس کے ساتھ گیا۔ وہاں اس نے کیا کیا۔ اس سب کی ایک مفصل رپورٹ میرے سامنے رکھ دی گئی تھی۔ ہر قسم کے ثبوت کے ساتھ۔ مگر میں نے کہا کہ یہ سازش ہے۔ جانی کو جان بوجھ کر پھنسایا گیا ہے۔ اسے ورغلایا گیا ہے۔ اس کے پیچھے شکاری عورتیں لگائی گئی تھیں۔ وہ کون سا عابد و زاہد اور متقی و پرہیزگار ہونے کا دعوے دار ہے۔ وہ انسان ہے آخر۔ یہ سب دلائل میں خود کو بچانے کے لیے استعمال کر رہی تھی۔ جانی کا دفاع کرنے کے لیے نہیں۔ مگر ڈیڈی بھی جانتے تھے کہ میرا یہی ردِعمل ہوگا۔ انھوں نے مجھے چند لڑکیوں سے ملوایا۔ وہ سب عام قسم کی لڑکیاں تھیں جن کو جانی نے محبت اور شادی کا جھانسا دیا تھا۔ انھیں اپنے بارے میں یہ بتایا تھا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے اور بہت بڑے بزنس کا مالک ہے۔ کسی بھی شریف اور اچھی لڑکی کو ورغلانے کے لیے جس قسم کا جھوٹ ضروری ہوتا ہے وہ اس نے بولا تھا اور ان سب کو ایک جیسا دھوکا دیا تھا۔ ان میں سے دو اس کی پرسنل سیکریٹری بن کر بیرونِ ملک سفر میں بھی ساتھ رہی تھیں۔ چنانچہ وہ چشم دید گواہ تھیں۔ میں آخری وقت تک مزاحمت کرتی رہی اور سچ کو جھوٹ کہہ کے خود کو شکست سے بچاتی رہی مگر بالآخر یہ سب ناممکن ہو گیا۔ ڈیڈی نے مرحلے وار مجھے شکست دی۔ آخری مرحلے میں انھوں نے مجھے جائے واردات پر بھیج دیا جہاں جانی رنگے ہاتھوں پکڑا

گیا۔ اس کے لیے کسی بھی بات سے مکرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ وہ ایک بہت گھٹیا، تکلیف دہ اور بدصورت، انتہائی شرمناک منظر تھا جب جانی، میرا محبوب، میرے سامنے ایک مجرم کی طرح کانپ رہا تھا اور اپنے ہر جرم کا خود اقرار کر رہا تھا۔ ہر سچ اتنا ناقابلِ تردید تھا کہ اس کے لیے انکار کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔ ڈیڈی کی تھیوری پھر درست ثابت ہوئی تھی۔ میرے اعتماد کی یہ شکست اتنی عبرتناک تھی کہ اس نے مجھے پاگل کر دیا۔ محبت اتنا بڑا فریب دے سکتی ہے۔ محبت کرنے والا انسان کی اس انتہا تک جا سکتا ہے۔ یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت اذیت دینے والا تجربہ تھا۔ معلوم نہیں کیوں میں سچ کو جھوٹ کہتے کہتے ڈرنے لگی تھی کہ اگر یہ بعد میں سچ نکلا تو کیا ہوگا۔ جیسے جیسے ثبوت میرے سامنے آ رہے تھے، میرے اندر بے یقینی کا خلا بڑھتا جا رہا تھا۔ زبان سے اقرار نہ کرنے کے باوجود شکست کا آسیب مجھ پر مسلط ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ ظلم کا آخری سین اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد وہی ہوا جس کا فیصلہ میں پہلے ہی کر چکی تھی۔ پھر بھی مجھے شک تھا کہ وقت آنے پر میں شاید اپنے فیصلے پر عمل نہ کر سکوں۔ مگر جب وقت آیا تو میرے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا۔ میں نے ریوالور نکالا اور اسے گولی مار دی۔ خود اپنے ہاتھوں سے۔ اس سے پہلے میرا خیال تھا کہ میں اسے قتل نہ کر سکی تو خود کو گولی مار لوں گی۔ مگر اس کے جرم کی سزا میں اپنے آپ کو نہ دے سکی۔ میں نے سوچا کہ یہ تو بڑی بے وقوفی کی بات ہوگی کہ جس نے میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیا وہ زندہ رہے اور اس کا یہ کھیل بھی اسی طرح جاری رہے۔ ویسے یہ بھی بات ہے کہ اگر میں اسے وہاں سزا نہ دیتی تو بعد میں ڈیڈی میرا یہ کام خود کر دیتے اور ان کے لیے کوئی مشکل پیدا نہ ہوتی جو میری بے وقوفی کے باعث ہوئی۔ مگر وہ مشکلات کو خرید لیتے تھے۔ مسائل کے بارے میں وہ کبھی جذباتی نہیں ہوتے تھے۔ ان کا تو سیدھا اصول یہ تھا کہ پیسہ ہے تو فکر مت کرو۔ خرید لو۔ بے فکری خرید لو۔ اپنی فکریں دوسروں کو دے دو۔ پیسہ کمانے کی فکر، سنبھالنے کی فکر، جمع کرنے کی فکر۔ ان سب کے لیے ہی تو بے شمار ملازم رکھے ہیں میں نے۔ گھر اور گھر سے باہر خود کیا کرنا، جو کام ہو اس کے لیے ملازم رکھ لو۔ جو چیز چاہیے وہ خرید لو، مکان، کار، دولت، عیش و عشرت کے اسباب۔ انسان اور اس کا ایمان وغیرہ۔ قانون اور انصاف کرنے والے۔ سب کو خرید لو اور بس۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ یہی انھوں نے میرے لیے بھی کیا۔ مگر بعد میں ان کے لیے ایک مشکل پیدا ہو گئی۔ انھوں نے مشکل کو خرید لیا۔ خرید کر وہ مارکیٹ کو بھی ان کے لیے مزید مشکلات پیدا کرتی۔ جب میں نے اسے مار دیا تو ایک چھوٹی سی قانونی مشکل پیدا ہوئی۔ اس مشکل کو انھوں نے آسانی سے خرید لیا۔ میرا نام تک کسی کی

زبان پر نہیں آیا۔ کسی نے پوچھا بھی نہیں کہ جانی کدھر گیا؟"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں کھلی کھڑکی سے باہر اندھیرے میں اپنے ماضی کی متحرک پرچھائیاں دیکھتی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا۔ معصوم نظر آنے کے باوجود وہ کتنی خطرناک عورت تھی۔ نڈر اور بے باک۔ نہ جھکنے والی، نہ مرنے والی۔ جانی تو اس کی محبت کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ میرا کیا بنے گا؟ میں نے تو اسے کوئی دھوکا نہیں دیا۔ اس سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے اسے صاف بتا دیا ہے کہ میرے لیے اس کی محبت کو قبول کرنا ممکن ہی نہیں اور میں رابعہ سے محبت کرتا ہوں۔ کیا وہ میرے انکار کو اور اس توہین کو برداشت کرے گی؟ کہیں سچ میرا جرم تو نہیں بن جائے گا؟

"معلوم ہے اس کے بعد میں نے کیا کیا؟" وہ اچانک بولی۔ "میں نے بدصورتی اختیار کر لی۔ خوبصورتی تو محبت کا نام ہے۔ جب آدمی نفرت میں ڈوب جاتا ہے تو وہ بدصورت ہو جاتا ہے۔ میری طرح۔"

"خدا کے واسطے کملا! خود کو بدصورت کہنا چھوڑ دو۔۔۔"

"شٹ اپ!" وہ چیخ کر بولی۔ "مجھے جھوٹ کی طرف لے جانے کی کوشش مت کرو۔ تین سال سے میں اس گھر میں ہوں۔ نفرت اور غلاظت کے گھر میں۔ اپنی مرضی سے میں نے خود کو اس میں گرا لیا تھا۔ کیونکہ اسی میں ڈوب کر جانی مر گیا تھا۔ کملا اس کے ساتھ ستی ہو گئی تھی مگر میں زندہ ہوں۔ تین سال سے زائد ہو گئے مجھے مرتے ہوئے مگر میں زندہ ہوں۔ محبت چھوڑ کر نفرت اختیار کرنے کے بعد میں نے وہی کیا جو میرا جانی کرتا تھا۔ جب اسے دولت ملی تو وہ عیاشی کرنے لگا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں کیا بے وقوف ہوں کہ اتنی دولت مند ہونے کے باوجود عیش نہیں کرتی۔ خواہ مخواہ اس شرافت اور عزت، محبت اور شادی کے چکر میں اپنی خوبصورتی اور جوانی پر خود ہی پہرے دار بنی رہی۔ سب کا دل توڑتی رہی۔ دل توڑنا کوئی اچھی بات ہے؟ چنانچہ اس کے بعد میں نے سب پر اپنے دروازے کھول دیے اور وہ سب جو میرے پرانے پرستار تھے ایک دم آ گئے۔ جیسے نئی ریلیز ہونے والی فلم پر لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میں نے کہا کہ سب آ جاؤ مگر باری باری۔ بلیک نہیں چلے گی۔ لائن بنا لو۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسی۔ "میرے ڈیڈی نے مجھے ماہر نفسیات کے سپرد کیا۔ وہ بھی میرے پرستاروں میں شامل ہو گیا۔ میں نے کہا کہ یہ حسن اور جوانی اب کسی کی ملکیت نہیں۔ یہ تو بہتی گنگا ہے۔ آؤ، ہاتھ دھو کے پوتر ہو جاؤ۔ اس کے بعد سب نے مجھے دیکھا۔ اس جہانِ نو میں اپنی مرضی سے سوار ہوئی تھی اور میرے ڈیڈی ابھی یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ یہ کوئی غلطی کی ہے یا نہیں۔ بے شک میں نے دلیل سے انھیں قائل کر لیا تھا کہ میں نے نیکی کی

www.paksociety.com

ہے۔ مگر وہ جانتے ہیں میری جیسی بدی کو۔ وہ میری خاطر اپنا نقصان نہیں کریں گے۔ میں نے تو اپنا جو نقصان کیا وہ کسی کھاتے میں نہیں۔۔۔"

"کملا دیوی۔۔۔" میں نے پریشان ہو کے کہا۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ نقصان نہ تمہارا ہوگا نہ تمہارے ڈیڈی کا۔ نقصان مجھے ہوگا۔ حالانکہ میں نے کوئی جرم کوئی گناہ نہیں کیا کہ اس لانچ کو واپس لے آیا جس پر بدقسمتی سے تم سوار تھیں۔ مجھے بھی پہنچنا تھا اور اس کی یہی ایک صورت تھی۔ میرا مقصد ہرگز تمہاری ذاتی زندگی میں مداخلت نہیں تھا۔ یہ تمہاری زندگی ہے۔ اسے تم جیسے چاہو گزارو۔ جس کو چاہو خیرات میں دو اور جسے چاہو انعام میں۔ تم جب اسے نہ گزارنا چاہو تو ختم کرنے کا اختیار بھی رکھتی ہو۔ لیکن خدا کے لیے مجھے یہ بتا دو کہ میں کیا کروں۔۔۔؟"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ نکلنا چاہتا ہوں اس پاگل خانے سے جہاں صرف خرید و فروخت ہوتی ہے۔ نہ میں خریدار ہوں اور نہ برائے فروخت۔"

"تم جا سکتے ہو۔ میرے ساتھ۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا۔ "سمجھنے کی کوشش کرو کملا۔ میں ایک ایسا شخص ہوں جس کی زندگی مسلسل فرار کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہر جگہ شکاری میرے تعاقب میں ہیں۔ وہ یہاں بھی پہنچ گئے ہیں اور میں جان بچا کے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ تم کہاں تک بھاگ سکتی ہو میرے ساتھ؟"

وہ ہنس پڑی۔ "جب تک زمین تم پر تنگ نہ ہو جائے۔"

میں نے کہا۔ "تنگ تو آج بھی ہے۔ لیکن میں پھر بھی اس طرح پکڑا جانا نہیں چاہتا جیسے چوہے دان میں چوہا پکڑا جاتا ہے۔ مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے۔ تمہاری زندگی کے دکھ یقیناً بہت بڑے ہیں لیکن میں انھیں بانٹ نہیں سکتا۔ تم اپنے ڈیڈی کی بات چھوڑو۔ اپنی کہو کہ جو کچھ میں نے کیا وہ اچھا تھا یا برا۔ تم اسے کیا سمجھتی ہو؟ کیا تمہارے نزدیک مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے؟"

"میں تمہیں کوئی سزا نہیں دے رہی ہوں۔ تم خود سزا مانگ رہے ہو۔" وہ بگڑ کے بولی۔

"کملا! کاش یہ ممکن ہوتا۔ میرے پاس کوئی جگہ ہوتی۔ کوئی گھر ہوتا میرا یا دوست ہوتا یہاں کوئی میرا۔ پھر شاید میں تمہیں لے جاتا اور تمہاری مدد کرتا۔۔۔"

"مجھے تمہاری مدد کی نہیں، تمہاری ضرورت ہے۔" وہ چلا کے بولی۔

میں نے سخت پریشان ہو کے سوچا۔ یہ میں کہاں پھنس گیا۔ وہ لڑکی ایک نفسیاتی مریض تھی۔ ایک ایسی لڑکی جو اپنی آزادی کے اہتمام میں سب دنیا کو شریک کر رہی تھی۔ اس کا دماغی توازن دیکھتے ہوئے کوئی بھی اسے پاگل نہیں کہہ سکتا تھا مگر جو کچھ اور اس نے مجھے بتایا تھا اس سے میں یہی اندازہ کر سکتا تھا کہ کسی غلط نے اسے بری طرح توڑ پھوڑ دیا تھا۔ اسے بطور عورت ہونے پر غرور تھا۔ اپنے حسن پر ناز تھا اور اپنی پاک دامنی پر فخر تھا۔ ایک شخص جسے کملا نے پسند کیا اس نے دوسری عورتوں کو فوقیت دی جو بدصورت تھیں، بدکردار تھیں اور بدنام تھیں۔ احساس ذلت نے کملا کی شخصیت کو اسی طرح مسخ کر دیا جیسے مصور کے ہاتھوں خود اس کا شاہکار مسخ ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اس کے حسن کو سراہنے کے بجائے کسی گھٹیا فلمی رسالے کے سرورق کو اس سے بہتر قرار دے دے۔ کملا نے اپنے آپ کو تباہ کر دیا۔ وہ عورت سے فاحشہ بن گئی۔ اور اگر میں یہ کہوں کہ کسی حد تک جنسی جنون میں مبتلا ہو گئی تو غلط نہ ہوگا۔

معلوم نہیں ترلوچن کی دولت اس کی بیٹی کے لیے ذہنی سکون اور شخصیت کا توازن کیوں نہ خرید سکی۔ وہ تو ہر چیز کو خرید لینے کا قائل تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کملا کے لیے مجھے بھی خریدنا چاہتا ہو۔ یہ بات اس نے دلاور کے سامنے بھی کہی تھی کہ میں اپنی بیٹی کی کسی فرمائش کو رد نہیں کر سکتا۔ بیٹی نے کہا کہ مجھے سکندر چاہیے تو وہ اسے گٹھا کر رکھ لے۔ اور پھر سکندر کیا کرے گا؟ ایک طرف دلاور کا جال، دوسری طرف کملا کی جیل۔ جس میں قید با مشقت بھی جیل سے زیادہ ذہنی تھی۔ آگے کنواں پیچھے خندق۔ اس پاگل خانے میں کہیں میں بھی پاگل نہ ہو جاؤں۔ میری آنکھوں سے نیند بہت دور تھی حالانکہ رات کے دو بج چکے تھے۔ ابھی تک مجھے معلوم نہ تھا کہ اس شب کی سحر کیسے ہوگی۔ مجھے یہاں سے نکلنا نصیب ہوگا تو کس حال میں ہوگا۔ میں چاہتا تھا کہ رابعہ کے بارے میں سوچوں کہ وہ کب ملے گی۔ محسن کے اور غالب کے بارے میں سوچوں کہ وہ کہاں ہوں گے لیکن میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

"کافی پیو گے؟" کملا نے ایک انگڑائی لے کر کہا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر گھبرا کے نظر دوسری طرف کر لی۔ "خداوندا! مجھے اس امتحان سے بچا۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ میں وہی جنت سے نکالا ہوا انسان ہوں جس کے لیے گناہ کی ترغیب سے لڑنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں اس حالت سے کیسے بچوں گا اگر میں اسی طرح محصور رہا۔

میری دعا کا جواب فوراً ایک خیال بن کے آیا۔ میرے دل نے کہا۔ "سکندر اعظم! گھبرانے کی کون سی بات ہے۔ ایک عورت کو طاقت سے شکست نہیں دے سکتے تو کیا ہوا۔ عقل استعمال کرو۔

وہ حالات کو سمجھو۔ اور پھر اپنا راستہ بناؤ۔"

میں نے مسکرا کے کہا۔ "کیا تمہیں نیند نہیں آ رہی ہے؟"

اس نے کہا۔ "وہ تو اب اکثر نہیں آتی۔ رات ایسے ہی گزر جاتی ہے۔ خواب آور گولیاں بھی اثر نہیں کرتیں۔ اکیلے تو بالکل نہیں آتی۔۔۔"

"وہ۔۔۔ کافی۔۔۔ میرا خیال ہے۔۔۔" میں نے کہا۔ "کوئی حرج نہیں اگر ہم دونوں پی لیں۔۔۔"

اگر میں فوراً اپنا رویہ بدل لیتا تو اسے ضرور شک ہوتا کہ یہ میری چال ہے۔ میرے لیے محتاط رہنا ضروری تھا ورنہ وہ لڑکی کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اس کے لیے ناممکن کچھ نہیں تھا۔

"کیا تمہارے ڈیڈی سو گئے ہوں گے؟" میں نے کافی پینے کے بعد سگریٹ جلا کے کہا۔

"معلوم نہیں۔ ان کی فکر کیوں ہے تمہیں؟"

"میرا مطلب تھا کہ۔۔۔ وہ واپس کیوں نہیں آئے۔ انھوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا کہ میرے بارے میں انھوں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔۔۔؟"

"فیصلہ تو میں نے بتا دیا تھا۔ ان میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اس فیصلے کے خلاف کچھ کر سکیں۔" وہ بولی۔

"کیا دلاور واقعی چلا گیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"بھاڑ میں جائے دلاور۔ وہ اندر بھی ہے تو تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمہارے سامنے آ گیا تو اسے گولی مار دوں گی۔ بالکل۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔" وہ بولی۔ "لاش میں اٹھوا دوں گی۔"

"میں اپنا اطمینان چاہتا تھا کہ اب اس کی طرف سے مجھے کوئی ڈر نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ بہت عیار آدمی ہے۔"

"میری حفاظت میں آ کر کیسے ڈرو گے؟"

"حفاظت کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم نے کہا ہے کہ اسے گولی مار دو گی۔ مگر میں سوچ رہا ہوں کہ خالی ہاتھ میں اسے گولی کیسے ماروں گا۔ اگر وہ اچانک آ گیا۔۔۔"

"یہ لو۔۔۔ میرا ریوالور۔۔۔" اس نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اسے اپنے ہی پاس رکھو۔ تم خود نشانہ بنا لو گی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ تمہارے گھر میں کسی کو ہلاک کر سکوں۔ خواہ وہ میرا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ اب یہاں سے نکلنے کی سوچنا چاہیے۔"

"سوچنے کی تو اس میں کوئی بات نہیں۔ ہم صبح ہوتے ہی نکل جائیں گے۔" اس نے کہا۔

"صبح! یعنی ابھی نہیں جا سکتے؟"

"ابھی کیسے جا سکتے ہیں۔۔۔ سارے گیٹ بند ہیں۔ کوئی گاڑی گیراج سے نہیں نکل سکتی جب تک ڈیڈی کا حکم نہ ہو۔ گارڈن میں چاروں طرف بڑے خونخوار قسم کے کتے پھر رہے ہیں۔"

"کیا وہ تمہیں بھی نہیں پہچانتے؟"

"وہ کسی کو نہیں پہچانتے۔ سوائے اس شخص کے جس کے ہاتھوں میں ان کی زنجیر ہوتی ہے۔" کملا نے کہا۔ "اگر وہ زنجیر کھول دے تو یہ کسی کو بخشنے والے نہیں۔ اس کے علاوہ دیواریں تم نے شاید نہیں دیکھیں۔"

"جس حالت میں مجھے لایا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ تم نے تو دیکھی ہوگی۔ کیا میں کچھ دیکھ سکتا تھا؟"

"دیواروں کے اوپر بالکل جیل جیسا حفاظتی حصار ہے خاردار تاروں والا۔ جن میں برقی رو دوڑ رہی ہے۔" وہ بولی۔

"صبح ہم کیسے جائیں گے؟"

"صبح کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ گیراج کھل جائے گا۔ میری گاڑی آ جائے گی۔ میں تمہیں لے جاؤں گی جہاں تم کہو گے۔" وہ بولی۔

"میرے پاس تو کوئی بھی ایسی جگہ نہیں۔۔۔ تم کہاں جا سکتی ہو مجھے لے کر؟" میں نے کہا۔ "جہاں میں کچھ عرصہ روپوش رہ سکوں اور کسی کو حتیٰ کہ تمہارے ڈیڈی کو بھی معلوم نہ ہو۔"

"ایسی تو کوئی بھی جگہ نہیں ہو سکتی۔" وہ سوچ کے بولی۔ "بہت سے فلیٹ ہیں۔ ساحل سمندر پر کاٹیج ہے۔ مگر وہاں ڈیڈی سے چھپ کے رہنا ناممکن ہی سمجھو۔ انھیں تو میری ہر سہیلی، ہر بوائے فرینڈ اور آشنا کا پتا ٹھکانا بھی معلوم ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ ایسے ہزاروں مقامات ہوں گے جہاں تمہارے ڈیڈی کا خیال بھی نہیں جا سکتا۔"

"تمہیں معلوم ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے تھے؟"

"صرف معلوم ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی بھی جگہ مفت تو نہیں ملتی اور پیسہ میرے پاس ہے نہیں۔ جو تھا وہ تمہارے ڈیڈی نے چھین لیا۔"

"پیسہ میرے پاس ہے۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں ہے۔" وہ اس خیال سے جذباتی ہونے لگی تھی کہ میں اسے ساتھ رکھنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

"بینک کو گولی مارو۔ نقد کی بات کرو جو اس وقت تمہارے پاس ہے۔" میں نے کہا۔

"نقد۔۔۔ ہوگا آٹھ دس ہزار۔ لیکن میرے زیورات بھی ہیں۔ کئی لاکھ کے۔۔۔"

"زیورات کے بدلے مکان نہیں ملتا۔ اور انھیں بیچنے گیا تو دھر لیا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "کہاں ہے یہ رقم۔ لاؤ نکالو۔"

www.paksociety.com

"یہاں کیا ہے میرے پاس۔ بیڈ روم میں ہے۔"
"کیا ہم وہاں نہیں جا سکتے؟" میں نے کہا۔
وہ ہنسی۔ "میں اپنے بیڈ روم میں نہیں جا سکتی۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔۔۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر کسی نے دیکھ لیا؟"
"کون دیکھے گا؟" وہ بولی۔
"کوئی محافظ۔۔۔ نوکر۔"
"اندر کوئی نہیں ہوتا۔ سب باہر پہرا دیتے ہیں۔"
"یہاں تو خفیہ کیمرے اور مائیکروفون سب کچھ ہیں۔ کہیں یہ گفتگو بھی کوئی سن نہ رہا ہو۔"
"کیمرے تو ہیں۔ لیکن میں تم کو محفوظ راستے سے گزار کر لے جاؤں گی۔" وہ بولی۔ "یہ باتیں کوئی نہیں سن رہا ہے۔"
"پھر تمہارے ڈیڈی کیسے آگئے تھے۔۔۔؟"
"وہ میرے پاس نہیں آئے تھے۔ تمہارے پاس آئے تھے اور باتیں کچھ بھی نہیں سنی تھیں انھوں نے۔ سب کچھ تو اٹکل ہے۔" کملا نے کہا۔ "بس راستے میں مت بولنا۔"
"کیا تمہارا بیڈ روم محفوظ ہے؟" میں نے کہا۔
وہ بڑے معنی خیز طریقے پر مسکرائی۔ "یہ تو نہیں۔ مگر میں اپنی پرائیویسی کی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔ چلو آؤ۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
باہر کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں کملا مجھے بہت کچھ بتا چکی تھی۔ اب میں اندر کا نقشہ دیکھنا چاہتا تھا اور باہر نکلنے کی کوشش کرنے سے پہلے باہر جانے کا راستہ سمجھنا چاہتا تھا۔ دروازے سے نکلتے ہی میں نے ایک بہت بلند چھت والی وسیع راہداری دیکھی جس میں یکساں فاصلے سے تین فانوس آویزاں تھے۔ اس وقت یہ فانوس روشن نہیں تھے۔ راہداری میں لیمپ جیسی وال لائٹس کا دھندلا اجالا تھا۔ میرے قدموں کے نیچے دبیز قالین تھا جو مجھے مدھم روشنی میں گہرا سبز لگا۔ راہداری میں چار دروازے کھلتے تھے۔ دو ایک طرف اور دو دوسری طرف۔ کملا نے مجھے دیوار سے لگ کر چلنے کو کہا اور ایک انگلی سے فانوس کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا مطلب واضح تھا۔ فانوس میں یہاں بھی کیمرے پوشیدہ تھے۔
کملا نے آخری دروازے کو کھولا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ یہ ایک اور مختصر سا کوریڈور یا لاؤنج تھا جس میں اوپر سے زینہ اتر رہا تھا۔ زینے کا کٹہرا جگمگاتے ہوئے پیتل کا تھا اور ریلنگ پر چاندی جیسی سفید دھات کی پالش تھی۔ گھوم کر اوپر جانے والے زینے پر بھی وہی گہرے سبز رنگ کا قالین تھا۔ زینے

تھوڑے تھوڑے فاصلے سے لگی ہوئی وال لائٹس نے روشن کر رکھا تھا جن کی شکل بالکل مٹی کے تیل سے جلنے والے لیمپ جیسی تھی۔ میں گرد و پیش کا جائزہ لینے کے ساتھ اس پلان پر بھی غور کرتا جا رہا تھا جو میرے ذہن میں فائنل ہو چکا تھا۔ ابھی تک میں نے کسی بھی ملازم یا محافظ کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ اندر پورے ماحول پر ایک پر ہیبت خاموشی مسلط تھی۔ کملا دبے پاؤں کسی بلی کی طرح بغیر چاپ کے چلی جا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس قصر عالی شان میں کملا کے اور اس کے باپ کے ساتھ رہنے والے کون لوگ ہیں؟ صرف ملازم اور محافظ۔ کملا کی ماں' ترلوچن کی بیوی' اس کے بھائی بہن' وہ سب کہاں ہیں؟
اچانک کملا نے ایک دروازے کا ہینڈل گھما کے کھولا اور مجھے ہاتھ پکڑ کے اندر کھینچ لیا۔
بیڈ روم کی شان و شوکت دیکھ کے میں دنگ رہ گیا۔ کملا بڑی احتیاط کے ساتھ کچھ سوئچ آف کر رہی تھی اور میری طرف چور نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ بیڈ روم میں نے پہلے بھی دیکھے تھے جو بہت عالی شان تھے۔ کچھ فلموں میں اور کچھ حقیقی زندگی میں۔ لیکن یہاں سب پر بازی لے گیا تھا۔ یہ ایک ایسی خواب گاہ تھی جو شاید میں خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایسی خواب گاہ کا کچھ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مثلاً وہ جو فٹ پاتھ پر یا پھر کسی پارک کی بینچ پر کسی مال گاڑی کے ڈبے میں، کھنڈر میں یا قبرستان کی چار دیواری کے سائے میں اور قبروں کی خاک پر راتیں گزار دیتے ہیں۔ قدرت کی کیا ستم ظریفی ہے کہ وہ تو کسی پریشانی کے بغیر گہری نیند سوتے ہیں اور جو اچھی خواب گاہوں کو عیش و عشرت کے سارے لوازمات۔ آرائش کے تمام اسباب، آرام و آسائش کے ساز و سامان اور دولت کی قوت خرید میں آنے والی ہر خوبصورت چیز سے بھر لیتے ہیں وہ خواب آور گولیاں کھاتے ہیں۔ ڈپریشن میں مبتلا ہوتے ہیں اور کروٹیں بدل کے راتیں گزارتے ہیں۔
"بیٹھ جاؤ۔ کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کے بیڈ پر دھکیل دیا۔
میں تو۔۔۔ اٹھ بیٹھا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ تمہارے اس محل میں ایسی کتنی خواب گاہیں ہوں گی؟"
وہ ہنس پڑی۔ "ایسے سات بیڈ روم ہیں۔"
"اور پوری بمبئی میں ایسے کتنے محل ہیں؟" میں نے کہا۔ "تمہاری صرف ایک خواب گاہ کی آرائش پر جتنا پیسہ خرچ ہوا ہوگا اس سے ایک ہزار افراد کو مرنے کے لیے ایک کمرے کی چھت تو ضرور فراہم کی جا سکتی تھی۔ اور پورے بمبئی شہر کو دیکھا جائے تو۔۔۔"
"ایسی باتیں کہاں سے آگئیں تمہارے دماغ میں؟ ایک بھی

کیا بات کیوں کرتے ہو؟" وہ ایک الماری کھولتے ہوئے بولی۔ "ساری دنیا کو دیکھو۔ نیویارک۔ پیرس۔ سوئٹزرلینڈ۔۔۔"
ہاں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ہر دولت مند شہر ایسے ہی تضادات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ بمبئی میں لوگ فٹ پاتھوں پر سوتے ہیں تو کیا کراچی میں جھگیوں میں نہیں رہتے؟ کیا نیویارک میں۔۔۔ زیر بستیاں نہیں ہیں؟ امرا کے محل بھی کھڑے ہوئے ہیں اور ان کے تقابل اور وراثت بے نقاب ان لوگوں کا بسیرا بھی ہے جہاں زندگی میں حرف بدصورتی ہے۔ غربت اور غلاظت ہے۔ بھوک اور بیماری ہے۔ معلوم نہیں وہ غریب کہاں ہیں جن کو علامہ اقبال نے کہا تھا کہ اٹھو کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو۔ کیا ان کا احساس تک مر چکا ہے اور ان کے خون میں آج کم ہمتی سرایت کر چکی ہے کہ وہ مقدر پر تابع رہتے ہیں اور انسانوں کی طرح جینے کا حق تک نہیں مانگتے۔ چنانچہ امرا بھی محفوظ ہیں۔ ان کے کاخ بھی اور در و دیوار بھی۔۔۔
"یہ لو۔ اس وقت یہی ہے میرے پاس۔" کملا نے ایک بیگ میرے سامنے الٹ دیا۔ پھر اس نے دوسرا بیگ خالی کیا۔ پھر تیسرا۔ اس مخمل سطح والے بیڈ پر نوٹ ہی نوٹ پھیل گئے۔ میں نے خود کو سنبھالا اور نوٹ گننے لگا۔ بے ساختہ بہک جانے والی نظروں اور خیالات کے انتشار سے بچنے کے لیے۔
"یہ تقریباً بارہ ہزار روپے ہیں۔" میں نے کہا۔
اس نے وارڈ روب کی طرف دیکھا۔ "صبح اور مل جائیں گے۔ میں اپنی چیک بک ساتھ لے چلوں گی۔"
میں نے کہا۔ "کیا تمہارے ڈیڈی اتنے ہی بے وقوف اور بے بس ہیں۔ کہ تم کو میرے ساتھ جاتے دیکھ کر کچھ نہیں کہیں گے اور کچھ نہیں کر سکیں گے؟"
"ان کو تو کہنا تھا کہ پہلے اور وہ کر کیا سکتے ہیں؟ ہاں وہ کچھ کریں تو پھر میں بھی کچھ کر سکتی ہوں۔" اس نے پھر اپنا ریوالور نکالا۔ ابھی میری طرف ہاتھ بڑھا ہی رہی تھی کہ میں نے جھپٹ کر ریوالور اپنے قبضے میں کر لیا۔
"یہ کیا بے وقوفی ہے؟" میں نے کہا۔ "مذاق بھی نہیں کرنا چاہیے اس قسم کا۔"
وہ ہنسنے لگی۔ "تم اتنا ڈرتے کیوں ہو۔ سیفٹی لاک۔۔۔"
"مجھے معلوم ہے۔ مگر بہک لینے سے فائدہ؟" میں نے کہا۔ ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ "تمہارے پاس ہونا ہی نہیں چاہیے ایسا خطرناک کھلونا۔ میں حیران ہوں کہ تمہارے ڈیڈی منع نہیں کرتے۔"
"انھیں تو آج پتا چلا ہوگا کہ ریوالور بھی ہے میرے پاس۔"

"وہ کہاں سوتے ہیں؟ اوپر کہیں؟" میں نے کہا۔
"اوپر آخری بیڈ روم انھی کا ہے۔" وہ بولی۔
میں نے ایک کھڑکی پر پڑے ہوئے پردے کی طرف اشارہ کیا۔ "ادھر کیا ہے۔ پائیں باغ؟"
اس نے پردہ ہٹا دیا۔ "ادھر سے سمندر نظر آتا ہے۔ وہ دیکھو۔ ادھر ایک میل کے فاصلے پر سمندر ہے۔ میرین ڈرائیو۔ تم کو روشنیاں نظر آرہی ہیں؟"
مجھے ہر سمت روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ یہ بڑا دلفریب نظارہ تھا۔ زمین پر جگمگانے والی اسٹریٹ لائٹس۔ سمندر میں روشن جہاز۔ آسمان پر نظر آنے والے ستارے۔ سب مل کے ایک ہو گئے تھے۔ مگر میں نے زمین کو آسمان سے الگ کر کے دیکھا اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے شہر کے جغرافیے کو سمجھ کر ذہن نشین کرنے لگا۔ سمندر کے صرف ایک میل دور ہونے کی اطلاع ایک حوصلہ افزا بات تھی۔ دور سے آنے والی ایک کار کی ہیڈ لائٹس سیدھی مجھ پر پڑیں۔ کار قریب آئی اور پھر دائیں طرف گھوم گئی۔ اس سے مجھے یہ اندازہ کرنے میں مدد ملی کہ ترلوچن کے محل کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ بھی سڑک چل رہی ہے اور غالباً بالکل سامنے وہی سڑک ہوگی جو مجھے ساحل تک پہنچا دے گی۔
کملا نے اپنی شربتی آواز میں مجھے پکارا تو میں چونک کے پلٹا۔ جب میری نظر کملا پر پڑی تو میں پھر پلٹا۔ اس نے اپنا لباس بدل لیا تھا مگر اب جو لباس پہنا تھا وہ کہنے کو شب خوابی کا لباس تھا مگر در حقیقت کچھ نہیں تھا۔ وہ شفاف جالی والا کپڑا تھا جس کی ہر شکن کملا کے جسم کی الگ سے انداز سے نمائش کر رہی تھی۔
میں نے کملا کی کھنکتی ہنسی سنی۔ "اب کیا ساری رات باہر ہی دیکھتے رہو گے؟"
"کملا! تمہیں کچھ معلوم ہے۔ میرا سامان کہاں ہے؟" میں نے اس کھیل کو ختم کر دینے کا فیصلہ کیا۔
"کون سا سامان؟ کوئی سوٹ کیس وغیرہ تھا؟"
"نہیں۔ ایک پاسپورٹ تھا۔ ریوالور تھا اور کچھ نقد رقم تھی جو ایک بیلٹ میں لپٹی ہوئی تھی۔"
"مجھے نہیں معلوم۔ ڈیڈی کے پاس ہوگا اگر ہوا۔" وہ ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر بولی۔ "مل جائے گا صبح۔"
"سوری کملا ڈیئر!" میں نے اس کے قریب جا کے کہا۔ "صبح تک میں نہیں ٹھہر سکتا۔ میں جا رہا ہوں۔ ابھی۔ اسی وقت۔"
کملا کا رنگ فق ہو گیا۔ "جا رہے ہو؟ کیسے؟"
"ہاں۔ میں مجبور ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تم کو ساتھ نہیں لے جا سکتا۔۔۔"

www.paksociety.com

"مگر... تم نے... کہا تھا..."

"میں نے جھوٹ بولا تھا۔ بے وقوف بنایا تھا تمہیں۔" میں نے کہا۔

"ذلیل... کمینے..." کملا چلائی۔

میں نے اسے ایک دم دبوچ لیا۔ میرا ہاتھ اس کی نازک گردن پر جم گیا۔ "میں تم کو مار کے جانا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں ایسا کر نہیں سکتا۔ کیا تم نے سنا نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ جانے پر میں نے دلاور کے ساتھ جانے کو ترجیح دی تھی۔ اس کے باوجود تم نے اعتبار کر لیا مجھ پر؟ تم اتنی آسانی سے بے وقوف بن جاؤ گی، یہ امید نہیں تھی مجھے۔ مگر تم نے خود کو بالآخر وہی عورت ثابت کر دیا جس کو مرد ناقص العقل کہتے ہیں تو غلط نہیں کہتے۔"

وہ میری گرفت میں کسمسائی اور اس نے سانس لینے کی جدوجہد میں منہ کھول دیا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں دہشت سے مجھے دیکھتی رہیں۔ میں نے اسے بستر پر پھینک دیا۔ وہ زخم خوردہ شیرنی کی طرح اٹھی اور مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ میرا الٹا ہاتھ حرکت میں آیا اور وہ گھوم کر پھر بستر پر جا گری۔ میں نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔ میں نے اسے ایک گھٹنے سے دبا لیا اور پھر اس کے منہ میں اپنا رومال ٹھونس دیا۔ اس کے نائٹ گاؤن کو پھاڑ کے اسی کے ہاتھ پیر باندھنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

کملا کی طرف سے بے فکر ہو جانے کے بعد میں نے اپنی حالت درست کی۔ رہائی کی جانب اگلا قدم اٹھانے سے پہلے میں نے پرسکون ہو جانا بہتر سمجھا۔ وہیں بیڈ کے کنارے پر بیٹھ کر میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور مجموعی صورت حال کا جائزہ لیا۔ مجھے کملا کی زندگی کے مسائل سے ہمدردی تھی مگر اس ہمدردی کی خاطر میں عملاً کچھ بھی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے اس کی بالکل فکر نہیں تھی کہ بعد میں اس کا رد عمل کیا ہوگا اور وہ خودکشی کرے گی یا پھر کسی 'مہاتما جی' پر سوار ہو جائے گی۔

کملا کے دیے ہوئے بارہ ہزار روپے میری جیب میں تھے۔ اس سے کہیں زیادہ وہ رقم تھی جو مجھے اغوا کرنے کے بعد مجھ سے چھین لی گئی تھی۔ اس میں پانچ ہزار تو انڈین کرنسی تھی اور پانچ ہزار ڈالر بھی تھے۔ اس طرح بارہ ہزار وصول کرنے کا مجھے بہرحال حق تھا۔ اب سوال تھا لاکھوں کی مالیت کے زیورات کا۔ جو کملا کی وارڈروب میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ دشمن کا مال تھا اور دشمن کی حلال کمائی کا بھی نہیں تھا۔ دوسری طرف پیسہ ہمارے بہت سے مسائل حل کر سکتا تھا لیکن میں اخلاقی جواز سے مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔ مجھے یہ چوری لگتی تھی۔

بالآخر میں نے زیورات کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ایک نظر وارڈروب میں ڈالی۔ اس میں سے دلآویز خوشبو کا ایک معطر جھونکا آیا۔ سائیڈ کی دراز کھولنے پر مجھے فرانس کی اعلیٰ ترین پرفیوم کی رنگا رنگ دلکش ڈیزائن والی شیشیاں صف بستہ دکھائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی مختلف قسم کی کریم اور درجنوں شیڈ کی لپ اسٹک، نیل پالش وغیرہ بھری پڑی تھیں۔ سب سے نیچے کی دراز کھول کر دیکھنے پر مجھے خطوط اور تصاویر کا ایک بنڈل ملا۔ یہ سب کملا کے پرستاروں کے خطوط تھے۔ ان پرستاروں کے حوالے سے محبت کے نام پر دھوکا دے کر دنیا کی ویرانی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔ ان میں کچھ کے ساتھ کملا کی تصویریں بھی جوانی کی تھیں۔ ہر تصویر کے پس منظر سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ تصویر کہاں لی گئی ہوگی۔ تاہم ان میں کوئی بھی تصویر قابل اعتراض یا ایسی نہیں تھی جس پر کوئی اسے بلیک میل کر سکتا۔

بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں مجھے واہیات کتابوں اور تصویروں کا ایک افسوسناک ڈھیر ملا۔ یہ سب بھی کملا کی ذہنی بے راہ روی کا سبب بنے ہوں گے۔ میں نے اسے پھر بند کر دیا۔ مزید وقت ضائع کرنے کا اب کوئی فائدہ نہ تھا۔

میں نے کملا کو دیکھا تو وہ سر کو ادھر سے ادھر پٹخ رہی تھی اور اس کی بے چینی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ ہوش میں آنے ہی والی ہے۔ اس حالت میں کملا کا بے ہوش پڑے رہنا ہی بہتر تھا چنانچہ میں نے اس کو اپنے ہاتھ کے ہلکے سے وار سے بے حس کیا اور پھر بیڈ سے اٹھا کے باتھ روم میں لٹا دیا۔ دروازے کو باہر سے لاک کرنے کے بعد میں مطمئن ہو گیا کہ اب کم سے کم دو گھنٹے تک کملا کسی کو کچھ نہیں بتا سکے گی۔ اسے تلاش کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ اگر آ گیا تو کمرا خالی دیکھ کے چلا جائے گا۔ وہ خود صبح چھ بجے تک ہوش میں آئے گی۔ پھر دروازہ پیٹے گی اور یہ شور سن کر کوئی آئے گا تو اسے دروازہ توڑنا پڑے گا۔ اگر میں باہر نکلنے میں کامیاب رہا تو میرے لیے اتنی مہلت کافی ہوگی۔

کمرے سے باہر آ کے میں نے نقشے کو ذہن میں رکھا اور بائیں جانب چل پڑا۔ راہداری کے آخر میں ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ میں نے اس کا ڈور لاک گھما کے دیکھا۔ دروازہ باہر سے مقفل کیا گیا تھا۔ ابھی میں نے واپس جا کے کسی دوسرے دروازے پر قسمت آزمائی کا سوچا ہی تھا کہ باہر سے تالے میں چابی گھمانے کی آواز سنائی دی۔

میں دیوار کے ساتھ چپک کے کھڑا ہو گیا۔ کوئی شخص دروازہ کھول کے اندر آیا۔ اس کے کندھے سے ایک مشین گن لٹکی ہوئی تھی۔ اندر کسی کو نہ پا کے وہ حیران ہوا۔ شاید وہ اسی طرح اندر سے خفیف سی آواز سن کے دروازہ کھول دینے کا عادی تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ باہر سے کسی غیر متعلقہ فرد کو اندر نہ جانے دے لیکن اندر

والوں کے لیے ضرورت پڑنے پر فوراً دروازہ کھولنا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔

اسے زیادہ حیرانی ہوئی جب میں نے پیچھے سے کلاکا دیا اور ریوالور اس کی گدی پر رکھ دیا۔ "بالکل خاموش کھڑے رہو۔" میں نے حکم دیا۔

خوف سے زیادہ اسے حیرت نے منجمد کیا۔ "کون ہو تم؟"

"موت کا فرشتہ ملک الموت۔" میں نے کہا۔ "واپس باہر چلو۔ آہستہ آہستہ پلٹ کے اور ہاتھ اوپر اٹھا کے۔ پھرتی اچھی چیز ہے مگر اس کا غیر ضروری مظاہرہ تمہاری وفات کا سبب بن سکتا ہے۔ میں تم کو سلو موشن میں احکامات کی تعمیل کرتے دیکھنا پسند کروں گا۔ پہلے یہ مشین گن اتار دو۔"

اس نے ہاتھ سیدھا کیا اور میں نے مشین گن خود اتار کے اپنے شانے پر ڈال لی۔ وہ پلٹ کے دروازے سے گزرا اور میں نے پوری طرح مستعد رہتے ہوئے ریوالور کا دباؤ کم نہیں ہونے دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں بھی گھومتا گیا اور باہر آ گیا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں۔" وہ بولا۔ "تم باہر نہیں جا سکو گے۔ یہ دروازہ بھی باہر سے بند ہے۔"

میرے سامنے اب ایک اور دروازہ آ گیا تھا۔ اس مختصر سے کمرے کو جس میں آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے آگے پیچھے دو دروازے تھے "حفاظتی نظام" کا ایک حصہ سمجھا جا سکتا تھا۔ ایک شخص کو میں نے قابو کر لیا تھا مگر دوسرا محافظ جو باہر تھا بالکل آزاد تھا۔

"کیا تم اپنے ساتھی سے نہیں کہو گے کہ وہ دروازہ کھول دے؟" میں نے کہا۔

"وہ میرے کہنے سے دروازہ نہیں کھولے گا۔"

"پھر کب کھولے گا۔ جب فائر کی آواز اور تمہاری دردناک چیخ سنے گا؟" میں نے کہا۔ "میں اس مشین گن سے دروازے کا تالا توڑ سکتا ہوں۔ وہ بھی خواہ مخواہ باہر مارا جائے گا۔"

"تم جو چاہو کرو۔ جو بھی ہو۔ شاید تم نہیں جانتے کہ..."

"میں سب جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں اسی دروازے سے گزر کے اندر گیا تھا۔ میں کوئی اجنبی نہیں ہوں۔"

وہ شاید قائل ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کے دروازے پر چند دستک دی۔

باہر سے کسی نے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"دروازہ کھول یار۔" میرے قیدی نے کہا۔ باہر والا اس کا ساتھی تھا چنانچہ آواز پہچانتا تھا۔ اس نے دروازہ کھلوانے کی وجہ پوچھنا ضروری نہیں سمجھی۔ اسے یہ شک کیسے ہو سکتا تھا کہ کوئی دشمن اندر سے بھی آ سکتا ہے۔

میں نے جیسے ہی دروازے میں چابی لگنے کی آواز سنی، اپنی پوری قوت کے ساتھ ریوالور سے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے سر پر وار کیا۔ ریوالور بڑا ہوتا تو اس کا سر پھٹ جاتا۔ اس چھوٹے سے زنانہ ریوالور کی ضرب نے اسے ناک آؤٹ کر دیا لیکن وہ گرتے گرتے پُر اذیت آواز میں چلایا۔

باہر والا اس چیخ پر ضرور کھٹک گیا ہوگا مگر میں نے اسے دوبارہ چابی لگا کے دروازہ مقفل کرنے کی مہلت نہیں دی۔ میں نے ہینڈل گھما کے دروازہ اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایک جھٹکے سے وہ بھی اندر آ گیا۔ میری مشین گن کا رخ اس کی طرف تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے اور اپنے ساتھی کو دیکھنے لگا جو میرے قدموں میں لیٹا ہوا تھا۔

"یہ... کیا ہے آخر... کون ہو تم؟"

"میں تمہارا دوست نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "دشمن ہوں۔ مجھ سے کسی رعایت کی امید مت رکھنا۔"

"تم نے... اسے مار دیا ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا مگر اس نے وعدہ خلافی کی۔ تم اپنی جان بچا سکتے ہو اگر مجھے یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ بتا دو اور باہر نکلنے میں میری مدد کرو۔"

اس نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا۔ "میں... یہ کیسے کر سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں کر سکتے۔ کیا تمہیں راستہ معلوم نہیں؟ یا اپنی جان عزیز نہیں؟" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا... باہر جانے کے لیے... میں کیا مدد کروں۔ اور بھی بہت سے لوگ ہیں... اور اس وقت تو گیٹ بھی لاک ہوتے ہیں۔ پھر باہر کا گیٹ بجلی سے کھلتا ہے۔"

"مین گیٹ کو چھوڑو۔ پیچھے سے جانے کا بھی تو کوئی راستہ ہوگا؟" میں نے کہا۔ "جہاں نہ چوکیدار ہوں اور نہ کتے ہوں۔"

"راستہ تو ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن اس دیوار کو تم کیسے عبور کرو گے جس پر تار لگے ہوئے ہیں۔ بجلی ہے ان میں۔"

"تم مجھے دیوار تک پہنچا دو۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد تمہارا کام ختم۔"

وہ مجھے واپس اندر لے گیا۔ ایک اسٹور اور کچن سے گزرنے کے بعد ہم عمارت کے عقبی حصے میں تھے۔ وہ مجھ سے آگے تھا اور میں اس کی ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ ایک باغ سے گزرنے کے بعد سرونٹ کوارٹر آ گئے۔

جو شخص میرے آگے آگے بظاہر بڑے صبر و سکون اور

www.paksociety.com

سعادت مندی کے ساتھ چل رہا تھا میری توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ اس نے ابتدا ہی سے مزاحمت نہیں کی تھی اور ظاہر لگتا تھا کہ اسے واقعی جان پیاری ہے۔ مجھے اس کی ایک جیب کے اوپر جو ابھار سا نظر آ رہا تھا وہ ریوالور کا تھا جسے اس نے مشین گن کا مقابلہ کرنے کے لیے نکالنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

چلتے چلتے وہ ایک دم بیٹھ گیا۔ میں اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس حد تک ضرور مستعد تھا کہ وہ ریوالور نکالنے یا پلٹ کر مجھ پر حملہ کرنے تو مشین گن کا بٹ مار کے اس کا سر توڑ دوں۔ اس کے اور میرے درمیان مشکل سے دو فٹ کا فاصلہ تھا اور اپنی چال کو کامیاب بنانے کے لیے اس نے ابتدا ہی سے رفتار زیادہ رکھی تھی۔ میں بھی کم سے کم وقت میں خطرناک علاقے سے نکل جانے کا خواہش مند تھا چنانچہ اس کے قدم ایک مشینی انداز میں تیز اٹھ رہے تھے تو میں بھی اس کی رفتار کا ساتھ دے رہا تھا۔

وہ اچانک میرے سامنے سنگ راہ کی طرح حائل ہوا تو میں اپنی تیز گامی پر فوراً قابو نہ پا سکا۔ میں اس سے ٹکرایا اور پھر اوپر سے گزر کے اس کے سامنے چت ہو گیا۔ وہ اس ایکشن کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھا سیدھے بیٹھتے ہوئے اس نے اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔

میں نے اٹھنے میں ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی نہیں کی مگر اس سے پہلے ہی حریف نے ریوالور مجھ پر مار دیا۔ گولی چلانے کے لیے یہ فاصلہ بہت کم تھا۔ اس نے میرے سر کا نشانہ لیا ہو گا لیکن میری پھرتی میرے کام آ گئی۔ ریوالور کا دستہ میرے شانے پر لگا۔ وار سخت تھا اور ہڈی پر پڑا تھا۔ درد کی ٹیس نے ذرا سی دیر کے لیے میرے بازو کو مفلوج کر دیا۔ پھر صورت حال کی سنگینی کے خیال نے مجھے ایک وحشیانہ جذبے کی قوت دی اور میں نے مشین گن کو ایک ہاتھ سے پکڑ کے گھما دیا۔ دستہ اس کی پیشانی پر یوں پڑا کہ میں نے ہلکی سی چٹ کی آواز سنی۔ اس کی پیشانی کی ہڈی سامنے سے چٹخ کے اندر دھنس گئی۔

اس نے ایک بھیانک آواز نکالی اور باغ کے درمیان بنی ہوئی سنگ مرمر کی روش پر گر گیا۔ اس کے ماتھے سے پھوٹنے والا خون سفید سنگ مرمر کو سرخ کرنے لگا۔ میں نے اس کی قمیص کے سامنے والے حصے میں ہاتھ ڈالا اور وہ ریوالور کھینچ لیا جو اس نے پتلون کی بیلٹ اور پیٹ کے درمیان دبا رکھا تھا۔ شاید اس کی پتلون کی جیب [illegible] ضرورت پڑنے پر وہ جیب میں ہاتھ ڈالتا اور اوپر لگا ہوا ریوالور کھینچ لیتا۔

میں نے اس کو خاموش کرنے کے لیے ایک بار پھر مشین گن اس کے سر پر ماری۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے چیخ رہا

تھا۔ دوسرا وار اس کے منہ پر پڑ گیا۔ اس کے جبڑوں کی ہڈی کے ساتھ کچھ دانت بھی ٹوٹے ہوں گے اور شاید ناک بھی چپٹی ہو گئی۔ وہ ایک بار پھر وہ اذیت سے چلایا۔ اس کا چہرہ سامنے سے بگڑ گیا تھا مگر یہ غلط نشانے بازی کا نتیجہ تھا۔ ایک صحیح وار اگر اس کی کھوپڑی کے پیچھے یا سائیڈ میں پڑ جاتا تو وہ آواز نکالے بغیر بے ہوش ہو سکتا تھا۔

دور سے میں نے ایک تیز سیٹی کی آواز سنی۔ پھر ایسی ہی سیٹی دائیں اور بائیں جانب سے سنائی دی۔ اس شخص کی چیخ محافظوں نے سن لی تھی اور وہ ہر سمت سے خطرے کا سگنل دے رہے تھے۔ سیٹی کے ساتھ ہی کتے بھونکنے لگے۔ رات کی خاموشی میں ان کی خونخوار آواز بہت قریب اور زیادہ خطرناک محسوس ہوتی تھی۔

اب میں نے ناپ تول کے وار کیا تاکہ اس شخص کی اذیت بھی ختم ہو اور ہنگامہ آرائی بھی۔ گردن کے ٹوٹتے ہی وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی ناک اور منہ سے اچھلنے والے خون کے چھینٹے ملکی بار پر بھی نہیں مجھ پر بھی پڑے تھے۔ سیٹی بجانے والے بار بار ایک دوسرے کو خبردار کر رہے تھے اور کتوں کے بھونکنے کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ بھی ادھر ہی دوڑتے ہوئے آ رہے ہیں۔

میں اٹھ کے بھاگا اور سامنے آ جانے والے پہلے ہی سرونٹ کوارٹر کی دیوار پر چڑھ کے اندر کود گیا۔ بیرونی احاطے کی دیوار مزید پچاس گز دور تھی۔ اگر میں دوڑ کر یہ فاصلہ طے کر بھی لیتا تو اس فصیل کو عبور نہیں کر سکتا تھا جس پر ہزاروں وولٹ کی برقی رو والے تار پھیلے ہوئے تھے۔

یہ بھی ایک اچھا فیصلہ ثابت ہوا۔ میں اندر کودا ہی تھا کہ باہر ولن نکل آیا۔ یہ سرچ لائٹس کی روشنی تھی۔ معلوم نہیں کتنی سرچ لائٹس بیک وقت آن ہو گئی تھیں۔ میں باہر ہوتا تو میرے لیے خود کو پوشیدہ رکھنا ناممکن ہو جاتا۔ میری خفیف سی حرکت کے ساتھ ہر سمت میں میرا سایہ متحرک نظر آتا اور چند قدم دوڑنے سے پہلے ہی ہر طرف سے آنے والی گولیاں مجھے چھلنی کر دیتیں۔

سرونٹ کوارٹر کے مختصر سے آنگن میں اندھیرا تھا۔ یہ ایک کمرے کا کوارٹر تھا۔ کمرے کے سامنے والے برآمدے میں ایک طرف شاید کچن تھا اور دوسری طرف باتھ روم۔ دروازہ وسط میں کھلتا تھا اور یہ باہر سے مقفل نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ کمرے میں کم از کم ایک شخص ہو گا یا اس کے بیوی بچے ہوں گے۔ باہر کا شور شرابہ کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور نیند سے جاگ اٹھنے والی ایک عورت نے باہر جھانک کے دیکھا۔ میں ایک کونے میں تھا چنانچہ اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی لیکن وہ باہر آ گئی تو میرے لیے اس جائے پناہ سے نکلنا ضروری ہو گیا ورنہ ایک سیکنڈ بعد وہ چیخ مارتی تو خطرے کی

گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے نیند سے بوجھل لہجے میں کہا۔ "آدھی رات کو کیا آفت آ گئی؟"

پھر میں نے اس کے منہ پر پیچھے سے ہاتھ رکھ دیا اور اسے دھکیل کے واپس اندر لے گیا۔ مشین گن اب میرے کندھے پر تھی اور ریوالور میں نے دوسری جیب میں ڈال لیا تھا چنانچہ میں اپنے دونوں ہاتھ آزادی سے استعمال کر سکتا تھا۔

عورت قدرتی طور پر سہمی تھی۔ اسے اندر لانے کے لیے مجھے اپنی قوت صرف کرنی پڑی کیونکہ وہ خود کو چھڑانے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھی اور جسم کی ساری طاقت لگا رہی تھی۔ کمرے کے اندر زیرو واٹ کا نیلا بلب جل رہا تھا۔ اس مدھم سے اجالے میں مجھے اس کے وحشت زدہ چہرے کا سیاہی مائل سانولا رنگ نظر آیا۔ وہ تیس سال سے زیادہ عمر کی لگتی تھی اور یقیناً کسی ملازم کی بیوی تھی۔ نیچے کے مخصوص لباس یعنی بالشت بھر کی چولی اور لہنگے میں اس کا ابھرا بدن بہت نمایاں تھا۔ ایک چھوٹے سے تخت پر چھ سات سال کی ایک بچی بڑی معصومیت سے منہ کھولے نیند میں بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ وہ خود جس بستر سے اٹھ کر آئی تھی وہ فرش پر بچھا ہوا تھا۔ میں نے اسے وہیں لٹا دیا۔

"اگر تم نے ذرا بھی آواز نکالی تو میں تم کو اور اس بچی کو کاٹ کر رکھ دوں گا!" میں نے لہجہ خطرناک بنا کے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "تمہارے مالک کے علاوہ میں اندر تین آدمی مار کے آیا ہوں۔ دو خون اور کرنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سمجھ میں آئی بات یا نہیں؟" میں نے اس کی گردن کو ایک جھٹکا دیا۔

اس نے سخت خوفزدہ انداز میں سر کو ہلا کے مجھے یقین دلایا کہ وہ بات سمجھ گئی ہے۔ اس کی مزاحمت اب ختم ہو چکی تھی۔ "یہ جو آوازیں تم سن رہی ہو نا یہ سب لوگ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جب تک اس مشین گن کی آخری گولی ختم نہیں ہو گی اور میرے دونوں ریوالور خالی نہیں ہو جاتے کسی کا باپ بھی میرے نزدیک نہیں آ سکتا۔ جو اندر آئے گا اس کی لاش کھڑکی سے آنگن میں گرے گی۔ سب کا خون اسی مٹی میں ملے گا مگر پہلے تم اپنے شوہر کو لاشوں کے ڈھیر اور خون کے سیلاب سے محفوظ نہیں رکھ سکو گی۔ سمجھ میں آئی بات؟" میں نے پھر اسے جھٹکا دیا۔

اس نے زیادہ خوف کی کیفیت میں سر ہلایا اور دم سادھے بیٹھی رہی۔ لاشوں کا اور خون کا تذکرہ اس کی رہی سہی ہمت کو ختم کرنے کے لیے ضروری تھا۔ [illegible] نفسیاتی دہشت میں زیادہ مبتلا ہوتی ہے۔ فوری ردعمل کے طور پر وہ چیخ بھی سکتی تھی مگر دو چار منٹ گزر جانے کے بعد جب اس کو لگا کہ مجھ سے تعاون کر کے وہ خود کو اپنی بچی کو اور اپنے گھر کو بچا سکتی ہے تو اس کا خوف کچھ کم ہوا۔ اسے یہ اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے سودا کر سکتی ہے۔ میں نے اسے آزاد کر دیا۔ اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے میں محتاط ضرور تھا لیکن وہ چیخ بھی دیتی تو یہ احتیاط مجھے بچا نہیں سکتی تھی۔ شکاری اور ان کے کتے سیدھے ادھر آ جاتے۔ پھر اس عورت کو یا اس کی بچی کو مارنے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ میں محصور ہو جاتا اور محاصرہ کرنے والے اطمینان سے سامنے آئے بغیر ساری کارروائی کرتے۔

"ڈرو نہیں بہن!" میں نے نرمی سے کہا۔ "میں کسی غریب کی جان کا دشمن نہیں ہوں۔ میرا دشمن ترلوچن تھا۔ اسے میں نے مار دیا۔"

"تم... سیٹھ کو مار دیا...؟" وہ کانپتے ہوئے بولی اور ایک ہاتھ کے سہارے آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھی۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں دکھ یا پریشانی کے بجائے حیرانی زیادہ ہے۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال اس لیے نہیں کیا تھا کہ اسے اپنے کانوں سے سنے ہوئے الفاظ پر شک تھا یا پھر وہ دوبارہ مجھ سے جواب سن کے ناممکن کے ممکن ہونے کا یقین کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لہجے میں نامعلوم سا اطمینان کا اظہار تھا جو آہستہ آہستہ اس کے لبوں پر ایک خفیف سی زہر بھری مسکراہٹ بن کے پھیل گیا۔

اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ "یہ تو ہونا ہی تھا ایک نہ ایک دن... بلکہ بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔"

میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "کیوں؟"

اس نے ایک گہری سانس لے کر چولی کو ٹھیک کیا اور دوپٹہ سنبھالا۔ "کیا تم نہیں جانتے؟ یہ تو وہ خود بھی جانتا تھا۔ اسی لیے تو اتنی بڑی فوج رکھتا تھا اپنی حفاظت کے لیے۔ پر بھگوان سے بچا کر کوئی کیسے جی سکتا ہے۔ بے شک قلعے کے اندر بیٹھ جائے۔ دیکھو نا آخر تم نے کر دیا وہ کام جو پہلے کوئی نہیں کر سکا۔"

باہر ایک شور مچا ہوا تھا۔ کتے مسلسل بھونک رہے تھے اور سیٹیاں بجانے والے آپس میں چلا چلا کے کچھ کہہ رہے تھے۔ ان کی ساری دوڑ دھوپ اسی سرونٹ کوارٹر سے کچھ فاصلے پر ہو رہی تھی۔ وہ مجھے باغ کی ایک ایک جھاڑی میں تلاش کرتے ہوں گے۔ یہ میں جانتا تھا۔ وہ درختوں کی شاخوں میں جھانک کر دیکھیں گے۔ محل کے اندر باہر کوئی گوشہ نہیں چھوڑیں گے اور بالآخر سرونٹ کوارٹر کی طرف بھی [illegible]۔ اب تک تو شاید انہوں نے ان کو کچھ نہیں بتایا ہو گا مگر ایک بے ہوش محافظ کی مشین گن اور لاش کا ریوالور غائب پا کے وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ دشمن جو بھی ہے خالی ہاتھ نہیں ہے۔ اب تک تو شاید ترلوچن انہیں اس دشمن کے بارے میں تفصیل

www.paksociety.com

سے بتا چکا ہوگا۔ ممکن ہے اس نے کملا کی تلاش بھی شروع کر دی ہو اور پولیس کو بھی اطلاع کر دی ہو۔

"تم نے کیوں مارا اسے؟" وہ بولی۔

"تم اسی کے گھر میں رہتی ہو۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ وہ کیسا آدمی تھا؟" میں نے کہا۔

"وہ آدمی نہیں راکشش تھا۔" وہ نفرت سے بولی۔

"پھر تو تمھارا بھی فرض بنتا تھا اسے مارنا۔ مگر ظاہر ہے یہ تمھارے بس کی بات نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "یہ نیک کام میں نے کر دیا۔ اب ایک نیکی تم میرے ساتھ کر سکتی ہو۔ کسی طرح مجھے ان شکاری کتوں سے بچاؤ اور یہاں سے نکال دو۔"

"ابھی... ابھی تو بہت مشکل ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ابھی نہ سہی۔ کچھ دیر بعد۔" میں نے کہا۔ اور دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک کتا بہت قریب آ گیا تھا۔ اس کے بھونکنے کی آواز صحن میں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"وہ ادھر آ گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ ہر سرونٹ کوارٹر میں جا کے دیکھیں گے۔ ان کو اندر مت آنے دو۔ باہر ہی سے جواب دے کر لوٹا دو۔ اور مجھے بتاؤ میں کہاں چھپوں؟"

وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے باہر کی طرف کھینچا۔ "جلدی کرو۔ آؤ۔"

"مگر باہر..." میں نے پریشانی اور تذبذب کا شکار ہو کے کہا۔ اس عورت کی باتوں نے مجھے یہ اطمینان ضرور دلا دیا تھا کہ وہ تریویدی کے قتل پر میرے خلاف اپنے دل میں عناد کے جذبات نہیں رکھتی۔ میرا ایک غیر ارادی اور بے مقصد جھوٹ میرے تحفظ کی ضمانت بن گیا تھا۔ اب مجھے اس عورت یا اس کی بچی کے ساتھ زبردستی کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے نزدیک میں نے واقعی اچھا کام کیا تھا چنانچہ مجھے بچانے کی کوشش وہ پورے خلوص سے کرنا چاہتی تھی۔

"جیسا میں کہہ رہی ہوں ویسا کرو۔" اس نے مجھے صحن کے ایک کونے میں بٹھا دیا۔ پھر بڑی پھرتی سے اس نے میرے اوپر میلے کپڑے پھینکنے شروع کیے۔ یہ میلے کپڑے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور ان کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں سی بنی ہوئی تھیں۔ جب پہلی کھیپ میں مجھ پر پتلونیں اور دوسری کھیپ میں قمیصوں کا ڈھیر لگا اور میری ناک نے میل اور پسینے کی بو محسوس کی تو میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ رہا کہ میں کسی دھوبی کے گھر میں ہوں۔ دھوبی اس کا شوہر تھا یا وہ خود دھوبن تھی۔ یہ سب کپڑے اس نے خود ہی الگ الگ کیے ہوں گے جو اب پھر ایک ساتھ مجھ پر گر کے ڈھیر کی صورت اختیار کر رہے تھے۔

"بلاشبہ بالکل۔" اس نے میرے قریب سے سرگوشی کی۔ "اور بھگوان کے لیے چھینک مت مار دینا۔ تمھارے ساتھ میں بھی اپرادھی بن جاؤں گی۔ خود میرا گھر والا میری ناک چوٹی کاٹ ڈالے گا کہ یار تھا تیرا وہ جسے چھپایا تھا۔" وہ کپڑے پھینکتے ہوئے کہتی جا رہی تھی۔ میں گندے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے غائب ہونے کے بعد کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ اتنے کپڑے کہاں سے لا رہی ہے اور اندر باہر کتنی تیزی سے آ جا رہی ہے۔ میرا دھیان باہر کی آوازوں پر تھا۔ مجھے تلاش کرنے والے گھر گھر جھانکتے ہوئے آگے جا رہے تھے۔

جب کسی نے دروازے پر دستک دی تو میرا دل زور سے دھڑکا۔ میلے کپڑوں کے متعفن ڈھیر کے نیچے میں گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔ میرا سر زمین سے لگا ہوا تھا اور کہنیاں مشکل سے مجھے سنبھالنے کی کوشش میں چھل رہی تھیں۔ کیا دھوبن کی ہوشیاری ایک قاتل کی تلاش کرنے والوں کو دھوکا دے سکے گی۔ انسپکٹر کو تو وہ زبان سے قائل کر سکتی تھی کہ ادھر کوئی نہیں آیا۔ مگر کتے تو بو پا گئے تھے۔ پھر ایک خیال نے مجھے بڑی امید دی۔ دھوبن کے ذہن میں تو شاید صرف یہی ہوگا کہ مجھے میلے کپڑوں کا ڈھیر تلاشی کے لیے آنے والوں کو مطمئن کر دے۔ اس کے مختصر گھر کے کمرے، غسل خانے یا باورچی خانے میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں وہ مجھے چھپا سکتی۔ لیکن میلے کپڑوں کے ڈھیر کا مجھے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ میرے جسم کی بو بھی کئی گھروں کے استعمال شدہ کپڑوں کی بو میں شامل ہو گئی تھی۔ یہ مختلف جسموں کی بو تھی۔ اس محل کے اندر کام کرنے والے سب ہی لوگوں کا میل اور پسینہ تھا۔ تریویدی اور اس کے خاندان کے کپڑے ان کپڑوں میں شامل ہوتے تو مجھے بہتر قسم کی خوشبو بھی آتی، لیکن کسی دھوبن کو ان کے کپڑے کیسے دیے جا سکتے تھے۔ یہ لوگ تو ایک لباس کو دوبارہ استعمال کرتے ہی نہیں ہوں گے یا سال چھ مہینے بعد کوئی لباس دوبارہ پہنا جاتا ہوگا تو بھی کسی ٹاپ کلاس ڈرائی کلینر کو ہی اسے دھونے کا اعزاز حاصل ہوتا ہوگا۔

دروازہ دوسری بار زیادہ زور سے بجایا گیا اور کسی نے زور سے کہا۔ "مر گئی ہے کیا؟"

"جی دھوبن مہارانی!" میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کے کہا۔ اس نے فوراً دروازہ کھول دیا ہوتا تو یہ سمجھا جاتا کہ شاید وہ جاگ رہی تھی اور صحن میں ہی تھی۔ مگر وہ مجھے دفنا کے اندر چلی گئی تھی اور دوسری دستک پر بھی جب اس نے جواب دیا تو ایک اکتائی ہوئی آواز کے ساتھ۔

"کون ہے رے۔ آدھی رات کو۔ کواڑ توڑے گا کیا؟" وہ غرائی اور

بڑبڑاتی ہوئی باہر آئی۔ پھر اس نے باہر کا دروازہ کھولا۔

"کیا ہے؟" وہ چلائی۔ "بیل کی طرح منہ اٹھائے چلا آ رہا ہے۔" پھر اس نے چیخ ماری۔ "اپنے باپ کو ساتھ کیوں لایا ہے؟"

"چپ کر حرام زادی۔" کسی نے غرا کے کہا۔ "ہم ایک قاتل ڈھونڈ رہے ہیں۔ ادھر تو نہیں آیا کوئی؟"

"آیا تھا۔ اندر سو رہا تھا میرے ساتھ۔" دھوبن نے چیخ کر کہا۔

"چل ڈاکو، بھونکنے دے اس کتیا کو۔"

ڈاکو غالباً وہ کتا تھا جس کو دھوبن نے بیل کا باپ قرار دے کر چیخ ماری تھی۔ میں دم سادھے پڑا رہا۔ دھوبن عقل کی نہیں زبان کی بھی بڑی تیز تھی۔ میں نے کتے کے اندر جانے کی اور غرانے کی آواز سنی۔ چند سیکنڈ میں وہ پھر باہر آ گئے۔ تلاشی کے لیے آنے والے نے دھوبن سے ایک بڑی بے شرمی کی بات کی۔ دھوبن نے جواب میں اپنے سیاں کا نام لے کر کہا کہ اپنی اماں کو بھیج دے اس کے پاس آرام کے لیے۔ غالباً اس نے دھوبن سے ملاقات کا وقت مانگا تھا۔

"ادھر... ادھر تو..." وہ ہنسا۔ "دیکھ میلے کپڑوں کا ڈھیر ہے وہ..." اس نے مجھے ایک خاصی اشتعال انگیز گالی دی۔ کتا میرے بہت قریب آ گیا۔ میرے دل کی دھڑکن رکنے لگی اور ٹریگر پر میری انگلی کی گرفت سخت ہو گئی۔ کشیدگی سے میرے اعصاب چٹخنے لگے۔ کتے کا کیا بھروسا۔ اس کی شامہ اور مہارت کا تقاضا تھا کہ وہ میری بو کو گرد و پیش کی ہر بو سے الگ کر کے بتا دے۔

انتظار و اضطراب، خوف اور دہشت کی سنسنی سے معمور وہ لمحہ میرے لیے زندگی اور موت کے درمیان کے خلا کی طرح تھا۔ اگر کتا مجھے بہت سے جسموں کے میل اور پسینے کی بو سے الگ ہونے والی چیز سمجھ کے ان میلے کپڑوں سے نکال لیتا تو میری شکست ہو جاتی۔ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زیادہ زور آور ہوتا ہے۔ میں اس ڈھیر میں دریافت ہوتے ہی کھل کے کھیل سکتا تھا۔ شاید فوراً اس کتے کے ساتھ آنے والے کو مار دیتا۔ اس کے بعد خود بھی مارا جاتا۔

لیکن کتے کی ناک کو اس عورت کی عقل نے شکست دے دی جو ایک دھوبن تھی اور جو مجھے کسی رشتے سے نہیں جانتی تھی سوائے انسانیت کے رشتے کے۔ اس نے ایک حقیقت کو پہلے ہی تسلیم کر لیا تھا کہ تریویدی ایک شیطان ہے۔ دوسری حقیقت کو اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ میں مجرم نہیں ہوں کیونکہ برائی کو مٹانے والے نے نیکی کی ہے۔ بس اسی پرانے فلسفے میں جینے والی اس عورت نے اپنی جان کی بازی لگا کے ایک جوا کھیلا اور جیت گئی۔

جب شکاری اور کتے دونوں چلے گئے تو اس نے دروازہ بند کیا۔ میرا خیال تھا کہ اب مجھے اس کی آواز سنائی دے گی۔ وہ کہے گی کہ چلو اب نکل آؤ خطرہ ٹل گیا۔ مگر میں نے اندر کے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ میں اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر اس میلے کپڑوں کے ڈھیر کی قید با عفونت کب تمام ہوگی۔ پھر میں دھوبن کی چالاکی سمجھ گیا۔ وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔ اسے ڈر ہوگا کہ باہر کے بند دروازے کی جھری سے کوئی جھانک رہا ہو یا دیوار کے اوپر سے دیکھ لے۔ اس نے نارمل طریقے پر تلاش کرنے والے کو کوسا اور گویا پھر سو گئی۔ کتے اب قریب نہیں بھونک رہے تھے۔ وہ فصیل کے شمال اور مغرب کی جانب چلے گئے تھے۔ باہر گشت کرنے والوں کی بھی اب کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تقریباً دس منٹ جو میرے لیے دس گھنٹوں سے کم نہیں تھے، دروازہ پھر کھلا اور میں نے اس کے قدموں کی آہٹ سنی۔

"باہر آ جاؤ بابو۔" اس نے میلے کپڑے ہٹا کے کہا۔

میں بڑی مشکل سے اٹھا۔ تازہ ہوا میں ایک گہری سانس لے کر میں نے کمر کو سیدھا کیا اور اسٹین گن کو پھر کندھے پر ڈال لیا۔

"تم کیا ان کی عورت ہو؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھارا کس طرح شکریہ ادا کروں۔" میں نے اس کا موٹا بھدا ہاتھ چوم کے کہا۔

وہ مسکرائی۔ "اندر آ جاؤ۔ ان کا کوئی بھروسا نہیں، پھر آ جائیں۔"

میں نے کہا۔ "وہ پھر آ گئے تو تم کیا کرو گی؟"

"جو اب کیا تھا۔" اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

"تمھارا گھر والا..... دھوبی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بابو! یہ کام تو میں کرتی ہوں۔ میرا باپ اور میرے سگے بھائی دھوبی گھاٹ پر کپڑے کا کام کرتے ہیں۔" وہ بولی۔

"یہ بچی ہے تمھاری؟"

"کیا تمھیں بچا نظر آتا ہے؟" وہ بولی۔ "آرام سے بیٹھ جاؤ اب۔"

"آرام سے میں کیسے بیٹھ سکتا ہوں بس دھوبن۔" میں نے کہا۔

"مجھے جانا ہے۔" اور تخت کے کونے پر آرام سے بیٹھ گیا۔

"ابھی کیسے جاؤ گے؟" وہ بولی۔

"صبح کیسے جاؤں گا؟" میں نے کہا۔ "ابھی تو رات ہے۔"

"رات سے کیا ہوتا ہے۔ باہر کون سے راستے سے جاؤ گے؟ ان کو معلوم ہے کہ تم اندر ہی ہو۔" وہ بولی۔

"کچھ بھی ہو۔ یہاں تم کب تک چھپائے رکھو گی؟ مجھے اپنا راستہ خود ہی بنانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "یا میں مارا جاؤں گا یا سب

www.paksociety.com

کو مار کے نکل جاؤں گا۔"

اچانک دروازے پہ دستک ہوئی۔ میں اچھل پڑا۔ میرے لیے یہ آواز بم کے دھماکے سے کم نہ تھی۔ میں گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب کون آ گیا؟" میں نے کہا۔

"میرا گھر والا ہوگا۔" وہ بولی۔ "تم ایسا کرو اس تخت کے نیچے چلے جاؤ، جلدی....."

میں نے اپنے سر پہ ہاتھ مارا۔ یا علم الحجاب! آج تقدیر میں کیا ہے۔ پھر ہو نہ ہو کسی کے ہاتھوں مرنا ہے۔ مجھے میں نے تخت کے نیچے چوروں کی طرح پناہ لے کر سوچا۔ اب اس وقت شامت اعمال کے باعث چھینک آ جائے مجھے تو دھوبی کا اپنی باوفا دھرم پتنی پہ شک میں مبتلا ہونا بڑی مہلک غلط فہمی بن جائے گا۔ وہ بلاوجہ جوش رقابت میں اپنی سمجھدار بیوی کو مار ڈالے گا اور مجھے مار نہیں سکا تو مروا دے گا یا پھر میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔

میں اس بدکردار شخص کی طرح تخت کے نیچے چھپا ہوا تھا جس نے کسی دوسری عورت کے ساتھ ناجائز مراسم استوار کر لیے ہوں۔ ایسی کوئی بات نہ ہو تب بھی، جو نظر آتی تھی آدمی کی آنکھ تو ظاہر کو دیکھتی ہے۔ سچ کو سمجھنے یا پرکھنے سے پہلے غیرت میں آ جانے والے خون کر بیٹھتے ہیں۔

باہر دھوبن نے چلا کے کہا۔ "ارے ایسی کیا آفت آ گئی...؟" مرد نے ہی ہی کر کے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "تو ایسے ہی غصے ہو جاتی ہے۔ میں تو بتانے آیا تھا....."

"معلوم ہے معلوم ہے مجھے۔ ابھی آیا تھا تیرا وہ سنگا بھی [illegible] کر سیدھا گھس آیا گھر میں۔" دھوبن نے کہا۔ "اسے عجائب گھر کے کو میرے ساتھ لفنگا پن کرتا ہے۔ کتنی چیزیں دوں گی کسی دن اور لکھت ڈلی کے استری پھیر دوں گی۔"

"پھر کیا کہا اس نے.....؟"

"ہاں سنو اب جھگڑا مت کرنا اس کے ساتھ۔ اس کی تو عادت ہے۔ سارے کپڑے الگ الگ کیے تھے۔ سب ملا گیا۔ میں نے کہا کپڑے کیا جھاڑ جھاڑ کے دیکھتا ہے جیبوں میں بھی دیکھ لے کسی میں وہ بتیا دا اندر نہ ہو۔ چل اب جا مجھے سونے دے۔ اللہ....."

"دروازہ بند کر لو۔" اس نے عاجزی سے کہا اور کھی کھی کرتا ہوا چلا گیا۔ میں نے پھر خدا کا شکر ادا کیا اور تخت کے نیچے سے نکل آیا۔

"تو نے کچھ کھایا پیا ہے؟" دھوبن نے ہمدردی سے کہا۔

"ہاں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "بس اب میں جاؤں گا۔"

"کہاں؟ ابھی نہیں۔" وہ مجھے ڈانٹ کر بولی۔ "صبح میں خود نکال دوں گی تجھے باہر۔ دو گھنٹے رک نہیں سکتا؟"

"رک تو سکتا ہوں۔" میں نے پھر تخت پہ بیٹھ کے کہا۔ "مگر اس دھوبن! تم کیسے نکالو گی مجھے؟"

"میں یہ کپڑے لے جاؤں گی دھلائی کے لیے۔ [illegible]" وہ بولی۔ "جیسے یہاں چھپایا تھا ایسے ہی تجھے [illegible]"

"مگر..... کیسے...؟ اچھا میرا مطلب ہے پہلے مجھے گٹھری میں باندھ دو گی اور سر پہ اٹھا کے لے جاؤ گی؟"

وہ ہنس پڑی۔ "کیسی بے عقلی کی باتیں کرتا ہے تو۔ [illegible] پتلون پہن لگا لیا ہے۔ ہاتھ میں بندوق اٹھائی ہے۔ بے وقوف۔"

میں نے تسلیم کیا۔ "یہ سچ فرمایا آپ نے بی بی!"

"میں لے جاؤں گی اپنی گدھا گاڑی میں۔" وہ بولی۔ "کوئی نہیں دیکھے گا مجھے بستی والے، دن میں صبح صبح نکل جاتی ہوں، میں کپڑے چھوڑ کے پھر آ جاتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تم کو مجھ سے ڈر نہیں لگتا؟ آخر میں ایک آدمی ہوں۔"

"مجھے کیوں ڈر لگے گا؟ میں نے کیا بگاڑا ہے تیرا۔ تو برا آدمی ہوتا تو اب تک انتظار کرتا؟" وہ بولی۔ "جو مرد کو ہونا تھا وہ ایسی شکل نہ ہوتی۔ تو نے تو دیکھا بھی نہیں ادھر ادھر۔ آنکھ نیچے رکھتا ہے۔"

میں حیران رہ گیا۔ "اچھا..... کتنا زیور پہن رکھا ہے تم نے؟"

"تو نے تو غور بھی نہیں کیا۔ خیر چھوڑ، ایک بات بتا۔ تم نے یہ پوچھا تھا کہ میں نے تریوینی کو قتل کیا تو اچھا کیا۔"

"برے آدمی کو قتل کر دینا اچھی بات ہے۔ جنت کی بات ہے۔" وہ بولی۔ "تیرا کیا نقصان کیا تھا اس نے؟"

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ تمہارا کیا نقصان کیا تھا اس نے؟" میں نے کہا۔ "تم اس کا نمک بھی کھاتی ہو۔"

"چل رہنے دے ختم کر بات۔ میں بھی نہیں بتا سکتی کہ میرے پاس کیا تھا جو اس نے لے لیا۔" وہ بگڑ کے بولی۔

اس کے بعد میں نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ عورت ہر بات نہیں بتا سکتی۔ نمک اور عزت کی قیمت بھی برابر نہیں ہو سکتی کہ کوئی بازار میں سودا کر سکے۔ تریوینی سے اس کی عداوت کے ایک سو ایک اسباب ہو سکتے تھے جو میں فرض کر سکتا تھا۔ میرے لیے ان کا جاننا قطعی ضروری نہیں تھا۔ قابل تعریف یہ عورت تھی جس کے اعصاب اتنے مضبوط تھے کہ اس نے تریوینی جیسے شخص کے دشمن کو پناہ دی اور اس کے لیے سارے خطرات مول لیے۔

میرا دل چاہتا تھا کہ اب اس سے اجازت لوں اور سواری کا اپنے رسک پہ کروں لیکن مجھے کملا کی بات یاد آ گئی تھی جس نے کہا تھا کہ اس کلبے کے حفاظتی انتظامات کو میں شکست نہیں دے سکتا۔ دھوبن بھی مجھے منع کر رہی تھی اور سمجھا رہی تھی کہ میرے بچنے کا واحد

راستہ یہی ہے کہ وہ اسی قصبے میں رہتی تھی۔ وہ [illegible] سے نکلنا بھی آتا تھا اور نکالنا بھی۔ مجھے تذبذب تھا تو بس اس لیے کہ میں اس کے احسانات کا بدلہ اس کے لیے مزید [illegible] نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خدانخواستہ کسی نے اسے [illegible] پکڑ لیا تو میرا جو ہوگا سو ہوگا وہ بڑی مشکل میں پھنس جائے گی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی مگر وہ نہیں مانی۔ پھر مجھے اپنے جھوٹ پر افسوس ہونے لگا۔ یہ سب کچھ وہ محض اس لیے کر رہی تھی کہ اس کے خیال میں تریوینی کو قتل کر کے میں نے اس کا کوئی پرانا حساب برابر کر دیا تھا جو وہ خود نہ کر سکتی تھی۔ بعد میں جب اسے معلوم ہوگا کہ وہ ایک جھوٹ تھا اور تریوینی زندہ نظر آئے گا تو اسے کتنا صدمہ ہوگا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ میں نے اسے بے وقوف بنایا تھا۔ اسے اپنی تمام جدوجہد کے رائیگاں جانے پر افسوس ہوگا جو وہ مجھے بحفاظت باہر پہنچانے کے لیے کر رہی تھی۔

ایک بار مجھے خیال آیا بھی کہ کیوں نہ اس سے سب سچ کہہ دوں۔ مگر پھر میں ڈر گیا۔ اگر میں نے ایک سچ بولا تو مجھے سو جھوٹ بھی بولنے پڑیں گے کہ میں یہاں کیوں آیا تھا اور کیسے آیا تھا۔ بہت کچھ چھپانا بھی پڑے گا۔ مثلاً وہ جو میں نے کملا کے ساتھ کیا اور جو کملا کے ساتھ نہیں کیا۔ سچ اور جھوٹ کا یہ [illegible] بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اسے پھر [illegible] کے حال پر چھوڑ دینے کے [illegible] وقت تھا کہ میں اپنی [illegible] ساتھ سکوں اور وہ اس میں کوئی [illegible]۔ میرا یہ تصور بہتر تھا جس سے میری جان بچ سکتی تھی اور اس دھوبن کا اعتماد میں دھوکے کا صدمہ اٹھانے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا تھا۔

[illegible] ڈیڑھ گھنٹا میں نے اس سے غیر متعلق باتیں کرتے گزارے۔ [illegible] حقیقت سے متعلق باتیں رہی تھیں۔ میں نے اس سے [illegible] اور بچی کے بارے میں پوچھا اور اس نے جو کچھ بتایا [illegible] کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ جب میری باری آئی تو میں نے [illegible] سنانے پر اکتفا کیا۔ ایک دھوبن اور [illegible] اور ایک گھر کی کہانی۔ اس میں دھوبن کے لیے کوئی [illegible] بات نہیں تھی۔ دونوں کی کہانی میں فرق صرف موقع شخص [illegible]۔ [illegible] خیال تھا کہ تریوینی کا دشمن اور قاتل کوئی غریب کمزور اور [illegible] آدمی نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ [illegible] دولت مند تو نہیں ہوں لیکن طاقت صرف دولت سے نہیں آتی۔ جذبات کی شدید مرضی سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ [illegible] تریوینی کو کسی نے بھی اپنا انتقام لینے کے لیے قتل کیا ہے۔

صبح ساڑھے پانچ بجے اس نے مجھے چائے بنا کے پلائی اور خود بھی پی۔ وہ چائے مجھے اس لیے بہت اچھی لگی کہ اس میں اعتماد اور خلوص نیت کی مہک تھی۔ اس نے مجھے تقویت دی اور یقین عطا کیا کہ جدوجہد ختم نہیں ہوئی۔ شکاری جو تدبیر جال پھینکنے کی [illegible] تقدیر نے ان کا ہر جال کاٹ دیا ہے اور ان کی ہر چال ناکام کر دی ہے لیکن یہ بات وہ ابھی نہیں جانتے۔ شاید انہیں کبھی معلوم نہ ہوگا کہ ایسے سخت حفاظتی انتظامات کو ایک دھوبن کی عقل نے بے مصرف کر دیا تھا۔

میں نے میلے کپڑے باندھنے میں اس کی مدد کی۔ اتنی دیر میں وہ گدھے کو گاڑی میں جوت کے لے آئی۔ گٹھریاں گدھا گاڑی میں رکھنے کے بعد اس نے کہا۔

"اب تو اس کے بیچ میں بیٹھ جا بابو۔"

"کیا... یعنی مجھے بھی گٹھری میں باندھو گی؟" میں نے کہا۔

"اور کیا گٹھری کے اوپر بچا کے لے جاؤں گی؟" وہ بولی۔

"اسی طرح جیسے کی صبح گٹھری سے جاتی ہوں میں۔"

"اچھا..... یہ دیکھو کسی نے چیک کر لیا تو....؟"

"ارے کچھ نہیں ہوگا تو بیٹھ ہی جا۔" وہ بولی۔

"تمہاری بچی تو ابھی سو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ سوتی نہیں رہے گی۔" اس نے کہا۔ "میں واپس آ جاؤں گی دو گھنٹے میں۔"

"تم اسے کوارٹر میں ایسے ہی چھوڑ جاؤ گی؟ وہ ڈر نہیں جائے گی اور جاگ کے رونے لگی تو؟"

"ابھی اس کا باپ آ جائے گا گھنٹا بھر بعد سات بجے۔" وہ بولی۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر میں نے کہا۔ "تمہارا شکریہ تو میں کیا ادا کروں۔ میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔ یہ احسان ایسا ہے کہ میں اس کا بدلہ چکانے کی کوشش بھی نہیں کر سکتا۔ [illegible] یاد رکھوں گا ہمیشہ۔ اب برا مت ماننا ایک بات کا۔" میں نے جیب سے ایک ہزار روپے نکالے اور سوتی ہوئی بچی کی مٹھی میں پکڑا دیے۔ "جب یہ سو کر اٹھے نا تو اسے بتا دینا کہ تمہارا ایک ماما آیا تھا بہت دور سے، وہ دے گیا۔"

اس نے احتجاج کے لیے منہ کھولا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کے چپ رہی۔ رشتوں کا بھرم رکھنے کے لیے آدمی بہت کچھ برداشت کر جاتا ہے۔

"خدا حافظ۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"مسلمان ہو تم؟" اس نے چونک کر کہا اور اس کا چہرہ اتر گیا۔

"ہاں بہن میں اور سارے ہندوستان میں مسلمان بہت

www.paksociety.com

میں آئیک نے اس کی مایوسی پر حیران ہو کے کہا۔

"میں تم سے پہلے پوچھ لیتی تو اچھا تھا..."

مجھے تھوڑا سا افسوس ہوا۔ "کیا تم نے ہندو سمجھ کے میری مدد کی تھی مگر تم کو پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ میں مسلمان ہوں تو مجھے پکڑوا دیتیں؟"

"معلوم نہیں، چلو چھوڑو اب۔"

"نہیں، مجھے بتاؤ کیا ہے یہ بات، تم ہمت والی اور مضبوط کردار کی عورت ہو۔ تمہارا دل بہت بڑا ہے۔"

"وہ بھی ایک بڑا ہمت والا مسلمان مرد تھا اور بڑا نیک سمجھا جاتا تھا اسے بھی، جس نے میری ماں کو اغوا کر لیا تھا۔" وہ زہر آلود لہجے میں بولی۔ "اتنی بڑی داڑھی تھی اس کی ایک بالشت کی۔ وہ بھی مضبوط کردار کا مالک تھا۔"

میں نے کہا۔ "داڑھی ایک ہاتھ سے تو نہیں بجتی۔"

اس نے مجھے نفرت سے دیکھا۔ "تم میری ماں پر الزام لگا رہے ہو کہ وہ اپنی مرضی سے بھاگ گئی تھی۔ اپنے گھر اور بچوں کو چھوڑ کے۔"

"نہیں، یہ مطلب نہیں تھا میرا۔" میں نے دل ہی دل میں سخت شرمندہ ہو کے کہا۔ "کب کی بات ہے یہ؟"

"اس وقت کی جب ہم جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔ اس نے ہماری مجبوری سے فائدہ اٹھا لیا۔ ہمیں سرحد پار پہنچانے کے بہانے لوٹ لیا۔ میری ماں کو ہم سے جدا کر دیا۔ اسے وہ دھوکے سے واپس لے گیا اور ہمیں بھی سرحدی لٹیروں کے سپرد کر گیا... معلوم نہیں ان پر کیا بیتی۔ ضرور ماں نے خودکشی کر لی ہوگی۔" وہ بے حد مغموم نظر آنے لگی تھی۔

میں نے کہا۔ "تم نے یا تمہارے باپ نے بعد میں کبھی اس کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی؟"

"کہاں جاتے، کس سے پوچھتے... اور کیسے معلوم کرتے؟ ہمیں بھی معلوم ہوتا کہ مر گئی وہ۔"

"یہ سب واقعی افسوسناک ہے۔ جو کچھ اس زمانے میں کسی کے ساتھ بھی ہو پڑا ہوا۔ ایک ایسا ہی دور تھا وہ جب انسانوں پر بھی شیطان سوار تھا۔ میں کسی کی صفائی پیش نہیں کرتا لیکن سب لوگ ایک سے نہیں ہوتے۔ اچھے برے دونوں طرف تھے۔ اب میں تم کو کیا بتاؤں کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میرا تو پورا خاندان کٹ گیا تھا جس میں میری ماں تھی اور بہنیں تھیں۔ چھوٹے بھائی تھے۔ میں لاشوں کے نیچے پڑا رہ گیا تھا۔ میری ایک بہن نے کنوئیں میں کود کے جان دے دی تھی۔ کیا اس بنیاد پر مجھے ان سب سے نفرت ہونی چاہیے جو مسلمان نہیں تھے۔ ہر ہندو سکھ کو دشمن سمجھنا چاہیے؟"

وہ حیرانی سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کا زہر پھیلا رنگ اب باقی نہیں رہا تھا۔ لوگ اونٹ کے بارے میں کہتے ہیں کہ جب تک پہاڑ کے نیچے سے نہ گزرے اونٹ خود کو بہت بڑا سمجھتا رہتا ہے۔ آدمی بھی خود کو سب سے زیادہ مظلوم اور مصیبت زدہ سمجھتا ہے مگر پھر کوئی اس سے زیادہ بدقسمت مل جاتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ ایک میرے ہی دل کا زخم خونچکاں نہیں۔ یہاں اور بھی دل ہیں جو زخموں سے لہو فشاں ہیں۔ دیکی کا یہ عمر بھر ماضی کا ایک خونی اقتباس سنا کے میں نے کسی حد تک اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ اب وہ قدرے شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

"اور تم خوش قسمت یوں بھی ہو۔" میں نے کہا۔ "کہ اب بار بار ہو۔ میرے ساتھ تو ابھی تک بدقسمتی کا سفر جاری ہے۔ پہلے میرے باپ کو قتل کیا گیا۔ وہ ایک شریف آدمی تھا۔ اس کے دشمنوں نے پہلے اس کا سارا کاروبار ہتھیا لیا پھر اسے اپنے راستے سے ہٹا دیا۔ آج کل وہ میرے پیچھے ہیں۔ تریویدی بھی انہی کا ساتھی تھا۔ مجبوری ہے کہ میں تم کو ساری کہانی نہیں سنا سکتا۔ یہ سمجھ لو کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ ہاں، ایک جھوٹ بولا تھا میں نے تم سے ضرورت کے تحت۔ میں تریویدی کو قتل کرنے ضرور آیا تھا مگر میں اس کوشش میں ناکام رہا۔ پہلے میں اس کی پارٹی کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ اس سے جان چھڑا کے بھاگا تو ایک شخص میرے ہاتھوں مارا گیا۔ جس نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ ایک کو میں نے زخمی کر دیا تھا۔"

"تو تریویدی... زندہ ہے؟" وہ آہستہ سے بولی۔

"ہاں، وہ ابھی زندہ ہے۔ ابھی اس کے لیے خدا کی طرف سے ملنے والی زندگی کی مہلت تمام نہیں ہوئی۔ اس کے ساتھ وہ شخص جس کو میں اپنے باپ کا قاتل سمجھتا ہوں۔ یہ میں نے تم کو اس لیے بتا دیا کہ بعد میں تم مجھے دھوکے باز نہ کہو۔"

"کیا تم پاکستان سے آئے ہو؟" وہ بولی۔

میں نے کہا۔ "یہ اندازہ کیسے کیا تم نے؟"

"تم نے خود ہی تو بتایا ہے ابھی کہ تمہارا خاندان مارا گیا تھا۔ ان کو مارنے والے ہندو یا سکھ ہوں گے۔ جیسے ہم ادھر آ رہے تھے۔ تم ادھر جا رہے ہو گے۔"

میں نے کہا۔ "جب تم نے ساری بات سمجھ ہی لی ہے تو میں کیوں انکار کروں۔ اس سے میرے اور تمہارے درمیان دوستی کا رشتہ زیادہ پکا ہو گیا۔"

وہ حیران ہو کے بولی۔ "وہ کیوں؟"

"بھئی ایک تو میں مسلمان اور تم ہندو۔ دوسرے میں پاکستانی اور تم بھارتی۔ اب تم چاہو تو مجھے پکڑوا دو ورنہ..."

اس نے ایک گہری سانس لی۔ "چھوڑو، یہ بالو کیا کہتا ہے اس

زندگی میں۔ ویسے بھی چھوٹے آدمی کی دوستی کیا اور بڑے آدمی کی۔ جو بھلائی کر لی کسی کے ساتھ وہی بہت، برائی کیا۔ نہیں، دل کا چین بھی نہیں رہے گا۔ مطلب سمجھ گئے ہو گے۔"

میں بھوچکا رہ گیا۔ اس نے اپنی سیدھی سادی زبان میں زندگی کا سارا فلسفہ سمیٹ لیا تھا اور ساری الہامی کتابوں کی تعلیمات کا نچوڑ پیش کر دیا تھا اور وہ نظریہ حیات پیش کر دیا جس پر عمل کیا جاتا تو یہی دنیا آج کے آدمی کے لیے جنت کے خواب کی حقیقی تعبیر بن جاتی۔ اس دھوبن کو احساس نہیں تھا کہ وہ کتنی بہت بڑی بات کہہ رہی ہے۔ اس نے تو جو دل میں تھا کہہ دیا۔

میں خاموشی سے گٹھڑی کھول کے بیٹھ گیا اور اس نے میرے چاروں طرف میلے کپڑے جما کے گٹھڑی کو پھر ایسے باندھ دیا کہ باہر سے دیکھنے والوں کو شک بھی نہ ہو کہ ایک دھوبن ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کے ان کے دشمن کو لے کے جا رہی ہے۔ وہ سب بہت ہوشیار، تجربہ کار اور مستعد لوگ تھے اور وہ صرف دھوبن تھی۔ جاہل، بے حیثیت اور ناقص العقل جو ہر روز صبح سے شام تک جمع ہونے والے میلے کپڑوں کی گٹھڑی صبح سویرے اپنی گدھا گاڑی پر لے جاتی تھی۔ آج بھی گدھا گاڑی پر میرا بوجھ تھا۔ کسی کو کیسے خیال آ سکتا تھا کہ وہ ایسی زبردست اداکاری کا مظاہرہ بھی کر سکتی ہے کہ سب دیکھتے ہی رہ جائیں۔

گدھا گاڑی جھٹکے سے آہستہ آہستہ چلی۔ اس گاڑی کی ڈرائیور دھوبن اور بچپن سے حاصل ہونے والی ٹریننگ کے مطابق گدھے کو چابک رسید کرنے اور رواں رکھنے کے لیے بڑی روانی سے ہاتھ اور زبان چلا رہی تھی۔ میری پیکنگ بڑے شاندار طریقے سے ہوئی تھی۔ اتنے بڑے کپڑوں کے ڈھیر میں مجھے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ میں خود کو کم سے کم جگہ میں سمیٹ چکا تھا اور تا حد میری پوزیشن شکم مادر میں پرورش پانے والے بچے جیسی تھی۔

میرا خیال تھا کہ گیٹ پر تریویدی سے ملاقات ہو سکتی ہے لیکن چند منٹ بعد یہ ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی۔

میں نے پہلے دھوبن کی آواز سنی۔ "سلام سیٹھ جی۔"

اس سلام کا کسی نے جواب نہیں دیا۔

"کون ہے یہ، کیا لے جا رہی ہے؟" یہ آواز ولاور کی تھی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ خبیث ابھی تک اندر ہی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تریویدی اور اس کے درمیان کاروباری مذاکرات ختم نہیں ہوئے تھے۔ ولاور بہت ہوشیار بزنس مین تھا تریویدی اس کے مقابلے میں بہت بڑا حرام زادہ تھا۔ کملا جیسی بیٹی کے لیے وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ مگر اس طرح کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ولاور ہاتھ میں آئے ہوئے شکار کو چھوڑ کر جانے والا شکاری نہیں تھا۔ اس نے بولی بڑھا کے تریویدی کو بھی شکار کر لیا ہوگا۔ اور ان کے درمیان معاملات خوش اسلوبی سے طے پا گئے ہوں گے کہ صبح سب ٹھیک ہو جائے گا۔

"ارے کھول دروازہ۔ گھور کیا دیکھ رہا ہے میرا۔ اتنی خوبصورت تو نہیں ہوں میں۔" دھوبن نے کہا۔

"تریویدی!" ولاور نے کہا۔

"یہ دھوبن ہے، جانے دو اسے۔" تریویدی بولا۔

"میں کہتا ہوں چیک کر لو اس گٹھڑی میں..."

"فضول باتیں مت کرو۔ میں کسی ملازم پر شک کرنے کا عادی نہیں۔"

"کیا ملازم نمک حرام نہیں ہوتے؟" ولاور نے خفگی سے کہا۔

"میرے ملازم نہیں ہوتے۔" تریویدی نے مختصر جواب دیا۔

شاید ولاور کی اس بات سے تسلی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اپنے چاروں طرف دباؤ محسوس کیا۔ یہ ولاور کے ہاتھ تھے جو گٹھڑی کو ٹٹول رہے تھے۔ اسٹین گن میرے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ میں کسی بھی ناخوشگوار صورت حال کے لیے بالکل تیار تھا۔ اپنے دریافت کر لیے جانے کے امکانات کو میں نے ایک لمحے کے لیے بھی نظرانداز نہیں کیا تھا اور اس بارے میں میرے ذہن میں کوئی ابہام نہ تھا کہ اگر ولاور اس گٹھڑی کو کھولتا یا شک کا اظہار کرتا تو میں خود ہی باہر نکل آتا اور پھر جو بھی سامنے نظر آتا اسے بھون دیتا۔ اسٹین گن کا ایک راؤنڈ ان سب سے نمٹنے کے لیے کافی ہوتا جو گیٹ پر موجود تھے۔

"ہائے رام، اندر کیا دیکھ رہے ہو اب میں صاحب!" دھوبن نے کہا۔ "تمہارا کوئی مال گیا آگیا ہے کیا۔ ہم دھو دیں گے۔"

"بہت بدتمیز عورت ہے۔" ولاور نے بے رخی سے کہا مگر اس کا ہاتھ گٹھڑی پر سے ہٹ گیا۔

"چل، دفع ہو جا۔" یہ آواز تریویدی کی تھی۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ جو چند منٹ کی شدید آزمائش میں سخت کشیدہ ہو گئے تھے۔ سکون کا اور تحفظ و عافیت کا خیال میرے سارے وجود میں راحت اور مسرت کا احساس بن کے پھیلنے لگا۔ گدھا گاڑی نے پھر جھٹکا لیا اور آگے بڑھی۔ مجھے فرار کی ان گنت کہانیاں یاد آ گئیں۔ کیسے کیسے ناممکن طریقے اختیار کر کے لوگ ان قید خانوں سے نکل گئے تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں سے جسم کے ساتھ روح نہیں نکل

www.paksociety.com

سکتی۔ ہاں روح نکل جائے تو پھر جسم باہر جا سکتا ہے۔ میرا طریقہ سب سے انوکھا رہا۔ شاید جب تک انسان میں زندہ رہنے اور آزاد رہنے کی خواہش ہے، قید کرنے والے ناممکنات کے زنداں تعمیر کرتے رہیں گے مگر ارادے رکھنے والے ان کی شکست کے نئے سامان نئے انداز سے حاصل کرتے رہیں گے اور یہ مقابلہ جاری رہے گا۔

ایک بار پھر میں اپنی جدوجہد کے کامیاب ہو جانے کی خوشی میں خدا کے سامنے شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کرنے پر مجبور تھا۔ اس نے مجھے ہمت اور طاقت دی اور پھر وسائل بھی دیے اور راستہ دیا۔ گدھا گاڑی جیسے ایک طلسماتی سواری بن گئی تھی اڑنے والے قالین کی طرح۔ جس پہ سوار ہو کے میں اپنے دشمنوں کے سامنے سے گزر گیا، اور وہ مجھے دیکھ بھی نہ سکے۔ "میں آ رہا ہوں، میں آ رہا ہوں۔" میں نے زبان خاموشی میں چلا کے اپنے دوستوں سے کہا۔ "ایک شب کی جدائی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے رابعہ سے کہا۔

بالآخر گدھا گاڑی ٹھہر گئی۔

دھوبن نے کہا۔ "آ جاؤ باہر بابو۔ خطرے کی اب کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے ہاتھ پیر ہلا کے میلے کپڑوں کو ادھر ادھر کیا اور اس گٹھڑی میں سے ایسے باہر آیا جیسے انڈے کے خول میں سے چوزہ برآمد ہوتا ہے۔

"یا آ آ ..... ہو وو وو ....." میں نے چلا کے کہا۔ "دھوبن دی گریٹ، وومن آف دی ایئر۔ تم کو ایم آر ایس کی طرف سے اسپیشل گن کا سیلوٹ۔"

وہ مجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اس کا ایسا سمجھنا غلط بھی نہ تھا۔ میرے جذبات کی کیفیت میں پاگل پن نمایاں تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں دھوبن کی کمر میں ہاتھ ڈال کے ایک زبردست جھگڑا ڈالوں اور کوئی فضول سا گانا بھی گاؤں۔ "بیتاں دھوبن تیرے حوصلے کا بول بالا کر دیا، دشمنوں کا منہ کالا ..... وغیرہ۔"

لیکن گدھا گاڑی سے چھلانگ مارنے کے بعد میں نے صرف اس کا ہاتھ پکڑ کے دوسری بار چوما اور اپنی آنکھوں سے لگا کر کہا۔ "خدا کرے کبھی تمہاری زندگی میں کوئی غم نہ آئے۔ میرا خدا اور تمہارا بھگوان تمہیں وہ سب کچھ دے جس سے خوشی ملتی ہے۔"

وہ ہنسی۔ "اب کہاں جاؤ گے تم؟"

"جہاں سینگ سمائیں۔" میں نے کہا۔ "کیا سینگ میں میرے سر پہ نہیں۔ گدھے کے سر پہ سینگ کہاں۔ میرا مطلب ہے کہ جہاں تقدیر لے جائے۔ تم اب جاؤ۔ خدا حافظ۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "بھگوان رکھشا کرے تمہاری۔"

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ "مس دھوبن، یہ کپڑے ..... تو پھر چل جائیں گے مگر ایک چادر دے دو مجھے، جس میں یہ چھپا لوں۔" میں نے سٹین گن کو اٹھا کے کہا۔

اس نے کہا۔ "کپڑے بھی بدل ڈالو تو دیکھ لو اس ڈھیر میں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں، بس یہ چادر کافی ہے۔" اور اس میں سے ایک چادر نکال کے بکل مار لی۔ اس طرح میرا ... بھی نمایاں نہ رہا۔ اب نیچے صرف پتلون دکھائی دیتی تھی۔ ... پر چادر نے سینے، چہرے تک چھپا لیا۔ فضا میں آغاز سحر کی سرمئی سی خنکی اور نمی تھی۔ آسمان کے کنارے روشن ہونے لگے تھے۔

گدھا گاڑی آگے بڑھی اور میں نے اس کے پیچھے پیدل چلنا شروع کیا۔ وہ سڑک ابھی ویران تھی۔ اس کے دونوں جانب بہت عالی شان کوٹھیاں تھیں۔ چنانچہ اس سڑک پہ عام ٹریفک کا گزر نہ تھا۔ اکا دکا سائیکل سوار اخبار ڈالنے والے تھے۔

جب تک دھوبن دکھائی دیتی رہی میں اسے ہاتھ ہلا کے خدا حافظ کہتا رہا۔ پھر میں نے سامنے سے پولیس کی گاڑی آتے دیکھی اور ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ میرے اندازے کے مطابق ابھی میں ترویدی ہاؤس سے ایک میل دور تھا۔ شاید اس سے بھی کم۔ چنانچہ یہ ممکن تھا کہ پولیس کی اس گاڑی کو وہیں بلایا گیا ہو جہاں ایک قتل کی واردات بہرحال ہو چکی تھی۔ ترویدی اور اس کے نمک خوار والے اپنے برسوں کے تجربے اور مہارت سے حاصل ہونے والی ... کے ساتھ میری تلاش میں محل کا چپہ چپہ چھان مارا تھا لیکن وہ سب برآمد کرنے میں ناکام رہے تھے۔

ان ... کا احساس میرے لیے بے حد مسرت کا باعث تھا ... اس یقین میں مبتلا ہو گئے کہ میں ان کے زبردست حفاظتی انتظامات کے باعث اندر ہی کہیں روپوش ہوں اور اپنی چالاکی یا خوش قسمتی کے باعث ان کی نظر مجھے تلاش کرنے میں ناکام ہے لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ چودھری ولایت نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہو گا کہ اپنے ترویدی صاحب کیا کہتے ہیں اسے بڑی ہی خبیث روح ہے یہ سکندر بھی۔ آپ نہیں جانتے اسے۔ جن بھوت کو چمٹ جائے تو وہ بھی پناہ مانگتے ہیں۔ اور ترویدی نے بھی اپنے مخصوص ہیکڑی لہجے میں مختصر جواب دیا ہو گا کہ ہم اسے زمین سے بھی کھود نکالیں گے۔

اب یہ ہو سکتا تھا کہ انھوں نے پولیس کو طلب کر لیا ہو کہ اپنے پیشہ ورانہ انداز میں تفتیش کریں کہ قتل ہوا کیسے اور پھر کہاں گیا قاتل۔ کملا کا بیان، اس محافظ ... کا بیان جو پہلے ناک آؤٹ ہو گیا تھا اور جس سے میں نے سٹین گن کا تحفہ حاصل کیا تھا۔ بیانات تو پولیس ان کا بھی لے سکتی ہے جن کا واردات سے دور کا تعلق بھی نہ ہو۔

وہ جو فرمایا ہے شاعر نے کہ جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔ تو پولیس کے تیرہ نمبر پالوش کی ضرب سے تو زبان خنجر بھی بول لیتی تھی۔

میری جیب میں گیارہ ہزار سے زیادہ کی رقم محفوظ تھی چنانچہ مالی مسائل کسی قسم کے نہ تھے۔ مسئلہ سب سے بڑا تھا اپنے یاران کہن سے رابطہ۔ رابعہ سے تجدید وفا۔ کچھ ایسا انتظام کہ اب کبھی ہم نہ بچھڑیں اور موت بھی جدا کرے تو اگلے جہاں میں ملانے کے لیے۔ مگر کیا یہ اپنے اختیار کی بات تھی؟ اتنا اختیار ہوتا تو پھر بچھڑنے کی نوبت ہی کیوں آتی؟

چلتے چلتے میں ایک نسبتاً آباد سڑک پہ آ نکلا تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی کو گزرتے دیکھا اور اس کے پیچھے دوڑا۔ میری چیخ و پکار پہ وہ رک گیا۔

"ابھی کا ہے کو اتنا انتظار کرتا پڑا ہے؟"

"وہ ..... کچھ نہیں، ٹیکسی خالی ہے؟" میں نے احمقانہ سوال کیا۔ کیونکہ کراچی میں تو یہ تھا کہ خالی ٹیکسی نظر آ جاتی تھی اور ڈرائیور اچھے موڈ میں اسے روک بھی لیتا تھا تو پھر یہ سوال لازماً کرنا پڑتا تھا اس لیے کہ ڈرائیور اُدھر جانا چاہتا ہو جو آپ کی منزل ہے تو پھر وہ کھڑکی ہلا کے بڑی رعونت سے کہتا تھا کہ خالی نہیں ہے، ورنہ ... کہتا ہے، نہیں ہے۔

لیکن بمبئی میں ایسا نہیں تھا۔ ڈرائیور میرے سوال پہ حیران ہوا۔ "خالی نظر آتا پڑا ہے تیرے کو، یا بھرا ہوا؟"

میں پیچھے بیٹھ گیا۔ اسٹین گن کو میں نے ناجائز اولاد کی طرح سینے سے لگائے رکھا، مگر دنیا سے چھپائے رکھا۔

"ابھی تیرے پاس سے گزرا میں تو لپا سوتا پڑا تھا۔ ابھی بول کدھر جانے کا ہے؟" ڈرائیور نے کہا۔

"جانا ہے مجھے ... کے گھر۔" میں نے کہا۔ اور پھر ڈرائیور کی مختصر ... نظروں دیکھ کر اسے پورا پتا سمجھایا۔ رستے میں ڈرائیور نے مجھے نصیحت کی کہ میں کم پیا کروں لیکن اچھی پیا کروں اور میں نے مسکرا کے وعدہ کیا کہ اگر پی تو اس نصیحت کو ذہن میں رکھ کے پیوں گا۔ مجھے اس وقت بھی بہت حیرانی ہوئی جب ٹیکسی آدھے گھنٹے تک دوڑتی رہی مگر اس کا میٹر اتنا تیز نہیں بھاگا۔ صرف دس روپے دے کر میں اتر گیا تو ایک روپیہ ٹپ رکھنے والے ڈرائیور نے شکریہ ادا کیا، اور ... ہاتھ ہلا کے مجھ سے رخصت لی۔

میں بڑی پھرتی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ خیال یہ تھا کہ غالباً لوٹ کر ضرور آیا ہو گا۔ ممکن ہے وہ اپنے ساتھ محسن کو بھی لایا ہو۔ فلیٹ ایک جگہ تھی جہاں میرا واپس پہنچنا یقینی تھا اور جہاں مجھے ان کی خبر مل سکتی تھی۔ گزشتہ شب کے سارے واقعات بہت ہنگامہ دینے والے تھے۔ ایک دھوبن کی ہمت سے مجھے رہائی نہ ملتی تو شاید میں اتنی آسانی سے یہاں نہ پہنچ پاتا ..... یہ پہنچ کا احساس تھا جس نے میری ساری کلفت اور تھکن طاری کی تھی۔ میں بڑا پُرامید اور خوش تھا جس خدا نے اتنی بڑی آفت سے بچا لیا، وہی بچھڑ جانے والوں کو ملانے کے اسباب بھی مہیا کرے گا۔

ڈرانے والا خیال صرف ایک تھا کہ کہیں گزشتہ رات میری گرفتاری کے لیے آنے والوں نے ایم آر ایس کے دیگر نامی گرامی اراکین کو بھی نہ دھر لیا ہو۔ میری اطلاع کے مطابق شام کے دھندلکے ... ہمارے تعاقب میں تین شکاری تھے۔ ایک وہ تھے جن کو ہم نے تازہ تازہ زخم دیا تھا اور ان کے کاروبار کا بیڑا تقریباً غرق کر دیا تھا وہ ہمیں صورت سے نہیں جانتے تھے مگر ان کی لاوڈ "بھالو نتی" کی واپسی ایک اشتعال انگیز کارروائی تھی۔ جس کی سزا دینے کے لیے انھوں نے اپنے گو بیٹے بھیجے تھے کہ وہ جہاں بھی ملیں انھیں پکڑ کے لائیں۔ دوسرے شکاری، بقول اس دو ہوٹ نما ترویدی کے "اس کے نئے بھی بچانے کے لیے بیچ تھے اور وہ کہیں بچا تو سکتے تھے۔" ہم نے انھیں اچھی طرح بجا دیا تھا۔ وہ رات کو پھر آئے تھے اور مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے۔ تیسرے پرانے شکاری تھے یعنی اپنے چودھری ولایت اور ان کا دوست ناصر استاد، وہ غالباً ابھی تیسرے گروہ کی قیادت کر رہا ہو گا۔ یہ امر باعث حیرت تھا کہ وہ دوسری بار بھی ڈوب کے نہیں مرا تھا۔ بلکہ آسانا زخم خوردہ ہونے کے باوجود مجھ سے پہلے بمبئی کے ساحل پہ پہنچنے میں کامیاب رہا تھا۔ کیا انھوں نے میرے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی دیکھا ہو گا؟

اوپر پہنچنے تک سارے خدشات و امکانات میرے ذہن سے گزر رہے۔ پھر میں نے خود کو فلیٹ کے دروازے پر پایا۔ چونکہ بلڈنگ میں ابھی تک صبح کا سکوت طاری تھا۔ سامنے والے فلیٹ میں سے البتہ ریڈیو سیلون کی نشریات سنائی دے رہی تھیں اور پرانے فلمی گانے چل رہے تھے۔ میں نے دستک دی تو دروازہ تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔ میں نے اندر جانے کا سوچا مگر بلا اجازت اور اطلاع دیے بغیر ایسا کرنا خلاف آداب تھا۔ ملی اکیلی رہنے والی عورت تھی۔ اکیلا مرد بھی ہو تو خلوت میں نسبتاً آزادی سے رہتا ہے اور پھر کال بیل کا بٹن تھا۔ میں نے اسے دیر سے دیکھا۔ بٹن دبا کے میں نے واضح سُروں میں ڈنگ ڈانگ کی آواز سنی لیکن اندر سے نہ کوئی جواب آیا اور نہ ملی نے دروازے تک آ کے جھانکا۔ میں نے دوبارہ بٹن دبایا اور پھر انتظار میں دو منٹ گزار دیے۔

عام حالات میں میرا ذہن اندیشوں سے دور رہتا۔ میں فرض کر لیتا کہ وہ باتھ روم میں ہو گی اور اس کے لیے کال بیل کے جواب میں فوراً آنا ممکن نہیں۔ لیکن ان واقعات کے تناظر میں جو میرے

www.paksociety.com

ساتھ ہی پیش آ چکے تھے۔ میں پریشان کن خیالات میں گھر گیا۔ وہ باہر کا دروازہ کھلا چھوڑ کے باتھ روم میں کیوں گھس گئی۔ اور اگر بھول سے ایسا ہوا تو وہ باتھ روم ہی سے پکار کے کہہ سکتی ہے کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔ یا اس نے دانستہ دروازہ کھلا چھوڑا تھا تو اندر آ کے بیٹھنے کے لیے کہنا کیا مشکل تھا؟

میں نے گھبرا کے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہوتے ہی دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا۔ نہ جانے یہ چھٹی حس کیوں کہہ رہی ہے جو بالکل صحیح وقت پہ آدمی کو خبردار کر دیتی ہے۔ آٹو میٹک الارم کی طرح خطرہ خطرہ چلانے لگتی ہے۔

"للی!" میں نے آواز دے کر کہا۔ "مس للی!" خاموشی سرد و سفاک کسی آسیب سا نا خوف کی سرگوشی سے گونجتا ہوا جواب کوئی نہیں، میری آواز کی بازگشت ابھی تک فضا میں ارتعاش تھی۔ کون ہے جو اس پکار پہ آتے۔ "للی... للی..." میں نے آگے بڑھ کے کہا۔ لاؤنج وہی تھا جس میں گزشتہ شام تک بیٹھا ہوا تھا۔

اس کی ساری آرائش و زیبائش ایک پُرہیبت بدصورتی میں بدل چکی تھی۔ کرسیاں الٹی ہوئی تھیں۔ صوفے بے ترتیب اور داغ دار تھے۔ یہ داغ بہت بھیانک تھے ان کا رنگ بڑا بے رحم تھا گہرا سرخ۔

"للی!" میں نے چلا کے کہا اور اس کے بیڈ روم میں گھس گیا۔ وہ وہاں قالین پہ الٹی پڑی ہوئی تھی۔ زرد قالین پہ اس کا سرخ خون جم کے کالا پڑنے لگا تھا۔ اس کا بے لباس جسم زخموں کا لالہ زار تھا۔ یہ سب زخم انسان نما درندوں کی وحشت اور بربریت کی منہ بولتی تصویر تھے اور اس ظلم کی داستان خونچکاں تھی جو للی کے جسم پہ توڑا گیا۔

اس کو سگریٹوں سے داغا گیا تھا اور بجلی کے تار کے کوڑے سے مارا گیا تھا۔ یہ تار کا لمبا ٹکڑا ابھی وہیں موجود تھا۔ جس نے للی کے بدن پہ آڑی ترچھی سیاہ لکیروں کا جال بنا دیا تھا۔ اس کے بکھرے ہوئے بال بتاتے تھے کہ انھیں کس بے رحمی سے نوچا گیا ہوگا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا لیکن میری ہمت نہیں پڑی کہ میں ادھر جا کے اس کی کھلی آنکھوں میں دیکھ سکوں۔ اس کے منہ میں ٹھونسا جانے والا کپڑا ابھی مجھے دکھائی دے رہا تھا۔

میں ایک دم اٹھا اور پیچھے ہٹا۔ میرے پاؤں کے نیچے آنے والی کوئی چیز چٹخ کے ٹوٹ گئی۔ یہ روشن گھر اچانک آسیب زدہ ہو گیا تھا۔ میں نے گھبرا کے پیر اٹھا لیا اور نیچے دیکھا۔ یہ ایک تصویر کا فریم تھا جو الٹی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے تصویر کو اٹھا کے دیکھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کی چند کرچیاں اب بھی فریم میں اٹکی ہوئی تھیں۔ شیشے کی تیز دھار نے اس تصویر کو بھی زخمی کر دیا تھا جو شکستہ فریم میں ایسے لگتی تھی جیسے دھنسی ہوئی قبر میں سے دکھائی دینے والا کسی لاش کا ڈھانچا۔

کسی دشواری کے بغیر میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ چہرہ کسی اور کا نہیں تھا۔ گزشتہ شام اسے غالب نے دیکھا تھا اور مجھے بتایا تھا کہ للی کی مجھ سے جذباتی وابستگی کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔ اس وقت میں نے غالب کا مذاق اڑایا تھا مگر اب مجھے کوئی شک نہیں رہا تھا کہ للی نے میری صورت میں ایک گمشدہ چہرے کے خدوخال تلاش کر لیے تھے اور اسے احساس تھا یا نہیں تھا لیکن وہ اپنی کمزوری پر قابو پانے میں ناکام رہی تھی۔

میرا سارا وجود ایک دم سلگنے لگا تھا۔ للی کی پُرسکون زندگی کے سفر کو اس ہولناک انجام سے دوچار کرنے کی تمام ذمے داری مجھ پر تھی۔ میں نے اسے نہیں مارا تھا لیکن میں نے اسے مروا دیا تھا۔ اس طرح اخلاقی طور پر اس کے قتل میں بالواسطہ طور پر میں بھی شریک تھا۔ ترلوچن کے سامنے اس کے حکم کے غلاموں نے صاف بتا دیا تھا کہ انھوں نے للی سے میرا پتا پوچھنے کے لیے کوئی تشدد کا حربہ استعمال نہیں کیا تھا۔ انھوں نے جذباتی دباؤ ڈال کے اسے بلیک میل کیا تھا۔ جسمانی تشدد کرنے والے چوہدری والا ورسے کے ایجنٹ ہی ہو سکتے تھے۔ وہ بعد میں وہاں پہنچے جب انھیں ترلوچن کے کسی آدمی سے معلوم ہوا کہ ہم للی کے ساتھ تھے۔ وہ ایک طرح سے ترلوچن کے گروہ کے پیچھے انجانے کے چھوڑے ہوئے سراغ کی مدد سے للی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے ہوں گے۔ اس بات نے للی کو ضرور پریشان کیا ہوگا کہ آخر اس نقلی چہرے والے کے کتنے دشمن ہیں۔ ان میں نقلی کتنے ہیں اور اصلی کتنے۔ بعد میں اس سے میرا پتا پوچھنے والوں کا طریقۂ کار مختلف تھا۔ انھوں نے للی سے ہمارے بارے میں معلومات حاصل کر لینے کے بعد اسے ہماری میزبانی کی سزا بھی دی۔

مجھے اب وہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں جو للی نے ہم سے کہی تھیں اور وہ سارے وعدے یاد آ رہے تھے جو ہم نے للی سے کیے تھے۔ وہ سب کھیل ختم ہو گیا تھا اور صرف پچھتاوا رہ گیا تھا۔ معذرت معافی تلافی سب بے معنی الفاظ ہو گئے تھے۔ للی کے آنجہانی شوہر کی تصویر مجھے پُرملامت دکھی نظروں سے گھور رہی تھی۔

کال بیل بجی تو میں اچھل پڑا۔ یکلخت مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ مجھے تو یہاں ایک منٹ بھی نہیں رکنا چاہیے تھا۔ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ سوچنے اور انتقام کی آگ میں جلنے سے اور اس قتل پہ آنسو بہانے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ویسی صورت میں میرا یہاں اس لاش کے ساتھ پکڑے جانے کا امکان زیادہ تھا۔ گھنٹی کی آواز نے میرے خوف کو یقینی خطرے سے دوچار کر دیا۔

یہ کون ہو سکتا ہے؟ کوئی پڑوسی؟ دودھ والا یا اخبار والا؟ پولیس؟

گھنٹی پھر بجی۔ دروازہ میں نے بھی اندر سے مقفل نہیں کیا تھا۔ کوئی میری طرح شکوک میں مبتلا ہو کے اندر بھی آ سکتا تھا۔ اس کے تنہا ایسے بھی ہوں گے جو للی کی عادات کو اور اس کے معمولات کو سمجھتے ہوں گے۔ کسی کو یہ بات خلاف معمول لگے گی تو وہ حقیقت جاننے کے لیے اجازت کا انتظار نہیں کرے گا۔

میں تیزی سے دروازے کی طرف گیا اور ایک کونے میں سمٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت ہینڈل گھوما۔

"للی!" کسی عورت نے دروازے کو تھوڑا سا کھول کے آواز دی۔ "کہاں ہو تم؟" وہ انگریزی بول رہی تھی اور للی سے بے تکلف معلوم ہوتی تھی۔ کوئی جواب نہ پا کے اس نے زور سے "ڈیم اٹ" کہا اور اندر آ گئی۔

ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے اس کو شانے سے پکڑ کے کھینچا اور آگے دھکیل دیا۔ وہ منہ کے بل گر گئی۔ میں نے بڑی پھرتی سے اپنا چہرہ دوسری طرف کیا اور دروازے سے نکل گیا۔ باہر کی طرف وہ کنڈی بھی تھی جس کو کھینچ کر بند کیا جاتا ہے۔ کنڈی لگاتے وقت میں نے اس عورت کی چیخ سنی۔ میں نے اس کا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھا تھا لیکن یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ بھی جوان عورت تھی اور شاید اینگلو انڈین تھی کیونکہ اس نے اسکرٹ پہن رکھا تھا۔

اپنے بارے میں مجھے اطمینان تھا کہ وہ میرا چہرہ بالکل نہیں دیکھ سکی ہوگی۔ للی کی لاش دیکھ لینے کے بعد اس کے لیے شک کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی کہ وہ للی کا قاتل ہی تھا جو اندر موجود تھا اور جو ایک چادر میں چہرہ چھپا کے کھڑا ہوا تھا اور اسے دھکا دینے کے بعد باہر سے کنڈی لگا کے فرار ہو گیا تھا۔

جب وہ پولیس کے سامنے بیان دے گی تو سو فیصد یقین کے ساتھ حلفیہ کہے گی کہ قاتل وہی شخص تھا۔ اس کا یقین بے بنیاد ہوگا مگر آدمی جو کچھ دیکھتا ہے اسی پر یقین کی بنیاد رکھتا ہے۔ بعض اوقات ایک جھوٹ ہی سب سے بڑا سچ دکھائی دیتا ہے اور جو سچ ہوتا ہے وہ نظر سے اوجھل رہتا ہے۔ میرا معمہ میرے مجرم ہونے کی تصدیق کرتا تھا اور میرے سوا جائے واردات پر تھا بھی کون۔ للی کے آنجہانی شوہر کی تصویر میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کی اور بھی بہت سی تصویریں ہوں گی اور اسے اپنی زندگی میں للی کے سب دوست احباب نے دیکھا ہوگا۔ مگر اب کوئی یہ بتانے والا نہ ہوگا کہ وہ قاتل بالکل ویسا ہی چہرہ رکھتا تھا جیسا للی کے شوہر کا تھا۔ جو تصویر میرے ہاتھ آئی تھی وہ میرے لیے مددگار ثابت ہو سکتی تھی کہ اسے دیکھ کر میں ایک بالکل مختلف اور نیا چہرہ بنوا سکتا تھا۔

جس عورت کو میں للی کے فلیٹ میں للی کی لاش دریافت کرنے کے لیے چھوڑ آیا تھا وہ اب مجبور تھی کہ اس واردات کی خبر دوسروں کو دے۔ اس کی اپنی رہائی کی یہی صورت تھی کہ وہ شور مچائے، دروازہ بجائے اور پولیس کو للی کے گھر سے ہی فون کرے۔ رات بھر للی کی لاش بے کفن اور لاوارث پڑی رہی۔ یہ میری بدبختی تھی کہ سب سے پہلے میں نے ہی للی کو اس حال میں دیکھا۔ میرے لیے ممکن ہوتا تو میں اس کی تدفین کی رسوم میں آخر تک شریک ہو کے اظہار عقیدت کرتا۔ لیکن گردش وقت نے مجھے روپوش ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں بلڈنگ سے باہر آیا تو صبح کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک کا رش زیادہ ہو گیا تھا۔ اپنے اپنے کام پر جانے والے سب ہی لوگ گھروں سے نکل آئے تھے اور بسوں ٹراموں کے لیے قطاریں بنائے کھڑے ہوئے تھے یا ٹیکسی تلاش کر رہے تھے۔ میں جلد از جلد اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ایک مشین گن کو بغل میں چھپا کے بس یا ٹرام میں سفر کرنا دانش مندی نہ ہوتی لیکن مجھے کوئی بھی ٹیکسی خالی نظر نہیں آ رہی تھی۔

اچانک میری نظروں نے غالب کو دیکھا۔ وہ سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک سائن بورڈ کی آڑ لیے کھڑا تھا۔ اگر وہ چہرے کے سامنے سے اخبار نہ ہٹاتا تو میری نظر چوک جاتی اور شاید لگے ہی میں کسی خالی ٹیکسی میں بیٹھ کے نکل جاتا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہاں اس طرح چھپ کے وہ میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اوپر کے حصے پہ چادر لپیٹ لی تھی اور کسی حد تک اپنی صورت کو بھی ڈھانپ لیا تھا چنانچہ مسلسل نگرانی کرنے کے باوجود

محی الدین نواب

کتابیات پبلی کیشنز

www.paksociety.com

غالب نے مجھے اوپر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اسے یقین ہوگا کہ مجھے موقع ملا تو میں وہاں ضرور جاؤں گا۔ اس کا حلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔

میں نے اطمینان سے سڑک پار کی حالانکہ اس وقت میں تھوڑا سا نروس تھا۔ میں آسانی سے گرے کے مجبور نہیں ایک تو ہو گیا تھا۔ تریوینی کے گھر سے تو میں نکل آیا تھا۔ اب لوگ کے گھر میں پھنس جاتا تو ناکردہ گناہ کی سزا پاتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس اجنبی ملک میں ایسی کوئی بات ہو جس سے رسوائی یا تشہیر کے اسباب پیدا ہوں۔ میں گمنام اور روپوش رہنا چاہتا تھا مگر میری خواہش کے برعکس واقعات کا سلسلہ میری مشکلات میں اضافہ کر رہا تھا۔

غالب مجھے دیکھ کے بھونچکا رہ گیا۔ "یعنی آپ... ؟"

"ہاں۔ میں یہاں سے فرار ہو رہا ہوں۔" میں نے بے فکری سے کہا۔ وہ میرے ساتھ چل پڑا۔ "کل ان سے یار! تم نے مجھے دیکھ لیا۔ حالانکہ مجھے یہاں اسی لیے کھڑا کیا گیا تھا کہ تمہیں دیکھتا رہوں۔"

"مگر تم اخبار دیکھ رہے تھے؟" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"اخبار تو ایک پردہ تھا۔" اس نے مجھے بندی میں چھپا ہوا اخبار دکھا کے کہا۔ "مگر تم کیوں یا پردہ فرار ہو رہے ہو؟ اور آخر یہ کیا نیا شوق ہے تمہارا۔ کل رات بھی تم فرار ہو گئے تھے بغیر کچھ بتائے۔"

"میں اغوا ہو گیا تھا۔" میں نے اس کی تصحیح کی۔

"اور جو چاقو اغوا ہونے سے کرلان رونما ہے۔" ...مرزا غالب نے اخبار کا ڈنڈا سا بنا کے ہلایا۔ "مگر کچھ بتاتے تو جانا اپنا... کھا کے یوں تمہیں پریشان نہ کیجیے... ساری رات کہاں رہے تم آخر... یہ اور بقول شخصے عرض ہے تمہارے... کوئی بات کرنے..."

"مرزا! کیا تمہیں معلوم ہے کہ رتی کا قتل ہو گیا ہے..." میں نے کہا۔

"ہاں۔ اسی لیے تو میں کھڑا ہوا تھا یہاں۔ کہ تم کو اوپر جاتے دیکھوں۔" مرزا غالب نے کہا۔

"میں اوپر ہو آیا۔ سب کچھ دیکھ لیا میں نے... تم بھی گئے تھے رتی کے فلیٹ میں؟"

"نہیں۔ وہ خود ہی آئی تھی مجھے یہ بتانے کے لیے کہ میں قتل ہو گئی ہوں۔" مرزا نے کہا۔

"میں جانتا ہوں اس کا جرم کیا تھا جس پر اسے سزائے موت دی گئی۔"

"جرم تو میں بھی جانتا ہوں۔ بلکہ میں تو اس کے نامعلوم قاتل سے بھی واقف ہوں۔" غالب نے کہا۔ "جب سے میں نے فلیٹ میں جا کے دیکھا ہے میرا خون کھول رہا ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس شیطان کو کہاں جا کے قتل کروں۔ اور کیسے قتل کروں۔"

"تمہیں کیا معلوم کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟"

"معلوم ہے مجھے۔" غالب نے کہا۔ "یہاں اور کون دشمن ہے ہمارا۔ ہماری وجہ سے جن کا کاروبار چوپٹ ہوا۔ جن کا وہ سب مال واپس آ گیا جو لانچ پر تھا..."

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ وہ لوگ ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ انہیں ناکامی نے زیادہ مشتعل بھی کیا تھا اور وہ رتی کی کار کے ذریعے اس کے فلیٹ تک رسائی حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہے تھے۔ لیکن انہوں نے رتی پر کوئی جسمانی تشدد نہیں کیا تھا۔ اس کے بغیر ہی رتی نے ان کو بتا دیا تھا کہ تم کہاں ہو گے۔"

"مگر یار... رتی... یہ اس نے کیوں کیا؟"

"مجبوری۔ یہاں کون ہے جو مجبور نہیں ہے۔ اور اس کے پاس جانے والوں نے بھی ایک مجبوری سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن رتی کے ساتھ یہ بربریت کا سلوک بعد میں جانے والوں نے کیا۔" میں نے کہا۔

"بعد میں کون گیا تھا؟"

"ہمارے دیرینہ دشمن۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے شکاری کتے۔" میں نے کہا۔

غالب چلتے چلتے رک گیا۔ "کیا؟... وہ یہاں؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "یہ لمبی بات ہے۔"

"لمبی بات ہے تو کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ چائے پی لیتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"چائے سے کام نہیں چلے گا۔ ناشتا چاہیے پورا۔ ساری رات کا تھکا ہوا ہوں۔"

"ناشتا کیا ملے گا یہاں۔ سب ایرانی ہوٹل ہیں۔"

"بھوک تو ہے انڈا ایرانی ہو یا تورانی۔ جو بھی ملے گا چلے گا۔" میں نے کہا۔ "تو یہ بتا کہ... وہ اچھی..."

"رابعہ کیسی ہے... اور کہاں ہے؟" غالب نے طنز سے کہا۔ "بڑی جلدی خیال آ گیا اس کا۔ وہ منتظر ہے آپ کی۔ کہ آپ آئیں تو آپ کو قتل کر دے۔"

میں نے خوش ہو کے کہا۔ "قتل تو ہم ہوتے رہتے ہیں مگر یہ اچھی بات ہے کہ اب اسے انتظار ہے۔ ہم نے بھی بہت انتظار کیا ہے۔"

"انتظار میں تو سب ہی ہیں کہ اس نامعقولیت کے نتائج پر آپ کی گوشمالی کی جائے۔" غالب نے خفگی سے کہا۔ "ایسے تو شاید گوٹھ کے سر سے سینگ بھی غائب نہیں ہو سکتے جیسے آپ غائب ہوئے تھے۔"

"وہاں کوئی پکنک پر نہیں گیا تھا۔" میں نے بھنا کے کہا۔

غالب نے ایک ریسٹورنٹ کی طرف اشارہ کیا جو نسبتاً صاف ستھرا تھا اور کچھ خالی خالی نظر آتا تھا۔ "یہاں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ تو یہ چادر تو ہٹا دے اب۔ اس جگہ سے ہم بہت دور ہیں جہاں خطرہ تھا۔"

"خطرہ تو میں ساتھ لیے پھر رہا ہوں۔" میں نے چادر کا کونا ہٹا کے اسے شیلین گن کی زیارت کرائی۔ "اس کے علاوہ بھی کچھ نوادرات لایا ہوں۔"

ناشتے کے دوران اور پھر اس کے بعد بھی میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ غالب حیرانی سے سنتا رہا۔ شیلین گن کو میں نے اب چادر میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا کیونکہ ہم ایک کیبن میں تھے جہاں سب کی نظریں ہمیں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ غالب نے پہلے موٹ کی تعریف کی۔ پھر وضو بن کی اور آخر میں میری۔ کمال کے بارے میں اس نے تمام بے ساختہ خیالات کا اظہار کیا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ شاید میں نے اصل واقعات کو مختصر کر دیا ہے۔

"تم لوگ آخر کیسے بچ گئے؟" میں نے کہا۔ "مجھے تو خاصی امید تھی کہ اغوا کرنے والوں نے تمہیں کو دیکھا ہو گا۔ گل کے سوا وہ سب کو پہچانتے ہیں۔"

"میں تو حیران ہوں کہ یہ استاد پیڈرو آخر کیا چیز ہے۔ کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔" غالب نے کہا۔ "وہ پھر بھی غرق نہیں ہوا۔"

"اسے وقت مل گیا تھا۔ کسی جہاز نے بچا لیا ہوگا۔ وہ ہم سے پہلے بمبئی پہنچ گئے ہیں تو چوہدری صاحب کو پوری رپورٹ دے چکے۔ ظاہر ہے کہ چوہدری صاحب بہت مشتعل تھے۔"

"لیکن انہیں ہمارے بارے میں کس نے بتایا؟"

"ان سب نے جن کو ہم وہاں سے گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "لانچ کی واپسی نے خاصی سنسنی پھیلائی ہوگی۔ دلاور نے سمجھ لیا کہ یہ سارا ماجرا ہے۔"

"ان عورتوں کے بیان سے ہماری تصویر سامنے آ گئی ہو گی۔" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ دلاور کے بندے وہیں پھر رہے تھے۔ انہوں نے سنا یا خود دلاور نے سنا اور اس کے بعد ان کا کام آسان ہو گیا۔ وہاں سے پیچھے لگ گئے جو ہمارے تعاقب میں تھے۔ جو نرملا کی لانچ کو ساحل تک لے گئی تھی اس نے بتا دیا ہوگا کہ وہ دونوں میرو گھسال اتر رہے تھے۔ لانچ کے مالکان کے ایجنٹ وہاں پہنچے تو چوہدری دلاور کے بندے ان کے پیچھے گئے۔ وہ رتی کے گھر پہنچے تو جو لوگ سائے کی طرح ان کے تعاقب میں تھے وہ بھی رتی کے گھر گئے اور وہاں سے حاجی علی کی درگاہ کا پتا بتا دیا گیا تو شکاری نمبر ایک اور دو آگے پیچھے تھے۔ آگے والے مجھے اٹھا کر لے گئے۔ پیچھے والے پھر پیچھے رہے اور ان سے میری ملاقات تریوینی کے شیش محل میں ہوئی۔"

"ویری سمپل۔" غالب نے اتفاق کیا۔ "کیا اس سے یہ وضاحت نہیں ہو جاتی کہ باقی سب گرفتار کیوں نہیں ہوئے تھے۔ اگر تیرے ساتھ میں ہوتا تو شاید ہاتھ لیا جاتا۔ لیکن ساری بات ہے اتفاق کی۔"

"یعنی آپ نادر کے ساتھ بحر ہند کے ساحل پر عشق فرما رہے تھے تو یہ ٹھیک عمل تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے کہ میری قربانی کے صدقے میں سب بچ گئے۔ وہ مجھے اٹھا کر لے گئے اور دلاور اینڈ کمپنی کے شکاری کتے جو ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے، انہیں بھی پیچھے دوڑ لگانی پڑی۔ تم سب کو تلاش کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی ان کو۔"

"وہ اپنے دلاور صاحب ابھی تک اندر ہی ہیں؟"

"بالکل ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "سالا پاگل ہو جائے گا کہ بندہ آخر کیسے غائب ہو گیا۔ فصیل کو طور کرکے نکلنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تاروں میں بجلی تھی۔ اگر میں تار کاٹ دیتا جو کہ خالی ہاتھوں سے ایک ناممکن کام تھا تب بھی الارم بج اٹھتے لیکن کسی الارم نے شور نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ایک ہی مین گیٹ تھا۔ وہاں وہ دونوں بظاہر خود موجود تھے۔ دلاور اور تریوینی۔"

"نوبان پاشا خان۔ وہ دھو بن بالا آخر ناکی جائے گی۔ پولیس والے بہت خبیث ہوتے ہیں۔ جب وہ تفتیش کریں گے اور ایک منٹ کی رپورٹ لیں گے تو یہ بات نوٹ کر لیں گے کہ صبح دھو بی ایک گٹھری لے کر گئی تھی جس کو چیک نہیں کیا گیا تھا۔"

"تریوینی کے حکم پر۔"

"ہاں تریوینی کے حکم پر۔ مگر اس سے بعد میں بھی تو پوچھ گچھ کی جا سکتی ہے۔ تریوینی بالکل معترض نہیں ہوگا اور دھوبن تو بھی بہادر بنے یا چالاک ہے۔ پانچ منٹ میں ساری اسٹوری اگل دے گی۔ اس پر جب تشدد کے وہ حربے آزمائے جائیں گے جو صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہیں تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ بولے گی۔ اور نہیں بولے گی تو بہت عذاب جھیلے گی۔"

میں نے ایک سرد آہ بھری۔ "معلوم نہیں ہماری وجہ سے کس کس پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا ہے۔ ان سب کا بار ہمارے سر پر ہے۔ میں اس خیال سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں کہ اس دھوبن پر ایک اور مسلمان کی وجہ سے برا وقت آئے گا۔ ممکن ہے اس کی عزت یا متاعِ حیات لٹ جائے۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر وہ اتنی نفرت کرتی تھی ہم

www.paksociety.com

مسلمانوں سے۔ تو وہ کیوں عذاب میں ڈالے گی خود کو۔ ٹھیک ہے آپ نے اپنی کہانی سنا کے اسے قائل کر لیا کہ! چھپے ہوئے لوگ دونوں طرف ہوتے ہیں۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ اگر جاہل عورت ہوگی تو خود کو بچا لے گی۔ جھوٹ بول دے گی کہ سرکار میں کیا کرتی۔ اس مشٹنڈے نے گٹھری کے اندر میری بچی کو دبوچ رکھا تھا میں بولتی تو وہ اس کو مار ڈالتا۔"

"بالکل درست۔" میں نے مطمئن ہو کے کہا۔ "وہ ایسا ہی کرے گی کیونکہ میں نے ایسا ہی کیا تھا جب میں اس کے گھر میں گھسا تھا تو میں نے اسے جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی تھی۔ یہ بات اس کے ذہن میں ہوگی۔ اس کی جان بچ سکتی ہے۔"

"چل اب باقی باتیں بعد میں۔" غالب نے کہا۔ "اس مشین گن کے علاوہ کیا تحائف ویسے آپ ترلوچن سے؟"

میں نے اسے ریوالور دکھایا۔ پھر کھلا کا نانا پستول۔

"بہت نفیس چیز ہے۔" غالب نے اسے ہاتھ میں لے کر اور الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"گیارہ ہزار روپے سالانہ بھی ملی تھی۔" میں نے کہا۔ "مگر یار وہ سب اسی کے پاس رہ گیا۔ میرا ریوالور اور پاسپورٹ۔"

"پاسپورٹ بھی؟"

"ہاں۔ ویسے وہ اب بے کار تھا۔" میں نے کہا۔ "میرا یہ چہرہ اور نام دونوں مشتہر ہو گئے ہیں۔ پولیس کو میری وہی تصویر فراہم کر دی جائے گی جو پاسپورٹ پر تھی۔ نام کے ساتھ یہ تصویر ان کے ریکارڈ پر آ جائے گی۔ فی الحال ایک قتل کا الزام تو ثابت ہے۔ ڈکیتی چوری وغیرہ بھی کی ہے میں نے زبردستی بجو بادو عزائم کے ساتھ ترلوچن کے گھر میں داخلے کا مجرم بھی ہوں۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا۔ "امیر چند ہی کو نہیں بلکہ اس کے بھائی فقیر چند ولد موتی لال کو بھی نیا نام اور نیا حلیہ اختیار کرنا پڑے گا ورنہ ایک پکڑا گیا تو دوسرا پکڑا جائے گا۔"

"یہ کام ہوگا کیسے۔۔۔؟"

"جیسے اپنے وطن میں ہوتا تھا۔ یہاں بھی پیسہ ہی سارے بگڑے کام سنوارے گا۔" غالب نے کہا۔ "ہم کون سے ولایت میں آ گئے ہیں۔ رشوت کا سکہ دونوں طرف ایک جیسا چلتا ہے۔"

"رشوت کا سکہ ساری دنیا میں چلتا ہے۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اب دھوپ تیز ہونے لگی تھی۔ معلوم نہیں وہ کون سی سڑک تھی اور ہم کس بازار سے گزر رہے تھے۔ مزاج کے اعتبار سے یہ شہر کراچی جیسا ہی لگتا تھا۔ کم سے کم سڑکوں اور نئی پرانی عمارتوں کی حد تک کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ موسم بھی وہی تھا۔ ہوا میں نمی۔ مچھلیوں کی بو۔ دھواں۔ آسمان مٹیالا نیلا غبار آلود۔ لوگ قد میں مختلف دکھائی دیتے تھے تو اس کی وجہ اس معاشرے کا آزادانہ اختلاط تھا۔ مرد عورت یہاں عموماً ایک گاڑی کے دو پہیے لگتے تھے۔ کہیں کوئی تفریق نہ تھی۔ سڑکوں بازاروں کی بھیڑ میں عورتوں کا تناسب برابر کا تھا۔ بسوں میں ان کے لیے کوئی سیٹ مخصوص نہ تھی۔ سب ملے جلے بیٹھے ہوتے تھے۔ کیا عورت کیا مرد۔ عورتوں میں ساڑی اور اسکرٹ زیادہ نظر آتا تھا۔ بلاؤز پہنیں تو عورتیں خال خال رہتی تھیں۔ عورتوں کی مجموعی حالت سے ابتری ظاہر ہوتی تھی۔ ساڑیاں میلی اور بدنما لگتی تھیں۔ ان کی جسمانی صحت کا معیار بھی افسوس ناک تھا۔ خوبصورتی عنقا تھی اور اچھی صورت کہیں سیکڑوں میں ایک دکھائی دیتی تھی۔ مرد مجھے سب کو لڑکے جیسے لگے۔ کام میں مگن۔ اپنی دھن میں رواں۔ تاہم ڈسپلن کے اعتبار سے وہ قدرے بہتر معاشرہ تھا۔ لوگ ہر جگہ قطار بنانے کے عادی تھے۔ بغیر ٹکٹ کے بس میں سفر کرنا مشکل تھا۔ بسوں اور ٹراموں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ آبادی کے تناسب سے کاریں کم تھیں اور ٹیکسیاں زیادہ۔ سفر کے مختلف مراحل میں مشاہدے سے میں نے بہت کچھ جان لیا۔

ہم ابھی کسی راستے سے واقف نہیں تھے چنانچہ ہر جگہ لوگوں سے کچھ پوچھنا پڑتا تھا تو زیادہ تر لوگ ہم سے بھی زیادہ ناواقف ثابت ہوتے تھے یا کسی ناقابل فہم زبان میں حقے کی طرح گڑگڑا کے نکل جاتے تھے۔ ایک بازار سے میں نے اپنے سائز کے جوتے لیے۔ پھر قمیص اور پتلون خریدی اور یہ لباس ایک ریسٹورنٹ کے ٹائلٹ روم میں جا کے بدلا۔ ترلوچن کا عطا کردہ قیمتی سوٹ میں نے وہیں چھوڑ دیا۔ مشین گن کو بھی ہم نے ایک لمبوترے کینوس کے بیگ میں ڈال لیا تھا۔ یہ آلات موسیقی فروخت کرنے والے ایک بنگالی نے ہمیں بہت مہنگا دیا تھا کیونکہ درحقیقت یہ وائلن کا کور تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ اس میں مشین گن رکھی جائے گی تو شاید صدمے سے اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔

اپنے قاتلانہ حلیے کو فوراً آسانی سے بدلنے کے لیے لباس کا بدل لینا کافی نہیں تھا۔ غالب کے مشورے پر میں نے ایک چوگوشیا نیپالی ٹوپی خرید کے سر پر سجا لی۔ غالب تو منفرد تھا کہ ان بجوڑے بالوں سے نجات کا آسان اور سب سے سستا نسخہ استعمال کر دیا یعنی کسی بھی فٹ پاتھ پر کسی بھی نائی کے استرے کے سامنے سر نگوں ہو جاؤں اور اس سے کہوں کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہاتھ کی صفائی دکھا دے۔ تاہم میں نے اس شہر میں گنجا ہونا قبول نہیں کیا جہاں ہیئر اسٹائل کی بنیاد پر بھی بہروپ بدلنے کے امکانات بھی روشن تھے۔

گلے میں ایک رنگین اسکارف باندھ کے اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ چڑھانے کے بعد میں نے غالب سے اپنے حلیے کی داد مانگی تو اس نے عاجزانہ لہجے میں کہا کہ ہیرو کا نہیں البتہ اب ولن کا چانس دے سکتا ہے کوئی کاٹھ کا الو پروڈیوسر ڈائریکٹر ورنہ جوکر کا رول تو پکا ہے۔ ... رہا ہوں۔ مجھے اب بے چینی ہو رہی تھی۔ اپنی حفاظت کا خیال بھی ضروری تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا للو سے ملنے کی خواہش غالب آ رہی تھی اور مجھے غالب پر جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی جو بڑی بے فکری سے گھوم رہا تھا۔ پہلے یہ کام کر لیں۔ وہ پہننے لیے وغیرہ وغیرہ۔

تنگ آ کے میں نے کہا۔ "مرزا۔۔۔ تم نشانے پر ہو ضروری کام اگر ہو جاتے تو آ جاتا۔ ورنہ میدان حشر میں تو ملاقات ہوگی ہی۔۔۔ میں چلا۔"

غالب نے کہا۔ "یہ مجبوری داڑھی بھی خطرے کی علامت ہے۔"

"اسے میں خود کتروں گا قینچی سے یا پھر شیو کر لوں گا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک کام میں دیر کیوں۔ یہ دیکھو اپنے مولانا صاحب کیسی پیار بھری متوقع نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔" غالب نے کہا اور مجھے کھینچ کر فٹ پاتھ پر رکھی ہوئی کرسی میں فٹ کر دیا۔ "دو منٹ کی بات ہے۔"

مولانا نے شیو کے سوال پر سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ "اس کو شیو بولتا ہے اتنا بڑا جھاڑی کاٹنے کا۔"

"یہ جھاڑی نہیں، داڑھی ہے۔" میں نے بھی خفگی سے کہا۔

"او بابا جاتا ہم۔ یہ چار آنہ شیو کا ریٹ ہے۔ ایک روپیہ منظور کرو ورنہ کرسی خالی کرو۔" اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

ایک روپیہ اس محنت کے عوض بہت کم تھا جو اسے میرے چہرے کے جنگل سے میری صورت برآمد کرنے کے لیے کرنی پڑی۔ اس سے زیادہ مسرت مجھے اپنی جلد پر ٹھنڈی ہوا کے لمس سے ہوئی۔ بار بار اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرنے کے بعد میں نے اسے پانچ روپے کا نوٹ پیش کیا تو اس نے نوٹ کو روشنی کے رخ کر کے واٹر مارک دیکھا۔ چونکہ ہم نئے نئے تھے اس لیے پروپرائٹر نیو ہالی وڈ بولڈنا اسٹار ہیئر ڈریسنگ سیلون۔ کو یہ شک ہونا فطری امر تھا کہ نوٹ جعلی تو نہیں۔ جتنا لمبا اس کا نام خود لکھا ہوا سائن بورڈ تھا اتنی اس کے حصے کی فٹ پاتھ تھی جس کا کرایہ وہ چھ آنے روز دیتا ہوگا۔ بالعموم ہر جگہ ایسے کئی فٹ پاتھ کی تختی جہاں سے کام والا بار بار چھ گلاس ایک ہینگر میں لٹکا کے دوڑ لگاتا تھا۔ یا ہر ٹالا بھی میں جا کے کی آؤٹ ڈور سروس فراہم کرنے والا کہلاتا ہے جو عموماً بارہ پندرہ سال کا لڑکا ہوتا ہے۔

اب دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے کالے رنگ کی ایک گاڑی کو دیکھا جو غیر معمولی طور پر لمبی تھی۔ اس کے اوپر پھول رکھے ہوئے تھے۔ یہ جنازہ گاڑی تھی جو بتی کی ٹریفک کے درمیان رواں تھی۔ زندہ انسانوں کا سفر اپنی اپنی نامعلوم منزل پر پورے اختیار کے ساتھ جاری تھا۔ ان کے ساتھ ایک لاش آخری بار بستی کی سڑکوں پر سے گزر رہی تھی اور کسی کو خیال نہ تھا کہ کل تک یہ بھی انہی کی طرح زندہ جیتا جاگتا متحرک انسان تھا۔ نہ جانے کب میرا دھیان للو کی طرف چلا گیا۔ اس کی لاش کہاں ہوگی۔ شاید کسی سرکاری اسپتال میں، مردہ خانے کی بینچ پر یا پتھر جیسے فرش پر۔ کل اسی وقت وہ اپنی کار میں کہیں سے آ رہی تھی پھر کار رک گئی۔ اس کا چلتے رہنا ہی زندگی تھا۔ وہ کار بھی کہیں لاوارث پڑی تھی۔

"معلوم نہیں للو کا دنیا میں اپنا کون تھا؟" میں نے کہا۔

غالب نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "میں بھی اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کی آخری رسوم میں کون شریک ہوگا۔"

"ہم بہرحال نہیں جا سکتے۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ معلوم ہو بھی جائے کہ رسوم کہاں ادا کی جائیں گی۔ مگر کون بتائے گا۔۔۔؟"

"ہم آر کے اسٹوڈیو سے پوچھ سکتے ہیں۔ للو نے راج کپور کا حوالہ دیا تھا۔ اور اس کے باپ پرتھوی راج کا۔ انہیں یقیناً اطلاع ملے گی۔" غالب نے کہا۔

"کون اطلاع دے گا؟"

"اس کے جاننے والے پڑوسی۔ سب جانتے ہوں گے کہ وہ کون ہے اور کیا کرتی ہے۔" غالب نے کہا۔

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "چندر کی دلاور بڑا کائیاں شکاری ہے۔ وہ اپنے شکار کی نفسیات کو سمجھتا ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق کے بارے میں بھی ہم ایک جذباتی رد عمل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انسانی رشتوں کو بہت اہم سمجھتے ہیں۔ اس کو سب معلوم ہے۔ للو کو اسی نے مروایا ہے اور دلاور سمجھتا ہے کہ ہم اس پر جتنے چراغ پا ہوں گے اتنے ہی افسردہ بھی ہوں گے۔ اگر ہم للو کی آخری رسوم میں شریک ہونے پہنچے تو یہ دلاور کی توقعات کے عین مطابق ہوگا۔ وہ للو کو گالا بنائے گا۔ گالا سمجھتے ہو؟"

"ہاں۔ وہ قربانی کا بکرا یا بیل جسے شیر سے مروانے کے لیے رکھا جاتا ہے اور پھر شیر کو شکار کر لیا جاتا ہے۔" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ اس چکر میں مت پڑنا بھائی۔ دلاور ہر طرف سے محصور کرے گا۔ ترلوچن کے آدمی الگ ہوں گے اور ان سب کو دلاور ہدایت کرے گا کہ خیال رکھنا۔ وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کے ماہر ہیں۔ مشکوک حلیے کا کوئی بھی شخص نظر آئے اسے دھر لو۔ عین ممکن ہے وہ للو کے دوست احباب کو فوراً شناخت کریں اور ان سے کہیں کہ جو نا آشنا چہرہ ہو اس کی نشان دہی کر دیں۔"

www.paksociety.com

لی کے لیے ہم دور رہ کے بھی دعا کر سکتے ہیں۔"
"دعا۔۔۔!" غالب نے افسردگی اور تلخی سے کہا۔
دوپہر ڈھلنے لگی تھی جب ہم پھر حاجی علی کی درگاہ کے پیچھے ساحلِ سمندر پر پہنچے۔ وہ جگہ اب مجھے محفوظ نظر آتی تھی۔ جانور بھی جہاں ایک بار پکڑا جائے وہاں دوبارہ کسی صورت میں پھر نہیں جاتا۔ نہ ولاور اور نہ ترلوچن کو یہ خیال آسکتا تھا کہ جھٹکا دا پاتے ہی میں پھر وہیں پہنچوں گا۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا کہ میں اکیلا گرفتار ہوا تھا۔ وہاں ایم آر ایس کی سادی وردی نظر آتی تو گمان ہو سکتا تھا۔ بستی میں یہ ہمارا مستقر نہ ہو۔
عمداً میں نے حوالات کے حاجی صاحب کا سامنا کرنے سے گریز کیا اور ہم مسجد کے عقب سے گھوم گئے۔ دھوپ ریت پر چمک رہی تھی اور سمندر کی موجوں میں تحلیل ہو رہی تھی۔ رطوبت اتنی بڑھ گئی تھی کہ میرے جسم پر پسینہ بھی پانی کی طرح بہہ رہا تھا حالانکہ تیز ہوا سمندر کی جانب سے مسلسل آ رہی تھی۔
سمندر کے ساحل پر بہت سی پرانی شکستہ کشتیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سرکنڈوں اور چٹائیوں کی چھت ڈال کے پورے پورے خاندان آباد تھے۔ لانچ کا صرف ایک ہی ڈھانچا تھا جو تقریباً آدھا میل دور ایک کھنڈر کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ یہ خاصی بڑی لانچ تھی اس کے اوپر رنگین چیتھڑے ہوا سے لہرا رہے تھے۔ یہ ملبوں کے کپڑے تھے جو دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈالے گئے تھے۔
غالب نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ پینے کے لیے پانی ایک میل دور سے لاتے ہیں۔ اور جب پانی لینے جاتے ہیں تو وہیں نہا کے کپڑے بھی دھو لیتے ہیں۔ لانچ میں چار خاندان آباد تھے لیکن اس کا "مالک" ایک تھا۔ اس نے ہی سب سے پہلے لانچ کا قبضہ حاصل کیا تھا اور موجودہ کرایہ داروں نے اس کے حقِ ملکیت کو چیلنج نہیں کیا تھا۔ ان میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔ کرائے دار بدلتے رہتے تھے۔ اوپر نیچے کی منزلوں کو چار خاندانوں نے ایک پرامن سمجھوتے باہمی کے تحت تقسیم کیا تھا۔ کیا چیز مشترک ہوگی اور کیا نہیں ہوگی" یہ سب پہلے سے طے تھا۔
"کل رات میری لینڈ لارڈ صاحب سے بات ہوئی" غالب نے کہا۔ "بہت اکڑ فوں دکھا رہا تھا کہ ایسے نہیں چلے گا۔ کون چھوکری لوگ ہے یہ اور کیا دھندا ہے تمہارا۔ ادھر شریف لوگ رہتا ہے۔"
"تمہارا نہیں سالے کے ایک جھانپڑ؟"
"یار ہر جگہ جھانپڑ نہیں چلتے۔" میں نے کہا تھا کہ اس کا اصل مسئلہ کیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "اسے پیسہ چاہیے اور بس۔" "پیسہ دیے بغیر تو ہم بھی نہیں رہتے۔"

"ہاں۔ لیکن روز کا کرایہ دینے والے کی پوزیشن ہوٹل کے مسافر جیسی رہتی ہے" غالب نے کہا۔ "میں نے اسے بتایا کہ اپنا بھی ایک دم شریف لوگ ہے پر ادھر رہنے کے واسطے جگہ ملے تو بتا نہیں۔ تم ادھر جگہ بنا دو اپن ادھر خوش ہیں۔ پھر اس کا موڈ بدل گیا۔ اس نے کہا کہ یہ مہنگا پڑے گا۔ ابھی تم کسی سے بات کر لو۔ اس کا مطلب تھا کہ جو لوگ اب وہاں مقیم ہیں، ان میں سے کوئی جگہ بیچنے کو تیار ہو تو اسے کوئی اعتراض نہیں۔ رات کو ہی میں نے ایک سے بات کر لی۔ اس نے پانچ ہزار پگڑی مانگی۔ میں نے فوراً پانچ سو بیعانہ دے دیا۔"
"کیوں۔ کیا یہاں مستقل رہنا ہے؟"
"نہیں۔ بیعانہ دیتے ہی ہم جگہ کے مالک ہو گئے۔ لیکن قبضہ ملے گا پندرہ دن بعد" غالب ہنسا۔ "میں نے ہی یہ مہلت دی ہے۔ ظاہر ہے اب پندرہ دن تک ہمیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پانچ سو میں بیچ کر لٹے وارد ہو گئے۔ اس سے پہلے ہی بھاگ جائیں گے تو وہ بہت خوش ہوگا کہ مفت میں پانچ سو ملے۔ جگہ بھی خالی نہیں کرنی پڑی۔ اس کے نقطۂ نظر سے تو ہم ایک احمق ہیں" میں ہنس پڑا۔ "دنیا کے سب عقلمندوں کی رائے ہمارے بارے میں ایک جیسی ہے۔"
ایک طرف سے لانچ کا ڈھانچا پانی کے تھپیڑوں کی زد میں تھا مگر دوسری طرف خشکی تھی اور اوپر سے نیچے آنے کے لیے ایک سیڑھی بھی لگا دی گئی تھی۔ لانچ کو سمندر کا شور زدہ پانی اور مرطوب ہوا گھن کے کھا رہے تھے۔ اس کا فولادی جسم زنگ میں ڈھل رہا تھا اور گل رہا تھا۔ رات کے وقت اس کے دوسری جانب بھی پانی آ جاتا تھا۔ اس کے باوجود لوگ یہاں اطمینان سے رہتے تھے اور "جائداد غیر منقولہ" سمجھ کے اس کی پگڑی وصول کر لیتے تھے۔ حالانکہ اس بات کا امکان ہر وقت موجود تھا کہ کسی دن لانچ کی قوتِ برداشت اور مزاحمت بالکل ختم ہو گئی تو اچانک سمندر اس کو کھینچ لے گا یا اس کا ڈھانچا سمندر کی یلغار کے سامنے بکھر جائے گا۔
میرا دل اب عجیب سی بے قراری کا شکار تھا۔ میری نگاہیں لانچ پر رہنے والوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک کھڑکی کے شگاف کا پردہ ہٹا کے کوئی عورت جھانک رہی تھی۔ وہ رابعہ نہیں تھی۔ اوپر کوئی عورت بال سکھا رہی تھی۔ وہ بھی رابعہ نہیں تھی۔ ان میں نازو کی جھلک بھی نہ تھی۔ میرے قدم میرے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہونے لگے تھے۔ اسے کب دیکھا تھا۔ جب دیکھا تھا تب کیا تھا۔ آج پھر حسن دلآرائی وہی دھج ہوگی۔ میں کیا کہوں گا۔ کل ایفائے عہد کیوں نہ ہوا؟ اس سے پوچھوں گا کہ فرقت کے روز و شب

میں جو میرا حال تھا، کیا اس کا بھی وہی حال تھا؟
غالب نے ایک بوسیدہ سیڑھی کے پاس رک کے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "پہلے آپ۔"
میں رک گیا۔ میری گھبراہٹ اچانک بڑھ گئی تھی۔ میں نے سوچا بھی کہ یہ کیا ہو گیا ہے مجھے۔ میں کوئی آغازِ شباب کے اولین تجربۂ عشق سے دوچار ہونے والا نوجوان لڑکا نہیں ہوں۔ رابعہ اور میں تو ایک ہیں۔ قربت میں بھی اور دوری میں بھی۔ حقیقتِ منتظر اور دہاں مجاز کا ایک ہی روپ۔ جیسے صبح سے رات جدا نہیں ایسے ہی محبت کا سورج تو ہر حال چمکتا ہے۔ کبھی ادھر تو کبھی ادھر۔ اس کا نہ ملنا یا ملنا کون سی انوکھی بات ہے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ میرا خوف ہے جو دامن گیر ہے۔ اب تک بارہا اس نے قریب آ کر دور سے کر بہلایا تھا۔ وہ بھی تو خواب کی صورت ایک جھلک دکھا کے اوجھل ہو گئی۔ میں خواہش کے سراب سے خائف تھا۔ کہیں وہ نہ ملی تو جیسے کل رات مل کے دل لگی تھی۔ ایسے ہی میرے لیے احساسِ پشیمانی چھوڑ کے پھر کھو گئی ہو۔ میں اندر جاؤں تو بس وہی محرومی کے ملال کا تسلسل ہو۔
"کیا ہو گیا۔ حوصلہ جواب دے گیا؟" غالب نے قہقہہ مار کے کہا۔ "نقاہت سنبھالوں؟"
میں نے کہا۔ "یار! عجیب سی کیفیت ہے دل کی۔ شور مچا ہے۔"
"تو ابھی سے ڈرنے لگا ہے آشنا۔ تف ہے تیری مردانگی پر۔ تو رسوا کرے گا سب غیرت مند شوہروں کو جو اپنی جوتی کی نوک پر رکھتے ہیں بیویوں کو" غالب نے کہا۔ "مثلاً میں۔۔۔"
"یہ بات نہیں ہے مرزا۔۔۔"
"چل میں ساتھ ہوں تیرے۔ نہیں مارے گی وہ تجھے" غالب نے کہا۔
میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "وہ نازو نہیں ہے۔ اور میں غالب نہیں ہوں کہ مار سے ڈروں۔" اور سیڑھی پر چڑھ گیا۔
مجھے ایک شگاف کو دروازہ فرض کرتے ہوئے اندر جانے کے لیے سرنگوں ہونا پڑا ورنہ میرا سر چھت سے اوپر نکلتا۔ تاہم اس سے زیادہ فرق نہیں پڑا۔ میں اندر قدم رکھ بھی نہ پایا تھا کہ کسی چیز سے ٹکرا گیا جو کہ جنوب مغرب کی سمت سے شہابِ ثاقب کی طرح نمودار ہوئی تھی۔ اندر اندھیرا تھا چنانچہ تصادم کے بعد میں نے ایک زنانہ چیخ سنی۔
"نازو!" میں نے کہا۔ "یہ کیا حرکت ہے تم؟"
وہ ہنسی۔ "ایسے جائنٹ سائز پر یونہی ایکسیڈنٹ ہو جاتے ہیں۔ آپ آ گئے۔ خیر ہے۔"
میں نے سر سہلا کے کہا۔ "تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"
اس نے میری ٹوپی اٹھا کے مجھے پکڑائی۔ "میں بہت دیر سے دیکھ رہی تھی۔ آپ سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے ڈر رہے تھے یا کوئی فلسفیانہ نکتہ تھا جس پر غور فرما رہے تھے۔ یہ مرزا غالب والی ٹوپی کا اثر تھا؟"
غالب میرے پیچھے اندر آ گیا تھا۔ "اس ٹوپی کو بھلا مجھ سے کیا نسبت۔ تم کو اگر میرے سر پہ اچھی لگتی ہے تو ۔۔۔ وہ بات ہے۔"
نازو آگے چلنے لگی۔ "یہ ترت خالی ہو تو اس پہ ڈھکنا لگانے کی کیا ضرورت ہے۔"
میں نے کہا۔ "کل کیسی بات؟"
"بہت اچھی ہے۔ مجھے تو بہت اچھی لگتی ہے پہلے سے۔ تم کو بہت یاد کرتی تھی" نازو نے کہا۔ "کل بہت انتظار کرتی رہی تمہارا۔ جب ہم نے واپس آکے بتایا کہ وہ تو کہیں چلے گئے۔۔۔"
"لاحول ولا قوۃ۔ یہاں جسے دیکھو یہ سمجھتا ہے کہ میں سندباد جہازی کی طرح منہ اٹھا کے گھومنے چلا گیا تھا" میں نے کہا۔
نازو نے ایک پردہ ہٹا کے کہا۔ "ادھر تشریف لائیے۔ یہ ہے فی الحال ہمارا دولت خانہ۔"
اندھیرا وہاں بھی تھا مگر اب میری آنکھیں اس اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ آخر اس اندھیرے میں لوگ زندگی کیسے گزار رہے ہیں! باہر اتنا اجلا دن ہے اور اندر ہر وقت رات۔ نمی، سیلن اور بو۔
"بھائی سکندر!" گل کی آواز پر میں چونکا اور میں نے پلٹ کے بائیں طرف دیکھا۔ وہ ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی حالت یقیناً پہلے سے بہت بہتر تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔
"تم کو پھر صحت مند دیکھ کے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے" [illegible] سے نماز اور ادھر ادھر دیکھا۔ وہ ایک کوٹھڑی سا تھا جو تقریباً بیس فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا تھا۔ اس میں عجیب گھٹن اور ویرانی کی کیفیت تھی۔ میری آنکھیں جسے تلاش کر رہی تھیں۔ میرے کان جس آواز کے لیے ترس رہے تھے، اس کے بغیر وہ اندھیرا دور نہیں ہو سکتا تھا جو باہر سے زیادہ میرے دل کے اندر پھیلا ہوا تھا۔

میں نے نازو کی طرف دیکھا اور کہا۔ "رابعہ کہاں ہے؟"

نازو نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے تو نہیں معلوم۔"

میں نے غور سے اس کی صورت کو دیکھا۔ وہ بالکل سنجیدہ تھی اور کسی شرارت پر مائل نظر نہ آ رہی تھی۔

"تمھیں نہیں معلوم تو پھر کسے معلوم ہوگا؟ محسن کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"ان کے بارے میں بھی یہی عرض کر سکتی ہے بندی۔۔۔"

"نازو، خواہ مخواہ پریشان مت کرو مجھے۔ میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"دماغ خراب ہو رہا ہے تو پاگل خانے جائیں۔ یا نکل جائیں کسی صحرا کی طرف رابعہ رابعہ چلاتے۔" نازو نے کہا۔ "مجھے سخت ڈر تھی۔ میں کیا ان کی پرائیویٹ سیکریٹری ہوں کہ ان کے پروگرام کی خبر رکھوں۔" گل بتانے لگی۔ "بھائی سکندر! وہ دونوں کہیں اکٹھے گئے ہیں۔ رابعہ ہی کا کوئی کام تھا۔ کہہ رہے تھے کہ دوپہر تک لوٹ آئیں گے لیکن شام بھی ہو جائے تو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور کسی کو ان کی تلاش میں جانے کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ خود آجائیں گے۔

بہتر ہے سب اسی جگہ رہیں تاکہ یہ نہ ہو کہ ایک آ گیا تو دوسرے کی تلاش میں نکل گیا اور دوسرا آیا تو تیسرا غائب۔"

میں نے مفصل معلومات حاصل ہو جانے کے بعد محسوس کیا کہ وہ سب اندیشے جو میرے احساس پر دھند کی طرح چھائے ہوئے تھے چھٹ گئے ہیں۔ میں نے نازو کو شرمندہ کرنے والی نظروں سے گھورا۔

نازو نے گل کو ڈانٹا۔ "چپ نہیں رہ سکتی تھیں تم۔ کوئی ضرورت نہیں تھی اپنے بھائی سکندر کو کچھ بتانے کی۔ ہوتے یہ پریشان تو اچھا تھا۔ ہم کیا کم پریشان رہے رات بھر۔"

"آپ کہاں چلے گئے تھے؟" گل نے کہا۔

"یہ میں فوراً فوراً ہر ایک کو نہیں بتا سکتا۔ شام کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کروں گا۔" میں نے کہا۔ "اس میں وہ سنسنی خیز تفصیلات بیان کروں گا کہ سب پر چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔"

"کل چودہ طبق باقی کس پر چودہ طبق؟" نازو نے کہا۔ "میرے حصے کے طبق ابھی روشن کر دیں۔"

"ابھی تو میری آنکھوں کے آگے بھی اندھیرا چھا رہا ہے۔۔۔"

"وہ ایسا ہے۔۔۔ کہ یہاں اندھیرا ہی ہے۔ قصور آپ کی آنکھوں کا نہیں ہے۔" غالب نے کہا۔

"قصور ہے میرے پیٹ کا جس میں دوڑنے والے چوہے بھی کب سے بے حال پڑے ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ لوگ کیا خالی ہاتھ آگئے ہیں؟" نازو نے کہا۔ "کھانے کے لیے کچھ نہیں لائے؟"

"گھر میں کچھ نہیں ہے؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"گھر، یہ گھر ہے؟" نازو نے بگڑ کے کہا۔ "آپ لوگوں نے کیا سمجھا تھا کہ واپس جائیں گے تو گرم گرم کھانا تیار ملے گا۔ ہم ہانڈی چولھے میں لگ جائیں گے بغیر ہانڈی چڑھائے کے۔۔۔"

غالب نے کہا۔ "اسی لیے میں نے کہا تھا کہ لنچ کر لو۔ مگر تمھیں مانے اپنے سکندر اعظم۔ ہجر و فراق کا مروڑ اٹھ رہا تھا نا پیٹ میں۔ محبت کی تپش ہو رہی تھی۔ اچھا ہوتا اگر دعوت اڑا کے آتے اور لمبی تان کے سو جاتے۔ ان بجھو بجر عورتوں سے توقع رکھنا ہی عبث ہے۔ ان کے پاس دس بہانے ہیں حرام خوری کے۔"

"غالب کے بچے! ابھی بجھو بجر اور حرام خور کہتے ہو۔" نازو نے بگڑ کے کہا۔ "پھر لاتے دیا تھا پکانے کو۔ کچن ہے یہاں؟ اور ہو بھی تو ہم کیا اسی کام کے لیے رہ گئے ہیں۔ نوکر ہیں تمھارے؟"

"نوکر نہیں۔ کنیز! اور کنیز بھی زر خرید۔ بے شک تمھارا یہی کام ہے کہ پکاؤ۔ پھر ہمیں کھلاؤ۔ خود بچا ہوا کھاؤ اور خدمت کرو ہماری صبح سے رات تک۔ تھوڑی سی لفٹ کیا دے دی تمھیں تم تو سر چڑھ گئی ہو۔ اوقات بھول گئی ہو اپنی۔ زبان چلاتی ہو ہمارے سامنے گستاخ کنیز باندی کی جوتی۔" ظاہر ہے اس اشتعال انگیزی کے نتیجے میں فساد ہی ہو سکتا تھا۔ نازو نے جتنی بات سن لی تھی وہی بہت تھی خود غالب کا بھی مقصد یہی تھا کہ نازو اس پر دست درازی کرے۔ ایسی ہی نوبت اچھی لگتی تھی اسے۔ وہ اس وقت میری پناہ میں خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا چنانچہ اس نے بارود کی ڈھیری ہوئی نازو کے سامنے آتش بازی جب ساری کی نہیں یہاں تک کہ نازو کو آگ لگ گئی۔ جگہ کم تھی اور غیر محفوظ بھی تھی چنانچہ میں نے نازو کو روک لیا۔

"یہ کیا کرتی ہو۔ موقع محل تو دیکھا کرو۔ یہاں تماشا بن جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "تمھارے لیے تو دل لگی ہے۔"

"یہ دل لگی کی بات نہیں ہے۔" نازو نے کہا۔

"یہ دل کو لگنے والی بات ہے۔" غالب نے کہا۔ "کیونکہ سچی بات ہے اس لیے مرچیں لگ گئی ہیں۔ مگر ہم حق گو ہیں۔ مر جائیں گے مگر بات منہ پر کہیں گے۔ ابھی تو خاموش ہیں ہم۔"

"یار غالب!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "خوب ہے یہ خاموشی بھی۔ اس میں کتنی زندگی ہے۔ بہت دنوں بعد مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں واقعی اپنوں میں ہوں۔ اور جہاں اپنے ہوں وہی تو اپنا گھر ہوتا ہے۔ کل رات میں ایک بہت عالی شان محل میں تھا مگر وہاں یہ سکون، یہ اپنائیت کی خوشی اور یہ راحت کا احساس نہیں تھا۔ جو یہاں ہے۔ کاش! یہ ممکن ہوتا کہ ہم آج کے دن پر قناعت کر سکتے اگلے دن کی ضرورت کو نظر انداز کر سکتے۔"

"قناعت، سکون، ٹھہراؤ۔ شاید یہ ہماری فطرت کے خلاف ہیں۔ کائنات کا نظام ایک مسلسل حرکت سے ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہر دن گزر جاتا ہے، اچھا ہونے کے باوجود۔"

"میرے لیے تو ہر آنے والا دن اچھا ہے۔" گل نے کہا۔ "اس دن سے جو گزر چکا۔"

میں ہنس پڑا۔ "ہم سب بھی تو آنے والے اچھے دن کی امید کے سفر میں ساتھ ہیں۔ آنا میسر نہیں ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

غالب نے جیسے چونک کے کہا۔ "میں ابھی کھانا لے کر آیا۔ بیتی بریانی مسالے والی۔"

"تھوڑی سی میرے لیے کھیر بھی لے آنا۔" نازو نے کہا۔

غالب رک گیا۔ اس کی فرمائش کے انداز محبوبی نے غالب کو زیر خطمی کر دیا۔ وہ کہہ سکتی تھی کہ کھیر بھی لے آنا۔ یا ہم سب کی بات کر سکتی تھی۔ اس نے کہا "میرے لیے" تو غالب کے دل پہ گویا چھری چلا دی۔ اس نے ہاتھ سینے پر رکھا اور جھک کر بولا۔ "کھیر کے بغیر اب میں واپس نہیں آؤں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے جانا پڑے کراچی۔" نازو بے ساختگی یا بے خیالی میں جو کہہ چکی تھی اسے ادائے حسن کی معصومیت کے سوا کچھ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ جب ہم ہنسے تو اس کا رنگ گلابی ہو گیا۔

"میرا مطلب۔۔۔ تھا۔۔۔ سب کے لیے۔۔۔" وہ گھبرا کے بولی۔

"اب یہ ناممکن ہے کہ وہ سب کے لیے کھیر لائے۔ شرط لگا لو۔" میں نے کہا۔

آدھے گھنٹے بعد میں شرط جیت گیا۔ غالب باقی سب کے لیے حاجی علی کی درگاہ کے بازار سے بھی بریانی لایا تھا اور حلوا پوری۔ کھیر کا وہ صرف ایک پیالہ لایا تھا جو اس نے بڑی عاشقانہ نیاز مندی کے ساتھ نازو کو پیش کر دیا۔

"یہ ہم بھی کھا لیں گے۔" میں نے کہا۔

"ایمان سے کھیر بنا دوں گا اس کی جس نے ادھر آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔" غالب نے کہا۔ "یہ میرے جذبات کی کھیر ہے۔"

گل ہنسنے لگی۔ "اگر کھیر نہ ملتی تو۔۔۔"

"میں اپنی کھیر بنا کے پیش کر دیتا۔ آج زندگی میں پہلی بار تو اس نے کچھ مانگا مجھ سے، صرف اپنے لیے۔" غالب بہت خوش تھا۔ فرمانے ہوئے نازو نے خاصا تکلف اور احتجاج کیا لیکن غالب نے پروا نہیں کی۔ کھیر اسے ہی کھانی پڑی۔ پھر میں سو گیا یہ تاکید کر کے کہ جیسے ہی رابعہ اور محسن آئیں مجھے جگا دیا جائے۔

"کتنے شرم کی بات ہے۔ تم کو خود جاگ اٹھنا چاہیے کہ نازیبا کے ساتھ۔ تمھارے دل کے آٹومیٹک الارم میں محبت کی چابی

خوف!

ایک ایسا مسئلہ جس سے ہر شخص دوچار ہے

خوف سے آدمی پریشان ہوتا ہے۔

خوف سے آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔

خوف سے زندگی ناکام ہو جاتی ہے۔

خوف سے ازدواجی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

خوف سے آدمی خودکشی کر لیتا ہے۔

خوف دیمک کی طرح زندگی کو چاٹتا رہتا ہے۔

شرم بھی خوف ہی کا ایک پہلو ہے اور اتنا ہی خطرناک

اردو کے جانے پہچانے منفرد نفسیاتی ادیب اسلام حسین کے قلم سے

خوف و شرم

اور اس کا سدِباب

کا مطالعہ کیجیے

اور ان کمزوریوں سے نجات حاصل کر کے

کامیاب اور خوش و خرم زندگی گزاریے

قیمت: ۴۰ روپے

مکتبۂ نفسیات پوسٹ بکس ۱۹۲۳ کراچی

نہیں رہی کیا؟" غالب نے کہا۔

"یہ جاپانی والی محبت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم آتنی دیر کیا کرو گے۔ فارغ مت بیٹھو۔ دیکھو جسے دل چاہے مگر زبان سے میرا رات کا فسانہ بھی سناتے جاؤ۔"

"پھر تم کیا بتاؤ گے پریس کانفرنس میں؟"

"یہی سب کچھ۔ مرچ ذرا کم ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

جب میں سو کر اٹھا تو ہر سو اندھیرا تھا اور خاموشی تھی۔ پہلے تو مجھے گمان ہوا کہ یہ وہی اندھیرا ہے جو دن رات کی قید سے بے نیاز ہے۔ مگر ایک کونے میں جلنے والی لالٹین نے مجھے رات کی خبر دی۔ میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی اور پھر دوبارہ دیکھی۔ ابھی رات کے دس بج رہے تھے۔ میں ساڑھے چھ سات گھنٹے تک سوتا رہا تھا۔

قدرتی طور پر سب سے پہلے مجھے رالف کا خیال آیا۔ کیا وہ ابھی تک نہیں آئی ہو؟ اس کمرے میں جسے ایک تجربہ کہنا زیادہ مناسب تھا اب میں اکیلا تھا۔ گل بھی اپنے بستر پر موجود نہ تھی۔ میں نے اس خرابے میں آ کر دوسرے خاندان کے افراد کی آوازیں سنیں۔

کہیں ایک مرد اور عورت ایک دوسرے پر چلا رہے تھے۔ ایک بچہ ایک دوسرے میں مسلسل ریں ریں کر رہا تھا۔ کسی نے پیار سے تم کے ساتھ زیادتی کرنے کی قسم کھائی تھی۔ یار تم بھی دریں ہوں کر رہا تھا۔ میں نے جھک کے باہر دیکھا اور دونوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے لانچ سے نیچے اترا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر وہ دونوں ریت پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن قریب جا کر دیکھنے کے بعد وہ اجنبی ثابت ہوئے۔ میں نے دوسری طرف نظر ڈالی۔ سمندر کے کنارے اندھیرا ابھی گہرا نہیں ہوا تھا۔ وہی دھندلکا سا جو کراچی کے ساحل کی تاریک راتوں میں نظر آتا تھا۔ مجھے دور کچھ سائے سے متحرک دکھائی دیے۔

یہ غالب اور نازو تھے۔ وہ بڑی بے فکری سے ریت پر ٹہل رہے تھے۔

"بہتر ہے چھ کے بعد" غالب نے کہا۔ "نیند پوری ہو گئی؟"

میں نے کہا۔ "وہ لوگ نہیں آئے؟"

"کون لوگ؟ وہ چوہدری رالا اور وغیرہ؟ نہیں وہ نہیں آئے۔" غالب نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ دونوں ننگے پاؤں تھے۔

"غالب! میں سمندر میں پھینک دوں گا۔" میں نے بھنا کے کہا۔ "کہاں ہے؟" اور پھر اپنے جوتے بھی اتار دیے۔

"لاحول ولا قوۃ۔ بھائی تم سے پوچھ کر نازو کہاں ہے تو ہم بتا دیں گے۔" غالب نے کہا۔ "لا بھی کی خبر تم کو ہونی چاہیے۔"

میں اس کے پیچھے دوڑا اور وہ پلیٹ سے بھاگا مگر بیس پچیس قدم دوڑ کے میں نے اسے پکڑ لیا اور اٹھا کے پانی کی طرف چل پڑا۔ نازو نے بالکل مداخلت نہیں کی۔ اس نے تو کہا کہ ذرا آگے لے جا کر پھینکنا کسی شارک کے سامنے۔

غالب نے شور مچایا۔ "یار کیا وحشیانہ پن ہے۔ ایک میں ہی رہ گیا ہوں۔ مجھ سے نازو نے کہا تھا کہ مت بتانا۔ لیے جھگڑے..." مگر میں نے اسے پانی میں پھینکنے کے بعد کہا۔ "اب بولو۔"

غالب کو تیرنا نہیں آتا تھا۔ ایک بہت بڑی لہر کو اپنی طرف آتے دیکھ کے وہ واپس دوڑا۔ میں نے اسے پھر پکڑ لیا۔ "یار میں ڈوب گیا تو..."

"کوئی بات نہیں۔ ایم آر ایس کی ٹوٹے گی نہیں۔ نازو بھی خوش رہے گی تمہارے بغیر۔" میں نے کہا۔ اور اسے پھر اٹھا لیا۔

"یار... وہ... وہ ادھر..." غالب نے چلا کے کہا۔ "گل کے ساتھ ہے۔" مگر اس وقت تک میں پھر اس کو پانی میں اچھال چکا تھا۔ وہ صنعت بلکہ جھٹکا ابھرا یا اور اس کی نازو سے لڑائی شروع ہو گئی۔

"مروا دیا تھا ابھی مجھے۔ خوب دانت نکال رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں شارک کے سامنے ڈالو۔ تم خود کسی شارک سے کم ہو؟"

"میں شارک ہوں؟" نازو نے چلا کے کہا۔

میں آگے نکل گیا اور سمندر کے شور میں ان دونوں کی آواز دب گئی۔ یا شاید خود سمندر کا شور اس تلاطم سے دب گیا جو میرے وجود میں اچانک برپا ہو گیا تھا۔ ساحل پر اکا دکا لوگ اب بھی تھے۔ زیادہ تر اسی علاقے کے رہنے والے تھے جو اپنے لباس اور حلیے سے پہچانے جاتے تھے۔ میری نگاہیں بہت آگے تک دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں اور میرے قدم تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ دل کی دھڑکن کی طرح۔

وہ اچانک نمودار ہوئی۔ بالکل ایسے جیسے دیو مالائی قصوں کی کوئی مخلوق جو سمندر کے جھاگ سے سطح آب پر کسی خیال کی طرح تیرتی ہوئی آئے اور مجسم ہو جائے۔ اس نے سفید ساڑی باندھ رکھی تھی جو تیز ہوا میں بادل کے ٹکڑے کی طرح لگتی تھی جس نے اسے ڈھانپ لیا ہو۔ میں خواب زدہ شخص کی طرح چلتا گیا یہاں تک کہ اس کے اور میرے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات گیارہویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

پسندیدہ رسائل و ڈائجسٹ کراچی پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں

معاشرے کے ان
ناسوروں کی روداد جو
گوشت و پوست سے گزر کر
انسانی ہڈیوں میں اتر رہے
تھے. ایک کفن بردوش نوجوان کی
کہانی جس کے شب و روز میت کی
بستی میں گزر رہے تھے. جلتے دن
سلگتی راتیں، آس و یاس
خوف و ہراس، تلخ
حقیقتیں شیریں خواب

رابعہ بڑی خاموشی سے روتی رہی اور سسکیاں لیتی رہی۔ میرے شانوں پر اس کے آنسو آتش سیال کی طرح بہتے گئے۔ اس کے بال ہوا کے ساتھ اڑ کے میرے چہرے پہ آ گئے تھے اور اس کی خوشبو میرے وجود میں ایسے اتر آئی جیسے بہار کی خوشبو فضا میں پھیلتی جاتی ہے۔ میں نے اس کے ملنے سے پہلے بھی کچھ نہیں سوچا تھا کہ جب وہ سامنے ہوگی تو اس سے کیا کہوں گا۔ اور اس کے ملنے کے بعد بھی میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اس سے کیا پوچھوں. کیا کہوں۔ الفاظ یکلخت اپنے وجود کی اہمیت کھو بیٹھے تھے غیر ضروری ہو گئے تھے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ خاموشی سے بڑھ کے کون سی زبان میں گفتگو ہو سکتی ہے؟ یہ خاموشی تو محرم راز ہے۔ اس کی اور میری آواز ہے جو دلوں کی دھڑکنوں میں شامل ہے۔

میں آہستہ آہستہ اس کے سر کو تھپکتا رہا اور اس کے بالوں کو سہلاتا رہا۔ میرے اور اس کے قدموں کے نیچے پانی سیر ہوتا آتا تھا اور سنسناتے جھاگ کے بلبلے بکھیر کر کے لوٹ جاتا تھا۔ نرم ٹھنڈی ریت ہمارے پیروں پر آ گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس طرح ہم کتنی دیر کھڑے رہے اور اس عرصے میں کتنے لوگوں نے ہماری اس دیوانگی کی بے خودی کا نظارہ کیا۔

مجھے تو یہ بھی پتا نہیں چلا تھا کہ کل جو رابعہ کے ساتھ تھی کب ہمیں تنہا چھوڑ کے فرار ہو گئی تھی۔

بالآخر اس نے سر اٹھایا اور مجھے دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ستارے روشن نظر آئے۔

"کل کہاں چلے گئے تھے؟" اس نے زندگی ہوئی آواز میں کہا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ شاید پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی تھی۔ مگر یہ احساس تو مجھے اس سے ہر بار مل کے ہوتا تھا۔ کبھی درمیان میں جدائی کا وقفہ آیا تو اس کا تصور ضرور ساتھ رہا لیکن وہ ملی تو اس کے حسن کی تصویر زیادہ حسین نظر آئی۔

"ناراض ہو کیا؟" رابعہ نے کہا۔ "بولو گے نہیں؟"

"کیا بولوں؟" میں نے کہا۔ "ڈر لگتا ہے یہ خواب بھی ختم ہو جائے گا۔ اچھا ہے جتنی دیر تمہیں دیکھ لوں۔ اس روشنی کو دل میں اتار لوں۔"

وہ مسکرائی۔ "میں اب نہیں جاؤں گی۔"

"یہ تو پہلے بھی کہا تھا تم نے۔ ایسا کیوں ہے رابعہ؟ پہلے تو ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ مگر اب تم چھوڑ جاتی ہو

مجھے اور ۔ دور رہ سکتی ہو مجھ سے ۔ یہ احساس بھی نہیں ہوتا تم کو ۔ کہ جدائی کتنی بڑی سزا بن جاتی ہے میرے لیے ۔"

"صرف تمھارے لیے ؟"

"ہاں ۔ صرف میرے لیے ۔ تم بے رحم ہو گئی ہو ۔ تم نے بے رخی کا یہ چلن کیوں اختیار کر لیا ہے ؟" میں نے کہا ۔" مجبوری کی بات مت کرنا ۔ میں نہیں سنوں گا ۔"

"میں کچھ نہیں کہوں گی ۔ صرف تمھاری سنوں گی ۔ جو چاہو کہو مجھے ۔ مجھے معلوم ہے تم بہت خفا ہو مجھ سے ۔"

میں نے کہا ۔" جان ! خفا ہونا کیسا ۔ اگر خفا ہو سکتا میں تو پھر پریشان کیوں ہوتا ۔ میں روٹھ جاتا ۔ بے نیاز ہو جاتا ۔ کم سے کم بے نیازی کا اظہار کر سکتا ۔ کوشش کر سکتا کہ تمھیں بھول جاؤں لیکن یہ سب تو میرے لیے اتنا ہی ناممکن ہے جتنا زندگی کے احساس سے زندگی کو الگ کرنا ۔"

"بہت کچھ اپنے اختیار میں نہیں ہوتا ۔" اس نے جیسے خود سے کہا ۔" جیسے محبت کرنا ۔ یا نہ کرنا ۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔" آج کے بعد ۔ پھر کوئی ایسی رات آئے گی جب اپنی تنہائی کے سوا ہر رفیق کوئی نہ ہوگا ۔ تو میں اس وقت کو یاد کروں گا ۔ آج سے پہلے کی چند راتیں بھی ہیں جو تصویر بن گئی ہیں جن کے سارے رنگ تازہ ہیں اور سب نقش انمٹ ہیں ۔ اکثر میں ان کو دیکھتا رہتا تھا ۔"

وہ پلٹ کے میرے ساتھ چلنے لگی ۔ ہوا اس کے پیکر کو چھو کے مجھ تک پہنچ رہی تھی ۔ جنگل میں اب مہک بھی شامل ہو گئی تھی ۔ اس کے بال اڑتے تھے تو میرے چہرے کو چھو لیتے تھے ۔ آنچل اڑتا تھا تو مجھ سے لپٹ جاتا تھا ۔ اس کے قرب کی ساری آنچ مجھ تک پہنچ رہی تھی اور میرے حواس پر اس رات کا طلسم طاری تھا ۔

"محسن بھی تمھارے ساتھ تھا ۔ وہ کہاں گیا ؟"

"کھانا لینے گیا ہوگا ۔ آیا تو میرے ساتھ ہی تھا ۔" رابعہ نے کہا ۔

"تم نے مجھے جگایا نہیں ؟"

"محسن تو جگانا چاہتا تھا ۔ میں نے روک دیا پھر غالب نے کہا کہ ابھی سونے دو ۔"

"غالب نے بتایا ہوگا کہ رات کیا ہوا تھا ؟"

"ہاں ۔ کچھ بتایا تھا ۔ بس ایک منٹ کی تاخیر سے فرق پڑ گیا ورنہ کچھ نہ ہوتا ۔" وہ بولی ۔

"کیا نہ ہوتا ؟" میں نے کہا ۔" وہ سب جو ہوا اور قتل نہ ہوتا مگر اس سے برا ہوتا ۔ میرے ساتھ تم کو بھی اٹھا لیا جاتا ۔ میں اکیلا تو کسی نہ کسی طرح نکل آیا ۔ تمھارا ساتھ ہوتا تو وہاں کی صورت ہی کوئی نہ رہتی ۔"

"مجھے تم سب کے بارے میں معلوم ہوتا رہتا تھا ۔ بس درمیان میں یہی ایک وقفہ تھا جب میں یہاں پہنچ گئی تھی اور تم نہیں پہنچے تھے تو مجھے بہت تشویش تھی ۔"

"میں وعدے کے مطابق جمعرات کی شام کو پہنچ گیا تھا ۔ حالانکہ بعض اوقات حالات میرے راستے کی دیوار بنے ۔"

"مجھے بتایا ہے غالب اور محسن نے ۔"

"کیا تمھیں کبھی یہ خیال آیا کہ میں نہیں پہنچ سکا تو کیا ہوگا ؟" میں نے کہا ۔" اگر جمعرات کی رات کو تمھیں یہاں کوئی نہ ملتا ؟"

رابعہ نے کہا ۔" خیال تو آتا تھا لیکن اس سے یقین میں فرق نہیں پڑتا تھا ۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ملو گے ۔ اگر میں نہ آتی تو کیا ہوتا ؟"

"معلوم نہیں کیا ہوتا ۔" میں نے کہا ۔" سچ پوچھو تو مجھے امید کم تھی ۔ خوف زیادہ تھا ۔"

"مجھ پر اعتماد نہیں تھا ؟"

"بات اعتماد کی نہیں ۔ اختیار کی تھی ۔ تم آزاد نہیں تھیں ۔" میں نے کہا ۔

"مگر اب میں آزاد ہوں ۔" رابعہ نے قطعی لہجے میں کہا ۔

"کیا تم تسلیم کر رہی ہو کہ چاند بھائی نے تمھیں قید کر رکھا تھا ؟" میں نے کہا ۔" تم اس کی مرضی کی پابند تھیں ؟"

اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا ۔" ہاں ۔ میں اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی تھی ۔"

"آخر کیوں رابعہ ؟" میں نے کہا ۔" جب تم میرے پاس آتی تھیں تو نہ تمھارے ہاتھوں میں زنجیر ہوتی تھی اور نہ تمھارے ساتھ کوئی محافظ آتا تھا ۔ تم خود کیوں چلی جاتی تھیں ؟"

"میں نے بتایا تو تھا کہ میں مجبور تھی ۔"

میں نے کہا ۔" لیکن یہ کبھی نہیں بتایا تھا کہ مجبوری کیا تھی ۔ کون تھا یہ خبیث چاند بھائی ، جو میرے اور تمھارے درمیان آ گیا تھا ؟"

رابعہ مسکرائی ۔" میں نے سنا ہے تم کو سخت حسد ہو گیا تھا ۔ پاگل پن کی حد تک ۔"

"یہ ٹھیک ہے ۔ میرا بس چلتا تو میں اس کو قتل کر دیتا ۔ پھر تم نے مجھے روکا ۔ کچھ حالات نے ۔ وہ میرے سامنے ہی نہیں آیا ۔"

"تم تو میرے بارے میں بھی ۔۔۔" وہ رنجیدہ لہجے میں بولی ۔

میں شرمندہ ہو گیا ۔" دیکھو رابعہ ! محبت میں یہی ہوتا ہے ۔ آدمی پاگل ہو جاتا ہے ۔ شکی اور حاسد ہو جاتا ہے ۔ تم تو اس کے ساتھ تھیں ۔ میں اس کی وہ نظر برداشت نہیں کر سکتا تھا جو تم کو میری طرح دیکھے ۔ جب تمھاری یاد کا دورہ پڑتا تھا تو مجھے تم سے بھی شکوہ ہوتا تھا کہ تم جانتے بوجھتے میرے آزار میں اضافہ کر رہی ہو ۔ تم نے بتا دیا ہوتا کہ تمھاری مجبوری کیا ہے تو میں سمجھ لیتا ۔ یا سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا ۔ مگر یہ تو میں اب بھی نہیں جانتا کہ چاند بھائی کیا چاہتا تھا ۔ کیا وہ تمھیں چاہتا تھا ؟"

رابعہ نے کہا ۔" چاند بھائی بے وقوف نہیں تھا کہ مجھے چاہنے لگتا ۔ اسے معلوم تھا کہ میں اور تم کسی اور کے نہیں ہو سکتے ۔ بہت اچھی طرح جانتا تھا وہ یہ بات ۔ ویسے بھی چاہت اور محبت کا کھیل اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا ۔ وہ کسی بھی عورت سے اس طرح محبت کر ہی نہیں سکتا جیسے سب کرتے ہیں ۔"

"پھر کیوں دور رکھا اس نے ۔ تم کو مجھ سے ۔۔۔ ؟ کیا ملا اسے ۔" جھلا کے میں نے کہا ۔

رابعہ نے کہا ۔" پہلے اس کا ایک مقصد تھا ۔ اس کے اور دلاور کے درمیان ایک کاروباری معاہدہ تھا ۔ تم دلاور کے دشمن تھے ۔ اس کے دشمن ہو جاتے تو اس کا بھی بہت نقصان ہوتا ۔"

"وہ بھی اس کاروبار میں شریک تھا ؟"

"نہیں ۔ یہ اسلحے کی اسمگلنگ کا دھندا تو دلاور کا ہے ۔ چاند بھائی ہر غیر قانونی کام کرتا ہے مگر وہ وطن فروش نہیں ہے ۔ یہ بات اس نے بھی تم کو بتا دی تھی ۔ وہ دلاور سے الگ ہونا چاہتا تھا اور تمھاری مدد بھی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ کاروباری معاہدے کا پابند تھا اور میعاد ختم ہونے تک دلاور کا ساتھ دینے پر مجبور تھا ۔ اگر دلاور کو معلوم ہو جاتا کہ وہ تمھاری مدد کرتا ہے تو دلاور اسے نقصان پہنچا سکتا تھا ۔ وہ تمھیں کسی مخبر کے ذریعے چاند بھائی کے بارے میں معلومات فراہم کر سکتا تھا ۔ اس کے بعد شاید تم ہی چاند بھائی کی تباہی کا سبب بن جاتے ، جوشِ رقابت میں ۔ چاند بھائی نے مجھے اپنے ساتھ رکھا لیکن دلاور کو یہ تاثر دیا کہ اس نے مجھے قید کر رکھا ہے اور وہ دلاور کی مدد کرنا چاہتا ہے ۔ اس نے مجھ سے کہا کہ جب تک دلاور کے ساتھ معاہدے کی میعاد پوری نہ ہو جائے تم میرا ساتھ دو ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بعد نہ صرف یہ کہ دلاور سے الگ ہو جاؤں گا بلکہ بے خوف ہو کے تم سب کی زیادہ مدد کر سکوں گا ۔ یہ

اس کی مجبوری تھی کہ وہ سامنے آ کے کچھ نہیں کر سکتا تھا ۔ وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہے ۔ اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ کوئی شریفانہ کاروبار اختیار کر سکے اور غیر قانونی دھندوں میں جو اس کے دوست ہیں یا ساتھی ہیں وہی اس کے دشمن بھی ہو سکتے ہیں ۔ شاید پولیس اس کا دیا کھاتی ہے اور یہ مال کس کس کو پہنچا ہے نیچے سے اوپر تک کس کا حصہ کتنا ہے ، سب جانتا ہے چاند بھائی ۔ اسے کون اجازت دے گا کہ اچانک اپنے سارے کالے دھندے چھوڑ دے ؟ اسے اب مجرموں کے درمیان انھی جیسا بن کے رہنا پڑے گا ورنہ وہی لوگ اسے مروا دیں گے ۔ پولیس ہی نہیں اس کے ہم پیشہ بھی اس اندیشے میں مبتلا ہو جائیں گے کہ جس شخص کو آج شرافت اور نیکی کا دورہ پڑا ہے کل تک تو وہ ہمارا ساتھی تھا ۔ وہ ہمارے بارے میں سب کچھ جانتا ہے ۔ کہیں اس دورے کی کیفیت میں وہ سب کا بھید نہ کھول دے ۔ پولیس بھی ڈرتی ہے کہ ایسا شخص خطرناک ثابت ہو سکتا ہے ۔ چنانچہ جو اندھیرے میں ہے ، وہ روشنی میں نہیں آ سکتا ۔ شاید روشنی کو چھوڑ کے اندھیرے میں جانا اتنا مشکل نہیں ہوتا ۔ چاند بھائی کو اپنی جان کی بازی لگا کے تمھاری مدد کرنے کا کوئی شوق نہیں ۔ زندگی کے تجربات نے اسے اتنا پختہ کر دیا ہے کہ اب وہ جذباتی باتیں نہیں کرتا ۔ وہ حقائق کو تسلیم کرتا ہے ۔ تسلیم کرتا ہے کہ وہ مجرم ہے ۔ اس کے سارے کاروبار غیر قانونی اور غیر اخلاقی ہیں اور اس کے پاس سب حرام کی کمائی ہے ۔ وہ منافق نہیں ہے حاجی عبداللہ جیسے لوگوں کی طرح جو اتنی لمبی داڑھی رکھ کے اور دو دو بار حج کر کے دنیا کے سامنے مومن اور پاکباز بنتے ہیں ۔ ہاتھ میں تسبیح اور زبان پر سبحان اللہ اور جزاک اللہ رکھتے ہیں لیکن کاروبار وہی کرتے ہیں جو چاند بھائی کرتا ہے ۔ وہ تو صاف کہتا ہے کہ مجھے کسی کے سامنے نیکی کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے اور گناہ میرے اتنے ہیں کہ شیطان کے بعد شاید میں ہی مردود ہوں ۔ معلوم نہیں خدا کب توفیق دے گا ۔ ابھی تو مجھ میں ہمت ہے نہیں خدا کے سامنے جا کے سر جھکانے کی یا خانۂ خدا سے حاجی کا خطاب لانے کی ۔ میرا دل ایسی چیزوں کی طرف مائل ہی نہیں ہوتا تو میں کیا کروں ۔"

آہستہ آہستہ رابعہ کا لہجہ متوازن ہوتا جا رہا تھا اور اس کی باتوں میں ربط پیدا ہو رہا تھا ۔ ہم چلتے چلتے بہت دور آ گئے تھے ۔ نہ جانے کب اس نے میرے بازو کا سہارا لے لیا تھا ۔ اب وہ مجھ سے لگ کے اپنا سر میرے شانے پر رکھے چل رہی تھی ۔ میرا ایک ہاتھ اس کے دوسرے شانے

www.paksociety.com

تک پہنچا ہوا تھا' اسے سہارا دینے کے لیے اور اپنے قریب رکھنے کے لیے۔

اچانک اس نے کہا: "ہم تو بہت آگے آ گئے۔" پھر اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا: "وہ لوگ... انتظار کریں گے!"

"نہیں - انھیں معلوم ہے کہ اتنے انتظار کے بعد ہم ملے ہیں۔ ہمیں بہت باتیں کرنی ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"چلو پھر کہیں بیٹھ جائیں۔ میں تھک گئی ہوں۔"

میں نے بائیں جانب ایک چٹان سی دیکھی۔ اس کا سیاہ سایہ دور سے سائبان کی طرح لگتا تھا۔ ساحل اب بالکل ویران تھا۔ کہیں کہیں کیکڑے ہی نظر آنے لگے تھے جو دیکھتے ہی پھر پانی میں غائب ہو جاتے تھے۔ ایک جگہ بہت بڑا کچھوا دیکھ کے رابعہ ڈری تھی ورنہ وہ پرسکون تھی۔ میں نے اس چٹان تک پہنچ کے دیکھا تو وہ لانچ مجھے کہیں دکھائی نہ دی جو ہمارا عارضی گھر تھی۔ اس کے پیچھے حاجی علی کی درگاہ کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں اور بہت پیچھے بمبئی کا پورا شہر تاروں بھرے روشن آسمان کی طرح لگتا تھا۔

مجھے دو چٹانوں کے درمیان ایک ایسا پلیٹ فارم سا نظر آیا جو قدرے ہموار اور محفوظ تھا۔ میں نے رابعہ کو اٹھایا اور اوپر بٹھا دیا۔ وہ مجھے پہلے کی طرح ہلکی پھلکی لگی۔ وہ ہنسی اور تھوڑا سا شرمائی مگر پھر پیر لٹکا کے بیٹھ گئی۔ میں دونوں ہاتھوں اور کہنیوں کے بل اوپر چڑھا تو میری ہتھیلیاں رابعہ کی کمر کے نرم ریشمی لمس کے بعد پتھر کی سخت کھردری سطح پر پھسل گئیں۔

میں نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تو رابعہ نے کہا: "یہ گھڑی کس کی ہے؟"

میں نے کہا: "یہ تحفہ ہے کسی کا۔"

وہ شرارت سے بولی: "کس کا؟ کملا کا یا... تقی کا؟"

"اچھا جی - آپ کو نام بھی معلوم ہو گئے۔" میں نے کہا۔

"اور فوراً استعمال بھی کر لیے آپ نے طعنے کے طور پر۔"

وہ شرمندہ ہو گئی: "میں مذاق کر رہی تھی۔ طعنہ کیسا؟"

"کملا تو خیر پاگل تھی۔ تقی کا مجھے بہت رنج ہے۔ کاش، ہم اس سے نہ ملے ہوتے۔" میں نے کہا: "تمھارے لیے ضرور ایک تحفہ ہے کملا کی طرف سے۔"

"میرے لیے؟" رابعہ نے حیران ہو کے کہا۔

میں نے جیب میں سے وہ زنانہ ماڈل کا ریوالور نکالا جس کے ہاتھی دانت سے بنے ہوئے دستے پر سنہرے نقش و نگار تھے۔

رابعہ نے ریوالور کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ میں نے سگریٹ جلا کے دیا سلائی کو روشن رکھا۔

"یہ کملا کا ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "کیا وہ خود بھی ایسی ہی تھی؟"

"کیا مطلب؟" میں نے دیاسلائی جھٹک دی۔

"خوبصورت۔ مہلک۔ آٹومیٹک۔" رابعہ ہنسی۔

"وہ پہلے بہت خوبصورت تھی۔ جب میں اس سے نہیں ملا تھا۔ یہ تو میں نہ مان سکتا ہوں اور نہ کہہ سکتا ہوں کہ تم سے بڑھ کر کوئی اور حسین بھی ہو سکتا ہے اس کائنات میں۔"

"چلو چلو۔ ایسے ڈائیلاگ سننے کا شوق نہیں ہے مجھے۔"

میں نے کہا: "جان! یہ سچ ہے۔ تم جو چاہو کہو۔ ممکن ہے کوئی اسے میری نظر کا قصور کہے لیکن قصور تو دل کا ہے۔ کملا پہلے واقعی بہت حسین تھی لیکن تم سے کیا موازنہ اس کا۔ اس نے مجھے اپنی پہلے کی تصویریں دکھائیں۔ وہ خود کہتی تھی کہ اس وقت تم دیکھتے مجھے تو یہ ناممکن تھا کہ مجھ پر فریفتہ نہ ہوتے۔"

رابعہ ہنسی: "کیا تمھیں افسوس ہوا کہ اس سے پہلے نہیں ملے؟"

"یہ تو ایسی ہی بات ہو گی جیسے میں کہوں کہ مجھے سوئٹزرلینڈ میں پیدا نہ ہونے کا افسوس ہے۔ یہ ایک احمقانہ خواہش ہو گی بلکہ دیوانگی کی بات ہو گی اگر میں کہوں کہ کاش میں پرنس آف ویلز ہوتا۔ اس کے علاوہ۔ یہ تو کملا کا غرور تھا۔ کیا پتا میں اس کے مقابلے میں اس کی خادمہ پر فریفتہ ہو جاتا۔ فریفتہ ہونے کے لیے کسی کے ملکۂ حسن ہونے کی شرط کس مجنوں نے رکھی ہے آج تک۔"

"اس کا ریوالور تمھارے ہاتھ کیسے لگ گیا؟"

"مجھے اس سے چھیننا پڑا تھا۔ پہلے وہ پاگل خودکشی کی دھمکی دے چکی تھی اپنے باپ کو۔ پھر مجھے ڈرا رہی تھی۔ ایسا خطرناک کھلونا کسی دیوانے کے ہاتھ میں نہیں رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"میرے ہاتھ میں تو ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "کیا میں پاگل نہیں ہوں؟"

میں نے کہا: "اس لحاظ سے ضرور ہو کہ میری خاطر تم نے خود کو برباد کر لیا۔ سب کچھ گنوا دیا اپنا۔"

"نہیں۔ ایسا مت کہو۔ میں نے خود کو پا لیا۔ پھر سے دریافت کر لیا۔ ورنہ میں خود کو بھی ایسا کہاں جانتی تھی۔"

اس نے تھوڑا سا پیچھے کھسک کے چٹان سے پشت لگا لی۔ میں بھی پیچھے کھسک گیا۔ وہاں صرف اتنی ہی جگہ تھی کہ ہم دونوں پیر پھیلا کے بیٹھ سکتے تھے۔ رابعہ نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔

"تمھیں سردی تو نہیں لگ رہی ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے آہستہ سے سر کو نفی میں ہلایا: "تمھیں بھوک لگ رہی ہوگی۔"

میں نے کہا: "نہیں!" پھر ہم دونوں چپ بیٹھے رہے اور ایک دوسرے کے قرب کے احساس کی خوشی سے دل کو بھرتے رہے۔

"تم سب سے بچھڑ کے میں بے گھر ہو گئی تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "میرا اپنا گھر جب تباہ ہوا تھا تب مجھے یہ احساس نہیں ہوا تھا۔ تم سب کی مجھے بہت یاد آتی تھی۔ اکثر رات کو میں سوچتی تھی کہ تم لوگ کہاں ہو گے۔ کیا کر رہے ہو گے؟ ہر صورت میرے سامنے آ جاتی تھی۔ محسن اور شمالی کی، غالب اور نازو کی۔ میں سوچتی تھی کہ تم سب نہ جانے کیا سمجھتے ہو گے، کیا کہتے ہو گے کہ رابعہ یہ کیا کر رہی ہے اور کیوں کر رہی ہے۔ تم سب اکٹھے ہو کے میرے بارے میں کیا باتیں کرتے ہو۔ چاند بھائی کے ساتھ رہنے میں بس یہی ایک ذہنی اذیت تھی ورنہ آرام اور آسائش کے تو سب اسباب تھے وہاں۔ اس نے مجھے ایک جگہ نہیں کئی جگہ رکھا۔ ہر جگہ ایک علیحدہ حصہ میرے لیے مختص رہا۔ وہ دن میں ایک آدھ بار چکر ضرور لگاتا تھا میری طرف لیکن بیشتر وقت تو وہ غائب رہتا تھا۔ اپنے چکروں میں پڑا رہتا تھا۔ جب اسے فرصت ہوتی تھی تو وہ مجھ سے کہتا تھا کہ چلو کہیں گھوم آئیں۔ گھر کے اندر اس نے رسالے، اخبار، ریکارڈ، ریڈیو گرام اور ٹی وی وغیرہ ہی کا نہیں فلموں کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ اٹھارہ ملی میٹر پہ بے شمار اچھی فلموں کا ذخیرہ تھا۔ ایک چھوٹا سا پرائیویٹ سنیما کمرہ ہوا سے جس میں وہ فلمیں دیکھی جا سکتی تھیں لیکن میرا دل کسی چیز میں نہیں لگتا تھا۔ وہ بے حد معذرت کرتا تھا کہ مجھے بہ قید تنہائی کاٹنی پڑ رہی ہے اور بعد میں وہ میرا بہت شکر گزار رہتا تھا کہ میں نے اس سے تعاون کیا۔ میری وجہ سے اس کو نقصان نہیں اٹھانا پڑا اور دلاور کے ساتھ اس کے کاروباری معاہدے میں خلل نہیں آیا۔"

"کبھی دلاور آیا تھا وہاں جب تم وہاں تھیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ دو بار۔ اسے میں نے دور سے دیکھا۔ پھر ایک بار ملاقات ہو گئی۔ وہی تیور تھے اس کے۔" رابعہ نے کہا۔ "بکنے لگا کیا حال ہیں اپنے ہیرو کے بغیر۔ میں نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور یہی ظاہر کرتی رہی جیسے میں اپنی مرضی کے خلاف چاند میاں کی قید میں ہوں۔ جب وہ دونوں تمھارے خلاف بولنے لگتے تھے تو میں دلاور کو مشتعل کرنے کے لیے کوئی بات کہہ دیتی تھی۔ مثلاً ایک بار اس نے چاند بھائی سے کہا کہ اس... کو اچھی طرح قابو میں رکھنا۔ پھر اس نے کیا کہا تھا مجھے' یہ میں نہیں دہرا سکتی۔ اس نے کہا کہ فکر ہی نہ کرو چودھری صاحب۔ یہ چڑیا اپنے جال سے اڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس کی آواز پر چڑا خود آئے گا چوں چوں کرتا۔ چڑیا چڑے کی کہانی سے وہ اکثر مثالیں دے کر ہمارا مذاق اڑاتے تھے کہ اب بھی چڑا لایا چاول کا دانہ چڑیا لائی دال کا دانہ۔ دونوں نے کہا کہ مل کے کھچڑی پکائیں گے کیسی پکی پھر کھچڑی۔ تو میں نے کہا کہ اس کھچڑی میں جب تم دونوں کو ڈال کے گھوٹا جائے گا تو پھر بنے گا حلیم۔ جو سکندر کھلائے گا اپنے کتوں کو۔ چاند بھائی نے میرے ایک ہاتھ مار دیا کہ مجھے کہنے کی ضرورت نہیں صندوق کل والا حشر کروں گا۔ اب یہ دلاور کیا جانے کہ کل کی بات تو فقط زیب داستان کے لیے تھی۔ میں نے بھی چاند بھائی کو گالیاں دیں اور ان دونوں کو رو رو کے خوب کوسا۔ بعد میں چاند بھائی مجھ سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگتا رہا کہ وہ نشے میں تھا۔ دلاور کو یہ شک کبھی نہیں ہوا کہ اسے بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ اس نے چاند بھائی سے کہا تھا کہ اسے ابھی تک سنبھال کے لے جانا اور نہ سنبھال سکو تو میرے حوالے کر دینا۔"

میں نے کہا: "اگر دلاور کبھی اڑ جاتا کہ رابعہ کو میرے سپرد کر دو۔"

"چاند بھائی اس کی ماننے والا نہیں تھا۔ دلاور کو ہمیشہ چاند بھائی کی ماننی پڑتی تھی۔" رابعہ نے کہا: "درمیان میں جب دلاور کوٹھی میں موجود نہیں ہوتا تھا تو وہ میری اور تمھاری ملاقات کا اہتمام کر دیتا تھا۔ انتہائی رازداری سے۔ بعض اوقات وعدے کے باوجود چاند بھائی مجبور ہو جاتا تھا اور میں نہیں آ پاتی تھی۔"

"تمھیں کبھی شک نہیں ہوا کہ چاند بھائی دھوکا نہ دے رہا ہو۔ وہ ایکٹر تو بہت اچھا ہے۔"

"میں نے اسے ہر طرح آزما لیا تھا۔ اس کے علاوہ حالات ایسے تھے کہ وہ چاہتا تو سب کچھ کر سکتا تھا۔" رابعہ نے نظر جھکا کے کہا: "میں بالکل بے بس تھی — اور اس کے رحم و کرم پر تھی۔ اسے کون روکنے والا تھا اور کس کا ڈر تھا۔ دراصل اس کے کردار کا ایک مضبوط پہلو یہی تھا کہ وہ دوغلا نہیں تھا۔ وہ خود کو قانون کا مجرم اور گناہ گار ضرور مانتا تھا لیکن

www.paksociety.com

اپنے پاکستانی ہونے پہ فخر کرتا تھا۔"

"بالکل شیش ناگ کی طرح۔" میں نے کہا۔ "تمھارا بھائی بھی ایک ڈاکو تھا۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ اس نے پاکستان کی خاطر جان دے دی۔ میں اس کا موازنہ شہیدانِ آزادی سے ہرگز نہیں کر سکتا۔ مگر سوچو کہ اس نے جان کیوں دی اور کس کے لیے دی؟ صرف ہمیں بچانے کے لیے اور ہمیں اس نے کیوں بچایا؟ صرف اس لیے کہ ہم وطن کے دشمنوں کے خلاف لڑتے ہوئے محصور ہو گئے تھے۔ ڈاکو، لٹیرا، اسمگلر، مجرم ہونا ایک الگ بات ہے اور غدار ہونا بالکل مختلف بات ہے۔"

"ایسا ہی کیس چاند بھائی کا تھا۔" رابعہ نے کہا۔ "اس نے بالواسطہ طور پر تمھاری کئی بار مدد کی۔ دوست محمد کے ذریعے۔ مثلاً لانچ فراہم کرنے میں اسی کا ہاتھ تھا۔"

"دوست محمد ایک پُراسرار شخص تھا۔"

"بہت عجیب آدمی تھا وہ بھی۔ وہ کہاں رہ گیا؟"

"وہ ساتھ ہی تھا ہمارے۔ مگر راستے میں حالات ایسے ہو گئے کہ اسے الگ ہونا پڑا۔" میں نے کہا۔ "اس کے ساتھ کریم بلوچ اور مشتری بھی ہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ حاجی علی کی درگاہ پر ملیں گے۔"

رابعہ نے کہا۔ "کریم بلوچ کا نام تو سنا ہے۔ یہ مشتری کون ہے؟"

"بڑی دلچسپ چیز ہے۔" میں نے کہا۔ "کریم تو اسے مستری کہتا ہے۔ اس کی بڑی بہن تھی بتول۔ مگر کریم بھول جاتا تھا تو اسے بانسری کہتا تھا۔ کریم اور مشتری بھی لیلیٰ مجنوں ہیں مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ مشتری کو اس کے باپ نے پیسے لے کر اپنے داماد روشن میاں کے حوالے کر دیا۔"

"روشن میاں؟" رابعہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

"ہاں۔ اس خبیث نے بڑی بہن سے شادی کی تھی۔ وہ کچھ ذہنی طور پر معذور تھی مگر خوبصورت تھی۔" میں نے کہا۔ "اس پر بڑا ظلم ہوا۔ وہ بھاگ جاتی تھی۔ روشن میاں پھر پکڑ لاتا تھا۔ بالآخر ایک دن اسے بیچ دیا اور جو پیسہ ملا اس سے مشتری کو خرید لیا۔ کریم بلوچ کو پتا چلا تو اس نے جا کے روشن میاں کو ذبح کر دیا اور اپنی بیٹی کو بوری میں ڈال کے اور سر پر اٹھا کے لانچ پر لے آیا۔ وہ ایک پٹاخا چیز ہے۔ کریم تو اس کے سامنے دم نہیں مار سکتا۔ دم ہلاتا رہتا ہے اور وہ جب بولنے پر آتی ہے تو خدا کی پناہ۔ قینچی کی طرح کترتی ہے اس کی زبان۔"

رابعہ کو بہت ہنسی آئی۔ "کیا ہم ان کا انتظار کریں گے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ انتظار تو نہیں کریں گے۔ اچھا ہے اگر وہ آ جائیں لیکن ہمیں جانا پڑا کہیں تو پھر چلے جائیں گے۔"

رابعہ نے کہا۔ "وہ پریشان ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ وہ بمبئی میں بھی اسی طرح رہ سکتے ہیں جیسے کراچی میں رہتے تھے۔ استاد بھی ہے ان کے ساتھ دوست محمد۔"

"چاند بھائی مجھے بمبئی پہنچا کے چلا گیا۔ منگلا پور۔" رابعہ بولی۔ "کہہ گیا تھا کہ واپسی میں دیکھ لوں گا۔ یہ پتا نہیں واپسی کب ہو گی۔ شاید ہانگ کانگ چلا جاؤں اور وہاں سے واپس کراچی۔"

"اور تم۔ اکیلی تھیں یہاں؟"

"اکیلی یوں کہ نہ تم تھے اور نہ کوئی جاننے والا تھا۔ لیکن رہائش کی کمی نہیں تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "چاند بھائی نے بہت اچھا انتظام کر دیا تھا۔"

"کسی ہوٹل میں؟"

"ہوٹل میں کیسے رہ سکتی تھی میں؟ اس کے کوئی جاننے والے تھے۔ ایک بہت شریف پارسی فیملی تھی۔ معلوم نہیں ان کے چاند بھائی جیسے شخص سے ذاتی مراسم کس طرح استوار ہوئے۔ رشتے دار وہ ہو نہیں سکتے تھے۔ پارسیوں سے خاندانی تعلق کی گنجائش بھی نظر نہ آتی تھی۔ چاند بھائی کا کوئی خاندان ہی نہیں ہے۔"

"وہ کاروباری شریک ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ایسے لگتے تو نہیں تھے..."

"چاند بھائی کیا صورت شکل سے اور ادب آداب سے کوئی ایسا آدمی نظر آتا ہے جو اتنا بڑا اسمگلر ہو۔ سارے غیر قانونی دھندوں میں ملوث ہو اور خطرناک مجرم ہو؟" میں نے کہا۔

"یہ بات تو ہے۔ اگر چاند بھائی خود نہ بتاتا کہ وہ کیا کرتا ہے تو ہم اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بہت مہذب، شریف، تعلیم یافتہ اور مذہبی آدمی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی بے حد خطرناک بھی۔ منفی رجحانات رکھنے والا اور الجھی ہوئی شخصیت کا مالک۔"

"دہری شخصیت کا کیس۔" میں نے کہا۔

"وہ فیملی بہرحال دہرے کردار کی مالک نہیں تھی۔ سب بہت وضع دار مخلص لوگ تھے۔" رابعہ نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ مرد چاند بھائی کے بزنس پارٹنر ہوں مگر ان سے میرا واسطہ ہی نہیں رہا۔ ایک ہی کوٹھی میں دو بھائی تھے۔ دو ان کی بیویاں۔ دونوں کے دو دو بچے۔ اور دونوں کی ایک حقیقی ماں۔ اور بچے رہتے تھے۔ نوکر چاکر، خدمت گار۔ گاڑیاں سب کے پاس اپنی اپنی لیکن جس کا جی چاہے لے جائے۔ ایک گاڑی فیملی کے لیے تھی۔ ایک انھوں نے مجھے

سے الگ میری تحویل میں دے دی تھی۔ مجھ سے پوچھا کہ تم ڈرائیونگ کر لیتی ہو؟ میں نے کہا کہ ہاں تو انھوں نے گاڑی کا بندوبست کر دیا کہ جہاں چاہو جاؤ۔ مجھے کہاں جانا تھا۔ بمبئی کے راستے ہی معلوم نہ تھے۔"

میں نے کہا۔ "اس تمام عرصے میں تمھاری دیگر ضروریات کون پوری کرتا رہا؟"

"جل جاؤ گے سن کے۔" رابعہ نے کہا۔ "چاند بھائی نے ایک لاکھ روپے رکھوا دیے تھے میرے پاس ذاتی مصارف کے لیے۔"

"اور تم نے رکھ لیے؟" میں نے کہا۔

"دیکھا۔ جل گئے نا؟" رابعہ نے کہا۔ "میں نے کیا مانگے تھے اس سے؟ کیا کرنا تھا مجھے ایک لاکھ کا؟ مجھے کسی بھی چیز کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بہت انکار کیا میں نے لیکن وہ نہیں مانا۔ جوں کے توں رکھے تھے بمبئی کی ٹکٹ تک۔"

"اس کے منہ پر مارنے تھے۔ وہ کون ہوتا تھا..."

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ اس کا سلوک اتنا شریفانہ رہا۔ اس نے ایک طرح سے میری حفاظت کی۔ تمھاری مدد بھی کی۔ تم کو میری طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہونے دی۔"

"یہ غلط ہے۔ اس نے پریشان رکھا مجھے۔ تم کو مجھ سے دور رکھ کر۔" میں نے کہا۔ "تم اس کی تعریف کر رہی ہو؟"

"خیر، میں اچھائی کو تو برائی نہیں بنا سکتی۔ وہ خود بُرا آدمی ہو گا دوسروں کے لیے۔ اس کے دھندے بُرے ہوں گے۔ مگر میرے ساتھ اس نے کوئی برائی نہیں کی۔ مجھے بُری نظر سے دیکھا تک نہیں۔ اس کے جواب میں میرے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ میں بداخلاقی سے پیش آتی۔ اس کے حسنِ سلوک..."

"میں نہیں مانتا کہ اس کا حسنِ سلوک بے سبب تھا۔ وہ ضرور اپنے دل میں تمھارے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہو گا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پتھر میں جونک لگانے کی کوشش کر رہا تھا اور تم پر کوئی اثر نہیں ہوا..."

"سکندر، دل کا حال تو خدا بہتر جانتا ہے۔ لیکن فرض کرو کہ ایسا ہی تھا۔ تو میں کیا کر سکتی تھی۔ دیکھو نا تمھارے لیے بھی تو پسندیدگی کے جذبات رکھتی تھی فوزیہ۔ اس کے بعد نازیہ پھر موہنی۔ اور اب ایک نام کنول کا سنا میں نے۔ سب نے اپنے جذبات کا اظہار بھی کیا۔ تمھاری طرف سے میں نے کبھی اتنا حسد محسوس کیا؟ مجھے معلوم تھا کہ تم پر میرے اعتماد کو شکست نہیں ہو سکتی۔ بہت اداس تھے تم موہنی کی موت کی خبر ملنے پر۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا تھا تم سے۔ خود مجھے رنج تھا۔"

مجھے یوں لگا جیسے رابعہ نے میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ شرمندگی سے میرا بُرا حال ہو گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ زیادتی میری تھی اور میں اپنے جذبات کے اظہار میں معقولیت کی حد سے آگے بڑھ گیا تھا جس کے ردِعمل میں رابعہ بھی مجھ سے وہ بات کہنے پر مجبور ہوئی جو وہ کہنا نہیں چاہتی تھی چنانچہ اب خود بھی پشیمانی کا شکار تھی۔

کچھ دیر میں چپ بیٹھا رہا۔ پھر اچانک میرے اس ہاتھ کی پشت پر جو رابعہ کے ہاتھ میں تھا گرم پانی کا ایک قطرہ گرا۔

میں نے ایک دم اس کا چہرہ اوپر کیا۔ "تم... یہ کیا ہے رابعہ... یہ آنسو...؟"

"مجھے معاف کر دو... ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا مجھے۔"

"حد ہو گئی۔ آخر کم حوصلہ ہے تمھارا۔" میں نے اس کی بھیگی پلکوں سے ستارے چن لیے۔ "کچھ تو سزا دینی تھی مجھے۔ تھوڑی دیر کے لیے روٹھ جاتیں، خفا ہو کے دیکھتیں۔ کم سے کم مجھے موقع تو ملتا تمھیں منانے کا۔"

"میں کیسے خفا رہ سکتی ہوں تم سے۔"

میں نے کہا۔ "جان! یہ روٹھنا منانا بھی تو آنا چاہیے تمھیں۔ ادائے حسن میں اتنی معصومیت بھی کیسی! مجھے احساس تو ہوتا کہ میں نے کتنی زیادتی کی۔ لیکن میں بھی کیا کروں۔ تمھاری محبت کا معاملہ ایسا ہے کہ اس میں جذبات کی یلغار کے سامنے میری عقل خبط ہو جاتی ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں اپنی کمزوری کا۔ میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ تمھارے متعلق کوئی ایسے سوچے... جیسے میں سوچتا ہوں یا کوئی تم کو ایسے دیکھے جیسے میں دیکھتا ہوں یا کسی کی زبان پر تمھارا نام یوں آئے جیسے میری زبان پر آتا ہے۔ یہ وقت ہی ایسا تھا۔ حالات پر اختیار نہیں تھا میرا اور تم سے دوری سے اپنے خیالات کے انتشار سے بچنا زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے دل دکھایا تمھارا... تم کو حق ہے مجھ سے روٹھنے کا۔ مجھے رُلانے کا۔"

"یہ حق تو تم کو بھی حاصل ہے۔" وہ بولی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ کبھی کبھی یہ حق بھی استعمال کر لیا کریں گے دونوں۔ ظاہر ہے جب یہ زندگی ساتھ گزرے گی تو پھر سب کچھ ہی ہو گا۔ لڑائی بھی ہو گی۔ ظاہر ہے ایک ہی کو تو لڑنے کا حق نہیں ہے؟ ہم دونوں ہی پاگل۔ وہ کیا فرمایا ہے اسی مسئلے پر شاعر نے کہ بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔"

"تم لڑو گے مجھ سے؟" رابعہ ہنس پڑی۔

"نہیں۔ روٹھنا تم۔ مناؤں گا میں۔" میں نے کہا۔

پھر خاموشی کا ایک پُرسکون وقفہ آیا۔ میں نے نصف شب کے آسمان کی وسعت میں سکوت اور ٹھہراؤ کو محسوس کیا۔ خمار میں کھوئے ہوئے ستارے خوابیدہ سے لگتے تھے۔ پیچھے سمندر کی سرسراہٹ مدھم پڑ گئی تھی۔

بہت دیر بعد رابعہ نے کہا۔ "کیا محسن یاد کرتا ہے شہلا کو؟"

www.paksociety.com

میں نے کہا: "وہ بھولتا ہی کب ہوگا!"
رابعہ نے کہا: "مجھے دکھ ہوتا ہے شہلا کے اکیلے پن کے خیال سے۔"
میں نے کہا: "وہ بہت باہمت لڑکی ہے۔ صبر کا اتنا حوصلہ مجھ میں تو نہیں ہے۔"
رابعہ نے کہا: "تم نے اس کے بچے کو دیکھا؟"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "خود محسن نے ایک ہی بار دیکھا ہے۔"
"وہ باپ کو پہچانتا ہی نہیں ہوگا۔"
"ہاں، محسن کو ماما۔ ماما کہتا رہا۔" میں نے کہا: "پاپا کہنا کیسے سیکھتا۔ اس کے آس پاس جو بھی ہے ماما ہے۔"
"یہ وقت نے ہمیں کہاں پہنچا دیا ہے!" رابعہ نے کہا: "جہاں کچھ بھی اپنا نہیں ہے۔ نہ زمیں نہ آسمان۔ سب چہرے اجنبی ہیں۔ پہلے راستے پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہم آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ کہاں جائیں گے بالآخر ہم سکندر؟"
"ہم پھر وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے۔ کیونکہ زمین گول ہے۔" میں نے کہا۔ "شرط چلتے رہنے کی ہے۔ اگر ہم رک گئے تو اکیلے رہ جائیں گے۔"
"ہم واپس بھی تو جا سکتے ہیں۔۔۔" رابعہ نے حسرت سے کہا۔
"نہیں جان۔ واپسی کے راستے پر نہ کوئی ہمسفر ملے گا اور نہ کسی کا نقش پا۔ کیا تم تھک گئی ہو؟"
رابعہ نے کہا: "مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں میں اکیلی نہ رہ جاؤں۔ پیچھا نہ ہو یا دو ٹوٹ۔ میرا ساتھ کہیں مت چھوڑنا۔" اس کے ہاتھ کی انگلیوں نے میری انگلیوں کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔
میں خاموشی کے طلسم میں اسیر ہو گیا۔ اس خاموشی کا ہر لمحہ اس کے قرب کی کیفیت کا احساس تھا جس نے مجھے ہر احساس سے بیگانہ کر دیا تھا۔ نہ مجھے یہ خیال آیا کہ رات کتنی گزر چکی ہے، نہ کسی کی یاد آئی۔ غالب اور محسن، نازو اور گل سب ہمارے لیے منتظر ہوں گے، یہ بھی میں نے نہیں سوچا۔
مجھے نہ بھوک نے ستایا نہ پیاس نے۔ مجھے چائے اور سگریٹ کی طلب نے بھی بے قرار نہیں کیا۔ یہ عجیب بے خودی و سرشاری تھی جس نے بیک وقت مجھے اور رابعہ کو تمام مادی ضروریات کے احساس سے بھی بے نیاز رکھا۔ ہم ایک دوسرے کی قربت کے احساس سے اتنے مدہوش تھے کہ ہمیں کسی اور چیز کا ہوش نہ تھا تاہم اس خلوت میں بھی جہاں مخل ہونے والا کوئی نہ تھا مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ ایک عورت ہے اور میں ایک مرد ہوں۔ وہ رابعہ تھی، میری محبت تھی اور میں اس محبت کے تقدس کا امانت دار تھا۔ اس محبت کی ایک خوشبو تھی اور ایک روشنی تھی جس کو محسوس تو کیا جا سکتا تھا چھو کر میلا نہیں کیا جا سکتا تھا۔
ہم اس محدود سی جگہ میں بمشکل سمٹ کر بیٹھے تھے۔ ہمارے پیچھے اور دائیں بائیں پتھر کی چٹان تھی جس کے اوپر آسمان کا تھوڑا سا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ سامنے تا حد نگاہ بمبئی کے شہر کی جھلملاتی روشنیاں تھیں اور اس چٹان کے پیچھے سمندر جاگ رہا تھا۔ اندھیرا پر ہیبت میں تھا اور رات کے ساتھ تھا۔ پھر اچانک منظر بدل گیا۔ شفق کا سنہرا اجالا میری پلکوں پر جھلملایا۔ میں نے سورج کا آتشیں گولا دیکھا جس کی ہر کرن سونے کا تاج تھی۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں کھلیں تو میں نے دیکھا کہ میرا سر پتھر پر ٹکا ہوا ہے۔ میرا ایک ہاتھ رابعہ کے شانوں کے گرد حمائل ہے اور وہ میرے شانے پر سر رکھے سو رہی ہے۔ اس کی خوابیدہ آنکھوں پر پلکوں کی چلمن گری ہوئی تھی۔ نودمیدہ روشنی میں اس کے بال جھلملا رہے تھے اور اس کے رخسار دہک رہے تھے۔ یہ اتنا دلفریب منظر تھا کہ میں پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ میں خفیف سی جنبش سے بھی گریز کرتا رہا کہ کہیں میری حرکت سے اس کی یہ نیند ٹوٹ نہ جائے۔ میں اس حسن رعنائی کو دل میں اتار لینا چاہتا تھا۔
مجھے تعجب ہوا کہ رات گزر گئی اور افسوس ہوا کہ یہ رات بھی گزر گئی۔ لیکن یہ رات میرے دامن کو اتنی خوشیوں سے بھر گئی تھی کہ ہجر کی سب راتوں کے رنج و غم کا حساب برابر کر گئی تھی۔ مجھے پیچھے سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ ساحل سمندر پر پھرنے والے لوگ تھے یا وہ مچھیرے جو کشتیوں سے آتے جاتے رہتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔
شور مچانے والے آبی پرندوں کی ایک ڈار بہت بلندی پر اڑتی ہوئی سامنے سے گزری۔ رابعہ نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ پر جھلملاتی نیم وا اور بوجھل پلکوں سے اس نے مجھے محو نظارہ دیکھا تو اس کا گلابی رنگ لال ہو گیا۔
"ہائے اللہ! صبح ہو گئی۔" اس نے خفت اور پریشانی سے کہا اور اپنے پریشان بالوں کو سمیٹا۔
میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا: "ہاں۔ صبح ہو گئی۔"
"تم کب سے جاگ رہے ہو؟" اس نے اپنی مسکراہٹ کو دبا لیا۔
"معلوم نہیں۔ میں تو تمہیں دیکھ رہا تھا۔"
اس نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔ "مجھے جگایا کیوں نہیں؟"
"جگا دیتا تو دیکھتا کیسے کہ سوتے میں تم کیسی لگتی ہو؟" میں نے کہا۔
"حد کرتے ہو تم بھی۔ ذرا خیال نہیں تمہیں کہ وہ لوگ کیا کہیں گے" رابعہ نے کہا۔

"وہ یہی تو ہمیشہ کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور بقول فلمی شاعر ہم جو کہہ دیں گے ان سے کہہ دو... پیار کیا کوئی چوری نہیں کی..."
رابعہ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ "مجھے تو اب شرم آ رہی ہے ان کے سامنے جاتے ہوئے۔"
میں نے کہا: "اچھا تم یہاں بیٹھ کے شرماتی رہو۔ میں جا کے بتا رہا ہوں کہ بھئی رابعہ ساتھ ہے لیکن نہیں آئی کہ وہ شرمیلی لڑکی ہے۔ تمہارے سسرالی خود آ جائیں گے تمہیں لے جانے کے لیے۔ میں تو اب چلتا ہوں۔ میرے ناشتے کا وقت ہے یہ۔" میں نیچے کود گیا۔
رابعہ نے خود اترنے کی کوشش کی اور پھر ادھر ادھر دیکھا۔
میں نے کہا: "کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ آجاؤ۔" میں نے ہاتھ پھیلا کے کہا۔ اس نے کچھ تذبذب کیا تو میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کے کھینچی۔ رابعہ نے ایک دبی دبی چیخ ماری پھر ہنسی اور میرے ہاتھوں میں آ گئی۔ میں نے اسے نرمی سے ریت پر اتار دیا۔
"کیسی عجیب بات ہے۔" رابعہ نے میرے ساتھ چلتے چلتے کہا۔ "رات گزر گئی اور وقت کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ میں نے ایک بار گھڑی دیکھی تھی تو ساڑھے گیارہ بجے تھے کچھ دیر وقت تھا۔"
"مجھے تو خیال ہی نہیں آیا گھڑی دیکھنے کا۔" میں نے کہا۔
"پتا نہیں نیند کس وقت آ گئی۔ میں نے سوچا تھا کہ بارہ بجے تک واپس چلے جائیں گے۔" رابعہ اس خیال سے سخت پریشان نظر آتی تھی کہ وہ محسن اور غالب کو کیا جواب دے گی۔ ہم نے انہیں باتیں بنانے کے لیے بہترین موضوع فراہم کر دیا تھا۔
میں نے کہا: "ابھی دیکھنا میں کیسی خبر لیتا ہوں سب کی۔"
"یعنی چور ڈانٹے گا کوتوال کو۔"
"ہاں۔ کیا یہ ان کا فرض نہیں بنتا تھا کہ ہماری خبر لیتے؟"
رابعہ مسکرائی۔ "خبر تو وہ اچھی طرح لیں گے اب۔"
"رات کو کیوں خیال نہیں آیا انہیں ہمارا؟ کوئی تو آتا ہمیں تلاش کرنے کے لیے۔ ان کو سوچنا چاہیے تھا کہیں ہم دونوں کے ساتھ کوئی واردات تو نہیں ہو گئی۔"
رابعہ نے دبی زبان سے کہا: "کیا پتا... وہ آئے ہوں۔"
میں نے اس بات پر غور کیا اور ہنس پڑا۔ "تمہارا مطلب ہے... اچھا۔ ہاں... یہ ہو سکتا ہے۔"
رابعہ نے بالکل ٹھیک سوچا تھا۔ صبح کے سات بجے صرف گل اور نازو جاگ رہی تھیں مگر انہوں نے ہمیں دیکھ کر کسی قسم کی حیرانی یا پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ غالب اور محسن غائب تھے۔
"ختم ہو گئیں آپ دونوں کی باتیں؟" نازو نے کہا۔
"باتیں کہاں ختم ہوتی ہیں بی بی!" میں نے کہا۔ "رات ختم ہو گئی تھی یا نازو قت۔"
"باتوں سے پیٹ بھی بھر گیا بھائی سکندر؟" گل نے کہا۔
"تمہیں تو خیال بھی نہیں آیا کہ ہم بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں۔ کوئی آکے پوچھ لیتا کہ کچھ چاہیے؟" میں نے کہا۔ "تم آ تو نہیں سکتے تھے اتنی ضروری باتیں چھوڑ کے۔"
"میں نے تو کہا تھا کہ وہیں پہنچا دو انہیں چائے بھی اور کھانا بھی۔" نازو ہنسی۔ "تمہارے دوست ہی مخالف ہو گئے۔"
"کون؟ غالب اور محسن؟" میں نے کہا۔ "وہ میرے دوست کب سے ہو گئے۔ دونوں ماتحت ہیں اور بہت چھوٹے لوگ۔ لیکن وہ ہیں کہاں؟"
"یہاں تو ناشتے کھانے کا کوئی انتظام ہے نہیں۔" نازو نے کہا۔
"محسن سے کہہ گئے ہیں، اخبار بھی لائیں گے۔"
"کب سے گئے ہوئے ہیں؟" میں نے کہا۔
نازو نے رابعہ کی طرف دیکھا جو گل سے باتوں میں مصروف تھی اور معلوم نہیں کس بات پر دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کے کھی کھی کر رہی تھیں۔ نازو نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا۔ "کافی دیر ہو گئی ہے۔"
"میں آتا ہوں ابھی!" میں نے کہا۔
"اب آپ بھی جا رہے ہیں!" نازو نے شکایت کے انداز میں کہا۔
"کوئی ولایت نہیں جا رہا ہوں بھئی۔ سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔ تمہارے پاس ہے کچھ تو دے دو ورنہ میں نہیں جاتا۔" میں نے کہا۔
"میں سگریٹ نہیں پیتی۔"
"اچھا! بڑی بات ہے۔ پیا کرو۔" میں نے کہا اور باہر نکل گیا۔ پانچ منٹ تک میں لانچ کے ڈھابے سے ذرا فاصلے پر پیچھے کی طرف ٹہلتا رہا۔ پھر نازو نمودار ہوئی۔ یہ تمام وقت میں نے نازو کے خفیہ اشارے کا مطلب نکالنے کی ناکام کوشش میں صرف کر دیا تھا۔ آخر ایسی کون سی بات تھی جو اس نے گل اور رابعہ کے سامنے کہنا مناسب نہیں سمجھا۔
"تم کچھ پریشان ہو؟" میں نے نازو کے قریب آنے کے بعد کہا۔
"پریشانی کی وجہ ہے۔ معلوم ہے رات کیا ہوا؟" نازو بولی۔ "مگر آپ کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔"
"اب بتا دو۔" میں نے جھینپ کر کہا۔
"جب آپ دونوں واپس نہیں آئے تو محسن اور غالب نے بارہ بجے تک تو انتظار کیا۔" نازو بولی۔ "محسن کا خیال تھا کہ چھوڑو جتنی باتیں کر سکتے ہیں کر لیں۔ باتوں سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔ آ جائیں گے خود ہی جھک مار کے جب بھوک لگے گی۔ مگر غالب اسے کھینچ کر لے گیا کہ چلو دیکھ تو آئیں کہ لیلیٰ مجنوں ہیں کہاں؟"
"لیلیٰ کسے کہا تھا اس نے اور مجنوں کسے؟ وہ بھی بتا دو۔"

نازو مسکرائی۔ "میں ابھی کہاں تھکی ہوں ایسی باتیں۔" اس نے کہا۔ "وہ دونوں گئے اور پھر بقول ان کے، جو کچھ انھوں نے دیکھا وہ عملاً دشمن کو دکھائے۔"

"دوست دیکھ لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

"جی۔ وہ بھی یہی کہتے تھے۔" نازو ہنسی۔ "لیکن واپسی میں ایک شخص نے ان کا تعاقب کیا۔ معلوم نہیں وہ کہاں سے ان کے پیچھے لگا تھا۔ وہ پہلے تو سمجھے تھے کہ ایسے ہی کوئی ساحل پر بھٹک رہا ہے لیکن اس کی نقل و حرکت پر غالب کو شبہ ہوا۔ اس نے محسن سے کہا کہ کوئی ہمارے پیچھے ہے۔ تصدیق کے لیے انھوں نے واپسی کا راستہ بدل دیا اور مخالف سمت میں نکل گئے۔ انھوں نے بے مقصد چکر لگائے اور اس شخص کو ڈاج کرنے کی کوشش کی مگر وہ بہت چالاک بھی تھا اور بے وقوف بھی۔ صرف چالاک ہوتا تو تعاقب ایسے کرتا کہ انھیں معلوم ہی نہ ہو۔ رات کا وقت تھا اور اندھیرا تھا۔ وہ خود کو روپوش رکھ سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ مسئلہ بھی تھا کہ لوگ بہت کم تھے اور بعض مقامات پر وہ چھپ کر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ مزید یہ کہ غالب کے بارے میں اسے یہ علم نہیں تھا کہ اس کی نظر اندھیرے میں بھی دیکھتی ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "بی بی! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ اس بات کا تو ہمیں بھی علم نہیں۔"

نازو نے مجھے بے یقینی کے ساتھ دیکھا۔ اسے شک ہوا تھا کہ شاید میں مذاق میں اسے بے وقوف بنا رہا ہوں۔ مجھے سنجیدہ دیکھ کر اس کا شک حیرانی میں بدل گیا۔ "آپ لوگوں کو... واقعی نہیں معلوم؟"

میں نے کہا۔ "کیا عرض کرے یہ بندۂ حقیر و پرتقصیر، تمام شرم کا ہے لیکن سچ ہے... ایسی کسی پراسرار صلاحیت کا علم ہوتا ہم میں سے کسی کو بھی تو سب کو یہ بات معلوم ہوتی۔ تم نے اس کی آنکھوں کی گہرائی میں جھانک کر، بلکہ ڈوب کر دیکھا ہے۔ تم بتاؤ۔"

وہ ہنسی۔ "آپ کے دوست نے خود بھی یہ بات نہیں بتائی؟ حیرت ہے! جب وہ اندھیرے میں دیکھنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسے پراسرار نہیں کہا جا سکتا۔ بہت سے لوگ اندھیرے میں بالکل نہیں دیکھ سکتے۔ کچھ زیادہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس نے ہی محسن کو متوجہ کیا تھا جب تصدیق ہو گئی کہ کوئی پیچھا کر رہا ہے تو وہ دونوں اس کو بہت دور ویرانے کی سمت میں لے گئے اور پھر ایک جگہ چھپ گئے۔ غالب نے اسے قریب سے گزرتے دیکھا اور پہچان لیا۔ اس نے محسن کو بتایا کہ یہ تو انھی میں سے ایک ہے جو بستی پہنچتے ہی استقبال کے لیے آ گئے تھے۔"

میں چونک پڑا۔ "کون؟ ترلوپستی کے آدمی؟"

"ہاں۔ غالب نے بڑے وثوق سے کہا کہ جو لوگ ایک بلیک سیڈان میں آئے تھے یہ انھی میں سے ایک ہے۔" نازو بولی۔

"وہ تو چار تھے۔" میں نے کہا۔ "ایک مارا گیا تھا۔ باقی دو مجھے ترلوپستی کے گھر میں نظر آئے تھے۔"

"غالب نے بتایا کہ اسے تم بے ہوشی کے عالم میں چھوڑ آئے تھے۔" نازو نے کہا۔ "محسن نے یہ بات ماننے میں تامل کیا اور کہا کہ اتنی دور سے کیا پتا چلتا ہے۔ غالب نے کہا ابھی کہ میں دیکھ کے بتا رہا ہوں، یہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے غالب تو اس کی صورت صاف دیکھ رہا تھا مگر محسن کو اتنے فاصلے سے وہ ایک آدمی کا سایہ دکھائی دے رہا تھا اور بس۔"

"محسن کو بھی یہ بات کہاں معلوم ہے کہ غالب اندھیرے میں دیکھتا ہے؟" میں نے کہا۔

"تصدیق سے یہ تو ثابت ہو گیا تھا کہ وہ تعاقب میں ہے۔ اب انھوں نے اس کو گھیرنے کا سوچا۔" نازو بولی۔ "پھر معاملہ الٹ ہو گیا یعنی وہ آگے بھاگنے لگا اور یہ دونوں اس کے تعاقب میں۔ تاہم وہ زیادہ چالاک نکلا۔ جیسے ہی اسے اندازہ ہوا کہ اس کا راز فاش ہو گیا ہے، وہ جان بچا کے نکل بھاگا۔ اس نے آبادی کا رخ کیا اور آسانی سے خود کو گم کرنے میں کامیاب رہا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ جاسوسی کر رہا تھا۔ صرف یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا کہ اس علاقے میں ہماری موجودگی کا سراغ لگائے اور اس مقصد میں وہ یقیناً کامیاب رہا۔" میں نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے مس نازلی! کہ اس نے غالب اور محسن کا تعاقب کیوں کیا؟"

"اگر وہ ملتا تو شاید بتاتا۔" نازو نے طنز سے کہا۔ "ممکن ہے آٹوگراف لینا چاہتا ہو مگر ذرا شرمیلا تھا اس لیے دور دور رہا۔"

"کم عقل لڑکی... تم سمجھ نہیں رہی ہو ایک عقل کی بات۔" میں نے کہا۔ "وہ محسن کو نہیں پہچانتے اور غالب اپنا حلیہ بالکل بدل چکا ہے۔"

"رات بھر آپ کی عقل بھی گھاس چرتی رہی ہے۔" نازو نے برہم ہو کے کہا۔ "آپ کی سمجھ میں یہ موٹی سی بات کیسے آ سکتی ہے کہ ابھی تک محسن نے اپنا حلیہ نہیں بدلا ہے۔ وہ ابھی تک امیر چند کا بھائی فقیر چند بنا ہوا ہے جو کہ وظیری لالہ کی اولاد تھے اور ایک سی شکل کے تھے۔ جو بھی محسن کے تعاقب میں تھا وہ محسن کو امیر چند یعنی سکندر بخت سمجھے ہوئے تھا۔ آئی عقل شریف میں یہ بات؟"

وہ پیر پٹخ کے چلی گئی۔

میں اس کے پیچھے لپکا۔ "ارے نازو! خدا کی قسم تم کو جو ناقص العقل کہے وہ غالب... میرا مطلب ہے گدھا کیا دور کی کوڑی لائی ہو تم۔ وہ واقعی محسن کو سکندر سمجھا ہوگا اور اس کا مقصد بھی وہی ہوگا جو تم نے فرمایا۔ یہ تو بڑی غلط بات ہو گئی۔ اس نے جاکے رپورٹ دی ہوگی کہ جناب مفرور کا سراغ مل گیا ہے۔"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ جاسوس تم تک نہیں پہنچا۔ وہ پیچھے تھا اور پیچھے ہی رہا۔" نازو دروازے تک گئی۔ "اگر غالب اور محسن آگے نکل جاتے تو وہ بھی دیکھ لیتا۔"

"کیا دیکھ لیتا؟"

"لیلیٰ مجنوں کا گوشۂ عافیت اور کیا۔" نازو نے کہا۔

"لیلیٰ مجنوں کس کو کہہ رہی ہو۔ کون ہے لیلیٰ۔ اور مجنوں۔"

"جاؤ انھیں دیکھو۔" نازو نے مجھے دھکا دیا۔ "بہت دیر ہو گئی ہے۔"

ایک اجنبی شخص جو پاگل تھا یا نشے میں تھا، قہقہہ مار کے ہنسا اور بولا۔ "ارے دھکا کیوں دیتی ہے سالی۔ پیسہ چاہیے تیرے کو؟"

نازو کا منہ لال ہو گیا۔ غصہ مجھے بھی بہت سخت آیا تھا مگر وہ پاگل وہیں لیٹ گیا اور مٹھی میں ریت بھر بھر کے گرانے لگا۔ "یہ... یہ ہوتا ہے سالا پیسہ۔ ادھر آیا، ادھر گیا۔"

"چھوڑو اسے۔" میں نے کہا۔ "پاگل ہے کوئی۔ تم اندر جاؤ اور ذرا چوکس رہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ترلوپستی کو اس ٹھکانے کا شاید پتا نہ چلا ہو۔ مگر یہ بہرحال معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں اسی علاقے میں ہوں۔ دلاور کو بھی یہ بات معلوم ہو جائے گی تو ہمارا یہاں رہنا مشکل ہوگا۔ تمہارے پاس ریوالور ہے؟"

نازو نے اقرار میں سر ہلایا۔ "تم دور مت جانا۔"

"ریوالور گل کے پاس بھی ہوگا۔ دلاور کے پاس نہیں تھا۔ میں نے دے دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے تو شین گن بھی ہے لیکن ابھی حول خراب ہے گریز کرنا ہی بہتر ہے۔"

"مجھے شک ہے کہ تم لیے جا رہے ہو۔ دیکھو جانا ہو تو ہمیں بتا کے جانا۔ ایسے مت نکل جانا کہ پتا ہی نہ چلے کسی کا۔ ہم کہاں تلاش کرنے جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں نہ پھر اغوا ہونے کے موڈ میں ہوں اور نہ فرار ہونے کے۔ تم جاکے رابعہ اور گل کو بہلانے جاؤ۔ جیسے اب تک انھیں کچھ پتا نہیں چلا، ایسے ہی کچھ دیر مطمئن رکھو۔"

جب نازو لوٹ گئی تو میں نے حاجی صاحب سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ نازو سے باتیں کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں مجھے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ اگر غالب اور محسن نہ ملے تو میں کیا کروں گا؟ کس سے معلوم کروں گا اور کہاں جاؤں گا؟ پولیس سے مدد لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ راہ چلتے لوگ بھی کچھ نہیں بتا سکتے تھے۔ صرف سوات کے حاجی صاحب کا جوس سینٹر ایک ایسی جگہ تھی جہاں سے راہنمائی حاصل ہونے کی امید کی جا سکتی تھی۔

میرا موجودہ حلیہ کسی حد تک مجھے تحفظ فراہم کرتا تھا۔ اب میں سے زیادہ خطرہ محسن کو تھا جو بدستور فقیر چند بنا گھوم رہا تھا اور جیسا کہ نازو کی بات سے ظاہر ہوتا تھا، وہ کسی نامعلوم جاسوس کی نظر میں بھی آ چکا تھا۔

حاجی صاحب کی دکان تک پہنچنے کے لیے میں نے نسبتاً لمبا مگر محفوظ راستہ اختیار کیا۔ دکان ابھی کھلی ہی تھی چنانچہ نوکر اندر کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھے۔

میرا خیال تھا کہ حاجی صاحب مجھے شناخت نہ کر پائیں گے۔ میں نے انھیں سلام کیا۔

"آہا۔ وعلیکم السلام۔ تو یہ تم ہو۔" انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "کمال ہو گئی...."

"آپ نے پہچان لیا مجھے؟" میں نے کہا۔

"آواز سے پہچانی بھئی۔" وہ بولے۔ "لیکن کمال کی بات یہ نہیں ہے کہ تم کو میں نے کیسے پہچان لی۔ کمال یہ ہے کہ تم کیسے آ گئی ہو؟"

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "جی؟... کیسے آ گیا...! بس آ گیا۔"

"وہی تو میں نے بھی کہی۔ کہ کیسے آ گئی۔" حاجی صاحب نے عادتاً میرے لیے بھی مؤنث کا صیغہ استعمال کیا۔ "ابھی میں تمہارے بارے میں ہی سوچتا تھی۔ ادھر تم حاضر۔ کیا نام بتائی تم میرے کو؟"

میں نے کہا۔ "نام تو میں نے جو بتایا تھا، کچھ اور تھا۔ لیکن یہ بتائیں کہ آپ نے کیسے یاد کیا تھا اس وقت؟"

انھوں نے ایک رقعہ کھول کے دیکھا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے کوئی خدا کا بندہ آئی۔ وہ میرے کو بولتی کہ تمہارا ملک سے دو بھائی ادھر آئی۔ ایک جیسا شکل کا ہوتی۔ ایسا بھورا داڑھی، مونچھ والا۔ اور بھورا بال۔ بس میرے کو یاد آ گئی۔ میں اس کو بولتی کہ ہاں آیا تھی لیکن میرے کو کچھ پتا نہیں ہوتی۔ بس جناب صاحب، وہ بولتی کہ آپ یہ رقعہ ان کو دو، جو بھی آئی۔ اور میں یہ رقعہ پڑھ کے سوچتی کہ ابھی کیا کرے؟ ہم بسم خان ہوتی یا تمہارا بھائی؟"

"بسم خان میں ہوں۔" میں نے کہا۔

انھوں نے رقعہ مجھے پکڑا دیا۔ "ہو گئی نا کمال؟"

میں نے کہا۔ "وہ کون تھا... میرا مطلب ہے کیا آپ نے پہلے کبھی اس کو دیکھا؟"

حاجی صاحب نے دونوں ہاتھ پھیلا کے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "ادھر آتی ہوتی دنیا آتی اللہ کے حکم سے۔ ہم سب کو کیسے پہچانتی؟"

میں نے رقعہ کھول کے پڑھا۔ اس میں صرف ایک سطر کا

www.paksociety.com

پیغام تھا۔ "تمھارے دونوں دوست سلام کہتے ہیں۔ ڈی + ٹی۔"
اُردو کا یہ جملہ انگریزی حروف میں لکھا گیا تھا یعنی پیغام رومن اُردو میں دیا گیا تھا۔ کسی مذبذب کے بغیر میں نے ڈی + ٹی کا مطلب دلاور + ترلوچن اخذ کر لیا۔ انھوں نے مشترکہ طور پر مجھے یعنی عرف تیر چند سمجھتے ہوئے یہ اطلاع دی تھی کہ وہ دونوں جو اصل بدمعاش تھے، "ایس ایس کراتی تھتر ڈ" کو غرق کرنے اور بھاؤ تی کو واپس لانے کے ذمے دار تھے وہ ہماری تحویل میں ہیں۔

آگے کو واضح فیصلہ سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں واضح طور پر دلاور کی آواز سن سکتا تھا اور ترلوچن کی آواز بھی مجھ تک صاف پہنچ رہی تھی۔ ان کے عالم تحریر کا مدعا بہت واضح تھا۔ "اپنے سکندر صاحب۔ یہ تو خوب ہوئی۔ کیا کہتے ہیں وہ۔ احمد کی پگڑی محمود کے سر۔ تمھاری جگہ آ گئے تمھارے دو چرچے ٹکڑے۔ اب آپ بھی آجاؤ خیر سے۔" اور ترلوچن نے اپنے میکانکی لہجے میں کہا۔ "تو تم ہو تیر چند۔ اور یہ کیا تھا، لاپتے دھڑی لال!"

حاجی صاحب نے مجھے اورنج جوس کا گلاس پیش کیا۔

"بسم اللہ کرو جناب صاحب۔ حاجی کا دل خوش کرو۔"

میں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا کہ یہ تکلف کیوں کرتے ہیں یا اس کی کیا ضرورت تھی۔ میرا دل کچھ کھانے پینے کو نہیں چاہتا لیکن حاجی کے خلوص کو ٹھکرانا مشکل تھا اور اس کا دل خوش کرنا بے حد ضروری تھا چنانچہ میں نے وہ بڑا والا جوس کا گلاس ایک سانس میں خالی کر دیا۔ بلاشبہ اس کا منفرد ذائقہ وہی تھا اور اس مشروب کی فرحت بخشی بھی کم نہ تھی مگر میرا اپنا ذوق و شوق کا جذبہ بے کیف ہو گیا تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

"آپ ہمارا ہم وطن۔ حاجی آپ کا خادم۔" انھوں نے دل پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "ادھر آؤ۔ دل ٹھنڈا کرو تو ہمارا دل خوش۔"

"حاجی صاحب! ابھی ہمارا یہاں کوئی پتا ٹھکانا نہیں ہے۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی اگر ہمارے نام کوئی خط یا پیغام آئے تو رکھ لیں۔ نہ آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ لیکن یہ ہمارے لیے رابطے کی ایک جگہ ہے۔ کوئی میرے بارے میں پوچھے تو بس یہی بتا دیں کہ آیا تھا۔"

"کیوں نہیں جناب صاحب۔" انھوں نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا۔

اس انکشاف نے کہ محسن اور غالب کو دلاور یا ترلوچن کے آدمی لے گئے ہیں، مجھے سخت ذہنی خلفشار اور مایوسی کا شکار کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ میں اکیلا رہ گیا تھا بلکہ پیغام میں واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ میں سلام کا جواب دوں۔ دوستوں کی رہائی منظور ہے تو خود جاؤں اور ان کی شرائط پر ان سے بات کروں۔ بات وہ کیا کریں گے،" دلاور کہے گا "کر دو اپنے سکندر اعظم صاحب۔ بہت لمبا ہو گیا تمھاری فتوحات کا سلسلہ۔ اب کچھ آرام کرو۔" اور آرام کا ان کی زبان میں یہ مطلب بھی ہو سکتا تھا کہ سو جاؤ کسی بے نشان مدفن میں ابدی نیند اور حق و انصاف کے لیے صور اسرافیل کے پھونکے جانے کا انتظار کرتے رہو۔ اس دنیا میں تو یہ ممکن نہ تھا چنانچہ یہاں سے روانگی پکڑو۔

میں نے وہیں سے ایک تھرمس خریدا جو غیر ملکی تھا چنانچہ بہت مہنگا ملا۔ اس میں ابلتی ہوئی چائے بھروانے کے بعد میں نے ناشتے کے لیے پوری حلوہ خریدنا ہی مناسب سمجھا کیونکہ ڈبل روٹی، مکھن یا انڈے فراہم کرنے کا ہمارے پاس کوئی انتظام نہ تھا۔ وہیں سے مجھے "ٹائمز آف انڈیا" کا تازہ شمارہ مل گیا۔ دوسرے سب اخبار ہندی زبان کے تھے یا گجراتی کے، اردو کا ایک اخبار اتنا خراب چھپا ہوا تھا کہ مجھے افسوس ہوا۔ عین ممکن تھا کہ میں اسے نہ خریدتا لیکن اس کی سرخیاں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اس اُردو اخبار کی وجہِ اشاعت اس کی سنسنی خیزی ہے۔ عرفِ عام میں یہ زرد صحافت کا علمبردار یعنی چیتھڑا اخبار تھا جو جرائم اور اسکینڈل کی خبروں پر پلتا ہے۔ اس میں مجھے اندر کا صفحہ دیکھتے ہی لّلی کی خاصی بڑی تصویر کے ساتھ پوری خبر اور اس کے بارے میں ایک فیچر دکھائی دیا۔ میں نے اس کی قیمت بھی ادا کر دی اور واپس لوٹ گیا۔

اس وقت تک میں یہ طے کر چکا تھا کہ میرا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے اور کیا ہوگا۔ میرے ذہن کے اندر مختلف اور متضاد خیالات کی جنگ ایک منطقی انجام کو پہنچ چکی تھی۔ خود کو دلاور یا ترلوچن کے حوالے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے ہر قیمت پر محسن اور غالب کو ان بدمعاشوں کے قبضے سے چھڑانا تھا۔ اس کام کو آسان نہیں سمجھا جا سکتا تھا اور مجھے کچھ کرنے سے پہلے مشورہ کرنا تھا اور سوچنا تھا کہ یہ مشکل کیسے آسان ہوگی۔ طریقہ وہ ہونا چاہیے کہ چھوٹی مشکل بڑی مشکل نہ بنے یعنی سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

نازو بھی تشویش میں مبتلا تھی لیکن اس کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔ رابعہ اور گل کے چہرے ان کی پریشانی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا... محسن...؟"

"محسن اس میں ہے۔" میں نے ایک لفافہ رابعہ کو تھما دیا جس میں حلوہ تھا۔ "اور غالب اس میں۔" گل کو میں نے پوریوں والا لفافہ پکڑا دیا۔ پھر کندھے سے لٹکا ہوا تھرمس نازو کے حوالے کیا۔ "اور اس کے اندر میں خود ہوں۔ یعنی میری جان ہے۔ ٹافٹ چلانے نہ ملی تو سمجھو میں گیا..."

"یہ کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔" رابعہ نے برہمی سے کہا۔

"بھائی سکندر! محسن اور غالب کہاں چلے گئے؟" گل نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

"بھئی آپ لوگ کیوں پریشان ہونے پر مصر ہیں۔ وہ دونوں مجھے نہیں ملے۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے ان کے بارے میں معلوم ضرور ہو گیا ہے کہ وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ آدمی گھر سے نکلتا ہے نیک ارادے کے ساتھ، مگر آگے تقدیر کھڑی مل جاتی ہے کہیں اور لے جانے کے لیے۔ مثلاً جو لوگ ولایت جاتے تھے تعلیم کے لیے، وہ ڈگری کی جگہ میم لے آتے تھے..."

"سیدھی طرح بتاتے کیوں نہیں... ناشتا لینے گئے تھے وہ۔ کہاں چلے گئے؟"

"ایک زیادہ اہم کام یاد آ گیا۔" میں نے کہا۔ "تم لوگ اگر دوپہر تک بھی کھائے پیے بغیر بیٹھی رہو گی تو کچھ نہیں ہوگا۔"

"مجھے لگتا ایسا ہے کہ آپ جانتے بوجھتے کچھ چھپا رہے ہیں۔" گل نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ "آپ کو آخر کیسے معلوم ہوا...؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ ابھی تو میرا بیان بھی ادھورا ہے۔ درمیان میں بولنے کی اجازت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے حاجی صاحب نے اطلاع دی ہے کہ وہ دونوں بندرگاہ کی طرف گئے ہیں اور دوپہر تک واپس آئیں گے۔ تم ناشتا وغیرہ کرو۔ گل بالو! ایسے بات بات پہ رونے سے مسائل نہ کبھی حل ہوئے ہیں نہ ہوں گے۔ بفرضِ محال وہ کسی مصیبت میں پڑ گئے ہوتے تو کیا تمھارے آنسو ان کو بچا سکتے تھے یا ان کی مدد کر سکتے تھے؟ اتنا کم ہمت تو نہیں سمجھتا تھا میں تمھیں۔ آخر تم نائک رہی تھیں۔ گل بات سنتے ہی یہ حال ہو گیا؟ تم تو بڑے دعوے سے آئی تھیں ساتھ کہ میں یہ کروں گی اور وہ کروں گی۔ مردانہ لباس میں یہاں سے وہاں تک سب دشمنوں کا صفایا کر دوں گی اور کشتوں کے پشتے لگا دوں گی۔ تم تو دوسروں کو بھی بزدل بنا رہی ہو۔"

میری بات کا اثر ہوا۔ میں نے لہجہ بھی سخت اختیار کیا تھا۔ گل شرمندہ نظر آنے لگی۔ نازو نے سب کے لیے ناشتے کا اہتمام شروع کیا۔ بھوک جتنی مجھے تھی وہ ایک سطری اطلاع نے ختم کر دی تھی۔ رہی سہی کسر حاجی صاحب نے جوس پلا کے پوری کی۔ پھر بھی ان سب کے ساتھ مجھے بھی ناشتے میں شریک ہونا پڑا۔ لازماً ان کا شک پکا ہو جاتا کہ کوئی بات ضرور ہے اور میں پریشانی کے باعث کچھ نہیں کھا سکا۔

"ٹائمز آف انڈیا" میں لّلی کے حوالے سے کوئی خبر نہیں تھی۔ قتل اور دیگر جرائم کی مختصر خبریں اندر کے ایک ہی کالم میں دی گئی تھیں۔ اعلانات کے ایک باکس میں لّلی کی ایک انچ کی تصویر کبھی میں فوراً نہ پہچان سکتا۔ یہ تصویر پرانی تھی اور غالباً کسی گروپ فوٹو سے نکالی گئی تھی تاکہ صرف چہرہ دیا جا سکے۔ مرنے والوں کے لواحقین نے اطلاع عام کے لیے اپنی اپنی استطاعت اور ضرورت کے مطابق یہ اعلانات شائع کروائے تھے۔ لّلی کی موت کی اطلاع دینے والے نے اپنے نام کی جگہ صرف 'ایک دوست' شائع کرایا تھا اور یہ بتایا تھا کہ ایک افسوس ناک ناگہانی موت کا شکار ہونے والی ہم سب کی دوست لّلی کی آخری رسوم کہاں اور کب ادا کی جائیں گی۔

یہ ایک دوست کون تھا اس کا اندازہ کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ لّلی کے بہت دوست ہوں گے مگر میں کسی سے واقف نہ تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اطلاع واقعی کسی دوست کی طرف سے دی گئی ہو مگر میں اس بات کو خارج از امکان قرار نہیں دے سکتا تھا کہ اطلاع دینے والے شکاری ہیں جنھوں نے یہ جال ہمارے لیے پھیلایا ہے۔

حالانکہ میں نے تو دوسرے اُردو اخبار کی سنسنی خیز یا تصویری خبر اور متعلق فیچر کا مطالعہ کر لیا تھا۔ گل نے اب لّلی کی دردناک موت کو رونے کا بہانہ بنا لیا تھا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ رابعہ اور نازو اداس تھیں مگر رونے پر آمادہ نہ تھیں۔ میں سمجھتا تھا کہ گل پر رقت طاری ہونے کے اسباب میں سرفہرست محسن ہے جس کی طرف سے وہ اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہے، اور یہ سب اس کی محبت کی ون وے ٹریفک کا نتیجہ تھا جس کو میں معاشرے کا کانسٹیبل بن کر کنٹرول نہیں کر سکتا تھا۔

باتصویر فیچر کو میں نے بھی پڑھا۔ اس میں واردات کی تفصیل کے ساتھ کرائم رپورٹر نے زیب داستان کے لیے بہت کچھ بڑھا دیا تھا اور نمک مرچ لگا کے متعدد ممکنات اور ناممکنات پر روشنی بھی ڈالی تھی۔ اس میں لّلی کی داستانِ ماضی کے کچھ حوالے تھے اور اس کے بارے میں چند قریبی جاننے والوں کے تاثرات تھے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ ایک معمولی عورت کے بارے میں جو ریکارڈ لپ کرتی تھی اتنا بڑا فیچر لکھنے سے اخبار کو کیا فائدہ ہوگا۔ لّلی کوئی بہت بڑی اداکارہ ہوتی۔ گلوکارہ ہوتی یا کسی اسکینڈل سے ہی منسوب ہوتی تو مشہور کہلاتی۔ مگر وہ گمنام عورت تھی۔ بمبئی کے شہر میں اس جیسی لاکھوں تھیں اور ہزاروں ایسی تھیں جن کو زمانہ لّلی سے زیادہ جانتا تھا مگر وہ مر جاتیں تو ان کے بارے میں اتنی بڑی خبر نہ ہوتی اور ایسا فیچر شائع نہ ہوتا۔

میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ فیچر میں راجکپور فیملی کے کسی فرد کے تاثرات شامل نہیں۔ لّلی نے راج کپور کے پتا شری پرتھوی راج کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کی عزت پوری فیملی کرتی ہے۔ وہ آر کے اسٹوڈیوز میں بہرحال ملازمت کرتی تھی لیکن کرائم رپورٹر نے آر کے اسٹوڈیو کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔

پھر بات میری سمجھ میں آ گئی۔ یہ فیچر نہیں ایک اشتہار تھا۔

www.paksociety.com

اس کے لیے معاوضہ ادا کیا گیا ہوگا۔ لی کی موت کی خبر کو پھیلانے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے ٹائمز آف انڈیا کو کوئی مضمون دے سکتا۔ ریہ خبر ریڈیو سے نشر ہوئی اور نہ کسی اچھے اخبار میں نمایاں جگہ پائی۔ ایک اخبار میں اس کے لیے جگہ بنائی گئی۔ اور وہ اردو کا اخبار تھا۔ اردو میں اسے ہم پڑھ سکتے تھے اور اس کا مقصد بھی یہی رہی وہ سب کچھ پڑھوانا تھا جو مضمون میں غیر ضروری نظر آتا تھا۔

اخبار رکھ کے میں نے کہا: "خوا... مین۔ آپ میں ہی اور میں اکیلا آپ سب کے آنسو نہیں پونچھ سکتا اور نہ سب سے گلے مل کے رو سکتا ہوں" میں نے کہا۔ "سوائے... " میں نے رابعہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "خیر..."

نازو ہنسنے لگی۔ رابعہ کا چہرہ لال ہو گیا۔

"اب گزارش اس خدوی کی یہ ہے" میں نے کہا "کہ آپ لوگ کمر ہمت کس لیں۔ مانا کہ آپ تینوں کی کمر اتنی کمر ہے کہ بقول شاعر جلتم جتنے ہیں تیری بھی کمر ہے۔ کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے۔ مگر پھر بھی آپ لوگ کمر باندھیں۔ کس لیے" میں نے سر پر ہاتھ رکھ کے سوچنے کی اداکاری کی "یہ تو میں بھول گیا کہ کمر کسنے کے بعد کیا کرنا تھا۔"

گل ہنسنے لگی۔ میرا مقصد بھی ان کا موڈ شگفتہ رکھنا تھا۔

نازو اور رابعہ ہنسی کو دبانے کی کوشش میں مسکرا رہی تھیں۔

"ہاں یاد آیا" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "وہ کیا نام ہے تمہارا بی بی؟ رابعہ۔ مس رابعہ آپ نے ایک فارسی فیملی کا ذکر کیا تھا۔"

"فارسی نہیں پارسی۔" رابعہ ہنسی۔

"ایک ہی بات ہے۔ پارسی یا فارسی۔" میں نے کہا۔ "اس پارسی فیملی کے اوصاف حمیدہ کا بھی ذکر ہوا تھا۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ واپس وہیں تشریف لے جائیں؟"

"کیا مطلب؟" رابعہ نے مسکرانا چھوڑ کے کہا۔

"مطلب یہ کہ میری جان بخشی کریں۔ میں ہر رات اتنی باتیں نہیں کر سکتا اور اتنے ڈائیلاگ نہیں بول سکتا۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا" میں نے کہا۔ "جس دن میرا موڈ بہت رومانٹک ہوگا اور فرصت ہوگی مجھے تو میں آپ کو بلا لوں گا۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا کیا؟" رابعہ نے بگڑ کے کہا۔ "میں کیوں واپس جاؤں۔ آپ خود چلے جائیں واپس وہاں۔ کراچی یا بھاڑ میں جائیں۔"

"بی بی! خفا کیوں ہوتی ہو" میں نے عاجزی سے کہا۔ "ہم بھاڑ میں ہی جانا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ آپ کی طرف سے کوئی فکر نہ ہو۔ اپنے ساتھ گل کو بھی لے جاؤ۔ تمہارا پتا دل پر نقش ہے میرے۔ یہیں تھی میں اور نازو رفارغ ہوں گے... گو

"میں؟" نازو نے گڑبڑا کے کہا۔

"جی آپ۔ آپ کو چلنا ہوگا میرے ساتھ۔ اٹھا لیں اپنا سارا توپ خانہ۔ خنجر تلوار جتن کی شمشیر سب ساتھ لے کر چلیں اور سمجھ لیں کہ دوسروں کی جان ہتھیلی پر رکھ کے جانا ہے۔ ہتھیلی کے وار سے جان لینا یا تمہیں آتا ہے یا مجھے۔ چنانچہ میں ان ردنالا ہی... سوری۔ ان معززہ... پھر سوری کیونکہ معززہ تو تم بھی ہو سوان نازک جسم کی صرف طبنچہ چلانے والی یا زبان چلانے والی خواتین کے ساتھ نہیں جانا چاہتا۔"

"کچھ پتا بھی تو چلے کہ جانا کہاں ہے؟" نازو نے کہا۔

"ابھی تم جاؤ گی اپنے ان کو لینے۔ مرزا غالب کو۔ اور میں لے آؤں گا محسن کو۔ انھیں وہ دلن ترپ ہی اور دلا ورا تھا کر لے گئے ہیں" میں نے کہا۔

اس انداز سے ایک انکشاف کا نتیجہ نکلا کہ وہ تینوں کچھ دیر ہکا بکا کھڑی رہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ بولنا شروع کرتیں میں نے انھیں مختصر ترین الفاظ میں ساری بات بتا دی۔ رابعہ بہت بگڑی اور گل نے بھی برا مانا کہ یہ بات بتانے سے پہلے میں نے اپنا رویہ اتنا غیر سنجیدہ کیوں رکھا۔

"کمال ہے سکندر! کتنی بے فکری سے تم ہنسی مذاق میں لگے ہوئے ہو" رابعہ نے کہا۔

"حد ہے بھائی سکندر۔ آپ ذرا سیریس نہیں ہیں" گل نے بھی خفگی کا اظہار کیا۔

"بی بی گل! اور مس رابعہ! میرے سیریس ہونے یا نہ ہونے سے کتنا فرق پڑتا ہے میں جاننا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔ "کیا ہوتا اگر میں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھ جاتا اور سینہ کوٹ کے دھاڑیں مار مار کے رونے لگتا۔"

"آپ نے اتنا وقت ضائع کر دیا۔"

"کتنا وقت ضائع کر دیا" میں نے سنجیدہ ہو کے کہا۔ "اور اس وقت میں کیا ہو سکتا تھا؟ ظاہر ہے اب جو کچھ کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہے اور میرے سامنے مقصد بہت واضح ہے۔ میں ان دونوں کو چھڑا لاؤں گا۔ میں خود کو ان کے حوالے تو کرنے سے رہا۔ انھوں نے بڑے جال پھیلائے ہیں میرے لیے۔ یہ جو اطلاع ہے ایک دوست کی طرف سے۔ ٹائمز آف انڈیا۔ یہ میرا دشمن بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح مجھے لی کی تدفین اور آخری رسوم میں شرکت کے لیے بلایا گیا ہے۔ مگر میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ وہاں نازو جائے گی۔ جو وہاں ہوگا اور میں کیا بتاؤں۔ اگر موقع ملا تو ہم بھی کسی کو اٹھا لائیں گے ورنہ دیکھیں گے کہ کون کون آتا ہے۔ کسی سے زیادہ حسنہ بہانے میں معلوم کریں گے۔"

"لیکن نازو کو دلاور پہچانتا ہے... " رابعہ نے کہا۔

"نازو ہاتھی کے لباس میں جائے گی" میں نے کہا۔ "چہرے پر کالا جالی دار نقاب ڈال کے" میں نے کہا۔ "اور دوسری خواتین کے درمیان رہ کے جائزہ لے گی کہ دلاور ہے یا نہیں۔ میں اس جگہ سے دور مگر نازو کے قریب ہی موجود ہوں گا۔ اس کے علاوہ میرا ارادہ راج کپور فیملی سے مدد لینے کا بھی ہے۔"

"ان کو کہاں فرصت ہوگی۔ اور وہ کیوں کریں گے تمہاری مدد؟" رابعہ نے کہا۔

"میں کوشش ضرور کر کے دیکھوں گا" میں نے کہا۔ "اس کام میں بھی نازو میرا ہاتھ بٹائے گی۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گی" گل نے کہا۔

"تم ابھی فٹ نہیں ہو" میں نے کہا۔

"میں بالکل فٹ ہوں" اس نے ضد کی۔ "میں مردانہ کپڑے پہن کے جاؤں گی۔"

"گل بی بی! ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ تم کو بہت مواقع ملیں گے اپنی ہمت مردانہ سے کام لینے کے۔ لیکن ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ ساری فوج کو ایک محاذ پر نہیں جھونک دیا جاتا۔ ریزرو دستے پیچھے تیار رہتے ہیں۔ تم بھی تیار رہنا۔ ہم کسی وقت بھی آ جائیں گے۔ یا بلا لیں گے۔"

رابعہ نے کہا۔ "کیسے بلاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "تمہارا پتا یاد ہے مجھے۔ فون نمبر بھی دے دو۔ اور ہاں! یہ بتاؤ کہ نقد رقم اب کتنی ہے تمہارے پاس؟"

"وہ... ایک لاکھ... ایسے ہی پڑے ہوئے ہیں۔"

"جزاک اللہ۔ آپ لوگ لوئی ہی" میں نے چندہ جمع کرنے والوں کی طرح کہا۔ "دس ہزار میرے بھی۔ پانچ تمہارے پاس ہیں اور پانچ گل کے پاس۔ یہ ہوئے ایک لاکھ بیس ہزار۔"

"پانچ پانچ ہزار ڈالر بھی ہیں۔ ہم سب کے پاس۔" نازو نے مجھے یاد دلایا۔

"ماشاء اللہ! اس فقیر کے پاس ڈالر نہیں ہے۔ سب لٹ گیا خزانہ۔" میں نے کہا۔ "یہ ہوئے پندرہ ہزار ڈالر۔ چلو اب یوں کرو کہ ڈالر تو دے دو مجھ فقیر کو۔ تم لے جاؤ سوا لاکھ اپنے ساتھ اور کوشش یہ کرو کہ اس رقم سے کہیں کوئی عارضی ٹھکانا مل جائے۔ پگڑی چلتی ہے یہاں ...... پگڑی پر ایک کمرا بھی مل سکتا ہے تو جس میں فون ہو۔ بمبئی میں کوئی نہیں پوچھتا ذات حوالے۔ اکیلی عورتیں بہت رہتی ہیں۔ خود کو جو جتا ہو کہو۔ سب سے آسان یہ کہنا ہے کہ فلموں میں کام کرنے آئی ہوں۔ یا کرتی ہوں۔ ایکسٹرا ہوں۔"

"کیا میں ایکسٹرا لگتی ہوں؟" رابعہ نے سخت برہمان کے کہا۔

"تم ایکسٹرا آرڈینری لگتی ہو" میں نے کہا۔ "بیوٹی فل۔ لیکن کہنے کو بمبئی میں چالیس کی بات ہے۔ موسم کو بھی چالیس نہیں ملا کوئی تم سے نہیں پوچھے گا کہ کیوں نہیں ملا اور نہیں ملا تو گھر کا بھاڑا کون دیتا ہے اور خرچ کدھر سے پورا ہوتا ہے۔ کوئی نہیں پوچھے گا کہ کہاں سے آئی ہو اور کب آئی ہو۔ اول تو ہم ساتھ ہی ہوں گے مگر ساتھ نہ ہوں تو ڈرنا نہیں۔ ہم آ جائیں گے بعد میں۔ تم کوئی بھی چھوٹا موٹا فلیٹ لے کر آباد ہو جانا۔"

"سوال کو بھی جھیلا رہی ہو کیا مستقل رہنا ہے یہاں؟"

"نہیں۔ مستقل کون رہ سکتا ہے دنیا میں۔ ہم بھی مہمان ہیں۔ یہ جگہ رین بسیرا بندے نہ تیرا نہ میرا" میں نے کہا۔ "پگڑی پر فلیٹ لیں گے تو پگڑی پر اٹھا کے جب جائیں گے رخت سفر باندھ لیں گے۔ مگر ابھی تو جگہ چاہیے۔ اس پارسی فیملی کی زندگی کو ان کے لیے مزا بنانے سے کیا فائدہ۔ لی کے انجام سے عبرت پکڑو۔ اپنا ٹھکانا الگ بناؤ تاکہ جو مصیبت ہم پر نازل ہوا اس سے دوسرے محفوظ رہیں۔ رابطے کے لیے فون ہونا ضروری ہے۔ نہ ملے تو مجبوری۔"

میرے ذہن میں پوشیدہ خوف کا ایک اور پہلو بھی تھا جس کو میں نے خواتین کے سامنے لانے سے گریز کیا۔ مجھے یہ خیال جلد از جلد یہاں سے نکل جانے پر اکسا رہا تھا کہ کہیں محسن اور غالب کو لے جانے والے پھر شہ آ جائیں اور دوسرے پھیرے میں اسلم آ رائیں کے یہ سارا مکان گھیر لیں۔ اپنی غلطی کا اندازہ تو انھیں ہو ہی گیا ہوگا کہ جسے وہ امیر چند یعنی سکندر سمجھ کے اٹھا لائے ہیں وہ در حقیقت اس کے روپ میں محسن ہے۔ یہ فرق دلاور محسوس کرے گا اور کارکردگی کے اس مظاہرے پر انعام کی توقع رکھنے والوں کو شرمندہ لوٹنا پڑے گا۔ دلاور کہے گا کہ "جاؤ وہیں رکھو انھیں دوسرے بھی مل جائیں گے۔" یہ تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ محسن یا غالب انھیں کچھ بتائیں لیکن ایک چھوٹی کامیابی ان کو بڑی کامیابی کے لیے حوصلہ دے گی۔ وہ زیادہ تیاری کے ساتھ واپس آئیں گے اور اس علاقے کی ناکہ بندی کر دیں گے۔

میرا خیال یہ بھی کہتا تھا کہ جب تک ہم محفوظ ہیں محسن اور غالب بھی محفوظ ہیں۔ دونوں کو اغوا کرنے والے اس وقت تک خود کو غیر محفوظ سمجھنے پر مجبور ہوں گے جب تک وہ اسلم آرائیں کی قوت کو بالکل ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ میں چاہتا تھا کہ ان کے لیے خطرے کے احساس کی شدت کم نہ ہونے دوں۔ اس حد تک کہ وہ بھی اپنے آپ کو میری دسترس سے دور رکھیں گا جب تک سامنے نہ آئیں۔

گل اور رابعہ کی تیاری مکمل ہو گئی تو میں نے ان سے پہلے نکل جانے کو کہا اور پھر تاکید کی کہ وہ اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہ ہوں۔ جب تک ہم ان سے پھر رابطہ قائم نہیں کرتے، وہ اسی گھر میں رہیں جہاں رابعہ رہ رہی تھی۔ یہ نہ ہو کہ وہ گھبرا کے ہماری تلاش میں نکل کھڑی ہوں اور جب ہم جائیں تو پتا چلے کہ وہ خود گم ہو چکی ہیں۔ گل کی صحت اب تقریباً ٹھیک ہو چکی تھی۔ اس کے زخم مندمل ہونے لگے تھے اور امید کی جا سکتی تھی کہ دو چار دن علاج اور آرام جاری رہا تو وہ بالکل پہلے جیسی صحت مند ہو جائے گی۔

"کیا خیال ہے اب ہم بھی چلیں؟" نازو نے کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ بعد میں محسن یا غالب میں سے کوئی یہاں آیا تو کیا ہوگا۔ فرض کرو انھیں کوئی موقع مل گیا یا تائید ایزدی سے کوئی قید سے فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ تو یہاں کوئی بھی نہیں ہوگا۔"

نازو نے کہا "پھر کیا کریں۔ ہم پیغام چھوڑ جائیں؟"

"ویسے تو حاجی صاحب کے پاس میں نے پیغام چھوڑ دیا ہے۔ مگر کیا حرج ہے اگر اس لانچ کے لینڈ لارڈ یا دوسرے کسی مکین کو بتا جائیں کہ ہم سے رابطے کے لیے رابعہ کے پتے پر رجوع کیا جائے۔ رابعہ نے اپنا فون نمبر بھی دیا ہے۔"

نازو نے کہا "کیوں اس گھر کا پتا بتاتے ہو کسی کو جو ابھی تک محفوظ ہے۔ غالب یا محسن کے علاوہ بھی تو کوئی آ سکتا ہے ہماری تلاش میں یہاں۔"

میں نے قائل ہو کے سر ہلایا "چلو رہنے دو۔ حاجی صاحب کا پتا کافی ہے۔"

"تم نے ابھی تک بتایا نہیں کہ جانا کہاں ہے؟"

"تم... کیا تم ضرورت سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو؟..." مس نازو بیڈ میں نے کہا۔

"یہ کون سا موقع ہے..."

"موقع محل تو دیکھنا پڑتا ہے۔ اس چہرے اور حلیے کے ساتھ تم جس راستے سے گزرو گی نگاہوں کو خیرہ کر دو گی۔ لوگ سر گھما گھما کے اور دیدے پھاڑ پھاڑ کے دیکھیں گے۔"

"پھر کیا کروں میں؟ برقع اوڑھ لوں؟" نازو چڑ کے بولی۔

"بمبئی شہر فلمی ستاروں کی کہکشاں ہے اور اس اعتبار سے پریوں کا نگر ہے کہ یہاں سارے ہندوستان کا حسن خود کھنچ کر آ جاتا ہے۔ ورنہ حسن شناس کھینچ لاتے ہیں۔ یہاں وہ جوہری ہیں جن کی نگاہ ہمہ وقت کسی جوہر نایاب کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ میری مراد ان فلم سازوں سے ہے جو نیا چہرہ متعارف کرانے کے لیے خوب سے خوب تر کی جستجو کو اپنی کامیابی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ کیا تم میری بات کا مطلب سمجھ رہی ہو؟"

"ابھی تک تو نہیں سمجھی۔" نازو نے کہا۔

"مجھے بھی یہی امید تھی۔ عقل کی بات سمجھنا۔" میں نے کہا۔ "اب ایک بات اور عرض کرتا ہوں جو تمھیں بے محل لگے گی اور ممکن ہے اس کا غلط مطلب نکال لو کہ تم بے سروپا باتیں بھی کرنے لگے۔ لیکن میں دوراندیشی کو حالات کا تقاضا سمجھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے نازو کہ اس وقت جو خواتین فلمی افق کے روشن ترین ستاروں میں شامل ہیں اور اپنے حسن بے مثال کی جلوہ سامانی سے کروڑوں پرستاروں کے دلوں پر قیامت ڈھاتی ہیں، وہ کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ بھی نہیں کا مطلب یہ کہ آپ کی نظر میں..."

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں ایک حقیقت بیان کر رہا تھا عزیزہ۔ وہ تمھارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ فلاسفی تو خیر بعد میں ہوگا۔ وہ پردۂ اسکرین کی بجلیاں جو سات سے ستر برس کے ہر فرد کے دل کی دھڑکن بنی ہوئی ہیں، پچاس فیصد حسن فطری رکھتی ہیں۔ باقی پچیس فیصد کمال ہے میک اپ کا اور پچیس فیصد کیمرے کی آنکھ کا جو ذرے کو آفتاب کر کے دکھاتی ہے۔ بلکہ اصل حسن وہی ہے جو کیمرہ مین پیش کرتا ہے۔ چہرے تو پھیکے پھیکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم ان سب کے مقابل آ جاؤ تو ان فلمی ستاروں کی چمک دمک اسی طرح ماند پڑ جائے جیسے..."

"جیسے چاند کے سامنے ستاروں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔"

نازو نے میری بات کاٹ دی "میں سمجھ گئی۔ لیکن..."

"لیکن کیا۔ تم خاک بھی نہیں سمجھیں جو میری بات کو۔"

"تم کیا چاہتے ہو میں فلموں میں کام کرنے لگوں؟ تمھارے ساتھ چلی جاؤں اسکرین ٹیسٹ دینے کے لیے؟" نازو نے بگڑ کے کہا۔

"پھر میں کہوں گا ناقص العقل تو تمھیں سچ کرنا لگے گا۔ ارے بابا میرا کیا دماغ خراب ہے کہ تم کو ہیروئن بننے کا مشورہ دوں؟ ہم یہاں فلمی دنیا میں تہلکہ مچانے آئے ہیں؟ تم سے پہلے تو میں والیے کہہ سکتا تھا یہی بات۔ لیکن میں تو تمھیں بچانا چاہتا ہوں۔ ابھی ہم یہاں سے نکلیں گے تو آر کے اسٹوڈیو جائیں گے۔ وہ فلمی دنیا کا ایک بڑا اعظم ہے۔ قدم قدم پر تم کو حسن کے شکاری جال پھیلائے نظر آئیں گے۔ خود راج کپور جیسی چیز کو ہیرا بنا دینے کا ہنر جانتی ہے اور تم تو پہلے ہی ہیرا ہو۔ تم کو ان سب سے بچ کے رہنا ہوگا۔"

"تم سب کی فکر مت کرو۔ اپنی حفاظت میں خود بھی کر سکتی ہوں۔" نازو نے تلخی سے کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ اچانک بمبئی کے پروڈیوسر کنٹریکٹ بغل میں دبا کے لائن لگا لیں گے؟"

"ان کے ایجنٹ ضرور تمھارے پیچھے لگ سکتے ہیں۔ تم

جتنا چاہو بچو۔ شہرت سے کیسے بچو گی جو خود بخود ہو گی۔ جہاں بھی تم جاؤ گی پرکھنے والے تم کو پرکھ لیں گے کہ ان کے لیے تم چھپا ہوا خزانہ ہو۔ کامیابی کی کنجی ہو۔ تم فلمی دنیا میں قدم رنجہ فرما کے وحیدہ رحمان کا مستقبل تاریک کر سکتی ہو۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ تم وحیدہ رحمان سے کافی مشابہت رکھتی ہو؟"

"مجھے وحیدہ رحمان سے کوئی دلچسپی نہیں اور اس سے دشمنی بھی نہیں۔" نازو نے کہا۔ "اب شہرت ہوتی ہے تو ہوا کرے۔ جو میرے پیچھے آئے گا ہڈیاں تڑوا کے جائے گا۔"

"ہاں یہ ہوئی نا بات۔" میں نے کہا۔ "اس سے کیا ہوگا بھلا تمھاری شہرت کو چار چاند لگ جائیں گے۔ دھوم مچ جائے گی کہ کیا چھوکری آئی ہے۔ اس لفظ کا برا مت ماننا۔ یہاں یہی مستعمل ہے۔ ایک دم فٹ سا اور حسن ایسا بساط۔ ارے بابا غصے میں ہو تو ایک دم چیر پھاڑ، باکس آفس کا ریکارڈ ٹوٹ جائے۔ تمھاری یہ شہرت تمھارا بمبئی میں رہنا محال کر دے گی۔"

"پھر میں کیا کروں؟ یہ بھی بتا دو۔ اپنی صورت تو میں بگاڑنے سے رہی۔"

"یہ کون کمبخت چاہے گا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تم اس سے پورا فائدہ اٹھاؤ۔ وہ فائدہ جس میں ہم سب کا فائدہ ہو۔ ہم اب چلتے ہیں۔ ہمیں تریویدی کا پتا معلوم کرنا ہے۔ تم کو تھوڑا سا میک اپ کرنا ہوگا۔ ایک تو یہ شلوار قمیص چھوڑ کے ساڑی باندھو۔"

"ساڑی تو میں نے کبھی نہیں باندھی۔"

"اب باندھو۔ ایک دم انڈین اسٹائل میں... ساڑی ہم راستے میں لے لیں گے۔" میں نے کہا۔ "ماتھے پر لگا لو بندیا۔ بالوں میں گجرے۔"

"میں یہ سب نہیں کر سکتی۔"

"تم کو وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گا۔ اور نہیں کرنا تو تم بھی جاؤ رابعہ کے ساتھ گھر بیٹھو۔ میں گل کو لے جاتا ہوں۔ وہ خود سر تو نہیں ہے تمھاری طرح۔" میں نے بے رخی سے کہا۔ "ایسے تو کچھ نہیں ہوگا اگر ہر معاملے میں بحث اور دلائل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔"

یہ دھمکی کام کر گئی۔ نازو کچھ شرمندہ نظر آنے لگی۔

"لعنت بھیجتا ہوں میں بھی اس فلمی دنیا کی دلدل پر جس میں ہر سال سیکڑوں شریف گھروں کی لڑکیاں اپنی عزت ڈبو دیتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "میرا مشن کچھ اور ہے۔ یہ تو ہم پھنس گئے ہیں یہاں۔ ہمیں آگے جانا ہے۔"

"آئی ایم سوری۔" نازو نے کہا۔

میں نے وہ مشین گن اٹھالی جو دالان کے کونے میں تھی۔

"تم ایک ہندو لڑکی بن کے میرے ساتھ چلو گی۔ میں تم کو اپنی دھرم پتنی کہوں گا۔ میری بات پر یقین کسی کو نہیں آئے گا۔ فلمی دنیا میں داخل ہونے کے لیے جو بھی آتا ہے اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی حسین سہارا رکھتا ہے اور ایسا ہی بدصورت جھوٹ بولتا ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ حقیقی میاں کبھی اپنی بیوی کو فلم نگری کے بدکار بھیڑیوں کے سامنے لاکر نہیں ڈالتا۔ وہ گھر سے بھاگے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ یا عشق مرد اور عورت۔ مرد ہوتا ہے ایجنٹ جو کامیابی کی صورت میں تمام مالی معاملات کی نگرانی کرتا ہے اور اپنی سونے کا انڈا دینے والی مرغی کی حفاظت کرتا ہے۔ یہی مجھے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ڈونٹ مائنڈ آل دس۔ میں تریویدی کو تلاش کرنے کے لیے اور اس کی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو کافی نہیں سمجھتا۔ مجھے کسی بڑی طاقت کی پشت پناہی بے غرض حاصل نہیں ہو سکتی۔ خرچ مند کو تم مجبور کر سکتی ہو کہ اپنی طاقت اور اپنے وسائل تمھارے قدموں میں ڈال دے۔ کیا تمھاری سمجھ میں آ رہی ہے بات؟"

نازو نے اقرار میں سر ہلایا "میں کون ہوں؟ پہلے کیا کرتی تھی؟ کہاں سے آئی ہوں؟"

میں نے خوش ہو کے کہا "فرض کرو کہ میرا نام ہے... ہیرا لال اور تم ہو... بندیا۔ کیسا نام ہے؟"

"ایک دم فلمی۔"

"تم آگرہ میں پڑھتی تھیں۔ بی اے میں۔ اداکاری کا شوق تھا۔ تم کو مجھ سے پریم ہو گیا اور ہم دونوں بیاہ کر کے بمبئی آ گئے۔ ہندی کے جتنے زیادہ الفاظ استعمال کر سکو اتنا بہتر۔" میں نے کہا۔

یہ سب نازو کو سخت ناپسند تھا مگر اس نے مجبوری میں میرے کہنے کے مطابق عمل کیا۔ اس کو ساڑی باندھنی نہیں آتی تھی۔ اس کام میں ایک بیوٹی پارلر کی خدمت حاصل کرنے سے سارے مسائل حل ہو گئے۔ بیوٹی پارلر کی مالک ایک تجربہ کار عورت تھی۔ اس نے فوراً تاڑ لیا کہ ہم بمبئی میں نو وارد ہیں۔ میں صورت سے احمق نظر آنے کی کوشش بھی کرتا رہا اور باتوں سے خود کو چغد بھی ثابت کرتا رہا۔

میں نے کہا "یہ دھرم پتنی ہے ہماری۔ بندیا۔ اس کو بالکل وحیدہ رحمان بنا دو۔"

اس نے مجھے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا "ہیرا لال، یہ تو بم گرے گا۔ تم بولا بھی اس چھوکری..."

"ہماری دھرم پتنی..."

"اچھا بابا تمھارا دھرم پتنی کو ادھر فلم لائن میں کام مانگتا؟"

میں نے خوش ہو کے کہا "او یس مانگتا۔ ہم اسی لیے تو آئے ہیں۔ آج ایک اسکرین ٹیسٹ ہے۔"

www.paksociety.com

"اچھا، اُدھر۔۔۔" وہ کچھ مایوس ہوئی۔
"راج کا متعدد جانا ہے۔" میں نے کہا۔
"تم ہمارا بات مانے گا تو ادھر مت جاؤ۔ ہمارا پاس بہت بڑا بڑا ڈائریکٹر، پروڈیوسر، ایکٹر لوگ آتا ہے۔ اپنا دلیپ کمار کا بال ہم سیٹ کرتا۔ کیا ظالم ہیئر اسٹائل بنایا اس کا۔ اور بھی بہت لوگ آتا۔ ہم ان کو بولے گا۔ وحیدہ رحمان کیا چیز ہوتا۔ یہ چھوکری۔۔۔"
"ہماری دھرم پتنی۔۔۔"
اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "ہیرالال! ایسا یار ہونے گا تو کوئی چانس نہیں دے گا تیرے کو۔ بولو یہ سسٹر ہے ہمارا۔ کزن ہے۔"
"رام رام۔۔۔" میں نے کانوں کو چھو کے کہا۔ "ایسا پاپ۔ ہم نہیں کر سکتے۔"
وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی اور بیٹا کو میرے خلاف اُکساتی رہی کہ تم اس کاٹھ کے اُلو کو چھوڑ دو۔ تم تو سونے کی چڑیا۔ اس کا تمھارا کیا میل۔ یہ تم کو کچھ نہیں کرنے دے گا۔ نازو بڑی معصومیت سے ہر بات میں کھوئی رہی۔ "جو یہ کہیں، میرے سوامی ہیں۔"
بالآخر اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے میک اپ کر کے نازو کو وحیدہ رحمان تو بنا دیا مگر مجھ پر واضح کر دیا کہ میں بہت بڑا احمق ہوں جو کسی چالباز کے جھوٹے وعدے پر اعتبار کر کے اپنی دھرم پتنی کو اسکرین ٹیسٹ کے لیے لے جا رہا ہوں اور مجھے بمبئی کے ہر احمق کے عبرتناک انجام سے بھی ڈرایا۔ "تمھارا سب کچھ لٹ جائے گا اُدھر۔۔۔"
"اب تو اوکھلی میں سر دے دیا ہے ہم نے۔" میں نے کہا۔
"ہم کو پیسے بتاؤ۔"
اس نے دو سو روپے مانگے اور جیب میں سے میں نے ڈالر نکالے تو اس کی صورت قابلِ دید ہو گئی۔ اسے یقیناً افسوس ہوا ہوگا کہ اس کام کے دو سو روپے کیوں مانگے۔ دو سو ڈالر کیوں نہیں کہے۔ بیوٹی کلینک کی ہر صورت ملازمہ اور وہاں آنے جانے والوں کی نظر کا میں نے بڑی دلچسپی سے مشاہدہ کیا تھا۔ لوگ نازو کی صورت آئینے میں دیکھتے ہی ٹھٹک کر رک جاتے تھے۔ جب میں اس کے ساتھ باہر نکلا تب بھی یہ ردِ عمل مختلف نہ تھا۔ ساری نے اور میک اپ نے بلا مبالغہ نازو کے حسن میں محشر کی ساری فتنہ گری کے اسباب پیدا کر دیے تھے ـــــ خود میں نے بھی کھدر کا کرتا اور دھوتی اور پگڑی باندھ کے میں نے ایک سادہ لوح دیہاتی کی وضع قطع اختیار کر لی تھی۔

آر کے اسٹوڈیو کا میں نے صرف نام سنا تھا۔ بمبئی پہنچنے کے بعد یہ نام للی کی زبان سے بھی سنا۔ وہ للی اب اپنی آخری رسوم کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ وہ جو تماشا دیکھنے والوں کے لیے صورتیں بناتی اور بگاڑتی تھی خود تماشا بنی کسی تابوت میں پڑی تھی اور شاید اس کی روح اس تماشا گاہِ عالم میں للی کے دوستوں اور دشمنوں کی مہربانیاں دیکھ رہی تھی۔ کون آتا ہے۔ کون نہیں آتا اور کون کس کے لیے آتا ہے۔
آر کے اسٹوڈیو میں روزمرہ کے معمولات کے مطابق کام جاری ہوگا۔ فلموں کی شوٹنگ للی کی وجہ سے ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رکی ہوگی۔ کسی کا شیڈول متاثر نہیں ہوا ہوگا۔ کسی میک اپ روم میں کسی نے تشکا پتا کہا ہوگا کہ آج للی کہاں مر گئی۔ اور جواب میں کسی نے کہا ہوگا کہ وہ سچ مچ مر گئی۔ مر گئی؟ کب؟ کیسے؟ اچھا چلو کسی اور کو بلاؤ۔ میک اپ تو ہوگا۔
اسٹوڈیو میں داخلہ امریکی ایوانِ صدر میں داخلے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ مسلح گارڈ تھے جو صورت سے پیشہ ور قاتل نظر آتے تھے اور ہر آنے جانے والے کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ بار بار گیٹ کھولتے تھے تو راستہ صاف کراتے ہوئے بہت شور مچاتے تھے۔ مشتاقانِ دید کا اجتماع الگ تھا جو اندر سے آنے والی ہر کار میں راج کپور یا ششی کپور کو دیکھنا چاہتے تھے یا کسی بھی نامور ہیرو ہیروئن کو۔ فلم میں کام تلاش کرنے اور مقدر آزمانے کے شوقین لڑکے لڑکیاں الگ تھے جو مختلف حیلوں حوالوں سے منت سماجت سے یا زر اور زور سے اندر داخلے کی اجازت چاہتے تھے مگر گورکھے بہت سخت مزاج اور ٹس سے مس نہ ہونے والے تھے۔ وہ بہت تنگ آ جاتے تھے تو ہاتھ جوڑتے تھے کہ بابا ہماری نوکری کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔
یہ صورتِ حال میرے لیے قدرے غیر متوقع تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ للی کے حوالے سے راج کپور یا اس کے باپ تک پہنچ سکا تو ان کو بتاؤں گا کہ للی کا قاتل کون ہے اور ان سے کہوں گا کہ ترلوچن تک پہنچنے میں میری مدد کریں۔ لیکن وہاں کوئی سننے والا ہی نہ تھا۔ گاڑیاں آتی تھیں اور ان سے گزر جاتی تھیں۔ گیٹ کھلتا تھا اور پھر بند ہو جاتا تھا۔ مجھے رشوت کی طاقت پر بڑا اعتماد تھا جو سارے بند دروازے کھلوانے میں ہمیشہ میرے کام آئی تھی مگر یہاں محافظ مجبور تھے۔ وہ رشوت لے کر کسی کو اندر جانے دیتے اور وہ گھس جاتا راج کپور کے آفس میں تو محافظ کو کھڑے کھڑے نوکری سے برخواست کر دیا جاتا۔ یہ رسک کوئی بھی نہیں لے سکتا تھا۔ گورکھا اپنی جگہ سے ایک انچ ہٹ کے میری بات سننے کے لیے تیار نہ تھا۔

خود نازو پریشان تھی کہ اس طرح ہم کب تک خوار ہوں گے اور ایسے خوار ہونے کا فائدہ کیا۔ پھر اچانک ایک ایسی بات ہوئی کہ دروازہ ہمارے لیے کھل گیا۔ دو افراد اندر سے پیدل چلتے ہوئے آئے اور چھوٹے دروازے سے باہر آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں اردو کا اخبار تھا جو میں نے دیکھا تھا۔ وہ صفحۂ اول پر للی کی تصویر دیکھتے ہوئے آ رہے تھے اور شاید اسی کے بارے میں بات بھی کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا چہرہ مجھے جانا پہچانا لگا۔ حافظے نے بروقت میری مدد کی اور میں نازو کو وہیں چھوڑ کے ان کے پیچھے لپکا۔ وہ ایک موسیقار تھا۔ اس نے بہت کم فلموں میں موسیقی دی تھی لیکن وہ موسیقاروں میں اپنا ایک مقام رکھتا تھا۔ اس کی پرانی فلموں کے بہت سے گانے سپرہٹ ہوئے تھے۔
اس کے بالکل قریب پہنچ کے میں نے کہا۔ "جناب! ایک بات سن لیں میری۔ کوئی نہیں سن رہا۔ آپ اتنے بڑے موسیقار ہیں۔"
وہ رک گیا۔ اس نے خاصے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں ایک بڑا موسیقار۔۔۔ تھا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ تم نے مجھے پہچان لیا۔"
"آپ کو بھلا کون نہیں پہچانتا۔" میں نے کہا۔ "کیا شاندار سنگیت دیا تھا آپ نے۔" میں نے اس کی چند فلموں کے نام لیے۔
"وہ پرانی بات ہوگئی۔ اب میں جھک مارتا ہوں۔ اندر گیا تھا بڑی مشکل سے لیکن دنیا بدل گئی ہے۔"
"چھوڑیں سجاد صاحب! دل چھوٹا مت کریں۔" دوسرے شخص نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیا بات ہے؟ بولو۔"
میں نے کہا۔ "مجھے اس کے بارے میں بات کرنی تھی۔" میں نے للی کی اخباری تصویر کی طرف اشارہ کیا۔
"للی کے بارے میں۔۔۔ کیا بات کرنی تھی، اور کس سے؟"
"راج صاحب سے یا ان کے پتا جی مل جاتے تو اچھا تھا۔ شری پرتھوی راج۔۔۔" میں نے کہا۔ "للی نے ان کا ذکر کیا تھا۔"
وہ شخص میری بات سے محظوظ ہوا۔ "ذکر تو سب ہی کرتے ہیں ان کا۔ مگر دیکھو بھیا، ان سے کوئی بھی ایسے نہیں مل سکتا۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔"
"پھر آپ ملوا دو گے ان سے؟" میں نے کہا۔
"نہیں بھائی۔ نہ میں وعدہ کر سکتا ہوں اور نہ کوشش۔"
"کوشش بھی نہیں کر سکتے تو پھر کیا فائدہ؟" میں نے کہا۔
"وہ مر گئی۔ اب کون سنے گا اس کی بات۔"
"بات سن رہا ہوں میں۔ ایسی کوئی بات ہوگی تو۔۔۔ میں کچھ کروں گا۔ کسی سے کہوں گا۔ پھر بھی یہ بہت مشکل ہے۔" وہ بولا۔ "میں اسی جگہ کام کرتا ہوں جہاں للی کام کرتی تھی۔"
"اچھا۔ تو آپ اکیلے میں سن لو میری بات۔" میں نے کہا۔

موسیقار سجاد نے سخت برا مانا۔ "ہاں بھئی، میں اب ناقابلِ اعتبار جو ہو گیا ہوں۔ ایسے جاہل گنواروں کے لیے بھی۔ میں چلتا ہوں۔"
دوسرے شخص نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اس آدمی کو خراب کیا اس کی زبان نے۔ سب کو دشمن بنا لیا اپنا۔ خیر اب بتاؤ۔"
"بات یہ ہے جناب۔۔۔" میں نے کہا۔ "کہ للی کو قتل کیا گیا ہے۔"
اس نے مجھے غصے سے دیکھا۔ "حد ہو گئی۔ یہ بات کہنے کے لیے۔۔۔"
میں نے جلدی سے کہا۔ "یہ بات نہیں۔ بات یہ ہے کہ میں جانتا ہوں اس کو کس نے قتل کیا ہے۔"
اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میری دماغی حالت کے درست ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں فیصلہ کرنا اس کے لیے دشوار ہو گیا ہے۔ پھر اس نے کہا۔ "تم یہ بات جانتے ہو تو پولیس کو بتاؤ۔"
میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "یہ بات کہنا تو بہت آسان ہے۔ میں آپ کو قاتل کا نام بتا دوں تو کیا آپ چلے جاؤ گے پولیس کے پاس؟"
اس نے میرے پیچھے کھڑی ہوئی نازو کو غور سے دیکھا۔ "کون ہے وہ؟ تم نے کیسے جان لیا کہ وہی قاتل ہے؟"
"دیکھو جی۔ آپ بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ میں نے جو بات آپ سے کی اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ پولیس مجھے اور آپ کو پھانسی گھاٹ پہنچا دے گی اگر میں نے وہ نام لیا اور آپ نے پولیس کو بتایا۔ ہاں راج صاحب کا پولیس کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"
"تمھارا دماغ خراب ہے۔ راج صاحب کیا فالتو بیٹھے ہیں ایسی باتیں سننے کے لیے۔ وہ میری استاد تھی۔ مجھے میک اپ کرنا سکھایا تھا اس نے۔ مجھے بہت دکھ ہے اس کی موت کا۔ لیکن۔۔۔"
"لیکن کو چھوڑو۔ دکھ ہے اس کے مارے جانے کا تو میری مدد کرو۔ میں قاتل پر ہاتھ ڈال سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں یہاں اسی لیے آیا تھا مگر کوئی میری بات تک سننے کو تیار نہیں۔ میں کہتا ہوں ایک بار اندر جا کے کسی سے بات تو کرو۔ میں نے تم سے کہا۔ تم کسی اور سے کہو۔ کانوں کان یہ بات راج صاحب تک پہنچ سکتی ہے۔ ان کے پتا تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ وہ للی کا بہت خیال رکھتے تھے۔"
وہ کچھ دیر مجھے اور نازو کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "دیکھو! مجھے دھوکا دینے کی کوشش مت کرنا۔ اندر جا کے اگر تم نے کہا نا کہ میں اس چھوکری کو۔۔۔"

www.paksociety.com

"یہ دھرم پتنی ہے ہماری، بندیا۔" میں نے کہا۔

"اور تمہارا کیا نام ہے؟"

"ہیرالال۔" میں نے کہا۔ اگر میں اندر جاکے کہوں کہ اس کو چانس دلوانے کے لیے جھوٹ بولا تھا میں نے۔ تو مجھے جوتے لگوا کے باہر کرا دیتا۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر چھوٹے دروازے سے گزر کے اندر گیا۔ اس نے گیٹ کے اندر بنے ہوئے کمرے میں جا کے کسی سے بات کی اور چند منٹ کے بعد باہر آکے مجھے اشارہ کیا کہ میں چھوٹے گیٹ سے گزر کے آجاؤں۔ اس نے گورکھے چوکیدار کو بھی ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ آنے دو۔

میں اور نازو ایک ایسی دنیا میں داخل ہوئے جہاں کوئی بھی چیز اصلی نہیں لگتی تھی۔ ہر چیز کسی سیٹ کا حصہ نظر آتی تھی، ہر شخص اداکاری کرتا محسوس ہوتا تھا۔ مجھے آرکے پروڈکشن کی بہت سی فلمیں یاد آئیں "برسات" اور "آگ" سے لے کر "میرا نام جوکر" تک۔ میں بھوتوں کی طرح اس شخص کے پیچھے چلتے ہوئے چاروں طرف دیکھتا گیا کہ کہیں میری دیکھی ہوئی کسی فلم کا کوئی سین نظر آجائے مگر وہاں سب کچھ اجنبی تھا۔ اسٹوڈیوز سے پہلے ہی وہ شخص دوسری طرف چل پڑا۔ بہت خوبصورت پھولوں اور سبزہ زاروں کے سامنے کاریں کھڑی ہوئی تھیں اور یہ وہ حصہ تھا جہاں انتظامی امور کے دفاتر تھے۔ اس نے مجھے اور نازو کو ایک کمرے میں بٹھا دیا۔

میں نے باہر سے اس کی آواز سنی۔ شاید وہ اونچی آواز میں کسی سے کہہ رہا تھا۔ "یہ جو دو نمونے اندر رکھے ہیں میں نے، ان کو ادھر اُدھر مت ہونے دینا۔ یہ ڈھونڈ کر سالے پہنچ جائیں کسی سیٹ پہ اور مصیبت میرے گلے پڑ جائے۔"

جواب میں کسی نے کہا۔ "ان کی تو۔۔۔" اور قہقہہ مار کے ہنسا۔ میں نے غصے کی ایک لہر کو اٹھتے ہی دبا لیا۔

"کیا تم ایسے ہی کہہ دو گے راج کپور سے بھی؟" نازو نے کہا۔

"نہیں۔ فارسی میں کہوں گا۔ یا گا کے سناؤں گا۔" میں نے کہا۔

نازو کا موڈ آف ہو گیا۔ "خود تو بنے ہو کارٹون۔ مجھے بھی تماشا بنا دیا۔ کیسے دیکھ رہے تھے سب کمینے۔ ندیدے لوگ۔"

میں نے دانت نکال کے کہا۔ "ان کی نظر خراب معلوم ہوتی ہے مجھے۔ ابھی تک کسی نے تمہیں وحیدہ رحمان نہیں سمجھا۔"

"وحیدہ رحمان کے ساتھ ہوگا دلیپ کمار۔ کوئی ہیرالال یا کھیرالال نہیں۔"

"میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ میری اداکاری کا معیار کسی طرح بھی ان سے کم نہیں جو اپنے نام کا سکہ چلاتے ہیں۔ رہ گئی صورت تو ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہوں۔ تم تو ہو نقلی، اصلی وحیدہ رحمان دیکھ لے تو چت سے گرے بے ہوش ہو کے۔"

"ہاں، سنا ہے بہت بزدل ہے۔ جن بھوت سے ڈرتا ہے۔"

جو شخص ہمیں اندر لایا تھا وہ ایک خاصے خطرناک قسم کے باکسر ٹائپ شخص کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس کا رنگ کالا تھا اور جسم بے ڈول۔ رہی سہی کسر چیچک کے داغوں نے پوری کر دی تھی۔ سگریٹ کا دھواں نتھنوں سے خارج کرتے ہوئے اس نے میرا اور نازو کا ایسے جائزہ لیا جیسے تفتیش کا آغاز کرنے سے پہلے تھانیدار ملزم کو دیکھتے ہیں کہ اس پر کتنی محنت درکار ہوگی۔

"یہ پرتھوی راج کی گاڑی چلاتے ہیں۔" اس شخص نے کہا جو ہمیں اندر لانے کا ذمے دار تھا۔ اس نے پیچھے سے مجھے اشارہ کیا کہ احتراماً مجھے کھڑا ہو جانا چاہیے۔ جب میں بیٹھا رہا تو اس نے دانت پیس کے زیر لب کچھ کہا۔

"ہیرالال، یہ کیا معاملہ ہے؟" شوفر صاحب نے کہا۔ "تم نے کیسے دیکھ لیا للی کے قاتل کو؟"

میں نے کہا۔ "جو بات مجھے راج صاحب کو یا ان کے پتا کو بتانی ہے وہ میں کسی اور کو نہیں بتا سکتا۔ جانے کو میں پولیس کے پاس بھی چلا جاتا مگر مجھے اپنی زندگی عزیز ہے اور اپنی گھر والی کی عزت۔"

نازو نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار مجھے گھور کے کیا۔

"تم مجھے نشے میں تو نہیں لگتے۔" شوفر نے سوچ کے کہا۔ "لیکن ایک بات اچھی طرح سمجھ لو بیٹا ہیرالال۔ اندر آنا جتنا مشکل ہے باہر جانا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ جاؤ گے تو اسٹریچر پر یا ایمبولینس میں اگر یہ بات جھوٹ ہوئی۔ پرتھوی جی خود پریشان ہیں صبح سے جب سے یہ خبر سنی ہے۔ میں تم کو ان کے آفس میں لے چلتا ہوں۔ پہلے ان کے سیکریٹری سے بات کرلو۔ اس کی مرضی ہے آگے۔"

"کیا اسٹریچر پر واپس کرے گا یا ایمبولینس میں؟" میں نے کہا۔

اس نے مجھے خون آشام نظروں سے گھورا لیکن کچھ بولا نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ صورت کا جتنا برا ہے دل کا اتنا برا نہیں ہے۔ ہمیں اس مقام تک پہنچانے والا سخت مایوس تھا کہ ہم نے اسے اتنا حقیر اہم سمجھ کے نظرانداز کر دیا۔ ہم اس کا شکریہ ادا کیے بغیر شوفر صاحب کے پیچھے چل پڑے۔ اس سے پہلے ہم نے شوفر کے لیے اس کی خواہش کے مطابق کھڑے نہ ہو کر بھی خاصی معیوب حرکت کی تھی۔

پرتھوی راج کے سیکریٹری کا آفس ہی اتنا شاندار تھا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا یہی ایک سیکریٹری نہیں ہے۔ مختلف معاملات مختلف سیکریٹری

طے کرتے تھے جو کسی حد تک منیجر بھی سمجھے جا سکتے تھے۔ شوفر صاحب نے سیکریٹری کے کان میں کچھ سرگوشی کی۔ بنگالی ٹائپ گنجے دھوتی پوش سیکریٹری کی آنکھیں ایک دم حلقوں سے باہر آنے لگیں اور مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ چٹخنے نہ لگے یا اسے دل کا دورہ نہ پڑ جائے۔

جب شوفر چلا گیا تو اس نے دراز سے کوئی گولی نکال کے منہ میں رکھی، پانی کا ایک گھونٹ پیا اور حلق سے گڑگڑ کی آواز نکالی۔ نازو نے مجھے اشارہ کیا کہ بکلا رہے ہیں — گڑگڑ کی آواز انگریزی کا ایک جملہ تھا جو اس نے مرہٹہ لہجے میں بولا تھا۔ جب میں نے جواب میں انگریزی بولنا شروع کی تو گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔

ایک بار پھر مجھ سے میرے نام اور میرے ساتھ نظر آنے والی حسینہ کے رشتے کا سوال ہوا۔ پھر یہ پوچھا گیا کہ میں للی کو کب سے اور کیوں جانتا تھا۔ اس کے قاتل کو میں جانتا ہوں تو میں نے صرف راج کپور اور ان کے پتا کو قابل اعتبار کیوں سمجھا؟ لوگ تو پولیس کو بتا دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بنگالی سخت نروس شخص تھا مگر حسن پرست بھی واقع ہوا تھا چنانچہ اس کے کان میری طرف تھے اور آنکھیں نازو کی طرف۔ "یہ تمہاری دھرم پتنی تو نہیں لگتی۔" اس نے بالآخر شکوک کا اظہار کر دیا۔

"پھر کیا لگتی ہے، تمہاری دھرم پتنی؟" میں نے کہا۔

اس نے کہا۔ "تم مجھے وائلن بجانے والے بھی نہیں لگتے۔"

"میں تو ریڈیو بھی بجا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وائلن کیا چیز ہے؟"

اس نے مجھے گھور کے دیکھا۔ "اس میں کیا ہے؟"

میں نے وائلن کا کور کھول کے مشین گن نکال لی۔ "کیا ہے یہ؟"

بنگالی سیکریٹری نے ایک چیخ ماری جو ریل کے کالے انجن کی وسل جیسی تھی۔ وہ کھڑا ہو کے تھرتھر کانپنے لگا کچھ غصے سے کچھ خوف سے۔ پھر اس نے ان سب پر چلانا شروع کیا جو آنکھوں کے اندھے تھے اور مسلح قاتلوں، ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کی جوڑی کو سیدھا اندر لے آئے تھے۔

اچانک درمیان والا دروازہ کھلا اور پرتھوی راج کا غصے سے بھرا ہوا چہرہ نمودار ہوا۔ اس کے ماتھے پر گہری شکنوں کا جال تھا اور جلالی آنکھوں میں ایک سوال کہ یہ سب ہنگامہ کیسا ہے۔ بنگالی کے شور نے سب کو ہلا دیا تھا اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سیکیورٹی کے قواعد کی ایسی زبردست خلاف ورزی پر مالکان ان کے خلاف کیا اقدام کریں گے۔

"کیسا شور ہے یہ؟" پرتھوی راج نے اپنی بھاری رعب دار آواز میں بنگالی کو مخاطب کیا مگر نگاہ مجھ پر اور نازو پر رکھی۔

میں نے براہ راست مداخلت کی۔ "سر! ہم للی کے قاتل کے بارے میں صرف آپ کو بتانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں مت بتاؤ۔"

بنگالی نے ہڑبڑا کے کہا۔ "یہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہم کب روکا؟"

میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ پرتھوی راج آہستہ آہستہ میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کی عقابی نظریں بغور میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ یہ طے کرنے میں مصروف تھا کہ میں کس حد تک احمق یا خطرناک ہوں گا۔

"یہ مشین گن لے کر کیوں آئے تھے؟"

میں نے مشین گن بنگالی کو تھما دی۔ "اسے ہم اپنی دھرم پتنی کی طرح ساتھ رکھتے ہیں۔ بندیا نمسکار کرو بڑے صاحب کو۔"

نازو نے انکسار کے ہاتھ اٹھائے۔ "نمستے جی۔"

پرتھوی راج نے کہا۔ "تم جانتے ہو للی کے قاتل کو؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہم اکیلے میں بتائیں گے آپ کو۔"

پرتھوی راج نے کہا۔ "ان کی تلاشی لو، اور اندر بھیج دو۔"

پھر وہ میری طرف پلٹا۔ "دس منٹ بعد۔"

بنگالی نے مشین گن کو ایک ہاتھ سے ایسے پکڑ رکھا تھا جیسے وہ خود بخود چل جائے گی۔

"لاؤ ہم اسے بند کر دیں۔" میں نے کہا۔ "واپس پنجرے میں۔"

"پنجرے کا بچہ۔" شوفر نے غرا کے کہا اور کور مجھ سے چھین لیا۔ پھر اس نے میری تلاشی یوں لی کہ صرف جسم کے اندرونی اعضا نہیں دیکھے۔ وقت ہوتا تو وہ میرا ایکسرے بھی کراتا کہ کہیں میں دستی بم نگل کے تو نہیں آگیا ہوں جو میرے اندر جاتے ہی پھٹ جائے۔ نازو کی تلاشی لیتے ہوئے اس نے خاصی بدحواسی کی مگر میں نے نازو کو بھی مشتعل نہ ہونے کا اشارہ کر دیا تھا۔ شوفر صاحب ہی ہمیں اندر لائے تھے اور ایک طرح سے حفاظتی انتظامات میں ایسی سنگین کوتاہی کے ملزم ثابت ہوئے تھے۔

دس منٹ کے بعد میں نے راج کپور کو باہر آتے دیکھا۔ وہ ہمارے پاس سے گزرتے گزرتے رک گیا۔ اس کی نظر نازو پر جم گئی تھی۔

"یہ کون ہے؟" وہ بولا۔ "کیا اسے بلایا تھا میں نے؟"

بنگالی نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں سر، یہ تو۔۔۔"

"کسی اور نے بلایا تھا۔ کوئی ٹیسٹ وغیرہ لیا؟۔۔۔"

"یہ ہماری دھرم پتنی ہے سرکار، بندیا۔ ہم ہیں ہیرالال۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا۔

اسی وقت دروازہ بجا اور ہمیں اندر طلب کر لیا گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ راج کپور کس چکر میں پڑ گیا ہے۔ اس نے معمولی لڑکیوں کو ہیروئن بنا کے راتوں رات فرش سے عرش پر پہنچا دیا تھا اور یہاں ناز وہ کے روپ میں اس کے سامنے ایک غیر معمولی حسن کی مالک لڑکی کھڑی تھی۔ راج کپور کی نظر یقیناً اسے اپنی اگلی فلم کے مرکزی کردار کے لیے منتخب کر چکی تھی۔ ہماری طرف سے کسی درخواست کے بغیر۔

پرتھوی راج کے سامنے پہنچتے ہی میں نے حماقت کا وہ نقاب اتار دیا جو میرے چہرے پر نظر آتا تھا۔

میں نے کہا۔ "بات یہ ہے سر کہ بمبئی میں تو وارد ہوا ہوں۔ مجھے یہاں کوئی بھی نہیں جانتا تھا" سوائے للی کے۔ اس سے میری ملاقات اتفاقیہ ہوئی تھی۔ وہ ترس کھا کے ہمیں اپنے گھر لے گئی۔ اور ہم اس کے گھر میں صرف ایک رات رہے۔"

"اور اسی رات للی قتل ہو گئی؟" پرتھوی راج نے کہا۔

"جی۔ یہ سب ہمارے سامنے ہوا۔" میں نے کہا۔ "ہم نے سب کچھ دیکھا۔ مگر ہم اس کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ ہم بہت ڈرے ہوئے تھے اور پلنگ کے نیچے گھس گئے تھے۔ ہمیں ڈر تھا کہ... اُنھوں نے ہمارے سانس لینے کی آواز بھی سن لی تو وہ ہمیں بھی قتل کر دیں گے۔"

"وہ کون تھے؟"

"وہ چار آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کا نام ہی سُنا ہم نے۔ للی کا اسی سے جھگڑا ہو رہا تھا۔ اس کا نام تریوینی تھا۔"

پرتھوی راج ایک دم سنبھل کے بیٹھ گیا۔ "تریوینی... حلیہ بتاؤ اس کا؟"

میں نے خاصی کوشش کی اور کم سے کم الفاظ میں تریوینی کی تصویر پیش کر دی۔ پرتھوی راج سر ہلاتا رہا۔ میں اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"میرا لال! تم نے جھگڑے کی وجہ بھی سنی ہو گی؟"

میں نے کہا۔ "وہ للی سے کسی کا پتا پوچھ رہے تھے۔ تریوینی بار بار کہہ رہا تھا کہ ان دونوں کو تو نے چھپا کے رکھا تھا۔ تو ان کو اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ سچ سچ بتا دے وہ کہاں گئے؟ للی نے بہت کہا کہ مجھے نہیں معلوم لیکن اس نے اعتبار نہیں کیا۔ اس کے ساتھ آنے والا دوسرا آدمی بھی یہی سوال کرتا تھا۔ للی کے انکار پر باقی دو نے اسے مارا۔ بہت مارا۔ بہت ظلم کیا اس پر سر۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت تھی۔ پرشیتن گن اس وقت میرے پاس نہیں تھی ورنہ میں انھیں بھون دیتا۔"

پرتھوی راج کی نظریں مجھ پر جمی رہیں۔ "یہ پرشیتن گن کہاں سے حاصل کی تم نے؟"

"میں نے خریدی تھی سر۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟ اسے چلا بھی سکتے ہو؟" وہ حیران ہو کے بولا۔

میں نے کہا۔ "ایسے ہی تو نہیں اٹھائے پھر رہا ہوں اسے۔ آپ نشانہ آزما لیں۔"

اس نے کہا۔ "یہ بازار میں ملنے والی چیز تو نہیں ہے۔ اور آسانی سے ملتی بھی نہیں۔ سچ سچ بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟ تم اسے کس کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "سر یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ آپ بس یہ مان لیں... یوں سمجھ لیں کہ میرا کوئی دشمن ہے یہاں۔ ابھی میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔ جس دن بھی مجھے ملا میں اس کو مار دوں گا۔ میں نے اپنی ساری زمین بیچ دی۔ مکان بیچ دیا اور یہ چیز لے لی۔"

"آخر کون ہے وہ۔ کیا بگاڑا ہے اس نے تمہارا؟"

"یہ پوچھیں سر کہ کیا چھوڑا ہے اس نے میرے پاس۔ وہ ایک راکشس ہے۔ وہ میری بہن کو اغوا کر کے لے گیا۔ مجھے پتا چلا کہ وہ بمبئی میں ہے۔ یہاں آنے سے پہلے ہی مجھے اپنی بہن کا ایک پیغام ملا کہ اسے کسی بردہ فروشوں کے ایجنٹ نے اغوا کیا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لڑکیاں بھی تھیں۔ ان سب کی عزت پہلے یہاں لوٹی گئی۔ معلوم نہیں ان کو کس کس سیٹھ کے پاس بھیجا گیا۔ لیکن بعد میں انھیں باہر بھجوا کے بیچنے کے لیے ایک اور بدمعاش کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کا نام ہے فروش۔ صرف فروش۔ ان کو کسی لانچ پر بٹھا کر کے باہر بھیجا جا رہا تھا۔ لانچ کا نام بھی معلوم ہے مجھے۔ بھارتی۔"

پرتھوی راج ایک دم چونکا۔ "یہ... کس نے بتایا؟"

"اسی پیغام میں سب کچھ تھا۔"

"کون لایا تھا وہ پیغام؟ اور کیسے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ بس مجھے ایک خط ملا ڈاک سے۔ اس میں لکھا تھا کہ میں نے یہ باتیں اور تمہارا پتا ایک شخص کو بتا دیا ہے۔ اور اس سے کہا ہے کہ خط میں لکھ دے۔ ظاہر ہے اسے بڑی مشکل سے بات کرنے کا موقع ملا ہوگا۔ وہ خود تو نہ خط لکھ سکتی تھی اور نہ مجھے بھیج سکتی تھی۔ جس شخص سے بھی اس کی بات ہوئی تھی" وہ تھا نیک آدمی۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور مجھے خط ڈال دیا۔ بس اس کے بعد میں روانہ ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ لانچ گئی ہوئی ہے۔ اب مجھے اس کی واپسی کا انتظار ہے۔"

پرتھوی راج نے آگے جھک کر کہا۔ "کیا تم اخبار نہیں پڑھتے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ دو دن سے ویسے بھی میں سفر میں تھا۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ للی کی گاڑی خراب ہو گئی۔ میرے دھکا لگانے سے گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ للی نے ہمیں بٹھا لیا اور راستے میں پوچھا کہ کہاں جاؤ گے۔ میں نے کہہ دیا کہ ابھی تو کوئی جگہ نہیں۔ کہیں بھی اتار دو۔ وقت ہی گزارنا ہے۔ دن گزاریں گے بندرگاہ کے علاقے میں۔ رات کو کہیں پڑ کے سو جائیں گے۔ اس نے کہا کہ بے وقوف۔ اپنا نہیں تو اپنی بیوی کا ہی خیال کرو۔ اسے بھی فٹ پاتھ پر سلاؤ گے؟ یا کسی پارک میں؟ اول تو کوئی سونے نہیں دے گا۔ اور کسی نے مروا دیا تو لاش اٹھا لیا جائے گا۔ تم کبھی نہیں اٹھو گے۔ بس جناب! اس نے ہمیں فلیٹ میں رہنے کو کہا۔"

پرتھوی راج نے ایک گہری لمبی سانس لی۔ "شی واز اے گڈ وومن۔ خیر۔ مجھے بتاؤ کہ تریوینی کے ساتھ جو لوگ آئے تھے ان سب کو پہچان سکتے ہو تم؟ کسی کا نام سنا ہو تو یاد کرو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نام تو بس ایک ہی سُنا تھا۔ ہاں ایک نام اور تھا۔ کملا کا۔ وہ تریوینی کی بیٹی ہے۔ تریوینی نے کہا تھا کہ میں اپنی پاگل بیٹی کی وجہ سے مجبور ہوں۔ باقی لوگوں کو میں صورت سے پہچان لوں گا۔ سامنے آئے ہی۔ وہ سب شیطان تھے۔ اُنھوں نے بہت ظلم کیا للی پر۔"

"یہ کس وقت کی بات ہے؟"

میں نے کہا۔ "رات گیارہ بارہ بجے کے بعد آئے تھے وہ لوگ۔ اور صبح تین چار بجے گئے ہوں گے۔ ان کے جاتے ہی ہم نے بھی اپنی جان بچا کے نکل جانا بہتر سمجھا۔"

"یہ سب بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ ایک تو میں تریوینی اور کملا کے درمیان دشمنی کا سبب سمجھنے سے قاصر ہوں۔" پرتھوی راج نے کہا۔ "للی نے کسے پناہ دی تھی اور کیوں؟ اور اگر وہ تریوینی کے دشمن تھے تو للی کا ان سے کیا تعلق؟ اسے معلوم ہوتا کچھ تو وہ ضرور بتا دیتی۔ کیوں چھپاتی وہ۔ ایک بات اور بتاؤ۔ تم میرے پاس کیسے پہنچ گئے؟"

میں نے کہا۔ "للی نے آپ کی بہت تعریف کی تھی۔ اس نے سب بتایا تھا کہ آپ اس کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔"

"تمھاری کیا مدد کر سکتا ہوں میں؟"

"سر! ہم پولیس کے سامنے بیان نہیں دے سکتے۔ وہ ہمیں بھی پکڑ لیں گے۔ تریوینی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ مجھے مروا دے گا۔ میری پرشیتن گن بھی ضبط ہو جائے گی۔ اس سے بہت کام لینا ہے مجھے۔"

پرتھوی راج نے کہا۔ "تم فکر مت کرو۔ پولیس کمشنر سے میں خود بات کر لیتا ہوں۔ تمھاری حفاظت کی جائے گی۔ تم بے خوف ہو کے بیان دو۔ پولیس تم کو سب کی صورت دکھا دے گی۔"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں کوئی بیان نہیں دوں گا پولیس کے سامنے سر۔ مجھے تو آپ تریوینی کا پتا بتا دیں۔ اور اس کے پاس پہنچانے کے لیے کسی کو ساتھ کر سکتے ہوں تو اس سے علاوہ یہ بدمعاشی کا مقابلہ قانون سے نہیں کیا جا سکتا۔"

"تم کیا کرو گے؟"

"میں خود نمٹ لوں گا اس سے۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ قانون نے بھی نہیں دیکھا اور آپ نے بھی نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے پیچھے گواہ ختم کر دیے جاتے ہیں۔ پھر قاتلوں کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وکیل اور جج سب کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم پورے ثبوت کے ساتھ یہ کام کر سکتے ہیں کہ ایک قاتل کو سزائے موت دے دیں۔ پھر تو کوئی شک نہیں رہے گا؟"

"کیا تمھیں... معلوم ہے... کہ وہ لانچ واپس آ گئی ہے؟"

پرتھوی راج نے کچھ دیر مجھے گھورنے کے بعد کہا۔

میں اچھل پڑا۔ یعنی کھڑا ہوا اور پھر بیٹھ گیا۔ "آ گئی ہے... کب؟"

"کل۔ اور وہ سب لڑکیاں بھی واپس آ گئی ہیں۔" پرتھوی راج بولا۔ "یہ سب اخبار میں آ چکا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے میری بہن بھی آ گئی ہو گی۔" میں نے بڑے جوش سے کہا۔ "اب میں نہیں چھوڑوں گا اسے۔"

"لیکن فروش مارا جا چکا ہے۔" پرتھوی راج نے کہا۔ "اخبار میں ہی یہ بھی تھا کہ اس لانچ کو واپس لانے میں دو نوجوانوں کا ہاتھ تھا جو لانچ کے عملے کو مار کے لانچ پر قابض ہوئے اور ان سب کو واپس لے آئے۔"

"ہوں گے وہ بھی کوئی غیرت مند بھائی۔" میں نے کہا۔

"مجھے شک پڑتا ہے کہ کہیں تریوینی کو انہی دونوں کی تلاش نہ ہو۔ مگر ان کا للی سے کیا تعلق؟ وہ للی کے پاس کیسے جا سکتے تھے وہ؟ اور للی ان کو کہاں چھپا سکتی تھی؟ پھر بھی یہ ہو سکتا ہے کہ تریوینی کو لانچ واپس لانے والے دونوں بہادر اور غیرت مند نوجوانوں کی تلاش ہو۔"

"کیا... تریوینی کا بھی کوئی تعلق ہے لانچ سے؟"

پرتھوی راج نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ خود بھی ایک بردہ فروش ہے۔ ایسے کام کرتا ہے وہ بھی۔ یہ اسی کی لانچ ہو گی۔"

میں نے کہا۔ "بس تو سر۔ اب آپ کچھ مت کریں۔ اگر وہ ایک ہی شخص ہے جس نے میری بہن کی عزت خراب کی اور للی کو قتل

www.paksociety.com

کیا۔ تو آپ مجھے اس کے ٹھکانے تک پہنچا دیں۔ اور مجھے کسی ایسے شخص سے ملوا دیں۔ جو ہماری عملی مدد کر سکے۔"
"عملی مدد تو صرف بدمعاش ہی کر سکتے ہیں۔"
"آپ تو ساری بستی کو جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔
"لیکن میں فلمساز ہوں۔ بدمعاش نہیں۔ قتل نہیں کرواتا پھرتا لوگوں کو۔" اس نے برہمی سے کہا۔
"آپ کچھ مت کریں۔ ہمیں کسی کے پاس بھیج دیں۔ ہم خود تو کسی کو بھی نہیں جانتے۔ اور راہ چلتے کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتے۔" میں نے کہا۔

پرتھوی راج نے کہا۔ "ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے۔ لیکن دیکھو، میرا نام کبھی نہیں آنا چاہیے تمہاری زبان پر۔ میں نے تمہاری بات سُن لی۔ اس لیے کہ مجھے لکی کے قتل ہو جانے کا افسوس ہے اور میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ اس قتل کے الزام میں کوئی نہیں پکڑا جائے گا۔ اگر میں چاہتا تو تم کو سیدھا پولیس کے حوالے بھی کر سکتا تھا۔ تم جو کچھ کرو گے اپنی ذمے داری پر کرو گے اور آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کرو گے۔ کبھی ایسی بات ہوئی تو یہ سمجھ لو کہ میں صاف انکار کر دوں گا کہ میں نے تمہیں پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا کیونکہ بات تمہاری نہیں میری مانی جائے گی۔"
"ہم بے وقوف ضرور ہیں مگر پاگل نہیں ہیں کہ آپ کا ذکر کرکے اپنی مشکلات میں اضافہ کریں۔" میں نے کہا۔ "مجبوری آپ کے پاس لے آئی تھی۔ ہم کسی اور کے پاس جا کے یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے۔"
"اچھا۔ تم لوگ باہر بیٹھو۔ میں کچھ کرتا ہوں۔"
میں اور نازو باہر آ کے بنگالی کے سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے مشین گن کو غلاف میں لپیٹ کے الماری کے اوپر رکھ دیا تھا مگر اس کی نظر بار بار ادھر جاتی تھی۔ سر یوں جیسے وہاں کوئی پاگل کتا بیٹھا ہے جو اس کے غافل ہوتے ہی اسے کاٹ لے گا۔ اس نے مجھے اور نازو کو بڑے دکھی دل کے ساتھ دیکھا۔ میری طرف سے وہ اس لیے دکھی تھا کہ میں بیک وقت قتلِ عام کے قریبے اسباب رکھتا تھا۔ ایک حسینہ طرح دار اور ایک خطرناک مشین گن۔ نازو سے اس کو شاید یہ شکایت ہوگی کہ اس نے کیسے بے خود کے ہاتھوں میں اپنی قسمت کی باگ ڈور دے دی۔ جو اسے کچھ بھی نہیں دے سکتا سوائے خواری کے۔
میں نے اس کے سامنے بیٹھ کر کہا۔ "بابا ذرا چائے تو منگواؤ ہمارے لیے۔ ٹوہل جائے گی۔"
اس نے ایک فون کا ریسیور تھے پٹخ دیا۔ "رانگ نمبر سالا پھر رانگ نمبر۔ اور تم سالا کیا ہم کو بابو سمجھتا۔ بابو بولو ہم کو۔ ہم سالا کیا فرینڈ ہے تمہارا کہ چائے منگوائے گا۔"
"وہ پرتھوی راج نے کہا تھا۔۔۔ کہ باہر بیٹھ کے چائے پیئو۔ ابھی وہ پھر بلائیں گے ہمیں۔"
بنگالی نے خون کا گھونٹ پی کے مجھے دیکھا۔ اسی وقت نازو نے منمنا کے کہا۔ "سنو جی۔ بھوک بھی لگی ہے مجھے۔"
"تم پوچھ لو فون کرکے۔" میں نے کہا۔ بنگالی کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ فون پر کچھ معلوم کر سکتا۔ اس نے مجبوراً چائے اور بسکٹ لانے کا آرڈر دیا۔
پھر اس نے سر پیٹ کر ہاتھ مارا۔ "ابھی ہم ایک دم بھول گیا ہمارا مغز خراب ہو گیا۔"
"کیا پہلے ٹھیک تھا تمہارا مغز؟" میں نے کہا۔ "اور تم کو کیا معلوم کہ مغز تھا بھی یا نہیں تھا۔"
بنگالی نے میز پہ مکا مارا۔ "ابھی ایک بات پوچھتا ہوں میں۔ سیدھا جواب دو۔ ہاں یا نہیں۔ راج بابو بولا کہ اس چھوکری۔۔۔"
"یہ دھرم پتنی ہیں ہماری۔" میں نے کہا۔
بنگالی نے پھر ضبط سے کام لیا۔ "اچھا اچھا۔ ابھی نہیں بھولے گا ہم یہ بات۔ تم بولو کہ اپنا اس دھرم پتنی کو فلم لائن میں لانے کا ہے۔ راج بابو چانس دے گا۔ ایک نمبر ہیروئن بنائے گا۔"
میں نے کہا۔ "چانس ایک شرط پہ لے سکتا ہوں میں۔"
"شرط؟ اُف۔" بنگالی نے سر پکڑ لیا۔ "ادھر سارا دُنیا ماتھا پھوڑتا ہے ایک چانس کے لیے۔ سارا عمر لوگ دھکے کھاتا ہے۔ تھرڈ کلاس لوگ کا سامنے ناک رگڑتا ہے اور تو راج بابو کے لیے شرط کا بات کرتا ہے۔ جو پھر کو ہیرا اپنا لگتا ہے؟"
"میری شرط یہ ہے کہ مجھے ہیرو لیا جائے گا۔" میں نے کہا۔
اس سے پہلے کہ بنگالی پاگل ہو جاتا اندر سے وہی شوفر برآمد ہوا جو ہمیں یہاں لایا تھا۔
"آؤ میرے ساتھ۔" اس نے بڑے دوستانہ لہجے میں کہا۔
"وہ۔۔۔ ہم ذرا چائے پی لیں۔" میں نے کہا۔
"چائے کو گولی مارو۔" اس نے میری مشین گن اُٹھا لی۔ "ہم تمہیں باہر بہتر چائے پلوائیں گے۔"
میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ہمارے ریوالور؟"
بنگالی نے دراز میں سے میرے اور نازو کے وہ ریوالور نکالے جو تلاشی کے وقت برآمد ہو گئے تھے۔ بنگالی کی مایوسی قابلِ دید تھی۔ اس کی سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آئی ہوں گی جیسے یہ کہ اتنا اسلحہ لے کر اسٹوڈیو میں داخل ہونے کے جرم میں ہمیں پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا گیا تھا۔ وہ سارا اسلحہ بھی واپس کیوں دیا جا رہا تھا۔ راج کپور نے میری دھرم پتنی کو جو لوڈن چانس دیا تھا وہ میں نے ایک احمقانہ شرط پر کیوں قربان کر دیا تھا (جبکہ احمق میں نہیں تھا) اور پرتھوی راج نے مجھے اتنی لفٹ کیوں دی تھی؟
شوفر صاحب نے چلتے چلتے بنگالی کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے سر ہلا کے مجھے دیکھا۔ پھر مجھے دیکھ کے سر ہلایا اور پھر سر پکڑ کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "نہیں بولے گا۔ ہم کچھ نہیں دیکھا سالا ہم کسی کو کیا بولے گا۔" غالباً اسے تاکید کی گئی تھی کہ ہمارے آنے اور جانے تک جو کچھ ہوا وہ سب بھول جائے۔
اس مرتبہ باہر آنے کے بعد ہماری پوزیشن مختلف تھی۔ شوفر صاحب نے بھی اپنا رویہ بدل لیا تھا۔ اگر یہ معاملہ میری توقع کے برعکس سنگین ہو جاتا تو اس کا خمیازہ بھی اسی کو بھگتنا پڑتا کہ اس نے غیر ذمے داری کا ثبوت دیا اور ہمیں چیک کرنے میں ناکام رہا۔
"تم نے تو مروا دیا تھا مجھے۔" اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "بہت خطرناک آدمی ہو تم۔ اور چالاک بھی۔ یہ بتاؤ کہ کیا واقعی تمہارا نام ہیرالال ہے؟"
"اور کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "کھیرالال؟"
وہ ہنسنے لگا۔ "نہیں۔ یہ مطلب نہیں تھا میرا۔۔۔"
"تم نے تو ابھی تک اصلی نقلی کوئی نام ہی نہیں بتایا ہے اپنا۔" میں نے کہا۔
"میں۔۔۔ میرا نام ہریش چندر سمجھ لو۔" وہ بولا۔
صاف ظاہر تھا کہ اس نے اپنا اصل نام نہیں بتایا۔ لیکن مجھے نام سے نہیں کام سے غرض تھی۔ ایک قطار میں کھڑی ہوئی بہت سی ایک سی کاروں میں سے ایک کا دروازہ کھول کے اس نے مجھے آگے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نازو پیچھے بیٹھ گئی۔
"یہ جو تمہاری دھرم پتنی ہے۔" وہ شوخی خیز لہجے میں مسکرا کے بولا۔ "اس کو گولی چلانی آتی ہے؟"
میں نے بُرا مان کے کہا۔ "معلوم نہیں یہاں سب لوگ اتنے شکی مزاج کیوں ہیں۔ ہر بات میں شک۔ مجھے ہیرالال نہیں مانتے۔ اسے میری دھرم پتنی نہیں مانتے۔ تمہارے سیٹھ کو شک تھا کہ میں مشین گن نہیں چلا سکتا۔ تم کہتے ہو یہ گولی نہیں چلا سکتی۔ میں کہتا ہوں آزما کے کیوں نہیں دیکھ لیتے۔ تم اپنے سر پہ سیب رکھ کے کھڑے ہو جاؤ وہیں گر دو ور۔۔۔"
"نہ بھائی۔ اپن کو بالکل شوق نہیں ہے۔۔۔"
"سیب اچھے نہیں لگتے تو۔۔۔ کچھ اور رکھ لو سر پہ۔ مثلاً کٹشن یا لالٹین۔ تمہارا بال بیکا نہیں ہوگا۔۔۔"
گاڑی جب باہر نکلی تو شائقین کے ایک ہجوم نے ہمیں پہچاننے کی کوشش کی۔ ایک نے پکار کے کہا۔ "ابے یہ وہ ہی، پیچھے وحیدہ رحمان ہے۔" دوسرے نے مجھے بھی ایک ہیرو قرار دیا جبکہ اس کے ساتھی نے ایک مشہور ولن۔
"میں تم کو شیام دادا کے پاس لے جا رہا ہوں۔۔۔" ہریش چندر نے کہا۔
"تمہارے دادا سے میں کیا کروں گا؟" میں نے کہا۔
"شیام دادا بہت زبردست آدمی ہے۔ اپنا استاد بھی ہے۔ تم اس کو کچھ مت بتانا۔ یہ سب کہ تم آ کے اسٹوڈیو گئے تھے اور وہاں کیا ہوا تھا۔" ہریش چندر نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں یہ کہوں گا کہ انھیں ترلوچن سے ملوا دو۔ اس کے بعد میں واپس چلا جاؤں گا اور تم اسے سب بتا دینا۔ جو بھی تمہارا مسئلہ ہے۔ لیکن اچھا ہوتا اگر تم اکیلے جاتے۔ وہاں عورت کا جانا ٹھیک نہیں۔"
میں نے کہا۔ "یہ عورت کہاں ہے۔ دھرم پتنی ہے ہماری۔ بندیا نام ہے اس کا۔ یہ ہر جگہ ہمارے ساتھ جاتی ہے۔"
اس نے بُرا سا منہ بنا کے مجھے دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ گاڑی نامعلوم راستوں سے گزری اور ایک جگہ رک گئی۔ ہریش چندر چاہتا تھا کہ مشین گن کو میں گاڑی میں ہی چھوڑ دوں لیکن میں نے یہ رسک نہیں لیا کہ اعتبار کرکے پھر میں مشین گن گنوا دوں۔
یہ کوئی غربت زدہ علاقہ تھا جہاں پرانی عمارات کا سلسلہ کراچی کے لیاری کی یاد دلاتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں ہر عمارت کی بالکونی میں کوئی عورت کھڑی ہوئی تھی یا بچے لٹک رہے تھے اور کپڑے سوکھ رہے تھے۔ یہی کیفیت گلی میں تھی۔ سوکھی کالی پیلی یا بہت موٹی عورتیں، اسکرٹ یا معمولی سی ساڑی باندھے پھر رہی تھیں یا دروازوں کے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ کام میں مصروف تھیں یا باتیں کر رہی تھیں۔ انھیں آس پاس کسی مرد کی موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔
وہ انھی عورتوں کے پیدا کیے ہوئے بچے تھے جو گلی میں کنکروں پتھروں کی طرح بکھرے پڑے تھے اور آپس کے کھیل یا لڑائی کی چیخ و پکار میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے نظر آتے تھے۔ ان کے میلے کپڑے، بے رونق چہرے اور غلط اطوار ان کی زندگی کا عکس پیش کرتے تھے جس میں غربت، سختی اور محرومی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ گلی میں ہی چھابڑی والے، خوانچہ فروش، ریڑھی والے بھی چہک رہے تھے اور بے کار نوجوان اور بیزار بوڑھے بھی۔
حاصل یہ سب بے گھر لوگ تھے۔ ان کے گھر اتنے تنگ تھے کہ نہ ہونے کے برابر تھے۔ اگر یہ سب گھر کی خلوت میں بند ہو کے بیٹھ جاتے تو دم گھٹنے سے مر جاتے۔ ایک کھولی (ایک کمرے یا کوٹھڑی) کے گھر میں ماں باپ بھائی بہن سب کیسے رہتے ہیں

www.paksociety.com

گئے؟ اس کا تصور میرے جیسے شخص کے لیے محال تھا جس نے آنکھ کھولی تھی تو گھر میں کمرے ہی کمرے دیکھے تھے۔ سونے کا کمرا، کھانے کا کمرا، مہمانوں کا کمرا، ڈرائنگ روم، اسٹڈی۔۔۔

ہریش چندر ایک ایسے دروازے کے سامنے ٹھہر گیا جس کے وسط میں دو دو فٹ لمبے پٹ جھول رہے تھے۔ اوپر نیچے دروازے کی چوکھٹ خالی تھی۔ اس بے ہودہ کا منظر راہ چلتے آدمی کو دکھائی نہیں دیتا تھا مگر دروازے کے کھلے حصے سے دھواں اور بو باہر خارج ہوتے رہتے تھے۔

یہ ایک بار یا شراب خانہ تھا۔ ویسے تو غلاظت کی بو اس پورے ماحول پر حاوی تھی مگر اس تھرڈ کلاس بار کے سامنے کی بدبو سے متلی محسوس ہوتی تھی۔ اندر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ایک آدمی اندر گیا اور دوسرا اسی وقت باہر آیا تو مجھے وہ شرابی نظر آئے جو گندی میلی کچیلی میزوں اور کرسیوں پر بیٹھے سستی ترین شراب کا زہر اپنے حلق میں انڈیل رہے تھے اور احساس کو فنا کرنے والی اس لعنت پر خوش تھے جو انھیں غم زمانہ سے بے نیاز کر دیتی تھی۔

ہریش چندر نے رک کر مجھے دیکھا "ابھی تم کچھ خیال کرو اس چھوکری۔۔۔"

"یہ دھرم بھی ہے ہماری۔۔۔" میں نے کہا۔

"سالا پاگل۔" ہریش چندر بگڑ گیا۔ "میں تیرے فائدے کی بات بولتا ہوں۔ دھرم بھی ہے تو اندر کا ہے لے کے جاتا ہے۔ کون سا دھرم شالا ہے یہ۔ نشے میں کوئی چھیٹ جائے گا تو عورت کا نک توڑ دے گا۔ مت بولنا۔ ادھر سب شراب کا نشہ کر کے بیٹھا ہے۔۔۔"

بات فوراً میری سمجھ میں آ گئی۔ میں نے کہا۔ "پھر ہم کیا کریں؟ کیا اس کو اکیلا چھوڑ دیں یہاں؟"

"اچھا تو بھی ٹھہر ادھر۔ ہم جاتا ہے اور شیامو دادا کو ادھر ہی بلا کے لاتا ہے۔"

"شیامو دادا یا شیام دادا؟" میں نے چونک کر کہا۔

"شیام اور شیامو میں کیا فرق ہے ابھی؟ دادا ہے بھی تو تیرے کو کیا؟" وہ بولا اور اندر گھس گیا۔

میں نازو کے ساتھ دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر ٹھہر گیا۔

"مسں نازو! کیا کمال کی بات ہے کہ شیامو دادا بھی وہی ہے جو شیام دادا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ لطیفہ میں سمجھی نہیں۔" نازو نے کہا۔

"جب ہم نے بمبئی میں نزول فرمایا تھا۔" میں نے کہا۔ "تو سب سے پہلے جو وفد ہمارے استقبال کے لیے بھیجا گیا تھا وہ شیامو دادا نے ہی بھیجا تھا۔ ان میں سے ایک کو ہم نے فوت کر دیا تھا لیکن

تین میں سے دو نے بے ہوش ہو کے جان بچائی تھی مگر جو تھے نے رضا کارانہ طور پر تعاون کیا تھا اور اس نے اپنے بیان سے ثابت کیا تھا کہ ان چاروں کی خدمات انھی شیامو دادا نے حاصل کی تھیں۔ یہ دادا ہیں۔ وہ پوچھتے تھے یعنی عقی بدمعاش۔"

"کیا پتا یہ کوئی اور شیامو دادا ہو؟"

"ہاں۔ ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔ بمبئی شہر میں کچھ سکندر دادا بھی ہو سکتے ہیں، اور نادر دادا بھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ وہی ہوئے تو خوب ملاقات ہوگی۔"

"اگر اسے معلوم ہو گیا کہ تم نے ہی اس کا بیڑا غرق کیا تھا اور اس کی لانچ بھاڑ دی تھی کو واپس لانے والے تم ہی تھے تو سوچو وہ تمھارا کیا حشر کرے گا؟"

"یہ اس کو میری صورت دیکھ کے کیسے معلوم ہو سکتا ہے بھلا؟" میں نے کہا۔ "وہ مجھے نہیں پہچانتا۔ ہاں اس کے بھیجے ہوئے تینوں کرائے کے گوریلوں میں سے کوئی ساتھ آ گیا تو پھر معاملہ سنگین ہو جائے گا۔ خیر۔ اس معاملے سے بھی نمٹ لیں گے۔ ابھی تو یہ دیکھو کہ قدرت کیا کر رہی ہے۔ شیامو دادا کی خدمات حاصل کرنے والا تو خود ترلوچن تھا۔"

"یہ شیامو دادا ترلوچن کا آدمی ہے؟"

"یہ آدمی کسی کے نہیں ہوتے۔ یہ پروفیشنل لوگ ہیں۔ پیسے لے کر کام کرتے ہیں۔ جس کا جو دل چاہے وہ کام کرا لے۔ ترلوچن نے اس کے ذمے یہ کام کیا تھا کہ مجھے اور غالب کو اٹھا کر لے آؤ۔ مگر ہم ان کے ہاتھ نہ لگے۔ جو بچ بچا کے واپس پہنچے انھوں نے ترلوچن کو بتایا کہ وہ دونوں لولی کے ساتھ تھے۔ چنانچہ ترلوچن نے لولی سے معلوم کیا کہ ہم کہاں دستیاب ہوں گے اور دوسری کوشش میں غالب سار اغوا ہوا۔"

"تمھارا کیا خیال ہے کہ یہی قاتل ہے لولی کا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی تک حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق شیامو دادا کی ٹیم نے لولی پر کوئی تشدد نہیں کیا تھا یہ کام ولاور کی ٹیم نے بعد میں پہنچ کر کیا۔ مگر ان معلومات کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں میرا لال یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں خود شیامو دادا سے ملنا چاہتا تھا۔ اور اس کے لیے مجھے بار بار جانا پڑتا۔"

"بار بار کہاں جانا پڑتا؟"

"بار بار۔" میں نے کہا۔ نازو کی جھلاہٹ دیکھ کے مجھے ہنسی آ گئی۔ "دراصل ایک سماوات ہیں بار بار۔ ان کا شراب خانہ یعنی بار انھی کے نام پر بار بار کہلاتا ہے۔ شیامو دادا کا ٹھکانا وہی تھا۔"

"کیا یہ بار بار ہے؟"

"اس پر لکھا ہوا تو کہیں بھی کچھ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن قسمت کی خوبی دیکھو کہ پیاسا سید ھا کنوئیں تک آ گیا۔ اور اب بار بار پلٹ گئی ہے۔ پہلے ترلوچن نے شیامو دادا کو ہمارے خلاف استعمال کیا تھا۔ اب ہم اس کو ترلوچن کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں۔"

"کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"

"ہم کچھ لینے آئے ہیں نہ دینے۔ ہمارے پاس ایک جان ہی ایسی چیز ہے جو ہم لے بھی سکتے ہیں اور دے بھی سکتے ہیں۔"

"میرا مطلب تھا کہ یہ ترلوچن کے خلاف نمک حرامی کرے گا؟" نازو نے کہا۔

"معاف کرنا۔ ایسے لوگ صرف حرامی ہوتے ہیں۔ ان کا آقا اور دیوتا ہے پیسہ۔ آج جس کو سلام کرتے ہیں کل اسی کو قتل بھی کر سکتے ہیں۔ ترلوچن کا کام کر دیا کیونکہ اس نے پیسہ دیا تھا۔ اب پیسہ ملے گا اس کا کام تمام کرنے کا تو یہ بھی کر دیں گے۔ ہمارے لیے اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی کہ ایک دشمن کو دوسرے دشمن کے خلاف استعمال کرنے کا موقع مل جائے۔"

ہریش چندر دس منٹ کے بعد باہر نکلا تو کچھ مایوس سا دکھائی دیتا تھا۔ ہمارے قریب آ کے اس نے زیر لب ایک گالی دی۔

میں نے کہا۔ "کیا بات ہے۔ شیامو دادا نے گھاس نہیں ڈالی تمھیں؟"

اس نے غصے سے مجھے دیکھا۔ "گھاس تو میں ڈالنے گیا تھا اس کو۔ یہ دیکھو۔ یہ ہے اس کا چارا۔" اس نے جیب میں سے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کے پھر پھڑائیں۔ "مگر بیچ میں آ رہی ہے اس کی ماں۔"

"گویا تمھاری برادری۔ شیامو دادا کی ماں۔۔۔"

"میرے ساتھ مذاق بات کریں گا تو تیرا اتھوبڑا سجا دیں گا۔ ہم سالا تمھارے ساتھ اس لیے نہیں آیا ہے کہ۔۔۔"

"ہریش چندر! تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہو۔" نازو نے فوراً صورت حال کو سنبھالا۔ "یہ تو مذاق کر رہے تھے۔ کون ہے اس کی ماں۔ کیا کہتی ہے؟"

"کہتی ہے اپنا ففٹی پرسنٹ لے گا۔" اس نے ایک گالی دے کر کہا۔ "کس بات کا ففٹی پرسنٹ بابا۔ ہم ہزار پچیس کٹ میں دے سکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ بولتی ہے کہ جاؤ پھر خود تلاش کرو شیامو دادا کو۔"

"ففٹی پرسنٹ تو بہت زیادہ ہے۔" میں نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "آخر تم کو اپنا حصہ بھی تو نکالنا ہوگا۔"

اس نے مجھے گھور کے دیکھا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "ابھی تم کدی سمجھدار ہے۔ دیکھو یہ جو سالا شیامو دادا ہے نا۔ یہ کرتی دادا نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے۔ نانا؟" میں نے کہا۔

"اسے بابا کیسا آدمی ہے تم؟ ادھر بمبئی میں دادا بولتا بدمعاش کو۔ جو بہت بڑا بدمعاش ہو جاتا ہے اس کو لوگ دادا بنا دیتا ہے مگر یہ شیامو چھوکرے میں دادا گیری کرتا ہے۔ یہ عورت سالا پکڑ چلاتی ہے جس کا یہ بار کا اڈا ہے۔"

"تمھاری مراد ہے بار بار؟"

وہ چونکا۔ "تم جانتا ہے بار بار کو۔ سالا ایک دم۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے نازو کی طرف دیکھ کے خاموش ہو گیا۔ "ہم کیا کرے اپنا زبان میں بولتا ہے تو تیرا ادھر موتی لال چلا جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا شیامو دادا کے بغیر کام نہیں چل سکتا؟"

ہریش چندر نے نازو کی طرف دیکھا۔ "چل سکتا ہے۔ ایک دم چل سکتا ہے۔ تیرا یہ چھوکری ہمت کرے تو۔"

میں نے کہا۔ "اچھا ہم یہاں سے کہیں اور چل کے بات کرتے ہیں۔"

گاڑی میں بیٹھ کے ہم پھر اجنبی راستوں پر چل پڑے۔ فی الحال میں ان راستوں کو یاد رکھنے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا۔ گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے رک گئی۔

میں نے کہا۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟"

"چرچ گیٹ۔" ہریش چندر نے مختصر ترین جواب دیا۔

ایک جگہ میں نے وزیر یہاں روڈ کا سائن بورڈ بھی دیکھا تھا۔ ریسٹورنٹ کا نام "گے لارڈ" تھا اور یہ ایک فیئر بلڈنگ کے ایک حصے میں واقع تھا۔ مجھے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ ترلوچن تک پہنچنے کے لیے ہم نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ آر کے اسٹوڈیو میں داخل ہونے کی کوشش میں ہی کافی وقت ضائع ہو گیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ چھوکری براہ راست ترلوچن کا پتا بتا دے گا یا مجھے اس کے ٹھکانے تک پہنچا دے گا مگر اس نے براہ راست اس معاملے میں ملوث ہونے سے گریز کیا اور مجھے ہریش چندر کے حوالے کر دیا۔ اب ہریش چندر مجھے شیامو دادا کے سپرد کرنا چاہتا تھا تو بیچ میں بار بار حائل ہو گئی تھی۔ سب کے بیچ نکلنے والے تھے لیکن ابھی تک ہم اپنی منزل کا تعین بھی نہیں کر سکے تھے۔

"ابھی کھانا کھائے گا پہلے۔" ہریش چندر نے ایک گوشے میں ٹیبل سنبھالتے ہوئے کہا۔ "تم بمبئی میں نیا ہے نا؟"

میں نے کہا۔ "نیا ہی سمجھو۔"

"پھر تم مہمان۔ بولو کیا کھائے گا؟" اس نے بیک وقت مجھے اور نازو کو مخاطب کیا۔

www.paksociety.com

میں نے بلا تکلف چائنیز کا آرڈر دیا اور تین چار نام ایسے لیے کہ ہریش چندر بوکھلا گیا۔ ایک دیہاتی سے اس کو یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ وہ منتخب چینی کھانوں کے مشکل تلفظ والے کھانوں کے نام اس روانی سے لے گا جیسے وہ چائنیز مینو کا عادی ہے۔

"تم سالا... دیہاتی لگتا تو نہیں۔" اس نے ویٹر کے جانے کے بعد کہا۔ "صاف بتاؤ کیا چکر ہے؟"

"تم بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟ شیامو داس کی ایسی تیسی۔ مجھے ترلوچنی کا پتا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "شیامو داس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس سے ملنا ہوگا تو میں خود براہ راست بھی مل لوں گا۔ تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

اس نے دانت نکال کے کہا۔ "ایک دم گولی ہے تو یار! ابھی دیکھو صبح سے ایسے ہی پھرتا ہے پیٹ خالی ہووے تو اپنا یہ کھوپڑی بھی خالی ہو جاتا ہے۔ ابھی تو بالکل ٹھیک بولا۔ ہم تیرے کو ترلوچنی کا پتا بتلانے کا واسطے ادھر لایا ہے۔"

"کیا یہ اس کا ریسٹورنٹ ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ ادھر سے تھوڑا فاصلے پر کولابا میں اس کا جیولر شاپ ہے۔" ہریش چندر نے کہا۔ "سیمل کوربٹ دیکھا ہے؟"

میں نے کہا۔ "آج تک میں کسی کوربٹ میں نہیں گیا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "ایک بلڈنگ ہے۔ مہاکوی بھوشن مارگ پہ ایک جیولر شاپ ہے۔ پی کشن چند۔ وہ ترلوچنی کا فرنٹ ہے۔ ابھی تم فرنٹ کا مطلب جانتا ہے۔ سامنے کا دھندا۔ پیچھے کچھ اور ہوتا ہے۔"

"دکان کے پیچھے؟"

"نہیں۔ دھندے کا نام کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کی آڑ میں کام کچھ اور ہوتا ہے۔ ترلوچنی کشن چند ایک نہیں دو آدمی ہے۔ ادھر تو جیولری کا بزنس میں کوئی گھپلا نہیں۔ مگر کشن چند کا پارٹنر ترلوچنی باہر سے سمگل کرتا ہے۔ قیمتی پتھر لاتا ہے۔ خود نہیں لاتا۔ منگواتا ہے۔ اس کا کیریئر سب چھوکری لوگ ہے۔ دیسی ولایتی سب ایک نمبر کا چھوکری ہے۔ جو ہوائی ایئر آتا ہے اور جاتا ہے۔ باہر سے جو ٹورسٹ آتا ہے وہ ادھر کے پیسے خرچ کرتا ہے۔ کبھی کنگلا ہو جاتا ہے۔ یا کنگلا کر دیا جاتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"دیکھو۔ اپنا مقر جا افسر۔" ہریش چندر نے کہا۔ "بمبئی میں بہت ٹورسٹ لوگ آتا ہے۔ وہ اکثر جوہو بیچ پر کسی ہوٹل میں ٹھہرتا ہے۔ ادھر بہت ہوٹل ہے۔ ہوٹل سی سائیڈ۔ سن این سینڈ۔ پام گروو۔ ہالیڈے ان۔ انتہا۔ بہت اچھا ہوٹل ہے سب۔ ترلوچنی کا آدمی ادھر پھرتا ہے۔ کسی ایک ہوٹل میں نہیں۔ بہت سے ہوٹل میں دیکھتا رہتا ہے کہ کون سا غیر ملکی چھوکری خوالین ہے۔ کس کا پاس مال کم ہے۔ کون اکیلا ہے۔ وہ ترلوچنی کو بتاتا ہے اور ترلوچنی ایسا انتظام کرتا ہے کہ وہ پھنس جاتا ہے۔ اس کو پیسہ مل جاتا ہے.... اور پھر وہ ترلوچنی کا کوریئر بن کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ابھی ہم کیا بات بتائے تم کو۔ اکیلا چھوکری تو ایسے ہی ہاتھ آ جاتا ہے۔ اس کو گاڑی میں ڈالا اور لے گیا۔ ایک دم کنگلا کر کے چھوڑ دیا۔ یا اس کا فوٹو موٹو اتار لیا اور بس..."

میں نے کہا۔ "یہ نکتہ واضح ہو گیا مجھ پہ آگے چلو۔"

"پھر ترلوچنی اس کو اپنا خرچہ پہ باہر بھیجتا۔ ادھر کشن چند کا دکان سے اس کو نقلی جیولری ملتا۔ اصلی کا رسید۔ اسٹیشن دیکھا ہے تم؟ نقلی ہیرے کا ہار نیکلس وہ گلے میں ڈال کے باہر جاتی ہے تو ولیا ہی اصلی ہیروں کا ہار ساتھ لاتی ہے۔ کوئی پکڑے تو اس کا ہینڈ بیگ میں رسید موجود۔ گواہی کے لیے کشن چند حاضر کہ یہ جیولری ہم فروخت کیا تھا..."

"میں سمجھ گیا۔ لیکن اس معاملے کا ہمارے مسئلے سے کیا تعلق ہے؟" میں نے کہا۔

"ابھی غصہ مت کرنا۔ ایک بات بولتا ہوں تیرے کو۔ تیرا فائدے کا واسطے۔" ہریش چندر نے کہا۔ "تیرا یہ... دھرم پتنی۔ ادھر کشن چند کا پاس جا کے بولے گا کہ میرے کو ترلوچنی صاحب سے ملنے کا ہے۔"

"کشن چند اتنا بے وقوف تو نہیں ہے کہ یہ بات سن کے کہے۔ جائیے وہ آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ پوچھے گا نہیں کہ تم کون ہو اور کس نے بھیجا ہے تم کو...؟"

"بتاتا ہوں... بتاتا ہوں... ابھی کھانا بھی ساتھ کھا لو۔" ہریش چندر نے کہا۔ "اگلی کا ایک چھوکری ہے جینا۔ اس کا ساتھ یہ ہوا کہ ترلوچنی اس کو اٹھا لیا۔ ایک نمبر چھوکری تھا۔ ترلوچنی اس کا کچھ فوٹو موٹو بنایا۔ اپنا ساتھ رکھا اس کو ایک ہفتہ۔ پھر اس کو ادھر سے کچھ جیولری گفٹ کیا۔ ایک دم امیٹیشن۔ نقلی مال۔ لیکن اس کو کیا پتا وہ چپ ہو گیا کہ دس لاکھ کا جیولری کافی ہے۔ اس کو صرف دو چیز اصلی دیا۔ ایک ٹاپس اور ایک انگوٹھی۔ جب وہ ہوٹل واپس گیا تو کشن چند اس کے خلاف چوری کا رپورٹ لکھوا دیا۔ کہ ایسا ایسا نام کا لڑکی ہمارا شاپ پہ آیا اور دھوکے سے دس لاکھ کا جیولری لے گیا۔ وہ فلاں ہوٹل میں ملے گا۔ پولیس معلوم کیا تو ادھر اس نام کا کوئی چھوکرا نہیں۔ پھر دوسرا ہوٹل میں پتا کیا۔ ایک جگہ وہ مل گیا۔ پولیس اس کو گرفتار کر کے رکھا۔ اس نے بہت شور کیا کہ یہ ہم نے خریدا ہے لیکن اس کا پاس کوئی رسید نہیں تھا۔ وہ کشن چند کو نہیں پہچانتا تھا کشن چند نے اپنا مال پہچان لیا۔ اس نے کہا کہ بس دو چیز اصلی ملا ہے۔ اصلی نیکلس کدھر ہے۔ اب اس کا بات کون مانے گا۔ آخر اس نے بتایا کہ جیولری کسی نے گفٹ کیا تھا۔ پولیس نے پوچھا کس نے گفٹ کیا تھا اور کیوں؟ تو وہ لڑکی جو نام بتایا وہ غلط۔ اس نے اپنا پتا بھی غلط بتایا تھا۔ خریداری کا ثبوت کوئی نہیں۔ پولیس نے پوچھا کہ صرف جیولری پہ دس لاکھ کا شاپنگ کیا وہ تو اس کا پاس اتنا پیسہ کدھر سے آیا۔ بس وہ پھنس گیا۔ اصلی نیکلس وہ کدھر سے لاتا۔ اس پہ الزام آیا کہ اس نے کشن چند کو دھوکا دیا اور اصلی نیکلس کسی اور کو بیچ دیا۔"

"اس کے بعد ترلوچنی نے مدد کی ہوگی؟" میں نے کہا۔

"ترلوچنی بولا کہ میرا واسطے کام کرو تو میں چھڑا سکتا ہوں۔ وہ مان گئی۔ باہر آتے ہی اس نے کوئی ایسا چکر چلایا کہ ترلوچنی پاگل ہو گیا۔ اس نے جینا سے شادی بنا لیا۔ وہ بہت چالاک چھوکری تھا۔ دو تین مہینہ ادھر وہ ترلوچنی کا ساتھ رہا۔ اس نے اپنا سب فوٹو واپس لیا۔ ترلوچنی کا سیف کا ڈپلی کیٹ چابی بنایا اور ایک دن سب کچھ لے کر بھاگ گیا۔ کوئی بولتا ایک کروڑ کا مال لے گیا کوئی بولتا دو کروڑ۔ اور بھی بہت کچھ لے گیا وہ چھوکری۔ جس سے ترلوچنی پھنس سکتا ہے۔ وہ ابھی واپس نہیں گیا اور کسی یادلی میں ہے۔"

"یہ کوئی یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتا ہے؟"

"اس کا پاسپورٹ ویزا ختم ہو گیا تھا۔ ترلوچنی کر چکا تھا کہ ابھی وہ دوسرا ویزا نہیں لیا۔ انڈیا باہر سفارت خانے میں بھی ترلوچنی کا آدمی سب معلوم کیا۔ جینا کا فوٹو سب جگہ دیا۔ وہ نہیں ملا۔ اس کو دو مہینے بعد جینا کی طرف سے ایک خط ملا کہ نقدی، فوٹو اور جیولری کو بھول جاؤ۔ کاغذات وغیرہ کا سودا کرنا ہے تو ٹیلی فون کا انتظار کرو۔ لیکن اس کے بعد کچھ نہیں..."

"یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟"

"ہم اس کا مدد کیا تھا۔" ہریش چندر بولا۔ "جب وہ ترلوچنی کے گھر سے نکلا تو اپنا گاڑی چھوڑ کے ہمارا گاڑی کی ڈکی میں چھپ گیا۔ ہم کو کیا معلوم۔ ہم گاڑی سروس کرا کے لایا تھا اور ادھر سگریٹ لینے کا واسطے رک گیا تھا۔ وہ لڑکی اسٹوڈیو پہنچا۔ ادھر سے راج صاحب کا گھر۔ راج کپور صاحب کے گھر سے ہم گیا نرگس کا گھر۔ فلم اسٹار نرگس کو دیکھا ہے تم؟ ادھر آدھے راستے میں ٹائر فلیٹ ہو گیا تو ہم نے ڈکی کھولا۔ جینا ادھر لیٹا ہوا تھا۔ ہم نے پولیس کے حوالے کرنے کا دھمکی دیا تو وہ ہاتھ جوڑا کہ ہم کو سب بتا دے گا۔"

"اگر ٹائر فلیٹ نہ ہوتا تو کیا کرتی وہ؟"

"وہ رات کو کہیں نکل جاتا۔ اندر سے لاک کھول کر۔" ہریش چندر نے کہا۔ "خیر ہم اس کو گھر لے گیا۔ ابھی وہ کوئی شریف لڑکی نہیں تھا۔ مگر اس نے ہم کو سب بتایا۔ اپنا سب فوٹو بھی دکھایا جو ترلوچنی اتارا تھا۔ ہم نے کہا کہ تم اچھا کیا۔ اس بدمعاش کو اچھا سزا دیا۔ ایک مہینہ وہ ہمارے ساتھ رہا کیونکہ ہم اس کا واسطے دوسرے نام سے پاسپورٹ بنوایا اور ویزا حاصل کیا۔ ابھی وہ دلی میں ہے لیکن ترلوچنی سمجھتا ہے کہ ادھر بھارت میں ہے۔"

اس کے خاموش ہو جانے کے کچھ دیر بعد میں نے کہا۔ "اب یہ بھی بتا دو کہ مس جینا کی اس کہانی میں ہمارے لیے کیا ہے؟"

"تم کو ترلوچنی کا پاس جانا ہے نا۔" ہریش چندر بولا۔ "یہ تمہارا دھرم پتنی کشن چند کے پاس جاوے اور بولے کہ ہم جینا کا فرینڈ ہے۔ ترلوچنی کا واسطے پیغام لایا ہے۔ ترلوچنی جدھر بھی ہوگا اس کو پہنچا دیا جائے گا۔"

"اور واپسی کیسے ہوگی اس کی؟" میں نے کہا۔

"واپسی کیا مشکل ہے۔" ہریش چندر نے کہا۔ "یہ بولے گا کہ جینا ہم کو سودا کرنے کا واسطے بھیجا ہے۔ تمہارا سب چیز تم کو واپس مل جائے گا۔ ہم کو بتاؤ کتنا مال دے گا۔ ہم واپس جا کے جینا کو بتائے گا اور ہم واپس نہیں جائے گا تو جینا تمہارا بیڑا غرق کر دے گا۔"

"کیا وہ پوچھے گا نہیں کہ جینا سے تمہارا کیا رشتہ ہے اور تم خود کون ہو۔ فرض کرو ثبوت مانگا اس نے؟"

"جینا کا سارا اسٹوری ہم سنا دیا۔ جو کسی کو نہیں معلوم یہ اسٹوری کافی ہے۔ اس کا فوٹو بھی دکھائے گا ہم۔ ایک انگوٹھی ہے جو ترلوچنی اس کو دیا تھا۔ وہ نقلی ہیروں کا نیکلس بھی ہے جو پولیس نے برآمد کیا تھا۔ جینا بعد میں ترلوچنی کے گھر سے لے آئی تھی۔ اگر یہ سب دکھا دے گی تو ترلوچنی کا باپ بھی مانے گا۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں جاؤں گی۔" نازو بولی۔

میں نے اسے گھور کے دیکھا۔ "کہاں جاؤ گی؟ تمہارا دماغ..."

"دماغ ٹھیک ہے میرا۔ میں ترلوچنی سے ملنے اس کے گھر میں جاؤں گی۔ میری فکر مت کرو۔" نازو نے کہا۔

"ابھی میری بھی ایک بات سن لو۔" ہریش چندر بولا۔ "میں نے تم کو طریقہ بتا دیا۔ ہم پرتھوی ماتا سے بولے گا کہ ان دونوں کو ہم شیامو داس کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد ہم نہیں جانتا کیا ہوا۔"

میں نے کہا۔ "اگر پرتھوی ماتا خود تصدیق نہیں کرے گا تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مجھے تو کام سے غرض ہے۔ کام تم نے کر دیا۔ مال پر بھی تمہارا حق بنتا ہے۔"

"مال... کیسا مال...؟" اس نے کہا۔

"وہی جو تمہارے پاس نے دیا ہوگا کہ شیامو داس کو دے دینا۔ مجھے معلوم ہے وہ کرانے کا دادا ہے۔ پیسہ لیے بغیر کسی کا باپ تک نہیں مل سکتا۔" میں نے کہا۔

ہریش چندر نے جھینپ کر کہا۔ "بہت سیانا ہے تو میرا لال۔ خطرناک حد تک سیانا ہے۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا: "تم کو مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تم نے میرے ساتھ بھلائی کوئی نہیں کی۔ میری مدد ضرور کی ہے لیکن تیا مو والوں سے مجھے پرانا حساب برابر کرنا ہے۔"

"تم... جانتے تھے اسے۔ پہلے سے؟"

"زیادہ پرانی واقفیت نہیں ہے۔" میں نے کہا: "چنانچہ حساب بھی پرانا نہیں ہے۔ مگر یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ میرے وسیلے سے اس کو کسی قسم کا فائدہ حاصل ہو۔ کسی بھی ذریعے سے۔ تمہارے فائدے کو میں ترجیح دوں گا۔"

اس نے مطمئن ہو کے کہا: "کبھی پھر میری ضرورت محسوس ہو تو آپ کے اسٹوڈیو آ جانا۔"

میں نے کہا: "چوکیدار بھگا دے گا مجھے کہ یہاں کوئی ہرش چندر نہیں ہے۔"

وہ ہنسا: "تم کہنا ہرش چندر چھوٹا سے ملنا ہے۔"

میں نے کہا: "چھوٹا۔ کون سا چھوٹا؟ چھپا لیے کتنے والا...؟"

وہ بولا: "نام پڑ گیا ہے میرا خوامخواہ کہ میں سب کو چونا لگا دیتا ہوں۔"

"خوامخواہ تو نہیں۔ ابھی ابھی تم نے تیا مو والوں کو چونا لگا دیا۔" میں نے کہا: "اور سچ تو یہ ہے کہ اپنے پاپا کو بھی۔"

"سچ بولنے کی کیا ضرورت ہے... تم کو کس نے بتایا کہ پرتھوی راج کو پاپا کہتے ہیں سب؟"

"کیا یہ غلط ہے؟ ساری فلم انڈسٹری میں وہ پاپا ہیں، جیسے ایس ڈی برمن ہیں دادا برمن۔" میں نے کہا۔

"ابھی تیرے کو سب معلوم ہے اور تو بولتا ہے کہ بمبئی میں نیا آیا ہے۔" وہ پھر بمبئی کے لہجے پر آ گیا: "اچھا اب اپن چلیں گا۔"

"ایک منٹ۔ مجھے کوئی ایسا پتا ٹھکانا بتا دو تم جہاں ہم پھر مل سکیں۔" میں نے کہا: "اسٹوڈیو کے باہر۔"

اس نے سوچ کے کہا: "میرے کو ڈر لگتا ہے یار۔"

"یار بھی کہتے ہو اور ڈرتے بھی ہو۔" میں نے کہا: "اچھی ہے یہ یاری۔ ہم ایسے ہوتے تو تمہارا ناندہ کیسے برداشت کرتے۔ تم سے یار بولنے میں غلطی کی بات کی تھی۔ ہم نے تو نہیں کی حالانکہ ہم بھی کر سکتے تھے۔"

وہ قائل ہو گیا۔ اس نے مجھے کولابا کا ایک پتا لکھ کر دیا جس پر فون نمبر بھی تھا: "یہ بھی اپنا گھر ہے۔ تم میرا نام لو گے تو جگہ مل جائے گی۔ لیکن دیکھو، اس کو مشکل میں مت ڈال دینا۔"

"کس کو...؟"

"وہی جو اس پتے پر ملے گی۔ رات کو نہیں ملتی وہ۔ دن میں جاؤ تو دیکھنے کے اوپر سے چابی اٹھا لینا۔ واپس کرنے میں ہو گی۔" وہ بولا۔

"اس کا نام تو بتا دو یار۔ ہم ایسے ہی گھس جائیں گھر میں؟"

"نام تو بانو ہے۔ پاروتی۔ ایکسٹرا ہے ابھی۔ کسی دن تقدیر مہربان ہو گئی تو سب کو پیچھے چھوڑ دے گی۔"

میں نے کہا: "تم اچھی خاصی صاف اردو بولتے بولتے بمبئی کی بولی پر کیوں آ جاتے ہو؟"

وہ مجھے دیکھ کے بولا: "عادت پڑ گئی ہے کچھ۔"

میں نے کہا: "ہم مہمان تھے۔ جاتے ہوئے مل کے جانا۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے نازو سے کہا: "تم بہت خاموش رہی ہو۔ دھرم پتنی!"

"سیرالال! یہاں سے میرے اور تمہارے راستے جدا ہو گئے۔" نازو نے کہا: "کشن چند کے پاس میں اکیلی جاؤں گی۔"

"کہیں بھی اکیلے جانا مشکل نہیں ہوتا۔ یہ سوچ لو کہ واپسی کیسے ہوگی؟" میں نے کہا۔

"میرا راستہ کون روک سکتا ہے؟" اس نے اپنا ریوالور میرے حوالے کر دیا: "یہ بازو میرے اٹھائے ہوتے ہیں۔"

"ورنہ کچھ شک۔" میں نے کہا: "ہم بھی جانتے ہیں کہ زور کتنا بازو نے تاکی میں ہے۔ مگر تم نے ابھی تک تریوینی کا قلعہ نہیں دیکھا ہے۔"

"میں نے تریوینی کو بھی نہیں دیکھا ہے۔ مگر دیکھ لوں گی۔ تم بالکل فکر مت کرنا۔" نازو نے کہا: "اور دیر ہو جائے تو رونا مت۔"

"میں کیوں رونے لگا۔ رونے کا غالب۔" میں نے کہا: "بات میں بھی کہتا ہوں۔ مجھے بھی دیر ہو سکتی ہے لیکن میں ناشتے پر ملوں گا۔"

"یہاں۔ اس ریسٹورنٹ میں؟" وہ بولی: "یہاں میں تریوینی کو کیسے لا سکتی ہوں؟"

"تم اسے اغوا کر کے لاؤ گی؟"

"نہیں۔ بیاہ کر لاؤں گی۔" نازو نے جھنجلا کے کہا: "اسے ساتھ لائے بغیر میں خود کیسے آؤں گی؟"

میں نے ہنس کے کہا: "میں سمجھ گیا۔ ذرا دیر سے سمجھا۔ تم پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنے جا رہی ہو۔ سلیس اردو میں اس کو خلا کے آر پار کے بغیر۔ یہ ناز و انداز اور حسن خدا نے نہیں دیا ہوتا تو تم بھی یہی کرتے۔ اس میں تمہارا کیا کمال ہوگا۔ [illegible] غالب کو میں کیسے کرا دوں گا۔"

"چلو یہ بھی شرط لگا لو۔" اس نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔

"شرط کس بات پر؟" میں نے کہا۔

"ایک دعویٰ تم نے کیا ہے۔ دوسرا میں کرتی ہوں۔"

میں نے ہاتھ ملا لیا: "ٹھیک ہے۔ ہم پاروتی کے فلیٹ میں ملیں گے۔"

"ہار گئے تو کیا ہوگا؟"

"تم ہار جاؤ گی۔ تم بتاؤ۔" میں نے کہا: "بعد میں پریشانی نہ ہو تمہیں۔"

"ناک سے لکیریں نکالنی پڑیں گی۔ سات بار۔"

میں نے کہا: "نہیں۔ ناک کو سیاہی میں ڈبو کے فرش پر لکھنا پڑے گا۔ ناک کی نوک سے کریں تو ہوں۔"

"چلو اب چلتے ہیں۔" وہ بولی۔

باہر نکلنے کے بعد میں نے اس کے لیے ٹیکسی روکی اور ٹیکسی ڈرائیور کو بتا کے نازو سے کہا: "محتاط رہنا۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ بہتر ہوتا اگر تم خالی ہاتھ نہ جاتیں۔"

"بے شک۔ پیدا ہونے کا ٹھیکہ نہیں لے سکتی۔ تم اب کہاں جاؤ گے؟ والی کی آخری مکرم میں...؟"

"نہیں۔ میں بار بار جاؤں گا۔" میں نے کہا: "اگر اس کے ساتھ مجھے کسی اور جگہ جانا پڑا تو ممکن ہے کہ مجھے واپسی میں بہت دیر ہو جائے۔ یا میں رات کو نہ آ سکوں۔ ایسی صورت میں کہیں بھی مت جانا۔ یہیں رہنا۔"

"رالیبا اور گل...؟"

"وہ محفوظ ہیں۔ موقع ملا تو ان کو بھی بتا دوں گا میں..."

سکھ ٹیکسی والے نے کہا: "او جی بے کے گل کرو بادشاہو۔ یا پھر سالوں جہاں دل ہو۔"

میں نے کہا: "سردار جی! [illegible]"

ٹیکسی ایک دم روانہ ہو گئی۔ میں کچھ دیر وہیں کھڑا سوچتا رہا کہ میں نے نازو کو اکیلا بھیج کے غلطی تو نہیں کی؟ بے شک وہ اپنی حفاظت کر سکتی ہے اور میرے منع کرنے سے وہ کب مانتی۔ لیکن ہے تو وہ عورت ذات۔ بعض اوقات حد سے زیادہ خود اعتمادی بھی نقصان کا سبب بن جاتی ہے۔ مگر پھر میں نے خود کو اس خیال سے تسلی دی کہ جو لڑکی ایک بحری جہاز پر اتنا عرصہ اکیلی رہی اور حوصلہ نہیں ہارا، اس کی خود اعتمادی میں جذبات کو دخل نہیں۔ وہ عقل سے بھی اتنا ہی کام لے سکتی ہے جتنا اپنے ہاتھوں کی ہلاکت خیز مہارت سے یا اپنے حسن و شباب کی غارت گر قوت سے۔ اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا سوائے تقدیر کے۔ اور تقدیر سے تو میں بھی نہیں لڑ سکتا۔ اول تو میں اس کے ساتھ جا نہیں سکتا تھا۔ اور چلا جاتا تو باہر رہ کے اس کی کیا مدد کرتا۔

آہستہ آہستہ میں واپس چلنے لگا۔ صورت حال تقاضی پر امید اور حوصلہ افزا تھی۔ غالب اور محسن کے اغوا نے کچھ دیر کے لیے مجھے ناامیدی کے اندھیرے میں چھوڑ دیا تھا لیکن اب میں راستہ دیکھ سکتا تھا۔

بیس منٹ بعد میں نے بار میں قدم رکھا تو مجھے اندر کا منظر زیادہ تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا۔ شراب پینے والے ایک ہال میں جمع تھے اور ان کی حالت ایسی تھی کہ اس پر صرف افسوس کیا جا سکتا تھا۔ وہ انسان ضرور تھے مگر شراب نے انھیں انسانیت کی سطح سے بہت نیچے گرا رکھا تھا۔ ہوش و حواس سے بیگانگی کو وہ نجات سمجھتے تھے۔ نجات غم دوراں سے۔ تلخی حالات کے احساس سے۔ اپنی بے چارگی کے دکھ بھرے خیال سے۔ لیکن ہوش کھو کے وہ بہت کچھ کھو بھی دیتے تھے۔ جس کا انھیں احساس ضرور ہوتا ہوگا نشہ اترنے کے بعد۔ وہ سب قابل رحم لوگ تھے جو اتنے مجبور تھے کہ خود اپنے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

دائیں اور بائیں جانب لکڑی کے کیبن تھے جن پر میلے پردے پڑے ہوئے تھے۔ صرف دو کیبن ایسے تھے جن کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ ان میں دو بدصورت اور مظلوم نظر آنے والی عورتیں اداس بیٹھی تھیں۔ ان کا میک اپ ایسا تھا جیسے کوئی دھوئیں سے کالی ہو جانے والی دیوار پر چلے چونے کی کوچی پھیر دے۔

اندر تاریکی اور گھٹیا شراب کے بھبکے تھے اور غلیظ جسموں سے اٹھنے والی بو بھی۔ سگریٹ کا دھواں تھا اور شاید محسوس اندھیرے میں بسنے والے دق کے جراثیم تھے جو بیمار پھیپھڑوں والے کھانسی کے ساتھ پھیلاتے تھے۔ آخری حصے میں مجھے شیشے کی پارٹیشن نظر آئی۔ اس شیشے کے پیچھے ٹیوب لائٹس کا نیلگوں اجالا تھا اور میں واضح طور پر آراستہ کمرے میں گھومنے والی کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھ سکتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بار بابا ہے۔

میں شرابیوں کے درمیان سے گزرا تو کسی نے مجھے نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ ابھی میں اس کیبن کے دروازے سے دور تھا کہ ایک شخص نے میرا راستہ روک لیا۔ وہ بظاہر خونخوار اور دادا وغیرہ تھا۔ اپنے اطوار سے وہ یہی ظاہر کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ چست پتلون پر جسم سے چپکی ہوئی بنیان پہنے ہوئے تھا۔ لال پتلون کے دونوں پائنچوں پر اوپر سے نیچے تک سفید دھاری تھی اور لال بنیان پر سفید حروف کو نیم دائرے میں پھیلا کے لکھا گیا تھا "مائی لو از ڈیتھ" جس کے دونوں مطلب نکالے جا سکتے تھے کہ مجھے موت سے محبت ہے۔ یا میری محبت موت ہے۔ وہ گٹھے ہوئے بدن والا ادھیڑ عمر کا اور موٹا آدمی تھا اور اپنی بدمعاشی کو واضح کرنے کے لیے بیل کی طرح جبڑے ہلا ہلا کے چیونگم چبا رہا تھا۔ غالباً یہ دانت پیسنے کا ویسٹرن اسٹائل تھا۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا: "کدھر گھسا جاتا ہے، کدھر؟"

www.paksociety.com

میں نے سہم کے کہا۔" باقی جی سے ملنا تھا۔ ۔ ۔" اور پارٹیشن کی جانب اشارہ کیا۔

اس نمونے کا ایک اور والا پیچھے سے نمودار ہوا۔" چل پھُٹ سالا۔ دارو چاہیے تو ادھر بیٹھ ورنہ بھاگ ادھر سے۔"

میں نے پھر کہا۔" ہم باقی جی سے ملے بغیر نہیں جائیں گے۔ ہم کو بہت ضروری کام ہے۔"

پہلے والے نے مجھے ایک ہاتھ سے دھکا دیا۔" جا ادھر سے کنگلا کا بچہ۔ باقی جی سے تیرے کو کیا ضروری کام پڑ گیا۔ ادھار کا بات کرے گا۔"

" ہم دارو نہیں پیتے۔ ہم کو شیامو دادا نے بھیجا ہے ڈالمن بجانے کے لیے۔" میں نے کورا عطا کے کہا جس میں مشین گن تھی۔

" ڈالمن بجانے گا؟ ادھر۔ مستک پھر گیا ہے کیا تیرا۔ کنگلا ام۔" دوسرے والے نے کہا۔" آ ادھر کلب کر آ گیا بابا کا کچی جان" دوسرا قہقہہ مار کے ہنسا۔" کنگلا ام۔ ابھی دارو مانگتا ہے تو تیرے کو بول۔ ایک پٹیالہ پیگ ہم دے گا تیرے کو۔ ۔ ۔ چھوکٹ۔ ۔ ۔"

میں آگے بڑھا۔" باقی جی ؟" میں نے چلا کے کہا۔" دیکھو تو یہ روک رہے ہیں ہم کو۔"

میری آواز اندر بیٹھی ہوئی عورت نے سنی اور کچھ حیران ہو کے میری طرف دیکھا۔ پھر اس نے چٹکی بجا کے ایک بدمعاش کو طلب کیا۔ دوسرا میری راہ میں دیوار بنا کھڑا رہا۔ اندر کیا گفتگو ہوئی، یہ میں نہ سن سکا مگر دو منٹ کے بعد مجھے اندر پیش کر دیا گیا۔ بدمعاش نمبر ایک اور دو میرے دائیں بائیں ایسے کھڑے ہو گئے جیسے وہ میرے باڈی گارڈز ہوں۔

" کون ہے تم؟ کاہے کو بلا کرتا پڑا ہے؟" باقی جی نے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ خرانٹ جہاندیدہ عورت میرے شریفانہ حلیے اور میری صورت پر برسنے والی حماقت سے محظوظ ہو رہی ہے۔

" باقی جی ہم ڈالمن بجانے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔

" تو پیلی ور باقی جی۔ ہم یار برا ہے۔" وہ چھلک کے بولی" ڈبس ایڈیٹ نے بولا تم کو یہ بات کر ادھر جا کے ڈالمن بجا ؤ۔ تمہارا باپ لوگ نے لگا کیا؟" اس نے شرابیوں کے ہجوم کی طرف اشارہ کیا۔

" ہم کو شیامو دادا نے کہا تھا کہ باربرا کو ڈالمن سننے کا بہت شوق ہے۔" میں نے کہا۔

وہ شاید چالیس سال کی عورت تھی لیکن جسم کے تجربات کو عمر سمجھا جائے تو شاید سو برس گناہ کی زندگی کے ضرور گزار چکی تھی۔

ظاہر ہے وہ تیس کی نظر آنے کی بھونڈی کوشش کرتی تھی بھونڈے میک اپ سے اور بھدے جسم کی بے باکانہ نمائش سے وہ کسی بدصورت دیوار پر کسی شفاخانے کے اشتہار سے زیادہ فحش نظر آ رہی تھی۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔" یو باسٹرڈ۔ ہم سے مذاق کرتا تم۔ ابھی بولو شیامو دادا کا نام کیوں لیا تم؟ وہ ایسا بات نہیں بولے گا سالا۔ اپن کیا جانے ڈالمن کو۔"

میں نے کہا۔" تم شیامو دادا کو تو جانتی ہو۔ کہاں ہے وہ تمہارا مان کا خصم۔"

میرا لہجہ اور میری بات سن کر کچھ دیر وہ سب دم بخود بیٹھے رہے۔ ان کو میرے جیسے گاؤدی سے ایسی گستاخانہ جرأت کی امید بالکل نہ تھی۔

" سالا۔ حرامی۔" باربرا نے چیخ کر کہا۔

مجھے اندازہ تھا کہ میری بات کا ایسا ہی رد عمل ہوگا۔ میرے دونوں طرف کھڑے ہوئے بدمعاش ابھی کچھ کرنے بھی نہ پائے تھے کہ میں نے دونوں ہاتھوں کی کہنیوں سے پیچھے کی طرف وار کیا۔ کہنیوں کی ہڈی ان کے سینے کے وسط میں لگی۔ میں نے ان کے حلق سے سانس کے ساتھ خارج ہونے والی آواز بھی سنی۔ میں نے انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکے ہی تھے کہ پہلے میرا ایک پیر پیچھے کی طرف اٹھا پھر دوسرا۔ دونوں جوتوں کی ایڑیاں ان دونوں کی ٹانگوں کے درمیان اتنی قوت سے لگیں کہ وہ ایک ساتھ بلبلا گئے۔

میں نے جست لگائی اور میز کو عبور کر کے باربرا کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ وہ اپنی گھومنے والی کرسی چھوڑ کے اٹھی ہی تھی کہ میں نے اس کا شانہ دبا کے واپس بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔ باربرا کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اس کو جن محافظوں پر ناز تھا وہ سخت اذیت میں دوہرے ہو کے مجھے گالیاں بک رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے بالآخر حق نمک ادا کرنے کے لیے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر باربرا نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روک دیا۔

" یہ تم نے اچھا کیا باقی جی۔ ورنہ ہم بھی غصے والے آدمی جب غصہ آ جاتا ہے تو سامنے جو بھی آ جائے اسے باہر پھینک دیتے ہیں۔ ایک دفعہ ماموں پر غصہ آ گیا تھا۔ انہیں ہم نے بند کھڑکی میں سے باہر گلی میں پھینک دیا تھا۔ اسے بھی ہم باہر پھینک تو یہ شیشے کی دیوار میں سے گزر جاتا۔" میں نے کہا۔

" کنگلا ام۔ ۔ ۔ کیا مانگتا ہے تم۔ کاہے کو غرا کرتا۔" باربرا نے ہکلا کے کہا۔

میں نے اس نام پر کوئی اعتراض نہیں کیا جو مجھے انداز تمسخر

عطا کیا گیا تھا۔ میں نے کہا۔" ہمارے سوال کا جواب دے دو۔ ہم چلے جائیں گے۔"

" کون سا سوال؟ دیکھو ڈالمن۔ ۔ ۔"

" ڈالمن کو گولی مارو۔ ہم نے پوچھا تھا شیامو دادا کدھر ہے؟"

" مگر۔ ۔ ۔ تم تو بولا۔ ۔ ۔"

" ہم کو بھی گولی مارو۔ شیامو دادا کا پتا بتاؤ۔ ہمارے ساتھ چلو۔" میں نے کہا۔

وہ مجھے بے یقینی کے ساتھ دیکھتی رہی۔ وہ یہ طے کرنے سے قاصر تھی کہ میں سنجیدہ ہوں تو کس حد تک اور خطرناک ہوں تو کس حد تک؟

" شیامو دادا کے پاس جا کے کیا کرے گا؟"

میں نے کہا۔" ڈالمن بجانے گا اور تمہارا ڈانس دیکھے گا۔ سنا ہے شیامو دادا طبلہ بہت اچھا بجاتا ہے۔ وہ سنگت کرے گا۔"

باربرا نے میز پر زور سے ہاتھ مارا۔" شٹ اپ۔" پھر اس نے اپنے اسی محافظ کو اشارہ کیا جس کی مخنث کا نام نوٹ تھا۔" اس حرامی کو جوتا مار کے باہر گلی میں ڈالو۔"

وہ ایک دم آگے آیا۔ میں نے اسے قریب آنے کا موقع دیا۔ جب اس نے مجھ پر جست لگائی تو میں نے تول کر ہاتھ مارا جو اس کی کنپٹی پر صحیح جگہ پڑا۔ وہ ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھ پایا۔ باربرا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس بے ہنگم گوشت کے ڈھیر کو دیکھا جو اب بالکل ساکت تھا۔

" تم۔ ۔ ۔ مار دیا۔ ۔ ۔ مرڈر کر دیا۔ ۔ ۔ او ما گاڈ۔ ۔ ۔" وہ کانپنے لگی۔

" گاڈ کو یاد مت کرو۔ اس سے تمہارا تعلق بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔ اس شیطان کو یاد کر سکتی ہو تم جو تمہارا یار ہے۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

باربرا کرسی پر گر گئی۔ اس نے سامنے رکھی ہوئی قیمتی شراب کی بوتل کا ڈھکن کانپتے ہاتھوں سے کھولی اور بوتل سے منہ لگا کے ایک گھونٹ پی لیا۔

" ابھی تک باہر کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ اور کچھ نہیں سنا۔ اچھے اس دوسرے بدمعاش کو اٹھا کر اشارہ مت کرنا۔ ورنہ اس کا بھی یہی حشر ہوگا۔ بہتر ہوگا اگر تم اس کو اپنے ساتھ رکھو۔ لیکن بتا دو کہ کیا تمہارے پاس گاڑی ہے۔"

باربرا نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

" تمہارا یہ بلڈاگ ڈرائیو کرے گا۔" میں نے کہا۔" میں اور تم پیچھے بیٹھ کے باتیں کریں گے۔ میں تم کو بتاؤں گا کہ اور کس کس کو میں غصے میں پھینک چکا ہوں۔ اس کو سمجھا دینا کہ سیدھے راستے

پر چلے ورنہ میں اس کو چلتی گاڑی سے باہر پھینکنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ کیسے؟ یہ تم دیکھو گی تو تمہیں یقین آ جائے گا۔"

" ابھی۔ ۔ ۔ کدھر جانے کو مانگتا کنگلا ام۔ ۔ ۔؟"

" شیامو دادا کے پاس اور کہاں؟" میں نے کہا۔

" ہم نہیں جانتا بابا۔"

" تم سب جانتی ہو بی بی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔" ہو سکتا ہے کہ ابھی تم کو یاد نہ آ رہا ہو۔ لیکن جب سوچنے کا موقع ملے گا تو یاد آ جائے گا کہ شیامو دادا کے کتنے ٹھکانے ہیں اور وہ کس وقت کہاں ملتا ہے۔ رائٹ۔ اب چلو۔"

اس نے پریشانی سے نیچے پڑے ہوئے شخص کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔" یہ مرا نہیں ہے۔ کچھ دیر میں اپنے پیروں پر ایسے کھڑا ہو جائے گا جیسے گدھے کا بچہ پیدا ہونے کے بعد کھڑا ہو جاتا ہے۔ کسی کو اس کے پاس بٹھا جانا۔ جو اسے بتا دے کہ تم کنگلا ام کے ساتھ گئی ہو اور جلد ہی خیریت سے لوٹ آؤ گی۔ اگر اس نے چند باتوں سے پہلے کیا تو شور مچا دے۔ فون کرنے سے۔"

باتیں کرتے کرتے میں نے پُرسکون ڈرامائی انداز میں ڈالمن کو کھولا اور مشین گن برآمد کر لی۔" کیسا ہے یہ ڈالمن؟ اس پر موت کی دُھن اتنی خوبصورت بجاتا ہوں میں کہ۔ ۔ ۔"

باربرا نے ایک چیخ ماری جو شیشے کی دیوار کے پار شرابیوں کے شور میں کسی نے نہیں سنی۔" ہم۔ ۔ ۔ ہم چلے گا۔ اس کو۔ ۔ ۔ اس کو اندر ڈالو۔ کوئی دیکھے گا تو بہت بڑا ہو گا۔ بہت لفڑا ہو گا۔ پولیس آ جائے گا۔"

میں نے مشین گن کو واپس کور میں ڈال دیا۔ اس چیز کا نظارہ کرانا ضروری تھا۔ استعمال کے لیے ریوالور یا صرف میرے ہاتھ ہی کافی تھے۔ مشین گن کو میں نے کندھے پر ڈال لیا اور جیب سے ریوالور نکالا۔

" یہ تمہارے لیے نہیں، شیامو دادا کے لیے ہے۔ ویسے تو میں خالی ہاتھوں سے گردن بھی توڑ سکتا ہوں۔ یقین نہ ہو تو اپنے اس کتے سے کہو کہ مجھ پر حملہ کرے۔" میں نے کہا۔

کتا ایسا دم دبا کے کھڑا ہوا تھا کہ جو بھونکتا تھا۔ وہ غرانا بھی بھول گیا تھا۔

" کیا۔ ۔ ۔ مرڈر کرے گا تم شیامو کو؟" باربرا نے ہکلا کے کہا۔

" پتا نہیں۔" میں نے کہا۔" مگر تم اس کی نہیں اپنی فکر کرو۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ مجھے اس کے پاس پہنچا دو۔ پھر تم واپس آ جاؤ گی اور تمہارا یہ دھندا ایسے ہی چلتا رہے گا۔ تم اپنی کرسی پر اسی طرح بیٹھ جاؤ گی جیسے میرے آنے سے پہلے بیٹھی

www.paksociety.com

ہوئی تھیں۔ تمہارے دونوں بلڈاگ بھی اپنی اپنی ڈیوٹی دیتے رہیں گے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا کہ تم کس کے ساتھ کہاں گئی تھیں۔"

"وہ ۔ ۔ ۔ پوچھے گا مجھ سے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا: "اس دُنیا میں وہ تم سے کچھ نہیں پوچھے گا اور نہ اس جہنم میں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم سب گنگا رام کو بھول جاؤ۔ یہ دنیا کوئی گنگا رام آیا۔ نہ اس نے کسی سے کچھ کہا، نہ کچھ کیا۔ نہ اس نے شیاموداوا کا پتا پوچھا اور نہ تم نے بتایا۔ تم تو کہیں گئی بھی نہیں۔"

"اس کا میرا ساتھ تو ہوگا گنگا رام۔"

"پھر کیا ہوا۔ وہ دیکھے گا کہ تم مجبور تھیں۔ تم اسے نرمی سے اور شرافت سے سمجھا دینا کہ اپنی داداگیری نہ دکھائے۔ اسے بتا دینا کہ گنگا رام کون ہے اور وائلن پر موت کا گیت کتنا اچھا بجاتا ہے۔ اگر شیاموداوا نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے خاموشی سے میرے ساتھ چلنا منظور کیا تو تمہارا کام ختم۔ تم واپس جانے کے لیے آزاد ہوگی۔ بس یہ خیال رکھنا کہ واپسی میں، ہو۔ راستے میں کوئی پولیس اسٹیشن دیکھ کے جذباتی مت ہونا۔ گنگا رام کا تم سے پھر ملنے کا کوئی ارادہ نہیں مگر وہ اپنا ارادہ بدل بھی سکتا ہے۔ کیا خیال ہے اب ہم چلیں؟ پی اسے گڈ کرلیں۔ بالکل نارمل نظر آؤ۔ رائٹ؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ اپنے ہینڈ بیگ کی طرف گیا۔ وہ باہر جانے سے پہلے عادت کے مطابق اپنا میک اپ درست کرنا چاہتی تھی۔

میں نے کہا: "تم خاصی حسین نظر آ رہی ہو۔ اگر میری نظر سے دیکھو۔"

"اس میں ۔ ۔ ۔ کوئی ریالٹی نہیں ہے۔" اس نے مجروح لہجے میں کہا۔

"ہوگا بھی تو مجھے کیا فرق پڑے گا۔" میں نے کہا۔

جب ہم باہر آئے تو مے خواروں کے شغل اور ہنگامے میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ لڑکی کے وہ کیبن جو ہال کے دونوں جانب خلوت فراہم کرتے تھے، کچھ اور خالی ہو گئے تھے۔ اب چار عورتیں اپنی بجھی ہوئی مصنوعی اور لٹکے ہوئے جسموں کی سارکھ بے حیائی کے ساتھ پر حسرت نظروں سے ہر آنے والے کو تک رہی تھیں کہ شاید وہ اتنا مہمان ہو جو پر جام شراب کے ساتھ نشہ شباب کی عیاشی کا متحمل بھی ہو سکے۔ میں نے افسوس اور دکھ کے ساتھ سوچا کہ خراب ان کو کیا ملتا ہوگا اور جو کچھ ملتا ہوگا اس میں سے کتنا وہ اپنی ذات پر خرچ کرتی ہوں گی کتنا ان گدھوں کے سامنے ڈالتی

بھیڑیں جو ان کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں تاکہ ان کے جسموں پر اپنی اجارہ داری برقرار رکھ سکیں۔ آنے والے دن کے لیے ان کے پاس کیا ہے؟ کیا ان کو آنے والے دن کا تصور ڈراتا نہیں ہوگا؟

باربرا چھوٹے قد کی عورت تھی چنانچہ بہت اونچی ایڑی کے سینڈل استعمال کرتی تھی۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اپنے وقت میں وہ بھی مجسم فتنۂ محشر رہی ہوگی۔ آثار کہہ رہے تھے عمارت عظیم تھی۔ اس نے جسم کے خد و خال کی دلکشی کو برقرار رکھنے کی کوشش ترک نہیں کی تھی۔ مجھے انگریزی کا ایک مقولہ یاد آیا۔ تم شعلے کی لو جتنی زیادہ رکھو گے شمع کی زندگی اتنی ہی کم ہوگی۔ وہ شمع محفل کی جگہ چراغ خانہ ہوتی تو ابھی مزید بیس تیس سال اس کے آفتاب حسن کو گہن نہ لگتا مگر اس نے زندگی میں ملنے والی خوشیوں کے چراغ کی لو بہت اونچی رکھی تھی۔ اس نے یقیناً بہت نظروں کو خیرہ کیا ہوگا مگر اب خوشیوں اور لذتوں سے ضیا پانے والے چراغ میں کچھ نہیں رہا تھا۔ شعلۂ حسن ایک بجھی ہوئی چنگاری رہ گیا تھا۔

اس کے ساتھ چلنے والا بلڈاگ ظاہری بے نیازی کے ساتھ آگے بڑھتا جا رہا تھا اور شاید دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ گنگا رام جیسے کالے کے آنکھ کے اشارے پر دُم ہلانے سے اس کی عزت نفس سخت مجروح ہو رہی تھی مگر میں اس پر واضح کر چکا تھا کہ وہ خود بہادری کے جوہر دکھائے گا یا چھاڑ کے بیچ لگانے یا پولیس کو بلائے۔ ہر صورت میں میرے وائلن پر موت کا گیت باربرا سنے گی۔ مالکن کی جان بچانی ہے تو وہ مجھ سے تعاون کرے اور اس کی لاش واپس لانی ہے تو جو اس کا دل چاہے کرے۔

باربرا کی گاڑی دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ باربرا نے بلڈاگ کو چابی دی اور خود میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"امید ہے تم اپنی نظر سامنے سڑک پر رکھو گے مسٹر ڈرائیور۔" میں نے کہا۔ "اور کان اپنی مالکن کی آواز پر۔ یہ تم کو بتاتی رہیں گی کہ کہاں جانا ہے۔"

"وہ جانتا ہے کہ اسے کہاں جانا ہے۔" باربرا نے انگریزی میں کہا۔ "کیا ایک سگریٹ دو گے مجھے؟"

میں نے اسے سگریٹ دی۔ جب میں لائٹر سے اس کے لبوں میں دبی ہوئی سگریٹ جلا رہا تھا تو اس کی آنکھیں مجھے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"ابھی کچھ دیر پہلے بھی کوئی آیا تھا شیاموداوا کو پوچھتا ہوا۔" اس نے ایک کش لے کر کہا۔

"موت کا فرشتہ ہوگا۔" میں نے بھی سگریٹ جلاتے ہوئے

مختصراً کہا۔

"تم اسے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟" وہ بولی۔

"اس لیے کہ آج تک قانون اسے سزائے موت نہیں دے سکا۔ کیا یہ غلط ہے کہ اس نے زندگی میں ان گنت جرائم ایسے کیے ہیں کہ ہر جرم پر اسے پھانسی ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ بچتا رہا ۔ ۔ ۔"

"ایسے تو سیکڑوں، ہزاروں لوگ ہیں۔ کیا سب کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے خدا نے تمہیں دُنیا میں بھیجا ہے؟ کیا جاؤ تو دُنیا میں انصاف نہیں ہو رہا ہے۔ تم کرو یہ کام۔ خدائی فوجدار ہو تم۔" وہ بدمزگی اور تلخی سے بولی۔

"خدائی فوجدار تو سب ہی ہیں جو بھی اپنے نام کے ساتھ راوا کا لقب اختیار کرتا ہے، یہی سمجھتا ہے۔ اور یہ بھول جاتا ہے کہ خدا کے نظام میں ایک توازن ہے۔ بدی کے وجود کو ختم کرنے والی طاقتوں کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہا ہے۔ چنانچہ ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ پیدا ہوا۔ سانپ کے لیے لاٹھی بنائی گئی۔ اندھیرا انسان کے بے طبیب بیمار ہوا۔ دُنیا میں پیغمبر اور ولی، مصلح اور مبلغ فلسفی اور حق پرست آتے رہتے ہیں۔"

"تم کیا ہو؟" وہ جل کے بولی۔

"خدائی فوجدار، جیسا کہ ابھی خود تم نے کہا تھا۔ سیکڑوں ہزاروں کی بات میں نہیں کرتا۔ لیکن جب بھی اور جہاں بھی شیاموداوا جیسا کوئی شیطان میرے راستے میں آ جاتا ہے تو میں اس سے راستے کی بھیک نہیں مانگتا۔ میں اسے اپنے راستے سے ہٹا دیتا ہوں۔ دُنیا میں شیاموداوا ہزاروں ہیں تو گنگا رام جیسے خدائی فوجدار بھی ہزاروں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دُنیا اب تک قائم ہے۔ اور زندہ رہنے کے قابل ہے۔"

"مجھے تمہارا چہرہ بھی جانا پہچانا سا لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا: "کیا ہم پچھلے جنم میں پڑوسی تھے؟"

وہ مسکرائی: "تم ایک پُراسرار شخص ہو۔ بے حد پُراسرار۔"

"ایک بات کا خیال رکھنا مس باربرا۔" میں نے کہا: "اگر کبھی غلطی سے بھی تم کو یاد آ جائے تب بھی تم گنگا رام کے بارے میں کسی سے کچھ مت کہنا۔ درحقیقت وہ کوئی نہ تھا۔ بعض اوقات سچ نہ بولنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ایک بار سچ بولنے پر میں نے اپنے ماموں کو گلی سے اندر پھینک دیا تھا۔ کھڑکی کے راستے گرے تھے۔"

"اوہ گوش! تم نے کھڑکی کے راستے گلی میں بھی پھینکا تھا؟" وہ بیک نسخۂ زمانے کے انداز میں بولی۔

"وہ مجھلے ماموں تھے۔" میں نے کہا۔

"اُف سی۔ بڑے ماموں نے کیا سچ بولا تھا؟"

"انھوں نے مجھے گنجا کہہ دیا تھا۔" میں نے کہا۔ حالانکہ میں سر پر استرا پھروا کے آ رہا تھا۔"

گاڑی ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے رُک گئی۔ اس کے گراؤنڈ فلور پر دکانیں تھیں۔ پہلی اور دوسری منزل پر غالباً دفاتر تھے۔ سب سے اوپر چوڑائی کے برابر نیون سائن لگا ہوا تھا۔ اس پر بتی حروف سے ایک ٹرانسفر بنائی گئی تھی جو اس وقت ساکت تھی۔ مجھے کراچی کا بمبینو سینما یاد آیا جس پر ایک ایسی ہی رقاصہ متحرک نظر آتی تھی مگر وہ بہت چھوٹی تھی۔

یہ ایک نائٹ کلب تھا۔ شیاموداوا جیسے لوگوں کا ٹھکانا ایسی ہی جگہ ہو سکتا تھا۔

"جاؤ دیکھو وہ ہے یہاں یا نہیں۔" باربرا نے کہا۔

میں نے کہا: "ہم سب چلتے ہیں۔ نہ ملا تو واپس آ جائیں گے۔ تین زینے چڑھنے اور اُترنے میں کوئی رسک نہیں۔"

باربرا نے بُرا سا منہ بنایا مگر پھر نیچے اُتر آئی۔

"کیا شیاموداوا کے بیوی بچے ہیں؟" میں نے کہا۔

"کیا رحم کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں تمہارے دل میں؟" باربرا نے طنز سے کہا: "یا انھیں بھی قتل کرنے کا سوچ رہے ہو؟"

"ان سے میری کیا دشمنی۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ شیاموداوا کے ساتھ ہی اس کا یہ کاروبار بھی ختم ہو۔ اگر تم نے معاملات کو صحیح طور پر سنبھالا اور شیاموداوا نے جنگ نہ چھیڑی تو ان کے لیے آمدنی کا یہ ذریعہ باقی رہے گا۔ ورنہ یہ سمجھو کہ گنگا رام اس پوری بلڈنگ کو راکھ کر دے گا۔"

باربرا کے لیے میرے لہجے سے میری نیت پر شک کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میرے پاس عام اسلحہ نہیں ہے۔ اس نے یقیناً مجھے دہشت گرد سمجھا ہوگا جو لامحدود وسائل رکھتے ہیں۔

زینے پر قدم رکھنے سے پہلے باربرا نے پلٹ کے دیکھا: "مجھے یہیں سے واپس جانے دو۔ وہ اوپر موجود ہے۔"

"تم نے کیا اس کی بو سونگھ لی ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کی گاڑی پیچھے موجود ہے۔" وہ بولی: "اچھا ہے اگر وہ یا کوئی اور مجھے نہ دیکھے۔ اور کسی کو معلوم نہ ہو کہ تم کو یہاں تک میں نے پہنچایا تھا۔ میں ان کی دشمنی مول نہیں لے سکتی۔"

"او کے۔ تم واپس جاؤ۔" میں نے کہا: "مجھے اس عمارت کے پیچھے کا نقشہ سمجھا دو۔"

"اس دروازے کے پیچھے ہال ہے۔ بالکل سامنے بار ہے۔ اور دائیں جانب پہلا کمرا شیامو کا ہے۔" وہ بولی۔

"واپسی میں یہ بات یاد رکھنا کہ تم نے کسی گنگا رام کو دیکھا بھی

www.paksociety.com

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ کسی نے تمہاری گاڑی رکھی ہو۔ تم کہہ سکتی ہو کہ تم شاپنگ کے لیے آئی تھیں۔"

"زندہ رہنے کے لیے مجھے بہانوں کی کمی نہیں۔ تم اپنی فکر کرو۔ تم کو ابھی اندازہ نہیں ہے کہ۔ ۔ ۔"

"مگر شیامو دادا کتنا بڑا دادا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔ "دادا نہیں وہ پردادا ہو تب بھی مرے گا تو ایک ہی گولی سے میڈم۔"

"کبھی تم دوسری گولی کے بارے میں بھی سوچتے ہو۔ جو تمہیں نشانہ بنا سکتی ہے؟"

"ہاں۔ اس گولی سے کون بچ سکتا ہے جس پر کسی کا نام خود دستِ قضا نے لکھا ہو۔" میں نے کہا۔ "میں اس گولی کے بارے میں کیوں سوچوں۔ مرنا مجھے بھی ایک ہی بار ہے۔ صرف اتنا میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شیامو دادا کو اپنے وائلن پر موت کے گیت کی دھن سنائے بغیر میں نہیں مروں گا۔ اب جاؤ۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں ستائش کے جذبات دیکھے۔ "گڈ لک۔ بیسٹ آف لک۔ یہ اپو یقین گنگارام۔" وہ بولی۔ "آئی وش۔ ۔ ۔ کہ تم محفوظ رہو۔ اور اسے مار ڈالو۔"

میں نے کہا۔ "تم میری کامیابی کے لیے دعا کر رہی ہو کیوں؟"

اس نے اعصابی کشیدگی کے اضطراب میں ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "اس لیے کہ۔ ۔ ۔ میں نفرت کرتی ہوں اس سے۔ ۔ ۔ بہت زیادہ۔ باسٹرڈ۔ بیس سال پہلے کوئی گنگارام اس کے وجود سے دنیا کو پاک کر دیتا۔ ۔ ۔ تو یاد رکھو گنگارام کہ وہاں نہ ملتی جہاں آج ہے۔ وہ کسی گھر کی محفوظ چار دیواری میں ہوتی۔ ایک شوہر اور چند بچوں کی محبت سے ملنے والی خوشیوں کے درمیان۔ لیکن تم بہت دیر سے آئے۔ اب تو میں نے خود سے بھی سمجھوتا کر لیا تھا اور انتقام کی وہ آگ بھی سرد پڑ چکی تھی جو کبھی میرے دل میں روشن تھی۔ اب تم شیامو دادا کو مار ڈالو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا مجھے۔ میری اس زندگی کے معمولات وہی رہیں گے۔ پھر بھی اس کی لاش دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی۔"

"وہ ایک بردہ فروش ہے۔" میں نے کہا۔

"ضرور اس نے تمہاری کسی بہن، منگیتر یا بیوی کو بھی اپنے مالِ تجارت میں شامل کر لیا ہوگا۔ اسی لیے تم اتنے جذباتی ہو گئے ہو۔" وہ بڑبڑانے لگی۔

میں نے کہا۔ "بیوی یا منگیتر تو نہیں۔ لیکن ایک رشتے سے وہ سب میری بہنیں ہی ہیں۔"

"کس رشتے سے؟" وہ پلٹ کے جاتے جاتے بولی۔

میں نے کہا۔ "انسانی رشتے سے۔" اور اوپر بڑھ گیا۔

زینے کے آخری حصے میں بہرا ٹیک کا مقفل دروازہ تھا جس پر نائٹ کلب کا بورڈ زیادہ مخش خیز تفصیلات کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ یہ عریاں ساتی کا نہیں کسی پینٹر کے برش اور رنگ کا کمال تھا کہ دروازے پر تقریباً عورت جیتی جاگتی نظر آتی تھی۔ اس کا نیم مستور جسم آتشِ شوق کو بھڑکاتا تھا کہ تاب نظارہ ہے تو اس حد سے گزر کر دیکھو۔

میں نے دروازے کو بجایا۔ اس کے اوپر لگے ہوئے اسپیکر نے غرا کے کہا۔ "کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہم ہیں گنگارام۔ وائلن بجاتے ہیں۔"

"یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

"ہم اپنے شیام چاچا سے ملنے آئے ہیں۔" میں نے معصوم لہجے میں کہا۔

غالباً کسی نے کلوز سرکٹ ٹی وی سے جھانک کر دیکھا کہ شیامو دادا کہنے والے تو بہت ہیں یہ چاچا کہنے والا کون آ گیا۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ ایک ویٹر نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ "کیا تمہیں شیامو دادا نے بلایا تھا؟"

"وہ دادا ہیں تمہارے۔" میں نے مسرت سے کہا۔ "پھر تو تم بھی تمہارے چاچا ہو گئے۔"

اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ "کیا کام پڑ گیا ہے تمہیں ان سے؟"

"ماتا جی نے کہا تھا کسی اور کو مت بتانا۔" میں نے احمقانہ صورت بنا کے کہا۔ "وہ تمہارے دادا ہیں تو کیا۔"

اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "اُدھر جاؤ۔ میرے چاچا میرے باپ۔ وہ ہے شیامو دادا کا کمرا۔"

کمرا میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اگر میں چاہتا تو اپنے بھتیجے کے ایک ہاتھ مار کے بھی اس کمرے کے دروازے تک پہنچ سکتا تھا مگر تب اس وقت اپنے چار جانثار گھڑ کا اٹھا کر ناسب نہ ہوتا۔ میں نے ہال میں بہت سے لوگوں کو مصروفِ کار دیکھا۔ ابھی شام ڈھل چکی تھی۔ یہ سب رات کے شو کی تیاری میں مصروف تھے۔ مجھے دو لڑکیاں بھی دکھائی دیں۔ وہ ہال کے آخری حصے میں کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھی ہوئی کچھ پی رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔

شیامو دادا کے کمرے کے باہر ایک گنجے سر اور بڑی ڈاڑھی والا جن اسٹول پر وہ بکتر تا ٹاپ ڈریس پہنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی چمڑے کی جیکٹ میں دو جنوں پہلی کے پٹھے ہوتے ہوئے تھے سینے پر اس نے جنگز میں سجا رکھا تھا۔ جینز کے تنگ پائنچے بوٹ میں غائب ہو گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جنگل بچنے کے انتظار میں ہے اور جنگل بجتے ہی سر پہ خود رکھ کے نیزہ یا تلوار لے کر گھوڑے

پر بیٹھے گا اور ہوا ہو جائے گا۔ مجھے دیکھ کر اس میں سے عجیب سی غراہٹ نکلی۔ غالباً اس نے جنوبی ہندوستان کی بھاشا میں مجھ سے کوئی سوال کیا تھا۔ میں نے سلام کر کے عاجزانہ لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔ اس نے بھی شیامو دادا کے کسی بھتیجے کو پہلے کہاں دیکھا ہوگا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے مجھے اپنی جگہ اسٹول پر بٹھا دیا۔

"ہم دادا کو بولنے گا۔ کیا نام بولا تم اپنا؟"

"گنگارام وائلن والا۔" میں نے سکون سے کہا۔ میرے رویے سے بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ شیامو دادا کے باڈی گارڈ نے مجھے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ اس کی واپسی تک مجھے یہیں بیٹھ کر انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اندر گیا ہی تھا کہ میں نے کوٹ سے مشین گن نکالی اور خود بھی دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گیا۔

شاندار طریقے پر آراستہ کمرے کا آدھا حصہ شیامو دادا کا آفس سمجھا جا سکتا تھا۔ اس حصے میں ایک بہت بڑی آفس ٹیبل پر چار فون رکھے ہوئے تھے اور سامنے چار کرسیاں تھیں۔ پھر ایک صوفہ سیٹ تھا اور درمیان میں جھوٹی کافی ٹیبل۔ دوسرا حصہ پرائیویٹ تھا جس میں بھاری پردوں کے پیچھے ایک بیڈ لگا ہوا تھا۔ شیامو دادا کو اس کے بھتیجے گنگارام کی آمد کی اطلاع دینے والا اس پردے تک پہنچ چکا تھا۔ شیامو دادا ابھی ابھی پردہ ہٹا کے باہر آیا تھا کہ اس نے مجھے دیکھا اور مشین گن کا رخ اپنی جانب دیکھا۔ اس کا محافظ دروازہ کھلنے کی آواز پر پہلے ہی پلٹ کر یہ منظر دیکھ چکا تھا۔ اب وہ دونوں اپنی اپنی جگہ جمے کھڑے ہوئے تھے۔

اندر سے کسی عورت نے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "شیام! کہاں چلے گئے؟" مجھے اس کی آواز کچھ مانوس سی لگی۔

شیامو دادا نے کہا۔ "چپ چاپ بیٹھی رہو۔ باہر آنے کی ضرورت نہیں۔"

شیامو دادا کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس برس لگایا۔ وہ درمیانے قد کا اور بھاری جسم والا آدمی تھا جس کی صحت یقیناً قابلِ رشک تھی۔ صحت سے زیادہ اس کی صورت نے مجھے حیران کیا۔ وہ کسی طرح بھی ایک بدمعاش نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا رنگ صاف تھا اور چہرے پر وہ درشتی نہیں تھی جو پرانے مجرموں کی صورت پر ان کے کرتوتوں کا عکس بن کے نظر آتی ہے۔ اس نے بے داغ سفید قمیص کے ساتھ سلیٹی رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی اور اس کے کھچڑی بال درمیان سے بنے ہوئے تھے۔ کالے فریم والے چشمے کے ساتھ وہ انہیں کوئی پروفیسر یا ڈاکٹر نظر آتا تھا۔

"کیا بات ہے۔ کون ہو تم؟" اس نے متانت سے کہا۔ "کیا مقصد ہے آخر اس طرح یہاں آنے کا؟"

"دادا! ہم اس کو روکا تھا۔ ۔ ۔" محافظ نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی اور مجھے خونی آشام نظروں سے گھورا۔ شیامو دادا کے ہاتھ کا اشارہ پاکے وہ چپ ہو گیا۔

"اسے خود بتانے دو۔" شیامو دادا نے کہا۔ "تم جاؤ باہر بیٹھو۔"

"اور خیال رکھو کوئی اندر نہ آنے پائے۔" میں نے کہا۔ "میں بلاوجہ خون خرابے کا قائل نہیں لیکن ضرورت پڑنے پر سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

"کیا تم بیٹھ کے بات کرنا پسند کرو گے؟" شیامو دادا نے انگریزی میں کہا اور صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے جواب میں انگریزی ہی میں کہا۔ "میں زیادہ لمبی بات نہیں کروں گا۔"

"او کے۔ ویٹ۔ کیا پیو گے؟ ۔ ۔ ۔" اس نے اپنا پُرسکون انداز برقرار رکھا۔

"کاش میں تمہارا خون پی سکتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں ایک انسان ہوں اور چونکہ تمہارا دشمن بھی ہوں اس لیے تمہارے ہاتھوں سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں لوں گا۔ تم نے مجھ سے تین سوال کیے تھے شیامو دادا۔ یہ کہ میں کون ہوں؟ میں وہی ہوں جس کو گھیرنے کے لیے تم نے چار آدمی بھیجے تھے۔ ایک ذلیل سے انھوں نے بھی مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ باقی کو میں نے واپس کر دیا۔ پھر تم نے پوچھا تھا کہ بات کیا ہے۔ بات یہ ہے شیامو دادا کہ میں تو تمہاری قید سے نکل آیا لیکن اس نے میرے دو ساتھیوں کو اٹھوا لیا ہے اور میں انھیں رہا کرانا چاہتا ہوں۔ تمہارے آخری سوال کا جواب یہ ہے کہ میرے اس طرح یہاں آنے کا مقصد تم کو اپنے ساتھ لے جانا ہے۔"

"کہاں؟" شیامو دادا نے کہا۔

"تریلیسی کے پاس۔ تم چاہو تو اس کو یہاں بھی بلا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "وہی بتائے گا کہ میرے دونوں ساتھی کہاں ہیں۔"

شیامو دادا ہنسنے لگا۔ عورت نے ایک بار پھر اسے آواز دی۔ میرے کان پھر کھڑے ہو گئے۔ وہ نشے میں بول رہی تھی لیکن اس کے باوجود میں آواز کے لہجے کو کسی حد تک شناخت کر سکتا تھا۔ میرے شکوک کی بنیاد کوئی نہیں تھی۔ پھر بھی میرے یقین کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں۔ شیامو دادا نے ایک ڈوری کھینچا اور بیچ کا پردہ سمٹ کر ایک طرف ہو گیا۔

ایک لڑکی بستر پر بے ترتیب پڑی ہوئی تھی۔ سبز ریشمی چادر کی شکنوں کے درمیان اس کا گلابی جسم کسی شوخ رنگین تصویر کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بکھرے ہوئے بال ہٹا کے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

www.paksociety.com

جب سے میں نے اس کی آواز سنی تھی، میرے دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا تھا۔ یہ ایک رسوا کن اندیشے کی پھانس تھی جس نے میرے وجود کو خوف کے عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ جب میں نے اس کا چہرہ دیکھا تو میری روح کا آزار تمام ہوا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ نازو نہیں تھی بلکہ صرف اس کی آواز نازو کی آواز سے حیرت انگیز حد تک مشابہ تھی اور اس سے مشابہت کے انداز نے مجھے ڈرا دیا تھا کیونکہ میں اور نازو ایک ساتھ ایک سے عزائم لے کر نکلے تھے اور اگرچہ ہمارے راستے جدا تھے مگر منزل ہماری ایک تھی۔

شیاموداوا تک پہنچنے کے لیے مجھے پہلے بار بار جانا تھا اور وہاں سے شیاموداوا کے ساتھ تریوینی تک رسائی حاصل کرنا تھی۔ نازو نے تریوینی تک پہنچنے کے لیے کشن چند کو ذریعہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ تریوینی تک پہنچنا آسان کام نہیں تھا چنانچہ میں اس خیال کو بعید از امکان سمجھ کے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ کہیں نازو کسی شیطانی چکر میں پھنس کر یہاں نہ پہنچ گئی ہو۔

شیاموداوا نے میرے انہماک سے غلط نتیجہ اخذ کیا۔ وہ کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے کیسی ذہنی اذیت سے نجات مل گئی ہے۔ اس نے یہی سمجھا کہ میری نظر کو اس حسن و شباب کے نظارۂ بے حجاب نے خیرہ کر دیا ہے۔

"کیوں بھئی گنگارام!" اس نے معنی خیز لہجے میں مسکرا کے کہا۔ "قدم رک کیوں گئے ہو، سوچنے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے چونک کر کہا۔ "رام رام کرو بھیا۔ گنگارام نے اس راستے پہ چلنے کا کبھی نہیں سوچا۔ تم کیا سمجھتے ہو آخر ہم نے شراب نہیں پی تمہاری تو کیا ہم اس پہ پھسل جائیں گے!"

"میں کچھ نہیں سمجھتا۔" وہ عیاری سے بولا۔ "جو کچھ بھی سمجھ رہے ہو تم خود سمجھ رہے ہو اور غلط سمجھ رہے ہو۔ تم جانا چاہتے تھے تریوینی سے ملنے، تم کو وہیں لے جا رہا ہوں۔ چلو ادھر بھی ایک راستہ ہے۔"

اس نے سامنے والی دیوار کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن مجھے ادھر کوئی راستہ دکھائی نہ دیا۔ دیوار اوپر سے نیچے تک بھاری پردوں کی سلوٹوں میں چھپی ہوئی تھی جس پہ کسی دروازے کی موجودگی کا گمان نہیں تھا۔ شیاموداوا جیسے لوگوں کے لیے ہر جگہ ایک دروازہ آمد و رفت کے لیے ضروری ہوتا ہے تو دوسرا چور دروازہ فرار کے لیے اس سے بھی زیادہ ضروری ہوتا ہے لیکن میں کسی ایسے راستے سے گزرنے کا رسک لینے پہ آمادہ نہ تھا جو میرا دیکھا بھالا نہ ہو۔

میں نے ایک آہ بھر کے کہا۔ "ہم دیوار میں سے گزر سکتے تو بہت پہلے ان دیواروں سے گزر گئے ہوتے جو ہمارے اور ہماری سوہنیا لاریب کے بیچ حائل ہیں۔ پرکھوں نے کہا کہ ایسا منتر کوئی نہیں ہے۔"

وہ ہنسا۔ "ایسا تو واقعی کوئی منتر نہیں..."

"لیکن..." میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "پرکھوں نے کہا کہ بیٹا گنگارام! انجانے راستے پہ تب جاؤ جب راستہ بھول جاؤ۔"

اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ "وہ در اصل..... میرا مقصد کچھ اور تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو کچھ معلوم ہو۔ ادھر سے جائیں گے تو سب دیکھیں گے۔"

"ارے دیکھیں گے تو دیکھا کریں۔ شرم کی کون سی بات ہے اس میں۔" میں نے کہا۔ "آخر اس بے شرم کے ساتھ بھی تم کو آتے جاتے دیکھا ہوگا لوگوں نے۔ گنگارام کے سنگ کیا ہے؟"

"تم سمجھتے کیوں نہیں؟ وہ ماتحت ہیں میرے۔ تم چاہتے ہو کہ میں چوہے کی طرح دم دبا کے چل پڑوں تمہارے ساتھ۔ میرا امیج خراب ہو جائے گا۔"

"امیج خراب مت کرو۔" میں نے کہا۔ "تم کتے کی طرح دم ہلاتے چلو، غراتے چلو۔ ہم تمہارے پیچھے چلتے ہیں ہاتھ باندھ کر۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ ہمارے یہ ہاتھ بھی آٹومیٹک ہیں جو ایک بار چل جائیں تو پھر رکتے نہیں۔ ادھر کوئی غلط خیال آیا تمہاری کھوپڑی میں ادھر ہاتھ چالو۔ تم تو ان ہاتھوں کا کھیل دیکھ چکے ہو۔"

شیاموداوا غصے اور بے بسی کی کیفیت میں اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔ "وہ اور بات تھی، یہاں تمہاری بدمعاشی نہیں چلے گی۔"

"چھوڑو بدمعاشی کو، یہ بتاؤ تم خود چلو گے یا ہم ڈرائیو کریں تمہیں؟" میں نے کہا۔

معلوم نہیں شیاموداوا نے اس عورت کو اشارہ کیا تھا یا وہ مکار اور بے حیا عورت اس حد تک ہوش میں تھی کہ ہماری گفتگو سے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کر چکی تھی۔ اس نے بیڈ پہ حرکت کیے بغیر اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھانا شروع کیا۔ اس کے ہاتھ کی یہ خفیف سی حرکت ہرگز میری نظر میں نہ آتی اگر خود شیاموداوا کی نظر یہ راز فاش نہ کر دیتی۔ شیاموداوا نے اضطراری کیفیت میں دو بار مجھ سے بات کرتے کرتے

دوسری طرف دیکھا اور پھر فوراً نظر چرا کے مجھ پہ یوں نظر ڈالی جیسے وہ میری صورت سے کچھ اندازہ کرنا چاہتا ہے۔ مجھے شک ہوا۔ تیسری مرتبہ اس کی نگاہ بھٹکی تو میں نے بھی ادھر دیکھا۔ اس عورت کا ہاتھ تکیے کی ریشمی سطح پہ ایک ایک انچ آگے سرک رہا تھا۔ ایک پتلی سی ڈوری کی طرف جو بیڈ کے سرہانے دیوار پہ آویزاں تھی۔ یہ یقیناً کال بیل کا سوئچ تھا۔ مجھے معلوم بھی نہ ہوتا اور اندر کہیں گھنٹی بج جاتی۔ کوئی اچانک اندر آ جاتا اور اس کے بعد کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا۔ میں اندر آنے والے کو بند بنا لیتا تب بھی باہر والوں کو خبر مل جاتی کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ وہ بچ کے نکل جاتا تب بھی مشکلات پیدا کرتا۔ باہر والے پولیس کو بلا لیتے یا شور مچا کے مجمع اکٹھا کر لیتے۔ میں ہر صورت میں محصور ہو جاتا۔

میں نے اچانک شیاموداوا کے ایک لات ماری۔ وہ سیدھا اس عورت کے اوپر جا گرا۔ اس نے بے اختیار مجھے ایک گالی دی۔

"اونچی آواز مت نکالنا ورنہ بہت لوگ مارے جائیں گے۔" میں نے ایک جھٹکے سے کال بیل کا تار کھینچ کے توڑ دیا۔

شیاموداوا نے اس عورت کو بھی ایک گالی دی۔ "پیسہ لینے کے لیے ہاتھ کتنی تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔"

اس نے کانپتے ہوئے شیاموداوا کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی۔ شیاموداوا اسے دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اطوار کی ساری شائستگی اب رخصت ہو چکی تھی۔ وہ ناکامی اور خطرے کے احساس سے بپھرا ہوا ایک سفاک اور بدنفس نظر آنے لگا تھا۔ اس کی صورت میں کرختگی کی بدصورتی آ گئی تھی۔

"گنگارام کو بے وقوف بنانے یا اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا خیال اپنے دل سے نکال دو شیاموداوا!" میں نے مشین گن کو خطرناک انداز میں پکڑ لیا۔ "کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا، چاہو تو کوشش کر کے دیکھ لو۔ کہو اپنی ہمشیرہ صاحبہ سے کہ میری طرف سے انہیں باہر جانے کی اجازت ہے، کہاں ایسے جیسے جائیں۔ سب کی لاشیں نہیں پڑی رہ جائیں گی اور میں بہرحال تم کو لے کر نکل جاؤں گا۔ تم کیوں اپنا بزنس اپنی حماقت کی وجہ سے ختم کرنا چاہتے ہو۔ سب ایسے ہی چلتا ہے تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ باقی لوگ اپنا کام کرتے رہیں۔ نائٹ شو جاری ہے، تم خاموشی سے میرے ساتھ نکل چلو۔"

اس نے بند مٹھی سے میز پہ مکا مارا۔ "او کے، او کے، چلو۔ لیکن اس طرح نہیں۔ اپنا یہ اسلحہ ہٹا لو سامنے سے۔"

میں نے مشین گن کو پھر کوٹ میں ڈال دیا۔ "میری برداشت کا حوصلہ آزمانے کی پھر کوشش مت کرنا۔ میں تمہیں دوسرا موقع بھی نہیں دوں گا اور تمہارے ساتھ سب کو فنا کر دوں گا۔ اس کلب کو تباہ کر دوں گا، آگ لگا کے۔ میں جان ہتھیلی پہ رکھ کے آیا ہوں اور مرنے سے ڈرتا بھی نہیں۔ میری موت سے تم کو ڈرنا چاہیے کیونکہ میں مرنے سے پہلے ان سب میں موت تقسیم کروں گا جو تمہارے دادا گیری کے کاروبار کو چلاتے ہیں۔ تمہاری بدمعاشی کی بساط کے تمام فرزیں اور پیادے سب مارے جائیں گے شیاموداوا!"

میرا بدلا ہوا لہجہ یکسر مختلف تھا۔ اب گنگارام نہیں سکندر بول رہا تھا۔ چنانچہ شیاموداوا واقعی خوفزدہ نظر آنے لگا تھا۔ وہ عورت بھی پوری طرح ہوش میں آ گئی تھی اور اس نے ادھر ادھر سے اٹھا کے پورے کپڑے بھی پہن لیے تھے۔

شیاموداوا دروازے کی طرف بڑھا۔ "میری واپسی تک تم یہیں رہو گی۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے عورت کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"اگر کوئی بہت اصرار کرے۔" میں نے کہا۔ "تو تم کہہ سکتی ہو کہ شیاموداوا اپنے بھانجے کے ساتھ گئے ہیں اور بھانجا گنگارام کسی فلمی میوزک ڈائریکٹر کے آرکسٹرا میں وائلن بجانا چاہتا تھا۔"

صورت حال پوری طرح میرے قابو میں تھی اور میں کسی قسم کی خونریزی یا ہنگامہ آرائی کے بغیر شیاموداوا کو ساتھ لے کر جا سکتا تھا لیکن تجسس کا جذبہ جو میری فطرت میں شامل تھا، ایک سوال بن گیا۔ میں نے کہا۔ "شیاموداوا! اگر میں تمہاری بات مان لیتا اور ہم اس طرف سے جاتے تو کیا ہوتا؟"

شیاموداوا نے کہا۔ "کچھ بھی نہ ہوتا۔"

معلوم نہیں کیوں اس کے جواب کو میں نے چیلنج سمجھ لیا حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے شیاموداوا کے سرسری جواب میں کوئی تضحیک کا پہلو ہے۔ وہ میرا مذاق اڑا رہا ہے یا مجھ پہ طنز کر رہا ہے کہ زبانی دعوے تو میں بہت بڑے کر لیتا ہوں لیکن در حقیقت ڈرتا ہوں اور ایک بزدل آدمی ہوں۔ پھر مجھے یہ شک بھی ہوا کہ وہ مجھے ٹال رہا ہے اور مجھ سے کچھ چھپانا چاہتا ہے۔

میں نے کہا۔ "بس تو پھر ہم ادھر سے ہی چلتے ہیں۔"

شیاموداوا کا چہرہ بگڑ گیا۔ "نہیں، اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب میں چاہتا تھا تو تم اڑ گئے تھے۔ اب میں نہیں چاہتا۔"

میں نے کہا۔ "افسوس کی بات یہ ہے شیاموداوا! کہ تمہارے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سمجھ لو کہ میں پھر

www.paksociety.com

ادُّ گیا ہوں اور تم پھر بھی بجوب ہو۔"
اس سے پہلے کہ شیامو داوا کے ردِ عمل کا اظہار ہوتا،
دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایک خوف ناک سکھ اندر آ گیا۔ اس
کی گھنی داڑھی اور مونچھوں کے سیاہ بالوں میں چہرہ تقریباً چھپ
گیا تھا۔ ناک کے اوپر دو خون آشام آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔
سر کے بالوں کو اس نے جوڑے کی شکل میں باندھا تھا اور اس
طرح اپنے ساڑھے چھ فٹ قد میں مزید اضافہ کر لیا تھا۔ اپنے فربہ
جسم کے باعث وہ ایک دیوزاد لگتا تھا۔ اس نے میلی پتلون کے
ساتھ ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے ساتھ مگر ایک قدم
پیچھے رہ کر چلنے والے دو ایسے افراد بھی کمرے میں گھس آئے جن کو
بمبئی کی زبان میں موالی کہا جا سکتا تھا۔
میں نے ان کے اندر آتے ہی محتاط پوزیشن لے لی تھی جہاں
سے میں ان سب پر نظر رکھ سکوں اور ضرورت پڑے تو کوئی
عمل کر لوں پہلے میں یہی سمجھا تھا کہ میری وارننگ کے باوجود
شیامو داوا نے باہر سے حمایتی بلوا لیے ہیں اور آنکھیں چھپل پھینے
کے باوجود میں یہ نہ دیکھ سکا کہ اندر سے رابطہ کس نے قائم کیا
اور کیسے کیا؟ لیکن میرا یہ تاثر فوراً ہی ختم بھی ہو گیا۔
سکھ نے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے شیامو داوا کی طرف
پیش قدمی کی۔ ایک موالی نے لات مار کے دروازہ بند کر دیا۔
"شیامو! کیا بات ہے پتر۔ اب تیرے اتنے نخرے
ہو گئے ہیں کہ دروازہ بند ہو تو ہم بھی نہیں آ سکتے۔" سکھ نے
بگڑتے ہوئے پنجابی لہجے میں کہا۔ "وہ جو تیرا پیو باہر بیٹھا ہے
اس کو میں نے کہا کہ مار کے پتھر تو تھا لنگا ڈ دوں گا۔"
"وہ... دراصل میں کہیں جا رہا تھا۔" شیامو داوا نے
میری طرف دیکھ کے کہا۔
"او نے کنجر! اب ہم آئے ہیں تیرے پاس تو تو کہاں
جا رہا ہے؟" سکھ نے اس کو شانے پہ ہاتھ مار کے دھکا دیا۔
"روز باہر ہی ہوتا ہے تو۔ کیوں کھول لے ہو چکر بازی ہمارے
ساتھ...؟"
"کوئی چکر بازی نہیں۔" شیامو داوا نے پریشان ہو کے
کہا۔ "ایسا ہوا دو تین بار کہ تم آئے تو میں واقعی نہیں تھا۔"
"اچھا چھوڑ پچھلی باتیں۔ صاف بات کر کہ مال کدھر ہے؟"
سکھ نے ننھی سی کرپان سے دانتوں میں خلال شروع کیا۔
"دیکھو سردار جی! تم بیٹھو یہاں۔ میں ابھی آتا ہوں پھر اطمینان
سے بات کریں گے۔" شیامو داوا نے میرا اشارہ سمجھ کے کہا۔
"مجھے بہت ضروری کام ہے۔"
سکھ نے اسے دھکا دے کے بیڈ پہ گرا دیا۔ "سور دا پتر!
تجھے ضروری کام ہے تو ہم کیا کھیل کرنے آئے ہیں اور حرامی جواب
دے میری بات کا ورنہ..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کے ساتھ
آنے والوں کی طرف دیکھا۔ وہ پوری ریہرسل کر کے آئے تھے۔
ورنہ کا لفظ سنتے ہی انھوں نے کمانی والے خنجر نکالے۔ ایک
بار ان کو کھولنے کے خطرناک آواز کا ڈرامائی تاثر پیدا کیا اور پھر
انھیں یوں واپس جیب میں ڈال لیا جیسے فی الحال انھوں نے
سب کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہو۔
شیامو داوا نے خشک حلق کو تھوک نگل کے تر کیا۔ وہ میری
موجودگی میں سردار جی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا مگر یہ دیکھ
رہا تھا کہ مطمئن ہوئے بغیر سردار جی بھی ٹلنے والے نہیں۔ اس نے کہا۔
"سردار جی! مال کہیں نہیں جاتا۔ آپ کے میرے درمیان کبھی بھی
ہیرا پھیری والی بات ہوئی ہے؟"
"پھر اس بار کیوں ہو رہی ہے؟ چکر کیوں دے رہا ہے
مجھے؟" سردار جی نے غرا کے کہا۔
"چکر کیا سردار جی، مال تھوڑا ہے..."
"جل تھوڑا ہے تو تھوڑا ہی دے۔ سور دے پتر! رہا
نہیں تو دکھا ہی دے۔ ورنہ۔" سردار جی نے کہا۔
ورنہ پر سردار جی کے چیلوں نے ایک بار پھر اپنے اپنے
خنجروں کے اسپرنگ چیک کیے۔ اب میرے لیے دخل اندازی
کا جواز پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی وجہ سے ہماری روانگی ملتوی ہو رہی
تھی اور... کچھ میرے ہاتھوں میں بھی کھجلی ہونے لگی تھی۔
میں نے کہا۔ "کیا بات ہے؟ یہ خنجر خراب ہیں یا ان کا
دماغ خراب ہے؟"
سردار جی نے مجھے گھورا۔ "کیا مطلب ہے اس کا اوئے؟"
میں نے کہا۔ "تمھارے اشارے کو خوب سمجھتے ہیں تمھارے
دونوں بندر۔ ان کے خنجر اصلی ہیں یا نقلی؟"
سکھ نے حلق سے ریچھ جیسی آواز نکالی۔ "بہت لمبی زبان
ہے تیری پاگل دے پتر۔"
میں نے کہا۔ "زبان تو اتنی ہی لمبی ہے جتنی تمھاری مگر
ہم بلاوجہ بولتے نہیں۔ اتنی دیر سے چپ تھے ورنہ..."
"ورنہ... ورنہ کیا اوئے؟ دھمکی دیتا ہے؟" سردار جی
نے اپنے ہاتھ سے میرے شانے کو دھکا دیا۔
میں نے کہا۔ "سردار جی! ہم کو کام سے جانا ہے تھا۔ آپ
نے بہت وقت برباد کر دیا ہمارا۔ اب آپ ہمارا راستہ چھوڑ دیں
ورنہ..."
دوسری بار "ورنہ" کی دھمکی سن کے سکھ کے غصے کی انتہا
نہ رہی۔ اس نے چیخ کر مجھے ایک گالی دی۔ "ورنہ دے پتر...

تیری تو..."
اس کے دونوں چیلے ایک ساتھ مجھ پہ جھپٹے۔ میں نے
غوطہ مار کے خود کو بچایا لیکن اس طرح کہ سیدھا سردار جی میں
گھس گیا۔ وہ شیامو داوا سے ٹکرائے۔
میں نے چلا کے کہا۔ "اوئے سردار! تیرے تو میں بارہ بجا
دوں گا۔ روک اپنے بندروں کو ورنہ..."
سردار جی نے چیخ کر کہا۔ "مارو اس... کو... اس کی
ہڈیاں توڑ دو۔ تو تھا لنگا ڈ دو اس کا۔"
وہ دونوں جن کو میں نے بندر کہا تھا سخت مشتعل ہو کے
پھر حملہ آور ہوئے۔ میری پھرتی نے ان کے پہلے حملے کو ناکام
بنا دیا تھا اور انھیں کچھ حیران بھی کیا تھا۔ دوسری کوشش کے
لیے انھوں نے مجھے دو طرف سے محصور کیا اور آہستہ آہستہ
آگے آئے۔ میں ایک ایک قدم پیچھے ہوتا گیا۔
سردار جی نے کہا۔ "تو تے کر دو اس... کے۔"
شیامو داوا نے سخت پریشان ہو کے کہا۔ "سردار جی... جھگڑا
چھوڑیے۔ معاملہ بگڑ جائے گا۔" وہ سمجھ رہا تھا کہ حملہ آور جب
خنجر نکالیں گے تو میں مشین گن نکال لوں گا۔ اور اس کے لیے
جو خون خرابا ہو گا، اس میں نقصان صرف اسے ہو گا۔
میں نے کہا۔ "تمھاری اماں بندریا تھی یا باپ بندر تھا؟"
حسبِ توقع وہ ایک ساتھ اچھل کر آگے آئے۔ میں نے
بھی اچھل کے ایک کے لات ماری اور دوسرے کا سر اپنی بغل
میں دبا کے اسے یوں گھمایا کہ اس کے پیر اوپر اٹھ گئے۔ ایک
پورا چکر دے کر میں نے اسے دیوار پہ دے مارا۔ اتنی دیر میں
لات سے دور جا گرنے والا پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ خنجر نکال
کے آگے آیا اور میں نے وار کا انتظار کیا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ
اٹھا میرا بھی ہاتھ اٹھا۔ میں نے خنجر والے ہاتھ کی کلائی پکڑ کے
ایک جھٹکا دیا۔ وہ ایک دم نیچے جھکا تو میں نے اس کی ٹھوڑی
پہ گھٹنا مارا اور پھر اس کی بیلٹ میں ہاتھ ڈال کے اسے اٹھا
اٹھا لیا۔ جب میں نے اسے ایک چکر دیا تو اس کے دونوں
ہاتھ پھیل گئے اور اس نے کہا۔ "ہو... ہو... ہو۔" پھر وہ اس
جہاز کی طرح اڑتا ہوا گیا جس کا پائلٹ اندھا ہو۔ میں نے اسے
پہلوان کے پیچھے چھپی ہوئی دیوار سے سر ٹکراتے دیکھا۔ تصادم
اتنا شدید تھا کہ اس کا سر چپٹا ہو گیا ہو گا۔ اچھے ناریل کی طرح
چٹخ گیا ہو گا۔ دھماکے کی آواز پہلے آئی پھر اس نے چلا کے کہا۔
"ہائے اماں! مارا اور وہیں گر گیا۔ پہ دوں اور بیڈ کے درمیانی
خلا میں۔"
میری مصروفیت کے وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے
شیامو داوا نے دروازے کی طرف دوڑنے کی کوشش کی۔
اسے دوڑ کے نہیں پکڑ سکتا تھا چنانچہ میں نے کو سیٹ
مشین گن پھینک کر اس کی ٹانگوں پہ ماری۔ وہ الجھ کے منہ
کے بل گرا۔ اس کے اٹھنے سے پہلے میں اس پہ لیٹ گیا کہ وہ
میرے بوجھ سے دب گیا۔ مشین گن کو میں نے لات مار کے دور
کیا اور شیامو داوا کو کالر سے پکڑ کے کھینچ لیا۔ ایک بھرپور فلیٹ
ہینڈ نے اسے سردار جی کے قریب لٹا دیا۔
"سردار جی...!" شیامو داوا نے اٹھتے ہوئے چلا کے کہا۔
"کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ یہ ہم دونوں کا دشمن ہے۔ دونوں
کو تباہ کرنے آیا ہے۔"
سردار جی پر دیوانگی کی کیفیت طاری تھی۔ یہاں وہ اپنے
دو بندے مروانے نہیں آئے تھے لیکن آدھے منٹ میں ایک
چھچھوندر صورت آدمی نے اس طاقت کو شکست دے دی تھی جس
پر انھیں غرور تھا۔
شیامو داوا کی آواز پہ وہ چونکے۔ "مجھے پہلے کیوں نہیں
بتایا پاگل دے پتر۔ میں تو سمجھا تھا یہ کوئی نوکر ہے تیرا۔"
"میں آپ کا بھی خادم ہوں سردار جی۔" میں نے دونوں
ہاتھوں کو مل کے انھیں مقابلے کی دعوت دی۔ شیامو نے
ایک صوفے کے اوپر سے جست لگائی اور میرے سر پر پیچھے
سے ٹکا مارا۔ اس فولادی ٹکے نے ذرا سی دیر کے لیے میری
نظروں کے سامنے اندھیرا کر دیا۔ مجھے سر کو جھٹک کر سنبھلنے
میں چند سیکنڈ لگے۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے
سکھ مجھ سے چمٹ گیا۔ اس نے میری کمر کے گرد دونوں ہاتھ
ڈال کے مجھے اٹھا لیا۔ میرے قدم زمین سے چند انچ اوپر تھے
جب شیامو داوا نے وہ مشین گن اٹھائی جو میں نے کچھ دور
چھوڑ دی تھی۔ یہ غلطی مجھے بہت مہنگی پڑ گئی اگر شیامو داوا اطمینان
سے کونے جاتا اور گن کا رخ میری طرف کر کے مجھے بیٹھ آپ
کرا لیتا لیکن بد حواسی یا عجلت میں اس نے مشین گن کو ڈنڈے
کی طرح استعمال کیا اور اس کا دستہ میرے سر پہ مارنے کی
کوشش کی۔
میں نے سردار جی کی گرفت سے نکلتے ہوئے ایک
ٹانگ تیزی سے گھمائی ___ میرے جوتے کی ایڑی اس کی
ناک کے نیچے لگی۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے گیا۔ سردار جی اپنے
سر سے میرے سینے پہ گرز کی طرح دھم دھم وار کر رہے تھے۔
میں نے ان کے کیس کا جوڑا پکڑ لیا۔ اور پیچھے کی طرف ایسا
جھٹکا دیا کہ سردار جی کا منہ کھل گیا۔ ان کے ہاتھوں کی گرفت
کچھ ڈھیلی ہوئی تو میں نے دوسرا ہاتھ ان کے نرخرے پہ مارا۔

www.paksociety.com

سردار جی کے حلق سے ایسی آواز نکلی جیسے کوئی غرارے کر رہا ہو۔ وہ فرش پہ لوٹنے لگے۔

ان کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی میں شیاموولوا کی طرف پلٹا۔ وہ مشین گن کو نکال چکا تھا لیکن اسے اتنی مہلت دینا کہ اس کا رخ میری سمت کر سکتا۔ میں اسے ساتھ لیتا ہوا دیوار تک ایک طوفانی قوت کے ساتھ گیا۔ شیاموولوا میرے اور دیوار کے درمیان دب کے بلبلایا۔ ایک جھٹکے میں اس کے ہاتھ سے مشین گن چھین کر میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ میرا گھٹنا اوپر اٹھا اور اس کے پیٹ سے زناٹے سے لگا۔ وہ دہرا ہوا تو میں نے اس کے سر کو پھر دیوار پہ مارا۔ میرا پاؤں پھر اٹھا۔ اس مرتبہ گھٹنا صحیح جگہ پہ زیادہ قوت کے ساتھ لگا۔ شیاموولوا تڑپا مگر اس کی آواز حلق میں گھٹ کے رہ گئی۔ وہ تکلیف اور درد کی شدت سے میرے اوپر گرنے لگا۔ میں نے اسے دیوار سے دور کھینچا اور لات مار کے منہ کے بل فرش پہ گرا دیا۔ پھر میں نے اس کی پسلیوں کے بیچ بوٹ کی ٹھوکریں ماریں اور اسے لڑھکاتا ہوا ادھر لے گیا جہاں سردار جی اب اپنے قدموں پہ کھڑے ہو چکے تھے۔

میں نے سردار جی کے ہاتھ میں ایک فٹ لمبی چمکتی ہوئی کرپان دیکھی۔ ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ ایک جنونی کیفیت میں انہوں نے "ست سری اکال" کا نعرہ لگایا اور مجھ پہ وار کیا۔ کرپان لہراتی ہوئی میری گردن کی طرف آئی۔ میں نے سر کو پیچھے کیا۔ پیچھے دیوار تھی۔ میرا سر دیوار پہ لگا۔ کرپان میرے رخسارے کو تقریباً چھوتی ہوئی گزر گئی۔ دیوار پہ لگنے سے میرا سر چکرانے لگا تھا لیکن میں نے حواس بحال رکھے۔ دوسری بار ست سری اکال کہہ کر سکھ نے کرپان کو میری پسلیوں میں گھسیڑنے کی کوشش کی اور یہ وار بہت قریب سے کیا گیا تھا۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کرپان کا یہ وار کارگر ہو جاتا تو میری انتڑیوں کو ادھیڑ دیتا۔ خود کو بچانے کے لیے میں نے آگے کی طرف جست لگائی اور کرپان نیم دائرے میں لہرا کر دیوار پہ لگی۔ میں سردار جی کے سینے سے لگ گیا۔ میرے ایک ہاتھ کی کراٹے کی ضرب نے سردار جی کے اس بازو کو مفلوج کر دیا... جس میں کرپان تھی۔ سردار جی نے وحشیانہ انداز میں اپنا سر مار کے مجھے پیچھے ہٹنے پہ مجبور کر دیا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ اب یہ فنا و بقا کی جنگ ہے جس میں کسی کی مدد کرنے والا کوئی نہیں۔ ہارنے والا زندگی ہار جائے گا۔

پلک جھپکنے میں سردار جی نے جھک کر کرپان دوسرے ہاتھ میں اٹھائی۔ میں قدم جما کے کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے پہلا وار خالی دیا۔ کرپان سنسناتی ہوئی میرے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ پھر میں نے ایک دم اٹھ کے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی کا خنجر نما وار کیا جو ان کی گردن پہ پڑا اور فیصلہ کن ثابت ہوا۔ سکھ کی سانڈ جیسی گردن ایسے ٹوٹی جیسے کوئی خشک ٹہنی چٹختی ہے۔ اس نے ایک بھیانک آواز نکالی اور ہاتھ پھیلا کے فرش پہ سیدھا گرا۔

شیاموولوا نے بیڈ کی سائیڈ پکڑ کے اپنے وجود کو گھسیٹا اور جس بیڈ پہ وہ کچھ دیر پہلے داد عیش دے رہا تھا، اسی پہ گر کے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کی ناک سے اور منہ سے خون برس رہا تھا اور وہ ایک ہاتھ پسلیوں پہ رکھے کراہ رہا تھا۔

میں ساڑھے چھ فٹ قد والے ولوناد کو زندگی کے کرب میں ایڑیاں رگڑتے دیکھتا رہا۔ اس جنگ کو جو شاید پانچ سات منٹ جاری رہی تھی، ایک عورت نے بھی خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ اس تمام عرصے میں میرا دھیان صرف ایک بار اس کی طرف گیا تھا۔ اسے بے نیازانہ انداز میں خاموش دیکھ کے مجھے حیرانی ہوئی تھی۔ اگر وہ چاہتی تو اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چیخ و پکار کر سکتی تھی یا دروازے سے بھاگ سکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

وہ اب بھی بیڈ کے ایک کنارے پہ سہمی بیٹھی تھی۔ تب اس کی صورت پہ خوف اور دہشت کی جگہ نفرت کے زہر میں بجھی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کے تعجب ہوا۔ وہ شیاموولوا کو خاص انتقامی دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

شیاموولوا نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ "گنگارام! سچ بتاؤ تم کون ہو؟ کس نے بھیجا تھا تم کو؟"

لڑکی اچانک ہنسنے لگی۔ "مجھ سے پوچھو شیامو۔ یہ سب تمہاری شامت اعمال۔ اس کھیت کی فصل جس کو تم بوتے رہے اب کاٹنے کا وقت آگیا ہے شاید۔"

شیامو نے اس کے منہ پہ الٹا ہاتھ مارا۔ "تو کیوں بھونکنے لگی ہے کتیا..."

لڑکی نے ایک دم اس کے بال پکڑ لیے اور اس کے سر کو زور زور سے ہلانے لگی۔ "تو اب کیسے کاٹنے کا کہتے ہیں تیرا تو بھونکنا بھی مشکل ہوگا۔ ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہی تھا۔ سانپ کا سر بھی کوئی لاٹھی کچل دیتی ہے۔ آگ لگانے والے بھی ایک دن جل جاتے ہیں۔" وہ دیوانہ وار قہقہے لگانے لگی۔ یہ اس کے ہسٹریا کا اثر تھا۔ اس کی ہنسی درحقیقت وہ آنسو تھے جن کو بہنے کی عادت نہیں رہی تھی۔

شیاموولوا غصے میں پھنکارتا اٹھا۔ "پہلے میں تجھ سے ہی نمٹ لوں..."

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اگر اب بھی دم ہے ان ہاتھوں میں تو آؤ مجھ سے دو دو ہاتھ کر لو۔ عورت سے مقابلہ تم جیسے دادا کہلانے والے کو زیب نہیں دیتا۔"

شیامو نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ "دیکھو گنگارام تم جو بھی ہو تم نے بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے مجھے۔ دیکھو یہ کیا کر دیا ہے تم نے۔ تم اتنے بھولے بن کے ترلوچن کا پتا پوچھنے آئے تھے۔ میں نہیں مانتا۔ ضرور کسی دشمن نے بھیجا تھا تم کو مجھے تباہ کرنے کے لیے۔ سچ بتاؤ تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے تھے....؟"

میں نے کہا۔ "جب تم میرے ساتھ جاؤ گے تو تمہیں اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا۔ میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا تم سے۔"

"مگر اب میرا کیا ہوگا... یہ لوگ مجھے چھوڑنے والے نہیں ہیں۔" اس نے فریادی لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ "ان سے اب کیوں ڈرتے ہو۔ مردے تمہارا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟"

لڑکی پھر ہنسی۔ "اس سے مت پوچھو گنگارام۔ اسے بھی انہی کے ساتھ کر دو۔ پھر اس کے لیے ڈرنے کی بات کوئی نہیں رہے گی۔ اسے کیوں بخش رہا ہے تم نے؟ مار ڈالو اس کو بھی اور بھاگ جاؤ یا وہ کرپان اٹھا کے مجھے دو۔ میں اس کے کتنے ٹکڑے کر دوں۔ تم وہ ٹکڑے کتوں کے سامنے ڈال دینا۔"

میں نے نرمی سے کہا۔ "اگر اتنی ہمت تھی تم میں تو آج تک تم کیوں خاموش رہیں؟"

شیاموولوا نے اسے حقارت سے دیکھا۔ "یہ پیسہ چوس کے پلنے والی جونک ہے۔ اس پہ بھروسا مت کرنا۔ یہ تمہارا خون تک چوس جائے گی مگر اس کی پیاس نہیں بجھے گی۔"

عورت ایک دم اس پہ حملہ آور ہوئی۔ "میں.... میں جونک ہوں۔ کتنا پیسہ دیا ہے تو نے مجھے؟ کہاں ہے وہ پیسہ۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سب تو نے چھین لیا۔ میرا جسم تک میرا نہیں..." اس نے دیوانہ وار شیاموولوا کا چہرہ نوچ لیا۔ اس کے بال کھینچے اور اس کے کپڑے پھاڑ دیے۔ اس نے شیاموولوا کے جسم کو ناخنوں سے یوں کاٹا کہ جگہ جگہ سے خون رسنے لگا۔ وہ ایک زخم خوردہ پاگل ہو جانے والے وحشی درندے کی طرح شیاموولوا پر ٹوٹ پڑی تھی۔

میں نے سخت جدوجہد کے بعد شیاموولوا کو اس سے الگ کیا۔ وہ بستر پہ گر کر رونے لگی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے یوں ابلنے لگے جیسے برسوں کے سوئے ہوئے آتش فشاں سے لاوا ابلتا ہے۔ اس کا وجود ان آنسوؤں کی یلغار میں بہہ گیا۔ وہ ہچکیاں لیتی رہی اور اس کا جسم جھٹکوں سے لرزتا رہا۔

شیاموولوا اب سخت خوفزدہ تھا۔ اس نے التجائیہ انداز میں کہا۔ "گنگارام! جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب تم میرا ساتھ دو۔ تو ہم اس مصیبت سے بچ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کون سی مصیبت...؟"

اس نے کہا۔ "تم نے تین قتل کر دیے جب اور... پھر بھی یہ پوچھتے ہو کہ کیسی مصیبت... کیا تمہیں معلوم ہے یہ کتنے خطرناک لوگ تھے؟"

"چلو اب تو خطرناک نہیں رہے۔" میں نے کہا۔ "مردے کسی کے لیے خطرہ پیدا نہیں کرتے۔ تم نے تو بہت مردے ٹھکانے لگائے ہوں گے۔ کتنے قتل کیے ہوں گے۔ بھاڑ جھونک کے تو دادا نہیں بنے ہو گے تم۔"

اس نے کہا۔ "معلوم ہے ان کو کس نے بھیجا تھا؟ بہت بڑا دادا ہے وہ۔ ہم تم مل کے اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ تم میرے ساتھ رہو۔ اس میں ہم دونوں کا فائدہ ہوگا۔"

میں نے اسے بالوں سے پکڑ کے اٹھا لیا۔ "یہ سکھ تم سے کس مال کی بات کر رہا تھا؟"

لڑکی نے روتے ہوئے اپنا سر اٹھایا۔ "میں ہوں وہ مال۔ مجھے دیکھ لو۔ مجھ سے پوچھو کہ میری قیمت کیا ہے۔ میری مجبوری کی اور میری خاموشی کی قیمت کیا ہے۔ تم نے پوچھا تھا کہ میں آج تک خاموش کیوں رہی؟ خاموش نہ رہتی تو کیا کرتی۔ میں بک چکی تھی۔ میں بھلا کیسے بول سکتی تھی۔ بولتے تھے میری بولی لگانے والے۔"

میں نے شیاموولوا کے سر کو ایک مرتبہ بیڈ کے کنارے پہ مارا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں ہاں، میں جو تمہیں بتا رہی ہوں کہ سچ کیا ہے۔ باقی سچ بھی سن لو مجھ سے۔" اس نے سسکیوں کے درمیان کہا۔ "کوئی نئی کہانی نہیں ہے میری۔ سوتیلے بھائی نے بیچا تھا مجھے۔ مجھ سے تین گنا عمر کے بڈھے نے پندرہ سو میں مجھے۔ جسم منڈی بنا لیا تھا۔ شیامو کو وہ مار چکا تھا یا ایک ایسے انسان کو قتل کے جرم میں جیل کاٹ رہی تھی۔ وہ بھاگ گئی تھیں۔ پھر وہ مجھ پہ کیسے بھروسا کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔ اسے مار دوں گی یا کسی جوان کے ساتھ بھاگ کر چلی جاؤں گی۔ اور اس کا یقین غلط نہیں تھا۔ موقع ملتا تو میں یہی کرتی۔ لیکن

www.paksociety.com

چھ مہینے گزر گئے وہ مجھے مقفل رکھتا تھا۔ رات کو بھی میرے ایک ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے باندھ کر سوتا تھا۔ ہتھکڑی ڈال دیتا تھا۔ میں ذرا بھی حرکت کرتی تو وہ اُٹھ بیٹھتا۔ مگر بھگوان نے میری سُنی۔ وہ خود ایک رات سوتے میں مر گیا۔ میں رات بھر ایک لاش کے ساتھ بندھی پڑی رہی۔ صبح میری چیخ و پکار سن کے لوگوں نے گھر کا دروازہ توڑا اور اندر آئے تو انھوں نے دیکھا... کیا دیکھا... خیر چھوڑو۔ بڈھے کی خباثت تو مرنے کے بعد ظاہر ہوئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہر رات وہ تکیے کے نیچے کوئی خط رکھ کے سوتا ہے۔ وہ خط پولیس کے ہاتھ لگ گیا جس میں لکھا ہوا تھا کہ مجھے اپنی بدچلن جوان بیوی کے ہاتھوں قتل ہو جانے کا ڈر ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو اس سے ضرور پوچھ گچھ کی جائے۔ تم تو جانتے ہو کہ تھانوں میں پوچھ گچھ کیسے ہوتی ہے۔ ایک مہینے بعد کوئی میرا اضافی بن کے آیا اور مجھے تھانے سے چھڑا کے لے گیا۔ چھ ماہ میں کتنی بار بکا ہے یہ مال... مجھے نہیں معلوم۔ ہاں ایک بات مجھے یہاں آنے کے بعد معلوم ہوئی کہ غلاظت کے اس گٹر میں بہہ کر یہاں پہنچنے والی صرف میں ہی نہیں ہوں۔ اس گندگی میں میرے ساتھ جینے والی بہت ہیں۔ تم بھی مال دیکھنا چاہتے ہو۔ جاؤ اس دروازے کے پیچھے جا کے دیکھو... ابھی مال تھوڑا ہے۔ لیکن کل اور مال آئے گا۔ پرسوں بھی آئے گا... اس کے بعد بھی آتا رہے گا... گٹر اتنا چالو ہے..."

شیا موداوا کا خوف سے بُرا حال تھا۔ وہ لڑکی کو پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھور رہا تھا اور اپنی بے بسی پہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اب انکار سے کچھ نہیں ہوگا۔ تقدیر نے، ستاروں نے چال بدل لی ہے۔ اور اس کے گھناؤنے کاروبار کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ وہ صرف اس عورت کو ذمے دار قرار نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی تباہی کا آغاز میری تشریف آوری سے ہوا تھا۔ پھر اس کا ظہور ان تین افراد نے آگے بڑھایا تھا جو اب اس دُنیا میں نہیں رہے تھے۔ انتہا اس عورت نے کی تھی کہ جو ظاہر نہ تھا وہ بھی افشا کر دیا تھا۔

میں نے اسے نظر جما کے دیکھا تو وہ نروس ہو گیا۔ "دیکھو گنگارام! ان معاملات کو مت چھیڑو۔ سب کا اپنا اپنا دھندا ہے۔"

"شیا موداوا! کیا تم دُنیا میں اکیلے ہو؟ تمھارا کوئی خاندان ہے؟" میں نے کہا۔ "خاندان میں سب ہی شامل ہوتے ہیں۔ ماموں، چچا، بھانجے، بھتیجے، قریب اور دور کے رشتے دار۔"

اس نے کنفیوز ہو کے کہا۔ "خاندان... ہاں ہے..."

میں نے کہا۔ "تو پھر پریشانی کیا تھی۔ مال کم تھا تو اپنے اسی خاندان کی عورتیں شامل کر کے بات ختم کرتے۔ بہوؤں یا بیٹیوں کے علاوہ بھی تو جوان عورتیں ہوں گی۔ بھانجیاں اور بہنوں کی نندیں... اور بھتیجوں کی سالیاں... جیسی ایک عورت ویسی دوسری عورت۔ گھر کے مال کی اچھی قیمت ملتی تو رقم تمھاری ہی جیب میں جاتی۔"

اس کا چہرہ غصے کو ضبط کرنے کی کوشش میں بگڑ گیا۔ "فالتو بات مت کرو۔ تم تو رتنیوتی کے پاس چلے ہی ہو۔"

میں نے کہا۔ "دیر تو اب ہو ہی گئی ہے۔ اس بک بک میں تم نے ایک گھنٹا قیمتی دن سے اپنا قلعہ بچا مستقبل اور بہت کچھ بے سبب ہی ضائع کیا۔ دیر سے کام بگڑ بھی جاتے ہیں۔ تم شروع میں ہی اس تعاون کے جذبے کا مظاہرہ کرتے جو اب میرے ساتھ چل پڑتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا جو بعد میں ہوا۔ لیکن اس وقت تم اپنی داداگیری کے زعم میں تھے اور گنگارام تمھارے سامنے ایک کاٹھ کا اُلّو تھا۔"

"چلو غلطی ہوئی مجھ سے۔ میں اپنا قصور مانتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ایک بات میرے لیے اُلجھن کا سبب ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اتنی دیر سے تقریباً ایک گھنٹا ہو گیا، نہ کوئی اندر آیا، نہ کسی نے تم سے دھندے کام پہ بات کی اور نہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کیا یہ خاموشی تم جیسے مصروف اور اہم آدمی کے معمولات سے غیر معمولی نہیں لگتی۔ تم نے میرے سامنے کسی کو منع بھی نہیں کیا کہ اندر نہ آئے۔"

شیا موداوا کا رنگ اُڑ گیا۔ "وہ سب لوگ جانتے ہیں کہ ایک وقت میں ایک پارٹی سے بات کرتا ہوں میں..."

"جو ٹیلی فون کرتے ہیں تمھیں، ان کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت تمھارے ساتھ کون ہے۔ ایک پارٹی تو اس وقت بھی اندر تھی، جب تمھارے دربان نے جا کے میری آمد کا اعلان کیا تھا۔ اندر آ گئے۔"

"صاف کہو کیا کہنا چاہتے ہو...؟"

"مجھے یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ محسوس ہوتی ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟ باہر سب ٹھیک ہے۔ سب کام روٹین کے مطابق ہو رہا ہے؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ گزشتہ ایک گھنٹے میں یہاں کیا کچھ ہوا؟ سب کو یقین ہے کہ شیا موداوا کے آفس میں سب خیریت ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا لیکن اس کا انداز بے یقینی کا مظہر تھا۔ اعتماد سے خالی اور مصنوعی۔

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ آگے چلو اور دروازہ کھولو۔ میرا خیال ہے کہ یہاں جو کچھ ہوا وہ کسی نہ کسی نے سُنا ضرور ہے یا دیکھا ہے نہ ہو۔ اگر میرا خیال ٹھیک نکلا تو سمجھ لو کہ بہت سے لوگ مارے گئے۔ وہ سب جو خاموشی سے باہر کوئی جال پھیلا رہے ہیں یا حفاظتی حصار قائم کر چکے ہیں۔ نہ وہ تم کو بچا سکتے ہیں اور نہ خود کو۔ لاشوں کے اوپر سے گزر جانا گنگارام کے لیے مشکل ضرور ہوگا مگر ناممکن نہیں۔ تم چاہو تو خونریزی کو روکنے کے لیے اور مکمل تباہی سے بچنے کے لیے ابھی کچھ کر لو۔ میں تم کو ایک منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔"

میں نے قیاس کی بنیاد پہ صحیح فیصلہ کیا تھا۔ شیا موداوا کو یکلخت بدترین شکست کا سامنا تھا۔ یہ اس کی دانست میں آخری ترپ کا پتا تھا جو مجھ سے پوشیدہ تھا اور جو یک لخت چھپتے ہیں میری فتح کے طور پر نقش باطل کر دیتا۔ وہ ڈوب رہا تھا مگر اسے ایک تنکے کا سہارا تھا۔ یہ سہارا بھی چھن گیا تو اس کی مایوسی ایک دم جنون و وحشت کی وہ کیفیت بن گئی جو آدمی کو پاگل کر دیتی ہے۔

اس نے چیخ کر مجھے ایک فحش گالی دی۔ اور مجھ پہ پیپر ویٹ وہ سب چیزیں پھینکنے لگا جو اس کی دسترس میں تھیں۔ اس نے چلا چلا کے کہا۔ "گنگارام! میں بھی شیا موداوا ہوں۔ تم مارنا ضرور چاہتے ہو مجھے مگر ابھی میں مرا نہیں ہوں۔ میں زندہ ہوں۔ میں دیکھوں گا تم زندہ نکل کے کیسے جاتے ہو۔ اگر میری لاش گرے گی تو مجھ سے پہلے تمھاری بوٹیاں ہو جائیں گی۔ تم میرے قلعے میں چوروں کی طرح گھس آنے کے بعد بہادری کا ڈنکا بجاتے ہوئے واپس جانا چاہتے تھے۔"

پھر اس نے چیخ چیخ کے ان سب کو پکارنا شروع کیا جو باہر پوری جنگی تیاری کے ساتھ صف بستہ تھے اور مجھے تہس نہس کر دینے کے لیے خاموشی سے مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ "چلو آ جاؤ سب... گھیر لو اس کو... ہر طرف سے اس کو چھلنی کر دو..." اس نے گلدان، ٹیبل لیمپ اور کئی ہر چیز اٹھا اٹھا کے میری طرف پھینکتے ہوئے اپنی دیوانگی کا تماشا جاری رکھا۔ میں پہلے خود کو بچاتا رہا جب تک اس کی عقل ساتھ تھی وہ میرے لیے قابل توجہ تھا لیکن اب کیفیت یہ تھی کہ وہ شخص ایک بپھرا ہوا وحشی جانور تھا۔ کسی جانور سے وہ انسان نہیں ڈر سکتا جو ہر قسم کے خطرناک اسلحے سے لیس ہو۔ میں جانتا تھا کہ بہت جلد تھک کے وہ بے دم ہو جائے گا لیکن جب اس نے مددگاروں کو پکارنا شروع کیا تو میں اپنے دفاع کے لیے مستعد ہو گیا۔

میں نے مشین گن کو اس کے کور سے نکال کے ایک ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھام کے میں نے شیا مو کے سر پہ وار کیا۔ اس کے گرتے ہی میں نے کونے میں پوزیشن سنبھال لی۔ جہاں سے دائیں اور بائیں ہاتھ کے دونوں دروازے میری نظر میں تھے۔

سب سے پہلے دو آدمی اندر آئے جن کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ وہ اسی دروازے سے داخل ہوئے تھے جس سے گزر کے پہلے میں آیا تھا اور بعد میں سردار جی کی موت انھیں کھینچ لائی تھی۔ وہ دونوں ضرورت سے زیادہ جوشیلے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے زور میں کمرے کے وسط تک آ گئے۔ وہ فحش گالیاں بکتے ہوئے مجھے للکار رہے تھے۔

"سامنے آ گنگارام..... تیری تو...."

میں کونے میں دیوار سے لگ کے ساکت کھڑا ہوا تھا۔ چنانچہ ان کی نظر براہ راست مجھ پہ نہیں پڑی۔ انھوں نے سب سے پہلے سردار جی کی لاش کو دیکھا۔ پھر ان کے ایک ساتھی کو۔ شیا موداوا سے ہوتی ہوئی ان کی نظر اس لڑکی پہ گئی جو ایک ہی جگہ بیٹھی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

مجھے کافی مہلت مل گئی تھی۔ میں اپنے نشانے کی مہارت کا موازنہ غالب کی مہارت سے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے ان دونوں کو براہ راست سر یا سینے میں گولی مار کے ہلاک کرنے سے گریز کیا۔ میں نے ان کے ہاتھوں کا نشانہ لیا۔ اس میں میری کامیابی کا اوسط پچاس فیصد رہا۔ ایک کے ہاتھ کی پشت پہ گولی لگی اور اس کا ریوالور ہاتھوں سے طوطے کی طرح اُڑ گیا۔ دوسرے نے فائر کیا مگر یہ ایک اضطراری فعل تھا۔ فائر کی آواز سنتے ہی اس نے پلٹ کے گولی چلا دی۔ اس نے نشانہ لیا ہی نہیں تھا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی اور دیوار میں پیوست ہو گئی۔ پھر میں نے دوسری گولی چلائی جو اس کی بدقسمتی کے باعث پسلیوں میں گھس گئی۔ اس نے ایک چیخ ماری اور فرش پہ پیچھے کی طرف گرا۔

پہلا شخص زخمی ہاتھ سے بہتے ہوئے خون کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور بُری طرح چلا رہا تھا۔ گولی نے اس کی ہتھیلی میں سوراخ کر دیا تھا۔ میں نے میز کے اوپر سے چھلانگ لگائی اور اس کو درد کے عذاب سے نجات دلا دی۔ میں نے اس کو بھی سر پہ ریوالور کا دستہ مار کے بے ہوش کر دیا۔

باہر اب خاصی افراتفری کا شور تھا۔ میں نے اس لڑکی سے کہا۔ "یہ پردے سے ہٹا ڈرو دروازہ کھولو۔"

اس نے سر ہلایا اور بہ مشکل کہا۔ "مالا..." وہ

www.paksociety.com

بڑی مشکل سے سنبھالا دے کر بولی۔

میں پھر بیڈ پر چھلانگ مار کے چڑھا لیکن اپنے پیچھے والے دروازے کو بھی دیکھتا رہا۔ ایک ناخن سے میں نے تالے کو توڑ دیا اور لات مار کے دروازہ کھولا۔ اسی وقت میری نظر شیامو دلوا پر گئی۔ وہ فرش پر گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا بیڈ تک پہنچ گیا تھا۔ ریوالور اسی کا تھا جس کی آنچل میں چھپا رکھا تھا اگر میری نظر چوک جاتی یا آگے بڑھتے وقت پیچھے کی طرف سے غافل ہو جاتا تو میرا کام وہیں تمام ہو جاتا۔ شیامو تھوڑا سا اوپر اٹھ کے گولی چلاتا تو میں اسے بہترین ٹارگٹ فراہم کرتا۔ بیڈ کے اوپر چڑھا ہوا اور کھلے دروازے کے فریم میں میرا جسم پس منظر کی روشنی میں بہت نمایاں تھا۔

میں نے سر کو جھکاتے ہوئے گولی چلائی اور پھر شیامو دلوا کو اچھل کر لٹو کی طرح گھومتے اور دیوار سے ٹکرا کر گرتے دیکھا۔ خون کا جوہڑ تھا! اس کی پیشانی سے پھوٹا تھا، اس نے دیوار کو قوس کی شکل میں سرخ رنگ دیا تھا۔

باہر والے دروازے میں ایک سیاہ پوش نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ سیاہ نقاب میں تھا اور وہ اوپر سے نیچے تک کالے رنگ کے ڈانگری ٹائپ لباس میں تھا جو اس کے بدن سے چپکا ہوا تھا۔ میں نے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور اسے اپنے ساتھ لے کر دروازے سے گزر گیا۔ ہم دوسرے کمرے کے فرش پہ گرے۔ یہ کمرا خلاف توقع خالی پڑا تھا۔ سیاہ پوش نے مشین گن کا جو راؤنڈ چلایا وہ ہمارے اوپر سے گزرا۔ کچھ گولیاں دروازے سے داخل ہوئیں اور چھت سے آویزاں شیشے کا خاصا بڑا گلوب ایک چھناکے سے بکھر گیا۔ اس کے ساتھ ہی اندھیرا چھا گیا۔ میں نے درمیانی دروازے کو اندر سے بند کرنے میں دیر نہیں کی اور لڑکی کو کھڑا کر دیا۔ میں نے کہا۔ ”تم کو راستے کا کچھ علم ہے؟“

لڑکی نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

ہم نے اندھیرے میں بھاگنا شروع کیا۔ ”تم ریوالور چلا سکتی ہو؟“

”میرے پاس ریوالور نہیں ہے۔“ وہ بولی۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔

میں نے اسے ریوالور تھما دیا۔ ”اس میں ابھی دو گولیاں ہیں۔ جو بھی سامنے آئے اسے بغیر سوچے مار دینا۔“

”دیکھو! آگے زینہ ہے۔“ اس نے کہا اور ایک چٹخنی کھولی۔ ہمارے پیچھے دروازے پر تڑاتڑ گولیاں لگیں۔ میں نے اپنے سامنے نیم روشن زینے کو دیکھا۔ یہ لوہے کا چکر دار زینہ تھا اس

پر تمام روشنی باہر سے پڑ رہی تھی۔ زینے کا اوپر والا دروازہ بھی لوہے کا تھا۔ میں نے اسے بھی کھینچ کے بند کیا۔ باہر سے اس کی کنڈی مدت سے نہیں لگائی گئی تھی اور زنگ سے جام ہو رہی تھی، مگر میں نے اسے بند کیا اور مشین گن کا دستہ مار کے ٹائٹ کر دیا۔

ہم دونوں تیزی سے نیچے اترنے لگے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ زینہ کہاں جا کے ختم ہوگا۔ اپنے دائیں بائیں دوسری ایسی ہی عمارات سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید ہم کسی عقبی گلی میں اتریں گے۔ وہ لڑکی جو کچھ دیر پہلے رو رہی تھی اور دہشت سے کانپ رہی تھی اب بجلی کی طرح سبکتی ہوئی زینے پر گھومتی جا رہی تھی۔ میں اس کے جسم کی لچک اور توازن کی حیثیت کا کیسے مقابلہ کر سکتا تھا۔ مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک ایک زینہ نہیں اتر رہی ہے، اس کے نازک پاؤں رقص میں ہیں۔ وہ اس تنگ سی جگہ میں تیرتی جا رہی تھی جہاں مجھے سنبھل کے قدم رکھنا پڑ رہا تھا۔ میرا زینہ ایک طرف سے چوڑا تھا، دوسری طرف اس کی چوڑائی مسلسل کم ہوتی تھی۔ چنانچہ میں چوڑے حصے کی طرف رہنے پر مجبور تھا۔ یہ چکر دار پرانی طرز کے زینے ہنگامی ضرورت میں استعمال کے لیے رکھے جاتے تھے، اور ہنگامی ضرورت آج مجھے درپیش تھی۔

لڑکی بار بار پلٹ کے کہتی تھی: ”جلدی، جلدی چلو۔“ اور میں صرف گردن ہلاتا تھا کیونکہ میں اس سے زیادہ جلدی کا مظاہرہ کرتا تو لڑھکتا ہوا نیچے پہنچتا۔ اوپر لوہے کے دروازے پر مسلسل دھم دھم ہو رہی تھی لیکن وہ ٹوٹنے والا دروازہ نہیں تھا اور اس پر گولیاں برسانے کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔

”یہ ہم کہاں آگئے؟“ میں نے ایک مختصر سے صحن میں پہنچ کے کہا۔

لڑکی نے کہا۔ ”انھیں گھوم کر آنے میں وقت لگے گا۔ وہ آئیں گے دوسری طرف سے۔ تم ادھر آؤ، میرے پیچھے۔“

اس کی خواہش کے مطابق میں پیچھے رہا۔ وہ ایک دروازے سے گزری جو صرف دو فٹ چوڑا تھا۔ اندر پہنچ کے میں نے اسے اور خود کو ایک ایسے باتھ روم میں پایا جس کی لمبائی چوڑائی ہم دونوں کے لیے کافی تھی۔ چنانچہ وہ مجھ سے تقریباً چپک کر کھڑی ہوئی تھی۔

مجھ سے صرف ایک فٹ اوپر روشن دان تھا۔ اس پر پہلے کبھی شیشہ بھی لگا ہوگا۔ اب مضبوطی اور باہر کے خطرے سے بچنے کے لیے تاروں کی باریک فولادی پروف جالی لگا دی گئی تھی۔ جالی خاصی پرانی تھی اور ممبئی کے ساحل کی مرطوب آب و ہوا میں زنگ سے گل چکی تھی۔

کسی دشواری کے بغیر میں نے جالی کو چاروں کناروں پہ مشین گن کی فولادی بیرل مار کے توڑ دیا۔ وہ میرے اٹھے ہوئے ہاتھوں کے اور دیوار کے درمیان دبی رہی۔ اس کا جسم نرم تھا چنانچہ دیوار پر کھسکتے ہوئے مجھے کوئی رگڑ نہیں لگی لیکن میرے وزن کے ساتھ اس کا کھردری دیوار نے کیا حال کیا ہوگا، اس کا اندازہ مجھے فوراً نہ ہوا۔

جب جالی ہٹ گئی تو میں نے اس کے کراہنے کی آواز سنی۔ میں نے کہا۔ ”معاف کرنا میں نے تو تمھیں سینڈوچ کر دیا۔“

وہ بولی۔ ”میرے جسم کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ سفاکانہ سلوک ہوا ہے۔ تم نے تو پناہ دے رکھی تھی مجھے۔“

میں نے کہا۔ ”چلو اب تم پہلے نکل جاؤ۔ میں تم کو اٹھاتا ہوں۔“

میں نے مشین گن کو کندھے پر ڈال کے اس کی کمر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور اسے اوپر اٹھا لیا۔ اس کی کمر بہت پتلی تھی مگر زخمی۔ ساٹن کی قمیص پھسلنے لگی تو وہ نیچے آنے لگی۔

”اوپر سے روشن دان کی دہلیز کو پکڑو اور ہاتھوں کا زور لگاؤ۔“ میں نے کہا۔

”میں ایسے ... نہیں جا سکتی ...“ اس نے کہا۔ ”سر باہر نکال کے اتروں گی تو باہر سر کے بل گروں گی۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا پھر میں مرغا بنتا ہوں، تم میری کمر پہ چڑھو اور پلٹ کے روشن دان میں داخل ہو جاؤ۔“

”تم ... کیسے آؤ گے؟“ اس نے کہا۔

”میں آجاؤں گا۔“ میں نے جھکتے ہوئے کہا۔ وہ تھوڑے سے تذبذب کے بعد ننگے پاؤں میری کمر پر چڑھ گئی لیکن اب اس کے لیے روشن دان میں اپنے پیر داخل کرنا مسئلہ بن گیا۔ مجبوراً میں نے اسے پیچھے اتارا اور الٹا پلٹ دیا کہ اس کا سر نیچے ہو گیا۔ اس کے بال فرش کو چھونے لگے۔ وہ تھوڑا سا گھبرائی لیکن میں نے اسے کمر سے تھام کے اونچا کیا اور اس کے شانوں کے پیچھے سے ہاتھوں کا سہارا دے کر اٹھا لیا۔ یہاں تک کہ اس کے پاؤں روشن دان سے باہر نکل گئے۔ ظاہر ہے اس حالت میں وہ اپنے کپڑے نہیں سنبھال سکتی تھی۔ اس کی قمیص نے خاصا مسئلہ پیدا کیا لیکن بالآخر میں اسے باہر اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ آخر میں اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں رہ گئے تھے جو میں نے اس کی آواز سن کر چھوڑے۔

اس نے کہا۔ ”بس اب تم آجاؤ۔“

”لو، اسے پکڑو۔“ اور مشین گن روشن دان سے باہر لٹکا دی۔ پھر میں نے اپنے جسم کو ہاتھوں کے زور پہ کھینچا اور اپنا سر روشن دان سے گزارنے میں کامیاب ہو گیا۔ دیوار کی دوسری طرف مجھے الٹا لٹک کے اترنا پڑا۔ میرے پیر ایک ہک کی طرح روشن دان کے کنارے پر جمے ہوئے تھے۔ توازن کا صحیح اندازہ ہوتے ہی میں نے پیروں کو چھوڑا اور ایک قلابازی کھا کے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اب ہم ایک گلی میں تھے۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے کسی نے بھی ہمیں روشن دان سے طلوع ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

”ان کو یہاں پہنچ کے ادھر آنے میں کتنا وقت لگے گا؟“ میں نے اس کے ساتھ دوڑتے ہوئے کہا۔

ایک بڈھا کسی دروازے سے نکلا اور مجھ سے ٹکرا گیا۔

”ارے ... ارے بابا ... ارے پاگل ہو گیا ہے کیا؟“

میں نے کہا۔ ”کتا ... پاگل کتا ...“

وہ فوراً واپس ہو گیا۔ ”کدھر ہے پاگل کتا؟“ ایک اور شخص نے کہا جو اپنے دروازے پہ آلتی پالتی مارے ہوئے بیٹھا تھا۔

”پتا نہیں ... سنو ...“ میں نے کہا اور اس کو سوالیہ چھوڑ کے آگے بڑھ گیا۔ کتے میرے تعاقب میں نہ تھے مگر وہ پاگل کتے نہیں تھے شکاری کتے تھے۔ اگر میں سیدھا چلتا جاتا تو وہ مجھے پکڑ لیتے۔ میرے لیے ضروری تھا کہ میں غائب ہو جاؤں۔

اچانک گلی دو حصوں میں بٹ گئی۔ دائیں جانب مڑتے ہی میں نے ایک دروازہ دیکھا۔ یہ سب چھوٹے چھوٹے فلیٹ تھے۔ پرانی عمارتوں میں ایک ایک دو دو کمروں کے ایسے ہزاروں لاکھوں فلیٹ ممبئی میں ہر طرف نظر آتے ہیں۔ کہیں بیک وقت دو دو کمروں میں دو دو خاندان بھی رہتے ہیں۔ ممبئی کی زبان میں ہر کمرا ایک کھولی تھا اور وہ بھی ایک کھولی کا دروازہ تھا جس پہ دستک دیے بغیر میں اندر چلا گیا۔ اور دروازہ پھر بند کر دیا۔ ایک دبلے پتلے نوجوان نے جو چھوٹی سی میز پہ لیمپ رکھے کرسی پہ بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا پلٹ کے مجھے دیکھا۔ ایک مرد ایک عورت اور ایک مشین گن کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ”ڈرو نہیں ... بھیا ...“

”کون ہے تم ...؟“ اس نے بنگالی لہجے میں کہا۔ ”ایسے اندر آتا ہے ...“

میں نے کہا۔ ”میں اور میری بیوی سخت مصیبت میں ہیں۔ غنڈے ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔“

اس نے مشین گن کو دیکھ کر کہا۔ ”تم خود کیا غنڈہ نہیں ہے سالا؟“

www.paksociety.com

میں نے کہا: "ابھی تم کچھ بھی سمجھ لو لیکن تھوڑی دیر خاموش رہو۔ ہم یہاں ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں۔"

"کیسا بات بولتا تم۔ ہمارا جان لینے آئے گا شالا خنزیرہ تو اپن کو بھی مار دے گا....." وہ کرسی پر ٹک گیا اور اس لڑکی کو گھورنے لگا جو اپنی اداکاری سے میری بیوی نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ بلاشبہ وہ دلکش جسمانی نقوش رکھنے والی لڑکی تھی اور گہرے نیلے رنگ کی ریشمی ساڑھی میں خوفزدہ ہونے کے باوجود ٹھیک رہی تھی۔ قمیص کی آستین انتہائی مختصر تھی تو گلا انتہائی فراخ۔ لیکن اس افراتفری میں اسے ہوش بھی نہ تھا کہ شرماتی۔

میں نے کہا: "جلدی میں بھاگے تھے..... اس لیے جوتے نہ پہن سکی بے چاری۔ نہ دوپٹہ لے سکی۔"

"یہ.... تمہارا بیوی نہیں ہے۔" بنگالی لڑکے نے کافی غور و خوض کے بعد صحیح نتیجہ اخذ کیا۔

میں نے کہا: "اور کیا تمہاری بیوی ہے؟" اور مشین گن کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ "بولتا جا رہا ہے۔ ہماری سنتا ہی نہیں۔ اب بیٹھ جا چپ کر کے اور کام کر اپنا ورنہ....." میں نے مشین گن کے میگزین کو اس کے گال سے چھو کر لگا دیا۔

بنگالی کی گھگی بندھ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ "اچھا... اچھا... بیٹھو..."

میں نے کہا: "اگر کوئی پوچھنے آئے تو...؟"

"ہم بولے گا ادھر کوئی نہیں آیا۔"

"شاباش۔ اب عقل آئی ہے نا۔ آدمی کو موقع محل دیکھ کے اور سوچ سمجھ کے بات کرنی چاہیے۔ اب اس وقت اگر تم افلاطون بنتے یا ہیرو بنتے تو تمہاری زندگی کا سفر اسی جگہ ختم ہو جاتا۔ تم وکیل، انجینئر یا ڈاکٹر جو کچھ بھی بننا چاہتے ہو، کبھی نہ بن پاتے۔" میں نے کہا۔ اور کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ ایک تین فٹ چوڑے تخت کے علاوہ وہاں ایک صندوق تھا۔ دیواروں پر مہاتما گاندھی کے ساتھ ایک اور شخص کی تصویر نظر آئی جو دھوتی اور کرتے کے ساتھ دو پلی ٹوپی اوڑھے کھڑا تھا۔

"یہ ہمارا فادر ہے۔" لڑکے نے کہا۔

میں نے دوسری دیوار پر رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویر دیکھی اور اس کے ساتھ شرمیلا ٹیگور کی۔

"یہ کون ہے؟" میں نے کہا: "تمہارے دادا یا نانی۔ آئی مین مدر۔"

بنگالی نوجوان نے سخت برا مانا۔ باہر ایک دم شور اٹھا۔

کسی نے چلا کے کہا: "ادھر کوئی نہیں آیا؟"

"آیا کیسے نہیں۔ ایک مرد ہے ایک عورت۔ ادھر بھاگتا ہوا آیا پھر کیا ہوا۔ کہیں غائب ہو گیا؟"

"ہم کیا جانے۔ بھوت پریت ہم کو نظر نہیں آتا۔"

"چلو یار! اس کو تو دن کے اُجالے میں آئینہ دیکھ کے اپنی صورت نظر نہیں آتی ہو گی۔"

وہ شیا سوداوا کے شکاری کتے تھے جو اس کے قاتلوں کو تلاش کر رہے تھے۔ ان کے درمیان سخت بحث جاری تھی۔ ایک شخص کا خیال تھا کہ انہیں ہر گھر کی تلاشی لینی چاہیے۔ دوسرے نے اسے ناقابل عمل قرار دیا۔ اور گلی کے دونوں سروں پر ناکہ بندی کی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز قبول کر لی گئی۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو ہدایات دیتے رہے۔ "خیال رکھنا، آنکھیں کھلی رکھنا۔ کہاں جائیں گے آخر وہ۔ کہیں تو نکلیں گے۔ دیکھتے ہی گولی مار دینا۔"

بنگالی سخت دہشت زدہ بیٹھا رہا۔ ہم آوازوں پر کان لگائے دروازے سے لگے کھڑے تھے مگر اس کی طرف سے غافل نہیں تھے۔ میں نے اس پر اشاروں کی زبان میں واضح کر دیا تھا کہ وہ چپ رہے۔ مشین گن کے مقابل بڑے بڑے طرم خاں بولنا بھول جاتے ہیں۔ وہ بے چارہ کیا بولتا۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے کہا: "تمہارے گھر میں داخل ہونے کا یہی ایک راستہ ہے؟"

اس نے کہا: "یہ گھر نہیں ہے۔ کھولی ہے اور کوئی راستہ تم کو نظر آتا ہے؟"

ظاہر ہے میرا سوال ہی احمقانہ تھا۔ اس کھولی کے دائیں بائیں اور اوپر بھی ایسی ہی کھولیاں تھیں۔ ان سب میں آنے اور جانے کے لیے ایک ہی راستہ تھا۔ پھر بھی میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ مجھے ایک دروازے میں قفل نظر آیا۔

میں نے کہا: "یہ برابر والا دروازہ کس کا ہے؟"

"ایک فقیر کا کھولی ہے۔ پارٹ ٹائم کرتا ہے۔ رات کا شو کر کے آئے گا۔"

میں نے کہا: "یہ پارٹ ٹائم فقیر کیا ہوتا ہے؟"

"وہ آدھا دن بھیک مانگتا ہے۔ صبح چھ بجے سے دو بجے تک۔" بنگالی نے کہا: "بہت کمائی کر لیتا ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا: "پھر دو بجے تک ہی کیوں؟ کیا یہ کام دو بجے کے بعد بھیک مانگنا بری بات ہے؟"

"دو بجے وہ لنچ کرتا ہے اور آرام کرتا ہے۔ تین بجے سے ڈیوٹی سینما پہ دیتا ہے۔"

"کس قسم کی ڈیوٹی؟ وہ گیٹ کیپر ہے یا آپریٹر؟"

بنگالی نے نفی میں سر ہلایا۔ "ٹکٹ بلیک کرتا ہے۔ اس میں زیادہ کمائی ہے۔ بہت سمجھدار آدمی ہے۔ عیش کرتا ہے۔"

میں نے کہا: "اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو پھر اس کے ساتھ مل کے کام کیوں نہیں کرتے؟ تم بھی پارٹ ٹائم فقیر بن سکتے ہو اور اس کے بعد عیش کر سکتے ہو۔"

بنگالی نے میری بات کاٹ دی۔ "شالا ہمارا فادر بولتا کہ تم بھی پڑھے گا، ڈاکٹر بنے گا۔ ہمارا ماں بھی بولتا۔ ہم کیا کرے۔ فادر کو کیسے سمجھائے کہ عیش کا واسطے کیش مانگتا۔ اور کیش ڈاکٹر کا پاس کیسے آئے گا۔ سب شالا بیمار لوگ غریب ہوتا۔"

میں نے کہا: "ہاں غریب ہی بیمار ہوتے ہیں۔"

اس نے کہا: "وہ علاج کا واسطے جاتا سرکاری اسپتال۔ یا سنت سادھو کے پاس، پیر فقیر کے پاس۔ یا پھر ایسے ہی مر جاتا۔ امیر آدمی بیمار نہیں ہوتا۔ ہوتا تو بڑا بڑا ڈاکٹر کے پاس جاتا یا لندن جاتا... یا ایک دم مر جاتا۔ ہارٹ فیل۔"

میں نے کہا: "واقعی بڑی زیادتی کی بات ہے۔ تم جیسے غریب ڈاکٹر بن بھی جائیں تو صرف دکھی انسانیت کی خدمت کر سکتے ہیں۔ عیش نہیں کر سکتے۔ خیر یہ بتاؤ اس کمرے کی چابی کیا تمہارے پاس ہے؟"

وہ چونکا۔ "مگر شالا کیوں پوچھتا؟"

میں نے کہا: "گھبراؤ نہیں۔ میں اس فقیر کا خزانہ لوٹ کر نہیں لے جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے اس نے ساری کمائی اندر گاڑ رکھی ہو گی یا گھڑوں میں بھر رکھی ہو گی۔ میری ضرورت پیسہ ہوتا تو یہ مشین گن میرے کام آ سکتی تھی۔ مجھے صرف پناہ چاہیے۔"

"اندر چھپا رہے گا؟"

میں نے کہا: "اس وقت پارٹ ٹائم فقیر ٹکٹ بلیک کر رہا ہو گا۔ دوسرے شو کے کر چکا ہو گا۔ شاید آخری شو باقی ہے۔"

بنگالی نے کہا: "آخری شو کا ٹائم ختم ہو گا تو وہ حساب کتاب کرے گا۔ پھر ڈنر کرے گا۔ دس بجے آئے گا۔"

میں نے کہا: "اس کا فقیری لباس اندر ہی ہو گا۔"

بنگالی فوراً سمجھ گیا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ "تم فقیر بن کے جائے گا ادھر سے۔"

"اور کوئی صورت نظر نہیں آتی مجھے جان بچا کے نکلنے کی۔" میں نے کہا۔ "ہر طرف جان کے دشمن کھڑے ہوئے ہیں۔"

"مگر وہ کیا کرے گا صبح؟"

میں نے کہا: "کل وہ چھٹی کرے گا تو مر نہیں جائے گا فاقوں سے۔ کل وہ کہیں سے دوسری یونیفارم لے آئے گا۔ تم

دروازہ کھولو۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

بنگالی سہم گیا۔ "اچھا... مگر دیکھو! اس کا کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔ ہمارا نوکری چلا جائے گا اور رہنے کا جگہ بھی نہیں رہے گا۔"

میں نے کہا: "تم اس کے نوکر ہو؟ کیا کام کرتے ہو اس کے لیے؟"

بنگالی نے کہا: "ہم اس کا حساب کتاب کرتا۔ بینک اکاؤنٹ آپریٹ کرتا۔ انویسٹمنٹ کرتا۔ تم سمجھتا ہے انویسٹمنٹ؟ ہم اس کا پیسہ کاروبار میں لگاتا۔ شیئرز خریدتا۔ اس کا وہ پانچ سو روپے دیتا ہم کو۔ اور ادھر رہنے کا واسطے یہ جگہ بھی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ ایک فقیر آدھا دن بھیک مانگ کے اور باقی آدھا دن سینما کے ٹکٹوں کی بلیک کر کے اتنا کما رہا تھا کہ اس نے مستقل سے ایک ڈاکٹر کو ملازم رکھ لیا تھا اور آہستہ آہستہ وہ اپنی کمائی کو بزنس میں لگا رہا تھا۔ شاید آئندہ پانچ دس سال میں اس کا شمار صنعت کاروں میں ہو گا۔

بنگالی نے میرے خوف سے تالا کھول دیا اور اس کمرے میں لائٹ جلا کے چپ چاپ کھڑا ہو گیا جس کی آرائش نے مجھے دنگ کر دیا۔ یہ خاصا بڑا کمرا تھا جس میں نفیس قالین بچھا ہوا تھا۔ بڑے صوفے، ایئر کنڈیشنر اور فریج کے علاوہ اس کمرے میں جو کچھ تھا وہ اس پارٹ ٹائم فقیر کی دولت اور عیش پرست فطرت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ایک شیشے کے کپ بورڈ میں مجھے قیمتی شراب کی بوتلیں بھی نظر آئیں۔ سب سے زیادہ پریشان کن وہ رنگین تصاویر تھیں جو چاروں طرف دیواروں پہ چسپاں تھیں۔ یہ سب بڑے بڑے فحش پوسٹر تھے جن کی طرف ایک عورت کی موجودگی میں نظر نہیں اٹھتی تھی۔

میرے ساتھ آنے والی کوئی شریف عورت نہیں تھی۔ اسے حالات نے یا مجبوری نے جسم فروش بنا دیا تھا لیکن وہ بھی نظر فرش پہ جمائے پیر کے انگوٹھے سے قالین کو کرید رہی تھی۔ مجھے ایک فقیر کی اس پُرفریب زندگی اور دھوکا دہی پر اتنا طیش آیا کہ ممکن ہوتا تو میں اس کمرے کو آگ لگا دیتا۔ صبح یہ فقیر اپنی آواز میں مظلومیت کا سارا درد بھر کے سر آتے جاتے کے سامنے فریاد کرتا ہو گا کہ میں لاوارث ہوں، بیمار ہوں۔ میرے بیوی بچے فاقے کر رہے ہیں۔ ماں اسپتال میں پڑی ہے۔ باپ کی ارتھی اٹھانے کے لیے پیسہ چاہیے اور دلوں میں درد رکھنے والے پگھل جاتے ہوں گے۔ انسان کو کچھ نیکی بھی کرنا چاہیے۔ خیرات زکوٰۃ دان پُن کی ہر مذہب کے ماننے والوں کے لیے اہمیت ہے۔ ثواب تو وہ بھی خریدنا چاہتے ہیں جو شیا سوداوا کی طرح صرف

www.paksociety.com

گداگروں کی تجارت کرتے ہیں مگر وہ اس فقیر کی زندگی کا یہ دوسرا رخ دیکھ لیں تو ان کے جذبات کی کیا کیفیت ہو۔

اپنے مطلب کا سامان مجھے بیڈ کے نیچے سے ملا۔ بس فقیر کے دو چیتھڑے پرانے بیہودہ دلوں سے بنے ہوئے چغے نما بدبودار تھے۔ ان کو اس نے ایک تھیلی میں باندھ کے رکھا تھا۔ شاید وہ انھیں بدل بدل کے استعمال کرتا ہو گا۔ پیشہ ورانہ ضرورت کا دوسرا سامان بھی وہیں موجود تھا جس میں ٹوپیاں، کشکول اور گلے میں ڈالے جانے والے منکے سب کچھ شامل تھا۔

میک اپ سے چہرے بدلتے مجھے اتنا زمانہ ہو گیا تھا کہ اب یہ کام میرے لیے مشکل نہیں رہا تھا۔ اس وقت میک اپ سے چہرہ تو نہیں بدلا جا سکتا تھا مگر حلیہ بدلنا کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔ ایک چغہ میں نے پہنا اور دوسرا اپنے ساتھ آنے والی لڑکی کو پہنا دیا۔ مجھے وہ کچھ چھوٹا رہا اور اسے لمبا رہا۔ اس میں وہ اوپر سے نیچے تک چھپ گئی۔ میں نے اس کے بالوں کو سمیٹ کر باندھا اور اوپر لمبی سی ٹوپی اوڑھا دی۔ گلے میں منکوں کے ہار ڈال لینے کے بعد مجھے صورت کا خیال آیا۔ بنگالی نے مجھے سیاہی فراہم کی تو میں نے ہاتھوں پر پھیلا کے چہرے پر مل لی۔ پھر یہ رنگ کالا کرنے والی کریم میں نے اس عورت کو پیش کی جو میری صورت اور میرا حلیہ دیکھ دیکھ کے ہنس رہی تھی۔

میں نے کہا "ہنسنے کی فرصت نہیں ہے اور اجازت بھی نہیں ہے۔ ذرا اپنی صورت دیکھو۔"

ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھ کر وہ اور زیادہ ہنسی۔ "کیا ہوا ہے صورت کو؟"

میں نے کہا "کیا یہ صورت کسی فقیرنی کی ہو سکتی ہے؟"

اس نے ہاتھوں پر تھوڑی سی سیاہی ڈالی اور میری طرح منہ پر پھیلا کے پھر آئینہ دیکھا۔ اس کا گورا رنگ کالا نظر آنے لگا تھا۔

"ایسے نہیں، ہاتھوں پر اور گردن پر بھی ملو۔" میں نے کہا۔

"یہ نہ ہو کہ ہم منہ بھی کالا کریں اور پکڑے بھی جائیں۔"

میرا مطلب کچھ اور تھا مگر الفاظ غلط ہو گئے۔ وہ کچھ حیران ہوئی اور شرمائی پھر اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ بنگالی ہماری شخصیت میں رونما ہونے والی تبدیلی سے ذرا بھی محظوظ نہیں ہوا۔ اسے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ وہ اپنے "باس" کو کیا بتائے گا کہ اس کا کام والا باس کہاں گیا۔

میں نے کہا "تم اسے سب سچ سچ بتا دینا۔"

"سچ تو بتائے گا لیکن وہ سالا مانے گا؟" بنگالی نے رونے کے انداز میں کہا۔

"تم اس کو قائل کرنا کہ یہ چوری کا کیس نہیں ہے اور ڈکیتی بھی نہیں ہے۔ کوئی چور ڈاکو آتا تو وہ چیتھڑے پرانے چغے اور یہ کشکول لے جاتا؟ تم پر وہ شک کر نہیں سکتا۔ اس سے کہہ دینا کہ اپنی ایک ایک چیز دیکھ لے۔"

"وہ سالا بہت حرامی ہے۔ وہ ہم کو جھوٹا بولے گا۔"

میں نے کہا "اچھا پھر تو اسے یقین دلانے کی ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔" اور ایک ہاتھ مار کے بنگالی کو ناک آؤٹ کر دیا۔

لڑکی سہم گئی "اسے مارنے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے کہا "مرا نہیں ہے گھنٹہ بھر بعد ہوش میں آ جائے گا۔ اس کا باس آئے گا تو یہ اسی حالت میں پڑا ہوا ملے گا پھر اس کی کہانی قابل یقین ہو جائے گی۔ اب چلو۔"

میں نے درمیانی دروازہ بند کیا اور ہم واپس بنگالی نوجوان کے کمرے میں آ گئے۔

"اب تم کو تھوڑی سی اداکاری بھی کرنی ہے۔" میں نے کہا "کمر کو جھکا لو تاکہ تمہارا چہرہ نیچے کی طرف رہے۔ آواز کو بدل کے بھیک مانگتی ہوئی میرے ساتھ چلتی جاؤ۔ دیکھنے والوں کو ایسا لگنا چاہیے جیسے ہم دونوں بوڑھے اپاہج فقیر ہیں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کا باپ بھی ہمیں نہیں پہچان سکتا۔"

"اور اگر انھیں شک ہو گیا...؟"

"بفرض محال ایسا ہوا تو ان کا شک یہ چیز دور کر دے گی۔" میں نے مشین گن پہ ہاتھ مار کے کہا جو اب میرے چغے کے اندر محفوظ تھی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"دیکھو، ہم صرف یہ گلی پار کرنی ہے۔ وہ گلی کے آخری حصے میں ہوں گے۔" میں نے کہا "ان کے سامنے سے گزرتے وقت حوصلہ رکھنا ذرا مجھے چل کے دکھاؤ۔"

وہ تھوڑا سا جھک پائی۔ پھر اس نے چند قدم چل کے دکھایا اور آواز بدل کے کہا "بھگوان کے نام پر اندھی ناری کو کچھ دے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ تم اندھی بن جاؤ میرا بازو تھام کے چلو۔" میں نے کہا "خدا نے چاہا تو خون خرابے کی نوبت نہیں آئے گی۔"

وہ پوچھنے لگی "تم مسلمان ہو؟"

میں نے کہا "انسان کہو یا مسلمان کیا فرق پڑتا ہے! ہم دونوں کے لیے اس وقت زیادہ اہم اپنی اپنی زندگی ہے۔"

میں نے دروازے کی اوٹ سے سر نکال کے گلی میں جھانکا تو موقع مناسب تھا۔ وہ غنڈے خاصے فاصلے پر باتوں میں مصروف تھے۔

جنگ میں مصروف تھیں۔ دوسری طرف ٹین گلی کو روشن کرنے والے کھمبے کے نیچے چار افراد تاش یا جو سر قسم کی بازی جمانے بیٹھے تھے اور کچھ تعداد میں تماشا دیکھنے والے یا مفت مشورے دینے والے ان کے گرد جمع تھے۔ مجھے دونوں طرف چادر تان کے سونے والے بھی نظر آئے۔ شاید ایک بمبئی کے فٹ پاتھوں پر اور سڑکوں کے کنارے جتنے لوگ کھلے آسمان کے نیچے رات گزارتے ہیں پورے پاکستان میں اس کا دسواں حصہ بھی بے گھر افراد نہیں ہوں گے۔

میں نے اس لڑکی کو اشارہ کیا اور ہم ایک دم ایسے باہر آ گئے کہ کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ ہم زمین سے اگے ہیں یا آسمان سے ٹپکے ہیں۔ دروازے کو بند کر کے ہم نے گلی کے آخری حصے کی جانب چلنا شروع کیا۔ وہ خمیدہ کمر بڑھیا کی طرح رکوع کی حالت میں چل رہی تھی اور میں نے اسے بائیں ہاتھ کا سہارا فراہم کر رکھا تھا۔

"اے بابا... کچھ اندھی عورت کو بھی دو..." اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں پکارنا شروع کیا۔

"اے اپنی حرام کی کمائی میں سے کچھ تو نکالو... کوئی نوٹ سو پچاس کا تو نہیں مانگتے ہم... پانچ دس میں بھی دنیا منگی نہیں ہوتی۔ بلیک میں پانچ کا دس لگاتے ہو... دس میں ایک کے سو لگاتے ہو... شراب پی جاتے ہو اتنے کی جتنے میں تمہارا ہی چچا کی کھولی آ جائے گی۔ تمہارا کفن بنے گا...؟"

میں نے کشکول میں چند سکے ڈال کے بجاتے ہوئے بھنکانا شروع کیا۔ بہت سے لوگ ہنسنے لگے۔

ایک نے کہا "سالا اچھا ہے۔"

دوسرے نے کہا "فقیر کے مزاج دیکھو۔ سالا پانچ دس کا نوٹ مانگتا ہے۔"

"سب کی کمائی کو حرام کی کمائی بولتا ہے۔"

"کہتا ہے چچا کی کھولی..."

"کفن بنے گا۔ سالا... پاگل کا بچہ۔"

ظاہر ہے یوں بھیک کسے ملتی ہے۔ مجھے بھی لوگوں کی باتیں ہی سننے کو ملیں۔ میں چاہتا بھی نہیں تھا کہ کوئی مجھے خیرات دینے کے لیے قریب بلائے یا میرے قریب آئے۔ ہم نے اس گلی کا آدھے فرلانگ سے کچھ کم فاصلہ دس منٹ میں طے کیا۔ جہاں یہ گلی سڑک سے ملتی تھی، وہاں تین چار افراد گلی کی طرف منہ کیے کھڑے تھے۔

لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے شکاری کون ہیں۔ شاید مولو لکے نائٹ کلب سے ہمارے تعاقب میں کتنے افراد روانہ ہوئے تھے اور وہ کہاں کہاں ناکہ بندی کیے کھڑے تھے؟

"ابے بڈھا! کیا کرے گا پانچ کا نوٹ لے کر؟" ایک شخص نے کہا "اندھی کو سنیما دکھائے گا؟"

دوسرا قہقہہ مار کے بولا "اپن ولایتی شراب پیتا ہے اور سالا اپنا جب مرے گا تو کفن نہیں بچا۔ اپن کو ادھر سمندر میں ڈال دو۔ ہم مچھلی کو کھایا، مچھلی ہم کو کھا جائے۔" وہ نشے میں تھا اس کا ساتھی بھی ہوش میں تھا مگر کسی بوتل سے منہ لگا کے پی رہا تھا۔ ان دونوں کو میں نے خطرناک افراد کی فہرست سے خارج کر دیا۔ ہمارے گلی کے سرے تک پہنچنے سے قبل ہی وہ ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کے گاتے ہوئے چل پڑے۔

"جانے کا جب یہاں سے کچھ بھی پاس نہ ہو گا" ایک نے اپنی بے سری آواز میں ہانک لگائی۔

"ابے فقیر کی دعا سے بیٹے کا نمبر نکلے گا۔ فلم میں چانس ملے گا۔ باشوک مہربان ہوئیں گا..."

ایک شخص نے غرا کے کہا "بکواس بند کر سالا اور چل چپ ادھر سے۔ اڑا رے باز۔"

دوسرے نے کہا "کیسا کیسا فقیرا ادھر پیدا ہو گیا ہے۔"

"وہ کدھر مر گیا...؟" پہلے والے نے جھنجلا کے کہا "کیا ہم ایسے ہی کھڑا رہے گا رات بھر؟"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اب کوئی فائدہ نہیں۔ وہ سالا کسی اور طرف سے نکل گیا۔"

"کدھر سے نکل گیا سالا راستہ ہم دیکھ لیا۔ وہ ضرور کسی کے گھر میں گھسا ہے۔ ماں قسم ہم کو پتا چلیں گا کہ اس کو کس نے چھپایا تھا۔ ہم اس کا..."

"ابھی ایسے کا ہے کو خالی پیلی بوم مارتا ہے۔ اگر گلی کو قتل گاہ بنے گا۔ وہ جس گھر میں جائے گا اس کا خانہ خراب کرے گا۔ زبردستی کرے گا سب کے ساتھ اور بولے گا۔ ہم کو چھپاؤ، نہیں چھپائے گا تو مارے گا۔" دوسرے نے کہا۔

"اور چھپائے گا تو ہم مارے گا۔" پہلے نے کہا۔

ہم دونوں اپنی اپنی صدا لگاتے کشکول ہلاتے سڑک پر آ گئے۔ یہ خاصی پر رونق سڑک تھی۔ دونوں طرف پیدل چلنے والوں کا اژدہام تھا۔ درمیان سے ٹرام کی پٹری گزر رہی تھی جس پر مخالف سمت سے آنے والی ٹرام ایک ہی جگہ رکی ہوئی تھی۔ پھر ایک دو منزلہ بس آئی اور ایک ہی جگہ بہت سے مسافر اترے اور بہت سے مسافر اس میں سوار ہونے کے لیے بڑھے۔ میں نے اپنے ساتھ صدا لگانے والی فقیرنی کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور ہم دونوں ٹرام پر چڑھ گئے۔

www.paksociety.com

مجھے یقین تھا کہ ہم گلی کے آخر میں کھڑے ہوئے دونوں بدمعاشوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ میں نے نظر اٹھا کے تو نہیں دیکھا تھا لیکن ان کی باتوں سے کوئی ایسا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ انھیں شک ہو گیا ہے۔ مگر وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے اور ہماری حرکات و سکنات کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

جیسے ہی میں ٹرام پہ سوار ہوا، میری نظر گلی کی طرف گئی۔ ان میں سے ایک نے دوسرے کو متوجہ کر کے کچھ کہا تھا۔ شاید اس نے ہمیں دوڑ کر ٹرام میں سوار ہوتا دیکھ لیا تھا۔ ہم جب ان کے سامنے سے گزرے تھے تو کمر جھکا کے ایسے چل رہے تھے جیسے ہمارے لیے ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھانا بھی ضعف اور نقاہت کے باعث مشکل کام ہے۔ اندھی مستورہ فقیرنی اور بوڑھے فقیر نے ٹرام پر چڑھتے ہوئے جوانوں جیسی پھرتی اور مستعدی دکھائی تھی چنانچہ ان کے شک کا یقین میں بدلنا جائز تھا۔

ٹرام کی رفتار خاصی بڑھ چکی تھی جبکہ میں اس کے فٹ بورڈ پر کھڑا ہوا تھا اور سہارے کے لیے میں نے ایک ڈنڈا پکڑ رکھا تھا۔ گلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ میری اس حرکت نے ان کے لیے تذبذب کی گنجائش باقی نہیں رہنے دی۔ وہ مشتعل ہو کے دوڑے۔ ان میں سے ایک کے راستے میں ایک سائیکل سوار عورت حائل ہو گئی۔ میں نے انھیں ایک ساتھ سڑک پر گر کے آپس میں الجھتے دیکھا۔ دوسرا ایک کار کے نیچے آتے آتے مرتے مرتے بچا۔ تاہم اس کو کار کی ٹکر نے گرا دیا تھا۔

اگر یہ حادثات پیش نہ آتے تب بھی وہ دوڑ کر ٹرام کو نہیں پکڑ سکتے تھے۔ میں نے پیچھے آنے والی ٹریفک کو دیکھا۔ تو مجھے سب رکشا ٹیکسی بھرے ہوئے نظر آئے۔ پھر بھی میں اس امکان کو مسترد نہیں کر سکتا تھا کہ ان کو سواری مل جائے اور وہ ٹرام کے پیچھے لگ جائیں۔ چنانچہ اگلے ہی اسٹاپ پر میں اتر گیا۔

بہت سی نامعلوم گلیوں سے گزرنے کے بعد بالآخر ایک جگہ پہنچ کے مجھے یقین ہو گیا کہ اب میرے تعاقب میں کوئی نہیں ہے اور ہم محفوظ ہیں۔ وہ لڑکی جس کا میں نے ابھی تک نام بھی نہیں پوچھا تھا، میرے ساتھ تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے نو بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ میرا ٹریوی تک پہنچنے کا مشن ناکام رہا تھا اور رشیا سوداوا جو مجھے بردہ فروشوں کے گروہ تک پہنچا سکتا تھا، مارا جا چکا تھا۔ اب میرے لیے واپسی کے سوا چارہ نہ تھا۔

میں نے چلتے چلتے اس لڑکی سے کہا۔ "تم اب کہاں جاؤ گی؟"

اس نے مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھا۔ "جہاں تم لے جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "میں کیوں لے جاؤں گا بھلا اور کہاں لے جاؤں گا۔ مجھے تو راستے ٹھکانے کا علم نہیں۔"

"ٹھکانا تو میرا بھی کوئی نہیں۔"

"لیکن میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "میں نے تمھیں اس جگہ سے نکالا اور تم نے مجھے۔ وہاں میں تم سے ملنے نہیں گیا تھا۔ میں رشیا سوداوا کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے پہنچا تھا۔ مگر قسمت نے تم کو ساتھ کر دیا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

"میں نے تمھیں اپنی زندگی کی ساری کہانی سنا دی تھی۔"

"وہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن میرے بھی حالات ایسے ہیں کہ میں تم کو ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ اس میں تمھارے لیے بھی خطرہ ہے اور میرے لیے بھی۔ میرا کوئی گھر ہوتا یا میرے کسی دوست یار رشتے دار کا گھر ہوتا تو میں تم کو وہاں چھوڑ دیتا لیکن اس شہر میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں ایک اجنبی ہوں یہاں۔"

وہ اب رونے کے قریب ہو گئی تھی۔ "وہ لوگ جن سے تم مجھے بچا کے لائے ہو۔ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ وہ پھر مجھے پکڑ کے لے جائیں۔ میں خودکشی کر لوں گی..."

میں نے کہا۔ "تم جذباتی ہو رہی ہو۔ خودکشی تم بہت پہلے بھی کر سکتی تھیں۔ تمھیں کون روکنے والا تھا۔ اس کے مواقع بھی حاصل تھے تم کو۔ پھر اب ایسا کیوں سوچتی ہو جب تم دلدل سے نکل آئی ہو۔ قدرت نے مجھے وسیلہ بنایا۔ تمھیں ہمت دی کہ تم فرار ہو سکو۔ پھر یہ بزدلی کیسی۔ اپنا گھر نہ سہی، تمھارے خاندان کے دوسرے لوگ ضرور ہوں گے جو تمھاری مدد کر سکتے ہیں۔ بہنوں کے ماموں یا چچا اور کزن سب تو بُرے نہیں ہو سکتے۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔ پہلے وہ سب مدد کر سکتے تھے مگر اب نہیں کریں گے۔ اب میں عورت نہیں گناہ کی پوٹ ہوں۔ معاشرے کی پاک دامنی پر بدصورتی اور رسوائی کا ایسا داغ ہوں جس سے سب بچنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اچھا چلو، تمھیں لوگ متوجہ ہوں گے۔ یہ فقیری لباس اتار دو۔"

"کیسے اتار دوں؟ چلتے چلتے...؟"

میں نے کہا۔ "ایسے... کیا کسی نے دیکھا؟ اور دیکھا تو کیا ہوا۔ کوئی مجھ سے پوچھ کر دیکھے۔ میں صاف کہہ سکتا ہوں کہ جناب ڈیوٹی کا وقت ختم ہوا۔ میں نے یونیفارم اتار دی۔

آپ کو کیوں اعتراض ہے؟"

وہ مسکرائی اور اس نے بھی چغہ اتار کے گٹھڑی سی بنالی۔ میری ٹوپی اور میرے کشکول وغیرہ سب اس گٹھڑی میں سما گئے۔ ہم ان گٹھڑیوں کو بغل میں دبائے کچھ دیر خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر میں نے ادھر اُدھر دیکھا اور سب کی نظر بچا کے گٹھڑی کو ایک گٹر کے کھلے مین ہول میں ڈال دیا۔ اس نے میری تقلید کی۔

اب ہم پھر شریفانہ لباس میں تھے۔ صرف سیاہی تھی جو ہمارے چہروں پہ باقی رہ گئی تھی۔ مشین گن کا کور رشیا سوداوا کے اڈے پہ ہی رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس خطرناک اسلحے کو چھپانے کے لیے میں نے دوپٹا استعمال کیا۔ وہ دوپٹے کے بغیر میرے ساتھ اطمینان سے چلتی رہی۔

رات کے دس بج رہے تھے اور میں اب اس لڑکی سے پیچھا چھڑا کے واپس پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں اسے ایک درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ جس کے ایک دروازے پہ پنسل کے حروف نمایاں تھے۔ دروازے کے پیچھے لکڑی کے تختوں کا زینہ تھا۔ اوپر والے حصے میں دونوں جانب لکڑی کی پارٹیشن والے کیبن تھے۔ ہر قطار میں بوسیدہ پردوں والے چھ کیبن تھے۔ درمیان میں مشکل سے چھ فٹ چوڑی گلی تھی۔ چنانچہ وہ سب جو کسی بھی کیبن میں بیٹھے تھے، آہستہ آواز میں گفتگو کرنے پہ مجبور تھے۔ اس کے باوجود چوڑیوں کی اور دبے دبے قہقہوں کی کھنک سارے ماحول کا راز فاش کر رہی تھی۔

چھ فٹ لمبے اور چوڑے کیبن کے اندر درمیانی میز بھی لکڑی کی دو فٹ چوڑی اور پانچ فٹ لمبی بینچ تھی۔ اس کے دونوں جانب بیٹھنے والوں کے لیے بھی ڈیڑھ فٹ چوڑی بینچ تھی جس پر کشن لگا دیے گئے تھے۔ کشن میلے تھے اور دبے ہوئے تھے۔ جب میں بینچ پر بیٹھا تو مجھے کیبن کے اندر عجیب سی ناخوشگوار بو کا احساس ہوا۔ کسی ارادے کے بغیر میں نے کیبن کی دیواروں کو دیکھا تو میری نظریں شرمندگی سے جھک گئیں۔ ان کا حال کسی پبلک لیٹرین سے مختلف نہ تھا۔ یہاں آنے والوں نے قلم، پنسل یا چاک یہاں تک کہ چاقو کی نوک سے اپنے نام لکھے تھے۔ کسی کے نام پیغامات لکھے تھے اور وہ سب لکھا تھا جو لکھا تو جا سکتا ہے مگر شائع نہیں کیا جا سکتا۔ اصل فحاشی کے نمونے مصوری کے نامکمل اور بھونڈے شاہکار کی شکل میں پیش کیے گئے تھے۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ جہاں ہم بیٹھے ہیں یہ کوئی شریفانہ جگہ ہرگز نہیں ہے اور یہاں سب کھانا کھانے اور پینے پلانے کے لیے ہی نہیں آتے۔ کرسیوں کی جگہ بنچوں کی فراہمی مالک ریسٹورنٹ کی بڑی انتظامی اور کاروباری صلاحیت کا واضح ثبوت تھی۔ میرے ساتھ جو لڑکی آئی تھی وہ کوئی پاک دامن شریف نہیں تھی۔ اس کے باوجود میرے سامنے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "چلو کہیں اور چلتے ہیں۔"

وہ تلخی سے مسکرائی۔ "چھوڑو، میری اپنی زندگی اس سے زیادہ نفرت کے قابل ہے..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "زندگی کبھی نفرت کے قابل نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ دنیا میں بُرے ہیں یا دوسروں کی زندگی میں برائی کا زہر بھرتے ہیں تو ایسے سانپوں کو مار دینا چاہیے۔ چادر پہ ایک داغ لگ جائے تو اسے دھویا جا سکتا ہے۔ اسے جلانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تم صرف باتیں کر سکتے ہو، اچھائی کی اور نیکی کی۔"

میں نے شفقت سے کہا۔ "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے اور کیا اچھی بات نہیں کرنی چاہیے؟"

ویٹر نے پردہ ہٹا کے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی کیا کریں گا؟"

میں نے کہا۔ "پہلے کھانا کھائیں گا۔ پھر بل ادا کریں گا۔ اور چلا جائیں گا۔"

"بس؟" اس نے لڑکی کو معنی خیز انداز میں گھورتے ہوئے مایوسی سے کہا۔ "اچھا بولو کیا مانگتا؟"

"جو بھی ایک نمبر چیز ہے لے آؤ۔" میں نے کہا کیونکہ وہ لمبی سانس لے کر پورا مینو پڑھنے کے موڈ میں تھا۔ "ہم دونوں کے لیے۔"

جب ویٹر غائب ہو گیا تو میں نے کہا۔ "تم نے کچھ اور لڑکیوں کا بھی ذکر کیا تھا جو رشیا سوداوا کے پاس تھیں مگر وہاں تو ایک بھی نظر نہیں آئی۔"

"نظر کیسے آتیں۔ وہ سب کچھ باہر سن رہے تھے۔"

"کیسے سن رہے تھے؟ کسی دیوار یا چھت میں خفیہ مائیکروفون تھا؟" میں نے کہا۔ "تھا تو کہاں تھا؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اندر کی ساری باتیں باہر کہیں سنی جاتی ہیں۔" وہ بولی۔ "انھوں نے سب لڑکیوں کو ہٹا دیا۔"

"اگر ایسی ہی بات تھی تو انھوں نے پولیس کو کیوں طلب نہیں کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"وہ پولیس پہ بھروسا نہیں کرتے۔ پولیس نے ان کو [illegible]

www.paksociety.com

کا لائسنس دے دیا ہے لیکن خون خرابا ہو جائے تو یہ لائسنس کام نہیں آتا۔ معاملہ اوپر چلا جاتا ہے اور قابو سے باہر ہو جاتا ہے جس سے وہ خود ہی نمٹنا چاہتے تھے۔"

"خون خرابا! تو وہاں ہو گیا۔ اب وہ کیا کریں گے؟"

"وہ کچھ بھی نہیں کریں گے۔ لاشوں کو ہٹا کے کہیں ڈلوا دیں گے اور قتل اپنے کسی دشمن کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ کل سب ویسے ہی ہو گا جیسے آج تھا۔"

میں نے کہا۔ "تم کب سے یہاں تھیں؟"

"مجھے ایک مہینہ دو دن ہو گئے۔" وہ بولی۔ "یعنی بتیس دن۔"

"اسی لیے تم اتنا جانتی ہو۔" میں نے کہا۔

"تم وہاں کس چکر میں پہنچے تھے؟"

میں نے کہا۔ "تم نے سنا ضرور ہو گا، تم سن رہی تھیں۔ تم نے میرا بیڑا غرق کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ اگر تم وہ کال بیل کا بٹن دبانے میں کامیاب ہو جاتیں تو میں مارا جاتا۔"

"میں... کیا کرتی؟ اس کے اشارے کو کیسے نظر انداز کرتی۔ یہ سب بہت سفاک لوگ ہیں۔ کیا تم ان کی سفاکی کے نمونے دیکھ چکے ہو؟"

میں نے گھبرا کے کہا۔ "نہیں، میں تمہاری بات ایسے ہی مان لوں گا۔ ثبوت دیکھے بغیر۔"

وہ تلخی سے مسکرائی۔ "ڈر گئے؟ عورت کا جسم خوبصورت ہو تو ہر نگاہ اندر تک اتر جاتی ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "بتا سکتی ہو تو یہ بتاؤ کہ ان سب کو کہاں لے جایا گیا ہو گا؟"

"تم کیا ان سب کو چھڑاؤ گے؟" وہ بولی۔ "اس سے کیا ہو گا؟ ممکن ہے یہ پندرہ بیس لڑکیاں بچ جائیں لیکن بمبئی کے بازار میں پندرہ بیس روز آ جاتی ہیں۔ یہ تو ایک منڈی ہے۔ سارے ہندوستان کا مال یہاں پہنچتا ہے۔ کچھ یہاں رک جاتا ہے، باقی آگے چلا جاتا ہے۔ ان کے بیوپاری، آڑھتی، ہول سیلر، سپلائر سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان سے الجھنے کی کوشش بھی کوئی نہیں کرتا کیونکہ ان کے پیچھے پولیس ہے اور بڑے دھن والے ہیں۔ شیامو جیسے بہت سے دادا ہیں۔ تم ان سب کو ختم نہیں کر سکتے۔ وہ تمہیں بڑی آسانی سے ختم کر دیں گے۔"

اس کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یہ تو میرا مشن نہیں تھا۔ مجھے اس چکر میں پڑ کے مرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بمبئی جیسے دنیا میں نہ جانے کتنے شہر ہیں۔ بردہ فروشوں کے علاوہ ایسے شہروں میں ہر قسم کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی دھندے کرنے والے بھرے پڑے ہیں۔ چور، ڈاکو، اسمگلر، جوئے خانے اور شراب خانے چلانے والے، منشیات فروش اور ٹرگر مین۔ جہاں میں جاؤں گا ایسے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ میں ہر قدم پر بھٹک گیا تو منزل سے دور ہو جاؤں گا۔ میں مجبور ہوں کہ ہر برائی سے نظر بچا کے گزرتا جاؤں۔ میرا مقصد اپنے ملک کے ایک غدار اور اپنے باپ کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔ جب تک یہ نہ ہو جائے مجھے کچھ اور سوچنا ہی نہیں چاہیے۔ ہاں اس کے بعد جو فرصت عمر ہے سو وہ رابعہ کے لیے۔ اپنے گھر کی تعمیر کے لیے ہے۔ جس کی حسرت کو میں نے مجبوراً طاق نسیاں پر رکھ دیا ہے۔

"کیا میں نے غلط کہا؟ اور تم نے فیصلہ کر لیا ہے۔۔"

میں نے کہا۔ "نہیں، فیصلہ تو میں بہت پہلے کر چکا تھا اور وہ فیصلہ کچھ اور تھا۔ میں کسی بھی ایسے جھگڑے میں نہیں پڑ سکتا۔"

"پھر تم شیامو دادا کے پاس کیوں گئے تھے؟ کیوں اس کو ترلوچنی کے پاس لے جانا چاہتے تھے۔۔۔؟" وہ بولی۔

میں نے کہا۔ "ترلوچنی میرا دشمن ہے۔ اس نے میرے دوستوں کو قید کر لیا ہے۔ اس نے مجھے بھی قید کر لیا تھا مگر میں خوش قسمت تھا کہ فرار ہونے میں کامیاب رہا۔"

"ترلوچنی کے بارے میں جو کچھ میں نے سنا ہے، اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی سے نہیں ملتا۔ اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب کہاں ہو گا۔ شیامو دادا تمہارے ساتھ جاتا تب بھی کچھ نہ بتا پاتا۔"

"کیا وہ ترلوچنی سے ملتا ہی نہیں تھا؟"

"ملتا تھا جب بھی ترلوچنی اسے طلب کرتا تھا۔ وقت اور جگہ خود ترلوچنی بتا دیتا تھا۔ شیامو دادا کو وہاں سے ایک گاڑی لے جاتی تھی۔"

کھانا کھاتے ہوئے میں ادھر ادھر سے سنائی دینے والی آوازوں سے بے خبر نہیں تھا۔ ان آوازوں کو نظر انداز کرنا بھی مشکل تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس فحاشی کے اڈے سے نکل جاؤں۔ اچانک میں نے ایک ساتھ کئی بھاری قدموں کی آواز سنی۔ وہ سب لکڑی کے تختوں والے زینے پر دھم دھم کرتے اوپر آ رہے تھے۔

میرا ہاتھ بے اختیار اپنی مشین گن پر گیا۔ اسی وقت ایک عورت چلائی۔ اس کی چیخ میں خوف سے زیادہ غصہ شامل تھا۔ کسی مرد نے کہا۔ "سالا دیکھتا نہیں یہ ہم ہے۔"

کسی اور نے کہا۔ "آگے چلو، آگے دیکھو۔"

تیسری آواز نے کہا۔ "میں ادھر دیکھتا ہوں۔ وہ ادھر ہی نہ گئے ہوں۔"

میری چھٹی حس نے مجھے پہلے ہی خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے ایک دم مشین گن کو فائرنگ پوزیشن میں لے لیا اور تن کے کھڑا ہو گیا۔ میرے ساتھ آنے والی لڑکی بری طرح خوفزدہ نظر آنے لگی تھی۔ میں نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پردے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

پردہ ہٹا کے ایک شخص نے اندر جھانکا۔ وہ صورت سے ہی موالی نظر آتا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور مجھے دیکھتے ہی اس کی صورت کا تاثر بدل گیا۔ اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے مشین گن کا بٹ اس کے سر پہ مارا اور اسے پیچھے نہیں گرنے دیا۔ میں نے اسے آگے کھینچ لیا اور وہ درمیان کی میز پر اس طرح اوندھا گر گیا کہ اس کے دونوں ہاتھ میز کے دونوں طرف لٹکے ہوئے تھے اور وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تھا۔

دوسرے کیبنوں میں بیٹھے ہوئے سب جوڑے اس ہنگامے کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ ان کی خلوت گاہوں میں خون کے پیاسے وحشی درندے دندناتے ہوئے گھس آئے تھے۔ اب میزیں گر رہی تھیں۔ برتن ٹوٹ رہے تھے اور عورتوں کی چیخوں سے کہرام سا مچ گیا تھا۔

میں نے زینے پر چڑھ کے کیبن کی دیوار کے اوپر سے باہر جھانکا تو دو افراد نے ایک دم پلٹ کے مجھے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے کوئی گالی دی اور میرا نشانہ لیا۔ اگر میں مشین گن کا فائر کھول دیتا تو سامنے والے کیبن میں سے نکل کر بھاگنے والے مردوں عورتوں میں سے بھی کوئی مارا جاتا۔ ایک ریوالور جس میں صرف دو گولیاں تھیں، میں اپنے ساتھ آنے والی لڑکی کو دے چکا تھا۔ دوسرا نکالنے میں مجھے چند ہی سیکنڈ لگے ہوں گے لیکن اتنی دیر میں میرا ایک حریف ٹریگر دبا چکا تھا۔

میں نے اپنا سر نیچے کر لیا اور پھر فوراً اٹھ کے جوابی فائر کیا۔ میرا نشانہ لینے والا اچھل کے پیچھے والی دیوار سے ٹکرایا۔ اس کا دوسرا ساتھی شامت اعمال کے باعث مارا گیا۔ اس نے مجھ پر گولی چلائی لیکن گولی اس کے ریوالور سے نکلی ہی نہیں۔ یہ ریوالور کی فنی خرابی تھی یا وہ ریوالور میں گولیاں ڈالنا بھول گیا تھا۔ مجھے دوسری بات بعید از امکان لگی۔ تقدیر بنانے یا بچانے والے ہاتھ کی طاقت نے مجھے چند سیکنڈ کی مہلت عطا کی اور میں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے قادر پر بھروسا کرتے ہوئے اور خدا کا نام لے کر گولی چلائی۔ میرے ایک اور دشمن کا خاتمہ ہوا۔

آخری شکاری کو میری جوابی کارروائی نے دفاعی پوزیشن لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے تین ساتھی بیس سیکنڈ میں اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے حالانکہ وہ سب مسلح تھے اور اس یقین کے ساتھ یہاں پہنچے تھے کہ وہ مجھے محصور کرنے کے بعد کسی دشواری کے بغیر پکڑ لیں گے۔ چوتھا شخص اب کسی خوش فہمی کا شکار نہ تھا۔ پہلے چار کا مقابلہ ایک سے تھا تو اب ایک کا ایک سے۔ تین کے مارے جانے سے وہ کچھ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے پہلے کیبن کو مورچا بنا لیا تھا اور اب انتظار کر رہا تھا کہ میں فرار ہونے کی کوشش میں اس کے سامنے سے گزروں تو وہ مجھے شوٹ کر دے۔

میں خود یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن میرا راستہ مسدود تھا۔ ریسٹورنٹ سے فرار ہونے والے زینے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ عورتیں لباس سنبھالتے ہوئے گر رہی تھیں اور وہ پکار رہی تھیں۔ مرد انھیں دھکیل کر خود پہلے نکل جانے کی فکر میں لیڈیز فرسٹ کے اصول کو بھول چکے تھے۔ اس ہنگامہ آرائی سے ریسٹورنٹ کی نچلی منزل کے دیوان عام میں بھی افراتفری پھیل گئی تھی۔ کرسیاں، میزیں الٹنے، برتن اور شیشے ٹوٹنے کے علاوہ لوگوں کے چلانے سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ فائرنگ کی آوازوں نے انھیں دہشت زدہ کر دیا تھا۔ وہ جان بچا کے نکل جانا چاہتے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ پولیس آ گئی تو انھیں گواہی میں دھر لے گی۔ لوگ نہیں جانتے تھے کہ فائرنگ کیوں ہو رہی ہے تاہم اتنا اندازہ ضرور کر سکتے تھے کہ یہ بدمعاشی کی دنیا کے دو بادشاہوں کی جنگ ہے۔ جب سانڈ لڑ رہے ہوں تو حقیر اور کمزور حشرات الارض کو فوراً اپنے اپنے بلوں میں چھپ جانا چاہیے۔ اسی میں ان کی سلامتی ہے۔

وہ لڑکی بھی ایک طرف بے خود بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسا کشت و خون اس نے پہلے کہاں دیکھا ہو گا۔ اگر وہ چاہتی تو اس ریوالور سے میری مدد کر سکتی تھی جس میں ابھی دو گولیاں باقی تھیں، جو میں نے اسے سنبھال کر رکھنے کے لیے دیا تھا لیکن وہ گولی چلانا نہیں جانتی تھی۔ اس میں نہ مرنے کا حوصلہ تھا اور نہ مارنے کا۔

خاموشی کے ایک مختصر وقفے سے میں نے سمجھ لیا کہ میرا حریف سامنے آ کے مقابلہ کرنے سے گریز کر رہا ہے۔ اگر وہ کچھ بھی نہ کرتا تب بھی مجھی صورت حال سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ میرے لیے اپنے کیبن سے نکلنا اور آخری کیبن میں جا کے اسے تلاش کرنا اور پھر شوٹ کر دینا اتنا مشکل کام تھا کہ اس میں میری ناکامی کے امکانات نوے فیصد تھے اور کامیابی کے صرف دس فیصد۔ بہادری کا مظاہرہ خودکشی کی کوشش کے مترادف تھا۔ کچھ نہ کرنا اس مہلت کو ضائع کرنا تھا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں فرار ہو

www.paksociety.com

سکتا تھا۔ میرے حریف نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اس نے کسی کو بھی قتل نہیں کیا تھا چنانچہ پولیس کا طلبہ آجاتا تو اس کے حق میں تحفظ کی ضمانت بن سکتا تھا۔ شاید وہ یہی چاہتا بھی تھا۔

میرے لیے بہتر تھا کہ اس جگہ سے بھاگ جانے ہی میں عافیت تھی جہاں میرے جرم کا ہر ثبوت موجود تھا۔ آلۂ قتل میرے پاس تھا۔ تینوں لاشیں بھی وہیں موجود تھیں اور گو کہ بہت سے مجھے پکڑے جانے کی صورت میں میرا تختۂ دار تک پہنچنا لازمی تھا۔ ان سب عوامل کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے زینے پر کھڑے ہو کے پیچھے دیکھا۔

دشمن کے اور میرے درمیان تین کیبن حائل تھے۔ مشین گن کا برسٹ لکڑی کی تین دیواروں سے گزر جاتا تب بھی اس کا نشانہ بن جانا غیر یقینی تھا۔ میں نے ریوالور سے دو فائر کیے اور ایک دم بیٹھ گیا۔ جواب میں نہ کوئی چیخ سنائی دی اور نہ کوئی گولی چلی۔ میں نے ایک دم اٹھ کے پچھلے کیبن کی دیوار کو عبور کیا اور دوسرے کیبن میں چلا گیا۔ وہاں درمیان کی میز پر برتن پھیلے ہوئے تھے۔ میں میز سمیت گرا تو دوسرے کیبن کی دیوار ٹوٹ گئی۔ سوچتے ہی میں ذرا کر بیٹھنے والے دشمن نے سمجھا کہ میں دیوار میں گرا تو اس کی طرف آرہا ہوں۔ اس کے اور میرے درمیان اب ایک ہی پتلی سی دیوار حائل رہ گئی تھی۔

اس نے بیک وقت کئی فائر جھونک دیے۔ اگر میں سیدھا کھڑا ہوتا تو کوئی نہ کوئی گولی ضرور میرے جسم میں اتر جاتی۔ گولیوں نے پارٹیشن میں سوراخ کر دیے تھے۔ میں نے تھوڑا سا سر اٹھا کے ایک سوراخ میں سے جھانکا تو مجھے ایک کونے میں سایہ نظر آیا۔ جس زاویے سے یہ سایہ پڑ رہا تھا اس سے دشمن کی پوزیشن واضح ہو جاتی تھی۔ اسی اندازے کو بنیاد بنا کے میں نے پارٹیشن پر گولی چلائی۔

گولی پلائی وڈ کو چیرتی ہوئی گئی۔ اس نے ایک چیخ ماری اور ایک دم کیبن سے بھاگا۔ میں نے کیبن سے نکل کے دیکھا تو وہ زینے پر قدم رکھ چکا تھا۔ اس نے پلٹ کے گولی چلائی۔ میں اس ردعمل کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ خطرہ بھانپ کے میں نے خود کو نشانہ بننے سے بچا لیا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ سنائی دی اور میں نے اس لڑکی کو ہاتھ سینے پر رکھ کے ابلتے ہوئے خون کے ساتھ فرش پر لوٹتے دیکھا۔

اب احتیاط بے سود تھی۔ میرے اندر کا سفاک درندہ بھی جاگ اٹھا تھا۔ اس عورت کے خون نے میرے وجود میں انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی جسے میں اپنی دانست میں بجھا آیا تھا۔ یہ اس کا گوشت نوچ کھانے والے خون آشام بھیڑیوں کا غول تھا جو اس کے تعاقب میں یہاں تک آ گیا تھا۔ میری تمام جدوجہد ناکامی کا شکار ہو گئی تھی اور وہ مظلوم عورت بالآخر میری نظروں کے سامنے قتل کر دی گئی تھی۔

میں نے زینے کی جانب جست لگا کے مشین گن کا برسٹ مارا۔ فرار ہونے والا آخری شکاری تختے کے بل گرا۔ اس کے جسم کے ہر سوراخ سے خون ابل رہا تھا اور وہ تختوں کو اپنے لہو سے داغدار کرتا ہوا نیچے لڑھکتا جا رہا تھا۔

ایک بار پھر شور اٹھا۔ ریوالور کے فائر ہی کم نہ تھے کہ اب مشین گن کی تڑتڑاہٹ نے ہر شخص کو دیوانہ وار پناہ کے لیے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ میں اپنے آخری شکار کی لاش کے اوپر سے چھلانگ لگا کے ہال میں پہنچا تو مجھے عجیب حیران کر دینے والا منظر دکھائی دیا۔ یہاں کوئی لڑائی نہیں ہوئی تھی اور ایک بھی گولی نہیں چلی تھی مگر ہر طرف لوگ مُردوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ ان کے حلق سے کوئی آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بالکل ساکت تھے اور خوف سے نیم جاں ہو گئے تھے۔ کرسیاں اور میزیں گرنے سے ہال ایسے لگتا تھا جیسے وہاں سے کوئی طوفان سب کچھ تہس نہس کرتا گزرا ہے۔

صرف ایک شخص تھا جو کاؤنٹر کے پیچھے بالکل سیدھا کھڑا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔

"ابھی میرے کو مارتا ہے تو مار دے۔ اور جاتا ہے تو ادھر سے چلا جا۔" اس نے ہاتھ سے عقبی حصے کی طرف اشارہ کیا۔ "باہر والے دروازے سے پولیس آتا اور۔۔۔"

"ادھر کوئی نہیں ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ہوئے گا یا نہیں ہوئے گا میرے کو کیا پتا بابا۔ اپن تیرے کو راستہ بتاتا ہے اس لیے کہ تم جان بخش کریں گا تو پولیس آ جائیں گا پھر تو پولیس کو بھی مار دیں گا۔ دروازے کے سامنے جو ہوگا اس کو مار دیں گا۔۔۔ کا ہے کو۔۔۔"

"تم نے فون کیا ہے پولیس کو؟" میں نے غرّا کے کہا۔

"ارے نہیں یار۔ کا ہے کو ڈرتا ہے میرے کو۔ میں کچھ نہیں کیا۔ یہ دیکھ اپن کا تو فون بھی سالا ڈیڈ ہے۔" وہ فون میرے سامنے رکھ کر بولا۔ "پر کوئی اور ضرور کرے گا فون کو ادھر بڑا پھڈا ہو گیا ہے۔ پھر پولیس تیرے کو پکڑیں گا اور تیرا ساتھی اپن کو پکڑیں گا۔ تو جا بابا۔ بھاگ جا۔ اپن بولے گا پولیس کو کہ وہ سب والا لوگ بھاگ گیا۔ مالک قسم اور کچھ نہیں بولے گا ہم۔ بالکل کچھ نہیں بتائے گا کہ ادھر کون آیا تھا۔ اپن کسی کو نہیں دیکھا۔"

میں نے اطمینان کے انداز میں سر ہلایا اور اُدھر دوڑا جہاں ایک بند دروازے کے شیشے پر لال رنگ سے پرائیویٹ لکھا ہوا تھا۔ دروازے سے گزرتے ہی میں نے خود کو کچن میں پایا۔ وہاں تین حضرات ہکا بکا سانس روکے کھڑے ہوئے تھے۔ انھیں نہیں

بچا تھا کہ ہوٹل میں قتل عام ہو رہا ہے۔ ایک نے چیخ ماری اور ہکلا ہکلا کے کچھ کہنے لگا۔ دوسرا ہاتھ میں خاصا بڑا کفگیر لیے کھڑا تھا۔ اس نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ کفگیر اس کے ہاتھ سے چھوٹا تو سیدھا اس کے پاؤں پر گرا۔ تیسرا شخص چپاتیاں پکانے پر مامور تھا لیکن اس میز کے نیچے سجدے کے انداز میں پڑا کوئی منتر پڑھ رہا تھا جس پر وہ چپاتیاں پکاتا ہوگا۔

میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "ادھر سے راستہ ہے؟"

جس شخص کے پاؤں پر کفگیر گرا تھا وہ زخمی پنجہ پکڑے ایک ٹانگ پر ناچ رہا تھا۔ "ہاں ہے۔۔۔ اُدھر جاؤ۔۔۔ اُدھر۔۔۔ راستے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا جاتا ہوں۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔"

ہکلانے والے نے کہا۔ "ہم وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ بات یاد رکھے گا۔"

میں نے کہا۔ "پہلی بات یہ ہے کہ تم نے فائرنگ کی صرف آوازیں سنی ہیں اور تم کو اپنی جان پیاری تھی اس لیے تم باہر نکلے ہی نہیں۔ تم نے کچھ نہیں دیکھا۔ دوسری بات یہ کہ تم نے مجھے بھی نہیں دیکھا۔ اگر کسی نے کہا کہ وہ دھکے دے کر ادھر کچن میں سے نکلا تھا تو جانتے ہو کیا ہوگا؟"

میز کے نیچے سے ایک کانپتی ہوئی باریک سی آواز سنائی دی۔ "بابا جانتا ہے۔۔۔ جا تو لے۔ تم پھر آ جائے گا۔"

"ہاں۔ لیکن یہاں نہیں، میں تمھارے گھر پہنچ جاؤں گا۔ مجھے"

میں نے دہاڑ کر کہا۔ "اور اس کے بعد۔۔۔"

"رام رام ست ہے۔۔۔ رام نام ست ہے۔" چپاتی پکانے والے نے تھرتھراتے ہوئے کہا۔

میں لپک کے دروازے کی طرف گیا۔ ایک کھونٹی پر میلا تولیا لٹکا ہوا تھا۔ اس کا رنگ میل سے کالا پڑ رہا تھا لیکن مجھے صرف مشین گن کو چھپانے کے لیے ایک کپڑا درکار تھا۔ مشین گن کو اس میں لپیٹ کر میں نے بنڈل کو بغل میں دبایا اور باہر نکلا۔ گلی کے پچھلے حصے میں بہت کم لوگوں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی۔

ایک بڈھے نے جو گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا تھا مجھ سے کہا۔ "اندر کیا لفڑا ہو گیا ہے۔ گولی کون چلا رہا ہے؟"

میں نے مسکرا کے کہا۔ "گولی! یہاں کون گولی چلائے گا۔ بچے اُدھر دوسری طرف پٹاخے چلا رہے ہیں۔"

"میرا چھوکرا بھی ہو گیا گا۔ آج آوے سالا اس کی تو میں ٹانگ توڑتا ہے۔" اس نے بڑبڑانا شروع کیا۔ "جوتا مار کے سر پر بٹھانا مانگتا ہے۔"

دائیں ہاتھ پلٹنے کے بعد میں دوڑنے لگا۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ چند منٹ بعد میں اس جگہ سے بہت دور نکل آیا تھا۔ دونوں جانب فٹ پاتھوں پر رات کی مخلوق براجمان تھی۔ بیشتر لوگ سو چکے تھے۔ کچھ جاگ رہے تھے اور بیڑیاں پی رہے تھے یا آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ ایک بار پھر مجھے اس شہر کی ساری آبادی کو دیکھ کر دکھ ہوا جو ایک چھت کے سائے سے محروم تھی۔ بچے اور عورتیں، جوان اور بوڑھے۔ سب آسمان کی چھت کے نیچے ایک اچھے دن کی امید میں خواب دیکھ رہے تھے۔ ایک گھر کے خواب جو ان کا اپنا ہو۔ یہ لوگ دن کے اجالے میں کوٹھیاں اور بنگلے بھی دیکھتے تھے مگر اپنے خوابوں کو کسی کھولی یا فلیٹ تک محدود کر لیتے تھے۔ کیا کبھی ان کے خواب سچ ہوں گے؟ میں نے چلتے چلتے سوچا۔ یا ان کی ساری عمر فٹ پاتھ پر ایسے ہی گزر جائے گی۔ پھر ان کے بچوں کی۔۔۔

ایک اجنبی شہر میں رات کے وقت میں کسی سے کچھ پوچھے بغیر چلتا جا رہا تھا اور مجھے یہ علم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے شدت سے اپنے مشن کی ناکامی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے نازو سے شرط لگائی تھی کہ محسن اور غالب کو لے کر آؤں گا۔ اب میں اکیلا واپس جا رہا تھا۔ نازو شاید انھیں لے آئے گی۔ یا پہلے ہی لے آئی ہوگی اور اب وہ میری واپسی کے منتظر ہوں گے۔

میں شیامو دادا کے اڈے تک ضرور پہنچ گیا تھا لیکن اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ نہ میں اس بردہ فروش تک رسائی حاصل کر سکا تھا جس کے گروہ میں شیامو دادا بھی تھا اور وہ ساتھی بھی۔ اور نہ میں اس سے تریویدی کا پتا معلوم کر سکا تھا۔ شاید میری پلاننگ ہی غلط تھی۔ مجھے شیامو دادا سے کسی ایسے معاملے پر بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی جس سے میرا براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر میں اس کو اٹھا لاتا تو اچھا ہوتا۔ وہ شرافت سے نہ آتا تو زبردستی سے آتا۔ میں اس کو ناک آؤٹ کر کے بھی لا سکتا تھا۔ جب وہ ہوش میں آتا تو اسے تریویدی کا پتا بتانا پڑتا۔ تریویدی سے دلاور کے بارے میں پوچھا جا سکتا تھا پھر دلاور سے محسن اور غالب کے متعلق۔

لیکن شیامو دادا کو مار کے اور اس کے اڈے پر آنے والے دوسرے لوگوں کو مار کے بھی مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ الٹا میں نے اپنی ہی تباہی کا سامان کر لیا تھا۔ وہاں سے میرے پیچھے لگ جانے والے بھی بالآخر مارے گئے لیکن اس سے مجھے کیا ملا۔ میں اس ایک لڑکی کو بھی نہ بچا سکا جو اپنے ساتھ مجھے بھی نکال لائی تھی۔ وہ سب جو میرے ہاتھوں مارے گئے تھے شریف لوگ ہرگز نہیں تھے مگر بمبئی میں ایسے ہزاروں بدمعاش ہوں گے۔ دو چار کے کم ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میری شہرت کل تک سارے شہر میں ہوگی۔ واقعات کی کڑیاں خود بخود مل جائیں گی۔ بادروست شراب خانے سے شیامو دادا کے نائٹ کلب تک اور اس بدنام

www.paksociety.com

ریسٹورنٹ تک ہر جگہ گنگا رام ہی کا ذکر ہوگا۔ معلوم کرنے والے معلوم کرلیں گے کہ گنگا رام ہی کا نام ہیرا لال بھی تھا اور وہی سب قتل و غارت گری اور خونریزی کا ذمے دار تھا۔

ہیرا لال یا گنگا رام کے خلاف گواہی دینے والا کوئی نہیں تھا لیکن اسے پہچاننے والے بہت ہوں گے۔ آر کے اسٹوڈیو میں کم سے کم چار افراد جن میں پرتھوی راج بھی شامل ہے۔ مجھے بار بار کے بار بار میں اس کے محافظ اور خود بار بار۔ شیامو داد کا چوکیدار اور اس نائٹ کلب کے دوسرے بہت سے لوگ۔ اس ریسٹورنٹ کا مالک، کچن کے ملازم اور بہت سے گاہک۔ جن کو میں نے غور سے نہیں دیکھا تھا مگر انھوں نے یقیناً مجھے دیکھا ہوگا۔ پولیس ہر جگہ تفتیش کرے گی۔ ہر جگہ ہیرا کا حلیہ بیان ہوگا۔

کہیں کلاک نے رات کے بارہ بجائے تو میں چونکا۔ نازو میرا انتظار کر رہی ہوگی اور اگر بیچ میں رحمن اور غالب کرنے آئے ہوں گے تو سب کو میری طرف سے تشویش لاحق ہوگی۔ میں نے مرتضیٰ چند کا بتایا ہوا پتا یاد کرلیا تھا۔ اس فلیٹ میں آج رات کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔ میں نے ایک ٹیکسی کو روکا اور اسے پتا بتایا۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ "مذاق کرتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم میرے دوست نہیں ہو۔ میں تم سے کیوں مذاق کروں گا؟"

"ادھر نیا آیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، بالکل نیا۔ بمبئی میں ایک دم نیا ماڈل ہے ہم۔"

وہ مسکرایا۔ "ہم تیرے کو چیز بھی دے سکتا تھا۔ دس مل میٹر کا کے ادھر چھوڑ دیتا۔"

میں نے سڑک کی دوسری جانب دیکھا۔ "وہاں؟"

"ہاں۔ اس گلی سے جاؤ۔ تیسرا بلڈنگ ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

میں نے کہا۔ "تم ادھر کی ہر بلڈنگ سے واقف ہو؟"

اس نے ٹیکسی بند کرتے ہوئے کہا۔ "ہم ادھی بلڈنگ میں رہتا ہے۔ تم کس کو ملنے کا ہے؟"

آج قسمت ہی نہ جانے کیا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں جس سے پتا پوچھا وہ بھی گلے پڑ گیا۔ میں نے کہا۔ "ادھر اپنا ایک یار ہے۔ تیسرے مالے پہ۔ اس نے پتا لکھ کے دیا تھا کہیں میں راستہ نہ بھول جاؤں۔ اب میں پہنچ جاؤں گا۔" میں اس کی جرح سے بچنے کے لیے فوراً چل پڑا حالانکہ وہ جرح نہیں میری مدد کرنا چاہتا تھا۔

کسی دشواری کے بغیر میں نے بار دگی کا فلیٹ تلاش کرلیا۔ آدھی رات کے وقت اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھے پندرہ بیس میل دور جانا ہے اور پھر پتا تلاش کرنا ہے تو مجھے تعجب نہ ہوتا لیکن ذہنی و جسمانی طور پر میں اتنا خستہ حال تھا کہ میرا حوصلہ مزید پست ہو جاتا۔ خود کو ایک

اور فیروز تو آج فور پر منزل پر پہنچ کے میرا حوصلہ دوچند ہوگیا اور میری ساری تھکن دور ہوگئی۔

وہ بہت پرانی عمارت تھی جس کے تنگ اور تاریک زینے پر اوپر جاتے ہوئے میں نے کھلے دروازوں اور کھڑکیوں سے اندر سونے والوں کی پوری زندگی کو دیکھ لیا۔ ہر خاندان کے حصے میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے آئے تھے اور انھی دو کمروں میں ماں باپ بھی تھے، بھائی بہن بھی اور بیوی بچے بھی۔ کسی امتیاز اور تفریق کے بغیر وہ سب فرش پر ایک دوسرے میں گھس کر سو رہے تھے۔ سونے کے لیے صرف وہی جگہ دستیاب تھی جو چھت تک ٹھونسے جانے والے سامان کے بیچ میں بچ گئی تھی۔ اس ماحول میں حفظان صحت کے اصول اور ایک طرف اخلاقی اصول تک پامال ہو رہے تھے۔

ہر دروازے کی چوکھٹ پر ایک نمبر لگا ہوا تھا۔ وہاں کے چند سوں کو عمارت کی تعمیر کے وقت دیواروں میں ٹھونک دیا گیا ہوگا چنانچہ نمبر اب بھی پڑھے جاسکتے تھے۔ تیسری منزل تک میں نے کئی بار نمبروں کو ہاتھ سے چھو کر بھی پڑھا کیونکہ ان پر چوکھٹ کا رنگ چڑھ گیا تھا اور بلب کی نام روشنی میں میری آنکھیں ہر کام کرنے سے قاصر تھیں۔ میں اوپر کی طرف بڑھتے جا رہے تھے سامنے دروازے پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ میرے حساب اور اندازے کے مطابق یہ وہی فلیٹ تھا جہاں میں نے نازو سے ملنے کو کہا تھا۔

باہر دروازے کے مقفل ہونے یا نہ ہونے کا پتا نہیں چلتا تھا۔ میں نے ہینڈل گھما کے دیکھا اور پھر آہستہ سے دستک دی۔ نازو شاید دروازے کے قریب ہی ٹہل رہی تھی۔

اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "بھوت۔"

نازو نے دروازہ کھولے بغیر کہا۔ "کس کا بھوت؟"

میں نے کہا۔ "ایک شریف آدمی کا بھوت۔ مثلاً سکندر کا۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ "باقی بھوت کہاں ہیں؟" وہ سر نکال کے بولی۔ "اکیلے کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "وہ لاتوں کے بھوت میری باتوں میں نہیں آئے۔" اور دروازے کو دھکیل کر اندر گھس گیا۔ اس نے مجھے باہر رکھنے کی واجبی سی کوشش کی۔

"یعنی یہ کیا حرکت فرما رہے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔ "کوئی دیکھ لیتا کہ ایک بھوت اور بھوتنی باقاعدہ مذاکرات کر رہے ہیں تو اس کا کیا حال ہوتا صدمے سے۔ کیا مجھے ساری رات باہر رکھنے کا ارادہ تھا؟"

نازو نے کہا۔ "تم تو واقعی بھوت ہو۔" اور میری صورت پر ملی ہوئی سیاہی کو دیکھ کے بے ساختہ ہنسنے لگی۔ "یہ کہاں سے منہ کالا کر کے آ رہے ہو؟"

میں نے جملے کے مفہوم کو نظر انداز کردیا۔ "مقدر میں یہی لکھا تھا۔ بس تم نازو تو بندہ کیا کرسکتا ہے؟"

"لیکن یہ ہوا کیا؟ بڑے بے مروت ہیں اس شہر کے لوگ۔ سلوک کرتے ہیں مہمانوں کے ساتھ۔ کیا تمھیں وہ شاہی سواری پر الٹا بٹھا کے بمبئی دکھاتے رہے؟" وہ ہنس ہنس کے بے حال ہو رہی تھی۔ "گلے میں کس چیز کے ہار ڈالے تھے؟ ہمارے پاکستان میں ایک علاقہ ہے ایسا جہاں رمضان کے مہینے میں سحری کھانے والے کو گدھے پر الٹا بٹھاتے ہیں۔ دم کی طرف منہ کر کے۔ اور ہار ہوتا ہے جوتیوں کا۔"

میں اس فلیٹ میں آجانے کے بعد خود کو بہت محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ فلیٹ چھوٹا ضرور تھا مگر صاف ستھرا تھا۔ اس کے دونوں کمروں میں دو دو بیڈ تھے اور غیر ضروری سامان نہ ہونے کی وجہ سے ایک کمرے میں صوفے کی اور دوسرے میں چار افراد کے لیے کھانے کی میز کے لیے گنجائش نکل آئی تھی۔

"تم نے کب قدم رنجہ فرمایا یہاں عزیزہ؟" میں نے بیڈ پر جوتوں سمیت لیٹے ہوئے کہا۔

"جوتوں کی کوئی بات نہیں۔ لیکن تکیے پر چہرہ مت رکھنا ورنہ پرنٹ آجائے گا پورا۔" نازو نے کہا۔

"اور جس کا تکیہ ہے وہ سوچے گی کہ اس سے کس گدھے نے منہ پونچھا ہے۔ یہ لطیفہ میں نے بچپن میں پڑھا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ......"

"میں تو آگئی تھی... نو بجے۔" نازو نے کہا۔

"کیوں؟ آدھے راستے میں ہی ارادہ بدل گیا تھا کیا؟" میں نے کہا۔ "چھوڑ دیا خیال ان دونوں کا؟"

"انھیں لانے کے لیے تو آپ گئے تھے۔" نازو نے کہا۔ "اور بڑے دعوے کے ساتھ گئے تھے۔"

"میرے دعوے کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ غالب نے آنے سے ہی انکار کردیا۔ کہنے لگا اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ اس نے تو خیر اور بھی بہت کچھ سچ کہا تھا جو میں بتا نہیں سکتا۔ تم نے بھی اسے نکھا ہی دیا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔"

نازو نے کہا۔ "میرا پروگرام بدلنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ میں اس چیز کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہاں میں نے کہا کہ مجھے جینا نے بھیجا ہے اور میں ترویدی سے معاملے کی بات کرنے آئی ہوں۔ اس نے کہا کیسا معاملہ۔ میں نے کہا کہ یہ اس کا اور جینا کا کوئی معاملہ، تم نہیں سمجھ سکتے۔ اس نے کہیں فون کیا۔ وہاں سے اس کو دوسرا نمبر ملا۔ اس دوسرے نمبر سے تیسرا نمبر حاصل ہوا۔ بالآخر ترویدی سے میری بات ہوئی۔ اس نے کرید کرید کے سوالات پوچھے کہ جینا کہاں ہے۔ میں کون ہوں۔ اور معاملے میں کیسے ملوث ہو سکتی ہوں۔ میں نے کہا کہ میں یہ سب فون پر نہیں بتا سکتی۔ اس نے کہا کہ اچھا فون اسے دو۔ میں نے ریسیور چیز کو تھما دیا۔ وہ کچھ سنتا رہا اور سر ہلاتا رہا۔ اس کی نظریں مجھے عجیب طرح سے دیکھ رہی تھیں۔ مجھے شک تو تھا کہ معاملہ گڑبڑ بھی ہوسکتا ہے۔ جب اس نے ریسیور رکھ کے کہا کہ ترویدی ملنے کو تیار ہے اور کچھ دیر میں یہاں پہنچ جائے گا۔ اس نے کہا ہے کہ تمھیں روک لیا جائے۔ اس سے میں نے کہا کہ مجھے تو خیر تمھارا باپ بھی نہیں روک سکتا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کے ایک جھٹکا دیا تو وہ اوپر اٹھ گیا۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچا اور وہ شو کیس کے اوپر سے گزر کے میرے قدموں میں آگرا۔ میں نے اسے اٹھایا اور کہا کہ ایک بار پھر فون کرو۔ وہ اتنا گھبرا گیا کہ اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اس کے ایک محافظ نے آگے بڑھ کے مجھے ریوالور سے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے کہا کہ کیوں اپنے مالک کی جان کے دشمن ہوگئے ہو۔ جس کا کھاتے ہو اسی کو مرواتے ہو۔ اس کی خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ کھڑے رہو۔ خدا نے اسے عقل دی اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے مالک نے دو تھپڑ کھانے کے بعد پھر فون کیا اور ترویدی سے کہا کہ یہ عورت رکنے کو تیار نہیں۔ بہتر ہے تم اس سے مل لو۔ اس نے جواب میں کچھ کہا جو میں نے نہیں سنا۔ فون رکھنے کے بعد اس نے کہا کہ تمھیں کل صبح ملے گا۔ تم کو اس کی لانچ پر جانا پڑے گا۔ میں نے کہا کہ لانچ پر کیا راکٹ پر بھی جانا پڑے تو کوئی حرج نہیں۔ اس کے بعد میں نے اجازت چاہی تو اس نے کہا کہ جاؤ۔ میں نے کہا یہ تو بہت بری بات ہے کہ تم مجھے کچھ دور تک چھوڑنے بھی نہیں جا رہے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "یعنی تم اسے ساتھ لے آئیں؟"

"اس کے بغیر میں خود کیسے نکلتی۔" نازو نے کہا۔ "اس نے مجھے اپنی گاڑی میں ایک جگہ چھوڑ دیا۔ وہاں سے وہ پیدل واپس گیا ہوگا۔ یا شاید ٹیکسی لے لی ہو۔ میں نے اس کی کار میں زیادہ سیر نہیں کی۔ چار پانچ میل چلا کے اسے سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا تھا۔ بہت گھٹیا قسم کی کار تھی۔"

میں نے کہا۔ "نازو بی بی! تم کو اپنے اسیر وفا کی کوئی فکر نہیں؟"

"ان کی فکر کرنے سے کیا ہوگا؟" نازو نے کہا۔ "وہ چودھری صاحب کے مہمان ہیں۔ انھیں وہ گھر داماد بنا کے رکھنے کے لیے نہیں لے گئے ہیں۔ چودھری والا دو خود انتظار میں ہوگا کہ ہم اس سے رابطہ قائم کریں یا ہماری تلاش میں ہوگا۔"

"چودھری والا دو ان کی اچھی خاطر تواضع بھی کر رہا ہوگا۔ ان

www.paksociety.com

سے باقی لڑکوں کا پتا ٹھکانا معلوم کرنے کے لیے۔“ میں نے کہا۔
”میرا خیال ہے کہ وہ ایسی کوشش اب نہیں کرے گا۔ وہ بہت اچھی طرح جان چکا ہے ہم سب کو۔“ نازو نے کہا۔ ”اسے معلوم ہے کہ ایم آر ایس والے بہت ڈھیٹ ہیں۔ نہ مرنے سے ڈرتے ہیں نہ مار کھانے سے مرتے ہیں۔ غالب اور محسن کو وہ ٹریپ کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ وہ چاہے گا کہ ہم خود ان کی تلاش میں وہاں پہنچ جائیں اور اسیروں کو آزاد کرانے کی کوشش میں خود اسیر ہو جائیں۔ اس کے سوا ہم سب کے گرفتار ہونے کی کوئی صورت بھی نہیں۔ میرا دوسرا خیال یہ ہے کہ وہ ہم سے سودے بازی کرے گا۔“
”کس قسم کا سودا کرے گا؟“
”وہ ہمیشہ سودا کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ کہ کسی طرح ہم اپنے مقصد سے تائب ہو جائیں۔ ہمیں طاقت کے ذریعے اپنے راستے سے ہٹانے کی ہر کوشش کا نتیجہ الٹا نکلتا آیا ہے۔ ہر بار اسے پہلے سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ ان حالات میں اگر وہ سمجھتا ہے کہ ایم آر ایس کی طاقت بہت بڑھ چکی ہے اور بڑھتی جا رہی ہے تو اس کے سامنے صرف مذاکرات کا ہی راستہ کھلا رہ جاتا ہے۔“
”بی بی! اس وقت اپنی فہم و فراست اور دانائی کی باتوں سے تم نے ہمیں انگشت بدنداں کر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم ابھی اس والے کو بدلنے کے امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے غور کرنے کی تجویز کو مسترد نہیں کریں گے کہ آپ ناقص العقل ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اب اسی بات پر سگریٹ تو پلا دو ایک۔“
نازو نے سر ہلایا اور سرہانے کی طرف بیڈ کے پیچھے سے سگریٹ کیس اور لائٹر نکال کے میرے سامنے رکھ دیئے۔ ”اور لو۔“
میں نے کہا۔ ”یہ تو کمال کر دیا تم نے۔ آتی دیر میں تلاشی بھی لے لی تھی کمرے کی؟ کس کے ہیں؟“
”کسی کے بھی ہوں۔ تمہیں کیا۔ میزبان کے ہوں گے یا اس کے کسی مہمان کے۔“ نازو نے کہا۔
میں نے سگریٹ جلا کے ایک لمبا کش لیا۔ ”میری دکھ بھری کہانی بہت لمبی ہے۔ کبھی تھام کر پہلے سنو پھر داستاں میری۔“
”پہلے تم ہاتھ منہ دھو لو۔“ نازو نے کہا۔ ”اس سیاہی کو صاف کرنے کی کوشش تو کرو۔ کھانا تیار ہے۔“
میں دم بخود رہ گیا۔ ”کھانا تیار ہے؟ کیا مطلب؟“
”مطلب یہ کہ میں نے پکایا ہے۔ تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ سوچا تھا سب مل کے کھائیں گے۔“
”حد کر دی تم نے۔ ہم زبردستی کے مہمان۔ یہ تمہاری سسرال تو نہیں ہے کہ گھر پہ اپنا راج قائم کر لیا ہے۔“
وہ تنک کر بولی۔ ”فارغ بیٹھ کے کیا کرتی۔ پکانے کو جو ملا پکا لیا۔ نہ پکاتی تو اس وقت جاتا کون؟ تم واپس کھانا لانے کے لیے۔ سب ہوتے تو تھوڑا پڑتا۔ ہم دونوں کو کافی ہوگا۔“
میں نے کہا۔ ”بی بی! مجھے معاف رکھو۔ مجھے جان پیاری ہے۔ میں کھا کے آیا ہوں...“
نازو نے جل کے کہا۔ ”تم کھانا کھا کے آئے ہو؟ اور دو گھنٹے میں سے آدھی محنت کی ہے میں نے کیا۔ کیلی تمہارے سامنے بیٹھ کے خود بھی کچھ نہیں کھاتی۔ تم کو کھانا پڑے گا دوبارہ...“
میں نے گھبرا کے کہا۔ ”اچھا بابا۔ کھاؤں گا۔ ایسے مت چلاؤ کہ لوگ آ جائیں اور ہم دونوں کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں۔“
جب میں ہاتھ منہ دھو کے آیا تو وہ میز پر کھانا سجانے میں مصروف تھی۔ اس کھانے کو دیکھ کر میری روح فنا ہو گئی۔ اگر میں بھوکا ہوتا تو اسی کھانے کو من و سلویٰ سمجھ کر قبول کرتا مگر بھوک پہلے ہی نہیں تھی اور میز پر صرف دال چاول رکھے ہوئے تھے۔ دال کی کیفیت یہ تھی کہ اوپر پانی تھا اور نیچے دال یوں نظر آتی تھی جیسے دریا کی گہرائی میں سنگریزے پڑے ہوں۔ چاولوں کا حال پانی زیادہ ہو جانے سے پتلا ہو رہا تھا۔
میری منت سماجت سب رائیگاں گئی۔ سزا کے طور پر مجھے اس کا ساتھ دینا پڑا۔ یہ کھانا کھاتے ہوئے میں نے وہ سب واقعات اسے بتائے جو میرے ساتھ پیش آئے تھے۔ درمیان میں اس نے کئی بار کہا۔ ”ایک غلطی تم نے یہ کی۔ دوسری غلطی یہ کی۔ یہ بھی غلطی کی۔“ تنگ آ کے میں نے کہا۔ ”سب سے بڑی غلطی میں نے یہاں آنے کی کی۔ چلا جاتا کسی ہوٹل میں تو آرام سے سو جاتا۔“
”کھانا مت چھوڑو۔“ اس نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔
میں نے کہا۔ ”آدھا کھا لیا۔ اب آدھا تم کرو۔ دن کیسے گزرے گا میرا؟“
وہ بولی۔ ”کیا باہر سے کوئی دوا تلاش کر کے لاؤں؟“
میں نے کہا۔ ”دوا کے لیے جگہ کہاں۔ یہی ہے میرا پیٹ۔ پہلے کا بھرا ہوا تھا۔ معلوم نہیں یہ دال چاول کا کیچڑ دل میں جمع ہو رہا ہے یا پھیپھڑوں میں۔“
”اس کا مطلب ہے کہ تم چائے کافی کچھ نہیں پی سکتے۔ حلق سے ڈالو گے تو کان یا ناک سے باہر نکل آئے گی۔“ نازو نے عیاری سے کہا۔ ”ناک کان اور گلے کے راستے اندر کہیں ملتے ہیں۔“
”تم لاؤ کافی۔“ میں نے کہا۔ ”میں ناک اور کان بند کرتا ہوں کسی طرح۔“
نازو برتن اور برتن اٹھا کے کافی بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ میں اس صورت حال سے خاصا لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ہم مہمان ہیں لیکن میزبان کو علم نہیں۔ نہ ہم اسے جانتے ہیں اور نہ وہ ہمیں

پہچانتی ہے۔ اس کے باوجود ہم کتنی بے تکلفی سے گھر میں گھسے ہوئے ہیں اور ہر چیز کو بے دریغ استعمال کر رہے ہیں۔ صبح جب وہ گھر آئے گی تو کتنی حیران ہوگی۔
پھر مجھے خیال آیا کہ کیا صبح تک ہم یہاں ہوں گے؟ صبح نازو پھر زوبی سے رابطہ قائم کرنے کے لیے جائے گی۔ اسے تو زوبی نے اپنی لانچ پہ بلایا ہے مگر کیا اس نے کوئی وقت مقرر کیا ہے؟ یہ بتایا ہے کہ وہ لانچ کہاں ہوگی؟
میں اٹھ کر کچن تک گیا جہاں نازو برتن دھو کر رکھنے کے بعد کافی کے لیے پانی ابال رہی تھی۔ یہ کچن چار فٹ لمبا اور چوڑا تھا۔ اس میں صرف ایک آدمی کے لیے کام کرنے کی جگہ تھی جو دو فٹ جگہ میں چاروں طرف گھوم سکے۔ ایک ایک فٹ چوڑے تین شیلف تین کی دیوار کے ساتھ اوپر نیچے بنے ہوئے تھے اور ضرورت کا سب سامان انہیں ایک خاص ترتیب سے رکھا گیا تھا۔ مثلاً مرچ مسالے کے اور دال چاول کے سب ڈبے ایک شیلف پر دائیں طرف تھے تو ٹوائلٹ کی ضرورت کی چیزیں بائیں جانب رکھا گیا تھا۔ چینی کے سب برتن ایک طرف تھے تو دھات کے دوسری طرف۔
میں نے کہا۔ ”مس نازو! کسی کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر گھس جانا سخت غیر اخلاقی بات ہے۔“
نازو مسکرائی۔ ”غیر اخلاقی بات۔ میزبان چاہے تو ہمیں پولیس کے حوالے کر سکتی ہے۔ ٹریس پاس ایک سنگین قانونی جرم ہے۔“
”اس کے علاوہ میزبان کے مذہبی جذبات بھی مجروح ہو سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اگر وہ سمجھے کہ دھرتی میں کھانے پینے کے برتنوں کو ہاتھ لگا کے ہم نے انہیں بھرشٹ کر دیا ہے۔“
”کیا کر دیا ہے؟“ نازو نے حیران ہو کے کہا۔
”بھرشٹ۔ ناپاک کر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔
”وہ ایسی انتہا پسند ہوتی تو جس نے ہمیں یہاں بھیجا تھا وہ یہ بات ہمیں بتا دیتا۔“ نازو نے کہا۔ ”تم یہ کافی پیئو۔ ہم صبح اس سے معذرت کر لیں گے۔“
میں نے کافی کا مگ لیتے ہوئے کہا۔ ”معلوم نہیں وہ کیا سمجھے۔“
”جو چاہے سمجھے۔“ نازو کا رنگ کچھ لال ہوا۔
”میرا خیال ہے کہ ہمیں صبح کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ نازو کافی لے کر واپس کمرے میں آ گئی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“
میں بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ ”دل تو میرا ابھی چاہتا ہے کہ آنکھیں بند کر لوں اور سو جاؤں۔ تھکن سے میرا برا حال ہے۔ لیکن میری ایک بہن کا مسئلہ بھی ہے۔“
”اچھا؟“ نازو نے سخت تعجب کا اظہار کیا۔
”جی۔ میری چھوٹی بہن کا فرمان ہے کہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے یعنی گدھا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے ایک بات بتاؤ۔ صبح تم زوبی سے کیسے ملو گی؟“
”اس کی لانچ پر جا کے۔“
”کیا تم نے اس کی لانچ دیکھی ہے؟“ میں نے کہا۔
”نہیں دیکھی تو کیا ہوا۔ دیکھ لوں گی۔“ نازو بولی۔
”بابا کیسے دیکھ لو گی؟ مجھے بھی تو بتاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”لانچ تک کیسے جاؤ گی اور کب جاؤ گی؟“
اس نے کافی کا گھونٹ لے کر کہا۔ ”کب کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ صبح کا مطلب ہے صبح۔ جو شاید طلوع آفتاب سے دوپہر تک رہتی ہے۔ رہا سوال یہ کہ کیسے جاؤں گی تو جواب اس کا یہ ہے کہ جیسے پہلے گئی تھی۔“
”تمہارا دماغ خراب ہے۔ ایک بار تم بغیر بتلائے پہنچ گئی تھیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس لیے واپس بھی آ گئیں۔ بتلا کے جاؤ گی تو لوٹ کر آنا تمہارے اختیار کی بات نہیں رہے گی۔“
”مجھے کون روک سکتا ہے؟“
”مانا کہ تم قیامت سے کم نہیں ہو۔“ میں نے کہا۔ ”اور قیامت کو آنے سے واقعی کوئی نہیں روک سکتا۔ لیکن عزیزہ! کیا وہ قیامت کے قائل ہیں جن سے تمہارا معاملہ ہے؟ وہ سب تمہارے استقبال کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیے ملیں گے۔ تم کو جیسے تزک و احتشام کے ساتھ لانچ پہ لے جائیں گے۔ پھر لانچ کو جہاں چاہیں گے لے جائیں گے۔ تم بند دروازوں اور بند راستوں میں محصور ہو جاؤ گی۔ بیچ سمندر کے بیچ جہاں کوئی تمہاری مدد کے لیے بھی نہیں پہنچ سکتا۔“
”بس جی۔ بہت ڈرا لیا آپ نے۔ اس سے زیادہ دہشت زدہ ہونے کے لیے میں تیار نہیں۔“ نازو نے بگڑ کر کہا۔ ”آپ آخر کیا سمجھتے ہیں خود کو؟ یہ سب باتیں آپ ہی کے دماغ میں آ سکتی ہیں۔ میری ذاتی عقل تو گویا ہے ہی نہیں۔“
”اچھا۔ اگر ہے تو اس کا ثبوت پیش کرو۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا سوچا تھا؟“ میں نے ہنس کے کہا۔
”میں جب لانچ پہ جاؤں گی تو کیا اکیلی جاؤں گی؟“
میں نے کہا۔ ”کتنی پیادہ فوج۔ کتنے سوار۔ توپ خانہ بھی لاؤ لشکر ساتھ ہوگا؟“
”کیا تم کچھ نہیں کرو گے؟“
میں نے کہا۔ ”میں کیا کروں؟ جب تم لانچ پہ پہنچ جاؤ تو میں بھی نعرۂ تکبیر لگا کر میدان کارزار میں کود پڑوں۔ اسٹین گن سے سب کو بھون ڈالوں اور کشتوں کے پشتے لگا دوں؟ یا جب لانچ روانہ ہو جائے تو المدد المدد چلاتا ہوا سمندر میں کود جاؤں۔ بحر ظلمات

www.paksociety.com

کے گھوڑے کی طرح۔"

نازو کا موڈ رو دینے والا ہو گیا۔ "اچھا میں شہید ہو جاؤں تم جیتے جاؤ۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں کیوں مروں حرام موت۔ سمجھوں گا کہ دو دوست تھے جو بچھڑ گئے۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔ "آدمی کو صبر آ ہی جاتا ہے۔ ویسے بھی یہ جنگ ہے۔ اس میں دو ہی نظریے چلتے ہیں کہ مرنے سے شہید اور زندہ رہ جانے سے غازی۔۔۔ میں اور رابعہ سال کے سال ان کی برسی کیا کریں گے۔ ہاں تم ابھی سوچ لو۔ تم کیا کرو گی؟"

نازو ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کوئی ہوتا تو وہ اپنے غصے کا اظہار دو ہاتھ مار کے کرتی اور غالب کی برسی کی بات کرنے والے کی برسی کا انتظام کر دیتی۔ لیکن میرے سامنے وہ کچھ بے بس تھی۔ شاید میں مذاق میں حد سے گزر گیا تھا۔ نازو کے جذبات کا آئینہ ایسے سفاک الفاظ کے پتھروں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ایک دم بکھر گئی اور روتی ہوئی دوسرے کمرے میں جا کے پلنگ پر گر گئی۔

پھر مجھے وہ سب کچھ کرنا پڑا جو کسی بھی لڑکی کو منانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اسے چپ کرانے، منانے اور پھر سے مسکرانے پر مجبور کرنے کے لیے مجھے شرمندگی کا اظہار کرنا پڑا، معافی مانگنی پڑی اور خود کو بہت کچھ کہنا پڑا جو نازو نہ کہہ سکی تھی۔ دل ہی دل میں مجھے شدت سے احساس ہوا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ یہی رد عمل رابعہ کا بھی ہوتا اگر کوئی اس کے سامنے میری برسی کی بات کرتا۔ شمسو بھی ایسے ہی روتی اگر غالب اس سے محسن کے مرنے کا ذکر بھی کرتا۔ نازو یوں بڑی سخت جان تھی اور اس کا دل بہت مضبوط تھا۔ جہاز پر غالب کے ساتھ اکیلے رہ کر جس خطرے سے کھیلتی رہی تھی وہ جان کی بازی لگانے سے کم نہ تھا۔ اس نے اکرام شیخ جیسے بھائی سے دوری کو بھی برداشت کر لیا تھا اور مرنے مارنے پر تو وہ ہر وقت تلی رہتی تھی۔ لیکن میرے ایک جملے نے اس کی بہادری کے سب دعوے باطل کر دیے تھے اور اسے ایک کمزور، کم عقل اور کم ہمت عورت ثابت کر دیا تھا جو محبت کے معاملے میں اتنی ہی حساس، نازک اور بے بس ہوتی ہے۔

جب اس کا موڈ ٹھیک ہو گیا تو میں نے کہا۔ "تمہارا دل ویسے ہی رونے کو چاہ رہا تھا، میری بات کو بہانہ بنا لیا۔ میں بتاؤں گا۔۔۔"

وہ کچھ سختی سے بولی۔ "دیکھو۔ غالب کو کچھ مت بتانا۔"

"کیوں نہ بتاؤں۔ سارا پول کھل جائے گا تمہاری بہادری کا۔" میں نے کہا۔ "سب کو بتاؤں گا میں تو۔"

"وہ۔ باقی سب تو خیر مذاق ہی اڑائیں گے تمہاری طرح۔ مگر وہ۔ چڑھ جائیں گے سر پہ۔" نازو نے شرما کے کہا۔

ایسے شرماتے ہوئے محبت میں اپنی کمزوری کا اعتراف کرتے ہوئے وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ میں نے ہنس کے کہا۔ "اچھا بابا نہیں بتاؤں گا۔ اب وہ بات سنو جو میں کہنا چاہتا تھا۔ بیچ میں تمہارا آنسوؤں کا دریا آ گیا اور بات بہہ گئی۔ میرا مطلب ہے رہ گئی۔ اس وقت بجے ہیں رات کے ڈھائی۔ ہم ڈھائی گھنٹے تو سو سکتے ہیں۔"

"پانچ بجے صبح کیا ہوگا؟"

"پانچ بجے صبح اندھیرا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہم ایمی یزمان کے واپس آنے سے قبل ہی یہاں سے نکل جائیں تو اچھا ہے۔ میری چھٹی حس کا ایک اشارہ تو یہ ہے کہ ان حالات میں ہمیں روپوش رہنا چاہیے۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم کہاں ہیں۔"

"اس جگہ کے بارے میں کس کو معلوم ہے؟"

"ہربنس چند کو۔ اگر شیا مودار کے چیلے اور یار ہمارے پیچھے لگ گئے تو ان کے لیے ہمارا سراغ لگانا کوئی مشکل بات نہیں ہوگی۔ ہربنس چند بھی ہمارا دوست یا ہمدرد بہر حال نہیں ہے۔ روپیے کے لیے ہمیں بیچ بھی سکتا ہے۔ اگر اسے معلوم ہوا کہ ہم نے اس کے اڈے پر کیا کیا۔ پھر شیا مودار کے نائٹ کلب میں کتنی خونریزی کی، تو وہ کسی سے بھی سودا کر سکتا ہے۔ اس ملک کے لوگ بھی ہمارا پتا بتانے کی منہ مانگی رقم ادا کریں گے۔ لیکن یہ سب صبح ہونے کے بعد ہوگا۔ جب اخبارات کے ذریعے خبر پھیلے گی۔ فرض کرو صبح اخبار دیکھتے ہی ہربنس چند نے فون کر کے کہا کہ تمہارے مجرم کو میں پکڑوا سکتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہوگا۔ بتاؤ مجھے کیا ملے گا۔ تو سمجھ لو کہ ہم صورت نکلنے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر اسی جگہ پکڑے جائیں گے۔"

نازو نے سر ہلایا۔ "صبح پانچ بجے تک بھی انتظار کیوں؟ کیا ہم اسی وقت نہیں جا سکتے؟"

میں نے کہا۔ "تھوڑا سا آرام بھی کام کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ پھر جہاں تک کام کا تعلق ہے بہت محنت ہے جو ہمیں صبح کرنا ہے۔ ہم پانچ بجے نکل گئے تو منہ اندھیرے ہی رابعہ اور گل کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

"مگر وہ کسی فیملی کے ساتھ مقیم ہیں۔"

"پھر کیا ہوا۔ ہم صبح صبح انہیں جگانے پر معذرت کر لیں گے۔ ہم کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ٹرین لیٹ پہنچی دہلی سے۔ یا فلائٹ لیٹ تھی لکھنؤ سے۔"

"کیا مسافر ایسے خالی ہاتھ آتے ہیں؟"

"کیا خالی ہاتھ سفر کرنا جرم ہے؟" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "ان کا جو دل چاہے سمجھ لیں۔ سمجھ لیں کہ ہم دونوں ہی گھر سے بھاگے ہیں۔ اصل مقصد تو رابعہ اور گل کے پاس پہنچنے کا ہے۔ میں چاہتا ہوں

کہ صبح ہونے سے پہلے ہی وہ بھی وہاں سے اسباب سمیٹ لیں۔"

"چلو سامان اٹھا لیا۔ سامان ہے ہی کہاں۔ اس کے بعد؟"

میں نے کہا۔ "اس کے بعد ہم تریلوچن کے پاس جائیں گے۔ ہم سب۔"

"ہم سب؟ ایک ساتھ؟"

"میں نے کب کہا ہے کہ ایک ساتھ۔ مجھے ایک فیصد بھی شبہ نہیں کہ اس چھوکری رکمانی نے شکاری تمہارے لیے جال بچھائے بیٹھے ہوں گے، ہر طرف سے محاصرہ کیے۔ جب اس چھوکرے نے تریلوچن کو بتایا ہوگا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ تو ممکن ہے تریلوچن نے ولاور کو بتایا ہو۔ ولاور تو فوراً سمجھ جائے گا کہ ایسی نازک اور ایسی قاتل حسینہ بھلا نازو کے سوا اور کون ہوگی۔"

نازو اٹھلا کے کچھ شرمائی اور مسکرائی۔

"ظاہر ہے اس کے بعد ان کے لیے مختلف واقعات کی کڑیاں ملا کے نتائج اخذ کرنا بالکل مشکل نہ ہوگا۔ وہ بہت خوش ہوں گے کہ ان کا شکار خود چل کے ان کے پاس آ رہا ہے۔"

"پھر کیا ہوگا۔ کیا میری جگہ تم جاؤ گے؟"

"ہرگز نہیں۔ وہاں نہ تم جاؤ گی اور نہ میں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "میرے ذہن میں ایک پلان ہے جس کے مطابق وہاں جائیں گی گل اور رابعہ۔"

"پلان کیا ہے؟" نازو نے کہا۔

"پلان ابھی نہیں بتایا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم سے خدانخواستہ راز داری ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر کیا ہے؟" نازو نے برا مان کے کہا۔ "کیا میں سمجھوں گی نہیں؟"

"سمجھو گی نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "بات لمبی ہے۔ ایک بار شروع ہو گئی تو پھر ختم نہیں ہوگی۔ تم بھی چپ بیٹھ کے سننے والی نہیں ہو۔ بیچ میں بولو گی۔ دس سوال کرو گی۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ بتانا نہیں چاہتے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ آج تک ہم نے جو کچھ بھی کیا ہے آپس میں مشورے سے کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "آئندہ بھی جو ہوگا وہ تم کو بھی معلوم ہوگا۔ خدا نے چاہا تو کل غالب اور محسن واپس آ جائیں گے۔"

نازو نے صرف اداسی سے سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ "انشاء اللہ۔ کہو آمین۔ کچھ تو کہو۔"

"مگر اب ہم یہاں کیوں رک گئے ہیں؟ اس ظلم نگری میں ہمارا کیا کام؟"

میں نے کہا۔ "اب دماغ پر زیادہ زور مت ڈالو۔ نیند نہیں آ رہی ہے کیا؟"

"نیند تو آ رہی ہے۔"

"بس تو پھر آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ۔" میں نے کہا۔ "مگر ایسا نہ ہو کہ غالب کے ساتھ نکل جاؤ دنیا گھومنے۔ وقت کم ہے۔"

وہ مسکرائی۔ "میں الارم لگا دیتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ اگر ہم ساڑھے پانچ بجے بھی نکل جائیں تو اچھا ہے۔ رابعہ کے پاس پہنچتے پہنچتے چھ سات بج جائیں گے۔ پھر ان کے ساتھ نکلیں گے تو دو تین گھنٹے میں بہت کچھ کرنا ہوگا۔ ساڑھے دس گیارہ بجے سے پہلے جیولری کی دکانیں نہیں کھلتیں۔ گیارہ بجے تک گل کو لباس بدلنا پڑے گا۔ اور شاید رابعہ کو بھی۔ انہیں بھی کچھ حلیہ ضرور بدلنا ہوگا۔ مگر اس صورت کا میں کیا کروں؟"

نازو نے پلکیں جھپکا کے کہا۔ "ہے ایک آئیڈیا۔ پہلے کہو مانا استاد۔"

میں نے کہا۔ "کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔"

"نہیں ہوگا تو جاؤ پھر یہ کالا تھوبڑا لے کر رابعہ کے سامنے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا استانی جی۔ آپ کرامات ہیں۔ میں نے مانا استاد۔"

نازو ہنسی اور اٹھ کر باتھ روم تک گئی۔ وہاں سے وہ ایک شیشی کے ساتھ نمودار ہوئی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے بے رنگ محلول کی شیشی کو کھول کے سونگھا۔ اس کی تیز بو میرے دماغ میں چڑھ گئی۔

"یہ رنگ کاٹ ہے۔ بلیچنگ لوشن۔ پانی میں ملا کے چہرے پر لگاؤ اور دیکھو کیسا اجلا چہرہ نکل آتا ہے۔"

"کہیں کوے کی طرح نہ ہو جاؤں۔" میں نے کہا۔ "مجھے گورا بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"ذرا احتیاط سے لگانا۔ آنکھیں بچا کے۔ جلن لگے تو دھو ڈالنا۔" نازو نے کہا۔

بلیچ لوشن نے واقعی وہ سب سیاہی صاف کر دی جو میرے چہرے، میرے ہاتھوں اور گردن پر پھیلی ہوئی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد میری اصل جلد کا رنگ تقریباً بحال ہو چکا تھا مگر میرے چہرے پر جلن سی محسوس ہو رہی تھی۔ صابن لگا کے منہ دھونے اور کریم لگانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔

نازو مذاق کرتی رہی اور پھر سو گئی۔ میں بھی نیند کی ایک ضرورت کے قبول کرنے پر مجبور تھا۔ وہ کمبخت کی نیند بے خبری سے کم تھی۔ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب نازو نے مجھے جھنجھوڑنا شروع کیا۔

میں آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ "کیا الارم نہیں بجا؟"

"اب کل بجے گا۔" نازو بولی۔ "کل صبح ساڑھے پانچ بجے۔"

"یعنی شام کو ساڑھے پانچ بجے نہیں بجے گا؟" میں نے اپنی

www.paksociety.com

صورت کو آئینے میں ملاحظہ کرتے ہوئے کہا۔ میرے منہ پر چھالے سے پڑ گئے تھے سارا منہ لال ہو رہا تھا۔
"یہ ہے تمہاری آشتاری؟" میں نے نازو کو گھور کے کہا۔
"کوئی بات نہیں۔ ایک دو دن میں یہ بھی ٹھیک ہو جائیں گے لیکن سوچو اتنا کالا رنگ لے کر رابعہ کے سامنے جاتے تو وہ ہنستی یا روتی؟" نازو نے ہنستے ہنستے کہا۔
"کیا خیال ہے اگر ایک کپ کافی پی لیں چلتے چلتے۔ نیند اڑ جائے گی۔" میں نے کہا۔ "اور کیا حرج ہے اگر میں اتنی دیر میں غسل بھی فرما لوں۔ نہ جانے کب سے میل تہ در تہ جسم پر جمع ہو رہا ہے۔ میزبان کے ساتھ تھوڑی سی زیادتی ہی سہی۔"
نازو نے کہا: "میں نے تو رات ہی کو غسل کر لیا تھا۔ یہاں آتے ہی۔"
وقت کم تھا پھر بھی میں دل کھول کے نہایا۔ دو گھنٹے کی نیند نے بھی اپنا اثر دکھایا تھا۔ جسم کی توانائی کو اسٹور کرنے والی بیٹری پھر چارج ہو گئی تھی۔ ٹھنڈے پانی سے غنودگی کا اثر بھی زائل ہو گیا اور میں نے فرحت و انبساط کی کیفیت میں گانا شروع کیا۔ "او موری نانچے کمر بلیں بل آئی گوا۔ ہائے اماں۔ نانچے کمر بلیں۔" باہر نازو نے ہنسنا شروع کیا۔ "کیوں لوگوں کی نیند خراب کرتے ہو۔ لوگ سمجھیں گے ....."
میں نے باہر نکل کے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا: "کیا سمجھیں گے جی؟"
نازو نے کہا: "سمجھیں گے پڑوس کے گھر میں کوئی مر گیا ہے۔ لو اب جلدی سے کافی پی لو۔"
میں نے کافی کا مگ ہاتھ میں لے کر بال بناتے ہوئے کہا۔ "مس نازو! میرا اور محسن کا شمار لندن کے بہترین باتھ روم سنگرز میں ہوتا تھا۔"
"یہی درد بھرا نغمہ گاتے تھے آپ دونوں؟" نازو نے کہا۔
میں نے کہا: "نہیں۔ وہ دوسرا گانا تھا۔ آگ لگی تن من میں دل کو پڑا تھامنا۔ او ہے۔ یہ او ہے ہم ایک ساتھ نعرے کی طرح حلق سے نکالتے تھے۔ انگریز لڑکیاں اس سے بہت محظوظ ہوتی تھیں۔"
"مگر ... اس باتھ روم میں ..."
میں نے اسے افسوس ناک نظروں سے دیکھا: "مخلوط تعلیم کے باوجود وہ باتھ روم کیا ہوسٹل تک الگ تھے۔ لیکن ہماری شہرت کا ڈنکا ہر جگہ بج رہا تھا۔ معلوم ہے ایک بار کیا ہوا؟ ایک متعصب انگریز نے کہہ دیا کہ یہ کیا گیدڑ کی طرح چلاتے ہو۔ او ہے۔ بس میں اور محسن جھپٹ گئے اس پر کہ ہمارے قومی جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ او ہے ہمارا قومی نعرہ ہے جو ہم صبح نہاتے وقت ضرور لگاتے ہیں اور کوئی مائی کا لال ہمیں اس حق سے محروم کرے گا تو ہم اپنے سفیر کے ذریعے وزارت داخلہ کو احتجاجی مراسلہ دیں گے۔ ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ نے اس لڑکے کو خاصا ڈانٹا۔ اس واقعے کے بعد تو لڑکیاں باتھ روم کے باہر ہماری "او ہے" سننے کے لیے آ گئیں۔ اور ہم نے انہیں مایوس نہیں کیا۔"
نازو نے ہنستے ہنستے مگ رکھ دیا: "اپنی حرکتوں کی وجہ سے نکالے بھی گئے تھے؟"
میں نے کہا: "نکالے تو ہم جنت سے بھی گئے تھے۔"
"اب نکلو یہاں سے بھی۔" نازو نے کہا۔
ہم نے اپنے اس ایک رات کے غمگسار پناہ دینے والے گھر پر آخری نگاہ کی۔ اس کے اجنبی در و دیوار بھی اچھے میزبانوں کی طرح ہمیں کمالِ خیر کے ساتھ الوداع کہتے محسوس ہوتے تھے۔ باہر آ کے میں نے تالا لگایا اور چابی پھر وہیں رکھ دی جہاں سے نازو نے اٹھائی تھی۔
"شاید ہم کبھی لوٹ کر یہاں نہیں آئیں گے۔ لیکن یہ گھر ہمیں یاد رہے گا۔" نازو نے کہا۔
"ان مسافروں کی طرح جو کہیں ملے۔ کچھ دیر شریکِ سفر رہے اور جدا ہو گئے۔" میں نے کہا۔
دبے پاؤں جب ہم زینے سے نیچے جا رہے تھے تو صبح کا اندھیرا کچھ دھندلانے لگا تھا۔ رات بھی ہمارے ساتھ ہی رخصت ہو رہی تھی۔ دو زینے اتر کے میں گھوما تو مخالف سمت سے اوپر آنے والی ایک لڑکی مجھ سے ٹکرا گئی۔ وہ بھی دبے پاؤں بہت تیزی سے اوپر آ رہی تھی اور اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ اس وقت کوئی نیچے جا سکتا ہے۔ میں نے اسے فوراً سنبھال لیا ورنہ وہ واپس جاتی۔
"آئی ایم سوری!" میں نے کہا: "آپ کو چوٹ ....."
"نہیں نہیں۔" وہ جلدی سے بولی اور میری طرف دیکھے بغیر اوپر چڑھ گئی۔ خوشبو کا ایک جھونکا سا تھا جو پل بھر میں گزر گیا۔
زینے میں اندھیرا تھا چنانچہ میں اس کی صورت خوب سے نہیں دیکھ سکا۔ میں نے اسے زینے پر گھوم کے اوپر غائب ہوتے دیکھا۔
"... یہ روپ وتی تھی؟" نازو نے کہا۔
"روپ وتی نہیں۔ پدماوتی۔" میں نے کہا: "ہماری میزبان۔"
اوپر ایک دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ میں اور نازو نیچے اتر کے گلی میں آ گئے اور پھر سڑک پر۔
"اب تک اس نے دیکھ لیا ہو گا کہ فلیٹ میں کوئی آیا تھا۔" نازو نے کہا۔
"اچھا ہوا کہ اس نے ہماری صورت نہیں دیکھی۔ وہ کسی کو کچھ نہیں بتا سکتی۔"

نازو نے کہا: "پھر بھی وہ سوچے گی کہ کہیں وہ ہم ہی تو نہیں تھے۔ اس کے بن بلائے مہمان۔"
میں نے کہا: "اس کے کچھ مہمان ضرور ایسے ہوں گے جو اس کی عدم موجودگی میں بھی آ جاتے ہوں گے۔ جن سے اس کا بہت قریبی تعلق ہو گا۔ ابھی تو معلوم ہو گا کہ تالے کی چابی کہاں رکھی ہوتی ملے گی۔"
"اچھا ہوتا اگر ہم اس سے مل لیتے۔" نازو نے کہا۔
میں نے ہاتھ پکڑ کے اسے آگے کھینچ لیا: "تم جذباتی ہو رہی ہو۔"
نازو نے کہا: "کتنی بد اخلاقی کی بات ہے کہ ہم رات بھر اس کے گھر میں رہے۔ گھر کی ایک ایک چیز کو استعمال کرتے رہے اور اس سے ملے تک نہیں۔ شکریہ تک ادا نہیں کیا۔"
"ہمارے لیے تو بہت پہلے فرما دیا گیا تھا کہ جو ہوتے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔ ہم گلی سے ملے تھے تو کیا ہوا تھا۔ اسے کیا خوب صلہ ملا تھا ہماری میزبانی کا۔ سیار وتی کے حق میں اچھا یہی ہے کہ ہم اس کے لیے اجنبی رہیں تاکہ وہ پورے یقین کے ساتھ آشنائی کے ہر رشتے سے انکار کر سکے۔"
سڑک پر ٹریفک برائے نام تھی۔ سبزیوں اور پھلوں سے لدے ہوئے ٹرک جو منڈی سے دکانوں تک مال سپلائی کرتے تھے وقفے وقفے سے گزر رہے تھے۔ سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں پر یہاں بھی کراچی کی طرح اخبار فروش اور دودھ والے ہی سب سے زیادہ دکھائی دیتے تھے۔ فٹ پاتھوں پر سونے والے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے چنانچہ پیدل چلنے والے سڑک پر چل رہے تھے۔ ٹن ٹن کرتی ایک ٹرام ہمارے قریب سے گزری۔ رات بھر کھلے رہنے والے ایرانی ہوٹلوں میں لوگ کرسیوں پر پاؤں رکھے اکڑوں بیٹھے چائے کی پیالیاں خالی کر رہے تھے۔
میں اور نازو خاموشی سے چلتے گئے۔ اجنبیت اس شہر کے مزاج میں شامل تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے بے تعلق رہنے کے عادی تھے اور کوئی کسی کو نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر آدمی یہاں اکیلا ہے اور دوسرے ہر آدمی سے بیزار ہے۔ کسی کو غرض نہیں کہ کون کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ جی رہا ہے تو کیوں جی رہا ہے اور کیسے جی رہا ہے۔ اور مر رہا ہے تو کیوں مر رہا ہے اور کیسے مر رہا ہے۔
مجھے اور نازو کو بھی کسی نے قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ یہاں تک کہ گشت کر کے واپس جانے والی ایک پولیس پارٹی کے دو مستعد اہلکار بھی ہمارے سامنے سے یوں گزر گئے جیسے ان کی آنکھوں نے ہمیں دیکھا ہی نہیں۔ موڑ پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا مگر سب ٹیکسیاں بند کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ہر ٹیکسی میں جھانک کر دیکھا کہ شاید بند شیشوں کے پیچھے کوئی ڈرائیور نظر آ جائے۔
میں مایوس ہو گیا تھا کہ کسی نے پیچھے سے پکار کے کہا: "کدھر جانے کا ہے؟"
ٹیکسی ڈرائیور ابھی ابھی ایرانی ہوٹل سے گرما گرم چائے پی کے نکلا تھا اور بڑے اسٹائل سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔
میں نے کہا: "ہم مسافر ہیں ....."
اس نے کہا: "تم جو بھی ہے۔ ابھی بولو کدھر جانے کا ہے؟"
میں نے اسے پتا سمجھایا اور ہم ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ بمبئی میں ٹیکسی کا نظام بہت اچھا تھا۔ کوئی ڈرائیور انکار نہیں کرتا تھا۔ کوئی میٹر سے زیادہ بھی نہیں مانگتا تھا۔ مسافروں کے ساتھ بدتمیزی کا سوال ہی نہ تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ پولیس کا کنٹرول سخت تھا اور پبلک کی شکایات کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ پولیس اگر بھتہ لیتی ہو یا ٹیکسیاں خود پولیس افسروں کی ملکیت ہوں تو پھر پبلک کی کون سنتا ہے۔
میں نے مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے سڑکوں کے نام یاد کرنے کی بے سود کوشش کی۔ وہ نام بہت لمبے اور مشکل تھے مزید یہ کہ ٹیکسی ڈرائیور گلیوں سے شارٹ کٹ لے رہا تھا۔ میں نے کرلا کا نام سنا تھا۔ وہاں ایک سڑک شہید بھگت سنگھ روڈ تھی۔ بھگت سنگھ کے ساتھ شہید کا لفظ عجیب سا لگتا تھا مگر بھگت سنگھ آزادی کی تاریخ کا ایک باب تھا۔ پھر وہ [illegible] میں مڑ گئی۔ کرلا کا کارپیٹ انڈسٹری کے پاس سے گزرتے ہی ٹیکسی ایک اور گلی میں مڑ گئی۔
ٹیکسی ڈرائیور نے پیچھے مڑ کے کہا: "کدھر روکنے کا ہے؟"
میں نے کہا: "کیا ہم پہنچ گئے ہیں؟"
اس نے مجھے گھور کے دیکھا: "ابھی تمہارا گھر تو ہم نہیں دیکھا۔"
میں نے کہا: "چلو ہم تلاش کر لیں گے۔ تم ہمیں اسی جگہ اتار دو۔"
"تم نیا آیا ہے بمبئی میں؟" ڈرائیور نے کہا اور میرے اقرار میں سر ہلاتے ہی نیچے اتر آیا۔ صبح صبح ہمیں پتا بتانے والے بھی بہت کم تھے مگر ڈرائیور نے ہماری مدد کی۔ اس نے ایک گھر کا دروازہ بجایا۔ اندر سے دروازہ کھول کے باہر آنے والا مدراسی بوڑھا سخت چڑچڑے مزاج کا تھا مگر اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو جتنی گالیاں دیں جواب میں اتنی ہی سن کے وہ بے مزہ نہیں ہوا۔ اس نے دروازہ دھڑ سے بند کرنے سے پہلے صحیح پتا سمجھا دیا۔ میں نے اور نازو نے کوشش کی کہ وہ ہماری مدد سے باز آ جائے لیکن وہ صبح کا آغاز ایک نیکی سے کرنے کا قائل تھا۔ اس نے ہمیں اس گھر تک پہنچا کے ہی دم لیا جہاں رابعہ اور گل کا قیام تھا۔
دروازہ ایک عمر رسیدہ عورت نے کھولا۔ اس کی ضخامت نے مجھے دم بخود کر دیا۔ اتنی موٹی عورت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے بازو شاید میری رانوں سے بھی زیادہ موٹے تھے۔ اس کا جسم ہر سمت میں ناقابلِ یقین حد تک پھیلا ہوا تھا۔

www.paksociety.com

رابعہ کے نام پر اس نے مجھے شک کی نظر سے دیکھا۔ "تم کون ہے جو اس کو کیوں پوچھتا ہے؟"
"میں اس کا بھتیجا ہوں۔" میں نے کہا۔ "پنڈ داون خان۔"
"ویل داون خان۔ وہ ادھر نہیں ہے۔" پارسی عورت نے کہا اور دروازہ بند کرنے لگی۔
میں نے کہا۔ "سنو سنو۔ میرا نام توکیر خان ہے۔"
وہ رک گئی۔ "تو بھی کیا بولتا ابھی کیا۔ کون ہے تم اس کا۔ کیا بولا تم۔ پوتر یا پاپڑ؟"
میں نے کہا۔ "کزن سمجھ لو۔ گل اس کی کزن ہے۔"
اس نے اطمینان کے انداز میں نازو کی طرف دیکھا۔ "وہ ادھر سے چلا گیا۔"
"چلا گیا؟ کدھر چلا گیا؟" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔ "کوئی پتا چھوڑا ہے انھوں نے؟"
پارسی عورت نے سر ہلایا۔ "ہاں۔ پتا رکھا ہم۔ تم کو تم اندر آئیں گا؟"
میں نے کہا۔ "نہیں۔ ہم جائیں گا۔"
ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے مصافحہ کر کے کہا۔ "میاں جی تم مسلمان ہو تم۔ السلام علیکم۔"
"وعلیکم السلام۔" میں نے کہا۔ "مگر اتنی دیر بعد؟"
"نیک کام دیر سے بھی ہو تو کیا برائی ہے۔" وہ بولا۔
میں نے کہا۔ "تم نے تو لہجہ ہی بدل لیا۔"
وہ بولا۔ "بمبئی میں ایسے ہی بولنے کی عادت ہو گئی ہے۔" پھر اس نے رازدارانہ انداز میں میرے کان کے قریب چہرہ لا کے کہا۔ "کیا آپ پاکستان سے آئے ہو؟"
میں نے کہا۔ "پاکستان سے؟ نہیں۔ کس نے کہا...؟"
وہ ہنسا۔ "اب چھوڑو میاں۔ ہم سے مت چھپاؤ۔ یہاں لوگ اکثر پہچان جاتے ہیں کہ یہ پاکستانی ہے۔"
میں نے کہا۔ "کیسے پہچان جاتے ہیں؟"
وہ بولا۔ "بس ہے کچھ ایسی ہی بات۔ تم جہاں بھی جاؤ گے یہ تجربہ ہوگا تمھیں۔ کوئی نہ کوئی پوچھ بیٹھے گا کہ پاکستان سے آئے ہو؟ مسلمان تو خیر پہچانے جاتے ہیں۔ پاکستانی مسلمان الگ۔"
پارسی عورت نے اندر سے اپنا بھاری ہاتھ نکال کے ایک رقعہ سا مجھے تھما دیا۔ "ابھی ادھر ملیں گا تم کو تمھارا پاپڑ۔"
"پاپڑ نہیں۔ بھتیجا۔" میں نے تصحیح کی اور ڈرائیور کے ساتھ چل پڑا۔
ٹیکسی ڈرائیور ایک جذباتی آدمی تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ ہم مسلمان ہیں اور پاکستان سے آئے ہیں اس کے مہمان نوازی کے جذبات جاگ اٹھے۔ جب ہم پھر اس کی ٹیکسی میں بیٹھے تو اس نے بولنا شروع کیا۔ وہ مسلسل ہمیں ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ ان کی بہادری کے قصے سناتا رہا اور یہ یقین دلاتا رہا کہ دل سے وہ سب مسلمان پاکستان کے ساتھ ہیں، جو مجبوراً بھارت میں رہتے ہیں۔ میں نے اس کی جذباتی تقریر میں مداخلت نہیں کی۔

اب سورج طلوع ہو چکا تھا۔ سڑکوں پر ہر قسم کی گاڑیوں کی آمدورفت بڑھ گئی تھی۔ لوگوں کا ایک ہجوم غفیر ہر سڑک پر رواں دواں نظر آتا تھا۔ آدھا گھنٹا گزر گیا۔ پھر ایک گھنٹا گزر گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی پُرمغز گفتگو نان اسٹاپ جاری رہی۔ اس نے مشرقی پاکستان میں بھارتی مداخلت کی مذمت کی اور اس یقین کا اظہار بھی کیا کہ روس اور امریکا دونوں کی سازش ناکام ہوگی اور بالآخر وہاں امن ہو جائے گا۔

جب ٹیکسی رکی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ نازو نے مجھے اشارے سے منع کر دیا کہ میں اپنے خیالات اور سیاسی نظریات کے اظہار کی کوشش نہ کروں۔ میں خود بھی احتیاط کے تقاضوں کو سمجھتا تھا۔ دیارِ غیر میں دوست نظر آنے والے کو بھی دوست سمجھنا نقصان کا سبب ہو سکتا تھا۔ دشمن تو خیر دشمن ہوتا ہی ہے۔ نازو کی زنانہ منطق یہ تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور خفیہ پولیس کا آدمی ہو سکتا ہے جو ہر اجنبی پر نظر رکھتے ہیں۔
نازو نے ایک بار میرے کان میں کہا۔ "اسے اپنے بارے میں اور کچھ مت بتا دینا۔ کہیں جوش میں آ جاؤ۔"
میں نے سر ہلا کے "اچھا" کہا۔
دوسری بار اس نے کہا۔ "یہ تم سے پوچھے گا کہ بمبئی میں کب تک قیام ہوگا اور کہاں ٹھہرو گے۔ یہاں سے کہاں جاؤ گے؟"
میں نے کہا۔ "نہیں بتاؤں گا۔"
تیسری بار اس نے کہا۔ "یہ پوچھے گا کہ پاکستان میں کہاں سے آئے ہو..."
میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔ "یہ بھی نہیں بتاؤں گا۔"
جب ٹیکسی رکی تو میں نے کہا۔ "کتنے پیسے ہوئے؟"
اس نے کہا۔ "کچھ نہیں میاں۔ تم مہمان ہو۔ خدا حافظ۔" اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ ٹیکسی سمیت غائب ہو گیا۔
میں نے نازو کو گھور کے کہا۔ "یہ ہے تمھاری قیافہ شناسی۔ ایسے ہوتے ہیں خفیہ پولیس والے؟ اس نے کوئی سوال نہیں کیا؟"
نازو نے خفت سے کہا۔ "باتوں سے لگتا تھا۔"
میں نے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ تمھاری باتیں سن کے وہ برا مان گیا۔"
"میں تو تمھارے کان میں بات کر رہی تھی..."
"میں تو خیر بہرا ہوں۔ اس لیے تم اونچا بول رہی تھیں۔ مگر اس کے کان تیز تھے۔" میں نے کہا۔ "تم نے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی

ہے۔ تم خاموش بھی تو رہ سکتی تھیں۔"
"کیا تم خاموش نہیں رہ سکتے؟" نازو نے خفگی سے کہا۔
ہم دونوں ایک دوسرے سے خفا چلتے رہے اور لوگوں سے پتا معلوم کرتے رہے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے دوسری بار ہماری مدد نہیں کی تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ برا مان گیا تھا۔ دس منٹ بعد میں نے ایک پرانی عمارت کی دوسری منزل کے فلیٹ کا دروازہ بجایا۔ نازو نے جہالت کے اس مظاہرے پر مجھے ملامت بھری نظروں سے دیکھا اور کال بیل کا سوئچ دبایا جو میں نے نہیں دیکھا تھا۔ سوئچ ٹوٹا ہوا تھا۔ نازو کو کرنٹ لگا تو اس نے چیخ ماری۔ اب میں نے اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ مزید خفا ہو گئی۔
گل نے دروازے تک آ کے پوچھا۔ "کون ہے؟"
میں نے کہا۔ "کوئی نہیں۔"
اس نے ایک دم پورا دروازہ کھول دیا اور نازو سے لپٹ گئی۔ رابعہ اندر سے بھاگی ہوئی آئی اور ٹھٹک کر رک گئی۔ خوشی سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔
"کہاں سے آ رہے ہو تم دونوں؟" رابعہ نے کہا۔
"دھکے کھا کے۔" میں نے کہا۔ "تم کیا کھلاؤ گی ناشتے میں؟"
"پہلے بتاؤ ان دونوں کا کچھ پتا چلا؟"
"ہاں۔ یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ان کے بارے میں کچھ معلوم کرنا بھی آسان کام نہیں ہے۔" میں نے کہا۔
"یہ کیا بات ہوئی..." رابعہ نے کہا۔
"تم نے بڑی پھرتی دکھائی مکان تلاش کرنے میں۔ کیسے مل گیا یہ مکان؟ اور کیا سلسلہ ہے۔ پگڑی پر ہے یا کرائے پر؟" میں نے کہا۔ "ویسے خاصی محفوظ جگہ ہے۔"
رابعہ نے کہا۔ "یہ بھی انھی کے کوئی جاننے والے تھے۔ ایسے بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ ہفتے دو ہفتے کے لیے چاہیے تو یہ فلیٹ لے لو۔ ظاہر ہے ہماری ضرورت اس سے زیادہ کی نہیں تھی۔ ہم کل شام کو ہی آ گئے تھے۔ اس فلیٹ میں جو میاں بیوی رہتے ہیں وہ دس دن پونے گئے ہوئے ہیں۔"
میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھنے سے تو اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کسی نئے شادی شدہ جوڑے کا مکان ہے۔ نہ وہ سجا ہوا حجلۂ عروسی، نہ جہیز کا نیا سامان۔ نہ سہرے کے مرجھائے ہوئے پھول اور وہ خوشبو..."
رابعہ ہنسی۔ "یہ سب یہاں نہیں ہوتا۔"
نازو اور گل دوسرے کمرے میں ایک ساتھ بول رہی تھیں۔ میں نے رابعہ کے ساتھ کچن کا رخ کیا جہاں وہ ناشتے کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔ فلیٹ پوری طرح آراستہ تھا چنانچہ ہمیں گھر گرہستی کا اسباب خریدنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے رابعہ کو بتایا کہ گزشتہ رات بھی ہم نے ایک ایسے ہی فلیٹ میں گزاری تھی۔ وہ کھانے پینے کا سامان ساتھ لائی تھیں۔ جتنی دیر میں اس نے چائے بنائی، انڈے فرائی کیے اور سلائس گرم کیے میں نے اسے تاربابا سے پارسی کے فلیٹ تک پہنچنے کی پوری کہانی سنا دی۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔
جب ہم اس فلیٹ میں فرش پر بیٹھ کے ناشتا کر رہے تھے تو صبح کے ساڑھے سات بجے تھے۔ نازو نے کہا۔ "ان کی کھوپڑی میں کوئی زبردست پلان ہے۔ مجھے تو نہیں بتایا۔ تم پوچھو۔"
میں نے کہا۔ "ان سے پوچھو کہ ان کے پاس خفیہ پولیس کا کوئی آدمی تو نہیں ہے۔"
رابعہ نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا۔ "تمھاری آپس میں بات چیت بند ہے۔ کوئی لڑائی ہوئی ہے؟"
"ایک بار نہیں دو بار۔" میں نے کہا۔ "پہلی بار میں نے مروت میں معافی مانگ لی تھی۔ اب اس کی باری ہے۔"
"معافی مانگتی ہے میری جوتی..." نازو نے چیخ کے کہا۔
"او کے۔ ہم نے تمھیں جوتی سمیت معاف کیا۔" میں نے کہا۔ "اور اب میں آتا ہوں اپنے ماسٹر پلان کی طرف۔ گل بی بی! اس پلان کی کامیابی کا انحصار تمھارے حوصلے پر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم ان دونوں سے زیادہ نڈر ہو۔ یہ بتاؤ گل خان کیسا آدمی ہے؟"
گل نے حیران ہو کے کہا۔ "گل خان؟"
میں نے کہا۔ "پاکستان سے تم ہمارے ساتھ گل خان بن کے آئی تھیں۔ اور اب جو مرحلہ درپیش ہے اسے گل خان ہی سر کرے گا۔"
"آپ کا مطلب ہے بھائی سکندر... کہ...؟"
"میرا مطلب تم نے بالکل ٹھیک سمجھا۔" میں نے کہا۔ "اب سے کچھ دیر کے بعد تمھیں سردار گیٹ اپ میں رابعہ کے ساتھ جانا ہے اور ایک چھوٹا سا مگر خطرناک ڈراما کرنا ہے۔"
"پہیلیاں مت بجھاؤ۔ صاف بات کرو۔" رابعہ نے جھنجلا کے کہا۔
"تم نے شوہر تو دیکھے ہوں گے؟ سخت زہریلے شوہر؟" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "بلکہ بیچلے۔ اپنی نئی نویلی دلہن کی ہر ادا پر جان سے فریفتہ نظر آنے والے اور ازدواجی زندگی میں غلامی پہ فخر کرنے والے۔ زبان سے ہی نہیں عمل سے بھی آسمان کے ستارے توڑ لانے پر آمادہ۔ فلموں، زنانہ رومانی ناولوں کے علاوہ آپ سب نے اپنے اپنے خوابوں میں بھی دیکھے ہوں گے۔"
گل کھلکھلا کے ہنس پڑی مگر رابعہ نے تنک کر کہا۔ "خواہ مخواہ ہمیں بیچ میں مت لائیں۔ ہم نہیں دیکھتے ایسے خواب..."

www.paksociety.com

"پھر کیا دیکھتی ہیں، ہو کالا کلوٹا، موٹا، بھدا، گنجا اور کھیڑا، کھوں کھوں کرتا دلہا۔" میں نے کہا۔ "یہی تو مشکل ہے تم لڑکیوں کی۔ سچ کو بھی جھٹلا دیتی ہو۔ ارے بھئی! گرش نے شان رے رکی رکھیں خواب میں ہم جیسے دلہا دکھائی دیتے ہیں تو یہ کون سی عیب کی بات ہے۔ اچھی بات ہے یہ تو۔ پتا چلتا ہے اس سے کہ آپ لوگوں کی نظر کمزور نہیں ہے اور عقل بھی ٹھیک ہے۔۔۔ خیر یہ بات تو ضمنی تھی۔ تم دونوں زندگی کے سفر کا آغاز کرنے والے خوش باش، خوش پوش اور خوش شکل جوڑے کی قابلِ رشک زندگی کا کردار ادا کرو گے۔ آج کی ریہرسل کل کام آئے گی۔ انشاء اللہ تم دیکھو گے۔"

"یعنی کل بھی ڈراما ہی کریں گے آپ؟" رابعہ نے کہا۔

"تم آج کی فکر کرو۔ تمھیں گل خان کی زوجہ گل جان کا رول قبول ہے؟ بہ آوازِ بلند تین بار کہو قبول ہے۔"

نازو ہنسنے لگی۔ "تم قاضی بن کے پورا نکاح کیوں نہیں پڑھا دیتے؟"

"اچھا مذاق ختم۔" میں نے کہا۔ "گل! تم کو رابعہ کے ساتھ ایک جیولر کی دکان پر جانا ہوگا۔ جیولر کا نام ہے لی کشن چند۔ کل نازو نے پہلے اسے سب کے سامنے اچھالا اور مجھے گاڑی سے پھر کھڑا کیا اور اپنے ساتھ اغوا کر کے لے گئی۔ آدھے راستے میں اسے گاڑی سے بھی گرا کے پیدل کر دیا حالانکہ گاڑی اسی کی تھی۔ وہ بہت مشتعل ہوگا۔"

نازو ہنسی۔ "اب تک گاڑی مل گئی ہوگی اسے۔"

"نہیں ملی ہوگی تو وہ بھی تب تک مل جائے گی تاہم وہ اپنی اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے بے تاب ہوگا۔" میں نے کہا۔ "نازو نے صبح پھر آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ نازو کا استقبال کرنے کے لیے تریوینی ضرور ہوگا۔ دلاور کی موجودگی بھی خارج از امکان نہیں۔ دکان کی ہر سمت سے نگرانی جاری ہوگی۔ میں اور نازو وہاں جا نہیں سکتے کیونکہ نازو کو کشن چند پہچانتا ہے اور مجھے تریوینی۔"

"اگر دلاور بھی ہوا تو کیا ہوگا؟" رابعہ نے کہا۔ "کیا وہ مجھے نہیں پہچانے گا؟"

"کیسے پہچانے گا۔ تم ایک غیرت مند مسلمان کی باپردہ یا بیاہی منکوحہ کی طرح برقع اوڑھ کے جاؤ گی۔" میں نے کہا۔

"برقع یہاں نہیں ملے گا۔" رابعہ نے کہا۔

"چلو برقع نہ سہی۔ چادر تو ملے گی۔ تم چادر سے منہ سر ڈھانپ کر جاؤ گی۔ اس طرح کہ صرف تمھاری آنکھیں دکھائی دیں۔ گل کا میک اپ صحیح ہونا چاہیے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم کسی میک اپ مین کی خدمات حاصل کریں۔ گل کا مسئلہ یہ ہے۔۔۔ کہ یہ ہے خوبصورت۔۔۔ خیر خوبصورت نوجوان بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی آواز۔۔۔"

"میں آواز کو تھوڑا بہت مردانہ بنا لوں گی۔" گل نے کہا۔

"کیسے؟ ذرا نمونہ پیش کرو۔ رابعہ سے کہو۔۔۔"

"کیا کہوں؟" گل نے شرماتے اور ہنستے ہوئے کہا۔

"وہی بات کہو جو تم کو دکان میں جا کے کرنی ہوگی۔ تم اسے بہت بیش قیمت جیسٹ تحفے میں دینا چاہتے ہو۔ جیسے معلوم ہے کوئی مسئلہ نہیں۔ تمھاری بیوی کی پسند بہت اعلیٰ ہے۔"

گل نے جھینپتے مسکراتے ایک جملہ کہا۔ پہلی کوشش مضحکہ خیز تھی۔ ہم سب ہنسنے لگے۔ اس نے دوسری ... اعتماد کے ساتھ بات کی۔

میں نے کہا۔ "یہ چلے گا۔ اس میں شرمانا گھس ... لیکن چلے گا۔ کچھ مردوں کی آواز ویسا بھی ... ہوتی ہے۔ اب یہ سمجھو کہ تمھیں اندر کچھ وقت گزارنا ہے۔ ... کے لیے استعمال ہونے والی مشین گن پوشیدہ رہے گی۔ ... فرمائش کرتے رہنا۔ ویسے تو خود سیلز مین ... ساری دکان ایک رکھ دیتے ہیں۔ کسی بھی چیز کو ایک ... مسترد کرنا۔ دیکھ بھال کے اور الجھن میں بات کرنے ... کیونکہ تمھیں کچھ وقت گزارنا ہے۔"

"کتنا وقت گزارنا ہے آخر؟" رابعہ نے کہا۔

"یہ میں ابھی کیسے بتاؤں۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ تم جاؤ اور تمھیں وہ دونوں یا تینوں شیطان ایک دم نظر آ جائیں۔ تریوینی اور کشن چند کو بڑی بے چینی سے اس لڑکی کا انتظار ہوگا جو تریوینی کا منہ کالا کر کے ... گئی تھی۔ اضطراری کیفیت ... باہر اور باہر سے اندر چکر لگاتے رہیں گے۔ وہ دکان ... گے اور دکان میں گاہکوں کا داخلہ بھی بند نہیں کریں گے ... کچھ معمول کے مطابق اور نارمل دکھائی دے۔ تم ... جیسے ہی ان میں سے دو قریب آ گئیں۔ تریوینی یا کشن چند ..."

"وہ ہمارے قریب کیوں آئیں گے؟"

"وہاں جا کے دیکھنا کہ کب ان کو آسانی سے قابو کیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ مشین گن نکال لے گی اور گل اپنی ... مشین گن کی نمائش صرف دہشت قائم کرنے کے لیے ہوگی ... جیولر اپنی دکان کے اندر خونریزی نہیں چاہتا۔ اس کی دکان تو ... گھر ہوتی ہے۔ پھر اسے یہ ڈر بھی ہوگا کہیں مال بھی نہ چلا جائے ... جتنا چھوٹا ... عدالتی کو ترجیح دے گا۔ تریوینی ذرا خطرناک ... اگر اسے گولی مارنی پڑے تو دریغ مت کرنا۔ ہر صورت میں ... لانا ہے اور سب کو خبردار کر دینا ہے کہ کسی نے مداخلت کی ... کو اطلاع دی تو ان دونوں کی لاشیں بھی واپس نہیں کی جائیں گی ... کرنے سے ان دونوں کی جان بھی بچ جائے گی اور ... کر دیے جائیں گے۔ ان دونوں کو کسی گاڑی میں بٹھا کے ... دونوں آگے بیٹھیں گے۔ ایک ڈرائیونگ کرے گا ...

تریوینی کو ذرا دیر بہلاوے تاکہ وہ کچھ نہ کر سکے۔ اس کے پیچھے گاڑی سے دلاور لگا کے گل بیٹھے گی۔ کشن چند کو رابعہ سنبھالے گی۔"

"کار کس کی ہوگی؟"

"کار تریوینی کی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں مت بیٹھنا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تریوینی اپنی گاڑی کو ٹریپ بنا کے لایا ہو۔ تم اس میں بیٹھو تو نکل نہ پاؤ۔ اندر اس کے کمانڈوز چھپے ہوئے ہوں۔ رسک لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس جیولر کی گاڑی استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

"مگر اس کی گاڑی۔۔۔؟"

"پاپی! وہ سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کا بیوپاری ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے وہ اس کی اکلوتی کار تھی جو اس کے پاس رہ جائے؟ کتنی کاریں ہوں گی۔ وہ آج دوسری گاڑی میں آیا ہوگا۔ ان دونوں کو اغوا کر کے باہر تک لانے کے بعد سمجھو کہ میدان مار لیا۔ حسن اور غالب کے بدلے میں یہ دو آدمی ہمارے پاس بھی آ گئے۔ ہم کہیں قریب ہی آخری جنگ کے منتظر ہوں گے۔ کسی دوسری کار میں اور جیسے ہی تمھاری کار وہاں سے روانہ ہوگی، ہم سائے کی طرح پیچھے ہوں گے۔ ابھی یہ بتانا مشکل ہے کہ انھیں کہاں لے جانا مناسب ہوگا مگر ان کو چلتے رہنے کی تاکید کروں گا۔ کسی ایک سمت میں چلتے رہو۔ تم بالآخر انھیں نسبتاً کم آباد علاقے میں لے جانے میں کامیاب رہو گی۔ ہم کسی بھی جگہ اوور ٹیک کریں گے۔ اور پھر سارے معاملات کو ٹیک اوور کر لیں گے۔"

"اور اگر کسی وجہ سے تم نے بھی بس کر دیا تو ہم تو مارے جائیں گے اس بھروسے میں کہ تم ساتھ ہو۔" رابعہ نے کہا۔

"لبنیٰ! یہ ایک وار گیم ہے۔ اندازوں اور قیاس آرائیوں کی بنیاد پر ہم نے ایک پلان بنایا ہے۔ اندازے غلط ہوں تو پلان فیل بھی ہو سکتا ہے۔ عملی صورتِ حال اس کے برعکس بھی ہو سکتی ہے۔ تقدیر ساتھ نہ دے کسی وقت کوئی غیر متوقع بات بھی ہو سکتی ہے جس کے لیے ہم اس وقت کوئی پیش بندی نہیں کر سکتے۔ ہم جیت کے لیے لڑتے ہیں۔ امید کی بنیاد پر لیکن شکست کی حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ تم ... کوئی ٹھوس ضمانت کیسے فراہم کر سکتا ہوں۔ اگر میری بات تمھاری سمجھ میں آ گئی ہے تو پھر اٹھو۔ چلنے کی تیاری کرو۔"

تیاری کا سب سے دشوار مرحلہ گل کے لیے اس کے سائز پر فٹ آنے والے مردانہ کپڑوں کی فراہمی کا تھا۔ جس سے شادی شدہ جوڑے کا یہ خلیفہ تھا وہ ... کپڑے ... باقی سب پرانے اور فاضل کپڑوں سے ... نازو اور رابعہ ... مطلب کے کپڑے ... کوئی دشواری پیش نہیں آئی لیکن گل کے لیے پتلون اور کوٹ اس کے سائز سے بہت بڑے تھے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مجھے بازار جانا پڑا۔

بازاروں سے ناواقفیت بھی ایک مسئلہ تھی لیکن ٹیکسی ڈرائیور بہت مددگار ثابت ہوا۔

"ریڈی میڈ سوٹ کا ایک نمبر دکان ہے ادھر اپنا کراچی میں۔" اس نے کہا۔ "لندن فیشن۔"

"کراچی میں کہاں۔۔۔؟"

"ادھر اپنا صدر، لندن فیشن ہے۔۔۔" ڈرائیور نے کہا۔

ڈرائیور کے لیے سب کچھ اپنا تھا۔ جب مجھے لندن فیشن سے بھی گل کے سائز کا مردانہ سوٹ نہیں ملا تو اس نے کہا۔ "ابھی اپنا لندن فیشن کا دوسرا برانچ بھی ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"ادھر اپنا ہائیڈ پارک میں، واٹر فیلڈ روڈ پر۔" اس نے کہا۔ "ابھی گری کا مالک جائیں گا۔"

میرے پاس وقت کم تھا چنانچہ مطلوبہ سائز کا ایک سوٹ مل گیا تو میں نے جوتے خریدے۔ معلوم نہیں کیوں ٹیکسی ڈرائیور نے فرض کر لیا تھا کہ میں بہت بڑا سیٹھ ہوں۔ وہ مجھے زیبان پوائنٹ پر ڈونی شوز والوں کے پاس لے گیا۔ ان کی دکان ... میں تھی اور وہاں واقعی سیٹھ یا غیر ملکی سیاح تیار کرتے تھے۔ جوتے مجھے توقع سے زیادہ مہنگے پڑے۔ دو گھنٹے بعد میں نے یہ سب کچھ گل کے حوالے کیا۔

جب وہ سوٹ بوٹ پہن کے میرے سامنے آئی تو مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ اب بھی مردانگی کا تاثر پیدا کرنے میں ناکام تھی۔

"اب ان بالوں کا کیا ہوگا؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا۔ "انھیں کٹوا لو۔ بوائز کٹ۔"

"بالکل ہی صاف کرا لوں؟ آپ بھی کمال کرتے ہیں بھائی صاحب۔" گل نے خفگی سے کہا۔

"ایک صورت اور ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "کیا ضروری ہے کہ گل کو گل خان ہی بنایا جائے۔ اگر یہ سردار پرتاب سنگھ بن جائے تو؟"

"آفرین!" میں نے کہا۔ "گل خان ہو یا پرتاب سنگھ۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ تم سکھوں کی طرح جوڑا باندھ لو۔"

"سکھوں کا ایک خاص اسٹائل ہے۔ میں ان کی طرح جوڑا کیسے بناؤں؟"

"تو پھر پگڑی رکھ لو سر پر۔۔۔"

"پگڑی کون باندھے گا؟" رابعہ نے کہا۔ "اس کا بھی ایک خاص اسٹائل ہے۔"

"مجھے یاد آیا۔" میں نے کہا۔ "جب میں واپس آ رہا تھا تو میں نے

www.paksociety.com

کہیں ایک دکان دیکھی تھی۔ بیلڈ نمبر… ان کے پاس ہر چیز ملتی تھی جو سر پہ رکھی یا اوڑھی جاتی ہے۔ ہر قسم کی ٹوپی اور ہیٹ۔ ان کے پاس ریڈی میڈ پگڑیاں بھی ہوں گی۔ مہاراجہ اسٹائل، بڑھیا اسٹائل اور سکھوا اسٹائل کی پگڑی ہم راستے میں خرید لیں گے۔"

"یہ بھی طے کر لو کہ سردار پرتاب سنگھ کی گھر والی کا نام کیا ہوگا؟" اس نے غیر موجود مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔

"میں نے کہا: "کیا سکھ خواتین نام نہیں لیتیں اپنے شوہر کا؟"

"آج کل سب عورتیں نام لیتی ہیں۔"

میں نے آہ بھر کے کہا: "کیا زمانہ آگیا ہے۔ ایک ہمارے دادا کا وقت تھا کہ بیویاں نام لیتے ہوئے کانوں کو سو بار ہاتھ لگاتی تھیں کہ اس سے تو نکاح ٹوٹ جائے گا۔ خیر۔ تم دونوں کے لیے سہولت اسی میں ہے کہ تم کہو، سردار جی۔ گل تے سنو۔ اور یہ کہے "سردارنی حکم کرو۔ اسی نے ان حکم دے غلام، کیسے؟ ذرا بات کر کے دکھاؤ۔"

"چلو جی۔ ہم کریں گے اپنی باتیں۔" رابعہ نے کچھ شرما کے کہا۔ "تمہارے سامنے کیوں کریں۔"

ٹھیک گیارہ بجے ہم ایک ساتھ نکلے اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ رابعہ نے چادر کو یوں لپیٹا تھا کہ شین گن دکھائی بھی نہ دیتی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ بھی چھپا لیا تھا۔ گل اس کے ساتھ آ کر بیٹھے ہوئے مجھے مسلح خبر ہی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ کوئی اور انھیں دیکھ کر نہ حیران ہوا ہے نہ پریشان۔ یہ نقلی چہروں اور نقلی جذبات کے مظاہرے کرنے والوں کا شہر تھا اور اداکاروں کا شہر تھا۔ کہیں کچھ بھی معمول کے مطابق ہو یا غیر معمولی نظر آئے تو لوگ فرض کر لیتے تھے کہ کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔

سکھ اسٹائل کی پگڑی راستے میں ایک اور ویسی ہی دکان سے مل گئی جیسی میں نے دیکھی تھی۔ پگڑی سر پہ رکھنے کے بعد گل ایک پشتہ سکھ نوجوان سکھ نظر آنے لگی۔ رنگ روپ کے اعتبار سے سکھ ایک خوبصورت قوم ہیں۔ لڑکے لڑکیاں نوجوانی کے آغاز میں ایک سے نظر آتے ہیں اور ان کی جنس کا تعین شہر والوں میں تو لباس سے ہو جاتا ہے لیکن دیہات میں جہاں کُرتا پاجامہ مشترک پہناوا ہے خاصی گڑبڑ ہوتی ہے۔

ٹیکسی ابھی کشن چند جیولرز کی دکان سے دور ہی تھی کہ میں نے اور نازو نے اتر جانے کا فیصلہ کیا۔ سردار پرتاب سنگھ اور ان کی گھر والی کو بھی میں نے تاکید کی کہ وہ عین دکان کے سامنے جا کے نہ اتریں۔ بہتر یہ ہوگا کہ وہ شاپنگ اور تفریح ایک ساتھ کرتے ہوئے جائیں۔ دکانوں کے شوکیسوں میں جھانکتے اور باتیں کرتے۔ کشن چند کی دکان میں بھی وہ یوں داخل ہوں جیسے ان کا پہلے سے کوئی پروگرام نہیں تھا

لیکن دکان سامنے آگئی ہے تو سردار پرتاب سنگھ جذباتی ہو گئے ہیں۔ جب ٹیکسی آگے بڑھ گئی تو میں نے نازو سے کہا: "ہم ایسا کریں! ہم ابھی تک بے کار ہیں۔"

"ہم ٹیکسی سے سکتے ہیں۔" نازو نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا: "ٹیکسی بھروسے کے قابل نہیں ہوتی۔ ٹیکسی ڈرائیور اس سے بھی زیادہ ناقابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ ہمیں ایک کار چاہیے۔"

"خرید لو۔ ایک سے بڑھ کر ایک نظر آ رہی ہے ہر شوروم میں۔" نازو نے کہا۔

"ان ہی میں سے دیکھو۔ جو ہمارے سامنے ہیں۔" میں نے مسکرا کے کہا، "اگر کوئی شامت کا مارا لفٹ دے دے۔"

"یہاں کون لفٹ دے گا۔" نازو نے کہا: "جہاں خلوص ہم ہر وقت دستیاب ہے۔"

"فرض کرو ہماری جیب میں جتنا تھا اس سے ٹیکسی کا کرایہ … جیب کٹ چکی ہے۔" میں نے کہا: "اب تم بحث مت کرو۔ …"

"کیا کہوں کسی زرک جانے والے سے کہ کہاں جانا ہے؟" نازو نے کہا۔

"یہ سوال ایسا ہے کہ اس کا جواب تم اپنی مرضی سے کچھ بھی دے سکتی ہو۔" میں نے کہا، "بمبئی میں ایسی خواتین بھی ہیں۔ بمبئی میں کیا سامان ڈھیلا ملتا ہے۔ جو کہتی ہیں کہ جہاں آپ چاہیں لے جائیں۔ لیکن بہ جواب پسند نہیں تو پھر کچھ بھی مت کہو۔ دروازہ کھولو اور بیٹھ جاؤ۔ باقی مجھ پر چھوڑ دو۔ … اس خادم پر۔"

نازو نے ایک طرف سے آنے والی ہر کار کو بڑی معصومیت سے اشارہ کیا مگر ان کو گھور کر دیکھنے والے رکے بغیر گزر گئے۔ سب با ذوق لوگ نہیں تھے۔ اصل خرابی میری موجودگی پیدا کر رہی تھی۔ نازو کے ساتھ مجھے دیکھ کر نیکی کرنے کے جذبات پر اوس پڑ جاتی تھی۔ مجبوراً میں نے پرانا طریقہ استعمال کیا اور خود دور کھڑا ہو کے … کرنے لگا۔

حسب توقع ایک شوخ لباس والے نوجوان نے اپنی کار نازو کے لیے یوں روکی کہ پہلے وہ آگے نکل گیا پھر بریک لگا کے اور ریورس میں جھلکے وہ فوراً سے واپس آیا۔

"حکم کریں جی" اس نے بڑے اسٹائل سے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"کہاں جا رہے ہیں جی آپ؟" نازو نے جھلا کے کہا۔

"ارے بھائی جانا کہاں ہے صاحب تو ہمیں جہاں جانا …" اس نے سخت عاشقانہ اسٹائل میں سینے پر ہاتھ رکھا۔ نازو نے … کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ دوسری طرف میں پہنچ چکا تھا۔ …

پہلے کہ نازو کے حسن پر فریفتہ ہو جانے والا نوجوان سنبھلتا میں نے اسے بڑی صفائی سے ناک آؤٹ کر دیا۔ وہ ساتھ والی سیٹ پر جھکا اور ساکت ہو گیا۔ نازو کے جھٹکے نے اسے پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ سے دور کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ اتنے کم وقت میں ہوا کہ ادھر اُدھر سے گزرنے والی کسی کار کے ڈرائیور نے کچھ نہیں دیکھا۔ اسپورٹس کار کے ایک دروازے کو میں نے بلاک کر رکھا تھا اور دوسرے کو نازو نے۔ گاڑی ایک جھٹکا لے کر بند ہو گئی تھی۔ میں نے چند سیکنڈ میں اسے پھر اسٹارٹ کیا۔ نازو کے بیٹھتے ہی کار پھر اسی طرح دوڑنے لگی جیسے اصل مالک کے اشارے پر دوڑ رہی تھی۔ جب میں نے کار کو ایک ٹرک کے پیچھے روکا تو نازو نے کار کے مالک کو پچھلی سیٹ پر الٹ دیا۔ کھڑکی میں پیرا شوٹ کے کپڑے کا بنا ہوا کار کور تھا۔ یہ کور نازو نے بے حس و حرکت پڑے ہوئے نوجوان پر ڈال دیا۔

ایک بار ہم کشن چند کی دکان کے سامنے سے اندر اور باہر کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے گزر گئے۔ اندر بھی سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ جگمگاتے شوکیسوں کے پیچھے سیلزمین کھڑے ہوئے تھے اور ان کے سامنے اونچے اسٹولوں پر گاہک براجمان تھے۔ کوشش کے باوجود میں گل یا رابعہ کی جھلک بھی نہ دیکھ سکا۔ دکان کے باہر سیکڑوں کاریں صف بستہ تھیں لیکن ان میں ایک بھی پولیس کار نہیں تھی۔ یہ اندازہ کرنا تقریباً ناممکن تھا کہ کس کار میں ہمارے دشمن شکار کی بو پا چکے بیٹھے ہیں۔

ایک ون وے اسٹریٹ سے گزر کے اور دوبارہ بائیں ہاتھ پر گھوم کے میں پھر اسی سڑک پر پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔

اس گڑبڑ کا احساس مجھے نازو نے دلایا: "سکندر! کیا کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے؟"

میں نے کہا: "اس کا مطلب ہے کہ یہ میرا وہم نہیں ایک حقیقت ہے۔ شک مجھے بھی ہوا تھا۔"

لیکن اب شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ گاڑی جو مجھے مسلسل بیک ویو مرر میں نظر آ رہی تھی ایک دم آگے بڑھی۔ اس نے ہماری اسپورٹس کار کو اوور ٹیک کیا اور عین ہمارے سامنے آ کے ہمارا راستہ روک دیا۔

گاڑی کو ایک نوجوان چلا رہا تھا۔ اس کی صورت نے مجھے ذرا سی دیر کے لیے چکرا دیا۔ اگر فرق لباس کا نہ ہوتا تو شاید میں پلٹ کر دیکھتا کہ کہیں وہ نوجوان سیٹ پر سے غائب تو نہیں ہو گیا ہے جسے ہم نے بڑی احتیاط کے ساتھ سیٹ کور کے نیچے چھپایا

رہا تھا۔ اس دوسرے نوجوان کی صورت ناقابلِ یقین حد تک اس کار کے مالک کی صورت سے ملتی تھی جسے ہم بڑے اعتماد کے ساتھ چلا رہے تھے۔ ایک شوخ طرح دار حسینہ اس کے ساتھ فلی پھندنا بنائے بیٹھی ہوئی تھی۔

جب وہ اتر کے میرے قریب آیا تو میں نے کہا: "جی کیا تکلیف ہے آپ کو، راستہ کیوں بلاک کیا ہے میرا؟"

سوال انگریزی میں کیا گیا تھا چنانچہ وہ محتاط ہو گیا اور اس کے تیور بھی ایسے جیسے جارحانہ نہیں رہے: "آئی ایم سوری۔"

"انگریزوں کا مزاج یہ ہے کہ جب تک انھیں واقعی افسوس یا شرمندگی نہ ہو وہ ایسا نہیں کہتے لیکن ہم تو اس جملے کا استعمال عادتاً کرتے ہیں۔ مجھے بالکل ایسا نہیں لگتا کہ آپ کو اپنی غلطی کا احساس بھی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ مزید نروس ہو گیا۔ اس نے اپنی گرل فرینڈ کی طرف خفت سے دیکھا جس کی مسکراہٹ میں تمسخر کا رنگ اس کے جذبات کو مجروح کر رہا تھا۔

"یہ گاڑی آپ کیوں چلا رہے ہیں؟" اس نے ایک احمقانہ سوال کیا اور میری گاڑی کی طرف دیکھا۔

"وہ گاڑی آپ کیوں چلا رہے ہیں؟" میں نے اسی کے لہجے میں کہا اور اس کی گاڑی کی طرف دیکھا۔

نازو کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں نفسیاتی غلبہ حاصل کر چکا ہوں اور وہ نوجوان جس نے شک کیا تھا تو کوئی غلطی نہیں کی تھی، خواہ مخواہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس سے کوئی خلافِ تہذیب حرکت سرزد ہو گئی ہے۔ نازو کی ہنسی نے اسے نروس کر دیا۔

"دراصل… یہ کار میرے بھائی فرینڈ کی ہے۔" وہ بولا۔

میں نے گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈالتے ہوئے کہا: "اگر صرف یہی بات بتانے کے لیے آپ نے اتنی زحمت کی تھی تو شکریہ۔ فرینڈ میرا بھی دوست ہے۔ میرا نام ہے اگروال۔ آپ سے کچھ بتایا ہے فرینڈ نے؟"

اب وہ شائستگی سے مسکرانے لگا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "فرینڈ مجھ سے پانچ منٹ بڑا ہے۔ میرا نام سریندر ہے۔ آج آپ سے اس کی ملاقات تو ہوگی؟"

میں نے کہا: "ہاں۔ اسے ہم لنچ کے لیے پک کریں گے۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ پیٹ پر یہ گاڑی ہم اسے واپس کریں گے گاڑی سمیت۔"

"بس اسے بتا دیں کہ میں پونا جا رہا ہوں۔ کل واپس آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اینڈ سوری ونس اگین۔" وہ بولا۔

www.paksociety.com

میں نے بھی مسکرا کے کہا "میں بتا دوں گا اسے"
"پہلے میرا ارادہ گاڑی کو واپس لے جا کر آگے نکل جانے کا تھا" اب میں نے اسے موقع دیا کہ وہ سامنے سے گاڑی ہٹا لے اور پہلے روانہ ہو جائے۔ ہم ایک ساتھ چلے مگر وہ تیز رفتاری کا عادی تھا یا خفت مٹانے کے لیے بھاگ جانا چاہتا تھا کہ ایک منٹ میں ایک فرلانگ آگے نکل گیا۔ میں نے کار کو ایک فرلانگ کے بعد پارک کر دیا۔

"اس وقت تو بال بال بچے" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "ہاں لیکن اگر بڑے بھائی صاحب کھلانے لگتے یا آہ بھی کرتے تو ہمارا بنا بنایا کام بگاڑ دیتے"

"ہمارا کام کیا بگاڑتے۔ وہ خود معقولات کی سزا بھگتنے کو ملتی۔ وہ خود بھی مارا جاتا اور بے چاری گرل فرینڈ..." نازو بولی۔

"تم نے کیسے اندازہ کر لیا کہ وہ گرل فرینڈ تھی، بیوی یا بہن نہیں ہو سکتی کیا؟"

نازو ہنسی "نہیں۔ بیویوں کے یہ انداز نہیں ہوتے"

"اچھا، پھر کیا انداز ہوتے ہیں؟" میں نے کہا۔

نازو بولی "جب بیوی آئے گی تو معلوم ہو جائے گا"

میں نے کہا "تمہارے انداز بھی بدل جائیں گے۔ بیوی بننے کے بعد؟"

"صرف میری بات کیوں کرتے ہو۔ تم بھی نہیں رہو گے یہ نیاز مندی، یہ وارفتگی — اور یہ بے قراری تب تک ہے جب تک جذبات کی راہ میں فاصلے حائل ہیں" نازو نے کہا۔ "جب تک تم شوہر نہیں ہو"

میں حیران رہ گیا "کیا شوہروں کے جذبات نہیں ہوتے؟"

"ہوتے ہوں گے مگر جذبات کی شدت اور نوعیت میں فرق تو پڑ ہی جاتا ہے بعد میں"

میں نے کہا "اور بیویوں کے بارے میں کیا ارشاد ہے۔ کیا تم وہی رہو گی جو آج ہو؟"

"نہیں — ظاہر ہے وقت بدلے گا اور حالات بدلیں گے۔ تو پھر میں بھی کیسے بچ سکتی ہوں" نازو نے کہا۔

"لیکن یہ تبدیلی تمہیں پسند نہیں؟ تمہارے لیے اس وقت اور آج کے حالات ہی زیادہ قابل قبول ہیں" میں نے کہا۔

"قبول سب کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس سے گریز ممکن نہیں۔ مگر آج ہے وہ آج اچھا لگتا ہے۔ آنے والا دن ایک خواب ہے۔ اس کی تعبیر بھی اچھی ہوگی، ایسا نہ ہوتا تو ہم اپنے خوابوں کی تعبیر کیوں مانگتے۔ اس وقت وہ بھی اچھا لگے گا جو کل ہوگا"

میں نے کہا "میں بے حد مرعوب ہوا ہوں اس وقت۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی حقیقت پسندانہ سوچ بھی رکھ سکتی ہو"

"آپ تو یہ سمجھتے ہیں نا کہ آپ مرد ہیں۔ صرف آپ ہی کی سوچ حقیقت پسندانہ ہو سکتی ہے۔ ہم بے چاری لڑکیاں رومانی خوابوں کی اسیر..."

میں نے کہا "میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ آئی ایم سوری"

نازو نے کہا "انگریز قوم کا مزاج یہ ہے کہ..."

میں ہنس پڑا "اچھا — میرا ہی وار مجھ پر۔ میں تو اسے جھٹکا دینا چاہتا تھا۔ وہ میری توقع سے زیادہ بودا نکلا۔ اگر وہ پیچھے پڑ جاتا تو واقعی مشکل ہو جاتی"

ہم "کشن چند جیولرز" کی دکان سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر بہت سی دوسری کاروں کے درمیان اپنی کار پارک کیے بیٹھے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ دور سے میری یا نازو کی صورت صاف نظر آئے چنانچہ ہم نے سب شیشے بند کر دیے تھے۔ بہت قریب سے ہمیں دو افراد نے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے ساتھ والی گاڑی نکالی تھی اور دوسرے نے فوراً اس کی جگہ کار کھڑی کر دی تھی۔ ان دونوں نے یقیناً ہمیں ان مبتلائے عشق میں شامل کیا ہوگا جو زمانے کی نظر سے یونہی چھپ چھپ کر ملنے پر مجبور ہیں کیونکہ ترقی پسند معاشرہ بھی اب تک عشق کرنے کا اوپن لائسنس نہیں دیتا۔

نازو کی نگاہ کشن چند جیولر کے شفاف شیشوں والے دروازے تک جا کے لوٹ آتی تھی۔ دروازہ بار بار کھلتا تھا اور کسی کے اندر جانے یا باہر آنے کے بعد آہستہ آہستہ جھولتا رہتا تھا۔ دوسری سب دکانوں میں بھی خریداروں کی آمد و رفت جاری تھی۔ یہ سب دولت مندوں کی تفریح گاہیں تھیں اور یہاں شاپنگ صرف ایک تفریح تھی۔ ضرورت نہیں۔

میں نے کئی بار ان سب گاڑیوں کو دیکھا جو کشن چند جیولر کی دکان کے سامنے اور دو سو گز کے فاصلے میں کھڑی ہوئی تھیں لیکن مجھے کہیں کسی گاڑی میں کوئی مشتبہ چہرہ نظر نہیں آیا۔ جیولر کی دکان کے آس پاس اگر شکاری کہیں موجود تھے تو بڑی ہنرمندی سے خود کو چھپائے رکھنے میں کامیاب تھے۔

"وہ دونوں اندر ہی ہوں گی" نازو کچھ دیر بعد بولی۔

"ہاں — اور کہاں ہو سکتی ہیں" میں نے کہا۔

"فرض کرو سکندر — وہ دھوکا دینے میں ناکام رہیں۔ اندر دلاور بھی موجود ہوا۔ وہ رابعہ کو فوراً پہچان لے گا"

میں نے کہا "ہاں — یہ رسک تو ہے لیکن دلاور یہاں کیوں، اور کیسے ہوگا؟"

"میں تو کہہ رہی ہوں کہ فرض کرو وہ ہوا"

"اللہ مالک ہے" میں نے کہا "تریوینی اور کشن چند کے ساتھ اپنے دلاور صاحب بھی آ جائیں تو چشم ما روشن دل ما شاد"

نازو نے نفی میں سر ہلایا "تریوینی اور کشن چند سے میں واقف نہیں — لیکن دلاور اتنی آسانی سے..."

میں نے غصے میں اس کی بات کاٹ دی "آخر تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ اور کیا کہلوانا چاہتی ہو مجھ سے۔ میں غیب کا علم نہیں رکھتا۔ میں کیا بتاؤں کہ کیا ہوگا۔ میری آنکھیں اندر کچھ نہیں دیکھ رہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور۔ وہ تینوں ہاتھ نہ آئے تو یہ ہو سکتا ہے کہ مارے جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ گل اور رابعہ کو پکڑ لیں یا انہیں گولی مار دیں"

نازو کا رنگ اڑ گیا۔ اسے مجھ سے ایسے شدید ردعمل کی توقع نہیں تھی۔

ایک گہری سانس لے کر میں نے کہا "بات یہ ہے نازو بی بی! کہ میری نظر بھی صرف اجالے کو نہیں دیکھتی۔ میں تاریک پہلو پر نظر ضرور رکھتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ ناکامی کا خیال میرا ارادہ نہیں بدلتا۔ جو کچھ تم سوچ سوچ کے خوف میں مبتلا ہو رہی ہو وہ میرے ذہن میں اس وقت بھی تھا جب میں نے گل اور رابعہ کو اس مشن پر بھیجا تھا اور تمہارا کیا خیال ہے خود انہیں اندازہ نہیں ہوگا کہ ان کا یہ کام کتنا مشکل ہے؟ کامیابی کی خواہش اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے کوشش کی شرط ہے مگر کوشش بھی تو ناکام ہو سکتی ہے"

نازو باہر دیکھ رہی تھی اور جانتے بوجھتے یہ ظاہر کر رہی تھی جیسے اس کی توجہ کہیں اور ہے اور وہ میری بات سن ہی نہیں رہی ہے۔ اس نے اچانک میری طرف دیکھا اور بولی۔ "تم کچھ کہہ رہے تھے"

میں نے ہنس کے کہا "میں جھک مار رہا تھا"

وہ معصومیت سے بولی "خفا کیوں ہوتے ہو۔ وہاں تک تو سنا تھا میں نے، جب تم تاریک پہلو کی بات کر رہے تھے۔ اس کے بعد والا پیراگراف پھر بول دو گے تو کیا زبان گھس جائے گی"

مجھے ہنسی آ گئی "تم بہت چالاک لڑکی ہو"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اس کے برعکس میں خود کو ایک بے وقوف اور عاقبت نااندیش لڑکی سمجھتی ہوں جس نے اپنے مستقبل کے بارے میں بے حد جذباتی اور غیر عملی انداز فکر اختیار کیا"

"اس بات کا احساس تمہیں آج اچانک کیوں ہوا؟"

"یہ بات نہیں۔ ایسے ہی کبھی ڈپریشن [illegible] کے دورے میں خیال آتا ہے کہ میں ایک عام سی لڑکی ہوتی [illegible] ہم سب جو ایک مشترک مقصد کی جدوجہد میں [illegible] عام قسم کے لوگ ہوتے تو آج اپنے اپنے گھروں میں [illegible] جیسے تم نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ حالانکہ تمہیں [illegible] زیادہ مل سکتا تھا جو تمہارا حق تھا۔ پھر رابعہ نے اپنا گھر اور اپنا کیریئر سب داؤ پر لگا دیا۔ میں نے والدین کو اور گھر کو چھوڑا اور ایک بھائی بچا تھا..."

"تم کو افسوس ہے کہ تم عام سی لڑکی کیوں نہ ہوئیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں — یہ تو مقام شکر ہے۔ خدا نے ہمیں غیر معمولی بنایا کیونکہ وہ ہم سے غیر معمولی کام لینا چاہتا تھا" نازو نے کہا۔ "پھر کس خوبی سے اس نے ہمیں یکجا کر دیا۔ کوئی کہاں سے آیا کوئی کہاں سے"

"ہاں — ابتدا میں تو صرف محسن تھا اور میں۔ یہ اتفاق..."

نازو نے میری بات کاٹ دی "میں اسے اتفاق نہیں سمجھ سکتی۔ یہ قدرت کا حسن انتظام تھا۔ پہلے سے طے تھا کہ کب کیا ہوگا اور کیسے ہوگا۔ اور اگر ہم چاہتے کہ ایسا نہ ہو — تو یہ ناممکن تھا"

تریوینی اچانک دروازے سے نمودار ہوا۔ اس کے بالکل پیچھے میں نے گل کو دیکھا۔ ایک جوشیلے جذباتی جوان مرد کی طرح اس نے اپنی سوچی دوستی کے لیے دروازے کو تھامے رکھا۔ تریوینی کے تقریباً ساتھ ہی رابعہ بھی برآمد ہوئی۔ گل ان کے پیچھے رہی اور اس نے ایک بار پلٹ کے جھولتے ہوئے دروازے سے دکان کے اندر کا منظر بھی دیکھا مگر کوئی بھی ان کے بعد باہر نہیں آیا تھا۔

تریوینی بالکل مطمئن تھا۔ یوں بھی وہ جذبات سے عاری ایک مشینی انسان کی طرح ہے حس نظر آنے کی پوری کوشش کرتا تھا اور اس کی مصنوعی شخصیت ہی اس کا اصل روپ بن کر رہ گئی تھی۔ وہ تھری پیس سوٹ میں تھا اور سگار پی رہا تھا۔

دور سے ہی میں نے گل اور رابعہ کی مستعدی کا اندازہ کر لیا۔ وہ ہر قسم کی غیر متوقع صورت حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح چوکس تھیں۔ رابعہ کی زد میں تریوینی تھا۔ شاید گل نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ ادھر ادھر کی فکر بالکل نہ کرے۔ یہ کام وہ خود کر رہی تھی۔ اس کی نظریں خاصی بے چین لگ رہی تھیں۔

www.paksociety.com

وہ اپنے چاروں طرف موجود لوگوں کو اور پھر گاڑی کو دیکھتی جا رہی تھی۔ ان کے پُراعتماد انداز سے بالکل واضح ہو جاتا تھا کہ تریلوچنی کی معمولی سی غلطی پر رابعہ اس سے کچھ پوچھے بغیر اپنے ریوالور سے اس کے سر میں سوراخ کر دے گی اور اگر کسی حامی نے کسی بھی سمت سے مداخلت کی تو وہ گل کے ہاتھوں مارا جائے گا۔

میں نے کار کا انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے نازو کی طرف دیکھا اور کہا: "دلاور رہا تو نہیں آیا!"

نازو نے سر ہلایا: "چلو — کوئی تو ملا۔"

میں نے کار کو ریورس کرتے ہوئے کہا: "ان۔ اہل کا بیانیہ ہے کہ گل اور رابعہ کا مشن ناکامی سے دوچار نہیں ہوا۔"

پلان کے مطابق تریلوچنی کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا گیا تھا۔ گل عین اس کے پیچھے تھی اور رابعہ اس کے ساتھ بیٹھی۔ میں نے تریلوچنی کو تقریباً سو گز آگے رہنے کا موقع دیا۔ دونوں گاڑیوں کے آگے پیچھے روانہ ہونے کے وقت میں نے بھی آگے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھا مگر نہ کوئی اور گاڑی عین اسی وقت قطار سے باہر نکلی تھی اور نہ ہمارے ساتھ روانہ ہوئی تھی۔

لکشمن چند کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے نازو سے کہا: "تمہاری دونوں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں نا؟"

اس نے چڑ کے کہا: "کیا تمہاری محبوب کی نظر اتنی کمزور ہے؟"

میں نے کہا: "میری نظر کو نظر مت لگاؤ۔ کیا ہوا ہے میری نظر کو؟"

نازو نے کہا: "پھر تم کو میری آنکھیں کھلی ہوئی نظر کیوں نہیں آ رہی ہیں؟"

"اچھا۔ کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہو کہ دخل در معقولات کے لیے کسی نے بھی ہمارا تعاقب شروع نہیں کیا ہے؟"

"میں پچاس فیصد یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتی ہوں۔ پچاس فیصد امکان اس بات کا بھی ہے کہ تعاقب بعد میں کیا جائے۔ یا وائرلیس پر ہماری گاڑیوں کی موومنٹ کے بارے میں اطلاع دی جا رہی ہو۔"

"کسے اطلاع دی جا رہی ہو؟"

"کسی کو بھی — جو سامنے تو نہیں ہے مگر دور بیٹھ کے بھی سب کچھ کر سکتا ہے۔ مثلاً دلاور۔" نازو نے کہا۔

آگے والی گاڑی کو تریلوچنی بہت محتاط انداز میں چلا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہماری آسانی کے لیے رفتار کم رکھنے پر مجبور ہے۔ محتاط میں بھی تھا لیکن نہ جانے کہاں سے دوسری جنگِ عظیم کے زمانے کی ایک گاڑی نمودار ہوئی جسے پہلی جنگِ عظیم میں ریٹائر ہو جانے والا فوجی افسر ٹائپ پارسی چلا رہا تھا۔ اس نے جوشِ جوانی میں ہم سے آگے نکلنے کی کوشش کی تو اس کے بوڑھے انجن کا سانس اکھڑ گیا اور کار لڑکھڑانے لگی۔ میں نے اسے بچانے کی کوشش کی اس کے باوجود دونوں کاروں کے بمپر ٹکرا گئے۔

میرے خیال میں بمپر کا بمپر سے چھو جانا کوئی حادثہ نہیں تھا۔ مگر پارسی نے ایسی دلدوز چیخ ماری جیسے بمپر اس کے سر پر لگا ہے اور کار کو روک دیا۔ اس نے میرا راستہ مکمل طور پر بلاک کر دیا تھا۔ درمیانی فاصلہ اتنا کم تھا کہ میں اپنی گاڑی کو سائڈ سے نہیں نکال سکتا تھا۔ مزید یہ کہ میرے بالکل پیچھے ایک دم بریک لگانے سے ایک اناڑی خاتون ڈرائیور کی گاڑی بند ہو گئی تھی جو اب اسٹارٹ ہونے پر آمادہ نہیں تھی۔ میں بیچ میں بُری طرح پھنس چکا تھا۔

میں نے پارسی کو دل ہی دل میں ایک درجن ناقابلِ اشاعت گالیاں دیں لیکن زبان سے صرف اسے اُلو کا پٹھا کہا۔ اس آفتِ ناگہانی نے نازو کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ میں سخت مشتعل تھا اور اپنی بے بسی پر سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پارسی جلد از جلد اپنی گاڑی ہٹا لے مگر وہ انجن بند کر کے اپنی ہم عمر مجروح کار کے نقصانات کا جائزہ لینے کے لیے نیچے اتر آیا تھا۔

نازو نے اپنے سر پر ہاتھ مار کے کہا: "یہ کیا مصیبت نازل ہو گئی۔ آگے والی گاڑی تو گم ہو گئی۔"

میں نے کار کی کھڑکی سے سر نکالا اور چیخ کے کہا: "ابے بڈھے پھونس! ہٹا سامنے سے اس ڈھانچے کو۔"

نازو نے چلا کے پیچھے والی خاتون سے کہا: "خدا کے لیے تم ہی کچھ پیچھے کر لو اپنی گاڑی کو۔ میں اسٹارٹ کر دوں۔"

خاتون نے گھبرا کے کہا: "بیٹری! بالکل ڈیڈ ہے۔"

پارسی میری طرف لپکا۔ "سالا حرامی۔ نیا گاڑی کا ناس کیا۔ ابھی تیرے کو کیا معلوم یہ رولز رائس ہے جس کو تو لوہا سمجھا بولا!"

نازو نے نیچے اتر کے خاتون ڈرائیور سے کہا: "آپ نیوٹرل کریں۔ دھکا لگانے سے گاڑی پیچھے ہو جائے گی۔"

ہاتھ جوڑ کر میں نے پارسی سے کہا: "اچھا میرے باپ میرے دادا۔ تیری رولز رائس کا کتنا نقصان ہوا ہے بول؟"

"ابھی دو سو روپیہ لگ جائیں گا۔۔۔"

میں نے فوراً دو سو روپے نکالے اور اسے تھما دیے۔ "چلو اب ہٹاؤ اپنی رولز رائس۔" ٹریفک آف بند ہو گئے ہوتے: ایک ٹریفک کانسٹیبل کہاں سے ٹپکتا ہوا آیا اور کس نے کہا:

"ایک جام کس نے کس کو ٹکر ماری ہے؟" اس نے آواز میں قانون کی دہشت پیدا کر کے کہا۔

میں نے مسکرا کے کہا: "ٹکر؟ کیسی ٹکر۔ بس ہم جا رہے ہیں۔ تم بہت تھکے ہوئے نظر آ رہے ہو۔ یہ لو جلدی کہیں بیٹھ کے چائے ہی پی لو کم سے کم۔" اور دس کا ایک نوٹ اس کی مٹھی میں دبا دیا۔

لیکن یہ سب بے سود رہا۔ تریلوچنی کی کار اتنی دیر میں غائب ہو چکی تھی۔ جب ہم پھر روانہ ہوئے تو سڑک پر دور دور تک اس کار کا کہیں پتا نہ تھا۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔" نازو نے کہا۔ "سارا کام خراب ہو گیا۔"

"مگر میرا تو کوئی قصور نہیں اس میں۔" میں نے کہا۔

"تم محتاط نہیں تھے۔ تمہاری توجہ کہیں اور تھی۔" نازو نے کہا۔

"یہ غلط ہے۔" میں نے ڈیش بورڈ پر مُکا مارا۔ "وہ بڈھا جان بوجھ کے سامنے آیا تھا اسی طرح روز دو چار سو بناتا ہو گا وہ۔"

"تمہاری جگہ میں ہوتی تو۔۔۔"

"کیا کر لیتیں تم؟ اوپر سے گاڑی کو گزار کے لے جاتیں؟" میں نے چلا کے کہا: "دیکھا نہیں اپنی اس خالہ کو جو پیچھے آ کے پھنس گئی تھی۔ افلاطون نہیں ہیں سب اور ہوتی ہیں ناقص العقل۔ رابعہ اور گل بھی ہیں ورنہ خیال رکھنا چاہیے تھا انھیں کہ ہم بھی پیچھے ہیں اور اگر نہیں ہیں تو کیوں نہیں ہیں۔ ٹریفک میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے لیے کہیں رک کے انتظار کرنا کیا مشکل تھا۔ وہ تریلوچنی سے کہہ سکتی تھیں کہ رک جاؤ۔"

نازو نے کہا: "یہی کیا ہے انھوں نے۔"

اسی وقت میں نے تریلوچنی کی گاڑی کو سڑک کے بائیں کنارے پر دیکھا اور میرا تمام غصے کا جوش و خروش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

نازو نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا۔ "ہو نا تم بھی ایک عام متعصب جاہل قسم کے مرد۔ عورت کے بارے میں اپنی رائے تم کبھی نہیں بدلو گے۔ اب کہو گے سوری — میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ مگر تمہارا شرمندہ ہونا بھی ڈھونگ ہو گا۔"

میں ہنس پڑا۔ "غصے میں آدمی کے منہ سے سچ نکل جاتا ہے بلا ارادہ — اب کچھ قوتِ برداشت پیدا کریں خاتون!"

تریلوچنی کی گاڑی میں سے رابعہ نے سر نکال کے دیکھا اور مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں نے اپنی کار روک لی اور اتر کے آگے گیا۔

"گڈ مارننگ مسٹر تریلوچنی۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "کیا عجیب اتفاق ہے کہ ہم پھر مل رہے ہیں۔"

تریلوچنی کا چہرہ سپاٹ رہا۔ وہ سکوت سے بیٹھا رہا۔

رابعہ نے کہا: "ہمارے ساتھ آ جاؤ۔"

"بلے بلے سردار جی۔" میں نے گل سے کہا: "تیری وردی تے چن دا لوٹا لے۔"

گل نے غیر موجود مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا: "او سے میں ٹوٹے کر دیاں گا۔ چن دے پتر۔"

میں نے نہایت لوفروں والے انداز میں سیٹی بجا کے نازو کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ نازو بُرا سا منہ بناتی ہوئی آئی اور پچھلی سیٹ پر ہی فٹ ہو گئی۔ میں نے واپس جا کے اس کار کے شیشے چڑھا دیے جو مشکل سے ایک گھنٹا ہمارے پاس رہی تھی۔ اس کا مالک جو پیچھے والی سیٹ پر بے ہوش پڑا ہوا تھا اب کلبلا رہا تھا اور پندرہ بیس منٹ بعد اس کے ہوش میں آ جانے کے امکانات پیدا ہو چلے تھے۔ میں نے وہاں سے اسٹیئرنگ وہیل کو اور اپنے اندازے کے مطابق ہر اس جگہ کو صاف کر دیا جہاں ہمارے ہاتھ لگے تھے۔ چابی اگنیشن سوئچ میں چھوڑ کے میں نے دل ہی دل میں اس شخص سے معذرت کی اور پھر دروازہ بند کر کے آگے چلا گیا۔

"کیا تم میری ڈرائیونگ کا کمال نہیں دیکھو گے؟" میں نے تریلوچنی سے کہا۔

"کسی اور کو آج تک یہ گاڑی چلاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔" اس نے کہا۔ "تم کو بھی ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

"مگر تم کو وہی کرنا چاہیے جو میں کہوں۔"

"ضد سے تمہیں نقصان ہو سکتا ہے۔" تریلوچنی نے اپنی سیٹ پر رہتے ہوئے کہا: "ویسے تمہاری مرضی۔"

اس کے تذبذب اور انکار نے جہاں مجھے مشتعل کیا تھا وہاں یہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیا تھا کہ تعاون کا عملی مظاہرہ کرنے والا تریلوچنی ایک معمولی سی بات پر کیوں اڑ گیا ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ اس کی مرضی نہیں چل سکتی اور ضد کا نقصان اگر ہو سکتا ہے تو اسے۔ وہ ہمارے رحم و کرم پر ہے اور بے بس ہے۔ یقیناً کوئی ایسی بات تھی جو میں فوری طور پر نہیں سمجھ سکا۔ تریلوچنی نے مجھے بضد دیکھا تو وہ دوسری سیٹ کی طرف کھسکنے لگا۔ اس نے ہاتھ کی صفائی دکھانے کی کوشش کی لیکن میری نظروں سے وہ خفیف سی حرکت پوشیدہ نہ رہ سکی جو اس نے ایک باریک سے تار کو چھپانے کے لیے کی تھی۔

میں نے ظاہر یہ کیا کہ میں نے کچھ نہیں دیکھا اور اس کی شاندار گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔ انجن میں غیر ملکی بجلی جیسی تیزی

www.paksociety.com

کاریں گشتی کی تھیں اور یہ کار یقیناً منفرد تھی۔ تریلوینی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کار کو پہچاننے والے بہت ہوں گے اور انھیں ڈرائیور کی جگہ ایک اجنبی چہرہ نظر آئے گا تو ان کے دل میں شکوک جنم لیں گے مگر کیا تریلوینی جیسا دولت مند اپنی کار خود چلاتا ہوگا؟ نہیں۔ وہ ایک نہیں دس شوفر رکھ سکتا تھا۔ اس کے محل میں بہت کاریں تھیں اور ان کاروں کو چلانے والے بھی تھے۔ جہاں ہر کام نوکر کرتے ہوں، وہاں ڈرائیونگ جیسا مشکل کام خود کون کرتا ہے۔ میں نے سوچا۔ اصل بات وہی تھی جو تریلوینی چھپانا چاہتا تھا مگر چھپا نہیں سکا تھا۔

وہ باریک سا تار اس کے کوٹ کی نچلی جیب میں غائب ہو چکا تھا۔ غور کرنے پر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ کسی وائی ٹاکی یا کار فون کا تار تھا جس کو تریلوینی کار کے بند دروازے سے باہر لٹکائے بیٹھا ہوا تھا اور اس کار فون یا ٹرانسمیٹر کے ذریعے وہ سب گفتگو سنی جا رہی تھی جو اس کے اور میرے درمیان ہوئی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کار بیٹری سے لگایا جانے والا تار ہو اور تریلوینی کی جیب میں موجود کسی ٹیپ ریکارڈ کو چلاتا ہو۔

میں تریلوینی سے کچھ پوچھے بغیر بھی اس کی جیب میں ہاتھ ڈال سکتا تھا لیکن اندیشہ یہ تھا کہ وہ شور کرے گا اور اگر جیب میں ٹرانسمیٹر ہوا تو یہ شور بھی نشر ہو جائے گا۔ اس کے نادیدہ محافظ جان لیں گے کہ یہاں سے رابطے کا ذریعہ باقی نہیں رہا۔ پھر وہ براہ راست رابطہ قائم کریں گے۔

تریلوینی نے خاموشی کے طویل ہو جانے والے وقفے کو ختم کیا۔ "تمھیں کچھ معلوم ہے کہ جانا کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "کیا تم کو نہیں معلوم کہ ہم سب کو بالآخر کہاں جانا ہے؟"

"تم جو کچھ کر رہے ہو، بے سبب کر رہے ہو۔" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "کیا تم بے سبب کچھ نہیں کرتے؟ میرا خیال ہے کہ پہلے تو تم پیدا ہی بلاوجہ ہوئے۔ تم جیسے شیطانوں کی دنیا کو کبھی بھی ضرورت نہیں رہی۔ اب تم بلاوجہ مُصر ہو کہ میں ہی تم کو جہنم رسید کروں۔"

"تم بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔ میں تمھارا دشمن نہیں ہوں۔" تریلوینی بولا۔

میں نے تمسخر اڑانے کے لیے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اچھا! پھر کیا ہو تم — میرے دوست؟"

"دوست کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ سب مشترک مفادات کے لیے ساتھی بن جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ تمھاری زندگی کا تجربہ ہے۔ جس میں بھی عبرت کا سامان ہے۔"

تریلوینی نے کہا۔ "میں تمھاری مدد کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے ان چھوکریوں کے ساتھ آ گیا تھا۔ ان کا یقین تھا کہ انھوں نے ایسا زبردست کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکا اور چوہے کی طرح پکڑا گیا۔ صورت حال اس کے برعکس ہوتی اگر میں خود ایسا نہ چاہتا۔ خیر یہ ڈراما اس لیے، اس طرح کسی کو مجھ پر شک نہیں ہوگا کہ میں تمھاری مدد کرنا چاہتا تھا۔"

"اس لطیفے پر مجھے ہنسی نہیں آئی۔" میں نے کہا۔

"اسٹاپ دس نان سنس۔" تریلوینی بولا۔ "جو میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔ میں کسی ایڈونچر میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ تم کو بھی احمقانہ ہنگامہ آرائی سے گریز کرنا چاہیے۔ مجھے بتاؤ آخر کس راستے پر جا رہے ہو تم؟"

"یہ نجات کا راستہ ہے۔" میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "دنیا کو تم سے نجات ملے گی اور تم کو اپنی گناہ گار اور بےکار زندگی کے بوجھ سے۔"

"کیا تم یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ اس راستے پر تمھاری کار کو روکا جا سکتا ہے؟" وہ بولا۔ "او کے۔ میں تم کو روکنا نہیں چاہتا۔"

تینوں لڑکیاں خاموشی سے ساری گفتگو سن رہی تھیں اور ابھی تک انھوں نے آپس میں بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کا ایک سبب کشیدگی کی فضا تھی تو دوسرا سبب تریلوینی کی موجودگی۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ وہ پوری طرح مستعد تھیں۔

جب تریلوینی نے جیب میں سے ایک پاکٹ ٹرانزسٹر نکال کر میرے سامنے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا... تو میں ذرا کنفیوز ہو گیا۔ ابھی تک میں اس خیال سے مطمئن تھا کہ جیسے یہ راز فاش کروں گا تو تریلوینی کی شیخی گم ہو جائے گی۔ میں نے انجانے راستوں سے گزرتے ہوئے سمت کا خیال رکھا تھا۔ ایک ہی دائرے میں چلتے رہنے کا امکان نہ تھا۔ رخ مغرب کی طرف تھا اور میں آبادی سے دور کسی بھی ساحل پر پہنچنا چاہتا تھا۔ دوپہر کے وقت ساحل عموماً ویران ملتے۔ ہم اب مضافات کی کسی نئی آبادی سے گزر رہے تھے۔ جدید وضع کی کوٹھیاں اور ان کے شاندار باغات مکینوں کی دولت کا منہ بولتا اشتہار تھے۔ ممبئی میں ایک ایک انچ زمین سونے کے بھاؤ ملتی ہے اور سونے کو بھی جگہ نہیں ملتی۔ یہاں باغات کے سبزہ و گل کو دیکھ کر وہ فاقہ زدہ نہ جانے کیوں بے اماں لوگ یاد آتے تھے جن کو جینے مرنے کے لیے فٹ پاتھ

بھی میسر نہ تھا۔

فضا میں سمندر کی نمی اور بو کچھ زیادہ ہو گئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہی سڑک مجھے چند منٹ میں ساحل پر پہنچا دے گی۔ سڑک کے کنارے گاڑی روک کے میں تریلوینی سے کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا اور ابھی تک مجھے کوئی زیر تعمیر عمارت بھی ویران نظر نہیں آئی تھی جہاں میں اپنے اطمینان کے مطابق تفتیش کر سکتا۔

اچانک سامنے کی کسی لین میں سے ایک واٹر ٹینکر نمودار ہوا۔ سڑک تنگ تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ آمنے سامنے سے دو ٹرک آسانی سے نہ گزر سکیں۔ مگر واٹر ٹینکر نے سیدھے ہاتھ کی طرف سے گزرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ بالکل سامنے آ گیا اور پھر تھوڑا سا گھوم کے ترچھا رک گیا۔ میں نے زبردست بریک لگائے اور کار تقریباً ٹرک کو چھو کر رک گئی۔

"دشمنوں نے میرا نہیں، تمھاری زندگی کا راستہ روکا ہے۔" میں نے غرا کے کہا۔

"ان سے کہو راستہ چھوڑ دیں۔" پیچھے سے نازو نے حکم دیا۔

"ورنہ تم مجھے گولی مار دو گی؟" تریلوینی سپاٹ لہجے میں بولا۔

ٹرک ڈرائیور نے خاصی بلندی سے مجھے دیکھا۔ "کیا بات ہے؟ وار رہے لاہے سالا۔ اپنا سائڈ کاہے کو چھوڑتا ہے؟" وہ بمبئی کے بدمعاشوں کے روایتی حلیے میں تھا اور اسی لہجے میں بول رہا تھا۔

ٹرک ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے باقاعدہ بدمعاش نے میرے کچھ بولنے سے پہلے چیخ کر کہا۔ "گالی دیتا ہے؟" اور نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک کمانی والا چاقو تھا۔ جسے اس نے ڈرامائی تاثر دینے کے لیے پوری آواز کے ساتھ کھولا۔

تریلوینی میری طرف دیکھ کے مسکرایا۔ پھر اس نے ایک ہاتھ سے ایسے اشارہ کیا جیسے ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی کو اڑا رہا ہو مگر یہ راستہ چھوڑ دینے کا اشارہ تھا۔ کمانی دار چاقو والے نے بلیڈ کو ہاتھ سے دبا کر سر ہلایا اور واپس ٹرک میں جا بیٹھا۔ ڈرائیور نے ٹرک کو تھوڑا سا پیچھے کیا اور پھر سائڈ سے گزار دیا۔ اتنی دیر میں دو کاریں پیچھے بھی آ گئی تھیں مگر ڈرائیور قریب آنے سے پہلے ہی راستہ بند دیکھ کے بھاگ گئے تھے۔ ممبئی میں بھی کوئی کسی جھگڑے کا تماشائی یا گواہ نہیں بننا چاہتا اور یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتا کہ قانون کو کس نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے، مظلوم کون ہے اور ظلم کس نے کیا ہے۔

پانچ منٹ میں تریلوینی کے اشارے پر ہونے والا ڈراما ختم ہو گیا تھا اور اب وہ فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے میری شکست کی خفت کو دیکھ رہا تھا۔

"اس واٹر ٹینکر میں پانی نہیں تھا۔" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "ہاں۔ اس میں ایٹم بم ہوں گے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ جو کام کی بات ہے وہ کی جائے۔" اس نے ٹرانسمیٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں نے ٹرانسمیٹر کو پہلے جھپٹ کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ "میں نے تم کو یہ تار سیٹ کر جیب میں ڈالتے دیکھ لیا تھا۔ تمھارے محافظ اسی کے ذریعے ساری گفتگو سن رہے تھے۔"

"میں نے تم کو بتا دیا تھا کہ ڈرائیونگ تم کرو گے تو خطرہ مول لو گے۔" وہ بولا۔

"تمھاری جیب میں خود کار ریوالور بھی ہوگا۔ جو تم نے عمداً استعمال نہیں کیا۔" میں نے تلخی سے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور دوسری جیب میں سے ریوالور نکال کے میرے سامنے رکھ دیا۔ "یونہی۔ میں خود آنا چاہتا تھا اور میں تمھارے طریقۂ کار کی تعریف کرتا ہوں۔ اس سے میری پوزیشن خراب نہیں ہوئی۔ میرا ایک اشارہ بھی کافی ہوتا لیکن میں نے کہا کہ کسی کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود چل کے دیکھتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے۔ جب میں خیریت سے واپس پہنچ جاؤں گا تو اس سے کیا ثابت ہوگا؟ یہی کہ میں تنہا بھی اپنے دشمنوں سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ ایک بزدل آدمی بدمعاشوں پر حکم چلانے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔"

"تم بہادر ہوتے تو واقعی اکیلے آتے۔ مسلح فورس تمھارے پیچھے تھی۔"

وہ بولا۔ "بہادری اور بے وقوفی میں فرق ہے۔ میں اپنے دفاع سے کبھی غافل نہیں ہوتا اور ناکامی کے امکانات کو نظرانداز نہیں کرتا۔ مثلاً اس ٹرانسمیٹر میں فنی خرابی پیدا ہو جاتی تو معلوم ہے میں کیا کرتا۔ میں اس بٹن کو دبا دیتا۔"

میں نے ڈیش بورڈ کے اس بٹن کو دیکھا جس پر تریلوینی نے انگلی رکھی تھی۔ "اس سے کیا ہوتا؟" "اندر چھت میں سے مشین گنیں نمودار ہو جاتیں جن کا رخ ہماری طرف ہوتا یا ایسی شعاعیں خارج ہوتیں کہ ہم بھک سے اڑ جاتے۔"

وہ مسکرایا۔ "سائنس فکشن میں جو کچھ بھی ہوتا ہے سب خیالی اور ناممکن نہیں ہوتا لیکن میرا انتظام بہت سیدھا سادہ ہے۔ میں آدھے منٹ کے لیے سانس روک لیتا۔ اس سے پہلے ہی تم سب بے ہوش ہو جاتے۔ اس بٹن کو دباتے ہی اندر ایک گیس بھر جاتی ہے جس کی کوئی بو بھی نہیں ہوتی۔ مجھے ایک منٹ تک سانس کو روکنے کی خاصی مشق ہے۔"

www.paksociety.com

"آل رائٹ مسٹر ترلوچنی۔" میں نے خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد کہا۔ "تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم ناقابلِ تسخیر ہو۔ چونکہ ہم ابھی مرنا نہیں چاہتے، اس لیے تم بھی زندہ رہو گے۔ ورنہ یہ سب انتظامات دھرے رہ جاتے۔ دلاور ہوتا تو تمھیں بتاتا کہ ہم زندگی کتنی بار داؤ پر لگا چکے ہیں لیکن وہ مقصد مختلف ہے جس پر جان دینا ہمارا مقصد ہے۔"

"مجھے معلوم ہے تم لوگ کیا سمجھتے ہو کہ جہاد کر رہے ہو۔ تم مرنا نہیں چاہتے، شہید کہلانا چاہتے ہو۔" ترلوچنی بولا۔

"تو گویا دلاور تمھیں سب کچھ بتا چکا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم آگے چلیں اور کہیں بیٹھ کے بات کریں؟" ترلوچنی بولا۔ "ساحل پر میری ایک کاٹیج ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "کھلے ساحل پر میں خود کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہوں۔"

وہ مسکرایا۔ "مسٹر سکندر بخت! جب تم میرے ساتھ ہو تو محفوظ ہو ہر جگہ۔ ورنہ کہیں بھی محفوظ نہیں ہو۔ جیسا کہ تم نے ابھی دیکھا، تمھارے لیے کوئی چانس نہیں ہے۔ مجھ پر اعتماد کے سوا۔ اور یہ اعتماد تمھارے حق میں اچھا ہوگا۔ میں جھوٹ بولنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتا۔ میں واقعی تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے پلٹ کے پیچھے دیکھا۔ خواتین دم بخود بیٹھی تھیں اور شاید بہت پہلے قائل ہو چکی تھیں کہ ترلوچنی کے دستِ تعاون کو جھٹکنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہوگی۔ انھوں نے بیک وقت سر ہلا کے اس خیال کا اظہار کیا تو میں نے رسک لینے کا فیصلہ کیا۔ دس منٹ کے بعد ترلوچنی کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے میں نے کار کو اس کی بیچ ہٹ کے احاطے میں روک لیا۔

بیچ ہٹ سرخ پتھروں اور شیشے کی بے حد خوب صورت عمارت تھی۔ سمندر کے رخ اس کی سب دیواریں بے داغ شیشے کی تھیں جن کے سامنے چھت سے فرش تک پہنچنے والے ریشمی پردے آویزاں تھے۔ اس نے ایک ڈوری کھینچی تو یک لخت سمندر اپنی تمام وسعت کے ساتھ میرے سامنے آگیا لیکن اس کا تاثر بڑا عجیب تھا۔ سمندر متلاطم تھا اور جھاگ اڑاتی لہریں مسلسل ساحل سے ٹکرا رہی تھیں مگر یہ سمندر بالکل خاموش تھا۔ اس کی پرہیبت گرج کو شیشوں نے روک لیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے سامنے سنیما کے پردے پر سمندر کا منظر ہے مگر سنیما ہال کے لاؤڈ اسپیکر خاموش ہیں۔

"مجھے افسوس ہے کہ اس وقت یہاں کوئی خدمت گار نہیں ہے۔" ترلوچنی بولا۔ "میں کسی پروگرام کے بغیر آ گیا ہوں لیکن کچن میں سب کچھ ہوگا۔ چائے، کافی۔ اور وہ بھی جو مرد پیتے ہیں۔"

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اگر شراب پینے والے ہی مرد ہوتے ہیں تو میں خواتین کی صف میں رہنا پسند کروں گا اور کافی کو کافی سمجھوں گا۔ مگر تم یہاں بیٹھو۔" میں نے نازیہ، صغریٰ، رابعہ اور گل کو اشارہ کیا۔ وہ اشارہ سمجھ کے کمرے سے چلی گئیں۔

"ترلوچنی! ہم پہلے ہی بہت وقت ضائع کر چکے ہیں۔ ہمارے دو ساتھی دلاور نے اغوا کر لیے ہیں۔" میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "ابھی تک کوشش کے باوجود ہمیں ان کا سراغ نہیں ملا۔ مگر تم ہی دلاور کے بارے میں بتا سکتے تھے کہ وہ کہاں ہوگا۔ تمھیں تلاش کرنا بھی آسان نہیں تھا۔"

"چنانچہ اس کے لیے تمھیں مشکل راستہ اختیار کرنا پڑا۔" ترلوچنی نے کمرے کے قالین پر بے آواز قدموں سے ٹہلنا شروع کیا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بار بار گئے اور بار بار ساتھ شیاما مورداوا کے اڈے پر پہنچے۔ وہاں تم نے خاصا کشت و خون کیا۔"

"تمھاری انٹیلی جنس سروس بہت فعال ہے۔"

"ایسی باتیں چھپی نہیں رہتیں۔" وہ بولا۔ "بار بار بہت دراز ہے۔ اس نے پولیس کو مکمل رپورٹ دے دی ہے۔ خود کو شیاما داوا کے عتاب سے بچانے کے لیے۔"

"شیاما مورداوا اب کہاں ہے؟"

"اس کا گینگ تو ہے۔" ترلوچنی بولا۔

"کیا شیاما مورداوا تمھارا دشمن تھا؟" میں نے کہا۔

ترلوچنی نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہ دوست تھا نہ دشمن۔ اس کا اپنا کاروبار تھا۔ ہم ایک دوسرے کے راستے نہیں کاٹتے تھے۔ یہ بقائے باہمی کے لیے ضروری ہے۔ ایسے معاہدے ہم آپس میں اپنے فائدے کے لیے کرتے ہیں۔ دشمنی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی کسی کے کاروبار میں دخل دے۔ مجھے تعجب ہے کہ تم شیاما مورداوا کو مار کے زندہ کیسے نکل آئے؟"

"قید تو تم نے بھی کر لیا تھا مجھے!"

ترلوچنی چلتے چلتے رک گیا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ "تم اپنی کوشش سے کامیاب نہ ہو سکتے تھے لیکن تمھاری قسمت یقیناً اچھی تھی کہ ایک دھوبی نے تمھاری خاطر جان دینا منظور کر لیا تھا۔"

"... تم... تم نے اسے مار دیا۔" میں نے محسوس کیا میرے حلق میں کڑواہٹ گھل گئی ہے۔

"ظاہر ہے۔" ترلوچنی بولا۔ "نمک حرامی کی سزا سب کے لیے ایک ہی ہوتی ہے۔ کیا تم آستین میں سانپ پالنے والے کو عقلمند کہہ سکتے ہو؟"

مجھے اس خبر سے صدمہ ہوا تھا۔ میرے لیے اس دھوبی

نے جرأت اور ذہانت کا بے مثال مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے مجھ پر اپنی جان کا قرض چھوڑ دیا تھا جو میں اپنی جان دے کر یا ترلوچنی کی جان لے کر ادا نہیں کر سکتا تھا۔

"وہ ایک بہادر عورت تھی ترلوچنی۔" میں نے کہا۔ "یقیناً وہ جانتی تھی کہ تم کتنے طاقتور ہو اور تمھارے مقابلے میں وہ کتنی کمزور ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس کا یہ جرم کتنا سنگین سمجھا جائے گا اور اس کی سزا کیا ہوگی۔ تم اسے آستین کا سانپ کہہ سکتے ہو مگر یہ بھی تو دیکھو کہ اس نے تم جیسے خون آشام اژدہے سے ٹکر لی۔ کیا تم میں اتنی ہمت ہے؟ اپنے سے ہزار گنا زیادہ طاقتور حریف کے خلاف قدم اٹھانے کی؟ نہیں ترلوچنی۔ تم اسے سلام کرو گے۔ اس کا راستہ کبھی نہیں کاٹو گے۔ اپنی بقا کے لیے اس کے ساتھ کوئی سمجھوتا کرو گے۔ تم طاقتور کے سامنے کمزور بن جاؤ گے۔"

"ہاں۔ اگر مجھے یا تمھیں زندہ رہنا ہو تو ایسے سمجھوتے کرنے پڑیں گے۔" وہ بولا۔ "قانونِ قدرت یہی ہے۔ بڑی مچھلی ہمیشہ چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ بڑی مچھلیاں آپس میں نہیں لڑتیں۔ شیر اور چیتا ایک ہی جنگل میں شکار کرتے ہیں مگر کبھی جانور کا۔ وہ ایک دوسرے پر حملہ نہیں کرتے۔"

"یہ جنگل کا قانون ہے۔ میں انسانوں کی بات کر رہا تھا جو تم نہیں سمجھو گے۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے دلاور کے ساتھ بقائے باہمی کی بنیاد پر اپنے فائدے کا سودا کیوں نہیں کیا؟ اس کے مقابلے میں میری مدد کیوں کرنا چاہتے ہو تم؟ کیا تمھیں ڈر نہیں کہ اس کو معلوم ہوگا تو وہ تمھارا بھی دشمن ہو جائے گا؟"

ترلوچنی کچھ دیر خاموشی سے ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "ہر آدمی کسی نہ کسی پہلو سے کمزور ہوتا ہے سکندر بخت۔ میں بھی بہت سخت آدمی ہوں۔ جتنا سخت باہر سے نظر آتا ہوں، اندر اس سے زیادہ سخت ہوں اور یہ سختی ایک دن یا ایک سال کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ ساری عمر کی محنت ہے۔ سخت فیصلے کی صلاحیت مجھ میں یقیناً پیدائشی تھی لیکن مجھ میں اضافی صلاحیت سختی اختیار کرنے کی تھی چنانچہ آہستہ آہستہ میں اندر سے سخت ہوتا گیا۔ جیسے کوئلہ جو بدصورت اور بے وقعت ہوتا ہے، زمین کے اندر کی سختی، حرارت... اور دباؤ سے رفتہ رفتہ بدلتا جاتا ہے۔ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔ یہاں تک کہ وہ ہیرا بن جاتا ہے جس سے زیادہ قیمتی، روشن اور سخت چیز کوئی نہیں رہتی۔ مثال کے لیے تم مجھ کو لو کہ میں بھی کوئلہ تھا۔"

"اور اب کوہِ نور ہیرا ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔

"ہاں۔ میری یہ سب شان و شوکت، دولت اور طاقت مجھے ورثے میں نہیں ملی تھی۔ یہ میں نے خود حاصل کی اور اس کے لیے مجھے سخت ہونا پڑا۔ میں نیک، رحم دل اور جذباتی ہوتا تو ترلوچنی نہ ہوتا لیکن اب میں ترلوچنی ہوں۔ میرے نام کی دہشت ہے اور انسانی زندگی کی قیمت میرے نزدیک تنکے برابر نوٹ ہیں جو میں کسی بھی پیشہ ور قاتل کی جھولی میں ڈال دوں تو وہ اپنے باپ کو قتل کر آئے لیکن میرا ایک اصول ہے۔ میں بے سبب قتل کبھی نہیں کرتا۔ دلاور کیا چیز ہے۔ اسے میں یوں غائب کرا دوں۔" وہ چٹکی بجا کے بولا۔

"وہ ایک خطرناک دشمن ثابت ہو سکتا ہے۔"

"ہر دشمن خطرناک ہی ہوتا ہے جس سے خطرہ محسوس نہ ہو وہ دشمن کیا ہوا۔" ترلوچنی بولا۔ "مگر جب تک وہ خود میرے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتا، میں اسے نظر انداز کرتا رہوں گا اور میرا خیال ہے کہ وہ بے وقوف نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا۔ "میں تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ وہ ذہین ہے۔ عیار اور مکار ہے۔"

"ظاہر ہے پھر وہ مجھ سے دشمنی کے چکر میں نہیں پڑے گا۔"

"ہاں۔ یہ اس کا ہوم گراؤنڈ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی میری مدد کر کے تمھیں کیا ملے گا جو دلاور کی مدد کر کے تم جو فائدہ حاصل کر سکتے تھے، وہ کیوں ٹھکرا رہے ہو؟"

"میں نے کہا نا۔ کہ ہر آدمی کسی نہ کسی پہلو سے کمزور ہوتا ہے۔" وہ بولا۔ "ایک کمزوری میری بھی ہے۔ میں کسی کا قرض نہیں رکھتا۔ احسان بھی ایک قرض ہوتا ہے۔ میں کسی کا احسان قبول ہی نہیں کرتا۔ اس لیے کہ میں قرض لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میرا ہر کام برابری کی بنیاد پر یا نقد ہوتا ہے۔ شاید میں نے بتایا تھا تمھیں کہ میں پیسہ خرچ کر کے بے فکری خریدتا ہوں۔ کوئی پریشانی مجھے اس لیے نہیں ہوتی کہ اس کا حل کسی نہ کسی سے خریدا جا سکتا ہے لیکن اب مسئلہ یہ بن گیا ہے کہ تم نے مجھ پر ایک احسان کر دیا ہے۔"

"میں نے؟"

"ہاں۔ تم کملا کو... میری بیٹی کو بچا لائے۔ تم نے اس شخص کو بھی مار دیا جو اسے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ یہ سب تم نے انجانے میں کیا۔ تم کو معلوم نہیں تھا کہ کملا کون ہے اور کس کی بیٹی ہے اور یہ کیسے وہ اس انسانی ریوڑ میں شامل کر لی گئی ہے جو ایکسپورٹ کیا جا رہا تھا۔"

"تم بھی اس ایکسپورٹ کے کاروبار میں شامل ہو؟"

ترلوچنی نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور مجھ سے

www.paksociety.com

نظر بھی نہیں ملائی۔ وہ شفاف شیشوں کے پار خاموش سمندر کے تلاطم کو دیکھتا رہا۔

"اس کاروبار میں ایسا تو ہو جاتا ہے تریویدی!" میں نے کہا۔ "تم یہ کیوں بھول گئے تھے کہ تمھاری بھی ایک بیٹی ہے۔"

"اس بات کو چھوڑو۔ بات ہے تمھارے احسان کی جو تم مجھ پر کر چکے ہو!" وہ پلٹ کے بولا۔ "وہ سب کچھ نہ کر سکے جن کو میں نے اس کام پر مامور کیا تھا۔"

"اور کیا معاوضہ تھا تمھاری اس بیٹی کی عزت کا اور زندگی کا؟"

"معلوم نہیں۔ کم سے کم دس افراد نے کہا تھا کہ وہ کملا کا سراغ لگا لیں گے۔ انھوں نے پوچھا تھا کہ انعام کیا ملے گا اور میں نے کہا تھا کہ ابھی بتا دو۔ کسی نے بھی دس لاکھ سے زیادہ کی بات نہیں کی تھی اور میں نے سب کو دس گنا دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ان میں وہ بھی تو ہو سکتے تھے جو خود کملا کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔"

تریویدی نے نفی میں سر ہلایا۔ "اتنی ہمت کس میں ہے کہ تریویدی کی بیٹی کو اٹھا لے اور پھر معاوضہ لے کر چھوڑ دے۔ یہ ایک احمقانہ کارروائی تھی۔ تم نے اسے ناکام بنا دیا اور کملا واپس گھر پہنچ گئی۔ اس احسان کا قرض میں تمھیں ایک کروڑ دے کر اتار سکتا تو میرے لیے بہت آسان ہوتا۔ کوئی اور کملا کو لاتا تو میں اپنے وعدے کے مطابق زیادہ سے زیادہ اتنی ہی رقم ادا کرتا اور مجھ پر کوئی قرض باقی نہ رہتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم ایک کروڑ کیا دس کروڑ لے کر بھی میرے منہ پر مار دو گے۔"

"یہ تم نے کیسے جانا؟"

وہ تلخی سے مسکرایا۔ "تم کو لالچ ہوتا تو تم کملا کو نہ بھگاتے۔ وہ تمھارے لیے پاگل ہو گئی تھی۔ پاگل تو وہ ہے۔ مگر اسے میں نے کسی کے سامنے اتنا گرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے کسی سے محبت کی بھیک کبھی نہیں مانگی تھی۔ تم اس سے شادی کر سکتے تھے۔"

"تمھیں کوئی اعتراض نہ ہوتا؟"

"نہیں۔ میرا تو مسئلہ حل ہو جاتا۔ یہ اس کا علاج ہوتا۔ اور ظاہر ہے پھر یہ سب کچھ تمھارا ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مجھ پر تمھارا احسان باقی رہ گیا۔ احسان کے بدلے میں تم پر احسان کر سکتا ہوں۔"

"جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم اپنے ضمیر سے بچنے کے لیے احسان کرنا چاہتے ہو تو ہمیں دلاور کے بارے میں بتا دو۔ وہ کہاں ملے گا؟"

"دلاور نے مجھے اپنے کاروبار میں شراکت داری کی پیشکش کی تھی۔" تریویدی نے کہا۔ "وہ بہت منافع بخش کاروبار کر رہا ہے لیکن میں بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے انکار کر دینا چاہیے۔"

"بہت منافع بخش سمجھنے کے باوجود تم اس کاروبار میں شریک نہیں ہونا چاہتے۔"

"ہاں۔ منافع بخش تو بہت سے دھندے ہیں مگر میں ہر کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔" وہ بولا۔

"یہ ضمیر اور شرافت کی بات تو ہو نہیں سکتی۔ بدمعاش اور غیر اخلاقی کام کرنے والا تریویدی..."

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "میرا ایک سیاسی کاروبار ہے۔ میرا مطلب ہے اس کاروبار کے پیچھے بین الاقوامی کی عالمی سیاست کا ہاتھ بھی ہے۔ اس خطے کی جغرافیائی ٹوٹ پھوٹ، انتشار اور عدم استحکام میں سپر پاورز کو بہت دلچسپی ہے۔ معلوم نہیں گولہ بارود کے اس کھیل کا انجام کیا ہوگا۔ جیت کس کی ہوتی ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ سیاست میں پانسے پلٹتے رہتے ہیں۔ آج کے دشمن کل پھر دوست ہو گئے ہیں اور دوست آپس میں لڑ سکتے ہیں۔ میرے حق میں یہ ہے کہ اس چکر میں نہ پڑوں جس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں۔ میں سیاست کا وہ مہرہ نہیں بننا چاہتا جس کو چلنے والے ہاتھ جب چاہیں پیٹ دیں۔ اس کے علاوہ ایک بات ہے جو میں نے ابھی کہی تھی کہ میں بے سبب قتل کرنے کا قائل نہیں ہوں اور بے حساب منافع کمانے کی ہوس بھی مجھے قائل نہیں کر سکا کہ یہ قتل عام جائز ہے جو مشرقی پاکستان میں ہو رہا ہے۔ مجھے اس کے سیاسی اسباب سے سروکار نہیں اور نہ میں سوچتا ہوں کہ مرنے والے ظالم ہیں یا مظلوم لیکن وہ سب جن میں بوڑھے، بیمار اور بچے، نوجوان عورتیں اور لوگ شامل ہوں، بے سبب ہے۔ ان کو تو سیاست کا مطلب بھی نہ معلوم ہے، نہ وہ عجیب کے جو نکات کو سمجھتے ہیں اور نہ دو قومی نظریے کو۔ اپنے سیاسی حریف کو قتل کرنا میری سمجھ میں آتا ہے۔ وہ اسی طرح سے کاروباری حریف ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دشمن کون ہے اور دشمنی کی وجہ کیا ہے۔ جیسے میں جانتا ہوں کہ کوئی مجھ پر گولی چلانے آئے گا تو کیوں آئے گا اور مرے گا تو کیوں ہوگا۔ میں بھی یہ نہیں کر سکتا کہ کسی کو ایک بندوق دوں اور کہوں کہ جاؤ کسی بھی چھوٹی بستی میں یا کسی بھی جگہ پر سوتے ہوئے دس آدمی مار آؤ۔ اسلحہ کسی ایسے آدمی کو نہیں جانا چاہیے جو اس کا جائز استعمال نہ کرے۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ صرف یہ کہ اس نے اپنی سیاسی سمجھ بوجھ کی معقولیت کا مظاہرہ کیا تھا بلکہ اپنی شخصیت کے ایک ایسے پہلو کو بھی بے نقاب کر دیا تھا جو شاید کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے کہا۔ "تم نے بالآخر مجھے قائل کر لیا ہے کہ تم شیطان نہیں ہو۔ شیطان اور آدمی کے درمیان فرق کتنا بھی کم ہو جائے مگر شیطان کبھی انسان بن سکتا ہے اور نہ انسان پورا شیطان۔ تم احسان کو تسلیم کرتے ہو اور بے گناہ خون کے خلاف ہو۔ چنانچہ اپنی تمام ظاہری و باطنی سختی اور فطری خباثت کے باوجود تم آدمی ہو۔ بہت برے آدمی ہو مگر آدمی ہو۔"

اس کی صورت پر عجیب طرح کی ناپسندیدگی سے مسکراہٹ پھیل گئی۔ "تھینک یو۔"

رابعہ اور گل کافی بدل گئی تھیں۔ انھوں نے بھی تریویدی کے خیالات سنے تھے اور متاثر نظر آ رہی تھیں۔ تریویدی کے اور ہمارے درمیان کشیدگی کم ہو گئی تھی۔

"دلاور کو یہ سب معلوم نہیں ہونا چاہیے۔" تریویدی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "ورنہ وہ میرا دشمن ہو جائے گا۔ پھر مجھے اس کے خلاف کارروائی کرنی پڑے گی اور اگر میرا نقصان ہوا تو اس کا ذمے دار میں تمھیں سمجھوں گا۔"

"ہمارے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہے کہ ہم یہاں کسی کی دوستی یا دشمنی کے چکر میں پڑیں۔" میں نے کہا۔ "ہم مجبوراً یہاں رکے تھے اور ہماری بدقسمتی کہ دلاور کو یہاں ہماری موجودگی کا علم ہو گیا۔ ہم اگر اس لانچ کو واپس نہ لاتے تو شاید اس کارنامے کی شہرت ہوتی اور نہ دلاور کو ہمارا سراغ ملتا۔ اس کے بعد انھیں اس پیشکش کا پتا چل گیا کہ ہمارے دونوں ساتھی اغوا ہو گئے۔"

"اور تمھیں یقین ہے کہ انھیں دلاور کے سوا کوئی اغوا نہیں کر سکتا؟" تریویدی بولا۔

"نہیں۔ ہمیں یہاں جاننا کون ہے؟" میں نے کہا۔

"انھیں اغوا کرنے کا مقصد؟"

"یہ معلوم کرنا کہ باقی لوگ کہاں ہیں اور ہمارا پروگرام کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ جاننا چاہتا ہے کہ ہم اس کے پروگرام کے بارے میں کتنا جانتے ہیں۔"

"وہ ایک بین الاقوامی گروہ کا رکن ہے۔ اسلحے کے کاروبار میں ملوث لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔"

"ہم بھی ایک بہت بڑی طاقت ہیں۔ ایم آر ایس کا نام ضرور سنا ہوگا تم نے۔"

تریویدی نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اخبار نہیں پڑھتا۔ میرے کام کی خبر مجھے اپنے ذرائع سے مل جاتی ہے۔"

"یہ وطن پرست، انسانیت دوست اور انصاف پرور شوریدہ سر انسانوں کی تنظیم ہے۔"

"شوریدہ سر؟"

"جنونی اور خبطی۔ ٹھیک ٹھیک کہہ سکتے ہو تم۔" میں نے کہا۔

"اور کیا قوت ہے اس تنظیم کی؟" وہ بولا۔

"لامحدود۔ کیونکہ جذبے کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ ہم موت کی سرحد سے بھی آگے چلے جاتے ہیں۔ شہید ہو کر۔"

"میرا مطلب افرادی قوت سے تھا۔" تریویدی نے کہا۔

"وہ بھی بہت ہے۔ ہر قدم پر ہر جگہ۔ جہاں بھی ہم جاتے ہیں ہمارے ساتھی، ہمارے حامی موجود ہوتے ہیں جو عملاً ہماری مدد کرتے ہیں۔ اس حد تک ہمارے ہم خیال تم بھی ہو کہ تم اس قتل عام کے خلاف ہو جو مشرقی پاکستان میں ہو رہا ہے اور تم ہماری مدد بھی کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔

تریویدی متاثر نظر آنے لگا تھا۔ اس نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ دلاور تک پہنچنا آسان نہیں ہوگا۔ پہلے اس نے روم نمبر فور زیرو فور، ہوٹل سی سائڈ دیا تھا۔ پھر نمبر بھی رہا مگر اس نے ہوٹل پام گروو بتایا۔"

"لیکن وہ دونوں جگہ نہیں ملا ہوگا۔"

"ہاں۔ ہوٹل سی سائڈ والوں نے کہا کہ اس کمرے میں کوئی چوہدری دلاور نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا انھوں نے بتایا تھا کہ وہاں کون ہے؟"

تریویدی نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کیوں بتاتے۔ لیکن ہوٹل پام گروو کی آپریٹر نے غلطی سے بتا دیا تھا۔"

"تمھیں یاد ہے وہ نام؟" میں نے کہا۔

تریویدی نے ذہن پر زور دیا۔ "کسی نواب کا نام لیا تھا۔"

"نواب خسرو جمشید؟" میں نے کہا۔

"یس۔ یہی نام تھا۔ مگر تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے ذہانت کے اس مظاہرے پر داد طلب نظروں سے خواتین کی طرف دیکھا۔ "یہ بھی چوہدری دلاور کا ایک مرحوم نام ہے۔"

"مرحوم نام؟"

"ہاں۔ ان کا ایک ساتھی تھا جو مارا جا چکا ہے۔ اگر تم ملنے جاتے تو تمھاری ملاقات مرحوم دلاور سے ہو جاتی۔ ٹیلیفون پر وہ کیسے مل سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ "خیر اب ہم اسے تلاش کر لیں گے۔"

www.paksociety.com

"ایک بات اور بتادوں۔" وہ بولا۔ "بمبئی کے ساحل سے مشرق کی جانب تیس پینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ویران جزیرہ ہے۔ پہلے وہ ایک بہت دولت مند آدمی کی ملکیت تھا۔ اس نے وہاں ایک محل بنوایا تھا۔ کہتے ہیں اس میں ایک سو اٹھارہ خواب گاہیں تھیں۔ عام دنوں میں وہاں وہ خود رہتا تھا۔ اپنی کنیزوں اور دیگر ملازمین کے ساتھ۔ کہا جاتا ہے کہ ان لڑکیوں کی مجموعی تعداد ڈھائی سو کے لگ بھگ تھی جو اس کے مہمانوں کی خدمت پر مامور تھیں۔ خدمت کا مطلب تو سمجھتے ہو نا۔ ہر چودھویں چاند کی رات کو وہ ایک ڈنر دیا کرتا تھا جس کے شرکا ٹاپ کے لوگ ہوتے تھے۔ اس جیسے بزنس مین، ایسے کو ر دینے والے ٹاپ کے بیوروکریٹ، سیاستداں۔ میں خود کبھی وہاں نہیں بلایا گیا، کیونکہ میں نچلی سطح کا آدمی تھا لیکن میں نے سنا ہے کہ اس ڈنر کے لیے خفیہ دعوت نامے ارسال کیے جاتے تھے اور جو لوگ مدعو ہوتے تھے وہ اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتے تھے۔ ظاہر ہے اس رات کوئی خواب گاہ خالی نہیں رہتی تھی۔ میں کسی کا نام نہیں لے سکتا مگر میں نے سنا ہے کہ کچھ مہمان تو مستقل تھے تقریباً نصف۔ باقی نصف بدلتے رہتے تھے۔ اس میں دہلی اور آسام تک کے لوگ بلائے جاتے تھے اور شاید بیرونی ممالک سے بھی۔ یہ ایک کاروباری تقریب ہوتی تھی لیکن عام آدمی اسے عیاشی کا نام دیتا تھا۔ حالانکہ جس قسم کے لوگ وہاں آتے تھے ان کو عیاشی کے لیے کہیں جانے یا جمع ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ عیاشی کے لیے روز ٹوکیو یا پیرس بھی جا سکتے ہیں اور ان کی زندگی میں عیاشی اتنی اہم بھی نہیں ہوتی۔ خیر یہ ایک دلچسپ کہانی تھی اس لیے سنا دی۔ بتانا میں یہ چاہتا تھا کہ اب وہ محل ایک کھنڈر ہو گیا ہے۔ صرف دس سال پہلے جہاں لونڈیاں رہتی تھیں وہاں اب بھوتوں کا بسیرا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا حکومت کی نظر میں آ گئی تھی وہ جگہ؟"

ترلوچنی پہلی بار ہنسا۔ "کبھی کبھی معقول آدمی بھی احمقانہ بات کر سکتا ہے جیسے کہ تم نے ابھی کی۔ حکومت کرنے والے تو خود وہاں ہوتے تھے۔ سب نہیں مگر کچھ ایسے ضرور ہوتے تھے جو حکومت سمجھے جا سکتے تھے یا جن کے لیے حکومت کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ محل آج بھی آباد ہوتا لیکن اسے قدرت نے اجاڑ دیا۔ اس ایک مربع کلومیٹر کے جزیرے کو جنوب کی طرف سے ایک چٹان نے بچا رکھا تھا جو دیوار کی طرح مغرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ سمندر جب چڑھتا تھا تو یہی دیوار محل کو محفوظ رکھتی تھی۔ شاید ہزاروں لاکھوں سال سے لہریں اس دیوار سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ بالآخر لہروں نے دیوار کو شکست دی اور ایک رات چٹان جزوی طور پر گر گئی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ایسا سمندر میں زلزلے کی وجہ سے ہوا۔ وجہ کچھ بھی ہو جو بات دلچسپ ہے وہ یہ ہے کہ اس رات بھی چودھویں رات کا جشن جاری تھا۔ جب سمندر کا پانی محل کی دیواروں سے ٹکرایا اور خواب گاہوں کے دروازے توڑ کے اندر داخل ہوا تو قیامت آ گئی۔ محل کا ایک حصہ منہدم ہونے سے سات افراد تو دب کے مر گئے۔ تقریباً نصف کو سمندر بہا کے لے گیا۔ ہر موج جب واپس جاتی تھی تو اپنے ساتھ کسی کو لے جاتی تھی۔ جو لوگ اندر بھاگ گئے وہ بچ گئے۔ جو بھاگے وہی جو ہوش میں تھے۔ لوگوں نے کہا کہ خدا کا قہر تھا گناہوں کی سزا تھی۔ لوگ ایسے واقعات سے ایسے ہی نتائج اخذ کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ سیلاب کتنی غریب بستیوں کو ہر سال بہا کر لے جاتا ہے۔ محل کا مالک بھی مرنے والوں میں شامل تھا۔ اس کے بعد کسی نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔ چٹان کی جگہ کنکریٹ کی دیوار بھی کھڑی کی جا سکتی تھی مگر کسی نے توجہ ہی نہیں دی۔ بعد میں جسے موقع ملا وہ سامان میں سے کچھ لے گیا۔ دروازے کھڑکیاں تک باقی نہیں ہیں۔ اب بھی پانی وہاں اکثر یلغار کرتا ہے۔ محل آہستہ آہستہ گر رہا ہے۔ کچھ عرصہ وہاں اسمگلر اپنا مال اتارتے رہے تھے مگر کسٹم والوں نے چھاپے مارنے شروع کیے تو یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ غالباً دلاور اسی جزیرے پر ہے۔"

میں نے پوری بات خاصی دلچسپی کے ساتھ سنی تھی مگر مجھے اندازہ نہ تھا کہ اس کا اختتام اتنا حیرت انگیز ہو گا۔

میں نے چونک کر کہا۔ "یہ خیال کیسے آیا تمہیں؟"

"اسے دیکھ کر۔" ترلوچنی نے کہا۔

"تم نے اسے جزیرے پر دیکھا ہے۔ پھر شک کی کیا بات ہے۔ ضرور محسن اور غالب وہیں قید ہوں گے۔"

"نہ میں نے اسے جزیرے پر دیکھا ہے اور نہ یقین کے ساتھ کچھ کہہ رہا ہوں۔" ترلوچنی بولا۔ "ایک اطلاع تھی مجھے کہ دلاور کو جو بیچ پر دیکھا گیا ہے۔ اس کی اطلاع کرنے والے نے بعد میں بتایا کہ وہ کسی لانچ پر گیا تھا۔ جب لانچ واپس آئی تو وہ لانچ پر نہیں تھا۔ لانچ چلانے والے نے تصدیق کی کہ ایک شخص اس جزیرے پر گیا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے آنے جانے کا معاوضہ طے کیا تھا۔ مگر وہاں جا کر اس کا ارادہ بدل گیا۔ اس نے کرایہ دونوں طرف کا دے کر معاہدے کے مطابق۔ مگر لانچ کو رخصت کر دیا تھا۔ ظاہر ہے ایک لانچ کے ناخدا کو اپنے ارادے کے بدلنے کی وجہ بتانے یا اپنا نام بتلانے کا پابند نہیں تھا۔ تاہم اس کے حلیے سے

ہوئی تھی کہ وہ دلاور ہی ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ میرے آدمی سی سائیڈ اور پام گرووز دونوں ہوٹلوں کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ان کی رپورٹ ہے کہ گزشتہ رات سے اب تک روم نمبر فور بدستور خالی ہے۔ دلاور کو ہوٹل میں آتے یا وہاں سے نکلتے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ ایک روم بوائے نے تصدیق کی ہے کہ دلاور کے حلیے کا ایک آدمی اس کمرے میں کبھی کبھی آتا ہے۔ دونوں جگہ۔ مگر اس کے آنے کا اور جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے اور اس کا نام وہی ہے نواب خسرو جمشید۔"

"تمہاری سیکرٹ سروس کی رپورٹ میرے لیے بہت مددگار ثابت ہو گی۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ ہم وہاں جانا چاہیں تو لانچ کے علاوہ بھی کسی ذریعے سے جا سکتے ہیں؟"

"لانچ پر جانے میں کیا ہرج ہے؟"

"اگر وہ وہاں ہوئے تو انہیں ہماری آمد کا علم ہو جائے گا اور وہ ہمارا استقبال گولیوں سے کریں گے۔" میں نے کہا۔

"تم رات کے وقت جا سکتے ہو۔ لانچ کی آواز بہرحال ان کے کانوں تک پہنچ جائے گی۔" ترلوچنی نے کہا۔

"تم ہماری مدد کرنا چاہتے ہو تو ہمارے بحفاظت وہاں اتر جانے کا کوئی بندوبست کر دو۔" میں نے کہا۔

"تم ابھی۔ اسی وقت جاؤ گے؟" ترلوچنی نے کہا۔

"اگر ممکن ہو تو اس سے بہتر بات کیا ہو گی کہ ہم جلد از جلد ان تک پہنچ جائیں۔" میں نے کہا۔

"لانچ کا بندوبست میں کر سکتا ہوں۔" اس نے اپنی رسٹ واچ دیکھ کر کہا۔ "ایک بجا ہے اس وقت۔ دو گھنٹے بعد تم جا سکتے ہو مگر۔ سوال وہی ہے کہ۔۔۔ اچھا دیکھو میں کوشش کرتا ہوں اگر کسٹم کی کوئی لانچ مل جائے اور تم کسٹم والوں کی وردی میں وہاں اتر سکو۔"

"یہ محفوظ ترین صورت ہو گی۔" میں نے کہا۔ "ہم اطمینان سے جزیرے کی اور پورے محل کی تلاشی بھی لے سکیں گے۔"

"پھر میں چلتا ہوں۔" ترلوچنی اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ انجوائے کرو۔ اچھی خوبصورت لڑکیاں جمع کی ہیں تم نے، اور یہ لڑکی تو بہت شاطر ہے۔ ایکٹنگ اچھی کر لیتی ہے اور بہت وائلڈ بھی ہے مگر لڑکا نہیں بن سکتی۔ کیوں سردار جی؟"

گل کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ میں نے ترلوچنی کی بات کا برا نہیں مانا۔ وہ ہم سب کو اپنی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ ہم اسے کیا بتاتے کہ ہم دو گھنٹے میں کیا انجوائے کریں گے۔ کیونکہ ہم نے اس زندگی کے لیے خود کانٹوں کی سیج سجائی ہے حالانکہ ہماری عمر اور ہمارے حالات اپنے دامن میں خوشیوں کے سب پھول بھر لینے کے لیے بھی سازگار ہو سکتے تھے۔ جیسے رابعہ جیسی عورت کی محبت اور زندگی پر کامل تصرف حاصل ہو اور جسے دلاور نے لاکھوں نہیں کروڑوں کے خزانے کی کنجی تھما دی ہو، وہ اپنے لیے دربدری اور حسرت تعمیر کے خواب منتخب کرے، وہ ترلوچنی جیسے شخص کی نظر میں تو پاگل ہی ٹھہرے گا! مگر اپنی یہی دیوانگی عشق تو وہ انداز تھا جس پر مجھے بھی اتنا ہی ناز تھا جتنا رابعہ کو۔ یا غالب کو اور نازو کو۔

"تمہیں اور کچھ چاہیے تو بولو۔ آج جو چاہو مانگ لو۔" ترلوچنی نے کہا۔

"کل تم ہمیں پہچانو گے بھی نہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اپنا قرض بے باق کر رہا ہوں اور میں یہ نہیں پسند کروں گا کہ کل تم اس قرض کی دوسری قسط وصول کرنے آجاؤ۔ یکمشت مانگ لو مجھ سے کچھ بھی۔ نقد رقم۔ اسلحہ۔"

میں نے کہا۔ "سوچ کے بتاؤں گا۔"

ترلوچنی نے سر ہلایا۔ "سوچ لو اور مشورہ کر لو۔ میں تین بجے سے پہلے ہی پھر آؤں گا۔"

اس کی شاندار بلیک شیورلٹ بے آواز چلتی ہوئی گیٹ کے ڈرائیو وے سے گزر گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا اور صوفے پر دراز ہو گیا۔ اسی کمرے میں رابعہ کے ساتھ گل بیٹھی ہوئی تھی اور نازو کنگ سائز بیڈ پر دراز تھی۔

"ساڈے دل وی تے ویکھو سوہنیو۔" گل نے رابعہ کے گالوں پر چٹکی لے کر کہا۔ "اسی تے مر گئے آں۔"

رابعہ کا رنگ سرخ پڑ گیا۔ "یہ کیا بیہودگی ہے۔"

نازو نے ہنسنا شروع کیا۔ "سردار جی! ہم بھی جائیں؟ بڑا پیار آ رہا ہے سردارنی پر۔"

میں نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ "خاک پیار آ رہا ہے۔ ناک کٹوا دی مردوں کی۔ وہ جاتے جاتے پتا نہیں کیا کہہ گیا۔"

اب گل کا رنگ گلابی ہونے لگا۔

رابعہ ہنسی۔ "تم سے نہیں ہو گا یہ مردانہ رول۔ تم وہ زنانہ رول کر لو۔ ورنہ ہر جگہ یہی ہو گا۔"

گل نے بگڑ کے کہا۔ "پتا نہیں کتنی بار میں مردانہ لباس میں بھیا کے ساتھ وارداتوں میں شریک ہوئی۔ کبھی کسی نے نہیں پہچانا۔"

میں نے کہا۔ "کہتی تم بھی ٹھیک ہو مس گل بانو۔ دراصل وہ تمہارا نہیں ناگ منی کا روپ تھا۔ جسے کسی نے نہیں پہچانا تھا۔ اب تم گل بانو بن کے سب بھول گئی ہو کہ مردوں کے کیا انداز ہوتے

www.paksociety.com

ہیں۔ یاد ہے تمہیں کہ تم سگریٹ پیتی تھیں اور فراٹے سے مردانہ وار گالیاں بکتی تھیں۔ وہ گالیاں جو دوسرے لوگ بھی عام گفتگو میں استعمال کرتے تھے تمہاری زبان پر بھی چڑھی ہوئی تھیں۔ اب تو واڑھی مونچھ لگا کے بھی تم وہی ہائے اللہ اور اوئی اللہ سے بات کرو گی!"

گل کا شرم سے بُرا حال ہو گیا "اب میں ویسی تو پھر بن نہیں سکتی۔"

"بھئی تمہارے لیے کیا مشکل ہے۔ جب نمونہ سامنے ہو تو بس نقل ہی آسانی ہے نا" نازو نے کہا۔

"نمونہ۔ کیسا نمونہ؟" رابعہ نے کہا۔

"بھئی تمہارے میاں کو کردار کرنا ہے تو میاں کو دیکھو" نازو شرارت سے گل بیٹھی تھی "اور سا گر نہیں دیکھا تو بھی چھپ کے دیکھو۔ بھئی سکندر الڑکی ناتجربہ کار ہے۔ اس کے لیے ایک تربیتی مظاہرہ ہونا چاہیے" ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس کا ساتھ گل بھی دے رہی تھی۔ چنانچہ رابعہ کی حالت غیر تھی۔

"ہاں ہاں۔ تربیتی مظاہرے میں میرا رول تو کر لے۔ نازو کی بچی" رابعہ نے اسے نوچنا شروع کیا۔ مجھے بھی ہنسی آگئی۔

جب یہ طوفانِ بدتمیزی تھما تو میں نے کہا "کیا خیال ہے سونگنگ کے بارے میں۔ کاسٹیوم تو مل جائیں گے۔"

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر نازو نے جھلا کے کہا "آپ اپنی والی کو لے جائیں نا۔"

میں نے کہا "بھئی وہ دیکھو۔ اُدھر۔ اس کے ساتھ تو چار ہیں اور ترلوچنی کہہ گیا ہے کہ انھوں نے۔۔۔"

"میں بتاؤں گی غالب اور محسن کو" رابعہ نے کہا۔

"کیا بتاؤ گی؟" میں نے کہا "غالب اور محسن کی یادداشت اتنی بھی تو میرے ہی پاس ہے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کی سب اخلاقی اور غیر اخلاقی ذمے داریاں میں پوری نہیں کروں گا تو کون کرے گا۔"

"نہیں آگئی مجھے غیرت" نازو ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے سامنے آگئی "اٹھو۔"

رابعہ نے تالی بجائی "شاباش نازو۔ ایسا دھوبی پٹکا دے کہ انھوں نے ہم کر سکے۔"

میں نے نازو کے تیور دیکھے۔ وہ سچ مچ مقابلے کے موڈ میں تھی چنانچہ مجھے اٹھنا پڑا "خواتین کے لیے رعایتی شو۔"

"کوئی رعایت نہیں" نازو نے کہا اور بجلی کی طرح جست لگا کے آئی۔ میں نے وار خالی دیا مگر وہ پلٹی اور میں اس کی برق رفتاری پر حیران رہ گیا۔ یہ اس کے جسم کا لوچ تھا کہ وہ اس طرح گھوم گئی اور مجھ پر ایک بھرپور وار کرنے میں کامیاب رہی۔ میرا بایاں شانہ سن ہو گیا۔ میں نے اگلے وار کو ہاتھ پر روکا اس کی کلائی کو جھٹکا دیا اور اسے اوپر اٹھا کے بیڈ پر پھینک دیا۔ وہ اسپرنگ والے بیڈ سے اچھلی اور مجھے ایک غلاتنگ کس مارگئی۔ میں پلٹ کے پیچھے گیا تو صوفے پر اُلٹ گیا۔ رابعہ نے خوب شور مچایا۔

"واہ۔ ایک بار پھر نازو۔ مکرر ارشاد۔"

گل حیرت سے کہ کھڑی یہ تماشا دیکھتی رہی۔ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ نازو اتنی اچھی کراٹیکا ہے۔ اس کی اور میری فائیٹ خود رابعہ نے پہلی بار دیکھی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ میرے اور نازو کے درمیان صرف ایک بار مقابلہ ہوا تھا۔ وہ بھی نازو کے والدین کے گھر میں۔ یہ بہت پرانی بات تھی۔

میں نے جتنی کوشش کی کہ معاملہ مذاق سے آگے نہ بڑھے نازو اتنی ہی سیریس ہوتی گئی۔ بالآخر مجھے بھی سیریس ہونا پڑا۔ رابعہ مذاق بھول گئی اور گل تو باقاعدہ چلا چلا کے رونے لگی کیونکہ یقیناً یہ مقابلہ بہت سخت ہو رہا تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو بُری طرح مار رہے تھے۔ یہ صرف ہم جانتے تھے کہ ہم میں سے کوئی بھی غیر محتاط نہیں ہے۔ نہ میں نے نازو پر کوئی ایسا داؤ آزمایا تھا جس سے اُسے نقصان ہوتا اور نہ اس نے مجھ پر۔ ہم ایک دوسرے کا پورا خیال رکھتے ہوئے لڑ رہے تھے۔

آخری بار جب میں نے نازو کو گھما کے بیڈ پر مارا تو میرا سانس بُری طرح پھولا ہوا تھا اور نازو بھی ہانپ رہی تھی۔ ایک دم گل نے اور رابعہ نے اسے دبوچ لیا اور وہیں بیڈ پہ دبا لیا۔ نازو نے پہلے ہنسنا شروع کیا پھر رونے۔

"سردار جی حد کر دی آپ نے۔ ہم تو کھیل رہے تھے۔ آپ کے بارہ کیوں بج گئے؟" میں نے کہا۔

"یہ کیا وحشیانہ کھیل ہے" گل نے چلا کے کہا "ابھی کسی کو چوٹ لگ جاتی پھر۔۔۔"

رابعہ نے اسے سمجھایا "تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو گل۔ یہ تو بس پریکٹس تھی۔"

نازو نے کہا "ہاں۔ بہت عرصہ ہو گیا تھا۔ میں بالکل آؤٹ آف پریکٹس تھی۔ کہیں موقع ہی نہیں ملا تھا ہاتھ پیر چلانے کا۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "آپس میں اس قسم کے تجربے کرتے رہنا چاہیے پریکٹس کے طور پر۔"

گل اب مزید خفیف ہو کے نازو کو حیرت و استعجاب کے ساتھ تعریفی انداز میں دیکھ رہی تھی "تم نے لڑنا کہاں سے سیکھا تھا تم نے؟"

نازو نے بال سمیٹے اور کمر پر لپٹا ہوا دوپٹا کھول لیا "سیکھا تھا کالج کے زمانے میں۔"

"مجھے بھی سکھا دو" گل نے بڑی معصومیت سے کہا۔

نازو ہنس پڑی "سکھا دوں گی۔ مگر پہلے بہت پٹائی ہوتی ہے اور یہ دو چار دن کا کھیل نہیں ہوتا۔ کئی سال لگ جاتے ہیں اسے سیکھنے میں۔"

"کئی سال؟"

"ہاں۔ اور اتنی فرصت کہاں ہے اب۔ نہ تمہارے پاس اور نہ میرے پاس" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "ہاں۔ اس سے پہلے ہی یہ چھوڑ بابل کا گھر۔ موسیقی کے نخرے تم کو جانا پڑا" میں نے گانا شروع کیا اور خواتین کے ردعمل سے پہلے ہی بھاگ کے باتھ روم میں گھس گیا۔

ڈھائی بجے ترلوچنی آیا تو ہم سب فرصت کے وقت سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے نہا دھو کے تازہ دم ہو گئے تھے اور وہاں جو کچھ دستیاب تھا کھا پی چکے تھے۔ ہم نے تمام امکانات پر بھی غور کر لیا تھا جو ترلوچنی کے نہ آنے یا اس کے دھوکا دینے سے پیدا ہو سکتے تھے۔

ترلوچنی اپنی ہی گاڑی میں آیا تھا لیکن اس کے ساتھ دوسری عام استعمال ہونے والی ٹیکسی بھی تھی۔

"تم سب لوگ خاصے بدلے ہوئے لگتے ہو" ترلوچنی نے کہا۔

میں نے کہا "ہم انجوائے کرتے رہے۔ تم نے کیا کیا؟"

"یہ ٹیکسی میری ہے اور ڈرائیور بھروسے کا آدمی ہے۔ یہ تم کو وہاں لے جائے گا جہاں سے کسٹم کی ایک لانچ روانہ ہو گی۔ انھیں بتایا گیا ہے کہ جزیرے میں غیر ملکی شراب کا اسٹاک رکھا گیا ہے۔ وہ ایک مخبر کو ساتھ لے جانے پر تیار ہیں اور حفاظت کے لیے اُسے وردی فراہم کرنے پر بھی آمادہ ہیں۔"

"صرف ایک کو؟"

"ابھی سے فوج ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم جا کے جزیرے کو اور محل کے کھنڈر کو کسٹم والوں کے ساتھ ہی خوب دیکھ لو گے۔ اگر تمھیں شک بھی ہو کہ دلاور نے تمہارے ساتھیوں کو وہاں قید کر رکھا ہے تو تم بعد میں پوری تیاری کے ساتھ جا سکتے ہو۔"

"بعد میں کب؟" میں نے کہا۔

"کسی بھی وقت۔ آج رات کو" وہ بولا۔

یہ تجویز مجھے قابلِ عمل لگی۔ میں نے کہا "رات کو تم لانچ کا بندوبست کر دو گے؟"

اس نے کہا "لانچ کے علاوہ کیا چاہیے ہم نے کہا تھا کہ سوچ کر بتاؤ گے۔"

اس وقت تک میں نے کچھ نہیں سوچا تھا مگر ایک اسکیم اچانک میرے ذہن میں آگئی چنانچہ میں نے کہا "ہم نے اس پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ کچھ چیزوں کی ہمیں اشد ضرورت پڑے گی۔"

"کوئی فہرست بنائی ہے تو مجھے دے دو۔"

میں نے کہا "لکھو۔ لائف جیکٹ چھ عدد۔۔۔"

ترلوچنی نے بے بسی سے کہا "میں تمہارا منشی نہیں ہوں۔ اس ڈرائیور کو بتا دینا۔ وہ شام تک تمہارے ساتھ رہے گا۔ تمہاری واپسی تک۔"

میں نے کہا "اچھا اسے بلاؤ۔ تمہارے سامنے پوری فہرست ہو گی تو تمھیں پریشانی ہو گی نہ ہمیں۔"

"مجھے کوئی پریشانی نہیں ہو گی" ترلوچنی نے کہا۔

میں نے کہا "فرض کرو ہم نے لکھوا دیں چھ اڑن طشتریاں، چھ الٰہ دین کے چراغ۔ چھ سلیمانی ٹوپیاں جن کو اوڑھ کے آدمی غائب ہو جاتا ہے۔۔۔"

ترلوچنی کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی "مجھے دلاور نے بتایا تھا کہ انتہائی خطرے میں بھی تم سیریس نہیں ہوتے۔ میں ڈرائیور کو بلاتا ہوں۔"

ڈرائیور ایک عجوبہ تھا۔ وہ اشرف المخلوقات کی مختصر ترین صورت تھا اور پانچ فٹ قد کا بے حد لوپ ٹیل آدمی تھا۔ اس کے کپڑے سائز سے بہت بڑے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وردی کے اندر کا آدمی اچانک سکڑ گیا ہے۔ حیرت انگیز طور پر اس کی آواز بڑی پاٹ دار تھی۔

میں نے کہا "لکھو لائف جیکٹ چھ عدد۔۔۔"

اس نے مجھے ڈانٹ کر کہا "سائز؟"

میں گڑبڑا گیا "سائز۔۔۔ دو میانہ۔۔۔ میڈیم لکھو۔"

"ٹھیک ہے۔ رنگ بتاؤ۔"

"رنگ جو تمھیں پسند ہو" میں نے کہا۔

"مجھے کوئی رنگ پسند نہیں۔ سفید لائف جیکٹ نہیں ملتی" اس نے پھر مجھے ڈانٹا۔

www.paksociety.com

"اچھا بھائی! ہر رنگ کی ایک لے آؤ۔ قوس قزح کے جتنے رنگ ہوتے ہیں۔" میں نے جھلا کے کہا۔

"اس میں سات رنگ ہوتے ہیں، دو نظر نہیں آتے۔" اس نے کہا۔ "جیکٹ چھ ہیں۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "اُف۔ تم سب زرد رنگ کی لے آؤ۔"

"چلو آگے بھی بولو۔"

نگ نے کہا۔ "دو سیٹ واکی ٹاکی۔"

"کتنی رینج کے؟"

میں نے کہا۔ "تیرہ وار جواب میری بات کاٹی، شارٹ ویو، پانچ سے دس کلو میٹر رینج، نو وولٹ بیٹری یا بارہ وولٹ۔

پوری تفصیل:"

"آپ کی بات پوری ہو گئی؟"

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ہاں، آگے لکھو۔"

"واکی ٹاکی کس کمپنی کے ہوں؟" اس نے قلم روک کے کہا۔

"کسی بھی اچھی کمپنی کے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"کس ملک کی؟"

"جو بھی تمھیں پسند ہو۔" میں نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

"مجھے کیا پتہ ہے، وہاں واکی ٹاکی نہیں بنتے۔"

"ترلوچن! یہ تو مجھے پاگل کرے گا۔" میں نے اس سے کاغذ قلم چھین لیا۔ "یا پھر شام تک اس کا خون ہو جانے کا میرے ہاتھوں۔"

نازو اور رابعہ اس صورت حال سے بہت لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ میری جھلاہٹ پر انھیں ہنسی آ رہی تھی۔ گل کچھ جھینپ رہی تھی کیوں کہ ترلوچن اس میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔

رابعہ نے کہا۔ "تمھاری فہرست مکمل ہو جائے تو مجھے بھی کچھ چیزیں لکھوانی ہیں۔ میک اپ کا سامان۔ نیل پالش۔ لپ اسٹک۔ ان کے کلر شیڈ وغیرہ۔ تفصیل میں بتا دوں گی۔"

نازو نے کہا۔ "اور چوڑیاں ہار جب ہے۔ رنگ ڈیزائن سائز سب میں لکھواؤں گی۔"

میں نے فہرست میں صرف ایک اور آئٹم کا اضافہ کیا۔ میں نے سائلنسر والے چھ آٹو میٹک ریوالور لکھے اور فہرست ترلوچن کو تھما دی۔ میرا خیال تھا کہ اس آخری آئٹم پر وہ معترض ہوگا مگر اس نے صرف سر ہلایا۔ ہمارا کام تو کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا تھا مگر میں نے موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ اگر ترلوچن خود کو اتنا ہی صاحب اختیار سمجھتا ہے کہ ہمارے لیے سب کچھ کرنے کو آسان سمجھتا ہے تو یہ سامان فراہم کر دے جو ہم خود آسانی سے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ سوائے لائف جیکٹ کے کوئی چیز بازار میں ملنے والی نہیں تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ آگے چل کے ہمیں ان کی ضرورت پڑے گی۔

"شام تک یا رات تک تم اس گاڑی کو جہاں چاہو لے جاؤ۔" ترلوچن بولا۔ "کسٹم والوں کی لانچ ساڑھے چار بجے کے بعد جائے گی۔ ظاہر ہے تم اس میں جاؤ گے۔"

"اس وقت تک یہ دماغ خراب کرنے والی چیز بھی ہمارے ساتھ رہے گی؟" میں نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کو ساتھ رکھنے میں تمھارا فائدہ ہے۔" وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ تو ایسا شخص ہے کہ اگر اس کو دائیں ہاتھ مڑنے کے لیے کہوں گا تو یہ پوچھے گا کس رفتار سے مڑنا ہے۔ کتنے زاویے پر موڑ کاٹنا ہے۔ بغیر دیکھے موڑ کاٹنا ہے یا دیکھ بھال کے۔ مسلسل بند ہو تب موڑ کاٹنا ہے یا جب کھلا ہوا ہو۔ موڑ کاٹتے وقت کس کے اوپر سے گزرنا ہے۔ کس سے ٹکرانا ہے یا نہیں۔ تم کہتے ہو فائدہ ہے!"

ترلوچن مسکرانے لگا۔ رابعہ، نازو اور گل بھی ہنس رہی تھیں مگر وہ شخص جس کا ذکر ہو رہا تھا ایسے کھڑا ہوا تھا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہو رہی ہے۔ ترلوچن نے اُسے باہر بھیج دیا۔

"تم جزیرے پر جاؤ گے تو تین چار گھنٹے ضرور لگ جائیں گے۔ یہ اتنی دیر میں لڑکیوں کو بمبئی کی سیر کرا دے گا۔"

میں نے کہا۔ "اور جب وہ سیر کر کے آئیں گی تو بال نوچتی ہوئی، پاگل ہو کے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس کے بغیر ہی گزارا کر لیں گے۔"

ترلوچن کی نظریں گل پر جمی ہوئی تھیں۔ "تم کیا کہتی ہو؟"

گل کی ہنسی کافور ہو گئی۔ "کس بارے میں..."

"بمبئی کی سیر کرنا چاہتی ہو تم؟" ترلوچن بولا۔

گل اس کے سوال کا مطلب مجھ سے پہلے سمجھ گئی کیوں کہ وہ بہرحال عورت تھی جو مرد کی نگاہ کو بھی سمجھ لیتی ہے۔ اس نے کہا۔ "مجھے کوئی شوق نہیں۔"

"تم بہت اچھی ایکٹریس ہو۔" وہ بولا۔ "بمبئی میں شاید ہی کوئی ہیروئن تمھارا مقابلہ کر سکے۔ اگر تم اس لائن میں آ جاؤ۔"

"کیا تم کوئی فلم پروڈیوس کر رہے ہو؟" گل نے کہا۔

ترلوچن مسکرایا۔ "میں بھی کر سکتا ہوں ورنہ جس پروڈیوسر سے میں کہوں وہ تمھیں سائن کر سکتا ہے۔"

"راج کپور سائن کرے گا؟" گل نے کہا۔

"ہاں... تم کو دلچسپی ہے تو بتاؤ۔ اور دلچسپی کیوں نہیں ہوگی۔ اس کیریئر میں سب کچھ ہے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" گل نے کہا۔ "ہم، میرا مطلب ہے میں اور میرا شوہر آپ سے ملیں گے۔ وہ بھی اتنا ہینڈسم ہے کہ دلیپ کمار اس کے جوتے صاف کرے۔ آپ دیکھیں گے تو قائل ہو جائیں گے۔ ہم دونوں کے لیے لیڈنگ رول سائن کرانے کا بندوبست آپ کر لیں، بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔ کوئی جاندار اسٹار کا رول ہو۔ میرا لڑکا ہے تو دس سال کا۔ اس سے چھوٹی لڑکی ہے پانچ سال کی۔"

ہم سب بالکل سیریس رہے۔ جتنے اعتماد کے ساتھ گل نے ترلوچن سے بات کی اور یہ بات سن کے ترلوچن کی جو حالت ہوئی اس سے مجھے دلی خوشی ہوئی۔ اب تک گل اس کے گھورنے سے پریشان تھی۔ وہ شرما رہی تھی اور جھینپ رہی تھی۔ مگر بات جب حد سے گزر گئی تو گل نے اس کو ایک ہی بار میں چت کر دیا۔

ترلوچن بے وقوف نہیں تھا کہ گل کے جھوٹ کو سچ نہ سمجھتا لیکن وہ گل کو جھوٹا بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

اس نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ "ہاں۔ ہاں دیکھیں گے بعد میں۔ اب میں چلتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ میں نے تمھارے احسان کا قرض چکا دیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہم نے کسی قرض کی ادائیگی کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ جو کچھ تم نے کیا اس کے لیے شکریہ۔ برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔"

"کہو۔" ترلوچن بولا۔

"یہ احسان اور قرض والی بات مجھے ایک جھوٹ لگتی ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے۔"

ترلوچن کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ "کیا؟"

"میرا خیال ہے کہ تم اپنی بیٹی کملا کی وجہ سے مجبور ہو گئے۔ اس نے تمھیں بلیک میل کیا۔ یا تم پر دباؤ ڈالا اور تم سے سودا کیا کہ تم میری مدد کرو۔" میں نے کہا۔

ترلوچن کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ میں اس کے اعتراف کی تحریر اس کی جھنجھلاہٹ میں پڑھ سکتا تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس کچھ دیر سے ہوا۔ مجھے بھلا کیا ضرورت تھی اسے شرمندہ کرنے کی۔ اس کے جھوٹ سے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جھوٹ بول کے اپنی انا کا بھرم رکھ رہا تھا۔ اب یہ ہو سکتا تھا کہ وہ مشتعل ہو جائے اور ہماری مدد کا ارادہ بھی بدل دے۔ اس جیسا کینہ پرور شخص ہمارا دشمن بھی ہو سکتا تھا۔

وہ ایک دم پلٹا اور کمرے سے نکل گیا۔ ہم نے اس کی گاڑی کے انجن کو غراتے سنا۔ پھر گاڑی راکٹ کی طرح گیٹ سے نکل گئی۔ غصے میں اس کا گاڑی پر پورا کنٹرول نہیں رہا تھا۔ گیٹ سے گزرتے ہوئے گاڑی کا پچھلا حصہ دیوار سے ٹکرایا اور دیوار کا ایک کونا منہدم ہو گیا۔

"مجھے تو ڈر تھا کہ راستے میں ہی اس کا ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔" گل نے کہا۔ "خدا کرے ہو جائے۔"

"تم نے بلاوجہ اسے مشتعل کیا۔" رابعہ نے کہا۔ "ہر جگہ سچ کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"سچ تو سچ ہے۔ کڑوا لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ سچ کا اظہار موقع محل دیکھ کے کرنا چاہیے۔ اس سچ سے نقصان ہمارا ہی ہو سکتا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"کیا ہم اس پہ بہت زیادہ بھروسا نہیں کر رہے ہیں؟" نازو بولی۔

گل نے اس کی تائید کی۔ "میرا تو خیال ہے کہ لعنت بھیجو اس کی مدد پر۔ جو کچھ کرنا ہے ہم خود کر لیں گے۔"

میں نے کہا۔ "لیڈیز! میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں مگر ڈرنے کی اور جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ لوگوں کو کیا معلوم کہ میرے ذہن میں کیا ہے۔ اب ہم کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

ٹیکسی ڈرائیور ٹیڑھے اسٹائل سے بیڑی پی رہا تھا۔ اس نے بیڑی کو بجھا کے کان پر اٹکایا اور بڑی مستعدی سے پیچھے والا دروازہ کھولا۔ میں آگے بیٹھ گیا تو اس نے ٹیکسی کو اسٹارٹ کیا۔

"تم کو معلوم ہے نا کہ ہمیں کہاں جانا ہے؟"

"معلوم ہے۔" اس نے کہا۔ "کس راستے سے جانا ہے؟"

"مختصر راستے سے۔" میں نے کہا۔

"مختصر کیا ہوتا ہے؟ ہندی میں بتاؤ۔"

"چھوٹے راستے سے۔" میں نے کہا۔

"چھوٹا راستہ شمشان سے گزرتا ہے۔ بیچ میں نالہ پڑتا ہے۔"

"تو پھر لمبے راستے سے چلو۔" میں نے زچ ہو کے کہا۔

"کتنے لمبے راستے سے؟ بہت سے لمبے راستے ہیں۔"

www.paksociety.com

پیچھے نازو جیسی مگر میں نے جوابی کارروائی کا فیصلہ کیا۔

"طبیے راستے کتنے ہیں؟ سب سے لمبا راستہ کون سا ہے؟"

اس نے مجھے سب سے لمبا راستہ بتایا۔ میں نے پوچھا یہ راستہ کتنے کلومیٹر لمبا ہے۔ اس راستے کے دونوں طرف کتنی ڈنڈا کٹیاں یا مکان ہیں۔ سڑک پر کتنے موڑ ہیں، بجلی کے کھمبے کتنے ہیں اور ٹیلی فون کے کتنے۔ وہ بوکھلا گیا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اسے معلوم نہیں کہنا پڑتا تھا۔

"خاک معلومات ہیں تمھاری۔ ڈرائیور ہو تم یا کاٹھ کے اُلّو؟ سڑک پر سے گزرتے وقت آنکھیں بند رکھتے ہو کیا؟ ابھی میں نے صرف ایک راستے کے بارے میں پوچھا ہے مگر تم کچھ نہیں جانتے۔ باقی راستوں کے بارے میں کیا بتاؤ گے؟"

میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا: "تم وقت ضائع کرتے ہو میرا۔ چار بجے تک مجھے نہ پہنچایا تم نے تو سمجھو تمھاری خیر نہیں۔

سمندر میں بھی کلومیٹر ٹیکسی چلا کے لے جانی پڑے گی کبھی چلائی ہے پہلے سمندر میں ٹیکسی؟ کس سمندر میں چلائی ہے؟ بحرالکاہل میں؟ اسی لیے اتنے کاہل ہو...!"

وہ مجھ سے زیادہ زبان نہیں چلا سکتا تھا۔ اگر وہ میرے بے تکے سوالات کا جواب دینے کی کوشش کرتا تو خود پاگل ہو جاتا۔ اس نے خاموشی اختیار کی اور میں نے فاتحانہ نظروں سے پیچھے دیکھا۔ رابعہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا کہ بس اتنا کافی ہے۔ نازو نے اشارے سے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے یہ سلوک۔ تماشا جاری رکھو۔ مگر میں اسے زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں وہ جھنجھلا کے ٹیکسی کھمبے میں نہ مار دے اور بھڑک کے کہ اب بولو۔

پونے چار بجے اس نے ہمیں سمندر کے ساحل پر پہنچا دیا۔ یہ پورٹ کا آخری حصہ تھا جہاں کسٹم والوں کی ان گنت موٹر بوٹس اور لانچیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ خاصی پریشان کن صورتِ حال تھی۔ ترلوچنی نے مجھے اس لانچ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جس پر مجھے جزیرے تک جانا تھا۔ میں رابعہ، نازو اور گل سے مشورہ بھی کرنا چاہتا تھا لیکن اس ڈرائیور کی موجودگی میں بات نہیں کی جا سکتی تھی۔

میں نے اس سے کہا: "وہ لانچ کون سی ہے جس کا ذکر ترلوچنی نے کیا تھا؟"

"مجھ سے انھوں نے کسی لانچ کا ذکر نہیں کیا تھا۔" وہ بولا۔

"اچھا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کیا نام ہے تمھارا؟"

"کون سا نام؟"

میں نے کہا: "کیا نام بھی کئی ہوتے ہیں؟"

"میرے تین نام ہیں۔" وہ بولا۔

"تین نام کیوں ہیں؟" میں نے لطف لیتے ہوئے پوچھا۔

"لوگوں کی مرضی۔ ماں باپ نے غلام محمد کہا۔ گاؤں والے گامو کہنے لگے۔ ترلوچنی صاحب غلام کہتے ہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا: "جو کہ کیوں نہیں کہتے۔ وہ بھی [illegible] ہی ہوتا ہے۔ خیر تم نیچے اُتر کے مشرق کی طرف [illegible] کے زاویے پر [illegible] کی رفتار سے جاؤ اور جا کر [illegible] کے فاصلے پر رک کے سمندر کو گھورتے رہو تین بج کر [illegible] منٹ تک۔"

اس نے قابلِ رحم نظروں سے میری طرف دیکھا اور نیچے اُتر کے میری بتائی ہوئی سمت میں چل پڑا۔

تینوں لڑکیوں نے اب ہنسنا شروع کیا۔ "وہ بیچارہ عادت سے مجبور ہے۔ تم اسے کیوں پریشان کرتے ہو۔"

"اس لیے کہ میں پریشان ہونا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "یہ اگر ایک ہفتہ رہے میرے ساتھ تو اس کی عادتیں درست ہو جائیں۔ خیر اب وہ بات سنو جو میں اس کے سامنے کہنا نہیں چاہتا تھا۔"

رابعہ نے انگوٹھے کی مدد سے اس طرف اشارہ کیا جدھر اس ٹیکسی کا ڈرائیور غلام محمد یا گامو کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کا مطلب سمجھ لیا۔ رابعہ مجھے خبردار کرنا چاہتی تھی کہ ہماری گفتگو اس کے کانوں تک نہ پہنچ رہی ہو۔ وہ ٹھیک چالیس قدم کے فاصلے پر رک گیا تھا۔ جو اندازاً چالیس گز ہی ہوتے ہیں۔ لیکن کسی معمولی سے وائی ٹائی یا بچوں کے کھلونے جیسے [illegible] کے لیے یہ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اگر کار میں کہیں خفیہ مائیکرو فون ہوتے تو وہ آسانی سے ہماری ساری گفتگو سن سکتا۔ ترلوچنی کی گاڑی میں مواصلاتی رابطے کے مؤثر نظام کا مشاہدہ ہم سب کر چکے تھے۔ اس میں اپنے دفاع اور کسی حملہ آور کے خلاف کارروائی کا بھی غیر معمولی بندوبست تھا۔ یہ گاڑی بھی خود ترلوچنی ہی لایا تھا اور اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ڈرائیور اس کا اپنا آدمی ہے چنانچہ یہ بات بعید از امکان نہ تھی کہ اس ٹیکسی میں بھی اس نے جاسوسی کے لیے خصوصی آلات نصب کرائے ہوں۔ ترلوچنی کی ملکیت ہونے کے باوجود یہ ٹیکسی تھی [illegible] اسے ترلوچنی کی عیاری سمجھا جا سکتا تھا۔ ٹیکسی پبلک ٹرانسپورٹ ہوتی ہے۔ ہم اسے محفوظ سمجھ سکتے تھے۔ ٹیکسی کسی کی نظر میں بھی نہیں آتی کیوں کہ ایسی ہزاروں گاڑیاں ہر جگہ ہر وقت نظر

آتی ہیں۔ رابعہ کی دور اندیشی نے ہمیں بچا لیا۔ میں نے غلام کی طرف دیکھا تو وہ بڑے فرماں بردارانہ انداز میں سمندر کو دیکھ رہا تھا لیکن مجھے ایسا لگا جیسے اس کی توجہ ہماری طرف ہے۔ اسے آزمانے کے لیے میں نے کہا: "تم لوگ اس کے ساتھ بستی کی سیر کرنے جاؤ تو ذرا محتاط رہنا۔ یہ شخص مجھے پاگل لگتا ہے۔"

یہ بات کہتے ہوئے میری نگاہ ڈرائیور پر تھی۔ میں نے واضح طور پر اس کے جسمانی ردِعمل کو نوٹ کیا۔ اس کے سر کو جھٹکا سا لگا اور محاورے کے مطابق اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

"پاگل تو نہیں۔ خبطی ہے۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا: "نہیں۔ مجھے تو وہ ایک ایسا شخص نظر آتا ہے جس پر جنون کے دورے پڑتے ہوں گے۔ اس کے سائے سے بچ کے رہنا۔ اس کے اطوار بتاتے ہیں کہ وہ ایک جنسی جنونی ہے اور مجھے یہ موروثی مرض لگتا ہے۔ اس کا باپ پاگل ہو گا یا ماں جنسی جنون میں مبتلا ہوگی۔"

یہ بہت بڑی گالی تھی۔ باپ کی حد تک شاید وہ... برداشت کر جاتا مگر ماں پر یہ تہمت بہت سنگین تھی۔ ضبط سے کام لینے کی پوری کوشش کے باوجود وہ سر گھما کے مجھے گھورے بغیر نہ رہ سکا۔ صرف ایک بار اس نے پلٹ کر دیکھا پھر شاید اسے اپنی غیر ارادی حرکت کی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ پھر سامنے دیکھنے لگا۔

اب میرے لیے شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ٹیکسی کے اندر یقیناً کہیں مائیکرو فون پوشیدہ تھا جو اس گفتگو کو ڈرائیور تک پہنچا رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا مگر مجھے اس کے کانوں میں کوئی ایئر فون یا پلگ دکھائی نہ دیا۔ اگر اس کی کسی جیب میں سے نکلنے والا تار کانوں تک جاتا تو اس سے تاثر یہی ملتا کہ وہ اونچا سنتا ہے اور ہیئرنگ ایڈ استعمال کرتا ہے۔ مگر میں دھوکا نہ کھاتا۔ میں اسے ریسیور ہی سمجھتا۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔

میں نے غور کیا۔ ڈیش بورڈ کو کھول کے دیکھا۔ اس میں صرف کاغذات تھے۔ ڈیش بورڈ پر ایک پنسل بھی رکھی ہوئی نظر آئی۔

میں نے لکھا: "تم اچانک عقل مند ہو گئی ہو۔ ڈرائیور واقعی مشکوک ہے۔"

جواب میں رابعہ نے لکھا: "اچانک کی کوئی بات نہیں۔ میں ہمیشہ سے عقلمند ہوں۔ دوسرا مشورہ یہ ہے کہ باتیں جاری رکھیے۔"

میں نے کہا: "تفریح کے لیے کہاں کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" کاغذ پر میں نے لکھا: "میں گل کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم رابعہ کا بھی خیال رکھنا۔ اور اس پُراسرار ڈرائیور کا بھی۔" یہ تحریر میں نے نازو کو پیش کی۔

رابعہ نے کہا: "دل تو چاہتا ہے ساری بستی دیکھ لیں۔"

میں نے کہا: "دماغ خراب ہے تمھارا۔ تین چار گھنٹے ہیں تمھارے پاس۔ ایسا نہ ہو کہ وقت کا خیال ہی نہ رہے۔ یہاں میں انتظار کرتے کرتے دنیا سے گزر جاؤں۔"

اتنی دیر میں نازو نے لکھا: "مجھے شروع سے شک تھا کہ یہ آدمی جیسا نظر آنے کی کوشش کرتا ہے ویسا نہیں ہے۔"

میں نے زور سے کہا: "میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کدھر جاؤں۔ آخر کس لانچ پر جانا تھا مجھے؟"

اس کے بعد میں نے کاغذ پر لکھا: "غلام محمد کو آہستہ سے آواز دو۔"

نازو نے پکارنے کے انداز میں کہا: "غلام محمد!" اس کی آواز اتنی کم تھی کہ کار سے دو فٹ دور بھی سنی جا سکتی تھی۔ لاشعوری طور پر اس نے پلٹ کے دیکھا۔ اس کے کانوں میں یہ آواز ایسے پہنچی جیسے اس کو بیچ کسی نے نام لے کر آواز دی ہو۔ وہ ہوشیار آدمی تھا۔ آہستہ آہستہ ہماری طرف آیا۔

"آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

میں نے دہاڑ کر کہا: "کسی لڑکی نے تمھیں بلایا تھا؟ قریب آنے کا بہانہ ڈھونڈتے ہو؟ پرائیویٹ گفتگو سننا چاہتے ہو۔ چلو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

احساسِ ذلت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا مگر وہ بولا کچھ نہیں۔ اس کے لیے یہ اطمینان ہی کافی تھا کہ اس کا راز افشا نہیں ہوا۔ میں نے اتنی دیر میں اس کا بغور جائزہ لیا تھا اور یہ معلوم کر لیا تھا کہ آواز اس کے کانوں تک کیسے پہنچ جاتی ہے۔ اس نے اتنے ڈھیلے ڈھالے کپڑے اسی لیے پہنے تھے کہ وہ پھولے ہوئے حصوں میں اور خالی جگہوں پر کچھ بھی رکھ سکتا تھا۔ بشرٹ نما کوٹ کے اوپر اس نے ٹائٹ بیلٹ باندھی تھی۔ اس بیلٹ کے اوپر گردن تک وہ سینے اور پیٹ کے ساتھ کوئی مختصر ٹرانسمیٹر ریسیور یا اسلحہ باندھ کے رکھ سکتا تھا اور غالباً اس کے کندھے پر کوئی چھوٹا سا اسپیکر تھا۔ تاہم یہ سب میرے اندازے تھے جو غلط بھی ہو سکتے تھے۔

www.paksociety.com

فوری مسئلہ یہ تھا کہ میں بیک وقت دو کام کیسے کروں؟ یعنی زبان سے بے معنی گفتگو جاری رکھوں اور پنسل سے لکھ لکھ کے کام کی باتیں بھی کروں۔ سب سے بہتر اور آسان طریقہ یہ تھا کہ ہم ٹیکسی چھوڑ کے باہر نکل جائیں اور کچھ فاصلے پر کھڑے ہو جائیں۔

اچانک کسٹم کی وردی میں ایک شخص تیز تیز قدم اٹھاتا ہماری طرف آنے لگا۔ ابھی وہ پچاس قدم دور تھا کہ ڈرائیور نے جو میرے حکم کی تعمیل میں سمندر کی طرف منہ کیے کھڑا ہوا تھا، چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا اور سر کو خفیف سی جنبش دی۔ دوسرے شخص نے فوراً سر ہلا کے اس کا جواب دیا۔ یہ ایک لمحے کی بات تھی اور اگر میں ان دونوں کو غور سے نہ دیکھ رہا ہوتا تو اس نامعلوم اشاروں کی زبان میں ہونے والی خفیہ اور پُراسرار گفتگو کو کیسے سمجھتا۔

یہ بات مجھے کچھ عجیب لگی۔ شاید ڈرائیور کے رویے نے میرے ذہن میں شکوک کی دھند پھیلا دی تھی چنانچہ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا یا پھر یہ اسی چھٹی حس کا اعجاز تھا جو خطرے کی گھنٹی بجا کے خبردار کر دیتی ہے کہ کچھ ہونے والا ہے جو اچھا نہیں ہوگا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ اگر یہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے تو انھوں نے کھل کے سلام دعا کیوں نہیں کی۔ اس طرح چوری چھپے اشاروں میں کچھ کہنا چہ معنی دارد؟ یقیناً کوئی بات ایسی تھی کہ وہ آشنا ہو کے بھی اجنبیت کا اظہار کر رہے تھے۔

میں چوکنا ہو گیا۔ وہ شخص جو کسٹم والوں کی وردی میں تھا بڑی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا۔ "آپ میں سے کون میرے ساتھ جائے گا؟" اس نے کسی تعارف یا تمہید کے بغیر کہا۔

"کون کہاں جائے گا۔ اور کیوں جائے گا؟" میں نے کہا۔

وہ ایسے جواب کے لیے تیار نہیں تھا۔ "میں کسٹم سے تعلق رکھتا ہوں۔" اس نے اپنی آستین پر لگے ہوئے نشانات سے اپنا عہدہ واضح کیا۔

"بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ بات مجھے بتانے کا مقصد؟"

اس نے کنفیوز ہو کے کہا۔ "کیا آپ کو کسٹم کی لانچ پر رنگ محل نہیں جانا تھا؟"

"رنگ محل؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ رائل سائنز آئی لینڈ پر۔"

"وہاں جا کے میں کیا کروں گا بھائی۔ میں یہاں ٹھیک ہوں۔"

وہ اب گرم ہونے لگا۔ "تم وہ نہیں ہو جس سے کسٹم میں ٹیلیفون پر بات کی تھی؟"

"تیری بیٹی کون سوزر کا بچہ ہے؟" میں نے بھی گرم ہو کر کہا اور مجھے خاصی خوشی ہوئی جب میرے لبوں سے نکلی گالی سن کے ڈرائیور اچھل پڑا۔ ہماری گفتگو سن سکنے والا وہی تھا جو ہیر پھیر ہو رہا تھا اور بے بس بھی تھا ورنہ چلا کے اتنا گرم جوش کر رہا ہوں اور جانتے ہو مجھے جھوٹ بول رہا ہوں۔ کسٹم والا قدرے مایوس ہوا۔ "تو آپ سکندر بختیار نہیں ہو؟"

میں نے کہا۔ "لعنت سکندر بخت پر بھی اور تم پر بھی۔ اسے بابا بمع نواب واجد علی شاہ کے پڑپوتے شہزادہ حقیقتاً آتش فشاں، اپنی بیس عدد زر خریدان کے ہمراہ یہاں آئے تھے۔ تم یہاں سے رنگ محل کا ذکر لے کر رنگ کے پھول فلانے آگئے ہو بھٹکی؟"

وہ سخت پریشان بھی ہوا اور مشتعل بھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ آیا تھا تو صرف یہ کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ مجھے سمجھا تھا۔ یہ اس کے لیے اتنا اہم بات تھی کیونکہ میں مقررہ وقت پر نشانیوں کے ساتھ وہیں موجود تھا جہاں اس کی اطلاعات کے مطابق مجھے ہونا چاہیے تھا۔ ڈرائیور نے تصدیق بھی کر دی تھی سب ٹھیک ہے مگر میں بضد تھا کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔

پھر ایک بات ایسی ہوئی کہ ان کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ جیسے ہی کسٹم والا غصے اور جھنجلاہٹ میں پلٹا نازو نے گاڑی پر ہاتھ رکھ کے مجھے دوسری طرف متوجہ کیا۔ میں نے مخالف سمت دیکھا تو ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکا کا گمان گزرا۔ ایک احاطے کی دیوار کے پیچھے سے کوئی ہاتھ ہاتھ ہلانے والا پل بھر کے لیے سامنے آیا اور چھپ گیا۔ کملا تھی۔ ترلوچن کی بالکل جیتی۔ وہ نہ جانے کب سے وہاں مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم سب کی نظر دوسری سمت میں تھی چنانچہ یہ محض اتفاق تھا کہ نازو نے اس کو دیکھ لیا۔ وہ کملا کو نہیں پہچانتی تھی چنانچہ وہ حیران ہوئی کہ ایک اجنبی قدرت سے ہمیں کیوں اپنی جانب متوجہ کر رہی ہے اور اس نے مجھے بتا دیا۔

اس کے بعد مجھے کوئی شک نہ رہا کہ میری چھٹی حس نے مجھے بالکل صحیح اطلاع دی تھی۔ پلک جھپکتے میں میں سیٹ بدل کر ڈرائیور کی سیٹ پر آگیا۔ ڈرائیور پھر سمندر کی جانب منہ کیے ہوئے کھڑا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ کسٹم والا اس سے بات کرے گا اور پوچھے گا کہ یہ کیا کھیل ہے۔

میں نے پیچھے نازو پر ایک نظر ڈالی اور اسے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ریوالور نکال لے۔ ایک ساتھ گل اور نازو نے ریوالور نکال لیے۔ میں نے چابی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور سر ہلا کے کہا۔ "بائے بائے۔" ادھر کار کا انجن اسٹارٹ ہوا ادھر نازو نے گولی چلائی۔ فائر ادھر کو ہوا تھا مگر اس نے فائر کی آواز سنی اور ڈرائیور بڑی تیزی سے مڑا۔ کسٹم کی وردی پہن کر آنے والے کو زمین پر پڑا دیکھا تو وہ خود بھی زمین پر اوندھے منہ گر گیا۔

گاڑی کو ریورس گیئر میں موڑنے کے لیے میں نے ایکسیلیٹر اتنا دبا دیا تھا کہ انجن بہت شور کر رہا تھا اور گاڑی اُلٹے پاؤں اتنی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی کہ میرے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ٹیکسی پیچھے والے ونڈ اسکرین سے عقب کا پورا منظر صاف نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ نتیجہ یہ کہ گاڑی ایک اینٹ کے اوپر جھٹکا کھا کے چڑھی اور اچھلی پھر اس کا دوسرا پہیہ یعنی آگے والا پہیہ بھی اینٹ پر سے گزرا۔

ان دو جھٹکوں نے گاڑی کے اندر سب کو الٹ پلٹ دیا۔ میں نے مسلسل ہونے والے فائروں کی آواز سنی لیکن سامنے نہیں دیکھا۔ میں گاڑی کو ریورس گیئر میں دوڑاتا ہوا ادھر لے جا رہا تھا جہاں کملا دیوار کی اوٹ سے چلا چلا کے کچھ کہہ رہی تھی۔ مگر اس کی آواز انجن کی غوں غوں میں بالکل سنائی نہیں دے رہی تھی۔

معلوم نہیں نازو، زلیخا اور گل نے خود کو کیسے سنبھالا۔ جھٹکوں سے ان کا توازن بھی برقرار نہیں رہا تھا پھر الٹی دوڑنے والی گاڑی سے ان کو سامنے اس دشمن پر فائر کرنے تھے جس کا فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ نازو اور گل دونوں نے جو اس بدحالی میں فائر کیے تھے مگر ان کی ایک ہی گولی نشانے پر پہنچی تھی جو سب سے پہلے نازو نے چلائی تھی۔ اس کے بعد ڈرائیور نے لیٹ کر اپنی بشرٹ کے اندر سے ریوالور نکالا تھا اور جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔

گاڑی کی ٹیڑھی ترچھی چال نے اور جھٹکوں نے ہم سب کو دشمن کا نشانہ بننے سے محفوظ رکھا۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا کہ وہ ڈرائیور اناڑی تھا۔ وہ ایک تربیت یافتہ اور مکار شخص تھا جس نے ہمیں بے وقوف بنانے کے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے لیٹ کر جوابی فائر کیے تھے تو یہ کوشش ضرور کی ہوگی کہ نشانہ مجھے بنائے کیوں کہ میں ہی گاڑی لے کر بھاگ رہا تھا۔

جب ایک گولی ونڈ اسکرین پر لگی اور شیشے میں سوراخ کے گرد مکڑی کا جالا سا پھیل گیا تو میں نے گاڑی کو موڑ لیا اور پہلے گیئر میں ڈال کے اسٹیرنگ گھما دیا۔ پیچھے دوڑنے والی گاڑی ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھی اور ابھی خواتین سنبھل بھی نہ پائی تھیں کہ گاڑی ایک طرف جھک کر گھوم گئی۔ وہ سب اسی طرف لڑھک گئیں۔ گولیاں اب بھی کار کے بونٹ اور بمپر سے ٹکرا رہی تھیں لیکن میں محفوظ تھا اور میری ہمت بڑھانے کے لیے یہی احساس کافی تھا۔

اچانک میں نے کملا کو دیوار کی اوٹ سے نکل کے اپنی طرف دوڑتے دیکھا۔ "بے وقوف!" میں نے چیخ کر کہا۔ "پاگل۔ واپس جاؤ۔ میں وہیں لا رہا ہوں گاڑی۔"

لیکن کملا بدحواس ہو کے گاڑی کی طرف دوڑ پڑی تھی۔ میں نے اسے بچانے کی پوری کوشش کی مگر وہ ایک سائڈ سے ٹکرائی اور گرتے گرتے اس نے گاڑی کا ہینڈل پکڑ لیا۔

"ٹھہرو۔ وہاں مت جانا۔ ان کے ساتھ۔" کملا نے چیخ کر کہا۔

پھر نازو نے چیخ کر کہا۔ "گاڑی روکو سکندر۔ اس نے ہینڈل باہر سے پکڑ رکھا ہے۔ میں اندر سے کیسے دروازہ کھولوں؟"

کملا گاڑی کے ساتھ گھسٹتی آ رہی تھی۔ میں نے ایک دم بریک لگائے تو وہ جھٹکے سے گر گئی۔

میں نے چلا کے کہا۔ "اسے کھینچ لو اندر۔"

نازو نے دروازہ کھولا اور کملا اٹھ کے بھاگی مگر وہ زخمی ہو چکی تھی اور اس کی ٹانگیں جسم کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ پھر ایک دم وہ تڑپ کے گر پڑی۔ اس کے بعد فائر کی آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا تو گولی کملا کے سر میں گھس چکی تھی۔ خون اس کے سر سے ابل کر زمین میں جذب ہو رہا تھا۔

اب میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں گاڑی روک کے نیچے اترتا تو خود اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگاتا اور باقی سب کی زندگی کو بھی۔ کوئی گولی پیٹرول ٹینک میں بھی لگ سکتی تھی اور آگ لگتے ہی پیٹرول ٹینک پھٹ جاتا تو ہم سب جل کے خاک ہو جاتے۔

میں نے ایک لمحے میں ایک ایسا فیصلہ کیا جو بظاہر خود غرضی اور بے رحمی کا آئینہ دار تھا مگر اس کے حقیقت پسندانہ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے نازو، زلیخا اور گل کے چلانے کی پروا نہیں کی اور مری ہوئی کملا کو وہیں چھوڑ کے گاڑی کو پوری رفتار سے دوڑاتا ہوا وہاں سے نکال لے گیا۔ اب ہم فائرنگ کی زد سے باہر آ چکے تھے اور اس بات کا کوئی امکان نہیں رہا تھا کہ کوئی گولی وہاں تک پہنچ جائے گی۔

میں نے گاڑی کی رفتار پر قابو پا کے کہا۔ "کیا ہوا؟"

نازو نے ہسٹیریائی لہجے میں چلا کے کہا۔ "وہ... اسے گولی لگ گئی۔"

میں نے کہا۔ "ہاں میں نے دیکھ لیا تھا۔"

www.paksociety.com

رابعہ نے کہا: "یہ... کون تھی سکندر؟"
میں نے کہا: "کملا۔"
"کون کملا؟ تریوینی کی بیٹی؟" رابعہ نے کہا اور اس کی آواز کے دکھ سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ بھی نروس تھی اور رو رہی تھی۔
"تم نے کچھ بھی نہیں؟" نازو نے کہا۔
میں نے کہا: "کیا فائدہ ہوتا؟ کیا کر سکتا تھا میں یا کوئی اور اس کے لیے؟"
"اتنے سنگ دل ہو تم؟" نازو نے کہا۔
میں نے چڑ کے کہا: "بند کرو یہ رونے کا ڈراما۔ ہوش میں آؤ نازو۔ میں نے اسے نہیں مارا۔ نہ میں نے اسے مروایا۔ میں تو اسے بچانے کے لیے ہی واپس گیا تھا۔ اس سے پہلے خود اس کے باپ نے قتل کر دیا کملا کو۔"
"باپ نے؟ نہیں مارا اسے؟"
"اور کس نے مارا۔ کس کا آدمی تھا وہ۔ کس نے اس کے ہاتھ میں وہ ریوالور دیا تھا؟" میں نے کہا: "کس نے حکم دیا تھا اسے کہ سکندر کو دھوکے سے وہاں سے لے جاؤ اور مار ڈالو۔ اگر گولی میرے بجائے اس کی اپنی بیٹی کو لگ گئی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ گڑھا اس کے باپ نے میرے لیے کھودا تھا۔ اس کی بیٹی گر گئی اس میں۔ یہ تو ہوتا ہے۔ قدرت کے نظام انصاف کو کون بدل سکتا ہے۔ تریوینی نے اپنے کیے کی سزا پائی۔ حرامزادہ۔ دھوکے باز۔ مدد کرنے آیا تھا ہماری۔"
"کملا بھی یہی بتانے آئی تھی؟" رابعہ نے کہا۔
"ہاں۔ اسے معلوم ہوا ہوگا کہ باپ نے کیا سازش کی ہے دلاور کے ساتھ مل کر۔" میں نے کہا: "کسی نہ کسی طرح وہ یہاں تک پہنچ ہی گئی۔"
"مجھے بہت رنج ہے اس کی موت کا۔" نازو نے کہا۔
"رنج تو مجھے بھی ہے نازو۔ لیکن دیکھو کہ اس وقت ہم بال بال بچے ہیں۔" میں نے کہا: "اگر میں اس بدمعاش کے ساتھ چلا جاتا تو کیا ہوتا؟ شاید میں اور گل کبھی واپس نہ آ سکتے۔ اور بعد میں تمہارے ساتھ خدا معلوم کیا ہوتا۔ ہم سب کو خدا نے بچا لیا۔ اس ڈرائیور پر ہمیں شک نہ ہوتا اور میں کسٹم آفیسر بن کر آنے والے کی اور ڈرائیور کی سازباز نہ دیکھتا تو ہم سب مارے جا سکتے۔"
"وہ دونوں تریوینی کے ایجنٹ تھے؟"
"اور کیا۔ انھیں بطور خاص مامور کیا گیا تھا کہ مجھے لا کر پہلے جائیں اور دلاور کے حوالے کر دیں۔ تم سے وہ بعد میں نمٹ لیتے۔"
"خدا کے لیے کہیں گاڑی روکو۔" رابعہ نے اچانک گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
"کیوں، کیا ہوا؟"
"یہ گل تو بے ہوش پڑی ہے۔" رابعہ نے کہا۔
"حد ہے بھئی۔ تم لڑکیوں سے اپنا ہسٹیریا نہیں سنبھالا جاتا۔ ذرا کوئی بات ہوئی اور لیں بے ہوش یا پاگل۔" میں نے ٹیکسی کو سڑک کے ایک کنارے پر روک دیا: "تمھیں بھی خیال نہیں آیا کہ یہ اتنی دیر سے خاموش کیوں ہے؟"
"اب بس کرو سکندر۔" رابعہ نے جھڑک کے کہا: "جلدی چھوڑو اس ٹیکسی سے جان چھڑاؤ۔ دوسری کوئی ٹیکسی ملے تو دور ہیں وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے نہ آ جائیں۔"
"اس گاڑی میں ٹرانسمیٹر بھی تو ہے۔ نہ جانے اس کی آواز کس حد تک سنی جاتی ہے۔" نازو بولی۔
میں نے کہا: "ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ٹرانسمیٹر ہے کہاں۔ خیر تم ایسا کرو کہ کوئی گاڑی روکو۔ میں گل کو اتارتا ہوں۔"
میں نے گل کو اتار کے سڑک کے کنارے لٹا دیا اور خود ٹیکسی کے پیچھے چھپ کے بیٹھ گیا۔ رابعہ اور نازو کے لیے چند منٹ بعد ایک کار رک گئی جس کو ایک [illegible] چلا رہا تھا۔
"ابھی آپ لوگاں کو کیا ہوا جی؟" اس نے کبوتر کی طرح غٹرغوں کی۔
"وہ جی۔ ہماری ٹیکسی خراب ہو گئی۔" رابعہ نے مظلوم بن کے کہا۔
"یہ تو بہت برا ہوا جی۔" وہ بولا: "اور اس کو کیا ہوا جی...؟"
"یہ بہن ہے میری۔" رابعہ نے کہا: "ہم اسے اسپتال لے جا رہے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور چلا گیا ہے کسی مکینک کو لانے۔ معلوم نہیں کب آئے گا۔"
"آپ بیٹھو جی ہماری گاڑی میں۔" اس نے پچھلے والے دروازے کا لاک کھولتے ہوئے کہا۔
نازو پہلے بیٹھی۔ اس نے رابعہ کی مدد سے گل کو اندر کھینچا پھر رابعہ بیٹھنے لگی۔ میں ٹیکسی کے پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے خاموشی سے ریوالور نکالا اور اس کا دستہ کار والے کے سر پر کھینچ مارا تو میں لپک کر سامنے آیا۔ میں نے اسے ڈرائیور کے دروازے کی طرف سے کھینچا اور ٹیکسی میں ڈال کے دروازہ بند کر دیا۔
یہ سب کارروائی مشکل سے پانچ منٹ میں ختم ہو گئی۔

وہ ایک غیر آباد سڑک تھی۔ شاید تریوینی کا ایجنٹ ہمیں قصداً ایک ایسے راستے سے لایا تھا جو بہت کم استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں ہی گزر رہی تھیں۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ گزرنے والی بیشتر گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے دیکھا تھا کہ سڑک کے کنارے ٹیکسی رکی ہوئی ہے۔ دو عورتیں پریشان کھڑی ہیں اور تیسری لیٹی ہوئی ہے جو معلوم نہیں زندہ ہے کہ مر گئی ہے۔ مگر کسی نے رک کر مدد کرنے یا پوچھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ سب نظریں چرا کے گزر رہے تھے۔ بڑے شہر کی ایک افسوس ناک عادت لاتعلقی اور بے حسی کی ہوتی ہے اور شہر جتنا بڑا ہوتا ہے اتنا ہی اندھا بہرا ہوتا جاتا ہے۔ کوئی کیا کر رہا ہے' ان کی بلا سے۔ کوئی مر رہا ہے یا مدد کے لیے پکار رہا ہے' انھیں اپنے کام سے کام۔ کسی کے پاس دوسروں کے لیے فرصت نہیں۔ ضائع کرنے کے لیے ہمدردی کے دو بول تک نہیں۔ یہ بات میں نے لندن میں بہت زیادہ دیکھی تھی۔ سڑک کے کنارے بسوں یا ڈراموں میں۔ تھیٹر یا ریسٹورنٹ میں نہ کوئی کسی کو دیکھتا تھا اور نہ کسی کی بات سنتا تھا۔ بمبئی میں یہ رویہ نسبتاً کم شدت کے ساتھ محسوس ہوتا تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہاں کے رہنے والے جذباتی طور پر ایک دوسرے سے دور تھے۔ کسی کا عقیدہ کیا ہے' مذہب کیا ہے' لباس کیا ہے اور اخلاق کیا' اس سے دوسرے کو قطعی سروکار نہیں۔
یہی وجہ تھی کہ دیکھنے والے دیکھ کر گزرتے رہے اور وہاں کی زبان میں کوئی اس لفڑے میں نہیں پڑا۔ جو نسبتاً شریف یا جذباتی آدمی لفڑے میں پڑا اس کے ساتھ ہم نے وہ سلوک کیا کہ آئندہ کے لیے اسے بھی نصیحت ہو گئی ہوگی۔ یہ قابل مذمت واقعہ وہ ہر جگہ سنائے گا اور یوں سو افراد انسانی ہمدردی کے جذبے سے تائب ہو جائیں گے۔ مجھے افسوس ہوا کہ مجبوری میں ہم نے ایک غلط رسم کے خلاف صحیح قدم نہیں اٹھایا اور شکریہ ادا کرنے کے بجائے مدد کرنے والے کو ناک آؤٹ کر دیا۔
گل نے اپنا راز افشا ہو جانے کے بعد سردار جی کے ٹربنڈ طرز والی پگڑی تریوینی کی بیچ سڑک میں ہی اتار دی تھی۔ کسی باتھ روم کے سے استعمال شدہ ساڑی مل گئی تھی جو اس نے قمیص کے اوپر ہی باندھ لی تھی۔
میرے سامنے نہ آنے کا ایک مقصد تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہوش میں آتے ہی کار کا مالک پولیس اسٹیشن کی طرف دوڑ لگائے گا اور یہ بیان دے گا کہ اسے تین عورتوں نے مل کے دھوکا دیا۔ ایک بیماری کا ڈراما کیے جی۔ دوسرے ہم کو لڑکے جگہ تیسری نے ہمارے سر پہ زور سے کچھ مارے جی۔
بعد میں جب تفتیش ہوگی تو مزید انکشافات ہوں گے اور تریوینی کو معلوم ہو گا کہ اس کے غلام کی اور کار کی کا بھانڈا پھوٹ گیا اور اس کی سازش ناکام ہو گئی تو وہ سخت پیچ و تاب کھائے گا۔ وہ سمجھ جائے گا کہ ان ٹیکسی سے اترنے والی تین عورتیں کون ہو سکتی ہیں لیکن ان کے ساتھ کسی مرد کا نہ ہونا... اسے کنفیوز کرے گا۔ کار والا حلفیہ بیان دے گا کہ ان کے ساتھ کوئی نہیں تھا اور خود تریوینی بھی سوچے گا کہ سکندر ساتھ ہوتا تو یہ ساری کارروائی عورتیں کیوں کرتیں۔ سوال یہ ہے کہ سکندر کہاں غائب ہو گیا؟
اس جگہ سے تقریباً دو میل دور آ جانے کے بعد میں نے ایک دکان کے سامنے گاڑی روک دی۔ وہ دودھ دہی کی دکان تھی جس پر ایک بہت بھاری بھرکم سکھ بیٹھا ہوا تھا۔
"صرف پانی۔ بادشاہو کوئی دودھ لسی...؟"
میں نے کہا: "ایک لڑکی بے ہوش ہو گئی ہے۔ اس پر دودھ لسی کے چھینٹے نہیں مارے جا سکتے۔"
"او ہو ہو۔ معاف کرنا۔" اس نے مٹکے میں سے شیشے کا گلاس ڈبو کے بھرا اور مجھے پکڑا دیا۔ وہ خود بھی اتر کر میرے ساتھ ہی آ گیا اور بولا: "کسی کی ہو یا اسے کالی فول؟"
میں نے کہا: "اس پر جن چاچا آتے ہیں۔"
"جن چاچا؟" وہ بھونچکا رہ گیا۔
"ہاں۔ اس کا ایک خبیث چاچا تھا۔ ساری زندگی پریشان کرتا رہا۔ مر کے بھی جان نہیں چھوڑ رہا ہے۔" میں نے کہا: "تم اس گلاس کے پیسے لے لو۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے۔"
"توبہ کرو جی۔ آپ ایک اٹھنی لے کے میرو ہی چلا لیجیے۔ رکھو گلاس۔ گلاس وی کوئی شے ہوندی اے۔" وہ سخت برا مان کے واپس اپنی گدی پہ جا بیٹھا۔
پانی کے چھینٹے پڑتے ہی گل ہوش میں آ گئی۔ رابعہ اور نازو نے اسے ایک گھونٹ پانی پلا بھی دیا۔ جب میں نے اسے پلٹ کے دیکھا تو وہ اپنی جذباتی کمزوری کے مظاہرے پر خاصی شرمسار سی بیٹھی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔
میں نے کہا: "آپ لوگوں کی جذباتیت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اب تک کیسے کیسے مقابلے کیے ہیں آپ سب نے۔ کتنی معرکہ آرائی کی ہے۔ کتنی سختی جھیلی ہے۔"
"دشمن کو گولی مارنا بہت آسان ہوتا ہے۔ کسی اپنے کو مرتے دیکھنا بہت مشکل کام ہے۔" نازو نے کہا۔
"تم نے اسے اپنا بھی لیا؟"
"آخر وہ کس کی مدد کرتے ہوئے ماری گئی؟" رابعہ نے کہا۔

www.paksociety.com

اُسے پرواہ ہوتی ہماری تو وہ آتی ہی کیوں۔"

"افسوس تو مجھے بھی ہے۔ لیکن دیکھو نا کبھی میدانِ جنگ میں اپنے ہاتھوں بھی اپنے مارے جاتے ہیں۔ غلطی سے یا مجبوری میں۔ اور جو گولی کملا کو لگی وہ ہم میں سے کسی کو بھی لگ سکتی تھی پھر کیا ہم سب اسی طرح بے ہوش ہو جاتیں۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ اس بھیانک منظر سے دہشت زدہ ہو گئی تھی۔" گل نے کہا۔

"موت کا منظر وحشتناک ہی ہوتا ہے خوشگوار کبھی نہیں ہوتا۔ مگر اس وقت عقل و ہوش سلامت رہنے چاہئیں ہمت سے کام لینا چاہیے۔" میں نے کہا۔

ان میں سے کسی نے اور کچھ نہیں کہا۔ میں اب سوچ رہا تھا کہ تریوینی کی سیکرٹری کا بھانڈا تو پھوٹ گیا لیکن اب ایک خطرناک دشمن سامنے آ گیا تھا۔ اس نے فریب دوستی کی جو نقاب اوڑھ رکھی تھی وہ ہٹ گئی تھی چنانچہ ہمارے اور اس کے درمیان کھلی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں تریوینی کو سب سے زیادہ خطرناک سمجھنے پر اس لیے بھی مجبور تھا کہ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے پھر اس کا ولاور سے الحاق ہو گیا تھا اور وہ میری ہر کمزوری سے پورا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ اسے اپنے نقصان کی خبر پہنچے گی تو اس کے غیظ و غضب کا کیا عالم ہو گا۔ شکر کے غلام تو مرتے ہی رہتے ہیں۔ اس کی اکلوتی بیٹی کا مرنا سب سے بڑا نقصان تھا جس کا صدمہ اسے پاگل کر سکتا تھا۔ مجھے اس کے وسائل کا بھی اندازہ تھا۔ وہ میری تلاش کے لیے بمبئی کی ساری پولیس کو مستعد کر سکتا تھا۔ بمبئی کے سارے بدمعاش اور ان کے چیلے چانٹے دادا اور ان کے سب پوتے اپنی متحدہ قوت کے ساتھ میرے دشمن ہو سکتے تھے۔

"اب کہاں چلتے جا رہے ہو؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا: "تم کہو تو میں کیا سارا زمانہ رک جائے۔ ہوا اور فضا رک جائے۔ سورج اور چاند ستاروں کی گردش رک جائے۔"

"زیادہ تکلف مت کریں۔ بس اس گاڑی کو کہیں روک لیں۔" رابعہ نے کہا۔

"اس سے جلد از جلد جان چھڑا لینا ہی بہتر ہے۔" نازو نے اس کی تائید کی۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے۔"

"کہیں پولیس نے روک لیا تو معلوم ہو جائے گا کہ کار چوری کی ہے۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔ "جان بچ گئی اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ مصیبت کو گلے لگانے کا شوق ہے۔"

"تم مصیبت کیوں سمجھتی ہو خود کو۔" میں نے کہا۔

ظاہر ہے اس کے بعد رابعہ کچھ نہیں بولی۔ نازو کی ہنسی نے مجھے بتا دیا کہ رابعہ کا چہرہ تصویرِ حیا بن گیا ہوگا۔

گل نے کہا: "رابعہ باجی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں کہ کہیں چھوڑ دیں اس گاڑی کو۔"

میں نے کہا: "تم اور تمہاری باجی دونوں کی مخالفت مول نہیں لے سکتا مگر نیک بی بیو۔ بمبئی کو ایسے ہی سمجھو جیسے اپنا کراچی۔ ابھی تو اس گاڑی کا مالک آنکھیں کھولے گا تو روتا دھوتا تھانے جائے گا اور تھانے میں جب اس کی تحریرات ہو چکی ہوں گی۔ وہ بھی کہیں گے کہ جلدی کیا ہے اب ہم دیکھیں گے تمہاری گاڑی کون لے گیا۔ اور صبح وہ تلاش کے لیے پولیس کو الرٹ کریں گے تو یہ ایک ضابطے کی کارروائی ہوگی بس۔ وہ اتنے سیریس بھی نہیں ہوتے کہ سچ مچ ہر چوری کا سراغ لگانا شروع کر دیں۔"

"آخر آپ یہ رسک کیوں لیتے ہیں؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا: "لاحول ولاقوۃ۔ میرے لیے کوئی رسک نہیں۔ رسک ہے تمہارا تینوں کا۔ میرا تو وہ نام بھی نہیں لے گا۔ تم تینوں کو البتہ پہچان لے گا۔"

اس سے پہلے کہ ان کا احتجاج عملی صورت اختیار کرتا میں نے گاڑی کو ایک ایسی جگہ روک لیا جو شاید پہلے بس یا ٹرام کا اسٹاپ تھی۔ اس سڑک پہ مجھے ٹرام کی پٹری دکھائی نہ دی تو چنانچہ میں نے فرض کیا کہ اس روٹ پر اب ٹرام نہیں چلتی۔ مسافروں کے لیے تعمیر کیا جانے والا شیڈ خالی پڑا ہوا تھا۔ بس اسٹاپ تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔

"گاڑی اچھی ہے۔" میں نے اس کا انجن بند کرتے ہوئے کہا۔

"بے چارہ مالک نیکی کے چکر میں مارا گیا۔" نازو نے کہا۔

"نیکی کی بات مت کرو۔ ایک ساتھ تین خوب صورت لڑکیاں دیکھ کر کسی کے دل میں پاکیزہ خیالات پیدا نہیں ہوتے۔"

"اپنے جیسا سمجھتے ہو سب کو۔" رابعہ نے کہا۔ "زبان کے بہت خراب ہیں۔ اس کسٹم آفیسر کے سامنے واجد علی شاہ کے تڑپتے ہوئے خوب بول رہے تھے۔ زوجگان کے ساتھ [illegible] عیش و نشاط آ گئے تھے۔" اس نے میری نقل اُتارتے ہوئے کہا۔

میں نے ڈھٹائی سے کہا: "وہ کون سا اصلی کسٹم آفیسر تھا۔ ایک جھوٹ اس نے بولا تو ایک میں نے بول دیا۔ برابر کا [illegible] کیا بات ہے اس میں؟"

"اس کا بریف کیس رکھا ہوا ہے پیچھے۔" نازو نے کہا۔

میں اس وقت گلوز کمپارٹمنٹ میں ہاتھ ڈال چکا تھا۔ اس میں ایک اخبار تھا جسے سول بار تہہ کیا گیا تھا۔ گاڑی کی رجسٹریشن بک کے ساتھ ایک ڈرائیونگ لائسنس تھا۔ میں نے ڈرائیونگ لائسنس کی تصویر کو غور سے دیکھا اور پھر اس پر لکھے ہوئے نام کو۔

"یہ تو وہ شخص نہیں ہے۔" میں نے لائسنس پیچھے دکھا کے کہا۔ "یہ تو کوئی صوفی یا سادھو ہے۔ گاڑی بھی اسی کی ہے۔" پھر میں نے اخبار کی تہوں کو کھولا۔ اس پر آج کی تاریخ تھی اور یہ شام کا اخبار تھا۔ اس کے پہلے ہی صفحے پر میری نظر پڑی تو میں چونک پڑا۔ میرے سامنے اسی شخص کا چہرہ آ گیا تھا جس سے ہم نے کار چھینی تھی۔

میں نے کہا: "مس رابعہ تاری! اخبار تو پڑھ لیتی ہیں آپ۔ ماشاء اللہ سے انگریزی بھی فرفر بولتی ہیں۔ ذرا یہ خبر پڑھ کر بتائیے۔"

رابعہ نے کہا: "ماشاء اللہ سے یہ ہندی ہے یا گجراتی جسے آپ انگریزی سمجھ رہے ہیں۔"

مگر نازو اور گل نے اتنی دیر میں اخبار لے لیا تھا۔ تصویر دیکھتے ہی دونوں ایک ساتھ چلائیں: "یہ۔۔۔ یہ تو وہی ہے۔"

میں نے کہا: "دیکھا۔ یہ دونوں ہیں پڑھی لکھی لڑکیاں۔"

اب رابعہ نے بھی اخبار کو غور سے دیکھا۔ "مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔ آخر کیا ہے یہ خبر؟"

"کسی سے پوچھ لیتے ہیں۔" میں نے کار سے اتر کے کہا اور ایک راہ گیر کو روک لیا جو بڑی شان سے دھوتی باندھے سر پر دوپلی ٹوپی اوڑھے چھڑی گھماتے جا رہے تھے۔

"شوہان!" میں نے کہا۔ "کرپا سے یہ سماچار پڑھ کے بتلائیں کہ یہ شخص کون ہے؟"

اس نے جب غصے میں ہر گرم گم گم [illegible] شروع کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مراٹھی یا کسی بھاشا میں اس بے ہودہ مذاق پر خفا ہو رہا ہے۔ وہ کیسے یقین کر سکتا تھا کہ میں واقعی اخبار نہیں پڑھ سکتا۔ اگر میں اصرار کرتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی چھڑی سے میری پٹائی کرتا۔ رابعہ، نازو اور گل نے میرا خاصا مذاق اُڑایا۔

"اور ہندی بولو۔"

"معلوم نہیں کیا کہہ گیا اپنی زبان میں۔ سوچتا ہوگا کیسا بزدل ہے کہ چوں تک نہیں کی۔"

ایک لڑکا ہاکی تھامے ایک ہاتھ سے سائیکل چلاتا نمودار ہوا۔ وہ راستے کے ہر پتھر کو بال کی طرح شاٹ مارتا جا رہا تھا۔ میں نے اسے روک کے کہا: "نورِ چشم سلمہ ذرا توقف فرمائیے۔" وہ رک گیا۔ "آ اردو میں بتائیں کیا بات ہے؟"

میں نے کہا: "یہ شخص کون ہے؟" اور اخبار اس کے سامنے کر دیا۔

اس نے خبر پڑھی اور حیرت کے آثار اس کی صورت پر پھیل گئے۔ "کیا آپ جانتے ہیں اسے؟"

میں نے کہا: "میں نے آج دیکھا تھا اسے۔"

"کہاں دیکھا تھا؟" لڑکا جوش میں بولا۔

"جنوبی افریقہ میں جہاں میں شیر کے شکار کے لیے گیا تھا۔ اس کو ایک شیر نے میرے سامنے کھا لیا تھا۔ کیا یہ وہی شخص ہے؟"

لڑکے نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ تو ایک ڈاکو ہے۔ صبح کسی شخص سے دس لاکھ روپے لے کر بھاگ گیا۔ بھاگتے وقت اسی کی گاڑی بھی لے گیا اسے مار کر۔" لڑکے نے کہا۔

میں نے اپنی صورت سے اپنے جذبات ظاہر نہیں ہونے دیے اور لڑکے سے اخبار لے لیا۔ "اچھا خیر تم جاؤ۔"

"اچھا آپ اخبار نہیں پڑھ سکتے؟"

میں نے کہا: "گجراتی نہیں پڑھ سکتے بیٹا۔"

"مگر یہ تو ہندی ہے۔" وہ ہنسا اور بولا۔ "ہندی بھی نہیں سمجھتے؟"

میں نے آہ بھر کے کہا: "بس ایک دل کی زبان سمجھتے ہیں ہم۔"

مگر یہ بات اس لڑکے نے نہیں سنی۔ وہ جا چکا تھا۔ میں نے لڑکیوں کی طرف دیکھا تو ان کی حالت خوف سے غیر ہو رہی تھی۔

"سو سمجھ یہ ہوتا ہے مصیبت کا تعویذ۔" رابعہ نے کہا۔ "کب سے کہہ رہی ہوں میں کہ دفع کرو اس گاڑی کو۔"

نازو میٹھ سے بولی: "خدا نے ہی بچایا ورنہ سارے شہر کی پولیس کو تلاش ہو گی اس گاڑی کی۔"

گل نے کہا: "واقعی بال بال بچے۔ پکڑے جاتے تو ڈکیتی کا جرم ہمارے سر منڈھ دیا جاتا۔"

میں نے کہا: "چلو اب باہر نکلو سب۔ اندر بیٹھ کے ڈانٹ رہی ہو مجھے۔"

جب وہ تینوں باہر نکل کے گاڑی سے کچھ دور چلی گئیں تو میں نے رومال سے گاڑی کے اندر کی ہر جگہ کو صاف کیا۔ اس انکشاف نے مجھے بھی نروس کر دیا تھا کہ میں بڑے اطمینان سے ایک ڈاکو کی گاڑی چلا رہا تھا اور جسے ہم نے چھینا تھا وہ پہلے سے چھینی ہوئی کار تھی۔ مجھے اس شخص کی صورت اور اس کا باتیں کرنے کا انداز یاد آتا تھا تو میری حیرت میں اضافہ ہوتا تھا کہ کیا ڈاکو ایسے بھی ہوتے ہیں؟ اتنے پُرسکون بھی رہ سکتے ہیں کہ راہ چلتے کسی کی مدد کر دیں۔ اور وہ ڈاکو ہی نہیں قاتل بھی تھا۔

میں نے گاڑی بند کرنے سے پہلے بریف کیس کو دیکھا۔

www.paksociety.com

ٹرین۔ اب وہ معزز خواتین جو ایسے عالی شان ہوٹلوں میں قیام فرماتی ہیں، دن میں کتنی بار لباس بدلتی ہیں اور کس طرح رنگ بدلتی ہیں۔ میرا مطلب ہے نیل پالش اور لپ اسٹک وغیرہ کا رنگ۔ یہ آپ دو گوروں کو ضرور معلوم ہوگا۔"

"تم بھی تو دیکھتے ہی ہوگے۔ تم بتا دو۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے دونوں کانوں کو چھو کر کہا۔ "توبہ کرو جی۔ میں غیر عورت کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتا۔ بس ایسے ہی کبھی نظر خود اٹھ جائے تو الگ بات ہے۔ آخر بندہ خطا کا پتلا ہے۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے معزز خواتین اکثر لباس عموماً دو طرح کے زیب تن فرماتے جاتے ہیں۔ تن اور دھن کے اعتبار سے مشرقی یا مغربی۔ گویا مختصر ترین اور مکمل ترین۔ میری طرف سے آپ پر کوئی پابندی نہیں۔ آپ وہ لباس پسند کریں جو برتری یا ضرورت جیتی ہے تو ناظرین زیادہ پسند کریں گے۔"

"بس بہک گئے۔ اتر گئے پٹری سے۔" رابعہ نے کہا۔

"اچھا بابا۔ تشلی کا کک ہے اور ٹیڈے کے گھس جاؤ خدا کے لیے میں سے مجھے کیا۔" میں نے کہا۔

نازو ہنسی۔ "کیوں۔ تم بھی صوفیانہ لنگی اور گگڑی میں ساتھ ہو جانا۔"

میں نے کہا۔ "معاف کیجیے۔ میں کسی کے ساتھ نہیں رہوں گا، خواہ آپ لباس پہنیں یا نہ پہنیں۔"

"حد ہوتی ہے بے شرمی کی بھی سکندر۔" رابعہ نے کہا۔

"بھئی مجھے شرم آتی ہے اسی لیے تو کسی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ تم خواہ مخواہ ڈانٹ رہی ہو مجھے۔" میں نے کہا۔ "میں بالکل الگ کسی دوسرے ہوٹل میں جاؤں گا۔ اور آپ سب بھی الگ الگ ہوں گی اسی طرح۔"

"الگ الگ کمروں میں؟ ڈر لگے گا مجھے۔" گل نے کہا۔

"میں نے کب کہا ہے کہ الگ الگ کمروں میں۔ الگ الگ ہوٹلوں میں رہو گی تم سب۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

"مگر اس کا مقصد؟" گل نے کہا۔

"مقاصد دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ آج رات اگر پولیس یا تریویدی کے جاسوس ہماری تلاش میں ہوٹلوں کی خاک چھانیں تو انھیں کہیں سے بھی تین عورتوں کے ساتھ ایک مرد کے اکٹھے آنے کی اطلاع نہ ملے۔ وہ تم سے یہ توقع نہیں رکھیں گے کہ تم الگ الگ بالکل اکیلی کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں جا کے قیام کرنے کی ہمت کر سکتی ہو مگر تم کو یہی کرنا ہوگا۔ تلاش کرنے والے اسی نکتے کو بنیاد بنائیں گے کہ ہمیں اس قسم کے حلیے میں چار افراد ایک ساتھ پہنچے ہیں تو انھوں نے کہاں ڈبل کمرے لیے ہیں۔ ایک کمرے میں تین تو ٹھہر نہیں سکتے چنانچہ وہ فرض کر لیں گے کہ ہم دو ڈبل کمرے ضرور لیں گے۔ یہ ایک فائدہ ہے سب ایک ایک کرکے جاؤ۔ ڈرنے کی قطعی کوئی بات نہیں۔ یہ بمبئی ہے اور یہاں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھی جاتی اگر اکیلی عورت ہوٹل میں قیام کرے۔ سارا کھیل اعتماد کا ہے۔ ان ہوٹلوں میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ ہی نہیں سکتا۔ بفرض محال کچھ ہو۔ تو اللہ تمہارا نگہبان ہے اور پھر تمہارا حوصلہ ہے بے دریغ گولی مار دینا۔ موقع ملے تو گولی مارنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کر لینا۔"

"چلو وہ ہمارا مسئلہ ہے۔" نازو نے کہا۔ "ہم گولی سے ماریں یا ٹھنس چھری سے ذبح کر دیں۔ قتل کرنا آتا ہے ہمیں۔"

رابعہ اور گل کے لبوں پر بھی نازو کی بات سے مسکراہٹ پھیل گئی۔ "تم دوسرا فائدہ بتاؤ۔"

"دوسرا فائدہ؟... غالباً یہ تھا۔" میں نے سوچنے کی اداکاری کی۔ "کہ تم لوگوں کو اندازہ ہو جائے گا۔"

"کس بات کا؟"

"یہی کہ تم کتنے پانی میں ہو۔ واقعی جادو کر دیتی ہو اور ایسا ہی تباہ کن حسن ہے تمہارا۔ یا ہم احمق تھے جو تباہ ہو بیٹھے۔" میں نے کہا۔ "بے چارہ غالب اور میر۔ مر گئے بے موت مر گئے۔"

"سب ٹھرکی تھے باز۔ میر اور غالب عاشق۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "اکیلا ہوں اس لیے جو چاہو کہہ لو۔ مگر اب سُن لو دوسرا فائدہ کیا تھا۔"

"تیسرا فائدہ کہو اب تو۔"

"اچھا تیسرا فائدہ۔ ان ہوٹلوں میں تمہارا قیام مختصر ہی ہوگا مگر پھر بھی چانس ہے کہ تمہیں والا دو نظر آ جائے۔ کوشش کرو تو معلوم بھی کر سکتی ہو۔ ان ہوٹلوں کی خادمائیں اور ویٹر وہ سب کام کر دیتے ہیں جو بعض اوقات آدمی خود نہیں کر سکتا۔ ان کو زبردست انعام دو اور زبردست رازداری کے ساتھ معلوم کروا لو کہ شکاری کہاں گھات میں بیٹھے ہیں۔ تب تو تم ہی کیا سب کو دلا دو سے نواب خسرو جمشید کا نام اختیار کیا ہے لہٰذا یہی ٹھیک ہو جائے۔ اب بتاؤ یہ کوئی مشکل کام ہے؟"

"لیکن یہی پلان ہے؟"

"نہیں۔ یہ تو اس کا دیباچہ ہے۔" میں نے کہا۔ "آج رات میں اور نازو اس جزیرے پر جائیں گے۔ آدھی رات کے بعد۔"

"آدھی رات کے بعد۔ کیسے؟" رابعہ نے کہا۔

"اس کے بہت سے مروجہ طریقے ہیں۔ بذریعہ ڈونگی

ٹرین یا ہوائی جہاز سے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو خودکشی کرنے والی بات ہے۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "عجیب بے تکی ہے، دیکھا ہے بس خودکشی کی عادت سی ہو گئی ہے۔"

"ہر وقت اچھی نہیں لگتیں یہ باتیں۔" رابعہ نے چڑ کے کہا۔

"شام چھ بجے تو ابھی لگتی ہیں۔" میں نے گھڑی دیکھ کے کہا۔ "کیا خیال ہے چلیں؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس جزیرے پر جانے کی اب کیا ضرورت ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اس نے تو جھوٹ بولا تھا۔"

"بالکل۔" نازو نے کہا۔ "ایسے کسی جزیرے کا وجود ہوگا ہی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "کوئی بھی عقل مند آدمی جھوٹ بولتے وقت یہ خیال رکھتا ہے کہ وہ بے سر و پا نہ ہو۔ بے بنیاد نہ ہو۔ وہ جھوٹ کو سچ بنا کے پیش کرتا ہے اور اس کو قابل یقین بنانے کے لیے کوئی بنیاد ضرور رکھتا ہے۔ تریویدی سے ایسی حماقت کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کوئی بے تکی کہانی سنائے گا تو اس خوش فہمی کا شکار ہو جائے گا کہ ہم نے کہانی کو حقیقت مان لیا ہے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ جزیرے اور محل والی کہانی سو فی صد درست ہوگی۔ اصل مقصد ہی یہ تھا کہ ہم اعتبار کر لیں اور شک کریں تو اس کہانی کی تصدیق کے بعد ہمارا شک رفع ہو جائے اور تریویدی پر ہمارا یقین پختہ ہو جائے۔"

"اچھا مان لیا کہ ویران محل اور جزیرہ سب کچھ ہیں۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ محسن اور غالب وہیں ہوں گے؟"

"یہ واقعی ثابت نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں کچھ میں عقل سے تو کچھ وجدان سے رہنمائی حاصل کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ خود تریویدی نے بتا دیا تھا کہ اس جزیرے کو اسمگلر استعمال کرتے تھے۔ پھر وہاں چھاپے پڑنے لگے تو انھوں نے ٹھکانا بدل لیا۔ اب اگر وہاں کوئی نہیں جاتا تو جو بدری ولا وہ ایشٹ کمپنی کے لیے وہ آئیڈیل جگہ ہے۔ اسمگلروں کا مسئلہ یہ ہوگا کہ وہ سامان اُتارنے کے بعد بمبئی کے ساحل پر پہنچاتے ہوں گے اور اس مقصد کے لیے چھوٹی بڑی کشتیاں اور لانچیں آتی جاتی ہوں گی۔ اسی لیے وہ نگرانی کرنے والوں کی نظروں میں آ گئے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی کسٹم والوں سے لین دین کے معاملے پر ان بن ہو گئی ہو۔ اگر وہ کسٹم والوں کو بھی منافع میں شریک رکھتے تو وہ اپنی آنکھیں بند رکھتے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کاروبار بڑھا ہو تو اس سے پولیس اور اعلیٰ حکام کے سامنے شور مچایا ہو کہ میری ذاتی جاگیر کو اسمگلروں نے اپنا گودام بنا رکھا ہے۔"

"جزیرے کا مالک تو شاید مر گیا تھا۔ اس کہانی میں۔"

"اس کے وارث تو ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "وہاں وہ محل نہیں رہا اور پرانے جھگڑے نہیں رہے لیکن جزیرہ تو اپنی جگہ پر ہے۔ کروڑوں کی مالیت ہوگی اس کی۔ کل پھر کوئی اسے خرید کے ٹورسٹ ہوٹل کے نام سے عیاشی کا اڈہ کھولنا چاہے تو کھول سکتا ہے۔ خود تریویدی نے بتایا تھا کہ جہاں سے چٹان ٹوٹی ہے وہاں کنکریٹ کی دیوار کھڑی کی جا سکتی ہے۔ یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ایسا جزیرہ ان لوگوں کے لیے بہت کارآمد ہوگا جو اسمگلر نہیں ہیں۔ وہاں سے کوئی سامان بھی نہیں لاتے اور روز آتے جاتے بھی نہیں۔ شاید مہینے میں ایک یا دو بار کوئی چھوٹا موٹا بحری جہاز وہاں لنگر انداز ہو کے رات بھر میں اپنا اسباب اُتار دیتا ہوگا۔ اسباب سے میری مراد ہے اسلحہ۔ ایسا ہی ایک جہاز ہم نے غرق کر دیا ورنہ وہ بھی اسی جزیرے پر اَن لوڈ ہوتا۔"

"کسی بحری جہاز کو وہاں سامان اُتارنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بحری جہاز سیدھا مشرقی پاکستان جا سکتا ہے۔" نازو نے اعتراض کیا۔

"تم نے ایک عاقلانہ سوال کر دیا ہے غلطی سے۔" میں نے کہا۔ "بات یہ ہے عزیزہ! جس جہاز کو ہم نے غرق کیا وہ بمبئی ہی آ رہا تھا۔ وہ انڈین مرچنٹ نیوی کا شپ تھا: ایس ایس کرانتی تھری۔ اس قسم کے بحری جہاز راستے میں کسی پورٹ کو ٹچ کرتے ہیں تو مقصد ہوتا ہے تازہ پانی کا اسٹاک لینا یا فیول لینا۔ کسی چھوٹی موٹی خرابی کو دور کرانے کے لیے پورٹ کی ورکشاپ کی خدمات حاصل کرنا۔ کوئی بحری جہاز اگر آ گئے... راس کماری تک چکر لگا کے مشرقی پاکستان جائے تو اُسے کولمبو بھی ٹچ کرنا پڑے گا۔ اور اس کا راستہ بہت طویل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اسلحے کی اطلاع پاکستانی بحریہ کو مل جائے تو خلیج بنگال میں بھی بیڑہ غرق ہو سکتا ہے۔ زیادہ محفوظ طریقہ یہ ہے کہ اسلحہ بمبئی کے ساحل پر یا آگے کسی ویران ساحل پر اُتار دیا جائے۔ اگلی رات اسے ٹرکوں پر لوڈ کیا جائے اور یہ ٹرک خشکی کے راستے روانہ ہو جائیں۔ مشرقی اور مغربی بنگال کی سرحد کے بارے میں یقیناً تمھیں علم ہوگا کہ جغرافیائی اعتبار سے وہ ایک مشکل سرحد ہے۔ جہاں ہر جگہ سرحدی پابندیاں عائد کرنا اور خلاف ورزیاں روکنا عملاً ناممکن ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہزاروں لوگ اب بھی روزی معاش کے لیے کلکتہ جاتے ہیں اور روز واپس آ جاتے

www.paksociety.com

ہیں۔ علاوہ ان کے جو شوقیہ جاتے ہیں۔ اسی طرح ادھر کے لوگ پاسپورٹ ویزا اور کسی قسم کی روک ٹوک کے بغیر ڈھاکا پہنچ جاتے ہیں۔ سرحدی دیہات میں تو یہ صورت حال زیادہ خراب ہے۔ بعض جگہ تو پتا ہی نہیں چلتا کہ ہندوستان کہاں ختم ہوا اور پاکستان کہاں شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلحہ خشکی کے راستے جا رہا ہے۔ جہاں جتنی ضرورت ہوتی اتنا اسلحہ پہنچا دیا۔ ایک ٹرک کچے راستوں اور جنگلوں سے گزر کے دس جگہ اسلحہ تقسیم کر سکتا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ جزیرے کو استعمال کرنے کی اجازت حاصل کر لی گئی ہوگی۔ مالکوں کو اس کا کرایہ ادا کر دیا گیا ہوگا۔ مالکوں کو کیا کہ اس ویران جزیرے کا کرایہ کسی نے کیوں ادا کیا ہے۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے مقاصد سیاسی ہیں۔ انھیں سیاسی حمایت بھی حاصل ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسٹم والے اور نیوی والے جانتے بوجھتے ان کو نظر انداز کریں۔ انھیں تاکید ہو کہ دخل در معقولات نہ کیا جائے۔"

"تمھاری بات میں وزن ہے۔" رابعہ نے مسکرا کے کہا۔

میں نے آہ بھر کے کہا۔ "ایک شعر عرض ہے۔ یہ بھی وزن سے خارج نہیں۔"

"بالکل نہیں۔ یہ شعر کہاں سے آ گیا بیچ میں۔" نازو نے احتجاج کیا۔ "بات جزیرے کی ہو رہی تھی۔"

"کیا جزیرے میں شعر نہیں ہو سکتا؟ اتنا ڈرتی ہو تم تو میں رابعہ کو لے جاتا ہوں ساتھ۔" میں نے کہا۔ "رابعہ کسی شعر سے نہیں ڈرتی۔"

"بجا ارشاد۔ مگر میں آپ کی شاعری سے ڈرتی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔ "یہ تو غالب کو ہر شعر پہ داد دے سکتی ہے۔ بھلا۔ میں نہیں دے سکتی۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "اچھا بھئی۔ جیسی تمھاری مرضی۔ نازو کو تو جانا ہی تھا جیسے بھی۔ میں جاتا یا نہ جاتا۔"

"چلو اب اٹھو۔ ایک گھنٹا گزار لیا یہاں۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے بل ادا کیا اور ہم باہر آ گئے۔ جس دکان کا میں نے ذکر کیا تھا وہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اسٹیڈیم ہاؤس میں کے "ستمز" ایک جدید ترین ملبوسات کا اسٹور تھا۔ مہذب اور خوش اطوار... سیلز گرلز نے ذرا سی دیر میں تاڑ لیا کہ گاہک بڑے ہیں اور انھوں نے بڑی پیشہ ورانہ مہارت سے ملبوسات کے ڈھیر لگانے شروع کیے۔ سر اور میڈم کہتے کہتے ان کے گلے خشک ہونے لگے مگر تو میں اکیلا تھا اور مجھے اپنے لیے تین سوٹ چند ٹائیاں اور شرٹس اور جوتے خریدنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ خواتین نے فطرت کے تقاضوں کے مطابق ایک چیز خریدی تو دس مسترد کر دیں اور اس کے بعد پیک کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو ہم ڈیڑھ گھنٹے بعد باہر سے نکلے۔ ہمارا اسباب ہماری خواہش کے مطابق الگ الگ سوٹ کیسوں میں پیک کر دیا گیا تھا۔ خواتین نے ڈریسنگ روم میں جا کے لباس بھی بدل لیے تھے اور واجبی سا میک اپ بھی کر لیا تھا۔ چنانچہ ہم عجیب حلیے میں اندر گئے تھے مگر جب آئے تو ہماری شان ہی نرالی تھی۔ سوٹ کیس اٹھا کے لانے والے کا خیال تھا کہ اتنے بڑے لوگ کسی بہت بڑی گاڑی میں آئے ہوں گے جس کا مؤدب شوفر باہر اٹینشن کھڑا ہوگا۔

اگر ہم ٹیکسی میں جاتے تو سوٹ کیس اٹھانے والا یہ مایوس ہوتا اور ہماری شان بھی گھٹتی۔ اس صورت حال سے میں یوں نمٹا کہ دور کھڑی ہوئی ایک شاندار کار کے شوفر کو ہاتھ کے اشارے سے اور چٹکی بجا کے آواز دی اور سوٹ کیس لانے والے کو پچاس کا نوٹ ٹپ دے کر رخصت کر دیا۔ ظاہر ہے میرے بلانے سے وہ شوفر حاضر نہیں ہو سکتا تھا جسے میں نے اشارہ کیا تھا۔ سوٹ کیس لانے والا اسلام جھاڑ کے چلا گیا تو میں نے ایک ٹیکسی روکی۔

"تم دونوں جاؤ اس میں۔" میں نے گل اور رابعہ کو حکم دیا۔

"ہم... اکیلے...؟" گل نے کہا مگر پھر میری صورت دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ میں نے سوٹ کیس ڈکی میں رکھے۔

"تم جس ہوٹل میں چاہو ٹھہرو۔" میں نے کہا۔ "نام کچھ لکھوا دینا بس پرانا تھا وہ رہنے دو۔ اور مجھے بتا دینا۔"

"تمھیں کیسے بتا دیں؟" رابعہ نے کہا۔

"میں یہیں جیب پہ۔ ایمبیسیڈر ہوٹل میں جا رہا ہوں۔ میں نازو کے بھتیجے کے نام سے کمرا لوں گا۔ ایسا آدمی نام تمھیں یاد رہے گا۔"

"بس تو پھر میں بھی موہنی کے نام سے کمرا لوں گی۔ تمھیں یاد رہے گا۔" رابعہ نے کہا اور ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

میں نازو کے ساتھ وہیں کھڑا سوچتا رہ گیا کہ کیا یہ رابعہ کی غیر ارادی حرکت تھی اور اس وقت موہنی کا نام لینے میں کا وہ جذبہ کارفرما تھا جو ہر عورت کے دل میں خلش پیدا کرتا ہے۔ موہنی سر چڑھی تھی۔ کیا رابعہ اب بھی محسوس کرتی تھی کہ نازو کے ساتھ میری جذباتی وابستگی کا عرصہ زیادہ طویل تھا اور اس کی جڑیں میرے بچپن تک پہنچتی تھیں۔ عمر کے اس دور تک جہاں رابعہ کی کسی یاد کا گزر نہ تھا۔

نازو نے دوسری ٹیکسی روک کے کہا۔ "اب کہاں جانا ہے۔ خلا میں کب تک گھورتے رہو گے۔ رابعہ تو گئی۔"

"کون گئی؟" میں نے کہا اور باقی دو سوٹ کیس ڈکی میں رکھے۔

"جس کے نام نے تمھیں افسردہ کر دیا۔" نازو نے کہا۔

میں نے بے رخی سے کہا۔ "تمھارا ابھی دماغ خراب ہو رہا ہے۔ میں کیوں افسردہ ہونے لگا موہنی کے نام سے۔"

"میں نے کب موہنی کا نام لیا ہے؟" نازو نے بگڑ کے کہا۔

"پھر تم نے کیا کہا تھا؟" میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے رابعہ کا نام لیا تھا۔ تم نے موہنی کا نام کیوں سنا؟ اس کا مطلب ہے...."

"خاک مطلب ہے۔ کوئی مطلب وطلب نہیں اس کا..."

"صاحب میرے کو بولو کدھر چلنے کا ہے۔" ڈرائیور نے ہماری لڑائی سے اکتا کے کہا۔

"ایمبیسیڈر ہوٹل۔" میں نے کہا۔ "تم اپنا ہوٹل چلی جاؤ۔" میں نے نازو کو مخاطب کیا۔

"میں ایمبیسیڈر ہوٹل جا رہی ہوں۔ تم چلے جاؤ اپنا ہوٹل۔" نازو نے منہ پھلا کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"بے کار خواہ مخواہ کی ضد ہے۔ میں رابعہ اور گل سے کہہ چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ فون کریں گی مجھے ایمبیسیڈر میں۔"

"پھر میں کیا کروں؟" نازو نے کہا۔ "تم کو کس نے منع کیا ہے ایمبیسیڈر میں ٹھہرنے سے؟"

"لیکن ہم نے طے کیا تھا کہ ایک ہی جگہ نہیں ہوں گے۔"

"ہو گئے تو کون سی قیامت آ جائے گی۔ یہ کون سا آسمانی فیصلہ تھا۔" نازو نے کہا۔ "الگ الگ فلور ہو سکتے ہیں ہمارے اور اگر آج ہی رات کو ہمیں اکٹھے جانا بھی ہے تو پھر یہ کوئی عقلمندی نہیں کہ میں میلوں دور جا کے رہوں۔ آنکھ تو نہ لگ سکے گی۔"

"اچھا بابا۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "تم جاؤ ایمبیسیڈر میں۔ میں چلا جاتا ہوں کہیں اور۔"

لیکن یہ بات صرف ٹیکسی ڈرائیور کو سنانے کے لیے تھی۔ نازو کی بات نے مجھے قائل کر لیا تھا کہ تین چار گھنٹوں کے لیے نازو کا اور میرا الگ ہونا صرف باعث زحمت ہوگا۔ اس وقت میں نازو کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے گی۔ میرا وقت بھی آنے جانے میں ہی صرف ہو جائے گا۔

میں نے نازو کے کان میں کہا۔ "میں آتا ہوں دس پندرہ منٹ کے بعد۔"

اور ڈرائیور سے چلا کے کہا۔ "ڈرائیور گاڑی روکو۔"

ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ میں نے اپنا سوٹ کیس نکال لیا اور نازو سے کہا۔ "میں جا رہا ہوں اپنے ہوٹل۔"

"مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔" نازو نے چیخ کے کہا۔ "میری طرف سے تم بھاڑ میں جاؤ۔"

ڈرائیور نے یقیناً یہی سمجھا ہوگا کہ میاں بیوی یا محبت کرنے والوں میں لڑائی ہو گئی ہے۔ جذباتی لڑائیاں ایسی ہی فضول باتوں پر مگر اتنی ہی دھواں دھار ہوتی ہیں۔ جب ٹیکسی چلی گئی تو میں نے کچھ وقت گزارنے کے لیے تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کیا۔ ایک جگہ سے امپورٹڈ سگریٹوں کا کارٹن خریدا اور ایک لائٹر۔ سگریٹ جلا کے میں چند قدم ہی چلا تھا کہ ایک خبیث صورت شخص میرے پیچھے لگ گیا۔

"صاحب تھوڑا۔ ڈانس۔ بیوٹی فل گرل۔"

میں نے غرا کے کہا۔ "دفع ہو جاؤ۔"

لیکن وہ باز آنے والا نہیں تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلتا رہا اور بولتا رہا۔ "سی سائیڈ۔ فل ہوٹل سرو۔ اسکاچ وہسکی۔ اینگلو انڈین۔ ویری بیوٹی فل لیڈی سر۔"

تنگ آ کے میں نے اسے گالی دی اور مارنے کو دوڑا تو اس نے میری جان چھوڑی۔ میں بہترین سوٹ میں تھا۔ میرا بریف کیس بھی بہت قیمتی تھا اور میرے دوسرے ہاتھ میں غیر ملکی سگریٹ تھے لیکن میں پیدل تھا چنانچہ اس نے مجھے ٹورسٹ فرض کر لیا تھا اور اپنی سیلز مین شپ کے مظاہرے پر کمربستہ تھا۔ ہر بڑے شہر کی طرح جہاں انتہائی غربت کے ساتھ انتہائی دولت مندی بھی نظر آتی ہو اور جہاں آبادی کی کثرت نے معاش کے شریفانہ راستے مسدود کر دیے ہوں، غیر ملکی سیاحوں کی پذیرائی کے لیے آوارگی کے سب لوازمات میسر ہوں، وہاں نائٹ لائف کی تفریح میں کاروبار حسن خود جھک اٹھتا ہے۔ بمبئی ابھی سنگاپور یا ہانگ کانگ اور بنکاک سے بہت پیچھے تھا مگر کراچی سے بہرحال آگے تھا۔

اس معمولی سے واقعے نے مجھے تھوڑا سا جذباتی اور متزلزل کر دیا تھا مگر ایمبیسیڈر ہوٹل پہنچتے پہنچتے میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک ڈالا۔ میں کسی بزنس ایگزیکٹو کی طرح کاؤنٹر پر پہنچا اور رجسٹر پر ایک نظر ڈالتے ہی میں نے نازو کے کمرے کا نمبر دیکھ لیا۔ وہ سیکنڈ فلور کے بارہ نمبر کمرے میں تھی۔ روم نمبر دو سو بارہ۔ وہ رجسٹر کا آخری اندراج تھا چنانچہ میں نے کسی دشواری کے بغیر نام بھی پڑھ لیا۔ نازو نے بھی اپنا نام موہنی دیوی لکھوایا تھا۔

www.paksociety.com

کلرک نے مجھ سے میرا نام پوچھا تو میں نے کہا۔

"ایس آئی شیخ۔"

کلرک نے پوچھا۔ "کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

میں نے رجسٹر کو دیکھ کر کہا۔ "دہلی سے۔ مگر میں اپنا پتا سیکریٹ رکھوں گا۔"

کلرک کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

میں نے کہا۔ "بات یہ ہے ینگ مین کہ میری بیوی مجھ سے ناراض ہو کے آئی ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ یہاں ٹھہری ہے۔ یقیناً اس نے بھی اپنا نام پتا غلط لکھوایا ہوگا، میں نہیں چاہتا کہ اسے میری یہاں موجودگی کا علم ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئی ہوگی وہ۔ اکیلی۔"

کلرک مسکرانے لگا۔ "سوری ڈیوی۔۔۔ اور کوئی اکیلی خاتون آج کوئی نہیں آئیں۔"

میں ہنسا۔ "مجھے معلوم تھا۔ خیر تم مجھے کسی دوسرے فلور پر جگہ دو۔ آئی وانٹ ٹو سرپرائز ہر۔ لیکن آج رات نہیں، صبح۔"

کلرک نے سر ہلایا اور میرے نام کے سامنے دہلی کا پتا لکھ لیا جو نادر نے لکھوایا تھا پھر اس نے مجھے تیسرے فلور کا بارہ نمبر کمرا دے دیا۔

"بالکل اوپر والا کمرا سر۔ وش یو گڈ لک۔" وہ مجھے چابی دے کر مسکرایا۔ میں نے چابی، بیل بوائے کو دی جو میرے ہاتھ سے بریف کیس لینے کے لیے مستعد کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کمرے تک میری راہنمائی کی۔ وہ پندرہ سولہ سال کا لڑکا تھا۔ ٹپ کے دس روپے لے کر پلیوٹ جھاڑنے کے بعد اس نے متوقع نظروں سے مجھے دیکھا۔ "کر اور کوئی خدمت؟" اب خدمت کے ہزار مفہوم نکلتے ہیں اور کوئی کچھ بھی مانگ سکتا ہے یہاں استطاعت کی نہیں طبع خریدار کی بات تھی۔

میں نے کہا۔ "تم اسمارٹ لڑکے ہو کتنا عرصہ ہوا ہے یہاں؟"

"تین سال سر۔" اس نے پُرامید ہو کے کہا۔

"پھر تو تمھیں بہت تجربہ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ کلیدی رستے کا آدمی کون ہے؟"

"میں سب کچھ کر سکتا ہوں سر۔ آپ بتائیے کیا چاہیے؟"

میں نے کہا۔ "ہوٹل کے اندر تم یقیناً سب کچھ لا سکتے ہو۔ مگر یہ کام باہر کا ہے۔"

"باہر کا مال اندر لا سکتا ہوں میں سر۔" اس نے معنی خیز انداز میں مسکرا کے کہا۔

"یہ مال کی بات نہیں ہے۔ کام ایسا ہے جس کے لیے کسی کو باہر جانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "اور تم ڈیوٹی پر ہو۔"

"پھر میں اپنے چاچا کو بھیج دیتا ہوں سر۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ "وہ باہر کا ہر کام کر سکتا ہے۔ اور باہر ہی موجود ہے۔"

"باہر کہاں؟"

"کار پارکنگ میں۔" لڑکے نے کہا۔

"کسی کو کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے پچاس کا ایک نوٹ دکھا کے کہا۔

"بالکل فکر مت کریں آپ سر۔"

"انعام میں بڑا دیتا ہوں۔ تھینکس۔" میں نے دوسرے ہاتھ سے اپنا ریوالور نکال کے واپس جیب میں رکھ لیا۔ "کام خراب ہو جائے تو خانہ خراب کر دیتا ہوں۔ کیا سمجھے؟"

"سب سمجھ گیا سر۔" لڑکے نے کہا۔ ریوالور دیکھ کے وہ ڈرا نہیں تھا۔ اس کا واسطہ ہر قسم کے لوگوں سے پڑتا ہوگا جو اس کے دل میں کوئی بے ایمانی نہیں تھی اور بڑے انعام کا لالچ الگ تھا اس لیے وہ مطمئن رہا۔

"کیا نام ہے تمھارے چاچا کا؟ یہ کوئی رشتے کا چاچا ہے یا تم نے بنا لیا ہے چاچا؟" میں نے کہا۔

"اصلی۔ سگا والا چاچا ہے سر۔"

"کیا نام ہے اس کا؟" میں نے پچاس کا نوٹ اسے دے دیا۔

"تھینک یو سر۔ اس کا نام ہے اینڈی۔ اینڈریو۔"

جب اینڈریو نے دستک دے کر اپنا نام بتایا تو میں اطمینان سے صوفے پر پاؤں پھیلائے سگریٹ پی رہا تھا اور کافی میرے سامنے رکھا ہوا تھا۔ اینڈی کو اس کے بھتیجے نے یقیناً بتا دیا ہوگا کہ اسے کس قماش کے سیٹھ نے طلب کیا ہے۔ وہ تیس سال کا جوان آدمی تھا۔ اس نے براؤن شرٹ اور پینٹ کے ساتھ براؤن جوتے پہن رکھے تھے اور غالباً شوقیہ اپنے بال بھی براؤن کرا لیے تھے۔

میں نے کہا۔ "اینڈی نہیں۔ تمھارا نام مسٹر براؤن ہونا چاہیے۔"

وہ مسکرایا۔ "لوگ یہی کال می براؤن سر۔"

میں نے کہا۔ "مسٹر براؤن! ایک کام ہے جو خطرناک تو نہیں ہے لیکن بہت رازداری کا ہے۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"آپ مجھ پر بھروسا کر سکتے ہیں سر۔"

"اس کام کے پانچ ہزار بھی مل سکتے ہیں اگر یہ کام میری مرضی کے مطابق ہو جائے۔" میں نے کسی بہت بڑے بدمعاش کی طرح دھواں چھت کی طرف چھوڑتے ہوئے کہا اور براؤن کی

طرف دیکھا تک نہیں۔

براؤن خاموش کھڑا رہا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ہیلو، کس سے بات کرنی ہے؟" میں نے ریسیور اٹھا کے کہا۔

"تم سے۔" رابعہ کی آواز آئی۔ "میں ہوٹل اجنبا میں ہوں۔"

"ارے بابا گولی مارو لالچ کو۔" میں نے کہا۔ "میں آدھی رات سے پہلے نہیں آ سکتا۔" اور فون پٹخ دیا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔" میں نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کے کہا۔ "کیا تم بہادر آدمی ہو؟"

"آپ مجھے آزما سکتے ہیں۔" وہ بولا۔ رابعہ تو یقیناً سمجھ گئی ہوگی میری اس فضول بات کا مطلب کچھ نہیں۔ کسی وجہ سے میں فون پر بات کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن مودب کھڑے ہوئے مسٹر براؤن پر میری رعونت کا خاطر خواہ اثر ہوا۔

"مسٹر براؤن آج رات اور دیکھنے کے لیے ایک لانچ چاہیے کوئی چھوٹی سی لانچ جس پر دو لائف جیکٹ ہوں۔"

اس نے کچھ دیر میری بات پر غور کیا اور پھر بولا۔ "لانچ کو آپ کہاں لے جائیں گے سر؟"

میں نے ہنس کر کہا۔ "لانچ مجھے لے جائے گی بیوقوف اور سمندر میں مجھے ایک جگہ چھوڑ کے واپس لوٹ جائے گی۔"

"کہاں چھوڑ کے سر؟"

اس سے میں نے جزیرے اور محل کے بارے میں سوالات کیے تو ثابت ہو گیا کہ تریوینی کی کہانی غلط نہیں تھی۔ شاید بمبئی میں بہت سے لوگ یہ کہانی جانتے تھے، تھوڑے بہت فرق کے ساتھ سب ان پُراسرار واقعات پر روشنی ڈال سکتے تھے۔

"لانچ مجھے اس جزیرے سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر چھوڑ کے واپس چلی جائے گی۔" میں نے کہا۔ "اس کے میں دس ہزار دوں گا۔"

"او مائی گاڈ سر۔" مسٹر براؤن کا چہرہ دمکنے لگا۔

"اس کے بعد۔" میں نے کہا۔ "صبح جو لانچ سورج نکلنے کے بعد مجھے وہاں لینے پہنچے گی اسے دگنی رقم بھی مل سکتی ہے۔ اسے انتظار کرنا ہوگا۔"

"کتنی دیر تک سر؟"

"میرا خیال ہے کہ سورج نکلنے سے ایک گھنٹا پہلے اور پھر ایک گھنٹا بعد تک۔ دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ ہم وہیں مل جائیں گے۔"

"آپ کے ساتھ اور کوئی بھی ہوگا؟"

میں نے اسے آنکھ ماری اور مسکرایا۔ "بس ایک عورت۔"

مسٹر براؤن نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اب تک وہ سمجھ رہا تھا کہ معاملہ اسمگلنگ کا ہے مگر یہ تو بس اتنی سی بات تھی کہ کوئی سر پھرا کسی عورت کے ساتھ اس ویران جزیرے پر ایک رات گزارنا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس کی بیوی تھی کہ وہ اتنے رازداری اور ایسے احتیاطی انتظامات کر رہا تھا۔ ورنہ ہوٹل میں بھی کیا پتا چلتا ہے، کون آیا کون گیا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ میں سمجھ گیا کہ اس بار گل کا فون ہوگا۔

ریسیور اٹھا کے میں نے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

گل نے میری آواز شناخت کر لی۔ "بہت غصے میں معلوم ہوتے ہیں آپ۔"

"معلوم ہوتے ہیں کیا مطلب۔ اچھا۔" میں نے کہا۔ "تم کہاں ہو؟"

اس نے کہا۔ "مجھے رابعہ باجی نے ریویرا میں ٹھہرنے کو کہا۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔"

"کیوں؟ ڈرنے کی کیا بات تھی؟"

"بس ایسے ہی۔ پہلے کبھی ایسے ہوٹل میں اکیلی نہیں رہی نا۔۔۔ میں نے نوریہ لکھوایا ہے اپنا نام۔"

"کیا؟" میں نے کہا۔

"مجھ سے رابعہ باجی نے کہا تھا۔" گل میرے لہجے سے ڈر گئی۔

"تم کو معلوم ہے یہ کس کا نام تھا؟"

"نہیں۔ کوئی غلطی ہو گئی مجھ سے؟"

"تم سے غلطی نہیں ہوئی۔ اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے کچھ شاید۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "خیر۔ ٹھیک کر دوں گا میں۔ تم اب دوبارہ فون مت کرنا۔"

اینڈریو عرف اینڈی یعنی مسٹر براؤن نے خاموشی سے اس گفتگو میں یقینی طور پر صرف میرے ڈائلاگ سنے تھے۔ اس سے یہ اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ میں کسی مرد سے مخاطب ہوں یا کسی عورت سے۔ تاہم میرے تحکمانہ بلکہ کسی حد تک جھنجھلائے لہجے نے اسے یقیناً متاثر کیا ہوگا کہ میں بھی کوئی دادا قسم کی چیز ہوں جس سے شاید لوگ رابطہ قائم کر رہے ہیں۔

"ہاں تو مسٹر براؤن۔" میں نے بریف کیس کھول کے کہا۔ "پھر گویا بات پکی ہو گئی۔"

مسٹر براؤن نے نوٹوں کی گڈیوں کو دہشت زدہ نظروں سے دیکھا کیوں کہ اس دولت پر سانپ تو نہیں ایک دیوِ اژدہا بیٹھا تھا جو سانپ سے زیادہ بے رحم اور بیدار تھا۔ میں نے پانچ ہزار روپے نکالے اور اسے تھما دیے۔

www.paksociety.com

"یہ تمہارا ایڈوانس ہے۔"
"یس... یس سر... تھینک یو سر۔" اس نے ڈرتے ڈرتے نوٹ جیب میں ٹھونس لیے۔ "ہم غریب آدمی ہے سر، ایسا کوئی بات ہے... تو بول دو۔ ہمارا فیملی ہے۔"
میں نے مسکرا کے کہا۔ "تمہارے لیے کوئی رسک نہیں ہے مسٹر جان۔"
"آپ کس وقت جائیں گے سر؟"
"ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر۔" میں نے بریف کیس بند کر دیا مگر ریوالور کو جیب میں ڈال لیا۔
"پھر میں چلتا ہوں سر۔"
"ایک منٹ اور مسٹر براؤن۔" میں نے کہا۔ "میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی۔ تم جانتے ہو ایسے معاملات میں رازداری کتنی اہم ہوتی ہے!"
"میں آپ کو یقین دلا چکا ہوں سر کہ میری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔"
میں نے سر ہلایا۔ "تم پر اعتبار ہے مجھے۔ اب مسئلہ ہے ہمارا۔ میرا اور اس عورت کا۔ ہم باہر کیسے جائیں کہ کسی کو معلوم نہ ہو؟"
وہ بھونچکا رہ گیا۔ میں نے اس کی صورت پر تذبذب کے آثار دیکھے۔ اس پُراسرار معاملے کا دوسرا پہلو اب سامنے آیا تھا۔ وہ بات پکی کر چکا تھا اور پانچ ہزار جیب میں بھی ڈال چکا تھا۔ اب پیچھے ہٹنا مشکل تھا اور جیب میں آ جانے والی رقم کو واپس کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل۔
"کیا وہ... اسی ہوٹل میں ہے؟"
میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس سے زیادہ میں تم کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اس ہوٹل سے باہر جانے کے کتنے راستے ہیں؟"
"راستے؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔
"ہاں۔ ہم سب کے سامنے سے گزر کر نہیں جا سکتے۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میرے ساتھ کون ہے۔"
"میں سمجھ گیا سر لیکن یہ کام میں اکیلا نہیں کر سکتا... میرا مطلب ہے کہ... کسی کو شریک کرنا پڑے گا۔"
"مثلاً کس کو؟" میں نے کہا۔
"کاؤنٹر کلرک۔ جہاں آپ باہر جاتے وقت چابیاں چھوڑ جاتے ہیں۔"
"او نو۔" میں نے کہا۔ "اچھا تم یہ تو معلوم کر سکتے ہو کہ اس فلور پر اور اس کے نیچے والے فلور پر کون کون سے کمرے خالی ہیں؟"
وہ میرے سوال پر چکرا گیا۔ "یہ کوئی مشکل کام نہیں..."
"اچھا۔ کسی کمرے کی چابی نہ ہو تو اسے کیسے کھولا جا سکتا ہے؟"
"میں سمجھا نہیں سر! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"
میں نے کہا۔ "یہی فرض کرو ہم اسی ہوٹل کے کسی کمرے میں ملنا چاہیں اور یہ بھی چاہتے ہوں کہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ ایسی صورت میں ہمارا باہر جانا شاید ضروری نہ ہو۔ تمہارا معاوضہ بہرحال مل جائے گا۔"
وہ کچھ مطمئن نظر آنے لگا۔ "یہ ہو سکتا ہے سر مگر اس کے لیے ڈپلی کیٹ کی ضرورت پڑے گی۔"
"وہ تو معلوم ہو جائے گا کہ ڈپلی کیٹ غائب ہے۔" میں نے کہا۔
وہ مسکرایا۔ "نہیں سر، وہ ڈپلی کیٹ اسپیشل ہے۔ کچھ خاص مہمانوں کے لیے، جو بکنگ کرائے بغیر کمرے لیتے ہیں۔ ان کے رجسٹر میں کچھ نہیں لکھا جاتا... اور نہ ہوٹل والوں کو پتا ہے۔"
"پھر کیسے ملتا ہے؟"
"جس کے پاس بھی ڈپلی کیٹ ہو۔" وہ بولا۔ "زیادہ سے زیادہ بس چار یا پانچ ایسی چابیاں ہیں۔ جو چوری چھپے بنوائی گئی تھیں۔ پانچ سو ایک رات کے مل جاتے ہیں۔ سب کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔"
"اچھا انتظام ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو معلوم ہے کہ کوئی چابی آج رات کس سے مل سکتی ہے؟"
"آپ کے خادم کے پاس ایک چابی ہے سر۔"
"کس کمرے کی؟"
"روم فور ٹو زیرو۔ چار سو بیس۔ کوئی بھی یہ نمبر لینا پسند نہیں کرتا۔ جب تک مجبوری نہ ہو۔"
میں نے مسکرا کے کہا۔ "ظاہر ہے۔ چار سو بیس کا کام ہی ایسا ہے کہ چار سو بیس کرنے والوں کے کام آ سکتا ہے لیکن مسٹر براؤن! آج رات کوئی مجبوری تو در پیش نہیں ہے؟"
"نہیں سر۔ ابھی سیزن نہیں ہے۔ ہر فلور پر کمرے دستیاب ہیں۔" وہ بولا۔ "اس کے علاوہ میں نے ایسا بندوبست کیا ہے کہ مجبوری میں بھی وہ کمرا شاید کوئی نہ لے۔ اس کی لائٹس خراب ہو جاتی ہیں۔"
"خراب ہو جاتی ہیں یا ہیں؟"
"ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی استعمال کرے۔ فیوز اڑ جاتا ہے۔

خود ہی اور عموماً رات کے وقت خرابی کا پتا چلانا مشکل ہوتا ہے۔ الیکٹریشن دن میں آتا ہے تو کوئی خرابی نہیں ہوتی۔ یہ وہم خیال کیا جاتا ہے۔"
"یہ کیا چکر ہے؟ تم اندھیرا فراہم کرتے ہو، خواہ کوئی اندھیرے میں نہ رہنا چاہے؟"
"ایمرجنسی لائٹ ہے کمرے میں۔ وہ ضرورت کے مطابق روشنی ہوتی ہے۔ پانچ سو میں اسپرنگ بیڈ، فریج وغیرہ تو نہیں دے سکتے سر... مگر رازداری اور پرائیویسی ملتی ہے۔"
"یہ فیوز صرف رات کو کیسے اڑتا ہے آخر؟"
"بس سر، ہاتھ کی صفائی ہے۔" وہ بولا۔ "ایک وال لائٹ کے ٹیبل لیمپ کے بلب پر پچیس پیسے کا سکہ رکھ کے بلب فٹ کر دیتا ہوں۔ آپ دس بار فیوز لگائیں، وہ اڑ جائے گا۔ صبح بلب ہٹا کے سکہ الگ کر لیتا ہوں۔"
"بہت چالاک آدمی ہو تم۔ خیر۔ یہ بتاؤ اس کمرے کی چابی کے پانچ سو الگ ہوں گے؟"
اب وہ سمجھ گیا تھا کہ مجھ سے پیسہ لوٹا جا سکتا ہے۔ اس نے عاجزی سے کہا۔ "آپ کی فیاضی ہو گی اگر مل جائیں۔"
میں نے اسے مزید ایک ہزار بخش دیے۔ "چلو تم خوش رہو۔ اب یہ بتاؤ کہ چابی کہاں ہے؟"
اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چابی نکالی۔ "سر! جاتے جاتے کوئی مصیبت پیدا نہ ہو۔ ہم غریب لوگ ہیں۔"
میں نے دل ہی دل میں اسے اور اس جیسے بدمعاشوں کو گالی دی جو غریب کا نام مفت میں بدنام کرتے ہیں اور مسکرا کے کہا۔ "تم بالکل بے فکر رہو۔"
"یہ چابی صبح آپ سے لوں گا۔ اسی کمرے میں آ کے۔"
میں نے کہا۔ "صبح ذرا دیر سے آنا۔ نو بجے کے بعد، یہ نہ ہو کہ فجر کے وقت آ جاؤ۔"
وہ چونکا۔ "آپ مسلمان ہیں سر؟"
میرے منہ سے بے اختیار وہ الفاظ نکل جاتے تھے جو خود میری چغلی کھاتے تھے لیکن میں اپنی فطرت کو کیسے بدل سکتا تھا۔ عادات جب پختہ ہو جائیں تو فطرت میں شامل ہو جاتی ہیں۔ ایک مسلمان کو ماحول اور معاشرے نے گفتگو کا جو انداز سکھا دیا تھا وہ بدل کیسے سکتا تھا۔
میں نے کہا۔ "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"
وہ گڑبڑا گیا۔ "سوری سر۔" اور کمرے سے نکل گیا۔
کمرا نمبر چار سو بیس کی چابی کے ہاتھ میں آتے ہی میرا پروگرام بدل گیا تھا۔ اب میں مسٹر براؤن کی مدد کا محتاج نہیں رہا تھا بلکہ مسٹر براؤن کے کندھے پر رکھ کے اپنی بندوق چلا سکتا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو دس بج رہے تھے۔
ریسیور اٹھا کر میں نے آپریٹر سے نازو کے کمرے کا نمبر مانگا۔ چند سیکنڈ بعد نازو نے کہا۔ "ہیلو۔"
میں نے کہا۔ "کیا میں تمہارے اعزاز میں عشائیہ دوں؟"
نازو نے کہا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے۔"
"صاف کہو نا کہ بھوک ہڑتال ہے۔"
"بھوک ہڑتال کریں میرے دشمن۔ میں کھانا کھا چکی ہوں۔"
میں نے کہا۔ "کیا؟ ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ بھوک نہیں ہے۔"
"ظاہر ہے کھانا کھانے کے دس منٹ بعد میں تمہاری ڈنر کی دعوت کیسے قبول کر سکتی ہوں۔ جو میں نے کہا سچ تھا۔"
میں نے کہا۔ "اچھا تو اب یوں کرو، اوپر کمرا نمبر چار سو بیس میں آ جاؤ۔"
"میں یہ لطیفہ سمجھی نہیں۔"
"میں لطیفے سناتا بھی نہیں خصوصاً انھیں جو ہنسنا نہ جانتے ہوں۔" میں نے کہا۔ "فورتھ فلور پر وائٹی کمرا نمبر چار سو بیس ہے۔ میں تم کو وہیں ملوں گا۔ آدھے گھنٹے بعد۔ تم آ کے مجھ سے چابی لے لو۔"
نازو پانچ منٹ بعد آئی تو میں نے اسے مختصراً اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے روم سروس کو ڈنر کے لیے آرڈر دیا۔ دس منٹ میں ایک ویٹر کھانے کی ٹرے سجائے ہوئے آ گیا۔ اس نے ایک ایک ڈش کھانے کی میز پر سجانی شروع کی۔
میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔ "تمہارا کیا نام ہے... مجھے یاد نہیں رہا۔"
اس نے پلٹ کے کہا۔ "ساون سر۔"
"ہاں ساون۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "گزشتہ بار جب میں یہاں آیا تھا تو تم نے ایک کام کیا تھا میرا۔ اس کا انعام باقی رہ گیا تھا۔ مجھے اچانک جانا پڑا تھا اور تم اس وقت ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ یہ لو۔"
میں نے اسے پانچ سو روپے دیے تو اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "تھینک یو سر۔" اس نے بمشکل تمام کہا۔ اسے ہرگز یاد نہیں آ سکتا کہ وہ کیا کام تھا مگر سب ویٹر سب کے کام آتے ہیں اور ہر قسم کا کام کرتے ہیں۔

www.paksociety.com

میں نے کہا: "دراصل تم سمجھ رہے ہو... دشمن۔ دشمن بھی کہا جاسکتا ہے انھیں۔ میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آ گئے تھے اور جیسے ہی مجھے یہ معلوم ہوا میں انھیں بتائے بغیر خاموشی سے چلا گیا لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ اس بار بھی میں تمھارا انعام دیے بغیر بھاگ جاؤں گا۔"

"تو کیا... وہ پھر آ گئے ہیں سر؟"

میں نے کہا: "میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے ان سے بچنے کے لیے کمرا نمبر چار سو بیس بک کرایا تھا۔ جو عموماً کوئی نہیں لیتا، لیکن ان کو معلوم ہو گیا۔ مجھے شک ہے کہ میرا ہی کوئی آدمی انھیں بتا دیتا ہے۔ خیر، میں نے یہاں آ کے دوسرا کمرا لے لیا۔ اب میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کہیں وہ کمرا نمبر چار سو انیس یا چار سو اکیس میں تو نہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں ان کا سامنا نہیں چاہتا۔ وہ ہوں گے تو میں ابھی چلا جاؤں گا۔ یہ معلوم کر کے خاموشی سے مجھے بتا دو۔" میں نے اسے مزید پانچ سو بخشیش دے کے کہا۔

"جی... یس سر... کیا نام ہے ان کا؟" وہ خوشی سے پاگل ہونے لگا۔ "میں ابھی معلوم کرتا ہوں سر۔"

میں نے کہا: "تم یہ بتاؤ کہ ان کمروں میں کون لوگ ہیں۔ اگر وہ فرضی ناموں سے ٹھہرے ہوں گے تو مجھے معلوم ہو... جائے گا۔"

وہ گیا اور دس منٹ میں واپس آ گیا۔ اس نے کہا۔ "روم نمبر چار سو انیس میں ایک بنگالی فلم ڈائریکٹر ہے اور اس کی سیکرٹری۔ روم نمبر چار سو اکیس میں کلکتہ کی ایک ہیروئن۔"

میں نے کہا: "شکریہ" اور ایک ہزار اسے دے کے مسکرایا۔

"پورا فلم یونٹ تھا۔ باقی سب چلے گئے۔" ویٹر نے اضافی اطلاع فراہم کی۔ اتنے کم وقت میں ایسے معمولی سے کام کے لیے ایک ہزار کسی نے نہ دیے ہوں گے۔

وہ برتن اٹھا کے جانے لگا تو میں نے کہا: "تمھاری کب تک ڈیوٹی ہوگی؟"

اس نے کہا: "صبح کے آٹھ بجے تک۔ کوئی کام ہے سر؟"

"نہیں، جو تمھاری جگہ آئے اسے بتا دینا کہ دس بجے سے پہلے مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔ کوئی فون، کوئی وزیٹر، پیغام کچھ نہیں۔"

"میں بتا دوں گا سر۔ گڈ نائٹ۔" وہ بولا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

میں نے دروازے کے ہینڈل پر باہر کی طرف "ڈو ناٹ ڈسٹرب" کا پلے کارڈ لٹکا دیا اور کمرے کو مقفل کر دیا۔ میرے ہاتھ میں بریف کیس تھا جس میں رقم، ایک ٹائٹ فٹ ٹی شرٹ اور پتلون تھی۔ یوں کہیے کہ یہ امر میرے ذہن میں اس وقت تھا جب میں خواتین کے ساتھ کپڑے خرید رہا تھا کہ یہ لباس میں نے ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے [illegible] ایسا ہی ٹائٹ لباس میں نے نازو کو بتائے بغیر اس کے لیے بھی خریدا تھا۔ اگر میں اسے بتاتا تو شاید وہ وہاں راضی نہ ہوتی۔ وہ دبلی پتلی اور چھوٹی سی لڑکی تھی جیسا کہ اس کے لیے ایک چودہ سال کے لڑکے کا سائز بتانا پڑا تھا [illegible]۔ مجھے اب بھی اندیشہ تھا کہ وہ اس واہیات لباس پر سخت اعتراض اور احتجاج کرے گی مگر یہاں اس سے بات منوانا آسان تھا۔

کمرا نمبر چار سو بیس میں تقریباً اندھیرا تھا۔ ایک پیلی پڑتی ہوئی ایمرجنسی لائٹ اس کمرے کو روشن کرنے کے لیے قطعی ناکافی تھی۔

نازو نے بگڑ کے کہا: "یہ کیا مصیبت ہے۔"

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا: "آہستہ۔ یہ انتظام کیا ہے میں نے۔ ہر ایک کو نہیں ملتا یہ کمرا۔ معلوم ہے یہاں کون لوگ آتے ہیں؟"

"کون آتا ہے؟"

"وہ جو اندھیرے سے پیار کرتے ہیں اور صرف [illegible] کرتے ہیں۔ ہم تو خیر بدقسمت ہیں شروع سے۔" میں نے [illegible]

"ہم کیا جانیں پیار کو۔"

"یہ فضول باتیں کرنے کے لیے لایا تھا یہاں؟"

"نہیں بھائی۔ فضول باتیں تم نے اب شروع کر دیں۔ اس کمرے کے ساتھ اس طرف کمرا نمبر چار سو اکیس ہے۔ وہاں [illegible] طرف کمرا نمبر چار سو انیس۔"

"واہ۔ کیا زبردست نتائج اخذ کیے ہیں۔"

میں نے کہا: "ادھر ایک فلم ڈائریکٹر ہے۔ [illegible] یونٹ اور اپنی سیکرٹری کے ساتھ شوٹنگ کے لیے آیا تھا۔ یونٹ چلا گیا مگر سیکرٹری یا رفیقہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ ابھی تک موجود ہے۔ ایک حیرت انگیز نتیجہ یہ بھی اخذ کیا ہے آپ کے اس خاکسار نے کہ فلم کی ہیروئن اس فلم ڈائریکٹر کو بالکل گھاس نہیں ڈالتی۔"

"یہ تم نے کیسے جان لیا؟" نازو مسکرائی۔

"بھئی سامنے کی بات ہے۔ ہیروئن کہاں [illegible] ڈائریکٹر کی سیکرٹری بھی یونٹ کے ساتھ رخصت ہو جاتی۔" میں نے کہا: "ہیروئن یہ الگ کمرے کا خرچ تو نہ [illegible]

[illegible] ہے۔"

"[illegible] ہے سیکرٹری زیادہ خوب صورت ہو۔" نازو ہنسی۔ "بتا سکتی ہیں۔ ایسا ہوتا تو سیکرٹری ہی فلم کی ہیروئن بھی ہوتی۔"

"بیچاری ہیروئن اکیلی ہے۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"اوہ۔ بڑا دکھ ہے اس کی تنہائی کا۔ پوچھ لو جا کے حال، میں نہیں بتاؤں گی رابعہ کو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم جاؤ اور پھر دکھاؤ اپنے ہاتھ کی صفائی۔ اس کے بعد مجھے درمیان کی دیوار بجا کے طلب کر لینا، آ کے اسے پیک کر دوں گا۔"

نازو نے کہا: "مگر اس کا مقصد؟"

میں نے کہا: "ہر بات کا مطلب سمجھانے کے لیے وقت نہیں ہے۔ تم جاؤ۔" میں نے اسے باہر دھکیل کے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے ساتھ والے دروازے پر ہلکی سی دستک سنی اور کمرا نمبر چار سو بیس میں سگریٹ جلا کے شمار کیا۔ پانچ منٹ بعد نازو نے دیوار پر ہلکے مارنے شروع کیے تو میں نے سگریٹ فرش پر مسل کر دوڑا۔

بنگالی ہیروئن بیڈ پر سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی زلف بنگالی اور حسن بنگالی کا سحر نازو نے ختم کر دیا تھا مگر پھر بھی دل و نگاہ کو دیوانہ کرنے کے اسباب موجود تھے اور یہ بے حجابی میں نشہ شراب سے زیادہ نشہ شباب کا اثر تھا۔

"بری بات۔" نازو نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

میں نے جھینپ کر نظر ہٹالی۔ "میں دراصل دیکھ رہا تھا۔ مطلب یہ کہ خاتون نشے میں تھیں۔ اسی لیے لباس میں نہیں تھیں۔"

نازو ہنسنے لگی۔ "آنا تم کو چاہیے تھا، خراب ان کا کرنا کیا ہے؟"

میں نے کہا: "اسے تو میں پیک کرتا ہوں۔ تم ذرا روم سروس سے کسی میڈ کو طلب کرو اور اس کے کپڑے پہن لو۔"

نازو حیران ضرور ہوئی مگر اس نے میری بات سمجھ لی۔ جب وہ فون پر بات کر رہی تھی تو اس کی آواز کچھ بدلی ہوئی اور شراب کے نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے بڑی عجلت میں بنگالی ہیروئن کو چادر میں لپیٹا اور باتھ روم میں اٹھا کے لے گیا۔ وہاں میں نے اس کے ہاتھ پیر باندھے، اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا۔ اس کے لیے میں نے چادر ہی کو پھاڑا۔

اس لمحے میں میرے کان باہر کی آواز پر لگے رہے۔ میں نے دروازے پر دستک سنی۔ دروازہ کھلا اور کھٹ سے بند ہو گیا۔ غالباً روم سروس سے نازو نے شراب منگوائی تھی کیوں کہ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ میں نے بوتل کے ٹوٹنے کی آواز سنی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

میں نے دروازہ بجا کے کہا: "میں اندر آ سکتا ہوں؟"

نازو نے گھبرا کے جواب دیا: "ابھی نہیں۔ ویسے تم اندر ہی ہو۔ اور کیسے بھی نہیں ہو۔ باہر آ کے کیا کرو گے؟"

"تمھاری مدد؟" میں نے کہا: "آ جاؤں؟"

"مجھے مدد کی ضرورت ہوگی تو میں آپ کو نہیں بلاؤں گی۔" وہ ہنسی۔

جب میں نے باہر آ کے دیکھا تو قالین پر شراب کی ایک بوتل ٹوٹی پڑی تھی اور دیوار سے لگ کے ٹوٹی تھی۔ دوسری بھی شراب کی بوتل سے کم تر تھی۔ وہ بھی دیوار سے لگ کے پڑی ہوئی تھی۔ اسے میں نے ہاتھ لگانے سے گریز کیا اور نازو کو دیکھا۔ وہ روم میڈ کی پوری یونیفارم میں خاصی اسمارٹ لگ رہی تھی۔ میری درخواست پر اس نے روم میڈ کو بنگالی ہیروئن کے کپڑے پہنائے اور اسے باندھ کر بستر پر یوں سلا دیا کہ کوئی آتا تو اسے شک کی کوئی بات نظر نہ آتی۔

"یہ سب تو ہو گیا۔" میں نے ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کے کہا: "لیکن یہ خواتین اس وقت تک سکون سے سوتی رہیں گی جب تک ہم اس علاقے سے نکل نہیں جاتے؟"

"ہاں دو گھنٹے سمجھ لو۔ زیادہ وقت چاہیے تو ان کو صبح تک کے لیے بھی سلایا جا سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے کہا۔

"خواب آور گولیاں ان خاتون کے پاس ہیں جن کے ساتھ آپ باتھ روم میں تھے۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا: "شراب کے ساتھ خواب آور گولیاں مہلک بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔"

نازو نے کہا: "مگر وہ عادی معلوم ہوتی ہے۔"

میں نے کہا: "اچھا تو پھر ڈال دو ان دونوں کے حلق میں دو دو گولیاں۔ حل ہو کے حلق سے اتر جائیں گی۔ اور جب اس کار خیر سے فارغ ہو جاؤ تو تمھارے لائق ایک اور... خدمت ہے۔"

"جی۔ فرمائیے۔" نازو نے کار خیر سے فارغ ہو کے کہا۔

میں نے کہا: "اب روم سروس سے کسی ویٹر کو بلاؤ۔ بنگالی فلم ڈائریکٹر کی سیکرٹری بن کے۔"

"مجھے کیا معلوم وہ کیسے بولتی ہے۔"

"ابھی تم نے مدہوش اداکارہ کے ڈائیلاگ ایسے بولے تھے۔ اگر تم انگریزی میں بات کرو تو بات بن جانے

www.paksociety.com

گی۔ روم سروس والوں کو یہ شک نہیں ہوگا کہ یہ لوڈر ہی نقشہ ساز ہے۔"

نازو نے کہا۔ "رسک تمہارا۔" پھر روم سروس والوں سے مخاطب ہو گئی۔ "کافی پلیز۔ روم نمبر فور ٹو ون... صرف ایک کافی۔ ایک جائے... ارجنٹ۔"

میں نے دروازہ کھولا اور روم نمبر چار سو بیس میں چلا گیا۔ پانچ منٹ بعد ویٹر کافی کی ٹرے لیے گزرا تو میں دروازے کی جھری سے آنکھ لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ کس نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے اسے اندر گھسیٹ لیا۔ اس کے ہاتھ کی ٹرے کمرے میں اس وقت گری جب میں دروازے کو لات مار کے بند کر چکا تھا۔ ویٹر کو میری صورت دیکھنے کی یا آواز نکالنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ میں نے آڑی ہتھیلی سے اس کے کان کے پیچھے وار کیا اور وہ بے سُدھ ہو کے میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔

میں واپس اس کمرے میں گیا جہاں نازو خاصی پریشانی کے عالم میں ٹہل رہی تھی۔ "یہ کیسا شور تھا؟"

میں نے کہا۔ "ٹرے گر گئی تھی۔"

نازو نے کہا۔ "ساتھ والوں نے ضرور سنا ہوگا۔ آواز مجھ تک بھی آئی تھی۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ اگر انہیں ہوش ہوا اور سننے کی فرصت ہوئی۔ اب آجاؤ میرے ساتھ۔ پہلے دیکھو باہر کوئی ہے تو نہیں۔"

"اس فلور پر تو ویرانی سی ہے۔" نازو نے گردن باہر نکال کے جھانکا۔ "شاید پورا فلور بلیو ٹرسٹ نے لیا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ وہ لوگ اکٹھے رہنا چاہتے ہوں گے اور عوام سے دور بھی۔"

میں نے بنگالی پیرونٹ کے دروازے کے باہر بھی وہی کارڈ لٹکا دیا جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا کہ مداخلت نہ کیجیے۔ خواب آور گولیاں میری ہتھیلی پر تھیں۔ پھر میں نے کمرا نمبر چار سو بیس کے ویٹر کو کھلا دیں اور اس کے کپڑے اتارنے لگا۔ نازو منہ پھیر کے کھڑی ہو گئی۔

ویٹر کے کپڑے پہن لینے کے بعد میں نے گھڑی دیکھی تو گیارہ بج کے دس منٹ ہوئے تھے۔

"اب تم کو پہلے باہر جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"مین گیٹ سے؟"

میں نے کہا۔ "اگر کچن کے راستے سے نکل سکو تو زیادہ اچھی بات ہے۔ یہ چادریں اور میلے کپڑے اٹھا کر کندھے پر ڈال لو۔"

"تم کیسے آؤ گے؟" وہ بولی۔

"بھیا میں دیر نہیں لگتا؟ ایسے آؤں گا۔" میں نے بریف کیس کو ٹرے میں رکھا۔ اس کے اوپر کپڑا ڈال کے ٹرے اٹھالی۔

"سکندر! کیا ضمانت ہے کہ ہم جیتے جی چھوٹ آئیں گے؟"

"یہ ضمانت کون دے سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "اچھا یہ ہے کہ ہم کبھی لوٹ کر نہ آئیں۔ لیکن یہاں ہم کون سا چھوڑ کے جا رہے ہیں۔ نام پتا سب غلط ہے۔ میں کپڑے نہیں۔ وہ کوئی بھی لے جائے۔ ہمیں ان کی فکر نہیں۔ نقد رقم میرے پاس ہے اور اپنی حفاظت کے لیے جتنا اسلحہ کام آ سکتا ہے وہ ہم دونوں کے پاس ہے۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ نازو کا رنگ اڑ گیا اور میرے ہاتھوں سے ٹرے گرتے گرتے رہ گئی۔

"یہ... کون ہو سکتا ہے؟" نازو نے سرگوشی کی۔

"معلوم نہیں۔ اس کمرے کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں کہ یہاں کوئی ہے۔" میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

"اب کیا ہوگا؟" نازو نے گھبراہٹ میں کہا۔

اس سوال کا میں اسے کیا جواب دیتا۔ وہ ایک روم میڈ کی وردی پہنے کھڑی ہوئی تھی۔ میں ویٹر بنا تھا لیکن میرے ہاتھ میں جو ٹرے تھی اس میں نوٹوں کی گڈیاں اور رقم تھی اور ہم دونوں اس کمرے میں اپنی موجودگی کا جواز نہیں پیش کر سکتے تھے۔

"کہیں یہ روم سروس والے نہ ہوں۔ ابھی تک روم میڈ واپس نہیں پہنچی۔ پھر ایک ویٹر۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ دوسری بار دروازے پر واضح دستک ہوئی۔ پھر کسی نے کہا۔ "آپ کو غلط فہمی ہے جناب!"

"ہم خود سنا۔ ادھر برتن گرتا۔" یہ کسی بنگالی کی آواز تھی۔

"نہیں سر۔ آپ یقین کریں یہ کمرا خالی ہے۔" اس آواز کو میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی کاؤنٹر کلرک تھا جس نے کمرا دیا تھا۔ میں نے اس سے بڑی اداکاری کے ساتھ بڑا جھوٹ بولا تھا۔

"پتا نہیں شالا کیا گڑبڑ گھوٹالا ہے؟" بنگالی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ لوگوں کو کھول کے دکھا دیتا ہوں۔" کلرک نے کہا اور لہو میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔

بنگالی نہ جانے کیا بڑبڑا رہا تھا اور اگر اسے فوراً واپس طلب نہ کر لیا جاتا تو وہ اپنا شک رفع کیے بغیر نہ جاتا۔ واپسی کا حکم دینے والی غالباً وہی لڑکی تھی جو بدقسمتی میں بنگالی فلم ڈائریکٹر کی سیکریٹری کا رول کر رہی تھی اور اسے اپنا باس بھی مانتی تھی۔ اس وقت رات تھی چنانچہ صورت حال برعکس تھی۔ بنگالی نے فوراً مراجعت اختیار کی۔ میں نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔

پھر بنگالی غصے سے بولا۔ "سالا نشے میں گول تھا۔"

کسی اور نے کہا۔ "بہت ڈرتا ہے بیوی سے۔"

"بیوی!" بنگالی بولا۔ "بے وقوف۔ کتنا عرصہ ہو گیا تم کو اس ہوٹل میں کام کرتے؟"

"جی۔ آٹھ سال۔"

"آٹھ سال جھک ماری تم نے۔ ہم کو آدمی کے دیکھے سے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کیا ہے۔ شوہر، عاشق، باس یا صرف خریدار۔ چلو سب پیچھے۔ خوامخواہ آدھی رات کو میلہ لگایا۔ سب بالکل ہی گول ہو عقل سے۔"

میں یہ سب آوازیں سن رہا تھا اور بالکل ساکت کھڑا ہوا تھا۔ غالباً میں سانس تک لینا بھول گیا تھا۔ بلا سر سے ٹل گئی تو میں نے ایک گہری سانس لی اور نازو کی طرف دیکھ کے مسکرایا۔ اس کی صورت پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اگر دروازہ کھولنے کی نوبت آ جاتی تو ہم دونوں کے لیے ایک ساتھ میدان کارزار میں کود پڑنے کے سوا چارہ نہ رہتا۔ ہمارے پاس اسلحہ بھی تھا اور ہم خالی ہاتھوں سے اسلحے کا کام لینا بھی جانتے تھے مگر مار دھاڑ کی صورت میں ہمارے لیے فرار کے راستے بالکل مسدود ہو جاتے۔ ہنگامہ شروع ہوتے ہی پیچھے اور ٹرنک خبر پھیل جاتی۔ ہر فلور پر بدحواسی اور تجسس میں مبتلا ہونے والے جمع ہو جاتے۔ اول تو خود انتظامیہ بہت موثر طور پر حرکت لیتی۔ ان کے پاس اس قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی سیکیورٹی فورس ہوتی ہے جس میں مسلح ریٹائرڈ گارڈز رکھے جاتے ہیں۔ انتظامیہ پولیس کو بھی اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع فراہم کر سکتی تھی۔ غریبوں کی ایک پوری بستی لٹ جائے یا اس میں قتل عام ہو جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو کوئی بڑی واردات نہیں مگر کسی فائیو اسٹار ہوٹل کی انتظامیہ طلب کرے تو انہیں سر کے بل جانا پڑتا ہے۔

کمرے میں لگے ہوئے کلاک نے ایک گھنٹہ بجایا تو میں اچھل پڑا۔ "کیا... ایک بج گیا؟" میں نے کہا۔

"ن... ن... نہیں۔" نازو نے کہا۔ "ساڑھے بارہ۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "خوف سے تمہاری زبان تک کانپ رہی ہے۔"

"تمہاری جرأت اور مردانگی کا کیا کہنا۔ تو قابل تعریف رہا۔" نازو نے طنز سے کہا۔ "اب دانت نکال رہے ہو۔ اس وقت تو جیسے نبض رکی ہوئی تھی۔"

"جب دونوں کی ایک سی حالت ہے تو پھر جھگڑا کیسا؟" میں نے دروازہ کھول کے باہر جھانکنا شروع کیا۔ کاریڈور سنسان پڑا ہوا تھا۔ بنگالی فلم ڈائریکٹر کے کمرے میں بھی خاموشی تھی۔ میں نے نازو کو انگلی سے اشارہ کیا اور وہ میرے پیچھے پیچھے باہر آ گئی۔

"ہم دونوں کا ساتھ ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"اچھا تم آگے چلو۔" نازو نے کہا۔ "مجھے تو راستہ معلوم نہیں ہے۔"

"راستہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر خیر۔ آخر میں مشن کا لیڈر ہوں۔ مجھے آگے چلنا ہی پڑے گا۔"

گراؤنڈ فلور تک خیریت رہی۔ اگر کسی نے مجھے دیکھا بھی تو اہمیت نہیں دی۔ میں ویٹرز کی فوج کا ایک عام رکن تھا جن کی وردی ایک تھی۔ لوگ ویٹرز کو انسان نہیں ایک نمبر سمجھتے ہیں اور ان کے چہرے نہ دیکھتے ہیں اور نہ یاد رکھتے ہیں۔ ہر فلور پر میں نے پلٹ کر دیکھا تو روم میڈ کے انداز میں نازو میرے نقش قدم دیکھتی آ رہی تھی۔ اس کے اور میرے درمیان آدھے فلور کی سیڑھیوں کا فرق برقرار تھا۔

گراؤنڈ فلور کا لاؤنج اس وقت خالی پڑا ہوا تھا۔ ٹیبر کا کمرا بند تھا۔ کاؤنٹر پر دو کلرک موجود تھے مگر وہ گھومنے والی کرسیوں پر ایک دوسرے کی طرف منہ کیے باتوں میں مصروف تھے۔ میں نے نازو کو سیدھا گزر جانے کا اشارہ کیا اور خود اس طرف چل پڑا جدھر سے ایک ویٹر ہاتھوں میں ٹرے لیے نکلا تھا۔ ٹرے میں جام و مینا کے لوازمات تھے اور اوپر ایک کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔

شفاف شیشے کے جھومتے ہوئے دروازے سے گزرتے ہی میں نے خود کو بار میں پایا۔ ایک بہت موٹا بارمین ماتھے پر سے پسینہ خشک کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی بھاری فریم اور موٹے شیشوں والی عینک اتار کے کاؤنٹر ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ اسی وقت ایک اور ویٹر مخالف سمت کے دروازے سے اندر آ گیا۔ اس نے اندر آتے ہی بارمین پر چلانا شروع کر دیا۔ "سالا یہ کیا دیا تم نے ہم کو؟ ہم وسکی مانگا اور تم دیا شیمپین۔ وہ تو ہم کو کھٹے

www.paksociety.com

کا واسطہ دوڑا۔"

"تم کسے کو نہیں دیکھا؟" بار مین نے عینک لگا کے جوابی حملہ کیا۔ "ایسا اندھا کا مالک کچھ بھی اٹھا کے لے جاتا تو جیرا روتا کاہے کو۔ تیرے کو آنکھ کس واسطے دیا بھگوان نے۔ ہم غلطی کرتا اگر کسی کو مانتا۔ تو مانتا! بول؟"

ان کے جھگڑے کا مجھے فائدہ ہوا۔ انھوں نے میری طرف دھیان ہی نہیں دیا اور میں سامنے والے دروازے سے سیدھا گزرا تو میں نے اچانک خود کو سوئمنگ پول پر پایا۔ مجھے آدھی رات کے وقت سوئمنگ کرنے والوں کی تعداد نے متحیر کیا لیکن جیسا کہ میرا اندازہ تھا، وہ سوئمنگ پول میں سوئمنگ کرنے نہیں آئے تھے۔

مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ اس سوئمنگ پول کے بعد کیا ہوگا۔ میں اگر کسی سے پتا پوچھتا تو خود اپنے اجنبی ہونے کا راز افشا کرتا۔ میں سوئمنگ پول سے دور لاؤنج کی بالکونی کے سامنے میں چلتا گیا۔ سوئمنگ پول کے قریب سبزے پر رنگین چھتریوں کے نیچے اور ڈریسنگ روم میں مجھے خاصے ہیجان انگیز جذباتی مناظر دیکھنے کو ملے۔ وہاں سب ایک دوسرے کی خلوت کا پورا احترام کرتے ہوئے کسی اور کو نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے تھے اور مطمئن تھے کہ کوئی ان کی پرائیویسی میں مخل نہیں ہو رہا ہے۔

سوئمنگ پول کے بعد ایک طرف مجھے ٹینس کورٹ نظر آئے۔ میں دوسری طرف مڑ گیا۔ ایک وسیع ہال کے چاروں طرف شاپنگ آرکیڈ تھا جہاں سے عام ضرورت کی تمام اشیا مل سکتی تھیں۔ یہاں لوگ ہر طرف سے آ جا رہے تھے۔ بڑے بڑے شفاف شیشوں کے پار مجھے سڑک پر ٹریفک دکھائی دی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ دکانوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے میں نے ایک دروازے پر "جینٹس" لکھا ہوا دیکھا اور اندر چلا گیا۔

جب میں باہر آیا تو میرے ہاتھ میں صرف میرا بریف کیس تھا۔ ٹرے کو میں نے ٹائلٹ میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ باہر آنے تک کسی نے بھی مجھ سے سوال نہیں کیا کہ تم یہ کس کا بریف کیس اٹھا کے کہاں جا رہے ہو۔ ویٹر کی یونیفارم میں یہ بات شک پیدا کر سکتی تھی کہ کہیں میں نے کسی مسافر کا سامان تو چوری نہیں کر لیا ہے۔

باہر والے دروازے پر ایک گورکھا پہرا دے رہا تھا۔

اس نے مجھے للکارا۔ "اے۔۔۔ کدھر جاتا پڑا ہے؟"

میں نے انگلی اٹھا کے کہا۔ "وہ صاحب۔۔۔ اس کا ہے یہ۔ بار میں چھوڑ گیا تھا۔"

گورکھے نے میری انگلی کی سمت میں دیکھنے کی کوشش کی مگر ادھر کاروں کا ایک ہجوم تھا جو قطار در قطار میں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ اندازہ نہ کر سکا کہ میں نے کس کار کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا یا پوچھتا، میں باہر نکل کے کاروں کے درمیان دوڑنے لگا تھا۔ ایک کار ابھی ابھی روانہ ہوئی تھی۔ میں اس کے پیچھے بھاگا۔ "صاحب! صاحب! آپ کا بریف کیس۔" میں چلا کے کہا۔ ظاہر ہے کسی صاحب نے میری آواز نہیں سنی۔ اس طرح کار کے پیچھے دوڑتا ہوا میں گیٹ سے بھی نکل گیا۔ گیٹ پر جو مسلح گورکھا استادہ تھا، اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور سارا ماجرا تسلیم کر لیا اور میری راہ میں حائل نہیں ہوا۔ جب کار گیٹ سے باہر نکل گئی تو میں رک گیا۔

اب میں عام لوگوں میں شامل ہو چکا تھا۔ میرا ہوٹل سے تعلق صرف یونیفارم کی حد تک رہ گیا تھا۔ میں نے ایک طرف سے سمت کا تعین کیا اور پھر اس گیٹ کی طرف چلنے لگا جہاں سے نازو باہر گئی تھی۔ ابھی تک مجھے صرف یہ فکر تھی کہ کسی طرح نازو کے بغیر میں ہوٹل سے نکل جاؤں۔ اب مجھے نازو کی فکر ہو گئی۔ خدا کرے اسے بھی کسی نے نہ روکا ہو۔ ایک ویٹر سے روم میڈ کی پوزیشن بہتر ہوتی ہے۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ کسی پرائیویٹ کام سے باہر جا رہی ہے۔

میں گیٹ سے کچھ دور ہی تھا کہ ایک ٹیکسی میرے پاس سے چھوتی ہوئی تیزی سے گزری۔ میں نے جست لگا کے اپنا بچاؤ کیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو گالی دی۔ "سالا اندھا ہے کیا؟"

جواب میں نازو نے سر نکال کے کہا۔ "دارو پی کے سڑک کا بیچ میں کاہے کو چلتا ہے؟" اور ٹیکسی روک لی۔

"ارے واہ۔۔۔ مان گئے تم کو استاد یا پارٹنر۔" میں نے دروازہ کھول کے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا مان گئے۔ استاد یا پارٹنر؟" وہ ہنسی اور ٹیکسی کو آگے بڑھا دیا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو اصل ٹیکسی ڈرائیور مجھے بے ہوش پڑا نظر آیا۔ "بڑی پھرتی دکھائی تم نے۔"

"تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟ میں تو پریشان ہو گئی انتظار کرتے کرتے۔" نازو نے کہا۔

"تم سیدھے راستے سے نکل ہو۔ مجھے بہت گھوم کے آنا پڑا۔" میں نے کہا۔ "کسی نے روکا تمہیں؟"

"روکا تھا گیٹ پر۔ معلوم نہیں کون تھا۔ کہنے لگا کہاں جا رہی ہیں آپ۔ میں نے کہا آپ کے باپ کے پاس۔ وہ منہ لے کر اندر چلا گیا۔ ایسے کہیں کھڑی رہتی تو شاید اور بھی کچھ پوچھتے۔ شاید کوئی یہ بھی کہہ دیتا کہ باپ کو تو لاؤ ساتھ چلو۔ میں نے ایک ٹیکسی والے سے بات کی۔ اس نے میرے لہجے سے سمجھا کہ میں سخت نشے میں ہوں۔ کہنے لگا کہاں جاؤ گی بلبل۔ میں نے کہا کیا تو بلبل ہے؟ اگر تو بلبل ہے تو بلبل تیرے ساتھ جائے گی۔ مگر یہ بتا دے کہ تو پانی کا بلبلہ ہے یا بلبل؟ کم کا بس وہ خوش ہو گیا۔ اس نے کہا کہ اچھا پیچھے بیٹھ جاؤ۔ میں اس کے ساتھ بیٹھی تھی تو اس کے اوپر گر رہی تھی۔ اس نے مجھے پیچھے بٹھانے کی بلکہ لٹانے کی کوشش کی۔ میں نے اسے ایک ہاتھ مار کے اپنی جگہ لٹا دیا۔"

"کسی نے تمہیں دیکھا تو نہیں؟"

"سب آنکھوں والے مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔" وہ بولی۔

"میرا مطلب تھا کسی نے تمہیں ڈکیتی اور اغوا کی یہ واردات کرتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟"

"اگر کوئی دیکھ رہا تھا تو میں نے اسے نہیں دیکھا۔" نازو نے کہا۔ "کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے نا؟"

"کم سے کم ایک درجن گاڑیاں ہمارے پیچھے چلی آ رہی ہیں۔ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ کون تعاقب کر رہا ہے۔"

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔" نازو نے کہا اور ٹیکسی کو ریس کے گھوڑے کی طرح بھگانا شروع کیا۔ رات کے وقت سڑکیں خالی تھیں۔ بہت جلد ہم ایک سنسان راستے پر جا نکلے۔ میری نظریں پیچھے لگی ہوئی تھیں۔ صرف دس منٹ میں مجھے معلوم ہو گیا کہ ہمارے تعاقب میں کوئی نہیں ہے۔ آدھی رات کی فضا میں سمندر کی نمی اور بو دن سے زیادہ محسوس ہوتی تھی۔

"ایسے سمت کا تعین کیے بغیر مت دوڑتی جاؤ۔" میں نے کہا۔

نازو بولی۔ "سمت کا تعین میں نے بہت پہلے کر لیا تھا۔ ہم سمندر کی طرف ہی جا رہے ہیں۔"

"تمہارا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"اچھا تم بتاؤ۔ قطب ستارے کی مدد سے دیکھو شمال کدھر ہے۔" نازو نے کہا۔

"پہلے تم بتاؤ کہ قطب ستارہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

نازو نے کہا۔ "ہوگا کہیں ادھر ہی۔ آسمان پر بادلوں کا غبار ہے۔ اس لیے صاف نظر نہیں آ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمہارا دماغ خراب ہے۔ کسی سے پوچھ لینا چاہیے۔"

"کیا ضرورت ہے۔" وہ بولی۔ "کیا تم سمندر کو سن نہیں سکتے؟" میں نے غور سے سننے کی کوشش کی مگر مجھے کچھ سنائی نہیں دیا۔ میں نے کان میں انگلی ڈال کے ہلائی اور کہا۔ "مجھے تو سمندر کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔"

"کمال ہے۔" نازو نے کہا۔ "مجھے بھی سنائی نہیں دیتی مگر کوئی بات نہیں۔ میری چھٹی حس کہتی ہے کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔"

"ایسی کی تیسی تمہاری۔۔"

"خبردار جو میری چھٹی حس کو کچھ کہا۔ میں نے کبھی کچھ کہا ہے تمہاری چھٹی حس کو؟"

اسی وقت گاڑی نے ایک دو جھٹکے لیے۔ اس کا انجن کھانس کے بند ہوا۔ پھر چلا اور رک گیا۔

"پیٹرول ختم ہو گیا۔" نازو نے معصومیت سے کہا۔

"یہ اطلاع نہیں دی تمہیں تمہاری چھٹی حس نے؟" میں نے کہا۔

"میری چھٹی حس کوئی فیول میٹر نہیں ہے۔" وہ خفا ہو کے بولی۔

"فیول میٹر تمہارے سامنے ڈیش بورڈ پر تھا۔" میں نے کہا۔

"اس کا کانٹا خراب ہے۔"

میں جھلا کے نیچے اترا۔ سڑک کے دونوں جانب پام کے درختوں کی قطاریں تھیں اور جدید وضع کی کوٹھیاں تھیں۔ یہ خوش حال طبقے کا رہائشی علاقہ تھا۔ خواص اپنے ایئر کنڈیشنڈ بیڈ روم میں سو رہے تھے۔ کوٹھیوں کی بیرونی لائٹس جل رہی تھیں اور بند دروازوں کے پیچھے زندگی کے آثار مفقود تھے۔ میں نے موت کے ایک بے کراں سناٹے کے مٹ گھر جیسی کھڑکی کھول کے ایک گورکھے نے مجھے گھورا۔ "کیا مانگتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "کچھ نہیں۔ بس یہ بتا دو کہ سمندر کدھر ہے؟"

وہ مجھے سخت مشکوک نظروں سے گھورتا رہا۔ "کیسا بات بولتا۔ سمندر ادھر ہی ہے۔ جدھر تھا۔ سمندر سالا کدھر جانے گا۔ ابھی تم بولو، تم کو یہ آسمان نظر آتا؟"

میں نے کہا۔ "مجھے آسمان پر نہیں جانا ہے فی الحال۔ سمندر کے کنارے پہنچنا ہے۔"

"بابا! کون سا سمندر؟ سمندر کا بہت نام ہے۔ جو پانی، جوہو، اپولو بندر، میرین ڈرائیو۔ صرف ڈوبنا ہے تو اسی سڑک پر سیدھا جاؤ۔" اس نے کھٹاک سے کھڑکی بند کر دی۔

میں نے اس حسن سلوک کا برا نہیں مانا کیونکہ راستہ اس نے بہرحال بتا دیا تھا۔ میں واپس سڑک پر پہنچا تو ٹیکسی کا انجن چل رہا تھا۔

"تم تو میکینک بھی ہو۔" میں نے کہا۔ "کیا خرابی ہو گئی تھی؟"

نازو نے کہا۔ "کوئی خرابی نہیں تھی۔ پیٹرول ختم ہو گیا تھا۔"

میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کے دروازہ بند کیا۔ "تھوڑی دیر میں تم نے تیل کہاں سے نکال لیا؟"

اس نے کہا۔ "ڈکی میں سے۔"

میں سمجھ گیا کہ ڈکی میں ٹیکسی ڈرائیور نے اس قسم کی صورت حال کے لیے فالتو پیٹرول کسی جیری کین میں ڈال کے رکھا ہوگا۔ وہ سب جن کی گاڑیوں کے فیول میٹر کام نہیں کرتے اگر احتیاط پسند ہوں

www.paksociety.com

تو یہی کرتے ہیں۔
"تمہاری چھٹی حس کے بارے میں وہ سب خیالات میں واپس لیتا ہوں جن کے اظہار پر تم نے پابندی لگا دی تھی۔ یہ سڑک واقعی سمندر کی طرف لے جاتی ہے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ وہ کون سا سمندر ہے۔ بحرالکاہل یا بحراوقیانوس۔"
"سمندر وہی ایک ہے۔ جیسے زمین ایک ہے۔ اس کو الگ الگ نام ہم نے دیا ہے۔" نازو نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔
"میں نے نہیں دیا۔" میں نے احتجاج کے انداز میں کہا۔
"میں انسانوں کی بات کر رہی تھی۔" نازو نے مسکرا کے کہا۔
رات کے پونے ایک بجے میں نے کسی ساحلی بستی کے آثار دیکھے اور نازو سے ٹیکسی وہیں روک دینے کے لیے کہا۔ دور سے مدھم روشن افق کے پس منظر میں بہ جھونپڑوں کے جھونپڑے نظر آتے تھے۔ میں نے نازو کے اتر جانے کے بعد ٹیکسی کا رخ موڑا اور اسے واپسی کے راستے پر ایک فرلانگ دور لے گیا۔ اس طرح میں نے تھوڑا سا کنفیوژن پیدا کیا۔ بعد میں کوئی ہمارا سراغ نکالنے کی کوشش کرتا تو اسے ٹائروں کے نشانات ایک خاص مقام سے واپس جاتے دکھائی دیتے۔ اس کے بعد کوئی سراغ نہ ملتا کہ ہم دائیں طرف گئے یا بائیں طرف۔ اور سیدھے گئے تو کیسے گئے۔ تاہم مجھے امید تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور عقلمند ہوگا تو ہوش میں آتے ہی خدا کا شکر بجا لائے گا کہ جان سمیت ہر چیز بچ گئی اور بھاگ جائے گا۔ بولے گا تو پولیس کے ہاتھوں بھی خوار ہوگا۔ سو پیانگ کھا چکا۔ سو جوتے بھی کھائے گا۔
ایک فرلانگ دوڑ کر میں نازو کے پاس پہنچا تو بری طرح ہانپ رہا تھا۔ نازو ہنسنے لگی۔
میں نے کہا: "ایک ... فرلانگ ... تو کیا ... ایک گز دوڑ کر دکھاؤ۔ میں اور محسن — تین میل دوڑتے تھے۔"
نازو نے آہ بھر کے کہا: "ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی۔"
مجھے بھی ہنسی آ گئی: "چلو اب وہ مت کرو۔ یہ لو کپڑے۔"
میں نے بریف کیس میں سے ایک بنڈل نکالا۔
"یہ کہاں سے آ گئے؟" نازو نے حیرانی سے ٹائٹ فٹ کالی پتلون اور ٹی شرٹ کو دیکھا۔
"جہاں سے یہ آئے۔" میں نے اپنے کپڑوں کی نمائش کی۔ "اب یہ لباس فاخرہ بدل لو۔ ویسے تو تم ہر لباس میں خوب ہو مگر یہ شب رنگ لباس بھی آزماؤ۔ جو رات کی ضرورت ہے۔"
نازو نے ادھر ادھر دیکھا: "اچھا۔ میں ادھر والے ڈریسنگ روم میں چلی جاتی ہوں۔ تم ادھر جاؤ۔"
میں نے کہا: "فکر مت کرو۔ میں خود بہت شرمیلا ہوں۔"

پانچ منٹ بعد میں نے اسے دیکھا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ ہی مختصر تھی مگر اس کے جسم کے سارے نقوش زیادہ نمایاں نظر آ گئے۔
"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ شرما کے ہنسی۔
میں نے کہا: "تم خود تو غائب ہو گئی، یہ صرف چہرہ ہنڈے کی طرح روشن ہے۔ تم آگے چلو تاکہ راستہ نظر آتا رہے۔"
مچھیروں کی بستی میں گئے جو کہ سب سے تھے۔ لہروں میں سمندر کے چنگھاڑنے کی آواز اب بہت واضح تھی۔ کا سماں ڈری ہوئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم آگے بڑھے۔ جھونپڑیوں کے درمیان ایک پتلی سی گلی تھی۔ یہ گلی ایسی ہی تھی جیسے لاہور کی مال روڈ جو چھوٹا زعفران تک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ کوئی ملے تو اس سے لانچ کرائے پر لینے کی بات کروں مگر بستی پر نیند کا راج تھا۔
وہ گلی اچانک ختم ہو گئی اور میں نے اپنے سامنے سمندر کو دیکھا۔ بستی قدرے بلندی پر واقع تھی۔ اس کے چٹانوں کا سلسلہ تھا جو تقریباً ایک فرلانگ تک پھیلا ہوا۔ سمندر کی لہریں ان چٹانوں سے ٹکرا کر منتشر ہو رہی تھیں۔ بائیں جانب بہت سی کشتیاں اور لانچیں بندھی ہوئی تھیں۔ اس طرف سمندر کا ساحل ہموار تھا اور چٹانوں کی دیوار موجوں کی یلغار روک لیتی تھی۔
ہم پوری گلی سے گزر آئے تھے اور آوارہ کتوں کے سوا کسی بھی ذی روح نے ہمارا استقبال نہیں کیا تھا۔ کتوں سے میں خود بھی خاصا ڈرتا تھا مگر نازو کے ساتھ میں اپنی بہادری کا بھرم رکھنے پر مجبور تھا۔ وہ کتے بھی کچھ بزدل تھے کہ ذرا پسپا ہو گئے۔
ابھی میں آگے جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک جھونپڑی کی اوٹ سے ایک سیاہ ہیولا سا نکلا اور میرے سامنے آ گیا۔ نازو تو ایک دم سہم کے میرے پیچھے ہو گئی۔ وہ شخص بھوت کی طرح نمودار ہوا تھا اور لگتا بھی بھوت ہی تھا۔ اس نے کمر سے نیچے صرف گھٹنوں تک پہنچنے والا ایک کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ ستر پوشی کے تقاضے پورے کیے تھے۔ اس کا رنگ توے کی طرح کالا تھا اور اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ وہ آدمی تھا اور اس کا بدن فولاد کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ میں نے اس کی بے قرار آنکھوں کا اندازہ پتلیوں سے کیا جو سفید پردے پر متحرک تھیں۔

"کون ہو تم؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔
اندھیرے میں اس کے سفید دانت جھلملائے۔ "آپ کا خادم۔"
"اگر یہ تمہارا نام ہے۔ تو بہت اچھا نام ہے۔" میں نے کہا: "خادم ہو تو ہمارے ایک کام ہے۔"
"آپ پولیس ہے سر؟" اس نے باری باری میرا اور نازو کا جائزہ لیتے ہوئے کہا: "لانچ چاہیے؟"
"تم تو بہت سمجھدار اور ہوشیار ہو خادم۔ دل کی بات ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی سمجھ لیتے ہو۔" میں نے کہا۔
"اپنا کام ہی خدمت کرنا ہے سر اور یہاں آنے والے اور کوئی چیز نہیں مانگتے۔" وہ بولا۔
"یہاں بہت لوگ آتے ہیں؟" میں نے متفکر ہو کے کہا۔
"وہی آتے ہیں سر جو خادم کو جانتے ہیں۔ آپ پہلی بار آئے ہیں نا اس لیے گھبرا رہے ہیں؟" وہ حیرت انگیز طور پر صاف اردو بول رہا تھا: "لیکن آپ خادم پر بھروسا کریں سر۔ کسی کو کبھی کچھ معلوم نہیں ہوگا۔"
"کیا معلوم نہیں ہوگا؟" میں نے کہا۔
"یہی ... کہ آپ آئے تھے اور آپ نے ایک رات کے لیے ہم سے لانچ لی تھی۔" وہ بولا: "ہم کسی سے کچھ نہیں پوچھتے سر۔ اس کا نام چھپانا ہمارے لیے بے کار ہے۔"
"تمہیں دام سے کام ہے؟" میں نے کہا: "یہ نا یہی بات؟"
"بالکل ٹھیک بولا آپ نے سر۔ ہم دام لیں گے اور کام کریں گے۔ جیسا دام ویسا کام — اور جیسا کام ویسا دام۔ اب آپ بولو۔"
میں نے کہا: "تمہاری لانچ کیسی ہے؟"
"ایک دم فرسٹ کلاس — لگژری۔"
میں نے کہا: "مجھے لگژری سے زیادہ دوسری چیزوں کی ضرورت ہے۔ شاید لوگ تمہاری لانچ پر ایک رات گزارنے کے لیے آتے ہوں گے اور صبح ہونے سے پہلے چھپ جاتے ہوں گے۔"
"لیکن سر۔ ہم لانچ کو سمندر میں لے جاتے ہیں۔ لانچ پر سب کچھ ہے۔ شراب بھی ولایتی ملے گی۔"
میں نے کہا: "لائف جیکٹ ہے؟"
وہ کچھ حیران ہو کے بولا: "ہے سر۔ ویسے لانچ ایک دم اچھی ہے۔ ایسا کوئی خطرے کا بات نہیں۔ بیڈ روم بھی اچھا ہے۔"

میں نے کہا: "رات بھر کا معاوضہ تم کیا لیتے ہو؟"
"ایک ہزار روپے سر۔" وہ بولا: "آپ کل دن کا واسطے بولو تو ہم آگے چلے جائیں۔ دو رات کا پندرہ سو۔"
میں نے کہا: "تم نے راک سائیڈ آئی لینڈ دیکھا ہے؟"
وہ چونکا: "رنگ محل والا؟"
میں نے کہا: "ہاں۔ ہمیں اس جزیرے پر جانا ہے۔"
"اس وقت ...؟"
"ہاں ابھی۔" میں نے کہا: "اس جزیرے پر ایک طرف چٹانوں کی دیوار ہے جو لہروں کے زور سے ٹوٹ گئی تھی۔"
اس نے اقرار میں سر ہلایا: "دیکھی ہے ہم نے۔"
میں نے کہا: "ہم اسی سمت سے جائیں گے۔"
"وہ — بہت خطرناک جگہ ہے سر۔ آپ دوسری طرف سے جاؤ۔"
میں نے کہا: "تم ہمیں اس جگہ سے دور پانی میں چھوڑ دینا لائف جیکٹ کے ساتھ۔ دو سو گز دور۔ آگے ہم تیر کر جائیں گے۔"
"اور پھر ہم کیا کریں گے؟"
"تم واپس آ جاؤ گے اور صبح سورج نکلنے سے پہلے پھر وہیں ہو گے۔ جہاں ہمیں چھوڑو گے۔"
وہ تذبذب کی کیفیت میں کھڑا کچھ سوچتا رہا۔
میں نے کہا: "جانتے ہو کہ تم کو پانچ ہزار ملیں گے۔ واپس لانے کے دس ہزار۔ اگر تم میں ہمت ہے یا پیچھے ہٹتے میں پندرہ ہزار کمانے کی تو بولو۔"
اس کے تذبذب پر بے یقینی غالب آ گئی: "پندرہ ہزار؟ آپ پندرہ سو بولا یا پندرہ ہزار؟"
"پندرہ ہزار۔" میں نے کہا: "لیکن ابھی میں صرف پانچ ہزار دوں گا۔ باقی صبح جب تم آؤ گے ہمیں لینے۔"
"ہم آئیں گے۔ کیوں نہیں آئیں گے سر۔" خادم نے خوشی سے کانپتی آواز میں کہا: "آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ ہمارے پیچھے آئیں۔"
میں نے کہا: "ہم ساتھ نہیں جا سکتے۔ تم راستہ بتا دو اور جگہ بتا دو۔"
اس نے سر ہلایا۔ شاید وہ سمجھ نہیں سکا تھا کہ ہم اس کے ساتھ جاتے ہوئے ڈرتے کیوں ہیں اور جو کام آسانی سے ہو سکتا ہے۔ وہ مشکل طریقے پر کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ میں اسے اپنا مسئلہ نہیں بتا سکتا تھا کہ سمندر میں لانچ پر قدم رکھنے سے پہلے میں اس بریف کیس کو کہیں چھپانا چاہتا ہوں

www.paksociety.com

جس میں نو لاکھ سے زیادہ کی رقم تھی۔

"اچھا۔ آپ ایسا کرو۔ اودھر آ جاؤ۔" اس نے ہاتھ اُٹھا کے اُنگلی سے کشتیوں اور لانچوں کے مختصر سے ہجوم کی طرف اشارہ کیا۔ "ادھر سے گھوم کے نیچے جاؤ۔ پتھروں کے اوپر سے بھی گزر کے جا سکتے ہو لیکن مس صاحب کے واسطے مشکل ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ہم گھوم کر آ جائیں گے۔"

"یہ راستہ تھوڑا لمبا ہے لیکن محفوظ ہے۔"

"ہم چھوٹے راستے سے آئیں گے۔" نازو نے اعلان کیا۔

"پتھروں پر رات کے وقت چلنا خطرناک کام ہے۔ پیر پھسل جائے گا۔ موچ آ جائے گی۔ پتھر چکنے ہیں اور۔۔۔ ہم تو کود جاتے ہیں۔"

نازو نے کہا۔ "ہم بھی کود جائیں گے۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "جب میں نے کہہ دیا ہے کہ ہم محفوظ راستہ اختیار کریں گے تو بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

نازو دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میرے ذہن میں کوئی ایسی بات ہے جو میں خادم کے سامنے نہیں کر سکتا۔

"ہماری چھوٹی سی لانچ ہے۔ گولڈن اور بلیک۔ اگر آپ کو نظر نہ آئے تو لائٹ کو دیکھنا۔ ہم ٹارچ سے سگنل دیں گے۔ ہمارے ساتھ چلتے تو۔۔۔"

"تم عجیب آدمی ہو۔" میں نے بگڑ کے کہا۔ "ایک بار کہہ دیا کہ ہم ساتھ نہیں جا سکتے۔ پھر کیوں ضد کرتے ہو۔"

"جیسی آپ کی مرضی سر۔" اس نے ندامت سے سر جھکا کے کہا۔ "آئی ایم سوری۔"

وہ پلٹ کے سمندر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اندھیرے میں وہ چٹانوں اور پتھروں پر بندر کی طرح بڑی پھرتی سے قدم جماتا اور کودتا ہوا جا رہا تھا۔ یہ اس کا تجربہ تھا جو اس کے کام آ رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس کا تاریک ہیولا رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

"اب آ جاؤ۔ ہم بھی ادھر سے ہی جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"اس کے سامنے انکار میں کیا مصلحت تھی۔" نازو نے کہا۔

"مجھے یہ بریف کیس ادھر ہی کہیں چھپانا ہوگا۔ اتنی رقم لے کر ہم اس ویران جزیرے پر نہیں جا سکتے جو ویسے ہی جرائم پیشہ افراد کی آماجگاہ ہے۔ وہاں ہمارے دیرینہ دشمن بھی مل سکتے ہیں۔"

نازو نے میرے پیچھے پتھروں پر قدم جما کے اور سنبھل سنبھل کے آگے بڑھنا شروع کیا۔ جہاں بھی ضرورت پڑی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے سہارا دیا یا بازو تھام کے اُتار لیا۔

"اگر میں اس بریف کیس کو کسی چٹان کے پیچھے [illegible] میں سے دو فٹ مربع ہوا ہو پتھر پر رکھ کے ادھر ادھر [illegible]"

"پھر یاد کیسے رکھو گے کہ وہ کون سی چٹان تھی؟" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ یہی اُلجھن میرے ذہن میں بھی ہے۔ نشانی [illegible] نہیں رہے گی۔ یہاں تو سب ایک سے پتھر ہیں۔" میں سوچ [illegible]

نازو نے کہا۔ "اس کے علاوہ۔ یہ کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے۔ خادم فوراً سمجھ جائے گا کہ ہم اس کے ساتھ کیوں جانا نہیں چاہتے تھے۔ اس نے بریف کیس تمہارے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ جب تم خالی ہاتھ نظر آؤ گے تو اس کے لیے کچھ بھی پوچھنا ضروری نہیں ہوگا۔"

"لیکن وہ بریف کیس کو تلاش کیسے کر سکتا ہے۔ فرض کرو میں اسے کسی بڑے پتھر کے نیچے رکھ دوں اور آس پاس پتھر ڈھیر کر دوں۔"

"وہ یہیں رہتا ہے۔ یہاں کے ایک ایک پتھر سے واقف ہوگا۔ اسے ایک بھی پتھر اپنی جگہ سے ہٹا ہوا نظر آ گیا تو وہ تاڑ جائے گا۔ پتھروں کا نیا ڈھیر تو اپنی خبر آپ دے گا۔ یہ شک تو ایک بچے کے ذہن میں بھی پیدا ہوگا کہ [illegible] بریف کیس میں کوئی ایسی چیز تھی جسے ہم ساتھ رکھتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ تم نے پندرہ سو کے بجائے پندرہ ہزار دے کر خود اپنی رئیسانہ شان بگھاری ہے۔"

"اس نے کہا تھا جیسا دام ویسا کام۔" میں نے ایک پتھر پر کودتے ہوئے کہا۔

نازو نے میرے پیچھے چھلانگ لگائی اور گرتے گرتے بچی۔ میں نے اسے تھام نہ لیا ہوتا تو وہ ایک خلا میں گر جاتی۔

"خادم کا خیال ہے کہ ہم محفوظ راستے سے آ رہے ہیں۔ وہ بریف کیس تلاش کرے گا تو ادھر ہی کرے گا۔"

"اس کی جگہ میں ہوتی تو معلوم ہے کیا کرتی؟"

"نہیں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کرتا۔ میں اب اس سے بریف کیس چھین لیتا۔ وہ ہاتھ مار کے۔"

"اونہہ۔ وہ ہاتھ مار کے۔" نازو نے کہا۔ "آپ مفت [illegible] ہوتے اگر ایسا نہ کر لیتے۔ میں تو خود بریف کیس تلاش کرتی۔ ملتا تو اس پوری آبادی کے ہر جوان بوڑھے عورت مرد ہر بچے کو بریف کیس تلاش کرنے پر لگا دیتی اور انعام مقرر کر دیتی کہ جس نے بھی وہ صندوق تلاش کر دیا اسے ایک ہزار روپے ملیں گے۔ ان کے لیے ایک ہزار کی رقم قارون کا خزانہ ہوتی ہے۔ اور میں شرط لگا سکتی ہوں کہ تم نے بریف کیس یہاں چھوڑا تو خادم یہی کرے گا اور وہ تمہارے ہاتھ بھی نہیں آئے گا۔ تم کہاں تلاش کرو گے اسے۔ تمہارے پاس وقت بھی نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ اسے بھی اپنے ساتھ رکھو۔"

"اتنے دلائل دینے کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے اسے زچ کر کے کہا۔ "یہ فیصلہ تو میں بہت پہلے کر چکا ہوں۔"

"عورتوں کو زیادہ بولنے کی عادت جو ہوتی ہے۔" نازو نے طنز سے کہا۔ "اب تم اٹھاتے کیا دیکھ رہے ہو۔ نیچے اتارو مجھے۔"

وہ چھ سات فٹ اوپر ایک چٹان پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی ایک ٹانگ پکڑ کے کھینچی تو اس نے چیخ ماری اور سیدھی میرے اوپر آئی۔ میں نے اسے بھی بریف کیس کے پاس رکھ دیا۔

"خوامخواہ بے مروت بنو۔" نازو نے خفگی سے کہا۔

"تم بھی خوامخواہ نخرے مت دکھاؤ۔ میں کیا کرتا آخر۔ سر آگے کر دیتا کہ جوتوں سمیت اُتر آؤ۔" میں نے کہا۔ "اوپر بیٹھ کے حکم دے دیا کہ اتارو مجھے۔ ٹھیک ہے یوں نہیں کہا جاتا؟"

ہم اب ساحل کی ریت پر اُتر گئے تھے اور کشتیوں کے خاصے قریب پہنچ چکے تھے۔ ایک دوستانہ لڑائی کے بعد ہمارے درمیان بات چیت بند ہو گئی تھی۔

میں نے کشتیوں اور لانچوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر رات کے اندھیرے میں گولڈن اور بلیک رنگ کی تمیز کرنا مشکل تھا۔

"اچھا ہوتا اگر اسی کے ساتھ آ جاتے۔" میں نے کہا۔

نازو نے کوئی جواب نہیں دیا اور پلٹ کے ایک طرف چل پڑی۔ میں نے دیکھا تو تھوڑا سا دائیں جانب ایک ٹمٹماتی لائٹ چمک رہی تھی۔ خادم کے سگنل کو نازو نے پہلے دیکھ لیا تھا۔

خادم نے کہا۔ "آپ ادھر سے نہیں آئے۔ وہ لانچ سے اُتر کے ساحل تک آ گیا تھا۔"

"ہاں۔ مس صاحب نے کہا کہ جب یہ بندر کا بچہ اندھیرے میں جا سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں جا سکتے۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"میں نے بندر کا بچہ نہیں کہا۔" نازو بولی۔

"اوہ یس۔ تم نے بندر کہا تھا۔ مجھے یاد آ گیا۔" میں نے کہا۔ "مگر دیکھو مس صاحب کو بالکل موچ نہیں آئی۔ یہ بھی کم نہیں ہیں تم سے۔"

نازو نے مجھے خون آشام نظروں سے گھورا۔

خادم نے آگے چلتے ہوئے کہا۔ "آپ بھی تو ساتھ تھے مس صاحب کے۔ موچ کیسے آتی۔"

غالباً وہ چالاک آدمی چھپ کر ہماری پیش رفت پر نظر رکھے ہوئے تھا اور یہ دیکھتا رہا تھا کہ میں نے کتنی بار نازو کی مدد کی تھی۔ اگر میں بریف کیس چھپانے کی کوشش کرتا تو کسی دشواری کے بغیر وہ واپس جا کر اسے اپنے قبضے میں کرتا اور غائب ہو جاتا۔

ہمارے لانچ پر چڑھ جانے کے بعد اس نے لانچ کو چپوؤں کی مدد سے آگے بڑھانا شروع کیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ انجن چلا کے سونے والوں کو جگانا نہیں چاہتا اور اپنی روانگی کو خفیہ رکھنا چاہتا ہے مگر بے خوابی کے شکار ایک بوڑھے نے پھر ایک ناراض بڑھیا نے اور مڈ نائٹ رومانس میں مصروف ایک نوجوان جوڑے نے لانچ کو دیکھا اور خادم سے سوال بھی کیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔ جہاں میری مرضی۔

بالآخر اس نے لانچ کا انجن اسٹارٹ کیا اور لانچ تیز رفتاری سے راک آئی لینڈ کی طرف بڑھنے لگی۔

میں نے خادم سے کہا۔ "وہ لائف جیکٹ کہاں ہیں؟"

"نیچے۔ بیڈ روم میں۔" خادم نے کہا۔

میں نے نازو سے کہا۔ "میں لاتا ہوں۔" اور آنکھ سے خادم کی طرف اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ اس کی طرف سے محتاط رہنا۔ نازو نے سر تک نہیں ہلایا اور اُفق کو گھورتی رہی۔ میں نیچے اُتر گیا۔ اس چھوٹی سی لانچ پر مجھے کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی۔

بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ میں نے باہر ہی سے اندازہ کیا کہ وہ کیبن شاید چھ فٹ چوڑا اور آٹھ فٹ لمبا ہوگا۔ اس کی اونچائی بھی چھ فٹ ہی تھی۔ اس لانچ پر زیادہ بڑے کمرے کی گنجائش تھی بھی نہیں اور بیڈ روم میں بیڈ کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھل گیا۔

دروازے کے پیچھے اندھیرا دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ بیڈ روم میں تھوڑی بہت روشنی تو ہونی چاہیے۔ خادم نے مجھے بتایا بھی نہیں تھا کہ اندر لائٹ نہیں ہے۔ لائٹ کے بغیر میں لائف جیکٹ کیسے تلاش کروں گا۔ میں نے دروازے کو لات مار کے پورا کھول دیا۔

www.paksociety.com

ایک دم تین آدمی میرے سامنے آ گئے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کے مجھے اندر کھینچ لیا۔ میں اسے رگیدتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا اور کیبن کے فرش پر گرا۔ خادم کی ساری بدمعاشی میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ نازو کی توقع سے زیادہ بدنیت اور خبیث ثابت ہوا تھا۔ اس نے تاڑ لیا تھا کہ میں نقد مال بھی ساتھ لیے پھر رہا ہوں۔ میں نے اسے پندرہ سو کے بجائے پندرہ ہزار دینے پر رضامندی ظاہر کی تھی تو اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ میرا بریف کیس مال سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے لیے تو نازو بھی مال ہی تھی۔ چنانچہ اس نے مجھ سے جان و مال ہتھیانے کے لیے فوری طور پر بدمعاش اکٹھے کر لیے تھے۔

گڑبڑ یہ ہوئی کہ وہ سب جو ماہی گیروں کی اس بستی کے دادا سمجھے جاتے ہوں گے، بنیادی طور پر چھچھورے تھے۔ انھوں نے صحیح بدمعاشی سیکھی بھی نہیں تھی۔ پھر یہ کہ انھوں نے مجھے ایک عیاش سیٹھ سمجھنے کی غلطی کی۔ پیسے والے جو آدھی رات کو ایک چھوکری کے ساتھ سمندر کی سیر کے لیے آتے ہیں وہ سیٹھ ہوتے ہیں اور سیٹھ لوگ لڑوانا تو جانتے ہیں خود لڑنا نہیں جانتے۔ معلوم نہیں اس سے پہلے کتنے سیٹھ ان کے ہاتھوں لٹ چکے تھے اور چپ رہے تھے کیونکہ وہ کسی سے کچھ کہتے تو اپنی رسوائی کی داستان سناتے۔ بالآخر خدا نے ان سب کا حساب برابر کرنے کے لیے مجھے بھیجا اور میرے ساتھ نازو کو بھی بھیج دیا۔

پہلا بدمعاش تو میرے نیچے دب کر ہی ہاتھ پاؤں مارنے لگا تھا۔ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور بڑی پھرتی سے پلٹ کے اٹھا۔ دوسرے بدمعاش نے اتنی دیر میں میرے سر پر ڈنڈا مار دیا۔ ذرا سی دیر کے لیے میرا سر چکرا گیا۔ میں ڈھیلا پڑا تو وہ تینوں مجھ سے چمٹ گئے۔ انھوں نے مجھے گرا لیا۔ ایک میرے سینے پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبانے لگا۔ دوسرے نے احتیاطاً میرے پیر پکڑ لیے کہ میں نزع کے کرب میں لاتیں نہ چلاؤں۔ تیسرا ڈنڈا لیے میرے سر پر سوار رہا۔

ٹانگیں پکڑنے والا سب سے پہلے جوابی کارروائی کا شکار ہوا۔ میں نے اسے ایک جھٹکے سے دونوں پنجوں پر اٹھا کے اپنے سر کے پیچھے پھینک دیا۔ وہ ڈنڈا مارنے والے کے ساتھ ہی کیبن کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اب میں نے کمر کو ایک جھٹکا دیا اور میرا گلا دبانے والا آگے آیا تو میں نے اپنے ہاتھوں کی دو انگلیاں اس کی دونوں آنکھوں میں گھونپ دیں۔ وہ اذیت سے چلایا اور اس کے ہاتھوں نے میری گردن کو چھوڑ دیا۔ وہ اندھا ہو چکا تھا اور دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے بری طرح چیخ رہا تھا۔ میں اٹھا ہی تھا کہ ڈنڈے والا مجھ پر حملہ آور ہوا اور ہوا میں نے دوسرے وار کو فیصلہ کن بنانے کے لیے ڈنڈے کو پوری طاقت کے ساتھ گھمایا تھا مگر نشانہ چوک گیا تو ڈنڈا اندھے ہو جانے والے ساتھی کے سر پر لگا۔ اس کی چیخ نکلی اور دم ختم ہو گیا اور وہ بھدے فرش پر گر کے ساکت ہو گیا۔ وہ پلٹ کے میری طرف آیا۔ اس کے ساتھی نے مجھے پیچھے سے پکڑ لیا اور مجھے گرانے کے لیے زور لگانے لگا۔

میں نے ایک لات گھما کے اس کے پیٹ پر ماری۔ وہ ڈنڈا دونوں ہاتھوں میں اٹھا کے میرے سر پر مارنے کے لیے بڑھا تھا۔ وہ بلبلایا اور ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے اسے دوہرا ہو کے زمین پر لوٹتے دیکھا۔ مجھے پیچھے سے گرفت میں لینے والا میرے سر کو اپنے سر سے ٹکریں مار رہا تھا۔ میں نے جھٹکا دے کر اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی اور پیچھے کو پیچھے وار کیا۔ کہنی اس کی ناک پر لگی۔ میں نے پھر کہنی ماری تو وہ مجھے چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ شاید اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

اس نے میرا بریف کیس اٹھا کے بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے اسے ٹانگ اڑا کے گرا دیا۔ اس کا سر دہلیز پر لگا اور چوٹ پھر اس کی ناک پر ہی آئی۔ میں نے اسے ٹانگ سے پکڑ کے اندر کھینچ لیا۔ جھٹکے سے اوپر اٹھا کے ایک پورا راؤنڈ دے کر چھوڑ دیا۔ اس کا سر کیبن کی دیوار پر یوں لگا جیسے غلیل سے نکلا ہوا پتھر دیوار سے ٹکراتا ہے۔ وہ وہیں گرا اور تڑپنے لگا۔

مجھے پہلا ڈنڈا مارنے والا اتنی دیر میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک اور ڈنڈا رسید کرنے میں کامیابی حاصل کی جو میں نے اسے سر سے اوپر اٹھایا اور فرش پر دے مارا۔ پھر اٹھایا، پھر پٹخا۔ میرا خیال ہے کہ دوسری بار ایسا میں نے جوش میں کیا، وہ تو پہلی بار ہی گرا تھا تو بے ہوش ہو گیا تھا۔

میں نے ہاتھ جھاڑ کے ان تینوں کا بھی معائنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ان میں سے ایک تو خود اپنے ہی ساتھی کا ڈنڈا لگنے سے فوت ہوا تھا۔ دوسرا بے ہوش تھا اور تیسرا لیٹنے کی تیاری کر رہا تھا۔ میرے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ اتنا غل غپاڑہ سن کے بھی نازو نیچے نہیں آئی تھی۔ ان تینوں کی ہائے واویلا سمندر کے شور سے کہیں زیادہ تھی۔ لانچ یوں اپنے سفر پر رواں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

میں سمجھ گیا کہ ایسا کیوں ہے اور اوپر آ کے دیکھ کر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ہمارا خادم غائب تھا اور ناخدا کے فرائض مس نازو نے سنبھال لیے تھے۔

"وہ کہاں ہے؟ آپ کا خادم۔"

نازو نے ہنس کر کہا۔ "وہاں۔" اور ہاتھ سے پیچھے طرف اشارہ کیا۔ "کوئی وہیل ہی پیچھے۔"

"کون... بدتمیزی کی تھی اس نے؟"

"ہاں۔ وہ بھوت کی طرح چمٹ گیا تھا مجھ سے۔ میں نے اسے فوراً عالم ارواح میں بھیج دیا۔ بہت خستہ تھی اس کی گردن۔" نازو نے کہا۔

"تین شکار نیچے بھی پڑے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ آوازیں ابھی آ رہی تھیں اوپر۔" نازو نے کہا۔

"تم نے آ کر دیکھا بھی نہیں؟"

"کیا کرتی میں دیکھ کر۔ اور پھر مجھے اس شپ کی کپتانی کا چارج بھی تو لینا تھا۔"

"آخر میں ان کا کیا کروں؟"

"لانچ اگر لاوارث رہ جائے تو اچھا ہے۔ کوئی وارث بچ گیا تو ہمارے خلاف گواہ بن جائے گا۔" نازو نے کہا۔

"یہ خطرہ یقیناً لاحق رہے گا۔" میں نے کہا۔ "خیر ان کا بندوبست تو ہو جائے گا۔ ہمارا کیا ہو گا؟"

"کیا ہونا چاہیے؟" نازو نے کہا۔

"تم کہاں لے جا رہی ہو آخر مجھے؟ مجھے راک آئی لینڈ جانا تھا۔"

وہ ہنسی۔ "انشاءاللہ وہیں جا کے دم لیں گے۔ خادم نے لانچ کی سمت مقرر کر دی تھی خودکشی سے پہلے۔ میں نے اس سمت کو ابھی تک بدلا نہیں ہے۔ تم ذرا دوربین سے دیکھو۔"

"دوربین کہاں سے لاؤں؟" میں نے کہا۔

"نیچے ہی جا کے دیکھو۔ لائف جیکٹ لینے گئے تھے تم۔ کچھ تو دیکھا ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ ایک ڈنڈا دیکھا تھا سب سے پہلے۔ وہ سر پر لگا۔ پھر اس کے بعد چند لمحوں میں روشنی نہ رہی یہ تاریکی دل سے مجھے تو میں دیکھوں چراغ ہی کہاں۔"

ٹارچ لے کر میں نیچے گیا تو مجھے ایک دیوار پر بیٹری سے چلنے والی لائٹس نظر آئیں۔ میں نے سوئچ آن کیا تو ٹیوب لائٹس کا مدھم دودھیا اجالا کیبن میں پھیل گیا۔ اس بیڈ روم میں فولڈنگ بیڈ تھا جسے ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے لاک کر دیا جاتا تھا۔ کیبن کی ہر چیز فولڈنگ تھی۔ کرسیاں، میز اور شیلف سب اوپر سمیٹے جا سکتے تھے۔

لیکن آگے سے ترچھے پڑے ہوئے افراد میں سے دو اپنی اپنی کی سزا پا چکے تھے۔ انھیں شامت اعمال موت کے ہاتھ کے حوالے لے آئی تھی جہاں ان کو تا ابد سونا تھا۔ میں نے ان کی لاشوں کو سمندر کے سپرد کیا اور تیسرے شخص کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ ابھی زندہ تھا۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ اس کی بے ہوشی کی نوعیت معمولی ہے یا سنگین اور وہ ہوش میں آنے لگا یا اسی کیفیت میں اپنے ساتھیوں سے جا ملے گا۔ اس حالت میں وہ میرے لیے خطرناک نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اسے چھوڑ کے کیبن کا جائزہ لیا۔

چار لائف جیکٹ مجھے ایک الماری سے ملیں۔ اسی میں دوربین اور ایک ٹرانسسٹر ریڈیو، شراب کی بوتلیں اور کچھ کھانے پینے کا سامان بھی تھا۔ ایک ایک کر کے میں نے سب شراب کی بوتلوں کو سمندر میں پھینک دیا۔ یہ لانچ عیاشی اور بدکاری کا اڈا تھی۔ چنانچہ الماری میں وہ سب تھا جو عیاشی کے لوازمات میں شمار ہوتا تھا۔

دوربین کے ساتھ میں اوپر پہنچا تو نازو بڑی مہارت سے لانچ کو کنٹرول کر رہی تھی۔ اب لہریں بڑی ہو گئی تھیں اور پانی کی بوچھاڑ ہم دونوں کو شرابور کرنے لگی تھی۔ میں نے دوربین کو فوکس کیا اور چاروں طرف دیکھا۔ بمبئی کی بندرگاہ میں کھڑے ہوئے بحری جہازوں کی روشنیاں ایک دم میرے سامنے آ گئیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ دوربین خاصی طاقتور ہے۔

بہت بڑے بڑے تجارتی جہاز ہر طرف لنگر انداز تھے لیکن ہم کسی کے قریب سے بھی نہیں گزر رہے تھے۔ میں نے لانچ کی سمت میں دوربین کو فوکس کیا تو مجھے تھوڑا سا بائیں جانب چٹانوں کی سرمئی لکیر نظر آنے لگی۔

"میرا خیال ہے کہ راک آئی لینڈ یہی ہو گا۔" میں نے دوربین نازو کو تھما کے لانچ کو سنبھال لیا۔

نازو نے دوربین آنکھوں سے لگا کے سر ہلایا۔ "تھوڑا سا رخ بدل لینا چاہیے۔"

"اگر ہمارا اندازہ غلط ہو گیا؟"

"تو ہم غلط جگہ جا اتریں گے۔" نازو نے کہا۔ "اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم غلطی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ آج ہی رات ہمیں محسن اور غالب کے لیے کچھ کرنا ہو گا۔"

"رات آدھی سے زیادہ تو گزر چکی ہے۔" نازو نے کہا۔

"اس بات کو میں یوں کہوں گا کہ ابھی آدھی رات باقی ہے۔ صبح تک بہت وقت ہے ہمارے پاس۔" میں نے کہا۔ "بس دعا کرو کہ ہم سیدھے اس جزیرے پر جا اتریں۔ پھر کچھ امید کی جا سکتی ہے کیونکہ جزیرہ زیادہ بڑا نہیں ہے اور ہمیں سارے جزیرے پر نہیں، صرف اس محل میں دیکھنا ہے۔"

www.paksociety.com

"محل اب کہاں رہا ہے۔ کھنڈر ہے۔"

"کھنڈر ایسا پرانا بھی نہیں ہے۔ اس کا کچھ حصہ سلامت ہے۔ کچھ زمین دوز کمرے بھی ہیں۔"

"زمین دوز کمروں میں پانی نہیں بھر جاتا ہوگا؟"

"جو معلومات مجھے حاصل ہوئی ہیں، اس کے مطابق محل کا صرف مشرقی حصہ پانی کی زد میں آتا ہے۔ وہ بھی ایک خاص موسم میں۔ اس وقت جب سمندر چڑھتا ہے۔ جس سال یہ محل تباہ ہوا، اس مدوجزر میں غیر معمولی طوفان تھا۔ ویسا طوفان پھر کبھی نہیں آیا۔ اس طوفان کے اثرات ممبئی کے ساحل پر بھی محسوس کیے گئے تھے مگر یہی طوفان خلیج بنگال سے گزرا تو مشرقی پاکستان میں تباہی آگئی تھی۔" میں نے کہا۔

نازو نے دوربین آنکھوں سے ہٹا کے کہا۔ "کیا ہم آخر تک لانچ میں ہی جائیں گے؟"

"تمہارا کیا اندازہ ہے۔ ہم کتنی دور ہیں اب؟"

"شاید ایک میل۔ لو تم دیکھو۔" نازو نے کہا۔

ایک لہر نے اسے اور مجھے بری طرح جھنجھوڑ دیا۔ میں نے شیشے صاف کرکے دوربین سے دیکھا۔ نازو کا اندازہ ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔

"ہم جب ایک فرلانگ دور ہوں گے تو انجن بند کردیں گے۔" میں نے کہا۔ "پھر جہاں تک چپو چلا کے جاسکیں گے جائیں گے۔"

"ایسی لہروں میں چپو خاک کام دے گا۔"

"دیکھیں گے کوشش کرکے۔ ورنہ پھر لہریں جہاں تک پہنچا دیں۔" میں نے کہا۔ "باقی فاصلہ تیر کے۔"

لانچ شاید کسی چٹان سے ٹکرائی۔ ایک ساتھ میرے اور نازو کے قدم اکھڑ گئے۔ اب لانچ ایک سائڈ پر جھکنے لگی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھالا۔ پھر کنٹرول نازو کے حوالے کرکے میں نیچے گیا اور لائف جیکٹ اٹھا لایا۔ لائف جیکٹ نازو کے لیے بڑی تھی مگر اس کا فائدہ تھا۔ اپنے کم وزن کے ساتھ وہ زیادہ آسانی سے تیر سکتی تھی۔ بریف کیس کو میں نے ایک بیلٹ کے ساتھ کمر پر باندھا۔ اس میں ہماری کل رقم ہی نہیں ہمارا اسلحہ بھی تھا۔ جو ابھی تک بھیگنے سے اس لیے محفوظ رہا تھا کہ بریف کیس کے اندر پلاسٹک کور نے اسے تقریباً واٹر پروف بنا دیا تھا۔

میں نے پھر دوربین سے دیکھا تو راک آئی لینڈ کا پورا منظر میرے سامنے آگیا۔ چٹانیں کسی چھوٹے سے سلسلۂ کوہ کی طرح دیوار بنی کھڑی ہوئی تھیں۔ انسان کے بنائے محل کے آثار یوں دکھائی دیتے تھے جیسے گرے کینوس پر کالے رنگ میں بنی ہوئی تصویر۔

"کیپٹن! ہم صحیح جگہ پہنچ گئے ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "انجن بند کردو۔"

نازو نے دوربین مجھ سے لے لی۔ "میں کیپٹن ہوں، انجینئر نہیں۔ مجھے نہیں آتا انجن بند کرنا۔"

میں نے ٹارچ کی روشنی میں انجن کا سوئچ تلاش کیا اور سوئچ آف کرنے میں کامیاب رہا۔ یکلخت فضا خاموش ہوگئی اور اب مجھے احساس ہوا کہ یہ چھوٹا سا انجن کتنا زیادہ شور کر رہا تھا۔ سمندر کا شور اس کی آواز میں دب گیا تھا۔ لانچ کچھ دور ایسے ہی چلتی گئی۔ پھر اس پر لہروں نے غلبہ پالیا۔ کنارا کسی چٹان سے لگا اور جھٹکے نے نازو کو میرے اوپر گرا دیا۔ ابھی ہم سنبھلے بھی نہ تھے کہ ایک زبردست لہر ہمارے اوپر سے گزر گئی۔

میں نے نازو کا ہاتھ تھام کے کہا۔ "ریڈی؟"

نازو نے چہرے سے پانی صاف کرکے سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ "میری بیلٹ پکڑ لو۔ اچھا ٹھہرو، دونوں کو ایک ساتھ باندھ دیتا ہوں۔ اب ہم ایک ساتھ پانی میں کود کر ایک ساتھ تیرنا شروع کریں گے۔ لانچ بھی ڈوبنے ہی والی ہے۔ ون۔ ٹو۔ تھری۔"

میں اور نازو سمندر میں کود گئے۔ پانی کی ایک لہر ہمیں بہت آگے پہنچا رہی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ ڈر کسی چٹان سے ٹکرا جانے کا تھا۔ جزیرے کا یہ ساحل چٹانوں سے اٹا پڑا تھا اور کوئی طوفانی لہر ہمیں اٹھا کے کسی چٹان پر پٹخ دیتی تو ہماری ساری ہڈیاں چٹخ جاتیں۔ نازو بڑی بہادری سے موجوں کے خلاف نبرد آزما تھی۔ میں نے ایک چٹان کو بہت قریب دیکھا اور ایک ہاتھ پھیلا کے پکڑ لیا۔ نازو کا بھی ایک بازو سہارے کے لیے آگے بڑھا دیا۔ ہم دونوں نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے میں چند سیکنڈ لگائے، پھر آگے بڑھنا شروع کیا۔ اب پانی میں چٹانیں جگہ جگہ ہوگئی تھیں۔ چنانچہ میں زیادہ محتاط تھا۔ کسی بھی لہر کے آنے سے پہلے میں اور نازو قریبی چٹان کی اوٹ میں ہو جاتے۔ لہر چٹان سے ٹکراتی تھی اور اس کا زور ٹوٹ جاتا تھا۔ ساتھ پھوار سی ہمارے سروں پر برستی تھی۔ پھر ہم اگلی پناہ میں پہنچ جاتے تھے۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو ہر لہر اپنی قوت کے ساتھ کسی چٹان سے ٹکرا دیتی۔ خراشیں بھی آئی تھیں۔ میرے ہاتھوں کی پشت پر اور کلائی تک جہاں بھی رگڑ لگی تھی وہاں سمندر کے پانی سے جلن ہو رہی تھی۔ لیکن پانی سے میری آنکھوں میں بھی مرچیں سی لگ رہی تھیں۔ نازو کی حالت بھی مختلف نہیں ہوسکتی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی ہمت کی داد دی کہ وہ منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر ہر تکلیف برداشت کر رہی تھی۔ اور اس جدوجہد میں کسی طرح بھی مجھ سے پیچھے نہ تھی۔

بالآخر پانی اتنا کم ہوگیا کہ ہم ریت اور پتھروں پر قدم جما کے آگے بڑھ سکتے تھے۔ میں نے نازو کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھا اور اسے چکنے، اونچے نیچے اور ناہموار پتھروں پر سے پھسلنے نہیں دیا۔ آہستہ آہستہ ہم پانی سے بھی نکل آئے اور ایک ایسی ہموار چٹان پر پہنچ گئے جہاں تھوڑی دیر بیٹھ کے دم لینے کی گنجائش تھی۔ میں نے نازو کی لائف جیکٹ کا ہک کھولا۔ پھر بریف کیس کے بوجھ کو الگ کیا تو مجھے خاصا سکون ملا۔ میں نے سمندر کو دیکھا تو مجھے اپنا زندہ سلامت کنارے تک پہنچ جانا کسی معجزے سے کم نہ لگا۔ پانی میں ان گنت سیاہ چٹانیں نظر آرہی تھیں جو چمکتی ہوئی سمندر کے خونی دانتوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے صرف سمندری لہروں کی وحشت و تندی کا مقابلہ نہیں کیا تھا۔ اپنے ساتھ نازو کو بھی سنبھالا تھا اور بریف کیس کو بھی کھینچا تھا۔ میں خالی ہاتھ اکیلا تیر کر آتا تب بھی یہ مشکل کام تھا۔ اتنی مزاحمت کے ساتھ، خطرات کے ساتھ اور بڑھتے بوجھ کے ساتھ میری جدوجہد بہت زیادہ مشکل ہوگئی تھی۔ تھکن سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگا تھا۔

چہرے اور بالوں سے پانی صاف کرکے میں نے نازو کی طرف دیکھا۔ "تم بالکل ٹھیک ہونا؟"

نازو نے سر ہلایا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

میں نے کہا۔ "بس معمولی سی خراشیں ہیں ہاتھوں پر۔ تمہیں چوٹ تو نہیں آئی کہیں؟"

نازو نے جوتے اتار کے پانی اور ریت کو باہر جھاڑا۔ "نہیں، مجھے بھی خراشیں ہی محسوس ہوتی ہیں۔ میرا لباس بہت اچھا رہا۔"

"تم ایک حیرت انگیز لڑکی ہو۔" میں نے کہا۔ "پہلے بھی تم نے بہت مشکل کام کیے ہیں۔ اس وقت بھی کمال کر دیا تم نے۔ آدھی رات کے اندھیرے میں ایسے خطرناک سمندر کو تیر کر عبور کرنا اچھے اچھے مردوں کے بس کی بات نہیں۔ تم کو ڈر نہیں لگا؟"

وہ ہنسی۔ "میں اکیلی نہیں تھی۔ تم پر اعتماد میری اصل طاقت تھا۔"

میں نے کہا۔ "نہیں نازو، اصل طاقت تو آدمی کے اندر ہوتی ہے۔ باہر کے سہارے کوئی اہمیت نہیں رکھتے اگر یہ طاقت کام نہ آئے۔"

نازو نے کہا۔ "کیا بات ہے۔ آج منہ پر بہت تعریف کر رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "یہ میرے حقیقی جذبات ہیں۔"

نازو نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا۔ "غالباً یہی چٹان کی دیوار کا وہ حصہ ہے جو شگاف ہوگیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ ہمارے دائیں بائیں پھر طویل چٹانوں کا سلسلہ اور کسی جگہ سے ٹوٹا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔"

"گویا وہ رنگ محل عین اس کے پیچھے ہوگا۔ کیا خیال ہے چلیں؟"

میں نے کہا۔ "اگر ہم ان کپڑوں کو ایسے ہی پہنے رہے تو یہ خشک نہیں ہوں گے۔ تم ادھر اس چٹان کے پیچھے جا کے انہیں نچوڑ لو اور پھر پہن لو۔ اسی کو تولیے کے طور پر بھی استعمال کرلینا۔"

وہ چٹان کے پیچھے غائب ہوگئی اور جب پھر واپس آئی تو میں بھی بدن خشک کرکے اور کپڑوں کو نچوڑ کے پہن چکا تھا۔ بریف کیس کھول کے میں نے پلاسٹک میں لپٹے ہوئے ریوالور نکالے۔ ریوالور بالکل محفوظ رہے تھے۔ بریف کیس میں بھرے ہوئے نوٹ بھی خشک تھے۔ میں نے ایک ریوالور نازو کو دیا اور بریف کیس پھر بند کردیا۔

چند منٹ بعد دو چٹانوں کے درمیانی راستے سے گزرتے ہی میں نے رنگ محل کو دیکھا۔ اس کی برجیاں اور بلند دیواریں، محرابیں، مینارے اور بالکونیاں۔ سب ایک کھنڈر تھے۔ خود اپنی ویرانی پر نوحہ خواں۔ عہد رفتہ کی شان و شوکت پر گریہ کناں۔ اب اس وقت کا تصور بھی محال تھا جب یہاں رنگ و نور کے سیلاب میں سیم و زر کے بدن جھلملاتے ہوں گے اور شباب کے جام چھلکتے ہوں گے تو شراب کی آتش سیال کا نشہ بھی دو آتشہ ہو جاتا ہوگا۔ دولت مندوں کی یہ جنت ارضی اب ایک پراسرار شہر خموشاں تھی جس کی سنسان فضا میں موت کی سرگوشیاں محسوس ہوتی تھیں۔

"کیا سوچنے لگے؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "کچھ نہیں۔ سوچ رہا تھا کہ اس بریف کیس کو کہاں چھپاؤں۔"

نازو ہنسی۔ "جھوٹ۔ تم ایک قنوطی فلاسفر بنے ہوئے تھے۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "کیا تمھیں بالکل خیال نہیں آتا کہ یہ کیا جگہ تھی اور اب کیا ہے۔ کیسے کیسے لوگ آتے تھے یہاں کیا رنگین محفل تھا۔ آج ان کی ہڈیاں اس جزیرے پہ بکھری پڑی ہوں گی۔"

"ہمیں اپنی ہڈیوں کی فکر کرنی چاہیے۔" نازو نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں اس خزانے کو کہیں دفن کر دوں۔" میں نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا "جہاں سے پھر اسے نکالا بھی جا سکے۔"

"ادھر دیکھو۔ یہ دو ایک سے درخت ہیں۔ ایک ہی زاویے پر دائیں اور بائیں جھکے ہوئے۔" نازو نے کہا۔

میں نے دیکھا تو مجھے وہ درخت ایک بہت بڑے کوزی کی طرح نظر آئے۔ یہ اچھی نشانی تھی۔ زمین پر دونوں درختوں کی جڑیں ایک ہی جگہ سے پھوٹی تھیں۔ میں نے قریب جا کے دیکھا تو مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ زمین پتھریلی تھی۔ خالی ہاتھوں کی مدد سے بریف کیس کو زمین میں دفن کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ میں نے اور نازو نے اسے دو بڑے بڑے پتھروں کے درمیان میں رکھا اور اس کے آگے پیچھے بھی اتنے ہی بڑے پتھر کھسکا دیے۔ جب تک کوئی اوپر سے نہ جھانکتا ان چار پتھروں کی قبر میں پڑا ہوا بریف کیس نظر نہیں آ سکتا تھا۔ نازو کے مشورے پر میں نے درمیان کی خالی جگہ کو خودرو جھاڑیوں کی شاخوں سے بھر دیا اور پھر اوپر بھی پتھر ڈال دیے۔ ہمارا خزانہ پوری طرح کیموفلاج ہو گیا تھا۔

سمندر کی جانب سے آنے والی تیز ہوائیں بھی زیادہ تھیں۔ مگر اس نے ہمارے کپڑوں کی نمی کو جذب کر لیا تھا اور کپڑے اب جسم سے چپک نہیں رہے تھے۔ میرے ہاتھ بھی تقریباً خشک تھے۔ محل کے کھنڈر کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے ٹارچ کو زمین سے لگا کے روشن کیا۔ اس کی روشنی چند انچ قطر کے دائرے میں محدود رہی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ضرورت پڑنے پر ٹارچ کام آئے گی یا نہیں۔

رنگ محل کی مغربی دیوار سلامت تھی اور ایک نصف دائرے کی صورت میں شمال کی جانب گھوم گئی تھی۔ یہ محل کا عقبی منظر تھا۔ مجھے ایک طویل قطار ان کھڑکیوں کی نظر آئی جن کے پٹ اور فریم سب نکالے جا چکے تھے۔ دیواروں کے شگاف سیاہ دھبوں سے دکھائی دیتے تھے۔ غالباً ہر کھڑکی ایک خواب گاہ کی علامت تھی۔ ان خواب گاہوں میں راتیں گزارنے والے کھڑکی سے سمندر میں اترنے والی چاندنی کا نظارہ کرتے ہوں گے اور اس کی سحر انگیزی میں انھیں رنگ محل کا ماحول زیادہ رومانٹک نظر آتا ہوگا۔ میں نے ایک ایک کھڑکی میں سے اندر جھانکتے ہوئے سوچا۔

اندر کچھ نہیں تھا سوائے اندھیرے اور خاشاک، چمگادڑوں کے اور محبوس فضا کی بو کے۔ ملبے کے اوپر خودرو گھاس پھوس اگے۔ ہر شگاف سے اندر جھانکنے کے لیے مجھے دیوار کی جڑ تک پہنچ کے خود کو پنجوں پہ اوپر تک اٹھانا پڑتا۔ نازو قد میں میرے شانے تک ہی پہنچتی تھی۔ وہ پنجوں پر اٹھ کے بھی اندر نہیں دیکھ پا رہی تھی۔

"اندر کچھ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں ہے تو پھر تم کیا دیکھ رہے ہو؟" اس نے کہا۔ "میں بھی یہ سب دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور دیکھو۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ نازو نے جھک کر ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھی۔ اینٹوں کی وہاں کوئی کمی نہ تھی۔ ایک فٹ اونچا چبوترا سا بنا کے وہ مطمئن ہو گئی۔ اب وہ بہ آسانی شگاف تک پہنچ جائے گی۔ اس نے اوپر چڑھ کے ایک شگاف کے کنارے کو تھامنے کی کوشش کی مگر پیروں کے نیچے اینٹوں کا توازن بگڑ گیا۔ وہ خود کو سنبھال نہ سکی۔

میں گرنے کی آواز پر پلٹا اور دوڑ کر اسے اٹھانے گیا مگر وہ خفت مٹانے کے لیے خود ہی فوراً کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں۔ میں کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔" وہ بولی۔

"ابھی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔" میں نے کہا "موچ آجاتی تو تمھارا بوجھ بھی ڈھونا پڑتا۔ جان بچا کے بھاگنا بھی مشکل ہو جاتا۔ مرتا تمھارے ساتھ میں بھی۔ مخالب اور محسن کے لیے کچھ کرنے سے پہلے ہی۔" میری برہمی پر نازو شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا مناسب نہیں تھا ورنہ وہ پلٹ کے الٹا لڑنے لگتی۔ چنانچہ میں خاموش ہو گیا۔

اسی وقت میرے کانوں نے انسانی آواز سنی۔ کسی نے بہت قریب سے پوچھا تھا: "یہ کیا تھا؟"

جسے مخاطب کیا گیا تھا اس نے معلوم نہیں کیا جواب دیا۔

"او یار۔ کیسا شور تھا یہ۔ جیسے دیوار گری ہو۔"

"ایسے تو گری ہوگی دیوار۔" دوسرے نے کہا "کیا یہ دیواریں ایسے ہی کھڑی رہیں گی۔"

میں نے اور کچھ نہیں سنا۔ ایک جھٹکے سے میں نے نازو کو اپنے ساتھ کھینچا اور کمر سے پکڑ کے اوپر اٹھا دیا۔ وہ ایک دیوار کے خلا میں سے اندر اتر گئی۔ پھر میں نے خود کو

ہاتھوں کے بل پر اوپر اٹھایا اور اس اندھیرے ویران کھنڈر میں پہنچ گیا جس میں چمگادڑیں بھری پڑی تھیں۔ انھوں نے ہماری مداخلت بے جا پر سخت احتجاج کرتے ہوئے چلانا اور اندھیرے میں چکر لگانا شروع کیا تو نازو سخت دہشت زدہ ہوئی۔ ان کی آواز انتہائی کرخت اور مکروہ تھی لیکن یہی آواز انھیں راستہ بتاتی تھی۔ آواز نکالے بغیر چمگادڑ اڑ نہیں سکتی اور دیکھ نہیں سکتی۔ اس اندھیرے کے مسافر اندھے پرندے نے انسان کے لیے راڈار کی ایجاد کو ممکن بنایا تھا۔

کئی بار چمگادڑیں پرواز کرتی ہوئی ہمارے سر کے اوپر سے گزریں اور ہم نے سر جھکا کے خود کو بچایا۔ یہ ایک غیر ارادی حرکت تھی۔ چمگادڑیں خود کو ہم سے بچ کے نکل گئی ہوں گی۔ نازو بالکل مجھ سے چپکی کھڑی تھی اور اس کا بدن واقعی خوف سے لرز رہا تھا۔

"یہ کیا بزدلی ہے۔" میں نے اسے آہستہ سے ڈانٹا۔ "چمگادڑ کاٹتی نہیں۔"

"میں... میں نے سنا ہے دانت ہوتے ہیں ان کے۔" نازو نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہوں گے۔ مگر ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ صرف اس لیے چلا رہی ہیں کہ ڈسٹرب ہوگئی ہیں۔"

اسی وقت ایک چمگادڑ تیزی سے آئی اور نازو کی پشت سے ٹکرا کے نیچے گری۔ چمگادڑ کی طرح ہی نازو نے چیخ ماری۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "خدا کے واسطے عقل سے کام لو۔" میں نے کہا۔

نازو نے سر ہلایا اور دہشت زدہ نظروں سے پیچھے دیکھنے لگی جہاں وہ چمگادڑ دیوار کے نچلے حصے پر چپک گئی تھی۔ ایک اور چمگادڑ اپنی غلطی کے باعث میری گردن سے آ چپکی۔ میں نے ہاتھ مار کے اسے الگ کیا۔ نازو کا حال مزید خراب ہو گیا۔ مجبوراً میں نے اسے اپنے سامنے کیا اور نیچے بیٹھ جانے کو کہا۔ اس طرح میں نے نازو کو اپنے جسم کی پناہ میں لے لیا۔ وہ بچوں کی طرح سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی رہی۔ عورت کی ذات بھی مجموعہ تضادات ہے۔ کہاں وہ نازو جو دشمنوں پر بجلی بن کے گرتی ہے۔ ایک وار میں گردن توڑ کے اپنے سے دگنا قوی مرد کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے اور اسٹین گن کی گولیوں سے دشمنوں کے جسم چھلنی کر دیتی ہے اور مسکراتی رہتی ہے۔ کہاں یہ نازو جو چمگادڑ جیسے بے ضرر جانور کے خوف سے مری جا رہی تھی۔ ایسا ہی ایک تماشا میں نے پہلے بھی دیکھا تھا جب راجہ اور نازو کو ایک چوہے نے اتنا ہی دہشت میں مبتلا کر دیا تھا اور جب تک ہم نے اس چھوٹے سے چوہے کو مار نہیں دیا تھا وہ بینڈ پر چڑھی چلاتی رہی تھیں۔

اس پرانے واقعے کو یاد کر کے میرے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ باہر جھانکتے ہوئے میں نے پوری توجہ ان آوازوں پر مرکوز رکھی جو دوبارہ سنائی نہیں دی تھیں۔ معلوم نہیں وہ کون تھے جو شاید قریب آ کے دور چلے گئے تھے۔ اینٹوں کے گرنے کی آواز نے انھیں متوجہ کر لیا تھا۔ تو وہ نازو کی چیخ پر کیوں متوجہ نہیں ہوئے تھے؟ اینٹوں کے گرنے پر تو انھوں نے فرض کر لیا تھا کہ کھنڈر کی کسی خستہ حال دیوار کا کوئی حصہ گرا ہوگا لیکن نازو کی چیخ کو انھوں نے کیوں نظر انداز کیا؟ انھیں شک کیوں نہیں ہوا کہ چمگادڑیں اچانک رات کو کیوں چلانے لگی ہیں۔

کھڑکی کے اندر تاریکی نسبتاً گہری تھی۔ باہر کے نیم روشن اندھیرے سے کوئی اندر دیکھتا تو اسے کچھ نظر نہ آتا لیکن میں اندھیرے کی پناہ میں رہ کے باہر کا منظر بہتر طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اچانک بائیں اور دائیں جانب سے دو سائے سے نمودار ہوئے۔ وہ بہت احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم رکھتے آگے آ رہے تھے۔

میں سمجھ گیا کہ نازو کی چیخ نے نہیں ہمارا سراغ دے دیا ہے۔ جزیرے پر کسی اجنبی کی موجودگی ثابت ہو چکی تھی۔ کوئی عورت چلائی تھی تو اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی مرد ضرور ہوگا۔ وہ کون ہیں جو اس کھنڈر میں چھپے بیٹھے ہیں۔ مفرور مجرم، خلوت کے طلبگار یا دشمن۔ وہ اب یہی دیکھنے کے لیے آ رہے تھے اور انھیں تلاش کا مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ چمگادڑوں کے شور نے انھیں ہمارا سراغ دے دیا تھا۔

میں نے نیچے جھک کر کہا "نازو! دو آدمی آ رہے ہیں۔ دونوں مسلح ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دونوں کے پاس اسٹین گنیں ہیں۔"

نازو کی حالت میں ایک انقلابی تبدیلی آئی۔ یکلخت وہ کوئی عام لڑکی نہیں رہی۔ وہ نازو بن گئی جس کی صلاحیتوں پر میں پوری طرح انحصار کر سکتا تھا۔

"کس طرف سے آ رہے ہیں؟" اس نے کھڑے ہو کر کہا۔

"دونوں طرف سے آ رہے ہیں۔ تمھاری دعوت پر۔" میں نے کہا۔

"آنے دو۔ خاطر تواضع بھی ہو جائے گی۔" نازو نے مضبوط پُر یقین لہجے میں کہا۔

میں نے پھر باہر جھانک کے دیکھا تو مجھے دور کی جگہ ایک سایہ نظر آیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کے زیادہ غور سے پس منظر کی تاریکی میں دوسرے سائے کو تلاش کرنے کی بے سود

www.paksociety.com

کوشش کی۔ وہ اگر ہوتا تو ضرور نظر آتا۔ قریب آجانے کے بعد زیادہ نمایاں ہوتا مگر وہ غائب ہوچکا تھا۔ میں اسے بھوت یا آسیب نہیں تسلیم کرسکتا تھا جو پل میں نظر آئے اور پل میں اوجھل ہوجائے۔ وہ کسی خاص مقصد کے تحت روپوش ہوا تھا اور یہ مقصد تھوڑا سا سوچنے پر فوراً میرے ذہن میں آگیا۔ وہ بھی کسی کھڑکی میں داخل ہوگیا تھا۔ انھوں نے باہمی صلاح مشورے سے جو حکمت عملی اختیار کی تھی، وہ ہمیں دونوں طرف سے محصور کرنے کے لیے تھی۔ ایک ساتھ وہ دونوں ایک ہی راستے سے اندر نہیں آنا چاہتے تھے۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو مجھے اپنے سامنے کی دیوار میں ایسی ہی دوسری کھڑکی نظر آئی۔ یہ ایک چوکور شگاف تھا جو پرانے محل کی وسیع خوابگاہ کی دیوار میں باقی رہ گیا تھا۔ جب یہاں کھڑکیاں ہوں گی تو ان کی چوکھٹوں میں شیشے بھی ہوں گے اور شیشوں کے سامنے حریری پردے بھی سرسراتے ہوں گے۔ لوگ چوکھٹ نکال کے لے گئے تھے۔ چنانچہ کھڑکی اندر اس کے ساتھ دروازہ اس دیوار کی وسعت میں خلا کی طرح رہ گئے تھے۔ کھڑکی ایک ایسا مستطیل تھی جو چوڑائی کے رُخ پھیلی ہوئی تھی۔ دروازہ اوپر سے نیچے کھڑی ہوئی مستطیل لگتا تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا آسان تھا کہ میرے دائیں بائیں اور اس کے آگے دونوں جانب کی خوابگاہوں کا نقشہ مختلف نہیں ہوسکتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص دوسری کھڑکی سے کسی خواب گاہ کے کھنڈر میں آتا تھا، وہ سیدھا دروازے سے گزر گیا ہوگا اور اب بیرونی برآمدے میں چلتا ہوا اس دروازے کی طرف بڑھ رہا ہوگا جو میرے سامنے تھا۔

"نازو! ہم اس موقع سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں، اگر تم ہمت سے کام لو۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے سرگوشی کی۔

"میں — بالکل تیار ہوں۔"

"گڈ گرل — تم ادھر کھڑکی سے آنے والے کو سنبھالو۔ میں اُدھر دروازے پر جاکے دوسرے کا استقبال کرتا ہوں۔"

میں نے کہا اور پلٹ کے دروازے کی جانب لپکا۔ میں چاہتا تھا کہ برآمدے سے ہوکے ساتھ والے کمرے میں چلا جاؤں مگر میں نے جھانک کر دیکھا تو میری طرف آنے والا چار پانچ کمروں کی دوری پر تھا۔ میں باہر نکلتا تو ایک فاش غلطی کرتا۔ وقت کم تھا۔ خود کو چھپانے کے لیے میں کسی بھی گوشے کا انتخاب کرسکتا تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ اندر آنے سے پہلے وہ دروازے کے دونوں طرف دیکھے گا۔ میں کتنا بھی دیوار سے لگ کر کونے میں کھڑا ہوجاؤں اس کی نظر مجھے دیکھ لے گی۔

میں نے اس کونے کو ترجیح دی جہاں دیوار اور دروازہ ملتے تھے اور دروازے سے دور جس کھڑکی کے نیچے ہاتھ پیر اکڑائے بالکل ساکت ہوگیا۔ میں نے سامنے والی دیوار کے خلا میں نازو کو ایسے بیٹھا ہوا دیکھا کہ وہ مجھے فریم میں لگی ہوئی تصویر جیسی نظر آئی۔ میں اس کا سائڈ پوز دیکھ رہا تھا۔ سیاہ چست لباس میں اس کے بدن کے سب خطوط بہت واضح تھے۔ پیر سمیٹ کر اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے جو کھٹ پر بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کی پشت دیوار سے لگ گئی تھی۔ یہ مشکل سے دس انچ چوڑی جگہ تھی جہاں وہ بڑے سکون سے کھڑکی کے قریب آنے والے کو دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ کیا کرے گی۔ وہ اپنے عورت ہونے کا فائدہ اٹھائے گی۔

"اے لڑکی! کون ہے تو؟" کسی نے درشت لہجے میں کہا۔ نازو کھلکھلا کے ہنس دی۔ "تم کو کیا لگتی ہوں میں؟"

"اور کون ہے تیرے ساتھ؟"

"اب یہ بھی میں بتاؤں۔ تم جو ہو۔" نازو پھر ہنسی۔

"بکواس مت کر۔ کوئی مرد تھا تیرے ساتھ۔"

"تھا کیا مطلب۔ اتنی جلدی تم مرد نہیں رہے؟" نازو نے بڑی بے شرم شوخی کے ساتھ کہا۔ پھر وہ باہر کو دیکھی۔

میں نے اچانک کھڑکی کے خلا میں ایک سایہ نمودار ہوتے دیکھا۔ "اندر کون ہے؟" وہ غرا کے بولا۔ "سامنے آجاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

یہ ایسی ہی بات تھی جیسی ایک ماسٹر صاحب نے غصے میں کی تھی کہ جو بچے غیر حاضر ہیں وہ کھڑے ہوجائیں۔ جب میں نے کوئی حرکت نہیں کی تو اس نے ٹارچ روشن کی۔ ٹارچ کی تیز روشنی کا دائرہ ویران کھنڈر کمرے کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک گیا۔ چمگادڑوں نے پھر وحشت میں چیخنا اور گردش کرنا شروع کیا۔ میں اس روشنی کی زد میں نہیں آیا۔ چراغ تلے اندھیرا والی بات پھر درست ثابت ہوئی۔ میری تھوڑی سی دوراندیشی نے مجھے بچالیا۔ اس نے آگے جھک کر عین کھڑکی کے نیچے دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

"کمال ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "کوئی بھی نہیں ہے یہاں تو۔"

باہر سے ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی شخص چیخنے کی بجائے وحشت زدہ زمین پر گر گیا۔ نازو کو ایک نازک حسین لڑکی سمجھنے کی غلطی کرنے والا اپنے انجام کو پہنچا۔ میں نے دیکھے بغیر جان لیا۔

ٹارچ کی روشنی ایک لکیر کی صورت میں سامنے والی کھڑکی کے خلا سے گزری۔ روشنی کو باہر کی تاریکی نے جذب کرلیا۔

ٹارچ والا اب دروازے کی طرف سے کمرے میں آیا اور سیدھا آگے بڑھا۔ شاید وہ دیکھنا چاہتا ہوگا کہ اس کا ساتھی کہاں ہے۔ وہ اسے بتانا چاہتا ہوگا کہ ان کا اندازہ غلط ہوگیا اور اس کمرے میں کوئی نہیں ہے جس میں ہم لڑکی اسے چکما دے سکی ہے۔

میں نے اسے پیچھے سے جست لگا کے جالیا۔ اسے پلٹ کر دیکھنے اور حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملا۔ میرے ایک ہاتھ نے اس کی گردن کو شکنجے کی طرح جکڑ لیا۔ سانس رک جانے سے وہ تڑپا مگر میری گرفت سے نکلنا ممکن ہی نہیں تھا۔ پیچھے سے اتھ مار کے میں نے اس کی گردن توڑ دی۔ اس کا سر ایک دم آگے جھک کر جھولنے لگا تو میں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ فرش پر سر کے بل گرا۔ میں نے اس کی مشین گن اٹھائی اور کھڑکی کی طرف لپکا۔

نازو کھڑکی کے نیچے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے مشین گن میری طرف اچھال دی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے کیچ کیا اور نیچے رکھ دیا۔ اس مشین گن کے ساتھ جو ابھی ابھی میں نے چھینی تھی۔ نازو نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ میں نے اپنے ہاتھ نیچے بڑھائے اور وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کے اندر آگئی۔

"یہ ٹارچ تو بجھا دینی تھی۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "دراصل یہ جب گرا تو ٹارچ اس کے ہاتھ میں ہی تھی۔ میں پہلے تمھیں دیکھنا چاہتا تھا۔"

"وہ بے چارا ابھی لیٹ کے دیکھتا رہ گیا۔ میں نے بڑے پیار سے جگایا تھا۔" نازو نے ٹارچ اٹھا کے آف کردی۔

"بے وقوف تھا کہ تم پر اعتبار کیا۔"

"اعتبار اس نے مجھ پر نہیں کیا تھا۔ اسے اپنی مردانہ شہ زوری پر اور مشین گن پر بھروسا تھا۔" نازو نے کہا۔ "کون ہیں آخر یہ لوگ؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ظاہر ہے ان کو کسی نے پہرے داری پر مامور کیا تھا۔ یہ پوچھو کہ وہ کون ہیں جن کے یہ پہرے دار تھے۔" میں نے کہا اور نیچے بیٹھ کے لاش کے کپڑوں کی تلاشی لی۔ اس شخص نے خاکی بشرٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ چوبیس پچیس سال کا نوجوان تھا۔ مجھے اس کے یوں مارے جانے کا افسوس ہوا۔ اسے کب معلوم ہوگا کہ دشت اجل میں جوانی میں اس پر یہاں شب خون مارے گا۔ اس کی جیب میں ایک پرس تھا۔ پرس میں سو روپے اور کچھ چھوٹے نوٹ تھے۔ قابل اعتراض تصاویر کا ایک البم تھا جس پر نظر پڑتے ہی نازو کا چہرہ لال ہوگیا۔ ایک اور تصویر کسی نوجوان لڑکی کی تھی۔ سیدھی سادی عام سی لڑکی۔ جو شاید اس کی محبوبہ، منگیتر یا بیوی تھی۔

"تم نے اس دوسرے آدمی کی جامہ تلاشی لی تھی؟"

"ہاں — مگر وہ اتنا اچھا ذوق نہیں رکھتا تھا۔" نازو نے کہا۔ "صرف پیسے تھے اس کی جیب میں۔ نام پتا کچھ نہیں۔"

"کیا کرنا ہے نام پتے کو۔ کون سا کتبہ لگے گا ان کے سرہانے۔" میں نے کہا۔ "آؤ اب چلیں اور دیکھیں ایسے کتنے محافظ اور ہیں۔"

ہم ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلتے گئے۔ یہ سب بالکل ایک سے کمرے تھے۔ سمندر کے رُخ کھلنے والی سب کھڑکیاں اپنی خواب گاہوں سے طلوعِ آفتاب کا منظر پیش کرتی ہوں گی۔ مگر شفق کا سنہرا اجالا شیشوں تک پہنچ کے رُک جاتا ہوگا اندر لذتِ خواب سحر میں ڈوبے ہوئے خمار آخر شب کے ساتھ اپنی خلوت کے اندھیروں میں سوتے رہتے ہوں گے۔ میں نے سوچا۔ کسی بھی قدیم تاریخی عمارت کو دیکھتے ہوئے ذہن ماضی کے جھروکوں سے جھانکنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

ایک جگہ اچانک وہ برآمدہ ختم ہوگیا۔ میں نے کھلے آسمان کو ایک وسیع چار دیواری سے دیکھا۔ اس چار دیواری پر پہلے بھی چھت نہیں تھی۔ چھت گری ہوتی تو اس کا ملبہ اندر ہی موجود ہوتا۔ میں نے ٹارچ روشن کرکے دیکھا تو ایک دیوار کے ساتھ اوپر جانے کا راستہ نظر آیا۔ روشنی چند زینوں پر محدود رہی۔ میں نے روشنی کو آگے بڑھایا۔ اسی دیوار کے دوسرے کنارے پر زینوں میں خلا سا تھا۔ لائٹ آف کرکے میں نازو کے ساتھ آگے بڑھا۔ پھر میرے کانوں نے آواز سنی۔ وہ جگہ جو زینوں میں ایک دھندلی ہوئی قبر جیسی نظر آئی تھی پھر روشن ہوگئی۔ یہ روشنی نیچے سے آرہی تھی۔ میں نے نازو کا ہاتھ تھاما اور پلٹ کے جاتا لیکن بھاگ کر چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ زینے سے کوئی اوپر آرہا تھا۔

میں نے نازو سے کہا کہ وہ زمین پر لیٹ جائے۔ میں خود بھی لیٹ کر رینگتا ہوا واپس گیا۔ کوئی شخص ٹارچ جلائے بھاری قدموں سے چلتا اوپر آرہا تھا۔ جب اس کا سر زمین سے طلوع ہوا تو میں اس سے کافی دور تھا اور اگر رینگتا ہوا جاتا تو اس تک نہ پہنچ پاتا۔ چنانچہ میں نے پیچھے سے اسے قابو کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاید نازو نے دور سے ہی اندازہ کرلیا تھا کہ مجھے دشواری کا سامنا ہے۔ اس نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا اور وہیں لیٹے لیٹے ہاتھ گھما کے ایک پتھر پھینکا۔ پتھر دیوار پر لگا تو اوپر آتے ہوئے اس شخص نے آواز کی سمت میں دیکھا

www.paksociety.com

اور مجھے اٹھنے کی مہلت مل گئی۔ میرے قدموں کی آہٹ پر وہ ایک دم گھوما۔ سیاہ لباس میں ایک شخص کو مشین گن کے سامنے حملہ آور ہوتا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ مفلوج ہو گیا۔ پھر اس نے اپنی مشین گن اٹھانے اور ٹریگر کھول کے چلانے کی کوشش کی مگر میں نے اسے دبوچ لیا۔ اس کے ہاتھ سے مشین گن چھوٹ گئی۔ آواز نکلنے سے پہلے ہی میرا ہاتھ اس کے حلق پر جم گیا۔ میں نے اس کی گردن کو بغل میں دبا کے ایک جھٹکا دیا تو اس کے قدم اکھڑ گئے۔ میں اسے اپنے ساتھ گھسیٹ کے لے گیا۔ پچھلے کمرے کے کھنڈر میں جا کے میں نے اس کو دیوار کے ساتھ لگا دیا اور ایک پاؤں اٹھا کے گھٹنے سے اس کا پیٹ دبا لیا۔ نازو میرے قریب ٹارچ روشن کیے کھڑی رہی۔ روشنی سیدھی اس کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔

میں نے کہا: "اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس کی ایک ہی صورت ہے۔ ہمیں اپنا نیا آقا مان لو۔"

"تمہارے جیسے ساتھیوں کی گردن ہم مولی گاجر کی طرح توڑ چکے ہیں ایسے" نازو نے کہا اور ایک دلچسپ حرکت کی۔ اس نے وہیں کھنڈر کے ملبے سے ایک پرانا لکڑی کا تختہ اٹھا لیا تھا۔ یہ لکڑی کا تختہ بھی نہیں کسی چوکھٹ کا ایک فٹ لمبا ٹکڑا تھا۔ چھ انچ چوڑا اور تقریباً ایک انچ موٹا۔ نازو نے اسے پورے اعتماد کے ساتھ ایک ہاتھ سے تھاما۔ تھوڑا سا اوپر اچھال کے چھوڑا اور بڑی برق رفتاری سے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی کا کراٹا وار کر کے دو ٹکڑے کر دیا۔

یہ ایک خطرناک مظاہرہ تھا۔ خطرناک اس لیے کہ نازو آؤٹ آف پریکٹس تھی۔ مشق جاری رہے تو آدمی ایک بار دس تختے ہاتھ مار کے توڑنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے مظاہروں کے لیے توازن اور ارتکاز کی ضرورت پڑتی ہے۔ نازو نے یہ مظاہرہ اپنی طاقت سے حریف کو امپریس کرنے کے لیے کیا تھا مگر یہ مظاہرہ ناکام بھی ہو سکتا تھا۔۔۔ وار کے غلط پڑنے سے نازو کی کلائی ٹوٹ سکتی تھی یا اس کا ہاتھ زخمی ہو سکتا تھا لیکن حسنِ اتفاق سے تختہ دو ٹکڑے ہو گیا۔

"تمہاری گردن اس تختے سے زیادہ مضبوط نہیں ہو سکتی" میں نے کہا "اور یہ تو کھیل تھا عورت کے نازک ہاتھوں کا۔ میرا ہاتھ تمہارے سر کو ناریل کی طرح پاش پاش کر دے گا۔" دہشت اس شخص کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا تو میں نے اسے آزاد کر دیا۔

"یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ تم نے آواز نکالی تو خود اپنی موت کو آواز دو گے۔ مدد کرنے والے تمہاری لاش ہی اٹھا سکتے ہیں۔ تمہیں بچا نہیں سکتے" میں نے کہا۔

"تم۔۔۔ کون لوگ ہو؟" اس نے مدراسی لہجے میں اردو کا کباڑا کرتے ہوئے کہا۔

"ہم سوال کریں گے۔ تم جواب دو گے" میں نے کہا۔ "جواب غلط ہوئے تو ذمے داری بھی تمہاری۔ ہم پیشہ ور قاتل ہیں اور بہت بڑے ٹھیکے بھی لیتے ہیں۔ پورے خاندان یا برادری کو صاف کرنا ہو، کسی گروہ کا خاتمہ کرنا ہو۔ تم کس گروہ سے تعلق رکھتے ہو؟"

"کسی۔۔۔ کسی گروہ سے نہیں" وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔

"بیوی بچے تو ہوں گے تمہارے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "ان کی بات مت کرو۔"

میں نے کہا "سوچنا تو پڑتا ہے نا کہ بعد میں ان کا کیا بنے گا۔ بعض لوگ اتنے بے وقوف ہوتے ہیں کہ ہم سے زیادہ چالاک اور بہادر بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود تو مر کھپ جاتے ہیں۔ بیوی خوار ہو جاتی ہے۔ آج کل کون مدد کرتا ہے کسی کی۔۔۔ بے غرض۔"

"خاص طور پر بیوہ کی۔ فوراً آ جاتے ہیں گدھ" نازو نے میری بات کی تائید کی۔

"بچے پھر ماں کی کمائی کھا کے پلتے ہیں" میں نے کہا۔

ہماری باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ "بھگوان کے واسطے دیا کرو مجھ پہ۔ میرے دونوں بچے بہت چھوٹے ہیں۔"

"پھر تو بیوی جوان ہی ہوگی تمہاری" میں نے سوچ کے کہا "بہت برا ہوگا اگر وہ کسی کوٹھے پر۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ ایسی نہیں ہے وہ" وہ دانت سے چلایا۔

"چلاؤ نہیں" میں نے اس کی گردن دبوچ کے کہا۔ "عورت کیسی بھی ہو مجبور ہو جاتی ہے۔ مجبور کر دی جاتی ہے۔ کون مرنے دیتا ہے ایک جوان خوبصورت عورت کو۔"

"اور تم کو اس کا اتنا ہی خیال ہے تو پھر بتاؤ کہ یہاں تم کیا کر رہے ہو؟" نازو نے کہا۔

"میں۔۔۔ مجھے انھوں نے ملازم رکھا ہے۔"

"نام بتاؤ ان کا" نازو بولی۔

"ترلوچن نے۔۔۔ اور اس کے ساتھ جو تین آدمی یہاں آتے ہیں۔ میں ان کے نام نہیں جانتا۔"

"صورت تو دیکھی ہوگی ان کی۔ حلیہ بتاؤ" میں نے کہا۔

اس نے کہا "ایک تو بہت بڑی داڑھی والا ہے۔ اس کا پیٹ بھی بہت بڑا ہے۔ ایک آنکھ میں کچھ فرق ہے۔

ایک پاؤں سے لنگڑا کے چلتا ہے۔ موٹے فریم کا بھاری شیشوں والا چشمہ لگاتا ہے۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا "بات بات پر ماشاءاللہ، سبحان اللہ کہتا ہے۔"

اس کا چونکنا دلیل بن گیا کہ میں نے جو تیر اندھیرے سے چلایا تھا وہ نشانے پر لگا ہے "ہاں۔ تم جانتے ہو اسے؟"

"میں نے کہا تھا کہ سوال مت کرنا" میں نے غرا کے کہا۔ "دوسرے کا حلیہ بتاؤ۔"

"دوسرا کوئی نیگرو ہے۔ کالا۔ چوڑی ناک والا۔ سر کے بال سخت اور مڑے ہوئے۔"

میں نے کہا "کانوں میں پیتل کی بالیاں پہنتا ہے؟"

وہ پھر چونکا "ہاں۔۔۔ اور وہ گونگا ہے۔ بات سن کر سمجھ لیتا ہے مگر جواب اشاروں میں یا پھر لکھ کر دیتا ہے۔"

میں چکر میں پڑ گیا۔ پہلے اس نے حاجی عبداللہ کا حلیہ بیان کیا تھا مگر اس میں ایک بات غلط تھی۔ حاجی عبداللہ کے کسی پاؤں میں لنگ نہیں تھا۔ دوسرا آدمی استاد پیارو کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر وہ گونگا نہیں تھا۔ جب اس نے تیسرے آدمی کی بات کی تو میرے اندازے کے مطابق وہ چوہدری ملاور ثابت ہوا مگر اس کے متعلق بھی ایک بات حقائق کے خلاف تھی۔ اس نے کہا کہ تیسرا شخص اندھا ہے اور ہر وقت گہرے سیاہ رنگ کا چشمہ لگاتا ہے لیکن وہ چھڑی کے بغیر بھی بڑے اعتماد کے ساتھ چلتا ہے۔

میں سمجھ گیا کہ یا تو جانتے بوجھتے یہ شخص حلیے کو غلط کر رہا ہے یا ان تینوں نے اپنی شخصیت کے ظاہری روپ کو بدل رکھا ہے۔

میں نے کہا "تم کچھ غلط بیانی کر رہے ہو۔ ابھی وقت ہے سوچ لو۔ اگر کچھ جھوٹ بکا ہے تو بتا دو۔"

"نہیں۔۔۔ میں نے سب ٹھیک ٹھیک بتایا ہے۔ بھگوان کی سوگند کھا کے کہتا ہوں میں" وہ گڑگڑانے لگا۔

"اچھا۔۔۔ جھوٹ سچ سامنے آ جائے گا تمہارے۔ یہ بتاؤ کہ یہاں تمہارا کیا کام ہے؟"

"جو سب چوکیدار رکھا ہے جزیرے کے ساحل پہ پہرا دینا" اس نے کہا "ہم چوکیدار ہیں۔"

"جزیرہ ان چاروں میں سے کسی کے باپ کا نہیں۔ انھوں نے یہاں پہرا کیوں بٹھا رکھا ہے؟" میں نے کہا۔

"جب مال آتا ہے تو خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ادھر کوئی کن ٹٹا نہ آئے۔ کبھی کبھی لوگ ایسے ہی سیر کرنے آ جاتے ہیں یا کسی کو ساتھ لے کر" اس نے نازو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں سمجھ گیا۔ یہ مال کیا ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

وہ نفی میں سر ہلانے لگا "جب مال آتا ہے تو ہم ادھر نہیں جا سکتے۔ جہاز سے مال اتارنے والے دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔"

"تم نے کبھی معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی؟"

"نہیں۔ ہم کو سیٹھ ترلوچن نے سمجھا دیا تھا کہ فالتو بات کوئی نہیں کرے گا۔ فالتو کام کوئی نہیں کرے گا۔ مطلب یہ کہ زبان بند رکھو اور اپنا کام کرو۔ سب ترلوچن سے ڈرتے ہیں۔ آپس میں بھی بات نہیں کرتے اور ادھر ادھر نہیں جاتے۔ سب کا اپنا اپنا علاقہ ہے۔ وہیں گھوم پھر کے دیکھتے رہتے ہیں۔"

"جو مال یہاں آتا ہے وہ یہاں سے کہاں جاتا ہے؟"

"ہم کیا بتائیں۔ ہم سب دور رہتے ہیں۔"

"اچھا یہ مال جاتا کیسے ہے؟ لانچوں پر؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "ایک رات میں مال اتارا جاتا ہے۔ دوسری رات لانچیں بھر بھر کے کہیں بھیج دیا جاتا ہے۔ دو دن سیٹھ لوگ بھی یہاں رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ اور بھی بہت سے ہوتے ہیں۔"

"کیا آج یہاں مال نہیں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "پرسوں گیا ہے مال۔ اب پھر کوئی جہاز آئے گا پندرہ دن بعد۔ یا ایک مہینے بعد۔"

"گویا ابھی سیٹھ لوگ یہاں نہیں ہیں؟"

"آج آئے تھے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے واپس گئے ہیں۔ سیٹھ ترلوچن کی لانچ میں آئے تھے اسی کے ساتھ چلے گئے۔"

"دو گھنٹے پہلے یعنی بارہ بجے تک وہ سب یہاں تھے" میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "کیا کر رہے تھے وہ لوگ؟"

"نہیں معلوم۔ شاید کسی جہاز کا انتظار۔"

"مگر تم نے کہا ہے کہ جہاز تو پرسوں ہی خالی ہوا ہے اور اب پندرہ دن بعد ہی آئے گا۔ کہیں وہ ہمارا انتظار تو نہیں کر رہے تھے؟"

"نہیں معلوم" اس نے سر ہلا کے کہا۔

"اچھا۔ تم پیچھے سے آئے تھے۔ نیچے کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"کمرے ہیں" اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا۔

"اندر یہ موٹر کہاں چل رہی ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ موٹر نہیں ہے۔ جنریٹر ہے" وہ بولا "بجلی کے لیے۔"

"اندر کتنے لوگ ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں؟"

"دو خاص آدمی پچھلے کمرے میں رہتے ہیں" وہ بولا۔

www.paksociety.com

"آگے کیا ہے، یہ وہی جانتے ہیں۔ ہم آگے نہیں جا سکتے۔"

میں نے کہا: "تم نے کبھی اندازہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ آخر اندر کیا ہو سکتا ہے؟ کوئی مال، خزانہ، اسلحہ یا سونا، ہیرے جواہرات، اسمگل کی ہوئی شراب۔ تم نے کچھ تو آتے جاتے دیکھا ہوگا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے ایسی کوئی بھی چیز آتے جاتے نہیں دیکھی۔"

"کسی اور سے بھی کچھ نہیں سنا؟"

"میں نے بتایا ہے کہ ہم آپس میں ایسی کوئی بات نہیں کر سکتے۔ سب ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں کہ وہ مالکوں کا مخبر نہ ہو۔"

"تم نے کہا تھا کہ چھ آدمی ساحل کی حفاظت کرتے ہیں۔ دو ہم نے ابھی کچھ دیر پہلے ٹھکانے لگا دیے۔ تیسرے تم ہو۔ باقی تین کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"اپنے اپنے علاقے میں ہوں گے۔"

"تمہارا علاقہ کون سا ہے؟" میں نے کہا۔

نازو نے اس کے جواب دینے سے پہلے کہا: "یہ علاقہ تمہارا نہیں ہو سکتا۔ یہاں تو دو آدمی پہلے سے موجود تھے۔ کیا تم اپنی ڈیوٹی چھوڑ کے آئے تھے؟"

نازو نے اچھا سوال کیا تھا۔ میں نے کہا: "اور اگر ایسا ہی ہے تو یہ بھی بتاؤ کہ ایسا کیا ضروری کام تھا جس کی وجہ سے تم کو ڈیوٹی چھوڑ کے آنا پڑا؟"

وہ بدحواس نظر آنے لگا: "کسی کی ڈیوٹی کسی خاص علاقے تک محدود نہیں رہتی۔ چاروں طرف سے ساحل کی کل لمبائی تین میل کے قریب ہے۔ ہم چار چار فرلانگ کے فاصلے پر چلتے رہتے ہیں۔ ایک ہی سمت میں۔"

میں نے اس کے منہ پر لات ماری۔ وہ پیچھے جا گرا اور منہ پہ ہاتھ رکھ کے بلبلانے لگا۔

میں نے کہا: "اپنی آواز کو خود روک لو۔ ورنہ میں تمہاری آواز کا یہ راستہ ہمیشہ کے لیے بند کر دوں گا۔" میں نے اس کی گردن کو دبایا۔

نازو نے کہا: "تم نے جھوٹ بولا تھا۔ یہ غلطی بہت کرتا ہے۔"

میں نے کہا: "تم سب الگ الگ ڈیوٹی نہیں دیتے اور چار چار فرلانگ کا فاصلہ درمیان رکھ کے گشت نہیں کرتے۔ وہ دونوں بھی ایک ساتھ ہی ملے تھے جو ایک ساتھ مارے گئے۔"

"وہ۔۔ بات یہ ہے۔۔۔ کہ جب خطرہ نہ ہو۔۔۔ تو سب تھوڑا سا آرام کر لیتے ہیں اور گپ شپ کر لیتے ہیں۔ پہروں کا

مال گیا ہے جو ایک دن پہلے جہاز سے اتارا گیا تھا۔ ٹرک بھی چلے گئے ہیں۔ ابھی دس پندرہ دن ایسے ہی گزریں گے۔ کوئی خاص کام نہیں ہوگا۔"

"چنانچہ تم یہاں ایسے ہی آ گئے تھے تفریح اور گپ شپ کے لیے۔ کیا باقی لوگ بھی آرام کر رہے ہیں، گشت موقوف کر کے؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "شاید۔۔۔ کچھ تو کر رہے ہوں گے۔"

"پیچھے جو خاص آدمی ہیں، ان کا کام بھی خاص ہے جو تم نہیں جانتے۔ پھر ان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ تم کیوں ملنے گئے تھے ان سے؟" میں نے کہا۔

"میں۔۔ شراب کی ایک بوتل مانگنے گیا تھا۔" وہ کچھ سوچ کے بولا۔ "انھوں نے انکار کر دیا۔ بے عزت کر دیا مجھے۔ اور کہا کہ جاؤ ڈیوٹی پر، ورنہ شکایت کر دیں گے۔ وہ خود پی رہے تھے۔"

میں نے کہا: "یعنی شراب کے نشے میں انھوں نے تم کو دھتکار دیا۔ نشے میں نہ ہوتے تو ایک بوتل تمھیں بطور خیرات کر دیتے۔"

"پہلے دیتے رہے تھے۔ مفت کی جو ملتی ہے انھیں۔"

"اچھا۔ تم اب کہاں جاؤ گے؟ اگر ہم تمھیں چھوڑ دیں؟"

"میں۔۔ واپس۔۔ دیکھوں گا کہ باقی سب کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ ہم نے پروگرام بنایا تھا رات بھر تاش کھیلنے کا۔ میں نے کہا تھا کہ ایک بوتل لے آؤں گا۔ وہ سب انتظار کر رہے ہوں گے۔" وہ بولا۔

میں نے کہا: "اچھا، اب تم پھر جاؤ۔ ان سے جھگڑو اور کہو کہ تمھیں شراب نہ ملی تو تم بھی ان کی شکایت کر دو گے۔" میں نے کہا۔

"وہ۔۔ گولی مار دیں گے مجھے۔" وہ خوفزدہ ہو کے بولا۔

"تمھارے پیچھے ہم ہوں گے۔ ہم انھیں ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ تم دروازہ کھلوا سکتے ہو، ہم نہیں کھلوا سکتے۔" میں نے کہا۔ "وہ مشتعل ہوں گے تو ایک دم گولی نہیں ماریں گے۔ پہلے وہ تمھیں گالیاں اور دھکے دے کر نکالنے کی کوشش کریں گے۔ اس وقت ان کا دھیان اپنے اسلحے کی طرف نہیں ہوگا اور تم سے جھگڑتے ہوئے ان کی توجہ دروازے کی طرف نہیں ہوگی۔ ہم موقع سے فائدہ اٹھائیں گے اور ایک دم اندر آ جائیں گے۔"

"لیکن۔۔ کیا کرو گے تم اندر جا کے؟"

میں نے اس کے منہ پہ الٹے ہاتھ سے چانٹا مارا۔ "پھر سوال کیا تم نے۔ احمق۔ وہی کرو جو ہم کہیں۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو۔ ورنہ۔۔" میں نے اسے ایک دم اٹھا لیا۔ تھوڑا سا اوپر نیچے، دائیں بائیں کیا۔ گھمایا پھرایا اور فرش پر پھینک دیا۔ اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا اور سہمی سہمی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"میں تم کو دیوار پر دے مارتا تو تمھاری ایک ہڈی سلامت نہ رہتی۔" میں نے کہا۔

"میں۔۔۔ میں جانتا ہوں۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

میں اور نازو اس کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہے۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں مشین گن فائر کے لیے بالکل تیار تھی۔ نیچے جانے والا راستہ باقی عمارت کی خستہ حالی کو دیکھتے ہوئے بہت صاف ستھرا نظر آتا تھا۔ ہر زینہ بالکل نئی حالت میں تھا اور زینے کے دونوں جانب دیوار پر رنگ بھی کیا گیا تھا۔ آٹھ دس سیڑھیاں نیچے ایک موڑ تھا جہاں سیڑھیوں کے دونوں حصوں کو روشن رکھنے کے لیے لائٹ لگا دی گئی تھی۔ یہ دھیما شیڈ والی لائٹ تھی اور بلب بھی بڑا نہیں تھا۔ چنانچہ اس کا اجالا اوپر کے حصے میں صرف اتنا ہی تھا کہ اندھیرا نہیں رہا تھا اور راستہ صاف دکھائی دیتا تھا۔

موڑ تک ہم ساتھ رہے۔ پھر میں نے جھانک کر دیکھا تو مجھے صرف چار سیڑھیوں کے بعد ایک بند دروازہ نظر آیا۔ یہ شیشم کی لکڑی کا بہت مضبوط اور بالکل نیا دروازہ تھا۔ جو نئے حالات کے تقاضے پورے کرنے کے لیے خاص طور پر نصب کیا گیا تھا۔ یعنی دروازے پہ ایک کیمرا نصب تھا اور اس کے پیچھے سرچ لائٹ تھی۔ یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ جب کوئی دروازے پر دستک دیتا ہوگا تو سرچ لائٹ براہ راست اس پر پڑتی ہوگی اور کیمرا آنے والے کی واضح تصویر اندر پہنچا دیتا ہوگا۔ ہمارے لیے اس حد سے آگے جانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

"کیا میں جاؤں؟" پہرے دار نے کہا۔

"ایک منٹ رکو۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کہیں یہ ایکشن فیل نہ ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "فرض کرو انھوں نے جھگڑا نہ کیا۔ لیکن کوئی شخص کیا کرے گا؟ اس کی پیش گوئی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ اس کے برعکس بھی کر سکتا ہے۔ اگر انھوں نے تمھیں شراب کی بوتل تھما دی تو تمھیں خاموشی سے واپس آنا پڑے گا۔ یا انھوں نے دروازہ بند کر کے تمھیں اندر بلا لیا اور مارنا شروع کر دیا تو ہم یہ دروازہ کیسے کھلوائیں گے۔ ہم نے باہر سے فائرنگ کی تو وہ اندر سے اس کا جواب دیں گے۔ ان کے پاس وائرلیس یا ٹیلی فون تو ضرور ہوگا۔"

"وائرلیس سیٹ ہے۔ اس پر وہ کسی بھی وقت رپورٹ دے سکتے

بات کر سکتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "پھر تو سارا معاملہ الٹا ہمارے گلے پڑ جائے گا۔"

"تم لوگ آخر چاہتے کیا ہو؟"

اس بار سوال کرنے کے جرم کی سزا اسے چانٹے کی صورت میں نہیں ملی۔ میں نے کہا: "ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ اندر ایسی کیا چیز ہے جس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اندر لڑکیاں تو نہیں ہیں؟"

"لڑکیاں؟" وہ پھر چونک سا گیا۔

"ہاں۔ جو برآمد کی جاتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایکسپورٹ سے پہلے انھیں یہاں جمع تو نہیں کیا جاتا؟"

وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا: "ایسی کوئی بات ہوتی تو سب کو معلوم ہوتی۔"

میں نے کہا: "خیر ہم دیکھ لیں گے۔ اب تم یوں کرو کہ اس دروازے پر دستک دو۔" پھر میں نے نازو کی طرف دیکھا: "تم یہ مشین گن مجھے دو۔ میں اوپر جاتا ہوں۔ تم یہاں رک کے دروازہ کھلنے کا انتظار کرو۔"

نازو نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا: "اور پھر؟"

"پھر فائدہ اٹھاؤ اپنے عورت ہونے کا۔ جیسے ہی دروازہ کھلے، تم چیخ مار کے اوپر بھاگو، جیسے تم اس کی گرفت سے نکل کے بھاگی ہو۔ یہ تمہارے پیچھے بھاگے گا تمھیں پکڑنے کے لیے۔ مجھے یقین ہے کہ پھر یہ دروازہ بند کر کے نہیں بیٹھ سکتے۔ وہ بھی تمہارے پیچھے اوپر آئیں گے۔"

نازو نے سر ہلایا اور مشین گن مجھے تھما دی: "میں اس جگہ بھی نمٹ سکتی ہوں ان سے۔"

"کیا ضرورت ہے رسک مول لینے کی۔ وہ اوپر آ گئے تو ہم آسانی سے نمٹ لیں گے۔" میں نے کہا۔ پھر میں اس شخص سے مخاطب ہوا: "تم سمجھ گئے ہو نا کہ تمھیں کیا کرنا ہے؟ اس میں ذرا سی بھی غلطی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سب سے پہلے تم مارے جاؤ گے۔"

"میں۔۔۔ ویسا ہی کروں گا۔۔۔ جیسا تم نے کہا۔"

نازو نے کہا: "میں دروازے تک تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ تمہارے دستک دینے تک انتظار کروں گی۔ دروازہ کھلتے ہی میں واپس جاؤں گی چلاتی ہوئی اور تم دروازے کو بھول کے میرے پیچھے آؤ گے مجھے گالیاں دیتے ہوئے۔ جیسی گالیاں چاہو دینا۔ میں برا نہیں مانوں گی۔"

اس نے سر ہلایا: "میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں مگر دیکھو۔ مجھے مارنا نہیں۔ میرے ساتھ دھوکا مت کرنا۔ یہ نہ ہو کہ وہ اوپر آ جائیں تو ان کے ساتھ تم مجھے بھی گولی مار دو۔"

www.paksociety.com

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "ہم جھوٹا وعدہ نہیں کرتے۔ تمھاری جان بخش دی تو بخش دی۔ تم ہماری مدد کر رہے ہو۔ ہم اس کا یہی صلہ دے سکتے ہیں۔"

میں دبے پاؤں اوپر چڑھ گیا لیکن زینے کے آخری حصے سے جھانکتا رہا تاکہ پیچھے کا سارا ڈراما دیکھ سکوں اور سن سکوں۔ مجھے سرنگ جیسے راستے سے ہر آواز صاف سنائی دینے کی امید تھی۔ دروازے پر دستک کی آواز میں نے صاف سنی تھی۔ پھر زینہ ایسے روشن ہو گیا جیسے دن نکل آیا ہو۔

"کون ہے؟" کسی نے غرا کے کہا۔ یہ انسانی آواز اسپیکر سے گزر کر آئی تھی چنانچہ کچھ بدل گئی تھی۔

"ابے۔ یہ تو وہی ہے۔" کسی دوسرے شخص نے درمیان میں مخش گالیاں فٹ کر کے کہا۔

"اب کیا مصیبت ہے؟ تو دفع نہیں ہوا ابھی تک۔"

اسی وقت نازو نے چیخ ماری۔ "چھوڑ۔ چھوڑ مجھے کمینے!" وہ پیر زور زور سے نیچے مارتے ہوئے بھاگی۔

"ٹھہر۔ جاتی کہاں ہے تیری تو..." وہ گالیاں بکتا ہوا نازو کے پیچھے لپکا۔

"یہ۔ کسی چھوکری کو لایا تھا؟" کسی نے چلا کے کہا۔ اور دروازہ کھول دیا۔

"اسی لیے بار بار شراب مانگنے آ رہا تھا۔" دوسرا بولا اور باہر آ گیا۔ "اوئے۔ ٹھہرو تم دونوں۔"

پیچھے والے شخص نے کہا۔ "پکڑ لے دونوں کو۔"

میں پیچھے ہٹ گیا تھا۔ آگے نازو اور اس کے پیچھے وہ شخص اوپر آ گیا جو اسے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے تعاقب میں دونوں خاص آدمی دوڑتے ہوئے آئے۔ میں نے مشین گن نازو کی طرف اچھال دی جسے اس نے سائڈ میں رہتے ہوئے کیچ کر لیا۔ ابھی پیچھے آنے والوں کا سر ہی نمودار ہوا تھا کہ زینے کے دونوں جانب سے میں نے اور نازو نے مشین گن کا بٹ مار کے انھیں واپس لڑھکا دیا۔ وار بڑی عجلت میں کیا گیا تھا اور بھرپور تھا۔ ان دونوں کے حلق سے بھیانک چیخ نکلی۔ ان کے سر پھٹ گئے تھے۔ جب وہ پلٹ کے گرے تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ وہ لپٹے خون سے سیڑھیوں کو رنگتے ہوئے واپس گئے۔ اردگرد کی دیواریں بھی ان کے لہو کے چھینٹوں سے داغدار ہو گئیں۔ انھیں دھوکا دے کر اوپر بلانے والا انتہائی دہشت کے ساتھ یہ منظر دیکھتا رہا۔

دونوں خاص آدمی زینے کے موڑ پر یوں رکے تھے کہ ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے تھے اور تڑپتے ہوئے ایک دوسرے کو ہی نوچ رہے تھے۔ سرچ لائٹ کی تیز روشنی میں ان کے سر سے بہنے والا تازہ خون چمک رہا تھا اور قرمزی نظر آتا تھا۔ میں نے پیچھے جا کے اپنا ریوالور نکالا اور ایک ایک فائر سے دونوں کے سر اڑا دیے۔ وہ تڑپ کر ایک دوسرے میں گھس گئے اور پھر بے ہنگم بدصورت مشکل خونی ڈھیر کی صورت میں ساکت ہو گئے۔ زینے کا کونا لہو سے سرخ ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ اب راستہ صاف ہے لیکن پہلے فائر کے ساتھ ہی ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ اندر ایک الارم بجنے لگا۔ اس کی آواز زیادہ تیز نہیں تھی لیکن جو الارم باہر شور کرنے لگے تھے، ان کی آواز اس سائرن سے کم نہ تھی جو ہوائی حملے کے وقت بجائے جاتے ہیں۔ یہ آوازیں قریب سے بھی آ رہی تھیں اور دور سے بھی۔ چنانچہ ایسا لگتا تھا کہ یہ ایک ہی آواز ہے جس کی بازگشت فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔

میں نے ریوالور کا رخ اس شخص کی طرف کیا۔ "یہ کیا ہے؟ تم نے ہمیں یہ کیوں نہیں بتایا تھا؟"

"مجھے... مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔" وہ چلانے لگا۔

"جھوٹ بکتے ہو تم۔ تم نے دھوکا دیا ہمیں۔"

"اگر مجھے دھوکا دینا ہوتا۔ تو میں تم سے بالکل تعاون نہ کرتا۔ یہ سب نہ بتاتا تمھیں جو مجھے معلوم تھا۔ مجھے مت مارو۔" وہ تھر تھر کانپتے ہوئے دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔

"اچھا جاؤ۔ بھاگ جاؤ جتنی دور جا سکتے ہو چلے جاؤ۔" میں نے کہا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین آ گیا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ یہ کوئی خودکار نظام تھا جس کے بارے میں وہ کوئی معلومات نہیں رکھتا تھا۔

جب وہ بھاگ گیا تو میں نے نازو کی طرف دیکھا۔ "غالباً یہ الارم اس فائر کی آواز پر اسٹارٹ ہوئے۔"

"اب یہاں سے نکلنے کی کرو۔ یہ الارم کسی نہ کسی کو متوجہ کرنے کے لیے لگائے گئے ہوں گے۔" نازو نے کہا۔ "ممکن ہے وائرلیس پر اس آواز کو تریلوچن بھی سن رہا ہو۔"

میں نے نازو کا ہاتھ پکڑا اور لاشوں کے اوپر سے چھلانگ لگا گیا۔ شیشم کی مضبوط لکڑی کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ اس کے اندر مجھے لوہے کی وہ گرل نظر آئی جو سمٹ جاتی ہے اور پھیل جاتی ہے۔ ہم نے اچھا کیا کہ چالاکی سے دروازہ کھلوا لیا اور اندر موجود چاروں محافظوں کو باہر بلا کے مار دیا۔ اگر ہم طاقت استعمال کرتے تو لکڑی کے دروازے کو گولیوں سے چھلنی کر کے توڑ سکتے تھے۔ لوہے کی گرل سے ہم پھر بھی نہ گزر پاتے۔

وہ بالکل ویسی ہی خواب گاہ تھی جیسی اوپر بنائی گئی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس میں عقبی کھڑکی شمال کی جانب کھلتی تھی۔ یہ کھڑکی بند نہیں تھی۔ اس میں سے میں نے سمندر کو بہت قریب دیکھا۔ غور کرنے پر نقشہ میری سمجھ میں آ گیا۔ اوپر والی خواب گاہ کسی بلند چٹان پر تعمیر ہوئی تھیں۔ محل کا یہ دوسرا حصہ اتنا نیچا تھا کہ سیڑھیاں اتر کے آنا پڑتا تھا لیکن یہ تہ خانہ نہیں تھا۔

اس کمرے کی دیواروں کی حالت بہت اچھی تھی۔ اگر سمندر نے محل پر یلغار نہ کی ہوتی تو شاید ہر خواب گاہ ایسی ہی نظر آتی۔ یہ ایک بے سروپا خیال تھا۔ سمندر اس شہر کو برباد نہ کرتا تو اس خواب گاہ میں سکندرا اور نازو کیوں آتے۔ یہاں کوئی کروڑ پتی اور ارب پتی ہوتا اور اس کی شب خواب ہوتی اور خواب گاہ بھی ایسی کہاں ہوتی۔ اس سے ہزار درجہ بہتر طور پر آراستہ ہوتی۔

کمرے میں آمنے سامنے دو بیڈ لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف پرانا صوفہ سیٹ پڑا ہوا تھا اور درمیان میں پرانی سینٹر ٹیبل تھی جس پر تاش کے پتے اور نوٹ نظر آ رہے تھے۔ دونوں خاص آدمی شغل مے کے ساتھ دل بہلانے کے لیے تاش کھیل رہے تھے اور تاش کے کھیل کو بھی سنسنی خیز بنانے کے لیے پیسے لگا کے کھیل رہے تھے۔ شراب کے خالی گلاس فرش کے گھسے ہوئے قالین پر اوندھے پڑے تھے۔ جنریٹر کی آواز اب زیادہ ہو گئی تھی اور شاید ساتھ والے کسی کمرے سے آ رہی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ لگی ہوئی میز پر مجھے وائرلیس سیٹ نظر آیا۔ اس کی ایک سرخ روشن آنکھ یہ بتاتی تھی کہ سیٹ آن ہے اور کسی سے اس کا مواصلاتی رابطہ قائم ہے۔ الارم کی آواز اسی ٹرانسمیٹر کے اسپیکر سے نکل رہی تھی۔ میں نے اس کو آف کرنے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔ اس کے ساتھ ہی باہر والے الارم بھی خاموش ہو گئے۔

"میرا اندازہ درست تھا۔ یہ خودکار الارم ہے۔" میں نے کہا۔ "یا تو دھماکے سے پیدا ہونے والے ارتعاش نے اسے چالو کر دیا۔ یا بارود کی بو نے۔"

"میرا خیال ہے کہ تریلوچن کو ضرور معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔" نازو نے کہا۔

"وہ اتنی جلدی یہاں نہیں آ سکتا۔" میں نے کہا۔

"کوئی اور تو آ سکتا ہے۔ آخر جزیرے پر یہ الارم کیوں نصب تھے؟ سب کا ایک ہی کنٹرول تھا۔" نازو نے کہا۔

"جزیرے پر اب چار محافظ ہیں۔ ان میں سے ایک جان بچا کے فرار ہوا ہے۔ باقی تین کو اطلاع مل گئی ہوگی تو وہ ضرور آئیں گے۔"

"یہ ہو سکتا ہے سکندر کہ... ان لوگوں نے حفاظت کے غیر معمولی انتظامات کر رکھے ہوں جن کا اس چوکیدار کو پتا نہ ہو۔ جیسے اس کو ایمرجنسی الارم کا پتا نہیں تھا۔"

"تم بلا وجہ پریشان ہو۔ یہاں وہ اپنی فوج کو چھپا کے تو رکھنے سے رہے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے یہ الارم سسٹم اس وقت کے لیے ہو جب کوئی جہاز لنگر انداز ہو اور اس پر سے اسباب اتارا جا رہا ہو۔ فی الحال کوئی جہاز نہیں آ رہا ہے۔"

"پھر وہ آج یہاں کیوں موجود تھے؟"

"وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "تریلوچن نے ہم سب کو کسٹم کی لانچ میں روانہ کرنے کا پکا بندوبست کر لیا تھا۔ وہ تو ہماری قسمت تھی کہ ہم بچ کر فرار ہو گئے۔ مگر تریلوچن نے تو چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کو خوشخبری بھی دے دی ہوگی کہ تمھارے مہمان آنے ہی والے ہیں۔ وہ آدھی رات تک راہ دیکھتے رہے اور مایوس ہو کے لوٹ گئے۔ اب تک انھیں پوری رپورٹ مل چکی ہوگی۔"

"اچھا چلو اندر بھی تو دیکھو۔" وہ بولی۔ "ممکن ہے وہ بھی یہیں قید ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "انھیں وہ ساتھ ہی لائے ہوں گے اور جاتے وقت ساتھ لے گئے ہوں گے۔ وہ ان کو یہاں قید رکھنے کا رسک نہیں لیں گے۔"

"رسک کیا ہے؟" نازو نے درمیانی دروازے کا پردہ ہٹا کے کہا۔ "انھیں تو یقین ہوگا کہ ہم یہاں پہنچ ہی نہیں سکتے اور آ بھی گئے تو ساحل پر قدم رکھنے سے پہلے ہی مارے جائیں گے۔ یہ جو محافظ مشین گن لے کر چاروں طرف سے ساحل کی نگرانی کر رہے ہیں یہ اسی لیے ہے کہ ہم یہاں نہ آئیں۔"

"مگر ہم آ گئے ہیں اس طرف سے جدھر سے ان کو بالکل امید نہیں ہوگی کہ ادھر سے آنے والا زندہ سلامت کنارے پر اتر سکتا ہے۔ پھر یہ کہ محافظ کچھ ڈھیلے تھے اور ہم کسی نہ کسی طرح اس جگہ تک آ پہنچے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ جنریٹر کی آواز تو اسی کمرے میں سے سنائی دے رہی ہے۔ اس دروازے کو کیسے کھولیں؟"

"اس کے قفل کی چابی تو ہوگی۔" نازو نے کہا۔ "لیکن اسے تلاش کرنا مشکل کام ہے۔ یا تو ان کی جیب میں ہوگی۔ جو زینے میں پڑے ہیں یا پھر اسی کمرے میں کہیں۔ ہم توڑ نہیں سکتے؟"

میں نے کہا۔ "بی بی۔ میں آدمی ہوں۔ ٹارزن نہیں۔"

"چلو گولی سے اڑا دو۔" نازو نے کہا۔ "اس طرح یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ الارم کیا واقعی فائر کرنے سے آن ہو جاتا ہے؟"

"پہلے میں وائرلیس سیٹ کو لنگڑا دوں۔" میں نے کہا۔

ابھی میں نے تار لگایا ہی نہیں تھا کہ اندر کی ہر لائٹ آف ہو گئی اور یکلخت فضا پر بوجھل سکوت کا تسلط ہو گیا۔

www.paksociety.com

"جنریٹر بند ہو گیا۔" میں نے کہا۔

"جنریٹر مسلسل نہیں چل سکتے۔" نازو نے ٹارچ روشن کی۔ "ان کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ کبھی فیول ختم ہو جاتا ہے، کبھی پلگ شارٹ ہو جاتا ہے۔ ایسا پہلے بھی ہوتا ہوگا۔"

"اگر یہی دونوں جنریٹر کو چلانے کے ذمے دار بھی تھے تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔ "اندھیرا ہی رہے گا یہاں۔"

اسی وقت جنریٹر چند سیکنڈ کے لیے بولا، لائٹ آئی اور ایک جھلک دکھا کے غائب ہو گئی۔

"اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اندر کوئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ کوئی جنریٹر کو پھر چلا رہا ہے۔ انتظار کرو۔"

جنریٹر دوسری بار اسٹارٹ ہو گیا۔ کمرے کی ہر لائٹ پھر جل اٹھی۔ اس غیر متوقع صورتِ حال نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔

"آخر کون ہے اندر؟ اور وہ الارم سننے کے باوجود باہر کیوں نہیں آیا؟" میں نے کہا۔ "اگر وہ چل پھر سکتا ہے تو اندر سے دروازہ بھی کھول سکتا ہے۔"

"کیا میں دستک دے کر بلاؤں؟" نازو نے کہا۔

میں مشین گن لے کر ایک دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ "بلاؤ۔" میں نے کہا۔ "اس سے بھی نمٹ لیں گے۔"

نازو نے دروازے کو ہاتھ سے بجایا۔ ایک بار، دوسری بار، تیسری بار۔ کوئی بھی دروازہ کھولنے نہیں آیا۔ کسی نے اندر سے دستک دینے والے سے کوئی سوال بھی نہیں کیا۔

"کیا تم یہ آواز سن رہے ہو؟" نازو نے اچانک کہا۔

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ "یہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہ ہیلی کاپٹر کی آواز ہے۔"

"جلدی کرو۔ کہیں یہ وہی لوگ نہ ہوں۔" نازو نے کہا۔

"کیا کروں؟ اچھا ہٹ جاؤ۔ میں تالے کو اڑاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

نازو نے پیچھے ہٹ کر وائرلیس ٹرانسمیٹر کا پلگ لگا دیا۔ میں نے نشانہ لے کر گولی چلائی۔ الارم ایک دم چلّانے لگا۔ نازو نے گھبرا کے پلگ نکال دیا۔ میرا یہ خیال درست ثابت ہوا تھا کہ خودکار الارم فائر کی آواز سے آن ہوتا ہے۔ تالا ابھی ٹوٹا نہیں تھا۔ میں نے نازو سے کہا کہ پھر ٹرانسمیٹر کو آن کرے۔ دوسرے فائر سے تالا ٹوٹ گیا۔ الارم پھر شور کرنے لگا۔ میں نے اس پر ریوالور کی باقی گولیاں خالی کر دیں۔ ٹرانسمیٹر کے اندر کی ساری مشینری ٹوٹ پھوٹ گئی۔ تار شارٹ ہونے سے چنگاریاں اڑیں اور کمرے میں تار جلنے کی بو پھیل گئی۔ سائرن اور الارم ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔

ہیلی کاپٹر کی آواز اب بہت صاف سنائی دے رہی تھی۔ نازو نے ہینڈل گھمایا تو ہینڈل اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے دروازے کو لات ماری۔ دروازے کا پٹ چوکھٹ سے جدا ہو گیا۔ میں نے اندر ایک اور کمرا دیکھا۔ کمرے میں ایک ہی بلب روشن تھا۔ اس کے آسیب زدہ اُجالے میں مجھے سامنے کی دیوار میں ایک کھڑکی سی نظر آئی۔ دو فٹ چوڑے اور ایک فٹ اونچے چوکھٹے میں کالے رنگ کا شیشہ فٹ کیا گیا تھا۔ میں نے قریب جا کے دوسری طرف کا منظر دیکھنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ اس پوری دیوار میں یہی ایک روشندان سا تھا۔

"کیا ہے ادھر؟" نازو نے کہا۔

"پتا نہیں۔ ایسے کچھ دکھائی نہیں دیتا لیکن مجھے یقین ہے جنریٹر اس کمرے میں بھی نہیں ہے تو اُدھر ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ کھڑکی کھلتی نہیں ہے؟"

"مجھے تو ہر طرف سے بند دکھائی دیتی ہے اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ پلیٹ گلاس ہے۔ یا پھر بلٹ پروف شیشہ۔" میں نے کہا۔ "اسے توڑنا بھی آسان نہیں۔"

نازو نے شیشے پر دستک دی۔ اس کا جواب آیا۔ فوراً کسی نے دوسری طرف سے شیشے کو بجایا۔ نازو کے لیے یہ اتنی غیر متوقع بات تھی کہ وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گئی۔ ایک فوری جذبے کے تحت میں نے آگے بڑھ کر شیشے کو انگلی سے بجانا شروع کیا۔ یہ بہت پرانی بات تھی جب میں نے اور محسن نے مورس کوڈ سیکھا تھا اور اس کی اچھی خاصی پریکٹس بھی کر لی تھی۔ مورس کوڈ نقطوں اور لکیروں کی وہ بین الاقوامی زبان ہے جو وائرلیس سگنل دینے میں کام آتی ہے۔ اس کا سب سے عام استعمال تارگھر میں ہوتا ہے جہاں آپریٹر مسلسل کی دبا کے ٹک ٹک کرتے رہتے ہیں۔ میں اور محسن اس زبان میں پیغام رسانی کے اتنے ماہر ہو گئے تھے کہ پنسل سے میز بجا کے کوئی بات کر لیتے تھے اور میز کے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ کچھ بھی نہیں سمجھ پاتے تھے۔

دھڑکتے دل کی امیدوں کے ساتھ میں نے انگلی سے شیشہ بجا کے مورس کوڈ میں پوچھا۔ "کیا تم محسن ہو؟" اور اس وقت میرا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا جب جواب میں دوسری طرف سے مورس کوڈ میں جواب ملا۔ "نہیں۔ میں تمہارا باپ ہوں۔" سراب یکلخت حقیقت بن کے سامنے آ گیا تھا۔ میں ذہنی طور پر اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا چنانچہ میں نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ صرف آرزو کا فریب ہے۔ ورنہ درحقیقت مجھے کسی نے بھی میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔

نازو نے میری صورت پر رونما ہونے والے تغیرات سے میری ذہنی و جذباتی کیفیت کا کچھ اندازہ کیا۔ "سکندر! کیا بات ہے؟"

میں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر شیشے کی طرف۔ شیشے نے کہا۔ "کیا ہوا سکندر؟" اور یہ جملہ بھی مورس کوڈ میں ارسال کیا گیا تھا۔ دوسری طرف محسن کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

نازو نے پریشانی سے باہر کی طرف دیکھا۔ "وہ ہیلی کاپٹر۔"

میں نے فرطِ جذبات میں ہکلاتے ہوئے کہا۔ "نازو۔۔۔ ہم۔۔۔ ہم پہنچ گئے۔۔۔ انہیں پا لیا ہم نے۔"

نازو کا چہرہ فرطِ مسرت سے دمکنے لگا۔ "کیا؟ کہاں پا لیا۔ کدھر ہیں وہ۔۔۔؟"

"بے وقوف۔" میں نے کہا۔ "ادھر۔ اس شیشے کے پیچھے محسن کھڑا ہوا ہے۔ شاید غالب بھی ہوگا۔ وہ دونوں انتظار کر رہے ہیں کہ ہم انہیں اس قید سے نکال لیں۔" میں ہنسنے لگا اور پھر رونے لگا۔

"اچھا۔۔۔ یہاں۔" نازو نے شیشے کے ساتھ کان لگا کے کہا۔ "یہاں ہیں وہ؟ محسن۔۔۔ غالب۔۔۔ دیکھو ہم آ گئے۔" وہ شیشے پر ہاتھ مار کے چلانے لگی۔ "تم سن رہے ہو نا۔ جواب دو۔"

میں نے اسے کھینچ کر ایک طرف کیا۔ "تمہاری آواز نہیں سن سکتے وہ۔ ہٹ جاؤ۔ میں پیغام دیتا ہوں انہیں۔"

نازو کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ کانپ رہی تھی۔ "میں۔۔۔ میں بھی سنوں گی۔"

میں نے شیشے پر انگلیوں کی مدد سے پیغام دیا۔ "میں اور نازو تمہیں لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ غالب کو بھی بتا دو۔"

جواب میں شیشے نے کہا۔ کٹ کٹ۔۔۔ کٹا کٹ۔۔۔ کٹا کٹ کٹ کٹ۔ "غالب چلا رہا ہے۔ کیا نازو اس کی آواز نہیں سن رہی ہے؟"

میں نے کہا۔ "شیشے سے دور چلے جاؤ۔ میں اسے گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔ اس کو توڑنا مشکل ہے۔ کیا تم نے یہ بات کھول لی ہے؟ ہاں کہو اور نیچے لیٹ جاؤ۔ میں اوپر کی طرف فائر کروں گا۔"

محسن نے کہا۔ "ہاں۔"

میں نے مشین گن کا رخ شیشے کی طرف کیا اور دس سیکنڈ شمار کیے۔ پھر مشین گن نے آگ اگلی۔ اس کی گولیاں شیشے کے بخیے ادھیڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئیں۔ میں نے اس کے کنارے کاٹ دیے تھے۔ نازو کے ہاتھ سے ٹارچ چھین کر میں نے روشنی اس بے ہنگم خلا سے گزاری۔ دو اجنبی چہرے مجھے درمیانی خلا میں ایک ساتھ نظر آئے جو ایک ساتھ مجھے گھور رہے تھے۔ میں ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ چہرے بیچ کے خلا سے میری طرف بڑھے۔

نازو نے ایک دل دہلا دینے والی چیخ ماری۔ میں نے پھر انہیں ٹارچ جلا کے دیکھا۔ وہ محسن اور غالب ہی تھے۔ مگر ان کی حالت دیکھ کے میرا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ وہ ہڈیوں کے ڈھانچے رہ گئے تھے۔ ان کی آنکھیں گہرے حلقوں کے گڑھوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر کھال کی ہر شکن میں اس تشدد کی داستان تھی جو ان پر قید میں روا رکھا گیا تھا۔ ان کے سر کے اور داڑھی کے بال جھاڑ جھنکار بنے ہوئے تھے اور وہ کسی وحشی انسان کی طرح مجھے بھوکی پُر آسیب خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

آہستہ آہستہ میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ "محسن۔ میری جان۔ غالب۔" میں نے ان کے چہرے کو چھو کے کہا۔ "دیکھو ہم آ گئے۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ آؤ۔ ادھر سے ہی آ جاؤ۔ میں تم کو کھینچ لیتا ہوں۔ دیکھو یہ نازو ہے۔"

ان دونوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اپنے چہرے پر مل رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کے ویران گڑھے آنسوؤں کی بارش سے بھیگ گئے تھے۔ پھر نازو نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور وہ پنجرے میں قید جانور کی طرح اس کے ہاتھ کو بھی چومنے لگے، چاٹنے لگے۔ نازو بھی ان سے کچھ کہتی رہی جو میں نے نہیں سنا۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کیسے رو رہی ہے۔

پھر اچانک مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے نازو کو بڑی سختی سے پیچھے کھینچا۔ "یہ کیا کر رہی ہو تم۔ ہٹ جاؤ۔ میں انہیں نکالتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "رونا دھونا بند کرو۔"

نازو سہم کر پیچھے ہو گئی۔ اس کے ہسٹیریا کا زور وہیں ٹوٹ گیا۔ ورنہ میں اسے بھی سنبھالنے پر مجبور ہوتا۔ ہیلی کاپٹر اب عین ہمارے سر پر آ گیا تھا اور مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس میں کون آیا ہوگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس میں ترلوچن ہی ہوگا۔ اس کے ساتھ باقی سب شکاری ہوں گے۔ ایمرجنسی سگنل ملتے ہی وہ روانہ ہو گئے تھے۔ ان کے پاس اڑ کر آنے کے لیے وسائل تھے چنانچہ وہ کم سے کم وقت میں آ پہنچے تھے۔ انہوں نے ہمیں باہر نکلنے سے پہلے ہی محصور کر لیا تھا۔

میں نے اندر جھانک کر کہا۔ "محسن! کیا اندر کی طرف کوئی اور دروازہ ہے؟"

محسن نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ "ہاں۔ وہ دروازہ ہے مگر اس میں باہر سے بھی قفل ہے اور اندر سے بھی۔ تم کدھر سے آئے تھے؟"

www.paksociety.com

میں نے کہا: "ادھر سے اب راستہ نہیں رہا۔ ہم تمھارے پاس آجاتے ہیں۔ تم یہ جنریٹر بند کر دو۔"

محسن نے کہا: "ہمارے لیے کپڑے لے کر آنا۔"

میں نے نازو کی طرف دیکھا۔ وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی واپس بھاگی۔ پہلے بیڈ روم میں جہاں وہ محافظ خاص رہتے تھے، ان کے استعمال کے کپڑے مل سکتے تھے ورنہ بیڈ کی چادریں تھیں۔ نازو کے واپس آنے سے پہلے ہی میں نے تین مشین گنوں کو درمیانی کھڑکی سے اندر پھینک دیا۔ پھر میں نے اپنے ہاتھوں سے کنارے کو تھاما اور اس شگاف میں سے گزر گیا۔ میں نے پہلے اس میں اپنا سر ڈالا، پھر دھڑ کو آگے کھینچتے ہوئے...... اپنے ہاتھ فرش پر لگا دیے۔ ٹانگوں کے نکلتے ہی میں سیدھا کھڑا ہو گیا اور تب مجھے پہلی بار شدید بدبو کا احساس ہوا۔

میں نے خود کو ایک ایسے کمرے میں پایا جس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی اور روشندان نہیں تھا۔ اس کی دیواریں سپاٹ تھیں اور تازہ ہوا یا روشنی صرف اس درز سے اندر آتی تھی جو بند دروازے کے نیچے نظر آ رہی تھی۔ درز مشکل سے تین انچ چوڑی تھی اور اس میں سے ایک ربر کا پائپ اندر آ رہا تھا۔ شاید اسی پائپ سے انھیں پینے کے لیے پانی دیا جاتا ہوگا۔ اسی درز سے انھیں کھانے کو بھی مل جاتا ہوگا۔

میں نے ٹارچ جلا کے دیکھا تو مجھے فرش پر ہر طرف بول و براز کے ڈھیر نظر آئے۔ غالب اور محسن اسی کمرے کو حوائج ضروریہ سے فراغت کے لیے استعمال کرنے پر مجبور تھے اور اسی غلیظ متعفن فضا میں دن رات کے چوبیس گھنٹے گزارتے تھے۔ ان کے عذاب کی سختی کا تصور کر کے میرا دل لرزنے لگا۔

محسن نے کہا: "دن میں تین بار پانی ملتا تھا۔ تھوڑا تھوڑا ہم دونوں پی لیتے تھے۔"

غالب نے کہا: "ہر روز ایک سوکھی روٹی ملتی تھی۔"

محسن نے کہا: "اس درز میں سے چوہے اندر آجاتے تھے رات کو۔"

غالب نے کہا: "چیونٹے اور کاکروچ آجاتے تھے۔"

میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے: "خدا کے لیے مجھے مت بتاؤ۔ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں، وہی بہت ہے مجھے پاگل کرنے کے لیے۔"

غالب نے کہا: "ہم تو پاگل نہیں ہوئے۔"

محسن بولا: "ہم نے سوچا کہ اگر ہم نے ہمت ہار دی تو واقعی پاگل ہو جائیں گے۔"

نازو نے چلا کے کہا: "سکندر! یہ کپڑے لو اور مجھے بھی اندر آنا ہے۔ میں خود نہیں آسکتی۔"

میں نے اس سے کپڑے لیے اور محسن کو تھما دیے: "یہ پہن لو جلدی سے۔ پھر میں نازو کو کھینچتا ہوں۔"

نازو نے کہا: "سکندر! وہ لوگ آ رہے ہیں۔ جلدی کرو۔"

میں نے کہا: "اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ۔"

نازو نے ہاتھ اوپر کیے تو میں نے اسے کھینچ لیا۔ وہ پھسلتی ہوئی اندر آئی اور میرے ہاتھوں سے نکل کے فرش پر ٹک گئی۔ محسن اور غالب ابھی کپڑے پہن رہے تھے۔ میں نے ٹارچ کی روشنی دوسری طرف کی۔

نازو نے میرا بازو تھام لیا: "اوہ میرے خدا! ایسے تھے یہ لوگ۔ کیسی بدبو ہے یہاں۔ اس میں چوبیس گھنٹے بند رہتے تھے یہ لوگ۔"

میں نے کہا: "ہاں۔ کیڑوں مکوڑوں اور چوہوں کے ساتھ۔ ایک ایک روٹی کھا کے اور ایک ایک گھونٹ پانی پی کے۔ مگر ان کے حوصلے کو شکست کون دے سکتا تھا!"

"یہ اندھیرا کیوں ہو گیا؟ جنریٹر کیوں بند ہے؟"

"میں نے بند کرا دیا تھا۔" میں نے کہا: "اندھیرا ٹھیک ہے۔ تم یہ مشین گن اٹھا لو۔ ہم دوسری طرف سے باہر جائیں گے۔"

نازو نے مشین گن اٹھا لی: "ہیلی کاپٹر کہیں قریب ہی اتر رہا ہے۔"

میں نے کہا: "تم اس دروازے کو آزماؤ۔ اس کے قبضوں کو نشانہ بناؤ۔ دروازہ گر جائے گا۔ تم غالب اور محسن کے ساتھ باہر نکلو۔ میں اس درمیانی کھڑکی سے انھیں دیکھتا رہوں گا۔ اگر وہ اندر آگئے تو انھیں روکنے کی کوشش بھی کروں گا۔"

"تم ہمارے ساتھ چلو گے؟" نازو نے کہا۔

"ہاں بابا۔ ساتھ ہی چلوں گا۔ تم تو نکلو۔" میں نے کہا۔

نازو نے اندازے سے فائر کیے۔ بند کمرے میں فائر کی آواز بم کے دھماکوں کی طرح سنائی دی۔ پھر دروازہ دوسری طرف جا گرا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ میرے کانوں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سن لی تھیں۔ باہر روشنیاں بھی نظر آنے لگی تھیں۔

"لائٹس کیوں آف ہیں؟" کسی نے چیخ کر کہا۔

کسی اور نے چلا کے کہا: "ان کی تو لاشیں پڑی ہیں۔ دونوں کی؟"

"کیا وہ نکل گئے؟ وہ اتنی جلدی کہاں جا سکتے تھے؟"

زینے میں بیک وقت کئی ٹارچوں کی روشنی ابھر رہی تھی۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو غالب، محسن اور نازو دروازے سے گزر چکے تھے۔ دوسری جانب کے دروازے سے ایک ساتھ بہت سے لوگ اندر آگئے۔ میں نے مشین گن کا ٹریگر دبا دیا۔

پہلے راؤنڈ نے ہی ان سب کو مٹا دیا۔ ایک شخص جو بچ گیا تھا پلٹ کے بھاگا۔ مخالف سمت سے آنے والے دو اور آدمی ٹکرائے۔ مشین گن نے انھیں بھی چھلنی کر دیا۔ اوپر سے آنے والے شور مچاتے واپس ہوئے۔ انھیں غیر متوقع حملے نے بدحواس کر دیا تھا۔

اب میں پلٹ کے بھاگا۔ آخری راؤنڈ کو میں نے جنریٹر پر صرف کر دیا۔ دروازے سے گزرتے ہی میں نے ان تینوں کو دیکھا۔ وہ ایک کھڑکی کھولے میرا انتظار کر رہے تھے۔ نازو نے مجھے ایک مشین گن تھما دی۔ میں نے باری باری ان تینوں کو باہر اتارا۔ پھر خود باہر کود گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ سامنے سے حملہ کرنے والے اب کسی اور سمت سے ہمیں روکنے کی کوشش کریں گے۔

محسن اور غالب ہانپنے لگے تھے۔ ان کی جسمانی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ہمارے ساتھ دوڑ سکتے۔ ہمارے قدموں کے نیچے ریت تھی مگر آگے چٹانیں تھیں اور اس کے بعد سمندر۔ ابھی تک میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس جزیرے سے ہم کیسے فرار ہوں گے جب کہ ہمارے پاس کوئی کشتی تک نہیں...... مجھے سمت کا کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

اچانک محسن گر گیا: "نہیں...... میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ تم جاؤ۔ اپنی جان بچاؤ۔"

میں نے اسے اٹھا لیا: "ہمت سے کام لو محسن۔ ہم مر گئے تو اکٹھے مریں گے۔"

نازو نے غالب کو سہارا دے رکھا تھا اور وہ ابھی تک بڑی ثابت قدمی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے محسن کو ایک طرف سے اپنے کندھے پر لٹکا لیا، پھر دوسرے ہاتھ سے غالب کو پکڑ لیا۔ نازو نے بھی غالب کو کھینچنا شروع کیا اور ہم پلٹ کر دیکھے بغیر آگے چلتے گئے۔ چٹانوں کے پاس پہنچ کے میں نے اپنے پیچھے دیکھا۔ عمارت کی مختلف کھڑکیوں سے تین ٹارچ لائٹس تاریکی میں لکیریں بناتی ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ سمندر ابھی بہت دور تھا۔

"نازو! تم سب یہاں چھپ جاؤ۔" میں نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کیا۔

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" نازو نے کہا۔

"پہلے وہ کرو جو میں نے کہا ہے۔" میں نے دوبارہ کہا اور محسن کے ساتھ غالب کو بھی گھسیٹ کر لے گیا۔ انھیں چٹان کے پیچھے لٹا کے میں نے ایک گہری سانس لی۔ تھکن سے میرا بھی حال خراب ہو رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی چٹان کے آس پاس منڈلانے لگی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم صحیح وقت پر روپوش ہو گئے۔ ورنہ روشنی کے ساتھ ہی گولیوں کی بوچھاڑ آتی اور ہماری جدوجہد یہیں تمام ہو جاتی۔

"دیکھو نازو! ہم اس طرح کبھی جزیرے سے نہیں نکل سکتے۔" میں نے کہا: "محسن اور غالب کی حالت بہت خراب ہے لیکن یہ ٹھیک ہوتے تب بھی سمندر کو عبور کر کے کہیں پہنچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ہمارے پاس صرف وہ لائف جیکٹ ہیں مگر وہ بھی یہاں نہیں ہیں۔ وہاں ہیں جہاں ہم نے بریف کیس چھپایا تھا۔"

"کیا تم اس بریف کیس کو لانے کے لیے جانا چاہتے ہو؟" نازو نے کہا: "لعنت بھیجو۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم سمندر کو تیر کر پار کر جائیں؟" میں نے کہا: "اس حالت میں تو محسن اور غالب کا سمندر تک پہنچنا بھی ناممکن ہے۔ یہ جگہ بہت محفوظ ہے۔ میرا خیال ہے، وہ یہاں نہیں آئیں گے۔ میں انھیں نہیں آنے دوں گا۔"

"تم انھیں کیسے روکو گے؟"

"میں یہاں سے دور جا کے ایک فائر کروں گا اور انھیں ادھر بلا لوں گا۔" میں نے کہا: "ان کے کافی ساتھی ہم نے مار دیے ہیں۔ میرا خیال ہے چھ سات تو کم ہو چکے ہیں۔ ایک ہیلی کاپٹر میں آخر کتنے لوگ آتے ہوں گے؟ زیادہ سے زیادہ دس بارہ۔ ان میں تین چار تو وہی ہوں گے۔ 'ٹریولی'، 'دلاور' اور 'پیڈرو' وغیرہ۔ سات آٹھ مسلح افراد کی فوج یقیناً بہت کافی ہوتی۔ مگر آدھے سے زیادہ تو اپنی بے وقوفی کے باعث پہلے ہی حملے میں مارے گئے۔ باقی بچے ہوں گے دو تین۔"

"اس جزیرے پر بھی چار گارڈ تھے۔"

"انھیں بھی شامل کر لو تو اب زیادہ سے زیادہ چھ سات افراد سے ہمارا مقابلہ ہے۔" میں نے کہا: "اپنی مشین گن اور ریوالور دونوں مجھے دے دو۔ میں انھیں تلاش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ خود ہی میرے سامنے آتے جائیں گے۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں ٹارچ لے کر۔ اس طرح وہ آسانی سے میرا نشانہ بن سکتے ہیں۔ میں چھپ کر ایک ایک کو ٹھکانے لگا دوں گا لیکن میرا اصل مقصد کچھ اور ہے۔ میں ہیلی کاپٹر تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ ابھی مجھے معلوم نہیں کہ ہیلی کاپٹر کہاں ہے مگر جزیرہ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ ہیلی کاپٹر مجھے نظر آجائے گا۔ ٹریولی اور دلاور ہیلی کاپٹر میں ہی ہوں گے۔ وہ چپکے سے اڑنے کا رسک مول نہیں لیں گے۔ پائلٹ بھی وہیں ہوگا۔ اگر میں کسی طرح ہیلی کاپٹر کے قریب پہنچ گیا تو پھر سب کی ایسی تیسی کر دوں گا۔"

"تم ہیلی کاپٹر پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ تم اس کے قریب بھی گئے

www.paksociety.com

تو وہ گولی مار دیں گے تمہیں۔"

"مجھے معلوم ہے، میں دور ہی رہوں گا لیکن ایک بار ہیلی کاپٹر میری نظر میں آگیا تو پھر وہ لوگ اس میں سے نکلنے پر مجبور ہوں گے اور میں دھمکی دوں گا ہیلی کاپٹر کو اڑانے کی۔ اس کے فیول ٹینک پر ایک گولی بھی لگ گئی تو دھماکے سے اس میں آگ لگ جائے گی۔"

"مجھے رشک آتا ہے تمہارے دماغ پر... ایسے حالات میں بھی تم نے کیا زبردست پلان بنایا ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے، تو مجھے تعریف کی نہیں تعاون کی ضرورت ہے۔"

"تعاون کے لیے ہی تو ساتھ آئی تھی میں اور تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی۔" نازو نے کہا۔

"انھیں چھوڑ کر؟"

"وہ یہاں بیٹھے رہیں گے، انھیں کچھ نہیں ہوگا۔" نازو نے کہا۔ "مگر تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو اس میں تمہارا ساتھ دینا زیادہ ضروری ہے۔"

"دیر ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک اکیلا دو گیارہ... تم ساتھ رہو گی تو کچھ بھی نہ کر پاؤں گا۔"

"ایک منٹ، میں ذرا محسن اور غالب کو سمجھا دوں کہ پریشان نہ ہوں۔" نازو نے کہا۔

صبح کے پونے چار بج رہے تھے۔ صبح کا اجالا پھیلنے میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو گھنٹے باقی تھے اور میں اس سے پہلے ہی اپنا کام ختم کر لینا چاہتا تھا۔ اندھیرے میں مجھے جو تحفظ حاصل تھا وہ دن کی روشنی میں باقی نہیں رہتا تھا۔ محسن اور غالب کی رہائی اس مشن کا ایک اہم حصہ تھی لیکن یہ کامیابی اس وقت تک ادھوری تھی جب تک ہم ان کے ساتھ اس جزیرے سے بخیر و عافیت رخصت نہ ہو جاتے۔ ابھی وہ صرف ایک کمرے کی قید سے باہر آئے تھے مگر ہمارے ساتھ اس جزیرے کی حدود میں قید تھے۔

ہیلی کاپٹر کے آنے سے پہلے میرے ذہن میں اس جزیرے سے نکلنے اور درمیان میں حائل بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے بمبئی کے ساحل پر اترنے کا خیال بھی صرف ایک آرزو تھا۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی میرے ذہن میں کوئی واضح صورت نہیں تھی۔ سوچا میں نے بہت کچھ تھا مثلاً یہ کہ دو لائف جیکٹس پہنا کے غالب اور محسن کو سمندر میں ڈال دیا جائے اور وہ تیرتے تیرتے کسی کشتی، لانچ یا بحری جہاز تک پہنچ جائیں۔ میں اور نازو کسی تختے کے سہارے سفر شروع کریں اور موجوں کے تھپیڑے کھاتے بالآخر ساحل پر جا لگیں یا ہمیں بھی کوئی دیکھ لے تو اٹھا لے۔ لائف جیکٹ کا رنگ روشن زرد ہوتا ہے چنانچہ دن اور رات کے وقت بھی زیادہ آسانی سے نظر آجاتا ہے۔ تختے کے سہارے پر سمندر میں لوگوں کے سیکڑوں میل تک جا پہنچنے کی حیرت انگیز داستانیں بھی حقیقت ہیں۔

لائف جیکٹ یا تختے سے اتنا فائدہ ضرور ہو سکتا ہے کہ آدمی ڈوبتا نہیں مگر اس کے ساتھ ہی سفر کی سختی برداشت کرنا بھی ایک شرط ہے۔ محسن اور غالب ویسے ہی جاں بلب تھے۔ لائف جیکٹ پہنا کے سمندر کے سپرد کر دینے کے بعد بھی ان کی بقا کے لیے صرف خدا کی مدد پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ وہ خود بپھری ہوئی موجوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھے۔ سمندر میں شارک سے واسطہ پڑ سکتا تھا اور سامنے آنے والی چٹانوں میں ... یا خطرناک سمندری مخلوق سے واسطہ پڑ جاتا تو ان کی آزادی ہی ان کی موت کا پیغام ثابت ہوتی۔

اب میں ہیلی کاپٹر پر قبضہ کرنے کی سوچ رہا تھا۔ یہ بھی ایک دیوانے کے خواب کی طرح ناممکنات اور مشکلات کا سلسلہ تھا۔ ہیلی کاپٹر پر قبضہ کر کے اس میں محسن اور غالب کو ساتھ لینا، پھر اسے اڑانا اور بمبئی کے کسی ویران ساحل پر بحفاظت اتار دینا، کسی کی نظر میں آئے بغیر یہ سب مرحلے کیسے سر ہوں گے، اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا لیکن میں نے اس کام میں ہاتھ ڈال دیا تھا تو اب اپنے ارادے کو ترک نہیں کر سکتا تھا خواہ ...

میں اور نازو ایک مختصر سا لائحہ عمل طے کرنے کے بعد مخالف سمتوں میں روانہ ہوئے۔ ساحل سے کچھ دور رہتے ہوئے ایک دائرے میں اس کو سفر کرنا تھا۔ دوسرے نصف دائرے میں چل کے مجھے پھر اس سے جا ملنا تھا۔ اس طرح ہم چاروں طرف سے گھوم کے یہ دیکھ سکتے تھے کہ ہیلی کاپٹر کس جگہ سے قریب ہے اور اس کو کس سمت سے سر کرنا بہتر ہوگا۔

جزیرے کی لمبائی اور چوڑائی پونے میل کے لگ بھگ تھی۔ چنانچہ ساحل سے تین فرلانگ دور رہ کے ہیلی کاپٹر کو آسانی سے تلاش کیا جا سکتا تھا۔ میں دائیں طرف بھی تین فرلانگ تک دیکھ سکتا تھا اور بائیں طرف بھی۔ ایسے ہی نازو شمال اور مشرق کی طرف سے جائزہ لے سکتی تھی۔ جنوب اور مغرب کا حصہ مجھے دیکھنا تھا۔ ہیلی کاپٹر کوئی پرندہ نہیں تھا کہ کسی درخت کے پتوں میں چھپ کر بیٹھ جاتا یا گھنے جنگل کے کسی گوشے میں دکھائی نہ دیتا۔ یہ ایک بہت بڑی آہنی مشین تھی جس کو عموماً اترنے کے لیے کم سے کم سو گز ہموار اور صاف میدان درکار تھا جہاں اس کے اوپر گھومنے والے پنکھے درخت سے نہ ٹکرائیں اور اس کی لمبی دم کو خطرہ لاحق نہ ہو۔

تیز تیز قدموں سے اپنے اندازے کے مطابق جزیرے کا احاطہ کرتے ہوئے میں بہت محتاط بھی تھا۔ میرا ایک ہاتھ گن کے ٹریگر پر تھا اور میری پوری کوشش تھی کہ میرے قدموں کی چاپ بھی سنائی نہ دے لیکن ایسا کرنا عملاً ناممکن تھا۔ ٹوٹی ہوئی ٹہنیاں اور خشک پتے میرے جوتوں سے دب کے بہت آواز ضرور پیدا کرتے تھے۔ یہ آوازیں مجھے اپنے احساسات کے خوف کے باعث زیادہ محسوس ہوتی تھیں۔ کچھ فاصلے پر شاید انھیں کوئی نہیں سن سکتا تھا کیونکہ ہر لمحہ متواتر جاری رہنے والا سمندر کا شور سب آوازوں کو جذب کر لیتا تھا۔ میری آنکھیں اندھیرے کو چیر کر بہت آگے تک دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں اور میرے کان خفیف سی سرگوشی یا آہٹ بھی سننے کے لیے تیار تھے۔

چند منٹ بعد جب اپنے اندازے کے مطابق میں اپنے حصے کا نصف فاصلہ طے کر چکا تھا، میں نے درختوں، جھاڑیوں اور اندھیرے کے درمیان ایک کھلی جگہ پر ہیلی کاپٹر کا ایک حصہ دیکھا۔ وہ دیو ہیکل مشینی پرندہ اپنے فولادی بازو ہر طرف پھیلائے بڑی نخوت کے ساتھ ایک ہموار قطعہ زمین پر استادہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ جگہ خاص طور پر اسی مقصد کے لیے درخت چھانٹ کر اور کاٹ کر بنائی گئی ہو۔ یہ ہیلی پیڈ اس وقت بھی جزیرے کی ضرورت ہو گا جب یہاں رنگ محل میں عشرت و نشاط کی محفلیں ہوتی تھیں اور اب ان کے کام آ رہا تھا جو رات کے پردے میں اپنے مجرمانہ کاروبار کو زیادہ اوجھل رکھنا چاہتے تھے۔

ہمیں تلاش کرنے والے سمندر کی طرف نکل گئے تھے۔ میں ان کی ٹارچ کی روشنی اندھیرے میں جلتی بجھتی دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے ایک منطقی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ہم سمندر کی جانب فرار ہوئے ہیں تو یقیناً وہاں کوئی کشتی یا لانچ موجود ہے جس تک ہم جزیرے سے دور جانے کی کوشش کریں گے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کا کام بہت آسان ہو جاتا۔ وہ ہیلی کاپٹر میں اڑ کر کشتی یا لانچ کے اوپر پہنچتے اور اوپر ہی سے فائر کر کے اسے غرق کر دیتے۔ یہ خیال انھیں نہیں آ سکتا تھا کہ ہم جزیرے کے اندر کی طرف بھی جا سکتے ہیں۔

جیسے ہی تریوپی کو وائرلیس پر خود کار ایمرجنسی الارم سنائی دیا ہوگا، اس نے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فورس اکٹھی کی ہو گی۔ چوہدری مظفر ... کو مطلع کیا ہوگا کہ شاید تمہارے دشمن جزیرے پر پہنچ گئے ہیں اور معاملہ گڑبڑ دکھائی دیتا ہے۔ وہ جتنی قوت کے ساتھ آئے تھے، وہ ہمیں محصور کرنے کے لیے یقیناً کافی ہوتی مگر انھوں نے عجلت میں منصوبہ بندی نہیں کی۔ طاقت کے زعم میں وہ ایک لشکر جرار کی طرح حملہ آور ہو گئے اور یہ بھول گئے کہ ہم اگر پیچھے سے حملہ کریں تو انھیں بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ تریوپی کو یقیناً ہیلی کاپٹر میں ہی اپنے نصف سے زیادہ ساتھیوں کے مارے جانے کا صدمہ ہو گا۔ اب اس کی طاقت آدھی بھی نہیں تھی۔ ... ہم پسپا ہو کے فرار ہو گئے تھے۔ اگر اسے اندازہ ہوتا ... تو وہ اپنے ساتھ شکاری کتے بھی لاتا جو اس جزیرے پر ہماری بو سے ہمیں تلاش کر لیتے لیکن اب شاید وہ ہیلی کاپٹر میں بیٹھا افسوس سے ہاتھ مل رہا ہوگا اور غصے سے دانت پیس رہا ہوگا۔ باقی ماندہ لوگوں کو ان کی نااہلی اور بے وقوفی پر گالیاں دے رہا ہوگا جو ابھی تک کچھ نہیں کر پائے تھے۔

میں نصف دائرہ مکمل کر چکا تھا اور اب نازو کے انتظار میں تھا۔ ہم کسی طور پر نہیں مل رہے تھے چنانچہ ایک دوسرے کو دائیں بائیں سے کراس کر گئے تھے۔ دس منٹ بعد میں نے ہیلی کاپٹر کو چھوڑ کر نازو کو تلاش کرنا شروع کیا۔ وہ خود بھی آگے جا کے لوٹ آئی تھی۔ میں نے اسے ایک سائے کی طرح حرکت کرتے دیکھا اور ایک درخت کی اوٹ سے آواز دی۔ اگر میں اچانک سامنے چلا جاتا تو شاید وہ دشمن سمجھ کر مجھ پر بھی مشین گن کھول دیتی۔

"تم نے دیکھا، ہیلی کاپٹر میں تریوپی ہے؟" وہ بولی۔

"یہ تو میں نے نہیں دیکھا۔" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"وہ پیچھے کی طرف تھا پھر کسی نے اسے اوپر بلا لیا۔ میرا خیال ہے کو پائلٹ چوہدری ولاور صاحب تھے..." نازو نے سرگوشی کی۔

"کیا اسے بھی دیکھا تم نے؟"

"نہیں، آواز اسی کی لگتی تھی۔" نازو نے کہا۔

"تم ماشاءاللہ کہ آواز سے دشمن کے پہچان لیتی ہو، وہ بھی تمہاری آواز پہچان لیتے..." میں نے خفگی سے کہا۔

"کیسے پہچان لیتے جب میں نے آواز نکالی ہی نہیں۔"

"تم کو چھینک آ جاتی..."

"میں روک سکتی ہوں چھینک بھی۔" نازو نے کہا۔ "اب یہی بکواس کرتے رہو گے اور کچھ نہیں کرو گے؟"

میں نے کہا "تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے، بڑا فرق کروں؟ کمان تمہارے ہاتھ میں ہے، یو آر دی باس... لیڈی۔"

"اچھا، بعد میں کچھ ہو جائے تو یہ مت کہنا کہ ناقص العقل عورت ذات نے مروا دیا۔"

میں نے کہا "نہیں کہوں گا۔ بتاؤ کیا پلان ہے تمہارے ذہن میں؟ اپنا پلان میں بعد میں بتاؤں گا۔"

نازو نے کہا "میں زمین پر لیٹ کر سانپ کی طرح آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی ادھر سے ہیلی کاپٹر تک جانے کی کوشش کرتی ہوں۔ اندھیرے میں یہ کالا لباس انھیں نظر نہیں آئے گا اور میں ایک ایک انچ آگے بڑھوں گی تاکہ انھیں حرکت کا احساس بھی نہ ہو۔ تم جاؤ دوسری طرف، وہاں کچھ بھی کرو، حلق سے آواز نکالو، کوئی پاس کسی درخت کی شاخیں توڑو، بس ان کی توجہ دوسری طرف ہو جائے۔ اس کے بعد تم وہاں سے کھسک جاؤ اور واپس اسی جگہ آ کے میرے پیچھے پیچھے آگے بڑھو، میرے اور تمہارے درمیان پچاس گز کا فاصلہ رہے تو اچھا ہے۔

www.paksociety.com

تم پہلے گزر سکتے ہو۔

میں نے کہا ”باس! میں کچھ عرض کروں؟“

”کیا یہ پلان ٹھیک نہیں ہے؟“ وہ بولی۔

”پلان ایک دم فٹ ہے“ میں نے کہا ”بس ایک معمولی سی ترمیم کی ضرورت ہے۔ میں ان کی توجہ دوسری طرف کرانے کے بعد واپس آنا مناسب نہیں سمجھتا۔ ہم ایک ہی جگہ سے ایک ہی لائن میں پیش رفت کریں گے تو ایک ہی وقت میں نظر بھی آجائیں گے۔ تم کو صحیح کو روکنے کے لیے میرا کسی اور طرف ہونا زیادہ فائدہ مند رہے گا۔ ایک طرف سے تم جاؤ، میں دوسری طرف جا کے انھیں متوجہ کرنے کے لیے کچھ کرتا ہوں اور پھر خود تیسری طرف سے آتا ہوں۔“

نازو نے کہا ”میں واقعی باس نہیں بن سکتی۔“

”برا مان گئیں۔ بابا، تمہارا اچھا پلان ہے تمہارا۔“

”میں نے بالکل برا نہیں مانا، تمہارا آئیڈیا یقیناً بہت بہتر ہے۔ اب میں جا رہی ہوں۔“

”ایک منٹ۔ قریب جا کے کیا کرو گی؟“

”وہی جو تم کرو گے، میں اندھیرے کے ٹینک کو زد میں رکھتے ہوئے انھیں للکاروں گی کہ سب پیچھے آجائیں کیونکہ دس منٹ گنے کے بعد میں ہیلی کاپٹر کو اڑا دوں گی۔“ نازو نے کہا۔

”بالکل ٹھیک“ میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی ”گھبرانا بالکل نہیں۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔“

اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا ”جاؤ، اللہ حافظ۔“

میں نے اسے زمین پر پیٹ کے بل کیچوے کی طرح آگے بڑھتا دیکھا اور پلٹ کر اسی طرف چلا، جدھر سے میں آیا تھا۔ تقریباً سو گز دور جا کے میں نے ایک درخت کی پتلی سی شاخ کو زور زور سے ہلایا، اس سے درخت کے پتے صدا دینے لگے پھر شاخ خاصی آواز کے ساتھ ٹوٹی۔ میں نے حلق سے ایسی آواز نکالی جیسے کوئی درخت کے اوپر سے گرا ہو یا شاخ اس کے سر پر آ گری ہو۔

ہیلی کاپٹر سے سر نکال کر کسی نے کہا ”کون ہے اُدھر؟“ پھر ایک فائر ہوا۔ یہ آواز تریویٹی کی تھی۔ گولی چلنے سے پہلے ہی میں اس جگہ سے روانہ ہو چکا تھا۔ مزید سو گز دور جا کے میں نے ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ جہاں تک ممکن ہوا میں نے خود کو پودوں اور جھاڑیوں کے پیچھے رکھ کر درمیانی فاصلے کو کم کیا۔ ہیلی کاپٹر کی دم مجھ سے بیس گز دور رہ گئی تھی جب مجھے مونی نظر آئی۔

اب میں نے الٹا لیٹ کر خود کو کھسکانا شروع کیا۔ مجھے بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔ اس میں ایک طرف تو میری کمر بالکل سیدھی تھی اور سخت پتھریلی زمین کی رگڑ سے میرا جسم کانٹوں پر محسوس ہو رہا تھا۔ دوسری طرف اس حرکت کو جاری رکھنے کے لیے احتیاط کے تقاضوں پر عمل کرنے میں بڑی دشواری پیش آ رہی تھی۔ مجھے مشین گن کو زمین سے بہت اونچا رکھنا پڑ رہا تھا۔ زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے مجھے مسلسل ستا رہے تھے۔ پھر کسی نسل کے اڑنے والے کیڑے میری ناک کو اپنا مسکن بنانے پر آمادہ تھے اور میں جانتا تھا کہ میں چھینک کو نہیں روک سکوں گا۔

مخالف سمت میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہنا۔ میں نازو کو ایک تاریک دھبے کی طرح دریافت کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے پہلے روانہ ہوئی تھی مگر اس نے سست رفتاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زیادہ محتاط ہے۔ یہ فاصلہ میرے لیے میلوں کی صبر آزما مسافت بن گیا تھا۔ مجھ پر خیال حاوی تھا کہ ابھی ہیلی کاپٹر میں سے کوئی سر نکال کے دیکھے گا اور اس کے ساتھ ہی گولی میرے سر میں گھس جائے گی۔ چند گز بھی گھٹتی بے یقینی کا سفر ہے۔ ایک ایک انچ ابھرتی زندگی ہے یا موت ہے اور وہ خط جو اس یقین اور بے یقینی کی سرحد کے درمیان نظر نہ آنے کے باوجود حائل رہتا ہے زندہ بھی رکھتا ہے چنانچہ جدوجہد جاری رہتی ہے۔

اس اعصاب شکن سکوت کو اچانک نازو کی آواز نے توڑ دیا۔ اس کی آواز مشین گن کے پہلے برسٹ کی طرح آئی اور تمام فضا پر مسلط تجارب فوجیوں کے سکوت کو ختم کر گئی۔

”تریویٹی! باہر آ جاؤ۔“ اس نے چلا کے کہا ”جو وائلڈ جانا، مجھ پر میرے ہاتھ میں مشین گن ہے، میں ہیلی کاپٹر کو اڑا دوں گی، اس کے ساتھ ہی تم سب بھی جل کے خاک ہو جاؤ گے تم بھی.....“

پھر میں نے چلا کے کہا ”چوہدری دلاور! پیچھے آ جاؤ، اگر کچھ اور زندہ رہنا چاہتے ہو تو تم ہر طرف سے محصور ہو۔“

ہیلی کاپٹر میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا خیال تھا کہ ہمارے اعلان نے ان کے حواس مختل کر دیے ہوں گے۔ فتح کے یقین سے سرشار اپنی طاقت کے غرور میں مبتلا بے خبر تھے کہ ہماری حیثیت کو اس بات سے بھی بدتر ہے۔ یہ جزیرے میں قید ہو۔ ہم سمندر سے گھرے ہوئے جزیرے کی حدود سے نکل کے کہاں جا سکتے ہیں۔ بالآخر ان کی سمجھ میں آئے گی اور زندہ یا مردہ ان کی خدمت میں پیش کر دیے گئے۔ ایسے چالاک حاکم پر کیا اثر ہوا ہوگا، اس کا تصور کر کے مجھے بڑی مسرت اور طمانیت محسوس ہوئی۔

”میں پھر تم کو وارننگ دیتا ہوں تریویٹی“ میں نے پھیپھڑوں کی ساری طاقت صرف کر کے آواز نکالی ”اگر کوئی جوابی کارروائی کی تو اسی ہیلی کاپٹر کے ساتھ تباہ ہو جاؤ گے۔ ہیلی کاپٹر کے پیسے ہی ملے گی تمہاری۔“

ہیلی کاپٹر کے کیبن کا دروازہ کھلا اور مجھے ایک سایہ سا نظر آیا۔ اس نے باہر آنے کی کوشش کی اور اس کے کھڑے ہونے کا انداز اسے تریویٹی ثابت کر رہا تھا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور مجھے میدان میں میری طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

”اگر تم یہاں سے جانا چاہتے ہو تو صرف تم کو یہ ہیلی کاپٹر مل سکتا ہے“ تریویٹی نے کہا۔

”ہیلی کاپٹر حاصل کرنے کے لیے مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے“ میں نے کہا۔

”میری اجازت کے بغیر تم کیسے جا سکتے ہو اور اگر چلے بھی گئے تو آگے کیا ہوگا“ تریویٹی نے کہا ”کہاں اترو گے تم اور کیسے اترو گے؟“

میں نے کہا ”وقت ضائع مت کرو، دلاور سے کہو کہ نیچے آ جائے۔“

”میرے ساتھ دلاور نہیں آیا تھا“ تریویٹی نے کہا۔

”تریویٹی! جھوٹ مت بولو۔ تم نے اپنی بیٹی کو قربان کر دیا۔ کیا جلا نہیں اس کی جان لے کر؟“ میں نے کہا۔

”اس کے قاتل تم ہو.....“ وہ ایک گالی دے کر بولا۔

”شاید تمہیں یہ بتایا گیا ہوگا مسٹر تریویٹی! اس کو تمہارے اپنے ہی آدمیوں نے مارا تھا کیونکہ وہ سچ بتلانے آئی تھی۔“

”جھوٹ کہتے ہو تم“ وہ چلایا۔

”میں تم سے ڈرتا نہیں ہوں کہ جھوٹ بولوں لیکن انھوں نے کسی وجہ سے ہی جھوٹ بولا ہوگا جنھوں نے اس پر گولیاں برسائی تھیں تو میں نے کہا ”میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا تریویٹی! تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔ تم چوہدری دلاور کو اپنے ساتھ لائے ہو۔ پل میں تم اس کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ دلاور! اس کا پالا ہوا تھا، پیدا کردہ یا پالا ہوا جو خود کو حاجی کہلاتا ہے..... حاجی عبداللہ، تم سب ہمارا انتظار کرتے رہتے، دلاور سے کہو کہ ہیلی کاپٹر سے اتر جائے۔“

دوسری طرف سے نازو نے چلا کے کہا ”چوہدری دلاور! اگر تم کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ اور بھی لایا ہے تو ان سب کے ساتھ نیچے آ جاؤ۔“

تریویٹی نے پلٹ کے دیکھا پھر اس کی نگاہ سمندر کی طرف تھی۔ اس کے ساتھی نازو کی آواز پر متوجہ ہو گئے تھے اور واپس گردن گھما رہے تھے ”دیکھو سکندر! محصور تم ہو۔“

نازو نے چلا کے کہا ”ون..... ٹو.....!“

تریویٹی نے گھبرا کے کہا ”کیا یہ لڑکی پاگل ہے؟“

نازو نے دو وقفے وقفے سے گنتی جاری رکھی تھی ”تھری..... فور.....!“

میں نے کہا ”ہم سب انتہائی خطرناک قسم کے پاگل ہیں، تریویٹی.....“

گالیاں بکتا ہوا تریویٹی ہیلی کاپٹر کی طرف مڑا ”دلاور! نیچے آ جاؤ۔“

نازو نے کہا ”فائیو..... سکس.....“

میں نے کہا ”ہیلی کاپٹر میں کوئی نہیں رہے گا، پائلٹ بھی نہیں۔“

پانچ پانچ سیکنڈ کے وقفے سے نازو پکار رہی تھی ”سیون..... ایٹ.....“

چوہدری دلاور کے ساتھ ہی پائلٹ بھی نیچے آ گیا۔ میں نے کہا ”اب میں اوپر جا کے دیکھوں گا۔ اس پاگل لڑکی کی طرف سے ہوشیار رہنا۔ اس کے پاس مشین گن ہے اور اس کا نشانہ بھی بہت اچھا ہے۔ چلو ایک لائن میں آ جاؤ سب اور ہاتھ سر کے اوپر رکھ لو۔“ میں مشین گن کا رخ ان کی طرف کیے ہیلی کاپٹر تک گیا اور اوپر چڑھ گیا۔ اس کے پچھلے حصے میں بھی اب کوئی نہیں تھا۔ میں نے دوسری طرف سے نازو کو آواز دی۔ نازو قریب آ گئی۔

”ان دونوں کو باری باری میرے پاس بھیج دو، تریویٹی کو اور دلاور کو.....“ میں نے کہا۔

اپنی ساری زندگی میں تریویٹی اور دلاور نے خود کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا ہوگا اور اپنی ذلت کو اتنی خاموشی سے برداشت بھی نہیں کیا ہوگا۔ وہ سر جھکائے ہاتھ اٹھائے آگے بڑھے۔

نازو نے کہا ”پہلے تریویٹی جائے گا۔“

دلاور رک گیا۔ تریویٹی زخم خوردہ سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا اوپر آ گیا۔ میں نے اسے پلٹ کر کھڑے ہونے کا حکم دیا اور اس کی دونوں جیبوں میں سے دو ریوالور برآمد کیے پھر میں نے اسے آگے دھکیل دیا۔ اس کے آدمی مجھے تین طرف سے اپنی جانب بڑھتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ تاریکی کی وجہ سے ہی چاروں طرف دیکھ رہے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی تک وہ مایوس نہیں ہوئے ہیں۔

چوہدری دلاور اوپر آنے والا دوسرا شخص تھا۔ اسے ایک بار پھر دیکھ کے مجھے بہت سی پرانی باتیں یاد آ گئیں تو میرے حلق میں تلخی کا ذائقہ گھل گیا۔ اس وقت میرے لیے اس کو ہلاک کر کے اس کی لاش کو اس جزیرے کے گدھوں کے لیے چھوڑ جانا بہت آسان تھا لیکن ہم ایسے دشمن تھے جو موقع ملنے پر بھی ایک دوسرے کے وجود کو ختم نہیں کر پائے تھے۔ کبھی اس کی مجبوریاں سدِّراہ بنی تھیں تو کبھی ہم مجبور ہو جاتے تھے۔ اس وقت بھی میں چوہدری دلاور کو قتل نہ کر سکا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے اس سے بہت کچھ معلوم کرنا تھا اور یہی جاننا تھا کہ اس کے باقی ساتھی کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ دن

www.paksociety.com

پہلے جو اسلحہ جہاز سے اُتارا گیا تھا وہ کہاں ارسال کیا گیا تھا۔

ترلوچنی کے برعکس دلاور بالکل نروس نہیں تھا۔ اس نے بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "چلو ایک اور بازی آپ نے جیت لی اپنے سکندر صاحب!"

میں نے کہا۔ "ہم آخری بازی بھی جیت لیں گے دلاور۔"

وہ ہنسا۔ "چلو اچھا ہے۔ کیا کہتے ہیں وہ اپنے مرزا غالب کہ دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔" وہ بولا۔ "کیا تم اپنے دوستوں سے ملے ہو؟"

میں نے کہا۔ "وہ ہمارے ساتھ ہی جائیں گے۔ باری اب تمہاری ہے چوہدری دلاور... انھوں نے تو اپنی سزا کاٹ لی اور وہ بچ بھی گئے کیونکہ انھیں بچانے والے دوست تھے۔ تمھیں کون بچانے آئے گا؟"

دلاور کی تلاشی لینے کے بعد میں نے اسے بھی ترلوچنی کی طرف دھکا دے دیا۔ آخری آدمی پائلٹ تھا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اپنا اسلحہ اس نے رضاکارانہ طور پر ہمارے حوالے کر دیا۔ نازو بھی اس کے پیچھے پیچھے اوپر آ گئی تھی۔ میں نے ہیلی کاپٹر اس کے حوالے ہی رہنے دیا۔

"یہ پائلٹ یہیں رہے گا۔" میں نے کہا۔ "ضرورت پڑے تو اسے تھوڑا سا سبق سکھا دینا۔ مگر مارنا نہیں۔"

"تم کہاں جا رہے ہو؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "میں ترلوچنی اور دلاور کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔ مجھے دونوں کی ضرورت ہے۔ میری عدم موجودگی میں کوئی قریب آنے کی کوشش بھی کرے تو اسے گولی مار دینا۔"

ایک بار پھر دلاور اور ترلوچنی نیچے اُترے۔ اب وہ خالی ہاتھ تھے۔ ان کے ساتھ میں بھی خالی ہاتھ جا سکتا تھا اگر مجھے ان کے ساتھ آنے والوں کی طرف سے اندیشہ نہ ہوتا۔

"ترلوچنی! تم اس جزیرے کے جغرافیے سے تو واقف ہو۔ مجھے ایک ایسی جگہ کی تلاش ہے جہاں پام کے دو درخت انگریزی کے حرف وی کی طرح کھڑے ہوئے ہیں۔"

ترلوچنی نے سر ہلایا۔ "وہ جگہ اس طرف ہے۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر چلو... تم بھی آگے رہو دلاور۔ اگر تمہارے ترلوچنی صاحب کوئی غلط حرکت کریں تو ان کو روک لینا۔ یہ مجھ سے اتنی اچھی طرح واقف نہیں ہیں جتنے تم ہو۔"

دلاور نے افسوس کے انداز میں سر ہلایا۔ "تم بھی کب سے جانتے ہو مجھے لیکن پھر بھی پہچانتے نہیں۔ یہ جو تم کر رہے ہو [illegible] ہو سکتا ہے تمہارے لیے بڑی خوشی کی بات ہے۔ بہت فخر ہوگا انھیں اپنے اس بہادر بیٹے کے کارنامے پر لیکن تم ابھی حقائق سے بے خبر ہو۔ تمہاری جیت ہی تمہاری ہار کا سبب بنے گی۔ تم بہت جلد جان لو گے۔"

ترلوچنی نے چلتے چلتے رُک کر دائیں اور بائیں جانب دیکھا۔ دو مسلح افراد ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گئے۔

میں نے کہا۔ "ترلوچنی! ان سے کہو کہ واپس چلے جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے جاں نثار تمہاری جان تم پر قربان کر دیں۔ ان کو یہ بھی سمجھا دو کہ تمہاری واپسی تک ہیلی کاپٹر کی حفاظت کریں۔"

ترلوچنی نے انھیں زبردست گالیاں دیں۔ [illegible] سارا غصہ اس نے انھیں ذلیل کر کے اُتارا۔ وہ ترلوچنی کا [illegible] بہر طور نہیں اُترے تھے اور یہ ان کی کمزوری تھی [illegible] ترلوچنی جگت [illegible] تھا۔ ان کے سامنے ترلوچنی کو اپنی ذلت زیادہ گراں گزر رہی تھی جسے وہ باس سمجھتے تھے وہ غلام بن کر تعمیل حکم پر مجبور تھا۔ جب وہ چلے گئے تو میں نے اچانک [illegible] طرف نگاہ دوڑائی اور وہ دونوں درخت دیکھ لیے جہاں میں نے [illegible] بریف کیس چھوڑا تھا۔

میں نے کہا۔ "چلیے چوہدری دلاور صاحب! اگر میں آپ کو ان پتھروں میں ایک خزانہ دکھا دوں تو تم مانو گے؟"

دلاور نے بُرا سا منہ بنایا۔ "تمہاری زندگی ایسے ہی خواب دیکھتے گزری ہے سکندر اعظم۔ تم بھی دُنیا کی بہت سی حسرتیں لیے جب دُنیا سے جاؤ گے تو تمہارے بھی دونوں ہاتھ خالی ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "یار چوہدری دیکھو یہ خواب ہے یا حقیقت، ان پتھروں کو ہٹاؤ۔"

اس نے متذبذب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ میں عادت کے مطابق مذاق کر رہا ہوں یا [illegible] نہیں۔ میں نے اس کے گھٹنے پر لات رسید کی۔ وہ منہ کے بل گر پڑا۔

"ایک ایک کر کے یہ پتھر اُٹھاؤ۔" میں نے کہا۔ "احتیاط کے ساتھ ایک طرف رکھتے جاؤ۔ عدم احتیاط کی صورت میں اپنی موت کے ذمے دار تم خود کہلاؤ گے۔ میں نے تمھیں خبردار کر دیا ہے۔"

ترلوچنی نے شک آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ "یہ کیا کھیل ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ کھیل وہی پرانا ہے۔ زندگی اور موت کا۔ اپنے چوہدری صاحب پرانے شکاری ہیں۔ کبھی یہ جال ہمارے لیے بچھاتے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود گرفتار ہو جاتے ہیں۔"

احساس ذلت سے چوہدری دلاور کا چہرہ بگڑ گیا تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ میں نے اس کے دل میں یہ خوف ڈال دیا تھا کہ ان پتھروں کے نیچے بم یا کوئی ایسی ہی تباہ کن چیز موجود ہے۔ میرا اصل مقصد یہ تھا کہ پتھروں کے نیچے سے بریف کیس نکالتے ہوئے دلاور مجھ پر حملہ کرنے کی نہ سوچے اور کوئی پتھر میرے سر پر [illegible] میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔

اس نے آہستہ آہستہ پتھروں کو ہٹایا اور بریف کیس نکال لیا۔ اس تمام عرصے میں ایک لمحے کے لیے بھی میں اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔ ترلوچنی خاموش کھڑا اپنے ہونٹ کاٹتا رہا اور [illegible] امید کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا رہا کہ اس کے جاں نثار ایک بار پھر اپنی کسی چال سے کھیل کا نقشہ بدل دیں۔ وہ بہت بڑا بدمعاش تھا [illegible] اس کا شوق ہوگا۔ اسی شوق نے بدمعاشی کے میدان میں ترقی کے امکانات روشن کیے [illegible] کہلایا اور اب یہ دادا قسم کی چیز بنا۔ نہ جانے کتنے دادا اس کو سلام کرتے تھے لیکن اب وہ خود اس قابل نہیں رہا تھا کہ [illegible] اس نے نازو جیسی لڑکی کے ہاتھوں کمال فن دیکھا تھا۔ [illegible] جانتا تھا کہ میرے ہاتھ اس سے کہیں زیادہ سفاک ہیں۔

دلاور نے ماتھے سے پسینہ خشک کیا اور بریف کیس میرے سامنے رکھ دیا۔ اس کے ساتھ دونوں لائف جیکٹس بھی تھیں۔ ایک میں نے پہن لی اور دوسری کندھے پر ڈال لی۔ پھر میں نے دلاور سے کہا۔ "بریف کیس اُٹھا کے آگے چلو۔" ابھی تک میں اپنا لائحہ عمل طے نہیں کر پایا تھا۔ ارادہ تو میرا یہی تھا کہ میں محسن اور غالب کو ہیلی کاپٹر پر پہنچا دوں اور تحفظ کی ضمانت کے طور پر ترلوچنی اور دلاور کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ انھیں یہاں چھوڑ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہیلی کاپٹر کے پرواز کرنے سے پہلے ہی ان کے گماشتے چاروں طرف سے ہم پر فائر کھول دیتے۔ ایک ہیلی کاپٹر کی تباہی ترلوچنی جیسے شخص کے لیے کوئی بہت بڑا مالی نقصان نہیں تھی لیکن وہ ہمارے ساتھ ہوگا تو اس کی جان بچانے والے ہی ہمارے محافظ بن جائیں گے۔ پائلٹ اس کے حکم کے تابع ہوگا اور ہمیں دھوکا نہیں دے سکے گا۔

اصل مسائل ممبئی میں اُترنے کے بعد سامنے آئیں گے۔ یہ ممکن ہے کہ ہیلی کاپٹر کے اُترنے سے پہلے ہی پائلٹ نے پولیس یا [illegible] کے ذریعے ایس او ایس بھیج دیا ہو۔ ترلوچنی کے حکم پر اس نے پولیس کو اطلاع کر دی ہو کہ ایک آئی لینڈ پر چند پاکستانی دہشت گردوں نے ہیلی کاپٹر پر قبضہ کر لیا ہے اور ان سب کو یرغمال بنا لیا ہے۔ [illegible] پولیس سے مقابلہ ہمارے بس کی بات نہیں تھی اور ہم فرار ہو کر بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمارے [illegible] واحد اُمید یہی تھی کہ ہم جہاں بھی ہیلی کاپٹر اُتاریں [illegible] ساتھ دلاور اور ترلوچنی کو بھی [illegible] کے ذریعے [illegible] دیا جائے کہ ہمارا راستہ کوئی نہ روکے ورنہ ہم مقابلہ [illegible] اور یرغمالی کو ٹھکانے لگا دیں گے۔

[illegible] سکتا تھا کہ ہم کسی اجنبی ویران مقام پر اُتر جائیں اور [illegible] ہیلی کاپٹر چلا جائے لیکن ہم دلاور اور ترلوچنی کے ساتھ کہیں روپوش ہو جائیں۔ یہ کام جتنا آسان نظر آتا تھا درحقیقت اتنا ہی مشکل تھا۔ پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ ہم کہاں جائیں گے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ کیسے جائیں گے۔ نہ ہمارے پاس کوئی گاڑی تھی اور نہ کوئی ایسی جگہ جہاں ہم دلاور اور ترلوچنی کے ساتھ روپوشی اختیار کر سکیں۔ اس بات کے قوی امکانات تھے کہ ہمارا تعاقب ہیلی کاپٹر کریں۔ ہم جہاں اُتریں وہیں سے تعاقب کرنے والے سامنے آ کر ہماری گرفتاری شروع کر دیں اور موقع پاتے ہی ہمیں گھیر لیں۔

خطرہ صرف پولیس کی طرف سے ہی نہیں، ترلوچنی کی... حفاظت پر مامور جاں نثاروں سے بھی تھا جو سر دھڑ کی بازی لگا کے اپنے باس کو ہماری قید سے چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ ان کے وسائل لامحدود تھے اور مجھے ابھی تک اس مسئلے کا کوئی حل نہیں سوجھا تھا۔ ترلوچنی اور دلاور پریشان ضرور تھے مگر مایوس نظر نہیں آتے تھے۔ اگر میں ان سے پوچھتا کہ انھوں نے وائرلیس پر کسی کو اس صورت حال کی اطلاع دی ہے یا نہیں تو یہ خود اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے کے مترادف ہوتا اور وہ مجھ پر نفسیاتی غلبہ حاصل کرنے کے لیے مجھے بلف کرتے۔ انھیں یہ موقع فراہم کرنا خود اپنی شکست کا سامان کرنا تھا۔

زیادہ امکان مجھے اسی بات کا نظر آتا تھا کہ ترلوچنی نے وائرلیس پر پیغام دے دیا ہوگا۔ ہر جہاز اور ہیلی کاپٹر کا زمین سے رابطہ ضرور رہتا ہے۔ خود کو ہمارے حوالے کرنے سے پہلے ترلوچنی اور دلاور نے چند منٹ کی مہلت سے یہ فائدہ ضرور اُٹھایا ہوگا۔ ان کی جگہ ہم بھی ہوتے تو یہی کرتے۔ ایسی صورت میں بڑا امکان یہ تھا کہ ہم اپنے ساتھیوں اور اسیروں کے ساتھ پرواز کرتے ہی چاروں طرف سے نرغے میں لے لیے جائیں۔ تیس پینتیس کلومیٹر کا فاصلہ کسی ہیلی کاپٹر کے لیے اور بھی کم ہو کے پندرہ بیس کلومیٹر ہی رہ جاتا ہے۔ ممبئی کے ائیرپورٹ کے کسی کنٹرول ٹاور کا راڈار ہماری پرواز پر نظر رکھ سکتا ہے اور کسی بھی جگہ سے آنے والے پولیس کے ہیلی کاپٹر دس منٹ میں ہمیں کہیں بھی لینڈ کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ دلاور اور ترلوچنی کو مار دینے کی دھمکی انھیں دُور رہنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ ہم انھیں مار دیں یا چھوڑ دیں ہر صورت میں بچ کر کہیں جا نہیں سکتے۔ ہیلی کاپٹر کھلی جگہ پر ہی اُتارا جا سکتا تھا اور کھلی جگہ ہمیں کوئی پناہ نہیں فراہم کرتی۔ خصوصاً اس حالت میں کہ ہمیں دو بیمار ساتھیوں کو بھی اُٹھانا ہو۔ ہیلی کاپٹر بھی لامحدود پرواز نہیں کر سکتا۔ بالآخر اس کا فیول ختم ہو جائے گا اور ہمیں اُترنا پڑے گا۔

محسن اور غالب کی طرف جاتے ہوئے میرے ذہن نے تمام مسائل اور مشکلات کا جائزہ لیا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ بالآخر میں نے انجام کو حالات پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے

www.paksociety.com

گویہ ضروری تھا کہ ہم اس دلدل سے نکل جائیں جس کے چاروں طرف سمندر کا حصار ہے۔ ہیلی کاپٹر ایک معجزۂ خداوندی تھا جس کے بارے میں ہم نے سوچا تک نہ تھا۔ ہم تو سمندر عبور کرنے کی سوچ رہے تھے اور وہ بھی تختوں کے سہارے پر۔۔ کسی دشواری کے بغیر ہیلی کاپٹر پر قبضہ ہو جانا ایک اُمید افزا بات تھی آگے کیا ہو گا یہ بعد میں دیکھی جائے گی۔ سب کے شور سے کوئی اشارہ سا نکل آئے گا جو میری عقل کو نہیں سوجھ رہا ہے۔ اللہ نے پہلے بھی مایوس نہیں کیا، آج بھی سب کچھ اسی کی مدد سے ہو گا۔

میرے ذہن میں اس جگہ کا نقشہ تھا جہاں ہم محسن اور غالب کو چھوڑ گئے تھے۔ یہ رنگ محل کے پچھلے حصے میں واقع ایک چٹان تھی۔ ولادر اور تریوینی کا خیال یہ تھا کہ میں انھیں اسی قید خانے کی طرف لے جا رہا ہوں جہاں محسن اور غالب قید تھے پھر ان کا خیال بدل گیا۔ وہ سمجھے کہ میں انھیں کہیں دُور لے جا کے گولی مار دوں گا۔ میں نے انھیں مطلع کیا کہ میرے دل میں ایسی خواہش ہوتی تو اس کی تکمیل کے لیے وقت اور مقام کی کیا شرط، میں انھیں اسی وقت گولی مار سکتا تھا جب وہ ہیلی کاپٹر سے اُتر رہے تھے۔

وہ میری ہدایات کے مطابق چلتے گئے۔ اچانک ایک جگہ میں نے انھیں رُک جانے کا حکم دیا۔

"اس چٹان کے پیچھے تمھارے مہمان موجود ہیں تریوینی!" میں نے کہا۔ "جو اپنے چوہدری ولادر صاحب کے بھی دوست ہیں ایک کو تم اپنے کندھے پر اٹھا لو، دوسرے کو چوہدری ولادر صاحب پر لاد دو۔ اور واپس چلو ہیلی کاپٹر کی طرف۔ وقت کم ہے۔"

"وقت کی کمی کا شکوہ تم کر سکتے ہو۔" تریوینی نے تلخی سے کہا۔ "کیونکہ بہت موقع ضائع کر دیا ہے تم نے۔ تم کوشش کرتے تو شاید اس غرفے سے نکل جاتے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کے سمندر کی طرف اشارہ کیا۔

"چلو جی مرضی ان کی۔ ہمارے ساتھ ہیلی کاپٹر میں سیر کرتے ہوئے چلیں۔" ولادر نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا۔

"ابھی تو تم تھوڑی سی سیر کراؤ محسن کو، میرے پاس کیمرا ہوتا تو میں تصویر اُتار رکھتا۔"

"اور تصویر کا عنوان کیا رکھتے، گدھے پر سواری۔" ولادر نے کہا اور اپنی بات پر خود ہی ہنسا۔

کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہوئے محسن اور غالب کی ظاہری حالت اب پہلے سے بہتر لگتی تھی۔ ان کی ہمت بحال کرنے کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ ہم نے انھیں قید کے عذاب سے چھٹکارا دلا دیا ہے اور وہ بہت جلد پھر اپنوں کے درمیان ہوں گے۔ جب ولادر اور تریوینی ان کو کندھوں پر ڈال کے روانہ ہوئے تو ان کے پیچھے چلتے ہوئے میں غالب اور محسن کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ ابھی ان کی جسمانی حالت اتنی ابتر تھی کہ انھیں معالجے کے ساتھ کم سے کم ایک ہفتہ مکمل آرام کی ضرورت تھی۔ بالکل ٹھیک ہو جانے کے بعد بھی ان سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی مشن میں شانہ بشانہ ... اور سخت حالات کے خلاف نبرد آزما ہوں۔ اس کے ... رہنے بھی کم تھے۔ ویسے تو ان کا خیال رکھنے والے ہم تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ آنے والے وقت کا کوئی ... نہیں بتا سکتا تھا کہ اسے اچانک کب اور کہاں جانا پڑے۔ ایسی صورت حال ہوئی تو پھر کل یا ان میں سے کوئی ... کے لیے رُک جائے گی جب تک محسن اور غالب ... ہو کے ہم سے نہیں آ ملتے۔

تریوینی کے گرد لپٹے ہیلی کاپٹر سے خاصے فاصلے پر ہوتے اپنی بے چارگی کا ماتم کر رہے تھے۔ ان کا ... طاقت سب بے مصرف ہو گئے تھے۔ انھوں نے ... کو گدھوں کی طرح بوجھ ڈھوتے دیکھا۔ وہ جو اشاروں ... کی تقدیر بدل دینے کا دعویٰ رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ... نظر سے زندگی اور موت کے فیصلے ہو جاتے ہیں ... زندگی پر اپنے اختیار سے بھی محروم تھے اور اپنے مجبور ... ذلت کو خاموشی سے برداشت کر رہے تھے۔

تریوینی بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ وہ غالب کو ... آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں ... سے وارننگ دی تھی کہ غالب کو خفیف سی خراش بھی آئی تو اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا اور اسے ساری عمر کے لیے اپاہج ... گا۔ اسے زندگی سے بہت پیار تھا۔ اس کی زندگی دولت ... اور عیش و عشرت سے عبارت تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ ... کی جسم ... کی اور عیاشی کی طویل جدوجہد کے بعد بالآخر ... مقام پر ہے وہاں اس کے لیے پورے فخر اور غرور کے ساتھ رہنے میں مزہ ہے۔ وہ اس وقت نہیں مرا جب ایک ... تھا تو آج بدمعاشی کی سلطنت پر حکمرانی کے زمانے میں ... قبل از وقت کیوں قبول کرے۔ چنانچہ اس نے ذلت کے ... سے بھی سمجھوتا کر لیا تھا اور ہماری غلامی کو کسی مزاحمت کے ... قبول کر لیا تھا۔ یہی سب چوہدری ولادر پر بھی صادق آتا ... کو گلے لگانے سے نہیں ڈرتے ہم جیسے سرپھرے ... کو زندگی سے زیادہ اہم سمجھتے ہوں یا پھر زندگی سے ... ہوں کہ جینے کی ضرورت ہی نہ سمجھتے ہوں۔

محسن اور غالب کو پیچھے والے کیبن میں آرام سے ... تو شکن نے بازو سے چارج لے لیا۔

"اب تم دیکھو یہیں کچھ کھانے پینے کے لیے دستیاب ..." میں نے کہا۔ "جو کچھ بھی ملے غالب اور محسن کو دے دو۔"

پائلٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہاں کچھ بھی نہیں ہے سوائے شراب اور سگریٹ کے۔"

محسن نے کہا۔ "ایک سگریٹ جلا دو مجھے۔"

میں نے اسے منع کر دیا۔ "اس حالت میں سگریٹ زیادہ نقصان کرے گی۔"

محسن ہنسنے لگا۔ "نہیں مروں گا، اب تک زندہ ہوں نا بھی..."

وہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار تھا۔ میں نے اُسے انکار مناسب نہیں سمجھا اور سگریٹ سلگا دی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ایک کش لیا اور کھانستے کھانستے بے دم ہو گیا۔ سگریٹ اس نے خود ہی پرے پھینک دی۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

"حکومت کرو۔" میں نے کہا۔ "بس تھوڑی دیر کی بات اور ہے۔"

ولادر ہنسا۔ اس کی ہنسی میں طنز کی تلخی تھی۔ وہ محسن کی حالت پر اور میری بات پر ہنس رہا تھا۔ بڑے غلط وقت پر اس نے ایک غلط حرکت کی تھی۔ اچانک غصّے سے میرا دماغ اُلٹ گیا۔ میں نے اُسے کالر سے پکڑ کے کھینچ لیا اور بڑی بے دردی سے مارا۔ وہ میرا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا تھا اس لیے کہ وہ خود کبھی لڑا ہی نہیں تھا، ... ہی نہیں تھا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے اور اس کی ناک سے اور اس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ تریوینی نہ بچاتا تو میں شاید اسے جان سے مار دیتا۔

"سوری... سوری سکندر، دیکھو میں مانتا ہوں اس نے غلطی کی ہے۔" تریوینی مجھ سے لپٹ گیا۔ "اس کو اندازہ کرنا چاہیے تھا تمھارے جذبات کا...؟"

"کیا یہ بزدل ... جانتا نہیں، اسے نہیں معلوم کہ یہ کون لوگ ہیں۔" میں نے جھنکارتے ہوئے محسن اور غالب کی طرف اشارہ کیا۔ "دونوں کی ایک سانس پر میں ایسی دس زندگیاں قربان کر سکتا ہوں۔ میں چپ تھا اور برداشت کر رہا تھا تو اس لیے کہ میں نے سلطنت کے تقاضوں کو قبول کر لیا تھا۔"

تریوینی درمیان میں آ کر ... وہ ولادر کو بچانے ... ولادر نے کوئی دخل نہیں دیا تھا اور پھر شمشیر سنگھ نے ... ہو گئی تھی تاکہ باہر کی صورت حال پر نظر رکھ سکے۔ محسن اس دوران ... قہقہے لگاتا رہا۔

"یہ بات تم بھی سمجھ لو تریوینی۔" میں نے کہا۔ "اگر تم نے جان بچانے کے لیے کوئی موت کا جال پھیلایا ہے تو اس سے تم بھی نہیں بچ سکتے۔ تم بھول جاؤ گے تو تمھارے ساتھ... بہتر یہ ہو گا کہ تم ہمارے محافظ ... اس طرح تم خود بھی محفوظ رہو گے۔"

تریوینی نے سر ہلایا۔ "پائلٹ کو بلاؤ اور اس سے کہو کہ جلد از جلد یہاں سے نکل چلے۔"

پائلٹ ابھی تک پیچھے کھڑا ہوا احکامات کا منتظر تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ جو حکم دینے والے تھے وہ اب حکم کی تعمیل کر رہے ہیں چنانچہ اس نے بھی ہمیں حاکم تسلیم کر لیا تھا۔ میرے کہنے ہی وہ کاک پٹ میں آ بیٹھا۔

میں نے کہا۔ "مسٹر پائلٹ، کیا تم جانتے ہو کہ تمھیں کہاں جانا ہے؟"

اس نے پہلے تریوینی کو اور پھر مجھے دیکھا۔ "میں اپنی مرضی سے کہیں نہیں جاتا، صرف اس مشین پر اپنی مرضی چلاتا ہوں۔"

"او کے، اس مشین کو ایسی جگہ لے چلو جہاں ہمارے لیے خطرے کی کوئی بات نہ ہو۔" میں نے کہا۔

وہ میرا منہ تکنے لگا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ خطرہ کہاں ہو گا اور کہاں نہیں ہو گا۔ ٹیک آف کرنے کے بعد مجھے ایئر کنٹرول سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔ "مزید ہدایات بعد میں دی جائیں گی۔۔۔ تم ٹیک آف کرو۔"

جہاز کے روٹر نے گھومنا شروع کیا۔ اس کی آواز ایک شور بن گئی۔ میں نے درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ سے کچھ لوگوں کو باہر آتے دیکھا جو تریوینی کے ساتھ اس کی حفاظت کے لیے آئے تھے اور ہمیں گرفتار کرنے۔۔ سخت صدمے کی کیفیت میں وہ اپنی شکست کا انجام دیکھ رہے تھے کہ ہم ان کے آقاؤں کو جیلی کی طرح لیے جا رہے ہیں اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

"تریوینی! یہ ہیلی کاپٹر کہاں سے پرواز کر کے آیا تھا؟" میں نے کہا۔ "اور اگر ہم قابض نہ ہوتے تو واپسی پر کہاں اُترتا؟"

"میرے اپنے ہیلی پیڈ پر، میرے پاس شہری ہوا بازی کے محکمے کا اجازت نامہ ہے۔"

"تم نے کبھی بلا اجازت کہیں اُتر کے دیکھا ہے؟ نہیں دیکھا ہے تو آج کوشش کر لو۔" میں نے کہا۔

"میں تم کو خوش فہمی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔" تریوینی نے کہا۔ "میں پولیس کو اطلاع دے چکا ہوں اور وائرلیس فون پر اپنے گھر کے محافظوں کو بھی بتا چکا ہوں۔"

"مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔" میں نے کہا۔

"اب تم کچھ بھی کر لو، اس ہیلی کاپٹر میں بچ کے کہیں جانا تمھارے لیے ممکن ہی نہیں۔" تریوینی نے کہا۔ "تم مجھے بھی قتل کر سکتے ہو، ولادر کو بھی مار سکتے ہو مگر اس سے تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ تم جہاں بھی جاؤ گے تمھیں راستے مسدود ملیں گے۔ پولیس زمینی راستوں سے بھی تمھارا تعاقب کرے گی اور فضا میں بھی۔"

www.paksociety.com

یہ بات مجھے متفکر کر دینے کے لیے کافی تھی مگر میں نے اپنی بے نیازی کے انداز میں فرق نہیں آنے دیا۔ میں نے کہا ”چلو اچھا ہے جب تک ہم مقابلہ کر سکتے کریں گے۔ مرنا ہو گا تو تمہارے ساتھ ہی مریں گے، ابھی تم اتنا کرو کہ ہیلی کاپٹر کو ممبئی سے پچاس کلو میٹر مشرق کی طرف ساحل سے تین میل اندر اتارنے کے لیے احکامات جاری کر دو۔“

”یہ کون سی جگہ ہے؟“ ترلوچنی نے کہا۔

”یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔

میری بات نے اور میرے اعتماد نے ترلوچنی کو الجھن میں ڈال دیا۔ وہ اب یہ سمجھنے پر مجبور تھا کہ ہم ہیلی کاپٹر کو اپنے کسی ٹھکانے پہ لیے جا رہے ہیں۔ اس نے پائلٹ تک میرا پیغام پہنچا دیا۔ پائلٹ نے کسی پرندے کی طرح پنکھ پھڑپھڑاتے ہوئے رخ بدلا اور سمندر کے اوپر مشرقی افق کی جانب اڑنے لگا۔ صبح کاذب کے آثار ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ میں نے آسمان پہ صبح کے ستارے کو تلاش کرنا چاہا مگر آسمان پہ جگہ جگہ ابر تھا۔

وقت بہت کم تھا۔ پچاس کلو میٹر کی پرواز دس پندرہ منٹ کی بات تھی۔ میں نے ذہنی مشق شروع کی۔ حسن آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی ذہنی کیفیت ابھی نارمل نہیں ہے۔ لیکن غالب بہت توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔

”ہم پولیس کو ڈاج نہیں کر سکتے۔“ میں نے کہا ”پولیس تو ترلوچنی جیسے لوگوں کی زر خرید ہوتی ہے۔ ان کے تعاون کے بغیر وہ سب نہیں ہو سکتا تھا جو جزیرے پہ موجود ہے۔ وہ یہ زمین گھیرنے، خود کار اسلحوں سے گشت کرنے والے سنتری، مال کا آنا جانا، یہ سب پولیس کے علم میں ہو گا اور یہ جزیرہ کیا ترلوچنی کے باپ کا ہے۔“

”پھر تو یہی ایک صورت رہ جاتی ہے کہ ہم انھیں یرغمال بنائے رکھیں۔“ نازو نے کہا۔

”لیکن کب تک؟“ میں نے کہا ”یوں سمجھو کہ اس وقت بھی پولیس کی گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں تیار ہوں گی۔ بس یہ اطلاع ملنے کی دیر ہے کہ ہم نے ہیلی کاپٹر کہاں اتارا ہے۔“

”فرض کرو انھیں معلوم ہی نہ ہو۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم بتائیں یا نہ بتائیں، وہ ہیلی کاپٹر کا سراغ لگا لیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”راڈار سے، دوسرے ہیلی کاپٹر سے یا دوربین کی مدد سے۔ ہم جہاں اتریں گے وہ پہلے سے موجود ہوں گے۔“

غالب نے کہا ”تم نے ٹھیک سوچا ہے، ہم بھاگ کے نہیں جا سکتے اور بھاگ جائیں تو چھپ کر نہیں رہ سکتے۔ بہتر ہے کہ ترلوچنی اور یولانڈے کے ساتھ سودا کر لو۔“

میں اس کی بات سمجھ گیا۔ سودا صرف زندگی کی ضمانت کے بدلے کیا جا سکتا تھا۔ جہاز کی پرواز جاری تھی مگر اس کی سمت کا اندازہ میں نہیں کر سکتا تھا۔ ممبئی کا شہر پیچھے رہ گیا تھا۔ بلند و بالا عمارات کا سایہ سا افق پہ نظر آ رہا تھا۔ اس شہر کی روشنیاں دور سے ستاروں کی طرح نظر آتی تھیں۔ بہت [illegible]

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ [illegible] نے نیچے اترنا شروع کیا تو میں نے ترلوچنی سے کہا ”یہ [illegible] تا جو میں نے بتائی تھی؟“

ترلوچنی نے کہا ”تم چیک کر سکتے ہو اور چاہو تو [illegible] سکتے ہو۔“

میں نے اقرار میں سر ہلایا تو اب پائلٹ نے [illegible] پر پرواز کرتے ہوئے اور شمال کی طرف دس کلو میٹر چلے [illegible] سی چھوٹی سڑکیں ہیں۔ شاہراہ صرف ایک ہے۔“

ترلوچنی نے کہا ”پونا جانے والی سڑک؟“

میں نے اندھیرے میں [illegible] کے اطراف میں سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ترلوچنی نے [illegible] میں میری مدد یوں کی کہ مجھے صحیح جگہ بتا دی۔

”پونا جانے والی سڑک سے دو فرلانگ مغرب کی طرف ایک جگہ اترنا ہو گا۔“ میں نے کہا ”جگہ میں بتا دوں گا۔“

ترلوچنی نے احکامات آگے ارسال کیے۔ پائلٹ نے [illegible] منٹ اور پرواز جاری رکھی۔ سمندر پیچھے رہ گیا۔ [illegible] کسی مضافاتی بستی کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ [illegible] ہو گیا۔ جنگل کے ختم ہوتے ہی میں نے ساکت اور متحرک [illegible] کی قطاریں دیکھیں۔ ساکت روشنیاں سڑک کے کھمبوں کی [illegible] متحرک روشنیاں ان گاڑیوں کی تھیں جو سڑک پہ رواں [illegible] میں نے اندازہ کیا کہ یہی بستی سے پونا جانے والی شاہراہ [illegible] میں اب زمین کو واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔ ایک جگہ [illegible] کے اشارے سے کہا ”ادھر۔ ۔ ۔ وہاں چلو۔“ اور پائلٹ نے [illegible] کو تھوڑا سا موڑ لیا۔ یہ کوئی کھیت یا میدان تھا جو سڑک سے [illegible] دور نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر جب سو فٹ اوپر تھا تو میں نے دوسری ذیلی سڑک کو دیکھا جو اس میدان کے ساتھ ساتھ [illegible] سڑک تک جا رہی تھی۔ میں نے پائلٹ کو حکم دیا کہ ہیلی [illegible] اسی سڑک پر اتار دے۔

ہیلی کاپٹر نے سڑک کو چھوا۔ پھر اس کا انجن بند ہو گیا۔ شور جو میری سماعت کو متاثر کر رہا تھا، یکلخت تھم گیا اور مجھے گہرے سکوت کا اور سکون کا احساس ہوا۔

میں نے ترلوچنی کی طرف دیکھتے ہوئے ریوالور نکال لیا [illegible]

ترلوچنی اب وائرلیس پر پولیس سے رابطہ قائم کرو۔“

”ان سے مجھے کیا کہنا ہو گا؟“ ترلوچنی نے پوچھا۔

”تم ان سے کہو گے کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں [illegible] حفاظت اتر چکے ہو۔“

”میرے کہنے سے کچھ نہیں ہو گا، وہ محاصرہ ختم نہیں کریں گے اور تعاقب بھی جاری رکھیں گے۔“

میں نے دلاور کے چہرے پر شاطرانہ پُر تمسخر اور معنی خیز مسکراہٹ دیکھی جو صاف یہ کہتی محسوس ہوتی تھی کہ اپنے سکندرِ اعظم صاحب... چہرے سے آپ پریشان لگتے ہو۔ لہجہ بھی بدلا ہوا ہے آپ کا...

میں نے دلاور کو نظر انداز کر دیا اور کہا ”دیکھو ترلوچنی تمہاری زندگی کا انحصار اب ہماری زندگی پر ہے۔ جب تک تمہاری طرف سے ہمیں یہ اطمینان نہیں حاصل ہو گا کہ ہمارے لیے واقعی خطرے کی بات کوئی نہیں رہی تم اور ہم جہاں جائیں گے، ایک ساتھ جائیں گے۔ ہم تمہیں اپنے تحفظ کی ضمانت کے طور پر ساتھ رکھیں گے کب تک... یہ خود ہم بھی نہیں جانتے لیکن اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ ہم اپنی آخری سانس تک ہتھیار نہیں ڈالیں گے اور خود کو پولیس کے اور تمہارے شکاری کتوں کے حوالے نہیں کریں گے۔ اب تم سوچ لو کہ تم کب تک خوار ہوتے رہو گے ہمارے ساتھ... کتنا خطرہ ہے تم بھی ہمارے ساتھ ہر جگہ جاؤ گے۔“

”مجھے یہ بھی بتا دو کہ تم ہمیں اپنے ساتھ کیسے لے جاؤ گے؟“ یہ دلاور تھا جس نے پھر میرا مذاق اڑانے کی جسارت کی تھی۔ اس بار میں نے کچھ نہیں کیا۔ نازو نے اسے پلک جھپکتے میں تین بار ہلکے سے تھپکی دی۔

”اب میں بتاتا ہوں کہ ہم تمہیں کیسے لے جائیں گے۔“ میں نے کہا ”ابھی میں ہیلی کاپٹر سے اتر کے سڑک تک جاتا ہوں۔ چند منٹ میں مجھے کوئی کار مل جائے گی۔ کوئی نہ کوئی مجھے لفٹ دینے کے لیے رک جائے گا۔ یہ کام نازو بہتر طور پر کر سکتی ہے۔“

”تم سڑک تک جاؤ گے کیسے؟“ ترلوچنی نے کہا ”اس سے پہلے ہی پولیس تمہارا راستہ روک لے گی۔“

میں نے کہا ”ابھی تک مجھے گرد و نواح میں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے جو میرا راستہ روکے۔“

”نظر آئیں گے بھی نہیں مگر یقین کرو وہ آس پاس ہی موجود ہیں۔“ ترلوچنی نے کہا۔

”چلو میں مان لیتا ہوں کہ ایسا ہی ہے لیکن ایک آدمی جاؤں [illegible] دوسری بات یہ کہ ابھی تم ہمارے قبضے میں ہو۔ اگر پولیس [illegible] کی تو نقصان تمہارا ہو گا۔ زندگی تمہاری خطرے میں پڑ جائے گی۔“

ترلوچنی سوچ میں پڑ گیا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟ میں پولیس سے کیا کہوں؟“

”ان سے کہو کہ قریب نہ آئیں اور جب تک تمہاری طرف سے اشارہ نہ ملے گولی کا استعمال نہ کریں۔“ میں نے کہا۔

ترلوچنی نے سر ہلایا اور وائرلیس کا مائک منہ کے قریب لے جا کر بولنے لگا۔

”ہیلو کوبرا اتھارٹی ون زیرو... ترلوچنی ہیئر۔“

”کوبرا اتھارٹی ون زیرو۔“ وائرلیس کے اسپیکر نے کہا۔

”اپنی لوکیشن بتاؤ۔“ ترلوچنی نے کہا۔

کوبرا اتھارٹی ون زیرو نے جو شاید پولیس کوڈ تھا اپنی پوزیشن کی وضاحت کی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ پولیس کی دو گاڑیاں اس بستی پونا روڈ پر ہم سے تین کلو میٹر دور کھڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے جہاز اترنے کا سراغ لگانے کے بعد آپس میں رابطہ رکھا تھا اور مسلسل ہمارا تعاقب کیا تھا۔

”اچھا فی الحال ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ تم لوگ واپس چلے جاؤ۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو، محاصرہ ختم کر دیں؟“

”جو میں کہہ رہا ہوں وہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری زندگی خطرے میں ہے اور تم مجھے نہیں بچا سکتے۔“ ترلوچنی نے ڈپٹ کر کہا۔

”ہم بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”تو چلی جاؤ یہ کوشش۔ تمہارے قریب آنے سے پہلے یہ مجھے گولی مار دیں گے۔“ ترلوچنی نے چیخ کر کہا ”انھوں نے مجھے دھمکی دی ہے اور تم انھیں نہیں روک سکتے۔ او کے گیٹ لاسٹ۔“

”تم ان پر اعتبار کرنے کی غلطی کر رہے ہو۔“

”میں وہی کر رہا ہوں جو میری عقل کہتی ہے اور ابھی میرا دماغ خراب نہیں ہوا ہے۔ جب میں پھر تمہاری ضرورت محسوس کروں گا تو تمہیں بلا لوں گا۔“ ترلوچنی نے کہا ”یہ میں کسی قسم کی مداخلت نہیں چاہتا سمجھے؟“

”جیسی تمہاری مرضی، ہمیں کوئی شوق نہیں ہے مداخلت کا۔“

ترلوچنی نے وائرلیس سیٹ بند کر دیا۔ ”اب تم جو چاہو کرو، تم آزاد ہو۔“ اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا ”تم وعدہ خلافی کرتے ہوئے مجھے گولی مار کے بھی جا سکتے ہو، تمہارا راستہ کوئی روکنے والا نہیں ہے، جہاں چاہو چلے جاؤ۔“

میں نے کہا ”میں پیٹھ پر گولی مارنے کا قائل نہیں ہوں۔ جب مجھے یقین آ جائے گا کہ اب واقعی ہمارا تعاقب کوئی نہیں کر رہا ہے تو میں بھی تمہیں اجازت دوں گا کہ جہاں چاہو چلے جاؤ۔“

”اور یہ یقین کیسے آئے گا تمہیں؟“ وہ بولا۔

میں نے کہا ”یہ بات تو نگن کو آنی ہی ہے... نازو! کیا یہاں سے ہمیں پونا جانے کے لیے کوئی سواری مل سکتی ہے؟“

”کیوں نہیں مل سکتی۔“ نازو نے کہا ”میں ابھی لاتی ہوں۔“

میرے اندازے کے مطابق سڑک تک کا فاصلہ سو گز یا کچھ زیادہ

www.paksociety.com

ہوگا جس چھوٹی سڑک پر ہم نے بجلی کا پٹرا اتارا تھا اس پر سے ابھی تک کوئی گاڑی نہیں گزری تھی۔ پتا تو یہ متروکہ سڑک تھی یا پھر کسی گاؤں کو جاتی تھی۔ نازو نے نئی سڑک پر چلنا شروع کیا اور اپنا رخ شاہراہ کی طرف رکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مین روڈ تک پہنچتی، میں نے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کو دیکھا جو مخالف سمت سے آ رہی تھی۔ دو منٹ بعد ایک بڑا سا ٹرک ہمارے قریب سے گزر گیا۔ وہ سڑک کے بیچ میں ایک بجلی کا پٹرا دیکھ کر یقیناً حیران ضرور ہوا مگر ٹرک میں بیٹھے ہوئے ہیلپر یا ڈرائیور نے ٹرک کو کچے راستے پر اتار کے نکال لیا۔ یہ دودھ لے جانے والا ٹرک تھا جس میں پیچھے دودھ کے ڈرم رکھے ہوئے تھے۔

ٹرک کی ہیڈ لائٹس نازو پر پڑیں تو میں نے اسے سڑک کے بیچ میں آ کے زور زور سے ہاتھ ہلاتے دیکھا۔ ٹرک کے بچ کر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ٹرک ذرا سی دیر کے لیے رکا اور پھر واپس ہوا۔ جب وہ پھر ہمارے سامنے آیا تو ڈرائیور کی جگہ نازو براجمان تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

میں نے مسکرا کے زرینہ کی طرف دیکھا ”کیسی شاہانہ شان کی سواری آئی ہے تمہارے لیے۔“

زرینہ نے کہا ”یہ لڑکی ہے کہ قیامت؟“

میں نے کہا ”چھوٹے چودھری صاحب تم کو اس قیامت کے بارے میں زیادہ تفصیل سے بتا سکتے ہیں۔ اب چلو اور اطمینان سے ان صوفوں پر بیٹھ جاؤ۔“ صوفوں سے میری مراد دودھ کے ڈرموں سے تھی۔

ٹرک دس منٹ بعد روانہ ہوا تو اس کے آخری حصے میں محسن اور غالب … بیٹھے ہوئے تھے کہ نظر نہیں آتے تھے۔ میں ایک ڈرم پر بیٹھا ہوا تھا اور میرے سامنے زرینہ اور دلاور کے ساتھ … پاشا موجود تھا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس کا رخ ان تینوں کی طرف تھا۔ ٹرک اب واپس گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ افق پر صبح کاذب کے آثار نمودار ہو کے ختم ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر میں اجالا پھیلنے والا تھا۔

ایک میل چلنے کے بعد ٹرک رک گیا۔ میں نے … زرینہ کو اترنے کے لیے کہا ”وعدے کے مطابق ہم تمہیں چھوڑ رہے ہیں۔“

زرینہ نے احتجاج کیا ”لیکن یہاں؟“

میں نے کہا ”صرف پاشا کو ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ میں واپس … تمہیں آ کر ملا دیا تھا۔ رخصت کرنے سے پہلے میں تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھوں گا اور تمہارے ہاتھ بھی تمہارے پیچھے باندھوں گا۔ اس کے لیے رسی موجود ہے۔ مجھے امید ہے کہ پندرہ بیس منٹ یا آدھے گھنٹے میں کوئی تمہاری مدد کرنے والا آ جائے گا یا پھر چلتے رہے تو سڑک تک پہنچ جاؤ گے۔“

پہلے میں نے دلاور کی آنکھوں پر پٹی باندھی … پھر ہاتھ باندھے اور اس کو ایک لات رسید کر کے … واپس ہوا تو زرینہ کی امید دلایا … اس نے شاید … کہ میں ان دونوں کو ایک جگہ چھوڑ دوں گا تو وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوئے ہاتھ کھول لیں گے اور … سے پٹی ہٹا دیں گے۔ آدھا میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد … نے زرینہ کو اسی طرح رخصت کیا پھر وہ فوراً … کو وہ اندھوں کی طرح مختلف سمتوں میں …

افق پر صبح پھوٹ رہی تھی جب ہم ٹرک سے … پر نازو … ٹرک کے اصل ڈرائیور کو میں نے پیچھے … اور ڈرائیونگ خود سنبھالی تھی۔ سڑک پر پہنچتے ہی … کو اتار دیا۔ وہ سڑک کے کنارے پیدل چلنے لگا … جانب ڈرائیور بنا لیا۔ دو میل جانے کے بعد میں نے ٹرک … سائیڈ پر روکا اور اس کا بونٹ آگے سے اٹھا کے …

پروگرام کے مطابق نازو کو ایک کار لے کر … آنا تھا۔ اس کے لیے کسی سے لفٹ مانگنا اور … بے کار کر دینا کوئی مشکل کام نہیں … میں نے افق کو روشن ہوتے دیکھا پھر سورج کی ایک … آسمان کے کنارے کو منور کر دیا۔ ہر قسم کی گاڑیاں میرے پاس سے گزرتی رہیں۔ ان میں کاریں بھی تھیں … ابھی تک نہیں آیا تھا جس میں مجھے نازو کا چہرہ دکھائی دیتا۔ مجھے یقین تھا کہ دس پندرہ منٹ میں وہ ضرور پہنچ جائے گی لیکن آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا اور اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ آہستہ آہستہ اندیشے میرے دل میں بیدار ہو رہے تھے۔ کہیں زرینہ نے مجھے بے وقوف تو نہیں بنایا تھا یا پولیس نے زرینہ سے بھی جھوٹ تو نہیں بول دیا تھا … واپس جا رہے ہیں۔

میں سیاہ لباس میں زرد رنگ کی ڈاؤن جیکٹ پہنے ہوئے … دور سے … نظر نہیں آ سکتا تھا۔ ڈاؤن جیکٹ کو میں نے فوراً اتار کے اندر ڈال لیا مگر اسی وقت میں نے دونوں جانب سے پولیس کی گاڑیوں کو قریب آتے دیکھا۔

مجھے سخت ترین آزمائش کا مرحلہ درپیش تھا …

دونوں جانب سے پیش قدمی کرنے والے قانون کے محافظوں کو میں زور بازو نہیں روک سکتا تھا اور انھیں … نکل کر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ جب پولیس کی ایک گاڑی … سیدھی گزر گئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا … دوسری گاڑی اس طرح میرے سامنے آ کے رکی کہ اس نے میرا راستہ بلاک کر دیا۔ یہ جیپ اور ٹرک …

… درمیانے سائز کی گاڑی تھی اور اس میں دو پولیس مین تھے جن میں سے ایک قد و قامت کا … تھا اور دوسرا اس کا … ماتحت کم عمر … پولیس میں نو وارد لگتا تھا۔ جوانی کے جوش کے ساتھ اس میں نئی وردی کے ساتھ حاصل ہونے والے اختیارات کا بے پناہ جذبہ تھا۔ چنانچہ اس نے گاڑی رکتے ہی چلا کے کہا ”خبردار! بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔“

اس کا حکم سننے سے پہلے میرا بھاگنے کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر یہ بات سن کے مجھے خیال آیا کہ میرے لیے سب سے معقول راستہ تو یہی ہے کہ میں بھاگ جاؤں۔ تیس سال والا افسر محکمہ پولیس کے … کی پرانی چیز تھا اور وہ روایتی … رشوت خور اور نااہلی کا شاہکار نظر آتا تھا جن کی وجہ سے پولیس کا محکمہ بدنام ہوتا ہے۔ اگر اس میں یہ صفات نہ ہوتیں تو اب تک وہ ترقی کر کے افسر بن چکا ہوتا۔ اس کی صورت کے نقوش کرخت تھے اور اس کے تاثرات میں کلف لگی مونچھیں … خاطر خواہ اضافہ تھیں۔ آخری چیز جو میں نے اس کے برآمد ہونے پر دیکھی وہ اس کی عظیم توند کا نصف کرہ تھا جس پر پتلون اس طرح نہیں ٹھہری تھی جیسے چکنے گھڑے پر پانی کی بوند نہیں ٹکتی۔

اس کے زمین پر قدم رکھتے ہی میں نے دوڑ لگا دی۔ یہ ان دونوں کو اس جگہ سے دور لے جانے کی ایک خطرناک کوشش تھی۔ موٹا حوالدار خود تو میرے تعاقب میں دو قدم بھی نہیں بھاگ سکتا تھا لیکن اس کے ریوالور کی گولی بہرحال میرا راستہ روک سکتی تھی۔ میں نے اپنے سامنے دور تک پھیلے ہوئے گھنے جنگل پر بھروسا کیا اور وہ ٹھیک وقت ابھرتا ہوا آ گیا۔ اس طرح نشانہ خطا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے تھے۔

مجھے ایک فائدہ اور بھی ہوا۔ نوجوان ڈرائیور کا حکم سننے کے بعد میں اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا تھا۔ میری صورت سے اور حالت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ قانون کی دہشت سے میرا برا حال ہے۔ قدرتی طور پر موٹا حوالدار مطمئن تھا اور اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال نہیں تھا کہ میں فرار ہو جاؤں گا۔ چنانچہ میرے بھاگ جانے کے بعد وہ چند سیکنڈ تو حیرت اور صدمے سے … کھڑا رہا پھر غیر ارادی طور پر میرے پیچھے بھاگا۔ اس نے … آواز میں چلا کے کہا ”… رک جا! … گولی مار دوں گا۔“ جب میں نہیں رکا تو اس نے … سمجھا … اپنے نوجوان ماتحت کو حکم دیا کہ میرا …

نوجوان سرپٹ بھاگتا ہوا آیا۔ میں ایک جھاڑی کے پیچھے … ہوا تھا۔ وہ میرے سامنے سے گزرا تو میں نے اسے یوں دبوچ لیا کہ اس کی آواز تک نہیں نکلی۔

میں نے کہا ”میں اس سے پہلے سات بار قتل کر کے جیل جا چکا ہوں۔ سات بار مجھے پھانسی ہو چکی ہے… میرا مطلب ہے سزا سنائی جا چکی ہے اور ہر بار میں جیل سے نکل آیا ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں آٹھواں قتل کر دوں… تم کو فوت کر دوں؟“

اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے سر کو تھوڑا سا دائیں بائیں ہلانے کی کوشش کی۔

میں نے کہا ”میں خالی ہاتھوں سے قتل کرتا ہوں۔ یہ میرا اصول ہے اور ہمیشہ گردن توڑتا ہوں … کی طرح… اس طرح مرنے والے کو تکلیف نہیں ہوتی اور مارنے والے کو بھی۔ گلا گھونٹنے میں دونوں کو پریشانی ہوتی ہے۔“

اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگیں۔ میں نے اسے پوری طرح دہشت زدہ کر دیا تھا اور اب میں امید کر سکتا تھا کہ وہ زندہ رہنا چاہے گا تو میرا کہا مانے گا۔

میں نے کہا ”ابھی تم پولیس میں نئے ہو… ابھی سے مر گئے تو خاک فائدہ ہوگا پولیس میں نوکری کرنے کا۔ زندہ رہو گے تو خوب ترقی کرو گے۔ سب انسپکٹر اور انسپکٹر ہو گے۔ خوب بندے پکڑو گے۔ خوب چھترول کرو گے ان کی اور خوب کماؤ گے اور خوب عیش کرو گے۔“

حوالدار نے دور سے چلاتے ہوئے کہا ”او … خبیث! کدھر مر گیا؟“ غالباً وہ … ادھر ہی آ رہا تھا۔

میں نے کہا ”تم صرف اتنا کرو کہ اس موٹے حوالدار کو ادھر بلاؤ۔ آواز دو یوں جیسے تم اسے مدد کے لیے پکار رہے ہو لیکن اتنا خیال ضرور رکھنا کہ تمہارے حلق سے غلط آواز نکلی تو اس کے ساتھ ہی تمہارے نرخرے سے تمہاری آتما بھی نکل جائے گی۔“

جیسے ہی میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹایا اس نے فریاد کے انداز میں پکار کے کہا ”حوالدار جی… ادھر…!“

میں نے کہا ”ٹھیک ہے“ اور ایک ہلکا سا ہاتھ مار کے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ موٹا حوالدار اب … آ رہا تھا۔ ”او نے کیا ہو گیا ہے منہ سے تو بول“ اس نے ہانپتے ہوئے کہا اور اچانک میرے سامنے آ گیا۔

میں نے اس کے پیٹ میں انگلی چبھو کے کہا ”یہ موٹاپا ساری عمر کی حرام کھانے کا ہے۔ اس نوجوان کو آگے بھیج دیا مرنے کے لیے۔“

وہ اچھلا ”تم… کون ہو؟“

میں نے دوسری بار زیادہ قوت سے اس کے … وار

www.paksociety.com

پیٹ میں انگلی مارتی ہیں۔۔۔ میرا نام ہے پیٹ پھاڑنے والا۔ سیٹھوں کے جو کالے دھندے کرتے ہیں اور تم جیسے حرام خوروں کے پیٹ پھاڑ کے مجھے بہت تسکین ملتی ہے۔ مال حرام پر پلنے والے ننانوے خوفناک پیٹ پھاڑ چکا ہوں اب تک۔ آج سنچری ہو جائے گی۔ ابھی ایک دھماکا ہوگا۔"

میرے اور اس کے درمیان فاصلہ اتنا کم تھا کہ وہ ریوالور نہیں نکال سکتا تھا۔ میں تقریباً اس سے چپکا ہوا تھا۔ ہر بار وہ اچھل کے ایک قدم پیچھے ہوتا تھا تو میں اتنا ہی آگے بڑھ جاتا تھا۔

موٹے حوالدار کی حالت غیر تھی۔ اس نے کئی بار چلا کے اپنے ماتحت کو مدد کے لیے پکارا اور ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالنے میں بھی کامیاب ہو گیا مگر کسی دشواری کے بغیر وہ ریوالور میں نے لے لیا۔

موٹا حوالدار مجھے گالیاں دینے لگا۔ "میں جیل میں سڑا دوں گا تجھے۔ بڑے بڑے بدمعاشوں کو دیکھا ہے میں نے۔"

"پھر مجھے کیوں نہیں پہچانا موٹے سور!" میں نے اس کے پیٹ میں مکا مارا۔ "ساری زندگی جھک ماری پولیس میں؟ کسی مجرم کو صورت سے نہیں پہچانتے تو پکڑو گے کیسے۔ بغور سے دیکھو مجھے۔۔۔ میں ہوں مشہور سیریل کلر جس نے سات قتل کیے، سات بار پھانسی ہوئی، ہر بار میں جیل سے نکل گیا۔ آٹھویں بار بھی ایسا ہی ہوگا۔" میں نے فلمی ولن کی طرح قہقہہ مار کے کہا۔

موٹے حوالدار کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ "تم کو جگنوؤں کا واسطہ مجھ پہ دیا کرو، میری جوان بیوی ہے گھر میں۔"

میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "کیا بکتا ہے، بیوی یا بیٹی؟"

"بیوی مائی باپ۔ بیٹیاں تو سب اپنے گھر کی ہو گئیں۔ ان سے فارغ ہو کے ہی اپنا گھر بسایا تھا میں نے۔" وہ دہائی دینے لگا۔

"اس وجہ سے تم پر رعایت کی جا سکتی ہے۔" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میری کچھ شرائط ہیں۔"

"مجھے ہر شرط منظور ہے۔" وہ تقریباً رو کے بولا۔

"اچھا تو پہلے یہ وردی اتار کے میرے حوالے کرو۔" میں نے کہا۔

"وردی؟" اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ "اور میں خود کیا کروں؟"

میں نے کہا۔ "مجھے صرف وردی چاہیے۔ انڈروئیر نہیں۔"

اس نے جیسے ہی وردی اتار کے مجھے پکڑائی، میں نے اسے بھی لٹا دیا۔ بعد میں اس کے بھاری بھرکم جسم پر سے وردی اتارنا مشکل کام ہوتا۔ یہ وردی تو میرے ابھی کام آ سکتی تھی۔ اسے میں نے اپنے سیاہ ٹائٹ فٹ لباس پر چڑھا لیا۔ اتنی ڈھیلی وردی یقیناً میرے جسم پر مضحکہ خیز تھی ہوگی لیکن پولیس والے تو ویسے ہی پبلک کو مضحکہ خیز ہی نظر آتے ہیں۔ اس کے نوجوان ماتحت کی وردی میں نے دو منٹ میں اتاری اور پھر سڑک کی طرف دوڑا۔

میری واپسی تک تقریباً بیس منٹ گزر گئے تھے۔ غالب اور محسن جو درختوں کے تنوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے، خاصے پریشان تھے اور ان کی حالت بری تھی۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ بس اب تھوڑی سی بات اور ہے۔

میری نگاہیں نازو کو تلاش کر رہی تھیں اور میں ہر سمت سے آنے والی ہر کار کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نازو کو آتا دیکھا مگر وہ مخالف سمت میں میرے پیچھے سے آئی۔ جب اس نے بریک لگا کے کار روکی تو میں اچھل کے اس کی طرف بڑھا۔

"سالے بڑی! قانون پر قاتلانہ حملہ کرتی ہے۔"

اس نے دروازہ کھول کے کہا۔ "معاف کرنا، ذرا دیر ہو گئی۔"

"یہ تم کس طرف سے آ رہی ہو؟ آخر میں تمہارے لیے اس طرف چشم براہ تھا۔" میں نے کہا۔

"خاک چشم براہ تھے، میں دو بار چکر لگا کے گئی۔ پولیس کی گاڑی کو دیکھ کے اور پریشانی ہو رہی تھی۔"

"تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی تھی؟" میں نے کہا۔

"گاڑی میرے گھر کے پورچ میں نہیں کھڑی تھی۔ وہ ڈیڈی کے پول پہ تھی، مجھے کسی سے چھین کر لانی تھی۔"

میں نے کہا۔ "گاڑی نہیں اپنا آدمی، اس کا اصل کہاں ہے؟"

"سوال یہ ہے پہلے تم یہ بتاؤ کہ پولیس سے جھگڑے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ وہ آ بیل مجھے مار۔"

"میں ایسی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ خود بیل نے آ کے کہا کہ آ سکندر مجھے مار۔۔۔ مجبوراً میں بیل۔۔۔ تھے۔ انہیں میں ادھر جنگل میں لے گیا اور بس ایک ہاتھ مارا تو وہ لیٹ گئے۔ ایک کی وردی میں نے پہن لی ہے۔ دوسرے کی تم پہن لو۔" میں نے پولیس جیسی وردی اس کی طرف اچھال دی۔

نازو نے وردی جھپٹ لی۔ "یہ جو وردی تم نے پہنی ہے، یہ تم پر قطعی نہیں سج رہی ہے۔"

"چلو یہ تم لے لو، شاید تم پر سج جائے۔"

وہ ہنسی۔ "مجھے تو یہ بھی ڈھیلی ہے۔"

"معلوم ہے ہم دونوں کیسے لگیں گے؟" وہ مزاحیہ

جیسے ایبٹ اور کاسٹیلو۔" نازو نے کہا۔ "میں نے کہا، کے اداکار تھے۔ فلم دیکھی تھی کہ اسٹون کا بس بالکل وہی سین ہوگا۔"

"اچھا جواب باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ ان دونوں کی حالت خراب ہوئی۔ انہیں کار میں شفٹ کر دو۔ میں آتا ہوں۔" یہ وردی بدل کے۔

میں نے کہا۔ "اب ہم کار میں نہیں جائیں گے۔"

وہ جنگل کی طرف جاتے جاتے رک گئی۔ "کیوں؟"

"اس لیے کہ پولیس والے ایسی کاروں میں نہیں پھرتے۔"

"کار کی ضرورت نہیں تھی تو مجھے کیوں خواہ مخواہ ایک ایڈونچر کے لیے بھیج دیا تھا؟" اس نے بگڑ کے کہا۔

"اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ پولیس ہمارے لیے خود گاڑی لے کر آ جائے گی۔"

"یہ کوئی عقل مندی کی بات نہیں ہوئی سکندر صاحب! وردی کی حد تک تو ٹھیک ہے، اس لیے کہ دن میں یہ سیاہ پوشی شکوک پیدا کرتی ہے اور مجبوری یہ ہے کہ بدلنے کے لیے اور کوئی لباس نہیں مگر پولیس کی گاڑی استعمال کرنے میں خطرہ بڑھ جاتا ہے۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "خطرہ کیسا، گاڑی پولیس کی اور ہم پولیس میں تھا۔۔۔!"

"اس کار کے چھینے جانے کی رپورٹ ابھی تک نہیں ہوئی۔۔۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ اس پولیس موبائل وین کا دوسری گاڑیوں سے یا ہیڈ کوارٹر سے رابطہ ہو اور اگر کسی کو جواب نہ ملا تو اس گاڑی کی تلاش شروع ہو جائے گی۔ ہم چند منٹ میں پکڑے جائیں گے۔ اسی سڑک پر پولیس کی بہت سی گاڑیاں پھر رہی ہیں۔"

"تم نے تو مجھے وحشت زدہ کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب دیر کیوں کر رہی ہو، کیا پکڑوانا چاہتی ہو مجھے؟ خدا کے لیے جلدی کرو۔"

میں نے لپک میں چڑھ کے غالب اور محسن کو ٹوکوں کے درمیان سے اٹھایا اور سہارا دے کر کار تک لے گیا۔ آزادی کا احساس اور تحفظ کے یقین سے ان کا نفسیاتی اعتماد اس حد تک بحال ہو گیا تھا کہ وہ خوفزدہ نہیں رہے تھے اور کچھ امید نظر آنے لگے تھے۔ ان کے چہروں پر نقاہت اور تھکن کے باوجود مسکراہٹ تھی۔

"یہ پولیس کی گاڑی یہاں کیوں کھڑی ہوئی ہے؟" محسن نے کہا۔

میں نے کہا۔ "ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

لیکن اس جواب نے محسن کو مطمئن نہیں کیا۔ "پھر تم نے پولیس کی وردی کیوں پہنی ہے؟"

"میں نے کہا۔ "قمیص بدلنے کے لیے۔۔۔ مگر تم اپنے دماغ پر بوجھ مت ڈالو، اب فکر کی کوئی بات نہیں رہی۔ بہت جلد ہم اپنے گھر پہنچ جائیں گے۔"

"ہمارا گھر کہاں ہے؟" محسن نے یوں کہا کہ نہ یہ سوال تھا اور نہ کسی محرومی کے خیال کا اظہار۔ یہ فقط ایک حقیقت کا اعتراف تھا۔

"میرا مطلب ہے اس جگہ، جہاں ہم سب رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہم سب کون؟" محسن بولا۔

"میں، نازو، رابعہ اور گل، تم اور غالب۔"

"بس؟ اور کوئی نہیں؟" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"اور کون؟" میں نے کہا۔

"شہلا کہاں رہتی ہے اور میرا بیٹا، وہ نہیں ہیں وہاں؟"

"وہ۔۔۔ نہیں۔۔۔" میں نے کہا۔ "تم تو جانتے ہو وہ لاہور میں ہیں۔"

"پھر میرا گھر تو لاہور میں ہے۔" محسن نے کہا۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ابھی تک وہ ذہنی طور پر نارمل نہیں ہوا ہے اور اس کے لیے ماضی کے تمام حقائق سے منقطع ہو جانے والے ہر رشتے کو حسب سابق استوار کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔

جب نازو پولیس مین کی وردی میں نمودار ہوئی تو میں ہنس پڑا۔ وہ کچھ جھینپ کر میرے ساتھ آگے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"تم ڈرتے نہیں مجھ سے؟" نازو نے پلٹ کے غالب سے کہا۔

غالب مسکرایا۔ "تم جیسے پولیس والے ہوں تو قانون کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے آگے پیچھے دیکھا اور موقع ملتے ہی سڑک پر ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہو گیا۔ سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد دونوں جانب سے گاڑیوں کی آمدورفت میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ کار کی سائڈ میں لگے ہوئے شیشے میں مجھے پولیس کی وین اور دودھ والے کا ٹرک بھی دکھائی دے رہے تھے جو آہستہ آہستہ اتنے پیچھے رہ گئے کہ دوسری گاڑیوں کے درمیان غائب ہو گئے۔

غالب کی بات پر میں نے کہا۔ "قانون کا ویسے بھی بس اللہ ہی حافظ ہے۔"

غالب نے کہا۔ "تم جیسے گل اندام اور نازک بدن پولیس مین کے سامنے کس کا قدم پھسل نہ جائے گا کہ کچھ کرے۔ کوئی قابل دست اندازی پولیس جرم۔۔۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا۔ ”تم جیسے عادی مجرم کا دل تو ٹھیک رہا ہوگا مگر خدا کے بیٹے ابھی کچھ مرمت کرتا رہا۔“

”نازو کو نازک سمجھا تو پھر وہی ہوگا جو پہلے ہوتا تھا۔“ نازو نے ہنس کے کہا۔

”اور تمہیں دیکھ کے جی اُٹھے ہیں اُن کو مار کے کیا ملے گا تمہیں۔“ غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔

محسن بدستور گم صم بیٹھا ہوا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس کے سامنے میں اسیری کے دوران کوئی بھی بات کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ خود ابھی تک اپنے احساس کی اذیت سے نجات پانے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ غالب کی حالت بہت بہتر تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ نازو کی موجودگی اس کے لیے کس حد تک اطمینانِ قلب کا باعث ہے۔ محسن نے بھی شہلا ہی کو یاد کیا تھا اور میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ ہوتی تو محسن کا ذہن خوف کے آسیب سے نکل آتا۔

رات کے ساتھ ہی ایک بھیانک خواب ختم ہو گیا تھا۔ یہ ظلم و جبر کی وہ شب تھی جو قربت کی سحر کے ساتھ ہی ختم ہو چکی تھی۔ بچھڑے ہوئے قافلے کے رفیقانِ سفر پھر ایک ساتھ تھے اور پھر سوئے منزل گامزن ہو گئے تھے۔

مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں نے اور نازو نے جو دعویٰ کیا تھا اسے تائیدِ خداوندی حاصل ہوئی اور ہم واقعی صبح ہونے سے پہلے محسن اور غالب کو دشمن کی قید سے نکال لائے۔ تریپتی جیسے عیار اور دلاور جیسے سفاک شکاری کا ہمارے خلاف متحد ہو جانا ہمارے خلاف تقدیر کی ایک خطرناک سازش ثابت ہونے لگی تھی۔ ان کے جال بہت مضبوط تھے اور انہوں نے بدمعاشی کے سارے وسائل ایک مشترک مقصد کے لیے استعمال کرتے ہوئے ہمارے راستے ہر طرف سے بند کر دیے تھے۔ ان کی شکارگاہ تک پہنچنا ہی بڑی بات تھی۔ ہم وہاں جا کے خود بھی سلامتی کے ساتھ لوٹ آئے اور اپنے ساتھ انہیں بھی لے آئے جو ناقابلِ تسخیر حصار میں مقید تھے۔

نازو نے اچانک کہا۔ ”کیا واپس اُسی ہوٹل میں جانے کا ارادہ ہے؟“

میں چونک پڑا۔ ”وہاں کیسے جا سکتے ہیں ہم...؟“

نازو نے کہا۔ ”جانا تو اُسی راستے پر ہے جی آپ۔“

میں نے کہا۔ ”راستہ کہیں بھی بدل جاتا ہے جانِ من! تم ذرا یہ سوچو کہ اس صبح کی خبر گل اور رابعہ کو کیسے دی جاتی ہے؟“

”رابعہ اور گل کہاں ہیں؟“ غالب نے کہا۔

”ہوٹل میں وہ صبح سے سخت بے چین ہوں گی۔“ میں نے کہا۔

”وہ رات بھر بے چین رہی ہوں گی۔ انہیں خبر نہیں ہوگی۔“ نازو نے کہا۔ ”ہم ایسا کرتے ہیں کہ خود جا کے انہیں لے آتے ہیں۔“

”اس حلیے میں؟“ میں نے کہا۔

نازو نے افسوس سے اپنی وردی کو دیکھا۔ ”یہ حلیہ بھی تو جا سکتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی ڈرائنگ روم سے بھی نہیں نکلے... ایک آسان طریقہ ہے کہ جو اتنی ڈھیروں شاپنگ کی ہے، سب نے کپڑے کافی نہیں ہیں۔ رابعہ اور گل کو فون کر دیتے ہیں کہ جب وہ آئیں تو اپنے ساتھ لے آئیں۔“

”کہیں اشتعال نہ ہو تم سے فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔“ نازو نے کہا۔ ”بڑی پریشانی میں ہوں گی وہ...؟“

نازو کا اندیشہ بے سبب نہیں تھا۔ ہم نے ہوٹل میں بہت گڑبڑ پھیلائی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ جو بھی رابطہ قائم کرے اسے میرا ساتھی تسلیم کر لیا جائے اور پولیس فون کال سے پتا چلا لے کہ فون کس نے کہاں سے کیا تھا۔ میرے لیے اس اندیشے کے خلاف اُمید کا سہارا بہت کم تھا۔ مجھے اس بات کا امکان بہت کم نظر آتا تھا کہ کسی ہوٹل کی انتظامیہ کو ہماری کارگزاری کا علم ہو جائے۔ بغرضِ محال ایسا ہوا تو ہوٹل والے فوراً پولیس کو اطلاع کر سکتے گئے۔ کسی بھی اچھے ہوٹل سے پولیس کو دور ہی رکھا جاتا ہے اور انتظامیہ تمام قانونی و غیر قانونی معاملات سے خود نمٹنے پر قادر ہوتی ہے۔ مگر یہ حالات میں واپس کر جانے سے پہلے تمام عواقب کا جائزہ لیں گے۔ ابھی جنسِ لطیف محبوب ہے بہرحال کم نہیں ہوتی کہ آتے جاتے بھی نہ آنے کے ہزار بہانے تلاش کرتی ہے۔ ان کا آنا بھی قیامت کے آنے سے کم نہیں ہوتا۔ بعد جب وہ خالصاً کی کارروائی شروع کرتے ہیں تو تم انتظارِ قسمت کو رو رہا ہے کہ یہ احوال جو نہ کرتے تو احساس ہوتا۔ اتنی مستعدی تو ابھی ولایتی پولیس کی ہی ملتی ہے کہ فون کال ختم ہونے سے پہلے کال کرنے والے کو جا پکڑتی ہے اور مجرم فون پر تین منٹ سے لمبی بات نہیں کرتے۔

ایک پی سی او کا بورڈ دیکھتے ہی میں نے کار کا رُخ کم کیا اور ٹیلی فون کے نشان والے کھمبے سے چار قدم آگے ہی روک لی۔

”تم کو میں اپنا جانشین بناتا ہوں۔“ میں نے نیچے

اُترتے ہوئے کہا۔ ”میرے جانے کے بعد خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو میری فکر مت کرنا۔ سب کو بھگا لے جانا۔“

”ایسی ویسی بات کیا ہوگی اور کیوں ہوگی؟“ نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”بزرگوں نے آخر کیوں کہا ہے کہ مصیبت بھی بتا کے نہیں آتی۔“

نازو میری جگہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ”بزرگوں کا لحاظ کرتے ہوئے تمہاری بات مان لیتی ہوں مگر یہ تو بتا جاؤ کہ ان دونوں کو بھگا کے کہاں لے جاؤں گل بیٹوں کو؟“

”پھر اگر کون ہوگا؟ میں تو فون کرنے جا رہا ہوں۔“

”تیسرا اگر کا مالک ہے جو ڈکی میں رکھا ہوا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم کو سپنا ریسٹورنٹ یاد ہے؟“

نازو نے سر ہلایا۔ ”چرچ گیٹ پر۔ راستہ تو یاد نہیں مگر میں راستہ پوچھ کے پہنچ سکتی ہوں۔“

”بس تو پھر وہاں پہنچ جانا۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو۔“

”اور تم...؟“

”ظاہر ہے میں وہاں آ جاؤں گا۔ ہم سب کو غیر متوقع صورتِ حال کے لیے بھی تیار ضرور رہنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”اب رابعہ اور گل کی مثال لو۔ ایک اجنبی ہوٹل میں بے زور سری ریلیزاوٹ ہیں۔ ہم نے غلطی یہ کی تھی کہ ان کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔“

”کیا نہیں بتایا تھا؟“

”یہی کہ اگر ہم صبح تک لوٹ کے نہ آئیں تو پھر انہیں کیا کرنا چاہیے؟“

”اچھا اب تم جاؤ پہلے ہی بہت وقت ہو گیا ہے۔ میرا اور اپنا بھی ان دونوں کا ہی کچھ خیال کرو۔“ نازو نے کہا۔

ٹیلی فون کال آفس تک جاتے ہوئے میں نے اپنی حالت پر غور کیا اور کن انکھیوں سے یہ دیکھنے کی کوشش بھی کرتا رہا کہ میری اس ہیئتِ کذائی سے لوگ کس حد تک محظوظ ہو رہے ہیں مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ کوئی میری طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ اپنی مصروفیات کے جنجال میں پھنسے ہوئے لوگ راہ چلتے ہوئے ہماری کوئی پروا کیے بغیر سے بے نیاز تھے۔ وہ اگر سوچ رہے تھے تو صرف اپنی ذات سے تعلق رکھنے والے مسائل کے بارے میں۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں تو صرف راستہ دیکھنے کے لیے، دیکھنے کے لیے کہ وہ صحیح سمت میں جائیں اور نکلنے گزر جائیں اور پاگل کہنے سے بچ جائیں۔ ان کے ذہن میں فکر یہ تھا کہ ان کو کہاں پہنچنا ہے۔ کس بس میں سوار ہونا ہے اور کس وقت کیا کرنا ہے۔ وہ کسی بھی دوسرے شخص کے چہرے یا حلیے کو نہیں دیکھ رہے تھے۔

میری پتلون اوپر سے بھی اتنی ہی ڈھیلی تھی جتنی نیچے سے۔ اوپر کے حصے کو میں نے بیلٹ ٹائٹ کر کے اپنی کمر کے مطابق کر لیا تھا مگر اس طرح پتلون درمیان سے جھول کر کسی جوکر کے لباس کی طرح ہو گئی تھی۔ اس طرح قمیص بھی سمٹ کر پتلون میں داخل تو ہو گئی تھی مگر دیکھنے والا اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ میرے سائز سے کتنی بڑی ہے۔

فون ایک سکھ فوٹو گرافر کی دکان میں لگا ہوا تھا۔ سکھ اسٹول پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا گرنتھ صاحب کا پاٹھ کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے گرنتھ صاحب کو ایک طرف رکھ دیا اور بڑے جارحانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔

”کیا بات ہے؟ فوٹو اترواتی ہے مفت میں کیا؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں، مجھے فون کرنا ہے۔“

”مفت میں؟“ اس نے زیادہ جارحانہ لہجے میں کہا۔ ”تم سنتری بادشاہ چل چھوٹ ادھر سے۔ میں تیری وردی سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ ہتھکنے چلنا ہے تو چلا۔ اس سے پہلے بھی دو بار ہتھانے جا چکا ہوں مگر مفت کال نہیں کرنے دی کسی کو۔ میں نے دی تو وہ کوئی پولیس کمشنر کا باپ ہو۔“

میں نے کہا۔ ”سردار جی! میں نے تو نہیں کہا کہ میں مفت میں فون کرنے آیا ہوں۔“

سردار جی نے تھوڑا سا لہجہ بدل کے کہا۔ ”اچھا تو پھر پہلے پیسے نکال۔ ادھر پیسے رکھ ادھر۔“

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر اس وردی کی ہر جیب تو میں نے خود ہی خالی کی تھی اور جیب سے نکلنے والی ہر چیز وہیں چھوڑ دی تھی سوائے ریوالور کے۔ میں نے ہر جیب ٹٹولی کہ شاید کسی میں سے ریزگاری نکل آئے یا کوئی ایک روپے کا مڑا تڑا نوٹ برآمد ہو جائے۔ سردار جی بڑی طنز آمیز اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ میری صورت کو دیکھتے رہے جس پر اب خفت کے آثار عیاں تھے۔ میں نے خود کو جھوٹا ثابت کر دیا تھا۔ میری جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا اور میں نے دعویٰ کیا تھا کہ میں فون کال کے پیسے دوں گا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ سردار جی بولے۔

”وہ... میرا خیال ہے۔“ میں نے کہا۔

”کہ پیسے لانا یاد نہیں رہا۔“ سردار جی نے سر افسوس سے ہلاتے ہوئے کہا۔ ”گھر سے چلتے وقت پرس بھول گیا۔ ابھی کوئی اسامی نہیں پھنسی جس سے مال ملتا... اوئے! چل بھاگ ادھر سے۔ مفت خورے! میں تو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔“

میں نے وعدے سے کاؤنٹر پر ہاتھ مارا۔ ”سردار جی! اتنا فون

www.paksociety.com

کو مشتعل مت کرو، ہم سرکاری وردی میں ہیں اور سرکاری ڈیوٹی کے لیے سرکاری فون استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں۔"

"چل اوئے جا، حق وا پتر۔"

میں نے کہا۔ "تم قانون کی راہ میں ٹانگ اڑا رہے ہو۔ پولیس کو اولین فرض سے روک رہے ہو، یہ کتنا سنگین جرم ہے۔"

"سنگین جرم ہے تو مجھے چڑھا دے پھانسی لیکن فون تو میں مفت میں نہیں کرنے دوں گا تجھے۔" سردار جی نے کہا۔

"کیا یہ فون کٹوا دوں گا۔" میں نے ڈٹ کر کہا۔

سردار جی نے کہا۔ "اوئے میں گردن کٹوا دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "اچھا تم میری کوئی چیز رکھ لو تسلی کے لیے گھڑی۔"

"تاکہ تھوڑی دیر بعد تو وارنٹ لے کر آ جائے۔ چوری کی گھڑی برآمد کرنے۔ اوئے کاکا میں تیرے چکر میں آنے والا نہیں ہوں۔ بس بات ختم... تیس پیسے ہیں تو فون کر ورنہ دوڑ جا۔"

میں نے اسے سخت خون آشام نظروں سے گھورا مگر وہ متاثر نہیں ہوا۔ مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی کہ تیس پیسے کی حقیر رقم کی خاطر وہ مجھ پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگر میں پولیس کی وردی میں نہ ہوتا تو شاید وہ مجھے شریف آدمی سمجھ کے ادھار بھی کر لیتا مگر پولیس کے معاملے میں وہ اعتبار کا ایک سکہ بھی دینے پر تیار نہ تھا۔ اب مجھے واپس گاڑی تک جا کے پیسے لانے تھے ورنہ میں فون نہیں کر سکتا تھا۔ گرد و نواح میں دوسرا کوئی پبلک کال آفس نظر ہی نہیں آ رہا تھا اور ہوتا تو وہاں خالی ہاتھ جانے سے یہ صورت حال پھر پیدا ہو جاتی۔

میں احتجاجی انداز میں مارچ کرتا ہوا واپس گیا۔

"بات ہو گئی؟" نازو نے پوچھا۔

"ہاں مگر بات بنی نہیں، وہ خبیث کہتا ہے کہ پہلے تیس پیسے لاؤ۔" میں نے کہا۔

"کون خبیث؟" نازو نے کہا۔

"جس کا فون ہے۔ ایک روپیہ دو مجھے۔"

"میرے پاس روپیہ کہاں ہے؟" نازو نے کہا۔

روپیہ غالب یا محسن کے پاس بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مجبوراً مجھے سوٹ کیس کھولنا پڑا جس میں تو لاکھ سے زیادہ کی رقم ابھی تک محفوظ تھی۔ ایک روپے کا نوٹ اس میں بھی نہیں تھا۔ سب سے چھوٹا نوٹ پچاس روپے کا ملا۔ میں پچاس کے نوٹ کو لہراتا ہوا پھر سردار جی کی دکان میں داخل ہوا۔

"یہ لو پیسے۔" میں نے پچاس کا نوٹ کاؤنٹر پر رکھ کے فون اپنی طرف کھینچ لیا۔ سردار جی نے نوٹ کو روشنی کے رخ کر کے اس کے اصلی نقلی ہونے کی تصدیق شروع کی اور میں نے اجنتا ہوٹل کا نمبر ملایا اور پھر آپریٹر سے [illegible] کے کمرے کا نمبر مانگا۔

چند سیکنڈ کے بعد رابعہ نے کہا۔ "ہیلو۔"

میں نے کہا۔ "اس کا کیا مطلب ہوا؟ السلام علیکم [illegible]"

رابعہ نے خوشی سے چیخ ماری۔ "سکندر! کہاں ہو تم؟"

"ہم عالم بالا سے بول رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ کیا مذاق ہے؟ محسن اور غالب کہاں ہیں؟"

میں نے کہا۔ "وہ بھی اپنے ساتھ ہیں۔ تم کو نظر نہیں آ رہے؟"

"ساتھ ہیں تو بات کراؤ۔" رابعہ نے کہا۔

"بات کرنی ہے تو خود آ جاؤ۔ فون پر بات نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟" رابعہ نے بے چینی سے کہا۔

"ایک بڑی غلط چیز موجود ہے یہاں۔" میں نے سردار جی کی طرف دیکھ کے کہا۔ "اس کے علاوہ ابھی تمہیں صرف اتنا کہ تم دونوں اب نکل آؤ۔ زیور کپڑے سب ساتھ [illegible] سپنا ریسٹورنٹ دیکھا ہے نا تم نے، فوراً آ جاؤ۔"

سکندر نے مجھ سے ریسیور چھین کے پیچھے رکھ دیا۔ "[illegible] ہو گئے پورے۔"

میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "لالچی کیوں کاٹی؟ [illegible] ادا کروں گا۔"

"میں فون کا غلط استعمال نہیں کرنے دوں گا، تمہیں چاہے تم تیس لاکھ بھی دو تب بھی۔" سردار جی نے کہا۔

"کیا غلط استعمال کیا ہے میں نے فون کا؟" میں نے [illegible] کے کہا۔ "کیا میں نے فون الٹا پکڑ رکھا تھا؟"

"تم نے ایک لڑکی سے بات کی۔ اس سے کہا کہ [illegible] کے ساتھ گھر سے بھاگ آئے، سارے زیور کپڑے لے کر۔ اور تم سے سپنا ریسٹورنٹ میں ملے۔ بدمعاشی کرتے ہو [illegible] اور سے پوچھتے ہو فون کا کیا غلط استعمال کیا۔" وہ بھی چلانے لگا۔

میں نے کہا۔ "تم ماما لگتے ہو لڑکی کے؟"

اس نے خفگی سے کہا۔ "ہوش میں رہ کے بات کرو، بدمعاشی مت کرو۔"

"کیا؟" میں نے چلا کے کہا۔ "میں بدمعاش ہوں؟ [illegible] نہیں، تم نے اس وردی کو گالی دی ہے۔"

"یہ وردی تم کو کس الو کے پٹھے نے دی ہے؟" سردار جی نے بھی چلا کے کہا۔

"تم نے پولیس کمشنر کو الو کا پٹھا کہا؟" میں نے [illegible] لہرا کے کہا۔ "میں کیس کر دوں گا تم پر۔"

"میں پہلے ہی تین کیس لڑ رہا ہوں پولیس کے خلاف۔

اچھا! میرے پیسے واپس کرو۔" میں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

سردار جی نے انچاس روپے مختلف درازوں میں سے اکٹھے کیے پھر جیب میں سے پچاس پیسے نکالے۔ انہیں پیسے اب بھی کم تھے۔

"جاؤ کہیں سے کھلا لے کر آؤ۔" سردار جی نے کہا۔

"یہ میرا کام نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "کھلا نہیں تھا تو نوٹ لیا کیوں تھا؟"

"بیس پیسے بچے، اس کا کھلا کون دے گا؟ بیس پیسے بعد میں لے جانا۔" سردار جی نے کہا۔

"بیس میل دور سے میں بیس پیسے لینے کے لیے پھر آ سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "ٹیکسی کا آنے جانے کا کرایہ دے دو تو آ جاؤں گا ورنہ ابھی لے کر جاؤں گا۔"

"چلو تم ایک کال اور کر لو بیس پیسے میں۔"

"ٹھیک ہے اپنے گھر کا نمبر بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"میرے گھر کس کو فون کرو گے اور کیا کہو گے...؟"

میں نے کہا۔ "جو میرا دل چاہے گا کہوں گا۔"

سردار جی سخت اشتعال کے عالم میں دکان سے باہر گئے اور بیس پیسے لے کر لوٹے۔ وہ سکے میرے سامنے پھینکتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "خبردار! جو پھر کبھی میری دکان میں قدم رکھا۔"

میں نے کہا۔ "میں ابھی واپس آتا ہوں اور دیکھتا ہوں تم مجھے کیسے روکتے ہو۔ یہ پبلک فون ہے۔"

"تم پبلک نہیں، پبلک سرونٹ ہو۔"

میں نے کہا۔ "میں سرکاری افسر ہوں، تمہاری لائن کٹوا دوں گا۔"

"اوئے میں گردن کٹوا دوں گا مگر تیری آنکھیں توڑ دوں گا اگر تو پھر یہاں آیا۔ سرکاری افسر دے پتر۔" ان کی یہ آخری بات میں نے دکان سے باہر آنے کے بعد سنی اور بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو ضبط کیا۔ سردار جی جذباتی تھے اور گردن کٹوانے کے خاصے شوقین معلوم ہوتے تھے۔

نازو نے مجھے دیکھتے ہی خفا ہونا شروع کیا۔ "آخر یہ کیا مصیبت ہے؟ اتنی دیر لگتی ہے ایک فون کال میں؟ آدھا گھنٹا لگا دیا۔"

میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کے کہا۔ "اگر غالب تمہیں فون کرتا تو ایک گھنٹا بھی تمہیں کم لگتا۔"

غالب نے کہا۔ "میں فون کیوں کرتا؟ ایک گھنٹے میں تو پیدل آ جاتا۔"

نازو نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔ "ہم عورتوں کو تو خواہ مخواہ بدنام کیا جاتا ہے کہ باتیں بہت کرتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس آدھے گھنٹے کے بارے میں تم کیسے یہ کہہ سکتی ہو کہ صرف میں بولتا رہا۔ اکتیس منٹ رابعہ بولی۔ میں نے اپنی بات ایک منٹ میں کہہ دی تھی۔ انصاف سے کہو کیا میں اسے بولنے سے روک سکتا تھا۔" غالب نے کہا۔ "ہے کوئی [illegible] اور سنا کرے کوئی۔"

"جبھی وہ میں نے اپنے لیے کہا تھا۔" غالب بولا۔ "اور یہاں سے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے جیسے تم اس سکھ کو مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے دلائل دے رہے تھے یا وہ تمہیں سکھ بنانا چاہتا تھا۔"

"اور بعد میں؟" میں نے کہا۔

"بعد میں ممکن ہے گھر والے بلانے کی کوشش کرتا۔" نازو نے کہا۔ "یہ صورت سے تم اسی لگتے ہو جو تم نظر آ رہے ہو اس وقت۔"

"وہ ایک اصول پرست سکھ تھا۔" میں نے کہا۔

سردار جی کی اور میری گفتگو کے احوال نے سب کو محظوظ کیا۔ نازو اپنے یقین کے سہارے سپنا ریسٹورنٹ کی طرف بڑھ رہی تھی اور کسی سے راستہ پوچھنے پر آمادہ نہ تھی۔

میں نے کہا۔ "ایسے مت چلتی جاؤ، یہ نہ ہو کہ ہم مخالف سمت میں جا رہے ہوں۔"

"پھر کیا ہوا؟ دنیا گول ہے۔ جب ہم زمین کے گرد چکر مکمل کر لیں گے تو راستے میں سپنا ریسٹورنٹ ضرور آئے گا۔ بس ذرا راستہ لمبا ہو جائے گا۔"

ابھی اس کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ پیچھے سے آنے والی ایک گاڑی نے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ اور انتہائی خطرناک طور پر ہماری گاڑی کو اوورٹیک کیا۔ نازو نے تصادم کو بڑی مشکل سے بچایا۔ بریک لگا کے اس نے گاڑی کو دائیں طرف کیا تو اس کے اگلے پہیے فٹ پاتھ کی سائیڈ سے ٹکرا گئے۔

میرے منہ سے اس گاڑی والے کے لیے بے اختیار ایک گالی نکلی اور میں نے چلا کے کہا۔ "کیا جلدی ہے الو کے پٹھے؟"

الو کا پٹھا ایک جاہل اور خونخوار قسم کا شخص تھا۔ اس نے مجھے گھور کے دیکھا اور ایک دم بریک لگا دیے۔

"یہ تو لڑنے کے موڈ میں نظر آتا ہے۔" نازو نے تشویش کے ساتھ کہا۔

"غلطی اس کی تھی..."

"تم کو کیا ضرورت تھی گالی دینے کی؟ جب ہوا کچھ نہیں۔" نازو نے کہا اور اپنی گاڑی کو تھوڑا سا پیچھے کر کے سائیڈ سے نکالنا چاہا مگر اتنی دیر میں وہ گاڑی سے اتر کے سامنے آ گیا۔ میں لڑنے بھڑنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ اس کے تن و توش

www.paksociety.com

اور خوفناک مونچھوں کے باوجود نازو بھی اس سے تیس سیکنڈ میں مرعوب ہو گئی تھی۔

جب وہ سائڈ پر آیا تو میں نے کہا "دیکھو غلطی تم نے کی تھی مگر میں معافی مانگ لیتا ہوں۔"

جواب میں اس نے بڑی غیر متوقع حرکت کی۔ اس نے ایک دم پچھلے کا دروازہ کھولا اور محسن کو دھکیل کر اس کے ساتھ فٹ ہو گیا۔ میں نے مشتعل ہو کے پیچھے دیکھا تو مجھے اس کے ہاتھ میں ایک انتہائی خطرناک قسم کا ریوالور دکھائی دیا، جس کا رخ میرے سر کی طرف تھا۔

"گاڑی چلاؤ، میری صورت مت دیکھو گئے۔" اس نے اکھڑ لہجے میں غرا کے کہا "ورنہ کھوپڑی سے دماغ باہر کر دوں گا سمجھے۔ محمد خان نام ہے میرا لیکن خونی خان کہتے ہیں دنیا والے مجھے، تم تو اچھی طرح جانتے ہو گے۔" اس نے ایک قلمی دہن بانسپ قہقہہ لگایا۔

بلاشبہ وہ آدمی صورت سے جرائم پیشہ اور خونی ہی نظر آتا تھا۔ نازو نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ میں ابھی تک اس شخص کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ایک ہاتھ مار کے اس کی غلط فہمی دور کر دوں لیکن اس کے تیور خطرناک نظر آتے تھے۔۔۔۔۔۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے لال ڈورے گواہی دے رہے تھے کہ وہ واقعی خونی خان ہے اور اگر میں نے اس سے تکرار کی تو وہ میرا قتل کرنے میں دیر بھی نہیں لگائے گا۔ ابھی بہت کو ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ اس کا چہرہ بھاری اور سیاہی مائل گندمی تھا۔ اس کی داڑھی گھنی سیاہ اور برابر تراشی ہوئی تھی اور اس کے چہرے کے جلال میں اضافہ کر رہی تھی۔ یہ اس کی مونچھیں تھیں جو اس کی صورت کو دہشت ناک بناتی تھیں۔ خود غالب اور محسن اس کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے خوفزدہ وہ بھی نہیں تھے۔

"خونی خان! تم کہاں جانا چاہتے ہو؟" نازو نے پیچھے پلٹ کر دیکھے بغیر تمسخر آمیز انداز میں کہا۔

نازو کی آواز پر وہ چونکا "لڑکی۔۔۔ لڑکی ہے تو۔"

میں نے کہا "اس میں اعتراض کی کون سی بات ہے۔"

"مذاق اڑاتے ہو میرا تم لوگ، خدا کا شکر ادا نہیں کرتے کہ ابھی تک زندہ ہو۔ پولیس کے کتو!" خونی خان نے غرا کے کہا "میں بے گناہ کو بے وجہ مارنے کا قائل نہیں۔ بائیں طرف چلو لڑکی۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ تم اصولوں کے قائل ہو مگر ایک غلط فہمی ہوئی ہے تمہیں۔"

"تو نے یہ وردی کیوں پہن رکھی ہے؟" خونی خان نے میری بات سنے بغیر نازو سے کہا "یہ لیڈی پولیس والی کی وردی نہیں ہے۔"

"ہم پولیس والے نہیں ہیں خان صاحب۔" میں نے کہا۔

"تم پولیس کے آدمی نہیں ہو تو مجھے یقین ہے کہ یہ پولیس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تم نے میری بات نہیں سنی۔" میں نے کہا۔

خونی خان نے غالب اور محسن کی طرف دیکھا "لو کیا یہ دو زیر حراست مجرم نہیں ہیں، اب دائیں طرف موڑو گاڑی۔"

میں نے مسکرا کے کہا "یہ زیر حراست تو ہیں مگر مجرم نہیں ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑی کہاں ہے؟"

"پھر یہ زیر حراست کیسے ہوئے کیوں پکڑ رکھا ہے انہیں تم نے؟"

"ہم نے نہ انہیں پکڑ رکھا ہے نہ آپ کو۔" میں نے کہا "جس کا دل چاہے گاڑی رکوا لے اور اتر جائے۔"

"تم پولیس والے نہیں ہو تو یہ وردی کہاں سے آئی؟ کیا چکر ہے آخر؟ صاف صاف بات کرو۔" اس نے غرا کے اور بھنکار کے کہا "کون ہو تم لوگ؟"

میں نے کہا "بنا سمجھ، ہم اور آپ ایک ہی جیسے آتے ہیں۔ ہم بھی پولیس کی نگاہ میں مجرم تھے اور یہ وردیاں ہم نے پولیس سے چھین کر پہن لی ہیں۔"

"جیل سے بھاگے ہو تم لوگ؟" اس نے ہم سب پر ایک خشمگیں نظر ڈال کے کہا "گاڑی تیز چلاؤ اور چوک سے سیدھے ہاتھ پہ چلو۔"

میں نے اس کی بات پر غور کر کے کہا "کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔"

"تم نے کہا تھا یہ زیر حراست ہیں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "ہم سب دوست ہیں۔ دوستی کی زنجیر نے انہیں بھی ہمارے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ یہ ریوالور اب جیب میں ڈال لو باہر سے کسی نے دیکھا تو یہ صورت حال بہت غلط نظر آئے گی کہ خونی خان دو پولیس والوں کو گرفتار کر کے جا رہا ہے یہ نہ ہو پولیس تمہیں پہچان لے یا تمہیں چھڑانے کے لیے پیچھے لگ جائے۔"

"پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔" خونی خان نے کہا "یہ لڑکی اچھی ڈرائیور ہے۔"

میں نے کہا "یہ لڑکی نہیں آسمانی بجلی ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ غرایا۔

میں نے کہا "جس پر گر جائے وہ کہیں کا نہیں رہتا بلکہ یہ تمہارے احکامات کی تعمیل کر رہی ہے تو اس کی وجہ ہے کہ تم نے صرف خطرناک باتیں کی ہیں کوئی خطرناک حرکت نہیں کی اس ریوالور کا استعمال کر کے دیکھو پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ خونی خان جس کی بالشت بھر لمبی مونچھیں ہیں اور حقیقت ایک ہو جاتی ہے اس کی مونچھیں بھی لمبی ہوتی ہیں۔"

"بکواس کرتا ہے مجھے۔" خونی خان نے چیخ کے کہا۔ "اگر تم اپنی طاقت آزمانا چاہتے ہو تو ہم گاڑی ایک طرف روک لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"بس بہت ہو چکا، گاڑی روک دو۔ یہ لڑکی دو منٹ سے کم وقت میں ثابت کر دے گی کہ ریوالور زندوں کو کھلونا ہے۔ مقابلہ کرو گے اس سے خالی ہاتھ؟"

خونی خان مسکرایا "بے وقوف بنانا چاہتے ہو مجھے باتوں سے، چالاک آدمی ہو تم مگر کسی خوش فہمی میں مت رہنا، چار قتل کر چکا ہوں میں۔۔۔"

"صرف چار!" میں نے مایوسی سے کہا "نام ہے خونی خان اور قتل صرف چار کیے ہیں۔"

اس نے خفت کو چھپانے کے لیے کہا "چار تو میرے سامنے مر گئے تھے جو زخمی ہو کے بعد میں مرے یا جن کو میں نے مرتے ہوئے نہیں دیکھا ان کی تعداد بہت زیادہ ہو گی اور تمہاری طرح بک بک کرتے رہے تو پانچواں قتل تمہارا ہو گا، چھٹا اس لڑکی کا۔"

میں نے کہا "یعنی ان دونوں کو تم بخش دو گے جو تمہارے ساتھ بیٹھے ہیں، یہ تو بڑی غلط بات ہو گی۔ کیا تم کر دیتے ہو ان سے خان صاحب؟"

"بکواس بند کرو اپنی۔"

میں نے کہا "جب تمہیں اپنا اسکور آٹھ تک پہنچانے کا موقع مل رہا ہے تو تکلف کیسا، گنتی کے چھٹے لگاؤ سب کو صاف کر دو اور گاڑی لے جاؤ۔"

باتیں کرتے کرتے میں نے ایک ہاتھ مارا اور اس کا ریوالور اچھل کے آگے آ گرا۔ اس کی کلائی پر خاصی چوٹ آئی تھی ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ میں نے اسے آگے کھینچ کر اس کی گردن دبا لی۔ نازو نے اپنا ریوالور مجھے پکڑا دیا پھر اس نے گاڑی روک لی اور خان کا ریوالور غالب کو دے دیا۔

"خونی خان! کیا خیال ہے اب؟" میں نے کہا "تمہارے ہاتھ میں ابھی اس لڑکی سے مقابلہ کرو گے؟"

خونی خان بری طرح محصور ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرف گاڑی کا دروازہ تھا اور دوسری طرف سے غالب نے اسے دبا لیا تھا۔ وہ خود کو چھڑانے کے لیے پورا زور لگا رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا مگر اپنی کوشش میں ناکام تھا۔

"جلدی کرو لڑکو!" میں نے کہا "وقت کم ہے جانے دو۔"

"مجھے چھوڑ دو تو سہی۔" اس نے ڈکارتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی گردن چھوڑی تو اس نے ایک لمبی گہری سانس لی۔ اسے اپنے سامنے اور بائیں جانب دو ریوالور دکھائی دیئے۔ نازو نے ایک نقشہ اپنے سامنے پھیلا کے کچھ دیکھنا شروع کیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"بمبئی کا نقشہ۔" نازو نے سرسری انداز میں کہا۔

"یہ کہاں سے لیا تم نے؟"

"جب تم فون کرنے گئے ہوئے تھے تو ایک بک اسٹال پر نظر آ گیا تھا۔" غالب نے کہا "میں اخبار دیکھنے گیا تھا مگر یہاں تو سب اخبار سندھی میں چھپتے ہیں۔"

"پتا نہیں ہم کدھر آ گئے اس خبیث کی وجہ سے۔" محسن نے دانت پیس کر غصے سے خونی خان کو دیکھا۔

خونی خان کا چہرہ لال پڑ گیا "اگر تیرے پاس ساتھ نہ ہوتے اور ریوالور نہ ہوتے تو میں سبق سکھاتا تجھے۔"

میں نے اس کے منہ پر چانٹا لگایا "چوہے کی اولاد! ابھی جب تیرے ہاتھ میں تھا یہ ریوالور تو خونی خان بھی بہت بہادر بن رہا تھا مگر خیر ہم یہ ریوالور ہٹا لیتے ہیں۔ اب یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو، انتخاب تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

میں نے اور غالب نے ریوالور جیب میں ڈال لیے۔

"اب کچھ پتا نہیں چل رہا ہے راستوں کا۔" نازو نے کہا "میں نے نشان لگا لیا تھا نقشہ دیکھنے کے بعد۔"

"لاؤ یہ مجھے دو۔" غالب نے کہا "میں دیکھتا ہوں۔"

"وہ انتظار کر رہی ہوں گی ہمارا۔" نازو نے نقشہ غالب کو تھما کے کہا اور خونی خان کی طرف دیکھا جو چانٹا کھانے کے بعد اپنا گال سہلانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی تھی مگر وہ حیران تھا کہ ہم لوگ کون ہیں جو نہ پولیس والے ہیں اور نہ رویے سے مجرم نظر آتے ہیں۔

میں نے کہا "خونی خان! مجھے تمہارے جواب کا انتظار ہے۔ بولو تمہارے جاؤ گے یا مقابلہ کرو گے اس لڑکی سے؟"

خان پریشان نظر آنے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے یہ سوال سنجیدگی سے کیا ہے۔ غالب بڑے انہماک سے سیلار ریسٹورنٹ پہنچنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا اور نازو کو نقشے کی مدد سے بتا رہا تھا کہ اب کس طرف سے وہاں پہنچنے کی کوشش کرنا ہے۔ محسن بالکل خاموش تھا اور سیٹ کی پشت پر سر ٹکائے آنکھیں بند کیے پڑا ہوا تھا۔ نازو نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی۔

"دیکھو میں تمہیں پولیس سمجھ کے غلطی سے تمہاری گاڑی

www.paksociety.com

"میں پہنچ گیا تھا۔" خان نے کہا۔

"وہ غلطی ہم نے معاف کی۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ تم نے غنڈے پکڑنے کے لیے پولیس کی گاڑی میں بیٹھنا پسند کیا جب کہ پولیس تمھارے تعاقب میں تھی۔"

"میرا مقصد یہ تھا کہ تمھیں یرغمال بنا لوں اور اگر پولیس پیچھے رہے تو تمھیں جان سے مارنے کی دھمکی دے کر نکل جاؤں۔ جب وہ دیکھتے کہ دو پولیس والے میرے قبضے میں ہیں تو وہ گاڑی پر فائرنگ نہیں کر سکتے تھے۔"

میں نے سر ہلا کے کہا۔ "تمھاری بات سمجھ میں آتی ہے۔ یہ ایک اچھا پلان تھا۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ پولیس تمھارے تعاقب میں کیوں تھی کیونکہ وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"میں ایک مشہور ڈاکو ہوں۔" خان نے کہا۔ "کیا تم نے میرا نام کبھی نہیں سنا؟"

"افسوس کہ ہم اس سعادت سے محروم رہے۔ بہرحال مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے۔" میں نے کہا۔ "کیا کرو گے تم اب؟ مقابلہ یا خود کو پولیس کے حوالے؟"

"پولیس کے حوالے کیسے کر سکتا ہوں میں خود کو۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "اور تم بھی مجھے پولیس اسٹیشن کیسے لے جا سکتے ہو؟"

"تمھیں پولیس کے حوالے کرنے کے لیے ہمارا پولیس اسٹیشن جانا ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم تمھیں گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر دھکا دے سکتے ہیں۔ تمھیں ناک آؤٹ کرنے کے بعد۔ راستے میں کئی جگہ پولیس نظر آئے گی۔ پولیس کی چوکیاں بھی ہوں گی، وہ خود اٹھا کے لے جائیں گے تمھیں۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔" وہ پہلی بار التجا کرنے پر مجبور نظر آیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم اس لڑکی سے مقابلہ کر لو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے بڑی تیزی سے اس کے دوسرے گال پر چانٹا مارا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے کیا کہا تھا تم نے کہ تیرے یار ساتھی ہوتے اور ان کے ہاتھ میں ریوالور نہ ہوتے تو تم اس لڑکی کو سبق سکھاتے۔ ہم تمھیں موقع دے رہے ہیں کہ جو کہا تھا وہ کر کے دکھاؤ۔ ہم دخل نہیں دیں گے اور نہ ریوالور استعمال کریں گے۔"

"خونی خان ایک لڑکی سے مقابلہ کرے تو اس پر ہزار بار لعنت۔" وہ مشتعل ہو کے بولا۔ "تم خود آؤ مقابلے پر۔"

میں نے کہا۔ "میری باری بعد میں آئے گی۔ پہلے تم اس لڑکی سے نمٹ لو، خونی خان!"

"یہاں؟ سڑک پر؟"

"نہیں، اس کے لیے ہم جگہ تلاش کر لیں گے۔ ابھی تو ہم کہیں جا رہے ہیں کسی سے ملنے کے لیے۔"

"تو تم جاؤ، مجھے چھوڑ دو۔" وہ بولا۔

"ایسے ہی چھوڑ دیں؟ کیا تم نے سنا نہیں کہ آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے مگر جانا دوسرے کی مرضی سے۔" میں نے کہا۔

وہ بہت نامی گرامی ڈاکو تھا یا نہیں تھا، اس بارے میں ہم سب کچھ نہیں جانتے تھے کیونکہ ہم پردیسی تھے۔ جو شخص ہمارے سامنے تھا، وہ صورت سے ضرور خطرناک لگتا تھا لیکن انتہائی بے بسی اور مجبوری نے اسے بزدل بنا دیا تھا۔ خونی خان کہلانے والا جیسا کہ وہ خود پہلے کہہ چکا تھا، اسلحہ کھو بیٹھا تھا اور اب ہمارے رحم و کرم پر تھا۔ شاید اس کے لیے سب سے مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ اسے ایک لڑکی سے مقابلے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ اسے وہ اپنی مردانگی کی توہین سمجھ رہا ہوگا۔ بصورتِ دیگر اس کے لیے پولیس کا ہوا تھا۔ گویا آگے کھائی اور پیچھے خندق۔ دکھاوے کے ہم اسے مجبور کر رہے تھے کہ لڑو، مت رہو آگے چلو یا پیچھے جاؤ۔ شاید لوگ اس کے نام سے خوف بھی کھاتے ہوں گے مگر یہاں اس کا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑا تھا جو اس کو خونی خان کہہ کے مزید ذلیل کر رہے تھے۔

اس کے گاڑی میں بیٹھنے تک میرے ذہن میں کوئی ایسی ویسی بات نہ تھی۔ اگر وہ خود اپنا تعارف نہ کراتا تو میں بہت پہلے ہی اس کو چلتی گاڑی سے ڈراپ کر دیتا مگر اس نے بتایا کہ وہ ڈاکو ہے تو میں نے اسے بلیک میل کر کے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"یہ آخر تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" خونی خان نے کچھ دیر بعد پریشان ہو کے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "جب تم ہماری کشتی میں آ کودے ہو تو اب جو بھی ہو، ڈوبے یا پار لگے۔"

اس نے کہا۔ "تم مجھے وہاں چھوڑ دو جہاں میں جانا چاہتا تھا، اس کا تمھیں منہ مانگا معاوضہ دوں گا میں۔"

میں نے کہا۔ "اندازاً کتنا؟"

اس نے کہا۔ "تمھاری توقع سے بہت زیادہ۔"

میں نے کہا۔ "ایک کروڑ یا اس سے بھی زیادہ؟"

اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ "ڈاکو ہے اور بڑی مت سوچو۔"

"تم نے منہ مانگنے کی بات کی تھی، پہلے ہی بتا دیتے کہ ایک لاکھ سے زیادہ کی اوقات نہیں ہے تمھاری۔"

"میری اوقات کی بات بھی مت کرو۔ دس لاکھ کا انعام ہے میری گرفتاری پر، مجھے زندہ یا مردہ پیش کرنے پر۔"

بے اختیار نازو نے بھی اسے پلٹ کر دیکھا اور ہنس پڑی۔

"ہنسی کیوں ہے لڑکی؟ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" وہ برہم ہو کے بولا۔

"ہنسی مجھے اس بات پر آ رہی ہے کہ تم جتنے بڑے ڈاکو ہو اتنے بڑے احمق بھی ہو۔" نازو نے کہا۔ "تم ایک لاکھ لینے کی بات بھی کرتے ہو اور یہ بھی بتاتے ہو کہ تمھارے سر کی قیمت دس لاکھ ہے جو ہمیں پولیس سے مل سکتی ہے۔"

وہ کچھ جھینپ کر بولا۔ "مگر تم دس لاکھ پولیس سے کیسے لے سکتے ہو؟ میرا مطلب ہے لو گے کیسے؟"

میں نے کہا۔ "تمھیں پیش کر کے، یہ کیا مشکل کام ہے؟"

"تمھارے لیے مشکل ہے۔" وہ بولا۔

"ہم سب کے لیے مشکل ہو سکتا ہے مگر ہمارے کچھ لوگ بھی ساتھی ہیں۔ وہ تمھیں لے جا سکتے ہیں اور شرط تو زندہ پیش کرنے کی نہیں ہے تو پھر کیا مشکل ہے؟ تمھارا جنازہ ہی تھانے لے جانا ہوگا۔"

نازو نے کہا۔ "وہ بھی ہم نہیں اٹھائیں گے، میونسپلٹی کی گاڑی یا کچرا گاڑی لے جائے گی۔"

یکلخت خان کو جلال آ گیا۔ "اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ بھی سوچا ہے تم نے؟"

میں نے کہا۔ "ظاہر ہے دس لاکھ ہم آپس میں بانٹ لیں گے۔ بحساب دو دو لاکھ روپے فی کس۔"

"مگر یہ اتنا آسان ہوتا تو اب تک کئی لوگ امیر ہو جاتے۔ کس میں ہے اتنی ہمت کہ خونی خان کی زندگی کا سودا کرے۔ دس لاکھ تو بہت بعد میں ملیں گے کسی وارث کو، اگر کوئی وارث بچا۔ تین سو کے قریب نے لانچ میں مخبری کی تھی، راتوں رات ان کا خاندان غائب ہو گیا۔ تم بھی چلے آئے، مال کسی کو پولیس کے پاس بھیج کر دیکھو۔ وہ جا کے صرف اتنا کہے کہ اسے خونی خان کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ وہ آج کل کہاں ہے۔ اگر وہ واپس آ جائے تو میرا ذمہ۔"

"کیا ایسے بتانے والے خود فوراً پھانسی چڑھا دیے گئے؟" میں نے طنز سے کہا۔

"میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو تم؟" وہ بولا۔ "پولیس کیا ہم سے الگ ہے؟ ہم لوگوں سے زیادہ وہ ہمارا دیا ہوا نمک کھاتے ہیں۔ حکومت پورے سال میں انھیں اتنی تنخواہ نہیں دیتی جتنا انعام ڈاکو انھیں ہر مہینے دیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "گویا یہاں بھی پولیس ڈاکوؤں کے ساتھ ہے۔"

"یہاں بھی کا کیا مطلب؟" اس نے حیران ہو کے پوچھا۔

میرا ذہن غیر ارادی طور پر اپنے پاکستان کی طرف چلا گیا تھا جہاں زبانِ خلق یہی کہتی تھی۔ اس میں کتنا سچ تھا، کتنا جھوٹ، کتنی حقیقت تھی اور کتنا مبالغہ تھا، یہ کوئی کیسے جان سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ "چلو چھوڑو یہ بات۔"

"تم بھی دس لاکھ کے چکر میں مت پڑو۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آدمی لالچ میں ہی مارا جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمھیں اپنے ساتھیوں پر بہت بھروسا ہے؟"

خان نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "ان میں سے ہر ایک میری خاطر اپنی زندگی ہزار بار قربان کر سکتا ہے۔ جہاں میرے خون کا ایک قطرہ گرے، وہاں وہ اپنا سر کٹا سکتے ہیں۔ میرے خون کے ہر قطرے کے بدلے میں وہ ایک خون کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مگر آخر وہ سب ڈاکو تمھارے بیٹے تو نہیں ہیں۔"

اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ "ایسا مت کہو، وہ سب بیٹے ہی ہیں میرے، بیٹوں سے زیادہ عزیز ہیں مجھے۔ اگر میرے اپنے بیٹے ہوتے تو شاید میرے لیے اتنا نہ کر سکتے جتنا میرے یہ ساتھی کر سکتے ہیں۔ ہمارے درمیان خون کا رشتہ نہیں ہے تو کیا ہوا؟"

میں نے کہا۔ "کچھ رشتے خون کے رشتوں سے زیادہ پائدار اور سچے ہوتے ہیں، میں تسلیم کرتا ہوں۔"

"دیکھو اب بات ختم کرو۔ میں تمھیں دو لاکھ دیتا ہوں۔" خان نے کہا۔

گاڑی سپر اسٹور سے کچھ فاصلے پر ایک سائڈ اسٹریٹ میں رک گئی۔ میں نے غالب سے کہا۔ "اندر سے ان دونوں کو اپنے ساتھ لے آؤ اور ٹیکسی میں ہمارے پیچھے پیچھے آؤ۔ بھوک کے ہم سب ہیں، اپنے ساتھ کھانے پینے کا جتنا سامان اٹھا کے لا سکتے ہو وہ بھی لیتے آؤ۔"

غالب نے محسن کی طرف دیکھا جو اب تقریباً بے ہوش تھا اور میں نے اس کی نگاہوں کے سوال کو سمجھ لیا۔

میں نے کہا۔ "خان صاحب کی فکر مت کرو، یہ سمجھدار آدمی معلوم ہوتے ہیں، خودکشی نہیں کریں گے۔"

غالب نے نازو کو اشارہ کیا۔ "تم بھی آؤ۔"

پہلے نازو تذبذب میں پڑ گئی پھر اس نے اپنا ریوالور بھی مجھے تھما دیا۔

میں نے کہا۔ "اندر ٹائلٹ روم بھی ہوگا۔"

نازو نے میری بات فوراً سمجھ لی۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اندر جائے تو اپنی یہ پولیس کی وردی اتار کر میرے ساتھ لگے ہوئے لیڈیز ٹائلٹ روم جا کر بدل لے۔ میری ہدایات کے مطابق کل لوزر البتہ اپنے ساتھ کپڑوں کا سوٹ کیس ضرور لائی ہوں

گی — اس میں نازو کے پیسے بھی شیشے چڑھے تھے جن کو ابھی تک چٹخنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ پولیس کی وردی میں وہ بے حد مضحکہ خیز نظر آتی تھی۔ دیکھنے والے اتنے نرم و نازک اور دبلے پتلے پولیس مین کو دیکھ کر بھی حیران ہوتے تھے اور اس کی ڈھیلی ڈھالی وردی کو دیکھ کر بھی۔ پھر جب وہ بات کرتی تھی تو سارا پول کھل جاتا تھا اور اس کی وردی شکوک پیدا کرتی تھی کیونکہ نازو پولیس کی وردی ہی الگ تھی۔

غالب اور نازو ابھی چند قدم دور ہی گئے تھے کہ پولیس کی ایک گاڑی ہم سے کچھ فاصلے پر آکے ٹھہر گئی۔ اس ہی آگے ڈرائیور کے ساتھ کوئی انسپکٹر کے عہدے کا افسر ٹیک لیے بیٹھا ہوا تھا اور شاید کسی سے وائرلیس پر گفتگو کر رہا تھا۔

جس گاڑی میں ہم بیٹھے ہوئے تھے اس کے شیشے سیاہی مائل سرمئی تھے چنانچہ گاڑی کے اندر سے باہر سب کچھ دکھائی دیتا تھا لیکن باہر سے دیکھنے والوں کو گاڑی میں صرف اندھیرا نظر آتا تھا۔ اگر گاڑی کے شیشے شفاف ہوتے تو میں اس طرح سرِعام ایک ڈاکو پر ریوالور تانے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

اچانک مجھے ڈاکو محمد خان عرف خوفی خان کے چہرے پر تشویش اور پریشانی کے آثار نظر آنے لگے۔

"یہ تو وہی گاڑی ہے۔"

"کون سی گاڑی؟" میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔

"جو میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔"

"یہ سیدھے یہاں کیسے آپہنچے؟" میں نے بھی فکر میں مبتلا ہو کے سوچا۔

"معلوم نہیں، کسی نے مخبری نہ کی ہو۔" خان نے کہا اور اس وقت وہ مجھے واقعی خوف سے لوٹتے میں ڈوبتا جانے والا لگا۔ پولیس کی گاڑی ہم سے بیس گز کے فاصلے پر رکی ہوئی تھی اور اس کے پچھلے حصے میں بیٹھے ہوئے بندوق بردار سپاہی بھی کود کود کے باہر آرہے تھے۔

میں نے خان سے کہا "خاموش بیٹھے رہو۔ یہ لوگ تمہیں دیکھ نہیں سکتے۔ شیشے بند ہوں تو گاڑی خالی لگتی ہے۔"

اس نے سر ہلایا مگر اس کے ماتھے پر تفکرات کی شکنوں کا جال بدستور گہرا رہا۔ اس نے پھر کہا "یہ یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ ہمارے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ وہ گاڑی کس کی تھی جو تم نے چھوڑ دی تھی؟"

"وہ میں نے چھینی تھی اور پولیس نے اتفاق سے مجھے اس گاڑی میں دیکھ لیا تھا۔" خان نے کہا۔

"گاڑی چھینتے وقت دیکھ لیا تھا؟"

"نہیں، ایک چوک سے گزرتے ہوئے میں سگنل پر ٹریفک جام میں پھنس گیا تھا۔ وہاں پولیس کی یہ گاڑی مجھ سے کچھ دور آگے ٹھہری۔ ادھر سگنل کھلا ادھر ایک خبیث انسپکٹر نے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا۔ اسی نے جو اب مائیک لیے بیٹھا ہے۔"

"اسی لیے تم نے وہ گاڑی وہاں چھوڑ دی تھی؟"

"ہاں، میں سمجھا تھا تم پولیس والے ہو، تمہیں اپنی ڈھال بنانا چاہتا تھا۔" خان نے کہا۔

میں نے کہا "یعنی تم آسمان سے گر کے کھجور میں اٹک گئے۔"

"وہ کیسے؟" خوفی خان نے بے خیالی میں کہا۔

"تم پولیس سے بچنا چاہتے تھے اور پھنس گئے ایسے لوگوں کے ساتھ جو پولیس کے بھی باپ ہیں۔"

"یہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ ایک اور گاڑی بھی آگئی ہے پولیس کی۔" ڈاکو محمد خان نے پریشان ہو کے کہا۔

دوسری گاڑی سینار ریسٹورنٹ سے بیس گز پیچھے ٹھہر گئی تھی اور اس میں آنے والوں نے بھی محاصرے کے انداز میں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ پولیس والے جب اعلیٰ افسران کی نگرانی میں کوئی کام دوائی سنجیدگی سے کرتے ہیں تو ان کی مستعدی کا ڈراما قابلِ دید ہوتا ہے۔ دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس محکمے کا کام چوری اور حرام خوری سے تو دور کا بھی تعلق نہیں۔

بظاہر آگے پیچھے کھڑی ہوئی دونوں گاڑیوں کے درمیان رابطہ قائم تھا اور ان کے تیور بتاتے تھے کہ وہ سینار ریسٹورنٹ کا محاصرہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کی نظریں بار بار ریسٹورنٹ کے دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ خیال میرے لیے بھی باعثِ تشویش ہونے لگا تھا۔

اگر یہ کوئی عام ایرانی ہوٹل ہوتا تو وہ اتنا تکلف نہ کرتے۔ وہ بندوقیں اٹھا کے دندناتے ہوئے اندر جاتے اور مطلوبہ ملزمان کے علاوہ بھی جو ہاتھ لگتا یا انہیں مشکوک نظر آتا اسے باندھ لاتے مگر یہ ایک فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ تھا جس کے باہر کاروں کی قطاریں گواہ تھیں کہ اندر عام لوگ نہیں ہوں گے اور کسی قانونی اختیار کے بغیر وہ اندر داخل ہوں گے تو خود پھنس جائیں گے۔ شاید ابھی تک انہیں یہ قانونی اختیار حاصل نہیں ہوا تھا۔

اب میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ پولیس نے اتنے کم وقت میں سینار ریسٹورنٹ تک رسائی کیسے حاصل کر لی اور وہاں وہ ڈاکو محمد خان کو پکڑنے کے لیے آئے ہیں یا "ایم آر ایس" کے معتبر اراکین کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ پولیس کو ہماری تلاش بھی تھی اور شاید ایک ڈاکو کے مقابلے میں ہمارے زیادہ بڑے دشمن تھے۔ ان لوگوں سے تو انہیں کچھ ملتا ہی تھا۔ ہم انہیں جل دے کر نکل آئے تھے۔ ترکیبی اور

دلاوروں نے مل کے ہمارے خلاف محاذ بنایا تھا اور انھوں نے دولت سے پولیس کی طاقت کو بھی خرید رکھا تھا۔ اسی دوران وہ بھی اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی اتار کے اور بندھے ہوئے ہاتھ کھول کے سڑک تک پہنچ گئے ہوں گے۔ زحمت طلبی میں ہوں گے ساتھیوں نے پیچھے سے اور پھر تک پولیس کے محکمے کو ہلا دیا ہوگا اور اپنی ذاتی خفیہ فورس کو بھی سارے شہر میں پھیلا دیا ہوگا۔

میں ڈاکو محمد خان کی طرف سے بھی غافل نہیں تھا اور یہ بھی سوچ رہا تھا کہ پولیس نے سینار ریسٹورنٹ میں داخل ہو کر رابعہ، نازو اور غالب کو دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔ غالب مزاحمت کر نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنا ریوالور بھی چھوڑ گیا تھا۔ رابعہ کے پاس ریوالور ہوگا مگر اسے موقع بھی نہیں ملے گا کہ ریوالور نکال سکے اور اگر وہ ریوالور نکالنے میں کامیاب رہی تو ایک ریوالور سے کب تک سب کو بچانے گی اور کیسے بچائے گی۔ نازو بھی خالی ہاتھوں کی مدد سے کچھ دیر اپنا دفاع کر سکتی تھی مگر کسی ریسٹورنٹ میں پولیس سے مقابلہ کرنا بہت مشکل کام تھا۔ ان کے چاروں طرف میزیں اور کرسیاں ہوں گی، لوگ ہوں گے اور فرار کا راستہ بھی مسدود ہوگا۔ انھیں یہ ڈر بھی ہوگا کہ فائرنگ کی زد میں بے گناہ لوگ نہ آجائیں۔ بفرضِ محال وہ دروازے سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے تب بھی دروازے کا دونوں طرف سے پولیس کی گاڑیوں نے محاصرہ کر رکھا ہے۔

اب میرا باہر نکلنا بھی اتنا ہی ناممکن تھا جتنا میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ڈاکو کا۔ میری وردی مجھے نہیں بچا سکتی تھی۔ تمام لوگوں نے یعنی سردار جی نے اس وردی کو مشکوک سمجھا تھا۔ پولیس والے تو فوراً تاڑ جاتے کہ نہ یہ وردی میری ہے اور نہ وردی کے اندر کوئی پولیس مین ہے۔ ڈاکو محمد خان کی پوزیشن بدتر تھی۔ وہ باہر نکل کے کیا کرتا جب کہ اس کے لیے فرار کے سب راستے مسدود تھے۔ ہمارے دائیں بائیں بہت کم فاصلے سے گاڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی کھڑی تھیں اور آگے پیچھے لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو سڑک پر اور فٹ پاتھ پر رواں تھا۔

جب محمد خان نے خود کلامی کے انداز میں تیسری بار کہا کہ "ان حرام زادوں کو یہاں کس نے بھیجا" تو میرا ذہن فوراً پلٹ گیا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کسی نے مخبری کی ہو۔ میں نے سوچا اور معاملہ فوراً میری سمجھ میں آگیا۔ انھیں [illegible] سمگلر کمپنی نے سینار ریسٹورنٹ کا پتا دیا ہوگا۔

میں نے کہا "خان صاحب! تم نے اپنے ساتھ ہمیں بھی مروا دیا۔"

"میں نے؟ وہ کیسے؟"

میں نے کہا "جہاں تم نے اپنی گاڑی چھوڑی تھی وہاں ایک سکھ فوٹوگرافر کی دکان تھی۔"

"وہ میں نے نہیں دیکھی۔"

"مگر میرا اس سے جھگڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کی دکان سے فون کیا تھا اور میرا خیال ہے کہ وہ میری گفتگو بہت غور سے سن رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"تم نے کسے فون کیا تھا؟"

"میں نے کہا تھا کہ ہم سینار ریسٹورنٹ پہنچتے ہیں، تم بھی پہنچ جاؤ۔ وہ کچھ خبطی تھا۔ کہنے لگا کہ کیسے بلا رہے ہو سینار ریسٹورنٹ میں، میرا جواب اسے پسند نہیں آیا اور جھگڑا ہو گیا۔"

"تم نے کسی لڑکی کو فون کیا تھا؟"

"میں نے دو لڑکیوں کو فون کیا تھا، وہ اندر ہوں گی اور اب آ گئی ہی ہوں گی۔" میں نے کہا "سکھ نے مجھے تو خیر دیکھا ہی تھا، غالباً اس نے تمہیں بھی اپنی گاڑی سے اتر کے ہماری گاڑی میں بیٹھتے دیکھ لیا۔ وہ گاڑی تو وہیں کھڑی ہوگی۔ پولیس نے گاڑی کو قبضے میں لینے کے بعد ادھر ادھر کے لوگوں سے پوچھا ہوگا تو اس خبیث سکھ نے بتایا ہوگا کہ جو شخص اس گاڑی میں سے اترا تھا وہ ایک کارٹون ٹائپ پولیس مین کی گاڑی میں بیٹھ کے چلا گیا تھا۔"

"کیا اس نے تمہاری گاڑی کا نمبر نہیں دیکھا تھا؟"

"اگر دیکھا ہوتا تو پولیس اب تک ہمیں باہر نکال چکی ہوتی۔ شاید اس کی نظر کمزور ہوگی کہ وہ نمبر نوٹ نہیں کر سکا۔" میں نے ایک امکان ظاہر کیا۔

"پھر اب ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟"

میں نے کہا "اس گاڑی کے اندر تو کوئی خطرہ نہیں۔ اس گاڑی سے نکلے تو ہم دونوں پکڑے جائیں گے۔" میں نے کہا

"تم عجیب بے وقوف آدمی ہو۔ گاڑی لے کر نکل کیوں نہیں جاتے یہاں سے؟" خوفی خان نے کہا۔

میں نے کہا "تم مجھ سے بڑے بے وقوف ہو جانی! کہاں ہے گاڑی میں؟ بخیریت اسی میں ہے کہ خاموش بیٹھے رہو۔ تم سے زیادہ مجھے اپنے ساتھیوں کی فکر ہے جو اندر گئے ہوئے ہیں۔ اب وہ لڑکی واپس آئے گی جو گاڑی چلا رہی تھی تو ہم جائیں گے یہاں سے۔"

"تم نے تو اسے کہا تھا کہ ٹیکسی میں آنا۔"

"اچھی بات یہ ہے کہ وہ بے وقوف نہیں ہے۔ جب وہ دیکھے گی کہ چابی اس کے پاس ہے تو ادھر ضرور آئے گی۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا۔ "اور میری گاڑی نکال لے گی۔"

"وہ اسی پولیس کی وردی میں ہوگی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ دوسری اچھی بات ہے کہ وہ لباس بدل کے آئے گی۔ جب وہ کار نکالے گی تو کسی کو بھی شک نہیں ہوگا۔"

"اور اگر اس سے پہلے ہی وہ پکڑی گئی؟"

"آسمانی بجلی کو بھلا کون پکڑ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ اس کا اصل نام ہے؟"

میں نے کہا۔ "آسمانی بجلی کا اصل نقلی نام کیا۔ بس ایک ہی نام ہے۔"

"آخر ابھی تک پولیس اندر کیوں نہیں گئی؟"

"ان کے پاس سرچ وارنٹ نہیں ہوں گے۔ وہ ہمیں باہر نکلتے ہی گرفتار کرنا چاہتے ہیں شاید۔" میں نے کہا۔ "یہ تیسری اچھی بات ہے مگر یہ لوگ اسی طرح یہاں کھڑے رہے تو سمجھو ہم بچ گئے۔"

لیکن اسی وقت ایک جیپ دونوں پولیس کی گاڑیوں کے درمیان اور ریسٹورنٹ کے دروازے کے سامنے آکے رکی اور اس میں سے ایک پولیس افسر اترا جسے میں نے غور سے دیکھ کے ایس پی تسلیم کر لیا۔ اس کے ساتھ اترنے والا دوسرا شخص سوٹ میں تھا اور جو تحکم خود ایس پی صاحب اس کے سامنے باادب، باملاحظہ ہوشیار کھڑے تھے، اس لیے میرا قیاس کہتا تھا کہ وہ ایس ڈی ایم یا کمشنر قسم کا انتظامی افسر ہوگا۔

وہ دونوں ایک ساتھ ریسٹورنٹ کی طرف بڑھے تو میں نروس ہونے لگا۔ اب پولیس کے لیے معاملہ اختیار کا نہیں رہا تھا۔ بااختیار افسران خود ان کی مشکل آسان کرنے کے لیے آگئے تھے۔ انھیں کوئی اندر جانے سے اور پھر پولیس کے خود لیے گرفتار کرنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ وہ حکم دے سکتے تھے کہ تمام دروازے بند کر دیے جائیں اور اندر موجود سب افراد اندر ہی رہیں۔ یہ بہت خطرناک صورتِ حال بن سکتی تھی اور میں خاموش تماشائی بن کے اپنے ساتھیوں کی گرفتاری کا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ڈاکٹر محمد خان کی مجھے زیادہ فکر نہیں تھی۔ اگر وہ پکڑا بھی جاتا تو مجھے پروا نہ ہوتی مگر اس کی وجہ سے میں گاڑی کے اندر چھپ کر بیٹھ نہ سکتا تھا۔ میں باہر نکل کے پولیس سے ان کے ہتھیار چھینتا اور اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے لیے مجھے وہاں موجود ساری پولیس فورس کا مقابلہ کرنا پڑتا تو بھی دریغ نہ کرتا۔

لیکن خدا نے مجھے آزمائش سے محفوظ رکھا۔ اس سے پہلے کہ ایس پی اور اس کا افسرِ اعلیٰ ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے، سب سے پہلے رابعہ باہر آئی۔ اس نے بڑے اہتمام کے ساتھ گلابی ساڑی باندھ رکھی تھی جس پر گہرے سرخ دائرے سے تھے اور دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں میچنگ ہوا ہینڈ بیگ تھا اور غالباً اس نے اپنے بال اسی ہوٹل کے ہیئر ڈریسر سے سیٹ کروا لیے تھے جہاں وہ مقیم تھی۔ اس کے بالوں کا یہ انداز بھی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے حسن اور تمکنت کے ساتھ اس انداز آرائش نے رابعہ کی شخصیت کو بے حد بارعب اور متاثر کن بنا دیا تھا۔ ایس پی اور اس کا ساتھی از خود احتراماً ایک طرف ہو گئے۔ رابعہ کے پیچھے کل آئی تو اس کی شان بھی نرالی تھی۔ وہ سر سے پیر تک سفید تھی۔ لباس میں تھی اس کی جارجٹ کی ساڑی، جوتے، ہینڈ بیگ اور جیولری سب سفید تھے۔ صرف اس کے بال کالے تھے جن کو اس نے دو حصوں میں تقسیم کر کے دونوں شانوں پر پھیلا دیا تھا۔ نازو نے عجلت میں لباس تبدیل کیا تھا مگر پھر بھی خاصا سلیقہ برتا تھا۔ یونیفارم پولیس کی وردی شاید اس نے ٹائلٹ روم میں ہی چھوڑ دی تھی۔ اب وہ سیاہ بلاؤز اور ساڑی میں تھی اور اس نے بھی سیاہ فریم کا دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس سیاہی کے ساتھ اس کے اپنے گورے رنگ کی چمک دمک زیادہ خیرہ کن لگتی تھی۔ دروازے سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے والے ان معزز خواتین کے لیے دروازہ تھامے کھڑے رہے اور میں سانس روکے یہ منظر دیکھتا رہا۔ مجھے اب غالب کا انتظار تھا۔

غالب اور پیچھے چار دوسرے اٹھائے تمودار ہوا تو کسی نے بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ سب کی نظریں ان تین مختصر پوشاک خواتین پر تھیں جو اپنے حسن و جمال اور اداؤں سے پردۂ سیمیں کی اداکارہ لگتی تھیں مگر ان کو نہ کسی نے پہلے دیکھا تھا اور نہ ان کی صورتیں کسی بھی مشہور فلم سٹار سے ملتی تھیں چنانچہ دیکھنے والے محض رعبِ حسن میں مبہوت کھڑے ہوئے تھے۔ ایسے میں غالب کی طرف کون دیکھتا جو ویسے بھی ان کا باڈی گارڈ یا ملازم نظر آتا تھا۔

ریسٹورنٹ کے سامنے ہی ایک ساتھ تین ٹیکسیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ رابعہ کے ساتھ غالب ایک ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔ نازو نے مرچ فرام نازنے کی ٹیکسی تے ہوئے دروازہ اپنا ہینڈ بیگ جھلاتے ہوئے سیدھا اس کار کی طرف رخ کیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اگر نازو بھی ٹیکسی میں بیٹھ کے چلی جاتی تو میں کیا کرتا لیکن مجھے احساس تھا کہ وہ غیر ارادی طور پر گاڑی کی چابیاں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

اس کی غلطی ہمارے حق میں نیکی بن گئی۔ وہ شاید مجھے جانی رہ لینا چاہتی تھی مگر میں نے گاڑی کا شیشہ تھوڑا سا نیچا کر کے اس سے کہا۔ "جلدی سے گاڑی نکال لو یہاں سے۔" اور پھر شیشہ بند کر دیا۔

نازو بے وقوف نہیں تھی کہ اسے کچھ سمجھانے کی ضرورت پیش آتی۔ باہر آتے ہی اس نے پولیس کی گاڑیاں دیکھی ہوں گی اور ایک ایس پی کو ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے دیکھا ہوگا تو وہ فوراً سمجھ گئی ہوگی کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے اور گاڑی کو اسٹارٹ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ جب وہ گاڑی کو ریورس کرنے کے بعد پھر سیدھا کر رہی تھی تو میں نے ایس پی کو ریسٹورنٹ کے دروازے سے باہر آتے اور پولیس کو طلب کرتے دیکھا۔ میری نظر نے ایک ٹیکسی کو بھی حرکت میں آتے دیکھا۔ اس کے ونڈ اسکرین کے پیچھے مجھے ڈرائیور کے ساتھ دوسرا چہرہ غالب کا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے شاید اندازہ کر لیا یا اسے احساس تھا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں کیونکہ اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے ڈاکٹر محمد خان پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ غالب نے ایک انگوٹھا بلند کر کے مجھے سب ٹھیک ہے کا سگنل دیا۔

"آج تو خدا نے بال بال بچا لیا تمھیں۔" میں نے نازو سے کہا۔

خوش خان بھی اب قدرے پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ "خدا نے تو تمھیں بھی بچا لیا، میرے ساتھ۔"

"مگر تمھیں شکر گزار ہمارا بھی ہونا چاہیے۔"

"کیوں، تم نے تو مجھے بھی اپنے ساتھ سولی پر لٹکانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اپنا پتا بتا چھوڑ آئے تھے اس سکھ کے پاس کہ کوئی ملاقاتی آئے تو وہاں بھیج دینا۔" محمد خان بولا۔

میں نے نازو سے کہا۔ "بولی بی! جلد از جلد اس علاقے سے نکل جاؤ، باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔"

نازو نے نگاہ سڑک پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اتنا تو بتا سکتے ہو تم کہ اب میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

میں نے کہا۔ "کیا غالب نے کچھ نہیں کہا، زبان سے یا نظروں سے؟ بہت غلط بات ہے، خیر... میں اس کی طرف سے مناسب ڈائیلاگ عرض کرتا ہوں۔ قصیدہ در مدحِ حسن..."

نازو ہنس پڑی۔ "چلو چھوڑو، رابعہ کیسی لگی؟"

"یہ الفاظ میں کیسے بیان کیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اندازہ میں لگا سکتا ہوں اس کی ذہانت کا... اس نے چاند کا خوب بدلا۔ میں نے ہیں دل کی آنکھ سے پہچانا۔"

"اب جیسا حال ہے؟ محسن کی حالت ٹھیک نہیں لگتی۔ غالب نے تو وہیں کھڑے کھڑے کافی کا ایک کپ پی لیا تھا۔ جتنی دیر میں اس کے آرڈر کی تعمیل ہوئی۔"

"اب ایسا کرو کہ گاڑی کہیں روک لو۔"

"یہ آگے ایک میدان سا نظر آ رہا ہے۔" نازو نے کہا۔

میں نے بائیں ہاتھ پر ریلوے لائن کے ساتھ پھیلا ہوا سیمنٹ کا بنا ہوا مگر ٹوٹا پھوٹا پلیٹ فارم سا دیکھا۔ یہ شاید پہلے مال گاڑی سے سامان اتارنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہوگا۔ بہت سے تجارتی اور صنعتی ادارے ریلوے سے یہ سہولت حاصل کر لیتے ہیں کہ ایک لائن ان کے لیے مخصوص کر دی جائے جہاں ان کا سامان انھی کی نگرانی میں اتارا جا سکے۔ اب نہ جانے کیوں یہ جگہ ویران پڑی تھی۔ آثار بتاتے تھے کہ مدت سے اس طرف کوئی ٹرین نہیں آئی۔ ریلوے لائن کے درمیان اور اوپر بھی خودرو گھاس اُگ آئی تھی۔ شاید وہ کمپنی جو اس جگہ ریلوے سے مال لیتی تھی اب بند ہو چکی تھی یا انھوں نے اس سے بہتر انتظامات کر لیے تھے۔ اس وقت ان اسباب پر غور کرنے کی نہ ضرورت تھی اور نہ فرصت۔ مجھے یہ جگہ ہر لحاظ سے مناسب لگی۔

ریلوے لائن اور پلیٹ فارم جیسے میدان پر ابھی تک کسی نے ناجائز قبضہ نہیں کیا تھا۔ اس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ یہ جگہ لاوارث بھی نہیں تھی۔ نازو نے گاڑی روکی تو میں نے نیچے اتر کے چاروں طرف نگاہ ڈالی لیکن مجھے کوئی بھی کیا نہ دکھائی دیا۔

ہمارے پیچھے آنے والی ٹیکسی میرے قریب آکے رکی۔ اس کے ایک دروازے سے غالب برآمد ہوا۔ میری طرف دیکھے بغیر وہ اس گاڑی کی طرف لپکی جس میں محسن خاموش لیٹا ہوا تھا یا بے ہوش پڑا ہوا تھا۔

رابعہ نے نیچے اتر کے ایک نظر مجھے دیکھا۔ ایک دلنواز شرمیلی مسکراہٹ عطا کی۔ اس کے انداز حسن کی نئی جلوہ سامانی نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں وہ سب بھول گیا جو ایک لمحہ پہلے میرے ذہن میں تھا۔ پھر غالب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا ٹیکسی چھوڑ دوں؟" غالب نے کہا۔

رابعہ نے کہا۔ "میں ذرا محسن کو دیکھ لوں۔"

میں نے کہا۔ "ہاں، اب اجازت ہے۔" اور پھر غالب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "تھوڑی سی ہمت اور کرو دوست! اسی ٹیکسی میں جاؤ اور کہیں سے چائے لے آؤ یا کافی کلو کوز

سلے تو وہ بھی کسے آنا چاہئے کے لیے تھوڑا سی تو خرید لیتا۔"

غالب نے کہا۔ "اس میں ایک سوٹ کیس ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ میں اتار لیتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تمہاری تھکن اور کمزوری کے علاوہ بھوک پیاس سے کیا حالت ہو رہی ہے۔"

"تھوڑی سی قوت ارادی ابھی باقی ہے۔" غالب نے کہا اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

"درست کرنا اور زیادہ دور مت جانا۔" میں نے کہا اور غالب نے سر ہلایا۔ ٹیکسی ڈرائیور جو بالکل بے نیاز بیٹھا ہوا تھا گاڑی کو اس احاطہ نما میدان سے نکال لے گیا جس کے تین طرف نیم شکستہ دیواریں باقی تھیں چنانچہ چوتھی سمت کو دروازہ فرض کیا جا سکتا تھا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو ڈاکو محمد خان عرف خونی خان بھی کار سے باہر کھڑا ہوا میری طرف دیکھ رہا تھا اور بے حد فرض شناس اور مستعد نظر آ رہا تھا۔ رابعہ ایک انداز محبوبی کے ساتھ کار کے بونٹ پر بیٹھی ہوئی تھی کیونکہ حقیقت وہ خان صاحب کی نگرانی کر رہی تھی اور اس نے ریوالور کو بڑی مہارت کے ساتھ چھپا بھی رکھا تھا۔ محمد خان اب بھاگ جانے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔

"کیا گاڑی میں بیٹھے بیٹھے تھک گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"گاڑی میں میرے لیے جگہ نہیں رہی تھی۔" اس نے کہا۔

اور میں نے دیکھا تو مجھے اس کی بات پر یقین آ گیا۔ پہلے جس سیٹ پر وہ محسن کے ساتھ اکیلا تھا اس پر اب محسن کے ساتھ رابعہ اور گل براجمان تھیں۔ گل نے محسن کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا تھا اور بڑی محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کے دکھ ہوا۔ آنسو رابعہ کی آنکھوں میں بھی تھے اور ایک ہی جذبے کی غمازی کر رہے تھے۔ یہ جذبہ تھا درد مشترک کا اور غمگساری کے خلوص کا اور رفاقت کا۔ محبت ہم سب ہی محسن سے کرتے تھے مگر گل اسے چاہنے لگی تھی اور ابھی تک اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ محسن کی جائیداد کے جملہ حقوق شہلا کے نام پر محفوظ ہو چکے ہیں۔

میں نے کھڑکی میں سر ڈال کے کہا۔ "آپ لوگ تو بہت مزے میں ہیں۔"

گل نے مجھے پلٹ کے زخم خوردہ نظروں سے دیکھا۔ "یہ دیکھیں نا سکندر بھائی کیا حالت ہو گئی ہے ان کی۔"

میں نے کہا۔ "بہت سختی جھیلی ہے اس نے۔"

رابعہ نے کہا۔ "تم نے واقعی کمال کر دیا۔"

میں نے کہا۔ "توفیق خدا دیتا ہے۔ حوصلہ تم دیتی ہو۔ جو ناممکن نظر آتا ہے وہ بھی ممکن ہو جاتا ہے۔"

گل نے کہا۔ "سکندر بھائی! یہ ٹھیک تو ہو جائیں گے؟"

میں نے کہا۔ "اگر تم چاہو گی تو ضرور ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اس کا دماغ خراب ہو جائے میری طرح۔"

"دماغ کیوں خراب ہو رہا ہے آپ کا؟" رابعہ نے کہا۔

"تمہارا یہ روپ دیکھ کر۔ چشم بد دور۔"

اس سے پہلے کہ رابعہ کچھ کہتی، ایک شخص ڈنڈا لیے دوڑتا ہوا آیا اور بولا۔ "کون ہے تم؟ کیا ہے ادھر؟"

میں نے کہا۔ "ابھی تو کچھ نہیں کیا لیکن اب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ کیا خیال ہے یہاں کوٹھی بنائی جائے یا فیکٹری؟"

"چلو چلو، ادھر سے روانہ ہو جاؤ۔ یہ تمہارے باپ کا جگہ نہیں ہے۔" اس نے چلا کے کہا۔ "یہ تریویدی صاحب کی جگہ ہے۔ ادھر تمہارا مزار شریف بنا دے گا وہ۔"

"یہ تریویدی صاحب کی جگہ ہے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "وہ تو دولت مند آدمی ہیں، یہاں کھلے آسمان کے نیچے کیوں پڑے رہتے ہیں؟"

محمد خان نے پیچھے سے اس کی گردن پکڑ کے کہا۔ "تم تریویدی سے جا کے بولو کہ ہم یہ جگہ خریدنا چاہتے ہیں۔ ابھی اور اسی وقت۔"

چوکیدار کا رنگ اڑ گیا۔ "تم... تم تو ڈاکو ہے۔ ڈاکو خونی خان..." وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

خونی خان نے کہا۔ "جب یہ بات جانتے ہو تو پھر جان بچا کے بھاگ کیوں نہیں جاتے۔ مرنا چاہتے ہو تو بتا دو۔"

چوکیدار کی گھگھی بندھ گئی۔ "آپ... میرے کو معاف کر دو۔ ابھی ہم کیا کرے۔ تریویدی صاحب کا جہاز آتا ہے ادھر۔ اگر وہ دیکھے گا تم کو ادھر تو ہمارا نوکری خلاص کر دے گا۔"

میں نے کہا۔ "اس کا ہیلی کاپٹر یہاں اترتا ہے؟"

چوکیدار نے اقرار میں سر ہلایا۔ "آپ مہربانی کرو صاب!"

میں نے کہا۔ "کیا وہ آنے والا ہے؟"

"ہم کیا بولے صاب، وہ کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔ آپ اپنا گاڑی ادھر سے ہٹا لو۔"

میں نے کہا۔ "ہم یہاں زیادہ دیر قیام نہیں کریں گے۔ تم فکر مت کرو۔ اگر اس کا ہیلی کاپٹر نظر آیا تو ہم فوراً جگہ خالی کر دیں گے۔ تمہاری نوکری نہیں جانے دیں گے۔"

وہ کچھ مطمئن ہوا کچھ نہیں ہوا مگر ہم سے کچھ دور جا کے چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

"عجیب آدمی ہے۔" میں نے خونی خان سے کہا۔

"لیکن اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔" خونی خان نے کہا۔

میں نے کہا۔ "تم نے تریویدی کا نام سنا ہے کبھی؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "بمبئی میں اس کو کون نہیں جانتا۔"

میں نے کہا۔ "ہم نہیں جانتے تھے لیکن اب تو اس نے بھی ہمیں جان لیا ہے۔ آج کی تاریخ یاد رکھنا اور کبھی موقع ملے تو اس سے پوچھنا کہ وہ کل رات اس آدمی کے پیچھے کیا لینے گیا تھا۔"

"تم خود ہی بتا دو۔"

"وہ ایک فوج کے ساتھ رنگ محل پر حملہ آور ہوا تھا کیونکہ ہم وہاں اپنے دو ساتھیوں کو چھڑانے کے لیے جا پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک یہ ہے اور دوسرا پچھلی ٹیکسی میں آیا تھا۔"

ڈاکو محمد خان نے محسن کی طرف دیکھ کے سر ہلایا۔ "ان کو تریویدی نے کیوں قید کر رکھا تھا؟"

"یہ بہت لمبی کہانی ہے جس سے شاید تمہیں دلچسپی بھی نہ ہو۔ تریویدی کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا جو تریویدی کا بھی باپ ہے۔ وہ ہیلی کاپٹر میں بدمعاشوں کی ایک فوج لے کر آئے تھے۔ اب ان میں سے نصف کی لاشیں تو وہیں پڑی ہوئی ہیں اور جو باقی بچے تھے وہ اسی جزیرے پر مقید ہیں، تریویدی اور دلاور...!"

"یہ دلاور کون ہے؟"

"یہ ایک شخص جسے شیطان نے اپنا جانشین نامزد کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ان دونوں کو ہم انہی کے ہیلی کاپٹر میں اغوا کر کے لے گئے تھے اور انہیں جنگل میں بھٹکتا چھوڑ کے بھاگ آئے تھے۔ پولیس نے ہمیں ہر طرف سے محصور کر لیا تھا مگر انہیں محاصرہ ختم کرنا پڑا ورنہ ہم تریویدی کو مار دیتے۔ ہم نے دھمکی دی تھی۔ اس لڑکی نے یہ گاڑی چھینی تھی جس میں تم اس وقت موجود ہو۔ ہم نے تمہیں پناہ دی۔ اگر ہم چاہتے تو گولی مار کے تمہاری لاش کو چلتی گاڑی سے باہر پھینک دیتے یا ویسے ہی تمہیں دھکا دے کر سڑک پر گرا دیتے۔ ہم نے ابھی تک تمہیں پولیس سے بھی بچایا ہے۔ نہ ہمیں انعام کا لالچ تھا اور نہ پولیس کا خوف۔ اب صورت حال یہ ہے کہ تمہیں صرف پولیس تلاش کر رہی ہے مگر ہمیں پولیس کے علاوہ تریویدی کے شکاری کتے بھی ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔"

"اگر یہ سب سچ ہے تو پھر ہم سب مصیبت کے ساتھی ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تم ہمارے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

"اگر تم مجھے حفاظت کے ساتھ میرے ساتھیوں تک پہنچا دو تو میں تمہارا ہر مسئلہ حل کر سکتا ہوں۔" ڈاکو محمد خان نے کہا۔

"یہ بات تم نے پہلے بھی کہی تھی لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے یہ ساتھی اب کہاں ہیں؟"

"اپنے ٹھکانے پر۔"

"کیا پولیس کو ان کے ٹھکانے کا علم نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ پولیس کو علم نہ ہو تب بھی احتیاطاً تو کرنا پڑتی ہے۔ گیارہ مہینے پہلے میں پکڑا گیا تھا۔ میرے دو ساتھی مارے گئے تھے۔ باقی ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ اب وہ پھر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے منصوبہ بندی کی اور مجھے چھڑانے میں کامیاب رہے۔"

میں اسے گاڑی کے پیچھے لے گیا۔ ڈکی کھول کے میں نے وہ سوٹ کیس نکالا جس میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ کی رقم تھی۔

"یہ دیکھو، وہ رقم جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔" میں نے سوٹ کیس کھول کر دکھانے کے بعد کہا۔

وہ حیرانی سے نوٹوں کے انبار کو دیکھتا رہا۔ "میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ آخر تم لوگ کون ہو، کیا کرتے ہو؟"

میں نے سوٹ کیس واپس ڈکی میں رکھ دیا۔ "اگر میں تمہیں وہ سب بتا دوں جو ہم کر چکے ہیں یا کر سکتے ہیں تو ممکن ہے تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔ بس یہ سمجھ لو کہ یہاں بمبئی میں جتنے بھی دادا اور بدمعاش پھرتے ہیں وہ سب بچے ہیں ہمارے سامنے۔"

اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "تم ان سے بھی بڑے بدمعاش ہو؟"

"نہیں، ہم بدمعاش نہیں ہیں۔ ذاتی مفاد کے لیے چوری ڈکیتی اور قتل کچھ نہیں کرتے۔ ہم بڑے کام کرتے ہیں۔"

"اور بڑا کام کیا ہوتا ہے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "بڑے کام ہیں کسی جلسے میں قتل عام کر دینا، مشین گن سے سو پچاس لاشیں گرا دینا، دستی بم پھینک کر بازار ویران کر دینا، ٹرک میں بم لگا کے کسی جگہ کو اڑا دینا، حکومت کے کسی مخالف کو ٹھکانے لگانا یا حکومت کا تختہ الٹنا۔ تم نے سنا ہو گا کہ کچھ لوگ تربیت یافتہ دہشت گرد ہوتے ہیں۔ ہم تجربہ کار دہشت گرد ہیں۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔ "میں نہیں مانتا، تم صورت سے شریف اور تعلیم یافتہ نظر آتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "یہی ہماری کامیابی کا راز ہے۔ خیر اب باقی باتیں پھر کریں گے۔ ہمارا دوست واپس آ گیا ہے۔ پہلے کچھ کھا پی لیں، ہماری بھی حالت غیر ہو رہی ہے بھوک سے۔"

"تم بہت پراسرار لوگ ہو۔" اس نے کہا۔ "یہ لڑکی کیا لگتی ہے تمہاری؟"

میں نے کہا۔ "کچھ نہیں، ہم سب ایک دوسرے کے کچھ نہیں لگتے اور سب کچھ ہیں۔ سب سے تعارف یہاں نہیں ہو

www.paksociety.com

سکتا۔ کیا خیال ہے اب چلیں تمہارے ساتھ؟"
"مجھے چھوڑ کے تم کہاں جاؤ گے؟" محمد خان نے کہا۔
"چھوڑ کے کیوں، اب تو معاملہ الٹا ہے یعنی تم کیمل کو نہیں چھوڑ سکتے جہاں تم وہاں ہم۔" میں نے کہا۔
"میرا خیال ہے کہ تم ایسی غلطی نہیں کرو گے۔"
"میں جانتے بوجھتے یہ غلطی کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ تم بھی اسے غلطی ہی کہو گے۔" میں نے کہا۔
"تمہارے ساتھ ایک نہیں تین لڑکیاں ہیں، بے حد خوبصورت اور شریف۔"
"اور تقریباً دس لاکھ روپے نقد ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا تم ہمارے جان و مال اور ہماری عزت کی حفاظت نہیں کر سکتے؟"
"مجھے ڈر ہے کہ تمہاری وجہ سے کہیں ہم پکڑے نہ جائیں کہیں کوئی مخبری نہ کر دے۔ ہمارا کیا ہے ہمارے تو دن رات پولیس مقابلے چلتے ہیں، ہر جگہ ہر وقت جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں، موقع ملے تو بھاگ بھی جاتے ہیں اور نہ مرنے سے گھبراتے ہیں نہ مارنے سے۔"
میں نے کہا۔ "پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ یہی انداز ہماری زندگی کا بھی ہے لیکن ابھی ہمیں دو چار دن روپوشی کا مسئلہ درپیش ہے۔ اپنی حفاظت ہم خود کر سکتے ہیں بلکہ تمہاری حفاظت بھی کر سکتے ہیں اگر ضرورت پڑے۔" میں نے کہا۔ "کیا خیال ہے اب چلیں؟"

اس نے کہا۔ "جیسی تمہاری مرضی۔" اور اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم اس چوکیدار کو بالکل بھولے ہوئے تھے جس نے ہمیں یہاں سے فوراً دفع ہو جانے کا حکم دیا تھا۔ وہ نہ جانے کب غائب ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مطمئن ہو کے چلا گیا ہے۔ ہم نے اسے بتا دیا تھا کہ ہم اس جگہ پر قبضہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے لیکن بمبئی میں شاید خالی زمین کی حفاظت کے معاملے میں لوگ کسی پر بھروسا کرنے کے قائل نہیں تھے چنانچہ چوکیدار نہ جانے کہاں سے خوفناک شکل والے اسٹیٹ کے ماہرین کی ایک ٹیم اکٹھی کر لایا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم سب نے انھیں اس وقت دیکھا جب وہ سر پر پہنچ گئے تھے۔ سب سے پہلے رابعہ کی ان پر نظر گئی۔
"مسئلہ دراصل کیا ہے؟" اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔
میں نے پلٹ کے دیکھا تو چھ افراد کو ایک نیم دائرے کی شکل میں استادہ پایا۔ ان میں وہ چوکیدار بھی شامل تھا جس کے احکامات کی تعمیل نہ کر کے ہم نے گویا ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اس کی فریاد پر فوری انصاف فراہم کرنے والے حکام فوراً تشریف لے آئے تھے۔

ان میں ایک قدر مشترک تو یہ تھی کہ وہ ایک ہی ملک سے تعلق رکھتے تھے یعنی ہمارا مناسب گو شمالی ہند بھی سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ اتفاق و اتحاد کی برکات کے قائل تھے اور شاید ہم پیشہ بھی تھے۔ چوکیدار کے فرائض ہر جگہ جسمانی طور پر صحت مند اور صورت سے خونخوار نظر آنے والوں کے ہی سپرد کیے جاتے ہیں۔ اچھے اور بڑے ادارے سوائے گارڈ کی خدمات سے استفادہ کرتے ہیں تو چھوٹے کاروباری دستخطوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ بمبئی میں عموماً پہرے دار اور محافظ گورکھے کہلاتے ہیں۔ یہ سب بھی آس پاس کے چوکیدار ہی تھے مگر ان میں کوئی گورکھا قوم کا نظر نہ آتا تھا۔
"یہی ہیں وہ واداگیر؟" ایک گنجے سر والے پستہ قد شخص نے لاٹھی زمین پر مار کے کہا۔
چوکیدار نے سر ہلا کے مجرمان کی شناخت کی۔
"بے حس نے کہا تھا کہ وہ یہاں ہوٹل بنانا چاہتا ہے؟" پھر کپکپاتی آواز والے شخص نے حقارت سے زمین پر تھوک کے کہا۔
چوکیدار نے میری طرف انگلی سے اشارہ کیا۔
اتنی دیر میں ہم سب بھی ہوشیار ہو چکے تھے۔ مگر ہم جانتے تو صورت کے ساتھ فوری رد عمل بھی اختیار کر سکتے تھے۔ مگر مجھے ان سب کی صورتوں پر بھی ہنسی آ رہی تھی اور ان کی بھونڈی اداکاری پر بھی جس سے وہ خود کو دادا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ انھیں رلوا اور دکھا کے بھی فرار ہونے پر مجبور کیا جا سکتا تھا مگر میرے ساتھ شاید نازو کا موڈ بھی تفریح کا تھا۔
"یہ پلاٹ ترویدی کا ہے۔" تیسرے شخص نے اپنی مونچھیں مروڑ کے کہا۔ "خیریت چاہتے ہو تو فوراً خالی کر دو۔"
چوتھے شخص نے فقط سر ہلا کے اس بات کی تائید کی۔ وہ دبلا پتلا گو معلوم ہوتا تھا مگر اس کی آنکھیں سانپ کی آنکھوں کی طرح گول تھیں۔
اچانک نازو نے کہا۔ "اب تو ہم قبضہ کریں گے اس جگہ پر۔"
میں نے کہا۔ "ہاں جائے بھاڑ میں ترویدی کو۔"
گنجا ایک قدم آگے بڑھ آیا۔ "ترویدی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔"
"ہاں! اسے بتا دیا تو وہ تمہارے گنجے سر پر جوتے سے طبلہ بجانے لگے گا۔" نازو نے کہا۔
"اے چھوکری! بہت بڑھ کے مت بول۔" وہ مشتعل ہو کے اس نے پھر لاٹھی کو زمین پر مارا۔
نازو بڑے اطمینان سے اس کے سامنے چلی گئی اور اس سے چند انچ کے فاصلے پر ٹھہر گئی۔ محسن اور غالب نے مجھے دبے لفظوں میں کہا کہ جب جا ہی رہے ہیں تو پھر خواہ مخواہ کا جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت ہے مگر میں نے انھیں اشارے سے

خاموش کر دیا کہ تھوڑا سا تماشا دیکھو۔
نازو چند سیکنڈ لاٹھی والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ وہ بڑا حیران تھا کہ آخر یہ لڑکی کیا چاہتی ہے۔ عورت پر ہاتھ اٹھانا اس کی شان مردانگی کے خلاف ہوتا چنانچہ اس نے انتظار کیا۔ اس کے فرشتوں کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ چند سیکنڈ بعد کیا ہونے والا ہے۔
نازو نے ایک ہاتھ مار کے پہلے اس کی لاٹھی چھینی اور دور پھینک دی۔ اس کے لیے نازو نے صرف ایک ہاتھ اس کی کلائی کے جوڑ پر مارا۔ وہ بلبلایا اور لاٹھی پر اس کی گرفت باقی نہ رہی۔ غالباً اس کی کلائی کا جوڑ ہل گیا تھا۔
پھر اس سے پہلے کہ لاٹھی والا کوئی جوابی کارروائی کرتا، نازو نے ساڑی میں ہونے کے باوجود زنانہ سینڈل سے اس کی پنڈلی پر زور سے کک رسید کی اور ایک ہاتھ کی دو انگلیاں اس کی آنکھوں میں گھسیڑ دیں۔ وہ پاگلوں کی طرح منہ پر ہاتھ رکھ کے چلانے لگا اور زمین پر گر گیا۔
دوسرے شخص نے صورت حال کی نزاکت کو فوراً سمجھ لیا اور وہ پیچھے سے نازو کی نازک کمر دبوچنے کے لیے لپکا ہی تھا کہ نازو نے گھوم کے اس کی پشت پر ایک ہاتھ مارا اور وہ آگے جھکا تو نازو نے ایک پاؤں اٹھا کے منہ کے بل گرا دیا۔ وہ بڑی پھرتی سے اٹھ گیا تھا لیکن نازو نے اس کا ہاتھ تھام کے ایک جھٹکا دیا، ایک گھٹنا اوپر اٹھایا اور اسے پلٹ کے زمین پر پٹخ مارا۔
اب تک مقابلہ ایک اور ایک کا تھا جب باقی چار نے نازو کو گھیرنے کی کوشش کی تو میرے لیے بھی جنگ میں کود پڑنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ غالب اور محسن کے لیے یہ کوئی غیر متوقع یا انوکھا مقابلہ نہیں تھا مگر ڈاکو محمد خان عرف تورنی خان تو نازو کی چابک دستی، مہارت، فن اور ناقابل یقین بہادری کا تماشا حیرت سے منہ کھولے کھڑا بار بار کہہ رہا تھا۔
"واہ... بھئی کمال کر دیا... بھئی واہ..."
میری محنت سے جنگ کا نقشہ بدلنے میں دیر نہیں لگی۔ چند منٹ بعد میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ "چلو کام ختم۔"
ڈاکو محمد خان حیرت اور ستائش کے جذبات کے ساتھ میری اور نازو کی کارکردگی کا نتیجہ دیکھ رہا تھا۔ چھ افراد زمین پر ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح بکھرے پڑے ہوئے کرب سے چیخ رہے تھے، لوٹ رہے تھے یا بالکل ساکت پڑے ہوئے تھے۔ بہت دور روڈ سے ٹائی کلاڈی دوسری طرف جھونپڑ پٹی کے مکینوں کا ایک مختصر سا مجمع خاموشی و دہشت سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کو فلمی غیر مقابلے کو دیکھ رہا تھا — اس کے پاس کوئی نہیں تھا ورنہ وہ فرض کر لیتے کہ یہ بھی کسی فلم

کی شوٹنگ کا سین ہے۔ اب انھوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ یہ اقتدار کی جنگ تھی۔ بمبئی میں بدمعاشوں کے مختلف گروہ کسی نہ کسی دادا کی کمان میں اسی طرح جھگڑتے رہتے ہیں۔
"تم نے واقعی ٹھیک کہا تھا یہ لڑکی آسمانی بجلی ہے۔" تورنی خان نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ "ایسی ایک لڑکی میرے ساتھ ہوتی تو میں سارے ہندوستان کو فتح کر لیتا۔"
میں نے ہنس کے کہا۔ "خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا۔"
رابعہ نے کہا۔ "اب اس سے پہلے کہ پولیس بھی آ جائے یہاں سے نکل چلو۔"

میں نے کہا۔ "اچھا تم کہتی ہو تو چلتے ہیں ورنہ کچھ دیر ٹھہرتے تو شاید ترویدی کا دیسی کا چیلا بھی ہمارے سامنے آ جاتا۔"
"تم نے پھر کیا سوچا ہے؟" نازو نے کہا۔
"تم گاڑی سے آئے تھے، کتنی سواریاں ہیں تمہارے پاس؟"
"ہم سب پہلے دو گاڑیوں میں آئے تھے، ایک ٹیکسی بھی تھی۔" گل نے کہا۔
"اب بھی ایسا ہی کریں گے۔ تم گل کو چھوڑ جاؤ وہ پیدل چل سکتی ہے کچھ دور تمہارے ساتھ... چاہو تو رابعہ کو بھی چھوڑ دو اور صرف اپنے بیمار کو لے جاؤ۔"
"کہاں لے جاؤں بچہ تیا بھی تو چلے۔" نازو نے کہا۔
"ابھی تو سڑک تک چلو ہم پیدل پہنچتے ہیں اس کے بعد پکڑ لیتے ہیں کوئی ٹیکسی۔" میں نے کہا۔ "آیئے خان صاحب؟"
ڈاکو محمد خان جو تورنی خان کے نام سے مشہور تھا اب کسی شریف آدمی اور پرانے شناسا کی طرح میرے ساتھ چل پڑا۔
"تم بھی آ جاؤ گل بانو۔" میں نے کہا۔ "بہت ہو گئی بچہ لڑائی۔"
"مجھ پر کیوں حکم چلاتے ہیں، رابعہ باجی کو لے جائیں نا ساتھ۔" گل نے کہا۔
نازو کو موقع مل گیا۔ "ہاں دل تو یہی چاہتا ہو گا جناب کا بھی۔"
میں نے کہا۔ "ہاہا آخر ظاہر کی شرم و حیا بھی کوئی چیز ہے۔ تم دونوں کے تو دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔ چلو تم ہی آ جاؤ رابعہ اگر ابھی نہیں چاہتی محسن کو چھوڑنا۔"
میں، رابعہ اور محمد خان ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ گاڑی ہمارے قریب سے دھول اڑاتی گزر گئی۔ ابھی ہم نے دو سینٹ کا پختہ میدان جو ترویدی کا دیسی بنڈ تھا عبور نہیں کیا تھا کہ میرے کانوں نے ایک مانوس آواز سنی اور میں نے بے اختیار سر گھما کے پیچھے آسمان کی سمت میں دیکھا تو مجھے سمجھ کے پڑ مانوس

آسمان پر کوؤں اور چیلوں سے الگ ایک بہت بڑا پرندہ محو پرواز دکھائی دیا۔ یہ ہیلی کاپٹر تھا اور اس کا رخ دیکھ کے

www.paksociety.com

یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ تریوینی باآخر اپنے پاٹنر اور اپنے نئے کاروباری رفیق چوہدری دلاور کے ہمراہ بڑی شان سے شکست قبول کر کے لوٹ آیا ہے۔

اچانک ہمیں سامنے سے خالی ٹیکسی آتی دکھائی دی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے ہاتھ دے کر روکتا، ڈرائیور نے خود ہی بریک لگا کے اپنا سر باہر نکالا۔

"ایک عورت، دو مرد، ایک لڑکی بڑی مونچھیں، دوسرا... ٹھیک ہے۔" ڈرائیور نے بہ آوازِ بلند ہمارا حلیہ دیکھ کے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

میں سمجھ گیا کہ اسے نازو نے ہماری طرف بھیجا ہو گا۔ ٹیکسی کے آ جانے سے ہم سڑک کے پیدل جانے کی پریشانی سے بچ گئے اور اس طرح خطرے کی حدود سے باہر نکلنے میں کامیاب رہے۔ چند منٹ بعد ہم اس سڑک پر عین اس جگہ پہنچے جہاں نازو نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روک رکھا تھا۔ میں اُتر کے اس کے پاس گیا۔

"اب ہم آگے چلو۔" نازو نے کہا۔ "لیکن آگے پولیس بہت سخت چیکنگ کر رہی ہے۔"

"پولیس کیا چیک کر رہی ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم مگر ممکن ہے چوری کی گاڑیاں دیکھ رہی ہو، کسی مفرور ڈاکو یا کسی سکندرِ اعظم کی تلاش میں ہو۔" نازو نے کہا۔

"پھر اب کیا کرنا چاہیے؟" میں نے کہا۔ "ہمارے پاس تو پکڑے جانے کے لیے بہت کچھ ہے، چوری کی گاڑی بھی ہے اور ایک ڈاکو بھی۔"

"آسان طریقہ ہے کہ واپس چلیں۔"

میں نے محمد خان سے مشورہ کیا تو وہ پریشان نظر آنے لگا۔ "اگر راستے میں کہیں بھی چیکنگ ہو گی تو میرا بچ کے نکلنا ہی ناممکن ہو گا۔"

"یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"لیکن یہ رسک نہیں لے سکتا۔" محمد خان نے کہا۔ "بمبئی میں ایسا کوئی پولیس افسر نہیں جو مجھے نہ پہچانتا ہو۔"

"اتنی شہرت کے باوجود تم یوں پھر رہے ہو؟"

"میں پھر نہیں رہا ہوں، بھاگ رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "آج ہی صبح تو میں جیل سے بھاگا ہوں۔"

"میرا مطلب تھا کہ تم کو اپنا چہرہ اور حلیہ بدل لینا چاہیے تھا اتنی دیر میں۔" میں نے کہا۔

"اس کا موقع ہی کہاں ملا مجھے، میں پھنس گیا تمہارے ساتھ۔" محمد خان نے کہا۔ "کوئی اور ہوتا تو میں اسے مروا کر رکھ کے اسی کے گھر جاتا اور پھر وہاں سے نکلتا تو میرا باپ بھی نہ پہچان سکتا۔"

"ہم بھی تو گاڑی لیے پھر رہے ہیں۔" نازو نے کہا۔

"گاڑی اتنی اہم نہیں ہو سکتی جتنا محمد خان۔" محمد خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم نہیں جانتے، سارے بمبئی کو الرٹ کر دیا گیا ہو گا۔ گاڑیاں تو روز نہ جانے کتنی چوری ہوتی ہیں۔"

"اس گاڑی کا معاملہ بھی ایسا ہے کہ پولیس اسے معمولی نہیں سمجھ سکتی۔" میں نے کہا۔ "پولیس پر تریوینی کا دباؤ ہو گا اور پولیس کے افسر بہت مشتعل ہوں گے۔ ہم نے ان کے ساتھ بھی تو بہت زیادتی کی تھی۔"

ٹیکسی والے نے چلا کے کہا۔ "ادھر کیا کانفرنس ہو رہی ہے؟ کہیں جانا ہے یا نہیں جانا؟"

میں نے اسے گھور کے دیکھا۔ "ہمیں جلدی کیا ہے؟"

نازو نے کہا۔ "تم سے ہم نے کہا تھا کہ بمبئی کی سیر کراؤ۔"

"تو سیر کرو نا۔" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "ہم سیر ہی کر رہے ہیں، تم کو کرایہ میٹر سے نہیں گھنٹے کے حساب سے دیں گے۔"

محمد خان نے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔"

میں نے کہا۔ "عقل سے کام لو، تم اکیلے کہاں جا سکتے ہو؟ اگر پولیس پرائیویٹ گاڑیوں کو بھی چیک کر رہی ہے تو کیا تم پیدل جاؤ گے؟ آج ایک دن میں بہت سے واقعات پیش آئے ہیں۔ پہلے تم جیل سے فرار ہوئے، پھر تم نے ایک گاڑی چھینی، ہم نے تریوینی کا خانہ خراب کیا اور اس کے بعد پولیس کا... پھر ہم نے ایک گاڑی چھینی جو ابھی تک ہمارے پاس ہے اور صبح سے اب تک بمبئی میں یہ تمام سنگین جرائم کرنے والے ہیں ہم لوگ جو ایک ساتھ پھر رہے ہیں۔"

"ہمیں ایک ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔" نازو نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"یہ ٹھیک ہے، ہمیں الگ الگ ہو جانا چاہیے۔" غالب نے کہا۔

"محمد خان صاحب!" میں نے کہا۔ "اب آپ کو صرف ہم بچا سکتے ہیں۔ اگر پولیس ہر موڑ پر ہر گاڑی کو چیک کرے تب بھی تمہیں نہیں پکڑ سکتی۔"

"وہ کیسے؟" محمد خان بے حد متفکر نظر آ رہا تھا۔

"ہے ایک طریقہ، پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہارا ٹھکانا کہاں ہے، بالکل صحیح نقشہ بنا کے سمجھا دو۔" میں نے کہا۔ "پرانے زمانے میں ڈاکوؤں کے ٹھکانے شہر سے باہر پہاڑوں کے غار ہوا کرتے تھے۔"

"فلموں میں اب بھی ہوتے ہیں۔" نازو نے کہا۔

"یہ لڑکی تم کو سیدھا وہاں پہنچا دے گی جہاں تم کہتے ہو، تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں۔" میں نے کہا۔

محمد خان نے سر ہلایا مگر وہ تذبذب کا شکار تھا۔

میں نے کہا۔ "یہ تین لڑکیاں ہیں، تم ان کے ساتھ جاؤ۔"

محمد خان نفی میں سر ہلانے لگا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرے ساتھ کون ہے۔ پولیس تو مجھے ایک نظر دیکھتے ہی ہر طرف سے گھیر لے گی۔"

میں نے کہا۔ "جب تم نظر ہی نہیں آؤ گے تو پولیس کیسے گھیرے گی؟"

"دیکھو، پہیلیوں میں باتیں مت کرو۔ میں جاہل آدمی ہوں اور پریشان بھی ہوں۔ اگر میں پکڑا گیا تو واپس جیل بھیج دیا جاؤں گا۔ میں آسانی سے گرفتار ہونے والا نہیں ہوں لیکن تمہارے ساتھ رہ کے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "خان صاحب! طیش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ جو کام آسانی سے ہو جائے وہ مشکل میں پڑ کے نہیں کرنا چاہیے۔ تم بس یہ بتاؤ کہ تمہارا وہ ٹھکانا کہاں ہے جہاں تم پہنچنا چاہتے تھے اور جہاں تمہارے ساتھی تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اچھی طرح سمجھا دو نازو کو۔ ویسے تو یہ تم سے راستے میں بھی پوچھ سکتی ہے۔ اگر کہیں راستہ بھول گئی تو ڈکی کھولے گی اور تم سے بات کر لے گی۔"

"ڈکی... میں ڈکی میں جاؤں گا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، گاڑی میں یہ تین لڑکیاں ہوں گی۔ اگر پولیس نے انہیں غلطی سے روکا بھی تو ان کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ اندر انہیں ڈاکو تو کیا کوئی مرد بھی نظر نہیں آئے گا۔ ان کے لیے بعید از قیاس بات ہو گی کہ اتنی حسین اور معزز نظر آنے والی خواتین کسی ڈاکو کو ڈکی میں چھپا کے لے جا رہی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تلاشی بھی نہیں لے سکتے اور یہ خیال بھی انہیں نہیں آ سکتا کہ کار چوری کی ہو گی۔"

"کہتے تو تم ٹھیک ہو۔" محمد خان نے کہا۔

"بس تو پھر دیر مت کرو، نازو کو پتا سمجھاؤ اور جاؤ۔" میں نے کہا۔

"اور تم لوگ...؟"

میں نے کہا۔ "ہمیں بھی بتا دو کہ کہاں پہنچنا ہو گا۔ ہم کسی نہ کسی طرح راستہ بنا لیں گے اپنا۔ ہمیں تریوینی کے آدمی بھی تلاش کر رہے ہیں اور کسی حد تک ہم پولیس کو بھی مطلوب ہیں مگر ہماری شہرت ابھی ایسی نہیں ہے کہ ہر تھانے میں ہماری تصویر ہو اور بمبئی کی ساری پولیس ہمارے نام اور حلیے سے واقف ہو۔ ہم ابھی گمنام لوگ ہیں۔"

بات محمد خان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں پتا زبانی سمجھاؤں یا لکھ کے دوں؟"

نازو نے کہا۔ "لکھ دو تو اچھا ہے، ہم کسی سے پوچھ بھی لیں گے۔"

"کاغذ قلم... میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

نازو نے کار کے گلو کمپارٹمنٹ میں ہاتھ مارا اور ایک نوٹ بک برآمد کی جس کے اندر بال پوائنٹ پین لگا ہوا تھا۔ محمد خان نے اس پر پتا لکھا پھر کچھ نقشہ سا بنایا اور صفحہ پھاڑ کے مجھے پکڑا دیا۔ یہی نقشہ اس نے دوسری بار بنا کے نوٹ بک نازو کے حوالے کر دی۔ میں نے پتے کو صرف پڑھا اور تہہ کیے بغیر جیب میں ڈال لیا۔

ٹیکسی ڈرائیور کے غیر معمولی تجسس نے مجھے چوکنا کر دیا۔ وہ بڑے غور سے محمد خان کی صورت دیکھ رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے کسی سوچ میں ہے۔ میں نے گل کو کار میں منتقل ہونے کا اشارہ کیا اور کار میں سے غالب اور محسن نکل کے ٹیکسی میں بیٹھے تو شک کے سائے ٹیکسی ڈرائیور کی آنکھوں میں گہرے ہو گئے۔

میں نے کہا۔ "اب کیا سوچ رہے ہو؟ چلو!"

ٹیکسی ڈرائیور چونکا۔ "آپ دوسری ٹیکسی لے لو۔"

میں نے کہا۔ "وہ کیوں؟"

"وہ... وہ اصل میں مجھے ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا ہے۔" اس نے کہا اور مجھے یقین آنے لگا کہ وہ محمد خان کو پہچان چکا ہے مگر میں نے اس خدشے کا اظہار نہیں کیا۔

"تم اب کہاں جاؤ گے، اپنے گھر؟" میں نے کہا۔

"نہیں، گھر تو نہیں جاؤں گا۔"

"تو پھر جہاں بھی جا رہے ہو ہمیں ساتھ لے چلو۔" میں نے کہا۔

"تمہیں کیا معلوم میں کہاں جانا چاہتا ہوں۔" ڈرائیور نے چڑ کے کہا۔

"ہاں معلوم تو نہیں ہے لیکن ہمارا مقصد بھی سیر کرنے سے ہوا ہے۔ سیر کہیں بھی کی جا سکتی ہے۔ تم چلتے رہو، ہم نظارہ کرتے جائیں گے اور جہاں تم کہو گے اتر جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"آخر تم دوسری ٹیکسی کیوں نہیں لیتے؟ میں یہ کرایہ بھی چھوڑتا ہوں جو ابھی میٹر میں ہے۔"

لہجہ بدل کے میں نے کہا۔ "اب ہم تمہیں چھوڑنے کے موڈ میں نہیں ہیں دوست! شرافت سے ٹیکسی کو واپس موڑو اور جہاں بھی ہم کہیں خاموشی سے چلتے جاؤ ورنہ..."

"ورنہ... ورنہ کیا کرو گے؟"

"ورنہ ہم خود بھی ڈرائیونگ جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ ٹیکسی بھی چلا سکتے ہیں۔"

www.paksociety.com

"یہ تم دھمکی دیتے ہو مجھے گاڑی چھینو گے تم میری؟" اس نے مشتعل ہو کے گاڑی سے اترنے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے وہیں دبوچ لیا۔ اس نے مدد کے لیے لوگوں کو بلانے کی کوشش کی تو میں نے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا اور پھر اُسے سیٹ سے اُٹھا کے پیچھے کھینچ لیا۔ وہ تڑپا پھر اس نے لاتیں چلائیں مگر میری گرفت سے نہ نکل سکا۔ میرا ارادہ اُس کو مارنے کا نہیں تھا، چنانچہ میں نے کہا۔

"اب ہم سیر کرانے لگے ہیں اور تم خاموش بیٹھو گے تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا ورنہ ہم تمہیں خاموش بھی کر سکتے ہیں کچھ دیر کے لیے یا ہمیشہ کے لیے۔"

غالب نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس نے احتیاط کے ساتھ ٹیکسی کو ریورس گیئر میں ڈالا اور پھر ایک نصف دائرہ بناتے ہوئے واپس موڑا۔ یہ سب کارروائی ایک ایسی جگہ پر ہوئی تھی جہاں بہت کم لوگوں کی نظر پڑ سکتی تھی۔ سڑک پر ٹریفک کم نہیں تھی مگر نازو نے کار ایک عمارت کے عقبی حصے میں روکی تھی جس کے سامنے کسی میدان کی سبزی بھری باڑھ تھی۔ باڑھ کے ادھر کافی فاصلے پر بچے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ غالباً وہ کسی اسکول یا کالج کا سپورٹس گراؤنڈ تھا۔ عمارت کے سامنے والے حصے میں دکانیں تھیں اور اوپر فلیٹ تھے مگر پچھلے حصے کو لوگ صرف کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ہم وہاں دس پندرہ سیکنڈ ہی رکے تھے اور اس دوران میں عمارت کی مختلف منزلوں سے تین کھڑکیوں کے راستے باہر کوڑا پھینکا گیا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ ہم براہِ راست اس کی زد میں نہیں آئے۔

ڈاکو محمد خان نے خود کو ڈکی میں بند کر لیا تھا۔ کار روانہ ہوئی لیکن واپس مڑ کر ہمارے پیچھے نہیں آئی۔ نازو، گل اور زلیخا نے وہی راستہ اختیار کیا جس پر آگے چیکنگ ہو رہی تھی اور پولیس کی ناکہ بندی تھی۔ میں نے محمد خان کا دیا ہوا پتا غالب کے حوالے کر دیا۔

ٹیکسی اس جگہ سے ایک کلو میٹر دور آ چکی تھی۔ میں نے ڈرائیور کو آزاد کرنے سے پہلے ٹیکسی کے شیشے چڑھا لیے۔

ڈرائیور نے ایک لمبی گہری سانس لی اور پھر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ "تم ڈاکو تو نہیں لگتے۔"

میں نے کہا "تمہاری بصارت اور بصیرت دونوں ہی ٹھیک ہیں۔"

"کیا مطلب؟ میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک کہا تھا تم نے۔ ہماری سات پشتوں میں کوئی ڈاکو نہیں تھا اور نہ آنے والی سات نسلوں میں کسی کے ڈاکو بننے کے امکانات ہیں۔"

"پھر تم ڈاکو محمد خان کے ساتھ کیوں پھر رہے ہو؟"

"کون محمد خان؟ کیسا ڈاکو؟" میں نے کہا۔

"وہ مونچھوں والا۔ وہ آج ہی جیل سے فرار ہوا ہے۔ میں نے تو اخبار کا ضمیمہ پڑھا ہے۔ اس کی تصویر بھی چھپی ہے۔ سارے بمبئی کی پولیس ہر جگہ اسے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"ہاں تمہیں شاید معلوم نہیں۔" ٹیکسی ڈرائیور کا حوصلہ کچھ بڑھ گیا۔ "اس کو گرفتار کرانے والے کے لیے دس لاکھ کے انعام کا اعلان بھی ہوا ہے۔"

"کمال ہے! آج ہی وہ فرار ہوا ہے اور آج ہی انعام کا اعلان بھی ہو گیا۔"

"انعام پہلے بھی تھا مگر پھر وہ پکڑا گیا۔"

"اس نے خود گرفتاری پیش کر دی تھی؟" غالب نے پوچھا۔

"نہیں، وہ بڑے سخت مقابلے کے بعد گرفتار ہوا تھا۔"

"جس نے اس کا پتا بتایا تھا اُسے دس لاکھ ملے تھے؟"

"نہیں، میرا خیال ہے انعام تو کسی کو نہیں ملا تھا۔" ڈرائیور نے سوچ کے کہا۔

"کیوں؟ عموماً ایسی گرفتاریاں اور چھاپے پولیس کے مخبروں کی اطلاع کا نتیجہ ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "یار وہ راہ چلتے مل گیا ہوگا کہیں اور بس پولیس نے کھٹ سے پکڑ لیا۔ مقابلہ تو ایسے ہی نمائشی ہوا ہوگا؟"

"اس وقت کی بات تو مجھے معلوم نہیں۔"

"میں بتاتا ہوں تمہیں ٹیکسی والے بھائی۔ خونی خان کو گرفتار کرانا اور پھر اس بہادری کے کارنامے پر انعام وصول کرنا اتنا ہی مشکل اور ناممکن ہے جتنا کسی آدم خور شیر کے خالی ہاتھ جبڑا اُس کے گال سے پکڑ کے باہر لانا اور اس کی کھال اتار کے دس لاکھ میں فروخت کرنا۔ مجھے پہلے ہی شک ہوا تھا کہ تمہارے دماغ میں کیا ہے۔ تم پولیس کو اطلاع دینا چاہتے تھے نا؟ بے وقوف آدمی! خود کشی کے آسان طریقے بھی ہیں۔ خود شوق سے مرو، کم سے کم بیوی بچوں کی، ماں باپ کی اور بھائی بہنوں کی جان تو مت لو۔"

اس کا رنگ فق ہو گیا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں تم کو ایک ایسی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں جو تمہاری ناقص عقل میں اس لیے نہیں آ رہی ہے کہ تمہاری آنکھوں پر دس لاکھ کے لالچ کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ یہ دس لاکھ کیسے لو گے؟ تم خونی خان کو پکڑ کے تھانے لے جاؤ گے اور تھانیدار اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کے دس لاکھ نکالے گا اور تمہارے شانے پر تھپکی دے کے کہے گا 'شاباش جوان!' اور وہ تمہارے حوالے کر دے گا اور تم اس کے بعد عیش کرو گے کوٹھی میں، اور کار میں گھومو گے۔ تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ خونی خان کے کچھ ساتھی بھی ہیں جو تمہیں چھوڑیں گے نہیں، خواہ تم قطب شمالی میں چلے جاؤ یا بحر اوقیانوس کی تہ میں جا بیٹھو۔"

"حکومت نے انعام کا اعلان کیا ہے تو حفاظت بھی لے گی۔" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا مگر اب اُس کا لہجہ اعتماد سے خالی تھا۔

"حکومت کب تک حفاظت کرے گی اور کس کس کی حفاظت کرے گی۔ بفرضِ محال کوئی خود کو انعام کا حق دار ثابت کر دے تب بھی انعام ملنے تک مہینوں تو ضابطے کی کارروائی میں لگ جاتے ہیں۔ اتنا عرصہ تم کہاں رہو گے؟ وہ تمہارے خاندان کے ایک ایک فرد کو ختم کر سکتے ہیں جو اپنے سردار کو جان ہتھیلی پر رکھ کے جیل سے نکال لاتے ہیں۔ اس خیال کو ذہن سے نکال دو۔ ٹیکسی چلا کے کتنا کما لیتے ہو؟"

"سو سوا سو روپے روز کا مل جاتا ہے۔"

"ابھی اسی کو بہت سمجھو بھائی اور اپنے سارے خاندان کی زندگی کے بدلے میں دس لاکھ لے کر کیا کرو گے؟"

وہ خاموش ہو گیا مگر مجھے ایسا لگتا تھا کہ میری بات نے اُسے مطمئن نہیں کیا ہے۔ اُس کی نظروں کے سامنے دس لاکھ گھوم رہے تھے۔ شاید وہ سوچ رہا ہو گا کہ دس لاکھ مل جائیں گے تو اپنے خاندان سمیت اس شہر سے یا اس ملک سے ہی چلا جائے گا۔ ڈاکو محمد خان کے ساتھی اسے کہاں تلاش کریں گے، دنیا بہت بڑی ہے۔

بازاروں کی بھیڑ، لوگوں کے ہجوم اور ٹریفک کے اژدہام سے گزرتی ہوئی ٹیکسی نہ جانے کدھر رواں تھی۔ آگے غالب کے ساتھ محسن بھی بیٹھا ہوا تھا اور صرف ایک گھنٹے میں اس کی حالت میں ایک معجزہ رونما ہوا تھا۔ وہ اب بالکل نارمل تھا اور غالب کو نقشے کی مدد سے صحیح راستے پر چلتے رہنے میں مدد دے رہا تھا۔ شاک کی وہ ذہنی کیفیت ختم ہو چکی تھی جو اسیری کے پُرتشدد دور کا نتیجہ تھی۔ ہم سب کو اپنے قریب پا کے اور ہماری محبت اور توجہ دیکھ کے بالآخر اس کو تحفظ کا احساس حاصل ہو گیا تھا۔ تھوڑے سے آرام اور کچھ مناسب خوراک نے اس کی توانائی بھی بحال کر دی تھی کہ وہ خوش گوار موڈ میں بات کرنے کے قابل ہو گیا تھا اور اگلی سیٹ پر سیدھا بیٹھا ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے اس شخص سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا جسے میں نے اور نازو نے ایک پنجرہ نما قید خانے میں سے نکالا تھا۔

میں ٹیکسی ڈرائیور کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس شخص کو ڈاکو محمد خان کے ٹھکانے تک لے جانا خود ہمارے لیے بھی خطرناک ہو سکتا تھا۔ وہ میرے ڈرانے کے باوجود دس لاکھ کے خوابوں سے تائب نہیں ہوا تھا۔ معلوم نہیں اس کے دل میں کتنی ناآسودہ خواہشوں اور حسرتوں نے طوفان بپا کر رکھا تھا اور عقل کی کوئی دلیل اس طوفان کو نہیں دبا سکتی تھی۔

میں نے ایک اور کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔ "مسٹر ٹیکسی ڈرائیور! تم نے ڈاکو محمد خان کو ہمارے ساتھ دیکھا تھا۔ ہم ڈاکو ہوں یا نہ ہوں، اس کے دشمن بہرحال نہیں ہیں۔ دشمن ہوتے تو تم سے پہلے دس لاکھ وصول کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔ تمہیں ہم سے بھی ڈرنا چاہیے۔ ہم ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گے کہ کوئی دس لاکھ کے لیے محمد خان کو پولیس کے ہاتھ بیچ دے۔"

"کیوں مسٹر کیا ارادہ ہے اس اُلو کے پٹھے کے ساتھ؟"

غالب نے کہا "گولی مارو اور لاش باہر گرا دو۔"

"نہیں!" ٹیکسی ڈرائیور چلایا۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

میں نے کہا "یہ تو سب سے آسان کام ہو گا ہمارے لیے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے ایک دم دروازہ کھول کے باہر کودنے کی کوشش کی۔ دروازہ پورا کھل گیا لیکن میں ٹیکسی ڈرائیور کو دبوچ کر پیچھے کر دینے میں کامیاب رہا۔ ٹیکسی کی رفتار زیادہ تھی اور ہوا مخالف۔ دروازہ ایک دم کھلا تو اس کی لپیٹ میں ایک موٹر سائیکل والا آ گیا جو ٹیکسی کو غلط سائیڈ سے اوور ٹیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دروازہ اس سے ٹکرایا تو وہ موٹر سائیکل سمیت اُلٹ گیا۔ میں نے اُسے سڑک پر گرتے دیکھا۔ ٹیکسی اس وقت ایک ٹرک سے گزر رہی تھی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے ٹریفک پولیس کی ایک گاڑی کو رواں ہوتے دیکھا۔ جہاں وہ موٹر سائیکل سوار گرا تھا، وہاں بھی لوگ جمع ہو رہے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کس حد تک زخمی ہوا تھا۔ موٹر سائیکل کے حادثے میں بہت کچھ آدمی کی اپنی قسمت پر منحصر رہتا ہے۔ بعض اوقات صرف خراشوں پر بات ٹل جاتی ہے اور کبھی کچھ نہیں ہوتا مگر سر کی اندرونی چوٹ جان لے لیتی ہے۔

میں نے غصے میں ٹیکسی ڈرائیور کے ایک ہاتھ مارا تو وہ دوسرے دروازے پہ گرا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سخت خوفزدہ اور بدحواس ہونے کے باوجود اس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ ایک ناکامی کے بعد اتنی جلدی دوسری کوشش کرے گا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ اس نے اپنے مدعا کا اظہار کر کے خود اپنی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا ہے اور اگر اس نے خود ہی ہماری قید سے نجات حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہ کی تو ہم بالآخر اسے خونی خان کے حوالے

www.paksociety.com

کے میرا ماتھ ٹھنکا۔ نازو نے غالباً ٹھیک ہی کہا تھا۔ میر ڈاکو سٹینشن گن کی طرح مجبور سے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس کے پیچھے میں نے رابعہ کو دیکھا۔

"تو تم بھی پہنچ گئے؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ یہ کوئی سوال نہیں تھا بلکہ تمسخر اڑانے کا ایک انداز تھا کہ دیکھا، شامت اعمال تمہیں خود یہاں کھینچ لائی۔

میں نے کہا۔ "کیا تم ہمارے آنے سے خوش نہیں ہوئے؟"

خونی خان نے قہر آلود نگاہوں سے رابعہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اسے بھی پہنچا دو اسی آسمانی بجلی کے پاس۔" یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ اس نے یہ حکم دو فرمانبرداروں کو جاری کیا تھا۔ وہ خونی خان کے پیچھے خون آشام کتوں کی طرح اپنے شکار پر جست لگانے کے لیے تیار کھڑے تھے... اور نہ صرف یہ کہ خود بہت تندرست و توانا تھے بلکہ پوری طرح مسلح بھی تھے۔ میں نے رابعہ کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔

"تم چلو ادھر۔" محمد خان نے گرج کے مجھے حکم دیا۔

"محمد خان! یہ تم کیا کر رہے ہو؟" میں نے احتجاجاً کہا۔

"معلوم ہو جائے گا تمہیں۔" اس نے کہا۔

"یہ کوئی شرافت نہیں ہے۔" غالب نے کہا۔

"شرافت کا نام گالی ہے ہمارے لیے کیونکہ ہم ڈاکو ہیں۔" محمد خان نے کہا۔ "جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا..."

"ہم نے کیا برائی کی تھی تمہارے ساتھ جس کا تم یہ صلہ دے رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"اور تم نے وعدہ کیا تھا..."

"تم سے بڑا احمق کون ہوگا جس نے ایک ڈاکو کے وعدے کو قابل اعتبار سمجھ لیا تھا۔" اس نے کہا۔ "تم کیا دیکھ رہے ہو؟" اس نے رک کر اپنے دونوں حکم کے غلاموں سے کہا۔

"چلو بی بی! ورنہ تمہیں زبردستی کرنی پڑے گی۔" ان میں سے ایک نے مکروہ قہقہوں سے رابعہ کا بازو پکڑ لیا۔

رابعہ نے اپنا بازو چھڑا لیا۔ "ہاتھ مت لگاؤ مجھے، چلو۔"

میں نے کہا۔ "خونی خان! اپنے گھر میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت تم نے دے دیا ہے۔ تم بہادر ہوتے تو..."

"بکواس بند کرو اور چلو۔" وہ گرج کے بولا۔

غالب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "بھائی! اس سے الجھنا ٹھیک نہیں۔ غلطی ہماری تھی کہ اس فریبی انسان کو سمجھ نہ سکے۔"

میں نے اپنے آپ کو بہت برا لیکن وقت پر تصور کیا جو اپنی ہی غلطی سے خود بھی اس پر ہے۔ ہے وہاں میں گرفتار ہونے چلا آیا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے آیا۔ یہاں ہماری نہ منطق چل سکتی تھی نہ ہماری فریاد سننے والا کوئی تھا۔ شرافت اور انسانیت یا خدا رسول کا واسطہ دینے سے بھی کچھ حاصل نہیں تھا۔ اور ہم مقابلہ کرتے تو ناحق مارے جاتے۔ وہاں ان کا ایک پورا گروہ موجود تھا جن کی طاقت ان کی تعداد اور ان کا خطرناک اسلحہ تھا۔ ہم دو چار کو مار گراتے تب بھی یہاں سے جانے کے سارے راستے بند ہو چکے تھے۔ محسن کا اندازہ ہو گیا تھا۔ یہ عمارت واقعی ایک جیل خانہ بن گئی تھی۔

محسن میں اور غالب چپ چاپ ڈاکو محمد خان کے اشارے پر بڑھے۔ اندر ہی اندر میرا خون ایسے کھول رہا تھا جیسے مجھ میں آتش فشاں کا پگھلا ہوا لاوا اُبل رہا ہے لیکن کوئی کام کرنے پر مجبور تھا۔ ابھی نہ سہی مناسب وقت میں قدرت کوئی سبیل پیدا کر دے اور ہم ان ڈاکوؤں کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں۔

● بس ادھر سیدھے اندر والا دروازہ کھولو۔ ڈاکو نے حکم دیا۔

میں نے دروازہ کھولا اور چند سیکنڈ بے وقوفوں کی طرح ہکا بکا کھڑا رہا۔ پھر میں نے گل اور نازو کو دیکھا۔ وہ ایک نرم پر بڑی فراغت سے بیٹھی چائے یا کافی پی رہی تھیں۔ پیچھے قالین پر درمیان میں بچھی ہوئی میز انواع و اقسام کے لوازمات سے بھری پڑی تھی۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو ڈاکو محمد خان کو مسکراتے پایا۔ غالب کو شاید پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ ہمارے ساتھ مذاق ہوا تھا۔ اس کے لبوں پر بھی بھینچی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

"کہو کیسی رہی؟" محمد خان نے کہا۔ "تم تو بس نام کے سکندر اعظم ہو یار۔ سب بھول گئے اپنی بہادری۔" شرافت...

میں نے کہا۔ "خان صاحب! یہ میری بھول نہیں، یہ دور اندیشی تھی کہ میں نے مقابلہ نہیں کیا ورنہ مذاق کا غلط بھی نکل سکتا تھا۔"

نازو نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ "ان کے ساتھ بھی وہی حرکت کی تم نے؟"

میں نے کہا۔ "گویا ابھی آپ کے ساتھ ہو چکا ہے؟"

گل نے کہا۔ "ہاں مجھے اور نازو کو پکڑ کے ایک طرف سے رابعہ کو دوسری طرف۔ رابعہ نے تو بہت گالیاں دی ہیں۔ کوئی سنے روک لیا تھا ورنہ وہ تو کل گئی تھی۔" میں گائی...

ڈاکو محمد خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بہنیں... سے بڑھتا تو ہم سر جھکا لیتے، بھیج تو کیا کرتے۔"

میں نے کہا۔ "تمہارے وہ حکم کے غلام رابعہ کو کہاں لے گئے ہیں؟"

گل ہنسنے لگی۔ "وہ گھبرائیں نہیں بھائی سکندر! ہم سب کمرا ادھر ہی ہے۔ خواتین ایک ہی کمرے میں ہیں اور جا گئی۔"

"تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟ ہم سب نہا دھو کے کپڑے بدل چکے۔" نازو نے کہا۔

"بس یہ سمجھ لو کہ تھوڑی سی بھول ہو گئی تھی راستے میں۔" میں نے کہا۔ "جو ہوئی بہت کوئی خاص بات نہیں۔"

ڈاکٹر اور نرس کو دیکھ کر میں نے کہا۔ "یہ کیا سلسلہ ہے؟"

"یہ بھی سب خان صاحب کا کمال ہے۔ انھوں نے آتے ہی فون کیا اور ڈاکٹر، نرس سب کو بلوا لیا۔ یہ بھی ان کی مہمان نوازی کا ایک حصہ ہے۔" گل نے کہا۔ "ڈاکٹر نے دوا ہی دینی ہے کہ کل تک ہمارے بیماروں کو گھوڑے کی طرح دوڑنا ہے۔ یہ تو بڑا غضب ہے محسن!"

"تم بھی تیار ہو جاؤ۔" محسن نے غالب سے کہا۔ "ممکن ہے یہی سلوک تمہارے ساتھ بھی کیا جائے۔ کل تمہیں بھی میرے ساتھ دوڑنا پڑے گا۔"

"گدھے گھوڑے کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا... میرا مطلب ہے ایک ساتھ دوڑانا تو غلط بات ہے۔" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا۔ "آپ نے گدھا سمجھا، یہ بھی حسن ظن ہے آپ کا۔"

"ظن کو زنت پڑھا جائے۔" میں نے کہا۔

"چلو اب باقی باتیں بعد میں۔ آپ دونوں ساتھ والے کمرے میں جائیں اور تیار ہو کے آ جائیں۔" ڈاکو محمد خان نے کہا۔ "وہاں سب کچھ ہے پھر بھی کسی چیز کی کمی ہو تو بٹن دبا کے بتا دیجیے گا۔ ویسے تو کہہ دیا تھا کہ سب کے لیے الگ الگ انتظام بھی کیا جا سکتا ہے مگر انھوں نے کہا کہ ہم ایک ساتھ ہی رہیں گے۔" اس نے نازو اور گل کی طرف اشارہ کیا۔

"ہم بھی ایک ساتھ رہنے کو ترجیح دیں گے۔" میں نے کہا اور غالب کو اپنے ساتھ کھینچ کر لے گیا جو بڑی حسرت بھری نظروں سے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔ نازو اور رابعہ شلوار اور قمیصان کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں جیسے بچے کی گھبراہٹ اور ستی کچھ نہ کچھ کھا رہی تھیں۔ کھانے پینے کی چیزیں دیکھ کر پیٹ میں بھی مروڑ اٹھنے لگے تھے۔ نے مجھ سے کہا کہ پہلے نہا دھو کے لباس بدل لیا جائے۔ کمرے کی آرائش اور تمام دستیاب سہولتوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ہم ڈاکوؤں کے ڈیرے پر نہیں کسی فائیو سٹار ہوٹل کے کمرے میں ہیں۔

غالب نے کہا۔ "یار یہ جیل تو بڑا اچھا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اور اب تک جو کچھ ملا ہے وہ بھی اچھا تھا۔"

غالب نے کہا۔ "کیا مزا ہے۔ زمانہ بھی ہمارے قدموں میں وہی پرانے تصورات ہیں ڈاکوؤں کے اور ان کی پناہ گاہوں کے۔ ہم ابھی تک سمجھتے آئے ہیں کہ ڈاکو جاہل اور بڑے سفاک ہوتے ہیں۔ وہ چار آدمی کو شوقیہ مار دیتے ہیں سر راہ۔"

"ڈاکو تو اب بھی ڈاکو ہیں مگر بات وہی ہے کہ ڈاکو کی تعریف کیا ہے اور کون کس کے لیے ڈاکو ہے۔ ایک ڈاکو دوسرے ڈاکو کا دوست ہے۔ جیسے وہ لوٹ نہ سکے اس کے لیے وہ ڈاکو نہیں ہے۔ بعض ڈاکو غریبوں کے دوست تھے۔ محمد خان ڈاکو بھی کوئی شریف آدمی نہیں ہے مگر ہمارا وہ کیا بگاڑ سکتا ہے۔ یہاں اس کا حسن سلوک محض قرض ادا کرنے کی ایک صورت ہے جو ہم نے نیکی کی صورت میں اس پر چھوڑ دیا تھا۔"

"چل بھائی اب باتیں چھوڑ۔ پہلے میں نہا کے آتا ہوں۔ مجھے بھوک بھی سخت لگی ہے اور آرام کی ضرورت بھی ہے۔" غالب نے کہا۔

محسن کے بعد جب غالب غسل سے فارغ ہو کے نکلا تو میں نے باتھ روم کا رخ کیا۔ وہ ایک شاہانہ باتھ روم تھا۔ مدت ہوتا تو میں ایک گھنٹا سلیم نہاتا لیتا اور جسم سے ساری تکان دھو ڈالتا۔ اب رات ہونے والی تھی اور میں بھی سکون سے سونا چاہتا تھا۔ ڈاکوؤں کی اس کمین گاہ پر کتنے لوگ تھے اس کا مجھے ابھی اندازہ نہیں تھا۔ مجھے کہیں سے کسی کے بات کرنے کی آواز تک نہیں آ رہی تھی۔ اس کمرے میں تازہ میرے سائز کے کپڑے موجود تھے۔ صاف دھلی ہوئی قمیص پتلون جن پر تازہ استری کی گئی تھی۔

میں واپس وہاں پہنچا جہاں نازو اور گل کے ساتھ اب رابعہ بھی موجود تھی کیونکہ ڈاکٹر نے غالب کا معائنہ شروع کر دیا تھا۔ اس کمرے میں دوسرا بیڈ لگا کے غالب کو لٹا دیا گیا تھا۔ ان دونوں بیماروں کا علاج جتنی توجہ اور محنت سے ہو رہا تھا اس سے تو یہی لگتا تھا کہ محسن اور غالب واقعی دو چار دن میں بالکل صحت مند ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر صورت سے سمجھ دار نظر آ رہا تھا اور یہ تو سمجھنے کی بات تھی کہ اس کی پیشہ ورانہ خدمات حاصل کرنے میں خونی خان کا خوف اور اس کا پیسہ دونوں کام آئے تھے۔

میں نے کھانے کی میز کو غور سے دیکھا۔ اس پر اب بھی بہت کچھ باقی تھا۔ رابعہ نے صرف ایک سینڈوچ لیا تھا اور اب کافی پی رہی تھی۔ اس نے جو کپڑے پہنے تھے وہ تقریباً اسی کے سائز کے تھے۔ یہی کیفیت گل کے لباس کی تھی۔ صرف نازو تھی جس کو اس سائز کے کپڑے بہت ڈھیلے ہو گئے تھے۔ گل اور رابعہ کے جسم متناسب تھے اور ان کے قد و قامت میں بھی زیادہ فرق نہیں تھا۔ نازو اپنی جسامت میں ان سے بہت کم تھی۔ وہاں غالباً اوسط سائز کے زنانہ

www.paksociety.com

اور مردانہ کپڑے سب کے استعمال کے لیے رکھے گئے تھے۔

یکلخت ہم سب بہت پُرسکون اور آسودہ ہو گئے تھے۔ وقتی طور پر تحفظ کا احساس سب کو ایک نعمت محسوس ہو رہا تھا اور یہ بات سب کی صورتوں سے عیاں تھی۔ میں بھی سینڈوچ اور بلیک کافی کا گھونٹ لے کر رابعہ کے ساتھ قالین پر بیٹھ گیا۔ رابعہ انھیں بتا چکی تھی کہ یہاں پہنچنے میں دیر کیوں ہوئی تھی۔

میں نے کہا۔ ”تمھیں راستے میں روکا تھا کسی نے؟“

گل نے کہا۔ ”دو جگہ بہت سخت چیکنگ ہو رہی تھی مگر ظاہر ہے ہمیں کون روکتا۔“

”محمد خان کہاں ہے؟“

”ڈاکٹر صاحب نے کچھ دوائیں لکھ کر دی تھیں، وہی لینے گیا ہے۔“

”خود گیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”نہیں، کسی کو بھیجا ہے۔“ گل نے جواب دیا۔ ”یہ بھی خوب آدمی ہے۔“

”سوچو کل رات اس وقت ہم کہاں تھے؟“ میں نے کہا۔

”اور یہ کتنا عجیب لگتا ہے کہ ہم سب پھر اکٹھے ہیں اور کہاں آ کے اکٹھے ہوئے ہیں۔“ نازو نے اداسی سے کہا۔

”ہر کام کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک کام ہے۔ کل جو کچھ ہوا اور اس سے پہلے جو بھی ہوا یا جو آج ہے وہ سب اور جو کل ہوگا وہ بھی طے شدہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”اُف... میرا خیال ہے تم فوراً کچھ کھا پی لو ورنہ ایسے ہی بولتے رہے تو ہم پاگل ہو جائیں گے۔“ رابعہ نے کہا۔

”یار! اب آپ بھائی ہیں تو بہت پہلے ہی پاگل کر دیا تھا آپ نے۔“ میں نے کہا۔ ”تم کیوں اداس ہو نازو؟“

نازو کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ”سب کو اکٹھا دیکھ کے مجھے بھیا یاد آ گئے۔ معلوم نہیں وہ کہاں ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اکرام شیخ اکیلا رہ گیا۔ اسے بھی ہم سب کی یاد آئی ہوگی۔ کل کوشش کروں گا کہ اس سے رابطہ ہو جائے۔“

گل نے اس کے آنسو پونچھ دیے۔ ”روتی کیوں ہو؟ ہم انھیں بھی بلا لیں گے۔“

رات کے کھانے کے بعد محمد خان کے حکم پر غالب اور محسن کو اور میرے حکم پر خواتین کو سونے کے لیے جانا پڑا حالانکہ وہ سب اتنا عرصہ بعد مل کر بیٹھے تھے اور گپ لگانے کے موڈ میں تھے۔ غالب اور محسن کے بارے میں پہلے میرا ارادہ تھا کہ انھیں مکمل صحت یابی تک محمد خان کی نگرانی میں چھوڑ دوں گا مگر ان کی بحالی صحت کی رفتار دیکھتے ہوئے میں نے دو تین دن انتظار کر لینا بہتر سمجھا۔ ڈاکٹر اور نرس کی اب زیادہ ضرورت نہ تھی مگر وہ محمد خان کا فیملی ڈاکٹر تھا اس کی فیس ... کے ساتھی ڈاکٹر کو ہمراہ ایک خطیر رقم ایسے ہی اصول ... ادا کی جاتی تھی جو عام طور پر ڈاکٹر نہیں کرتے تھے۔ ... غالب اور محسن کے ساتھ رہنے پر مجبور تھے۔ ڈاکٹر ... یقین دلایا تھا کہ جسمانی تشدد، نیند اور ساقی، اعصابی کشیدگی ... کمزوری کے اثرات دو تین دن میں بالکل غائب ہو جائیں گے۔

رابعہ کو مجھ سے شکایت ہوئی کہ میں نے اس ... کا احترام نہ کرتے ہوئے اسے بھی رخصت کر دیا۔ شاید ... خواہش ہوگی کہ میں اور وہ کچھ دیر اپنی باتیں بھی کریں۔ ... لیے فراغت اور خلوت دونوں ضروری تھیں لیکن میرے ذہن ... جو کچھ تھا وہ میں سب کے سامنے اسے نہیں بتا سکتا تھا۔ ... نے اس کی آنکھوں میں شکایت دیکھی لیکن انجان بنا رہا۔

اس چھوٹے ڈیرے جیسی عمارت کے عقبی حصے میں ایک مختصر سا ڈرائنگ روم تھا۔ ڈاکو محمد خان وہاں بیٹھے ... اور اگرچہ وہ مجھ سے اپنا اضطراب چھپانے کی کوشش کر ... مگر اس کی کیفیت مجھ سے پوشیدہ نہ تھی۔ اس نے کھانے کے دوران کسی کو احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ کھانے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اس نے سب کا ساتھ دیا تھا لیکن میں نے ... کر لیا تھا کہ اس نے برائے نام کھانا کھایا تھا۔ اب وہ ... سے سگریٹ پھونک رہا تھا اس سے بھی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ پریشان ہے۔

میں نے اس کے قریب جھک کے کہا۔ ”محمد خان صاحب! کیا بات ہے تم کس پریشانی میں مبتلا ہو؟ کیا اس کی وجہ ...“

اس نے زبردستی مسکرا کے کہا۔ ”نہیں یار! اپنی تو ساری زندگی ایسی ہی پریشانیوں میں گزری ہے۔ تم تو محسن ہو میرے اور مہمان ہو۔“

میں نے کہا۔ ”تمھارے ساتھی کہاں ہیں؟“

”ساتھی؟“

”ہاں۔ تمھارے علاوہ مجھے یہاں کوئی نظر آیا ہے تو وہ تمھارے ملازم ہیں۔ کیا تمھیں چھاپا پڑنے کا ڈر ہے؟“

اس نے کہا۔ ”یہاں کون چھاپا مار سکتا ہے؟“

”پولیس... منزل پر رسائی کرنے والے۔“ میں نے ...

”کوئی مخبری کر دے کہ خونی خان جیل سے فرار ہو کے یہاں پہنچا ہے۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تمھیں معلوم نہیں، یہ کوٹھی کس کی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں معلوم تو تم بتا دو۔“

وہ کچھ دیر مجھے تکتا رہا پھر بولا۔ ”یہ کوٹھی پولیس کے ... وزارت داخلہ کے ڈائریکٹر جنرل کی ... اس کے سالے ... بریگیڈیئر جنرل ... خانہ جات ہے۔“

میں پھر چونک گیا۔ ”تم انھی کے گھر میں بیٹھے ہو؟ تمھاری ... بڑی خوفناک ...“

”مگر یہ بڑی کارآمد ہے۔ خود ان کے محکمے کے اہلکار، وہ خاک ... اور پھر اس سارے شہر میں یہی تو ایک جگہ ہے جہاں پولیس گشت بھی قدم نہیں رکھ سکتا۔ میں محفوظ ترین مقام پر بیٹھا ہوا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو میرے ساتھی مجھے جیل خانے سے نہیں نکال سکتے تھے۔“

”اس کا تم انھیں معاوضہ ادا کرتے ہو گے؟“

”بابا! خدمت ہے۔“

”پھر تو تمھاری پریشانی کی کوئی وجہ نہیں۔“

”میں اپنے ساتھیوں کی طرف سے پریشان ہوں۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”وہ ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے۔“

”کیا وہ... وہ کسی کام سے گئے ہیں؟“ میں نے دانستہ انداز سے گریز کیا۔

”میری رہائی کے ذرائع ہیں۔ ان کا ایک مخبر پولیس کو مخبر تھا پھر وہ سب منتشر ہو گئے تھے۔ انھوں نے کہا تھا سب یہاں پہنچ جائیں گے۔ خیر چھوڑو مجھے کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔“

”کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں۔“ میں نے کہا۔ ”پہلے میرا خیال تھا کہ میں تم سے تمھارے ماضی اور حال کے بارے میں پوچھوں گا اور پھر اپنے متعلق کچھ بتاؤں گا جیسے شریف لوگ سمجھتے ہیں لیکن ایسے ہی ہم بھی رخصت ہو جائیں گے لیکن مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے اور اب تو میرا خیال ہے کہ تم میرے لیے بہت کچھ کر سکتے ہو۔“

”مجھے دہشت گردی کا کوئی تجربہ نہیں۔“ وہ مسکرایا۔

”تمھیں اب بھی یقین نہیں کہ ہم دہشت گردی میں ملوث نہیں ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”ہم دونوں ہی صورتوں سے، گفتگو سے اور انداز و اطوار سے تم ذرا بھی دہشت گرد نہیں لگتے لیکن میں نے تمھیں ایکشن میں بھی دیکھا ہے۔ تم لوگ خطرناک بھی ہو۔“

میں نے کہا۔ ”ہم دلوں کے یار ہیں اور دشمنوں کے بڑے کٹر دشمن ہیں۔“

”تمھارا دشمن کون ہے؟“ اس نے اچانک سوال کیا۔

میں نے جواب تفصیل سے اور اختصار سے دیا۔ تفصیل ... کیونکہ میں نے سب کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ... مقاصد پر روشنی ڈالی ... دشمنوں کے عزائم ... کا حساب مقصد کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا ذکر کیا اور پھر مستقبل کے پروگرام کی بات کی لیکن میں نے... اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی اور اپنے تجربات و حادثات کے بیان میں اختصار برتا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا اور ہم اس لان پر ٹہلتے ہوئے سگریٹ پیتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈاکو محمد خان کی دلچسپی میں ایک قدر آفرین اور پرستائش حیرت شامل ہے۔ وہ بار بار کہتا تھا۔ ”بھئی یہ تو کمال ہو گیا۔“ ”یا اچھا! حد ہو گئی بھئی۔“

جب میں نے اپنی بات ختم کی تو خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں ہم دونوں لان کے ایک کنارے پر بچھی ہوئی بنچ پر بیٹھے رہے۔

پھر اس نے کہا۔ ”تم نے بہت اچھا کیا کہ یہ سب بتا دیا۔ تمھارے سچ نے تمھاری جان بچالی۔“

میں نے حیران ہو کے کہا۔ ”جان بچالی؟ تو کیا تم نے...؟“

”ہاں، میں نے تم سب کو قتل کرنے کا سوچ لیا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو میرے ساتھی مجھے مار دیتے۔ ان کے اصرار پر میں مجبور ہو جاتا۔ خونی خان کے کسی ٹھکانے سے کوئی واقف حال زندہ لوٹ کر نہیں گیا۔ تم بہت جان چکے تھے اور ایک چشم دید گواہ تھے۔ اس کے علاوہ تم عام لوگ نہیں تھے۔ تم نے مجھے ذلیل بھی بہت کیا تھا۔“

”خان صاحب! پھر یہ سب کیا تھا؟ تمھارا حسنِ سلوک... مہمان نوازی کا ایسا شاندار مظاہرہ...؟“

”تمھیں مطمئن رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا تاکہ تم بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ تمھیں اپنے ساتھ لانے کا فیصلہ میں نے یہ جان کر کیا تھا کہ تم زبردستی میرے ساتھ آ گئے تھے اور زبردستی مجھ سے کام لینا چاہتے تھے۔“

میں اسے تعجب سے دیکھتا رہا۔ ”تم واقعی خونی خان ہو اور ایک ڈاکو ہو، بالکل عام ڈاکو... گو دیکھنے میں تم ایک مہذب اور شریف آدمی لگتے ہو۔ آخر تم نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا؟ اس لیے کہ ہم بھی مسلمان ہیں؟“

”او نہیں! مجھے کسی کے مذہب سے کوئی سروکار نہیں۔“

”پھر کیا تمھیں ہمارے مشن سے دلچسپی ہے؟ کوئی نرم گوشہ پیدا ہو گیا ہے تمھارے دل میں مشرقی پاکستان کے لوگوں کے لیے...؟“

”وہ جیسا بھی ڈاکو کے پاس دل کہاں ہوتا ہے اور ہو تو اس میں کسی کے لیے نرم گوشہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ کیا پتھر کبھی موم ہو سکتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”پھر یہ جاں بخشی کا خیال کیسے آیا تمھیں؟“

”ایک لڑکی ہے تمھارے ساتھ۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ”میرا دل ڈرنے لگا کہ محمد خان ڈاکو نے رابعہ، گل اور نازو میں سے کسی کو اپنے لیے پسند کر لیا ہے، اگر وہ تنہا ہی

www.paksociety.com

بے رحم اور سفاک تھا جتنا کہ اس کا نام تو وہ کسی کو بھی روک سکتا تھا اور ایسا ہوتا تو اس کی نگاہِ انتخاب میں پہلے وہ آسمانی بجلی آتی جس نے اس کی عقل کو حیران کر دیا تھا۔ اس نے صاف کہا تھا کہ یہ لڑکی اس کے گروہ میں شامل ہو جائے تو وہ سارا ہندوستان فتح کر لے۔

جب اس نے کہا "تمھیں یقیناً شکر ادا کرنا چاہیے اس لڑکی کا جس کے طفیل تم سب نے آج نئی زندگی پائی۔"

"میں سمجھا نہیں تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"میں شیش ناگ کی بہن ناگ منی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ بھی ایک عظیم ڈاکو تھا۔ نہ میں اس سے کبھی ملا اور نہ میرا اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق تھا لیکن وہ میرا ہم پیشہ تھا اور جب اس نے تمھاری جان بچانے کے لیے اپنی جان دینے کے بعد تم پر اتنا اعتماد کیا کہ اپنی بہن کو تمھارے حوالے کر دیا تو اب یہ میرا بھی اخلاقی فرض بنتا ہے کہ اس ڈاکو کی بہن کو جہاں تک ممکن ہے تحفظ فراہم کروں۔ وہ میری بھی بہن ہے، اس رشتے سے کہ میں اس کے بھائی کی طرح ڈاکو ہوں۔"

پشتونوں کی نفسیات اور پیشے کی اخلاقیات کے اس فلسفے نے مجھے دم بخود کر دیا۔ اس ڈاکو کے لیے سب آسمانی صحیفوں کے فرمان، پیغمبروں کے فرمودات، شرافت اور انسانیت کی تبلیغ کرنے والوں کے ارشادات، نیکی اور راستبازی کی سب ترغیبات بے معنی اور لاحاصل تھے۔ اس کے لیے ہم، ہمارا احسان، ہمارا مذہبی تعلق، ہمارا مشن سب کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اس کو صرف ایک احساس نے مغلوب کر لیا تھا کہ گل بانو ایک ڈاکو کی بہن ہے، وہ اس ڈاکو کو ایک بڑا آدمی مانتا تھا۔ ایک پاکستان کا ڈاکو تھا تو دوسرا ہندوستان کا ڈاکو تھا مگر وہ سیاسی و نظریاتی سرحدوں سے بے نیاز۔۔۔ صرف ایک رشتے کو تسلیم کرتے تھے اور ڈاکوؤں کی عالمی برادری کے حوالے سے ایک دوسرے کے ساتھ اپنے ضابطۂ اخلاق کے مطابق یگانگت رکھتے تھے۔

میں نے خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد کہا "تو کیا اب میں امید رکھوں کہ تم ہماری مدد کرو گے؟"

"ہاں اگر ہماری بہن ناگ منی کہے گی۔"

میں نے کہا "وہ اب گل بانو ہے۔"

"گل بانو ہو گی تمھارے لیے۔ ہمارے لیے ناگ منی کا نام اہم ہے۔ جاؤ اب بے فکر ہو کے سو جاؤ۔ صبح بات ہو گی۔"

میں واپس اپنے کمرے میں آیا لیکن میرا ذہن اتنا پریشان تھا کہ میں سو نہ سکا۔ محسن اور غالب کو خواب آور دوا دی گئی تھی۔ یہ بات مجھے خود ڈاکٹر نے بتائی تو مجھے خیال آیا کہ کہیں ڈاکٹر ایک ڈاکو کے حکم پر محسن اور غالب کو سمِ قاتل کا ایک انجکشن

بھی دے سکتا تھا۔ بہت دیر تک میں کروٹیں بدلتا رہا … کیوں نہ ذرا باہر جا کر دیکھ لوں۔ راستے کے دو … آنے والی کسی گاڑی کی آواز سنی اور بند کھڑکی کے شیشے … کر دیکھا۔ ایک جیپ ڈیوڑھی سے چھ سات مسلح افراد … تھے۔ دور سے میں ان کے تاریک سائے ہی دیکھ سکتا تھا۔ … سے اترنے والے آخری آدمی کے ہاتھ پیر رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ڈاکو اسے بڑی بے رحمی سے گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے۔ … جیپ کے پچھلے حصے سے کسی عورت کو اتارا گیا۔ وہ ڈاکو اسے دھکیلتے ہوئے اندر لے گئے۔ عورت کے صرف ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن منہ میں کپڑا ٹھونس کے بند کر دیا گیا تھا۔

اشتعال کی ایک لہر اٹھی جس نے وقتی طور پر مجھے ان مظلوموں کی حمایت پر اکسایا مگر میں نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ مجھے کیا ضرورت ہے ان ڈاکوؤں سے محاذ آرائی کی جب کہ ہم یہیں کبھی کے ٹھکانے لگا چکے ہوتے اگر ہمارے ساتھ ایک ڈاکو کی بہن نہ ہوتی۔ اب مجھے جلد از جلد اپنا کام نکال کر یہاں سے نکلنے کی فکر کرنی چاہیے اور بس۔ میں پھر بستر پر لیٹ گیا … دل پھر رابعہ کے لیے مچلنے لگا۔ دوسری بار سونے کی کوشش میں ناکام ہو کے میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کے ڈھائی بج … میری گزشتہ رات بڑی سخت آزمائش میں گزری تھی اور تھکن سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ میں نے جو اسپرین کھائی تھی اب اس کا اثر بھی ختم ہو رہا تھا۔ میں مزید اسپرین کھانے … کے موڈ میں تھا۔ خونی خان نے کہا تھا کہ جس چیز کی ضرورت ہو گھنٹی بجا کے کہہ دینا۔ گھنٹی کا بٹن ایک دیوار کے سوئچ بورڈ پر نظر آ رہا تھا۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے، میں نے سوچا اور بٹن دبا دیا۔ گھنٹی نہ جانے کہاں بجی تھی کہ میں نے اس کی خفیف سی آواز بھی نہیں سنی مگر سوئچ کے اوپر کی جالی سے کسی نے کہا۔

"یس سر؟"

میں نے کہا "کافی مل سکتی ہے اور اسپرین؟"

"یس سر۔ اور کچھ؟" اسی سپاٹ لہجے میں پوچھا گیا۔

"فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ تھینک یو۔"

دس منٹ بعد کسی نے دروازے پر دستک دی … جا کے دیکھا تو مجھے کوریڈور میں دروازے کے سامنے ایک ٹی ٹرالی نظر آئی۔ اس میں کافی تھی۔ کچھ بسکٹ تھے اور اسپرین کا پیکٹ تھا۔ ٹرالی لانے والا کون تھا، میرے اندازہ … کوریڈور خالی پڑا ہوا تھا۔ میں نے ٹرالی کو اندر کھینچ لیا … کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ کیا خونی خان نے بھوت بھی ملازم رکھے ہیں۔

جب دوسری بار دستک ہوئی تو میں اچھل پڑا۔

… سے بند نہیں کیا تھا۔ ہینڈل آہستہ سے گھوما اور رابعہ … اندر آ گئی۔

… بقول شاعر۔ دونوں طرف ہے پیاس برابر لگی ہوئی … نے کہا "سرداد کا ٹانک پیاس سے ہے۔"

وہ ہنس دی اور میرے پاس بیٹھ گئی "نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟"

میں نے کہا "بہت خوب۔ میں شگفتگی وغیرہ کا قائل تو نہیں مگر بات کیا کروں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں سوچ رہا تھا … نہیں … تمھاری یاد پریشان کر رہی تھی۔"

"ایسے جھوٹ کی ضرورت تو نہیں تھی۔" رابعہ نے کہا "مزے سے بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو ڈائیلاگ بول دیا۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "کیا محبت میں آدمی اپنا اعتبار بھی کھو بیٹھتا ہے … اور تو پھر سب کچھ ٹھکانا ہے۔"

رابعہ نے کہا "خان صاحب سے کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

"… کوئی خیر۔ اور خدا کا شکر ادا کرو کہ اس وقت تم میرے … میاں کے پاس نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

"ہیرو ایک … ہے۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "سب تو دور ہیں۔ براہ راست نہ ملیں تو کیا … لب کے دیکھنے سے تر ہو سکتے ہیں۔"

رابعہ نے شرما کے کافی کے مگ سے ایک گھونٹ لیا … دوسرا گھونٹ لینے کے لیے کہا "اس کا تو مزہ ہی بدل گیا ہے تمھاری … شامل ہونے سے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" رابعہ نے کہا اور پھر ایک گھونٹ لیا۔ "بقول شاعر۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔ کافی میں … نے نشہ گھول دیا ہے۔ میں کیا کروں۔"

"اس سے زیادہ نشے میں کچھ کہا تو میں چلی جاؤں گی۔" رابعہ … اور مگ میرے ہاتھ سے لے کر پھر ایک گھونٹ لیا۔

میں نے … کہا "ایسی جان لیوا … چلیں خاموش ہو جاتا ہوں … اور تمھیں دیکھتا ہوں۔"

"تم نے دیکھا ابھی کچھ لوگ جیپ سے اتر کے آئے ہیں؟"

میں نے کہا "تم بھی دیکھ رہی تھیں۔ وہ ساتھی … محمد خان … گل نے ان کے ہاتھوں ہمارا خون ہونے سے بچا لیا۔" رابعہ بولی۔ اور میں نے اسے تفصیل سے اپنی … خان کی گفتگو کے بارے میں بتایا۔

… سب کچھ سن کے کہا "تو ہمیں صبح ہوتے ہی یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

میں نے کہا "اب کوئی خطرے کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ خونی خان سے وہ کام لینے ہیں جو میں خود نہیں کر سکتا۔"

"ایسا کون سا کام ہے اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ تمھارا کام کرے گا؟"

"گل کے حکم پر وہ سب کچھ کرے گا۔ مجھے تریپاٹھی کے ذریعے دلاور کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔ خونی خان کے ساتھی شہر بھر میں اپنے تعلقات رکھتے ہیں اور خود خان صاحب کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔" میں نے کہا "چھوڑو یہ بات۔ کوئی اور بات کرو۔"

"اور کیا بات کروں؟"

"اچھا میں باتیں کرتا ہوں۔ تم اسی طرح بیٹھی رہو۔"

صبح میں نے ڈاکو محمد خان کو محسن اور غالب کے کمرے میں دیکھا۔ وہ ڈاکٹر سے مریضوں کی پروگریس رپورٹ لے رہا تھا۔

ان دونوں کی حالت اتنی اچھی نظر آ رہی تھی کہ مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ نازو اور گل بانو اپنے بیماروں کے سرہانے پہلے سے موجود تھیں۔

میں نے کہا "اب ایسی تیمارداری سے کیا فائدہ کہ رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ پھر خود لیٹ جاؤ گی بیمار بن کے۔"

"آپ جا کے اپنی آنکھیں آئینے میں دیکھیں جو ابھی تک سوئی سوئی ہیں۔" نازو نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی صورت دیکھے بغیر آنکھیں نہیں کھولیں گی۔"

گل نے مسکرا کے معنی خیز لہجے میں کہا "حالانکہ پوری رات انھوں نے سو کے ہی گزاری ہے۔"

میں نے کہا "خدا بچائے تم لڑکیوں کی زبان سے۔" اور محمد خان کے ساتھ باہر نکل گیا۔

"خان صاحب! کیا آپ گل سے مل چکے ہیں؟"

"ہاں۔ ابھی تھوڑی سی بات ہوئی تھی۔ پھر میں نے اس کے بھائی کی بات نہیں کی۔" محمد خان نے جواب دیا۔

"رات کو تمھارے ساتھی آ گئے۔ میں نے … دیکھی تھی۔" میں نے کہا۔

"رات کو میری تریپاٹھی سے بات ہوئی تھی۔" محمد خان نے کہا۔

میرے ذہن کو بجلی کا جھٹکا لگا۔ "تم نے خود فون کیا تھا؟"

"ہاں" اس نے بے نیازی سے کہا "اور مجھے ایک بڑی عجیب بات معلوم ہوئی۔ وہ جو دلاور ہے نا۔۔۔ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

میں نے چونک کے کہا "خان صاحب! آپ نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ ہم یہاں ہیں؟"

محمد خان کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

www.paksociety.com

محمد خان نے کہا: "پریشان ہونے ڈرنے کی بات کوئی نہیں۔"

میں نے کہا: "خان صاحب! تم ہماری پوزیشن کو نہیں سمجھے۔ تمہیں کیا معلوم کتنی پریشانی اٹھا کے ہم نے اس مردود سے پیچھا چھڑایا تھا۔"

"تم کس مردود کی بات کر رہے ہو؟"

"چوہدری دلاور کی۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ اس کا شکاری ٹولا ہمیں کسی جال میں گرفتار نہ کر سکا اور انھوں نے ہمارے خلاف سازشوں کے جتنے جال پھیلائے وہ انھی کے شکست کا سامان بنتے چلے گئے۔ یہ ہمارا کمال نہیں تھا۔ خدا کی مہربانی تھی اور مدد تھی۔ اب اسے ہماری بے وقوفی سمجھو یا قسمت کہ بمبئی پہنچ کے ہم خود کو روپوش نہ رکھ سکے۔ ہم سے ایک ایسا کارنامہ سرزد ہو گیا۔"

"کارنامے سرانجام دیے جاتے ہیں۔"

"مگر یہ کارنامہ ہماری راہ میں آ گیا اور ہمارے لیے ناگزیر ہو گیا۔ ہم کیا کرتے؟ کوئی شخص ساحل پر ٹہل رہا ہو اور اچانک کسی کو ڈوبتا ہوا دیکھے تو کیا کرے گا؟ ٹہلتا رہے گا اور دیکھتا رہے گا؟ نہیں! اگر وہ انسان کا بچہ ہے تو سوچے سمجھے بغیر اپنی جان خطرے میں ڈال کے سمندر میں کود جائے گا اور اسے بچا لایا تو اس کی یہ غیر ارادی حرکت بھی ایک کارنامہ کہلائے گی۔ ہمارا تو یہ ہے کہ ہر خطرے میں بغیر سوچے سمجھے کود پڑنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم ڈوب رہے تھے کہ ایک لانچ کے عملے نے ہمیں بچا لیا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ اللہ نے ہمیں اُن کی شامت بنا کے بھیجا تھا۔ ہمیں بچانا اُن کو مہنگا پڑا۔ وہ لانچ میں اغوا شدہ لڑکیاں لے کر کہیں بیچنے جا رہے تھے۔ جب یہ بات معلوم ہوئی تو بس ہماری غیرت نے جوش مارا۔ پھر ہم نے اُن سب کو مارا اور لانچ کو واپس بمبئی لے آئے۔ اس واقعے کی بہت شہرت ہوئی اور یہی شہرت ہمیں لے ڈوبی۔ جب دلاور کے کانوں تک اس شہرت کا چرچا پہنچا تو وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ کام ہمارے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا۔ جیسے پولیس واقعی تفتیش کرے تو طریقۂ واردات سے اندازہ کر لیتی ہے کہ مجرم نو آموز ہے یا پرانا پاپی اور بعض اوقات تو صحیح مجرم تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسے ہی دلاور سیدھا تریویدی کے پاس جا پہنچا جہاں ہم ایک طرح سے قید میں تھے۔"

"یہ تم بتا چکے ہو مجھے کہ تم وہاں سے نکلے کیسے تھے؟"

"خان صاحب! ہم تو یہ بھی بتا چکے ہیں کہ ہم پھر گرفتار کیسے ہوئے تھے اور اپنے ساتھیوں کو گزشتہ رات کیسی خونریزی کے بعد ایک ویران جزیرے کی قید سے نکال کر لائے تھے۔

بڑی مشکل سے ہم اکٹھے ہوئے تھے اور جلد از جلد بمبئی سے جانا چاہتے تھے۔ یہ ہماری منزل نہیں تھی۔ بمبئی راستے میں ہم تقدیر کے چکر میں پھنس گئے اور . . . ابھی تک پھنسے ہوئے ہیں۔"

"لوگ تو بڑے شوق سے بمبئی آتے ہیں۔" خان بولا۔

"لعنت ہو بمبئی پر اور اُن لوگوں پر جو یہاں خوار ہونے آتے ہیں۔ ہمارے سامنے فلمی دنیا میں چانس حاصل کرنے سے کہیں زیادہ عظیم اور اہم مقصد ہے۔ ہمارا بہت وقت ضائع ہو چکا اور ہماری وجہ سے خواہ مخواہ کچھ لوگ اپنی جان سے گئے۔ اب سوچا تھا کہ خاموشی سے نکل جائیں گے تو تم نے تریویدی کو ہمارا پتا بتا دیا۔ یوں لگتا ہے خان صاحب کہ ابھی کچھ اور لوگ مارے جائیں گے ہمارے ہاتھوں، پھر راستہ صاف ہو گا۔"

ڈاکٹر محمد خان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا: "نروس ہو۔ اسی لیے تمہارا دماغ میدانِ جنگ بنا ہوا ہے۔ کس نے کس کو دیا ہے تمہارا پتا؟"

"جب تم نے فون پر بات کر لی تریویدی سے تو کیا رہا؟"

"میں نے اُسے اپنا فون نمبر تو نہیں دیا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ میں بمبئی سے بول رہا ہوں یا دہلی سے . . ."

"وہ اندازہ کرے گا، معلوم کرے گا۔ اُسے معلوم ہو گا کہ تمہارا نمبر؟" میں نے کہا۔

محمد خان نے نفی میں سر ہلایا: "اوّل تو یہ محال ہے لیکن فرض کرو وہ فون نمبر بھی معلوم کر لے تو اس سے پتا معلوم ہو گا میرا؟"

"ہر فون نمبر سے ایڈریس معلوم ہو جاتا ہے۔"

"لیکن وہ فون یہاں سے پانچ کلو میٹر دور ایک خالی بنگلے میں لگا ہوا ہے اور اس کا مالک ایک ڈاکٹر ہے جو دو سال سے لندن میں ہے۔ میں اس کو ڈلیس فون پر بات کر رہا تھا۔" محمد خان نے جیب میں سے ایک پاکٹ سائز سیٹ نکالا: "تم سمجھتے ہو نا اس نظام کو۔ اس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک میرے ہاتھ میں ہے۔ دوسرا پانچ کلو میٹر دور اس فون کے ساتھ منسلک ہے۔ ہر کال اسی فون سے گزر کے جاتی ہے اور اسی سے گزر کر مجھ تک پہنچتی ہے۔"

"وہ کون ڈاکٹر ہے جس نے اپنا فون تمہیں دے رکھا ہے؟ تمہارا کوئی ساتھی؟"

خان مسکرایا: "اُس بیچارے کو معلوم بھی نہیں کہ اس کا فون کون استعمال کر رہا ہے۔"

"کتنا عرصہ ہو گیا تمہیں یہ فون استعمال کر

"شاید چھ مہینے . . ."

"چھ مہینے سے تمہاری ہر کال اُس ڈاکٹر کے بل میں لگ رہی ہے۔ وہ تو دیوالیہ ہو جائے گا جب واپس آنے کے بعد اُسے معلوم ہو گا کہ فون واجبات ادا نہ کرنے کے باعث کٹ گیا اور واجبات نہایت ناگفتہ . . ."

محمد خان بولا: "یار تم بعض اوقات بالکل بچوں کی طرح سوچتے ہو۔ جب ہم وہ فون آزادانہ استعمال کر رہے ہیں تو کیا اس کے بل ادا نہیں کریں گے۔ فون تو کب کا کٹ چکا ہوتا اگر ہم نے انتظام نہ کیا ہوتا۔ ہر ماہ ہم بل کو لیٹر باکس میں سے نکال لیتے ہیں۔"

"والے تو لوگ تمھیں آتے جاتے بھی دیکھتے ہوں گے؟"

"اوّل تو کوئی دیکھتا ہی نہیں۔ . . پھر ہم یہ کام رات کو کرتے ہیں۔"

میں نے کہا: "اگر وہ ڈاکٹر واپس آ گیا تو؟"

"اُسے واپس آنے سے کون روک سکتا ہے۔ وہ سمجھ جائے گا کہ اس کا فون کوئی استعمال کرتا رہا ہے۔ کورڈلیس فون کا جو حصہ اس فون کے ساتھ منسلک ہے وہ ہم واپس نہیں لا سکیں گے۔ وہ کوئی بہت بڑی قیمتی چیز نہیں ہے۔ پانچ دس ہزار تو ہم ایسے ہی ادھر اُدھر پھینکتے رہتے ہیں۔ اگر ہم کوئی فون نمبر خریدیں یا نیا فون لگوائیں تو ہمارا خرچ زیادہ ہو گا اور رسک اس سے بھی زیادہ۔ جو طریقہ ہم نے اختیار کیا ہے اس میں کوئی رسک نہیں۔ ڈاکٹر کو معلوم ہو جائے گا کہ کسی نے بھی فون استعمال کیا وہ بل باقاعدگی سے ادا کرتا رہا وہ مطمئن ہو جائے گا۔ ہم اپنا بندوبست کہیں اور کر لیں گے۔ ہم ویسے بھی ہر چھ ماہ بعد فون نمبر بدل دیتے ہیں۔"

"اچھی ترکیب ہے؟"

"ہاں مجھے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص گھر خالی کر کے چلا گیا ہے اور یہ معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ہم فوراً اپنا سیٹ اُس بنگلے سے ہٹا کر دوسری جگہ منتقل کر دیتے ہیں۔ اب تک ہمارے دو سیٹ ضائع بھی ہو چکے ہیں۔"

میں یہ تفصیلی معلومات ایسے ہی نہیں حاصل کر رہا تھا۔ مجھے مواصلاتی رابطے کا یہ طریقہ پسند آیا تھا۔ ٹیلی فون سے بہتر اور تیز تر پیغام رسانی کا کوئی اور ذریعہ اب تک ایجاد نہیں ہوا۔ ایک ٹیلی فون لائن آدمی کو ہر شہر اور قصبے سے ہی نہیں ساری دنیا سے منسلک کر دیتی ہے۔ آج تک ہم بندروں کی طرح کسی ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھ کے ڈائریکٹ لائن استعمال کرتے رہے تھے مگر خطرہ بہت تھا۔ یہ طریقہ ہر وقت اور ہر جگہ آسانی سے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پہلے تو ایسا کھمبا تلاش کرنا پڑتا تھا جس پر چڑھتے ہوئے کوئی نہ دیکھے۔ اس کے بعد دوسرا خطرہ جو ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا وہ کرنٹ لگنے یا نیچے ٹپک پڑنے کا تھا لیکن تیسرا سب

سے بڑا نقصان یہ تھا کہ کھمبے پر چڑھنے کے صرف ہم تینوں یعنی میرے علاوہ ممن اور غالب ہی لطف و تشنید کرتے تھے۔ ہماری خواتین کے لیے یہ طریقہ کارآمد نہیں تھا کیونکہ ٹیلی فون کے کھمبے پر رابعہ، نادرہ اور فضل جیسی تو کیا کوئی لیڈی پولیس جیسی بھیانک شکل والی . . . لائن وومن نہیں ہے۔ محمد خان نے ٹیلی فون کے بے ضابطہ استعمال کا جدید اور محفوظ طریقہ اختیار کیا تھا۔

"تم کس سوچ میں پڑ گئے؟"

میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا: "میں سوچ رہا تھا کہ دلاور آخر مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔"

"یہ بات تریویدی بھی نہیں جانتا۔"

"کیا تم نے اُس سے پوچھا تھا؟" میں نے کہا۔

خان صاحب نے سر ہلایا: "ہاں، میں نے پوچھا تھا کہ بات کیا ہے تو اُس نے کہا کہ خان صاحب، مجھے اس نے نہیں بتائی۔"

میں نے کہا: "خان صاحب! تریویدی جھوٹ بھی تو بولتا ہو گا؟"

"دنیا میں کون جھوٹ نہیں بولتا۔" خان نے کسی فلسفی کی طرح کہا: "اگر کوئی خود کو دنیا کا سب سے سچا آدمی کہے تو یہ بھی جھوٹ ہو گا۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہر روز دنیا میں جتنا جھوٹ بولا جاتا ہے اُس کا دسواں حصہ بھی سچ نہیں بولا جاتا۔"

میں نے کہا: "میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ آہستہ آہستہ سچ اور کم ہوتا جا رہا ہے۔ آج تناسب ایک اور دس کا ہے تو کل ایک اور بیس کا ہو گا۔ مگر مجھے دنیا میں سچ کے سکے کی گرتی ہوئی قیمت کے بارے میں نہیں تریویدی کے سچ کے بارے میں بتاؤ۔"

"تریویدی مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا۔" ڈاکٹر محمد خان نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا جیسے ہر ماں اپنے بچے کے بارے میں پڑوسن کی شکایت پر یقین کامل کے ساتھ آستین چڑھا لیتی ہے کہ میرا بچہ ایسا نہیں ہے۔

میں نے کہا: "لوگ اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولتے ہیں۔"

محمد خان نے کہا: "تریویدی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ اس کا جھوٹ میں نے پکڑ لیا تو موقع ملتے ہی میں اُسے پکڑ لوں گا بلکہ پکڑ لاؤں گا اور اُسے جھوٹ کی نقد قیمت چکانی پڑے گی۔"

میں نے کہا: "وہ جھوٹ بولے تو تم جرمانہ کر دیتے ہو؟"

"ہاں۔ جھوٹ اُسے مہنگا پڑتا ہے۔ جانتا ہے وہ بھی۔ سچ بولنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے۔"

"یہ تو عجیب بات ہے۔ آخر کیوں ڈرتا ہے وہ تم سے؟"

محمد خان نے مونچھوں کو تاؤ دیا: "اس لیے کہ میرا نام اشفاق خان

www.paksociety.com

ہے اور یہ تالا کھولنے کے لیے مجھے کتنی محنت کرنی پڑی یہ عام آدمی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں عام ڈاکو نہیں ہوں۔"

میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ "تم خاص ڈاکو ہو۔ تم نے کوئی کورس کیا ہے رہزنی کا . . . جیسے عام ڈاکٹر اسپیشلسٹ بن جاتے ہیں؟"

محمد خان زور سے ہنسا۔ "مثال اچھی دی تم نے لیکن میں اپنے کام کی نوعیت کو عام نہیں سمجھتا۔ عام ڈاکو بینک توڑتے ہیں، سیٹھوں کی تجوریاں لوٹتے ہیں اور نقد سونا چاندی، ہیرے جواہرات جو ملے چھین کر لے جاتے ہیں۔ یہ خطرناک کام ہے اور اس میں چانس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے ظاہری ٹھاٹ باٹ ایسے ہوں کہ وہ لکھ پتی یا کروڑ پتی لگتا ہو لیکن اندر سے کنگال ہو۔ یا کسی سیٹھ کی تجوری تو الماری سے بڑی ہو مگر اس میں سے ملیں ساٹھ تین روپے۔ سیٹھ بھی بڑے عیار ہو گئے ہیں اب تو سارا مال گاڑ دیتے ہیں کہیں کسی شمشان میں یا کسی مندر میں مہالکشمی کی مورتی کے نیچے تہ خانہ بنوا لیتے ہیں۔ مندر بھی اُن کا بنا ہوتا ہے اور پروہت درحقیقت خزانے کا محافظ ہوتا ہے۔ سر کی بودی، تلک اور جنیو کے باوجود کوئی سابق کمانڈو ہوتا ہے۔"

"مندر میں خزانہ محفوظ رہتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مندر پر تو ڈاکو بھی حملہ نہیں کرتے۔ نہ وہاں چور جاتے ہیں۔ بس ایک احساس ہوتا ہے کہ پاپ کریں تو بندے کے ساتھ اور بھگوان کے ساتھ ہی رہے۔ بھگوان کی مورتی کی ضرورت بھی تو پڑ جاتی ہے سب ہی کو۔"

مجھے ہنسی تک اس تصور پر بہت ہنسی آئی۔ "کیا سب سیٹھ ایسا کرتے ہیں؟"

"نہیں۔ یہ بات عام ہو جائے تو پھر ڈاکو بھی سمجھ جائیں گے کہ بھگوان کے نام پر اُن کو دھوکا دیا جا رہا ہے اور وہ بھگوان کے گھر میں بھی گھس جائیں گے۔" خان نے کہا۔ "بمبئی میں دو تین ہی ایسے عیار سیٹھ ہیں بھگوان کے۔ اُن میں ایک ترلوچنی ہے۔ اس نے دس لاکھ کے خرچ سے مہالکشمی کا مندر بنوایا۔ وہاں کے سب پنڈت پروہت خود اپنے اعتماد کے لوگ رکھے۔ ایک لاکھ روپیہ سالانہ دان دیتا ہے سب کے سامنے۔ مگر وہ واپس لوٹ کے ترلوچنی کے پاس ہی آتا ہے۔ گھی کہاں گیا؟ کھچڑی میں اور کھچڑی کہاں گئی؟ اپنے پیٹ میں۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو آمدنی کا دھندا بھی ہوگا اچھا خاصا۔"

"بالکل ہے۔ لوگ جو چڑھاوے لاتے ہیں، دان پن کرتے ہیں وہ بھگوان کو نہیں اُس کے بھگتوں کو پہنچتا ہے۔ ترلوچنی کی طرف سے اجازت ہے کہ جتنا مال جتنا کہ بنے آپس میں برابر بانٹ لیں۔ ایک اور سیٹھ نے ہنومان جی کا مندر بنوایا ہے۔ کبھی جا کے دیکھنا تو وہاں انسانوں سے زیادہ بندر رہتے ہیں۔ تیسرے سیٹھ کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ گنیش جی اور کالی ماتا کے جو مندروں میں پوجا پاٹھ کے لیے جاتا ہے وہ بھی کالے دھن کے خزانے ہیں یا واقعی اُسے عقیدت ہے؟"

"عجیب۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا تو تم کیا کرو گے؟"

"وہی جو میں نے ترلوچنی کے ساتھ دو بار کیا اور جس کی وجہ سے میں اپنے آپ کو عام ڈاکو نہیں کہتا۔" محمد خان [illegible] "بلڈنگ سے تنہا سے اٹھوا لیا۔ وہ رات کے وقت مندر کی سیڑھیوں پر سے آ رہا تھا کہ میرے آدمی اُسے گاڑی میں ڈال کے لے آئے۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ مہالکشمی کے مندر کی ساری حقیقت مجھے معلوم ہو چکی ہے اور میں نے یہ بات سرکار اور جنتا کو بتا دی تو تم پر بھگوان کی مار پہلے ہی ہے، پولیس کی مار الگ پڑے گی اور عقیدت مندوں کی الگ لیکن سب سے بڑی مار ہوگی پیسے کی۔ تمہاری ٹریژری حکومت صاف کر دے گی۔ سب سے بڑا چور تو خود حکومت ہے جو انکم ٹیکس، دولت ٹیکس، سپر ٹیکس اور درجنوں دوسرے ٹیکسوں کی صورت میں سب کچھ چھین لیتی ہے۔ تمہارا کالا دھن جائے گا سرکار کے خزانے میں اور تم جاؤ گے سرکار کی جیل میں۔ میرے ساتھ سودا نہیں کرو گے تو یہی ہوگا اور ممکن ہے کہ اتنا بڑا صدمہ تم جھیل نہ سکو۔ مجھے پچاس لاکھ دے کر محفوظ ہو جاؤ۔ دین اور دنیا کی خدمت کرتے رہو۔" اُس نے کہا کہ "تمہارا کیا ہے؟ سال چھ مہینے بعد مجھے پھر اٹھا لاؤ گے۔" تو میں نے کہا کہ "ایک تو میں مسلمان . . . پھر پٹھان اور مرد۔ قول دے کر میرے لیے پھرنا ایسا ہی ہے جیسے تم خود کہا۔ یا سگی بہن سے شادی کرنا۔ اب تم اعتبار کرتے ہو تو بتاؤ، نہیں کرتے تو کوئی بات نہیں، میں اپنے کمانڈو آج رات بھیج دیتا ہوں کہ مہالکشمی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں اور سونے کی ایک ایک اینٹ اور چاندی کی ایک ایک مورتی اٹھا لائیں۔ میں نے تو سنا ہے کہ مندر کا گھنٹا خالص سونے کا ہے اور اُس کا کلس بھی۔" بس اس کے بعد ترلوچنی مجبور ہو گیا۔ اُس نے پچاس لاکھ منگوا لیے اور میرے حوالے کر دیے۔ میں نے اُسے چالیس لاکھ واپس دیے اور کہا کہ اپنے پاس رکھے۔ جب ضرورت پڑے گی لے لوں گا۔ وہ بڑا حیران و پریشان واپس گیا۔ عقل مند ہوتا تو کسی سے بات نہ کرتا۔ دس لاکھ میں ساری زندگی کے لیے ایک ضمانت حاصل ہو گئی تھی لیکن اُس کا کوئی ساتھی پولیس کمشنر تھا جس کے سامنے اُس نے دس لاکھ لٹ جانے کا رونا پولیس کمشنر کے سامنے رویا اور جب پولیس حرکت میں آئی تو مجھے معلوم ہو گیا۔ مجھے کوئی کیسے پکڑ سکتا تھا۔ میں نے پھر ترلوچنی کو پکڑ لیا۔ دوسری بار میں اُس کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے میں ملا۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے ایک [illegible]

[illegible] میں اُس کے ساتھ صوفے پر جا بیٹھا۔ اُس وقت میں سوٹ میں تھا۔ مجھے پہچانتے ہی شراب اور آواز دونوں اُس کے حلق میں پھنس جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ میں نے کہا کہ "ترلوچنی، بڑی گڑبڑ بات ہے۔ وعدہ توڑا۔ میں نے چالیس لاکھ امانت رکھوائے تھے تمہارے پاس، اعتبار کیا تھا تم پر اور تم دس لاکھ کی شکایت لے کر پولیس کے پاس چلے گئے۔ اب مجھے بتاؤ کہ یہاں پولیس تمہاری کیا مدد کر سکتی ہے؟ میرا پستول اور تمہارے دل کو چھو رہا ہے۔ اس میں سائلنسر بھی لگا ہوا ہے۔ لوگ سمجھیں گے کہ تم زیادہ پی کے گر گئے۔ [illegible] زور سے ہنس رہا ہے۔ تمہاری آواز سن کر یقیناً کچھ لوگ آ جائیں گے مگر اتنی دیر میں محمد خان غائب ہو جائے گا۔ ایسی [illegible] کی امید نہیں تھی مجھے تم سے۔ کہ پچاس لاکھ میں دیتا ہے [illegible] منظور کر لو گے۔ تمہارے پاس تو کروڑوں ہیں، [illegible] تمہاری زندگی بہت قیمتی ہے ترلوچنی۔" اور اُس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ اُس کے بعد ہم دوستوں کی طرح باتیں کرتے رہے۔ مختلف وقتوں میں تین لاکھ لے چکا ہوں میں اُس سے۔ ایسا ہی معاملہ دوسرے سیٹھ کا ہے لیکن اُس نے کبھی وعدہ نہیں توڑا۔ بڑی عزت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اُس کے بچے مجھے ماما کہتے ہیں۔ پچھلے سال اُس کی بچی نے بی اے پاس کیا تھا اور باپ سے کار کے لیے ضد کر رہی تھی۔ باپ سالا ایک نمبر کا کنجوس ہے۔ کہہ رہا تھا کہ جہاں تیری سگائی ہوئی ہے اُن کے پاس کار ہے وہ تیری ہی ہوگی چند دن بعد۔ میں نے کہا کہ یار بچی کا دل توڑنا غلط بات ہے اور کار میں نے اُسے گفٹ کر دی۔ اُس کی سال بھر [illegible] ہے۔"

میں خود یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ عام ڈاکو اور خاص ڈاکو کا فرق میری عقل خبط کرنے کے لیے کافی تھا۔ "تم . . . اُسی کو لوٹتے رہے ہو اور ماما بنے ہو اُس کے بچوں کے۔ کار بھی تحفے میں دے ڈالی تم نے . . .؟"

وہ ہنسا۔ "بہت سے ماما تو ایسے خبیث ہوتے ہیں کہ تمام عمر لوٹتے ہیں اور دیتے کچھ نہیں . . . اب یہ تو ایک رشتہ قائم ہو گیا ہے۔"

"لوٹنے والے کا لٹنے والے سے رشتہ۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ترلوچنی کی بیوی کا جنم دن تھا تو میں نے ہیروں کا نیکلس دیا تھا تحفے میں۔ ہوگا شاید ایک لاکھ کا۔ ترلوچنی بڑا تلملایا۔ [illegible] مجھ سے لپٹ گئی سب کے سامنے اور کیا [illegible] سب کے سامنے مجھے کس کر کے کتنا شرمندہ کیا؟"

ترلوچنی نے قتل نہیں کیا اپنی بیوی کو؟"

خان ہنسا۔ "وہ ایک ایم ایل اے کی بہن ہے۔ اُس کا ایک بھائی بارڈر سیکیورٹی فورس میں میجر ہے۔ ترلوچنی کے باقی سالے بھی ایک سے ایک طرم خان ہیں۔ سب سالے حرامی ٹمبر ہیں۔ ترلوچنی اُن کے سامنے دم ہلاتا ہے مگر انہی سالوں کی مدد سے اُس نے مجھے اندر کروا دیا تھا۔ رات میں نے اُسے صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ میں جیل سے آ گیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے دوسری طرف اُس کی دھوتی گیلی ہو گئی ہوگی میری آواز سن کر۔"

"یہ دلاور کا ذکر کیسے آ گیا تمہاری گفتگو میں؟"

محمد خان نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ "خود اُس سالے ہی نے پوچھا تھا اُس سے کہ یہ چودھری دلاور کون ہے تمہارا باپ؟ میں تصور کر سکتا ہوں کہ اس سوال پر تو شاید دھوتی گیلی ہی ہو گئی ہوگی اُس کی۔ وہ اندر سے بہت بزدل آدمی ہے۔ دولت سے حاصل کی ہوئی طاقت پر اکڑتا ہے۔ غنڈے بدمعاش پال رکھے ہیں، اسلحہ اور بیوی کے خاندان کا اثر و رسوخ ہے ورنہ وہ خود کچھ نہیں۔ کہنے لگا کہ تم کیسے جانتے ہو چودھری دلاور کو؟ میں نے کہا: "میں تمہاری پچھلی سات نسلوں کو بھی جانتا ہوں اور آنے والی سات نسلوں کو بھی۔ جو سوال میں نے پوچھا ہے اُس کا جواب ہاں یا نہ میں دو۔" اُس نے اقرار کیا تو میں نے اُسے سمجھا دیا کہ دلاور سے اُس کے تعلقات خود اُس کے حق میں کتنے تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ "ترلوچنی! تم نے جو حرامی پن کیا تھا مجھے جیل پہنچا کے اُسے میں معاف کر سکتا ہوں اور ہمارے تعلقات اُسی کی بنیاد پر پہلے جیسے ہی رہیں گے لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے۔" جب اُس نے شرط پوچھی تو میں نے کہا کہ "ایک تو تم چودھری دلاور کا ساتھ چھوڑ دو کیونکہ اُس کے دشمن میرے دوست اور مہمان ہیں۔ ہم پٹھان جب کسی کو مہمان بنا لیں تو پھر اپنی روایات کے مطابق جان دے کر بھی اُس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔"

"تم نے ہم سب کے بارے میں بتا دیا؟ کہ تمہارے مہمان کتنے ہیں اور کون کون لوگ ہیں؟"

"نام تو نہیں لیا تھا میں نے کسی کا، مگر ظاہر ہے وہ سمجھ گیا ہوگا۔" ڈاکو محمد خان نے کہا۔ "ترلوچنی نے کہا کہ میرا دلاور سے صرف ایک کاروباری تعلق ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تعلق تمہیں مبارک، مگر اس کی وجہ سے کہیں میرے اور تمہارے تعلق میں گڑبڑ نہ ہو جائے۔ تمہارے مہمان نے میرے مہمانوں کو پریشان کیا تو پریشانی تمہیں بھی ہوگی۔ تم خود کو اس جنگ سے دور رکھو اور دلاور سے اپنی جان چھڑا لو۔ اُس نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا اور میں نے اُسے یاد دلایا کہ مہالکشمی کے مندر کی طرف ہم نے کبھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھا حالانکہ ہمارے اور اس کے معاہدے کو ایک سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے مگر اس

www.paksociety.com

نے جھوٹ بولا یا پھر دھوکا دینے کی کوشش کی تو مہا لکشمی جی اس کی مدد نہیں کر سکے گی۔"

"یہ اچھا حربہ ہاتھ آیا ہے تمھارے۔۔۔ اُس کو بلیک میل کرنے کا۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "لیکن فرض کرو وہ مندر والوں نے اپنا خزانہ کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا ہو؟"

محمد خان نے عادتاً مونچھ مروڑی۔ "خونی خان نے کبھی کچا کام نہیں کیا۔ جب تریویدی سے معاہدہ ہوا تھا تو ایک چھوٹی سی شرط یہ بھی شامل کی گئی تھی کہ میرا ایک پروہت بھی وہاں رہے گا جو کسی معاملے میں دخل نہیں دے گا لیکن مجھے پل پل کی خبر دے گا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ میرا وہ پروہت اس وقت بھی مندر میں موجود ہے۔ تریویدی جانتا ہے کہ میں جب چاہوں مندر کو لوٹ سکتا ہوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ معاہدے کی خلاف ورزی اُس کی طرف سے ہوئی تھی۔"

"جتنا عرصہ تم جیل میں رہے کیا تریویدی نے اس عرصے میں کوشش نہیں کی کہ مہا لکشمی کے مندر سے خزانہ منتقل کر دے؟"

"اُسے میرے ساتھیوں کی طرف سے پیغام مل گیا تھا کہ ہم سب دیکھ رہے ہیں۔ تم یہ خزانہ کہیں لے جاؤ یا پاتال میں رکھو، رہے گا ہماری نظر میں۔ رات کو جب میں نے اُسے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ تریویدی صاحب! السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ، تو اُس نے بڑی مشکل سے کہا تھا۔ خان صاحب! ایک ہندو کو مسلمان کبھی سلام نہیں کرتا، آداب کہتا ہے۔ میرا مخصوص سلام ایک کوڈ کا کام بھی کرتا ہے۔ اُس کی جان میں جان آ گئی ہو گی جب میں نے کہا تھا کہ تمھاری پچھلی وعدہ خلافی کو میں نے معاف کیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد میری شرط ایک حکم بن گئی۔ اُس نے فوراً ہی کہا کہ یہ چوہدری دلاور تمھارے ایک مہمان سکندر بخت سے ملنا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم پہلے اُس سے ملو۔"

میں چونک پڑا۔ "چوہدری دلاور سے ملوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کوئی چوہے سے کہے کہ بلی سے ملاقات کر لو اور بلی سے کہے کہ کتے سے مل لو۔۔۔"

محمد خان ہنس پڑا۔ "اگر بلی پنجرے میں ہو تو چوہے کو اُس سے ہینڈ شیک کرتے ہوئے ڈرنا نہیں چاہیے۔ ویسے۔۔۔ کیا تمھیں یاد ہے کہ تم نے مجھے چوہا کہا تھا۔ چوہے خان کا خطاب دیا تھا مجھے۔"

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ "پہلی ملاقات ہو تو غلط فہمی کی بنیاد پر بہت سی غلط باتیں بھی منہ سے نکل جاتی ہیں۔"

"تم دلاور سے یہاں ملو گے۔" محمد خان نے کہا۔ "یا کہیں اور ملنا پسند کرو گے؟"

میں نے کہا۔ "خان صاحب! آپ کی یہ بات مجھے ایک کہاوت یاد دلاتی ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ آپ میرٹھ جیل میں پچاس برس گزارنا پسند فرمائیں گے یا دہلی کی جیل میں۔ تو بتاؤ کیا جواب دے گا؟"

"یہ مثال اس لیے غلط ہے کہ جب خونی خان تمھارے ساتھ ہوگا، تمھارے میزبان کی حیثیت سے، تو کس مائی کے لال میں اتنی ہمت ہے کہ وہ تمھاری طرف غلط نگاہ سے دیکھ بھی سکے۔" ذرا کو محمد خان جلال میں آ گیا۔ "خدا کی قسم! اگر کوئی ہوتا تو ایسے ہی نہیں کہا ہے۔ میری بہن کے گھر جو آئے گا تو عزت سے آئے گا اور شرافت سے آئے گا۔ ورنہ اپنے پیروں پر چل کے نہیں جا سکے گا، کندھوں پر جائے گا۔ کیا تم اپنی بہن کے گھر میں یہ بات برداشت کر سکتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "مجھے موقع دو کہ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لوں۔"

"مشورہ ضرور کرو، لیکن ڈرو نہیں۔"

میں نے کہا۔ "فرض کرو میں تمھاری بات مان لیتا ہوں پھر تم کیا کرو گے؟ دلاور یا تریویدی سے رابطہ قائم کرو گے؟"

"ہاں، میں اُسے پھر فون کروں گا۔ تریویدی خود ملاقات کا بندوبست کرے گا۔ وہ خود دلاور کو سمجھا دے گا کہ اس کی پوزیشن کیا ہے۔ تریویدی مجبور ہے میری وجہ سے اور اُس کے پیچھے مجبور ہے اپنی آتما کی وجہ سے۔ میں نے تو صاف کہا تھا تریویدی سے کہ جو ہوا اُسے بھول جاؤ۔ میں نے اب تک تمھاری حفاظت کی۔ آئندہ تم میری حفاظت بھی کرو گے۔۔۔ اب کی بار کسی نے کچھ بھی ہاتھ ڈالا تو یہ سمجھ لینا کہ تمھاری بیوی اور سات بھائیوں کی بہن بیوہ ہو جائے گی۔ تم اپنی حفاظت کہاں تک کرو گے؟ کیا ہر جگہ ٹینک میں بیٹھ کے جاؤ گے؟ پھر بھی کہیں تو باہر آؤ گے۔۔۔ وہ بہت دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ اُس کا باپ بھی اب میری بات نہیں ٹال سکتا۔"

"اچھا تو پھر تم اپنی ذمے داری پر میری ملاقات کا بندوبست کرو لیکن پہلے اُس سے پوچھ تو لو کہ وہ کیوں ملنا چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میری بات کرا دو دلاور سے۔"

محمد خان نے کچھ سوچا اور پھر اقرار میں سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔ تم پہلے فون پہ بات کر لو۔"

"تمھیں یقین ہے نا کہ فون کال کے ذریعے کوئی ہمارا سراغ نہیں لگا سکتا؟" میں نے کہا۔

"تم کسی پر بھروسا کرنے کے عادی معلوم نہیں ہوتے۔" وہ بُرا مان کے بولا۔

میں نے کہا۔ "تمھارے اور ہمارے پیشے میں احتیاط کی بہت اہمیت ہے۔ میرے کہنے پر کوئی قدم اٹھانے سے پہلے تم بھی

دس بار سوچ لیتے ہو۔ ہر بار ایک پہلو پر نظر رکھنا اچھی بات ہے۔ اسے یہ جانتے ہیں ہر طرف روشن پہلو کو دیکھتے ہیں۔"

اُس نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے کی دیواریں سپاٹ تھیں۔ چھت سے فرش تک کسی بھی دیوار پر نہ پردے تھے اور نہ آرائش کے لیے کوئی تصویر لگائی گئی تھی۔ کمرے کے وسط میں ایک میز لگی ہوئی تھی جس پر ٹیلی فون کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس میز پر ایک ٹیلی فون سیٹ رکھا ہوا تھا اور ایک سیاہ رنگ کا چوکور ڈبا جو شاید ایک فٹ لمبا، اس سے آدھا چوڑا اور اونچا تھا۔ اس ڈبے سے نکلنے والے ایک تار کو دیوار پر نصب بورڈ میں پلگ کر دیا گیا تھا۔ ایک اور لمبا سا تار کھڑکی سے گزر کر کہیں باہر جا رہا تھا۔ اچانک لائٹ چلی گئی اور کمرا اندھیرے میں ڈوب گیا۔ محمد خان نے جھک کر ٹیبل کے نیچے کسی سوئچ پہ ہاتھ پھیرا اور کچھ مطمئن ہو کے سر ہلایا۔ پھر اُس نے باہر نکلنے والی کھڑکی سے جھانک کر دوبارہ سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ "خان صاحب! اس کا کیا مطلب ہے؟"

"تمھارے اور ہمارے پیشے میں احتیاط کی بہت اہمیت ہے۔" اُس نے میری بات دہراتے ہوئے کہا۔

"اس کمرے میں سامان کیوں نہیں ہے۔ کیا یہ بھی احتیاط میں شامل ہے؟"

"ہاں، ایک بار ایک غدار شامل ہو گیا تھا ہم میں۔ اُس نے ایک خفیہ مائیکروفون لگا دیا۔ ٹیلی فون ایکسچینج میں الگ ہر بات ریکارڈ ہوتی رہی۔ اس خفیہ مائیکروفون کے ذریعے اسی گھر میں ایک ٹیپ ریکارڈر پر الگ ریکارڈ ہو گئی۔ پہلے دو بار چھاپا پڑا تھا کہ پولیس نے شک کی بنیاد پر ٹیلی فون نمبروں کو آبزرویشن پر رکھا تھا۔ جب چھاپا مارا گیا تو وہاں ٹیلی فون کے سوا کچھ نہ ملا۔ ان کے پاس صرف ٹیلی فون تھا، اُسے کوئی کیسے پکڑتا۔ ایک شہر سے باہر تھا اور دوسرا ملک سے۔ جو شہر سے باہر تھا وہ لکھنؤ کے ایک اسپتال میں پڑا ہوا تھا اور بالآخر وہیں مر گیا۔ جو ملک سے باہر تھا وہ بھی پکڑا گیا ہوا تھا لیکن جب خفیہ مائیکروفون نصب ہوا تو معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔ چھاپا مار کے پولیس نے وہ ٹیپ ریکارڈر قبضے میں لے لیا جس میں کیسٹ لگا ہوا تھا اور وہ سب گفتگو بھری ہوئی تھی۔ ٹیلی فون ایکسچینج والا ٹیپ بھی ان کے پاس تھا لیکن اس میں میری آواز خاصی مختلف تھی۔ تاہم دونوں کے الفاظ بالکل یکساں تھے اور یہ ٹیپ میرے خلاف ایک مضبوط، ناقابل تردید اور واضح شہادت فراہم کرتے تھے۔"

"ٹیپ کی ہوئی گفتگو کو عدالت بطور ثبوت تسلیم نہیں کرتی۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے انھوں نے دہرا انتظام کیا تھا۔ ایک ٹیپ انھوں نے ٹیلی فون ایکسچینج سے حاصل کیا۔ دوسرا اُس جگہ ملا جہاں اُس زمانے میں میرا ٹھکانا تھا۔ دونوں کے ایک ہونے سے بہت کچھ ثابت کیا جا سکتا تھا۔"

میں نے کہا۔ "پھر کیا تمھیں سزا ہو گئی تھی؟"

خان ہنسا۔ "سزا اُس وقت ہوتی جب معاملہ عدالت تک جاتا۔ پہلے میں نے چھاپا مارنے والوں سے ٹیپ خرید لیے پھر ایکسچینج والوں سے۔ آٹھ دس لاکھ سے زیادہ خرچ کرنے پڑے مجھے لیکن ظاہر ہے آزادی کی قیمت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ تین لاکھ تو مجسٹریٹ نے لیے جو چھاپا مار پارٹی کے ساتھ آیا تھا۔ ایک لاکھ انسپکٹر نے اور پچاس پچاس ہزار ہر پولیس مین نے لیے۔ اسی تناسب سے ٹیلی فون ایکسچینج والوں نے بھی مانگا اور میں نے دیا۔"

"تمھیں اُس غدار کا پتا چلا جس نے یہ حرکت کی تھی؟"

"پھر وہ کیسے چھپا رہ سکتا تھا۔" محمد خان کے چہرے پر ایک بھیانک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "اس کی لاش میں نے بہت اچھی طرح پیک کرا کے گورنر کو بھجوا دی تھی۔ یہ تحفہ سنگاپور سے بھیجا گیا تھا اور گورنر کی بیوی کے لیے تھا۔ باہر سے یہ نظر آتا تھا کہ اندر بہت بڑا رنگین ٹی وی ہوگا۔ لاش کے ساتھ ایک سطر کا پیغام تھا کہ کیا تم اپنے شوہر کا پارسل اسی طرح وصول کرنا پسند کرو گی؟"

"یہ گورنر کی بیوی کا انتخاب کیوں کیا تھا تم نے؟"

"اُس نے اپنے شوہر کے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے بھائی کی جے پور سے بمبئی پوسٹنگ کرائی تھی۔ وہ پولیس کمشنر تھا۔ اور بڑا جوشیلا افسر تھا۔ اُس نے سوچا کہ بہنوئی گورنر ہے تو ڈر کیسا۔ اُس نے شہر کے چھوٹے بڑے بدمعاشوں کو پکڑنا شروع کیا۔ مقصد کچھ نہیں تھا سوائے اپنا بھتہ بڑھوانے کے۔ بھتہ ہر پولیس کمشنر کو ملتا ہے۔ اُس نے کہا کہ میں کوئی عام پولیس کمشنر نہیں ہوں۔ میں گورنر کا سالا ہوں۔ چنانچہ اُسے خاص بھتہ ملنے لگا۔ خاص شرح پر۔ بڑے بڑے سورما دب گئے اس سے اور بدقسمتی سے اُسی زمانے میں مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ میں نے ایک نئے آدمی کو گروہ میں شامل کر لیا۔"

"تم چھان بین اور اپنا اطمینان کیے بغیر بھرتی کر لیتے ہو؟"

"نہیں، نہیں۔ میں نے اُسے چھ مہینے ساتھ رکھا۔ ہر وقت اس پہ نگاہ رکھی۔ وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ گیا اور کبھی پیچھے نہیں رہا۔"

میں نے کہا۔ "اُسے لایا کون تھا؟"

"کوئی نہیں لایا تھا اُسے۔ ایک رات وہ میری جیپ سے ٹکرا کے زخمی ہو گیا۔ میں اُسے اپنے ساتھ لایا۔ یہ غلطی ہوئی مجھ سے کہ میں نے اُسے سرکاری اسپتال کے دروازے پر نہیں چھوڑا۔ جب وہ ہوش میں آیا اور اُس کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے، کہاں رہتا ہے اور اُس کے گھر اطلاع دینی

www.paksociety.com

ہو تو تم سے دی جاتی ہے۔ اُس نے رونا اور چلانا شروع کیا اور ڈاکو محمد خان کو گالیاں دینے لگا جس نے اُسے یتیم اور لاوارث کر دیا تھا۔ باپ اُس کی گولی سے مارا گیا تھا اور ماں نے بعد میں پاگل ہو کے خودکشی کر لی تھی۔ وہ اسی گھر میں آگ لگا کے جل مری تھی جس میں وہ سب رہتے تھے۔ قانونی طور پر شوہر کی چتا کے ساتھ جل کر مرنا اُس کے لیے ناممکن تھا۔ میں اُس کی بات سن کے حیران رہ گیا کیونکہ میں نے ایسی کوئی واردات نہیں کی تھی۔ کسی اور نے ڈاکا ڈالتے وقت میرا نام استعمال کیا تھا۔ جو کچھ اُس نوجوان نے بتایا تھا، لفظ بلفظ درست تھا۔ میں نے تصدیق کرا لی تھی۔ مجھے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ڈاکو جاتے وقت چلا چلا کے اعلان کر رہا تھا، 'خبردار جو کسی نے خونی خان کا نام لیا۔۔۔ میں خونی خان ہوں، خون پی جاؤں گا اُس کے سارے خاندان کا جس نے گواہی دی۔' لوگ بند دروازوں کے پیچھے دم سادھے سنتے رہے۔"

"وہ خونی خان نہیں تھا تو پھر کون تھا اور اُس نے تمھارا ہی نام کیوں لیا؟"

"میں جانتا ہوں وہ جنوبی ہندوستان کا ایک ڈاکو تھا جو مدراس کے علاقے سے بمبئی آ گیا تھا۔ اُسی نے مجھے خونی خان سے مشہور کیا، ورنہ مجھے کوئی جانتا تک نہیں تھا۔ اُس نے جہاں واردات کی یہی اعلان کیا۔ اس کے علاوہ اُس نے ہر جگہ بے گناہ لوگوں کو بھی مار دیا اور ایک جگہ تو اُس نے سب کے سامنے لاش کا تازہ بہتا ہوا خون پیا۔"

میں کچھ چکرا سا گیا۔ "کیا وہ آدم خور تھا؟ انسانی خون پی لیا اُس نے؟"

محمد خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "اُس نے صرف ڈراما کیا تھا۔ خوف زدہ منتشر ہجوم، چیختے ہوئے لوگوں میں کون غور سے دیکھ سکتا تھا کہ اُس نے واقعی خون پیا ہے یا صرف ہونٹوں کو خون سے لال کر لیا ہے۔ سب سے پہلے یہ ڈراما ایک پارسی کے گھر میں ہوا۔ پارسی کا خاصا بڑا خاندان تھا۔ چار جوان بیٹے تھے۔ اُن میں کوئی پولیس افسر بھی تھا لیکن وہ ڈیوٹی پر تھا۔ باقی گھر والوں میں سے بڑے بیٹے نے مزاحمت کی تھی اور بندوق تان لی تھی جس کا نتیجہ وہ مارا گیا۔ اُس ڈاکو نے زمین پر پڑی ہوئی لاش کے زخم سے خون ایسے پیا جیسے درندہ دریا سے پانی پیتا ہے۔ لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُس نے نیچے جھک کر منہ سے ایسی آوازیں نکالیں جن سے یقین آ جائے کہ وہ واقعی خون چوس رہا ہے اور پھر اپنے خون میں تھڑے ہوئے ہونٹ سب کو دکھا کے شک کی گنجائش ہی نہ چھوڑی۔ پارسی کی بیوی تو وہیں صدمے یا ہارٹ اٹیک سے مر گئی۔ اُس کی ایک لڑکی پاگل ہو گئی تھی، ہر وقت چلاتی رہتی تھی، کسی کو قریب نہ آنے دیتی تھی، کہتی تھی کہ تم خونی خان ہو، میرا خون پی جاؤ گے۔

اُس کے گھر والوں نے جو پاگل نہیں ہوئے تھے، یہی بیان دیا کہ ڈاکو محمد خان کوئی انسان نہیں بلکہ ایک خونی درندہ ہے جو تازہ انسانی خون پیتا ہے۔ یہ بات اخباروں میں آئی اور ایسی پھیلی کہ خونی خان کا ذکر کر کے عورتیں اپنے بچوں کو ڈرانے لگیں۔"

"مگر وہ تھا کون؟" میں نے محسوس کیا کہ میرے بدن پر خوف اور دہشت کی سنسنی خیزی سے ٹھنڈا پسینہ بہنے لگا ہے۔ "میں نے افریقہ کے جنگلی آدم خور قبائل کے بارے میں سنا ضرور تھا مگر یہ نہیں سنا تھا کہ مہذب دنیا کے کسی حصے میں کوئی انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اپنے ہم جنس کا خون پی سکے۔" محمد خان کی یہ بات بے بنیاد تھی مگر میں تصور میں ایک ڈاکو کے انسانی خون سے لتھڑے ہوئے لب دیکھ کر بھی لرزاں تھا۔

"مجھے آج تک نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کون تھا اور اُس نے مجھے ہی درندہ اور شیطان کیوں ثابت کیا؟"

"کیا تمھارے دشمن نہیں ہیں؟" میں نے طنز سے کہا۔

"دشمن بہت ہیں، مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ کون ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دشمنی میں آدمی قتل کر سکتا ہے۔ لاش کو بے حرمت کر سکتا ہے۔ بیوی بچوں سے انتقام لے سکتا ہے مگر یہ خون پینے والی بات مجھ سے منسوب کر کے کسی کو کیا ملا؟"

"محمد خان کسی اور کا نام بھی تو ہو سکتا ہے؟"

"یہ بھی معلوم کیا تھا میں نے، لیکن اُس ڈاکو کا تو مشن ہی یہ معلوم ہوتا تھا کہ صرف مجھے خونی خان مشہور کرے۔ اُس نے تین وارداتوں میں تازہ انسانی خون پینے کا ڈراما کیا۔ خون پی کے ڈکار بھی لی اور کہا کہ مزہ آ گیا۔ مجبور اور محصور دیکھنے والوں نے اخبارات اور پولیس کے سامنے یہ سب بتایا۔ اُس حرام زادے نے صرف اپنی دہشت قائم کی اُس علاقے میں میرے نام سے فائدہ اٹھا کے۔"

"کیا اُس کی صورت تم سے ملتی تھی؟"

"یہ کسی کو نہیں معلوم۔ دو آنکھیں، دو کان، ایک ناک تو تمھارے چہرے پر بھی ہیں۔ لوگوں کے ذہنوں میں صرف محمد خان کا نام رہ گیا۔ باقی تفصیل خود اُن کے ذہن نے فراہم کر دی اور میرا حلیہ لکھوا دیا۔ آخری حرکت اُس ڈاکو نے کی یا کسی اور نے، یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ اُسے جانے کے واردات پر اُتاری ہوئی ایک تصویر قرار دیا گیا۔ بیک وقت اخبارات کو اور پولیس کو میری ایک تصویر موصول ہوئی۔ یہ رنگین تصویر تھی جس میں میرے ہونٹوں پر خون لگا ہوا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ لال رنگ ہے اور ایک تصویر سے دوسری تصویر بنائی گئی ہے۔ مزید یہ کہ چہرہ ضرور میرا تھا لیکن باقی جسم میرا نہیں تھا۔ تصویر میں میرے ہاتھوں میں ایک کٹا ہوا سر دکھایا گیا تھا۔ میں نے سر کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور گردن سے ٹپکنے والا خون فرش پر گر رہا تھا۔ میرے ہاتھوں پر بھی یہی خون تھا اور ہونٹوں پر بھی۔ تصویر کیمرا ٹرک فوٹو گرافی کا شاہکار تھی۔ پولیس نے تو اس کو جعلی قرار دے کر نظر انداز کر دیا مگر جعلی ہو یا سنسنی پھیلانے کے اخبار بیچنے والوں کا۔ یہ چھپا تک تصویر اخبارات نے جو کچھ چھاپ دی۔ سوچو تم اس کا کیا اثر ہوا ہوگا۔ جب وہ تصویر دیکھی تو میرے دماغ پر اور اعصاب پر اس کا اثر کئی دن رہا۔ رنگین تصویر میں خون زیادہ دہشت ناک نظر آتا تھا۔ سنا ہے اس تصویر کو دیکھ کے عورتیں بے ہوش ہو گئیں اور کئی بچے نفسیاتی مریض ہو گئے۔ پھر حکومت نے اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔ اُس وقت تک وہ ڈاکو غائب ہو چکا تھا اور میں خونی خان کا لقب پا چکا تھا۔"

میں نے کہا۔ "تم نے کوئی کوشش نہیں کی تردید کی؟"

محمد خان ہنس پڑا۔ "ایک ڈاکو کے تردیدی بیان کو شائع کون کرتا اور یقین کون کرتا۔ پبلک کے سامنے میں جا نہیں سکتا تھا۔ ذرائع ابلاغ میں نے بہت سے اعلیٰ پولیس افسروں کو فون کر کے اپنی پوزیشن کی وضاحت کی مگر وہ پہلے ہی سے جانتے تھے کہ میں صرف محمد خان ہوں۔ خونی خان کون ہے؟ اس کی انھیں بھی تلاش تھی۔ اُن پر مرکزی حکومت کا دباؤ الگ تھا۔ پولیس اور پبلک تک سب چلا رہے تھے کہ آدمی کا خون پینے والے اس درندہ صفت شخص کو گرفتار کرو۔ وہ شخص اگر بمبئی میں رہتا تو کبھی نہ کبھی ضرور پکڑا جاتا۔ مجھ سے ڈاکو بھی ہمدردی رکھتے تھے۔ میری ڈاکو برادری کی گرفت مضبوط تھی۔ ذاتی دشمنی کو بھلا کے وہ بھی اُس ڈاکو کو تلاش کر رہے تھے جس نے مجھے درندے سے زیادہ قابلِ نفرت بنا دیا تھا۔ پولیس کے منشوں پر اُن دنوں میں بالکل روپوش رہا۔ ڈر یہ تھا کہ کسی نے پہچان لیا تو گرفتاری سے پہلے ہی لوگ میری تکا بوٹی کر دیں گے۔ وہ موذی کا بچہ جس طرح اچانک نمودار ہوا تھا ایسے ہی اچانک غائب ہو گیا۔ اُس نے آٹھ دس وارداتیں کی ہوں گی جس میں بیسیوں آدمی ہلاک ہوئے تھے لیکن تین بار اُس نے ناقابلِ اعتبار کمزور دل قسم کے چشم دید گواہوں کے سامنے خون پینے کا عمل ظاہر کیا تھا۔ آخری چیز وہ تصویر تھی جس کے بعد اکثریت کے لیے محمد خان کا نام خونی خان ہو گیا تھا۔ خیر یہ تو کئی سال پہلے کی بات ہے۔ تب تفصیل بتا رہا تھا اُس غدار کے بارے میں۔ اُس کا خاندان واقعی خونی خان کی بربریت کا شکار ہوا تھا۔ کمال کی بات یہ تھی کہ وہ محمد خان کو یعنی مجھے پہچانتا نہیں تھا مگر اس سے انتقام لینے کے جذبے میں پاگل ہو رہا تھا۔"

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا اُس نے تمھاری تصویر تک نہیں دیکھی تھی؟ تمھاری تصویر تو ہر جگہ ہو گی۔۔۔ خصوصاً وہ تصویر۔۔۔"

"بس اُس وقت میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی۔ وہ یقیناً مجھے پہچانتا تھا لیکن اپنی اداکاری سے اُس نے مجھے قائل کر لیا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ کچھ عرصہ پہلے مرکزی حکومت کی طرف سے اعلان ہوا تھا کہ مجھے زندہ یا مردہ پیش کرنے والے کو دس لاکھ روپے نقد انعام کے ساتھ جاگیر بھی دی جائے گی۔ وہ ذہین اور جرأت مند آدمی تھا اور اتفاق سے گورنر ہاؤس میں ملازم تھا۔ اُس نے گورنر کی بیوی سے بات کی۔ اُسے بتایا کہ وہ کون ہے۔ عورتیں زیادہ جذباتی ہوتی ہیں۔ اُس نے شوہر سے بات کی اور پھر اپنے بھائی سے۔ بھائی نے اُسے ایک اسکیم سمجھائی کہ ایک محمد خان ہے تو سہی مگر وہ تو عام ڈاکو بھی نہیں ہے۔ وہ انسانی خون پینے والا کوئی اور تھا مگر تم اپنی تسلی کرنا چاہو تو اُس کے گروہ میں شامل ہو کے دیکھ لو۔ چند وارداتوں کے بعد ہی تمھیں یقین آ جائے گا کہ محمد خان وہ خونی خان نہیں ہے جس نے تمھارے باپ کو مارا تھا۔ اُس نوجوان نے میری جیپ سے ٹکرا کے ڈراما شروع کیا اور مجھ سے وہی غلطی ہوئی جس کا میں نے پہلے ذکر کیا تھا۔ میں اُسے اپنے ساتھ لے آیا۔"

"اگر تم اُسے اپنے ساتھ نہ لاتے تو وہ کیا کرتا؟"

"معلوم نہیں کیا کرتا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ میرے گروہ میں شامل ہونے کی درخواست کرتا اور میں منظور کر لیتا۔" محمد خان بولا۔ "اُس نے وارداتوں میں میری مرضی سے حصہ لیا۔ میں خود زبان سے کچھ کہے بغیر اُسے قائل کرنا چاہتا تھا کہ میں خونی خان نہیں ہوں۔ میں کسی انسان کا خون پینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جب وہ قائل ہو جاتا تو میں اُسے بتا دیتا کہ مجھے کسی نے بدنام کرنے کے لیے ایک نام رکھا ہوا تھا اور وہ بھی صرف ظاہر کرتا تھا کہ خون پی رہا ہے۔ پیتا نہیں تھا لیکن اُس کی نوبت آنے سے پہلے ہی اُس کے دل میں دس لاکھ اور جاگیر کے لالچ نے گھر کر لیا۔ وہ انتقام کو بھول گیا یا شاید خود ہی سمجھ گیا کہ میں واقعی خونی خان نہیں ہوں۔ اُس نے چوری چھپے گورنر کی بیوی سے رابطہ قائم کیا کہ وہ مجھے گرفتار کرا سکتا ہے اور اُس کی بیوی نے پھر بھائی سے کہا ہو گا۔ بھائی انکار کیسے کرتا۔ اُس نے ٹالنے کے لیے مائیکروفون فراہم کر دیے۔"

"ٹالنے کے لیے کیوں؟ کیا پولیس کمشنر نہیں چاہتا تھا کہ تمھیں گرفتار کرے؟"

"سکندر صاحب! پولیس کو مجھ سے کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ مجھے پولیس سے۔ میں تو بمبئی جیسے سیٹھوں سے خراج وصول کرتا تھا اور حصہ پولیس کو بھی باقاعدگی سے پہنچاتا تھا۔ میں نے کبھی امن و امان کا مسئلہ پیدا نہیں کیا تھا اور بلاوجہ خون خرابا نہیں کیا۔ پانچ سات بڑی اسامیاں ہیں اپنے پاس، اُنھی سے بہت مل جاتا ہے۔ پولیس کمشنر کو کیا پڑی ہے کہ اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی کے لیے خطرہ مول لے۔ اُس نے تو مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا

www.paksociety.com

تھا کہ میرے خلاف مخبری ہو رہی ہے اور ممکن ہے چھاپا بھی پڑ جائے لیکن میں نے اس کی وارننگ کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ اُدھر گورنر نے یہ انتظام کیا تھا کہ چھاپا مار پارٹی دہلی سے آئے۔ اُسے مقامی پولیس پر بھروسا نہیں تھا۔ اسی لیے میرے اتنے پیسے خرچ ہوئے اور مجھے غدار کی لاش گورنر کی بیوی کو بھجوانی پڑی۔ اس کے بعد بھی کئی جعلی محمد خان ڈاکو پکڑے جا چکے ہیں۔ معلوم نہیں میری بدنامی سے کیوں فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں سب۔ میں چاہتا ہوں یہ نام پبلک بھول جائے مگر پھر ایک کسی خبر میں میرا نام آ جاتا ہے حالانکہ واردات کسی اور کی ہوتی ہے تم اجنبی تھے ورنہ خونی خان کا نام سن کر بے ہوش ہو جاتے خوف سے۔ میں نے اسی نام کی دہشت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔"

"تم جرم کی طرف کیسے گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"ایک گورنر کی وجہ سے جس کی بیوی کو میں نے ایک لاش کا تحفہ بھیج دیا تھا۔" محمد خان بولا۔ "اُس کی بیوی نیم پاگل ہو گئی تھی۔ اُس نے کھانا پینا سونا چھوڑ دیا تھا۔ اُس کی زبان پر ایک ہی رٹ تھی خونی خان کا سر لاؤ میرے سامنے۔ گورنر بھی بہت چراغ پا تھا۔ اُس نے پولیس کو نیچے سے اوپر تک ہلا کر رکھ دیا۔ وزارت داخلہ کا سیکرٹری اُس کا کزن تھا۔ اُس نے پولیس اور انتظامیہ کے سب اعلیٰ افسروں کو ٹرانسفر کرا دیا۔ اُن سے میرے اچھے مراسم تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ نئے لوگ مجھے جانتے نہیں تھے اور اُن پر بے پناہ دباؤ تھا۔ پولیس کا اصل مددگار مخبری کے نظام کا جال ہوتا ہے۔ اُن کی بیشتر کامیابیاں عقل و ذہانت کی مدد سے سراغرسانی کا نہیں کسی مخبر کی اطلاع کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ پس کسی نے مخبری کر دی۔ میں تو نکل گیا بچ کر وہ دولت سے لیکن اس بار پولیس نے یہ کمینگی کی کہ واپس جاتے ہوئے میری بیوی کو ساتھ لے گئے۔ اُن کا باپ بھی مجھے گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔ گرفتاری خود میں نے دی اس شرط پر کہ میری بیوی کو چھوڑ دیا جائے۔"

"تم صرف بیوی کی بات کر رہے ہو۔ بچے نہیں ہیں؟"

وہ مسکرایا۔ "بچے اپنے وقت پر ہوں گے۔ میری شادی کو چند دن ہی ہوئے تھے کہ میں پکڑا گیا۔"

"برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"ہم جیسے لوگ کسی کی بات کا برا نہیں مانتے۔ تم یہی پوچھو گے نا کہ وہ کون بدبخت تھی جس نے میری شریک حیات بننا قبول کر لیا؟"

میں نے کہا۔ "جوڑے تو قسمت آسمانوں پر بناتی ہے جن کو ملنا ہو تو ملے انھیں تقدیر کسی بہانے ملا دیتی ہے۔ صرف اس لیے تمہاری بیوی کو بدبخت نہیں کہہ سکتا کہ تم ڈاکو ہو تمہارا پیشہ خراب ہے لیکن تم خود اچھے آدمی ہو۔"

وہ ہنسا۔ "یہ تو وہی فلمی بات ہو گئی کہ نماز پڑھو اور چوری میرا پیشہ بھائی جب پیشہ ہی برا ہو تو آدمی اچھا کیسے ہوا؟"

میں نے کہا۔ "میں ایک حاجی صاحب کو جانتا ہوں۔ ریش مبارک سفید۔ نام بھی عبداللہ۔ اُس کا پیشہ بہت برا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ خود بھی مجسم برائی ہے۔ میں تم کو اُس کے مقابلے میں فرشتہ قرار دوں گا۔"

"میری بیوی بھی بس کمال کی چیز ہے۔ واقعی خدا نے اسے میرے جیسے شخص کے لیے بنایا تھا۔ مگر تم کیا پوچھنا چاہتے تھے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، پوچھنا مجھے یہ تھا کہ تم جیسے شخص کو شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ گھر تو زندگی کی گاڑی کا ایک اسٹیشن ہے بلکہ جنکشن ہے جہاں سے مستقبل کا سفر نئے وارثوں اور سہاروں کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ ایک ڈاکو گھر بسانے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ جب زندگی مسلسل فرار ہو تو ٹھہراؤ کی گنجائش نہیں نکلتی۔"

"تمہاری دل آزاری ہوئی۔ یہ میرا مقصد نہیں تھا۔ خود تم نے ابھی تک گھر نہیں بنایا کیونکہ تم سفر میں ہو۔ مگر اس امید کے ساتھ کہ ایک دن یہ سفر ضرور ختم ہو گا۔ کہاں؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ اس سفر کا اختتام ایک گھر کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے اور موت کی صورت میں بھی۔ لیکن تم گھر کیسے بساؤ گے؟ صرف کسی عورت کے ساتھ نکاح پڑھوا لینے سے تو گھر نہیں بنتا۔ کیا تم اس کی خاطر یہ پیشہ چھوڑ دو گے؟"

"میں نے ابھی سوچا نہیں۔" محمد خان بولا۔ "لیکن تم نے جو کچھ کہا وہ غلط نہیں ہے۔ اب میں پہلے کے مقابلے میں خود کو زیادہ مجبور اور کمزور محسوس کرتا ہوں۔ اکیلا تو میں کہیں بھی جا سکتا تھا اور مہینوں روپوش رہ سکتا تھا۔ اب مجھے اس کی فکر رہتی ہے۔ اور یہ بھی احساس رہتا ہے کہ کہیں پچھلی طرح اس کے ذریعے مجھے واپس جیل جانے پر مجبور نہ کر دیا جائے۔ میں نے اسے سب بتا دیا تھا اپنی زندگی کے بارے میں اور خطرات کے بارے میں مگر وہ پھر بھی نہیں مانی۔"

"جو عورت اتنی محبت کرتی ہے تم سے، وہ تم سے تمہارا پیشہ نہیں چھڑوا سکتی؟" میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا بجلی آ گئی۔

محمد خان نے کہا۔ "چلو تم بات کرو تریویدی سے۔"

"اُس سے میں کیا بات کروں گا۔۔۔ مجھے دلاور سے بات کرنی ہے۔"

محمد خان نے وائرلیس ریسیور پر ایک نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ "دلاور سے بھی تریویدی کی معرفت ہی بات ہو گی۔"

پھر اُس نے ایک بٹن دبا دیا۔ وائرلیس فون کا چھوٹا سا اسپیکر آن ہو گیا۔ اور میں دوسری طرف بجنے والی گھنٹی کی آواز صاف سننے لگا۔

"یس سر؟" کسی عورت نے اپنی نرم و ہموار آواز میں شائستگی اور مٹھاس بھر کے کہا۔ میں نے اُسے ایک اچھی سیکرٹری تسلیم کر لیا۔ اگر وہ تریویدی کی بیوی ہوتی تو اُس کے لہجے کا تیور خود بولتا۔

"مجھے تریویدی سے ملاؤ۔" محمد خان نے حکم دیتے ہوئے کہا۔

"آپ ہولڈ کریں، میں دیکھتی ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے وہ کہیں نہیں گیا ہے۔ اُس سے کہو کہ خان تم سے فوراً بات کرنا چاہتا ہے۔"

ریسیور پر ہاتھ رکھ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم نے دیکھا ہے اس عورت کو؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "کون ہے یہ؟ تریویدی کی سیکرٹری؟"

"کچھ بھی سمجھ لو۔" محمد خان بولا۔ "مگر دو دھاری تلوار ہے یہ اور تریویدی کی ایک طاقت۔ جو کام دولت یا دہشت کی طاقت سے نہ نکلتا ہو تو یہ تیسری طاقت کام آتی ہے۔"

"خان!" تریویدی کی آواز اسپیکر کی زبان سے نکلی۔

"ہاں، تمہارا نیا یار کہاں ہے؟" محمد خان نے کہا۔

تریویدی نے انجان بننے کی کوشش کی۔ "کون نیا یار؟"

"جس سے تم کوئی کاروباری معاہدہ کرنے کی سوچ رہے ہو۔ اگر تم نے ابھی تک معاہدہ نہیں کیا ہے تریویدی! تو اس ارادے سے باز آ جاؤ۔ تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے؟"

"مگر کاروبار کو پھیلانے اور نئے معاہدے کرنے میں کون سی غلط بات ہے؟" تریویدی نے کہا۔

"غلط بات نہ ہوتی تو میں تم کو منع کیوں کرتا۔ پہلے کبھی میں نے تمہیں منع کیا ہے کسی کام سے؟ تمہارے سب کاروبار میرے سامنے ہیں تریویدی۔" محمد خان بولا۔

"تم کو میرے کاروباری معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔" تریویدی نے بے باکی سے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اچھی طرح سوچ لو۔ میں تمہارا حاکم نہیں، مشورہ دے سکتا ہوں۔ دلاور جو کچھ کر رہا ہے اُسے کاروبار مت سمجھو، وہ سیاست کر رہا ہے۔ دہشت گردی اور تخریب کاری کی سیاست۔ اس آگ سے اپنا دامن بچاؤ تریویدی! ورنہ اس کی لپیٹ میں تم بھی آ جاؤ گے۔"

"کیا تم دھمکی دے رہے ہو مجھے؟ ایسا لگتا ہے کہ تم پر اُن لوگوں کا جادو چل گیا ہے۔ تم کسی کی زبان بول رہے ہو۔"

"میرے منہ میں اپنی زبان ہے اور خونی خان پر کسی کا دباؤ نہیں چلتا۔" محمد خان برہم ہو کے بولا۔ "دلاور نے تمہیں تصویر کا ایک ہی رخ دکھایا ہو گا کہ اس کا ساتھ دینے میں کتنا فائدہ ہے۔ یہ اُس نے تمہیں نہیں بتایا ہو گا کہ تمہیں نقصان کیا ہو سکتا ہے اور اس طرح کس قسم کے لوگ تمہارے دشمن ہو جائیں گے۔ خیر تم فیصلہ کر ہی چکے ہو تو ٹھیک ہے۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ میرے اور تمہارے درمیان براہ راست دشمنی نہ ہو۔ ہم دونوں کو اسی شہر میں رہنا ہے۔"

"اس وقت کیوں فون کیا تھا؟"

"دلاور سے بات کرنی تھی۔" محمد خان نے کہا۔

"تم بات کرو گے؟" تریویدی نے عیاری سے کہا۔

"نہیں، اُن سے میرے مہمان بات کریں گے۔" محمد خان نے اس عیاری کا جواب بہت ہوشیاری سے دیا۔ "یہ بات تم بھی ذہن میں رکھنا اور اپنے دوست کو بھی سمجھا دینا کہ ہم پٹھان لوگ اپنے مہمانوں کے معاملے میں سخت جذباتی ہوتے ہیں اور مہمانوں کی جان و مال کی حفاظت آج بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بیسویں صدی ہے اور یہ بمبئی شہر ہے۔ لیکن ہماری رگوں میں دوڑنے والا خون وہی ہے جو ہمارے آباؤ اجداد کا تھا۔ نہ یہ خون سرد پڑا ہے اور نہ سفید ہوا ہے۔"

"چونکہ دلاور تو اس وقت نہیں ہے خان۔۔۔" تریویدی نے خان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کہاں گیا ہے؟"

"مجھے بتا کے نہیں گیا اس لیے میں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کب واپس آئے گا۔" تریویدی نے کہا۔ "تمہارے مہمان تو تمہارے ساتھ ہی ہیں نا۔ مجھے فون نمبر دے دو اپنا۔۔۔"

میں نے انگلی کے اشارے سے محمد خان کو انکار کرنے کے لیے کہا۔

"وہ لوگ یہاں نہیں ہیں۔" محمد خان نے میری بات سمجھتے ہوئے کہا۔ "کیا اُن کا پتا اور فون نمبر دے دوں؟"

"خان! ایک حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ تم کب سے مجھے بلیک میل کر رہے ہو۔ میری مجبوری سے فائدہ اٹھا رہے ہو۔ میں کمزور نہیں ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جنگ کی صورت میں دونوں کا بہت نقصان ہے۔ اسی لیے میں نے تمہارا مقابلہ کرنے سے ہمیشہ گریز کیا لیکن اب تم میرے حوصلے کو آزما رہے ہو۔ تم نے ایسے لوگوں کو اپنے مہمان کا درجہ دے دیا ہے جو میری بیٹی کے قاتل ہیں۔"

"جھوٹ مت بولو تریویدی۔ تمہاری بیٹی کو قتل کرنے والے تو تمہارے اپنے آدمی تھے۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد تریویدی نے کہا۔ "یہ بھی سکندر نے ہی بتایا ہو گا تمہیں؟ اور کیا بتایا ہے؟"

www.paksociety.com

"اور یہ بتاؤ کہ وہ تمہاری بیٹی کو بردہ فروشوں کے چنگل سے چھڑا لایا تھا۔ اُس نے احسان کیا تھا تم پر، مگر تم احسان فراموش ہو۔ تم نے اُسے قتل کرانے کی کوشش کی۔۔۔"

"خان!" تریوشی مشتعل ہو کر بولا۔ "میری بیٹی اُس کو بچانے کی کوشش میں ماری گئی تھی۔ میں اسی کو قصور وار سمجھتا ہوں اپنی بیٹی کی موت کا۔ وہ بیچاری پاگل نفسیاتی مریض تھی۔ سکندر نے اُس کو پریم جال میں پھنسا لیا۔"

"پریم جال!" محمد خان طنز سے ہنسا۔ "اس بمبئی شہر میں یہ لفظ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور تمہاری بیٹی کے معاملے میں تو یہ لفظ بہت بدنام تھا۔ کون نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک جنسی جنونی تھی جس کے جسم کی آگ کبھی سرد نہیں پڑتی تھی۔ نت نئے دن رات بے جگہ ہر وقت نئے تجربات کرنے کی رسوا کن بیماری تھی۔۔۔"

"چھوڑو یہ بات کہ کملا کو کیا بیماری تھی۔ وہ کیسی بھی تھی میری بیٹی تھی۔" تریوشی چیخ کر بولا۔ "اور تمہارے اس سکندر اعظم کی اولاد نے تو میرا اتنا نقصان کیا ہے کہ میں اُسے معاف نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ سے میرے کتنے آدمی مارے گئے۔ وہ سب بڑے وفادار اور بہت کام کے لوگ تھے۔ تم میرے کسی دشمن کو پناہ دو گے تو یہ انتہا ہو گی خان! میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ تمہارا مہمان ہے تو ہوا کرے۔ میں اُسے چھوڑوں گا نہیں۔"

"تم بھی اچھی طرح سمجھ لو تریوشی! کہ میرا نام خونی خان ہے۔ میرے کسی مہمان پر آنچ آئی تو میں بھی تم کو نہیں چھوڑوں گا۔ میں تمہارے اعلانِ جنگ کے جواب میں خیر سگالی کے جذبات کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ یہ بمبئی شہر جہاں تمہاری بدمعاشی کا راج ہے کہاں کہاں تمہارے جوئے خانے، شراب خانے اور قحبہ خانے ہیں۔ مندر میں اور باتھ شالا میں۔ وہ مشہور آشرم اور ان آشرم میں کون کون سی بلڈنگ تمہاری ہے اور تمہارے کالے دھندے کا پیسہ کہاں لگا ہوا ہے۔ یہ سب میں بھی جانتا ہوں۔ اسی شہر میں جہاں تمہارے نام کی دہشت سے بڑے بڑے لوگ کانپتے ہیں، میں تم کو اور تمہارے حکم کے غلاموں کو کتے کی موت مار سکتا ہوں۔ ایسے کہ سارا زمانہ تماشا دیکھے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں کیونکہ تمہارا جو کچھ ہے میرے سامنے ہے۔ تم خود چھپ سکتے ہو نہ کچھ چھپا سکتے ہو جب کہ میں کسی کے سامنے نہیں ہوں اور آؤں گا بھی نہیں۔"

یکلخت تریوشی کا لہجہ بدل گیا۔ "خان۔۔۔ کیا فائدہ آپس میں لڑنے کا۔"

"لڑنے کی دھمکی تم نے دی تھی۔"

"چلو میں وہ دھمکی واپس لیتا ہوں۔" تریوشی ڈر گیا تھا۔ "ہم آپس میں معاہدہ کر لیتے ہیں۔ میں دلاور کا ساتھ چھوڑ دیتا ہوں۔ تم اُن کا ساتھ چھوڑ دو جو میرے دشمن ہیں۔"

"تریوشی! پہلی بات تو یہ کہ دلاور میرا دشمن نہیں ہے ورنہ میں کہتا کہ چلو ٹھیک ہے۔ تم میرے دشمن سے قطع تعلق کر لو تو میں تمہارے دشمن کی حمایت سے دستبردار ہو جاؤں گا لیکن یہ ذرا مختلف صورتِ حال ہے۔ دلاور تمہارا مہمان نہیں محض بزنس پارٹنر ہے۔ اس کے برعکس سکندر اور اُس کے ساتھی میرے مہمان ہیں۔ کاروبار میں شریک نہیں ہیں۔ دلاور نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا مگر مجھ پر سکندر کے احسان کا قرض بھی ہے۔ اس لیے یہ بات بھول جاؤ کہ میں کسی لالچ یا خوف کے باعث اپنے مہمانوں سے کنارہ کشی اختیار کر لوں گا۔ تم دلاور کے مددگار رہو تو میں ان کے ساتھ ہوں۔ آئندہ کیا ہو گا، یہ دیکھا جائے گا۔"

جب خان نے ریسیور رکھا تو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ سخت طیش میں تھا۔ اُس نے تریوشی سے جو گفتگو کی تھی وہ مہذب لب و لہجے میں نہیں کی تھی۔ دونوں طرف سے حسبِ ضرورت گالیاں بھی فراخدلی سے دی گئی تھیں اور دھمکی دینے کا انداز بھی ایسا شریفانہ نہیں تھا۔ یہ اُن کے اصل الفاظ میں ہونے والی گفتگو کا متن تھا جو میں نے پیش کیا۔ ایک ڈاکو اور ایک بدمعاش کیسے بات کرتے ہیں یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

میں نے خان کے کندھے پر تھپکی دے کر کہا۔ "تم واقعی بہادر ہو اور مہمان نوازی میں ایک وضعدار پٹھان۔ لیکن ہماری وجہ سے اپنے لیے مشکلات پیدا مت کرو۔ ہمارا تم پر کوئی احسان نہیں ہے۔"

خان نے تریوشی کو چند اور ناقابلِ اشاعت گالیاں دینے کے بعد کہا۔ "تم اسے جانتے نہیں یہ صرف گیدڑ بھبکیاں ہیں۔ لیکن میں اب یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ کہیں یہ تریوشی کی چال نہ ہو۔"

"کیسی چال؟"

"یہی۔۔۔ کہ دلاور تم سے ملنا چاہتا ہے۔ اس طرح وہ خود تمہارے خلاف کوئی شیطانی سازش کر رہا ہو۔"

"ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں خان! وہ دلاور ہو یا تریوشی اس کے کام آیا ہے کوئی تو نہیں بچتا۔ ہم ایسے لوگوں سے نمٹنا جانتے ہیں۔ وہ دشمن تو بہت آسانی سے شکست کھا جاتا ہے جو اپنے عزائم کا پہلے سے ڈھنڈورا پیٹنے لگے۔ دلاور جیسا شاطر دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے جو اپنی ظاہری چال کچھ اور رکھتا ہے لیکن اُس کے ذہن میں بالکل مختلف حکمتِ عملی ہوتی ہے۔ مانو تو میں تمہیں بھی ایک مشورہ دوں، بالکل مفت۔"

خان نے سر ہلایا۔ "مانوں تو تم بھی برا مت ماننا۔"

میں نے کہا۔ "تریوشی جیسے دشمن کو طاقت سے نہیں سیاست سے زیر کرنا چاہیے۔ اس سے کیا فائدہ کہ فون پر تم اُسے گالیاں دو اور وہ تمہیں۔ سب تم دھمکی دے کر اپنی طاقت سے آگے بڑھائے

کی کوشش کرو اور وہ تمہیں ڈرائے۔ نہیں یہ کرنا ہے سوچ سمجھ کے عقل سے کام لے کر خاموشی سے کرو۔ کیونکہ عقل ہمیشہ بھینس سے بڑی تھی، ہے اور رہے گی۔ آدمی کی اصل طاقت اُس کی عقل ہے۔ تمہیں اپنے جذبات پر اتنا کنٹرول ہونا چاہیے کہ دشمن تمہارے سامنے آئے تو دھوکا کھا جائے۔ تمہارے لبوں پر مسکراہٹ ہو اور تم اُسے گولی مار دو۔"

خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "معاف کرنا دوست! میرے نزدیک یہ منافقت ہے۔"

"یہ جنگی حکمتِ عملی ہے کہ جیسا دشمن ہو اُس کے ساتھ ویسا ہی طرزِ عمل رکھو۔ کیا تریوشی کوئی با اصول اور شریف دشمن ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ تو ہندو ہے سکندر! سدا کا مکار اور دھوکے باز۔ لیکن میں پٹھان ہوں۔ ہم پٹھان دشمن کو بھی للکار کے مارتے ہیں۔ دھوکے سے اس کی پیٹھ پہ وار نہیں کر سکتے۔ دوست ہیں کے دغا دینا ہماری فطرت کے خلاف ہے۔"

میں حیرت سے اُس کی صورت دیکھتا رہا۔ پیشے کے اعتبار سے ڈاکو تھا لیکن اُس نے اپنی فطرت کو حالات کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دینے دیا تھا۔ میرے نزدیک یہ بے وقوفی تھی۔ اُس کے نزدیک وضعداری۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرنا بے کار تھا۔ میں نے کوشش نہیں کی۔

"اب دلاور سے رابطہ کیسے ہو گا؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"رات گئے یا رات کے وقت پھر فون کر کے دیکھیں گے۔"

میں نے کہا۔ "میں ایک غیر ملکی کال کر سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں۔ جب ٹیلی فون ہے تو ساری دنیا میں بات کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "اس کے لیے کال بک کرانی پڑے گی؟"

"ہاں۔ اور سپیشل کال کی بکنگ ہو جاتی ہے۔" خان نے کہا۔ "مگر کال بک کرنے والے کو بھی اپنا نمبر دینا پڑتا ہے اور وہ بھی جہاں بات کرنی ہو۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"تم کہاں اور کس سے بات کرنا چاہتے ہو آخر؟ اگر نام بتانا نہیں چاہتے تو مت بتاؤ لیکن نمبر تو دونوں ہی دینے پڑیں گے ورنہ کال کیسے ملے گی؟" خان نے کہا۔

میرے ذہن میں ایک نام عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کا تھا۔ جس سے رابطہ قائم کر کے میں لاہور کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کر سکتا تھا کہ وہاں معاملات کس نہج پہ جا رہے ہیں اور سب کی خیریت دریافت کر سکتا تھا۔ سب میں شہلا اور اس کا بیٹا، مسز رضوی اور اُن کے بچے وغیرہ شامل تھے۔ اُس سے یہ بھی پوچھا جا سکتا تھا کہ کراچی سے اکرم شیخ نے رابطہ قائم کیا ہے یا نہیں۔ دراصل

اُس نے یقیناً قائم کیا ہو گا۔ ہم سب کے لیے منظر کے گھر کا فون نمبر ایک ٹیلی فون کیس جیسا تھا جیسے مسز رضوی کے اسکول کا نمبر بھی یاد تھا لیکن انھیں فون کرنا اچھے ہی لیے اور اُن کے لیے جذباتی مسائل پیدا کرنے کے مترادف ہوتا۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ بڑی محنت سے اسکول چلا کے عزت و آبرو کے ساتھ بچوں کی پرورش کر رہی تھیں اور یہی نہیں، وہ شہلا اور اُس کے بچے کی حفاظت کی ذمے داری بھی قبول کیے ہوئے تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ راہِ فرض کی راہ میں اُن کے لیے ہمارے دشمنوں کی طرف سے کتنے خطرات لاحق ہوں گے۔ انھوں نے خود غرضی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا ورنہ وہ کہہ سکتی تھیں کہ اب میں اکیلی ہوں اور شہلا کی وجہ سے میری اور میرے بچوں کی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اسے کہیں اور لے جاؤ۔ آخر منظر بھی تمہارا دوست ہے۔ اُس کے گھر میں رکھوا دو کہیں اور۔ وہ مگر یوں تاؤں سے اُن کے دل میں ہمارے لیے وہی جذبات تھے جو اپنے بچوں کے لیے تھے۔ برے وقت میں اُن کے شوہر انکل رضوی نے جہاں تک ممکن ہو سکا تھا ہماری حفاظت کی تھی لیکن جب اُن کے انتقال کے بعد مسز رضوی پر برا وقت آیا تو ہم نے ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ الٹا ہم نے شہلا کو اُن کی ذمے داری بنا دیا۔ شہلا کے لیے وہ گھر میکہ بن گیا تھا جہاں وہ مجبوراً سینے پہ صبر کی چٹان رکھے اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اصل آزمائش اُس کے حوصلے کی تھی جو سب سے بچھڑ کے پیچھے رہ گئی تھی جس کے ساتھ صرف اندیشے تھے، وسوسے تھے اور خواب تھے جن کی تعبیر پہ اُس کا اختیار نہ تھا۔

"تم کس سوچ میں پڑ گئے؟" خان نے کہا۔

میں نے چونک کر کہا۔ "سوچ میرے پیچھے پڑ جاتی ہے خان صاحب! میں کیا کروں۔"

"تم فون کرنا چاہتے تھے کس کو؟"

میں نے اُسے منظر کے گھر کا فون نمبر دیا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں مسز رضوی یا شہلا کے جذباتی ردِعمل کا مقابلہ کر سکوں چنانچہ میں نے منظر سے ہی اُن کی خیریت دریافت کر لینا بہتر سمجھا۔

"ایسے کب تک کھڑے رہو گے؟" خان نے ٹیبل پہ پاؤں لٹکا کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اور سپیشل کال ملنے میں کچھ وقت لگے گا۔"

میں نے کہا۔ "میں ذرا اُن سب کو دیکھ آؤں بہت دیر سے غائب ہوں میں۔"

میں اس کمرے سے نکلا تو بھول گیا کہ مجھے کس کمرے میں جانا تھا۔ سب کمرے ایک سے تھے اور کسی دروازے پہ پہچان کے لیے بھی کوئی نشانی نہ تھی۔ اس عمارت میں جانے والے یقیناً جانتے ہوں گے کہ دائیں ہاتھ پہ تیسرا دروازہ کس کمرے کا ہے اور چوتھا کس کا۔ مگر میں نو وارد تھا۔ اپنے اندازے کے مطابق میں نے

www.paksociety.com

ایک دروازے کا ہینڈل گھمایا اور اندر داخل ہو گیا۔ لیکن یہ وہ کمرا نہیں تھا جس میں غالب اور محسن کو رکھا گیا تھا۔ یہ ایک اسلحہ خانہ تھا جس میں ہر قسم کا جدید اور خطرناک ترین اسلحہ یوں ڈھیر ہوا پڑا تھا کہ کمرا کباڑی کی دکان لگتا تھا۔ کونوں میں آٹومیٹک رائفلوں کے ساتھ مشین گنوں کو دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ انھی دیواروں پر کیلوں کے ساتھ ریوالور اور میگزین لٹکے ہوئے تھے۔ نیچے فرش پر دستی بم اور دیسی ساخت کے کارتوس بکھرے ہوئے تھے۔

ایک عام آدمی ان چیزوں کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا اور وہاں سے بھاگ جاتا لیکن ایک مدت سے اپنا تو کاروبار شوق بھی یہی اسلحہ تھا۔ میں نے دروازہ بند کر کے لائٹ جلائی اور اسلحہ خانے کا غور سے معائنہ کیا۔ پہلے جو میرا شک تھا وہ یقین میں بدل گیا۔ میں نے مشین گنوں اور دستی بموں پر وہ مارکنگ دیکھ لی جو بڑی مہارت سے کھرچنے کے باوجود نظر آ رہی تھی۔ میرا آٹومیٹک رائفل اور ریوالور پہ سے ان نشانات کو رگڑ کر مٹایا گیا تھا لیکن میں نے کسی دشواری کے بغیر مخصوص شناخت رکھنے والے تمام اسلحے کو پہچان لیا۔ یہ وہی غیر ملکی اسلحہ تھا جو چوہدری ولا اور اینڈ کمپنی جیسے غدار اور ضمیر فروش باہر کے آقاؤں سے لے کر بھارت کے راستے مشرقی پاکستان پہنچا رہے تھے اور اس خدمت کے معاوضے سے اپنی تجوریاں بھر رہے تھے۔

وہاں زیادہ دیر رکنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ معلوم نہیں وہ دروازہ کسی نے کیوں کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ڈاکوؤں کے اڈے پر اسلحے کی موجودگی کوئی غیر متوقع بات نہیں کہی جا سکتی لیکن اسلحہ یوں کھلا نہیں چھوڑا جاتا کہ کسی کا جی چاہے لے جائے اور چھاپا پڑ جانے کے امکان کو بہر حال نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ حیرانی مجھے اس بات پر زیادہ تھی کہ یہ اسلحہ جو مخصوص سازشی مقاصد کے تحت مشرقی پاکستان کے تخریب کاروں کو اور علیحدگی پسندوں کو فراہم کیا جاتا تھا وہ ان ڈاکوؤں کے ہاتھ کیسے لگا؟ میرے ذہن میں اس سوال کے دو ہی جواب آتے تھے یا تو ڈاکوؤں نے چوہدری ولا اور اینڈ کمپنی کے کسی ٹھکانے کو لوٹا یا کسی درمیانی ایجنٹ کو لوٹا تھا جہاں یہ اسلحہ موجود تھا۔ دوسرا جواب زیادہ قرین قیاس لگتا تھا کہ مشرقی پاکستان جانے والے مال کا کچھ حصہ خورد برد ہوا اور یہ مال بلیک میں مجرموں کے ہاتھ فروخت ہوا۔ جیسی ہماری ہر چیز بلیک میں مل جاتی ہے۔ اسلحہ سب سے کم یاب چیز ہے۔ اس کی قیمت بھی اسی حساب سے زیادہ ملتی ہوگی۔ میں نے مناسب وقت پر یہ سوال خود محمد خان سے پوچھنے کا فیصلہ کیا۔

غالب اور محسن کو آرام کے لیے خود ڈاکٹر نے سونے کی دوا دے دی تھی مگر اسی کمرے میں ایک صوفے پر نازو اور دوسرے پر گل بھی سوئی پڑی تھیں۔ ڈاکٹر اس وقت موجود نہیں تھا۔ نرس کرسی پر اونگھ رہی تھی۔ وہاں اس کے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا لیکن وہ ڈیوٹی پر موجود رہنے کی پابند تھی۔

میں نے اشارے سے رابعہ کو بلا لیا اور وہ دبے پاؤں باہر آ گئی۔ "اتنی دیر سے کہاں غائب تھے؟" رابعہ نے کہا۔

"غائب ہوتے ہیں جن بھوت۔" میں نے کہا۔ "میں اس عمارت کے اندر اور غالباً تمہارے خیالوں میں بھی موجود تھا۔"

"غلط، میں شہلا کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" رابعہ نے کہا۔

"کیا تم شہلا سے بات کرو گی؟" میں نے چلتے ہوئے کہا۔

"شہلا سے بات ہو سکتی ہے... کیسے؟" رابعہ نے حیرانی کے لہجے میں کہا۔

"ٹیلی فون کے ذریعے اور کیسے؟"

"ٹیلی فون ہے یہاں؟... پھر تو میں ضرور بات کروں گی۔ میں اسے کہوں گی کہ فوراً آ جائے۔" رابعہ نے جوش کے ساتھ کہا۔

"ایسی بے وقوفی مت کرنا۔"

"بے وقوفی کی کیا بات ہے؟ ابھی تو اس کے آنے سے محسن کی حالت سنبھل جائے گی۔" رابعہ نے کہا۔

"لیکن خود شہلا کی حالت کیا ہوگی یہاں آ کے۔ یہ مت بھولو کہ اس کا ایک بچہ بھی ہے۔ وہ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی اور بچے کو چھوڑ کر بھی نہیں آ سکتی۔ وہ صبر و سکون کے ساتھ جدائی کے صدمے سہنے کی عادی ہو گئی ہے۔ اسے مضطرب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"یہ بہت ظلم ہے اس کے ساتھ۔"

"بعض اوقات ظلم کرنا بھی پڑتا ہے اور سہنا بھی پڑتا ہے کیونکہ مصلحت کے تقاضے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کم از کم میں تو ہمت نہیں اس سے بات کرنے کی۔ وہ کہے گی کہ محسن کو بلاؤ۔"

"محسن کیسے بات کر سکتا ہے۔" رابعہ نے اداسی سے کہا۔

"اسی لیے میں نے رسک نہیں لیا۔ اگر ہم شہلا سے کہتے کہ محسن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ سو رہا ہے، تو کیا وہ مانتی؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ عام حالات میں شہلا سے فون پر بات کرنے کا موقع ملے تو محسن سوتا رہے؟ وہ خدانخواستہ بستر مرگ پر بھی ہوگا تو شہلا کے نام پر کھڑا ہو جائے گا۔"

رابعہ نے تائید کے انداز میں سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر اس کی بات محسن سے نہ ہوئی تو وہ نہ جانے کیا سمجھے گی۔ بہت کچھ فرض کرے گی۔ جب آدمی اکیلا ہو اور سب سے دور ہو تو اس کے دل میں صرف برے خیال ہی آتے ہیں۔"

"محمد خان صاحب کوشش کر رہے ہیں کہ منظر کا نمبر مل جائے۔"

"منظر بتا دے گا سب کے بارے میں۔" رابعہ نے کہا۔ "وہ خیریت کی اطلاع بھی دوسروں تک پہنچا دے گا۔"

میں نے کہا۔ "محسن کو معلوم ہی نہیں ہونا چاہیے کہ ہم نے فون پر

کس سے بات کی ہے۔"

"تم نازو کو منع کر دینا۔ وہ تمہاری بھی نہ بتائے کہ اس عمارت میں ایک فون ہے جو استعمال ہو سکتا ہے ورنہ ممکن ہے محسن اصرار کرے کہ شہلا سے بات کروں گا۔ اس سے مسئلہ پیچیدہ ہو جائے گا۔"

"ویسے تو محسن کا مسئلہ بھی بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اسے بچانا ابھی مشکل ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے زیادہ خرابی کا امکان نظر آتا ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ ابھی تک اس کو شہلا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں؟"

"ہم سب نے آج تک یہ بات چھپائی ہے..."

"چھپانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہر عورت کی ایک چھٹی حس ہوتی ہے جو اسے مرد کے دل کا حال بتا سکتی ہے۔ اندر جھانک کر دیکھ لیتی ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ اور اس سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔"

"تم اتنے یقین کے ساتھ دعوے کر رہے ہو جیسے خصوصی نزاد جس تم میں بھی پیدا ہو گئی ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "یا پچھلے جنم میں تم عورت تھے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا اپنے ایمان سے کہو کیا یہ غلط ہے؟"

رابعہ مسکرائی۔ "نہیں... غلط تو خیر نہیں ہے۔"

"بات یہ ہے۔" میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "میں ایک عورت کو بالکل اسی طرح جانتا ہوں جیسے میں اپنے آپ کو جانتا ہوں۔ میں اسے کچھ بتاؤں یا نہ بتاؤں، اسے معلوم ہو جاتا ہے۔ وہ میرے خیالات تک پڑھ لیتی ہے اور انتہا تو یہ ہے وکیل صاحب کہ اس نے میرے خوابوں تک پر اجارہ داری قائم کر لی ہے۔ کہتی ہے خبردار جو میرے سوا خواب دیکھو ورنہ..."

"ورنہ کیا؟" رابعہ نے شوخی سے کہا۔

"ورنہ میرے خیال میں جاگتے رہو..." میں نے مظلوم لہجے میں کہا۔

"یہ تو واقعی بڑا ظلم ہے۔ تم احتجاج کیوں نہیں کرتے۔" رابعہ نے مصنوعی ہمدردی کا اظہار کیا۔

"اس کی کون سنتا ہے فغانِ درویش۔"

"درویش صاحب! مجھے بتائیں وہ کون ہے، کہاں رہتی ہے؟ شکوہ کروں گی کہ اس نے کس عقل سے کام لیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "رہتی ہے وہ میرے دل میں اور اسے دیکھنا ہے تو جھانک کر دیکھو میری آنکھوں میں۔ لیکن یہ جو آخری بات کی ہے تو اس سلسلے میں کہنا صرف یہ ہے کہ جو چیز اس کے پاس ہے ہی نہیں اس سے وہ کام کیسے لے سکتی ہے۔"

رابعہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں دروازہ کھول کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ خان اپنے دونوں ہاتھ باندھے اسی طرح میز پر بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟ کامیابی نہیں ہوئی؟" میں نے کہا۔

"کال تو بک ہو گئی ہے۔ اب یہ آپریٹر صاحب کی مرضی ہے کہ وہ کتنا انتظار کراتی ہیں۔" خان نے کہا۔

"کمال ہے کہ تم جیسا شخص بھی بے بس ہے۔" میں نے کہا۔

"ہم کیا، ان جیسے بہت سے چھوٹے موٹے لوگ ہیں جن پر کسی وزیر کا زور نہیں چلتا۔ پبلک ان کے رحم و کرم پر ہے۔" خان نے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں نچلی سطح پر بدانتظامی کے خلاف اپنے تجربے کی بات کرتا فون کی گھنٹی چلانے لگی۔ خان نے ریسیور اٹھا لیا۔

"لاہور کون بات کرے گا؟" کسی آپریٹر نے کہا۔

خان نے ریسیور مجھے تھما دیا۔ "میں بات کروں گا اور میرے گھر والے بات کریں گے۔ تم نمبر ملاؤ اور دیکھو کال درمیان میں کاٹنی نہیں ہے۔ اگر لائن کٹ جائے تو پھر ملا دینا۔"

معلوم نہیں آپریٹر نے میری ہدایات سنی تھیں یا نہیں کچھ دیر وہ لاہور کے آپریٹر کو ہیلو ہیلو کرتی رہی۔ محمد خان خاموشی سے باہر چلا گیا۔ پھر اچانک منظر کی آواز آئی۔ "میں منظر ایڈووکیٹ بول رہا ہوں۔"

آپریٹر نے کہا۔ "بمبئی سے کال ہے، بات کریں۔"

میں نے دھڑکتے دل کو سنبھال کے کہا۔ "منظر!" پھر میری آواز فرط جذبات سے گلے میں پھنس گئی۔

"کون؟" منظر چلایا۔ "سکندر!... ابے تو ہے کچھ تھکے... سکندر؟"

میں نے کہا۔ "ہاں یار! اچھا ہوا تو گھر پر مل گیا۔"

"گھر کے بچے!" منظر نے مجھے مزید گالیوں سے نوازنے کے بعد کہا۔ "میں تو ہر روز گھر پر ہوتا ہوں۔ رات کو کبھی گھر سے باہر رہا ہوں؟ چچا بچے اس کا ثبوت ہیں۔"

"کیا؟ ابھی تک صرف چچا وہ ہی ہیں؟" میں نے کہا۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ ابھی تجھے مار دوں تیرے سر پر کہ تیرے چودہ طبق روشن ہو جائیں۔ تیرا سر بھینس کے انڈے جیسا ہو جائے۔ کہاں مر گیا تھا تو؟ ہر رات میں سوتے وقت تجھے گالیاں دیتا تھا پھر آنکھ کھلتے ہی دیتا تھا۔ سالے سب شیطان ہو۔ کسی کو ایک فون کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ یہ مت کہنا کہ فرصت نہیں ملی اور موقع نہیں ملا۔ میرا بلڈ پریشر پہلے ہی بہت بڑھ چکا ہے میں فکر سے مر جاتا تو تمہارا کیا جاتا۔ سب بے تمہارا بچے رہتے۔ بیوی تو میری یتیم ہوتی... بچے میرے بیوہ ہو جاتے۔"

میں نے کہا۔ "بس کر یار! بہت غصے میں ہے تو مجھے معلوم ہو گیا۔ مگر تیرے منہ سے یہ گالیاں سن کے بڑا قرار ملا ہے دل کو۔

www.paksociety.com

"ہم سب واقعی قصوروار ہیں۔"

"ہم سب کون؟ مجھے کیا معلوم کہ کون کہاں ہے؟ کون سے زمین پر اور کون آسمان پر۔۔۔ یہ پوچھو تو بتا دے کہ سب ٹھیک تو ہیں نا؟"

"سب ٹھیک ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اکٹھے ہیں۔"

"اتنا عرصہ کیا کرتے رہے؟ کہاں رہے۔۔۔؟"

"یہ سب تفصیل فون پر نہ بتایا جا سکتا ہے اور نہ بتانا چاہیے۔ بس یوں سمجھ لے کہ سفر جاری ہے۔ خدا کی مدد اور اپنے حوصلے کے سہارے پر ابھی تک سب زندہ و سلامت ہیں اور پر امید ہیں۔" میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے۔ یہاں اُلٹے سیدھے خیالات نے زندگی عذاب کر دی تھی۔ پاکستان کی بات اور تھی۔ کچھ بھی ہو جاتا تھا تو ہم سب مل کر سنبھال لیتے تھے۔ وہاں سے تمہاری کوئی خیر خبر تک نہیں ملی۔ یہ سوچ سوچ کر دماغ خراب ہونے لگتا تھا کہ معلوم نہیں تم سب کہاں ہو، کوئی پکڑا تو نہیں گیا، مارا تو نہیں گیا؟ تم سب بچھڑ تو نہیں گئے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم سب نے بہت سختی جھیلی لیکن ہمت نہیں ہاری۔ تمہیں ہر روز رپورٹ دینے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ تم ہمارے لیے فکر کرنے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ آج کا دن غنیمت تھا کہ ہم سب یکجا ہوئے اور اتنی فرصت ملی کہ تم سے بات کر لیں۔ خیال تو ہمیں بھی رہتا تھا تمہارا، مگر رابطے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔"

"باقی سب لوگ کہاں ہیں؟"

"مس رابعہ قاری سابق ایڈووکیٹ ہائی کورٹ تو میرے قریب ہی موجود ہیں اور تمہاری گفتگو سن رہی ہیں۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا۔ "منظر بھائی آداب!"

"جیتی رہو خوش رہو۔" منظر نے کہا۔ "مگر بی بی! تم نے بہت مایوس کیا۔ اتنی پڑھی لکھی افلاطون قسم کی لڑکی اور ابھی تک تم نے اس جانور کو انسان نہیں بنایا۔ وکالت تو شاید تم بھول گئی ہو ورنہ اب تک اسے شرع کے مطابق عمر قید تو ہو ہی جاتی۔ بھابی کی قلم نگری سے دور رکھنا اسے۔ یہ آدمی بھروسے کے قابل نہیں ہے۔"

رابعہ ہنسی۔ "میں ایسی نہیں ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"غالب اور محسن کہاں ہیں؟ میں اُن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

رابعہ نے ریسیور مجھے دے دیا۔ "اس وقت تیری بات نہیں ہو سکتی۔ وہ سونے چلے گئے ہیں۔"

"سکندر! میرے ساتھ ایسا جھوٹ تو مت بول۔ آخر میں وکیل ہوں۔ جو دو بچوں کا باپ ہو، کوئی بچہ نہیں ہوں سالے۔ عرصے بعد رابطہ ہوا ہے اور بات اس لیے نہیں ہو سکتی کہ وہ سو رہے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ! ایسے نواب ہو گئے ہیں وہ، تعلق کی شرافت سے کہ وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے جاگنا پسند نہیں کرتے۔ تم میں ہمت نہیں ہے اُن کو جگانے کی؟"

"یار ایسی کوئی بات نہیں۔ کل رات ہی ہم انھیں ایک قید خانے سے چھڑا کے لائے ہیں۔ وہ جسمانی طور پر بہت خراب حالت میں تھے مگر انھیں فوری طور پر بہترین طبی امداد فراہم کر دی گئی۔ اب وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہے ہیں۔ انھیں ڈاکٹر نے دوا دے کر آرام کے لیے سلا دیا ہے۔ اگلی بار ہم فون کریں گے تو اُن سے بھی بات کر لینا۔"

"تو ٹھیک ہو رہے ہیں نا؟"

"یار آخر میں کیسے یقین دلاؤں تجھے کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"نازو اور گل کہاں ہیں؟"

"وہ بھی سو رہی ہیں مگر انھیں ابھی جگا کر بلوا سکتا ہوں۔ پہلے تو یہ بتا کہ کس حال میں ہیں یارانِ وطن؟"

منظر نے کہا۔ "اکرام شیخ اکثر فون کرتا رہتا ہے اور ظاہر ہے تمہاری طرف سے اسے بھی تشویش لاحق رہتی ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتا ہے اور میں اُس سے معلوم کرتا ہوں کہ کوئی خبر ملی؟ آخر تم نے اسے کراچی میں اکیلا کیوں چھوڑ دیا؟ آخر ایک دن رو رہا تھا ان کو یاد کر کے۔"

میں نے کہا۔ "کل تو نازو بھی رو پڑی حالانکہ وہ جذباتی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ لیکن دل آخر دل ہے۔ پھر تو بے چارہ اکرام شیخ ہے کہاں؟"

"وہیں کراچی میں۔۔۔ ٹیکسی چلا رہا ہے۔۔۔ کہہ رہا تھا کہ اب آخر میں کیا کروں؟ یہ کام چھوڑ سکتا ہوں نہ کہیں جا سکتا ہوں۔ یہ خیال آجاتا ہے کہ جب تم لوگ واپس آؤ گے تو مجھے اور میری ٹیکسی کو تلاش کرو گے۔ ٹیکسی کے نمبر کی مدد سے۔ کراچی میں کوئی ڈاکٹر جھنگل والا ہے۔"

"ہاں کیا اکرام اس کے ساتھ رہتا ہے؟"

"ہاں ڈاکٹر جھنگل والا کے نمبر پر تم اس سے رات دس بجے کے بعد بات کر سکتے ہو۔" منظر نے کہا۔

"اچھا شہلا کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا۔ "میں نے سوچا تھا کہ اسے فون کروں لیکن ہمت نہیں پڑی۔ وہ اصرار کرتی کہ محسن سے بات کراؤ۔ تم سے تو ہاں بھی ہماری بات۔ وہ کبھی دیتی۔ محسن کب خود اسے فون کرے گا؟"

"کہاں فون کرے گا وہ؟" منظر نے کہا۔ "شہلا اب وہاں نہیں ہے۔"

میرے ذہن کو اس جملے سے جھٹکا لگا۔ "کیا مطلب؟ کیا

وہ انکل رضوی کا گھر چھوڑ کے کہیں اور رہنے لگی ہے؟"

منظر نے کہا۔ "نہیں، یہ بات نہیں۔"

"تو پھر کیا بات ہے۔ کیا فون کٹ گیا ہے انکل رضوی کے گھر کا؟"

منظر نے رُک رُک کے کہا۔ "نہیں۔۔۔ فون تو ہے وہاں۔۔۔"

"کیا بات ہے منظر؟ اب تو کچھ چھپا رہا ہے مجھ سے، صاف بات کیوں نہیں کرتا؟" میں نے کہا۔

"صاف بات میں کیا بتاؤں جب کہ خود مجھے اصل بات معلوم نہیں۔" منظر نے کہا۔ "مسز رضوی نے وہ گھر چھوڑ دیا ہے اور کسی کو بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں چلی گئی ہیں۔"

"لیکن اُن کا اسکول تو ہے۔۔۔"

"اسکول سے بھی کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ وائس پرنسپل نے کہا کہ مسز رضوی نے تین دن پہلے فون پر اطلاع دی کہ وہ مکان بدل رہی ہیں۔ اس کے بعد نہ وہ اسکول گئیں اور نہ اُن کا کوئی پیغام ملا ہے۔ ظاہر ہے شہلا انھی کے ساتھ چلی گئی ہو گی۔"

"لیکن کہاں۔۔۔ اور کیوں۔۔۔ وہ گھر تو مسز رضوی کا اپنا تھا۔ کرائے کا مکان تو نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں عجیب بات یہ ہے کہ انھوں نے مکان بیچ دیا ہے۔ اُس میں کوئی اور رہتا ہے اب۔ میری اُس سے فون پر بات ہوئی تو اس نے کہا کہ مکان خالی تھا اور سودا کسی بروکر کی معرفت ہوا۔ اسے نہیں معلوم کہ مالک مکان کہاں ہے۔ خود میرے لیے یہ بات ناقابلِ یقین تھی۔ آخر مسز رضوی نے یہ فیصلہ کیوں کیا اور مجھ سے اتنی رازداری برتی جیسے میں غیر ہوں۔ سودا ایک بروکر کے ذریعے ہوا۔ کیا میں یہ کام نہیں کرا سکتا تھا؟ اور شہلا کو بھی خیال نہیں آیا کہ مجھے اطلاع کر دیتی؟"

"منظر! معاملہ کچھ اور ہے۔" میں نے محسوس کیا کہ کسی نامعلوم خطرے کا خوف میرے دل کو مایوسی کے شکنجے میں جکڑ رہا ہے۔

"ہاں مجھے بھی دال میں کالا نظر آتا ہے۔ بیگم رضوی نے کسی مجبوری یا دباؤ کے تحت وہ گھر چھوڑا ہو گا۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آتی کہ یہ سب مجھ سے چھپانے میں کون سی مجبوری کا دخل تھا؟ مجھ پہ اعتماد کیوں نہیں کیا انھوں نے؟ شہلا نے بھی مجھے نہیں بتایا کہ وہ مکان بیچ رہی ہیں اور اُن کا ارادہ کہیں اور جا رہنے کا ہے۔ آخر کیوں؟ اگر وہ مکان غیر محفوظ ہو گیا تھا تو یہ بات مجھے معلوم ہونی چاہیے تھی۔ شہلا پر لازم تھا کہ کوئی پریشانی تھی تو مجھے بتاتی۔ میں اُن کی مدد کرتا۔ لیکن مجھے تو کسی نے بعد میں بھی فون کر کے نئے گھر کا پتا دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بیگم رضوی اور شہلا کا رویہ بالکل ناقابلِ فہم ہے میرے لیے۔"

"منظر! یہ کوئی بہت سنگین معاملہ ہے۔ تو نے کیسے یقین کر لیا کہ وہ مکان بیچ کر گئی ہیں؟" میں نے کہا۔

"مکان کی فروخت کے سلسلے میں تمام قانونی اور کاغذی کارروائی ہوئی ہے۔" منظر نے کہا۔ "ابھی کوئی ثبوت نہیں میرے پاس کہ بیگم رضوی نے وہ مکان اپنی مرضی سے بیچا یا جبر کے تحت۔ اور خبر کس نے کیا؟ اگر کوئی بات تھی تو مجھے کیوں اطلاع نہیں دی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ابھی تک کسی کو علم نہیں کہ وہ کہاں شفٹ کر گئی ہیں۔"

"منظر! اس میں شک کی کون سی بات ہے کہ وہ لاپتا ہو گئی ہیں؟" میں نے کہا۔ "ممکن ہے انھیں کسی نے اغوا کر لیا ہو، قتل کر دیا ہو، کہیں قید میں ڈال دیا ہو۔ ان امکانات کی طرف تیرا ذہن کیوں نہیں گیا؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"یار یہ سب کچھ ہے میرے ذہن میں۔ میں تو رہتا ہی جرائم کی دنیا میں ہوں۔ میرا ذہن غیر معمولی طور پر شک پرست ہے۔ مجھے تمہارا بھی خیال آیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ محسن نے اپنی بیوی سے بات کرنے کی کوشش کی تو اُسے ناکامی ہو گی۔ اس کی بیوی نے ایسا کیوں نہیں سوچا؟ لیکن ابھی اس بات کو صرف تین دن ہوئے ہیں۔ میں نے ایس پی سے بات کی تھی۔ اس نے کہا گمشدگی کی رپورٹ تو ہر وقت درج کرائی جا سکتی ہے مگر جب اسکول والے کہتے ہیں کہ بیگم رضوی نے مکان بدل لیا ہے اور مکان خود انھوں نے کسی بروکر کے ذریعے فروخت کیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انھیں اغوا کر لیا گیا ہے یا یہ کہ وہ لاپتا ہو گئی ہیں۔ بروکر نے بتایا کہ مسز رضوی نے خود ہی مکان فروخت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ سودا بھی انھوں نے ہی کیا تھا اور رقم بھی خود ہی وصول کی تھی۔ بروکر نے صرف گاہک سے ملوا کے اپنا کمیشن لیا تھا۔ ہاں ایک بات اور۔۔۔ مکان کا خالی قبضہ دینے کے لیے بیگم رضوی نے ایک ہفتے کی مہلت لی تھی لیکن اس سے پہلے ہی قبضہ دے دیا گیا۔"

"قبضہ کس نے دیا تھا؟"

"بروکر نے۔ اس کا کہنا ہے کہ کوئی شخص اس کی عدم موجودگی میں مکان کے تالے کی چابی دے گیا تھا۔"

"یہ کوئی شخص کون تھا؟ خود بیگم رضوی؟"

"بروکر کچھ نہیں جانتا۔ تاہم پولیس کو اس سارے معاملے میں کوئی شک کی بات نظر نہیں آتی۔" منظر بولا۔ "ایس پی نے مجھ سے کہا کہ وکیل صاحب! اگر انھوں نے آپ کی خدمات سے فائدہ نہیں اٹھایا اور آپ کو اطلاع نہیں دی تو اُن کی مرضی۔ اس میں خلافِ قانون کون سی بات ہے۔ ممکن ہے ابھی تک انھیں فرصت نہ ملی ہو یا خیال نہ آیا ہو آپ کو نئے پتے سے مطلع کرنے کا۔ میں اس

www.paksociety.com

اُلّو کے پٹھے کو کیسے سمجھاتا کہ میرے شکوک کی بنیاد کیا ہے۔ جو بات مجھے ناقص لگتی تھی وہ اس کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔"

میں نے کہا۔ "پھر اب تو کیا کرے گا؟ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا؟"

"نہیں، میں انھیں تلاش کر رہا ہوں۔ دو چار دن بعد میں تمام اخبارات میں یہ اعلان شائع کرا دوں گا کہ بیگم رضوی جہاں کہیں ہوں، مجھ سے رابطہ قائم کریں۔ کوئی جواب نہ ملا تو میں مجبور ہو جاؤں گا پولیس میں گم شدگی کی رپورٹ لکھوانے پر۔"

"تو نے سخت تشویش میں مبتلا کر دیا ہے مجھے۔"

"ابھی محسن کو کچھ مت بتانا بلکہ کسی کو بھی کچھ مت بتانا۔ رابعہ کو سمجھا دینا کہ زبان بند رکھے۔" منظر نے کہا۔ "جب تک کہ صورتِ حال واضح نہ ہو جائے۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نہیں منظر، مجھے یہ معاملہ ٹھیک ہوتا نظر نہیں آتا۔ ابھی تو ہم محسن سے یہ بات چھپا لیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ کب تک۔ اگر خود محسن نے کبھی لاہور فون کیا اور خود شہلا سے بات کرنے کی کوشش کی تو کیا ہوگا؟"

"ظاہر ہے حقیقت کبھی نہ کبھی سامنے آجاتی ہے لیکن ابھی تم اس معاملے کو گول کر جاؤ۔"

"ہم ذکر ہی نہیں کریں گے اس گفتگو کا۔ تو انھیں تلاش کر منظر، میں کل پھر فون کروں گا، اگر موقع ملا۔ ہاں ایک بات اور بتا۔ تو نے اکرام شیخ سے آخری بار کب بات کی تھی؟"

"کوئی ایک ہفتہ پہلے۔ ۔ ۔ اس روز میری شہلا سے بھی بات ہوئی تھی۔ وہ پوچھتی رہتی تھی مجھ سے کہ کسی کی کوئی خیر خبر آئی؟ تقریباً ہر روز ہی اس کا فون آجاتا تھا اور مجھے ہر روز بڑا دکھ ہوتا تھا اور شرمندگی ہوتی تھی یہ کہتے ہوئے کہ میرے پاس اس کے لیے کوئی خوش خبری نہیں۔ اکرام شیخ بھی شہلا سے اور مجھ سے پوچھتا تھا۔ اب پھر فون کرے گا تو پوچھے گا۔"

"اسے ہمارے متعلق بتا دینا کہ ہم خیریت سے ہیں مگر یہ مت بتانا کہ شہلا اور بیگم رضوی لاپتا ہو گئی ہیں۔ اگر کال مل گئی تو آج رات میں اس سے بات بھی کر لوں گا۔"

"اس وقت تم کہاں سے بات کر رہے ہو؟"

"ہمارے ایک دوست ہیں، محمد خان صاحب۔ اُن کے گھر سے۔ ابھی محسن سو رہا ہے اور اُسے یہ معلوم نہیں کہ اس گھر میں فون بھی ہے۔"

"اُسے معلوم ہونے بھی مت دینا۔ تمھارا فون نمبر کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم۔ یہاں ہمارا قیام عارضی ہے۔"

منظر نے کہا۔ "وہ ایس پی سراج تھا نا!"

میں نے کہا۔ "تھا کا کیا مطلب۔ کیا اس پر خدا کا قہر نازل ہو گیا؟"

"وہ معطل ہو گیا تھا۔ پھر گرفتاری سے بچنے کے لیے روپوش ہو گیا۔ اس کا سرحد پار کے اسمگلروں سے رابطہ ثابت ہو گیا تھا۔ [illegible] نے اسے پکڑ لیا تھا مگر وہ اپنی وردی اور عہدے کے اختیار سے فائدہ اٹھا کے نکل آیا۔ اب کچھ پتا نہیں اس کا۔"

"چوہدری دلاور تو ہمارے پیچھے یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔ باقی شکاری کتے کہاں ہیں؟ پیٹرو اور حاجی عبداللہ؟"

"لاہور میں تو نہیں ہیں۔" منظر نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ بھی ہمارے تعاقب میں ہیں، اور یہیں ہیں۔ بمبئی میں بھی انھیں ایک اپنے جیسا شیطان مل گیا ہے جو دلاور کا بھی باپ ہے۔"

"کس کی بات کر رہے ہو تم؟"

"ترلوچن کی۔ یہاں بدمعاش ہوتے ہیں، پھر بڑے بدمعاش اور اُن سے بڑے بدمعاش داوا کہلاتے ہیں۔ ترلوچن کو تم بڑا داوا سمجھ لو۔ لیکن خدا نے ہر فرعون کے لیے موسیٰ کا بندوبست کر رکھا ہے۔ ہماری مدد کے لیے اُس نے محمد خان کو بھیج دیا۔ اس کے بارے میں تفصیل سے پھر کبھی بتاؤں گا بشرطِ زندگی۔"

"تم لوگ ابھی بمبئی میں ہو نا؟"

"آج اور کل کے بارے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دو دن اور یہاں گزریں گے لیکن اس کے بعد کا کچھ پتا نہیں۔ ہم تو بمبئی میں ایک دن بھی رُکنا نہیں چاہتے تھے مگر حالات نے روک لیا۔ اب کوشش یہی ہے کہ جلد از جلد نکل جائیں۔"

"کہیں جانے سے پہلے بتا دینا۔"

"نہیں یہ وعدہ نہیں کر سکتا۔ وہاں تو ہم کسی بھی ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھ کے کہیں بھی بات کر لیتے تھے۔ یہاں سے فون کرنا آسان نہیں ہے۔ پھر بھی کوشش کریں گے کہ رابطہ رہے۔ تو نے مجھے سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے شہلا کی طرف سے۔"

"وہ کہاں جا سکتی ہے یار! ہوں گی لاہور ہی میں۔ جب ملیں گی تو سب معلوم ہو جائے گا کہ بات کیا تھی۔" منظر نے میری تسلی کے لیے کہا مگر اس کے جھوٹ سے میں کیسے مطمئن ہو سکتا تھا۔ میں نے اُسے خدا حافظ کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

رابعہ کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ میں نے منظر کو فون کر کے غلطی کی۔ اس سے مجھے کوئی خوشی نہیں ملی تھی نہ کچھ حاصل ہوا۔ میں نے رابعہ کو بلا کے بھی غلطی کی۔ بہتر ہوتا اگر میں خود ہی اس سے بات کر لیتا اور وہ خلش میری ذات تک محدود رہتی جو شہلا کے بارے میں ایک غیر متوقع اطلاع سے پیدا ہوئی تھی۔ میرے ساتھ اب رابعہ بھی دکھی تھی اور میرے پاس اس کے دکھ کا مداوا نہیں تھا۔

"رابعہ، تم نے سب سُنا؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

"تم زبان سے نہیں بتاؤ گی مگر تمھاری صورت چغلی کھائے گی اگر تم کچھ چھپا رہی ہو۔" میں نے کہا۔ "ایسے نہیں جان۔"

"پھر میں کیا کروں؟" رابعہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔

"رونے سے کیا ہوا ابھی سے؟" میں نے اس کے سر کو سینے سے لگا کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کیے۔ "ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔ میں اور تم آزمائش کے کیسے کیسے مرحلوں سے گزر چکے ہیں۔ ہم سب نے بہت بڑی قربانیاں دی ہیں اور ہمت نہیں ہاری ہے۔ مجھ سے میرا گھر اور میرے سر سے باپ کا سایہ چھن گیا۔ تم سے تمھارا گھر اور تمھاری ماں کی محبت چھن گئی۔ محسن کے والدین نہیں رہے۔ نازو کے ماں باپ اس دنیا سے صدمے اٹھاتے رخصت ہو گئے اور بھائی بچھڑ گیا۔ گل کے بھائی نے اپنی جان دے دی۔ ہم سب سختی حالات کی بھٹی میں تپ کے کندن ہو گئے ہیں لیکن ابھی ہمارے لیے آزمائش کے کتنے مرحلے باقی ہیں، یہ ہم نہیں جانتے۔ ہمیں آنے والے وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے خواہ وقت اچھا ہو یا بُرا۔"

رابعہ نے نظر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ "میں نے کب کہا ہے کہ میں تیار نہیں ہوں۔ لیکن میں اکیلی نہ رہ جاؤں، یہ خوف میرے دل سے نہیں نکلتا۔ بس تم مجھے اتنا یقین دلا دو۔ ۔ کہ تم جہاں بھی ہو گے ساتھ ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "میں اپنی مرضی سے اکیلا مرنا بھی نہیں چاہتا مگر تقدیر میں کیا لکھا ہے، یہ کون بتا سکتا ہے۔ چلو اب ایسی مایوسی کی باتیں چھوڑو۔ سب کے سامنے مسکراتے ہوئے جائیں گے، سمجھ گئیں؟"

رابعہ بہ دقت مسکرائی۔ میں اس کا ہاتھ تھام کے باہر آ گیا۔ محمد خان باہر کہیں بھی نہیں تھا۔ اُس نے اخلاقاً کمرے سے نکل جانا بہتر سمجھا تھا کہ ہم آزادی سے بات کر لیں۔ اب سب پھر بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ میں نے ٹیلی فون پر منظر سے تقریباً آدھا گھنٹا بات کی تھی یا شاید اس سے بھی زیادہ دیر مگر کوئی ہمیں تلاش کرتا ہوا نہیں آیا تھا۔

محسن اور غالب جاگ رہے تھے اور بے حد صحت مند نظر آ رہے تھے۔ خوش اور خرم بھی نظر آتے تھے۔ تکلف کو بالائے طاق رکھ کے نازو نے غالب کی تیمارداری کے فرائض سنبھال رکھے تھے اور گل نے محسن کا چارج لے لیا تھا۔ نرس اب نظر نہیں آتی تھی۔

خوش قسمتی تو تھی کسی نے بھی ہم سے نہیں پوچھا کہ اتنی دیر سے کہاں تھے۔ وہ اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے چنانچہ انھوں نے فرض کر لیا تھا کہ ہم بھی کہیں مصروف رہے ہوں گے۔ اور انھیں وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ غالب اور محسن کو چلنے پھرنے کی آزادی ہوتی تو وہ کب ایک کمرے تک محدود رہتے۔ نازو اور غالب اپنے لیے کوئی گوشۂ خلوت تلاش کر لیتے اور گل کو کوشش کیے بغیر ہی تنہائی میسر آجاتی۔ ویسے سارا کھیل جذبات کا ہے۔ آدمی چاہے تو بھری محفل میں تنہا ہو جائے اور چاہے تو خلوت میں محفل آباد کر لے۔

میں نے محسن کے پاس جا کے کہا۔ "کیا حال ہے؟"

محسن نے محض شرارت میں مسکرا کے گل کی طرف دیکھا اور بولا۔ "وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔"

شہلا کے لاپتا ہو جانے کی خبر کا بوجھ ابھی میرے دل پہ تھا۔ چنانچہ محسن کی یہ شوخی مجھے اُس سہاگن کی چوڑیوں کی کھنک، اس کی مانگ کی افشاں کی چمک اور اس کے سنگھار کے رنگوں کی دمک جیسی لگی جس سے کوئی منحوس خبر چھپائی گئی ہو۔ میں نے بے سبب خود کو مجرم محسوس کیا اور میرا دل آزردہ ہوا مگر میں نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔

"اور دوسرے بیمار کے بارے میں دو مسیحا کا کیا خیال ہے؟" میں نے غالب کی طرف دیکھا۔

آہ بھر کے غالب نے کہا۔ "ہم مرے جا رہے ہیں وہ کہتے ہیں حال اچھا ہے۔"

نازو نے کہا۔ "سب ڈھونگ ہے مرے جا رہے ہیں اور کچھ نہیں۔"

گل نے کہا۔ "رابعہ باجی کا پیٹ تو شاید باتوں سے ہی بھر گیا ہے؟"

میں نے بات کو ٹالنے کے لیے کہا۔ "کسی کو خان صاحب کا بھی علم ہے؟"

"کیا وہ آپ کے ساتھ نہیں تھے؟" گل نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم تو باہر ٹہل رہے تھے۔ خیر میں دیکھتا ہوں۔"

اتنی بڑی کوٹھی میں کہیں کوئی آواز نہ تھی۔ گزشتہ رات میں نے جن لوگوں کو اندر آتے دیکھا تھا وہ بھی ارواح کی طرح کہیں غائب ہو گئے تھے۔ ایک ایک کر کے میں نے مختلف کمروں کے دروازے کھول کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن سب دروازے بند تھے۔ وہ دروازہ بھی اب بند تھا جس میں مجھے گولہ بارود کا اور اسلحے کا ذخیرہ نظر آیا تھا۔

یہ کوٹھی جو دیکھنے میں بہت سادہ نظر آتی تھی اندر سے پُراسرار ہوتی جا رہی تھی۔ گھنٹی بجا کے یہاں ہر چیز طلب کی جا سکتی تھی اور گزشتہ رات میں نے کافی منگوا کے اس کا تجربہ بھی کیا تھا

www.paksociety.com

لیکن نہ مجھے خادم دکھائی دیے تھے اور نہ کوئی بھی نظر آیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد میں نے جو دو چار چہرے دیکھے تھے وہ بھی پھر دکھائی نہیں دیے تھے۔ ڈاکٹر اور نرس بھی غائب تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کوٹھی میں صرف ہم چھ افراد رہ گئے ہیں۔ ساتواں ڈاکو محمد خان کچھ دیر پہلے میرے ساتھ تھا لیکن اب اُس کا بھی کہیں پتا نہ تھا۔

میں غیر ضروری تجسس کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور پھر ڈاکوؤں کی اس پناہ گاہ کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے چکر میں جاسوسی کرتے ہوئے پکڑے جانا منظور نہ تھا، چنانچہ میں واپس آ گیا۔

"یہاں تو کوئی ہے ہی نہیں۔" میں نے کہا۔

"پھر... کھانے کا کیا کریں؟" نازو نے کہا۔ "کیا وقت ہو گیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "خان صاحب نے تو بہت آسان طریقہ بتا دیا تھا کہ جس چیز کی ضرورت ہو، اس بٹن کو دبا کے کہہ دو۔ یوں۔"

بٹن دبانے کے چند سیکنڈ بعد کسی نے کہا۔ "یس سر!"

میں نے کہا۔ "محمد خان صاحب کہاں ہیں؟"

"آپ پیغام دے دیں، انھیں بتا دیا جائے گا۔" اُسی آواز نے کچھ تذبذب کے بعد کہا۔

"پیغام بہت مختصر ہے۔ ہم اُن کے ساتھ لنچ کرنا چاہتے ہیں۔ فوراً۔" میں نے کہا اور بٹن کو چھوڑ دیا۔

"یہ کون تھا اور کہاں سے بول رہا تھا؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "یہ کوئی آدمی تھا اور اسپیکر میں سے بول رہا تھا۔"

"عجیب پُراسرار جگہ ہے یہ بھی۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھے تو وحشت ہونے لگی ہے۔"

میں نے کہا۔ "شوق سے یہاں کون ٹھہرا ہوا ہے۔ غالب اور محسن سفر کے قابل ہو جائیں، یہی انتظار ہے۔"

نازو نے کہا۔ "ویسے بھی باہر کی نسبت ہم اندر زیادہ محفوظ ہیں۔"

"لیکن صرف حفاظت کے خیال سے ہم کب تک نظربند رہیں گے۔" رابعہ نے کہا۔

"یہ مہلت غنیمت ہے۔" میں نے کہا۔ "جب تک میسر ہے۔"

دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی اور محمد خان اندر آ گیا۔ اُس کے پیچھے دو افراد ٹرالیاں دھکیلتے ہوئے اندر لے آئے۔ ایک دم کمرا کھانوں کی خوشبو سے بھر گیا۔ آخر میں نرس اپنے ہاتھوں میں ایک ٹرے لیے آئی۔

محمد خان نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "معاف کرنا کھانے میں کچھ دیر ہو گئی۔ دراصل ان مریضوں کے لیے خصوصی بندوبست کرنا تھا۔ یہاں تو ہم جیسے لوگوں کے سوا کوئی رہتا ہی نہیں اور ہم کچھ بھی کھا لیتے ہیں۔"

دونوں خادم دروازہ بند کر کے خاموشی سے غائب ہو گئے تو میں نے کہا۔ "یہ خصوصی اور عمومی بندوبست کون کرتا ہے خان صاحب؟"

خان نے کہا۔ "یہی لوگ۔"

میں نے کہا۔ "مجھے نہ یہاں لوگ نظر آتے ہیں نہ زندگی کے آثار، لیکن اس جادو کے بٹن کو ہاتھ لگاتے ہی سب کچھ ہو جاتا ہے۔"

خان ہنسا۔ "اگر یہ ہو تو مجھے بتانا... آؤ اب کھانے کی طرف۔"

صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے یا کسی اور کو بھی اپنے خفیہ اڈے کی پُراسرار وسعت کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ اس رویے کا یہ مطلب تھا کہ ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ نازو اور گل نے ٹرے کو کور کو ہٹا کے کھانا نکالنا شروع کیا تو میں حیران رہ گیا۔ خان کے دسترخوان پر ہر وہ چیز موجود تھی جس کی ہم خواہش کر سکتے تھے تاہم غالب اور محسن کو مرغن اور مسالے والی چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں ملا۔ وہ اپنے سوپ اور اُبلے ہوئے کھانے کو تکتے ہوئے بڑی حسرت سے قورمے، بریانی اور کباب کو دیکھتے رہے پھر ڈاکٹر آ گیا۔ اُس نے دونوں کا معائنہ کیا اور نرس کو کچھ دوائیں دے کر چلا گیا۔ خان کی موجودگی میں ہم نے بھی کھانا خاموشی سے کھایا۔

غالب اور محسن کے لیے آرام ضروری تھا اور سکون آور دواؤں کی بھاری مقدار کے زیرِ اثر وہ جاگتے میں بھی مضمحل نظر آتے تھے۔ نرس انھیں دوا دینے کے بعد وہیں کرسی پر نیم دراز ہو گئی تھی۔

گل نے کہا۔ "تم جاؤ۔ ہم ان کی دیکھ بھال کر لیں گے۔"

"مجھے دیکھ بھال نہیں کرنی، باتیں کرنی ہیں۔" نرس نے شکایت کے انداز میں خان کی طرف دیکھا اور نازو کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

خان نے کہا۔ "تم خود بھی آرام کرو۔"

نازو نے ہنس کے کہا۔ "ہم یہاں آرام کرتے ہیں۔" مگر اس کی بات کا کسی پر اثر نہیں ہوا۔

جب کھانے کے بعد ہم نے کافی بھی پی لی تو خان اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں ایک کام سے جا رہا ہوں، شام کو ملاقات ہو گی۔"

میں اُس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اچانک مجھے غنودگی نے آ لیا۔ پہلے میں نے اسے مرغن خوراک کا نتیجہ سمجھا لیکن گل اور نازو پر بھی نیند غالب آ رہی تھی جو بڑی عجیب بات تھی کیونکہ وہ کھانے سے کچھ دیر پہلے تک سوتی رہی تھیں۔ تاہم بیدار ہونے کے بعد مجھے یہ خیال آیا کہ شاید ہمیں بھی کافی میں خواب آور دوا دے دی گئی ہے پھر مجھے نیند نے آ لیا۔

میری آنکھ کھلی تو کمرے میں ویسا ہی دن کا اُجالا تھا مگر گھڑی میں آٹھ بج رہے تھے۔ اگر رات کے آٹھ بجے کا وقت ہوتا تو اندھیرا ہوتا۔ میں نے گھڑی کو پھر غور سے دیکھا اور کھڑکی سے باہر جھانکا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ صبح کا سورج خاصا اُوپر اُٹھ چکا ہے۔ میں مسلسل سولہ سترہ گھنٹے سو کے اُٹھا تھا۔ یہ بات میرے لیے ناقابلِ یقین تھی مگر غلط نہیں تھی۔

غالب اور محسن کا سوتے رہنا اُن کے حق میں یقیناً اچھا تھا مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ خان صاحب نے ہم سب کو اُن کے ساتھ ہی کیوں سلا دیا تھا۔ خواتین میں صرف گل جاگ رہی تھی اور عجیب بے خودی کی کیفیت میں محسن کے بیڈ سے لگی اُسے دیکھے جا رہی تھی۔

میرے کھنکارنے پر وہ چونکی۔ "آپ اُٹھ گئے سکندر بھائی۔ مجھے تو ایسی ٹوٹ کے نیند آئی..."

میں نے کہا۔ "اِن دونوں کو بھی اُٹھاؤ۔ حد ہوتی ہے گھوڑے بیچ کر سونے کی... ہم اصطبل بیچ کے سوتے رہے۔"

نازو اور پھر رابعہ نے آنکھیں کھولنے کے بعد جو وقت پوچھا اور جب میں نے بتایا کہ صبح ہوئے بھی دیر ہوئی تو انھیں یقین نہ آیا، لیکن گل نے تصدیق کی۔

"یعنی شام گزر گئی، پھر رات بھی گزر گئی اور ہم سب کی آنکھ ہی نہیں کھلی۔" نازو نے جماہی لے کر آنکھیں ملتے ہوئے کہا اور اپنے پریشان بال سمیٹنے لگی۔

میں نے کہا۔ "میں اپنی مرضی سے اتنی دیر سو ہی نہیں سکتا۔"

"پھر کیا رابعہ باجی نے حکم دیا تھا؟" گل نے کہا۔

"یہ حرکت خان کی ہے۔ مجھے کھانے کے کچھ دیر بعد ہی شک ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کافی کے تلخ ذائقے میں کوئی خواب آور دوا شامل کر دی گئی تھی۔"

"لیکن کیوں؟" رابعہ نے پلکیں جھپکا کے کہا۔

"خان سے پوچھے بغیر میں کیا بتا سکتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ حرکت قابلِ اعتراض بات ہے۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اگر اُن کا مقصد ہمیں اپنی کسی کارروائی سے بے خبر رکھنا تھا... تو وہ ہم سے کہہ سکتا تھا کہ ہم اس کمرے سے باہر نہ جائیں۔"

"یہ تو دیکھو نوکر... سب ٹھیک ہے، میرا مطلب ہے ہمارے ساتھ کوئی دھوکا تو نہیں ہوا؟" نازو نے کہا۔

"دھوکا کیا ہو سکتا ہے؟" گل نے کہا۔

"آپ لوگ جائیں اپنے کمرے میں، منہ ہاتھ دھو کے کپڑے بدلیں۔ میں خان کو تلاش کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ سوٹ کیس بھی تو اب لوگوں کے پاس تھا جس میں ہمارا سب کچھ ہے۔"

وہ تینوں چلی گئیں تو میں کچھ دیر اندر ہی اندر تاؤ کھاتا رہا۔ رات کو مجھے چوہدری دلاور سے بات کرنی تھی۔ رات دس بجے کے بعد میں نے کراچی فون کر کے ڈاکٹر جگی والا کی معرفت اکرام شیخ سے بات کرنے کا پروگرام بھی بنایا تھا مگر نہ جانے کیوں محمد خان نے میرے سارے ارادوں کو خوابِ غفلت میں ڈبو دیا تھا۔ یقیناً اس کے سامنے کوئی مقصد تھا۔ کوئی ایسا مقصد جس کے بارے میں وہ نہ ہم سے بات کر سکتا تھا اور نہ یہ چاہتا تھا کہ ہمارے کانوں میں اس کی بھنک بھی پڑے۔ رات بھر میں اس نے اپنا کام کر لیا اور ہم پڑے سوتے رہ گئے۔

خواب آور دوا کی کسل مندی کا اثر ابھی تک باقی تھا۔ میں نے مصلحت کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خان کے ساتھ ٹھنڈے دل و دماغ سے بات کرنا مناسب سمجھا اور دماغ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے خود بھی باتھ روم میں گھس گیا۔ سولہ گھنٹے کی نیند کے بعد جب میں نے گرم پانی سے غسل کیا تو اچانک مجھے بے حد فرحت اور تازگی کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میری بھوک چمک اُٹھی۔

رابطے کا واحد ذریعہ ایک پش بٹن تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم ایک بہت بڑے قید خانے میں اکیلے ہیں۔ اس قید خانے کے دوسرے سب کمرے خالی پڑے ہیں اور یہ قید خانہ بھی ساری دنیا سے الگ کسی ویرانے میں واقع ہے۔ بظاہر ہم یہاں مہمان تھے اور ہماری خاطر داری میں کسی قسم کی کمی نہیں تھی لیکن اب مجھے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ یہ خوف سے تحفظ کی بات نہیں، ہماری نقل و حرکت پر قدغن کا احساس ہے اور خود مختاری کے اعتماد کی کمی ہے جس نے ہمیں اسیر بنا دیا ہے۔

بٹن دبا کے میں نے کہا کہ پہلے مجھے فون لائن کال فراہم کی جائے اور پھر ہم سب کے لیے ناشتا لایا جائے۔ دوسری طرف سے ایک سپاٹ فرماں بردار لہجے میں "یس سر" کے سوا کچھ نہیں کہا گیا۔ کافی پانچ منٹ میں آ گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ ڈاکٹر بھی آ گیا جس کو ابھی تک میں نے بات کرتے نہیں سنا تھا۔ میں نے اسے روک لیا۔ "ایک منٹ ڈاکٹر... کیا نام ہے تمھارا؟"

"میں صرف ڈاکٹر ہوں۔" اس نے بے رخی سے کہا۔

"اچھا مسٹر ڈاکٹر! میرے یہ دوست جو تمھارے زیرِ علاج ہیں، ان کی پروگریس کے بارے میں تمھاری کیا رپورٹ ہے؟" میں نے انگریزی میں کہا۔

"تم کیوں پوچھتے ہو؟"

www.paksociety.com

"تم کیوں بتانا نہیں چاہتے؟" میں نے کہا۔ "یہ میرے دوست ہیں اور میرا مطمئن ہونا ضروری ہے۔"

"میں صرف خان کو جواب دہ ہوں۔"

"خان کو گولی مارو۔" میں نے تلخ تیز کافی کا گھونٹ لے کر کہا۔ "میری مرضی کے بغیر تم اپنا علاج جاری نہیں رکھ سکتے۔ میں تمہاری صلاحیت پر عدم اعتماد کا اظہار نہیں کر رہا ہوں۔ تمہیں صرف یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میرے دوستوں کے بارے میں خان کو مجھ سے زیادہ تشویش نہیں ہوگی۔"

"ان کی حالت بہت اچھی ہے اور ان کا رسپونس میری توقعات سے بہت زیادہ حوصلہ افزا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"کیا یہ چل پھر سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ ان کی اپنی قوت ارادی اور جسمانی صحت پر منحصر ہے۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ کسی نقصان کا احتمال تو نہیں ہے؟ ہاں ان کی قوت ارادی سے میں واقف ہوں۔ اگر تم ان کے بارے میں سمجھتے ہو کہ یہ چل پھر سکتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمالیہ پر بھی چڑھ سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر انہیں ظاہری بیماری یا اندرونی خرابی کی کوئی پرابلم نہیں ہے تو پھر یہ علاج کیا ہے؟ تم انہیں کس قسم کی دوائیں دے رہے ہو؟"

"یہ صرف سکون بخش اور جسمانی صحت یا ان کے عمل کو تیز کرنے والی کچھ دوائیں ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ان کا اصل علاج زیادہ سے زیادہ آرام اور اچھی خوراک ہے۔"

"یہ پوری طرح صحت مند کب تک ہو جائیں گے؟"

"ویسے تو میں ان کو صحت مند ہی سمجھتا ہوں، بیمار نہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "آرام کا مطلب بستر پہ لیٹے رہنا ہر حال نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "ایسی صورت میں آپ ان کا آخری بار معائنہ کر لیں اور مجھے بتا دیں کہ بعد میں انہیں کس قسم کے علاج اور احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ شاید کل ہم آپ کو یہاں نہ ملیں۔"

گل نے کہا۔ "اس نرس کی بھی چھٹی۔"

ڈاکٹر نے برا سا منہ بنایا۔ "میں محمد خان سے ہدایات لیتا ہوں۔" اور پھر محسن کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے نبض دیکھی، بلڈ پریشر چیک کیا اور غیر شعوری طور پر سر ہلا کے اطمینان کا اظہار کیا۔

"اس نرس کو میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔" محسن نے کہا۔ "اسے دیکھ کر میرا بلڈ پریشر بہت گر جاتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی نکتہ بھی ہے۔ نرس ہونی چاہیے مریض کی پسند کی۔"

غالب نے کہا۔ "میں اتفاق کرتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ میں کہتا ہوں ایک خوبصورت نرس علاج اور پرہیز دونوں سے بہتر ہے۔ یہ نرس تو اتنی بدصورت تھی کہ زنانہ پولیس میں بھرتی ہو سکتی تھی۔"

میں نے کہا۔ "تم دونوں کو اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بہت ناز برداری کرا چکے ہو اور نہیں چلے گا بیماری کا ڈراما۔"

"یہ تو بڑا ظلم ہے۔ زبردستی ہمیں بستر مرگ سے اٹھایا جا رہا ہے۔" محسن بولا۔

غالب نے آہ بھر کے کہا۔ "بن گیا طبیب آخر تھا جو راز داں اپنا۔"

ڈاکٹر نے مجھے ان دونوں کے لیے ایک ہی نسخہ لکھ کر دیا۔ اس میں چند ملٹی وٹامن کیپسول اور آئرن کی گولیاں تھیں جن کے نام مختلف تھے۔ پاکستان میں یہ دوسرے نام سے دستیاب تھیں۔ ابھی ڈاکٹر رخصت ہوا تھا کہ رابعہ، نازو اور گل بھی پہنچ گئیں۔ یکلخت ان سب کے حسن کی تابندگی میں تازگی اور شگفتگی کا طلسمی انداز شامل ہو گیا تھا۔

میں نے رابعہ کو ناشتے کی طرف کھینچ لیا۔ "آؤ بھئی ہم تو شروع کریں۔"

رابعہ نے کہا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کچھ صبر کرو۔"

میں نے کہا۔ "بھئی غالب اور محسن بیمار ہیں، ممکن ہے ان کی وجہ سے تیمار دار بھی کچھ نہ کھائیں۔ ہم کیوں بھوکے رہیں ان کی خاطر۔"

غالب نے کہا۔ "نازو سب کچھ کر سکتی ہے میری خاطر۔"

"کیوں نہیں۔" نازو نے غالب کی جانب پیش قدمی کی۔ "میں تم کو اٹھا کر اپنے پیروں پہ کھڑا کر سکتی ہوں۔ تھوڑی سی ورزش کرا سکتی ہوں جس سے تم بالکل فٹ ہو جاؤ گے۔ تمہارے جسم کے سارے کل پرزے بالکل ٹھیک کام کرنے لگیں گے۔ تمہارا صحیح علاج یہی ہے۔"

جب غالب نے دیکھا کہ نازو کا موڈ خطرناک ہے تو اس نے بستر سے اٹھ کر باتھ روم کی طرف دوڑ لگاتے ہوئے کہا۔ "میں آج ہی خان سے کہوں گا اس نرس کو نہ جانے دے۔ وہ بدصورت ہے تو کیا۔ شرافت تو ہے اس میں۔"

نازو نے کہا۔ "تم پانچ منٹ میں غسل صحت کر کے آ گئے تو میں کر لوں گی ناشتا۔"

غالب نے باتھ روم کے دروازے سے سر نکال کے کہا۔ "اتنی جلدی ہے تو اپنا اور میرا ناشتا اندر لے آؤ۔" اور پھر زور سے دروازہ بند کر لیا۔

گل محجوبانہ انداز میں کھڑی ہنستی رہی۔ رابعہ نے سمجھ لیا تھا کہ وہ بھی محسن کے ساتھ ہی ناشتا کرے گی چنانچہ اس نے میرا ساتھ دیا۔

رابعہ نے آہستہ سے کہا۔ "کسی بہانے محسن کو بتا دینا چاہیے صاف نہ سہی، اشاروں میں۔"

میں نے کہا۔ "ابھی نہیں۔"

رابعہ نے کہا۔ "تم دیکھ نہیں رہے ہو گل کس طرح ذہنی طور سے جال میں گرفتار ہو رہی ہے۔"

"محسن کا رویہ غلط ہے۔ کیا وہ خود نہیں سمجھتا یہ بات؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے قصوروار ہم بھی ہیں۔ ہم نے گل کو اشتعال کے ڈر سے بے خبر رکھا۔ پہلے تو خیر ایک مصلحت تھی۔ یا ضرورت تھی مگر اب اسے معلوم ہو جانا چاہیے۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "گل کو سمجھا دینا بہتر ہے تاکہ وہ آسانی سے سمجھ لے۔ کوئی مشکل پیدا نہ ہو اس کے لیے یا ہمارے لیے۔"

محمد خان ایک دم اندر آ گیا۔ "اچھا۔ ابھی ناشتا چل رہا ہے۔"

اسے دیکھتے ہی میں اپنی بات بھول گیا۔ میں نے کہا۔ "سب آپ کا حسن انتظام ہے خان صاحب! ہم اپنی مرضی سے کیا کر سکتے ہیں۔"

"جو آپ کا جی چاہے کریں۔" خان نے کہا۔

"ہم کب چاہتے تھے کہ اگلے دن سو کر اٹھیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "کیا مقصد تھا آخر تمہاری اس حرکت کا؟"

انہوں نے حیران ہو کے کہا۔ "میں سمجھا نہیں۔"

میں نے کہا۔ "کل دوپہر کے کھانے کے بعد تم نے کافی منگوائی اور دو آئیسکریم ملوائی تھی۔ کیا ضرورت تھی اس کی؟"

انہوں نے معصوم نظر آنے کی بہترین اداکاری کی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں خود یہاں موجود تھا۔ تمہارے ساتھ وہی کافی میں نے بھی پی تھی۔"

بحث کے باوجود خان نے میرا یہ الزام درست تسلیم نہیں کیا کہ اس نے کسی خاص مقصد کے تحت کوئی غلط حرکت کی تھی۔ رابعہ نے مجھے بروقت اشارے سے روک دیا ورنہ شاید نوبت لڑائی تک آ جاتی۔ ابھی ہم محمد خان کے مہمان تھے لیکن ہم اپنے آپ کو ایسا مہمان نہیں سمجھ سکتے تھے کہ ہماری حیثیت بن بلائے مہمان سے بدتر ہو جائے اور محمد خان بگڑ جائے تو سچ مچ خونی خان بن جائے۔ ابھی بہت سے معاملات میں ہم اس کی مدد کے محتاج تھے۔ وہ مصیبت میں ہمارا پہلا دوست تھا جو حقیقی معنوں میں ہمارا مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ موجودہ حالات میں ایک دوست کو دشمن بنا لینا سخت نادانی ہوتی۔

ناشتا ختم کرتے ہی میں نے سگریٹ جلائی اور خان کے ساتھ باہر چلا گیا۔ "مجھے ایک ضروری بات کرنی تھی تم سے۔"

خان نے باہر آتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ "میرے کمرے میں آ جاؤ۔"

میں نے خان کا کمرا ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ ویسے تو یہاں جو کچھ تھا اسی کا تھا مگر پھر بھی میرے ذہن میں ایک تجسس تھا کہ اس شخص کا ذاتی کمرا کیسا ہوگا جو ایک نامی گرامی ڈاکو کی حیثیت سے خونی خان کہلاتا ہے لیکن خود کو عام ڈاکو نہیں سمجھتا۔ جس کی نگاہ میں ناسا ترلوچن جیسے کروڑپتی گرگے دہشت میں ہیں اور جو دعوے کرتا ہے کہ مقامی انتظامیہ میں نیچے سے اوپر تک سب اس کے ساتھ ہیں۔ اس کا ذہن شاہانہ اور ہمارے ساتھ اس کا رویہ شریفانہ تھا۔ اس کی بہت سی باتیں میرے لیے ناقابل فہم تھیں۔

اس کا کمرا دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ اس میں شان و شوکت کے اسباب مفقود تھے۔ خان سختی کے تخت پہ سونے کا عادی تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں ایک معمولی صوفہ سیٹ تھا اور ایک سینٹر ٹیبل۔ اس ٹیبل پہ ایک جا نماز رکھی تھی۔ میں چونکا لیکن میں نے اس بارے میں خان سے کوئی سوال نہیں کیا۔

"کل رات میری دلاور سے بات نہیں ہو سکی۔" میں نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میری بات ہوئی تھی۔" خان نے کہا۔ "ترلوچن نے اسے بتا دیا تھا کہ تم اس سے براہ راست بات کرنا چاہتے ہو۔"

"پھر اس نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔ اس نے آج دوپہر بارہ بجے کے بعد ترلوچن کی کال میں موجود رہنے کا وعدہ کیا ہے۔ بارہ بجے کے بعد تم اس سے فون پہ بات کر لینا۔"

"اس نے یہ نہیں بتایا کہ آخر وہ کیوں ملنا چاہتا ہے؟"

"اس نے کہا تھا کہ وہ تمہیں کوئی تحفہ دینا چاہتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ تم اس سے ملو۔"

"تحفہ؟" میں نے کہا۔ "وہ حرام زادہ مجھے تحفہ دینا چاہتا ہے۔ اب تک جتنے تحفے ملے ہیں مجھے اس کی طرف سے ان کے جواب میں نے بھی پیش کیے ہیں۔ وہ کوئی نیا جال پھیلا رہا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں بھی تیار ہوں۔"

"سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم مت اٹھانا۔۔۔" میں نے اسے

www.paksociety.com

یہ تو بتا دیا تھا کہ میں اپنے مہمانوں پر آنچ نہیں آنے دوں گا اور ان کے خلاف کوئی سازش کی گئی تو یہ سازش کرنے والوں کے حق میں برا ہوگا۔ ولاور نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اس میں کوئی دھوکے فریب والی بات نہیں ہے۔ سکندر بخت جہاں چاہے جیسے چاہے مجھ سے مل لے۔"

میں جانتا تھا کہ ولاور جیسے مکار اور بے ضمیر شخص کی زبان سے نکلے ہوئے کسی لفظ کو قابل اعتبار نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ خان کو بے وقوف بنا سکتا تھا، مجھے نہیں۔ اس کے شیطانی ذہن میں کیا تھا، یہ اس سے گفتگو کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ ولاور کے موضوع پر خان سے مزید کچھ کہنے کا فائدہ نہیں تھا۔

میں نے اچھی طرح غور کرنے کے بعد محتاط انداز میں کہا۔ "خان صاحب! میں کل ہی ایک بات پوچھنا چاہتا تھا لیکن جواب کہ آپ نے ہمیں سلا دیا۔"

خان مسکرایا۔ "اب تمہارے سامنے یہ اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ میں نے ایسا ڈاکٹر کے مشورے پر کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ سب لوگ تھکن اور اعصابی کشیدگی میں مبتلا ہیں۔ ان کو آرام کی ضرورت ہے۔ ویسے تم آرام نہ کرتے۔ تم سب نے اپنی اپنی نظریں یہاں رکھی تھیں۔"

میں نے کہا۔ "اس وضاحت کے بعد مجھے کوئی شکایت نہیں رہی۔ یہ بے شک نیک نیتی پر مبنی دوستانہ اقدام تھا۔ کل دوپہر مجھ سے نادانستگی میں ایک غلطی ہوئی۔ میں جانا چاہتا تھا اپنے کمرے میں لیکن کمرے ایک سے ہیں۔ میں کسی اور کمرے میں چلا گیا۔ معلوم نہیں وہ کمرا ایسے ہی کھلا رہتا ہے یا غلطی سے کھلا رہ گیا تھا۔"

خان نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کون سا کمرا؟"

میں نے کہا۔ "وہ کمرا شاید اسلحہ خانہ ہے۔ وہاں میں نے سب کچھ دیکھا۔ مشین گن سے آٹومیٹک رائفل، ریوالور، دستی بم اور ہر قسم کے کارتوس تک۔"

خان نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں اسلحہ دیکھ کر حیران یا پریشان نہیں ہوا۔ یہ سب ہمارے لیے بھی وہ کھلونے تھے جن سے ہم دن رات کھیلتے رہتے ہیں۔ اگر میں طبلہ، سارنگی اور ستار دیکھتا تو ضرور حیران ہوتا کہ ان چیزوں کا یہاں کیا کام؟"

محمد خان نے کہا۔ "میں ستار بہت اچھا بجاتا تھا۔ بہت عرصہ ہوا ریاض کیے۔ روی شنکر، استاد عبدالحلیم جعفر خان اور پاکستان کے محمد شریف کو میں نے بہت سنا ہے۔"

میں اس انکشاف پر سخت حیران ہوا مگر میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس کمرے میں جو اسلحہ میں نے دیکھا ہوا تھا میرا مطلب ہے وہ عام اسلحہ نہیں تھا۔"

"عام اسلحہ ہم استعمال بھی نہیں کرتے۔ عام آدمی کے لیے خنجر بھی اسلحہ ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ریوالور رکھ لیتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ اسلحہ غیر ملکی ساخت کا تھا مگر اس پر مخصوص شناختی نشانات تھے جن کو بڑی محنت سے مٹا دیا گیا تھا۔ ریتی سے رگڑ کے یا کسی اور چیز سے گھس کر۔ لیکن میری نظر نے پھر بھی پہچان لیا کہ یہ اسلحہ کہاں سے آیا ہے۔ میں نے تمہیں چوہدری ولاور کے بارے میں اور اس کے کاروبار کے متعلق ساری بات بتا دی تھی۔ یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کے اور میرے درمیان پہلے ذاتی دشمنی تھی کیونکہ وہ میرے باپ کا قاتل تھا لیکن اس کے بعد ہماری دشمنی کی سطح بدل گئی۔ ہم سب دوستوں اور جاں نثاروں نے چوہدری ولاور اینڈ کمپنی کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ ہم نے اس کے اسلحے کے متعدد ذخائر تباہ کیے اور اس کے کاروبار کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہمارے حساب میں بہت سی کامیابیاں ہیں مگر ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم ولاور کو روکنے میں کامیاب رہے۔ اس نے بہت نقصان اٹھایا مگر ابھی تک اس کا گروہ ختم نہیں ہوا اور اس کا کاروبار ختم نہیں ہوا۔ ہم اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور لگے رہیں گے۔ وہ مختلف راستوں سے اسلحہ مشرقی پاکستان بھیج رہا ہے اور ان کا ایک راستہ یہ بھی ہے جس پر چلتے ہوئے ہم یہاں تک آگئے۔ جہاں تک پہنچے وہ سب شکاری آگئے جو شرافت، انسانیت اور آدمیت کے بھی شکاری ہیں۔ یہاں ترلوچن جیسے ٹھاکر ان کے ساتھ مل گئے ہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خدا ہمیں کہیں تنہا اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ یہاں اس نے تمہیں ہماری مدد کے لیے بھیج دیا۔"

محمد خان نے اپنے دونوں کانوں کو چھوا۔ "میں بہت گنہگار ہوں بابا! خدا مجھ سے کوئی نیک کام نہیں لے گا۔ وہ جانتا ہے کہ میں تو شیطان کا چیلا ہوں۔"

"ایسا مت سوچو محمد خان! تمہارا اعتراف گناہ اسے پسند آیا ہوگا۔ وہ جسے چاہے نیکی کی توفیق دے۔ مجھے بتاؤ کیا تم مسلمان نہیں ہو؟"

"خدا ضرور جانتا ہے کہ میں اس کا بندہ ہوں۔"

"بھارت میں کروڑوں مسلمان آباد ہیں۔ میں ان کی مذہبی وابستگی اور جذباتی ہمدردی کی بات نہیں کرتا۔ وہ اپنا مستقبل خود استوار کرتے ہیں۔ ذہنی طور پر وہ پاکستان کے ہی نہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کے ساتھ ہیں مگر عملاً وہ بھارتی شہری ہیں اور کوئی انھیں پاکستان کا ایجنٹ یا ففتھ کالم کہے تو یہ ظلم ہے۔ میں تم سے بھی یہ توقع نہیں رکھتا کہ تم اس [illegible] دو [illegible] کو ہم ایک جیسا ہے کم مقدس نہیں کہتے

ہے۔ ایک سوال ضرور کروں گا جس کا جواب تم صرف ایک مسلمان کی حیثیت سے دے سکتے ہو۔ احادیث اور قرآن کے فرمودات پڑھنا چھوڑ دو۔ اس شخص کو کیا کہتے ہو جو صرف نام کا مسلمان ہو، خود کو مسلمان کہتا ہو مگر اس کا وجود مسلمانوں کے درمیان کشت و خون کا باعث ہو۔ جو خود مسلمانوں کے ہاتھ میں خنجر دیتا ہو کہ وہ دوسرے مسلمان کی پیٹھ میں گھونپ دے۔ جو بھائی کو بھائی کے ہاتھوں قتل کراتا ہو اور اس خونی کاروبار سے اپنی تجوریاں بھرتا ہو؟"

"خدا کی قسم، وہ مسلمان نہیں شیطان ہے۔" محمد خان بولا۔

"چوہدری ولاور اور اس کے ساتھی آخر کیا کر رہے ہیں؟ یہ کس کے ہاتھ میں اسلحہ دے رہے ہیں؟ مشرقی پاکستان میں مارنے والے بھی مسلمان ہیں اور مرنے والے بھی۔ پاکستان اور مسلمانوں کے دشمن یہ اسلحہ چوہدری ولاور اینڈ کمپنی کو فراہم کر رہے ہیں کہ یہ آگے پہنچاؤ۔ یہ کام کافر اور یہودی کریں تو ان سے کیا گلہ مگر یہ تو خود مسلمان ہیں مگر جیسا کہ تم نے کہا، یہ شیطان ہیں۔ اس کاروبار میں خوب کمائی کر رہے ہیں۔ یہ اسلحہ لا رہے ہیں، اپنا مال ہے، بیچ رہے ہیں۔ یہ مخصوص گروہ اور سیاسی طاقت کے آلۂ کار ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ اسلحہ کہاں سے آیا ہے۔ میرے لیے پریشانی کی بات یہ ہے خان صاحب کہ وہ تمہارے پاس کیسے پہنچا؟"

خان چونکا۔ "میرے پاس؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، تمہارے پاس وہ اسلحہ ہے جو چوہدری ولاور نے اسمگل کیا اور کچھ عرصہ پہلے اس پر مخصوص شناختی نشانات کے ساتھ مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کو ہوا دینے کے لیے بھیجا۔"

خان ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ میں کوئی فیصلہ عجلت میں نہیں کرتا۔ میں نے اس اسلحے کا غور سے معائنہ کیا تھا۔ خدانخواستہ میں تم پر یہ الزام عائد نہیں کر رہا ہوں کہ تم چوہدری ولاور کے ساتھی ہو یا تمہارے ساتھیوں میں کوئی ایسا بدبخت ہے۔"

"پھر کیا کہہ رہے ہو تم؟" خان کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"بہت تھوڑا سا اسلحہ ہے خان! وہ لوگ بحری جہازوں سے بھر بھر کے بھیجتے ہیں۔ ٹرک بھر بھر کے روانہ کرتے ہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے کسی آدمی نے یہ اسلحہ کہیں سے خریدا ہے یا لوٹا ہے تو معلوم کرو کہاں سے اور خریدا ہے تو کس سے؟ مجھے شک نہیں یقین ہے کہ ان کے راستے [illegible] معلوم ہو جائے گا۔ تھوڑا بہت جو بھی نکال لیتے [illegible]"

خان نے سر ہلایا۔ "آؤ میرے ساتھ۔ پہلے مجھے بتاؤ کہ تم نے کیسے شناخت کی؟"

ایک بار پھر میں خان کے ساتھ اس کمرے میں پہنچا جہاں میں نے وہ اسلحہ دیکھا تھا۔ یہ کمرا اب مقفل تھا مگر خان نے قفل کو جیب سے ایک چابی نکال کر کھول لیا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے اور لائٹ جلا کے میں نے ایک ایک چیز اٹھائی اور خان کو وہ مخصوص نشانات دکھائے جو بڑی محنت سے مٹانے کی کوشش کی گئی تھی۔

خان نے کہا۔ "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر اسلحہ فراہم کرنے والوں کو شناختی علامات بنانے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا۔ "ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسلحہ ساز فیکٹریاں یہ نشانات خود مشینوں سے لگا دیتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے الگ کارخانے قائم نہیں کیے گئے ہیں جہاں بغیر مارک کے اسلحہ بنایا جائے۔ ان کے پاس پرانے ذخائر بھی بہت ہیں۔ بیشتر اسلحہ انھی پرانے ذخیروں کو ختم کرنے کے لیے ادھر ادھر بھیج دیا جاتا ہے۔ پھر یہ نشانات خود دہشت گردوں کے لیے بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اسلحہ فراہم کرنے والوں کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلحہ راستے میں غائب ہو رہا ہے۔ ان کے مخبر اطلاع کر دیتے ہیں کہ مخصوص نشانات والا اسلحہ غیر متعلقہ لوگوں کے پاس بھی دیکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ حفاظتی انتظامات سخت کر دیتے ہیں اور چوروں کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چوہدری ولاور نے ذاتی مفاد میں ایک کام یہ کیا کہ دیسی ساخت کے اسلحہ پر ایسے ہی نشانات بنا دیے۔ میں بتا چکا ہوں کہ میرے والد کی فیکٹری میں زرعی مشینری کے آلات اور پرزے بنتے تھے۔ جب وہاں انھی مشینوں پر اسلحہ بننے لگا اور میرے والد کو پتا چلا تو انھیں راستے سے ہٹا دیا گیا۔ پھر میں بیچ میں کود پڑا اور وہ میرے ضمیر کا سودا نہ کر سکے تو میرے دشمن ہو گئے۔ اب تو خیر چوہدری ولاور نے وہ فیکٹری ختم کر دی ہے اور مشینوں کو کہیں اور شفٹ کر دیا ہے۔ اس فیکٹری کی جگہ اس حرام زادے نے ایک خیراتی اسپتال بنانے کا اعلان کیا ہے اور وہ بھی میرے باپ کے نام پر۔ لیکن دیسی اسلحے پر غیر ملکی نشانات لگانے کا سلسلہ شاید ابھی تک جاری ہوگا۔ اس طرح وہ زیادہ منافع کماتا ہوگا۔"

"یہ اسلحہ غیر ملکی ہے یا غیر ملکی نشانات والا دیسی؟"

"یہ دیسی اسلحہ ہے۔" میں نے پورے یقین کے ساتھ فیصلہ دیا۔ "جو چوہدری ولاور کے کسی کارخانے میں ڈھالا گیا ہے۔ اس پر غیر ملکی ساخت کے نشانات ٹھیک اس جگہ پر نہیں ہیں جہاں برآمد شدہ اسلحے پر ہوتے ہیں۔ دوسری چیز ہے سیریل نمبر، وہ ان پر نہیں ہیں۔ یہ سو فیصد چوہدری ولاور کا مال ہے۔"

خان نے سر ہلا کے کہا۔ "میں معلوم کر لوں گا۔" پھر اس نے کمرے کو اسی طرح مقفل کیا اور ہم اسی کمرے میں لوٹ آئے۔

میں نے کہا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری ذات بہت پُراسرار ہے۔ تم خود کو عام ڈاکو نہیں سمجھتے، خاص ڈاکو کہتے ہو۔ خدا سے ڈرتے بھی ہو اور زبان سے ہی نہیں عمل سے بھی ثابت کرتے ہو کہ تم مسلمان ہو۔ شاید مجھ سے بہتر مسلمان ہو۔ میں خدا کو یاد ہر وقت کرتا ہوں لیکن تمہاری طرح جائے نماز پر بیٹھنے کی توفیق مجھے نہیں ہوتی۔ ویسے تو ہر آدمی کی ذات مجموعہ ہوتی ہے تضادات کا لیکن یہاں مجھے سارا ماحول بڑا ہی آسیب زدہ اور پُراسرار محسوس ہوتا ہے۔"

اس نے کہا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

میں نے کہا۔ "ایک تو ہر وقت یہاں اُلّو بولتے رہتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی مہمان کی حیثیت سے ہماری خاطر کرنے والے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ کال بیل بجاتے ہی نہ جانے کہاں سے نکل آتے ہیں۔"

"وہ سب یہیں رہتے ہیں۔" خان نے سرسری انداز میں کہا۔

"اور تمہارے ساتھی؟" میں نے کہا۔ "کل رات میں نے دیکھا تھا...."

"کیا دیکھا تھا؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"کچھ لوگ جیپ میں آئے تھے۔ ایک مرد اور عورت ان کے ساتھ تھے۔" میں نے کہا۔ "جو قیدی معلوم ہوتے تھے۔"

خان نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ یوں جیسے اس نے میری بات کو قابل یقین نہیں سمجھا یا یقین کیا تو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس نے انٹرکام جیسے ایک بٹن کو دبا کے کہا۔ "سلیمان کو بھیج دو۔" اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سلیمان بہت ذہین آدمی ہے۔ پولیس کا مخبر بھی رہا ہے۔"

سلیمان گھنی داڑھی والا کوتاہ قامت شخص تھا۔ ساڑھے پانچ فٹ قد کے ساتھ اس کا پھیلا ہوا جسم زیادہ بے ہنگم نظر آتا تھا۔ اس کے سر پر ایک بھی بال نہیں تھا اور استرا پھری ہوئی سر کی جلد پر ایک گہرے زخم کا نشان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کلہاڑی کے وار کا نشان تھا۔

"سلیمان! کل رات تم لوگ کہیں گئے تھے؟"

سلیمان نے چونک کے مجھے دیکھا۔ "ہاں شاہ جی! مگر میں اکیلا نہیں تھا۔"

"اپنے ساتھ کیا لے گئے تھے تم؟"

"اپنا اپنا زیور شاہ جی!" سلیمان نے کہا۔

"اور جب واپس آئے تھے تو غالباً زیور کہاں سے لائے تھے؟ کچھ مال دیکھا ہے میں نے ایسا ہی تھا۔"

سلیمان تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ مال چھینا تھا کسی سے؟"

سلیمان نے کہا۔ "نہیں شاہ جی! اطلاع تھی ایک گھر سے۔ گھر والوں کو ہم ساتھ لے آئے تھے۔"

"وہی میاں بیوی؟"

"ہاں جی! بڑے سخت جان تھے دونوں۔ کچھ نہیں بتاتے تھے پہلے تو مگر ہم نے اگلوا لیا۔ انھوں نے یہ سب ایک پیر سے خریدا تھا۔ ایک ہزار نقد دیے تھے اور زیور دیا تھا۔"

محمد خان نے کہا۔ "کس لیے؟"

"انھیں کسی سے بدلہ لینا تھا۔ ان کی ایک بیٹی، شوہر کی ایک اور بیوی کی دو بہنوں کو باری باری اٹھا لیا گیا تھا۔ مطلب یہ ایک وارا تھا اور کوئی سیٹھ تھا۔"

"بے وقوف! پھر انھیں کیوں لے آئے تھے اپنے ساتھ؟" محمد خان نے برہمی سے کہا۔

"ان سے معلوم تو کرنا تھا شاہ جی کہ اس قسم کا اسلحہ کیوں جمع کیا تھا انھوں نے۔ اسی سیٹھ کے گھر میں موجود تھے وہ، جہاں ہم گئے تھے۔ شوہر تو پاگل ہو گیا تھا، کہنے لگا کہ تم لوگ چلے جاؤ ورنہ تم بھی مارے جاؤ گے۔ وہ بھی ہم نکال لیا تھا لیکن ہم نے اسے قابو کر لیا اور ساتھ لے آئے۔ اس سیٹھ کے گھر پھر جائیں گے تو انھیں ساتھ لے جائیں گے۔ ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ ان کے بتانے پر ہم پیر دہشت کو لے آئے تھے۔ پیر دہشت نے ایک ہزار بھی واپس کر دیا اور زیور بھی اور ہاتھ جوڑتا رہا کہ یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ اس نے چوری کی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ مال کس کا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ اس نے تو بس موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ ان میاں بیوی سے پیسے لے کر جگہ بتا دی تھی کہ ان کو اپنے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے اسلحہ چاہیے تو خود نکال لیں۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میاں بیوی کتنا مال نکالا۔"

"اچھا! وہ پیر دہشت کہاں ہے؟"

"اسے بھی واپس چھوڑ آئے ہم۔" سلیمان نے کہا۔

"مگر وہ رہتا کہاں ہے۔ اگر دوبارہ ملنا ہوا اس سے تو وہ کہاں ملے گا؟"

"اسی مندر میں جہاں سے ہم اسے لائے تھے۔ شہر کے باہر اشوکا اسٹیل اور جیناما سینٹر کے پیچھے والی آبادی کی شمالی طرف نالہ ہے جس میں فیکٹری کا گندا پانی بہتا ہے۔ وہاں پانچ ہزار مزدور رہتے ہیں۔" سلیمان نے کہا۔

اب میں نے کہا۔ "کیا آج رات کسی وقت ہم وہاں جا سکتے ہیں۔ ایسے کہ کسی کو کچھ پتا نہ چلے۔ میں اس پیر دہشت سے ملنا چاہتا ہوں۔"

جواب محمد خان نے دیا۔ "ہم آج رات اس سے ضرور ملیں گے۔" پھر اس نے سلیمان کو جانے کا اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ "یہ آدمی واقعی ہوشیار ہے۔ اس نے میرے لیے سب کچھ بتا دیا اور بہت کچھ گول کر گیا۔"

"میرا خیال ہے کہ اس نے کچھ چھپایا نہیں۔"

"اس نے کسی کا بھی نام نہیں لیا۔" میں نے کہا۔ "نہ ان میاں بیوی کا جن کو یہ لوگ اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ نہ ان کی کسی بہن کا اور نہ اس بدمعاش کا اور سیٹھ کا جو اصل اہم تھا۔"

محمد خان نے کہا۔ "نام غیر ضروری تھے۔ وہ سب مجھ کو اس نے بتایا۔"

میں نے کہا۔ "کیا رات کو تم بھی ہمارا ساتھ دو گے؟"

محمد خان نے کہا۔ "اگر تم نہیں چاہتے تو نہیں۔"

"یہ بات نہیں۔ ہم وہاں بھیس بدل کے جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ لوٹ کر نہ آ سکیں۔"

"کیا مطلب، تم یہاں سے جانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ظاہر ہے ہم یہاں تمہارے مہمان کب تک بن کے رہ سکتے ہیں۔ ہمارے پاس وقت کم ہے اور ہمارے کام کی نوعیت بھی ایسی ہے کہ خود ہم اپنے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہمارا واپس آنا یا نہ آنا حالات کے رحم و کرم پر رہتا ہے۔ ہم اس حقیقت سے بھی آنکھ نہیں چرا سکتے کہ خوش قسمتی کے ملاقات پر انحصار غلط بھی ہو سکتا ہے اور بہت ممکن ہے ہم میں سے کسی کا ذرا سی بھی بھول ہو تو سارے ارادوں کو خاک میں ملا سکتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم ایک ساتھ گئے مگر ایک ساتھ واپس نہ آ سکے۔ تقدیر کے راستے کہیں سے کہیں لے گئے۔"

"تمہارے مسائل کو سمجھتا ہوں لیکن آج رات کیا سب کا جانا ضروری ہے؟" محمد خان نے کہا۔ "میں غالب اور محسن کے معاملے میں سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ ان کو ابھی یہاں رہنے دو۔ پھر جا کے ہوگی تم پہلے تو ولاد سے بات کر لو۔"

"اگر مجھے ولاد سے ملاقات کے لیے جانا پڑا۔ تو مجھے تمہاری ضرورت ہوگی محمد خان صاحب۔" میں نے کہا۔

"کسی ضرورت؟ ولاد سے بات کر لو۔"

"ولاد بہت مکار آدمی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم سے اس کی کیا بات ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ترلوچنی سے میری حفاظت کے لیے اس کی ضمانت لو۔ کوئی ایسا جال پھیلاؤ کہ ولاد چاہے بھی تو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور اس کی کوشش کرے تو خود اس میں پھنس جائے۔"

محمد خان نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ولاد سے تمہاری ملاقات میں تمہارے لیے کوئی خطرے کی بات نہیں ہوگی۔ تم خان کے مہمان ہو، یہ بات میں ترلوچنی کو اپنے طور پر اچھی طرح سمجھا چکا ہوں۔ چوہدری ولاد کو ترلوچنی سمجھا دے گا۔"

"تم اسے نہیں جانتے۔ وہ شیطان کو بھی چکمہ دے سکتا ہے۔ اپنے باپ کے ساتھ بھی دھوکا کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"حفاظتی انتظامات کی ذمے داری مجھ پر چھوڑ دو۔ کیا تم اکیلے جاؤ گے؟"

"ہاں، ولاد سے ملنے کے لیے میں اکیلا ہی جاؤں گا لیکن آج رات اس پیر دہشت کے ساتھ ملاقات کے لیے میرے ساتھ کون کون جائے گا، اس کا فیصلہ میں مشورے کے بعد کروں گا۔" میں نے کہا۔

ایک بار پھر خان نے وائرلیس فون پر ترلوچنی کا نمبر ملایا۔ ریسیور اسی خوش آواز آپریٹر یا سیکریٹری نے اٹھایا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے ترلوچنی کی آواز سنی۔

"میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔" میں نے بے تکلفی سے اپنے اصل نام کا اعلان کیا۔

"چوہدری ولاد سے بات کرو۔" ترلوچنی نے بیزاری سے کہا۔

"کیا حال ہے اپنے سکندر صاحب؟" چوہدری ولاد نے خوش دلی سے کہا۔ "کہاں سے بول رہے ہو؟"

"اپنے مقبرے سے۔ تمہاری آواز کہاں سے برآمد ہو رہی ہے؟" میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ "تمہاری قسمت پر مجھے واقعی رشک آتا ہے۔ کوئی نہ کوئی اسرافیل ہی بجا جاتا ہے تمھیں۔"

میں نے کہا۔ "خدا نے ہمیں سہاروں سے کبھی مایوس نہیں کیا۔ کیونکہ ہم نے کبھی اس سے امید کا رشتہ نہیں توڑا۔"

"یہ سب کہنے کی بات ہے اپنے سکندر صاحب! بکرے کی ماں بھی خیر منگتی رہتی ہے لیکن اسے چھری سے بچنا نصیب نہیں ہوتا۔"

"یہی بات میں تمہارے لیے کہوں گا تو بکرے کا تمہیں حوالہ دوں گا۔" میں نے کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ اچانک تمہیں مجھ سے ملنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟ ہماری ملاقات کو زیادہ عرصہ تو نہیں گزرا۔"

"بات کچھ بھی نہیں سکندر صاحب! آپ کے لیے کسی نے وطن سے ہماری معرفت تحفہ بھیج دیا۔" ولاد بولا۔ "ویسے تو ہم دشمن ہیں مگر کبھی کبھی مروت بھی کر جاتے ہیں۔ جیسے تم نے بس مروت میں اپنے وعدے کا لحاظ رکھا۔ تم بھی کوئی بھی مار سکتے تھے۔ ترلوچنی حیران ہوا تھا لیکن میں نہیں۔"

وہ چاہتا تھا کہ جواب میں، میں خیر سگالی کے جذبات کا مظاہرہ کرتا

www.paksociety.com

چاہتے ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔

"ہاں یہی سمجھ لو۔ ویسے بھی جو تحفہ کسی نے تمہارے لیے بھیجا ہے وہ اپنے کس کام کا؟" ولادور نے کہا۔

"میں نے بھی تمہارے الفاظ کا مطلب وہ نہیں سمجھا جو تم نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ میں نے تمہاری نیت کو سمجھا اور دھوکے میں نہیں آیا۔ یہ تحفے والی بات بھی کوئی فریب کاری ہے۔ لیکن میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ میں یہ تحفہ وصول کرنے آؤں گا۔ اس کا فیصلہ وقت کرے گا کہ جواب میں تمہیں کیا تحفہ دیا جائے۔"

"تم اپنے اطمینان کے لیے اپنے لشکر کے ساتھ آؤ۔ اگر تمہیں کوئی ڈر ہے؟" ولادور نے کہا۔

میں نے کہا۔ "میں اکیلا آؤں گا مگر وقت اور مقام کا تعین میں کروں گا۔ آج میں مصروف ہوں۔"

ولادور ہنسا۔ "تمہارے کمانڈو تو ابھی اس قابل نہیں ہوئے ہوں گے کہ اپنی ٹانگوں پر سیدھے کھڑے ہو کے چل سکیں۔"

میں نے کہا۔ "میں پھر واضح کر دوں کہ میرے ساتھ کوئی نہیں آئے گا۔"

"وہ کیا نام ہے ان کا؟ اپنے شیروانی صاحب! انھیں تو لے ہی آؤ۔ ان کے بغیر تمہاری جوڑی پوری نہیں ہوتی۔" ولادور بولا۔

میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اکیلا آ جائے لیکن تمہیں بہت مایوسی ہوگی اسے دیکھ کر۔ دل چاہے تو اس سے مقابلہ کر کے دیکھ لینا۔ حسن کا حوصلہ بھی وہی ہے اور حسن بھی۔"

"اس کا حوصلہ ہم متعدد بار دیکھ چکے ہیں اپنے سکندر اعظم صاحب! اور تمہارا حوصلہ بھی۔ بہت جلد تمہیں احساس ہو جائے گا کہ وقت اب کس کا ہے۔ تم بہت آگے نکل آئے تھے۔ شاید اب تمہاری واپسی کا سفر شروع ہوگا۔ بشرطیکہ تم نے واپسی کا یہ آخری راستہ بھی خود ہی بند نہ کر دیا۔" ولادور نے کہا اور لائن کٹ گئی۔ اس نے ریسیور رکھ دیا تھا اور اس کے آخری الفاظ کی بازگشت باقی رہ گئی تھی۔ یکلخت ولادور کے لہجے میں اس کی فطرت کی تمام سفاکی اور درندگی بولنے لگی تھی۔ اس کی دھمکی میں چھپا ہوا الٹی میٹم کسی نامعلوم خطرے کا الارم بن گیا تھا۔

محمد خان نے کہا۔ "تم پریشان ہو گئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں میں اس کی بات سمجھ نہیں سکا۔ یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ اس کے ذہن میں کیا ہے۔ خیر معلوم ہو جائے گا وقت آنے پر۔ تم کل اس سے میری ملاقات کا بندوبست کرا دو۔"

"میں ترلوچن سے بات کر لوں گا۔" خان نے کہا۔

"اب شام تک میرے کچھ کام ہیں۔ جو تم کرا سکتے ہو۔ ایک تو ہم سب کے لیے یہاں سے نکلنے کا انتظام کرنا ہوگا۔ ہم آپس میں مشورہ کر کے تمہیں بتا دیں گے کہ سفر کے لیے کس قسم کی گاڑی درکار ہوگی۔ ہم پیسہ خرچ کر سکتے ہیں لیکن … اپنے سارے کام خود نہیں نمٹا سکتے۔"

خان نے کہا۔ "تمہارے سب کام ہو جائیں گے …"

میں نے کہا۔ "ہم سب اپنا یہ حلیہ بھی بدل چکے ہیں۔ کراچی اور لاہور میں ہم میک اپ کرنے والوں کی خدمات حاصل کر لیتے تھے۔ ایک عورت نے یہاں بھی ہماری مدد کی تھی۔ وہ بیچاری اس جرم کی پاداش میں اپنی جان سے گئی۔"

"میک اپ کرنے والے یہاں بہت ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہمارا چہرہ بالکل سب کچھ ایسا ہو جانا چاہیے کہ ہم آسانی سے کہیں بھی چلے جائیں۔ میں اور حسن فرانسیسی روانی سے بولتے ہیں۔ انگریزی سب کو آتی ہے۔ اگر ہم فرانسیسی بن جائیں تو ہمارے لیے سارے ہندوستان میں کہیں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا لیکن ہمارے پاس غیر ملکی پاسپورٹ ہونے چاہئیں۔ کیا وہ بازار میں ملتے ہیں؟"

"خریدار کو بازار میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ مانگنے والے کو بھیک مانگنے کا حق بھی نہیں ملتا۔" خان صاحب نے ایک فلسفیانہ بات کی۔

میں نے کہا۔ "آج رات کسی خاص تیاری کی ضرورت نہیں۔ میرے ساتھیوں میں سے کوئی ایک میرے ساتھ جائے گا۔"

"وہ ساتھ جائے گی؟" خان صاحب نے تعجب سے …

میں نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "چونکہ ہمیں ایک … سے ملنا ہے اس لیے ہم سیدھے سادے … نظر آنا پسند کریں گے۔ سلیمان کا کام ہمیں اس کے گھر تک پہنچانے کے بعد ختم ہو جائے گا۔"

خان نے سر ہلایا۔ "جیسی تمہاری مرضی۔ میں اب شام کو ملوں گا۔"

میں لوٹ کر اپنے کمرے میں آیا تو رابعہ صوفے پر … سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے پیر سامنے میز پر پھیلا رکھے تھے اور وہ بیکاری اور بیزاری کا شکار تھی۔

میں نے کہا۔ "کیا بات ہے، شاخِ آشیاں پر تنہا بلبل کی طرح اداس کیوں بیٹھی ہو؟"

رابعہ نے کہا۔ "اور کیا کروں۔ تمہارا کچھ پتا چلتا ہے کہ کہاں ہو اور کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "دیگر خواتین خوش قسمت … صحنِ چمن میں نغمہ سرا … تمہاری …"

رابعہ نے مجھے گھور کے دیکھا۔ "… سوجھ رہی ہے؟"

میں اس کے قریب قالین پر بیٹھ گیا۔ "خان نے …"

… کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ! عنوان ہے اس کتاب عشق کا … باب۔ ایک دفتر ہے حساب سے … اگر میں اس کے … و رخسار کی بات کروں، اس کے حسن بے مثال کے … ناز و ادائے غمزہ گری کے کمال کا ذکر کروں، اس کے نظارۂ جمال کا اور رعنائی خیال کا بیان کروں تو قصیدہ در قصیدہ غزل در غزل … پر ایک دیوان مرتب ہونے میں عمر تمام ہو جائے۔"

رابعہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "جھوٹ بولنے اور بے مقصد باتیں بنانے میں تم نے واقعی کمال حاصل کر لیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کبھی کبھی تو آمد ہوتی ہے اور تم … میں تم بہت خوش ہو میری باتوں سے۔"

رابعہ جھلا کے کھڑی ہو گئی۔ "اچھا تم بولتے رہو، میں جا رہی ہوں۔" میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کے اپنے پاس بٹھا لیا۔ "…

… بہت عرصہ ہو گیا تھا … یہ لوگ کہاں ہیں؟"

"باہر نکلے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "کتنے … لیٹے لیٹے اور کمرے میں پڑے پڑے تھک گئے ہیں۔"

"آج رات ہم بھی نکلیں گے۔ میں اور تم۔"

"کہیں گھومنے چلیں گے؟" رابعہ نے بے یقینی سے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔"

رابعہ کی آنکھوں میں شوق اور تجسس کی چمک ماند پڑ گئی۔ … کہا۔ "کسی کام سے جانا ہے؟"

میں نے کہا۔ "کام تو برائے نام ہے اور ہم … سے پہلے اور کام کے بعد باتیں ہوں گی اور فرصت … رات ملے گی گھومنے پھرنے کے لیے۔ اجنبی … سڑکوں پر آوارہ گردی کریں گے۔"

رابعہ کی دلچسپی پھر جاگ اٹھی۔ میں نے اسے خان سے … گفتگو کا مختصر احوال سنایا۔ ولادور سے ہونے والی بات … وہ متفکر ہو گئی۔

"تم وہاں اکیلے جاؤ گے؟"

"ہاں! میری حفاظت کی ذمے داری خان نے قبول کر لی ہے۔ … ابھی دو دن پہلے ہی ولادور اور ترلوچن … چکے ہیں۔ وہ … صاحب کی طرح … سب بھول گئے۔ تم ان کے افسانے … سب جھوٹ ہے۔ بھلا پاکستان سے … سکتا ہے اور وہ بھی ولادور کی معرفت؟"

… نے کہا۔ "مجھے ولادور کی بات بے معنی نہیں لگتی … سے میرا ذہن تمام پُرخطر امکانات کو تصور کر سکتا ہے۔ ایک دشمن جو میرے خون کا پیاسا ہو مجھے پھول بھی بھیجے گا تو میرے سہرے کے لیے نہیں۔ وہ سہرا بھیجے گا تو میں سمجھوں گا کہ اس نے میری قبر پر چڑھانے کے لیے پھولوں کی چادر ارسال کی ہے۔ اس کا تحفہ کیسا ہوگا اور کیا ہوگا؟ میں تصور کر سکتا ہوں۔"

"مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔" رابعہ نے کہا۔ اس کا چہرہ خوف کے احساس نے بے جان کر دیا تھا۔

میں نے کہا۔ "نہیں، تم خود بھی تو سوچ سکتی ہو۔ ہو سکتا ہے میرا خیال بے بنیاد ہو۔ میں کیوں تمہیں دہشت زدہ کروں۔"

اچانک رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ میں اس کی اعصابی کشیدگی کا اندازہ کر سکتا تھا۔ "کہیں… کہیں وہ… انھیں تو اغوا نہیں کرا لے گئے ہیں؟"

میں نے پورے اعتماد کے ساتھ جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے شہلا کو…"

"ان سے کچھ بعید نہیں۔" رابعہ نے کانپتے ہوئے کہا۔ "آخر بیگم رضوی اور شہلا غائب کیسے ہو گئی ہیں۔ اتنے پُراسرار طریقے پر۔"

میں ہنس پڑا۔ "پُراسرار بات کیا ہے۔ ان کے مکان بدلتے ہیں۔ انھوں نے کسی وجہ سے وہ مکان فروخت کر دیا۔ پرانا مکان تھا۔"

"تم مجھے جھوٹ سے بہلا رہے ہو… اگر یہ تشویش کی بات نہ ہوتی تو منظر پریشان کیوں ہوتا؟"

میں نے مزید جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "منظر پریشان کہاں تھا۔ خفا تھا کہ مجھے بغیر بتائے شہلا … وقوف نہیں ہے کہ ایسے منظر کو بھی اطلاع نہ دے … ہو جائے۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔ شہلا ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہوگا۔"

"کیسا حادثہ؟ خواہ مخواہ خود کو پریشان مت کرو۔"

"سکندر! بیگم رضوی اور شہلا کی حفاظت کرنے والا کون تھا؟ ہمارے یہاں آ جانے کے بعد کیا ہوا؟ یہ ہم نہیں جانتے۔" رابعہ نے کہا۔

"دیکھو ایسی باتیں تم حسن کے سامنے کرو گی تو خود سوچو کہ نتیجہ کیا نکلے گا؟" میں نے کہا۔

"مگر ایسا ہو سکتا ہے۔"

"خدا کرے کہ ایسا نہ ہو لیکن موجودہ حالات میں بری خبر سننے کے لیے میں ہر وقت تیار رہتا ہوں۔ جب منظر سے بات ہوئی تھی تو قدرتی طور پر سب سے پہلے میرے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ کہیں شہلا اور بیگم رضوی کسی خوف سے

www.paksociety.com

روپوش نہ ہوگئی ہوں۔ ممکن ہے انہیں والا ورانیٹڈ کمپنی کی طرف سے دھمکی ملی ہو یا کوئی خطرہ محسوس ہوا ہو۔ وہ پولیس کے پاس نہیں جاسکتی تھیں۔“

”مگر منظر کے پاس تو جاسکتی تھیں۔“

”ہاں یہی ایک بات مجھے بھی کھٹکتی ہے یہ ہو سکتا ہے کہ خاموشی سے مکان بیچنے کے بعد ان کا یہی ارادہ ہو لیکن وہ اپنے ارادے میں ناکام ہی ہوں۔ منظر بھی بے وقوف نہیں ہے لیکن اس نے ہماری حوصلہ شکنی سے اجتناب کیا اور ایسی کوئی بات کہنے سے گریز کیا جو ہمیں پریشان کردے یا ہماری مشکلات میں اضافے کا سبب بن جائے۔“

رابعہ کو سمجھانا بے سود تھا۔ اپنے طور پر اس نے مفروضے کو یقین بنالیا تھا اور یہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھی کہ شہلا خیریت سے بھی ہو سکتی ہے۔ ڈر مجھے بھی تھا لیکن میں دیگر امکانات کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے کہا ”رابعہ! تم بنا بنایا کھیل بگاڑ دوگی۔ بڑی مشکل سے محسن ٹھیک ہوا ہے دوبارہ پاگل ہو جائے گا۔“

رابعہ نے آنسوؤں کو پینے کی ناکام کوشش کی۔ باہر سے محسن اور غالب کے ہنسنے کی آواز پر وہ ایک دم اٹھی اور باتھ روم میں گھس گئی۔ میں قالین پر دراز ہو کے چھت کو گھورنے لگا۔

”تو یہاں اکیلا کیوں پڑا ہے بھائی؟“ محسن نے اندر آکر کہا۔

میں اٹھ بیٹھا ”مجھے کسی کے ساتھ کہاں پڑا ہونا چاہیے اس وقت؟“

غالب نے افسوس سے سر ہلایا ”تجھ سے کسی نے نہیں کہا کہ چلتے ہو تو چمن کو چلیے۔“

میں نے کہا ”گل و بلبل چہک رہے تھے وہاں... کہیں الو بول رہے تھے۔ ہم شرفا کی طرح باتیں کر رہے تھے یہاں۔“

محسن نے رابعہ کو آتے دیکھ کر کہا ”ہم تو گندی باتیں کرتے ہی نہیں کہ بعد میں منہ دھونا پڑے۔“

”آئینہ دیکھ، تیرا بھی منہ لال ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

جو اثر محسن کی بات کا رابعہ پر ہوا تھا، اس سے زیادہ گل پر میری بات کا ہوا۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پر ایک انگلی سے اپنی لپ اسٹک کو چھو کر دیکھ رہی تھی جو ایک بے ضرر سی زنانہ عادت کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب نازو اور غالب نے بھی کھل کے ہنسنا شروع کیا تو گل کو احساس ہوا۔ رابعہ کے ساتھ وہ بھی جھینپ گئی۔

”تم لوگوں کی زبان جب چلنے لگتی ہے تو بے لگام ہو جاتی ہے۔“ رابعہ نے مصنوعی غصے سے کہا۔

مگر گل نے برا مانے بغیر کہا ”چھوڑیں باجی! [illegible] مذاق ہی تو ہے۔“ اس نے بالواسطہ طور پر تسلیم کرلیا اور ہم سب نے بھی تسلیم کرلیا کہ اس کے نام کو محسن سے وہی نسبت ہے جو رابعہ کو میرے نام سے یا نازو کو غالب کے نام سے ہے۔ اس اعلان کے لیے ہم میں سے کوئی تیار نہ تھا۔ رابعہ کے لیے میری چاہت اور غالب کی نازو سے محبت واقعی ناقابلِ تردید حقیقت تھی لیکن اچانک گل نے خود کو محسن کے ساتھ ہماری صف میں شامل کرلیا تھا۔

ایک لمحے کے لیے ہم سب خاموش ہوگئے۔ میں نے رابعہ کی طرف دیکھا کہ کہیں اس کا ردِعمل شدید نہ ہو۔ جس اندوہناک خبر کو ہم نے مصلحت کا لفافہ چڑھا کے چھپا لیا تھا وہ مجھے بھی احساسِ جرم میں مبتلا کر رہی تھی اور ان حالات میں گل کا رویہ یقیناً زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ خاموشی کا وقفہ ناگواری کا تاثر پیدا کرتا، میں نے اپنے لیے بشاشت پیدا کر کے کہا ”تم سب تو عقل کے ساتھ کھانا بھی چر آئے ہو، تم نے تو شاید ابھی نہیں کھائی۔ میرا حال بھوک سے پتلا ہو رہا ہے۔“

محسن نے کہا ”ہاں واقعی بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ کیوں بھئی گل؟ تمہیں بھوک لگ رہی ہے نا؟“

گل نے شرما کے کہا ”جب مجھے لگ رہی ہے تو تمہیں بھی لگ رہی ہوگی۔“

میں نے کہا ”طلب فرماتے ہیں [illegible]...“ اور بٹن دبا کے کہا ”کیا کھانا تیار ہے؟“

”یس سر!“ کسی نے جواب دیا ”آپ حکم کریں۔“

”حکم کے بغیر ہی لے آؤ تو اچھا ہے۔“ میں نے کہا اور بٹن چھوڑ دیا ”کیا زبردست روم سروس ہے۔“

”اتنی اچھی سروس تو اس ہوٹل میں بھی نہیں تھی جہاں میں پچھلی رات ٹھہری تھی۔“ رابعہ نے کہا ”چائے تو آئی نہیں تھی، پانی کا [illegible] منگوائی، ہر مرتبہ یاد دہانی کرانے کے باوجود آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔“

گل نے کہا ”میں کافی تو پیتی نہیں، [illegible] سوچا چائے پی لوں۔ میں نے روم سروس سے کہا کوئی لے آؤ چائے وغیرہ۔ شاید انھوں نے آدھی بات سنی، دیر بعد ویٹر آیا اور شیشے رکھ گیا، تین چار قسم کی شراب... پتا نہیں کیا تھا۔ میں اس کے پیچھے دوڑی کہ اب بھاگ [illegible]

بہت ہے... وہ کاریڈور میں تھا اور میں ننگے پاؤں تھی۔ مجھے غور سے دیکھتا رہا اور پھر بولا ’میرا مشورہ ہے کہ آپ اور نہ پئیں، چلیں میں آپ کو کمرے میں چھوڑ آؤں‘۔“

گل نے اتنے بھولے پن سے یہ بات سنائی کہ ہم سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔ کسی بڑے ہوٹل میں وہ کبھی اکیلی نہیں رہی تھی شاید کسی بھی ہوٹل میں قیام کا یہ پہلا موقع تھا۔

نازو نے اچانک کہا ”سکندر بھائی نے فون نہیں کیا؟“

میں نے سنبھل کے کہا ”فون... نہیں... یہاں تو فون ہے ہی نہیں۔“

”اس نے تو آنا ہی ہے۔“ نازو نے کہا۔

”ہاں پہلے تھا۔“ میں نے کہا ”خان نے بتایا ہے کہ پہلے جو یہاں رہتا تھا وہ اچانک باہر چلا گیا ادائیگی کیے بغیر۔ آج رات کو باہر جائے کہیں کوشش کریں گے۔“

”میں چلوں گی تمہارے ساتھ۔“

”کیوں؟ تمہارے بھیا نے فون لگوا لیا ہے کیا کہ نمبر ملاتے ہی نازو کہیں گے ہیلو؟“

”ہم منظر سے بات کریں گے، کسی بھی کال آفس سے کال بک کرائیں گے۔“ نازو نے کہا۔

گل اپنے پیر کے انگوٹھے کو بلاوجہ کھرچ رہی تھی چنانچہ مجھے نازو کو اشارے سے خاموش کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے پہلے میری اور پھر رابعہ کی صورت کو حیرانی سے دیکھا۔ اسی وقت دروازہ کھول کے کھانا لانے والے نازل ہوگئے اور محسن نے یہ سمجھا کہ شاید انہی کی وجہ سے میں نے نازو کو خاموش ہوجانے کے لیے کہا ہے ورنہ نازو سے زیادہ وہ حیران ہوتا کہ میری اس حرکت کا کیا مقصد تھا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ شہلا کا ذکر آنے سے پہلے ہی بات ٹل گئی۔ کھانے کے دوران میں نے انہیں اپنے تمام پروگرام کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ غالب اور محسن نے بزرگانہ سنجیدہ خاموشی سے مان لیا کہ انہیں فی الحال آرام کے سوا کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ گل اور نازو نے بھی اپنے بھائیوں کا خیال رکھنے کی تجویز سے اختلاف نہیں کیا اور یوں مجھے اور رابعہ کو ایک معمولی سے کام کے لیے ساتھ جانے کی اجازت مل گئی۔ میں نے انہیں یقین دلایا تھا کہ فی الحال اس عمارت سے مل کر اس کا گھر دیکھنے کے سوا ہم کچھ نہیں کر پائیں گے۔

شام کو سورج غروب ہونے کے بعد سلیمان نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے اس سے باہر جا کے بات کی۔ ”شاہ جی نے کہا ہے کہ آپ تیار ہو جائیں۔“

میں نے کہا ”ابھی سے؟“

سلیمان نے کہا ”جائیں گے تو ہم رات نو بجے لیکن ایک آدمی آیا ہے کچھ سامان لے کر... آپ نے ہی کہا تھا شاید...“

میں نے کہا ”میں سمجھ گیا! وہ آدمی کہاں ہے؟“

سلیمان بولا ”آپ میرے ساتھ آئیں۔“

رابعہ اور میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے محمد خان کے کمرے میں گئے۔ راستے میں سلیمان سے مجھے ایک سوال کرنے کا موقع مل گیا ”سلیمان! یہ تم اپنے استاد کو شاہ جی کیوں کہتے ہو، نام تو محمد خان ہے ان کا؟“

سلیمان نے مجھے سپاٹ نظروں سے دیکھا ”یہاں سب کے لیے وہ شاہ جی ہیں۔“

میں نے اس نکتے پر اختلاف نہیں کیا۔ ابھی تو ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ محمد خان ہے اور شاہ جی ہیں۔ محمد خان کے کمرے میں ایک عجیب الخلقت چیز صوفے پر رکھی ہوئی تھی۔ یہ چیز قد میں ساڑھے چار فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے جسم پر ایک شیروانی تھی جو شاید بیس تیس سال پہلے اس کے جسم پر فٹ ہوتی ہوگی مگر اس عرصے میں وہ خود سکڑ کر نصف رہ گیا تھا یا پھر شیروانی کسی اور کی تھی جو سائز میں ڈبل تھا۔ یہ بھی سمجھا جاسکتا تھا کہ اتنی قدیم شیروانی ایک خاندانی ترکہ تھی اور اس کے مقابلے میں آبا و اجداد یقیناً بہتر صحت کے مالک تھے۔ شیروانی کے اصل رنگ کا اندازہ کرنا بھی مشکل تھا۔ امتدادِ زمانہ کے باعث رنگ اڑ گیا تھا اور جو باقی تھا اس میں میل کا رنگ شامل ہوچکا تھا۔ شیروانی کے ساتھ اس نے اپنے سر پر ایک ترکی ٹوپی لگا رکھی تھی جس کا پھندنا نہ جانے کس دور میں ٹوپی سے جدا ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ اب نوک سی باقی رہ گئی تھی۔ شیروانی کے نیچے جو پتلون تھی وہ بھی کثرتِ استعمال سے پاجامے کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ یہ پتلون بھی شیروانی کے رنگ کی نظر آتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ اس شیروانی کے نیچے قمیص نہیں ہوگی۔ اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کی ہیئت کذائی میں ٹھوڑی پر آویزاں بکرے جیسی تکلی داڑھی ایک دلچسپ اضافہ تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی تھی جسے بغل میں دبا کے وہ بڑی پھرتی سے مصافحہ کرنے کے لیے اٹھا۔

”بندگی حضور... بندگی... تسلیمات بیگم صاحبہ!“ اس نے جھک کر کورنش بجا لاتے ہوئے کہا۔ اس نے بڑی عقیدت سے میرا ہاتھ تھام کر چھوڑ دیا۔

میں نے محظوظ ہوتے ہوئے خان کی طرف دیکھا جو تخت پر نیم دراز مسکرا رہا تھا ”آپ کی تعریف؟“ میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"آپ کا بندۂ بے دام" اس نے اپنی منحنی کپکپاتی آواز میں گنگنانا شروع کیا "جو کہلاتا ہے شہزادہ گمنام"
میں نے اپنی ہنسی کو روک لیا "یہ شہزادہ گمنام ہے تمہارا نام؟"
"والدین نے جو رکھا نام، بچ گیا وہ ایک الزام" اس نے شعر پڑھنے کے انداز میں کہا "جہاں میں ہوا ہے نام جیسے ہوا مقبول خاص و عام"
میں نے کہا "بہت خوب! طبیعت شاعرانہ پائی ہے تم نے"
اس نے خوش ہو کے پیلے لال دانتوں کی نمائش کی "گرچہ کلام اپنا نہیں لافانی۔ فدوی تخلص کرتا ہے یوسف ثانی۔ طبیعت ہے ایسی طوفانی جیسے طوفان میل کی روانی۔ آپ جیسوں کی قدردانی"
"واہ واہ..." میں نے لطف لیتے ہوئے کہا "نام کی رعایت سے تخلص بھی خوب ہے... یوسف ثانی، شاعری کے علاوہ آپ کیا کرتے ہیں؟"
"گر حاصل ہو یہ سعادت، فدوی کر سکتا ہے ہر خدمت" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکایا "غلط بیانی نہیں اپنی عادت، دیں گے شاہ صاحب شہادت"
محمد خان نے جو تخت پر نیم دراز اس تماشے کو بے نیازانہ دیکھ رہا تھا، مجھے قریب بلا کر کان میں کہا "بھئی اس میں کوئی شک نہیں، یہ بہت کام کا آدمی ہے اور بہت بھروسے کے قابل۔ اس کی صورت اور حلیے پر مت جاؤ، یہ جن ہے جیسے بالکل علاؤالدین کے چراغ کا جن"
"دیکھنے سے تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ کارٹون ہماری کیا مدد کر سکتا ہے" میں نے حیرانی سے کہا "لیکن تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں"
"چلو تم اس سے میک اپ کرا کے دیکھو" خان نے مشورہ دیا۔
میں نے واپس آ کے کہا "حضرت یوسف ثانی! آپ اس ناچیز کا چہرہ بدل سکتے ہیں اس طرح کہ کوئی ہمیں شناخت نہ کر پائے؟"
یوسف ثانی نے پھر آغا حشر کے ڈرامے کے کسی کردار کی طرح بولنا شروع کیا "ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ ہنر، مٹی کو بنا دیں سونا، بٹھا دیں یا اٹھا دیں آپ کی بندی۔ خدا کے بندے کو بنا دیں خدا کی بندی"
رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا "ذرا دکھائیے اپنا کمال"
یوسف ثانی نے چاروں طرف سے میرا جائزہ لیا جیسے میں کوئی تھیں سیاہ ہوں جسے وہ چٹکی بجا کے گنبد بنا دے گا۔ وہ نیم پاگل نظر آنے والا شخص نہ اس بات کی پروا کرتا تھا کہ دیکھنے والے اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں اور کیا کہتے ہیں بلکہ کرتے ہوئے اس کی متانت میں ذرا فرق نہیں آتا تھا۔ انداز وہ اسٹیج کا ایک چلتا پھرتا مسخرہ کردار تھا مگر اس کردار کو وہ شروع سے نبھا رہا تھا۔ اب جو کچھ وہ کرتا تھا، بناوٹ نہیں اس کی عادت اور فطرت بن چکی تھی۔ مجھے اب اس پر ہنسی نہیں آ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کیا حالات تھے جن سے اس کی شخصیت کو ایک کارٹون بنا دیا۔ ماں کے پیٹ سے تو کوئی بھی کارٹون بننے کے لیے پیدا نہیں ہوتا۔
اس نے صوفے کی سائیڈ سے ایک سوٹ کیس اٹھایا جو ابھی تک میری نظر سے اوجھل تھا۔ یہ سوٹ کیس بھی اس کی مجموعی شخصیت سے میچ کرتا تھا اور قدامت میں بھی اس کی شیروانی یا ترکی ٹوپی سے کم نہ تھا۔ چمڑے کی اس صندوقچی کے اوپر اس نے واضح سفید حروف میں لکھا تھا "شہزادہ گمنام مقبول خاص و عام، متخلص بہ یوسف ثانی بقلم خود"
میں نے کہا "یہ بقلم خود کیا ہے؟ یہ دستخط ہیں آپ کے؟"
اس نے سنجیدہ نظروں سے مجھے دیکھا "اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے احقر نے یہ نام، کسی خوشنویس نے نہیں کیا ہے یہ کام"
میں حیران بھی ہوا اور شرمندہ بھی کیونکہ بلاشبہ نام کسی پینٹر کے ہاتھ کا لکھا ہوا لگتا تھا۔ اس نے اپنی تھیلی میں سے نہ جانے کیا کچھ نکالا۔ وہ ایک ٹیوب یا کوئی ڈبیا نکالتا تھا، اس میں سے کچھ میرے چہرے پر لگاتا تھا اور واپس رکھ دیتا تھا۔ اس کی شکی نظر بار بار اپنی صندوقچی کی طرف جاتی تھی جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں رابعہ اسے کھول کر نہ دیکھ لے یا اس میں سے کوئی چیز نہ نکال لے۔ وہ اب خاموشی سے اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ رابعہ کی صورت پر نظر آنے والی حیرانی سے میں اندازہ کر سکتا تھا کہ میری صورت کیسے بدلتی جا رہی ہے۔ آخری کام اس نے یہ کیا کہ میرے سر پر ایک جعلی سی چندیا دی اور پھر کناروں پر کوئی لوشن لگا دیا۔ رابعہ بے اختیار ہنس پڑی مگر یوسف ثانی کے انہماک میں فرق نہ آیا۔ اس نے پھر ماتھے پر تلک لگا کے مجھے آئینے کے روبرو کر دیا۔
"واہ مہاشے! کیا روپ نکالا ہے" رابعہ نے کہا "ذرا اپنے آپ کو دیکھو"
میں اپنی بدلی ہوئی صورت اور گنجے سر کو دیکھ کر حیران تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب گلے میں جنیو ڈال کے اور دھوتی پہن کے میں کسی بھی مندر میں جا بیٹھتا تو پجاری نظر آتا۔
"تم نے تو کمال کر دیا مسٹر یوسف ثانی" میں نے کہا۔
اس نے چونک کر کہا "مسٹر نہ کہیں مجھے جناب عالی،

سمجھتا ہے اسے گالی۔ اس میں کیا بات ہے کمال والی۔ پہلے آپ کی صورت بدل ڈالی، فقیر کی جھولی ابھی تک ہے خالی"
میں اس کا مطلب سمجھ گیا "یوسف ثانی! تمہیں تمہاری محنت کا معاوضہ اتنا ملے گا کہ تمہیں کوئی شکوہ نہیں رہے گا لیکن پہلے اپنا کام ختم کر لو"
رابعہ پر اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس نے رابعہ کے رنگ و روپ میں کچھ تبدیلی کی، باقی کام لباس نے کیا۔ میرے اور رابعہ کے لیے بہروپ کے مطابق پرانے کپڑوں کا بندوبست خود خان نے کیا تھا۔
خان نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا "یہ آدمی بہت اچھا ہے بس یہی اس کی ایک کمزوری ہے کہ پیسے کے پیچھے بھاگتا ہے"
میں نے کہا "کیا کرتا ہے یہ پیسے کا؟"
"کچھ نہیں۔ آخر میں ایک دھیلا نہیں رکھتا۔ مانگ کے کپڑے پہنتا ہے، مانگ کے کھا لیتا ہے۔ نہ کوئی گھر ہے نہ خاندان"
میں نے مزید حیران ہو کے کہا "یہ پیسہ پھر کہاں جاتا ہے؟ جو کماتا ہے وہ کیسے ٹھکانے لگ گیا؟"
"یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔ تم اسے پانچ سو یا ہزار دے دو۔ اگر خوش ہو گئے تو دانا نہیں ہے، ایک ہزار کافی ہیں۔ زیادہ پر احتجاج نہ کرنا"
اور ایسا ہی ہوا۔ میں نے اس کو ہزار روپے نذر کیے تو واویلا کرنے لگا "حضور کا سلامت رہے دم، لیکن یہ آپ نے انتہائی ستم کیا ہم تو رکھتے تھے امید کرم، سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم"
میں نے کہا "بھئی میں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا اور میرے خیال میں یہ بھی بہت ہے"
وہ غصے میں سر ہلانے لگا "یہ انصاف کا نہیں ہے وطیرہ، ہیرے کے بدلے میں دیا جائے نہ زیرہ، پتھر کے مول بک گیا ہیرا"
نہ جانے کیوں رابعہ نے کھٹ سے اسے پانچ سو کا نوٹ اور دے دیا "یہ لو اب تو خوش ہو"
اس نے نوٹ فوراً جیب میں ٹھونس لیے "خدا رکھے برقرار و آباد، عطا کرے ہر سال نیک اولاد، لیکن ناچیز کی ہے یہ فریاد..."
رابعہ نے آنکھیں نکال کے کہا "یہ بددعا ہے کہ فریاد؟ ہو جاؤ گے برباد، اگر سال کے سال ہوتی رہی اولاد"

رابعہ کی ہنسی رو کے نہ رکتی تھی۔ اس نے کہا "اب جانے بھی دو"
میں نے کہا "یعنی تمہیں کوئی اعتراض نہیں اس کی دعا پر؟"
شہزادہ گمنام عرف یوسف ثانی نے اپنی صندوقچی اٹھائی جیسے اسے بےدلی کے حکم پر سامان اٹھانا پڑ رہا ہے "اچھا حضور کی عنایت کہ یاد فرمایا، پھر ملیں گے اگر خدا لایا"
جب وہ چلا گیا تو میں اور رابعہ اپنے نئے روپ میں سب کے سامنے جلوہ گر ہوئے۔ جتنا وہ ہم پر ہنسے اس سے زیادہ شہزادہ گمنام عرف یوسف ثانی کی باتوں پر ہنسے۔ میں نے اس کے انداز گفتگو کی نقل کرنے کی کوشش کی مگر اس کا لہجہ اور اس کی حرکات و سکنات کا نمونہ پیش نہ کر سکا۔
محسن نے کہا "یار ایسی نادر روزگار چیز پہلے نہیں دکھائی"
نازو نے کہا "اسے پھر بلاؤ کسی کام سے، ہم بھی تو دیکھیں"
میں نے کہا "خان نے کہا تھا کہ وہ الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح ہر کام کر سکتا ہے"
غالب نے کہا "پھر تو اسے ضرور بلاؤ۔ کام کا آدمی ہے تو ایک ٹکٹ میں دو مزے، تفریح الگ اور کام الگ"
"ابھی تو ہم سلیمان کے ساتھ جا رہے ہیں۔ مجھے ابھی صرف اتنا معلوم کرنا ہے کہ وہ اسلحہ اس نے کہاں دیکھا تھا جو اس کے بتانے پر ان میاں بیوی نے چوری کیا۔ اگر خود اس نے کچھ نہ بتایا تو ہم ان میاں بیوی کا پتا پوچھیں گے"
"یہ آسان کام شاید نہ ہو" محسن نے کہا۔
"اتنا مشکل بھی نہیں ہو گا" میں نے کہا۔
"بہتر ہوتا اگر ہم بھی ساتھ چلتے یا تمہارے پیچھے رہتے" نازو نے کہا اور غالب نے تائید کی۔
میں نے کہا "ضرورت محسوس کرتا تو تمہیں بھی لے چلتا"
"ہاں تیری ضرورت تو تیرے ساتھ ہی ہے" محسن نے کہا "ہم سب اسی لیے غیر ضروری ہو گئے ہیں۔ خیر جاؤ"
میں نے رابعہ سے کہا "اجازت مل گئی، اب تو چلو"
ایک ریوالور میں نے اپنی دھوتی میں لپیٹ لیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر فوراً ہاتھ میں آ جائے۔ دوسرا رابعہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اس کی چھتری میں اتنی گنجائش تھی کہ وہ مشین گن بھی ساتھ لے کر چلتی تو کسی کو پتا نہ چلتا۔ سلیمان باہر ہمارے انتظار میں ایک جیپ کے مڈگارڈ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔
اس نے کہا "جیپ کو ہم ایک میل دور چھوڑ دیں گے"
میں نے کہا "چابی یہاں سیٹ کے نیچے رکھ دینا۔ ہم اگر دو گھنٹے تک لوٹ کر نہ آئیں تو جیپ وہیں چھوڑ کے واپس

www.paksociety.com

چلے جانا؟"

جیپ میں ہم دونوں آگے بیٹھ سکتے تھے۔ سلیمان کے ساتھ میں بیٹھا اور دوسری کھڑکی سے لگ کے رابعہ بیٹھ گئی۔ جیپ کوٹھی سے نکلی اور نامعلوم راستوں پر ایک گھنٹا دوڑتی رہی۔ کچھ دیر میں نے راستوں کے ہر موڑ کو ذہن میں رکھنے کی کوشش کی لیکن پھر سب گڈمڈ ہو گیا۔ مجھے یہ پریشانی لاحق ہو گئی کہ کسی وجہ سے خود مجھے جیپ ڈرائیو کر کے واپس لوٹنا پڑا تو میں یقیناً راستے سے بھٹک جاؤں گا۔ میں نے اس خدشے کا اظہار سلیمان سے کیا تو اس نے مجھے چند سڑکوں کے نام بتائے۔ ان سڑکوں پر نمایاں مقامات کی نشاندہی کی۔

میں نے کہا۔ "بس اتنا کافی ہے اگر میں ان جھونپڑیوں تک پہنچ گیا تو پھر میدان سے گزر کے ریلوے لائن کراس کرتے ہی خان کی کوٹھی ہے۔" سفید شٹل کاک برقع میں ایک عورت ہمارے قریب سے گزر گئی۔ اس وقت جیپ کو سلیمان نے ایک بند گیراج کے سامنے سینکڑوں زیر مرمت گاڑیوں کے درمیان کھڑا کر دیا تھا۔ ہم کسی صنعتی علاقے سے گزر آئے تھے۔ جہاں ہر طرف چھوٹے بڑے کارخانے تھے۔ فضا میں اونچی اونچی چمنیوں سے خارج ہونے والے زہریلے دھوئیں اور بخارات کی بدبو تھی یہ بدبو اس وقت انتہائی شدید ہو گئی جب ہم نے ایک نالے پر بنا ہوا لکڑی کا پل عبور کیا۔ اس نالے میں اور گرد و پیش پھیلے ہوئے کارخانوں کا کیمیکل ویسٹ بہہ رہا تھا یعنی وہ کیمیائی فضلہ جو مختلف مصنوعات کی تیاری کے دوران استعمال ہونے کے بعد ناکارہ ہو جاتا ہے۔

نالے کے کنارے تک بنی ہوئی جھونپڑیاں دیکھ کر مجھے زمین پر بسنے والی خدا کی مخلوق پر ترس آیا جو بے بسی اور مجبوری کے دوپاٹوں میں اتنی پس چکی تھی کہ اس عفونت زدہ زہریلے اور متعفن ماحول میں بھی جی رہی تھی جہاں شاید میں ایک دن رہتا تو بیمار پڑ جاتا لیکن آدمی بڑی سخت جان مخلوق ہے اور ہر قسم کے ماحول میں زندگی گزارنے کے لیے ذہنی اور جسمانی قوت مدافعت پیدا کر لیتی ہے۔ شاید اب ان لوگوں کو صاف ستھرے ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں رکھا جائے تو یہ بیمار پڑ جائیں میں نے سوچا۔

آبادی اور جگہ کی تنگی شہر کے دو سب سے بڑے اور زندگی کے تضادات کی سب سے نمایاں تصویر پیش کرنے والے مسائل ہیں۔ اس شہر میں جہاں لاکھوں انسان حشرات الارض کی طرح جیتے ہیں۔ لاکھوں ایسے بھی ہیں جن کے کتے اور گھریلو ملازم تک ایئرکنڈیشنڈ کوٹھیوں اور کاروں میں رہتے ہیں۔ انسانی معیار زندگی کی یہ پست ترین صورت میں نے کراچی کی کچی آبادیوں اور جھگیوں میں بھی دیکھی تھی لیکن جو یہاں نظر آ رہا تھا وہ میرے جیسے انسان کا ناقابل تصور ماحول تھا۔ جھونپڑیاں اتنی تنگ تھیں کہ شاید ان میں ایک اوسط قد کا آدمی پیر پھیلا کے نہیں سو سکتا تھا مگر ان میں لوگ پورے خاندان سمیت آباد تھے۔ ظاہر ہے ان کی جسمانی صحت بھی قابل رحم ہوگی اور اخلاقی حالت بھی۔ ایسی جان لیوا مفلسی میں اخلاقیات اور ساری قدریں انسانیت کے ساتھ مذاق اور آسودہ حال لوگوں کی ذہنی عیاشی محسوس ہونے لگتی ہیں۔

سلیمان نے ایک جگہ رک کے کہا۔ "وہ دائیں طرف آپ مندر کا کلس دیکھ رہے ہیں۔ اسی کے احاطے میں رہنے والا گھر پروہت کا ہے۔"

میں نے کہا۔ "احاطے میں اور بھی لوگ رہتے ہیں؟"

"احاطے کے اندر اور باہر دیوار کے ساتھ ساتھ کچے بنے ہوئے ہیں۔ آپ سیدھے ہاتھ والے کونے کے کچے میں جائیں۔ اس کے باہر تلسی کا پودا ہے۔ دروازے پر گہرے رنگ سے اوم لکھا ہوا ہے۔" سلیمان نے کہا۔

رابعہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم ان جھگیوں سے باہر کیسے جائیں گے؟"

سفید شٹل کاک برقعے میں دوسری عورت ہمارے پاس سے گزری تو میں حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیا یہاں مسلمان تعداد میں زیادہ ہیں؟"

سلیمان نے نفی میں سر ہلایا۔ "سب ملے جلے لوگ ہیں۔ ان کا مذہب بھی ملا جلا ہے۔"

"یہ دوسری پردے دار خاتون دیکھ رہا ہوں میں۔"

"میں نے خود یہ برقعہ پہلی بار دیکھا ہے یہاں۔"

"کہتا ہے۔" سلیمان نے کہا۔ "ہوں گے دو چار گھر ملاؤں کے بھی۔ واپسی پر کسی سے بھی پوچھ لینا کہ سورج جی کا گیراج کہاں ہے۔ گیراج اس کے سامنے ہی ہے۔"

سلیمان چلا گیا تو میں نے رابعہ سے کہا کہ حوصلہ رکھے۔ ابھی تک کسی نے ہمیں نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہاں لوگوں کا عام رویہ یہی ہے۔ کوئی کسی کو دیکھ کے حیران نہیں ہوتا۔ ہم انھی لوگوں جیسے نظر آتے تھے پھر کوئی ہماری طرف کیسے متوجہ ہوتا۔

مندر کے گیٹ سے سرخ ساڑھیاں پہنے لڑکیاں بالوں میں گجرے لگائے نکل رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا۔ رابعہ مسکرائی۔ ایک پاگل نظر آنے والی بڑھیا نے چبوترے کے قریب پڑی ہوئی تھی چلا کے کہا۔

"بھگوان کرے تجھے کالا ناگ ڈسے۔ تیری بیٹی رانڈ ہو جائے۔ تیرے گھر میں آگ لگے۔" معلوم نہیں وہ آتے جاتے سب لوگوں کو ایسی خوفناک بددعائیں کیوں دیتی تھی۔ رابعہ ڈر کے مجھ سے چمٹ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہی ہے۔

"اس پاگل کی باتوں سے ڈر گئی ہو۔" میں نے کہا۔

"اس کے ساتھ کچھ تو بُرا ہوا ہوگا۔" رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ہاں مگر ہم نے تو کچھ نہیں کیا۔" میں نے اس کا ہاتھ دبا کے اسے تسلی دی۔

آخری کونے میں تلسی کا پودا بھی دروازے کے سامنے گملے میں لگا ہوا تھا۔ کواڑ پر گیروے رنگ میں "اوم" کے حروف چمک رہے تھے۔ دونوں نشانیاں بہت واضح تھیں... دروازے کی جھری سے لالٹین کا برائے نام سا اجالا جھلک رہا تھا۔ اندر مکمل سکوت تھا۔

میں نے دروازے کی کنڈی بجائی۔ ایک شخص نے کچھ دیر بعد دروازہ کھولا۔ اس نے تامل یا حیا قسم میں کچھ کہا۔ میں نے سر ہلا دیا۔ وہ شخص آگے بڑھ گیا۔ اس نے پیچھے دیکھ کر دستک دی تو دروازہ پیچھے ہٹ گیا۔ اندر سے بند نہیں تھا۔ میں نے آہستہ سے دھکیلا اور رابعہ کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

دو کمرے تھے جیسے ہی اس مختصر کمرے کا تاریک گوشہ روشن ہوا دہشت سے میری پیٹھ پر آگری۔ رابعہ نے بے اختیار ایک چیخ ماری اور میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ معلوم نہیں مجھے اندر سے کنڈی لگانے کا خیال آ گیا اور میں خود کو سنبھالتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگا کے اس لاش کو دیکھتا رہا جو کمرے کے ایک کونے میں سر کے بل پڑی ہوئی تھی۔ گیروے لباس میں لاش کے برہنہ جسم پر خنجر کے زخم تھے اور خون لاش کے آس پاس فرش پر جمع ہو کے جم گیا تھا مگر ابھی گاڑھا نہیں پڑا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کی سرخی میں تازگی نظر آتی تھی اسے کسی نے زیادہ سے زیادہ گھنٹہ بھر پہلے قتل کیا تھا۔

میں نے رابعہ کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھپتھپایا۔ "رابعہ ہوش میں آؤ۔ دروازہ بند ہے۔ کوئی آ جائے تو الزام ہم پر ہی آئے گا۔ یہی کہہ دینا ہے کہ پروہت جی کہیں گئے ہوئے ہیں۔"

رابعہ نے اپنی آنکھیں ایک ہاتھ سے چہرے پر رکھ کے بند کر لیں اور وہ بُری طرح لرز بھی رہی تھی مگر میری بات پر اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے دوسری جانب رکھے ہوئے مٹکے میں سے تھوڑا سا پانی ایک کانسی کے کٹورے میں لیا اور رابعہ کو چند گھونٹ پلانے کے بعد خود بھی پیا۔ مٹکے کے قریب ہی ایک بوڑھی عورت رسوئی کی چوکی پر بیٹھے بیٹھے لڑھک گئی تھی مگر وہ زندہ تھی۔ میں نے اندازہ کیا کہ وہ پروہت کی گھروالی ہوگی مگر وہ بوڑھی عورت تھی اور لاش دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ پروہت کی عمر تیس سال بھی نہیں۔ شاید وہ اس کی ماں تھی جو اپنے سامنے بیٹے کا بہیمانہ قتل نہ دیکھ سکی تھی اور اب خود بھی جاں کنی کی کیفیت میں تھی۔

یہ ایک الگ سوال تھا کہ پروہت کو کس نے مارا اور کیوں مارا؟ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اس مختصر سے کمرے میں تشدد کی ایسی واردات کا ارتکاب ممکن کیسے ہوا؟ پروہت نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس نے یا اس کی ماں نے کسی کو مدد کے لیے نہیں پکارا؟ پروہت کے حلق سے کوئی چیخ نہیں نکلی۔ ساتھ والے کمروں کی دیواریں مشترک تھیں کیا ان دیواروں کے پار کسی کے کانوں نے کچھ نہیں سنا؟ چھوٹے سے کمرے میں توڑ پھوڑ کے آثار بالکل نہیں تھے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کسی نے پروہت کو اچانک وار کر کے مار ڈالا۔ شاید اسی وقت کسی نے اس کی ماں کو منہ بند رکھنے کی کارروائی کی۔ اگر وہ اجنبی ہوتے تو ان کے اندر آتے ہی پروہت چوکنا ہو جاتا۔ اگر وہ انھیں اپنا دشمن سمجھتا تو انھیں اچانک وار کرنے کا موقع نہ ملتا لیکن وہ ایسے لوگ تھے جن سے پروہت واقف تھا اور کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا۔ انھوں نے اسے ایک دم دبوچ لیا اور مار دیا۔ میرے خیال کے مطابق یہ کام کم سے کم تین افراد نے مل کے کیا۔ دو نے پروہت کو قتل کیا۔ تیسرے نے اس کی ماں کی آواز دبا دی۔ وہ ناتواں بڑھیا ان کا کیا مقابلہ کرتی۔ وہ وہیں بے ہوش ہو کے گر گئی۔

"سکندر! کھڑے کیوں ہو۔ نکل چلو۔" رابعہ نے مجھے جھنجوڑ کے کہا۔

"ابھی چلتے ہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ کسی نے ہمیں نہیں دیکھا۔"

"دیکھا ہے سکندر۔ وہ جو مندر والی میں کچھ کہہ گیا تھا۔" رابعہ نے سرگوشی کی لیکن میرے ذہن میں سلیمان کی ایک بات تھی جو اب اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ "میں نے خود یہ برقع پہلی بار دیکھا ہے۔ بستی میں کون پردہ کرتا ہے؟"

اچانک رابعہ پیچھے ہٹی۔ وہ کاغذ کا ایک کونا نظر آتا تھا جو لاش کے نیچے سے جھانک رہا تھا مگر یہ ایک تصویر تھی جس پر خون لگ گیا تھا۔ رابعہ نے تصویر مجھے تھما دی۔ میں نے ایک کپڑے سے خون کو صاف کیا تو تصویر واضح ہو گئی۔ یہ زیادہ پرانی تصویر نہیں تھی۔ اس کے رنگ بالکل واضح تھے۔ تصویر میں شیشے کا ایک باکس نظر آ رہا تھا اور اس تابوت جیسے باکس میں کوئی سو رہا تھا۔ میں نے تصویر کو لالٹین کے قریب لے جا کر دیکھا تو اس کی صورت کے نقوش روشن ہو گئے مگر میرے ذہن میں اور میرے آس پاس گھپ اندھیرا پھیل گیا۔

www.paksociety.com

رابعہ سے میری حالت کا تغیر چھپا نہ رہ سکا۔ "سکندر... کیا ہے یہ؟" اس نے تصویر میرے ہاتھ سے چھین کر کہا۔ "کس کی تصویر ہے؟"

میں فوراً ہوش میں آگیا۔ "کچھ نہیں..."

لیکن اس وقت تک رابعہ نے تصویر دیکھ لی تھی اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں تصویر پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اس نے اپنی چیخ کو منہ پر ہاتھ رکھ کر دبالیا تھا لیکن وہ اپنے خوف، دہشت اور اذیت کے جذبات کو کیسے دبا سکتی تھی۔

"یہ... یہ تو... شملا..."

میں نے کہا۔ "ہاں... پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا... لیکن یہ شملا کیسے ہو سکتی ہے۔ تم خود ہی سوچو۔"

رابعہ نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ "یہ شملا ہی ہے سکندر۔"

میں نے کہا۔ "بلاشبہ اس عورت میں... جو اس شیشے کے تابوت میں نظر آرہی ہے اور شملا میں صورت کی مشابہت... بہت زیادہ ہے۔"

رابعہ کا اعصاب اب اس کے کنٹرول سے باہر ہونے لگا تھا۔ "مشابہت کہتے ہو تم اسے؟" اس نے چلا کر کہا۔

میں نے اسے جھنجوڑا۔ "یہ کیا کررہی ہو تم۔ یہ دیکھو کہ ہم کہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ تم نے میرا ساتھ دیا تھا میری مدد کرنے کے لئے... میری مشکلات میں اضافہ کرنے کے لئے نہیں۔ اتنا حوصلہ نہیں تھا تو وہیں اشارہ کردیا تھا۔ میں نازو کو ساتھ لے آتا۔"

رابعہ نے ایک ہچکی لی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ٹپک پڑے۔ "ہاں میں بزدل... اور کم ہمت ہو گئی ہوں... تمہاری نظر میں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں انسان ہوں۔ نازو کیا چلتی پھرتی پتھر کی مورت ہے؟ کوئی فولادی اعصاب رکھنے والی مشین ہے۔ یہ تصویر دیکھ کر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ تمہارے جھوٹ سے بہل جاتی؟"

میں نے ندامت سے کہا۔ "آئی ایم سوری۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ اور میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ اپنے ایک خیال کا اظہار کررہا ہوں کہ اس تصویر میں جو عورت ہے وہ شملا نہیں ہو سکتی۔ تم خود ہی سوچو تاکہ شملا کو اس طرح شیشے کے تابوت میں بند کرکے اس کی تصویر کون اتارے گا؟ اور پھر یہ تصویر یہاں... اس پروہت کے گھر میں۔ یہ کوئی چکر ہے رابعہ۔ یہ کیمرہ ٹرک ہے۔ میں کوئی فوٹوگرافر نہیں ہوں کہ وضاحت کرسکوں، مگر تم نے فلموں میں ایسے سین ضرور دیکھے ہوں گے کہ تصویر کسی شیشے میں... بوتل اور گلاس یا انگوٹھی کے نگینے میں نظر آتی ہے۔ ایک نہیں سو نظر آجاتے ہیں۔ الٹے سیدھے۔ ڈبل رول میں ایک ہی کردار سے مخاطب نظر آتا ہے۔ یہ جیتی جاگتی بے جان۔ یہاں کی فلم نگری میں ایسے نظر فریب شعبدے دیکھے بھی جاسکتے ہیں اور دکھائے بھی جاسکتے ہیں۔"

رابعہ اب قدرے پرسکون ہوگئی تھی لیکن وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہی تھی۔ "میں تمہارے دلائل سے قائل ہوجاتی، اگر اس عورت نے وہی کپڑے بھی نہ پہن رکھے ہوتے جو شملا پہنتی تھی۔ کیا اسے بھی تم اتفاق کہو گے؟ ہندوستان میں بھی کسی نے بالکل وہی کپڑا۔ وہی ڈیزائن اور پرنٹ اسی رنگ میں لیا تھا۔ اور اس عورت نے جسے تم شملا کی ہم شکل قرار دینے پر مصر ہو، شلوار قمیص ہی بنوایا اس کپڑے سے؟ کہاں پہنا جاتا ہے اس قسم کا شلوار قمیص؟ بمبئی میں کتنی عورتیں پہنتی ہیں شلوار قمیص۔"

میں نے خود اپنی کوتاہی نظر کا اور ناقص قوت مشاہدہ کا اعتراف کیا لیکن اس میں میرا زیادہ قصور نہیں تھا۔ مرد ایک عورت کی نظر کہاں سے لاتا جو فوراً فیشن سے ڈیزائن اور پرنٹ تک کو پہلے دیکھ لیتی ہے اور پہچان لیتی ہے۔

میں نے تصویر واپس اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "کیا واقعی؟"

رابعہ نے کہا۔ "واقعی کیا۔ اس کے ٹاپس دیکھو۔"

میں نے بیوقوفوں کی طرح تصویر کو نظر جھکا کر دیکھا۔ مجھے یاد نہ آیا کہ شملا کے کانوں میں کبھی میں نے ایسے ٹاپس بھی دیکھے تھے۔

"یہ ٹاپس میں نے اسے دیئے تھے۔" رابعہ نے کہا۔ "اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ کب دیئے تھے۔ ایک دن اسے پتا کرکے ہوئے ٹاپس نہیں مل رہے تھے۔ حسن اتفاق سے میں نے پہن رکھے تھے۔ میں نے اتار کر اسے دے دیئے تھے۔"

میں نے کہا۔ "میں... مجھے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ میں مان لیتا ہوں کہ یہ شملا ہے۔ لیکن رابعہ! اس میں بھی ٹرک ہو سکتی ہے۔ ایک تصویر کو دوسری تصویر کے ساتھ ملایا جاسکتا ہے۔ بلیک میلر تو یہ دھندے کرتے ہی ہیں۔ کسی بھی شریف عورت کی تصویر کسی غلط قسم کے آدمی کے ساتھ جوڑ کر دو تصویروں سے تیسری تصویر گھڑ لی۔ ڈبل ایکسپوژر سے شریف آدمی کو حوالات کی سلاخوں کے پیچھے، کسی اور کی خواب گاہ میں، ہر جگہ دکھایا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی یہ تابوت الگ ہوگا جس میں شملا کو دکھایا گیا ہے۔"

"یہ بحث کرنے کی جگہ نہیں ہے۔" رابعہ نے تصویر میرے ہاتھ سے لے کر اپنے بلاؤز میں غائب کردی۔ "میں نہیں کہ ایسا ہی ہوگا لیکن اس تصویر کا اس لاش کے پیچھے ملنا۔ یہ کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں... اس بات کا میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔"

"ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ یہاں سے بھاگ چلو۔" رابعہ نے دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

باہر سے کسی نے دروازے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "اے بھیا کا گئے؟"

رابعہ نے دروازے کے پاس جاکر آواز بدل کے کہا۔ "کون ہے رے؟"

"اجی ہم پروہت جی کے پاس آئے تھے۔ جنم کنڈلی لے رہی بٹیا کا مہورت نکلوا دیویں۔"

رابعہ نے کہا۔ "ذرا دیر میں آویں گے۔ بول گئے تھے۔"

"اچھا ہم بھور بھئے آجائیں گے۔ رام رام۔"

میں نے مصیبت کے ٹل جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ رابعہ نے بڑے اعتماد کے ساتھ خطرے کو ٹال دیا تھا۔ میں کان دروازے سے لگائے جانے والے کے قدموں کی چاپ سنتا رہا۔ کھڑکی میں سے جھانکنے پر مجھے اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

"رابعہ! تم اس بڑھیا کو ہوش میں لاؤ۔ کوشش کرو۔ شاید کچھ بتائے۔"

"کچھ بتانے سے پہلے اگر یہ چلانے لگے۔ ہم بھی تو اجنبی مالک کے گھر میں۔" رابعہ نے کہا۔

لیکن میں نے اب تھوڑی سی تفتیش کا رسک لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ چنانچہ رابعہ مجبور ہوگئی۔ اس نے مٹکی میں سے تھوڑا سا پانی کٹوری میں انڈیل کر بڑھیا کے منہ پر چھینٹے مارے اور ایک چمچے سے تھوڑا سا پانی اس کے حلق میں اتارا۔

میں نے پروہت کی لاش کو احتیاط سے پلٹا۔ اس کی کھلی آنکھوں میں مجھے زیست کا آخری لمحہ منجمد محسوس ہوا۔ موت سے پہلے اس کے دل میں آنے والا خیال ایک مجسم سا بن کے ایسے ٹھہر گیا تھا جیسے کسی حادثے میں مرنے والے کے ہاتھ کی گھڑی میں وقت رک گیا ہو۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ میں نے خود بھی اس کیفیت کا مشاہدہ بہت سے سانحوں میں کیا تھا۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے پروہت خوف زدہ تھا۔ وہ حیران تھا۔ اس کی آنکھوں کی بے یقینی کا تاثر یہ ظاہر کرتا تھا کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا انتہائی غیر متوقع تھا۔ وہ اپنے قاتل سے ایسی سفاکانہ حرکت کی ہرگز امید نہیں رکھتا تھا۔

اس تاثر کو اہمیت دینے سے کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ نہ قاتل کا نام، نہ پتا، نہ حلیہ، نہ نشان۔ وہ آلہ قتل بھی چھوڑ کر نہیں گیا تھا اور قتل کی وجہ معلوم کرنے کی ذمے داری بھی پولیس کو سونپ گیا تھا۔ تاہم ایک بات میں نے پورے وثوق کے ساتھ سمجھ لی تھی۔ یہ قتل ہمارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی ہوا تھا۔

اس قتل کا ہم سے کوئی نہ کوئی تعلق بھی تھا ورنہ شملا کی وہ تصویر وہاں یوں نہ رکھی جاتی۔ ایسا نہیں تھا کہ تصویر قاتل کی جیب سے نکل کر گر گئی ہو۔ تصویر وہاں عمداً چھوڑی گئی تھی۔ اس طرح کہ چھپی نہ رہے۔

بڑھیا نے کراہ کے آواز نکالی تو میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "یہ ہوش میں آنے لگی ہے۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے اس کے منہ پر کچھ اور پانی کے چھینٹے مارے۔ اس نے آہستہ آہستہ بڑھیا کو ماتاجی کہہ کر بھی پکارا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ بڑی بی کو مزید پانی نہ پلائے۔ بیہوشی کی حالت میں بعض اوقات پانی سانس کی نالی میں اتر جاتا ہے تو موت کا سبب بن جاتا ہے۔

"تم سامنے سے ہٹ جاؤ۔" رابعہ نے کہا۔ "تاکہ ہوش میں آنے کے بعد اس کی نظر تم پر نہ پڑے۔"

"مانا کہ تم بے حد حسین ہو۔ مگر کیا میری شکل اتنی بھیانک ہے؟" میں نے احتجاج کیا۔

"کسی عورت کو اپنے سامنے پاکے یہ خوف زدہ نہیں ہوگی۔" رابعہ نے کہا۔ "گھر کے اندر کسی مرد اجنبی کا چہرہ نظر آئے تو چلانے لگے گی۔"

رابعہ کی دلیل میں معقولیت تھی۔ میں پھر پروہت کی لاش کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے صرف دھوتی پہن رکھی تھی چنانچہ جامہ تلاشی بے سود تھی۔ اس مختصر سے کمرے کے اسباب میں بھی مجھے ایسی کوئی چیز ملنے کی امید نہ تھی جس سے قاتلوں کے بارے میں یا قتل کے اسباب کا پتا چل سکتا۔ مثلاً خطوط، ڈائری یا ٹیلیفون بک۔ کمرے کی کل کائنات چند برتن اور ایک ٹین کا صندوق تھے۔ صندوق میں تالا لگا ہوا تھا۔

چابیوں کا ایک گچھا بڑی بی کے ایک پلو سے بندھا ہوا تھا۔ اس میں پانچ چابیاں تھیں جو بظاہر فالتو ہی لگتی تھیں۔ اس کمرے میں واحد قفل صندوق کا تھا۔ دوسرا قفل شاید وہ کہیں جاتے وقت دروازے میں ڈالتے ہوں گے۔

ایک چابی سے میں صندوق کا تالا کھولنے میں کامیاب رہا۔ اس کا ڈھکن اٹھانے سے پہلے میرا خیال یہ تھا کہ شاید اس میں تھوڑا بہت نقد اندوختہ ہوگا اور کچھ زیورات۔ باقی گزرے

www.paksociety.com

دفتوں کی نشانیاں ہوں گی۔ بڑی بی کی شادی کا زری گوٹے والا، کافور کی خوشبو سے مہکتا جوڑا یا نصف صدی پرانے سہرے کے سوکھے ہوئے پھول۔ ایک ادھ پرانی تصویر "اپنے شوہر کی یا ان بچوں کی جو اب پاس نہیں تھے" کپڑوں کے نیچے ہو گی لیکن ڈھکن کھلتے ہی میری نظریں اوپر رکھے ہوئے تھے پرانے نوٹوں کی گڈیوں پر جم کے رہ گئیں۔ اس صندوق میں ایک "پانچ" دس اور سو کے نوٹ الگ الگ دھاگے باندھ کر رکھے گئے تھے۔ ان کی مجموعی مالیت کا میں کوئی اندازہ نہ کر سکا۔

میں صندوق بند کرنے ہی والا تھا کہ میری نظر ڈھکنے میں اندر کی جانب بنی ہوئی پاکٹ پر پڑی۔ اس میں کچھ خطوط تھے جو لفافوں سمیت رکھے گئے تھے۔ میں نے دو لفافے نکال کر صندوق کو دوبارہ مقفل کر دیا۔

ایک کو چھوڑ کر باقی سب لفافے پرانے تھے۔ ان پر لکھی ہوئی تحریر کی روشنائی کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا تھا۔ یہ سب خطوط ہندی میں تھے۔ چنانچہ میں کسی کا مضمون نہ پڑھ سکا۔ نئے لفافے پر تین دن پہلے کی مہر تھی اور انگریزی میں تھی۔ یہ خط مقامی ڈاک سے آیا تھا اور بمبئی ہی میں پوسٹ کیا گیا تھا مگر اس کے اندر سے کوئی کاغذ نہیں نکلا۔ لفافے کی پشت پر لکھنے والے نے اپنا نام پتا بھی ہندی میں تحریر کیا تھا۔ کسی وجہ کے بغیر میں نے اسے رکھ لیا۔

بڑی بی نے ہوش میں آنے آنے میں منٹ لگا دیے۔

اس تمام عرصے میں میرا دھیان باہر کی ہر آہٹ میں اٹکا رہا۔ خطرہ ہمارے سر پر تلوار کی دھار بن کر لٹک رہا تھا اور یہ تلوار ایک لمحے کے نازک رشتے سے بندھی ہوئی تھی۔ جو سوت کے کچے دھاگے کی طرح ایک جھٹکے سے ٹوٹ سکتا تھا۔ اگلے لمحے شکاری دروازے کو توڑ کر اندر آ سکتے تھے "قانون کے محافظوں کے ساتھ۔ یا کوئی اجنبی ہمارے جرم کا گواہ بن کے نازل ہو سکتا تھا۔ اور شور مچا کے ہجوم کو اکٹھے کر سکتا تھا۔ میں طے کر چکا تھا کہ یوں رنگے ہاتھوں آسانی سے پکڑے جانے پر میں مقابلے کو ترجیح دوں گا۔ یہ بات میں نے رابعہ کو بھی سمجھا دی تھی کہ ہم ماریں گے اور مر جائیں گے مگر جب تک ہمارے ریوالور میں ایک بھی گولی ہے اور ہاتھوں میں دم ہے ہم کسی کے ہاتھ نہیں آئیں گے۔ مقابلہ کرتے ہوئے نکل جانے کی کوشش کرنے میں تھوڑا بہت چانس تھا۔ بلا مقابلہ ہتھیار ڈال دینے کی صورت میں یہ چانس بالکل نہیں تھا۔

ہوش میں آتے ہی بڑی بی نے کراہ کے کچھ کہا جو نہ میری سمجھ میں آیا نہ رابعہ کی۔

رابعہ نے کہا "موسی! یہ کیا ہوا؟"

ماتاجی کے بجائے موسی کا رشتہ مجھے بھی زیادہ مناسب لگا۔ رابعہ نے اپنی آواز میں دکھ اور ہمدردی کے جذبات سمونے کے لیے اداکاری کا سہارا نہیں لیا تھا۔ یہ جذبات فطری تھے چنانچہ اس کی آواز بھی گلوگیر ہو رہی تھی۔

بڑی بی نے چند اور الفاظ کہے جو اتنے ہی ناقابل فہم تھے۔ رابعہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ رابعہ نے اس کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔ شاید اسی لیے بڑی بی نے اجنبی عورت کے وجود کو تحفظ کی علامت سمجھ کر قبول کر لیا۔ میں نے خود کو پیچھے والی دیوار کے قریب رکھا جہاں بڑی بی کی نظر مجھ پر نہیں پڑ سکتی تھی۔

رابعہ نے کٹوری میں پانی ڈال کر بڑی بی کو سہارا دیا۔ انہوں نے ایک گھونٹ پی کے وحشت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ کس نے کیا ہے موسی؟"

بڑی بی نے کانپتی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تامل یا منگلوری بول رہی تھیں۔

"پروہت جی کو کس نے مارا ہے موسی؟" رابعہ نے اپنی کوشش جاری رکھی۔

بڑی بی نے دو انگلیوں سے اشارہ کیا "کیرتی۔ بی رو سودن۔" پھر اس نے چاقو مارنے کے انداز میں ہاتھ چلا کے مفہوم واضح کر دیا کہ ان دو نے پروہت کو مارا ہے۔

اب میں دونوں ہاتھ جوڑ کے بڑی بی کے سامنے آ گیا۔ میں نے ہندوؤں کے رواج کے مطابق ان کے پیروں کو ادب کے طور پر چھو کے اپنی نیک نیتی کے جذبات کا اظہار کیا تاکہ وہ مجھے اپنا برخوردار اور سعادت مند تسلیم کر لیں۔

ان کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کے میں نے کہا "موسی! یہ میری دھرم پتنی۔" میں نے رابعہ پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہم پروہت جی کے پاس آئے تھے۔ ان کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔"

بڑھیا نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ رابعہ نے گھبرا کے میری طرف دیکھا کہ "اب بتاؤ" اسے چپ کیسے کرایا جائے۔ اس سے صرف نام معلوم ہوئے تھے جو بڑے کے بچھڑے کا پوچھنا بہت مشکل کام تھا۔ نہ وہ ہماری زبان سمجھتی تھی نہ ہم اس کی۔

اچانک میں نے وہ نیا لفافہ نکال کے اسے دکھایا اور اس پر لکھے ہوئے پتے پر انگلی رکھ کے پروہت کی طرف اشارہ کیا۔ بڑی بی نے اقرار میں سر ہلایا۔ اس سے میں نے نتیجہ نکالا کہ لفافے پر نام اور پتا پروہت کا تھا۔ پھر میں نے لفافے الٹ کر

بڑی بی نے روتے روتے کہا "کیرتی۔ مدھو سودن۔"

میں نے سینے پر انگلی رکھ کے کہا "یہ مدھو سودن کا باپ ہے؟"

بڑی بی نے اقرار میں سر ہلایا اور سینہ کوٹ کے رونے لگی۔ اب میرے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بڑی بی کو جیسے جیسے ہوش آ رہا تھا اس کا احساس غم شدت اختیار کر رہا تھا۔ وہ کچھ چلانے بھی لگی تھی۔ شاید وہ ہم سے پوچھ رہی تھی کہ آخر ہم کون ہیں اور اس کے گھر میں گھس کے دروازہ کیوں بند کیے بیٹھے ہیں۔ ہم لوگوں کو کیوں نہیں بلاتے۔ انہیں بتاتے کیوں نہیں کہ پروہت کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ پولیس کو اطلاع کیوں نہیں کرتے؟

بڑی بی سے خاموش رہنے کی یا آہستہ بولنے کی التجا کرنا بے کار تھا۔ ان حالات میں میرے ذہن نے فوری فیصلہ کیا اور میں نے یکلخت سعادت مندی کا جھوٹا لبادہ اتار کے سفاک دشمن کا چہرہ بنا لیا۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اس بڑھیا پر ظلم کروں۔ جو پہلے ہی بہت مظلوم تھی۔ اس کی جان ناتواں معمولی سے تشدد کی تاب بھی نہیں لا سکتی تھی۔

اسے چپ کرانے کے لیے میں نے خوفناک شکل بنا کے اور آنکھیں نکال کے اسے گھورتے ہوئے ایک انگلی ہونٹوں پر رکھی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کا شکنجہ سا بنا کر اس پر واضح کرنے کی کوشش کی کہ میں اس کا گلا بھی دبا سکتا ہوں۔ اس کے بعد بڑی بی کی یہ خوش فہمی باقی نہ رہی کہ ہم اس کے ہمدرد بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمارے شریفانہ روپ کا بھرم کھل گیا اور ظاہر ہے اس کے بعد ہم صف دشمناں میں شامل ہو گئے۔

میرے خون آشامی کے مظاہرے نے بڑھیا کو فوراً خوفزدہ کر دیا اور وہ ایک دم چپ ہو گئی۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" رابعہ نے شکایت کے لہجے میں کہا۔

"اور کیا کرتا میں۔ اس کی آواز باہر پہنچ جاتی تو دروازے پر مجمع لگ جاتا۔ ہمارا باہر نکلنا مشکل ہو جاتا۔"

"اب کیسے باہر نکلیں گے ہم؟" رابعہ نے کہا "اس سے تو کچھ معلوم ہو گا نہیں۔ پھر ٹھہرنے کا فائدہ۔"

میں نے کہا "مجھے یہ بڑھیا پروہت کی ماں بھی نہیں لگتی۔"

"بھئی کا کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بیوی تو ہو نہیں سکتی۔ ماں ہوتی تو اپنے جوان بیٹے کی خون آلود لاش ایسے نہ دیکھ سکتی۔ اگر صدمے سے اس کا ہارٹ فیل نہ ہوتا تو دماغ ضرور خراب ہو جاتا۔ اسے بس اتنا ہی صدمہ ہے جتنا کسی بھی عورت کو ایک لرزہ خیز قتل کی واردات دیکھ کر ہو سکتا ہے۔"

"اب اس سے کیسے پوچھیں کہ یہ کون ہے؟" رابعہ نے بے بسی سے کہا۔

"یا تو بڑھیا کسی کام سے آئی ہوئی یا پڑوس میں کہیں رہتی ہو گی یا پھر یہ پروہت کی موسی وغیرہ ہو گی۔ کوئی بے آسرا عورت جو یہاں رہتی ہو گی اور پروہت کے کام کر دیتی ہو گی۔ خیر اب اسے کیا فرق پڑتا ہے کہ مرنے والے سے ان کا کیا رشتہ تھا۔"

رابعہ نے کہا "جو رشتہ تھا وہ تو ٹوٹ گیا۔"

میں نے کہا "پہلے تم باہر جھانک کر دیکھو لائن کلیئر ہے اور نکل جاؤ۔"

"تم کیسے نکلو گے؟" رابعہ نے تشویش سے کہا "یہ شور نہ مچا دے۔"

میں نے کہا "میں اسے اشاروں کی زبان میں سمجھا دوں گا کہ چپ پڑی رہے۔ ناگزیر ہو گیا تو اس کو خاموش کرنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"کیا کرو گے؟ پھر بیہوش کر دو گے اسے؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "نہیں۔ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا میں۔ خواہ مخواہ قتل کا الزام نہ آ جائے مجھ پر۔ میں اسے تھوڑا سا باندھ کر اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے کام چلا لوں گا۔ پہلے تم باہر کا جائزہ لو اور اگر آس پاس کوئی نہیں ہے تو مجھے سگنل دو۔ میں ایسے ہی دوڑ کے باہر نکل جاؤں گا۔ اگر باہر سے کنڈی لگا کر ہم رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھائیں اور ان گلیوں میں گم ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟"

"کوئی حرج نہیں۔" رابعہ نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا مگر وہ دروازے سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر تھی جب کسی نے باہر سے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا۔ رابعہ اچھل پڑی۔ میں نے بڑی بی کو دبوچ کر اس کا منہ پکڑ لیا۔

"کون ہے؟" اس نے بمشکل تمام کہا اور پیچھے ہٹ گئی۔

"تم کون ہو؟ دروازہ کھولو۔" کسی نے ڈانٹ کر کہا۔

میں نے یہ آواز ابھی کچھ دیر پہلے ہی سنی تھی۔ "یہ تو وہی معلوم ہوتا ہے جو اپنی بیوی کی جنم کنڈلی لے کر آیا تھا۔" میں نے رابعہ کے کان میں سرگوشی کی۔

رابعہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "معلوم ہوتا ہے اسے شک ہو گیا تھا۔ بڑھیا ہندی اردو جانتی ہی نہیں۔"

باہر کم سے کم تین افراد گفتگو کر رہے تھے۔

"ارے ہم ابھی آئے تھے۔ پروہت جی سے ملنے۔ اس وقت بھی یہ ناری اندر تھی۔"

"کون ناری ہے؟" کسی دوسرے شخص نے کہا۔

"پروہت کی کھولی میں ناری۔" تیسرا بولا۔

www.paksociety.com

"تم نے ابھی سنا نہیں؟" پہلے والے شخص نے کہا "اندر کیوں چھپ کر بیٹھی ہے آخر؟ دروازہ کیوں نہیں کھولتی۔"

"اور پروہت اندر ہے تو در کیوں چپ ہے؟" دوسرے شخص نے اپنے شک کا واضح اظہار کیا۔

"معاملہ گول مال ہے۔"

میں نے رابعہ سے کہا "جاؤ دروازہ کھول کر ان سے بات کرو۔ ان کا شک رفع کرو۔"

"میں۔ کیا کہوں ان سے؟"

"کہہ دو کہ پروہت تمہیں یہاں چھوڑ کر مندر گیا ہے۔ کہہ گیا تھا کہ ابھی واپس آتا ہوں۔" میں نے کہا "ان کو مندر بھیج دو کہ پروہت کو تلاش کرلائیں تاکہ تم گھر جاسکو۔"

"ارے ہم بولتے ہیں دروازہ کھول دے۔ پروہت!" پہلے شخص نے پھر دروازہ بجاتے ہوئے کہا۔

میں نے رابعہ کو دھکیلا۔ "جاؤ ورنہ اور لوگ جمع ہوجائیں گے۔ باہر جاکے بات کرنا۔"

رابعہ نے کہا "وہ اندر ضرور جھانک کر دیکھیں گے۔ ہوسکتا ہے سیدھے اندر آجائیں۔"

اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں بلاوجہ بڑی بی کے منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہوں۔ کیونکہ وہ پھر بیہوش ہوگئی ہے۔ میں اسے چھوڑ کر اٹھا۔

"چلو تم دروازہ کھولو۔" میں نے خود دروازے کے پیچھے دیوار سے لگ کر کہا "آنے دو جو آتا ہے۔"

رابعہ نے کنڈی کھول کر دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا۔ "یہ کیسا شور ہے۔"

"ہم پروہت سے ملنے آئے ہیں۔"

"پروہت نہیں ہے۔ ہوتا تو اب تک آجاتا۔" رابعہ نے کہا۔ "پروہت گھر میں نہیں ہے تو تم اندر کیا کررہی ہو؟" شکی مزاج شخص نے کہا "تم کون ہو؟"

"پروہت مجھے بٹھا کر مندر گیا تھا۔"

"مگر تم ہو کون مندری؟" پہلے شخص نے کچھ طنز سے کہا۔

"یہ خود پروہت بتائے گا تجھے۔" رابعہ نے چمک کر کہا۔ "جا اسے بلا کے لے آ۔ زیادہ بک بک مت کر۔"

"ہاں ہاں، ابھی دیکھ کر آتا ہوں مندر میں۔" رابعہ سے ڈانٹ کھانے والے نے مشتعل ہو کے کہا۔

"میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔" دوسرے شخص نے کہا۔

"میں کہتا ہوں چھوڑ دو۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" معلوم نہیں یہ کون صلح پسند شخص تھا۔

"جاؤ جاؤ، سب جاؤ۔ میں کھڑا ہوں یہاں۔" ایک اکھڑ لہجے والے شخص نے کہا "مجھے کچھ گول مال لگتا ہے۔"

"گول مال کے بچے! تیری مونچھیں اصلی ہیں یا نقلی مونچھیں لگا کے اکڑتا پھرتا ہے۔" رابعہ نے غرا کے کہا "گول مال کرتی ہوگی تیری بہن۔"

"عورت جات ہے اس لئے لحاظ کررہا ہوں سالی۔"

"سالی بنا اپنی ماں کو۔" رابعہ نے اسے مزید مشتعل کردیا۔

"جوتیاں مار مار کے شکل اور بگاڑ دوں گی تیری... کتے۔"

اس کے بعد وہ شخص پاگل بیل کی طرح اندر آگیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ خود رابعہ بھی یہی چاہتی ہے۔ اور میں نے اس کے استقبال کی تیاری کرلی تھی۔ رابعہ ایک قدم پیچھے ہٹی اور میں نے اسے اندر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کے لئے یہ سب اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ حلق سے احتجاج بھی نہ کرسکا۔ میرے سیدھے ہاتھ کے بھرپور وار نے اسے ہوش سے بیگانہ کردیا۔ اس نے منہ کھول کے ایک ادھوری سانس اندر کھینچی اور دھڑام سے فرش پر گرا۔

"ارے کا ہوئی گوا؟" باہر سے کسی نے پکار کے کہا۔ رابعہ ہنسی "اندر آکے دیکھ لے نا۔ آ۔ ڈرتا کیوں ہے۔"

دوسرا شخص بادل ناخواستہ اندر آگیا۔ ایک عورت کا چیلنج قبول کرنا اس کی مردانہ انا کے لئے ضروری ہوگیا تھا۔

"اور بھی ہے کوئی؟" میں نے دوسرے فری کو بھی لٹانے کے بعد ہاتھ جھاڑ کے کہا۔

اس سے پہلے کہ رابعہ جواب دیتی "وہ عورت اندر آئی جس کو میں دوبار شٹل کاک برقع میں دیکھ چکا تھا لیکن پلک جھپکتے ہی اس نے نقاب اٹھادیا اور میں اتنا حیران ہوا کہ میں نے بکلا کے کہا "تم! لاحول... ولا قوۃ..." اور مجھ سے زیادہ حیرت کا شکار ہونے والی رابعہ نے تقریباً چلا کر کہا "یوسف ثانی!"

برقع میں سے جھانکنے والا چہرہ شہزادہ گلفام عرف یوسف ثانی کا ہی تھا جو میری بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ اس نے اپنا برقع اتار کے رابعہ کے حوالے کیا اور بولا "اس میں ہوجائیے روپوش۔ بلی مسلوں کو کیجئے فراموش۔ قائم رکھئے حواس و ہوش۔"

میں نے کہا "یوسف ثانی! تم یہاں کیسے آگئے؟"

اس نے کہا "حضور وقت نہیں حجت کا۔ کام ہے عجلت کا۔ جب وقت ملے گا وضاحت کا۔ تو انعام بھی لوں گا اس خدمت کا۔"

اس نے اچھل کے برقع رابعہ کے سر پر ڈالا اور پھر اسے باہر دھکیل کر میری طرف لپکا مگر میں پہلے ہی رابعہ کے ساتھ

نکلنے کے لئے تیار ہوچکا تھا۔ وہ مجھ سے ٹکرایا اور باہر جاگرا۔ اس کی بڑی ٹوپی گلی میں جا پڑی لیکن اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ وہ بجلی کی طرح لپک کے اٹھا۔ جلدی سے ٹوپی کو جھاڑ کے سر پر رکھا اور منہ اٹھا کر باہر جانے والے راستے کی طرف چل پڑا۔ زنبیلی شیروانی اور پتلون میں اس کی چال کچھ زیادہ ہی مضحکہ خیز لگتی تھی۔

ہم چند قدم ہی گئے تھے کہ میں نے سامنے سے چار پانچ افراد کو تیز تیز قدموں سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ ان کے تیور جارحانہ لگتے تھے اور میں نے ان کے قریب سے گزرتے ہوئے انہیں آواز سے شناخت کرلیا۔ ان میں ایک تو وہی تھا جس نے رابعہ کو مندری کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اور جواب میں رابعہ نے اسے بک بک بند کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ مندر میں پروہت کو تلاش کرنے گیا تھا۔ اور ناکامی نے اسے مزید مشتعل کردیا تھا۔

"ایسی دو ناری ہے کوئی ایسی ویسی۔ ہم تو صورت سے پہچان لیتے ہیں۔" اس نے میرے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔

"یہ بدماس۔ ابھی پوچھ لیتے ہیں پروہت سے۔" اس کے ساتھی نے اعلان کیا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اپنی دھن میں وہ ہم پر غور کئے بغیر گزر گئے۔ انہوں نے صرف رابعہ کو دیکھا تھا جو اب برقع میں ملفوف تھی۔ پھر بھی میرے پیچھے پھدکتے ٹانپ شخص کے ساتھ ایک خالص برقع پوش خاتون کا ساتھ اس مندر کے علاقے میں شکوک پیدا کرسکتا تھا۔

یوسف ثانی بار بار مڑ کر ہمیں ہاتھ کے اشارے سے تیز چلنے کا اشارہ کررہا تھا۔ اس شخص نے جن کی طرح نمودار ہوکے مجھے قائل کردیا تھا کہ محمد خان غلط نہیں کہتا تھا۔ الہ دین کے چراغ کا جن بن بلائے نہیں حاضر ہوتا تھا۔ اسے بلانے کے لئے چراغ بہرحال رگڑنا پڑتا تھا لیکن یہ شخص تو خود نازل ہوا تھا۔ میرے ذہن میں اس کا خیال تک نہ تھا ورنہ میں سمجھتا کہ خدا نے میری سن لی اور اسے بھیج دیا۔

اتنی ہی حیران کن اور عقل میں نہ آنے والی بات اس کا برقع میں نمودار ہونا تھا۔ اسے میں نے دو مرتبہ دیکھا تھا اور میں یہ سمجھا تھا کہ شاید اس کا پروہت کے قتل سے کوئی تعلق ہوگا بلکہ اصل صورت حال اس کے برعکس تھی۔ وہ ہمارا تعاقب کررہا تھا اور ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے کسی طرح اندازہ کرلیا تھا کہ ہم مشکل میں پڑ چکے ہیں اور بالکل وقت پر فرشتہ غیب کی طرح ہمیں یہاں سے نکال لانے میں کامیاب رہا تھا۔ ایسے حالات میں بھی وہ اپنی قافیہ پیمائی نہیں بھولا تھا اور اس نے گفتگو مختصر ہی تھی مگر اپنے شاعرانہ انداز میں اور ہم پر یہ بھی واضح کردیا تھا کہ اس خدمت کا معاوضہ محض شکریے کے الفاظ اور جذبۂ احسان مندی کا اظہار نہیں ہوگا۔

ہم جس راستے سے آئے تھے وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ اب ہمیں کسی اور راستے سے نکال کے لے جانا چاہتا تھا۔

میں نے کہا "آخر یہ کدھر جارہا ہے؟"

رابعہ نے برقع کے اندر سے کہا "مجھے کیا معلوم مجھے تو اندر سے خود اپنے سر پیر کا پتا نہیں چل رہا ہے۔"

"بال بال بچ گئے آج۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے مجھے ٹھوکا دیا "آگے چلو۔ لوگوں کو شک ہوگا کہ یہ باپردہ بی بی اس پجاری کے ساتھ کیا باتیں کررہی ہے۔"

میں چند قدم آگے ہوگیا مگر پھر مجھے رک کر رابعہ کو اٹھانا پڑا جو برقع میں الجھ کر گر گئی تھی۔ ہم مندر سے کافی دور آگئے تھے اور سوائے ایک شخص کے جو جھونپڑی کے سائے میں لیٹا شراب پی رہا تھا کسی نے یہ منظر نہیں دیکھا۔ وہ دور سے ہنسا مگر میں نے اسے نظر انداز کردیا۔

"چوٹ تو نہیں آئی؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے لنگڑاتے ہوئے میرے پیچھے چلنا شروع کردیا۔ "گھٹنا چھل گیا ہے۔"

"ذرا سنبھل کے چلو۔" میں نے کہا۔

"بالکل آؤٹ آف پریکٹس ہوں۔ برقع کبھی اوڑھا ہی نہیں۔ اور یہ کوئی برقع ہے۔ چلتا پھرتا خیمہ ہے۔" رابعہ نے شکوہ شکایت کے انداز میں چڑاتے ہوئے کہا "معلوم نہیں وہ کیسے پہن کے مزے سے گھوم رہا تھا۔"

"اندر کا موسم کیسا ہے؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"اس یوسف ثانی سے پوچھنا کہ آخری بار کب نہایا تھا۔ ایسی بدبو بھری ہے اندر کہ معلوم ہوتا ہے میں گٹر میں چل رہی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔

ایک جگہ پہنچ کے یوسف ثانی رک گیا "آج اللہ کو نہ ہوتا منظور۔ تو ہوجاتے مرحوم حضور مگر اب نہ ہوں رنجور۔ خطرہ ہوگیا ہے دور۔"

میں نے کہا "یوسف ثانی! تم نے آج کمال کردیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیسے ہمارے پیچھے پیچھے آگئے۔ اور تم نے برقع اوڑھ کے ہمارا تعاقب کیوں جاری رکھا؟"

رابعہ نے جھنجلا کے کہا "وہ کہہ تو چکا ہے کہ بعد میں وضاحت کردے گا۔ تمہیں ابھی اسی جگہ سب جاننے کھڑا ہوجانا ہے۔"

میں نے کہا "معاف کرنا۔ مجھے خیال نہیں رہا کہ تم ابھی

www.paksociety.com

تک قید میں ہو۔ چلو نکل آؤ باہر۔"

"نہیں ابھی نہیں سرکار! برقع سے ابھی نہ ہوں نمودار۔"

یوسف ثانی نے کہا "آپ ہیں ایک بی بی پردہ دار۔ لیکن یہ آپ کے شوہر نامدار۔ مجھے سے نظر آتے ہیں مشکل کشار۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑا ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ رابعہ کا برقع میں رہنا ضروری ہے۔ میں اس کے ساتھ غلط نظر آتا ہوں۔ الگ ہم ہو نہیں سکتے۔"

یوسف ثانی نے تھوڑا سا اچھل کے میرے سر پر ہاتھ مارا۔ اس نے میرے سر کے اوپر سے وہ جعلی سی اتاری جس کی وجہ سے سر منڈا ہوا گنجا نظر آتا تھا۔ جعلی کے کنارے بالوں کے ساتھ کسی لوشن سے چپکائے گئے تھے چنانچہ اس نے جعلی کو نوچ کے الگ کیا تو میرے بال بھی ساتھ ہی چلے گئے۔

"ارے آہستہ۔" میں نے کہا "سارے بال بھی ساتھ ہی اتارنے ہیں کیا۔"

یوسف ثانی نے میری بات کا برا نہیں مانا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے نصف دائرے میں گھما دیا "اب بدل دیں یہ صورت ہندوانی۔ اس نلکے میں آ رہا ہے پانی۔ دھو ڈالیں کفر کی ہر نشانی۔ جمعہ سے کریں تکمیل مسلمانی۔"

پریشانی کے باوجود مجھے اس کی بات نے ہنسنے پر مجبور کر دیا اور منہ دھوتے ہوئے میں اس کی آخری بات پر بے اختیار ہنس پڑا۔ اس شخص کی قافیہ رانی کی نہ کوئی حد تھی نہ انتہا۔ بس وہ بولتا جاتا تھا اور جو کچھ وہ کہتا تھا اس میں نہ بحر ہوتی تھی اور نہ وزن ہوتا تھا۔ چنانچہ اسے آزاد شاعری بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مگر اس کا کمال یہ تھا کہ بات کتنی بھی لمبی ہو اور کیسی بھی ہو اس کے جملے ہم قافیہ رہتے تھے۔ آغا حشر کے اسٹیج کا یہ زندہ کردار بلاشبہ ایک عجوبہ تھا۔ جمعہ کا اشارہ اس نے ایک خاص انداز میں کیا تھا جس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ میں اسی دھوتی کو کھول کر پھر باندھوں اور تہمد بنا لوں۔ اس طرح میں مسلمان نظر آنے لگوں گا۔ مگر تکمیل مسلمانی کی اصطلاح ایسی تھی کہ شاید برقع کے اندر خود رابعہ کو بھی ہنسی آئی ہوگی۔

وہ تاریک سا گوشہ جہاں نلکا لگا ہوا تھا ایسی جگہ نہ تھی جہاں میں آسانی سے "تکمیل مسلمانی" کر سکتا۔ ایک کے بعد ایک وہاں سے مرد عورتیں، بچے پانی کی بالٹیاں اور ڈول بھرتے آ رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند حضرات غسل فرماتے ہوئے اس اصول پر عمل کر رہے تھے کہ اصل پردہ تو آنکھ کا ہوتا ہے۔ دوسری طرف شاید زنانہ باتھ روم تھے ادھر چٹائیاں کھڑی کر دی گئی تھیں اور اگرچہ لیڈیز اینڈ جینٹس کو الگ الگ کر دیا گیا تھا مگر پھر بھی ایک حمام والا ماحول دونوں پر لاگو ہوتا تھا۔ میں نے بھی اس [illegible] سہولت سے استفادہ کرتے ہوئے دھوتی کو تہمد کے انداز میں باندھا اور تکمیل مسلمانی کر کے واپس آیا تو رابعہ خلاف سمت میں منہ کئے کھڑی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس کے بولنے سے ہوا ورنہ اوپر سے تو پتا بھی نہ چلتا کہ وہ کدھر دیکھ رہی ہے۔

"بندہ چاہتا ہے اب اجازت۔" یوسف ثانی نے میری صورت اور میرے حلیے پر اطمینان کی نگاہ ڈال کے کہا "اگر کی آپ کو نہیں ہے حاجت۔ اللہ نے کی آپ کی حفاظت۔ ہوگی پھر ملاقات کی حاصل سعادت۔" پھر وہ لنگڑے کی طرح چلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

"کیا چیز ہے یہ۔ میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا کہ یہ پاگل بنتا ہے یا بنا ہوا ہے۔" میں نے کہا "بیک وقت اتنا بے وقوف اور اتنا ہوشیار آدمی کیسے ہو سکتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "آج وہ نہ آتا تو ہم پھنس گئے تھے۔ اب خدا کا شکر ادا کرو اور چلو۔ وہ کون سی خیراتی ڈسپنسری تھی؟"

میں نے کہا "اب ڈر کیسا۔ کام ختم کر کے چلیں گے۔"

رابعہ نے کہا "ایسے کام نہیں ہوگا۔ تم خود تو حلیہ بدل کے بے خوف ہو گئے ہو۔ میں کیا کروں۔ مجھ سے برقع میں تنہا چلا جاتا۔"

میں نے کہا "مجھے احساس ہے تمہاری دشواری کا لیکن یہ بھی تو سوچو کہ تمہارا چہرہ جس نے بھی دیکھا ہوگا وہ فوراً پہچان جائے گا۔ ایک تو خدا نے صورت لاکھوں میں ایک دی ہے۔ پھر یہ کہ پروہت کے گھر میں تمہیں جو لوگ دیکھ چکے ہیں وہ اب تک تمہارا حلیہ سب کو بتا چکے ہوں گے کہ پروہت کو قتل کرنے والی ایک دو دھاری تلوار تھی۔ حسن بے مثال تو زبان میں بھی لاجواب۔ مجھے وہاں کسی نے نہیں دیکھا تھا اور جنہوں نے دیکھا تھا وہ میرے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔"

رابعہ احتجاجی انداز میں میرے ساتھ چلتی رہی "تو کیا واپس وہیں جانا ہے؟"

میں نے کہا "خیر اب اتنا بھی عقل سے پیدل مت سمجھو مجھے۔ وہاں ایک مجمع ہوگا۔ ممکن ہے پولیس بھی آ گئی ہو۔ لاشیں تو کسی کو کچھ نہیں بتائیں گی مگر وہ بڑھیا ہوش میں آنے کے بعد سب کی غلط فہمی دور کر دے گی۔ کہ قاتل ایک حسن کی دیوی ہے۔ وہ حسن کی دیوی کے ساتھ ایک پجاری کا ذکر بھی کرے گی۔ مگر ہم دونوں کا ان سے کیا تعلق۔ ہم کیوں ڈریں۔"

"میری مانو تو واپس چلو۔ سلیمان نے جہاں جیپ چھوڑی تھی وہ جگہ معلوم کر لو۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "سلیمان کو میں نے سمجھا دیا تھا کہ اگر

واپسی میں دیر ہو تو جیپ چھوڑ کے چلا جائے اور چابیاں سیٹ کے نیچے رکھ جائے۔ پھر جلدی کیا ہے؟"

"تم کو پروہت سے تو کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔"

"مگر میرے پاس دو نام ہیں۔ مدھو سودن اور کیرتی۔ اور ان کا پتا بھی ہے جو ہندی میں لکھا ہوا ہے۔ میں کسی سے پڑھوا سکتا ہوں۔"

"اس بڑھیا نے انہیں قاتل قرار دیا تھا۔ وہ پروہت کے قاتل ہوں گے تو ہمارے ساتھ ہی پولیس بھی پہنچ جائے گی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ہماری پولیس اتنی جلدی قاتلوں کو گرفتار کرنے لگے تو خواہ مخواہ ایف بی آئی اور اسکاٹ لینڈ یارڈ والے شرمندہ ہوں۔ میں پولیس سے پہلے پہنچ کے ان میاں بیوی سے بات کر لینا چاہتا ہوں۔"

"میاں بیوی؟"

"کیرتی اور مدھو سودن۔ ان کا آپس میں اور کیا رشتہ ہو سکتا ہے؟"

"تم خواہ مخواہ شادی کرا رہے ہو ان کی۔ اس لئے کہ ایک نام عورت کا ہے اور ایک مرد کا۔" رابعہ نے کہا۔

"میں شرط لگا سکتا ہوں اس بات پر اور جیسا کہ تم جانتی ہو یقین کے بغیر میں شرط نہیں لگاتا۔ بولو شرط لگاتی ہو؟"

"جی نہیں، مجھے معلوم ہے آپ کی شرط کیا ہوگی۔" رابعہ نے کہا۔

"یہ تو وہی مشہور لطیفے والی بات ہوگئی۔ میرے جیسے کسی شریف اور بے ضرر آدمی کے پیچھے پڑ گئی تھیں کوئی خاتون کہ تم تو مجھے چھیڑو گے۔ وہ بیچارہ تردید کرتا رہا مگر خاتون بضد کہ نہیں مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے چھیڑو گے۔ وہ قسم کھانے لگا تب بھی وہی بات کہ جھوٹی قسم مت کھاؤ۔ مجھے پتا ہے کہ تم مجھے ضرور چھیڑو گے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

رابعہ برقع کے اندر تھی اس لئے میں اس کی خفت اور لاجواب ہو جانے کی ادائے برہمی نہ دیکھ سکا۔ اس نے جھنجھلا کے کہا "فوراً مطلب نکالتے رہتے ہو... فضول قسم کے۔"

میں نے جیب میں سے لفافہ نکال کے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ایک اسٹریٹ لیمپ کے نیچے مجھے ایک لڑکا نظر آیا۔ ہاتھ میں کتاب لئے کچھ یاد کر رہا تھا۔ شاید اس کے گھر میں بجلی کی روشنی نہیں تھی مگر یہ مجبوری اسے علم کی روشنی کے حصول سے باز نہ رکھ سکی تھی۔

میں نے کہا "بیٹا! یہ پتا بتا سکتے ہو مجھے؟"

لڑکے نے مجھے اور برقع میں ملفوف رابعہ کو غور سے دیکھا اور بولا "مدھو سودن۔ یہی نام ہے نا؟"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ تم جانتے ہو اسے؟ اس کی بیوی ہے کیرتی۔"

لڑکے نے نفی میں سر ہلایا "میں کیسے جان سکتا ہوں لیکن یہ جگہ قریب ہی ہے۔ تم پیدل جا سکتے ہو۔"

میں نے کہا "اچھا مجھے سمجھا دو۔ یا کاغذ پر نقشہ بنا دو۔"

"آسان پتا ہے۔ میں سمجھا رہا ہوں۔" اس نے کہا "کیا تم ہندی نہیں پڑھ سکتے؟"

میں نے کہا "ہندی پڑھ سکتا تو تم سے کیوں پوچھتا۔ تم ایسا کرو کہ انگریزی میں پتا لکھ دو۔"

لڑکے نے کان پر لگی ہوئی پنسل سے نام اور پتے کا ترجمہ کر دیا۔ پھر میری آسانی کے لئے اس نے زبانی ہدایات دیں اور تاریخ رٹنے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اسے پاس ہونے کی دعا دی اور واپس چل پڑا۔ باتوں باتوں میں ہم کافی آگے نکل آئے تھے۔ اگر میں نے پہلے کسی سے معلوم کیا ہوتا تو ہم بلاوجہ کی مسافت طے کرنے سے بچ جاتے۔"

جھونپڑیوں کے علاقے سے نکل کے ہم نے وہی گندہ بدبودار نالا عبور کیا جس میں کارخانوں کا فاضل مواد بہتا تھا۔ یہاں ہوا ابھی مجھے زہریلی لگی۔ اس میں نہ جانے کون کون سی گیسیں شامل تھیں۔ میرے دماغ کو امونیا اور کلورین جیسی تیز چبھنے والی اور دم گھونٹنے والی بو نے چکرا دیا اور نالا پار کرنے کے بعد جب تازہ ہوا کا جھونکا آیا تو میری جان میں جان آئی۔ مجھے ان کی قوت برداشت پر تعجب ہوا جو اس ہوا میں سانس لے کر زندہ تھے اور ان بچوں پر ترس آیا جن کے لئے اس لاکھوں کی آبادی والے 'سرمایہ دار شہر' میں خالص ہوا تک میسر نہ تھی۔ رابعہ نے پل کراس کرتے ہی برقع ہٹا دیا۔ اسے متلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سر پکڑ کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔

نالے کے پار ساری بو اور کیمیائی گیسوں کی سڑاند اس طرف محسوس ہوتی تھی جدھر سے ہوا آتی تھی۔ دوسرے کنارے پر رہنے والے یقیناً خوش قسمت تھے کہ انہیں اس صنعتی علاقے کی کثافت و غلاظت کا تحفہ شرط زندگی کے طور پر قبول نہیں کرنا پڑتا۔

جب رابعہ کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تو میں نے کہا "اب ہٹاؤ یہ نقاب۔ کوئی دیکھنے والا نہیں ہے یہاں۔"

"میں تھک گئی ہوں سکندر!" رابعہ نے برقع اتار کر سمیٹا اور بغل میں دبا لیا۔ ہم پھر چلنے لگے۔

میں نے کہا "مجھے یہاں ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آتی جہاں ہم آرام کر لیتے۔ کوئی ریسٹورنٹ بھی تو نہیں ہے۔"

"کیا ہم اسی طرف نہیں جا رہے ہیں۔ جہاں ہم نے

www.paksociety.com

جیپ چھوڑی تھی؟" رابعہ نے کہا۔ "وہاں ریسٹورنٹ تھا۔"

میں نے مدھوسودن کے گھر کا پتا تلاش کرنے کا ارادہ کچھ دیر کے لئے ملتوی کر دیا۔ ہماری جیپ وہیں بہت سی خراب گاڑیوں کے درمیان موجود تھی۔ کچھ گاڑیاں ڈینٹ پینٹ ہو رہی تھیں۔ باقی شاید کسی اور خرابی کے باعث گیراج کے باہر چھوڑ دی گئی تھیں۔ میں نے سیٹ کے نیچے سے چابی نکالی اور جیپ کو ریورس میں چلا کے سڑک پر لے آیا۔

ایک ملباری ریسٹورنٹ سے چند قدم کے فاصلے پر جیپ میں بیٹھ کے میں نے رابعہ کے ساتھ کڑک چائے کے دو گلاس پیئے اور آدھا ایک بھی حلق سے اتارا۔ ایک سگریٹ پینے کے بعد میں نے جیپ کو مدھوسودن کے مکان سے پچاس قدم دور لے جا کر کھڑا کر دیا۔ پتا جو اس ہوشیار طالب علم نے سمجھایا تھا، میرے ذہن میں گڈمڈ ہو گیا تھا لیکن میں نے ملباری کے ہوٹل سے نئی ہدایات حاصل کر لی تھیں۔

ہم جس صنعتی علاقے میں موجود تھے وہ کئی میل تک پھیلا ہوا تھا۔ مدھوسودن خود بھی ایک کمپنی کی طرف سے ملے ہوئے چھوٹے سے کوارٹر میں رہتا تھا۔ یہ رہائشی کالونی فیکٹری کی دیوار کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھی اور اس کے سامنے سے گزرنے والی سڑک بالکل سنسان تھی۔ اس پرائیویٹ روڈ پر سے صرف وہی لوگ گزرتے تھے جو یہاں رہتے تھے۔ کوارٹروں کی قطار کے آخر میں روشن چند بلب ان دکانوں کے تھے جو مقامی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی تھیں۔

ہر کوارٹر کے باہر مکینوں نے ذاتی شوق پورا کرنے کے لئے چھوٹا سا باغیچہ لگانے کی کوشش کی تھی لیکن زمین پودوں کی نشوونما کے لائق نہیں تھی چنانچہ گھاس اور پھولوں کے بجائے جھاڑ جھنکاڑ زیادہ اگا تھا۔ مدھوسودن کا کوارٹر اس قطار میں ساتواں تھا۔

میری ہدایات کے مطابق رابعہ نے دروازے پر دستک دی۔ "بابو مدھوسودن یہاں رہتے ہیں؟" رابعہ نے کسی جاہل عورت کی طرح سوال کیا۔ میں پیچھے دیوار کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔

"تم کون ہو؟" کسی عورت نے ترش لہجے میں کہا۔ "کیا کام ہے مدھوسودن سے؟"

"تمہارا نام کیرتی ہے نا؟" رابعہ نے کہا۔ "تم دھرم پتنی ہو مدھوسودن بابو کی۔"

"تم نے کیسے جانا؟" وہ کچھ نرم پڑ گئی۔

"بابو مدھوسودن نے کہا تھا کہ میری پتنی بڑی سندر ہے۔ گھر کے کام کاج کے لئے نوکرانی چاہئے تمہیں؟"

"تم... تم کو میں کیسے نوکر رکھ سکتی ہوں۔" مدھوسودن کی بیوی کا موڈ اپنے سے زیادہ حسین اور پرکشش خادمہ کے تصور سے خراب ہو گیا۔ "اور ویسے بھی ہم نوکرانی کیا رکھیں گے! اپنے کھانے کو تو پورا ہوتا نہیں۔ کیوں زبردستی اندر آ رہی ہو؟"

موقع پاتے ہی رابعہ اندر گھسی اور اس کے پیچھے میں بھی ریوالور ہاتھ میں لئے اندر داخل ہو گیا۔ کیرتی جوان عورت تھی مگر اسے ایک عورت سے یہ امید نہ تھی کہ وہ زور آزمائی کر کے اس کو پیچھے دھکیل دے گی۔ اس نے اپنے شوہر کو پکارا۔

"سنو جی! یہ کون ہے تمہاری چھتی... گھسی چلی آ رہی ہے۔" مدھوسودن بیوی کی آواز سن کے آگے آیا ہی تھا کہ اس نے مجھے ریوالور کے ساتھ دیکھا اور وہیں منجمد ہو گیا۔

میں نے کہا۔ "اپنی بیوی کی اور اپنی آواز قابو میں رکھنا۔ ورنہ اس سے پہلے کہ کوئی تمہاری مدد کے لئے آئے ہم تمہیں گولی مار کر چلے جائیں گے اور جو مدد کے لئے آئے گا وہ بھی مارا جائے گا۔"

انہیں مزید دہشت زدہ کرنے کے لئے رابعہ نے بھی ریوالور نکال لیا۔ کیرتی اور مدھوسودن کے چہرے لاش کی طرح سفید پڑ گئے۔

"تم... کون ہو... کیا چاہتے ہو؟" مدھوسودن نے بیوی کو اپنے قریب کر لیا جو بیہوش ہونے کے موڈ میں تھی۔

"چند سوالوں کے جواب... صحیح جواب دو گے تو فائدے میں رہو گے۔ ہم جتنی خاموشی سے آئے ہیں اتنی ہی خاموشی سے واپس چلے جائیں گے۔"

"دیکھو، ہمارے بچے... اور گھر کے لوگ دوسرے کمرے میں سو رہے ہیں۔"

مدھوسودن نے لجاجت سے کہا۔ "کیا میں بیچ کا دروازہ بند کر دوں؟"

میں نے کہا۔ "ضرور کر دو لیکن چالاکی سے کام لے کر اپنے لئے زندگی کے دروازے بند مت کرنا۔"

"تم بھی اتنی کرپا کرو کہ مارنے سے پہلے ہماری بات سن لو۔ ہمیں بتاؤ کہ تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "اگر میرا یہ ارادہ نہ ہوتا تو میں اب تک تمہیں پرلوک پہنچا کے واپس چلا گیا ہوتا۔"

مدھوسودن نے اپنی بیوی کو تسلی دی۔ "کیرتی! چنتا مت کر مجھے یہ لوگ ان جیسے نہیں لگتے۔"

معلوم نہیں "ان لوگوں" سے اس کی مراد کیا تھی۔ کیرتی کا خوف اس حد تک ضرور کم ہو گیا کہ ہسٹریا کے دورے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ ایک چارپائی پر بیٹھ گئی جس پر صاف ستھری

کاڑھے ہوئے پھولوں والی چادر بچھی ہوئی تھی۔ تکیے پر ہندی میں کچھ کاڑھا گیا تھا جو انگریزی میں سویٹ ڈریم اور اردو کے شب بخیر کا متبادل ہو سکتا تھا۔

مدھوسودن درمیانی دروازے کو بند کر کے بیوی کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ چارپائی کے دائیں بائیں دو بید کی بنی ہوئی آرام کرسیاں تھیں اور بالکل سامنے ایک نیا صوفہ سیٹ۔ میں نے کرسی کو ترجیح دی تو رابعہ نے دوسری کرسی پر پوزیشن سنبھال لی۔

میں نے کہا۔ "مدھوسودن! پرسوں رات تم کہاں تھے؟"

مدھوسودن کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "تم سیٹھ جگدیش کو اور جگو دادا کو جانتے ہو؟"

"میں نے ایک سوال کیا تھا۔ سوال کے جواب میں سوال مت کرو۔"

"یہ دونوں ایک ہی راکھشس کے دو روپ ہیں۔" مدھوسودن نے کہا۔ "ہم اسی کے گھر میں تھے۔ اس کا گھر ایک نہیں ہے لیکن ہم نے معلوم کر لیا تھا کہ وہ اس رات وہاں ہوگا۔"

"تم جسے گھر کہہ رہے ہو، وہ کوٹھی ہوگی اور اس میں داخل ہونا بھی آسان نہیں ہوگا۔ تم کیسے اندر پہنچ گئے تھے؟"

مدھوسودن نے کہا۔ "اسی کوٹھی کے ایک ڈرائیور نے ہماری سہائتا کی تھی۔ ہم اس کی ڈکی میں چھپ کر بیٹھ گئے اور اندر جا کے رات ہونے تک چھپ کر بیٹھے رہے۔" مدھوسودن نے کہا۔

"تم سیٹھ جگدیش یا جگو دادا کو قتل کرنے گئے تھے؟"

"ہم اسے ہی نہیں، اس کے سارے خاندان کو مار دیتے اس کی کوٹھی کو آگ لگا دیتے یا دھماکے سے اڑا دیتے۔"

"لیکن تمہیں اس کا موقع نہیں ملا؟"

"ہاں، اسی رات وہاں کچھ ڈاکو آ گئے۔ وہ ہمیں پکڑ کر لے گئے۔ انہوں نے ہماری بات کا وشواس نہیں کیا کہ ہم ان کے خلاف نہیں، ان کے ساتھ ہیں۔" مدھوسودن نے کہا۔

"تم جانتے ہو، وہ کون ڈاکو تھے؟"

"وہ خونی خان کے آدمی تھے۔" مدھوسودن بولا۔ "جب ہم نے اسے اپنی چتا سنائی تو اس نے کہا کہ چلو اب اس سے ہم نمٹ لیں گے۔ میں نے کہا بھی کہ اس سے مجھے شانتی نہیں ملے گی۔ تو اس نے کہا کہ شانتی کے بچے، آتنک بتا کر کے تمہیں کیا ملے گا۔ تمہارے بچے اناتھ ہو جائیں گے۔ تم خود بھی مارے جاؤ گے یا بچ گئے تو پھانسی چڑھ جاؤ گے۔ ایسے بدلے سے فائدہ۔ بدلہ لینا ہے تو ایسے لو کہ دشمن کا خاتمہ ہو جائے مگر خود پر آنچ نہ آئے۔ تم ایک پاپی کا برا انجام دیکھنے کے لئے زندہ رہو۔ خونی خان کے بہت قصے سنے تھے میں نے۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ بات سنتا ہی نہیں۔ اسے خون کر کے مزہ آتا ہے۔ وہ انسان نہیں درندہ ہے۔ انسانی خون پیتا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ وہ بڑوں کے حق میں برا ہے۔ اسے بدنام کر دیا گیا ہے کیونکہ اس کا نام سن کے جگو دادا جیسے بدمعاشوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ اس کی بات سن کے مجھے عقل آ گئی۔ اس نے بہت اچھی طرح بات کی تھی۔ اب کوئی کچھ بھی کہے، میں اسے بہت اچھا آدمی سمجھتا ہوں۔"

میں نے ساری بات سن کے کہا۔ "ایسی باتیں ہر ڈاکو اور راہزن کے بارے میں مشہور ہیں۔"

"خونی خان کے بارے میں کوئی سنی سنائی بات نہیں بتا رہا ہوں میں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "خیر، ہمیں کوئی سروکار نہیں خونی خان کی اچھائی برائی سے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ جو اسلحہ تم اپنے ساتھ لے کر گئے تھے وہ تم نے کہاں سے حاصل کیا تھا؟"

مدھوسودن کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ "تمہیں کیا معلوم کہ ہم کیسا اسلحہ لے کر گئے تھے؟"

میں نے کہا۔ "تم نے دوسری بار سوال کے جواب میں سوال کرنے کی غلطی کی ہے۔ پھر ایسا کیا تو میں تمہارے دانت توڑ کے تمہاری بیوہ کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ تم اسٹین گن اور دستی بم لے کر گئے تھے؟"

مدھوسودن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ ہم نے چرائے تھے۔"

میں نے کہا۔ "کہاں سے چرائے تھے؟ تم ہمیں وہ جگہ دکھا سکتے ہو؟"

مدھوسودن نے بے بسی سے کیرتی کی طرف دیکھا۔ اس سوال کا جواب کیرتی نے اقرار کے انداز میں سر ہلا کے دیا۔ پھر مدھوسودن نے کہا۔ "دکھا دیں گے۔"

"اس جگہ کا پتا تمہیں کس نے بتایا تھا؟"

"ایک پروہت نے۔" مدھوسودن نے تلخ، نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ "دھرم کے ایک بیوپاری نے۔"

کیرتی نے دیوار کو گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی تو پوچھو کہ ہم نے یہ سب کس کارن کیا۔" اس کے لہجے میں دبے ہوئے طوفان کا شور تھا جو اس کے وجود کو اندر سے تہس نہس کرنے کے لئے بے تاب تھا۔

میں نے کہا۔ "اب میں یہی پوچھنے والا تھا۔ تم سیٹھ جگدیش کو اور اس کے سارے خاندان کو ختم کر کے کس ظلم کا بدلہ لینا چاہتے تھے؟"

"یہ میں بتاؤں گی۔" کیرتی نے کہا۔

www.paksociety.com

مدھو سودن نے کہا "کیرتی' تم پر پھر دورہ پڑ جائے گا۔"

کیرتی نے کہا "نہیں' اب وہ آگ بجھ رہی ہے جو میرے شریر کو بھسم کر رہی تھی۔ خان نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ اسے سزا دینی ہے تو اس کو جیتے رہنے دو۔ ان سب کو مار دو جن سے جگو دادا پیار کرتا ہے۔ ساری دنیا اس سے نفرت کرتی ہے اور وہ ساری دنیا سے نفرت کرتا ہے۔ بس ایک اس کا خاندان ہی تو نفرت کے سمندر میں محبت کا چھوٹا سا جزیرہ ہے جس کے سہارے وہ زندہ ہے۔ اس جزیرے کو ڈبو دو پھر وہ خود ہی اس نفرت کے سمندر میں غوطے کھاتا رہے گا اور مدد کے لئے پکارتا رہے گا مگر کون ہے جو اس کی مدد کرے گا؟"

مدھو سودن کے مقابلے میں اس کی بیوی زیادہ صاف اور روانی سے اردو بولتی تھی۔

"اب وہ اکیلا زندہ ہے۔ اس کے چار بچے تھے۔ ایک لڑکا اور تین لڑکیاں۔ لڑکا بڑا تھا اور جیتا تو اچھا آدمی بنتا۔ چار چھ سال بعد ڈاکٹر کہلاتا۔ جگو دادا نے اپنے خاندان پر اپنے اعمال کا سایہ نہیں پڑنے دیا تھا۔ اس نے انہیں اپنی اپرادھ کی زندگی سے دور رکھنے کے لئے سخت محنت کی تھی۔ اولاد کے معاملے میں وہ صرف ایک باپ تھا۔ کون باپ یہ چاہتا ہے کہ اس کا جیون ایک دلدل میں بیتا ہو تو اس کے بچے بھی اس دلدل میں رہیں۔ کسی چور کی خواہش نہیں ہوتی کہ اس کا بیٹا اور آگے بڑھ کے ڈاکو بنے۔ کلرک چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا افسر ہو۔ ان پڑھ رہ جانے والا اپنی بدنصیبی کا ورثہ اپنی اگلی نسل کو منتقل نہیں کرنا چاہتا۔ سیٹھ جگدیش اور جگو دادا دونوں نہیں چاہتے تھے کہ ان کے باپ کا پھل ان کی اولاد کھائے۔ یہ ثبوت تھا اس بات کا کہ اس ایک شیطان کے لئے اپنے دونوں روپ ایک سے تھے۔ نفرت کے قابل۔ وہ بچوں کو اس نفرت کے احساس سے بھی بچانا چاہتا تھا کیونکہ وہ ان سے واقعی محبت کرتا تھا۔ یہ اس کی ضرورت یا مجبوری تھی۔ وہ جانتا ہو گا کہ اس کے ساتھی' اس کے حکم کے غلام' اس سے ڈرنے والے' سب اس کی طاقت اور دولت کے سامنے بے بس ہیں۔ کوئی سیٹھ جگدیش کو اچھا نہیں سمجھتا' کوئی جگو دادا سے محبت نہیں کر سکتا۔ لیکن گھر ایک ایسی جگہ تھی جہاں وہ ایک عورت اور چار بچوں سے عزت واحترام' محبت اور لگاؤ سب کچھ چاہتا تھا.... جو اسے بے غرض چاہتے تھے۔ خان نے محبت کے اس جزیرے کو غرق کر دیا۔ اس نے جگو دادا کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔ اب وہ نفرت کے جوہڑ میں اکیلا ڈبکیاں کھا رہا ہے۔ اگر اس کی سب دولت چھن جاتی تو اسے یہ صدمہ پاگل نہ کرتا۔ وہ دولت پھر حاصل کر لیتا مگر وہ گھر جس میں اسے عزت اور محبت حاصل تھی' اسے کہیں سے نہیں ملے گا۔ وہ یہ اذیت برداشت کرتا رہے گا' روتا رہے گا اور پاگلوں کی طرح چلاتا رہے گا۔ پتی کو دیوتا سمان ماننے والی ایک عورت اور باپ کو پیار کا آسمان سمجھنے والے چار بچوں کی محبت اسے کون دے گا؟ اس پر کوئی ترس کھانے والا بھی نہیں۔ مجھے مدھو سودن نے بتایا ہے کہ کوئی اس سے ہمدردی کرے تو وہ لاتیں مارتا ہے' کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ تم سب جھوٹ بولتے ہو۔ تم سب خوش ہو اندر سے' میری بدقسمتی کا تماشا دیکھ کر مزے لے رہے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ مجھے ٹھیک سزا دی ہے بھگوان نے۔ میرے کرم ہی ایسے تھے" وہ قہقہے مار کے ہنسی۔

"کیرتی!" مدھو سودن نے اسے تنبیہہ کے انداز میں گھورا۔

کیرتی نے اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لیا "میں پاگل ہوں نا۔ تم کیا سمجھتے ہو گے۔ بہت بولتی ہوں میں۔ کیا تمہیں معلوم تھا یہ سب؟ ضرور معلوم ہو گا۔ تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم سب کچھ پہلے سے جانتے ہو۔ ہر بات کا پتا کر کے آئے ہو تم مگر کوئی بات نہیں' مجھ سے سب پھر سن لو۔ میں تو چاہتی ہوں کہ ایک ایک شخص کے سامنے بیٹھ کے اسے خود پوری بات بتاؤں۔ سب سے سنے کی بات ہے۔ پہلے میں نے بہت دکھ جھیلے' بہت تڑپایا مجھے اس راکھشس نے۔ اب وہ خود تڑپ رہا ہے اور مجھے بہت خوشی ہے۔ اس نے جو کچھ میرے ساتھ کیا...."

"کیرتی! بس کرو۔ تمہاری طبیعت خراب ہونے لگی ہے۔ جاؤ اندر جا کر مہمانوں کے لئے چائے بناؤ" اس نے میری طرف اجازت طلب اور التجا آمیز نظروں سے دیکھا۔

میں نے کچھ سوچ کے کہا "اگر مہمان سمجھا ہے تو پھر ایسی کوئی بات نہ ہونے دینا جو ہمارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائے۔ ابھی تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ ہم کس حد تک بے رحم اور سفاک بھی ہو سکتے ہیں اور اب تک کتنے خون کر چکے ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہو گی" مدھو سودن نے کہا "کیرتی تمہیں چائے میں زہر دے دے یا رسوئی میں جلنے کے بہانے باہر نکل جائے اور کسی کو بلا لے۔ میں جو یہاں موجود ہوں۔ جاؤ کیرتی' شاباش' ذرا دھیان سے کام کرنا۔ آہٹ بھی نہ ہو اور کوئی جاگ اٹھے تو کہہ دینا' مہمان بیٹھے ہیں۔"

کیرتی جانا نہیں چاہتی تھی مگر اس نے شوہر کی بات کو حکم کے قبول کر لیا اور آہستہ سے درمیانی دروازہ کھول کے غائب ہو گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں جذبات کی رو میں بہہ کر میں نے غلطی تو نہیں کی۔ یہ میاں بیوی نہ بیوقوف تھے نہ بزدل۔ اگر بہادر بننے کی کوشش میں کیرتی نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو ہم جوابی کارروائی پر مجبور ہوں گے۔ پھر ہمارے ہاتھ سے بچے مارے جاتے ہیں' ہمارے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ میاں بیوی پہلے ہی مظلوم تھے' ان پر مزید ظلم کرنا مجھے گوارا نہ تھا۔ رابعہ نے بروقت مجھے اس الجھن سے یوں نجات دلائی کہ خود بھی اٹھ کے کیرتی کے پیچھے اندر چلی گئی۔

مدھو سودن نے مجروح نظروں سے مجھے دیکھا "تمہاری پتنی بہت شکی ہے۔ اعتبار نہیں کرتی۔"

میں نے کہا "عورت ذات فطرتاً شکی ہوتی ہے۔ ویسے احتیاطاً میں حرج بھی کیا ہے۔ تمہارے ساتھ جو ظلم ہوا تھا اس کا مجھے علم ہے۔ اگر تمہاری بیوی موجود رہتی تو میں اطمینان سے تفصیل سنتا۔ اس کی بات اور ہے۔ عورت دل کا بوجھ ہلکا نہ کرے تو ہسٹیریا کے دورے کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ سب تمہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے کچھ زیادہ اہم سوالوں کے جوابات دے سکتے ہو۔ تم نے کہا تھا کہ 'ہمیں ایک دھرم کے بیوپاری نے کسی اسلحے کے ذخیرے کا پتا بتایا تھا۔ وہاں سے تم نے کچھ اسلحہ نکال لیا۔ پھر اس پروہت کو تم نے کیوں قتل کیا؟"

وہ ایسے چونکا جیسے میں نے ریوالور نکال کے فائر کر دیا ہے۔

"میں..... میں نے" وہ زور زور سے انکار کے انداز میں گردن کو ہلاتا رہا "یہ غلط الزام لگا رہے ہو تم مجھ پر۔"

میں نے کہا "میرے پاس ثبوت ہے اور گواہ ہیں کہ پروہت کو تم نے اور تمہاری بیوی نے' دونوں نے مل کر قتل کیا ہے۔"

"نہیں' ہم اسے کیوں قتل کریں گے؟"

میں نے کہا "تم قتل کے اسباب جاننا چاہتے ہو' مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اسے کتنا معاوضہ ادا کیا تھا؟"

مدھو سودن نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا مگر اب اس کی بیوی مدد کے لئے موجود ہی نہیں تھی۔

"نقد کے علاوہ تم نے اس کے پاس اپنی بیوی کا تمام زیور بھی رکھوا دیا تھا" میں نے کہا "رکھوا دیا تھا' میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تمہارا ارادہ بالآخر وہ سب واپس لینے کا تھا۔"

مدھو سودن کے لب کانپنے لگے "یہ.... ٹھیک ہے کہ ہم اس سے وہ سب واپس لینے گئے تھے لیکن اس نے انکار کر دیا۔"

"تم مجھے اتنے احمق تو نہیں لگتے۔ کیا مانگنے سے وہ تمہارا روپیہ اور زیور واپس کر دیتا!! اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی انکار کرتا کہ تم سے ایک سودا کیا تھا۔ یہ مال کے بدلے مال کا سودا تھا۔ تمہیں اپنا مال مل گیا تو پھر قیمت کی واپسی کا کیا سوال۔ تم کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ تم اس سے زیور اور پیسہ مانگنے نہیں' چھیننے گئے تھے اور جب اس نے مزاحمت کی تو تم دونوں نے مل کر اسے مار دیا۔ شاید تم نے اسے پکڑے رکھا اور تمہاری بیوی نے اس پر خنجر سے وار کئے...."

"خنجر سے.... کیرتی کر سکتی ہے ایسا! وہ تو اتنی بزدل ہے کہ کاکروچ نہیں مار سکتی۔"

میں نے طنز سے کہا "لیکن جگو دادا کو اور اس کے سارے خاندان کو شکتی بم سے بھون سکتی ہے اور اس کے گھر دھماکے سے اڑا سکتی ہے؟"

"وہ..... وہ دوسری بات تھی۔ اپنے بچوں کے لئے بلی بھی شیرنی بن جاتی ہے۔ وہ انتقام کے جذبات تھے جو اس کے جنون کا کارن بن گئے تھے۔"

میں نے کہا "دیکھو' میں خود اس پروہت کی لاش دیکھ چکا ہوں اور اس پروہت کے گھر میں ایک بڑھیا رہتی ہے۔ اس نے سب کچھ دیکھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے پروہت کا خون کیا۔"

"وہ بڑھیا غلط کہتی ہے۔ ہم نے پروہت سے کہا تھا کہ وہ ہمارا پیسہ اور زیور واپس کر دے کیونکہ ہم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ ہمیں اب اسلحہ کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ کہنے لگا کہ میں نے بھی پیسہ خرچ کر دیا ہے اور زیور بیچ کے جو پیسہ ملا تھا' وہ بھی اڑا دیا ہے۔ اب میں کچھ واپس نہیں کر سکتا۔ جاؤ' جو کرنا ہے کر لو۔ پولیس کے پاس جاؤ یا کہیں اور۔ صاف ظاہر ہے' وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کی بات پر مجھے غصہ آیا اور میں نے اس کی گردن پکڑ لی۔ وہ چلانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بڑھیا کیرتی کو گالیاں دینے لگی۔ کیرتی نے اسے دھکا دیا تو وہ چوکی سے لڑھک گئی اور اس کا سر زمین پر لگا۔ کیرتی سمجھی وہ مر گئی۔ میں نے بھی پروہت کے سر پر جنگل کی لکڑی مار دی تھی اور وہ سر پکڑ کے لیٹ گیا تھا لیکن وہ دونوں زندہ تھے۔ اس میں شک کی کوئی بات نہیں۔ ہم دونوں بہت ڈر گئے تھے' اس لئے وہاں سے بھاگ آئے۔"

میں بڑے غور سے مدھو سودن کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس کا لہجہ ہی نہیں' چہرہ بھی سچ کی گواہی دے رہا تھا۔ یہ بات میری ذہنی الجھن میں اضافے کا سبب بن رہی تھی۔ اگر پروہت کو مدھو سودن اور کیرتی نے قتل نہیں کیا تھا تو پھر اس کا خون کس کے ہاتھوں ہوا تھا اور اس بڑھیا نے ہوش میں آتے ہی ان میاں بیوی کا نام کیوں لیا تھا۔ وہ پورے یقین کے ساتھ انہیں قاتل کیوں قرار دے رہی تھی؟

اگر میں مدھو سودن کے بیان کی حقیقت کو تسلیم کر لیتا تو

www.paksociety.com

پھر میرے لئے یہ بھی ماننا لازمی ہوتا کہ وہ بڑھیا جھوٹ بول رہی تھی مگر اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس سوال کا ایک جواب ہی ممکن تھا۔ جب تک وہ ہوش میں رہی، اس نے مدھوسودن کو پروہت سے دست و گریباں دیکھا تھا۔ پھر کیرتی نے اسے دھکا دیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ اسے نہیں معلوم کہ بعد میں کیا ہوا۔ پھر ہوش میں آنے کے بعد اسے پروہت کی لاش نظر آئی اور اس نے دونوں میاں بیوی کو غائب دیکھا تو قدرتی طور پر اس کے ذہن نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ پروہت کو قتل کر کے فرار ہو گئے جبکہ درمیانی وقفے میں کوئی اور بھی وہاں گیا اور اس نے پروہت کو قتل کر دیا۔ میرے ابتدائی اندازے کے مطابق یہ کام تین افراد کا تھا۔ اب مدھوسودن نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ بڑھیا کو کیرتی نے دھکا دے کر گرایا تھا جس سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس حد تک کیرتی کا جرم قابل معافی تھا اور میرے نزدیک یہ کوئی جرم بھی نہیں تھا تاہم یہ بات میرا ذہن بھی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا کہ بڑھیا کے بے ہوش ہو جانے کے بعد مدھوسودن نے پروہت کو پکڑ لیا اور کیرتی نے اس پر خنجر کے پے در پے وار کئے۔ عورت ریوالور یا مشین گن تو چلا سکتی ہے مگر کسی مرد کی طرح خنجر نہیں چلا سکتی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ ایک بار ہمت کر کے خنجر گھونپ دے مگر پروہت پر کئی وار ہوئے تھے۔ کیرتی نازک سی عورت تھی۔ وہ عام عورت کی طرح کاکروچ نہیں مار سکتی تھی یا چھپکلی کو دیکھ کر چیخ مارتی تھی تو یہ بات سمجھ میں آتی تھی۔

کیرتی چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آئی تو میں چونکا۔ رابعہ نے پھر کچن کا دروازہ بند کر دیا۔

"کیرتی! یہ کہتے ہیں کہ ہم نے پروہت کو خنجر سے مار دیا۔ میں نے اسے پکڑا اور تم نے اس پر وار کئے۔" مدھوسودن شکایت اور فریاد کے انداز میں بولا۔

کیرتی نے چائے کی ٹرے میز پر نہ رکھی ہوتی تو ضرور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر جاتی۔

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا تو اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں مجھے یہی سوال نظر آیا کہ دیکھو.... کیا میں ایسی ہوں؟ ایسا کر سکتی ہوں میں؟

میں نے کہا "ابھی تک حالات اور واقعات کی شہادت صرف تم دونوں کے خلاف ہے لیکن بعض اوقات آدمی کی نظر ہی نہیں، عقل بھی دھوکا کھا جاتی ہے۔"

"کیرتی! یہ کہتے ہیں....."

میں نے اسے ٹوک دیا "جو میں نے تم سے پوچھا تھا، وہ میں خود بھی کیرتی سے پوچھ سکتا ہوں اور سچ کسی اور کی زبان پر آ کے بڑا نہیں۔"

"ہاں، پوچھ لو کیرتی سے پوچھ لو۔"

رابعہ جب چائے بنانے لگی تو کیرتی اپنے پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی جیسے میں نے اس پر فرد جرم ہی عائد نہیں کی، اسے سزائے موت بھی سنا دی ہے۔ اسے تسلی دینے کے لئے میں نے کہا "میں مدھوسودن کی بات مان لیتا ہوں۔"

"کیا پروہت کو واقعی قتل کر دیا ہے کسی نے؟" کیرتی نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔"

"تم سے غلط کہا ہوگا کسی نے۔"

"ہم دونوں اس کے گھر میں وہ لاش دیکھ کر آئے ہیں جس پر خنجر کے کم سے کم چھ مہلک زخم تھے۔" میں نے درشتی سے کہا "میں سنی سنائی بات نہیں کر رہا ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارے واپس لوٹ آنے کے بعد پروہت کا کوئی اور دشمن وہاں پہنچا ہو اور اس کا کام تمام کر دیا ہو لیکن اس کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ تمہیں اس عورت نے دیکھا تھا.... اچھا کچھ دیر کے لئے یہ ذکر موقوف۔ تم بھی پہلے چائے پی لو۔"

دراصل میں کیرتی کی لمحہ بہ لمحہ بگڑتی حالت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا شوہر پہلے ہی دوبار تشویش کا اظہار کر چکا تھا کہ اس کی طبیعت بگڑ جائے گی۔ شاید مسلسل صدمات جھیلنے کے بعد اس کے اعصاب اتنے کمزور پڑ گئے تھے کہ اب وہ معمولی سا ہیجانی دباؤ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ مدھوسودن نے میری بات سن کے نظروں ہی نظروں میں شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کیا اور بڑی محبت، توجہ اور اصرار کے ساتھ بیوی کو خود چائے پلانے لگا۔

چائے پینے کے بعد کیرتی کی حالت میں بہتری کے نمایاں آثار نظر آنے لگے۔ اس نے میرے رویئے سے یہ بھی اندازہ کر لیا تھا کہ میری پوچھ گچھ کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں انہیں قانون کے حوالے کرنا چاہتا ہوں اور میں ان کے کسی دشمن کی نمائندگی کرنے بھی نہیں آیا۔

"اب ایک آخری بات تم سے اور معلوم کرنی رہ گئی ہے۔" میں نے کہا "مجھے یہ بتاؤ کہ اسلحہ حاصل کرنے کے لئے تم نے ایک پروہت سے رابطہ قائم کیوں کیا؟"

"رابطہ ہم نے نہیں، اس نے قائم کیا تھا۔"

"کیا مطلب؟ اس نے آ کے کہا تم سے کہ مدھوسودنا مشین گن اور دستی بم کی ضرورت ہے تو بتاؤ، کیا وہ اسلحے کا ڈیلر تھا اور ہر ایک سے یہ بات پوچھتا پھرتا تھا؟" میں نے کہا۔

"دراصل پروہت سے میرا بچپن کا یارانہ تھا۔ وہ شروع

سے فراڈ تھا۔ اس نے کئی بھیس بدلے، کئی بار جیل بھی گیا اور جب باہر آیا تو ایک نئے روپ میں۔ اس کو تم دوستی مت کہو، بس وہ مجھے اس وقت سے جانتا تھا جب میں بارہ سال کا تھا اور لڑکی کی عمر اس کی تھی۔ جو کچھ سیٹھ جگدیش یا جگو داوا نے ہمارے ساتھ کیا، اس کے بعد میں اور میری بیوی دونوں ہی کچھ عرصہ پاگل رہے۔"

"کسی پاگل خانے میں رہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں، ہم ایسے پاگل نہیں تھے کہ کسی کو نقصان پہنچاتے۔ بس ہمیں اپنا ہوش نہیں تھا۔ اسی زمانے میں یہ پروہت مل گیا مجھے۔ اس کے سامنے میں نے پہلی بار کھل کر اپنے ارادے کا اظہار کیا کہ میں اس حرامزادے جگو داوا کا خانہ خراب کر دوں گا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس کے ٹکڑے کر دوں۔ اس کے سارے خاندان کا نام و نشان مٹا دوں۔ اس کی کوٹھیوں کو آگ لگا دوں۔ پروہت نے مجھے سمجھایا کہ پاگل مت بن، کسی اور کے سامنے یہ بات مت کرنا، ورنہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ ایسے کام سوچ سمجھ کر کئے جاتے ہیں۔ موقع دیکھ کر۔ اور خالی ہاتھوں سے تو آدمی چڑیا کا بچہ بھی نہیں مار سکتا۔ جگو داوا کو کیا سمجھا ہے تو نے آخر؟ میں نے کہا کہ پروہت! اگر تیری چودہ سال کی بیٹی اس درندگی کا نشانہ بنتی اور تجھے اس کی لاش سڑک پر پڑی ملتی تو میں دیکھتا کہ تیری عقل کیا کہتی ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو گے، میں نے جگو داوا کے خلاف پرچا کٹوانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے میری چھوٹی بہن کو اغوا کیا۔ میں اخبار والوں کے پاس گیا۔ لیڈروں کے پاس گیا۔ کسی نے کچھ نہیں کیا۔ جگو نے ایک رات اس کی بہن کو اٹھوا لیا۔" مدھوسودن نے کیرتی کی طرف اشارہ کیا۔

"ان تکلیف دہ باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ مدھوسودن!" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"کچھ عرصے بعد اچانک پروہت میرے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ مدھوسودن جگو داوا سے بدلہ لینا ہے تو بتا۔ میں نے کہا کہ کیسے؟ میں تو آج بھی خالی ہاتھ ہوں۔ اس نے کہا کہ کیا چاہئے تجھے اپنے خالی ہاتھوں کے لئے۔ مشین گن، دستی بم؟ میں سمجھا یہ مذاق کر رہا ہے مگر اس نے کہا کہ پیسہ نکال، میں تجھے سب دلوا سکتا ہوں۔ میں یہ سمجھا کہ شاید کوئی شخص یہ چیزیں بیچ رہا ہوگا۔ ویسے بھی بمبئی میں کیا نہیں ملتا۔ لیکن اس نے تو دوسری ہی بات کی۔ اس نے کہا کہ کل میں ایک جگہ پوجا پاٹ کے لئے گیا تھا۔ وہاں بہت سے پجاری آئے ہوئے تھے۔ پوجا پاٹ کے بعد مجھے بڑی زور کی نیند آئی۔ میں وہاں سے کھسک گیا اور ایک ایسی جگہ جا کے سو گیا جہاں مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ میں بڑا گھبرایا۔ سب لوگ جا چکے تھے اور میں اندر بند ہو گیا تھا۔ خیر میں نے چوروں کی طرح دبے پاؤں اندر گھوم پھر کے باہر نکلنے کا ایک راستہ تلاش کر لیا مگر وہاں میں نے عجیب منظر دیکھا۔ ایک ٹرک پر کچھ لوگ سامان لاد رہے تھے۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ یہ آدھی رات کو کیا ہو رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ضرور کوئی گول مال ہے۔ سارے کالے دھندے آدھی رات کے بعد ہی ہوتے ہیں۔ موقع پاتے ہی میں ٹرک پر چڑھ گیا کیونکہ باہر نکلنے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ راستے میں کہیں ٹرک کی رفتار کم ہوگی تو اتر جاؤں گا لیکن رات کے وقت سڑکیں خالی تھیں۔ ٹرک کے ساتھ میں ایک گودام تک جا پہنچا۔ اس ٹرک سے اتر کر میں نے پہلے تو بھاگ جانے کا سوچا لیکن اتنی دور سے میں واپس کیسے آتا۔ میں چھپ کر دیکھتا رہا۔ کچھ لوگوں نے ٹرک سے سامان اتار کر گودام میں رکھا لیکن انہوں نے ہر پیٹی کو چیک کیا اور اسی وقت مجھے پتا چلا کہ ان پیٹیوں میں کیا ہے۔ اب تمہیں کچھ چاہئے تو میرے ساتھ چلو اور اس گودام سے لے لو۔ میں نے کہا کہ یہ اتنا آسان کام ہے کیا۔ وہاں چوکیدار بھی ہوں گے تو پروہت نے کہا کہ میں نے تو نہیں دیکھا۔ ٹرک خالی ہو گیا تھا تو میں اسی میں واپس شہر آ گیا تھا لیکن جہاں تک مجھے یقین ہے، اس ٹرک ڈرائیور نے خود ہی گودام کو تالا لگایا تھا اور اپنے پیچھے کسی کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ شہر پہنچنے کے بعد مجھے ٹرک سے اترنے کا موقع مل گیا اور میں صبح گھر پہنچا۔"

"تمہارے اس پروہت دوست کا کہنا ہے؟" میں نے ساری بات سننے کے بعد کہا "کہ ٹرک پر سامان چند افراد نے لادا تھا۔ کیا شہر سے باہر واقع گودام میں سامان اتارنے کے لئے یہی لوگ ساتھ گئے تھے؟"

"یہ.... تو نہیں معلوم۔ میں نے نہیں پوچھا تھا۔"

"اگر وہی لوگ ٹرک میں گئے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ پروہت کیسے سوار ہوا؟ انہوں نے پوچھا نہیں کہ تم کون ہو اور اس ٹرک میں کیا کر رہے ہو۔ ڈرائیور کے ساتھ ایک آدمی بیٹھ سکتا ہے، باقی ضرور پیچھے ہوں گے اور پروہت بھی پیچھے ہی سوار ہو سکتا تھا۔"

"ہاں!" مدھوسودن کنفیوز ہو کے بولا۔

"ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ٹرک کو صرف ایک ڈرائیور لے گیا تھا اور گودام میں مال اتارنے والے لوگ دوسرے تھے۔ اگر واپسی میں وہ بھی ٹرک پر آئے تھے تو پروہت ان میں شامل ہو کے کیسے آیا؟"

www.paksociety.com

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہاں صرف ٹرک ڈرائیور ہو۔"
میں نے کہا۔ "کیا ایک آدمی ایک پورے ٹرک کا سامان اتار کے گودام میں پہنچا سکتا ہے؟ اس کے علاوہ خود پروہت نے تمہیں بتایا تھا کہ وہاں کچھ لوگوں نے ہر پیٹی کو چیک کیا تھا۔"
مدھو سودن نے تسلیم کیا۔ "یہ بات اس نے کہی تھی۔"
میں نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ پروہت نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ یا تو وہ ٹرک میں واپس نہیں آیا تھا یا پھر اس نے یہ غلط کہا تھا کہ گودام میں کوئی نہیں رہا تھا اور خود ٹرک ڈرائیور مال لا کے گودام کو لاوارث چھوڑ آیا تھا۔"
"لیکن جب ہم وہاں گئے تھے۔ میں اور کیرتی۔ تو وہاں واقعی کوئی چوکیدار نہیں تھا۔" مدھو سودن نے کہا۔ "ورنہ وہ ہمیں گولی نہ مار دیتا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ "پھر تو ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ جو لوگ وہاں ٹرک سے سامان اتروانے کے لئے پہلے سے موجود تھے، وہ کام ختم کرنے کے بعد چلے گئے تھے۔ وہ قریب ہی کسی بستی میں رہتے ہوں گے یا انہیں خاص طور پر ایک خاص کام کے لئے وہاں بلایا گیا ہوگا اور پھر معاوضہ دے کر رخصت کر دیا گیا ہوگا۔ خیر، یہ بتاؤ کہ اس گودام کے آس پاس کیا ہے؟"

"اور بہت سے گودام ہیں۔ صنعتی علاقے میں آنے جانے والا مال وہیں اتارا جاتا ہے اور وہیں سے جہازوں پر چڑھایا جاتا ہے۔ ٹرکوں کے علاوہ وہاں سے مال لانے لے جانے کے لئے ریل کی پٹری بھی ہے اور مال گاڑی بھی چلتی ہے۔ گودام سے بندرگاہ تک۔"

میں نے کہا۔ "رات کے وقت دوسرے گودام بھی ایسے ہی کسی محافظ یا چوکیدار کے بغیر رہتے ہیں۔"
"میں سب کے بارے میں نہیں بتا سکتا۔ کچھ گوداموں کے چوکیدار میں نے دیکھے تھے۔" مدھو سودن بولا۔
"تم گودام میں کیسے داخل ہوئے؟"
"مجھے پروہت نے دور سے ہی بتا دیا تھا کہ وہ گودام ہے۔ پیچھے کی طرف سے جا کر دیکھنے پر ہمیں ایک کھڑکی نظر آئی۔ ہم نے اس کا اوپر والا شیشہ توڑا اور کنڈی کھول لی۔"
"کیرتی تمہارے ساتھ تھی؟"

مدھو سودن نے کچھ خفت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا مگر کیرتی نے اس سے نظر نہیں ملائی۔ "کیرتی کو میں نے سامنے چھوڑ دیا تھا کہ اگر کوئی چوکیدار آ جائے تو اسے باتوں میں لگائے۔"
"یعنی ورغلائے۔ اپنے عورت ہونے کا فائدہ اٹھائے۔"
مدھو سودن نے اقرار میں سر ہلایا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔

"پھر کیا ہوا؟ کیا کوئی چوکیدار آیا؟"
مدھو سودن نے اعتراف جرم کے انداز میں کہا۔ "ایک بدمعاش چوکیدار آ گیا تھا آواز سن کے لیکن کیرتی نے اسے روک لیا۔"

میں نے کیرتی کی طرف دیکھ کے کہا۔ "یہ کسی شریف آدمی کو بھی روک سکتی ہے.... اپنے حسن کی طاقت سے۔ کیا اس شخص نے اپنے کسی عمل سے خود کو بدمعاش ثابت کیا یا کرنے کی کوشش کی؟"
کیرتی کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔
مدھو سودن نے کہا۔ "اس نے سمجھا کہ کیرتی اکیلی بھٹک رہی ہے وہاں۔"

"کیا وہاں کیرتی جیسی عورت کا نظر آنا اسے عجیب نہیں لگا؟ اس نے پوچھا نہیں کہ وہ کیا لینے آئی تھی وہاں؟"
"کیرتی نے کہا.... کہ وہ اپنے شوہر کی تلاش میں آئی تھی اور اب بھول گئی ہے کہ وہ گودام کدھر ہے۔ سب گودام ایک سے لگتے ہیں اسے۔ چوکیدار نے کمپنی کا نام پوچھا تو کیرتی نے کہا کہ ہماری سیٹھ کا گودام ہے۔ شاید اس پر وہ شک میں پڑ گیا اور اس نے کیرتی پر دست درازی کی کوشش کی لیکن میں اتنی دیر میں کھڑکی کے راستے واپس نکل آیا تھا اور میرے ہاتھ میں مشین گن تھی۔"
"چنانچہ تم نے اس پر فائر کھول دیا۔"
"نہیں، میں نے دستہ مار کے اس کا سر پھاڑ دیا۔ پھر ہم بھاگ آئے۔"
"کیسے بھاگ کر آئے، پیدل؟ مشین گن اور دستی بم اٹھا کے؟"

مدھو سودن نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس سامان کو ہم نے ایک پوٹلی میں باندھ لیا تھا۔ وہ پوٹلی میں نے اٹھا رکھی تھی۔ تین چار میل پیدل چلنے کے بعد ہمیں ٹیکسی مل گئی تھی۔"
خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد میں نے کہا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہے کہ پروہت نے تم سے جھوٹ بھی نہیں بولا تھا۔ تمہارے ساتھ کوئی بے ایمانی بھی نہیں کی تھی اور اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ پھر تم اپنا پیسہ اور زیور کیوں واپس لینا چاہتے تھے؟ کیا جواز تھا تمہارے پاس؟"

"وہ..... ہم نے استعمال کہاں کیا۔"
میں نے کہا۔ "پروہت نے صرف اس بات کی قیمت وصول کی تھی کہ وہ تمہیں ایک جگہ دکھائے گا جہاں سے تم اسلحہ حاصل کر سکتے ہو۔ تم ناکام رہتے یا پکڑے جاتے، اسلحہ راستے میں پھینک دیتے یا استعمال نہ کرتے، ان سب

باتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ اس نے تمہاری ان سے کوئی ذمے داری قبول کی تھی۔ بے ایمانی تمہارے من میں آئی۔"
"تم پھر یہ کہہ رہے ہو کہ ہم نے اسے قتل کیا ہے۔"
"تم میرا شک رفع نہیں کر سکے۔"
"یہ ٹھیک ہے۔" کیرتی نے اچانک کہا۔ "چاہے وہ جو کہ ہم نے ایسا سوچا تھا۔ ہم کو یہ خیال پریشان کرنے لگا.... کہ ہم نے اپنا سب کچھ اس بدمعاش کو دے دیا۔ سارا پیسہ.... جو ہم نے برسوں میں جمع کیا تھا اور سب زیور...." وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔
مدھو سودن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "مت رو کیرتی! بھگوان نے اس کو بھی نرک میں پہنچا دیا ہے۔"
پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیرتی نے تھوڑا تھوڑا کر کے زیور اپنی بیٹی کے لئے بنوایا تھا۔ اس کی شادی کے لئے۔ اس کی بات طے ہو گئی تھی۔ ایک سال بعد وہ بیاہی جاتی۔ وہ جہیز اور کہاں کام آتا مگر جب وہ خود ہی نہ رہی تو ہم بیاہ کے لئے پیسہ اور زیور رکھ کے کیا کرتے۔ ہم نے اس کے خون کا بدلہ لینے کے لئے وہ سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ ہمیں بعد میں صدمہ ہوا کہ بیٹی بھی گئی اور ساری عمر کی کمائی بھی۔ پروہت کو اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے پاس پہلے ہی بہت ہے اور وہ اور بھی جائز ناجائز کی پروا کئے بغیر اور اپنے پرائے کا فرق کئے بغیر مال کھینچتا رہتا ہے۔ یہی سوچ کے ہم اس سے اپنا پیسہ اور زیور لینے گئے تھے لیکن میں اپنی اس بیٹی کی سوگند کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ ہم اسے قتل کرنے کا ارادہ لے کر نہیں گئے تھے۔ نہ ہم نے مارا اسے۔"

وہ اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ اپنی بیٹی کی قسم کھاتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو آنسو بہانے سے روکا مگر پھر بھی ایک قطرہ اس کی آنکھ سے پھسل گیا۔

میں نے کہا۔ "آئی ایم سوری۔ میں نے تم پر شک کیا۔ مجھے یقین ہے کہ قتل کسی اور نے کیا ہوگا لیکن تمہارے ذہن میں کوئی نام آتا ہے۔ آخر کون ہو سکتا ہے اس کا قاتل؟"
مدھو سودن نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کے دوست کم تھے، دشمن زیادہ کیونکہ جیون میں اس نے لوگوں کے ساتھ بھلائی کم کی، برائی زیادہ۔"

شما نے گھڑی دیکھی اور کہا۔ "اب ہم چلتے ہیں لیکن جانے سے پہلے تمہیں ایک بات سمجھا دینا چاہتے ہیں.... ہم تمہاری بے گناہی کے قائل ہو گئے ہیں مگر پولیس ایسا نہیں سمجھے گی۔ پولیس کو تم صرف ایک قسم کھا کے قائل نہیں کر سکتے

کیونکہ ان کے پاس ثبوت ہوگا اور گواہ ہوں گے۔ ایک گواہ چشم دید ہے، یعنی وہ بتائیں گے۔"
مدھو سودن نے بے بسی سے کہا۔ "اگر ہم نے ایسا نہیں کیا ہے تو ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟"
میں نے کہا۔ "انصاف کے حق پر بھروسا مت کرو۔ کمزور کو انصاف کہاں ملتا ہے۔ طاقتور انصاف چھین لیتا ہے یا خرید لیتا ہے۔ تم پکڑے جاؤ گے تو تمہیں یہ سب کچھ پولیس کو بھی بتانا پڑے گا جو تم نے ہمیں بتایا ہے۔ جانتے ہو اس کے بعد کیا ہوگا؟ تمہارے دشمن کچھ ایسے لوگ ہو جائیں گے جو شاید خود کو بھگوان سے زیادہ بھگوان سمجھنے لگے ہیں۔ ان کا مقابلہ تم نہیں کر سکتے اور ان جیسے دشمنوں سے نہ کوئی رعایت حاصل کر سکتے ہو اور نہ خیرات میں بچنے کا حق...."
"اگر بھگوان کو یہی منظور ہے...."
میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "بھگوان کو نہ کچھ منظور ہے، نہ نامنظور۔ وہ دنیا کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ میرا مشورہ مانو تو بھاگ جاؤ۔ اب بھی وقت ہے۔"
اس نے کہا۔ "بھاگ کے ہم کہاں جا سکتے ہیں؟"
میں نے کہا۔ "کہیں بھی چلے جاؤ جان بچانے کے لئے۔"
"میں اکیلا تو نہیں ہوں۔"
میں نے کہا۔ "کیرتی کو بھی ساتھ لے جاؤ۔"
مدھو سودن نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم سمجھتے کیوں نہیں؟ یہ گھر ہے میرا، بچے ہیں.... ماں باپ ہیں...."
"خود کو قانون کی تحویل میں دے دو۔ پولیس سے کہو، تمہیں جان کا خطرہ ہے۔ تمہاری حفاظت کی جائے۔ عدالت میں جا کر بیان دے دو کہ تمہاری ضمانت منظور کی جائے۔ قبل از گرفتاری، کیونکہ تمہیں کچھ لوگوں کی طرف سے اس بات کا ڈر ہے کہ وہ تمہیں قتل کے جھوٹے مقدمے میں پھنسا دیں گے۔"

مدھو سودن نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم یہ بھی نہیں کر سکتے۔ پولیس کے پاس جانے کی تو بات ہی فضول ہے۔ وہ صرف مجرموں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور بے گناہوں کو مجرم بنا کے چھوڑ دیتے ہیں۔ عدالت سے انصاف کی اپیل کی جا سکتی ہے لیکن انصاف بھی مفت تو نہیں ملتا۔ وکیل ہے کوئی ایسا جو فیس لئے بغیر میرا مقدمہ عدالت میں پیش کرے؟ اور وکیل کی بات چھوڑو.... عدالت نے اگر ضمانت منظور کر لی تو ضامن کون ہوگا میرا؟ نقد ضمانت طلب کر لی تو میں کیا کروں گا؟ اور ان سب باتوں کے بعد آخری بات یہ کہ عدالت صرف حکم دے سکتی ہے کہ ہماری حفاظت کی جائے۔ خود حفاظت نہیں

www.paksociety.com

کر سکتی۔ اور حفاظت کرنے والے ہی ہمیں قتل کر دیں تو عدالت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

میں نے کہا "بس تو پھر اللہ ہی رحم کرے تمہارے حال پر۔"

وہ چونکا "تم مسلمان ہو؟"

میں نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب میں اللہ کا نام لیتا ہوں تو لوگ چونکتے کیوں ہیں۔ کیا یہاں مسلمان نہیں رہتے اور وہ اللہ کا نام نہیں لیتے؟"

مگر مدھو سودن پر میری بات کا الٹا اثر ہوا "تمہارا ستیاناس ہو۔ ہمارا دھرم بھرشٹ کر دیا تم نے۔ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا کہ تم مسلمان ہو۔ ہم نے تمہارے ساتھ کھا پی لیا۔"

میں نے تلخ لہجے میں کہا "تم نے ہمارا جھوٹا نہیں کھایا۔ برتن اگر ناپاک ہو گئے ہیں تو ہمیں دے دو اور ہماری غلطی کے باعث تم سے انجانے میں جو پاپ ہو گیا ہے اس کے لئے بعد میں کفارہ ادا کرتے رہنا۔ مگر مدھو سودن! ایک غلطی تم نے بھی کی جس کی وجہ سے ہم مجبور ہیں۔ تم نے ہمیں مہمان بنایا تھا ہم تم سے دشمنی نہیں کر سکتے۔ ورنہ تم پر اعتبار کرنے کے بجائے تم کو خود قانون کے حوالے کر دیتے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مدھو سودن کے ہندو ذہن نے کے متعصب رویئے نے مجھے سخت دکھ پہنچایا تھا۔

"تمہاری بیوی نے رسوائی تک میں قدم رکھ دیا۔" مدھو سودن نے انتہائی افسوس کے ساتھ سر ہلایا۔

"تم بے عزتی کر رہے ہو ہماری۔" اس کی بات نے مجھے مشتعل کر دیا "یہ سب نتیجہ ہے تم کو رعایت دینے کا اور تمہارے ساتھ شریفانہ برتاؤ رکھنے کا۔ بہتر ہوتا کہ تم سے کوئی بات کئے بغیر میں تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جاتا اور پھر تمہارے دھرم کی طاقت آزماتا۔ تمہارے گھر میں کسی لحاظ کے بغیر تم کو بے عزت کرتا تو اچھا تھا؟"

کیرتی نے کہا "بھائی صاحب! اس کا باپ کٹر برہمن ہے۔ مدھو سودن مذہب کے معاملے میں بہت حساس ہے۔"

میں نے کہا "کس مذہب کے معاملے میں؟ جو انسانوں کو انسانوں سے نفرت سکھاتا ہے۔ ذات پات کے فرق سے کیا ہوتا، اگر یہ برہمن کا نہیں کسی شودر کا بچہ ہوتا۔"

رابعہ نے کہا "چلو لعنت بھیجو..."

اندر سے کسی نے سوتے میں بڑبڑا کر کہا "مدھو سودن! یہ کیا ہو رہا ہے آدھی رات کو؟"

میں رابعہ کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ مجھے کچھ یاد آ گیا۔ میں نے مدھو سودن سے کہا "ایک آخری بات۔"

اس نے مجھے ایک طرح سے باہر دھکیلنے کی کوشش کی "آخری بات تم کہہ چکے۔" اور پریشانی سے درمیانی دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

میں اپنی جگہ پر جم گیا "یہ بات کئے بغیر میں نہیں جاؤں گا" اور اسے وہ تصویر دکھائی جس کے بارے میں مجھے شک تھا کہ کیمرو ٹرک سے شملا کو شیشے کے باکس میں سوا اور دکھائی اور جو مجھے پروہت کی لاش سے ملی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" مدھو سودن نے کہا "کس کی تصویر ہے؟" تصویر اس کے ہاتھ سے کیرتی نے لے لی "یہ تصویر" اس نے بے اختیار حیرت سے کہا۔

میں نے کہا "کیا ہے اس تصویر میں؟"

کیرتی نے کچھ اجازت طلب، معذرت آمیز انداز میں اپنے شوہر کی طرف دیکھ کے کہا "ایسی ایک تصویر مجھے ملی تھی۔"

"ملی تھی کیا مطلب...؟ کوئی دے گیا تھا۔ ڈاک سے آئی تھی۔" میں نے کہا۔

"یہ نہیں معلوم۔ دروازے کے نیچے سے کوئی اندر ڈال گیا تھا۔" کیرتی نے کہا۔

"تم نے مجھے نہیں بتایا تھا۔" مدھو سودن خفگی سے بولا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے۔" کیرتی نے کہا "ان لوگوں کے آنے سے گھنٹا بھر پہلے کی بات ہے۔"

"مجھے دکھاؤ... کہاں ہے وہ تصویر؟" میں نے فکر مند ہو کے کہا۔

"اندر... اس میں کوئی ایسی بات نہیں۔ بالکل یہی تصویر ہے۔ اس کی دوسری کاپی۔" کیرتی نے وضاحت کی۔

میں نے کہا "اس کے پیچھے کچھ لکھا ہوا تو نہیں تھا؟ نام یا کوئی پیغام۔"

کیرتی نے نفی میں سر ہلایا "بس تصویر تھی۔ میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ فلمی پوسٹ کارڈ کی تصویر ملتی جیسی لگی تھی۔"

میں نے کہا "یہ کسی فلمی اداکارہ کی تصویر نہیں ہے۔" میرا ذہن سخت الجھن کا شکار تھا۔ ایک شک اچانک یقین کا درجہ اختیار کر گیا تھا۔ حالانکہ مجھے اپنے شک کی بنیاد کمزور لگتی تھی۔ یہ ایک بعید از امکان سی بات تھی... میرا خیال تھا کہ کہیں اس تصویر کو شکاری ایک چارے کے طور پر استعمال نہیں کر رہے ہیں۔ کہ جہاں بھی ہمارے پہنچنے کا امکان ہو وہاں یہ تصویر پہلے سے موجود ہو۔ پروہت کے قتل کے بعد انہوں نے سر اٹھایا تھا تو میں نے رابعہ کو بھی "کیمو ٹرک" کے حوالے سے مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ مگر اس کی

مجھے لاجواب کر دیا تھا کہ کپڑے اور بالیں شملا کے ہیں۔ دوسری تصویر نے مجھے کسی حد تک بدحواس کر دیا۔ کیا ہمارے ساتھ اسی طرح کھیل رہے تھے جیسے بلی چوہے سے کھیلتی ہے؟ انہیں معلوم تھا کہ ہم کہاں ہیں اور کہاں کہاں پہنچے ہیں۔ پروہت اور ان دونوں میاں بیوی کے درمیان تعلق بہت واضح تھا۔ یہ میاں بیوی ڈاکو محمد خان کے ٹھکانے سے بھی ہو آئے تھے۔ ڈاکو محمد خان کے ٹھکانے سے میں خود اس کے ساتھ فون پر بات کر چکا تھا۔ بہت سے کونے اور کھانچے تھے جو آپس میں فٹ نہیں بیٹھتے تھے مگر ان کے باہمی رابطے کا جو خاکہ بن سکتا تھا وہ واضح ہو چکا تھا۔

میں دروازہ کھولے کھڑا تھا اور مدھو سودن مجھے جلد از جلد باہر نکال کر دروازہ بند کرنے کے لئے بے چین نظر آتا تھا۔ بدحواسی میں خود بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اب میں کیوں رک گیا ہوں۔ میں اس وقت چونکا جب باہر گھپ اندھیرے کو چیرتی ہوئی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی کے ساتھ ہی میں نے جیپ کے انجن کی آواز سنی۔ میری چھٹی حس نے چلا کے کہا "پولیس۔"

"پولیس..." میں نے واپس اندر قدم رکھتے ہوئے دروازے کو بند کر دیا۔

کیرتی کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا "اب کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "پولیس تمہیں گرفتار کرنے کے لئے آئی ہے۔" اور رابعہ کا ہاتھ پکڑ کے اندر کی جانب لپکا۔

مدھو سودن نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی "اندر کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے اسے دھکیل کر ایک طرف کیا اور رابعہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں گھس گیا۔ اس کمرے میں اندھیرا تھا لیکن درمیان کے کھلے دروازے سے تھوڑا بہت اجالا ہو گیا تھا۔ میں نے فرش پر دو بچوں کو گٹھڑی بنے دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا اپنی چندھی چندھی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس نے چلانے کے لئے منہ کھولا اور پھر میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کے بند کر لیا۔

کمرے کا دوسرا دروازہ پر آدھے میں کھلا تھا۔ میں رابعہ کو کھینچتا ہوا اس دروازے سے گزر گیا۔ میں نے مدھو سودن کو پیچھے آتے دیکھا مگر پھر وہ باہر والے دروازے پر دستک سن کے رک گیا۔ پولیس اپنے پورے اختیار کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ کیرتی نے ایک چیخ ماری۔ میں نے پر آدھے دروازے کو باہر سے کنڈی لگائی اور ہم پھر بھاگے۔ ہمارے سامنے ایک مختصر سا صحن تھا۔ یہ کوارٹر کا عقبی حصہ تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ ادھر سے کھلنے والا دروازہ کہاں لے جانے کا

مگر اس وقت فرار کے دوسرے سب راستے مسدود تھے۔

گلی میں آتے ہی میں نے رابعہ کو ساتھ لے کر اندازے سے اس طرف دوڑنا شروع کیا جہاں ہماری جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ رابعہ بار بار پیچھے رہ جاتی تھی اور مجھے رک کر اسے ساتھ کھینچنا پڑتا تھا۔ میرے لئے یہ ایک مسئلہ بن گیا۔ ایک مرحلے پر میں نے دوڑتے دوڑتے اس کی کمر کو کھول کے زیادہ مضبوطی سے باندھی۔ مجھے ہر قدم پر یہ ڈر تھا کہ پولیس بھی اسی دروازے سے باہر آ کے ہمارا پیچھا کرے گی۔ انہیں یہ اختیار بھی حاصل ہوگا کہ وہ فرار ہونے والے مجرموں پر گولی چلا دیں۔ وہ ہماری گرفتاری کے لئے نہیں آئے تھے لیکن مدھو سودن سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اپنے ساتھ ہمیں بھی پکڑوا دے، پولیس سے کہے کہ اصل قاتل تو ابھی ابھی نکل کر گئے ہیں۔ اور یوں انہیں دھرم بھرشٹ کرنے کی سزا دلوانے کی کوشش کرے۔

پہلا موڑ کاٹتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ ہم گولی کا نشانہ بننے سے تو بچ گئے تھے۔ اگلا مرحلہ جیپ تک بخیرو عافیت پہنچنے کا اور پھر جیپ لے کر نکل جانے کا تھا۔ دوسرا موڑ کاٹتے ہی میں نے جیپ کو اپنی جگہ پر موجود پایا تو میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ پولیس کی جیپ گلی میں آگے تھی اور اگرچہ کھلے دروازے سے تھوڑی بہت روشنی گلی میں بھی پڑ رہی تھی مگر ہم اس روشنی کی زد میں نہیں تھے۔ پولیس والے شاید مجرموں کو اور ان کے لواحقین کو پکڑنے کے لئے اندر گھس گئے تھے اور ہمارے لئے میدان خالی چھوڑ گئے تھے۔

میں نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان رابعہ سے کہا۔ "اس وقت پھر خدا نے بال بال بچا لیا۔"

اور رابعہ نے ہانپتے ہوئے کہا "تم نے خواہ مخواہ دیر کی ورنہ پہلے نکل جاتے۔"

"کیا پتا راستے میں ہی پولیس سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔" میں نے کہا "یہ جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔ اب دیکھنے والا کوئی نہیں۔ چلو بیٹھو۔"

"مجھ میں دوڑنے کا دم بھی نہیں رہا تھا اب تو۔" رابعہ نے جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد جیب سے چابی نکالی اور اگنیشن سوئچ میں لگائی۔ چابی گھمانے سے پہلے ہی جیپ تھوڑا سا ہلی اور مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی مگر سر گھما کر دیکھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اندھیرے میں میری آنکھوں نے ایک سائے کو متحرک دیکھا۔ پھر میرے سر پر پیچھے سے ڈنڈا مارا گیا یا ایسی ہی کوئی چیز جس سے میری کھوپڑی

www.paksociety.com

چیخ گئی۔ مجھے اندھیرے میں جگنو سے اڑتے نظر آئے۔ ہوش میں رہتے ہوئے میرے کانوں نے آخری آواز رابعہ کی سنی۔ اس نے چیخ مارنے سے پہلے شاید میرا نام لیا تھا۔

جب مجھے ہوش آنے لگا تو آہستہ آہستہ میری آنکھوں کے سامنے پھیلتے سمٹتے دھندلے سائے واضح شکل اختیار کرنے لگے اور روشنیاں بھی ایک جگہ ٹھہر گئیں جو پہلے میرے دائیں بائیں گھومتی محسوس ہوتی تھیں اور جلتی بجھتی نظر آتی تھیں۔ آوازوں کے مضطرب گرداب میں بٹا ہوا شور بھی ریڈیو کے ریسپشن کی طرح کلیئر ہو گیا۔

مجھے خود کو ایک خالی بیرک کے فرش پر لیٹا ہوا پا کے تعجب ہوا۔ یہ اونچی محرابی چھت والی بیرک تھی جو ایئرپورٹ پر جہازوں کے ہینگر جیسی لگتی تھی۔ اس کا بیشتر حصہ تاریکی میں تھا اور کافی فاصلے پر میں ایک دروازہ دیکھ سکتا تھا۔ یہ دروازہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں سے ٹرک گزر جائے۔ میرے سر کے عین اوپر پرانے طرز کے شیڈ میں ایک بلب معلق تھا۔

جب میں نے اپنا سر ہلانے کی کوشش کی تو مجھے ایسا لگا جیسے اصل سر کی جگہ میری گردن پر دس گنا بوجھ تربوز رکھ دیا گیا ہے اور میری گردن کے نٹ بولٹ بھی ڈھیلے ہیں۔ میرا سر بہت بھاری ہو رہا تھا اور اس کے اندر کوئی مسلسل ہتھوڑے چلا رہا تھا چنانچہ درد کے بگولے سے اٹھ اٹھ کے سر کی دیواروں سے ٹکراتے تھے۔

آہستہ آہستہ میری یادداشت بھی بحال ہونے لگی۔ مجھے پہلے رابعہ کا خیال آیا۔ وہ میرے ساتھ ہی جیپ میں بیٹھی تھی۔ پھر... کیا ہوا تھا؟ میں نے جیپ اسٹارٹ کی تھی... نہیں... میں اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ رابعہ نے چلا کے مجھ سے کچھ کہا تھا اور کسی نے مجھ پر پیچھے سے حملہ کیا تھا... ہاں... وہ پہلے سے جیپ کی پچھلی سیٹوں کے درمیان موجود تھا لیکن اندھیرے میں میری نظر اسے نہیں دیکھ سکی تھی۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھاما اور اٹھ بیٹھا۔ اس کے بعد میری نگاہ نے رابعہ کو دیکھا۔ وہ گھٹنے سمیٹے اور ان پر ٹھوڑی رکھے مجھے دیکھ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

"رابعہ!" میں نے کہا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

جواب میں رابعہ نے فقط سر ہلایا۔ جواب کسی اور نے دیا۔

"آپ اپنی کہو۔ خیر سے سر کے اندر کا مال تو خراب نہیں ہوا اپنے سکندر صاحب۔"

"دلاور..." میں نے کہا۔ اور پھر رابعہ کی موجودگی کا خیال کیے بغیر اسے ایک سانس میں نصف درجن فحش گالیاں دیں۔ وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہوا جی۔ کہ اندر کا مال مسالہ بچ گیا۔ آپ کے پاس اور تھا بھی کیا۔ مجھے تو ... ہو رہی تھی۔ کیا کہتے ہیں اسے... تشویش... کہ ہوش ... آنے کے بعد آپ نے چیخ مار کے کہا آپا رابعہ... یا ... ڈیڈی کہہ کے مجھ سے لپٹ گئے تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ ... درست کرنا ہمارا کام تھوڑی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہاں، تمہارا کام تو وہ ہے جو شیطان کر سکتا یا تم کر سکتے ہو۔"

اندھیرے میں سے ایک شخص مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے میرے ٹک مارنے کی کوشش کی۔ اگر یہ ٹک لگ جاتا تو میرے جبڑے ٹوٹ جاتے یا سر گھوم کر الٹا ہو جاتا۔ میں نے خود بھی بچایا اور اس حملہ آور کی ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ شخص بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اسے اندازہ تو ہو گیا ... اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو اس کی خیر نہیں۔ یہ شخص استاد پیڈرو تھا۔ اب وہ گالیاں بک رہا تھا اور ان سب گالیوں میں کسی نہ کسی طرح رابعہ کو بھی شریک کر رہا تھا۔

رابعہ نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے آہستہ سے دبایا اور مجھے ضبط سے کام لینے کا اشارہ کیا۔

"ڈرتے کیوں ہو پیڈرو؟ ایک حملہ اور کر کے دیکھو ذرا قریب آؤ۔" میں نے کہا۔ "ویسے شوق تھا خود کو بہادر ثابت کرنے کا تو جتنی دیر میں بیہوش رہا تم اپنی حسرت نکال سکتے تھے۔"

پیڈرو نے پھر رابعہ کے بارے میں غلاظت سے بھرے جملوں کے ساتھ حملہ کیا اور دور کھڑا مجھے بتاتا رہا کہ مجھے ... موت مار دینے کے بعد وہ رابعہ کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ ... اکیلا نہیں تھا۔ میں ایک حلقے میں کھڑے ہوئے کم سے کم ... افراد کو دیکھ سکتا تھا۔ جو سب مسلح تھے۔

ان غیر متحرک غیر واضح خدوخال رکھنے والے اور اجنبی پرچھائیوں میں جو روشنی کے حلقے سے دور تھیں مجھے ہر ایک پر دلاور کا شبہ ہوا مگر دلاور ان میں شامل نہیں تھا۔ میں نے ... کی آواز سنی تھی جو کسی لاؤڈ اسپیکر سے نہیں آئی تھی۔ ... کی قدرتی آواز تھی۔ اس کے بعد جیسے ڈرامے کے کردار ... اور آتے ہیں۔ دلاور پس منظر میں چلا گیا تھا اور پیڈرو سامنے آ کے وہ پرفارمنس دے رہا تھا جو دلاور کے شایانِ شان ... تھی۔ جیسے یہ سزائے موت سنانے والے جج کے مرتبے ... وقار کے خلاف ہو گا۔ اگر وہ خود ہی جلاد کے فرائض ... دے۔ یہ اس کے لئے ناممکن نہیں ہوتا مگر ...

ایسے ہی دلاور بھی صرف حکم دیتا تھا اور سارے ... اور غیر انسانی کام اس کے حکم کے غلام کرتے تھے۔

استاد پیڈرو گالیاں دینے اور مغلظات سے تمام ...

رشتوں کی بے حرمتی کرنے کے اشتعال انگیز کام میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ ایسی باتوں کو سن کے نظر انداز کر دینا اور پرسکون رہنا ایک اعصاب شکن مرحلہ تھا مگر رابعہ نے مجھے مشورہ دیا۔ "یہ لوگ کتے بھونک رہے ہیں۔ ان پر بھونکنا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ تم ان پر مشتعل ہو کے حملہ کرو تو انہیں مل کے اپنی طاقت آزمانے کا بہانہ مل جائے۔ جب تک یہ خود کچھ نہ کریں تم بھی بیٹھے رہو۔"

میں نے کہا۔ "میرا تو خون کھول رہا ہے اس کی باتوں سے۔ یہ میرے ہاتھ آ جائے تو میں اپنے ہاتھوں سے اس کے دونوں جبڑے چیر دوں اور اس کی زبان کھینچ کر باہر کر دوں۔"

"یہ تمہاری قوتِ برداشت کا امتحان ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ لیکن اپنی فطرت سے لڑنا زیادہ بڑا امتحان ہے۔ گالی ویسے تو بس ایک لفظ ہے مگر یہ انسان کے احساس پر تازیانہ ثابت ہوتی ہے۔ عزتِ نفس اور غیرت رکھنے والے ہر انسان کے لئے احساس کو مصلحت کے تقاضوں پر قربان کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔"

"تم اس کی طرف دھیان ہی مت دو۔ کچھ اور سوچو... یا مجھ سے باتیں کرو۔" رابعہ نے کہا۔

اس وقت بلاشبہ رابعہ نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ استاد پیڈرو نے اسے وہ سب کچھ کہا جو نہ بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ نہ جانے کیوں اس کی فحش کلامی کا ہدف رابعہ تھی۔ یہ یقیناً ایک نفسیاتی حربہ تھا جسے ہم نے مل کے ناکام کر دیا تو پیڈرو نے اس عمل کو زیادہ تکلیف دہ بنا دیا۔ جیسے کوئی آواز کا والیوم بڑھا دے۔ انجن کی رفتار میں اضافہ کر دے یا درجہ حرارت کو زیادہ کر دے۔ ان میں سے ایک حبشی قسم کا گوریلا نما انسان آگے بڑھا اور اس نے کھلی گفتگو کے ساتھ خاصی جسمانی قوتوں کا مظاہرہ بھی کیا۔ اب میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ آنکھیں بند کرے اور اس منظر کو تصور سے خارج کر دے۔ یہ ایک مشکل بلکہ ناممکن مطالبہ تھا۔ لیکن رابعہ نے ظاہر کیا کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔

شاید ایک گھنٹے کے بعد یہ ذہنی اذیت پہنچانے کا انسانیت سوز عمل ختم ہوا اور میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو منظر بدل گیا تھا۔ وہ سب پھر خاموش کھڑے ہوئے تھے لیکن فضا اب بھی درد و کرب کے خونی لمحوں سے اور وحشی جذبوں کی گونجتی چیخوں سے لبریز تھی۔ یہ سکوت ڈراتا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ ... اگلا مرحلہ کیا ہو گا۔ کتنا پرعذاب ہو گا۔

لیکن خلافِ توقع اس شرمناک خاموشی کے حصار سے دلاور برآمد ہوا۔ یوں جیسے غلاظت سے اٹے گٹر کے تعفن میں سے اچانک ایک زہریلا سانپ پھن اٹھا کے سامنے آ جائے۔

اسے گالی دینے کے بجائے میں نے اس کے منہ پر شرافت کا طمانچہ مارنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے تمام آتش فشاں جذبات پر بے حسی کا پردہ ڈال کے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ اپنی آواز سنا کر کہاں غائب ہو گئے تھے چوہدری صاحب؟"

دلاور نے عیاری سے کہا۔ "میں ایک کال سننے چلا گیا تھا۔ تمہیں کسی نے پریشان تو نہیں کیا؟"

"نہیں چوہدری صاحب! یہ سب شریف لوگ لگتے ہیں مجھے۔ آپس میں ہنسی مذاق کرتے رہے۔ ہم اپنی باتیں کرتے رہے۔"

ایک شخص نے کرسی لا کر رکھ دی۔ چوہدری دلاور ہم سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"بڑی بات تو یہ ہے اپنے سکندر اعظم صاحب! کہ کچھ ہماری منصوبہ بندی ناقص تھی۔" دلاور نے کہا۔ "کچھ تقدیر نے تمہارا ساتھ دیا جس کی وجہ سے معاملات پر ہمارا کنٹرول نہیں رہا اور تمہارے حوصلے بڑھتے رہے۔ خیر آدمی اپنی غلطیوں سے ہی تجربہ حاصل کرتا ہے نا جی... تم بھی سیکھ سکتے تھے۔ نہیں سیکھا موقع ملنے کے باوجود... تو یہ بدقسمتی تمہاری۔ اب دیکھ لو کہ تم یہاں کیسے بیٹھے ہو جیسے چوہے دان میں چوہا پڑا ہو۔ اور تمہیں کچھ معلوم نہیں اپنے انجام کے بارے میں۔"

میں نے کہا۔ "ہم اپنے آخری انجام سے ڈرتے تو گھر سے ہی نہ نکلتے... اور اس وقت یہاں کیوں ہوتے۔"

دلاور نے کرسی میں پہلو بدلا۔ "ہاں، تم نے مجھ سے تعاون کیا ہوتا تو اس وقت لندن، پیرس یا سوئٹزرلینڈ میں عیش کر رہے ہوتے۔"

میں نے کہا۔ "پرانی بات کا ذکر کرنے سے کیا حاصل ہو گا دلاور! جو نہیں ہوا وہ آئندہ بھی نہیں ہو گا۔"

ایک شخص نے پیچھے سے کہا۔ "سر! آپ کی ٹیلی فون کال ہے۔"

"ابھی تم کچھ نہیں جانتے۔" دلاور بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا اور اٹھ کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی وہ شیطانی ٹولہ آگے آ گیا۔ اس بار وہ اسلحہ لے کر میری طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے ہاتھ اوپر اٹھانے کا حکم دیا۔ دوسرے نے پیچھے سے مجھ پر ایک جال پھینک دیا جو نائلون کی مضبوط رسیوں کا بنا ہوا تھا۔ اسے توڑ کر رہائی حاصل کرنے کی کوشش کا تصور بھی محال تھا۔ جال کی رسی کھینچ کر انہوں نے مجھے کسی جنگلی جانور کی طرح بے بس کر دیا جس کی

www.paksociety.com

خون آشامی کی وحشت ان کے اعصاب پر گرفتاری کے بعد بھی سوار ہو۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور انجام کو خدا کی رضا پر چھوڑتے ہوئے رابعہ کو بھی صبر کی تلقین کرتا رہا۔

لیکن اس کے بعد وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ انہوں نے رابعہ کو دبوچ لیا۔ رابعہ نے چیختے چلاتے ہوئے مزاحمت کی مگر وہ بیک وقت چھ تنومند مردوں سے نہیں جیت سکتی تھی۔

میں نے کئی بار آنکھیں بند کرلیں لیکن پھر مجبور ہو کے کھول دیں۔ اچانک ایک خیال نے مجھے وقتی حوصلہ دیا۔ انہیں اپنی وحشت میں حد سے بڑھنے کی اجازت نہیں تھی اور رابعہ کے ساتھ اشتعال انگیز چھیڑ میں بھی وہ پابند تھے کہ اس کارروائی میں رابعہ کو گزند نہ پہنچے چنانچہ وہ نوچنے کاٹنے سے گریز کر رہے تھے جس سے جسم پر تشدد کی کوئی علامت نمودار ہو جائے، کوئی خراش آئے یا کہیں زخم رسنے لگے۔

یہ یقین بڑا سکون دینے والا تھا کہ رابعہ کی عزت پر حملہ نہیں ہوگا۔ دشمن کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند نہیں ہوتا... اور دلاور جیسے دشمن تو دوستی میں بھی اخلاقیات سے دشمنی کا وتیرہ رکھتے تھے۔ پھر یہ حد سے نہ گزرنے کی پابندی کیوں؟ ابھی کچھ دیر پہلے دلاور دھمکی دے رہا تھا کہ ”میں انجام سے ڈرنا چاہئے کیونکہ ہماری حیثیت جو ہے وہ ان میں بند چوہے سے بھی زیادہ عبرت ناک ہے۔ اس کے آنے سے پہلے بھی ایک اعصاب شکن وحشیانہ کھیل ہوا تھا۔ کیا یہ بھی فقط ایک کھیل ہے؟ میری ذہنی شکست کے لئے... نہیں... یہ دلاور کی کوئی اور چال ہوگی جسے میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ شاید اس نے میرے ”انجام“ کو مختلف مرحلوں میں تکمیل تک پہنچانے کا سوچا ہوگا۔ انجام بدترین ہوگا مگر ایک طویل عرصے کے عذاب کے بعد۔

دلاور اچانک واپس آگیا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے دہاڑ کر کہا۔ ”بے مہار ہو جاتے ہو سب۔“

وہ سب کٹھ پتلیوں کی طرح رک گئے۔ چوہدری دلاور پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر جال میرے اوپر سے ہٹالیا گیا۔ اس وقت تک رابعہ بھی شکستہ حال میرے پاس آبیٹھی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی۔ میرے اندر کا وحشی انسان چاہتا تھا کہ دلاور کو گردن سے دبوچ لے اور اس سے پہلے کہ محافظوں کی گولیاں میرے جسم کو چھلنی کریں میں اس کی گردن توڑ دوں لیکن اس وحشی انسان کی لگام ابھی عقل کے ہاتھوں میں تھی۔ میں دلاور کو مار دیتا اور اس کے ساتھ خود بھی مارا جاتا تو اس سے رابعہ کو کوئی فائدہ نہ ہوتا اور میرے ساتھی وہ جنگ ہار جاتے جو ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دلاور کا فون ریسیو کرنے کے بہانے اٹھ کر جانا بھی اس ڈرامے کا ایک حصہ تھا۔ اس کے جاتے ہی جو کچھ رابعہ کے ساتھ ہوا وہ بھی دلاور کی ہدایات کے مطابق تھا۔ اس کے کسی حکم کے غلام کی مجال نہ تھی کہ اپنی مرضی سے یہ سب کر سکتا۔ اگر وہ بیچ میں نہ آتا تو ان کی کھال ادھیڑ دیتا۔ لیکن وہ بڑے سکون سے کرسی میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اشتعال کے رد عمل مظاہرے کا وہی نتیجہ نکلا تھا جو وہ چاہتا تھا۔ حکم کے غلام پھر دور جا کھڑے ہوئے تھے۔

”یہ سب بڑے حرامی ہیں۔“ دلاور نے کہنا شروع کیا۔

”بکواس بند کرو اپنی کتے! سب سے بڑے حرامی تم ہو۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”انہیں میں نہیں جانتا لیکن تمہارے خمیر کو بھی پہچانتا ہوں۔ تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں اور ان رگوں میں دوڑنے والے ہر بے غیرت، بے حیا اور نجس خون کے ہر قطرے کی سرشت کو سمجھتا ہوں۔“

دلاور نے تالی بجائی۔ ”واہ واہ۔ کیا زور بیان ہے اپنے سکندر اعظم صاحب کا۔ ہم تو ایسی گاڑھی اردو بول نہیں سکتے، بس کچھ سیکھ ہی لیتے ہیں سن کے۔“

میں نے ایک گہری سانس کو آہستہ آہستہ خارج کیا اور پھر رابعہ کو اپنے قریب کرلیا۔ وہ ایسے لرز رہی تھی جیسے اسے جاڑا بخار ہونے والا ہے۔

”تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو دلاور! ہم ایسی باتوں سے پہلے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ تجربات نے ہمیں زیادہ بے خوف کر دیا ہے۔ تم ہمارے جسموں کے ساتھ جو چاہو کرو۔ کوڑے مار دو یا خنجر سے کاٹو۔ آگ سے جلا دو یا روڈ رولر کے نیچے پیس دو۔ اس جسم سے قطرہ قطرہ خون کشید کرلو۔ اس کی عزت اور حرمت کو پامال کرو۔ مرنے کے بعد بھی اس پر ہوس کے دانت تیز کرو۔ ہمارا گوشت یا ہڈیاں چبالو یا اپنے کتوں کو ڈال دو۔ ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے لئے ہم ہمیشہ تیار ہیں مگر کیا اس طرح تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے؟ میرے یا رابعہ کے جسم کے لئے فنا ہے مگر ہم کوئی جسم نہیں، ’ایک جذبہ ہیں‘ ایک عقیدہ ہیں اور ایک یقین ہیں جو ناقابل شکست رہا ہے اور رہے گا۔ سکندر یا رابعہ ان جسموں کے نام ہیں۔ یہ تمہارے اختیار میں ہے مگر وہ فتح تمہارے اختیار میں نہیں ہے جس کی تم تمنا رکھتے ہو...“

دلاور نے میری بات میں دخل نہیں دیا۔ وہ اپنے لبوں پر اپنے مخصوص انداز بے نیازی کی ’عیاری کی اور خباثت کی طنز آمیز مسکراہٹ سجائے بیٹھا تھا۔ ایک بار پھر اس نے تالی بجائی۔ خالی ہیرک کے سکوت میں اس کی آواز نے زیادہ گونج پیدا کی۔

”واہ جی واہ۔ اس کو کہتے ہیں۔ کیا کہتے ہیں؟“ اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ”ہاں۔ رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔ ویسے کوئی شعر یاد نہیں آرہا ہے۔ آپ کو یاد ہو تو شاید ہماری طرف سے۔ نہیں تو میں ایک خبر سناتا ہوں... آپ کو اپنے سکندر مذہب! آپ بھی کیا یاد کرو گے۔ ایسی خوش خبری لی ہے آپ کے لئے۔ یہ جو ابھی فون سننے گیا تھا میں۔ تو اطلاع یہ ملی کہ ممبر سے اپنے مرزا غالب اور شیروانی صاحب بھی آرہے ہیں۔ جی جی... اپنی اپنی معشوقوں کے ساتھ۔ ایک بات کا بڑا افسوس ہوا مجھے۔ اپنے شیروانی صاحب بڑے بے وفا نکلے۔ لگتا ہے شہلا سے جان چھڑانا چاہتے تھے خود بھی۔ ہم نے ان کی مشکل آسان کردی۔ مقصد تو کچھ اور تھا ہمارا لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ شیروانی صاحب نے معشوق ہی بدل لیا ہے۔ وہ بے چاری شہلا خواہ مخواہ ماری گئی۔“

میں نے کہا۔ ”اب تم اس تصویر کی بات کرو گے۔“ ”وہ ایک بچکانہ حرکت تھی تمہاری۔ ایسی تصویروں پر کون نہیں ہوا سکتا۔ مگر ایک بچہ بھی ایسی کیمرہ ٹرک سے متاثر نہیں ہوتا۔“

اس سے پہلے کہ دلاور جواب دیتا ’سامنے والے دروازے سے تیز روشنی اندر آئی۔ دلاور نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک جیپ سیدھی اندر آگئی۔ اس کی تیز کن روشنی سیدھی مجھ پر اور رابعہ پر پڑی۔ انجن بند ہونے کے ساتھ ہی لائٹس آف ہو گئیں تو چند سیکنڈ کے لئے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا رہا۔ پھر میں نے پولیس کی وردی میں دو افراد کو دیکھا۔ جیپ سے اترنے کے بعد ان میں سے ایک سیدھا دلاور کی طرف آیا۔

دلاور نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا۔

”کیا خبر لائے ہو سب انسپکٹر؟“

سب انسپکٹر ہنسا۔ ”آپ خود ہی دیکھ لیں جناب!“

میرا دل ڈوبنے لگا۔ کیا واقعی وہ ہمارے باقی ساتھیوں کو لے آئے تھے؟ لیکن جیپ کے پیچھے میں نے مدھو سودان کے ساتھ گیرتی کو دیکھا تو جہاں میرے دل کو اطمینان ہوا وہیں حیرت بھی ہوئی۔ ان دونوں کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی۔ دو پولیس والے انہیں دھکیلتے ہوئے قریب لے آئے۔ مدھو سودان خاموش تھا مگر گیرتی رو رہی تھی۔

”یہ کون ہیں انسپکٹر؟“ دلاور نے حیرانی سے کہا۔

”یہ بڑے فنکار لوگ ہیں جناب!“ انسپکٹر نے کہا۔ ”ان پر قتل کا الزام ہے۔“

دلاور نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔ ”تو انہیں تھانے لے جاتے۔ یہاں لانے کا مقصد؟ میں کوئی جج ہوں کہ انہیں سزائے موت دے دوں۔“

”آپ حکم دیں۔ سزائے موت آپ کے سامنے دی جاسکتی ہے۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”دراصل یہ آپ کے بھی مجرم ہیں۔ آپ کا کچھ مال نکل گیا تھا گودام سے۔“

دلاور نے کہا۔ ”ہاں۔ میرا خیال ہے وہ چوکیدار کی حرکت تھی۔ ہم نے اسے چوری کا علم ہوتے ہی سزا دے دی تھی۔“

”آپ نے بہت جلدی کی سر سزا دینے میں۔“ سب انسپکٹر نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”پہلے تفتیش تو کر لینے دیتے ہمیں۔“

”ارے چھوڑو انسپکٹر! ہمیں معلوم ہے تم لوگ کیا تفتیش کرتے ہو۔“ دلاور نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ”کوئی ہمالیہ پہاڑ چوری کر کے لے جائے تو تفتیش کے بعد تم صرف اتنا معلوم کرتے ہو کہ یہ کام کسی چور کا ہے۔“

”نہیں جناب! یہ دیکھ لیں۔ اصل مجرم یہ ہیں۔ انہوں نے گودام سے مال نکالا تھا۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”کتنی جلدی پکڑ لیا انہیں ہم نے۔“

دلاور نے حیران ہو کے کہا۔ ”یہ... نہیں اپنے انسپکٹر صاحب۔ یہ تو بڑے غریب اور مظلوم بندے ہیں۔ غلط آدمی پکڑ کے لانا واقعی بہت آسان کام تھا۔“

”آپ پوچھ لیں ان سے جناب...“

”بھئی ان سے کیا خاک پوچھوں۔ جو تم نے کہا ہو گا وہی یہ کہہ دیں گے۔ اقبال جرم کرا لیتے ہو تم لوگ۔ مجھے میں نہیں مان سکتا۔ یا وہ مشین گن اور دستی بم ان کے کس کام کے؟ کوئی ڈاکو ہیں؟ مجھے تو پتا چلا تھا کہ وہ سب مال محمد خان کے ڈیرے پر موجود ہے۔“

اس وقت گیرتی نے بڑی عقل مندی کا مظاہرہ کیا۔ وہ ہتھکڑی سمیت دلاور کے پیروں سے لپٹ گئی۔ ”حضور۔ مائی باپ! ہم نے کچھ نہیں کیا۔ ہم شریف لوگ ہیں۔ آپ جس سے چاہو پوچھ لو۔ ہم نے کسی کو قتل بھی نہیں کیا۔ انسپکٹر خواہ مخواہ ہماری جان کا دشمن ہو گیا ہے۔ رشوت مانگتا ہے ہم سے۔ ہم دس ہزار کہاں سے لائیں۔“

سب انسپکٹر نے مشتعل ہو کے گیرتی کے ایک لات رسید کی اور ایک گالی دے کر بولا۔ ”بکواس کرتی جا رہی ہے... بھونکتی جا رہی ہے...“

گیرتی نے ایک دلدوز چیخ ماری۔ ”دیکھ لیں سرکار! ایسے ہوتا ہے غریبوں کے ساتھ۔ ہمیں بچالیں۔ ہم ساری عمر غلامی کریں گے۔ ہمارے بچے دعائیں دیں گے۔“

خلاف توقع دلاور نے گیرتی کو لات مار کے دور نہیں پھینکا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گیرتی کی آہ و زاری سے پسیج گیا ہے۔ اس نے

نرمی سے ہاتھ پکڑ کر کیرتی کو اٹھایا۔ "اٹھو، آرام سے بات کرو۔ کیا تم نے چوری کی تھی؟"

کیرتی نے رو کے کہا۔ "بھگوان کی سوگند سیٹھ صاحب! ہم نردوش ہیں۔"

سب انسپکٹر اسے مارنے کے لیے بڑھا تو دلاور نے روک دیا۔ "بس کرو سب انسپکٹر جانے دو انہیں۔"

سب انسپکٹر نے احتجاج کیا۔ "انہوں نے ایک پروہت کی ہتھیا قبول کی ہے۔"

دلاور نے غصے سے کہا۔ "بکواس بند کرو۔ تمہیں دس ہزار چاہئیں۔ یہ لو دس ہزار۔" اس نے اپنی جیب سے ایک گڈی نکال کے سب انسپکٹر کی طرف پھینک دی۔ "اب چھوڑو انہیں کھول دو ان کی ہتھکڑی۔"

سب انسپکٹر نے تذبذب اور احتجاج کے انداز میں کچھ سوچتے ہوئے گڈی اٹھائی۔ اسے جیب میں رکھنے سے پہلے ہاتھ پر مارتا رہا۔ پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ مدھو سودن اور کیرتی آزاد ہو گئے۔ وہ دلاور کو دیوتا قرار دیتے ہوئے اس کے پاؤں چھو رہے تھے اور دعائیں دے رہے تھے۔ دلاور ایک شان استغنا کے ساتھ انہیں دلاسا دے رہا تھا۔ میں اور رابعہ یہ سخی اور فیاض کا ناٹک دیکھ رہے تھے۔ دلاور جیسے شیطان نے صرف دس ہزار میں خود کو فرشتہ ثابت کر دیا تھا۔ اپنے رحمدل، نیک اور سخی ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا تھا۔ صرف میں ہی جانتا تھا کہ یہ دکھاوا ہے، جھوٹ ہے اور ڈراما ہے۔ لیکن میں اس ڈرامے کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ آخر دلاور کو کیا ضرورت تھی شرافت کی سند حاصل کرنے کی؟ وہ شک پر بھی اپنے کسی مجرم کو معاف نہیں کرتا تھا۔ مگر یہاں اس نے خواہ مخواہ انصاف کے عمل میں دخل دے کر دو مجرموں کی جاں بخشی کرا دی تھی۔ یہ سب کچھ ہمارے سامنے کیا گیا تھا۔ دلاور اتنا بے وقوف ہرگز نہیں تھا کہ ہمیں متاثر کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم شیطان کی شرافت اور نیکی کے قائل ہو سکتے ہیں مگر چوہدری دلاور کو شریف اور نیک تسلیم نہیں کر سکتے۔

"چلو اب جاؤ اپنے گھر۔" دلاور نے مدھو سودن اور کیرتی سے کہا۔ ان دونوں کے لیے رہائی کی خوشی ناقابل برداشت تھی۔ اسے وہ ایک معجزہ سمجھ رہے تھے کہ ایک اجنبی، رحمدل سیٹھ نے دس ہزار میں انہیں عزت اور آزادی خرید کر واپس کر دی۔ میری طرح رابعہ بھی اس وقت اتنی حیران تھی کہ رونا دھونا بھول گئی تھی۔ ہم دونوں نے مدھو سودن اور کیرتی کو ایسے فرار ہوتے دیکھا جیسے پنجرہ کھلا پا کے ایک دم قیدی پرندے پرواز کرتے ہیں۔

"اچھا اس دوسرے معاملے کا کیا ہوا؟" دلاور نے کہا۔

سب انسپکٹر نے کہا۔ "وہ کام بھی ہو گیا۔ میں ادھر ہو کے آیا ہوں خولی خان مقابلے میں مارا گیا ہے۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ "جھوٹ بکتے ہو تم۔" رابعہ نے بے اختیار ایک چیخ ماری۔ "نہیں... یہ نہیں ہو سکتا۔"

سب انسپکٹر نے ہمیں گھور کر دیکھا۔ "یہ کون ہیں؟"

دلاور نے کہا۔ "ان کی طرف دھیان مت دو اپنی بات کرو۔"

"اور کیا بات کروں جناب! خولی خان کے چار ساتھی بھی مارے گئے۔ انہیں زندہ پکڑ کر کیا کرنا تھا۔ خواہ مخواہ کی ذمے داری اور پریشانی تھانے میں رکھو تو مصیبت، عدالت میں لے جاؤ تو خطرہ۔"

"ہاں ایسے لوگوں کا فیصلہ تو فوراً ہی کر دینا چاہیے۔" دلاور نے کہا۔ "مگر انسپکٹر! وہاں اور بھی کچھ لوگ تھے۔"

"ہاں جی۔ خولی خان کے مہمان اب سرکاری مہمان ہیں۔" انسپکٹر نے کہا اور پھر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

ابھی تک میرے لیے اس سب انسپکٹر پر شک کرنے کی وجہ کوئی نہ تھی۔ میں اس کی ہر بات پر یقین نہ کرنے کی خواہش کے باوجود یقین کرنے پر مجبور تھا۔ لیکن اب یکلخت میں نے اس کے جھوٹ کو پکڑ لیا۔ ابھی دو منٹ پہلے ہی میرے رد عمل پر اس نے خاصی بے التفاتی کے ساتھ اظہار ناشناسائی کیا تھا اور دلاور سے پوچھا تھا کہ یہ کون ہیں۔ اگر ہم اس کے لیے اتنے ہی اجنبی تھے اور وہ ہمارے نام تک نہیں جانتا تھا تو پھر ہمارے ساتھیوں کے بارے میں اطلاع دیتے وقت اس کا ہماری طرف کاٹ دار نظروں سے دیکھ کے مسکرانا چہ معنی دارد۔ یقیناً وہ جانتا تھا کہ خان کے مہمانوں سے ہمارا کیا تعلق ہے چنانچہ ان کی گرفتاری کی اطلاع پر وہ میرا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے دلاور کے لیے ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اور اس کا اعلان کرتے ہوئے وہ بہت فخر محسوس کر رہا تھا۔

ہر جگہ پولیس کے بے ضمیر اور بد کردار لوگ ہی پرائے فروخت نہیں ہوتے۔ دولت کی قوت خرید کا دائرہ ہر محکمے اور ہر معاشرے کے سب طبقوں تک اور بلا لحاظ مذہب و ملت تمام افراد کو محیط کرتا ہے۔ میرے اپنے وطن میں لئیق پراچ کو وطن دشمنوں نے خرید لیا تھا۔ حاجی کہلانے والے اور عبداللہ نام رکھنے والے کو خرید لیا تھا۔ دلاور نے اگر بمبئی کے ایک پولیس سب انسپکٹر کو اور اس کے فرض کو خرید لیا تھا تو میرے لیے تعجب کی کوئی بات نہ تھی لیکن انسپکٹر کے جھوٹ نے میرے لیے امید کے بند ہوتے نظر آنے والے دروازے پر دستک دی۔ اگر وہ خریدا ہوا پولیس افسر ہوتا تو اس اطلاع پر دلاور اسے انعام دیتا۔ یا شاباش دیتا۔ ابھی ابھی اس نے اپنی دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو دس ہزار کی بخشش دی تھی، ایک ایسے معاملے میں جس سے اس کا براہ راست تعلق نہیں تھا۔ مدھو سودن اور کیرتی مجرم تھے یا نہیں تھے اور انہوں نے جرم کیا تھا یا نہیں کیا تھا، دلاور کو کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنی غریب پروری کا مظاہرہ کرتا مجرم جائیں اور قانون جانے۔ مگر وہ ڈراما تھا اور اب میرے سامنے اس ڈرامے کا دوسرا ایکٹ پیش کیا جا رہا تھا۔ وہ نقلی پولیس افسر تھا جو اپنا پارٹ بہت اچھا نبھا رہا تھا۔ اور ڈرامے میں واقعی بہت جان تھی۔ کیونکہ اس کا ہدایت کار خود چوہدری دلاور تھا۔ اس سے پہلے میں اس کے پیش کیے ہوئے بہت سے کامیاب ڈرامے دیکھ چکا تھا۔ موقع محل اور صورت حال کو اپنی ضرورت کے مطابق ڈرامائی بنانے میں اس کا ثانی نہیں تھا۔

ان تمام حقائق کا تجزیہ میرے دماغ کے کمپیوٹر نے پہلے سے دستیاب حقائق کی روشنی میں فوراً کر لیا۔ دلاور کو معلوم تھا کہ ہم پروہت کے بعد مدھو سودن کے گھر ضرور جائیں گے۔ اس نے وہاں پہلے سے ایک تصویر فراہم کر دی۔ وہ ایک طرح سے ہمارے لیے پیشگی اطلاع تھی کہ ہم سے پہلے شکاری وہاں پہنچ چکے ہیں۔ اور اب آزاد ہونے کے باوجود ہم ان کی شکار گاہ میں ہیں۔ کسی وجہ سے شکاری پروہت کے گھر میں نہ پہنچ سکے ورنہ یہ انسپکٹر ہمیں جائے واردات سے رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا اور دلاور کی خدمت میں لا کے پیش کر دیتا۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ ہم خوش قسمتی کے باعث زیادہ مضبوط جال سے بچ نکلے ہیں، وہ مدھو سودن اور کیرتی کے گھر پہنچا کر ہم وہاں سے بھی فرار ہونے میں کامیاب رہے تو اس نے دونوں میاں بیوی سے معلوم کیا کہ ہم کہاں گئے ہوں گے اور پھر ان کے ذریعے ٹھیک جگہ پر آ پہنچا۔ مدھو سودن اور کیرتی کی گرفتاری کوئی ڈراما نہ تھی۔ وہ اپنے اصل مشن میں ناکام رہا تھا۔ اس سے پہلے ہی دوسرے لوگ ہمیں لے آئے تھے۔ یہ دوسرے لوگ دلاور کے اپنے آدمی تھے یا تریویدی کی غنڈہ فورس کے ہمارا سراغ مل جانے کے بعد ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔ دلاور تنہا آدمی تھا اور کبھی ناکامی کے امکانات کو نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ جیسے ہی اسے اطلاع ملی ہوگی کہ پروہت کے گھر ہم ہاتھ نہیں آئے اور پراسرار طور پر وہاں سے غائب ہو گئے ہیں، یہ غنڈا فورس دوسری جگہ پر بھیج دی گئی۔

میرے اس ذہنی حساب کتاب میں کچھ سقم ضرور تھے۔ ایک سب سے اہم سوال تو یہ تھا کہ مخبری کس نے کی۔ محمد خان نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ تریویدی کا باپ بھی اس جگہ کا سراغ نہیں لگا سکتا۔ اور زیادہ سے زیادہ وہ اس گلی تک پہنچ سکتے ہیں جو کہیں اور لگا ہوا ہے لیکن تریویدی، دلاور اینڈ کمپنی نے اندر کے حالات تک جان لیے ہیں۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ مدھو سودن اور کیرتی کو وہاں لے جایا گیا اور پھر چھوڑ دیا گیا۔ انہیں محمد خان کے اڈے پر اپنے چوری ہو جانے والے اسلحے کی موجودگی کا علم تھا اور انہیں پروہت کے اس چوری میں ملوث ہونے کا بھی علم تھا۔ یہ سب انہیں کس نے بتایا؟ یقیناً خان کے وفاداروں میں کوئی غدار مخبر تھا۔ میرا ذہن شہزادہ گلفام عرف یوسف ہالی کو ڈبل ایجنٹ کے طور پر پیش کر رہا تھا۔ خود محمد خان نے کہا تھا کہ وہ لالچی آدمی ہے۔ پیسے کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ بیک وقت دونوں کے کام آ رہا تھا۔ محمد خان کے ساتھ بھی تھا اور تریویدی کے بھی۔ اسے دونوں کی مدد کرنے پر انعام مل رہا تھا۔ اور ابھی تک اس کی ذات شک سے بالاتر تھی۔ اس کا جرم ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا، جب تک کہ وہ محمد خان، تریویدی یا دلاور کی "مشترکہ عدالت" کے سامنے پیش نہ ہو اور اس پر دونوں طرف سے فرد جرم عائد نہ کی جائے۔ جو ایک ناممکن کام تھا۔ لیکن جیسا کہ مقولہ مشہور ہے، "دو کشتیوں کا مسافر بالآخر ڈوب جاتا ہے۔" جو ایک قدم ایک کشتی میں رکھتا ہو اور دوسرا قدم دوسری کشتی میں۔ دھوکا تو ایک دلاور کو دینا بھی مشکل کام تھا۔ وہ بیک وقت تریویدی اور محمد خان جیسے خطرناک لوگوں کو ڈبل کراس کر رہا تھا۔ اس کا عبرت ناک انجام زیادہ دور نہیں تھا۔ عشق اور مشک کی طرح جھوٹ بھی نہیں چھپتا۔

اچانک جیپ اسٹارٹ ہوئی اور ہیڈ لائٹس نے مجھ پر یلغار کی تو میں چونکا اور مجھے احساس ہوا کہ اس ڈرامے کے دوسرے ایکٹ کا بھی ڈراپ سین ہو چکا ہے۔ وہ نقلی سب انسپکٹر اپنے ماتحتوں کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔ شاید باہر جا کر نئی زندگی کے لیے خوش خوش دوڑنے والے مدھو سودن اور کیرتی کو مفرور قیدیوں کی طرح راستے میں ہی گولی مارنے کے لیے۔ اس ویرانے میں رات کے اندھیرے سے ان کو موت کے اندھیرے میں دھکیلنا بہت آسان اور بہت ضروری تھا۔

دلاور نے کلائی کی گھڑی دیکھ کے کہا۔ "اگر تمہیں نیند آ رہی ہے تو سو جاؤ۔ وہ تحفہ ابھی وصول کرو گے؟ یا اپنے ساتھیوں کا انتظار کرو گے، اپنے سکندر صاحب؟"

میں نے کہا۔ "تمہارے اس سارے جھوٹ پر مبنی ڈرامے نے مجھے بالکل متاثر نہیں کیا۔ سب انسپکٹر نقلی تھا۔ وہ نوٹ تو

www.paksociety.com

اصلی تھے یا جو تم نے اسے دیئے تھے۔"

"میں جعلی نوٹ چھاپنے کے چکر میں نہیں پڑتا۔" دلاور بولا۔ "تمہیں بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ سب انسپکٹر اصلی تھا یا نقلی؟"

"ہاں ۔ فرق تو ان بد نصیبوں کو پڑے گا جن کو تم نے ہمارے سامنے بڑی فیاضی سے انصاف کی آہنی گرفت سے چھڑا دیا تھا۔ وہ اب مارے جائیں گے۔ جب انہیں زندہ رہنے کی خواہش پوری ہونے کا یقین آگیا ہوگا۔ یہاں تو وہ آئے ہی مرنے کے لئے تھے۔ مگر اذیت پسند شکاری کے لئے اس میں زیادہ لطف ہے کہ شکار کو فرار کا موقع دے اور پھر اسے مار کے دہرا مزہ لے۔ اس کے خون کا اور اس کی جھوٹی خوشی کے خون کا۔"

چوہدری دلاور کے چہرے پر طاری مصنوعی خوشی آہستہ آہستہ جھنجلاہٹ اور فرسٹریشن میں بدل رہی تھی۔ اس کی صورت کی نرمی ایک پرانے اصلی چوہدری دلاور کے چہرے کی سفاکی میں ڈھل رہی تھی۔ عیاری کے نقاب کے پیچھے سے اس کی شکست خوردہ انا کا سانپ پھنکارنے لگا تھا۔

"سکندر! بہت بول چکے تم۔" اس نے دانت پیس کر اور مٹھی بند کر کے کہا۔ "کیوں مجھے مجبور کرتے ہو کہ تمہارے سامنے میں رابعہ......"

میں نے اسے ایک گالی دی "بھونکنے والے کتے۔ کاٹتے کیوں نہیں آخر۔ میں چیلنج قبول کر چکا ہوں۔"

دلاور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ وہ اپنے غیظ و غضب کی آگ کے شعلوں پر قابو پانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

"بزدل، بے غیرت۔ چھوڑ دے اپنے ان کتوں کو مجھ پر" میں نے چیخ کر کہا "تیری اپنی ساری ہمت اور طاقت ایک غبارہ ہے جو خود فریبی اور جھوٹ کی ہوا میں اڑ رہا ہے۔ تو خود کیا ہے؟ مجھ سے نہیں، اس عورت سے مقابلہ کر کے دیکھ لے۔ میں تیری مردانگی کے دعوے کو چیلنج کرتا ہوں رذیل۔ ایک چوہے کی طرح ادھیڑ دے گی یہ عورت تجھے۔ صرف نازو ہی نہیں، رابعہ بھی تجھے چیر کر پھینک سکتی ہے اب....."

اس سے زیادہ تذلیل وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یکلخت اس پر دیوانگی سوار ہوگئی۔ اس نے حکم دیا کہ مجھے پکڑ لیا جائے۔ جب میں بے دست و پا ہو گیا تو اس نے قریب آکر میرے منہ پر طمانچہ مارا۔ میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ اس نے دوسرا طمانچہ دوسری طرف مارا۔ میں پھر ہنسا۔ وہ مارتا گیا۔ باری باری ہر گال پر یہاں تک کہ میرے گال دہکنے لگے اور چٹخنے لگے مگر میں بھی ضد پر آگیا تھا۔ میں اس پر قہقہے لگاتا رہا۔ پھر مجھے موقع ملا اور میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

جواب میں اس نے بہت ذلیل حرکت کی۔ اس نے اپنے کتوں کو حکم دیا کہ وہ میرے چہرے پر باری باری تھوکیں۔ میں نے یہ ذلت بھی برداشت کی کیونکہ اب میرا یقین ہو گیا تھا کہ دلاور کسی وجہ سے مجبور ہے۔ وہ مجھے جسمانی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میرے ساتھ تشدد کے وہ طریقے آزمائے جا رہے تھے جو پولیس مخصوص حالات میں آزماتی ہے۔ جب ملزم کو اذیت دینے کے بعد یہ بھی ثابت کرنا مقصود ہو کہ اسے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔ عدالت میں طبی معائنے سے اس کے جسم پر ایک بھی علامت سے تشدد کا پتہ نہ چلے۔

خدا نے مجھے سخت تر آزمائش میں شکوہ بلب نہیں دیکھا تو میں نے ہی کیا رابعہ نے بھی ہر عذاب جھیلا تھا مگر اس کی رحمت سے مایوسی کو غالب نہیں آنے دیا تھا۔ آج کی رات جو اس کے اور میرے لئے ایک مشترک دکھ میں رفاقت کا آغاز تھا اور میں خوف کی بازگشت میں امید کا پیغام صاف سن سکتا تھا کہ ..... یہ رات اس درد کا تجربہ ہے جو مجھ سے تجھ تک ہے۔ اور اس پیغام کا حاصل یقین تھا۔

میرے یقین نے بالآخر دلاور کے فریب [illegible] کر دیا۔ وہ تھک کر کرسی پر گر گیا۔ ہار جانے کے باوجود ہار ماننے والا آدمی نہیں تھا۔ اس نے فوراً اپنی ہار پر دوسرے فریب کی چادر ڈال دی۔ فریب کا ایک پردہ چاک ہو جانے پر اسے فرق نہیں پڑتا تھا۔

"دیکھو! اپنے سکندر صاحب، تم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے" اس نے لہجہ بدل کے کہنا شروع کیا۔

"میں تو خدا کا شکر ہر حال میں ادا کرتا ہوں۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھی "یہ جو تم ابھی تک بک بک کر رہے ہو۔ ہیں جی، اور زندہ سلامت بیٹھے ہو۔ تو اپنا دل مت کرنا کہ مجھے ڈر ہے کسی...... کا۔" اس نے ایک گالی مجھ سے منسوب کر کے کہا۔ "یار دلاور اب وہ پرانا دلاور نہیں رہا۔ میری اور تمہاری دشمنی کی وہ..... کیا نام ہے اس کا۔ نوعیت نہیں بدلی۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اچانک تم رحم دل اور بامروت بن گئے ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔ "جس کو تم نے ابھی ثابت کیا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بات بس اتنی ہے کہ مجھ پر ایک چانس کا قرض ہے۔ چانس تم نے دیا تھا۔ اس وقت مار سکتے تھے مجھے۔ لیکن تم نے بس ہمیں ذلیل کیا۔ اور چھوڑ دیا۔ اپنے وعدے کا پاس رکھتے ہوئے تم نے ہماری جان بخش دی۔"

"چنانچہ تم یہ قرض یوں ادا کرو گے کہ اچھی طرح ذلیل کرنے کے بعد ہماری جان بخشی کرو گے۔" میں نے کہا۔ "چھوڑو یہ چکر۔ اسے رہنے دو۔ تمہیں جانتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ تم مجبور ہو۔"

"چلو آپ ایسا سمجھ کے خوش ہوتے ہو... تو ٹھیک ہے... ہم مجبور ہیں اور تم مختار ہو۔" دلاور نے کہا۔ "تمہیں پیغام تو مل گیا ہوگا۔ اسی لئے کہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تمہارے نام لاہور سے تحفہ بھیج دیا ہے کسی نے۔ میری معرفت۔"

"مجھے معلوم ہے وہ تحفہ کیا ہوگا۔"

"تصویر دیکھ کے تم نے سمجھ لیا ہوگا۔" دلاور بولا۔

"مجھے اس سے پہلے ہی اطلاع مل گئی تھی تمہارے بندوں کے کارنامے کی۔ انہوں نے ایک بیوہ کو اور اس کے بچوں کو اغوا کر لیا ہے....."

"تمہیں غلط اطلاع دی ہے کسی نے۔" دلاور بولا۔ "مرحوم رضوی صاحب ایس ایس پی ہمارے دشمن ضرور تھے۔ لیکن نیک اور اصول پرست تھے۔ پرانے وقتوں کے کچھ بندے کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں اب بھی۔ مگر وہ سب ختم ہوتے جا رہے ہیں رضوی صاحب کی طرح۔ وضعداری کا زمانہ نہیں رہا۔ ویسے آج کوئی ترکی ٹوپی شیروانی پہن کے بازار میں آجائے تو تماشا بن جائے۔ کارٹون نظر آئے۔"

"مثلاً شہزادہ گلفام عرف یوسف ثانی؟"

"یہ کون ذات شریف ہیں؟ ہیں جی۔" دلاور بولا۔

"اور کس کا حوالہ دے رہے تھے تم؟" میں نے طنز سے کہا۔

"وہ تو... بس ایسے ہی ایک مثال تھی... خیریت تھی رضوی صاحب کی فیملی کی۔ تو ان سے ہماری اب کیا دشمنی۔ رضوی صاحب کی زندگی میں ہم نے انہیں استعمال نہیں کیا۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور خیریت سے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ جھوٹ ہے۔ وہ اپنا مکان بیچ کر کسی اور کو بتائے بغیر کہیں چلی گئی ہیں۔ ان کا ایسے لاپتہ ہونا تمہاری دشمنی ہے دلاور!"

دلاور نے نفی میں سر ہلایا۔ "خواہ مخواہ الزام مت لگاؤ۔ ایسی کوئی بات ہوتی تو میں مان لیتا تمہارے سامنے۔ انہوں نے مکان ضرور بیچا تھا مگر وہ لاپتہ نہیں ہوئی ہیں۔"

"پھر کہاں ہیں وہ؟"

"ہیں... جہاں بھی ہیں... بالکل خیریت سے ہیں۔ انہیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ہر طرح کا آرام ہے۔"

"کسی قسم کی تنگی میں انہیں اے کلاس دی گئی ہے۔"

دلاور نے کہا۔ "انہوں نے دوسرا مکان پسند کر لیا تھا۔ میرا خیال ہے کل وہ اس میں شفٹ ہو جائیں گی۔" دلاور نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے مذموم عزائم کا شکار ہوئی صرف شہلا۔" میں نے کہا۔

دلاور نے میرے سوال کا جواب گول کر دیا۔ "وہ تصویر کیمرہ ٹرک نہیں تھی۔"

"کیا... یہی تحفہ لائے ہو تم میرے لئے۔" میں نے کہا۔

"تحفہ تھا تو اپنے محسن شیروانی صاحب کے لئے.... اچھا تھا اگر وہ خود آجاتے.... مگر خیر۔"

میں نے دل کو پتھر کر کے کہا۔ "میں محسن کی طرف سے شہلا کی لاش وصول کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

رابعہ نے پھر رونا شروع کیا۔ "میں نے کہا تھا نا تم سے.... وہ شہلا ہی تھی... اس کے کپڑے اور ناک، وہی تھے... ان لوگوں کو کیا ملا اسے مار کے۔"

"لو جی وکیل صاحبہ! یہ آپ سے کس نے کہا کہ ہم نے اسے مار دیا ہے۔ خدا نخواستہ۔" دلاور نے بے حد حیرانی کا اظہار کیا۔

"جھوٹ مت بولو... کمینے... ذلیل..." رابعہ چلانے لگی۔

میں نے اس کا کندھا سختی سے دبا کے کہا۔ "یہ نیا بے وقوفی ہے۔ تم میرے لئے باعث ندامت بن رہی ہو۔ شرم آنی چاہئے تمہیں۔"

رابعہ میرے کندھے پر سر رکھ کے سسکیاں لینے لگی۔ "میں کیا کروں سکندر؟"

"ابھی کیوں اپنے آنسو ضائع کر رہی ہیں مس رابعہ نادری ایک دن شاید آپ اسے رونے پر مجبور ہوں۔ اگر وہ دن آیا تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہوگا۔" دلاور نے کہا۔ "ہم اسے زندہ لے آئے ہیں۔ اور زندہ رکھیں گے۔ آپ کی امانت رہے گی ہمارے پاس۔ ہیں جی، اور جیسی ہوگی آپ کے حوالے کر دی جائے گی۔ لیکن یہاں نہیں۔"

رابعہ رونا بھول گئی۔ "وہ زندہ ہے؟"

دلاور مسکرایا۔ "ہاں جی، اتنی ہی زندہ ہے جتنی آپ ہو مگر اس کو زندہ رکھنا صرف ہمارا کام نہیں.... کچھ تھوڑا سا تعاون آپ کا بھی چاہئے۔"

میں نے کہا۔ "تم معاملے کو پراسرار بنا کے پیش کرنے کے عادی ہو لیکن میں نے تم سے غلط نہیں کہا۔ جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ مسز رضوی اور شہلا غائب ہیں اور اس کے بعد تمہاری طرف سے شہلا کی ایک تصویر ملی تھی۔ میں نے اپنے دل کو شہلا کے بارے میں بدترین خبر کے لئے تیار کر لیا تھا۔ اب احساس ہوتا ہے کہ انہیں ہم غیر محفوظ چھوڑ آئے تھے۔"

www.paksociety.com

ہماری ایک کمزوری تمہاری شہزوری بن سکتی تھی۔ تم جیسے دشمن سے ہر کمینگی کی توقع کی جا سکتی ہے۔"

"جنگ میں شرافت کا کیا سوال؟ جو کچھ تم نے کیا میرے نزدیک وہ کوئی شریفانہ عمل نہیں تھا۔" دلاور نے کہا۔ "تم اگر میرے بیوی بچوں کو مار دو تو میں تسلیم کروں گا کہ میں ان کی حفاظت نہیں کر سکا۔ تم سے نہیں کہوں گا کہ یہ کوئی شرافت ہے..... شملا اب ہمارے قبضے میں ہے اور زندہ ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد تم اسے دیکھ لوگے۔"

"صرف دیکھنے کی اجازت ہوگی؟"

رابعہ نے کہا۔ "کیا ہم مل نہیں سکتے شملا سے؟"

دلاور نے اسے غور سے دیکھنے کے بعد نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی نہیں۔ ملاقات بھی کرا دیں گے..... لیکن چند دن بعد۔"

"اس سے بات بھی نہیں ہو سکتی؟" رابعہ نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "ٹیلی فون پر ہی سہی۔"

میں نے کہا "میں بتاتا ہوں تمہیں..... وہ تمہیں اسی شیشے کے تابوت میں سوئی ہوئی نظر آئے گی۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ وہ کوئی کیمرہ ٹرک نہیں تھی۔ انہوں نے اسے کسی شیطانی عمل کے ذریعے اس شیشے کے قفس میں قید کرایا ہے۔ ممکن ہے شملا کو خواب آور دواؤں کے انجکشن دے دے کر محو خواب رکھا گیا ہو مگر میں اس امکان کو بھی مسترد نہیں کرتا کہ یہ اس کی لاش ہو جسے انہوں نے مصری ممی کی طرح بہ حفاظت رکھا ہو۔"

رابعہ پھر رونے لگی۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو رہا تھا اور وہ اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکنے کی کوشش میں ناکام تھی۔ دلاور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"اب وقت کم ہے۔" اس نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا۔ "اس لئے میں ڈائریکٹ بات کرتا ہوں۔ تمہارے ساتھ صلح صفائی یا سودے کی بات میں وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب تک ہم ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ ہم اپنا کاروبار نہیں چھوڑ سکتے اور تم یہ خبط نہیں چھوڑ سکتے جس نے تمہیں کہیں کا نہیں رکھا۔ ہم تو اپنا نقصان پورا کر بھی لیں گے۔ تمہیں بہت وقت گزر جانے کے بعد احساس ہوگا کہ سب کچھ گنوا کے تم نے کچھ نہیں پایا۔"

"نفع اور نقصان ایسے الفاظ ہیں جن کا مطلب تمہارے لئے کچھ اور ہے، ہمارے لئے کچھ اور۔"

"یہ بھی تمہاری خام خیالی ہے۔ نفع دنیاوی کاروبار میں دو مطلب نہیں رکھتا..... اور حساب کتاب میں نقصان کو نفع سمجھنے کا مطلب ہے خود فریبی، بے وقوفی..... میں آخرت کے حساب کی بات نہیں کر رہا ہوں، بزنس کے ہی کھاتے کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک وقت آئے گا جب تم اپنی عمر کے اس سب سے اچھے وقت کے آخر تک پہنچ جاؤ گے جو تم نے وقت کی سمت بدلنے کی سعی لاحاصل میں گنوا دیا۔"

اب میں نے تالی بجائی۔ "بہت خوب! اچھی اردو بولتے ہو تم بھی۔"

"یہ میری بدقسمتی ہے۔" دلاور نے میرے طنز کو نظر انداز کر دیا۔ "اور تمہاری بھی..... کہ ہم ابھی تک متصادم ہیں۔"

"تم میرے بارے میں کیسے فیصلہ کر سکتے ہو؟"

"بیچ میں مت بولو۔" دلاور نے برہمی سے کہا۔ "میں کہہ رہا تھا کہ تم سے جان چھوٹ گئی لیکن تم نحوست بن کے چمٹ گئے ہو ہم سے۔ حالات سازگار رہتے ہیں تم کو اور تم مرد ہو کر کے یہاں آنے کے بعد بھی ایک روگ بنے ہوئے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا "تم اس روگ سے چھٹکارا کیوں نہیں پا لیتے؟"

"کسی دن تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہوگی۔ ابھی نہ سہی۔ ہر جگہ تمہیں کوئی محمد خان نہیں بچا سکے گا۔"

یہ بات غصے میں اس کے منہ سے نکل گئی تھی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ وجہ محمد خان تھا جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کوئی ایسا بندوبست کر لیا تھا کہ دلاور مجھے اور رابعہ کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکے۔ کوئی ایسی ضمانت حاصل کر لی تھی کہ دلاور ہمیں حفاظت اور سلامتی کے ساتھ واپس کرنے پر مجبور تھا۔ ڈاکو محمد خان کا یہ بندوبست کیا تھا اور یہ ضمانت کیا تھی، اس کے بارے میں دلاور یقیناً بتانا نہیں چاہتا تو میں نے اس سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میرے لئے یہ اطمینان ہی بہت کافی تھا کہ دلاور اپنی من مانی کرنے کے لئے آزاد نہیں ہے۔ اس اطمینان نے مجھے بہت حوصلہ دیا۔ اب میں اس سے آنکھ ملا کے برابری کی سطح پر بات کر سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ "ہمارا اصل محافظ کوئی اور ہے دلاور..... جو سب سے بڑا محافظ ہے اور سامنے آئے بغیر اسی طرح اپنے بندوں کی حفاظت کے لئے کسی ڈاکو کو بھی وسیلہ بنا دے تو یہ اس کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ تمہیں اگر زعم ہے [illegible] تم سمجھتے ہو کہ اب کون تمہارے سامنے ٹھہر سکتا ہے۔ لیکن دیکھو..... وہ محمد خان جس کو دنیا ڈاکو اور خونی خان کہتی ہے"

"ایسی کی تیسی اس خونی خان کی۔" دلاور نے چیخ کر کہا۔ [illegible] کو غصہ اپنے آپ پر آ رہا تھا کہ اس نے کیوں

زندگی کا اعتراف کر لیا؟ جو میں کہہ رہا ہوں وہ سنو..... ہم اپنا کاروبار بند نہیں کر سکتے اور مزید نقصان بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ کل یا پرسوں..... چار دن میں ہم کل یہاں سے جانے والے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی لیکن میں یقین کی خود فریبی سے بچنا چاہتا ہوں، اس لئے میں نے ایک ایسا بندوبست کیا ہے کہ تمہاری طرف سے کوئی خطرہ نہ رہے۔"

"تم شملا کو اپنے ساتھ رکھو گے؟" میں نے کہا۔

دلاور مسکرایا۔ "آؤ..... میں تم کو شملا سے ملواؤں۔ یہ پوری بات نہیں ہوئی کیونکہ تم صرف اسے دیکھ سکو گے۔"

میں نے کہا۔ "میں اس ملاقات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

لیکن رابعہ نے میرا بازو تھام کے کہا۔ "سکندر....."

میں نے کہا۔ "رابعہ! اسے دیکھ کے تمہیں دکھ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ پھر تمہارے لئے اس کے تصور سے دامن چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ ابھی یہ سمجھ لو کہ دلاور نے جو بھی کہا ہے، جھوٹ ہے۔"

رابعہ نے کہا۔ "میں اپنے آپ کو یہ دھوکا نہیں دوں گی۔ میں اسے ضرور دیکھوں گی ایک بار۔"

اس کی ضد کے سامنے مجھے سر جھکانا پڑا۔ دلاور جاتے جاتے پلٹ کے رک گیا تھا۔ اس کی صورت پر اضطراب کی تحریر سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے میرے انکار سے کتنی تشویش تھی۔ اگر رابعہ میری بات مان لیتی تو شاید وہ ہم دونوں کو زبردستی پکڑ کے لے جاتا۔ اب وہ مطمئن ہو کے آگے بڑھا۔ ہر طرف سے حصار قائم کرنے والے مسلح محافظوں کی کمان استاد پیڈرو نے سنبھالی۔

اس نے مجھے پولیس کے انداز کی چند گالیاں دینے کے بعد کہا۔ "تمہارا دماغ کسی دن میں درست کروں گا۔"

میں نے پرسکون رہتے ہوئے کہا۔ "پیڈرو! میں بھی تمہارے معاملات میں الجھا ہوا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنے بے گناہ اور مظلوم والد کے قتل کو بھول گیا تھا۔ ان کے قاتل تم ہو اور تمہارے ساتھ میں اپنا حساب برابر کروں گا۔"

پیڈرو نے فلمی ولن اسٹائل میں ایک بے ہنگم قہقہہ مارا۔ "کتنے دن اور جیو گے سکندر اعظم؟ کسی دن کتے کی موت مارے جاؤ گے۔"

"کتے کی موت تم بھی مارے گئے ہوتے..... اگر تمہارا وقت پورا ہو گیا ہوتا لیکن خدا کی طرف سے تمہیں جو مہلت ملی تھی وہ ابھی تمام نہیں ہوئی۔ جب وقت آئے گا تو میں اچانک فرشتہ اجل کے ساتھ ہی آؤں گا اور تم سے پوچھوں گا کہ اب وزیر خان کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں۔ پھر اسی کے پیروں میں تمہیں گاڑ دوں گا۔"

"میرے ساتھ اسے بھی گاڑ دینا..... اپنی بہن کو۔" اس نے رابعہ کی طرف اشارہ کیا۔ "کیوں جانی..... میرے ساتھ دفن ہونا منظور ہے؟"

پلک جھپکنے میں میری عقل کا فیوز اڑ گیا۔ میں نے نتائج کی پروا کئے بغیر جست لگائی۔ پیڈرو کے ساتھ چلنے والے محافظ ہماری گفتگو سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور انہیں مجھ سے ایسی پھرتی کی توقع بھی نہ تھی۔ ان کے متحرک ہونے سے پہلے میں پیڈرو کو اٹھا چکا تھا۔ میں نے اسے گھما کے پوری قوت سے فرش پر دے مارا۔ اس کی چیخ نے دلاور کو بدحواس کر دیا۔ مسلح محافظوں نے مجھے دبوچ لیا۔

"کیا..... کیا ہوا؟" وہ دوڑ کر واپس آیا۔ پیڈرو فرش پر بل کھا رہا تھا۔ اس کے منہ سے مغلظات ابل رہی تھیں لیکن وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "میری بات یاد رکھنا پیڈرو..... چلو دلاور!"

دلاور نے غصے سے پیڈرو کو دیکھا۔ "تو کبھی بھونکنے سے باز نہیں آتا۔ کیا سمجھایا تھا میں نے....."

پھر وہ میری طرف پلٹا۔ "تم بھی زیادہ سورما مت بنو۔ یہ نہ ہو کہ تمہیں اکیلے واپس جانا پڑے۔"

میں نے کہا۔ "تم رابعہ کو روکنے کی دھمکی دے رہے ہو؟ روک لو..... مجھے بھی روک لو..... اگر تم خود کو اتنا با اختیار سمجھتے ہو۔"

دلاور کچھ دیر ہونٹ کاٹتا رہا۔ پھر واپس چل پڑا۔ "ان دونوں کو گھیر کر لاؤ اور اب اگر کوئی بھی ایسی ویسی بات ہو تو میری طرف سے اجازت ہے، انہیں چھلنی کر دینا۔"

استاد پیڈرو کے پاس دو افراد رک کر اسے اٹھنے میں مدد دے رہے تھے۔ میں اور رابعہ محافظوں کے نرغے میں آرام سے چلنے لگے۔

"اپنے غصے کی بریک ٹھیک رکھو۔" رابعہ نے کہا جو میرے فوری اور پرخطر اقدام سے پریشان ہو گئی تھی۔

"اس نے جو بات کی تھی وہ ناقابل معافی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"اس سے پہلے بھی بہت کچھ ہو چکا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"ہاں یہ سمجھ لو کہ برداشت اور کنٹرول کی حد تھی جو گزر گئی تھی..... بریک فیل ہو گئے تھے۔" میں نے کہا۔

اس نے کہا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے سکندر۔"

میں نے کہا۔ "چلو اچھا ہے، ڈر دور ہو جائے گا..... جب میں

www.paksociety.com

نے منع کیا تھا تو بہت بہادر بن رہی تھیں۔ اب ہم انکار بھی نہیں کر سکتے۔"

"انکار اس وقت بھی نہیں کر سکتے تھے۔" رابعہ نے کہا۔

بیرک سے باہر آتے ہی میں نے رات کو دیکھا جو تاحد نگاہ افق تا افق محیط تھی۔ اپنے سکوت اور ہمہ گیری کے احساس کے ساتھ۔ آسمان پر اکا دکا ستارے تھے۔ سمندر کے بخارات بمبئی کے آسمان پر غبار بن کے پھیلے ہوئے تھے چنانچہ کم روشن ستارے روپوش تھے۔

مجھے اپنے چاروں طرف ویسی ہی بیرک ٹائپ عمارات پھیلی ہوئی نظر آئیں جیسی بیرک سے میں باہر آیا تھا۔ یہ سب گودام تھے چنانچہ سارا علاقہ سنسان پڑا تھا۔ بیشتر گوداموں کے دروازے بند تھے اور کہیں کہیں خالی ٹرک بھی کھڑے ہوئے تھے۔ صرف حد بندی کے لئے ہر گودام کے گرد خاردار تاروں کی باڑھ لگا دی گئی تھی۔ اس کا مقصد حفاظتی انتظامات کو یقینی بنانا نہیں تھا۔ گودام کی بلند، بے رنگ دیواروں پر باہر کے حصے کو روشن رکھنے کے لئے بلب بھی لگائے گئے تھے مگر ان کی روشنی ناکافی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کو بھی گودام میں رکھے ہوئے مال کے چوری ہونے کا ڈر نہیں ہے چنانچہ چوکیدار بھی بہت کم نظر آ رہے تھے۔

اس علاقے کا جائزہ ایک نظر میں لینے کے بعد مجھے کبری اور مدھو سودن کے بیان کا خیال آیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اسلحہ چرانے کے لئے وہ ایسے ہی کسی گودام میں گئے تھے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ جس گودام سے ہم نکلے تھے، اسی کو دلاور اینڈ کمپنی اپنا مال جمع کرنے کے لئے استعمال کرتی تھی۔ وہ کھیپ جا چکی تھی جس میں سے ان میاں بیوی نے تھوڑا سا اسلحہ چرا لیا تھا۔ اس جرم کی سزا انہیں بیرک سے باہر جانے کے بعد ہی دے دی گئی ہوگی، ورنہ ان سے مزید تصدیق کی جا سکتی تھی۔ دلاور نے کہا تھا کہ کل پرسوں یا دو چار دن میں مزید مال جائے گا۔ اس کا صاف مطلب یہ نکلتا تھا کہ آج کل میں یہ گودام پھر بھر جائے گا۔

دلاور اب دوسرے گودام میں داخل ہو رہا تھا جو بیس گز دور بنا ہوا تھا۔ دونوں گودام ایک ہی کمپنی کی ملکیت نظر آتے تھے کیونکہ دونوں کے گرد ایک ہی تاروں کی باڑھ تھی۔ اس باڑھ میں ایک ایک فٹ کے فاصلے سے تاروں کی تین قطاریں ساتھ چلتی تھیں اور تقریباً ہر دس فٹ کے فاصلے پر اینگل آئرن کا ایک کھمبا انہیں سہارا دیتا تھا۔ دوسرے گودام کی تعمیر بالکل ویسی ہی تھی جیسی مدھو سودن نے بیان کی تھی یعنی اس کی چھت اونچی اور گول تھی۔ یہ نسبتاً قدیم بیرک تھی اور اس کی چھت آر سی سی سے نہیں بنائی گئی تھی۔

ایک بہت بلند فولادی گیٹ سے گزرتے ہی دلاور دائیں جانب مڑ گیا۔ بیرک کے اندر تاریکی تھی۔ پھر بھی میں نے وہ کریٹ دیکھ لئے جو دیواروں کے ساتھ ساتھ اوپر تک بھرے ہوئے تھے۔ یہ سب اسلحہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ چھ فٹ لمبے اور چوڑے ہزاروں کریٹ تھے جن کو لے جانے کے لئے سو ٹرک بھی کم پڑتے۔ اس وقت میں کوشش کے باوجود اس کمپنی کا نام نہ دیکھ سکا جو اس گودام کی مالک تھی ورنہ مجھے یہ پتہ چل جاتا کہ آخر ان ہزاروں کریٹس میں کیا چیز سپلائی کی جاتی ہے۔ تاہم طریقہ واردات میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ ہزاروں کریٹس میں سیکڑوں کریٹ اسلحہ کے اس طرح شامل کرنا کہ وہ پکڑے نہ جائیں کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ سو کریٹس میں اسلحے کے دس کریٹ بہ آسانی چھپائے جا سکتے تھے۔ اگر کسی ٹرک میں سب سے آگے والی قطار میں سب سے نیچے رکھ دیا جائے اور پھر ان کے اوپر اور آس پاس دوسرے کریٹ جمع کر دیئے جائیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تلاشی لینے والے پورا ٹرک خالی کرائیں اور پھر نیچے دبے ہوئے کریٹ کھول کے دیکھیں۔ ان کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے۔ ویسے بھی ایسے دھندے اشتراک سے چلتے ہیں۔

دلاور کے پیچھے میں اور رابعہ ایک ساتھ اترے۔ زینے میں نیچے سے کافی روشنی آ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ رابعہ کانپ رہی ہے اور اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

"دیکھو، بیہوش ہونے یا رونے دھونے کا پروگرام نہیں چلے گا۔" میں نے اسے زینے میں روک کے کہا۔ "تم اپنی مرضی سے آئی ہو۔"

رابعہ نے نقطہ اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے شیشے کا دروازہ کھولا جو زینے کے آخری حصے میں واقع تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی میں نے ایک اور شیطان کو دیکھا۔ یہ حاجی عبداللہ تھا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے زور سے کہا۔

حاجی عبداللہ کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی اور اس کا ایک کان بھی اڑ گیا تھا۔ اس کا نورانی چہرہ اب مکروہ اور بدصورت ہو گیا تھا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھا اور لنگڑاتا ہوا آگے آیا۔

"ماشاءاللہ، چاند سورج کی جوڑی پھر نظر آ رہی ہے۔ افسوس کا مقام ہے برخوردار کہ ہم تمہاری صحیح مزاج پرسی نہیں کر سکے ورنہ تم نے جس طرح سے ہماری صورت بگاڑی ہے....."

"بگاڑی کہاں ہے حاجی..... جیسے اعمال تھے، ویسی ہی تو ہے۔" میں نے کہا۔ "دیکھو کیا لعنت برس رہی ہے۔"

"بڑھاپا، زندگی..... ہم بتائیں گے تمہیں۔" حاجی دانت پیس کر بولا۔ "آئینے سے ڈر گئے برخوردار!"

"ماشاءاللہ سے کہنا بھول گئے تم۔" میں نے کہا۔

دلاور نے کہا۔ "شملا ادھر تمہارے لئے وہ ہے..... کیا کہتے ہیں..... چشم براہ! الیس جی اپنے سکندر اعظم صاحب!"

میں نے دروازہ آہستہ سے دھکیلا جس کی طرف دلاور نے اشارہ کیا تھا اور اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ شملا میرے سامنے تھی۔ ایک شفاف تابوت میں بالکل اسی طرح ساکت و صامت دراز تھی جیسے وہ تصویر میں نظر آئی تھی۔ اس نے کپڑے وہی پہن رکھے تھے اور اس کے کانوں میں وہی بالیاں تھیں جو رابعہ نے دیئے تھے لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے برابر وہ بچہ سو رہا تھا جسے میں اور رابعہ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ شملا اور محسن کی محبت کا ثمر تھا۔

رابعہ بے اختیار چلائی۔ "شملا!" اور دوڑ کر اس آہنی دیوار سے چمٹ گئی جو ہمارے اور شملا کے درمیان حائل تھی۔ شملا اور اس کے بچے کے لئے مصنوعی طور پر بنوایا گیا تابوت اس کمرے کی آخری دیوار کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ مضبوط، فولادی سلاخوں کی دیوار اس کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی جس کی لمبائی تقریباً اٹھارہ اور چوڑائی بارہ فٹ ہوگی۔

شملا اور اس کا بیٹا ہمارے ساتھ اسی کمرے میں موجود تھے مگر اس کے باوجود ہماری دسترس سے اتنے ہی دور تھے جتنے لاہور میں تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے ہم انہیں چشم تصور سے بھی نہیں دیکھ سکتے تھے مگر اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

اس نصف حصے کو جس میں شملا اور اس کا بیٹا سو رہے تھے، اس طرح روشن کیا گیا تھا کہ ایک اسپاٹ لائٹ صرف تابوت پر چھ فٹ قطر کے دائرے میں پڑ رہی تھی۔ دائرے کا نصف حصہ تابوت پر تھا اور بقیہ نصف دیوار پر گر رہا تھا۔ بقیہ کمرے میں وہی اجالا تھا جو دیوار یا تابوت سے منعکس ہونے والی روشنی نے پھیلا دیا تھا۔ یہ ایک بھیانک، عجیب اور دل دہلانے والا منظر تھا جس کے المناک تاثر کو گہرا کرنے کے لئے سلاخوں، سپاٹ دیواروں کی ویرانی اور اسپاٹ لائٹ سے مدد لی گئی تھی۔ یہ "اسپیشل ایفیکٹ" شیطان دلاور ہی دے سکتا تھا اور وہ مجموعی صورت حال سے ہمارے حوصلے پست کرنے اور ہمیں مایوسی میں مبتلا کرنے کی کوشش میں یقیناً کامیاب رہا تھا۔

میں سلاخوں کو اپنی انگلیوں سے جکڑے، پلک جھپکائے بغیر شملا کو دیکھتا رہا۔ شیشہ اتنا شفاف تھا کہ نظر کی راہ میں ذرا بھی حائل نہیں ہوتا تھا۔ میں شملا کو ایسے دیکھ سکتا تھا جیسے وہ میرے سامنے اپنے بیڈ پر محو خواب ہو۔ روشنی میں اس کی صورت کا ہر نقش روشن اور واضح تھا۔

اس عرصے میں جب ہم اس سے دور تھے اور وہ تنہا تھی، ہجر کے دن اور فراق کی راتوں کا سب درد اپنے دل میں سمیٹ کر لبوں پر حوصلہ مندی اور امید کی مسکراہٹ کو روشن رکھنے پر مجبور تھی۔ خوف اور اندیشوں سے نبرد آزما تھی اور بے یقینی کے عذاب آفریں لمحوں میں محصور تھی۔ اس نے اپنی ذمے داری کیسے نبھائی تھی، اس کا اندازہ شملا کے بیٹے کی صحت سے ہوتا تھا۔ وہ بے حد خوبصورت، معصوم اور صحت مند بچہ تھا جسے باپ کی شفقت سے محروم رہنا پڑا تھا۔ شاید اس کمی کو ماں نے اپنی محبت سے پورا کر دیا تھا کہ وہ سوتے میں بھی مطمئن اور آسودہ لگتا تھا اور اس کے لبوں کی بے نام سی شوخ مسکراہٹ بھی پر اعتماد تھی۔ وہ نیکر اور قمیص پہنے ہوئے تھا اور اس کے پیروں میں جرابوں کے ساتھ اسپورٹ شوز تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے سوتے سوتے وہ اچانک اٹھے گا، شملا کو جھنجھوڑے گا اور چلانے لگے گا۔ "ماں..... مجھے بھوک لگی ہے..... اور مجھے کھیلنے بھی جانا ہے۔" میں اس کی آنکھوں کا رنگ نہ دیکھ سکا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کی شفاف، صحت مند آنکھوں میں اس محبت کی چمک بھی شامل ہوگی جو اسے ماں باپ سے ورثے میں ملی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وقتی طور پر رنج، بے بسی اور مایوسی کے جذبات نے مجھے مغلوب کر لیا تھا۔ میں احساس جرم میں مبتلا ہو گیا تھا کہ شملا اور اس کے بیٹے پر ظلم کرنے والا دلاور نہیں، میں ہوں۔ یہ جنگ میں نے چھیڑی تھی جس نے آج شملا اور اس کے بیٹے کو ہم سے اتنا دور کر دیا تھا کہ ان کا پھر ہم سے ملنا محال اور ناممکن لگتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں شملا کو آخری بار دیکھ رہا ہوں..... اس کے بیٹے کو پہلی اور آخری بار دیکھ رہا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے تدفین سے پہلے میت کا آخری دیدار کرایا جاتا ہے..... جیسے لوگ چرچ میں رکھے ہوئے تابوت میں سونے والے کو آخری بار دیکھ کر تعظیم سے سر جھکاتے ہیں اور اس آخری نقش کے ساتھ جو ان کے ذہن میں ثبت رہتا ہے، گزرتے جاتے ہیں۔

پھر مجھے خیال آیا کہ میں کتنے بڑے گناہ کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ میں مایوس ہو رہا ہوں حالانکہ خدا کی رحمت کے سارے در کھلے ہیں اور مجھ پر تو اس کا خاص کرم ہمیشہ رہا ہے..... حالانکہ میں ایک بندہ گناہ گار ہرگز اس کا استحقاق نہیں رکھتا مگر وہ کریم

www.paksociety.com

اور غفور الرحیم بخشش کرنے والا' دلوں کا اور نیتوں کا حال جاننا ہے۔

میں نے آہستہ آہستہ سلاخوں کو چھوڑا۔ میرے ہاتھوں کی انگلیاں ٹیڑھی ہو گئی تھیں۔ ان فولادی سلاخوں کو موم کی طرح پگھلا کے توڑ مروڑ دینے کی لاشعوری کوشش صرف ایک جذباتی دیوانگی تھی۔ میں خود سے اتنا بے خبر تھا کہ میں نے رابعہ کو سلاخوں سے سر ٹکراتے' چلاتے اور گرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ میرے پیروں کے پاس بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی اور اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔

میں نے کہا تھا' سمجھایا تھا رابعہ...... کہ اسے مت دیکھو۔ اپنے دل میں اس دکھ کے ناسور کو تم کیسے پالو گی...... اس کی ٹیس کو کیسے چھپاؤ گی...... اپنے لہو کو اشکوں میں ڈھلنے سے کیسے روکو گی...... تمہارے اپنے غم پہلے ہی کیا کم تھے نادان لڑکی۔

میں نے اسے نرمی سے دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور واپس چل پڑا۔ ان سب نے مجھے راستہ دے دیا جو میرے پیچھے بندوقیں تانے ہوئے کھڑے تھے۔ میں نے ان کی طرف نہیں دیکھا مگر ان کی مجرم خاموشی کا احساس چھپا نہ رہ سکا۔ مجھے باہر نکلتے ہی وہ جیپ نظر آگئی جس میں ہم یہاں آئے تھے۔

دلاور نے کہا "اب تم جا سکتے ہو۔"

میں نے رابعہ کو سیٹ پر لٹا کے اس کے ماتھے پر سے خون صاف کیا۔ چند قطرے پیشانی کی جلد پھٹ جانے سے بہہ کر رخسار پر آگئے تھے۔

دلاور نے کہا "اب تمہیں کوئی غلط فہمی نہ ہو تو اچھا ہے۔ شملا اور اس کا بیٹا' دونوں کی زندگی کا انحصار تمہارے ارادوں پر ہے۔ جب ہم اپنے مال کی اگلی کھیپ ارسال کریں گے تو یہ دونوں ہمارے ساتھ جائیں گے۔ تم اپنے طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرو گے کہ وہ مال کب جائے گا اور کس راستے سے جائے گا۔ شاید تم معلوم بھی کر لو گے اور پھر ہمارا تعاقب بھی کرو گے۔ میں تمہیں روک نہیں سکتا۔ پہلے کی طرح تم اس مال کی کھیپ کو تباہ کرنے کے لئے ہمارا تعاقب بھی کرو گے۔ تم بہت ہوشیار اور بہت نڈر ہو۔ موت کا خوف تمہارے عزم کی راہ میں حائل نہ ہو گا مگر اس مرتبہ یہ مت بھولنا کہ تمہارے بچھڑے دوست محسن کی بیوی اور اس کا بیٹا بھی مال میں شامل ہیں۔ جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ کسی ٹرک میں اسلحہ روانہ کیا گیا ہے تو یہ بات ذہن میں رکھنا کہ ہم تحفظ کی ضمانت ساتھ لے جا رہے ہیں۔ ٹرک ایک ہو گا یا تین' دو ہوں گے یا پانچ۔ درمیان کے ٹرک میں آتش گیر ڈھیر میں کہیں یہ شیشے کا نازک تابوت بھی رکھا ہو گا۔ سب ٹرک ایک دوسرے کے آگے پیچھے اتنے قریب ہوں گے کہ کسی ایک میں دھماکا ہو تو باقی سب خود اس کی لپیٹ میں آجائیں گے۔"

میرے کان اس کی آواز سن رہے تھے لیکن میرے ذہن میں خلا تھا "کیا شملا زندہ ہے؟" میں نے کہا۔

"تم کو غور سے دیکھنا چاہئے تھا کہ وہ سانس لے رہی تھی اور اس کا بیٹا بھی۔" دلاور نے کہا "کیا تم پھر دیکھو گے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں اس کا آخری دیدار [illegible]"

دلاور کا چہرہ ذرا سی دیر کے لئے بدلا "یہ ہو سکتا ہے کہ تم پھر اس سے ملو اور وہ تم سے ایسے ہی ملے جیسے پہلا ملی تھی... محسن کو اس کا بیٹا مل جائے۔"

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم کہ خدا کی مرضی کیا ہے؟"

"یہ تمہاری اپنی مرضی' ارادے اور اختیار کی بات ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے' تمہیں کیا معلوم کہ کل کیا ہو گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ شملا اور اس کا بیٹا زندہ رہیں مگر محسن نہ رہے۔ میں نہ رہوں یا تم نہ رہو' اس لئے جو تم کو کرنا ہے تم کرو۔ جو ہمیں کرنا ہے ہم کریں گے۔"

دلاور نے سر ہلایا "مجھے اندازہ ہے کہ تم محسن کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

میں نے کہا "تم بتا دو اسے...... اور دیکھو کیا ردعمل ہوتا ہے' ہمارا ساتھ چھوڑ کے تم سے شملا کی زندگی کی بھیک مانگتا ہے یا اپنے بیٹے کی جاں بخشی کے لئے تمہارے سامنے سر جھکاتا ہے...... تمہیں مایوسی ہو گی۔"

"مایوسی تمہیں نہ اٹھانی پڑے سکندر! وہ تمہارا دوست ضرور ہے' لیکن دوستی ایک طرف ہو اور بیوی' بچوں کی زندگی دوسری طرف تو پہاڑ بھی راستہ نہیں روک سکتے۔ آدمی بیوی بچوں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ یہ بات تم ابھی اس لئے نہیں سمجھ سکتے کہ تم ان جذباتی رشتوں سے محروم ہو۔"

میں نے کہا "کیا اب میں جا سکتا ہوں؟"

"میں تمہارا راستہ نہیں روک سکتا۔" دلاور نے کہا۔

"مجھے حیرت ہے تمہارے اس اعتراف پر۔"

"اب تمہیں یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں کہ میں مجبور تھا۔ میں نے تمہاری حفاظت کے ساتھ واپسی کو یقینی بنایا تھا... ہمارے درمیان میں ایسے لوگ ضامن تھے جو یہاں مجھ پر پورا اختیار رکھتے ہیں۔"

میں نے کہا "تربوزی کا نام لیتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو؟ پہلے میرا خیال تھا کہ ان سے تھوڑا سا پانی مانگوں مگر تمہارے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے مجھے شرم آئی۔ میں نے

کہ یہاں سے نکل جانے کے بعد مجھے کسی بھی گھر یا دکان سے پانی مل جائے گا۔ رابعہ کی بے ہوشی چوٹ کا نتیجہ نہیں تھی۔ وہ صدمے سے اور جذباتی دباؤ سے بے ہوش ہوئی تھی۔

جیپ میں بیٹھنے کے بعد میں نے کہا "یہ ہو سکتا ہے کہ ابھی میں چابی گھماؤں تو جیپ دھماکے سے اڑ جائے...... یا اس سے پہلے کہ میں روانگی اختیار کروں' تمہارے حکم سے ہمارے جسم چھلنی کر دیئے جائیں۔ لیکن میں خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے جا رہا ہوں۔ تم پر مجھے اعتبار نہیں ہے دلاور کہ تم نے واقعی مجھے جانے کی اجازت دیدی ہے۔"

میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور جیپ آگے بڑھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس نے آروں کی باڑھ کے متوازی باہر جانے والے راستے کو روشن کر دیا۔ جیپ گیٹ سے باہر نکل گئی اور پھر سڑک پر آگئی۔ میرے پیچھے کسی نے مشین گن کا برسٹ بھی نہیں مارا۔ افق پر ایک بہت روشن ستارہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ شاید وہ صبح کا ستارہ تھا۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ جیپ تیزی سے سڑک پر دوڑتی جا رہی تھی۔ ہر سو پھیلی ہوئی خاموشی اور تاریکی میں ابھی تک اجالے کے آثار مفقود تھے۔ میرا پہلا مقصد اس جگہ سے دور جانا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں رکا تو شملا میرا راستہ روک لے گی۔ اس کی آواز میرا تعاقب کر رہی تھی "سکندر بھائی! کہاں جا رہے ہو تم؟ صرف مجھے دیکھنے کے لئے آئے تھے تم بھی۔ رابعہ' تم بھی کچھ نہیں کہو گی؟ یہ نہیں بتاؤ گی کہ مجھے اس شیشے کے قفس سے نکالنے کے لئے کون آئے گا؟ کب رہائی ملے گی مجھے' مجھے اس انتظار سے جو موت کے کرب سے زیادہ بے رحم ہے۔ کیا میں کسی کے لئے اہم نہیں رہی... سارے رشتوں کی زنجیر موت کے کچے دھاگے سے بھی زیادہ کمزور تھی کہ دوری سے ٹوٹ گئی۔ یاد اس کو استوار نہ رکھ سکی۔ تم سب بھول گئے مجھے۔ بیگانے ہو گئے۔ بولو رابعہ' بولو سکندر!" پھر ایک بچہ چلانے لگا "ماما جی... سکندر ماما مجھے ساتھ لے چلو... پاپا کے پاس... مجھے اکیلا چھوڑ کے مت جاؤ... ان سے کہنا تھا کہ وہ ناراض ہو گئے ہیں کیونکہ تم انہیں بھی ملانے آئے ہو... وہ تو پاپا ہیں تمہارے... میں انہیں یاد کروں گا... انہیں بتا دینا کہ میں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔" اور پھر شملا کی آواز بچے کی آواز پر غالب آگئی "نہیں نہیں... انہیں کچھ نہ بتانا تمہیں میری قسم سکندر بھائی... مجھے یقین ہے تم نہیں بتاؤ گے... لیکن رابعہ کا خیال رکھنا... کہیں اس کے منہ سے ایسی کوئی بات نہ نکل جائے... بے خیالی میں یا بے ہوشی میں یا نیند میں... محسن سے کچھ مت کہنا... ماما جی... ماما جی۔"

میرا خیال ہے کہ اس وقت میں ہوش میں نہیں تھا۔ اچانک ایک موڑ پر میرے سامنے ایک سائیکل والا آگیا جو سڑک کے بیچ میں جا رہا تھا۔ میں نے اسے بچانے کی پوری کوشش کی' اس کے باوجود جیپ نے اسے چھو لیا۔ پھر جیپ ایک دکان کے تھڑے سے ٹکرا کے رک گئی۔ سائیکل والا نیچے گر گیا تھا اور مجھے گالیاں بک رہا تھا۔

میں نے نیچے اتر کے اسے اٹھایا "معاف کرنا بھائی! میں پریشانی میں اسپتال جا رہا تھا۔ میری بیوی زخمی ہے...... اور بے ہوش ہے۔"

دکان کے تھڑے پر سونے والے دو آدمی بھی ہڑبڑا کے نیچے آگئے تھے "سالا' وارد نی کے گاڑی چلاتا ہے۔ پولیس کو بلاؤ۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "بابا' غلطی ہو گئی۔ دیکھو میری بیوی کی حالت خراب ہے۔"

انہوں نے جیپ میں پڑی ہوئی رابعہ کو دیکھا اور مجھے معاف کر دیا۔ میں پھر جیپ لے کر روانہ ہونے ہی والا تھا کہ مجھے ان سے راستہ معلوم کرنے کا خیال آگیا۔ سائیکل والے نے مجھے قریب ترین اسپتال کا راستہ بتایا اور واپس جانے کو کہا "ادھر تو آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ تم [illegible] بستی میں۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور جیپ کو واپس موڑ دیا۔

ابھی میں نے بمشکل آدھے میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ہیڈ لائٹس نے ایک موڑ کے منظر کو ایک لمحے کے لئے روشن کیا اور میں نے سڑک سے کچھ دور کسی کو اٹھ کر ہاتھ ہلاتے اور پھر گرتے دیکھا۔ میں نے ایک دم بریک لگائے اور جیپ کو موڑ کر واپس لے گیا۔

میری نظر نے غلط نہیں دیکھا تھا۔ وہ مدھو سودن تھا۔ میں نے جیپ کو اس کے قریب لے جا کر روکا تو اس نے پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ زخمی تھا۔ اس نے ایک ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھا ہوا تھا لیکن یہ ہاتھ خون میں تر تھا اور زخم سے بہنے والے خون کو روکنے میں ناکام تھا۔ کیرتی اس کے قریب ہی چت پڑی تھی۔ آسمان کی تاریکی سے آگے عدم آباد میں اپنی روح کو بے چین دیکھ رہی تھی... 'میں اکیلی ہوں مدھو سودن...... آخر تم آتے کیوں نہیں۔'

میں نے مدھو سودن کے پاس بیٹھ کر کہا "تم نے دیکھا اس حرام زادے' شیطان کا انصاف' اس کی رحم دلی اور سخاوت؟ مجھے معلوم تھا کہ تمہارے ساتھ یہی ہو گا۔"

مدھو سودن نے بڑی مشکل سے کہا "میں...... میں نے بہت کوشش کی...... مگر کوئی رکا نہیں...... سب بھاگ گئے...... مجھے

www.paksociety.com

کچھ کہنا تھا....."

میں نے کہا "تم ایک مسلمان پر اعتبار کر سکتے ہو تو مجھے بتادو۔"

اس کی نظر میں ندامت کا دکھ بھی شامل ہو گیا "میرے.... میرے بچے.... لاوارث ہو گئے.... میری ماں اندھی ہے.... باپ صدمے سے مر گیا.... اس وقت جب یہ مجھے پکڑ کے لائے تھے...."

"مجھے بہت افسوس ہے کہ اس وقت تم نے میری بات نہیں مانی تھی" میں نے کہا "میں نے تم سے کہا تھا کہ بھاگ جاؤ۔"

"اب .... چھوڑو .... ایک کام .... کرو گے ؟"

میں نے کہا "کوشش ضرور کروں گا۔"

دھوسودن پر نقاہت طاری تھی۔ اس کے جسم کا سارا خون تو وہیں بہہ گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ اب تک کیسے زندہ تھا۔ شاید کسی کو یہ بات بتائے بغیر وہ مرنا نہیں چاہتا تھا اور اپنی قوت ارادی کے بل پر اپنی زندگی کی آخری سانسوں کو طویل سے طویل تر کر رہا تھا۔

"یہاں..... میرا کوئی نہیں..... ان کو..... میرے بھائی کے پاس ..... پہنچا دینا ..... ورنہ ..... یہ لوگ ....."

میں نے کہا "تمہارا بھائی کہاں رہتا ہے ؟"

"وہ ڈاکٹر ہے..... دلی میں..... دل موہن نام ہے..... اس کا"

اس نے ایک دم منہ سے خون اگلا اور خاموش ہو گیا۔

"دھوسودن!" میں نے چلا کے کہا "اس کا پتا بتاؤ۔"

دھوسودن بڑبڑایا "آصف علی روڈ....." شاید اس کے آخری الفاظ تھے۔ پھر وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

میں چند سیکنڈ ان دونوں کی لاشوں کے پاس بیٹھا رہا۔ موت سے کون بچ سکتا ہے اور کون کسی کو بچا سکتا ہے؟ میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکا تھا لیکن مجھے ایک اطمینان ضرور حاصل ہوا تھا کہ مرنے سے پہلے مجھے اس کے ذہن سے تعصب دور کرنے کا موقع ملا اور انسانیت کے رشتے سے اس کی آخری خواہش پوری کرنے کا بھی۔

میں پلٹ کر جیپ کی طرف جانے کے ارادے سے اٹھا ہی تھا کہ مجھے اپنی نظر کے سامنے کوئی نوٹ بک سی نظر آئی لیکن یہ نوٹ بک نہیں تھی، چھوٹا سا پرس تھا۔ اس پر خون لگا ہوا تھا جو میرے ہاتھوں پر بھی چپک گیا۔ میں نے جیپ میں پڑے ہوئے میلے کپڑے سے ہاتھوں کو بھی رگڑ رگڑ کر صاف کیا اور پھر پرس کو اسی میں لپیٹ کر سیٹ کے پیچھے دبا دیا۔

ابھی تک اس سڑک پر سے کوئی گاڑی نہیں گزری تھی، ورنہ مجھے دو لاشوں کے پاس دیکھ کر کسی کو بھی شک ہو سکتا تھا۔ کوئی رکتا یا نہ رکتا مگر وہ جیپ کا نمبر نوٹ کر سکتا تھا۔ اب میں نے ایک نظر رابعہ پر ڈالی اور پھر جیپ کو گھما کے سڑک پر لے آیا۔

ایک میل سے زیادہ چلنے کے بعد مجھے ایک فیکٹری کے باہر چھوٹا سا چائے خانہ نظر آیا۔ یہاں سے آبادی شروع ہوتی تھی لیکن رات کے آخری پہر میں صرف وہی چند لوگ جاگ رہے تھے جو ایک میز کے گرد بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا۔

میں نے ریسٹورنٹ کے مالک سے کہا "مجھے ایک گلاس میں پانی چاہئے۔"

وہ ایک سوکھا سڑا، بدمزاج بوڑھا تھا "میاں، تمہارے ہاتھوں پر خون لگا ہوا ہے۔ یہ کس کی لاش لے جا رہے ہو؟ اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے کیا؟"

میں نے کہا "چچا، وہ زندہ ہے۔"

"خبردار، جو مجھے پھر چچا کہا۔ مجھے کسی خبیث بھتیجے کی ضرورت نہیں۔ پہلے ہی کیا کم ہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "میری بیوی کے سر میں معمولی سی چوٹ لگی ہے۔ آپ خود دیکھ لیں، وہی خون میرے ہاتھ پر لگ گیا ہے۔"

بوڑھے نے قریب آ کے رابعہ کا معائنہ کیا اور مطمئن ہونے کے بعد بولا "اسے اسپتال لے جا رہے ہو؟"

میں نے کہا "وہیں لے جا رہا ہوں۔ پانی اس لئے مانگا تھا کہ ہو سکتا ہے یہ ہوش میں آ جائے۔"

"چوٹ لگی کیسے ؟"

میں نے کہا "ایک سائیکل والے کو بچانے کی کوشش میں۔ وہ نشے میں تھا اور بیچ سڑک میں سائیکل چلا رہا تھا۔ جیپ ایک کھمبے سے ٹکرا گئی۔"

اس نے پانی کا گلاس بھرا "سرکاری کھمبا گرا دیا ہو گا۔ اور ہاں، یہ تو بتا دو کہ تم ہو کون..... ہندو یا مسلمان ؟"

اس کی گفتگو سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ مسلمان ہو گا۔ اس کے ماتھے پر نماز کے سجدوں کا نشان بھی نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا "الحمدللہ، مسلمان ہوں میں۔"

اس نے پانی کا گلاس مجھے دے دیا "بس تو میاں، اب چائے بھی پی کے جانا..... اور دیکھو، اپنی زوجہ کو اندر لے آؤ۔ ادھر سے میرے گھر کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ڈرو نہیں، اندر کوئی نہیں ہے۔"

"ارے چاچا، ایک سنگل اور مار دو اپنے کو" ایک چائے پینے والے نے کہا۔

"سالے! پھر وہی چاچا" وہ بگڑ گیا۔ اندر بیٹھے ہوئے لوگ ہنسنے لگے۔ شاید چاچا اس کی چڑ تھی۔

میں رابعہ کو ایک نظر نہ آنے والے دروازے سے اندر لے گیا۔ دروازہ ٹاٹ کے پیچھے تھا اور کھلا پڑا تھا۔ یہ چاچا کا اسٹور بھی تھا اور گھر بھی۔ اندر چائے کی پتی کے ڈبے اور زمانے بھر کا کباڑ جمع تھا اور اس کے درمیان ایک جھلنگا چارپائی پڑی تھی۔ میں نے رابعہ کو اس پر ڈال دیا اور خود اس کے پاس پٹی سے لگ کر بیٹھ گیا۔

پانی کے چند چھینٹے ڈالنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس کے سانس کی رفتار معمول پر آ گئی ہے۔ بے ہوشی میں جیپ کی سیٹ پر پڑے رہنے سے اس کی حالت بہتر نہیں ہو سکی تھی۔ پھر اس نے کراہنا شروع کیا تو میں نے اسے جھنجوڑا۔

"رابعہ! ہوش میں آؤ" میں نے کہا اور اس کے گالوں پر احتیاط سے طمانچے مارے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہوش میں آئے اور شور مچانے لگے۔ رابعہ نے آنکھیں کھولیں اور مجھے غور سے دیکھا۔

میں نے کہا "خدا کے لئے شور مت کرنا۔ ہم کسی اور کے گھر میں ہیں۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ رابعہ کی آنکھوں میں دہشت کے آثار باقی تھے لیکن اس نے میری بات سمجھ لی تھی اور اب چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ چاچا اپنے ہاتھوں میں دو گلاس چائے لئے اندر آئے اور رابعہ کو ہوش میں دیکھ کر خوش ہوئے "شاباش بیٹی واہ۔ ہوش آ گیا زوجہ کو تو انہیں گرما گرم چائے پلاؤ۔"

میں نے کہا "رابعہ! اٹھ کے بیٹھو۔"

رابعہ نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا "میرے سر میں درد ہے سکندر!"

میں نے کہا "ہاں، چوٹ جو لگی ہے۔ وہ شرابی سائیکل والا ایک دم سامنے آ گیا۔ اسے بچایا تو گاڑی کھمبے سے ٹکرا گئی۔ خدا کا شکر ہے، زیادہ چوٹ نہیں آئی تمہیں۔"

"میں دیکھتا ہوں، اسپرین شاید ہو" چاچا نے کہا اور دوبارہ دکان میں غائب ہو گئے۔

میں نے رابعہ سے کہا "بڈھے کو میں نے یہی بتایا ہے۔ اچھا آدمی ہے مگر چاچا کہنے سے چڑتا ہے۔"

"لو میاں، مل گئی" چاچا نے بڑی مسرت کے ساتھ اطلاع دی اور اسپرین کی دو گولیاں میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔ پھر کسی نے باہر سے ہانک لگائی "چاچا" اور وہ بکتا جھکتا باہر نکلا۔ میں نے رابعہ کو پانی کے ساتھ اسپرین نگلنے کو دیں۔ اس وقت یہ پانچ پیسے کی دو گولیاں اور یہ چائے کا گلاس خدا کی وہ نعمت ثابت ہوئے جس کی قدر کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو ہمارے جیسے حالات سے دوچار ہوئے ہوں۔

ہوش میں آنے کے بعد رابعہ بھی پرسکون تھی۔ کہتے ہیں، بے ہوشی درحقیقت جسم کے دفاعی نظام کا ایک حصہ ہے۔ غالب نے اسے یوں کہا تھا کہ .... درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ جب انسان کے لئے جسمانی یا ذہنی عذاب قوت برداشت سے باہر ہونے لگتا ہے تو جسم فوراً بے ہوشی کی پناہ میں چلا جاتا ہے۔ بے خبری اور آرام کا یہ وقفہ اس کو پھر تلخ حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے توانائی فراہم کرتا ہے۔

چائے پینے کے بعد رابعہ کی حالت میں نمایاں تبدیلی آئی۔ میں نے اسے مختصراً بتا دیا تھا کہ ہم دلاور کی قید سے نکل آنے کے بعد اب واپس جاتے ہوئے یہاں رک گئے ہیں اور میں نے چاچا کو ایک اسٹوری سنائی ہے۔ ایک کونے میں ٹی وی نظر آ رہا تھا مگر اس کے حلق سے صرف خرخراہٹ برآمد ہو رہی تھی۔ پانی ایک ڈرم میں تھا جسے ایک فٹ اونچا چبوترا بنا کے کونے میں رکھ دیا گیا تھا اور ٹونٹی لگا دی گئی تھی۔ رابعہ نے نیچے بیٹھ کے ہاتھ کا خون صاف کیا اور زخم کو اچھی طرح دھو ڈالا۔ چاچا دوبارہ آئے اور رابعہ کی صحت یابی پر خوشی کا اظہار فرما کے چلے گئے۔

اب صبح قریب تھی۔ جب آواز اذان میرے کانوں میں آئی تو میں کچھ حیران ہوا۔ یہ اپنا وطن نہیں تھا جہاں ہر قدم پر مسجد تھی اور موذن دن میں جتنی بار پکارتا تھا، اس کی آواز کانوں تک ضرور پہنچتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ سننے والے اسے ان کے دوسرے کان سے باہر نکال دیتے تھے۔ یہ آواز ان کے دل تک نہیں پہنچتی تھی۔ دل کے بند دروازوں پر دستک دے کر لوٹ جاتی تھی۔ یہاں اس آواز نے مجھ پر مختلف اثر کیا۔ ایسے مواقع پہلے بھی آئے تھے جب میں نے شکر کے ایک سجدہ نیاز کی ضرورت کو صمیم قلب کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

میں نے وہیں بیٹھ کے وضو کیا جہاں بیٹھ کے رابعہ نے اپنا زخم دھویا تھا۔ میں وضو سے فارغ ہوا ہی تھا کہ چاچا اندر آئے۔

"میاں جزاک اللہ، فجر سے نماز کا ارادہ ہے؟"

میں نے شرمندہ ہو کے کہا "بس چاچا، کبھی وقت پڑتا ہے تو خدا یاد آتا ہے۔"

اس بار انہوں نے چاچا کہنے پر خفگی کا اظہار نہیں کیا "بندہ تو بھول جاتا ہے اسے۔ مگر وہ نہیں بھولتا بندے کو۔ آؤ میرے ساتھ۔"

میں نے کہا "کہاں؟"

www.paksociety.com

"مسجد اور کہاں۔ نماز مجھے بھی پڑھنی ہے۔ جماعت کے ساتھ پڑھنے کا ثواب کیوں چھوڑتے ہو؟"

میں ان کے چائے خانے سے گزرا۔ وہاں اب دوسرے لوگ براجمان تھے۔ چاچا نے کاؤنٹر کے اوپر ایک بورڈ رکھ دیا تھا جس پر تحریر تھا "وقفہ برائے نماز" اور نیچے "تجمیم پروپرائٹر بقلم خود" سب انہوں نے واقعی اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ میں نے اس اعلان کو حیرت اور عقیدت کے ساتھ دیکھا۔ شاید دن میں پانچ بار چاچا اس اعلان کو اذان کے ساتھ ہی نمایاں جگہ پر رکھ دیتا تھا اور پھر کسی خوف ندامت یا احساس زیاں کے بغیر اپنے زیادہ اہم فرض کی ادائیگی کے لئے چل پڑتا تھا۔ یہ ایک مشکل کام تھا جس کے لئے اخلاقی جرأت اور ذہنی سکون کی ضرورت تھی۔ آس پاس سب مسلمان نہیں تھے اور جو تھے 'وہ میرے جیسے تھے لیکن اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

میں نے کہا "دکان ایسے ہی کھلی رہے گی؟"

چاچا نے کہا "وہاں کیا ہے؟ کیا لے جائے گا کوئی؟"

میں نے کہا "تم جانتے ہو انہیں.... جو وہاں بیٹھے ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ پہلی دفعہ آئے ہیں۔"

میں نے کہا "انہی میں سے کوئی کچھ نہ سہی کیش نکال کر لے گیا تو؟"

"لے جائے میاں! اگر ہم سے زیادہ ضرورت مند ہے۔ اپنا کیا ہے 'روز کنواں کھودتے ہیں پانی پی لیتے ہیں۔ دن بھر میں اللہ بہت دے گا۔ آج کا دن ابھی شروع ہوا ہے۔ کل کی فکر ہم کرتے نہیں۔ اوپر والا کرتا ہے۔ اکیلی جان ہے 'وہ بھی جب چاہے لے لے۔ اس کے لئے تیاری پوری ہے۔ مدینے سے آب زم زم میں دھلا ہوا کفن لا کے رکھ لیا ہے۔ اور کیا چاہئے؟ جب تک زندگی ہے میرا مقدر تو کوئی چھین کے نہیں لے جاسکتا۔" وہ تیز تیز چلتا ہوا اپنی دھن میں بولے جارہا تھا۔ ایک درویش کامل۔ توکل کا پیکر۔ بندگی کے آداب کو سمجھنے اور نباہنے والا.... جس نے مجھے شرمسار کردیا تھا۔ کتنی محدود اس کی خواہشات تھیں اور کتنا لامحدود اس کا یقین تھا۔

مختصر سے صحن اور ایک حجرے پر مشتمل مسجد چاروں طرف سے کوٹھریوں کی دیواروں میں پھنسی ہوئی تھی۔ حجرہ بھی مشکل سے دس بارہ گز کا تھا۔ حجرے پر کوئی گنبد نہیں تھا مگر صحن کے محرابی دروازے کے دونوں جانب استادہ مینار اعلان کرتے نظر آتے تھے کہ یہ عبادت گاہ ہے اور مسلمانوں کی مسجد ہے۔ بستی میں انسانوں کے رہنے کو انچ انچ جگہ کم تھی مگر خدا کے نام لیواؤں نے پھر بھی مسجد کے لئے جگہ نکال لی تھی۔

"میاں! خود اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے ہم نے یہ مسجد۔"

چاچا نے بڑے فخر سے بتایا۔

مسجد کی تعمیر بتاتی تھی کہ دیواریں اٹھانے والے پیشہ ور معمار نہیں تھے۔ دیواریں ٹیڑھی تھیں اور پلاستر ناہموار تھا لیکن اصل چیز وہ جذبہ تھا جس نے اس گھر کو بنایا تھا۔ اس پر تازہ چونے کی سفیدی چمک رہی تھی۔

"کیا یہ مسلمانوں کی آبادی ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں میاں! بہت ہوئے تو پچاس گھر مسلمانوں کے ہوں گے 'وہ بھی نام کے مسلمانوں کو ملا کے۔"

میں ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس مسجد کی سپاٹ دیواروں پر کسی قسم کی آرائش نہ تھی۔ نہ اس میں سنگ مرمر کا استعمال ہوا تھا اور نہ اس کا فرش موزیک کا تھا۔ اس میں خطاطی اور نقاشی کے اسلامی فن کا کوئی کمال نظر نہ آتا تھا۔ نہ تاکوں پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کی جلوہ گری تھی اور نہ آیات قرآنی کے طغرے آویزاں تھے۔ پھر بھی یہاں تقدس کی وہ فضا تھی جس میں آدمی خود کو اپنے خدا سے قریب تر محسوس کرسکتا تھا۔ مجھے اپنے وطن کی بہت سی مساجد یاد آگئیں جن کی ظاہری شان و شوکت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جھاڑ فانوس 'آرائشی اسباب 'پنکھے 'کلاک 'اسپیکر سسٹم 'قیمتی صفیں 'پرشکوہ مینار اور وسیع گنبد اور حسن تعمیر کے شاہکار محرابی در.... لیکن نمازی کم سے کم ہونے والے۔

دیکھتے دیکھتے حجرے میں بیس پچیس افراد آگئے۔ معلوم نہیں کون تھا جو اذان دے کر چلا گیا تھا۔ اب امامت چاچا نے سنبھالی تو میں پہلی صف میں مقتدی بن کے شامل ہوگیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے دائیں کون ہے اور بائیں کون۔ نہ کسی نے مجھے دیکھ کر کسی تعجب کا اظہار کیا۔

واپسی پر میں نے کہا "یہ گھر آپ نے کب خدا کے نام کیا؟"

وہ چونکے "میاں! ایسا کہتے ہو؟ گھر تو وہ پہلے بھی خدا ہی کا ہوا تھا۔ یہ پوچھو کہ میں نے وہاں رہنا کیوں چھوڑا۔ تو میاں 'جب گھر والی کو اللہ میاں نے بلالیا اور بچوں نے اپنے اپنے گھر بسالئے تو ہم نے سوچا کہ اب اتنے بڑے کارخانے میں رہ کے کیا کرنا ہے۔ اب وہی گھر ہے اپنا جہاں پیٹ کا دھندا ہے۔ وہ بھی کب تک۔ بالآخر تو اسی گھر میں جانا ہے.... جو معلوم نہیں کہاں ہوگا۔"

میں نے کہا "بچے یہیں ہیں.... بمبئی میں؟"

"ہاں.... ان کے بھی بچے بڑے ہیں اب تو۔"

"آپ ان کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟" میں نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

وہ دکھ سے مسکرائے "وہ میرے ساتھ نہیں رہتے۔ میرا خیال ہے 'خوش نہیں رہتے۔ میں نے کہا کہ بھئی جہاں خوش رہو۔ ہم اولاد کے لئے یہی چاہتے ہیں۔ بڑا والا خفا ہے کہ میں نے گھر کو مسجد کیوں بنادیا۔ اس کی نظر تھی گھر پر۔ میں نے کہا کہ بہت کیا تمہاری خاطر 'کچھ اس کے لئے بھی تو کرنا ہے جس کے پاس مجھے جانا ہے۔"

شاعر مشرق نے کہا۔ سنا میاں سکندر بخت سے وہیں واپس کبھی یورپ کے کلیساؤں میں۔ کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں۔ شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی.... جہانداروں کی۔ کلمہ پڑھتے تھے ہمیں چھاؤں میں تلواروں کی۔ ذرا دیکھو کہ یہ نحیف و ناتواں بوڑھا انہی میں سے ایک ہے۔ تم کیا ناز کرتے ہو اپنے جہاد پر۔ اس کے جہاد کو دیکھو اور جذبہ ایمانی دیکھو۔ کیسے مخالف حالات میں 'کیسی دلیری سے 'کتنی قربانی دے کر اس نے اسلام کے چراغ کو روشن رکھا ہے۔

اور میں نے اس آواز غیب کو ایسے سنا جیسے میں نے آواز دل کو سنا تھا۔ میں اب انتہائی سکون تھا کہ مجھ پر گزشتہ رات کے واقعے کا اثر بھی باقی نہ رہا تھا۔ اب صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ دکان میں آٹھ دس گاہک چاچا کی واپسی کے منتظر تھے۔ انہوں نے شور مچادیا۔

"ارے چاچا! اپن مرگیا۔ چائے ڈالو میرے اندر جلدی سے۔"

ہنستے ہنستے چاچا نے کہا "ارے تو نہیں مرنے کا میرے بھیجے۔ تو مجھے مار کے مرے گا ہرامی۔ ابھی دیتا ہوں چائے۔ پانچ منٹ چپکا بیٹھ۔"

اندر میں نے رابعہ کو بیٹھے دیکھا۔ اس نے دوپٹہ یوں سر پر اوڑھ رکھا تھا کہ بغیر پوچھے میں نے جان لیا کہ وہ بھی نماز پڑھ رہی تھی۔

"بس اب چاچا سے اجازت لے کر چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"چلو۔" رابعہ نے کہا "میں تیار ہوں۔"

"اب ایسی بھی کیا جلدی۔ ایک ایک گلاس اور پی لیں گرما گرم چائے کا جو پھر کبھی نصیب نہ ہوگی۔" میں نے کہا۔

اسی وقت باہر سے کسی نے چلا کے کہا "یہ جیپ کس کی ہے؟"

چاچا نے کہا "کیا بات ہے تھانیدار صاحب؟ بڑے گرم ہورہے ہو۔"

تھانیدار کا لہجہ رکھنے والے نے اسے گالی دی "جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دے۔"

"اندر مت جانا.... پردہ ہے" چاچا نے چیخ کر کہا۔

میں ایک دم سنبھل گیا۔ میں نے رابعہ کو چارپائی کے نیچے گھسا دیا اور خود ایک کونے میں کھڑا ہوگیا۔

تھانیدار نے پھر گالی دی "ہٹ راستے سے" اور شاید چاچا کو دھکا دیا۔ میں نے میز کرسیوں کے گرنے کی اور لوگوں کے بھاگنے کی آوازیں سنیں۔ چاچا کی دلخراش چیخ نے مجھے دہلا دیا۔ "ارے مار دیا ظالم...."

پولیس کی وردی میں ایک شخص بگولے کی طرح اندر آیا مگر اس کی نظر مجھے فوراً نہ دیکھ سکی۔ میں نے اسے پیچھے سے یوں دبوچا کہ اس کی آواز حلق میں ہی گھٹ کے رہ گئی۔ اس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں تھی۔ وہ تھوڑا سا تڑپا۔ پھر میں نے ایک جھٹکا دیا اور اس کی گردن چٹخ گئی۔ اس کے پیچھے آنے والا مختی سا بنگالی ٹائپ ہانفتے بڑی تیزی سے پلٹا تھا مگر چارپائی کے نیچے سے ہاتھ بڑھا کے رابعہ نے اس کی ٹانگ کھینچ لی۔ وہ منہ کے بل گرا۔ پھر میں نے اسے نہ اٹھنے دیا۔ تھانیدار کا ریوالور لے کر میں نے بیچ کے دروازے میں سے دکان میں جھانکا تو میری رگوں میں میرا لہو منجمد ہوگیا۔ چاچا فرش پر بے حس و حرکت پڑے تھے اور ان کی کھلی آنکھیں مجھے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں "میاں..... اپنی تو تیاری پوری تھی.... ہم چلے اپنے آخری گھر۔ تم بھی جاؤ.... دیر مت کرو۔"

بھاگنے والے میزیں کرسیاں گرا کے بھاگ گئے تھے۔

انہوں نے وہ چائے بھی نہیں پی تھی جس کے لئے چاچا نے چولہا جلا کے کیتلی چڑھادی تھی۔ چولہا اب بھی جل رہا تھا۔

چاچا کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے کا آخری گلاس ہمارے نصیب میں نہ تھا۔

اندر جاکے میں نے رابعہ سے کہا "ابھی راستہ روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ دو منٹ میں نکل چلو۔ اور دو منٹ میں یہ کپڑے بدل لو۔"

"کپڑے..... کیا پہنوں؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے بے ہوش پڑے ہوئے بنگالی سپاہی کی طرف اشارہ کیا "ہمارے نکلنے کی یہی ایک صورت ہے۔"

دو کے بجائے پانچ منٹ بعد میں تھانیدار کی وردی پہن کے باہر نکلا تو سپاہی کی وردی رابعہ نے پہن لی تھی۔ ریسٹورنٹ کے باہر مجمع اکٹھا ہوگیا تھا۔ سورج نکل آنے کے بعد بمبئی کی مخلوق حشرات الارض کی طرح ابل کے سڑکوں پر آرہی تھی۔ روانگی سے پہلے میں نے اپنی جیب میں سے وہ پرس نکال لیا۔ پھر میں نے ایک زبردست ڈانٹ لگا کے کہا "چلو.... دفع ہو جاؤ سب۔ کیا تماشا ہو رہا ہے یہاں" اور ریوالور نکال کے لہرایا۔

ایک دم مجمع منتشر ہوگیا۔ وہ لوگ سہمی ہوئی نظروں سے اندر دیکھ رہے تھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ پولیس کی

www.paksociety.com

موجودگی میں چاچا کو دیکھ سکے کہ وہ زندہ ہیں یا نہیں۔ میں نے اطمینان سے پولیس کی جیپ میں افسرانہ شان کے ساتھ بیٹھ کے رابعہ کو ڈرائیور کی سیٹ سنبھالنے کا موقع دیا۔ ماتحت کی موجودگی میں افسر کا گاڑی چلانا مجھے مناسب نہ لگتا۔ رابعہ نروس تھی اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ ایکسیڈنٹ نہ کر دے لیکن اس نے پرانے تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے جیپ کو خاصی رفتار سے دوڑایا اور تنگ سڑکوں کی ٹریفک میں سے گزار کے لے گئی۔

"اُف!" میں نے گہری سانس لے کر کہا "یہ بھی ہونا تھا!"

رابعہ نے افسوس سے سر ہلایا "مجھے ہمیشہ احساس رہے گا کہ اس کی موت کے ذمے دار ہم تھے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "کوئی کسی کی موت کا سبب نہیں بنتا۔ اگر چاچا سے پوچھا جاتا تو وہ یہی کہتا اور وہ میدان حشر میں بھی یہی کہے گا..... کہ میاں بس ہمارا وقت آ گیا تھا۔ وہاں بھی میں نے اسے چاچا کہا تو وہ چلانے لگے گا۔ مگر ہم پر الزام نہیں آنے دے گا۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ مجھے صرف یہ احساس جرم ہے کہ ایک روشن چراغ تھا، نہ رہا۔ مگر اس کی روشنی رہے گی۔"

"کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ لوگ یہاں کیسے پہنچے؟"

میں نے کہا "چاچا کسی نے اس وقت جیپ کو دیکھ لیا تھا جب میں مدھو سودن کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔"

"مدھو سودن..... وہ کب ملا تھا تمہیں؟"

اب مجھے رابعہ کو ان کے متعلق بھی سب کچھ بتانا پڑا۔

"تم کیوں رکے تھے وہاں؟" رابعہ نے کہا۔

"اس نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جیپ میں چلا رہا ہوں۔ وہ پہلے بھی چند گاڑیوں کو روکنے کی کوشش کر چکا تھا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہیں سے کوئی ہمارے پیچھے لگ گیا تھا؟"

میں نے کہا "یقین نہیں، شک ہے۔ اور پیچھے کوئی نہیں لگا تھا۔ پیچھے لگا ہوتا تو ہمارے ساتھ ہی وہ بھی یہاں پہنچ جاتا۔ ہمیں دو گھنٹے کی مہلت نہ ملتی۔ یوں لگتا ہے کہ کسی نے گزرتے گزرتے سب دیکھ لیا لیکن مجھے معلوم نہیں ہوا۔ اس نے پولیس کو اطلاع دی اور پولیس نے تلاش شروع کی تو انہیں جیپ کا سراغ مل گیا۔ پھر بھی پولیس کی یہ مستعدی ناقابل فہم ہے۔ دو گھنٹے میں اگر وہ قاتلوں کو پکڑنے کی صلاحیت حاصل کرلیں تو یہ معجزہ ہی ہوگا۔"

"تم نے انسپکٹر کی جامہ تلاشی لی تھی؟"

"جامہ میرے بدن پر ہے" میں نے کہا "تلاشی کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اب دیکھ لیتا ہوں۔"

رابعہ نے کہا "مجھے مدھو سودن اور گیری پر ترس آتا ہے۔ ان کے ساتھ تقدیر نے بڑا ظلم کیا۔ گھر کی عزت گئی۔ پھر ساری عمر کا اندوختہ گیا اور بیٹا آخر جان گنی۔"

"میں انصاف کے معاملے میں قدرت کو جانبداری یا بے رحمی کا الزام نہیں دے سکتا۔ میرا خیال ہے کہ جب کسی کو سزا ملتی ہے تو کہیں ماضی میں یا در پردہ اس کا سبب ضرور ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ سبب ہمیں دکھائی نہ دے۔ ہماری ان سے سرسری واقفیت تھی۔ ہم جھوٹ سچ کا تجزیہ کیسے کر سکتے ہیں۔ صرف اس کی بیٹی پر مجرمانہ حملہ کیوں ہوا؟ اس کی بہن کو کیوں اٹھایا گیا؟ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ بمبئی میں کسی کی عزت اور جان محفوظ نہیں اور بدمعاش حکومت سے زیادہ طاقتور ہیں اور قانون کا صرف نام ہے، ورنہ دادا گیری کے سوا کچھ نہیں۔ ننانوے فیصد لوگوں کے جان و مال اور آبرو کو تحفظ حاصل ہے۔ لڑکیاں اور عورتیں گھروں میں، دفتروں میں اور بازاروں میں، ہوٹلوں میں اور پارکوں میں گھومتی نظر نہیں آتیں لیکن کیا ان میں سے کسی کو خیال بھی آتا ہے کہ وہ غیر محفوظ ہیں؟"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو آخر؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ کوئی بات ضرور ہوگی کہ مدھو سودن کے گھر کی عورتیں اغوا ہوئیں۔ کسی سے ذاتی دشمنی، کسی کی جوابی کارروائی یا کوئی غلط کاروبار۔ اس کے آس پاس اتنے لوگ اور بھی رہتے ہیں، انہیں تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ مدھو سودن اور اس کی بیوی تاجے پراسرار لگتے تھے مجھے۔ ان کا حلیہ چرایا اور اس بیٹی کی ٹوہ میں ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ جاتا۔ اس کے پیچھے کوئی اور بھی کہانی ہے۔ شریف عورتیں اور عام مزدور پیشہ مرد ایسے دھندوں میں ملوث نہیں ہوتے۔"

وردی کی تلاشی لے کر میں نے انسپکٹر کی مختلف جیبوں میں سے چودہ ہزار روپے اور کچھ کاغذات نکال لیے تھے۔ کاغذات میں ایک تو اس کی ذاتی نوٹ بک تھی جس میں فون نمبر اور پتے لکھے ہوئے تھے۔ ایک ڈرائیونگ لائسنس تھا جس کی تجدید نہیں ہوئی تھی۔ ایک فوٹو شاپ کی رسید تھی جہاں اس نے کوئی فلم دھلوانے کے لیے دی تھی اور ایک اس کی بہن کا خط تھا۔ ان کاغذات سے اس کا نام پتا تو معلوم ہوتا تھا مگر یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ وہ پولیس انسپکٹر تھا بھی یا نہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے میں ایک جعلی سب انسپکٹر دیکھ چکا تھا۔ یہ دوسرا بھی جعلی ہو سکتا تھا۔ اس کی جیب میں سے کوئی سرکاری شناختی کارڈ برآمد

نہیں ہوا تھا۔

یہی پوزیشن رابعہ کی وردی سے ملنے والے کاغذات کی تھی۔ وہ بیاہتا تھا چنانچہ اس کی جیب میں صرف دو ہزار روپے تھے اور یہی فون نمبروں کی نوٹ بک نہیں تھی اور ڈرائیونگ لائسنس نہیں تھا تاہم اس کی جیب میں ایک لڑکی کی تصویر ملی جو کسی پرکالہ بنگالن تھی۔ چشم بنگال، زلف بنگال اور عمر کا دلکش نمونہ۔

"یہ اس کی بیوی نہیں ہو سکتی" میں نے کہا "اور نہ محبوبہ۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟"

"وہ اتنا خوش قسمت نہیں تھا، ورنہ سپاہی کیوں رہتا اور بے مارا کیوں جاتا" میں نے کہا۔

"تصویر کا دوسرا رخ بھی تو دیکھو۔ لڑکی بد قسمت تھی کہ اس کی بیوی تو کیا ہوئی اور پھر بیوہ ہو گئی۔"

"میں نے کہا "خواہ مخواہ اسے بیوہ مت کرو۔ صرف تھانیدار مارا گیا تھا۔ وہ تو بے ہوش تھا جس کی وردی تم نے پہن رکھی ہے۔"

رابعہ ہنسی "پھر تو اس سے دوبارہ مل کے یہ بات معلوم کی جا سکتی ہے۔"

"کیا بات؟"

"یہی کہ تصویر کس کی ہے۔"

میں نے کہا "تمہاری بات نے مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہم اس بنگالی سے پوچھ سکتے ہیں کہ انہیں شامت اعمال وہاں کیسے لے آئی تھی؟"

"مگر اس کا تو نام پتا کچھ بھی نہیں ہے۔ تم وہ نوٹ بک تو دیکھو جو مدھو سودن کے پاس پڑی ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "یہ خوب یاد دلایا" اور وہ نوٹ بک اٹھالی جسے میں نے اب تک ہاتھ لگانے سے گریز کیا تھا۔ یہ اسی کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی اور اب پولیس کی جیپ میں بھی پیچھے رکھی ہوئی تھی۔

یہ نئی نوٹ بک تھی لیکن اس کی بیرونی جلد پر خون کچھ جم گیا تھا اور گہرے سرخ رنگ کی جلد میں یہ سیاہ دھبے الگ نظر آتے تھے۔ ڈائری مٹی میں پڑی رہی تھی اور جب میں نے اسے رگڑ کے صاف کیا تھا تو خون اور مٹی کا رنگ جلد پر ایسے پھیل گیا تھا کہ نئی نوٹ بک بھی پرانی نظر آنے لگی تھی۔ خون نے اس کے کچھ صفحات کے کونوں کو بھی رنگین کیا تھا مگر اس کے اوراق صاف تھے اور مندرجات پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ نوٹ بک پاکٹ سائز کی تھی اور اس کے پہلے صفحے پر ہندی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

میں نے رابعہ سے کہا "بی بی! اس زبان نے بہت تنگ کیا ہے ہمیں۔"

"ہاں، جلو نے جا چلنے لگتی ہے اور بھٹکنے لگتی ہے۔"

میں نے جھلا کے کہا "میں اس تیغ کی بات نہیں کر رہا تھا جو تم بے زبان عورتوں کے منہ میں چلتی رہتی ہے۔ ہندی کی بات کر رہا تھا۔ یہ زبان سیکھے بغیر ہمارے لیے قدم قدم پر مسائل پیدا ہوں گے۔"

"تھوڑی بہت ہندی مجھے آتی ہے۔ میری شاگردی اختیار کر لو۔"

میں نے کہا "تم سے زیادہ میں بول سکتا ہوں اور سمجھ سکتا ہوں لیکن پڑھ نہیں سکتا۔ ذرا مجھے بتاؤ، یہ کیا لکھا ہوا ہے استاد جی؟"

رابعہ نے کہا "پہلے ثابت کرو کہ یہ ہندی ہے، گورمکھی نہیں ہے۔"

میں نے اگلا ورق الٹتے ہوئے کہا "بازار سے کوئی کتاب ضرور مل جائے گی ایسی کہ ہم کسی کی مدد کے بغیر تحریر پڑھنے کے قابل ہو جائیں۔ جو ہندی بولی جاتی ہے وہ تو اردو ہی ہے۔ انہوں نے اس پر زبردستی ہندی کا لیبل لگا رکھا ہے۔ دل کے خوش رکھنے کو....."

"شدھ ہندی آکاش وانی بولتا ہے۔"

"میں اسے سنسکرت قرار دیتا ہوں لیکن یہ کیا ہے؟" میں نے نوٹ بک کے اگلے صفحے اور اس کے بعد آٹھ دس صفحات کے اندراجات پر حیران ہو کے کہا۔

"یہ تعویذ ہے کوئی" رابعہ نے کہا۔

لیکن میں پہلے صفحے پر سطروں میں لکھے ہوئے اعداد کو دیکھ رہا تھا جو بظاہر ٹیلی فون نمبر یا حساب کتاب کے انداز میں لکھے گئے تھے مگر غور کرنے پر میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ فون نمبر نہیں ہو سکتے جہاں تک مجھے معلوم تھا، بمبئی میں ٹیلی فون کے نمبروں میں چھ ہندسے تھے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کہیں سات ہندسے بھی ہوں مگر چار یا پانچ ہندسوں والے ٹیلی فون نمبر کا کوئی امکان نہ تھا۔ یہ حساب کتاب بھی نہیں تھا۔ مثلاً پہلے صفحے کی پہلی سطر کچھ ایسے تھی۔

(۷-۳-۲۲-۳۳-۷-۲)-(۸-۲۳-۵-۲۲-۷-۱۹)-(۳۳-۱۸-۱۵-۲۲)

میں نے سمجھ لیا کہ یہ کوڈ ہیں۔ خفیہ زبان میں کچھ لکھا گیا ہے جس کو میں اتنی آسانی سے نہیں سمجھ سکوں گا۔ کوڈ کا استعمال کرنے والے اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کوڈ بچوں کا کھیل نہ ہو۔ یہ تحریر کسی نے اپنی یادداشت کے لیے محفوظ کی تھی۔

www.paksociety.com

سب سے محفوظ جگہ آدمی کا دماغ ہوتا ہے مگر کچھ لوگ اپنے حافظے پر بھروسا نہیں کرتے یا جو طبعی طور پر اس قابل نہیں ہوتے کہ ہر بات یاد رکھ سکیں۔ ایسے ہی کسی شخص نے خفیہ زبان میں خود کچھ لکھا تھا یا اسے لکھ کر سمجھا دیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ اصل مطلب کیسے اخذ کر سکتا ہے۔

چار صفحات کے بعد مجھے دوسرا کوڈ نظر آیا۔ یہ تحریر ہندسوں کی زبان میں نہیں تھی۔ اس میں اصل انگریزی حروف بھی استعمال کیے گئے تھے یا پھر ہندسوں کو حروف کے ساتھ ملا کے لکھا گیا تھا۔ مثلاً پہلی عبارت کچھ یوں تھی۔

TLOWVM UZOXLM

HZW - 8 - R - 23 - V NLGVO

یہ میرے نزدیک لایعنی' ردی کچھ نہیں تھی۔ میں نے عبارت رابعہ کو دکھائی تو اس نے بھی مجھ سے اتفاق کیا کہ اس خفیہ زبان کا مطلب نکالنے کے لیے خاصی ذہنی مشقت درکار ہوگی۔

"مجھے اچانک اس نوٹ بک کی اہمیت کا احساس یہ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے مس رابعہ.... کہ ہمارے تعاقب میں آنے والے دراصل یہی نوٹ بک واپس لینے آئے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔" رابعہ نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ اس میں لکھا ہوا ہے' وہ ان کے نزدیک ٹاپ سیکرٹ ہے۔ دمسودان یا کیری کے قتل پر مامور کسی شخص نے گھبراہٹ یا جلدی میں نوٹ بک گرا دی جس کا اسے فوراً پتا نہیں چلا اور جیسے ہی پتا چلا' دلاور نے ایک اور جعلی پولیس پارٹی ہمارے پیچھے روانہ کی۔"

"بار بار وہ پولیس کی وردی سے کام کیوں لیتا ہے آخر؟"

"پولیس کی وردی میں کسی سے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ پولیس لامحدود اختیارات رکھتی ہے یا رکھتی تو نہیں مگر سمجھتی ہے کہ انہیں حاصل ہیں۔ چنانچہ یہ کسی کے بھی گھر میں وارنٹ کے بغیر گھس سکتے ہیں اور کسی کو بھی گرفتار کر کے لے جا سکتے ہیں۔ ان کا راستہ کوئی نہیں روکتا اور یہ شک تو کسی کو ہوتا ہی نہیں کہ پولیس بھی نقلی ہو سکتی ہے۔"

اگر میں نے محمد حسن کے آدمی سلمان سے واپسی کا راستہ نہ سمجھا ہوتا تو شاید ہم سارا دن بمبئی کی سڑکوں پر بھٹکتے رہتے۔ پولیس کی وردی نے اس علاقے سے نکلنے میں ہماری مدد کی تھی جہاں چاچا مرحوم کے چائے خانے کے باہر متجسس اور برہم لوگوں کا جم غفیر جمع ہو گیا تھا۔ پولیس کہیں بھی جائے' لوگوں کے ذہن میں قانون کا احترام نہیں' لاقانونیت کے مظاہرے کا خوف پیدا کرتی ہے اور پھر جب یہ اندیشے آنکھوں کے سامنے درست بھی ثابت ہو جائیں تو نفرت کا ردعمل مظلوم اور مجبور لوگوں کے چہرے پر پڑھا جا سکتا ہے اور ان کے انداز میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ایسے میں ایک چنگاری ہجوم کے اشتعال کو تخریبی سوچ میں بدل دیتی ہے۔ وہ پولیس کو حکومت کی مشینری کا ایک پرزہ سمجھتے ہوئے حکومت سے انتقام لیتے ہیں۔ سرکاری دفتروں پر حملہ کرنا' سرکاری گاڑیوں کو نقصان پہنچانا اور سرکاری املاک کو تباہ کرنا اسی ردعمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر ہم اس وقت اپنے اصلی کپڑوں میں فرار ہونے کی کوشش کرتے تو ہجوم ہمیں نہ جانے دیتا۔ وہ پولیس کا غصہ ہم پر اتارتے۔ پولیس کا راستہ روکنے کی ان میں ہمت نہیں تھی ویسے بھی میں نے ریوالور ہاتھ میں رکھا تھا اور میرے جارحانہ انداز نے بے بس لوگوں کو دفاعی انداز میں پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ بعد میں وہاں کیا ہوا ہوگا' اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔

تاہم اب وہی پولیس کی وردی ایک مسئلہ پیدا کر رہی تھی۔ ہم کسی سے بھی راستہ نہیں پوچھ سکتے تھے ورنہ لوگ شک کرتے کہ یہ کیسی پولیس ہے جو شہر کے راستوں سے واقف نہیں۔ اس کے علاوہ رابعہ نے اپنے بال بڑی کوشش سے پولیس کی وردی میں چھپا تو لیے تھے مگر اس کے زنانہ خدوخال اور اس کے حسن کی آب و تاب پولیس کی بدنما وردی سے چھپائے نہ چھپتے تھے۔

سلیمان نے جو راستہ مجھے بتایا تھا وہ میرے ذہن میں تھا اور میری ہدایات کے مطابق رابعہ جیپ ڈرائیو کر رہی تھی لیکن اس کی حالت بتاتی تھی کہ وہ تھک چکی ہے۔ رات بھر جاگنے کے علاوہ اس نے میرے ساتھ جو ذہنی اذیت برداشت کی تھی وہ اب اس پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔

میں نے نوٹ بک کو جیب میں رکھ کے کہا۔ "گاڑی کہیں روک لو۔ اب میں ڈرائیونگ کروں گا۔"

رابعہ نے کہا۔ "تم نہ کہتے تب بھی میں یہی کرتی۔"

میں نے اس کی جگہ سنبھال کے کہا۔ "اب تم چاہو تو آنکھیں بند کر کے تھوڑا سا آرام کر لو۔"

"کیوں' کتنا سفر باقی ہے ابھی؟"

"یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم۔" میں نے کہا لیکن اسی وقت اچانک میری آنکھوں نے شناخت کی پہلی علامت دیکھ لی۔ میں نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن اب معلوم ہے۔"

رابعہ نے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "وہی جو تمہارے دل میں ہے۔ سمجھ لو کہ ہم پہنچ گئے۔"

جیپ جھونپڑیوں کے درمیان سے گزری۔ گلیوں میں کھیلتے ہوئے بچے ٹھٹک کے جیپ کو دیکھنے لگے۔ عورتیں جو لڑتی تھیں یا شاید باتیں کر رہی تھیں خاموش ہو گئیں۔ چند لڑکے جو زمین پر پتے بچھائے بیٹھے تھے ایک دم غائب ہو گئے۔ جب ہم نے ریلوے لائن پار کر لی تو میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ پتے باز لڑکے پھر آ گئے تھے۔ گلی کی رونق بحال ہو گئی تھی۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ قانون کا قہر و غضب کسی پر نہیں ٹوٹا۔

میں نے کہا۔ "خیر سے بدھو گھر کو آئے۔"

رابعہ نے کہا۔ "بدھو ابھی گھر نہیں پہنچے۔ خدا نے بچا لیا۔ ورنہ اب تک ساری بمبئی کی پولیس کو خبر مل گئی ہوگی کہ پولیس کی وردی میں دو مجرم فرار ہو گئے ہیں۔ جیپ کا نمبر ہے۔"

میں نے کہا۔ "جیپ پر کوئی نمبر ہے تو پڑھا نہیں جاتا۔ یہ میں نے وہیں دیکھ لیا تھا۔"

جیپ گیٹ میں داخل ہوئی تو صبح کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ عمارت کے تمام کھڑکی دروازے اسی طرح بند تھے جیسے ہم نے پہلی بار دیکھے تھے اور خاموشی یہ ظاہر کرتی تھی کہ یہاں کوئی رہتا ہی نہیں۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں جیپ کو عقبی حصے میں لے گیا اور اس طرح کھڑا کر دیا کہ سڑک پر سے دکھائی نہ دے۔

پچھلے کا ہر دروازہ بند تھا۔ میں نے سامنے آ کے مرکزی دروازے پر دستک دی اور کچھ دیر انتظار کیا۔ کسی نے بھی مقفل دروازے کو اندر سے نہیں کھولا۔ میں نے گھنٹی بجائی اور پھر بار بار ہر دروازے پر اور ہر کھڑکی پر مکے مارے لیکن یوں لگتا تھا کہ اندر تو کوئی ہے ہی نہیں۔

"سب مردے کی طرح سوئے پڑے ہیں۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا۔ "اب تک کسی کی آنکھ نہیں کھلی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" میں نے کہا اور ایک بار پھر پوری طاقت سے دروازوں کھڑکیوں کو بجایا۔ خاموشی اب مجھے خوفزدہ کرنے لگی تھی۔ یہ واقعی ناممکن تھا کہ اتنے شور ہنگامے کے باوجود بھی سونے والے بیدار نہ ہوں۔ محسن نیند کے معاملے میں گھوڑے بیچ کر سونے کا عادی تھا مگر غالب کی نیند بہت کچی تھی۔ وہ قدموں کی آہٹ پر اٹھ بیٹھتا تھا۔ اسی طرح نازو کی نیند کچی تھی تو گل کی آنکھ بھی خفیف سی آواز پر کھل جاتی تھی مگر اس وقت تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اندر سب بے ہوش پڑے ہیں۔ نیند کیسی بھی ہو ایسی نہیں ہو سکتی تھی۔ میرا ذہن یہ قبول نہیں کرتا تھا کہ میرے سب ساتھی ہم دونوں کی طرف سے اتنے بے فکر ہو کے سو جائیں گے۔ انہیں تو شاید رات بھر نیند نہیں آئی ہوگی۔

"کیا سوچ رہے ہو سکندر؟" رابعہ نے مجھے جھنجوڑ کے کہا۔

میں نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "وہی جو تم سوچ رہی ہو۔ یہ آثار اچھے نہیں ہیں۔"

رابعہ کا رنگ اڑ گیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "گھبرانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"پیچھے سے اندر جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سامنے سے کسی نے دیکھ لیا تو شک کرے گا۔"

"یہ سب لوگ کہاں چلے گئے اچانک؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے پریشانی میں چڑ کے کہا۔ "واپس کراچی چلے گئے صبح کی فلائٹ سے۔ احمقانہ سوالات سے دماغ مت خراب کرو میرا۔ میں بھی تو تمہارے ساتھ ہی تھا۔ مجھے کیا معلوم؟" میں نے چلتے ہوئے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

رابعہ کو مجھ سے اتنے سخت جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ "آئی ایم سوری۔"

"یہی تو مصیبت ہے تم عورتوں کی۔ فالتو آنسو لیے پھرتی ہو اور موقع محل دیکھے بغیر بہانا شروع کر دیتی ہو۔ رونے سے کیا ہوگا؟ اور رونا کس بات کا؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "قبل از مرگ واویلا۔"

رابعہ نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے آنسو آستین سے صاف کر لیے۔ میں نے ایک کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ پھر دوسری کھڑکی تک گیا۔ ریوالور سے میں نے اس کا سب سے نیچے کا اور پھر اوپر کا شیشہ توڑ کے اندر ہاتھ ڈالا اور اوپر نیچے کی چٹخنی کھولنے میں کامیاب رہا۔ کھڑکی کے پٹ کھول کے میں اندر اترا اور دروازے تک جا کے لوٹ آیا۔ دروازہ مقفل تھا۔ اسے بجانے یا کھینچنے کی میں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں طے کر چکا تھا کہ کوئی بھی دروازہ مقفل ہوا تو میں لاک کو گولی سے اڑا دوں گا۔

میں نے دوسری کھڑکی کا شیشہ توڑا اور اپنے ساتھ رابعہ کو بھی اندر کھینچ لیا۔ مجھے اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ اندر کوئی غیر متوقع بات ہوئی ہے ورنہ کھڑکی کے شیشوں کے ٹوٹنے کی

www.paksociety.com

آواز پر کوئی ضرور آجاتا۔ دوسرے کمرے میں اترنے کے بعد میں نے باہر کاریڈور میں کھلنے والے دروازے پر لاتیں ماریں مگر خالی کمرے میں کھڑکی کے پٹ کی آواز گونج کر رہ گئی۔

میں نے رابعہ سے کہا "پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں لاک توڑ رہا ہوں" اور شانے سے کر لاک کو اڑا دیا۔ خالی کمرے میں اعشاریہ چار پانچ کے سروس ریوالور کا دھماکا کسی بم کے دھماکے سے کم نہیں تھا۔ تالا ٹوٹ گیا اور میں نے ریوالور ہاتھ میں رکھتے ہوئے کاریڈور میں قدم رکھا۔ اندر اب بھی موت کا سا سکوت تھا۔

آہستہ آہستہ میں اس کمرے کی طرف بڑھا جس میں غالب کے ساتھ محسن زیر علاج تھا۔ میں نے ہینڈل گھما کے دروازے کو لات ماری۔ دروازہ ایک دم کھل گیا۔ رابعہ نے چیخ ماری اور مجھ سے چمٹ گئی۔ اس کمرے میں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ خالی دیواریں مجھے اجنبی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کمرے میں رہنے والے ہی نہیں کمرے کا تمام ساز و سامان راتوں رات ایسے غائب ہو گیا تھا جیسے وہ سب فریب نظر تھا۔ فریب خیال تھا۔

میں پلٹ کے بھاگا اور خان کے کمرے میں گیا۔ پھر اس کمرے میں جہاں سے میں نے فون پر دنادو سے بات کی تھی۔ سب کمروں کی ویرانی ایک ہی طرح میری دیوانگی کا مذاق اڑاتی رہی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ یا اندھا ہو گیا ہوں کہ سب کچھ موجود ہے مگر مجھے نظر نہیں آرہا ہے۔ یا میں غلط جگہ آگیا ہوں۔ میں نے وہ پش بٹن دبا کے دیکھے جو میں چائے، کافی یا کھانا طلب کرنے کے لئے استعمال کرتا تھا۔

میں نے چلا کے کہا "ہیلو کوئی ہے؟ میری آواز سن رہا ہے کوئی۔ جواب دو مجھے۔ محمد خان کہاں ہے؟"

میری آواز کی بازگشت خالی دیواروں سے ٹکرا کے لوٹ آئی۔ میں صدر دروازے کی طرف لپکا۔ رابعہ میرے ساتھ ہے یا نہیں میں نے یہ بھی نہیں دیکھا۔ مجھ پر دیوانگی غالب آچکی تھی۔ میں غالب اور محسن کو چلا چلا کے آواز دے رہا تھا۔ مینا اور نازو کو پکار رہا تھا۔

"کہاں ہو تم سب لوگ؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟" میں نے چیخ کر کہا اور پھر باہر نکل گیا۔ ایک کار گیٹ میں سے اندر آئی جو بالکل نئی مرسیڈیز تھی۔ میں نے رابعہ سے کہا "لو وہ آگئے" اور کار کی طرف دوڑا لیکن کار کو ایک غیر ملکی چلا رہا تھا۔ کار کی نمبر پلیٹ ڈپلومیٹک تھی۔ اگلی سیٹ پر میں نے ایک انگریز عورت کو اور پچھلی سیٹ پر دو بچوں کو دیکھا جو مجھے حیرت اور خوف کے ساتھ دیکھ رہے تھے البتہ غیر ملکی خاصا برہم دکھائی دیتا تھا۔

کار سے اترتے ہی اس نے چلانا شروع کیا تو ذرا سی دیر کے لئے میں بدحواس ہو گیا۔ ابھی میں ایک صدمے سے نہ سنبھلنے پایا تھا۔ رات کے چند گھنٹوں میں ڈاکو محمد خان اپنے اور میرے ساتھیوں سمیت کہیں غائب ہو گیا تھا جیسے وہ سب شہر طلسمات میں رہتے تھے اور کسی جادوگر نے پلک جھپکتے میں انہیں اڑن چھو کر دیا تھا۔ یا وہ کسی خواب کا قصہ تھے جسے صبح ہونے کے بعد صرف یاد کیا جا سکتا تھا لیکن خیال سے حقیقت کے پیکر میں نہیں ڈھالا جا سکتا تھا۔

یہ نئی مصیبت تھی۔ میں اور رابعہ پولیس کی وردی میں تھے لیکن اس غیر ملکی نے شاید اپنی زندگی میں ہم جیسے پریشان حال اور حواس باختہ پولیس مین نہیں دیکھے ہوں گے۔ حقیقت کچھ بھی تھی، زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی تھی مگر ہماری مشکلات میں ہمارے غلط رویئے سے اضافہ ہی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے بڑی کوشش سے خود کو سنبھال لیا۔

غیر ملکی فرنچ میں چلا رہا تھا اور محض دھمکیاں ہی نہیں گالیاں بھی دے رہا تھا۔ اگر وہ انگلش یا اردو جانتا تھا تب بھی ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ وہ اپنی مادری زبان کے سوا کچھ نہیں سمجھتا حالانکہ عموماً برصغیر کے ممالک میں سفارتی عملہ دونوں زبانوں سے نابلد ہو تو کام نہیں چلا سکتا اور سفارتی عملے میں ان افراد کو ترجیحاً بھیجا جاتا ہے جو اس ملک کی زبان تھوڑی بہت ضرور جانتے ہوں، ورنہ وہ سیکھ لیتے ہیں۔ اس سے انہیں دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ کچھ سفارت کار ایک فائدہ حاصل کرتے ہیں اور کسی ترجمان کے بغیر کہیں بھی بات کر سکتے ہیں۔ کچھ دوسرا فائدہ یہ حاصل کرتے ہیں کہ انجان بنے سب کی سنتے رہتے ہیں اور سمجھتے بھی رہتے ہیں مگر پھر بھی ترجمان ساتھ رکھتے ہیں۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اگر یہ شخص سفارتی عملے میں ہے تو اس ملک میں کیسے کام چلا رہا ہے جہاں انگریزی کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔

اسے جواب دینے سے پہلے میں نے اصلیت سے واقف ہونے کے لئے ایک بے ضرر سا کھیل کھیلا۔

میں نے رابعہ سے کہا "اس کتے کے بچے کو دیکھو، بکواس کئے جا رہا ہے۔" پھر میں نے لہجہ بدل کے بڑی متانت کے ساتھ روئے سخن اس کی طرف کیا اور کہا۔

"تمہارا باپ کس نسل کا کتا تھا؟ صرف بھونکنے والا یا کاٹنے والا بھی تھا۔ حرامی یا غیر حرامی؟"

اس کے ردعمل نے مجھے دلی مسرت عطا کی۔ وہ اردو جانتا تھا لیکن عیاری سے کام لے رہا تھا۔ اپنے آبا و اجداد کی روح کو آزار پہنچتا دیکھ کے وہ تلملایا مگر کچھ بولا نہیں۔ ایک لمحے میں اس کا رنگ دوبار بدلا۔ وہ مشتعل ہوا اور پھر نارمل ہو گیا۔

اس نے فرنچ میں سرہلا کے فرنچ میں مجھ سے تقریباً وہی سوال کیا جو میں نے اس سے کیا تھا لیکن اس کی اداکاری ایسی تھی جیسے وہ کہہ رہا ہو "سوری، میں اردو نہیں جانتا۔"

اب میں نے سرہلا کے رابعہ سے انگریزی میں کہا "لک ایٹ دس سن آف بچ" اور اس میں ناقابل اشاعت جملے کا اضافہ کیا جس پر رابعہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے اس سے انگریزی میں کہا "ضرور تمہاری ماں نے کسی شیطان سے شادی کی ہوگی کہ تم جیسا خبیث روح والا سؤر پیدا ہوا؟"

جب اس کی شکل واقعی سؤر جیسی ہو گئی تو میرا دل باغ باغ ہوا۔ ان سفید فاموں سے مجھے اور محسن کو ازلی بیر تھا۔ کیونکہ ہم نے اپنے قیام انگلستان کے چار سالہ دور میں خوب لیا تھا اور کوشش کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ سفید فام "متعصب اور تنگ نظر" شرفا کی لڑکیوں سے دوستی کریں۔ انہیں شادی کا جھانسا دیں اور ذلیل کر کے خود اپنی نظر میں دو کوڑی کا کر دیں۔ یہ بدیہہ تیغ پھر بیدار ہوا تھا اور میں اس بزعم خود ہوشیار سفارت کار کو وہ گالیاں دے چکا تھا جو اسے کسی ہم وطن نے دی ہوتیں تو وہ اس کے دانت توڑ کے جیل چلا جانا پسند کرتا۔

اس نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ انگریزی بھی نہیں جانتا تھا فرانسیسی انداز میں کندھے اچکائے۔ ہونٹ سکیڑے اور ہاتھ پھیلا کے بیوی بچے میں مجھے فرنچ میں ایسی شاندار گالیاں دیں کہ کار میں بیٹھی ہوئی اس کی بیوی کا چہرہ لال پڑ گیا اور اس کے بچے اپنے ڈیڈی کی فصاحت و بلاغت کا یہ نمونہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

اب وقت آگیا تھا کہ میں اسے آخری جھٹکا دے کر دھوبی پٹکا دوں اور چاروں شانے چت کر دوں۔

میں نے ریوالور نکال کے شستہ رواں فرانسیسی میں اس سے کہا "جو کچھ تم نے بکا ہے وہ اتنا سنگین جرم ہے کہ میں تمہیں گولی بھی مار سکتا ہوں۔ میں ہندوستان کے قانون کا نمائندہ ہوں جسے تم نے گالیاں دی ہیں۔ سفارتی مراعات میں یہ شامل نہیں ہے کہ تم اس ملک کے قانون کو ذلیل کرو۔ میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں۔ تمہیں سفارت خانے واپس چلنا ہوگا۔ اگر میں نے تمہیں ناپسندیدہ شخص قرار دلوا کے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس ملک سے نکل جانے کے احکامات جاری نہ کروائے تو استعفا دے دوں گا۔"

میری اس زبان دانی سے فرنچ ڈپلومیٹ کی حالت اس شخص سے بھی بدتر ہو گئی جس نے سویٹ ڈش سمجھ کے لال مرچوں کی چٹنی چمچ بھر کے کھالی ہو۔ چند سیکنڈ تو وہ منہ کھولے کھڑا رہا اور اس کے حلق سے حیرت یا ندامت کے الفاظ کے

بجائے خاموشی برآمد ہوتی رہی جو خود ایک اعتراف جرم تھی۔ پھر اس کی نصف بہتر نے صورت حال کو بدتر ہونے سے یوں بچایا کہ وہ اپنے گورے بدن کی ساری حشر سامانی کے ساتھ ایک بانکے پولیس افسر کی عقل کو مفلوج کرنے اور اسے اپنی ادائے دلبری سے چاروں کرنے کے لئے کار سے نکل آئی۔

اس نے پہلے سے عریاں شانوں کو مزید عریاں کرتے ہوئے مسکرا کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرنچ میں کہا "غصہ تھوک دو ڈیئر۔ یہ میرے لئے ایک بے حد خوشگوار حیرت کی بات ہے کہ یہاں ہمارا ہم زبان بھی کوئی ہے۔ ہم دوست بن سکتے ہیں۔"

میں نے اس کی طرف بے وقوفوں کی طرح دیکھ کے کہا۔ "کیا تم مجھے ورغلا رہی ہو۔ اچھا پہلے میں اسے بند کر دوں۔ پھر ہم دوستی کریں گے۔"

فرانسیسی نے چلا کے اپنی بیوی سے کہا "کیا تم مزید ذلیل ہونا چاہتی ہو اس کے ہاتھوں۔"

لیکن بیوی بہت دور اندیش ثابت ہوئی۔ اس نے کہا۔ "آفیسر! میں اپنے شوہر کی طرف سے معافی مانگتی ہوں۔ اس نے بہت نامناسب باتیں کی ہیں۔"

میں نے کہا "جو نامناسب سلوک میں اس کے ساتھ کرنے والا ہوں، اس کا یہ اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ ہمارا خصوصی آنرز تفتیش تیمور ہیرکا جو اس نے پہلے کبھی نہ کھایا ہوگا۔"

آنرز تفتیش کے کھانے کا ذکر سن کے وہ حیران ہوئی مگر اس نے اپنی کوشش جاری رکھی "بے شک یہ اس کی غلطی تھی۔ اس نے سخت اشتعال انگیزی کی لیکن تم خود سوچو کہ اپنے گھر میں پولیس کو دیکھ کر کیا تمہیں غصہ نہیں آئے گا۔"

میں نے کہا "آئے گا لیکن میں جرمن پولیس کو فارسی میں اور برطانوی پولیس کو عربی میں گالیاں نہیں دوں گا۔"

وہ بڑی ادا سے ہنسی جس کا رابعہ نے خاصا برا مانا "دیکھو یہ تو انتہائی غیر متوقع بات تھی۔ یہاں کون فرنچ جانتا ہے؟ لیکن تم فرنچ بول سکتے ہو تو تمہیں فرنچ ایٹی کیٹس کا بھی خیال ہونا چاہئے۔ اول تو معذرت قبول کرنی چاہیے اور پھر ایک معزز خاتون کی درخواست کو ٹھکرانا تو بہت ہی غلط ہوگا۔"

میں نے سرہلا کے ریوالور جیب میں رکھا جیسے اس دلیل نے مجھے قائل کر لیا ہے۔ پھر میں نے کہا "ہماری دوستی تو ہو گئی۔ یہ لباس جو تم نے پہن رکھا ہے، بلاشبہ حسن کی زینت ہے۔"

نہ صرف رابعہ نے بلکہ اس عورت کے شوہر نے مجھے شعلہ فشاں نظروں سے گھورا۔

عورت نے حسن کی قوت تسخیر سے مطمئن ہو کے کہا۔ "کیا میں پوچھ سکتی ہوں ہینڈسم آفیسر کہ تم ہمارے گھر میں

www.paksociety.com

کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "حسین خاتون! مجھے شک ہے کہ آپ یہاں رہتی ہیں۔ کیا اس بارے میں یہ بد شکل شخص بہتر وضاحت نہیں پیش کر سکتا جو خود کو تمہارا شوہر کہہ کے تمہاری توہین کر رہا ہے۔"

فرانسیسی تلملایا "میں اس کا حقیقی شوہر ہوں۔"

میں نے مسکرا کے کہا "کوئی ثبوت ہے اس دعوے کا؟"

"یہ دو بچے!" اس نے دہاڑ کر کہا۔

"یہ تمہارے بچے ہیں؟" میں نے بے حد مشکوک انداز میں کہا۔

"تم ان بچوں سے پوچھ سکتے ہو۔"

"بچے کچھ نہیں جانتے۔ یہ ثابت کرو کہ تم ہی اس عورت کے شوہر اور ان بچوں کے باپ بھی ہو" میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے 'حقیقی باپ۔'"

حسب توقع اس نے مشتعل ہو کے مجھ پر حملہ کیا اور میں نے ایک مکا مار کے اسے واپس لوٹا دیا۔ وہ گھوم کر گاڑی کی ڈکی پر گرا۔ ایک چیخ عورت نے ماری۔ دو اس کے بچوں نے۔

میں نے کہا "میں نے تمہیں معاف کر دیا تھا۔ لیکن تم نے قانون پر ہاتھ اٹھایا۔ یہ بہت سنگین جرم ہے۔"

عورت چلانے لگی "پلیز! یہ ہوش میں نہیں ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ یقین کرو 'ہم میاں بیوی ہیں۔ سفارت خانہ اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔ بلکہ پاسپورٹ ہیں ہمارے پاس۔" اس نے اچانک سنبھل کے اپنا ہینڈ بیگ دیکھا۔ پھر کار کی طرف لپکی اور ایک بریف کیس میں سے پاسپورٹ نکال لائی۔ اس کا شوہر بونٹ پر بیٹھا ہونٹ کاٹتا رہا۔ اس نے سگریٹ جلا کے اپنے غصے کا بخار دھوئیں کی صورت میں خارج کرنے کے لئے لمبے لمبے کش لئے۔

"اسے میں کیا سمجھوں؟ کیا تم جانتے بوجھتے بدتمیزی کا مظاہرہ کر کے مجھے ذلیل کرنا چاہتے ہو۔ تم نے مجھے سگریٹ کیوں پیش نہیں کی؟" میں نے کہا۔

فرانسیسی نے مجھے خونخوار نظروں سے گھورا مگر سگریٹ کا پیکٹ میری طرف بڑھا دیا۔ سگریٹ جلا کے میں نے پیکٹ اور لائٹر دونوں جیب میں ڈال لئے اور خود کو عمل سے بھی ایک پولیس مین ثابت کیا جو زبردستی نذرانے وصول کرتا ہے اور چھوٹی موٹی چیزوں کو بھی چھوڑتا نہیں۔ پاسپورٹ دیکھنے کے بعد میں نے اپنی تحویل میں رکھ لئے۔

"یہ افسوسناک اور شرمناک بات سہی۔ مگر میں مان لیتا ہوں کہ تم اس کی بیوی ہو۔ ہم پاسپورٹ واپس لینے کے لئے ضروری ہے شوہر صاحب کہ آپ میرے چند سوالات کا جواب دیں۔"

اس نے کہا "پوچھو 'کیا پوچھنا ہے؟'"

میں نے کہا "تم ڈاکو محمد خان کو جانتے ہو جو خونی خان مشہور ہے؟"

وہ مشتعل ہو کے بولا "ایسے سوالات کا کیا مقصد ہے آخر؟"

میں نے کہا "یہاں سوال کے جواب میں سوال کرو گے تو میں پوری قانونی کارروائی کروں گا۔"

اس نے خون کا گھونٹ پی کر کہا "میں ایک سفارت کار ہوں۔ میرا کسی ڈاکو محمد خان سے کوئی واسطہ نہیں۔"

"اور یہ مکان جسے تم اپنا کہتے ہو 'تم نے اسے کیوں کرائے پر دیا تھا؟ کرائے کے بدلے تم اس سے کیا لیتے تھے۔ نقد رقم یا خدمت؟"

"یہ کیا بکواس ہے؟ جب میں کہہ چکا ہوں کہ میرا ڈاکو محمد خان سے دور کا بھی تعلق نہیں تو پھر مکان کرائے پر دینے کا کیا سوال؟"

اس کی بیوی نے کسی خطرناک صورت حال کا اندازہ کرتے ہوئے خود کو کچھ اور نمایاں کیا۔ لب لعلیں پر ایک قاتل مسکراہٹ سجائی اور لہجے میں شیرینی گھول کر کہا "آفیسر! کون ڈپلومیٹ اپنا گھر کرائے پر دیتا ہے۔ پھر کسی ڈاکو کو دینے کا کیا سوال؟"

میں نے کہا "لیکن وہ یہاں رہتا تھا۔ کیا اس کا میں یہ مطلب لوں کہ وہ مفت رہتا تھا۔ ظاہر ہے 'اس عنایت کے بدلے وہ تمہارے لئے کچھ تو ضرور کرتا ہو گا۔"

"یہ غلط ہے" فرانسیسی چلایا "یہاں کوئی ڈاکو نہیں رہتا۔"

میں نے سرد مہری سے اس کی طرف دیکھا "میں اور میرا ساتھی پولیس افسر اس سے یہاں مل چکے ہیں۔ بے شک وہ فرار ہو گیا ہے لیکن یہاں اس کی موجودگی بہت سے چشم دید گواہوں کے ذریعے ثابت کی جا سکتی ہے۔"

فرانسیسی اب واقعی پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے سگریٹ کو نیچے پھینک کے جوتے سے کچلا اور بولا "مجھے پوری بات بتاؤ۔"

میں نے کہا "جو بات مجھے معلوم تھی اگر وہ پوری نہیں ہے تو باقی تم بتا دو۔ مثلاً یہ کہ کب سے یہ تمہارا گھر ہے 'اور اگر تم یہاں رہتے ہو تو اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟"

"میں اپنی فیملی کے ساتھ ایک مہینے کے لئے اپنے ملک گیا ہوا تھا۔ اس سے پہلے میں یہاں تھا۔"

"کتنے عرصے سے؟" میں نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"ڈیڑھ سال سے" اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کے کہا۔

"ڈیڑھ سال اور... سات دن۔" عورت نے انگلیوں پر حساب

لگا کے بتایا "ساتواں دن آج ہے۔"

"یہ رہائش تمہیں سرکاری طور پر فراہم کی گئی ہو گی؟"

"ظاہر ہے اتنا بیہودہ مکان میں خود نہ بنواتا۔"

میں نے کہا "اوپر نیچے کے بارہ کمرے چار افراد پر مشتمل خاندان کے لئے کم تو نہیں تھے۔"

اس نے جز بز ہو کے کہا "یہاں میں اکیلا نہیں رہتا تھا صرف اپنی فیملی کے ساتھ۔ ہم دو افراد اوپر نیچے الگ الگ رہتے تھے۔"

"دوسرا کون تھا؟" میں نے کہا۔

"وہ بھی ایک ڈپلومیٹ تھا۔ گزشتہ ماہ چلا گیا واپس۔ اس کی جگہ آنے والے نے میرے ساتھ رہائش کو پسند نہیں کیا۔"

"گویا تمہارے اپنے ہم وطن بھی تم سے اتنے ہی نالاں تھے؟"

"وہ اپنی پرائیویسی کو زیادہ اہم سمجھتا ہے اور اسے حق حاصل تھا اپنی مرضی کی جگہ حاصل کرنے کا۔ تو وہ اس حق کا استعمال کیوں نہ کرتا!" اس نے برہمی سے کہا۔

"تمہارا سابقہ ساتھی کیا چیز تھا؟"

"فضول باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔"

"اچھا۔ دوسرا بے فضول سوال سنو... تم اپنے ملک گئے تھے تو کیا گھر کی ہر چیز ساتھ لے گئے تھے؟ پردے 'قالین' زنجیر تک اور صرف خالی دیواریں چھوڑ گئے تھے مکان کی۔ اگلے چوروں کے لئے دیواریں لے جانا بہرحال مشکل تھا۔"

"کیا مطلب ہے آخر تمہارا؟"

"یا تم بغیر سامان کے رہنے کے عادی ہو" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے کہا "فرش پر سوتے تھے اور اپنی فیملی کو بھی اتنے بڑے گھر میں ایسے ہی رکھتے تھے جیسے ہم مجرموں کو جیل میں رکھتے ہیں؟"

اب عورت نے کہا "آفیسر 'ہم یہاں بہت آرام سے رہتے تھے۔ ہمارے پاس ہر چیز ہے۔ جو فرانس میں ہمارے معیار زندگی کے مطابق ہے۔"

میں نے کہا "آپ کا مطلب ہے کہ تھی؟ کیونکہ اب تو اندر صرف سپاٹ دیواریں ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" وہ چلائی "کیا میں اندر جا سکتی ہوں"

میں نے کہا "ضرور جائیں۔ اپنے ہی گھر میں جانے کے لئے آپ کو مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے مادام؟"

وہ ایک نام نہاد گھریلو عورت کی طرح پریشان ہو کے اندر جانے کے لئے لپکی۔ فرانسیسی نے بھی گاڑی آگے بڑھائی اور دروازے کے سامنے روک دی۔ بچے اتر کے وہ اندر چلے گئے۔ میں بھی اس کے ساتھ خالی گھر میں داخل ہوا۔ اندر قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک کے رک گیا اور بے یقینی سے خانہ ویرانی کے آسیب کو دیکھنے لگا۔ اس کی بیوی اندر کسی بدروح کی طرح بھٹک رہی تھی اور چلا رہی تھی "آخر یہ سب کیا ہے۔ یہ میرا گھر ہے کہ قبرستان... کون لے گیا ہے سارا سامان؟"

میں نے فرانسیسی میں کہا "تمہارے ساتھ یقیناً بہت زیادتی ہوئی ہے۔"

اس نے مٹھیاں بند کر کے کہا "میں سفارتی سطح پر احتجاج کروں گا۔"

میں نے کہا "اس سے پہلے تمہیں رپورٹ درج کرانی ہو گی کہ تمہاری عدم موجودگی میں کوئی یہاں جھاڑو پھیر گیا۔"

"کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟ محمد خان۔"

میں نے کہا "وہ ڈاکو ہے۔ کباڑیا نہیں کہ پورا سامان لے جائے۔ اس کا تو نام بھی مت لینا۔ ایک تو اس لئے کہ وہ خونی خان ہے۔ اس کا نام لینے سے تم خواہ مخواہ نئے چکر میں آ جاؤ گے کہ آخر وہ یہاں کیسے مقیم تھا۔ چونکہ اس بات کے گواہ ہیں 'اس لئے بہتر ہے کہ تم اپنی رپورٹ کو چوری تک محدود رکھو 'نام' کسی کا مت لو۔ تمہیں سارا سامان خود حکومت فراہم کرے گی۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟" اس نے درخواست کی۔

"میں یہ مدد کر سکتا ہوں کہ ڈاکو محمد خان کی یہاں موجودگی کا کسی سے بھی ذکر نہ کروں۔ میں ہی ایک معتبر سرکاری گواہ ہوں یا میرا یہ ساتھی۔ بات یہ ہے 'مسٹر ڈپلومیٹ' کہ خطرے سے دور رہنے کی کوشش ضرور کرنی چاہئے۔ تم جانتے ہو 'یہ انڈیا ہے۔ یہاں کی پولیس کتنی مستعد ہے' یہ بھی جانتے ہو گے۔ کیا فائدہ کہ دشمنی میں خونی خان تمہارے خاندان کو سابق خاندان کر دے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ واقعی آدمی کا خون پی لیتا ہے؟"

خوف سے اس کا رنگ اڑ گیا "خون پی لیتا ہے! انسانی خون! یہ ناممکن ہے۔"

"تم اپنے طور پر جب تفصیلی معلومات حاصل کرو گے تو تمہیں یقین آ جائے گا کہ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ خود پولیس تمہیں بتائے گی اور ممکن ہے تصویریں بھی دکھائے۔ ایسی ہولناک تصویریں جن میں اسے خون پیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔"

"خدا کے لئے یہ ذکر چھوڑ دو۔ میری مدد کرو۔ یہ تو بہت سنگین واردات ہے۔ چوروں نے گھر صاف کر دیا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ کیا اسی طرح حفاظت کی جاتی ہے سفارت کاروں کی؟"

میں نے کہا "تم سفارت کار ہو تو تمہارے گھر پر جھنڈا کیوں نہیں لہرا رہا ہے فرانس کا؟ گیٹ پر چوکیدار کیوں نہیں

www.paksociety.com

ہے ؟"

"اس لئے کہ میں نہ سفیر ہوں نہ کونسلیٹ ۔ میں سفارتی عملے کا ایک عام رکن ہوں۔" وہ بولا۔

اس نے کہ میں گھوم پھر کے مجھے تفصیل سے بتایا کہ کہاں کیا تھا جو اب نہیں ہے ۔ اس کی بیوی نے کئی بار روتے روتے دخل در معقولات کیا اور کہا کہ فلاں چیز بھی تو تھی ۔ تم یہ بھول گئے، وہ بھول گئے ۔ تنگ آ کے شوہر نے بیوی کے ساتھ وہی سلوک کیا جو عموماً ہم مشرقی شوہر پاؤں کی جوتی کے ساتھ روا رکھتے ہیں ۔ اس نے آداب سفارت کو بالائے طاق رکھ کے کہا "اگر تم نے کتیا کی طرح بھونکنا بند نہ کیا تو ......" باقی دھمکی مستر کی زد میں آتی ہے ۔

چلتے وقت میں نے اسے تسلی دی۔ اس نے ہاتھ ملا کے مجھ سے معذرت کی کہ اس نے میرے ساتھ بہت غلط رویہ اختیار کیا ۔

"ایک فرنچ جانے والا پولیس افسر یقیناً میرے بہت کام آسکتا ہے ۔ آئندہ بھی ۔"

"اور ہم دوست بھی ہو سکتے ہیں۔" میں نے اس کی بیوی کی طرف دیکھ کے کہا۔ "بے شک اس خود غرض دنیا میں کوئی غرض کے بغیر کسی کا دوست نہیں ہوتا۔" اس کی بیوی اب بھی جامے سے خاصی باہر تھی ۔

رابعہ نے کہا "اتنا دل للچا رہا ہے تو دوستی کیا، نکاح کرلو۔"

میں نے کہا "اہل کتاب سے نکاح بھی جائز ہے ۔ اس امکان پر بعد میں غور کریں گے عزیزہ ۔ تجویز ہمیں اچھی لگی۔"

ظاہر ہے، معاملہ رابعہ کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا ۔ "تمہیں قتل کر دے گا اس کا خصم ۔"

میں نے کہا "یہ لوگ جذباتی نہیں ہوتے ۔ مجھے معلوم ہے ۔ ویسے بھی قتل تو ہم ہوتے ہی رہتے ہیں ۔ ہر جگہ ۔ چھری پھیر رہی ہے ظالم نے ۔"

فرانسیسی اور اس کی بیوی کچھ حیران تھے کہ ہمارے درمیان یہ کیا مکالمہ ہو رہا ہے ۔ رابعہ کی آواز کی نسوانیت اور اس کے لہجے کا حاسدانہ جذبہ شکوک پیدا کرنے کے لئے کافی تھا لیکن وہ خبیث خالباً اردو بھی کچھ کچھ سمجھتا بھی تھا ۔ رابعہ کا منہ سوج گیا تھا چنانچہ میں نے فرار اختیار کرنے میں ہی عافیت جانی ۔

جیپ میں بیٹھ کے باہر آتے ہی مجھ پر جس کا دورہ پڑا ایسی اتنا ہی حوصلہ تھا ۔ ابھی تو بیچارہ نگاہوں نے بھی نہیں دیا تھا۔

رابعہ نے جل کے کہا "میں دیکھ رہی تھی تمہاری نگاہوں کی آوارگی کو ۔ نظریں خیرہ ہوئی جا رہی تھیں ۔"

میں نے کہا "تم بھی شادی کے بعد ایسا ہی لباس پہنا کرو۔ ایرانی تو دیکھ لیا ہے نا تم نے ۔ خصوصاً گلے کا ۔ یہ شلوار قمیص، غرارہ، شرارہ ۔ یہ کوئی لباس ہیں.... لاحول ولاقوۃ ۔ عورت کو اور

سے نیچے تک غرق کر دیا کپڑوں میں ۔ خواہ مخواہ کی فضول خرچی ۔ چھ گرہ کپڑے سے کام چلتا ہو تو چھ گز کیوں آخر .....؟"

رابعہ نے اب جواب دینے سے گریز کیا اور مسکراہٹ کو چھپانے کے لئے دوسری طرف دیکھنے لگی ۔ میں اسے قائل کرکے کچھ زیادہ گرما گرم بات کرنا چاہتا تھا کہ اچانک خالی سڑک کے بیچ میں کوئی چیز آئی اور گزر گئی ۔ میں نے ایک دم بریک لگائے ۔ جیپ تھوڑا سا دائیں طرف گھوم کے رک گئی ۔

"یہ کون الو کا پٹھا خودکشی کرنے والا تھا؟" میں نے کہا۔

بائیں جانب سے یوسف ثانی نے کہا "اتنی جسارت! یہ بندے کا قصور.... لیکن تھا روکنا آپ کو منظور ۔"

میں نے جھنجھلا کے کہا "اور اگر ہو جاتے آپ مرحوم یا مغفور یا ہو جاتیں ہڈیاں چور چور ۔ میں تو ہو جاتا مفرور ۔"

اس نے اب وہی شیروانی اور ترکی ٹوپی پہن رکھی تھی لیکن جانے کہاں سے اس پر ایک پھندنا بھی ٹانک لیا تھا۔ لال ٹوپی پر یہ کالا پھندنا اس کے سر کی حرکت کے ساتھ جھولتا تھا۔ وہ بندر کی طرح اچھل کے جیپ کے پچھلے حصے میں چڑھ گیا۔

"آپ نے تو جناب حد کر دی۔" وہ ہاتھ لہرا کے شکایتی آواز میں بولا "جسم پر چڑھا لی پولیس کی وردی ۔ حالانکہ ابھی کہاں سے سردی۔"

"سردی؟" میں نے کہا "یہ صرف قافیہ ملایا ہے تم نے۔"

رابعہ نے کہا "یہ ٹھیک کہہ رہا ہے ۔ یہ وردی پولیس کو موسم سرما میں دی جاتی ہے اور ابھی گرمی پڑ رہی ہے۔"

میں نے یوسف ثانی جیسے چغد کے مقابلے میں خود کو احمق محسوس کیا (حالانکہ چغد بھی لغت کے مطابق چھوٹا الو ہی ہوتا ہے) ۔ جس بات کا مجھے کئی گھنٹے وردی پہن کر پھرنے کے بعد بھی احساس نہ ہوا تھا، اسے وہ ایک دم تاڑ گیا۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی ۔ ایک فرانسیسی ڈپلومیٹ نے یہ غلطی نوٹ کی تھی یا نہیں، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا مگر اور بہت سے لوگوں نے ہمیں اس وردی میں دیکھا تھا ۔ ہم مرحوم چاچا کے گھر سے نکلے تھے تو ایک پورا مجمع ہمارے راستے میں حائل تھا ۔ ان میں سے کسی نہ کسی کی نظر نے یہ فرق ضرور دیکھا ہو گا ۔ اس کے ساتھ ہی مجھے چاچا کی مزاحمت کا خیال آیا ۔ کیا انہوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ اصلی نہیں، نقلی پولیس ہے ۔ چنانچہ انہوں نے بھی بچانے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں اپنی جان دے دی تھی ۔ یوسف ثانی کی بات نے میرے اس شک کو یقین میں بدل دیا تھا کہ ہماری گرفتاری کے لئے آنے والے درحقیقت شکاری تھے جو ہم سے وہ نوٹ بک لینے آئے تھے۔

میں نے اس کی ٹوپی پر دھپ سے ہاتھ مار کے کہا "یار تم بھی کمال کی چیز ہو ۔ کہاں چھپے بیٹھے تھے اتنی دیر سے؟"

وہ چلایا "ارے ارے یہ آپ نے کہاں وار کر دیا ۔ سرا

میاں کو خوار کر دیا ۔ یہ کیا غضب آپ نے میرے سرکار کر دیا؟"

میرے ساتھ رابعہ بھی ہنس پڑی کیونکہ دھپ سے ٹوپی کچھ دب گئی تھی ۔ کچھ نیچے اتر کے اس کی پیشانی سے آگے آنکھوں تک پہنچ گئی تھی اور اس کا پھندنا جو شاید اس نے حال ہی میں گوند سے چسپاں کیا تھا ایسے الگ ہو گیا تھا جیسے ہو ٹوٹتے ہی چھپکلی کی دم الگ ہو جاتی ہے ۔

میں نے کہا "سوری یار، میرا مقصد دل آزاری نہیں تھا۔"

اس نے بڑے دکھی لہجے میں کہا "اب آپ سے کیا بات چھپائی ۔ والد مرحوم کی ہے یہ نشانی ۔ آج ایک قوال نے کی مہربانی کہ بخش دیا یہ پھندنا لاثانی ۔ آپ نے پھیر دیا اس کے حسن پر پانی ۔"

میں نے کہا "چلو یار پھر جوڑ لینا ۔ یہ بتاؤ پہلے کہ سب لوگ کہاں گئے؟ ہم صبح سے پریشان ہو رہے ہیں ۔ رات تک تو کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی کہ مکان چھوڑنا پڑے ۔"

اس نے ٹوپی میں ہاتھ ڈال کے اسے سیدھا کیا اور پھر اپنے سر پر آہستہ سے جما کے پھندنے کو بڑے ملال سے دیکھتا رہا ۔ پھر ایک آہ بھر کے بولا "صبح دم سے کر رہا تھا انتظار ۔ آپ کا یہ خاکسار.... مگر آپ شتر بے مہار، جیپ میں ہو کے سوار ۔ اندر تشریف لے گئے بے اختیار ۔ پھر آیا وہ گورا ابکار اور آپ فرمانے لگے اس سے تکرار ۔"

"اور ہم پر فریفتہ ہوئے دیوانہ وار۔" رابعہ نے لقمہ دیا ۔

میں ہنس پڑا "اس پر لعنت ہزار بار ۔ آپ کے دل میں ابھی تک ہے غبار ۔ معافی کا ہے یہ بندہ طلبگار ۔"

رابعہ بھی ہنسنے لگی "چلو کام کی بات کرو اس سے ۔ مسخری بعد میں کرو۔"

میں نے کہا "میاں یوسف ثانی! اب زیادہ مت تڑپاؤ ۔ یہ بتاؤ کہ ہمارے ساتھی کہاں چلے گئے ہیں؟"

وہ بولا "بس اب یہاں سے نکلئے ۔ مطابق میری ہدایات کے چلئے ۔"

میں نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "مگر یہ سب غائب ہو کیسے گئے؟"

"اچانک تو انتقال پر ملال ہوتا ہے سر ۔ اس بات کا تو بہت پہلے سے تھا ڈر۔" یوسف ثانی نے کہنا شروع کیا "کل رات جب آئی یہ خبر کہ آ رہا ہے وہ جس کا ہے یہ گھر ۔ تو کیا کرتے جو رہتے تھے یہاں پر ۔ سوائے اس کے کہ باندھ لیں بستر، ورنہ سب ہی ہو جاتیں گے اندر ۔ پس محمد خان نے کہا مجھ سے کہ اے بشر اب کوئی دوسرا ٹھکانا تلاش کر ۔ یہ بندہ حقیر تو ہے سب کا نوکر ۔ کیسے ہونے دیتا سب کو در بدر ۔ ڈالی اس شہر پر ایک طائرانہ نظر ۔ تو دیکھا ایک مقام خوب تر ۔ جہاں رہ سکتے تھے بے خوف و خطر ۔ وہیں ہیں سب قصہ مختصر ۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "یوسف ثانی! کوئی قافیہ بچا ہے تو تمہیں اجازت ہے ۔ عرض کرتے رہو ۔"

رابعہ نے کہا "کیسے بد ذوق آدمی ہو ۔ داد نہیں دے سکتے۔ کیسے شاعرانہ پیرائے میں بات کرنے والا آدمی ملا ہے ۔ کوئی بے ربط یا فضول بات نہیں کی اور جو ضروری تھا، سب کچھ کہہ دیا لیکن قافیہ تنگ نہیں ہوا ۔"

میں نے کہا "اسے اگر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اپنا نمائندہ بنا کے بھیج دیا جائے تو اس کی تقریر ختم ہو گی نہ قافیے ۔ اجلاس ختم ہو جائے گا ۔ ممکن ہے اقوام متحدہ ہی ختم ہو جائے۔"

یوسف ثانی کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ کسی بات کا برا کبھی نہیں مانتا تھا ۔ عرف عام میں اسے ڈھیٹ ہونا بھی کہتے ہیں ۔ مرد ہلاؤں پر کلام نرم و نازک بے اثر ۔ وہ مرد بلاؤں تو تھیر نہیں تھا مگر ڈھیٹ بلا کا تھا ۔ راستے میں اس نے میری ناقدری کی پروا کئے بغیر مجھے اپنی بے مہار شاعری میں ہدایات دینے کا عمل جاری رکھا اور بالآخر مجھے اس جگہ پہنچا دیا جہاں محمد خان کا نیا ٹھکانا تھا ۔ اپنے دوستوں سے پھر ملنے کی مجھے جتنی خوشی ہوئی، اس سے زیادہ یوسف ثانی کی قافیہ آرائی سے بچ جانے کی ہوئی۔

محمد خان باہر ہی ٹہل رہا تھا ۔ یہ ایک بہت قدیم طرز کی حویلی تھی جس کو باہر سے دیکھ کر مقبروں کی ویرانی، قدیم قلعوں کی پراسراریت، شان و شوکت کی بے ثباتی کا تصور ابھرتا تھا ۔ معلوم نہیں یہ تاریخی عمارت کس کی ملکیت تھی اور کب سے مکینوں کے انتظار میں تھی ۔ اس کی بیرونی دیوار سلامت تھی مگر اس کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ رہا تھا ۔ احاطے کے اندر کا باغ ایک جنگل سا بن گیا تھا ۔ اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار اپنا گھر یاد آیا جو رابعہ نے پھر خرید لیا تھا ۔ شاید ایسی ہی پر آسیب فضا وہاں بھی آتے جاتے لوگوں کو اپنا فسانۂ عبرت کہتی ہو گی ۔ مجھے نواب خسرو جمشید کا آبائی محل یاد آیا جو اب ایک جل کے خاکستر ہو جانے والا کھنڈر تھا۔

جب محمد خان نے کہا "اتنی دیر کیوں ہوئی؟ قسم اللہ کی، میں تو پریشان ہو گیا۔"

میں نے برہمی سے کہا "یہ کیا طریقہ ہے خان صاحب؟ راتوں رات ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"

محمد خان مسکرایا "یہ تو ہوتا رہتا ہے ۔ مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں ۔ چلو اندر چلو ۔"

غالب اور محسن گھٹنوں سے اونچی خشک گھاس کے درمیان پتھر کی بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے "ادھر ادھر آ جاؤ" محسن نے کہا۔

میں نے آواز پر پلٹ کے دیکھا تو جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان ان کی جھلک سی نظر آئی ۔ وہ جس بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے اس کے سامنے ایک شکستہ خشک فوارہ تھا ۔ آس پاس گرے ہوئے

www.paksociety.com

اسی نوع کے دوسرے حشرات الارض پریشان پھر رہے تھے کہ یہ دو ٹانگوں پر چلنے والے جانور کہاں سے آ گئے۔

غالب نے کہا "کیسے پھول لہلہا رہے ہیں اور فوارہ چلنے سے تو لطف دوبالا ہو گیا ہے" پھر وہ دونوں بکی بکی کر کے ہنسنے لگے۔

میں نے کہا "کیا تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہے؟"

غالب نے کہا "تم بھی چھوڑ دو اپنی عقل کو۔ گھاس بہت ہے۔"

میں نے کہا "مجھے بات کرنی تھی تم سے۔"

غالب ہنسا "صرف تم سے بات کرنی ہے تو یہ محفوظ ترین مقام ہے۔ یہاں وہ نہیں آئیں گی۔ دونوں بلائیں۔"

"کیونکہ یہاں کرکٹ، چھپکلی جیسے خونی درندے پھر رہے ہیں۔ اندر انہیں بھوت وغیرہ نے پریشان کر رکھا تھا اور انہوں نے ہمیں پھر ہم کیا کرتے؟" محسن بولا۔

میں نے اندر جاتے ہوئے کہا "ابھی بتاتا ہوں جا کے کہ غالب تمہیں بلا کہہ رہا تھا۔"

"ہاں، کہہ دو۔ میں کوئی ڈرتا ہوں" غالب سینے پر ہاتھ مار کے بولا "اور یہ بھی کہہ دینا کہ ہمت ہے تو یہاں آ کے بات کرے۔"

رابعہ پہلے ہی اندر جا چکی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ محسن اور غالب جان بوجھ کے نازو اور گل کو پریشان کرنے کے لئے اس اجاڑ جگہ پر آ بیٹھے ہیں۔ محمد خان میرے انتظار میں تھا۔

"مجھے اس شاعر بے مہار نے بتا تو دیا ہے کہ تمہیں رات کو اچانک وہ جگہ چھوڑنی پڑی اور صبح میری اصل مالک سے بھی خاصی نوک جھونک ہوئی۔"

"وہ ملا تمہیں!" محمد خان حیران ہو کے بولا "قسم اللہ کی، مجھے نہیں معلوم۔"

"ہاں۔ مجھے بچالیا اس سوزی نے اور میری فریج نے۔ اسے بچالیا اس کی بیوی نے، ورنہ گڑبڑ ہو جاتی۔ وہ سخت پریشان تھے کہ ان کا تمام سامان کیسے غائب ہو گیا۔ تم سب اٹھا لائے؟"

"قسم اللہ کی مجبوری تھی۔ یہاں کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اسے سب کچھ مل جائے گا" محمد خان نے دروازہ کھول کے کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہو گیا اچانک کہ وہ آ رہا ہے؟"

"بھئی اتنا باخبر تو رہنا پڑتا ہے" محمد خان نے اندر جانے کے بعد ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا "ابھی سب کمرے رہائش کے قابل نہیں تھے۔ اس میں تم لوگوں کے لئے انتظام کر دیا ہے۔"

"اور تمہارے ساتھی؟"

"وہ بھی یہیں ہیں مگر وہ آرام دہ وہاں تھا، یہاں نہیں ہے۔ چند دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ہمارا مطلب ہے 'روم سروس' جیسی واہیات تھی کہ بغیر دبائے ہی چیز حاضر۔ وہ یہاں نہیں ہے؟"

"ہاں۔ ویسے کمانے پینے کی کسی چیز کی کمی نہیں البتہ تم بھی کچھ کرنا پڑے گا۔ لڑکیاں کر سکتی ہیں، میں نے دیکھا ہے" محمد خان نے کہا اور دوسری طرف بڑھ گیا۔ بات مجھے اس سے بھی کرنی تھی لیکن میں نے بہتر سمجھا کہ پہلے گل اور نازو سے مل لوں۔

جیسے ہی میں نے اندر قدم رکھا، وہ تینوں چونک کے الگ ہو گئیں۔ ان کے درمیان نہ جانے کیا راز و نیاز ہو رہے تھے۔ تینوں سر جوڑے چپکے چپکے باتوں میں مصروف تھیں۔

مجھے دیکھتے ہی گل نے کہا "بھائی سکندر! یہاں بھوت ہیں۔"

"اچھا!" میں نے دلچسپی سے کہا "صرف بھوت، میرا مطلب ہے کہ یہ بیچلر بھوتوں کا ہوسٹل ہے؟ بھوتنی کوئی نہیں؟"

"مذاق سمجھ رہے ہو ہماری بات کو" نازو نے بگڑ کر کہا۔ رابعہ نے بھی سر ہلایا "واقعی سکندر۔ جو کچھ انہوں نے بتایا ہے مجھے......"

میں نے کہا "خدا کے واسطے! کیا تم چاہتی ہو کہ میں بھی ان دونوں کے ساتھ جا بیٹھوں۔ اپنی بات کرو۔ لعنت بھیجو بھوتوں پر۔"

"تمہیں کیا معلوم کہ رات کیا ہوا ہمارے ساتھ" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "اور جو ہمارے ساتھ ہوا، اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ بھوت ہم سے زیادہ اہم ہیں۔ رابعہ، تم سنو ان کی اور اگر یہ تمہاری سننا چاہیں تو ان کی مرضی۔ میں جا رہا ہوں باہر۔"

محسن اور غالب مجھے واک آؤٹ کرتا دیکھ کے بہت خوش ہوئے "آ گیا نا تو بھی آخر" محسن نے کہا۔

"وہ تو پاگل ہو گئی ہیں۔ بھوت کے سوا کوئی بات ہی نہیں کرتیں" میں نے گرو سے اٹی ہوئی بنچ پر بیٹھ کے کہا۔

"ہم بھی پاگل ہو جاتے اگر یہاں پناہ نہ لیتے۔"

"کیا تمہیں کوئی بھوت نظر نہیں آیا؟" میں نے کہا "کیا واقعی کچھ چکر ہے یہاں؟"

"ہے تو سہی یار" محسن سر کھجا کے بولا "مگر اب ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ وہ پرانے رہنے والے ہیں۔ انہیں کیسے نکالیں یہاں سے۔ غالب نے بھی کہا کہ چند دن کی بات ہے۔ مل جل کے رہ لیں گے۔"

ان کی باتوں سے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کس حد تک سیریس ہیں۔ میں نے جیب سے غیر ملکی سگریٹ نکال کے کہا "لو تم بھی عیش کرو۔ مال غنیمت میں سب کا حصہ برابر ہوتا ہے۔"

محسن نے نعرہ لگایا "ابے یہ غیر ملکی سگریٹ کہاں مارے؟"

میں نے متانت سے کہا "مارے کیا مطلب؟ فرانسیسی سفیر نے تحفے میں دیئے ہیں۔"

"اور یہ وردی کیا پولیس کمشنر کا تحفہ ہے؟"

میں نے انہیں مختصراً رات بھر کے واقعات سے آگاہ کیا۔ محسن کے سامنے مجھے بہت محتاط رہنا پڑا۔ میں نے نہ شہلا کی تصویر کا ذکر کیا اور نہ اس کے بچے کا۔ یہ بہت مشکل کام تھا۔ میری نظر میں پھر وہ منظر تازہ ہو گیا تھا جب میں نے انہیں دیکھا تھا لیکن میرے لئے یہ جھوٹ بولنا بہت ضروری تھا۔ محسن کی حالت اتنی اچھی تھی کہ وہ بالکل پہلے والا محسن نظر آتا تھا۔ اگر میں اسے حقیقت بتا دیتا تو شاید یہ صدمہ اس کے ذہنی توازن پر ہی اثر انداز نہ ہوتا، اس کی جسمانی صحت کو بھی متاثر کرتا۔ رات بھر کے واقعات کو اختصار سے پیش کرتے ہوئے مجھے بارہا احساس ہوا کہ میں کامیابی سے جھوٹ بولنے میں ناکام ہوں اور محسن شک میں مبتلا ہو گیا ہے لیکن وہ میرا وہم تھا۔ غالب اور محسن دونوں ہی بڑے انہماک اور پوری توجہ سے ہر بات سن رہے تھے۔

"یہ تو عجیب بات ہے۔ اس سالے دلاور نے کیسے اغوا کرایا تم دونوں کو۔ اسے کیسے پتا چلا تمہارے پروگرام کا؟"

میں نے کہا "میں خود یہ نہیں سمجھ سکا۔ پہلے مجھے شک تھا اس کارٹون شاعر یوسف ثانی پر کہ یہ ڈبل ایجنٹ ہے مگر ایسی بات نہیں۔ اسے محمد خان صاحب کو خود پر ضرورت سے زیادہ ہی اعتماد تھا کہ کسی کو ان کے ٹھکانے کا علم نہیں ہو سکتا۔ انہیں معلوم تھا....."

"کسے معلوم تھا؟"

میں نے کہا "خان کے ساتھیوں میں کوئی مخبر ہے۔ یا پھر دلاور اپنے وسائل رکھتا ہے۔ معلومات حاصل کرنے کے لئے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ رات کو اچانک کسی نوٹس کے بغیر روانگی کا یہی مقصد ہو" غالب نے کہا "کہ تریوچی کو چکمہ دے کے چلے جائے؟ اگر اسے ایک ٹھکانے کا علم ہو گیا تھا تو دوسرے کا پتا چلانے میں وقت لگے گا اور پھر ایسا ہو گا تو خان اسی طرح دوبارہ غائب ہو جائے گا۔ آنکھ مچولی جاری رہے گی" محسن بولا۔

میں نے کہا "ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔ خان صاحب کسی ڈپلومیٹ کے گھر میں چھپے ہوئے تھے۔"

"یہ ایک احمقانہ اور خطرناک حرکت تھی۔ ڈپلومیٹ عام آدمی نہیں ہوتا" غالب نے کہا۔

"خان کو یہ پہلے سے معلوم ہو گا کہ وہ کتنے دن کے لئے گیا ہے اور کب واپس آئے گا۔ اس کی واپسی سے پہلے وہ جگہ چھوڑنی ضروری تھی لیکن وہ آخری وقت تک سکون سے بیٹھا رہا۔"

... دو بجے اعلان کر دیا کہ مرزا جی اٹھو اب کوچ کرو۔

غالب نے کہا "سوتے سے جگا کے یہ خوشخبری سنائی۔"

"ہم نے کہا کہ ایسی کیا آفت آ گئی ہے۔ تو ہمیں ڈانٹ دیا کہ بحث کے لئے وقت نہیں ہے۔ چلو" محسن بولا "میں نے کہا کہ ان دونوں کا کیا بنے گا جو یہاں واپس آئیں گے تو دیکھیں گے کہ نہ چمن ہے نہ آشیانہ اور ویرانے میں الو تک نہیں بول رہے ہیں۔"

غالب نے کہا "احتجاج میں نے بھی کیا تھا مگر اس نے کہا کہ ان کی فکر مت کرو۔ وہ تمہارے دوست ہیں تو میرے مہمان بھی ہیں اور میں نے پورا بندوبست کر لیا ہے۔ وہ جب بھی لوٹیں گے ہمارے پاس آ جائیں گے۔ ظاہر ہے، اس کے بعد میں خاموش ہو گیا۔"

"نازو اور گل بھی بہت برہم تھیں کہ یہ کیا آدھی رات کو کوچ کا بگل بجا دیا۔ جانا تھا کہیں تو رابعہ اور سکندر کو بھی بتا دیتے۔ انہیں بھی خان نے یہی جواب دیا کہ تم لوگ صرف باتیں کرتے ہو۔ شک کرتے ہو اور اعتراض کرتے ہو۔ باقی سب کو احمق سمجھتے ہو۔ میرے دم سے ہی ان دونوں کو حفاظت اور سلامتی کی ضمانت حاصل ہے اور وہ صبح خیریت کے ساتھ نہ آئیں تو پھر مجھے الزام دینا۔"

میں نے کہا "اس میں تو کوئی شبہے کی بات نہیں۔ یہ محمد خان ہی تھا جس کی وجہ سے ہم محفوظ رہے۔ دلاور، پیڈرو اور وہ پاپی عبداللہ..... سارے شیطانی لشکر کے شکاری اکٹھے تھے مگر وہ ہمیں شکار نہ کر سکے۔ انہوں نے ہمیں بڑا عیاشی تو احتیاط کے ساتھ۔ ذلیل بہت کیا۔ ذہنی اذیت جتنی دے سکتے تھے، دی۔ مگر محمد خان نے کچھ ایسا بندوبست کیا تھا کہ وہ صبح سے پہلے ہماری بخیر و عافیت واپسی کی شرط پوری کرنے کے پابند تھے۔"

"تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا اس نے؟"

"نہیں۔ میں نے اس سے کہا ضرور تھا کہ دلاور سے ہماری ملاقات کراوے اور تریوچی سے ہمارے زندہ سلامت واپس لوٹ آنے کی ضمانت حاصل کرلے۔ معلوم نہیں، اس نے کیا بندوبست کیا تھا۔ اس سے پوچھوں گا موقع ملنے پر" میں نے کہا۔

"خان بہت گہرا اور پراسرار آدمی ہے" غالب نے کہا۔

محسن نے اس کی تائید کی "رات دو بجے میں نے کہا کہ یہ نقل مکانی کیا سہولت کے ساتھ دن میں کسی وقت نہیں ہو سکتی تھی۔ تو مجھے اس نے جواب دیا کہ یہ رازداری کا تقاضا ہے۔"

"اور مجھ سے کہا کہ دن میں کہاں جاتے۔ ٹھکانا ہی کوئی نہیں تھا۔ ابھی ابھی ایک جگہ کا پتا چلا ہے جو ہمارے مطلب کی ہے" غالب نے کہا۔

"میں نہیں مانتا کہ آدھی رات کے بعد اسے یہ جگہ ملی تو

www.paksociety.com

اس نے فوراً سامان اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ سب پہلے سے طے شدہ تھا مگر خان کے سوا کسی کو بھی اس کے پروگرام کا علم نہیں تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ کسی پر بھروسا نہیں کرتا۔"

میں نے کہا "مجھے تو یوسف ثانی نے ایک نظم سنا کے مطلع کیا کہ خان صاحب نے نئے ٹھکانے کی تلاش پر اسے مامور کیا تھا اور اس نے یہ جگہ دیکھ کے خان سے کہا کہ چلئے نیا گھر آباد کیجئے۔"

"یوسف ثانی پرائیوٹ ایجنٹ ہے؟"

میں نے کہا "وہ سب کچھ ہے۔ یہ پوچھو کیا نہیں ہے۔ بقول خان 'وہ الہ دین کے چراغ کے جن سے زیادہ مستعد ہے۔'"

"وہ آیا تو تمہارے ہی ساتھ تھا۔ پھر کہاں گیا؟"

میں نے کہا "یہ تو میں نے بھی نہیں دیکھا۔ کہیں غائب ہوگیا بغیر بتائے۔"

"وہ نوٹ بک کہاں ہے جس میں خفیہ زبان لکھی ہوئی ہے؟"

میں نے نوٹ بک پیش کی اور انہوں نے اسے باری باری ملاحظہ کیا۔ اسے سمجھنے کے لئے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائے جو بحرِ ظلمات میں بھٹکتے رہ گئے۔ اس نوٹ بک کی بے سروپا عبارت سے کوئی مربوط تحریر اخذ کرنا اتنا آسان بہرحال نہیں تھا۔ غالب اور محسن مجھ سے پروہت کے بارے میں اور اس کے قتل کی واردات کے پیچھے خفیہ ہاتھ کے بارے میں پوچھتے رہے۔ میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ میرے کسی جواب میں غلطی سے بھی اس تصویر کا حوالہ نہ آنے پائے جو شملا کو ایک شیشے کے تابوت میں بند کرنے کے بعد اتاری گئی تھی۔ مدھو سودن اور کیرتی کا ذکر کرتے ہوئے بھی میں اس احتیاط سے دستبردار نہیں ہوا۔ اب دھوپ سر پر آگئی تھی اور تمازت ناقابلِ برداشت ہونے لگی تھی۔

میں نے کہا "اس بھوتوں کے ڈیرے میں نہانے دھونے کا کوئی بندوبست ہے؟"

"ہاں۔ پرانے وقتوں کے ایک باتھ روم میں ہینڈ پمپ ہے۔ چلائیے اور غسل فرمائیے۔ ورزش کے فوائد بونس میں۔" غالب نے کہا۔

"یہ محل ہے کس کا اور بھوتوں کا کیا چکر ہے؟ اس کی بھی کوئی اسٹوری ہوگی۔ پرانے مکینوں کی روحیں تو نہیں ہیں؟"

محسن نے کہا "ایک سانس میں تو نے اتنے سوال کرڈالے۔ ارے بھائی! ہم خود یہاں آدھی رات کو وارد ہوئے تھے۔ دس گھنٹے میں اتنی تاریخی ریسرچ کیسے کرسکتے تھے؟ رہیں گے تو کچھ معلوم ہوہی جائے گا۔"

غالب نے کہا "بھوت البتہ ہیں۔ میری تو ان سے سلام علیک نہیں ہوئی لیکن خواتین سے انہوں نے خاصی چھیڑ چھاڑ کی۔"

"بہت لوفر قسم کے جن ہیں" محسن بولا۔

"حسن پرست اور عاشق مزاج ہیں یار" غالب نے کہا۔ "ہماری طرح۔"

"ہم جن نہیں' بھوت ہیں" محسن بولا۔

میں نے کہا "یار! اگر وہ جنات عاشق ہوگئے خواتین پر۔ جیسے کہ یہ اکثر ہوجاتے ہیں تو ہم کیا کریں گے؟ آخر خواتین کو یہ وہم ہوا کیسے؟"

"وہم! بھائی ایک جن خود نازو نے دیکھا۔ تم تو جانتے ہو وہ کوئی وہمی لڑکی نہیں ہے۔ میں نے مذاق اڑایا اور کہا کہ کہیں میرے سسر تو نہیں تھے۔ اب ملیں تو مودبانہ سلام عرض کرنا میرا۔ وہ اگر لڑکا دیکھنا چاہیں تو میں حاضر ہوں۔ بس وہ بگڑ گئی۔"

غالب نے کہا "تم جانتے ہو اس کا بگڑنا۔"

میں نے کہا "ہاں' اس نے تمہاری خراب صحت کا لحاظ بھی نہیں کیا' زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟"

غالب جھینپ کر مسکرانے لگا "بس بال بال بچ گیا۔"

محسن نے اسے حقارت سے دیکھا "صاف بچ جاتا اگر تم ہی لیٹ گئے تھے۔ چلانے لگے تھے کہ جنیوا کنونشن کے تحت بیماروں پر دست درازی کی ممانعت ہے۔ تمہاری آہ و زاری کا بھی اس پر اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ تمہیں لٹوانا چاہتی تھی سسر سے مگر گل نے جان بچالی تمہاری۔"

میں نے کہا "گل نے کوئی جن بھوت نہیں دیکھا؟"

"اس نے تو حد کردی۔ ایک بھوت کے بارے میں اس کا بیان ہے کہ سرکس کے جوکر کی طرح ہوا میں الٹی قلابازیاں کھا رہا تھا۔ دوسرے کو اس نے دیکھا کہ تربوز کی طرح گول تھا۔ پھر گھڑی کی طرح لمبا ہوا اور ربڑ کی طرح کھنچ گیا اور نظروں سے غائب ہوگیا۔" محسن بولا۔ "میں نے کہا کہ تم بھی شامل ہوجاؤ اس سرکس میں۔ اچھا وقت گزرے گا۔ تب سے روٹھی ہوئی ہے۔"

"اچھا۔ اسی لئے تم دونوں یہاں سڑ رہے ہو دھوپ میں۔"

میں نے کہا "میں کیوں بیٹھا ہوں یہاں۔ جاکے نہاؤ دھوؤ۔ صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔"

اسی وقت گل نے باہر آکے چلانا شروع کیا "غضب! کیا بات ہے 'اندر نہیں آؤ گے؟ ناشتا بھی نہیں کرو گے؟'"

نازو نے چلا کے محسن سے کہا "دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟ سیدھی طرح اندر آجاؤ' ورنہ"

"دیکھا کیسی چالاک ہیں دونوں" محسن نے کہا "نازو نے غالب سے بات نہیں کی۔ گل نے مجھ سے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے بھئی۔ تم عیش کرو" اور اٹھ کے اس جھاڑ جھنکاڑ سے باہر آگیا۔

"بھائی سکندر! سمجھا دو ان دونوں کو" گل نے کہا۔

میں نے کہا "اپنی لعنت بھیجو دونوں پر۔ چلو ہم اندر چل کے ناشتا کرتے ہیں۔ بھوکے رہیں گے تو خود آئیں گے' ورنہ گھاس کھائیں گے۔"

گل کی شکل رونے والی ہوگئی۔ نازو سمجھ گئی کہ میں اس مشن میں ان کی مدد کے نیک جذبے سے گریز کررہا ہوں۔

اس نے پھر محسن سے کہا "اب باہر آتے ہو یا نہیں؟"

محسن بولا "تم آجاؤ یہاں۔ گرگٹ اور نیولے تمہیں کھا تو نہیں جائیں گے۔"

غالب نے کہا "ورنہ جو کہنا ہے' وہیں سے کہہ دو۔"

"محسن! سنا نہیں' میں کیا کہہ رہی ہوں؟" نازو نے کہا۔

"نہیں سنا۔ جاؤ' جو کرنا ہے کرلو۔ ہم بہرے ہیں۔"

نازو نے ایک پتھر اٹھایا پھر دوسرا۔ اس کا نشانہ خاصا صحیح رہا۔ گل نے اس کی تقلید کی۔

"ارے۔ رے۔ ارے پاگل ہوگئی ہو۔ یار سکندر' پکڑنا اس بھوت کی بچی کو" غالب نے گھاس میں ادھر ادھر رول لگاتے ہوئے کہا۔ ایک پتھر اس کی کمر پر لگا تو وہ بلبلایا۔

"اے گل! یہ کیا ہورہا ہے؟ سنگسار کرے گی مجھے! ابھی آجاؤں گا بھوت بن کے۔ بھوت سرکس میں۔" محسن نے خود کو پتھروں کی یلغار سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ایک چھوٹا سا پتھر اس کی گردن پر بھی لگا۔ پتھروں کی دہائی بھی نہیں تھی بالآخر ان دونوں کو باہر آنا پڑا۔ گل نے غالب کو اور نازو نے محسن کو مجبور کردیا۔

غالب نے کہا "اچھا' میں آتا ہوں لیکن میں ایک گرگٹ کے ساتھ آرہا ہوں۔"

"اور میں ایک نیولا ساتھ لے کر آؤں گا۔"

وہ دونوں ہنسنے لگیں "تم میں سے کون نیولا ہے اور کون گرگٹ؟" میں نے ان سے ایک منطقی سوال کیا۔ رابعہ اور خان میرے پیچھے کھڑے مسکراتے رہے۔

محمد خان اور اس کے ساتھی نہ جانے کدھر غائب ہوگئے تھے۔ میں نے اپنے کمرے میں جاکے دیکھا تو عجیب بے سروسامانی تھی۔ ادھڑے ہوئے فرش پر بستر لگادیئے گئے تھے اور ہمارے سامان کے سوٹ کیس بوسیدہ دیواروں کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر شاید بیس سال سے رنگ نہیں ہوا تھا۔ پرانا زرد رنگ میلا ہورہا تھا چنانچہ سب لائٹس جلانے کے باوجود اجالا کم محسوس ہوتا تھا۔

جتنی دیر میں غالب اور محسن کے ساتھ باتوں میں مصروف رہا تھا' رابعہ نے گل اور نازو کو رات بھر کے واقعات کا سنانے کے علاوہ بھوتوں سے ملاقات کے سنسنی خیز واقعات بھی سن لئے تھے اور پھر ہینڈ پمپ والے غسل خانے میں نہا دھو کے کپڑے بھی بدل لئے تھے۔ میں خود چاہتا تھا کہ اب پولیس کی وردی اتار کے انسان بن جاؤں۔

رابعہ نے باتھ روم تک میری رہنمائی کی "خیال رکھنا۔ اندر کہیں بھوت نہ آجائے' بھوت سے بچئے۔"

میں نے سہم کے کہا "اچھا' تو تم ساتھ ہونا۔ مجھے ڈر لگتا ہے" اور اس کا ہاتھ پکڑلیا۔

"ہٹو۔ بے شرم" رابعہ نے اپنا ہاتھ چھڑالیا اور بھاگ گئی۔ اس کے شرمانے اور مسکرانے کی ادا نے میرے دل کا قیمہ کردیا۔

گل اور نازو نے بڑی محنت سے ناشتا بنایا تھا اور بہت بنایا تھا مگر جب ہم کھانے بیٹھے تو سب چٹ کرگئے۔ کسی کو خیال ہی نہیں آیا کہ تکلف اور خدمت گزاری میں لڑکیوں نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔

جیسے ہی مجھے اس کا احساس ہوا میں نے سب کو ڈانٹا۔ "سب ادب آداب بھول گئے ہو شریف آدمیو۔ اصول ہے کہ لیڈیز فرسٹ۔"

"بھاڑ میں گیا شریف آدمی۔ کون ہے ان میں لیڈی؟ وہ جس نے میری کمر پر سوا سیر کا پتھر مارا تھا" غالب نے نازو کو آنکھیں نکال کے گھورا۔

"نشانہ چوک گیا تو میں کیا کروں" نازو نے بھی جواب میں اسے گھورا "میں نے تو سر پر مارا تھا۔ تم آرام سے نہیں کھڑے رہ سکتے تھے۔"

"اور اسے دیکھو۔ نام ہے گل اور پھینکتی ہے شرفا پر پتھر" محسن نے کہا "یقیناً میرا منکا ٹوٹ چکا ہے گردن کا۔ دیکھو سر کیسے ہل رہا ہے" اس نے سر کو دائیں بائیں ہلا کے دکھایا۔

میں نے کہا "چلو جھگڑا ختم۔ صلح کرلو۔"

نازو نے کہا "غالب کو ماننا پڑے گا کہ یہاں بھوت ہیں۔"

گل نے سر ہلایا "اور محسن کو بھی۔"

غالب نے کہا "بابا' میں نے کب انکار کیا تھا۔ بھوت تو ہے جیسن ہے وہی۔"

نازو لپک کے اٹھی "میں بتاتی ہوں تمہیں کہ وہ کون ہے۔"

غالب چھلانگ لگا کے میرے پیچھے آگیا "خود تم نے ہی بتایا تھا اس کا حلیہ۔ اس سے وہ میرا سسر ہی ثابت ہوتا ہے اور میں اپنے سسر کو جن کہوں یا بھوت' تم کیوں چڑتی ہو۔ تم دس دفعہ کہو اپنے سسر کو بھوت۔ مجھے کیا۔ زبردستی گلے کیوں پڑ رہی ہو میرے؟"

ہم سب ہنسنے لگے تو نازو کا چہرہ جو پہلے شرم سے گلابی ہوا تھا' غصے سے لال ہوگیا۔ اس نے پیر پٹخ کر گل سے کہا "چلو گل' اٹھاؤ یہ برتن۔ مل کے دھو لیتے ہیں۔ تم نل چلانا' میں برتن صاف کرلوں گی۔"

www.paksociety.com

"ہائے ہائے۔ برتن بھی دھونے پڑیں گے بے چاریوں کو۔ ان کی حیثیت تو واقعی کنیزوں جیسی ہو گئی۔" محسن بولا۔

میں نے کہا۔ "تمہاری بک بک کی سزا یہ ہے کہ تم جاؤ گل کے ساتھ برتن دھلواؤ۔"

"چلو غلام!" گل نے بڑی شوخی سے حکم دیا۔ میرا مقصد گل اور محسن کو کچھ دیر کے لئے رخصت کرنا تھا تاکہ میں باقی سب کو شملا کے بارے میں بتا سکوں۔ اس طرح گل اور محسن کی صلح بھی ہو جاتی اور باتوں میں غالب اور نازو بھی اپنا جھگڑا بھول جاتے لیکن گل کی تو دل کی مراد بر آئی۔ محسن کا چہرہ اتر گیا مگر اسے جانا پڑا۔ عمارت میں انڈر گراؤنڈ ٹینک بھی تھا اور وہ بھی لیکن برسوں سے استعمال نہیں ہوا تھا چنانچہ پانی کی موٹر بھی زنگ لگنے سے جام ہو چکی تھی۔ غالب نے بتایا کہ ہینڈ پمپ بھی خراب پڑا تھا مگر اسے کسی نے تیل ڈال کے چلا دیا تھا۔

میں نے کم سے کم الفاظ میں غالب اور نازو کو شملا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ صدمہ غالب کو بھی شدید پہنچا مگر نازو کا تو رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس کا جسم ٹھنڈا ہو کر کانپنے لگا۔ "شملا باجی..... کوٹ میں..... بچے کے ساتھ!" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس پر خوف کا ہسٹریا غالب آنے لگا تھا۔ غالب نے اسے فوراً سنبھال لیا "اے نازو! یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے نازو کو جھنجھوڑا اور پھر اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا۔ نازو ایک جھٹکے سے ہوش میں آ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"خدا کے واسطے نازو! ابھی وہ دونوں آ جائیں گے۔" غالب نے کہا۔

اگرچہ مجھے امید تھی کہ گل برتن دھونے کے بجائے محسن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کرے گی مگر میں نے بھی کہا۔ "عقل سے کام لو نازو۔ سوچو محسن کا کیا حال ہو گا اگر اسے یہ بات معلوم ہو گئی؟"

غالب نے نازو کے دوپٹے سے اس کے آنسو صاف کئے۔ "اتنا ظلم مت کرو مجھ پر۔ میں تمہیں روتا نہیں دیکھ سکتا نازو۔"

رابعہ میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "میں کیا کروں غالب؟ لگتا ہے میرا دل پھٹ جائے گا۔"

غالب نے کہا۔ "پاگل۔ ابھی کچھ ہوا تو نہیں ہے شملا کو۔ ہم سب مل کے اسے بچا لیں گے۔"

نازو نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور ایک لمبی گہری سسکی لی۔ کچھ دیر پہلے دشمنوں کی طرح لڑنے والے اب سراپا ناز و نیاز تھے اور ہماری موجودگی کو بھی بھولے ہوئے تھے۔

میں نے کہا۔ "ہمت سے کام لینا ہو گا ہم سب کو۔ لو یہ ایک بہت کٹھن کام ہے۔ معلوم نہیں آگے کیا ہو۔ اس سے بھی زیادہ سخت آزمائش کا سامنا ہو۔ جذبات کو ہمارے مقصد کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہئے۔ ہم شملا کو بچانے کے لئے جان کی بازی بھی لگا دیں گے کیونکہ وہ محسن کی جان ہے۔ لیکن محسن کو بچانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔"

"ہم محسن کو دھوکے میں رکھیں گے؟ آخر کب تک؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "جب تک ہم شملا کو حاصل نہیں کر لیتے۔"

"اور اگر......"

میں نے کہا۔ "اس سے آگے مت سوچو کیونکہ سوچ کی اس خندق میں بڑے خونی عفریت نظر آتے ہیں۔ سفاک اور دہشت زدہ کر دینے والے خیالوں کے عفریت۔ ان سے اپنے آپ کو بچاؤ تاکہ ہم ٹھنڈے دل اور دماغ کے ساتھ۔ امید کے ساتھ اور نیک خواہشات کے ساتھ ہر قدم اٹھانے کے قابل ہوں۔"

نازو سر جھکائے بیٹھی رہی۔ رابعہ سپاٹ دیوار کو گھورتی رہی۔ غالب اپنے ناخنوں کو کاٹتا رہا۔ ہم سب کے لئے نہ سوچنا ممکن نہیں تھا اور جو کچھ ہم سوچ رہے تھے وہ دوسروں سے چھپانا چاہتے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسا ہی دوسرے بھی سوچ رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ اپنے اپنے دکھی دل تھے۔ اپنا اپنا احساس جرم و بے بسی تھا اور اپنی اپنی مجبوریاں تھیں۔ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ کل کیا ہو گا اور کیسے ہو گا۔ صرف یہ چاہنے سے کہ ایسا نہ ہو کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ مستقبل کے اندھیرے میں کچھ دیکھنے کے لئے تصور بھی ناکام تھا۔

گل کی ہنسی پر ہم سب سنبھل گئے۔ وہ کام ختم کر کے آ رہے تھے۔

محسن نے کہا "ورزش اچھی ہے۔ آئندہ ہم ہی برتن دھوئیں گے۔"

گل کھلکھلا کے ہنسی "تمہیں تو بس بہانے کی تلاش تھی۔"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ نادان لڑکی۔ اس کھیل میں کتنی آگے نکل گئی تھی۔ قصور اس کا نہیں تھا۔ ہمارا تھا کہ ہم نے اسے سراب عطا کئے۔ اس راستے پر چلتے چلتے ایک دن اچانک اسے احساس ہو گا کہ وہ تنہا رہ گئی ہے۔ محسن تو شملا کے ساتھ اور اپنے بچے کے ساتھ اپنی دنیا بسانے کے لئے جا چکا ہے۔ ہم نے محسن سے کہا تھا کہ اس لڑکی نے بہت دکھ جھیلے ہیں۔ اسے یادوں کے پر عذاب ماضی سے نکالنے کے لئے اور اس کی تنہائی کے احساس کو مٹانے کے لئے اسے محبت دینا ہو گی۔ یہ بڑی مخلص لڑکی اپنے بھائی کے ساتھ ڈاکو بنی تھی اور رو اگروں میں رہی تھی۔ اس کو حالات کے گرداب سے نکالنا ضروری تھا۔ اس کا بھائی مرتے وقت ناگ منی کو ہمارے سپرد کر گیا تھا جسے ہم سب نے پھر گل بانو بنا دیا تھا اور اگرچہ محبت ہم سب نے کی تھی مگر سب سے زیادہ محسن نے کی تھی کیونکہ گل نے اسی سے محبت مانگی تھی اور محسن نے ہمارے مجبور کرنے پر اسے انکار نہیں کیا تھا۔ اب یہ کھیل بہت خطرناک ہوتا جا رہا تھا لیکن اسے ختم کرنے کی فوری طور پر کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ پہلے محسن اس سے ایک جھوٹ نبھاتا رہا تھا۔ اب ہم اس سے بڑے جھوٹ کو نبھانے پر مجبور تھے۔

ہم سب کی خاموشی محسن کو بہت خلاف توقع محسوس ہوئی "کیوں دوستو! ایسے رونی صورتیں بنائے کیوں بیٹھے ہو؟"

غالب نے ایک پرانا مذاق دہرایا "صورت ہی ایسی ہے بھائی۔"

محسن نے نازو کو دیکھا جس کی پلکوں پر آنسوؤں کی نمی اب بھی باقی تھی۔ وہ قہقہہ مار کے ہنسا "گویا رو دھو کے سب ہو چکا۔"

میں بھی زبردستی ہنسا "ڈراما تو پورا ہو گیا ہے شیروانی صاحب!"

"بہت ناشکرے ہو سب" گل نے کہا "آنسوؤں کی بھی قدر نہیں کرتے۔ یہ بھی ڈراما ہے تمہارے لئے۔ چل چھوڑ نازو۔"

محسن نے بھی کہا "چل چھوڑ غالب۔ جذباتی مت ہو۔ لڑکیاں تو موقع بے موقع آنسوؤں سے بلیک میل کرتی ہیں۔ بہت آنسو ہوتے ہیں ان کے اسٹاک میں۔"

میں نے کہا "چلو یار" اپنے مقبرے کی سیر تو کر لیں۔"

"ہاں چلو" شاید وہ بزرگ پھر مل جائیں غالب کو" محسن نے نازو کو چھیڑنے کی کوشش کی۔ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہم باہر نکلے تو سامنے سے محمد خان آتا دکھائی دیا۔ "کہاں کی تیاری ہے؟" اس نے خوشدلی سے کہا۔

میں نے کہا "کفن باندھے ہوئے بیٹھے کو یہاں سب یار بیٹھے ہیں۔"

خان نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا "قسم اللہ کی۔ ایسا مت کہو۔ ابھی تو جینے کھیلنے کے دن ہیں تمہارے۔"

میں نے کہا "ابھی تو زندگی ویسے ہی گزر رہی ہے۔ آج کے دن کی صبح دیکھ لی۔ یہ بھی غنیمت ہے۔"

اس نے کہا "ولاور سے ملاقات ہوئی؟"

میں نے کہا "ہاں" اس کا قرض چڑھ گیا۔"

"کیا مطلب؟ اس نے تو کوئی تحفہ دینے کو کہا تھا۔"

میں نے کہا "اس کا ہر تحفہ ایک دن اسے لوٹانا ہے۔ ذلت و رسوائی دل کے داغ اور روح کے زخم۔ عزت نفس کا خون اور ہمارے جذبۂ حب الوطنی کے منہ پر طمانچے یہی سب تحفے دیتا ہے وہ ہر ملاقات میں جن کا میرے پاس پورا حساب ہے۔"

"قسم اللہ کی؟" خان ایک دم سنجیدہ ہو گیا "مجھے بتاؤ" اگر تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہے۔ لو ادھر آؤ۔ اب وہ ہے میرا کمرا۔"

اس کا کمرا ایداری کا آخری کمرا تھا۔ اس کے اندر کا نقشہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا پرانی رہائش گاہ کے کمرے کا۔ وہ تخت پر بیٹھ گیا اور میں نے اس کے ساتھ بیٹھنے کو ترجیح دی۔ غالب اور محسن سامنے بیٹھ گئے تو میں نے اسے ابتدا سے انتہا تک اپنے ساتھ پیش آنے والے سارے واقعات بتا دیئے۔ درمیان میں کئی بار خان طیش میں آیا۔ اس نے ولاور کی ماں بہن کو یاد کرتے ہوئے بہت کچھ کہا لیکن میں نے اسے ٹھنڈا کر دیا۔

"میں تو شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا تمہارا۔"

"شکریہ؟" وہ حیران ہو کے بولا "کس بات کا؟"

"ہاں۔ تم نے بڑا اچھا انتظام کیا تھا ملاقات کا۔ ورنہ ہم بچ کے نہ آتے" میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ادا کرو کہ مجھے اطلاع پہنچ گئی۔ میں نے تو تمہیں ولاور سے ملاقات کے لئے نہیں بھیجا تھا اور نہ کوئی انتظام کیا تھا تمہاری حفاظت کا لیکن جیسے ہی مجھے معلوم ہوا کہ وہ تمہیں لے گئے ہیں' میں نے بھی دیر نہیں کی قسم اللہ کی۔"

میں نے کہا "تمہیں کیا فرشتوں نے اطلاع کر دی تھی؟"

وہ بولا "ہاں۔ فرشتہ کہو اسے یا کچھ اور۔ میں نے یوسف علی کو تمہارے پیچھے لگایا تھا۔ اس سے کہا تھا کہ دوری سے ان پر نظر رکھنا اور اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے فوراً بتانا۔"

میں بھونچکا رہ گیا "یعنی.... یہ سب معلوم تھا تمہیں؟"

"تمہارے اغوا ہونے تک کی رپورٹ میرے پاس تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ تمہیں کہاں لے جایا گیا ہے۔" محمد خان نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا "قسم اللہ کی' میں تو باجا بجا دیتا سب کا۔"

میں نے کہا "اس جو کرنے کیسے اندازہ کر لیا کہ ہمیں ولاور لے گیا ہے اور کہاں لے گیا ہے؟"

"یہ تو واقعی معلوم نہیں تھا لیکن اس نے ٹیلی فون کر کے بتایا کہ انہیں کوئی اغوا کر کے لے گیا ہے تو میں سمجھ گیا کہ ایسی حرکت ولاور کے سوا کون کر سکتا ہے۔ بس اسی وقت میں نے چار وفادار ساتھ لئے اور پہنچ گیا سید ماتریدی کی دکان پر۔ تیور تو پہچانتا ہے وہ میرے۔ میں نے ریوالور اس کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ قسم اللہ کی! اگر میرے مہمانوں کو کچھ ہوا تو سمجھ لو' تمہارا بھی کریا کرم ہو گیا۔ وہ اپنے کمرے میں تھا۔ میرا ایک آدمی گیٹ پر رک گیا۔ باقی تین نے اندر پوزیشن سنبھال لی۔ ترپاٹی پہلے تو بڑا اچھلا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ لیکن میں نے کہا کہ معلوم کرو بیٹے۔ ہم یہیں بیٹھے ہیں اور جانے کے ارادے سے نہیں آئے ہیں۔ جب تک ہمارے مہمان واپس نہیں آ جاتے' ہم بھی گھر نہیں جا سکتے۔ کوئی باہر نہیں جا سکتا۔

www.paksociety.com

اور اندر نہیں آسکتا۔ وہ کہنے لگا کہ دکان میں گاہک ہیں۔ میں نے کہا کہ انھیں ہم نے کچھ نہیں کہا اور تم نے بھی کچھ نہ کہنا تو وہ جیسے آئے تھے ویسے ہی چلے جائیں گے ورنہ قسم اللہ کی وہ بھی روک لئے جائیں گے۔ خیر' اس نے دکان کا دروازہ بند کر کے شیشے پر لٹکی ہوئی تختی کو الٹا دیا۔ ایک طرف لکھا ہوا ہے اوپن۔ دوسری طرف کلوزڈ۔ باہر کی لائٹس بھی میں نے بند کرا دیں۔ اکا دکا گاہک اندر آ گئیں۔ ویسے بھی دکان بند کرنے کا وقت تو ہو گیا تھا۔ گاہک رخصت ہو گئے تو چار سیلزمین رہ گئے

ترویدی نے کہیں فون کیا۔ پھر ایک سیلزمین کو کہیں بھیجا۔ دوسرے کو کسی اور سمت میں روانہ کیا۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ بیٹے 'اپنی زندگی اور اپنے لٹتے ہوئے کاروبار کا جوا مت کھیلنا میرے ساتھ۔ قسم اللہ کی' یہ سب ایک دھماکے سے اڑ جائے گا۔ میرے تین ساتھیوں نے اسے تین دستی بم دکھائے تو اس کا پیشاب خطا ہو گیا۔ ایک تو سالا بنیا ویسے بھی بزدل ہوتا ہے۔ پھر پیسہ آ جائے تو..... ہو جاتا ہے۔" خان نے ایک ناشائستہ مثال دے کے کہا۔ اس نے موٹی مرغی سے متعلق ایک محاورہ بھی بولا۔

میرے ساتھ غالب اور محسن بھی ہنس پڑے۔ "یہ تو آپ نے ٹھیک کہا خان صاحب۔ پیسے والے کی جان اس کے مال میں پھنسی جاتی ہے۔ جان لینی ہو تو مال لے لو۔"

خان نے کہا: "قسم اللہ کی' اگر وہ چالاک یا بہادر بننے کی کوشش کرتا تو مارا جاتا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میرے ریوالور میں چھ گولیاں ہیں۔ سب اتاروں گا اندر اور ہم یہ تین دستی بم اندر پھینک کر نکل جائیں گے۔ پولیس کے آنے تک تم پہنچ جاؤ گے پرلوک اور ہم ہوں گے اپنے ٹھکانے پر۔ خونی خان کے سائے کا بھی سراغ نہیں لگا سکتی پولیس۔ ترویدی بولا کہ میں دلاور کو تمہارے حوالے کر دیتا ہوں۔ میری طرف سے وہ جہنم میں جائے۔ اس کے ساتھ کاروبار ضرور ہے میرا۔ کوئی جنم جنم کا ساتھ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ قسم اللہ کی' تم جیسے دنیاوی معاملات میں بڑے سیانے ہوتے ہو۔ کاروبار پر دوستی کو اور رشتوں کو کتنی آسانی سے قربان کر دیتے ہو۔ خیر۔ کوئی آدھے گھنٹے میں پہلا سیلزمین لوٹ آیا۔ اس نے دلاور کا سراغ لگا لیا تھا۔ ترویدی نے وہیں میرے سامنے بیٹھ کے دلاور کو فون کیا۔"

میں نے کہا: "اچھا وہ تمہارا ہی فون ہوگا۔ وہ بات کرتے کرتے اٹھ کر گیا تھا۔ اور واپس آیا تھا تو اس کی ہوا کچھ نکلی ہوئی تھی۔ حالانکہ ظاہر اس نے نہیں ہونے دیا تھا۔ خیر کیا بات ہوئی ان کی؟"

خان نے کہا۔ "وہ ہینڈ فری ٹیلی فون تھا جس میں آواز اسپیکر سے نکلتی ہے۔ ترویدی نے کہا۔ دلاور..... تم رابعہ اور ... لے گئے ہو؟ دلاور نے کہا: نہیں۔" ترویدی نے اسے گالی دے کر کہا کہ "جھوٹ مت بولو ورنہ میں آ رہا ہوں۔" دلاور نے کہا: "کہاں آ رہے ہو سیٹھ صاحب۔ ہم بھی استقبال کے لئے تیار ہو جائیں۔" اس پر ترویدی نے کہا: "دلاور اس شہر میں تم کہیں بھی جا کے دیکھو۔ مجھے معلوم نہ ہو تو ترویدی نہیں۔ یہ سمجھنا کہ میں بمبئی کی گلی کا کتا ہوں۔ یہ میرا شہر ہے دلاور اور میرا نام ہے ترویدی۔ کسی سے پوچھ کے دیکھو اس نام کا مطلب۔" وہ کہنے لگا: "ہاں۔ اپنی گلی میں تو کتا بھی شیر ہوتا ہے۔" ترویدی نے کہا: "تو یہ بات سمجھ لو کہ بمبئی میری گلی ہے تمہاری نہیں۔ آنکھ بند کر کے میں کسی پر بھروسا کرنے کا قائل نہیں ہوں اور تمہارے جیسے آدمی پر تو شیطان بھی بھروسا نہیں کر سکتا۔ تم کس وقت کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو اس کی خبر مجھے ملتی رہتی ہے۔ اس وقت بھی میرے آدمی وہاں موجود ہیں۔" وہ کہنے لگا کہ "پھر۔ کیا چاہتے ہو تم؟" اس نے کہا: "تم جن کو اٹھا کر لے گئے ہو۔ انھیں خراش بھی نہیں آنی چاہئے ورنہ....." دلاور نے کہا: "ورنہ کیا ہوگا؟" ترویدی نے کہا: "ورنہ خونی خان میرا خون پی جائے گا۔ وہ اس وقت میرے سامنے موجود ہے اپنی فوج کے ساتھ۔ اس نے کہا ہے کہ وہ چھ سوراخ میرے جسم میں کرے گا اور تین دستی بم میری دکان میں پھینک کر چلا جائے گا۔ اب سمجھے کہ میں کیا چاہتا ہوں اور کیوں چاہتا ہوں؟" دلاور نے مجھے بہت گالیاں دیں لو اپنا تو دماغ ہے پٹھان [illegible] سے اڑ گیا۔ میں نے کہا: "قسم اللہ کی! تو دلاور ہے تو وہیں ٹھہر۔ میں آتا ہوں تیرا بھی باجا بجانے۔" بس اس کے بعد وہ بھی دلاور نہیں رہا۔ بزدل ہو گیا۔ اس نے کہا: "خان صاحب! آپ کے مہمان ہمارے مہمان۔ صبح واپس آئیں تو اندر باہر سے اچھی طرح چیک کر لینا ایک ایک اسکریو اور نٹ بولٹ ملے گا۔ سارے کنکشن ٹھیک ہوں گے۔ کوئی بتی فیوز نہیں ہوگی۔ بیٹری ڈاؤن نہیں ہوگی۔ ٹیوننگ فرسٹ کلاس اور گاڑی چلتی ہوئی جیسے آئی تھی ویسے ہی رواں ملے گی۔" میں نے کہا: "سالے مکینک کی اولاد۔ میں بندوں کی بات کر رہا ہوں۔ قسم اللہ کی۔ ان کا بال بھی بیکا ہوا تو تیری زندگی کے سارے چراغ گل کر دوں گا۔ انجن سیز ہو جائے گا اور چیسس سے پتا نہیں چلے گا کہ یہ آدمی تھا یا تنور کا بچہ۔" بس اس کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔"

ہم سب درمیان میں کئی بار ہنسے تھے۔ خان ترنگ میں تھا اور بات بھی ایسی ہی تھی۔ درمیان میں اس نے جو غیر پارلیمانی زبان استعمال کی اسے میں نے حذف کر دیا ہے۔

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا: "کیا واقعی تمہارے آدمی وہاں پہنچ چکے تھے؟"

"تم کیا سمجھتے ہو' خونی خان ایسے ہی گیدڑ بھبکی دیتا ہے؟"

میں نے کہا: "مجھے تو کوئی نظر آیا نہیں۔ وہاں سے

کے بعد۔"

خان نے کہا: "اپنے ساتھی ایسے احمق ساتھی نہیں ہوتے' قسم اللہ کی!"

میں نے کہا: "تم رات بھر وہاں بیٹھے رہے۔ تو پھر انتقال کیسے ہوا سرکار۔"

"کس کا انتقال ہوا؟" خان نے حیرانی سے کہا۔

میں نے کہا: "میرا مطلب تھا سامان کیسے منتقل ہوا؟"

محمد خان نے مسکراتے ہوئے کہا: "تم نے تو ڈرا ہی دیا تھا مجھے۔ میں وہاں رات بھر نہیں رکا تھا۔ ترویدی البتہ بیٹھا رہا اور اس کے سیلزمین بھی۔ بھوں بھوں کر کے روتا رہا۔"

"ان کی چھٹی کب ہوئی؟"

"صبح جب یوسف ثانی نے اطلاع دی کہ تم واپس پہنچ گئے ہو۔ اسے میں نے باہر کھڑا کیا تھا۔ پتا نہیں او کہہ گیا تھا افیمچی کا بچہ۔ کہ تم سیدھے اندر چلے گئے تھے۔ بڑی بری عادت ہے اسے۔"

میں نے کہا: "افیون سے شغل فرماتے ہیں شہزادہ گلفام!"

غالب نے کہا "مجھے بھی صورت سے ایسا ہی لگتا تھا۔ اگر وہ افیمچی نہ ہوتا تو مجھے حیرت ہوتی۔ بلکہ افسوس ہوتا۔"

دلاور کے ساتھ ملاقات کا تذکرہ کرتے وقت میرے ذہن میں ایک خوف جاگزیں رہتا تھا کہ کہیں غیر ارادی طور پر میں شملہ کے بارے میں کسی سچائی کا اشارہ نہ کر جاؤں۔ مجھے اور میرے ساتھ سب کو ایک ہی مجبوری کا سامنا تھا۔ ہم سب شملہ کے خیال کو ذہن سے جھٹک نہیں سکتے تھے۔ اور میری حالت تو یہ تھی کہ ہر وقت ہی اس شیشے کے تابوت کا ممدوح فرما تصور بہت سے سوالوں کے عذاب کو مجھ پر مسلط رکھتا تھا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا کہ ہم شملہ کو کیسے بچائیں گے۔ کیا ہم شملہ کی خاطر اپنے عزائم سے دستبردار ہو جائیں گے' اس سے جذباتی وابستگی ہمارے ارادوں کی راہ میں دیوار بن جائے گی۔ یا ہم محسن کی پروا کئے بغیر اس کی بیوی کو اور بیٹے کو' اسے بتائے بغیر اپنے مشن کی بھینٹ چڑھا دیں گے؟ اور پھر انھیں ایسے بھول جائیں گے جیسے وہ رشتوں کی زنجیر سے منسلک جیتے جاگتے انسانوں کی دنیا سے تعلق رکھنے والے اور محسن کے خوابوں کے تعبیر نہیں۔ فقط ایک سنگ گراں تھے جو ہماری راہ میں حائل ہوا تو ہم نے اسے ہٹا دیا' یا دیوار تھے جسے ہم نے گرا دیا اور آگے بڑھ گئے۔ وہ پتھر یا دیوار نہیں تھے۔ خود ہماری زندگی کا ایک حصہ تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ ہم محسن کے ساتھ وہ کریں جو کوئی اپنے بدترین دشمن کے ساتھ بھی نہیں کر سکتا کہ اسے بتائے بغیر خود اس کی موجودگی میں اور اسی کے ہاتھ' اس کے خاندان کا وجود ختم کرا دیں اور اپنے اس جرم پر' جھوٹ پر اور فریب پر کسی بے رحم حقیقت کا پردہ ڈالے رکھیں کہ یہ حالات کا تقاضا تھا اور سفاکی اور سنگدلی کے اس مظاہرے کو ادائے فرض کی ضرورت کا جواز عطا کریں اور مطمئن ہو جائیں۔ کیا بعد میں شرمندگی' افسوس اور دلی رنج کا اظہار محسن کے لئے تلافی ہوگا؟"

میرا خیال ہے کہ اپنی تمام زندگی میں میرے لئے ایسا سخت ترین امتحان نہیں آیا۔ میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم شملہ کو بچالیں گے۔ نہ بچا سکے تو کیا محسن کے سامنے اعتراف جرم کر سکیں گے اور اس کے بعد محسن کو یقین دلانے کے قابل ہوں گے کہ ہم اب بھی اس کے دوست ہیں اور اس کی زندگی حسب سابق جینے کے قابل ہے؟

بظاہر یہ ناممکن لگتا تھا۔ تاہم اس احساس کے سامنے ابھی سے شکست تسلیم کر لینا بھی غلط تھا۔ ہم خدا سے دعا کر سکتے تھے کہ وہ ہم پر اپنا کرم رکھے اور ہمیں حوصلہ دے کہ ہم اس امتحان سے گزر جائیں یا حالات کے دھارے کا رخ ہماری خواہشات کے مطابق رکھے۔ وہ قادر مطلق تھا اور اس کے قبضہ قدرت میں سب کچھ تھا۔

غالب نے مجھ سے کہا: "ارے بھائی 'کیا بیٹھے بیٹھے سو گیا؟"

تو میں چونکا: "آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں۔"

"اپنے سکندر صاحب سوچ بچار کے اونچے سمندر میں غوطہ زن تھے۔ ہیں جی؟" محسن نے دلاور کے انداز میں کہا۔ "ہم تو یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ کس کے خیال میں غرق تھے۔"

مجھے یوں لگا جیسے محسن نے میری چوری پکڑ لی ہے اور اسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں شملہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

میں نے کہا: "میرا خیال ہے کہ مجھے آرام کی اشد ضرورت ہے" اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔"

"کوئی بھی چیز بیکار پڑی رہے تو ناکارہ ہو جاتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "کچھ یاد ہے کہ آخری بار دماغ کب کام آیا تھا۔"

غالب نے کہا: "بچپن کی بات ہے۔ اب کہاں یاد ہوگی۔"

محسن نے کہا: "ہاں' اس کے بعد تو دل خانہ خراب کو اختیار رہا۔"

میں نے ان کو جواب نہیں دیا اور کمرے میں آ کے فرشی بستر پر لیٹ گیا جہاں نازو اور گل چپ بیٹھی تھیں۔ شملہ کے تصور کا آسیب ان کے اعصاب پر بھی مسلط ہو گیا تھا۔ رات بھر کی تھکی ہوئی رابعہ ایک کونے میں سکڑی پڑی ہوئی تھی۔ میں سگریٹ جلا کر دھوئیں کو نیم تاریک چھت کی طرف اٹھتا دیکھتا رہا۔ دھوئیں کے مرغولوں میں رہ رہ کے شملہ کا چہرہ ابھرتا تھا۔ اس کے چہرے کے ہزار روپ تھے جو میں نے دیکھے تھے۔ پہلی ملاقات سے اب تک میں نے اسے ہنستے مسکراتے

www.paksociety.com

بہانے 'محبت کرتے ' روٹھتے مناتے ' شرماتے لجاتے ' امنا کی روشنی سے جگمگاتے ' خوابوں کی تعبیر پالینے کی خوشی سے دمکتے اور درد فرقت میں آنے والے دن کے یقین سے بہلتے دیکھا تھا۔ مگر یہ سب لمحوں کے عکس تھے جو آج میری یادوں کے نہاں خانوں سے نکل کر تصور سے چلا رہے تھے۔ لیکن وہ نقش آخر جس سے مفر نہ تھا اس زخم لادوا کی طرح تھا جس کی ٹیس چھپائی نہ جاسکتی ہو۔ نازو اور گل کچن کی طرف چلی گئی تھیں۔ اچانک میں نے رابعہ کو سسکی لے کر روتے دیکھا۔ وہ آہستہ سے سر جھٹک کر چلائی "نہیں۔ شملا کو اس کا بچہ دے دو۔ اس کے بچے کو مت بیچو۔"

میں نے اسے شانے سے پکڑ کے جھنجوڑا "رابعہ!"

رابعہ نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوف کا سانپ کنڈلی مارے نظر آیا "انہیں... تم خرید لو سکندر۔"

میں نے کہا "کیا فضول بولے چلی جارہی ہو۔"

رابعہ کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے "انہیں خرید لو شملا کو اور اس کے بچے کو۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم رابعہ۔ ہوش میں آؤ" میں نے برہمی سے کہا "اپنی زبان پر ہی نہیں خیالوں پر بھی قابو رکھو' خوابوں کو اپنے کنٹرول میں رکھو۔"

رابعہ اٹھ بیٹھی "میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔"

"خاک ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تم ابھی تک ہوش میں نہیں ہو۔ اگر تم نے سوتے جاگتے بولنا شروع کردیا تو ہم سب کے کوشش کرنے سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ محسن کو سب معلوم ہوجائے گا۔"

"سکندر' میری بات سن لو پہلے" رابعہ نے لجاجت سے کہا "دیکھو' ہمارے پاس پیسہ کم تو نہیں ہے' پیسہ اور بھی حاصل کرسکتے ہیں ہم۔ محمد خان ہماری مدد کرسکتا ہے۔ دس بیس لاکھ"

میں نے کنفیوز ہو کر کہا "آخر کیا کرنا ہے پیسے سے؟"

رابعہ نے کہا "شملا کی اور اس کے بچے کی زندگی خرید لو"

میں نے کہا "کیسے خرید لوں' کیا انہوں نے کوئی قیمت مانگی ہے؟"

رابعہ نے کہا "قیمت تم لگا کر دیکھو۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں' پیسے کے لئے کر رہے ہیں۔ انہیں اس مال کی قیمت ادا کردو۔ اسلحے کے وہ سب ٹرک لے لو ان سے اور انہیں منہ مانگی قیمت دے دو۔"

میں نے کہا "رابعہ ڈارلنگ' کاش یہ ممکن ہوتا......"

رابعہ نے میری بات کاٹ دی "ابھی سے مت کہو کہ یہ ناممکن ہے۔ پہلے کوشش کرو۔ بات کرو ان سے۔"

"کس سے بات کروں اور کیا بات کروں؟ ایسی احمقانہ

بات کون سنے گا؟ دلاور؟" میں نے نفی میں سر ہلایا "اس کا مقصد ہمارے عزائم کو شکست دینا ہے' وہ ہمیں روکنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے یقیناً شملا ہماری یہ کمزوری پکڑنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ اپنی اس کامیابی کا سودا کرے گا؟ تاکہ ہمیں کوئی خطرہ نہ رہے تو ہم پھر اس کے لئے خطرہ بن جائیں۔ آج اس کے پاس تحفظ کی ایک ضمانت آگئی ہے جسے وہ کل بھی استعمال کرسکتا ہے۔ اسے وہ ہمارے حوالے کرسکتا ہے؟"

رابعہ نے کہا "دلاور سے نہیں' تریویدی سے سودا کرو۔ اس ایک ٹرک کا جس میں وہ شملا کو لے جانا چاہتے ہیں۔"

یکلخت مجھے احساس ہوا کہ رابعہ نے کتنی دور کی سوچی ہے۔ اس کی بات میں ایک چیلنج تھا' ہماری ذہانت اور ہمت کے لئے۔ یہ ایک زبردست جنگی حکمت عملی کا منصوبہ تھا جسے انتہائی مشکل تو سمجھا جاسکتا تھا مگر ناممکن سمجھتے ہوئے ناقابل عمل قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ عیاری' مکاری' دغا فریب' دھوکا اور چال بازی۔ یہ سب بھی ایسے جنگی طریقے تھے جو دلاور جیسے دشمن کے خلاف استعمال کئے جاسکتے تھے۔ بے شک جنگ کی بھی کچھ اخلاقیات ضرور ہوتی ہیں۔ مسلمانوں نے کبھی عورتوں' بچوں' بوڑھوں اور بیماروں کو جنگ کرنے والوں میں شامل نہیں سمجھا تھا۔ آج بھی جنیوا کنونشن کے تحت اسپتال اور ریڈ کراس کا عملہ اور متعدد دیگر اداروں کو متحارب فوجوں کی کارروائی سے تحفظ حاصل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خود ہی ایسی اخلاقی پابندیوں کی دھجیاں اڑاتے ہیں جو انہیں عائد کرانے میں پیش پیش نظر آتے ہیں اور "جنگ میں سب جائز ہے" کا جواز لے آتے ہیں۔

مگر جو کچھ رابعہ نے کہا تھا' اس میں کوئی ایسی غیر اخلاقی یا غیر انسانی بات نہیں تھی۔ تریویدی ایک کاروباری ذہن رکھنے والا لالچی اور بے ضمیر آدمی تھا۔ اس نے خود ہی کہا تھا کہ میری طرف سے دلاور جائے جہنم میں کیونکہ خود اس کے کاروباری مفادات اور اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ اس سے یہ سودا کیا جاسکتا تھا۔ دو دشمنوں کے اتحاد میں رخنہ ڈالنے کے لئے پیسے کی طاقت کو آزمانے کا خطرہ مول لیا جاسکتا تھا۔ تریویدی کا اس میں کوئی نقصان نہیں تھا۔ وہ منہ مانگی قیمت لے کر ایسا بندوبست کرسکتا تھا کہ ہم اس سارے مال پر قابض ہوجائیں جس کے ساتھ شملا کو یرغمال بناکے روانہ کیا جانا تھا۔ وہ ایک ٹرک کی نشاندہی کرسکتا تھا اور اس ٹرک کے اغوا میں ہماری مدد کرسکتا تھا۔ اس طرح کہ دلاور کو اس پر شک بھی نہ ہو۔ دلاور یہی سمجھتا رہے کہ شملا کو بحفاظت نکال لانے کا سارا پلان ہم نے اپنے طور پر بنایا تھا اور اس میں تریویدی کا کوئی ہاتھ نہیں۔

"سکندر' کیا سوچ رہے ہو؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے مسکرا کے کہا "ایسی بات کی ہے آج تم نے دل چاہتا ہے کہ تمہارا منہ..."

"بکو مت" رابعہ نے بگڑ کے کہا۔

"موتیوں سے بھروادوں" میں نے ہنستے ہوئے کہا "اس میں کیا بری بات ہے جو خفا ہو رہی ہو۔ محاورہ ہے یہ تو۔"

"تم تو سمجھ رہے تھے بڑے پاگل پن کی بات کی ہے میں نے" وہ طنز سے بولی۔

"اب تو نہیں سمجھ رہا۔ یہ بھی مانتا ہوں کہ میری سمجھ میں یہ عقل کی بات دیر سے آئی۔ دراصل تم سے توقع نہیں تھی ایسی عقل مندی کی۔"

"عقل کے معاملے میں تم مردوں کا جھوٹا احساس برتری کبھی ختم نہیں ہوگا" رابعہ نے خفا ہو کے کہا "ہمیں تم ناقص العقل ہی سمجھتے رہو گے۔"

"ماشاء اللہ!" میں نے وصیت بن کے دانت نکالتے ہوئے کہا "میرا مطلب تھا کہ تمہارے ساتھ زیادہ معاملہ ہے دل کا۔ خیر' اب تمہارے تحت رس ذہن کی داد دیتے ہوئے میں اس تجویز پر مزید غور فرماتا ہوں۔ تو مجھے دیگر عواقب بھی نظر آتے ہیں۔ بے شک ایسا ہوسکتا ہے کہ ہم رشوت دے کر تریویدی کو دلاور سے غداری پر آمادہ کرلیں۔ ویسے لوگوں کا ضمیر' دین' ایمان سب پیسہ ہی ہوتا ہے اور یہاں بالادستی حاصل ہے تریویدی کو۔ بفرض محال اسے بعد میں پتا چل جاتا ہے کہ شملا کو ہم تریویدی کی مدد سے نکال کر لے گئے تھے تو وہ تریویدی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"بس تو پھر کوشش کرو۔ آج ہی۔"

"بی بی رابعہ' ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی۔ پہلا مسئلہ تو قیمت کا ہے۔ تریویدی اگر مان گیا تو وہ کیا قیمت طلب کرے گا اور ہم اسے کیا دینے کے قابل ہوں گے؟"

"ہمارے پاس تقریباً دس لاکھ ہیں۔"

"ہاں۔ دس کے بیس بھی ہوسکتے ہیں۔ شملا کی جان بچانے کے لئے ہم ایک ڈاکا بھی ڈال سکتے ہیں۔ محمد خان سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کچھ بندوبست کردے۔ اس کے قبضے میں ہماری مولی مرغیاں ہیں۔"

"مرغیاں!"

"ہاں۔ سونے کا انڈا دینے والی۔ وہ ان سے انڈے وصول کرتا رہتا ہے۔ شاید وہ بیس تیس لاکھ فراہم کردے۔"

"اتنی رقم کافی ہونی چاہئے۔"

"تم اپنے ذہن سے مت سوچو۔ تریویدی کے ذہن سے سوچو گی تو قیمت کا تعین تمہارے لئے ممکن ہی نہیں رہے گا۔ وہ ایک کروڑ بھی مانگ سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ شملا کی اور اس کے بچے کی زندگی کی میرے نزدیک یہی قیمت ہے۔ میں انہیں اس قیمت پر بحفاظت تمہارے حوالے کرنے کی ذمے داری قبول کرتا ہوں۔ تمام خطرات کو قبول کرتا ہوں لیکن تمہیں یہ قیمت منظور نہیں ہے تو جاؤ ان پر فاتحہ پڑھ لو۔"

رابعہ کا رنگ فق ہوگیا "یہ نہیں ہوسکتا۔"

"عزیزہ' کیا ہوسکتا ہے اور کیا نہیں ہوسکتا' اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ فرض کرو کہ اس نے صرف دس لاکھ ہی مانگے یا ہم نے ایک کروڑ دے دیئے' تب بھی یہ جوا ہوگا جس میں ہمارے بے وقوف بن کے ہارنے کے امکانات زیادہ ہوں گے۔ تریویدی سے اگر ہم یہ امید رکھیں گے کہ وہ دلاور کو دھوکا دے تو یہ امید بھی رکھنی چاہئے کہ وہ الٹا ہمیں دھوکا دے۔ وہ قیمت لے کر مکر جائے۔ وعدہ پورا کرنا اس کے اختیار میں ہوگا اور اس نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے ہمیں ٹھینگا دکھایا۔ یا قیمت لے کر یہ بات دلاور کو بھی بتادی تو ہم کیا کریں گے؟ سوائے صبر کے اور اپنی بے وقوفی پر رونے کے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہم یہ جوا کھیلیں گے' خواہ اس میں ہماری جیت کا امکان ایک فیصد ہو" رابعہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"رائٹ۔ لیکن اب میرے دماغ کے دوسرے دروازے بھی کھل گئے ہیں۔ جو پہلا دروازہ تم نے کھولا تھا' یہ اس کے اندر والے دروازے ہیں۔"

"پہیلیوں میں بات مت کرو۔"

"میں دیگر امکانات پر غور فرمانے لگا ہوں۔ مثلاً یہ کہ رشوت سے صرف تریویدی کو ہی خریدنے کی کوشش کیوں کی جائے اور بھی تو لوگ ہیں اس گودام میں جہاں سے اسلحہ لوڈ کیا جائے گا۔"

"ہاں۔ تم محمد خان سے کہو کہ وہ اپنے کسی آدمی کے ذریعے ان کے کسی آدمی سے بات کرادے۔ یہ معلوم ہوجائے کہ ٹرک کس کمپنی کے ہیں تو ٹرک ڈرائیوروں کو بھی رشوت دی جاسکتی۔ وہ صرف اتنا بتادیں کہ کس ٹرک میں ہوگی شملا۔ پھر ہم ان کا تعاقب کریں اور موقع ملنے کا انتظار۔"

"آج تو تم بول چال میں دانش مندی کی باتیں کر رہی ہو۔ مجھے رشک آرہا ہے۔ بلکہ ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ صدقے میں کالا بکرا قربان کرتا ہوں۔ مگر...." میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔

رابعہ نے بگڑ کے کہا "یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

"اردو میں اسے ٹہوکا کہتے ہیں" میں نے اس کے شانے پر سینگنے والے ٹہوکے کو بیچ گرا کے کہا "فی الحال کالا ٹہوکا قربان کرتا ہوں۔ ویسے بھی یہ گستاخ نہ جانے کیا دست درازی کرتا آگے جاکے۔"

"بس شروع ہوگئی بک بک۔ اتر گئے چھڑی سے

www.paksociety.com

میں نے کہا۔ "پھر پٹڑی پر آتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ میں آج ہی خان صاحب سے مذاکرات کرتا ہوں۔"

رابعہ نے کہا۔ "یہ کام تو یوسف ثانی کر سکتا ہے۔"

میں اچھل پڑا۔ "واہ۔ کیا زبردست بات کی ہے۔ خاکسار کی عقل مات کی ہے۔ گویا بن بادل برسات کی ہے۔ دوپہر بارہ بجے رات کی ہے۔ آمد آمد بارات کی ہے۔ دلہن شاید گجرات کی ہے۔"

رابعہ ہنسنے لگی۔ "چھوڑ دو یہ کوشش۔" "وہ تک بندی نہیں کرتا اور بے مطلب قافیے نہیں ملاتا۔"

میں نے کہا۔ "واقعی بہت مشکل کام ہے اس کی زبان بولنا۔"

گل نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ "چلو بلاؤ سب کو کھانے کے لئے۔"

میں نے کہا۔ "سب کو گولی مارو۔ میں اکیلا ہی سب کھا جاؤں گا۔ پکایا کیا ہے؟"

"مسور کی دال ..... چاول۔"

میرا منہ لٹک گیا۔ "اچھا۔ پھر مجھے گولی مارو۔ میں سب کو بلا لاتا ہوں۔ میرے حصے کا بھی وہی کھائیں۔"

کھانے کے بعد غالب اور محسن سر جوڑ کے بیٹھے اور اس نوٹ بک کے کوڈز کو ڈی کوڈ کرنے لگے۔ اس خفیہ زبان کا مطلب نکالنا کسی مشکل معمے کو حل کرنے سے زیادہ دماغ سوزی کا کام تھا چنانچہ میں خان کے کمرے میں تخت پر جا کے سو گیا۔ تھوڑی دیر بعد غالب اور محسن کی بک بک سے میری آنکھ کھلی۔

"اس طرح تو مطلب نکلتا ہے خربوزے نے کریلا کھایا۔"

غالب نے کہا۔ "اور جو مطلب تم نے نکالا تھا، بندر کے انڈے میں بلبلی۔"

مجھے ہنسی آ رہی تھی اور غصہ بھی "چلو بھاگو یہاں سے۔ یہ کیا تڑ تڑ لگا رکھی ہے۔ دیکھتے نہیں کوئی شریف آدمی سو رہا ہے۔"

"یہ عجیب شرافت ہے۔" محسن نے کہا۔ "ادھر سے نکال دیا تمہاری اس شریفن نے کہ خاموشی سے باتیں کرو۔"

"آخر ہم کام کر رہے ہیں۔ ایک کمرے میں شریف، دوسرے میں شریفن! ہم کہاں جائیں؟"

میں نے کہا۔ "شریفن نے ٹھیک کہا تھا، خاموشی سے باتیں کرو۔ آواز نہ نکلنے پائے۔"

"چل یار! ہم ہی کہیں منہ کالا کر جاتے ہیں۔" محسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کہیں منہ کالا کر کے مت آنا۔" میں نے پھر منہ لپیٹ کر کہا۔

"منہ کالا برا چاہنے والوں کا۔" غالب نے کہا۔

میں شام تک سوتا رہا لیکن یہ نیند پُرسکون نہیں تھی۔ خیالات کے عفریت اور لاشعور میں بیٹھے ہوئے خوف کے ناگ میرے خوابوں میں بھی پھنکارتے رہے۔ میں کئی بار جاگا اور کوشش کر کے پھر سو گیا۔ آخری خواب بہت ڈراؤنا تھا۔ میں نے دلاور کو ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا۔ میں نیچے سے چلا رہا تھا۔ "نہیں دلاور..... نہیں" اور دلاور کھڑا زور زور سے ہنس رہا تھا۔ اس کی بھیانک، مکروہ ہنسی کی بازگشت ویران پہاڑوں کی پتھریلی سطح سے ٹکرا کر لوٹ رہی تھی۔ میں پسینے میں تر تھا مگر چوٹی تک پہنچنے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ میرے ہاتھوں سے خون بہنے لگا تھا اور میرے گھٹنے چھل گئے تھے۔ دلاور کے سامنے ایک چٹان کے کنارے پر شیشے کا تابوت رکھا ہوا تھا اور وہ اسے آگے دھکیل رہا تھا۔ میں اس کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ جب اس نے تابوت کو نیچے گرا دیا تو ایک زبردست چھناکے کے ساتھ شیشے کی کرچیاں بکھر کر اڑنے لگیں۔ سیکڑوں، ہزاروں ٹکڑے تیز ہوا کو کاٹتے ہوئے ہزاروں فٹ کی گہرائی تک گئے۔ ہر ٹکڑا جب کسی پتھر سے ٹکرا کے ٹوٹتا تھا تو ایک دلخراش چیخ سنائی دیتی تھی اور ادرگرد کے پتھر لہو کی بوچھاڑ سے بھر جاتے تھے۔

محمد خان نے مجھے کندھے پکڑ کے ہلایا۔ "اٹھ جاؤ سکندر!" میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ میرا جسم پسینے میں تر تھا اور ایک بھیانک خواب کا اثر ابھی تک میرے اعصاب پر طاری تھا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔

"تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔" خان نے کہا۔ "لو پانی پی لو۔"

میں نے پانی پی کے کہا۔ "کیا میں نے سوتے میں کچھ کہا؟"

محمد خان نے سرہلایا۔ "دو بار تم نے کہا، دلاور، نہیں۔"

میں متفکر ہو گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے رابعہ نیند میں بول رہی تھی۔ اب میں بول رہا تھا۔ یہ لاشعور کی گڑبڑ تھی۔ مگر اس پر قابو پانا بے حد ضروری تھا، ورنہ یہ ہو سکتا تھا کہ کسی دن محسن کسی سے وہ بات سن لے جو ابھی تک ہم سب نے مصلحت کے کفن میں لپیٹ کر اپنے اپنے دلوں کے مدفن میں چھپا رکھی تھی۔

"تم کب آئے اور گئے کہاں تھے؟" میں نے کہا۔

"میں ایک کام سے گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے آیا تو تم سو رہے تھے۔"

"تم کچھ پریشان ہو۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔"

محمد خان نے آہستہ سے سرہلایا۔ "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔"

میں نے کہا۔ "خان صاحب! میں سمجھ گیا، آپ کی پریشانی ہم لوگ بن رہے ہیں۔"

اس نے تردید کرتے ہوئے کہا۔ "قسم اللہ کی، یہ بات نہیں ہے۔ تم لوگوں سے ملاقات میری زندگی کا بڑا عجیب واقعہ ہے۔ پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ لوگ صرف اپنے لئے، اپنی خوشیوں اور اپنی ذات کے فائدے کے لئے نہیں جیتے حالانکہ میں بھی اسی دنیا میں تھا جس میں تم سب ہو لیکن میں نے جسے دیکھا، وہ صرف اپنے لئے زندہ تھا۔ میں بھی ان میں شامل ہوں۔ میں نے خود غرضی دیکھی تھی۔ ہوس دیکھی تھی، محبت بھی دیکھی تھی مگر بے غرض نہیں۔ ماں باپ یا بھائی بہن سے، اولاد سے، بیوی سے، سارے رشتوں کے پیچھے مقصد تھا۔ ماں باپ اگر اولاد کو پالتے ہیں تو اس امید میں کہ بڑھاپے میں بے آسرا نہ ہوں۔"

"سب رشتے غرض مندی کے رشتے نہیں ہوتے خان صاحب، مثلاً ماں کا بچے سے رشتہ۔"

"ہاں۔ میں کب کہتا ہوں کہ سب رشتے جھوٹے ہیں۔ میں تو اپنے تجربے کی بات کر رہا تھا۔ اپنی دنیا میں جو کچھ میں نے دیکھا تھا، وہ بہت مختلف تھا۔ مرد اور عورت کے رشتے کو میں نے سب سے زیادہ بدنام پایا اور یہ بھی دیکھا کہ اس رشتے کو بدنام کرنے والے بھی وہی لوگ ہیں جن کی نظر میں عورت بازار کی جنس ہے۔ یا ایک خوشنما کھلونا ہے۔ کہ جب چاہا خرید لیا، جتنے دن چاہا اس سے کھیل کے بھلا دیا۔ عورت ایک تماشا ہے، کوٹھے پر بھی، سینما اسکرین پر بھی، اشتہار میں بھی۔ اگر وہ بیوی ہے تو اس کی حیثیت ایک باندی جیسی ہے۔ گھر کا کام کرے، شوہر کو خوش رکھے، اس کے لئے بچے پیدا کرے اور پھر انہیں پالے۔ اگر وہ کسی ایک کام میں کوتاہی کرے تو تم جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟ اسے کسی بھی بہانے، کسی بھی وقت گھر سے نکالا جا سکتا ہے۔ وہ واقعی پاؤں کی جوتی ہے کہ جب چاہا بدل لی۔ اولاد نہ ہوئی تو صرف وہی قصوروار۔ حالانکہ قصوروار مرد بھی ہو سکتا ہے اور برابر کا۔ اس نے بیٹا نہ دیا، صرف بیٹیاں دیں تو بھی وہی مجرم۔ بڑے بڑے مذہبی قسم کے لوگوں کو دیکھا ہے میں نے۔ اسے وہ حیثیت ہی نہیں دیتے۔ عورت کا جرم سمجھتے ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ تم جانتے ہو کہ میں نے ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی شادی کی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ مجھ جیسے شخص کو شادی نہیں کرنی چاہئے۔ ٹھیک کہا تھا تم نے لیکن بعض اوقات آدمی اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر پاتا۔ شادی تم نے بھی نہیں کی۔ اس لئے کہ شادی کے بعد گھر بنانا اور بسانا پڑتا ہے جس کے لئے تمہارے پاس ابھی وقت نہیں تھا۔ اس کے باوجود تم ایک دوسرے کے ساتھ ہو۔ شریک حیات اور رفیق سفر ہو۔ تمہارے درمیان محبت اور اعتماد کا وہ رشتہ ہے جس کے سامنے بھی تعظیم کے لئے جھک جاتا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "ایسی کیا بات ہے خان صاحب؟"

"ہے سکندر! جب میں تم سے ملا تھا تو تمہیں نہیں جانتا تھا۔ پھر تم نے سب کا تعارف کرا دیا کہ کون کیا ہے اور کس کو کس سے رسم و راہ ہے۔ میں شک میں پڑ گیا تھا۔ معاف کرنا، میرے دل میں بدگمانی نے سر اٹھایا تھا۔ میں نے چھپ کر تم سب کو دیکھا اور مجھے اس وقت تمہارے سامنے شرمندگی کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ میری گندی سوچ تھی۔ ہر آدمی کی سوچ میں اس کے ماحول کا عکس بھی ہوتا ہے۔ جو میں اپنے آس پاس کی دنیا میں دیکھتا آیا تھا، وہی میں نے دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر تمہارے رشتوں کے تقدس نے مجھے تصویر کا دوسرا رخ دکھایا کہ کردار کی مضبوطی کیا ہوتی ہے اور نیت کا خلوص کیا ہوتا ہے۔ تم ایک دوسرے کو چاہتے ہو۔ باہم زندگی کے ساتھی بننے کے عہد و پیمان بھی رکھتے ہو۔ ہر وقت، ہر جگہ ساتھ بھی رہتے ہو لیکن اپنی محبت پر الزام نہیں آنے دیتے۔ انگشت نمائی کچھ لوگوں کا پیشہ ہے، کچھ لوگوں کی عادت یا فطرت۔ وہ کچھ بھی کہیں، تم سب کے کردار کا آئینہ جتنا شفاف ہے، رہے گا۔"

"آج تو بڑی سنجیدہ اور فلسفیانہ باتیں کر رہے ہیں آپ خان صاحب!" میں نے کہا۔

"ہاں۔ میں ایک انقلاب سے گزر رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا میرے الفاظ میرے خیالات کی صحیح ترجمانی کر سکتے ہیں یا نہیں لیکن جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، میری دلی کیفیت ہے۔ تم سے ملنے کے بعد میں وہ نہیں رہا، جو تھا۔ ڈاکو محمد خان، خونی خان۔ بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی کی یہ روش ترک کر دینا چاہئے اور تمہارا ساتھ دینا چاہئے۔"

میں حیرت اور خوشی سے دنگ رہ گیا۔ "آپ..... ہمارا ساتھ دیں گے خان صاحب!"

"مجھے تمہارا ساتھ دینا چاہئے۔ آخر میں بھی تو مسلمان ہوں۔ ہاں یہ ایک الگ کہانی ہے کہ میں پاکستانی ہونے کے باوجود پاکستان میں نہیں رہ سکا۔ تقسیم کے بعد میں بھی اپنے خاندان کے ساتھ بڑے جوش اور ولولے سے پاکستان گیا تھا۔ خاندان تو راستے ہی میں بچھڑ گیا تھا۔ ہم نے قافلے کے ساتھ پیدل سفر کیا تھا۔ میرے تین چھوٹے بہن بھائی اور میری بیمار ماں سفر کی صعوبت، بھوک پیاس کی تاب نہ لا کے دم توڑ گئے۔ انہیں ہم نے کچے راستے سے ہٹا کے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ تدفین ممکن ہی نہیں تھی۔ نہ کفن تھا، نہ کوئی غسل دینے والا۔ خود ہم اتنے کمزور تھے کہ کدال مل جاتی، تب بھی قبر نہیں کھود سکتے تھے اور قافلہ بھی چلا جا رہا تھا چنانچہ ہم نے انہیں خدا کو سونپا اور چلے گئے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد کیا ہوا، یہ زیادہ دکھ بھری کہانی ہے۔ اچھے برے لوگ کہاں نہیں ہوتے۔

www.paksociety.com

بدقسمتی کہ میرا واسطہ بُرے لوگوں سے پڑ گیا جنھوں نے مجھے برائی کے راستے پر ڈال دیا۔ جب میں نے پھر سیدھے راستے پر چلنے کی کوشش کی تو انھوں نے وہ سب راستے بند کر دیئے۔ میں ان کے چنگل سے نکل کے فرار ہو گیا مگر فرار ہو کے میں کہاں جا سکتا تھا۔ وہ میرے تعاقب میں رہے اور اس وطن کی زمین مجھ پر تنگ ہو گئی جس کی خاطر میں نے پا پیادہ سیکڑوں میل کا سفر طے کیا تھا۔ حالانکہ اس وقت میری عمر تیرہ چودہ سال کی تھی۔ تم سے کچھ ملتے جلتے حالات میرے بھی رہے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تم نے مقابلہ کیا اور میں نے فرار اختیار کیا۔ میں واپس آ گیا اور ایک نئے نام سے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ نئی زندگی بھی اچھی زندگی نہیں رہی۔ خواہش کے باوجود میں نیکی کے راستے پر نہ چل سکا۔ تن آسانی اور حرام خوری کی عادت کو ترک کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ہاتھ میں ریوالور ہو تو کسی کو لوٹ لینا آسان ہے۔ صبح سے شام تک محنت کر کے روزی کمانا مجھے بہت مشکل لگا۔ سیدھے راستے پر چلنے والے کی راہ میں روڑے اٹکانے والے بہت ہوتے ہیں جو اس کے لئے قدم قدم پر نئی آزمائش لے آتے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ شرافت کی زندگی گزارنے کے لئے آدمی کو پہلے خود سے لڑنا پڑتا ہے۔ لالچ اور ہوس اور نفس کی ترغیبات سے گریز کرنا پڑتا ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں" میں نے کہا۔

"بس میں اسی کمزوری کا شکار ہو گیا۔ میری قوتِ ارادی کمزور تھی۔ کچھ دن بعد محنت ایک مصیبت محسوس ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ میں پھر برائی کے آسان راستے کی طرف راغب ہو گیا جہاں میری رہنمائی کرنے والے بہت تھے۔ برائی کی دنیا میں یہ عجیب بات ہے کہ وہاں ہر نووارد کو فوراً تاڑ لیا جاتا ہے۔ اسے خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ وہ چور، گرہ کٹ کچھ بھی بننا چاہے۔ اس کے لئے ایسے افراد ہیں جو ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اسے اپنا لیتے ہیں اور پھر ساری عمر وہ ان کے سایۂ عاطفت میں رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ میں کراچی میں رہ کے یہ تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ بمبئی میں بدمعاشی کا کاروبار زیادہ منظم طریقے پر ہوتا ہے۔ ہر بدمعاش کا اپنا گروہ ہے' حلقۂ اثر ہے' دائرۂ اختیار ہے' اپنا کاروبار ہے۔ کوئی چھوٹا ہے' کوئی بڑا اور کوئی بہت بڑا۔ لیکن یہ سب بدمعاشی کا دھندا کرنے والے بمبئی کے آسمان پر اسی طرح موجود ہیں جیسے آسمان پر ستارے اور سیارے ایک دوسرے کے سہارے پر قائم' اپنی اپنی جگہ گردش کرتے ہوئے اور ایک ہی مدار پر رہنے والے۔ یہاں کے بدمعاشوں کی دنیا کے بھی اصول و ضوابط ہیں۔ جیسے بھی کبھی کوئی ستارا ٹوٹ کے بکھر جاتا ہے' ایسے ہی بدمعاشوں کے گروہ بھی آپس میں ٹکرا جاتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں۔ مگر بیشتر گروہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔ خیر' یہ تو میں نے تمہیں لمبا سا لیکچر دے دیا۔ بدمعاشیات پر۔ میں اپنی بات کر رہا تھا۔ یہاں میں نے کسی کے حلقۂ اثر میں رہنا قبول نہیں کیا بلکہ آہستہ آہستہ اپنا ایک گروہ منظم کر لیا۔ یہ برسوں پرانی واردات ہے۔ آج تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ ایک بار پھر مجھے پچھتاوے نے گھیر لیا ہے۔ تم سب کو دیکھ کر میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوں کہ آخر وہ سب میں کیوں نہیں کر سکا جو تم لوگ کر رہے ہو۔ میرا وطن اب بھی پاکستان ہے۔ کچھ حالات ایسے تھے کہ میں واپس نہیں جا سکتا تھا۔ مگر مجھے جانا ہے ایک دن۔ کیوں نہ میں تمہارے ساتھ چلوں۔ جب تم واپس جاؤ تو میں بھی سر اٹھا کے تمہارے ساتھ جاؤں۔ حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ وقت بدلتا رہتا ہے۔ تمہارے ساتھ مجھے تحفظ کی ضمانت نظر آتی ہے۔ شاید اب وہ لوگ باقی نہ ہوں جن کی وجہ سے مجھے جلاوطن ہونا پڑا تھا یا شاید وہ مجھے بھول گئے ہوں۔ نہیں بھولے ہوں گے تو کوئی بات نہیں۔ میں دوبارہ فرار اختیار نہیں کروں گا۔ اس بار میں ان کا مقابلہ کروں گا۔ لیکن اس سے پہلے میں اپنے گزرے ہوئے وقت کی ہر غلطی' ہر بھول اور گمراہی اور نادانی کا کفارہ ادا کروں گا۔ تمہارے ساتھ اس جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ کسی بھی حیثیت میں اپنے وطن کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں جو میرے ماضی کا کفارہ بن سکے۔ تمہیں دیکھ کے یہ خواہش پیدا ہوئی تو سوچتا ہوں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں' ورنہ تم لوگ چلے جاؤ گے تو پھر وہی زندگی ہوگی جس کو برائی نے مکڑی کے جالے کی طرح لپیٹ رکھا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟"

میں نے اٹھ کر محمد خان کو گلے لگا لیا "کیوں ممکن نہیں خان صاحب۔ آدمی ارادہ کرتا ہے۔ توفیق خدا دیتا ہے۔ اس سے بڑی خوشی کی بات ہمارے لئے کیا ہوگی' اگر ہمیں تم جیسا نڈر ساتھی مل جائے۔"

"لیکن تمہارے ساتھی۔ وہ مجھے قبول کریں گے؟ میں کوئی نیک نام آدمی نہیں ہوں قسم اللہ کی۔"

میں نے کہا "خان! نیک آدمی ہمیشہ نیک رہتا ہے۔ یہ نیکی اس کے وجود میں ایسے پوشیدہ رہتی ہے جیسے خاک میں مل جانے والے موتی کی آب۔ اگر اس کی سرشت میں آب ہو تو وقت کی گرد کسی موتی کو کنکر نہیں بناتی۔ وہ سب میرے ساتھی ہیں اور ہم ایک خاندان ہیں۔ تم پر اس خاندان کا دروازہ کھل گیا تو سمجھو سب کے دل کا دروازہ کھل گیا۔ تم سے پہلے بھی ہم ایک ڈاکو سے ملے تھے۔ اس کا ہمارا ساتھ چند

کا تھا لیکن اتنی کم رفاقت کے باوجود وہ ہم پر اپنی جان کا قرض چھوڑ گیا۔ تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں شیش ناگ کی بات کر رہا ہوں۔ وہ ڈاکو ضرور تھا لیکن بڑا محبِ وطن تھا۔ وہ غدار نہیں تھا' ان غداروں کی طرح جو دنیا کی نظر میں معتبر اور شریف بنا ہوا ہے اور ناگ منی اس کی بہن تھی جسے وہ ہمارے سپرد کر گیا تھا۔ چند ہفتوں کی رفاقت میں ہم نے اس کے دل میں اتنا اعتماد پیدا کر دیا تھا اور خدا کا شکر کہ ہم اس سے کئے ہوئے وعدے پر قائم ہیں۔ اس کی بہن ہماری ذمے داری ہے بلکہ ہم سب کی مشترکہ ذمے داری ہے۔ ہم نے آہستہ آہستہ اسے گل بانو بنا دیا ہے۔"

"قسم اللہ کی' میں بھی ڈاکو نہیں رہنا چاہتا۔ اس زندگی سے متنفر تو میں پہلے ہی ہو گیا تھا۔ یاد ہے' ایک بار تم نے پوچھا تھا کہ گھر بسانے کے بعد میں نے اپنی زندگی کی اس روش کو کیوں نہیں بدلا۔ اور میں نے کہا تھا کہ شاید ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ شادی کے بعد میں محسوس کرنے لگا تھا کہ میں بیک وقت ڈاکو اور ایک اچھا شوہر نہیں رہ سکتا۔ کل کو مجھے ایک اچھا باپ بھی بننا پڑے گا۔ ابھی ایک عورت کے لئے میں مجازی خدا ہوں۔ مجازی خدا میں وہ صفات تو ہونی چاہئیں جو خدا کی ذات کا کچھ عکس تو ہوں۔ اس میں خدا کے پیدا کئے ہوئے انسان کی تھوڑی بہت انسانیت تو ہو تاکہ بیوی میری عزت کر سکے۔ ویسے تو ہر عورت مجبور ہوتی ہے شوہر کو شوہر سمجھنے پر۔ اس کی اطاعت کرنے پر اور اس کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھ کے قبول کرنے پر۔ مگر اب میری خواہش ہے کہ وہ دل سے میری عزت کرے اور جب میرے بچے ہوں تو وہ اپنے باپ پر شرمندہ نہ ہوں کہ ان کا باپ ڈاکو ہے۔ یہ تبدیلی تو پہلے ہی آنے لگی تھی۔ ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر ہے اور جب وہ وقت آتا ہے تو اسباب پہلے سے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ شادی ایک سبب بنی۔ اس نے میرے وجود کے جمود کو توڑا۔ مجھے احساس دلایا کہ میں ڈاکو ہوں۔ جو کوئی شریف آدمی نہیں ہوتا۔ مجھے اپنی بیوی سے نظر ملاتے ہوئے ندامت محسوس ہونے لگی کہ کیا سوچتی ہو گی دل میں وہ عورت جو میری بیوی بنی جبکہ میرا شوہر ڈاکو ہے۔ ہائے ری قسمت! تمہارا آنا دوسرا سبب بن گیا۔"

میں نے کہا "خان صاحب! کیا تم نے اس کی مرضی کے خلاف اس سے شادی کی تھی؟"

وہ کچھ سوچ کے بولا "قسم اللہ کی' ایسی بات تو نہیں تھی۔"

"اس نے پسند کیا تھا تمہیں تو پھر وہ اپنی تقدیر سے کیسے گلہ کر سکتی تھی؟" میں نے کہا۔

"گلہ زبان سے تو نہیں کر سکتی مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شریف عورت کے دل میں یہ خیال بھی نہ آئے کہ کاش میرا شوہر بھی شریف آدمی ہوتا۔ تم بتاؤ' کیا کبھی ایسا خیال نہیں آتا ہو گا اسے؟"

"خیال.... ضرور آتا ہو گا" میں نے تسلیم کیا "کیا کبھی اس نے تم سے کچھ کہا؟"

"کیا؟"

"یہی کہ کوئی اور کام کرو۔ یہ پیشہ بُرا ہے۔"

"نہیں' اس نے زبان سے کبھی نہیں کہا لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ خاموشی کی زبان میں یہ سب کہتی رہتی ہے۔ شاید یہ میرے دل کا چور ہو۔"

"تم نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا ہے؟"

"قسم اللہ کی' ابھی نہیں۔ میں نے سوچا' پہلے تم سے بات کر لوں۔ مجھے معلوم ہے' جب میں اسے یہ بات بتاؤں گا تو وہ کتنی خوش ہو گی" خان کی مسکراتی ہوئی آنکھیں تصور میں اپنی بیوی کا دمکتا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

"خدا تمہارے ارادوں کو تقویت دے۔ تمہارا ایم آر ایس میں آنا مبارک" میں نے کہا۔

"ایم آر ایس! یہ کیا بلا ہے؟"

"مانٹ از رائٹ سوسائٹی" میں نے کہا "یہ نام بس ایسے ہی پڑ گیا۔ کیونکہ ہم خدائی فوجدار کہلانے لگے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہم قانون پر لاقانونیت کو ترجیح دیتے ہیں۔ دل سے ہم قانون کا احترام کرنے والے لوگ ہیں لیکن جہاں قانون مجبور' کمزور اور بے بس ہو جاتا ہے' وہاں ہم بھی مائٹ از رائٹ کے اصول کو اپنا لیتے ہیں کیونکہ جو ہمارے حریف ہیں وہ بھی تو "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے قانون پر عمل کر رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ لاقانونیت کو فروغ دیتے ہیں۔ ہم انھیں اپنی لاٹھی سے ہانک کر قانون کے دائرے میں لانے کے لئے لاقانونیت کا سہارا لیتے ہیں۔ جب تم ہمارے ساتھ رہو گے تو ہمارا یہ فلسفۂ حیات بھی سمجھ لو گے۔ ابھی تو مجھے یہ بتاؤ کہ اس فیصلے کا تمہارے ساتھیوں پر کیا اثر پڑے گا؟"

"میرے بیشتر ساتھی میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ ان کو مجھ سے اب یہ شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ میں پہلے جیسا محمد خان نہیں رہا۔ ایک عورت نے مجھے بزدل بنا دیا ہے۔ انھیں مجھ سے کبھی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ وہ میرے ساتھی اور دوست تھے۔ میرے ماتحت نہیں۔ میں نے اس الزام کو تسلیم کیا اور کہا کہ شاید آگے چل کے میں ان کا ساتھ دینے کے قابل بھی نہ رہوں۔ وہ اپنے طور پر جہاں جانا چاہیں' چلے جائیں۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ اس پرانی رہائش گاہ میں سناٹا رہتا تھا۔ وہاں تھا ہی کون۔ صرف چار جاں نثار رہ گئے تھے۔ پرانے ساتھی اب بھی عزت کرتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر میرے لئے جان

www.paksociety.com

بھی دے سکتے ہیں۔ انہی کی مدد سے میں نے تمہاری حفاظت کی تھی۔"

"اس پرانے گھر میں تو ایسا لگتا تھا کہ سب کچھ ہے۔ نوکر چاکر اور سارے انتظامات چلانے والے۔ ہم نے تو جب بھی بٹن دبا کے کچھ مانگا' فوراً آگیا۔ وقت پر ناشتا' کھانا۔"

"قسم اللہ کی' ملازم صرف ایک تھا جو کچن سے کھانا لاتا تھا۔ وہ بٹن تو پہلے سے لگے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے' ایک سفارت کار رہتا تھا اس میں تو اس کی سہولت کے یہ سامان پہلے سے موجود تھے۔"

"کچن میں کون رہتا تھا؟ بٹن دباتے ہی بڑی میٹھی' سریلی اور شائستہ آواز میں کہتی تھی' یس سر۔"

"وہ۔ ہاں۔ کوثر کی آواز ایسی ہی ہے۔" وہ ہنسا۔

"کون کوثر' کوئی ملازمہ تھی؟"

"نہیں۔ میری بیوی کا نام کوثر ہے۔"

مجھے یوں لگا جیسے محمد خان نے اچانک مجھ پر ٹھنڈے' یخ پانی سے بھرا ہوا مٹکا انڈیل دیا ہو۔ "تمہاری.... بیوی.... ؟" میں نے بمشکل تمام کہا۔ "وہ کرتی تھی سب کے لئے کھانا پکانا جسے ہم حکم دیتے رہتے تھے۔"

"ہاں۔"

میں نے کہا۔ "خان صاحب! یہ تم نے اچھا نہیں کیا ہمارے ساتھ۔ اگر ہم مہمان تھے تمہارے تو تم نے خاتون خانہ سے ملوایا کیوں نہیں؟ اگر وہ پردہ کرتی تھی تو کم سے کم رابعہ کو' گل اور نازو کو اس سے ملوا دیتے۔"

"پردہ تو کرتی ہے وہ لیکن اب تم سے کیا پردہ!"

"پھر یہ بات کیوں چھپائے رکھی تم نے؟ ہم اسے خادمہ سمجھ کے اس پر حکم چلاتے رہے۔ اسے پریشان کرتے رہے وقت ناوقت۔" میں نے سخت شرمندہ ہو کے کہا۔ "وہ تینوں اس کی مدد کر سکتی تھیں۔ اس کا ہاتھ بٹا کے وہ بہت خوش ہوتیں۔"

"بھی کیا ہوا اگر اس نے مہمانوں کی کچھ خاطر مدارات کر لی؟"

میں نے کہا۔ "خاطر مدارات کرنا اس کا حق تھا مگر جواب میں ہم نے کیا کیا؟ ہم نے اسے خاتون خانہ کی عزت دی؟ ہم نے اس کے ساتھ توہین آمیز رویہ اختیار کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے کوئی بد تمیزی نہیں کی۔ ہمیں عادت ہے مذاق کی۔ کوئی بیہودہ بات کہہ بیٹھتے اس سے تو خواہ مخواہ تمہارے ہاتھوں ہمارا خون ہوتا۔"

"قسم اللہ کی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔"

"ہو سکتا تھا خان صاحب۔ تم ٹھہرے پٹھان۔ وہ تم سے شکایت کر دیتی تو تمہارا غیرت مند خون جوش میں آجاتا۔ ہم انجانے میں مقتول ہو جاتے۔" میں نے کہا۔

"وہ ایسی نہیں ہے۔ برا ماننے والی۔" خان ہنسنے لگا۔

میں نے کہا۔ "اچھا اب جتنی بھی ہے' ہمیں اس کی خدمت میں پیش کرو تاکہ ہم اس سے دست بستہ معافی مانگیں۔ اپنی بھابی کو ہم نے اپنی ملازمہ سمجھا۔ اس کی جو سزا وہ دے' ہمیں منظور۔"

محمد خان کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ "چھوڑو یار سکندر۔ ایسی باتیں مت کرو۔ ہم پٹھان بہت بڑا دل رکھتے ہیں مہمانوں کے لئے اور دوستوں کے لئے اور میری بیوی دلی ہی ہے جیسا میری بیوی کو ہونا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے۔ رابعہ' گل اور نازو کو بلاتا ہوں میں۔ تم یہ بتاؤ کہ اسے یہاں کس طرف چھپا کے رکھا ہے؟"

خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہاں وہ نہیں آئی۔"

"پھر کہاں گئی؟"

"میں اسے اس کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ یہ جگہ مناسب نہیں تھی اس کے رہنے کے لئے۔" خان نے کہا۔ "وہ ہوتی تو کیا نازو اور گل کو یہ سب کام کرنے پڑتے؟"

"خان صاحب! ایسا کون سا تیر مارا ہے انہوں نے؟ ان کے کرنے کے کام کیا ہیں۔ آج نہیں کر رہی ہیں تو کیا ہوا۔ کل کریں گی جب اپنا گھر سنبھالیں گی۔ ہر لڑکی کرتی ہے۔ وہ کوئی مریخ کی مخلوق نہیں ہیں' عام لڑکیاں ہیں۔"

"نہیں سکندر! عام لڑکیاں نہیں ہیں وہ۔ میں نے دیکھی ہے یہ دنیا۔ تم خاص لوگ ہو اور اللہ کا خاص احسان ہے تم پر کہ تمہیں ایسی شریک سفر ملیں۔" خان نے کہا۔

"کوثر کہاں رہتی ہے؟" میں نے بے تکلفی میں ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اپنے باپ کے گھر میں۔ اس کا باپ ایک مسجد سے متصل حجرے میں رہتا ہے۔ حافظ ہے اور پیش امام ہے لیکن نابینا ہے۔"

"تمہارا سسر حافظ اور پیش امام ہے!" میں بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں' کوثر ایک ہی بیٹی تھی اس کی۔ ماں پہلے مر چکی تھی۔"

میں نے کہا۔ "تم سے کیسے شادی ہو گئی اس کی؟"

محمد خان نے انگلی اوپر اٹھائی۔ "کہتے ہیں وہ جوڑے اوپر بنتا ہے۔ یہ بھی وہیں کا فیصلہ ہو گا۔ جب اس نے طے کیا کہ اس گنہ گار کو اب توفیق عطا ہونی چاہئے نیکی کی تو اس نے مجھے کوثر سے ملوا دیا۔ پھر تمہیں بھیج دیا۔"

میں نے کہا۔ "کیا حافظ جی کو معلوم ہے؟"

"قسم اللہ کی' انہیں معلوم ہے کہ ان کا داماد ایک ڈاکو ہے۔"

"اس کے باوجود! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی خان صاحب۔" میں نے کہا۔

"میری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ جب حافظ جی نے بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا تھا کہ ضرور اس میں کوئی مصلحت پوشیدہ ہو گی میرے مولا کی اور انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔"

"کیا تم ان کے پاس خود گئے تھے شادی کی درخواست لے کر؟"

"میری اتنی کہاں مجال تھی۔ میں تو ایک رات پولیس سے بچنے کے لئے مسجد میں گھس گیا تھا۔ پولیس مسجد میں بھی آگئی۔ تم جانتے ہو' یہاں مسجدوں کی بے حرمتی کے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وہ جوتوں سمیت اندر آگئے میرے تعاقب میں مگر میں حافظ جی کے حجرے میں گھس کے اندر سے کنڈی لگا کے بیٹھ گیا۔ اس وقت کوثر کو میں نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سر تک چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ حافظ جی جا نماز پر تسبیح لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ "کون ہو میاں؟" میں نے محسوس کیا کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہوا۔ شاید یہ اس ماحول کا اثر تھا۔ میں چاہتا تو اس نابینا حافظ کے سینے پر ریوالور رکھ کے کہہ سکتا تھا کہ خبردار جو آواز نکالی۔ اگر پولیس آئے تو اس سے صرف یہ کہنا ہے کہ یہاں کوئی نہیں آیا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے کہا۔ "حافظ جی' میں ایک ڈاکو ہوں۔ ڈاکو محمد خان۔" انہوں نے کہا۔ "ڈرو نہیں۔ یہ بھی خدا کا ہی گھر ہے۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ مسلمان ہو۔ کلمہ سناؤ ذرا۔" اور میں نے انہیں کلمہ سنایا تو انہوں نے زیر لب جزاک اللہ کہا۔ کچھ دیر تسبیح کے دانے گھماتے رہے۔ پھر بولے۔ "خدا کے گھر آئے ہو تو خدا کو سلام ہی کر لو۔ کسی کے گھر جاتے ہو تو سلام کرتے ہو نا' نہیں؟" میں نے کہا۔ "جی' کرتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ "نماز آتی ہے؟" میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "جی' آتی ہے لیکن کبھی پڑھی نہیں بچپن کے بعد۔" وہ مسکرائے۔ "ہاں۔ بچپن میں پڑھتے ہیں لوگ نماز یا پھر پچپن میں۔ درمیان میں جوانی جو آجاتی ہے۔ خیر' آؤ میری جگہ۔" اور ان کی بات میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ میں مجبور ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "حافظ جی' وضو نہیں ہے میرا۔" انہوں نے کہا۔ "اللہ سے کہہ دینا۔" یہ بڑی عجیب بات تھی لیکن میں بے وضو ہی نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔ میں اسے مجبوری کہوں گا۔ اچانک میرے دل سے سارا خوف دور ہو گیا۔ مجھے پولیس کا خیال تک نہیں رہا اور میں نے بڑے سکون سے نماز ادا کی۔ وہ دن اور آج کا دن' میں نے نماز صرف حالت مجبوری میں چھوڑی ہے۔ مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا بعد میں اور کسی کا ڈر بھی نہیں تھا مجھے۔ میرے ساتھی ہمیشہ کہتے رہے میری اس عادت پر کہ لوٹ مار ڈاکے ڈالے' ادھر سجدے کرے لیکن میں نے کبھی کسی کی پروا نہیں کی۔ بس ایک عجیب نشے جیسی لت پڑ گئی تھی۔ جیسے نشہ نہ ملے تو نشہ کرنے والا بے چین ہو جاتا ہے' ایسے ہی نماز کا وقت ہوتے ہی میرے اندر ایک بے کلی سی بھر گئی تھی۔ اللہ معاف کرے مجھے' میں نماز کو نشے سے تشبیہہ دے رہا ہوں لیکن مجھے اور کوئی مثال نہیں سوجھتی۔ نماز پڑھتے ہی مجھے قرار آجاتا تھا۔ جیسے نشے کے عادی کو نشہ مل جائے تو وہ پرسکون ہو جاتا ہے۔ یہ عادت ابھی تک چل رہی ہے۔ مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ وہ نابینا حافظ کوئی قطب یا ابدال ہے جس نے چند الفاظ میں میرے اندر کے آدمی کو پہچان لیا۔ ڈاکو محمد خان کو اس نے ایک بار جانماز پر بٹھایا اور وہ پھر جانماز کو چھوڑ نہ سکا۔ تم نے اولیاء اور بزرگوں کے واقعات سنے ہوں گے کہ انہیں غیب سے حکم ملا کہ فلاں کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔ یہ بھی کوئی غیب کا فرمان ہی تھا جس نے مجھے وہاں پہنچا دیا تھا۔ اس حافظ نابینا کو بھی یقیناً پہلے سے معلوم تھا کہ ایک گنہ گار دور راستے سے بھٹکا ہوا ڈاکو آنے والا ہے جس کو صراط مستقیم دکھانی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا' وہ ہونا تھا۔ وہ خدا کا حکم تھا جو ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔"

میں دریائے حیرت میں غرق ایک ڈاکو سے وہ باتیں سن رہا تھا جو پہلے کسی صوفی' پیر' فقیر اور کسی پہنچے ہوئے بزرگ سے بھی نہیں سنی تھیں۔ ایک ڈاکو خدا کے معجزے کا اقرار کر رہا تھا۔ میں اس معجزے کی صداقت کو دیکھ رہا تھا۔ جانماز میں نے پہلے بھی محمد خان کے کمرے میں دیکھی تھی اور اس وقت بھی میری نظریں اسی کو دیکھ رہی تھیں۔

"پھر کیا ہوا؟ پولیس وہاں نہیں آئی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "قسم اللہ کی' ضرور یہ بھی کوئی کرامت ہوئی ہو گی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی چادر آگئی ہو گی۔ یا کوئی دیوار۔ انہیں وہ حجرہ نظر ہی نہیں آیا ہو گا۔"

"تم کتنا عرصہ رہے وہاں؟"

محمد خان نے کہا۔ "تین دن۔ میں جب جانے کی بات کرتا تھا' حافظ جی مجھے روک دیتے تھے۔ "ابھی نہیں میاں۔ مجھے خطرہ نظر آرہا ہے تمہارے لئے۔" کیسی عجیب بات ہے یہ سکندر! کہ ایک نابینا جو اپنے سامنے کی چیز نہیں دیکھ سکتا' وہ کہتا ہے کہ اس کی آنکھیں باہر خطرہ دیکھ رہی ہیں اور ایک ڈاکو اس کا مذاق نہیں اڑاتا۔ اسے غلط نہیں سمجھتا بلکہ اس کی بات مان لیتا ہے۔ ان تین دنوں میں کوثر نے میرے لئے سب کچھ کیا۔ کھانا پکانا اور کھلانا۔ وہ بہت کم بولتی تھی۔ کھانا کھا لیں' 'اٹھ جائیں' ادھر بیٹھ جائیں' مجھے جھاڑو دینی ہے۔ حافظ جی پانچ بار نماز پڑھانے جاتے تھے۔ میں اس کے ساتھ اکیلا رہ جاتا تھا۔ نہ حافظ جی نے کبھی مجھ سے کچھ کہا' نہ کوثر نے۔ مجھ پر غیب

www.paksociety.com

کیفیت سی سوار رہتی تھی۔ معلوم نہیں کیوں' مجھے کوثر کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کہ حافظ جی کو معلوم ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ تیسرے دن مجھے خیال آیا کہ کوثر جیسی بیوی ہو تو میری زندگی سنور جائے۔ میں اس سے متاثر تو ہو ہی چکا تھا۔ شام کو یہ خیال میرے ذہن میں آیا اور رات کو حافظ جی نے کہا کہ "میاں' میں چاہتا ہوں کہ اب اس فرض سے بھی سبکدوش ہو جاؤں۔ اب جیسا تم چاہتے ہو' ویسا ہی ہو گا۔ خدا کی مرضی یہی ہے۔" اور میں نے ان سے بحث نہیں کی۔ یہ نہیں پوچھا کہ انہیں خدا کی مرضی کا علم کیسے ہوا۔ خدا کی یہ کیا مرضی ہوئی کہ ایک ڈاکو کے ساتھ تم اپنی بیٹی کو رخصت کر رہے ہو۔ جسے نہ تم نے دیکھا ہے' نہ تم اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو کہ وہ تمہاری بیٹی کو خوش رکھ سکے گا یا نہیں؟"

میں نے کہا۔ "وہ جانتا ہو گا۔"

"قسم اللہ کی۔ وہ جانتا ہو گا۔ تم نے ٹھیک سمجھا۔" محمد خان بولا۔

"تمہارے لئے خدا کا حکم ہو چکا تھا۔ تمہارا اس حجرے میں جانا ضروری تھا اور اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا' سب ناگزیر تھا۔ اس حکم کے تحت تم ہم سے ملے اور ہم تمہارے مہمان ہوئے۔ خدا کی مرضی پوری ہوئی۔ اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے محمد خان۔ کمال تمہاری اپنی فطرت کی اس صلاحیت کا ہے جو نیکی کو جذب کر سکتی ہے۔"

"آج حافظ جی سے ملنے جاؤں گا تو انہیں بتاؤں گا کہ میرے مولا نے مجھے راستہ دکھلایا۔"

"اور تمہاری بیوی۔ وہ کہاں رہے گی؟"

"ہمارے ساتھ۔" خان نے بڑے جوش سے کہا۔ "اس کی تم فکر مت کرو۔ وہ کسی معاملے میں دخل نہیں دے گی۔ بالکل اللہ میاں کی گائے ہے وہ۔ کچھ نہیں کرے گی' سوائے خدمت کے۔"

میں نے کہا۔ "بات یہ ہے خان صاحب کہ یہ کام ذرا مختلف قسم کا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"مطلب یہ کہ ہر عورت کے بس کا نہیں ہے اور پھر جو عورت اللہ میاں کی گائے ہو' کچھ نہ کر سکتی ہو' وہ ایک غیر ضروری ذمے داری بن جائے گی کیونکہ خدمت کی کسی کو ضرورت نہیں ہے۔ سب اپنی خدمت آپ کرتے ہیں' اگر فرصت ملے۔"

میں نے دیکھا کہ خان کا چہرہ اتر گیا۔ "آپ آزما کے دیکھئے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ اس نے کبھی ریوالور یا پستول سے کوئی چلائی ہے؟"

"نہیں۔ ایک پیش امام کی بیٹی کا ایسی چیزوں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا۔ "مشین گن چلا سکتی ہے' دستی بم پھینک سکتی ہے؟"

"آپ مذاق کرتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ یہ مذاق نہیں ہے۔ یہ جو تین لڑکیاں ہمارے ساتھ ہیں' یہ ہر قسم کا اسلحہ استعمال کر چکی ہیں۔ مقابلے پر آنے والے نہ جانے کتنے دشمنوں کی لاشوں کے چیتھڑے بکھیر چکی ہیں۔ یہ خود بھی گولیوں کی بوچھاڑ سے گزر جاتی ہیں۔ بارودی سرنگ' ٹائم بم اور ڈائنامائٹ لگا سکتی ہیں۔ دستی بم پھینک سکتی ہیں اور ان میں خاص طور پر گل کا نشانہ بہت اچھا ہے۔ نازو کے ہاتھوں کا کمال تم دیکھ ہی چکے ہو۔ اس نازک سی لڑکی کا مقابلہ چار مرد نہیں کر سکتے۔ وہ چاروں کی ہڈیاں توڑ دے گی۔ یا انہیں جان سے مار دے گی۔ رابعہ ایک وکیل بھی ہے۔ بہت اونچے درجے کی۔ نازو ایک نرس بھی ہے' مرہم پٹی کر سکتی ہے۔ اب بتاؤ' تمہاری کوثر کو ایسا کوئی کام آتا ہے تو ہم اسے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔"

محمد خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "قسم اللہ کی' وہ تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ تم نے ٹھیک کہا۔ اس کا پیچھے رہ جانا ہی اچھا ہے' ورنہ وہ تو گولی کی آواز پر غش کھا جائے گی۔ لاش گرتے دیکھ لے گی تو بیہوش ہو جائے گی۔ میں سمجھا دوں گا اسے۔"

میں نے کہا۔ "صبر کرنا بھی تو جہاد سے کم نہیں۔ وہ تمہاری سلامتی کے لئے دعا کر سکتی ہے اور فاتحانہ واپسی تک انتظار کر سکتی ہے۔"

محمد خان نے کہا۔ "میں اسے بتا دوں گا۔"

"اس کے علاوہ تمہارے وہ ساتھی جو ابھی تک ساتھ نبھا رہے تھے' شاید تمہارے فیصلے سے مایوس ہوں گے۔"

"انہیں میں رخصت کر دوں گا۔" خان نے کہا۔

"کیا کہو گے ان سے؟"

"یہی کہ بس اب ہمارے راستے الگ ہو گئے ہیں۔ یہیں تک ساتھ تھا ہمارا۔"

"وہ وجہ نہیں پوچھیں گے؟"

"وجہ وہ جانتے ہیں۔ انہیں پہلے سے اندازہ ہے کہ مجھے شادی کے بعد شرافت کا بخار ہو گیا ہے کیونکہ میں نے ایک جی کی بیٹی سے شادی کر لی۔ اس لئے یہ تو ہونا ہی تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ انہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم ہمارے ساتھ جا رہے ہو۔" میں نے مطمئن ہو کے کہا۔

"کیا میں کوثر کو بھی کچھ نہ بتاؤں؟"

میں نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم' تمہاری بیوی کس حد تک راز کو راز رکھنے کی اہل ہے۔ عام طور پر عورتیں اس معاملے میں بدنام ہیں۔"

"میں حافظ جی کو بتادوں گا وہ بعد میں خود سمجھاتے رہیں گے اسے۔" محمد خان بولا۔ "کہنا میں اس کے ساتھ ہی کہلوں گا۔"

میں نے کہا۔ "حافظ جی سے یہ بھی کہنا کہ ہمارے لئے دعا ضرور کریں۔"

محمد خان چلا گیا تو میں کمرے سے نکلا۔ باقی سب لوگ ایک ہی کمرے میں جمع تھے۔ غالب اور محسن ایک کاپی کے صفحے پھاڑ پھاڑ کے پنسل سے کچھ لکھتے جا رہے تھے۔ فرش پر مڑے تڑے کاغذوں کی گولیاں بکھری پڑی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کتنی محنت کر چکے ہیں۔

"اٹھ گئے بھائی شریف۔" محسن بولا۔

"شریفن کئی بار یاد کر چکی ہیں۔" غالب نے کہا۔ "میں نے تو کہا کہ صور اسرافیل پھونکو' پھر اٹھے گا۔"

"میں گزشتہ ڈیڑھ گھنٹے سے ایم آر ایس کی رکنیت کے ایک امیدوار کا انٹرویو کر رہا تھا۔" میں نے زمین پر آلتی پالتی مارتے ہوئے کہا۔

"اب کیسے بھرتی کر لیا۔ اس شتر بے مہار کو؟"

میں نے انہیں محمد خان سے گفتگو کے کچھ اقتباسات سنائے۔ رابعہ' نازو اور گل اپنی باتیں چھوڑ کے میری طرف متوجہ ہوئیں تو محسن اور غالب نے انہیں ڈانٹا۔

"یہ آپ لوگوں کی باتیں نہیں ہیں۔ چلیں' اپنے بھوتوں کی باتیں کریں۔"

غالب نے کہا۔ "ہاں' رات ہو گئی ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے ملاقات کے لئے۔ اب خواہ مخواہ مت گھورو مجھے۔ میں نے اپنے کسی سسر کا نام نہیں لیا ہے۔"

گل نے کہا۔ "ہم کسی بھوت سے نہیں ڈرتے جی۔"

نازو نے کہا۔ "ہاں جب تم سے نہیں ڈرتے تو بھوت کیا ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میری بات سنو گے یا آپس میں لڑتے رہو گے؟"

"ہم سن رہے ہیں اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ خوانی خان نے عملاً ہمارا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" محسن بولا۔

"ایک سنسنی خیز خبر ہمارے پاس بھی ہے۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا۔ "تم نے اس خفیہ زبان سے پھر کوئی مطلب نکال لیا ہو گا۔ جیسے پہلے نکالا تھا۔"

محسن نے مجھے قابل فاست سمجھتے ہوئے کہا۔ "دوپہر کے بعد سے آپ تو سوئے پڑے تھے گھوڑے بیچ کے۔ ہم اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔"

"ایک دائرے میں۔" میں نے کہا۔

غالب اپنی کامیابی پر ضرورت سے زیادہ خوش تھا۔ اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا کر کہا۔ "اسے دیکھو چیف کہ تو ہم نے دشمن کا کوڈ پکڑ لیا ہے۔"

میں نے کاغذ کو غور سے دیکھا۔ "مجھے سمجھاؤ کہ آخر یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔"

غالب نے کہا۔ "پہلی تحریر تھی ہندسوں میں۔ ہم نے غور کیا تو اس میں سب سے بڑا عدد چھبیس کا تھا۔"

محسن نے کہا۔ "اور شاید آپ نے انگریزی پڑھی ہو۔ اس میں چھبیس حروف تہجی ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آفرین۔"

غالب نے کہا۔ "اس کے بعد ہم نے فرض کیا کہ چھبیس کا مطلب ہے زیڈ۔ پچیس ہو گیا وائی۔ اور اس طرح ایک نمبر ہو گیا اے۔ چونیں۔"

"مگر اس طرح اعداد کی جگہ الفاظ لکھنے سے جو عبارت بنی وہ کچھ یہ تھی۔" محسن نے ایک کاغذ مجھے تھما کے کہا۔

میں نے ایک بے معنی عبارت کو پڑھنے کی بے سود کوشش کی۔

اس پر جو تحریر تھی وہ کچھ یوں تھی۔

GDVMGR IIVEVMGS NROV

میں نے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ تمہاری عقل کے گھوڑے کیا بھنگ پی کر دوڑ رہے تھے۔ اور وہ گھوڑے تھے یا گدھے؟"

غالب ہنسا۔ "یہ بھی پوچھ لو کہ ہم کس طرف منہ کر کے بیٹھے تھے۔ دُم کی طرف یا منہ کی طرف۔"

محسن نے کہا۔ "یہ عقل آپ کی نہیں تھی جس سے ہم نے مدد لی۔ یہ کمال ہے ہمارے ان اعلیٰ دماغوں میں محفوظ سپر فائن گریڈ عقل کا۔"

غالب نے کہا۔ "ظاہر ہے اس نتیجے نے ہمیں بھی مایوس کیا تھا مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ اور دوسرا فارمولا وضع کیا۔"

"وہ میرا فارمولا تھا۔" نازو نے کہا۔

"خواہ مخواہ عقل مند بننے کی کوشش مت کرو۔ فارمولے کا مطلب معلوم ہے؟" غالب نے کہا۔

"تم نے کیا پیٹنٹ کرا لیا تھا اپنا فارمولا؟" محسن بولا۔

"غالب کے بچے' کھاؤ قسم کہ میں نے نہیں کہا تھا۔" نازو نے کہا۔

"لاؤ' کلام مجید ہے' قسم میں کھا کے دکھاتا ہوں۔ تم اس کی باتوں پر مت جاؤ۔ ہم نے اعداد کو الٹ کر دیکھا۔ یعنی یہ کہ نمبر چھبیس اگر انگریزی حرف اے کا ہو اور گنتی الٹی چلے تو ایک نمبر ہو جائے زیڈ کا۔"

محسن نے ایک کاغذ کو فتح کے جھنڈے کی طرح لہرایا۔

www.paksociety.com

"یوں حضرات و خواتین جو مطلب نکلا وہ آپ کے سامنے ہے۔"

میں نے کاغذ لے کر دیکھا۔ اس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔
ستائیسواں میل
(TWENTY SEVENTH MILE)

میں ان کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا "یہ تو واقعی کمال کر دیا تم نے۔ اگرچہ فارمولا مس نازو کا استعمال کیا۔"

نازو نے چہک کے کہا "صداقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے۔"

غالب نے اسے گھور کے کہا "کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے۔ ذرا دور ہٹ کے بیٹھو۔ لہسن کی بو آ رہی ہے۔"

نازو کا موڈ آف ہو گیا "چلو گل، کھانے کا کچھ کریں" اس نے احتجاجی انداز میں واک آؤٹ کرتے ہوئے کہا۔

"دوسری عبارت کا مطلب کیا نکلا؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے مسکرا کے کہا "میں یہ نہیں کہوں گی کہ اس کا فارمولا میں نے بتایا تھا۔"

"کہہ بھی دوگی تو کیا فرق پڑے گا" محسن جھلا کے بولا۔

غالب نے کہا "دوسری عبارت میں گنتی سیدھی تھی۔ لیکن کہیں کہیں کوڈ نمبر بھی استعمال ہوا تھا۔ تاہم اس کا مطلب ہم نے کئی بار کوشش کر کے یہ نکالا۔"

"سنہرا شاہین" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"(GOLDEN FALCON)"

"سنہرا شہباز۔ میری معلوماتِ عامہ کے مطابق شکاری باز کی ایک انتہائی کمیاب قسم ہے جس کی قیمت لاکھوں تک جاتی ہے۔"

میں نے کہا "مگر یہ بات تو ایسی نہیں کہ اسے پُراسرار طریقے پر لکھی جائے۔"

غالب نے کہا "ظاہر ہے اصل مطلب کچھ اور ہوگا۔ جو ابھی ہم معلوم نہیں کر سکے۔"

"اسی طرح ستائیسواں میل چہ معنی دارد" میں نے کہا۔

"تم بھی تو کچھ کرو چیف۔ ہم نے تالے کی چابی تلاش کر لی تم کم سے کم تالا کھول کر دیکھو" محسن نے کہا۔

"لو کے۔ میں معلوم کر لوں گا کہ یہ راز کیا ہے" میں نے کہا "مگر پہلے میں معلوم کرنا چاہوں گا کہ اس رات کا مینو کیا ہے؟"

"وہی مسوری دال + چاول" رابعہ نے کہا۔

میں نے مرگھٹ کے کہا "پھر دال۔ جیلوں کے ولیں تک آ کے کیا تم نے بھی گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے۔"

غالب نے کہا "گوشت نہ کھانے سے مسلمان کا ایمان کمزور نہیں پڑتا۔"

میں نے فریادی لہجے میں کہا "مگر مسلمان خود تو کمزور پڑ جاتا ہے۔"

محسن نے کہا "اب کیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے ہول سیل میں چاول پکائے ہیں ہفتے بھر کے لئے۔ پنچ اور ڈنر میں اور کچھ نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "تین وقت مسلسل دال کھانے کے بعد اگر میں اس تشدد سے ہلاک ہو جاؤں تو کم سے کم میرے سوئم میں قورمہ پلاؤ پکوا لینا۔"

غالب نے کہا "ان پھوہڑ خواتین میں سے کسی کو آتا ہے قورمہ پکانا؟ نازو پوچھ رہی تھی کہ کیا قورمے میں گوشت پڑتا ہے۔"

رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا "وہ سامنے نہیں ہے اس لئے جو چاہو کہو۔"

غالب نے کہا "بی بی! ہم ڈرتے نہیں ہیں کسی سے۔ تم سامنے ہو۔ تم بتاؤ کیا تم نے نہیں پوچھا تھا؟ کیا پوچھا تھا یار محسن؟"

محسن نے کہا "یہی کہ قورمہ پکاتے وقت چمچہ دائیں سے بائیں چلانا چاہئے یا بائیں سے دائیں۔"

"اور دیگچی الٹی رکھنی چاہئے یا سیدھی" غالب نے کہا۔

رابعہ نے کہا "باتیں کر لو قورمے کی۔ کھانی تو دال ہی پڑے گی۔"

لیکن اسی وقت نازو اور گل ٹرے اٹھائے اندر آئیں تو خوشبو نے سارا راز فاش کر دیا۔ انہوں نے چکن روسٹ کیا تھا اور چکن بریانی پکائی تھی اور ثابت کر دیا تھا کہ وہ اچھا پکا سکتی تھیں۔

میں نے کہا "یہ اچانک مرغیوں کی افراط کیسے ہو گئی؟"

غالب نے محسن کی طرف اور محسن نے غالب کی طرف دیکھ کے کہا "ہم خود لے کر آئے ہیں۔"

میں نے کہا "تم لوگ بازار گئے تھے؟"

"نہیں۔ بازار تو خیر نہیں گئے تھے۔"

"پھر یہ مرغیاں کہاں سے آئیں؟" میں نے کہا۔

"یار، آم کھانے والے کو پیڑ نہیں گننے چاہئیں" غالب نے کہا۔

"چکن قورمہ اور چکن بریانی کھانے والے کو فضول سوالات سے گریز کرنا چاہئے" محسن بولا۔

غالب نے کہا "اور دال کے وبال سے بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔"

رابعہ اور گل نے ہنسنا شروع کیا تو میں سمجھ گیا "کس کی مرغیاں پکڑی ہیں؟" میں نے کہا۔

سب سے زیادہ غالب اور نازو مجرم بنے ہوئے تھے۔ نازو نے کہا "سکندر، وہ خود ہی آ گئیں اندر۔"

"ہم کوئی انہیں پکڑنے کی نیت کر کے نہیں گئے تھے۔ ہم تو بس ایسے ہی ٹہلنے کے لئے نکلے تھے" غالب نے کہا۔ "ویسے تو ہم نے بھی یہ کام کئے تھے بچپن میں مگر نازو کی مہارت کا جواب نہیں۔ ایکدم زبردست مرغی چور ہے۔"

نازو بگڑ گئی "مجھے تم نے مجبور کیا تھا۔"

"میں نے صرف یہ کہا تھا کہ یہ مرغی پکڑ کر دکھاؤ ذرا" غالب نے ذہیت بن کے کہا "یہ نہیں کہا تھا کہ اسے پکڑ کے کچن میں لے جاؤ۔"

"ذبح کس نے کی تھی؟ اور صاف کس نے کی تھی۔ کس نے کہا تھا کہ بڑا جی چاہتا ہے چکن روسٹ اور چکن بریانی کھانے کے لئے۔"

اب جو جنگ شروع ہوئی تو اس میں گل اور محسن بھی فریق بن گئے۔ مرغی محسن نے ذبح کی تھی اور گل نے صاف کی تھی اور اس جرم کے ایڈونچر میں سب برابر کے شریک تھے۔ جب کھانا ختم ہوا تو سب کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ طے یہ کیا گیا تھا کہ مرغی کی قیمت کے برابر رقم سب اپنے اپنے طور پر صدقہ دیں گے تاکہ کفارہ ادا کیا جا سکے۔ معلوم نہیں یہ فیصلہ کس حد تک درست تھا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ مرغی کو چوری کی نیت سے نہیں پکڑا گیا تھا۔ اگر مالک سامنے ہوتا تو اسے قیمت ادا کر کے بھی مرغی خرید لی جاتی۔ کچن میں دال چاول کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ مرغی نے چکن بریانی کے امکانات کو روشن کیا اور اس دعوت کو ممکن بنا دیا۔

چائے رابعہ نے بنائی۔ گل اور نازو نے چند سیپ چلا کر برتن دھوئے اور اس وقفے میں سگریٹیں پھونکتے ہوئے میں نے غالب نے اور محسن نے اس نوٹ بک کے باقی صفحات کی غور و فکر کیا۔ اگلے چند صفحات پر کچھ نام تھے۔ ایک نام تھا "پی آر ملہوترہ" جس کے آگے بریکٹ میں "بالک رام" بھی لکھا ہوا تھا۔ دوسرا نام "کرن شما" تھا۔ جس سے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل تھا کہ یہ عورت ہے تو ہندو ہے، مسلمان یا عیسائی۔ دو صفحات پر ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ یہ ایک ٹیڑھی میڑھی شکستہ لکیر تھی جو دائیں بائیں اوپر نیچے بہت سے گول دائروں کو آپس میں ملاتی تھی۔ ہر دائرے پر ایک نام تھا۔

میں نے کہا "یہ لکیر کسی راستے کو ظاہر کرتی ہے؟"

محسن نے مجھ سے اتفاق کیا "اور غالباً یہ سڑک ہے جس پر بنے ہوئے دائرے مختلف مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں۔"

غالب نے کہا "کیا یہ شہر نہیں؟"

میں نے کہا "شہر، قصبے، گاؤں کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ان کے ٹھکانے ہیں۔"

محسن نے کہا "کیا یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ٹھکانے کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "اس کے لئے خاصے بڑے نقشے کی ضرورت پڑے گی جس میں تمام چھوٹے بڑے شہر اور قصبے اور انہیں آپس میں ملانے والی سڑکیں دکھائی گئی ہوں۔ لیکن اس سے بھی صرف اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ بالکل صحیح مقام کا پتہ چلانا تقریباً ناممکن ہے۔"

"ناممکن کیوں ہے نقشہ سامنے ہو تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کون سا دائرہ کس شہر یا قصبے کی جگہ بنایا گیا ہے۔"

میں نے کہا "نقشے میں ایک چیز ہوتی ہے اسکیل یعنی یہ کہ ایک سینٹی میٹر یا ایک انچ کتنے فاصلے کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً ایک انچ اگر تین سو میل کے برابر ہو تو دو شہروں کا درمیانی فاصلہ معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں اور فاصلہ معلوم ہو تو یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ بمبئی سے ایک انچ کے فاصلے پر شمال مغرب میں کون سا شہر یا قصبہ ہے اور تین انچ شمال مشرق میں کوئی نشان کس آبادی کو ظاہر کرتا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس ڈائری میں جو راستہ بنایا گیا ہے وہ کسی اسکیل کے مطابق ہے یا نہیں۔ ہم یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ دو دائروں کے درمیان جو فرق دکھایا گیا ہے وہ اصل فاصلے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ تو بس کسی ڈرائیور کی رہنمائی کے لئے ہے کہ یہاں سے چل کر وہاں جانا ہے۔ ایک منزل سے دوسری منزل تک کس طرح پہنچنا ہے۔"

غالب نے میری بات سب سے پہلے سمجھی "یہ بالکل ٹھیک ہے۔ قصبے، شہر کا نام اس لئے درج نہیں کیا گیا ہے کہ کسی کو راستے کا علم نہ ہو سکے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ہر دائرے پر ایک نام ہے۔ کسی شخص کا جو غالباً کوئی درمیانی آدمی ہے۔ رابطے کا ذریعہ ہے یا مال وصول کر کے آگے ترسیل کا ذمے دار ہے۔"

محسن نے کہا "پھر تو یہ بہت اہم چیز ہے۔"

میں نے کہا "اہم نہ ہوتی تو اس کی تلاش میں لوگ ہمارا تعاقب کرتے ہوئے کیوں آتے۔ یہ نوٹ بک غلطی سے رہ گئی تھی۔ انہیں بعد میں پریشانی ہوئی کہ کہیں اہم معلومات ہمارے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ مد مسودن اور کیرلی کو قتل کرنے والے نوٹ بک کی تلاش میں واپس گئے اور جب انہیں نوٹ بک نہیں ملی تو انہوں نے یہ سراغ لگانے کی کوشش کی کہ اسے کون لے جا سکتا ہے۔ جب مد مسودن اور کیرلی کی لاش کے پاس ہماری موجودگی ثابت ہوئی تو انہوں نے ہمیں تلاش کیا۔ اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتے اگر ہم مرحوم تایا کے چائے خانے کے پیچھے ان کے گھر میں نہ چھپے ہوئے ہوتے۔"

رابعہ نے کہا "پولیس کی وردی سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔"

میں نے کہا "بھیس بدلنے کے لئے پولیس کی وردی سے

www.paksociety.com

بستر کوئی لباس نہیں' میں بھی اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ ایک تو پولیس ہر جگہ ہے اور وردی کسی سے بھی چھینی جا سکتی ہے۔ پھر یہ وردی پہن کے آدمی آسانی سے پولیس میں شامل ہو جاتا ہے اور کسی حد تک گم ہو جاتا ہے۔ وہ پبلک میں شامل نہیں رہتا اور پولیس کے لئے یہ بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ہی ساتھیوں پر شک کرتے اور ان سب کو چیک کرنے لگے۔ آئندہ ہم بھی پولیس کے تعاون سے ہی کام چلائیں گے۔"

"اور انہیں مزید بدنام کریں گے۔" محسن بولا۔

"نہ وہ بدنامی سے ڈرتے ہیں اور نہ انہیں بدنامی سے کوئی فرق پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "توتے کو کیا ڈر کہ اس کے بدن پر کالک نہ لگ جائے۔"

غالب نے ایک بہت پتے کی بات کی۔ "اگر یہ نقشہ اور اس میں دیئے گئے نام اتنے ہی اہم ہیں تو اس کی ایک ایک نقل ہم سب کے پاس ہونی چاہئے۔ تاکہ اصل گم ہو جائے یا چھن جائے تو فرق نہ پڑے۔"

نازو نے کہا۔ "یہ میں نے کہا تھا۔"

غالب نے خفت میں جھلا کے کہا۔ "ہاں' ہاں۔ ہر عقل کی بات جو میرے منہ سے نکلتی ہے تمہارے دماغ کی پیداوار ہوتی ہے۔ اپنا دماغ تو میں نے فرائی کر کے کھالیا ہے اور تمہارے بھیجے سے کام چلا رہا ہوں۔"

"یعنی مس نازو کا دماغ فی الحال خالی ہے ایک دم۔" محسن بولا۔

"خالی دماغ شیطان کا ورکشاپ ہوتا ہے انگریزی محاورے کے مطابق۔" میں نے کہا۔

"اسی لئے تو بھوت نظر آتے ہیں اسے۔"

"خبردار جو تو نے بھوت کو اپنا سسر کہا۔" محسن بولا۔

"میری بیوی کا باپ بھوت ہو یا جن' کسی کو کیا۔" غالب نے نازو کی طرف دیکھ کے کہا۔ "میں کسی بھوت کی بچی سے نہیں ڈرتا۔"

اس مرتبہ غالب نہ بچ سکا۔ نازو نے اسے ہاتھ پکڑ کے بیٹھے بیٹھے کھینچا اور ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا کے اپنے پیچھے پھینک دیا۔ اس سے پہلے کہ نازو مزید جارحانہ کارروائی کرتی محسن ان کے بیچ میں آ گیا۔

"آخر یہ کیا غنڈا گردی ہے مس نازو۔ ہمارا یار اپنے سسر کو بھوت کہتا ہے تو تم کیوں خفا ہوتی ہو۔" محسن نے ڈانٹ کر کہا۔

"سکندر کیوں نہیں کہتا اپنے سسر کو بھوت' تم کیوں نہیں کہتے؟" نازو نے لال پیلا ہو کے کہا۔

"اس لئے کہ میرا سسر بھوت نہیں تھا۔ وزارت خارجہ میں ڈپٹی سیکریٹری تھا۔" محسن نے کہا۔ "اب اگر وہ بھوت بننا چاہے تو کیا میں روک سکتا ہوں اسے۔"

میں نے کہا۔ "اور سسر سچ مچ بھوت بن کر سامنے آ جائے تب بھی میں اسے بھوت نہیں کہوں گا۔"

"پھر کیا کہو گے؟" غالب نے سوچ کر کہا۔

"میں اسے گھوسٹ کہوں گا۔" میں نے متانت سے کہا۔

اس کے بعد رابعہ اور نازو احتجاجاً چادر میں منہ لپیٹ کر سو گئیں لیکن مجھے پتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہیں۔ میں محمد خان کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے تفصیل سے اس کی شادی کے بارے میں بتایا اور کوثر کے نابینا والد کے کشف و کرامات کا ذکر کیا جس نے ایک ڈاکو کو شرافت کی زندگی سے روشناس کرانے میں پہل کی تھی اور اس کے دل کے تاریک گوشوں کی روشنی کی پہلی کرن دی تھی۔

میں دن میں نیند پوری کر چکا تھا۔ غالب کو کچھ بے خوابی کی شکایت تھی۔ محسن اونگھنے لگا تو میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ سو جائے۔

"چلو ہم بھوتوں سے مل آئیں۔" میں نے تجویز پیش کی۔ "عام طور پر وہ آدھی رات کے وقت ملتے ہیں۔"

"لیکن ہم ان سے ملیں گے کہاں؟"

"گھوم پھر کے دیکھتے ہیں اس ویرانے میں۔ شاید کہیں ملاقات ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"چلو۔ ممکن ہے میرا سسر بھی مل جائے۔" غالب نے زور سے کہا تاکہ نازو بھی سن لے۔

نازو نے جاتے جاتے خراٹے لینے شروع کر دیئے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ گہری نیند میں ہے کچھ نہیں سن رہی ہے۔

"مل گیا تو کیا کہو گے؟" میں نے کہا۔

"کہوں گا کہ اپنی بیٹی کو سمجھا لو ورنہ میں دماغ درست کرنا جانتا ہوں۔ اور مجھے کوئی کمی بھی نہیں ہے لڑکیوں کی۔"

میں نے کہا۔ "اس میں کیا شک ہے۔ ابھی وحیدہ رحمان ہے اور صوفیہ لورین ہے اور رانی ہے...."

نازو چادر کے اندر سب سن کے یقیناً بہت تاؤ کھا رہی ہوگی مگر اس نے سوا پن کے ہماری بک بک کا جواب نہ دینا بہتر سمجھا۔

"تم بھی چلو گل۔" غالب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھوت دیکھنے۔"

"میں... نہیں... آپ لوگ جائیں۔" گل کی حالت غیر ہونے لگی۔ "میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

میں اور غالب باہر نکلے تو میں نے کہا۔ "میں بات کرنا چاہتا تھا شملا کی۔ کل رات سے اب تک چوبیس گھنٹے گزر گئے ہیں۔"

"پھر؟" غالب نے کہا۔

"کیا ہمیں وہاں جا کے صورت حال کا جائزہ نہیں لینا چاہئے؟"

میں نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ وہ روانہ کر دیں مال اور ہمیں پتا بھی نہ چلے۔"

"تمہیں راستہ یاد ہے۔ وہ کیا جگہ تھی؟"

میں نے کہا۔ "راستہ تو بالکل ذہن میں نہیں لیکن گودام تھے وہاں۔"

"گودام شہر کے ہر علاقے میں ہو سکتے ہیں۔ مشرق میں بھی ہو سکتے ہیں اور مغرب میں بھی۔"

ہم دونوں پرانی حویلی کے بند کمروں میں جھانکتے ہوئے چلتے گئے۔ محمد خان نے کہیں کہیں بلب لگوا دیئے تھے' اس کے باوجود تاریکی جو اس عمارت کے در و دیوار سے کالک بن کے چپکی ہوئی تھی' دور نہیں ہوئی تھی۔ بیچ کی راہداری کی چھت شاید بیس فٹ بلند تھی اور اس پر خوبصورت نقش و نگار والے ٹائل تھے۔ لیکن یہ ٹائل اکھڑ رہے تھے اور خالی جگہ اب کسی زخم کی طرح نظر آتی تھی جو وقت کے ہاتھوں نے اس تاریخی عمارت کے جسم پر لگا دیئے تھے۔ دیواروں کا پلاستر بھی جگہ جگہ سے اکھڑ کر گر چکا تھا اور اس کے نیچے سے پرانی چھوٹی اینٹیں نظر آنے لگی تھیں۔

باتھ روم اور کچن کے راستے سے ہم باہر کی طرف آ گئے۔ میں نے کہا۔ "اگر وہ یوسف ثانی مل جاتا تو ہماری رہنمائی کر سکتا تھا۔"

"آخر وہ گیا کہاں؟"

"مجھے اس کے جانے کا بالکل پتا نہیں چلا۔ یہاں تک وہ ہمارے ساتھ ہی آیا تھا۔ بلکہ ہمیں وہی لے کر آیا تھا۔ اس کے بعد غائب۔ وہ آدمی نہیں چھلاوا ہے۔"

غالب نے کہا۔ "کیا محمد خان واپس آئے گا؟"

"پتا نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ حافظ جی سے بات کرے گا اور کھانا اپنی بیوی کے ساتھ کھائے گا۔ وہ بھی لے جا سکتا ہے ہمیں۔" میں نے کہا۔ "اس کا ساتھ ایک بہت بڑا سہارا ہو گا۔"

"ہاں وہ اس سارے علاقے کو اچھی طرح جانتا ہے۔"

"اور ایک عام آدمی کے مقابلے میں ایک ڈاکو خفیہ راستوں سے اور خفیہ مقامات سے زیادہ واقف ہوتا ہے۔"

"اسے اب ڈاکو مت کہو۔" غالب نے کہا۔

"وہ ڈاکو تھا تو سہی۔ اس کا تجربہ...." بات کرتے ہوئے میں نے رک کر پیچھے دیکھا۔

غالب نے کہا۔ "یہ آواز تم نے سنی؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ چوڑیوں کی جھنکار' پائل کی کھنکار۔"

میں نے ایک سایہ دیکھا جو تیزی سے پرانے درخت کے تنے کے پیچھے چھپ گیا۔ میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "کون ہے؟" پھر غالب اور میں دوڑ کر ایک ساتھ درخت تک پہنچے مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اسے فریب سماعت یا فریب نظر اس لئے نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جو میں نے دیکھا اور سنا تھا وہ غالب نے بھی دیکھا اور سنا تھا۔

"یار' یہ کیا چکر ہے۔ پرانی انڈین فلم مغل اعظم شروع ہونے والی ہے کیا؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا۔ "ابھی مدھوبالا اچانک گاتا گاتی ہوئی نمودار ہوگی۔ آئے گا۔ آئے گا۔ آنے والا۔"

ہمارے پیچھے کوئی آہستہ سے ہنسا۔ یہ پُر متانت مردانہ ہنسی کی آواز تھی۔ پھر کسی نے کہا۔ "کیا زندگی فلم نہیں ہوتی؟ یا فلم میں حقیقی زندگی کی کوئی بات نہیں ہوتی؟"

میں کچھ دیر ہکا بکا کھڑا رہا۔ ابھی چند سیکنڈ قبل وہاں کوئی بھی نہیں تھا جہاں اب ایک شخص ہاتھ میں گول مٹھ والی چھڑی لئے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر پگڑی تھی' اس نے دھوتی پر کوٹ پہن رکھا تھا اور قمیص کے ساتھ ٹائی باندھ رکھی تھی۔ اس علاقے کے لوگ بہت پرانی تصویروں میں نظر آتے تھے۔ وہ بھاری بھرکم آدمی تھا اور اس کے چہرے کی مناسبت سے گول شیشوں والے چشمے کا فریم یقیناً چھوٹا تھا۔ وہ کلین شیو تھا لیکن اس کی مونچھیں تلوار مارکہ تھیں۔

"آپ کون ہیں؟" میں نے کہا۔ "اور اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

وہ آہستہ آہستہ آگے آیا۔ "اصولاً تو یہ سوال کرنے کا حق مجھے حاصل ہے۔ کیونکہ میں اس حویلی کا مالک رائے بہادر پرشاد او بی ای ہوں۔ او بی ای کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"جی۔ آرڈر آف دی برٹش ایمپائر۔" میں نے فخر سے کہا۔ "میں چار سال برطانیہ میں رہ چکا ہوں۔"

"او آئی سی۔ شاید اسی لئے تم جانتے ہو۔ ورنہ آج کل کے نوجوان عموماً گزرے ہوئے کل کی تاریخ کو اتنی اہمیت نہیں دیتے' وہ آنے والے کل میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "رائے بہادر صاحب! کیا ایسا کرنا غلط ہے؟"

"بالکل غلط رویہ ہے یہ۔ آنے والے کل کی بنیاد گزرے ہوئے کل کے تجربے پر رکھی جاتی ہے تو آدمی ہوتا ہے جو اب ہو رہا ہے۔ روایات کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ وضعداری باقی نہیں رہتی اور بس انداز گولڈ والی بات لطیفہ بن جاتی ہے۔" رائے بہادر نے بڑے دکھ سے کہا۔

"خود آپ نے اپنے ماضی سے رشتہ توڑ لیا ہے۔"

"میں نے...؟" رائے بہادر نے نفی میں سر ہلایا۔

"اگر ایسا نہیں ہے تو پھر آپ نے اس حویلی میں رہنا کیوں ترک کیا۔ یقیناً آپ نے جدید طرز کا بنگلہ یا محل بنوالیا ہو گا جو ہو بہو یا میرین ڈرائیو پر۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ آپ میری نظر سے دیکھیں تو جو حسن اس حویلی میں ہے...."

غالب نے کہا۔ "کیا طرز تعمیر کی اس روایات کو آپ نے اپنے نئے محل میں برقرار رکھا ہے؟"

www.paksociety.com

رائے بہادر نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر آپ نئی نسل کو کیا الزام دیتے ہیں۔ اگر وہ روایات سے ہٹتے جا رہے ہیں۔"

رائے بہادر نے کہا "کبھی کبھی میں یہی دیکھنے کے لئے آجاتا ہوں کہ میرے ماضی کی یہ نشانی سلامت ہے یا نہیں۔ اکثر میں نے دیکھا کہ یہاں فقیر آوارہ گرد ٹھہرے ہوتے ہیں۔ دو دو ٹکے کی عورتوں کو فٹ پاتھ سے اٹھا کر یہاں لے آتے ہیں۔"

"آپ پولیس کو کیوں نہیں بتاتے۔ چوکیدار سے باز پرس کیوں نہیں کرتے؟" غالب نے کہا۔

"چوکیدار ہی تو بدمعاشی کرتا ہے۔ دس دس روپے لیتا ہے ان سے۔ مجھے معلوم ہے۔ دوسرا رکھوں گا تو وہ بھی یہی کرے گا اور پولیس کو لانا بھی مشکل ہے۔ پولیس کے آنے سے پہلے تو بدمعاش بھاگ جاتے ہیں۔ تم نے دیکھا' شراب کی کتنی خالی بوتلیں پڑی ہیں یہاں۔ ایک شرابی نے کسی عورت کو قتل بھی کر دیا تھا یہاں۔ نشے میں۔ وہ بھی کوئی طوائف ہی تھی۔"

"دیکھئے۔ ہم بہرحال شریف لوگ ہیں۔" میں نے کہا۔

رائے بہادر ہنسے "بھئی تم سے کچھ کہا میں نے؟"

"ہم چلے جائیں گے کل تک" غالب نے کہا۔

"نہیں۔ رہو جب تک رہنا ہے۔ اگر کوئی جگہ نہیں ہے تمہارے پاس تو رہو۔ میں کون سا کرایہ مانگ رہا ہوں۔ میں نے تو بہت سے لوگوں کو بالکل مفت پیشکش کی کہ وہ یہاں اپنے خاندان کے ساتھ رہیں۔ اسے آباد کریں۔ اس کی حالت ٹھیک کریں۔ رنگ و روغن کرائیں۔ یہ تو ایسی جگہ ہے کہ راجے مہاراجے رہیں۔ ٹھاٹ سے۔ مگر کوئی نہیں آتا۔"

"کیوں نہیں آتا؟"

"بس وہمی لوگ ہیں۔ کہتے ہیں یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔ یہ تو نہیں کہ مشہور ہو گئی ہے۔ خود میرے بچے یہاں رہنے کو تیار نہیں۔"

میں نے کہا "کتنے بچے ہیں آپ کے؟"

انہوں نے کہا "آؤ ادھر بیٹھ کے باتیں کرتے ہیں" اور پھر ایک پرانے درخت کے گرد گلی ہوئی بینچ پر بیٹھ گئے۔

غالب نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے کان میں کہا "یہ بھوت ہے۔ حویلی کے اصل مالک کی روح۔"

میں نے سر ہلا کر اس کی تائید کی اور ہم اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اس نے جیب میں سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا "پیو گے؟"

میں نے کہا "ضرور" اور سگریٹ لے کر کہا "شکریہ۔"

غالب نے کہا "میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

"اچھا تو لو تالی کھاؤ۔ بچوں کے لئے میں کچھ نہ کچھ ضرور رکھتا ہوں اپنی جیب میں" انہوں نے دوسری جیب میں سے تالی نکالی۔

غالب نے کچھ ہچکچا کر تالی لے لی لیکن اسے منہ میں نہیں رکھا۔

"بہت جلد یہاں ریڈی میڈ گارمنٹس کی فیکٹری قائم ہو جائے گی" رائے بہادر بدری پرشاد نے اداسی سے کہا۔

میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا "بہت عمدہ سگریٹ ہیں یہ۔ ہندوستانی تو نہیں لگتے" بلاشبہ ان کی خوشبو کمال کی تھی۔

وہ خوش ہوا "نہیں' ولایتی مال ہے۔"

غالب نے کہا "اس کھنڈر کی جگہ ریڈی میڈ کی فیکٹری بننے پر آپ کو اعتراض ہے تو آپ منع کیوں نہیں کر دیتے؟"

اس نے آہ بھر کے کہا "کون سنتا ہے اب میری۔"

غالب نے کہا "ویسے بھی' جب یہاں رہنے پہ کوئی تیار نہیں تو اس جگہ کا کچھ استعمال تو ہو گا۔ ہر نقش کہن مٹ جاتا ہے بالآخر۔"

اس نے فخر سے کہا "پھر تو تاج محل کی جگہ بھی ایک دن کوئی الیکٹرونکس انڈسٹری قائم ہو جائے گی۔"

غالب نے خفت سے کہا "مگر... یہ تاج محل تو نہیں ہے۔"

"تمہارے لئے واقعی نہیں ہے" رائے بہادر نے خلا میں دیکھتے ہوئے دکھی لہجے میں کہا "میرے لئے ہے۔"

میں نے ہمت سے کام لے کر کہا "وہیں تو ممتاز محل کا مدفن ہے۔ جس سے شاہ جہاں کو محبت تھی۔"

رائے بہادر نے سگریٹ کا دھواں آہستہ آہستہ خارج کرتے ہوئے کہا "یہاں مدھومتی دفن ہے۔ جس سے میں محبت کرتا تھا۔ وہ میری بیوی تھی۔ تیس سال اس نے میرا ساتھ دیا۔"

غالب نے کہا "آئی ایم سوری۔ رائے بہادر صاحب' میرا مطلب تو یہ نہیں تھا۔"

اس نے سر ہلایا "فارگیٹ اٹ۔ میں اس سے ملنے آتا ہوں یہاں۔"

اب میں چونکا اور بے اختیار سرک کر کچھ دور ہو گیا۔ "آپ... مگر آپ نے تو کہا تھا... کہ وہ مر چکی ہے۔"

اچانک میں نے پھر چوڑیوں کی کھنک سنی۔ پھر پائل کی جھنکار آئی۔ اس بار یہ آواز اندر سے سنائی دی تھی۔

رائے بہادر اٹھ کھڑا ہوا "تم لوگوں کے سامنے نہیں آئے گی وہ" اس نے ہنس کے کہا "اب بھی شرماتی ہے" پھر اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھایا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔ یہ ٹھنڈک میرے جسم میں ریڑھ کی ہڈی تک اتر گئی۔ غالب سے ہاتھ ملا کے وہ چل پڑا۔ اپنی منہ والی چھڑی ہلاتا اور نپے تلے قدم اٹھاتا وہ سیدھا گیا۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ دیوار میں سے گزر گیا یا دیوار میں جذب ہو گیا وہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ رکا نہیں تھا۔ لمحہ بھر پہلے وہ نظر آ رہا تھا۔ اگلے پل وہ غائب ہو چکا تھا۔ شاید وہ آیا بھی ایسے ہی تھا کیونکہ ہم نے تو اسے اچانک دیکھا تھا۔ وہ اسی سمت سے نمودار ہوا تھا۔ اب میں اور غالب ہکا بکا اور خوف زدہ کھڑے تھے اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میرا جسم پتھر کا ہو گیا ہے۔

"یار... یہ تو واقعی بھوت تھا" غالب نے بالآخر کہا۔

میں نے اس سگریٹ کو دیکھا جو ابھی تک میرے ہاتھ میں سلگ رہی تھی۔ اس کے دھوئیں کی حیرت انگیز مہک کو میں محسوس کر سکتا تھا اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اعلیٰ ترین سگریٹوں میں بھی مجھے یہ ذائقہ نہیں ملا تھا۔

"رائے بہادر بدری پرشاد اوبرائے" میں نے زیر لب دہرایا۔ "کیا وہ مر چکا ہے؟"

"شاید بہت پہلے" غالب نے کہا۔

"اور اب وہ اپنی بیوی مدھومتی سے ملنے یہاں آتا ہے۔ جو اس سے بھی پہلے مر چکی تھی۔"

"ہم نے اس کی چوڑیوں کی کھنک اور پائل کی جھنکار سنی تھی" غالب نے کہا "تم نے بھی اور میں نے بھی۔"

"لیکن غالب... یہ سگریٹ... اور یہ تالی جو تیرے ہاتھ میں ہے؟"

اب غالب نے اپنی بند مٹھی کو دیکھا اور پھر تالی کو ایک دم ایسے پھینک دیا جیسے ابھی تک وہ مٹھی میں بچھو کو دبائے کھڑا ہوا تھا۔

میں نے تالی اٹھائی "آؤ اندر چلتے ہیں۔"

غالب نے کہا "یار' کیا یہ سچ ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا "یہ کوئی خواب نہیں تھا۔"

"ابھی... جو ہم سے ملا وہ زندہ آدمی نہیں' فقط ایک روح تھی۔ میں نہیں مان سکتا" غالب نے کہا "بھوت سگریٹ کے پیکٹ اور تالیاں جیب میں لے کر نہیں پھرتے۔"

"کیا تو نے اسے غائب ہوتے نہیں دیکھا تھا؟"

"وہ... دھوکا ہوا ہو گا میری نظر کو۔ وہ کسی اور طرف نکل گیا ہو گا۔" غالب نے بے بسی سے کہا۔

"بیک وقت ہم دونوں کی نظر کو دھوکا ہو گیا" میں نے کہا۔ "نہیں غالب! حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے۔ وہ ایک روح تھی۔ روح کا وجود ثابت ہو گیا ہے۔"

غالب نے کہا "میں روح کے وجود سے کب انکار کر رہا ہوں۔ لیکن یہ سگریٹ اور یہ تالی؟"

"دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے عقل سب کی توجیہ نہیں رکھتی لیکن رائے بہادر نے ہم سے جو کچھ کہا' ہم اس کی تصدیق ضرور کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ایک بات اور۔ اس نے کہا تھا کہ یہاں مدھومتی دفن ہے۔ ہندو دفنائے کہاں ہیں۔ مرگھٹ لے جاتے ہیں اور شمشان گھاٹ پر جلا دیتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

میں نے غور کرنے کے بعد کہا "ممکن ہے مدھومتی کی راکھ کو یہاں رکھا گیا ہو۔"

"راکھ بھی گنگا میں بہادی جاتی ہے۔"

"کچھ لوگ محبت وعقیدت میں اسے محفوظ بھی رکھتے ہیں۔ میں نے سنا ہے۔ چل اب اندر چلیں" میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ بھی برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے یار' لڑکیاں ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں" غالب نے کہا

میں نے کہا "مل گیا نا آخر تیرا سسر۔ بہت مذاق اڑا رہا تھا نازو کا۔"

ہم اندر پہنچے تو نازو جو چادر میں منہ لپیٹ کر پڑ گئی تھی گل سے باتیں کرتی پائی گئی۔

ہم دونوں کی صورت دیکھ کر اس نے کہا "سکندر! کیا بات ہے۔ ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں چہرے پر؟"

میں اب سگریٹ کا کش لیتے ہوئے ڈر رہا تھا چنانچہ میں نے اسے مسل کر بجھا دیا اور اس کے برانڈ کو غور سے دیکھا۔

"غالب! اتنا پسینہ تمہارے ماتھے پر" گل نے کہا۔

"چپ کیوں ہو تم دونوں" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "پہلے پانی پلاؤ تھوڑا سا۔"

نازو میرے لئے پانی لائی۔ دو گھونٹ پی کر میں نے گلاس غالب کی طرف بڑھا دیا۔

"ہم ایک بھوت دیکھ کر آئے ہیں" میں نے کہا "بلکہ اس سے مل کے باتیں کرتے رہے۔" میں نے کہا۔

نازو اور گل نے ایک دوسرے کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔ ان کے لئے یہ طے کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ ہم مذاق کر رہے ہیں یا سنجیدہ ہیں اور اداکاری کر رہے ہیں یا واقعی خوف زدہ ہیں۔

میں نے غالب سے کہا "یہ سگریٹ میں نے آج تک نہیں دیکھا' اس... تمباکو تک نہیں دیکھا اور نہ کسی سے اس کا ذکر سنا۔ حالانکہ میں اور محسن اتنا عرصہ لندن میں رہے۔ وہاں سے ہم فرانس اور وینس بھی چلے جاتے تھے۔ آسٹریا اور کبھی سوئٹزرلینڈ بھی گئے تھے۔"

"پچاس سال پہلے شاید ہوتے ہوں گے۔" غالب نے کہا۔

اب میں نے تالی کے ریپر کو غور سے دیکھا۔ یہ طالبہ کی تی

www.paksociety.com

ہوئی یہ ٹافی اب ملتی تھی یا نہیں۔" اس بارے میں میری معلومات محدود تھیں مگر جس چیز نے مجھے حیران کیا وہ اس کے ریپر کے کناروں پر لکھے ہوئے الفاظ تھے۔ ایک کنارے پر کمپنی کا نام تھا مگر دوسرے کنارے پر تھا "ناٹ فار سیل" (برائے فروخت نہیں) اس کے بعد لکھا ہوا تھا "صرف محاذ پر اتحادی افواج کے لئے۔"

میں نے وہ کاغذ غالب کو دیا "یہ دوسری جنگ عظیم میں محاذ جنگ پر لڑنے والے فوجیوں کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ ایسی بہت سی چیزیں جو فوج کی سپلائی میں شامل تھیں 'چوری ہو کے بازار میں بھی پہنچ جاتی تھیں۔ تاہم فوج کی سپلائی کا ٹھپہ ان پر ایسی مہریں لگا دیتا تھا یا ان کی مخصوص پیکنگ ہوتی تھی۔ تاکہ کہیں ہو تو پتا چل جائے۔"

"او مائی گاڈ... یہ انیس سو پینتالیس سے قبل کی ٹافی ہے۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "دوسری جنگ سن انتالیس سے پینتالیس تک جاری رہی تھی۔"

اب نازو نے ٹافی کے ریپر کو ملاحظہ کیا۔ پھر میں نے انہیں رائے بہادر بدری پرشاد سے ملاقات کا احوال سنایا۔ وہ اتنی خوف زدہ ہوئیں کہ ہمارا مذاق اڑانے کے بجائے خود تماشا بن گئیں۔ ہم نے انہیں بڑی مشکل سے سلایا اور کہا کہ "فکر مت کرو۔ ہم جاگ رہے ہیں۔" لیکن ان کے لئے سونا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے سامان میں سے ویلیم تلاش کی اور انہیں زبردستی کھلائی۔ دو بجے تک غالب بھی سو گیا تھا لیکن میرا ذہن خیالات کے انتشار کا شکار تھا۔ میرے خیالوں کی رو کبھی بھٹک کر شملا کی طرف چلی جاتی تھی اور میں تصور میں وہی شیشے کا تابوت دیکھتا تھا جس میں شملا اپنے بچے کے ساتھ محو خواب تھی اور سوچنے لگتا تھا کہ اس تابوت میں ہوا کی آمد و رفت کا کیا بندوبست تھا؟ اسے زندہ رکھنے کے لئے وہ کھانے پینے کو کیا دیتے تھے؟ ممکن ہے ٹالاور نے ہمیں یہ دکھانے کے لئے کہ شملا کو کیسے لے جایا جائے گا' اس وقت خاص طور پر اسے شیشے کے تابوت میں ڈالا ہو۔ بعد میں ہوش آنے پر انہیں نکال لیا ہو۔

شملا سے میرا ذہن پھر رائے بہادر بدری پرشاد کی طرف آجاتا۔ وہ یقیناً ایک روح تھی۔ شاید وہ اسی حویلی میں مر گیا تھا اور تب سے حویلی ویران پڑی ہوئی تھی۔ اگر وہ بھوت تھا تو ایک بے ضرر بھوت تھا۔ لیکن یہ بہت مضحکہ خیز بات تھی کہ ایک بھوت مجھے سگریٹ اور غالب کو ٹافی آفر کر کے غائب ہو گیا۔

اچانک ایک آہٹ نے مجھے اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ باہر کا دروازہ چرچرا کے کھلا تھا۔ میں نے چوڑیوں کی کھنک بھی بہت صاف سنی تھی۔ جن بھوت کا میں کبھی قائل نہیں رہا تھا لیکن آج ایک ایسا تجربہ ہوا تھا جس نے میرے یقین کی عمارت کو منہدم کر ڈالا تھا اور اس کی بنیادوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ میرے ذہن پر اور اعصاب پر آسیب کا اثر باقی تھا چنانچہ قدرتی طور پر مجھے خیال آیا کہ کیا پھر کوئی بھوت آگیا۔

آیت الکرسی پڑھ کر میں نے دائیں بائیں پھونک ماری اور اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر آنے کے بعد میں نے پھر چوڑیوں کی آواز سنی حالانکہ راہداری میں کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر راہداری کے آخری حصے میں ایک سایہ سا نظر آیا۔ یوں جیسے اندھیرا سمٹ کر گہرا ہو گیا اور ایک انسانی قالب میں ڈھل گیا۔ اس نے تاریکی سے ہی جنم لیا تھا۔

"رائے بہادر صاحب!" میں نے کہا اور آگے بڑھا۔

راہداری میں ایک بازگشت سی سنائی دی "مت نام لو میرے سامنے میرے قاتل کا۔"

مجھے ایک جھرجھری سی آئی۔ میں نے سوچا کہ واپس بھاگ جاؤں لیکن کوئی نادیدہ قوت تھی جس نے مجھے آگے دھکیل دیا۔ میں سحر زدہ شخص کی طرح چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ تقریباً میرا ہم عمر جوان آدمی تھا۔

"تم کون ہو؟"

"میں نے بتایا نا کہ مجھے رائے بہادر نے قتل کروایا تھا۔" وہ بولا۔

"مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ میں اس کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔" وہ بولا "اور اسی وقت میں نے سناٹے میں کسی عورت کی پُردرد سسکی سنی۔ خوف کی خنک لہر سے میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔

"رائے بہادر کو کیا اعتراض تھا اس پر؟" میں نے کہا۔

"وہ ایک تنگ نظر' کمینہ اور متعصب شخص تھا۔"

میں نے کہا "کیا اس کی بیٹی بھی شادی کرنا چاہتی تھی تم سے؟"

"ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے تھے کہ جب بالکل مایوس ہو گئے تو ہم نے ایک ساتھ مرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک رات ہم نے خود کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا۔ مضبوط رسی سے۔ پھر ہم نے خود کو جمنا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔"

کسی عورت کی درد بھری سسکی پھر سنائی دی۔

"رائے بہادر تمہیں کیوں ناپسند کرتا تھا؟" میں نے کہا۔

"وہ اونچی ذات کا برہمن تھا۔ میں ایک شودر کا بیٹا تھا۔"

"تم مجھے یہی بتانے کے لئے آئے ہو؟"

"میں یہاں رہتا نہیں ہوں۔ اپنی پریتما کے درشن کرنے آجاتا ہوں۔ مگر میں اسے دیکھ نہیں سکتا۔ وہ قید میں ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ کیا روح کو بھی قید میں رکھا جا سکتا ہے اور تم دونوں تو ایک ساتھ مر گئے تھے۔" اب میرا خوف دور ہونے لگا تھا اور میں اس سے باتیں کرتے ہوئے گھبرا نہیں رہا تھا۔

"انہوں نے ہماری لاشیں نکلوالی تھیں۔ مجھے پریتما سے الگ کر کے وہیں جلوا دیا گیا تھا۔ میری پریتما کی ارتھی کو جمنا کے گھاٹ پر آگ لگا کر اس کی راکھ کو وہ یہاں لے آئے تھے۔"

"پریتما نام تھا اس کا؟"

"پریتما کہتے ہیں محبوبہ کو۔" وہ بولا "اس کی راکھ یہاں سونے کے ایک راکھ دان میں رکھ دی گئی تھی۔ تب سے اس کی آتما یہاں قید میں ہے۔ وہ باہر نہیں نکل سکتی اور میں اسے نہیں دیکھ سکتا۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟"

وہ سسکی پھر سنائی دی۔ میں نے گھبرا کے کہا "میں... مجھے کیا معلوم کہ وہ راکھ دان کہاں ہے۔"

"اسی حویلی میں ہے کہیں۔" وہ مایوسی سے بولا "تم نے سنا وہ رو رہی ہے۔ اور کوئی اس کی مدد نہیں کرتا۔"

اب میرے لئے وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ میں پلٹ کر بھاگا۔ واپس کمرے میں جانے سے پہلے میں نے دیکھا تو راہداری خالی پڑی تھی' وہاں اب کوئی نہیں تھا جہاں میں ایک عاشق نامراد سے باتیں کر آ رہا تھا۔ جس کا عشق ذات پات کے مذہب کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔

واپس کمرے میں آنے کے بعد میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا اور لمبی لمبی سانسوں کی مدد سے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ سگریٹ جلاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ پہلے غالب کے ساتھ اور پھر اکیلے میں نے مافوق الفطرت واقعات کا جو تجربہ کیا تھا وہ میرے لئے ناقابل فہم' ناقابل یقین اور ناقابل تسلیم تھا۔ مگر میں خود کو بھی قائل نہیں کر سکتا تھا کہ میرے ذہن پر سنی سنائی باتوں کا اثر تھا یا اس پرانی حویلی کے آسیب زدہ ماحول نے میرے حواس کو اس حد تک مختل کر دیا تھا کہ مجھے جن بھوت جیتے جاگتے انسانوں کی طرح نظر آنے لگے تھے۔ آج تک میں ایسے واقعات سنانے والوں کا مذاق اڑاتا رہا تھا۔ اب مجھے یقین تھا کہ غالب کے علاوہ میرے سب ساتھی میرا تمسخر اڑائیں گے اور میں ان کی کسی بات کا جواب نہ دے سکوں گا۔ نازو' رابعہ اور گل تو ہمارا جینا عذاب کر دیں گی۔ ابھی رابعہ کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ گل اور نازو خوف زدہ ہو گئی تھیں لیکن یہاں سے جانے کے بعد جب یہ خوف باقی نہیں رہے گا تو انہیں ایک موضوع سخن ہاتھ آجائے گا۔

میں اب سو نہیں سکتا تھا چنانچہ ایک کے بعد ایک سگریٹ پیتا رہا۔ معلوم نہیں کلاک نے کہاں رات کے دو گھنٹے بجائے تو میں اچھل پڑا۔ اس قدیم عمارت میں جہاں برسوں سے کوئی رہنے نہیں آیا یہ کلاک کیسے زندہ ہے؟ اسے چابی دینے والا کون تھا کہ اس کی سوئیاں اب تک متحرک تھیں؟ گھنٹوں کی بازگشت رات کے سناٹے میں ابھی تک لرزاں تھی یا شاید میرے کان بج رہے تھے۔ پہلے میں نے غالب یا محسن کو جگانے کا ارادہ کیا پھر مجھے خیال آیا کہ ان کی پرسکون نیند میں خلل اندازی سے کیا فائدہ۔ خود مجھے کوشش کرنی چاہئے کہ ان واقعات کو بھلا کر سو جاؤں۔ ایک سکون آور گولی میں پہلے کھا چکا تھا۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ دوسری گولی نہ کھانے کے خلاف میری ذہنی مزاحمت کام نہ آئی اور میں نے شیشی کی آخری گولی کو پانی کے ساتھ حلق سے اتار لیا۔

جب میں گلاس رکھ رہا تھا تو پانی کا ایک قطرہ رابعہ پر ٹپک گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر اٹھ بیٹھی۔

"کیا بات ہے؟ تم سوئے نہیں؟" اس نے سرگوشی میں کہا۔

میں نے کہا "ہاں' نیند نہیں آئی۔"

رابعہ نے کہا "تم نے پھر سکون آور گولی کھائی ہے؟"

میں نے کہا "ایک ہی گولی تھی اس میں۔ میں تو پوری شیشی کھا جاتا۔"

رابعہ نے پریشان ہو کے کہا "کیا ہو گیا ہے تمہیں سکندر؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ تم سو جاؤ۔"

"نہیں۔ پہلے مجھے بتاؤ بات کیا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا باہر آؤ۔"

باہر لے جا کر میں نے اسے وہ جگہ دکھائی جہاں میری اور غالب کی ملاقات رائے بہادر سے ہوئی تھی۔ میں نے ثبوت کے طور پر وہ آدھی بجھی ہوئی سگریٹ اور دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی ٹافی پیش کی۔ پھر تازہ ترین واردات کے بارے میں بتایا کہ مجھے بدری پرشاد کی بیٹی کے چاہنے والے نے محبت کے ایک المناک انجام کی ایک داستان خونچکاں سنائی تھی۔ میں نے اس بدبخت لڑکی کی بے چین روح کی سسکیوں کا تذکرہ بھی کیا۔ حیرت انگیز طور پر رابعہ پرسکون رہی۔

اس نے کہا "فرض کرو وہ ان کی روحیں تھیں جن سے تم ملے۔ اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟"

"میں... ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ میرا خیال ہے کہ میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔"

"وہ بدروحیں تو نہیں تھیں۔ تمہیں کیا نقصان پہنچایا انہوں نے؟ ہم سب سے کوئی شکایت تو نہیں ہوئی ان کو۔"

"رابعہ! میں یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو۔ میرا ذہن شملا کی طرف سے بھی پریشان ہے۔ آج رات ہم کچھ نہ کچھ ضرور کر سکتے تھے۔ ایسے بیٹھے نہیں رہنا چاہئے ہمیں۔"

www.paksociety.com

رابعہ نے کہا۔ "ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ انہیں بہت سی باتیں معلوم ہوگئی ہیں جو بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ محمد خان بھی ہمارے ساتھ اس مہم میں شامل ہو جائے گا۔ ہم اکٹھے ہوں گے تو ہر کام آسان ہو جائے گا۔ ابھی تک محسن اور غالب کا مسئلہ تھا۔ اب وہ بھی فٹ ہیں۔"

رابعہ کی باتوں نے میرا اعتماد بحال کر دیا۔ آہستہ آہستہ میرا خوف بھی دور ہونے لگا۔ مجھے یہ احساس بھی پشیمانی میں مبتلا کر رہا تھا کہ رابعہ ایک لڑکی ہونے کے باوجود وحشت زدہ نہیں ہے۔ مجھے تو زیادہ حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔

رابعہ نے کہا۔ "چائے پیو گے؟ بنا کے لاؤں۔"

میں نے کہا۔ "اکیلے ڈر نہیں لگے گا کچن میں؟ دل تو چاہ رہا ہے۔"

وہ ہنسی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم یہیں بیٹھو۔ ڈرنا نہیں۔" اس نے یوں کہا جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔ میں پتھر کی گرد آلود بینچ پر بیٹھا رہا۔ رائے بہادر بدری پرشاد کا تصور میرے سامنے رہا مگر اس نے مجھے خوف زدہ نہیں کیا۔

رابعہ چائے لے کر آئی اور مجھے ایک مگ پکڑا دیا۔ آخر شب کے چاند نے ایک ٹنڈ منڈ درخت کی شاخوں سے جھانک کر ویرانی کے تاثر میں مزید اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ پھر تاریکی میں ایک ہیولا سا نمودار ہوا اور ہماری طرف بڑھا۔ میں چوکنا ہو گیا لیکن قریب آنے پر محمد خان کے نقوش واضح ہو گئے۔

میں نے کہا۔ "خان صاحب! تم اس وقت؟"

خان نے مسکرا کے کہا۔ "ہاں! اس وقت مجھے یہاں آنا تو نہیں چاہئے تھا۔"

رابعہ نے جلدی سے کہا۔ "چائے پئیں گے آپ؟"

خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔ ابھی پی کر آ رہا ہوں۔"

"کہاں سے آ رہے ہیں اس وقت؟" رابعہ نے کہا۔

"کوٹ کو خدا حافظ کہنے گیا تھا۔"

"تم نے بتایا اسے کہ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے؟"

"قسم اللہ کی' پہلے ارادہ نہیں تھا میرا لیکن حافظ جی نے کہا کہ اچھا ہے یہ خوشخبری اسے تم سے ملے کہ تم نے راہ حق کی مسافت قبول کر لی ہے۔ چنانچہ میں نے اسے بتایا کہ ہو سکتا ہے' میں لمبے عرصے تک لوٹ کر نہ آؤں۔"

"بہت روئی دھوتی ہوگی وہ؟"

محمد خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "اداس ضرور ہو گئی تھی کہنے لگی کہ آؤ گے تو سہی۔" میں نے کہا "نہیں آؤں گا تو کہاں جاؤں گا۔" اس نے کہا۔ "یہ وعدہ ہے تو پھر جاؤ۔ فی امان اللہ! میں تمہاری واپسی کا انتظار کرتی رہوں گی۔ زندگی کی آخری سانس تک۔ میں مایوس ہونے والی نہیں ہوں۔"

"بڑی بہادر لڑکی ہے۔ بہت بہادر۔"

"اس کا یقین اور ایمان بہت مضبوط ہے۔ اسے آزمانے کے لئے میں نے کہا کہ فرض کرو میں اپنا وعدہ نبھانے سکا اور واپس نہ آ سکا؟ تو اس نے کہا کہ تمہیں آنا پڑے گا۔ میں نے تمہیں خدا کے سپرد کیا ہے۔ اسی شرط پر کہ میرا بیٹا اپنے باپ کو ضرور دیکھے گا۔"

میں نے حیران ہو کے کہا۔ "وہ خدا سے مشروط معاہدہ کرتی ہے؟"

محمد خان مسکرانے لگا۔ "ہے نا پاگل؟ کہتی ہے خدا نے میری بات مان لی ہے اور اس کی گواہی میرے دل نے دی ہے۔ قسم اللہ کی' وہ بڑی عجیب لڑکی ہے۔"

رابعہ نے کہا۔ "وہ ماں بننے والی ہے؟"

محمد خان نے کہا۔ "ہاں بہن۔ آج میں پورے ایک ہفتے کے بعد گیا تھا۔ یہی امید لے کر کہ میں اپنے بیٹے سے بھی مل کے آؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "محمد خان! تم اور تمہاری بیوی۔ اتنے پُرامید ہو تم دونوں کہ وہ بیٹا ہی ہوگا۔ کیا بیٹی نہیں ہو سکتی؟"

"پتا نہیں۔ وہ دراصل حافظ جی نے کہا تھا مجھ سے کہ محمد خان۔ میں نے بچے کا نام فتح محمد رکھا ہے' جو ٹیپو سلطان کا نام تھا۔ اس وقت یہ خیال آیا تھا میرے دل میں کہ بیٹی ہوگی تو اس کا نام رضیہ رکھوں گا۔ لیکن حافظ جی کی بات ایسے ہی نہیں ہوتی۔ قسم اللہ کی۔"

میں نے کہا۔ "تم نے حافظ جی سے کہا تھا کہ ہمارے لئے دعا کریں۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اور معلوم ہے انہوں نے کیا کہا ہے؟"

"کیا کہا؟" میں نے اس کی خاموشی پر اسے غور سے دیکھا۔ وہ کچھ متفکر نظر آتا تھا۔ "انہوں نے کہا۔ "دیر مت کرو۔ ابھی چلے جاؤ گے تو محفوظ رہو گے بہت بڑی آفت سے۔" میں نے پوچھا کہ آفت کیسی؟" تو انہوں نے کہا۔ "بھئی آفت تو بس آفت ہوتی ہے۔ جاؤ انہیں بھی بتاؤ۔"

میں محمد خان کی بات سن کے پریشان ہونے لگا۔ نہ جانے کیوں اس سے حافظ جی کے کشف و کرامات کا ذکر سن سن کے میں بھی قائل ہونے لگا کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں' کسی الہامی کیفیت میں کہتے ہیں اور ان کی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔

"انہوں نے کہا تھا کہ اسی وقت روانہ ہو جائیں۔ رات کے وقت؟"

محمد خان نے کہا۔ "ہاں۔ یہی کہا تھا انہوں نے مگر اس وقت ہم کہاں جا سکتے ہیں؟"

میں نے بادل ناخواستہ کہا۔ "ہاں۔ صبح ہی جائیں گے اب تو۔ ورنہ میرا ارادہ تھا کہ تمہارے ساتھ وہاں جا کے دیکھوں کہ وہ لوگ روانگی کے لئے کیا تیاری کر رہے ہیں۔ مجھے راستہ معلوم نہیں تھا۔ یوسف ثانی ہوتا تو میں اسے ساتھ لے جاتا۔"

"اس کا کچھ پتا نہیں ہوتا کسی کو بھی۔"

اچانک رابعہ نے جو اب تک خاموش تھی' کہا۔ "خان صاحب! یہ عمارت کس کی ہے؟"

"معلوم نہیں اب کون مالک ہے اس کا۔" وہ بولا۔

"پہلے کون مالک تھا؟" میں نے کہا۔

"پہلے کوئی ہندو تھا۔"

میں نے کہا۔ "رائے بہادر بدری پرشاد تو نہیں اسے۔"

وہ چونکا۔ "جب تمہیں یہ بات معلوم تھی تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے تھے؟"

میں نے کہا۔ "تصدیق کے لئے۔ وہ اب کہاں ہے؟"

خان نے کہا۔ "مر کھپ گیا کب کا۔ اس کا نام اب بھی لکھا ہوا ہے باہر ایک تختی پر۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ عمارت انیسویں صدی کے آخر میں بنی تھی۔"

"یہ بدری پرشاد کون تھا؟"

"ایک غدار تھا ویسے تو۔ ہندوستانی حریت پسندوں کی بہت مدد کرتا تھا لیکن اس طرح ان کے ٹھکانوں کی اور ان کے عزائم کی خبر رکھتا تھا۔ اس کی اطلاع پر نہ جانے کتنے آزادی کے متوالے پکڑے گئے۔ کچھ کالے پانی گئے' کچھ پھانسی پر لٹکائے گئے۔ ہندو مسلمان دونوں۔ اسے انگریزوں سے انعام میں جاگیریں ملتی رہیں۔ یہ بات کب تک چھپی رہ سکتی تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں اسے بڑے بڑے ٹھیکے ملے۔ وہ یہاں سے بھاگ گیا تھا اور بہت پہلے چلا گیا تھا۔"

"ٹھیکے سپلائی کے تھے۔" میں نے کہا۔ "مثلاً سگریٹوں اور اناجوں کی سپلائی کے۔"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" محمد خان حیران ہو کے بولا۔ "وہ سنگاپور اور برما کے محاذ پر فوجوں کو راشن سپلائی کرتا تھا۔ اس میں بہت ہیرا پھیری کی اس نے۔ لاکھوں بنائے۔ پھر جاپانیوں کی بمباری میں وہ زخمی ہو گیا تھا اس کی جان بچ گئی لیکن آنکھیں ضائع ہو گئی تھیں۔"

میں نے کہا۔ "اس کی بیوی کا نام مدھو متی تھا۔"

"قسم اللہ کی' یہ بات تو میرے باپ کو بھی معلوم نہیں ہوگی۔ تمہیں کس نے بتائی ہیں یہ باتیں۔" خان نے کہا۔

میں نے اسے مختصراً بدری پرشاد کے بارے میں بتایا۔ وہ مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہا۔

"کوئی اور کہتا مجھ سے ایسی بات تو قسم اللہ کی میں اسے جھوٹا سمجھتا۔" خان نے کہا۔ "اور مجھ سے ملاقات ہو جاتی اس کی تو قتل ہو جاتا۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "بارث فیل تو میرا بھی ہو جاتا اگر اس وقت مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ زندہ آدمی نہیں بلکہ بھوت ہے۔ تمہاری زندگی بھی یہیں گزری ہے۔ یہ بتاؤ اور کیا مشہور ہے اس بدری پرشاد کے بارے میں؟"

"اس کا ایک ہی بیٹا ہے۔ بدری انڈسٹری کا مالک۔ وہ میرین ڈرائیو کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتا ہے۔ کسی ایکٹریس سے شادی کی ہے اس نے۔"

"کیا اس کا ارادہ اس عمارت کو گرا کے ریڈی میڈز کی فیکٹری لگانے کا ہے؟"

"ہوگا۔ اگر بدری پرشاد نے تمہیں بتایا ہے تو میں کیسے اس کو غلط کہہ سکتا ہوں۔" محمد خان نے کہا۔

"اس کی کوئی بیٹی تھی؟"

ہاں' یہ بات میں نے سنی ہے کہ وہ کسی چمار کے لونڈے پر عاشق ہو گئی تھی۔ بدری پرشاد اونچی ذات کا ہندو تھا۔ وہ کیسے

سسپنس ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
عصر حاضر کی الف لیلہ
دیوتا
36 واں حصہ شائع ہو گیا ہے
قیمت ● 50 روپے ڈاک خرچ ● 16 روپے
ایک ایسی داستان جو ایک بار شروع کر کے چھوڑی نہیں جا سکتی
ایک کتاب کا ڈاک خرچ 16 روپے' دو کتابوں کا 18 روپے' تین یا چار کتابوں کا ڈاک خرچ 24 روپے ہوگا۔
پانچ کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف
پورے 36 حصوں کی رعایتی قیمت صرف 1100 روپے مع ڈاک خرچ۔ یہ رعایت صرف پیشگی رقم بھیجنے پر ہی مل سکے گی۔
کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس 23
رمضان چیمبرز' ملحقہ پارسا اسٹیٹ۔ آئی آئی چندریگر روڈ
کراچی 74200 ۔ فون: 2628517

www.paksociety.com

برداشت کر سکتا تھا کہ کسی بیمار سے رشتہ جوڑے۔ لڑکی اور لڑکے نے خودکشی کرلی تھی۔ اس پر کوئی فلم بھی بنی ہے۔"

میں نے کہا "فلم تو نہیں دیکھی جناب نے۔ لیکن میں اس جھاڑ کے ٹوٹنے سے بھی مل چکا ہوں۔"

پھر میں نے اسے اپنے دوسرے تجربے کے بارے میں بتایا۔ محمد خان بزدل آدمی نہیں تھا لیکن جن بھوت کا معاملہ ایسا ہے کہ ایسے واقعات اچھے خاصے معقولیت پسند اور دلیر آدمی کو بھی وحشت زدہ کر دیتے ہیں۔

"قسم اللہ کی" مجھے معلوم ہوتا کہ سب ہو رہیں بھری پڑی ہیں یہاں۔ تو میں ادھر کا رخ بھی نہ کرتا۔" وہ بولا "مجھے تو اس شہزادے گلفام نے مروا دیا۔"

میں نے کہا "اسے بھی کہاں معلوم ہوگا؟"

"اسے نہیں معلوم ہوگا!" محمد خان نے کہا "اسے تو شہر کے ہر جن بھوت کے آباؤ اجداد کا شجرۂ نسب تک معلوم ہوگا۔ وہ خود جن ہے۔ میں نے بتایا تھا تمہیں۔ اس سے جن بھوت بھی پناہ مانگتے ہوں گے۔ رات کو قبرستانوں میں پھرا رہتا ہے۔ کبھی کوئی کھوپڑی اٹھالاتا ہے۔"

"وہ کس لئے؟"

"پتا نہیں۔ کہتا ہے عمل کرا رہا ہوں۔ یہ ہندو بنئے بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ اپنی دولت گاڑ دیتے ہیں کہیں۔ اور بعض اوقات کسی کو بتائے بغیر مر جاتے ہیں۔ ایسے کسی کم بخت کی روح قابو میں آگئی تو اس سے پوچھ لوں گا کہ اس کی دولت کہاں دفن ہے۔"

رابعہ نے کہا "وہ پاگل ہے کیا؟"

میں نے کہا "ایسا مت کہو۔ میں اور تم پاگل ہیں اس کی ہوشمندی کے سامنے۔"

محمد خان نے کہا "پرسوں معلوم ہے کیا ہوا؟ خود اس نے بتائی تھی یہ بات مجھے۔ وہ کسی قبر میں لیٹا ہوا کوئی وظیفہ پڑھ رہا تھا۔"

رابعہ سہم کر میرے قریب ہوگئی "پرانی قبر تھی؟"

محمد خان نے کہا "نہیں۔ تازہ کھدی ہوئی قبر تھی۔ گورکن تیار رکھتے ہیں کہ اچانک کوئی مردہ آجائے تو جب نہ لیں۔ وہ رات کو گیا اور قبر میں لوکر لیٹ گیا۔ کہہ رہا تھا اندر والیں ٹھنڈک تھی کہ مجھے وظیفہ پڑھتے پڑھتے نیند آگئی۔

اس سے وظیفہ خراب ہوا۔ اور پتا نہیں کس نے میرے اوپر مردہ پھینک دیا۔ آدھی رات کے بعد۔ وہ تو مجھ پر بھی مٹی ڈال دیتے۔

مگر میں نے شور مچایا کہ یہ کیا کرتے ہو۔ پہلے مجھے تو نکلنے دو۔ معلوم نہیں وہ کون تھے۔ ایسے بھاگے ڈر کر کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔"

"مگر ایسے کون پھینکتا ہے مردے کو؟" میں نے ایک جھرجھری لے کر کہا۔

"وہ کسی کی لاش کو ٹھکانے لگانے آئے تھے۔ معلوم نہیں کون تھا جسے قتل کیا گیا تھا اور وہ قاتل تھے یا محض لاش غائب کرنے پر مامور تھے۔ یوسف ثانی تو مردے کے نیچے سے نکل کے اور کپڑے جھاڑ کے آ گیا۔ اس سے کچھ بعید نہیں کہ اس وقت بھی کسی قبر میں پڑا ہو۔"

رابعہ چلائی "خدا کے لئے کوئی اور بات کریں۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہی ہے اور اس کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "اوکے۔ لعنت یوسف ثانی پر۔ چلو ہم اندر چلتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی۔"

"آؤ میرے کمرے میں آجاؤ" محمد خان نے کہا۔

میں نے بھی باقی سب کی نیند میں مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ ابھی ہم محمد خان کے کمرے میں جاکے بیٹھے ہی تھے کہ ایک کھڑکی کے دھندلے شیشے پر تیز روشنی پڑی اور غائب ہوگئی۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے روشنی کی جھلملاہٹ پھر نظر آئی۔

"یہ کیا ہے آخر؟" محمد خان نے کہا۔ اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن کنڈیاں زنگ سے جام ہوگئی تھیں۔ اس نے لوپ کے ایک ٹوٹے ہوئے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ پھر اس نے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میں بھی آ کر دیکھوں۔ محمد خان بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اور جب میں نے شیشے سے باہر دیکھا تو ایک لمحے کے لئے میری رگوں میں بھی خون منجمد ہونے لگا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات بارھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

جنہا شرقت کے ان خشوں کی روداد جو گوشت و
پوست سے نہیں بلکہ انسانی ہڈیوں
سے بنی ہوئی تھیں۔ ایک کشتی جو وحشی
خونخواروں کی کہانی جس کے شب و
روز خوفناک فضا میں
گزر رہے تھے۔

اندھیرے

میں دو گاڑیوں سے آگے
وہی آدمی اتر رہے تھے۔

انہی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹیں تھیں جو جلنے پر نظر آئی تھیں۔ پرانے نام پانے ز میں ان کے سامنے بڑے پراسرار انداز میں حرکت کر رہے تھے۔ میں نے ایک شخص کو ہاتھ ہلا کر ہدایات جاری کرتے دیکھا۔ اس کی صورت میری نظر سے اوجھل تھی لیکن پہلے اس کے قد و قامت سے اور پھر ایک دھندلی سی چمک سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اسٹائیڈر ہے۔ چمک اس نے دونوں کانوں میں پڑی ہوئی چمک کی مندریوں کی تھی۔ وہ اپنی سپاہ کو بڑی خاموشی سے اٹھا کر لایا تھا اور اب انہیں ہر طرف پھیلا دیا تھا۔

میں وابعہ کے ساتھ پلٹ کر بھاگا۔ محصور ہونے سے پہلے ہمارا نکل جانا ضروری تھا۔

میں نے غالب اور محسن کو وحشیانہ انداز میں جھنجوڑ ڈالا۔
"اٹھو جلدی کرو۔ غالب! محسن!"
"آخر کیا ہو گیا؟" غالب نے کہا "یہ کیا وحشت سوار ہے؟"
محسن نے کہا "یہ کیا بیہودگی ہے؟"
میں نے کہا "ہیڈر دو تین درجن مسلح افراد کے ساتھ آیا ہے۔ وہ گھیرا ڈال رہے ہیں ہر طرف سے۔"
غالب اور محسن پر ان الفاظ کا وہی اثر ہوا جو ریوالور کے فائر کا ہو سکتا تھا۔ باقی دو میں وابعہ نے گل اور ناز کو بیدار کر دیا تھا۔ میں نے کہا "سب باہر نکل جاؤ پیچھے کی طرف باغ میں۔"
"اور تم؟" وابعہ نے کہا۔
میں نے کہا "سب کچھ چھوڑ دو۔ میں یہ سوٹ کیس اٹھالو اور جاؤ۔ ناز! تم میرے ساتھ رہو گی۔"
محمد خان نے کہا "میرے پاس ایک ریوالور ہے۔"
"گڈ۔ تم کسی ایک دروازے پر پوزیشن سنبھال لو۔" میں نے کہا "گل! تم میرا ریوالور لے لو۔"
مگر گل سے پہلے ریوالور غالب نے لے لیا "گل کو جانے دو۔"

میں نے کہا "اچھا۔ تم دوسری طرف سے انہیں روکو۔"
"میں کیا کروں؟" محسن نے کہا۔
"تم کھڑے ہو ابھی تک۔ جاؤ وابعہ اور گل کے ساتھ۔ باہر چھپ جاؤ۔ وہ اندر آئیں گے تو ہم ان سے نمٹ لیں گے۔"
میں نے محسن کو دھکیل کر کہا "ادھر کچن سے نکل جاؤ۔ خان! اندر آنے کے لئے وہ کون سا راستہ اختیار کریں گے؟"
خان نے کہا "وہ کسی طرف سے بھی آ سکتے ہیں۔"
میں نے محسن سے کہا "تم ان کا راستہ مت روکنا۔ انہیں یہاں چلے آنے دو کہ تم باہر چھپے بیٹھے ہو۔ وہ تمہارے پاس سے بھی گزر رہے ہوں تو گزر جانے دینا۔ بہت جھاڑ جھنکاڑ ہے تمہارے چھپے رہنے کے لئے۔"
پھر میں نے ناز سے کہا "تم غالب کے ساتھ رہو۔ اگر کوئی اندر آ جائے تو اس سے نمٹ لینا۔"
ناز نے میرا مطلب سمجھ لیا۔ میں اب محمد خان کی طرف لپکا۔ وہ دروازے کے پیچھے کھڑا ایک جھری میں سے جھانک رہا تھا۔ اچانک اس نے فائر کیا۔ باہر کوئی دلخراش آواز میں چلایا۔ خان نے دوسرا فائر کیا۔
"قسم اللہ کی، بھاگنے نہیں دوں گا ایک کو بھی۔"

میں نے خود کو دیوار کے ساتھ لگالیا "کتنے مارے گئے؟"
"دو۔ ایک تو بالکل سامنے آگیا تھا۔"
میں نے کہا "اب تم تیسری طرف چلے جاؤ۔ یہاں میں ہوں۔"

باہر سے مشین گن کا ایک برسٹ آیا۔ دروازے میں سوراخ ہوگئے لیکن میں دیوار کی اوٹ میں تھا اس لئے محفوظ رہا۔ محمد خان بھی صرف چند سیکنڈ پہلے ہٹ گیا تھا ورنہ چھلنی ہو جاتا۔ دوسری طرف سے غالب نے بھی یکے بعد دیگرے دو فائر کئے۔ میں نے اس سے چلا کے جگہ بدلنے کو کہا۔ اس طرح وہ بھی بچ گیا ورنہ ادھر بھی جواب میں گولیوں کی بوچھاڑ آئی تھی۔
"تم مت ہلنا اپنی جگہ سے" میں نے نازو سے کہا۔
میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ مشین گن سے فائر کرنے والے نے ایک اور برسٹ مارا جس کا جواب میں نے ایک بھیانک چیخ سے دیا۔ وہ مطمئن ہو کے سیدھا دروازے کی طرف آیا۔ اسے یقین تھا کہ جو بھی دروازے کے پیچھے سے فائر کر رہا تھا وہ مشین گن کی گولیوں کا نشانہ بن گیا ہے۔ میں اسے دھوکا دینے میں کامیاب رہا تھا۔ وہ شکستہ دروازے کو دھکے سے توڑ کر اندر آیا تو میرا ہاتھ اس پر وار کرنے کے لئے تیار تھا۔ دروازہ بیچ میں گرنے سے میں اس وار سے حملہ آور کی گردن توڑنے میں ناکام رہا۔
وہ میری طرف پلٹا ہی تھا کہ میں نے اس پر جست لگا دی اور ہم دونوں ایک ساتھ گرے۔ مشین گن ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کے دستے سے میرا سر پھاڑ دے لیکن میرے ہاتھ اس کی گردن پر شکنجے بن چکے تھے۔ وہ تڑپا لیکن خود کو چھڑا نہ پایا۔ میرے دونوں گھٹنوں نے اس کے بازوؤں کو بیکار کر دیا تھا۔ چنانچہ دباؤ میں بڑھاتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کا تڑپنا ایک تشنج کی صورت اختیار کر گیا اور وہ ڈھیلا پڑنے لگا۔ میں نے مشین گن چھین کر اس کے سر پر ایک ضرب لگائی جس نے اس کا خاتمہ کر دیا۔
افسوس مجھے یہ دیکھ کر ہوا کہ مشین گن خالی ہو چکی تھی۔ پھر بھی یہ ایک ہتھیار تھا۔ غالب اور محمد خان کے ریوالور سے کئے جانے والے فائروں کی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں اور باہر سے سنائی دینے والی چیخوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا نشانہ خطا نہیں جا رہا ہے۔ نازو نے میری حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے ایک شخص کو یہ تاثر دیا تھا کہ مشین گن کی گولیوں نے کسی عورت کو ختم کر دیا ہے۔ جو دروازے کے پیچھے سے فائر کر رہی تھی۔ جب وہ کامیابی کی خوشی میں جھنکارتا ہوا اندر آیا تو نازو نے بجلی کی طرح تڑپ کے اس پر وار کیا اور اس کی سانڈ جیسی گردن کو اپنے نازک ہاتھوں کی ایک جنبش سے توڑ ڈالا۔ اب وہ بھی مشین گن اٹھائے کھڑی تھی۔
میرے اندازے کے مطابق آدھے حملہ آور ضرور ... ہو چکے تھے۔ یکلخت غالب نے چلا کر کہا "پیڈرو سامنے آ گیا۔ سور کی اولاد" اور میں اس کھڑکی کی طرف لپکا جسے غالب نے مورچہ بنا رکھا تھا۔
"یار! میرا ریوالور خالی ہو گیا ہے" اس نے آہستہ سے کہا۔
میں نے نازو کو اشارہ کیا "تم ادھر آ جاؤ۔ کیا پیڈرو سامنے ہے؟"
غالب نے کہا "میں نے اسے دیوار سے کود کر جاتے دیکھا تھا۔"
میں نے نازو سے مشین گن لے لی۔ اس میں اب ایک ہی راؤنڈ باقی رہ گیا تھا۔ سوچے سمجھے بغیر میں نے وہ راؤنڈ چلا دیا۔ کوئی جھاڑیوں میں سے خرگوش کی طرح اچھل کر گرا اور زمین پر لوٹنے لگا۔ باہر سے جیپ کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔
"وہ بھاگ رہے ہیں" میں نے کہا "خان! یہ ریوالور مجھے دو۔"
"ٹھہرو۔ میں اسے لوڈ تو کر لوں" خان نے کہا "حملہ آور یہ سمجھ کر آئے تھے کہ ہم انہیں سوتے ہوئے ملیں گے۔ ابھی وہ مقابلے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ ہوٹل کو ہر طرف سے گھیرے میں لینے کے بعد ایک ساتھ اندر داخل ہو کے اپنے اسلحے کی طاقت سے ہمیں ختم کر لیتے لیکن ہم نے ان کے شیطانوں کا سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ اگر ہم جاگ نہ رہے ہوتے تو ہمارا انجام برا ہوتا۔"
میں نے ریوالور سے فرار ہونے والوں پر مسلسل فائر کئے مگر ان کو ضرورت سے زیادہ مہلت مل گئی تھی۔ ان کے لئے ہماری جوابی کارروائی انتہائی غیر متوقع تھی۔ ہم نے ان ہی کی مشین گن استعمال کی تھی لیکن یہ بات انہیں کیسے معلوم ہو سکتی تھی۔ وہ یہی سمجھے کہ ہم پوری طرح مسلح ہیں۔ اپنے جانی نقصان نے انہیں پہلے ہی بدحواس کر دیا تھا۔ انہیں یہ اندازہ بھی تھا کہ ہم مورچہ بند ہیں اور وہ باہر کھلی جگہ میں ہونے کی وجہ سے ہمارا نشانہ بن رہے ہیں چنانچہ وہ جان بچا کر فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ ان کی طرح ہمیں بھی مرنے والوں کی صحیح تعداد معلوم نہ تھی۔ میں یہ جاننے کے لئے بے چین تھا کہ استاد پیڈرو مارا گیا یا بچ کے نکل گیا۔ لیکن اب خود فرار ہو جانا ضروری ہو گیا تھا۔ شدید فائرنگ کی آوازوں نے سارے علاقے میں ہل چل مچا دی تھی۔
میدان صاف ہوتے ہی میں نے خان سے کہا "خان صاحب! اب یہاں سے نکلنے کی فکر کرو۔ پولیس آنے ہی والی ہوگی۔"
خان مجھ سے زیادہ فکر مند تھا "مجھے تو راستے بھی نہیں معلوم۔ خیر آؤ۔ پیچھے سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔"
غالب اور نازو کے ساتھ میں نے اس طرف کا رخ کیا جہاں میرے اندازے کے مطابق رابعہ، گل اور محسن چھپے ہوئے تھے۔ یہ حویلی کا عقبی حصہ تھا جس میں لمبی لمبی گھاس

اور جھاڑیوں کے درمیان درخت کسی جنگل کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ سڑک کی طرف سے میں لوگوں کی آوازیں سن رہا تھا۔ جو شاید آس پاس کے گھروں سے نکل کر گیٹ کے سامنے جمع ہوگئے تھے۔ میری نظریں پریشانی کے عالم میں اپنے ساتھیوں کو تلاش کر رہی تھیں۔
"آخر کہاں چھپے ہیں یہ لوگ" میں نے کہا۔
نازو نے کہا "مجھے بھی کوئی دکھائی نہیں دیا۔"
غالب نے کہا "عجیب احمق ہے یہ محسن بھی۔ ایسا دبک کر بیٹھا ہے کہیں کہ سر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔"
نازو نے کہا "ہاں۔ ہم تو سامنے ہیں۔ انہیں دیکھ لینا چاہئے۔"
میں نے چلا کر کہا "محسن! نازو!"
باہر کہیں دور سے پولیس کی گاڑی کے سائرن سنائی دینے لگے تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسی وقت گھاس میں سے کوئی پھدک کے باہر آیا۔ میں نے برائے نام اجالے میں بھی ترکی ٹوپی کے پھندنے کو لہراتے ہوئے دیکھ لیا اور بھونچکا رہ گیا۔ "یوسف ثانی! تم؟"
یوسف ثانی نے ہاتھ بلند کر کے لہراتے ہوئے کہا۔ "جلدی کیجئے بندہ پرور! دشمن آ پہنچا ہے سر پر۔ نہ ماریئے کلہاڑی اپنے پاؤں پر۔ سوچ بچار میں وقت جائے نہ گزر۔"
میں نے دل ہی دل میں کہا "سالا اس وقت بھی بنا ہوا ہے شاعر" اور پھر دوڑ کر گھٹنوں تک آنے والی لمبی گھاس میں گھس گیا جس میں سے صرف یوسف ثانی کا سر اور ترکی ٹوپی دکھائی دیتے تھے۔ غالب اور نازو مجھ سے آگے تھے۔ میں نے یوسف ثانی کی موجودگی پر حیرت کا اظہار کرنے کے لئے پلٹ کر محمد خان کی طرف دیکھا ہی تھا کہ یوسف ثانی چلایا۔
"اجی توقف نہ فرمایئے۔ میرے پیچھے پیچھے آیئے۔"
محمد خان نے کہا "دیکھا تم نے۔ یہ کیسے جن کی طرح نمودار ہوا ہے۔ بھلا اس وقت کوئی سوچ سکتا تھا کہ یہ ٹپک پڑے گا۔"
میں نے کہا "میری تو خود عقل حیران ہے۔"
دوڑتے دوڑتے اچانک یوسف ثانی کو ٹھوکر لگی۔ وہ منہ کے بل گرا تو اس کی ٹوپی اڑ کر دور گئی۔
وہ چلایا "آہ یوسف ثانی کی تقدیر۔ ایسی کیا تھی میری تقصیر۔ کہ بنایا مجھے عبرت کی تصویر" وہ کراہتا، لنگڑاتا اٹھا اور اپنی ٹوپی کو تلاش کرنے لگا جس کا پھندنا پھر الگ ہو گیا تھا۔ اس نے ان دونوں کو الگ الگ اٹھا کے ایسے دیکھا جیسے اپنے نقصان عظیم کا اندازہ کر رہا ہو۔ پھر اس نے پھندنا سر پر رکھ کے ٹوپی کو ایسے جمایا کہ پھندنے کے پھر کہیں گر جانے کا احتمال نہ رہا۔ پھر وہ لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا۔
میں نے کہا "یوسف ثانی! یہ تم کہاں سے تیار ہو گئے؟"
"حضور! بھروسا کیجئے ناچیز پر۔ دکھا رہا ہوں آپ کو وہ راہ گزر۔ جہاں جا نہیں سکتی کسی بدخواہ کی نظر۔ عرف عام میں کہتے ہیں اس کو گٹر۔ جس کی لائن ہے زمین کے اندر۔ لیکن بے چارگی ہے باہر۔ آپ کے ساتھی ہیں وہیں منتظر۔ لیجئے ہم پہنچ گئے اس مقام پر۔"
"خدا سمجھے تمہاری قافیہ دانی سے" میں نے کہا اور کچھ دیر اس سوراخ کے کنارے تذبذب کی کیفیت میں کھڑا رہا جس میں مجھے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
پھر محسن نے نیچے سے کہا "کود جاؤ اندر۔ گہرائی زیادہ نہیں ہے۔ پہلے نازو کو اتار دو۔"
غالب نے نازو کا ہاتھ پکڑ کے اسے مین ہول میں لٹکا دیا۔
"اب میں چھوڑ رہا ہوں" غالب نے کہا اور اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور پھر نیچے جھانک کر کہا "چوٹ تو نہیں آئی؟"
"نہیں۔ تم بھی آجاؤ۔ سیدھے اترنا" نازو نے کہا۔
باری باری غالب، محمد خان اور یوسف ثانی اندر اتر کر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ میں نے اترنے سے پہلے مین ہول کے ڈھکنے کو قریب کر لیا اور پھر اندر اتر گیا۔ نیچے سے مجھے محمد خان نے اپنے کندھوں کا سہارا فراہم کیا۔ اس کے شانوں پر قدم جما کے میں نے گٹر کے ڈھکن کو کھینچا اور برابر کر دیا۔
اب میں گھپ اندھیرے میں تھا اور ایک عجیب سی بدبو میرے حواس کو مختل کر رہی تھی۔ محسن نے لائٹر روشن کیا تو اس کے بے نام اجالے میں مجھے رابعہ، گل اور نازو کے متوحش چہرے دکھائی دیئے۔ ہم سب کسی پرانی گٹر لائن میں کھڑے ہوئے تھے جو شاید برسوں سے استعمال نہیں ہوئی تھی۔ اس میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے جن پر چوہے دوڑ لگا رہے تھے۔
اتنے بڑے اور پلے ہوئے چوہے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ برسوں بعد کسی نے ان کی خلوت پر یلغار کی تھی چنانچہ وہ پریشان بھی تھے اور برہم بھی۔ ان میں سے کچھ ہمیں اپنی ننھی ننھی آنکھوں سے گھور رہے تھے اور ان کے تیور بہت جارحانہ تھے۔
میں نے کہا "دیکھو، یہ چوہے حملہ بھی کر سکتے ہیں۔ میرے ہاتھ میں یہ خالی مشین گن ہے جس سے میں ڈنڈے کا کام لے سکتا ہوں۔ میں آگے چلتا ہوں، میرے پیچھے رابعہ پھر محمد خان، اس کے پیچھے گل پھر محسن اور نازو۔ آخر میں غالب رہے گا۔"
غالب نے دوسری خالی مشین گن کو ڈنڈے کی طرح لہرایا۔
"ہم ایک قطار میں چلیں گے۔ تاکہ چوہوں کو دونوں طرف سے نکل جانے کا راستہ مل جائے" میں نے کہا "ہم بھیڑ کی شکل میں چلیں گے تو یہ آگے بھاگنے کی کوشش کریں گے یا پلٹ کر حملہ آور ہوں گے۔"
یوسف ثانی مجھ سے بھی چند قدم آگے تھا اور چوہوں کی موجودگی سے بے نیاز اپنی ٹوپی اور پھندنے کو بڑی [illegible] نظر۔

www.paksociety.com

سے دیکھ رہا تھا۔ ایک بار میں نے ہاتھ مار کر انھیں الگ کر دیا تھا تو اسے سخت صدمہ ہوا تھا۔ اب ایک حادثے نے پھر لوٹی کو لنڈورا کر دیا تھا جسے اس نے یقیناً بڑی محنت سے دوبارہ پھندنے کے ساتھ منسلک کیا تھا۔ اچانک ایک چوہے نے اس کی طرف چھلانگ لگائی۔ جس صفائی سے اس نے چوہے کو ٹھوکر مار کے دور پھینکا اس نے مجھے حیران کر دیا۔ یہ محمد خان جیسے کسی چیمپین کا شاٹ تھا جو بال کو آسانی سے باؤنڈری کے باہر پہنچا دے۔

میں نے کہا "دیکھو، یہ ہے صحیح طریقہ۔"

لیکن بہادری کے اس مظاہرے سے اور میرے الفاظ سے خواتین کی دہشت کم نہیں ہوئی تھی۔ اگر حالات اجازت دیتے تو وہ ضرور چیخ مار کے بے ہوش ہو جاتیں۔ ایک بار صرف ایک چوہے نے انھیں تگنی کا ناچ نچا دیا تھا۔ یہاں ایک نہیں ہزاروں چوہے تھے لیکن جائے فرار کوئی نہ تھی۔ جیسے ناگزیر خطرات میں ہر جانور اپنی جان بچانے کے لئے استطاعت سے بڑھ کر جرات کا مظاہرہ کرتا ہے اور جان کی بازی لگا دیتا ہے ایسے ہی رابعہ، گل اور نازو نے بھی خود کو ان خونخوار چوہوں سے مقابلے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ گٹر لائن میں صرف چوہے ہی نہیں تھے۔ فرش پر ہزاروں کی تعداد میں کاکروچ پھر رہے تھے۔

انھیں سگریٹ لائٹر کی معمولی سی روشنی نے مضطرب کر دیا تھا اور وہ اندھیرے کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ کئی بار کاکروچ ہمارے پیروں پر چڑھے۔ میں نے تو خیر انھیں ہاتھ مار کر جھٹک دیا لیکن خواتین نے بدحواسی میں اچھا خاصا ڈانس کیا۔ تاہم اس وقت کسی کو ان کی حالت پر ہنسی نہیں آئی۔

ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھے تو گٹر کی چھت سے چپٹی ہوئی، تاک رہنے والی چھپکلیاں تیزی سے ادھر ادھر ہو گئیں۔ رابعہ تقریباً مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔ اسی طرح غالب سے نازو چپٹی ہوئی تھی اور محسن کے ساتھ گل۔ ان کی حالت غیر تھی اور ایک کو دوسرے کا ہوش نہیں تھا۔ وہ بار بار چیخ مارتی تھیں۔ جیسے رابعہ میرا نام لیتی تھی ایسے ہی نازو بے اختیار غالب کو پکارتی تھی اور گل خود بخود محسن کو۔ ہم سب ایک ہی طرح انھیں ڈانٹتے تھے، حوصلے سے کام لینے کی تلقین کرتے تھے اور پھر ان کی ڈھال بن کے انھیں تحفظ فراہم کرتے تھے۔

میں آگے تھا چنانچہ جتنی مرتبہ وہ خون آشام چوہے مجھ پر حملہ آور ہوئے میں نے مشین گن کو ڈنڈے کی طرح استعمال کیا یا اپنے پیروں سے انھیں کک لگائی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی کم خوف زدہ نہ تھا۔ وہ مجھے آدم خور چوہے لگتے تھے۔ دراصل وہ چوہے کی نسل اور بِل کے جانور تھے جو "گھونس" کہلاتے ہیں اور ان کا ٹھکانا گٹر لائنوں میں ہی ہوتا ہے۔ ان کے دانت اتنے تیز ہوتے ہیں کہ سیمنٹ کی پائپ لائنوں کو کاٹ دیتے ہیں۔ وہ ڈرین پائپ میں پانی کے بہاؤ کے مخالف اوپر چڑھ سکتے ہیں اور نالی کے آخری سرے پر لوہے کا ڈھکن نہ ہو تو باتھ

مدم یا کچن میں داخل ہو کے خاصی تباہی پھیلا دیتے ہیں۔

یوسف ثانی اپنی مخصوص شیروانی اور پتلون میں بڑھا میز ما چیتا ہوا ہماری رہنمائی کر رہا تھا اور ہمیں اپنی تحقیر کے انداز کی شاعرانہ زبان میں یقین دلا رہا تھا کہ اس زمین دوز راستے سے بہت جلد ہم بخیر و عافیت باہر نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ محمد خان نے جب اسے جن قرار دیا تھا تو شاید اس نے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا۔ جن وہ سب کچھ نہیں کر سکتے تھے جو یوسف ثانی کے لئے کھیل تھا۔ وہ کارٹون تھا لیکن غضب صلاحیتوں کا مالک تھا اور اب تک کئی بار اپنی افادیت اس طرح ثابت کر چکا تھا کہ میں اسے ہر قیمت پر ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے ایک ہاتھ رابعہ کے شانے کے گرد ڈال کے اسے اپنے قریب ایک طرح سے اپنے جسم کی پناہ میں لے رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے مشین گن کو الٹا پکڑ کے آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ یہی کیفیت غالب کی تھی۔ مگر رابعہ کے مقابلے میں نازو زیادہ بزدلی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ وہ بار بار چیخ مارتی تھی اور پھر غالب اس پر چلاتا تھا کہ اب آواز نکلی تو تھپڑ ماروں گا۔ خالی ہاتھوں سے مردانہ وار لڑائی کے جوہر دکھانے والی اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے زندگی کی جدوجہد میں پیش پیش رہنے والی نازو اس وقت چوہوں، کاکروچوں اور چھپکلیوں کے درمیان گھری ہوئی انھیں خاصی تفریح کا سامان فراہم کر رہی تھی۔

گل سب سے بہادر ثابت ہوئی تھی۔ محسن کے ہاتھ میں لائٹر تھا جو بار بار بجھ جاتا تھا اور ہم سب اندھیرے میں کھڑے رہ جاتے تھے۔ اندھیرا ہوتے ہی رابعہ اور نازو چلانے لگتی تھیں "لائٹ جلاؤ" اور محسن جھلا کے کہتا تھا "اب کسی نے شور مچایا تو میں لائٹر پھینک دوں گا۔"

متعدد چوہے ہمارے دائیں بائیں بھاگ رہے تھے۔ جو ان میں زیادہ دلیر تھے وہ دوسروں کے لئے درس عبرت بن گئے تھے۔ ان کے زخمی جسم ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے اور ان کا خون شکستہ حصوں سے ابل رہا تھا۔ یہ بڑا کراہیت پیدا کرنے والا منظر تھا چنانچہ رابعہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا اور صرف میرے سہارے پر چل رہی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ بار بار کاکروچ اس کے پیروں پر چڑھ جاتے تھے اور اسے ہاتھ ہٹا کے یا پیر پٹخ کے انھیں جھاڑنا پڑتا تھا۔ کئی بار میں نے اس سے کہا "جان، بس تھوڑا سا فاصلہ اور ہے۔ شاباش ہمت نہ ہارو۔ ڈرنے کی کیا بات ہے۔ کاکروچ کاٹتے تھوڑا ہی ہیں۔ اور یہ چھپکلیاں کیا کہہ رہی ہیں؟ کچھ نہیں۔ یہ تو خود ڈری ہوئی ہیں۔ بس ادھر سے ادھر ہو جاتی ہیں۔ اب تو چوہے بھی راستہ دے رہے ہیں۔ دیکھو کیسے دُم دبا کے بھاگ رہے ہیں۔" میرا خیال ہے کہ ایسے ہی الفاظ سے غالب نے نازو کا اور محسن نے گل کا حوصلہ بحال رکھنے کی کوشش کی ہو گی۔

گٹر لائن کی دیواروں پر مکڑی کے جالے بھی تھے جن میں معلق مکڑیوں کو ہٹانے کے لئے مجھے اسٹین گن کو ڈنڈے کی طرح گھمانا پڑتا تھا۔ کئی جگہ جالے میرے ہاتھوں پر بھی چپک گئے۔ یوسف ثانی اس زیر زمین خفیہ راستے پر بڑے اعتماد کے ساتھ ہماری رہنمائی کرتا ہوا چلتا جا رہا تھا۔ تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم سب کے خوف کی شدت میں خاصی کمی آ گئی تھی اور یہ ماحول ہمیں غنیمت محسوس ہونے لگا تھا جس نے ہمیں وقت پر خطرے کی حدود سے نکالنے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔

عام حالات میں وہ بو ناقابل برداشت ہوتی جو زیر زمین برسوں سے بند پڑی ہوئی گٹر لائن میں بھری ہوئی تھی۔ لیکن جب ذہن زیادہ بڑے مسائل سے دوچار ہو تو چھوٹے اور غیر اہم مسائل خود بخود پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ سب سے بڑا خطرہ پولیس کے ہاتھوں گرفتاری کا تھا جو اب ٹل گیا تھا۔ اگر ہم پکڑے جاتے تو نہ جانے کتنے قتل ہمارے نام لکھے جاتے۔ ہمارے ہاتھوں مارے جانے والوں کی صحیح تعداد کا علم خود ہمیں بھی نہیں تھا۔ اصل مجرم فرار ہو گئے تھے اور لاشیں چھوڑ گئے تھے۔ یہ بتانا اور ثابت کرنا ناممکن تھا کہ وہ حملہ آور تھے اور ہم نے صرف اپنا دفاع کیا تھا۔

گرفتاری سے بچ جانے کے بعد اس گٹر لائن کے ذریعے فرار کا راستہ مل جانا یقیناً تائید ایزدی تھا اور یوسف ثانی کو ہم فرشتہ غیب سمجھ سکتے تھے جسے خدا نے بروقت بھیجا اور ہمیں بچا لیا۔ اس راستے پر اصل پریشانی کا سبب وہ خونخوار چوہے تھے جو ہر طرف سیکڑوں کی تعداد میں پھر رہے تھے اور اتنے نڈر تھے کہ حملہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ اگر وہ ایک منظم فوج ہوتے اور مل کے حملہ کرتے تو شاید ذرا سی دیر میں ہمارے جسموں کی جگہ صرف ہڈیوں کے ڈھانچے پڑے رہ جاتے جن پر گوشت کا ایک ریزہ نہ ہوتا۔ ہم نے چوہوں کا مقابلہ کیا اور اپنا راستہ بناتے آگے بڑھتے گئے۔ کاکروچ اور چھپکلیاں بے ضرر تھیں لیکن چوہوں کی طرف سے ہوشیار رہنا ضروری تھا۔ کوئی چوہا اگر اپنے تیز دانت کسی کے گوشت میں گاڑ دیتا تو اسے وہی انجکشن لگوانے پڑتے جو پاگل کتے کے کاٹے کا علاج ہیں۔ میں نے سنا تھا کہ کوئی بھی گوشت خور جانور (بشمول حضرت انسان) کسی کو کاٹ لے تو اس کے دانتوں کا مخصوص زہر خون میں سرایت کر جاتا ہے چنانچہ چوہے، بلی اور کتے سے لے کر بندر اور شیر تک سب کے کاٹے کا ایک ہی علاج ہے۔

ان تمام خطرات کی موجودگی میں غلاظت اور بو کی طرف کون توجہ دیتا۔ مجھے اندر اترتے وقت ایک خیال ضرور آیا تھا کہ کہیں گٹر لائن میں زہریلی گیس نہ ہو۔ ایسے بہت سے واقعات میں سنتے اور پڑھتے ہیں کہ لوگ کسی پرانے بند کنویں یا گٹر لائن میں اترے اور زہریلی گیس کے باعث ہلاک ہو گئے۔ ابھی تک میں نے اس زہریلی گیس کے اثرات کو محسوس

نہیں کیا تھا۔ صاف ہوا میں گیس کی بو پہچانی جاتی ہے مگر وہاں اتنی بو تھی کہ اس میں ہائیڈروجن سلفائیڈ، کلورین یا امونیا جیسی گیس کا بھی پتا نہیں چل سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ مجھے حبس کا اور دم گھٹنے کا احساس ہونے لگا۔ ہم نے زمین کے نیچے ہی نیچے تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ درمیان میں کئی موڑ بھی آئے تھے اور جنکشن بھی جہاں سے گٹر لائن دو یا تین حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ یوسف ثانی جیسا لیڈر نہ ہوتا تو ہم بھٹک کر نہ جانے کدھر نکل جاتے۔ وہ زمین دوز راستوں سے اس طرح واقف معلوم ہوتا تھا جیسے زمین کے اوپر سڑکوں اور گلیوں سے۔ ان زیر زمین خفیہ راستوں سے اس کی واقفیت کیوں تھی؟ اس کا جواب حاصل کرنا ضروری نہیں تھا۔ جو شخص رات کو قبرستان میں خالی قبروں میں لیٹ کر وظیفے پڑھتا ہو اور محمد خان کھانے کے کھوپچیان اکٹھی کرتا ہو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔

یوسف ثانی کی قیادت پر اعتماد کے باوجود میں بھی اس مسافت کے اختتام پذیر نہ ہونے سے پریشان ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے میں نے محسوس کیا کہ رابعہ کا بوجھ کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ پھسل کر گرتی میں نے اسے تھام لیا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو غالب نے بھی نازو کو ایسے ہی سنبھال رکھا تھا۔ آخر میں صورت حال اس کے برعکس تھی اور گل نے محسن کو سہارا دے رکھا تھا اور اسے محمد خان نے نہ پکڑا ہوتا تو وہ بھی گر جاتا۔

چوہے پیچھے رہ گئے تھے اور جو اکا دکا چوہا سامنے آتا تھا وہ بھی جان بچا کے بھاگنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی طرح چھپکلیاں اور کاکروچ بھی غائب ہو گئے تھے اور راستہ پہلے کے مقابلے میں آسان ہو گیا تھا چنانچہ رابعہ، نازو اور محسن کی بے ہوشی کو میں حبس، تازہ ہوا کی کمی یا کسی زہریلی گیس کا نتیجہ ہی قرار دے سکتا تھا جو آہستہ آہستہ سب کے جسموں میں سرایت کر گئی تھی۔

میں نے یوسف ثانی سے چلا کے کہا "یار، یہ راستہ ہے کہ شیطان کی آنت۔ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ کیا ہمیں سیدھا جہنم میں پہنچا کر دم لو گے۔"

یوسف ثانی نے برا ماننے کے بجائے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کی اور بولا "دو چار ہاتھ اب تو لب بام رہ گیا۔ یوں عقل و ہوش کھونے کا کیا کام رہ گیا۔"

میں نے کہا "میں دو چار ہاتھ تمھیں ماروں گا، دیکھتے نہیں سب کا کیا حال ہو رہا ہے۔"

اس نے سر جھکا کر کہا "فدوی کا اس میں ہے کوئی قصور تو وہی ہوئے مارئیے سر عزیز پہ ضرور۔ آپ کو لایا ہوں خطرات سے دور۔ تحسین و انعام وہ ہے زمانے کا دستور لیکن آپ کا مزاج عالی ہے برہم حضور۔"

میں نے جھلا کے کہا "حضور کے بچے، باہر نکالو نہیں پہلے۔

ورنہ تمہارا انجام یہ ہو گا کہ تمہیں کے ساتھ مرحوم بھی لگانا پڑے گا۔"

اس نے چند قدم پل کے نیچے سے زور لگایا اور ایک ڈھکن کھول دیا۔ پھر اچھلا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اوپر کا کنارہ پکڑ کے لٹک گیا۔ اس کی ترکی ٹوپی اس سے پہلے ہی ٹنل کے باہر نکل گئی تھی۔ یوسف ثانی نے خود کو اسپرنگ کی طرح اوپر کھینچا اور باہر نکل گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سرنگ کا سفر ختم ہوا۔

یوسف ثانی نے زمین پر پیٹ کے بل لیٹ کر ہاتھ نیچے پھیلائے اور رابعہ کو اوپر کھینچ لیا۔ رابعہ ایک صحت مند لڑکی تھی۔ نازو کی طرح دھان پان نہیں تھی۔ اس کا وزن ایک سو تیس پونڈ تھا لیکن جتنی آسانی سے یوسف ثانی نے اسے ایک ہاتھ سے اٹھایا اس پر مجھے حیرانی ہوئی کیونکہ وہ خود سوکھا اور مریل ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتا تھا۔ میں اس کی مدد کے بغیر ہی اوپر آ گیا اور تازہ ہوا میں ایک گہری لمبی سانس لے کر میں نے نازو کو اوپر کھینچا۔ ایک ایک کر کے سب اس گٹر کے مین ہول سے نکل آئے تو یوسف ثانی نے گٹر پر ڈھکن لگا دیا۔

میں زمین پر لیٹ گیا۔ ہوا بے حد پاک صاف، خنک اور ہلکی ہو، ایک ناقابل بیان راحت ہوئی۔ چند منٹ میں رابعہ اور نازو کو بھی ہوش آ گیا مگر میں نے انھیں لیٹے رہنے کی تاکید کی اور گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ابھی رات باقی تھی اور جہاں ہم زمین سے برآمد ہوئے تھے وہ جگہ غیر معمولی طور پر ویران تھی۔ مجھے اپنے سامنے ایک پرانی ریلوے لائن دکھائی دے رہی تھی جو نہ جانے کب سے استعمال نہیں ہوئی تھی۔ اس کا کچھ حصہ ٹوٹ چکا تھا۔ باقی ٹریک میں گھاس اگ آئی تھی جہاں پر ریلوے لائن ختم ہوتی تھی وہاں ایک بیریئر سا بنا ہوا تھا۔ عموماً ایسی ریلوے لائن شنٹنگ کے لئے استعمال ہوتی ہے مگر یہ سلسلہ بھی برسوں سے موقوف نظر آتا تھا۔

ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دونوں جانب جھونپڑیاں تھیں۔ یہاں رہنے والوں نے اتفاق رائے سے ریل کی پٹری کو اس آبادی کی گزرگاہ تسلیم کر لیا تھا۔ درمیان کے سلیپر اکھاڑ لئے گئے تھے اور شاید کسی نے اپنے گھر کی تعمیر میں استعمال کر لئے تھے۔ گھر بیچ کا حصہ ایک صاف سڑک کے طور پر موجود تھا۔ اس سڑک کا اختتام مال گاڑی کے ایک ڈبے پر ہوتا تھا جو بیریئر سے ملا ہوا کھڑا تھا۔ معلوم نہیں ریلوے والے اس ڈبے کو یہاں کب اور کیوں بھول گئے تھے اور اس ڈبے کی گمشدگی کا احساس انہیں کیوں کر نہیں ہوا تھا۔ آثار بتاتے تھے کہ زنگ کے رنگ کا یہ ڈبا سالہا سال سے اسی جگہ موجود ہے۔ یہ شہزادہ گلفام کا قصر عالی شان تھا۔ جھونپڑیوں کی آبادی میں لوہے کا بنا ہوا ایک وسیع و عریض ہال نما ڈبا ایک محل سے کم نہ تھا۔ اتنی جگہ میں چار خاندان رہ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ڈبے کی فولادی دیواریں اور اس کا مقفل ہو جانے والا دروازہ اسے ایک ناقابل شکست قلعہ بناتے تھے۔

یوسف ثانی نے شیروانی کو اوپر اٹھا کر پتلون پر بندھا ہوا ازار بند نکالا۔ یہ ازار بند پتلون کی بیلٹ کا کام بھی دیتا تھا۔ اس کے آخری سرے پر چابیوں کا ایک گچھا لٹک رہا تھا۔ اس نے ایک چابی لگا کے ایک بیرونی تالے کا قفل کھولا اور پھر بوگی کے دو میں سے ایک پٹ نیچے گرا دیا۔ دوسرا پٹ اس نے اوپر اٹھا کے کسی ہک سے اڑا دیا۔ میں حیرانی سے یہ سب کارروائی دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر یوسف ثانی نے ریلوے کی اس بوگی پر قبضہ کیسے کیا اور اب تک اس قبضے کو برقرار رکھنے میں کیسے کامیاب ہے۔ لیکن جیسا کہ محمد خان نے کہا تھا کہ وہ جن ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔

"یہ ہے اس ناچیز کا ٹھکانا۔ شہزادہ گلفام کا غریب خانہ۔ مبارک ہے آپ کا تشریف لانا" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے اشارہ کیا۔ میں نے نازو کو اور ثاقب نے رابعہ کو سہارا دے کر اوپر چڑھا دیا۔ گل حیرت انگیز طور پر تازہ دم تھی۔ وہ خود ہی اندر چلی گئی۔ میں آخر میں اندر پہنچا تو یوسف ثانی مٹی کے تیل کا لیمپ روشن کر رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ جتنا غلیظ، بے ہنگم اور بے ترتیب خود یوسف ثانی ہے ویسا ہی اس کا ٹھکانا بھی ہو گا مگر روشنی ہوتے ہی میں نے اندر کا نقشہ دیکھا تو میں دم بخود رہ گیا۔ بوگی کے آخری حصے میں صاف بستر بچھا ہوا تھا۔ آمنے سامنے کی دیواروں کے ساتھ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جو پرانی ضرور تھیں مگر صاف تھیں۔ درمیان میں میز پر سادہ میز پوش تھا لیکن ایک گلدان میں کاغذ کے خوش نما پھول نظر آ رہے تھے۔ دوسری طرف بوگی کے دروازے تھے۔ یہ پارٹیشن چوڑائی کے رخ باقاعدہ بورڈ سے کی گئی تھی۔ اس طرح آخر میں دو کمرے بن گئے تھے۔ ہر کمرے کی چوڑائی بوگی کی چوڑائی سے نصف تھی۔ ایک یوسف ثانی کا کچن تھا اور دوسرا باتھ روم۔ دونوں کے دروازے پر بھاری پردے لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر سفید رنگ بے داغ تھا اور لوہے کے نٹ بولٹ کو چھپانے کے لئے فلم ایکٹریسوں کی تصویروں والے بڑے بڑے پوسٹر لگا دیے گئے تھے۔ ان میں کچھ پوسٹر غیر ملکی تھے اور قابل اعتراض سمجھے جا سکتے تھے۔ مگر یہ یوسف ثانی کا ذوق حسن تھا جس پر ہم اعتراض نہیں کر سکتے تھے۔ اسے یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے گھر کو جیسے چاہے سجائے۔

رابعہ، نازو اور گل فرشی بستر پر دراز ہو گئی تھیں۔ محسن، ثاقب اور محمد خان کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور اس بے سروسامانی کے مکمل گھر کو دیکھ رہے تھے۔ جس میں تونگری، آسودگی، سلیقہ اور حسن سب کچھ تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ ریلوے کی پرانی بوسیدہ بوگی اندر سے اتنی آرام دہ اور خوبصورت ہو گی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس وقت یہ ہم جیسے بے سہارا اور بے گھر لوگوں کے لئے محفوظ ترین جگہ تھی جہاں ہمارے دشمنوں کے تصور کی رسائی بھی ممکن نہ تھی۔

صبح ہونے ہی والی تھی۔ ہم سب تھکن اور بے آرامی سے زیادہ شدید اعصابی دباؤ کا شکار تھے۔ رات کے آخری پہر میں جو کچھ ہم پر بیتی وہ ایک بھیانک خواب سے کم نہ تھا جس کی دہشت ابھی باقی تھی۔ ہم موت کے منہ سے بچ کر نکلے تھے اور ایک انتہائی خوفناک اور عجیب ذہنی سفر کے بعد کسی میں اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ اپنی زبان سے کچھ کہے۔ کلمۂ شکر یا صرف تسلی یا کوئی بھی بات جو اعتماد کو بحال کر سکے۔ ہم سب اپنے اپنے خیالوں کے گرداب میں غوطہ زن تھے اور زبانِ خاموشی میں ہمکلام تھے۔

تینوں لڑکیاں ایک بیڈ پر نڈھال پڑی چھت کو گھور رہی تھیں اور شاید ان کے تصور کی اسکرین پر ابھی تک اسی فلم کے مناظر چل رہے تھے جو شاید ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں ہم سب کو محصور کرنے والے شکاری غیر متوقع ناکامی سے دوچار ہو کر لوٹ گئے تھے۔ ہر شکست خوردہ کے لئے ناکامی کا احساس زہر ہوتا ہے۔ ایک صدمہ جان و مال کے زیاں کا ہوتا ہے تو دوسرا اپنے یقین کی شکست کا ہوتا ہے۔ اچانک اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے کامیابی کے لئے جو منصوبے بنائے تھے ان کی بنیاد غلط تھی۔ اس کے اندازے غلط تھے اور وہ یقین نہیں تھا اس کی خوش فہمی تھی۔

مجھے استاد حیدرو کا خیال آیا۔ اس وقت وہ کہاں ہو گا؟ کیا اس کی لاش رات بہادر کی حویلی کے آس پاس مرجانے والوں میں شامل ہو گی اور اس وقت پولیس کی تحویل میں ہو گی یا اپنے باس کے سامنے بچے کھچے شکست خوردہ لشکر کے ساتھ اپنی ناکامی کی ذمے داری پر تقدیر کو کوسنے میں مصروف ہو گا۔ دوسروں کی غلطی اور بزدلی کو سبب بنا کر پیش کر رہا ہو گا یا نئی منصوبہ بندی کرتے ہوئے ابھی کو مورد الزام ٹھہرا رہا ہو گا؟

وقت کے اسٹیج پر اب منظر تیزی سے بدل رہے تھے اور ہم سب جو تماشا بھی تھے اور تماشائی بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ آنے والے دن کے جانے سے پہلے زندگی کے سفر کا اگلا پڑاؤ کہاں ہو گا۔ کل تک ہم ڈاکو محمد خان کے مہمان تھے اور اس کے تحفظ کی امان میں تھے۔ آج وہ ہم میں سے ایک تھا اور ہمارے قافلۂ سخت جان کے ساتھ قدم ملا کے بیٹھا تھا۔ اب وہ خود بھی غیر محفوظ تھا۔

ہمارا اس پرانی حویلی سے نکلنا ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ میری عقل ان اسباب کو سمجھنے سے قاصر تھی جو خود بخود پیدا ہو گئے تھے۔ میرا عقیدہ بھوت پریت کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا تھا چنانچہ میں اسے اپنے ایمان کے مطابق انتظام دست غیب کہہ سکتا تھا کہ پہلے خود اللہ بدری پر شاہ صرف اس لئے تشریف لائے تھے کہ ہمیں باتوں میں لگا کے سونے نہ دیں۔ پھر ان کی بیٹی کا عاشق جالی شاہ نمودار ہو گیا جس نے اس محبت کی دردناک داستان صرف اس لئے سنائی کہ میں جاگتا رہوں، حملہ آوروں کے آنے تک اور یہ حقیقت ہے کہ بھوت نظر نہ آتے تو ہم غافل پڑے سوتے رہ جاتے اور استاد حیدرو کے ساتھیوں کے بجائے ہماری لاشیں اس وقت پولیس کی تحویل میں ہوتیں۔

لیکن سب سے زیادہ حیران کن حضرت شہزادہ گلفام عرف یوسف ثانی کا نمودار ہونا تھا۔ اگر وہ وہاں موجود تھا تو کیوں موجود تھا۔ محمد خان نے اس کے بارے میں ہمیشہ یہ کہا تھا کہ معلوم نہیں کہاں بھٹک رہا ہو گا مگر وہ ہمیشہ ہمارے آس پاس ہی پایا گیا۔ ہر وقت مدد کے لئے بالکل کسی جن کی طرح تیار رہا اور ہمیں مصیبت سے بچاتا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ جن محمد خان کے قبضے میں تھا، اس کے احکام کا پابند تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں بھوتوں کے وجود کو تسلیم کرنے پر تیار تھا مگر میں یہ نہیں تسلیم کر سکتا تھا کہ آدھی رات کے بعد یوسف ثانی کا آنا اور ایک خفیہ راستے سے گزار کے ہمیں اپنے ریلوے کے اس "ریسٹ ہاؤس" تک لے آنا کوئی اتفاقیہ بات تھی۔

اچانک اس فولادی کمرے کا دروازہ کھٹ سے کھلا۔ دھماکے سے ہل ہی نہیں وہاں موجود ہر شخص اچھل پڑا۔ گل ایک چیخ مار کر رابعہ اور نازو کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ ان سب کی پھٹی پھٹی آنکھیں یوسف ثانی پر جم گئی تھیں۔ وہ بڑے مکروہ، مسخرانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی نے اس ناقابل شکست دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کے مقفل کر دیا ہو۔ اس فولادی دیواروں والے زنداں سے باہر جانے کا کوئی ایک راستہ تھا جو اب بند ہو چکا تھا۔ تحفظ اور سلامتی کا خیال ایک سراب ثابت ہوا تھا۔ یوسف ثانی کے روپ میں وہ ہماری شامت اعمال تھی جو ہمیں گھیر کر یہاں لے آئی تھی اور جس عقل پر ہمیں ناز تھا، وہ دام ہمرنگ زمیں کے فریب میں آ گئی تھی۔ ہم سب اسی طرح پکڑے جا چکے تھے جیسے بلی کے پنجوں سے بچ نکلنے والا چوہا پھر گردن خود ہی چوہے دان میں پھنسا لے۔ میرے لئے یہ ماننا مشکل ہو رہا تھا کہ ایک ساتھ ہم سب کی عقل دوستی کے پردے میں نہاں دشمن کو پہچاننے سے قاصر رہی۔ لیکن آہنی دروازے کو کھولنے کی احمقانہ، دیوانہ وار کوشش میں ناکامی کے بعد میرے لئے اس حقیقت کو تسلیم کئے بنا چارہ نہ رہا کہ ہم نے محمد خان اور یوسف ثانی پر بھروسا کرنے میں غلطی نہ کی ہوتی تو حیدرو اور قربونی جیسے شکاری اتنی آسانی سے کامیاب نہ ہوتے۔

باہر سے ابھی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں نے ریوالور نکال لیا۔ ان حالات میں ہم سب کسی مشورے کے بغیر ایک ہی نتیجے کے حصول پر متفق ہو چکے تھے اور یہ مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ مقابلے کے بغیر ہم خود کو دشمن کے حوالے نہ کریں اور خود مرنے سے پہلے انہیں مار دیں۔ ہم ... مار کر انہیں ثابت کر چکے تھے۔

www.paksociety.com

یوسف ثانی کی ہنسی نے مجھے مشتعل کر دیا "یہ ٹھیک ہے کہ تم کو بچانے میں ہم سے غلطی ہو گئی تھی..."

محسن نے تیز لہجے میں کہا "لیکن اس کا خمیازہ ہم اکیلے ادا نہیں کریں گے۔"

محمد خان نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "خدا کے لئے عقل سے کام لو۔ میری بات تو سن لو پہلے۔"

میں نے پلٹ کر کہا "ذلیل۔ بے ضمیر ڈاکو... تیری کیا بات سنوں میں... تو نے ہی پشت میں یہ خنجر گھونپا ہے۔"

میں نے یوسف ثانی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ پٹاخے کی طرح اچھل کر بولا "آج آپ نے فرمایا ہے خنجر۔ اب نظر آ رہا ہے مجھے یہ زنجیر۔ کہ کسی دن آپ مجھے بتائیں گے یہ تجربہ...."

محسن نے کہا "مخبری نہیں، تم کمینے اور دغاباز بھی ہو۔ تم نے ہمارا اعتماد حاصل کیا اور پھر یہاں لے آئے۔ گرفتار کرانے کے لئے۔"

محمد خان نے کہا "تم لوگ غلط فہمی میں عقل سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے ہو۔"

میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا "ہم عقل سے کام لیتے تو یہ نوبت ہی کیوں آتی خان صاحب!"

غالب جو اب تک خاموش تھا۔ آگے بڑھ کر کہا۔

"دروغ گو اور ریاکار... کتنا مال ملا تجھے اے لالچی کتے؟"

"اور تیرے اس چیلے کو کیا ملا؟" محسن نے یوسف ثانی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا "تم نے ان سے اپنی زندگی کی قیمت وصول کر لی۔ ضمانت حاصل نہیں کی۔ اب وہ بھی ہم تک پہنچنے کو پہلے تمہاری لاش پر سے گزرے گا۔"

"پھر بھی وہ ہمیں گرفتار نہیں کر سکے گا۔ ہماری لاشوں پہ اختیار ہو گا اس کا۔"

محمد خان نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میں نے ریوالور ہلا کے اشارہ کیا "تم دونوں ادھر آ جاؤ۔ دروازے کے سامنے۔"

یوسف ثانی جو حیرت سے کھڑا ہوا تھر تھر کانپنے میں مصروف تھا ایک دم چلانے لگا "توقف جناب عالی... یہ سب آپ کی خام خیالی..."

اب نازو بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے پیچھے سے یوسف ثانی کے ایک لات ماری "خام خیالی کے بچے... اب تو ہمیں اور بے وقوف نہیں بنا سکتا۔"

یوسف دروازے کے قریب جا کے سجدہ ریز ہوا۔ اس کی ٹوپی اس صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے بے بال و پر سر کے ساتھ چھوٹ گئی اور دور جا گری۔ چھٹانک بھر چوٹی جو ٹوپی کے نیچے چھپا ہوا تھا، نہ جانے کیسے ایک فٹ اوپر تک کھل میں اٹک کے ہلنے لگا۔

یوسف ثانی نے ایک ایسی چیخ ماری جو برات کے آگے سے چلنے والے ریلوے کے کالے انجن کی سیٹی کی طرح تھی لیکن

وہ حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ کھڑا بھی ہو گیا۔ اس نے پھندنے کو پھر اپنے سر پر رکھا اور ٹوپی کو جھاڑ کے سر پر دستخط کی طرح جما لیا "اوہ! اگر یہ کانٹا سر ٹوٹ جاتا... ہمارا آپ کا ساتھ بھی چھوٹ جاتا... یہ پائی کا پاپا چھوٹ جاتا..."

میں نے کہا "بند کرو یہ بکواس کمینے لالچی بڈھے کے غلام۔" اس نے خود پر رقت طاری کر لی "لہجے میں تلخ سنائی لیں نام... سرکار پاپوش مبارک سے جمائیں سر عام... تا قیامت ہزار بار کریں قتل عام... لیکن اس پر نہ دھریں ایسا الزام... ہم حلالی ہیں بندہ کرتا ہے شام... آباؤ اجداد کا نیک نام... اور کہنا مال تک حرام۔"

معلوم نہیں اس کی جذباتی اپیل میں کیا بات تھی جس نے مجھے روک لیا اور میں اس کے جانچ مارنے سے باز رہا۔ وہ صورت سے بے وقوف نظر آنے والا اپنا معصوم بن گیا تھا کہ میں نے اس کی تک بندی سن لی اور یہ سلطنت بھی میرے غصے کی آگ کو سرد کرنے کا سبب بن گئی۔

میں نے کہا "اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ کیا ہے؟" میں نے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا "کس نے بند کیا ہے یہ دروازہ؟"

"لیجے تو سب ہیں یہاں مفلس و قلاش۔ لیکن ان میں بند ایسے ہیں بدمعاش... نمودی کو ستانے کے بہانے رہتے ہیں تلاش..." یوسف ثانی نے فریاد کرتے ہوئے کہا۔

اب میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا "تمہارا مطلب ہے کہ کسی نے شرارت میں باہر سے دروازہ بند کیا ہے؟"

"اس کے قبضے ہیں اتنے ڈھیلے سرکار... کہ دروازہ ہو گیا ہے خود کار... دن میں گر پڑتا ہے سو بار... کبھی سن لے آواز کوئی بار بار... تو کنڈی لگا کے ہو جاتا ہے فرار... حضور اشتہ نہ ہوں بے قرار... کچھ دیر فرمائیں انتظار... ابھی آ جاتا ہے چوکیدار۔"

یوسف ثانی کی وضاحت نے اس صورت حال کو ہم سب کے لئے باعث شرمندگی بنا دیا تھا۔ نازو سب سے زیادہ خفیف تھی جس نے مشتعل ہو کے اسے لات رسید کر دی تھی۔ وہ اب رابعہ اور گل کے ساتھ بیٹھی اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی اور مجھ سے زیادہ پشیمان نظر آ رہی تھی۔ گل مسکرا رہی تھی اور رابعہ خاموش تھی۔ خود میں نے یوسف ثانی کے علاوہ محمد خان سے بہت کچھ کہہ دیا تھا جو مجھے نہیں کہنا چاہئے تھا۔ یوسف ثانی اب ایک فٹ لمبے لوہے کے پائپ سے دروازے کو مسلسل بجا رہا تھا اور اس کی کرخت آواز اندر ویسے گونج رہی تھی کہ سب کے کان خراب کر رہی تھی۔ شاید وہ ہر بار قید ہو جانے کے بعد اپنے بچانے والوں کو اسی طرح "الیس اوالیس" دینے کا عادی تھا۔

ایک منٹ بعد کسی نے باہر سے چلا کے کہا "اب سن لیا بھوت کے بچے۔ ذرا دم لے۔"

یوسف ثانی نے دیگین کی ریو اور کوٹنے کا عمل موقوف کیا تو مجھے بڑا سکون محسوس ہوا۔ ایک منٹ کا وہ شور سخت اعصاب شکن ثابت ہوا تھا۔ لڑکیاں تو باقاعدہ دونوں کانوں میں انگلیاں

ڈالے بیٹھی تھیں۔ باہر سے کسی نے کنڈی کھٹکائی اور پھر دروازے کو تھوڑا سا اٹھایا۔

"آدھی رات کو باہر مچا کے سارا محلہ کو جگا دیے ہو" کسی نے سخت لہجے میں کہا۔ "ابھی ہم تم کا اندر آئی کے..." اس نے نہایت نامناسب الفاظ میں بتایا کہ اندر آ کے وہ کیا کرے گا۔

"حضرت یہ آپ کیسی کرتے ہیں بات۔ یہ صبح صادق ہے یا آدھی رات... ہمارے ساتھ کس نے کی ہے یہ واردات؟ ہمارے مہمان ہیں کچھ معزز خواتین و حضرات... باہر سے سب کو بند کر گیا کوئی بد ذات..."

اندر جھانکنے والے نے غور سے ہمیں دیکھا اور کچھ حیران ہوا... تاہم اس کے دوسرے ساتھی بھی جو یوسف ثانی کے الارم سے جاگ اٹھے تھے نا شائستہ گفتگو کر رہے تھے اور جواب میں یوسف ثانی انہیں قہقہے کے ساتھ بھرپور آزاد شاعری سے نواز رہا تھا۔

بالآخر وہ لوگ چلے گئے اور دروازہ پھر کھل گیا۔ اس مرتبہ یوسف ثانی نے اس لوہے کے پائپ کی مدد سے انتظام کیا کہ دروازہ پھر گرے تو بند نہ ہو۔ باہر ابھی اندھیرا غالب تھا لیکن صبح کا اجالا تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔ ریلوے لائن کے آس پاس کی آبادی میں کہیں کہیں بتیاں نظر آنے لگی تھیں۔ ریوالور کو بہت پہلے ہی میں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ اب میں نے محمد خان کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ مجھے رنجیدہ نظر آیا۔

میں نے کہا "خان صاحب! تم یقیناً بہت ناراض ہو۔ اور تمہیں حق حاصل ہے ناراض ہونے کا۔"

محمد خان پھٹ پڑا "قسم اللہ کی! بہت برداشت کیا میں نے اس لئے کہ اب میں وہ نہیں ہوں جو تھا۔ میں ڈوبی خان نہیں رہا۔ تمہارا ماتحت ہوں۔ تم باس ہو۔ میں نے خود اپنے ہاتھ پاؤں باندھ لئے ہیں۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم دوست ہو ہمارے۔"

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "نہیں... الو کا پٹھا ہوں میں قسم اللہ کی... اپنا سب کچھ چھوڑ دیا۔ یار بیلی، گھر بار، لوٹ مار کا دھندہ اور... اور اس کا اچھا صلہ دیا تم نے... کہ اعتبار بھی نہیں کیا۔ کتنی جلدی بتا دیا کہ تمہاری نظر میں میرا مقام کیا ہے؟"

میں نے کہا "خان! ہم سب شرمندہ ہیں۔ مجھ سے غلطی نہیں گناہ ہوا ہے کہ میں نے تم پر شک کیا۔ تمہیں گالیاں دیں۔"

غالب نے کہا "میں مجرم ہوں تمہارا۔ تم معاف کر سکتے ہو تو کر دو۔"

محسن نے کہا "خان بھائی! ایک بار ہمارا قصور بخش دو۔"

خان نے نفی میں سر ہلایا "قسم اللہ کی اپن کون ہوتے ہیں کسی کو معاف کرنے والے۔ اپن تو خود بہت گناہ گار ہے۔ سوچا

تھا کہ سب کے ساتھ رہنے سے عزت ملے گی۔ لیکن ایک ذلیل، بے ضمیر ڈاکو، لالچی کتا۔ اس کو ڈوبی خان ہی رہنا چاہئے تھا۔"

یہ گل تھی جس نے محمد خان کے پتھر ہو جانے والے دل کو موم کیا۔ وہ ایک دم اٹھی اور محمد خان کے سامنے آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے "تم واپس جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ میں تو سمجھی تھی کہ تمہیں میرا اتنا ہی خیال ہے جتنا میرے بھائی چنگیز ناگ کو تھا۔"

"مجھے... مجھے بہت خیال ہے تمہارا" محمد خان نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے گل سے نظریں بچانے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے۔ پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تم پھر ڈوبی خان بن جاؤ۔ میں ناگ کی بہن کے اپنے بھائی کا ساتھ دوں گی۔ ہم دونوں مل کے ڈاکے ڈالیں گے۔"

"گل بانو!" محمد خان چلایا "قسم اللہ کی اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسی بات پھر مت کرنا میرے سامنے۔ میں نہیں جاؤں گا۔ کبھی واپس نہیں جاؤں گا۔ خواہ تم سب مل کے مجھے ذلیل کرو۔ مجھے گالیاں دو یا مجھے مارو۔ کتے سے بدتر سلوک کرو میرے ساتھ مگر میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا تاکہ تو گل بانو ہی رہے۔ میں تجھے کبھی ناگ نہیں بننے دوں گا۔ جان سے مار دوں گا تجھے اگر پھر ایسی بات کی..."

اس میں کوئی شک نہیں کہ گل بانو کی وجہ سے ہی محمد خان نے ہماری جان بخش دی تھی اور اسی دن سے ہی اس ڈاکو کے دل میں ایک ڈاکو کی بہن کے لئے احترام کے جذبات پیدا ہو گئے تھے مگر اس وقت جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا وہ ناقابل یقین تھا۔ محمد خان نے گل کو بالکل بڑے بھائی کی طرح گلے سے لگا لیا تھا اور اسے بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ دلاسہ دے رہا تھا۔ گل رو رہی تھی۔ اور یہ ایسا منظر تھا جس نے ذہنی طور پر مجھے بھی سخت جذباتی کر دیا تھا۔ میں، غالب اور محسن ایک ساتھ محمد خان سے چمٹ گئے۔ وہ ہر طرف سے محصور ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور لبوں پر مسکراہٹ۔

"ارے بھئی چھوڑو مجھے۔"

میں نے کہا "ہم تمہیں اس وقت چھوڑیں گے جب تم کہو گے کہ تم نے ہمیں معاف کر دیا۔"

"قسم اللہ کی جب تم نے کچھ کیا ہی نہیں... تو معافی کیسی۔ تم اور ہم سب یار بیلی ہیں۔ بھائی ہیں۔ آپس میں جھگڑا بھی تو ہوتا ہے ساتھ رہتے ہیں" وہ ہنسنے لگا۔

غالب بولا "نہیں۔ ایسے نہیں۔"

"تم کہو کہ معاف کیا" محسن نے کہا۔

محمد خان نے بڑی مشکل سے "اچھا معاف کیا" کہہ کے جان چھڑائی تو ایک اور دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی۔ حضرت یوسف ثانی ابھی تک دم بخود کھڑے تھے اور یہ طے کرنے سے قاصر تھے کہ اس صورت حال میں ان کی رد

www.paksociety.com

سے پیدا ہوئی تھی؟ انہیں کیا کرنا چاہئے۔ وہ آدمی ڈھیٹ تھا؟ لوگوں کی ہر زیادتی کو برداشت کرنے کا غیر معمولی حوصلہ رکھتا تھا کہ اس نے ابھی تک نازو کے جارحانہ رویے کے خلاف کسی قسم کا احتجاج نہیں کیا تھا۔ محمد خان نے غلط فہمی کو بھی عدم انکار کا مظاہرہ سمجھا تھا اور اگر اسے گل کا خیال نہ ہوتا تو شاید وہ ہمیں چھوڑ کر اپنی دنیا میں لوٹ جاتا۔ لیکن یوسف ثانی نے نازو کی لات کے جواب میں کوئی بات تک نہ کی تھی۔

خود نازو نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا اور اوپر اٹھا لیا۔ وہ ساڑھے چار فٹ کا آدمی خود کو نازو کی گرفت سے چھڑانے کے لئے ہوا میں ہاتھ چلا رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کی ٹوپی اتر گئی اور پھندنا سر سے پھسل کے فرش پر جا گرا۔ "مجھے معاف کر دو یوسف ثانی" نازو نے کہا۔

"اتنی بیا کرتی ہیں خاتون... ناحق ہو جائے گا اس غریب کا خون... خدارا لیجئے ہوش کے ناخن..." اس نے اپنی مخنقی آواز میں بلبلاتے ہوئے کہا "کیا آپ پر سوار ہے جنون؟"

نازو نے کہا "ایسے نہیں چھوڑوں گی۔ کہو کہ تم نے معاف کیا۔"

یوسف ثانی کا خفت اور گھبراہٹ سے برا حال تھا۔ ایک لڑکی نے اسے یوں اٹھا رکھا تھا جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہو "او... اف... اے ستم پیشہ دراز دست حسینہ... اب تو آنے لگا ہے موت کا پسینہ... آغوش محبوب میں جان سے گزر جائے یہ کمینہ... ورنہ ئے حسن میں غرق ہو اپنا سفینہ... اسی مقصد کے لئے تھا اپنا جینا... مگر..."

نازو نے گھبرا کے اسے چھوڑ دیا۔ اس کا رنگ لال پڑ گیا تھا۔ "بڑے ڈھیٹ ہو جی تم تو..."

میں نے قہقہہ مار کے غالب سے کہا "لے بھئی تیرا تو ایک رقیب پیدا ہو گیا۔ کیا حسن پرست آدم پایا ہے شہزادہ گلفام نے۔"

محسن نے کہا "اور کیا جاں نثار پرستار ملا ہے نازو کو۔ یہیں مرنے پر تیار تھا۔ واہ! آغوش محبوب میں جان سے گزر جائے یہ کمینہ۔ اسی مقصد کے لئے تھا اپنا جینا۔ کیا جذبات ہیں۔"

غالب نے آہ بھر کے نازو کی طرف دیکھا "اچھا بھئی تمہیں ہم سے بھی زیادہ چاہنے والا مل گیا تو استعفٰی مرا باحسرت و یاس۔"

نازو کا رنگ اور گلابی ہونے لگا۔ اب اس حالت پر رابعہ اور گل بھی ہنس رہی تھیں اور محمد خان مسکرا رہا تھا۔ صرف یوسف ثانی تھا جس کو احساس نہیں تھا کہ کون کس سے کیا کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے پھندنے اور ٹوپی کو سنبھال رہا تھا اور زیر لب ٹوپی سے نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔

غالب نے کہا "یار یوسف ثانی تمہاری تو ... آپ عشق سے دستبردار ہو سکتے ہیں ... انتخاب تینوں کو اچھی طرح دیکھ کر کرو۔ کہیں بعد میں دل کسی اور پر آ جائے۔"

میں نے کہا "ویسے تمہیں تینوں پسند ہوں تب بھی کوئی بات نہیں۔ ہم سب دوستی میں قربانی دے سکتے ہیں۔ تم تینوں کے عشق کا چارج لے سکتے ہو۔"

محسن نے کہا "اور شرع کی رو سے تمہارے لئے مزید ایک کی گنجائش باقی رہے گی۔ فی الحال یہ تین مبارک...."

یوسف ثانی نے پھندنے کو پھر ٹوپی کے نیچے یوں رکھ لیا جیسے محمد شاہ رنگیلا نے نادر شاہ کی دستبرد سے بچانے کے لئے کوہ نور ہیرے کو اپنی پگڑی میں چھپا لیا تھا۔ پھر اس نے کورنش بجا لا کے اپنے لال پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا "اب نا چیز کیسے کرے انتخاب، جہاں ایک سے ایک ہو لاجواب، ہر ذرہ ہو آفتاب" سب پہ آتا ہے یہ دل خانہ خراب، عشق میں کیا شریعت کا حساب... اور کیسا حجاب..."

یوسف ثانی کی بات پر سب کو اتنی ہنسی آئی کہ تھوڑی دیر پہلے کی ساری کشیدگی اور کلفت دور ہو گئی۔ ہم پرسکون ہو کے بیٹھے تو خواتین نے یوسف ثانی کے ساتھ کچن کا رخ کیا اور ذرا سی دیر میں گرم چائے آ گئی۔ ہم سب تازہ دم ہو گئے۔ میں نے بھی ہوتے اتار کے پاؤں پھیلائے اور دو سگریٹ سلگا لی جو محسن نے مجھے جلا کر دی تھی۔ ایک بار پھر ہمیں تحفظ کی آسودگی کا احساس ملا۔ ریلوے کی ایک بوگی پر مشتمل اس گھر کی فضا میں اجنبیت نہیں تھی اور کسی آسیب کا خوف نہیں تھا۔ گزری ہوئی رات کے واقعات کا تصور اب کسی وحشت ناک خواب کی طرح لگتا تھا۔ اس رات کے ختم ہونے تک ہم اپنی زندگی کے ایسے تجربات سے گزرے تھے جو ناقابل یقین بھی تھے اور حقیقی بھی۔ میں نے غالب اور محسن کو بتایا تھا کہ کس طرح ہماری ملاقات پہلے راجے بہادر دیدر شاہ سے اور ان کی بیوی کی بھٹکتی روح سے ہوئی تھی اور پھر ان کی بیٹی کے ایک چاہنے والے کی روح سے۔ ہم سب میں سے کوئی بھی جن بھوت اور ارواح کے مادی وجود کا قائل نہ تھا اور کسی کو زندگی میں ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا کہ وہ میری بات کو سچ کے تسلیم کر لیتا مگر وہ مجھے اور رابعہ کو جھوٹا بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ اب میرا واہمہ اور رابعہ کے تصور کا کرشمہ بھی قرار نہیں دے سکتے تھے کیونکہ جو کچھ بھی ہم نے دیکھا اور سنا تھا، اس کی تصدیق حالات اور واقعات سے ہوتی تھی۔ محمد خان نے بہت سی ایسی باتیں بتائیں جو اس نے دوسروں سے سنی تھیں، اس آسیب زدہ حویلی سے منسوب تھیں لیکن ہمیں خود بدری پر شہزادے نے بتائی تھیں۔

سب سے زیادہ سنسنی ایک پرانی تانیا اور تہ میں ملی ہوئی ... نے پیدا کی۔ یہ مادی شہادت تھی جسے وہم نہیں، تصور کی پیداوار نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ باری باری سب نے ... ریٹ کا اور چائی کا معائنہ کیا۔ خواتین وہم بخود بیٹھی رہیں۔ محسن نے کہا "بھائی اپنی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ عقل کی کوئی بات پلے کب پڑتی ہے تم کو" غالب نے کہا۔

"تم ہی کوئی عقل کی بات کر کے دکھو بیٹے" محسن نے فوراً جواب دیا "آج تب تو کچھ نہیں کہ میں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"تمہاری ناقص عقل اس حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کرتی کہ اس حویلی میں بھوت تھے" غالب نے کہا "خواتین مل چکی ہیں ان سے۔"

"میں نے آج تک کوئی بھوت نہیں دیکھا۔"

"تم نے تو بہت کچھ نہیں دیکھا جیسا ایٹم بم۔ مگر ایٹم بم ہوتا ہے۔" غالب نے میز پہ مکا مار کے دلیل دی۔

"میں نے ایٹم بم کی تصویر دیکھی ہے" محسن نے میز پہ مکا مار کے کہا۔ "تم مجھے بھوت کی تصویر دکھا دو، میں مان لوں گا۔"

"میں تمہیں آئینہ دکھا سکتا ہوں۔ تمہاری تصویر اس وقت نہیں ہے میرے پاس۔"

میں نے کہا "حضرات، ہمارا مسئلہ بھوت نہیں ہیں۔ جس کا دل چاہے اعتبار کرے، جو تجربہ کرنا چاہے وہ آج رات پھر اس حویلی میں جا کر دیکھ لے۔"

"میں ایسے کسی بھوت سے نہیں ڈرتا" محسن نے غالب کو گھورتے ہوئے اعلان کیا "جو سگریٹ اور تانیا پیش کر تا ہو۔"

"سگریٹ اور تانیا ٹھوس شہادت ہیں" غالب نے کہا۔ "مگر یہ کیسے ثابت ہو گا کہ یہ کسی بھوت کا تحفہ ہے؟"

"تو کیا سکندر اور رابعہ دوسری جنگ عظیم میں شرکت کرنے گئے تھے؟ یہ چیزیں ان کے پاس کہاں سے آ گئیں؟"

"یہ ان کو حویلی میں کہیں پڑی ہوئی ملی ہوں گی" محسن بولا۔

"بھوت ہم نے بھی دیکھا تھا" نازو نے کہا "کیوں گل؟"

"ہاں" گل نے کہا۔

"چلو تم دونوں بھوت کا حلیہ بتاؤ۔ الگ الگ۔"

"لاحول ولا قوۃ" میں نے دہاڑ کر کہا "آخر اب تک یہ بحث چلے گی بھوتوں پر؟ بھاڑ میں گئے بھوت۔"

"میں بھوتوں کی توہین برداشت نہیں کر سکتا" غالب نے کن انکھیوں سے نازو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیونکہ میرے سسر محترم خود ایک بھوت ہیں۔"

اب اندیشہ نقص امن پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ میں نے فوراً خواتین کو حکم دیا کہ وہ ناشتا بنائیں۔ محمد خان بستر پہ لیٹا تھا اور اب سو چکا تھا۔

نازو نے اٹھتے ہوئے کہا "پہلے میں غالب کا آملیٹ بناؤں گی۔"

غالب نے دفاعی پوزیشن لے لی "صحیح بات یہ ہو گا عزیزہ کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنے غالب کے لئے مرغی کے دو انڈوں کا آملیٹ بناؤں گی اور انتقام خود اسے کھلاؤں گی۔"

"یہ حضرت یوسف ثانی کہاں ہیں؟" محسن نے اچانک کہا۔

میں نے کہا "ہاں... میزبان کہاں گیا؟"

غالب نے کہا "طاقت مہماں نداشت... خانہ بہ مہماں گذاشت۔ مطلب یہ ہوا کہ مہمانوں کا بوجھ اٹھا نہیں سکتا تھا، گھر چھوڑ کر چلا گیا۔"

رابعہ نے کہا "وہ ناشتا لینے گیا ہے۔"

"اچھا تم لوگ اتنی دیر میں نہا دھو کے کپڑے وغیرہ بدل لو تاکہ ہماری باری آئے" محسن نے کہا۔

ریلوے ویگن کا دروازہ تھوڑا سا اوپر اٹھا ہوا تھا جس میں سے دن کا اجالا صاف نظر آ رہا تھا۔ صبح کی نرم دھوپ اب وہ پھیلی ہوئی تھی۔ ارد گرد رہنے والوں کو اطلاع مل گئی تھی کہ شہزادہ گلفام کے گھر مہمان آئے ہیں۔ کئی بار میں نے تجسس عورتوں اور بچوں کو بوگی کے اندر جھانکتا پایا۔ وہ چوری چھپے قریب آ کر سر کو تھوڑا سا اٹھا کے اندر کے نیم تاریک ماحول میں اجنبی چہروں کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے تھے اور جیسے ہی یہ احساس ہوتا کہ ہم میں سے کسی نے انہیں دیکھ لیا ہے وہ غائب ہو جاتے تھے۔ یوسف ثانی اپنے اس "لقب" میں شہزادہ گلفام کے نام سے مشہور تھا، یہ نام میں نے کئی بار سنا۔

آدھے کھلے ہوئے دروازے سے خاصی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اگر اسے پورا کھول دیا جاتا تو وہ فولادی دیواروں والا کمرا زیادہ روشن ہو جاتا مگر ہماری پرائیویسی کا احساس باقی نہ رہتا۔ دروازے کو پورا کھولنے میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں وہ نیچے نہ گر پڑے چنانچہ میں نے اور محسن نے اس کے خود کار نظام کو نہ چھیڑنے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ خواتین کی طرف سے مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ کچن اور باتھ روم میں اندھیرا ہے۔ نازو اور رابعہ کچن میں کسی ہوئی چائے بنانے کے کام میں مصروف تھیں مگر ان سے زیادہ وہ بھوتوں پر یقین کامل کا اظہار کر رہی تھیں اور ان کا موضوع سخن کبھی بھوت ہو جاتے تھے اور کبھی چڑیلیں۔ رابعہ کا خیال تھا کہ وہ بھی بھوت تھے۔ نازو نے اس خیال کی تائید کی کہ بھوت کسی بھی شکل میں آ سکتے ہیں۔

گل ابھی باتھ روم میں ہی تھی کہ کسی نے باہر سے ہانک لگائی۔ پھر دروازہ بجایا۔ اس سے دروازے کو روکنے والا لوہے کا پائپ نکل گیا۔ دروازہ پھر گرا اور اندر اندھیرا ہو گیا۔

میں نے دروازے کو اٹھا کے پھر پائپ کا سہارا فراہم کیا اور اس شخص کو دیکھا جو تنگ دھڑنگ اپنے کالے سیاہ چیکتے ہوئے جسم کو نہرا کے کمر پہ پانی سے بھری ہوئی مشک لئے کھڑا ہوا تھا۔ وہ عجیب دھوتی جو کمر سے گھٹنوں تک پہنچتی تھی پانی میں بھیگ چکی تھی۔ اس نے سلام کے انداز میں ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "وڈ قم" چنانچہ میں نے جواب میں وڈ قم کہنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ یہ سلام تھا، جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ اس کی باقی باتیں میرے سر پر سے گزر گئیں مگر میں نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ اس نے مشک پہلے اوپر رکھی۔ پھر خود اوپر آیا اور مشک اٹھا کے باتھ روم کی طرف مڑا۔ گل باہر آ چکی تھی اور ...

www.paksociety.com

ٹھہری ہوئی لگتی تھی۔ ہاشمی نے ٹکٹ کو تار کول کے ایک ڈرم میں خالی کیا جو باتھ روم کے کونے میں رکھا ہوا تھا اور پھر کچھ کہہ گیا۔

"کیا یہ پیسے مانگ رہا تھا؟" محسن سر کھجا کے بولا۔

"نہیں' کچھ اور بات تھی" میں نے کہا۔

ہاشمی نے پلٹ کے کہا "ہم بولا پانی اور نا نے کا ایک دم فری" اور چلا گیا۔ ہم دونوں شرمندہ ہوئے۔ ہاشمی نے ... کم الفاظ میں بھی اپنی مہمان نوازی کے جذبات کا اظہار کر دیا تھا۔ پانی یہاں مفت میں ملنے والی چیز نہیں تھی۔ دور دور سے ٹنکیوں سے صرف ہاشمی ہی واٹر سپلائی کا ذریعہ تھے لیکن ان کی خدمات صرف وہی حاصل کرتے تھے جو استطاعت رکھتے تھے۔ بیشتر لوگ اپنے بچوں کو یا عورتوں کو صبح شام پانی حاصل کرنے کے لئے ٹنکیوں پر قطاروں میں کھڑا رکھنے پر مجبور تھے۔ اس مقبے نے ہمیں بتا دیا کہ ہمیں پانی کی کمی نہیں ہوگی۔ مہمانوں کے لئے یہ سروس وہ مفت فراہم کرے گا۔

غسل کرتے ہوئے میں نے باتھ روم کی بناوٹ پر غور کیا۔ یوسف ثانی نے جو گوشہ نہانے کے لئے مختص کیا تھا اس کے فرش میں ایک سوراخ تھا جس کو دیگر مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا اور میں نے کیا۔ غالباً غسل کے دوران استعمال ہونے والا پانی پیچھے غلاظت کو جمع نہیں ہونے دیتا تھا اور بہا کے کہیں لے جاتا تھا۔ اگرچہ اس میں شاور یا نلکے نہیں تھے مگر یہ ہر لحاظ سے ایک مکمل اور صاف ستھرا باتھ روم تھا۔ اسے اٹیچ باتھ بھی قرار دیا جا سکتا تھا۔ پانی وافر تھا چنانچہ نہا کے مجھے بڑی فرحت محسوس ہوئی۔

میں باہر نکلا تو ایک بچی کو بڑی پھرتی کے ساتھ عمومی صفائی میں مصروف پایا لیکن وہ بچی نہیں تھی' چار فٹ کی دبلی پتلی عورت تھی جس نے ہندو اسٹائل میں سفید سوتی ساڑی باندھ رکھی تھی اور بندیا بھی لگا رکھی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا لیکن بال حیرت انگیز طور پر لمبے تھے۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں مگر اس نے کاجل اور سرمے کی لکیر سے انہیں قابل قبول بنا دیا تھا۔

رابعہ نے مجھے مسکراتے ہوئے بتایا "یہ ... نے کہا"

... ہوئے کہا ... کھانا ...

"... اور نام بابو" عورت نے پلٹ کے کہا "جو ... مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی "زلیخا' یوسف زلیخا" ارے واہ۔ زلیخا کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے نام میں ایسی کیا بات ہے جس پر ہم سب یوں دانت نکال کے ہی ہی کر رہے ہیں۔ اس نے جھاڑو لہرا کے متانت سے کہا "بات ہے بی بی؟" کا ہم تم کا الو لگت ہیں؟ سینگ نج توت ہیں ہمرے سر پے؟"

رابعہ نے کہا "تم یوسف کی کیا لگتی ہو؟"

"ہم کوئی یوسف کا ناہی جانت ہیں" اس نے غصے سے کہا۔

نازو نے کہا "شہزادو گلفام سے کیا تعلق ہے تمہارا؟" اس نے ایک آہ بھر کے کہا "ہم پیار کرت ہیں ... سے" اس دو ٹوک اظہار محبت اور اعتراف عشق نے ہم سب کو چونکا دیا۔ اس کے بعد مذاق کی کوئی بات نہ رہی۔ ہم سب اس کی صورت کو دیکھتے رہے جس پر حسرت و ملال کا سایہ پھیل گیا تھا۔

"تم... پیار کرتی ہو اس سے؟" رابعہ نے ...

"ہاں... کا تم کسی سنگ پریم ناہی کرت ہو؟" زلیخا نے ہماری صورتوں کو دیکھ کر کہا۔ ہمارے لئے یقیناً یہ ایک ... تیز اور ناقابل یقین سی بات تھی کہ کوئی اس کارٹون سے بھی محبت کر سکتا ہے جس کا نام بھی اس کے ساتھ تقدیر کا ایک مذاق لگتا تھا۔ وہ بدصورت تھا اور بداطوار تھا۔ ایک تماشا تھا اور عجوبہ تھا لیکن وہ انسان تھا۔ اگر کوئی عورت اس کے لئے دل میں چاہت کے جذبات رکھتی تھی اور اس عشق کی شہرت کا سرعام تسلیم کرتی تھی تو یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ لیلیٰ کو مجنوں کی نظر سے دیکھو... کیا مجنوں کو لیلیٰ کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے؟

نازو نے کہا "معاف کرنا زلیخا... ہم کو ہنسی تمہارے پیار پر نہیں آئی تھی۔"

"ہم کا پتا ہے..." وہ اداس ہو کے بولی "تم اس بے چارے کی شکل پہ ہنست ہو۔ شانہ کا جانے' اور کتنا خوب صورت ہے!"

رابعہ نے کہا "تمہاری باتوں سے ایسا لگتا ہے کہ... گنگا تمہارے پیار کی قدر نہیں کرتا۔"

نازو نے کہا "ہاں' ورنہ وہ تم سے شادی کر لیتا۔ تم سے اچھی بیوی اسے کہاں مل سکتی ہے۔"

زلیخا کی صورت پر اطمینان اور مسرت کے آثار نظر آنے لگے "آپ ٹھیک بولت ہو جی۔ ہم بھی ... اس ... کرت ہیں۔ اور تو تجربہ ہے' پتھر۔ روح کہت ہے' ہوئے گا' ... تیرے سنگ ہی کروں گا پر ابھی نہیں۔ ایک گھر بنا لوں پہلے۔ ... سو کہو ہماری ایک ناہی مانت ہے۔ یہ ہم بتا کو کا ضرورت ہے کا! ہم جھونپڑا میں بھی گھس جیں۔ تیرے لئے ... ہے۔ پر اوکہت ہے کہ اسے ریل کا ڈبہ سرکار کا ہے۔ جس روز کھیال آئی گو سرکار کی "ہم کا باہر نکال" ... پھینک جاویں گے۔ ہم بولے کہ دس سال ہو گیا' آج تک کوئی ناہی آیا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اسے دس سال ہو گئے یہاں رہتے ہوئے!"

زلیخا نے اقرار میں سر ہلایا "جیادا..."

رابعہ نے کہا "تم دس سال سے انتظار کر رہی ہو؟"

زلیخا کے جواب دینے سے پہلے ہی یوسف ثانی نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی زلیخا کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ایک دم سر جھکا کے ... میں لگ گئی۔ جیسے ہم سے اس نے کوئی بات ہی نہیں کی۔

یوسف ثانی نے صرف ایک بار اسے گھور کے دیکھا تھا اور اس پاگل عورت کی ہنسی گم ہو گئی تھی جو یوسف ثانی کے آنے سے پہلے چہک چہک کر بول رہی تھی۔ وہ یوسف ثانی سے ڈرتی تھی۔ شاید وہ آج بھی اس کا شوہر ہے جو گزشتہ دس سال سے اس کے لئے ایک آرزو کا خواب تھا۔ اور وہ اس امید پر یقین کے ساتھ زندہ تھی کہ ایک نہ ایک دن اسے اپنے خواب کی تعبیر بھی ملے گی۔ محمد خان نے مجھے بتایا تھا کہ یوسف ثانی بہت لالچی ہے۔ اب اس کے لالچ کی وجہ میرے سامنے آ گئی تھی۔ شاید وہ اسی گھر کے لئے پیسہ جمع کر رہا تھا جس میں وہ اپنی زلیخا کو شادی کے بعد لے جانا چاہتا تھا۔ بمبئی میں گھر بنانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایک جھونپڑی سے ایک کھولی' ایک کمرے کے فلیٹ اور مکان تک لاکھوں کی مسافت ہے۔ یوسف ثانی بڑی مستقل مزاجی سے یہ مسافت طے کر رہا تھا۔ اس عشق کے کتنے رنگ ہیں اور کیسے انوکھے روپ ہیں۔

یوسف ثانی نے ہانپتے ہوئے دو بھاری لفافے رابعہ کے سپرد کئے "بندہ لے آیا گیا تھا گرم گرم پوریاں' لیکن حلوائی ہو گئے مشہور ہیاں' غریب خانے سے ہیں اس کی دوریاں... اور پھر قطاروں کی مجبوریاں..."

میں نے کہا "تم نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ اتنی دور گئے۔ ظاہر ہے' صبح بہت رش ہوتا ہوگا۔"

"بندہ پرور' آپ بھی اٹھ جائیے" وہ محمد خان کے قریب جا کے بولا "غسل کیجئے' ناشتا فرمائیے۔"

غالب نے کہا "یار یہ خدا نے بھی کیا جوڑی ملائی ہے۔ ایک کی زبان دوسرا کیسے سمجھتا ہوگا؟ زلیخا اردو سے ناواقف... یوسف مجسم اردو شاعری! زبان یار من ترکی..."

میں نے کہا "دل کی بات کہنے کیلئے اور سمجھنے کے لئے کسی زبان کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"وہ تو ہے۔ مگر کیسے گزرے گی ان کی زندگی؟ یہ ایسے ہی ہر وقت نایہ بیانی کرتا رہے گا۔ زلیخا تو پاگل ہو جائے گی۔"

محسن نے کہا "بھائی! وہ آج بھی پاگل ہے اس کے پیچھے۔ اور یہ پاگل پن ان کے کام آئے گا۔ ان کی زندگی ویسی ہی گزرے گی' جیسی ہماری۔ ہم کیا پاگل نہیں ہیں؟"

صبح کے ساڑھے نو بج چکے تھے اور نہانے کے بعد میری بھوک شدت سے بیدار ہو گئی تھی۔ پوریوں کی خوشبو نے مزید حالت خراب کی۔ محمد خان بھی اپنی باری کے انتظار میں تھا۔ کیونکہ غالب اندر گھسا ہوا تھا۔ میں نے اور محسن نے ادب آداب کو بالائے طاق رکھا اور ناشتے پر ٹوٹ پڑے۔ رابعہ اور نازو نے مجبوراً ہمارا ساتھ دیا۔ نازو اس وقت شریک ہوئی جب غالب باتھ روم سے نکل کر تیر کی طرح آیا اور ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ نازو اس کے انتظار میں تھی۔ تاہم اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ نازو کو روٹھنے سے پہلے منا لیا۔ یوسف ثانی اور زلیخا ہمارے اصرار کے باوجود دست بستہ

کھڑے رہے اور میزبانی کے آداب نبھاتے رہے۔ انہوں نے محمد خان کے ساتھ ناشتا کیا۔

ناشتے سے فراغت پانے کے بعد میں نے محمد خان سے کہا۔ "آج کے دن تمہیں بہت سے کام کرنے ہیں جو ہم نہیں کر سکتے۔ میرا مطلب ہے' آسانی سے نہیں کر سکتے۔"

محمد خان نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا "قسم اللہ کی' تم حکم کرو' کیا چاہئے؟"

میں نے کہا "ہمیں ایک عام قسم کی گاڑی چاہئے جو کہیں بھی کھڑی ہو تو نمایاں نہ ہو۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ کوئی بھی سفید رنگ کی پرانی کار لے لو' سال دو سال چلی ہوئی۔"

"بس گاڑی بھروسے کے قابل ہو جو وقت پر دھوکا نہ دے۔" میں نے کہا "اس کا رنگ کالا ہونا چاہئے۔"

"کس کے نام پر ہو؟"

"کسی کے نام پر نہیں' اوپن لیٹر پر" میں نے کہا۔

"اور کیا چاہئے؟"

"اس کار کی ایک اصلی نمبر پلیٹ ہوگی... دو تین ایسے نمبر مل جائیں جن کا وجود ہی نہ ہو۔ ضرورت پڑنے پر نمبر پلیٹ بدلی جا سکے۔"

محمد خان نے کہا "میں سمجھا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "بہت سی گاڑیاں حادثات میں تباہ ہو جاتی ہیں لیکن ان کے نمبر منسوخ نہیں ہوتے۔ کچھ دوسرے صوبوں میں چلی جاتی ہیں جہاں انہیں نئے رجسٹریشن نمبر مل جاتے ہیں۔ ایسے ہی چند نمبروں کی پلیٹ بنوا لو۔ اسکریپ میں گاڑیاں خریدنے والے کباڑی تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ دو نمبر بھی لے لو' ایک دہلی کا یا مدراس کا۔ کسی بھی جگہ کا۔"

محمد خان نے سر ہلا دیا "آگے بولو۔"

میں نے کہا۔ "اس گاڑی کی ڈگی میں ایک اسپرے مشین ہو اور وہ پیلا رنگ جو ٹیکسی کا رنگ ہے' جب ضرورت محسوس ہو ہم اس کی چھت اور اوپر کا حصہ پیلا کر دیں اور وہ ٹیکسی نظر آنے لگے۔"

"مگر ٹیکسی کے نمبر دوسرے ہوتے ہیں۔ کمرشل۔"

میں نے کہا "جو نمبر پلیٹیں تم لاؤ گے' ان میں ایک کمرشل بھی شامل کر لو اور زرد رنگ کے علاوہ کالا رنگ بھی چاہئے۔ تاکہ دوسری بار ٹیکسی کو پھر کالا کیا جا سکے۔ اور پرائیویٹ گاڑی میں تبدیل کیا جا سکے۔"

محمد خان نے تعریفی انداز میں سر ہلایا "اچھا آئیڈیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو تھی ایک گاڑی کی بات۔"

محمد خان نے کہا "تو کیا دو گاڑیاں چاہئیں؟"

اب غالب اور محسن بھی ہمارے ساتھ شریک گفتگو ہو گئے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ تین گاڑیوں کی ضرورت ہوگی"

www.paksociety.com

ہوا۔"

میں نے اس کی تائید کی "ہاں دوسری گاڑی کوئی ٹیکسی ہو، اس میں بھی اسپرے گن ہو۔"

محسن نے کہا "بالکل چھوٹی سی ... جو کار کی چھتوں سے چلائی جاتی ہیں اور آسانی سے ہاتھ میں اٹھا کے استعمال کی جا سکتی ہیں۔"

غالب نے کہا "معلوم نہیں، یہاں سے مل سکتی ہیں!"

"قسم اللہ کی، یہ بمبئی ہے۔ یہاں سب کچھ مل جاتا ہے جو یورپ اور امریکا میں یا دنیا میں کہیں بھی ملتا ہو" محمد خان بولا۔ "بس پیسہ چاہئے۔"

میں نے کہا "پیسہ بہت ہے۔ اور اسی کام کے لئے ہے۔ ایک پورا سوٹ کیس بھرا ہوا ہم اسی لئے ساتھ اٹھائے پھر رہے تھے۔"

محمد خان نے کہا "تیری گاڑی کیسی ہو؟"

"ایک ٹرک لے لو۔ جیسے کہ عام مال کا ہوتا ہے۔ مال یہاں سے وہاں لے جانے والے۔ ٹرک سب ایک جیسے ہوتے ہیں سامنے سے۔ بس بونٹ اور مڈگارڈ کا رنگ مختلف ہوتا ہے اور یہ رنگ برش سے ہی بدلا جا سکتا ہے۔"

محسن نے کہا "ٹرک ہمیشہ کمپنی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ جو عموماً دونوں سائیڈوں پر لکھا ہوا نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو نے ٹھیک کہا۔"

محسن بولا "اس کو مٹانا بھی آسان نہیں ہوگا اور لکھنا بھی۔ یہ کام پینٹر کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے، جب ضرورت پڑے گی تو ہم راستے میں کسی پینٹر کی خدمات بھی حاصل کر لیں گے۔ ابھی تم کوئی بھی اچھا سا ٹرک لے آؤ۔ اصل بات یہ ہے خان صاحب کہ ہمارے سامنے ایک طویل سفر ہے۔ ہمیں دشمن کے پیچھے جانا ہے۔"

محمد خان نے حیران ہو کے کہا "کہاں جانا ہے؟"

میں نے کہا "یہ وقت آنے پر سب کو معلوم ہو جائے گا۔ تاہم سفر ایسا ہے کہ اس میں بہت سے خطرات کا سامنا ہوگا۔ سب سے بڑا خطرہ یہ ہوگا کہ کہیں دشمن ہمیں پہچان نہ لے۔ اس کو پتا نہیں چلنا چاہئے کہ ہم تعاقب میں ہیں۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم اپنا حلیہ بھی بار بار بدلتے رہیں اور اپنی گاڑی کا بھی۔"

"قسم اللہ کی، میں سمجھ گیا" محمد خان بولا "اب یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

"اس سفر میں ہم سب الگ بھی ہوں گے اور ساتھ بھی رہیں گے۔ کبھی ہم آپس میں گاڑیاں بدلیں گے۔ کار والے ٹرک میں چلے جائیں گے اور ٹرک ڈرائیور، کلینر آ جائیں گے کار میں۔ دوسرا طریقہ بھیس بدلنے کا ہے۔"

"اس کے لئے یوسف کافی ہے۔" محمد خان نے کہا۔

میں نے کہا "نہیں، ہم یہ رسک نہیں لے سکتے۔ وہ اپنی مضحکہ خیزی کے باعث ہر جگہ فوراً پہچان لیا جائے گا۔"

"تم نہیں جانتے، وہ کتنے کام کا آدمی ہے۔"

میں نے کہا "ہمارے یہ کام ذرا مختلف ہیں۔ نوعیت کے اعتبار سے ان کے لئے وہ قطعی ناموزوں ہے۔ اس کے علاوہ پورا مجنوں لے کر نہیں چل سکتے اپنے ساتھ۔ یوسف کے ساتھ زلیخا بھی جائے گی ورنہ وہ یوسف کو نہیں جانے دے گی۔"

"یوسف اسے بتائے بغیر جا سکتا ہے" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "مشکل ہے، تم آزما لو۔"

"اگر زلیخا بھی ساتھ جائے تو کیا حرج ہے؟"

میں نے جھنجلا کے کہا "یار ہم اپنی حفاظت کریں گے یا ان کی؟ ہم سب مرنا بھی جانتے ہیں اور مارنا بھی۔ وہ شاعری اور [illegible] آرائی کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ صرف زبان چلا سکتا ہے، ہاتھ نہیں۔ ہم سختی برداشت کر سکتے ہیں، تشدد جھیل جاتے ہیں۔ بونوں کی اس جوڑی سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔"

اچانک میں نے محسوس کیا کہ محسن کی صورت کا تاثر بہت عجیب ہو گیا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو مجھے یوسف کا مایوس اور دکھی چہرہ نظر آیا۔ بات کرتے وقت میں یہ بھول گیا کہ وہ بھی سن رہا ہوگا۔ زلیخا اس کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ میری زبان سے نکلنے والے الفاظ یقیناً دل آزار تھے مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے کوئی غلط بات نہیں کی تھی اور اب اس پر جھوٹی معذرت کا پردہ ڈالنے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ چنانچہ میں نے دل کڑا کے ان کی طرف سے نظر پھیر لی۔

"یہ سارے کام آج کر سکتے ہو تم محمد خان؟" میں نے کہا۔

محمد خان نے اقرار میں سر ہلایا "شام تک ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "ان کے لئے دو لاکھ کافی ہوں گے؟"

"بہت کافی ہوں گے" محمد خان نے کہا۔

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا جو گل اور نازو کے ساتھ ہمارے قریب بیٹھی خاموشی سے ساری باتیں سن رہی تھی۔ "خان صاحب کو دو لاکھ نقد دے دو۔ [illegible]"

رابعہ نے کہا "خان صاحب خود لے سکتے ہیں، وہ سامنے رکھا ہوا ہے بیگ۔"

"خان صاحب یہ کام تم خود کیسے کرو گے؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ شہر میں کیسے پھرو گے؟ پولیس کے علاوہ بھی تمہیں پہچاننے والے بہت ہیں" میں نے کہا "ہمارا ساتھ دینے کا نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ جو ہمارے دشمن تھے تمہارے بھی دشمن بن گئے ہیں۔"

محسن نے کہا "ہاں، میرا خیال ہے کہ اب تمہیں بھی ڈرنا چاہئے۔"

محمد خان تلخی سے مسکرایا "قسم اللہ کی، ابھی وہ وقت نہیں

آیا۔"

میں نے کہا "خوش فہمی کے جال سے نکلو تو خان صاحب۔ کل تریویدی تم سے اس لئے ڈرتا تھا کہ تم خونی خان تھے۔"

"اسے کیا معلوم کہ اب میں وہ پہلے والا محمد خان نہیں رہا اور اب میں تمہارے ساتھ ہوں؟"

"اسے یقیناً معلوم ہو گیا ہے، چنانچہ اس نے بھی دلاور سے اتحاد کر لیا ہے اور دلاور کی شہ پر ہی وہ شیر ہو گیا ہے۔ دلاور نے ہی اسے کہا ہوگا کہ ایسے کب تک ڈرتے رہو گے اور ایک ڈاکو کے ہاتھوں بلیک میل ہوتے رہو گے۔ چلو ہم دونوں مل کے اپنے اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ تم بتاؤ وہ کہاں ملے گا اور باقی کام مجھ پر چھوڑ دو۔"

محمد خان نے حیرانی سے کہا "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

میں نے کہا "گزشتہ رات تمہارے ٹھکانے پر حملہ کرنے والے آخر کون تھے اور وہاں کیسے آ پہنچے تھے؟ ان کی رہنمائی کرنے والا تریویدی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جیسے تم ہر جگہ ہر وقت اس پر نظر رکھتے تھے، ایسے ہی وہ تمہاری نگرانی کرتا ہوگا، تمہاری نقل و حرکت پر نظر رکھتا ہوگا۔"

"یہ ممکن ہے۔"

"تو پھر یہ بھی ممکن ہے خان صاحب کہ تمہارے اپنے وفاداروں میں کوئی تریویدی کا مخبر بھی تھا۔"

"میں اپنے ہر ساتھی کو جانتا ہوں۔"

"آدمی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ جب تک تم ان کے سردار تھے، وہ تم سے ڈرتے تھے، تمہارے خلاف ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن پھر تم نے انہیں مایوس کیا۔ تمہارے ارادوں کا علم ہوتے ہی انہیں احساس ہوا ہوگا کہ اب وہ بے سہارا ہو گئے ہیں۔ انہیں یہ ڈر پہلے سے ہوگا کہ شادی کرنے کے بعد شاید تم بدل جاؤ۔ پھر تم جیل چلے گئے اور جب رہا ہوئے تو ہمارے ساتھ واپس پہنچے۔ تم واقعی بدل گئے تھے۔ انہیں تم نے کچھ بھی کہا ہو، وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ سردار اب سرداری کے قابل نہیں رہا۔ خونی خان بزدل ہو گیا ہے۔ تمہارے کچھ بتانے سے پہلے ہی وہ اپنی وفاداریاں بدلنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور غالباً ان میں سے کسی ایک نے اپنی وفاداری کا سودا تمہارے اس دشمن سے کر لیا تھا جو اس کی سب سے زیادہ قیمت لگا سکتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو رات کے اندھیرے میں ہمارے اور تمہارے دشمن اس طرح حملہ نہ کر سکتے تھے۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو" محمد خان نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا "انہوں نے میری شادی کی مخالفت کی تھی دبے دبے انداز میں۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ گھر گرہستی کی زنجیر میں الجھ کے میں اپنے مقصد سے دور ہو جاؤں گا۔ اس وقت میں نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ پھر بھی کچھ لوگ چلے گئے تھے۔"

"کہاں چلے گئے تھے؟"

"بس وہ میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنا گروہ بنا لیا ہے۔"

"کیا تم لوگوں کے ضابطۂ اخلاق میں یہ بغاوت نہیں سمجھی جاتی؟"

"قسم اللہ کی! وہ میرے مقابلے پر آتے تو میں انہیں باغی کہتا۔ انہوں نے تو کہلوایا تھا کہ وہ بہت شرمندہ ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو مجھے مار دیتے اور انہی میں سے کوئی سردار بن جاتا مگر وہ مجھے استاد سمجھتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ رشتہ باقی ہے اور باقی رہے گا۔ وہ میرے علاقے سے دور رہیں گے۔ وہ میرے دوستوں کو اپنا دوست اور دشمنوں کو اپنا دشمن تصور کریں گے" محمد خان نے کہا۔

"اور کیا بعد میں ایسا ہی ہوا؟"

"ہاں، جب میں جیل کے اندر تھا تو گروہ تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ لیکن انہوں نے ایک دوسرے سے رابطہ قائم کیا اور ایک مقصد کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ قسم اللہ کی، انہوں نے جان کی بازی لگا دی اور مجھے نکال لائے۔ حق ادا کر دیا شاگردی کا۔ میں انہیں کیسے باغی کہوں؟ کیسے سمجھوں کہ ان میں سے کوئی غدار ہو گیا ہے؟"

میں نے کہا "بات یہ ہے خان! اگر جس مقصد کے لئے وہ اکٹھے ہوئے اور جان کی بازی لگائی، کیا وہ مقصد پورا ہوا؟ انہوں نے تمہاری عدم موجودگی میں محسوس کیا ہوگا کہ تمہارے بغیر وہ ایسے ہی ہیں جیسے خاندان کا سربراہ نہ ہو۔ انہیں رہنمائی اور قیادت کے لئے تمہاری ضرورت نے مجبور کیا تھا کہ وہ تمہیں چھڑا لائیں اور خونی خان کی دہشت پھر قائم ہو جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ شاید اسی مایوسی نے کسی کو اتنا بددل کیا کہ وہ باغی ہو گیا۔"

خان کے لئے اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا "اب تو بس چار وفادار ہی رہ گئے ہیں۔"

میں نے کہا "خود سوچو، ان میں سے کون ہو سکتا ہے جس سے ایسے شدید ردعمل کی امید کی جا سکتی تھی۔ کسی کو یقیناً بہت دکھ پہنچا تھا کہ تم نے ان کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ انہوں نے تو یہاں تک شادی بھی نہیں کی۔ خود کو خطرے میں ڈال کے اور اپنی جان پر کھیل کے تمہیں جیل سے نکالا مگر تم نے ان کے جذبے کی قدر نہیں کی۔ کسی کو تمہارے فیصلے سے سخت صدمہ پہنچا اور اس بات نے بہت مشتعل کیا کہ اس نے ایک ایسے شخص کی خاطر جان کی بازی لگائی جو اب سردار تو کیا ڈاکو کہلانے میں بھی شرم محسوس کرتا ہے۔"

محمد خان کو جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا "میں... میں سمجھ گیا... وہ کون ہو سکتا ہے... وہ آخری آدمی تھا جو میرے گروہ میں شامل ہوا تھا۔"

محسن نے مذاق میں کہا "کیا گروہ میں خالی جگہ کو پر کرنے

www.paksociety.com

کے لئے تم اخبار میں اشتہار دیتے تھے؟ یا کوئی مقابلے کا امتحان ہوا تھا؟"

محمد خان نے صرف ایک بار محسن کی طرف دیکھا اور اپنی بات جاری رکھی "اس کا بڑا بھائی میرا سب سے پرانا ساتھی تھا۔ وہی لایا تھا اسے... مگر مجھے رہائی دلانے کی کوشش میں وہ خود مارا گیا۔"

میں نے کہا "پھر تو شک کی بات ہی نہیں۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ چھوٹے بھائی نے تم سے انتقام لینے کی کوشش کی۔ اسے دوہرا صدمہ ہوگا۔ ایک بھائی کے مرنے کا' دوسرا اس بات کا کہ بھائی نے اپنی جان بے سبب گنوائی۔ ایک بزدل آدمی کے لئے۔"

"قسم اللہ کی' جو مجھے بزدل کہے..." خان بھڑک اٹھا۔

میں نے کہا "یہ اس کا خیال ہوگا جو غلط ہے۔ تم نے پہلے سے زیادہ بہادر ثابت کیا ہے خود کو۔ برائی کے راستے کو چھوڑ کر نیکی کی راہ اپنانا بہت مشکل ہے' بہت ہمت چاہئے اس کے لئے۔ اور ہمارا ساتھ دینا صرف اخلاقی جرأت کی بات نہیں۔ واقعی زیادہ بہادری ہے کیونکہ اس میں خطرات زیادہ ہیں۔ اب تم ڈاکو نہیں' ایک مجاہد ہو۔ ڈاکو تو جان دینے سے ڈرتا ہے' مجاہد خود آگے بڑھ کے موت کو گلے لگاتا ہے۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ تم نے جو فیصلہ کیا صحیح تھا۔"

"شاید اس نے بھی جو فیصلہ کیا صحیح تھا۔" محمد خان بولا۔ "اگر اس طرح میرا بڑا بھائی مارا جاتا.... تو قسم اللہ کی میں بھی غصے میں پاگل ہو جاتا۔ مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں۔"

"لیکن اب تمہیں اس سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ پھر کہیں وار نہ کرے۔"

محمد خان تلخی سے مسکرایا "ابھی وہ بچہ ہے...."

غالب نے کہا "خان صاحب! اب وہ دشمن ہے اور دشمن کو کمزور سمجھنے والا ہی مارا جاتا ہے۔ اسے ترویجی نے اپنی طاقت بنا لیا اور اسے احساس ہے کہ ترویجی کی حمایت حاصل ہو جانے کے بعد وہ اتنا طاقتور ہو گیا ہے کہ خونی خان سے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لے سکتا ہے۔"

میں نے کہا "اور اس میں کیا شک ہے کہ گزشتہ رات ہم سب مارے جاتے۔ اگر اتفاق سے یوسف ثانی نہ آجاتا۔"

خان مسکرایا "تم اتفاق سمجھتے ہو اسے؟ کمال ہے!"

میں نے کہا "تو... کیا...؟"

"قسم اللہ کی' اپنی صورت سے بے وقوف نظر آتے ہوں تو وہ اور بات ہے لیکن اپنی زندگی جھک مارنے میں نہیں گزری۔ آنے سے پہلے ہم جانے کا راستہ دیکھنے والے لوگ ہیں۔ کبھی بند گلی میں گھر نہیں آتے اور وہ گھر نہیں ہے جس کا دروازہ ایک ہو۔"

مجھے اس نے خفت میں مبتلا کر دیا "یعنی تمہیں سب معلوم تھا کہ یوسف ثانی تمہیں نکال لے جائے گا؟"

محسن نے کہا "تمہارے اور یوسف ثانی کے تعلق کی نوعیت ابھی تک واضح نہیں ہوئی۔ تم کہتے ہو کہ وہ جن ہے۔ پھر نہیں کہاں ہوگا؟"

غالب نے کہا "وہ جس چراغ کا جن ہے... وہ خان صاحب کے پاس ہے۔ چراغ کے رگڑتے ہی نمودار ہو جاتا ہے۔"

"قسم اللہ کی" خان صاحب نے کہا "وہ میرے لئے سب سے زیادہ بھروسے کا آدمی ہے۔ اس نے کبھی مجھے مایوس نہیں کیا۔ میں نے اسے کہا کہ یوسف! ہمارے یہ مہمان اس شہر میں اجنبی ہیں۔ ان کا خیال رکھنا۔ اور تم دیکھو کہ اس نے کیسے تمہارا خیال رکھا۔ ایک لمحے کے لئے تمہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ میں نے کہا یوسف! اب ایک نیا ٹھکانہ چاہئے۔ اور اس نے کہا کہ جو حکم آقا... اور جب ہم اس حویلی میں گئے تھے تو میں نے پوچھا تھا کہ یوسف کیسی جگہ ہے یہ؟ تو اس نے کہا تھا کہ یہ بھوتوں کا ڈیرا ہے۔ ادھر کوئی نہیں آئے گا اور آ گیا تو ہم خود بھوت بن کے غائب ہو جائیں گے۔ پھر اس نے مجھے وہ آخری دروازہ دکھایا تھا تو قسم اللہ کی میں اس کی دور اندیشی کا قائل ہو گیا تھا۔"

میں نے تائیدی نظروں سے یوسف ثانی کو دیکھا تو اس کا چہرہ فخر و مسرت سے چمک رہا تھا "دشمن واقعی حیران ہوں گے کہ ہم اچانک کیسے غائب ہو گئے۔ ہمیں زمین نگل گئی' یہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔"

محسن نے کہا "حیرت تو یہ ہے کہ پولیس بھی اس خفیہ راستے کا سراغ نہیں لگا سکی۔ کیا پولیس نے بھی مان لیا ہوگا کہ حویلی میں بھوت فائرنگ کر رہے تھے؟"

غالب نے کہا "وہ بھی تو اس زمین دوز راستے سے آگے تھے۔"

خان بولا "اول تو اس جھاڑ جھنکاڑ میں وہ مین ہول تلاش نہیں کر سکتے... اور دیکھ لیں' تب بھی یہاں نہیں پہنچ سکتے۔"

"کیوں نہیں پہنچ سکتے؟"

"وہ آدھے راستے سے پہلے ہی طے کر لیں گے کہ اس طرف کسی کا جانا مشکل ہے۔ پھر اس راستے سے کئی راستے نکلتے ہیں۔ یہ پرانے شہر کی لائن تھی جس سے ہم گزر آئے۔ اب کوئی گزر کے نہیں آ سکتا۔"

میں نے کہا "سراغ لگانے والے بہرحال پولیس کے لوگ ہیں۔ ان کو اتنا بے وقوف اور نااہل نہیں سمجھنا چاہئے۔"

"قسم اللہ کی" خان نے کہا "اب تو ہم بھی اس راستے سے واپس نہیں جا سکتے کیونکہ وہ راستہ بند ہو گیا ہے۔"

"بند ہو گیا ہے!" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ کہا۔

"ہاں۔ ایک جگہ نئی لائن تھی پرانی لائن کے اوپر سے گزر رہی تھی' تم نے نہیں دیکھا مگر یوسف ثانی نے اندھیرے میں تم سب کے پیچھے تھا چنانچہ تم نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ میں نے وہاں ایک چھوٹا سا ٹائم بم رکھ دیا تھا جو ایک گھنٹے بعد پھٹ گیا ہوگا۔ اس سے اوپر کی گٹر لائن ٹوٹ گئی ہوگی اور اوپر کا پانی نیچے بھر چکا ہوگا۔"

میں نے کہا "یہ تو کمال کر دیا تم نے! ٹائم بم تھا تمہارے پاس؟"

خان نے کہا "کیا تم نے میرا اسلحہ خانہ نہیں دیکھا تھا؟ ایسی چیزیں نہ ہوتیں تو میرے ساتھی مجھے جیل سے کیسے نکالتے؟"

محسن نے کہا "دھماکا دور دور سنا گیا ہوگا۔"

غالب نے کہا "پولیس کو رپورٹ بھی مل گئی ہوگی۔"

خان نے کہا "ہاں' مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ یہی سمجھے گی' دھماکا گٹر لائن ٹوٹنے سے ہوا... پرانی گٹر لائن میں گیس بھر گئی ہوگی۔ پھر یہ کون شک کر سکتا ہے کہ گٹر لائن کے نیچے کسی نے ٹائم بم رکھا تھا؟"

رابعہ نے مجھ سے کہا "چلو یہ اچھا ہوا' ان موذی چوہوں کا بھی خاتمہ ہوا۔ ڈوب مرے ہوں گے سب کمینے۔"

ہم سب ہنس پڑے کیونکہ خواتین اب تک خاموش بیٹھی تھیں۔

غالب نے کہا "خان صاحب! برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟"

خان نے کہا "قسم اللہ کی! جو برا مانے وہ یار کیسا؟"

اس کی بات پر مجھے استاد لیڈی یاد آ گیا۔ وہ بھی بات بات پر کہتا تھا "قسم مولا علی کی..." وہ یاروں کا یار تھا۔ ایسا پیارا' مخلص دوست تھا کہ ہم سب اس کی ہنسی کا مذاق اڑاتے رہ گئے۔ وہ منصب شہادت پر آگے بڑھ کے فائز ہو گیا۔

غالب نے کہا "ٹائم بم میں ایک گھنٹے کی مہلت دینے کی مصلحت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا دس منٹ کافی نہیں تھے؟ پولیس اگر ہمارے پیچھے آ جاتی۔ یا دشمن بھی وہی راستہ اختیار کر لیتے تو انہیں آدھا گھنٹا بھی بہت تھا۔"

خان نے نفی میں سر ہلایا "دس منٹ میں کوئی کیسے آ سکتا تھا۔ انہوں نے پہلے تو آس پاس کے سارے علاقے کو چھان مارا ہوگا۔ قسم اللہ کی' یہ تو ان کی کھوپڑی میں آ ہی نہیں سکتا کہ فرار ہونے والے زمین میں گھس گئے جیسے سانپ اپنے بل میں غائب ہو جاتا ہے۔ انہوں نے تو آس پاس کے لوگوں سے پوچھا ہوگا اور ارد گرد کی گلیوں اور سڑکوں پر دیکھا ہوگا کہ آخر وہ کس طرف بھاگے ہیں۔ اگر بات صرف فائرنگ کی ہوتی تو پولیس کہتی کہ دو گروہ لڑ رہے تھے جو پولیس کے آتے ہی فرار ہو گئے۔ شاید لوگوں کی یہ بات بھی سن لیتے کہ اس بھوتوں کے ڈیرے سے تو عجیب و غریب آوازیں سنائی دیتی رہتی ہیں۔ بھوت ہی آپس میں لڑ رہے ہوں گے۔ انسان ہوتے تو نظر آ جاتے لیکن یہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ پولیس کو وہاں سے لاشیں بھی ملی ہوں گی۔"

"کتنی لاشیں ملی ہوں گی؟"

"قسم اللہ کی' میں نے بھی گنتی نہیں کیں" محمد خان بولا۔

"چار تو ضرور مارے گئے ہوں گے" غالب نے کہا۔

"میرا خیال ہے' زیادہ" نازو نے لقمہ دیا۔

"بی بی! کتنے زیادہ؟ ساڑھے چار' پونے پانچ؟"

"چھ سات' کم سے کم" نازو نے غالب کی بات کا برا مانے بغیر کہا۔

میں نے کہا "کیا ان میں پیڈرو بھی شامل ہے؟"

نازو نے کہا "یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں۔"

محسن نے کہا "میرا اندازہ ہے کہ وہ خبیث بچ کے نکل گیا۔"

غالب نے اس کی تائید کی "انہوں نے ایک بھرپور حملہ کیا تھا جو خلاف توقع مزاحمت کے باعث ناکام ہو گیا ورنہ وہ چند منٹ میں سب کو ٹھکانے لگا کے نکل جاتے۔ زیادہ دیر رکنا ان کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ انہیں معلوم ہوگا کہ پولیس آ جائے گی۔ فائرنگ کی آوازیں سن کر آس پاس رہنے والے پولیس کو فون کر دیں گے۔ اسے ان کی بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم مقابلے کے لئے تیار تھے اور ہمیں بے خبری میں شکار کرنے والے خود اپنی بے خبری میں مارے گئے۔ وہ اس نقصان سے بوکھلا گئے اور بدحواسی میں بھاگ کھڑے ہوئے۔"

محسن نے کہا "انہیں اپنے ساتھیوں کی لاشیں تک اٹھا کر لے جانے کا موقع نہیں ملا۔"

محمد خان نے کہا "سب معلوم ہو جاتا ہے قسم اللہ کی۔ مگر پولیس جن کا دیا کھاتی ہے' انہیں بچاتی ہے۔ وردی وہ سرکار کی دی ہوئی پہنتے ہیں اور سرکاری خزانے سے تنخواہ بھی لیتے ہیں مگر عیش تو ترویجی جیسے لوگ ہی کراتے ہیں۔ پولیس ان پر حرف نہیں آنے دے گی۔"

"ترویجی اور داور کی طرف سے ابھی تو پولیس پر دباؤ پڑے گا کہ جیسے بھی ہو' انہیں پکڑ کے لاؤ جو ہمارے ساتھیوں کو مار کے نکل گئے۔ آخر وہ کہاں جا سکتے ہیں ایسے۔ ہوں گے وہیں کہیں۔ ریڈیس لوور پیالک کی طرف سے بھی پولیس کو اس کی نااہلی پر لعن طعن کی جائے گی تو وہ مجبور ہو جائیں گے کہ وہ جیسے بھی ہو' ہمارا سراغ لگائیں۔"

محمد خان نے کہا "رات کے اندھیرے میں تو ان کے باپ کو بھی وہ جگہ نظر نہیں آ سکتی۔"

میں نے کہا "دن کے اجالے میں تو وہ دیکھ ہی لیں گے کہ ہم کس راستے سے فرار ہوئے تھے۔"

غالب نے کہا "اگر وہ چاہیں تو کتوں سے مدد لے سکتے ہیں۔ کتے اس جگہ کی نشاندہی کر دیں گے جہاں سے ہم زمین میں اترے تھے۔"

محمد خان نے مونچھوں پر تاؤ دیا "ہاں ہاں... وہ جیسے چاہیں پتا لگائیں مگر اس سے فائدہ کیا ہوگا؟ وہ نیچے اتریں گے اور آگے آئیں گے تو انہیں گٹر لائن میں پانی بھرا ہوا ملے گا۔ جتنا آگے جائیں گے' پانی زیادہ ہوگا۔ انہیں خود ہی یقین آ جائے گا کہ ادھر سے کسی کے لئے فرار کا راستہ ہی نہیں ہے۔ یہ تو ناممکن ہی

www.paksociety.com

بات ہے کہ کوئی گنز کے پانی میں سے تیر کر گزر جائے۔ وہ بھی عورتوں کے ساتھ۔"

محسن بولا "انھیں کیا معلوم کہ ہمارے ساتھ عورتیں بھی ہیں۔"

میں نے کہا "انھیں سب معلوم ہوگا۔ نہیں معلوم ہوگا تو بتا دیا جائے گا۔"

اس مسئلے پر مزید بحث کرنا لاحاصل تھا۔ اصل اور اہم بات یہ تھی کہ خدا نے انہیں بچا لیا تھا اور ہم پر اس کا شکر ادا کرنا لازم تھا۔ وہ انسان کی نیت اور اس کے ارادوں کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور وسائل و اسباب فراہم کرتا ہے۔ اس نے ہمیں ڈاکو محمد خان کی زندگی کے اطوار بدل کے اسے صراط مستقیم پر لانے کا وسیلہ بنایا۔ ڈاکو محمد خان کو ہمارے تحفظ و رہنمائی پر مامور کیا اور یوسف ثانی جیسے کارٹونسٹ کی عقل و ذہانت کو اس کا سبب بنایا۔

یہ رات اتنی ہنگامہ خیز تھی کہ جب پلازہ فرنیچ اپنے ساتھ سکون کا پیغام لائی تو شب بھر بتا کی ذہنی تشویش والے تھکن کی بے کلی کا شکار ہو گئے تھے۔ اور جیسے جیسے زندگی پر یقین کے ساتھ اعتماد بحال ہو رہا تھا، میرا ذہن حال اور مستقبل کے مسئلوں کی طرف متوجہ ہو رہا تھا۔ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ وقت گزر رہا ہے اور ہم سب باتوں کے سوا کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں۔ میرے تصور میں پھر شملا کی اور اس کے بچے کی تصویر ابھر آئی تھی۔ وہ تہہ خانے کے ایک تابوت میں لیٹے منتظر تھے کہ ہم انہیں جفا شعار اجنبی دشمنوں کی اسیری سے نکال کے پھر اپنی چاہتوں کے مضبوط حصار میں لے آئیں اور انہیں محبت کی روشنی دے کر موت کے اندھیرے سے واپس زندگی کی طرف آنے والا راستہ دکھائیں کیونکہ وہ خود اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے اور ان کی بے بسی میں ہمارے لئے ایک چیلنج تھا کہ ہم ان کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ وقت کم تھا اور ابھی تک ہم نے کوئی لائحہ عمل مرتب کرنے پر اتفاق نہیں کیا تھا۔

اچانک یہ مسئلہ اپنی پوری سنگینی کے ساتھ ابھر آیا۔

میں نے کہا "خان صاحب! تم کو اب کس کا انتظار ہے؟"

میرے لہجے نے خان کو تھوڑا سا حیران کیا۔ "کچھ نہیں .... بس میں جا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "تم اپنے ساتھ محسن کو بھی لے جاؤ۔"

خان سے پہلے گل نے کہا "میں بھی ..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "کیوں؟ یہ لوگ گھومنے پھرنے تو نہیں جا رہے ہیں۔ پکنک منانے کی سوجھ رہی ہے تمہیں۔"

گل کا چہرہ اتر گیا۔ اسے مجھ سے ایسے سخت اعتراض کی توقع نہیں تھی۔ مجھے رابعہ اور نازو کی صورت پر بھی ناگواری کے آثار نظر آئے۔ محسن کو میں اس لئے خان کے ساتھ بھیج رہا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں ہم شملا کے مسئلے پر کھل کے بات کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ کسی بھی جاننے والے کو کسی کام کے لئے بھیجنا خلاف احتیاط تھا۔ ایک ... محمد خان کا بہترین ساتھی محسن ہی ثابت ہو سکتا تھا۔ ... کام خان کے سپرد کئے تھے ان میں محسن کے ساتھ رہ کر اسے بھی مدد ملتی۔ محسن اور وہ ایک دوسرے کی حفاظت بھی کر سکتے تھے۔ اب مجھے خیال آیا کہ مسئلہ گل کے جذبات کا نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ وہ محسن پر بار ہوگی۔ ابھی تک ہم نے گل کو بھی شملا کے وجود سے بے خبر رکھا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ رہی تو آج ہی اسے سب کچھ بتانا پڑے گا۔ اس کے بعد کیا ... یہ سوچ کر ہی مجھ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔

میں نے کہا "گل بانو! ہم نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ تم جا سکتی ہو۔" مگر گل کا موڈ آف ہو چکا تھا۔

اس نے کہا "میں نہیں جا رہی ..."

رابعہ نے مجھے غصے سے دیکھا "پہلے اسے اتنی سختی سے ڈانٹ دیا ..."

میں نے کہا "حد ہو گئی۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

نازو نے کہا "بہتر ہو اگر آپ ہر بات پہلے فرما دیا کریں کیونکہ ہم سب مذاق کو نہیں سمجھتے۔"

ظاہر ہے نازو بھی مجھے اتنا ہی سمجھتی تھی جتنا رابعہ یا محسن سمجھتے تھے۔ لیکن گل نے مان لیا کہ میں واقعی مذاق کر رہا تھا۔ اجازت ملتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ محسن نے میرے دوسرے فیصلے کو پسند نہیں کیا۔ اس نے احتجاج نہیں کیا۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ اتنی جلد میرے فیصلے کی تبدیلی کا کوئی سبب ضرور ہے جو میں بتانا نہیں چاہتا۔

ایک بار پھر یوسف ثانی کا کمال صورت گری کام آیا۔ اس نے بہت کم وقت میں محسن اور گل کو اس حد تک بدل دیا کہ انہیں پہچاننا ممکن نہ رہا۔ جب وہ اپنے کام میں مصروف تھا، محمد خان نے مجھے ایک کاغذ پر نقشہ بنا کے اس گودام تک کا راستہ بتایا جہاں میرے اندازے کے مطابق ولاور کا مال ... کیا جاتا تھا۔ میں نے اس نقشے کو بھی سامنے رکھا جو ہم نے ... سے خریدا تھا اور جس میں بستی کی چھوٹی بڑی تمام سڑکیں اور تمام نمایاں مقامات دکھائے گئے تھے۔ محمد خان نے اپنے ذہن میں ہر موڑ اور وہاں کی کسی خاص جگہ کا حوالہ دیا تھا۔ ... اسے ذہن نشین کر لیا اور کاغذ پھاڑ دیا۔

ابھی مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ جو منصوبہ بندی میں کر رہا ہوں وہ کس حد تک موثر ثابت ہوگی اور ہمارے کام آئے گی یا نہیں۔ یہ ہو سکتا تھا کہ عین وقت پر ولاور اینڈ کمپنی کا پلان بدل جائے۔ تاہم جو کچھ مجھے آج معلوم تھا میں اسی کو بنیاد بنا کے اپنی حکمت عملی وضع کر رہا تھا۔ وہ ... ہم ایک بوجھ کی طرح اٹھائے پھر رہے تھے اور کہاں کام آتا۔ جب سوتے بھی

کے رابعہ نے دو لاکھ روپے خان کو دیئے تو اسے بھی احساس تھا کہ یہ کاغذ کے ٹکڑے ہیں اور کچھ نہیں۔ ان سے سکون، آرام، تحفظ اور سلامتی ... سکھ چین اور خوشی نہیں خریدے جا سکتے تھے۔

اس نے نوٹوں کی گڈیاں سمیٹتے ہوئے کہا "بھئی خان صاحب! آپ گن سکتے ہیں تو گن لیں۔ میرے بس کی بات نہیں۔"

میں نے کہا "اندازے سے ہاتھوں کے دے دو۔ وہ گن کر تمہیں کون سا حساب سے خرچ کرتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "خدا کا شکر ہے۔ ایک چوتھائی بوجھ تو کم ہوا۔ جان کے ساتھ اسے بھی بچا بچا کے رکھنا پڑتا ہے۔"

خان نے سارے نوٹ کپڑے کی ایک تھیلی میں ڈال لئے "واپسی میں دیر ہو جائے تو گھبرانا نہیں۔" محسن بولا۔

میں نے کہا "خان تمہارے ساتھ نہ ہوتا تو میں ضرور پریشان ہوتا کیونکہ گل بھی تمہارے ساتھ ہے۔"

"میں راستہ نہیں بھول سکتا" محسن نے کہا۔

"خان ساتھ نہ ہوتا تو تم پوری کوشش کرتے" غالب نے کہا۔ "اب تو واپس آنا ہی پڑے گا۔"

رابعہ نے کہا "لالہ، بچوں پر نظر رکھنا۔"

گل نے ہنستے ہنستے کہا "یہ لالہ تو ہندو بولتے ہیں۔"

محمد خان نے نفی میں سر ہلایا "ہمارے پشاور میں بڑے بھائی کے لئے استعمال ہوتا ہے یہ لفظ۔"

"اچھا۔ تو پھر آج سے تم سب کے لالہ ... لالہ جی" میں نے کہا۔ اور محمد خان کا چہرہ کھل اٹھا۔

"اچھا لالے دی جان ... وا خدائے پہ امان ..."

میں نے کہا "خدائے پہ امان ... پہ ما خارے خا ..."

میری پشتو دانی نے گل کو حیران کیا اور محمد خان کو بہت خوشی۔ باقی سب لوگ جانتے تھے کہ میری علمیت چند ہی جملوں تک محدود ہے۔

اب صبح کے گیارہ بجنے والے تھے۔ یوسف ثانی رات بھر کا جاگا ہوا تھا چنانچہ دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھا تھا تو بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا تھا اور وہیں لڑھک کر گٹھری بنا پڑا ہوا تھا۔ اس کی زلیخا نے جملہ امور خانہ داری سنبھال لئے تھے اور صفائی میں مصروف تھی۔ جب رابعہ نے سوٹ کیس کھول کے نوٹوں کے بنڈل نکالے تھے تو میں نے ان دونوں کا رد عمل چوری چھپے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ کوئی اور ہوتا جس نے اپنی زندگی تنگ دستی میں بسر کی ہوتی تو اتنی دولت دیکھ کے اس کی آنکھیں پھٹی رہ جاتیں اور سانس رک جاتا لیکن ان دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ان کی خواہشات کا افق بہت وسیع تھا۔ تمام انسانوں کی طرح خالق پروردگار سے بہت آگے تک پھیلا ہوا۔ لیکن ان کے جذبات بے لگام نہیں تھے۔ ان کے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ وہ ناجائز طریقے سے دوسروں کی دولت چھین کر امیر ہو جائیں چنانچہ ہماری دولت کی طرف انہوں نے نگاہ بھر کے بھی نہیں ڈالی تھی۔

جب میرے ساتھ رابعہ، غالب اور نازو رہ گئے تو نہ جانے کیوں مجھے بے بنیاد اندیشے پریشان کرنے لگے۔ میں نے سوچا کہ اگر اس شہر بے کنار کے اجنبی راستوں پر گل، محسن اور خان کے پیچھے شکاری لگ گئے تو کیا ہوگا؟ خان ان سے نمٹ گیا تو کیا ہوگا؟ ولاور اینڈ کمپنی کے سب شکاری کتے بھی انہی سڑکوں پر پھر رہے ہوں گے۔ تریولی کے چیلے بھی ہوں گے۔ پولیس بھی ہوگی۔ ان سب کو خونی خان کی اور ہماری تلاش ہوگی اور کیا ان سب کی نظروں کو دھوکا دینا آسان ہوگا؟ یا ان کی واپسی سے پہلے شکاری یہاں آ پہنچے تو کیا ہوگا؟

غالب نے کہا "کس سوچ میں پڑ گیا ہے بھائی؟"

میں نے چونک کر کہا "کچھ نہیں .... یہ کیا ہے؟"

"یہ وہی نوٹ بک ہے" غالب نے کہا "میں نے کچھ اور عبارت حل کی ہے۔"

"کوڈ تو ہم نے سمجھ لیا ہے لیکن اب اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی" میں نے کہا "وہ اپنا کوڈ بدل دیں گے۔ انھیں معلوم ہے کہ یہ ڈائری گم ہو چکی ہے۔"

"ہاں مگر انہیں یہ تو نہیں معلوم کہ ڈائری ہمارے پاس ہے۔"

"یہ بھی وہ نہیں معلوم ہے" میں نے کہا۔

"خیر کوڈ بدلنے سے حقائق تو نہیں بدلتے۔ جو بات ہمیں معلوم ہو چکی ہے ..."

"ابھی تک ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی جس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہوں" میں نے کہا "ستائیسواں میل ... گولڈن فالکن ... بلیک آر ملوترہ ... یہ سب کیا ہے؟"

"فرض کرو بمبئی سے ستائیس میل دور کوئی جگہ ہے۔ ہوٹل یا ریسٹورنٹ یا بار ... گولڈن فالکن ... جس کا مالک کوئی بلیک آر ملوترہ ہے" غالب نے کہا۔

"فرض کر لیا ... اب یہ فرمایئے کہ ستائیس میل مشرق میں یا مغرب میں؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "میرا خیال ہے کہ یہ ان کا روٹ ہے۔ مخصوص راستہ جس پر وہ سفر کرتے ہیں۔"

پہلے مجھے یہ بات مضحکہ خیز لگی تھی لیکن پھر مجھے اس کے مفہوم میں امکانات کا روشن پہلو نظر آنے لگا۔

رابعہ نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہے ہو دونوں مجھے؟"

غالب ہنسنے لگا "کوئی بہت باریک نکتہ پیدا کیا ہے آپ نے وکیل صاحب .... جو میری موٹی عقل میں نہیں آیا۔"

میں نے کہا "وکیل صاحب نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ ان کا ایک مخصوص راستہ ہوگا۔ نقشہ نکال۔"

www.paksociety.com

غالب نے نقشہ پھیلا دیا "اس میں تو راستے ہی راستے ہیں سر۔"

میں نے کہا "غور سے دیکھو۔ شہر سے باہر جانے والے راستوں پر واضح نشاندہی کی گئی ہے کہ کون سی سڑک کس شہر کی طرف جاتی ہے۔ اب ہمیں انڈیا کا نقشہ دیکھنا ہوگا۔"

غالب نے کہا "انڈیا کا روڈ میپ ادھر ہے" اس نے نقشے کو پلٹ کر پھیلا دیا۔

میں نے اس پر جھک کر غور کیا اور ایک انگلی سے راستہ ٹریس کر کے کہا "اگر آپ کو مشرقی پاکستان یا کلکتہ جانا ہو تو آپ کی سمت کیا ہوگی' یہ صاف ظاہر ہے" میں نے کہا "آپ براستہ جالندھر امرتسر یا دہلی احمد آباد نہیں جاسکتے۔ شمال یا جنوب کی طرف جانے کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ راستہ ہوگا شمال مشرق کی طرف۔ غور فرمائیے۔ کلکتہ جانے کے دو راستے ہوسکتے ہیں۔"

اب غالب بھی نقشے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوگیا "ایک تو یہ سڑک ہے" اس نے نقشے پر انگلی رکھ کے کہا "ناگپور... وہاں سے رائے پور' بہاس پور اور کلکتہ۔"

میں نے کہا "یہ سب سے مختصر راستہ ہے۔"

غالب نے کہا "یہ دوسری سڑک بھی ہے۔"

میں نے کہا "مگر یہ چھوٹی سڑک ہے۔ ہائی وے نہیں ہے اور ٹرک عموماً ہائی وے پر چلتے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ ہمیں دھوکا دینے کے لئے لمبا راستہ اختیار کریں۔ شاہراہ پر تقریباً ساڑھے تین چار سو کلو میٹر کے بعد ایک بڑی سڑک اندور کی طرف نکل جاتی ہے۔ وہ جبل پور' الہ آباد' بنارس اور پٹنہ کے راستے بھی کلکتہ پہنچ سکتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس طرح انہیں چار پانچ سو کلو میٹر کا فاصلہ زیادہ طے کرنا پڑے گا لیکن حفاظت کے خیال سے وہ گھوم کر جانا پسند کریں تو یہ بعید از امکان نہیں ہے۔"

غالب نے کافی دیر غور کرنے کے بعد کہا "مقصد ہمیں دھوکا دینا ہو تو وہ لمبے سے لمبا راستہ اختیار کرسکتے ہیں لیکن ان کی جگہ میں ہوتا تو خلیج بنگال کے ساتھ ساتھ سفر کرتا۔ پونا سے مدراس۔ پھر ... پور' ... اور کلکتہ۔ یہ راستہ شاید اس سے بھی لمبا ضرور ہے مگر ان کے نقطۂ نظر سے محفوظ ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ وقت کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں بھی طویل اور محفوظ راستے کو ترجیح دیتا۔ مگر ہماری وجہ سے ان کے پلان کی تکمیل میں رخنہ پڑ گیا ہے۔ ان کا ایک بحری جہاز اسلحے سمیت غرق ہوگیا۔ اس کے بعد اگر کوئی جہاز آیا ہے تو اس کا مال بھی ... میں رکا ہوا ہے۔ وہ بھی ہماری وجہ سے۔ انہیں یہ ... لاحق تھا کہ ہم راستے میں گڑبڑ کریں گے۔ اب انہیں اس ... ہے"

رابعہ نے کہا "انہوں نے ایک ضمانت ... شملا اور اس کے بیٹے کی صورت میں۔ وہ وقت ... کریں گے۔"

نازو نے اداسی سے کہا "اس صورت میں ہم کیا کرسکتے ہیں؟"

رابعہ نے کہا "ہمیں کچھ کرنا بھی نہیں چاہئے۔ اگر اسلحہ کی ایک کھیپ نکل جائے اور شملا کی جان بچ جائے تو اچھا ہے"

میں نے ان دونوں کی صورت کو غور سے دیکھ کر کہا "اس معاملے میں میرے جذبات بھی وہی ہیں جو آپ دونوں کے ہیں۔ میں کب چاہتا ہوں کہ ہماری غلطی کی سزا محسن کو یتیمی یا ماں سے محرومی کی صورت میں ملے۔"

نازو نے کہا "شملا نے تمہارے جدائی کے صدمے جھیلے تھے۔ اس کی آزمائش بہت بڑی تھی۔"

رابعہ نے کہا "اس نے اپنے شوہر کو اور اپنے بچے کے باپ کو ہمارے حوالے کرتے ہوئے کسی جذباتی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس کا صلہ کیا ملا ہے؟"

نازو نے کہا "کچھ نہیں۔ آج وہ زندگی اور موت کے صراط پر بھی تنہا ہے۔ اس کا مستقبل دوستوں اور دشمنوں کی کامیابی یا ناکامی سے مشروط ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو' ابھی شملا زندہ ہے۔ اور وہ زندہ رہے گی۔"

"اگر ہم بھی اسے بچانے کی کوشش نہیں کریں گے تو اسے مرنا ہی پڑے گا" رابعہ نے تلخی سے کہا۔

میں نے کہا "میں کب چاہتا ہوں کہ مجھ پر اپنے ایک دوست کا قاتل کہلانے کا الزام آئے جس سے زیادہ مجھے کوئی عزیز نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ شملا مرگئی تو محسن بھی نہیں رہے گا۔ جو کچھ میں کر رہا ہوں' شملا کو بچانے کے لئے ہی کر رہا ہوں۔ اور آخر کیا کروں میں؟"

رابعہ نے کہا "تم دلاور کو یقین دلادو کہ ہم کچھ نہیں کریں گے۔"

"بشرط کہ وہ شملا کو ہمارے حوالے کردے" نازو نے
میں نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے' اس شرط پر وہ راضی ہوجائے گا؟ اور کہے گا کہ ٹھیک ہے... لے جاؤ شملا کو۔ کیا اعتبار کرے گا ہمارے وعدے پر یا اعتبار کیا جاسکتا ہے' اس میں؟"

غالب نے کہا "دلاور جیسے لوگ نہ اعتبار کرسکتے ہیں نہ ان پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ فرض کرو ہم اس سے آج ایک معاہدہ کرلیتے ہیں کہ ہم تمہاری راہ میں حائل نہیں ہوں گے اس بار۔ تو وہ کہے گا کہ اپنے سکندر صاحب سے کہیں کہ مشرقی پاکستان میں فلاں جگہ آ کے شملا کو اپنے ساتھ لے جائیں جب اسلحہ وہاں تک پہنچ جائے۔"

"اور اس کے بعد کیا ہوگا... یہ میں بتاتا ہوں۔ ... کھیپ ہماری مداخلت کے بغیر مشرقی پاکستان پہنچ جائے گی ... ضمانت کے ساتھ دو ایک اور کھیپ لے جانے کی بات ...

اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا اگر ہم نے کمزوری دکھائی۔ ہر بار شملا اور اس کا بیٹا ایک گارنٹی ان کے مال کی ہر کھیپ کے ساتھ آتے جاتے رہیں گے اور دلاور کا کھلا چیلنج ہوگا کہ ہمت ہے تو کچھ کر کے دیکھو۔ نہیں۔ اس طرح ہم بلیک میل ہوتے رہے اور اپنے فرض میں مجرمانہ کوتاہی کا ارتکاب کرتے رہے تو نتیجہ ایک ہی ہوگا۔ اسلحہ کی ہر کھیپ جو ہماری اس کمزوری کی وجہ سے مشرقی پاکستان پہنچے گی' ہماری شکست کی گواہ ہوگی۔ اس سے جتنی خون ریزی ہوگی اس کی ذمہ داری براہ راست ہم پر عائد ہوگی۔"

رابعہ نے کہا "کیا ہم سارا اسلحہ روک سکتے ہیں۔ جو وہاں پہنچ چکا ہے... یا پہنچ رہا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ جو ہمارے علم میں نہیں اس معاملے میں ہم پر کوتاہی کا الزام نہیں آسکتا لیکن جانتے بوجھتے ہم اسلحے کی کھیپ نکل جانے دیں یہ ناممکن ہے۔ میں دلاور کو اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میری کمزوری سے مجھے اس طرح بلیک میل کرتا رہے۔"

رابعہ نے کہا "شاید اس لئے کہ شملا سے تمہارا کوئی جذباتی تعلق اتنا مضبوط نہیں ہے۔"

یہ خاصی اشتعال انگیز بات تھی لیکن میں نے رابعہ کی طبیعت کے جذباتی ابال کو سرد کرنے کے لئے ٹھنڈے دماغ سے کام لیا "اگر شملا کی جگہ تم ہوتیں' تب بھی میرا فیصلہ یہی ہوتا اور شاید میرے لئے زیادہ آسان ہوتا۔"

غالب نے کہا "پھر تو جانبداری کا الزام مجھ پر بھی آتا ہے۔ لیکن میں اس معاملے میں سکندر سے ایک سو ایک فیصد متفق ہوں۔ فرض کیا اگر شملا کے نام قرعہ نکل آیا ہے تو اسے بدقسمتی ہی کہا جاسکتا ہے۔ محسن کی جگہ میں ہوتا تو کیا فرق پڑتا؟ کیا میں اپنی تقدیر سے لڑسکتا تھا؟"

میں نے کہا "اور اگر اس کے باوجود تمہیں یہ احساس ہے کہ میں بے رحمی کا مرتکب ہو رہا ہوں تو فیصلہ خود محسن کو کرنے دو۔ جو ہم پر گزرنی ہے' ایک بار گزر جائے۔ آج نہ سہی کل اسے حقیقت کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس مرحلے کو ہم آج ہی سر کیوں نہ کرلیں؟ اسے بتادیتے ہیں کہ ہم کس مشکل صورت حال سے دوچار ہیں۔"

"میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ نفی کرے گا... یار سکندر... میں اتنا کمزور بھی نہیں ہوں۔ اور شملا یا میرے بیٹے کے نصیب میں شہادت کا درجہ حاصل کرنا لکھا ہے تو کیا میں انہیں اس سعادت سے محروم کرنے کی سوچ سکتا ہوں؟ اور وہ بھی فرض سے کوتاہی کر کے۔ بیک وقت گناہ گار اور مجرم بن کے..."

رابعہ نے اپنی آنکھوں تک آجانے والے آنسوؤں کو پی لیا "میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا سکندر۔"

"مجھے معلوم ہے" میں نے نرمی سے کہا "تم جذبات سے مغلوب ہوگئی تھیں۔ یقین کرو' میرے سامنے پہلا مقصد شملا اور اس کے بچے کے تحفظ کا ہے۔ پہلے ہم انہیں بچائیں گے' ہماری تمام کوشش' جدوجہد اور تگ و دو اس مقصد میں کامیابی کے لئے ہے... اور خدا نے چاہا تو بہت جلد شملا ہمارے ساتھ ہوگی۔ ہم حالات کے مطابق منصوبہ بندی کر رہے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ آگے جاکے کیا ہوگا۔ ہر صورت میں ہم جو کچھ کریں گے' شملا اور محسن کے مستقبل کو داؤ پر لگا کے نہیں کریں گے۔"

زلیخا نے ہمارے قریب آکے کہا "اب ہم چائے پئیں گی۔"

میں نے دیکھا تو وہ کام سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ منہ دھوچکی تھی اور بال بنا کے آنکھوں میں مزید کاجل بھر چکی تھی۔

میں نے کہا "تم رہتی کہاں ہو؟"

اس نے ایسے ہی ہاتھ سے اشارہ کیا "اپنا گھر میں رہتا جی۔"

رابعہ نے کہا "پھر کب آؤ گی؟"

"ابھی آٹھ بجے جاتا ہے جی۔ بازار سے سودا لانے کو۔ تمہارا واسطے کیا کھانا بنانے کا ہے؟"

رابعہ نے کہا "تم صبح سے شام تک یہاں کیا کام کرتی ہو؟"

"اور کا کریں۔ عورت جات کا اور کون ہے جی" زلیخا نے کہا۔

نازو نے کہا "پھر رات کو سونے کے لئے گھر جاتی ہو؟"

"اور کا ادھر سو جائیں" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کے بولی "ساری تو ہوئی نا۔ بچے ہوئی گئے تو کا ہوگا؟ توبہ توبہ۔"

اس کی سادگی اور بے باکی نے نازو کا رنگ لال کردیا۔ اسے سوال کرتے وقت اندازہ نہ تھا کہ جواب کیا ہوگا تاہم یہ زلیخا کی محبت کا ایک انداز تھا جس میں عورت کی عفت و عصمت کے مشرقی تصور' شادی کی روایت کے احترام اور اس رشتے کی تقدیس کے احساس کا سارا فلسفہ آگیا تھا۔ جب وہ چلی گئی تو نازو کے ساتھ رابعہ بھی منہ دبا کے ہنسنے لگی۔

میں اور غالب پھر نقشے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ہمارا حتمی فیصلہ یہ تھا کہ ناگپور سے رائے پور اور بلاس پور کا راستہ ہی دلاور لیفٹ کمپنی کا وہ مخصوص روٹ ہوسکتا ہے جس کے چالیسویں میل پر "گولڈن فالکن" یا اس آر ٹو تھری کا سراغ ملنے کے امکانات ہیں۔

"چالیس میل کا مطلب ہے تقریباً چالیس کلو میٹر" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "ناگپور ہائی وے پر ہمارا راستہ تین سو کلو میٹر کے بعد آئے گا۔ اگر ہم پہلے سے وہاں موجود ہوں تو ہمارے لئے بہتر ہے۔"

غالب نے کہا "ہم دو حصوں میں تقسیم ہوکے دونوں راستوں پر نگاہ رکھ سکتے ہیں۔"

"پھر آپس میں رابطے کی کیا صورت ہوگی؟"

"وائرلیس... جنرل خان کے کمپنی میں جیپ ہو تو سب ...

www.paksociety.com

ہے۔ اگر طویل فاصلے کے شارٹ ویو ٹرانسمیٹر والے وائرلیس سیٹ مل جائیں تو ہم ایک دوسرے کو اپنی پوزیشن بھی بتا سکتے ہیں اور یہ اطلاع بھی دے سکتے ہیں کہ کتنا وقت کس راستے پر ہے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "اگر یہ ہو جائے تو پھر ہمارا کام بہت آسان ہو جائے گا۔ آج شان جب شام کو واپس آئے گا تو اس سے بات کریں گے۔ ابھی میرا ارادہ ہے کہ ہم تھوڑا سا ابتدائی کام کر لیں۔ میں اور تم چل کے اس جگہ کو دیکھ آتے ہیں جہاں سے کارواں کی لوڈنگ اور روانگی متوقع ہے۔"

"لیڈیز کے ساتھ؟"

میں نے کہا "نہیں۔ لیڈیز جائیں اور کچھ سیر و تفریح کر آئیں۔"

"ہم کہاں سیر کرنے جائیں۔ خواہ مخواہ" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "ہمارے پاس خواہ مخواہ کچھ کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔ آپ دونوں کے سپرد ایک آسان سا کام ہے۔ یہ تم سب اپنے پاس رکھیں اور ناگپور چلی جائیں۔"

نازو اور رابعہ نے ایک ساتھ کہا "ناگپور؟"

"میرا مطلب تھا کہ ناگپور بائی روڈ تک ہو آئیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آپ لوگ لفٹ بھی لے سکتی ہیں اور ٹیکسی سے بھی جا سکتی ہیں۔"

رابعہ نے کہا "بمبئی کی ٹیکسی ناگپور کیسے جا سکتی ہے؟"

میں نے کہا "بمبئی سے چالیس پچاس کلومیٹر دور تو جا سکتی ہے۔ یہ دیکھو کہ اس سمت میں آخری جگہ کون سی ہے۔ وہاں تک ٹیکسی ڈرائیور بھی خوشی جائے گا۔ اسے میٹر سے دس روپے اوپر دینے کی بات کرو گی تو وہ ہر جگہ چلا جائے گا۔"

نازو ہنسی "اور انکار کرے گا تو مار کھائے گا۔ ٹیکسی بھی تڑوائے گا۔"

"شوق پورا کرنا ہے تو اور بات ہے" رابعہ نے کہا "ورنہ بلاوجہ مار دھاڑ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

نازو ایک ایڈونچر کے خیال سے خاصی خوش تھی "رابعہ باجی، چھوڑو ٹیکسی کو۔ ہم کار لے لیں گے کسی سے۔"

غالب نے کہا "ہاں، تم ہوائی جہاز لے لو، بحری جہاز لے لو۔ کون روک سکتا ہے تمہیں؟"

رابعہ نے کہا "بس جانا اور آنا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں، اصل کام تو میں نے ابھی بتایا ہی نہیں۔ ایک تو تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ گولڈن کا کلن کیا جاتا ہے۔ اور یہ شری گور تر کیا چیز ہے۔ یہ سراغرسانی تمہیں ایسے کرنی ہے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔"

نازو نے کہا "اگر شری گور تر ہمارے ساتھ آنا چاہیں تو کیا ہم انہیں بھی لے آئیں اپنے ساتھ؟"

غالب نے کہا "ہو سکتا ہے وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے۔"

میں نے کہا "چلو، اب تم دونوں روانہ ہو جاؤ۔"

"کیا ایسے ہی چلے جائیں۔ اسی حلیے میں؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے بنظر غائر ان کا جائزہ لیا "یوسف ثانی کو جگا کر تھوڑا سا میک اپ کروا لو۔"

"تم لوگ کیسے جاؤ گے اور کب تک واپس آؤ گے؟"

میں نے کہا "ہمارے پاس پولیس کی وردیاں ہیں۔ شو اور محسن کو فٹ آ جائیں گی۔ واپسی کے بارے میں ابھی سے کیسے بتائیں؟"

رابعہ نے کہا "تم کسی لمبے چکر میں مت پڑنا۔"

میں نے کہا "ویسے تو ہمارا کام دو گھنٹے کا ہے۔ مگر کیا عجب شام ہو جائے۔"

"دو گھنٹے میں ہم بھی واپس آ سکتے ہیں۔ کیوں نازو؟"

نازو نے کہا "کیا کریں گے اتنی جلدی آ کے۔ یہاں کے بور ہوں گے۔ کوئی بھی تو نہیں ہو گا یہاں۔"

میں نے کہا "میری طرف سے اجازت ہے کہ شام تک گھومو پھرو۔"

غالب نے کہا "کوئی دھر لے گا آوارہ گردی کے الزام میں۔"

میں نے کہا "یہ بمبئی ہے، یہاں کوئی کسی کی پروا نہیں کرتا۔ ہر جگہ عورتیں اور مرد برابر نظر آتے ہیں۔ ہوٹلوں، ڈراموں میں عورتیں اور مرد ساتھ ساتھ بیٹھتے ہیں اور بھیڑ میں ایک ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی الگ جگہ نہیں۔ کوئی تفاوت نہیں۔"

رابعہ نے کہا "سائیکل اور اسکوٹر چلاتی ہیں عورتیں۔"

نازو نے کہا "سنا ہے، ٹیکسی ڈرائیور بھی ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں، یہاں حد سے زیادہ آزادی ہے۔ ان لوگوں کی معاشرت مختلف ہے لیکن جو بمبئی کا ماحول ہے وہ سارے ہندوستان کا ماحول نہیں ہے۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں اتنی آزادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

میں نے یوسف ثانی کو جگانے کے لئے ہاتھ لگایا ہی تھا کہ وہ اچھل کے بیٹھ گیا۔ اس نے سب سے پہلے تو اپنی ٹوپی اٹھائی جس کا پھندنا اب الگ نہیں تھا۔ شاید یہ زلیخا کے ہاتھ کی بخیہ گری تھی جس نے اسے ٹوپی کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ یوسف ثانی نے خاصے اطمینان کے ساتھ ٹوپی کو سر پر جمایا۔

"ناچیز تھا کچھ محو آرام۔ لیکن اس میں نہیں کوئی کلام" اس نے عادت کے مطابق ہاتھ باندھ کے کہا "کہ آپ کا ہے کیا کام... تو حاضر ہے یہ بندہ بے دام۔"

میں نے کہا "بے دام کچھ نہیں ہو گا۔ تمہاری خدمات کا معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ جو تم نے کل سے اب تک سرانجام دی ہیں۔"

"اور آئندہ بھی سرانجام دو گے" غالب نے کہا۔

اس نے بزرگانہ انداز میں کہا "ایسا نہ کہئے مہربان، یہاں آپ ہیں معزز مہمان... گرچہ حقیر و فقیر ہے میزبان... لیکن یہ نہیں ہے اس کی شان..."

میں نے کہا "یوسف ثانی! ہم قدر کرتے ہیں تمہارے جذبات کی مگر ہم کسی طرح بھی تم پر بار نہیں بن سکتے۔ جیسے تم پہلے کام کرتے تھے اور حق محنت وصول کرتے تھے..."

وہ چلانے لگا "حضرت! اب اور نہ کریں اصرار... ناچیز ہے پہلے ہی شرمسار... یہ امر ہے از حد باعث آزار... پہلے کی بات اور تھی سرکار، جب بنائے تعلق تھا کاروبار..."

بلاشبہ وہ عجیب آدمی تھا۔ محمد خان نے اسے لالچی قرار دیا تھا۔ اس کے لالچ کی وجہ جانے بغیر دوسروں نے اسے اپنے ساتھ رکھنے کی تجویز کو سختی سے مسترد کر دیا تھا۔ اس کے خلوص کی پروا کئے بغیر... مگر اس نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا تھا۔ الٹا اپنے رویے سے اس نے مجھے شرمسار کر دیا تھا۔

اس نے واجبی سے میک اپ کے ذریعے رابعہ اور نازو کے چہروں کو بدلا۔ لباس کا مسئلہ آیا تو وہ دس منٹ میں تین سے دو ساڑیاں خرید لایا جو دو سو روپے میں بہت سستی تھیں۔ اس نے بتایا کہ یہ سیلون اور بنگال کی ساڑیاں ہیں جو کچھ لوگ اسمگل کر کے لاتے ہیں اور پھر کشتیوں میں لے جا کے بحری جہازوں کے مسافروں کو بیچتے ہیں۔ بانک کے کام کی یہ ساڑیاں بہت مہنگی فروخت ہو جاتی ہیں لیکن ان کے منافع سے کسٹم اور پولیس کے حکام زیادہ لے جاتے ہیں۔

جب وہ تیار ہو گئیں تو ایک لمحے کے لئے میری قوت فیصلہ پر ایک بے نام سا خوف غالب آنے لگا۔ جن حالات سے ہم دوچار تھے، وہ تقاضا کرتے تھے کہ سوچے سمجھے بغیر ہم کوئی قدم نہ اٹھائیں، کوئی خطرہ مول نہ لیں اور اپنے دفاع سے بھی غافل نہ ہوں۔ کیا ان حالات میں جبکہ ہمارے چاروں طرف نئے اور پرانے شکاری ہر قسم کے جال بچھا رہے تھے، دو عورتوں کو ایک خطرناک مہم پر بھیجنا مناسب ہو گا؟ بظاہر یہ کام معمولی تھا اور اس میں خطرے کا وجود محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن غیر متوقع واقعات اور نادانستہ سرزد ہونے والی غلطیاں کسی بھی صورت حال کو اچانک پلٹ سکتی تھیں۔ رابعہ اور نازو نے کبھی بزدلی یا بدحواسی اور اعتماد کے فقدان کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ مذاق کی بات اور تھی کہ انہیں کمزور، کم ہمت یا ناقص العقل قرار دے کر چھیڑا جائے۔ وہ کسی طرح بھی ہم سے کم تر نہ تھیں۔ پھر بھی انہیں رخصت کرتے ہوئے مجھے خیال رہا کہ وہ اکیلی ہیں اور ان کے ساتھ کسی مرد کے نہ ہونے سے کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو ہونا نہ چاہئے۔ پھر میں نے اس خیال کو اپنا وہم اور تعصب سمجھ کے ذہن سے جھٹک دیا۔

جب رابعہ نے کہا "ہم چلتے ہیں" تو مجھے اپنی جذباتی کمزوری پر شرم آئی۔

میں نے کہا "جاؤ خدا حافظ۔ ریوالور لے لیا ہے نا؟"

رابعہ نے کہا "اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

میں نے کہا "احتیاطاً لے لو۔ مجھے یقین ہے کہ جہاں تک ممکن ہو گا تم اس کے استعمال سے گریز کرو گی۔ ہر مشکل صورت حال سے نمٹنے کے لئے تمہارے پاس ایک طاقت تو عقل و ذہانت کی ہے جس سے تم پہلے بھی فائدہ اٹھاتی رہی ہو۔"

رابعہ نے نازو کی طرف دیکھا "تم نے سنا نازو! یہ ہمیں عقل مند اور ذہین ہونے کی سند دے رہے ہیں۔"

نازو نے طنز سے کہا "جذباتی ہو رہے ہیں شاید۔"

میں نے کہا "تمہاری دوسری طاقت ہے تمہارا عورت ہونا۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ حسن و شباب کا جوہری اسلحہ..."

"جس سے ہم مرد بیچارے محروم ہیں" غالب نے کہا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی "تاہم بعض اوقات عورت کا عورت ہونا ہی اسے محصور کر دیتا ہے۔ مقابلے پر جاہل اور وحشی انسان ہوں تو پھر ریوالور کی ایک چھوٹی سی گولی بہت بڑی طاقت بن جاتی ہے۔ تمہارے دفاع کو کسی پہلو سے بھی کمزور نہیں ہونا چاہئے۔"

رابعہ نے مجھ سے ریوالور لے لیا "اصلی طاقت تو انسان کا یقین ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "بجا ارشاد۔ مگر یقین کی بنیادوں کو استوار رکھنے کے لئے وسائل کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ایک اور طاقت بھی ہاتھ میں رکھو یعنی دولت کی طاقت کو۔ کہنے کو پیسہ ہاتھ کا میل ہے لیکن کچھ لوگ اس کے لئے اپنا سب کچھ بیچ دیتے ہیں۔ جہاں کسی بھی مقصد کے حصول کے لئے کامیابی خریدی جا سکتی ہو تو وہاں جدوجہد کا خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں۔"

غالب نے میری تائید کی "ہاں۔ وقت اور توانائی کیوں ضائع کی جائے۔ اگر یہ ضائع ہو جانے والی دولت کام آ سکتی ہو۔ جو ہمارے کسی مصرف کی نہیں۔"

میرے اصرار پر انہوں نے اپنے اپنے بیگ میں دس دس ہزار روپے ڈال لئے۔ غالب نے خاصی مہارت سے دس دس ہزار کی نو گڈیوں کو ایک دسترخوان جیسے کپڑے پر قطار میں رکھا اور اسے لپیٹ کر بیلٹ سی بنا دی جس کو رابعہ نے اپنی ساڑی کے نیچے کمر پر باندھ کے دونوں کناروں کو ایک پن سے جوڑ لیا۔ کسی اور لباس میں بھی شاید یہ بیلٹ نظر نہ آتی کیونکہ یہ مشکل سے آدھا انچ موٹی اور چار انچ چوڑی تھی۔ ساڑی کے نیچے تو اس کا وجود محسوس تک نہ ہوتا تھا اور نہ اس سے رابعہ یا نازو کو نقل و حرکت میں کسی دشواری کا سامنا ہو سکتا تھا۔ اس طرح ان دونوں کے پاس ایک ایک لاکھ ہو گئے۔

غالب نے نازو کو غور سے دیکھا "تمہاری کمر اب کچھ نظر آنے لگی ہے۔ پہلے تو تھی ہی نہیں۔"

نازو نے کہا "کیا ایک لاکھ کی کمر بھی نظر نہیں آئے گی؟"

www.paksociety.com

رابعہ ہنسی "ایک کلو وزن تو ہوگا۔"

غالب نے نازو کو ڈانٹ کر کہا "کسی سے اتنا بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں کہ وہ تمہاری کمر میں ہاتھ ڈال دے۔ اب تم ایک خوبصورت لڑکی بھی ہو۔"

نازو نے کہا "اتنی ہمت ہے کسی میں۔"

"ہاں مجھ میں ہے۔ لیکن اس کا مظاہرہ میں ابھی نہیں کروں گا۔"

میں نے کہا "اگر بفرض محال ایسا ہو کہ ہم واپسی پر یہاں نہ آئیں یا کسی کے ساتھ بھی ایسی ویسی کوئی بات ہو جائے تو....."

رابعہ نے گھبرا کے کہا "خواہ مخواہ ایسی ویسی بات مت نکالو منہ سے۔ کچھ نہیں ہوگا کسی کو۔ چلو نازو۔"

وہ ریلوے ٹریک سے اتر کے اسی راستے پر روانہ ہو گئیں جس سے ہم یہاں پہنچے تھے۔ وہاں کھیلنے والے بچوں اور مقامی عورتوں نے انہیں حیرت اور رشک و حسد کے ساتھ دیکھا۔ ان کالے، سوکھے، ننگ دھڑنگ بچوں کے اور ان کی ماؤں کے مقدر میں مفلسی کی ساری بدصورتی کا عذاب جھیلنا لکھا گیا تھا۔ رابعہ اور نازو جیسی تمام حسین اور خوش پوش عورتیں ان کے لئے کسی آسمانی مخلوق سے کم نہ تھیں جن سے وہ ایک ردعمل کے طور پر نفرت کرتے تھے اور خوف کھاتے تھے۔ وہ ابھی اتنی نفرت اور تحمل بھی نہیں ہوئی تھیں کہ میں نے زلیخا کو آتے دیکھا۔ زلیخا نے انہیں سلام کیا۔ جواب میں شاید رابعہ نے یہ کہا ہوگا کہ وہ اس بستی کے باہر تک ان کی رہنمائی کرے کیونکہ اس کے بعد زلیخا واپس چل پڑی۔

میں نے کہا "عورت کی ذات بھی کیسا مجموعہ اضداد ہے۔"

"یہ کسی دانا فلسفی کے اقوال زریں ہیں یا جناب یوسف میں آپ کی ذاتی رائے ہے" غالب نے کہا "میں تم سے اس وقت اتفاق کرنے کے موڈ میں ہوں۔"

میں نے کہا "رابعہ ہو یا نازو، دونوں بیک وقت انتہائی نڈر بھی ہیں اور حد درجہ بزدل بھی۔ انہوں نے بڑی ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ ہمارا ساتھ دیا ہے۔ قید و بند کی صعوبت برداشت کی ہے۔ قتل و خون ریزی، سفاکی اور درندگی دیکھی ہے۔ تشدد کی ذلت اٹھائی ہے اور وفا کی راہ میں سارے رشتوں کو قربان کر کے یہ زندگی اختیار کی ہے جس میں ہر قدم پر موت ہم رکاب ہے۔ اس کے برعکس دیکھو کہ یہی اندھیرے میں اپنے سائے سے ڈر جاتی ہیں۔ چوہے اور چھپکلی کو دیکھ کر دم نکلتا ہے ان کا۔ ابھی میں نے جو کہا بھی نہیں تھا مگر رابعہ نے کہہ دیا کہ بری بات منہ سے مت نکالو۔ بات سے ڈر گئی۔"

غالب ہنس پڑا "ایک دن میں نے بھی نازو سے کہہ دیا کہ مجھے کینسر ہو گیا ہے۔ اس کی حالت تو ایسی ہو گئی تھی جیسے میں نے اپنی تاریخ وفات کا اعلان کر دیا ہو۔ میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ مذاق میں بھی یہ منحوس الفاظ مت کہنا۔ میں نے کہا کہ یہ تمہاری محبت کا کینسر ہے اور ظاہر ہے میں نے تو ایک شاعرانہ بات کی تھی۔ مقصد تھا اپنے عشق کی شدت کا اظہار۔ مگر وہ ایک لفظ سے ڈر گئی۔"

میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "اس میں تو ایک بجنے والا ہے۔ چلیں یار! ہم بھی نکلتے ہیں۔ بہت دیر ہو گئی ہے پہلے ہی۔"

"ہاں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کانوائے نکل جائے۔"

"دلاور نے کہا تھا کہ وہ چار دن میں ٹرک روانہ ہوں گے۔ کل تک وہاں کچھ نہیں تھا۔ رات بھر میں کیسے پانچ ٹرک لوڈ ہو سکتے ہیں؟"

غالب نے سر ہلا کے کہا "یار! کیا ہو گیا ہے تیری عقل کو۔ تو دلاور کی بات پر کیوں یقین کرتا ہے؟ معلوم نہیں اس کے دل میں کیا بات ہو جس کو چھپانے کے لئے اس نے ایک جھوٹ بول دیا۔ ہو سکتا ہے ٹرک کچھ دیر بعد ہی روانہ ہو گئے ہوں۔ یا کسی اور جگہ لوڈ ہو کر نکل جائیں۔"

میں نے مایوسی کے غلبے سے بچنے کے لئے کہا "وہ ہم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ ہم سچ کا پتا چلا لیں گے۔"

"ٹھیک ہے، چل کے دیکھتے ہیں" غالب نے کہا۔

یوسف ثانی ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا اور بظاہر کچھ نہیں سن رہا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ وہ اوپر سے نظر آنے والا کتنا ہوشیار ہے۔ وہ کبھی گرد و پیش سے غافل نہیں ہوتا تھا بلکہ مجھے تو شک تھا کہ سوتے میں بھی اس کی آنکھیں سب کچھ دیکھتی ہیں اور اس کے کان ہر آہٹ اور سرگوشی کو سنتے ہیں۔ جب سے میں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کی تجویز کو مسترد کیا تھا وہ کچھ دل گرفتہ اور اداس نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھا مگر میں نے جو فیصلہ کیا تھا سوچ سمجھ کے کیا تھا اور اسے بدل نہیں سکتا تھا۔

یوسف ثانی نے میرا اور غالب کا میک اپ کیا۔ پولیس مین کی جو وردی رابعہ کو ڈھیلی تھی وہ مجھے فٹ آ گئی اور جو وردی میرے لئے کچھ تنگ تھی وہ غالب کے قالب پر پوری اتری۔ یوسف ثانی کو ہیئر اسٹائل بدلنے میں کمال حاصل تھا۔ اس نے میرے سر کے بالوں پر نہ جانے کیا محلول چھڑکا۔ اس سے میرے بال مخالف سمت میں آسانی سے سیٹ ہو گئے اور ان کا رنگ سیاہ سے براؤن ہو گیا۔ میرا خیال ہے اور تجربہ ہے کہ صورت کے نقوش کو بدلنے میں سب سے نمایاں کردار بال ہی ادا کرتے ہیں۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ جب تک میں بالوں کو اچھی طرح نہیں دھوتا ان کا رنگ نہیں اترے گا اور اسٹائل نہیں بدلے گا۔ غالب کے بالوں کو اس نے درمیان سے دو حصوں میں تقسیم کیا تو غالب کا چہرہ مجھے اجنبی سا محسوس ہونے لگا۔ پھر یوسف ثانی نے مجھے ایک چشمہ دیا جو نظر کا چشمہ لگتا تھا مگر اس کے شیشوں کا نمبر صفر تھا۔ غالب کو اس نے مشورہ دیا کہ وہ بازار سے دھوپ کا چشمہ خرید کر لگا لے کیونکہ اس کی وردی افسرانہ تھی اور گہرے رنگ کے شیشوں والے چشمے سے اس کی شان بڑھ سکتی تھی۔

پوری تیاری کے بعد میں نے آئینہ دیکھا تو یوسف ثانی کی کوشش کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا "استاد! تم نے یہ فن کہاں سے سیکھا؟"

یوسف ثانی نے خوش ہونے کے باوجود ایک آہ بھر کے کہا "نکانہ میں جب تھا خادم کا قیام۔ ایک تھیٹر میں کیا تھا برسوں کام۔ ایک صاحب کہ تھے اس فن کے امام۔ ہم چند کہ تھے سو دو اتنی نجام۔ رکھتے تھے آرائش گیسو میں شہرت عام۔ لیک اب ہیں اب حالی مقام۔ نہیں محتاج تعارف ان کا نام۔"

میں نے کہا "تم کیوں نہیں گئے فلموں میں؟ تم تو ہیرو بھی بن سکتے تھے۔"

"اپنی اپنے بس میں نہیں اپنی تقدیر" وہ بولا "الٹی ہو جاتی ہے اپنی ہر تدبیر۔ جس نے دیکھی بھی اپنی تصویر۔ اس نے کی ہر جگہ تشہیر۔ یہ بدنمائی تھی اپنی تقصیر۔"

غالب نے کہا "یار! وہ جاہل لوگ ہوں گے جو نہیں چاہتے تھے کہ تم ترقی کرو۔ ورنہ تم لاکھوں میں ایک ہو۔ یقین نہیں تو زلیخا سے پوچھ کے دیکھو۔"

میں نے سوٹ کیس میں سے مزید ایک لاکھ روپے نکالے۔ دس ہزار اپنی چار جیبوں میں تقسیم کر کے رکھے۔ ایسی ہی نوٹ گڈیوں کو میں نے بھی ایک کپڑے کی بیلٹ بنا کے کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ یہ بیلٹ پتلون کے اوپر تھی مگر شرٹ کے نیچے اور اسے میں نے بٹنوں کی مدد سے بیلٹ کے ساتھ ہی جوڑ دیا تھا تاکہ دوڑنے بھاگنے کی نوبت آئے تو بیلٹ کھل کر نہ گرے اور ڈھیلی بھی نہ ہو۔ اس سے میری نقل و حرکت کی آزادی میں بھی فرق نہیں آتا تھا۔ غالب نے بھی ایسا ہی کیا۔ یوسف ثانی نے یہ سب کچھ دیکھا مگر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ سوٹ کیس میں اب شاید دو ڈھائی لاکھ بچے تھے۔

میں نے کہا "اس میں سے تم جتنی رقم چاہو لے سکتے ہو۔ اگر معاوضہ منظور نہیں تو سمجھو دوستوں کی طرف سے۔"

غالب نے کہا "ہمیں بہت خوشی ہوگی اگر یہ رقم تمہارے کام آ جائے اور تم وہ گھر بنانے میں کامیاب ہو جاؤ جس کے لئے تم پیسہ جوڑتے چلے جا رہے ہو۔ جو تمہارے لئے زلیخا کا خواب ہے اور تمہاری منزل ہے۔"

میں نے کہا "ہاں، ایسا نہ ہو کہ تم منزل کے پیچھے دوڑتے رہو اور عمر کی آخری منزل آ جائے۔ زلیخا کیا ہے، وہ انتظار کرتی رہے گی لیکن اچھا ہے کہ اب تم اسے اپنا لو۔ اس سے اچھی شریک حیات تمہیں نہیں ملے گی مسٹر یوسف ثانی۔"

وہ کبھی میری صورت کو دیکھتا تھا اور کبھی غالب کی۔ ہماری فراخدلانہ پیشکش سے زیادہ وہ اس بات پر حیران تھا کہ ہم اس کے راز عشق سے آشنا ہیں۔ یعنی میں۔ سر ہلاتے ہوئے اس نے کہا "ناقص العقل ہے عورت کی ذات۔ کھول بیٹھتی ہے دفتر شکایات۔ سنانے لگتی ہے اپنی حکایات۔ نہیں سمجھتی یہ معمولی سی بات۔ کہ اس میں وہ رکھی نہیں ہے اوقات۔ جو حاصل ہو کر کے کوئی واردات۔ یا ملے کسی سے از راہ خیرات۔"

"اچھا بھئی جیسے تمہاری مرضی" میں نے کہا "تم اپنی محبت کی کہانی سے تاج محل بناتے رہو۔ ہم چلتے ہیں۔ شام تک ضرور لوٹ آئیں گے۔ اگر خدا لایا۔ اس درمیان میں خدا سے بس خیریت مطلوب ہے۔"

میرے پاس وہی ریوالور تھا جو مجھے وردی کے ساتھ ملا تھا۔ میں نے یہ ریوالور غالب کو دے دیا کیونکہ میں اپنے ننگے ہاتھوں سے ہتھیار کا کام لے سکتا تھا۔ ہم اس بستی سے گزرے تو اچانک بھگدڑ سی مچ گئی۔ لوگ ایسے بدحواس ہو گئے تھے جیسے جنگل میں شیر کے نمودار ہونے سے دوسرے کمزور اور حقیر جانور بدحواس ہو جاتے ہیں۔ پولیس بھی اس برصغیر میں آدم خور شیر سے کم وحشت ناک مخلوق نہیں ہے کہ جس بستی میں دکھائی دیتی ہے وہاں لوگ سہم جاتے ہیں کہ نہ جانے کس بدبخت کی شامت آئی ہے۔ معلوم نہیں وہ وقت کب آئے گا جب عوام پولیس کو اپنا محافظ اور قانون کا نمائندہ سمجھنے لگیں گے۔ ابھی تو وہ لاقانونیت کے علم بردار، زبردست کے دوست اور کمزور کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔

ایک سڑک پر آ جانے کے بعد میں نے غالب سے کہا۔ "آخر ہم ہیں کہاں اس وقت اور کب تک پیدل چلتے رہیں گے؟"

غالب نے سر ہلایا "مجھے تو سمت کا اندازہ بھی نہیں ہو رہا..... سورج سر پر ہے۔ کوئی ٹیکسی بھی نہیں آ رہی ہے۔ کسی سے پوچھا تو لوگ شک کریں گے کہ پولیس کو شہر کے راستے نہیں معلوم۔"

"شکر ہے تم نے سمجھا تھا۔ تم جاؤ کہ کدھر جانا ہے۔ ویسے بھی تم ہی چیف ہو" غالب نے کہا "چیف کے تو۔"

میں نے کہا "یہ بات ہے تو پھر دیکھو" اور ایک کار ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا لیکن وہ چالاک آدمی تھا۔ اس نے کار کی رفتار کم کی اور پھر ایک دم بڑھا کے فرار ہو گیا۔

"سر جی! کیا لوگ باغی ہو رہے ہیں؟ پولیس کی وردی دیکھ کے بھی نہیں ڈرتے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "بیوقوف! کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ڈر کے ہی بھاگا تھا اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجرم تھا۔"

"کیا جرم کیا تھا اس نے سر جی؟"

"بیشتر ڈرائیور کاغذات سے مار کھاتے ہیں۔ لائسنس نہیں ہے، یا ہے تو تاریخ گزر چکی ہے۔ ٹیکس نہیں بھرا۔ انشورنس نہیں ہے۔ محض عجلت کی عادت کے باعث۔ یہ دیکھو" میں نے ایک کار کو تقریباً سامنے آ کے روک لیا جسے سولہ سترہ سال کا ایک چھیل چھبیلا نوجوان چلا رہا تھا۔

"ڈرائیونگ لائسنس ہے؟" میں نے غرا کے کہا۔

نوجوان کی حالت غیر ہونے لگی "وہ جی۔ گھر پہ رہ گیا"

www.paksociety.com

"تم خود کیوں نہیں رہ گئے گھر پر؟" میں نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا "اب کیا خیال ہے' تمہارے گھر چلیں یا تھانے چلیں؟"

"جی... تھانے دار صاحب۔ میں تھانے نہیں جا سکتا.... میں اپنی غلطی مانتا ہوں... آئندہ لائسنس رکھوں گا...."

میں نے کہا "لائسنس ہوگا تو رکھو گے نا۔ تمہاری عمر کتنی ہے بھلا' پندرہ یا سولہ! تم تو بالغ بھی نہیں ہوئے ابھی۔"

غالب نے کہا "اور آئندہ کی آئندہ دیکھی جائے گی۔ ابھی کی بات کرو شہزادے۔"

شہزادے نے غالب کی بات کا مطلب کچھ اور سمجھا "جی میں جرمانہ ادا کرنے کے لئے تیار ہوں" اسی وقت اس نے ایک بہت پھولا ہوا پرس نکالا "آپ جتنا جرمانہ چاہیں رکھ لیں۔"

"ہمیں رشوت" میں نے چلا کے کہا "ایک اور جرم!"

غالب نے سفارش کے انداز میں کہا "غالباً گاڑی کے کاغذات نہیں ہیں اس کے پاس؟"

"کیا کاغذات بھی نہیں ہیں؟ اف تیسرا جرم! کیا یہ گاڑی چوری کی ہو' اب تو گرفتاری لازمی ہے۔ لگاؤ ہتھکڑی فوراً۔"

غالب نے کہا "سر! رہنے دیں' بچہ ہے۔ غلطی سے ہمیں بھی عام پولیس والوں کی طرح سمجھ بیٹھا۔ ہم کہاں رشوت لیتے ہیں۔"

"مگر ہم مجرموں کو چھوڑتے بھی تو نہیں ہیں" میں نے کہا۔

"سر شریف خاندان کا... آنکھ اور لیپ لگتا ہے سر۔"

"آنکھ اور نسب؟"

"میرا مطلب ہے چشم و چراغ سر" غالب نے کہا "اور چور تو بالکل نہیں لگتا۔"

"تو پھر یہ چور ڈاکو کی اولاد ہوگا" میں نے اسے غور سے ملاحظہ فرمایا۔

"میرے ڈیڈی کسٹم میں انسپکٹر ہیں" اس نے احتجاجی انداز میں کہا۔

میں نے غالب کے کندھے پر ہاتھ مارا "دیکھا ہم نے کیسا پہچانا۔"

غالب نے مجھے خون آشام نظروں سے گھورتے ہوئے کندھا سہلا کے کہا "آپ کی کیا بات ہے سر۔ آپ تو گدھے کو دیکھ کر زعفران کا بھاؤ جان لیتے ہیں۔"

ہندی بولنے والا نوجوان اردو کے اس محاورے سے نابلد تھا۔ غالباً اس نے فرض کر لیا ہوگا کہ گدھا اسے ہی کہا گیا ہے وہ مجرمانہ معصومیت کے ساتھ اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک میں نے ایک ٹیکسی کو آتے دیکھا اور سوچا اس نوجوان کو جانے دوں مگر اتنی دیر میں ٹیکسی قریب آ گئی تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس میں پہلے سے کوئی مسافر موجود ہے۔ میں نے کار کے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ٹیکسی سامنے سے گزری اور مجھے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کے چہرے کی ایک جھلک نظر آئی۔ یہ چہرہ سابق ڈی ایس پی سراج کا تھا۔

میں تقریباً اچھل پڑا۔ پھر میں نے غالب کی طرف دیکھا تو وہ بھی ہکا بکا کھڑا ہوا تھا۔

"تم... تم نے دیکھا؟"

"یس... یس سر... فور تھری ٹو ون...." غالب نے کسی مستعد ماتحت کی طرح جواب دیا۔

"شاباش!" میں کار کا دروازہ کھول کے سیٹ پر بیٹھ گیا "یہ وہی سور کا بچہ تھا نا؟"

"بالکل وہی تھا سر" غالب نے میرے ساتھ بیٹھ کے دروازہ بند کر دیا "کھڑے کیوں ہو؟ چلو" وہ نوجوان کی طرف دیکھ کر دہاڑا۔

"کہاں چلوں؟" نوجوان نے گھبرا کے کار اسٹارٹ کی۔

"احتیاط سے اس ٹیکسی کے پیچھے چلو جو ابھی گزری ہے' اسے نظروں سے اوجھل مت ہونے دینا۔ گاڑی کیسی ہے تمہاری؟ سمجھو کہ مقابلہ ہے اس ٹیکسی سے۔" میں نے کہا۔

نوجوان جوش میں آ گیا "یہ اسپورٹس کار ہے۔"

"اور تم ڈرائیور کیسے ہو؟" میں نے کہا۔

"ابھی پتا چل جائے گا آپ کو" نوجوان نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

گاڑی واقعی بہت جاندار تھی۔ دیکھتے دیکھتے رفتار بتانے والی سوئی اسی' نوے اور پھر سو کے ہندسوں سے آگے بڑھ گئی۔ گاڑی کا طاقتور انجن کچھ زیادہ ہی شور کر رہا تھا مگر اسٹیئرنگ پر نوجوان کا مکمل کنٹرول تھا۔ رفتار ٹیکسی کی بھی کم نہ تھی۔

"اس ٹیکسی میں کون ہے؟" اس نے چلا کے کہا اور اپنی نظر سڑک پر رکھی۔ ٹیکسی تقریباً دو فرلانگ آگے نظر آ رہی تھی۔

"ایک بہت خطرناک مجرم..." میں نے کہا "ہم اسی کو گرفتار کرنے کے لئے آئے تھے۔ بدمعاش جل دے کر نکل گیا تھا۔"

"کیا پیدل آئے تھے آپ لوگ؟ گاڑی کے بغیر اس کا پیچھا کیسے کرتے؟"

میں نے اس سوال کا جواب گول کر دیا "شاباش... اگر تم نے ٹیکسی کو مس نہیں کیا تو تمہارے سارے قصور معاف۔"

"اور اگر ٹیکسی نکل گئی تو یہ تمہارا ایک اور جرم ہوگا۔ مجرمانہ غفلت اور اعانت مجرمانہ" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "تم بھی بند... تمہاری گاڑی بھی بند۔"

لڑکے نے گھبرا کے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔ گاڑی لہرا کے سڑک کے نیچے اتری اور ایک کوڑے کے ڈرم کو ناک آؤٹ کرتی ہوئی پھر سڑک پر آ گئی۔ اس کی رفتار ایک سو بیس کلو میٹر سے زیادہ دیکھ کے مجھے نظروں میں کاروں کے الٹنے کے

خوفناک مناظر یاد آئے۔

میں نے کہا "آہستہ نوجوان! ایسے تو تم ٹیکسی سے آگے نکل جاؤ گے اور وہ بدمعاش ہمارے پیچھے لگ جائے گا۔"

"یا تم اپنے ساتھ ہمیں بھی پرلوک پہنچا دو گے۔ وہ بدمعاش بچ جائے گا اور ہم مارے جائیں گے" غالب نے...

نوجوان نے ذرا سی رفتار کم کی "اگر اس نے وہاں سے فائرنگ شروع کر دی؟"

میں نے کہا "کرنے دو... اس کا نشانہ خطا ہوگا۔ جیسے کہ فلموں میں ہوتا ہے۔ ولن ایک ہزار راؤنڈ چلاوے۔ پھر بھی ہیرو بچ جاتا ہے۔ ہیرو صرف ایک گولی چلاتا ہے اور ولن کے ساتھ دوسرے بدمعاشوں کو بھی مار دیتا ہے۔ ویسے بھی اس بدمعاش کی نظر کمزور ہے۔"

لڑکے نے کہا "نام کیا ہے اس بدمعاش کا؟"

میں نے سوچ کے کہا "ہیڈ لوڈے..."

"ہیڈ لوڈے؟" لڑکا حیران ہو کے بولا "یہ کیا نام ہوا بھلا؟"

میں نے غالب کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھوں میں سر ہلا کے میرے خیال کی تصدیق کی۔ میرا خیال تھا کہ ٹیکسی میں مجھے سراج کے چہرے کی جھلک دکھائی دی تھی مگر اس وقت میں نے اس کا نام لینے سے گریز کیا تھا۔ شک کی گنجائش پہلے بھی نہ تھی۔ اس سابق ڈی ایس پی کے چہرے کو میں کیسے بھول سکتا تھا جس کے ظلم و تشدد سے میرے اس دور پر آشوب کا آغاز ہوا تھا۔ اذیت کے اس پہلے تجربے کی یاد آج بھی میرے جسم پر کپکپی طاری کر دیتی ہے۔ حالانکہ اس کے بعد جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا' وہ اس سے کہیں زیادہ ہولناک تھا۔

میں نے کہا "اس کے نام پر مت جاؤ۔ اس بدمعاش کے سامنے تو گرگٹ بھی شرمندہ ہے۔"

"گرگٹ؟" نوجوان بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں ہاں گرگٹ صرف رنگ بدلتا ہے۔ یہ اپنا نام بدل لیتا ہے۔ چہرہ بدل لیتا ہے۔ آواز بدل لیتا ہے۔ مگر مذہب اور قومیت تو کوئی چیز نہیں اس کے سامنے۔ وہ جنس بھی بدل سکتا ہے۔ ایک منٹ میں۔ ابھی ہم اس کے پیچھے تو لگ گئے ہیں مگر یہ ہو سکتا ہے کہ جب ہم اس ٹیکسی کو روک کر دیکھیں تو اس میں سے کوئی لال مرچ نکلے۔"

"لال مرچ؟" لڑکا مزید بھونچکا رہ گیا۔

"میرا مطلب تھا کوئی ایسی لڑکی جو...."

"جو لال رنگ کے اسکرٹ میں ہو۔ منی اسکرٹ میں۔ اس کے ہونٹوں پر گہرے لال رنگ کی لپ اسٹک ہو اور اس کے گال کشمیری سیب کی طرح لال ہوں" غالب نے کہا۔

میں نے اسے ڈانٹا "افسر کی بات کاٹتے ہو۔ ہمارا مطلب تھا لال مرچ کی طرح مزاج کی تیز۔ جو بات کرنے سے پہلے ہاتھ چلاتی ہو اور ہاتھ چلانے سے پہلے زبان چلاتی ہو۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ راہ چلتے اس کی جنس بدل جائے؟" نوجوان نے کہا "ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے وہ زنانہ کپڑے پہن لے اور میک اپ سے اپنا حلیہ بدل لے۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "نوجوان! تم نے ابھی دنیا میں کچھ نہیں دیکھا۔ انسانوں کی نظریں بدل جاتی ہیں' دل بدل جاتے ہیں' خون بدل جاتا ہے۔ رشتے بدل جاتے ہیں۔ عورتیں شوہر بدل لیتی ہیں۔ مرد بیویاں...."

"ولدیت تک بدل جاتی ہے سر جی۔"

"ہاں۔ اس بدمعاش کا بس چلے تو مجھے باپ بنا لے" میں نے کہا۔

غالب نے سرد آہ بھر کے کہا "زمانہ ہی ایسا ہے۔ لوگ گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں ضرورت کے وقت۔"

"نوجوان! تم اپنا دھیان سڑک پر رکھو اور ٹیکسی کی رفتار پر رکھو" میں نے متانت سے کہا "بس یہی فاصلہ رہنا چاہئے ہمارے درمیان۔"

"اور اسے پتا نہیں چلنا چاہئے کہ ہم اس کا تعاقب کر رہے ہیں" غالب نے کہا۔

"وہ بیک ویو مرر میں سب دیکھ چکا ہوگا یا دیکھ لے گا" نوجوان نے تشویش سے کہا۔

"اگر ایسا ہوگا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ ٹیکسی ڈرائیور ہمیں ڈاج کر کے نکلنے کی کوشش کرے گا" میں نے کہا۔ "ٹیکسی ڈرائیور گلیوں کے شارٹ کٹ سے اور پیچ در پیچ راستوں سے واقف ہوتے ہیں۔"

"لیکن یہ بدمعاش کہاں جا رہا ہے آخر؟"

"اگر یہ بات ہمیں معلوم ہوتی تو ہم پہلے سے وہاں توپ اور ٹینک لے کر اس کا استقبال کرنے کے لئے موجود ہوتے" میں نے کہا۔

جو نقشہ محمد خان نے مجھے سمجھایا تھا وہ میرے ذہن میں تھا چنانچہ مجھے اپنی اور سراج کی منزل ایک ہی نظر آ رہی تھی۔ اگر وہ رہنمائی کے لئے آیا تھا تو اسے حسن اتفاق قرار دیا جا سکتا تھا اور وہ ہمیں اپنے پیچھے لگا کے کسی دام فریب کی طرف لے جا رہا تھا تو یہ ہماری شامت اعمال تھی۔ وہ ایک فریب کار شکاری تھا جس کی کسی چال کو سمجھنا آسان نہ تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ آخری وقت تک انجان بنا رہے اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اچانک فائرنگ سے کار کے ٹائر یا ہمارے جسم چھلنی کر کے نکل جائے چنانچہ غیر سنجیدہ باتوں میں مصروف رہنے کے باوجود میں ایک لمحے کے لئے بھی سراج کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا اور متوقع جوابی کارروائی کے لئے بالکل تیار تھا۔

اچانک کار دوڑتے دوڑتے لڑکھڑانے لگی۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا۔

"سر... ٹائر فلیٹ ہو گیا" لڑکے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"اور یہ فلیٹ نہیں ہو سکتا تھا جب ہم آبادی میں تھے یا کچھ دیر انتظار نہیں کر سکتا تھا" میں نے جھنجھلا کے کہا۔

www.paksociety.com

لڑکے نے کہا "میں ابھی... دو منٹ میں ٹائر بدل دیتا ہوں۔"

"دو منٹ؟" میں نے دور نظروں سے اوجھل ہوتی ٹیکسی کو دیکھ کے سرد آہ بھری "دو منٹ میں تو بندہ فرش سے عرش پر پہنچ جاتا ہے۔"

طلب نے نوجوان کی مدد کی اور دو کے بجائے پانچ منٹ میں ٹائر واقعی بدل گیا مگر میرے حوصلے کا ٹائر بدستور فلیٹ رہا۔ ٹیکسی اتنی دیر میں نہ جانے کہاں پہنچ چکی تھی۔ سراج کسی کوشش کے بغیر بچ کے نکل گیا تھا اور قسمت کی رخنہ اندازی نے ہماری امیدوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔

ہم دوبارہ روانہ ہوئے تو لڑکا خاصا شرمندہ تھا جیسے ٹائر اس کی غلطی سے فلیٹ ہوا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

"اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی خدا کی۔"

"اب... کیا آپ واپس جائیں گے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "نہیں۔ آگے چلو۔ راستہ میں بتاؤں گا"

لڑکے نے کار کی رفتار پھر بڑھائی۔

میں نے کہا "اب جلدی کی ضرورت نہیں۔ آرام سے چلو۔"

دس منٹ بعد میں نے محسوس کیا کہ راستہ کچھ جانا پہچانا سا لگتا ہے۔ میں نے بہت سی نشانیوں کو شناخت کر لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ رابعہ کے ساتھ میں اسی راستے سے گزر کے واپس گیا تھا۔ کچھ آگے جاکے وہ علاقہ شروع ہو گیا جہاں... تک گودام ہی گودام پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سب بند تھے... دروازوں والی وسیع و عریض، ایک سی بے ہنگم اور بے ذوق عمارات تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ آخر میں اس ایک بیرک کو کیسے شناخت کروں گا جہاں میں نے رابعہ کے ساتھ شہلا اور اس کے بیٹے کو ایک شیشے کے تابوت میں دیکھا تھا۔

اس سڑک پر آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اتنی دیر میں صرف دو ٹرک ہمارے سامنے سے آئے تھے جو اوپر تک سامان سے لدے ہوئے تھے۔ گودام بھی ویران پڑے تھے۔ نہ کہیں چوکیدار تھے نہ سامان اتارنے چڑھانے والے مزدور۔ فولادی دروازے بند تھے اور احاطوں کے اندر ٹرک بھی خالی کھڑے ہوئے تھے۔ اس خاموش ویرانی کا سبب مجھے گھڑی دیکھ کے سمجھ میں آیا۔ آج اتوار تھا۔ کارخانے اور دفاتر بند تھے۔ چنانچہ گودام بھی سونے پڑے تھے۔ لوگوں کی آمد و رفت بھی موقوف تھی۔

اچانک سراج کو لے کر جانے والی ٹیکسی سامنے سے نمودار ہوئی تو میں نے غالب سے کہا "کیا خیال ہے اگر اسے روک لیں؟ یہ وہی ٹیکسی ہوگی۔"

غالب نے کہا "اچھا خیال ہے۔ سراج ڈرائیور پوچھیں گے کہ اس نے مسٹر ہیڈ ٹو ہیڈ کو کہاں اتارا ہے۔"

ٹیکسی ابھی ایک فرلانگ دور تھی کہ میں نے اس کا دروازہ کھولنے اور پھر کسی کو باہر چھلانگ لگاتے دیکھا۔ چھلانگ مارنے والا گرتے ہی قلابازی کھا کے اٹھا اور ایک دیوار کی طرف دوڑا جو سڑک کے متوازی چلی جا رہی تھی۔ پلک جھپکتے ہی وہ دیوار کے اوپر سے اندر کود گیا۔ ٹیکسی اب بھی سیدھی آرہی تھی مگر اس کی چال ایسی ہوتی تھی جیسے ڈرائیور نشے میں اسٹیئرنگ کو سنبھالنے میں ناکام ہے۔ مگر یہ کا اندازہ غالب نے بھی کر لیا تھا۔

جب میری نظر نے ڈرائیور کو اسٹیئرنگ پر سر رکھے دیکھا تو ٹیکسی بالکل سامنے آچکی تھی اور بہت زیادہ لہرانے لگی تھی۔ میں نے چلا کے کہا "کار کو روک لو" اور پھر دروازہ کھول کے باہر کود گیا۔ شاید غالب نے بھی کسی خطرے کی بو سونگھ لی تھی یا اس نے محض میری تقلید کی تھی۔ وہ کار کا دوسرا دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ میں نے سڑک پر گرتے ہی اٹھ کے بھاگنے کی کوشش کی مگر توازن برقرار نہ رکھ سکا اور منہ کے بل گرا۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوف ناک دھماکا سنائی دیا اور ایک لمحے کے لئے میرا جسم مفلوج ہو گیا کیونکہ یہ صرف گاڑیوں کے تصادم کی آواز نہیں تھی۔ یہ بم کا دھماکا تھا۔ اگر میں گرا نہ ہوتا تو اتنے کم فاصلے پر ہونے کی وجہ سے مارا جاتا یا شدید زخمی ہوتا۔ قدرت نے مجھے بال بال بچایا تھا۔

حواس بحال ہوئے تو میں پھر اٹھ کے بھاگا۔ میرا مقصد اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ دور ہونا تھا۔ دھماکے نے گاڑیوں کے پرخچے اڑا دیے تھے اور گولی کی رفتار سے سفر کرنے والے لاتعداد دہکتے ہوئے تیز دھار والے فولادی ٹکڑے میرے سر کے اوپر سے گزر گئے تھے۔ میں نے غالب کو بھی باہر کودتے ضرور دیکھا تھا مگر اس کے بعد کی مجھے خبر نہ تھی۔ اب میں نے پلٹ کے دیکھا تو مجھے وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ سڑک کے درمیان میں کار اور ٹیکسی کے شعلے ڈھانچے کسی الاؤ کی طرح جل رہے تھے۔ اسی الاؤ میں ایک نوجوان بھی جل رہا تھا جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ شوق میں اپنے باپ کی گاڑی لے کر نکل آیا تھا۔ موت نے اسے ہمارے راستے پر پہنچایا تھا اور ہم اسے ایک پراذیت مرگ ناگہاں تک لے آئے تھے۔ ہم تنہا آزاد تھے کہ خطرہ محسوس کرتے ہی جان بچانے کی کوشش میں کامیاب رہے وہ اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھے پھنسا ہوا تھا کہ فوراً نہ نکل سکا اور تصادم سے بچنے کی کوشش ناکام کی نذر ہو گیا۔

"غالب!" میں نے چیخ کے کہا اور اس طرف دوڑا جدھر غالب گرا تھا۔ وہ سڑک کی دوسری جانب ہی جا سکتا تھا۔ یہ خیال میرے دل میں دکھ کا نشتر بن کے اترنے لگا تھا کہ شاید غالب کو اتنی مہلت نہیں ملی ہوگی جتنی مجھے ملی تھی۔ مجھے تو ایک حادثے نے بچایا تھا۔ میں منہ کے بل گرا تھا اور محفوظ رہا تھا۔

سڑک کو عبور کرتے ہی میں نے پھر غالب کو آواز دی اور جب وہ اچانک ایک درخت کے تنے کی اوٹ سے نکل آیا تو میں اس کی طرف دیوانہ وار بڑھا۔

"تو... ٹھیک ہے؟" میں نے اسے بانہوں کے کہا۔

غالب کی آنکھوں میں وحشت تھی اور اس کی نظریں شعلوں اور دھوئیں کے مرغولوں پر جمی ہوئی تھیں "مجھے... مجھے پتہ نہیں ہوا۔"

"چل یہاں سے نکل جائیں" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ غالب میرے ساتھ چل پڑا۔ ہم دونوں کے جسموں پر معمولی خراشوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ غالب کو ایک درخت نے بچا لیا تھا جو چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ اس برگد کے درخت کا تنا کئی فٹ چوڑی ڈھال بن گیا تھا۔ مجھے صورت حال کی سنگینی کا احساس تھا۔ دھماکا یقیناً دور دور تک سنا گیا ہوگا مگر جو لوگ گوداموں کے اندر ہوں گے وہ باہر نکلنے اور یہاں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ چوکیداروں کے علاوہ بہت سے مزدور بھی احاطے کے آس پاس کی جھونپڑیوں میں آباد تھے۔ شاید خالی نظر آنے والے ٹرکوں میں ڈرائیور کلینر سو رہے ہوں گے۔ لوگوں نے دو پولیس والوں کو حادثے کے بعد فرار ہوتے دیکھا تو انہیں شک ہوگا۔ یہ سوچ کے میں نے سڑک سے زیادہ سے زیادہ دور جانے کی کوشش کی اور اپنی کوشش میں کسی حد تک کامیاب رہا۔ ہم نے سڑک سے شمالی سمت میں دوڑنا شروع کیا اور چند منٹ بعد اس دیوار تک جا پہنچے جس کو ٹیکسی سے کودنے والے نے عبور کیا تھا۔

"وہ ادھری گیا تھا" میں نے کہا "وہ سراج کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"کسی کو باہر چھلانگ لگاتے میں نے بھی دیکھا تھا۔ مگر کیا معلوم وہ سراج ہی تھا یا کوئی اور تھا" غالب نے کہا "مجھے تو ایک سایہ سا نظر آیا تھا اس دیوار پر۔"

میں نے ایک پتھر پر بیٹھ کے سگریٹ نکالی... مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ آج چھٹی نہ ہوتی تو شاید ٹریفک میں شامل ہو کے ہم خود کو اس کی نظروں سے اوجھل رکھتے۔ مگر اس وقت تو ایک ہی کار تھی" میں نے بڑے دکھ کے ساتھ سر ہلایا۔

"وہ... بیچارا نوجوان! ہماری وجہ سے مارا گیا" غالب نے دل گرفتہ لہجے میں کہا "یہ کہنا کتنا آسان ہوگا کہ اس کا وقت پورا ہو گیا تھا اور اسے یہاں ایسے ہی مرنا تھا۔ لیکن ویسے مرنا کتنا مشکل ہو گیا ہوتا ہے۔ جس کی عمر ابھی مرنے کی نہ تھی۔ جو صرف زندگی کی خوبصورتی کے بارے میں سوچتا ہوگا۔ ہم سے ملنے کے بعد بھی اس کے دل سے موت کے خیال کا گزر تک نہ تھا۔"

"سراج نے ہمارے قتل کی سازش کی تھی لیکن ہم بچ گئے اور وہ مارا گیا جس کے بارے میں ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کون تھا۔ ورنہ..."

"ورنہ کیا؟ کیا ہم یہ اطلاع دیتے جاتے اس کے ماں باپ کو؟" غالب نے تلخی سے کہا "کہ جاؤ فلاں جگہ سے اپنے لخت جگر کی سوختہ لاش اٹھا لو۔ اس سے زیادہ آسان تو میرے لئے اعتراف جرم ہوگا۔ خواہ اس کی سزا کوئی بھی ہو۔"

"یہ میرے لئے بھی ناممکن تھا کہ میں جیتے جاگتے انسان کو جلا کے مار سکوں۔ مگر اس وقت سراج میرے سامنے آجائے تو خدا کی قسم میں اسے باندھ کر اس پر پیٹرول چھڑک سکتا ہوں اور آگ لگا کے اس کے مرنے کا تماشا دیکھ سکتا ہوں" میں نے سگریٹ کو مسل دیا۔ اس کا ذائقہ مجھے خون جیسا لگا تھا۔ اس کے دھوئیں میں جلتے ہوئے لہو کی بو تھی۔

"سکندر!" غالب دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا "کیا تو نے دیکھا تھا کہ اس ٹیکسی کو ایک لاش چلا رہی تھی؟"

"مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا جس طرح وہ اسٹیئرنگ پر سر رکھے آگے جھکا ہوا تھا اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ڈرائیور زندہ نہیں تھا۔"

غالب نے دور اٹھتے والے دھوئیں کی لکیر کو دیکھا "سراج نے اسے مار کے ڈرائیور کی سیٹ پر بٹھا دیا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ پھر اسٹیئرنگ کسی اور نے سنبھالا۔ یہاں تک کہ ٹیکسی عین کار کے سامنے پہنچ گئی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اب ٹیکسی سے کار کے تصادم کو بچانے کی گنجائش ہی نہیں رہی تو وہ خود باہر کود گیا۔ وہاں سڑک بھی تنگ تھی۔"

"دس منٹ میں یہ سب کیسے ممکن ہوا غالب؟"

"اس میں مشکل کیا تھی" غالب نے کہا "سراج نے تعاقب کرنے والی ایک کار کو دیکھا ہوگا تو پلان اس نے راستے میں بنایا ہوگا۔ وہ انجان بنا ایسے ہی نہیں بیٹھا رہا تھا۔ اس کا شیطانی دماغ کام کر رہا تھا۔ ٹیکسی جیسے ہی رکی ہوگی اس نے ڈرائیور کا کام تمام کر دیا ہوگا۔ پھر اس نے اپنے کسی ہوشیار آدمی کو دستی بم دے کر ٹیکسی میں بٹھا کے روانہ کر دیا ہوگا۔ بے ہوش ڈرائیور نے یا اس کی لاش نے ٹیکسی کے ایکسیلیریٹر کو دبائے رکھا اور ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے صرف اسٹیئرنگ سنبھالا۔ آج تو سڑک بھی خالی تھی۔ اسٹیئرنگ چھوڑنے کے بعد اس نے دستی بم کی پن نکالی اور بم وہیں چھوڑ کے خود باہر چھلانگ لگا دی۔ دستی بم پانچ سیکنڈ کے بعد پھٹتا ہے۔ پانچ سیکنڈ میں وہ خود خطرے کی حد سے باہر ہو گیا تھا۔ پانچ سیکنڈ میں ٹیکسی کار سے ٹکرا گئی۔"

"ہاں۔ جیسے ہی اس نے چھلانگ لگائی تھی، ٹیکسی لہرا کر کار کے سامنے آگئی تھی" میں نے اس سے اتفاق کیا "ہم تو کود گئے مگر وہ نوجوان پہلے تو کچھ سمجھا ہی نہیں ہوگا پھر اس نے کوشش کی ہوگی کہ کار کو ایک طرف سے بچا کے نکال لے مگر اس کی گنجائش نہیں تھی۔ نہ اتنی جگہ تھی اور نہ اتنی مہلت۔"

غالب نے کہا "وہ آدمی بہت پھرتیلا تھا۔ سراج خود بھی کم پھرتیلا نہیں ہے لیکن ایسے کام وہ خود کیوں کرے گا۔ اس کے لئے کام کے غلام جو ہیں۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کے کہا "اس کا مطلب یہ ہے سراج کہ وہ کہیں بہت ہی قریب موجود ہیں۔"

www.paksociety.com

"ہاں۔ انھیں دھماکے سے بھی خبر مل گئی ہوگی اور جو شخص اس کام کے لیے منتخب کیا گیا تھا وہ بھی پہنچ گیا ہوگا۔ اس نے بھی بتا دیا ہوگا کہ سراج صاحب کی اسکیم کامیاب رہی۔ دشمن مارے گئے۔"

میں نے کہا "سراج یادا اور اتنی آسانی سے ماننے والے نہیں ہیں۔ وہ تصدیق ضرور کریں گے۔"

غالب نے کہا "ہو سکتا ہے کہ وہ تصدیق کی ضرورت محسوس نہ کریں۔ شک کی گنجائش ہی کہاں ہوگی۔ یقین دلانے والا تم دھماکے کے گواہ، ٹیکسی اور کار بالکل سامنے آ کے ٹکرائی تھیں اور جب دھماکا ہوا تھا تو دشمن کار ہی میں تھے۔ اس نے ہمیں باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔"

"پھر تو ہم اس صورت حال سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں" میں نے کہا "اگر ہم اچانک پہنچ جائیں تو انھیں سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ ابھی تو وہ اس یقین کی خوشی منا رہے ہوں گے کہ ان کی جان ہم سے چھوٹ گئی۔"

"تمھیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ جگہ کس طرف ہے اور کتنی دور ہے؟" غالب نے پوچھا۔

میں نے سوچ کے کہا "یار! کیوں نہ ہم بھی اسی دیوار کو پھاند جائیں۔"

غالب نے کہا "اب کیا فائدہ۔ دس منٹ میں وہ نہ جانے کہاں پہنچ گیا ہوگا۔ وہ یہاں چھپ کر بیٹھا نہیں رہ سکتا۔"

میں نے کہا "غالب! وہ اندھا دھند نہیں بھاگا ہوگا۔ اسے معلوم ہوگا کہ اس دیوار کے..... دوسری طرف کوئی خطرہ نہیں۔ یہاں سے نزدیک ترین پناہ گاہ تھی جہاں وہ خود کو محفوظ تصور کر سکتا تھا۔ سمجھتا ہوگا کہ اس راستے سے وہ بڑی آسانی سے فرار ہو جائے گا۔ میں اندر جا کے ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ بھی ان کا ایک ٹھکانا ہے یا ادھر سے ہم بھی کوئی راستہ تلاش کرتے ہیں۔"

میری دلیل نے غالب کو قائل کیا۔ دیوار دس فٹ اونچی تھی۔ میں نے اچھل کے اوپر کے کنارے کو گرفت میں لینے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ پھر غالب نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں جکڑ کے ایک جھولا سا بنایا جس پر پاؤں رکھ کے میں نے خود کو اوپر اٹھایا اور دیوار پر ہاتھ جما کے آہستہ آہستہ اپنے جسم کے وزن کو کھینچا۔ غالب نے مجھے نیچے سے سہارا دیا اور احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے سر کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور احاطے کے اندر جھانک کے دیکھا۔ بائیں جانب لکڑی کے ٹوٹے پھوٹے کریٹ ایک ڈھیر کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔ بائیں جانب ایک ریلوے پلیٹ فارم بھی تھا۔ ریلوے لائن پر مال گاڑی کے چار ڈبے کھڑے ہوئے تھے مگر پلیٹ فارم خالی تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مال اتارا جا چکا ہے یا ابھی پہنچا ہی نہیں ہے۔ دائیں جانب اس کے پیچھے ایک گودام تھے جن کے دروازوں پر نمبر پڑے ہوئے تھے اور اوپر "گلاب پلاسٹک اینڈ چینٹ انڈسٹری" کا نام لکھا ہوا تھا۔ جہاں سے میں جھانک رہا تھا وہ گودام کا آفس بلاک تھا۔ پانچ چھ کمروں پر مشتمل یہ عمارت احاطے کی دیوار سے آٹھ دس فٹ دور تھی اور اس کے عقبی حصے کی سب کھڑکیاں بند تھیں۔ اس کے عین مقابل گیٹ تھا جہاں مجھے چوکیدار کے خالی کیبن کے علاوہ قطار میں کھڑے ہوئے چھ خالی ٹرک بھی نظر آ رہے تھے۔ ان سب کی سائیڈ پر بھی گلاب پلاسٹک اینڈ چینٹ انڈسٹری کا نام لکھا ہوا تھا۔ بہت غور سے دیکھنے پر بھی مجھے کہیں نقل و حرکت کے آثار دکھائی نہ دیے۔

خدا کا نام لے کر میں دیوار پر چڑھ گیا۔ اگر کوئی کسی گودام کی کھڑکی یا کسی روشن دان سے دیکھ رہا تھا تو روشن آسمان کے پس منظر میں میرا وجود اس کے لیے ایک بہت آسان ٹارگٹ تھا لیکن کسی بھی سمت سے نہ کسی نے مجھے للکارا اور نہ کوئی گولی مجھے گرانے آئی تو میں نے ہاتھ بڑھا کے غالب کو بھی اوپر کھینچ لیا اور کوئی آہٹ کیے بغیر ہم دونوں اندر اتر گئے۔

آفس بلاک کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے ہر بند کھڑکی کے شیشے سے اندر جھانک کے دیکھا۔ ایک کمرے میں چار میزیں اور کچھ کرسیاں کسی ترتیب کے بغیر رکھی ہوئی تھیں۔ میزوں کی حالت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں منشی ٹائپ کے لوگ بیٹھتے ہوں گے جو آنے اور جانے والے مال کا حساب رکھتے ہوں گے۔ کمرے میں دو ٹیلی فون بھی تھے لیکن کسی قسم کی آرائش نہیں تھی۔ یہاں تک کہ دیواروں کا رنگ بھی برسوں پرانا اور میل سے کالا ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں جانب دو کمرے تھے وہ ریکارڈ روم نظر آتے تھے۔ ان میں دیواروں کے ساتھ لگی ہوئی فولادی الماریاں کھڑی ہوئی تھیں اور جتنے شیلف تھے ان پر بے ہنگم و بد صورت فائلوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ آخری دو کمرے فی الحال کسی کام نہیں آ رہے تھے چنانچہ ریسٹ ہاؤس بنے ہوئے تھے۔ ان میں چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں اور بستر لپٹے ہوئے رکھے تھے۔

ہم گھوم کے سامنے گئے تو ایک طویل برآمدہ نظر آیا۔ ایک شخص خاکی وردی پہنے کمر سے ریوالور لٹکائے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرا اس کے قریب زمین پر بیٹھا اپنے ایک پاؤں کے ٹخنے پر پٹی باندھنے میں مصروف تھا۔ تکلیف کے آثار اس کی صورت سے عیاں تھے۔ میں نے غالب کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال و جواب کر کے ہم نے ایک دوسرے کے خیال کی تائید کی۔ پاؤں کی مرہم پٹی کرنے والا شخص وہی تھا جس نے ٹیکسی کو کار سے ٹکرانے کے لیے چھوڑ کے خود سڑک پر چھلانگ لگا دی تھی اور پھر دیوار پھاند گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر خراشیں تازہ تھیں اور شاید اس کے پاؤں میں بھی موچ آ گئی تھی۔

ہم نے ان میں سے کسی کو سنبھلنے کی مہلت نہ دی۔ میں اور غالب ایک جست میں ان کے سر پر جا کھڑے ہوئے۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے اٹھنے کی اور ریوالور نکالنے کی واجبی سی کوشش کی۔ لیکن غالب کے ریوالور کا رخ اپنی طرف دیکھ کے اور پولیس کی وردی پر نظر ڈال کے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اپنے ٹخنے پر پٹی باندھنے والا صورت سے زیادہ عیار نظر آتا تھا۔

اس نے ماتھے پر بل ڈال کے اپنی کنجی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا "یہ کیا بدمعاشی ہے؟ چھٹی والے دن چھاپا مارنے آئے ہو اور وہ بھی چوروں کی طرح۔ آپ کے مطلب کی یہاں کوئی چیز نہیں ہے تھانے دار صاحب۔"

میں نے غرا کے کہا "مطلب کی چیز ہم پیدا بھی کر لیتے ہیں اور نکال بھی لیتے ہیں۔"

غالب نے سر ہلایا "مثلاً یہ جو چیز تم نے رکھی ہوئی ہے ہمارے مطلب کی ہے" اس نے پاؤں پر پٹی باندھنے والے کی طرف اشارہ کیا۔

کنجی آنکھوں والے نے غالب کو خون فشاں نظروں سے گھورا "فضول باتیں مت کرو۔ یہاں نہ اسمگلنگ کا مال ہے نہ چوری کا۔ اور تم کو شک ہے تو سیٹھ سے بات کرو پہلے۔"

میں نے لات گھمائی "سیٹھ سے بھی بات کر لیں گے۔ پہلے تم سے تو تعارف ہو جائے۔"

وہ لڑھک کے چبوترے سے نیچے جا پڑا۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن غالب نے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے روک دیا۔ میں نیچے کود گیا۔ میں نے اس کے ٹخنے پر ٹھوکر ماری "سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔" کنجی آنکھوں والا بڑی مشکل سے اٹھا "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمھارے پیر میں موچ کیسے آ گئی؟"

اس کے رد عمل نے میرے شک کو یقین میں بدل دیا کہ وہی اصل مجرم ہے۔ وہ پہلے چونکا تھا مگر فوراً سنبھل کے انجان بھی بن گیا تھا۔ تاہم میرے سوال نے اسے خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔

"یہ... ٹھوکر لگنے سے پاؤں مڑ گیا تھا۔"

میں نے اسی پاؤں پر دوسری ٹھوکر ماری۔ "ٹوٹا تو نہیں ہے؟"

وہ بلبلایا "ایسے... ایسے تو ٹوٹ جائے گا۔"

میں نے کہا "انشاء اللہ۔ اب غور سے یہ فرماؤ کہ کہیں دیوار سے کودتے ہوئے تو یہ موچ نہیں آئی تھی؟ یا کسی چلتی ہوئی کار سے چھلانگ مارنے سے تو پیر نہیں مڑا تھا؟"

وہ درد سے کراہ رہا تھا اور ایک پاؤں پر لڑکھڑا گیا تھا "مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

میں نے اسے اوپر اٹھا کے چبوترے پر بٹھا دیا اور اس کی زخمی ٹانگ پکڑ لی "میں آسان زبان بول رہا تھا اور سوال تم نے سنا تھا۔ اب مجھے جواب چاہیے۔"

آہستہ آہستہ میں نے اس کے ٹخنے پر لپٹی ہوئی پٹی کو کھولنا شروع کیا۔ اس نے میری نیت کا اندازہ کرتے ہوئے مزاحمت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ سے ایک ایسا تھپڑ رسید کیا کہ وہ چبوترے پر لیٹ گیا۔ "میں کم سے کم وقت میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ سراج کہاں ہے" میں نے اس کے پاؤں کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ خود بھی دائیں بائیں کروٹیں لینے لگا اور ہائے ہائے کرنے لگا "میں کسی... سراج..."

"ہاں.... تم سراج کو نہیں جانتے۔ تم مجھے بھی نہیں جانتے" میں نے اس کے ٹخنے کو ایک جھٹکا دے کے موڑا۔ اس نے ایک چیخ ماری۔ درد کی شدت کا اظہار اس کے چہرے پر نظر آنے والی اذیت سے ہوتا تھا "ہائے میں مر گیا۔"

میں نے کہا "مرنے میں ابھی دیر ہے۔ ابھی تمھارے اس پیر کے جوڑ الگ ہوں گے۔ تمھارا پنجہ گھوم کے پیچھے ہو جائے گا اور پھر تمام عمر ایسے ہی رہے گا جیسے چڑیل کے پاؤں ہوتے ہیں" میں نے اس کے پاؤں کو مزید بل دیا۔

وہ زمین پر ہاتھ مارتے ہوئے تڑپا۔ اس کا جسم پٹخنے لگا مگر پنجے پر میری گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ ٹانگ نہ چھڑا سکا۔

"بولو.... سراج کہاں ہے؟ ورنہ اس پاؤں کے بعد دوسرے پاؤں کی باری ہے پھر دونوں ہاتھوں کی" میں نے کہا۔

کرسی پر بیٹھا ہوا شخص چلانے لگا "تھانے دار جی! یہ مر گیا تو؟"

"تو کیا؟" میں نے سوال کیا "کیا فرق پڑے گا تمھیں؟ مجھے یا اس دنیا کو.... یا سراج کو؟" میں نے محسوس کیا کہ کنجی آنکھوں والا جسمانی اذیت برداشت کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے تھا جو مر جاتے ہیں مگر لب نہیں کھولتے۔ یہ آزمانے کے لیے میں نے ایک آخری جھٹکا دیا۔ اس کے ٹخنوں کی ہڈیاں کڑکڑائیں اور اس نے ایک دل خراش چیخ مار کے مجھ پر حملہ کیا۔ اس کا پنجہ اب واقعی ٹانگ کے مضحکہ خیز انداز میں گھوم گیا تھا۔

میں نے اس کے منہ پر بھرپور مکا رسید کیا۔ وہ ایسے واپس گرا کہ اس کا سر فرش سے ٹکرایا۔ ذرا سی دیر کے لیے اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ بڑے بھیانک طریقے سے رو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے رال بہہ رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ اس کا چہرا پسینے میں تر تھا۔ کرسی پر بیٹھا ہوا شخص اس کی حالت پر دہشت زدہ بیٹھا تھا۔ میں نے اس کا دوسرا پاؤں پکڑ لیا۔

"سراج کہاں ہے؟" میں نے کہا "جس نے تمھیں ٹیکسی میں بھیجا تھا۔ ایک بم دے کر اور ایک ڈرائیور کی لاش دے کر کہ جاؤ اس ٹیکسی کو اس کار سے ٹکرا دو" میں نے اس کے دوسرے پاؤں کو تھوڑا تھوڑا گھمانا شروع کیا مگر وہ آ... [illegible]

www.paksociety.com

زیر ہونے والا شخص نہیں تھا اور مجھے یہ اندیشہ لاحق ہونے لگا تھا کہ اس کی قوتِ برداشت میرے ارادوں کو شکست دے سکتی ہے۔"

وہ پاگلوں کی طرح چیخنے اور مجھے گالیاں دینے لگا لیکن میں نے پروا نہیں کی۔ اس کی ضد نے مجھے زیادہ سفاک بنا دیا تھا۔ ویسے بھی میں اس شخص کے ساتھ کوئی رعایت کیسے کر سکتا تھا جس نے ایک ساتھ بہت سے ایسے سنگین جرائم کا ارتکاب کیا تھا کہ ان میں سے ہر جرم کی سزا موت ہی ہو سکتی تھی۔ اس نے میری اور غالب کی جان لینے کی کوشش کی تھی اور ایک بے گناہ نوجوان کو زندہ جلا دیا تھا۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور کی لاش کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا تھا۔ وہ ایک عام ٹیکسی ڈرائیور تھا جس کا کوئی خاندان بھی ہوگا۔ جس کے لئے وہ ٹیکسی ذریعۂ معاش تھی۔ اور وہ میرے وطن کے غداروں کا ساتھی بھی تھا۔

دوسرا پنجہ ٹوٹنے سے پہلے وہ بے ہوش ہو گیا۔ اب اس کی لاتیں چبوترے سے نیچے لٹکی ہوئی تھیں اور پیر صرف پنڈلی کی کھال سے جڑے ہوئے الگ جھول رہے تھے۔ اس کی پتلون بھی پیشاب خطا ہو جانے سے گیلی ہو چکی تھی اور اس کی زبان دانتوں کے درمیان دبی رہ گئی تھی چنانچہ تھوک کے ساتھ خون بھی بہہ کر باچھوں سے گر رہا تھا۔

کرسی پر بیٹھا ہوا شخص اس کی حالت کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی بہت منت سماجت کی تھی اور ہاتھ جوڑے تھے لیکن نہ میں نے اس کی طرف دھیان دیا تھا اور نہ غالب نے۔ وہ کانپ رہا تھا اور ہمیں یقین دلانے میں مصروف تھا کہ وہ واقعی سراج کو نہیں جانتا۔

میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا "تم بھی نہیں جانتے سراج کو؟"

اس کی حالت غیر ہو گئی "آپ.... یو.... میرے کو بتاؤ وہ کون ہے۔ کیسا ہے۔ پھر میں بتاؤں گا۔ اگر میرے کو معلوم ہوئیں گا۔"

اچانک مجھے احساس ہوا کہ بنیادی طور پر میرے سوال میں ایک سقم تھا۔ یہ ضروری تو نہیں کہ یہاں بھی وہ سراج ہی کہلاتا ہو۔ یہ اس کا اصلی نام تھا جو صرف ہم جانتے تھے یا اس کے کالے دھندوں کے ساتھی۔ یہاں ضرور وہ کسی دوسرے نام سے مشہور ہوگا۔

میں نے کہا "یہ شخص ابھی کچھ دیر پہلے اس دیوار کو پھاند کے آیا تھا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "آیا تھا۔"

میں نے کہا "تم نے اس کے آنے سے ایک منٹ پہلے کوئی دھماکا بھی سنا ہوگا؟"

"سنا تھا... ابھی ہم بولیں گا۔ آپ کو سب بولیں گا۔ جتنا اپن جانتا ہے وہ بتائیں گا مگر آپ مہربانی سے اپن کو مت مارو۔ اپنا کسی کے ساتھ کوئی دھندہ نہیں ہے۔ اپن اس کو بھی

بہت بولا کہ سالا کسی لفڑے میں مت پڑ۔ اپن چوکیدار لوگ ہیں۔ چپ رہنے سے اپن کا کیا دھندا اگر یہ سالا شراب اور رنڈی کے واسطے اور چھوکری کا واسطے بہت گول مال کرتا۔"

میں نے کہا "اس کی سوانح حیات کے اوراق رنگین سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ' مختصر بات کرو۔ دھماکے سے پہلے اس نے کچھ بتایا تھا نہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ ادھر سے آیا۔ اندر آ کے بولا کہ سب خلاص ہو گیا۔ پھر ادھر آ کے اپن کو بولا کر ابھی یہ آخری چانس تھا۔ اب اپنا سالا دو تین پیٹی کا اور بھاگ جائیں گا۔ ادھر اپنا لالا....."

"ماسٹر کو کولی مارو۔ یہ بتاؤ اس نے فون کسے کیا تھا؟"

"اپن کو نہیں معلوم بابا۔ قسم۔ ورنہ اپن بتاتا۔ اس نے ادھر بیٹھ کے بولا "ابھی سالا اپنا لاٹری نکل گیا۔ سیٹھ اپن کو بولا کر پانچ منٹ میں دس ہزار بنائیں گا؟" اپن بولا۔ ایک دم بنائیں گا۔ سیٹھ بولا کہ ڈریں گا تو مریں گا۔ اپن بولا کہ اپنا ماتک ایک بار مریں گا۔ ڈریں گا تو دس بار مریں گا۔ تم کام بولو۔ اس نے کام بولا۔ اور ابھی اپن اکھا کام خلاص کر کے آیا ہے "ہم پوچھا کہ کس کو خلاص کیا ہے؟ یہ بولا کہ اپن کو نہیں معلوم۔ اپن کام کیا۔ اب ادھر تم اسامنے دس ہزار لیں گا۔ سیٹھ بولا کہ تم ادھر ٹھہرو۔ ہم آ تا پڑا ہے۔"

"سیٹھ یہاں آ کے دس ہزار دینے والا تھا؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا "یہ ایسا ماتک ہی بولا تھا۔"

میں نے تشویش سے غالب کی طرف دیکھا "اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ آنے ہی والا ہوگا۔ تم سیٹھ کو جانتے ہو؟"

اب اس نے نفی میں سر ہلایا "ہاں قسم۔ ادھر اپنا واسطے تو سب سیٹھ ہے۔ تم بھی سیٹھ ہے۔"

میں نے کہا "اچھا اندر چلو۔ اسے بھی اٹھاؤ۔"

وہ چلانے لگا "تم اپن کو اندر لے جا کے گولی ماریں گا۔"

میں نے کہا "اگر تم نے تعاون نہیں کیا تو میں واقعی گولی ماروں گا۔ جلدی کرو۔ اٹھاؤ اسے۔ کہیں سیٹھ نہ آ جائے۔"

اس نے اپنے ساتھی کو گھسیٹ کر اٹھانے کی کوشش کی اور پھر گھسیٹ کے اندر لے گیا "سالا کاہے کو دس ہزار کا واسطے لفڑا کیا۔ ابھی کیا سالا تیرے کو۔ بول" وہ خود کلامی کے انداز میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نہ سن سکتا ہے اور نہ جواب دے سکتا ہے۔

میں نے کہا "یہ دوست ہے تمہارا؟"

اس نے کہا "دوست سالا کون ہوتا ہے کسی کا۔ یہ اپنا ساتھی ہے۔ یہ بھی چوکیدار ہے۔ اپن بھی چوکیدار ہے لیکن اپن چوری کا دھندا نہیں کرتا۔ یہ چوری بدمعاشی سے مال کمایا کدھر گیا وہ مال؟ سب بدمعاشی میں چلا گیا۔ ابھی خود اتنا تکلیف میں ہے تو مرتا کیوں نہیں سالا۔"

میں نے کہا "تمہیں بہت احساس ہے اس کی تکلیف کا"

اس نے کہا "اپن کیا کرے؟ یہ سالا ایسا لولا لنگڑا ماتک کیسے جئیں گا۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔ ایسی زندگی سے موت بہتر ہوگی۔ ویسے بھی اس کے لئے سزائے موت ناگزیر تھی۔ تمہاری خاطر میں اس کی تکلیف ختم کر دیتا ہوں۔"

میں نے ٹوٹے ہوئے پنجوں والے شخص کا سر ایک ہاتھ میں بالوں سے پکڑ کے تھوڑا سا اٹھایا اور اس کی گردن پر دوسرے ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی ماری۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ نیم تاریک کمرے کی خاموشی میں ہڈی کے چٹخنے کی آواز یوں سنائی دی جیسے کسی نے خشک ٹہنی کو توڑ دیا ہو۔ اس کے جسم نے ایک جھٹکا لیا اور ساکت ہو گیا۔

"یہ تم.... کیا کر دیا؟" چوکیدار نے بے خیالی میں کہا۔

"وہی جو تم چاہتے تھے۔ وہی جو اس کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ یہ قاتل تھا۔ سزائے موت سے کیسے بچ سکتا تھا" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

دور باہر سے کسی نے کار کا ہارن بجانا شروع کیا۔

غالب نے کہا "یہ شاید وہی سیٹھ ہوگا۔"

چوکیدار نے کہا "ابھی اپن... دیکھے گا..."

میں نے اسے گھور کے کہا "جا کے گیٹ کھول دو اور سیٹھ صاحب کو یہاں لے آؤ۔ اسے بالکل شک نہیں ہونا چاہئے۔"

غالب نے کہا "اگر اسے کچھ معلوم ہوا۔ یا ہمیں شک ہوا کہ تم نے اس سے کچھ کہا ہے تو ہم تمہیں بھی اسی طرح ختم کر دیں گے۔ ابھی تم مرنا تو نہیں چاہتے نا؟"

"ہاں قسم اپن کو مت مارو" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا "جیسا تم بولیں گا اپن ویسا ہی کریں گا۔"

کار کا ہارن پھر سنائی دیا۔ چوکیدار کمرے سے نکل کے آگے بڑھا۔ چبوترے سے اترا اور احاطے کو عبور کر کے گیٹ تک پہنچا۔ غالباً گیٹ کی جھری میں سے کسی نے اس کو آتا ہوا دیکھ لیا تھا کہ کار کا ہارن پھر سنائی نہیں دیا۔ چوکیدار نے ایک چھوٹی سی کھڑکی کھول کے جھانکنے کے بعد فولادی گیٹ کا ایک پٹ کھول دیا۔ میں اور غالب بڑی بے چینی سے اس سیٹھ کی صورت دیکھنے کے لئے ایک کھڑکی کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے شیشے سے باہر کا پورا منظر واضح ہوتا تھا مگر اندر کی تاریکی میں کوئی ہماری موجودگی کو نوٹ نہیں کر سکتا تھا۔

کار گیٹ سے آگے آئی تو میرا دل کامیابی کی خوشی سے دھڑکنے لگا۔ یہ وہی سابق ایس ایس پی سراج تھا جو اب ایک سفید رنگ کی کار میں ہمارے قاتل کو "انعام" دینے وہاں پہنچا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ انعام کیا ہوگا۔ وہ بے وقوف جو ہمارے ہاتھوں مارا گیا تھا اگر زندہ رہتا تو سراج کے ہاتھوں مارا جاتا۔ اس نے دس ہزار روپے کی لالچ میں اپنی موت کا خود سامان لیا تھا۔ سراج یہاں آ کے اس کی تصدیق کرتا کہ واقعی وہ سب مارے گئے جو اس کا تعاقب کر رہے تھے اور مطمئن ہو جانے کے بعد جیب میں ہاتھ ڈالتا۔ دس ہزار کے نوٹوں کی گڈی کے بجائے وہ ریوالور نکالتا اور صرف ایک گولی چلا کے کہتا کہ شاباش! تم نے تو کمال کر دیا مگر اب تمہارا زندہ رہنا میرے حق میں نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ پھر وہ دوسری گولی اس قتل کے عینی شاہد کو مارتا اور ہاتھ جھاڑ کے یہاں سے چلا جاتا۔

اس نے اپنی کار عین چبوترے کے سامنے روکی اور نیچے اتر کے چوکیدار کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ چوکیدار گیٹ کو بند کرنے کے بعد بڑے مردہ قدموں سے واپس آ رہا تھا۔ اس نے دوری سے اشارہ کرتے ہوئے سراج کو بتانے کی کوشش کی کہ وہ کمرے میں چلا جائے مگر سراج بہت مطمئن اور پُراعتماد تھا۔ وہ کوئی رسک لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ چنانچہ وہ چوکیدار کے ساتھ ہی اندر آیا۔

باہر کی روشنی کے بعد اس کی آنکھوں کو کمرے کی تاریکی سے مانوس ہونے میں چند سیکنڈ لگے۔ وہ دروازے سے گزر کے رکا۔ پھر اس کی نگاہ نے کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی لاش کو دیکھا۔

"یہ... اسے کیا ہوا ہے؟" سراج نے پلٹ کے کہا۔

اس وقت تک میں اس کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ شاید اپنی زندگی میں وہ کبھی اتنا حیران نہیں ہوا ہوگا جتنا مجھے وہاں دیکھ کے ہوا۔ کوئی آہٹ کئے بغیر میں اس کے اتنے قریب پہنچ گیا تھا کہ چاہتا تو آسانی سے اس کی گردن مروڑ سکتا تھا۔ حیرت اور صدمے کے بعد خوف نے سراج کو مفلوج کر دیا تھا۔

"تم....؟" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

میں نے مسکرا کے کہا "کیا تم کسی اور سے ملنے کے لئے آئے تھے؟"

اب دوسرے گوشے کے اندھیرے سے غالب بھی سامنے آ گیا "ہو سکتا ہے یہ مجھے گرفتار کرنے آئے ہوں؟"

آہستہ آہستہ سراج کی صورت پر مایوسی پھیل گئی۔ ریوالور نہ میرے ہاتھ میں تھا اور نہ غالب کے مگر سراج بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا اور میرا کوئی مقابلہ نہیں۔ اس نے ریوالور نکالنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کوشش کا انجام کیا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ وہ ریوالور نکالتا' میں اس کا ریوالور کی طرف بڑھنے والا ہاتھ توڑ دیتا۔

"جیسا کہ انگریز کہتے ہیں کہ یہ دنیا بہت مختصری جگہ ہے۔ دیکھ لو ہم کتنی جلدی پھر مل رہے ہیں۔" میں نے کہا "آج تم بڑے موقع سے آئے ہو سراج۔ ہمیں تمہارے جیسے ہی کسی آدمی کی ضرورت تھی۔"

سراج نے نفرت سے زمین پر مردہ پڑے ہوئے شخص کی طرف دیکھا "تو اس کتے نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

میں نے کہا "اب تم اسے انسان کہو یا کتا.... کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ شخص مردہ گوشت اور ہڈیوں کا ایک بے حس ڈھیر ہے

جو بہت جلد ڈی کمپوز ہو کے مٹی میں مل جائے گا۔ موت سب کو برابر کر دیتی ہے۔ اشرف المخلوقات اور حشرات الارض سے لے کر ہاتھی، شیر، ہوا میں اڑنے والے جانور اور سمندر کی مخلوق، پودے اور درخت سب خاک میں مل جاتے ہیں۔ کیسا دھوکا دیتی ہے موت آدمی کو... تم کسے مروانا چاہتے تھے اور مارا کون گیا؟ اور جنہیں اب تم خود مارنے آئے تھے وہ پہلے ہی ہمارے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ اجل کا اگلا شکار کون ہوگا؟ یہ فیصلہ وقت خود کرے گا۔"

سراج کا رنگ اڑ گیا تھا۔ شاید اس کی عقل ماؤف ہو گئی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اپنی جان بچانے کی کیا تدبیر کرے۔ اپنی کیا صفائی پیش کرے اور کس طرح ہمیں قائل کرے کہ وہ بے قصور ہے... اس میں جھوٹ بولنے کی ہمت بھی باقی نہ رہی تھی۔

غالب نے کہا "تم انعام کے دس ہزار روپے لائے ہو؟"

سراج چونکا "کیسا انعام؟"

میں نے کہا "جو تم اس کرائے کے قاتل کو اس کی بے مثل کارکردگی پر دینا چاہتے تھے۔ اس نے واقعی غیر معمولی ہمت، ذہانت اور پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اگر اسے چند سیکنڈ کی تاخیر ہو جاتی تو بم اس کے ہاتھ میں ہی پھٹ جاتا یا یہ خود بھی ڈرائیور کی لاش کے ساتھ ہماری کار میں گھس جاتا۔"

سراج نے کہا "میں سمجھا نہیں۔"

میں نے اس کے منہ پر ایک مکا مارا "تم سمجھے نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ تم واقعی بہت بھولے ہو... لیکن بہت جلد تم وہ سب کچھ سمجھ لو گے سراج جو آج تک تم نے نہیں سمجھا تھا اور کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ کہ جب وقت بدلتا ہے تو جو اندھیرے میں ہیں وہ اجالے میں آجاتے ہیں اور جو اندھیرے میں ہوتے ہیں وہ روشنی میں نظر آتے ہیں۔ ایسا پہلے بھی ہوا ہے کہ جو قید و سلاسل کے روز و شب کی سختی جھیل رہے تھے وہ انقلاب زمانہ سے مالک تخت و تاج ہوئے اور وہ جو صاحب تھے اور بادشاہی کے زعم باطل میں بھولے ہوئے تھے کہ ثبات... ایک تغیر کو ہے زمانے میں... وہ ان کی جگہ زنداں ہوئے۔ یہ بات تمہیں بہت فلسفیانہ لگی ہوگی مگر آج تمہیں دیکھ کے مجھے نمرود کی خدائی یاد آگئی۔ کیا تمہیں وہ وقت یاد ہے جب میں تمہارے اختیار اور اقتدار اور ظلم و ستم کی چکی کے دو پاٹوں میں پس گیا تھا؟ اس رات میں ملزم تھا اور تم منصف بھی تھے اور جلاد بھی۔ آج ایک انگریزی محاورے کے مطابق۔ تم میرے جوتوں میں ہو اور میں تمہارے جوتوں میں۔"

سراج نے آستین سے وہ خون صاف کیا جو اس کا ہونٹ پھٹ جانے سے نکلا تھا "گویا تم اب انتقام لے رہے ہو مجھ سے؟ ضرور لو۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ تم بچ نہیں سکو گے۔"

میں نے اس کی فضول دھمکی کو نظر انداز کر دیا "غالب! ایس ایس پی صاحب کی جامہ تلاشی لو۔ ان کے کپڑے اتار کے جیسا کہ تھانے میں ہوتا ہے۔ میں اس جگہ کو ایم آر ایس کا تفتیشی مرکز قرار دیتا ہوں۔"

"میں نہیں ڈرتا کسی تفتیش سے۔ ایس پی سکندر صاحب" سراج نے تلخی سے کہا اور خود اپنے کپڑے اتار کے غالب کی طرف پھینک دیئے۔

"مجرم کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ دو" میں نے کہا "چوکیدار سے پوچھو یہاں کوئی رسی ہے۔"

غالب باہر گیا اور چند منٹ میں لوٹ آیا۔ اس نے ایک چارپائی سے پیروں کی جانب والی نائیلون کی رسی کھول لی تھی جو چارپائی کی بنائی کو ٹائٹ رکھنے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ یہ تقریباً دس گز لمبی رسی تھی۔

"ہمارے پاس بہت وقت ہے اور اتفاق سے آج چھٹی بھی ہے چنانچہ کسی کی مداخلت کا کوئی امکان نہیں" میں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس میں پنکھے کا خالی ہک نظر آرہا تھا۔

سراج نے کہا "دیکھو... یہ سب غیر ضروری ہے۔ تم کو جو کچھ پوچھنا ہے پہلے ایسے ہی پوچھ لو۔"

"تم ایسے ہی بتادو گے؟" میں نے کہا "چلو ٹھیک ہے، آسان کام کو مشکل طریقے سے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے اسے دونوں کمروں کی درمیانی کھڑکی کے ساتھ کھڑا کر دیا اور باقی رسی کو اس کی کمر کے گرد اور کھڑکی کے زنگ آلود آہنی سلاخوں کے ساتھ ایسے باندھ دیا کہ اب وہ صرف سیدھا کھڑا رہ سکتا تھا۔ اس کے لئے سانس لینے کی گنجائش تھی مگر وہ جسم کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ رسی کے آخری سرے کو میں نے سراج کی گردن کے اوپر سے یوں گزارا کہ اس کا سر دو سلاخوں کے درمیان پھنس گیا۔ رسی اتنی ٹائٹ نہیں تھی کہ اس کی سانس کی نالی پر دباؤ پڑتا مگر وہ سر آگے جھکاتا تو پڑتا۔

"ایس پی صاحب، میرے سوالات اتنے مشکل بہرحال نہیں ہیں جتنے آپ کے حکم پر مجھ سے پوچھے گئے تھے۔ ایک اور فرق یہ ہے کہ میں ان سوالات کے جوابات واقعی نہیں جانتا تھا ورنہ جو مجھ پر اپنے وطن پہنچتے ہی تھانے میں ایک رات بیتی تھی، وہ میرے لئے ناقابل تصور اذیت تھی اور میری قوت برداشت سے بہت زیادہ تھی۔ تم سوالوں کے جواب دے سکتے ہو کیونکہ تمہیں سب معلوم ہے۔ تم آسانی سے ابھی سب کچھ بتا سکتے ہو اور اگر اپنی قوت برداشت آزمانے کا ارادہ ہے تو اپنے آپ کو میری جگہ تصور کرو اور سمجھو کہ یہ ویسی ہی ظلم کی رات ہے۔"

سراج نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "میں کہہ چکا ہوں کہ جو معلوم ہوگا ضرور بتاؤں گا۔ مگر یہ سب کیوں؟"

میں نے اس کے سامنے جا کے کہا "داور کا مال یہاں سے کب روانہ ہوگا؟ اس میں کتنے ٹرک ہوں گے اور وہ کہاں جائیں گے؟"

"ابھی داور سے مال نہیں" سراج نے ہکلا کے کہا۔ "ابھی... ورنہ چلا جاتا۔"

غالب نے مجھے ایک رسی کا ٹکڑا پیش کیا جو چار تہوں کو آپس میں بل دے کر بنانے سے ایک انچ موٹا رسا بن گیا تھا۔

"سرکی! چھ نمبر کا چھتر بننے میں وقت لگے گا۔ آرڈر ابھی دیا ہے" غالب نے کہا "ایک چھ نمبر کا اور ایک سات نمبر کا چھتر بنے گا؟"

"چلے گا" میں نے ایک گز کے رسے کو ہوا میں شائیں شائیں گھماتے تعریفی انداز میں سراہا "پہلے اس کو پانی میں بھگو کے لاؤ۔"

سراج چلانے لگا "میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔"

میں نے ادھر ادھر دیکھ کے ایک ہوائی چپل اٹھائی "یہ سات نمبر اور یہ بھی سات نمبر۔ ہمارے تھانے میں چودہ نمبر کا چھتر وہی کام کرتا ہے جو تمہارا روایتی چھ نمبر والا" میں نے اسے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک چپل اٹھا کے دکھائی اور پھر اس کے گالوں پر پے در پے دونوں جانب سے وار کئے۔ چٹاخ چٹاخ کی آواز کے ساتھ سراج کا منہ دائیں بائیں ہوتا رہا۔ اس کے گال سرخ پڑ گئے۔

"کچھ یاد آیا کہ میں نے کیا پوچھا تھا؟" میں نے چپل پھینک کے سگریٹ جلائی اور ایک طویل کش لیا۔

"جو... جو بات میں نہیں جانتا... وہ مر کے بھی نہیں بتا سکتا" اس نے کراہ کے کہا۔

میں نے اس کے دونوں جلتے ہوئے گالوں پر ایک دم سگریٹ رکھ کے دبادی۔ وہ تڑپا اور بلبلایا۔ میں نے پھر سگریٹ جلائی اور اس کے دوسرے گال پر رکھ دی۔ گالوں کے درمیان دو گہرے، سرخ خونی گڑھے سے نمودار ہو گئے۔

"تمہاری یادداشت بہت جلد بحال ہو جائے گی۔ تمہیں یاد آجائے گا کہ مال کب جائے گا۔ کتنے ٹرکوں میں ہوگا اور ٹرک کس راستے سے جائیں گے" میں نے دوسری سگریٹ جلائی۔

غالب نے مجھے رسی کا بھیگا ہوا ٹکڑا پیش کیا جو اب ایک سخت کوڑا بن چکا تھا۔

"افسر کو تکلیف دیتے ہو؟" میں نے غالب کو ڈانٹا "کوئی کام خود بھی کر لیا کرو۔"

"آپ حکم کرو جناب۔ میں چمڑی اور گوشت ہڈی سے الگ کر کے رکھ دوں" غالب نے کہا اور گھوم کے پوری قوت سے سراج کے جسم پر وار کیا۔ سراج تڑپ کے چلایا۔ رسی نے اس کے گوشت پر ایک خونی لکیر بنا دی تھی۔

"بڑی نازک کھال ہے ایس پی صاحب کی" غالب نے کہا۔

میں نے افسرانہ شان بے نیازی کے ساتھ سگریٹ کا کش لے کے سراج کی طرف دیکھا "ہاں بھئی، اپنے سراج صاحب! کیسا لگتا ہے آپ کو؟ کل جو مجرم تھا وہ آج تھانے دار ہے۔ اور آپ جو اتنے بڑے افسر تھے زیر تفتیش ہو۔ اسی مجرم کے سامنے۔"

"میرا خیال ہے ایس پی صاحب کی کھال ضائع نہیں کرنی چاہئے۔ ایسے ہی اتار لیتے ہیں۔ میں اپنی گھر والی کے لئے جوتے بنوالوں گا۔"

"بے وقوف! حرام جانور کی کھال کے جوتے پہنائے گا اسے" میں نے کہا "اس کی کھال میں صرف بھس بھرا جاسکتا ہے۔"

سراج کی حالت غیر ہونے لگی تھی "خدا کے لئے... رحم کرو"

میں نے کہا "رحم کی درخواست کے ساتھ سوالوں کے جواب ہوں تو غور کیا جاسکتا ہے۔"

غالب نے دوسری طرف سے ایک اور وار کیا۔ شائیں کی آواز کے ساتھ ہی سراج کی چیخ نکلی اور اس کے جسم پر دوسری خونی لکیر ایسے بن گئی کہ ایک کراس نظر آنے لگا۔ اس کا سر ڈھلک گیا۔ میں نے بال پکڑ کے اس کے سر کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ سچ مچ بے ہوش ہے یا مکر کر رہا ہے، سگریٹ اس جگہ رکھ دی جہاں کراس کی دونوں لکیریں ملتی تھیں۔ وہ ایک دم اچھلا اور اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا سیلاب امڈ آیا۔

میں قہقہہ مار کے ہنسا "ابھی تو کچھ نہیں ہوا سراج۔ سوچو، اس نوجوان نے کیسی اذیت برداشت کی ہوگی جو اپنی ہی کار میں زندہ جل گیا۔ تم اندازہ کر سکتے ہو کہ جسے تم نے دس ہزار کے انعام کا لالچ دے کر بھیجا تھا اس کی موت کتنی پر عذاب تھی۔ دیکھو اس کی لاش کو۔ یہ آدمی کہاں کہاں سے ٹوٹ چکا ہے۔ صرف دس ہزار کے جھوٹے وعدے پر اس نے اپنی جان دے دی لیکن کچھ بتایا نہیں۔"

"اگر یہ کچھ بولتا تو شاید بچ جاتا" غالب نے کہا "مجرم تو یہ بھی تھا مگر مجبور بھی تھا۔ تم مجبور نہیں جابر ہو۔ جرم تم نے کیا تھا۔ تمہارے لئے رعایت نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میرے پہلے سوال کو ذہن میں رکھو اور دوسرا سوال سنو۔ گولڈن فالکن۔ ستائیسویں میل بلیو ٹرہ۔ یہ ایک معمہ ہے۔ کیا تم اس کا مطلب جانتے ہو؟"

سراج نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے اور... اور کچھ بھی بتاؤ تفصیل سے..."

"تفصیل ہی تو میں پوچھ رہا ہوں تم سے" میں نے کہا۔ "تمہارے پاس سوچ کر جواب دینے کے لئے پانچ منٹ ہیں۔"

میں غالب کے ساتھ باہر آیا تو مجھے وہ چوکیدار نظر آیا جس نے ہم سے تعاون کیا تھا۔ اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو رہا تھا اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے خلا میں گھور رہا تھا۔ وہ اتنا دہشت زدہ تھا کہ اس میں ہم سے کوئی سوال پوچھنے کا حوصلہ بھی نہ رہا تھا۔ ورنہ وہ ضرور پوچھتا کہ آخر یہ سب کیا ہے۔

www.paksociety.com

"مرزا غالب! کیا خیال ہے اب؟"

غالب نے کہا "اس کو پہلے سوال کا جواب معلوم ہونا چاہئے۔"

میں نے کہا "وہ ایک بزدل آدمی ہے۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو بتا دیتا مگر اس دوسرے سوال کے بارے میں میں زیادہ پُر امید ہوں۔"

"چلو کیا پوچھو پہلے۔"

"مجھے ایک بالٹی چاہئے یا ڈرم۔"

"بالٹی" غالب نے کہا "وہ رہی بالٹی!" اس نے ایک اسٹینڈ میں لٹکی ہوئی چار بالٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔ لال رنگ کی ہر بالٹی پر "فائر" لکھا ہوا تھا اور یہ آگ بجھانے کے اسباب میں شامل تھیں۔

میں نے ایک بالٹی کو خالی کیا جس میں ریت بھری ہوئی تھی اور پھر اندر پہنچا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے ہاتھ میں بالٹی دیکھ کے سراج نے فوراً سمجھ لیا ہوگا کہ اب کیا ہوگا۔

"اگرچہ تفتیش کے طریقے بہت بدل گئے ہیں" میں نے کہا "اور نئے طریقے زیادہ مؤثر بھی ہیں لیکن میں تم پر تمہارا ہی ایک واز آزمانے کو ترجیح دوں گا۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے میری خود اعتمادی، سرکشی اور قوت ارادی کو کس طرح شکست دی تھی؟"

سراج کی آنکھوں کی وحشیانہ بے قراری اور اس کی پُر خوف گھبراہٹ اعتراف کر رہی تھی کہ اسے بتا وہ وقت یاد ہے جب وہ طاقتور تھا اور میں بے بس۔ لیکن آج معاملہ برعکس تھا اور اسے کچھ بھی نام دیا جا سکتا تھا۔ کرنی کا پھل، قدرت کا انتقام، انصاف، گردش حالات، تقدیر کا کھیل۔ کہ جو کل شکاری تھے وہ آج اپنے ہی تیر کا شکار تھے۔

میں نے بالٹی سراج کے سر پر الٹی جلدی۔ اس کا سر بالٹی میں غائب ہو گیا۔ غالب اتنی دیر میں کہیں سے عمارتی سریے کے دو زنگ خوردہ ٹکڑے ڈھونڈ لایا تھا۔ ان میں سے ایک تین فٹ لمبا تھا اور دوسرا کچھ زیادہ تھا۔ باری باری میں نے اور غالب نے سریے کو بالٹی پر مارا۔ سراج کا جسم ہلا اور اس کی ٹانگیں متحرک ہوئیں مگر یہ حرکت بہت محدود رہی۔ اس کے جسم کو اور گردن کو رسی نے ایسے جکڑ رکھا تھا کہ وہ بالٹی کے اندر ہی سر مارنے اور چلانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"کچھ یاد آیا؟" میں نے اس کے قریب جا کے کہا۔

سراج نے مجھے ایک درجن کے قریب فحش گالیاں دیں مگر اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ میں نے اور غالب نے پھر بالٹی کو کوٹنا شروع کیا۔ ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ سراج دیوانوں کی طرح چیخنے لگا۔ بالٹی کی کرخت آواز سے ہمارے اپنے کان بھی خراب ہو رہے تھے۔ بند کمرے کے اندر یہ شور زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ چوکیدار کبھی اپنے ساتھی کی مسخ شدہ لاش دیکھتا تھا اور کبھی سراج کی طرف۔ وہ تشدد کی اس کارروائی کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا لیکن اس میں حوصلہ نہ تھا کہ ہمیں روکے یا ہم سے کچھ پوچھے۔

جب میں نے بالٹی ہٹائی تو سراج کا چہرہ بھیانک ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں میں گردش کرنے لگی تھیں اور وہ سر کو سیدھا رکھنے میں ناکام تھا۔ مشکل یہ تھی کہ جیسے آگے جھکاتا تھا تو رسی کا حلقہ اس کا گلا گھونٹنے لگتا تھا اور پیچھے کرتا تھا تو اس کا سر دو آہنی سلاخوں سے ٹکراتا تھا۔

"دلاور کا اسلحہ کب جائے گا؟ کتنے ٹرکوں میں جائے گا؟ کس راستے سے جائے گا؟" میں نے سوال اس کے آگے دہرایا۔

"میں... نہیں... جا... جانتا" اس کی لڑکھڑاتی زبان …

"ہیجان لوگے۔ بس ایک آنچ کی کسر ہے" میں نے بالٹی اسے اڑھا دی۔ کمرا پھر شور سے گونجنے لگا۔ ہر ضرب کے ساتھ سراج کا جسم کرب سے بل کھاتا تھا اور وہ ذبح ہونے والے بکرے کی طرح چلاتا تھا۔ اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ اب وہ گالیاں نہیں دے رہا تھا۔ خدا اور رسول کے واسطے دے رہا تھا۔ رحم مانگ رہا تھا۔

جب بالٹی دوسری بار ہٹائی گئی تو وہ تقریباً بے ہوش تھا۔ اس کی زبان سے بے معنی الفاظ نکل رہے تھے۔ اسے اپنی آواز پر قابو نہ رہا تھا۔ اور اس کی زبان باہر نکل آئی تھی۔ آنکھوں میں اس رات کا نقشہ گھوم رہا تھا جب اس نے کہیں زیادہ بدتر حالت میری کی تھی۔ پرانی یادیں، پرانے زخم ہرے کر دیتی تھیں۔ اپنے والد مرحوم وزیر کا چہرہ بار بار میرے سامنے آتا تھا جو انہی سفاک، بے ضمیر، دل شیطانوں، درندہ صفت انسانوں اور ہوس زر کے بھوکے غداروں کے نرغے میں گھر گئے تھے۔ انہیں بے بسی کی موت مارنے کے بعد انہی بھیڑیوں نے مجھے گھیر لیا تھا اور تب سے آج تک یہ انسانیت کے … بربریت کے سب حربے آزما چکے تھے۔ میں، رابعہ اور اکرام، کل اور غالب۔ شہلا اور نازو۔ ایسے ان گنت … ان کے جسم کے ہر حصے کا نشانہ بنے تھے۔ اور ایسے … جو ان کے مذموم عزائم کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ … کے لئے میری لغت میں رحم یا رعایت کا لفظ شامل نہ تھا۔

غالب نے جھک کے سراج کے کان میں کہا "ڈولفن … کیا ہے؟ ستائیسویں میل کا کیا مطلب ہے؟" … وقتی طور پر وہ بہرا ہو چکا تھا مگر اس نے خاصی دیر کے بعد اپنے سر کو اقرار میں جنبش دی "پ..... پ..."

غالب نے رسی کھول دی۔ وہ دھڑام سے فرش پر … ہی جسم کی غلاظت میں گر گیا۔ اس کا اعصابی نظام … چکا تھا۔ جب غالب نے اسے پانی کا گلاس پکڑایا تو اس نے مشکل سے ہاتھ بڑھایا لیکن اس کا ہاتھ رعشے … رہا تھا کہ گلاس گر گیا۔ غالب نے تھوڑا سا بچا ہوا پانی …

… منہ میں انڈیل دیا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ میرے پاس کیمرا نہیں ہے ورنہ میں اس منظر کو محفوظ کر لیتا اور تصویر کی ایک ایک نقل وادوا ایجنٹ کمپنی کے ہر شکاری کو ارسال کر آتا جو تنظیم طاقت میں بزعم خود رستم دوراں اور غرور میں فرعون بے سامانی بنا پھرتا ہے۔ کہ دیکھو جب گرفت کا لمحہ قریب آتا ہے تو شیر کی طرح دہاڑنے والا ایس ایس پی بھی خارش زدہ پاگل کتے کی طرح خود اپنی ہی غلاظت کی ہولناک گندگی میں ایسے لوٹتا دکھائی دیتا ہے۔

چند ہی منٹ کے بعد سراج کی حالت اس قابل ہوئی کہ ٹوٹے ہوئے الفاظ میں ہمارے سوالوں کے جواب دے سکے۔ اسے اپنی زبان کی لکنت پر پورا قابو نہ تھا اور جو بات اس کے کانوں میں انڈیلی جاتی تھی وہ بہت دیر میں فلٹر ہو کے اس کے دماغ تک پہنچتی تھی۔ وہ اب ہمارے ساتھ جا کے ڈولفن کا اور طور ترہ کا پتا چلانے پر تیار تھا۔ میں نے غالب سے کہا کہ اسے کپڑے پہنا کے پھر انسان بنا دے۔ اس نے مزید عقل مندی یہ کی کہ اس کا لباس خود پہن لیا اور پولیس کی وردی اس کے جسم پر چڑھا دی۔

وہ چوکیدار جس نے ہم سے پوری طرح تعاون کیا تھا کمرے کے باہر دیوار سے لگا پتھر کے بت کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ جب میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اچھل پڑا۔

میں نے کہا "تم اچھے اور سمجھدار آدمی ہو۔ تمہارا ساتھی واقعی بے وقوف تھا جو لالچ میں مارا گیا۔ لالچ سے زیادہ اسے غلط کام میں، غلط لوگوں کا ساتھ دینے کی سزا ملی۔ تم کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

"اپن غریب آدمی..... اپن کدھر جائے گا صاب..."

میں نے کہا "تم اپنا کام کرتے رہو۔ جیسے پہلے کرتے تھے۔ سمجھ لو کہ تم نے کچھ نہیں دیکھا..." میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "اپن کیا بولے گا۔ اس لاش کو دیکھیں گا تو پولیس اپن کو پھانسی دے دیں گا۔"

میں نے اسے تسلی دی "فکر مت کرو۔ لاش ہم اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ تم صرف یہ سمجھو کہ جو کچھ آج ہوا اس کے بارے میں تم بھول کر بھی کسی سے بات نہیں کرو گے۔ لیکن اگر بھی تم نے کہا تو یہ راز تمہاری موت کا … ہم دوبارہ تم کو نظر نہیں آئیں گے۔ ہم سب۔ تم سے کوئی کیا پوچھے گا اور کیوں پوچھے گا؟ جب کوئی گواہ نہیں ہوگا۔ تم فرض کر لو کہ آج رات تم سوتے رہے۔ یہاں کوئی بھی نہیں آیا۔ تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم کہ تمہارا یہ ساتھی کہاں رہا۔"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔

میں نے اپنی چاروں جیبوں میں سے نوٹ اکٹھے کئے "یہ دس ہزار کی رقم ہے۔ یہ تمہارا انعام ہے۔"

وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گیا "نہیں... اپن کو معاف کرو۔"

میں نے کہا "ڈرو نہیں۔ یہ کسی غلط کام کا معاوضہ نہیں ہے یا رشوت نہیں ہے۔ کیا تمہیں پیسے کی ضرورت نہیں ہے؟"

اس کی مزاحمت کمزور پڑ گئی "اگر کسی کو مالوم ہو گیں گا!!"

میں نے کہا "کسی کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟ تم کہہ سکتے ہو کہ لاٹری نکلی ہے۔ یا سیٹھ نے انعام دیا ہے۔ راستے میں پڑے ہوئے ملے ہیں۔"

اس نے کانپتا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا اور نوٹوں کو مٹھی میں دبا لیا۔ اس کے لئے یہ بہت بڑی دولت تھی۔ اتنی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس کی خواہش بھی نہیں رکھتا تھا۔ یہ دولت اسے بن مانگے مل رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں وہ سارے خواب جاگ اٹھے تھے جن کو اس نے مجبوری کا کفن دے کے محرومی کے قبرستان میں دفنا دیا تھا۔ ایک دم اس نے نوٹوں کو سینے سے لگایا اور آنکھیں بند کر کے زیر لب کچھ کہنے لگا۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی "انہیں جیب میں رکھ لو اور ذرا ہماری مدد کرو۔ یہ لاش ڈگی میں ڈال دو۔"

اس نے تعمیل کی اور لاش کو ایک بوری میں پیک کر کے ڈگی میں اتنی احتیاط کے ساتھ رکھا جیسے وہ اپنے ساتھی کو قبر میں لٹا رہا ہو۔

غالب نے مجھے ایک آٹومیٹک ریوالور پیش کیا جس پر سائلنسر بھی لگا ہوا تھا "یہ مال غنیمت ہے" اور سراج کو پیچھے والی سیٹ پر دھکیل دیا۔

"بہت عمدہ چیز ہے" میں نے کہا "خصوصاً اس کا سائلنسر۔ اور کیا ملا؟"

غالب نے کہا "کچھ نہیں۔ ایس پی صاحب صرف وہی چیز ساتھ لائے تھے جس کی ضرورت درپیش تھی۔ کسی جیب میں ایسی کوئی چیز نہیں جو غلطی سے بھی کسی کے ہاتھ لگ جاتی تو شناخت کا سبب بن جاتی۔"

چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ میں نے ڈرائیونگ کا فریضہ غالب کو سونپا اور خود اپنی تھانے دار کی وردی میں ملزم کے ساتھ بیٹھ گیا۔ گاڑی ابھی باہر بھی نہ نکلی تھی کہ مجھے ایک اور خیال آیا۔

میں نے غالب سے انگریزی میں کہا "کیا اس شخص کا زندہ رہنا ہمارے لئے خطرے کا سبب نہیں ہوگا؟"

غالب سمجھ گیا کہ میں نے ایسا کیوں کہا ہے "یہ بے ضرر نظر آتا ہے مگر پھر بھی چشم دید گواہ ہے۔ ہمیں شناخت کر سکتا ہے۔"

"اچھا تم ٹھہرو۔ میں یہ کام بھی نمٹا لوں۔ اسی ریوالور سے۔" میں نے سراج کا ریوالور اس کے چہرے کے سامنے لہرا کے کہا۔

سراج اب تقریباً نارمل تھا چنانچہ اس نے ہماری باتیں بڑے غور سے سنی تھیں۔ کن انکھیوں سے میں نے اس کی توجہ کو تاڑ لیا تھا۔ نیچے اتر کے میں چوکیدار کی طرف بڑھا۔۔

www.paksociety.com

وحشت زدہ ہو کے چلانے لگا۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا "دیکھو! ابھی میں ایک فائر کروں گا۔ تم پر نہیں۔ نشانہ میں تمہارا لوں گا لیکن گولی تمہارے کندھے پر سے گزر جائے گی۔ تم چیخ مار کے گر جانا۔"

"لیکن کیوں.....؟"

میں نے کہا "تمہاری جان بچانے کے لئے۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو یہ شخص بعد میں آ جائے گا اور تمہیں پھر بھی مار جائے گا۔ شاباش۔ ڈرنا نہیں۔"

سراج کے ریوالور سے آواز نہ ہوتی چنانچہ میں نے اپنا ریوالور استعمال کیا۔ چوکیدار پر بے یقینی کا خوف طاری تھا مگر میں نے گولی چلائی تو اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور نیچے گر کے تڑپنے لگا۔ واپس لوٹتے ہوئے مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سراج نے کار کے پچھلے ونڈ اسکرین سے قتل کے اس حقیقی نظر آنے والے منظر کو دیکھ لیا ہے۔

"اب جلدی سے نکل چلو" میں نے سراج کے ساتھ بیٹھتے ہوئے دروازہ بند کیا "کہیں گولی کی آواز پر کوئی آ نہ جائے۔"

غالب نے کہا "اب آنے دو، ہمارا کوئی کیا بگاڑ لے گا۔ دیکھے گا تو ایس پی صاحب کی کار کا نمبر دیکھے گا۔"

سراج کچھ مایوس تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ چوکیدار کے قتل سے خوش نہیں۔ یقیناً اس کا ارادہ تھا کہ موقع ملتے ہی اس کو اغوا کرا لے اور اس سے ہمارے بارے میں پوچھے۔ اب چوکیدار بالکل محفوظ تھا۔

کافی آگے آ جانے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھا تو گیٹ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ چوکیدار نے عقل مند ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ وہ ہمارے رخصت ہوتے ہی اٹھ کھڑا ہوتا تو سارا معاملہ مشکوک ہو جاتا۔

شام کے سائے اب ڈھلنے لگے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی تو چار بج چکے تھے۔ میں نے صبح کے ناشتے کے بعد سے اب تک کچھ بھی نہیں کھایا تھا مگر مجھے بھوک کا خیال تک نہیں آیا تھا۔

"گاڑی میں پیٹرول ہے؟" میں نے کہا۔

غالب نے فیول میٹر پر نگاہ ڈالی "آدھا ٹینک ہے۔"

میں نے کہا "فل کرا لو۔"

"تم قیدی کا خیال رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ پیٹرول پمپ پر اس کا سائرن بجنے لگے" غالب نے کہا۔

میں نے سراج کی طرف دیکھا "فکر مت کرو۔ اس کے دل میں خیال بھی آیا کسی کو مدد کے لئے پکارنے کا تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔"

سراج سخت اذیت میں تھا۔ اس کے جسم پر جو زخم آئے تھے وہ تکلیف دے رہے تھے۔ رسیوں کے بل اس کے گوشت میں گڑ گئے تھے جن سے خون رس کر خشک ہو چکا تھا۔

غالب نے اس کی قمیص پتلون اور جوتے سب چھین لئے تھے یہاں تک کہ اس کی سنہری رولیکس گھڑی بھی چھین لی تھی اور بدلے میں اسے اپنی خستہ و خراب پولیس کی وردی دے دی تھی۔ غالب اس شاندار لباس میں واقعی کار کا مالک نظر آ رہا تھا اور مجھے اس پر رشک آنے لگا تھا۔ میں پولیس کی اس منحوس وردی سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔

سراج نے اس وقت بھی کچھ نہیں کیا جب میں نے غالب کو ایک سپر اسٹور سے کچھ فاصلے پر کچھ دیر کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ کم سے کم وقت میں اپنے لئے پینٹ شرٹ خرید کرنے کے بعد میں نے اندازے سے اپنے لئے اور غالب کے لئے دو ٹریک سوٹ بھی لئے اور دھوپ کے دو چشمے بھی۔ مجھے تھرمس نظر آ گئے اور غیر ملکی سگریٹ کے علاوہ وہ پائپ بھی مل گئی جو مجھے پسند تھی۔ دکان دار کا خیال تھا کہ میں تھانے داری کے اختیارات کے چیک پر ساری خریداری کر رہا ہوں چنانچہ وہ بادل ناخواستہ میرے احکامات کی تعمیل کر رہا تھا۔ جب میں نے ادائیگی کی تو وہ شرمندہ ہوا کیونکہ اس کا رویہ میرے ساتھ غیر مہذب نہیں تھا تو مہذب بھی نہ تھا۔

سراج نے ایک ڈرائیو ان ریسٹورنٹ میں بھی کسی ہنگامہ آرائی یا فرار کی کوشش سے اجتناب کیا۔ بظاہر وہ خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ چکا تھا اور نوشتۂ تقدیر سے لڑنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا۔ اس نے خاموشی سے ہمارے ساتھ چائے پی لیکن کچھ کھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے تھرمس کو چائے سے بھر لیا اور کھانے کا جو سامان بچا وہ ساتھ لے لیا۔ اس دوران غالب نے کار کی تلاشی لی اور یہ معلوم کیا کہ وہ کار "ورلڈ ٹن روپ انڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ" کے نام پر رجسٹرڈ ہے جو اسباب آرائش بنانے والا ادارہ تھا۔

شہر میں متعدد مقامات پر پولیس موجود تھی اور کئی بار ٹریفک سگنل پر بھی رکے لیکن سراج اسی شکست خوردہ ناامیدی کے ساتھ چپ بیٹھا رہا جو درحقیقت ایک دھوکا تھا۔ وہ موقع کے انتظار میں اس وقت تک رہا جب تک کہ اس نے ہمیں اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا یقین نہیں دلا دیا۔ یہ اسے پیٹرول پمپ پر ملا۔ غالب اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلا رہا تھا اور تقریباً پون گھنٹے بعد ہم شہر کے مضافات میں پونا جانے والی شاہراہ پر رواں تھے کہ غالب کو پیٹرول کا خیال آیا اور اس نے کار کو ایک پیٹرول پمپ پر موڑ لیا۔ غالباً سراج کو احساس ہوا کہ اس نے اب بھی کچھ نہ کیا تو یہ آخری موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔

اس نے ایک دم دروازہ کھول کے باہر چھلانگ لگانے کی کوشش کی اور چلانے لگا "بچاؤ..... بچاؤ۔"

میں اتنا غافل بھی نہیں تھا کہ اسے نکل جانے دیتا۔ ایک ہاتھ اس کی گردن کے پیچھے قمیص کے کالر پر پڑا۔ ایک سے میں نے اسے واپس کھینچا۔ دروازہ ابھی کھلا ہوا تھا۔

غالب نے کار کا ایکسیلیٹر دبا دیا۔ پائپ کو فیول ٹینک میں ڈال کے میٹر کو دیکھنے والا نوجوان اتنا بوکھلا گیا تھا کہ وہ پائپ نہ نکال سکا اور خود بھی اسی میں الجھ کے گرا۔ یکلخت پیٹرول پمپ کے سارے ملازم سراج کی چیخ پکار پر متوجہ ہو گئے تھے۔ دو کاریں بھی ہمارے پیچھے رکی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک نے ہمت سے کام لیا اور ہمارا تعاقب کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ریوالور نکال کے پہلے اس کا دستہ سراج کے سر پر مارا اور پھر ایک ہاتھ نکال کے پیچھے ایک فائر کیا۔ پیچھے آنے والی کار لہرا کے سڑک سے اتر گئی۔

غالب نے چلا کے کہا "دروازہ تو بند کر۔"

ابھی میں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کھلے دروازے کا پٹ ایک ٹرک کی سائیڈ سے ٹکرایا جسے غالب اوورٹیک کر رہا تھا اور ٹوٹ کے سڑک پر گر پڑا۔ سراج اب بے ہوش پڑا ہوا تھا لیکن کام بگڑ گیا تھا۔ اس کی ہنگامہ آرائی نے بہت سے لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا۔ فائرنگ سے مزید خرابی پیدا ہوئی کیونکہ اس شاہراہ پر ہم اکیلے نہیں تھے۔ ہمارے آگے پیچھے گاڑیوں کی قطار تھی جس میں ٹرک، بسیں اور کاریں سب ہی شامل تھے۔

غالب نے جائے واردات سے فرار ہونے میں ڈرائیونگ کی تمام مہارت اور حاضر دماغی سے کام لیا۔ بہت جلد ہم ان گاڑیوں کو پیچھے چھوڑ آئے جو آس پاس موجود تھیں لیکن خطرہ اب بھی ہمارے ساتھ تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ اس کار کا نمبر ان سب نے نوٹ کیا ہوگا جن کو ہم اوورٹیک کر کے آگے نکل آئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی پولیس کو اطلاع دے سکتا تھا۔ پیٹرول پمپ والے تو فون کر ہی چکے ہوں گے۔ اب تک پولیس نے آگے وائرلیس پر رابطہ قائم کر لیا ہوگا چنانچہ پولیس کسی بھی وقت آگے سے اچانک نمودار ہو کے ہمارا راستہ روک لے گی۔ یہ بڑا پریشان کن خیال تھا۔ مشکل یہ تھی کہ اب تک غالب کو راستہ بدلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ جب بالآخر ایک جگہ اس نے کار کو بائیں طرف موڑا اور ہم ایک نسبتاً تنگ سڑک پر آ گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے غالب کو ہدایت دینے سے گریز کیا تھا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ ان حالات میں اسے کیا کرنا چاہئے۔ اگر میں مداخلت کرتا تو اس کی یکسوئی میں فرق آتا اور اس کی قوت فیصلہ بھی متاثر ہوتی۔

ذیلی سڑک نہ جانے کہاں جاتی تھی۔ غالب نے شاید ایک دو بار عقب نما میں دیکھا کہ پیچھے سڑک صاف ہے، سامنے سے بھی کوئی نہیں آ رہا تھا چنانچہ اس نے کار کو کچے راستے پر اتار دیا۔ کار جھاڑ جھنکاڑ کو روندتی ایک منڈیر کو توڑتی ہوئی کیلوں کے ایک باغ میں جا گھسی۔ لمبے لمبے پتوں اور نازک تنوں والے درجنوں درخت گر گئے۔ اس سے پہلے کہ باغ کا مالی یا مالک نمودار ہوتا، میں نے سراج کو گھسیٹ کے باہر نکالا اور اپنے کندھے پر ڈال لیا۔

ہم نے ایک ساتھ واپس اسی سمت میں دوڑنا شروع کیا جدھر سے کار کچے راستے پر اتری تھی۔ سراج کے بوجھ کو اٹھا کے اس ناہموار راستے پر بھاگنا آسان کام نہ تھا۔ میرا سانس پھولنے لگا لیکن میں نے رفتار میں فرق نہ آنے دیا۔ غالب نے کار کی چابیاں نکال لی تھیں اور وہ بیگ بھی اٹھا لیا تھا جس میں میری شاپنگ کا سامان تھا۔ سڑک پار کرتے ہی اس نے یہ بیگ مجھے تھما دیا اور سراج کو مجھ سے لے لیا۔ اس بوجھ کو باری باری ڈھو کے ہم آدھے گھنٹے میں اس جگہ سے دو میل دور آ گئے جہاں اب کار لاوارث کھڑی ہوئی تھی۔ اب صرف کوئی ماہر کھوجی ہی ہمارے قدموں کے نشان دیکھ کے بتا سکتا تھا کہ جو لوگ کار میں تھے وہ آگے نہیں گئے ہیں۔ عام آدمی اور خود پولیس بھی اس کار کو دیکھنے کے بعد یہی رائے قائم کرتی کہ ملزم کیلے کے باغ میں روپوش ہوں گے یا سیدھے اسی سمت میں بھاگے ہوں گے۔

ہمارے چاروں طرف بھی کیلے اور ناریل کے باغ تھے۔ درمیان میں کہیں کہیں بے فصل زمین بھی آ گئی تھی جس پر خودرو نباتات کا قبضہ تھا۔ اب ہم دوڑ نہیں رہے تھے پھر بھی میری جسمانی قوت کا گراف زیرو پر آ چکا تھا۔ ایک جگہ میں گڑھے میں پیر پڑ جانے سے گرا تو سراج دور جا پڑا اور میں اس وقت تک نہ اٹھ سکا جب تک غالب نے مجھے سہارا دے کر نہیں اٹھایا۔

"اس..... حرامزادے نے..... مروا دیا تھا ہمیں" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

غالب نے سر ہلایا اور میرے قریب ہی بیٹھ گیا "کچھ دیر رک کر آرام کر لیتے ہیں یہاں....."

وہ ایک وسیع قطعۂ زمین تھا۔ جس پر ناریل کے درخت سیکڑوں کی تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ ان کے بلند اور چکنے تنے ان گنت ستونوں کی طرح تھے۔ بہت اوپر درختوں کے پھیلے ہوئے پتوں کا سبز رنگ آسمان کی نیلاہٹ کو نمایاں کر رہا تھا۔ کچے ناریل دیکھ کے مجھے احساس ہوا کہ میرا حلق کتنا خشک ہو رہا ہے لیکن ناریل کا قدرتی ٹھنڈا میٹھا مشروب ہماری دسترس سے بہت دور تھا۔ پانی آس پاس کہیں بھی نہیں تھا۔ تھرمس میں صرف چائے تھی جو میں نے شوقیہ بھروائی تھی۔ اس وقت مجھے اندازہ نہ تھا کہ ہمارا گزر کسی ویرانے سے ہوگا جہاں نہ پینے کے لئے کچھ ہوگا اور نہ کھانے کے لئے۔ ناگ پور بائی وے پر دس بیس میل کے فاصلے پر کوئی ریسٹورنٹ ضرور آتا تھا۔ دونوں طرف سے آنے والی اور چوبیس گھنٹے رواں رہنے والی ٹریفک سے یہ سڑک آباد رہتی تھی۔

سراج بڑے بے ڈھنگے پن سے زمین پر پڑا ہوا تھا لیکن میں نے اسے نظر میں رکھا۔ اس کی بے ہوشی کے فریب سے نمٹنے کے لئے میں نے ریوالور بھی دسترس میں رکھا۔ غالب سیدھا لیٹ کے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ نہ اسے کپڑوں کے مٹی سے خراب ہو جانے کا خیال تھا اور نہ کمر میں چبھنے

گھاس اور پتھریلی زمین کا۔ اس کی نظر بھی ناریل کے گچھوں پر تھی۔ پھر وہ ایک دم اٹھا اور پتھر تلاش کرنے لگا۔ اس نے تین پتھر پھینکے۔ ایک نشانے پر لگا اور ناریل ٹوٹ کے نیچے آگیا۔ غالب نے اسے باؤنڈری لائن کے فیلڈر کی طرح کیچ کرلیا اور اپنی اس کامیابی پر بچوں کی طرح کھلکھلا کے ہنسا۔

ناریل کا پانی دنیا کے اعلیٰ ترین مشروب سے زیادہ ولذیذ اور فرحت بخش ثابت ہوا۔ اس کی تازگی اور توانائی بخش مٹھاس نے صرف پیاس ہی نہیں بجھائی سکون اور سرور بھی عطا کیا۔ اس کے بعد چائے کی باری آئی اور دس منٹ بعد میری ساری تھکن وغیرہ غائب ہوگئی۔ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے میں نے غالب کو سراج پر نظر رکھنے کی ہدایت کی اور خود لیٹ کر اس نئی صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔

ہم نے ایک چھوٹی سی کامیابی حاصل کی تھی جو کسی بڑی کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی تھی۔ لیکن ہم اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئے تھے۔ فوری طور پر ہماری واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ سراج نے ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اور اینڈ کمپنی کے ٹرک اسلحہ لے کر کب روانہ ہوں گے اور کس راستے پر سفر کریں گے۔ شاید وہ خود بھی یہ بات نہیں جانتا تھا لیکن وہ میرے دوسرے سوال کا جواب جانتا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ یہ معلومات اہم ہوں گی۔ یہی معلومات حاصل کرنے کے لئے رابعہ اور نازو بھی نکلی تھیں۔ مجھے ان دونوں کی صلاحیت پر ذرا بھی شبہ نہ تھا مگر ان کا مشن ایک تفریحی دورے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ انہیں کسی قسم کا خطرہ مول لئے بغیر اور تحفظ کو مقدم رکھتے ہوئے محض زبانی پوچھ گچھ کرنی تھی اور لوٹ آنا تھا۔ شاید اب تک وہ واپس بھی آچکی ہوں گی۔ میں نے سوچا۔ محمد خان بھی لوٹ آیا ہوگا۔ لیکن ہم سراج سے حاصل ہونے والی معلومات کی تصدیق کئے بغیر واپس جا نہیں سکتے تھے۔ خیر اب ارادہ کرکے جانے اور وعدے کے مطابق واپس نہ آنے میں کوئی بات خلافِ معمول نہیں رہی۔ سب انتظار کرنے اور امید کے ساتھ مطمئن رہنے کی مجبوری کو قبول کرچکے ہیں۔ وہ سمجھ لیں گے کہ کچھ ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔

سراج کے کراہنے کی آواز پر میں اٹھ بیٹھا "شام ہورہی ہے مرزا جی۔ معلوم نہیں ہم کہاں ہیں۔"

"ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔"

"یار، اس مُردے کو اٹھا" میں نے کہا "یہ ہوش میں آئے تو اس سے کچھ پوچھیں۔"

غالب نے کہا "جب ہم روانہ ہوئے تھے تو میں نے آنے والی سڑک پر پہلا سنگِ میل دیکھا تھا۔ اس کے نیچے "بمبئی سات کلو میٹر" لکھا ہوا تھا۔ پھر میں نے سیدھے ہاتھ پر ایسے ہی آٹھ سنگِ میل اور شمار کئے تھے۔"

"اچھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم بمبئی سے ستائیس کلو میٹر دور آگئے ہیں۔"

"میں نے بیسوں سنگِ میل نہیں دیکھا۔"

"لیکن ہم کہیں اس کے قریب ہی ہیں" میں نے کہا "مین روڈ سے ہم کتنا اندر آئے تھے؟"

"شاید دو کلو میٹر" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "دو کلو میٹر تو زیادہ نہیں ہوتے۔ ہم پیدل واپس جاسکتے ہیں۔ سڑک سے دور رہتے ہوئے۔"

"اب تک پولیس الرٹ ہوچکی ہوگی۔ ممکن ہے ہمارا حلیہ اور کار کا نمبر بھی وائرلیس پر مشتہر کردیا گیا ہو اور وہ ذیلی سڑک پر ہمیں تلاش کررہے ہوں" غالب نے کہا۔

"میں نے کہا ناکہ ہم سڑک سے دور رہیں گے۔ یہاں آخر کب تک بیٹھے رہ سکتے ہیں ہم؟" میں نے کہا "رات ہوگئی تو راستے کا بھی پتا نہیں چلے گا۔"

غالب نے کہا "اچھا چائے پی کے چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "یار، اس ایس پی کو بھی چائے پلا دے تاکہ یہ خود اپنے پیروں پر چلے۔ میری تو کمر ٹوٹ گئی ہے۔"

"دو کلو میٹر تو میں بھی اسے اٹھا کر نہیں جاسکتا" غالب نے کہا۔

سراج اب ہوش میں آنے لگا تھا۔ غالب نے اس کے حلق سے چائے اتاری تو اس کی حالت کافی بہتر ہوگئی۔ دس منٹ بعد وہ اٹھ بیٹھا اور احمقوں کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "بہت آرام کرلیا...... اب اٹھ کر کھڑے ہوجاؤ اپنے پیروں پر" سراج نے سر کو اس جگہ سے چھو کر دیکھا جہاں میں نے ریوالور مارا تھا اور آہستہ سے کراہا۔

میں نے کہا "خدا کا شکر ادا کرو کہ سر سلامت ہے۔ صرف اس لئے کہ تمہارے سر کے لاکر میں ہمارے مطلب کی کچھ معلومات محفوظ ہیں۔"

"یعنی یہ معلومات...... حاصل کرنے کے بعد...... تم مجھے مار دو گے؟" سراج نے کہا

"تم کیا توقع رکھتے ہو ہم سے؟" میں نے کہا۔

سراج نے کہا "بہتر ہے کہ تم مجھے ابھی مار دو۔ کیا فائدہ تمہیں کچھ بتانے کا۔"

"کچھ نہ بتانے کا نقصان تو ہوسکتا ہے تمہیں۔"

"کیا نقصان؟ تم جان سے زیادہ کیا لے سکتے ہو" وہ تلخی سے بولا "لے لو جب چاہو لے لو لیکن مجھ سے کچھ نہ مانگو۔ میں تمہیں اور کچھ نہیں دوں گا۔ تم کو میرے دماغ کے لاکر میں سے جو چیز چاہئے اسے کھول کے نکال لو۔ تمہیں اختیار ہے۔"

میں نے کہا "کیا تم سودا کرنا چاہتے ہو؟"

معلوم نہیں سراج میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی "ہاں۔ یہ میری زندگی کا سودا ہوگا۔ جو کچھ میں تمہیں بتاؤں گا وہ تمہارے لئے بہت اہم ہوگا۔ میرے لئے میری زندگی اہم ہے۔

تمہارے لئے شہلا کی زندگی اہم ہے۔ اس کی زندگی کے بدلے مجھے میری زندگی دے دو۔"

میں نے ریوالور اٹھایا "تم اتنے بااختیار نہیں ہو کہ سودا کرسکو۔"

اس نے بے خوفی سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "چلاؤ گولی۔ میں اب تیار ہوں۔ تم کو اگر یہ سودا منظور نہیں تو مجھے بھی کیا ضرورت ہے تمہیں کچھ بتا کے مرنے کی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا "تم مجھے بلیک میل نہیں کرسکتے۔"

"ہاں میں کچھ نہیں کرسکتا۔ لیکن میری مدد کے بغیر تم بھی کچھ نہیں کرسکتے۔ مجھے معلوم ہے کہ شہلا کہاں ہے اور اسے کیسے بچایا جاسکتا ہے۔ میں اپنے ساتھیوں سے غداری کروں گا۔ اس کے بدلے میں تم سے بھی کچھ نہ ملے تو میں یہ گناہ بے لذت کیوں کروں۔"

"فرض کرو میں تم سے جھوٹا وعدہ کرلوں۔ کہ اگر تم نے شہلا کو بچانے میں میری مدد کی تو میں اس بار تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا۔"

"ایسے نہیں سکندر! تم قسم کھاؤ گے...... تین بار...... ایک بار خدا کی...... دوسری بار وزیر خان کے اس خون کی جس کے لئے تم انصاف طلب ہو۔ اور......"

میں نے اس کے منہ پر لات ماری۔ "میرے والد کا نام مت لے اپنی گندی زبان سے...... کتے۔"

"اور تیسری قسم تم کھاؤ گے رابعہ کی محبت کی" سراج نے کراہتے ہوئے کہا "اس کے بغیر میں یقین نہیں کروں گا۔"

اچانک ہمارے پیچھے جنگل کی طرف سے پولیس کا سائرن سنائی دیا۔ خاموشی میں موٹر سائیکلوں کے انجن گرج رہے تھے۔ یہ پولیس تھی جو اب ہر طرف پھیل چکی تھی۔ شاید انہوں نے وہ کار دیکھ لی تھی جسے ہم چھوڑ آئے تھے۔ وہ ہم سے صرف دو کلو میٹر کے فاصلے پر تھے۔ ان کی جیپوں اور موٹر سائیکلوں کے لئے دس کلو میٹر کا علاقہ چھان مارنا بھی کوئی مشکل کام نہ تھا۔

سراج نے کہا "فیصلہ کرلو سکندر۔ تمہیں یہ سودا منظور ہے یا نہیں؟ تم شہلا کی جان بچانا چاہتے ہو نا۔"

میں نے محسوس کیا کہ سراج نے مجھے مجبور کردیا ہے۔ اب میں اس کو مار بھی نہیں سکتا۔ اگر میں گولی چلاتا تو وہ شکاری متوجہ ہوجاتے جو زیادہ دور نہیں تھے۔ پھر مجھے اس ریوالور کا خیال آیا جو مجھے غالب نے دیا تھا مگر سراج کی ملکیت تھا اور جس پر سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ فیصلہ میں پہلے ہی کرچکا تھا۔

میں نے ریوالور کا رخ سراج کی جانب کردیا "صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ تمہارے اپنے ریوالور کی گولی تمہاری جان لے لے گی۔"

سراج نے کہا "تم کو میری جان لینی ہے تو لے لو۔ بہانے کیوں تلاش کرتے ہو؟ جب میرے اور تمہارے درمیان

معاہدہ ہوگیا ہے......"

میں نے کہا "میں تمہارے وعدوں اور معاہدوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ تم انسانوں کے جس قبیلے سے تعلق رکھتے ہو وہ شیطان کے پیروکار ہوتے ہیں۔"

"اور ہم ان پر اعتبار کا رسک لیتے تو کب کے مرحوم و مغفور ہوچکے ہوتے" غالب نے کہا۔

میں نے سراج کو حکم دیا "اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور چلو۔"

سراج نے تعمیل کی "قانونی طور پر میری پوزیشن بھی وہی ہے جو تمہاری۔ میرے پاس بھی کوئی شناخت اور اس ملک میں داخلے کا قانونی اجازت نامہ نہیں ہے۔"

میں نے اسے پلٹ کر آگے دھکیلا "تمہارے مددگار تو یہاں ہیں جو تمہیں چھڑا لیں گے۔ ہمارا کون ہے؟"

سراج نے آگے چلتے ہوئے طنز سے کہا "دنیا میں جن کا کوئی نہیں ان کا خدا ہے۔ کیا تم اس فلسفے کے قائل نہیں؟ کیا رب؟"

میں نے کہا "یہ فلسفہ نہیں، عقیدہ ہے۔"

غالب نے کہا "یار، یہ پولیس ہے تو کیسی پولیس ہے۔ یہ آخر کس پر گولیاں چلا رہے ہیں؟ ایک دوسرے پر۔"

میں نے غالب کی بات پر غور کیا "پولیس بے سبب گولیاں ضائع نہیں کرتی۔ انہیں حکم ملتا ہے فائر کرنے کا تو فائر کرتے ہیں۔"

"اور حکم اس وقت ملتا ہے جب کوئی مقابلے پر ہو۔ یا انہیں نظر آرہا ہو کہ گولی نہ چلائی تو بھاگ جائے گا۔ پولیس اتنی غیر منظم اور بے مہار نہیں ہوسکتی۔"

میں غالب کی دلیل سے قائل ہوچکا تھا "ایسا لگتا ہے کہ پولیس کے ساتھ دوسرے شکاری بھی آئے ہیں۔"

"آئے کیا ہیں، وہی پولیس کو لائے ہیں" غالب نے کہا۔ "اور اب دھڑا دھڑ فائرنگ کرکے دہشت پھیلانے میں مصروف ہیں۔ احمق۔"

میں نے کہا "پولیس منع بھی تو کرسکتی ہے انہیں۔"

"جیسی روح ویسے فرشتے۔ پولیس ان کی خادم ہے اور وہ پولیس کے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خاموشی سے محاصرہ کرتے تو ہمارے اچانک...... پکڑے جانے کے امکانات زیادہ ہوتے لیکن اب تو وہ خود ہمیں خبردار کرتے آرہے تھے اور ان کے دوڑنے بھاگنے سے پیدا ہونے والی ہلچل ہمارے فرار کے راستے کا تعین کرنے میں مددگار ثابت ہورہی تھی۔ ہم اپنے پیچھے سنائی دینے والے شوروغل سے دور ہونے کی کوشش میں کھیتوں کے درمیان سے اور کیلے کے جنگل جیسے باغات سے گزرتے جارہے تھے۔ کھیت ویران تھے مگر کیلے کے گھنے درختوں میں نمی بہت زیادہ تھی۔ زمین کی مٹی زیادہ پانی سے کیچڑ جیسی ہورہی تھی جس میں ہمارے پیر دھنس جاتے تھے۔

ہم ایک چھوٹے سے قصبے کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ کوتاہ قامت کیکر کے درختوں کے عقب میں ایک طرف دیکھنے پر کسی مسجد کے دو سفید مینار نظر آتے تھے۔ مخالف سمت میں کسی مندر کا سنہرا کلس دھوپ میں چمک رہا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ شکاری ہمارے نقشِ قدم دیکھتے ٹھیک اسی سمت میں آ رہے ہیں جدھر ہم جا رہے ہیں... ہمارے اور ان کے درمیان ایک میل دور چلے آنے کے باوجود وہی فاصلہ تھا اور یہ ایک خطرناک بات تھی۔ یا تو ان کے ساتھ شکاری کتے تھے جو ہوا کے ساتھ ہماری بو سونگھتے آ رہے تھے یا ان کی راہنمائی پیشہ ور کھوجی کر رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی چلا کے کسی سے کہتا تھا "ادھر" یا شور مچا کے کسی کو منع کرتا تھا "ادھر نہیں"... بیشتر آوازوں کا مفہوم واضح نہیں تھا لیکن مقصد وہی تھا کہ لینا 'پکڑنا' دوڑنا' جانے نہ پائیں۔

کچی' نرم زمین اور کیچڑ میں ہمارے نقشِ قدم اتنے نمایاں تھے کہ از خود ہمارے دشمنوں کو ہمارا پتا دیتے تھے۔ سراج بڑے یقین کے ساتھ آگے دوڑ رہا تھا۔ اچانک ایک جگہ پہنچ کے وہ گھنے درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا "وہ اسی طرف آ رہے ہیں غالب!"

غالب نے کہا "بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں کہیں مورچہ بند ہو کے ان کا مقابلہ کرنا چاہئے۔"

میں نے مایوسی سے سامنے پھیلے ہوئے سپاٹ میدان کو دیکھا "ہم کب تک مقابلہ کریں گے۔ صرف دو ریوالور ہیں ہمارے پاس۔"

پھر میری نظر نے ایک کنواں اور رہٹ دیکھا۔ غالباً اسی کے ذریعے کیلے کے باغ کو پانی دیا جاتا تھا۔ اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ "غالب' ہم یہاں چھپ سکتے ہیں" میں نے کہا۔ "اس کنویں میں۔"

"کنویں میں!" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ جوتے اتار دو یہاں" میں نے اپنے پلان پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا "میں تھوڑا سا بائیں جانب جا کے واپس آتا ہوں۔ تم تھوڑا دائیں طرف نکل جاؤ۔ یہ جوتے ہمارا سراغ دے رہے ہیں۔ ان کے سول پر کیچڑ لگا ہوا ہے۔ انہیں گیلی زمین پر ہی پھینک دینا۔"

غالب نے میری بات فوراً سمجھ لی۔ اس کے دائیں جانب دوڑتے ہی میں نے سراج کو اپنے ساتھ دوسری سمت کھینچ لیا۔ تقریباً دو گز دور جا کے میں نے ایک پتھر پر قدم جمائے اور جوتے اتار کے پانی سے نرم ہو جانے والی زمین پر پھینک دیئے... جوتے باغ کے اندر دس گز دور جا کرے جہاں کیلے کے درختوں کی جڑوں میں پانی ٹھہرا ہوا تھا۔ پھر میں نے ایک جست لگائی اور باغ کی منڈیر کو عبور کرتا ہوا خشک زمین پر جا اترا۔ سراج نے میری تقلید کی۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح میں

وقتی طور پر اپنے پیچھے آنے والوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ وہ ذرا سی دیر کے لئے ضرور چکرا جائیں گے کہ ہم جوتے وہیں چھوڑ کے آسمان کی طرف پرواز کر گئے یا ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ لیکن ہم جن بھوت نہیں تھے۔ دشمن کو ہماری چالاکی کا اندازہ کرنے میں دیر نہ لگتی۔ آگے ہماری بقا کا انحصار اس کی رضا پر تھا جس کی رحمت نے ہمیں کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔

غالب مخالف سمت سے نمودار ہوا۔ اس وقت کیلے کے باغ میں ہلچل کے آثار بہت واضح ہو گئے تھے اور دشمن کسی بھی لمحے ہمارے سامنے آ سکتے تھے۔ پہل غالب نے کی۔ اس نے رہٹ کی رسی کو تھاما اور اس مضبوط سیڑھی پر قدم جماتا نیچے اترنے لگا جس میں اوپر سے پانی کی سطح کے اندر تک چمڑے کے ڈول بندھے ہوئے تھے۔ جب رہٹ چلتا تھا تو چمڑے کے ڈول پانی سے بھرے ہوئے نکلتے تھے اور اوپر اٹھتے جاتے تھے۔ اوپر والے بڑے پہیے پر سے گزرتے ہوئے ڈول اپنا سارا پانی ایک نالی میں الٹ دیتے تھے اور پہیے کی گردش کے ساتھ ساتھ خالی ہو کے دوسری طرف سے پھر پانی میں غوطہ لگانے کے لئے اتر جاتے تھے۔

غالب کے غائب ہوتے ہی میں نے سراج کو اشارہ کیا۔ وہ پریشانی اور تذبذب کا شکار تھا "میں... نیچے نہیں اتر سکتا۔"

"بکواس میں وقت ضائع مت کرو۔ اس میں کیا مشکل ہے۔ نیچے تک رسی کی سیڑھی ہے..."

"یہ بات نہیں... مجھے پانی سے ڈر لگتا ہے۔ ہائیڈرو فوبیا ہے مجھے..."

میں نے مشتعل ہو کے کہا "میں کچھ نہیں جانتا۔ ایسے نہیں اترو گے تم تو میں تمہیں کنویں میں پھینک دوں گا۔"

فوبیا ایک نفسیاتی خوف کی بیماری ہے۔ کچھ لوگ بلندی سے ڈرتے ہیں' کچھ بند دروازوں اور کھڑکیوں سے' کچھ خون بہتا نہیں دیکھ سکتے تو کچھ اندھیرے میں نہیں جا سکتے۔ سراج کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے لیکن میں اس کے ہائیڈرو فوبیا کو عین وقت پر اپنی موت کا سبب بننے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور کنویں کی منڈیر پر رک گیا۔ میں نے اسے پیچھے سے دھکا دیا۔ اس نے خود کو سر کے بل کنویں میں گرنے سے بچایا اور رسی کو پکڑ لیا۔ آنکھیں بند کر کے نیچے پانی کی چمک کو دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے سراج نے اپنے پاؤں ایک ڈول پر رکھے اور میرے لئے جگہ خالی کر دی۔

میں سراج کے ساتھ ہی اتر گیا۔ وہ مجھ سے صرف ایک ڈول یا ایک سیڑھی کے فاصلے پر تھا۔ غالب بہت گہرائی میں اتر گیا تھا۔ کنویں کا اوپر والا حصہ قدرے روشن تھا۔ گہرائی کے ساتھ ساتھ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ میں مٹی' گھاس اور کائی کی

ملی تیز مہک کو سونگھ رہا تھا اور ریوالور کو دانتوں میں دبائے دونوں ہاتھوں سے رسی پکڑ کے اپنا بوجھ سنبھال رہا تھا۔ میری نظر سراج پر تھی۔ اگرچہ وہ خوف زدہ تھا لیکن اس کا دماغ کام کر رہا تھا۔ اچانک اس نے ہاتھ بڑھا کے میری ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی۔

اگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا تو میں ریوالور سمیت اس کے اوپر سے گزرتا' کنویں کی دیواروں سے ٹکراتا ہوا سیدھا پانی میں جاتا اور شاید اپنے ساتھ غالب کو بھی لے جاتا۔ پھر وہ ہماری طرف سے بے خوف ہو کے بڑی پھرتی سے باہر نکل جاتا اور آوازیں دے کر ہمارے دشمنوں کو بتا دیتا کہ ادھر آؤ۔ جن کو تم ڈھونڈتے پھر رہے ہو وہ اس کنویں میں ہیں۔ اگر ڈوب کر مرے نہیں ہیں تو نکل لو یا اوپر سے پتھروں کی بارش کرو تاکہ وہ یہیں دفن ہو جائیں۔

لیکن سراج کو ناکامی ہوئی۔ میں نے اپنی ٹانگ بچائی اور پھر تیزی سے نیچے جا کے اس کے سر پر لات ماری۔ وہ اس جوابی کارروائی کے لئے تیار نہ تھا۔ جھٹکا لگا تو اس کے ہاتھ کی گرفت کمزور پڑ گئی اور رسی چھوٹ گئی۔ اس نے ایک چیخ ماری اور کنویں کی سائڈ سے ٹکرا کے نیچے گیا۔ میں نے اس کے پانی میں گرنے کا چھپاکا سنا اور اوپر دیکھا۔ کنویں کا کھلا حصہ ایک گول روشن دائرے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ہم بیس چالیس فٹ اوپر۔

پانی کا فاصلہ بھی شاید اتنا ہی تھا یا اس سے کچھ کم۔ جب سراج درمیان میں حائل نہیں رہا تو میں زیادہ تیزی سے نیچے اترا۔ شاید غالب نے سراج کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے گھبراہٹ اور دیوانگی کی مزید حرامی میں غالب کو بھی پانی میں کھینچ لیا تھا۔ سراج بری طرح چلا رہا تھا "ارے مر گیا میں!... او۔ اوف... میں ڈوب جاؤں گا۔"

میں نے کہا "غالب! اس کتے کی آواز بند کر۔"

"یہ... یہ تو مجھے بھی لے ڈوبے گا یار" غالب نے پانی میں غوطے کھاتے ہوئے کہا۔

پانی سے دو فٹ اوپر ٹھہر کے میں نے ایک ہاتھ سے رسی کو اپنی گرفت میں رکھا۔ دونوں پاؤں ڈول پر جمائے اور دوسرے ہاتھ میں وہ ریوالور لے لیا جو اب تک میرے دانتوں میں دبا ہوا تھا۔ میں نے اس کا دستہ سراج کے سر پر مارا۔ اس کی آواز بند ہو گئی۔

"اسے ڈوبنے مت دینا" میں نے غالب سے کہا "تو خود بھی ڈول کی رسی کو پکڑ کے ایک کنارے پر ہو جا۔ کوئی اوپر سے دیکھے تو اسے پانی میں کوئی حرکت یا ہلچل نظر نہ آئے" میری طرف سے تو آپ... "سمجھو ہونے والا ہے۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔" "تنہائی تھا۔ میں نے صرف پچھلا' ٹھنڈک کا اندازہ کر لیا ہے۔"

"ہو جائے گا کسی دن۔ میں فریج میں سے رات بھر کا رکھا

میں نے کہا "کیا سراج مر گیا؟"

غالب نے کہا "نہیں۔ لیکن اس کا وزن کسی لاش سے کم تو نہیں ہے۔"

"پانی میں وزن کم ہو جاتا ہے۔ ایک ہاتھ سے اس کو سنبھال لے اور دوسرے ہاتھ سے رسی کو پکڑ لے" میں نے کہا۔

"ابھی تو میں خود بھی پانی میں ہوں" غالب نے کہا۔

"یار' کیا تو بھی بدحواس ہو رہا ہے؟ رسی پکڑ کے خود اوپر چڑھ جا۔ پاؤں جما لے ڈول پر۔ اور اس کی قمیص کا کالر پکڑ کے صرف منہ کو پانی سے اوپر رکھ۔ تاکہ یہ سانس لیتا رہے۔ تھوڑی دیر کی بات ہے' اگر کوئی نہ آیا ادھر تو پھر سمجھو سب خیریت ہے۔"

غالب آہستہ آہستہ رہٹ کی رسی کو پکڑنے کے لئے بڑھتا گیا۔ ایک ہاتھ سے وہ سراج کا بوجھ بھی کھینچ رہا تھا جو آسان کام بہرحال نہیں تھا لیکن میں اتنی دور تھا کہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ رہٹ کی وجہ سے کنویں کی چوڑائی زیادہ تھی۔ ڈول ایک طرف سے اوپر جاتے تھے تو دوسری طرف سے واپس نیچے آتے تھے۔ اوپر جانے والے ڈول سیدھے تھے۔ نیچے آنے والے الٹے۔ یہ دونوں قطاریں متوازی تھیں مگر ان کے درمیان سات آٹھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں کنویں کی اس دیوار کے ساتھ لگ گیا تھا جس کے متوازی سیدھے ڈول تھے جو پانی میں سے گزر آنے تھے چنانچہ بھرے ہوئے تھے۔ غالب دوسری طرف دس بارہ فٹ دور تھا۔ ہم دونوں سیاہ چمڑے کے ڈولوں کے پیچھے ایک ڈیڑھ فٹ کی خالی جگہ میں سمائے تھے۔ اب کوئی اوپر سے جھانکتا تو اسے زمین کا... حصہ صاف نظر آتا۔ وہ روشنی کو منعکس کرنے والے... کو بھی دیکھ لیتا لیکن اس بات کا امکان کم تھا کہ... رنگ کے ڈولوں کی قطار کے آخر میں وہ دو کالے بالوں والے سر بھی دیکھ سکے۔ نیچے تاریکی بھی اور اوپر سے دیکھنے والے کی آنکھوں پر وہ چمک پڑتی تھی جو بیچ کے حصے میں کسی جھلمل کرتے آئینے کی طرح تھی۔ تو وہ کناروں کے اندھیرے میں ویسے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

غالب نے چند منٹ کے بعد کہا "یار' یہ بہت مشکل کام ہے۔ اس طرح رسی کو پکڑ کے ایک ہاتھ سے معلق رہنا اور دوسرے ہاتھ سے ایک لش پش کو نہ ڈوبنے دینا۔"

میں نے کہا "میں آسان کام بتاؤں۔ آپ اللہ کا نام لے کر رسی کو چھوڑ دیں اور دونوں کنویں کی تہہ میں جا کے بیٹھ جائیں یا لیٹ جائیں۔"

"بتا پھر کیا ہو گا۔ کتنی دیر انتظار کریں گے ہم آخر۔"

"کم سے کم آدھا گھنٹا" میں نے کہا "ابھی صرف پانچ

میرے منہ سے ... احتیاط ...

"ہاں۔ بہت بھٹکنے کے بعد ہم یہاں پہنچ ہی گئے" غالب نے خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔

www.paksociety.com

"نوٹ گیلے ہونے سے خراب نہیں ہوتے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "ریوالور بھی بے کار ہو گیا۔"

"ابھی تک میں اپنا ریوالور محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوں۔"

ہم بہت آہستہ سرگوشی میں بات کر رہے تھے اور یہ کوشش بھی کر رہے تھے کہ حرکت سے گریز کریں تاکہ اچانک اوپر سے جھانکنے والے کسی دشمن کی تیز نظر پانی میں تلاطم نہ دیکھ سکے۔ میری نظر بار بار اوپر جاتی تھی جہاں انتہائی بلندی پر آسمان ایک گول روشن ٹکڑے تک محدود ہو گیا تھا۔ زمین کی اتنی گہرائی میں اترنے سے پہلے میں نے کبھی دنیا اور کائنات کی وسعت کا تصور نہیں کیا تھا۔ اب مجھے یوں لگا جیسے میں کسی ٹیسٹ ٹیوب میں بند جرثومہ ہوں اور یہ ٹیسٹ ٹیوب ایک لیبارٹری میں رکھی ہوئی ہے۔

اچانک کسی نے اوپر سے پکار کے کچھ کہا۔ اس کی گونج نیچے تک پہنچی لیکن الفاظ میری سمجھ میں نہ آسکے۔ میں نے اپنا سر اٹھا کے اوپر دیکھا تو گول روشن دائرے کے ایک کنارے پر سیاہ نقطہ سا نظر آیا۔ یہ کسی کا سر تھا جو نیچے دیکھ رہا تھا۔ پھر اسی کے ساتھ دوسرا نقطہ نمودار ہوا۔

"وہ... نیچے..." کسی نے کہا اور میں نے اس کے ہاتھ کا اشارہ دیکھا۔

"کہاں؟" دوسرا آگے جھک آیا "کچھ نہیں ہے بے یہاں۔"

"ابے وہ... کالا کالا... سر ہے کسی کا۔"

"یہ کالے کالے سر لگے ہوئے ہیں" دوسرا زور سے ہنسا "ابے یہ ڈول ہیں۔"

"ڈول کے نیچے... تو کالا ہے۔"

"چڈول کے نیچے تو اندھا ہے... صاف پانی نظر آرہا ہے مجھے نیچے اتر کے دیکھ لے..."

"تو جاکے دیکھ... مجھے یہاں سے بھی نیچے تک صاف دکھائی دیتا ہے" دوسرا بولا۔

پھر کوئی تیسرا فیصلہ کرنے آگیا "کیا ہے؟"

"جھانک کر دیکھ... وہ اندر اترے ہوئے ہیں" پہلا مصر رہا۔

میں دم سادھے ساکت و صامت رہا۔ اس وقت اگر مجھے ایک چھینک آجاتی تو دنیا یہ کہنے میں حق بجانب ہوتی کہ مرحوم کی موت زکام کے باعث ہوئی۔ تیسرے نے نظروں کو فوکس کرنے کے بعد کہا "میرا بھی خیال ہے کہ کچھ نہیں ہے نیچے۔ رہٹ ہے اور اس کا عکس ہے۔ ویسے کیا حرج ہے دیکھ لینے میں۔"

میرا دل بیٹھنے لگا... خود... تھا زمین پر جا گرا... سراج نے میری تقلید کی۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح میں

لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں آیا۔ انھوں نے پتھر لڑھکا کے دیکھ لینا کافی سمجھا۔ وہ خاصا بڑا پتھر تھا جو ہوائی جہاز سے گرائے جانے والے بم کی طرح نیچے آیا۔ میں نے خود کو کنویں کی گیلی مٹی کے ساتھ چپکا لیا لیکن یہ دفاعی بندوبست بے سود تھا۔ پتھر کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ وہ وسط میں گرا تو مجھے دکھائی بھی نہ دیا۔ میں نے پانی کا چھپاکا سنا اور بوچھاڑ میرے چہرے تک آئی۔ میری طرح ... بھی بچ گیا تھا کیونکہ میں نے اس کی کوئی آواز نہیں سنی۔

"دیکھا" میں نے کہا تھا نا..."

"ایسے نہیں پتا چلتا" پہلے شخص نے کہا جو بلاشبہ سب سے تیز نظر رکھتا تھا اور سب سے زیادہ ہوشیار تھا۔

"ابے چل" تیسرے نے ایک گالی کے ساتھ کہا "اگر اندر ہوتے بھی تو ان کی چٹنی بن گئی ہوگی۔"

"چلو یہاں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں" ... نے کہا۔

میں نے روشنی کے دائرے سے تینوں کالے نقطے غائب ہوتے دیکھا اور اطمینان کی گہری سانس لی۔

"مرزا جی خیریت سے ہو نا؟"

غالب نے کہا "خیریت کہاں یار..."

"کیوں؟" میں نے گھبرا کے پوچھا "کیا ہوا ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں ہوا... میرا خیال ہے... یہ مر گیا۔"

"مر گیا... کیسے؟"

"وہ پتھر... اس کی کمر پر لگا تھا" غالب نے کہا "شاید بالکل کنارے پر تھا۔ سراج پانی میں تیر رہا تھا۔ سر ... تھا۔ ٹانگیں اور دھڑ ذرا دور تھے۔ کمر ٹوٹ گئی اس کی۔" میرے لئے کامیابی کی خوشی آدھی رہ گئی "یہ تو برا ہوا۔"

"ہاں خواہ مخواہ اسے اٹھا کے پھرے۔ یہاں تک اس امید میں کہ یہ کچھ بتائے گا" غالب تلخ ہو گیا۔

"خدا نے کہاں لا کے اسے کیسے مارا" میں نے کہا "میں نے تو اپنی طرف سے جاں بخشی کا وعدہ کر لیا تھا لیکن ... ہوتے ہیں فیصلہ کرنے والے۔"

"واقعی۔ آدمی کی موت اسے کھینچ لاتی ہے۔ ... وہ تصور بھی نہیں کر سکتا اس جگہ کا" غالب نے کہا "کتنا باعزت عہدہ تھا اس کا۔ کیا رعب اور دبدبہ اور وسیع اختیارات تھے" میں نے کہا "ایس پی صاحب ... تھے ایس پی سراج بھی تھا۔ انکل رضوی جتنی آبرو کے ... دنیا سے رخصت ہوئے۔ کہ انھیں رونے والے بھی ...

وہاں پا ایک سیڑھی کے فاصلے پر تھا۔ غالب کا ... اتر گیا تھا۔ کنویں کا اوپر والا حصہ قدرے روشن تھا۔ گہرائی کے ساتھ ساتھ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ میں مٹی گھاس اور کائی کی

دے کر کہیں جلادے گی یا میڈیکل کالج کے طلبا کے سپرد کردے گی جو اس کے ٹکڑے کریں گے اور ہڈیاں بانٹ لیں گے۔ ناکارہ اور بے مصرف جسے کوڑے میں ڈال دیئے جائیں گے۔"

غالب نے کہا "اگر ہم بھی کسی کو بتانا چاہیں کہ سراج کہاں مارا گیا تھا تو شاید صحیح نہ بتا سکیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ سکتے ہیں کہ تھا کوئی کنواں۔ معلوم نہیں کہاں۔ اوپر سے ایک پتھر آیا معلوم نہیں کس نے پھینکا تھا۔"

میں نے کہا "مقام عبرت ہے۔ جو شخص دوسروں کے قاتلوں کا سراغ لگاتا رہا تھا اس کے قاتل کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا۔ خود قاتل کو بھی خبر نہیں کہ اس نے ایک سابق ایس پی کو قتل کر دیا۔"

غالب نے کہا "کیا خیال ہے اب نکل چلیں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔"

"ہاں چلتے ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے سراج کو بہت پہلے چھوڑ دیا تھا۔ شاید اس وقت جب سراج کی کمر پہ پتھر لگا تھا۔ اب اس کی لاش کنویں کے ساکت پانی میں تیر رہی تھی۔ یہ میرا دوسرا دشمن تھا جس سے مجھے پورا حساب بے باق کرنا تھا۔ پہلا دشمن اسکواڈ ہیڈ رہو تھا جس نے میرے پاکستان پہنچتے ہی مجھے قاتل بنا دیا تھا۔ اس کے بعد سراج نے مجھ پر ستم کے وہ پہاڑ توڑے تھے جن کی یاد سے آج بھی میرے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ میرا بدلہ کسی نامعلوم شخص نے لیا۔ جو سنگ میرے لئے تھا وہ سراج کے حصے میں آیا۔ دست اجل نے اس کا راستہ اور اس کی سمت بدل دی۔ سراج کا بے جان جسم کنویں کی گہرائی میں تیر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میں اور غالب رہٹ کے مخالف حصوں کی رسی کے سہارے پر اوپر چڑھتے گئے۔ کنویں کا روشن حصہ قریب آگیا یہاں تک کہ میں نے اس کی منڈیر سے سر نکالا اور باہر چاروں طرف دور دور تک نظر دوڑا کے دیکھا۔ ہماری تلاش میں سرگرداں دشمن واپس لوٹ گیا تھا یا کسی اور طرف نکل گیا تھا۔

غالب نے بہت ڈبکیاں لگائی تھیں۔ اس کے کپڑے پانی میں شرابور تھے۔ میں صرف پانی کے چھپاکے سے بھیگا تھا۔ میں نے غالب کو مشورہ دیا کہ وہ کپڑوں کو اتار کے نچوڑ لے۔ پھر گرمی نہ جانے کی وہ ہوا سے ختم ہو جائے گی۔

"اچھا ہے غسل کر لیا آپ نے عید تو ابھی دور تھی" میں نے کہا۔

"مجھے زلفی تو میں ہو چکا ہے" غالب نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا "نزلہ ہونے والا ہے۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔"

"ٹھنڈا بھی تھا۔ میں نے صرف چکھا ٹھنڈک کا اندازہ نہیں ہوا۔"

"ہو جائے گا کسی دن۔ میں فریج میں سے رات بھر کا رکھا

ہو ایا آپ پر ڈال کے پوچھوں گا" غالب نے کانپتے ہوئے کہا۔

"واپس چلیں کے دیکھتے ہیں۔ شاید ہمارا زاد راہ مل جائے" میری مراد اس تھیلے سے ہے۔"

"وہ اب کہاں چھوڑا ہوگا انھوں نے۔ جوتے ہی مل جائیں تو بہت غنیمت ہے" غالب نے کہا۔

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ ہمارے جوتے بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ اب ہم دونوں لکھ پتی ہونے کے باوجود ننگے پاؤں چلنے پر مجبور تھے۔ پانی میں پیروں کی کھال بھی نرم پڑ گئی تھی۔ اب کھردری زمین بھی کانٹوں کی طرح پاؤں میں چبھتی تھی۔ جگہ جگہ گول گوکھرو جیسے کانٹے بھی تھے اور نوکیلے کنکر بھی۔ ہم ہمیشہ اچھے سے اچھے جوتے پہننے والے آج پہلی بار اس تکلیف کا تجربہ کر رہے تھے جو ہندوستان پاکستان کے افراد کی زندگی کا حصہ ہے۔ دنیا کے کروڑوں غربت زدہ انسان تمام عمر جوتے پہننے کی عیاشی کا خواب ہی دیکھتے ہیں اس کی تعبیر نہیں پاتے۔ پاؤں کی راحت سے پہلے پیٹ کی آگ بجھانا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔

اس وقت غالب کے خیالات بھی ایسے ہی تھے۔ اس نے چلتے چلتے اچانک کہا "میں نے بچپن میں سعدی کی ایک حکایت پڑھی تھی۔ کسی نے گلہ کیا تھا کہ اے خدا مجھے جوتے تک نصیب نہیں۔ اسی وقت ایک شخص سامنے آگیا جو معذور تھا۔ اس کے پاؤں ہی نہیں تھے۔"

میں نے کہا "ہم خوش قسمتی کو یاد نہیں رکھتے۔ خدا کا کوئی احسان نہیں مانتے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی میں جو راحت میسر ہے وہ تو ہمارا حق ہے۔ جب محرومی آتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ نعمت کیا ہے۔"

ہم جس آبادی کی طرف بڑھ رہے تھے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ آبادی کا پہلا گھر نظر آیا تو میں نے بکر کے گرد لپٹی ہوئی بیلٹ کھولی اور اس میں سے تقریباً دس ہزار روپے نکال لئے۔ باقی رقم کو میں نے پھر اسی طرح بیلٹ کی صورت میں لپیٹا اور کمر کے اوپر باندھ لیا۔ جب میں اس کارروائی میں مصروف تھا تو غالب بستی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال رہا تھا۔ یہ جگہ قدرے بلندی پر تھی۔ آگے نشیب تھا چنانچہ بستی کے سب مکانوں کا پھیلا ہوا منظر یہاں سے صاف دکھائی دیتا تھا۔

اچانک غالب نے میرا بازو پکڑ لیا "سکندر..."

میں نے حیران ہو کے کہا "کیا ہے؟" اور پھر اس سمت میں دیکھا جدھر غالب کی نگاہیں جم کے رہ گئی تھیں۔

"وہ دیکھ..." اس نے انگلی سے اشارہ کیا "مسجد کے مینار سے دائیں جانب... درخت... اس کے بعد..."

میرے منہ سے بے اختیار نکلا "گولڈن فاکس۔"

"ہاں۔ بہت بھٹکنے کے بعد ہم یہاں پہنچ ہی گئے" غالب نے خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔

www.paksociety.com

یہ ایک وسیع سہ منزلہ عمارت تھی۔ مغرب شاید غروب کے قریب پہنچنے والے سورج کی کرنیں اس کی بے داغ سفیدی پر براہ راست پڑ رہی تھیں اور گرد و پیش کے سرسبز ماحول میں یہ عمارت زیادہ ہی اجلی اجلی محسوس ہوتی تھی۔ یہ سارا علاقہ اونچا نیچا تھا۔ پتھریلی زمین کے بہت سے حصے باقاعدہ چٹانوں کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے اور ایسی ہی ایک چٹان پر وہ عمارت ایستادہ تھی۔ بظاہر یہ رہائشی عمارت تھی۔ پرانے سٹائل کی نئی کوٹھی جس کی آرائش میں جالیوں اور محرابی کھڑکیوں کا بہت دخل تھا لیکن سب سے نمایاں ایک عقاب کی شبیہ تھی جو عمارت کے ماتھے پر یعنی سب سے اوپر عین وسط میں سیمنٹ سے بنائی گئی تھی۔ بعد میں اس پر سنہرا رنگ کر دیا گیا تھا جو اس وقت چمک رہا تھا۔ اس سنہرے شاہین کے نیچے سن تعمیر چار سال پہلے کا تھا۔

میں اور غالب دم بخود اس پرندے کی تصویر دیکھتے رہے جس نے اپنے سنہرے پر پرواز کے لئے پورے کھول رکھے تھے۔ ہم نے ایک خفیہ زبان کا مطلب اخذ کرنے میں بہت سر کھپایا تھا تب کہیں جا کے اس کا سراغ پایا تھا۔ پھر اس کی تلاش میں ہم سے پہلے رابعہ اور نازو نکل گئیں۔ ہم بعد میں چلے تھے مگر بھٹک گئے تھے اور سراج کے ساتھ فرار ہوئے تھے۔ اس تلاش نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

میں نے کہا "مرزا جی! تو ہم منزل پر پہنچ گئے۔"

غالب نے کہا "کتنا آسان کام تھا یہ... کتنی مشکل سے ہوئی"

میں ہنسا "کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ منزل ایسے لگتی ہے جیسے بھول بھلیوں سے باہر نکلنے کا راستہ۔"

"اب کیا کرنا چاہئے؟ معلوم کریں کہ یہ کیا ہے۔"

میں نے کہا "ایسے کہاں معلوم ہوگا اور اتنا تو رابعہ اور نازو بھی معلوم کر گئی ہوں گی کہ یہاں کون رہتا ہے۔ نہیں رہتا تو کیوں نہیں رہتا۔ یہ گھر ہے، ہوٹل یا کوئی ایسی ویسی جگہ۔"

"تو پھر ہم پہلے یہی معلوم کرتے ہیں کہ یہاں رابعہ اور نازو آئی تھیں یا نہیں" غالب نے کہا "آئی ہوں گی تو سب نے انہیں دیکھا ہوگا اور انہیں یاد بھی رکھا ہوگا۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "ہم ننگے پاؤں پھرتے ہوئے خود کو مشتبہ بنائیں گے۔ پہلے کہیں سے جوتے مل جائیں تو اچھا ہے۔"

"ملیں گے کیوں نہیں۔ بستی ہے تو بازار بھی ہوگا۔"

"جوتے کھا کے... میرا مطلب ہے جوتے پہن کے پہلے چائے، اس کے بعد مزید چائے اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے جو میسر آئے..."

غالب نے کہا "یہاں ہندو ہوٹل الگ ہوں گے، مسلم ہوٹل الگ۔"

میں نے کہا "ہم اپنا ایمان خراب نہیں ہونے دیں گے۔ ویسے اپنا ایمان اتنا کچا نہیں ہے کہ ہندو کے ہوٹل کی چائے سے خطرے میں پڑ جائے۔"

میں اور غالب نشیب سے اترے تو ایک تنگ سی گلی میں طلوع ہوئے۔ یہ اس بستی کا سب سے بڑا بازار معلوم ہوتا تھا کیونکہ دکانیں قطار میں تھیں اور خاصے خطرناک نظر آنے والے دیہاتی مرد جتھوں کی صورت میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ مساوی تعداد میں خواتین شاپنگ کر رہی تھیں۔ یہ شاپنگ روز مرہ ضروریات کے دائرے تک محدود تھی۔ پنساری کی دکانوں پر گمان ہوتا تھا کہ یہاں کوئی واردات ہوئی ہے یا ہونے والی ہے۔ سبزی فروش قریباً فارغ تھے اور دن کی بچی ہوئی سبزی کی کلیئرنس سیل کر رہے تھے۔ نہ جانے کدھر سے ایک بنا ٹھنا مولوی سائیکل کو خچر کی طرح دوڑاتا ہوا راکٹ کی طرح ہم دونوں کے درمیان سے گزر گیا۔ جیسے اس نے قصداً ایسا کیا تھا اور کسی سے شرط لگائی تھی۔ ہم تو بچ گئے مگر وہ ہمارے سامنے سائیکل سمیت لیٹ گیا۔

میں نے اٹھنے میں اس کی مدد کی "یہ کرتب آپ نے پہلی مرتبہ دکھایا ہے آج؟"

وہ کپڑے جھاڑ کے بولا "لاحول ولا قوۃ۔ کیسا کرتب؟"

"آپ ہماری ٹانگوں میں سے گزرنا چاہتے تھے نا؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "نہیں یار، یہ ہم دونوں کو گرانا چاہتے تھے ایک دفعہ میں۔"

کچھ لوگ جو آس پاس رک گئے تھے ہنسنے لگے۔ مولوی مزید جز بز ہو گیا تاہم اس نے جواب دینے کے بجائے وہاں سے فوراً بھاگنے کی کوشش کی۔ وہ بڑی جلدی میں معلوم ہوتا تھا۔ یہ سارا علاقہ اونچا نیچا تھا۔ سڑک کی اترائی تھی اور سائیکل کے بریک نہیں تھے جس کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا۔ مولوی لنگڑا رہا تھا اور سر کے ایک حصے کے بارے میں تشویش کا شکار نظر آتا تھا لیکن اس کی سائیکل کو زیادہ چوٹیں آئی تھیں۔ چنانچہ جب اس نے پھر اس پر سوار ہو کے روانگی کا ارادہ کیا تو پہیے نے گھومنے سے انکار کر دیا۔ اس تاخیر کے بڑے نتائج برآمد ہوئے۔

پیچھے سے کوئی شخص شور مچاتا ہوا آیا اور اس نے ہمیں دھکیل کر ایک طرف کیا۔ پھر اس سے پہلے کہ مولوی فرار ہوتا، وہ اس سے بھوت کی طرح چمٹ گیا۔ وہ خاصا پیٹ والا دھوتی پوش بنیا تھا جو نہ جانے کہاں سے دوڑتا ہوا آیا تھا کہ اس کا پیٹ دھونکنی کی طرح کام کر رہا تھا۔ اپنے ہونٹوں نے مولوی کو قسطوں میں گالیاں دینا...

"آج... نہیں چھوڑوں گا... اب کیسے... بھاگے گا... تیرے کپڑے اترواتا ہوں... ابھی... اسی جگہ..."

مجھے بڑی حیرت ہوئی جب مولوی نے جواب میں منمنا کے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا "لالہ جی، میری بات سن لیں..." "ارے... تیری... چپ بیٹھے اوپر ہو کے..." لالہ جی نے اب اسے باقاعدہ مارنا شروع کیا۔ وہاں ایک مجمع اکٹھا ہو گیا لیکن ان میں سے کسی نے مولوی کی مدد نہیں کی۔

میں نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے ایک تماشائی سے کہا۔ "یار، یہ سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ کوئی بیچ میں نہیں پڑتا۔"

وہ ہنسا "یہ تو ہوتا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "آخر لالہ جی کیوں مار رہے ہیں اس غریب کو؟"

"غریب!" غالب نے مجھے یوں دیکھا جیسے مولوی کی حمایت کر کے میں نے سخت احمق ہونے کا ثبوت دیا ہے "اس بدمعاش کے ساتھ تو جو بھی ہو کم ہے۔ چھ مہینے سے مکان کا کرایہ نہیں دیا۔ بیوی کے زیور تک بیچ ڈالے۔ کام کرتا نہیں، سب کو ٹھگتا پھرتا ہے۔ یہ سائیکل بھی نہ جانے کس کی اٹھا لی ہوگی۔"

اب میں نے دخل دینا مناسب سمجھا۔ میں نے لالہ جی کا ہاتھ پکڑ کے کہا "لالہ جی، یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ شرم آنی چاہئے۔"

لالہ جی حسب توقع اچھلے "شرم مجھے آنی چاہئے۔ تو کون ہے رے، اس کا حمایتی؟" انہوں نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا "نیا ہے کوئی۔"

"نیا تو ہوں، مگر پھر بھی یہ ظلم نہیں دیکھ سکتا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟" میں نے کہا "اب آپ نے اس پر ہاتھ اٹھایا تو میں آپ کے ہاتھ توڑ دوں گا۔"

لالہ جی آپے سے باہر ہو گئے "میں تجھے اور اسے دونوں کو ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔ فقیر کا حمایتی لنگا" انہوں نے میرے جوتوں سے بے نیاز پیروں کی طرف اشارہ کر کے رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش کی۔

آٹھ دس افراد کے مجمع میں سے ایک مقامی "دادا" ٹائپ شخص آگے بڑھا اور اس نے لالہ جی کا ہاتھ چھڑانے کے لئے میرے ہاتھ کو جھٹکا دیا لیکن میری گرفت مضبوط تھی۔ جھٹکے سے لالہ جی گرتے گرتے بچے۔

"دیکھ بے، زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں" وہ تقریباً مجھ سے چمٹ کے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "بہت خیال ہے اپنے باپ کا تو اس کے لئے پیسے نکال کتنے ہیں جیب میں۔"

میں نے لالہ جی کا ہاتھ چھوڑ کے کہا "اچھا، تو یہ لین دین کا معاملہ تھا۔ کتنی رقم ہے؟ اس کے لئے بازار میں مار پیٹ اور بے عزتی کی کیا ضرورت ہے۔"

لالہ جی اچھلنے لگے "اور پھر کیا کروں؟ تھانہ کچہری کروں؟"

دادا ٹائپ والے نے کہا "لالہ جی، آج لے ہی جاؤ اسے تھانے، اس کو بھی اور اس کے داماد کو بھی۔"

لوگ ہنسنے لگے۔ کسی نے کہا "داماد ہے کہ بہنوئی!"

میں نے سادگی سے کہا "بہنوئی تو اس کا ہوں" اور بدمعاش کی طرف دیکھا۔

"تیری تو..." وہ بھڑک کے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے میرے سر پر مکا مارنے کی کوشش کی۔ میں نے جھکائی دے کر اس کی کلائی پکڑی۔ اسے ایک چکر دیا اور تھوڑا سا اوپر اٹھا کے الٹ دیا۔ ہنسنے والے ایک دم سنجیدہ اور خاموش ہو کے اس شخص کو دیکھنے لگے جو بازار میں چت پڑا اپنی بے بسی کی تصویر نظر آتا تھا۔ بھرے بازار میں اس کی دادا گیری کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا اور ایک طرح سے اس منصب پر اب میں فائز تھا۔ لوگ خوف، حیرت اور خاصے احترام کے ساتھ مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے کہا "چلو لالہ جی، حساب کر لیتے ہیں کہیں بیٹھ کے۔ کتنی رقم ہے کل؟" اور جیب میں سے دس ہزار روپے نکالے۔ لوگوں میں پہلے سے زیادہ حیرت کی لہر دوڑ گئی۔ مولوی اور لالہ جی دونوں دم بخود کھڑے رہے۔

میں نے اپنی بات دہرائی "اب کیا ہے؟ کھڑے کیوں ہو، چلو۔"

مولوی نے سخت شرمندگی کے ساتھ سائیکل کو اٹھایا اور اپنے ساتھ گھسیٹنا شروع کیا۔ لالہ جی نے احتجاجی انداز میں مارچ شروع کیا۔ کچھ لوگ شوقیہ پیچھے آئے تو میں نے ڈانٹ کے بھگا دیا۔ میری دھاک پہلے ہی بیٹھ گئی تھی۔ لوگ فوراً ہی چمپت ہو گئے۔

ایک گلی میں ٹاٹ کا پردہ ہٹا کے مولوی نے کہا "اندر آ جائیں۔"

لالہ نے کہا "ہم یہیں اچھے، تم حساب کرو۔"

میں نے کہا "میں کوئی معاملہ کھلی سڑک پر طے نہیں کرتا۔"

مولوی نے ابھی تک اپنے محسن سے یعنی مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ نہ میرا شکریہ ادا کیا تھا اور نہ اتفاقاً یہ کہا تھا کہ آخر میں اس کا قرض کیوں ادا کرنا چاہتا ہوں۔ شاید وہ لالہ کے سامنے یہ ظاہر کر کے خوش ہو رہا تھا کہ اسے لاوارث سمجھنے والے غلطی پر تھے، وہ اتنا گیا گزرا بھی نہیں تھا۔ کوئی تو آ ہی گیا اس کا ساتھ دینے والا۔

میں اور لالہ جی دو تپائی نما موڑھوں پر بیٹھے، غالب اور مولوی ایک کھاٹ پر۔ لالہ جی کی نظر بار بار ہمارے پیروں پر جاتی تھی۔

"آخر تم ہو کون؟ پہلے کبھی دیکھا نہیں۔"

میں نے کہا "آپ اگر گینڈا دیکھیں گے تو اس سے بھی یہی سوال کریں گے لیکن اس سوال کی گینڈے کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔"

غالب نے کہا "ہم مریخ کی مخلوق ہیں۔"

"وہ جوتے نہیں پہنتے کیا؟" لالہ نے طنزاً کہا۔

www.paksociety.com

میں نے کہا "یہاں کے لوگ جوتے کھانے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔"

غالب نے کہا "شاید اور کچھ ملتا نہیں...."

میں نے کہا "ہم نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں گئے تھے' کسی بدبخت نے ہم دونوں کے جوتے اٹھا لئے۔ خیر' اللہ معاف کرے اسے۔ شاید وہ ہم سے زیادہ ضرورت مند تھا۔"

اندازہ میں نے ابتدا ہی میں کر لیا تھا کہ مولوی مسلمان ہے۔

میری بات پر وہ چونکا "ماشاء اللہ۔"

میں نے کہا "میرا نام انشاء اللہ خان ہے۔ ماشاء اللہ اس کا نام ہے' میرے بھائی کا۔"

مولوی نے دانت نکال کے کہا "آپ مسافر ہیں؟"

میں نے کہا "ہم شکاری ہیں۔ ادھر سے گزر رہے تھے ایک شیر کا تعاقب کرتے ہوئے کہ گیدڑ اور کتے کی لڑائی دیکھ لی۔"

لالہ جی اور مولوی دونوں کی ہنسی اتر گئی کہ معلوم نہیں میں نے کس کو گیدڑ کہا ہے اور کسے کتا۔

"اس علاقے میں شیر تو نہیں ہے۔" لالہ جی نے کہا۔

"ہمارے ساتھ چلو' پتا چل جائے گا۔ بکرے کی جگہ تمہیں باندھ دیں گے۔"

غالب نے سمجھایا "شیر بھی تمہیں کھا کے خوش ہوگا۔ اچھا خاصا گوشت ملے گا۔"

لالہ جی نے تن کے کہا "بات ختم کرو جی۔ چھ مہینے کا کرایہ بارہ سو۔ بیاج تین سو۔"

"اور بیاج پر بیاج مزید پچیس فیصد.... پچھتر روپے" میں نے کہا "یہ لو دو ہزار۔ چار سو پچیس واپس کرو۔"

لالہ جی کا منہ کھلا اور بند ہو گیا۔ انہوں نے بنڈی کی جیب سے چار سو پچیس روپے نکال کے مجھے پکڑا دئے۔

میں نے کہا "پچیس دے دو۔ چار سو رکھ لو اگلے دو مہینے کا کرایہ۔ کہا سنا معاف۔ ہم ابھی چلے جائیں گے لیکن ہو سکتا ہے پھر کبھی ایسے ہی آ جائیں۔"

لالہ جی نے ہاتھ جوڑ کے کہا "رام بھلی کریں۔"

میں نے کہا "کبھی خود بھی تو بھلائی کیا کرو۔"

جب لالہ جی چلے گئے تو مولوی ایک دم اٹھا اور اس نے میرے پاؤں پکڑ لئے "آپ کا یہ احسان...."

میں نے اسے سیدھا بٹھا کے کہا "احسان کے بچے! تمہاری عزت غیرت سب مر گئی ہے! مسلمان ہو کے ہندو سے گالیاں جوتے کھاتے ہو۔ کام دھندا نہیں کرتے۔"

اب اندر سے کسی عورت نے اسے کوسنا شروع کیا "ابھی اس سے تو یہ مر جائے' میرا عذاب ختم ہو۔ یہ منحوس کا جنا مجھے بھی بیچ دے گا کسی دن۔"

میں نے ڈانٹ کے کہا "یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ تمہارا شوہر ہے یہ" "اس پر کوئی اثر نہ ہوا" "ابھی بھاڑ میں جائے ایسا شوہر۔ اللہ کرے اس پر بجلی گرے' ہیضہ ہو اسے.... میں [illegible] کر لوں۔"

"پھر اس پر بجلی گرے' اسے ہیضہ ہو تاکہ تم [illegible]" غالب نے کہا "پھر چوتھا۔ علیٰ ھذا القیاس..."

عورت کے واویلے سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مولوی کو نشے کی لت ہے۔ وہ ہر شخص کا مقروض ہے اور اب مولوی چوریاں بھی کرنے لگا ہے۔ اس نے واقعی بیوی کے زیور بیچ کھائے تھے۔ جس مقصد کے تحت میں نے یہ نیکی کی تھی وہ پورا ہوتا نظر آتا تھا۔ ہم اس بے غیرت اور لالچی آدمی کو خرید سکتے تھے اور پیسے کے لئے وہ ہمارے جائز اور ناجائز سب کام کر سکتا تھا۔ اس کی داڑھی کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ مولوی نظر آتا تھا مگر مولوی نہیں تھا۔ للہٰذا اس جیسے لوگوں کی وجہ سے مولوی بدنام ہو سکتے تھے۔

میں نے کہا "بہن' کتنے کے زیور تھے تمہارے؟"

"تھے تو پورے پانچ ہزار کے۔ یہ دو ہزار میں گروی رکھ آیا۔ اب دو ہزار میں اس کی میا کو بیچ کر لاؤں؟"

میں نے اس زبان دراز' بیہودہ گوئی میں طاق عورت سے کہا "میں دے کر جاؤں گا۔ اپنا زیور چھڑا لینا۔ آئندہ کا میں ذمے دار نہیں۔"

"ابھی آئندہ یہ میرے گہنے کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھے' میں اس کی آنکھیں پھوڑ دوں۔" اس نے یہ اطلاع دیتے ہوئے خاصی مسرت کا اظہار کیا۔

غالب نے کہا "پھر یہ تمہیں کیسے دیکھے گا؟"

اب مولوی نے کہا "لعنت اس پر جو شکل دیکھے اس منحوس چڑیل کی۔ جو عذاب بن کے نازل ہوئی ہے۔"

ظاہر ہے اس کے بعد فریقین کے درمیان ایک خوفناک زبانی جنگ ہوئی جس میں ایک دوسرے کے لئے بے شمار ناقابل اشاعت الفاظ استعمال ہوئے۔ قصوروار اگر مرد تھا تو مرد کو بگاڑنے کی ذمے دار عورت بھی تھی۔ اگر وہ چاہتی تو عورت ہونے سے فائدہ اٹھا کے اپنے شوہر کو نرمی' پیار محبت سے راہ راست پر بھی لا سکتی تھی لیکن اب تو معاملہ ختم تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بیزار تھے اور یہ بیزاری بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے ازدواجی مستقبل کی بہتری کے لئے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ خود کو اس کے بچپن کے دوست ظاہر کرتے ہوئے ہم نے مولوی کو اتنا دے دیا کہ اس کے قرضے ختم ہو جائیں۔ شرمندگی' احسان مندی اور [illegible] کے جذبات سے مولوی ہمارا غلام ہو چکا تھا۔ ہم نے وہاں مولوی کو بازار سے کھانا لانے بھیجا۔ اسی کے گھر اپنی مرضی کی چائے بنوا کے پی اور جب اس کی بیوی کھانے سے فراغت پا کے روتی دھوتی زیور چھڑوانے گئی تو شاکر نے مولوی سے مطلب کی بات کی۔ اس کا نام شاکر علی تھا۔

میں نے کہا "شاکر علی' ہم نے تمہارے سب مسئلے حل کر دیئے۔ تم ہمارے لئے کیا کر سکتے ہو؟"

اس نے خوشامدانہ انداز میں کہا "میں آپ کا زر خرید ہوں۔ آپ کے لئے جان بھی نچھاور کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "جان کو سنبھال کے رکھو۔"

غالب نے کہا "کرنا ہی ہے تو اپنی منکوحہ پر نچھاور کرو۔"

میں نے کہا "ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر تم ہماری توقعات پر پورے اترے تو باقی سب تمہارے" میں نے دس ہزار میں سے بچ جانے والے نوٹوں کو لہرایا۔

شاکر کی آنکھوں میں لالچ کی چمک پیدا ہو گئی "آپ حکم کریں۔"

میں نے کہا "تم اس گاؤں میں کب سے ہو؟"

"پیدائش کے وقت سے۔ جس دن جنگ عظیم شروع ہوئی تھی اسی دن میں پیدا ہوا تھا۔"

"ٹھیک کہ تم پیدا ہونے کی غلطی نہ کرتے۔ یہ جنگ عظیم پہلی تھی یا دوسری؟" غالب نے کہا۔

"کیا میں بچپن کا لگتا ہوں؟" شاکر جھینپ کر بولا۔

غالب نے کہا "اپنی حرکتوں سے تم سٹھیائے ہوئے یعنی ساٹھ کے لگتے ہو۔"

میں نے غالب کو گھور کے واضح کیا کہ میں سنجیدگی سے بات کرنے کے موڈ میں ہوں "شاکر' ہم یہاں ایک خاص مقصد سے آئے ہیں۔"

"وہ کیا مقصد ہے؟"

"تمہارے لئے مقصد جاننا ضروری نہیں" میں نے کہا۔ "ہم جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔"

"کہاں جانا ہے آپ کو؟"

"جہنم میں۔ اب بیچ میں مت بولنا ورنہ ہم یہ کام کسی اور کے سپرد کر دیں گے۔ تمہارا پانچ ہزار کا نقصان ہو جائے گا" میں نے خفا ہو کے کہا "تم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے تمہارے لئے غیب سے ہمیں بھیج دیا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ بعد میں کبھی تم کسی سے کچھ نہیں کہو گے۔ سوائے اس کے کہ ہم بچپن کے دوست تھے اور یہ ملاقات ایک اتفاق کا نتیجہ تھی۔ ہم بمبئی کے کاروباری لوگ تھے اور واپس بمبئی چلے گئے۔ اگر اس سے زیادہ تم نے کسی کو کچھ بتایا تو یہ سمجھ لو کہ تمہاری بیوی کی سب دعائیں قبول ہو جائیں گی۔"

"کیا مطلب؟ ہیضہ ہو جائے گا مجھے یا بجلی گرے گی مجھ پر؟"

"نہیں" غالب بولا۔ "ہمارے دشمن تم کو بجلی لگا کے مار دیں گے۔"

"ہمارے دشمن تمہیں مار ڈالیں گے۔ وہ تم سے پوچھیں گے کہ ہم دونوں کہاں گئے۔ چونکہ تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں ہوگا اس لئے تم انہیں کچھ نہیں بتا سکو گے۔ وہ سمجھیں گے تم جھوٹ بول رہے ہو۔ جھوٹ بولو گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا۔ ہر صورت میں تمہارا انجام برا ہوگا۔"

"اور پھر تمہاری بیوی وہی کرے گی جو اس کا پروگرام ہے۔ ٹھیک چار مہینے دس دن بعد وہ تمہاری بیوہ نہیں رہے گی" غالب نے کہا۔

اس خیال نے مولوی کو ملول کیا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کہ جس مکان پر سنہرے رنگ کا باز بنا ہوا ہے وہ کس کا ہے؟" میں نے کہا۔

"طورترہ کا" شاکر نے کہا "وہ تو بڑا خطرناک دشمن ہے۔"

میں نے کہا "میں نے یہ کب کہا ہے کہ وہ میرا دشمن ہے۔"

شاکر نے سٹپٹا کے کہا "وہ نہیں ہے.... پھر کون ہے؟"

میں نے اس کے سوال کو گول کر دیا "وہ کیوں خطرناک ہے؟ کیا کرتا ہے؟"

"یہ تو معلوم نہیں کہ کیا کرتا ہے" شاکر نے سوچ کے کہا۔ "اس کے باپ طورترہ صاحب تو بڑے اچھے اور سچے آدمی تھے۔"

"وہ بھی طورترہ تھے" غالب نے کہا "باپ بیٹے کا ایک ہی نام!"

"یہ ذات ہے" میں نے کہا "آخر ہمارے بھی تو قریشی صدیقی ہوتے ہیں۔"

"انہوں نے بہت نیک کام کئے تھے پیسے سے" شاکر نے کہا "یہ مندر انہوں نے ہی بنوایا تھا۔ اس کے ساتھ ایک یتیم خانہ تھا جسے ہندو ناتھ آشرم کہتے ہیں۔"

میں نے کہا "صرف ہندوؤں کے لئے تھا ان کا پیسہ اور ان کا نیکی کا جذبہ؟"

شاکر نے کہا "نہیں۔ ایک خیراتی ڈسپنسری بھی تھی۔ ہندو مسلمان دونوں کے لئے۔ ادھار بھی دیتے تھے وہ سب کو۔"

"مگر یا مسلمانوں کو خیرات میں دوا مل جاتی تھی' بیمار ہونے کی شرط تھی۔ اور ادھار مل جاتا تھا اس کے لئے محتاج ہونے کی شرط تھی۔ اس پر وہ سود لیتے ہوں گے۔ جائیدادیں قرق کرتے ہوں گے۔ تم اس کے باوجود انہیں اچھا اور سچا آدمی کہتے ہو۔"

شاکر بغلیں جھانکنے لگا "وہ.... دراصل.... مسلمان غریب تھے اکثر۔ ہندو کاروبار پر قابض تھے۔ ایک گھر سید صاحب کا تھا.... انہوں نے یہ مسجد بنوائی تھی۔ ان کی اولاد عیاشی میں پڑ گئی۔ قالین کا کاروبار تھا۔ وہ بھی بیچ دیا۔ آج کل سنا ہے بمبئی میں بھیل پوری بیچتے ہیں۔ دو گھر اور تھے پیسے والے۔ ان کے درمیان بہت پہلے کارپوریشن کے انتخابات کے موقع پر آپس میں ٹھن گئی تھی۔ جو کچھ بچا وہ مقدمے بازی میں لگ گیا۔ ان کی جائیدادیں بھی طورترہ نے خرید لیں۔"

میں نے افسوس اور دکھ سے سر ہلایا "یہی تو مسئلہ رہا ہے

www.paksociety.com

ہم مسلمانوں کا۔ بے جا اسراف، جھوٹی شان و شوکت، آپس کی رنجش۔ اسی سے فائدہ اٹھا کے ہندوؤں نے ہمیں کنگال کیا... خیر، تم لعوترہ کے بیٹے کی بات کرو۔"

"بیٹا ایک نمبر کا لفنگا تھا۔ باپ کی زندگی میں بھی اس کی حرکتوں سے سب پریشان تھے۔ کہتے ہیں ایک بھائی کو اور اپنے باپ کو خود اسی نے قتل کیا۔ بھائی کو کنوئیں میں پھینک آیا۔ وہ شکار پر گیا تھا اور لوٹ کر نہیں آیا۔ ساتویں دن اس کی سڑی ہوئی لاش آئی۔ رات کو اس نے باپ کو گلا گھونٹ کے مار ڈالا۔ مشہور یہ کیا کہ صدمے سے اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ پولیس کے ساتھ مل کے اس نے اپنے خلاف تفتیش ہونے ہی نہیں دی۔ اس کے خلاف شکایت کون کرتا۔ سبھی ڈرتے تھے۔ لیکن یہ بات سب کو معلوم ہے یہاں۔ بعد میں اس نے یتیم خانہ بند کر دیا۔"

"اور یتیم بچے کہاں گئے؟"

"معلوم نہیں... اس کا کہنا تھا کہ سب کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اچھے گھروں میں۔" شاکر بولا۔

"اس نے سب کو بیچ دیا ہوگا۔ وہ واقعی اچھے گھروں میں ہوں گے مگر غلامی کر رہے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"اب اس احاطہ آشرم میں کیا ہے؟" غالب نے ایک اچھا سوال کیا۔

شاکر بولا "گودام ہے اس کا۔"

"وہ خود کہاں ہے؟ کیا کرتا ہے؟"

"بمبئی میں کہیں رہتا ہے۔ مہینے میں چار چکر لگاتا ہے۔ کاروبار کا کسی کو علم نہیں۔" شاکر نے کہا۔

"کیا وہ اس کوٹھی میں قیام کرتا ہے؟"

"ہاں۔ جب آتا ہے تو وہیں رہتا ہے... ایک رات..."

"یہ کوٹھی تو نئی ہے۔ پہلے کیا تھا یہاں؟"

"وہی ڈسپنسری تھی جو باپ نے بنوائی تھی۔ جب اسے گرایا گیا تو کچھ لوگوں نے شور کیا تھا۔ اس نے سب کو اٹھوا لیا۔"

"کیسے اٹھوا لیا۔ کرین سے؟" غالب نے کہا۔

شاکر علی نے اسے افسوس سے دیکھا "اپنے غنڈوں کی مدد سے۔ اسی گاؤں کے دس لڑکے پال رکھے ہیں اس نے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ بدمعاش ہیں جو کسی کا لحاظ نہیں کرتے، کسی کو نہیں بخشتے۔ اس مندر کا جو پرانا پروہت تھا وہ ایسے ہی مارا گیا۔"

"کیسے مارا گیا؟"

"اس نے سب کے سامنے کہا تھا کہ مندر پوجا پاٹھ کی جگہ ہے۔ اسے کسی اور کام کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا ورنہ میرے جیتے جی ایسا نہیں ہوگا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"سال، ڈیڑھ سال پہلے کی" شاکر بولا۔

"تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ لعوترہ اسے کس مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا؟"

شاکر نے نفی میں سر ہلایا "ظاہر ہے کوئی غلط مقصد۔"

"مندر کے ساتھ جو احاطہ آشرم تھا، وہ کب سے گودام کے طور پر استعمال ہو رہا ہے؟" میں نے محسوس کیا کہ مجھے صحیح نتائج حاصل ہو رہے ہیں۔

شاکر علی نے سوچ کے کہا "بہت پہلے سے۔ باپ کے مرنے کے بعد ہی لعوترہ نے یتیم خانہ خالی کرا لیا تھا۔"

"اور باپ کب مرا تھا اس کا؟ یہ تو سب جانتے ہوں [illegible]"

"ہاں۔ چار سال ہو گئے یا ہونے والے ہیں۔"

"پھر مندر کا جھگڑا کیسے طے ہوا؟" میں نے کہا۔

"طے کہاں ہوا... اس کے بدمعاشوں نے پروہت کو دھمکایا تو پروہت نے سب کی موجودگی میں کہہ دیا کہ دھمکیاں دی جا رہی ہیں لیکن یہ مندر کسی کی جاگیر نہیں۔ لعوترہ کے باپ نے بنوایا ضرور تھا مگر لعوترہ کا اس پر [illegible] نہیں۔ لعوترہ نے اسے ذلیل کیا کہ تو میرے باپ کے ٹکڑوں پر پلنے والا کتا آج مجھ پر بھونکتا ہے۔ پروہت نے کہا کہ تیرا باپ میری اتنی عزت کرتا تھا اور تو مجھے کتا کہتا ہے۔ اس پر [illegible] نے پروہت کے تھپڑ مار دیا اور کہا کہ میرے باپ نے تو بہت سی غلطیاں کی تھیں۔"

"سب سے بڑی غلطی تو وہ خود تھا" غالب نے کہا۔

شاکر علی نے سر ہلایا "پروہت نے بھی کچھ [illegible] لیکن اس وقت لوگ بیچ میں پڑ گئے تھے اور بات ختم ہو گئی۔ لعوترہ بھی اگلے دن سب کی موجودگی میں آیا اور اس نے ڈرامے کے پروہت جی کے پیر چھوئے اور ان سے معافی [illegible] بہ کل میں نشے میں تھا لیکن یہ اس کی چال تھی۔ [illegible] بھی مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ پروہت کے خلاف سازش کی گئی۔ شہر سے کوئی بدنام عورت رات کو پروہت کے پاس پہنچی کہ مجھے پناہ چاہئے، بستی کے [illegible] میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ پروہت نے کہا کہ اندر آ جاؤ [illegible] کے گھر میں کس کی مجال ہے کہ تمہیں ہاتھ بھی لگا سکے۔ اندر پہنچتے ہی وہ خود بھگوان کے اس داس کے گلے [illegible] پروہت جنم جنم کا برہمچاری تھا۔ یعنی شادی نہیں کی تھی [illegible]

وہ گھبرا گیا۔ عورت نے خود کپڑے اتار دیے اور [illegible] پکار دیا۔ جب لوگ پہنچے تو پروہت بے چارے کی [illegible] بنی تھی۔ اکثر لوگ جانتے تھے کہ وہ کیسا آدمی [illegible] بھی کچھ لوگوں نے کہا کہ مرد تو مرد ہی ہوتا ہے۔ کیا پتہ [illegible] ہی گئی ہو۔ اس عورت کو گاؤں میں پہلے کبھی نہیں دیکھا [illegible] اور وہ بعد میں بھی نظر نہیں آئی لیکن پروہت کی ساری نیک نامی کو خاک میں ملا گئی۔ وہ کسی کو منہ دکھانے [illegible]

نہیں رہا۔ ویسے سب کے سامنے اس نے کہا تھا کہ میرا من صاف ہے۔ میں الزام لگانے والوں سے نہیں ڈرتا۔ انہوں نے تو سیتا جیسی دیوی پر بھی الزام لگایا تھا۔ تاہم اگلے دن صبح وہ مرا ہوا پایا گیا۔ اس نے مندر کے گھنٹے سے لٹک کر خودکشی کر لی لیکن یہ قتل تھا۔"

"تم کہہ رہے ہو یا پولیس نے کہا تھا؟"

"پولیس!" اس نے طنز سے کہا "لعوترہ کے ٹکڑوں پر پلنے والے اس کی مرضی کے خلاف بول سکتے ہیں؟ پولیس اور بدمعاشوں کی مدد سے ہی تو اس نے اپنی دہشت پھیلا رکھی ہے اس سارے علاقے میں۔ یہ سب جانتے ہیں۔"

"سب کے جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔"

"ہاں" شاکر نے تسلیم کیا "لعوترہ نے کہا بات مشہور کی کہ پنڈت جی نے آتما ہتیا کر لی... خودکشی... ان کے ضمیر نے ملامت کی اور وہ بدنامی سے ڈر کے مر گئے۔ لوگ یقین نہ کرتے تو کیا کرتے۔ اس کی جگہ دوسرا پروہت آ گیا جو اس بستی کا تو نہیں تھا۔ مندر میں ایک جوگی کا ڈیرا تھا۔ وہ بھی مر گیا۔ کہتے ہیں اسے سوتے میں سانپ نے ڈس لیا۔ تین سیوا کرنے والے جو مندر میں ہی رہتے تھے خود اپنی جان بچا کے بھاگ گئے۔"

"لوگ اب پوجا پاٹھ کے لئے کہاں جاتے ہیں؟"

"جائیں گے کہاں، وہیں جاتے ہیں۔ سب کچھ پہلے کی طرح ہے۔"

"پھر بھی کچھ تو فرق پڑا ہوگا۔"

"یہ کسی کو نہیں معلوم۔ شروع شروع میں لوگوں نے باتیں کی تھیں۔ دو چار تجسس پسند نوجوان ٹوہ میں رہنے لگے تھے اور چھپ چھپ کر دیکھتے تھے لیکن وہ بھی ایک ایک کر کے مارے گئے۔ پہلا ایک مارا گیا۔ پولیس نے اس کے قتل کے الزام میں دوسرے کو پکڑ لیا اور پھانسی کے تختے تک پہنچا دیا۔ تیسرا رات کے اندھیرے میں کسی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ شاید بستی میں پہلی مرتبہ کسی کو گولی ماری گئی تھی۔ اس سے پہلے اشتعال میں قتل ہو جاتے تھے۔ کسی نے لاٹھی سے سر پھاڑ دیا، کسی نے درانتی سے پیٹ چاک کر دیا، کسی نے خنجر سے گلا کاٹ دیا۔ ایک شخص کا سر پتھر سے کچل دیا گیا تھا۔ اکثر ان کا سبب عداوت ہوتی تھی۔ زر، زمین یا زن میں سب سے زیادہ جان لینے والی چیز عورت تھی۔ ہمیشہ قتل کرنے والا پکڑا جاتا تھا۔ سب کو پہلے سے معلوم ہوتا تھا کہ قاتل کون ہے۔"

غالب نے کہا "یہاں سب سراغ رسانی کے ماہر ہیں۔"

"یہ بات نہیں۔ جب معاملہ عورت کا ہو تو دوسرے لوگ ضرور جانتے ہیں۔ ایک لڑکی کو چاہتا کوئی اور تھا، منگنی کسی اور سے ہو گئی۔ جب منگیتر قتل ہوا تو عاشق پکڑا گیا۔ دو شادی شدہ عورتوں کے ناجائز تعلقات کا سب کو علم تھا، سوائے ان کے شوہروں کے۔ ایک کا شوہر مارا گیا تو سب نے آشنا کا نام لے دیا۔ دوسری کا آشنا قتل ہوا تو الزام شوہر پر آیا لیکن اس کے بعد جو قتل ہوئے ان میں کوئی نہیں پکڑا گیا۔ لوگ جانتے ہوئے بھی قاتل کا نام لینے سے گریز کرنے لگے کہ کہیں اپنا نمبر نہ آ جائے۔ یہی لعوترہ بھی چاہتا تھا۔ اب لوگ اس سے دہشت زدہ ہیں۔ اس کے گھر کی طرف کوئی نہیں جاتا۔ بڑے خطرناک کتے پال رکھے ہیں اس نے۔"

غالب نے کہا "دو ٹانگوں والے یا چار ٹانگوں والے؟"

"میں دو ٹانگوں والے کی بات کر رہا تھا" شاکر نے دانت نکال کے کہا۔

"اچھا شاکر علی، یہ سب باتیں واقعی بہت مفید ہیں ہمارے لئے۔ یہ بتاؤ کہ اس پرانے یتیم خانے کو گودام بنانے کی مصلحت کیا تھی؟ تم نے بھی کسی سے کچھ سنا؟"

"سنا تو بہت کچھ، دیکھا نہیں۔ کہتے ہیں مندر گاؤں کی حد سے باہر ہے اور سڑک قریب ہے۔ کوئی مندر کے پیچھے والے علاقے میں مکان نہیں بنوا سکتا۔"

"مندر کے پیچھے کیا ہے؟"

"زمین ہے، کھیت ہیں" شاکر علی نے کہا "وہاں بھی کوئی ہل نہیں چلاتا۔ جس کی زمین تھی اسے قیمت ادا کر دی گئی ہے کہ دوسری طرف زمین خرید لے۔"

میں نے کہا "مقصد یہ ہے کہ مندر ہمیشہ گاؤں کے آخری کنارے پر ہی رہے، کبھی آبادی کے بیچ میں نہ آئے۔ میں سمجھ گیا۔ آس پاس کا کتنا علاقہ مندر کے نام پر ہے؟"

"پیچھے کی طرف سے... ہوگی ایک فرلانگ تک انہی کی زمین۔ اس کے بعد سڑک آ جاتی ہے۔"

"گویا سڑک سے مال براہ راست گودام تک لانے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی؟ تم نے کبھی دیکھا مال آتے جاتے؟"

شاکر علی نے نفی میں سر ہلایا "رات کو آواز سنائی دیتی ہے ٹرک آنے کی۔ دور سے میں نے بھی دیکھے ہیں۔ ایک بات بہت عجیب تھی۔ آپ کسی سے کہو گے تو نہیں؟"

میں نے کہا "عجیب بات کرتے ہو تم بھی۔ ہم کیا تمہارے دشمن ہیں؟"

شاکر نے کہا "ٹرک جب سڑک سے اندر آتے ہیں تو لائٹ آف کر دیتے ہیں۔ اندھیرے میں یہاں تک پہنچتے ہیں... جب جاتے ہیں تب بھی لائٹ نہیں جلاتے۔ سڑک پر پہنچنے کے بعد جلاتے ہیں۔"

میں نے کہا "اس سے تو صاف یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس گودام میں گھپلا ہو رہا ہے۔"

"بالکل جناب۔ بلیک مارکیٹ کا مال آتا ہے اور جاتا ہے۔ اسمگلر بن گیا ہے لعوترہ۔ بستی کے جتنے لوگ اس کا دیا کھاتے ہیں، وہ اس سے ڈرتے بھی ہیں اور لوگوں کو اس سے ڈراتے

www.paksociety.com

بھی ہیں۔"

میں نے کہا "یہ جگہ سمندر سے کتنی دور ہے؟ میرا مطلب ہے بستی سے؟"

شاکر نے کہا "بستی کی طرف سے تو فاصلہ زیادہ ہے۔ ادھر دس گیارہ میل کے فاصلے پر ایک کریک ہے" شاکر علی نے کہا "کچا راستہ ہے۔"

"اس پر ٹرک جاسکتے ہیں؟"

"جاتے ہیں جناب' اب تو صاف راستہ بن گیا ہے۔ پہلے صرف ماہی گیر آتے جاتے تھے اس راستے سے۔ انھیں بھی رخصت کردیا گیا ہے۔ ان کی پوری بستی اٹھا کے دوسری جگہ رکھ دی گئی ہے راتوں رات۔"

"وہ کیسے؟ ماہی گیروں نے احتجاج نہیں کیا؟"

شاکر علی نے کہا "وہ تو بہت خوش ہوئے۔ ہر ایک کو دو ہزار روپے نقد ملے اور نئی جھونپڑی بنانے کا پورا سامان۔ پرانی جھونپڑیاں بے ترتیب تھیں۔ نئی جگہ پر انھوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ گلیاں سیدھی اور چوڑی ہوں۔"

"یعنی ٹاؤن پلاننگ کے اصول مدنظر رکھے گئے۔ مگر میاں شاکر علی' کیا کسی قانون کے تحت اس کی ممانعت نہیں تھی؟ جس کا جہاں بھی جی چاہے نیا نگر آباد کرلے" میں نے کہا۔

"سب راتوں رات ہوا جی' طے تو پہلے ہی تھا۔ لوگوں نے اپنی اپنی جگہ بھی دیکھ لی تھی اور نشان بھی لگا لیے تھے۔ رات کو ادھر جھونپڑیاں بنانے کا سامان ٹرک سے اترنا شروع ہوا ادھر انھوں نے پرانی جھونپڑیوں سے سامان اٹھا لیا۔ رات بھر میں نئی جھونپڑیاں بن گئیں۔ پرانی خالی ہو گئیں۔ ٹرک بھر کے مزدور لائے گئے تھے۔ وہ صبح ہونے سے پہلے واپس چلے گئے۔ ایک بلڈوزر آیا تھا۔ اس نے پرانی بستی کو دو گھنٹے میں کوڑے کی طرح صاف کردیا اور سمندر کے کنارے ڈھیر کردیا۔ پھر اس ڈھیر کو آگ لگادی گئی تو سب کچرا راکھ بن گیا۔ راکھ کو سمندر بہا کے لے گیا۔ دوپہر تک جس نے اس جگہ کو دیکھا حیران رہ گیا۔ وہاں ایک صاف میدان نکل آیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں کبھی کوئی بستی تھی ہی نہیں۔ دوسری طرف ایک نیا نگر آباد ہو چکا تھا۔"

میں نے کہا "کیا منظم طریقۂ واردات ہے۔ اب اس بستی کو بھلا کون ہٹا سکتا ہے۔"

شاکر علی نے کہا "ایک ہزار جھونپڑیاں تھیں۔ ایک ہزار ماہی گیروں کے گھروں کو گرانے کی کوشش بھی کی جائے تو سیاسی مسئلہ بن جائے گا۔ یہ لوگ بھوک ہڑتال کردیں گے۔ ان کی حمایت میں کئی لیڈر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس کے علاوہ یہ سب اوپر والوں کی ملی بھگت سے ہوتا ہے۔ وہ سب جانتے ہیں لیکن کرتے کچھ نہیں۔ اپنی آنکھیں بند رکھنے کی قیمت وہ وصول کرلیتے ہیں۔"

میں نے کہا "ماہی گیروں کو نئی جگہ جانے سے فرق نہیں پڑا؟"

"فرق کیا پڑے گا۔ پہلے کریک کے اس کنارے پر تھے۔ چٹان کے ایک طرف۔ اب دوسری طرف ہیں۔ اور زیادہ خوش ہیں کیونکہ ہر ایک نے جھونپڑی کے لیے کم سے کم دگنی جگہ گھیری ہے" شاکر علی نے کہا "بہت سے ماہی گیر ان کے ساتھ کام بھی کرتے ہیں۔"

"تم بہت باخبر آدمی ہو شاکر علی' ہر بات پر غور کرسکتے ہو۔ اپنی حالت پر غور کیوں نہیں کرتے۔ کام دھندا کیوں چھوڑ رکھا ہے؟"

"کیا بتاؤں جناب۔ اس چھپا بیگم نے کہیں کا نہیں رکھا" وہ شرم سے سر جھکا کے بولا۔

غالب نے خفگی سے کہا "ایک سنبھالی نہیں جاتی تم سے' دوسری کے چکر میں پڑ گئے ہو۔"

میں نے ہنس کر کہا "شاکر علی کی مراد افیون سے تھی۔"

"میں بہت کوشش کرتا ہوں' عادت نہیں چھٹتی۔ اسی لیے کام بھی نہیں ملتا ورنہ میں درزی تھا" شاکر علی نے کہا۔ "اب بیوی کپڑے سیتی ہے لوگوں کے۔ وہ زبان کی بری ہے' دل کی بری نہیں ہے۔"

"عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو زبان کے میٹھے ہوں وہ میٹھی چھری ثابت ہوتے ہیں" میں نے کہا "خیر اب تم ہمارا ایک کام کرو۔ ذرا بستی کا ایک چکر لگاؤ۔ لوگوں سے معلوم کرو کہ آج رات میں یہاں دو لڑکیاں آئی تھیں شہر سے؟"

"کون لڑکیاں تھیں وہ؟"

"فلم اسٹار تھیں۔ جس نے بھی دیکھا ہوگا انھیں' یہی سمجھا ہوگا۔"

"کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں آئی تھیں؟"

"یہی سمجھ لو۔ تم یہ معلوم کرکے آؤ کہ وہ کب آئی تھیں اور کب واپس گئیں۔ انھوں نے بازار میں کہیں چائے پی ہوگی۔ یا کھانا کھایا ہوگا۔ ہم تمہارا یہیں انتظار کریں گے۔ ہمارے بارے میں کوئی پوچھے تو کہنا کہ وہ تو گئے۔ کچھ دیر بعد نکل گئے تھے۔ یہ خیال رکھنا کہ کسی کو شک نہ ہو کہ تم جو کچھ معلوم کررہے ہو ہمارے لیے کررہے ہو" میں نے کہا "ورنہ تم خود اپنے لیے مسائل پیدا کرلو گے۔ ہم تو چلے جائیں گے۔"

"آپ فکر نہ کریں جناب' میں یوں گیا اور یوں آیا" شاکر علی نے جاتے ہوئے کہا۔

شاکر علی کے جاتے ہی اس کی بیوی نے گھر میں قدم رکھا اور آتے ہی شاکر علی کو چلا چلا کے پکارنے لگی۔ "مر گیا کہیں کا "ارے کہاں لیٹ گیا جا کے۔ پھر کوئی کھا کے گھس گیا ہے چارپائی کے نیچے۔ باہر آ۔"

میں نے شور سے تنگ آ کے کہا "بی بی! وہ ذرا کام سے گیا ہے۔"

"کام سے؟ ارے بھیا! شاکر اور کام کرے کسی کا۔ اس نے تو زندگی میں کبھی بلی کے پانی نہیں پیا" وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"ہم نے اسے ایک کام سے بھیجا ہے" غالب نے اسے ڈانٹا۔

شاکر علی کی بیوی نے کہا "بھیا! احسان ہوگا تمہارا۔ اس مردود کو بھی کہیں لگا دو کام سے ورنہ اسے جیل ہی بھجوا دو۔"

غالب نے کہا "تم سے شادی کرنے کے جرم میں۔ اس جرم میں تو اسے عمر قید کی سزا مل چکی ہے۔"

عورت نے سخت برا مانا "میں نے کیا قید کر رکھا ہے اسے؟ جانے میری طرف سے جہاں جائے" پھر وہ اپنے مرغی کے ڈربے جیسے باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس کے دونوں بچے کمرے میں ہنگامہ کرتے رہے اور وہ انہیں وہیں سے گالیاں اور کوسنے دیتی رہی۔ مجھے شاکر علی اپنی تمام خرابیوں کے باوجود قابل رحم محسوس ہوا جو اس عورت کا شوہر بن کر رہنے پر مجبور تھا۔ وہ بیک وقت بدصورت' بدزبان اور جاہل تھی۔ عورت کی بدصورتی اس کا قصور نہیں سمجھی جاسکتی اور اگر وہ کوشش کرے تو حسن سیرت سے احساس محرومی کی تلافی کرسکتی ہے۔ حسن اخلاق سے' سلیقے سے اور خوش اطواری و خوش لباسی سے دلکشی کا وہ انداز پیدا کرسکتی ہے جو کسی بھی مرد کو دیوانہ کردے۔ لیکن خوبصورت سے خوبصورت عورت کی جہالت' بد اطواری اور بد زبانی کے ساتھ نباہ کرنا کسی بھی طرح قید بامشقت کے عذاب سے کم نہیں۔

"بد قسمت اور صابر و شاکر عورت ہی نہیں ہوتی۔ مرد بھی ہوتے ہیں" غالب نے جیسے میرے خیالات پڑھتے ہوئے تائید کی۔

"ہاں۔ مولوی شاکر علی اسم بامسمیٰ ہے۔ خدا ہی رحم کرے اس کے حال پر۔ ہم کچھ نہیں کرسکتے۔"

"کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا" غالب بولا۔

"گھر آدمی کے لیے جنت ہوتا ہے۔ گر عورت اسے جہنم بنادے تو مرد کیا کرے' کہاں جائے؟"

"چلے بھی جاتے ہیں جانے والے۔ پہلے کوٹھوں کا رخ کرتے تھے۔ دوسری اب بھی انتقاماً پناہ کے لیے کرتے ہیں۔ کچھ بھی نہ کرپاسکا تو خود کو شراب یا کسی بھی نشے کی خود فراموشی کے حوالے کردیتے ہیں۔ شاکر علی شراب نہیں پی سکتا تو افیون سے سکون حاصل کرتا ہے۔"

"زندگی کی تلخی سے فرار حاصل کرتا ہے۔ چند گھنٹوں کے لیے ہی سہی عذاب زندگی کے رنج و الم سے نجات مل جاتی ہے۔ میں سمجھا تھا کہ اس کو نشے کی عادت میں مبتلا کرنے والی ملکہ کوئی عورت ہے۔ قصور وار شاکر بھی ہے کہ اس نے مقابلہ نہیں کیا' فرار اختیار کیا اور ہار مان لی۔"

"ہاں۔ ورنہ بھی چنگیز خانی شوہر بھی کے جوتا سنبھال لیتا تو اس پاؤں کی جوتی کی کیا مجال تھی کہ زبان چلاتی۔"

شاکر علی کا گھر غربت اور بدحالی کی منہ بولتی تصویر تھا۔ اس ایک کمرے کے گھر میں سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ خوشی اس گھر سے روٹھ گئی تھی۔ اس کی جگہ دکھوں نے لے لی تھی جو سرطان کے خلیوں کی طرح پھیل رہے تھے۔

وقت گزارنے کے لیے میں نے اور غالب نے باہر نکل کے ایک سرسری سا جائزہ لیا۔ اب شام ڈھل چکی تھی اور آہستہ آہستہ بستی کے در و دیوار پر رات کے سائے منڈلانے لگے تھے۔ کہیں کہیں ٹمٹماتے بلب نظر آرہے تھے اور گھروں میں جلنے والے چولہوں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ مجموعی طور پر ہزار ڈیڑھ ہزار مکانوں کی یہ بستی بے ترتیبی اور عدم توازن کا شکار تھی۔ اس کی کوئی پلاننگ نہیں تھی چنانچہ جس نے جہاں چاہا تھا' جیسے چاہا تھا گھر بنالیا تھا۔ ایک کا رخ مشرق کی جانب تھا تو دوسرے کا مغرب کی طرف۔ جگہ اونچی نیچی ہونے کی وجہ سے کچھ گھر الگ تھلگ بھی نظر آتے تھے۔ بیشتر مکان ایک منزلہ' تنگ اور مختصر تھے۔ بالکل شاکر علی کے مکان کی طرح۔ چند گھر پلاٹ اور اینٹ بھی بنے ہوئے تھے۔

غالب نے گھڑی دیکھ کے کہا "ایک گھنٹا ہونے والا ہے اسے گئے ہوئے۔"

میں نے کہا "انتظار کے سوا ہم کیا کرسکتے ہیں؟"

"انتظار تو باقی سب لوگ بھی کررہے ہوں گے ہمارا" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ رابعہ اور نازو پہلے پہنچی ہوں گی۔ پھر وہ تینوں آگئے ہوں گے۔ گل' محسن اور محمد خان۔"

"کیا خیال ہے تمہارا۔ وہ سب کچھ لے آئے ہوں گے؟"

"کیوں نہیں لائے ہوں گے۔ وہ بازار گئے تھے اور ان کی جیب میں پیسہ تھا" میں نے کہا "رہی کسی اتفاق یا حادثے کے امکان کی بات۔ تو ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔ اس کا غم کیوں کریں جو ابھی ہوا نہیں۔"

"یہ غم نہیں' اندیشے ہیں" غالب بولا "خطرات کے وجود کو نظرانداز کرنا خود فریبی ہے۔"

میں نے کہا "خدا نے چاہا تو ہم بھی ایک دو گھنٹے میں واپس پہنچ جائیں گے۔"

"یہاں ہمارا کام ختم؟"

"ہاں۔ ابھی تو ختم ہی سمجھو۔ ہمیں جو معلوم کرنا تھا وہ معلوم ہوگیا۔ اب مشورے سے اور منصوبہ بندی کرکے پوری تیاری کے ساتھ آئیں گے۔"

غالب نے کہا "طہورہ ہمارا نیا حریف ہے۔ ملاوٹ اور ترویج کے سلسلے کی ایک اور کڑی۔ یہ ظلم و استحصال' ہوس

www.paksociety.com

اور لالچ، تعصب اور نفرت کی سیاست کی زنجیر ہے جو نہ جانے کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جائیں گے ایسے چہرے بے نقاب ہوتے جائیں گے جو درحقیقت چوہدری ولاور ہی کے روپ ہوں گے۔ مختلف ناموں کے ساتھ مگر ایک جیسی سوچ اور ایک جیسے عزائم رکھنے والے۔"

"اب مجھے یقین آنے لگا ہے کہ بمبئی سے چل کے مال یہاں پہنچتا ہے۔ پھر اس گودام سے آگے روانہ کیا جاتا ہے" میں نے کہا "یہاں فیصلہ کن معرکہ ہو سکتا ہے۔ شہلا کی بازیابی کے لئے۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا "ہاں۔ راستے کی نسبت یہاں بہتر مواقع حاصل ہوں گے۔ ہم صورت حال اور امکانات کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے قدم اٹھائیں گے۔"

"بظاہر حفاظتی اقدامات بہت سخت ہیں۔ اور گودام کے اندر یا لمبو ترہ کے گھر میں گھسنا مجھے ناممکن نظر آتا ہے۔ لیکن ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔ کوشش کی شرط ہے۔"

غالب نے کہا "کیوں نہ ہم ایک نظر دیکھ آئیں۔ اور کچھ نہیں تو راستہ ہی معلوم ہو جائے گا۔"

میں نے سوچ کے کہا "مندر اور گودام تو دور ہیں۔ بالکل مخالف سمت میں۔ اور وہ جگہ ایسی ہے کہ بستی کے لوگ بھی ادھر بے سبب نہیں جا سکتے۔ ایک طرح سے علاقہ ممنوعہ ہے۔"

"پوجا پاٹ کے لئے تو جاتے ہوں گے؟"

"معلوم نہیں یہ پوجا پاٹ کا وقت ہے یا نہیں۔ اور پوجا پاٹ ہم کر بھی نہیں سکتے" میں نے کہا "لمبو ترہ کا گھر قریب ہے۔"

"وہاں تو شاید کوئی نہیں ہے۔ اندر باہر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔"

"شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ لمبو ترہ موجود نہیں۔"

"مالک نہ ہو تو محافظ بھی زیادہ مستعد نہیں رہتے۔ کوئی خطرہ مول لئے بغیر ہم جہاں تک جا سکتے ہیں۔"

ہم نے اندازے سے راستے کا تعین کیا۔ ایک جگہ اچانک ہماری راہ میں ایک نالا حائل ہو گیا جس کے وجود سے اب تک ہم بے خبر تھے۔ یہ برساتی نالا تھا جس میں اب پانی برائے نام نظر آ رہا تھا مگر اس کے کنارے ناہموار تھے اور دونوں کناروں پر بستی کا کوڑا کرکٹ نہ جانے کب سے پھینکا جا رہا تھا۔ اس کے ڈھیر دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ نالے کے دوسرے کنارے پر نسبتاً بہتر اور بڑے مکانات یہ ظاہر کرتے تھے کہ نئی آبادی یہاں بھی دوسرے شہروں کی طرح خوشحال لوگوں کا علاقہ ہے اور اس کی پلاننگ بھی بہتر طور پر کی گئی تھی۔ دونوں حصوں کو ملانے والا پل بھی نیا تھا جسے ہم نے اندھیرے میں نظر آنے والی روشنیوں کی قطار دیکھ کے دریافت کیا۔ سفرے بازو والی عمارت کے گرد و نواح میں چھوٹی کوٹھیاں یا بڑے مکانات پھیلے ہوئے تھے لیکن ان سب کے درمیان

لمبو ترہ کی شان امارت کی نشانی کے طور پر دو منزلہ عمارت سب سے نمایاں اور مغرور انداز سے کھڑی تھی۔ اس کی تعمیر ایک چٹانی میدان پر ہوئی تھی جو سطح مرتفع کی طرح تھا۔ چاروں طرف گھوم کر دیکھنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ ایک خاصی وسیع پہاڑی تھی جس کو اوپر سے کاٹ کر ہموار کیا گیا تھا۔ اس کے وسط میں عمارت تھی اور چاروں طرف پہاڑی کی ڈھلوان اب بھی موجود تھی جس پر سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اوپر جانے کے لئے ایک ہی راستہ تھا جو بڑے فولادی گیٹ سے شروع ہوتا تھا۔ سیمنٹ سے بنا ہوا یہ راستہ بہت آہستہ آہستہ بلند ہوتا تھا اور کسی بیل کی طرح عمارت کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ ایک دائرے کی شکل میں پیچھے سے چکر لگا کے یہ دس بارہ فٹ چوڑی سڑک دوبارہ وہیں آ جاتی تھی۔ گیٹ سے کھڑے ہو کر دیکھا جاتا تو اس راستے کی شکل نوک کے ہندسے جیسی بنتی تھی۔

ڈھلوان کے آخری حصے پر پیڑ تھے جو اس ترتیب سے لگائے گئے تھے کہ ہر درخت دوسرے درخت سے چند ہی فٹ دور تھا۔ نیچے ان کے تنے خاردار تاروں کے لئے بہترین اور مضبوط کھمبے کا کام دیتے تھے۔ ان میں آٹھ فٹ کی بلندی تک کانٹوں والے تار کیلوں سے ٹھوک کر ایک جال سا بنا دیا گیا تھا۔ تاروں سے اوپر درختوں کی شاخیں پھیل کے ایک دوسرے تک پہنچتی تھیں چنانچہ سرسبز گھنے پتوں کی اس قدرتی فصیل کو آسانی سے عبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

غالب نے کہا "یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ ان تاروں میں کرنٹ ہو گا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ دن میں نہ سہی رات کو ضرور چھوڑا جاتا ہو گا۔"

"رات کو محافظ کتے بھی چھوڑ دیے جاتے ہیں۔"

"کیا اس ڈر سے ہم اس قلعے کی تسخیر کا خیال چھوڑ دیں؟ مرزا جی! ان تاروں میں بجلی کی فراہمی روکی جا سکتی ہے۔ کیا خیال ہے کہ یہ وہی بجلی ہو گی جو بستی میں سب کو سپلائی کی جاتی ہے۔ ان کا اپنا جنریٹر نہیں ہو گا؟" میں نے کہا۔

"ایسا فرض کرنے کی وجہ؟"

"وجہ کچھ نہیں۔ انہیں ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہو گی۔ یہاں کون ہے جو اندر داخل ہونے کی سوچے۔ سب جانتے ہیں کہ انجام کیا ہوتا ہے۔"

"تار کاٹتے ہی اندر الارم بجنے لگتا ہو گا۔"

میں نے کہا "الارم بھی تو بجلی سے چلتا ہے۔ اگر کوئی تار کاٹے بغیر اس وقت اندر داخل ہو جائے جب لائٹ آف ہو تو کیسے پتا چلے گا؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "ہنگامی ضرورت کے لئے جنریٹر ضرور ہو گا۔ کہ بجلی چلی جائے تو فرق نہ پڑے۔"

میں نے کہا "آپ توجہ فرمائیں میری بات پر۔ فرض کیا

ہم کسی سب اسٹیشن یا پاور ہاؤس پر قبضہ کر کے لائٹ آف کر دیتے ہیں۔ پوری بستی میں اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ تو ہو گا نہیں۔ ہمارے ملک کی طرح یہاں بھی بریک ڈاؤن ہوتے ہیں اور لوگ اس کے عادی ہیں۔ سب اسٹیشن یا پاور ہاؤس کا عملہ محدود ہوتا ہے۔ انہیں آسانی سے قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ ایک آدھ سنتری ہو گا تو کیا کرے گا۔ ہم صرف پانچ منٹ کے لئے سپلائی آف کر دیں۔ پانچ منٹ میں تاروں کی باڑھ عبور کی جا سکتی ہے۔ پانچ منٹ تو جنریٹر کو اسٹارٹ کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ لائٹ جانے کے بعد ایک آدھ منٹ تو انتظار کرنے میں گزر جاتا ہے اور اس امید میں کہ شاید لائٹ آ جائے۔ پھر کوئی سوچتا ہے کہ اب جنریٹر چلایا جائے۔ جنریٹر عموماً الگ اور گھر کے آخری حصے میں دور لگائے جاتے ہیں کیوں کہ وہ شور بہت کرتے ہیں۔ جتنی دیر میں کوئی جنریٹر تک پہنچے گا اور اسے رسی کھینچ کے اسٹارٹ کرے گا، سپلائی بحال ہو جائے گی۔ کسی کو کیسے شک ہو سکتا ہے کہ چند منٹ کا یہ بریک ڈاؤن سازش تھی۔"

غالب نے کہا "تجویز قابل عمل ہے۔ چلو اب واپس چلتے ہیں۔"

ہم اسی راستے سے واپس ہوئے جدھر سے گئے تھے۔

"میں سوچتا ہوں کہ پانچ منٹ بہت ہوتے ہیں۔ ہماری ٹیم کا ایک رکن پاور ہاؤس میں رہے اور باقی سب یہاں انتظار کریں۔ اندھیرا ہوتے ہی وہ اندر کود جائیں اور دیکھن کی ڈھلوان چڑھ کے اوپر کوٹھی تک پہنچ جائیں۔"

"اور خونخوار قسم کے کتے بھی ہیں۔"

میں نے کہا "کتے ہر وقت کھلے نہیں پھرتے ہوں گے۔ انہیں رات گئے کھولا جاتا ہو گا۔ ہم اپنا کام رات کے ابتدائی حصے میں کر سکتے ہیں۔ سورج غروب ہونے کے ایک گھنٹے بعد۔ اس وقت کتے بند ہوں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ لمبا بریک ڈاؤن ہو تو وہ کتوں کو چھوڑ دیں۔ مگر صرف پانچ منٹ بعد لائٹ آ جائے گی تو اندر جو لوگ موجود ہوں گے وہ مطمئن ہو کے بیٹھ جائیں گے اور ان پر اچانک حملہ کر کے..."

"ابھی تک اس حملے کی غرض و غایت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ سب کرنے سے حاصل کیا ہو گا؟" غالب نے معنی خیز بات کاٹ کے کہا۔

میں نے سوچ کے کہا "ابھی میں کیا بتا سکتا ہوں۔ لیکن یہ کسی دشمن کا قلعہ ہے۔"

"اس میں تو شک کی کوئی بات نہیں۔"

"یہاں کچھ نہ ملا تب بھی وہ لوگ تو ملیں گے جو اس قلعے کی حفاظت کے لئے مامور ہیں۔ انہیں یرغمال بنایا جا سکتا ہے اور انہیں مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ دوسرے ٹھکانے تک ہماری رہنمائی کریں۔ ان سے وہ سب کچھ پوچھا جا سکتا ہے جو ہمارے لئے جاننا ضروری ہے۔ براہ راست مندر پر حملہ کرنا خلاف مصلحت ہو گا لیکن دوسرے مرحلے میں ہم گودام تک پہنچ سکتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں کامیابی سے ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔"

غالب نے کہا "میں کوشش کر رہا ہوں کہ اس منصوبے میں کوئی خامی تلاش کر کے اسے مسترد کر دوں۔"

میں نے کہا "اس میں ناقابل عمل کوئی بات نہیں۔ رابعہ، نازو یا گل میں سے کوئی پاور ہاؤس میں آسانی سے داخل ہو سکتی ہے۔ اور ٹھیک وقت پر پاور کی سپلائی آف کر سکتی ہے۔ یا کرا سکتی ہے۔ بہتر ہو گا اگر یہ کام رابعہ کو دیا جائے۔ گل اور نازو ہمارا ساتھ دیں۔"

"وہ گیٹ بھی کھلوا سکتی ہیں۔ اور ادھر سے اندر پہنچ سکتی ہیں" غالب نے کہا۔

"میں اس ترمیم سے اتفاق کرتا ہوں۔ پیچھے سے ہم تینوں داخل ہو جائیں تو سمجھو قلعہ فتح" میں نے کہا "اگر شہلا کو چھپانا ہے تو اس کے لئے یہی سب سے موزوں جگہ ہے۔ اسے وہ یہاں لائیں گے تو کسی ایک جگہ رکھیں گے۔ یا اس پرانے یتیم خانے میں جو اب گودام ہے۔ یا لمبو ترہ کی اس کوٹھی میں۔ گولڈن فالکن کے حوالے سے ان کا یہاں آنا قرین قیاس ہے۔ کتنا مزہ آئے اگر ہم پہلے سے ان کے استقبال کے لئے موجود ہوں۔"

شاکر علی کا گھر آ گیا تھا اور وہ دروازے میں کھڑا بڑی بے چینی سے ہماری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ پانچ ہزار روپے انعام میں ملنے کا خیال اس کو مضطرب رکھنے کے لئے کافی تھا۔

"آپ لوگ کہاں چلے گئے تھے؟" اس نے قریب آ کے کہا۔

"ہم ایسے ہی گھومنے گئے تھے" میں نے کہا "تم کیا خبر لائے ہو؟"

"وہ دونوں لڑکیاں آئی تھیں" شاکر علی نے کہا "انہیں کئی لوگوں نے دیکھا تھا۔"

"وہ کیسے آئی تھیں؟ ٹیکسی میں۔"

"یہ... یہ تو کسی نے نہیں بتایا بس گاڑی کی بات کی تھی۔ گاڑی روک کے انہوں نے ایک جگہ چائے پی تھی۔ اور یہ معلوم کیا تھا کہ گولڈن فالکن نام کا کوئی ہوٹل یا ریسٹورنٹ ہے یہاں۔"

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "براہ راست پوچھ لیا۔ حد ہے عقل مندی کی۔ خیر۔ پھر کیا ہوا؟"

شاکر حیران ہوا "لوگوں نے کہا کہ اس نام کا ہوٹل ریسٹورنٹ تو کوئی نہیں۔ ایک نوجوان نے کہا کہ کہیں یہ لمبو ترہ صاحب کی کوٹھی کا پتا تو نہیں پوچھ رہی ہیں۔ وہ انگریزی سمجھتا تھا۔"

www.paksociety.com

"اچھا پھر؟" میں نے تشویش سے کہا۔
"پھر وہ انہی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا تھا' انہیں راستہ بتانے کے لئے۔ راستہ ادھر پل کے اوپر سے جاتا ہے۔"
"میں نے کہا" پھر وہ کب واپس ہوئیں؟"
"یہ کسی نے نہیں دیکھا" شاکر علی بولا۔
"وہ نوجوان کون تھا؟ اس سے معلوم کرنا تھا۔"
"میں نے اسے تلاش کیا تھا مگر وہ ملا ہی نہیں۔ اس کے گھر بھی گیا تھا۔ دوپہر کے بعد سے وہ غائب ہے۔ کسی نے اسے نہیں دیکھا" شاکر علی بولا۔
غالب نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا "کہیں وہ مندر کی طرف تو نہیں گئی تھیں؟"
شاکر علی نے سر ہلایا "بس اتنا ہی معلوم ہوا۔ لوگ آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ دوست تھے۔ اسی وقت چلے گئے تھے۔ جس بدمعاش کو آپ نے مارا تھا' اس نے بہت گالیاں دیں مجھے۔ اور مجھے مارتا۔ لیکن میں نے کہا کہ میرا کیا قصور ہے۔ تم نے خود ہی لڑائی مول لی تھی ان سے۔"
میں نے کہا "شاکر علی' ہم اب واپس جائیں گے۔"
شاکر علی کا چہرہ اتر گیا "ابھی۔ اسی وقت؟"
میں اس کی مایوسی کی وجہ سمجھ گیا۔ میں نے کہا "تم ابھی تک بہت کارآمد ثابت ہوئے ہو اس لئے یہ لو اپنا انعام۔"
پانچ ہزار وصول کرتے ہی اس کا چہرہ روشن ہو گیا "مہربانی ہے آپ کی۔"
"لیکن ابھی تمہارا کام پورا نہیں ہوا" میں نے کہا۔ "اصل کام ابھی باقی ہے شاکر علی۔ اس کا معاوضہ الگ ہوگا۔"
"لیکن آپ تو جا رہے ہیں۔"
"ہاں۔ ابھی ہم جا رہے ہیں۔ مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ہم آج رات کو کسی وقت لوٹ آئیں یا کل رات ہم آ جائیں" میں نے کہا "ہم چھپ کر آئیں گے۔ کسی کو ہمارے آنے کی خبر نہیں ہوگی۔"
اس نے کہا "آپ فکر مت کریں۔ میں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گا۔"
"یہ نہ ہو کہ پیسہ ہاتھ میں آتے ہی تم [illegible] کے ہو جاؤ ہم آئیں تو تمہیں اپنا بھی ہوش نہ ہو۔" میں نے کہا "اگر ایسا کرو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔ تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ ہم کب آئے اور کب چلے گئے۔ تم سوتے رہ جاؤ گے۔ دس ہزار گنوا دو گے۔"
شاکر نے کہا "ایسا نہیں ہوگا' آپ یقین کریں۔"
میں نے کہا "اور صرف دس ہزار کی بات نہیں ہے۔ تم کس حد تک ہمارا ساتھ دیتے ہو' اس پر تمہارے انعام کا انحصار ہے۔"
"میں... میں سب کچھ کر سکتا ہوں" اس کی آواز کانپنے لگی۔
میں نے اسے آزمانے کے لئے کہا "ہمیں گھر [illegible] کے رکھ سکتے ہو؟"
"کیوں... کیوں نہیں" وہ پھڑک کر بولا۔
"کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے کہ ہم تمہارے گھر میں چھپے ہوئے تھے۔ یہ ذمہ داری قبول کر [illegible]"
اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اس نے کسی خطرے میں شرکت کے لئے رضامندی کا اظہار کر دیا ہے۔ [illegible] نوعیت کا بھی اسے صحیح علم نہیں۔ مگر اتنی بڑی رقم کا [illegible] مجبور کر رہا تھا کہ وہ سوچے سمجھے بغیر اقرار کرے۔
"تمہاری بیوی کس حد تک بھروسے کے قابل [illegible]"
"وہ.... وہ کسی سے ذکر نہیں کرے گی۔ میں اسے [illegible] دوں گا۔ جب اسے معلوم ہوگا... کہ یہ مکان خرید [illegible] ...تو وہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جائے گی۔ اسے [illegible] ہے کہ بچوں کے لئے چھت کا سایہ تو ہو۔ ہر مہینے کرایہ [illegible] ہی سب سے مشکل ہوتا ہے۔ جتنا وہ محنت کر کے [illegible] اس میں سے آدھا تو کرائے میں نکل جاتا ہے۔ پھر [illegible] نہیں رہے گی۔ ابھی وہ ڈرتی ہے کہ کچھ ہو گیا۔ تو تمہاری دوسری کر لوں گا۔ اس کا قیاس ہے کہ مرد ایسے ہی ہوتے [illegible] سب۔ میرے یقین دلانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا [illegible] ہے تم تو جیتے جی مر گئے ہو سب کے لئے۔ بعد میں کیا [illegible] بچوں کے لئے' جب آج کچھ نہیں کر رہے ہو۔ اور وہ اس سے بھی ڈرتی ہے کہ بیمار نہ پڑ جائے۔ ایک بار بڑی [illegible] چڑھ گیا تھا۔ لالہ جی دو دن سامان باہر رکھنے کی دھمکی دیتے [illegible] اگر یہ فکر دور ہو جائے گی تو وہ بچوں کو پال لے گی۔ مجھے [illegible] لے گی اب بھی انہوں کے پیچھے دیتی ہے۔ کوسنے بھی [illegible] مگر..." وہ بات کرتے کرتے رونے لگا۔
میں نے اور غالب نے اس کی بات بڑے دکھ کے انداز کے ساتھ سنی تھی۔ مجھے اس آدمی کی بے بسی پر غصہ [illegible] اور ترس بھی۔
میں نے کہا "شرم نہیں آتی روتے ہوئے۔ مرد روتے ہو۔ اتنا ہی احساس ہے تو کام کرو۔ اب بھی وقت [illegible] ساری عمر پڑی ہے۔"
اس نے آنسو پونچھ کے کہا "آپ یہ بھی اسے [illegible] میری بیوی کو۔ اور کل بھی جو دیں اسے ہی دیں۔ مجھ [illegible] بھروسہ نہیں۔ کہیں اڑا دوں گا گنوا دوں گا۔ کوئی [illegible] کا مجھ سے۔"
میں نے رقم اس سے لے لی "ٹھیک ہے جیسا چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔"
غالب نے کہا "تمہارا یہ مکان کتنی قیمت کا ہے؟"
"پہلے تو لالہ جی کسی سے پچیس ہزار میں سودا کر [illegible] رہا تھا۔ اب پتا نہیں کیا مانگ لیں" وہ بولا۔
میں نے کہا "خیر تم اس کی فکر مت کرو۔ مکان جتنی قیمت کا بھی ہوگا تمہیں مل جائے گا۔"
غالب نے کہا "لالہ جی بیچنے پر تیار ہوں گے؟ اور تم سے پوچھیں گے نہیں کہ کل تک تم کرایہ بھی نہیں دے سکتے تھے۔ آج مکان کیسے خرید رہے ہو۔"
"یہ تو سب ہی پوچھیں گے" وہ سر جھکا کے بولا "میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ مجھے آپ کا بھی نام نہیں لینا پڑے گا۔ کوئی نہیں مانے گا کہ میری لاٹری نکل آئی ہے۔"
میں نے کہا "تم کہنا کہ میرے دوست ہی پھر آ کے سودا کریں گے۔ اور ہم لالہ جی سے معاملہ طے کرنے کے بجائے خود نہ آئے تو اپنے کسی وکیل کو بھیج دیں گے جو سب قانونی معاملات ٹھیک کرے گا۔ تمہیں بعد میں بھی پریشانی نہیں ہوگی۔"
شاکر علی نے کہا "ایک بات پوچھوں اگر آپ ناراض نہ ہوں تو؟"
"مجھے معلوم ہے کہ تم کیا پوچھو گے" میں نے کہا "تم پوچھو گے کہ آخر ہم اتنی فراخدلی سے پیسہ کیوں پھینک رہے ہیں۔ اور تم پر اتنے مہربان کیوں ہو گئے ہیں۔ جب کہ ابھی تک ہم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ ہم یہاں کیوں آئے تھے۔ ہمارے دشمن کون ہیں؟"
شاکر علی نے بمشکل تمام سر ہلایا "آپ کو سب معلوم ہے۔ میں بہت غریب اور کمزور آدمی ہوں۔ میں کسی کی دشمنی مول لے کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لالچ میں میرے بیوی بچوں کی جان بھی جائے اور یہ مکان ہی ان کا مزار بن جائے۔"
میں نے اسے تسلی دینے کے لئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "ابھی تک ہمارے دشمنوں کو بھی معلوم نہیں کہ ہم یہاں تک آ گئے ہیں۔"
"آخر کون ہیں آپ کے دشمن؟"
"یہ ہم ابھی نہیں بتا سکتے شاکر علی۔ اور تمہارے لئے یہ سب جاننا قطعی غیر ضروری ہے کہ اس دشمنی کا سبب کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ تم ان معاملات سے بالکل لاتعلق رہو تو اچھا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ تم ہمیں مل گئے۔ تم مسلمان بھی ہو اور تمہاری ضرورت پوری کرتے ہوئے ہمیں تھوڑا سا اطمینان قلب بھی حاصل ہوگا۔ تم نہ ملتے تو ہم کسی اور کی خدمات حاصل کرتے۔ نقد پیسہ خرچ کر کے سب کچھ مل جاتا ہے۔"
"میں اور میرے بچے جب تک زندہ رہیں گے...."
میں نے اس کی بات کاٹ دی "احسان کی بات مت کرنا' ہم کوئی احسان نہیں کر رہے ہیں۔ تم سے ایک کام لے رہے ہیں اور اس کا معاوضہ ادا کر رہے ہیں۔ آج رات یا کل ہمارا انتظار کرنا' ہم ضرور آئیں گے۔ اگر آج ہی لوٹ آئے تو کل کا دن چھپ کر تمہارے گھر میں گزاریں گے اور رات ہوتے ہی چلے جائیں گے۔ کل آئے تو چند گھنٹے تمہارے مہمان ہوں گے۔ اس کے بعد تم ہمیں ایسے بھول جاؤ گے جیسے ہم کبھی آئے ہی نہیں تھے۔ رازداری بہت ضروری ہے۔ تمہارے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی۔"
غالب نے کہا "تم نے سب کو بتا دیا ہے نا کہ ہم چلے گئے ہیں؟"
"ہاں۔ لیکن آپ ابھی باہر گھوم کے آئے ہو...."
میں نے کہا "یہ رات کا وقت تھا۔ کسی نے ہمیں نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ یہ ہو سکتا ہے کہ کل ہم آئیں تو ہمارا حلیہ بدلا ہوا ہو۔"
غالب نے کہا "ہمارے ساتھ کچھ اور ساتھی بھی ہوں گے۔ چند عورتیں۔"
"کون عورتیں؟" شاکر علی چونکا "وہی...."
"ہاں۔ جو آج دن میں چکر لگا گئی ہیں۔"
"وہ... آپ کے گروہ میں شامل ہیں۔ آپ لوگ ڈاکو ہو؟ یا جاسوس؟" شاکر علی پریشان ہو کے بولا۔
میں نے اس کے اطمینان کی خاطر کہا "وہ بیویاں ہیں ہماری' ہم انہیں پیچھے نہیں چھوڑ سکتے۔"
غالب نے کہا "کیا ڈاکو ہم جیسے ہوتے ہیں۔ کہ کچھ لے جانے کے بجائے کچھ دے کر جائیں۔ اور جاسوس یہاں بھلا کیا لینے آئیں گے؟ کیا ہے یہاں آخر؟"
شاکر علی مطمئن ہو گیا "سب ملا کے کتنے لوگ ہوں گے؟"
میں نے کہا "زیادہ سے زیادہ چھ۔ لیکن تم مہمان داری کے چکر میں مت پڑنا ہم کھانا پینا خود کر لیں گے۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
میں نے کہا "ایک آخری بات۔ کیا تم ضرورت کا کچھ سامان یہاں سے لے کر رکھ سکتے ہو؟"
"کیسا سامان؟"
میں نے کہا "کچھ کپڑے ہمارے لئے۔ فرض کرو ہم ہندو برہمن وغیرہ بن کے جانا چاہیں۔ تم نے دیکھا تو ہوگا کہ ان کا حلیہ کیسا ہوتا ہے۔ پیسے ہم سے لے لو اور حلیہ بدلنے کا سامان خرید لاؤ یا کسی سے منگوا لو۔ کسی دوسری جگہ سے لے آؤ تاکہ شک نہ ہو کسی کو۔"
شاکر علی اب دلچسپی لینے لگا تھا "میں یہ سب کر لوں گا۔"
غالب نے کہا "ایسے ہی تین عورتوں کے لئے مقامی لباس جس میں وہ یہاں کی رہنے والی نظر آئیں۔ پرانے کپڑے ہوں تو بہتر ہے۔"
"میری بیوی کے کپڑے ہیں...."
میں نے کہا "تمہاری بیوی کے کپڑے سب کے دیکھے بھالے ہوں گے۔ اپنے لئے خطرہ مول مت لو۔ تم نے ہماری

www.paksociety.com

ساری بات سمجھ لی ہے نا؟ ہم یہاں چھپ کر رہیں گے۔ ہمیں بدلے کے دشمنوں پر حملہ کرنے جائیں گے کیوں کہ ہمارے دشمن ہندو ہیں۔ انہیں نیست و نابود کر کے ہم واپس یہیں آئیں گے تمہارے پاس... ٹھیک ہے؟"

اس نے سر ہلایا اور ہم اس کی بیوی کو پانچ ہزار روپے دے کے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ وہ بضد تھی کہ ہم کھانا کھا کر جائیں لیکن ہم مزید دیر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اسے ساری بات سمجھانے کی ذمے داری شکار علی کو سونپ دی تھی۔ اس عورت کا مزاج اب بہت بدلا ہوا تھا لیکن وہ تجسس میں مبتلا تھی اور شاید ہم سے بہت سے سوال پوچھنے کے لئے بیتاب تھی۔

ہم نے ایک طویل راستہ اختیار کیا اور مندر کی جانب سے گزر کے سڑک پر پہنچے۔ مندر کے ساتھ والی عمارت کو دیکھتے ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ کبھی پہلے یتیم خانہ تھا۔ اور اب یہ گودام ہے۔ اس کے گرد چار دیواری تھی اور شاید گودام بنانے کے بعد اس کی بلندی بڑھا کر آٹھ فٹ کر دی گئی تھی۔ پرانی دیوار صرف تین فٹ اونچی تھی۔ فصیل کی چار دیواری پر لالٹینیں نصب تھیں جو اس وقت بھی جل رہی تھیں اور دیوار کے دونوں جانب کے علاقے کو روشن کر رہی تھیں۔ گودام سے سڑک تک جانے والا کچا راستہ گیٹ کے سامنے سے شروع ہوتا تھا۔ ہم اس راستے سے بہت دور رہے اور بڑی سڑک تک پہنچ گئے۔

رات کے دس بجے تھے۔ دونوں جانب سے گاڑیاں مسلسل آ جا رہی تھیں۔ بس کے ذریعے سفر کرنا مناسب نہ تھا۔ اس میں وقت بھی ضائع ہوتا اور بس ہمیں نہ جانے کہاں اتارتی۔ وہاں سے پھر ٹیکسی ہی لینی پڑتی چنانچہ ہم کسی خالی ٹیکسی کے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ ٹیکسی بمبئی کی طرف سے ہی آسکتی تھی مگر رات کے وقت ٹریفک نسبتاً کم تھا۔ اتنی دیر میں ناگپور کی طرف سے آنے والی بہت سی گاڑیاں گزریں لیکن واضح اشارے کے باوجود کسی نے لفٹ دینے کی درخواست کو قابل غور نہیں سمجھا۔ ایک شخص نے ہمیں بتایا کہ اگر کوئی ٹیکسی آئے گی تو کہاں کھڑی ہوگی۔ اس نے ایک ہوٹل کی طرف اشارہ کیا تھا جہاں خاصی رونق تھی۔ لوگ کرسیوں پر پاؤں رکھے چائے پی رہے تھے اور سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے بلند آواز میں لتا کے پرانے گانے سن رہے تھے۔

اتفاق رائے سے میں نے اور غالب نے ڈنر کا فیصلہ کیا۔ اگر ہم فوراً روانہ ہو جاتے تب بھی گیارہ ساڑھے گیارہ سے پہلے اپنے ٹھکانے پر نہیں پہنچ سکتے تھے اور وہاں پہنچ کر بھی کھانا ملنا غیر یقینی تھا۔

کونے کی ایک خالی میز کرسی پر قبضہ جماکے میں نے پیروں کو جوتوں سے نجات دلائی۔ نئے جوتوں نے میری ایڑی پر کاٹا تھا اور جلد کو چھیل دیا تھا۔ غالب اپنے دونوں انگوٹھوں پر پڑ جانے والے نشانات کو مسل رہا تھا۔

ایک ملباری نے ہمارے سر پر نازل ہو کے کہا۔۔۔ غالب نے کہا "تم ہی کچھ بولو۔ آج غالب غزل [illegible] ہوگا۔"

ویٹر نے غالب کی بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ایک غزل پڑھنی شروع کی جس کا قافیہ تھا گوشت۔ گوشت اور آلو گوشت... پالک گوشت۔ بھنا گوشت۔ میں نے اسے وہیں روک دیا "یہ سب نہیں [illegible] بس ایک اچھی چیز لے آؤ جو آسانی سے کھائی جائے۔"

"اور جو انسان کھاتے ہوں" غالب نے کہا "آدم خور [illegible] شادی شدہ یا قیدی نہیں۔"

ویٹر نے ہمیں عجیب سی نظروں سے دیکھا اور نہیں کیا کہہ گیا۔ جانے سے پہلے اس نے المونیم کا جگ گلاس دھڑ سے میز پر رکھا۔ صبح سے مسلسل استعمال والے جگ اور گلاس پر سب گاہک اپنے فنگر پرنٹ [illegible] مکمل اور پان سے لال ہونٹوں کے نشانات چھوڑ گئے [illegible] جراثیم نظر آتے تھے اور نہ ان کی اقسام کا شمار ممکن تھا۔ جگ کے اندر مٹیالا پانی تھا۔ غالب نے اسے معدنیاتی پانی قرار دیا۔ کھانے کے بعد غالب نے کہا "یار، کیا کھایا تھا ہم [illegible]"

میں نے کہا "میں دیکھ نہیں سکا تھا۔ بھوک اتنی لگی تھی کہ بس کھا لیا۔"

"اور کھانے کا معیار کیسا تھا؟"

میں ہنس پڑا "اس پر بھی غور کرنے کا خیال نہیں [illegible]"

"ابھی ہم چائے کے نام پر ایک بدذائقہ گرم [illegible] بہت خوش ہو کے نکلیں گے" غالب بولا۔

میری نظر میز کے نیچے گئی۔ وہاں ہڈیوں، [illegible] چیکنوں اور بچے ہوئے ٹکڑوں کے درمیان ایک [illegible] اخبار بھی پڑا ہوا تھا جسے دن بھر میں درجنوں افراد کے ہاتھوں [illegible] بڑی بے دردی سے استعمال کیا تھا۔ میں نے اسے کسی مقصد کے بغیر اٹھا لیا۔ یہ ہندی کا اخبار تھا جو ہمارے لئے [illegible] سے کم نہ تھی۔

"معلوم نہیں آج کل دنیا میں کیا ہو رہا ہے" میں نے [illegible]

"اور اپنے وطن میں کیا ہو رہا ہے۔"

"ہماری مرضی سے کچھ نہیں ہو رہا ہے" غالب [illegible] "اور نہ ہوگا۔"

اچانک میں نے اخبار کے پہلے صفحے پر محمد خان کی [illegible] دیکھی۔ میں نے باکس میں لگی ہوئی خبر کو دیکھا اور کہا "یہ دیکھو، محمد خان کی تصویر ہے۔"

غالب نے تصویر دیکھ کے سر ہلایا "محمد خان ایک شخصیت ہے۔"

میں نے کہا "اگر یہ آج کا اخبار ہے تو ضرور کوئی [illegible]

کسی سے پوچھیں؟"

غالب نے اخبار مجھ سے لے لیا "تاریخ تو آج کی ہے۔ یہ دیکھو اخبار کی لوح پر" تاریخ انگریزی میں بھی درج تھی "کسی سے پوچھ لیتے ہیں۔"

غالب نے کہا "یعنی گویا پھر اعتراف کریں کہ ہم ان پڑھ ہیں۔"

ویٹر نے ہمارا مسئلہ حل کر دیا۔ وہ برتن اٹھانے کے لئے آیا تھا۔ میں نے اخبار اس کے سامنے کر دیا "یہ تو ڈاکو خونی خان ہے۔"

ویٹر نے انداز میں سر ہلایا "مارا گیا سالا" اور تیزی سے میز پر گیلا کپڑا مارنے لگا۔

میرا دل ایک لمحے کے لئے دھڑکنا بھول گیا تھا "مارا گیا۔ کب؟"

"آج۔ پولیس نے مار دیا۔ اخبار میں آیا ہے۔"

میں نے آواز کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا "ہم ہندی نہیں جانتے۔ ذرا مہربانی کر کے یہ خبر سنا دو۔"

ویٹر نے اسے اپنی عزت افزائی سمجھتے ہوئے ہماری درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور مختصر سی خبر کو فوراً پڑھ دیا۔ اس خبر کے مطابق جیل سے فرار ہونے والے ڈاکو خونی خان کو اسپیشل پولیس کے ایک اسکواڈ نے اس وقت گولی مار کے ہلاک کر دیا جب وہ کسی واردات کی نیت سے ایک کار ڈیلر کے شوروم میں داخل ہوا۔ کار ڈیلر نے اسے پہچان کے پولیس کو فون کر دیا۔ خونی خان شوروم کے ایک ملازم کو یہ جھانسا دے رہا تھا کہ وہ ایک اچھی سی گاڑی خریدنا چاہتا ہے مگر درحقیقت وہ اس بہانے سے اندر گھس کر مالک کے سیف میں پڑی ہوئی کئی لاکھ کی رقم چھین کر بھاگنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔ پولیس کو دیکھتے ہی اس نے بھاگنے کی اور فائرنگ کرتے ہوئے گھیرا توڑ کر نکل جانے کی کوشش کی مگر پولیس نے جوابی فائرنگ سے یہ کوشش ناکام بنا دی۔ ڈاکو محمد خان تین گولیاں لگنے سے موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ پولیس کا ایک نوجوان سب انسپکٹر بھی مارا گیا۔ تین پولیس والوں کو زخمی حالت میں اسپتال لے جایا گیا۔ زخمی ہونے والوں میں شوروم کے مالک کے علاوہ ایک مرد اور ایک عورت بھی شامل ہیں۔

آواز پڑتے ہی ویٹر نے اخبار میز پر پھینکا اور برتن لے کے بھاگ گیا۔ ہم نے خبر کا ایک ایک لفظ سنا تھا اور اب صدمے کی شدت سے سنبھلنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ذرا سی دیر میں گزر جانے والا جذباتی زلزلہ ہمارے حواس کو تہس نہس کر گیا تھا۔ خبر کا ہر لفظ چیخ چیخ کر اپنے سچ کو تسلیم کرانے پر مصر تھا اور خواہش کی آواز کہتی تھی کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

"یار، خونی خان مر گیا" غالب نے کھوکھلے سپاٹ لہجے میں یوں کہا جیسے یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔

"ڈاکو تھا۔ ڈاکو مارا گیا تو" میں نے تلخی سے کہا "ڈاکو کہیں بھی جاتا ہے اسی نیت سے جاتا ہے۔ اس سے کسی کو کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ کیا لینے آیا تھا۔ وہ بیمار بیوی کے لئے دوا لینے جاتا یا بچے کے دودھ لینے اسی طرح مارا جاتا۔ کاروں کے شوروم میں تو اس کی موجودگی سے ہی اس کی نیت ثابت ہو جاتی ہے۔ وہ کسی بینک کے سامنے سے گزرتا یا جیولر کی دکان کے سامنے سے تب بھی یہی سمجھا جاتا۔"

"کاش کوئی اسے مہلت دیتا۔ اسے گرفتار کر کے کچھ پوچھتا" غالب نے دکھ سے کہا۔

"کیا ضرورت تھی اس سارے جھمیلے کی۔ آسان کام یہی تھا کہ اسے مار دیا جائے۔ پہلے بھی اسے پکڑا تھا تو کارروائی قانون کے مطابق ہوئی تھی اور سزا بھی۔ مگر حاصل کیا ہوا اس سے؟ وقت ضائع ہوا انصاف کرنے والوں کا۔ وہ جیل توڑ کے بھاگ گیا۔ اب دوبارہ کسی لمبے چکر میں پڑنے کی ضرورت کو نظر انداز کیا گیا۔ ہمارا ایسے پولیس مقابلے انصاف کے نام پر ہمارے ملک میں بھی ہوتے ہیں۔"

غالب نے تلخی سے کہا "اب پولیس کو اضافی سند ملے گی۔ ترقی ملے گی۔ حالانکہ وہ قاتل ہیں۔ انہوں نے سامنے جا کے اس سے کچھ پوچھے بغیر اسے گولی ماری ہوگی۔ محمد خان نے ہرگز مقابلہ نہیں کیا ہوگا۔ اسے موقع ملتا تو وہ اپنی صفائی پیش کرتا۔ شاید یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ وہ تائب ہو چکا ہے۔"

"کون مانتا ہے کسی ڈاکو کی بات۔ کون موقع دیتا ہے اسے تائب ہونے کا۔ قتل وہ ہوتا ہے جو قتل ثابت کیا جائے۔ پولیس نے تو اپنے دفاع میں گولی چلا کے اپنا فرض ادا کیا۔"

"اسے ہم نے مروا دیا سکندر" غالب نے افسوس سے سر ہلا کے کہا "ہم نے بھیجا تھا اسے۔ اتنا تو وہ بھی جانتا ہوگا کہ اس کے لئے تمام عمر پولیس کی نظر سے چھپ کر گزارنا مشکل ہوگا۔ لیکن اس نے ایک چانس لیا تھا۔ وہ اپنی سابقہ زندگی کے سارے جرائم کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ ایک اچھے مقصد کے لئے جان دینا چاہتا تھا۔ مقدر نے اسے یہ بھی نہ کرنے دیا۔ اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کہ وہ شہید ہو۔ وہ ایک ڈاکو کی طرح ہی مارا گیا۔"

"اگر وہ ڈاکو رہتا تو شاید اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی نہ مارا جاتا" میں نے کہا "ہمارا ساتھ دینے سے اس کی زندگی مختصر ہو گئی۔"

"زندگی کو طول دینا یا مختصر کرنا کس کے اختیار کی بات ہے... ہاں اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جب اس نے ہمارا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور جان بھی اس نے ہمارے ہی لئے دی تو کیا اس کا مقصد پورا نہیں ہو گیا؟ وہ یہاں نہ مارا جاتا کہیں اور ہمارے کسی دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا جاتا۔ گنتی والے ہو چاہیں گنتے رہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ مرتے وقت وہ ڈاکو نہیں تھا۔ اتنا ہی مجاہد تھا جتنے ہم ہیں۔"

www.paksociety.com

"ہم بعد میں اس کے لئے فتوے حاصل کریں گے۔ وہ ڈاکو اگر جملہ کرتے ہوئے مارا جائے تو شہید کہلاتا ہے یا نہیں؟" میں نے احساس کی تلخی سے مغلوب ہو کے کہا "اور اس کے لئے مغفرت کی دعا کرنی جائز ہے یا نہیں۔ ابھی سوچو محسن اور گل کے بارے میں۔ وہ زخمی ہو کے اسپتال میں پڑے ہوئے تھا۔"

"ان کا نام تو نہیں تھا خبر میں" غالب بولا۔

"مگر اور کون ہو سکتا ہے محمد خان کے ساتھ زخمی ہونے والا۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ نام کیسے آسکتا ہے ان کا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کس اسپتال میں ہیں۔ اور پولیس نے انہیں بھی ڈاکو محمد خان کے ساتھی کی حیثیت سے حراست میں تو نہیں لے رکھا ہے۔ وہ اکٹھے گئے تھے۔ شاید اس وقت وہ بھی شوروم میں ہی ہوں گے۔ اور پولیس نے ان کے پاس سے بھی ایک ایک لاکھ بھی برآمد کر لئے ہوں گے۔" تاریکی کے اندھیرے میں میرا دماغ دیوانہ وار بھٹکنے لگا۔ اگر ایسا ہوا تو ہم انہیں کیسے چھڑائیں گے؟ وہ کیا بتائیں گے پولیس کو۔ کہ اتنی بڑی رقم ان کے پاس کہاں سے آئی۔"

غالب نے اٹھتے ہوئے کہا "چل۔ وقت ضائع کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ رابعہ اور نازو کو بھی اب تک ساری بات معلوم ہو چکی ہوگی۔ وہ کتنی پریشان ہوں گی۔"

ویٹر ہمارے پیچھے دوڑا "اے بھائی! کھایا پیا اور کھسکنا مانگتا ہے کیا؟"

میں نے معافی مانگتے ہوئے اسے سو روپے کا نوٹ دیا۔ بل صرف ساڑھے آٹھ روپے بنا تھا۔ میں نے روپے واپس لے اور باقی چھوڑ دیے۔ ہوٹل کے سامنے خالی جگہ میں اب ایک ساتھ دو ٹیکسیاں خالی کھڑی ہوئی تھیں مگر ڈرائیور کسی کا موجود نہ تھا۔ ہمارے قریب پہنچتے ہی ایک ٹیکسی کا ڈرائیور جانے کدھر سے نمودار ہو گیا۔

"کدھر جانے کو ہے صاحب؟" اس نے خوش دلی سے کہا۔

میں نے بیٹھنے کے بعد کہا "بمبئی۔"

"بمبئی... بمبئی میں کدھر؟" اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔

"یہ ہم بمبئی جا کے بتائیں گے" غالب نے کہا۔

"دراصل ہم اجنبی ہیں اس شہر میں۔ ہم نہیں جانتے کسی بھی جگہ کا اور سڑک کا" میں نے کہا۔

ڈرائیور نے سر گھما کے پیچھے دیکھا "پھر کیسا پہنچے گا؟"

میں نے کہا "ہمارے پاس ایک نقشہ ہے۔ اسے سمجھو۔"

اس نے مجھ سے نقشہ لے کر اسٹیئرنگ پر رکھا اور اپنی نظر بھی سڑک کے بجائے نقشے پر رکھی۔ نتیجہ یہ کہ دو مرتبہ میں نے کلمہ پڑھا مگر سامنے سے آنے والے دونوں ڈرائیور بڑی ہوشیاری سے خود کو بچا کے نکل گئے۔

"ابھی آپ تسلی کرو" اس نے نقشہ مجھے واپس کیا "ادھر بمبئی میں سب سالا چور ہے۔ آپ بولے گا کہ اپنا نیا آدمی ہے تو وہ آپ کو ایک شہر گھمائے گا۔ بھاڑا بنائے گا ڈبل۔"

اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ خود بھی انہی ڈرائیوروں کی صف میں شامل ہے اور تقریباً دو گنا کرایہ بنانے میں کامیاب رہا۔ رات کی وجہ سے سڑکیں خالی تھیں چنانچہ اس کی رفتار بھی بہت زیادہ تھی۔ ایک گھنٹے بعد جب ہم نے ٹیکسی کو چھوڑا تو رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ ہم اب خاموش تھے اور اپنے طور پر رابعہ اور نازو کا سامنا کرنے کے خیال سے خائف تھے۔ محمد خان کی ہلاکت کی خبر شام کے ان اخبارات نے شائع کی تھی جو عام طور پر دوپہر ایک بجے تک بازار میں پہنچ جاتے تھے۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ محمد خان گیارہ ساڑھے گیارہ بجے مارا گیا ہوگا۔ خبر کے اخبار تک پہنچنے اور شائع ہونے کا عمل کم از کم اتنے وقت کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا تھا کہ ہم سے رخصت لے کر جانے کے بعد انہیں زیادہ فرصت نہیں ملی۔ رابعہ اور نازو نے واپسی پر یہ سنسنی خیز خبر ضرور سن لی ہوگی۔ اخبار فروش لڑکوں نے جو بازار میں ایسی خبریں چلا چلا کے سناتے ہیں انہیں بتایا ہوگا کہ ڈاکو محمد خان کی پولیس کے ہاتھوں ہلاکت۔ آج کی تازہ خبر۔ خونی خان کا خاتمہ ہو گیا۔ ڈاکا ڈالنے سے پہلے خونی خان کو گولی مار دی گئی۔ پڑھیے صاحب...

غریبوں کی بستی میں اندھیرا تھا اور خاموشی تھی۔ ہم کسی آشنا صورت کے انتظار میں گوش بر آواز ادھر ادھر دیکھتے جا رہے تھے۔ اس امید میں کہ شاید وہ مرد عورت محسن اور گل سمجھوں۔ محسن ہمارے لیے اس راستے پر چشم براہ مل جائے۔ یوسف ثانی نظر آجائے اور کہے "کہاں چلے گئے تھے مراد اس درجہ تھا دل بے قرار۔ کب سے ہیں محو انتظار۔ آپ کے دوست اور یہ خاکسار۔ وسوسے تھے خیال میں ہزار...."

اچانک غالب نے کہا "یار، ہم غلط جگہ آ گئے۔"

میں خیالات کے انہماک میں چونک پڑا "غلط جگہ آ گئے" [illegible] نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ جگہ ویسی ہی تھی ہے۔" غالب نے کہا۔

"یہ وہی جگہ ہے غالب!"

"پھر... وہ ریل کا ڈبا کہاں ہے؟ یوسف ثانی کا گھر۔"

میں نے اس جگہ کو آنکھیں مل کے دیکھا جو اب ایک تاریک خلا کے سوا کچھ نہ تھی۔ ریلوے کی پرانی لائن اپنی جگہ موجود تھی۔ وہ سب نشانیاں اپنی جگہ پر تھیں جو ثابت کرتی تھیں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں یوسف ثانی رہتا تھا۔

میں نے زمین کو چھو کے دیکھا۔ ریلوے کی پٹری کو ٹھوکر ماری۔ "وہ ریل کا ڈبا کہاں جا سکتا ہے غالب؟ اسے تو جنات بھی غائب نہیں کر سکتے تھے۔"

غالب نے میرے ساتھ گھٹنوں کے بل بیٹھ کے پرانی پٹری کا جائزہ لیا اور اس پر ہاتھ پھیر کے دیکھا "وہ گھاس کٹ گئی ہے جو لائن کے اوپر تک آ گئی تھی۔ دونوں طرف سے۔"

"کیا مطلب... اس کو ریلوے والے لے گئے چلا کے؟"

"ہاں۔ وہ ڈبا خود تو چل کے نہیں جا سکتا تھا۔ سو آدمی بھی اسے مل کے دھکا لگاتے تو اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے تھے۔ اسے ہاتھی گھوڑے کھینچ کر نہیں لے جا سکتے تھے۔ کوئی ریلوے انجن اسے لے گیا۔"

میں نے چلا کے کہا "مگر کیوں؟ اتنے سالوں سے وہ ناکارہ ڈبا یہاں کھڑا ہوا تھا۔ خود ریلوے والوں کے ریکارڈ پر اس کا وجود نہیں تھا۔ ہوتا تو وہ اسے بہت پہلے لے جاتے۔"

"اب اس بات پر بحث کرنے سے کیا ملے گا۔ اسے ریلوے والے نہیں لے گئے تو کون لے گیا؟"

غالب نے برہم ہو کے کہا "جو بھی لے گیا۔ لے گیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ کہاں لے گیا۔ سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے سے کچھ نہیں ملے گا۔"

میں نے کہا "یہ کس سے پوچھیں؟ لوگوں سے۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ سب ہی نے دیکھا ہوگا۔"

میں نے قریب ہی ایک جھونپڑی میں چراغ کی روشنی دیکھی اور اس کا ٹین کا دروازہ بجایا۔ ایک بڈھا جس نے صرف دھوتی باندھ رکھی تھی کھانستا ہوا باہر آیا "کون آگیا آدھی رات کو جگانے؟ اتنی مشکل سے نیند آئی تھی۔"

میں نے معافی مانگنے کے بعد کہا "معلوم یہ کرنا تھا کہ یہاں جو ریلوے کا ڈبا کھڑا ہوا تھا وہ کہاں گیا؟"

بوڑھے نے ناگواری سے کہا "ریلوے کا ڈبا گیا ریلوے کے پاس۔"

میں نے کہا "لیکن اس میں تو یوسف ثانی رہتا تھا۔"

"رہتا تھا" بڈھا طنز سے بولا "کیا اس کے باپ کا چھوڑا ہوا گھر تھا وہ؟"

میں نے کہا "پھر بھی۔ اتنے سالوں کے بعد..."

"ارے بھائی اتنے سالوں کے بعد اگر وہ اپنا ڈبا لے گئے تو غلطی کیا کی۔ مجھ سے کیا بحث کرتے ہو۔ جا کے ریلوے سے بولو۔"

وہ دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔

میں نے غصے کو ضبط کیا اور غالب کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی نظروں میں ایک ہی سوال تھا۔ اب کیا کریں؟ کہاں جائیں؟

اچانک اندھیرے میں ایک سایہ نمودار ہوا۔ یہ کوئی رات کی شفٹ کے لئے جانے والا مزدور تھا۔ غالب نے اس سے پوچھا۔ "وہ تو صاحب پرسوں پڑا ہوا۔ ادھر بہت پولیس آیا۔ بہت لفڑا ہوا۔ پھر انجن آیا اور ویگن کو لے گیا۔ پولیس لوگوں کو ڈنڈا مار مار کے بھگا دیا۔"

"اور وہ چھوٹا سا آدمی جو اس میں رہتا تھا؟"

اس نے افسوس سے سر ہلایا "وہ بھاگ گیا۔"

"جان بچا کے بھاگ گیا؟" میں نے کہا۔

"نہیں نا صاب۔ سالا حرامی اس رنڈی کا ساتھ بھاگ گیا" اس نے یوسف ثانی اور زلیخا دونوں کو گالیاں دیتے ہوئے کہا میں بھونچکا رہ گیا۔ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی مگر میں نے صاف سن لینا بہتر سمجھا "کیا وہ خود لے کر آیا تھا ریلوے انجن؟"

مزدور نے اقرار میں سر ہلایا "لوگ ایسا ہی بات کرتا۔ وہ خود گیا اور انجن پر بیٹھ کر آیا۔ اس پر دونوں چلا گیا۔"

"دونوں زلیخا اور یوسف۔ اس ڈبے میں چلے گئے" غصے سے میرا برا حال ہو گیا "اسپیشل سیلون میں بیٹھ کے نکل گئے ہنی مون پر۔"

غالب نے اسے مزید گالیاں دیں "سالا چور، بے ایمان۔"

مزدور حیران ہوا "آپ کا کچھ لے گیا وہ؟ ہمارا تو پیسہ لے گیا۔"

"کس چیز کا پیسہ؟"

"ہمارا دکان سے ادھار لیتا۔ ہم دن میں پرچون کا دکان چلاتا" مزدور فریاد کرنے لگا "آپ ان کو پکڑو صاحب۔ ریلوے میں جا کے۔"

میں نے کہا "ہم نہیں پکڑ سکتے... ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

غالب نے کہا "وہ عورت کہاں رہتی تھی۔ تمہیں کچھ معلوم ہے؟"

"ہاں۔ ادھر آگے اس کا کھولی ہے۔"

غالب نے کہا "چلو راستہ دکھاؤ۔"

میں نے کہا "وہاں اب کیا ملے گا غالب؟"

غالب نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا "دیکھنے میں حرج ہی کیا ہے۔"

میں نے مزدور کے پیچھے چلتے ہوئے کہا "یہ صرف اس کی نیت کی خرابی نے سب کام خراب کیا۔ ہم دو ڈھائی لاکھ پیچھے چھوڑ گئے تھے۔"

غالب نے اقرار میں سر ہلایا "وہ بہت چھوٹا اور دغاباز آدمی تھا۔ فراڈ۔ اب وہ کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہ محمد خان کا آدمی تھا ہمارا نہیں۔"

میں نے کہا "اور وہ موقع کی تلاش میں تھا۔ موقع اسے ہم نے فراہم کر دیا۔ اور اس نے سوچا کہ ایسا موقع پھر کہاں ملے گا۔"

"کیسا شیطانی دماغ تھا اس کا۔ گھر سمیت غائب ہو گیا۔"

"وہ تو خیر گیا۔ یہ رابعہ اور نازو کہاں گئیں؟"

غالب نے کہا "یہی معلوم کرنے تو جا رہے ہیں۔"

www.paksociety.com

"زلیخا کے گھر۔ وہاں کون ہے اب ...."

ایک دم مزدور رک گیا" یہ اس کا گھر ہے۔ اب ہم جاتا ہے۔ ڈیوٹی میں دیر ہوتا۔"

اس تنگ گلی میں دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ زلیخا کا گھر بھی عام گھروں کی طرح ایک جھونپڑی پر مشتمل تھا جس پر ٹین کی چھت تھی اور ٹین کا ہی دروازہ تھا۔ دروازہ بند تھا مگر باہر سے مقفل نہیں تھا اور اندر مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔

غالب نے آہستہ سے دستک دی "نازو!"

میں اس کی دستک پر حیران ہوا" پاگل ہو گیا ہے کیا؟"

لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اندر سے نازو نے پوچھا "کون ہے؟"

"ہم ہیں اور کون" غالب نے خوشی اور بے تکلفی کے ساتھ کہا اور مسکرا کے میری طرف دیکھا" میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔"

"یہ اندازہ تھا یا وحی نازل ہوئی تھی۔ کیسے اندازہ کر لیا تو نے؟" میں نے کہا۔

غالب کے جواب دینے سے پہلے ہی دروازہ کھل گیا اور میں نے سچ مچ زلیخا کے گھر میں نازو کے ساتھ رابعہ کو دیکھا۔

"ہو یا احمق۔ ناقص العقل۔ یہاں چھپ کر بیٹھنے کی بھلا کیا تک تھی؟" غالب نے بگڑ کے کہا۔

"اور.... کیا کرتے ہم؟" نازو ور کے بولی "وہاں گئے تو شہ یوسف خالی تھا نہ اس کا گھر۔ ہم نے سوچا زلیخا سے پوچھ لیں۔"

"اور جب زلیخا نہیں ملی تو اندر گھس کے بیٹھ گئیں اس کے گھر میں؟"

"اور کیا کرتے ہم؟ کہاں جاتے؟" رابعہ نے نازو کا دفاع کیا اور کہا" وہیں کھڑے رہتے آپ لوگوں کی واپسی تک۔"

نازو نے کہا" چھ سات گھنٹے کیسے گزارتے وہاں؟ تماشا نہ بن جاتا ہمارا۔"

"کسی سے پوچھا تو ہوتا کہ آخر ماجرا کیا ہے" میں نے کہا۔

"پوچھ لیا تھا" رابعہ بولی۔

تمہیں معلوم ہو گیا تھا کہ یوسف اپنی زلیخا کو لے کر بھاگ گیا؟"

"زلیخا! یہ تو اس وقت نہیں بتایا تھا کسی نے۔ صرف یہ کہا تھا کہ ریلوے والے اجاڑ لے گئے" رابعہ بولی۔

"یہ نہیں بتایا تھا کہ خود یوسف ریلوے انجن پر بیٹھ کر ساتھ آیا تھا؟"

"نہیں۔ ہم نے جس عورت سے بات کی تھی۔ شاید اسے بھی معلوم نہیں ہوگا" رابعہ نے کہا۔

"ہم نے سوچا کہ زلیخا سے پوچھ لیں۔ یہاں آئے تو وہ گھر میں نہیں تھی اور دروازہ کھلا پڑا تھا۔ ہم اندر بیٹھ گئے۔" نازو نے کہا۔

"ہمارا خیال نہیں آیا؟ کہ ہم وہاں جھک مارتے آئیں گے اور جب کوئی نہیں ملے گا تو کتنے پریشان ہوں گے" غالب چلا کے کہا۔

"تمہیں کتنا خیال تھا ہمارا؟" نازو نے بھی چلا کے کہا" اس وقت آئے ہو، آدھی رات کو" اس نے رونے کی تیاری۔

غالب نے سر پہ ہاتھ مارا" یہ لو۔ اسی لئے ہم تصور وار لیکن جواب نہ ہو تو عورت آنسو لے آتی ہے۔ اچھا بابا غلطی ہماری میرے باپ کی۔ جو حماقت تم نے کی وہ بھی میری غلطی۔ جو نے تلاش کر لیا تمہیں یہ بھی میری غلطی۔"

ظاہر ہے اس معافی کا اثر الٹا ہوا۔ نازو چیخ چیخ کر بولی اور چیخ گئی۔ پڑوس میں سے کسی نے چلا کے کہا "ارے یہ کیا ہے آدھی رات کو۔ سونے دو گے یا نہیں۔"

رابعہ نے کہا "شور مچانے کی عادت ہے تم لوگوں کی۔"

میں نے کہا "مجھے واقعی احساس ہو رہا ہے اپنی غلطی کا کہ میں اور غالب یہاں کیوں آئے۔ کہیں چلے جاتے ہم تو اچھا ہوتا۔ یہ تو معلوم نہیں کیسے غالب کے دماغ میں یہ بات آئی کہ تمہارا یہاں ملنا ممکن ہے۔ مجھے ایسا خیال کبھی نہ آتا۔"

"کیا اب تم لڑو گے مجھ سے؟ میں بالکل نہیں لڑوں گی" رابعہ نے کہا اور پلٹ کے اندر چلی گئی۔

"ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے اخبار نہیں دیکھا۔ اور خبر نہ پڑھی۔"

"انہیں بتانا تو پڑے گا" میں نے کہا۔

رابعہ اور نازو تنگ اور نیچی چھت والے کچے کمرے کے فرش پر احتجاجی انداز میں دھرنا دے کے بیٹھ گئی تھیں۔ زلیخا شاید بڑی جلدی میں گئی تھی کہ اپنا سب اثاثہ چھوڑ گئی تھی۔ اس کے کپڑے کھونٹیوں پر لٹکے ہوئے تھے۔ بستر بچھا ہوا تھا۔ گھرداری کا دوسرا سامان بھی بڑے سلیقے سے رکھا ہوا نظر آتا تھا۔ کچے کمرے کی دیواریں اور فرش زلیخا نے اپنے ہاتھ سے لیپ پوت کے صاف کئے ہوں گے۔ اس کی صفائی پسندی اور سگھڑاپے کا احساس ہر چیز سے ہوتا تھا۔ ایک طاق میں چراغ جل رہا تھا، سونے کی طرح چمک رہا تھا۔

میں نے کہا "تم دونوں نے کچھ کھایا بھی ہے۔ یا بھوکی بیٹھی ہو؟"

رابعہ اور نازو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منہ پھلائے رہیں۔

"ہم نے تو کھایا ہے بھئی، خوب ڈٹ کے" غالب پیٹ پر ہاتھ پھیر کے کہا "چکن بریانی، چکن قورمہ کوفتے۔ واہ واہ۔"

نازو نے اسے خون آشام نظروں سے دیکھا "تم دونوں تھا کیا؟"

رابعہ نے کہا "فاقے میں آدمی ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔ ہم کیوں بھوکے بیٹھے رہتے؟ کسی کے محتاج نہیں ہیں۔"

پایا اور کھایا۔

"ہو گیا قصہ ختم بھلا یہاں بھی" میں نے کہا "خراب ہو رہا بستر گول کرو اپنا اور چلو، اس سے پہلے کہ محلے والے پکڑ لیں۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ یہ روٹھنے اور نخرے دکھانے کا پروگرام کسی اور وقت پر اٹھا رکھو۔"

رابعہ نے کہا "مگر وہ لوگ...."

"کون لوگ؟" میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے غالب کی طرف دیکھا مگر وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔

"گل، محسن اور خان صاحب" رابعہ نے کہا" وہ کہاں ہیں؟ تمہیں نہیں ملے؟"

میں نے کہا" وہ لوگ آئے نہیں ابھی تک؟ میں تو سمجھا تھا آ کے پھر کہیں چلے گئے ہیں۔"

غالب نے پلٹ کے کہا "چھوڑو سکندر۔ تم نے ہی کہا تھا کہ انہیں بتانا ضروری ہے۔ اب ہمت نہیں پڑتی تو میں بتا دیتا ہوں۔"

"کیا.. کیا بات ہے آخر؟" نازو نے کہا۔

غالب نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا "دیکھو اس وقت ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ تم عقل اور ہوش کا دامن نہیں چھوڑو گی۔ ایک بری خبر ہے مگر تمہیں صبر اور حوصلے سے سننی ہوگی۔"

"کیا فضول باتیں کئے جا رہے ہو" رابعہ نے چلا کے کہا۔ اصل بات کیوں نہیں بتاتے۔ کیا ہوا ہے انہیں؟"

"خان مارا جا چکا ہے پولیس کے ہاتھوں۔" غالب نے کہا۔

بیک وقت ان دونوں نے منہ پر ہاتھ رکھ کے چیخ کو دبایا مگر ان کا جسم طوفان کی زد میں آ جانے والے کمزور درخت کی طرح لرزنے لگا۔

"گل اور محسن کو کچھ نہیں ہوا" میں نے فوراً باقی بات مکمل کی۔

رابعہ نے کچھ دیر بعد سسکیوں کے درمیان کہا "یہ سب کیسے ہوا؟" آنسو اس کی آنکھوں سے بھی اسی طرح ابل رہے تھے جیسے نازو کی آنکھوں سے۔ عورتیں جتنی حساس اور جذباتی ہوتی ہیں قدرت نے اسی تناسب سے ان کو ہر صدمے کے خلاف ردعمل کی مؤثر صلاحیت عطا کی ہے۔ وہ رو لیتی ہیں اور غم کے احساس کو بہا دیتی ہیں۔ اور صدمہ برداشت سے باہر ہو تو ہسٹیریا کا دورہ ان کے غم کو ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا بوجھ اعصاب پر پڑتا نہیں رہتا۔

میں نے کہا "ہمیں بھی ابھی کچھ دیر پہلے معلوم ہوا۔ ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ وہاں شام کا اخبار پڑا تھا۔ اس میں خان کی تصویر تھی۔"

غالب نے ایک کٹورے میں پانی لا کے دیا "چلو رونا دھونا بند کرو اور یہ پانی پی لو، شاباش۔ تمہیں ابھی واپس جانا ہے۔" اس نے نازو اور رابعہ کو باری باری ایک ایک گھونٹ پینے پر مجبور کیا۔

میں نے انہیں کم سے کم الفاظ میں ساری بات بتا دی۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے آنسوؤں کو روک لیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ غالب کی پیش بندی کے باعث طوفان زیادہ تباہی لائے بغیر گزر گیا۔

"ہم اب کہاں جائیں گے؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "معلوم کریں گے کہ محسن اور گل کو کہاں رکھا گیا ہے۔"

غالب نے کہا" ابھی امید کی گنجائش باقی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ گل اور محسن نہ ہوں۔"

نازو نے کہا "کیا فائدہ ایسی خوش فہمی سے۔ وہ سب ساتھ تھے۔"

غالب نے کہا "بعض اوقات راہ گیر بھی فائرنگ کی زد میں آ کے زخمی ہو جاتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "خبر میں اسپتال کا نام نہیں تھا؟"

میں نے کہا "وہ ہندی کا اخبار تھا جو ہم نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ...کسی نے خبر پڑھ کے سنائی تھی۔ اس میں اتنی تفصیل نہیں تھی۔"

"پھر کیسے معلوم ہوگا؟"

"پولیس سے یا پھر ان اسپتالوں سے جہاں پولیس کیس جاتے ہیں" میں نے کہا "ہم اخباری نمائندے بن کے فون کر سکتے ہیں۔"

غالب نے کہا "اخبار والے بھی بتائیں گے۔ اب تک کل صبح آنے والے اخباروں کو بھی تفصیل مل گئی ہوگی۔"

"ہاں۔ خان کوئی معمولی مجرم نہیں تھا۔"

"وہ بہت غیر معمولی آدمی تھا" میں نے کہا" چلو اب اٹھو۔ ...یہ بہترین وقت ہے خاموشی سے نکل جانے کے لئے۔"

غالب نے ایک نظر ان کے کپڑوں کو دیکھا "لباس بدل لو۔"

میں نے کہا" زلیخا کا قد چھوٹا تھا۔ ان کے لئے بے کار ہیں یہ کپڑے۔"

غالب نے کہا" ساڑی کا سائز چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ دیکھو اگر اس کی پرانی ساڑیاں تمہیں آ جائیں تو اچھا ہے۔"

رابعہ نے ایک چھوٹے سے ٹرنک کی طرف اشارہ کیا۔

"ساڑیاں تو ہیں لیکن..."

میں اس کے تذبذب کی وجہ سمجھ گیا" بلاؤز کی جگہ کیا قمیص چلے گی۔"

ہم چند منٹ کے بعد اس آبادی سے نکلے تو ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ خاموش اور تاریک گلیوں سے نکل کے پیدل چلتے ہوئے ہم نے دو میل کا فاصلہ طے کیا۔ پھر کوئی

www.paksociety.com

سڑک آگئی جو اس وقت بھی آباد تھی۔ متعدد ریسٹورنٹ کھلے ہوئے تھے اور روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ دونوں طرف سے بسوں اور ٹراموں کی آمدورفت بھی جاری تھی۔

مجھے ایک برانچ ٹیلی گراف آفس نظر آیا جس کے باہر لگے ہوئے بورڈ پر ٹیلی فون بنا ہوا تھا اور ہندی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

"یہ پبلک کال آفس معلوم ہوتا ہے" میں نے کہا "میں ابھی آتا ہوں فون کرکے۔"

"پہلے کسی اخبار کے دفتر فون کرنا، پھر اسپتال۔ آخر میں پولیس سے بات کرنا، اگر کہیں سے بھی کچھ معلوم نہ ہو" غالب نے مجھے نصیحت کی۔

میں نے کہا "مجھے تو اخباروں کے نمبر بھی معلوم نہیں۔"

غالب نے کہا "ڈائریکٹری میں دیکھ لینا۔ آخری حصے کے زرد صفحات میں سب اخبارات و رسائل کے نمبر مل جائیں گے۔"

لیکن اندر جانے کے بعد میرا واسطہ ایک ایسے شخص سے پڑا جو نیند میں تھا یا شاید نشے میں۔ اس نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی "فون خراب ہے۔"

مجھے شک ہوا اور میں نے اس کے سامنے رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کے کان سے لگایا "جھوٹ بولتے ہو پبلک کے ساتھ" میں نے برہمی سے کہا "جانتے ہو میں کون ہوں، میں ٹائمز آف انڈیا کا رپورٹر ہوں۔"

اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ وہ کاؤنٹر پر سر رکھ کے سوتے ہوئے بولا "اچھا بھائی غلطی ہو گئی۔ کرو جتنے فون کرنے ہیں۔"

اس کے بعد ضروری ہو گیا کہ میں اخباری نمائندہ بن کے بات کروں۔ میں نے اس سے ڈائریکٹری طلب کی تو اس نے سر اٹھائے بغیر کہا "ڈائریکٹری نہیں ہے۔ لے گیا کوئی الو کا پٹھا۔ انکوائری سے پوچھ لو۔"

اتفاق سے میری نظر دیوار پر لگے ہوئے بوسیدہ چارٹ پر گئی جس پر کسی نے بقلم خود نہایت بدنمائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اہم فون نمبر لکھے تھے۔ اس میں پولیس کا نمبر بھی شامل تھا۔

یہ نمبر ملانے کے بعد میں نے کہا "میں ٹائمز آف انڈیا کا کرائم رپورٹر بول رہا ہوں۔ خونی خان کے کیس ....."

"آپ نے غلط نمبر پر ڈائل کیا ہے، یہ ایمرجنسی ہے۔"

میں نے کہا "وہاں کوئی اٹھا نہیں رہا ہے۔"

وہ میرے جھانسے میں آگیا "آپ دوسرا نمبر لکھ لیں۔ یہ ڈی ایس پی صاحب کی لائن ہے۔"

میں نے دوسرا نمبر ملایا اور کہا "میں ٹائمز آف انڈیا کا کرائم رپورٹر بول رہا ہوں۔ روندر ناتھ ٹھاکر۔"

"کون ..... وہ شرما جی کہاں گئے؟" کسی نے انگریزی میں پوچھا۔

"وہ چھٹی پر ہیں۔ ان کی جگہ میں کام کر رہا ہوں۔"

"اچھا جی ٹھاکر صاحب، کیسے تکلیف کی اس وقت؟"

"تکلیف تو آپ لوگ سب وغیرہ دیتے ہیں سب کو۔ غلط بیانات جس کا جی چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ کسی اخبار میں کچھ چھپ جاتا ہے، کسی میں کچھ" میں نے کہا۔

"کیوں جی کیا ہو گیا؟ آپ تو بہت خفا ہیں۔"

میں نے کہا "دیکھئے نا، یہ جو آج ڈاکو مارا گیا ہے، خونی خان، اس کے بارے میں رپورٹ یہ بھی ہے کہ وہاں فائرنگ میں مرد اور عورت بھی زخمی ہوئے ہیں" میں نے کہا "اور ایک ذمے دار آدمی نے بتایا تھا کہ وہ ڈاکو کے ساتھ نہیں تھے۔"

"بالکل ٹھیک بتایا تھا....."

میں نے اطمینان کا تھوڑا سا سانس لیا "چلیے یہ تو کنفرم ہوا۔ پھر مجھے خبر ملی تھی کہ وہ میاں بیوی ہیں۔"

"میاں بیوی ......" وہ کنفیوز ہونے لگا۔

"ہاں۔ ایک رپورٹ ہے کہ وہ وہاں موجود تھے۔ دوسری یہ ہے کہ باہر سے گزر رہے تھے۔"

"آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اسپتال فون کرکے ... افسر سے پوچھ لیں۔ براہ راست۔"

"یہ بھی سنا ہے کہ انہیں نازک حالت میں کہیں ... شفٹ کر دیا گیا ہے" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"یہ تو میرے لئے بھی خبر ہے .... میرے خیال میں ایسا کوئی امکان تو نہیں ہے ....."

"اچھا مجھے ذرا بتائیں، ڈیوٹی افسر کا نمبر۔"

دوسرے نمبر پر ڈیوٹی افسر پہلے تو کچھ بتانے پر آمادہ نہ تھا۔ میں نے اسے ڈی ایس پی کا نمبر دے کر کہا "تم ان سے بات کرو۔ انہوں نے تو کہا تھا کہ تم پولیس میں شائع ہونے والی خبروں کے بارے میں صحیح صورت حال کی وضاحت کر سکتے ہو۔ ہمارا ... ہے۔ ہم یہ بھی چھاپ دیں گے کہ پولیس کے محکمے میں ایک افسر کی بات دوسرا نہیں سنتا۔"

وہ مجھ سے متاثر ہوا "بات کیا ہے؟"

میں نے کہا "خونی خان کے ساتھ زخمی ہونے والے مرد و عورت آخر کون ہیں؟ میاں بیوی یا الگ الگ گزرتے ہوئے زخمی ہونے والے راہ گیر؟"

"ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ بس ایک ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں جوان ہیں اس لئے کسی نے ... سمجھا ہوگا۔"

"اور ..... یہ جو بتایا گیا ہے کہ ابھی تک انہیں ہوش نہیں آیا چنانچہ ان کے وارثوں کو اطلاع نہیں دی گئی۔"

"یہ کس نے بتایا ہے؟ بالکل غلط ہے یہ۔ ان کے وارث پہنچ چکے ہیں" ڈیوٹی افسر بولا۔

"نام بتائیں گے ان کے آپ؟"

"وہ لڑکی ایک پارسی ڈاکٹر کی بیوی ہے۔ دوسرا شخص سورتی بیٹا مین ہے اور ابھی شادی نہیں ہوئی ہے اس کی۔ اس کے والدین آگئے ہیں۔"

اس سے آگے مجھے کچھ سننے یا جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا دل جو اندیشوں اور وسوسوں کی طنابوں میں جکڑا ہوا تھا پھر سے آزاد ہو گیا ہے۔ میرے لئے یہ اتنی بڑی خوش خبری بن گئی کہ میں نے دھڑ سے ریسیور رکھا۔ دس کا نوٹ سر اٹھا کے گھورنے والے کلرک کے سامنے پھینکا اور دوڑ کے باہر آیا۔ میں خونی خان کی موت کے صدمے کو بالکل بھول گیا تھا۔ بڑے جوش کے ساتھ میں نے باہر انتظار کرنے والے غالب، رابعہ اور نازو سے کہا "مبارک ہو، وہ گل اور محسن نہیں تھے۔ میں نے معلوم کر لیا ہے۔ وہ کوئی اور تھے۔"

ایک دم سب کے چہرے روشن ہو گئے "شکر ہے خدا کا" رابعہ نے کہا۔

نازو نے کہا "اللہ نے بچا لیا بڑی پریشانی سے۔"

لیکن غالب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا "اس کا مطلب ہے کہ بس ایک خونی خان ہی اپنے احساس شرمندگی کے ساتھ مر گیا۔"

"شرمندگی کیسی؟" میں نے کہا۔ ہم پھر چلنے لگے۔

"جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔"

"اس نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ جس حد تک زندگی نے مہلت دی۔ زندہ رہتا تو اور بہت کچھ کرتا" میں نے کہا "اللہ اس کی مغفرت کرے۔"

"اب گل اور محسن کو کہاں تلاش کریں؟" رابعہ نے موضوع بدل دیا۔

میں نے سوچتے ہوئے کہا "کہاں تلاش کریں!"

غالب نے کہا "ایک ٹھکانا تھا، وہ بھی نہیں رہا۔"

"شاید وہ گئے ہوں وہاں" نازو نے کہا۔

غالب نے اسے گھورا "مجھے غصہ مت دلاؤ بار بار۔ تم جو چپ کر بیٹھ گئی تھیں" "یہ سب اسی وجہ سے ہوا۔"

نازو نے کہا "ہم پر الزام مت رکھو خوامخواہ۔ آخر تم نے بھی تو کاوش کی تھی؟"

"میرے پاس ایک غیر معمولی دماغ ہے" غالب نے کہا۔ "مجھے کسی کی سرکشی، بدلگام گھوڑے کے مزاج کو ایک ذہن ... سمجھتا ہے۔ ایسے ہی میں اب تمہارے مزاج کو سمجھنے لگا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ پھر جھگڑا ہوتا، رابعہ نے کہا "وہ انتظار تو کر سکتے تھے۔ وہیں یا آس پاس رہ کے۔ چکر لگاتے رہتے وہ تو کبھی نہ کبھی سے ضرور ملاقات ہو جاتی۔"

"کیا پتا انہوں نے کتنا انتظار کیا اور کتنے چکر لگائے۔ خان کے ساتھ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے واردات ہوئی تھی" میں نے کہا۔

"یار، اس وقت وہ خان کے ساتھ کیوں نہیں تھے؟" غالب بولا۔

"کیا معلوم ساتھ ہی ہوں" میں نے کہا "لیکن خطرہ محسوس کرتے ہی نکل گئے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی جگہ گل اور محسن الگ چلے گئے ہوں کہ ایک کام تم نمٹاؤ، دوسرا ہم نمٹاتے ہیں۔ یا وہ دوسرے شو دم دیکھ رہے ہوں" میں نے مزید کہا "ایسی صورت میں انہوں نے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے خان کے قریب رہنے کی کوشش ضرور کی ہوگی۔ اگر وہ ساتھ نہیں تھے تو انہیں دوپہر کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہونے سے قبل ہی پتا چل گیا ہوگا کہ خان پولیس کے نرغے میں مارا گیا۔"

"اس کے بعد وہ کیا کرتے رہے؟ کیا کر سکتے تھے آخر وہ خان کے لئے ... کچھ نہیں ... انہیں واپس آ جانا چاہئے تھا۔"

میں نے کہا "میرا اندازہ ہے کہ وہ فوراً واپس آگئے ہوں گے اور ہمیں وہاں نہ پاکے انہوں نے کسی سے کچھ پوچھے بغیر سمجھ لیا ہوگا کہ یہ واقعات کا ایک ہی سلسلہ ہے۔ شاید ترویدی نے پھر محمد خان کا سراغ لگا لیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے اور کوئی کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ محسن نے سمجھا ہوگا کہ انہوں نے یوسف قائلی کو اور اس کے گھر کو ٹھکانے لگا دیا۔ پھر انہی کی مخبری سے پولیس نے خونی خان کو ٹھکانے لگا دیا۔ ہم ساتھ ہوتے تو ہمیں بھی ٹھکانے لگا دیا جاتا۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال میں وہ کیسے وہاں رکتے؟"

غالب نے کہا "انہیں رکنا چاہئے تھا، ہمیں خبردار کرنے کے لئے۔"

"ہم پہنچے بھی تو رات بارہ بجے تھے۔ وہ مایوسی اور پریشانی میں مبتلا ہو کے چلے گئے ..."

"سوال یہ ہے کہ کہاں چلے گئے؟"

ایک خیال کے تحت میں چلتے چلتے رک گیا "مجھے معلوم ہے۔ غالب! وہ وہیں گئے ہوں گے" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔

غالب نے میری طرف دیکھا "وہیں ..... جہاں سے ہم آئے تھے؟"

"ہاں۔ ہم سب کو وہاں پہنچنا تھا۔ محسن کو معلوم تھا کہ ہماری اگلی منزل کہاں ہے۔ گولڈن فالکن، ستائیسواں سیل" میں نے کہا "اس خفیہ زبان کا مطلب سمجھ لینے کے بعد ہم نے یہی طے کیا تھا اور ساری تیاری آخر تھی کس لئے؟ ان کی

www.paksociety.com

جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ وہاں جاکے بیٹھ جاتا اور انتظار کرتا۔"

"بالکل ٹھیک" نازو نے سب سے پہلے کہا۔

"بس تو پھر وہیں چلتے ہیں... واپس" غالب نے بھی کہا۔

آدھی رات کے بعد ایک ٹیکسی والے نے وہاں جانے پر رضامندی ضرور ظاہر کی لیکن دس روپے زیادہ مانگے جو کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی۔ احتیاط کے پیش نظر کسی نے راستے میں کوئی بات نہیں لیکن خاموشی کی اپنی ہی زبان تھی جو سب کے دلوں کا ماجرا کہتی تھی۔ ہم سب خان کے انجام پر دل گرفتہ تھے اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے فکر مند۔ میرے اندازے پر یقین کرلینا مجبوری بھی تھی اور ضرورت بھی۔ مایوسی میں جھوٹے سہارے بھی کام آتے ہیں۔ میری بات میں بے بنیاد امید پرستی نہیں تھی، عقل کا ایک جواز تھا۔

اس سڑک پر رات کے وقت بھی ٹریفک رواں تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس وقت پرائیویٹ کاروں اور مسافر بسوں کی تعداد کم تھی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر سامان لانے لے جانے والے ٹرک زیادہ تھے۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں ڈرائیوروں نے ٹریفک کے سب قاعدے قانون بھلا دیئے تھے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ زیادہ حادثات رات کے وقت انہی ٹرک ڈرائیوروں کی تیز رفتاری اور غلط اوور ٹیکنگ کا نتیجہ ہوتے ہیں جس کی لپیٹ میں بعض اوقات وہ بھی آجاتے ہیں جن کی کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ یہی میرے وطن میں کراچی سے حیدر آباد اور لاہور سے پنڈی کے درمیان مختصر فاصلے کی روڈ میں ہوتا ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور بہت محتاط تھا اور جب تک راستہ صاف نہیں ملتا تھا اوور ٹیک نہیں کرتا تھا۔ میں آگے بیٹھا ہوا تھا چنانچہ غیر ارادی طور پر سامنے جانے والے ہر ٹرک پر میری نگاہ پڑتی تھی۔ کسی ٹریفک سارجنٹ کی طرح جو کسی نہ کسی بہانے چالان کرنے پر آمادہ ہو، میں نے ہر ٹرک میں نقائص دیکھے۔ کسی کی ٹیل لائٹ نہیں ہے، کسی کی بریک لائٹ خراب ہے، کس کے انڈی کیٹر کام نہیں کرتے۔ میں نمبر پلیٹوں کو بھی دیکھ رہا تھا... سے نمبر عمداً ایسے کردیئے گئے تھے کہ پڑھے نہیں جاتے تھے۔

میں نے بغیر نمبر والے بھی دو ٹرک دیکھے لیکن ان میں کوئی اور بات مشکوک نظر نہیں آئی۔ ایک خالی تھا اور دوسرے میں بھوسہ لدا ہوا تھا۔ پھر ایک جگہ مجھے سڑک سے ذرا ہٹ کے ایک قطار میں کچھ ٹرک کھڑے ہوئے نظر آئے۔ یہ چھ ٹرک تھے جو ایک کنوائے کی صورت میں ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے اور شاید کوئی ٹرک پیچھے رہ گیا تھا کہ وہ سب رک کر اس کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک ٹرک کے کیبن میں بیٹھا ہوا ڈرائیور سر نکال کے اپنے پیچھے والے ڈرائیور سے بات کررہا تھا۔ جب ٹیکسی ان کے پاس سے گزری تو میں نے کسی کو گالی دیتے سنا۔ پھر کوئی اور بولا "آجائے گا یار..." مجھے یاد آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہم ایک ٹرک کے پاس سے گزر کر آئے تھے جس کی شافٹ ٹوٹ گئی تھی۔

شافٹ ٹوٹ جانے کی صورت میں ٹرک ہی نہیں ہر گاڑی جہاں ہو وہیں رک جاتی ہے۔ انجن چلتا رہتا ہے لیکن پہیے نہیں گھومتے کیونکہ پہیوں کو انجن سے پچھلے ... تک جانے والی شافٹ گھماتی ہے تو پچھلے پہیے حرکت میں آتے ہیں اور اگلے پہیوں کو دھکیلتے ہیں۔ سمجھدار ڈرائیور شافٹ کو تار کے ساتھ مضبوطی سے باندھنے کی احتیاط کرتے ہیں ورنہ یہ بھی ہوتا ہے کہ شافٹ ٹوٹ کے سڑک پر لگتا ہے اور وہیں گڑ جائے تو متحرک ٹرک الٹ جاتا ہے۔

جب میں نے پلٹ کے دیکھا تو غالب بھی پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

"کیا... یہ وہی ٹرک ہوسکتے ہیں؟" غالب نے کہا۔

میں نے آئینے میں سر ہلایا "بالکل ہوسکتے ہیں۔ سب ساتھ ہیں۔"

"چھ ٹرک تھے" رابعہ نے کہا "ساتواں شاید پیچھے رہ گیا۔"

نازو نے ثابت کردیا کہ وہ سب بھی مستعد تھے "ہاں ایک ٹرک خراب کھڑا ہوا تھا۔ راستے میں۔"

میں نے کہا "کسی نے نمبر دیکھا؟"

نمبر کسی نے نوٹ نہیں کیا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ باقی سب ٹرک ایک ایک یا دو دو جا رہے تھے۔ چھ ٹرک تھے۔ ساتواں ٹرک فی الحال ان کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ شافٹ کی مرمت کئی گھنٹوں کا کام تھا لیکن یہ ہوسکتا تھا کہ اسے وہ کھینچ کر لے آئیں۔ سامان سے لدا ہوا کوئی ٹرک ... جاکے خراب ٹرک کو نہیں لاسکتا تھا۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ کوئی ڈرائیور یا کلینر واپس جاکے صورت حال معلوم کرے اور پھر خراب ٹرک کو کسی خالی ٹرک کے پیچھے باندھ کر لے جانے کا بندوبست کیا جائے گا۔ اس سارے کام کے لئے کم سے کم بھی ایک ڈیڑھ گھنٹہ درکار تھا۔ اور ہم اس مہلت سے فائدہ اٹھاسکتے تھے۔

اگر یہ دلاور کا قافلہ تھا تو میں یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ درمیان والے ٹرک میں شیشے کا وہ بکس یا تابوت بھی ہوگا جس کے اندر شہلا اور اس کا بیٹا محو خواب تھے۔ ... ہر ٹرک میں ...

... صرف اس ٹرک میں یا سب میں تھوڑا تھوڑا تھا؟ اس کا بھی قیاس آرائی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تاہم یہ بات ... تھی کہ درمیان والا ٹرک جو اب آگے سے چوتھا اور پیچھے سے قطار کا تیسرا ٹرک تھا، ہماری دخل اندازی کے خلاف ... تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا تھا۔ دلاور اینڈ کمپنی نے ...

سامنے کھلا چیلنج رکھ دیا تھا کہ ہمت ہے تو کچھ کرکے دکھاؤ۔ طاقت استعمال کرکے دیکھو۔ عقل کے گھوڑے دوڑاؤ اور درمیان والے ٹرک کو ہائی جیک کرکے لے جاسکتے ہو تو لے جاؤ۔ کسی ایک ٹرک پر ایک گولی چلا کے دیکھو۔ میدان حشر میں شہلا تمہارا دامن تھام لے گی کہ سکندر بھائی "آپ نے یہ کیوں کیا؟ مارنا ہی تھا مجھے تو جانے سے پہلے مار جاتے۔ انتظار ختم کرنے کے اتنے صبر آزما عذاب سے گزار کے مجھے کیوں مارا؟" اس کا بچہ ... کہ کاکا میرے ان دیکھے ماما جی کی تو بہت تعریف کرتی تھیں آپ کی۔ آپ سب کی۔ اور آپ سب نے مل کے...."

میں نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کے کہا "نہیں...."

ٹیکسی ڈرائیور نے حیرانی سے مجھے دیکھا "کیا نہیں صاحب؟"

غالب نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "سب ٹھیک ہوجائے گا یار" اس نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے لہجے کا کھوکھلا پن خود اس کے خلاف گواہی دیتا تھا۔

"ٹیکسی یہیں روک لو" میں نے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے تعمیل کی مگر اس کی حیرانی بڑھ گئی۔ جہاں ہم اترے تھے وہاں دور دور تک آبادی کا نشان نہ تھا۔ سڑک کے دونوں جانب تاریک رات میں جنگل سائیں سائیں کررہا تھا۔ دو جوان عورتوں کے ساتھ دو مردوں کا اس ویرانے میں کیا کام ہوسکتا تھا؟ ڈرائیور کو ضرور شک ہوا ہوگا۔ ابھی ٹیکسی واپس بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں مخالف سمت میں چل پڑا۔ باقی سب نے سمجھ لیا کہ میرا مقصد ٹیکسی ڈرائیور کو دھوکا دینا ہے۔ وہ میرے ساتھ ایسے چل پڑے جیسے ہماری منزل اسی سمت میں اور بہت قریب ہے۔

پچاس قدم چل کے میں واپس ہوا۔ اس وقت تک بستی کی طرف جانے والی ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ ... سڑک عبور کرکے ہم نے تقریباً نصف فاصلہ خاموشی سے طے کیا۔

پھر ایک جگہ رک کے میں نے نازو اور رابعہ پر شاکر علی کے گھر، طورتہ کی شہرت، باز ولی کوٹھی اور اس کے مندر اور گوردوام کی پوزیشن واضح کی اور انہیں اپنا پلان سمجھایا۔

"اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ٹرک ایک گھنٹے سے دو گھنٹے کے درمیان طورتہ کے گوردوام میں پہنچ جائیں گے۔ اگر وہ چوہدری دلاور کا مال ہوگا تو وہ ٹرک سڑک سے اس طرف مڑ جائیں گے" میں نے اشارے سے بتایا "گوردوام کا راستہ ایک فرلانگ دور ہے۔ ہم قریب جاکے ... کو دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کی ضرورت نہیں۔ ان کے یہاں پہنچنے سے قبل ہمیں بہت سے کام ختم کرنے ہیں۔"

"اور اگر وہ ٹرک کسی اور کے ہوئے؟"

"ٹرک کسی اور کے نہیں ہوسکتے لیکن ہوئے تو کوئی بات نہیں۔ ہم اپنا باقی پروگرام التوا میں رکھیں گے۔ کل تک۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا "کل کا بھی کیا بھروسہ... ہم آدھا کام کرکے بیٹھ جائیں اور اس کے بعد معلوم ہو کہ یہ ٹرک تو سیدھے گزر گئے۔ اصل ٹرک دو دن بعد آئیں یا چار دن بعد۔ ہمارا پلان ادھورا رہ جائے گا اور آدھی کامیابی سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ مفروضے سے آغاز کرنا غلط ہے۔ کام شروع ہو تو پورا ہو ورنہ ہم انتظار کریں۔"

میں نے کہا "یو آر رائٹ۔ چلو پھر ہم فی الحال کچھ نہیں کرتے۔ چھپ کر دیکھتے ہیں کہ ٹرک کب یہاں سے گزرتے ہیں اور کدھر جاتے ہیں۔"

میں نے رابعہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ خاصی خوفزدہ اور نروس تھی۔ اس کا ہاتھ ٹھنڈا ہورہا تھا۔

"یہ کیسی منحوس آوازیں ہیں؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "یہ گیدڑ ہیں۔ تمہیں خوش آمدید کہہ رہے ہیں اپنی سریلی آواز میں۔"

نازو نے کہا "جب گیدڑ اس طرح اکٹھے روتے ہیں تو کوئی آفت آتی ہے۔ میں نے سنا ہے۔"

"ٹھیک سنا ہے تم نے" غالب بولا "انہیں تمہارے آنے کی اطلاع مل گئی ہوگی۔"

نازو کے بولنے سے پہلے ہی میں نے کہا "جسے تم نے رونے کا نام دے دیا ہے بی بی، یہ ان کا گانا بھی تو ہوسکتا ہے۔ کبھی کسی گویئے سے پوچھا ہے کسی نے؟"

غالب نے کہا "بہت سے انسان بھی گاتے ہیں تو ان کا گانا رونا ہی لگتا ہے۔ مثلاً چینی یا جاپانی۔"

رابعہ اور نازو ہنس پڑیں۔

غالب نے کہا "کیا غضب کرتی ہو۔ کوئی قریب سے گزرتے ہوئے سن لے گا تو بے ہوش ہوجائے گا۔ جنگل میں چڑیلوں کی ہنسی سن کے۔"

"بس اس سے آگے جانے کا کوئی فائدہ نہیں" میں نے کہا اور ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ آس پاس ایسے ہی بہت سے بڑے بڑے پتھر تھے جو چٹانوں کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ چھ سات فٹ اونچی ایک چٹان نے ہمیں سڑک کی جانب سے دیوار کا تحفظ فراہم کردیا تھا۔ یہاں بیٹھ کے ہم سڑک پر سے گزرنے والی ٹریفک لائٹس کو حرکت کرتا دیکھ سکتے تھے۔

گیدڑ اب دور چلے گئے تھے۔ غالباً بستی کی طرف۔ گیدڑ بھی خاموش ہوگئے تھے۔ شاید دم لینے کے لئے۔ میں نے ایک سگریٹ سلگا کے پاؤں سیدھے کئے ہی تھے کہ اچانک ایک گیدڑ ہمارے سامنے آگیا۔ غالباً اس کے لئے بھی ...

www.paksociety.com

وہاں موجودگی کم تحیر خیز نہ تھی۔ وہ کچھ دیر حیران کھڑا رہا۔ نازو یا رابعہ میں سے کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ ان کے پیچھے تھا لیکن غالب نے دیکھ لیا تھا۔ اگر وہ خاموشی سے واپس چلا جاتا تو کچھ نہ ہوتا مگر اس نے ایک چیخ ماری اور بھاگ گیا۔

اس کے ساتھ ہی رابعہ نے چیخ ماری اور مجھ سے چمٹ گئی۔ نازو نے چیخ مار کے غالب کے ساتھ یہی حرکت کی۔ مجھے رابعہ کے منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا۔

"دماغ خراب ہے۔ گیدڑ تھا ایک چلا گیا" میں نے محسوس کیا کہ اس کا پورا جسم کانپ رہا ہے "اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

غالب نے نازو کو تسلی بھی دی اور ڈانٹا بھی "تم تو مروا دو گی ایسے۔ گیدڑ تھا وہ، کوئی شیر نہیں تھا۔ گیدڑ تو آدمی کی صورت دیکھ کے بھاگتا ہے۔"

"وہ بھولا بھٹکا، غلطی سے ادھر آ نکلا تھا" میں نے کہا۔

"اگر سچ مچ شیر آ جائے تو کیا چیخ سن کے ڈر جائے گا۔ یا چیخ سے مر جائے گا" غالب نے کہا۔

نازو اور رابعہ سخت خفت کے ساتھ الگ ہو کے بیٹھ گئیں۔ ان کی یہ حرکت غیر ارادی تھی۔ ایک نفسیاتی خوف کا نتیجہ۔ گیدڑ کے بجائے کوئی دشمن خطرناک اسلحے سے لیس ہو کے سامنے آ جاتا تو نازو کا ردعمل بالکل مختلف ہوتا۔ میں اور غالب ان کی حالت پر ہنستے رہے اور ان کی بدحواسی سے لطف لیتے رہے۔ وہ جھینپ رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔ اگر تاریکی نہ ہوتی تو شاید روشنی گلابی ہو جاتی۔

غالب نے کہا "گیدڑ اچھی چیز ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ایک پال لوں۔ واشنگ آئیڈ بکار۔"

میں نے کہا "ہاں۔ جب چاہا نکال بیوی کے سامنے کر دیا۔"

"بیوی کیا یار، کوئی بھی ہو۔ ہمیں کیا، جس کا دل چاہے چمٹ جائے۔"

رابعہ نے جل بھن کے کہا "ہاں۔ ستر سال کی کالی کلوٹی سوکھی چڑچڑی بڑھیا ہو۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ پوپلے منہ سے "بیٹا" کہہ کے چمٹ جائے۔"

نازو نے کہا "خولو کوئی بھتنی چمٹ جائے۔"

غالب نے دانت نکال کے کہا "اور ابھی کون چمٹا تھا۔ کچھ اس سے بہتر یہ ثابت نہیں ہوا کہ میرے مرحوم سسر تھے۔"

رابعہ اور نازو کو خفا ہونے کا موقع نہیں ملا۔ سڑک کی جانب سے ایک دم تیز روشنی کا سیلاب سا آیا۔ روشنی چٹان کو اور آس پاس کے پتھروں، درختوں اور جھاڑیوں کو روشن کرتی گزر گئی۔ یہ پہلا ٹرک تھا جو سڑک سے ادھر مڑ گیا تھا۔ اس کے بعد مزید پانچ ٹرک گزرے۔ ان سب نے گودام کی طرف جانے والی سڑک پر آتے ہی ہیڈ لائٹس آف کر دیں۔ اندھیرے میں ان کے متحرک سائے آگے بڑھتے گئے ساتھ چھ طاقتور انجنوں کی آواز سے رات کا سکوت ٹوٹتا رہا۔

"ساتواں ٹرک نہیں آیا" غالب نے کہا۔

میں نے سر ہلایا "آ جائے گا وہ بھی بعد میں... چوتھ"

"چوتھے ٹرک پر ایک نیلی بتی ہے" غالب بولا۔

"اندھیرے میں نیلا رنگ کیسے نظر آ گیا تمہیں؟"

"جب پانچواں ٹرک مڑا تھا تو اس کی روشنی اگلے پر پڑی تھی... میں سب کو دیکھتا رہا تھا۔ کسی اور پر نہیں تھی" غالب نے پورے وثوق سے کہا جس کے بعد شک کی گنجائش نہ رہی۔

"اب چلو یہاں سے... شاکر کی طرف۔"

غالب نے کہا "خدا کرے وہ اپنی چھپا بیگم سمیت سو رہا ہو۔"

"کیا؟" نازو نے خفگی سے کہا۔

میں نے فوراً وضاحت کی "افیون کو کہتے ہیں۔"

نازو نے جھینپ کر کہا "میں نے بھی سنا تھا۔"

"تم شترکی کسی دن مجھ سے کھری کھری۔ تمہارا غصہ ہر وقت ناک پر دھرا رہتا ہے ناظمی کی عینک کی طرح۔ اچھی بات نہیں ہے" غالب نے آگے چلتے ہوئے ٹھوکر ماری۔

نازو نے کہا "آئی ایم سوری۔ کسی اور پر تو غصہ آتا نہیں مجھے۔"

غالب کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی پگھل جاتا۔ چہرہ ہو جاتا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا اور ہنس پڑا۔

میں نے کہا "یہ وہ غصہ ہے جس کے بارے میں فرمایا ہے۔"

"رہنے دو شاعر کے فرمائے ہوئے کو" نازو نے... لیکن میں نے بات جاری رکھی "مگر ان کو آتا ہے غصہ۔"

"سکندر" نازو چلائی۔

میں نے ہنس کے کہا "ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے۔ غصہ کیوں آتا ہے؟ مرزا غالب کے نام کا بھی لحاظ"

رابعہ اور نازو اب پیچھے چلنے لگیں۔ راستہ مجھے ہی معلوم تھا۔ ہم نصف دائرے میں بائیں جانب اور بستی کے مرکزی علاقے سے بچتے ہوئے شاکر علی کے پیچھے پہنچے۔ برساتی نالہ ہمارے بائیں ہاتھ پر تھا۔ ہم نے دائیں طرف کی گلی پکڑی تو نالہ دور ہو گیا۔ پطرس بخاری کے مطابق کتوں کا مشاعرہ ہو رہا

شام تھا جہاں سے میں اور غالب اپنی مردانگی کے دعوے کو داؤ پر لگا کے گزرے۔ بظاہر بے خوفی کے ساتھ اور اعتماد سے یہ ثابت کرتے ہوئے کہ "بھونکنے والے کتے کاٹتے نہیں۔ ان سے کیا ڈرنا" لیکن اندر ہی اندر خوف سے کانپتے ہوئے کہ کوئی اچانک غزل چھوڑ کے ٹانگ نہ پکڑ لے۔ غالباً کتا وہ واحد شہری مخلوق ہے جس سے بیشتر بہادر مرد بھی نفسیاتی خوف کھاتے ہیں۔ چوروں ڈاکوؤں سے بھی زیادہ۔ خواتین کا یہ ہے کہ وہ کاکروچ سے چھپکلی تک سب گھریلو، بے ضرر قسم کے کیڑے مکوڑوں سے بھی خوفزدہ رہتی ہیں۔

کتوں کے غول بیابانی کے پاس سے گزر آنے کے بعد غالب نے ایک لمبی سانس کھینچ کے کہا "بچ گئے آج بھی بائیس انجکشنوں سے۔"

میں نے کہا "کتے سے کون ڈرتا ہے؟"

رابعہ اور نازو کچھ بھی کہنے لگیں "ہم نے دیکھا تھا۔ کتے دیکھ کے ایک طرف خاموشی اور باادب کھڑے ہو گئے تھے۔"

غالب نے مجھ سے کہا "سنا ہے کتے صرف چڑیلوں سے ڈرتے ہیں۔ انہیں دیکھ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "شادی کے بعد ایک عدد کتا بھی پال کر دیکھ لیں گے کہ یہ بات کس حد تک سچ ہے۔"

شاکر علی کے گھر پہنچنے تک ہمیں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اس چھوٹی سی بستی میں رات کو جاگنے والا کوئی نہیں تھا۔ نہ یہاں کسی کارخانے کی نائٹ شفٹ چلتی تھی۔ نہ رات کو لوگ ہوٹلوں میں بیٹھتے تھے اور نہ ٹریفک ہوتی تھی۔ بے خوابی کا مریض بھی کوئی تھا تو اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ گلیوں میں چوکیدار کے گشت کرنے کا ثبوت بھی کہیں نہیں ملا۔

شاکر علی کے گھر میں مکمل اندھیرا اور سکوت تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی تو دروازہ ہلا۔ میں نے اسے تھوڑا سا دھکیلا۔ اس کا پٹ پیچھے ہو گیا اور اوپر لٹکنے والی کنڈی ہلنے لگی۔

"یہاں دروازے کھلے چھوڑ کے سوتے ہیں لوگ؟" میں نے کہا۔

"شاکر علی نے ہمارے لیے کھلا چھوڑا ہو گا" غالب بولا۔

"شاکر علی؟" میں نے آہستہ سے آواز دی۔ ان کے پاس ایک ہی کمرا تھا جو ان کی خواب گاہ بھی تھا۔ میں دستک دیے بغیر اندر داخل ہونے سے گریز کر رہا تھا۔ میں نے دوبارہ زیادہ بلند آواز میں اسے پکارا اور اوپر ہاتھ بڑھا کے کنڈی بجائی۔

"نکل آ میرے یار" غالب نے کہا "وہ کوئی چڑھا کے سویا ہو گا۔"

"شکر یار کہیں۔ میرا مطلب ہے ایسے سوتے میں ہم پر جا گھسنے ہوں۔ یہ اچھی بات نہیں ہوگی۔"

"پھر کیا رات بھر کنڈی بجاتے رہیں گے؟ اگر وہ صبح ہونے کے بعد جاگے تو صبح جائیں گے گھر میں" غالب بولا۔

"تم دونوں چلی جاؤ" میں نے کہا۔

رابعہ ہنسی "کیا ہمارے لیے یہ اچھی بات ہوگی۔"

میں نے تنگ آ کے خود ہی پہل کی اور اندر داخل ہو گیا۔ صحن کے بعد ایک کمرا تھا۔ ہم سب صحن میں رک گئے۔ غالب نے باہر والا دروازہ بند کر دیا۔ میں نے پھر شاکر علی کو آواز دی۔ اس بار زیادہ زور سے مگر مجھے اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔

"کیا اصلی بیگم بھی چھپا بیگم کے ساتھ سو رہی ہیں؟" نازو نے کہا۔

میں نے اسے گھور کے دیکھا "نازو بیگم، مجھے دال میں کالا نظر آ رہا ہے۔"

"اندھیرے میں کالا کیسے نظر آ سکتا ہے" رابعہ نے کہا۔ وہ جتنی غیر سنجیدہ تھی اتنی ہی میں کسی نامعلوم خوف میں مبتلا تھا۔ شاکر علی نہ سہی اس کی بیوی کو بہرحال جاگ اٹھنا چاہیے۔ وہ ایسی بے فکری کی نیند کیسے سو سکتی ہے جس کی زندگی میں فکروں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

آہستہ آہستہ میں آگے بڑھا اور کمرے کی دہلیز پر رک کے میں نے اتنی اونچی آواز میں شاکر علی کو پکارا کہ جو سو رہا تھا وہ ضرور جاگ جاتا۔ پھر میں نے جیب سے ماچس نکالی اور ایک دیا سلائی روشن کی۔ شعلہ روشن ہوتے ہی بجھ گیا۔ ایک سیکنڈ کے لیے تاریکی سے ابھرنے والا ہولناک منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا اور اپنا سفاک نقش چھوڑ گیا۔ میں پتھر کے بت کی طرح جامد کھڑا رہ گیا۔

غالب نے کہا "کیا بات ہے؟"

میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "چلو۔ یہاں سے نکل چلو۔"

غالب نے میرے لہجے سے بات سمجھ لی "کیا..."

"ہاں۔ کرنے والے اپنا کام کر گئے" میں نے اپنا ریوالور نکال لیا "سب کو مار گئے۔"

رابعہ اور نازو نے بے اختیار ہائے اللہ کہا۔

میں نے کہا "اچھا ہوا کہ تم نے کچھ نہیں دیکھا۔ تم نے شاکر علی کو اور اس کی بیوی کو بھی نہیں دیکھا۔ اب چلو۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں نے کیا دیکھا تھا۔"

میں نے شاکر علی کو دیکھا تھا۔ اس کی لاش کمرے کے وسط میں الٹی پڑی ہوئی تھی۔ اپنے ہی خون میں غلطاں۔ اس کی بیوی کو دیکھا تھا۔ وہ آدھی شوہر کے اوپر تھی۔ اس کا باقی دھڑ فرش پر تھا اور وہ چت پڑی ہوئی تھی۔ ان کے دونوں بچے چارپائی پر سو رہے تھے یا شاید مردہ لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا، صرف فرض کیا جا سکتا تھا کہ جن لوگوں نے شاکر اور اس کی صابر بیوی کو کسی ناقابل معافی

www.paksociety.com

خطا کی سزا دی تھی انھوں نے بچوں کو کب بخشنا ہوگا کہ وہ کسی کے سامنے ان کو شناخت کرلیں اور ان کے دامن پر اپنا لہو پہچان جائیں۔

گھر سے باہر آتے وقت ہم خطرے کو بہت قریب محسوس کر رہے تھے۔ میں نے اور غالب نے ریوالور تیار رکھے تھے۔ اپنے ریوالور کے متعلق مجھے کوئی شک وشبہ نہ تھا کہ ضرورت پڑی تو اس کی باقی پانچ گولیوں کا نشانہ خطا نہیں جائے گا... غالب کو یقین نہیں تھا کہ ریوالور کی کارکردگی کا معیار اب کیا ہے۔ اس کا ریوالور پانی میں بھیگا تھا یا نہیں اور بھیگا تھا تو خشک ہوجانے کے بعد کارآمد تھا یا نہیں۔ پھر بھی اس ریوالور کا ہاتھ میں ہونا خالی ہاتھ ہونے سے بہتر تھا۔

حملہ آور شاید انتظار میں تھے۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ ہم اندر جائیں گے تو لائٹ بھی جلائیں گے اور اس کے بعد کسی کی چیخ سنائی دے گی تو انھیں معلوم ہوجائے گا کہ ہم محصور ہوگئے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہم اندر داخل ہونے سے پہلے ہی واپس ہوگئے۔

بیرونی صحن کی تین دیواریں قد آدم اونچی تھیں۔ ان پر تین افراد یوں سیدھے لیٹے ہوئے تھے کہ ان کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ اندھیرے میں وہ دیوار کا ایک حصہ معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک نے حرکت کی تو میں نے دیکھ لیا۔ اس نے نازو پر چھلانگ ماری تھی جو سب سے آگے اور باہر والے دروازے کے قریب تھی۔

میں نے چلا کے غالب کو خبردار کیا۔ دوسرے شخص نے اندر کودنے سے پہلے ہی ریوالور نکال لیا تھا۔ نسبتاً روشن آسمان کے پس منظر میں اس کی حرکات وسکنات بہت واضح تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، میرے ریوالور سے نکلنے والی بے آواز گولی نے اسے نشانہ بنالیا۔ وہ ہاتھ اوپر اٹھا کے منہ کے بل سیدھا اندر آیا اور صحن میں بڑی آواز کے ساتھ گرا۔ اس کا ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کے دیوار پر لگا اور اچھل کے رابعہ کے قدموں میں آگرا۔

نازو نے سب سے پہلے حملہ کرنے والے کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ مجھے یہی امید تھی۔ جیسا کہ اس نے بعد میں بتایا، پہلے تو وہ بھی ڈر گئی تھی۔ کیونکہ وہ اس غیر متوقع حملے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ اسے نازک اور کمزور عورت سمجھنے والے مرد نے سمجھا کہ میدان مار لیا اور اس نے نازو کا منہ چومنے کے لیے اپنی تھوتھنی آگے بڑھائی۔ نازو نے ہاتھ پیر چھوڑ کے ظاہر کیا کہ وہ مزاحمت کے قابل بھی نہیں اور جب فاتح مرد کا چہرہ اس کی دسترس میں آگیا تو اس نے بس ایک ہی وار کیا اور اس کی نلکی جیسی گردن توڑ دی۔ اسے اپنے اوپر سے گرا کے وہ کھڑی ہوئی تو اس نے تیسرے شخص کو غالب کے ساتھ نبرد آزما دیکھا۔

غالب کا ریوالور دھوکا دے گیا تھا۔ اس نے آخری حربے کے طور پر ریوالور کے دستے سے کام چلانے کی کوشش کی مگر وار نہیں پڑا۔ اس نے غالب کو ٹکر ماری اور گرا کے اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ نازو سے پہلے رابعہ نے غالب کی مدد کی۔ اس نے اپنے پیروں کے پاس آکر گرنے والا ریوالور اٹھا لیا تھا۔ اس نے بڑی عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور گولی نہیں چلائی۔ اس نے غالب پر سوار شخص کے سر پر ریوالور کے دستے سے ... وار کیے۔ یہاں تک کہ وہ سر پکڑ کے کراہتا ہوا گر گیا۔

یہ سب تین چار منٹ کی معرکہ آرائی تھی جس میں صرف ایک گولی چلائی گئی تھی اور وہ بھی میرے سائلنسر لگے ہوئے ریوالور سے۔ یہ سراغ کا تحفہ تھا جو ہمارے کام آیا۔ اس میں اب بھی چار گولیاں موجود تھیں۔ تقریباً اسی وقت ... نے دوسرے کو ختم کردیا تھا۔ آخری شخص رابعہ کے ہاتھوں مارا گیا مگر اس نے شور بہت کیا۔ سر پر پڑنے والی پہلی ضرب پر بھی اس نے ایک دل خراش چیخ ماری تھی۔ دوسری ضرب پر بھی وہ چلایا اور پھر کراہتے ہوئے بے ہوش ہو کر گر گیا۔ اس کی چیخ پکار نے باہر کھڑے ہوئے باقی دونوں افراد کو متوجہ کیا اور وہ بھی ان کی مدد کے لیے اندر آگئے۔

دروازے میں نمودار ہونے والا شخص باقاعدہ مشین گن کے ساتھ تھا۔ اس ہتھیار کی تباہ کاری پر اسے اتنا بھروسہ تھا کہ وہ بے خوفی سے اندر آگیا۔ باہر اس لیے کھڑا ہوا تھا کہ وہ مشین گن کی قوت کو اس کام کے لیے کافی سمجھتا تھا۔ ان میں سے ... کے پاس ریوالور بھی تھا۔ انھیں یقین تھا کہ ہم بچ کر نہیں نکل سکتے لیکن اندر تین منٹ میں نقشہ بدل گیا تھا۔ ... گن والے کو ہدایات ملی ہوں گی کہ صرف اشد ہنگامی صورت میں وہ فائر کھولے۔ جب وہ دیکھے کہ دشمن غالب آکر فرار ہونے والا ہے۔

اپنے ساتھی کی آواز پر وہ اندر آیا اور اس نے صورت حال کا اندازہ کرنے کے لیے میدان کارزار پر ایک نگاہ ڈالی۔ اچانک نازو نے کہا "الو کے پٹھے، اندر آ..." نازو نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ... تھی اور مجھے تھوڑی سی مہلت فراہم کرنے کے لیے ... نے مشتعل ہو کے نازو کو دیکھا چنانچہ وہ مجھے ریوالور ... دیکھ سکا۔ ذرا سی ہلکی سی آواز کے ساتھ گولی نے اس کے ... سوراخ کردیا۔ وہ پیچھے کی طرف گرا۔ آخری آدمی ... پیچھے موجود تھا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی ... مشین گن والے کو آگے دھکا دے کر بھاگا۔

میں ایک جست میں مشین گن والے کے ... گزر کے دہلیز پھلانگ گیا۔ بھاگنے والے کا حوصلہ ... جواب دے چکا تھا کیونکہ اسے اپنے سب ساتھیوں ...

دیکھنے کے لیے زیادہ وقت ملا تھا۔ اب اس نے محسوس کیا کہ وہ بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ ایک دم زمین پر لیٹ گیا اور رونے لگا۔ "بچوں کے لیے دیا کرو مجھ پر۔ مجھے مت مارو۔" میرا اٹھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ "آواز بند کرو اپنی پہلے۔" اس کی آواز یوں بند ہوگئی جیسے کسی نے اس کے گلے کے اسپیکر کا تار کاٹ دیا ہو۔ وہ دم سادھے زمین پر پڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ریوالور کی طرف اور میری طرف دیکھتا رہا۔

"خاموشی سے اٹھ کے اندر چلو" میں نے اس کے ایک لات رسید کی۔ وہ حلق سے آواز نکالے بغیر اٹھا۔ میرا ارادہ اس کو فوراً مارنے کا نہیں تھا۔ اس کا زندہ ہاتھ آجانا ہمارے حق میں بہتر تھا۔ ہم اس سے بہت سے سوالات کے جواب حاصل کرسکتے تھے اور اسے زندہ رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ اتفاق رائے سے بعد میں کیا جاسکتا تھا۔ معلوم نہیں اچانک اس کو کیا خیال آیا کہ وہ پھر بھاگ نکلا اور اس بار میں نے اسے رعایت نہیں دی۔ وہ دہلیز کے قریب گرا اور تڑپنے لگا۔ گولی اس کی گردن کے پچھلے حصے میں لگی تھی اور سامنے سے پار ہوگئی تھی۔ میں نے ٹانگ سے پکڑ کے اسے بھی اندر گھسیٹ لیا اور دروازہ بند کردیا۔ خون کی ایک لکیر باہر سے اندر تک بن گئی۔ رات کا اندھیرا ختم ہونے سے پہلے اس خون کا نظر آنا محال تھا لیکن لاش باہر پڑی رہتی تو شاید صبح ہونے سے پہلے ہی کسی کو متوجہ کرلیتی۔

اب راستہ صاف تھا۔ مکان ساتھ ساتھ ہوتے تو تھوڑا بہت ہنگامہ کسی پڑوسی کو بیدار کرسکتا تھا۔ مگر یہاں مکان الگ الگ تھے۔ بے ترتیب بنے ہوئے تھے اور ایک سطح پر نہیں تھے۔ شاکر علی کا مکان کچھ بلندی پر تھا۔ اس کے نزدیک دونوں جانب دو گھر تھے۔ ایک کا رخ مخالف سمت میں تھا اور دوسرا زیادہ بلندی پر دس گز دور تھا۔

میں نے اپنا ریوالور غالب کو دے دیا۔ اس کا نشانہ ہم سب سے اچھا تھا۔ "جب تک اس کی تینوں گولیاں کام نہ آجائیں دوسرا ریوالور استعمال نہیں کرنا ہے" میں نے کہا۔ دوسرا ریوالور رابعہ کے پاس تھا۔ اس نے سرہلا کے ان ہدایات پر عمل کرنے کا اقرار کیا۔ مشین گن کو لاش کے نیچے سے کھینچ کر نکالنے کے بعد میں نے اسی کے کپڑوں سے صاف کیا تاکہ اس پر خون ہو تو میرے ہاتھوں پر داغ نہ آئے۔ اس کے ساتھ اضافی راؤنڈ بھی تھے۔ پھر ہم باہر نکلتے ہی مکان کے دونوں طرف سے چکر لگاتے ہوئے پیچھے جمع ہوئے۔ رابعہ میرے ساتھ الٹے ہاتھ کی طرف سے گئی تھی۔ غالب اور نازو سیدھے ہاتھ کا جائزہ لے کر آئے تھے۔

"ادھر کوئی نہیں" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "اب یہ کام ہمیں آج ہی رات ختم کرنا ہوگا۔ شاکر علی زندہ رہتا تو کل کرتے۔"

"اسے کس نے مار دیا؟ پورے خاندان کے ساتھ؟" غالب نے بڑے افسوس سے کہا۔

"یہ کارروائی اس بدمعاش کی بھی ہوسکتی ہے جس کو سب کے سامنے ذلت اٹھانا پڑی تھی" میں نے کہا "وہ شاکر کا دشمن ہوگیا تھا۔"

غالب نے کہا "مگر وہ بیوی بچوں سے انتقام نہ لیتا اپنی ذلت کا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اتنے حملہ آوروں کی موجودگی سے بھی ثابت یہی ہوتا ہے کہ شاکر علی کے دشمن شاید دوسرے ہیں۔ جو درحقیقت ہمارے دشمن ہیں۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ شاکر علی کے گھر میں ہماری موجودگی کا راز فاش ہوچکا ہے" غالب بولا۔

"ہاں۔ بستی میں یہ خبر تو اسی وقت ہی پھیل گئی ہوگی جب ہم نے شاکر علی کو بچانے کی نیکی کی تھی۔ یہ نیکی اسے بھی مہنگی پڑی۔ میرا خیال یہ ہے کہ قاتل شاکر سے ہمارے بارے میں معلوم کرنے آئے تھے۔ یہ کہ ہم کون تھے اور اب کہاں گئے۔ شاکر کے جھوٹ نے انھیں مطمئن نہیں کیا ہوگا چنانچہ انھوں نے اس کے سارے خاندان کو مار ڈالا۔"

"ایک گھر بنانے کی خواہش پوری ہونے کا وقت آیا تو زندگی کی مہلت پوری ہوگئی۔ خوش نصیبی اس کے نصیب میں نہ تھی۔"

"کوئی کسی کی تقدیر بدل بھی نہیں سکتا" میں نے کہا "یہ لوگ اب ہماری واپسی کا انتظار کر رہے تھے اور درحقیقت موت کا انتظار کر رہے تھے۔"

"سکندر! کیا اس سے کچھ اور ثابت نہیں ہوتا؟" رابعہ نے کہا۔

"کیا؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ شاکر علی نے انھیں سب بتادیا... اپنی جان بچانے کے لیے مگر جان پھر بھی نہ بچا سکا" رابعہ نے کہا "وہ اسے قتل کرنے کا تہیہ کر کے آئے تھے۔ اسے وہ آج قتل نہ کرتے تو کل کیا کرتے جب وہ سب کو پہچان جاتا۔"

غالب نے کچھ دیر سوچ کے کہا "وکیل صاحب کی بات دل کو لگتی ہے۔"

رابعہ نے کہا "شاکر علی سے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ہم آج ہی رات واپس آئیں گے، وہ یہاں گھات میں بیٹھ گئے... ورنہ وہ چلے جاتے۔"

رابعہ کی وکیل سے اب میں بھی قائل ہونے لگا تھا "یہ اچھا ہوا کہ ہم نے شاکر علی کے سامنے کسی کا نام نہیں لیا تھا۔ نہ ظہیر ترمذی کا، نہ وڈا اور اینڈ کمپنی کے کسی فرد کا۔ ہم نے تو اپنے نام بھی نہیں بتائے تھے۔ پھر اس نے کیا بتایا ہوگا؟"

www.paksociety.com

"یہی کہ... ہم اپنے دشمنوں سے نمٹنے کے لئے آئے تھے مگر دشمن کون ہے اور دشمنی کا سبب کیا ہے؟ یہ سب ہم نے نہیں بتایا تھا۔ انھوں نے سمجھا ہوگا کہ شاکر جھوٹ بول کے ہمیں بچانا چاہتا ہے چنانچہ اسے مارنے کے بعد وہ انتظار کرتے رہے۔" غالب نے کہا۔

"جس نے انھیں بھیجا تھا' وہ بھی تو انتظار کر رہا ہوگا کہ میرے سورما واپس آکے دشمن کے خاتمے کی خوش خبری دیں؟"

"ہاں۔ لیکن وہ صبح تک انتظار کرے گا۔"

"وہ کون؟ یالک رام مہرترہ؟" میں نے سوچ کے کہا۔ غالب نے اقرار میں سر ہلایا "میرے ذہن میں بھی اسی کا نام آتا ہے۔"

"مہرترہ مشن وپیچ میں ہوگا کہ یہ کون دشمن آگئے ہیں" میں نے کہا "اس کے تو سب ہی دشمن ہیں۔ جو اسے جانتے ہیں اور اس کے ہاتھوں زک اٹھا چکے ہیں۔"

"میں اس نئے شکاری سے ملنے کے لئے بے چین ہوں؟" غالب بولا "یہ کسی بھی طرح دلاور اور تریویدی سے کم نظر نہیں آتا۔"

"دلاور اپنے سے کم تر آدمی کا انتخاب نہیں کرتا۔ اس کی ایک مثال تریویدی ہے" میں نے کہا "یہ اس کے کاروبار کی نوعیت کا تقاضا ہے کہ جس سے وہ معاملہ کرے وہ اس کا ہم پلہ ہو۔"

آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے اب ہم اس پل کی جانب جا رہے تھے جو پرانی اور نئی آبادی کو ملاتا تھا۔ ہماری پوری کوشش تھی کہ ہماری نقل و حرکت پوشیدہ رہے چنانچہ ہم سب تاریکی میں گردوپیش پر نظر رکھنے کی پوری کوشش کر رہے تھے اور خود بھی چھوٹی سی نیم پختہ سڑک کو چھوڑ کر کچے راستے پر چل رہے تھے جہاں ہمیں جھاڑیوں اور درختوں کے علاوہ اس علاقے میں ہر طرف پھیلی ہوئی چھوٹی بڑی چٹانوں کا تحفظ حاصل تھا۔ ابھی تک پل کی جانب سے صرف ایک چوکیدار آیا تھا جس نے اپنی آمد کی اطلاع پہلے ہی دے دی تھی۔ ...اس کی لاٹھی کی ٹھک ٹھک کی آواز پل پر سنائی دی تھی تو ہم سب ٹھٹک کر رک گئے تھے اور اس وقت تک ساکت و صامت کھڑے رہے تھے جب تک کہ چوکیدار گزر کے پرانی بستی میں غائب نہیں ہو گیا تھا۔

اب پل ہمارے سامنے تھا۔ اسے عبور کرتے ہی مہرترہ کا قلعہ نما گھر تھا۔ اس پر حملہ کرنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر اپنے منصوبے کی تفصیلات پر سب کی رائے لی۔ طے یہ پایا کہ میں رابعہ کے ساتھ بجلی کی سپلائی منقطع کرنے کے لئے جاؤں گا۔ اندھیرا ہوتے ہی غالب اور مازو دیوار پر چڑھ کے تاروں کی باڑھ پھلانگ جائیں گے اور اوپر چڑھ کے اندر جانے کا راستہ تلاش کریں گے۔ اتنی دیر میں ہم سامنے گیٹ کی جانب سے اپنا راستہ بنائیں گے اور جب ہم بھی اندر پہنچ جائیں گے تو پھر ایک ایک کر کے سارے محافظوں کو ختم کرتے ہوئے مہرترہ کو یرغمال بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

غالب نے کہا "پلان میں ویسے تو کوئی خامی نہیں لیکن غیر متوقع کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ لائٹ جاتے ہی جنریٹر زور چل پڑے یا الارم شور مچا دے۔"

"اس کے علاوہ کتے..." مازو نے کہا۔

"یہ رسک تو لینے ہی ہوں گے۔ تاہم زیادہ امید یہی ہے کہ چند منٹ کا بریک ڈاؤن ہمیں اندر پہنچنے کے لئے کافی ہو جائے۔ چند منٹ انھیں جنریٹر چلانے میں بھی لگ جائیں گے۔ عام طور پر جنریٹر خودکار نہیں ہوتے۔ انھیں اسٹارٹ کرنا پڑتا ہے۔"

مازو نے پھر کہا "کتے تو خود ہی اسٹارٹ ہو جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہاں دو درجن بھر کتے تو ہو نہیں سکتے۔ دو تین۔ یا زیادہ سے زیادہ چار کتے ہوں گے۔ وہ سب پیچھے کی طرف نہیں ہوں گے۔ چار میں سے دو سامنے والے حصے کی حفاظت کرتے ہوں گے۔"

"دو کتے بھی کم تو نہیں ہوتے" غالب نے سر ہلایا۔

میں نے کہا "انھیں شوٹ کر دینا۔ اور کوئی طریقہ نہیں۔ تمہارے پاس سائلنسر والا ریوالور ہے۔"

"لیکن کتوں کے گلوں میں سائلنسر نہیں ہوگا۔ وہ شور مچائیں گے تو سب کو متوجہ کرلیں گے۔ اور گولی لگنے کے بعد بھی خاموشی سے فوت نہیں ہوں گے۔"

میں نے کہا "ایک صورت اور ہے۔ تم ادھر نہیں جاؤ بلکہ تو رابعہ کے ساتھ چلے جاؤ۔ پانچ منٹ کے لئے بجلی بند کرنا مشکل کام نہیں ہے۔"

رابعہ نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ میرے لئے اور غالب کے لئے آسان کام ہی بہتر ہے۔ ہم ریوالور تو چلا سکتے ہیں۔ اتر نہیں چلا سکتے۔"

میں نے مازو کی طرف دیکھا "تم میں اتنی ہمت ہے؟" مازو نے کہا "میں تو غالب جیسے شخص کے ساتھ بھی جا رہی تھی۔"

غالب نے سخت برا منایا "اس بیان میں خاصا توہین آمیز مواد ہے۔ میرے جیسے شخص سے آخر کیا مراد ہے تمہاری؟"

"یار! یہ کون سا موقع ہے لڑنے کا" میں نے ان کی جنگ چھڑنے سے پہلے روک دی "میں مازو سے یہ پوچھ رہا تھا کہ مردوں کو چت کر دیتی ہو ہاتھ مار کے۔ اگر مقابلے پر کتا خونخوار قسم کا۔ تو ایک ہاتھ سے اسے بھی مار سکو گی؟"

"پتا نہیں" مازو نے کہا "جب وقت آئے گا میں کیا کر سکوں گی۔ ایسا موقع پہلے کبھی نہیں آیا۔"

میں نے کہا "بس اپنے حواس پر قابو رکھنا۔ کتا آدمی کے برخلاف ہوتا ہے۔ یہ اپنا دفاع کر سکتا ہے اور یہ جوڈو کراٹے کے داؤ جانتا ہے۔ اس کی گردن آدمی کی گردن سے کمزور ہوتی ہے۔"

مازو نے کہا "یہ ٹریننگ لیکچر میرے کام نہیں آئے گا۔ شاید مجھے یاد بھی نہیں رہے گا۔ اپنے آپ کو بچانے کے لئے جو بھی مجھے کرنا پڑا وہ خود ہی ہو جائے گا۔ جان پر بن جائے تو بلی بھی شیر ہو جاتی ہے۔"

میں نے کہا "رابعہ! یہ ریوالور مجھے دے دو۔"

"تم یہ ریوالور بھی رکھو گے" رابعہ نے کہا "اور مشین گن بھی۔"

میں نے کہا "اندر پہنچ جانے کے بعد ریوالور مازو کو مل جائے گا۔ یعنی پہلے مرحلے سے گزرنے کے بعد۔ اگر کتوں سے مقابلہ کرنا پڑا تو مازو بھی خالی ہاتھوں سے کرے گی۔ ہم دونوں گولی نہیں چلائیں گے۔"

"جب ریوالور ہی نہیں ہوگا میرے پاس تو مجھے گولی چلانے کا خیال بھی نہیں آئے گا۔" مازو نے کہا۔

"تمھیں ڈر نہیں لگ رہا ہے مازو؟ تم واقعی بہادر ہو" رابعہ نے کہا۔

"ڈر تو بہت لگ رہا ہے۔ مگر کیا ہوگا ڈرنے سے؟" مازو نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی "آخر تمہاری صورت کیوں اتر گئی ہے۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

غالب غفلت سے چونک کر مسکرایا "سوچ رہا ہوں کہیں یہ آخری ملاقات نہ ہو تم سے۔"

"کیوں؟ کتے کھا جائیں گے مجھے کیا؟"

"نہیں۔ تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ خطرہ تو میرے لئے ہے۔ چار سو چالیس وولٹ کی بجلی سے مقابلہ ہے ...ایک جھٹکے میں اچھے خاصے آدمی کا [illegible]۔"

میں نے کہا "بجلی گھر دیکھا ہے؟"

غالب نے کہا "بجلی گھر تو نہیں' ایک سب اسٹیشن دیکھا تھا۔ یہاں آتے ہوئے۔"

میں نے کہا "بس تو پھر چلو۔"

رابعہ نے کہا "وہ... گل اور محسن نہیں پہنچے ابھی تک؟"

غالب نے کہا "ہم ان کا انتظار تو نہیں کر سکتے ایک مفروضے کی بنیاد پر۔ انھوں نے نہیں کہا تھا کہ وہ یہاں ملیں گے۔ یہ ہمارا خیال تھا۔"

"اور خیال غلط بھی ثابت ہو جاتا ہے" میں نے کہا "وہ کہاں جا سکتے ہیں۔ زندگی رہی تو پھر مل جائیں گے۔"

میری بات ادھوری ہی تھی کہ کسی نے بھاری بوجھل آواز میں کہا "............ ہاتھ اوپر اٹھائے بغیر یہ مشین گن نیچے رکھ دو۔ اپنے قدموں میں اور پھر چار قدم آگے جا کے ہاتھ اٹھا کر۔ پیچھے مڑ کے مت دیکھنا۔"

ریوالور کی نال میری ریڑھ کی ہڈی سے لگی ہوئی تھی۔ میں پیچھے مڑ کے کیسے دیکھتا۔ میں نے تو سر اٹھا کے مازو کی طرف دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میری طرح اسے بھی بے بس کر دیا گیا ہے۔ وہ کم سے کم دو افراد تھے جو میرے اور مازو کے پیچھے تاریک سائے کی طرح موجود تھے۔ اگر ان کے ساتھی اور بھی تھے تو کہیں چھپے ہوئے تھے۔

میں نے مازو سے کہا "مقابلہ مت کرنا۔"

"ہتھیار ڈال دو لڑکی" کسی عورت نے لہجے کو خوفناک بنا کے کہا۔

"تمہاری تو ایسی کی تیسی" مازو نے ایک دم کہا "بدمعاش!"

شک مجھے بھی ہوا تھا مگر مجھ سے پہلے مازو پلٹ چکی تھی۔ اس نے گل کو ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور تھوڑا سا اوپر اٹھایا ہی تھا کہ گل چلانے لگی۔

"ارے مازو' یہ میں ہوں گل..." اس نے چہرے پر سے کالی چادر ہٹانے کی کوشش کی۔ مازو نے اسے چھوڑ دیا۔ میں نے محسن کی طرف دیکھا جو ابھی ہی کالی چادر سر سے ہٹا رہا تھا۔

"الو کے پٹھے" میں نے کہا "تو نے کیا سمجھا تھا' ہم ڈر گئے؟ ابھی شہید ہو جاتا میرے ہاتھوں' بچ گیا بال بال۔"

محسن پیچھے ہٹ گیا اور ہنسنے لگا "تو بچ گیا بال بال۔ گل کی بے وقوفی کے باعث۔"

"ورنہ کیا کرتا تو؟" میں نے خفت مٹانے کی کوشش کی۔

"میں تجھے مرغا بناتا اور کہتا انڈا دو۔ اتنی فرمانبرداری دکھائی تو نے کہ میرے حکم پر تو اذان بھی دیتا اور انڈا بھی۔"

"اور میں پلٹ کے ہاتھ مار دیتا یا گولی مار دیتا؟"

محسن کی ہنسی مجھے مزید شرمندہ کر رہی تھی "اتنی شرافت سے ہتھیار ڈال دیئے کہ شرم آرہی ہے گل کو بھی..."

"میری ہڈیاں ٹوٹ جاتیں ابھی" گل نے بگڑ کے کہا "میں نے منع کیا تھا کہ ایسا مذاق مت کرو۔"

"تم لوگ کیا نالے میں چھپے ہوئے تھے؟" میں نے بہتر سمجھا کہ موضوع بدل دیا جائے "کب سے بیٹھے ہوئے تھے؟ چلو آگے چلتے ہیں۔"

"ہم شام کو یہاں پہنچے تھے" محسن بولا اور میرے ساتھ چلنے لگا۔

"اور ہم نہ آتے تو کیا کرتے؟" میں نے کہا۔

"آج نہ آتے تو کل آتے" محسن بولا "ہمیں اتنا تو معلوم ہو گیا تھا۔"

"کیسے معلوم ہو گیا تھا؟ تم شاکر علی سے ملے تھے؟"

urdusoftbooks.com

"ہم نے تو یہاں پہنچ کے ہی آر لھوترہ کو پوچھا تھا۔ ایک بوڑھے نے بتایا کہ وہ ہے اس شیطان کا گھر" محسن بولا "جب ہم نے گھر دیکھا تو اس پر سنہری باز نظر آ گیا۔ بڈھے کی رائے سے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ لھوترہ کو خلق خدا کیا کہتی ہے۔ بستی میں ایک مسجد بھی ہے۔ ہم اذان کی آواز سن کے ادھر چلے گئے۔ نماز کے بعد وہاں سے چھ سات بوڑھے نکلے۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ مسلمان یہاں بہت کم ہیں۔ جو شخص آخر میں نکلا وہ مسجد کا پیش امام تھا۔ میں نے السلام علیکم کر کے اس سے مصافحہ کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ ہم نے کہا کہ یہاں ایک دوست سے ملنے آئے تھے مگر پتا چلا کہ وہ بمبئی گئے ہوئے ہیں اور کل آئیں گے۔ کوئی ایسی جگہ بتایئے جہاں ایک رات قیام کیا جا سکے۔ ظاہر ہے ہوٹل یہاں کہاں۔ اس شریف آدمی نے اپنے گھر مدعو کیا۔ وہاں کھانا بھی کھایا۔ باتوں باتوں میں لھوترہ کے متعلق پوچھا تو حیرت انگیز انکشافات ہوئے۔ پھر تمہارا ذکر آ گیا۔"

"پیش امام ہمیں جانتا تھا؟"

"نہیں۔ اس نے لوگوں سے سنا تھا کہ آج دو ایسے فرشتہ سیرت نوجوان آئے تھے جنہوں نے بازار میں ایک ہندو کے ہاتھوں ایک مسلمان کو ذلیل ہونے سے بچایا اور اس علاقے کے سب سے بڑے بدمعاش کو سب کے سامنے ایسی پٹخنی دی کہ وہ پھر اٹھ نہ سکا۔ ہم نے کریدا تو اس نے بتایا کہ وہ کون تھا جس کی تم نے اور غالب نے مدد کی تھی۔ اس نے شاکر علی کا نام لیا۔ میں تھوڑی دیر بعد گل کو وہیں چھوڑ کے نکلا اور شاکر علی کا پتا پوچھتا ہوا اس کے گھر جا پہنچا۔"

"یہ کتنے بجے کی بات ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ... رات تین بجے کی۔"

"اس وقت وہ زندہ تھا؟"

"کیا مطلب؟" محسن چونکا "اب زندہ نہیں ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اس کے خاندان کے ایک ایک فرد کو مار دیا۔"

"کس نے؟" محسن سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔

"غالباً لھوترہ کے غنڈوں نے۔"

"اس وقت وہ زندہ تھا۔ اس نے پہلے انکار کیا مگر صاف نظر آتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ خیر میں اسے یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ میں تمہارا دوست ہوں، دشمن نہیں۔ پھر اس نے سب بتا دیا۔"

"یہ بتایا تھا اس نے کہ ہم لھوترہ کے دشمن ہیں؟"

محسن نے کہا "نہیں۔ نام کسی کا نہیں لیا تھا اس نے۔ صرف یہ کہا تھا کہ ان کے کچھ دشمن ہیں یہاں۔ وہ انہیں ڈھونڈنے لگانے کے لئے آج ہی رات آئیں گے۔ یا کل۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "اس کا مطلب یہ ہے دوست کہ مولوی شاکر علی بے وقوف آدمی تھا۔ ہم نے راز داری کی اہمیت پر بہت زور دیا تھا مگر اس نے تمہیں ساری بات بتا دی۔ لھوترہ کے غنڈوں کے خلاف خاک مزاحمت کی ہوگی اس نے۔ خود اپنے پاؤں پر تو کلہاڑی ماری تھی۔ بیوی بچوں کو بھی مروا دیا۔"

"میں سمجھ گیا تھا کہ تم لھوترہ سے نمٹنے کے لئے آؤ گے۔ چنانچہ میں واپس گیا اور ساری بات گل کو بتا دی۔ ہم مولوی صاحب کے سونے کا انتظار کرتے رہے۔ بارہ بجے کے قریب ہم کنڈی کھول کے نکل آئے۔ یہ دونوں کالی چادریں بھی انہی کی ہیں۔"

"میزبان کے گھر میں چوری کی، مہمان بن کے۔"

"کیا کرتے۔ خود کو چھپانے کے لئے یہ گناہ بھی کیا۔ مگر سو روپے چھوڑ آئے تھے۔" محسن بولا۔

"اس شریف آدمی کو مزید شرمندہ کرنے کے لئے۔ خیر بتاؤ کہ تم وہاں گئے تھے۔"

محسن سمجھ گیا کہ میں کہاں کی بات کر رہا ہوں "ہاں مگر وہاں تو میدان ہی صاف تھا۔ جو لوگوں سے معلوم ہوا وہ ناقابل یقین تھا...."

"وہ خبیث ڈھائی تین لاکھ لے گیا اور بڑی ہوشیاری سے نکل گیا" میں نے کہا۔

"اس کے لئے یہ اتنی بڑی رقم تھی۔ کہ میں سمجھتا ہوں ٹھیک ہی کیا اس نے۔ وہ تھوڑا تھوڑا کر کے جمع کر رہا تھا۔ قسمت نے اسے ایک موقع دیا اور اس نے فائدہ اٹھایا۔ میں اس لئے نہیں کہتا ہے کہ جب تک اس نے ہمارا ساتھ دیا نیک نیتی سے دیا۔ کوئی نقصان نہیں ہوا ہمیں بلکہ اس کی مدد سے ہم بچ گئے کئی بار۔ بعد میں شیطان نے بہکایا تو گناہ اس کے سر۔ ہمارا کیا لے گیا وہ؟ مال حرام تھا۔"

میں نے محسن کے نقطۂ نظر سے اختلاف نہیں کیا "تلسی بھی تو ایک آدمی تھا۔ کتنا مختلف..."

"تلسی کا اس کارٹون سے کیا مقابلہ۔ تلسی تو ہم پر اپنی جان کا قرض چھوڑ گیا" محسن افسردہ لہجے میں بولا "بہت تھوڑے دن ساتھ رہا لیکن ہمارے لئے بہت کچھ کر گیا۔ افسوس ہے کہ اپنے لئے کچھ نہ کر سکا۔ جو وہ کرنا چاہتا تھا۔"

"خیر اب تم تازہ صورت حال کو سمجھو" پھر میں نے اپنے نئے پروگرام کی تفصیل سمجھاتے ہوئے کہا "پہلے پروگرام کے مطابق رابعہ کے ہمراہ غالب کو روانہ ہونا تھا مگر اب تم آ گئے۔ لائٹس بند کرنے کی ذمہ داری تمہاری۔ تم فوراً روانہ ہو جاؤ۔"

محسن یا دیگر افراد میں سے کسی نے بھی میری رائے سے اس وقت اختلاف نہیں کیا۔

جب رابعہ اور محسن روانہ ہو گئے تو ہم نے ایک سا...

کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ میرا اندازہ تھا کہ انہیں بجلی کے سب اسٹیشن تک پہنچنے میں کم سے کم تیس منٹ ضرور لگیں گے۔ سب اسٹیشن میں نے بھی دیکھا تھا۔ یہ ایک کمرے پر مشتمل عمارت تھی جس کے چاروں طرف خاردار تار لگا دیئے گئے تھے۔ یہ انسانوں سے زیادہ مویشیوں کو روکنے کے لئے تھے جو عموماً آس پاس کے علاقے میں چرتے پھرتے تھے۔ سب اسٹیشن کو میں نے اندر سے نہیں دیکھا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ ایسے سب اسٹیشن میں ایک چوکیدار اور ایک الیکٹریشن کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ انہیں قریب ہی کوارٹر فراہم کر دیا جاتا ہے اور ان کی کوئی خاص ذمہ داری نہیں ہوتی۔ معمولی خرابی تو الیکٹریشن دور کر دیتا ہے لیکن سب اسٹیشن کا ٹرانسفارمر ہی اڑ جائے تو پھر انجینئر شہر سے ہی آتے ہیں۔ اندر پاور سوئچ بورڈ اور سرکٹ بریکر الگ ہوتے ہیں۔ جن سے ضرورت پڑنے پر سپلائی بند کی جا سکتی ہے۔ محسن کا اصل کام چوکیدار یا الیکٹریشن کی دخل اندازی سے نمٹنے کا تھا۔

"اس سے آگے نہیں جانا چاہئے ہمیں" میں نے کہا۔ ہم اب لھوترہ کے گھر سے چند گز کے فاصلے پر تھے اور وہ فصیل ہمارے سامنے تھی جس پر لائٹس روشن تھیں۔ ان لائٹس کے آف ہوتے ہی ہمیں عمل کے لئے مستعد ہونا تھا۔ پیچھے کی طرف ہمیں ایک گڑھا سا نظر آیا۔ شاید یہاں سے لوگ مٹی کھود کر لے جاتے رہے تھے۔ ریت، کنکر اور پتھریلی چٹانوں کے اس علاقے میں چکنی مٹی بہت کم تھی۔ رابعہ اور محسن کو گئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ لائٹس اب کسی وقت بھی بجھ سکتی تھیں۔

نازو نے کہا "بہت دیر ہو گئی انہیں گئے ہوئے۔"

میں نے گھڑی دیکھی "ہاں۔ چالیس منٹ ہونے والے ہیں۔"

اسی وقت ایک دم اندھیرا پھیل گیا۔ بجلی کی ہر ایک بجھ گئی۔ ہمارے سامنے فصیل کی ہر روشنی گل ہو گئی اور اندر بھی تاریکی پھیل گئی۔ میں اور غالب ایک جست لگا کے باہر نکلے۔ میں نے گل کا ہاتھ پکڑ کے اوپر کھینچا اور غالب نے نازو کو۔ میں نے دیوار کی طرف دوڑتے ہوئے کہا "لائٹس آن نہیں ہوں گی۔ جنریٹر آٹومیٹک نہیں ہیں۔"

گل نے کہا "بھائی سکندر، آہستہ۔"

لیکن میں نے رفتار میں کمی نہ آنے دی "تیز دوڑو۔ تین منٹ پورے ہونے سے پہلے اندر اترنا ہے ہمیں۔"

غالب نے کہا "پہلے ہم اوپر چڑھ جاتے ہیں۔ پھر انہیں بھی کھینچ لیں گے۔"

میں نے کہا "انہیں تاروں کے اوپر سے پھینک دینا۔ دوسری طرف۔ ورنہ یہ تاروں پر سے گزرنے میں وقت ضائع کریں گی۔"

غالب نے کہا "تم ذرا ادھر جاؤ۔ مجھ سے دور رہو تاکہ کتے ایک وقت میں دو طرف جائیں۔"

دیوار کے پاس پہنچ کے میں نے ہاتھ دیوار پر جمائے اور اپنے جسم کے وزن کو اوپر کھینچا۔ فصیل کا یہ حصہ ایک فٹ چوڑا اور لمبا تھا اور اس کے ستون دس دس گز کے... فاصلے پر بنے ہوئے تھے۔ باقی دیوار کی موٹائی وہی چھ انچ تھی۔ ہر ستون پر ڈھائی تین فٹ اونچا اینگل آئرن نصب تھا جس نے تاروں کی باڑھ کو سنبھال رکھا تھا۔ اس ستون پر میرے قدم جمانے کھڑے ہونے کے لئے کافی جگہ تھی۔ میں نے جھک کر اپنا سیدھا ہاتھ نیچے بڑھایا اور الٹے ہاتھ سے سہارے کے لئے اینگل آئرن کو پکڑ لیا۔ گل نے ایک ہاتھ اوپر اٹھایا اور میں نے اسے کہا کہ جب میں "ون ٹو تھری" کہوں تو وہ اوپر جمپ لگائے۔ ...تھری کے ساتھ ہی گل اوپر اٹھی اور میرے ہاتھ نے اسے سنبھال کے اپنے پاس کھینچ لیا۔

گل کے پاؤں ستون پر جم گئے تو میں نے کہا "اپنی یہ چادر مجھے دے دو اور دیکھو ادھر چھلانگ لگانی ہے تم کو۔"

"اتنی بلندی سے!"

میں نے اسے اٹھایا اور تاروں کے اوپر سے گزار کے ستون کے دوسری طرف اتار دیا۔ وہ لڑکھڑائی اور پھر اندر کود گئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نرم زمین پر اترا۔ یہ پھولوں کی کیاری تھی۔ نرم مٹی میں کودنے سے گل کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ دوسرے ستون کے قریب میں نے نازو اور غالب کو ایسے اترتے دیکھا جیسے وہ پیراشوٹ کے بغیر جہاز سے کودے ہیں۔

ابھی تک کسی نے جنریٹر نہیں چلایا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق دو منٹ گزر گئے تھے۔ ابھی تک محافظ بھی نمودار نہیں ہوئے تھے۔ میں نے گل سے چادر لے کر اپنے الٹے ہاتھ پر انگلیوں سے کہنی تک لپیٹی اور سیدھے ہاتھ میں مشین گن اٹھا کے آگے دوڑا۔ اب ہمارے سامنے سبز گھاس کا ایک میدان تھا جو تقریباً چالیس درجے کے زاویے پر بلند ہو کے کوٹھی کے برآمدے تک پہنچتا تھا۔ ہمیں اس بلندی کو ایک منٹ میں سر کرنا تھا۔

اندر سے لوگوں کے شور مچانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اچانک کتوں کا ایک غول نمودار ہوا۔ وہ اپنی مکروہ آوازوں میں بھونکتے ہوئے اوپر سے نیچے کی طرف دوڑتے آ رہے تھے۔ ایک کتا آگے تھا۔ میں نے مشین گن گل کی طرف پھینکی۔ اسی وقت کتے نے مجھ پر جست لگائی۔ وہ پانچ چھ گز دور سے اڑتا ہوا آیا۔ اس کے خون آشام جبڑوں میں سے بھیانک غراہٹ نکل رہی تھی اور وہ مداخلت بے جا کے مرتکب ہونے والوں کو ادھیڑ دینا چاہتا تھا۔

www.paksociety.com

میں نے وہ ہاتھ ڈھال بنا کے آگے رکھا جس پر چادر لپٹی ہوئی تھی۔ کتے نے میرے ہاتھ کو دبوچ لیا اور اس میں اپنے دانت ایسے گاڑ دیے کہ جب میں نے ہاتھ کھینچا تو وہ بھی اس کے ساتھ لٹک گیا۔ اب میں نے اس کی گردن پر کھڑی ہتھیلی کا بھرپور وار کیا جو بالکل صحیح لگا۔ گردن کی ہڈی ٹوٹتے ہی اس کی آواز بند ہو گئی اور میرے بازو پر اس کے دانتوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

میں نے اسے جھٹکا اور ایک دم گل کو کھینچ لیا ورنہ دوسرا کتا اس پر جست لگا چکا تھا اور وہ خوف سے مفلوج ہو جانے کے بعد اس قابل بھی نہ رہی تھی کہ حرکت کر سکے یا خود کو بچانے کے لئے مشین گن کا دستہ ہی کتے کے سر پر مار سکے۔

دوسرا کتا بلا کا پھرتیلا تھا۔ اس نے ایک دم پلٹ کے مجھ پر حملہ کیا اور میں نے پھر وہی تکنیک استعمال کی۔ میں نے اسے اپنا کپڑے میں لپٹا ہوا بازو پیش کیا۔ اس نے کپڑے میں دانت گاڑے اور اسے ادھیڑ کر رکھ دینے کے لئے زور لگایا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی وحشیانہ قوت کے سامنے میرے قدم بھی اکھڑ گئے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میرے قدموں کے نیچے ہموار زمین نہیں تھی تاہم گرنے سے پہلے میں نے قول کے ہاتھ مارا اور دوسرے کتے کی آواز بھی خاموش ہو گئی۔ جب میں گرا تو پھڑکتا، دم توڑتا کتا میرے اوپر گرا۔ میں نے اسے ایک طرف پھینکا اور اٹھ کے اوپر کی طرف لپکا۔

گل نے میرا ساتھ دیا اور ہم نے بلندی کی طرف مائل باقی راستہ طے کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ اوپر پہنچ کے میں نے دیکھا کہ نازو اور غالب مجھ سے پہلے اوپر موجود ہیں۔ ابھی تک لائٹس روشن نہیں ہوئی تھیں مگر اندر سے مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟" کسی نے گرج کے کہا۔

"کتے کیوں بھونک رہے ہیں؟ کون گھسا ہے اندر؟"

"جا کے دیکھو، سُور کے بچے..."

"جنریٹر کیوں نہیں چلایا ابھی تک؟" پہلے شخص نے کہا۔

معلوم نہیں کس نے بڑی فرمانبرداری سے کہا "چلا رہے ہیں جی۔"

ایک سیکنڈ کے لئے لائٹس جل کے بجھ گئیں۔ اندر کسی نے جنریٹر کی ڈوری کھینچی تھی۔ میں نے غالب کو ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مقصد تھا کہ وہ دوسری طرف سے آئے۔ اس نے میری بات سمجھ لی۔ وہ اور نازو طویل برآمدے میں مغرب کی طرف چلے گئے۔ اسی وقت میں نے پہلا فائر سنا جو غالب کے سائیلنسر والے پستول سے کیا گیا تھا۔ کوئی شخص بری طرح چلایا۔ جنریٹر پھٹ پھٹ کر کے چلا اور بند ہو گیا۔

میں نے مشین گن گل سے لینے کا ارادہ کیا اور بدل دیا۔

"تیار رہنا" میں نے کہا "جو سامنے آئے اسے بھون دینا۔"

گل نے سر ہلایا اور ہم برآمدے کے مشرقی حصے کی طرف لپکے۔ اس برآمدے میں کھلنے والے سب کمرے کھلے اور روشن تھے۔ آخری دروازے سے کوئی ایک دم باہر نکلا اور ہمارے سامنے حائل ہوا۔ میں نے اس کا ہاتھ اٹھتے دیکھا اور اسی کے ساتھ دے مارا۔ اس نے فائر کیا مگر گولی نہ جانے کدھر گئی۔ گل نے مشین گن کا لوہے کا دستہ مار کے اس کا سر توڑ دیا۔ اب فائر دوسری طرف سے بھی ہو رہے تھے۔

"شاباش" میں نے کہا "بس میرے سر کا خیال رکھنا۔"

گل نے کہا "تم خود بھی اپنا سر بچا کے رکھنا۔"

میں اور گل کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ لائٹ آ گئی۔ جنریٹر ابھی تک اسٹارٹ نہیں ہوا تھا۔ نہ جانے کون جنریٹر چلانے والے کو اس بٹن کی گالیاں دے رہا تھا۔ اچانک میں نے خود کو ایک ہال میں پایا۔ گل کی مشین گن نے گولیاں اگلیں۔ ایک ساتھ تین آدمی اپنا چہرہ بچاتے، چلاتے ہوئے زمین پر لوٹنے لگے۔ میں اور گل دوڑتے ہوئے ہال سے گزرے تو سامنے ایک زینہ آ گیا۔ اوپر سے لوگ دھم دھم کرتے آ رہے تھے۔ ایک آخری زینے پر تھا۔ میں نے اسے دبوچا اور اس کا سر زینے کی ریلنگ کے آخری پول پر مارا۔ ریلنگ مضبوط شیشم کی لکڑی کے ستون پر ختم ہوتی تھی۔ اس ستون پر لگتے ہی اس کا سر پھٹ گیا اور وہ سیڑھیوں میں لڑھک گیا۔

دوسرے شخص نے ریوالور نکال کے کوئی چلانا چاہا، نشانہ لینے کی مہلت نہیں ملی...... دوسرا فائر کرنے سے پہلے گل نے اسے چھلنی کر دیا۔ ہال میں مشین گن کی آواز بڑے بھیانک انداز میں گونجی۔ اب سامنے کوئی نہیں تھا۔ میں نے ان دونوں کے ریوالور بھی اٹھا کے جیب میں ڈال لئے۔ ایک ریوالور میرے ہاتھ میں رہا۔

میرے ذہن میں عمارت کا کوئی نقشہ نہیں تھا۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اندر کتنے افراد ہیں۔ زینے کے پیچھے والے کی دوسری جانب سے نازو اور غالب کے نمودار ہونے کا انتظار کیا۔ وقفے وقفے سے میں نے فائرنگ کی آوازیں سنیں۔ تین بار کسی کے چلانے کی آواز بھی آئی تھی مگر اب اندر سے خاموشی تھی۔

گل کی نگاہیں بھی برآمدے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"غالب کہاں رہ گیا؟"

میں نے کہا "انہیں آ جانا چاہئے۔ کیا خیال ہے، چل کے دیکھیں؟"

گل کا جواب ملنے سے پہلے اوپر کی منزل سے یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ کسی عورت نے چیخنا

شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے اوپر کوئی طوفان آ گیا ہو۔ اس کے متعلق۔ چینی کے برتنوں کی دکان میں بیل گھس گیا ہو۔

"وہ لوگ اوپر ہیں" میں نے کہا۔

گل اوپر جانے لگی "پھر ہم یہاں کیوں کھڑے ہوئے ہیں؟"

میں نے اسے روک لیا "جس راستے سے وہ اوپر گئے ہیں۔ ہم بھی ادھر سے ہی جائیں گے۔"

اوپر جانے کے لئے دوسرا راستہ شمالی سمت میں تھا۔ وہاں دو آدمی مرے پڑے تھے اور ان میں سے ایک یقیناً نازو کی دست درازی کا شکار ہوا تھا۔ دوسرے کے سر میں گولی لگی تھی اور وہ زینے میں ایسے پڑا ہوا تھا کہ اس کی ٹانگیں زینے پر تھیں اور سر نیچے فرش پر۔ سر کے سوراخ سے تازہ سرخ خون مغز کی سفیدی کے ساتھ مل کے بہہ رہا تھا۔

میں نے خون سے بچتے ہوئے اوپر تک کا آدھا فاصلہ ایک جست میں طے کیا اور زینے کے موڑ پر رک گیا۔ میں نے گل کو ہدایت کی تھی کہ وہ مجھے کور کرے اور جب تک میں اشارہ نہ کروں وہ اوپر نہ آئے۔ اس نے میری جگہ لی تو میں اوپر چلا گیا۔ نیچے اور اوپر کے نقشے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ اوپر کمروں کے گرد برآمدہ نہیں تھا۔ صرف اس حصے میں ایک ایئڈور جیسی بالکونی تھی جس میں زینہ کھلتا تھا۔

اوپر اب مکمل خاموشی تھی۔ دیوانہ وار چیخنے والی عورت بھی خاموش تھی۔ میں نے لات مار کے پہلے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ دوسرے کمرے سے کوئی ایک دم باہر آیا۔ اس کے ریوالور کا رخ میری طرف تھا۔ غیر ارادی طور پر میں جھک گیا لیکن یہ غالب تھا۔ غالب نے مجھے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔

"یہ کیا بے وقوفی کی حرکت ہے؟" میں نے کہا "ابھی میں جنرل کر جاتا پھر؟"

"دیکھ لیجئے" غالب بولا "میں نے تو دیکھ لیا تھا۔"

"پھر باہر آنے سے پہلے آواز کیوں نہیں دی؟" میں نے کہا "نازو کہاں ہے؟"

"خانہ تلاشی میں مصروف ہے" غالب نے کہا۔

گل نے کہا "یہ کون عورت چیخ رہی تھی؟"

غالب نے کہا "اندر جا کے دیکھ لو، ڈرو نہیں۔"

گل اندر چلی گئی تو میں نے کہا "اور کوئی نہیں بچا؟"

"ابھی اوپر والی منزل نہیں دیکھی لیکن میرا خیال ہے کہ محافظ تو سب مارے گئے۔ تین میرے ہاتھوں جہنم رسید ہوئے لیکن نازو کا اسکور زیادہ رہا۔ اس نے دو کتے بھی ہلاک کئے۔ یوں" غالب نے ہوا میں ہاتھ چلا کے واضح کیا۔ "دونوں اس پر حملہ آور ہوئے تھے۔"

"پہلے ایک آیا تھا۔ نازو نے چادر سامنے پھیلا دی۔ جیسے بل فائٹر کرتے ہیں۔ بیل کے سامنے لال کپڑا لہراتے ہیں اور بیل حملہ کرتا ہے تو ہٹ جاتے ہیں۔ کتا کپڑے سے ٹکرا کے گرا تو نازو نے لات مار کے گردن توڑ دی۔ دوسرے نے نازو کو گرا دیا تھا مگر نازو نے پلٹ کے ہاتھ مارا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ بالکل ناقابل یقین منظر تھا وہ۔ میں تو گولی چلانے ہی والا تھا۔"

"تم لوگ کیا باتوں میں لگ گئے" نازو نے ایک کمرے سے سر نکال کے جھنجھلا کر کہا۔

میں اور غالب باری باری دوسرے کمروں میں گئے مگر سب کمرے فضول سامان سے بھرے پڑے تھے۔ اوپر کی منزل پر چار بیڈ روم تھے۔ ان میں سے ایک طرہ کا تھا۔ اس کے وسیع بیڈ پر ایک عورت بے لباس پڑی ہوئی تھی۔ غالب نے مجھے بتایا کہ چیخنے والی عورت یہی تھی۔

"خود طرہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"انہی میں سے کوئی ہو گا جو مارے جا چکے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اتنے ملازموں اور محافظوں کے ساتھ رہنے والا خود سامنے آ کے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یا تو وہ بھاگ گیا یا کہیں چھپ گیا۔"

"ہم اسے پہچانتے بھی تو نہیں" غالب نے کہا "میں نے سنا تھا کہ وہ آج کل یہاں نہیں ہے۔"

"ہم کسی سے پوچھ لیتے تو اچھا تھا مارنے سے پہلے۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "اتنی مہلت کسی نے نہیں دی کہ ہم سوال جواب کر سکتے۔ جو بھی سامنے آیا اس نے فوراً ہمیں مارنے کی کوشش کی اور خود مارا گیا۔ کسی نے ہم سے بھی تو نہیں پوچھا کہ آخر ہم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔"

"چور پکڑا جائے تو سوال جواب سے بچ کے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اور بھاگ نہ سکے تو مرتا ہے یا مار دیتا ہے" میں نے کہا "مجھے بھی کسی نے موقع نہیں دیا کہ میں اسے خبردار کر پاتا کہ ہتھیار ڈال دے۔"

"آخر یہ کون لوگ تھے؟"

"مجرم کے ساتھی۔ مجرم کے محافظ اور مجرم۔ یہ کوئی شریف اور بے گناہ لوگ ہوتے تو براہ راست حملہ نہ کرتے... خیر اب دیکھتے ہیں کوئی بچا ہے یا نہیں۔"

نازو نے اعلان کیا "یہاں کوئی کام کی چیز نہیں ہے۔"

میں نے ان سب چیزوں کو دیکھا جو نازو اور گل نے تلاشی لیتے ہوئے الماریوں میں سے اور درازوں میں سے نکال کے باہر پھینک دی تھیں۔ بیش قیمت زیورات، سامانِ آرائش، ملبوسات اور پرفیوم وغیرہ۔

"یہ سب چیزیں آپ ہی کے کام کی ہیں" غالب نے کہا۔

"سپاہ حسن کے لئے اسباب قتل و غارت گری..."

www.paksociety.com

میں نے کہا "جمالو زندگانی میں یہ ہیں عورتوں کی شمشیریں"
بازو مسکرائی "شعر کی مٹی تو مت پلید کرو۔"
ایک الماری میں شراب کی درجنوں خوبصورت بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ سب غیر ملکی شراب تھی۔ گل نے کہا۔
"یہ تمہارے کام کی چیز تو نہیں ہے؟"
میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ ہم سارا مے خانہ پی چکے ہیں۔ یہ حرام شے تو بہت حقیر ہے اس نشے کے سامنے جس سے ہم سرشار ہیں۔"
"چل یار، اب اوپر بھی دیکھ آئیں۔ ویسے اوپر کچھ ہے نہیں۔ زینے پر تالا پڑا ہوا ہے" غالب بولا۔
اس کا کہنا صحیح تھا۔ ہم دروازے کا تالا توڑ کے اوپر پہنچے تو خالی کمروں کے سوا ہمیں کچھ نہیں ملا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ اضافی منزل مستقبل کی ضروریات یا محض عمارت کی وسعت اور شان و شوکت بڑھانے کے لئے تعمیر کی گئی تھی۔ ہم لوٹ کر درمیانی منزل پر پہنچے تو گل اور بازو باقی کمروں کو بھی کھنگال چکی تھیں۔ اچانک لائٹ آف ہو گئی۔
میں نے کہا "یہ تو بجلی کا بریک ڈاؤن ہے۔"
غالب نے کہا "بستی کی لائٹس تو جل رہی ہیں۔"
میں نے گل سے مشین گن لے کر اسے ریوالور دے دیا اور غالب کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔ لائٹ کسی نے اندر سے بند کی تھی اور جس نے بھی یہ حرکت کی تھی وہ تاریکی سے فائدہ اٹھا کے فرار ہونا چاہتا تھا یا ہمارے خلاف کوئی غیر متوقع کارروائی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے غالب اور بازو کو اس طرف جانے کے لئے کہا جدھر سے ہم داخل ہوئے تھے۔ گل کے ساتھ میں نے سامنے والے حصے پر نظر رکھی۔ میری نظر تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی۔ کوٹھی کے سامنے والے حصے میں ڈھائی سو مربع گز کا لان تھا اور فصیل کا باقی حصہ تھا۔ وسط میں سفید سیمنٹ یا سنگ مرمر کا ایک فوارہ خاموش کھڑا ہوا تھا اور فصیل کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے درخت بھی ساکت تھے۔ آخری حصے میں گیٹ تھا جس کے دونوں فولادی پٹ اس وقت بند تھے۔ گیٹ لائٹس کے بند ہو جانے کے باوجود آٹھ دس فٹ چوڑا سیمنٹ کا بنا ہوا راستہ صاف دکھائی دیتا تھا جو برآمدے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ میں اس راستے سے چار سیڑھیوں کی بلندی پر برآمدے کے ایک ستون کی اوٹ میں تھا اور ایسے ہی دوسرے ستون کے پیچھے گل کھڑی ہوئی تھی۔
اچانک دائیں جانب ایک کار کا انجن اسٹارٹ ہوا۔ انجن کی آواز بہت کم تھی۔ کسی نے پوری کوشش کی تھی کہ اس کو اسٹارٹ کرنے کے بعد ریس نہ دے اور خاموشی سے نکل لے... ے۔ اس کا خیال تھا کہ ہم اوپر کی منزل پر مصروف ہیں

اور وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جان بچا... ہونے کی کوشش کر سکتا ہے۔ میں نے گل کو اشارے سے متوجہ کیا۔
"میرا خیال ہے کہ گاڑی یہاں سے گزرے گی... سامنے سے۔ فائر کر کے اس کے دونوں پچھلے ٹائر پھاڑ دو"
"آپ فکر ہی نہ کریں..."
میں نے کہا "اتنے کم فاصلے سے نشانہ خطا نہ ہو جائے۔"
اس نے پھر کہا "آپ فکر ہی نہ کریں۔"
اسی وقت کسی نے عقبی حصے میں چلانا شروع کر...
"... نا ... لئے دعا کرو۔"
میں نے کہا "... غالب نے ایک شکار کو زندہ..."
گل نے کہا "آپ کو کیا معلوم۔ شکار بازو کا بھی ہو... ہے۔"
میں نے دائیں جانب اندھیرے کو گھورتے ہوئے...
"ہاں بھئی، تم لوگوں کے نشانے سے ہم نہ بچ سکے۔ ... شکار ہو گئے۔"
گل آہستہ سے ہنسی، پھر خاموش ہو گئی۔ دائیں... سے ایک سیاہ کار آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آ رہی تھی... قریب پہنچ کے اس نے یکلخت اپنی رفتار بڑھا دی... ستون کی اوٹ میں ہمارے مجسمے سائے دیکھ لئے تھے... نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ جان کی بازی لگا کے گاڑی کو... سے دوڑا کر لے جائے اور گیٹ سے ٹکرا کے رکے... جائے۔ کم رفتار سے گیٹ کو توڑتے ہوئے نکلنا مشکل...
گل نے ٹھیک وقت پر فائر کیا لیکن کار کی رفتار... کے باعث کوئی ٹائر میں نہیں لگی تاہم ونڈ اسکرین... بیٹھے ہوئے شخص نے سمجھ لیا کہ نشانہ اسے ہی بنایا... نے ایک آخری کوشش کے طور پر کار کا رخ بدل دیا... راستے پر رہنے کے بجائے اس نے کار کو لان پر اتار... شارٹ کٹ سے گیٹ کا رخ کیا۔ یہ ایک طاقتور... امپالا کار تھی۔ اس کا انجن اب اپنی قوت میں طوفان... گرج رہا تھا۔ گل نے گھبراہٹ میں دوسری گولی چلائی... پچھلا ونڈ اسکرین پاش پاش کر دیا۔ اب میں روک... سکتا تھا۔ میں نے مشین گن کا برسٹ مارا اور پورا... کار نے لان کو تقریباً عبور کر لیا تھا کہ اس کے...
گئے۔ دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا والی بات... گیٹ پر پہنچ کے گاڑی رک گئی۔ ایک شخص آہستہ... دروازہ کھول کے باہر نکلا اور ہاتھ اوپر اٹھا کے لڑکھڑا...
"گولی مت چلانا" اس نے وہیں سے کہا۔
میں نے کہا "ایسے ہی ہاتھ ... کر آگے آؤ

تمہاری جیب میں اسٹم بم ہے۔ تب بھی استعمال کرنے کی کوشش مت کرنا۔"
پیچھے سے غالب کی آواز آئی "ایک پنچھی کو میں نے بھی اڑنے سے پہلے پکڑ لیا ہے۔"
میں نے کہا "اسے کہیں پنجرے میں ڈال دے۔ میں نے ... پنچھی یا شیر کو اڑنے سے پہلے گرفتار کیا ہے۔"
تب بازو نے کہا "اس کو کمرے میں لے جاؤ مگر ذرا خیال کے۔ نازک چیز ہے" پھر وہ میرے ساتھ آ کے کھڑا ہو گیا۔
"بھئی اتم جاکے مین سوئچ تلاش کرو اور لائٹ جلا دو" میں نے کہا۔
کار سے اترنے والا بالکل سیدھا چلتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے اور صاف نظر آتا تھا کہ اس نے شکست کو موت پر ترجیح دیتے ہوئے مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر آ کے رک گیا۔ وہ تیس پینتیس سال کا جوان اور صحت مند آدمی تھا جس نے نائٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بیڈروم میں پڑی ہوئی عورت کے ساتھ تھا مگر وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی غلط نہ تھا کہ وہی پالک رام ملہوترہ ہے۔
"مسٹر پالک رام ملہوترہ" میں نے کہا "اب پلٹ کے کھڑے ہو جاؤ۔"
اس نے پلٹ جانے کے بعد کہا "آخر یہ سب کیوں کیا ہے تم نے؟"
میں نے کہا "اس فضول سوال کا جواب ہم کیوں دیں۔ جب کہ خود تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہارا جرم کیا ہے۔"
لائٹس جل گئیں تو غالب نے پیچھے جا کے اس کی جامہ تلاشی لی۔ اس کے پاس ایک ہی ریوالور تھا جو اس نے پاجامے کے نیچے دبا رکھا تھا۔ غالب اسے اندر لے گیا۔
"میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا" ملہوترہ نے کہا۔
"کیسی عجیب بات ہے! ہم نے بھی پہلے تمہیں نہیں دیکھا" میں نے کہا "لیکن ہم تمہیں جانتے ہیں۔ تمہارے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے وہ جان لیں گے۔"
اس کا انداز لب ہلکا ہونے لگا تھا "تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ تم نے بلاوجہ اتنے آدمی مار دیئے۔"
"اگر ہم ایسا نہ کرتے تو وہ ہمیں مار دیتے۔ بلاوجہ ہم نے ان تک ایک چیونٹی کو بھی نہیں مارا۔"
"آخر ان سب سے کیا دشمنی تھی تمہاری؟"
"ہماری تم سے بھی کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ تم سب قانون اور معاشرے کے مجرم ہو لیکن یہ قانون اور معاشرہ تمہاری شیطانی طاقت، تمہارے وسائل اور تمہاری طاقت کے سامنے بے بس ہو کے رہ گئے تھے چنانچہ تم ایسے سب لوگوں کے معاملات اب ہم نے اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں۔"
"مگر تم ہو کون؟"
"ہم انصاف کرنے والے لوگ ہیں ملہوترہ...."
"دیکھو، میں تمہیں ایک موقع دیتا ہوں۔ ابھی وقت ہے۔ صبح ہونے سے پہلے نکل جاؤ" ملہوترہ نے کہا۔
"ہم صبح کا انتظار بھی نہیں کریں گے۔ ہم ابھی اور اسی وقت جائیں گے۔ تمہارے ساتھ۔"
"ہاں۔ اگر تم جہنم میں جاؤ گے تو ہم بھی جائیں گے۔ دروازے تک چھوڑنے" غالب بولا۔
میں نے کہا "جاکے دیکھو دوسرے پنچھی نے کچھ بتایا ہے؟"
"تم.... اپنا بھی وقت ضائع کر رہے ہو..." ملہوترہ پریشان اور متفکر نظر آنے لگا "اور میرا بھی.... چلو جو ہوا تھا ہو گیا۔ اب مجھے بھی جانے دو اور خود بھی بھاگ جاؤ میرے ساتھ۔"
"یہ دولت مجھے آج تک کسی لڑکی نے نہیں دی" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اور میں حیران ہوں کہ آج سے پہلے کبھی تمہیں بھاگنے کا خیال کیوں نہیں آیا؟"
"دیکھو، وہ لوگ آتے ہی ہوں گے... انہوں نے فائرنگ کی آوازیں سن لی ہوں گی" وہ چلا کے بولا۔
"کون لوگ؟" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔
"وہی جو کسی کو بخشتے نہیں ہیں" وہ اب بھی نام لینے سے گریز کر رہا تھا "یہ سب انہی کے آدمی تھے جن کو تم نے مار دیا ہے۔ وہ... مجھے بھی مار دیں گے۔"
"تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ پھر تمہیں کیوں ماریں گے؟"
"میں... مجھے یہاں نہیں ہونا چاہئے" وہ بمشکل تمام بولا۔ "میں صبح ہونے سے پہلے نکل جاتا۔"
"چور کبھی نہ کبھی ایسے ہی پکڑا جاتا ہے۔ اس کی شامتِ اعمال اس کے لئے سارے راستے اچانک بند کر دیتی ہے" میں نے کہا۔
غالب کے ساتھ بازو اور گل افسردہ صورت بنائے اندر آئیں۔
"کیا ہوا؟" میں نے کہا۔
"وہ کچھ بتائے بغیر مر گیا" بازو نے کہا۔
"کیسے مر گیا؟ کوئی زہر تھا اس کے دانتوں کے کسی خلا میں یا اس نے کوئی کیپسول نگل لیا؟"
"وہ دوڑ کر کھڑکی سے کود گیا..." بازو نے کچھ یوں کہا جیسے اسے اپنی کوتاہی پر شرمندگی ہے۔

www.paksociety.com

باہر سے میں نے رات کے آخری پہر کی خاموشی میں کسی جیپ کے انجن کی آواز سنی۔ طوطرّا کا چہرہ پیلا پڑ گیا "وہ... وہ آ گئے۔"

ہم لے بغیر نازو نے رونی صورت بنا کے کہا "وہ... کیوں نہیں آئے ابھی تک؟ اب تو ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا۔"
میں نے کہا "وہ نہیں آئے تو کیا ہوا۔ ہم چلتے ہیں ان کے پاس۔ مسٹر طوطرّا! تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم کس طرف سے بحفاظت نکل سکتے ہیں۔ تمہیں اندازہ ہوگا کہ کون سا راستہ محفوظ ہے۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا "میرے ساتھ آؤ... جلدی کرو... وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا... میری گاڑی..." اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

"ہاں گاڑی تو اب وہ دیکھ ہی لیں گے اور گاڑی کو بنایا بھی نہیں جا سکتا" میں نے کہا "اب تم جان بچاؤ اور بھاگ جاؤ۔"
"کہاں جا سکتا ہوں میں۔ اس سے بچ کے" وہ آگے دوڑتے ہوئے بڑبڑایا "وہ تلاش کر لے گا مجھے... میں کیسے چھپ کے رہ سکتا ہوں اس کی نظر سے..."

خوف کی دیوانگی میں وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔
طوطرّا کے ساتھ ہم نے گیراج کی طرف دوڑ لگائی۔ جو جنوب کی فصیل کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک جیسے چار گیراج تھے۔ ان کے دونوں جانب سرونٹ کوارٹر نظر آ رہے تھے۔ طوطرّا ایک گیراج میں داخل ہو گیا۔ گیراج کا ایک دروازہ دوسری طرف بھی تھا۔ اس نے اندر سے بھاری کنڈی کھولی اور باہر نکل گیا۔ اچانک ہم نے خود کو طوطرّا کے قلعہ نما گھر کے باہر پایا۔ یہ ایک طرح سے چور دروازہ تھا جو ہنگامی ضرورت کے لئے رکھا گیا تھا۔

گیراج کا اندر والا دروازہ ہم نے بھی بند کر دیا تھا چنانچہ فوری طور پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم چور دروازے سے فرار ہو گئے۔ باہر آنے کے بعد میں نے بیرونی دروازہ بھی بند کیا اور طوطرّا کے پیچھے دوڑنے لگے۔

وہ معلوم نہیں ہمیں کس طرف لے جا رہا تھا۔ اس کا اپنا مسئلہ کچھ اور تھا۔ افشائے راز کے بعد اس کے لئے ان کے سامنے جا کے زندہ بچ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی جان بچا کے فرار ہو رہا تھا۔ اسے ابھی اندازہ نہیں تھا کہ ہم نے اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔

بالآخر ایک جگہ نازو اور گل کی ہمت جواب دے گئی۔ پہلے گل ایک دم بیٹھ گئی۔ پھر نازو۔ انہوں نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بڑی مشکل سے چند الفاظ میں بتایا کہ وہ ہمارا ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔

میں نے طوطرّا کو روک لیا "تم کدھر بھاگے جا رہے ہو؟"

اس نے ریوالور کا رخ اپنی طرف دیکھا تو خوامخواہ یہ سمجھا کہ ہم اس جنگل میں اسے گولی مار کے چلے جائیں گے۔
"دیکھو میں... میں نے مدد کی تمہاری۔ میں نے تو مقابلہ نہیں کیا۔ کوئی آدمی نہیں مارا..."
میں نے کہا "ہمیں مندر اور ملحقہ آشرم کا راستہ ... تمہیں جانے کی اجازت ہوگی۔"

وہ چلایا "میں... ادھر... ادھر نہیں جا سکتا۔"
میں نے کہا "تمہارا باپ بھی جائے گا۔"

اسی وقت دو طرف سے ہم تیز روشنی کی زد میں آ گئے۔ یہ جیپ کی ہیڈ لائٹس تھیں جو دونوں سمت سے ہماری طرف بڑھتی آ رہی تھیں۔ گل اور نازو کی حالت ایسی نہیں تھی کہ دوڑ سکیں۔ ویسے بھی جیپ کے مقابلے میں آدمی کتنا دوڑ سکتا ہے۔ جیپ ایک مضبوط "کبھی نہ تھکنے والی" مشین تھی اور ہم تھکے ہارے انسان جو اپنی ... کر چکے تھے۔ مشین گن کا راؤنڈ ختم ہو گیا تھا۔ اب ہمارے پاس صرف ریوالور تھے لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ محصور کرنے والے تعداد میں کتنے ہیں اور کتنے طاقتور۔

"یہ انہی کے ساتھی ہوں گے" غالب نے کہا۔
میں نے کہا "یہ تو قریب آنے پر ہی معلوم ہوگا لیکن فوراً منتشر ہو جانا چاہئے۔ تم ادھر جاؤ۔ نازو! تم گل کو لے کر ادھر... جاؤ شکل مت دیکھو میری۔"
نازو نے کہا "اب ایسی صورت بھی نہیں ہے ... میں جان کا خطرہ مول لے کر دیکھتی رہوں۔ آخر کدھر جاؤں؟"
"دیکھو اپنی ذاتی عقل بھی استعمال کر لو۔ جیسی بھی ہے" میں نے جھنجھلا کے کہا "بس ادھر مت جاؤ جدھر غالب گیا ہے۔"
گل نے اسے کھینچ لیا "جائیں آپ اپنی فکر کریں۔"
میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "خدا کے لئے ... لگاؤ۔ جھک کر جاؤ لیٹ کر آگے بڑھتی رہو۔"
دونوں جیپوں کی ہیڈ لائٹس قریب آنے کے بعد ... تھیں اور مجھے تقریباً سو گز کے فاصلے پر دونوں طرف حرکت پیش قدمی کرتے نظر آ رہے تھے۔ اندھیرے اور جنگل کی ... کے باعث صحیح تعداد کا اندازہ مشکل تھا۔ شاید ... سے تین تین افراد اترے تھے۔
میں نے بالک رام طوطرّا کو کھینچ کر اپنے ساتھ ... میرا ریوالور اس کی پسلیوں سے لگا ہوا "کون ہیں یہ لوگ؟" میں نے سرگوشی میں کہا۔
"میں... کیا بتا سکتا ہوں..." وہ بولا۔
میں نے کہا "اچھا مت بتاؤ۔ ایک بات میں بتا دوں سن لو۔ تمہارے محافظ یا مددگار اگر ... بھی آ جائیں تو وہ تمہیں اس ایک گولی سے نہیں بچا سکتے جو تمہارے دل سے دو انچ دور میری انگلی کے ایک اشارے ...

"آخری گولی ہے بالک رام۔"
... "اس ریوالور میں ... کوئی اچھی بات کی ہے میں نے" وہ ... زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ اس کی آواز حلق میں پھنس ... رہا تھا اور کانپ رہا تھا۔ اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔

جھاڑیوں کی اوٹ سے میں نے ایک شخص کو نمودار ہوتے دیکھا جو ہاتھ میں ریوالور لئے بڑی احتیاط کے ساتھ ہر طرف دیکھتا ہوا اور چونک چونک کر قدم رکھتا آ رہا تھا۔
"ادھر کوئی نہیں ہے" نہ جانے کس نے اچانک کہا۔
شخص چونک کے پلٹا "کتے" "مجھے معلوم تھا پہلے تو ہی بھونکے گا۔ تیری زبان خاموش نہیں رہے گی۔"
جس کو کہا گیا تھا وہ سامنے آ گیا "ابھی میرے پر کاٹ کو ... کرتی کھاتا ہے۔ اس سالے نے پوچھا تھا کہ ادھر ہے کوئی؟ میں نے بتا دیا استاد۔"
اب تیسرا شخص بھی اندھیرے کی اوٹ سے نکل آیا "اب کیا یہ بھی ... بولا تھا کہ لاؤڈ اسپیکر کا ناک جواب دے؟"
"بند کرو دونوں اپنی بکواس... انہیں تلاش کرو۔ کہیں وہ نکل نہ جائیں تمہاری بک بک میں" پہلے شخص نے کہا۔ وہ اپنے لہجے اور سلیقے سے خود کو اس شکاری ٹولے کا لیڈر ثابت کر چکا تھا۔

غالب، نازو اور گل ہم سے زیادہ دور نہیں تھے۔ یقیناً یہ گفتگو ان کے کانوں تک بھی پہنچی ہوگی لیکن وہ بھی دم سادھے پڑے رہے۔
"ٹارچ کہاں ہے تو" پہلے شخص نے اپنی ٹارچ کی روشنی سے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
"ٹارچ... جل نہیں رہی ہے" ایک نے اعتراف جرم کے انداز میں کہا۔
ان کے لیڈر نے انہیں ایک انتہائی نامناسب مشورہ دیا کہ ... اس کو کیسے استعمال کرنا چاہئے۔
دوسرے نے اپنی ٹارچ روشن کی تو اس کی روشنی بھی کمزور ... "ابھی سیل ڈاؤن ہے استاد..."
استاد نے اسے دوسرا انتہائی نامناسب مشورہ دیا کہ جو سیل ڈاؤن ہوں ان کو کیسے استعمال کرنا چاہئے۔ وہ خود بھی کم بے وقوف نہیں تھا کہ میرے سامنے کھلی جگہ پر کھڑا ہوا تھا۔ کسی ... ان تینوں کو گولی مار سکتا تھا لیکن ... میں انہیں اس طرح مارنا چاہتا تھا کہ ایک کے بعد ... عالم بالا میں ...
... کے ساتھی تھے ... کوئی بات نہیں رہی تھی۔ یہ سب طوطرّا کے گھر کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں ... آشرم سے بھیجے گئے تھے کہ صورت حال کا ... نظر آئے تو اسے ختم کریں۔ یقیناً ان کی

موجودگی سے طوطرّا کے مایوس دل کو حوصلہ اور تقویت حاصل ہو رہی ہوگی مگر وہ انہیں متوجہ کر کے خودکشی کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ ضرور دعا کر رہا ہوگا کہ وہ جلد از جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہوں تاکہ اس کی جان سولی کے عذاب سے چھوٹے۔ میں اس کی عیاری کو سمجھتا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ بھی لاحق ہونے لگا تھا کہ کہیں یہ سسپنس اس کے اعصاب کی شکست کا سبب نہ بن جائے۔ وہ پاگل پن میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے کہ مجھے اس کو مارنا پڑے جس کے بعد ایک کھلی جنگ شروع ہو جائے۔ میرے لئے دونوں طرف توجہ میں فرق نہ آنے دینا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں اس کی طرف سے ذرا بھی غافل ہوتا تو وہ کوئی غلط حرکت کر بیٹھتا اور میں صرف اسے دیکھتا رہتا تو عین ممکن تھا کہ دشمن کی نقل و حرکت پر نظر نہ رکھ پاتا۔

اس دوہری پریشانی سے نجات پانے کے لئے میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر طوطرّا کو خاموش کر دیا۔ میں نے اسے ایک دم دبا لیا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے دوسرا ہاتھ اس کی گردن پر کان کے قریب مارا۔ وہ مزاحمت کرتے کرتے ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ جب مجھے یقین آ گیا کہ اس بے ہوشی میں طوطرّا کی اداکاری کا کوئی دخل نہیں تو میں نے اسے سیدھا لٹا دیا اور اپنے دشمنوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو اب بھی میرے قریب ہی جھاڑیوں کو کھنگالتے پھر رہے تھے۔ ان کی باتیں سن کے اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ہمیں دیکھ لیا تھا چنانچہ ہمارے غائب ہو جانے سے وہ جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان کی ناکامی میرے لئے باعث اطمینان تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ غالب کے علاوہ گل اور نازو نے بھی خود کو خاصی ذہانت سے کیموفلاج کیا تھا۔

پہلی آواز میں نے چند منٹ بعد سنی۔ یہ آواز کچھ ایسی تھی جیسے کسی نے ہچکی لی ہو۔ پھر کوئی دو چار قدم دوڑا۔ اس کے بعد خاموشی ہو گئی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا وہ پہلا شکار تھا جو نازو نے کیا تھا اور آخری ہچکی کے بعد وہ دوڑا نہیں تھا۔ اس نے زمین پر پاؤں مارے تھے۔
"کیا ہے... یہ کیا ہے؟" میرے سامنے سے گزرتے ہوئے استاد نے بڑی تشویش سے کہا۔
میں نے اسے ایک دم پیچھے سے یوں دبوچا کہ میرا دایاں ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ میں نے اس کی کمر میں گھٹنا مارا اور وہ ایک جھٹکا کھا کے کمان ہوا تو میں نے منہ پر رکھے ہوئے ہاتھ سے پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی اور شاید ریڑھ کی ہڈی بھی کیونکہ وہ عجیب مضحکہ خیز طریقے پر انگریزی حرف ایل کی شکل بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ دو منٹ میں اس کی روح اس کے جسم سے جدا ہو گئی۔ دو منٹ تک میں نے اسے حرکت بھی نہ کرنے دی۔
اب اس ٹیم کا ایک ہی فرد باقی رہ گیا تھا۔ دوسری ٹیم باقی

www.paksociety.com

آگے لور ترہ کے کھر کی جانب نکل گئی تھی۔ خاموشی سے دشمن کو ختم کرنے کا منصوبہ ابھی تک کامیاب تھا۔ پھر فضا کا سکوت ریوالور کی ایک گولی کی تیز آواز نے ختم کر دیا۔ کوئی شخص چلایا۔

"احتیاط..." اور میں نے اس شخص کی آواز پہچان لی جس کی تاریخ کے سیل ڈاؤن تھے۔ دوسری گولی چلنے کی آواز پر میں پریشان ہو کے بھاگا کیونکہ یہ آواز بالکل مختلف اور یقیناً دوسرے ریوالور کی تھی۔ کیا پہلی گولی کا نشانہ خطا ہو گیا تھا اور اس شخص نے جوابی فائر کیا تھا؟

میرے سیدھے ہاتھ کی طرف سے غالب نے کہا "شاہد...!" میں رک گیا۔

"فائر تم نے کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ پہلا فائر میں نے کیا تھا" غالب ایک بہت بڑے پتھر کی اوٹ سے نکل آیا "وہ اچانک سامنے آ گیا تھا۔"

"تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ اس نے گرتے گرتے گولی چلا دی تھی۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "میں تو ڈر گیا تھا کہ شاید نشانہ چوک گیا۔"

"میرا نشانہ کبھی خطا ہوا ہے؟" غالب نے کہا۔

"مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ یہ گولی تو نے چلائی تھی۔"

"اور کون چلا سکتا تھا؟" نازو نے پیچھے سے کہا۔

میں اچھل پڑا "تم... تم کہاں تھیں؟"

نازو نے کہا "اودھر... ایک درخت پر۔ اوپر سے ٹارگٹ لینے میں آسانی رہی۔ وہ بدبخت نیچے آ گیا۔"

"تم دونوں درخت پر چڑھ کے بیٹھ گئی تھیں!" غالب نے حیران ہو کے کہا۔

"کیا درخت پر چڑھنا خلاف ضابطہ ہے" گل نے ...۔

"خلاف عقل ضرور ہے" غالب نے کہا "کوئی کارنامہ سرانجام دیے بغیر ہی تمہاری ٹانگ ٹوٹ جاتی پھر؟"

"کیسے ٹوٹ جاتی۔ اور ٹوٹ جاتی تو میں لنگڑا کے بھی چل سکتی ہوں" نازو نے کہا۔

"چلو ٹوٹی تو نہیں۔ اب نکلو یہاں سے فوراً" میں نے کہا "ان کے باقی ساتھی تو مرے جیپ والے ہیں۔"

"کیوں نہ ان سے بھی نمٹ لیں" نازو نے کہا۔

"فرار ہو جانا بہتر ہے" غالب نے کہا "بچہ کہاں ہے؟"

"بچہ!" میں بھونچکا رہ گیا "کون سا بچہ؟ کس کا بچہ؟"

"بالک... بالک رام" غالب نے کہا "بالک بچے ہی کو کہتے ہیں ہندی میں۔"

میں نے مسکرا کے کہا "بچہ سو رہا ہے۔ رو رہا تھا، میں نے سلا دیا۔"

بالک رام لور ترہ کی حویلی کی طرف سے دوسری ٹیم کے ارکان فائرنگ سن کے پلٹے تھے لیکن انہوں نے اندھا دھند

ور ڈنے سے گریز کیا تھا۔ وہ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ دو کے پیچھے ہے اور ان کے ساتھی مقابلہ کر رہے ہیں ... تو بس صرف دو گولیاں ہی کیوں چلائی گئیں۔

میں نے بالک رام کو کندھے پر ڈالا اور ہم جیپ تک پہنچے۔ حسب توقع وہ چابیاں لگی ہوئی چھوڑ گئے تھے۔ ... تعداد اور طاقت پر یقین کے فریب کا شکار ہوتے تو ایسا نہ کرتے۔ وہ ڈرائیور کو جیپ میں چھوڑ جاتے یا چابیاں نکال لیتے۔ میں نے لور ترہ کو ایک جیپ میں ڈالا اور جیپ کا انجن گرجا اور ایک دم دو فائر ہوئے۔ ہماری ... والے شاید سمجھ گئے تھے کہ ہم جیپ لے کر فرار ہو رہے ... ان کے اپنے ساتھی انہیں کچھ بتائے بغیر یوں چھوڑ کر ... تھے۔

گولی کا نشانہ بننے سے بچنے کے لئے میں نے جیپ ... کے بعد بھی لائٹس نہیں جلائیں لیکن اندھیرے میں ... جھاڑیوں میں فرق کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ... دوسری طرف اندھیرے کی کالی چادر تھی جس میں ... سے بھی اس وقت نظر آتے تھے جب فاصلہ چند قدم ... اور میں ایک درخت سے بچ کے نکلا تھا تو کوئی ... جیپ کی طرف دوڑتا محسوس ہوتا تھا۔ یہ دوسری جنگ ... زمانے کی ملٹری ماڈل جیپ تھی جو پتھروں کے اوپر ... گڑھوں کو پھلانگتی، درختوں سے رگڑ کھاتی اور ... روندتی ہوئی چلتی گئی۔ اس کی جگہ کار ہوتی تو اس ... الگ پڑے ہوتے اور مسافر الگ۔

مجھے صرف جیپ کو اور خود کو بحفاظت نکال لے ... خیال تھا چنانچہ میں نے وہ فائر شمار نہیں کیے جو پیچھے والے اندھیرے میں نشانہ لئے بغیر کر رہے تھے۔ ... حالات میں بہترین نشانے باز بھی کچھ نہیں کر سکتا ... افتاں و خیزاں بھاگ رہے تھے، جیپ الگ دوڑ رہی ... ناہموار زمین کا سامنا بھی دونوں کو تھا... اور اندھیرے ... تلاش کرنے کا مسئلہ بھی دونوں کو درپیش تھا۔ میں ... کر دوسری جیپ کو دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ... جھاڑ جھنکار کر سامنے دیکھ رہا تھا۔ اگر میں پلک بھی جھپکا ... کسی درخت پر چڑھ جاتی۔

دوسری جیپ کو میں نے روانہ ہوتے ضرور ... مجھے یہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ اسے کون ڈرائیو ... میرے لئے ایک اطمینان کی بات یہ تھی کہ ... لائٹس بھی روشن نہیں تھیں۔ میں نے ایک جگہ ... آواز دی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بھی چیخ کر جواب دے ... میں وہ میری آواز کیسے سن سکتا تھا۔ اور اگر وہ خود ... تو اس کی ساری جدوجہد بھی اتنی ہی سخت اور مبہم ... میری۔

جنگل میں فائرنگ نے سارے پرندوں کو بیدار اور بدحواس کر دیا تھا۔ وہ اب دیوانہ وار چلا رہے تھے اور فضا میں اپنے آشیانوں کے قریب منڈلا رہے تھے۔ گولیوں کے ساتھ گالیاں بھی کچھ دیر سنائی دیتی رہیں۔ پھر ایک جگہ میں نے محسوس کیا کہ ہم ... والوں کی دوڑ جیت گئے ہیں۔ وہ قدرے ہموار جگہ تھی چنانچہ میں نے جیپ کی رفتار کم کی اور پلٹ کے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی کہ کہیں بچہ تو بیچ کے نکلنے سے نہیں گر گیا۔ گل کو ... میں بھونچکا رہ گیا۔

"بی بی... تم... بیٹھی ہو... کب... میرا... خدا... تم تب سے میرے ساتھ تھیں ہو نا؟" میں نے مختلف خیالات اور جملوں کا آتش بازی ہوتے کہا اور جیپ روک لی... بخدا مجھے معلوم نہیں تھا...؟"

گل نے بڑی مشکل سے کہا "آپ... حد کر دی آپ نے... میں تو آیت کریمہ کا ورد کر رہی تھی... اف اللہ... میرا تو دل کانپ رہا ہے...؟"

میں نے بالک رام کو دیکھا۔ وہ سیٹ سے لڑھک گیا تھا "وہ دونوں کہاں رہ گئے؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

گل نے پھولی ہوئی سانس کو قابو میں لاتے ہوئے پیچھے دیکھا اور کہا "ساتھ ہی... آ رہے تھے..."

"تم نے دیکھا تھا؟"

"ہاں" گل نے سر ہلایا اور "ہائے میں مر گئی" کہہ کے ثابت کیا کہ اس کی حالت جھٹکوں نے ابتر کر دی ہے۔

میں نے کہا "کوئی ہڈی... خدانخواستہ... ٹوٹی ہے کیا؟"

"نہیں... ٹوٹی تو نہیں... اچھی طرح سے سب ہل گئی ہیں" اس نے فریاد کے انداز میں کہا "یہ کوئی طریقہ ہے..."

"وہ... وہ آ گئے" میں نے خوش ہو کر کہا۔

اندھیرے میں سے غالب اور نازو سرپٹ دوڑتے ہوئے نمودار ہوئے اور جیپ پر چڑھ گئے۔

غالب کی سانس اس کے قابو میں نہ تھی مگر اس نے آدھی آدھی کر کے مجھے ایک دو جن گالیاں دیں۔ مثلاً۔ الو... نکما... نازو نے اس کے ساتھ ساتھ بولتے ہوئے کہا "آپ ہمیں چھوڑ کے بھاگ گئے۔"

"لاحول ولا قوۃ..." میں نے جیپ کو اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "تم خود ہی تو جیپ لے کر بھاگے تھے۔"

"وہ ایک پہاڑ پر چڑھ گئی..." غالب نے ایک گہری سانس لی۔

"پہاڑ نہیں ... درخت تھا" نازو نے کہا۔

"جیپ ... نہیں... ہمیں کیا معلوم... جیپ میں چلا رہا ... لے کر۔"

"... رہی تھی" نازو نے بھی چلا کے کہا۔

اب مجھا سے ہیڈ لائٹس جلا دیں "کوئی گولی وغیرہ نہیں گی

تمہیں، فائر ہو رہے تھے۔"

"نازو سے پوچھو... مجھے تو نہیں لگی" غالب نے کہا۔

"اچھا ہوتا، اگر لگ جاتی۔ بھی ذرا ٹیک ... ہے تھے اس پر میں تمہیں گولی مار دیتی" نازو نے چبا چبا کے کہا "آپ نے ساتھ مجھے بھی مروا دیا تھا۔"

"ہاں۔ مال روڈ پر گاڑی چلا رہا تھا میں" غالب ہنس کے بولا۔ "اتنی نزاکت ہے تو بیٹھ جاتا تھا ہوائی جہاز میں۔ میرے ساتھ مرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

نازو نے ایک چیخ ماری "یہ... یہ کیا ہے...؟"

غالب نے کہا "بچہ ہے، نازا بچہ..."

"غالب! میں پھینک دوں گی اٹھا کے باہر۔"

"وہ... میرا مطلب تھا نام سب تو بچہ بالک رام" غالب نے فوراً معذرت کرتے ہوئے دانت نکالے۔ گل پہلے ہی ہنس رہی تھی۔ اب مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ اس ہنسی نے اعصابی کشیدگی کو ایک دم بہت کم کر دیا۔

"کہیں وہ جیپ لے کر نہ آ جائیں ہمارے پیچھے" میں نے کہا۔

"جیپ کو تو گولی ماری میں نے" غالب نے کہا "وہیں قتل کر دیا نافرمان کو۔ میری مرضی کے خلاف وہ پہاڑ پر کیسے چڑھ گئی۔"

"وہ پہاڑ نہیں تھا، درخت تھا" نازو نے شرافت سے کہا۔

غالب نے کچھ دیر اسے گھورنے کے بعد کہا "میں درخت کو پہاڑ نہیں مان سکتا، خواہ تم مجھے دس بار اٹھا کے جیپ سے پھینک دو۔"

"گیارھویں بار تو مانو گے نا؟" نازو نے کہا۔

میں نے اسے فوراً روک دیا "ہم بعد میں جا کے خود دیکھیں گے کہ وہ درخت تھا یا پہاڑ۔"

"اور تمہیں بھی پتا نہ چلا تو؟" گل نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"تو ہم یہ معاملہ اقوام متحدہ میں لے جائیں گے۔ کشمیر کا مسئلہ حل کرتے ہی وہ ہمارا مسئلہ بھی حل کر دیں گے" میں نے کہا۔ "ابھی تو یہ سوچو کہ ہم اس لاوارث بچے کو کہاں لے جائیں۔"

"بچے کو لینے والی ہیوی تک نہیں رہی" غالب بولا۔

"اسے ہوش میں لا کے اسی سے پوچھ لینا بہتر ہوگا" نازو نے کہا۔

میں نے جیپ روک دی اور بالک رام کو سیٹ پر لٹا دیا۔ غالب نے جیپ کی تلاشی لی اور اس کی سیٹ کے نیچے سے مزید اسلحہ برآمد کیا۔ اس میں ایک چیز بہت کار آمد تھی۔ یہ غیر ملکی ساخت کا دستی بم تھا جو شاید ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لئے رکھا گیا تھا۔ کہ اگر مقابلہ سخت ہو جائے اور ہم گولی کی زبان سمجھنے پر آمادہ نہ ہوں تو یہ گولا مار دیا جائے۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ یہ اور اب ہر ایک ... تھا۔ مجھے اب

www.paksociety.com

والے ریوالور کے لئے گولیاں درکار تھیں۔ جیپ میں سے ملنے والی گولیاں میگزین میں ڈال کے میں نے غیر ضروری ریوالور دور پھینک دیئے۔

اتنی دیر میں نازو نے جیپ کا بونٹ کھولا جو عام کار کی طرح اشارے سے نہیں کھلتا۔ اسے خاصی قوت صرف کر کے دونوں طرف کے ہک ہٹانے پڑے۔ پھر اس نے ریڈی ایٹر کے پانی میں رومال بھگویا اور ٹھنڈا کر کے بالک رام کی پیشانی پر رکھا۔

نازو نے کہا "اٹھو بچے' آنکھیں کھولو... ہوش میں آ جاؤ۔"

غالب نے اسے ڈانٹ کے کہا "اتنی محبت اور اتنے پیار کا مظاہرہ کرو گی تو یہ کبھی آنکھیں نہیں کھولے گا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ کیا کہا ہے وہ کسی شاعر نے کہ۔ تھا سے ہوئے بیٹھے تھے آغوشِ محبت میں۔ بے ہوش ہی اچھا تھا ناحق مجھے ہوش آیا۔"

غالب نے کہا "یہ لاتوں کا بھوت ہے' ممتا نچھاور مت کرو۔"

نازو نے کہا "پھر کیا کروں؟"

"اس سے کہو۔ حرام زادے' اٹھو' نہیں تو لات ماروں گی اور پھر لات مار کے کہو' الو کے پٹھے اٹھو۔ نہیں تو دانت توڑ دوں گی۔ پھر دانت توڑ کے کہو' سور کے بچے ہوش میں آ جا' نہیں تو جہنم رسید کرتی ہوں..."

ابھی غالب کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ بالک رام لبو ترے کراہ کے کہا "ہائے میری ماں..."

ہم سب ہنس پڑے۔ غالب نے کہا "دیکھا' کیسا اثر ہوا ہے میری بات کا۔"

پھر وہ بالک رام پر جھک کے بولا "ماں نہیں' میں تمہارا باپ ہوں۔ نرکھ سے تمہیں لینے آیا ہوں بالک رام۔"

بالک رام اٹھ بیٹھا۔ اس نے ایک ہاتھ سر پر رکھ کے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھا "یہ کیا جگہ ہے..."

"یہ وہ جگہ ہے بیٹا' جہاں پہلے تیرا پیٹ پھاڑا جائے گا پھر تجھے زمین میں گاڑا جائے گا۔ اور تیری پتنی کا سہاگ اجاڑا جائے گا..."

بالک رام کو اتنی دیر میں پوری طرح ہوش آ چکا تھا۔ اس نے پُر وحشت انداز میں باری باری ہم سب کی صورتوں کو دیکھا۔ "تم مجھے مت مارو' میں تمہاری ہر شرط منظور کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "شرائط بہت ہیں' ہم ساتھ ساتھ بتاتے جائیں گے اور منواتے جائیں گے۔"

غالب نے کہا "یار' یہ آوازیں..."

نازو اور گل نے سر ہلایا "میرا خیال ہے..."

"تمہارا خیال درست ہے" میں نے کہا "لیکن اب فرار نہیں ہوں گے۔ ہم ان کا استقبال کریں گے... بالک رام' یہ تمہارے ہی پالے ہوئے کتے ہیں۔ ان کے ساتھ مرنا پسند کرو گے تم اب یا انہیں کتے کی موت مارنے کے نیک کام میں ہماری مدد کرو گے؟"

بالک رام کانپتے ہوئے بولا "تم... کیا کہہ رہے ہو؟ میں سمجھا نہیں!"

باقی بچ جانے والے ہمارا سراغ تلاش کرتے اسی راستے دوڑتے ہوئے ہم تک آ پہنچے تھے۔ ان کے دوڑتے قدموں کی اور آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔

میں نے کہا "ہم نے تمہاری مدد کے لئے آنے والے آدھے لشکر کا صفایا کر دیا ہے۔ جو باقی بچے تھے وہ مرنے کے لئے خود ادھر آ رہے ہیں۔ تم انہیں مدد کے لئے بلاؤ۔ ہم چھپ کر دیکھ رہیں گے۔"

"اور تمہاری گفتگو کا ایک ایک لفظ سنیں گے" غالب نے کہا۔

قریب ہی سے سنائی دینے والی سب آوازیں یکلخت بند ہو گئی تھیں۔ غالباً انہوں نے جیپ دیکھ لی تھی یا اندازہ کر لیا تھا کہ ہم کہیں قریب ہی موجود ہیں۔ جنگل میں جہاں خطرہ خود شکار آتا ہے شکار اور شکاری دونوں ہی چھٹی حس کی مدد سے یہ پکار سن لیتے ہیں۔

میں نے نازو اور گل کو چٹکی سے اشارہ کیا "تم دونوں غائب ہو جاؤ۔"

غالب نے کہا "جیسے جنگل میں چڑیلیں غائب ہوتی ہیں۔"

"تم نے دیکھا ہے کبھی؟" گل نے خفگی سے کہا۔

غالب نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا "نہیں دیکھا۔ کیا ابھی دیکھ لیں گے۔"

نازو پھر درخت پر چڑھ گئی۔ اس کام میں مہارت کا شوق نازو نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اسے اپنے دبلے پتلے پن کو استعمال کرنا آتا تھا۔ وہ گلہری کی طرح پلک جھپکتے میں ایک شاخ پر پہنچ گئی جو زمین سے دس بارہ فٹ اونچی تھی۔ گل نے ایک جھاڑی کے پیچھے پناہ لی۔

میں نے دستی بم لبو ترہ کو دکھا کے کہا "یہ چیز تم نے دیکھی ضرور ہو گی۔ تمہارے ہی اسٹاک کا مال ہے۔ ہم صرف دس گز دور بیٹھے ہیں۔ اگر تم نے چالاکی کی تو ہم تمہارا سامان یہیں سے ارسال کر دیں گے۔"

"لیکن خود محفوظ رہیں گے" غالب نے سرگوشی میں کہا۔

میں نے کہا "انہیں یہ بتانا ہے کہ ہم تمہیں یہاں چھوڑ کر فرار ہو گئے اور تم کو ابھی ابھی ہوش آیا ہے۔"

"اس بیان کا آخری حصہ بہرحال سچ ہے" غالب نے کہا۔

پھر ہم دونوں بھی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روپوش ہو گئے۔ بالک رام کو اپنی زندگی سے اتنا پیار تھا کہ کسی تردد کے بغیر اس نے تینوں افراد کو خود موت کی راہ گزر پر بلا لیا۔ وہ کراہنے چیخنے لگا۔

"ارے... کون ہے؟ ادھر آؤ... ہائے... آہ..."

"کون؟ بالک رام جی" اندھیرے میں سے ایک آواز ابھری۔

"ارے ہاں' میں بالک رام ہوں... ستیاناس ہو ان کا۔"

اس نے ذرا لاچاری دکھائی۔ اندھیرے کی اوٹ سے تین سائے بڑی تیزی سے بالک رام کی طرف لپکے۔ ان سب کے ہاتھ یوں اٹھے ہوئے تھے کہ دور سے بھی ہم ان کے مسلح ہونے کا اندازہ کر سکتے تھے۔

"یہ کیا ہوا بالک رام جی؟"

"ارے... ہو گیا تھا۔ نمک حرام' نالائق... کدھر گئے... وہ میرا کام تمام کر گئے۔ آپ بھاگ گئے مجھے یہاں ڈال کے..."

"آخر... کون تھے وہ؟" یہ دوسری آواز تھی۔

"کیسے گئے کدھر وہ..." تیسرے نے ہمارے لئے ایک گالی کو بلا روک ٹوک استعمال کیا۔

"پولیس کے بچے' کیا میں پوچھتا ان سے کہ وہ کون ہیں؟ اور کیا ہے تمہیں پرواہ؟... میں تو بے ہوش تھا۔ مجھے کیا معلوم وہ کہاں گئے۔"

میں نے ایک پتھر اٹھا لیا اور اس طرف پھینکا جدھر نازو درخت پر چھپی بیٹھی ہوئی تھی۔

"یہ... کیسی آواز تھی یہ؟" کسی نے چونک کر کہا۔

"ادھر سے آئی تھی آواز..." دوسرا بولا۔

"دیکھو... ہوشیار... کہیں وہ دھوکا دینے کے لئے آس پاس نہ چھپ گئے ہوں" تیسرے نے کہا۔

"میں دیکھتا ہوں ادھر" پہلے نے کہا "تم دوسری طرف جاؤ۔"

اس وقت نازو نے ایک دلچسپ حرکت کی۔ اس نے حلق یا لب سے کسی پرندے کی آواز نکالی لیکن یہ آواز بے حد مصنوعی ناقص تھی۔

"یہ کون بولا تھا؟"

"طوطا ہو گا" بالک رام نے کہا۔

نازو نے پھر سے طوطے کی طرح کہا "میاں مٹھو..."

وہ شخص درخت کی جانب بڑھ گیا "میں نے جنگل میں کبھی رات کے وقت طوطے کو بولتے نہیں سنا" وہ حیرانی سے بولا "ابھی پکڑتا ہوں۔"

"ابے دیکھ لے' طوطا ہے کہ طوطی" دوسرا بولا۔

"یہ بھی پوچھ لینا کیوں جاگ رہا ہے" تیسرے نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

دوسرا شخص بڑی بے فکری سے چلتا ہوا مجھ سے چند فٹ دور تک آیا اور رک گیا۔ میں نے پہلو بدلا تھا اور اس نے آہٹ سن لی تھی۔

"کون ہے؟ سامنے آ جا" اس نے ریوالور کا رخ میری طرف کر کے حکم دیا۔

اگر میں نے فوراً جگہ نہ بدلی ہوتی تو شاید نشانہ لئے بغیر چلائی جانے والی گولی مجھے لگ جاتی۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر فائر کرتا میں نے اس پر جست لگائی۔ لیکن اسے گرانے میں ناکام رہا۔ آخری لمحے تک وہ پینترا بدل کے بچ گیا۔ اس نے پلٹ کر پہلے فائر کرنا چاہا اور پھر مجھے بالکل سامنے پا کے ریوالور سے میرے سر پر وار کیا۔ میں نے سر کو بچاتے ہوئے گھوم کر لات ماری جو اس کے پیٹ پر بڑے بھرپور انداز میں لگی۔ وہ بلبلایا اور دوہرا ہو گیا۔ میں نے اس کی گردن بغل میں دبائی اور ہاتھ سے کلائی تھام کے جھٹکا دیا تو اس کا ریوالور وہیں گر گیا۔ میں نے اسے دبا کے تھوڑی سی دوڑ لگائی اور پھر اسے آزاد کر دیا۔ چھوڑنے سے پہلے میں نے اسے یوں دھکیلا کہ وہ اپنی ہی قوت میں سیدھا آگے گیا۔ اس نے خود کو سنبھالنے اور بریک لگانے کی ناکام کوشش کی لیکن خود کو اس درخت سے نہ بچا سکا جو اس کے سامنے آ گیا تھا۔ اس کا سر درخت کے تنے پر یوں لگا جیسے کک لگنے سے فٹ بال گول میں نہ جائے اور پول سے ٹکرا جائے۔ اس کا سر پاش پاش ہو گیا۔

میں نے ایک فائر کی آواز اور سنی تھی۔ اب میں جیپ کی طرف متوجہ ہوا تو مجھے وہاں غالب کے ساتھ گل نظر آئی۔ پھر دوسری سمت سے نازو ہاتھ جھاڑتی نمودار ہوئی۔

"قسمت بالخیر" میں نے کہا۔

"قفس" نازو نے کہا "بے چارہ بولنے والا طوطا پکڑنے آیا تھا۔"

"تمہارے اس بولنے والے طوطے کو آج میں نے بچا لیا" گل نے ریوالور لہرا کے کہا "ورنہ یہ..."

"وہ... دراصل... ایک دم پیچھے آ گیا" غالب نے اپنی خفت مٹانے کے لئے کہا "بزدل... سامنے سے آتا تو میں دیکھتا۔"

گل ہنسنے لگی "واقعی۔ بہت بہادر ہیں آپ۔ آج دیکھ لیا میں نے۔ سٹی گم ہو گئی تھی۔ کھڑے تھے بت بنے ہوئے..."

"میں اسے بچانا چاہ رہا تھا" غالب نے متانت سے کہا "تم نے خواہ مخواہ گولی چلائی' وہ میرے قدموں میں گرنے ہی والا تھا۔"

"اور درخواست کرنے والا تھا کہ لیجئے' مجھے میرے ریوالور سے قتل فرمایئے" نازو نے تمسخر سے کہا۔

"چلو اب باتوں کا وقت نہیں ہے" میں نے ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کے کہا "بالک رام! ہم تمہارے باپ کے بنائے ہوئے مندر کے اندر جانا چاہتے ہیں۔"

"مندر میں... اس وقت!"

"ہاں۔ ہم جیپ کو دور چھوڑ دیں گے" میں نے جیپ کو اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا اور غالب اور نازو کی چخ چخ کو نظر انداز کر دیا۔

"تم اندر کیسے جاؤ گے؟" بالک رام نے مایوسی سے انکار میں سر ہلایا۔

"تم آخر کس مرض کی دوا ہو... یہ تمہیں سوچنا ہے کہ اندر جانے کے لئے کون سا راستہ محفوظ رہے گا اور کیا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ ہم تو کچھ بھی نہیں جانتے" میں نے کہا۔

"یہ... بہت مشکل ہو گا..."

www.paksociety.com

"مشکل اور ناممکن۔ ان دو الفاظ کو ہم اپنی ڈکشنری سے خارج کر چکے ہیں" میں نے کہا "ہم آسان کام ویسے بھی پسند نہیں کرتے ورنہ اس وقت یہاں نہ ہوتے۔ کہیں داد عیش دے رہے ہوتے۔ عیش کرنا ہمارے اختیار میں تھا۔"

غالب نے پیچھے سے ایک سرد آہ بھری "دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ ورنہ یہ جھوٹ ہے۔ لیوں نازو؟"

"[illegible] مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی" نازو نے بھی آہ بھرے غالب ہی [illegible] کی حالانکہ ایک منٹ پہلے دونوں میں تو تو میں میں جاری تھی۔

میں نے کہا "واہ بھئی، آج تو تم نے بھی ایک پورا مصرع بالکل صحیح [illegible] ہو گیا۔ لاحق تمہیں بھی یہ شاعری کا مرض [illegible]"

"یہ محبت کی بیماری ہے۔ چھونے سے لگ جاتی ہے" گل نے کہا۔

"یہ جہاں ہم شکیں والی بات ہے، جو تم نہیں سمجھو گی" غالب نے کہا۔

"آخر کیوں نہیں سمجھوں گی میں؟"

"اس لئے کہ یہ فارسی ہے" غالب نے کہا۔

"چلو تم اردو میں سمجھا دو" گل نے اصرار کیا۔

"شعر نہیں سناتا، مطلب بتا رہا ہوں۔ مٹی سے پھول کی خوشبو آ رہی تھی۔ مٹی نے کہا کہ اس میں میرا کمال نہیں، یہ خوشبو اس پھول کا عطیہ ہے جو خاک میں مل گیا۔ اب تم خاک فرض کر لو نازو کو اور گل مجھے۔"

"گل تو میں ہوں" گل ہنسنے لگی "تمہیں گل محمد فرض کر سکتی ہوں۔"

میں نے جیپ کو روک دیا کیونکہ اب مندر کی عمارت کا مخروطی سیاہ ہیولا سو قدم کے فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔

غالب نے اچانک سنجیدہ ہو کے کہا "سکندر! وہ دو افراد کہاں گئے؟ رابعہ اور محسن۔"

میں نے ابھی تک اس سوال پر ذہن کے سارے دروازے بند کر رکھے تھے کیونکہ میرے پاس خود کو مطمئن رکھنے کے لئے بھی جواب کوئی نہیں تھا۔

میں نے کہا "وہ کہاں جا سکتے ہیں" اور غالب کو ٹالنے کی کوشش کی۔

لیکن غالب آسانی سے ٹلنے والا نہیں تھا "میں جانے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے وہ ہمیں چھوڑ کے نہیں جا سکتے۔"

"لے جائے تو جا سکتے ہیں" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا "اور وہ لوٹ کر نہیں آئے تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "یار، یہ بھی تو کیا نہیں ہو سکتا۔ اور میرا ذہن بھی اچھے اور برے ہر قسم کے امکانات سے بے نیاز نہیں ہے۔ مجھے بھی ان کی اتنی ہی فکر ہے جتنی تمہیں۔ لیکن فکر کرنے سے کیا ہو گا؟"

"یعنی ان کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہئے" نازو نے [illegible] غصے میں کہا "بھول جانا چاہئے ان کو۔ اگر قسمت [illegible] ہو گا تو مل جائیں گے ورنہ پڑھ لیں گے ان پر فاتحہ۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو" میں نے برہمی سے کہا۔

"تم تحمل جذباتی بے حسی کے ساتھ کہہ رہے ہو [illegible] سے کیا ہو گا۔"

"ہاں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ فکر کرنے سے کچھ نہیں ہو گا صرف ہمارا وقت ضائع ہو سکتا ہے اور ہمارا کام رک سکتا ہے۔"

میں نے نازو کو سمجھانے کی کوشش کی جو باقی سب کی طرح جذبات کی رو میں بہہ گئی تھی "اگر وہ آزاد ہیں تو خود ہی کسی وجہ سے نہیں آ سکے۔ یہ وجہ کیا ہو گی؟ اس کا علم ان سے ملنے کے بعد ہو گا لیکن اندازہ بہرحال کیا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی اہم وجہ یا کوئی ایسا کام ہو گا جو فوری توجہ کا طالب ہو گا۔ مجھے التوا رکھنے کی گنجائش نہیں ہو گی۔ چنانچہ انہوں نے واپسی کو [illegible] ملتوی کر دیا اور اس کام سے انہیں فرصت ہو گی تو وہ خود آ جائیں گے۔ انہیں معلوم ہے کہ ہم اس علاقے میں کہیں مل جائیں گے۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ ہم انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ لیکن بالفرض محال وہ دشمن کی قید میں ہیں تو [illegible] کرنے سے زیادہ ان کے لئے عملاً کچھ کرنے کی ضرورت ہے اور وہ ہم کر رہے ہیں۔ سر ہتھیلی پر رکھ کر ہم یہاں تک آ گئے۔ اب دشمن کے حصار میں داخل ہونے کا مرحلہ ہے۔ یہاں جا کے ہی معلوم ہو گا کہ ہمارے راستے میں کتنی دیواریں حائل ہیں، انہیں کیسے گرایا جا سکتا ہے اور زنجیریں کیسے کاٹی جا سکتی ہیں۔ دشمن کس حد تک قوی ہے اور ہم اپنے محدود وسائل کے ساتھ اس کی طاقت سے کیسے ٹکرا سکتے ہیں۔ شہلا کو اور اس کے بیٹے کو بحفاظت کیسے نکالا جا سکتا ہے۔ یہی ہمارا مقصد ہے۔ تم سب کی رائے ہے کہ پہلے رابعہ اور محسن کو تلاش کیا جائے تو ٹھیک ہے۔ ہم اپنا پلان بدل دیتے ہیں۔ لیکن کوئی مجھے بتائے کہ رابعہ اور محسن کو کہاں جا کے تلاش کریں؟ اگر وہ آزاد ہوئے تو مل جائیں گے لیکن صورت حال اس کے برعکس ہوئی تو یہ وقت ضائع ہو جائے گا۔ اتنی دیر میں دشمن کا [illegible] جائے گا۔ وہ شہلا کو بھی ساتھ لے جائیں گے اور۔۔۔ [illegible] ہم غبار دیکھتے رہ جائیں گے۔"

میں نے دل کا سارا غبار نکال دیا تھا اور خود بھی [illegible] رہنمائی میں ایک جذباتی بحران سے گزرنے میں کامیاب [illegible] میں نے ایک واضح، منطقی سوچ کی مدد سے اپنے راستے کا [illegible] کر لیا تھا اور بہت مطمئن محسوس کر رہا تھا کہ میں تذبذب اور بے یقینی، قوت فیصلہ کی کشمکش اور عدم اعتماد کی دلدل [illegible] دھنسنے سے پہلے ہی سنبھل گیا۔

[illegible] نازو اور گل کی صورتوں پر شرمندگی [illegible] تھے۔ گل سیدھی سادی لڑکی تھی۔ اس نے اپنی غلطی فوراً تسلیم کر لی "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سکندر بھائی۔ مجھے پورا بھروسہ رکھنا چاہئے آپ پر۔"

پھر نازو نے کہا "آئی ایم سوری سکندر، میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ مجھے تم پر اعتماد نہیں رہا یا تم کوئی غلط فیصلہ کر رہے ہو۔"

غالب نے تفت سے سر کھجا کے کہا "ہاں، غلطی ہے کر سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ایسی کی تیسی ہاں کی۔ نہ میں ہاں ہوں اور نہ میں کوئی غلطی نہ کروں۔ تم اختلاف کا حق رکھتے ہو کیونکہ تم سب اپنے ہی اہم ہو جتنا کوئی اور۔ میرا کوئی فیصلہ ذاتی فیصلہ نہیں ہوتا چاہئے لیکن اس کے ساتھ ہی تم سے بھی میں ایک رعایت مانگتا ہوں۔ کہ اگر مجھ سے غلطی ہو جائے یا میرے غلط فیصلے سے نقصان ہو جائے تو مجھے معاف کر دینا۔"

غالب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "چل یار، اب بس بھی کر۔ کیوں اتنا شرمندہ کر رہا ہے مجھے سب کے سامنے۔"

میں نے بالک رام کو دیکھا جو احمقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا ہوا یہ ساری گفتگو سن رہا تھا اور اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا کر اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم کس پلان، منصوبے اور مشن، کس دشمن اور کس ساتھی کی اسیری و رہائی کی باتیں کر رہے تھے۔ اس کے لئے ہم سب کے نام اور چہرے بھی اتنے ہی اجنبی تھے جتنے ہمارے مقاصد پُراسرار تھے۔

میں نے کہا "لالہ جی، اب آگے چلو۔"

بالک رام چونکا "میں نے کہا ہے نا۔۔۔ کہ یہ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "ہمارا تجربہ ہے بالک رام کہ دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اور جو کام زور سے نہ بنتے ہوں وہ زر کی مدد سے کئے جا سکتے ہیں۔ انتخاب ہم تم پر چھوڑتے ہیں۔"

"میں۔۔۔ میں کچھ نہیں کر سکتا" اس نے خوف زدہ ہو کے کہا۔

"بالک رام! تم کو اس مندر میں جانے سے کون روک سکتا ہے۔ جو تمہارے باپ کی جاگیر ہے" میں نے ریوالور نکال لیا "تم کیا سمجھتے ہو؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ کہ اس مندر کے بڑے پجاریوں کے ساتھ تم نے کیا سلوک کیا تھا۔ اسی لئے آخر تم کو دیوتا بنایا تھا۔ مندر میں تمہارے اپنے آدمی ہیں جو پجاری بنے پھرتے ہیں، تمہارے ایجنٹ ہیں۔"

بالک رام کا رنگ اڑ گیا "آخر۔۔۔ تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟ تم نے میرے سب آدمی مار دیئے۔"

میں نے کہا "تم بھی مارے جاتے۔ لیکن تم نے کہا تھا کہ تمہیں ہماری ہر شرط منظور ہو گی۔ ہم کون ہیں، اس کا اندازہ تمہیں اب تک ہو جانا چاہئے۔"

"تم۔۔۔ تم تو بھی ہو، بہت خطرناک اور پاگل ہو۔"

میں نے کہا "ہاں۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ ہم مرنے مارنے سے نہیں ڈرتے۔ اور کوئی ہمارے راستے میں رکاوٹ بنے تو اسے ہم کتنی آسانی سے ہٹا دیتے ہیں۔ اب بولو، مرنا چاہتے ہو؟"

"بھگوان کے لئے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ میں نے تمہاری مدد کی تھی۔۔۔ تو تم چھوڑ دو گے مگر وہ مجھے مار ڈالیں گے" بالک رام رونے لگا۔

"وہ کون؟" میں نے کہا۔

"میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا، بتا دوں تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے اتنا نقصان برداشت کیا، تمہاری ہر بات مانی۔۔۔ آخر کس لئے؟ صرف اس لئے کہ میں مرنا نہیں چاہتا۔"

"ان سب کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں تھی جو تمہاری خاطر جان سے گئے؟" غالب نے تلخ لہجے میں کہا۔

"قیمت تھی۔ ان کو ملتی رہتی تھی۔ باقاعدگی سے۔۔۔"

"صرف اتنی ہی قیمت ہوتی ہے انسان کی زندگی کی، جتنی اس کی تنخواہ؟"

"اگر یہ قیمت کم تھی، تو انہیں قبول کرنے سے انکار کر دینا چاہئے تھا۔ انہوں نے اپنی خوشی سے یہ ذمے داری لی تھی۔ میں نے کوئی زبردستی نہیں کی تھی۔ اور انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ اس کام میں جان بھی جا سکتی ہے۔ انہیں میری حفاظت کرنی ہو گی، مجھے میرے دشمنوں سے بچانا ہو گا۔ دشمن، چور، ڈاکو بھی ہو سکتے ہیں۔ جب وہ گولی چلائیں تو یہ گولی مجھ تک نہ پہنچے، یہی ان کی ذمے داری تھی، اسی کا معاوضہ لیتے تھے وہ۔ اپنی مرضی اور خوشی سے۔۔۔ وہ مارے گئے تو یہ ان کی غلطی یا ان کا نصیب تھا۔ آج تک انہوں نے میرے لئے کسی پر گولی نہیں چلائی تھی۔ مفت کی طرح وہ بھی پل رہے تھے۔ اب انہی کی طرح مارے گئے تو اس میں میرا کیا قصور؟ میں نے یہ سب انتظام اپنی زندگی کی حفاظت کے لئے کیا تھا۔ میں اتنا خرچ اپنی جان بچانے کے لئے کر رہا تھا۔"

میں نے کہا "اس کے باوجود تم موت کے سامنے کیسے بے بس ہو!"

"مجھے جانے دو۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ کوئی رپورٹ درج نہیں کراؤں گا۔ کسی کا نام نہیں لوں گا۔۔۔ کہوں گا کہ ڈاکو آئے تھے، سب کو مار گئے۔۔۔ ہاں، میں تمہیں ایک طریقہ بتا سکتا ہوں۔ ایک آدمی تم کو اندر لے جا سکتا ہے، بہت لالچی آدمی ہے۔"

"وہ کون ہے؟"

"پروہت۔۔۔ رام داس۔ پیسے کے لئے وہ بھگوان کو بھی بیچ دے۔"

میں نے کہا "بھگوان کا ہم کیا کریں گے، ہمارے لئے ایک خدا بہت ہے۔"

وہ ایک دم چونکا "تم۔۔۔ مسلمان ہو!"

www.paksociety.com

میں نے کہا "الحمدللہ — ہم سب مسلمان ہیں — تم کو اب تک اندازہ ہو جانا چاہئے تھا — ہمارے ناموں سے۔"

"تم... بھگوان کے استھان کو بھرشٹ کرو گے — نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

میں نے ریوالور اس کے سینے پر رکھ کے کہا "بھگوان کے بھگت یہ ہم جانتے ہیں کہ کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں ہو سکتا۔"

"میں... میں سمجھ گیا تم کون ہو — تم وہی پاکستانی ایجنٹ ہو" بالک رام نے بڑی مشکل سے کہا "میں بھی مورکھ ہوں" آتنی دیر سے سمجھا۔"

"نہیں لالہ! تم اب بھی نہیں سمجھے" میں نے کہا "ہمارا وقت برباد مت کرو — ہمیں راستہ دکھاؤ — آگے چلو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تم نادان ہو — جب مرنا ہی ہے تو یہ پاپ کر کے کیا مرنا — آج نہیں تو کل مجھے غدار سمجھنے والے زیادہ تکلیف دے کر ماریں گے — میں وطن کے دشمنوں کے ہاتھوں مرنا پسند کروں گا۔"

میں نے کہا "تمہاری مرضی — میں دس تک گنوں گا۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں" وہ بولا۔

ایک بے ضمیر، بد کردار اور گناہ گار آدمی اچانک اپنے دھرم اور اپنے وطن کی خاطر جان دینے پر تیار ہو گیا تھا — یہ جذباتی دیوانگی تھی یا خوف کی انتہا کا رد عمل — لیکن آخری وقت میں بالک رام بہادر ہو گیا تھا — میں نے دس تک گن کر کسی تذبذب کے بغیر اس کے سر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی — وہ بالکل سیدھا کھڑا رہا اور زیر لب کچھ بڑبڑاتا رہا — جب میں دس پر پہنچا تو اس نے کہا "جے دھرتی ماتا" اور نیچے گر گیا اس کا خون زمین پی گئی۔

"کیسی عجیب بات ہے" غالب نے افسوس سے کہا "اس شخص کے کردار میں اچانک اتنی بڑی تبدیلی آ گئی۔"

میں نے کہا "کیا تمہیں ڈاکو جیش ناگ یاد نہیں — اس نے اپنے وطن کی خاطر جان دے دی تھی — ایک ڈاکو کتنا بڑا محب وطن ثابت ہوا تھا اور پھر محمد خان۔"

"اپنی ساری زندگی کے جرائم اور سب گناہوں — کردار کی بیماری خامیوں کے باوجود جیش ناگ، محمد خان اور بالک رام کی موت ولاور اور تریونی جیسے لوگوں کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔"

سائیلنسر والے پستول کے فائر کی آواز بہت کم رہی تھی۔ تعجب مجھے بالک رام کی خاموشی پر ہوا — اگر وہ چاہتا تو مرنے سے پہلے چلا بھی سکتا تھا مگر اس نے تو مرتے وقت بھی آواز نہ نکالی تھی — گل قدرے افسردہ سی بالک رام کی لاش کو دیکھ رہی تھی — اس کے بھائی ڈاکو جیش ناگ کا حوالہ دے کر میں نے اسے زیادہ ملول کر دیا تھا — خود نازو کے لئے آخری وقت میں بالک رام کا موت کو گلے لگانا حیرت سے زیادہ صدمے کا سبب بن گیا تھا — ہم آہستہ آہستہ مندر کی جانب چلنے لگے۔

"بے وقوف، مرنا تھا تو پہلے ہی مر جاتا"۔۔۔ نازو نے...

میں نے کہا "یہ وقت اور جگہ کا مسئلہ ہے بلا بتاؤ فیصلہ کوئی اور کرتا ہے۔"

غالب نے کہا "آدمی بہرحال احمق تھا کہ خود ایک راستہ دکھا گیا اور پھر مر گیا — خدا اس کی مدد کرے —"

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی تو صبح کے چار بجنے والے تھے "ٹھیک کا راستہ پروہت جی سے پوچھتے ہیں" میں نے کہا۔

"پروہت جی سو رہے ہوں گے" غالب نے کہا۔

"یہ دیویاں انہیں جگا دیں گی — انہیں دیکھ کر وہ آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھے" میں نے کہا "وہ دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"اور پھر مندر کا ہی نہیں دل کا دروازہ بھی توڑ دیں گے — اگر اندر سے نہ ہوئے" غالب نے کہا۔

نازو نے گل کی طرف اور گل نے نازو کی طرف دیکھا "تعریف کر رہے ہو یا مذاق اڑا رہے ہو یا..." نازو بولی۔

"یا بے وقوف بنا رہے ہو ہمیں؟" گل نے کہا۔

میں نے کہا "اب دیر مت کرو — سورج نکلنے سے پہلے پجاری آنے لگیں گے۔"

نازو نے کہا "راما راؤ کچھ مدراسی قسم کا نام لگتا ہے۔"

غالب نے کہا "کوئی بات نہیں — سب سے پہلے ہاتھ جوڑ کے — پھر اسے ترچھی نظر سے مسکرا کے دیکھنا جیسے پہلے کبھی نہیں دیکھا — جب وہ پاگل ہو جائے میری طرح۔"

"فضول باتیں مت کرو" نازو نے شوخی اور خفگی سے گل کا ہاتھ پکڑ کے مندر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

میں نے پیچھے چلتے ہوئے کہا "ڈرامہ ختم، ہم صرف تمہارے — پروہت جی سے ہم خود نمٹ لیں گے۔"

مندر کے بیرونی احاطے میں پتھروں سے بنی ہوئی چار دیواری تھی جس میں ایک جگہ آٹھ دس فٹ تک کچھ نہیں تھا — جانے کا راستہ تھا — وسیع احاطے کے دونوں جانب گھاس پھوس تھی — یہ غالباً مندر کی ملکیت تھیں — گائے ایک جانور بھی پالی تھی چنانچہ یہاں بھی انہیں رکھا جاتا ہوگا۔ پاپ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

درمیان سے سیدھا مندر کے دروازے تک جانے کا راستہ بھی سنسان پڑا ہوا تھا — مندر کے عقبی حصے میں کہیں پیچھے روشنی نظر آ رہی تھی — وہ شاید پرانا قیام خانہ تھا جو گودام کے طور پر استعمال ہو رہا تھا — پروہت کی رہائش گاہ احاطے میں دائیں جانب تھی۔

غالب نے چلتے چلتے کہا "یار یہاں اتنی خاموشی کیوں ہے۔"

میں نے کہا "سب سو رہے ہیں اب تک۔"

غالب نے کہا "کسی کو تشویش نہیں کہ دشمنوں کے لئے جو لشکر بھیجا گیا تھا اس کا کیا ہوا۔"

"لشکر بھیجنے والے مطمئن ہیں کہ لشکر کو کچھ نہیں ہو سکتا —

صفوار راؤ کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔"

"ان سب نے فائرنگ کی آوازیں تو سنی ہوں گی۔"

"ہونہہ مگر ان میں بھی تشویش کی کوئی بات نہیں ان کے لئے تو "بابا" نے سمجھ لیا ہوگا کہ سب دشمن ہلاک کر دیئے گئے — فرض کی جگہ یہ خاموشی ہے — فاتح لشکر واپس آتا ہی ہوگا" میں نے چنانچہ اب سرگوشی میں کہا۔

نازو نے پلٹ کے کہا "اب بند کرو اپنی باتیں۔"

غالب نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "لشکر میں تمہاری ہی باتیں کر رہا تھا۔"

ہم مندر کی طرف جانے والے راستے سے ہٹ کر دائیں جانب آخری حصے میں پہنچے — میں نے اور غالب نے ایک دروازے کے دونوں جانب پوزیشن سنبھال لی اور ہم مندر کی دیوار کے ساتھ چپٹ کر کھڑے ہو گئے تو نازو نے لوہے کی زنجیر والی کنڈی ہلائی — دروازے کے نیچے سے نظر آنے والی مدھم روشنی ظاہر کرتی تھی کہ اندر کوئی جاگ رہا ہے — گل اور نازو مقامی لباس میں تھیں چنانچہ پروہت کو ان پر کوئی شک نہیں ہو سکتا تھا۔

نازو نے دوسری بار زیادہ زور سے کنڈی بجائی تو اندر سے رعب دار آواز آئی — "ارے ٹھہرو کم کم کرم" مدراسی زبان نہ جانے کیوں مجھے ایسی ہی لگتی تھی — پروہت نے پہلا پوچھا تھا کہ آدھی رات کو یہ کون ناسمجھ دروازہ توڑ رہا ہے — پھر اس نے دروازہ کھولا اور مزید ڈم ڈم کی — اس کے لہجے میں خاصی بیزاری تھی جو نازو اور گل پر نگاہ پڑتے ہی دلچسپی میں بدل گئی — حسب ہدایت نازو نے ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا اور مسکرا کے کہا "وڑکم راما راؤ جی۔"

ظاہر ہے اتنی محبت سے کسی کا نام نازو جیسی لڑکی لے تو وہ کیا کرے گا — راما راؤ بھی ریشہ خطمی ہو گئے — اسے اپنی ہم زبان سمجھتے ہوئے انہوں نے بے حساب مدراسی داغ دی اور دروازہ پورا کھول دیا — اس کا مطلب کچھ بھی لیا جا سکتا تھا — غالباً یہ کہ خوش آمدید — چشم ما روشن دل ما شاد — تم میں سے کون پری ہے اور کون حور — کون کوہ قاف سے اتری ہے اور کون آسمان سے — عدم کا ایک شعر جو حسب حال تھا مجھے بہت وقت پر یاد آیا نے

بال بکھرائے سوئی قبروں پہ جب کوئی مہ جبیں روتی ہے
مجھ کو اکثر خیال آتا ہے — موت کتنی حسین ہوتی ہے

بے چارے پروہت بھی کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ موت کتنی حسین ہوتی ہے — وہ اس پر بہت حیران ہوگا کہ آنکھ کھلتے ہی بھگوان نے کیسی صورتیں دکھائی ہیں اور یہ کیا طلسم ہے کہ اس بستی میں ایسی حسینائیں خوش اطوار جو پہلے کبھی نظر نہیں آئیں اس کے نام سے بھی واقف ہیں — وہ چاہتا تھا کہ نازو اور گل بھی شاید بھگوان کی تو کرپا تمام ہو گئی تھی "وہ کیا پوچھتیں؟" انہیں ان کے ساتھ ہی اپنا تعارف کرانے کی ضرورت پیش نہیں آئی — ہم نے بھی اندر قدم رنجہ فرمایا — ایسے کہ

پروہت کی آنکھیں جو ایک حسین خواب دیکھ رہی تھیں، دوسرے ہی لمحے ایک بھیانک خواب میں الجھ گئیں۔

وہ ریوالور کی شکل دیکھ کر گھگھیانے لگا "ارے... ارے گولی... گولی مت چلانا جی — مر جائیں گا اپن۔"

میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا "تم بھی شور مت مچانا جی۔"

اس کے دانت ایسے بج رہے تھے جیسے کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہو — وہ سوتے سے اٹھا تھا چنانچہ صرف دھوتی میں تھا — اوپر کے بدن میں جنیو کے سوا کچھ نہیں تھا — تاہم میں نے یہ نوٹ کیا کہ نہ وہ کوئی عمر رسیدہ آدمی تھا اور نہ ہی اس کی توند عام پنڈتوں کی طرح حلوے مانڈے کھانے سے پھولی ہوئی تھی — وہ جوان آدمی تھا اور اس کی کاٹھی مضبوط تھی — ظاہر ہے اسے بالک رام نے جس کام کے لئے رکھا تھا وہ کوئی بوڑھا، کمزور اور بزدل آدمی نہیں کر سکتا تھا — اس کا گھگھیانا اور خوف سے کانپنا مجھے اداکاری لگا — وہ ایک دھوکے باز تھا، یہ بات تو ہمیں پہلے سے معلوم تھی — اس کے طرز رہائش کو دیکھ کر مجھے یقین آنے لگا کہ وہ پروہت کے بھیس میں ایک مجرمانہ زندگی گزار رہا ہے — اس کے بیڈ روم میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی — زیب و زینت اور عیاشی کے اسباب کا ایک پروہت کی فقیرانہ زندگی سے کیا تعلق؟ مگر یہاں کے پردے، قالین اور فرنیچر سب بیش قیمت تھے — بیڈ سائیڈ ٹیبل پر شیشے کے جام رکھے ہوئے تھے — میں نے انہیں سونگھا تو اسکاچ وہسکی کی بو آئی — بیڈ پر واہیات قسم کے انگریزی رسالے بکھرے ہوئے تھے۔ جب میں نے الماری کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بلبلانے لگا۔

"اتی کیا ہے اس میں — سوا گم ٹین میں گا جی۔"

میں نے غالب سے کہا "اس کتے کی زبان بند رکھو۔"

وہ اچھلا "اتنا بولے — آپ کتا بولے جی میرے کو۔"

غالب نے اسے تخت پر بٹھا دیا اور نازو کے سپرد کر دیا "یہ پھر بولے نا جی — تو اس کی منڈی مروڑ دینا جی۔"

نازو نے بھی اس کی نقل اتاری "منڈی مروڑنے سے پہلے مر جائیں گا — ایک دم مر جائیں گا جی۔"

میں نے الماری میں سے اسکاچ وہسکی برآمد کی۔ ایک بوتل آدھی استعمال شدہ تھی — دوسری سربند رکھی۔

"مسٹر راما راؤ! اسٹاپ دس نان سنس" میں نے بوتل اٹھا کر کہا "ورنہ..."

راما راؤ کا رویہ ایک دم بدل گیا "ورنہ کیا؟ دھمکی دیتے ہو مجھے!" اس نے صاف انگریزی میں کہا "کون ہو آخر تم لوگ؟ جو اس طرح بھگوان جی کے مندر میں ڈاکوؤں کی طرح گھس آئے، یہ بالک رام جی کا مندر ہے۔"

میں نے کہا "ڈاکو تو بہت پہلے مندر میں گھس گئے تھے — آج ہم ان ڈاکوؤں سے تمہارے بھگوان جی کو نجات دلانے آئے ہیں۔"

غالب نے کہا "تمہارا کھیل ختم ہوا — بالک رام کی اکالی وقت نرک میں ہوگی — اس نے مرنے سے پہلے سب کچھ بتا دیا۔"

www.paksociety.com

کرلیا تھا۔"

میں نے کہا "اگر وہ ہم سے تعاون کرتا تو مارا نہ جاتا۔"

راما راؤ نے مجھے گھورتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا "تم جھوٹ بولتے ہو۔"

میں نے اسے گردن پکڑ کے اٹھا لیا اور دروازے کی طرف لپکا "چلو پھر سچ خود اس کی لاش سے معلوم کرلو۔"

غالب نے کہا "اگر اس کی لاش کو دیکھنے کے بعد بھی تمہارا شک دور نہ ہوا تو پھر تم اپنی لاش دیکھو گے۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا "کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟"

میں نے کہا "تعاون۔"

"کس قسم کا تعاون؟"

"بالک رام نے مرنے سے پہلے ایک سچ بولا تھا" میں نے کہا۔ "تم پیسے کے لئے بھگوان بھی بیچ سکتے ہو۔ تم ہوش سے کام لو تو ایک فائدے کا سودا کرسکتے ہو جس میں تمہاری زندگی بھی محفوظ ہوگی اور تمہارے لئے تعاون کا نقد معاوضہ الگ ہوگا۔ پورے ایک لاکھ۔"

وہ انگریزی بھی مدراس کے لہجے میں جھٹکے دے کر اپنے حلق سے برآمد کررہا تھا مگر صاف ظاہر تھا کہ ہندی میں وہ اتنی روانی سے بات نہیں کرسکتا۔ اس نے میری بات پر غور کرنے کے بعد کہا "معاوضے سے پہلے کام کی نوعیت معلوم ہونی چاہئے۔" اس نے باری باری کپل اور تازو کی طرف دیکھا "کیا تم ان دونوں کو ہلاک کرانا چاہتے ہو؟ اور یہ کام کرنا چاہتے ہو جو ان سے متعلق ہیں؟"

میں نے کہا "جب ہم بیاہ کریں گے کسی سے تو تمہیں تکلیف نہیں دیں گے۔ ہمارا مسئلہ مختلف ہے۔ آسان کام ہوتا تو معاوضہ بھی کم ہوتا لیکن ایک لاکھ کم نہیں ہوتے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ تم میں سے کسی کے پاس اتنی رقم ہوگی۔"

میں نے اس کے منہ پر چانٹا مارا "تم نے جھوٹا کہا ہے مجھے۔ پھر ایسی غلطی مت کرنا۔ ہم دو مرتبہ خبردار نہیں کرتے۔"

غالب نے کہا "پیسہ ہمارے لئے ہاتھ کا میل ہے۔ غیرت کے لئے ہم اکثر جان کی بازی لگاتے رہتے ہیں۔ ہم تو قتل کرچکے ہیں اب تک؟"

میں نے سوچ کے کہا "تناؤ ہے۔"

غالب نے کہا "اگر چندرت نے پھر کوئی غلط بات کی تو گنتی پوری ہو جائے گی۔"

میرے اشارے پر غالب نے بیلٹ کھولی اور اس میں سے وہ ایک لاکھ روپے نکالے جو بھیگنے کے بعد خشک ہوچکے تھے "یہ اصلی نوٹ ہیں اور بالکل پاک صاف۔ دھو کر لائے ہیں گنگا جل میں۔ کیونکہ یہ مال حرام تھا۔"

"چندرت جی حرام حلال کا فرق باہر رکھتے ہیں۔ یہ اندر کا معاملہ ہے۔ آدمی کی بات ہے۔" غالب نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

راما راؤ نے ایک لاکھ کے نوٹوں کا بے یقینی کے ساتھ معائنہ کیا اور ہر گڈی کے کسی ایک نوٹ کو روشنی کے سامنے رکھ کے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں لالچ کی چمک پیدا ہوئی تو آہستہ آہستہ اس کے چہرے کی معاندانہ کیفیت اور کشیدگی کم ہونے لگی۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر نوٹ تخت پر رکھ دیئے۔

"میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟" راما راؤ نے کہا "یہ بتاؤ تمہیں۔"

میں نے کہا "یہ سب سوالات غیر ضروری ہیں۔ ان کے جواب نہیں دیں گے۔"

راما راؤ نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کہا "تم ... نہیں ہو۔"

غالب نے کہا "مگر تم ڈاکو بھی ہو۔ پروہت ہونے کے باوجود یہ تمہاری اضافی کوالیفکیشن ہے۔"

"میں تم پر کیسے بھروسا کرسکتا ہوں۔۔"

میں نے کہا "اور تم کیا کرسکتے ہو آخر۔ تمہارے پاس چوائس کہاں ہے۔"

"اگر اعتبار کرو گے تو رسک ختم ہو جائے گا۔ ہم اگر کرلیں تو نبھاتے ہیں۔ تم آزمالو۔" میں بولا۔

"او کے۔ ایک لاکھ کے بدلے مجھے کیا کرنا ہوگا؟" آدھی بھری ہوئی شراب کی بوتل اٹھائی "پیو گے؟"

میں نے بوتل اس کے ہاتھ سے لے لی "ہم یہ نہیں پیتے۔ نہ پینے دیں گے۔ پہلے کام کی بات کریں گے۔"

اس نے حسرت سے بوتل کو دیکھا "مجھے اس کی طلب تھی۔"

"صبح اٹھتے ہی!" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "بھگوان کا نام لینے سے پہلے؟"

وہ شرمندہ ہوتے ہوئے ہنسے بولا "ہر روز میں ایسا نہیں کرتا۔ ہر روز کوئی بھی مجھے اس طرح بیدار کر کے میرے سامنے نہیں لاتا۔ ایک ناکو دیکھ کے بھی میرے اعصاب ابتر ہو گئے ہیں۔"

میں نے بوتل اسے دے کر تعاون کے بعد ... "اس مندر سے ملحق ایک گودام ہے جو پہلے ہاتھ آتا ہے۔"

اس نے گلاس کو آدھا بھرا اور خالی کر دیا۔

"اس گودام میں کس قسم کا مال آتا ہے؟"

"ہر قسم کا مال۔ جو سب غیر قانونی ہوتا ہے۔ اسمگل ہو کر لایا جاتا ہے اور بلیک مارکیٹ میں فروخت ہوتا ہے۔"

"مثلاً؟"

"یہ شراب جو سب سے پہلے آئی تھی۔ اس کے بعد۔"

"خاموش کیوں ہو گئے؟ آج کل کیا آرہا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم" وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔

"تم تعاون نہیں کررہے ہو" میں نے کہا۔

"یہ حقیقت ہے۔ اب میں ادھر نہیں جا سکتا۔ پروہت جی کس لئے لگائی گئی ہے مجھ پر۔ میں ان کے لئے ان کا اعتبار قائم رکھتا ہوں۔ وہ مجھ پر بھی بھروسا نہیں کرتے" اس نے شکایتی لہجے میں کہا اور بوتل حلق میں انڈیلا۔

"ممکن ہے وہ سمجھیں تم سے زیادہ قابل اعتماد لوگ مل گئے ہوں۔ تمہاری وفاداری محدود ہو گئی ہے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "یہ احساس تمہیں کب ہوا کہ انہوں نے تم پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا ہے؟"

"اس مہینے کے شروع میں تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ پروہت تیرا ادھر کوئی کام نہیں۔ اگر پھر قدم رکھا تو تیرے گودام میں... تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ تاڑی" پروہت پر خالی پیٹ پینے سے نشہ طاری ہونے لگا تھا "اور ایک دن ایسا بھی ہوا انہوں نے مجھے مارا۔ اس کے گنڈے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔"

میں نے کہا "آج کل وہ ایک خطرناک کھیل میں ملوث تھا۔ چنانچہ مارا گیا۔ اس کے سب گنڈے بھی مارے گئے۔ وہاں۔ اس کے گھر میں۔"

پروہت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "تم نے اس کے گھر پر حملہ کیا تھا؟ کتنے لوگ تھے تمہارے ساتھ۔"

"ہم یہی لوگ تھے۔ اپنے ساتھی" میں نے کہا۔

"تم اس کے مخالف گروہ کے لوگ ہو؟ اسمگلر ایک دوسرے کے ساتھی بھی ہوتے ہیں۔ مگر دشمن بھی ہو جاتے ہیں اگر معاملات بگڑ جائیں۔" پروہت نے کہا "اگر تم نے واقعی سب کو مار دیا ہے تو پھر تم پاس ہو۔ رائٹ؟"

"رائٹ۔ قاعدہ یہی ہے۔ جو زبردست ہو وہی پاس ہوتا ہے۔ مائٹ از رائٹ" میں نے کہا "ہم اس فلسفے کے قائل نہیں تھے۔ اب ہو گئے ہیں۔ لیکن ایک تصحیح ضروری ہے۔ ہم اسمگلر نہیں ہیں۔"

"تم اسمگلر نہیں ہو؟" اس نے زیر لب میرے الفاظ دہرائے "پھر کون ہو تم؟ سیکرٹ ایجنٹ زیرو زیرو سیون۔ جیمز بانڈ" وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسنے لگا۔

میں نے اس کے پاس سے بوتل ہٹائی "اب تم ضرورت کا حساب نہیں کرسکتے۔ تم ضرورت سے کہیں زیادہ پی چکے ہو۔ سنجیدگی سے بات نہیں کررہے ہو۔"

"میں بالکل سنجیدہ ہوں" اس نے کہا "میں نے بھروسا کیا ہے تم پر کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بول رہے ہو۔ تم نوٹ دے کر بھینٹ والے نہیں ہو۔ تم بالک رام کے دشمن ہو۔ میرے بھی۔ تم مجھے مارو گے نہیں اور اگر میں نے تم سے تعاون کیا تو یہ ایک لاکھ مجھے ضرور دو گے۔ یہ سب طے ہے؟"

میں نے کہا "ان سب معاملات پر ہمارے درمیان اتفاق ہو چکا ہے۔"

"جب ہم ایک دوسرے پر بھروسا کرسکتے ہیں تو ایک دوسرے کے دوست سمجھے جاسکتے ہیں" وہ بولا۔

میں نے کہا "ہاں۔ سمجھے جاسکتے ہیں لیکن یہ عارضی دوستی کا رشتہ ہے۔"

"ہر رشتہ عارضی ہوتا ہے" اس نے ایک فلسفیانہ بات کی۔ "خون کا۔ زمین کا۔ زندگی کا اور کاروبار کا۔"

غالب نے اسے حیرانی سے دیکھا "تم تعلیم یافتہ ہو؟"

اس نے سر ہلایا "اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ سوشیالوجی اور سائیکالوجی میں ڈبل ایم اے۔ مدراس یونیورسٹی۔ فرسٹ کلاس گولڈ میڈلسٹ۔"

"اور تم۔۔ یہ کام کررہے ہو!"

"اور کیا کروں؟ نوکری کروں؟ سفارش کے بغیر وہ بھی نہیں ملتی۔۔۔ مزدوری میں کر نہیں سکتا۔ لیکچرر شپ کے لئے میں نااہل قرار دے دیا گیا کیونکہ میں ایک خطرناک ذہن رکھتا تھا اور اپنے باغیانہ خیالات سے طلبا کو متاثر اور گمراہ کررہا تھا۔ ابھی یہاں سوچ آزاد نہیں ہے۔ آپ وہ نہیں کہہ سکتے جو آپ کہنا چاہتے ہیں۔ معاشرہ، مذہب یا ریاست۔ کسی نہ کسی کی نظر میں آپ مجرم ہو جائیں گے۔ ان کے دائرے ہیں۔ حد بندیاں ہیں۔ آپ کو اس میں رہنا پڑے گا۔ نہ آپ ان حدود سے تجاوز کرسکتے ہیں نہ انہیں غلط قرار دے سکتے ہیں۔ میں اس معاشرے کی کمزوریوں سے واقف تھا۔ انسانی نفسیات کو سمجھتا تھا۔ میں نے اپنی ذہانت سے کام لیتے ہوئے بروقت سیدھے راستے کو ترک کردیا۔ اگر میں سیدھے راستے پر چلتا رہتا تو یہ دکھ پہنچ جاتا یا پہنچتا۔ میں نے وہ راستہ اختیار کیا جو ننانوے فیصد عقل مند استعمال کرتے ہیں۔ استحصال کا راستہ۔ چور، ڈاکو، اسمگلر، سیاست داں، پیر، فقیر، جوگی، درویش۔ سب ننانوے فیصد کم عقل ناسمجھ اور ان پڑھ انسانوں کو لوٹتے ہیں۔ باتوں سے۔ وعدوں سے۔ ریا اور ... سے۔"

اگر میں اسے نہ ٹوکتا تو وہ بولتا رہتا۔ میں نے کہا "راما راؤ! تم نشے میں ہو۔ میں نے غلطی کی جو تم کو پینے کی اجازت دے دی۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں نشے میں ہوں؟"

"اس لئے کہ تم خالص سچ بول رہے ہو۔ جو آدمی ہوش میں ہو نہیں بولتا" میں نے کہا "اس نشے سے نجات پانے کی کوئی صورت ہے؟"

"دیکھو، اب تم دوست ہو۔ عارضی ہی سہی۔ دوست ہو تو میرے مہمان ہو۔ یہ گھر تمہارا ہے" اس نے آواز کی لکنت پر قابو پاکے کہا۔

"کیا تمہارے گھر میں ہم محفوظ ہیں؟"

"بالکل محفوظ ہو تم۔ ادھر کوئی نہیں آسکتا۔ یہ میرا پرائیویٹ علاقہ ہے۔"

میں نے کہا "صبح ہونے والی ہے۔ لوگ پوجا پاٹ کے لئے آئیں گے۔"

www.paksociety.com

"وہ ادھر جائیں گے، ہنومان جی کے پاس۔"

"کیا ہم آج کا دن یہاں گزار سکتے ہیں؟ اس طرح کہ کسی کو شک نہ ہو" میں نے کہا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا "اگر تم نے ان سب کو مار دیا ہے۔ تو ظاہر ہے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی اور جب لاشیں ملیں گی تو بہت ہنگامہ ہوگا۔"

"اسی لئے ہمارا آج کے دن یہاں چھپے رہنا ضروری ہے۔ ہمارے لئے بھی سب سے محفوظ جگہ بھگوان کے ایک سیوک کا گھر ہی ہو سکتی ہے۔ ہم فرار ہو کے کہیں بھی جاتے پکڑے جاتے۔"

"میرا خیال ہے کہ ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ لیکن آیا تو تمہیں کہاں چھپاؤں گا" اس نے گویا فیصلہ کر لیا۔

غالب نے کہا "کیسے چھپاؤ گے؟ اگر وہ گھر کے اندر آ گئے۔"

"گھر کے اندر کوئی کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ میں جانتا ہوں ہر ایسی جگہ کو جہاں تم کچھ دیر اوجھل رہ سکتے ہو" وہ بولا۔

"ایک بات میں صاف صاف بتا دوں۔ اگر کوئی اندر آیا یا ہماری یہاں موجودگی کا راز افشا ہو جانے کا خطرہ پیدا ہوا تو یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ہمیں گرفتار کر لے۔ ہم مقابلہ کریں گے جو اندر آیا اسے مار دیں گے۔"

"تمہیں سب سے پہلے مار دیں گے" غالب نے کہا۔

"آخر میں ہم خود بھی مارے جائیں گے۔ اچھا ہے اگر اتنا خون خرابہ تمہارے گھر میں نہ ہو۔ ہمیں پتہ ہے لاشیں ضرور گریں گی۔ خون سے تمہارا یہ صاف ستھرا خوبصورت گھر خراب ہو جائے گا" میں نے کہا۔

"مجھے بلاوجہ دہشت زدہ مت کرو" پروہت بولا "جب میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اندر کوئی نہیں آئے گا تو تم یقین کیوں نہیں کرتے۔ میری ذات شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کوئی میرے دروازے تک یہ پوچھنے آ جائے گا کہ کسی ایسے ویسے شخص کو ادھر آتے تو نہیں دیکھا۔ ایسے ویسے کا مطلب ہے تم جیسے۔ میرا انکار کر دینا ہی کافی ہوگا۔"

"اگر پولیس ہوگی تو اندر آ کے دیکھے گی۔"

"اول تو یہ مشکل ہے۔ لیکن ایسا ہوا تب بھی وہ ناکام ہو جائیں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ گھر میں ایک نظر ڈالیں گے اور بس۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں تم کو چھپا سکتا ہوں۔"

"اوکے۔ اب میں مطمئن ہوں۔ باقی باتیں ہم بعد میں کریں گے۔ رات بھر جاگنے سے ہماری حالت خراب ہو رہی ہے۔ اور یہ صرف جاگنا ہی نہیں تھا، ہم بڑے جان لیوا مراحل سے گزر کے آئے تھے۔"

"دونوں لڑکیاں بہت تھکی ہوئی تھیں۔ اسی لئے سو گئی ہیں۔" راما راؤ نے کہا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ گل اور نازو بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ پھر وہیں گر کر سو گئی تھیں، اس طرح کہ ...... ان کے پیر اب بھی بیڈ سے نیچے لٹکے ہوئے تھے۔

"اتنی خوبصورت لڑکیاں کہاں سے ملیں تمہیں؟"

میں نے کہا "راما راؤ! تم کو ان لڑکیوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے بہت محتاط رہنا ہوگا۔ ہم ان کے لئے زیادہ مختلف قسم کے جذبات رکھتے ہیں۔"

"مختلف کیسے؟"

"ہمارے لئے وہ ایک یقین اور اعتماد کی علامت ہیں۔ ایک مقدس امانت ہیں۔ کردار کے احترام اور رشتوں کے تقدس کی ضمانت ہیں۔ ممکن ہے تمہاری سمجھ میں یہ بات نہ آئے۔"

"تم ان سے محبت کرتے ہو؟"

"تم شاید محبت کے عام مفہوم کا حوالہ دے رہے ہو۔ فلموں اور ناولوں والی محبت یا وہ محبت جو اس عمر میں کسی بھی لڑکی یا لڑکے کو ہو جاتی ہے۔ کسی بھی پڑوسی کلاس فیلو یا کزن سے۔ ایک سستا لفظ بن گئی ہے محبت۔ یہ اس سے بہت اعلیٰ و ارفع جذبہ ہے۔ ہم اس کی توہین برداشت نہیں کر سکتے" میں نے کہا۔

"یہ بات میں سمجھا تو نہیں۔ لیکن خیال رکھوں گا۔ اب زبردستی میرے مہمان بن گئے ہو تو میرا بھی فرض بنتا ہے کہ تمہارے لئے کچھ کروں۔"

"ہم پے اِنگ گیسٹ ہیں۔ جو کچھ تم کرو گے اس کا معاوضہ دنیا کے سب سے مہنگے 'فائیو اسٹار ہوٹل' کے ریٹ پر دیں گے" غالب نے کہا۔

"میں ایک برہمن ہوں" وہ آنکھ مار کے بولا "اپنا کھانا خود پکاتا ہوں۔ دراصل میں نہیں چاہتا کہ خواہ مخواہ خدمت کے لئے اس بستی کی سب بدصورت بوڑھیاں مجھ پر مسلط ہو جائیں۔"

میں نے کہا "کیا جوان اور حسین خادمہ نہیں تھی؟"

وہ پھر آنکھ مار کے مسکرایا "ملنے کو سب کچھ ملتا ہے۔ مگر لوگوں کے سامنے پردہ تو رکھنا ہی پڑتا ہے ایک پروہت کو۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ میرا یہ کوارٹر بالکل آخری حصے میں ہے اور اس کا ایک راستہ پیچھے کی طرف بھی کھلتا ہے۔"

"ہمیں معلوم ہوا تھا کہ مندر کے پیچھے سے نہ کوئی گزر سکتا ہے اور نہ کوئی وہاں کاشت کر سکتا ہے۔"

"ادھر پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ محاورے کے مطابق" غالب بولا۔

"اب تم تیار ہو سکتے ہو۔ میرے کچن میں سب کچھ ہے۔" کسی نے دروازے کی کنڈی بجائی تو میں اچھل پڑا۔ بے اختیار میں نے اور غالب نے ریوالور نکال لئے۔ نازو اور گل چونک کر اٹھ گئیں۔

راما راؤ نے سکون سے کہا "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ دودھ والا ہوگا۔"

"پروہت جی!" دودھ والے نے باہر سے صدا لگائی اور کنڈی کھڑکائی۔

راما راؤ نے کھرج کے کہا "آ رہا ہوں بھئی۔ تم شور نہیں کرو نا۔" وہ اٹھا اور کچن سے ڈول لے کر واپس آیا۔ دروازے تک گیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھول کے اس نے دودھ والے کو برتن پکڑایا اور رسمی سلام علیک کی۔ اس تمام کارروائی کے دوران میں ریوالور لئے اس کے پیچھے موجود رہا۔

دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے کہا "تم نے مجھے میرے گھر میں یرغمال بنا لیا ہے۔ یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "مجبوری ہے۔"

"تم ہر جگہ ایسے ساتھ رہو گے تو کام کیسے چلے گا؟" اس نے مایوسی اور خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "بہت مشکل ہو جائے گی میرے لئے۔"

میں نے کہا "ہم کسی قسم کا رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں راما راؤ۔ اعتبار کرنے میں بھی رسک ہوتا ہے۔ خصوصاً تم جیسے ناقابل اعتبار آدمی پر۔ جس کی زندگی صبح سے شام تک مسلسل جھوٹ اور فریب اور اداکاری ہو۔"

اس نے قائل ہو کے سر ہلایا "شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ خیر۔۔۔ یہ لو دودھ۔ جا کے چائے بنا دیا کافی، ناشتے کے لئے سب کچھ موجود ہے۔ میں یہاں بیٹھتا ہوں تمہارے نشانے پر۔"

میں نے نازو اور گل سے کہا "میں اور راما راؤ باتیں کریں گے۔ تم ہو تو غسل کر لو۔ پھر ناشتہ بنا لو۔"

"آٹا گوندھ کے روٹی پکائی ہے کبھی؟" راما راؤ بولا "یہاں ڈبل روٹی نہیں ملے گی۔"

میں نے کہا "راما راؤ! اس لڑکی کے ہاتھوں کو غور سے دیکھو۔" نازو نے قریب آ کے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے "کیا کہتی ہیں ہاتھوں کی ریکھائیں؟"

راما راؤ اس کی انگریزی پر چونکا "یہ بہت نازک ہاتھ ہیں۔ ان ہاتھوں نے کبھی ایسے کام نہیں کئے جو عورتیں کرتی ہیں۔۔ جھاڑو دینا۔ برتن مانجھنا۔ کپڑے دھونا۔۔۔"

"کیا ایسے نازک ہاتھوں سے یہ کوئی سخت، سفاکانہ یا زور طلب کام کر سکتی ہے؟ مثلاً کسی کی ہڈی پسلی توڑنا؟ تم جیسے مرد کی، یا خونخوار شکاری کتے کی گردن توڑنا جو اس پر حملہ کرے۔"

راما راؤ نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ کہ میں مذاق کر رہا ہوں یا سنجیدہ ہوں۔ نازو نے میری بات کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ پلک جھپکتے میں اس نے پروہت کو جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچا، اوپر اٹھایا اور اپنے اوپر سے گزار کے بیڈ پر پھینک دیا۔ پھر دودھ کا ڈول لے کر گل کے ساتھ اندر چلی گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں اور غالب بھی اطمینان سے بیٹھے رہے۔

بے جان قیدیوں کی طرح چھت کو گھورنے والا پروہت بالآخر اٹھا اور اس نے اپنی دھوتی کو پھر سے باندھا "او گاڈ! یہ سب کیا تھا؟ ایک دم آسمان نیچے آ گیا زمین اوپر چلی گئی۔ اور اب پھر دنیا ٹھیک ہے۔"

غالب نے کہا "یہ انہی ہاتھوں کا کمال تھا جن کو تم نازک سمجھے تھے۔"

میں نے کہا "اس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی آنکھ صرف ظاہر کو دیکھتی ہے۔"

غالب نے میری بات آگے بڑھائی "اب اگر تم انہی ہاتھوں کو آٹا گوندھتے پراٹھے بناتے دیکھنا چاہو تو اندر جا کے دیکھو۔"

راما راؤ ابھی تک پوری طرح ہوش میں نہیں آیا تھا۔ اسے خراش تک نہیں آئی تھی مگر ذہنی صدمہ انتہائی غیر متوقع اور شدید تھا۔ وہ خاموشی سے ہمارے سامنے آ کے بیٹھ گیا۔

"اب میرے مندر جانے کا وقت ہے۔"

میں نے کہا "اگر ایک دن چھٹی کر لو گے تو کیا ہنومان جی خفا ہو جائیں گے؟"

"لوگ تشویش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ مزاج پرسی کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھ جائے گا۔ سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا ہے تو اچھا ہے۔"

میں نے کہا "ایسی صورت میں تمہارے ساتھ کوئی جائے گا۔"

"ریوالور لے کر۔ مجھے ہینڈز اپ کرا کے لے جائے گا۔ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟" وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "اگر ایک پجارن تمہارے ساتھ ہو تو کیا حرج ہے؟"

"کون پجارن؟"

"وہی نازک ہاتھوں والی" غالب نے کہا۔

پروہت کچھ دیر خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سر ہلایا "تمہاری مرضی۔"

غالب نے کہا "اس کا نشانہ بھی بہت اچھا ہے۔ میری مراد ریوالور کی گولی سے ہے۔"

"وہ ریوالور لے کر جائے گی؟ مندر میں۔۔"

میں نے اسے تسلی دی "نہ اس کا چہرہ نظر آئے گا کسی کو اور نہ اس کا ریوالور۔ وہ گھونگھٹ نکالے چپ چاپ کھڑی رہے گی ایک طرف۔"

"آج اپنی عبادت کو مختصر رکھنا۔"

"اور تعاون کے جذبے سے کام لینا۔ ہمارے درمیان معاہدہ ہو گیا ہے اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج۔۔"

"مجھے دھمکی مت دو۔ رسک تمہارے لئے ہے۔ اگر کسی نے پوچھ لیا کہ یہ کون ہے۔ یا شک ہو گیا کسی کو۔ تو میری کوئی ذمے داری نہیں ہوگی۔"

"شک کیوں ہوگا؟ وہ اسی علاقے کی رہنے والی نظر آتی ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ آس پاس کے کسی گاؤں کی رہنے والی ہے۔ صبح ہی آئی تھی اپنے پتی کے ساتھ۔"

"پتی کے ساتھ! پتی کہاں ہے؟"

غالب نے کہا "پتی گیا ہے اپنے کام سے۔ واپسی میں ا

www.paksociety.com

لے جائے گا۔"
"اس کے آنے کی وجہ کیا بتاؤں؟"
میں نے کہا "لوگ مندر کیوں جاتے ہیں؟ بھگوان سے کچھ مانگنے۔ وہ منتیں کیا مانگتی ہیں؟ تم تجربے کار آدمی ہو۔ اور مرشد بھی۔ تمہاری سوشیالوجی اور سائیکالوجی کس کام آئے گی مسٹر راما راؤ؟"
"اوکے اوکے" وہ جھنجلا کے بولا "کہو اس مصیبت سے کہ میرے پیچھے لگ جائے۔"
نازو نے بڑی عجلت میں سیاہ کافی کا ایک کپ پیا۔ کافی اتنی گرم تھی کہ اسے پلیٹ میں ڈال کے ٹھنڈا کرنا پڑا۔ میں نے اسے مختصراً بتا دیا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ دس منٹ میں وہ پرانی سوتی ساری کو ہندو عورتوں کے انداز میں باندھ چکی تھی۔ ماتھے پر توے کی کالک سے بندیا لگا چکی تھی اور اپنے ریوالور کی نمائش کر چکی تھی۔ صرف راما راؤ پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ وہ خالی ہاتھ نہیں ہے اور ریوالور بھی خالی نہیں ہے۔ اس نے ریوالور کا میگزین چیک کیا اور پھر ریوالور کو ساری سے اڑس لیا۔ پروہت راما راؤ نے یہ سب حیرت، خوف اور رشک کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا۔
"باہر سے تالا لگا دینا جاتے وقت" میں نے کہا۔
غالب نے نازو کو ڈانٹا "گھونگھٹ نکالو۔ بہت شوق ہے یہ طباق سا چہرہ دکھانے کا غیر مردوں کو۔ بے شرم۔"
نازو نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا مگر کچھ بولی نہیں اور گھونگھٹ میں چہرہ چھپا کے راما راؤ کے ساتھ باہر نکل گئی۔ باہر اجالا پھیل گیا تھا لیکن سورج نے ابھی شفق کا رنگ نہیں بکھیرا تھا۔ نازو نے اپنی چال تک بدل دی تھی اور بے حد منکسر انداز میں راما راؤ کے ساتھ اس سے چند قدم پیچھے رہتے ہوئے چل رہی تھی۔ ایک جگہ اس نے پلٹ کے دیکھا اور مسکرائی۔ ہم سب دروازے کی جھری سے جھانک رہے تھے۔ یہ بات شاید اسے بھی معلوم تھی۔ جب وہ نظر سے اوجھل ہو گئے تو ہم نہانے چلے گئے۔

غسل کے بعد میں نے اور غالب نے پروہت کے گھر کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس کا دوسرا کمرا بھی بیڈ روم سمجھا جا سکتا تھا۔ بیڈ شاید بستی کے کسی ماہر فن بڑھئی نے محنت کے ساتھ عقیدت و احترام کے جذبات شامل کر کے تیار کئے تھے۔ ان میں وہ نزاکت اور جدت نہیں تھی جو شہر کے 'ماڈرن اسٹائل' میں نظر آتی ہے۔ یہ بھاری بھرکم اور مضبوط 'شیشم' کی لکڑی کے بھدے نقش و نگار والے بیڈ تھے جن پر پھول بوٹے کندہ کئے گئے تھے۔ پردے، بستر کی چادریں اور تکیے کے غلاف کھدی کے کام کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ صرف قالین شہر جیسے تھے۔ کوارٹر میں لائٹ ہی نہیں پنکھے بھی تھے اور ایک پرانا فریج تھا واٹر سپلائی کے لئے پانی کا انڈر گراؤنڈ ٹینک، موٹر اور چھت کے اوپر ٹنکی۔ سب تھے۔
"ایک گاؤں کے پروہت کے یہ ٹھاٹ" غالب نے کہا۔

"پروہت کہاں ہے وہ؟" میں نے کہا۔
"تیرا کیا خیال ہے وہ ہمارا ساتھ دے گا؟"
"ہاں۔ ملوترہ نے ایک ہی سچ بولا تھا جو ہمارے لئے ثابت ہو رہا ہے۔ راما راؤ نے اپنی مجبوری کے ساتھ کچھ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہم زبردستی بھی اس سے ہر کام لے سکتے ہیں۔ چنانچہ اس نے معاوضے کی پیشکش کو فوراً قبول کر لیا۔"
ہم گھومتے ہوئے عقبی حصے میں چلے گئے۔ وہاں اپنے شوق کے لئے چھوٹا سا باغیچہ بنا رکھا تھا۔ فصیل جہاں تک نظر جاتی تھی ویرانی تھی۔
"پڑھا لکھا آدمی کس چکر میں پڑ گیا!"
"مایوسی کا ردعمل انتہائی ہو جاتا ہے۔ اس نے سمجھ کر شرافت سے پیسہ نہیں کمایا جا سکتا۔ زر سے خواہشات کی تکمیل ہو جاتی ہے۔"
"فراڈ ایک منظم پیشہ ہے۔ ہر جگہ۔ مگر اس سے خواہشات کیسے پوری ہو سکتی ہیں۔ عزت کہاں ملتی ہے۔ کی خوشی کہاں ملتی ہے۔ محبت کہاں ملتی ہے؟"
"دولت تو ملتی ہے۔ راما راؤ نے اسے مقصد بنا لیا اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ جس دن وہ محسوس کرے اب آئین بدل لینی چاہیے۔ عزت خرید لی جائے۔ وہ کرے گا۔ محبت کی ضرورت ہوگی تو شادی کرے گا۔"
غالب نے سر اٹھا کے گودام کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ ادھر بالکل خاموشی تھی "میرا خیال ہے کہ رابعہ اور محسن پکڑے گئے۔"
"ہو سکتا ہے پکڑے گئے ہوں۔"
"اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان کے واپس نہ آنے کی وجہ نہیں ہو سکتی" غالب نے کہا۔
"چھڑا لیں گے انہیں بھی۔ یہاں تک آ گئے ہیں تو" دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں اس موضوع پر بات ہوئے ڈر رہا تھا۔ جب گل نے ہمیں پکار کے اطلاع دی تیار ہے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ رابعہ اور محسن کا میرے دل کے اندر موجود تھا۔ اس نوک خار کی طرح ٹوٹ کر رہ جائے۔ ان کا ذکر اس زخم کو کریدنے کے مترادف غالب نے غلط نہیں کہا تھا لیکن ایک بات کہنے کی جرأت اس میں بھی نہیں تھی... کہ کہیں وہ مارے نہ گئے ہوں۔
نازو کے چلے جانے سے گل پھر امور خانہ داری میں منتقل نہ کر سکی تھی اور فیل ہوئی تھی۔ اس نے ایک بھی اعتراف کیا تھا کہ گھر میں جو تربیت ماں سے حاصل وہ اسے کبھی نہیں ملی تھی چنانچہ جو کام سب لڑکیاں شروع کر دیتی ہیں وہ بڑی ہونے کے بعد اپنے عمر کے والے آتے ہی نہیں تھے۔
اس نے ہم سے نظر ملانے سے گریز کیا اور کہا "

سانچے پر ڈھلے؟" اور شکنجے میں رکھی ہوئی
غالب نے شکل کی ہوئی روٹی کو اٹھا کے دیکھنے لگا "یہ کیا چیز ہے؟ شکل سے کہا "یہ بکھرے ہوئے آٹے کا سوال ہے شاید۔"
"یہ ہیں یہ دوالائی ناشتا کرتے ہیں۔ ہم نے کیا جرم کیا ہے یار؟" غالب زیادہ بے چینی سے بولا۔
میں نے اپنی پلیٹ سے دوسرا پراٹھا اٹھایا جس کی شکل سری لنکا کے جزیرے جیسی تھی "یہ دیکھ تیری شکل کا نقشہ کھینچ بنایا ہے گل نے۔ دیا کا اور نقشہ بھی چاند پر تھا۔"
"یہ کالے کالے داغ کیسے ہیں؟"
"یہ تیرے دل کے داغ ہیں" میں نے کہا "یہ جلکر کے آئے ہیں۔"
گل مزے سے خالص مکھن کے ساتھ پراٹھا کھاتی رہی۔ "میں کچھ نہیں سن رہی ہوں۔ کھانا ہے تو کھاؤ ورنہ جاؤ۔ ہوا کھاؤ۔"
غالب نے ایک سرد آہ بھر کے کھانا شروع کیا "یار! یہ بیویاں اپنے شوہروں پر ظلم ڈھاتی ہیں۔ انہیں ایسی بد شکل روٹیاں کھلاتے ہیں اور کدو کرکے کھلاتے اور پانی سے پتلی دال کھلاتے ہیں جس میں آدمی چاہے تو ڈوب مرے۔ انہیں تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔"
"انہیں اندر ہونے والے وحشی جرائم والے پکڑ کر لے جاتے ہیں" گل نے کہا "وہ جانوروں پر ظلم نہیں کرنے دیتے۔"
"عورتوں شادی سے پہلے گل ہی تمہارے یہ کتنا خانہ خیالات اور باغیانہ انکار ہوتا جو تم اپنے مجازی خدا کے بارے میں رکھتی ہو، اپنی عزت ہیں" غالب نے کہا "اگر میں کبھی برسر اقتدار آیا، تم جیسی بیویوں کے لئے قانون میں سخت سزا میں رکھوں گا۔ لانا بھی ہے۔ منہ ماوں کے لئے لپ اسٹک بند۔ نیل پالش بند۔ گوشت گلا نہیں تھا۔ دو سال کے لئے زیور بند۔"
گل ہنسنے لگی "بیویاں جب بھتنی نظر آئیں گی یا کھانا پکانا ہی چھوڑ دیں گی تو پتا چلے گا کہ سزا کسے ملی۔"
میں نے غالب کی طرف دیکھ کے سر ہلایا "یہ تو ہے مرزا جی۔ بہتر ہے چپ چاپ سب برداشت کر لو۔"
اتنے میں مکھن نے بہت مزہ دیا۔ یہ ملاوٹ والا یا مصنوعی ترسے والا مکھن نہیں تھا۔ بھوک میں ہم نازو کے حصے کا پراٹھا بھی کھا گئے۔ کافی نے اس سے زیادہ لطف دیا۔ پھر میں اطمینان سے لیٹ کر سگریٹ پینے لگا اور گل نے برتن دھو کے رکھے۔ یہ انتظار اور احتیاطی نظر بندی کا وقفہ کسی طرح کاٹنا ہی تھا۔ غالب خانہ تلاشی میں لگا رہا۔
اب سورج نکل آیا تھا اور اس کی دھوپ نے ماحول کو اجلا بنا دیا تھا۔ مجھے فکر لاحق ہونے لگی تھی کہ رات کو یہاں پہنچنے والے ٹرک کہیں صبح ہی روانہ نہ ہو جائیں۔ تجسس کا آزار الگ تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کاروانے میں شامل کون ہے۔ شمشاد اور اس کا بیٹا بھی ہیں یا نہیں۔ شیشے کے تابوت میں ذہن پر یوں نقش ہو گیا تھا کہ اب شہلا کا خیال

آتے ہی مجھے یوں لگتا تھا کہ میری آنکھیں اسے دیکھ بھی رہی ہیں۔
"یار سکندر، اگر شہلا نہ ہوئی کسی ٹرک میں؟"
میں چونک پڑا "تو بھی اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"
"ہاں۔ سب سے بڑی فکر یہی ہے کہ کسی طرح ہم اسے بچا لیں۔"
"بچا لیں گے یار۔ حالات خود موافق ہوتے جا رہے ہیں۔ اس وقت ہمارے اور اس کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔ اور دشمنوں کو بالکل معلوم نہیں کہ ہم اتنے نزدیک ہیں؟"
"اب معلوم ہو جائے گا۔ ملوترہ کی لاش سب سے پہلے نظر آئے گی۔ پھر ان سب کی لاشیں ملیں گی جو راستے میں مارے گئے تھے۔ ان کی جیبوں سے سراغ مل جائے گا۔ خود ملوترہ کے گھر کا نقشہ ہماری یہاں موجودگی کا راز فاش کر دے گا۔"
"وہ پروہت کے گھر تک نہیں آ سکتے" میں نے کہا۔
"آ بھی سکتے ہیں۔ ملا اور اینڈ کمپنی میں ایک سے ایک عیار شامل ہے اب۔"
"وہ بستی کے ہر گھر میں ہمیں کیسے تلاش کر سکتے ہیں اور یہاں ہماری موجودگی کی طرف تو ان کا خیال بھی نہیں جا سکتا کہ ہم یہیں ان کی شکارگاہ کے سب سے غیر محفوظ مقام پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ ہم سے ایسی بے وقوفی کی توقع نہیں کر سکتے۔ اور راما راؤ کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ غداری کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ انہی کے دشمنوں کو پناہ فراہم کر سکتا ہے۔"
غالب نے سر ہلایا "اچھا ہے اگر ان کی یہی غلط فہمی ہمارے تحفظ کی ضمانت بن جائے۔"
میں نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ وہ آس پاس کا سارا علاقہ چھان ماریں گے آج۔ سارے شکاری اکٹھے ہو جائیں گے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہم یہیں چھپے ہوئے ہوں گے۔ جب تک ٹرک روانہ نہیں ہوتے ہم بھی انتظار کریں گے۔ شاید ہم راستے میں کہیں کوئی کارروائی کریں گے۔ وہ ہماری تلاش جاری رکھیں گے اور جب تک کامیاب نہیں ہوں گے یہاں سے روانگی کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ ہم اپنے قیام کی مدت بڑھا بھی سکتے ہیں۔"
"یہ تو نے بالکل ٹھیک کہا۔ وہ خوفزدہ ضرور ہوں گے گزشتہ رات کی کارروائی سے" غالب نے کہا۔
"یہ بہت بڑا شگون مارا تھا ہم نے۔ میرا خیال ہے سب ملا کے چند ہی ہیں تو بھی تو ضرور مارے گئے ہوں گے۔"
"زیادہ۔ اتنے تو ملوترہ کے گھر میں پڑے ہوئے مل جائیں گے" غالب نے کہا۔
"پھر چار خونخوار کتوں کی لاشیں ہیں۔"
"اور شاکر علی کے گھر میں جو لوگ مارے گئے تھے" غالب نے کہا "ولاور اور ترویدی یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ اتنے وسیع پیمانے پر خونریزی کرنے والے آخر کتنے لوگ تھے؟"
میں نے کہا "وہ... معلوم کرنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ رابعہ اور محسن سے۔"

www.paksociety.com

غالب چپ ہو گیا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ کوشش سے کیا ہوتا ہے۔ وہ کوشش کا مطلب سمجھتا تھا۔ کسی سے کچھ پوچھنا ہو تو کیسے پوچھا جا سکتا ہے۔ وہ اس کا تجربہ بھی رکھتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ رابعہ اور محسن پر تشدد کا سارا تجربہ آزمانے والے پرانے شکاری نہ پہلے کامیاب ہوئے تھے نہ اب ہوں گے مگر اس خیال کے ساتھ عذاب ناک تصورات کے سلسلے تھے اور اپنی بے چارگی کا احساس تھا کہ ہم ان کے لئے کچھ نہیں کر سکے۔

"کسی طرح یہ معلوم ہو جائے کہ وہ شملا کو ساتھ لائے ہیں۔ تو ہم پورے یقین کے ساتھ کارروائی کریں" غالب نے کہا۔

"ابھی تک کوئی پلان نہیں ہے ہمارے پاس" میں نے کہا۔

"پلان، موقع محل اور حالات کو دیکھ کے بنایا جاتا ہے۔ ایسے ہوا میں تیر چلانے کے لئے کیا منصوبہ بندی کریں" غالب نے کہا۔

"شملا کو وہ ضرور لائے ہوں گے۔ اسے ہلاک کر کے انھیں کیا ملے گا۔ ان کا مقصد شملا کی زندگی کو گارنٹی کے طور پر استعمال کرنے کا تھا اور یہ بات وہ ہمیں سمجھا چکے تھے کہ ہم نے ان کو نقصان پہنچایا تو خود ہی شملا اور اس کے بیٹے کی جان لیں گے۔ اپنی طرف سے انہوں نے بہت مضبوط حصار قائم کیا ہے چنانچہ وہ ہمیں موقع دے کر دیکھنا چاہیں گے کہ ہم میں کتنی ہمت ہے۔ یہ سات نرک ہیں۔ بہت بڑی کھیپ ہے اسلحے کی۔ اسے وہ شملا کو ڈھال بنا کے ہی نکالیں گے۔"

غالب نے کہا "میں شملا کی زندگی کو زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔"

"میں بھی" میں نے قطعی لہجے میں کہا "یہ فرض اور محبت کا امتحان ہے تو میں قتل ہو جانے سے نہیں ڈرتا۔"

"اگر وہ ہم سے سودا کر لیتے تو اچھا تھا۔ ہم شملا اور اس کے بیٹے کو مانگ لیتے اور اس کے بدلے میں انہیں یہ کھیپ نکال لے جانے کی اجازت دیتے۔"

"اجازت!" میں نے تلخی سے ہنس کے کہا "ہم درخواست کر سکتے تھے اور وعدہ کر سکتے تھے کہ ہم ان کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ لیکن کیا وہ اعتبار کرتے؟ ہم خدا، رسولؐ اور سارے زمانے کی قسم کھا کے بھی انہیں یقین نہیں دلا سکتے تھے۔ کہ ہم قول نبھائیں گے۔ اس کے علاوہ بات صرف ایک کھیپ کی نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ شملا کو پھر استعمال کریں۔ اگلے پھیرے میں پھر اس سے اگلی بار جانے والے قافلے میں۔

یہاں تک کہ ہمارے قول و قرار خود ہمارے لئے باعث عار ہو جائیں۔ ہمارا حال سوپیاز اور سو جوتے کھانے والے سے بدتر ہو۔ کہ ہم ضمیر کی رسوائی قبول کریں پھر مجبور ہو کے شملا کے قتل کا الزام قبول کریں۔"

کل اب سر جھکائے ہمارے پاس بیٹھی دانتوں سے اپنے ناخن کاٹ رہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں جیسے رک گئی تھیں۔ کئی بار میں اٹھ کر دروازے تک گیا اور جھری میں سے جھانک کے

مایوس لوٹ آیا۔ غالب نے باغیچے کی طرف جا کے ... دیکھنے کی بے سود کوشش کی۔ سناٹا اور سکوت ... شکست دے رہا تھا۔ نہ کوئی میرا ان خیال تھا کہ ... صدا تھی کہ امید کی شمع جلتی ... بس انتظار تھا۔ ... آزار سے بھرا ہوا۔ رابعہ اور محسن کے چہرے ... سامنے آتے تھے۔ شیشے کے ایک تابوت میں شملا اور ... بچے کے ساکت جسم تھے جو کہتے تھے۔ خموشی گفتگو ہے ... بے زبانی ہے زباں میری۔ نازو کو گئے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ ہو ... وہ راما راؤ جیسے مکار اور فریبی شخص سے نمٹنے جا ... اکیلی تھی۔ ایک پروہت کو مار سکتی تھی مگر اس کے بعد ... باپ کی سزا سے بچ سکتی تھی؟

جب دروازے کا قفل کھلا تو میں اس کی آواز سے ... گل اونگھ رہی تھی اور غالب آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا۔

راما راؤ اور نازو اندر آئے تو ہم سب پوری طرح مستعد ... اپنے ہاتھوں میں ریوالور لئے بیٹھے تھے۔

"اف۔ آج تو بس خدا نے ہی بچا لیا" نازو ... پر گر گئی۔

"کیوں، کیا ہوا؟" گل نے اور پھر میں نے کہا۔

"ہوا کچھ نہیں۔ مگر ہو سکتا تھا۔ مجھے کیا معلوم ... جا کے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ آج پہلی بار ... میں قدم رکھا تھا۔ راما راؤ چپکے چپکے بتاتا رہا ورنہ بھانڈا ... جاتا" نازو نے ایک گہری سانس لی۔

راما راؤ کرسی پر سخت مشتعل بیٹھا ہوا تھا۔ میں ... طرف دیکھا تو وہ پھٹ پڑا "بہت افسوس کی بات ہے۔ تم نے ... بتایا کیوں نہیں تھا کہ تم سب مسلمان ہو۔"

"یہ دھرم کا معاملہ تھا۔ شاید تم جذباتی ہو جاتے اور ... کر دیتے تعاون کرنے سے" میں نے کہا۔

"میرا کیا دھرم ہے" اس نے کہا "تم اچھی طرح جانتے ... خود میں نے بتا دیا تھا تمہیں کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے ... دھوکا ہے۔ فراڈ ہے سب میرا یہ روپ۔"

"پھر بھی۔ تم ہندو ہو۔"

"کچھ نہیں۔ نہ میں ہندو ہوں نہ مسلمان۔ انسان ... ہوں میں۔ میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں۔ مجھے ... کیا ضرورت تھی۔ تم مجھے سچ بتا دیتے تو میرے لئے ...

خطرے کی بات نہ ہوتی۔ میں یہاں سے نکال کے ... سوچو ذرا کہ اس کی کسی غلطی سے یہ راز فاش ہو جاتا تو ... یہ شریمتی ماردھاڑ کر سکتی تھیں وہاں؟ کتنے لوگوں کو مار ... ایک ریوالور کی گولیوں سے کتنی لاشیں ڈھیر کرتیں؟" ... افسوس سے نفی میں سر ہلایا "خیر۔ اس کو اور ... اور مجھے میری عقل نے۔"

"بھگوان نے مدد کی ہو گی تمہاری" میں نے کہا۔

"شاید کام دیتے دیتے رک گیا "دیکھو مجھے اپنے بارے میں سچ بتا دو۔ اگر تم ڈاکو بھی نہیں ہو، سمگلر بھی نہیں ہو تو پھر کون ہو؟"

میں نے سوچ کے کہا "ہم شکاری ہیں۔"

"شکاری!"

"ہم سب شکاری ہیں" پوہت نے بھی بے حد فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "اگر تم غور کرو تو ساری دنیا شکاری ہے۔ کچھ سیاست کے میدان کے شکاری ہیں۔ ووٹرز کا شکار کرتے ہیں۔ کچھ حسن کے شکاری ہیں۔ عاشقی کو بدنام کرتے ہیں۔ دولت کے شکاری ہیں اور جرم کے شکاری ہیں۔"

راما راؤ نے اپنا سر پکڑ لیا "اس کا مطلب ہے کہ تم بتانا نہیں چاہتے۔ تمہاری مرضی۔ میں نے تعاون کی پوری کوشش ... میں اب تم خود ہی عدم تعاون کی تحریک چلا رہے ہو۔"

میں نے کہا "یار تم تو ذرا سی بات پر خفا ہو گئے۔ چلو میں تمہیں اصل بات کا عرق نکال کے پیش کرتا ہوں۔ پوری بات کی تو کل تک ختم نہیں ہو گی۔ یہ جو تمہارے ہم ترو دی تھے۔ یہ بہت خراب تھے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"ظاہر ہے ان کے کاروباری تعلقات بھی ایسے ہی لوگوں سے ہو سکتے تھے۔ جو کم خراب نہ ہوں" میں نے کہا "ان میں سے ایک نے میری کا سینہ زہر پیا۔"

"میں اسے بھی جانتا ہوں۔ بہت اچھی طرح۔"

"ان لوگوں نے مل کے ایک عورت اور اس کے بچے کو اغوا کر لیا۔"

"کون تھی وہ عورت، تمہاری کیا لگتی تھی؟" پروہت بولا۔

"ایسے سوالات کرو گے تو میری بات کیسے پوری ہو گی؟" میں نے کہا "فرض کر لو کہ میری بہن تھی۔ شادی کو اس کی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن اس کے شوہر کا زیادہ وقت گھر سے باہر گزرتا۔ کاروبار کے سلسلے میں۔ اس کی عدم موجودگی میں بیوی اور بچے کو اغوا کر لیا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو....."

"اغوا کرنے والے کون تھے۔ اور ان کا مقصد کیا تھا؟"

"اغوا کرنے والے دشمن تھے۔ دوست تو ہو نہیں سکتے" میں نے کہا "مقصد تھا اسے بلیک میل کرنا۔ اور چونکہ وہ معمولی ... بلیک میل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہم نے مقابلہ کر کے ان کا بیڑا غرق کر دینے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے انہیں بتایا تھا کہ ہم خود بھی تباہ ہو جائیں گے اور تمہیں بھی تباہ کر دیں گے۔ وہ بدمعاش تھے اور طاقت ور تھے۔ انہوں نے ہماری دھمکی کا مذاق اڑایا۔ نتیجہ یہ کہ اس عورت کا شوہر۔ میں اور میرا یہ دوست" میں نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔

"تم کسی کا نام نہیں بتا رہے ہو" راما راؤ نے کہا۔

"نام غیر اہم ہیں" میں نے کہا "فرض کر لو میں سکندر ہوں یہ میرا دوست غالب ہے۔ مرزا غالب۔"

"مرزا غالب!" راما راؤ نے طنز سے کہا "سنا ہے اردو کا بہت بڑا شاعر تھا۔ آج دیکھا ہے پہلی بار۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "وہ تو نازیا ناٹپ کی لڑکی ہے ایک دن اپنے مرزا غالب کی ہو جائے گی۔"

"کیا ہو جائے گی؟"

"گھر والی اور کیا یار" میں نے کہا "سمجھا بھی کرو بات کو۔ کل رات میری بہن کا شوہر اپنی بہن کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کے بیوی بچوں کو بالک رام اہر ترو کے گھر میں رکھا گیا ہے۔ اس نے ہمیں اطلاع دی۔ ہم نے بالک رام کے گھر پر حملہ کیا اور وہاں اس کے جتنے ساتھی تھے وہ مارے گئے لیکن نہ مجھے اپنی بہن ملی اور نہ بھتوئی ملا۔ اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انہیں اس پرانے اناتھ آشرم میں رکھا گیا ہے۔ چاروں کو۔"

"چار کون؟"

میں نے کہا "میری بہن۔ اس کا شوہر اور بچہ اور بچے کی پھوپی یعنی..."

"میں سمجھ گیا۔"

میں راما راؤ کو ایک قابل یقین کہانی کے تانے بانے میں الجھا کے خوش ہوا۔ میں نے رابعہ کا ذکر گول کر دیا تھا۔ گل کا حوالہ کسی رشتے سے نہیں آیا تھا۔ مجھے محسن اور شملا کے اہم نام لینے پڑے تھے۔

"اب ہم کسی طرح انہیں یہاں سے نکال کے لے جانا چاہتے ہیں۔ ہمارے دشمنوں کو معلوم ہے کہ ہم ان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آ پہنچے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں کہ تمہارے گھر میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہم ان کو دھوکے میں رکھ کے اچانک حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیں آس پاس کے سارے علاقے میں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ پولیس بھی انہی کے ساتھ ہو گی اور ان کی ساری غنڈہ فورس۔"

"پھر تو تمہارا کام بہت مشکل ہے۔ اور خطرناک بھی؟" پروہت فکرمند ہو کے بولا۔

"ہاں۔ ہماری اپنی جان کی کوئی بات نہیں۔ ہم تو نکلے ہی اس ارادے سے ہیں کہ ماریں گے اور مر جائیں گے۔ لیکن خدانخواستہ دشمنوں نے انہیں مار دیا۔ جن کو ہم بچانا چاہتے ہیں۔ تو ہماری ساری جدوجہد رائیگاں جائے گی۔ ابھی ہمیں پورا یقین بھی نہیں کہ وہ سب اناتھ آشرم میں کو دام میں ہیں یا نہیں۔"

"ابھی تک یہ تمہارا مفروضہ ہے؟"

"مفروضہ ہے لیکن حقیقت کے بہت قریب، اس بات کے امکانات بہت زیادہ ہیں کہ وہ وہیں ہوں گے۔ تصدیق بہرحال ضروری ہے۔ اور اسی کام میں تم ہماری مدد کر سکتے ہو۔ اس کے

www.paksociety.com

علاوہ تم کو کچھ بھی نہیں کرنا۔ باقی کام ہم خود کر سکتے ہیں۔"

"مگر میں کیسے تصدیق کر سکتا ہوں؟" راما راؤ پریشان ہو کے بولا۔

"اس احاطے میں کل رات کچھ ٹرک پہنچے ہیں۔ سات ٹرک ہیں۔ انہی میں سے ایک ٹرک میں میری بہن اور اس کا بیٹا ہے۔ ان بدمعاشوں نے انہیں ایک شیشے کے تابوت میں سلا رکھا ہے۔ بے ہوش کر کے۔"

"یہ تم مجھے کسی فلم کی کہانی سنا رہے ہو!" راما راؤ نے کہا۔

"زندگی تقریباً ستر فی صد حقیقت ہے اور تیس فی صد فلم۔"

"چنانچہ فلم تقریباً ستر فی صد حقیقت نہیں ہے اور تیس فیصد زندگی۔ اسی فارمولے کو معکوس کر لو" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "کہنے کا مطلب یہ تھا کہ زندگی اتفاقات اور ناقابلِ فہم واقعات سے خالی نہیں ہے۔ کیا خود تمہاری زندگی کے دو رخ نہیں ہیں؟ ایک وہ جو نظر آتا ہے اور ایک وہ جو موجود ہونے کے باوجود دکھائی نہیں دیتا۔ کچھ تجربات تمہاری زندگی کے ہمارے لئے اتنے ہی حیرت انگیز ہوں گے جتنے ہماری زندگی کے کچھ واقعات تمہیں فلمی لگ رہے ہیں۔"

"لیکن یہ سب کیسے ممکن ہے؟ شیشے کے تابوت میں کسی کو کب تک بے ہوش رکھا جا سکتا ہے؟ کب تک سانس لے کے زندہ رکھنا ممکن ہے؟" راما راؤ بولا۔

"میں نے اس قسم کا تجربہ کبھی نہیں کیا اور نہ کبھی خود ایسے تجربے سے گزرا" میں نے کہا "تاہم میں وہ بتا رہا ہوں جو میں نے ایک بار دیکھا تھا۔ انہوں نے مجھے وہ منظر دکھایا تھا۔ تاکہ میں ان کی دھمکی کو محض دھمکی نہ سمجھوں۔ میری بہن واقعی شیشے کے ایک تابوت میں سو رہی تھی اور اس کا بیٹا بھی اسی تابوت میں سو رہا تھا۔"

"شیشے کا وہ تابوت بالکل بند نہیں ہو سکتا۔ اس میں تازہ ہوا کے لئے راستہ رکھا گیا ہو گا۔"

"یقیناً رکھا گیا ہو گا۔ مگر میں نے اس وقت دیکھا نہیں تھا۔ غور ہی نہیں کیا تھا۔ میں تو صرف اپنی بہن کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھ سے بہت دور تھی۔ آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر۔ میں لوہے کے ایک جنگلے کے پیچھے سے تابوت کو چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر میں نے ان کا مال لے جانے والے ٹرک تباہ کئے۔ جیسا کہ میرا ارادہ تھا۔ تو میں خود اپنی بہن اور اس کے بیٹے کے خون سے اپنے ہاتھ رنگوں گا۔ انہوں نے اس تابوت کو درمیان والے ایک ٹرک میں رکھا ہے۔ اس کے پیچھے بارود ہے یا ڈائنا مائٹ یا کوئی ایسا ہی تباہ کن آتش گیر مادہ۔ اب میں کتنا مجبور ہوں اس کا اندازہ کر لو۔"

اس نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا "تم واقعی مجبور ہو۔"

"مگر میں لاچار نہیں ہوں۔ میں نے اسی وقت تہیہ کر لیا تھا کہ ہو نہ ہو کچھ ضرور کروں گا۔ میں نے ان سب لوگوں کو اکٹھا کیا اور ہم ایک ساتھ اس مشن پر روانہ ہو گئے۔ پوری تیاری کے ساتھ۔ میرا مشن تھا اپنی بہن کو بچانا اور اپنے دشمنوں کا ناکام بنانے کے بعد ان کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا۔ رات ہمارے دو ساتھی اسی چکر میں ان کے ہاتھ لگ گئے۔ ہمیں ان کو بھی چھڑانا ہے۔"

"یہ کام تم کیسے کرو گے آخر؟"

میں نے کہا "بس ایک بار یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہیں۔ اگر وہ اس گودام میں ہیں تو پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم رات کو یا تو حملہ کریں گے یا راستے میں کہیں روک لیں گے اور ایک ایک کو ٹھکانے لگا دیں گے۔ اس طرح کہ ہمارے مقصد کو نقصان نہ ہو۔"

"اگر وہ ایک شیشے کے تابوت میں بے ہوش لیٹی ہوئی ہے اور تابوت رکھا ہوا ہے بارود کے ڈھیر پر تو مجھے بہت کم امکان نظر آتا ہے کہ تم اپنی بہن کو بچا سکو۔"

"امکان کم ہو یا زیادہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ احتیاط ہم پوری کریں گے۔"

"میرا ذہن ابھی تک ایک بات پر الجھن کا شکار ہے کہ کسی کو مسلسل تابوت میں بند رکھنا اور ساتھ لئے پھرنا کیسے ممکن ہے؟ آخر زندہ آدمی کو کھانے پینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ خوراک تو اسے دی جا سکتی ہے براہ راست ڈرپ کے ذریعے مگر آدمی کا اخراج بھی کام کرتا رہتا ہے۔ اسے بے ہوش رکھنے کے لئے ہر گھنٹے کے وقفے سے انجکشن بھی دینے پڑتے ہوں گے۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔ ایک موبائل میڈیکل یونٹ چاہئے اس کے لئے۔ ایک ڈاکٹر اور ایک نرس کے ساتھ۔ تو میرا ذہن یہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ اتنا مشکل انتظام کریں گے۔"

راما راؤ نے مجھے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا "پھر کیا کرو گے؟"

"میں بتاتا ہوں۔ اگر میں ہوتا ان کی جگہ تو کیا کرتا۔ میں نے زندگی میں بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ بڑے چکر چلائے ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ میں پیر فقیر جادوگر جوگی۔ سب کچھ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے تمہیں یقین دلانے کے لئے شیشے کے تابوت کا انتظام کیا اور تمہاری بہن کو اس میں ذرا سی دیر کے لئے بے ہوش کر کے ڈال دیا۔ تمہارے رخصت ہوتے ہی انہوں نے اسے تابوت میں سے نکال لیا ہو گا۔ ایک شیشے کے تابوت کو ٹرک میں اٹھائے پھرنا کوئی آسان کام ہے؟ جو راستے میں جھٹکوں سے بکھر جائے۔ اس کے علاوہ میڈیکل پرابلم۔ جن کا میں نے ذکر کیا تھا۔ تمہاری بہن اور تمہارا بھانجا ان کے ساتھ ضرور ہوں گے لیکن اس تابوت میں نہیں۔ اس طرح نہیں جیسے تم نے دیکھا تھا اور جو اب تک تمہارے تصور میں ہے۔ وہ کسی ٹرک میں ہوں گے اور ممکن ہے ڈائنا مائٹ پر ہی بیٹھے ہوئے ہوں مگر بے ہوش نہیں ہو سکتے۔ وہ ان کی قید میں ہیں۔ ان کی مرضی کے غلام بنے جی رہے ہیں اور مرنے کے لئے تیار ہیں۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ کسی ٹرک میں کوئی شیشے کا تابوت نہیں ہو گا۔"

میں نے راما راؤ کو گلے لگا کے کہا "راما راؤ! یو آر اے جینئس۔ تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم کتنے ذہین آدمی ہو۔ تم بہت بڑے آدمی ہو گے۔"

"ایک ناکام بہت بڑا آدمی۔" وہ تلخی سے مسکرایا "میرے مقدر کا حال یہ بات مجھے نجومی بتا چکے ہیں۔ میں یا تو ملک کا صدر بھی بن سکتا تھا جس کا نام تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا جاتا۔ یا وہ مجرم جس کا ذکر تاریخ میں آتا۔ ان کی تفصیل کے ساتھ جو بالآخر تختہ دار تک لے جاتا۔ [illegible] دوسرا امکان اب واضح ہونے لگا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی ایسا مت سوچو۔ ایک لمحہ آدمی کی ساری زندگی بدل دیتا ہے۔ اس کا راستہ اور اس کی منزل بدل دیتا ہے۔ اس رات تم نے مجھے جس عذاب سے نجات دلائی ہے۔ اس کا تمہیں صلہ یا انعام دے سکتا ہوں۔ اس ایک تھینکس کے علاوہ تمہیں کیا دیا جا سکتا ہے۔"

غالب نے کہا "ایک بات بتاؤ گے؟ برا مانے بغیر۔"

"ہر برائی میں ملوث آدمی کس بات کا برا مان سکتا ہے!"

"تم یہ سب کتنا جمع کر رہے ہو؟ ملہوترہ نے کہا تھا کہ تم لالچی نہیں ہو۔"

اس نے ملہوترہ کو ایک گالی دی "کیا وہ خود لالچی نہیں تھا۔ یہ سارے ذخیرے وہ کس لئے کرتا تھا؟ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے؟ ..."

"ہر شخص ایک مقصد سامنے رکھ کے کچھ کرتا ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک شخص نے دوست بنا کے ہمیں لوٹ لیا۔ حالانکہ ہم خود لٹنے کے لئے بھی تیار ہو جاتے۔ اگر وہ کہتا کہ میں تمہیں لوٹنا چاہتا ہوں۔ اس کے سامنے بہت چھوٹا سا مقصد تھا۔ ایک عورت۔ لیکن اس ایک عورت کے لئے پہلے ایک گھر کا حصول تھا۔"

"مقصد تو میرے سامنے بھی ہے۔ میں کسی دن صنعت کار بن جاؤں گا۔ اپنا کام اور اپنا نام۔ اپنا ماضی حال اور مستقبل سب بدل ڈالوں گا۔ چالیس پچاس لاکھ سے میں کوئی کارخانہ قائم کروں گا۔ دہلی یا کانپور میں یا الٰہ آباد میں۔ سیٹھ کروڑی مل کہلاؤں گا۔ مجھے عزت مل جائے گی۔ رشتے مل جائیں گے اور وہ سب مل جائے گا جس کی میں نے زندگی سے توقع کی تھی مگر وہ مجھے سیدھے راستے پر چل کر محنت کرنے سے نہیں ملا۔ اور نہ مل سکتا تھا۔" راما راؤ نے کہا۔

"میں نے بالکل یہی کہا تھا تمہارے متعلق۔ یہی اندازہ تھا مگر چونکہ تم کسی کی نہیں مانتے اس لئے تم یہ بھی جان لو کہ تم اپنے مقصد سے کتنے دور ہو یا کتنے قریب ہو۔"

"میں نے سمجھو آدھا راستہ طے کر لیا ہے۔ اب اور باقی کے لئے مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ بس یہی دو تین سال۔ خیر اب میری بات چھوڑو اپنی بات کرو۔ آج کے دن اور شاید کل تک میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکوں گا۔"

"کیوں؟" میں نے کہا۔

"میں بے حد مصروف رہوں گا۔ تم نے میری مصروفیات بڑھا دی ہیں۔ اس وقت بستی پر پولیس نے یلغار کی ہوئی ہے۔ وہ گھر گھر تلاشی لینے اور ایک ایک آدمی سے پوچھ گچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"تم سے آج بھی پوچھ گچھ ہوئی اور کل بھی!"

"سمجھنے کی کوشش کیا کرو" وہ جھلا کے بولا "میری پوزیشن بہت مختلف ہے۔ میری مصروفیت کا سبب ہیں وہ لاشیں جو ابھی پولیس لے گئی ہے۔ قانونی کارروائی تو پوری ہوتی ہے۔ شام تک سب لاشیں واپس آ جائیں گی تو ان کا کریا کرم ہو گا۔ سب جگہ میں ہی جاؤں گا۔ یہاں اتنے لوگ کبھی نہیں مرے۔ ایک دو مرے تو ٹھکانے لگانے کا موقع ملتا ہے۔ بچتے بچاتے۔"

"تم مردہ کیا لیتے ہو؟" غالب نے کہا۔

"اس میں ریٹ کہاں چلتا ہے۔ حیثیت دیکھنی پڑتی ہے لواحقین کی۔"

"یہ ہول سیل بزنس مل گیا تمہیں ہماری وجہ سے۔"

"ہاں چونکہ پیش آ رہی ہیں۔"

"کچھ میں لاشیں ہیں۔ یا مرے ہیں" غالب نے تصحیح کی۔

"ان میں سے آٹھ یہاں کے نہیں تھے" راما راؤ بولا۔

"امپورٹ کئے گئے تھے۔ کرائے کے گوریلے۔"

"سب کا کریا کرم بہرحال مجھے کرنا ہے۔ اگر لاشیں شام کو دیر سے ملیں تو پھر رات کو فرصت ہو گی۔ کل کا دن مصروف گزرے گا۔ میں نے کہا ہے کہ سب ایک ساتھ شمشان گھاٹ لائے جائیں۔ ایک ساتھ جلانے کے لئے۔ پھر بھی دوسری رسوم تو الگ الگ ہوں گی۔ ابھی ہفتہ دس دن تک دان پن اور بھوجن چلے گا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو پروہت جی۔ ہفتہ دس دن ہم یہاں کیسے قید رہ سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"صرف آج کے دن کی بات ہے۔ گیتا اور رامائن کا پاٹھ کرنے کے لئے تو میں نے چیلوں سے کہہ دیا ہے لیکن شمشان میں تو مجھے ہی سب کچھ کرنا ہو گا۔ ابھی میں بستی میں جا کر صورت حال دیکھوں گا کہ پولیس کیا کر رہی ہے۔ وہ مندر کی طرف بھی ضرور آئیں گے۔ میں ان سے مل لوں گا۔ تو وہ گھر نہیں آئیں گے۔ جو پوچھنا یا کہنا ہو گا وہیں پوچھیں گے اور کہہ دیں گے..."

باہر سے میں نے کسی موٹر سائیکل کی آواز سنی جو رفتہ رفتہ قریب آتی محسوس ہوتی تھی۔ میرا دھیان ایک دم پولیس کی طرف گیا۔

"راما راؤ! یہ موٹر سائیکل پر کون آیا ہے؟"

"موٹر سائیکل پر... اور کون آ سکتا ہے" وہ گھبرا کے اٹھا۔

"یہ پولیس ہے" غالب نے کہا۔

موٹر سائیکل عین دروازے کے سامنے آ کر رک گئی۔

"ادھر... ادھر جاؤ" راما راؤ نے سرگوشی میں کہا۔ اور ہاتھ

www.paksociety.com

کے اشارے سے نہیں کھلنے لگا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ شریفانہ دستک نہیں تھی۔ کسی نے دروازے کو ڈنڈے سے بجایا تھا۔ یہ اختیار اور فرعونیت کا غرور اور طاقت رکھنے والوں کی دستک تھی۔

"انڈر گراؤنڈ ٹینک" راماراؤ نے سرگوشی میں کہا۔

"راماراؤ کیا بات ہے؟ دروازہ کھولو۔"

"آ رہا ہوں جی۔ جلدی مت کرو۔۔۔۔ ابھی دھوتی تو باندھنے گا دی پہلے" راماراؤ نے آواز بنا کے کہا۔

میں اور غالب انڈر گراؤنڈ ٹینک کی طرف لپکے جو ہم پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ اس وقت ہم نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ اس ٹینک کی گہرائی کتنی ہے اور اس میں پانی کتنا ہے۔ میں نے اس کا ڈھکنا کھولا اور اندر اتر گیا۔ مجھے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ اوپر سے کھلے حصے کی چمک بھی پڑ رہی تھی۔ مگر میرے پاؤں پانی کی سطح سے ٹکرائے تو مجھے اندازہ ہوا کہ ٹینک سات فٹ کے قریب گہرا ہے اور اس میں پانی چار فٹ تک بھرا ہوا ہے۔

غالب نے اتنی دیر میں نازو کو ہاتھ پکڑ کے لٹکا دیا تھا۔ گل خود ہی ٹنک کے پانی میں گری۔ میں نے اسے سنبھال کر کھڑا کر دیا۔ غالب نے اندر آتے ہوئے ڈھکن اوپر کھینچا اور برابر کر دیا۔

اب ہم گھپ اندھیرے میں کھڑے ہوئے تھے۔ چار فٹ پانی میری کمر تک تھا لیکن نازو کی گردن تک پہنچ رہا تھا اور گل کے شانوں [illegible] پانی ٹھنڈا تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ سردی سے دانت بجنے لگتے۔ [illegible] کے دانت خوف سے بج رہے تھے۔ وہ خود بھی لرز رہی تھی۔

میں نے ڈانٹا "یہ کیا بے وقوفی ہے۔ یہاں کسی کو بھی اجازت نہیں دی جا سکتی بے ہوش ہونے کی۔"

اس نے کانپتے ہوئے کہا "وہ۔۔۔ دراصل ناک میں پانی چلا گیا۔"

غالب نے کہا "کس نے کہا تھا کہ بہادرین کے خود کود جاؤ۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اسے اپنے قریب کر لیا "چند منٹ کی بات ہے۔ ڈرنے لگو تو مجھے تو ڈر دے دینا۔"

"میں نہیں ڈروں گی۔۔۔" گل نے کہا اور میرے بازو کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

نازو نے کہا "ادھر آ جاؤ گل میرے پاس۔"

"تم کہاں ہو؟ پانی کے نیچے یا اوپر" غالب نے کہا۔

نازو ہنسی "ادھر۔ اس دیوار کے ساتھ لوہے کے ٹنک بھی لگے ہوئے ہیں اور لوہے سے آنے والا پائپ ہے سہارے کے لئے۔"

"اچھا بھئی۔ یہاں بھی مل ہی گیا تمہیں کوئی سہارا دینے والا" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"کاش تم ایک پائپ ہوتے" نازو نے اسے چھیڑا "یا لوہے کا ٹنک ہی ہوتے۔"

"جو ماہی تھا تو میں زلف ہو آیا تیرے رخسار پہ تل ہو آ"

غالب نے یوں کہا کہ نازو سے جواب نہ بن پڑا۔ اس [illegible] تے میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ جھینپ سی گئی ہوگی اور [illegible] غالب کی چشم تصور نے تاریکی میں بھی اس کے عارض [illegible] گلابی رنگ دیکھ لیا ہو۔

"آخر اور کتنی دیر تلاشی لیں گے پولیس والے" [illegible] کہا۔

میں نے کہا "اگر تفصیلی تلاشی لی تو۔۔۔ تم لوگ تھک [illegible] ہو؟"

"اور۔۔۔ کیا۔۔۔ ہوتے تلاش کرتے رہتے؟"

"مروا دیا" میں نے کہا "تماشا ہوتے خود نظر انداز کیا جائے گا راماراؤ پولیس کو بک کس کے بیٹھا۔"

غالب نے کہا "تفصیلی تلاشی میں تو یہ ٹینک سے [illegible] خطرناک چیزیں مل جائیں گی۔ ریوالور سے دستی بم تک [illegible] اب مجھے صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا [illegible] یہ سب چیزیں کیا سامنے ہی پڑی ہوئی تھیں۔"

غالب نے کہا "قسمت اچھی تھی کہ تمہارے [illegible] دور اندیش آدمی آ گیا۔ یعنی یہ خاکسار۔ میں نے انہیں [illegible]

"ٹھیک ہے مسٹر دور اندیش۔ تم نے کہاں رکھ دی [illegible]

"بیڈ کے نیچے ہے صندوق کے پیچھے۔ صرف اس [illegible] کہ اچانک کوئی آ جائے تو ہمیں پریشانی نہ ہو" غالب نے [illegible]

"مسٹر دور اندیش! اگر ہمیں اچانک ریوالور کی ضرورت پڑ جاتی تو ہم کیا کرتے؟ جتنی دیر میں ہم بیڈ کے نیچے گھستے اور [illegible] کے پیچھے سے ریوالور نکالتے۔ کیا ہمارے پیچھے ایک سوراخ نہ ہو جاتے؟" میں نے کہا۔

"وہ تو یہاں بھی ہو سکتے ہیں۔"

"خدا کے لئے مت کرو ایسی باتیں" گل نے [illegible] کہا۔

نازو نے کہا "ایسے ہم کتنی دیر کھڑے رہ سکتے ہیں [illegible]"

غالب نے کہا "کس نے کہا ہے کھڑی رہو۔ بیٹھ جاؤ۔"

نازو کے سوال نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ [illegible] اندازے کے مطابق ابھی صرف پانچ منٹ ہی گزرے تھے۔ اگر ایسے پانچ گھنٹے گزارنے پڑے تو کیا ہوگا؟ شاید ہم میں سے [illegible] اتنی قوت برداشت نہیں رکھتا تھا۔ پانی کی قید کا عذاب [illegible] تجربہ تھا جس سے کوئی پہلے نہیں گزرا تھا۔

ابھی سے ہمارے جسم سرد ہو رہے تھے۔ شاید تھوڑی دیر بعد ہمارے پانی میں ڈوبے ہوئے جسم سن ہو جاتے۔ پھر توازن قائم رکھنا مشکل ہو جاتا۔ ہماری ٹانگیں کانپنے لگتیں اور بالآخر ہم گر پڑتے۔ غالب کے سوا سب کو تیرنا آتا تھا۔ ٹینک میں تیرنا بھی تو مشکل تھا۔ گھپ اندھیرے میں ہم ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ اندھیرا [illegible] مادی وجود رکھتا تھا۔ اس ٹھنڈک کی طرح جو پانی کا [illegible] ہوئی تھی۔ اتنا ہی ٹھوس احساس۔

ہو گئے تھے۔ اندھے اور بہرے۔ خود کو اس بات کا یقین دلانے کے لئے کہ میں اندھا بہرہ اور گونگا نہیں ہو گیا ہوں، میں نے کہا "نازو کدھر ہے؟"

"یہاں میرے پاس۔"

"بھائی سکندر! مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے مجھے جیسے مجھے زندہ دفن کر دیا گیا ہے۔ یہ قبر ہے میری" گل نے ہذیانی کیفیت میں کہا "میں مر چکی ہوں۔"

"نہیں، ہم سب غرق ہو گئے ہیں۔ سمندر میں ڈوب گئے ہیں" نازو نے کہا "اور اتھاہ گہرائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں تک سورج کی روشنی بھی نہیں پہنچ سکتی۔ حالانکہ اوپر زمین روشن ہے۔ آسمان پہ سورج چمک رہا ہے۔"

"نازو! بس تھوڑا سا انتظار اور میری جان" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "گل! ہمت سے کام لو۔ تم بہت بہادر ہو، ایک بہادر بھائی کی بہادر بہن۔"

خاموشی۔ پانی کا معمولی سا تموج اب مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے قدموں کے نیچے زمین ہل رہی ہے۔ زلزلے کی زد میں ہم سب ساکت تھے۔ لیکن ہمارے سانس لینے سے بھی جو خفیف سی حرکت ہوتی تھی وہ میرے وجود کی عمارت کو ہلا دیتی تھی۔ میں سمجھتا تھا پھر گل کو سنبھالنا تھا۔ وہ اب گرنے لگی تھی۔ میں نے اسے ایک بغل میں ہاتھ دے کر سہارا فراہم کر رکھا تھا لیکن میرے ہاتھ پر اس کا بوجھ اثر انداز ہو رہا تھا۔ یہ بوجھ بڑھتا جا رہا تھا اور میرا ہاتھ سن ہوتا جا رہا تھا۔

پانی کی اس قید کا عذاب کب ختم ہوا؟ شاید ایک دن گزر گیا اور پھر ایک رات گزر گئی۔ وقت اگر احساس کی شدت کا نام تھا تو زندگی ہم نے اس آدھے گھنٹے میں جھیلی وہ ناقابل بیان ہے۔ گل پہلے بے ہوش ہوئی۔ پھر نازو۔ میں اور غالب وقت سے لڑتے رہے۔ راماراؤ کو گالیاں دیتے رہے۔ سؤر کے بچے نے کہاں لا کے مارا۔ کیسا دھوکا دیا۔ ایسے ہی یوسف بھائی نے دھوکا دیا تھا۔

اوپر کا ڈھکنا ایک دم کھلا۔ یک لخت زندگی کا نیا سورج طلوع ہو گیا۔ میں نے اوپر دیکھا تو میری نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ روشنی کے اس سیلاب میں راماراؤ کا سایہ مجھے آسمان پر پھیلا ہوا لگا۔

"آئی ایم سوری۔"

"سؤر کے بچے!" میں نے چیخ کے کہا اور اسے ایک درجن ایسی گالیاں دیں جو میں گل یا نازو کے سامنے ہی نہیں کسی بھی عورت کے سامنے نہیں دے سکتا تھا۔ وہ ہوش میں نہیں تھیں اس لئے انہوں نے کچھ نہیں سنا۔ مگر میں بھی ہوش میں نہیں تھا۔

راماراؤ نے مجھے۔ پھر میں نے گل کو۔ اس کے بعد نازو کو اور پھر ہم دونوں نے غالب کو اوپر کھینچا۔ میں اور غالب پانی میں تر بتر نکل کر لیٹ گئے۔ دھوپ نے ہمارے جسموں میں حرارت پہنچائی۔ چند منٹ کے بعد ہم نے گل اور نازو کو اٹھایا اور اندر لے گئے۔

راماراؤ بہت نادم اور پریشان تھا "میں کیا کرتا۔ انہوں نے گھر کے اندر دیکھا اور شکر ہے زنانہ سینڈلوں کے بارے میں سوال نہیں کیا۔ وہ سمجھے ہوں گے کہ میری فیملی بھی ساتھ ہوگی۔ وہ انسپکٹر بڑا شکی تھا۔ مجھے مندر لے گیا۔ مندر کا کونا کونا دیکھا۔ پوچھتا رہا کہ کل سے آج تک میں نے کسی اجنبی کا چہرہ تو نہیں دیکھا۔ پھر اس نے کہا کہ ایک سنتری مندر کے باہر موجود رہے گا۔۔۔ ہر آنے جانے والے پر نظر رکھنے کے لئے اپنا کوئی ایسا آدمی اس کے ساتھ بٹھا دو جو بستی کے ہر شخص کو پہچانتا ہو۔ میں نے کہا کہ ایسا تو میرے سوا کوئی نہیں لیکن میں یہاں شناخت کے لئے بیٹھ گیا تو مرنے والوں کا کریا کرم کون کرے گا۔ تمہارا باپ۔ یہ آخری بات میں نے دل میں کہی۔ پھر وہ چلا گیا۔ جاتے جاتے کہہ گیا کہ آنکھیں کھلی رکھنا۔ میں نے کہا۔ میں پلک بھی نہیں جھپکاؤں گا۔ کہہ رہا تھا کہ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ جو سامنے آ جائے اسے کچھ پوچھے بغیر مار دیتے ہیں۔ میں نے پوچھا کیا پاگل ہیں تو بولا کہ جنونی ہیں۔ مندر میں گھس گئے تو سمجھو مندر کی خیر نہیں۔ بھگوان سے پجاری تک سب کو مار دیں گے۔ میں نے کہا مندر کی حفاظت خود بھگوان جی کرتے ہیں۔ تم فکر مت کرو۔ بس اسی میں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔"

"آدھا گھنٹہ!" میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی جو سو فیصد واٹر پروف ثابت ہوئی تھی "مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ آدھا دن گزر گیا۔"

غالب نے کہا "خیر۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نہیں گزر گئے۔"

میں نے راماراؤ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے معذرت آمیز لہجے میں کہا "پنڈت جی! میں نے بڑا پاپ کیا ہے۔ تم کو وہ گالیاں دی ہیں جو صرف تھانے دار ہی اپنے مجرموں کو دیتے ہیں۔ تم تو مہربان اور مددگار ہو۔"

اس نے کہا "میں نے سائیکالوجی پڑھی ہے۔ تمہاری نفسیاتی اور ذہنی کیفیت کے پیش نظر تمہارا وہ رد عمل میرے لئے غیر متوقع نہیں تھا۔ ہاں اب تم کچھ کہو گے تو۔۔۔"

"تو کیا؟" میں نے کہا۔

اس نے دانت نکال کے کہا "میں تمہیں مدراسی زبان میں وہ گالیاں دوں گا کہ تم کو اپنی دی ہوئی گالیاں بہت ہلکی محسوس ہوں گی۔ جیسے پتھر کے مقابلے میں پھول۔"

"میں نے کہا "منظور؟"

غالب نے بھی کہا "ہاں یار۔ حساب برابر کر لو۔ ہم بھی برا نہیں مانیں گے۔"

"راماراؤ نے کہا "چھوڑو یار۔ دیکھو یہ لڑکیاں آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہی ہیں۔ ان کے گیلے کپڑے بدل دو۔"

"کیسے بدل دیں؟ ہمارے پاس دوسرے کپڑے نہیں ہیں۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے زمین پر جھک کے بیڈ کے نیچے سے پرانا ٹین کا صندوق گھسیٹ کر باہر نکالا۔ ایک چابی سے اس کا پرانا قفل کھولا۔ اس میں سے مجھے کافور کی مہک

www.paksociety.com

رامارا ؤ نے بہت سی ساریاں نکالیں۔ یہ سب پرانی تھیں اور شاید برسوں سے استعمال نہیں ہوئی تھیں۔ ان میں بنارسی ساریاں بھی تھیں لیکن اس نے وہ پرانی سوتی ساریاں نکال لیں۔

"یہ سب میری ماں کی ہیں" وہ بولا "اس صندوق میں میرا بچپن بند ہے۔ میری ماں کی بہت سی ایسی نشانیاں ہیں جو عموماً کسی کے پاس نہیں ہوتیں۔ مثلاً اس کے بالوں کی ایک لٹ ہے۔ کاجل کی وہ ڈبیا ہے جو وہ استعمال کرتی تھی بہت خوبصورت تھی وہ۔"

"اور تمہارا باپ؟" میں نے انجانے میں اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"باپ!" اس کا چہرہ کسی اندرونی کرب سے مسخ ہو گیا "میں کسی باپ کو نہیں جانتا۔ میرا باپ تھا ہی نہیں۔ اگر کوئی مجھے اپنا بیٹا مانتا تو میں کہہ سکتا تھا اسے باپ۔ وہاں تو سارے ہی میرے باپ تھے۔ یو سی۔ میری ماں ایک طوائف تھی۔ مجھے یہ بات بتاتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "ماں صرف ماں ہوتی ہے۔ عورت صرف عورت ہوتی ہے۔ بعد میں وہ استانی بنتی ہے یا ڈاکٹر۔ بیوی بنتی ہے یا طوائف۔ اس کا الزام حالات کو دیا جا سکتا ہے۔ اس عورت کو نہیں۔"

وہ خاصا پُرسکون نظر آنے لگا "معلوم نہیں میں نے تمہیں یہ بات کیوں بتا دی۔"

میں نے کہا "اس سے ہماری نظر میں تمہاری وقعت بڑھ گئی کم نہیں ہوئی۔"

غالب نے کہا "کیا تمہاری ماں چاہتی تھی کہ تم پڑھ لکھ کے بڑے آدمی بنو؟"

رامارا ؤ چونکا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"غالب نے کہا "مائیں تو ہم سب کی ایک ہی طرح سوچتی ہیں۔"

وہ کچھ دیر صدمے کی کیفیت میں بیٹھا رہا "اگر وہ زندہ رہتی تو میں ضرور بڑا آدمی بن جاتا۔ وہ مجھے سیدھے راستے سے بھٹکنے نہ دیتی۔ لیکن مجھے بہت افسوس ہے کہ وہ زندہ نہ رہی۔ میں نے ایک ایم اے کیا۔ پھر دوسرا۔ اس کی خواہش پر۔ وہ کہنے لگی کہ ایک ایم اے اور کر لے بیٹا۔ پاگل عورت! میں تیسرا ایم اے کر لیتا تو وہ کہتی ایک اور بیٹا۔ شاباش۔ جیسے میری ڈگریاں ہی اس کے کام آئیں گی۔ اس کے سارے پاپ کے پہاڑ کاٹ دیں گی اور اس میں سے وہ گنگا کی نہر نکلے گی جو اس کی گنگا ہو گی۔ پوتر پانی والی جس میں سب کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ لیکن ...." اس نے دکھ سے نفی میں سر ہلایا! "وہ اچانک مر گئی مجھے بتائے بغیر۔"

"کیا ہوا تھا اسے؟ کوئی مہلک مرض یا ہارٹ اٹیک؟"

"اس نے خودکشی کر لی تھی؟" غالب نے اسے خاموش دیکھ کے کہا۔

"نہیں۔ اسے میرے وجود کی شرمندگی نے مار دیا۔ سب طرح وہ بھی چاہتی تھی کہ ایک بہو لائے۔ میں کہتا تھا کہ ماں! بہو آ گئی تو تیرا بیٹا چھین لے گی۔ وہ کہتی تھی کہ میں اس کے حوالے کر دوں گی بیٹے کو۔ کہہ کے اب تو اسے سنبھال اور خود کاشی چلی جاؤں گی۔ ایک دن میں نے خود اس کا کہا مانا۔ تیری خواہش پوری ہو گئی۔ جا اپنی بہو لے آ۔ وہ بہت خوش ہو گئی۔ اور دولت اٹھا کے واپس آ گئی۔ جس لڑکی کو میں بیاہ کر لاتا اس کے باپ نے میری ماں کو پہچان لیا۔ وہ خود اس کے کوٹھے پر جاتا رہا تھا۔ مگر وہ مرد تھا۔ گناہ تو صرف عورت کا ہوتا ہے۔ اس نے کہا دو ٹکے کی رنڈی تیری یہ مجال۔ خاندانی لوگوں کا منہ کالا کرنے آئی ہے۔ ہمارے منہ پر گٹر کی غلاظت ملنے آئی ہے۔ تیرا بیٹا وہ گٹر ہے جس میں سب اپنی غلاظت بہاتے ہیں۔ میری بیٹی آسمان سے اترنے والی گنگا ہے۔ میری ماں نے سب سنا کچھ نہیں بتایا۔ جب میں واپس آیا تو لوگ اس کی لاش اتار رہے تھے۔ پنکھے سے لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اگلے ہی دن اس برہمن کو جس کو اپنی بلندی پر ناز تھا اور دعویٰ تھا کہ گنگا اس کے گھر کا پاک پانی ہے۔ میں نے اس کا خون نالی میں بہا دیا۔ اسے گٹر میں ذبح کر کے ڈال دیا۔ پھر میں بھاگ گیا۔ اب میں رامارا ؤ ہوں۔ اونچی ذات کا برہمن۔ میں نے سب سے بدلہ لے لیا اپنی ماں کے ساتھ ہونے والے ظلم کا۔ میں نے شادی نہیں کی نہ کروں گا۔ لیکن ہر اونچی ذات کا غرور رکھنے والے کی بیٹی بہو ہے میری۔ میں نے طوائف بنا دیا ہے سب کو۔ میرا یہی ایمان ہے۔"

میں نے ساریاں اس سے لے لیں۔ وہ بڑی عجیب شخصیت تھا۔ ایک مجبور 'قابل رحم' آدمی۔ اپنے انتقام کی آگ میں جلنے والا اور انتقام لینے کے بعد پشیمانی کے احساس کی اذیت سہنے والا ... بیک وقت ظالم اور مظلوم۔ خود اپنے خنجر سے زخم لگانے والا اور پھر اس زخم کے آزار پر رونے والا۔ ایک ایم اے جو اپنی سائیکالوجی بگاڑ چکا تھا۔

کچھ دیر بعد جب نازو اور گل نے ہوش میں آ کے کپڑے بدل لئے تھے، وہ ایک ٹرے میں چائے کے برتن اٹھائے مسکراتا ہوا اندر آیا۔ وہی پرانا رامارا ؤ۔ ذرا سی دیر کے لئے اصل رامارا ؤ اس شخص کے صندوق میں سے ایسے نکل آیا تھا جیسے بوتل میں قید جن آزاد ہو گیا ہو۔ اس جن کو رامارا ؤ نے پھر بند کر دیا تھا۔

"یہ تم نے کیوں تکلیف کی؟"

"میں تو کہتا ہی خود ہی پکاتا ہوں اپنا۔ چائے بنانے میں کیسی تکلیف۔ لڑکیوں کو ضرورت تھی۔"

میں نے کہا "یہ نازو ہے۔ نازلی بیگم اس کا پورا نام ہے۔ یہ گل بانو ہے۔ پہلے یہ ناگ منی تھی۔ اس کا بھائی اور ایک بہت نامور ڈاکو تھا۔ یہ بھی ڈاکو تھی۔ اب سوچو اور سوچو کہ ایک لڑکی ناگ منی سے گل بانو بن سکتی ہے تو رامارا ؤ وہ کیوں نہیں بن سکتا جو وہ بننا چاہتا تھا؟"

رامارا ؤ اسے یوں دیکھتا رہا کہ گل کا رنگ لال پڑ گیا۔

"اور میرا نام واقعی مرزا غالب ہے۔ پہلے میں ایک صحافی تھا۔"

غالب نے کہا "وہ لڑکی جس کو ہم چھڑانے کے لئے آئے ہیں اس کا نام شہلا ہے۔" میں نے کہا "اس کے شوہر کا نام محسن ہے۔"

غالب نے کہا "محسن کے ساتھ جو لڑکی غالباً قید ہو گئی ہے اس کا نام رابعہ ہے۔ بہت بڑی وکیل تھی وہ۔ ایک دن وہ منصور کی ہو جائے گی۔"

رامارا ؤ نے کہا "کیا ہو جائے گی؟"

"یار سمجھا کرو بات کو۔ گھر والی اور کیا" غالب نے میری ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

"اب میں سمجھ گیا۔ ساری بات سمجھ گیا" رامارا ؤ نے سر ہلایا "تم چائے پیو۔ میں مٹھائی لاتا ہوں۔"

"کہاں سے؟"

"مٹھائی کے ڈھیر آتے ہیں ہر روز۔ مجھے تو الرجی ہو گئی ہے مٹھائی کی صورت سے۔ لیکن آج کھاؤں گا تمہارے ساتھ۔ آؤ مٹھائی بہت اچھی ہوتی ہے یہاں۔ خالص دودھ سے بنتی ہے نا۔ میں ابھی گیا اور ابھی آیا" اس نے چٹکی بجا کے کہا "منٹوں میں آ جاتا ہے۔"

وہ واقعی پانچ منٹ میں واپس آ گیا۔

"ایک خبر ہے تمہارے لئے" اس نے ہمارے ساتھ چائے پیتے ہوئے کہا "موقع نہیں ملا پہلے بتانے کا۔ وہ جو لڑکی ہے نا تمہارے بھائی کی بیوی"

میں نے مسکرا کر کہا "رابعہ؟"

"ہاں اور وہ تمہارا بہنوئی۔ محسن نام بتایا تھا تم نے۔ وہ دونوں بھاگ گئے ہیں" رامارا ؤ بولا۔

میں نے چائے کا کپ رکھ دیا "یہ کیسے معلوم کیا تم نے؟"

"میں نے معلوم نہیں کیا۔ پولیس نے بتا دیا ہے مجھے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔"

"کیا باتیں کر رہے تھے؟"

"یہی کہ دو ساتھی پکڑے گئے کل رات ان کے۔ بجلی گھر کے ٹاپ سے۔ چوکیدار نے انہیں صبح پہچان لیا۔ اس نے کہا کہ انہی دونوں نے مجھے مجبور کیا تھا بجلی بند کرنے پر۔ دس منٹ کے لئے۔"

"وہ پکڑے کیسے گئے؟"

"شاید کہ وہ ادھر ہی کی طرف گئے تھے" رامارا ؤ بولا۔

"مجھے اندازہ تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے وہ۔ سب کو الٹا پلٹا کرنے کی عادت ہے۔ شوق ہے۔" میرا پارہ چڑھ گیا۔ "کوئی بات مشورہ نہیں کرتا۔ کسی سے پوچھتا نہیں۔ ایک ٹیم ہے تو سب اس میں چیمپئن ہیں۔ الگ الگ اپنا کھیل کھیلتے ہیں۔ ایسی کی تیسی ہو جائے گی۔"

غالب، نازو، گل سب خاموش تھے۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ انہیں شاید احساس تھا کہ رابعہ اور محسن نے غلطی کی۔ اور اس کے نتیجے میں ہمارے لئے پریشانی پیدا کی۔ تو خود بھی مصیبت میں گرفتار ہوئے۔ کچھ دیر بعد جب میرا غصہ کم ہوا تو میرے خیالات کی رو نے مخالف سمت اختیار کر لی۔ میں سوچنے لگا کہ شاید محسن کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ اگر میری بیوی ... لیکن محسن کو یہ بات کہاں معلوم تھی کہ شہلا اور اس کا بیٹا دشمنوں کی قید میں اتنے قریب موجود ہیں۔ معلوم ہوتا تو پھر اس کی بے قراری جائز ہوتی۔ کبھی آدمی جذبات کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ جاتا ہے۔ ... کہیں رابعہ نے اسے بتا تو نہیں دیا تھا۔ غلطی سے کوئی ایسی بات تو نہیں کر دی تھی جس نے راز افشا کر دیا ہو۔ پھر محسن نے اسے مجبور کر دیا ہو کہ حقیقت کو نہ چھپائے۔ یا میرے خدا! اگر رابعہ نے ایسی غلطی کی تو پھر محسن کا کیا قصور؟ اگر وہ پاگل ہو گئے۔ بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق تو قصور وار عشق کو کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔

غالب نے کہا "یار سکندر! یہ ہونا تھا وہ ہو گیا۔"

"اب ہمیں کچھ کرنا چاہئے" میں نے کہا "آج ہی رات۔"

"اتنی جلدی مت کرو" رامارا ؤ نے کہا "سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ۔"

"میں نے سوچ لیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آج کی رات ہی ہمارے لئے بہترین موقع فراہم کرتی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

میں نے کہا "آج سارا دن پولیس بھی زیادہ سے زیادہ دوڑ دھوپ کرے گی۔ ہمارے دشمن بھی سارا دن تلاش کرنے کے بعد یہ سمجھ لیں گے کہ ہم اس بستی میں بہرحال نہیں ہیں۔ آس پاس کے علاقے میں بھی نہیں ہیں۔ ورنہ پکڑے جاتے۔ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ فی الحال ہم کہیں دور چلے گئے ہیں۔ یا ایسی جگہ جا کر چھپ گئے ہیں جہاں تک کسی کا پہنچنا مشکل ہے۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم عین ان کی ناک کے نیچے موجود ہیں۔ چراغ تلے اندھیرا اسی کو کہتے ہیں۔ دشمن اب باہر سے بستی کی جانب آنے والے راستوں کی نگرانی کریں گے۔ اس خیال سے کہ ہم پھر لوٹ کے آئیں گے مگر کچھ وقت گزر جانے کے بعد یا ہم بستی میں موجود ہیں تو پھر باہر جانے کی کوشش کریں گے۔ ہر صورت میں اب شکاری اس بستی کے آس پاس ہی ہمیں تلاش کریں گے۔ آج رات وہ ہم سے کسی تازہ واردات کی توقع نہیں رکھیں گے۔"

غالب نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک نفسیاتی حربہ ہے۔ ہم اچانک، بے خبری میں ان پر غالب آ جائیں۔ جب وہ اس کے لئے ذہنی طور پر بالکل تیار نہ ہوں۔"

"اس کے علاوہ۔ آج رات بستی میں خوف و ہراس کی فضا ہو گی۔ اتنے بہت سے گھروں میں سوگ ہو گا۔ اس سوگ میں سب ہی شریک ہوں گے۔ دن بھر کی مصروفیت کے بعد پولیس والے بھی رات کو کچھ آرام کریں گے کہ چلو جو ہونا تھا ہو گیا۔ آج کی قانونی کارروائی ختم ہوئی۔ اب رات کو کیا کریں۔

www.paksociety.com

آرام کرنے کے ۔ ہماری یہ اسکیم زیادہ کامیاب ہو سکتی ہے اگر شہر کے اسپتال سے انھیں جلد مل جائیں اور مرنے والوں کو آج ہی جلانے کا انتظام ہو ۔ ظاہر ہے اس میں رات ہو جائے گی ۔ شمشان میں سولہ ارتھیاں ایک ساتھ جلائی تو جا سکتی ہیں ۔ ایک ساتھ لانا مشکل ہو گا ۔ سب کے آتے آتے دیر لگے گی ۔ اور چتا کو آگ تب ہی لگائی جائے گی جب آخری ارتھی بھی پہنچ جائے گی ۔ میرا خیال ہے پوری نہ سہی آدھی بستی تو ضرور وہاں موجود ہو گی ۔"

"پوری ہی ہو گی ۔ شاید کچھ لوگ نہ جائیں ۔ یہاں تو سب ہی ایک دوسرے کو جانتے ہیں" راما راؤ نے کہا ۔

"شمشان کہاں ہے ؟"

"بستی سے باہر ۔ یہاں سے کوئی ایک میل ۔"

میں نے کہا " رات کے وقت بستی سنسان ہو گی تو ہمارے لئے خطرات بھی کم ہوں گے ۔ اس وقت ہم گودام میں داخل ہو سکتے ہیں ۔"

"کیسے ؟ کس طرف سے ..." غالب نے کہا ۔

"پہلے میری بات سن لو ۔ گودام کے محافظوں کی پوزیشن بھی آج خراب ہو گی کیونکہ جو لوگ مارے گئے ہیں وہ سب ٹھاکر کے گھر اور گودام کے مشترکہ محافظ تھے ۔ وہ فوج تھی جو ٹھاکر کے ناجائز کاروبار کو تحفظ فراہم کرتی تھی ۔ سولہ مقامی آدمی تھے ۔ آٹھ باہر سے بھی آئے ہوئے تھے ۔ یہ باہر سے آنے والے کون تھے ؟ ظاہر ہے تریولی کے آدمی ۔ یا دلاور اینڈ کمپنی کے لوگ ۔"

"دلاور اینڈ کمپنی کیا ہے ؟" راما راؤ بولا ۔

"یہ بھی تریولی کی ایک کمپنی ہے" میں نے کہا " جو سولہ افراد یہاں کے تھے ان کی جگہ آج ہی نئی بھرتی نہیں کی گئی ہو گی ۔ ہو سکتا ہے کل پرسوں میں ان کی جگہ دوسرے آ جائیں ۔ مگر آج ان کی جگہ خالی ہو گی ۔ متبادل حفاظتی فورس اتنی جلدی فراہم نہیں ہو سکتی ۔ وہ دیکھ بھال کے اور بھروسے کے لوگ رکھتے ہوں گے ۔ اناڑیوں کو نہیں رکھتے ہوں گے اور کم ہمت لوگوں کو نہیں رکھتے ہوں گے ۔ اپنے مطلب کے آدمی مشکل سے ملتے ہیں اور انہیں بھی تربیت دے کر کام کی نوعیت اور فرائض کی اہمیت سمجھانے میں وقت لگتا ہے ۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج ان کی غنڈہ فورس اور حفاظتی فورس کی قوت کم سے کم ہے ۔ مزاحمت بھی کم سے کم ملے گی ۔ چنانچہ ہم آج رات حملہ کر دیں تو ہماری کامیابی کے امکانات زیادہ ہوں گے ۔"

ناذر نے بڑے جوش سے کہا " بالکل ٹھیک ۔"

میں نے کہا " اب سوال وہی آتا ہے جو سب سے اہم ہے یعنی یہ کہ ہم حملہ کب کریں گے ؟ کیسے کریں گے اور کس طرف سے کریں گے ؟ تو اس سلسلے میں ہم پہلے راما راؤ سے کہیں گے کہ ایک نقشہ بنائے اپنے اندازے کے مطابق ۔"

"میں بالکل صحیح نقشہ بنا سکتا ہوں ۔"

"اوکے ۔ نقشے میں اپنے گھر، مندر اور گودام ۔ تینوں کی

پوزیشن بتاؤ" میں نے کہا ۔

راما راؤ نے ایک سادہ کاغذ پر جینسل سے نقشہ بنایا ۔

"یہ ہے بیرونی احاطہ ۔ یہ گیٹ ۔ یہاں سے مندر کو جانے کا سیدھا راستہ ۔ یہ میرا گھر" اس نے لکیروں سے مقامات کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا " یہ چوکور خانہ ہے مندر ۔ یہ بڑا کمرہ مندر کے پیچھے یہ دوسری فصیل ہے ۔ پہلے مندر اور اناتھ آشرم کی ایک ہی فصیل تھی ۔ دونوں ایک ہی احاطے میں تھے ۔ بعد میں ایک اور دیوار اٹھا کر مندر کو الگ کر دیا گیا اور اناتھ آشرم کو گودام بنا دیا گیا ۔"

میں نے غور سے نقشے کا معائنہ کرنے کے بعد کہا " اس تقسیم سے پہلے مندر اور اناتھ آشرم کی عمارتوں کے درمیان کتنا فاصلہ تھا ؟"

"پہلے یہ ایک گراؤنڈ میدان تھا ۔ سو گز لمبا اور سو گز چوڑا" راما راؤ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا " مندر اور اناتھ آشرم جانے کے لئے ایک ہی راستہ استعمال ہوتا ہے ۔ سامنے گیٹ سے ۔ یہ راستہ اب صرف مندر کے لئے رہ گیا ہے ۔ یتیم خانے آنے کے لئے ۔ جب مندر کو الگ کیا گیا تو دیوار اس کے بیچ اٹھائی گئی ۔ مندر تقریباً وسط میں تھا چنانچہ ساٹھ گز چوڑا حصہ میں مندر اور اس کا احاطہ آ گئے ۔ چالیس گز کی چوڑائی اناتھ آشرم کو ملی ۔"

"یعنی اب مندر والا احاطہ سو گز لمبا اور ساٹھ گز چوڑا ہے اور جو اب گودام بن گیا ہے اس حصے کی لمبائی تو سو گز ہی ہے مگر چوڑائی چالیس گز ہے" میں نے کہا ۔

"دس ہزار مربع گز میں سے چھ ہزار مربع گز مندر کا ہے ۔ گودام کا رقبہ چار ہزار مربع گز ہے" غالب نے حساب لگا کے بتایا ۔

"اب گودام میں آنے جانے کے لئے دوسری طرف سے راستہ بنا دیا گیا ہے" راما راؤ بولا " اور چونکہ درمیان میں دیوار حائل ہے اس لئے یہاں سے کچھ پتا نہیں چلتا کہ ادھر کیا ہو رہا ہے ۔"

"مندر کی عمارت سے گودام کتنی دور ہے ؟" میں نے سوال دہرایا " اس نقشے سے واضح نہیں ہوتا ۔"

"یہ فاصلہ تقریباً بیس گز کا ہو گا ۔"

"درمیان میں کیا ہے ؟"

"کھلا میدان ۔ بیس گز چوڑا اور سو گز لمبا ۔"

"دائیں بائیں کچھ نہیں ۔ صرف فصیل ہے ۔"

"دائیں جانب غسل خانے ہیں اور رسوئی ہے ۔ جب یہاں اناتھ آشرم تھا غسل خانے بھی استعمال ہوتے تھے ۔"

"اور اب ؟" غالب نے کہا ۔

"اب کون استعمال کرے گا ؟" راما راؤ بولا ۔

"محافظ جو رہتے ہیں وہاں ؟"

"ان کے لئے جدید باتھ روم بنائے گئے ہیں ۔ عمارت کے اندر ہی آخری حصے میں ۔ دائیں جانب ۔ لیکن غسل خانے اور

وغیرہ سے ماقبل ۔ جب یہاں یتیم بچے رہتے تھے تو پرانی وضع کے غسل خانے اور بیت الخلا تھے جو ایک لائن میں بنے ہوئے ہیں اور اب بیکار پڑے ہیں ۔"

"پیچھے باتھ روم میرا مطلب ہے یہ پرانے غسل خانے اور بیت الخلا تعداد میں کتنے ہیں ؟ کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں" میں نے کہا ۔

"دائیں جانب ۔ میں دوسرا نقشہ بناتا ہوں ۔ اس سے سب واضح ہو جائے گا" راما راؤ بولا ۔

اس نے جو دوسرا نقشہ بنایا وہ کچھ یوں تھا ۔

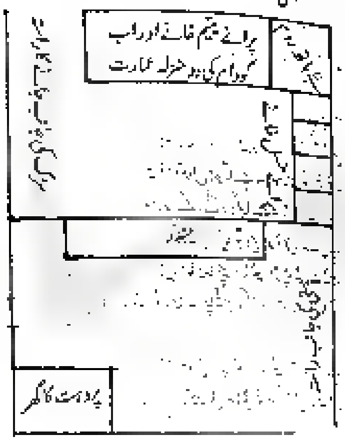

باری باری میں نے اور غالب نے نقشے پر غور کیا ۔ ناذر اور گل نے اس میں واجبی سی دلچسپی لی اور پھر نقشہ میرے سامنے رکھ دیا ۔

"یہ کام ہو سکتا ہے" میں نے کہا " اس نقشے نے بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے ۔ مسئلہ تھا گودام تک پہنچنے کا ۔ اور اس کے فاصلے پھیلے والے میدان کو عبور کرنے کا ۔"

غالب نے کہا " غالباً ٹرک اسی میدان میں کھڑے کئے جاتے ہوں گے ۔"

راما راؤ نے کہا " ہاں ۔ ٹرک عموماً گودام کے سامنے رہتے ہیں ۔ وہاں ان کی حفاظت کرنا آسان ہوتا ہے ۔"

میں نے کہا " ایک اور اہم سوال ۔ سنتری کہاں ہوتے ہیں ؟"

راما راؤ نے کہا " دو گیٹ پر ۔ ایک اندر اور دوسرا باہر ۔ پیچھے کی جانب کی فصیل کے اوپر خاردار تار ہیں ۔ ادھر سے کوئی اوپر چڑھ نہیں سکتا ۔ چڑھے گا تو مارا جائے گا ۔"

"کیسا ۔ تاروں میں بجلی ہے کیا ؟"

"ہاں ۔ تاروں میں ہر وقت کرنٹ رہتا ہے ۔"

"عام کرنٹ ۔ دو سو بیس وولٹ یا زیادہ ؟" میں نے کہا ۔

"میرا خیال ہے کہ یہ عام استعمال کی بجلی کا کرنٹ ہے ۔"

"اس کے علاوہ کوئی الارم بھی ہے ؟" میں نے پوچھا ۔

"الارم بھی ہے ۔ کوئی تار کاٹے تو الارم بجنے لگتا ہے ۔"

"ایسا ہی انتظام بائیں جانب بھی ہو گا ؟" غالب نے کہا ۔

"ہاں ۔ پرانے غسل خانوں کی چھت پر تاروں کے علاوہ دو سرچ لائٹس لگی ہوئی ہیں جو اندر کے احاطے کو روشن رکھتی ہیں ۔"

"اور درمیانی دیوار پر جو مندر کو گودام سے جدا کرتی ہے ؟"

راما راؤ نے کہا " تم نے دیکھا کہ مندر کی عقبی دیوار احاطے سے ملی ہوئی ہے ۔ مندر کا ایک دروازہ پہلے پیچھے بھی کھلتا تھا مگر جب دیوار اٹھائی گئی تو اسے بھی اینٹوں سے چن کر بند کر دیا گیا اور پلاستر کر کے برابر کر دیا گیا ۔ لیکن مندر کی چھت کے پچھلے حصے میں یعنی عین گودام کے سامنے ایک چوکی سی بنی ہوئی ہے ۔ اس میں بھی دو مسلح محافظ ہر وقت موجود رہتے ہیں ۔ ان کے پاس دوربین بھی ہوتی ہے ۔ وہ گیٹ سے اندر آنے والے ہر شخص کا اور ہر گاڑی کا جائزہ لیتے رہتے ہیں ۔ گودام اور اس کے سامنے کھڑے ہوئے ٹرک بھی ان کی زد میں ہیں ۔"

غالب نے مایوسی سے سر ہلایا " ایسی صورت میں احاطے کو عبور کر کے گودام تک پہنچنا عملاً ناممکن ہے ۔"

ناذر نے اس کی تائید کی " خودکشی کرنا چاہے آدمی تو اور بات ہے ۔"

گل نے بھی کہا " دونوں طرف سے اندر داخل ہونے کی کوئی صورت نہیں ۔"

میں نے اس وقت انھیں اپنے پلان کی بنیادی تفصیلات بتانے سے گریز کیا ۔ میں پہلے تمام معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا اور پھر اچھی طرح غور کرنے کے بعد راما راؤ کی عدم موجودگی میں سب سے مشورے سے اسے آخری شکل دینا چاہتا تھا ۔

باقی سب خاصے مایوس تھے ۔ سرچ لائٹس اور محافظوں کی موجودگی میں صحن کی ساٹھ فٹ چوڑائی سے گزرنا واقعی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا ۔ کھلے میدان میں ایک چوہا بھی حرکت کرتا تو انہیں نظر آ جاتا ۔ ہم کیسے چھپ سکتے تھے ۔

ناذر نے کہا " سرچ لائٹس آف نہیں ہو سکتیں ؟ فرض کرو یہاں کی بجلی بھی بند کرا دی جائے ۔"

میں نے کہا " ہر روز یہ کھیل نہیں ہو سکتا بابا ۔"

غالب نے کہا " ہو سکتا ہے ۔ اس طرح کہ آج میں اور ناذر جائیں اور پکڑے جائیں ۔ کل تم اور گل جاؤ ۔ سب اکٹھے ہو جائیں گے ۔"

راما راؤ نے کہا " یہاں الگ جنریٹر ہے ۔ بجلی جاتے ہی خود چل پڑتا ہے ۔"

"یہ عمارت جو پہلے اناتھ آشرم تھی ۔ اس میں کتنے کمرے ہیں اوپر نیچے ؟"

"دس کمرے اوپر ہیں ۔ دس نیچے بھی تھے مگر بعد میں دو کو ملا کر ایک بڑا کمرا بنا دیا گیا ۔ درمیانی دیوار نکال دی گئی ۔"

"ظاہر ہے گودام کے لئے بڑے ہال بہتر رہتے ہیں ۔ اور کیا

www.paksociety.com

ہے؟"

"اوپر رہائشی کمرے ہیں۔ بالکل دائیں جانب پرانے غسل خانوں کی قطار میں نئے باتھ روم بنا دیئے گئے ہیں" راما راؤ نے کہا۔

"غالباً سیوریج لائن پیچھے سے گزرتی ہوگی۔"

"سیوریج کی کوئی لائن نہیں ہے۔ سیپٹک ٹینک ہیں۔"

"سیپٹک ٹینک کیا ہوتے ہیں؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "سیوریج کا پرانا نظام۔ ایک کنواں کھود کے اس میں آٹھ دس فٹ تک پتھر بھر دیتے ہیں بڑے بڑے۔ اس کا منہ اوپر سے بند کر دیا جاتا ہے۔ سارے غسل خانوں اور بیت الخلا وغیرہ کی لائن کو اس ٹینک سے ملا دیا جاتا ہے۔ پانی نیچے اتر جاتا ہے اور زمین کی گہرائی میں جذب ہوتا رہتا ہے۔ پانچ سات یا دو چار سال میں ایک بار اسے کھول کے اوپر جمع ہو جانے والی غلاظت کو صاف کر دیا جاتا ہے۔"

"وہ کھاد بنانے میں کام آتی ہے۔ زمین میں دبا دیتے ہیں... کہیں گھاس پھوس مویشیوں کے گوبر کے ساتھ۔"

راما راؤ نے اچانک گھڑی دیکھ کر کہا "اب میں جاتا ہوں۔ آج دوپہر کا کھانا تمہیں خود ہی بنانا پڑے گا۔ باغیچے میں سبزیاں میں خود اگاتا ہوں۔ جو پسند آئے نکال لو۔ ویسے دال چاول بھی ہیں۔"

"گوشت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" غالب نے آہ بھر کے کہا۔

میں نے کہا "لوگ کہتے ہیں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ ایسے ہی برہمن کے گھر میں ماس کہاں۔"

راما راؤ ہنسا "اب تم سے تو کوئی بات بھی نہیں چھپائی میں نے۔ جب شراب پیتا ہوں میں اور دنیا کی ہر برائی میں ملوث ہوا تو گوشت کھانے کا گناہ کیا چیز ہے۔ لیکن دنیا والوں کے سامنے برہمن بن کر رہنا ہی پڑتا ہے۔ کبھی مرغی خود ہی کاٹ کے ذبح کر لیتا ہوں اور پکا کر کھا لیتا ہوں۔ اس کا بھی بہت خیال رکھنا پڑتا ہے کہ پر اور فالتو حصے نظر نہ آئیں۔ گڑھا کھود کے دبا دیتا ہوں۔"

"جب تم مرغی خریدتے ہو تو کوئی پوچھتا نہیں کہ پروہت جی کیا کرو گے اس کا؟"

"کیا تم مجھے اتنا بے وقوف سمجھتے ہو کہ میں مرغی خریدوں گا۔ مجھے تو ویسے بھی مفت کا کھانے کی عادت پڑ گئی ہے" وہ ہنسا "میں چراتا ہوں۔ دور گاؤں کی خبر لو۔"

"اچھی طرح خبر لینا" نازو نے کہا۔

"تم مذاق سمجھ رہے ہو۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ بستی والے تمہارے کیسے جانی دشمن ہو رہے ہیں۔ تمہیں راکشش کہا جا رہا ہے۔ ہر شخص کسی کے بچے پر قسم کھا رہا ہے کہ وہ راکشش مل جائیں تو وہ خود ان کا خون کرے گا۔ مرنے والے بے کام کرتے تھے۔"

"اور برے کام کا برا انجام ہوتا ہے۔"

"ہاں۔ مگر ان کے رشتے اور جذبات تو نہیں بدلتے۔ خونی رشتوں میں انہیں روتے ہیں۔ کسی کے ماں باپ، کسی کے بھائی بہن۔"

"مجھے ان سے یقیناً ہمدردی ہے۔ شاید انہیں علم نہیں تھا کہ ان کے بھائی اور بیٹے کس راہ پر چل رہے ہیں۔ یا اگر علم تھا تو وہ بے بس تھے۔ یا اس لئے خاموش تھے کہ انہیں بھی فائدہ پہنچ رہا تھا" غالب نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ تمہیں بہت محتاط اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ میرے سوا یہاں تمہارا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہے۔ سب تمہارے خون کے پیاسے شکاری ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا۔ ساری دنیا شکاری ہے۔ پھر شکار کون ہے؟ کوئی نہیں۔ وہی شکار بھی ہیں جو شکاری ہیں۔ مثلاً تم۔"

"یہ ایک منطقی استدلال ہے جس کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا" میں نے کہا "تم واپس کب آؤ گے؟"

راما راؤ جاتے جاتے رک گیا "میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب بھی مجھے موقع ملا چکر لگا جاؤں گا۔ اگر کوئی خاص بات نہ ہوئی۔"

راما راؤ کے جاتے ہی میں نے نازو اور گل کو کچن کی طرف روانہ کیا اور خود غالب کے ساتھ نقشے پر کر بیٹھ گیا۔

"میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے جو کامیاب ہو سکتا ہے اگر قسمت ساتھ دے۔"

"قسمت ساتھ دے تو آدمی بغیر منصوبے کے بھی کامیاب ہو جاتا ہے میاں سکندر اعظم۔"

"اس میں خطرے سے بچنے اور دشمن پر بے خبری میں وار کر کے اسے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ ذرا اس نقشے پر غور فرمایئے۔"

"میں غور فرما رہا ہوں۔"

"میرا پلان بہت سیدھا سادا ہے لیکن احتیاط طلب اور مشکل ہے۔ ادھر دائیں جانب جو پرانے غسل خانے ہیں وہ اب استعمال نہیں ہوتے۔ اس طرف سے ہم اندر جا سکتے ہیں" میں نے کہا۔

غالب ایک دم ساری بات سمجھ گیا "واقعی۔ یہ تو آسان ہے۔ افسوس ہے کہ یہ بات مجھے نہیں سوجھی۔"

"ایک تو یہ عقل کی کوتاہی کا مسئلہ ہے۔ دوسرے استعمال کا۔ چنانچہ ہر بات جو میرے ذہن میں آتی ہے وہ آپ کی کھوپڑی میں نہیں آ سکتی۔ ہم اگر رات کے وقت اس کا آغاز کریں۔ ہمیں ڈیڑھ سے دو فٹ مربع جگہ بنانے کے لئے اینٹوں کو نکالنا ہوگا؟"

"ایک اینٹ کی لمبائی ہو آٹھ انچ۔ تو ایک قطار بنانے کے لئے اینٹوں کو نکالنے سے ۲/۱ فٹ کی چوڑائی۔ پھر اوپر سے نیچے اینٹوں کو نکالا جائے تو ہوئے تقریباً بارہ پندرہ انچ۔ دو چار انچ اور پندرہ انچ کے خلا سے ہم سب گزر سکتے ہیں۔ تو اینٹوں کو نکالنے میں کتنا وقت صرف ہو گا؟" میں نے کہا۔

غالب نے ایک کاغذ پنسل لے کر نقشے کی شیٹ پر حساب لگایا "اصل مسئلہ پہلی اینٹ نکالنے کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد باقی اینٹوں کو ہلا کر نکالا جا سکتا ہے۔ پہلی اینٹ کے چاروں طرف چونے کا مسالہ ہو گا تو اسے کھرچنا نسبتاً آسان ہوگا۔ سیمنٹ ہوا تو مشکل ہو گی۔"

"اس کے لئے چھ انچ بس بھی کافی ہیں۔ بیک وقت دو آدمی اس کام میں لگ جائیں تو ایک انچ کی چوڑائی کو دس پندرہ منٹ میں کھرچ سکتے ہیں۔ ایک اینٹ نکل جانے کے بعد باقی آٹھ اینٹوں میں آٹھ دس منٹ سے زیادہ نہیں لگ سکتے۔"

"پندرہ اور دس ہوئے پچیس منٹ۔"

"پچیس منٹ کے بعد ہم پہلے غسل خانے یا بیت الخلا میں ہوں گے۔ اب پھر اس نقشے کی طرف آیئے۔ ایسی ہی سات دیواریں اور آئیں گی۔"

غالب نے پھر حساب لگا کے کہا "یہ تقریباً تین گھنٹے کا کام ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ وقت کچھ اور کم ہو جائے گا۔ اگر ہم نے پھرتی اور مستعدی سے کام کیا۔ ہمارے لئے خطرات کی بات تو کوئی نہیں ہو گی۔ ہم اندھیرے میں ہوں گے۔ باہر سے ویسے بھی کون دیکھ سکتا ہے۔ دروازے نہ جانے کب سے بند پڑے ہیں۔ چھت کے اوپر کوئی محافظ نہیں ہے۔ صرف سرچ لائٹس ہیں اس لئے خطرہ بھی نہیں کہ کھرچنے کی آواز کسی کے کانوں تک پہنچ جائے گی۔ ہم کو صرف پہلی دیوار میں شگاف ڈالتے ہوئے خطرہ ہو گا۔ جب ہم مقبرہ کی دوسری جانب ہوں گے۔ لیکن وہ آخری کنارا ہے۔ وہاں ہمیں رات کے وقت کون دیکھنے آئے گا۔ لاولیکن ہماری شامت اعمال کسی کو بلا لے۔"

"آج رات چاندنی ہوگی۔"

"چاند کی کون سی تاریخ ہے آج؟" میں نے سر کھجا کے کہا۔ "مجھے اسلامی تاریخ بھی یاد نہیں۔"

"عورتوں کو عموماً معلوم ہوتی ہے اسلامی تاریخ" غالب نے کہا اور نازو کو آواز دی۔

"ابھی کچھ نہیں پکا" نازو نے وہیں سے جواب دیا "ابھی تو میں نے چولہا بھی نہیں جلایا۔"

"چولہے میں گیا چولہا۔ جب ہم پکار رہے ہیں تمہیں۔ تو تمہیں دست بستہ حاضر ہونا چاہئے کنیز" غالب نے چلا کے کہا "ارشاد۔"

"ورنہ کیا؟" نازو نے وہیں سے منع کیا۔

"ورنہ بدولت خود تشریف لانے پر مجبور ہو جائیں گے" غالب نے کہا۔

لاچار اسے ہی نواب شہنشاہ کی کنیز کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔ لاتعلقی کا اعلان کرتا "انہیں سب جاہل ہیں۔ ان کا کیا واسطہ اسلام سے اور اسلامی تاریخ سے۔ ایک کہتی ہے ہو گی دس پندرہ تاریخ۔ دوسری نے فرمایا کہ چلو تمیں چالیس کر لو۔ تاہم گل نے حلفیہ بیان دیا ہے کہ گزشتہ رات آسمان سے چاند غیر حاضر تھا۔ مطلع صاف تھا اور اسے اپنی نظر پر بھروسہ ہے۔"

"خیر دیکھیں گے رات کو۔ چاندنی نہ ہوئی تو خطرہ کم ہو گا۔ پہلے شگاف کی پہلی اینٹ نکالنے کے لئے ایک آدمی جائے گا۔ کالی چادر اوڑھ کے کام کرے گا اور جب وہ راستہ بنا لے گا تو باقی سب کو بلا لے گا۔ جو اینٹیں نکالی جائیں گی وہ اسی ترتیب سے واپس جما دی جائیں گی تاکہ بعد میں کسی کو غلط محسوس نہ ہو" میں نے کہا۔

"اگر ہم نے رات نو دس بجے کے درمیان اس کام کا آغاز کیا تو آدھی رات کے بعد بارہ ایک کے درمیان ہم عین آخری دیوار کے سامنے ہوں گے۔ پھر آئے گا اس دیوار کا مرحلہ جو گودام کے آخری کمرے کی وہ دیوار ہے جو آخری غسل خانے سے ملی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "رہائشی کمرے اوپر ہیں۔ اگر ہم احتیاط سے کام لیں تو اس دیوار سے گزر کے پہلے گودام میں داخل ہو سکتے ہیں۔ غسل خانوں کی سرنگ میں ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں۔"

"سوائے ایک خطرے کے۔"

"وہ کیا؟" میں نے کہا۔

"خطرہ یہ ہے کہ مسماۃ نازو اور گل بانو کے ازلی دشمن وہاں موجود ہوں گے۔ حشرات الارض اور کاکروچ۔ چھپکلی اور مکڑیاں وغیرہ۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "یہ سب تو ہوں گے۔ غسل خانے اور بیت الخلا مدت سے بند جو پڑے ہیں۔"

"پھر وہ ماریں گی چیخ اور سارا منصوبہ ہو جائے گا چوپٹ۔"

میں نے کہا "انہیں سمجھا دیں گے۔ ویسے وہ خود ہی سمجھدار ہیں۔"

"وہ بہادر ہیں۔ حسین ہیں۔ وفادار ہیں۔ سب کچھ ہیں لیکن چھپکلی اور کاکروچ کے معاملے میں بات سمجھداری کی نہیں نفسیات کی ہے۔ خیر ہم انہیں اپنی جان کی قسم دے دیں گے۔ یا ان کے منہ بند کر دیں گے۔ کپڑا ٹھونس دیں گے۔ تم آگے بتاؤ۔"

"آگے کیا بتاؤں۔ جب ہم قلعے کے اندر داخل ہو گئے تو پھر قلعے کو تسخیر کرنا ہے" میں نے کہا "گودام بارہ سے متصل ہوں گے۔ پہلے تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ گودام خالی نہیں ہیں تو مال کیا ہے۔ پھر یہ کہ ایک ہال کا راستہ دوسرے ہال تک ہے یا نہیں۔ اگر دروازے سب کمروں کو آپس میں ملاتے ہیں تو وہ کھلے ہوئے ہیں یا بند ہیں۔ بصورت دیگر ہمیں ایک ہال سے دوسرے ہال تک جانے کے لئے وہی نقب زنوں والا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ مجھے امید تو یہی ہے کہ رات کے وقت کسی ہال میں کوئی بھی نہیں ہو گا۔ سب اوپر ہوں گے یا اپنی اپنی جگہ ڈیوٹی دے رہے ہوں گے۔ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی اور ہم اندر ہی اندر آ جائیں۔"

www.paksociety.com

ہاں تک پہنچ جائیں گے۔ اس کام میں مزید دو گھنٹے صرف ہو سکتے ہیں۔"

"اس کے بعد؟"

"اس کے بعد اصل مرحلہ شروع ہوگا۔ جب ہم اوپر جائیں گے۔ رابعہ اور محسن کو اوپر ہی رکھا گیا ہوگا۔ یہ نہیں معلوم کہ اوپر جانے کا راستہ کس طرف سے ملے گا۔"

"یہ ہم راما راؤ سے پوچھ لیں گے۔"

"ہاں۔ اگر زینہ باہر ہے تو پھر دیکھنا پڑے گا کہ باہر کیسے نکلا جائے۔ ممکن ہے اس کے لئے بھی دیوار میں سے راستہ بنانا پڑے۔ اگر کوئی غیر متوقع بات نہ ہوئی تو ہم رات کے دو ڈھائی بجے کے بعد اصل کارروائی کا آغاز کر سکتے ہیں۔"

"یعنی ٹرک میں سے شملا کو نکالنے کی کارروائی؟"

"بے وقوف وہ ٹرک میں نہیں ہیں۔ راما راؤ نے جو بات ہمیں سمجھائی تھی وہ سو فیصد درست تھی۔"

"میں بھول گیا تھا۔ دراصل دماغ میں تو وہی شیشے کا تابوت رہتا ہے نا۔ شہریار کیا وہ ایک ہی جگہ ہوں گے؟"

"ہو بھی سکتے ہیں۔ اور نہیں بھی۔" میں نے کہا "دشمن اگر محسن کی جذباتی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ کریں کہ اسے بیوی بچے کی ایک جھلک دکھا دیں۔ تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہوگا۔ لیکن وہ شملا اور اس کے بچے کی موجودگی کو راز رکھنا چاہیں گے تو انہیں الگ رکھیں گے اور دور دور رکھیں گے۔ جہاں وہ ایک دوسرے کی آواز بھی نہ سن سکیں۔ ورنہ وہ آواز پہچان لیں گے۔ رابعہ اور محسن اگر پہلے کمرے میں ہوئے تو شملا اور اس کا بیٹا آخری کمرے میں ہوں گے۔"

"فرض کرو ہم اوپر پہنچ گئے۔ پھر؟"

"پھر تو کھلی جنگ ہوگی۔ رات دو ڈھائی بجے سب سو رہے ہوں گے۔ مگر اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی جاگ رہا ہو۔ یہ سب ابھی سے طے نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اوپر پہنچ جانے کے بعد اس کے سوا کوئی واپسی کی صورت نہیں ہوگی کہ ہم دشمن کا صفایا کر دیں۔ جو سامنے آئے اسے مار دیں۔ اپنے دوستوں کو نکالیں اور مقابلہ کرتے ہوئے نکل جائیں۔"

غالب نے کہا "بظاہر تو منصوبہ مکمل ہے۔ زبانی جمع خرچ کی حد تک۔"

میں نے کہا "اندر جانے سے پہلے ہمارے پاس صرف ریوالور ہوں گے اور ایک دستی بم بھی ہوگا لیکن اندر پہنچ جانے کے بعد سب کچھ مل جانے کی امید کی جا سکتی ہے۔"

"سب کچھ کیا؟"

"ہر قسم کا اسلحہ۔ صرف ایک دستی بم اور ریوالور تو مقابلے کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔ ان کے پاس اسٹین گنیں ہوں گی۔ گودام سے مل جائیں تو کیا بات ہے ورنہ ہم انہی سے چھین لیں گے۔ کامیابی کا انحصار ہماری بھرپور قوت پر ہے۔ ہم آدھی رات [illegible] اچانک قہر الٰہی بن کے ٹوٹ پڑیں۔ وہ سوچتے ہی رہ جائیں کہ آخر ہم ان کے دفاعی انتظام کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ پلان میں کوئی خامی نہیں [illegible] تائید خداوندی کی ضرورت ہے" غالب نے کہا۔

"ظاہر ہے اس کے بغیر ہم کیا اور ہماری کوشش" [illegible] نے کہا۔

آدھے گھنٹے کے بعد نازو نے اعلان کیا کہ کھانا [illegible] ہم نے منصوبے کی آخری جزئیات پر بحث ختم کی۔ [illegible] آٹے کی روٹیاں۔ مکھن اور مولیاں۔ خالص [illegible] چار صحت بخش اجزا تھے۔ شہر میں تو ان نعمتوں کا تصور [illegible] کیا جا سکتا۔ جہاں لوگ ناخالص چیزیں خوب مزے [illegible] ساتھ کھاتے ہیں اور جسم کے ان میں ذائقہ پیدا کر [illegible] چٹخارے پر صحت کو قربان کر کے بلڈ پریشر [illegible] اور انجائنا جیسی فیشن ایبل بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لمبی ڈگریوں والے اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کی لمبی [illegible] کر کے دواؤں سے شوق کرتے ہیں اور ایک "اضافی" کے طور پر خارج کے لئے "اسٹیٹس" بنتے جاتے ہیں۔

زندگی میں پہلی بار میں نے [illegible] کی روٹی کے [illegible] مکھن کے ذائقے کو محسوس کیا۔ ہم سب [illegible] کسی نے اگر کاریں دیکھا تھا تو فلموں میں [illegible] ٹرین کی کھڑکی سے۔ غالب نے بھی پہلے [illegible] اس نے بھی میری طرح زیادہ کھا لیا۔ نازو کو پھر [illegible] اور روٹیاں پکا کے لانی پڑیں۔

دن بہت لمبا ہو گیا تھا۔ وقت کی سست رفتاری [illegible] ابھی صرف ایک بجا تھا۔ نازو اور گل تو کھانے کے فوراً [illegible] دراز ہوتے ہی سو گئی تھیں۔ میں نے غالب کو بھی [illegible] دوسرے کمرے میں جا کے سو جائے۔ میرا ارادہ [illegible] تھا لیکن کچھ دیر بعد مجھ پر بھی غنودگی غالب آنے [illegible] نہیں کب میں بھی قالین پر دراز ہو کے سو گیا۔ [illegible] تھکن کا اثر تھا کہ ہم سب مردوں کی طرح پڑے رہے [illegible] کوئی دشمن آ جاتا تو کسی مزاحمت کے بغیر ہم سب [illegible] میری آنکھ روشنی کی یلغار سے کھلی۔ میں نے [illegible] اپنے سامنے راما راؤ کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ [illegible] تھی۔

"اندھیرا ہو گیا!" میں نے حیرانی سے کہا اور گھڑی دیکھی۔

"سات بجے ہیں" راما راؤ نے مجھے مطلع کیا۔

"تم کب آئے؟"

"ابھی آیا ہوں۔ اندر اندھیرا دیکھ کر میں [illegible] کوئی آواز بھی نہیں تھی اندر" وہ بولا۔

"سب سو رہے ہیں" میں نے کہا۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں [illegible] بہت دیر ہو گئی سب کو سوتے

"تم نے اچھا کیا جگا دیا۔ اب اٹھ جانا چاہئے۔"

ہماری آواز سن کے نازو اور گل بھی اٹھ بیٹھی تھیں۔ دوسرے کمرے سے غالب آنکھیں ملتا ہوا نمودار ہوا۔

"صبح کے سات بجے ہیں یا شام کے؟"

"تمہارے لئے کیا صبح شام سے کیا فرق پڑتا ہے؟" راما راؤ نے کہا۔

غالب نے جماہی لے کر کہا "کوئی تازہ خبر؟"

راما راؤ نے کہا "خبر تمہاری خبریں ہیں۔"

میں نے کہا "ذرا میں منہ دھو لوں۔ آنکھیں اور کان کھل جائیں۔"

"[illegible] کے بغیر بیدار نہیں ہوگا" غالب نے کہا اور [illegible] کہا "یا اللہ کے نام پر یہ نیکی کر دو کی تم ٹیک رہیو؟" [illegible] "میں نے کہا "دعا میں تو اور بھی ہیں" [illegible] "کل ادا وقت ادا۔" [illegible] "سدا خوش رہو۔ جگ جگ جیو۔ سدا سہاگن [illegible]" غالب نے بڑی بوڑھیوں کی نقل کی۔

نازو اور گل ان دعاؤں کے ختم ہونے سے پہلے ہی واک [illegible] میں چلی گئیں۔ راما راؤ کچھ سمجھا نہیں مگر ہنسنے لگا۔ کچھ دیر بعد [illegible] ہاتھ منہ دھو کر آ گئے۔ اب ہماری ساری تھکان [illegible] دور ہو گئی اور چھ گھنٹے کی نیند نے ہمیں آنے والی رات کی ہر آزمائش سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عطا کر دیا تھا۔

"میں بھی اب چلا جاؤں گا یہاں سے" راما راؤ نے کہا۔

"اتنی جلدی فیصلہ کر لیا؟"

"ہاں۔ میرا دل پہلے بھی بھر گیا تھا اس جگہ سے۔ میں اتنا [illegible] تنگ کر نہیں بیٹھا" وہ بولا "اس بستی کے سیدھے سادے لوگوں کو دھرم کے نام پر بے وقوف بنانے میں کوئی مزہ نہیں تھا۔ بالک رام کو میری ضرورت تھی اس لئے یہ کھیل [illegible] یہاں تک جو کچھ ملا اسی کے کاروبار کی وجہ سے ملا۔ [illegible] کے پاس دینے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔"

"تم کچھ افسردہ اور نادم نظر آ رہے ہو۔"

"ہاں۔ سولہ گھروں میں موت کا رقص دیکھ کر میں بھی دکھی ہو گیا ہوں۔ مجبوری ہے ورنہ میں کریا کرم سے پہلے ہی بھاگ جاتا۔ [illegible] "مرنے والوں کے لواحقین بڑی عقیدت کے ساتھ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی آخری رسوم مذہبی روایات کے مطابق ہوں تاکہ مرنے والوں کی آتما کو شانتی ملے۔ اور وہ مکتی پا کے پرلوک میں جائیں۔ مرنے والوں کے کریا کرم کیسے تھے [illegible] کوئی نہیں دیکھتا۔ یہ عقل کا نہیں جذبات کا معاملہ ہے اور مجھے [illegible] افسوس ہوتا ہے کہ میں نے جینے والوں کے ساتھ تو دھوکا کیا [illegible] مرنے والوں کے ساتھ بھی دھوکا کروں گا۔ جو کچھ میں کریا کرم [illegible] کراؤں گا سب جھوٹ ہوگا۔ کوئی حقیقی پروہت ہوتا تو [illegible] اسے یہ احساس نہ ہوتا۔ وہ نیک نیتی سے سب کچھ کرتا۔"

"اس سے پہلے کبھی پچھتاوے کا احساس ہوا تھا تمہیں؟"

"نہیں۔ میں نے ایک سے ایک بڑا فراڈ کیا۔ لیکن ان کے ساتھ جو خود فراڈ تھے۔ جن کے پاس اتنا پیسہ تھا کہ ان کو لوٹ کر افسوس نہیں ہوتا۔ یہ اطمینان حاصل ہوتا تھا کہ کسی نے تو ان سے کچھ لیا۔ استحصال اور لوٹ مار سے پیسہ جمع کرنے والے لاشعوری طور پر احساس گناہ میں مبتلا رہتے ہیں۔ میں ان کی روح کی تسکین کے لئے ایسے ڈرامے کرتا تھا کہ وہ وقتی طور پر مطمئن ہو جاتے تھے۔ میں پیر فقیر کے بھیس میں انہیں خدمت کا موقع دیتا تھا۔ ہندو سیٹھ ہو۔ تو جوگی سنیاسی بن کے۔ مسلمان ہو۔ تو [illegible] کسی [illegible] پیر یا مجذوب کے روپ میں... مت پوچھو ان کی نفسیاتی کمزوریوں سے میں نے کس طرح فائدہ اٹھایا۔ بڑی لمبی کہانی ہے مگر وہ سب اسی سلوک کے مستحق تھے۔"

نازو اور گل جب چائے لے کر آئیں تو وہ خاموش ہو گیا۔

"میں ابھی شام کی پوجا ارچنا سے فارغ ہو کر ادھر آ گیا۔ مجھے واپس بھی جانا ہے" راما راؤ نے کہا "مندر میں لوگ بہت رنجیدہ اور ملول تھے۔ ڈرے ہوئے تھے اور مشتعل تھے۔ پولیس کے آدمی ان کے درمیان سادہ کپڑوں میں موجود تھے۔ سب نے دیکھ لیا تھا۔ اس لئے کوئی بولا نہیں۔"

"پولیس نے آج سارے دن کوئی بات معلوم کی؟"

"انہوں نے یہ معلوم کیا کہ یہ کارروائی تخریب کاروں کے کسی گروہ کی ہے" راما راؤ نے کہا "ایسے میں بے سروپا نتائج اخذ کرتے ہیں یہ لوگ۔ بھلا یہاں تخریب کاروں کا کیا کام۔ یہ کوئی اہم جگہ ہے دفاعی نقطۂ نظر سے۔ نہ کوئی ایسا پروجیکٹ ہے۔ مثلاً ایٹمی ریسرچ کا۔ یہاں تو کوئی فیکٹری، ڈیم یا پاور پلانٹ تک نہیں ہے۔"

میں نے اور غالب نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ پولیس کی رائے غلط نہیں تھی۔ یہ رائے انہوں نے ابھی تفتیش کے بعد قائم نہیں کی تھی۔ انہیں پہلے ہی بتا دیا گیا ہوگا کہ یہ کارروائی کس نے کی ہے۔

"پولیس نے کسی کو گرفتار کیا؟"

"ہاں۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا انہیں۔ خانہ بدوشوں کے ایک خاندان کو گھیر لائے تھے۔ سارا دن ان کو جوتے مارے پھر چھوڑ دیا۔ وہ اعلیٰ افسر بھی آئے تھے۔ انہوں نے بستی کے آس پاس ہر طرف باہر نکلنے والے راستوں کی نگرانی کا حکم دیا اور واپس چلے گئے۔"

"کیا خیال ہے ان کا۔ قاتل کہاں ہیں؟"

راما راؤ نے کہا "وہ سمجھتے ہیں کہ تم لوگ راتوں رات بھاگ گئے۔ لیکن تم واپس آؤ گے دو چار دن میں۔ اس وقت وہ تمہیں پکڑ لیں گے۔ بستی کی طرف آنے والے سارے راستوں کی سخت نگرانی کی جا رہی ہے۔ سادہ کپڑوں میں پولیس بھی ہے اور دوسرے لوگ بھی۔"

"دوسرے کون؟"

www.paksociety.com

"حرمونی نے کچھ لوگ بھیجے ہیں" راما راؤ نے کہا۔
"وہ نہیں یہ شک بالکل نہیں کہ ہم بستی میں بھی رہ سکتے ہیں؟"
راما راؤ نے نفی میں سر ہلایا "یہ شک کیسے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تمہیں تلاش کرتے رہے ہیں۔ لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ مسلمان گھروں پر زیادہ سختی کی گئی۔"
"وہ کیوں؟"
"شاکر علی کی وجہ سے۔ کچھ لوگوں نے شاید یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ حملہ آوروں کی شاکر علی نے مدد کی۔ اس کو پیسہ دیا مگر بعد میں خود ہی مار گئے اسے۔"
"یہ کیسے ثابت ہوا؟" میں نے کہا۔
"اس کے گھر میں لاشوں کے ساتھ ہی وہ پیسہ بکھرا پڑا تھا۔ پولیس نے شاکر علی کے سب ملنے جلنے والوں کے گھروں میں گھس کر دیکھا۔ صندوق اور الماریاں تک کھلوائیں۔ اس بہانے وہ بہت کچھ مار گئے۔"
"یہ تو ہوتا ہے" غالب نے تلخی سے کہا۔
"یہ بتاؤ۔ لاشیں واپس مل گئی ہیں یا نہیں" میں نے کہا۔
"لاشیں ابھی تک واپس نہیں آئی ہیں۔ اب کل ہی ہو گا ان کا کریا کرم" راما راؤ نے کہا "اس وقت بستی میں عجیب سناٹا ہے۔ بازار بھی بند ہیں۔ لوگ گھروں میں چھپے بیٹھے ہیں کہ باہر نکلے تو وہ بھی مارے جائیں گے۔ پولیس نے الگ دہشت پھیلا رکھی تھی۔ وہ بھی اب تھک ہار کر بیٹھ گئے ہیں۔"
"کہاں بیٹھ گئے ہیں؟" میں نے کہا۔
"ایک مندر میں ہے۔ ایک کی ڈیوٹی ٹھیکیدار کے گھر پر لگی ہے۔ ایک شاید تمہیں گودام میں بھی بھیجا گیا ہے۔ وہ گشت پر رہتا ہے مگر مجھے معلوم ہے ان کو بھی گودام کی حفاظت کرنی ہے۔ وہاں آج محافظ کم پڑ گئے ہیں نا۔"
یہ سب میری توقعات کے عین مطابق ہوا تھا۔ حالات آج کی رات ہمارے مشن کے لئے سازگار ہوتے جا رہے تھے۔
"کیا جبل... خود آیا تھا یہاں؟" میں نے کہا۔
"سنا ہے کہ آیا تھا مگر فوراً ہی واپس چلا گیا۔"
"اس کے ساتھ اور کون تھا؟"
"یہ تو معلوم نہیں۔ لیکن ایک شخص اس کا ساتھی معلوم ہوتا ہے۔ صورت سے بھی وہ دادا لگتا ہے۔ اور پولیس سے تو ایسے بات کرتا ہے جیسے اس کے زر خرید ہیں۔ اور پولیس جو بستی کے سیدھے سادے غریب لوگوں کو تفتیش کے نام پر ہراساں کر رہی ہے، اس کے سامنے 'باادب باملاحظہ ہوشیار' رہتی ہے۔"
میں نے کہا "اس کا نام کیا ہے؟"
"نام تو میں نے نہیں پوچھا لیکن معلوم ہو جائے گا۔"
"حلیہ بتا سکتے ہو......؟"
"ہاں۔ کالا رنگ ہے۔ چہرے کے نقوش سے جنوبی ہند کا لگتا ہے مگر تامل، تیلگو یا ملیالم۔ کوئی زبان نہیں جانتا۔ مجھے سے بھی ساؤتھ انڈیا کا نہیں لگتا۔ موٹے ہونٹ ہیں ہونٹ سخت اور چھوٹے چھوٹے بال۔"
"کانوں میں پیتل کی مندریاں..." میں نے کہا۔
"مندریاں کیا؟" راما راؤ حیران ہو کے بولا۔
"بالیاں چھوٹی چھوٹی..."
"تم جانتے ہو اسے؟" راما راؤ نے کہا۔
"ہاں۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں" میں نے کہا۔
"پھر تو نام بھی معلوم ہو گا تمہیں اس کا۔"
"اس کے نام کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ ضرورت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن راما راؤ! اس سے ہوشیار رہنا۔ خطرناک آدمی ہے۔"
"میرا کیا تعلق اس سے؟"
"بات تعلق کی نہیں۔ اس کی بھی ایک چھٹی حس ہے۔ کتے کی طرح سونگھ لیتا ہے اپنے دشمنوں کی بو کو۔ اسے شک ہوا تو وہ تمہارے پیچھے لگ جائے گا اور یہاں تک آ پہنچے گا۔ کیا تم واپس جاؤ گے؟"
"ہاں۔ میرا کچھ کام باقی ہے۔ لاشیں واپس آ جائیں تو بھی لوٹ آؤں گا تو دس بجے تک۔ میرا بھوجن تو آ جائے گا پھر خود ہی کچھ کرنا ہو گا رات کے کھانے کے لئے۔"
میں نے کہا "وہ ہم کر لیں گے۔ آج کی رات ہم اپنا کام کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جو اصل کام ہے اور جس کے لئے ہم نے یہاں چھپ کے پورا دن گزارا تھا۔ ہم کل کا انتظار نہیں کر سکتے۔"
غالب نے کہا "یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری پھر ملاقات نہ ہو سکے۔ تم لوگ ابھی جا رہے ہو؟"
میں نے کہا "ابھی کا مطلب ہے نو دس بجے تک۔ بہتر ہو گا کہ تم ساری بات سن لو" میں نے کہا اور اسے اپنے پلان سے آگاہ کر دیا۔
وہ بڑی توجہ سے سنتا رہا "میں تمہیں روک تو نہیں سکتا۔ تمہاری کوئی مدد بھی نہیں کر سکتا۔"
"جتنی مدد تم نے کی ہے وہ کافی ہے" میں نے کہا۔
"اگر سب کچھ تمہاری توقعات کے مطابق نہ ہوا تو... پہنچ جانے کے بعد تمہیں معلوم ہوا کہ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہا؟"
"واپسی کا ہم نے ابھی تک سوچا بھی نہیں ہے۔ اپنا راستہ خود بنائیں گے" میں نے کہا۔
غالب نے کہا "ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سب کچھ توقعات کے مطابق نہیں ہو گا۔ ہم غیر متوقع کے لئے تیار رہتے ہیں۔"
"تم سے ایک دو باتیں معلوم کرنی تھیں۔ ایک تو گودام میں اوپر جانے والا زینہ کہاں ہے۔ گیٹ کے پاس؟"
"نہیں۔ یہ گیٹ تو بعد میں بنایا گیا ہے۔ پرانا راستہ بھی وہی تھا جو اب مندر میں آنے کا راستہ ہے۔ یہ راستہ سیدھا آشرم کی طرف جاتا تھا اور سیڑھیاں بھی سامنے ہی آ جاتی تھیں۔ غسل خانوں کی قطار کے بعد جہاں سے برآمدہ شروع ہوتا ہے وہیں سے زینہ اوپر جاتا ہے۔"
"اور ایمرجنسی والے نئے باتھ روم کے قریب جا کے نکلتا ہے؟"
میں نے کہا "یہ بہت اچھی بات ہے۔ دوسری بات یہ بتاؤ کہ گودام کی بجلی والے سب کمرے آپس میں بھی ملے ہوئے ہیں یا نہیں؟"
راما راؤ نے نفی میں سر ہلایا "پہلے ہر کمرا الگ تھا اور اس میں ایک دروازہ تھا۔ ایک کھڑکی تھی۔ جب دو کمرے ملا کے ایک بنا دیا گیا تو اب ہر کمرے میں دو دروازے ہیں اور دو کھڑکیاں۔ دونوں باہر برآمدے میں کھلتے ہیں۔ کمروں کو ملانے والا بیچ میں کوئی دروازہ نہیں ہے۔"
میں نے یہ بات بھی نوٹ کر لی "بجلی کا مین سوئچ کہاں ہے؟"
"پچھلے زینے کے موڑ کے نیچے کی خالی جگہ پر بورڈ لگا ہوا ہے" راما راؤ نے کہا "جس پر میٹر ہے اور مین سوئچ ہے۔"
"اور جنریٹر کہاں ہے؟" غالب نے ایک اچھا سوال کیا۔
"جنریٹر بھی وہیں ہے۔ بورڈ کے پیچھے زمین پر رکھا ہوا ہے۔ پاس ہی اس کا کنکشن مین سوئچ کے تاروں سے ہے۔"
"ویری گڈ" میں نے کہا "تم بہت ہوشیار آدمی ہو راما راؤ۔ پڑھے لکھے اور ذہین بھی ہو۔ کبھی جنریٹر پر غور کیا؟"
"جنریٹر دیکھا ہے میں نے۔ پیٹرول سے چلتا ہے۔ سنگل فیز ہے۔ دو سو دس سے چالیس وولٹ۔ پچاس سائیکل۔ فور اسٹروک انجن ہے۔ اور کیا بتاؤں؟"
میں نے ہنس کے کہا "یہ تو تم نے ضرورت سے زیادہ ہی بتا دیا۔ اس جنریٹر کو چلانا پڑتا ہے بریک ڈاؤن کے بعد۔"
"نہیں۔ یہ سیلف اسٹارٹ ہے...... خود بخود ٹرپ ہو جاتا ہے۔"
"الارم کہاں کہاں ہے" میں نے کہا۔
"ایک گیٹ پر۔ دوسرا اوپر والی منزل پر۔"
"ٹھیک ہے راما راؤ۔ اب ہماری معلومات مکمل ہیں۔ ہم خود یہ سب کچھ معلوم نہیں کر سکتے تھے۔ اب ایک آخری مسئلہ ہے کچھ سامان کا۔ ایک تو اوزاروں کا مسئلہ ہے۔ کھولنے کے لئے پیچ کس بھی کہاں مل جائیں۔"
اس نے کہا "میرے پاس ایک بڑا پیچ کس ہے۔ ایک چھوٹا۔ ڈرل مشین کہاں نہیں لے جاتے ہو؟"
"ڈرل مشین کہاں ملے گی؟" میں نے کہا۔
"اس کے علاوہ ڈرل مشین بجلی سے چلتی ہے اور بہت شور کرتی ہے" غالب نے کہا۔
"میرے پاس ہاتھ سے چلانے والی ڈرل مشین ہے۔ چھوٹی سی، مگر بڑی کام کی۔ تختوں میں کیل لگانے، پیچ لگانے یا کہیں سوراخ کرنے کا کام آتی ہے۔ وہ میری نہیں ہے۔ یہاں مندر میں کوئی شخص اپنا تھیلا بھول گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوئی بڑھئی تھا۔ تھیلے میں اس کے اوزار تھے۔ چھ مہینے ہو گئے۔ ابھی تک تو وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ اب کیا آئے گا۔"
میں نے اس سے ہاتھ ملایا "تم قدرت پر یقین رکھتے ہو؟"
"بالکل نہیں۔"
"خیر ہم رکھتے ہیں۔ ہمارا خیال۔ بلکہ ایمان ہے کہ قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے چنانچہ جب وہ کسی پر مہربان ہو تو اس کے حق میں حالات کو ہر سمت سے سازگار کر دیتا ہے۔ مثلاً یہ چھوٹی سی ڈرل مشین آ گئی بھی ہے۔ خدا نے یہ سب انتظام ہمارے لئے کیا تھا۔ اس بڑھئی کا یہاں آنا اور اپنے اوزاروں کا تھیلا بھول جانا۔ سب اسی کے حسن انتظام کا سلسلہ تھا کیونکہ وہ عالم غیب بھی ہے۔"
راما راؤ ہنسا "میں تمہارے عقیدے کا مذاق نہیں اڑاؤں گا۔ تاہم میرے لئے یہ محض اتفاق ہے۔ کیا تم بھی کہیں کچھ نہیں بھولے؟"
"ضرور بھولا ہوں مگر وہ بھی مشیت ایزدی تھی۔ معلوم نہیں اس کا مقصد کیا تھا۔ ایک بار میں اپنا پرس پوسٹ آفس کے کاؤنٹر پر بھول آیا تھا۔ ممکن ہے وہ کسی ضرورت مند کو ملا ہو۔ یہ خدا کے انتظام کا حصہ تھا کہ میں پوسٹ آفس جاؤں اور وسیلہ بنوں۔"
"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پرس کسی جواری یا شرابی نے اٹھا لیا ہو۔"
"ہم خدا کے تصور سے بھلائی اور نیکی کو منسوب رکھتے ہیں کیونکہ وہ اس کائنات کا خالق اور منتظم ہے۔ خیر چھوڑو۔ ان باتوں میں تمہارے لئے کچھ نہیں۔"
"میں تمہیں وہ سب چیزیں لا دیتا ہوں" راما راؤ نے کہا۔
اس تھیلے میں تیز دھار والی چھینی اور ہتھوڑی کے علاوہ دو مضبوط پیچ کس تھے۔ ڈرل مشین میں ایک چھوٹا سا پہیہ لگا ہوا تھا۔ اسے ایک ہتھی گھماتی تھی۔ چرخی کے ساتھ کاربن اسٹیل کے بنے ہوئے نوکیلے اور بلیڈ جیسی دھار رکھنے والے "بٹ" تھے۔ پیچ کس کے فولادی حصے کی شکل کے ٹکڑے جو چھوٹا یا بڑا سوراخ کرنے کے لئے تبدیل کئے جا سکتے تھے۔ اس کو چلانے سے آواز پیدا ہوتی تھی مگر وہ آواز بند کمرے کے باہر نہیں سنی جا سکتی تھی۔ جہاں ہمیں اس ڈرل مشین سے کام لینا تھا وہاں تیس چالیس گز تک کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ محافظ گیٹ پر تھے۔ مندر کی چھت کے عقبی حصے پر تھے اور گودام کی دوسری منزل پر تھے۔
سیاہ چادر کوئی نہ مل سکی۔ راما راؤ نے ایک گہرے سرخ رنگ کی دھوتی اور ایک گہرے جامنی رنگ کی پرانی ساڑی پیش کی۔ میں نے دھوتی رکھ لی۔ اندھیرے میں گہرا سرخ رنگ بھی کیمو فلاج کرنے کے کام آ سکتا تھا۔ پھر راما راؤ جانے کے لئے تیار ہوا۔ اس نے باری باری ہم سب سے ہاتھ ملایا۔
"ہم پھر ملیں گے" میں نے رسماً کہا۔
"دنیا بہت مختصر ہے" غالب نے انگریزی کا قول دہرایا۔

www.paksociety.com

"ہاں۔ مگر ہمارے راستے جدا ہیں" راما راؤ بولا۔

"ممکن ہے وقت تمہارے اور ہمارے راستے ایک کر دے۔"

"میں نہیں چاہوں گا کہ تم اس راستے پر چلو جس راستے پر میں چل رہا ہوں" راما راؤ نے کہا۔

"لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے راستے پر چلو۔ یہ جنگ تو غربت اور غیرت کا مسئلہ ہے۔ ورنہ ہم صلح پسند محبت کرنے والے اور شریف لوگ ہیں" میں نے کہا "جیسے کہ عام لوگ ہوتے ہیں۔ جب یہ جنگ ختم ہو جائے گی تو ہم اپنے اپنے گھروں میں ملیں گے۔"

"لیکن اس عجیب قاروی دوست" وہ بولا۔

میں نے کہا "ایک لاکھ روپے کے عوض جو معاہدہ ہوا تھا وہ پورا ہوا۔ اب ایک لاکھ ہماری طرف سے۔"

نازو نے اپنی بیلٹ کھولی اور راما راؤ کے حوالے کر دی "میں نے تم کو انعام کے طور پر دیا تھا اس کے لئے سوری۔"

غالب نے کہا "ایک بے دین آدمی ہونے کے باوجود تم اچھے آدمی ہو۔"

"اگر میں کسی دین دھرم کو ماننے والا ہوتا تو ہم دشمن ہوتے۔ کوئی اصل پنڈت تمہیں کب کا تمہارے دشمن کے حوالے کر چکا ہوتا" وہ بولا۔

"یا مار چکا ہوتا ہمارے ہاتھوں" میں نے کہا۔

جب وہ چلا گیا تو ہمارے پاس کہنے یا کرنے کو کچھ نہ رہا۔ ابھی آٹھ بھی نہیں بجے تھے چنانچہ ہمیں کم سے کم ایک گھنٹا انتظار کرنا تھا۔ نازو نے اس وقت میں دوبار کافی بنائی۔ میں نے اور غالب نے ایک بار پھر منصوبے کا اول تا آخر جائزہ لیا۔ نو بجے ہم نے اپنے اپنے ریوالور اٹھائے۔ ایک دستی بم کہاں کام آئے گا۔ یہ ابھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ مگر اس تباہ کن ہتھیار کو ساتھ رکھنا ضروری تھا۔

سرخ چادر میں خود کو لپیٹ کر میں نے کہا "میں جاتا ہوں۔"

غالب نے کہا "ابھی ڈرل مشین استعمال مت کرنا۔"

"تمہیں بلانے کے لئے میں الو کی آواز نکالوں گا" میں نے کہا۔

"گویا اپنی اصل آواز میں بلاؤ گے" نازو نے کہا "ہم گوش بر آواز رہیں گے۔"

میں دروازے سے باہر نکلا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں ایک قدم بڑھاتا تھا اور رک جاتا تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں سے کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ آسمان تاریک اور ابر آلود تھا چنانچہ چاند اگر کہیں تھا تو اس کی روشنی بادلوں کے اوپر ہی رک گئی تھی۔ گیٹ تک کا فاصلہ میں نے دس منٹ میں طے کیا۔ میرے الٹے ہاتھ پر مندر کی عمارت بھی سنسان پڑی ہوئی تھی۔ ہنومان جی کے خدمت گار بھی آج غیر حاضر تھے۔ وہ ایک ساتھ سولہ مُردوں کی آتما کو مکتی کرنے کے عمل میں مصروف تھے۔

گیٹ پر رک کے میں نے باہر بستی کی طرف ایک نظر ڈالی

بستی میں خاموشی تھی۔ بیشتر گھروں کے مکین ہندوانہ رسم کے مطابق سورج ڈھلتے ہی کھانا کھا لیتے تھے۔ اب سو چکے تھے کہیں روشنی زندگی کی علامت تھی۔ گیٹ سے گزر کر دوسری دیوار کے ساتھ زیادہ بے خوفی سے چل کر میں بعد اس گوشے میں جا پہنچا جہاں عقبی دیوار تھی۔ مندر کو الگ کرنے والی۔ دھرم اور دنیا کے کاروبار کو الگ ہنومان جی کے پجاری اور ان کے کاروبار ایک طرف اور ان کے کالے دھن کو دھندہ دوسری طرف لیکن دیوار طور پر جس نے یہ تقسیم کی تھی۔ خود بھی دو حصوں میں ہو گیا تھا۔ اس کا جسم ابھی دنیا میں تھا اور روح دوسری دنیا پہنچ چکی تھی۔

دیوار کی جڑ میں بیٹھ کے میں نے اپنی پشت مندر کی طرف رکھی اور اندازے سے ایک جگہ مقرر کی۔ زمین سے تین فٹ اوپر۔ دائیں طرف کی دیوار سے تین فٹ بائیں میرے خیال میں یہ غسل خانے کی دیوار کے مرکز کی اینٹ تھی۔ اس سے بڑا پیچ کس نکال کے میں نے دیوار پر ہاتھ پھیرا۔ اوپر پلاسٹر نہیں تھا اس لئے چنائی کی درز تلاش کرنا بہت آسان تھا۔ خدا کا نام لے کر میں نے پیچ کس سے لائنوں کو کھرچنا شروع کیا۔ میرے سر کے اوپر عقبی سرخ لائٹس کا اجالا تھا جیسے آسمان کا افق روشن ہو۔ مجھے بہت دور بائیں جانب کے عقبی حصے میں چوکی ضرور نظر آ رہی تھی۔ لیکن میں کسی کی نقل و حرکت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے کان بہر آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔

دوبار مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی دبے پاؤں میری طرف آ رہا ہے۔ میرے ماتھے پر پسینے کی نمی آ گئی لیکن جب پلٹ کر دیکھا تو رات کی تاریکی اور سکوت میں کوئی نظر نہ آیا تھا۔

آہستہ آہستہ ایک اینٹ کے چاروں طرف سے مسالا صاف کیا اور لکیریں گہری ہوتی گئیں۔ میں نے اینٹ کو ہلانے کے لئے پیچ کس کو بطور لیور استعمال کیا۔ ہلنے والی اینٹ اچانک نکل آئی... میں نے اسے فوراً پکڑ لیا ورنہ وہ اندر جا گرتی اور دھماکا ہوتا۔ بلندی سے پکے فرش پر اینٹ گرتی تو اس کا دھماکا دور تک سنائی دیتا۔ اس اینٹ کو نکال کے میں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ دوسری اینٹ کو ہلانے لگا۔ چنائی کا پلاسٹر اکھڑ کے گرا اور اینٹ بھی الگ ہو گئی۔ دس منٹ بعد میں نے دیوار کے خلا کو خوشی اور امید کے ساتھ دیکھا۔ یہ کامیابی کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس میں سے گزر کے میں نے باہر کی اینٹوں کو اٹھانا پھر یہ کام غالب کی مدد سے کرنے کا فیصلہ کیا۔ سوراخ سے باہر نکل کے میں نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھے اور حلق سے الو کی آواز نکالی۔ یہ بہترین الو کی آواز تھی۔ کسی طرف سے بھی الو بولتا تو میں فرق بتا دیتا۔ میرے سوا اسے پہچاننے والا دوسرا آدمی غالب کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

غالب نے ڈیلیور فرسٹ کے اصول پر عمل کیا۔ سب سے پہلے نازو کو شگاف میں سے اندر کھینچ لیا۔ اینٹوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے اس کی کہنیوں پر اور ٹانگوں پر خراشیں آ گئیں۔ جب وہ باہر آئی تو اس کے بعد اپنے چہروں پر کھڑی ہوئی تو نازو خوش ہو رہی تھی۔ اندر آنے کے بعد اس کا جسم اور دونوں ہاتھ دونوں کے مقابلے میں کم تھے اور وہ بھی بھوت کی طرح منتظر اور چوکنا۔

اس نے اندر آ کے غسل خانے کا معائنہ کیا۔ شگاف میں سے آنے والی روشنی بہت کم تھی مگر آہستہ آہستہ ہماری آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھنے لگی تھیں۔ غسل خانہ مشکل سے چھ فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا تھا۔ اس کی ایک دیوار کے ساتھ ٹونٹی لگی ہوئی تھی۔ نازو نے یہ بات ایک سروے کرتے ہوئے بتائی۔

"ہوں! یہ کیا مصیبت ہے" نازو نے کہا "جالے ہی جالے۔"

نجیبا نے کہا "تم نے کہاں تفریح شروع کر دی اندر آتے ہی!"

غالب نے سر اندر ڈال کے کہا "ہیلو لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ایک شریف آدمی کے لئے جگہ ہے؟"

"بڑی جگہ نہیں بھئی۔ بھرے پڑے ہیں ہر قسم کے جانور" نازو نے کہا "لال بیگ اور مکڑیاں۔"

"مگر آپ کے دل میں تو ہوگی خاتون" غالب نے اندر آتے ہوئے کہا "بہت نازک اور چھوٹا دل ہے مگر اپنا گزارا ہو جائے گا۔"

نجیبا نے کہا "یہاں تو بہت بدبو ہے۔ دم گھٹ رہا ہے میرا۔"

"میں ابھی اسپرے کرتا ہوں آپ کی پسندیدہ خوشبو کا۔ آپ تشریف رکھئے قالین پر یا صوفے پر" میں نے کہا "اس غسل خانے میں ایئر کنڈیشنر لگے ہیں۔"

غالب نے کہا "یہ تو تھا غسل خانہ۔ خوشبو تو آئے گی بہت اندر پہنچنے کے بعد۔"

میں نے کہا "چھوڑو ان کی باتیں مت سن چلیں یہ اینٹیں پکڑاؤ مجھے۔"

"ابھی واپس باہر جاؤں؟" غالب نے کہا اور پھر باہر جا کے ایک ایک اینٹ اٹھا کر دینے لگا۔ میں ان اینٹوں کو اندر جمع کرتا گیا۔ غالب اندر لوٹ آیا تو ہم نے ان اینٹوں کو خاصی مہارت اور احتیاط کے ساتھ واپس دیوار کے شگاف میں رکھ دیا۔

میں نے اور غالب نے دوسری دیوار کی اینٹ دس منٹ سے کم وقت میں نکال لی۔ ایک طرف سے... میں نے ڈرل مشین کو آہستہ گھماتے ہوئے چنائی کو کھرچ دیا۔ دوسری طرف سے محسن نے یہ کام پیچ کس سے کیا۔ لیکن جتنی دیر میں اس نے ایک لکیر کھودی اتنی دیر میں میں تین لکیروں کو کھود چکا تھا۔

پھر ایک دوسری طرف جا گری۔ دھماکے کے ساتھ ہم سب سکتے میں آ گئے کیونکہ اس کی گونج اندر ہی زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ باہر کسی کی آواز کا کسی نے نوٹس لیا ہوتا تو شور مچ جاتا۔

"جلدی کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "یہ ہو سکتا ہے کہ اس غسل خانے میں کوئی پرانی ٹین کی بالٹی بھی پڑی ہوئی ہو اور

اینٹ اس پر جا لگی توپ کے کسی گولے کی طرح۔"

"بقول شاعر کے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام۔"

نازو نے ایک دبی دبی سی چیخ ماری مگر ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔

"کیا ہوا؟ میں نے کہا تھا کہ چیخ ماری ہو تو گلا میں بھینچ جاؤ" غالب بگڑ کے بولا۔

"وہ چھپ... چھپ..." نازو نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"کیا چھپ چھپ لگا رکھی ہے۔ صاف کہو چھپکلی۔ چھپکلی ہاتھ سے۔ میں ابھی پکڑ کے لا دیتا ہوں" غالب نے کہا "ذرا اینٹ نکال لوں۔"

"وہ... میرے اوپر چڑھ گئی تھی" نازو نے خفا ہو کے کہا۔

"چلو اگلی دفعہ تم چھپکلی پر چڑھ جانا۔ آگے زیادہ بڑی اور صحت مند چھپکلیاں ہوں گی۔"

دوسری دیوار کے بعد بیت الخلا آ گیا۔ اس میں بدبو واقعی ناقابل برداشت تھی۔ برسوں کی محبوس فضا میں سڑاند بس گئی تھی۔ یہاں کاکروچ بھی سیکڑوں کی تعداد میں جمع تھے جو سرنگ نقب میں سے گزر کے آ گئے تھے۔ میں نے ٹارچ کی ایک جھلک جلانے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ اس کی روشنی باہر نہیں جا سکتی تھی۔ کاکروچ ایک دم بھاگے اور دیواروں میں گھس گئے۔ نازو اور گل ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی ہی چیختی رہیں۔ افراتفری میں بھاگنے والے کاکروچ کبھی ان کے چہروں پر بھی چڑھ جاتے تھے۔

"یار! ان کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ ایک چھوٹی سی چیخ مارنے کی اجازت دے دیں؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "اچھا ایک سیکنڈ کی چیخ کی اجازت ہے جو ایک فٹ سے آگے سنائی نہ دے۔"

ہماری پیش قدمی کی رفتار بہت اطمینان بخش تھی۔ اندر ہم بڑے سکون اور اعتماد کے ساتھ ایک کے بعد دوسری دیوار سے گزرتے جا رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برسوں بند رہنے والے غسل خانے اور بیت الخلا انتہائی متعفن تھے۔ اندر گرد تھی اور مکڑیوں کے جالے تھے۔ مچھر تھے جو ہم پر مسلسل حملہ آور ہو رہے تھے۔ مجھے کاکروچ اور چھپکلی جیسے بے ضرر جانوروں کا ڈر نہیں تھا۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں اندر بچھو نہ ہوں۔ جو اچانک ڈنک مار دیں۔ میں نے اس خوف کا اظہار نہیں کیا ورنہ اس کے بعد خواتین کو ہر کاکروچ بچھو نظر آنے لگتا۔

اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے تھے جب ہم نے آخری غسل خانے سے گزر کے رسوئی یعنی پرانے باورچی خانے میں قدم رکھا۔ اس کے بعد والی دیوار پر پہنچ کے میں رک گیا۔ آگے فرش اچانک دو فٹ اوپر اٹھا ہوا نظر آیا۔

"مرزا جی! ایک بات بتاؤ۔ اس دیوار سے گزر کر ہم کہاں طلوع ہوں گے؟ برآمدے میں۔ زینے کے نیچے جہاں الیکٹرک سوئچ بورڈ اور حجرہ لگے ہوئے ہیں۔ یا پچھلی منزل کے آخری کمرے میں؟"

غالب کی صورت پر بھی الجھن کے آثار نظر آنے لگے۔

www.paksociety.com

"اچھا ہوتا اگر ہم یہ بات راما راؤ سے ہی پوچھ لیتے۔"
"اب ٹیلی فون کرکے پوچھ لو" نازو نے کہا۔
میں نے ہنس کے کہا "چلو اللہ مالک ہے۔ کچھ تو کرنا ہی ہے۔"
آخری دیوار پر ہم نے پھر ڈرل مشین کے استعمال سے گریز کیا اور چینی کو بھی احتیاط سے استعمال کرتے رہے۔ یہاں پہلی اینٹ نکالنے میں بیس منٹ لگے۔ جیسے ہی اینٹ ہلی میں نے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا۔
دوسری طرف سے آنے والی تیز روشنی میرے منہ پر پڑی۔ میرے کانوں نے مکروہ آواز میں ایک بھیانک قہقہہ سنا۔
روشنی ساتھ والے کمرے سے آرہی تھی۔ اس کی چھت میں ٹین کے دو پرانے شیڈ لٹک رہے تھے۔ ان میں دو دو سو واٹ کے دو بلب روشن تھے۔ پہلے جب عمارت یتیم خانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی تو ہر کمرے کے لیے ایک مرکزی لائٹ کافی سمجھی گئی ہوگی۔ پھر نقشے میں ضرورت کے مطابق ترمیم کی گئی اور درمیانی دیوار نکال کے دو کمروں کو بیس فٹ چوڑے اور چھبیس فٹ لمبے ہال کی شکل دی گئی تو نا کافی روشنی کی وجہ سے شاید چالیس یا ساٹھ واٹ کے بلب کی روشنی کا خرچ بھی مکینوں کو ضرورت سے زیادہ لگتا ہوگا لیکن اب دو دو سو واٹ کے بلبوں کی تیز روشنی میں ہال جگمگا رہا تھا۔
میں نے جس شخص کی ہنسی کی مکروہ آواز سنی تھی وہ میری طرف پیٹھ کیے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا پست قد سیاہ فام شخص تھا جس نے اپنا سر منڈوا رکھا تھا مگر وہ پھر بھی گنجا نہیں لگتا تھا۔ اس کے سر کی کالی چمڑی بالوں جیسی ہی نظر آتی تھی۔ مشین گن کو اس نے کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔
"ارے پاگل کا بچہ۔ ادھر کیا ہے۔ سالا چوہا کا بچہ تمہیں آئیلا ہے ادھر۔"
اس کا دوسرا ساتھی لمبے قد اور دبلے پتلے جسم کا مالک تھا اور اس کی مونچھیں پرانے فلموں کے اسٹائل کی تھیں "ہم خود سنا ہے۔"
"ابھی تو بہرا ہوگیا اے۔ کان کھراب ہوگیا۔ کبھی کبھی کنڈم ہو جائیں گا ایک دن" پہلے والے شخص نے دروازے کے قریب جا کے کہا۔
"جولی فادر، ہمارا کان ایک دم ٹھیک ہے" تلوار مارکہ مونچھ والے نے برا مان کے خفگی سے کہا "ہمارا دماغ کو خراب بولتا سالا۔ تم خود دو دو پی کے ایک دم اپ سیٹ ہو جاتا ہے۔ ہم بولتا ہے تیرے کو۔ یسوع مسیح کا قسم کھاکے بولتا ہے کہ کوئی دیوار کھودتا پڑا ہے۔ ایسا ہی آواز کو ہم جانتا ہے۔ ہم ناگپور جیل سے بھاگا تھا۔"
"یہ اسٹوری تم سو مرتبہ سنائیلا ہے۔"
"ہاں۔ مگر یہ سچ ہے۔ ہم جب دیوار سے اینٹ نکالتا تھا تو ہمارا کان یہ آواز سنتا تھا۔"

پست قد ہنسا "لیکن ابھی ادھر کیا ہے۔ بول۔ کون دیوار کھودتا ہے؟ نہیں ہے؟"
"دیکھو، میں تیرے کو بتاتا ہے۔ ابھی تو نیچے کا کمرہ ضرور کوئی کھول ہال ہے۔ اوپر کچھ نہیں ہے۔ لیکن۔۔۔"
"لیکن کیا؟"
"نیچے کچھ ہو گئیں گا" دراز قد سوچتے ہوئے بولا۔
"نیچے، زمین میں!" پست قد پہلے حیران ہوا اور پھر قہقہہ مار کے ہنس پڑا "اوئے چوہا، نیچے کیا ہو گئیں گا۔" سرنگ؟
دراز قد نے اقرار میں سر ہلایا "ابھی کیا پتا کوئی سرنگ بنائے تو۔ بائی گاڈ ہم ادھر تھا جب ہم آواز سنا۔ ابھی بھی سنائی دیتی ہے۔"
"چل میرے باپ، یہ اچھا اسٹوری ہے۔ تو بولا تو دیوار۔ اس کا نیچے سرنگ بنالیا۔ گٹر میں نکلا اور بھاگ گیا۔ ابھی یہ کوئی جیل نہیں اے۔ ادھر تیرا اسٹوری کیا ہے" اس نے اپنے ساتھی کو دروازے سے دھکیل دیا اور قفل لگایا۔
دراز قد کے نہ کان خراب تھے اور نہ اس کے حافظے میں کچھ تھا۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ دراز قد اسی طرح اینٹیں نکال کر کسی زمین دوز سرنگ کے راستے کسی گٹر تک پہنچا تھا اور ناگپور جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ سابقہ تجربے کی بنیاد پر اس کے کانوں نے جو آوازیں سنی تھیں بلاشبہ ان کا اس نے بالکل صحیح مطلب اخذ کیا تھا مگر خوش قسمتی کہ جب انہوں نے دیکھا تو انہیں کچھ نظر نہ آیا۔ ایک وجہ شاید یہ تھی کہ انہوں نے کمرے کی ہر دیوار کا معائنہ نہیں کیا ہوگا جب اینٹ اکھڑ چکی تھی۔ جگہ پر موجود تھی۔ اس سے پہلے میں نے ساری چٹائی کھینچ کر ڈال دی تھی لیکن اس کا امکان نہیں تھا ورنہ کمرے کے اندر پلستر ٹوٹ کے گرتا اور شگاف سے مشین گن کی نال گزار کے ہم سب کو ایسے ہی چھید دیتے جیسے چھلنی میں مٹی کے دانے۔
ہم نے اس دیوار پر کام کرتے ہوئے خصوصی احتیاط کی تھی اور ڈرل مشین تو بالکل استعمال نہیں کی تھی۔ احتیاط نے بھی ہمیں بچایا تھا لیکن ہماری اصل حفاظت ایک الماری کی جو تھوڑے سے فاصلے پر بائیں جانب رکھی ہوئی تھی۔ ہمارے اور ان کی نگاہوں کے درمیان حائل رہی۔ وہ دروازے کے قریب کھڑے ہوئے تھے اور میں نے فٹ کے فاصلے پر زمین سے ایک فٹ اوپر شگاف کیا تھا۔ سامنے ہوتے تو ان کی نظریں سوراخ کے اندر تک جاتیں۔ جب میں نے دیکھا تو وہ واپس جا رہے تھے اور ان کا رخ دروازے کی طرف تھا۔
دو منٹ کا یہ وقفہ مجھ پر دو گھنٹے سے زیادہ بھاری گزرا۔ دم سادھے بیٹھا رہا اور ہر لمحہ گزران کے ساتھ انکشاف کے لمحے کا تصور کرکے کانپتا رہا۔

جب ان کی آہٹ رکنے کی کوشش نہیں کی کہ کہیں آہٹ انہیں متوجہ نہ کرلے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے دل کے دھڑکنے کی اور سانس لینے کی آواز سے بھی خوف زدہ تھا کہ اس خاموشی میں ان کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ غیر معمولی طور پر حساس ہو جانے والے کان ہوشیار نہ ہو جائیں۔
کیفیت دوسروں کی بھی مختلف نہ تھی۔ گل، نازو اور غالب سب اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھے رہ گئے تھے۔ ہال میں گونجنے والی آوازیں اس شگاف سے گزر کے سب کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میری طرح وہ کچھ دیکھ نہیں رہے تھے چنانچہ تصورات سے وحشت زدہ تھے۔ یکلخت تحفظ کا احساس خیال باطل ثابت ہوا تھا۔ سات دیواریں عبور کرلینے کے بعد حاصل ہونے والے اعتماد اور کامیابی کے یقین کی خوشی لذت خواب سحر کی طرح مٹ گئی تھی۔
جب دروازہ بند ہوا اور میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیتے ہوئے مسکرا کے پیچھے دیکھا تو آہستہ آہستہ سب کے بجھے ہوئے چہروں پر خوف چھٹنے لگا پھر امید کی روشنی اور شکر گزاری کے جذبات سے دمکنے لگے۔
"اللہ تیرا شکر ہے" سب سے پہلے نازو نے کہا اور ایک دم اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا کے لیٹ گئی۔
پھر گل نے بھی نازو کے اسٹائل میں ڈانس کرتے ہوئے کہا "میرا تو ہارٹ فیل ہونے والا تھا۔"
میں اور غالب پہلے حیران ہوئے اور پھر بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کرسکے۔ گل اور نازو پر کاکروچ چڑھ گئے تھے اور اب وہ ہاتھ مار مار کے انہیں جامے سے باہر کر رہی تھیں۔ ان کی حالت خوف اور خفت سے قابل رحم ہو رہی تھی لیکن خطرہ ایک ایسی مجبوری بن گیا تھا کہ وہ نہ ہاتھ ہلا سکتی تھیں اور نہ پیر جھٹک سکتی تھیں۔ وہ بے حس و حرکت دانت پر دانت جمائے بیٹھی رہیں اور بے ادب لچکنے ان کی مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔
ہنسی کو ضبط کرنے کی کوشش میں میری اور غالب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نازو اور گل بالآخر ہر کاکروچ کو بے دخل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں اور اب ہمارے غیر ہمدردانہ رویے پر تحت برہم تھیں۔
"کمبخت تمیز کا کروچ تھے" غالب نے کہا۔
"اب تم سوچ رہے ہو گے کہ کاش میں ایک کاکروچ ہوتا" گل نے کہا اور پھر باقی لڑکیوں کو ہلانے لگا۔
"اسی طرح اڑاتے ہی رہو گے" نازو نے بگڑ کے کہا۔
"کمینے بھائی، آپ مذاق اڑا رہے ہیں۔ اللہ ہم نے کتنی مشکل سے اپنے آپ کو روکا۔ کہیں منہ سے چیخ نکل جاتی تو کیا ہوتا؟" اس نے کہا۔
غالب نے کہا "رہنے دو بی بی، تمہارا چیخ مارنا محض ایک ادا ہے، خوف کی۔ خوف نہیں ہوتا۔"

"ہاں" غالب نے کہا "اس وقت کاکروچ کیا تم پر چھپکلیاں یلغار کرتیں تب بھی تمہاری آواز نہ نکلتی۔"
"آواز نہ نکلتی، دم نکل جاتا تو؟" نازو نے کہا۔
"اللہ ایسی باتیں مت کرو، میرا دم نکل جائے گا" غالب نے ان کی نقل اتارتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "سچ کہہ رہا ہوں۔"
"ایسے ہی سچے ہو تو دکھاؤ مر کے" نازو نے جل کے کہا۔
"میں مر گیا نا۔۔۔ تو بھوت بن جاؤں گا۔ اپنے سسر کی طرح" غالب نے کہا "یہ شرافت، انسانیت سب چھوڑ دوں گا۔ بھوت تو چمٹ جاتے ہیں۔"
میں نے کہا "چلو، راستہ بن گیا۔ پہلے تم مرزا جی۔"
غالب کے بعد میں نے گل اور نازو کو گزارا اور پھر خود بھی شگاف کے راستے ہال میں پہنچ گیا۔ اس ہال میں سب پرانا سامان بھرا پڑا تھا۔ پرانے پلنگ جو شاید پہلے یتیم خانے کی ملکیت تھے۔ اب بے مصرف ہو گئے تھے۔ ان کی پٹیاں ٹیڑھی ہو گئی تھیں اور بنائی لٹک رہی تھی۔ دوسری طرف ٹوٹی پھوٹی ڈیسکوں اور بنچوں کا انبار پڑا ہوا تھا۔ کچھ شکستہ کرسیاں اور میزیں بھی اپنا فسانۂ عبرت سناتی نظر آتی تھیں۔ مجھے ایک افسردہ کردینے والا خیال آیا کہ آخر یتیم خانہ بند ہو جانے کے بعد وہ سب بچے کہاں گئے ہوں گے جن کے ماں باپ تو خیر دنیا ہی چھوڑ گئے تھے لیکن جن کے لیے دنیا میں کسی عزیز رشتے دار کے گھر میں بھی جگہ نہ تھی۔
کیا احساسات ہوں گے ان لاوارث اور مجبور بچوں کے؟ جب انہیں کہا گیا ہوگا کہ چلو خالی کرو یہ جگہ۔ ساری عمر مفت کھلانے اور جگہ فراہم کرنے کا ٹھیکا نہیں لیا تھا ہم نے۔ ان معصوموں نے ضرور پوچھا ہوگا کہ ہم آخر کہاں جائیں؟ تو انہیں یہی جواب ملا ہوگا کہ جہنم میں جاؤ ہماری طرف سے۔۔۔ اور کیا معلوم ان لوگوں نے بچوں کو خود انہیں جہنم میں جھونک دیا ہو۔ ان کی زندگی کو پیشہ ور گداگری کے ٹھیکے داروں کے ہاتھ فروخت کردیا ہو اور اس وقت وہ ٹوٹے ہاتھ پاؤں لیے کسی فٹ پاتھ پر دست سوال دراز کر رہے ہوں۔۔۔ بھگوان کے نام پر یتیم کو کچھ دے جاؤ۔۔۔ بھگوان تمہیں بہت دے گا۔۔۔ اور نہ دینے والے ان کا مذاق اڑاتے ہوں گے کہ آخر بھگوان نے تمہیں بہت کچھ کیوں نہیں دے دیا۔ وہ کسی کو کیسے بتا سکتے ہیں کہ بھگوان تو سب کو دیتا ہے مگر اس کے بالک رام جیسے بھگت سب چھین لیتے ہیں۔
"آخر اس کباڑ خانے میں کیا ہے غور فرمانے کے لیے؟" غالب نے کہا۔
میں چونکا "کچھ نہیں، میں کباڑ خانے کو نہیں دیکھ رہا تھا۔"
نازو نے کہا "کیا دیوار کے پار کچھ نظر آرہا تھا؟"
میں نے کہا "ہاں، وہ وقت جس کی یہ نشانیاں باقی رہ گئی ہیں جیسے جسم مٹی میں مل جاتا ہے مگر روح سوا باقی رہتی ہے۔"
غالب نے کہا "تو جلی ہوئے کے مواقع پھر آئیں گے۔ ابھی

www.paksociety.com

تو وقت کم ہے۔"

میں نے کہا "اب کیا کریں؟ شطرنج کے گھوڑے کی طرح ڈھائی گھر کی چال چلیں؟"

"میرا خیال ہے وہ تین ہی گھر ہوتے ہیں جن کو خواہ مخواہ ڈھائی گھر کہا جاتا ہے" غالب بولا "ویسے چال کی وضاحت فرمائیے اور یہ بھی کہ آخر ہم گھوڑے کب سے ہو گئے۔"

"ہاں 'ڈھینچوں ڈھینچوں' تو اب بھی کرتے ہو" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "ایک دیوار یہ ہے اس سے متصل کمرے کی۔ دوسری متقابل کی دیوار ہے۔ اس میں سے گزر کے ہم بجلی کے مین سوئچ اور جنریٹر تک پہنچ سکتے ہیں۔ تیسری یہ دیوار ہے۔ اس کی ایک اینٹ نکال کے باہر کا جائزہ لیا جاسکتا ہے اور یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ کیا گیٹ کی طرف سے بھی حملہ ممکن ہے۔"

غالب نے کچھ دیر سوچا پھر کہا "ساری بات وقت کی ہے۔"

میں نے کہا "فرض کرو ہم ایسے ہی دیواریں عبور کرتے گئے جیسے ابھی غسل خانوں سے گزر کر آئے ہیں۔ ایسے ہی ہر کمرے سے گزرتے ہوئے آخری کمرے میں جا پہنچے اور ایسے ہی ہر کمرا خالی ملا تو یہ محنت رائیگاں جائے گی۔ اس میں چار دیواروں سے گزرنے کا رسک بھی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی دیوار کے گر پڑنے کی آواز اوپر پہنچ جائے۔ اس کمرے میں جہاں محافظ موجود ہیں۔"

گل نے کہا "یہ رسک تو یہاں بھی ہے۔"

میں نے کہا "ہاں مگر ایک بار رسک لینے اور چار بار رسک لینے میں بہت فرق ہے۔"

"رسک کم سے کم لینا چاہیے" نازو نے میری تائید کی۔

"اور اس کا طریقہ ہے براہ راست گیٹ تک رسائی" میں نے کہا "ہم اسی طرح دیواریں کھودتے ہوئے گئے تو پانچویں دیوار کھود کے گیٹ تک پہنچ پائیں گے۔ بشرطیکہ اس سے پہلے ہی پکڑے نہ گئے۔"

"براہ راست ہم کیسے جاسکتے ہیں؟" گل نے کہا۔

"اور پکڑے جائیں گے تو پھر کیسے بھی جائیں" نازو بولی۔

میں نے کہا "تم عجیب بے پیندے کی لڑکی ہو۔ کبھی میری حمایت کرتی ہو کبھی مخالفت۔"

"میں ایک غیر جانبدارانہ حقیقت پسندی سے کام لے رہی ہوں" نازو نے فلسفیانہ متانت سے کہا۔

"دیکھو جتنا فرق رسک میں ہے۔ اتنا ہی پکڑے جانے میں بھی ہے" میں نے کہا "یہاں ہم ایسے مارے جائیں گے جیسے چوہے دان میں گرفتار ہونے والے چوہے مارے جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں ہم کیا کریں گے اگر آخری دیوار کے شگاف سے طلوع ہونے کے بعد ہم نے نصف درجن مشین گنوں کا رخ اپنی طرف دیکھا؟ مقابلہ کرکے گرفتار ہونا بہتر ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا" نازو نے کہا "اب میں غیر مشروط حمایت کرتی ہوں تمہاری۔"

غالب نے اسے غصے سے دیکھا "سکندر نے کچھ [illegible] تھا تمہیں ابھی۔"

میں نے کہا "پہلے بات سمجھ لو میری۔ دیواریں کھودنے سے بہتر ہے کہ ہم صرف دو دیواروں پر قسمت آزمائی کریں۔ اسی کباڑ خانے میں۔ کسی اور کمرے میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے سے محافظ موجود ہوں یا چکر لگاتے رہتے ہوں۔ یہاں دوبارہ کوئی نہیں آئے گا۔ ایک ٹیم ادھر سے باہر نکلنے کا راستہ بنائے گی۔ دوسری ٹیم برآمدے کی طرف شگاف ڈالے گی تاکہ مین سوئچ بورڈ اور جنریٹر تک رسائی حاصل ہو جائے۔"

غالب نے کہا "مدعا [illegible]......"

میں نے کہا "نہیں ابھی ہم صرف بلیک آؤٹ کے انتظامات کریں گے۔ تاکہ جب ضرورت پڑے تو دشمن کے سارے حفاظتی انتظامات دھرے رہ جائیں۔ مین سوئچ آف کرنا کوئی مشکل کام نہیں مگر اس کے ساتھ ہی جنریٹر چل پڑے گا۔ اصل کام ہے جنریٹر کو ناکارہ بنانا۔"

"میں تو الیکٹریشن نہیں ہوں۔"

نازو نے کہا "خاموشی سے وقت ہم گزار دیں گے۔"

میں نے کہا "لڑکی تم غالب کے ساتھ خاموشی سے ایک طرف کی دیوار کھودنے میں لگ جاؤ۔"

"بیک وقت دونوں کام نہیں ہو سکتے" نازو نے کہا "میں غالب کے ساتھ رہ سکتی ہوں یا خاموش رہ سکتی ہوں۔"

"پھر تم میرے ساتھ آجاؤ۔ گل! تم غالب کے ساتھ باہر کی طرف والی دیوار کھودو" میں نے اسے ایک چھینی دیتے ہوئے کہا "یہاں ہم ڈرل مشین استعمال نہیں کر سکتے۔ چونا جگہ میں مت لگ جائیں کوئی بات نہیں۔ کام بہت خاموشی اور احتیاط کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ہم ایک گھنٹے سے زیادہ وقت بچا رہے ہیں۔"

"وہ کیسے؟" گل نے کہا۔

"باقی سب دیواروں کو بخش کے" غالب نے کہا "تم تو ویسے ہی بک بک کرتی رہو گی نازو کی طرح یا کوئی کام بھی کرو گی۔ چلو۔"

اس سے پہلے کہ نازو پلٹ کر جواب دیتی میں نے اسے اپنے ساتھ کھینچ لیا۔ ہم دونوں کے پاس بھی ایک ہی چھینی تھی چنانچہ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ نازو کو محافظ مقرر کردوں۔ جب میں اپنے کام میں مصروف ہوا وہ ہاتھ میں ریوالور لئے کھڑی رہی۔ دوسری طرف غالب نے بھی گل کو یہی ذمے داری سونپ دی تھی جو درحقیقت فراغت تھی۔ وہ دونوں کچھ دیر تو کھڑی رہیں پھر انہوں نے ٹہلنا شروع کیا۔ پانچ منٹ بعد وہ دونوں کمرے کے [illegible] میں کھڑی ہوئی گپ لگا رہی تھیں۔

میں نے اپنا کام اتنی نزاکت اور احتیاط سے کیا جیسے [illegible]

سے اینٹ نکالنے کا نہیں شیشے پر نقاشی کا کام ہے۔ نتیجہ یہ کہ ایک اینٹ کو ہٹانے میں میرے بیس منٹ سے زیادہ ہی صرف ہوگئے۔ تاہم اپنے منصوبے میں ترمیم کے بعد مجھے وقت کی کمی کا احساس نہیں رہا تھا۔ میں زیادہ مطمئن اور پراعتماد تھا۔

ایک اینٹ ہٹانے کے بعد میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ شگاف برآمدے کے آخری حصے میں نکلا تھا۔ دائیں جانب وہ زینہ تھا جو نصف بلندی تک جا کے گھوم جاتا تھا۔ اس نصف بلندی کے نیچے ایک تکونی جیب والی جگہ میں بجلی کا سوئچ بورڈ تھا جس میں سے تار نکل کے جنریٹر تک جا رہے تھے۔ رابطوں کی اطلاعات بہت صحیح تھیں۔ جنریٹر ایک بیٹری سے چلتا تھا اور یہ بالکل کار کے انجن کی طرح سیلف اسٹارٹ تھا۔

زینے کے آغاز میں ایک ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ اوپر جہاں سے زینہ گھومتا تھا دوسری ٹیوب لائٹ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بجلی کے بورڈ پر ایک بلب لگا ہوا تھا مگر روشن نہیں تھا۔ اس کے قریب ہی دیوار پر وہ ایمرجنسی لائٹ لگی ہوئی تھی جس کی بیٹری چارج ہوتی رہتی ہے اور جو بجلی جاتے ہی خود بخود جل جاتی ہے۔ ان سب انتظامات کو ناکارہ کرنا معمولی کام تھا۔

جب شگاف اتنا بڑا ہو گیا کہ اس میں سے میں گزر سکتا تو میں نے دوسری طرف جا کے دیکھا۔ غالب کی پوزیشن نسبتاً محفوظ تھی کیونکہ وہ ہمارے کاٹھ کباڑ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا مگر اسے جگہ بنانے میں دقت پیش آرہی تھی۔ پانچ منٹ کی تاخیر سے اس نے بھی اپنا کام ختم کرلیا۔ اب میں نے بھی باہر اس طرف دیکھا جدھر لان تھی۔ سڑک سے آنے والے راستے پر مرکری بلب جل رہے تھے۔ میں نے مرکزی [illegible] کے بائیں طرف دیکھا تو مجھے دو گارڈ نظر آئے۔ ان میں سے ایک مشین گن لئے گشت کر رہا تھا لیکن دوسرا سر کے نیچے کچھ رکھے سویا پڑا تھا۔ غالباً یہ ان کا آپس میں طے کردہ دستور العمل تھا۔ دو افراد کو ساری رات جاگتے رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ چوکیداری کا کام تو ایک آدمی بھی کر سکتا ہے جو ضرورت پڑنے پر دوسرے کو فوراً جگا سکتا ہے۔ یہ ایک پرلطف سا سمجھوتہ تھا جس میں دونوں کے لئے بیک وقت کام اور آرام کی گنجائش نکل آتی تھی۔ وہ دونوں رات کو باری باری جاگتے اور سوتے ہوں گے۔

"رانا راؤ نے کہا تھا کہ آج پولیس بھی ہوگی" غالب نے کہا۔

"جب اصل محافظ سو رہے ہیں تو پولیس جاگ کر کیا کرے گی" میں نے کہا "وہ آگئے ان کا فرض پورا ہو گیا۔"

"ویسے بھی جو ہونا تھا ہو گیا۔ دوبارہ تو ہوگا نہیں۔"

"اور جو ہوا تھا وہ تمام حفاظتی انتظامات کے باوجود ہو گیا" میں نے کہا "اب میں پہلے الیکٹرک بریک ڈاؤن سسٹم میں تھوڑا سا [illegible] کرلوں پھر باہر نکلتے ہیں۔"

بجلی کو صرف ایک لیور کھینچ کر بند کیا جاسکتا تھا۔ ابھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اصل خطرہ متبادل نظام کا تھا جو بجلی بند ہوتے ہی فعال ہو جاتا تھا۔ ایمرجنسی لائٹس کو میں نے اسی کے سوئچ سے آف کیا اور پھر بہتر یہی سمجھا کہ اسے وہاں سے ہٹا دیا جائے تاکہ ہنگامی صورت حال پیدا ہوتے ہی کوئی وہاں پہنچے تو اسے روشنی نہ ملے۔ ایمرجنسی لائٹ پلاسٹک کے چھوٹے سے خوب صورت پیکٹ میں تھی اور اسے آسانی سے کیل پر بھی لٹکایا جاسکتا تھا یا ہاتھ میں بھی اٹھایا جاسکتا۔ یہ عام گھریلو استعمال کی لائٹ تھی جو بجلی نہ ہونے کی صورت میں دو تین گھنٹے کام دے جاتی تھی۔ اسے میں نے اتار کے نازو کے سپرد کیا۔ نازو اسے اندر پڑے ہوئے کاٹھ کباڑ میں ڈال آئی۔

جنریٹر کو میں نے پہلے تو بیٹری سے الگ کیا تاکہ بجلی جانے کی صورت میں یہ خود اسٹارٹ نہ ہو۔ بیٹری کے پول سے سیلف اسٹارٹ یونٹ تک جانے والے تار ایک جھٹکا دینے سے الگ ہوگئے۔ انہیں بھی میں نے نازو کو تھما دیا۔

"انہیں بھی اندر پھینک آؤں؟" وہ بولی۔

"جو چاہو کرو" میں نے کہا "مگر آہستہ بولو۔"

"انہیں رکھ لیتی ہوں۔ مضبوط تار ہیں" نازو نے کہا۔

"تمہارے کس کام کے؟" میں نے جنریٹر پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"ان سے ہتھکڑی کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ مجرموں کو باندھا جاسکتا ہے۔ ان کی کھال بھی ادھیڑی جاسکتی ہے۔ بل دے کر دوہرا کرلیا جائے تو ایسا مضبوط کوڑا بن جاتا ہے" نازو نے کہا۔ "اور جناب اس سے تو پھانسی بھی دی جاسکتی ہے۔ یوں گردن میں ڈال کے ایک جھٹکا۔"

"خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔ کوئی سن لے گا۔"

"میں نے تو کہہ دیا تھا کہ میں چپ نہیں رہ سکتی۔"

"وہ تم نے غالب کے ساتھ رخصتی کے وقت شرط لگائی تھی میرے ساتھ نہیں" میں نے کہا "آخر آج کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے مجھ پر بولنے کا" وہ بولی۔

"آج بہت غلط وقت پر اور غلط جگہ دورہ پڑا ہے" میں نے کہا۔

"میں تو اتنا آہستہ بول رہی ہوں کہ خود بھی صاف نہیں سن سکتی" نازو نے کہا "معلوم نہیں تم کیسے سن رہے ہو۔"

میں نے جنریٹر کے اسپارک پلگ کے اوپر لگی ہوئی پلاسٹک کیپ ہٹائی اور اس سے منسلک تار کو کھینچ کر توڑ دیا۔ اتنا کافی تھا۔ اب لائٹ آف ہونے کے بعد جنریٹر کے خود اسٹارٹ ہونے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کوئی خود آکے بھی اسے نہیں چلا سکتا تھا۔ اسے لائٹ نہ ملتی اور لائٹ مل جاتی تب بھی وہ اسپارک پلگ کا تار کہاں سے لاتا۔ ابھی ہم اس کارروائی سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ اوپر سے دو افراد کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ باتیں کرتے نیچے آرہے تھے۔

میں نے نازو کو اپنے ساتھ زینے کے نیچے کھینچ لیا۔ زینے

www.paksociety.com

کے پیچھے بھی بہت سا فاضل سامان پڑا ہوا تھا۔ مثلاً انجن آئل کے خالی ڈبے۔ ایک پرانا ٹائر اور پلاسٹک کے پائپ کا ایک لچھا۔ پھر بھی ہم دونوں کے لئے گنجائش موجود تھی۔

"یہ ابھی مصیبت پڑ گئی ہے گلے" اوپر سے اترنے والے ایک شخص نے نیم خوابیدہ بیزار لہجے میں کہا۔

"چل یار ایک چکر لگانے میں کیا ہے" دوسرے نے کہا۔ "اپنی کارروائی پوری ہو جائے گی ورنہ افسر لوگ صبح کہیں گے کہ تم ساری رات سوتے رہے۔"

میں نے سر تھوڑا سا نکال کے دیکھا۔ وہ پولیس کے محکمے کے لوگ تھے جن کو آج خاص طور پر یہاں حفاظتی انتظام کے لئے چھوڑا گیا تھا۔ وہ زینے سے اتر کے برآمدے کی جانب بڑھ گئے۔ میں نے ذرا پیچھے جا کے انہیں کونے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے ہوئے بند کمروں کے سامنے سے گزرتے جا رہے تھے اور ہر تالے کو چیک کر رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک برآمدے سے اتر گیا اور اس طرف چلا گیا جہاں اب سات ٹرک ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔

"ابھی یہ لوگ واپس بھی آئیں گے" نازو نے کہا۔

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا "ہاں" ایک چکر لگا کے آئیں گے۔"

"پھر ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟" نازو نے کہا "اوپر واپس جانے دیں یا اوپر پہنچا دیں؟ جہاں سے خدا ابھی ہی نہ ہو۔"

غالب نے شگاف میں سے سر نکال کے دیکھا "اب کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "دو پولیس والے آ گئے تھے۔ نازو کا خیال ہے کہ ان سے ابھی نمٹ لینا آسان ہے۔ ہم انتظار کر رہے ہیں ان کی واپسی کا۔"

"مگر میں کیا کروں یار؟ وہ قتل تو یاد میں بھی نہیں کرتی۔ کرتی ہے تو صرف محسن کی۔"

میں نے کہا "چل کچھ دیر تو بھی برداشت سے کام لے۔ مجھے اگر نازو سے کام نہ ہوتا تو میں ابھی تیرے حوالے کر دیتا۔ اس نے بہت ناچ نچایا ہے میرا۔"

"ذرا لفظ تو محترم کا نہیں تھا، کچھ بھرے جیسا تھا" نازو نے کہا۔

دونوں سپاہی پانچ منٹ بعد پھر نظر آئے۔ غالب اندر غائب ہو گیا۔

"یہ دونوں تو اکیلے آ رہے ہیں" میں نے نازو کے کان میں کہا۔

"پھر کیا ہوا۔ آنے دو۔"

"دونوں کو ایک ساتھ قابو کرنا ضروری ہو گا۔"

"تم پسند کر لو ایک کو" نازو بولی۔

"لیڈیز فرسٹ۔ جو تمہیں اچھا لگ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"موٹا مجھے زیادہ برا لگ رہا ہے" نازو نے کہا "چھوٹا تم لے لو۔"

"ارے کے تیار ہو جاؤ۔ میں دیکھ رہا ہوں انہیں آتے ہوئے"

"آواز میں بھی سن رہی ہوں" نازو نے بیزار ہو کے کہا۔

"ان میں سے کسی کی آواز نکلی تو مصیبت ہو جائے گی" میں نے کہا۔

آخری وقت میں معلوم نہیں کیا ہوا کہ ایک سائز والے دونوں پولیس مین آگے پیچھے نمودار ہوئے۔ چھوٹا ... اسے میں نے یوں دبوچا جیسے شکاری باز اپنے پنجوں میں کبوتر پکڑتا ہے۔ اس کی آواز تو نہیں نکلی مگر اس کے پیر ... خفیف سی آہٹ ہوئی۔ میں اسے کھینچ کر پیچھے لے گیا۔

موٹے نے ابھی اتنا ہی کہا تھا "کیا ہے یار" کہ نازو نے کمند ڈال کے گرا دیا۔ یہ کام وہ ہاتھوں سے بھی کر سکتی تھی مگر اس نے بجلی کے تار استعمال کئے۔ شاید مجھے ... نتیجہ کہ وہ اپنے مقصد میں کسی حد تک حق بجانب تھی۔

میں چھوٹے کو گردن مروڑ کے ڈال چکا تھا جب میں نے نازو کو بجلی کے تاروں کا حلقہ موٹے کی گردن میں ڈال کر اس کے دونوں کناروں کو پکڑ کے جھٹکا دیتے دیکھا۔ موٹا لڑکھڑایا ... لینے کے لئے تو میں نازو کی اس بے رحمی پر گھبرا کے متوجہ ہوا تھا۔ آخر ایسے وقت میں ایک نیا کھیل دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔ میرا خیال تھا کہ موٹا اب چلائے گا مگر نازو نے پھر ... اس کی گردن کی ہڈی ایک آواز کے ساتھ ٹوٹی۔ وہ اپنے وزن کے ساتھ نیچے گرا۔ نازو نے اسے روکا اور چھوڑا تو اس کے گرنے کا شور نہیں ہوا۔ نازو نے تار کھینچ لیا "فنش۔"

"چلو اب اٹھاؤ اپنے شکار کو" میں نے کہا۔

"اس گینڈے کو میں اٹھاؤں؟"

"خوب شکار آپ کریں۔ اٹھائے کوئی اور۔ بلاوے کے غلام کو۔" میں نے چھوٹے پولیس مین کو اٹھا کے شگاف تک پہنچایا اور اندر ڈال دیا۔

"غالب ذرا میری بات تو سنو" نازو نے بڑے پیار سے کہا۔

"باہر آ کے۔ اندر کیا کر رہے ہو؟"

"میں اندر ہی ٹھیک ہوں" غالب نے بے نیازی سے کہا۔

"جھک مار رہا ہوں اندر مگر خوش ہوں۔"

"دیکھو پھر میں روٹھ جاؤں گی" نازو نے ایسی ادا سے کہا کہ شرارت نہ ہوتی تو غالب سر کے بل آتا۔

"چلو تم روٹھے ہم چھوٹے" غالب نے کہا "دھوکے کا کام میں نہیں کرتا۔ میں نہیں آ رہا۔"

"اچھا پھر میں اندر آتی ہوں" نازو نے ہاتھ بڑھایا۔

"یار سکندر روک لے اسے۔ یہ کوئی جگہ نہ دکھانے کی" غالب نے پیچھے ہٹ کے کہا۔

"بدمعاش کو بدمعاشی سے کون روک سکتا ہے"

"بدمعاش نہیں، پیارا ہوں پیارا" نازو نے کہا۔

"اچھا یار ذرا جی" غالب نے ہاتھ جوڑ کے کہا "میں بے غیرتی اٹھا لوں۔ خدا کی قسم محبت کی تلخ تاریخ میں آج تک میرے جیسا ذلت اٹھانے والا عاشق نہیں ہوا۔ سب کچھ نہ کچھ عزت نفس رکھتے تھے۔ مجال ہے جو لیلیٰ نے کبھی مجنوں کو ذرا بھی ڈانٹا ہو یا شیریں نے فرہاد کو عذاب چکھایا ہو۔ ایسی خشونت گردی کی محبت سے تو بہتر ہے تنہائی ہو یا اور سوچ کے کھانے کی مشق کرے۔"

وہ تو باہر آ گیا تھا۔ باہر نازو نے اس کے کان میں کچھ کہا جو میں نہ سن سکا۔ پھر جب وہ واپس آیا تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ نازو مجسم ناز اور سراپا نیاز بنی ہوئی تھی۔ بہت بعد میں جب میں نے پوچھا تو غالب نے کہا کہ یار نازو نے بات ہی ایسی کر دی تھی۔ اس نے کہا کہ میرے سامنے لیلیٰ مجنوں کی باتیں مت کرو۔ انہوں نے تو جان لے لی تھی مجنوں کی اور فرہاد کی۔ میں تو محبت کرتی ہوں تم سے۔ اس کا اندازہ تمہیں اس وقت ہو گا جب نازو اپنی جان دے دے گی۔ اس کے بعد نازو کے جور و ستم کا گلہ کون کافر کر سکتا تھا۔

مرے ہوئے پولیس مین کی لاش کو دیوار کے شگاف سے گزارنا بڑا مشکل کام ثابت ہوا۔ میں اسے اٹھا کے کباڑ خانے میں بالائیوں کے پیچھے لے گیا اور چند منٹ بعد اس کی وردی میرے جسم پر تھی۔ یہ وردی مجھے ڈھیلی ضرور تھی لیکن اس وقت بھیس بدل کے مشتبہ شخصوں میں شامل ہونے کی اس سے بہتر صورت کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی جیب میں ایک پرس تھا جس میں کچھ نقد رقم تھی اور اس کا شناختی کارڈ تھا۔

غالب نے دوسرے پولیس مین کی لاش بھی وہیں ڈال دی جہاں اس کا ساتھی پڑا ہوا تھا۔ میری ہدایات کے مطابق غالب اس کی وردی بھی اتار لایا۔

"ان کے پاس نہ رائفلیں ہیں اور نہ ریوالور" نازو بولی۔

"ڈیوٹی چھوڑ آئے ہوں گے سب کچھ" میں نے کہا "تم لیڈیز ... وردی پہن لو۔ پھر میرے ساتھ چلو۔"

غالب نے کہا "اب کیا پروگرام ہے تمہارا؟"

میں نے کہا "ہم دونوں اس شگاف سے نکل کے سڑک کی طرف سے گیٹ تک جائیں گے۔ پولیس کی وردی سے محافظ دھوکا کھا جائیں گے اور مارے جائیں گے۔ ان کی مشین گنیں نکال لائیں گے۔"

نازو نے سر ہلایا اور اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

"نازو کے ساتھ میں گیٹ کی طرف سے اندر جاؤں گا" میں نے کہا "تم کسی کے ساتھ نہیں رہو گے۔ یہاں سے تم جھانک کر ساری اندر کا حال دیکھتے رہو گے۔ جب میں اور نازو مشین گن کے ساتھ اندر داخل ہو جائیں تو تم بجلی کا مین سوئچ آف کر دینا اور ہمیں آنے کے بعد پیچھے انتظار کرنا۔ اندھیرا ہوتے ہی کھلبلی مچے گی۔ کوئی فوراً یہاں پہنچے گا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ جنریٹر کیوں نہیں چلا اور الارم کیوں خاموش ہے۔ اگر ایک آدمی ہو تو کوشش کرنا کہ فائر کئے بغیر ہی کام چل جائے۔ دو ہوں تو رسک مت لینا۔ دونوں کو فوراً گولی مار دینا۔"

"فائر ہوتے ہی سامنے والے گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں گے۔"

"کرنے دو۔ آخر ان کے پاس کتنا اسلحہ ہو گا؟ اسلحہ ختم ہونے سے پہلے ہی ہم کوشش کریں گے انہیں ختم کرنے کی" میں نے کہا۔

"اندھیرے میں نشانہ کیسے لو گے؟"

"نشانہ لے کر تو وہ بھی فائر نہیں کر سکتے" میں نے کہا "ہم سیدھے ادھر ہی آئیں گے گیٹ کھلوانے کے بعد۔ ہو سکتا ہے کہ میں گیٹ پر نازو کو کھڑا کر دوں اور خود تمہارا ساتھ دینے کے لئے آ جاؤں۔ پھر ہم ادھر چلیں گے۔"

"نازو گیٹ پر کیا کرے گی؟"

"وہ نہ کسی کو باہر جانے دے گی نہ باہر سے کسی کو اندر آنے دے گی۔"

غالب نے کہا "یہ کام وہ کیسے کرے گی؟"

"اس کے پاس مشین گن ہو گی" میں نے کہا۔

"پھر یہ کام کل کو کرنے دو۔ نازو کو ہمارے ساتھ اندر جانا چاہئے" غالب نے کہا۔

میں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا "ٹھیک ہے۔ کل... جیسے ہی ہم اندر داخل ہوں، تم دوڑ کر گیٹ پر آ جانا۔ اس کے بعد تمہاری ڈیوٹی صرف گیٹ پر رہے گی۔ پھر کچھ بھی ہو جائے تم ہمارے آنے تک وہاں سے ہلو گی نہیں۔"

اندھیرے کی اوٹ سے نکل کے نازو نے کہا "میں تیار ہوں۔"

"چلو پھر نکلو" میں نے کہا اور خود بھی نازو کے ساتھ باہر آ گیا۔ ہم نے دو منزلہ عمارت کی عقبی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ ہم پہلے ایک فرلانگ تک سیدھے گئے۔ عقبی دیوار کے سائے میں اندھیرا تھا اور اس طرف سے کسی کی مداخلت کو ناممکن سمجھ لیا گیا تھا چنانچہ نگرانی کرنے والوں کی نظر ہمیں نہیں دیکھ سکتی تھی۔

ایک فرلانگ چلنے کے بعد ہم نے سڑک کا رخ کیا۔ سڑک مزید ایک فرلانگ دور بائیں جانب تھی۔ وہاں سے پھر بائیں ہاتھ گھوم کے ہم اس راستے تک پہنچ گئے جس پر مرکری بلب روشن تھے۔ یہ سیمنٹ کا بنا ہوا تقریباً دس فٹ چوڑا راستہ سیدھا گیٹ تک جا رہا تھا جو سڑک سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ ابھی تک ہم نے ایک ایسے مربع کے تین ضلعے طے کئے تھے جس کا ہر ضلع ایک فرلانگ لمبا تھا۔ چوتھا ضلع طے کرنے کے بعد آدھا میل پورا ہوتا تھا۔ یہ فاصلہ ہم نے تقریباً بیس منٹ میں طے کیا تھا۔

www.paksociety.com

جیسے ہی ہم تاریکی سے نکل کے روشن راستے پر نمودار ہوئے، میں نے جاگنے والے محافظ کو ٹھٹک کر رکتے دیکھا۔ اس نے جھک کر اپنے ساتھی کو بیدار کیا اور اس سے کچھ کہا۔ اس نے ہماری طرف اشارہ بھی کیا تھا۔ دوسرا محافظ بڑی پھرتی سے اٹھا اور اپنی مشین گن لے کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے نازو سے کہا "جاتے ہی حملہ مت کرنا۔ چند منٹ ان سے باتیں کروں گا میں۔ تم خاموش رہو تو اچھا ہے۔"

نازو نے سر ہلایا "کیا انہیں شک ہو گیا ہے؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں یہ لوگ ہمیں۔"

میں نے کہا "دیکھنے دو انہیں، ڈرو نہیں۔"

ہم بڑی بے فکری کے ساتھ جھکے جھکے انداز میں قدم اٹھاتے گیٹ کی طرف بڑھتے گئے۔ بالکل ان کے قریب پہنچ کے میں نے سگریٹ نازو کی طرف بڑھائی۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے اور کسی جھجک کے بغیر دو کش لئے۔ ظاہر ہے اس نے دھوئیں کو حلق سے نیچے نہیں اتارا تھا مگر اپنے سگریٹ پینے کے انداز میں مردانگی کا پہلو نمایاں کر دیا تھا۔

"کیا بات ہے سنتری بادشاہ؟" ایک محافظ نے جاہلانہ لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "بات کیا ہو گی بھیا، اپنی گشت کی ڈیوٹی ادھر ہے۔"

"سڑک کی طرف؟" دوسرے نے کہا۔

"ہاں بھیا، ادھر کریں تو کیا کریں" میں نے کہا "چائے تک نہیں ملی پینے کو۔ سوچا تم سے پوچھ لیں۔"

پہلے محافظ نے مشین گن کو کندھے پر لٹکا لیا۔ اس کی نظریں نازو پر جمی ہوئی تھیں۔

"چائے تو مشکل ہے اس وقت۔"

دوسرے محافظ نے اپنی مشین گن نیچے رکھ کے کہا "اب تم آ گئے ہو تو سگریٹ ہی پلا جاؤ۔"

"کیوں نہیں بھیا، یہ لو" میں نے آگے بڑھ کے سگریٹ کا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔ یہ میرے لئے بہترین موقع تھا۔ اسی وقت پہلے محافظ کو اس کی شامتِ اعمال نازو کی طرف لے گئی۔

"واہ بھئی، کیسا چھوکری کا ٹائپ معشوق لونڈا بھرتی کیا ہے" اس نے بے شرمی سے آنکھ مار کے کہا اور نازو کی طرف بڑھا۔

ادھر ایک محافظ نے مجھ سے سگریٹ لینے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ میں نے پیکٹ چھوڑ کے اس کی گردن کو ایک جھٹکے سے اپنی بغل میں دبا لیا۔ دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھا اور گھما کے تھوڑا سا اوپر اٹھایا تو اس کی گردن کی ہڈی جسم کے بوجھ سے ٹوٹ گئی۔ وہ میری گرفت میں تھوڑا سا تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔

ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں نازو بھی اپنے ہاتھوں کی ہلاکت آفریں مہارت کا مظاہرہ کر چکی تھی۔ اسے معشوق لونڈا کہنے والا بھی آواز نکالے بغیر مر گیا تھا اور ایک بے سدھ سے انداز میں اکڑا پڑا ہوا تھا۔

نازو نے سرگوشی میں کہا "گیٹ کے اندر بھی تو محافظ ہوں گے۔"

میں نے کہا "ہاں، ریما راؤ نے کہا تھا کہ دو محافظ ہوتے ہیں اور وہ اندر۔"

"ان سے دروازہ کیسے کھلوائیں گے ہم؟"

"ہم کہیں گے کہ اوپر ہمارے ساتھی کا پیغام ہے۔ اب … پولیس کو بھلا کون روکے گا۔"

"فرض کرو انہوں نے نام پوچھ لیا یا کہا کہ … کو ہم گیٹ پر بلا لیتے ہیں، پھر؟"

"پھر کیا۔ گیٹ کھلوانا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔"

نازو نے کہا "اگر گیٹ کھولنے کے بعد انہوں نے اپنے ساتھیوں کو غیر موجود پایا تو کیا ہو گا؟ لیکن ہم انہی کے ساتھ کے کسی ہنگامے کے بغیر اندر داخل ہو جائیں۔ ہمیں ایک بھی نہ چلانی پڑے تو کیا یہ بہتر نہ ہو گا؟"

میں نے کہا "بہتر! یہ تو بہترین عمل ہے عزیزہ۔ جب سے باتیں کرنے کا دورہ پڑا ہے یہ تم نے پہلی عقل کی بات کی ہے۔" میں ایک محافظ کو اٹھا کے گیٹ سے کچھ دور لے گیا۔ ایک قدرے تاریک جگہ پر ڈال کے لوٹ آیا۔ یہ جگہ بالکل جڑ میں تھی اور اس پر ایک درخت کا سایہ بھی تھا۔ دوسرے شخص کو میں دوسری طرف لے گیا۔ نازو کی آمد سے پہلے میں نے خود ہی اس کی وردی بھی اتار لی۔ یہ … کی وردی تھی۔

"یہ لو" میں نے وردی نازو کے حوالے کرتے ہوئے کہا "چلو اس طرف میں جاتا ہوں دوسری طرف۔"

نازو نے وردی لے کر قدرے تذبذب کے ساتھ کہا …

میں نے کہا "یہاں ڈریسنگ روم تو ہے نہیں۔ میری … مشرق کی سمت، تم مغرب کی طرف دیکھتی رہنا۔ اصل … ہی ہوتا ہے اور ہمیں کون ہے یہاں دیکھنے والا۔"

نازو کچھ شرمائی مگر پھر راستے سے اتر کے اندھیرے کے لئے ایک جھاڑی کے پیچھے روپوش ہو گئی۔ میں نے … طرف جا کے اطمینان سے پولیس کی وردی اتاری اور وردی پہن لینے کے بعد بھی کافی دیر انتظار کیا۔ پھر پلٹ کے دیکھا تو نازو ڈھیلی وردی میں کارٹون بنی کھڑی تھی۔ اس نے ساری پر پولیس کی وردی چڑھائی تھی اور اب … کی وردی پر ہی یہ ڈھیلی یونیفارم پہن آئی تھی۔ اس کے جسم کے … لباس تھے چنانچہ وہ کچھ پھولی ہوئی اور ڈھیلی … تھی۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں کی نزاکت کی جسم کے … پن سے کوئی نسبت نظر نہیں آتی تھی۔

گیٹ کے دوسری طرف بھی شاید ایسی ہی صورتحال … ان دو میں سے ایک محافظ جاگ رہا تھا۔ شاید دونوں … باہر والوں کی طرح ان کے لئے اپنی آنکھیں کھلی رکھنا اتنا ضروری بھی نہیں تھا۔ اگر کوئی گیٹ بجاتا تو ان کی آنکھ خود ہی کھل جاتی۔ گیٹ توڑ کر کسی کے اندر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"کیا اندر والے کوئی رابطہ نہیں رکھتے باہر والوں سے؟" میں نے آہستہ سے کہا "اتنی دیر میں ایک بار بھی نہ کسی نے … نہ کوئی بات کی۔"

نازو نے سر ہلایا "اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ رات کو بلا ضرورت کوئی کسی کی خبر نہیں لیتا۔"

"کیا خیال ہے میں گیٹ پر چڑھ کے دیکھوں؟"

"کیا ضرورت ہے اس اقدامِ خودکشی کی" نازو نے کہا۔

لوہے کے آٹھ فٹ چوڑے گیٹ میں ساڑھے پانچ فٹ کی بلندی پر ایک چھوٹی سی کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ تقریباً چھ انچ لمبی اور … انچ چوڑی۔ یہ اندر والے محافظوں کے استعمال کے لئے تھی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے وہ اس کھڑکی کا شٹر اٹھا کے دیکھ لیتے ہوں گے کہ دروازہ بجانے والا حقیقتاً داخلہ رکھتا ہے یا نہیں۔

نازو کو میں نے اپنی … سے کافی فاصلے پر کھڑا کیا اور خود دروازہ بجانے لگا۔

"ابے کیا ہے یار" کسی نے بے زاری سے چلا کے کہا۔ "سونے بھی نہیں دیتا۔"

"سالا پھر زیادہ کھا گیا ہو گا۔ ہماری نیند حرام کرنے کے لئے۔"

دوسرے شخص نے میرے اس مفروضے کو درست ثابت کیا کہ محافظ اندر سوئے پڑے ہوں گے۔ اس نے میری مشکل بھی آسان کر دی۔

"ہائے۔ ہائے۔ بڑا درد ہے پیٹ میں" میں نے کراہتے ہوئے کہا اور ایک محافظ کی آواز کی نقل اتارنے کی پوری کوشش کی۔

"تیرے لئے تو باہری ہونی چاہئے لیٹرین" پہلے شخص کی آواز دروازے کے قریب سے سنائی دی۔ پھر قفل کھلا اور گیٹ ابھی تھوڑا سا کھلا تھا کہ میں اسے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ سامنے آ جانے والے شخص کی صورت دیکھے بغیر میں نے اس کے سر پر مشین گن کا دستہ مارا۔ وہ چیخ مار کے وہیں گر گیا۔ دوسرے نے ہاتھ اپنی مشین گن کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ میں نے اس پر … کاری … اسے چارپائی سے اٹھنے کا موقع بھی نہ ملا۔ میں نے اس کے سر پر بھی مشین گن ماری تو اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور … کے زمین پر گر گیا۔ دونوں پر میں نے پوری قوت سے وار کیا تھا۔ ان کے سر پھٹ گئے تھے۔ نازو نے میرے پیچھے اندر داخل ہو کے پہلے شخص کی گردن پر پاؤں مارا تھا اور اسے ختم کر ڈالا تھا۔

… کا بھی کام تمام کر دیتی لیکن احاطے کے دوسری جانب … کی چھت پر سے کسی نے چلا کے کچھ کہا۔ اسی وقت لائٹ آن ہو گئی۔ میں نازو کا ہاتھ پکڑ کے دوسری طرف بھاگا۔ اندھیرے میں سامنے سے گولیوں کی ایک باڑھ آئی لیکن ہم گیٹ سے کافی دور جا چکے تھے۔ اندر والے دونوں محافظوں کی مشین گنیں بھی اب ہمارے پاس تھیں۔ ایک مشین گن نازو نے اٹھائی تھی اور دوسری میں نے۔ یوں اب ہمارے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک مشین گن تھی لیکن ہم رکے بغیر جوابی فائرنگ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اوپر سے کسی نے چیخ کے کہا "کون کر رہا ہے یہ فائرنگ؟"

کسی اور نے کہا "لائٹ کس نے بند کی ہے؟ باہر کی لائٹس تو جل رہی ہیں۔"

"جنریٹر کو دیکھو۔" پہلے والے شخص نے گالی دے کر کہا۔

سامنے سے محافظوں نے مشین گن کا دوسرا برسٹ مارا۔ اس کا رخ بھی گیٹ کی طرف تھا۔ سرچ لائٹس آف ہو جانے کے بعد وہ ہماری نقل و حرکت نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں اور نازو اب برآمدے میں دوڑ رہے تھے اور ہمیں ایک قطار میں کھڑے ہوئے سات ٹرکوں کی دیوار کا تحفظ حاصل تھا۔

"وہ ٹرکوں پر فائرنگ نہیں کریں گے" میں نے کہا "تم جا کے ایک مشین گن غائب کر دو۔"

"تم کہاں جا رہے ہو؟" نازو نے کہا۔

"میں آ رہا ہوں" میں نے دو ٹرکوں کے درمیان گھس کے کہا۔ اس تین فٹ کی گلی میں اگلے پہیوں کے پاس بیٹھ کے میں نے اطمینان سے نشانہ لیا اور مندر کی چھت پر بیٹھے ہوئے محافظوں پر پورا راؤنڈ چلا دیا۔ رات کے سناٹے میں گولیوں کی تڑتڑ کے ساتھ ہی کسی نے چیخ ماری۔ اس ایک چیخ میں دو آوازیں شامل تھیں۔ معلوم نہیں کون زخمی ہوا تھا اور کس حد تک۔ خالی ہو جانے والی مشین گن کو میں نے وہیں چھوڑ دیا۔

مجھ پر اوپر کی منزل سے کسی نے ریوالور کی گولی چلائی۔ میں ایک دم پیچھے ہٹا اور ایک جست میں پھر برآمدے کی چھت کے نیچے پہنچ گیا۔ بالائی منزل پر اب کھلبلی مچ گئی تھی۔ بہت سے لوگ ایک دوسرے پر چیخ چلا رہے تھے۔ محافظوں کو گالیاں دے دے کر بلا رہے تھے اور اس ہنگامے کا سبب پوچھ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو پکار رہے تھے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اب تک جنریٹر کیوں اسٹارٹ نہیں ہوا لیکن کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ اوپر سے کوئی شخص اندھا دھند فائر کرنے میں مصروف تھا۔

"ابے تمری…" کسی نے گالی دے کر کہا "کس پر گولیاں ضائع کر رہا ہے؟"

"وہ… ادھر میں نے خود دیکھا ہے کسی کو استاد۔ ٹرکوں کے بیچ میں۔"

"استاد کے بچے کوئی گولی ٹرک میں لگ جائے گی۔"

www.paksociety.com

زینے کی طرف کوئی ریوالور سے فائرنگ کر رہا تھا۔ آوازوں سے میں نے اندازہ کیا کہ گولیاں چلانے والے کم سے کم دو افراد تھے۔ ان دونوں کے ریوالور مختلف "کیلی بر" کے تھے چنانچہ ان کی آوازوں میں بھی فرق تھا۔ ایک آواز کرخت اور بھاری تھی' دوسری تیز۔ ان آوازوں نے رات کے سکوت کو درہم برہم کر دیا تھا اور آشیانوں سے نکل آنے والے پنچھی پر وحشت انداز میں چہکارتے ہوئے چلانے لگے تھے۔

گودام کے اندر یکلخت قیامت آ گئی تھی۔ اپنے حفاظتی انتظامات کو اطمینان بخش سمجھ کے سکون سے اس قلعے کے اندر بے خوف سو جانے والوں کے لئے یہ احساس کسی بھیانک خواب سے کم نہ ہوگا کہ دشمن اندر آ پہنچا ہے۔ ان کے حفاظتی انتظامات دھرے رہ گئے ہیں اور تاریکی میں ہر طرف سے موت کے سفاک سائے ان کی جانب بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ تربیت یافتہ اور تجربہ کار لوگ تھے مگر حملہ اتنا اچانک' شدید اور غیر متوقع تھا کہ وہ بدحواس ہو گئے تھے۔ دشمن کس طرف سے اندر آئے؟ کیسے آئے؟ محافظ انہیں روکنے میں کیوں ناکام رہے؟ انہوں نے کس طرح بجلی کی سپلائی اور بریک ڈاؤن کے متبادل انتظام کو ناکارہ کر دیا اور انہیں خبر تک نہ ہو سکی؟ یہ سب ایسے سوالات تھے جو ان سب کے ذہن میں ہوں گے مگر ان کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ قادیتا کی جنگ آدھی رات کے بعد ایک دم شروع ہو گئی تھی' جب وہ اس کے تصور اور امکان سے بے نیاز اپنے خوابوں اور خیالوں کی دنیا آباد کئے بیٹھے تھے یا سو رہے تھے۔ انہیں ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہونے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ اس سنگین حقیقت کا اعتراف انہیں ذہنی طور پر مفلوج کر رہا تھا کہ وہ محصور ہو گئے ہیں۔ یہ خوف ان کے اعصاب کو شکست دے رہا تھا کہ وہ خطرناک دشمن جس نے گزشتہ رات چوبیس لاشوں کے انبار لگا دیئے تھے' اپنی ساری ہلاکت خیز قوت کے ساتھ ایک طوفان بن کے ان پر ٹوٹ پڑا ہے۔

زینے کی طرف سے مشین گن نے ایک ساتھ کئی فائر کئے۔ ایک ہی موت کی لے میں کئی آوازوں' پر اذیت چیخوں اور درد بھری کراہوں کا شور مجھ تک پہنچا۔ میں ایک کمرے کے دروازے سے چپک کے کھڑا ہو گیا تھا۔ بھاگتے ہوئے مجھے اندیشہ تھا کہ میں کسی بھی سمت سے آنے والی گولی کا نشانہ بن جاؤں گا۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں تاریکی میں دیکھنے لگی تھیں۔ باہر گیٹ سے سڑک تک جانے والے راستے پر لگی ہوئی مرکری لائٹس کا تھوڑا سا اجالا منعکس ہو کے اندر بھی پہنچ رہا تھا۔

میں نے بائیں جانب دیکھا جہاں اب کوئی کسی پر گولی نہیں چلا رہا تھا اور چلا کے کہا "غالب!"

غالب کا جواب فوراً آیا "ادھر سب ٹھیک ہے۔"

"تم لوگ کہاں ہو؟"

"ہم اندر ہیں۔ پہلے کمرے میں۔ دروازہ کھول دیا ہے ہم نے" غالب نے کہا۔

"ٹھیک ہے' وہیں رہو ابھی۔"

"تم کیا کر رہے ہو اکیلے؟"

میں نے اندھیرے میں نظر جما کے کہا "میں اگر..." میری نظروں نے مندر کی چھت پر سے اتر کر طرف آنے والوں کو تاڑ لیا تھا۔ وہ احاطے کی ... ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ اب منظم ہو گئے تھے ... میں نہیں دوڑ رہے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے ... فاصلہ ایک جست میں طے کرتے تھے اور پھر لیٹ ... ہو جاتے تھے۔ رینگ کر یا جھک کر چلتے ہوئے آہستہ ... گیٹ کی طرف سے چکر لگا کے آ رہے تھے۔ میں ... باری باری اٹھتے اور دوڑ کر گرتے دیکھا۔ شاید ... چھت پر چھ افراد کی چوکی تھی اور ان میں سے دو ... جا چکے تھے۔ برآمدے سے نکل کر میں ... پھر میں نے نشانہ لے کر انتظار کیا۔ وہ جیسے ہی ... دوسری مشین گن کا راؤنڈ چلا دیا۔ وہ چاروں ... زد میں آ گئے۔ ایک ساتھ اچھلے اور چیخ مار کے گرے۔

"ویری گڈ" زینے کی طرف سے غالب نے نعرہ لگایا۔

"ادھر سے اب کوئی خطرہ نہیں رہا" میں نے کہا ... دوسرے دروازے تک چلا گیا۔ میرے اور غالب کے ... اب صرف چند فٹ کا فاصلہ حائل رہ گیا تھا۔ اوپر کی ... مکمل خاموشی تھی۔ چیخ پکار اور اندھا دھند فائرنگ ... تاہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوتا کہ اوپر ... سب مارے جا چکے ہیں۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا ... مورچہ بند ہو کے بیٹھ گئے ہیں اور یہ سب لوگ ... مضبوط اعصاب کے مالک ہیں اور اتنی ٹریننگ ... سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوئے ... خطرناک بھی تھے جو اب خاموشی سے انتظار کر رہے ... پیش قدمی کرے۔ وہ ہمیں دھوکا دے کر موقع فراہم ... کہ ہم میدان صاف سمجھتے ہوئے بے خوف ہو کے ... انہیں اپنے شکاری ہونے کا یقین حوصلہ ... بھی ضرور ہوگا کہ مقابلے پر ... اناڑی نہیں ہیں۔ گزشتہ رات ... کارروائی بہت موثر رہی تھی اور جیسا کہ ... ہماری وحشت ایسی بیٹھی تھی کہ ساری بستی پر خوف ... طاری تھا۔ اس ناقابل تسخیر سمجھے جانے والے ... کامیاب حملے نے یقیناً اس دہشت میں اضافہ کیا ... جانے والوں میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے تھے جو ... شکست تسلیم کر چکے تھے۔ اگر ہم انہیں موقع ... ہتھیار ڈالنے کو ترجیح دیتے اور میں نے فیصلہ کیا ... کارروائی سے پہلے ایک اعلان ضرور کروں گا۔

اچانک میں نے گیٹ کی طرف اوپر سے ایک سایہ ... دیکھا۔ تاریکی میں وہ انسانی ہیولا جھولتا ہوا نظر آیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی رسی سے لٹک کر اتر رہا ہے اور گیٹ سے نکل کر فرار ہو جانے کے چکر میں ہے۔

میں نے ریوالور نکال کے نشانہ لیا اور وہیں سے چلا کے کہا "خبردار! تم میری زد میں ہو۔ وہیں رک جاؤ۔"

وہ چلانے لگا "بھگوان کے لئے گولی مت چلانا... میں مر جاؤں گا۔"

میں نے کہا "نیچے اتر کے ہاتھ سر پر رکھو اور آہستہ آہستہ ادھر آ جاؤ۔ میری آنکھیں اندھیرے میں تمہاری ہر حرکت دیکھ رہی ہیں۔"

"میں ویسا ہی کروں گا جیسا حکم کرو گے... لیکن دیکھو گولی مت چلانا بھیا" اس نے گڑگڑا کے کہا "میں مر جاؤں گا۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ اندھیرے میں تمہاری کھوپڑی کو نشانہ بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے میرے لئے" میں نے کہا "کیا میں گولی مار کے یہ رسی توڑ دوں جس سے تم لٹکے ہوئے ہو۔"

"نہیں' ایسا ظلم مت کرنا۔ ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی میری" اس نے بلبلا کے کہا۔

"تمہارے پاس ہتھیار ہے تو نیچے پھینک دو" میں نے کہا۔

"پستول۔ جیب میں ہے' میں نکال نہیں سکتا۔ نیچے آ کے نکال دوں گا" وہ تقریباً رو کے بولا "بس گولی مت مارنا مجھے' میں مر جاؤں گا۔"

مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی جو اس نے تیسری بار کہی تھی لیکن میں نے اس میں اداکاری کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ بزدلی کا ڈرامہ رچا کے مجھے الجھانے کی کوشش کر رہا ہو اور جب میں اس کو بے ضرر تسلیم کر لوں تو وہ اپنی چالاکی سے کام لیتے ہوئے میرا کام تمام کر دے۔

میں نے کہا "نیچے اتر کے ہاتھ اوپر کئے تم نے یا گیٹ کی طرف دوڑ لگانے کی کوشش کی تو چھلنی کر دوں گا۔"

وہ نیچے اتر کے ہاتھ اوپر کئے میری طرف بڑھا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اس پر سے نظر نہیں ہٹائی۔ میرے ریوالور کا نشانہ اس کا دل تھا اور میری انگلی ٹریگر دبانے کے لئے تیار رہی۔ جب وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رہ گیا تو میں نے اسے غور سے دیکھا اور بھونچکا رہ گیا۔ مجھے شک ہوا کہ شاید اندھیرے میں میری نظروں نے اس کی صورت میں آشنائی کے نقوش دیکھ کر دھوکا کھایا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ جس شخص کو خود میں نے اپنے ہاتھ سے گولی ماری تھی وہ پھر میرے سامنے زندہ سلامت آ جائے۔

میں نے کہا "بس۔ آگے مت آؤ۔ اپنا چہرہ دوسری طرف کرو۔"

"اچھا۔ اچھا جی۔ مگر مجھے گولی مت مارنا' میں مر جاؤں گا" اس بار اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میرا تو خیال تھا کہ تم مر چکے ہو" میں نے آگے بڑھ کے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "بالک رام لھوترہ۔"

"میں' میں تو زندہ ہوں جی۔ ابھی تک۔ بھگوان کی کرپا ہے" وہ خوشامدانہ انداز میں بولا۔

میں نے اس کے کرتے کی جیب میں سے ریوالور نکال لیا۔ "اب چلو میرے ساتھ' یہ فیصلہ تمہیں دیکھ کر دوسرے کریں گے کہ تم زندہ ہو یا مردہ۔ اور اگر تم بالک رام ہو تو گولی مارا جانے والا کون تھا؟ بالک رام۔"

"میں بالک رام ہوں جی۔"

"اچھا آگے چلو... تم جو بھی ہو" میں نے کہا اور اسے دھکیل کر خود اس کے پیچھے ہو گیا۔

جس کمرے میں داخل ہونے کے لئے ہم نے دیوار پھاندی تھی' اب اس کے دروازے کا قفل ٹوٹا پڑا تھا اور دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ دروازے کی طرف غالب ایک مشین گن لئے کھڑا ہوا تھا۔ عقبی راستے کی حفاظت پر گل مامور تھی۔ میں اور نازو اسی راستے سے باہر گئے تھے۔ تیسری طرف جدھر بجلی کا سوئچ بورڈ اور جنریٹر تھا وہاں نازو کا پہرہ تھا۔

"یہ کون ہے؟" غالب نے کہا۔

"یہ دوسرا بچہ ہے" میں نے کہا "سنبھالو اسے۔"

"بالک رام لھوترہ ثانی" غالب نے حیران ہو کے کہا "یا پہلے بالک رام کا بھوت؟"

"ادھر کی صورت حال کیا ہے؟" میں نے نازو کے پاس جا کے باہر کا جائزہ لیا۔ دو افراد جنریٹر کے پاس پڑے ہوئے تھے۔ دو زینوں پر۔

نازو نے ایمرجنسی لائٹ جلائی "یہ دو لائٹ جلانے آئے تھے۔ وہ دونوں بعد میں اترے تھے۔"

میں نے کہا "زینے پر یا آس پاس کوئی چھپ کر تو نہیں بیٹھا ہوا ہے؟"

نازو نے نفی میں سر ہلایا "غالب کا کہنا ہے کہ دو بری طرح زخمی ہوئے تھے لیکن پلٹ کے اوپر بھاگ گئے تھے۔"

"اس کا کچھ اندازہ ہوا کہ اوپر اب کتنے آدمی باقی بچے ہیں؟"

"اندازے لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے پوچھ لو۔ تم زندہ پکڑ لائے ہو" نازو بولی۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ یہ اوپر سے ہی نازل ہوا تھا۔"

"کیا یہ واقعی بالک رام ہے؟"

میں نے کہا "نام کا پتا نہیں۔ صورت شکل میں اس کی کاربن کاپی ہے۔ چاہو تو اسے اصل سمجھ لو اور جو گولی مارا گیا تھا اسے نقل۔"

"ہم شکل جڑواں بھائی۔"

"غالباً۔ ڈبل رول میں کوئی اور بھی ہو سکتا ہے" میں نے کہا "کسی اور کو بالک رام بننے کا فائدہ؟"

www.paksociety.com

"قائدہ بالک رام اپنا ہی کھاتا ہوگا۔ نواب خسرو جیسے آنجہانی بھی اپنا ہمشکل ضرور رکھتے تھے۔ جہاں خطرہ محسوس کرتے تھے اپنے نقش ثانی کو بھیج دیتے تھے۔ مقصد اصل کی حفاظت تھا۔ ضائع ہو تو نقل ضائع ہو' نقل ایک اور بھی بنائی جا سکتی ہے۔"

نازو نے قائل ہو کے کہا "شاید ایسا ہی ہو۔ بالک رام کا کوئی جڑواں بھائی ہوتا تو دلدار اس کا ذکر ضرور کرتا۔ اسے سب معلوم تھا۔"

"ہاں۔ اب تم جا کے مین سوئچ آن کر دو۔"

"نہ بابا' یہ بجلی کا کھیل میں نہیں کھیلتی" نازو نے کان کو ہاتھ لگا کے کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم ہو کیا چیز!" میں نے شگاف سے باہر جاتے ہوئے کہا "کسی آدمی سے نہیں ڈرتی ہو' خواہ اس کے ہاتھ میں مشین گن ہو یا بم۔ لڑتے وقت موت کو بھول جاتی ہو۔ مگر کاکروچ سے اور بجلی سے ڈرتی ہو۔ بجلی کیا کہتی ہے" میں نے لیور کو اوپر اٹھا دیا۔

"بجلی کرنٹ مارتی ہے جناب" نازو نے خفت سے کہا۔

ایک دم اوپر نیچے کی ساری لائٹیں جل اٹھیں۔ کمرے میں دو سو واٹ کے دو بلبوں کی خیرہ کن روشنی پھیل گئی۔ اوپر کی منزل پر تھوڑی سی ہلچل پیدا ہوئی۔ شاید گھات میں بیٹھے ہوئے دشمنوں نے جو اب تک تاریکی سے فائدہ اٹھانے کا سوچ رہے تھے' اب اپنے منصوبے بدل لئے تھے۔ پرانے طرز کی چھتوں پر لگی ہوئی سرچ لائٹس کے روشن ہو جانے سے احاطے کے اندر کا منظر واضح ہو گیا تھا۔ مندر کی چھت کے عقبی حصے کی چوکی پر اب کوئی نہیں تھا۔ گیٹ کی طرف سے چوڑائی کے رخ پھیلی ہوئی دیوار کے ساتھ چار لاشیں الٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے خون کے چھینٹے تک دیوار پر صاف نظر آتے تھے۔

اب میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے بارہ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ ہم نے ساری کارروائی اپنے پروگرام کے مطابق مکمل کر لی تھی اور باقی مسائل سے نمٹنے کے لئے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔

غالب نے اپنے طور پر بالک رام ثانی سے کچھ تفتیش کی تھی۔ اس کے آثار بالک رام کی آنکھ کے نیچے نیل اور ہونٹوں کے کنارے پر خون کے نشان کی صورت میں دیکھے جا سکتے تھے۔

"یہ بالک رام نہیں ہے" غالب نے اعلان کیا۔

میں نے پلٹ کے نازو کی طرف دیکھا "میرا بھی یہی اندازہ تھا۔ تم نے اتنی جلدی تفتیش مکمل کر لی۔"

"اس نے وعدہ معاف گواہ بننے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کی فراہم کردہ معلومات درست ثابت ہوئیں تو اس کی جاں بخشی کر دی جائے گی۔"

"بالکل ٹھیک" میں نے کہا پھر بالک رام ثانی سے مخاطب ہوا "تم نے یہ بہروپ کیوں اختیار کیا تھا؟"

"اپنی مرضی سے نہیں کیا تھا جی' مجبوری کی بات تھی۔ میری شکل کچھ ملتی تھی بالک رام سے۔ اس نے کہا کہ میرے ساتھ رہو۔ جو کام کہوں وہ کرو۔ اگر میرے کام کے قابل ثابت ہوئے تو اچھا پیسہ دوں گا۔ میں بے روزگار تھا' قربانی کا بکرا بننے کے لئے بھی تیار ہو گیا۔"

"کتنے معاوضے پر تم نے اپنی زندگی رہن رکھی تھی؟"

"پہلے دو ہزار مہینہ طے ہوا تھا' کھانا پینا الگ۔ حادثے کی صورت میں بیوی بچوں کو پچاس ہزار اور موت کی صورت میں ایک لاکھ ملتے۔ بعد میں جب بالک رام نے دیکھا کہ میں بھروسے کا آدمی ہوں تو اس نے پانچ ہزار مہینہ کر دیا' حادثے کے لاکھ اور موت کے پانچ لاکھ۔"

"حادثہ کبھی پیش نہیں آیا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ایسا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا کہ میں معذور ہو جاتا۔"

"تمہیں یہ یقین تھا کہ اگر تم مر گئے۔ تو وہ تمہارے بیوی بچوں کو پانچ لاکھ ضرور دے گا؟" میں نے کہا "تمہاری زندگی کے لئے کاروبار تھی۔ اس کا معاوضہ وہ اچھا دے رہا تھا تو اسے بالک رام کی ضرورت یا مجبوری سمجھا جا سکتا تھا۔ مگر تمہارے مرنے کے بعد تمہارے بیوی بچوں پر وہ پانچ لاکھ کیوں لٹاتا۔ ایمان آدمی کا کوئی ایمان ہوتا ہے؟"

اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ نہ اقرار نہ انکار۔ شاید وہ خود بھی سمجھتا تھا مگر وہ پانچ ہزار ماہانہ نقد سے دستبردار ہونا قبول نہیں کر سکتا تھا۔

"تم اس کا کیا کام کرتے تھے؟"

"جہاں وہ خود جاتے ہوئے ڈرتا تھا یا یہ سمجھتا تھا کہ اس کا جانا ضروری نہیں' وہاں مجھے بھیج دیتا تھا۔ میں اس کی بہت اچھی آواز بنا لیتا تھا۔ اس کے سارے معاملات کو سمجھتا تھا اور فیصلے کرتا تھا۔ صورت میں جو معمولی سا فرق تھا وہ اس نے بمبئی لے جا کے دور کرا دیا تھا۔"

"اس نے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا ہوگا تمہارے تعاون سے؟"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے تسلیم کیا کہ شروع شروع میں ایسا ہوا تھا۔ پہلی بار بالک رام نے اپنی کوٹھی میں دعوت کا انتظام کیا۔ اس میں علاقے کے سب معزز لوگ' پولیس افسر اور جج وغیرہ موجود تھے۔ میزبانی کے فرائض نقلی بالک رام نے ادا کئے۔ اصل بالک رام اپنے کمرے میں سوتا رہا اور نہ جانے کس وقت پیچھے سے نکل کے اپنی بیوی کے میکے جا پہنچا۔ اس کی دوسری بیوی بہت نقد اور زیور لے کر ماں باپ کے گھر جا بیٹھی تھی اور غالباً اسے بلیک میل بھی کر رہی تھی۔ بالک رام نے اس کے متعلق کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ دعوت والی رات اس نے اطمینان سے بیوی کو' ایک سالی کو اور اس کے بچوں کو قتل کیا۔ اپنا سب نقد اور زیور اٹھایا اور واپس آ گیا۔

گواہ اس نے مار دیئے تھے مگر بہت سے لوگوں نے قتل کے چشم دید گواہ کے طور پر اسے وہاں آتے اور پیچھے جاتے دیکھا تھا۔ وہ سب جھوٹے ثابت ہوئے۔ بہت سے لوگوں اور پولیس نے ان کی وضاحت کی کہ انہیں سرکاری مہمان کے طور پر خوب خاطر مدارات کی۔ بالک رام لمحہ بھر کو اس رات تمام وقت مہمانوں کے درمیان موجود رہا تھا اور وہ سب بڑے معتبر لوگ تھے جو پورے یقین کے ساتھ یہ بات تسلیم کرتے تھے۔

"ایسے بہت سے واقعات ہیں جی" وہ بولا۔

میں نے کہا "ایک مثال کافی ہے۔ ایک آخری بات یہ بتاؤ۔ تمہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ تم بالک رام بن سکتے ہو۔ اصلی بالک رام کے وجود کو ختم کر کے؟"

اس نے کچھ قدرے تذبذب کے بعد اقرار کیا کہ ایسا خیال اس کے دماغ میں اکثر آتا تھا۔ مگر یہ بات خود اصل بالک رام بھی سمجھتا تھا چنانچہ وہ اپنی حفاظت کے خیال سے کبھی غافل نہیں رہتا تھا۔ ہم اس کی پہیلی تھی ورنہ موقع تو مل ہی جاتے۔ وہ مجھ پر بھروسہ تو کرتا تھا مگر کسی کا خون نہیں کر سکتا تھا اور یہ بات اس نے بالک رام کو پہلے ہی بتا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ قتل کرنے کے لئے وہ خود جاتا تھا۔

"ایک فائدہ ایسا تھا جو میں نے اٹھایا اور بالک رام کو خبر نہ ہوئی" اس نے مسکرانے کی کوشش کی "ابو! بات کیسے خبر ہو سکتی تھی جب ایسی کسی بدھرم پتی کو نہیں ہوا۔"

"یہ نا ممکن ہے۔ کہ بیوی اصل اور نقل میں فرق محسوس نہ کر سکے۔"

"پھر وہ خود ہی خاموش رہی ہوں گی جی۔ اس سے خوش ہوتی تھی جو خود کبھی کسی کا نہیں ہوا۔ بیوی تو بازار کی جوتی کی طرح بدل لیتا تھا۔ دوسری عورتیں الگ آتی جاتی رہتی تھیں۔"

میں نے کہا "لعنت بھیجو اس پر' اب یہ بتاؤ کہ اوپر کتنے لوگ ہیں؟"

"مجھے۔ نہیں معلوم جی' میں تو کل رات جان بچا کے بھاگا تو ادھر یہاں آ کے چھپ گیا تھا۔ بالک رام ہی ہمیشہ اس کمرے میں ٹھہرتے تھے۔ یہ ان کا اپنا کمرہ تھا۔ میں اس کمرے سے باہر نکلا بھی نہیں تھا۔ ابھی نکلا تھا جی پھر جان بچانے کے لئے تو آپ سامنے آ گئے تھے۔"

میں نے دھمکی کے انداز میں کہا "تم کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ سچ کو چھپانا اور جھوٹ بولنا برابر ہوتا ہے۔ اس طرح تم رعایت سے محروم کر دو گے۔"

"بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں جی...."

"بھگوان کو بیچ میں مت لاؤ" میں نے کہا "جو کہنا ہے اپنی استواری کو یہ سمجھتے ہوئے کہو کہ داؤ پر تمہاری زندگی ہے۔"

"اگر تم بالک رام بن کے ٹھہرے ہوئے تھے۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہیں اوپر کے ہر کمرے میں موجود ہر شخص کے بارے میں معلوم نہ ہو۔ تم بالک رام ہو اس جگہ کے۔"

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا "اگر تم بالک رام ہو۔ تو ایک بالک رام کی موت کو کیسے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس کی لاش مل چکی ہے۔"

"یہی تو گڑبڑ ہو گئی تھی۔ اگر اس کی لاش غائب ہو جاتی تو میرے لئے کوئی مشکل نہ ہوتی۔ میں بالک رام بن جاتا جی۔ مگر رات کو جب میں بھاگ کے آیا تھا تو یہاں کسی کو شک نہیں ہوا تھا۔ میں بالک رام کے کمرے میں گھس کے بیٹھ گیا تھا۔ صبح اس کی لاش ملنے کے بعد یہ لوگ آ کے مجھے مارنے لگے۔"

"کون لوگ؟"

"ایک تو استاد پیڈرو ہے' کالا بھجنگ...."

"ہم جانتے ہیں اسے۔"

"اسی نے سب سے زیادہ مارا مجھے' کہنے لگا' بدمعاش' تم کون ہو جو بالک رام بنے ہوئے ہو؟ بالک رام تو مارا گیا رات کو۔ مجبوراً مجھے سب کچھ بتانا پڑا۔"

"استاد پیڈرو کے علاوہ کون آیا تھا؟"

"ایک بمبئی کا سیٹھ ترپاٹھی تھا۔ اس کے ساتھ ایک پولیس افسر تھا۔ اس نے کہا کہ ابھی اسے بند رکھو' باہر مت نکلنے دو۔ بعد میں اس سے اچھی طرح پوچھیں گے کہ بالک رام کب سے بے وقوف بنا رہا تھا ہم سب کو' انہوں نے بالک رام کو بہت گالیاں دیں جو ڈبل رول سے دنیا کے ساتھ ان کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکتا رہا۔"

"بس یہی تین آدمی تھے؟"

"وہ تین آدمی بالک رام کے بھی تھے۔ وہ اوپر ہی ہوں گے۔ اس کے بعد میں ان کا قیدی بن گیا تھا۔ مجھے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ کسی نے کھانے پینے کو بھی نہیں پوچھا مجھ سے۔ اس وقت بھگدڑ مچی تو شاید کسی نے غلطی سے کنڈی کھول دی۔ پھر مجھے ایک رسی مل گئی اور میں.... موقع پا کے نکل آیا۔ زینے کی طرف سے جاتا تو سارے کمروں کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ اور زینہ تھا بھی گیٹ سے دور۔ معلوم نہیں نصیب میں کیا ہے۔ کل جان بچا کے نکلا تو یہاں پھنس گیا۔ آج آپ نے پکڑ لیا۔"

"جیسا کھیل تم کھیل رہے تھے جی' اس میں ایسا تو ہو سکتا تھا جی" میں نے اس کی نقل اتار کے کہا۔

نازو نے کہا "کیا خیال ہے۔ اوپر چلیں؟"

میں نے کہا "جلدی کی ضرورت نہیں' وہ لوگ ہماری قید میں ہیں۔ ہم ان کی قید میں نہیں ہیں۔"

"فائرنگ کی آوازیں بستی میں بھی سنی گئی ہوں گی" گل بولی۔

"بستی والے محاصرہ کرنے کے لئے نہیں آ جائیں گے۔ جو ہمارے گئے ابھی ان کا کریا کرم بھی نہیں ہوا اور کسی کو کل سب کے ساتھ چتا میں جلنے کا شوق نہیں ہوگا۔ اپنے دروازے ہی نہیں کان بھی بند کر لئے ہوں گے سب نے۔ اپنی جان سب

www.paksociety.com

بنائی ہوئی ہے۔ گشت پر مامور پولیس والے بھی غائب ہو چکے ہوں گے۔ صبح تک کوئی خلل نہیں ہوگا ہماری کارروائی میں۔"

میرے بجائے غالب نے جواب دیا اور خواتین کو خاموش کرادیا جو اوپر جاکے رابعہ اور محسن سے ملنے کے لئے زیادہ بے قرار تھیں۔

میں نے کہا "جتنی معلومات ہمیں حاصل ہوں گی ہماری منصوبہ بندی اتنی ہی بہتر ہوگی اور اتنے ہی کامیابی کے امکانات روشن ہوں گے۔"

"ہم کیا کریں؟ تم تو تفتیش میں مصروف ہو" نازو نے کہا۔

"تم بھی بے کار نہیں بیٹھی ہو، تمہارا کام زیادہ اہم ہے۔ یہ نہ ہو ادھر ہم بالک رام نمبر دو سے پوچھ گچھ کرتے رہ جائیں، ادھر کسی سمت سے اچانک دشمن حملہ کردے۔"

غالب نے کہا "اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔ صرف زبان بند رکھو۔"

میں نے کہا "یہ مشکل ہے، آج اسے دورہ پڑا ہے باتیں کرنے کا۔"

نازو نے کہا "باتیں کس سے کروں؟ دیواروں سے، یا ان لاشوں سے جو سامنے پڑی مجھے گھور رہی ہیں۔ کل بھی تو اتنی دور بیٹھی ہے دوسری طرف منہ کئے۔"

غالب نے کہا "دورہ شدید ہے تو میرے تصور سے باتیں کرو اور وہ سب کہہ ڈالو جو آج تک شرم کی وجہ سے خود سنسر کرتی رہی ہو۔"

"ایسی بے شرمی کی باتیں تمہیں ہی سوجھتی ہوں گی" نازو نے کہا۔

"کیسی بے شرمی کی باتیں۔ میں نے کب کہا ہے کہ وہ بے شرمی کی باتیں ہوں گی" غالب ہنسنے لگا "اسے کہتے ہیں، چور کی داڑھی میں تنکا۔"

میں پھر اپنے قیدی کی طرف متوجہ ہوگیا "تم بالک رام نہیں ہو مگر ہم تمہارے لئے یہی نام استعمال کریں گے۔ ذرا سوچ کے بتاؤ، اس سوال کے جواب پر تمہاری زندگی کا انحصار ہے۔ جواب غلط مت دینا۔ کیا اوپر کسی کمرے میں کوئی قیدی ہے؟"

"میں نے سنا تھا جی، کل ایک مرد اور عورت پکڑے گئے تھے۔ انہوں نے بنگلے کے کمرے میں گھس کے کنڈی بند کی تھی۔"

"تم نے انہیں دیکھا نہیں؟"

"نہیں۔ میں بتا چکا ہوں جی کہ پہلے میں کمرے سے نہیں نکلا تھا۔ پھر مجھے نکلنے نہیں دیا گیا تھا" بالک رام بولا۔

"کیا وہ اس وقت بھی اوپر موجود ہوں گے؟" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "اور اگر موجود ہیں تو کس کمرے میں۔"

"میں کیا بتاؤں جی، کل رات تو تھے۔ آج دن بھر کی مجھے کوئی خبر نہیں کہ کون آیا کون گیا" وہ بولا۔

مجھے اس کی بات میں جھوٹ محسوس نہیں ہو رہا تھا "ان دونوں کے علاوہ یہاں کوئی قیدی نہیں تھا۔ پہلے سے؟"

بالک رام نے نفی میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "اچھی طرح سوچ لو۔ ایک عورت کو، کسی بچے کو دیکھا تھا تم نے؟"

"عورت اور بچہ!"

میں نے شملا کا حلیہ بتایا "وہ ان میں سے کہاں لائے گئے تھے۔"

"کب لائے گئے تھے؟"

"یہ ٹرک کب پہنچے تھے، تم جانتے ہو؟" [illegible] اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا جھانپڑ مارا اور ریوالور کا رخ اس کی طرف کردیا۔

وہ پیچھے گرا اور بلبلانے لگا "بھگوان کے لئے مجھے [illegible] ورنہ میں مرجاؤں گا۔"

"تو پھر جو تم سے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔"

"یہ ٹرک میرے سامنے نہیں آئے، میں ایک ہفتہ باہر تھا۔ پرسوں ہی بمبئی سے واپس لوٹا تھا۔ مجھے نہیں معلوم۔"

"بمبئی کس کام سے گئے تھے؟"

"سیٹھ ترویدی سے مال کی بات کرنے کے لئے اور وصول کرنے کے لئے۔"

میں نے کہا "کیا مال لانا تھا وہاں سے؟"

"وہی جو ہمیشہ آتا تھا، اسمگلنگ کا مال۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "ان ٹرکوں میں وہی مال آیا ہوگا۔ شراب، خوشبو، سگریٹ۔"

"ہاں جی، جیسی مال ہی اسمگل ہوتا ہے۔"

"اس کے علاوہ کچھ نہیں؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "ہمیں معلوم ہے اس کیمپ میں کیا کیا ہے اور ہم دیکھ بھی لیں گے۔ تمہیں دکھا بھی دیں گے۔ [illegible] رہے ہو تو ابھی وقت ہے۔ ہم سچ بولنے کے لئے ایک موقع [illegible] سکتے ہیں۔"

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا "کچھ گولہ بارود [illegible] بھی ہیں۔"

میں نے اس کے منہ پر ایک مکا رسید کیا "تم جو بات [illegible] تھے اسے کیوں چھپا رہے تھے؟"

وہ پیچھے کی طرف گرا اور پھر بڑی مشکل سے کراہا۔ [illegible] کے جبڑوں سے خون رسنے لگا تھا۔ "مجھے ٹھیک سے معلوم [illegible] تھا۔ میں نے صرف سنا تھا۔ دیکھا کچھ نہیں تھا۔ [illegible] کیا بھروسہ۔ میں پورے یقین کے ساتھ ایک بات [illegible] میں غلط ثابت ہوتی" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیا اس سے پہلے بھی تم نے اسلحہ آتے نہیں دیکھا [illegible]"

"نہیں، میں سوگند کھا سکتا ہوں کہ پہلے ایسا کوئی [illegible] آتی تھی۔ جو مال آتا رہا اس کے متعلق مجھے پہلے ہی [illegible] تھا۔ مجھے یہ بھی بتادیا جاتا تھا کہ کتنا مال کہاں جانے [illegible]

[illegible] جمعدار اور عدالت سے پیش کار۔ پولیس افسر اور خاص خاص لوگوں کے لئے تحفے میں ہی لے کر جاتا تھا۔ صاحب لوگوں کے لئے ولایتی شراب، ان کی بیویوں کے لئے خوشبو اور بچوں کے لئے کھلونے وغیرہ۔ اس مرتبہ بالک رام نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ ترویدی کے پاس صرف یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا کہ مال کب پہنچے گا۔ اس کی تفصیل سے مجھے بے خبر رکھا تھا۔ اور جب اس مرتبہ مال آیا تو وہ خود یہاں موجود تھا۔ ورنہ وہ مجھے بھیج دیتا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ اس بار معاملہ نازک ہے چنانچہ میں گودام کی طرف نہ جاؤں۔"

"تم نے پھر اسلحے کی بات کس سے سنی؟"

"کل رات یہاں پہنچنے کے بعد، استاد پیڈرو نے اور دوسرے سب لوگوں نے مجھے بالک رام سمجھ کے بات کی اور کہا کہ معاملہ بہت گڑبڑ ہوگیا ہے۔ انہوں نے تسلی دے کر کہا تھا کہ سکندر اور اس کے ساتھی یہاں بھی پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے سب [illegible] قتل و غارتگری کی ہے۔ کیا تم سکندر ہو؟"

سوال اتنا اچانک کیا گیا تھا کہ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا "نہیں میں سکندر نہیں ہوں، اس کے ماتحتوں کا ماتحت ہوں، وہ بہت اونچی چیز ہے۔"

غالب نے معنی خیز طریقے پر کھنکار کے کہا "بالکل ہمالیہ پہاڑ سمجھ لو۔"

نازو نے کہا "بلکہ ہمالیہ پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر کھڑا ہوا سمجھ لو، اس سے اونچی کیا چیز ہوگی۔"

میں نے بڑی مشکل سے بات بنائی "مطلب یہ کہ وہ ایسے چھوٹے موٹے کام خود نہیں کرتا۔ خیر تم بتاؤ اور استاد پیڈرو نے کیا کہا تھا؟"

"انہوں نے کہا تھا کہ جب تک وہ پکڑے نہیں جاتے یا ان کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو جاتا کہ وہ اس علاقے سے نکل گئے ہیں، ہم آگے اسلحہ روانہ کرنے کا رسک نہیں لیں گے۔ وہ راستے میں بھی حملہ کرسکتے ہیں۔ اس پر ترویدی نے کہا تھا کہ حملہ تو یہ کرسکتے ہیں۔ ہمارا انتظام پکا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ نقصان کریں گے۔ قابل تلافی نقصان۔ بہادر آدمی کتنا بھی بہادر کیوں نہ ہو [illegible] بہرحال نہیں ہوتا۔"

محسن نے کہا "اس پکے انتظام کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں بتایا تھا؟"

"نہیں، وہ جلدی میں تھا۔ اسے پولیس کے کسی بڑے افسر کا [illegible] درست کرانے کے لئے کسی وزیر سے فون کرانا تھا۔ [illegible] چیف منسٹر کا خاص آدمی ہے وہ۔ وہ اس سارے [illegible] کی ناکہ بندی کرانا چاہتا تھا۔ جو پولیس افسران کے ساتھ [illegible] نے کہا تھا کہ مجھے تحریری مل جائے تو میں اس علاقے کا چپہ چپہ چھان ماروں۔ وہ اگر چوہے بن کے بل میں گھس جائیں تب بھی انہیں ڈھونڈ نکالوں۔ اسے یقین تھا کہ تم لوگ پانچ سات میل کے اندر ہی آس پاس کہیں موجود ہو۔ ان کی باتوں سے ہی میں نے اندازہ کیا تھا کہ اس مرتبہ اسلحہ آیا ہے۔"

میں نے اس صورت حال پر کچھ دیر غور کرنے کے بعد جرح ملتوی کی اور غالب سے مشورہ کرنے کے لئے اسے الگ لے گیا۔ نقلی بالک رام کو میں نے دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑا ہونے کا حکم دیا اور اسے بتادیا کہ میرے ریوالور کی گولی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے، وہ بے حس و حرکت کھڑا رہے۔

"اب کیا خیال ہے۔ پہلے کیا کرنا چاہئے۔ اوپر جاکے باقی سب کو بھی ٹھکانے لگا دینا چاہئے یا ٹرکوں اور گوداموں کو دیکھنا چاہئے۔"

غالب نے کہا "نیچے کا کام پہلے ختم کرلینا بہتر ہے۔ یہ معلوم تو ہو کہ اسلحہ کیا ہے اور کتنا ہے۔ ہمیں اپنے مطلب کی کوئی چیز مل جائے۔ مثلاً ٹائم بم یا مشین گن کے راؤنڈ، کوئی شیشے کا تابوت نظر آجائے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یار وہ سب بلفر کا ڈرامہ تھا۔ وہ شملا کو ایسے ہی اپنے ساتھ لے آئے ہوں گے۔ اس وقت مجھے اور رابعہ کو دہشت زدہ کرنے کے لئے شملا کو تابوت میں دکھایا تھا۔ ...تابوت اتنا نازک تھا کہ اسے وہ اٹھائے نہیں پھر سکتے۔ شملا اول تو ویسے ہی خاموش رہنے پر راضی ہوگئی ہوگی اور اس نے اپنے بیٹے کو بھی چپ رکھا ہوگا۔ شور مچانے سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ اسے بے ہوش کرکے یا باندھ کے ڈال دیتے۔"

"ہم اوپر کیسے جائیں گے یار؟ رابعہ، محسن اور شملا نہ ہوتے تو کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ ہم اپنا اکلوتا ٹائم بم پھینک کے سب کا ملبہ کردیتے لیکن سب کے ساتھ تو وہ بھی ہیں" غالب نے کہا "ہماری کارروائی سے انہیں بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"اس مسئلے کا کوئی حل تو نکالنا ہی پڑے گا" میں نے کہا۔

"کیوں نہ ہم بالک رام کو ڈھال بنائیں۔"

میں نے کہا "اس کا کوئی فائدہ نہیں، ان کے نزدیک یہ نقلی بالک رام ایک بے وقعت چیز ہے جسے وہ خود ضائع کرنا چاہیں گے... اگر وہ کسی کی غلطی کے نتیجے میں فرار نہ ہوتا تو انہی کے ہاتھوں مارا جاتا۔ اس کا ہماری تحویل میں رہنا دشمنوں کے لئے باعث تشویش بن جائے گا۔ اسے وہ پہلے گولی ماریں گے کہ کہیں ہم اس سے وہ سب باتیں نہ اگلوالیں جو ان کے نقطہ نظر سے اہم ہیں اور ہمیں معلوم نہیں ہونی چاہئیں۔"

"چلو ٹھیک ہے، ہم اس وعدہ معاف گواہ کو فی الحال زندہ رکھنے کے لئے نیچے ہی چھوڑ جائیں گے۔"

"یہ تو ابھی اور بہت کچھ بتائے گا۔"

"ٹرکوں کی تلاشی ہم سب کو مل کر لینی چاہئے۔ یہ سات ٹرک ہیں" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"ہم گل کو یہاں چھوڑ دیتے ہیں، بچے کو سنبھالے۔" غالب نے اونچی آواز میں کہا "اگر ہم ایک ایک ٹرک دیکھیں گے تو ایک ہی وقت میں تین ٹرک دیکھ لیں گے۔"

گل نے اپنا نام سن کے سر گھمایا "میں بہت تھک گئی ہوں ایسے بیٹھے بیٹھے۔"

میں نے کہا "اچھا ادھر آ جاؤ، بچے سے دل بہلاؤ۔"

غالب نے نازو کو بلا لیا "تمہاری ناقص عقل کیا کہتی ہے بیچ اس مسئلے کے؟"

نازو نے ہماری باتیں سنی تھیں کیونکہ ہم اس کے بہت قریب کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے کہا "ایسے منہ اٹھا کے ٹرک میں چڑھو گے تو وہ اوپر سے گولی مار دیں گے۔"

"نہیں" میں نے کہا "بارود کے ڈھیر میں چنگاری پھینکنے کی حماقت کوئی نہیں کرے گا۔ ایک ٹرک کو صرف ایک گولی اڑا دے گی۔ اس ایک دھماکے سے باقی اسلحے کا ذخیرہ بھی تباہ ہوگا اور اس کے بعد کچھ بھی نہیں بچے گا۔ نہ یہ جگہ اور نہ وہ۔ وہ ابھی تک اس لئے مورچہ بند ہیں کہ انہیں اپنی شکست منظور نہیں۔ انہیں یقین ہے کہ وہ ہمیں روک سکتے ہیں اور اس وقت تک ہمارا مقابلہ کر سکتے ہیں جب تک کہ باہر سے ان کے مددگار نہ آ جائیں۔ ابھی وہ محصور ہیں لیکن انہیں امید ہے کہ بالآخر ہم محصور ہو جائیں گے اور ہتھیار ڈال دیں گے۔"

"اسی لئے انہوں نے ٹرک کی سمت میں ابھی تک فائر کرنے سے گریز کیا ہے" غالب نے کہا۔

"ایک گولی نہیں چلائی مجھ پر۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ میں ٹرکوں کے بیچ میں سے فائر کر رہا ہوں۔ یا برآمدے میں موجود ہوں۔ یہ ٹرک نہ ہوتے تو ایک برسٹ مار کے وہ میرا خاتمہ کر دیتے" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "اتنی دیر سے ہم خاموش ہیں۔ کہیں دشمن یہ نہ سمجھ رہا ہو کہ ہم جتنا نقصان کر سکتے تھے ایک حملے میں کر گئے اور جان بچا کے نکل گئے۔"

"اچھا ہے اگر ایسی غلط فہمی کا شکار ہو کے وہ اپنے مورچے سے نکل آئیں" غالب نے کہا "لیکن بے وقوف وہ ہوتا ہے جو دشمن کو بے وقوف سمجھے۔ ہمارے یہ دشمن نہ ہمیں کمزور سمجھتے ہیں اور نہ بے وقوف۔"

میں نے کہا "وہ صبح تک دم سادھے بیٹھے رہیں گے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہماری خاموشی بھی کوئی چال ہے۔ ان کی دلی خواہش ہوگی کہ ہم بھی رات بھر ایسے ہی بیٹھے رہیں اور صبح ہو جائے کسی طرح۔"

غالب نے کہا "اب یہ عقل سے کام لینے کی اور صبر و ضبط کے حوصلے کی آزمائش ہے۔ جو گھبرا کے یا خوش فہمی کا شکار ہو کے پہلے اپنی کمین گاہ سے نکلے گا وہی مارا جائے گا۔"

"اپنی موجودگی کا ثبوت ہم ابھی فراہم کر دیتے ہیں" شہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تعریف لائیے خاتون" غالب نے کہا۔

"جی نہیں حضور، پہلے آپ۔"

"لیڈیز فرسٹ" میں ایک مہذب آدمی ہوں" غالب نے ... میں نے برآمدے میں آ کے ریوالور سے سرچ لائٹ کو نشانہ لیا جو پرانے فصیل نما عمارت کی چھت پر میرے بالکل سامنے نصب نظر آ رہی تھیں۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی شیشہ چھناکا ہوا اور ایک سرچ لائٹ اندھی ہو گئی۔ ابھی شہزاد دوسری کا نشانہ ہی لیا تھا کہ غالب نے فائر کر دیا۔ اس کا نشانہ بھی غیر معمولی اور ہم سب کے نشانے سے بہتر تھا۔ دوسری سرچ لائٹ بھی گل ہو گئی اور احاطے میں اندھیرا پھیل گیا۔

میں برآمدے میں چلتا ہوا دوسرے اور پھر تیسرے گودام کے دروازے تک گیا۔ ایک ایک گولی سے میں نے قفل توڑ دیا۔ ہم نے لائٹ جلا کے ہر گودام کا جائزہ لیا۔ ہر ہال میں سامنے کی طرف گندم اور چاول کی بوریوں کی دیوار تھی۔ اس دیوار کے پیچھے اسلحے کے بکس تھے۔ لکڑی کے ان صندوقوں کو بھی چاروں طرف چھت تک چائے کے ڈبوں، ملک پاؤڈر کے ڈبے اور گھٹیا قسم کی کریم وغیرہ سے بھر دیا گیا تھا۔ اسلحہ نیچے تھا۔ ہمارے لئے بکس کھول کر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ جو چند باکس ہم نے دیکھے ان میں وہی پرانا اسلحہ تھا جو ہم پہلے کئی جگہ دیکھ چکے تھے۔ وہی غیر ملکی ساخت کے پستول اور ریوالور، ان کی گولیاں، ملکی ساخت کے دستی بم جن پر غیر ملکی نشانات بنائے گئے تھے تاکہ ان کی زیادہ قیمت وصول ہو سکے۔ رائفلیں، مشین گنیں اور ان کے راؤنڈ۔

"کیا مال ہم نہیں ہیں اس کیمپ میں" غالب نے مایوسی سے کہا۔

"ہوں گے کسی کریٹ میں۔ سب تو نہیں کھولے ہم نے" میں نے کہا۔

"یہ تو بہت زیادہ اسلحہ ہے یار" غالب نے کہا "اس کے علاوہ ٹرک الگ کھڑے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ٹرکوں پر سے مال اتار لیا گیا ہے" نازو نے کہا۔

"یہ بے سروپا خیال آخر تمہارے ہی دماغ میں کیوں آتا؟" غالب نے کہا "کبھی ہمیں بھی موقع دیا کرو کوئی احمقانہ بات کرنے کا۔"

"اچھا میں اب نہیں بولوں گی" نازو نے برا مان کے کہا "تم نہیں خود کو کیا سمجھتے ہو۔ دنیا کے سب سے بڑے احمق تم خود ہو۔"

"اس میں کیا شک ہے۔ جو تم جیسی مصیبت کو لے کے بھی خوش ہو وہ اور کیا کہلائے گا" غالب نے کہا۔

معلوم نہیں نازو نے اسے کیا سمجھا۔ اعتراف محبت یا ...

... حملہ، تعریف یا تنقیص۔ میں نے اسے کچھ اور ... کہنے کا موقع نہیں دیا۔ گودام سے باہر نکل کے میں نے پہلے ٹرک میں چڑھنے کا ارادہ کیا۔ اس کا پچھلا حصہ برآمدے سے لگا ہوا تھا جسے ترپال سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ پیچھے سے ترپال کے نیچے لگے ہوئے ہک کے چھلوں میں سے ایک ہی رسی اس طرح گزاری گئی تھی جیسے ٹانکے لگا کے ترپال کو ٹرک کے ساتھ سی دیا گیا ہے۔

اس رسی کو کھولتے ہوئے میری نگاہ اوپر دیکھتی رہی اور میرے ہاتھوں کی انگلیاں اپنا کام کرتی رہیں۔ دوسرے ٹرک کا پہرہ غالب بنا ہوا تھا اور تیسرے ٹرک کے پاس نازو تھی۔ اگر اوپر سے کوئی ہمیں نشانہ بنانا چاہتا تو اس موقع سے پورا فائدہ اٹھا سکتا تھا جب ہمارے ہاتھ خالی تھے اور ہماری توجہ بھی بٹی ہوئی تھی۔ شاید فائرنگ کے بعد دشمن کی باقی ماندہ سپاہ نے باہر نکلنے اور ہماری موجودگی کے بارے میں اپنے شکوک رفع کرنے کے سارے منصوبے ختم کر دیے تھے۔

ٹرک میں داخل ہونے سے پہلے میں بھی کسی حد تک نازو کے اس خیال سے متفق ہونے لگا تھا جسے غالب نے احمقانہ قرار دیا تھا۔ مگر یہ بات صرف نازو کو چھیڑنے کے لئے کی گئی تھی۔ وہ درست ثابت ہوئی۔ ٹرک میں نیچے سے اوپر تک وہ کریٹ بھرے ہوئے تھے جو عموماً پھل وغیرہ کی نقل و حمل میں استعمال ہوتے ہیں۔ میں نے اوپر چڑھ کے ایک کریٹ کھولا تو اس میں آلو نظر آئے۔ میں نے اندر ہاتھ ڈال کے دیکھا اور پھر کریٹ الٹ دیا لیکن اس میں صرف آلو تھے۔ دوسری لائن کے کریٹ میں بھی آلو تھے۔ اس کے نیچے والے میں پیاز تھے۔ ظاہر ہے یہ اصل مال کو چھپانے کی تدبیر تھی۔ آلو اور پیاز ضائع ہونے والی چیز نہیں تھے۔ ٹرک اگر ہفتہ بھر بھی یونہی کھڑا رہتا تو کوئی حرج واقع نہ ہوتا۔ پیشتر سبزیاں، پھل اور انڈے خراب ہو کے سڑ جاتے ہیں اور بو دینے لگتے ہیں۔ آلو اور پیاز کے کریٹ بھرنا سستا بھی پڑتا ہے۔

ٹرک میں شاید دو ڈھائی سو کریٹ تھے۔ ہر کریٹ کو کھول کر دیکھنا ممکن نہ سہی بہت دشوار کام تھا۔ پانچ منٹ بھی اگر ایک کریٹ کھولنے میں صرف ہوتے تو اس ایک ٹرک کے لئے شاید گھنٹوں بھی کم تھے۔ چنانچہ میں نے سامنے کے کریٹ نہ کھولنے کا فیصلہ کیا۔ اصل مال پیچھے ہوگا اور بہت پیچھے ہوگا۔ اس فارمولے پر عمل کرتے ہوئے میں نے آخری حصے کی نشاندہی کی۔ ٹارچ کی روشنی میں ... سے اوپر کے کریٹ ہٹا کے دیکھا اور کامیاب رہا۔ نیچے کے پانچ کریٹ اسلحے سے بھرے ہوئے تھے۔

میں نے اپنی ریسرچ کے نتائج سے غالب اور نازو کو آگاہ کرنا بہتر سمجھا تاکہ وہ غیر ضروری طور پر وقت اور محنت کے ضیاع سے بچ جائیں۔ مگر ابتدائی ناکامی کے بعد خود انہوں نے بھی ... لیا تھا۔

"یہ تو بہت اسلحہ ہے یار سکندر" غالب نے پریشانی سے کہا۔

میں نے کہا "ہاں، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب گودام پہلے ہی بھرے ہوئے تھے تو ایک اور کیپ یہاں کیوں لائی گئی۔"

"جو مال پہلے سے موجود تھا وہ اب تک آگے کیوں نہیں روانہ کیا گیا؟" غالب نے کہا۔

"غالباً یہی وجہ ہے کہ ٹرک بھرے ہوئے کھڑے ہیں۔ ہو گی کوئی ایسی بات کہ ابھی تک پچھلا مال نہیں نکلا۔"

"ایسی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"وجوہات کئی ہو سکتی ہیں۔ ٹرک نہ ملے ہوں۔ راستے میں کوئی خطرہ یا رکاوٹ ہو چنانچہ لائن کلیئر ہونے کا سگنل نہ ملا ہو۔"

غالب نیچے اتر آیا اور نازو کی طرف گیا "کیا تم ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہو کہ اس ٹرک میں صرف آلو اور پیاز ہیں۔"

میں نے کہا "نیچے آ جاؤ، جو ثابت ہونا تھا وہ ثابت ہو گیا ہے۔"

نازو نے پودے سے برآمد ہوتے ہوئے کہا "یہ پیاز تمہارے لئے بھیجے گئے ہیں۔ لو پہلے سو پیاز کھا لو" اس نے غالب کو ایک پیاز پیش کیا۔

مجھے اچانک درمیان والے ٹرک کا خیال آیا۔ اس کے باہر نیلے کی رنگ کی وہ پٹی بھی موجود تھی جو شناخت کی علامت تھی۔ نازو نے میری نگاہوں کا مفہوم سمجھ لیا اور اس کے پردے کی ڈوریاں کھولنے لگی۔ نازو کے بعد غالب اور پھر میں نے اندر پہنچ کے دیکھا تو کریٹ مختلف انداز میں رکھے ہوئے نظر آئے۔ یہ کریٹ ایک قطار کے پیچھے دوسری قطار جما کے نہیں بھرے گئے تھے۔ اس میں درمیان کی جگہ کو خالی چھوڑا گیا تھا۔ یہ چار چھ فٹ کی جگہ اوپر سے ایک گہری قبر کی طرح نظر آتی تھی کریٹ اس کے چاروں طرف ... اور انہیں گرنے سے بچانے کے لئے چاروں طرف لوہے کی مضبوط گرل کھڑی کی گئی تھی۔

کچھ کہے بغیر سب نے جان لیا کہ یہ انتظام کس کے لئے تھا۔ اس پنجرے میں شملا کو اور اس کے بیٹے کو قید کر کے لایا گیا تھا لیکن اب وہ یہاں نہیں تھے۔ میں لوہے کی گرل پر قدم جما کے اندر اتر گیا۔ یہ ایک بے مقصد جذباتی حرکت تھی جس کے پیچھے شوق اور تجسس سے زیادہ محبت کے جذبات کارفرما تھے۔ ہم سب وہ جگہ دیکھنا چاہتے تھے جہاں شملا کا تصور باقی تھا۔ اس کی مظلومیت اور بے بسی کا احساس باقی تھا۔ اس کی پُر اذیت قید تنہائی میں گزرنے والے صبر آزما لمحوں کا لمس باقی تھا۔ جب میں رابعہ کے ساتھ دوبارہ اپنے والد وزیر خان مرحوم کے گھر میں داخل ہوا تھا تو اس وقت بھی میری جذباتی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔

نازو نے نیچے جھک کر کوئی چیز اٹھائی۔ یہ مٹی کا ایک ختم ہو جانے والا ٹکڑا تھا۔ نازو نے اسے چوما اور مٹھی میں رکھ لیا۔ میں نے اور غالب نے اندھیرے میں بھی اس کے رخساروں پر

شانے پر ہاتھ رکھ کے اسے قریب کرلیا۔

"اور کچھ دیر ان آنسوؤں کو سنبھال کے رکھو جان" غالب نے پیار سے کہا "ابھی کچھ دیر بعد اس سے گلے مل کے جتنا چاہو رو لینا۔"

نازو نے ایک ادھوری سسکی کے ساتھ کہا "میں کہاں رو رہی ہوں۔"

میں نے اور غالب نے اس کو جھوٹا نہیں کہا کیونکہ وہ واقعی نہیں رو رہی تھی۔ آنسو خود اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ قصور نازو کا نہیں تھا۔ اس کے آنسوؤں کا تھا' قصور نازو کے حساس' نازک دل کا تھا جو یادوں کی آنچ سے پگھل کر اشک بن گیا تھا۔ ہم زیادہ سخت دل رکھتے تھے کہ اس پر صرف نمی آئی جو پردہ چشم تک پہنچ کے غائب ہوگئی۔

میں نے اور غالب نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اور ہاتھوں سے ٹٹول کے دیکھا۔ غالب کو ٹافیوں کے کچھ ریپر ملے۔

"انہوں نے بچے کو ٹافیاں دی تھیں" غالب نے تلخی سے کہا۔

"چپ کرانے کے لئے دی ہوں گی" میں نے کہا۔

"تو ان کی مہمان نوازی کو تسلیم نہیں کرتا ہے۔"

اچانک میرے ہاتھ میں کانٹا چبھا۔ میں نے اس چیز کو اٹھالیا۔ یہ کانوں کے ٹاپس میں سے ایک تھا۔ میں نے اسے روشنی کے رخ کرکے دیکھا۔

"یہ شملا کا ہے؟" نازو نے کہا۔

"اور کس کا ہو سکتا ہے" میں نے اداسی سے کہا۔

تاریکی میں اس کا رنگ تو نظر نہیں آتا تھا لیکن نازو نے اس کے ڈیزائن کو پہچان لیا تھا۔ جب میں نے اسے شیشے کے ایک تابوت میں محو خواب دیکھا تھا تو اس نے یہی ٹاپس پہن رکھے تھے اور رابعہ نے مجھے بتایا تھا کہ یہ ٹاپس اس نے شملا کو دیے تھے۔ اس نے ٹاپس کو تصویر میں بھی شناخت کرلیا تھا۔ اب یہ شملا اور رابعہ دونوں کی نشانی تھا۔ میں نے اسے سنبھال کے رکھ لیا۔ اس کے علاوہ وہاں کچھ نہیں تھا۔ ہم تینوں نے اپنے ہاتھوں سے فرش کو کھنگال ڈالا مگر کچھ اور تلاش کرنے میں ناکام رہے۔

"معلوم نہیں یہ گر گیا تھا... یا گرایا گیا تھا۔"

"گر گیا ہوگا" میں نے کہا "گرانے میں کوئی سینس نہیں ہے۔ نہ شملا یہ سوچ سکتی تھی کہ ہم یہاں پہنچ جائیں گے۔ نہ اس کو قید کرکے یہاں لانے والوں کے نزدیک اس کا کوئی امکان تھا۔ کوئی مقصد حاصل نہیں ہوسکتا تھا اسے عمداً یہاں چھوڑنے سے۔"

"مجھے یہ تو ثابت ہوگیا کہ شملا اسی ٹرک میں یہاں پہنچی تھی۔ اپنے بیٹے کے ساتھ" غالب نے کہا۔

"اور اب وہ کہیں ہیں" نازو نے کہا۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ — نہیں... اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا' لیکن میں نے بے سبب نازو کو مایوسی عطا کرنے سے گریز کیا جو بہرحال ناامیدی سے بہتر ہے۔

"باقی ٹرکوں کو دیکھنا ہے؟" غالب نے باہر آکے سوال کیا۔

میں نے کہا "میرے خیال میں تو اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم جو معلوم کرنا چاہتے تھے وہ کرچکے ہیں۔"

"ہاں۔ صرف آلو پیاز کے بھرے ہوئے ٹرک سے اور کیا نکلے گا یہ لوگ" غالب نے کہا۔

نازو نے کہا "اتنے آلو پیاز کہاں جائیں گے آخر؟"

"چوہدری بڈاور کے گھر اس کی ہوٹل کی بھی باقی تمام عمر خریدنے کی ضرورت سے بے نیاز ہوگی" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "پیکنگ میٹریل بھی بک جاتا ہے۔ مال اتار کے ڈرائیور چلے جاتے ہوں گے سبزی منڈی۔"

"رائٹ" غالب نے کہا "یہ لوگ سبزی منڈی میں کسی فرضی نام سے آلو پیاز کے آڑھتی بنے بیٹھے ہوں گے۔ خوب چل رہے ہوں گے ان کے بے ضرر کاروبار۔"

کسی چلانے کی آواز سن کر ہم سب اچھل پڑے اور اس کمرے کی طرف بھاگے جہاں ہم نقلی بانکے رام کو گل کی تحویل میں چھوڑ آئے تھے۔ اندر جاتے ہی میں نے بانکے رام کو فرش پر ایڑیاں رگڑتے دیکھا۔ خون کا فوارہ اس کے سینے سے اٹھ رہا تھا۔

"اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی" گل نے بتایا۔

میں نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔"

"کیا تم نے کوئی رعایت دی تھی اسے؟" غالب نے کہا۔

گل نے اعتراف جرم کے انداز میں سر ہلایا "اس نے کہا تھا کہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اور ہاتھ اٹھا کے کھڑے کھڑے تھک گیا ہے۔ میں نے بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ بیٹھا رہے گا تو وہیں۔ اس نے قریب سے لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھایا پتا نہیں کیسے اور مجھ پر کھینچ مارا۔"

"ارے! تمہارے سر سے تو خون نکل رہا ہے" نازو نے چونک کر کہا "تم نے بتایا نہیں۔"

گل مسکرائی "ایسے ہی معمولی سی چوٹ ہے۔"

اب میں نے اور غالب نے بھی گل کی پیشانی پر بائیں جانب خون کے داغ کو دیکھا' ابھی تک ہماری ساری توجہ دم توڑتے ہوئے شخص کی طرف تھی۔

نازو نے قریب جاکے زخم کا معائنہ کیا "خون ابھی نکل رہا ہے مگر کوئی فکر کی بات نہیں' صرف کھال ہی پھٹی ہے۔ کچھ باندھ دیتی ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں" گل نے کہا۔

"اچھا صاف تو کردوں" نازو نے کہا اور پھر جیب سے ایک رومال نکال لیا۔

میں نے کہا "یہ سب غیر ضروری وردیوں کا بوجھ تو اتاردو۔"

"واقعی" اس سے کچھ زیادہ ہی گھٹن ہوتی ہے" نازو نے کہا اور محافظ کی جعلی وردی اتار پھینکی۔

"پولیس کی وردی کیسے چڑھائی تھی تم نے ساری پر" غالب نے حیران ہوکے کہا۔

"یہ مت پوچھو کیسے چڑھائی تھی" نازو نے کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

گل نے کہا "ساری تو اوپر تک اٹھائی پڑی ہوگی... بالکل اور تنگ۔"

اب میں نے بھی نازو کی مشکلات پر غور کیا "اسی لئے چال بھی عجیب سی ہو رہی تھی اس کی۔"

غالب ہنس پڑا "مرغی اگر بطخ کی طرح چلنے کی کوشش کرے تو ایسا ہی لگے گا۔"

نازو نے واپس آتے ہوئے یہ بات سن لی تھی۔ اس نے ساری غالب کے منہ پر ماری "بس تو رہنے دو۔ ذرا پہلے یہ باندھو اور پھر پتلون پہن کے دکھاؤ۔"

میں نے کہا "نہیں بھئی ہم یہ نہیں کرسکتے۔"

غالب یہ چیلنج قبول کرنے کے موڈ میں آگیا "کیوں نہیں کرسکتے۔"

میں نے کہا "اچھا جب فرصت ہوگی تب دیکھیں گے۔ تم نے یہ پولیس کی وردی رکھی ہے' ساری پسند نہیں تھی کیا؟" میں نے نازو سے مخاطب ہوکے کہا۔

"پسند ناپسند کی بات نہیں' ساری کے ساتھ دوڑنے بھاگنے میں دشواری ہوتی ہے" نازو نے کہا۔

"اب ہم اوپر جائیں گے" میں نے کہا "لیکن سب ایک ساتھ نہیں۔ گل پیچھے رہے گی۔"

"یہ کیا مصیبت ہے! میں اکیلی رہوں گی" گل نے احتجاج کیا۔

"اکیلی کیوں' مشین گن ہے تمہارے ساتھ" نازو نے کہا۔

"اور آتی ساری لاشیں ہیں" غالب بولا۔

"ڈر اور کچھ نہیں رہتا؟"

میں نے کہا "گل... سب کا اپنا اپنا کام ہے۔ نازو درخت پر چڑھ سکتی ہے۔"

"میں کمند ڈال کے دیوار پر چڑھ سکتی ہوں۔ ہاں تھوڑو ڈرانے نہیں جاتی۔"

میں نے کہا "گل کمند موجود ہے اوپر چڑھ جاؤ گی؟" "کیا۔" گل نے کہا "کیوں نہیں' بھائی کے ساتھ ایسے کام بہت کیے ہیں میں نے' کہاں ہے کمند؟"

غالب نے میری بات کا مطلب سمجھ لیا "دوسری بھی وہیں ہے۔ یہ تمہاری جس کے سہارے یہ اترا تھا۔ تمہارا آخری شکار" اس نے بانکے رام کی طرف اشارہ کیا۔

"اگر یہ اسکیم کامیاب رہی تو سمجھو کام بن گیا" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "گل کے اوپر جانے سے پہلے ہم پھر اندھیرا کردیں گے۔ ایک طرف سے گل اوپر جائے گی۔ دوسری طرف سے میں جاؤں گا۔ زینے کی طرف سے۔ نازو تم نیچے سے گل کو پورا پورا کور فراہم کروگی۔ کسی کا سایہ دکھائی دے اوپر تو اسے شوٹ کردینا نیچے سے۔"

"اتنا اچھا نشانہ نہیں ہے میرا" نازو نے کہا۔

"میں کرلوں گا یہ کام" غالب نے کہا۔

"ایسی صورت میں نازو مجھے کور کرے گی۔ گل' تم مشین گن کے ساتھ رسی پر چڑھ جاؤ گی؟"

گل نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا "کیوں نہیں' اپنی کمر سے باندھ لوں گی" وہ خوش تھی کہ آج اسے بھی اپنی ایک غیر معمولی صلاحیت کے مظاہرے کا موقع ملا جو پہلے ناٹک منی کے کام آئی تھی۔

"میں اوپر جاکے سب کو وارننگ دوں گا کہ وہ باہر آکے خود کو ہمارے حوالے کردیں۔ وہ ہر طرف سے محصور ہیں اور کسی کا بچ کر نکلنا ناممکن ہے۔ اس اعلان پر سب تو نہیں نکلیں گے مگر یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی نکل آئے۔ اس اعلان کے بعد میں واپس زینے میں چھپ جاؤں گا۔ تم ان سب کو چھلنی کردینا جو باہر آئیں۔"

"ایسے... دھوکا دے کر..."

"یہ جنگ ہے بی بی" غالب نے برہمی سے کہا "ہر دشمن دھوکا دیتا ہے اور جنگی تاریخ کی ان گنت فتوحات دھوکا دے کر حاصل کی گئی ہیں۔ دشمن کو دھوکا دینے کا نام جنگی حکمت عملی کہلاتا ہے۔ ہارے وہ جاتے ہیں جو دھوکا کھاتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم نے ابھی کچھ دیر پہلے دھوکا کھایا تھا اور ایک رعایت دی تھی دشمن کو۔ اس کا انجام دیکھا تھا؟ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس کے ہاتھ میں لکڑی کا ٹکڑا ہی آیا۔ پتھر ہوتا تو تمہارا سر پھٹ جاتا۔ وہ تمہاری مشین گن چھین لیتا اور ہماری ساری کامیابی ایک معمولی سی کوتاہی کے باعث ناکامی میں بدل جاتی۔"

"شکست ہوجاتی ہمیں" غالب نے کہا "وہ ہمیں کمرے میں قدم رکھتے ہی بھون ڈالتا۔"

"کمند ڈال کے اوپر چڑھتے ہوئے کیا تم دھوکا نہیں دوگی؟" نازو بولی۔

میں نے کہا "جنگ میں جذبات کو الگ رکھو۔ صرف عقل استعمال کرو اور ڈسپلن سے کام لو۔ ہر فوجی اگر سوال کرنے لگے حکم دینے والے سے یا جواز مانگنے لگے ہر کارروائی کا تو کیا حشر ہو جائے فوج کا۔"

گل رونے کے قریب ہوگئی "میرا یہ مطلب نہیں تھا سکندر بھائی' مجھے معاف کردیں۔"

www.paksociety.com

"ارے اب رونا مت شروع کر دینا" میں نے ہنس کے کہا "اس وقت دو بجے ہیں۔ ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ہیں۔ ہم چار بجے یہاں سے نکل جائیں تو پانچ بجے تک اتنی دور جا سکتے ہیں کہ پھر دشمن کے ہاتھ آنے کا ڈر نہ رہے۔ پانچ بجے کے بعد اجالے کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔ تم تیار رہو تو جاؤ غالب کے ساتھ۔"

گل نے مشین گن کو اپنی کمر کے ساتھ باندھنے کے لئے نازو کی شلوار سے پٹی پھاڑنے کے لئے ساری کو درمیان سے چیر دیا۔

"یہ رانا زادو کی ماں کی نشانی تھی" غالب نے کہا۔

"جنگ میں جذبات کو الگ رکھو' صرف عقل استعمال کرو" گل نے میری طرف دیکھے بغیر میری بات دہرائی "کیا یہ حکم صرف میرے لئے تھا۔"

غالب نے خفت سے دانت نکالے "اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ تم مشین بن جاؤ۔"

"میں مشین گن بن گئی ہوں' چچا" گل نے کہا اور باہر نکل گئی۔

"بہت حساس لڑکی ہے" نازو نے کہا اور غالب کو گل کے پیچھے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

میں نے باہر نکل کے مین سوئچ کو دوبارہ آف کیا۔ اوپر نیچے کی دونوں منزلیں تاریکی میں ڈوب گئیں۔ چند منٹ کے بعد جب میری آنکھیں پھر اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے گل اس رسی پر نظر آئی۔ اتنی ہی بلندی پر جتنی بلندی پر میں نے بالک رام کو دیکھا تھا۔ غالب سر اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا۔ گل نے اندھیرے میں ہماری طرف دیکھ کے ہاتھ ہلایا تو میرے دل نے قلابازی کھائی۔ ایک ہاتھ ہلاتے وقت گل نے رسی کو صرف ایک ہی ہاتھ سے تھاما ہو گا "بے وقوف۔ گرے گی" میں نے بے اختیار کہا۔

"اسے آج موقع ملا ہے سب کو امپریس کرنے کا" نازو بولی۔

"چلو' ورنہ وہ پھر ہاتھ ہلائے گی" میں نے کہا۔

میں نے زینے کا رخ کیا تو مجھے پہلی لاش عین پہلی سیڑھی کے سامنے پڑی ہوئی نظر آئی۔ اس نے اوپر جانے کا راستہ روک رکھا تھا۔ میں نے اسے عبور کرنے کے لئے لمبا قدم اٹھایا تو میرا پیر پھسل گیا۔ میرے قدموں کے نیچے اس کا خون تھا جو اتنی دیر میں جیلی کی طرح جم گیا تھا۔ میں نے ریلنگ کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا اور نازو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ذرا دھیان سے' نیچے خون ہے" میں نے کہا۔

خون اوپر بھی تھا۔ چوتھی سیڑھی پر ایک اور شخص ایسے پڑا تھا کہ اس کا سر نیچے کی طرف تھا اور دھڑ اوپر۔ اس کی ٹانگیں ریلنگ سے نیچے کی گرل میں پھنس گئی تھیں۔ اندھیرے میں خون کے داغ نظر نہیں آ رہے تھے جو اوپر سے نیچے تک بہہ رہا تھا۔ کراہیت کے شدید احساس سے نازو کو ابکائی سی آ گئی۔ ... ہی خون کی بو سے متلا رہا تھا اور مجھے اپنے ہم جنس انسانوں کے لہو پر قدم رکھتے ہوئے چلنا بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ وحشت کی حدود سے گزرتے ہوئے ایسے سخت مقام آتے ہیں۔ یہ خون میرا بھی ہو سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا ... خون ہے ... لیکن دونوں صورت گزر جاتا۔ میں خدا ... تسلسل پر خدا کے حضور شکر گزاری کے جذبات ... تک میں کامیاب ہوں کیونکہ میں زندہ ہوں۔

معلوم نہیں نازو کے جذبات کیا تھے۔ ہم دونوں صرف اپنی خاموشی کی زبان میں ہی گفتگو کر سکتے تھے۔ ... کہے بغیر ہم دبے پاؤں ایک ایک قدم اوپر کی جانب بڑھنے ... شروع کی چند سیڑھیوں پر مجھے جوتوں کے سول کچھ چپکتے ہوئے لگے مگر اب سول پر لگ جانے والا خون صاف ...

زینے کے موڑ پر نازو نے رک کر دیوار کا سہارا لیا اور لمبے سانس لینے لگی۔ مجھے اس کا ہاتھ برف کی طرح ... اس کے ماتھے پر پسینے کی نمی تھی۔

میں نے اس کے کان میں کہا "نازو' ہمیں زندہ ... ایسے مرنا نہیں ہے' ہمت سے کام لو۔"

نازو نے سر ہلایا اور پھر میرے ساتھ چل پڑی۔

تین سیڑھیاں ابھی باقی تھیں کہ میں نے نازو کو ... پھر میں نے آگے جا کے پہلے کمرے کی دیوار کی اوٹ سے ... کر دیکھا۔ اوپر کا نقشہ مختلف نہیں تھا۔ فرق صرف یہ تھا ... جتنی جگہ زینے کے لئے چھوڑی گئی تھی وہ اوپر ... باتھ روم بنانے میں استعمال ہوئی تھی۔ یہ باتھ روم میرے بائیں ... پر تھے۔ دائیں جانب وہی طویل برآمدہ تھا جس میں سارے کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔

برآمدے کے آخری حصے میں گل دیوار سے لگی کھڑی ... دیوار اسے کسی قسم کا تحفظ فراہم نہیں کر رہی تھی۔ کسی کمرے سے باہر آئے بغیر کوئی بھی شخص اسے دیکھ سکتا تھا۔ جہاں ... ختم ہوتا تھا وہاں ایک طرف آخری کمرے کی دیوار تھی ... طرف برآمدے کی حد بندی کرنے والی چار فٹ اونچی دیوار ... برآمدے کی چھت کو سہارا دینے والے ستونوں کی ... تھی چنانچہ اس کے چھپنے کے لئے وہاں کوئی گوشہ نہ ... تھا۔ وہ انتہائی غیر محفوظ تھی اور پس منظر کی روشنی ... وجود ایک آسان ٹارگٹ تھا۔ گل کو اس خطرے کا ... ہوئے وار ہم سب تھے مگر اب اسے واپس بھیجنا ہمارے ... بات نہ تھی۔

میں نے نازو کو قریب بلا کے کہا "یہ باتھ روم ..."

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

... "تمہارے لئے ایک محفوظ مورچہ ثابت ہو سکتے ہیں"

... کے کان میں کہا "اگر تم اندر رہ سکو۔"

... نازو نے میرے کان میں سرگوشی کی "میں جاتی ہوں۔ تم ... رکنا۔"

وہ پنجوں کے بل چلتی بلی کی طرح بے آواز قدموں سے آگے ... میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے خون آلود جوتوں سے ... نجات حاصل کر لی تھی۔ مقصد اپنے پیروں کے نیچے انسانی خون کی ... کے احساس سے نجات حاصل کرنا تھا۔ واپسی میں وہ کیا ... پھر اس خون پر سے ہو گا" میں نے سوچا۔

نازو نے باتھ روم کے بند دروازے کے ڈور ناب کو کھولنے کے لئے آہستہ سے گھمایا۔ ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا۔ اس خاموشی میں معمولی سی آواز بھی بہت زیادہ لگی جو بند کمروں میں چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے یا دشمن کے کانوں تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ نازو نے بڑی پھرتی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کے بند کر دیا۔ میرے کانوں نے دوبارہ اس کے قبضوں کی چوں چوں سنی مگر میں ... کے دروازوں اور کھڑکیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس مختصر ... میں کوئی اپنا ہاتھ یا سر نکالتا تو ٹریگر پر میری انگلی خود بخود دب جاتی۔

اطمینان کا گہرا سانس لے کر میں نے آستین سے ماتھے کا پسینہ صاف کیا اور پھر سامنے آئے بغیر لاؤڈ اسپیکر کی طرح کہا۔ "ہیلو۔"

میری آواز برآمدے میں گونجی اور اس اعصاب شکن خاموشی کے آئینے پر بھاری پتھر بن کے گری۔

"ہیلو' تم سب لوگ جو میری آواز سن سکتے ہو" میں نے ... ہوئے کہا "یہ تم سب کے لئے ایک وارننگ ہے۔"

میں نے کچھ توقف کیا۔ اب میرے اعتماد کا گراف بہت اونچا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو کسی فاتح لشکر کے کمانڈر کی طرح محسوس کیا جس کی سپاہ نے واقعی دشمن کا کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو۔

"تم لوگ اب کچھ نہیں کر سکتے" میں نے ... تحکم ... بارعب اور ... آواز میں دھاڑ کے کہا "تم جانتے ہو تمہارے سب ... ساتھی مارے جا چکے ہیں۔ یہ جگہ اور سارا اسلحہ خانہ ... ہے۔ تمہاری مدد کے لئے کوئی نہیں آ سکتا۔ تم ... مار سکتے ہو اور زندہ بچ کے نہیں جا سکتے۔ ہم نے ... اسلحے کو اڑانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے لئے ... والے گودام میں ٹائم بم رکھ چکے ہیں ... بم کے پھٹتے ہی یہاں کچھ نہیں بچے گا ... دوسرے سب گودام بھی اڑ جائیں گے ... ہوئے ٹرک بھی اڑ جائیں گے لیکن ہم محفوظ ... پانچ منٹ میں ہم بہت دور جا چکے ہوں گے مگر پانچ منٹ میں تم باہر بھی نہیں نکل سکو گے۔"

میں نے پھر ایک مختصر وقفہ دیا۔ ابھی تک میرے اعلان کے جواب میں نہ کوئی بولا تھا اور نہ کسی نے جوابی کارروائی کے طور پر کچھ کیا تھا۔ میں باقی اعلان شروع کرنے ہی والا تھا کہ تیسرے کمرے سے کسی نے چیخ کر کہا۔

"مجھے جانے دو' میں بات کرتا ہوں ان سے۔"

اس کے بعد ایک فائر ہوا اور بات کرنے والا ایک چیخ مار کے خاموش ہو گیا۔

"تم سب کو خودکشی کی اجازت ہے۔ تم چاہو تو ایک دوسرے کو قتل کر سکتے ہو" میں نے پھر بلند آواز میں پکار کے کہا۔ "لیکن تم چاہو تو اپنی جان بچا سکتے ہو۔ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ اپنی شکست تسلیم کر لو۔ ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کے باہر آنے والے کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جو غلطی سے یا مجبوری میں ہمارے پرانے دشمنوں کے آلۂ کار بنے تھے ان سب کو ہماری طرف سے معافی ملے گی۔ ان کی جان بخش دی جائے گی اور وہ جہاں بھی جانا چاہیں گے انہیں جانے کی اجازت ہو گی۔ ہماری طرف سے تمہیں دس منٹ کی مہلت دی جا رہی ہے۔ اچھی طرح سوچ لو۔ دس منٹ بعد ہم اپنی کارروائی کا آغاز کر دیں گے۔ جو اس مہلت سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے ان کے پرخچے اڑ جائیں گے۔"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ وقت کی رفتار سست پڑ گئی۔ ہر لمحہ ایک طویل' صبر آزما انتظار کی گھڑی بن گیا۔ ابھی تک میرے اعلان پر کسی قسم کے ردعمل کا فقدان ایک مایوس کن بات تھی۔ اگر کسی نے بھی ہتھیار نہ ڈالے' کوئی دروازے سے باہر نہ آیا اور کسی پر دھمکی کا اثر نہ ہوا تو ہمارا اگلا عمل کیا ہو گا' یہ میں نے ابھی تک نہیں سوچا تھا۔ یہاں دشمنوں کے ساتھ ہمارے دوست بھی تھے۔ کسی کمرے میں رابعہ اور محسن قید تھے۔ شاید ان کے ساتھ شہلا بھی تھی اور اس کا معصوم بچہ بھی تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آخر انہیں چیخنے بولنے' یہاں تک کے رونے کی آزادی بھی کیوں حاصل نہیں رہی۔ شاید ان سب کی آوازوں پر پہرے تھے۔ ان کے منہ بند کر دئے گئے تھے یا انہیں ہوش و حواس سے بے نیاز کر کے ڈال دیا گیا تھا ورنہ وہ جواب دیتے۔ اپنی موجودگی کا کوئی ثبوت فراہم کرتے۔

"دو منٹ گزر گئے ہیں" میں نے خاموشی کے تالاب میں اچانک پتھر پھینک دیا۔ نتیجہ پھر صفر۔ سب کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے مگر کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ تاریکی میں دبکے ہوئے منتظر تھے کہ ہم برآمدے سے گزرنے کی کوشش کریں تو ان کے کسی ریوالور یا مشین گن کی گولی کا آسانی سے نشانہ بن جائیں۔ صرف ایک شخص باہر آنے کے لئے اٹھا تھا۔ وہ ہم سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اسے باقی لوگوں نے خود ہی مار ڈالا تھا۔ اس کے بعد کون ہمت کرے گا اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کی۔

www.paksociety.com

"چار منٹ گزر گئے ہیں" میں نے اعلان کیا۔ جب میں ایک طالب علم تھا تو سالانہ امتحانات میں سیٹوں کے درمیان پھر کے نگرانی کرنے والے وقفے وقفے سے بتاتے رہتے تھے "ایک گھنٹا گزر گیا ہے" "آدھا وقت گزر گیا ہے۔" اپنی محنت میں پرچہ حل کرنے والے چونک پڑتے تھے اور پھر زیادہ مستعدی کے ساتھ وقت کی تیز رفتاری کا ساتھ دینے کی کوشش میں لگ جاتے تھے۔ اس وقت یوں لگتا تھا جیسے وقت کو پر لگ گئے ہیں۔ ہر سیکنڈ کی رفتار منٹ کے برابر ہو گئی ہے اور ایک گھنٹا سمٹ کر ساٹھ سیکنڈ کا ہو گیا۔ اس وقت صورتِ حال برعکس ہو گئی تھی۔ سیکنڈ پھیل کر منٹ سے زیادہ طویل وقفہ بن گیا تھا۔ دس منٹ ایک گھنٹے کے برابر ہو گئے تھے۔ میں ممتحن تھا "انوجی لیٹر" شاید ان کے لئے جو محض نگرانی کرتے تھے، وقت کا بیزار کن وقفہ ایسے ہی طوالت اختیار کر لیتا ہو گا۔

میں دس منٹ تک خاموش بھی بیٹھ سکتا تھا مگر بار بار اعلان کرتے رہنا ان کے اعصاب کی قوتِ برداشت پر وار کرنے کے مترادف تھا۔ خطرے سے سب ڈرتے ہیں مگر کوئی چلانے لگے 'خطرہ' 'خطرہ' تو خطرے کی دہشت بڑھ جاتی ہے اور اعصاب کے کشیدہ تار جھنجھنانے لگتے ہیں۔

اب میں نے سنجیدگی سے نئی حکمتِ عملی کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ پہلے کمرے کی کھڑکی مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر تھی۔ اس کے بعد ایک دروازہ تھا۔ میں جھک کر کھڑکی کی سطح سے نیچے ہو کر رینگتا ہوا دروازے تک جا سکتا تھا اور جھانک کے اندر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ مجھے نشانہ بنانے والے کو دروازے تک آنا پڑے گا یا کھڑکی سے جھانک کر دیکھنا پڑے گا۔ نازو آسانی سے اسے شوٹ کر سکے گی۔ کیا وہ اپنی گن تان کر دیکھ رہے ہوں گے۔ میں ہر دو منٹ کے بعد گھڑیال کی طرح منادی کرتا ہوں۔ گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی۔ اس دو منٹ کے وقفے سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جب وہ کسی کارروائی کی توقع نہیں رکھتے۔

یہ خیال آتے ہی میں نے چلا کے کہا "چار منٹ باقی ہیں" اور پھر ایک دم جھک کے گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا آگے گیا۔ میں نے دل ہی دل میں دو دعائیں مانگیں۔ ایک یہ کہ دور سے کوئی مجھ پر ہی مشین گن کا راؤنڈ نہ چلا دے۔ دوسری یہ کہ نازو کی نظر میری نقل و حرکت پر ہو اور وہ سمجھ لے کہ میرا ارادہ کیا ہے۔ میں فرش پر سرسراہٹ پیدا کئے بغیر آگے بڑھا یہاں تک کہ دروازہ مجھ سے چار انچ دور رہ گیا۔ ایک جست کا فاصلہ احتیاط کے باعث ایک منٹ میں طے ہوا۔ ایک منٹ اب بھی باقی تھا۔ دشمن سمجھ رہے ہوں گے کہ ابھی تو میں اپنی جگہ پر موجود ہوں۔ جو تھا اعلان کرنے کے لئے۔

میں نے آہستہ آہستہ سر کو جھکا کے آگے بڑھایا۔ ایسے کہ کسی کو حرکت کا احساس بھی نہ ہو۔ میں کسی جانور کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں پر جسم کا توازن قائم رکھے تھوڑا سا... وہ مشین گن کو بھی صاف سن رہا تھا اور لمحے لمحے پسینہ پھوٹتا محسوس کر رہا تھا۔ میری زندگی کا انحصار ایک لمحے کے یا ہزارویں حصے کی مہلت پر تھا جس میں اندر جھانک... طرح مستعد دشمن کی نگاہ میرے سر کی آہٹ... مگر میں اسے دیکھ لوں۔

اسی میں نے کمرے کے وسط میں مشین گن کے ساتھ... استادہ دیکھا........ سانس روک کے میں نے اپنا... اور اپنا ریوالور نکالا۔ میری پوزیشن ایسی تھی کہ دشمن ریوالور الٹے ہاتھ میں پکڑ کے گولی چلا سکتا تھا۔ میرے دائیں ہاتھ... تھی اور چوکٹ تھی۔ مجھے نشانہ بھی اندازے سے لینا... سامنے جائے بغیر لینا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ نشانہ خطا نہ... اس کے سر یا سینے میں نہ لگی تو وہ صرف زخمی ہو گا اور... طور پر حملہ کرے گا۔ شاید نازو اسے مار گرائے۔ مگر یہ بھی... تھا کہ وہ مجھ پر پورا راؤنڈ چلا دے اور میں مارا جاؤں۔

میں نے آنکھیں بند کر کے خدا کو یاد کیا۔ پھر ایک دم... ہاتھ سامنے کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ اس وقت گولی چلنے کی آواز بھی بم کے دھماکے سے کم نہ تھی۔ میں نے پلٹ کر ایک جست لگائی اور جب واپس دیوار کی پناہ میں جا کر گرا تو مجھے یقین آیا کہ میں زندہ ہوں۔ میں نے کسی کی بھیانک چیخ سنی تھی۔ پھر ایک دھماکا سنا تھا جو کسی کے گرنے کا تھا۔ دوسری آواز مشین گن کے فرش سے ٹکرانے کی تھی اور تیسری آواز... کے اٹھا "تیسری آواز رابعہ کی تھی" اس نے مجھے آواز دی کہ

میں نے چلا کے کہا "رابعہ؟"

رابعہ نے کہا "تم... تم ٹھیک ہو؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"ہاں... ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں۔ تم وہیں رہو، باہر مت آنا۔ سنا تم نے، میں ابھی آتا ہوں تمہارے پاس۔"

"ہاں، میں اندر رہوں گی... تم اکیلے ہو؟"

"نہیں، ہم سب ساتھ ہیں۔ فکر مت کرو، تھوڑی دیر کی بات اور ہے۔ ہم نکال لیں گے تمہیں۔ اور کوئی ہے تمہارے ساتھ؟"

"نہیں، اور کوئی نہیں۔ یہ ایک ہی تھا۔"

"مارا گیا وہ یا..."

"وہ مارا گیا، اس کی مشین گن میرے پاس ہے۔"

"ٹھیک ہے، مورچے سے مت نکلنا۔ محسن کہاں ہے؟"

"محسن یہاں تو نہیں ہے۔"

"یہاں نہیں ہے؟ پھر کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم، وہ بھاگ گیا تھا" رابعہ نے کہا۔

...نیچے کمرے سے استاد پیڈرو نے ایک مکروہ قہقہہ مارا اور... معنوی انداز میں خوفناک تھا "تمہارا یار یہاں ہے سکندر... آزاد ہونے جا رہے..."

...نے ہاتھ بڑھا کے دروازہ کھول کے کہا "رابعہ کو نکال لو... آگے مت جانا۔"

...نے کہا "تم... مت چھوڑنا۔ میں تمہارے کور پر انحصار کر رہا ہوں۔"

میں نے برآمدے کے آخری کنارے پر غالب کو... دیکھا۔ وہ نالائق بے کار کھڑا پریشان ہو رہا تھا۔ ...اس نے اوپر آ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کی جگہ... بھی لاتعلق کھڑا رہنا ناممکن ہوتا۔ دوسری... اوپر چڑھا تھا۔ یہ اس کے لئے مشکل کام ثابت ہوا... اس نے برآمدے میں آ کے مجھے ہاتھ ہلا کے اپنی آمد سے... میں نے اسے ہاتھ ہلا کے جواب دیا۔ پھر میں نے ایک... دروازے تک کا فاصلہ طے کیا اور کمرے کے اندر...

رابعہ ایک دیوار کا سہارا لئے کھڑی ہوئی تھی۔ اندھیرے... اس کے حسن کی تابانی کو میں نے دل کی آنکھ سے دیکھا... آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ وہ کسی مورت کی طرح ساکت رہی... قریب جا کے میں نے اسے سمیٹ لیا اور اس کے... ساری آسودگی دینے والی نرمی اور سکون عطا کرنے والی... خوشبو اور اس کے قرب سے حاصل ہونے والی محبت کی... حرارت میرے وجود میں بھر گئی۔

میں نے اس کی آنکھوں کے آنسو پیتے ہوئے کہا "بس جان... اب اپنے سارے آنسو روک لو اور میرا ہاتھ تھام لو۔ مجھے بہت ضرورت ہے تمہارے سہارے کی اور تمہاری رفاقت کے تحفظ کی۔"

اس نے پھر مشین گن اٹھالی "مجھے اپنے ساتھ رکھنا سکندر، کہیں کسی اور کے ساتھ مت بھیجنا۔"

"ہم سب ایک ہیں، سب ساتھ ہیں۔"

"نہیں، میرا حوصلہ تم ہو، تمہارے بغیر حوصلہ ختم ہو جاتا ہے... میں نہیں جاؤں گی کسی کے ساتھ۔"

"اچھا مت جانا" میں نے بہتر سمجھا کہ اس وقت بحث نہ کروں۔ اس کی عقل پر جذبات کا غلبہ تھا۔ وہ کوئی منطقی بات یا استدلال قبول کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔

باہر سے ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک دم رابعہ کا ہاتھ پکڑا اور ہم... دروازے کی طرف بڑھے۔

"یہ کیا تھا؟" میں نے دروازے کی اوٹ سے نازو کو مخاطب کیا۔

"...نے وہی کیا جو تم نے کیا تھا" نازو بولی۔

"کوئی غالب نے چلائی تھی؟"

"ہاں۔ وہ دونوں آخری کمرے میں ہیں" نازو نے مجھے مطلع کیا۔

"کوئی اور آواز سنائی نہیں دی؟" میں نے تشویش سے کہا۔ "گولی کس پر چلائی تھی اس نے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہاں کوئی نہیں تھا" نازو نے کہا۔

"تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ محسن کو کہاں رکھا گیا ہو گا؟" میں نے رابعہ سے پوچھا۔

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا "میں نے اس کمرے کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا۔ میں اور محسن الگ الگ سمتوں میں بھاگے تھے۔ مجھے نہیں معلوم وہ پکڑا گیا تھا یا نہیں۔"

"غالباً استاد پیڈرو بلف کر رہا ہے" میں نے کہا "محسن اس کے کمرے میں قید نہیں ہے۔ تم سے جدا ہو کے وہ کدھر گیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ کیا وہ تمہیں نہیں ملا؟"

"نہیں۔ ممکن ہے اس نے ہم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی ہو مگر ہم تو خود روپوش تھے۔ ایک ایسی جگہ تھے جہاں اس کا خیال بھی نہیں جا سکتا تھا اور کسی کا خیال بھی نہیں گیا ورنہ ہم پکڑے جاتے۔ ہم اسی بستی میں تھے لیکن محسن کو یہ بات بتانے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ خود بھی تو روپوش ہو گا کہیں اپنی جان بچانے کے لئے" میں نے کہا "مگر سوال یہ ہے کہ کہاں؟"

"اس کے بچ کر نکلنے کے امکانات بہت کم تھے" رابعہ نے کہا "ہم جنگل گھر سے روانہ ہوتے ہی چاروں طرف سے محصور ہو گئے تھے۔"

میں نے مایوسی سے کہا "اس کا مطلب ہے وہ پیڈرو کی قید میں ہو بھی سکتا ہے۔"

اب چھپانے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ دونوں طرف سے شکاری کھل کے سامنے آ گئے تھے۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ ہمارا مقابلہ استاد پیڈرو سے ہے اور استاد پیڈرو نے بھی ان سب کے نام جن لئے تھے جو اس کے گرد اپنا حصار تنگ کرتے جا رہے تھے۔ پہلے ہم احاطے سے باہر تھے اور انتہائی خاموشی سے اور پُراسرار طریقے پر اچانک دشمن کے اس قلعے میں نمودار ہو گئے تھے جو حفاظتی انتظامات کی کثرت کے باعث کسی حد تک ناقابلِ تسخیر بھی تھا۔ خود استاد پیڈرو کی عقل کے لئے سب سے زیادہ حیران کن اور ناقابلِ فہم بات یہی ہو گی کہ آخر ہم اندر کیسے گھس آئے۔ اس کے بعد ہم نے نچلی منزل پر قبضہ کیا تھا۔ پھر زینے تک آ گئے تھے۔ زینے سے اوپر آ کے اب ہم اوپر دونوں کناروں پر واقع کمروں میں گھس کر مورچہ بند ہو گئے تھے اور اس طرح قریب سے قریب تر ہونے کے ساتھ ہم فرار کے راستے بند کرتے رہے تھے۔ اب تو پیڈرو کے لئے یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ دوڑ کر کمرے سے نکلے اور برآمدے سے نیچے کود جائے۔ خواہ ایسا

www.paksociety.com

کوشش کا نتیجہ ٹانگ ٹوٹنے کی صورت میں نکلے۔ ٹانگ ٹوٹنے کی نوبت آنے سے پہلے تو وہ دونوں جانب سے آنے والی گولیوں کا نشانہ بن جاتے۔ ہم دونوں طرف چوکیاں قائم کیے بیٹھے تھے اور پورا برآمدہ ہمارے سامنے تھا۔

تاہم اس محفوظ طریقے پر ہم اپنے اپنے مورچوں میں یہ انتظار نہیں کاٹ سکتے تھے کہ کبھی تو دشمن باہر آئے گا۔ ہمارے پاس اگر کوئی چیز کم تھی تو وہ وقت تھا۔ یہاں اسلحے کی کمی نہ تھی۔ لیکن خدا نے ہمیں لامحدود عطا کیا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہمارا حوصلہ بھی ختم ہونے والا نہ تھا لیکن رات اور وقت کی عطا کردہ مہلت ہر لمحہ گزرنے کے ساتھ کم ہو رہی تھی۔

میں نے چلا کے کہا "غالب!" اس وقت میں دروازے کے قریب تھا۔

غالب نے آخری کمرے کے دروازے کے پاس سے جواب دیا "اب کیا حکم ہے باس۔"

براہ راست چلا چلا کے ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کے سوا ہمارے پاس رابطے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس طرح نہ راز داری برقرار رکھی جا سکتی تھی اور نہ تفصیل سے منصوبے پر بحث ممکن تھی۔

"تمہاری پوزیشن کیا ہے؟"

غالب نے کہا "ہم محفوظ ہیں آخری کمرے میں۔ یہ بالک رام جی کا عشرت کدہ تھا۔ فریج میں ٹھنڈا پانی ہے، دودھ ہے! پھل کھاؤ گے؟"

میں نے جواب کہا "بھیج دو ہوائی ڈاک سے۔"

غالب نے ایک سیب پھینکا جو برآمدے کی [illegible] ہوا سیدھا اس باتھ روم کے دروازے پر لگا جس میں نازو موجود تھی۔

میں نے کہا "نازو سامنے مت آنا۔"

ابھی الفاظ میرے منہ ہی میں تھے کہ مشین گن کی تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ باتھ روم کا دروازہ چھلنی ہو گیا۔ میں نے بایاں ہاتھ باہر نکال کے اندازے سے تین فائر کیے۔ چیڑو نے ایک شیطانی قہقہہ لگایا۔

رابعہ نے بدحواسی میں نازو کو پکارا "تم ٹھیک ہو؟"

نازو نے چیڑو کو گالی دیتے ہوئے جوابی قہقہہ مارا "چلاتے رہو انہیں گولیاں اور کوکے۔"

میں نے کہا "دروازے کے سامنے مت آنا۔"

"میں پہلے بھی کب دروازے کے سامنے تھی" نازو نے جواب دیا۔

"سیب کیسا تھا؟" غالب نے آواز دی۔

میں نے کہا "تو کتنے دستی بم لایا ہے پیچھے؟"

غالب کوئی دستی بم لے کر نہیں آیا تھا مگر اس نے میرے سوال کے مقصد کو سمجھتے ہوئے جواب دیا "صرف ایک میرے پاس ہے دوسرا گل کے پاس۔"

میں نے کہا "ایک تو میرے پاس بھی ہے۔ [illegible] باقی رہی ہے؟"

"دیکھتا ہوں" غالب نے جواب دیا۔

میں نے کہا "اگر بجلی کا تار ہو تو کام چل جائے گا۔"

"کام کیا ہے؟"

میں نے کہا "ڈوری کو دستی بم کی پن کے ساتھ باندھ کر لمبا کر سکتے ہو کرلو۔"

"ساڑی کی ایک ہی پٹی چھ گز لمبی ہوگی۔ تار تار کر کے بارہ گز کی ڈوری بن جائے گی۔"

"فائن۔ یہ کام کرلو تو مجھے اطلاع دو۔"

"فرض کرو کام ہو گیا۔"

"اب ذرا ہوشیاری سے یہ دستی بم تیرے کمرے کے دروازے سے اندر پھینکنے کی کوشش کرو۔"

"اس کے لئے تو مجھے باہر نکلنا پڑے گا۔"

"صرف ہاتھ باہر نکالنے سے کام نہیں بنتا میں کور کر رہا ہوں تمہیں پیچھے سے۔ اگر کوئی تم پر فائر کرنے کے لئے نکلا مارا جائے گا۔"

"لیکن باس میں بھی تو مارا جاؤں گا" غالب نے [illegible]

"او کے، باہر مت نکلو۔ دستی بم کو دروازے کے سامنے پھینک سکتے ہو پھینک دو۔ ڈوری اندر سے آتی رہے گی جتنا دروازے تک فاصلہ ہے۔ پھر ڈوری کو ایک جھٹکے سے پن نکل جائے گی مگر اس سے پہلے اپنے آپ کو محفوظ کر لو۔"

"ہم دستی بم کے دھماکے کے بعد بچیں گے یا یہ عمارت ہی اڑ جائے گی؟"

میں نے کہا "بچے روتی کی باتیں مت کرو۔ ایک دستی بم عمارت نہیں گرا سکتا۔ آدمی ہی [illegible] ہے۔ تم محفوظ رہو گے۔ زیادہ سے زیادہ فرش میں سوراخ ہو جائے گا۔ یہ نیچے والے برآمدے کی چھت ہے۔ بم دروازے کے جتنا قریب گرے گا اتنا ہی کمرے کے اندر زیادہ تباہی پھیلائے گا۔"

"اگر تھوڑا سا آگے گر جائے۔ آپ کے قدموں میں۔ آپ شہید ہو جائیں تو اس معمولی سی غلطی پر ناچیز کو معاف [illegible] کا عالم ارواح میں پہنچنے کے بعد" غالب نے کہا۔

"ایسے مت پھینکنا جیسے سیب پھینکا تھا" میں نے کہا "سیب اور دستی بم میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

"اچھا کیا آپ نے بتا دیا" غالب نے کہا۔

چلا چلا کے میرا گلا درد کرنے لگا تھا مگر مجھے اپنی کامیابی کے آثار نظر آنے لگے تھے [illegible] خاموشی

ایک ثبوت تھی۔ وہ بیچ میں نہیں بولا تھا اور اس نے ہمارا مذاق بھی نہیں اڑایا تھا۔ وہ ہر لفظ کو غور سے سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا۔ منصوبہ پیشہ ور لحاظ سے قابل عمل محسوس ہوا ہوگا۔

اسے اصل صورت حال اس کے برعکس تھی۔ دستی بم میرے پاس تھا اور اسے ہم اب تک بڑی حفاظت سے ساتھ لئے پھرتے تھے۔ غالب سے چیخ چیخ کر باتیں کرتے ہوئے میں نے بیلٹ کے ساتھ ہک سے لٹکا ہوا دستی بم رابعہ کے حوالے کیا تھا اور اسے اشاروں کی زبان میں سمجھا دیا تھا کہ جو ہدایات میں غالب کو دے رہا ہوں وہ درحقیقت اس کے لئے ہیں۔ رابعہ نے اپنی ساڑی کے نچلے حصے کے کنارے سے ایک انچ چوڑی پٹی بڑے سلیقے سے ساتھ پھاڑ لی تھی۔ ایسی ہی دوسری پٹی اوپر والے کونے سے پھاڑنے کے لئے اسے اپنی ساڑی کھولنی پڑی اور پھر دوسری طرف منہ کئے صرف پیٹی کوٹ اور بلاؤز میں کھڑی رہی۔ معلوم نہیں دوسری پٹی نیچے سے نہ پھاڑنے میں کیا مصلحت تھی۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ نیچے سے ساڑی زیادہ چھوٹی ہو۔

"چیڑو!" میں نے چند منٹ انتظار کرنے کے بعد اسے آواز دی "دس منٹ کی مدت تو تین منٹ پہلے ہی ختم ہو گئی۔ اب ایک موقع اور دیتا ہوں تمہیں۔"

چیڑو نے پھر وہی مصنوعی قہقہہ مارا۔ وہ اس طرح یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ اس کے اعصاب پر خوف کا کوئی اثر نہیں ہے لیکن کھوکھلا پن ہی اس کے جھوٹ کی قلعی کھولتا تھا۔

"اس کے بعد کیا ہو گا سکندر اعظم کی اولاد؟"

میں نے کہا "تمہیں معلوم ہو جائے گا۔"

اس نے مجھے ایک غلیظ گالی دے کر کہا "تم [illegible] کیونکہ تو یہ بھی مارا جائے گا۔"

"یہ کون؟ اپنے چوہدری صاحب بھی تشریف لے آئے کیا؟"

"تمہاری اماں کا یار محسن" چیڑو نے چیخ کر کہا۔

اب میں نے اسے زیادہ بڑی گالی دی "تو کیا سمجھتا ہے ہمیں، ہم بچے ہیں یا پاگل ہیں۔"

میں نے رابعہ سے آہستہ سے کہا "پلیز ڈونٹ مائنڈ، اس قسم کی گندی زبان استعمال کرنے پر مجبور ہوں۔ اسے ذہنی طور پر [illegible] کرنے کے لئے۔"

رابعہ میرے کندھے پر سر ٹکا کے ہنسی۔

میں نے کہا "محسن ہے تمہارے پاس تو مجھے اس کی آواز سنا دو۔"

"صرف محسن ہی نہیں، اس کی بیوہ بھی ہے یہاں" چیڑو نے [illegible] کے ساتھ جواب دیا "اس کا بچہ بھی ہے۔"

میں نے بھی بہت سی ناقابل اشاعت گالیاں لڑھکنے کے بعد کہا "[illegible] کی بات کرا دے میری محسن سے یا اس کی بیوی سے۔"

"اگر کرا دی پھر؟"

"پھر ابھی تمہاری جان بھی بچ سکتی ہے ان کے طفیل۔ ان سے کہ بات کریں مجھ سے" میں نے کہا۔

یہ ٹرمپ کارڈ کام کر گیا۔ اس نے چیڑو کے سارے پتے کاٹ دیئے۔ چیڑو کی کتے کی طرح بھونکنے والی زبان خاموش ہو گئی۔

میں نے کہا "چیڑو، تیرے دن پورے ہو گئے۔ کل تمہارے ایک بہت اہم مہرے کی باری تھی۔ اس پولیس افسر کی جو سب سے بڑا غدار تھا۔ ملک کے علاوہ اس نے اپنے فرض اور قانون سے بھی غداری کی تھی۔ ڈی ایس پی حلوا مارا گیا۔ خسرو جمشید مارا گیا۔ کل سراج مارا گیا، اب تیری باری ہے۔"

"تم مجھے نکل جانے دو" چیڑو نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "میں محسن اور شملا کو چھوڑ دیتا ہوں۔"

میں نے اس کے انداز میں قہقہہ مار کے کہا "کھیل ختم ہو گیا چیڑو، ہمت ہے تو باہر نکل کے مقابلہ کرو اور بہادری کے ساتھ جان دو۔ ورنہ کسی شرط کے بغیر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"تمہیں محسن اور شملا کی بھی فکر نہیں؟"

"نہیں۔ یہ شہادت کی موت ان کا مقدر ہے تو انہیں مبارک ہو۔ تم صرف اپنی فکر کرو چیڑو۔"

آخری کمرے کی طرف سے پھر مشین گن گرجی، اس کا نشانہ بننے والے نے موت کی دہشت بھری چیخ ماری۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔ دو افراد نے برآمدہ عبور کر کے نیچے کود جانے کی بازی کے ساتھ نکل کر فرار ہونے کا ناکام ہو جانے والا منصوبہ بنایا تھا۔ زندگی کی امید سے مایوس ہو کے انہوں نے جوا کھیلا تھا اور بازی ہار گئے تھے۔ ان کی لاشیں ہر طرف اونچی برآمدے کی دیوار پر پھڑک رہی تھیں۔ وہ درمیانی کمرے سے نکل کر بھاگے تھے جو غالب کے مقبوضہ کمرے اور چیڑو کے کمرے کے بیچ میں تھا۔ شاید وہ ساری گفتگو سن رہے تھے اور یہ محسوس کرنے کے بعد کہ ان کے کمانڈر انچیف کے لہجے میں شکست بولنے لگی ہے، انہوں نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ جو بھی تھے چیڑو سے زیادہ بہادر اور جری تھے کیونکہ وہ ہتھیار ڈالنے کی ذلت قبول نہ کر سکے تھے اور مرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔

میں نے غالب اور گلابو کی ایک جھلک دیکھی۔ انہوں نے بڑی پھرتی سے پیش قدمی کی تھی جو میرے نزدیک ایک غیر ضروری پُرخطر اور احمقانہ فعل تھا۔ وہ چیڑو کی گولی کا نشانہ بھی بن سکتے تھے۔ لیکن نشانہ اس لئے نہیں بنے تھے کہ چیڑو نے جنگ میں اپنی ہار تسلیم کر لینے کے بعد جارحانہ حکمت عملی ترک کر دی تھی۔ اب وہ دفاع کی حد سے بھی پیچھے جا چکا تھا اور پسپا ہونے کے بعد جان بچا کے نکل جانے کی فکر میں جتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا

www.paksociety.com

کہ اس نے خود کو میرے حوالے کر دیا تو اس کا انجام کیا ہو گا۔ اگر میں بھی دلاور اینڈ کمپنی کے ہر مجرم کو معاف کرنے پر تیار ہو جاتا۔ جس کا بچنا تو کیا عقل و ہوش کوئی امکان نہ تھا۔ تب بھی ایک شخص کو معاف نہ کرتا۔ استاد پیڈرو کے لئے میری لغت میں رعایت و معافی جیسے الفاظ ہی نہیں تھے کیونکہ وہ میرے والد وزیر خان مرحوم کا سفاک قاتل تھا اور میری زندگی کے سارے عذاب اسی کے نام سے شروع ہوتے تھے۔

غالب اور گل اب اگلے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ ان کے اور پیڈرو کے درمیان صرف ایک دیوار حائل رہ گئی تھی۔ اگر پیڈرو کے ساتھ کوئی اور بھی تھا تو وہ مرنے کے لئے تیار تھا۔ تاہم ان میں محسن، شہلا اور ان کا بیٹا شامل نہیں تھے۔ یہ بیک وقت حوصلہ افزا اور حوصلہ شکن خبر تھی۔ محسن کے بارے میں رابعہ کے بیان سے ہی شکوک پیدا ہو گئے تھے کہ ممکن ہے وہ نہ پکڑا گیا ہو۔ اس کے نہ پکڑے جانے کے امکانات کو رابعہ نے کم بتایا تھا مگر قسمت ساتھ دے تو امکانات نہ ہونے کے باوجود زندگی کی ناؤ خطرات کے پُرآشوب سمندر سے سلامتی کے ساتھ نکل جاتی ہے۔ شہلا اور اس کے بیٹے کی عدم موجودگی البتہ ایک مایوس کن بات تھی اور ان کے بارے میں کوئی قیاس آرائی کام نہیں آ سکتی تھی کہ انہیں کہاں لے جایا گیا ہو گا۔

"پیڈرو!" میں نے چلا کے کہا "اب میں صرف تین تک گنوں گا۔ تم ہاں یا نہیں میں جواب دو۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو گے۔ ایک..."

پیڈرو نے چیخ کر کہا "نہیں..." اور مجھے گالیاں دینے لگا۔

"دو..." میں نے کہا۔

پیڈرو نے پھر کہا "نہیں" اس کی آواز میں دیوانگی اور جنون کی کیفیت اس شخص کے ذہن کی آئینہ دار تھی جو خودکشی کا فیصلہ کر چکا ہو۔

"تین" میں نے کہا۔

"نہیں، نہیں، نہیں" پیڈرو نے چلا کے کہا۔

میں نے غلیظ گالیوں کے طوفان کو نظر انداز کرتے ہوئے غالب کو آواز دی "آر یو ریڈی؟"

"میں تیار ہوں" غالب نے جواب دیا۔

"گل سے کہو خود کو محفوظ کر لے۔ اسے سمجھا دو۔"

"میں نے اسے بتا دیا ہے۔"

"او کے، بم پھینک دو" میں نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے باہر نکل کے دستی بم اس کمرے کے دروازے پر پھینک دیا جس میں پیڈرو بند تھا۔ میری چال کامیاب رہی۔ وہ غالب کے کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اگر غالب باہر آتا تو پیڈرو اس پر مشین گن خالی کر دیتا۔ دستی بم اس کے پیچھے گرا۔ مجھے واپس کمرے میں جست لگانے کی مہلت مل گئی۔

ڈوری کی لمبائی میں نے اندازے کے مطابق رکھی تھی اصل فاصلے سے دو تین فٹ زیادہ۔ ڈوری کا دوسرا سرا اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ جب میں نے کی طرف چھلانگ لگائی تو اس کے ساتھ ہی میں نے ڈوری کو جھٹکا دیا۔ جھٹکا شدید نہ ہوتا تو پن نہ نکلتی۔ دستی بم کھنچا چلا آتا۔

جب ڈوری کھینچ کر ڈھیلی پڑ گئی تو مجھے یوں لگا جیسے جگہ پر موجود ہے۔ اس کی پن بھی نہیں نکلی ہے بلکہ گئی ہے۔ لمحے بھر کی یہ مایوسی ایک زبردست دھماکے سے ختم ہو گئی۔ میں اور رابعہ فرش پر کہنیوں کے بل لیٹے ہوئے تھے اور ہم نے ہتھیلیوں سے دونوں کان بند کر لئے تھے۔

اندازے کو بنیاد بناتے ہوئے میں نے اپنے تئیں موت کا سامان کرنے میں کسر نہ چھوڑی تھی۔ اگر یہ ہو جاتا اور دستی بم کے دھماکے سے نچلی منزل پر رکھے چنگاری جا گرتی تو دوسرے دھماکے کے ساتھ ہی تمام اور اس کا جرأت مندانہ مقدس مشن سب داستان ہو جاتے تھے سنانے والا صرف محسن کا خاندان ہوتا۔

دھماکے سے عمارت لرز گئی تھی لیکن نہ ہم پر کوئی گری تھی اور نہ دیواریں۔ میں ایک دم اٹھا اور دروازے طرف لپکا۔ برآمدے میں دھوئیں اور گرد کا بگولا سا تھا جس کے پار کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مانڈو ہاتھ روم سے نکل میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔

میں نے چلا کے غالب کو آواز دی اور گل کو پکارا "ٹھیک ہے نا؟"

غالب کی آواز سن کے میں نے اطمینان کا سانس لیا "ٹھیک ہے۔"

میں نے مانڈو سے کہا "نیچے جا کے مین سوئچ آن کر دو۔"

مانڈو نے منمنا کے کہا "وہ... دراصل... بجلی۔"

میں اسے گالی دیتے دیتے رک گیا۔ زیادہ سے زیادہ اسے الو کی پٹھی کہتا۔ پھر بھی زنانہ کم عقلی کو خوف سے ڈوری نہیں، بجلی کا مین سوئچ آن کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے لیور بھی کرنٹ مارتا ہے۔ میں نے خود نیچے جاتے ہوئے ایک بار پھر میں خون پر پھسل کے گرتے گرتے بچا اور اوپر سے گزر کے سوئچ بورڈ تک گیا۔

میں لائٹ جلا کے لوٹ رہا تھا کہ اوپر سے مشین گن کی آواز آئی۔ یہ فائرنگ مانڈو نے کی تھی۔ میں تیزی سے اوپر "کیا ہوا؟" میں نے باہر ہی سے آواز دے کر پوچھا۔

"وہ بھاگ گئے دونوں۔"

"کون دونوں؟ کیسے بھاگ گئے؟" میں نے کہا۔

مانڈو نے اشارہ کیا "نیچے کود گئے۔"

برآمدے کے فرش میں ایک شگاف پڑ گیا تھا جو... نظر آتا تھا "تم یہیں رہو، میں دیکھتا ہوں" میں آیا تھا اتنی ہی تیزی سے پھر نیچے جانے کے... غالب کو برآمدے کے دوسرے کنارے پر... اس کے ہاتھ میں بھی مشین گن تھی۔ گل دیوار اور ان... کے سہارے نیچے جھانکنے کے لئے دیوار پر سے... میرے پاس وقت نہیں تھا کہ میں اسے روکتا اور... کی کوشش کرنے والوں کی راہ میں حائل ہونے کے... جان بچا کے بھاگنے والا کسی کی جان کی پروا نہیں...

... نیچے کے راستے چند سیکنڈ بعد پہنچا۔ گل رسی پر سے... راستہ لینڈ کر چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں... حال کو دیکھتا اور سمجھتا، میرے کانوں نے ایک فائر کی... پھر گل کی چیخ سنائی دی اور میرا دل ایک لمحے کے لئے... ڈوبتا ہوا گیا۔

آخری زینے پر سے میں نے ان دونوں کو دیکھا جو زخمی ... کے باوجود چھت کے شگاف سے نیچے کود گئے تھے۔ اتنی ... سے فرش پر گرنے کے بعد ان کے لئے بھاگ جانے کی ... کرنا بھی ممکن نہ رہا تھا۔ وہ خود کو گھسیٹ کر گیٹ تک ... کی ناکام جدوجہد کر رہے تھے کہ انہوں نے گل کو ... زخمی کر لیا۔ ان میں سے کسی نے بچی کچی ہمت سے کام لے کر ... کر دیا تھا۔ وہ اب فرش پر پڑی ہوئی تھی۔

میں نے اطمینان سے نشانہ لے کر ان دونوں کے سر پاش ... کر دئیے۔ پھر میں گل کی طرف دوڑا۔

اوپر سے مانڈو نے چلا کے کہا "کیا اسے گولی لگی ہے؟"

میں نے رک کر اس کے فضول سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور گل کے پاس جا کے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ گولی ... کے بازو میں لگی تھی جس کے بعد وہ اپنی گرفت برقرار نہ رکھ ... سکی اور سیدھی نیچے جا گری تھی۔ میرے لئے یہ اندازہ کرنا ... دشوار تھا کہ اس کی ہڈی پسلی سلامت ہے یا نہیں مگر میں نے یہ ... دیکھ لیا کہ بازو سے گزرنے والی گولی نے ہڈی کو نقصان نہیں ... پہنچایا۔ گولی بازو کے گوشت میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی ... تھی۔ یہ اچھی بات تھی۔ گولی اگر گوشت میں ہی پھنسی رہ جاتی ... تو اسے نکالنا مشکل ہوتا اور اس سے بعد میں بھی زیادہ خرابی ہوتی۔

... گولی لگنے کی دہشت سے بے ہوش تھی۔ ... میں دعا مانگی کہ یہ بے ہوشی دماغ کی کسی ... چوٹ کا نتیجہ نہ ہو۔ مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ وہ کتنی ... اونچائی سے گری تھی۔

"اب جاؤ" میں نے اپنے پیچھے مانڈو کی آواز سنی "میں اسے سنبھال لوں گی۔"

"میں تمہیں اوپر چھوڑ کے آیا تھا" میں نے ڈانٹ کے کہا۔

"غالب ہے اوپر" اس نے میرے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا اور زمین پر بیٹھ گئی۔ بلاشبہ وہ ایک تربیت یافتہ نرس تھی مگر یہ ایسا کام نہیں تھا جو میں نہ کر سکتا۔ اس نے ڈیوٹی چھوڑ دی تھی۔ یہ ایک جذباتی حرکت تھی۔ میں نے اسے اور گل کو بعد میں اچھی طرح جھاڑنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں کی حرکت غلط تھی۔ ایسے اگر ہر شخص سوچے سمجھے بغیر خود فیصلے کرنے لگا ہے تو پھر ہم آرمی کو کسی کمانڈر کی کیا ضرورت ہے۔ بھاڑ میں گیا ڈسپلن اور ایسی کی تیسی منصوبہ بندی اور حکمت عملی کی۔

میں اوپر گیا تو مرزا غالب مشین گن کے ساتھ وہیں موجود تھے "گل ٹھیک ہے؟"

"وہ ٹھیک ہے۔ مگر یہ گل کو تم نے کیوں اجازت دی تھی؟"

"نہ میں نے اجازت دی تھی اور نہ اس نے مانگی تھی" غالب نے کہا۔

"تم اسے روک تو سکتے تھے۔"

"میں نے روکا بھی تھا مگر اس سے پہلے ہی وہ اتر گئی تھی۔"

رابعہ نے کہا "کیا پیڈرو بھاگ گیا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "وہ کوئی اور تھے۔ پیڈرو اندر ہی ہو گا۔"

"گل... زیادہ زخمی تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ زندگی تھی بچ گئی۔ بازو میں گولی لگی تھی۔ پار ہو گئی۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے" میں نے کہا "مانڈو پٹی باندھ رہی ہے۔ ابھی کچھ دیر میں ہوش آ جائے گا۔"

میں نے غالب کو ہاتھ سے پیچھے ہٹ جانے کا اشارہ کیا اور ایک دم دوڑ لگائی۔ شگاف سے بچ کے میں اس دروازے کے سامنے سے گزرا جس کے پیچھے پیڈرو موجود تھا یا اس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ مجھے اندر سے کسی گولی کے آنے کی امید ضرور تھی۔ تاہم زخمی حالت میں پیڈرو کے لئے اتنی تیزی سے فائر کرنا آسان نہ ہوتا۔ اس امید کے آسرے پر میں خود گولی کی طرح دروازے کے سامنے سے گزرا اور جھک کر دوسری طرف جا گرا۔ اگر میں سیدھا جاتا تو اس کھڑکی کے سامنے سے بھی گزرتا جس کے شیشے بھی نہیں ٹوٹے تھے پٹ بھی غائب ہو گئے تھے۔

پہلے کمرے میں جا کے میں نے فریج کھولا اور ٹھنڈا پانی پیا۔

"پیڈرو کا کیا بنا؟" غالب نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ مارا گیا ہو۔ یا صرف زخمی ہو" میں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ اب مجھے اپنے ذہن پر کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ حسب توقع بستی کی طرف سے کسی نے مندر کے پیچھے بم بندوق کے خونی کھیل کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ مجموعی طور پر ہمارا مشن کامیاب رہا تھا۔ گل

www.paksociety.com

اپنی حماقت سے زخمی ہوئی تھی۔ باقی سب خیریت سے تھے۔ ہم نے رابعہ کو برآمد کرلیا تھا۔ محسن کے بارے میں امید کی روشنی پالی تھی کہ شاید وہ اب ہمیں ڈھونڈتا ہوا آجائے۔ ممکن ہے باہر نکلتے ہی مل جائے۔

اب رات کے سوا تین بج رہے تھے۔ میں نے ابھی تک سگریٹ کی طلب محسوس ہی نہیں کی تھی۔ اب میرا ہاتھ جیب میں گیا اور میں نے ایک سگریٹ جلا کے طویل کش لیا۔ میں زیادہ پرسکون ہو کے آخری قدم اٹھانا چاہتا تھا۔

"اس کمرے میں کوئی ایسی چیز ہے جسے ہم ڈھال کے طور پر استعمال کرسکیں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "بیڈ' صوفے' قالین۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "پیڈرو کو اندر سے نکالنا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے۔"

"اگر وہ بے ہوش' ہے تو اسے بچانا بھی ہے۔"

"یہ تو اندر جا کے دیکھے بغیر معلوم نہیں ہوسکتا" میں نے کہا

رابعہ نے چلا کے کہا "کیا میں نیچے جاؤں؟"

وہ گل کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھی' میں نے کہا "جاؤ' دونوں مل کے اسے برآمدے میں لٹا دو۔"

غالب نے کہا "اگر ہم کوئی جلتی ہوئی چیز اندر پھینک دیں؟"

"اس سے کیا ہوگا؟" میں نے بے خیالی میں پوچھا۔

"آگ لگ جائے گی کمرے میں۔ وہ بے ہوش نہیں ہوگا تو آگ کو بجھانے کی کوشش کرے گا یا باہر نکلنے پر مجبور ہوگا۔"

مجھے یہ تجویز پسند آئی "آگ نچلی منزل تک تو نہیں پہنچ سکتی"

غالب نے کہا "نہیں۔ ایک ہی کمرے تک محدود رہے گی۔"

"جلتی ہوئی کیا چیز پھینکی جاسکتی ہے؟" میں نے کہا۔

غالب نے بیڈ پر سے چادر کھینچ لی۔ پھر اس پر شراب کی بوتل خالی کرنے لگا۔ غالب کا دماغ اچھا کام کر رہا تھا۔ شراب میں الکحل ہوتی ہے جو فوراً آگ پکڑ لیتی ہے۔ چادر سوتی تھی' اس نے شراب کو جذب کرلیا۔ غالب نے اس پر دوسری بوتل توڑ کے خالی کی۔ چادر شراب میں تر ہوگئی تو اس نے مجھ سے ماچس لی۔

کمرے سے نکل کے وہ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا کھڑکی تک گیا میں نے اپنے ریوالور کو تیار رکھا۔ اگر پیڈرو اچانک نمودار ہوتا تو اچانک مارا جاتا۔ غالب نے ایک کونے کو دیا سلائی دکھائی۔ چادر نے فوراً آگ پکڑلی۔ غالب نے بڑی مہارت سے اس کا گولا سا بنایا اور بغیر پٹ والی کھڑکی سے اندر پھینک کر واپس بھاگا۔ آگ کا ایک گولا کمرے کے اندر جا گرا تھا۔ میں نے اور غالب نے انتظار کیا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ چادر جل کے راکھ ہو جائے۔ کمرے کا دوسرا سامان جلنے سے محفوظ رہے۔

چند منٹ بعد کمرے میں شعلوں کا عکس نظر آنے لگا۔ روشنی باہر بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ آگ کمرے میں پھیل چکی تھی لیکن ابھی تک کمرے میں خاموشی تھی۔ میں نے غالب کو [illegible] نظروں سے دیکھا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جل کے مرجائے" نیچے سے نازو نے چیخ کر کہا "یہ آگ کیسی ہے؟"

غالب نے نیچے جھانک کر کہا "آگ اندر لگی ہوئی۔ جو تم نے لگائی ہے کس نازو۔"

"کیوں مت" نازو نے ایک پتھر اٹھا کے پھینکا۔

"دوسری آگ خود ہم نے کمرے میں لگائی ہے"

"تفکر کا تماشا جب اچھا ہے تو تجربے سے کام [illegible]"

میں نے کہا "غالب' میں اندر جا رہا ہوں۔"

غالب پیچھے ہٹ گیا "چلو' ایک ساتھ [illegible] مرو دونوں۔"

آگ بہت پھیل گئی تھی۔ اس کی روشنی باہر نکل رہی تھی۔ بجلی کے تار جل گئے تھے اور بلب بجھ گیا۔ کمرے میں صرف آگ کا اجالا تھا۔ میں نے کھڑکی سے سر اٹھا کے جھانکا تھا۔ پھر میں دروازے کے سامنے [illegible] مجھے پورا یقین آچکا تھا کہ پیڈرو مرچکا ہے یا بے ہوش ہوا ہے۔ آگ سے ایک بیڈ جل رہا تھا اور [illegible] جل رہی تھی۔ گوشت کے جلنے کی بو میرے حواس پر [illegible] ہوئی تھی مگر میں خود پر جبر کرکے آگے بڑھا تاکہ اس [illegible] سے دیکھ سکوں۔ آگ کی حدت مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔ کمرا بھی تپتا جا رہا تھا اور شعلوں [illegible] پردوں تک پہنچ رہی تھی مگر میں نے اس شخص کا [illegible] جو جسمانی ساخت کے فرق کی وجہ سے بھی پیڈرو [illegible] میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اطمینان کرلینا چاہتا تھا کہ واقعی پیڈرو نہیں تھا۔ غالباً اسے ہی پیڈرو نے مارا تھا کیونکہ وہ باہر نکلا اور ہم سے بات کرتا [illegible]

غالب نے کہا "سکندر' یہ کیا کر رہا ہے تو!! آگ کی لپیٹ میں آجائے گا۔"

میں نے کہا "ابھی تک پیڈرو نہیں ملا کہیں وہ نہ کھسک گیا ہو۔"

"[illegible] ان کمروں کے ساتھ [illegible]"

اچانک میری نگاہ عقبی دیوار کی کھڑکی پر گئی۔ شیشے ٹوٹ چکے تھے اور باہر کی طرف کھلی ہوئی گرل [illegible] قریب جا کر دیکھنے سے مجھ پر انکشاف ہوا کہ شیشے [illegible] کھڑکی کے پٹ تک ٹوٹ گئے تھے اور باہر [illegible] لوہے کے ٹکڑوں کو ویلڈ کرکے بنائی گئی تھی [illegible] تھی۔

نیچے فرش پر خون کی ایک لکیر تھی جو باہر [illegible] کھڑکی کے قریب ایک خاصے بڑے دھبے کی صورت [illegible]

[illegible] گرل کو ہلایا تو وہ درمیان سے جھولنے لگی۔ [illegible] ابھی تک چوکھٹ کے ساتھ مضبوطی سے [illegible] ہوئی تھی۔ یہ وہی بیڈ شیٹ کو پھاڑ [illegible] ایک رسی [illegible] گرہ دے کے رسی بنائی گئی تھی۔ چھ چھ فٹ کی [illegible] سے بھی زیادہ چوڑی تھیں چنانچہ اتنی [illegible] آسانی ایک آدمی کا بوجھ سہار لیتیں۔

"[illegible] حرامزادہ نکل گیا" میں نے چلا کے کہا۔

[illegible] ایک جست میں میرے پاس پہنچا [illegible] "پاگل ہوگیا ہے کیا؟" [illegible] پھیل رہی ہے۔ جسم جل جائے گا [illegible] دکھا رہی تھی۔ الماری میں کپڑے جل رہے تھے [illegible] آگ لگی ہوئی تھی۔ میں نے غالب کے ساتھ [illegible] شعلوں سے بھرے ہوئے کمرے کو عبور کیا تو میرا دم [illegible] لے کے مجھے یوں لگا جیسے میں چکرا کے گر [illegible] کھانس رہا تھا اور مجھے کھینچ رہا تھا۔ بیڈ پر جلتے [illegible] ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔ خدا کا نام [illegible] ایک آخری جست لگائی اور برآمدے میں آگرا۔ [illegible] میرے چہرے سے ٹکرائی۔

[illegible] نے مجھے سنبھال لیا۔ اس نے میرے ماتھے پر [illegible] کیا اور مجھے کھینچ کر لے جانے کی جدوجہد کرنے [illegible] اس کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ نیم بے [illegible] تھا۔ ہوش میں آتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ نازو [illegible] سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال لائی تھی اور غالب [illegible] تھی۔ غالب نے سر جھکا اور [illegible] ہاتھ سے بوتل لے کر منہ سے لگائی اور پھر میری [illegible] پیاس سے میرا حلق بھی خشک ہو رہا تھا۔ چند [illegible] جسمانی توانائی بحال ہوگئی۔

[illegible] کے راستے نیچے اترے۔ اوپر ہمارا کام ختم ہوچکا [illegible] معرکے میں کامیابی کا دعویٰ غلط نہ تھا مگر آخری [illegible] پیڈرو کے نکل جانے سے فتح کی خوشی میں احساس زیاں [illegible] میں نے گھڑی دیکھی تو چار بجنے میں دس منٹ باقی [illegible]

"پیڈرو کے ہاتھ نہ آنے کا بہت ملال ہے" میں نے کہا [illegible] اقرار میں سرہلایا "شاید ہم نے دیر کی۔"

[illegible] "نہیں تقدیر نے اس کا ساتھ دیا۔ دھماکے سے [illegible]"

[illegible] کہ گرل دھماکے سے نہیں ٹوٹی۔"

[illegible] کار اور ٹرنک جلا کے توڑ دی۔ فرار کا پورا [illegible] کے ذہن میں پہلے سے تھا" غالب نے کہا۔

"پھر اس نے اتنی دیر کیوں کی؟"

"شاید اس امید میں کہ اسے کوئی موقع مل جائے اور وہ ہمیں ختم کردے۔ اسلحے کے اتنے بڑے ذخیرے کو بچا لے۔"

میں نے غالب سے اتفاق کیا "شاید یہی بات تھی۔ چادر پھاڑ کے اس طرف سے نکلنے کی تیاری وہ پہلے ہی کرچکا ہوگا۔ اس کی آخری وقت تک جاری رہنے والی جدوجہد کا مقصد اس ذخیرے کو بچانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔"

"اس کوشش میں وہ زخمی بہرحال ہوا" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ شاید اس چالاک آدمی نے یہ سمجھا کہ ہم اسے دھوکا دے رہے ہیں۔ ہم دستی بم پھینکنے کی حماقت نہیں کریں گے اس اقدام خودکشی کی اسے ہرگز امید نہ تھی۔"

"ہاں' یہ بہت خطرناک قدم اٹھایا تھا ہم نے' اس سے یہاں موجود اسلحے کا سارا ذخیرہ اڑ سکتا تھا" غالب نے کہا۔

"وہ دستی بم پھٹنے کے بعد فرار ہوا۔ جب وہ زخمی ہوچکا تھا۔ میرا خیال ہے یہ اسی کا خون تھا جو کھڑکی تک بہتا گیا۔"

"کھڑکی کے اوپر اور باہر کی طرف بھی تھا۔ بستر کی چادر کی رسی پر بھی تھا" غالب نے کہا "اس نے دو افراد کو روک رکھا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں' ہم جب چاہیں گے ادھر سے نکل جائیں گے مگر ان کے حوصلے نے آخری وقت تک ساتھ نہیں دیا دستی بم کی بات سن کے ان کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔"

ہم برآمدے میں لیٹی ہوئی گل کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ اب ہوش میں تھی۔ نازو نے اس کے بازو پر کس کے پٹی باندھی تھی مگر خون کا داغ پٹی پر بھی نظر آرہا تھا۔

"مبارک ہو" میں نے اس کے پاس بیٹھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ مجھے دیکھنے لگی "کس بات کی؟"

"گولی تمہارے دل میں نہیں لگی' جگر میں نہیں لگی' سر میں نہیں لگی۔ تمہاری ہڈی تک نہیں ٹوٹی۔ تمہاری اس خوش قسمتی پر تمہیں مبارکباد نہ دوں تو کیا کہوں۔"

وہ شرمندہ نظر آنے لگی "غلطی میں نے کی تھی۔"

"اس غلطی کا خمیازہ ہم سب کو نہیں صرف تمہیں بھگتنا پڑتا۔ جان تمہاری جاتی۔ خدا نے تمہیں دوسری زندگی دی ہے۔ مبارکباد تو مجھے بھی دینی چاہئے" غالب بولا۔

"میں واقعی بہت بے وقوف لڑکی ہوں" وہ رونے لگی۔

میں نے اس کے بالوں کو سہلایا "چلو چھوڑو' یہ بتاؤ تم چل سکتی ہو؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا۔

غالب نے کہا "پیڈرو کس حد تک زخمی ہوا ہے۔ یہ معلوم ہو جاتا۔"

"نہیں۔ اگر یہ معلوم ہو جائے تب بھی ہم اس کے پیچھے

www.paksociety.com

نہیں جائیں گے۔ ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے۔ اس کا کیا بھروسہ، نیچے اترتے ہی کہیں چھپ کر بیٹھ گیا ہو۔ اس امید میں کہ ہم نکلیں گے تو اسی گیٹ کی طرف سے۔ مشین گن ہے اس کے پاس۔"

نازو نے کہا "ہمارے پاس وقت بھی نہیں ہے۔"

"تم دونوں جاؤ" میں نے کہا "جس راستے سے ہم یہاں پہنچے تھے اسی راستے سے۔"

"تم لوگ کیوں ساتھ نہیں چلتے؟" نازو نے کہا۔

"فضول جرح مت کیا کرو" میں نے برہمی سے کہا "ہم تفریح کے لیے نہیں رک رہے ہیں۔ کچھ کام باقی ہے، وہ ختم کر کے آئیں گے۔"

"واپسی میں جتنی چھپکلیاں وغیرہ نظر آئیں ان سے الوداعی ملاقات کر لینا" غالب نے کہا "پیچھے [illegible] پابندی بھی ہٹا لی گئی ہے۔"

نازو نے گل کو سہارا دیا "چلو جی" انھوں نے تو مذاق بنا لیا ہے۔ ہم نہیں ڈرتے کسی سے۔"

"بھوت سے بھی نہیں؟" غالب نے کہا۔

"ایسی کی تیسی بھوت کی" نازو نے کہا۔

"بھوت کی بچی، سوچ سمجھ کے بولا کرو، میرا سسر بھی بھوت ہے" غالب نے کہا۔ مگر وہ تینوں روانہ ہو چکی تھیں۔ ہم نے انھیں پہلے شگاف تک ساتھ جا کے سی آف کیا۔ پھر میں اوپر گیا اور وہ ساری اٹھا لایا جو نازو نے اتار کے غالب کی طرف پھینکی تھی۔ ہم نے مل کے اس کی پتلی پتلی پٹیاں بنانا شروع کیں۔ ہر پٹی تقریباً دو انچ چوڑی تھی۔ ہم چھ گز لمبی پٹیوں کو آپس میں جوڑتے گئے۔ چار پٹیاں مل کے چوبیس گز لمبی رسی بن گئی۔ ایسی ہی ایک رسی غالب کے پاس تھی۔

"میرا خیال ہے کہ اتنی لمبائی کافی ہوگی۔"

غالب نے احاطے کا جائزہ لیا "ہاں۔ وتر کی صورت میں آخری غسل خانے تک کا فاصلہ کم ہوگا۔"

"ایک رسی کچھ لمبی ہونی چاہیے۔"

"میں نے پانچ پٹیاں جوڑی ہیں" غالب نے کہا "تیس گز سے کچھ کم لمبائی ہوگی۔"

"کم کیوں ہوگی؟"

غالب نے کہا "ہر ٹکڑے کا تقریباً چھ انچ حصہ گانٹھ باندھنے میں کم ہو گیا ہے۔"

"کیا تمھیں مضبوط لگائی ہیں نا؟"

غالب نے اقرار میں سر ہلایا اور بولا "میں اندر جاتا ہوں۔"

"کون سے گودام میں؟"

"درمیان والے" غالب نے کہا "دستی بم اسی میں تھے۔ مجھے یاد ہے۔"

"چل پھر میں بھی دو ہیں ہے ایک سے [illegible] چڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

ہم دونوں برآمدے سے گزر کے گودام تک گئے [illegible] بوریوں کی دیوار کے پیچھے ایک کھلی ہوئی پیٹی [illegible] طرح چھپائے گئے تھے کہ اوپر تا تک [illegible] میں ایک دستی بم لے کر باہر گیا اور پہنچے ٹرک کے پیچھے [illegible] دستی بم کو میں نے پیٹرول ٹینک پر باندھا اور اس کی [illegible] آزمانے کے لیے ہلا کے دیکھا۔ بم اب اپنی جگہ سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتا تھا۔ پوری طرح [illegible] میں نے پن کے گرد حلقہ بنا کے گرہ لگائی اور [illegible] اب میں باقی ڈوری کو احتیاط کے ساتھ پیچھے سے نکال [illegible] میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ جب [illegible] سے ڈوری کھینچوں تو وہ کسی چیز میں اڑ کر نہ ٹوٹے۔

غالب نے اپنا کام مجھ سے پہلے ہی ختم کر لیا تھا [illegible] ڈوری ہاتھ میں تھامے کھڑا ہوا تھا۔ ہم ڈوری کے لچھے کھولتے اور پیچھے ہٹتے گئے۔ احاطے کے میدان سے گزر کے ہم آخری غسل خانے تک پہنچے جو مندر کی عقبی دیوار کی طرف سے [illegible] خانہ تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔

میں نے دستک دے کر کہا "ہیلو ہیلو، ہیلو۔ خواتین [illegible]"

"کیا وہ ابھی تک سفر میں ہیں؟" غالب نے [illegible] لہجے میں کہا۔

"ہم نے انھیں بہت پہلے رخصت کیا تھا اور [illegible] بھی نہیں تھا" میں نے کہا۔

"یار وہ ایک ایک لیٹ [illegible] ہوں گی" غالب نے [illegible]

"اب اس احتیاط کی کیا ضرورت ہے۔ دھکا دے کر [illegible] اینٹوں کو گرا دیں جو ہم نے اپنے ہی واپسی [illegible]"

"میں دیکھتا ہوں وہ کہاں کس منزل پر ہیں" غالب نے [illegible] اور دوسرے غسل خانے پر دستک دی۔

"کیا مصیبت ہے" نازو نے چڑ کے کہا۔

"ساری عمر گلے پڑنے والی مصیبت ہے" غالب نے [illegible] دروازہ کھولو۔"

"دماغ خراب ہے کیا۔ دروازہ باہر سے بند ہے" آواز آئی۔

"اچھا" غالب نے کہا "خفا ہونے کی کون سی بات ہے [illegible] میں پیار سے بھی تو بتا سکتی ہو۔"

میں نے کہا "یار ہم نے بھی خود کو احمق ثابت کر [illegible]"

"واقعی دروازے تو سب باہر سے بند تھے" غالب [illegible] صرف کنڈیاں لگی ہوئی ہیں۔"

میں نے زنگ اور گرد و غبار سے جام ہو جانے والی [illegible] تھوڑی سی کوشش سے کھول دیا۔ اندر وہ تینوں [illegible]

[illegible] چپٹی ہوئی کھڑی تھیں۔

ایک [illegible] "تم کے چلو، یہاں کیوں جام ہو گئی ہو" میں نے کہا اور [illegible] سہمی ہوئی لڑکیوں کو دوسری طرف کرا دیا۔ وہ [illegible] آخری شگاف سے گزر گئیں تو ہم بھی اپنی [illegible] پھر مندر کے احاطے میں طلوع ہوئے۔

[illegible] "[illegible] بچاؤ" راہداری کے کوارٹر کی طرف لیکن ہمارے [illegible] نزدیک مت جانا" میں نے کہا۔

"[illegible] دھماکا بہت شدید ہوگا۔ دیوار سے دور رہنا۔ کھلی زمین پر [illegible] لیٹ کر کانوں میں انگلیاں دے لینا۔"

"[illegible] سب معلوم ہے ہمیں۔ سول ڈیفنس کا کورس کیا تھا میں نے۔"

نازو نے کہا "تم اپنا خیال رکھنا۔"

"رخصتی کے وقت ایسی جذباتی باتیں مت کرو، مجھ پر رقت طاری ہو جائے گی" غالب نے کہا "اب کے ہم بچھڑیں تو شاید [illegible] کر لیں گے۔"

"ایک عرض میری بھی ہے" میں نے کہا "مس رابعہ!"

رابعہ رک گئی "کیا بات ہے؟"

"آخری بار مسکرا کے دیکھ لو نا۔"

"شٹ اپ، ایسی باتیں کرو گے تو میں نہیں جاؤں گی" رابعہ [illegible]

نازو نے اسے کھینچ لیا "بکنے دو انھیں۔"

میں نے ان کے دور جانے کے بعد کہا "ہیڈی؟"

غالب نے کہا "سکندر، محسن کہیں آس پاس ہی نہ ہو۔"

میں نے کہا "ہم اسے خدا کی امان میں دے چکے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں ہم۔"

"[illegible] کا بچہ کہیں قریب ہی چھپا ہوگا تو مارا جائے گا۔"

میں نے کہا "نہیں اسے اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ ہم بعد [illegible] محفوظ فاصلے پر پہنچ کے رکے گا۔"

"ہم محفوظ فاصلے پر نہیں ہیں" غالب بولا۔

"[illegible] چالیس گز کچھ نہیں ہوتے۔ مگر ہم اور کتنی دور [illegible]" میں نے کہا۔

"[illegible] مل جاتا تو کام آسان ہو جاتا۔"

"مل جاتا اگر ہم تلاش کرتے لیکن مسئلہ وقت کی کمی کا ہے [illegible] سے نکلنا بھی ہوگا۔"

"ٹھیک ہے پھر" غالب نے کہا "ون ٹو تھری۔"

ہم ڈوری کھینچ کے بھاگے۔ رسی میں خاصی لچک بھی تھی۔ دستی بم [illegible] پانچ سیکنڈ بعد پھٹتا ہے۔ پانچ سیکنڈ میں ہم تقریباً [illegible] باہر والے راستے تک پہنچ گئے تھے۔ جب دھماکا ہوا تو ہم [illegible] کر گئے۔ پہلا دھماکا [illegible] ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی [illegible] ہوا۔ پھر زمین پر قیامت آگئی۔ پے در پے ہونے والے [illegible] نے زمین آسمان کو تہ و بالا کر دیا۔ میرے کان [illegible] گودام میں رکھا ہوا اور ہر ٹرک میں رکھا ہوا تمام آتش گیر مادہ آگ اگلتے دھماکوں سے اڑتا جا رہا تھا۔ یہ ایک "چین ری ایکشن" تھا۔ ایک بم سے دوسرا بم پھٹ رہا تھا۔ گولیاں چھوٹ رہی تھیں اور شاید [illegible] عمارت کر رہی تھی۔ میں نے جو بم پٹرول ٹینک پر باندھا تھا اس نے ٹینک کو پٹرول بم کی طرح پھاڑا ہوگا اور آگ نے ہر ٹرک تک چنگاری پہنچا دی ہوگی۔ میں نے سر اٹھا کے دیکھا تو عجیب منظر تھا۔ آگ اور دھوئیں کا بادل اوپر اٹھ رہا تھا۔ اس میں سیکڑوں ہزاروں چھوٹے بڑے پتھر اور ریزہ ریزہ ہو جانے والے ٹرکوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ میری نظروں کے سامنے ہنومان جی کے مندر کا بالائی حصہ ٹوٹ کر جھکا اور اس کے ساتھ ہی باقی عمارت منہدم ہو گئی۔ دھول مٹی کا ایک اور بگولا اٹھا۔ بستی کی طرف شور مچ رہا تھا۔ غالباً دھماکے کی شدت سے گھروں کی دیواریں شق ہو گئی ہوں گی۔ کچی دیواریں اس دھماکے سے لرز کے زمیں بوس ہو گئی ہوں گی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے ہوں گے۔

چند منٹ بعد جب یہ طوفان تھما اور ختم ہوئی بارش سنگ تو میں نے اٹھ کے غالب سے ہاتھ ملایا۔ بہت عرصے کے بعد خدا نے پھر ہمیں سرخرو کیا تھا اور ہم نے آلام و مصائب کے بعد ایک بہت بڑی کامیابی کا انعام پایا تھا۔

"ایسی کی تیسی چوہدری دلاور کی اور تریوینی کی" غالب نے قہقہہ مار کے کہا۔

"بڑے شادیانے بجتے پھرتے ہیں" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ خوشی ایسی تھی کہ میں قہقہے لگانا چاہتا تھا۔ ایسے [illegible] میں رقص کرنا چاہتا تھا اور قلابازیاں کھانا چاہتا تھا۔ کامیابی کی اس منزل تک پہنچنے سے پہلے ہم نے بہت انتظار کیا تھا اور بہت دکھ جھیلے تھے۔ ذہنی و جسمانی اذیت برداشت کی تھی اور جلاوطنی قبول کی تھی۔

غالب کے ساتھ میں گل اور نازو کی طرف گیا۔ وہ بھی دمکتے چہروں کے ساتھ اس طرف دیکھ رہی تھیں جہاں ایک آتش فشاں پھٹ چکا تھا اور اس کی تباہ کاری نے دشمنوں کے ایک ٹھکانے کا وجود حرف غلط کی طرح مٹا دیا تھا۔ ان کی لاشیں بھی پرزہ پرزہ ہو کے خاکستر ہو گئی تھیں اور وہ عمارت جس میں انسانیت کے خون کی گرم بازاری کے شوق اور کاروبار میں مبتلا ہوس زر کے سوداگر موت کا سامان بیچتے تھے، صفحۂ ہستی سے ایسے نیست و نابود ہو چکی تھی جیسے پہلے بھی حق کی قوتوں کے سامنے باطل کی خدائی کے دعوے داروں کا غرور خاک میں ملتا رہا ہے۔

غالب نے کہا "یہ کروڑوں کا نقصان تو ہوگا۔"

"کروڑوں کا نہ سہی۔ لاکھوں کا تو ہے" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "لاکھوں کا تو ایک خالی ٹرک ہوتا ہے۔ یہ سات ٹرک تھے۔ ان پر لدا ہوا اسباب خونریزی الگ تھا۔ پھر یہ عمارت اور اس کے اندر بھرا ہوا سامان قتل۔"

غالب نے کہا "سب ملا کے کروڑ کا تو ہو جائے گا۔"

www.paksociety.com

"اسے چاند زر کی قدروقیمت سے مت دیکھو۔ متاعِ جاں کا کوئی مول نہیں۔ یہ سوچو کہ ہم نے کتنی زندگیوں کے چراغ روشن رکھے۔ کتنے گھروں اور کتنے خاندانوں کا نام ونشان مٹنے نہیں دیا۔ کتنے بچے یتیم ہونے سے رہ گئے اور کتنی عورتوں کا سہاگ نہیں اجڑا۔ یہ سب اسلحہ ضمیر فروشوں کی تجوریاں بھرتا مگر اس سے ہزاروں، شاید لاکھوں انسان، جن کا جرم صرف حب الوطنی ہے اور ایمان برحق ہے۔ لقمۂ اجل بنتے، زخمی ہوتے اور معذور ہوتے۔"

"جن میں بوڑھے اور بچے بھی شامل ہوتے۔ عورتیں بھی ہوتیں۔"

"ہم انہیں نہیں جانتے مگر وہ ہم جیسے ہیں، ہمارے ہم وطن اور ہم مذہب ہیں" میں نے کہا "نہ ہم نے ان پر احسان کیا۔ نہ ہم نے کوئی کارنامہ سرانجام دیا۔ بس خدا نے ہمیں وسیلہ بنایا اور توفیق دی۔ ہم نے وہ کیا جو ہمارا فرض تھا۔ جو ہمارے ضمیر نے کہا۔"

راما راؤ اندھیرے میں بڑے مشکوک طریقے پر چلتا ہوا ہماری طرف آیا "کون ہے... یہ تم لوگ ہو؟" اس نے کہا۔

"ہاں، راما راؤ، یہ ہم ہیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں" میں نے انگریزی ہی میں جواب دیا۔

رابعہ نے کہا "یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "اس مندر کا پروہت 'مدراسی' ہے۔ اردو ہندی نہیں بول سکتا ... بات کرتا ہے۔"

"تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو؟" اس نے قریب ... پُروحشت آواز میں کہا "اور یہاں کا...!"

"اور کیا کرنا چاہئے ہمیں؟" میں نے کہا۔

"تم کو بھاگ جانا چاہئے۔ ایک منٹ ضائع کئے بغیر" وہ بولا "کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ تم نے کیا کروایا ہے۔ یہ سب دھماکے تم ہی کر رہے تھے نا؟ جتنی دور تک... وہاں تم نے کی؟"

میں نے کہا "یہ آتش بازی کا شوق بہت برا ہے۔"

"ساری بستی میں ہر شخص یہ سمجھ رہا ہے کہ آج رات دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ صبح تک کوئی نہیں بچے گا۔ عورتیں اور بچے سب رو رہے ہیں۔ مرد خوف کے مارے باہر نہیں نکلتے۔ لوگ پوجا میں مصروف ہیں۔ اپنے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہے ہیں اور تم یہاں کھڑے ہنس رہے ہو اور مذاق کر رہے ہو" اس نے برہمی سے کہا۔

میں نے کہا "ہم اس کھیل کے عادی ہیں۔"

"لیکن دوسروں کے لئے یہ کھیل نہیں ہے" اس نے چلا کے کہا "قتل و خونریزی ہے۔ تباہی و بربادی ہے۔ انسانوں کو آخر کیا سمجھتے ہو تم؟ انسانوں کی جان لینا کھیل ہے؟"

"ہمارے لئے وہ انسان نہیں شیطان تھے۔ ان کے چہرے انسانی تھے مگر ان کے اعمال..."

"دیکھو فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ جن کو تم شیطان قرار دے رہے ہو، وہ کسی نہ کسی کے ... ضرور تھے اور ہوں گی۔ ... رشتہ رکھنے ... اور تم کو ان کا قاتل سمجھتے ہیں اور وہ کہہ ... بھگوان کا مندر بھی گروایا ہے۔ بھگوان نے کیا ...

میں نے کہا "جب ... سیلاب آتا ہے ... سے گھر ہی نہیں عبادت گاہیں، اسپتال اور ...

ہیں۔ شریف اور بے گناہ، معصوم اور بے خطا ... ہیں۔ ہم ہر مذہب کی عبادت گاہ کا احترام کرتے ہیں ... وہ ہیں جنہوں نے بھگوان کے گھر میں اپنے پاپ کا ... اگر مندر کے ساتھ اتنا بڑا آشرم بھی رہتا تو یہ تباہی ...

"میں سمجھتا ہوں کہ تم بے وقوف ہو جو ... سے ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو کہ قصوروار ... لوگوں کی نظر میں پاپی تم ہو جس نے بھگوان کا گھر گرایا ... ہو جس نے قتل کئے۔ تمہاری وکیل سے کون ... سنے گا تمہاری بات؟ کسی عدالت میں بھی تم اپنی ... نہیں کرسکتے۔ خواہ وہ عدالت بالکل غیر جانبدار ... بے جذبات کا۔ اس سے پہلے کہ لوگ مشتعل ہو کے ... کے لئے اکٹھے ہو کے نکل آئیں یہاں سے دور ... تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میرے سوا تم کو کسی نے نہیں ...

میں کوئی مذہبی آدمی نہیں ہوں۔ ورنہ سب سے پہلے ... مار ڈالتا لیکن میری پوزیشن پر غور کرو۔ میں تم کو ... رسک نہیں لے سکتا۔ میری عزت، میرا کاروبار ... سب خطرے میں ہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے راما راؤ، ہم جا رہے ہیں ... بتا دو کہ کون سا راستہ ہمارے لئے محفوظ ہوگا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے لئے خطرہ ہر طرف موجود ہے۔ چاروں طرف سے پولیس نے ... گھیر رکھا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ تم چار پانچ میل کے اندر ہی ... موجود ہو۔"

"پھر وہ آئے کیوں نہیں؟ یہ آوازیں تو انہوں نے بھی سنی ہوں گی۔"

"ضرور سنی ہوں گی۔ شاید انہوں نے ... سے مقابلے پر آنے سے گریز کیا لیکن گودام میں ... جن سے ہونے والی فائرنگ کی اطلاع انہوں نے ... پہنچا دی ہوگی۔ جدید اسلحے سے لیس پولیس اور ... روانہ کر دی گئی ہوگی۔ یہ جو اسلحہ تباہ کیا ہے تم نے ... تو دس دس کوس تک سنی گئی ہوگی۔ میں ... کرو کہ تم خود زندہ بچ گئے ہو۔ ابھی تک ... اور رات باقی ہے۔ اندھیرے سے فائدہ اٹھاؤ اور نکل ... تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔"

... کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ راما راؤ کی باتوں نے ... کو پریشانی میں بدل دیا تھا۔

... نے کہا "تم نے بالکل صحیح مشورہ دیا ہے۔ ہم ابھی چلے ... تھوڑی سی مدد اور کر دو۔"

"... اب کیا چاہئے تمہیں؟"

... نے کہا "مجھے اپنے جیسے کپڑے لا دو۔ ہم دونوں کے لئے ... اس لڑکی کے لئے ایک ساڑی۔ جو پولیس کی وردی میں ہے۔"

"... کہاں گئی جو تم نے دی تھی؟" وہ بولا۔

"... آگ لگ گئی تھی اس میں" میں نے ... "ضائع ہو گیا۔"

... "اچھا میرے ساتھ آؤ۔ جلدی کرو۔ صبح نہ ہو جائے کہیں۔"

راما راؤ نے مجھے اور نائب کو سفید دھوتیاں دیں اور سفید ... اس نے ہمارے ماتھے پر تلک بھی لگایا اور ہمیں اپنی ... چپل اور ایک کھڑاؤں دی۔ نائدو کو ایک اور پرانی ...

"... سڑک کی طرف مت جانا" اس نے کہا "اگر پولیس ... آئے تو ادھر سے آئیں گے۔ مخالف سمت میں ... نکل جاؤ۔ ان لڑکیوں سے کہنا گھونگٹ نکالے رکھیں۔ ... کہ بھگوان جی کے مندر جانا تھا مگر ادھر تو ... ہو رہا ہے۔"

"... یہ کیا؟" نائدو نے کہا۔

"... جنگ" میں نے کہا۔

"ادھر کوئی گاؤں ہے۔ کسی نے پوچھا کہ ہم کہاں کے رہنے ... کیا کہیں گے؟"

"ادھر 'مائی مراد' ہے اور 'پوری بان' ہے" اس نے ... ہاتھ میں ... کی تھالیاں اور ایک کنڈی پکڑا دی۔

... کہا "کچھ کھانے کو ہے تو لا دو۔"

راما راؤ نے سر پر ہاتھ مارا "تم جانتے ہو کہ کھانا میں خود ... یہاں پھل ہیں اور مٹھائی ہے۔ یہی لے جاؤ۔ اب ..."

... نے پھل اور مٹھائیوں کا تھیلا پکڑ لیا "تمہارا احسان ہم ... نہیں بھولیں گے۔"

"اپنے شناختی نام یاد رکھنا۔ کچھ بھی بتانا اگر کوئی پوچھے ... کے مت بتانا۔ اس لڑکی کو میں نے پہلے نہیں دیکھا۔"

"یہ مریم ہے ... میری بہن" میں نے کہا "کیا نام ہے؟"

راما راؤ نے رابعہ کی طرف دیکھا جو سخت جزبز ہو رہی تھی مگر ... مجبور تھی۔

... کہا "کیا ہونا بھی چاہئے اس کا نام" وہ بولا "آؤ ادھر ... سے۔"

... نے کہا "راستے میں شیر چیتے تو نہیں ملیں گے؟ ندی پہاڑ تو نہیں آئیں گے؟"

"ایک برساتی ندی آئے گی۔ ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر... اس کے کنارے چلتے جاؤ گے تو محفوظ رہو گے۔ ندی دو پہاڑوں کے بیچ سے گزرتی ہے۔ سیدھے ہاتھ پر 'مائی مراد' ہے۔ الٹے ہاتھ پر 'پوری بان'۔"

باقی سب لوگ آگے روانہ ہو گئے تھے۔ میں بھی ہاتھ ملا کے چلنے ہی والا تھا کہ مجھے ایک بات یاد آ گئی "راما راؤ، آج کوئی ہمارے بارے میں معلوم کرنے تو نہیں آیا تھا؟"

"تمہارے بارے میں پولیس سب سے معلوم کرتی پھر رہی ہے۔"

"میرا مطلب تھا کوئی ہم جیسا، ہمارا ایک ساتھی بچھڑ گیا ہے۔"

"وہ... وہ تمہارا ساتھی تھا؟" اس نے پھر سر پر ہاتھ مارا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"وہ پوچھتا پھر رہا تھا تمہیں۔ اس نے نام تو نہیں لیا تھا تمہارا لیکن لوگوں کو شک ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔"

"پولیس کے حوالے کر دیا تھا!" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا "پولیس اسے کہاں لے گئی ہوگی؟"

راما راؤ نے نفی میں سر ہلایا "یہ تو مجھے نہیں معلوم۔"

"اچھا دیکھو، اگر اس کے بارے میں کچھ پتا چلے... کہ پولیس نے اس کو کہاں رکھا ہے... تو معلوم کرنا۔ میں کسی روز رات کو آ جاؤں گا تم سے پوچھنے۔"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں ایک بات صاف بتا دوں۔ آج کے بعد میں نے تم کو دیکھا تو میں وہی کروں گا جو ایک اصلی پروہت کرتا۔ جتنا میں نے کیا اس سے زیادہ کی توقع بالکل مت رکھو۔ مجھے بھی زندگی عزیز ہے اور اگر تمہیں بھی جینا ہے تو پھر ادھر کا رخ مت کرنا۔ میں کوئی مروت لحاظ نہیں کروں گا۔ سمجھے" اس نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

مجھے افسوس ضرور ہوا لیکن میں نے اس کی حرکت کا برا نہیں مانا۔ اس کی قوت برداشت ختم ہو گئی تھی۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو چکا تھا۔ وہ احساس جرم کے رد عمل کا شکار تھا۔

"کیا کہہ رہا تھا راما راؤ؟" نائب نے کہا۔

"کچھ نہیں، کہہ رہا تھا کہ جلد از جلد چلے جاؤ اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا" میں نے محسن کے بارے میں اس کی فراہم کردہ اطلاع کو فی الحال چھپا لیا۔

ہم گاؤں کی بیرونی حدود سے بھی دور دور رہتے ہوئے راما راؤ کے سمجھائے ہوئے راستے پر چلتے گئے۔ میری گھڑی میں چار بج کے بیس منٹ ہو رہے تھے اور میرے اندازے کے مطابق پانچ بجے صبح صادق کے آثار نمودار ہو سکتے تھے چنانچہ ہم نے اپنی

www.paksociety.com

رفتار تیز رکھی۔ چپل غالب کے پاؤں میں تھی۔ کھڑاؤں میں نے پہن رکھی تھی جو پتھروں پر زیادہ آواز کرتی تھی۔ مجھے اس کے ساتھ چلنے میں خاصی دشواری بھی پیش آرہی تھی مگر خطرے کا احساس مجھے مجبور کرتا تھا کہ میں چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو نظرانداز کردوں۔ چالیس منٹ میں ہم دو میل دور جا چکے تھے۔

بستی پر ایک پُر آسیب سناٹے کی حکومت تھی جس کو کبھی کبھی اچانک بلند ہونے والی نالہ و شیون کی صدا منتشر کردیتی تھی کسی گھر میں کوئی عورت چیخ مار کے رونے لگتی تھی۔ پھر اس کے ساتھ دوسری آوازیں مل کے ماحول کو زیادہ سوگوار اور ماتمی بنا دیتی تھیں۔ بستی سے بالکل الگ تھلگ ایک گھر کے باہر دو چارپائیوں پر دو بوڑھے بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔

میں نے اور غالب نے گزرتے گزرتے ہاتھ جوڑ کے انہیں پرنام کیا۔

"جیتے رہو، خوش رہو" ان میں سے ایک نے کہا "تم کہاں نکل آئے اس سے عورتوں کے سنگ۔"

میں نے کہا "بھوانی جی کے مندر جا رہا تھا۔ ادھر تو یدھ کا سماں ہے۔ واپس جا رہا ہوں۔"

"کل سے پتا نہیں کیا ہو رہا ہے یہاں" دوسرے نے کہا "کل رات دھائیں دھائیں ہوتی رہی۔ بالک رام کی حویلی پر ڈاکا پڑا۔ آج سنا ہے کہ رام لوٹ لیا۔"

"گرو رام لوٹ لیا! انہی ڈاکوؤں نے؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"اور کون ہوگا۔ سارا دن پولیس نے کچھ نہیں کیا۔ گھروں میں گھس کر دیکھتے رہے۔ اس حرامی بالک رام کی وجہ سے ایک دن یہ بستی تباہ ہو جائے گی۔"

"آج دیکھو کتنے مرتے ہیں؟" دوسرے نے آہ بھری۔

میں نے اجازت لی "اچھا، رام رام۔"

"کون سے گاؤں جاؤ گے؟"

میں نے کہا "مانی مراد۔"

اس نے کہا "اچھا۔ گرداور کا لڑکا ہے بانکے لال۔"

"وہ!" میں نے یوں کہا جیسے بانکے لال میرا لنگوٹیا ہے "ہاں ہے۔"

"اس حرامی سے کہنا میرا کام کردے۔ آخر چاچا ہوں اس کا، سگا نہ سہی۔ وہ کیا چاہتا ہے میں اس کے پاؤں پکڑوں، چندو نام ہے میرا۔"

میں نے کہا "میں ضرور کہہ دوں گا چاچا۔"

"جاؤ، رام بھلی کریں" وہ بولا "ذرا ہوشیاری سے جانا۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھ سے مانی مراد کا حال احوال تفصیل سے نہیں پوچھا اور وہاں کے ہر فرد و بشر کی خیریت دریافت نہیں کی۔ اس کی گفتگو سے ایک کارآمد بات یہ معلوم ہو گئی تھی کہ بستی کے لوگ اس قتل و خون ریزی کا ذمہ دار ان ڈاکوؤں سے منسوب کر رہے ہیں اور ان کا مقابلہ ڈاکوؤں کے اور بالک رام کے درمیان چلا۔ بالک رام اس علاقے میں کوئی اچھی شہرت نہیں رکھتا تھا۔ لوگ اس سے نالاں تھے اور اس کے کالے کرتوتوں سے واقف تھے۔

"خواہ مخواہ گپ لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ گڑبڑ ہو جائے گی باتوں باتوں میں" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "مانی مراد کے گرداور کے بیٹے کا نام بانکے ہے اور یہ اس کا رشتے کا چاچا تھا، چندو۔"

"پھر؟" رابعہ نے حیرانی سے کہا اور نازو نے ستائشی نظروں سے دیکھا "آپ کیوں بتا رہے ہو؟"

میں نے کہا "کمال ہے، تم اور ہم مانی مراد کے رشتے دار ہیں اور ضرورت پڑنے پر یہی حوالے سند ثابت ہوں گے ڈومیسائل سرٹیفکیٹ کی طرح۔ اس کے علاوہ یہ بھی اچھی بات ہے کہ اس ساری کارروائی کو لوگ ڈاکوؤں کا کام سمجھ رہے ہیں۔"

غالب نے کہا "اچھا، یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔"

"اس میں کیا اچھائی ہے جی؟" نازو نے کہا۔

"۔۔۔ پوچھ رہی ہیں کہ اس میں اچھائی کیا ہے؟" نازو کے انداز تخاطب کا مذاق اڑاتے ہوئے اس نے بات کی تھی جیسے سہاگنیں اپنے شوہروں سے کرتی ہیں۔

"اچھی بات یہ ہے کہ ہم صورت سے بھلے مانس دکھتے ہیں۔ ہم پر ڈاکو ہونے کا شک کوئی نہیں کر سکتا۔"

اچانک کسی نے چلّا کے کہا "کون ہے، رک جاؤ ورنہ مار دوں گا۔"

ہم سب کا اچھل پڑنا اور خوف زدہ ہو جانا ایک فطری عمل تھا۔ نازو اور گل نے چیخ مار کے خوف کی بہترین اداکاری کی۔ رابعہ نے میرا بازو تھام کے میرے پیچھے پناہ لی اور نازو غالب کے پیچھے، گل ہمارے بیچ میں رہی۔

پرانے زمانے کی بندوق تانے ایک پولیس مین سامنے تھا۔ مجھے اس بے چارے پر ترس بھی آیا اور ہنسی بھی آئی۔ وہ فرض ادا کر رہا تھا اور یہ کوئی سڑک پر ٹریفک کنٹرول کرنے جیسا کام نہیں تھا۔ اس کو ڈاکوؤں کا راستہ روکنے اور جان کی بازی لگا کے انہیں پکڑنے یا پکڑوانے کا مشکل فرض سونپا گیا تھا مگر مقابلے کے لئے اور اپنے دفاع کے لئے جو ہتھیار اس کا اردانہ ہوا برابر تھا۔ ایک ہاتھ مار کے نازو اس کا زنگ آلود تھرڈ کلاس رائفل چھین سکتی تھی۔

ہم تھر تھر کانپتے رہے۔ "کہاں" ... سنتری صاحب۔

"کون ہو تم لوگ، کہاں گھوم رہے ہو؟" اس نے ڈانٹ کر کہا "کون ہیں یہ استریاں؟"

میں نے اسے ہمدردی اسٹوری سنائی جو میں نے چندو چاچا کو ... سنائی تھی مگر اب اس نام بھی بتا رہا۔ اس وقت بات مذاق کی نہیں تھی۔ ... جب ... نے رابعہ کو اپنی محرم پتی کہا تو اس نے سرہلا کے ... اور نازو نے بھی خود کو غالب کی نالیا تسلیم کیا۔ گل ... ابھی سالی بنالیا۔ اس وقت جب ہمارے پاس اپنا ... کوئی نہیں تھا میں نے کہا "گرداور کا لڑکا بانکے ... اس کا بھائی۔۔۔ یہ اپنے چاچا کے پاس رک گئی ... بدھوا ہے، وہ ہے ان کا گھر۔"

... نے ذاتی تفتیش کو کافی سمجھا۔ ہم تو صرف یہ کہ ہندو ... بالکل بھی مسلمان نہیں لگتے تھے۔ بلکہ بے ... بھی نظر آتے تھے۔ ہم جیسے لوگ بھلا ڈاکو کیسے ... سکتے تھے۔ اس نے انہیں آگے جانے کی اجازت دے دی اور ... لوٹ گیا۔

... تک راستہ دونوں جانب ویران تھا اور دور دور تک بے ... جھاڑیوں اور اکا دکا درختوں کے سوا زمین سونی تھی ... کہیں کہیں جھنڈ کی صورت میں بھی دکھائی دے رہے ... اور کیلوں کے باغات تھے جو اس سارے علاقے ... سے پائے جاتے تھے۔

میں نے رفتار بڑھائی اور غالب کے ساتھ کچھ آگے چلنے لگا۔ رابعہ، گل اور نازو تینوں تھکی ہاری اپنی باتوں میں مصروف تھیں۔ ایک سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ شہلا کا تھا جس پر ... ہم نے گل کے سامنے کوئی بات کرنے سے گریز کیا تھا۔ ... زخمی تھی اور یہ بات یقینی تھی کہ اسے فوراً مناسب طبی امداد فراہم نہ ہوئی تو اس کا زخم بگڑ جائے گا۔ ابھی تک وہ اپنی تکلیف کو برداشت کر رہی تھی۔ نازو نے اس کے بائیں ہاتھ کو ... باندھنے کے بعد دوسری پٹی کا جھولا سا بنا کے گلے میں لٹکا دیا تھا ... حرکت سے زخم کا منہ نہ کھلے اور خون جو ابھی بہنے سے رک ... دوبارہ نہ بہنے لگے۔

میں نے کہا "غالب، تمہارے اور میرے لئے۔ بلکہ ہم سب کے لئے ایک بری خبر ہے۔"

غالب نے کہا "محسن کے بارے میں؟"

میں نے حیران ہو کے کہا "تم نے کیسے اندازہ کیا؟"

"... اب خبر اسی کی مل سکتی ہے۔"

"... کیا شہلا کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکتا؟"

"شہلا کے بارے میں صرف وہی لوگ بتا سکتے ہیں جو اسے ... لے گئے تھے اور اب اپنے ساتھ لئے پھر رہے ہیں۔ ان ... کسی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پیڈ مل جاتا تو اس ... ہو سکتے تھے کہ یہاں سے وہ شہلا کو کہاں لے گئے ہیں۔"

... نے کہا۔ "مجھے محسن کے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ ... نے پکڑ لیا ہے۔"

غالب فکرمند نظر آنے لگا "یہ کس نے بتایا؟"

میں نے کہا "رامداد نے۔"

"اس سے یہ بھی پوچھ لینا تھا کہ محسن کا نام اسے کیسے معلوم ہوا۔ ممکن ہے پکڑا جانے والا کوئی اور ہو۔" غالب نے کہا۔

"ہمارے بارے میں اور کون پوچھے گا؟ اس کا کہنا ہے کہ وہ شخص ہمارے متعلق لوگوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شک کی بنا پر اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔"

"پھر پولیس اسے کہاں لے گئی؟"

"یہ رامداد کے علم میں نہیں تھا لیکن ہم معلوم کر سکتے ہیں۔ اس علاقے کا تھانہ دور نہیں ہو سکتا۔ عام طور پر دیہی علاقوں میں دس مربع میل میں ایک ہی تھانہ ہوتا ہے۔ گاؤں جتنے بھی ہوں۔"

"پھر اب کیا تھانے پر حملہ کرنا ہے؟"

میں نے کہا "یہ بھی کر سکتے ہیں۔ گاؤں دیہات میں تھانہ کوئی ناقابل تسخیر قلعہ نہیں ہوتی۔ پہلے معلوم تو ہو جائے کہ وہ محسن ہی تھا جو پکڑا گیا تھا یا کوئی اور تھا۔ اگر محسن تھا تو پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ اسے شہری پولیس تو نہیں لے گئی۔"

مجھے باتوں میں بالکل پتا نہ چلا کہ رابعہ، گل اور نازو نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ان کے اور ہمارے درمیان فاصلہ زیادہ ہو گیا ہے اپنی رفتار بڑھا دی تھی۔

رابعہ نے اچانک کہا "کیا پولیس نے گرفتار کرلیا ہے محسن کو؟"

اب میرے لئے ان سے کچھ چھپانے کی گنجائش نہ رہی۔ ویسے بھی بالآخر ان کو یہ بات معلوم ہو جاتی۔ میں نے انہیں مختصراً رامداد سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا۔ تشویش اور پریشانی میں مبتلا ہونا تو خیر ایک قدرتی امر تھا مگر گل پر اس خبر کا زیادہ ہی اثر ہوا۔ اس کے اعصاب پر ویسے ہی گولی لگ جانے کے بعد خوف سوار تھا۔ حالات کے پیش نظر اس نے اپنے خوف پر قابو پالیا تھا لیکن اس کی جذباتی مزاحمت کی صلاحیت کا گراف بہت گر چکا تھا۔ یہ خبر ایک بہانہ بن گئی۔

اس نے ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا "محسن کو پولیس نے پکڑ لیا ہے۔۔۔ اور آپ سب۔۔۔ کیسی بے فکری سے باتیں کرتے جا رہے ہیں۔ جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں" اس نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

میں نے پریشان ہو کے کہا "گل، کیسی باتیں کرتی ہو۔ وہ ہمارا دوست ہے۔۔۔ ہمیں اس کی فکر نہیں ہوگی تو کسے ہوگی۔۔۔"

"جھوٹ بولتے ہیں آپ سکندر بھائی" اس نے میری بات کاٹ دی "آپ کو صرف اپنی کامیابی کی فکر تھی، صرف فتح کی خوشی ہے آپ سب کو۔ کسی کے منہ سے میں نے محسن کا نام تک نہیں سنا۔ کسی نے بھی نہیں کہا کہ۔۔۔ اسے تلاش کرنا چاہئے۔ رابعہ باجی کیا تمہیں، آپ دنیا کو بھول گئے۔"

www.paksociety.com

"گل" میں نے سخت لہجے میں کہا "فضول باتیں مت کرو۔"

"یہ فضول باتیں نہیں، سچ ہے جو آپ کو کڑوا لگ رہا ہے" وہ چلائی "آپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ محسن پکڑا نہیں گیا۔ وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ پھر اتنا بڑا دعوٰی کرنے سے پہلے کسی نے اس کے بارے میں سوچا کیوں نہیں کہ کہیں وہ نہ مارا جائے۔"

رابعہ نے مجھے کچھ کہنے سے روک دیا اور گل کے آنسو پونچھتے ہوئے اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا "گل میری بہن غلط مت سمجھو انہیں۔"

"نہیں باجی مجھے بتائیں کیا فکر کی اس کی کسی نے؟ کیا یہ ناممکن تھا کہ کوئی باہر جا کے اسے تلاش کرتا؟ آس پاس دیکھ آتا؟ ... وہ خود تو اس لئے قریب نہیں آیا ہوگا کہ اسے اندر کی صورت حال کا باہر سے صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر ہم سب کو کس کا ڈر تھا؟ کون تھا باہر ہمارا راستہ روکنے والا؟ سکندر بھائی اور غالب میں سے کوئی باہر جا کے اس کو بلا نہیں سکتا تھا۔"

"اسے ہم کیسے بلاتے گل، کہاں سے بلا کے لاتے؟" غالب نے کہا۔

"کیوں؟ اتنا چیخ چیخ کے باتیں کر سکتے ہو، اعلان کر سکتے ہو جو سارا زمانہ سن لے۔ باہر جا کے اسے آواز نہیں دے سکتے تھے۔ اس کا نام لے کر اسے پکارتے تو وہ سن لیتا۔ آدھے میل تک وہ جہاں بھی ہوتا تمہاری آواز اس تک پہنچ جاتی۔ مگر کس نے پروا کی؟ کون گیا باہر اسے بلانے کے لئے۔ اور اب اس کو پولیس لے گئی ہے" وہ پھر بڑی شدت سے رونے لگی۔

"ہم اسے چھڑا لائیں گے گل" نازو نے اسے تسلی دی۔

"کیسے چھڑا لائیں گے؟ کب چھڑا لائیں گے؟" گل نے تند لہجے میں کہا "جب پولیس مار مار کے اس کی جان لے لے گی۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ پولیس کیا کرتی ہے۔ ڈاکوؤں کا ایک ساتھی ان کے ہاتھ لگ جائے تو اسی سے وہ باقی گروہ کا پتا ٹھکانا معلوم کرتے ہیں۔ یہاں بھی مشہور ہے کہ حملہ کرنے والے ڈاکو تھے۔ اسے پولیس نے ہمارا ساتھی مان لیا تو ..."

ہم سب گل کی وجہ سے رکنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی تھی اور رو رو کے بے حال ہو رہی تھی۔ بے وقوف، انجام سے بے خبر، حقائق سے ناآشنا جذبات کی رو میں بہہ جانے والی لڑکی ... جو محسن کو دیوانگی کی حد تک پیار کرنے لگی تھی۔ یہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔ خود گل کو اس کا اقرار کرنا اچھا لگتا تھا۔ ابھی تک کسی نہ کسی طرح ہم محسن اور شہلا کے رشتے کی نوعیت کو چھپانے میں کامیاب رہے تھے اور گل کو یہ بتانے سے گریز کرتے رہے تھے کہ وہ سراب کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ محسن نہ کبھی اس کا تھا اور نہ ہوگا۔

رابعہ اور نازو اس کے پاس بیٹھی کوشش کر رہی تھیں کہ کسی طرح اسے چپ کرا دیں۔ میں اور غالب خاموش کھڑے افق پر نمودار ہونے والے صبح کاذب کے اجالے کو دیکھ رہے تھے۔

اچانک میں نے دونوں جانب سے دوڑ کر آنے والے قدموں کی آواز سنی۔ دو جھاڑیوں کے پیچھے سے [illegible] والے نمودار ہوئے۔

"کون ہو تم لوگ؟ سیدھے کھڑے ہو جاؤ" ایک [illegible] نے گرج کے کہا۔

"حوالدار صاحب، ہم شریف لوگ ہیں۔"

"شریف لوگ!" حوالدار نے میرے منہ پر ایک [illegible] کیا "وہ تو صورت سے نظر آ رہے ہو تم لیکن ہم نے [illegible] سن لی ہے۔ تم اس ڈاکو کے ساتھی ہو جو پکڑا جا چکا ہے [illegible] اوئے گرفتار کر لو ان کو بھی۔"

ایک سپاہی ہتھکڑی لے کر آگے بڑھا۔

میں نے کسی مظلوم دیہاتی کی طرح گڑگڑانا شروع کیا۔

"تھانے دار صاحب ... کیسی بات کرتے ہو جی آپ [illegible] کیا تعلق کسی ڈاکو سے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے" [illegible] گل کی طرف اشارہ کیا "یہ ضرور اس بدمعاش کی [illegible] گھر والی ہے۔ دیکھو کیا حال کر لیا ہے اس نے اپنا رو رو کے۔"

"اوئے تم بکواس مت کرو۔ نصیب [illegible] اس ڈاکو تک تیرے کو پہنچا دیا" غالب نے [illegible] جذبات کے ساتھ کہا۔

گل نے جو اب تک محسن کی وجہ سے [illegible] تھی اب صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے [illegible] کیا "ارے میرے نصیب کو کیوں الزام دیتے ہو [illegible] تھا اسے۔"

میں نے کہا "اس وقت وہ کام کرتا تھا۔ تھوڑا بہت [illegible] کر کے جو کما لیتا تھا اس میں خوش تھا۔ [illegible] دل میں۔"

"میں نے ..." گل نے چیخ ماری "ہائے کیا [illegible] خود [illegible] کیا میں نے اسے برائی کے راستے پر ڈالا؟ [illegible] درست [illegible]" سپاہی جو ہتھکڑی لے کر آگے بڑھا تھا وہ [illegible] کر رک گیا۔

غالب نے برہم ہو کے کہا "ارے تو نے روز [illegible] یہ چاہیے وہ چاہیے۔ اس کے پاس اتنا کہاں ہے [illegible] نہیں ہے۔ پھر وہ کیا کرتا؟ مجبور ہو گیا چوری [illegible]"

میں نے اس کی تائید کی "آپ اپنے تھانے دار صاحب [illegible] پوچھ لو۔ یہ تو خیر رشوت لیتے ہی نہیں لیکن ان کے محکمے [illegible] لوگ رشوت لیتے ہیں سب اپنی بیویوں کی وجہ سے [illegible] کیوں سرکار کیا غلط کہا میں نے؟"

حوالدار نے غصے میں [illegible] چند منٹ میں [illegible]

[illegible] کر دیا تھا مونچھوں پر تاؤ دے کر تائید کے [illegible]

[illegible]

"[illegible] تمہارے ہتھکڑی لگے گی۔"

[illegible] ہتھکڑی ایک تھی اور ملزمان ہم [illegible] اگر نازو، رابعہ اور گل کو عورت ہونے کی [illegible] تب بھی ایک ہتھکڑی ناکافی تھی۔ سپاہی نے [illegible] میری طرف رکھا اور نہ غالب کی طرف۔ ہم دونوں [illegible] رہ گئے۔

"[illegible] اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہم کوئی بھاگنے والے [illegible] عزت دار ہیں۔ ان مستورات کو چھوڑ کے کہاں [illegible]"

"ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں" غالب نے لجاجت سے کہا۔ "[illegible] ایک بار میری بہن کی اس بیٹے سے ملاقات کرا دیں [illegible] تھانے دار جی [illegible] ایک نظر دیکھ لوں اسے" گل نے [illegible] کہا "جیسا بھی ہے [illegible] میرا گھر والا ہے [illegible] بچے [illegible] کا باپ ہے۔"

[illegible] اداکاری میں حقیقت کا تاثر پیدا کرنے کے لئے گل [illegible] کیا تھا ٹھیک تھا۔ پھر بھی نازو کے ساتھ رابعہ نے اسے [illegible] اور زیر لب مسکرائیں اور شرمائیں۔

میں نے کہا "ہاں جی ہم کو ساتھ لے چلو ... آپ کی بڑی [illegible] اس صورت ملاقات کرا دینا۔"

"ملاقات کرا دیں" حوالدار نے غصے سے کہا "تمہارے باپ کا نوکر ہوں کہ جب جی چاہا مل کر آ گئے۔ چلو اب سارے [illegible] اس کے ساتھ۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "ہم تو گھر سے نہ نکلتے جی اس کی [illegible] ہم تو کہتے ہیں چھوڑ اسے [illegible] نہیں چھوڑتی ... [illegible] بے غیرتی کے سوا۔"

[illegible] "چوری چکاری میں ہو تا تمہارا بھی [illegible] دیا تھا۔"

"اب جناب ڈاکہ ڈالا تھا اس نے یہاں۔ ہم نے سوچا تھا کہ بچا ہو گا اسے ساتھ لے جائیں گے" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "میں تو کہتی ہوں گھر چلو واپس۔"

گل نے پھر چیخ ماری "نہیں نہیں میں ملے بغیر نہیں جاؤں گی [illegible] تھانے دار جی میں چلوں گی آپ کے ساتھ ... ان کو [illegible]"

[illegible] نے تنگ آ کے کہا "اب پاگل ہو رہی ہے اس کے پیچھے۔ [illegible] اس سے لڑتی ہے۔"

[illegible] نے کہا "ایسی تو سب کرتی ہیں۔ کیوں تھانے دار جی کیا [illegible]"

"[illegible] افلاطون کی اولاد تو کیسے غلط بول سکتا ہے" تھانے دار نے قدرے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "سرکار، اس کو چھوڑو اس سے ایک بار ہم آپ کی خدمت کریں گے۔"

"کیا خدمت کرو گے؟" وہ براہ راست سودا کرنے پر اتر آیا۔ "کیا ہے تمہارے پاس ... نہ کوئی پیسہ۔"

"ہم پیسہ دیں گے جی، ہم کو بتاؤ وہ ہے کہاں" گل نے روتے روتے کہا "جتنا مانگو گے دیں گے۔"

"ہاں ... جمع کر کے رکھا ہوگا چوری کا مال" تھانے دار کا لہجہ پھر بگڑ گیا "ارے وہ ہم خود نکلوا لیں گے۔"

میں نے غصے سے گل کو گھورا "پاگل ... مورکھ ... سوچا بھی ہے کیا دے گی انہیں؟ بڑا خزانہ ہے نا تیرے پاس۔ کہہ دیا جو مانگو گے دیں گے" میں نے گل کی نقل اتاری۔

"سوچا ہی!" تھانے دار بھڑک اٹھا "تیرا جی دے رہی ہے [illegible]"

غالب نے کہا "حضور، بے وقوف عورت ہے۔ ہم وعدہ [illegible] کیا کریں ... بڑے بھائی نے [illegible]"

"یہ چھوٹی بہن ہے تیری" تھانے دار نے کہا "کیا نام ہے [illegible]"

"[illegible]" غالب نے کہا۔

"اسے اس کا ... تیری بہن کا" تھانے دار کا [illegible]

"بدبختی سرکار" میں نے کہا۔

حوالدار اب اونچ نیچ میں آ گیا تھا۔ اس کی نظریں باری باری تینوں عورتوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اسے ایک ہزار روپے کی [illegible] بھی اچھی لگی تھی۔

"ایک ہزار تو کم ہیں" اس نے کہا۔

"ہم غریب لوگ ہیں جی۔ وہ بتا نہیں کیسے چوری ڈال دیا [illegible] بھی مٹی میں مل گئی۔ ہمارے پاس اتنا ہی ہے [illegible]"

"ہم سے کم پانچ سو اور نکال" تھانے دار بولا "[illegible] سب کے لئے۔"

"نہیں حضور اتنا نہیں ہے میرے پاس" غالب نے کہا۔

"اس کا کیا ہوگا" تھانے دار نے گل کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ دونوں کون ہیں؟"

"یہ ... ایک میری دھرم پتنی ہے، ایک اس کی" میں نے کہا۔

"تو یہ بھی کیا کسی کنگال کی بیٹیاں ہیں؟" حوالدار بولا۔

"لو ... میں کیوں دوں گی اپنا گہنا" رابعہ نے تڑخ کے کہا۔

"بھگوان نہ کرے جو میرا باپ کنگلا ہو" نازو غصے سے بولی۔ "مگر ایسے حرام کھوانے کے لئے کچھ نہیں ہے میرے پاس۔ لوٹی [illegible] چوری ڈکیتی کوئی کرے جرمانہ کوئی بھرے۔"

"اچھا اچھا ... زیادہ بک بک مت کر" میں نے مشتعل ہو کے کہا "میں دے دوں گا ... اپنا یار ہے۔ اس کے لئے جان بھی قربان۔"

www.paksociety.com

"چل رہنے دے... بڑا آیا جان قربان کرنے والا۔ اس کی ساری زندگی خراب کر دی۔ بیوی بچوں کا خانہ خراب کر دیا" نازو نے ...

"کیا پتا ... سنبھالے اپنی ... والی لو..." میں نے بگڑ کے کہا۔

"چپ چپ کر" غالب نے اسے ڈانٹ لگائی "تھانے دار سامنے کھڑا ہے اور تو بولے جا رہی ہے۔ ابھی سارا ... نکال دیں گے تیرا۔"

میں نے کہا "سرکار، ہم آپ ... ہم آپ کے غلام..."

"یہ غلام کی اولاد ایک ایک کر کے جاتا ہے" حوالدار نے گرم ہو کے کہا "چپ کر نکل۔"

"... ضرور دیں گے سرکار۔ جب وعدہ کیا ہے تو ... گے لیکن ہم کو گھر سے پیسہ لانے کی مہلت دو" میں نے ... ہو کے "یا ہمارے ساتھ چلو۔"

حوالدار کچھ مایوس ہوا "کیا اب گھر جانا پڑے گا تیرے... نہیں۔ تو جانے دے آپ۔"

ایک سپاہی نے کہا "میں... میں چلا جاؤں اس کے ساتھ؟"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں" حوالدار نے کہا۔

اسے شاید ڈر تھا کہ نوجوان کانسٹیبل وصول شدہ رقم ایمانداری سے اس تک نہیں پہنچائے گا۔ رقم ہمارے پاس بھی تھی لیکن میں ان کے سامنے بیلٹ کھول کے ایک ہزار نکالتا تو باقی رقم وہ خود ہم سے چھین لیتے۔

"آپ ادھر انتظار کریں۔ میں بس یوں گیا اور یوں آیا" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔

"وہاں کے رہنے والے ہو تم لوگ؟" حوالدار نے کہا۔

"بانی مراد کے جناب" غالب نے جواب دیا۔

"اچھا" حوالدار سوچ میں پڑ گیا "تمہارا آدمی تو دوسرے تھانے میں ہے۔"

میں نے کہا "چوری بابا کے تھانے میں؟"

"ہاں ایسے چٹکی بجا کے کہنا تو آسان ہے کہ میں یوں گیا اور یوں آیا" حوالدار خفگی سے بولا "دو گھنٹے لگ جائیں گے۔"

غالب نے مجھے مخاطب کیا "وہاں مانک لال بھی تو ہے۔"

میں نے کہا "وہ گرودوار کا لڑکا؟"

حوالدار نے ہم دونوں کی صورت کو غور سے دیکھا "تم جانتے ہو مانک لال کو؟"

"ارے جی، اپنا تو یار ہے" میں نے کہا۔

غالب نے تائید میں سر ہلایا "وہ دو ہزار کا بندوبست کر دے گا۔"

"ہم اسے کل واپس کر دیں گے" میں نے کہا۔

حوالدار کو یہ تجویز پسند آئی "ٹھیک ہے، ویسے کرو تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ ابھی تمہارا آدمی، کیا نام ہے اس کا؟ چمن لال؟"

"ہاں جی، چمن لال" میں نے فوراً کہا۔

"دیکھو ابھی اس کے خلاف تو پرچہ کاٹا گیا ... قانونی کارروائی ہوئی ہے" حوالدار بولا "... ابھی تم چاہو تو ان سے معاملہ طے کر ... مشکل ہو جائے گا۔ آٹھ بجے تھانے دار آ ... اسے چھڑانے کے لئے اپنا سب کچھ بیچ دو گے پھر ... ہو گا۔ تھانے دار دس ہزار سے کم کی بات ہی نہیں کرتا۔"

میں نے آنکھیں پھاڑ کے کہا "دس ہزار۔"

"ہاں، دس ہزار بھی چھوٹی موٹی چوری کے الزام ... جانے والوں کے ہوتے ہیں۔ چمن لال پر تو شک ہے ... کا ساتھی ہے۔"

میں نے سخت پریشان ہو کے کہا "تھانے دار ... خدا کرو ہماری۔ آپ کو بھگوان کا واسطہ ہم ... لال جیل میں چلا گیا تو یہ بچی مر جائے گی۔"

"جیل تو جائے گا بعد میں۔ پہلے ہوگی تفتیش" ... کہا "تفتیش میں ہی ضائع ہو گیا..."

گل نے ایک چیخ ماری "ایسا مت کہو۔"

حوالدار نے بے رحمی سے کہا "تفتیش شروع ... تمہاری خیر نہیں۔ سارے گھر کو تھانے بلائیں گے ایک ... مار نہیں جھیل سکو گے تم لوگ۔"

میں نے کانپتے ہوئے کہا "ہم آپ سے سچ ... ہم شریف عزت دار لوگ ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ ایسے ہی لوگوں کی عزت ... تفتیش میں جو اپنی عزت پر اکڑتے ہوں جیسے تم ..."

غالب نے کہا "نہیں جی، ہم اکڑ تو نہیں رہے ..."

"اور کیا کر رہے ہو! بار بار ایک ہی بات کرتے ... عزت دار ہیں اور شریف ہیں۔ ارے بھئی چمن لال ... ساتھی ہے اور تم اس کے ساتھی ہو تو تم کیا ہو ... کر اس کے کہنے سے شریف عزت دار ... اس وقت چلے گا جب تمہارے سامنے تمہاری ... ستھریوں کی..."

میں نے گھبرا کے کہا "نہیں جی... ایسا کیسے ہو سکتا ہے!"

حوالدار بگڑ کے بولا "ابے جب ہو گا تو دیکھ لینا ... ہے..."

غالب نے کہا "سرکار، آپ کوئی اپائے بتا ..."

"اپائے بتا تو رہا ہوں... معاملہ صبح سے پہلے ... کی کوشش کرو" چالاک حوالدار نے سوچ ...

اسے یقین آ گیا تھا کہ وہ ہمیں ہراساں ... طریقے آزمانے میں کامیاب رہا ہے اور اب ہم ...

بات کریں گے۔ اسے منہ مانگی رقم دیں گے کہ ہمارے ساتھی کو ... اور وہ ہم پر یہ احسان کرے گا کہ دس بیس ہزار میں ... ختم کرا دے گا۔ یقیناً یہ اس کے اختیار کی بات تھی اور وہ ... اپنے اختیارات کو ہمارے حق میں استعمال کرنے کی پوری قیمت وصول کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ہمارے سامنے ایک صورت حال ... واضح کر دیا تھا کہ یا تو ہم اس کی معروف عزت کی قیمت ادا کر کے سب کی عزت آبرو اور جان بچا لیں یا پھر جملہ اہل خانہ کے ساتھ جن میں خواتین بھی شامل ہوں گی، تفتیش کے سنگین ... کو بھگتنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اسے اس بات سے کوئی ... نہ تھا کہ ہم یہ منہ مانگی قیمت کیسے ادا کریں گے۔

... بات بھی ... سسپنس میں جتنا اپنے ہوشیار افسر کے معیار ... ذہن کی کاروباری صلاحیت کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ اس سودے میں بالآخر ان کو کیا ملے گا۔ شیر کے منہ سے اس کا نوالہ کون چھین سکتا ہے۔ وہ کتنا کھاتا ہے اور کتنا چھوڑتا ہے یہ اس کی مرضی۔

حوالدار کے ساتھ سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے کرانے کا سودا چالیس ہزار سے شروع ہوا اور چھتیس ہزار روپے طے پایا۔ اس نے چمن لال یعنی محسن کو حوالات سے نکال کے بظاہر ہماری تحویل میں دینے اور ہمیں تفتیش سے تحفظ فراہم کرنے کی پوری ذمے داری قبول کر لی تھی۔ فی الحال دو ہزار نقد کے عوض اس نے ایک ملاقات کرانے پر رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ باقی کے معاملات کا انحصار ہماری کوششوں کی کامیابی پر تھا کہ ہم مطلوبہ رقم کتنے عرصے میں فراہم کر سکتے ہیں۔ ہم نے وعدہ کیا کہ دو تین دن میں سب کا گہنا بیچ کے رقم اکٹھی کر لیں گے۔

اس کے ساتھ رابعہ نے اس سودے کے خلاف احتجاج کیا۔

"ایک چھلا نہیں دوں گی میں" رابعہ نے کہا۔

"اپنی ماں کا زیور بیچ دونا" نازو بولی۔

میں نے رابعہ کے ایک جھانپڑ رسید کیا "اب بولی تو تیرا گہنا کیا، تجھے بھی بیچ دوں گا... سمجھی؟"

یہ جھانپڑ مارنا ازحد ضروری تھا۔ اصل شوہر اس قسم کی صورت حال کو ایسے ہی کنٹرول کرتے ہیں۔ میں نے ہاتھ زیادہ زور سے گھمایا تھا۔ جھانپڑ آہستہ سے مارا تھا۔ پھر بھی ایک ... رابعہ ... کر گئی اور نیچے گر گئی۔

مجھے اس حرکت پر جتنا تعجب کسی اور کو ہوا تھا اس سے کہیں زیادہ دکھ مجھے ہوا تھا لیکن جھوٹ کو سچ بنانے کے لئے دل پر جبر کرتے ہوئے ایک تکلیف دہ اور ناپسندیدہ فعل کا ارتکاب ... کرنا پڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رابعہ نے برا نہیں مانا ہوگا، اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ فنا اور بقا کی جدوجہد میں ایسے مرحلے آتے ہیں جہاں آدمی مجبور ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ کرنے پر جو عام حالات میں اس کے لئے ناممکن ہوتا ہے۔ پھر بھی میں شرمسار تھا اور اس سے نظر نہیں ملا سکتا تھا۔

نازو نے میری مدد کی۔ اس نے میرے ذہنی کرب کا ٹھیک اندازہ کر لیا تھا چنانچہ میرے احساس جرم کی شدت کو ختم کرنے کے لئے وہ غالب پر چلانے لگی۔

"میں صاف بتا رہی ہوں ابھی سے، میں جان دے دوں گی مگر کسی نے میرے گہنے کی طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھا..."

غالب نے اس کا مقصد بھانپ لیا اور میری تقلید کرتے ہوئے نازو کے منہ پر ایک تھپڑ مارا "بھونکتی جا رہی ہے۔ بھونکتی جا رہی ہے، زبان کھینچ کے ہاتھ پر رکھ دوں گا جو اب منہ سے ایک لفظ بھی نکالا۔ تیری بہن کا معاملہ ہوتا تو فٹ سارے گہنے رکھ دیتی میرے سامنے... یہ میری بہن کا معاملہ ہے تو کیا... تیرے باپ کی جان کی پروا نہ کروں میں..."

دونوں بیویاں ایک ایک جھانپڑ کھا کے خاموش ہو گئیں۔ جیسے کہ شوہر کو مجازی خدا اور دیوتا ماننے والی سب مشرقی بیویاں ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے ظاہر کیا کہ ظلم کے خلاف احتجاج میں وہ اپنی حد سے آگے بڑھ گئی تھیں چنانچہ انہیں جو سزا ملی وہ مشرق کی جاہلانہ روایات اور فرسودہ اخلاقی اقدار کے معیار پر کسی طرح بھی غیر منصفانہ نہیں سمجھی جا سکتی۔

جب ہم نے حوالدار کی قیادت میں بانی مراد کی جانب سفر شروع کیا تو صبح کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ ہم اس بستی سے بہت دور آ گئے تھے جہاں ایک تاریک رات کے ساتھ ہی موت اور زیست کی خوں ریز جنگ کا بھی اختتام ہو گیا تھا۔ ہماری طویل جدوجہد کا انجام ایک ادھوری فتح تھی۔ ہم اپنے پیچھے دشمن کے ایک مضبوط قلعے کا کھنڈر چھوڑ آئے تھے جس میں بکھری ہوئی لاشیں، جلے ہوئے ٹرک، شکستہ و سوختہ درودیوار خود اپنی زبان سے ایک عبرت کی داستان کہتے تھے۔ آسمان تک اٹھتا ہوا دھوئیں کا بادل گواہی دیتا تھا کہ یہ صرف تائید ایزدی ہے جس نے ایم آر ایس جیسی بے سروسامان تنظیم کو حوصلہ اور طاقت دی کہ وہ چوہدری داؤد اور ترلوچن جیسے فرعون صفت شیطانوں کے غرور کو شکست دے۔ ازل سے یہ بندوبست خود خالق کائنات نے قائم رکھا ہے کہ دنیا میں جہاں بھی نیکی بدی کی قوتیں کسی رزم گاہ میں مقابل ہوں تو باطل کبھی حق پر غالب نہ آئے۔

آسمان روشن ہونے لگا تھا اور اس کے ساتھ ہی رات کا سکوت ختم ہو رہا تھا۔ آشیانوں میں پرندے ایک نئی صبح کے آغاز کا گیت شروع کر چکے تھے اور ان کے کورس میں ہر طرح کی آوازیں شامل ہوتی جا رہی تھیں۔ ساری فضا ان آوازوں کے شور سے گونجنے لگی تھی۔ پرندوں کے غول درختوں سے پرواز کے لئے پر تول رہے تھے۔

رات بھر گولیوں کی آوازوں، دھماکوں، میدان جنگ کی بربریت، سفاک اور دل خراش چیخ پکار، آگ اور دھوئیں، بارود کی

www.paksociety.com

اور جلتی ہوئی لاشوں کی بو اور موت کی سرد مہری کو برداشت کرتے رہنے سے میرے اعصاب بالکل جواب دے چکے تھے۔ ظاہر ہے دوسروں کی حالت بھی ایسی ہی ہوگی۔ خطرے کا احساس اب زندگی کے روز و شب کا حصہ تھا۔ ایک خطرہ پیچھے رہ گیا تھا تو دوسرا ہمارے ساتھ تھا اور تیسرا آگے ہمارے انتظار میں تھا۔ ایک ذات بڑی فتح کی مسرت میں خوف کے ان گنت اندیشے شامل تھے چنانچہ ہم خوش ہونے کے باوجود رنجیدہ تھے کہ ہم نے شملا اور اس کے بچے کی زندگی کو دشمن کے قبضۂ اختیار سے چھڑانے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکام ہو گئی۔ اس ناکامی کا خیال میرے دل کا بوجھ تھا۔ میں شملا کا تصور کرتا تھا تو ذہن میں ایک خلا نمودار ہو جاتا تھا جس میں ان گنت سوال سرگرداں تھے۔ بے رحم شکاری اب اسے کہاں لے گئے ہوں گے؟ کیا ہماری ناکامی کا خمیازہ بھی شملا کو بھگتنا پڑے گا اور ہماری کامیابی کی سزا بھی اسے ہی ملے گی؟ اس کا سفر کہاں تمام ہوگا؟ وہ پھر کبھی محسن سے ملے گی تو کس حال میں؟ قید حیات سے نجات پانے کے بعد اگلے جہان میں یا اسی زندگی میں عشق کے ہر امتحان سے گزر کے؟ کہیں اس کی اسیری کی طرح اس کی محرومی کے عذاب کے ذمے دار بھی ہم تو نہیں ہوں گے؟ جو اس کے اپنے تھے۔ جن پر وہ بھروسا کرتی تھی۔ کیا ہم ہی اس کے خواب چھین کر اسے موت کی … کے سپرد … کر دیں گے؟

صبح کی تازگی اور ایک سکون بخش ماحول کا اثر تھا کہ میرا ذہن پھر سوچنے لگا تھا۔ رات بھر سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی تھی۔ اب یہ جدوجہد ایک کامیابی پر تمام ہوئی تھی تو دوسری بڑی ناکامی کا خیال سب کے احساس کو پریشان کر رہا تھا۔ میری طرح باقی سب بھی اداس تھے اور دل گرفتہ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ سب کے خیالات کی رو متوازی خطوط پر ایک ہی سمت میں بہہ رہی ہے۔ جو میں سوچ رہا ہوں وہی سب سوچ رہے ہیں۔

حوالدار کے لئے تیز قدم اٹھانا ممکن نہ تھا۔ وہ پتھریلے ناہموار راستے پر ہانپتا ہوا چل رہا تھا۔ اس سے چند قدم پیچھے میں اور غالب تھے۔ ہم سے چند قدم پیچھے گل، رابعہ اور مادو تھیں اور حوالدار نے اپنی سپاہ کو سب کے پیچھے رکھ کر ثابت کیا تھا کہ وہ اتنا بے وقوف شکاری نہیں ہے جتنا نظر آتا ہے۔ وہ کسی ملزم کو فرار ہونے کا موقع کیسے دے سکتا تھا جب کہ انہی ملزموں سے اس کی معاشی خوشحالی وابستہ تھی۔ ملزم نہیں اس نے پچیس ہزار روپے پکڑے تھے۔ ایسا شکار اس علاقے میں روز کہاں ملتا ہے۔

ہم نے اس برساتی ندی کو عبور کیا جس میں آج کل پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ ریت اور گول چکنے پتھروں کے فرش پر چل کے ہم نے بڑے نظم و ضبط اور خاموشی کے ساتھ سفر کیا۔ ہم نے آپس میں کوئی بات کرنے سے گریز کیا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ … پولیس ہماری راہنمائی کر رہی تھی اور حفاظت بھی۔ ہماری

اداکاری کا معیار اطمینان بخش نہ ہوتا تو وہ ہمیں … پکڑ کے لے جاتے اور جامہ تلاشی میں وہ سب … کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ وہ ہمیں … ایسے احمق نظر آنے والے دیہاتیوں کے پاس … اور جدید ترین ریوالور بھی ہو سکتے ہیں۔

پہاڑی ختم ہوتے ہی حوالدار نے کہا "اوئے … ہوشیار رہنا ہے… کسی کو پتا نہ چلنے پائے۔"

غالب نے کہا "آپ فکر مت کریں … بے وقوف ہیں۔"

میں نے ایک انگلی اٹھا کے کہا "سرکار …"

حوالدار نے میرا مطلب سمجھتے ہوئے کہا "… بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔"

"اجی اب ہم کہاں جائیں گے بھاگ کے" … نے کہا "یہ سسری جانے دے گی ہمیں؟"

رابعہ نے ایک روٹھی ہوئی بیوی کی طرح کہا "… چلے جاؤ جس کے سنگ جانا ہے۔ میری بھی …"

"بڑا غصہ ہے بھئی" میں نے … کہا … کی اوٹ میں چلا گیا۔ وہاں میں نے دھوتی کے نیچے … کی بیلٹ نکالی جس میں اب ہمارا باقی سرمایہ محفوظ تھا۔ ایک بیلٹ غالب کے پاس تھی۔ میں نے اس میں سے … روپے نکالے اور دھوتی کستا ہوا پھر قافلے سے آ ملا۔

سورج کے آتشیں گولے نے مشرق سے اپنا سر … اور خاصی تیزی سے اوپر اٹھ رہا تھا۔ سنہری دھوپ میں … بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اب آدھے یا پون میل کے فاصلے پر … چھوٹے سے گاؤں کے آثار دیکھ سکتا تھا۔ کسی سے پوچھے … نے سمجھ لیا کہ یہ وہاں کی مراد ہے۔

حوالدار نے پھر پلٹ کے میری طرف دیکھا "دیکھ … بات سمجھ لے اچھی طرح۔ کہ کسی کو اس معاملے کی خبر … چاہئے۔"

"کس معاملے کی؟" میں نے احمقوں کی طرح …

حوالدار نے مجھے گالی دی "ابے یہ جو تیرے اور … درمیان ہوا ہے۔"

غالب نے کہا "آپ بالکل مطمئن رہیں جناب۔"

"یہ جو تمہارا یار ہے … گردوار کا لونڈا … مانک لال … سے بھی ذکر مت کرنا۔"

"کس بات کا؟" میں نے زیادہ احمق ہونے …

حوالدار نے میرے منہ پر تھپڑ مارنے کی کوشش کی "… ذاتی تعلقات کی وجہ سے تمہاری مدد کر رہا ہوں … فرار ہے تو … وہ میری ملازمت کا مسئلہ ہے۔ سمجھے؟" میں اس کا … گیا۔"

… نے میرا ادا کیا "یہ ذرا سورج … ہے … اسے سمجھا …"

… سوچ رہا تھا کہ گاؤں میں پہنچنے کے بعد کیا ہوگا … مجھے صرف معلوم تھا کہ وہاں کسی گردوارے کے لڑکے مانک … تھا کہ میں اس سے ملوں۔ اس کے لئے … میں مانک لال کو اس کے چاچا کا پیغام … کہہ سکتا تھا کہ میں دو دن سے … تھا کہ میں مانک لال کا پتا کس سے پوچھوں … میں نے اسے اپنے بھتیجا کا پیار کیا تھا۔ اگر میں … اس کا گھر معلوم نہیں تو ایک دم حوالدار کا شبہ پختہ ہو جاتا۔

… مشکل کو خود حوالدار نے آسان کیا۔ … اس نے کہا "دیکھ میں ان کو لے کر سیدھا تھانے کی طرف جا رہا ہوں" اس نے بائیں جانب ہاتھ سے اشارہ کیا "تو …"

مجھے غور سے دیکھنے کے باوجود اس سمت میں کوئی عمارت … نہیں دی۔ تاہم مجھے اندازہ ہو گیا کہ حوالدار … داخل ہونے سے گریز کر رہا ہے اور باہر باہر سے … تک پہنچنا چاہتا ہے۔

میں نے کہا "کیا میں اکیلا جاؤں؟"

"ابے وہ سامنے گھر ہے گردوارے کا" حوالدار نے … "… جا اور پانچ منٹ میں واپس آ جانا۔"

میں نے گردوارے کے گھر کی طرف دیکھا۔ بہت سے کچے … گھروں کے درمیان سب سے الگ ایک پختہ مکان نظر آتا تھا جو گردوارے کا گھر ہو سکتا تھا۔ میں نے سر ہلا کے کہا "جلدی ہی آتا ہوں۔"

حوالدار نے کہا "میں ایسے کچھ نہیں کرنے کا۔ … ملاقات بھی ہو جائے گی۔ ہمارے اندر ہی …"

غالب نے کہا "نہیں جی جیسے آپ کو پہلے ملے گا۔ مگر آپ … سرکار۔ دو تین دن میں باقی بندوبست بھی ہو جائے … مانک لال کا پتا … جائے۔"

"… نہیں ہوگا۔ اس کے بعد میری … اگر اس کے ساتھ تم بھی پکڑے جاؤ" حوالدار بولا "… کرنا ہے۔ جا کہاں نہیں۔"

غالب نے کہا "ہاں ہم انتظار کرتے ہیں تیرا …"

… سیدھا ادھر ہی تھا۔ ہم … کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی میری نظر سے … اگر درمیان میں کوئی موڑ آتا تو مجھے گردوارے … کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ میں چند

منٹ انتظار میں گزار کے پھر ان کے پاس پہنچ جاتا مگر اب حوالدار کی پارٹی دور جانے کے باوجود مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

مجبوراً میں نے گردوارے کے دروازے پر دستک دی۔ … حوالدار اسی علاقے کا رہنے والا لگتا تھا اور شاید … گاؤں میں رہنے والوں کو پہچانتا بھی ہوگا۔ اس کے پاس … شناخت نہیں کر سکتا تھا تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ … نظر آتے تھے اور پولیس کے … خاص لوگوں سے رشتے ہیں۔ … یا اپنے کرتوتوں کے باعث شہرت حاصل کر لیں۔

پہلے ایک ملازم قسم کا بوڑھا دروازے تک آیا۔ اس نے … زبان میں پوچھا جس کا مطلب میں نے اندازے سے سمجھ لیا۔

"مجھے مانک لال سے کام ہے" میں نے پولیس پارٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

… حوالدار کی نظر مجھ پر نہ ہوتی تو میں بوڑھے سے دعا سلام کر کے واپس چلا جاتا مگر اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں اصلی مانک لال سے گفتگو کرتا ہوا دیکھا جاؤں تاکہ شک کی گنجائش نہ رہے۔

بوڑھے نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور واپس چلا گیا۔ چند منٹ کے بعد ایک جوان آدمی نمودار ہوا جس نے صرف دھوتی باندھ رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک نیند … تھی۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے مجھے غور سے دیکھا اور سر ہلایا جس کا مطلب تھا کہ کیا ہے؟

تسلیم کرنے کے بعد میں نے اسے چاچا کا پیغام دیا۔ وہ مجھے دیکھتا رہا "بس… یہی بات تھی؟"

میں نے کہا "اور کیا کہوں… جتنا تمہارے چاچا نے کہا تھا اس سے زیادہ تو نہیں کہہ سکتا۔"

اس نے کہا "لعنت تم پر اور چاچا پر۔"

"میں یہ جواب پہنچا دوں گا" میں نے کہا "نمستے۔"

"حرام خور نمک حرام کی۔"

میں نے کہا "مجھے ایک روپیہ چاہئے۔"

وہ دم بخود رہ گیا "اس کے لئے چندو چاچا کا نام لیا تو نے مجھے دھوکا دیا… ایک روپے کے لئے" وہ چلا کے بولا۔

میں نے کہا "مانک لال جی بھگوان کی سوگند…"

"سوگند کے بچے… بھکاریوں کی اولاد… جھوٹے…"

میں نے کہا "میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میرے ساتھ خود چلو یا کسی کو بھیج دو۔ اگر چندو چاچا انکار کریں اور مجھے نہ پہچانیں تو جو بھی سزا دو میری۔ اور میں بھکاری بھی نہیں ہوں۔"

"اور کیا تیرے باپ نے قرض دیا تھا میرے باپ کو۔ جو تو صبح صبح وصول کرنے آ گیا" مانک لال چلا ہوا گیا۔

www.paksociety.com

میں نے اسے دو ہزار روپے دکھائے جو سو سو کے نوٹوں کی صورت میں تھے "مجھے بس کے کرائے کا ایک روپیہ لینا چاہیے۔ وہ بھی ادھار۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں صبح آ گیا سو کا نوٹ لے کر۔"
"تو کیا لگتا ہے چندو چاچا کا؟"
میں نے سوچ کر کہا "جب وہ چاچا ہیں تو پھر میں بھتیجا ہی ہوا۔ یہاں اور کسی کو جانتا نہیں تھا اس لیے آپ سے ایک روپیہ مانگ لیا۔ آپ اتنے بڑے آدمی ہو۔ ایک روپیہ دیتے ہوئے دل دکھتا ہے تو رہنے دو۔ کسی فقیر سے مانگ لوں گا اٹھنی۔"
حسب توقع وہ مجھے گالی دے کر بولا "فقیر... میں لاتا ہوں۔"
میرا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اندر جا کے پھر آئے تا کہ دور سے نظارہ کرنے والے حوالدار کو اس ایکٹ کے کھیل میں ڈائریکشن کا سقم کا نظر نہ آ سکے۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ مانک لال نے صرف دھوتی باندھ رکھی تھی اور اس نے دھوتی میں ہی ہاتھ نہیں ڈالا تھا ورنہ یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ دھوتی میں کوئی جیب تھی۔
مانک لال پھر آیا تو اس کے ہاتھ میں واقعی ایک روپے کا نوٹ تھا "یہ لے۔ اور کچھ چندو چاچا سے مت کہنا جو میں نے کہا تھا" وہ جاتے ہوئے کہہ گیا اور دروازے کے پیچھے روپوش ہو گیا۔
میں نے دل ہی دل میں کہا کہ لعنت تم پر اور تمہارے چندو چاچا پر۔ لو اس پر جو پلٹ کر جائے۔ آہستہ آہستہ میں نے واپسی کے لئے قدم بڑھائے۔ گاؤں میں خاصی ٹریفک شروع ہو چکی تھی جو ایک گاؤں کے معمولات کے عین مطابق تھی۔ حضرات بیلوں کے ساتھ کھیتوں میں موجود تھے۔ بچے گلیوں میں کھیل رہے تھے اور خواتین امور خانہ داری سے فراغت کے بعد دیگر مشاغل میں مصروف تھیں۔ مثلاً گوبر سے دیواروں پر اُپلے چپکانا۔ مٹی گارے سے رسوئی چوکی کو لیپنا، مویشیوں کی دیکھ بھال۔ ہر گاؤں کی عورت شاید مرد سے کئی گنا زیادہ کام کرتی ہے۔
حوالدار میری سست روی پر نالاں تھا "کیا ہوا؟"
میں نے مٹھی کھول کے روپے اسے پکڑا دیے "کچھ بھی نہیں ہوا۔"
حوالدار نے نوٹ جھپٹ کے اطمینان کا سانس لیا "میں تو تیری رونی شکل دیکھ کے سمجھا تھا کہ کچھ نہیں ملا۔"
میں نے کہا "یہ بھی دیکھ لو ابھی کہ نوٹ اصلی ہیں۔ بعد میں کچھ مت کہنا۔"
حوالدار نے مجھے غصے سے دیکھا مگر بولا نہیں۔
غالب نے کہا "تھانے دار صاحب' ناراض مت ہونا... ایک بات ہے۔"
"کیا بات ہے؟" حوالدار کا موڈ دو ہزار نقد صبح دم جیب میں آ جانے سے بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔
"یہ تھانے والے کچھ نہیں لیں گے؟ ایسے ہی ملاقات کی اجازت دے دیں گے۔"

"اب ہماری بات کون ٹال سکتا ہے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے جی۔ لیکن بعد میں نہیں بات گڑبڑ … یہاں دوسرا تھانے دار ہے" غالب نے کہا "اگر اس نے بات نہ مانی۔ یا اس نے بھی ہم سے پچیس ہزار مانگ لیے تو … کریں گے۔"
"یہ سب میرے سوچنے کی بات ہے" حوالدار … "تو کیوں مرا جا رہا ہے۔ آخر وہ میری سالی کا گھر والا ہے۔ ہم آدمی لے جائیں تو اسے کیا۔"
"اپنا آدمی!"
"ہاں۔ اسے پکڑا بھی ہم نے ہی تھا" حوالدار بولا۔
"ہاں جی' ہماری مرضی ہے اسے یہاں رکھیں یا وہاں" ایک کانسٹیبل نے اپنے افسر کی تائید کی۔
حوالدار نے سر ہلایا "اور ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ … غلطی سے غلط آدمی کو پکڑ لیا تھا۔"
اس انکشاف نے ہم سب کو حیران کر دیا۔ رابعہ … کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو مگر یہ عملاً ناممکن تھا۔ پولیس والے ایک ہی وردی میں ایک … سے لگتے ہیں۔ رابعہ نے انہیں دیکھا بھی رات کے اندھیرے میں تھا اور اس وقت خود اسے ہوش کہاں تھا کہ کسی کی صورت یاد رکھنے کے لئے غور سے دیکھتی۔
میں نے کہا "تم ابھی نکال لاؤ گے اسے۔"
غالب نے کہا "پھر کہاں رکھو گے؟ اپنے گھر میں؟"
حوالدار نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا "یہ ہماری مرضی ہے اسے جہاں چاہے رکھیں۔ تم فکر کرو اسے چھڑانے کی۔ … میں تاوان ادا نہ کیا تو میں پھر اسے بند کرا دوں گا اور پکا … ایک بار تو تمہارا باپ بھی اسے نہیں چھڑا سکے گا۔"
میں نے کہا "ہاں جی' وہ بے چارہ کیسے چھڑائے گا وہ کب کا مر چکا۔"
اب میں ساری بات سمجھ گیا تھا۔ یہ … قاعدے قانون تو خیر شہر کے تھانے میں بھی نہیں چلتے مگر یہاں سب اپنی مرضی کی بات تھی۔ حوالدار نے اپنی … کے ساتھ محسن کو پکڑ لیا تھا اور اپنی سالی کے گھر والے کی حوالات میں لا کے بند کر دیا تھا۔ یہ گویا گھر کی بات تھی۔ اب اس نے … پکا سودا کر لیا تھا تو اپنا آدمی واپس لے جانے کے لئے … اس میں کوئی غلط بات نہیں تھی۔ تھانے والے جسے چاہیں … اور جسے چاہیں چھوڑ دیں۔ یہ تو ایک سیدھا سا نام اصول … ہے جس پر ہر جگہ عمل ہوتا ہے۔
یہ حوالدار کچھ زیادہ ہی لالچ میں آ گیا تھا کہ اب … واقعی اپنے گھر میں یرغمال بنا کے رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے … کر لیا تھا کہ ہم لاوارث اور کم مایہ لوگ ہیں۔ اگر ہم …

… پہچانتا ہے۔ یہ بھی امید ہو گئی تھی کہ ہم خود کو … کا مطالبہ پورا کریں گے۔ یہ بہت بڑی رقم تھی۔ … کوئی قتل کر کے بھی جان بچانے کے لئے اتنا بڑا … نہیں کرتا۔ قتل ہر روز نہیں ہوتے اور ہر قاتل کے … نہیں ہوتے۔ حوالدار کے نزدیک ہم شاید اتنے … عزت بچانے کے لئے گھر بار بیچ سکتے تھے۔ دنیا … اب احمق سمجھے جاتے ہیں اور الو بنائے جاتے ہیں … دیہات میں۔
… میں اس سوچ نے حوالدار کو ایسی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا کہ … اس کی سالی کا گھر والا ہی نہیں ان کی آنے والی نسلیں بھی … سے عبرت حاصل کریں۔ تاہم یہ سب کچھ محسن کی … رہائی کے بعد ہی ممکن تھا۔
… وہ دو کمروں پر مشتمل عمارت تھی … کے سامنے مختصر آمد تھا۔ ایک کمرا حوالات کے طور پر … دوسرا مختصر تھا اور تھانے دار کا کمرا تھا۔ باہر … پڑی ہوئی بیچ پر ایک شخص گھٹنوں میں سر دیے سو رہا … اس نے وردی کے بجائے دھوتی کرتا پہن رکھا تھا مگر وہ … کا نگراں ثابت ہوا۔
… حوالدار نے اسے گالی دے کر جگایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور اپنی رائفل کی طرف لپکا۔ رائفل کسی بے ضرر ڈنڈے کی طرح دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ یہ بے ضابطگی کوئی غیر معمولی نہیں تھی مگر حوالدار نے اس پر ضابطے کے مطابق … ضروری سمجھی۔
"سو رہا تھا..." وہ گالیاں دے کر بولا۔ گالی دینا تو … پولیس والوں کی عادت اور پھر فطرت بن جاتی … اس کے بغیر وہ بات ہی نہیں کر پاتے اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں کس کے سامنے اور کسے گالی دے رہے ہیں۔
ہمارے ساتھ دو شریف خواتین تھیں ان کے چہرے شرم سے لال ہو گئے "سوتا کہاں جناب' ایسے ہی ذرا سر جھکایا تھا" نگران حوالات نے وضاحت کی۔ پھر ہم سب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
حوالدار نے بیچ پر بیٹھنے کے بعد چند لمبے لمبے سانس لئے۔ "اب کوئی رائفل لے جاتا تو پھر؟"
"کیسے لے جاتا جناب' … " حوالات کے نگران نے کہا۔
حوالدار نے اتنی وضاحت طلبی کو کافی سمجھا۔ اس نے نگران حوالات سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ وردی میں کیوں نہیں ہے۔ … کانسٹیبل اس کے سامنے رائفلیں لئے کھڑے ہوئے تھے … خوبصورت لڑکیاں گھونگٹ نکالنے کے باوجود اپنے حسن کی … چھپانے سے قاصر تھیں۔ میری اور غالب کی

صورت میں دو کانٹے کے الو بہت کھڑے تھے۔ حوالدار کو یہ منظر اچانک اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اپنا بیچ پر بیٹھا اپنی تھکن دور کرتا رہا اور شاید اس دولت کے بارے میں سوچتا رہا جو اس کے نام لکھی جا چکی تھی۔
"یہ کون... ہیں جناب؟" حوالات کے نگران نے … کے رکھنا مشکل ہو گیا "کیا جرم کیا ہے انہوں نے۔"
حوالدار نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے گھورا "… تھانے میں شریف لوگ نہیں آتے؟ اور یہ صورت سے مجرم لگتے ہیں تجھے؟"
"صورت سے تو اچھے بھلے لگتے ہیں" وہ ہمیں زیادہ غور سے دیکھنے لگا مگر اس کی توجہ کا اصل مرکز بالآخر نازو ہو گئی۔ ہم ضبط سے کام لیتے رہے اور نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو صبر و ضبط کی تلقین کرتے رہے۔ محسن کے سامنے آنے تک … ہمارا یہی مظلوم نظر آنا ضروری تھا۔
"وہ قیدی کہاں ہے؟" حوالدار نے بالآخر پوچھا۔
"کون قیدی سر؟" حوالات کا نگراں چونکا۔
"وہی... جس کو ہم نے یہاں رکھوایا تھا... چمن لال... اب ادھر دیکھ میری طرف" حوالدار نے اسے جھاڑ پلائی۔
وہ پھر کچھ … سے چونکنے پر مجبور ہو گیا "چمن لال... وہ... وہ تو نہیں ہے۔"
"نہیں ہے کا کیا مطلب؟" گل نے چلا کے کہا۔ چونکے ہم سب تھے مگر اس کا جذباتی ردعمل زیادہ شدید تھا جو ایک فطری بات تھی۔
میں نے بھی کہا "ہاں ہاں کیا مطلب ہے آخر اس بات کا؟"
حوالدار نے ہم دونوں کو گھورا اور صورت حال کو سنبھالنے کے لئے حوالات کے انچارج کو ڈانٹا "ٹھیک … رہتے ہیں یہ لوگ۔"
"لیکن سر' آپ کے جاتے ہی... وہ بھی چلا گیا تھا۔"
اب حوالدار کا پارہ چڑھ گیا "کہاں چلا گیا تھا... اور کیسے چلا گیا جب میں نے اس کو خود حوالات میں بند کیا تھا... اور کہا تھا کہ..."
"وہ تو ٹھیک ہے جناب... مگر بعد میں انچارج صاحب نے حکم دیا کہ اسے چھوڑ دو... معلوم نہیں کون چھڑانے کے لئے آیا …"
حوالدار کے منہ سے گالیوں کا طوفان امڈ آیا "وہ... اس کی تو ... وہ کون ہوتا ہے میرے معاملات میں دخل دینے والا... مجھ سے پوچھے بغیر اس نے کیسے چھوڑا ایک مجرم کو۔ جواب دہی اس کا باپ کرے گا۔"
میں نے کہا "وہ مجرم نہیں تھا حوالدار... اور اس کو تم نے گرفتار کیا تھا۔ کسی جرم کے بغیر۔ جواب دہی تم کرو گے۔"

www.paksociety.com

میرے بدلے ہوئے لہجے نے حوالدار کو چونکا دیا "کیا بکتا ہے!"

میں نے اس کے قریب جانے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "جو میں کہہ رہا ہوں وہ کان کھول کے سنو۔ یہ دو ہزار تو میں نے دیئے ہیں کچھ بھی نہیں۔ مگر مجھے اپنا آدمی چاہئے۔ تم اور تمہارے سالی کا نمبر والا... دونوں مل کے نہ میرا پیسہ ہضم کر سکتے ہو اور نہ میرا آدمی غائب کر سکتے ہو۔"

حوالات کے نگراں نے میری گدی پر ہاتھ مارا "بدتمیزی کرتا ہے حوالدار صاحب کے ساتھ... دھمکی دیتا ہے۔"

میں نے اس کی کلائی پکڑ کے ایک جھٹکا دیا تو وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کے اٹھایا اور پیچھے دھکیل دیا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا تھا اور سب کے لئے اتنا غیر متوقع تھا کہ موٹے حوالدار کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ اس کے دونوں رائفل بردار ماتحت بھی ہکا بکا کھڑے رہے۔

پھر حوالدار نے گرج کے کہا "اوئے پکڑو اس بدمعاش کو۔ ابھی بتاتے ہیں اسے کہ تھانے میں کیسے بات کرنی چاہئے۔"

ایک رائفل والے نے مجھ پر حملہ کیا۔ دوسرے نے اپنی رائفل کا رخ میری طرف یوں کر دیا جیسے مجھ پر واقعی گولی چلا دے گا۔ میں نے حملہ کرنے والے کانسٹیبل سے اس کی رائفل چھین کر اسے ایک دھکا دیا اور موٹے حوالدار پر پھینک دیا۔ رائفل اب میرے ہاتھ میں تھی۔ اسے میں نے ڈنڈے کی طرح استعمال کیا اور دوسرے کانسٹیبل کی رائفل پر مارا۔

"ارے تمہاری... دیکھتے کیا ہو سب مل کے اس کی..." حوالدار پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

میں نے اشارے سے نازو اور گل کے علاوہ غالب اور رابعہ کو بھی پیچھے کر دیا۔ فی الحال ان میں سے کسی کو مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تینوں نہتے رہ جانے والے کانسٹیبل ایک ساتھ جست لگا کے میری طرف آئے۔ ایک کو میں نے گھٹنا مار کے اچھالا۔ وہ پیٹ پکڑ کے زمین پر لوٹنے لگا اور بلبلانے لگا۔ دوسرے کو میں نے ہاتھ گردن میں ڈال کے سیدھا گزار دیا۔ وہ دیوار سے ٹکرایا اور وہیں ڈھ گیا۔ تیسرا مجھے ایک مکا مارنے میں کامیاب رہا۔ یہ مکا میرے پیٹ میں لگا اور کسی حد تک موثر ثابت ہوا۔ وہ طاقتور جسمانی نوجوان تھا اور معلوم نہیں کس طرح اس نے ایک چیتے دریا کسر والا پنچ مارا تھا۔ ذرا سی دیر کے لئے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔ پھر میں نے اسے دو دو الٹے مارے جو اس کی ناک پر اور ٹھوڑی کے نیچے لگے۔ وہ موٹے حوالدار کے قدموں میں جا گرا اور ناک سے بہنے والے خون کو دیکھ کر مزید بدحواس ہو گیا۔ وہ حوالات کا نگراں تھا اور تھانے میں اس کی حیثیت ڈی آئی جی سے کم نہ تھی لیکن دھوتی نے اسے ونادی۔ مزید یہ کہ اس نے ناک صاف کرنے کے لئے بھی دھوتی سے رجوع کیا۔ عادت کے مطابق... اور پھر ایک کونے میں […]

ہوئی بالٹی کی طرف دوڑا۔ گل، رابعہ اور نازو خوشی سے منہ پھیر کے کھڑی ہو گئیں۔ حوالدار شکست خوردہ لشکر کے سالار کی طرح خوف زدہ ہونے کے باوجود اپنی خودی کو بلند رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

"دیکھو۔ دنگا فساد بڑا سخت جرم ہے" اس نے مجھے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی "سات سال کے لئے اندر ہو جاؤ گے..."

میں نے کہا "رشوت لینے کے جرم کی سزا کیا ہے؟"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا "دیدے یار اپنے دو ہزار اور ہماری جان چھوڑ۔"

میں نے دو ہزار کے نوٹ اس کے منہ پر مارے "یہ خیرات دینے کے بعد اور کتے کو ہڈی ڈالنے کے بعد واپس نہیں لیتا... مجھے میرا آدمی چاہئے۔ ورنہ میں تیرا پیٹ پھاڑ دوں گا... مار کے۔"

حوالدار کا رنگ فق ہو گیا "تم... تم کون ہو؟"

میں نے قاتل دلہن کی طرح قہقہہ لگا کے کہا "ڈاکو چمن لال کے ساتھی۔ کہاں ہے وہ؟ اس سے پوچھو ورنہ میں اس کا ناک خراب کر دوں گا۔"

حوالات کا نگراں اب دھوتی باندھ چکا تھا اور مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھک کر ایک مگ پانی سے بھر […] ناک صاف کی "میں نے بتایا ہے ناکہ انچارج صاحب کے پاس کوئی آیا تھا۔ وہ لے گیا۔"

میں نے اس کے آگے بڑھ کر لات رسید کی۔ وہ دیوار سے ٹکرایا اور بالٹی سمیت فرش پر لڑھک گیا "انچارج کہاں ہے! اس نے کتنے پیسے لئے ہیں... اور کس کے ہاتھ بیچا ہے اسے۔"

لیکن حوالات کا نگراں اب جواب دینے کے قابل نہیں رہا تھا یا جان بوجھ کے مکر کر رہا تھا اور بے ہوش نظر آتا تھا۔

میں نے غالب سے کہا "تم اس کو دیکھو... پوچھو اس سے کہ چمن لال کو لے جانے والا کون تھا۔"

غالب نے مجھ سے ماچس لی۔ ایک تیلی جلا کے بجھائی اور فوراً بے ہوش پڑے ہوئے شخص کی جامے سے باہر ہونے والی ٹانگ پر لگا دی۔

وہ چیخ مار کے اٹھ بیٹھا "مجھے نہیں معلوم۔"

غالب نے میز سے ایک بید کی چھڑی اٹھائی جو وہاں آلۂ تفتیش کے طور پر استعمال کی جاتی ہوگی اور تھانے دار اسے لے کر ٹہلتے ہوئے اپنی شان بڑھاتا ہوگا۔

"معلوم نہیں ہے یا... یاد نہیں آرہا ہے" غالب نے شائیں سے لچکتی چھڑی اس کے پیٹ پر ماری۔

وہ بلبلانے لگا اور پیٹ کو زور زور سے ملنے لگا۔

"آرام نہ لگے" غالب نے اس پر مسلسل وار کئے۔ وہ چلاتا رہا اور اچھلتا رہا۔ […] کو بچانے کی بے سود کوششیں کرتا رہا۔ اس چھڑی کو آج تک اس نے نہ جانے کتنے انسانوں کی چمڑی […]

[…] تو تمام خود اپنی چمڑی پر اس کی ایک ضرب برداشت […] کبھی نہ ہوا تھا۔

"[…] کون لے گیا ہے چمن لال کو؟"

ابھی صبح کا وقت تھا اور تھانہ کاری کی حد سے باہر تھا […] کا شور و غل کسی کو متوجہ نہیں کر سکتا تھا۔ تفتیش میں […] اعتنا نہیں کرتا کہ کہیں وہ خود شامل تفتیش نہ […] چیخ پکار سے کسی کو بھی لگے معلوم ہو سکتا تھا کہ […] کرنے والے خود آج زیر تفتیش ہیں۔ اور اگر معلوم […] اس بات سے دلی مسرت حاصل کرتے۔ ان کی […] نہ آتا۔

حوالات کے نگراں کی امید بھری نظریں بار بار حوالدار […] کی طرف اٹھتی تھیں کہ شاید وہ خود کو افسر ثابت کرنے […] والے اور ان مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچا دے جو […] کے اندر چند زوری کے مرتکب ہو رہے تھے اور تھانے کے اندر […] کا خون کرنے کے درپے تھے مگر میں حوالدار کے سر پر سوار تھا۔ اس کے دونوں وردی پوش ماتحت اب ہوش میں آچکے تھے لیکن وہ کچھ کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ شاید موٹا حوالدار بھی انہیں حکم دیتا کہ اٹھو اور ہتھیار اٹھا کے جان کی بازی لگاتے ہوئے مجرموں کا قلع قمع کر دو تب بھی وہ اتنی ہی […] کے ساتھ بیٹھے […] رہتے […] کی سزا کو جان کی بازی لگانے پر ترجیح دیتے۔ وہ حوالات […] حالت سے خاصی […] لطف حاصل کر رہے تھے۔

حوالدار نے کہا "اسے بتاؤ […] جو تجھے معلوم ہے۔ […] کیا برا جانتا ہے۔"

"بھگوان کی سوگند کھا کے کہتا ہوں... مجھے نہیں معلوم..." وہ اسی طرح کراہتے ہوئے بولا۔

اس کے سارے بدن پر نیل کی لکیریں ابھرنے لگی تھیں جن کو […] ایسی لکیریں اس نے بہت سے […] کی اذیت کیا ہوتی ہے اس کا اندازہ […] اس […] نہ تصور صورت حال تھی کہ وہ […] صورت سے شریف آدمی لگتے تھے اور اپنے حلئے سے […] کی آنکھوں میں دھول جھونک چکے تھے۔ اب تھانے کے اندر […] افراد پر حاوی آچکے تھے۔ کوئی اس کی مدد نہیں کر رہا […] مقابلہ کرنے والے حوصلہ تک ہار چکے تھے۔ ممکن ہے اسے […] ہو کہ ڈاکو واقعی بڑے جیالے، طاقتور اور خطرناک […] اتنے باہمت اور باصلاحیت نہ ہوتے تو ڈاکو […] پولیس میں بھرتی ہو جاتے۔

غالب نے دوسری بار بڑی بے رحمی سے مارا اور عملاً […] کا خاتمہ کر دیا۔ اس کی جلد کئی جگہ سے پھٹ گئی اور بید کے نشانوں سے خون رسنے لگا۔ وہ لمبا چوڑا مرد ہونے کے باوجود کم ہمت اور بزدل آدمی تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں فرش پر لوٹ رہا تھا اور غالب کے پاؤں پکڑ رہا تھا۔ ہاتھ جوڑ کے منت سماجت کر رہا تھا۔ آج تک اسے اپنی جسمانی طاقت پر بہت غرور ہو گا اور پولیس میں بھرتی ہو جانے کے... بعد تو کریلا نیم چڑھا ہو گیا ہو گا۔ سب اس سے ڈرتے ہوں گے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا ہو گا مگر وہ کتنا کمزور تھا اس کا اندازہ آج ہو رہا تھا۔ اس سے کمزور جسم کے مالک زیادہ قوت برداشت کے مالک ہوتے ہیں جو سخت ترین تشدد کو خاموشی سے جھیل جاتے ہیں۔

اب حوالدار کی حالت بھی غیر ہونے لگی تھی "ڈاکو صاحب بھگوان کے لئے ہماری غلطی معاف کر دو" اس نے اچانک ہاتھ جوڑ کے کہا "ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کا ساتھی ہے۔"

"ورنہ تم اسے گرفتار نہ کرتے" میں نے اس کے منہ پر الٹا طمانچہ مار کے کہا "اصلی بات یہ ہے موٹے... کہ تمہیں دھوکا ہوا... ہماری صورت سے اور ہماری باتوں سے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ چمن لال کے ساتھی یہاں پہنچ جائیں گے۔"

ماتحتوں کے سامنے گال پر طمانچہ کھا کے حوالدار کا چہرہ احساس ذلت کی تصویر بن گیا۔ اس نے خون آشام نظروں سے بے غیرت ماتحتوں کو دیکھا جو اپنے افسر پر اپنی جان قربان کر سکتے تھے لیکن وہ خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے اور اپنی اپنی جگہ دبکے بیٹھے اپنی جان کی سلامتی کے لئے فکر مند تھے۔

"میں کہہ رہا ہوں ان لوگوں سے ضد مت کر" حوالدار نے حوالات کے نگراں کو گالی دے کر کہا "کچھ تو کہنا ہو گا تجھے۔"

حوالات کے نگراں نے بالٹی میں رہ جانے والے پانی کے چند قطرے مگ میں ڈال کے پی لئے۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور اس پر لرزہ طاری تھا۔

"میں مر جاؤں گا... مجھے مت مارو... میں نے... صرف اسے پیچھے سے دیکھا تھا" اس نے لڑکھڑاتی زبان کے ساتھ کہا۔

"پیچھے سے کیا دیکھا تھا؟" غالب نے کہا "جوان تھا یا بوڑھا؟ کیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اکیلا آیا تھا یا کسی کے ساتھ؟"

"کسی کے ساتھ... آیا تھا" اس نے سوچ کے کہا "درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ اچھے کپڑے پہن رکھے تھے... قمیص پتلون۔ نیلی دھاری والی قمیص، کالی پتلون۔"

"اس کے ساتھ کون تھا؟"

"اسے میں نے نہیں دیکھا... وہ گاڑی میں بیٹھا رہا تھا۔"

غالب نے کہا "گاڑی میں! وہ گاڑی میں آئے تھے۔ کیسی گاڑی تھی؟"

"کار تھی۔ رنگ نہیں دیکھا میں نے۔ گہرا نیلا تھا... یا کالا۔"

"نمبر دیکھا تھا؟" غالب نے کہا۔

حسب توقع اس نے نفی میں سر ہلایا "کار دور تھی"

www.paksociety.com

اندھیرے میں تھی۔ وہ انچارج صاحب کے کمرے میں گیا اور وہیں بیٹھا رہا۔"

"انچارج صاحب اتنی رات کو یہاں موجود تھے؟" میں نے کہا۔

"نہیں... اسی کے ساتھ آئے تھے وہ بھی۔"

"میں سمجھ گیا... انہوں نے باہر ہی باہر تمہارے انچارج صاحب سے سودا پکا کرایا تھا" میں نے کہا "اب ذرا سوچ کے اس شخص کے بارے میں بتاؤ، جو انچارج صاحب کے ساتھ آیا تھا۔ اس وقت تم کہاں تھے؟"

"میں... اسی جگہ۔"

"پھر تم نے اسے دیکھا کیوں نہیں؟" غالب نے بیلا لہرا کے کہا۔

وہ چلایا "میں... میں سو رہا تھا ایسے ہی... ٹیک لگا کے... وہ معلوم نہیں کب آئے تھے۔ مجھے انچارج صاحب نے اٹھا کے کہا کہ چمن لال کو نکال لاؤ۔"

"پھر... جب تم چمن لال کے ساتھ گئے تھے" ... وقت...

اس نے غالب کی بات کاٹ دی "میں اس کے ساتھ کمرے میں نہیں گیا تھا، انچارج صاحب میرے ساتھ... تھے اور چمن لال کو ساتھ لے گئے تھے۔ اتنی دیر میں... جا چکا تھا۔ انچارج صاحب بھی چمن لال کے ساتھ نکل گئے تھے۔ میں نے حوالات کو تالا لگایا..."

"تالا کیوں لگایا جب اندر کوئی نہیں تھا؟"

وہ کچھ دیر بعد بولا "آرڈر ہے جناب، عادت ہو گئی ہے۔ جب میں باہر آیا تو وہ گاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے اسے پیچھے سے ہی دیکھا۔"

غالب نے کہا "اور دوسرا شخص جو گاڑی میں تھا۔"

"اسے میں نے بالکل نہیں دیکھا..."

بظاہر یہ ساری تفتیش بے نتیجہ رہی تھی۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہو سکا اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ کسی نے محسن کے بارے میں تھانے کے انچارج سے معلوم کیا یا کسی اور سے مگر وہ راتوں رات اسے حوالات میں سے نکال لے گئے۔ انہیں کس نے اطلاع دی؟ تھانے کے انچارج نے محسن کو ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ دباؤ کے تحت کیا یا لالچ میں؟ محسن کو لے جانے والے کون ہیں اور اسے کہاں لے گئے۔ ان سب سوالات کا یقینی جواب کسی کے ذہن میں نہیں تھا۔ تھانہ انچارج سے بہت کچھ معلوم ہونے کی امید تھی لیکن وہ غائب تھا اور اس کی واپسی کے بارے میں کوئی کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

میرا قیاس کہتا تھا کہ محسن کو وہی لے گئے ہوں گے جن کے قبضے میں اس کے بیوی بچے پہلے سے تھے۔ وہ تھانے تک کیسے پہنچے... اس بارے میں یہ مفروضہ قائم کیا جا سکتا تھا کہ جب محسن گرفتار ہوا تھا تو کوئی دیکھ رہا تھا۔ شاید بجلی گھر کے چوکیدار نے دیکھ لیا ہو کہ جس نے بجلی بند کی تھی وہ پکڑا گیا۔ اس نے فوراً دلاور، راجندر گپتی یا ترویدی کے کسی آدمی سے پوچھا ہو کہ بجلی کس نے بند کی تھی۔ اور اس نے بتایا ہو گا کہ اس کا جواب... پولیس سے ملے گی۔ پھر یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے علاقے کے تھانوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہو اور محسن کو حوالات میں بند دیکھا ہو تو انچارج کے گھر جا پہنچے ہوں... سے نقد سودا کیا ہو یا ڈرایا اور دھمکا کے انچارج کو... ہوں۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگتا تھا کہ یہ قیاس درست ہے تو بہت برا ہو گا۔ ابھی شملا کی رہائی کے لئے ہماری ناکام کوشش کا زخم ہرا تھا۔ یہ ایک اور زیادہ بڑی ناکامی کا داغ ہو گا۔ ہمارے دشمن پہلے ہی شملا کو ہماری جذباتی کمزوری بنا کے ہمیں ... طرح بلیک میل کر رہے ہیں۔ اگر محسن بھی ان کی تحویل میں ... گیا تو ہم زیادہ مجبور اور بے بس ہو جائیں گے۔ خود محسن کے لئے یہ انکشاف کتنا بڑا صدمہ ہو گا کہ اس کی بیوی اور اس کا بچہ ... سے یرغمال ہیں اور ان کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی ... اس سے یہ بات چھپائی۔ وہ سمجھے گا کہ ہم اسے بتائے بغیر شملا کی قربانی دینے پر تیار رہتے۔ ہمیں اس کی بہن کی فکر ... اور محسن کے جذبات کا کوئی خیال نہ تھا۔ یا اسے افسوس ہو گا کہ میں نے اس پر بھروسا نہیں کیا۔ اسے بزدل اور کمزور ... فرض کر لیا کہ محسن اپنے بیوی بچوں کی خاطر ایمان ... چھوڑ جائے گا یا مشن کو اپنی محبت پر قربان کر دے گا۔ ہر صورت میں اسے ہم سے گلہ ہو گا اور الزام ہماری ذات پر آئے گا۔ ہماری سوچ پر آنچ آئے گی اور ہماری بے اعتمادی پر آئے گی۔

غالب نے کہا "اب کیا کرنا ہے استاد؟"

میں نے پوچھا "کیا کرنا چاہئے؟"

"انچارج صاحب کے گھر جانا چاہئے" غالب نے کہا۔

"بالکل ٹھیک، اور اگر وہ گھر پر نہ ملیں تو پھر یہاں رک کر ان کی واپسی کا انتظار کرنا چاہئے" میں نے کہا۔

صبح کے آٹھ بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ تھوڑی ... کے ساتھ تھکن غالب آنے لگی تھی۔ رات بھر کی معرکہ آرائی نے سب کو جسمانی طور پر بھی نڈھال کر دیا تھا اور ذہنی طور پر بھی... اگر شملا مل جاتی اور محسن ساتھ رہتا تو ہمارے لئے ... خوشی بہت بڑی ہوتی جو تھکن اور مایوسی کے احساس کو ... لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ ہم نے اپنے کٹھ پتلی ... اسلحے کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تو تباہ کر دیا تھا لیکن ... ہمارے لئے شکست کے اسباب بھی پیدا کر لئے تھے۔

گل، رابعہ اور نازو برآمدے میں فرش پر بیٹھی تھیں ... بالکل خاموش تھیں۔ وہ آپس میں بھی کوئی بات نہیں کر ... تھیں۔ محسن کے بارے میں تازہ اطلاع نے ان کے حوصلے ...

... بڑے تھے۔ ان کو آرام کی ضرورت تھی۔ اس کا اندازہ ... حالت سے ہوتا تھا۔ میری ٹانگیں درد کر رہی تھیں اور ... چل رہی تھیں۔ کچھ دیر سکون کے ساتھ مجھے چائے ... مل جاتی تو حالت بہت بہتر ہو جاتی۔

... کچھ دیر اس صورت حال پر غور کیا اور پھر یہ طے کیا ... انچارج کی تلاش میں نکلنا خود کو زیادہ تھکانے کے ... ہو گا۔ یہاں رک کے ہم آرام بھی کر سکتے تھے اور ... کے آنے تک ملنے والی مہلت میں کھانے پینے کے لئے ... منگوا سکتے تھے۔

حوالدار پیچھے واپس کرو" میں نے کہا۔

حوالدار نے وہ نوٹ فوراً میرے حوالے کر دئیے جو اس نے ... کر جیب میں رکھ لئے تھے۔

"جیب خالی کرو۔ جو کچھ ہے یہاں ڈال دو" اس ریوالور ... میں نے کہا۔

"ریوالور سرکاری ہے۔"

میں نے اس کے پیٹ پر لات ماری "سب کچھ سرکاری ہے۔ تمہاری یہ وردی، تمہاری یہ ملک، تمہاری جان۔ ہم سب ... سکتے ہیں۔"

وہ کچھ دیر پیٹ پکڑ کے پاگل ہو جانے والے بکرے جیسی ... میں نے غالب سے بید کی چھڑی لی تو اس نے ... میرے سامنے ڈال دی۔

"چلو تم بھی" میں نے اس کے دونوں ماتحتوں کو اشارہ کیا۔ ... پھرتی سے اٹھے۔ انہوں نے رائفلیں بھی میرے ... قریب حوالدار کے ریوالور کے پاس رکھیں۔ پھر جب ... اور سیدھے کھڑے ہو کے مجھے یوں دیکھنے لگے جیسے پوچھ ... کہ اور کیا حکم ہے ہمارے لئے۔

"تم سب باری باری حوالات میں جاؤ گے" میں نے کہا۔

... حوالدار نے بیمار کرنے کی کوشش کی۔ یہ اس کے ... اطمینان کی بات تھی کہ ہم نے تفتیش روک دی ہے ... جسمانی طور پر کوئی گزند پہنچنے کے امکانات ختم ہو رہے ... حوالات اس کے لئے بہت محفوظ مقام تھا۔

... نے اس کے پیٹ پر ایک بید مارا "پوری بات سن لو" ... کے بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ پیٹ کو ملنے لگا۔

"حوالدار جائے گا، وہ اپنی وردی اتار کے باہر پھینک دے گا" ... نے کہا۔

... امکانات میں کے ان کو سخت ہو گیا۔ سب سے زیادہ ... حوالدار ... کیونکہ وہ بہرحال افسر تھا۔

"ایسا ظلم مت کرو۔ ہم کسی کو کیا منہ دکھائیں گے" اس ... حوالدار نے ... کہا۔

"کیا ہم اپنا منہ نہیں دکھانا چاہتے آئندہ کسی کو" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "ان کی مرضی ہم ان کا منہ غائب کر دیں گے؟"

"اس کے لئے تو سر بھی کاٹنا پڑے گا" میں نے کہا۔

"ابھی ہم نے پہلے کم سر کاٹے ہیں" غالب نے کہا۔

"ہم نے تو لاشوں کے کپڑے بھی اکثر اتارے ہیں۔ ان کی وردی بھی بعد میں اتار لیں گے" میں نے کہا اور حوالدار کا ریوالور اٹھا لیا۔

حوالدار کا ایک ماتحت حوالات کی طرف دوڑا "مجھے... مجھے مت مارنا گولی، میں وردی دیتا ہوں۔"

دوسرے نے ہکلا کے کہا "میں... میں... میں بھی۔"

ان دونوں نے نہایت پھرتی کے ساتھ حوالات میں جاتے ہی اپنی اپنی وردیاں باہر پھینک دیں۔ پھر تقدیر کو کوستا ہوا بھورا موٹا حوالدار بھی اٹھا۔ اس نے حوالات میں قدم رنجہ فرمانے سے پہلے آخری بار ہماری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا اور مایوس ہو کے اپنے ماتحتوں کے ساتھ اندر جیسا ہو گیا۔ فرق صرف وردی کی وجہ سے پڑ رہا تھا۔ لباس قدرت میں سب ایک سے اور برابر تھے۔ معلوم نہیں ماتحت مسکرائے تھے یا حوالدار اپنی خفت مٹانے کے لئے ان پر گرجنے برسنے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ حوالات میں سے اس کے چیخنے دھاڑنے اور گالیاں بکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے دروازے کے پاس جا کے کہا "یہ کون بھونک رہا ہے؟"

حوالدار ایک دم خاموش ہو کے بیٹھ گیا۔

"اب کسی نے چوں بھی کی تو گنجے کی موت ماروں گا" میں نے کہا۔

حوالات کا نگراں منتظر تھا کہ اب اسے جانا ہو گا مگر میں نے اسے روک لیا۔

"یہاں چائے پانی کا کیا انتظام ہے؟" میں نے کہا۔

"سب انتظام ہے، چائے میں خود بناتا ہوں" وہ بولا۔

"کیسے بناتے ہو، سامان کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"انچارج صاحب کی الماری میں" اس نے کہا۔

"چلو پھر چائے بناؤ، ہم سب کے لئے" میں نے کہا "کھانے کو کچھ ملے گا؟"

"صرف بسکٹ ہوں گے جناب" وہ بولا۔

اس کمرے میں تین کرسیاں تھیں اور ایک لمبی سی بینچ تھی۔ گل کی حالت گولی کے زخم کی وجہ سے خراب ہونے لگی تھی۔ اس کے زخم کی فوری طور پر صفائی ضروری تھی اور اسے دوا کی بھی ضرورت تھی مگر فی الحال ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے بینچ پر لٹایا تو مجھے احساس ہوا کہ اسے بخار چڑھ گیا ہے۔ نازو اس کے سرہانے اس کا سر اپنی گود میں رکھ کے بیٹھ گئی۔

www.paksociety.com

رابعہ اس کے چہرے کی طرف تکتی۔ وہ خاصی فکر مند نظر آرہی تھی۔

"یہاں اسپرین تمہیں ملے گی؟"

حوالات کا نگران الماری میں سے بجلی کا ہیٹر نکال چکا تھا۔ کیتلی اٹھاتے ہوئے اس نے پلٹ کے دیکھا "کیا چیز بیگم صاحب؟"

بیگم صاحب کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی "بخار کی گولی۔"

"ہم کی میز کی دراز میں۔ انچارج صاحب رکھتے ہیں سر درد کے لئے" اس نے سرہلا کے کہا۔

اوپر والی دراز مقفل تھی۔ میں نے اس کا تالا دو جھٹکوں میں توڑ دیا۔ دراز میں سر درد کی گولیاں بھری پڑی تھیں۔ ہر نام اور ہر برانڈ کی۔ ان میں اسپرین بھی تھی اور پیراسیٹامول بھی۔

"کیا انچارج صاحب کا سر خراب ہے... درد رہتا ہے اکثر" میں نے تین گولیاں نکال کے کہا۔

"ہاں جی آدھے سر کا درد ہوتا ہے ان کو۔"

"پانی کہاں ہے؟"

"باہر میں لاتا ہوں... پیچھے ٹینک بھی ہے۔"

میں نے کہا "لاؤ کیتلی مجھے دو... میں لاتا ہوں۔ تم جاؤ گے تو کیتلی سمیت بھاگنے کی کوشش کرو گے۔ پھر ہمیں تم پر گولی چلانی پڑے گی۔ تمہاری لاش اٹھانی پڑے گی۔ کیا فائدہ۔"

آدھے گھنٹے بعد میں گل کو دو گولیاں دے چکا تھا اور وہ خاموشی سے آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا بخار ختم نہیں ہوا تھا مگر درد اور بے چینی کی کیفیت باقی نہیں رہی تھی۔ نازو نے اسے چائے بھی زبردستی پلائی تھی اور ایک بسکٹ بھی زبردستی کھلایا تھا۔ باقی سب نے بسکٹ کھانے میں مقابلہ کیا تھا اور سابق انچارج حوالات ایک ایک کر کے ڈبے ہمارے سامنے کھولتا گیا تھا۔ چار ڈبے ختم ہو گئے تو اس نے اسٹاک ختم ہو جانے کا اعلان ڈرتے ڈرتے کیا۔ اسپرین کی ضرورت سب کو تھی۔ باقی گولیاں ہم نے ساتھ رکھنے کے لئے جیبوں میں ڈال لیں۔ دراز میں اعلیٰ درجے کی سگریٹ بھی تھی اور ایک غیر ملکی ساخت کا ریوالور بھی تھا۔

نازو نے اچانک کہا "وہ تھیلا تو باہر ہی رہ گیا۔"

غالب نے کہا "جس میں پھل تھے اور مٹھائی تھی۔ بہت خوب۔"

میں نے کہا "ابھی رہنے دو بعد میں کام آئے گا۔"

"ہم یہاں کب تک انتظار کریں گے؟" غالب نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"انچارج صاحب کے آنے تک۔"

"وہ کب آئیں گے؟"

"جب خدا لایا" میں نے کہا "مجھے نیند آرہی ہے۔"

"نیند مجھے بھی آرہی ہے۔"

"لیکن جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے' یعنی گدھا ہے' چنانچہ ہم

"ایک کام کر سکتے ہیں" میں نے دوسری کہا "ہم یہ حلیہ بدل لیتے ہیں اس علاقے میں مجھے دیکھ چکا ہے۔"

غالب نے کہا "کام کی تو صرف دو وردیاں ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں' موٹے حوالدار کی وردی سکتے ہیں۔"

"مثلاً میں اور نازو" غالب نے کہا۔

"ایک نیام میں دو تلواریں" میں نے دیکھا۔

نازو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بھی رابعہ کا شکار تھی۔ شملہ کے نہ ملنے' محسن کے کی طبیعت بگڑ جانے سے ان دونوں کی صورت

وردیاں میں نے اور غالب نے پہن لیں۔ نکلنے والا غیر ملکی ساخت کا ریوالور میں نے رکھ لیا۔ مجھ سے بہت اچھا تھا اور روسی ساخت کے ریوالور سے چلا سکتا تھا۔ حوالات کے نگران کو میں نے حوالات کے کر دیا تھا۔ حوالات میں ایسی خاموشی تھی کہ معلوم ہوتا شرم اور غیرت سے مر گئے ہیں۔ موٹے حوالدار کی نے پہاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تھانے میں ایک تھی۔ اضافی ملزموں کو باندھ کر رکھنے کے لئے کی جاتی تھی۔

میں نے غالب کے ساتھ حوالات کا رخ کیا نظر رکھنے اور انچارج صاحب کی تشریف آوری کی مطلع رہنے کی تاکید کی۔ انچارج حوالات کے لئے باعث شرمندگی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں مدد کرنے سے قاصر تھا چنانچہ وہ ان سے نظر بھی نہیں مار سب سے زیادہ اسی نے کھائی تھی اور اگرچہ حالت بہت ابتر تھی مگر پھر بھی وہ ان کی طرح نہیں عالم میں تھے۔

جب میں نے اسے حوالات کے اندر آنے کا پریشان ہو گیا "میں نے کیا قصور کیا ہے جناب؟"

"تم سب اسی لئے زندہ ہو کہ ڈیوٹی" میں نے کہا "نادانستگی میں تم سے ایک غلطی ہو گئی ہمارے ساتھی کو پکڑا اور تم نے غلط آدمی کے حوالے کی معمولی سزا ہے۔"

وہ اندر آگیا تو میں نے کہا "وردی کہاں ہے"

"الماری میں" اس نے کہا "آپ بے شک"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ مجھے یہ دھوتی اور آرہا ہے۔"

"ادھر آجاؤ" میں نے عقبی حصے کے روشندان کر دیا۔ روشندان میں مضبوط آہنی سلاخیں لگی ہوئی کو توڑنا' موڑنا یا اکھاڑنا عملاً ناممکن تھا۔ تھانے کی کو میں نے اپنے استعمال کیا کہ پہلے ایک حلقے میں سلاخ ڈالی۔ پھر اسی کے ساتھ حوالدار کی کلائی فٹ کر دی۔ موٹا حوالدار اب اپنا ہاتھ سر سے اوپر مجبور تھا۔ اس کی رہائی صرف اسی صورت میں ہتھکڑی' سلاخ یا کلائی میں سے کوئی ایک چیز کاٹی

حوالات کے نگران کو بھی میں نے اسی طرح روشندان کی کے ساتھ منسلک کیا تو وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہو گئے۔ موٹے حوالدار کا پیٹ اپنی حدود سے نکلا ہوا تھا کہ دوسرے شخص کے لئے خود کو دور رکھنا تھا۔ وہ دونوں ایک ہاتھ اوپر اٹھائے ایک دوسرے ذلت اور بے بسی کی تصویر بن گئے تھے۔ انہیں بعد میں کیا ہوگا۔ ہم چابی اپنے ساتھ لے جائیں گے سے کوئی لوہار لایا جائے گا جو ہتھکڑی کو کاٹے گا۔ تب سخت ترین جسمانی اذیت میں مبتلا رہیں گے اور یہ بات کہ کبھی نہ سکے۔ وہ بعد میں اپنے گاؤں والوں کی نہیں گے جن کے سامنے سے وہ مونچھوں پر تاؤ کرتے تھے۔

میں ان دونوں کے آزاد ہاتھوں کو آزاد ہی چھوڑنا چاہتا تھا نے ان کی زبان بندی پر اصرار کیا تو میں نے ان کے ہاتھ ایک ہی رسی سے باندھ دیئے۔ ان کے منہ میں وردی کے کترے ٹھونس کے میں نے باقی دونوں طرف دیکھا۔ وہ گاؤں کے اجڈ لونڈے تھے اور شاید زندگی میں پہلے کبھی ڈاکو نہیں دیکھے تھے۔ وہ بے حد تھے۔ انہوں نے اپنی اسیری کے عمل کو ہمارے لئے ہم سے پورا تعاون کیا۔

"کیا یہ سب ضروری تھا؟" غالب نے واپس آ کے کہا۔

"ہاں۔ ایک تو اس لئے کہ یہ موقع ملتے ہی شور مچا کے مشکل نہ پیدا کریں" میں نے کہا۔

"لیکن یہ کب تک اسی طرح بند رہیں گے۔ کسی کو خبر"

"گی" میں نے کہا "رات تک ورنہ کل صبح تک۔"

نے افسوس سے سرہلایا "یہ اس وقت تک زندہ رہیں"

"جلدی مرنے والے لوگ نہیں ہیں' زیادہ سے زیادہ ہو جائیں گے۔ مگر مجھے امید ہے یہ اس سزا کو بھول لیں گے کسی پر تشدد کریں گے تو انہیں دوسرے کی اذیت کا احساس ہوگا۔"

"دس بج گئے' نہ انچارج آیا نہ کوئی اور" نازو نے سخت بے زاری سے کہا۔

"کوئی اور تھانے کی طرف کیوں آئے گا" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "گل کو پھر بخار ہو رہا ہے۔"

غالب نے کہا "اور گولیاں دے دو۔ اس سے زیادہ ہم یہاں کیا کر سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "تم چاہو تو اسے گاؤں میں کسی سیانے کے پاس لے جاؤ۔ وید یا حکیم بھی شاید مل جائے۔ ڈاکٹر بہرحال نہیں ہوگا یہاں۔"

"تمہارے لئے خطرے کی کوئی بات نہیں" غالب نے کہا۔ "کس نے دیکھا ہے تمہیں... اور اس حلئے میں کون شک کر سکتا ہے تم پر۔"

"گل کو باقاعدہ علاج اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوگی۔ دو چار دن" رابعہ نے کہا۔

"میرا مشورہ مانو تو بمبئی چلی جاؤ" میں نے کہا۔

"کس کے پاس؟"

"کسی بھی ہوٹل میں دو چار دن گزار لو' مثلاً اسی ہوٹل میں جہاں تم پہلے ٹھہری تھیں۔ ہم خیریت معلوم کرتے رہیں گے ٹیلی فون کر کے۔"

"جی نہیں' ہم جہاں جائیں گے ساتھ جائیں گے" رابعہ نے قطعی لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا' تھانہ انچارج آگیا۔ معلوم نہیں کس بات نے اسے شک میں مبتلا کیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ بالکل خاموشی سے اور دبے پاؤں ایک دم ہمارے سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا چنانچہ ہم جو اتنی دیر سے اس کی آمد کی تیاریاں کر رہے تھے کچھ بھی نہ کر سکے۔

وہ ایک نوجوان اینگلو انڈین تھا۔ بہت اسمارٹ اور تیز طرار۔ اس کی آنکھوں میں عیاری کی چمک تھی۔ اس نے جو وردی پہن رکھی تھی وہ بہت صاف دھلی ہوئی تھی۔ اس پر استری بھی تازہ تھی۔ اس کے جوتوں پر بھی بہت اچھی پالش تھی۔

"خبردار' ہلے گا تو ہم شوٹ کر دے گا" اس نے گورا شاہی اردو میں کہا۔

میں نے انگریزی میں کہا "تم ایک ریوالور سے کتنے آدمی مار سکتے ہو؟ ایک یا دو' پھر بھی تین عورتیں بچ جائیں گی... اور ان میں سے کوئی بھی تمہیں مار دے گی' کوشش کر کے دیکھو۔"

"شٹ اپ" اس نے دہاڑ کے کہا "آخر کون ہو تم جو اس طرح میرے کمرے میں اور میری کرسی پر قبضہ جمائے بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا "ہم بھی پولیس مین ہیں۔"

"جھوٹ بکتے ہو تم' یہ تمہاری وردی نہیں ہے۔ تم نے مجھے

www.paksociety.com

دھوکا دینے کے لئے بنی ہے۔ اگر تم سچ مچ پولیس میں ہوتے تو ایک افسر کو دیکھ کر خود بخود کھڑے ہو جاتے۔ تمہارا ہاتھ خود سیلوٹ کرتا، مجھے بتاؤ آخر کیا مقصد ہے یہ سوانگ رچانے کا؟"

میں نے غالب کی طرف دیکھ کر کہا "میں تمہاری ذہانت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں۔"

"مجھے بالکل ضرورت نہیں ہے تمہارے کسی اعتراف کی۔ میں وضاحت چاہتا ہوں کہ یہ سب کیا ہے۔ کون ہیں یہ عورتیں؟ انہیں کیوں میرے کمرے میں بٹھا رکھا ہے تم نے اور یہ جو لیٹی ہوئی ہے......"

میں نے کہا "اگر تم سوالات کرتے رہے تو مجھے وضاحت کی مہلت کیسے ملے گی۔ بہتر ہو گا اگر تم اپنی کرسی پر بیٹھ کے بات کرو۔ میرا ارادہ ہرگز اس پر قبضے کا نہیں ہو سکتا۔"

میرے اٹھتے ہی وہ بڑے محتاط انداز میں آگے بڑھا، اس کی نظر بیک وقت ہم سب پر رہی اور وہ ایک لمحے کے لئے بھی کسی کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔ مجھے وہ نوجوان افسر پسند آیا تھا۔ اس کی مستعدی اور ہوشیاری پسند آئی تھی اور میں حیران تھا کہ اس جیسا چاق و چوبند اور ذہین افسر اس فضول سے گاؤں کے تھانے میں کیا کر رہا ہے۔ جو تھانہ بھی نہیں صرف ایک پولیس چوکی تھا اور جہاں نگران حوالات جو اس کا واحد ماتحت تھا، اپنے افسر کے برعکس نالائق اور احمق تھا۔

"ارمانی گاؤ! تم نے دراز میں سے سب نکال لیا۔ تم میرے سگریٹ پیتے رہے، چائے پی ہے تم نے، بسکٹ کھائے ہیں۔ بدمعاش میں سب کو گولی مار دوں گا۔" اس نے مشتعل ہو کے کہا۔ "میرا ریوالور فوراً دے دو۔"

"یہ نہ ہو میں اسی ریوالور سے تمہیں گولی ماردوں" میں نے ریوالور نکال کے اس کے سامنے ڈالتے ہوئے کہا "مسٹر......"

"میرا نام سائمن ہے" اس نے ریوالور واپس دراز میں رکھ لیا۔

"مسٹر سائمن، نہ تو میرا ارادہ تمہیں گولی مارنے کا ہے اور نہ میرے کسی ساتھی کا۔ ورنہ کم سے کم ایک ریوالور تو ہر شخص کے پاس ہے۔ خواتین سمیت" میں نے کہا۔

اس نے نازو کی طرف دیکھا جو بڑی صفائی سے ریوالور نکال چکی تھی۔ سائمن نے اسے غور سے دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر اپنا ریوالور میز پر رکھ دیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔

میں اور غالب اس کے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"تم کمسور ہو مسٹر سائمن، کیا یہ غلط ہے؟" میں نے کہا۔ "ذہانت کے ساتھ تجربہ بھی ہوتا تو تم یہ غلطی نہ کرتے۔"

"میں کیسے تصور کر سکتا تھا کہ... اس قسم کی عورتوں کے پاس بھی ریوالور ہوں گے" اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ "اس ملک میں کتنی عورتوں کو ریوالور چلانا آتا ہے اور کیا آخر وہ اس گاؤں کی طرف کیسے آ نکلی ہے" اس کی حالت شرمناک محسوس ہوئی تھی۔"

"کیسے؟" میں نے کہا۔

"باہر ایک تھیلا رکھا ہوا تھا، اس میں ٹماٹر تھے۔ آدمی مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ برآمدے کا پانی بہہ گیا تھی۔ سارا پانی بہہ گیا تھا اور مگ پڑا ہوا تھا۔ وہ دا نکھ فرش پر رکھی ہوئی تھیں۔"

"تم نے اپنے ماتحت کو آواز نہیں دی۔"

"وہ اس وقت نہیں ہوتا، کام چور۔ کاہل نکما" میں نے کہا "تم کو پہلے سے بتا دیا بہتر ہے، میرا انگریزی سمجھتی ہیں۔ بول بھی سکتی ہیں۔"

وہ پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے اچھے، ہاتھ بڑھا کر میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے... کہ تم سب گولیاں کھا گئے" میں نے اسے جیب میں سے گولیاں نکال کے دیں "کب سے ہے آدھے سر کے درد کی شکایت؟"

وہ اچھل پڑا "تم... یہ بھی جانتے ہو کیسے؟"

"تمہیں معلوم ہو جائے گا، اپنے وقت پر" میں بولا اس نے گولیاں کھائیں، گلاس میں پانی ڈال کے الماری کا جائزہ لینے لگا "اس میں سے اور کیا لیا ہے تم نے"

غالب نے کہا "تمہاری مراد کاغذات سے ہے ہمارے لئے بے کار ہیں۔"

"تم نے اپنے بارے میں نہ بتایا۔ تو میں ڈگی ہوا تم بہت پُراسرار لوگ ہو۔ یہاں تمہارا کیا کام؟ تم صورتِ بدمعاش اور مجرم بھی نہیں لگتے۔ پھر یہ سب ڈراما کیوں"

میں نے کہا "سب انسپکٹر سائمن، صورت حال یہ ہے کہ ہم اپنے بارے میں کچھ بتا نہیں سکتے، ورنہ خود تمہارے لئے بہت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ نام کی تمہارے لئے اہمیت نہیں ہونی چاہئے۔ نام ٹوک اور ہیری، سب ایک ہے۔ ہم کچھ بھی بتا سکتے ہیں مگر کیا فائدہ۔"

"اوکے، اصل بات بتاؤ" وہ بولا۔

"اصل بات یہ ہے کہ ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے" میں نے کہا "ہم علی الصباح یہاں پہنچے تھے۔ اس وقت تالا، کاہل اور غلیظ ماتحت وحوالی پہنچے سو رہا تھا۔ ہم رات قفل اٹھا کے چلے جاتے تو اسے پتا بھی نہ چلتا۔"

"کیا تم نے اسے مار دیا؟"

"اسے مار کے کیا فائدہ ہوتا... ایک راتقل اٹھا لائی"

"اور دوسری؟"

"دوسری اس پولیس مین کی ہے جو ہمیں یہاں لایا تھا۔"

"کہاں سے لایا تھا؟"

"یہ میرا کام ہے" میں نے سوچ کے کہا۔

"اگر یہ انہی دونوں کی وردیاں ہیں تو وہ دونوں کہاں ہیں؟" سائمن نے کہا۔

"اچھا سوال ہے" میں نے کہا "مگر میں ایک گول مول جواب دوں گا۔ وہ زندہ ہیں اور خیریت سے ہیں۔ بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹ نہیں ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہم نے ان کی وردی لے لی اور انہیں کہیں بھیج دیا۔"

"ایسے بات نہیں بنے گی، تم کچھ نہیں بتا رہے ہو۔"

میں نے کہا "اصل بات کے سوا میں کچھ بتاؤں گا بھی نہیں، اور اصل بات بننے سے پہلے ہی تم نے سوالات اور جرح کا سلسلہ شروع کر دیا تو واقعی بات نہیں بنے گی۔ میں نے بتایا ہے کہ ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔"

"آخر کیوں؟"

"اس لئے کہ تم سے ہم اپنے آدمی کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے۔ تمہارا ماتحت اس معاملے میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکا۔ اس نے صرف یہ بتایا کہ تم نے اسے کسی اور کے حوالے کر دیا ہے۔"

وہ میری صورت پر نظر جمائے بیٹھا رہا "تم اس ڈاکو کی بات کر رہے ہو۔"

"وہ ڈاکو نہیں تھا" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ ڈاکو تھا، اس کے ساتھیوں نے..."

میں نے چلا کے کہا "اس کے ساتھی ہم ہیں۔ کیا ہم ڈاکو ہیں؟ ایسے ہوتے ہیں ڈاکو؟ نوکری تو خیر نئی ہے تمہاری لیکن پولیس میں بھرتی ہونے سے پہلے بھی تم نے کبھی ہم جیسے ڈاکوؤں کے بارے میں سنا یا اخبار میں پڑھا! جو اپنی بیویوں کے ساتھ پھرتے ہیں۔ وہ خود ہی نہیں، ان کی بیویاں تک تعلیم یافتہ ہوں۔"

"بے شک میرے لئے یہ ایک نیا تجربہ ہے مگر میں پھر کہتا ہوں کہ وہ ڈاکو تھا اور تم اس کے ساتھی ہو تو ڈاکو ہو۔ اسی لئے تم جنگل کے اور اسلحہ لے کر پھر رہے ہو۔ اور ڈاکو کیسے ہوتے ہیں، جاہل ہوتے ہیں مگر تمہارے گروہ میں سب تعلیم یافتہ ہیں یہ ایک نئی بات ہے لیکن ناممکن نہیں۔ ابھی تمہاری شہرت نہیں پھیلی۔ ہو جائے گی۔ ابھی تک تم پکڑے نہیں گئے ہو، پولیس اور سب کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے ہو۔ اس لئے اپنی زبان، انگریزی سے اور ان خوب صورت تعلیم یافتہ خواتین سے۔"

"ویری فٹ لپ" میں نے شائستگی سے کہا "تم بے بنیاد قیاس آرائی کر رہے ہو۔ میں مجبور نہیں کر سکتا تمہیں اپنی بات ماننے پر لیکن تمہارے دلائل سے ہم ڈاکو نہیں بن سکتے۔

مجھے بتاؤ کہ ہمارے ساتھی کو کیسے ڈاکو مان لیا تم نے؟ اس لئے کہ ایک موٹی عقل والا، موٹا گینڈے جیسا حوالدار اسے یہاں پکڑ کر لایا تھا۔ اس نے کہا اور تم نے مان لیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ ڈکیتی کی واردات یہاں سے چھ سات میل دور ہوئی ہے۔ وہ کسی راہ چلتے کو نہ پکڑ لایا ہو۔"

"ناؤ یو پلیز شٹ اپ" اس نے بھی میرے لہجے میں میری بات کاٹ دی "میں اس وقت یہاں تھا ہی نہیں جب اس ڈاکو کو لایا گیا تھا۔"

"وہ ڈاکو نہیں تھا" میں نے میز پر مکا مار کے برہمی سے کہا۔

"رات کو میرے گھر اسپیشل پولیس کے لوگ آئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے لاک اپ میں ایک ڈاکو چمن لال بند ہے۔"

"مسٹر سائمن، تم ایک ایڈیٹ ہو۔"

"بکواس بند کرو۔ میں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے کہا کہ اس نام کا کوئی آدمی میری تحویل میں نہیں ہے لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ میں چل کے دیکھوں۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ آیا۔"

"اور تم نے کہا مسٹر ڈاکو، اپنا شناختی کارڈ پیش کرو جس پر تمہارا نام اور پیشہ صاف لکھا ہوا ہو۔ چنانچہ چمن لال نے شناختی دستاویزات پیش کر دیں اور ان میں صاف لکھا ہوا تھا کہ اس کا پیشہ ڈاکو ہے۔"

"طنز کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں انہیں غلط نہیں کہہ سکتا تھا جو ڈاکو کو پہچانتے تھے۔"

"مجھے بتاؤ کہ کیا تم انہیں پہچانتے تھے" میں نے سر پکڑ کے کہا "تم کو معلوم تھا کہ وہ اسپیشل پولیس کے آدمی ہیں؟ کیا تم نے ان سے کہا تھا کہ اپنی شناخت کرائیں؟"

"شناختی کارڈ تھے ان کے پاس" وہ بولا مگر اب اس کا لہجہ اعتماد سے خالی محسوس ہونے لگا تھا۔

"کیا نام تھے ان کے؟ عہدے کیا تھے؟ مسٹر سائمن، میرا خیال ہے کہ انہوں نے کارڈ نکال کے تمہارے سامنے کئے اور اس سے پہلے کہ تم غور سے دیکھتے انہوں نے واپس جیب میں ڈال لئے۔ تم مطمئن ہو گئے کہ شناختی کارڈ دیکھ کر۔"

وہ سوچ کے بولا "میرے پاس کوئی وجہ نہیں تھی کہ شناختی کارڈ کو جعلی سمجھتا۔"

"مگر یہ ٹھیک ہے کہ تم نے ان کا نام، عہدہ کچھ نہیں پوچھا تھا؟"

"ہیں، یہ کوتاہی مجھ سے ہوئی۔"

"کوتاہی!" میں نے ایک دم آگے بڑھ کے اس کی گردن دبوچ لی "مجھے بے وقوف مت سمجھو مسٹر سائمن، اس لئے کہ میں تمہیں بے وقوف نہیں سمجھتا۔ تم جیسا چالاک اور ذہین آدمی اتنی بڑی غلطی نہیں کرے گا، کبھی نہیں۔ مجھے سچ سچ بتا دو گے تو

www.paksociety.com

قائدے میں رہو گے ورنہ میں تمہیں اس نازک سی لڑکی کے حوالے کردوں گا جو تمہاری ہڈیوں کا سرمہ کر سکتی ہے۔"

"مجھے چھوڑ دو.... ورنہ۔"

"ورنہ کیا؟" میں نے اسے کرسی سے اٹھا کے اپنی طرف کھینچ لیا "آؤ میرے ساتھ، میں تم کو ایک نظارہ دکھاتا ہوں۔ کیا تم چاہو گے کہ تمہارے ساتھ بدتر سلوک کیا جائے؟"

میں اسے گھسیٹ کر حوالات کی طرف لے گیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر اس کی عقل خبط ہو گئی۔

"یہ کیا ہے؟" وہ چلانے لگا "کیوں ایسا غیر انسانی سلوک کر رہے ہو تم ان کے ساتھ، کیا جرم کیا ہے انہوں نے؟"

"جرم کی بات مت کرو، ان کے جرائم تو اتنے ہیں کہ یہ خود شمار نہیں کر سکتے۔ قانونی بھی اور اخلاقی بھی لیکن ابھی ان کو یہ سزا صرف اس لئے ملی ہے کہ انہوں نے ہمارے ایک دوست کو ڈاکو سمجھ کے پکڑا۔ حالانکہ وہ ان کے مقابلے میں ہزار درجہ بہتر انسان ہے۔ اور یہ انسان ہیں تو وہ فرشتہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر تم نے اصرار کیا کہ وہ ڈاکو تھا اور تم نے اسے کسی انجانے اسپیشل پولیس والوں کے حوالے کر کے ٹھیک کیا ہے۔ تو پھر تمہارے ساتھ ہم جو بھی سلوک کریں ٹھیک ہو گا۔ ہم اپنے دوست کو کسی ناانصافی کا شکار نہیں ہونے دیں گے۔ تمہارے پاس ایک جواز ہے تو ہمارے پاس دوسرا۔ ہم سب کچھ کر گزریں گے۔"

حوالات میں بند چار افراد ایسے جانور کی طرح لگتے تھے جنہیں ابھی جنگل سے پکڑ کے لایا گیا ہو۔ ان کی نظروں میں خون کی پیاس تھی اور کینہ تھا۔ وہ غرا رہے تھے اور اپنے افسر کے سامنے جس حد تک اپنی برہمی کا اظہار کر سکتے تھے کر رہے تھے۔ شاید آدمی اپنی سرپرستی سے ہی جانور نہیں ہوتا ورنہ اس میں اور کسی بھی حیوان میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔

"دیکھو، تم ان پر رحم کرو۔ ہم بات کر سکتے ہیں اور اس غلطی یا غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لئے کچھ سوچتے ہیں جس کی وجہ سے تمہارا ایک دوست... غلط ہاتھوں میں چلا گیا۔"

"ہم بات چیت کریں گے۔ اگر بات چیت مفید اور نتیجہ خیز رہی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ انہیں اس حالت میں قید نہیں رہنا پڑے گا۔"

"گویا قید میں رہنا پڑے گا؟"

"میں انہیں آزاد کیسے کر سکتا ہوں۔ جب تک خود اپنے تحفظ کا یقین حاصل نہ ہو" میں نے کہا۔

آفس میں واپس آنے کے بعد وہ کرسی پر گرا تو ایک بالکل مختلف اور بدلا ہوا شخص تھا۔ وہ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ کسی اندرونی کرب کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی قوتِ فیصلہ کی مدد سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی پوری مہلت دی۔

"میں نے آج تک رشوت نہیں لی تھی" اس نے [illegible] مجھ سے نظر ملائے بغیر خود کلامی کے انداز میں کہا۔ اس کا [illegible] سپاٹ اور جذبات سے عاری تھا۔

اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا چنانچہ میں خاموش رہا۔

"مجھے معلوم ہے تم اس پر یقین نہیں کرو گے" اس نے ایک پنسل سے کاغذ پر بے معنی نقش بناتے ہوئے کہا "لیکن مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔"

"فرق تمہیں آج پہلی بار رشوت لینے سے پڑا ہے" میں نے کہا۔

"ہاں" وہ ایک لمبی سانس لے کر بولا "بہت فرق پڑا ہے۔ آج میں وہ نہیں ہوں جو کل تھا۔ کل تک میں مطمئن تھا۔ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک بار کوئی بات نہیں۔ میرا ضمیر بھی [illegible] کے خاموش ہو جائے گا۔ اس جواز کو قبول کر لے گا کہ حرام اور حلال کا نظریہ حالات کے تابع ہوتا ہے۔ جب آدمی کے کھانے کو کچھ نہ ہو تو وہ مردار تک کھا لیتا ہے۔ یہ کوئی قصے کہانی کی بات نہیں۔ انسان انسان کو کھاتا ہے۔ مجبور ہو کے۔ میں افریقہ کے آدم خور قبائل کی مثال بھی دے سکتا تھا لیکن میں اپنے اور تمہارے مہذب دنیا کے انسانوں کی بات کر رہا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے، ایسے متعدد واقعات ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے کسی کشتی کے مسافروں نے اپنے ایک ساتھی کو کھا لیا جو مر گیا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ سمندری مخلوق بھی تو اسے کھا جائے گی۔ ان کے کھانے کو سمندر میں اور بہت کچھ ہے لیکن ہمارے پاس کچھ نہیں رہا اور اسے ہم نے سمندر میں پھینک دیا تو کل خود مر جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس گوشت کو اپنی زندگی بچانے کے لئے استعمال کر لیا۔"

"یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ مجبوری کتنی بڑی تھی اور مجبور میں آدمی کا استحصال کرنے والی قوتیں کتنی بڑی تھیں" اس نے کہا "جس شخص کو روز چار ہزار درکار ہوں تو وہ پہلے [illegible] ادھار مانگتا ہے یا پھر اپنی کوئی چیز بیچنے کی کوشش کرتا ہے اور حاصل نہ ہو تو صبر کر لیتا ہے، نقصان بھی برداشت کر لیتا ہے لیکن اسے وہ چار ہزار کے لئے چوری کرنے یا ڈاکہ ڈالنے کا خیال آتا لیکن اس وقت جب وہ شدید مایوسی کا شکار ہو۔ اس کو [illegible] مل جائے۔ یا موقع ملے پچاس ہزار چوری کرنے کا، ایک [illegible] چھین لینے کا، پکڑے جانے کا ڈر بھی نہ ہو تو شاید وہ [illegible] گزرے گا۔ یہی کتنے مخالف عناصر یکجا ہو گئے۔ [illegible] بڑی رقم، تحفظ کا احساس۔"

"تمہارے ساتھ کیا ہوا؟"

"یہی۔ میں نے بہت مقابلہ کیا، تمام ترغیبات کو [illegible]

[illegible] فیصلے پر قائم رہا کہ انسان کی سلامتی ضروری ہے۔ [illegible] کے لئے قربانی دی جا سکتی ہے۔ اگر میں نے رشوت لینی شروع [illegible] تمام عمر لیتا رہوں گا۔ ایک برائی سے دوسری برائی کا [illegible] کھلتا ہے۔ تم کے ہر برائی کے راستے خود بخود کھلتے جاتے ہیں [illegible] ضمیر قبول کر لے....

[illegible] بالآخر [illegible] پر رضا مند ہو جاتا ہے۔"

"ہاں، میرا ضمیر بھی کہتا ہے کہ میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔ شراب پیو، جوا کھیلو یا عورتوں کی عصمتوں سے کھیلو، مجھے کیا۔ [illegible] میں نے برائی کا پہلا دروازہ بھی نہیں کھولا۔ میں نوشتۂ تقدیر [illegible] قبول کر لینے اور نقصان پر صبر کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار تھا۔"

"کیا نقصان ہو سکتا تھا تمہیں؟"

"میری ماں کی زندگی کا" اس نے کہا "ماں سب کی ہمیشہ [illegible] نہیں رہتی لیکن ہر بیٹا چاہتا ہے کہ وہ جتنا عرصہ زندہ رہے اچھا ہے۔ [illegible] اسی سال یا سو سال، میری ماں تو صرف چالیس سال کی [illegible] اور وہ مشکل سے پچپن کی لگتی ہے۔ اس کی قدرتی [illegible] ساخت بھی ایسی ہے کہ وہ میری ماں نہیں لگتی۔ لوگ بڑی [illegible] سمجھ لیتے ہیں۔ چالیس سال میں عورت جوان ہی رہتی ہے۔ [illegible] ساٹھ سال میں بھی جوان رہتی ہے اور نہ صرف یہ کہ نظر آتی ہے بلکہ خود کو جوان سمجھتی ہے۔ دوسرے بھی اسے بڑھیا [illegible] بے مروت اور اس پر بڑھاپا مسلط نہیں کرتے۔ خیر، میں [illegible] نہیں چاہتا تھا کہ اتنی کم عمر میں میری ماں مر جائے۔ میں چاہتا تھا [illegible] اتنا ہی عرصہ اور زندہ رہے۔ لیکن میرے چاہنے سے اس کا [illegible] ختم نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے مان لیا کہ یہ نوشتۂ تقدیر ہے۔ میرے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ میں اس کا مکمل علاج باہر [illegible] کراؤں۔ نہ میں اپنے وسائل سے اتنا سرمایہ اکٹھا کر سکتا ہوں۔ پہلے بھی اپنی ایمانداری کے چکر میں بہت نقصان اٹھا چکا ہوں۔ [illegible] افسروں کی ناراضگی ہی کا نتیجہ ہے کہ میں یہاں بیٹھا ہوں [illegible] میں اپنی ذہانت کا منفی استعمال کرتا تو کوئی سونے کی کان [illegible] کر لیتا۔ سونے کی کان وہ تھانے ہوتے ہیں جہاں کوئی [illegible] افسر بھی مٹی سے سونا بنا سکتا ہے۔ مجھے سمجھانے والوں [illegible] سمجھایا، ڈرایا دھمکایا، پولیس ہیڈ کوارٹرز میں رکھا اور بالآخر [illegible] بھیج دیا کہ بھاڑ میں جاؤ۔ میرے دوست احباب رشتے دار [illegible] مزاحمت کی قوت سے عاجز تھے۔ ان سب کی متفقہ [illegible] کہ میں ایماندار نہیں احمق ہوں۔ ایک ایماندار پولیس [illegible] اکیلا چنا ہے جو بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ محکمہ جیسا ہے [illegible] رہے گا۔ تمہارے حصے کا فائدہ کسی اور کو پہنچے گا۔ جو مال [illegible] جیب میں آ سکتا تھا وہ کسی اور کی جیب میں جائے گا۔ [illegible] کام ضرور ہوں گے۔ میں نے سب سنا اور نظر انداز [illegible] مجھے صرف اپنی ذات سے سروکار تھا۔ مجھے یہ اطمینان [illegible] مجھ پر کیچڑ کا ایک چھینٹا بھی نہیں ہے۔ دوسرے کیچڑ

[illegible] میں بیٹھے ہیں۔ اگر [illegible] چاہتے ہیں تو [illegible] میرے پاس اختیار ہے کہ انہیں روک سکوں نہ وسیلہ۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ ہم سب منتظر رہے کہ وہ پھر الفاظ اکٹھے کر لے۔

"یہاں آنے کے بعد میں کچھ محفوظ ہو گیا تھا۔" اس نے کہا "کم سے کم لوگوں کی باتوں سے۔ لیکن میرا ذہنی عذاب بڑھتا گیا۔ ماں کی بیماری شدت اختیار کر گئی۔ یہ بات اسے معلوم بھی ہو گئی کہ اس کے مرض کا علاج ممکن ہے مگر آسان نہیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم کیسے بیٹے ہو، ماں نے تمہارے لئے کیا نہیں کیا تھا۔ اب تم ماں کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ میں نے اس کا مطلب سمجھ لیا۔ وہ زندہ رہنا چاہتی تھی اور اس کے لئے میرا سہارا چاہتی تھی۔ ...اسے یقین تھا کہ میں چاہوں تو اس کا علاج باہر ہو سکتا ہے۔ پھر میں ایسا کیوں نہیں چاہتا؟ میری چھوٹی بہن کو جب سے یہ معلوم ہوا ہے اس کی بری حالت ہے۔ ہمارا اپنا مکان ہوتا تو ہم بیچ دیتے... وہ مکان بھی کرائے کا ہے۔ پھر اچانک میری ماں نے بیٹی کی شادی کا فیصلہ کر لیا۔ وہ یہ کام اپنی زندگی میں ہی کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے بھی پیسہ درکار تھا اور میری تنخواہ میں سے آج تک تو کچھ بچا نہیں تھا۔ بچ بھی نہیں سکتا۔ اب تم خود کہو کہ میرے خلاف کتنی زبردست قوتیں ایک دم سرگرم عمل ہو گئی تھیں۔ ماں کی بیماری، اس کا مطالبہ، بہن کی شادی۔ اور ایسے میں حالات نے بہانہ بھی فراہم کر دیا۔ ایک وسیلہ آمدنی کا پیدا ہوا جو بہت بڑا تھا۔ تقریباً اتنا ہی بڑا جتنی بڑی میری ماں، اس کی زندگی کے لئے میری خواہش اور اس کا اصرار کہ زندگی کے وسائل فراہم کرنے کے لئے میں جو بھی کر سکتا ہوں کروں۔ بس مجھے شکست ہو گئی۔ میں انکار نہ کر سکا۔ بے شک میں نے سوچا تھا کہ یہ پہلی اور آخری بار ہے لیکن پہلی کے بعد دوسری بار، پھر تیسری بار، سلسلہ چلتا ہے۔ آخری بار نہیں ہوتی۔ خدا نے بہت جلد مجھے سزا دی۔ حالانکہ خدا نے دوسرے عادی گنہگاروں کو ابھی تک معاف کر رکھا ہے۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ کم سے کم میں گناہ سے بچا رہوں۔ جو صاف ہے وہ تو صاف رہے۔ جو گندا ہو گیا سو ہو گیا۔ دیکھ لو میں پکڑا گیا۔ میں تمہارے سامنے جرم کا اعتراف کر رہا ہوں۔ ذلیل ہو رہا ہوں، حالانکہ میں نے جھوٹ بول کے ایک جرم کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔"

"ان لوگوں نے تمہیں کیا دیا تھا؟"

"ایک لاکھ نقد۔ شروع انہوں نے دس ہزار سے کیا تھا۔ عام طور پر ایک معمولی اے ایس آئی کو جو گاؤں کی کسی پولیس پوسٹ کا نگراں ہو، اس سے زیادہ نہیں ملتا۔ لیکن میں بگڑ گیا اور ان سے کہا کہ میں انہیں رشوت دینے کے جرم میں بند کرا دوں گا۔ انہوں نے رقم دگنی کر دی، مجھے ڈرایا دھمکایا، افسرانِ بالا سے بات کر کے میرا بیڑا غرق کرانے کی بات کی، جب انہیں اندازہ

www.paksociety.com

ہوا کہ میرا پہلے ہی بیڑا غرق ہے تو وہ پچاس تک گئے۔ بالآخر ان پر انکشاف ہوا کہ مجھے ایمانداری کا مرض لاحق ہے۔ ظاہر ہے کسی کا ایمان خریدنے کے لئے بھاری قیمت لگانی پڑتی ہے۔ مجھے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ یہ آدمی قانون کے لئے اہم ہو نہ ہو ان کے لئے بہت اہم ہے۔ انہوں نے بولی ایک دم دگنی کر دی۔ ہزار سے بات لاکھ تک پہنچ گئی تو میں تذبذب میں پڑ گیا اور انہوں نے دیکھ لیا کہ میرے ایمان کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ انہیں میں کیا بتا تا کہ بنیادیں تو پہلے ہی کمزور پڑ چکی تھیں۔ بنیادوں میں رخنہ نہ پڑا ہوتا تو لاکھ کیا کروڑ کی ضرب سے بھی دیوار پر خراش تک نہ آتی۔ ...وہ کامیاب بیوپاری تھا۔ بیوپار ان کا کچھ بھی ہو جائز نہیں ہو سکتا۔ ایک نے میرے سامنے لاکھ روپے ڈال دیئے۔ دوسرے نے آخری وار کیا اور اپنی جیب خالی کر دی۔ اس میں تقریباً تیس ہزار تھے۔ اور بس' میں ان کی گاڑی میں بیٹھ کے یہاں آیا اور ان کا آدمی ان کے حوالے کر دیا۔"

"تم نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ آدمی ان کے لئے کیوں اہم تھا؟"

"انہوں نے بتایا تھا کہ وہ ایک ڈاکو ہے۔ میں نے کہا 'میری بلا سے اب قاتل بھی ہو تو کیا' مجھے کون پکڑ سکتا ہے' میں نے تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"ایک لاکھ تیس ہزار خاصی بڑی تفصیل ہے۔"

"لیکن یہ تفصیل کافی تھی" سائرن نے کہا۔

"وہ تمہارے گھر پہنچے تھے؟"

"ہاں۔ میں روز گھر چلا جاتا ہوں' ان حالات میں میرا اکیلے رہنا ناممکن ہے" سائرن نے کہا۔

"گھر کہاں ہے تمہارا؟"

"ذاتی گھر ہوتا تو میں اپنا کہتا' اب جہاں میری ڈیوٹی ہو وہیں میں بہن اور ماں کو بھی بلا لیتا ہوں۔ کرائے کا چھوٹا سا مکان صرف پچاس روپے میں مل گیا تھا اس گاؤں میں' شہر میں تھے تو پولیس لائنز میں کوارٹر تھا۔ اس سے زیادہ کرائے سے واسطہ نہیں پڑا تھا' ورنہ مشکل ہو جاتی۔"

"وہ لوگ آدھی رات کے وقت پہنچے تھے۔ اتنا نقد روپیہ تھا ان کے پاس۔ تم نے پوچھا نہیں؟"

"میں کیوں پوچھتا' لوگ ٹرنک بھر کے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ وہ تو آئے ہی مجھے خریدنے کے لئے تھے۔"

میں نے کہا "واپسی میں تم ان کے ساتھ گئے تھے۔"

"ہاں" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

"کیوں؟ جب کہ رقم تمہیں پوری مل گئی تھی۔ پھر تم نے یہ رسک کیوں لیا؟" غالب نے کہا

"رسک کیسا؟ میرے پاس ریوالور تھا... سرکاری' اگر وہ ایسی ویسی حرکت کرتے تو میں انہیں شوٹ کر دیتا۔"

میں نے مسکرا کے کہا "جیسے تم نے ہمیں شوٹ کیا' ماؤزر نہ نکل جائے' تم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ [illegible] تمہیں تو معلوم بھی نہ ہوتا اور تم مر جاتے' تمہاری [illegible] چالاکی اور مستعدی دھری رہ جاتی۔ پیشہ ور قاتلوں سے تمہارا واسطہ نہیں پڑا کبھی۔"

"ویسے تم گئے کیوں تھے ان کے ساتھ؟" غالب نے کہا۔

"کچھ ادھار باقی تھا" میں نے کہا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور مسکرانے لگا "تم بہت چالاک آدمی ہو۔"

میں نے کہا "جب آدھے سچ کا اعتراف کر لیا ہے تو پورا بتانے میں تکلف کیسا؟"

اس نے کہا "تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے جب فیصلہ کر لیا کہ اپنا ایمان بیچنا پڑے گا' تو میں نے اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کی۔ میں نے ایک لاکھ تیس ہزار روکڑے لئے اور مزید ستر ہزار مانگے۔ میں نے کہا دو لاکھ سے ایک پیسہ کم پر بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ایک لاکھ تیس ہزار بھی [illegible] ...وہ پھنس گئے' اپنی طرف سے وہ لمبا بندوبست کر کے آئے تھے مگر ایک چھوٹا سا پولیس افسر مہنگا پڑا۔ نقد ان کے پاس تھا نہیں' انہوں نے چیک دینے کی بات کی' میں نے کہا کہ اس کاغذ کا کیا کروں گا۔"

میں نے اسے ٹوک دیا "خواتین انگریزی جانتی ہیں۔"

"مجھے یاد آ گیا' اسی لئے میں رک گیا ورنہ ایک بے ہودہ بات کرتا۔ سوری... میں نے چیک قبول نہیں کیا۔ ان میں سے ایک واپس جا کے نقد لانے پر تیار تھا مگر دوسرے نے کہا کہ ہم انسپکٹر کو ساتھ لے جا سکتے ہیں اور ادائیگی کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ احمق تھا۔"

"کیوں؟"

"اس طرح میں نے ان کا ٹھکانا جو دیکھ لیا' وہ عقل مند ہوتا تو ایسی غلطی نہ کرتا۔"

میں نے کہا "ٹھکانا تو انہوں نے بھی دیکھ لیا ہے تمہارا۔"

"انہیں مجھ سے پھر کیا کام پڑ سکتا ہے؟" وہ بولا۔

"کیا تمہیں ان سے پھر کام پڑے گا؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "خیر چھوڑو' یہ فیصلہ وقت کرتا ہے کہ احمق کون تھا۔ جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں... آخری بار کون ہنستا ہے' یہ دیکھنا ہے۔"

غالب نے کہا "تم ستر ہزار وصول کر لائے؟"

"ادھ نہیں۔"

"اگر وہ نہ دیتے؟ وہاں جا کے انکار کر دیتے۔"

"تو میں انہیں مجبور کرتا کہ واپس چلیں' ورنہ میں انہیں پولیس اسٹیشن لے جاتا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور میں نے انہیں

بل کا انکوائری روک لی تھی۔ وہ آدمی مال تھا۔ اگر وہ خود فلاں بل کا تھا' اسے ضائع کر دینا گوارا نہیں تھا۔"

"وہ تمہیں ضائع کر دیتے... خیر۔ انہوں نے تمہیں ستر ہزار دے کر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد۔"

"میں نے وہ رقم شہر میں جمع کرا دی۔ اپنی بہن کے اکاؤنٹ میں۔ اس کا بیلنس کئی سال سے ایک سو انتیس روپے تھا۔ آج ستر ہزار ایک سو انتیس ہو گیا۔"

"اور وہ تم رات کو لائے تھے؟"

"وہ کل جمع کراؤں گا۔ آج تو وقت نہیں رہا۔"

"یعنی وہ رقم ابھی تمہارے ہی گھر میں ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن میری بہن کو یا ماں کو علم نہیں۔ جس وقت یہ سودا ہوا میرے ضمیر کا سودا تو وہ سو رہی تھیں۔"

میں نے کہا "یو ایڈیٹ! کیا تم عقل سے بالکل پیدل ہو! تم کو [illegible] نہیں ہے کہ تم نے ان دونوں کی زندگی کو کتنے بڑے خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔"

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا "جب کسی کو معلوم نہیں میرے سوا۔"

"تمہارے سوا وہ جانتے ہیں جن کو تم نے بلیک میل کیا تھا۔ ایسے لوگ نہیں ہیں جن کو بلیک میل کیا جا سکے۔ وہ کبھی برداشت نہیں کرتے کہ کوئی ان کی طاقت کے سامنے دیوار بن جائے جیسے تم بنے تھے اور انہیں کمزور یا مجبور کر دے۔ ان کے لئے ایک ایس آئی کی زندگی دو لاکھ کی نہیں ہوتی۔ تم ان سے دو لاکھ خیرات میں مانگ سکتے تھے مگر تم نے ان کا گلا دبا کر لئے۔ یہ غلطی کی تم نے۔ وہ اپنی رقم واپس لے لیں گے۔"

وہ پریشان ہو کے کھڑا ہو گیا "کیا وہ واپس لے جا سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ دو لاکھ کے بدلے وہ تمہاری ماں اور بہن کو لے جائیں گے بے وقوف آدمی' تم نہیں جانتے انہیں' ہم جانتے ہیں۔"

وہ ایک دم باہر کی طرف لپکا "میں ابھی آتا ہوں۔"

میں اور غالب اس کے ساتھ بھاگے۔ یہ اچھی بات تھی کہ ہم دونوں کے جسم پر بھی پولیس کی وردی تھی ورنہ ہم اس کے پیچھے بھاری بوٹوں سمیت دوڑتے تو بہت عجیب لگتے۔

سائرن بہت اچھا دوڑنے والا تھا اور شاید ہر روز دوڑنے کا شوقین تھا کہ وہ کے بغیر بھاگتا گیا۔ میرا اور غالب کا سانس پھول گیا۔

"نہیں... موقع ملے... کچھ... دوڑ لینا چاہئے" غالب نے دوڑتے ہوئے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

"ہاں۔ پریکٹس فرار... کی بھی... ہونی چاہئے۔"

صرف چار منٹ کے بعد سائرن کا گھر آیا۔ ہم نے اسے [illegible] احساس دلا دیا تھا اور اس کو بھی اپنی غلطی کے سنگین نتائج کا تصور پاگل کر رہا تھا۔ وہ ایک بگولے کی طرح گھر میں داخل

ہوا۔ اس کے ہاتھ لگاتے ہی دروازہ کھل گیا۔ میں اور غالب پیچھے رہ گئے تھے لیکن ہم نے اس کے دیوانہ وار چلانے کی آواز سن لی۔

میرا دل بیٹھنے لگا۔ جو بات میرے ذہن میں ایک اندیشہ بن کے آئی تھی اور میرے لبوں سے وارننگ بن کے نکلی تھی وہ سچ ہو گئی تھی۔ مجھے دکھ کے ایک انوکھے احساس نے گھیر لیا۔ میں نے سوچا کاش میں نے یہ بات نہ کی ہوتی۔ اس سے فرق کچھ نہ پڑتا لیکن بری بات اور بری خبر اپنی زبان سے سنانا کسے اچھا لگتا ہے۔

گاؤں کے بہت سے لوگ پولیس کو سرپٹ بھاگتا ہوا دیکھ کے ہمارے ساتھ دوڑنے لگے تھے۔ انہوں نے گاؤں کے نیک دل تھانے دار کو بھی بھاگتے دیکھا تھا جو تھا تو کرسچین مگر اخلاق و کردار میں مومن کی صفات رکھتا تھا۔ گاؤں کا تھانے دار ایک ظالم و جابر حکمران ہوتا ہے۔ ایسے تھانے دار گاؤں والوں نے کہاں دیکھے ہوں گے جو رشوت نہ لیتے ہوں اور ریکارڈ بھی کرانے کا لے کر رہتے ہوں۔

جتنی دیر میں ہم دروازے تک پہنچے سائرن کے پاگلوں کی طرح چیخنے کی آوازیں شاید سارے گاؤں میں سنی جا رہی تھیں۔ ...وہ اپنی ماں کو اور بہن کو پکار رہا تھا۔ میں نے اور غالب نے ساتھ آنے والوں کو باہر ہی روک دیا۔ میں اور غالب دروازے سے گزر کے اندر پہنچے۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا' ایک فائر ہوا' سائرن نے چیخ کر مجھے ایک گالی دی۔ دھماکا میرے کان کے پاس ہوا تھا لیکن میں بچ گیا تھا۔ میں نے دوسری گولی کا نشانہ بننے سے پہلے جست لگا کے سائرن کو دبوچ لیا۔ اس نے دیوانگی کی کیفیت میں مجھے اور غالب کو گالیاں دینی شروع کیں۔

"تم... تمہاری وجہ سے... تمہارے اس دوست کی وجہ سے یہ سب ہوا' میں جان سے مار دوں گا تمہیں۔"

میں نے اسے دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا "سائرن' ہوش میں آؤ' باہر لوگ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کو کچھ معلوم نہیں اور معلوم ہونا بھی نہیں چاہئے۔"

"نہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے" وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا "کہ یہ میرے جیسے بدبخت بیٹے ہوتے ہیں اور گناہ گار بھائی ہوتے ہیں' جن کے قصور کی سزا ان کی ماؤں اور بہنوں کو ملتی ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے ہی انہیں مار ڈالا۔ میں قاتل ہوں ان کا۔ لالچی کتا' رشوت خور' ذلیل آدمی' شیطان۔"

میں اسے گھسیٹ کر دوسرے کمرے میں لے گیا کیونکہ اس کمرے کا منظر خود میرے لئے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا جس میں دو خون آلود مسخ شدہ لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ یقیناً ان میں سے ایک سائرن کی ماں تھی اور دوسری اس کی بہن۔ ان کے جسم بے لباس تھے اور انسانی درندگی کا نشانہ بنے تھے۔ ان کے

www.paksociety.com

وجود کا ہر زخم انسانیت کے منہ پر رسوائی کا داغ تھا۔

انھیں مارنے والے کون تھے' یہ سوال کسی جواب کا محتاج نہیں تھا۔ وہ ایک لاکھ تیس ہزار وصول کرنے آئے تھے اور اس کے بدلے میں دو مجبور اور کمزور عورتوں سے ان کی آبرو کا اور زندگی کا خراج لے کر چلے گئے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ انھیں اپنی رقم مل جاتی تو وہ کچھ نہ کرتے۔ وہ بدلہ لینے آئے تھے اور سزا دینے آئے تھے۔ پیسہ وصول کرنے کے بعد بھی وہ ایسا ہی کرتے۔ ان کو حکم تھا کہ ایک حقیر اے ایس آئی کو ایسا سبق پڑھا کے آئیں جو وہ کبھی نہ بھولے اور آئندہ اپنی اوقات یاد رکھے۔ انھیں اس کی مجبوری یا ان عورتوں کی بے بسی' شرافت یا رحمدلی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ انھیں تو اب بھی سخت ملال اور غصہ ہوگا کہ وہ جس مقصد سے آئے تھے وہ ادھورا رہ گیا۔ بے وقوف' ضدی لالچی عورتوں نے نہیں بتایا کہ پیسہ کہاں چھپایا ہے... عزت گنوائی اور جان گنوائی۔ اتنا بھی خیال نہیں کیا کہ وہ خالی ہاتھ واپس جا کے اپنے آقاؤں کو کیا منہ دکھائیں گے۔

دوسرے کمرے میں غالب نے باہر سے آنے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے باہر بھیج دیا تھا مگر اس واردات کی خبر پھیل رہی تھی۔ آہستہ آہستہ باہر مجمع اکٹھا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے سائمن کو پانی پلایا اور اسے تسلی دیتا رہا یہاں تک کہ اس کے اندر کا پولیس مین ہوش میں آگیا۔

"میرا خیال ہے کہ اب میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا" اس نے کہا۔

"لیکن ہم تمہارے لئے کچھ ضرور کر سکتے ہیں" میں نے کہا۔

"اب کوئی کچھ نہیں کر سکتا..."

"کیوں' کیا تم نہیں چاہو گے کہ ان کو پکڑو جو تمہارے ساتھ اس ظلم کے ذمے دار ہیں؟"

"میں انھیں چھوڑوں گا نہیں' اس کے لئے مجھے تمہاری مدد نہیں درکار ہوگی' میرے اتنے اختیارات ہیں..."

"تمہارے اختیارات ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ بات غلط نہیں ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو مسٹر سائمن" میں نے کہا۔

اس نے کہا "لیکن مجھے پہلے قانون کے مطابق کارروائی کرنی ہوگی۔"

"ضرور کرو' اس میں بھی ہم تمہاری مدد کریں گے۔ سامنے آئے بغیر" میں نے کہا "آخری رسوم کی ادائیگی تک ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں خطرے کی زد میں تمہاری ذات بھی ہے۔ فی الحال سب کچھ بھول جاؤ۔ جب تم آخری رسوم سے فارغ ہو جاؤ گے تو ہم خود تم کو آ ملیں گے اور پھر ہم ایک ساتھ چلیں گے۔"

"کہاں؟" اس نے بے خیالی میں کہا۔

"تم ہمیں بتاؤ کہ اس رات وہ تم کو کہاں لے گئے تھے" میں نے کہا "اگر تم کو ان کی گاڑی کا نمبر یاد ہے تو [illegible]"

"مجھے یاد ہے۔ نائن ایٹ ایٹ نائن۔"

"مسٹر سائمن' تمہارے پاس کوئی گواہ نہیں ہے لیکن تم جانتے ہو کہ مجرم کون تھے۔ انھیں قانون سزا نہ دے سکا۔ یہ بات ایک ناقابل تردید اور تلخ حقیقت ہے سائمن' سزا تم خود دے سکتے ہو۔ کسی شک و شبے کے بغیر' کوئی رعایت دئیے بغیر۔"

"رعایت!" وہ چلایا "میں ان کو بدترین' زیادہ سے زیادہ عذاب دے کر مارنا چاہتا ہوں۔"

"یہ کام تم اکیلے نہیں کر سکو گے۔ تم پھر مار کھا جاؤ گے۔ بہتر ہے کہ تم عقل سے کام لو۔ کسی کو کچھ مت بتاؤ' کسی سے بات بھی مت کرو کہ کیا ہوا تھا اور کیا نہیں ہوا تھا۔ تم کس سے ملے تھے اور کس سے نہیں ملے تھے۔ نہ ہمارا ذکر کرنا نہ چمن لال کا نہ کسی اور کا۔ صرف یہ کہنا کہ ڈکیتی کی واردات ہے' ڈاکوؤں کو جب کچھ نہیں ملا تو عورتوں کو مار گئے۔ بس' اس سے زیادہ رپورٹ میں بھی مت لکھنا۔ آخری رسوم کب تک کرو گے تم؟"

"شاید... کل شام تک۔"

"یہ رسوم کہاں ہوں گی" میں نے کہا۔

"سینٹ اینڈریو چرچ' بمبئی میں۔"

"اوکے' ہم اب جاتے ہیں" میں نے کہا "کل شام تک کے لئے۔"

"تم نے ان ٹھگوں کو سزا دینے کا وعدہ کیا ہے' میرے ساتھ مل کر' یہ بات بھولو گے تو نہیں؟" سائمن نے کہا۔

"فکر مت کرو۔"

"میں نے انتقام نہ لیا تو میں پاگل ہو جاؤں گا" وہ بولا۔

میں نے کہا "اسے سزا کہو' انتقام مت کہو۔"

"سزا تو خدا نے مجھے دی ہے" وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا "اور نہ جانے کب تک دے گا۔"

میں نے اسے بڑی مشکل سے چپ کرایا "یہ تمہاری آزمائش بھی ہو سکتی ہے' خدا اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے"

"لیتا ہوگا' مگر میں فیل ہو گیا ہوں اس امتحان میں' میں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا تھا کہ میں نیک آدمی ہوں... خدا منصف ہے تو یہ کیسا انصاف ہے..."

میں نے کہا "تم صدمے اور مایوسی کی کیفیت میں جو کچھ کہہ رہے ہو قابل معافی ہے۔ آج تم یہ بات نہیں سمجھ سکتے لیکن کبھی تم اس کے نظام انصاف کے ضرور قائل ہو جاؤ گے۔ اب ہم چلتے ہیں۔"

اس نے کہا "جاؤ' فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ۔ جو کچھ [illegible] تھانے میں کیا' شاید وہ ایک فطری رد عمل تھا۔ وہ [illegible] تھی' کیا انھوں نے تمہارے دوست کو بھی مار دیا ہوگا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو ہم ان سے خود نمٹ لیں گے۔"

"تھانے جا کے... ان سب کو بھیج دو... ان کے کپڑے انھیں دے دو۔"

میں نے سر ہلایا اور دوسرے کمرے میں سے غالب کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں ان لاشوں کو پھر دیکھ سکتا۔ اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر دیہاتیوں کا ایک غول سہما ہوا خوف زدہ کھڑا تھا۔ ابھی تک گاؤں کا کوئی وی آئی پی وہاں نہیں پہنچا تھا۔

پھر ایک شخص آگے بڑھا۔ یہ کرداور کا لڑکا مانک لال تھا۔ "کیا ہوا تھانے دار کے گھر میں' ڈاکا پڑ گیا؟"

میں نے کہا "ہاں' بے چارے کے پاس تھا ہی کیا۔ ڈاکو تو سمجھتے ہیں کہ ہر تھانے دار کے گھر سے مال ملتا ہے۔"

"عورتوں کو مار دیا انھوں نے؟" کسی اور نے کہا۔

"ہاں' جب کچھ نہیں ملا تو عورتوں سے پوچھتے رہے کہ مال کہاں چھپایا ہے" غالب نے کہا "وہ کیا بتاتیں۔"

"یہ تھانے دار بھی عجیب چیز ہے" مانک لال بولا "ایسا غریب مسکین تھانے دار بھی نہیں دیکھا۔"

ہم نے مجمع سے نکلنے کے لئے اس سے اتفاق کیا "ہم نے بھی نہیں دیکھا۔"

"مجھے تمہاری صورت کچھ... دیکھی ہوئی لگتی ہے" کرداور کے لڑکے نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔

"فلم بزدل دیکھی تھی؟"

"وہ جس میں پریم ناتھ ڈاکو بنا تھا؟"

"ہاں' ڈاکو میرا ماموں تھا' میری شکل اس پر گئی ہے۔ اب ہٹو میرے راستے سے" میں نے دہاڑ کے کہا۔

کرداور کا لڑکا برا سا منہ بنا کے ایک طرف ہو گیا۔ وہ ابھی تک کنفیوژن کا شکار تھا۔ اس نے آج صبح سب سے پہلے میرا ہی چہرہ دیکھا تھا مگر اس خاکے کا پولیس کی وردی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میری صورت کا بھی پریم ناتھ کی صورت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

واپس جاتے ہوئے میں نے غالب سے کہا "یہ تو دوسرا ہی شروع ہو گیا۔ اب ہم کہاں جائیں گے؟"

"یہاں سے تو جانا ہی پڑے گا۔ آگے کا راستہ تم بتاؤ۔"

"جانا تو واپس بمبئی ہے" میں نے سوچتے ہوئے کہا "کل شام سے بڑی امید وابستہ ہے ورنہ مجھے سارے راستے بند لگتے ہیں۔ کیس بند گلی تک پہنچ گیا ہے۔ آگے کوئی سراغ نہیں۔ نہ نشانہ اور نہ محسن کا۔"

"کل شام کیا ہوگا؟"

"شاید وہ لوگ یا ان کا کوئی آدمی چرچ پہنچے گا۔ ایک پرانا نظریہ ہے کہ قاتل اپنے مقتول سے بے تعلق ہو کے نہیں رہ جاتا... وہ واردات کی تفتیش کے نتائج سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہاں ان کے آنے کی ایک اور وجہ بھی ہوگی۔"

"وہ کیا؟"

"ہم" میں نے کہا "جیسے ہم پر امید ہیں کہ ان کا سراغ وہیں ملے گا' ایسے ہی وہ ہماری آمد کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ ہم ان کی سوچ کو سمجھتے ہیں' وہ ہمارے ذہن سے واقف ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے' وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم محسن کو تلاش ضرور کریں گے۔ ہمیں اس کے اغوا کا علم ہو جائے گا۔ پھر ہم سمجھ جائیں گے کہ اغوا کرنے والے کون تھے اور شاید تھانے دار سے سب معلوم کر لیں گے لیکن وہ ایسا رسک کیوں لیں گے؟ کیا انہیں ڈر نہیں ہوگا کہ خود تھانے دار نے کوئی جال نہ بچھا رکھا ہو؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے اصل مجرم یہ رسک نہیں لیں گے۔ یا تو وہ اصل چہرے لے کر سامنے نہیں آئیں گے۔ یا اصل لوگ نہیں ہوں گے۔ کوئی اور آئے گا' یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمارا رد عمل کیا ہے اور خود تھانے دار کا کیا حال ہے اس سزا کے بعد؟"

"پر انہیں ہم کیسے پہچانیں گے؟"

"کوشش کریں گے... پہلے یہاں سے تو نکل جائیں" میں نے کہا۔

تھانے میں بدستور سکوت تھا۔ حوالات کے اسیران کی حالت خراب تھی۔ صرف دو گھنٹے میں حوالدار پر نیم بے ہوشی کا عالم تھا اور اس کا بھاری بھرکم وجود زنجیر کے ساتھ تقریباً جھول رہا تھا۔ نگران حوالات کے لئے بھی جسمانی اذیت کا یہ دوسرا مرحلہ زیادہ سخت تھا۔ انہوں نے ہمارے قدموں کی چاپ سنتے ہی ناک سے آوازیں نکالتے ہوئے سخت عاجزانہ انداز میں ممیانا شروع کیا۔

میں نے کہا "غالب' ان کو چھوڑ کے کہیں ہم مشکل میں نہ پڑ جائیں۔"

غالب نے کہا "ان حالات میں ہم انہیں قید بھی نہیں رکھ سکتے۔"

"یہ ہمارے خون کے پیاسے ہوں گے۔ خصوصاً یہ موٹا حوالدار سب کو چھوڑ کے ہمارے پیچھے نہ پڑ جائے۔ اس کو بہت بے عزت کیا ہے ہم نے۔"

"ابھی یہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اسے فوراً سائمن کی خدمت میں حاضر ہونا ہے" غالب نے کہا۔

"وہاں اس کا کوئی خاص کام نہیں ہے۔"

"کام کیوں نہیں ہے۔ سائمن اکیلا ہی سب کچھ کرے گا؟"

میں نے کہا "سائمن کو بھی یہاں کیا کرنا ہے۔ سوائے ایک رپورٹ درج کرنے کے۔ باقی سارے کام شہر کے ہیں' ایمبولینس وہیں سے آئے گی' پوسٹ مارٹم وہیں ہوگا اور اس کے بعد کل

www.paksociety.com

آخری رسوم بھی وہیں ادا ہوں گی۔ اگر تفتیش کے لئے کوئی خصوصی ٹیم تشکیل دی گئی تو وہ بھی شہر سے آئے گی۔ لڑکوں کو جائے واردات سے دور رکھنے کے لئے ایک کانسٹیبل ڈیوٹی پر کھڑا کر دینا کافی ہوگا۔ پھر سائیں شہر چلا جائے گا۔ موٹا حوالدار اور نگران حوالات اپنی حالتِ زار کو بہانہ بنا کے سارے معاملات سے جان چھڑا لیں گے۔ وہ سائیں سے کچھ نہیں کہیں گے مگر یہ ہو سکتا ہے کہ کسی بڑے افسر کے پاس جا کے فریاد کریں۔ سائیں پہلے ہی ناپسندیدہ شخص ہے۔ حوالدار بھی اس کے سخت خلاف ہے۔ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

غالب نے کہا "ہم تو پہلے ہی ہر طرف سے محصور ہیں۔ پولیس سارے علاقے کی ناکہ بندی کئے بیٹھی ہے۔ اعلیٰ افسران خود یہیں موجود ہوں گے۔"

میں نے کہا "اگر حوالدار نے جا کے یہ بتا دیا کہ گزشتہ رات اس نے ڈاکوؤں کے ایک ساتھی کو پکڑ لیا تھا مگر اسے سائیں صاحب نے چھوڑ دیا۔ تو سائیں بھی مشکل میں پڑ جائے گا۔ پھر یہ کہ گاؤں کے ڈاکو کے ساتھی تھانے میں آ گئے تھے اور انہوں نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا وہ آپ دیکھ لیں۔ مگر سائیں صاحب نے انہیں کچھ بھی نہیں کہا اور آزاد چھوڑ دیا۔ وہ اسی علاقے میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ تو ایک دم پولیس اپنی ساری نفری کے ساتھ یہاں پہنچ جائے گی۔ ہمارا نکلنا مشکل کیا ناممکن ہو جائے گا۔"

"پھر کیا کریں؟ اسے چھوڑنا بھی ضروری ہے۔ سائیں نے کہا تھا۔"

"اس نے تو کہا تھا... لیکن میرا خیال ہے کہ اسے چھوڑنا غلطی ہوگا۔ جب تک ہم اس علاقے سے نکل نہ جائیں اسے بھی مکمل چھٹی نہیں ہونی چاہئے کہ ہمارے اور سائیں کے خلاف ہو جائے کرتا پھرے۔ ہم ان دو سپاہیوں کو چھوڑ دیتے ہیں جو نا تجربہ کار لڑکے ہیں اور بہت زیادہ ڈرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بالکل مزاحمت نہیں کی تھی۔"

غالب نے کہا "میری قوتِ فیصلہ تو بالکل مفلوج ہو گئی ہے۔"

"اچھا تو پھر یہ سارے معاملات مجھ پر چھوڑ دے۔ تو خواتین کے ساتھ نکل جا۔" میں نے کہا۔

غالب نے حیرانی سے کہا "نکل کے کہاں جاؤں؟"

میں نے کہا "کیا یہاں آتے ہوئے تو نے خانہ بدوشوں کے خیمے دیکھے تھے؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا! "ایک فقیروں کا ڈیرا نظر آیا تھا۔"

میں نے کہا "وہی۔ وہ خانہ بدوش ہیں... چھ سات خیمے ہیں گاؤں سے کچھ فاصلے پر۔ اگر ہم ان میں شامل ہو جائیں تو اس علاقے سے نکل سکتے ہیں۔ فقیروں اور خانہ بدوشوں کو پولیس کیا کہے گی۔"

"ہم یہ چانس لے سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"ان سے صاف صاف بات کرنا کہ پولیس ہمارے تعاقب میں ہے۔ تم کسی طرح ہمیں یہاں سے نکال دو۔ یہ لالچی لوگ ہوتے ہیں۔ دو چار ہزار کی خاطر سب کچھ کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔"

"پھر دو چار ہزار کیا دس بیس ہزار دے جا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اگر انہیں اندازہ ہو گیا کہ تم لاکھوں میں ہو تو وہ خود تمہیں مروا لیں گے۔ اس لئے تم اپنے اسلحے کی حفاظت کرنا تاکہ ضرورت کے وقت کام آ سکے۔ میں کچھ دیر بعد آتا ہوں۔"

"پھر اتنی لمبی وصیت کس لئے؟" غالب نے کہا۔

"میں ان دونوں سپاہیوں کو لاتا ہوں۔ تو یہ وردی اتار کے پھر پرانا بٹنوں والا لباس پہن لے۔ وردی بدلنی بھی ضروری ہے۔"

"ویسے بھی ہم خانہ بدوشوں کے ڈیرے میں پولیس کی وردی پہن کے نہیں جا سکتے۔" غالب نے کہا۔

"میں بھی یہ وردی اتاروں گا لیکن الماری میں نگران حوالات کی وردی موجود ہے۔ وہ پہن کے آؤں گا۔"

"وردی میں آنا ضروری ہے؟"

"ہاں یار! مجھے دھوکہ دینے میں پکڑے جانے کا ڈر ہے۔ گرداور کے لڑکے نے مجھے دیکھ لیا تو فوراً پہچان جائے گا۔ تو جا کپڑے بدل اور خواتین کو تیار کر۔ خانہ بدوشوں سے معاملہ طے ہو جائے تو انہیں سمجھا دینا کہ ابھی ہمارا ایک اور ساتھی پولیس کی وردی میں آئے گا۔ اس سے ڈرنے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میں لوٹ کر حوالات میں گیا تو حوالدار کی التجا آمیز نگاہیں میرے قدموں میں لوٹ رہی تھیں۔ وہ ہاتھ جوڑنے اور پاؤں پکڑنے اور گڑگڑانے سے قاصر تھا لیکن اس کا چہرہ فریاد کناں تھا اور اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو رحم کی درخواست تھے۔ نگران حوالات کی مظلومیت اور بے بسی الگ نوحہ خواں تھی۔ میں نے ان کی طرف دیکھے بغیر دونوں سپاہیوں کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسی کھولی اور ان کے منہ میں ٹھونسا ہوا کپڑا نکالا۔

"ابھی میں تم دونوں کو چھوڑ رہا ہوں" میں نے کہا "اس لئے کہ مجھے تمہاری جوانی پر ترس آتا ہے۔"

وہ دونوں رونے لگے۔ پہلے ایک نے پھر دوسرے نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔

میں نے کہا "یہاں سے تمہاری لاشیں نہیں جا رہی ہیں تو اس کو ہمارا احسان سمجھو۔ یہ مت سمجھنا کہ ہم بزدل تھے۔ ہم بے وجہ قتل نہیں کرتے لیکن قتل بہت کئے ہیں ہم نے۔ اگر بعد میں تم نے کسی سے کچھ کہا یا ہمارے بارے میں کوئی بات کی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ پھر ہم کسی روز بھی تمہارے گھر آ پائیں گے۔"

ان میں سے ایک نے پتا نہیں کس کس کی قسم کھا کے کہا۔ "نوکری ہی چھوڑ دوں گا۔ میری زبان سے ایک لفظ بھی نکلے تو ماں باپ کا نہیں کتے کا بچہ۔"

دوسرے نے اس کی تقلید کی۔ اس نے بھی قسمیں کھا کے یقین دلایا کہ وہ مر جائے گا مگر ہمارے بارے میں اپنی زبان کبھی نہیں کھولے گا۔

"اگر تم نے یہ سمجھا ہے کہ جھوٹی قسمیں کھا کے اس وقت جان بچا لو گے اور بعد میں یہ موٹا حوالدار تمہیں بچا لے گا۔ تو یہ بھی سوچ لو کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ کسی دن تم سوتے رہ جاؤ گے اور ہم تمہارے سر اتار کے لے جائیں گے۔ صرف تمہارے ہی نہیں تمہارے گھر میں جو بھی ہوگا اس کی چتا سر کے بغیر جلے گی۔"

دہشت سے ان کا برا حال ہو گیا۔ اپنی اپنی وردیاں پہنے ان کے جسم لرز رہے تھے اور ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ پولیس کی نوکری میں ان کے لئے یہ پہلا تجربہ تھا جب انہیں اندازہ ہوا تھا کہ وردی سے صرف تھانے داری ہی نہیں ملتی کبھی ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو موت کے نامہ بر ہوتے ہیں۔ مجرم ہونے کے باوجود رشوت نہیں دیتے اور قانون کی گرفت سے بالاتر ہوتے ہیں۔

"اب تم لوگ سیدھے سائیں صاحب کے گھر جاؤ گے۔"

"جو حکم آپ کا۔"

میں نے کہا "ان کی ماں کو بھی قتل کر دیا گیا ہے اور بہن کو بھی۔"

ان کی آنکھوں سے بے یقینی عیاں ہونے لگی۔ وہ چپ کھڑے رہے۔

میں نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ ہمارے دوسرے ساتھیوں نے خان صاحب کو سزا دی ہے۔"

غالب نے کہا "ہاں غلطی تو انہی کی تھی۔ انہوں نے ہمارا دل دکھایا تھا۔"

"شاید تم کو یقین نہیں آیا۔ اس لئے تم جا کے دیکھ لو" میں نے کہا اور پھر گرج کے کہا "جاؤ۔"

وہ بے تحاشا بھاگے۔ لڑکھڑاتے اور بار بار پیچھے مڑ کے دیکھتے ہوئے۔ ان کی حالت اتنی مضحکہ خیز تھی کہ ہم سب اعصابی تھکن اور پریشانی کے باوجود مسکرانے لگے۔ میں نے ریوالور فائر کرنے کے انداز میں ان کی طرف کیا تو وہ دوڑتے دوڑتے گر گئے۔ کچھ دیر بعد پھر اٹھے اور زیادہ تیزی سے بھاگے۔

غالب نے گل کو کندھے پر ڈالا اور بولا "اسے تو تیز بخار ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو شاید خانہ بدوش کوئی علاج کر لیں۔ ابھی تم ان سے رابطہ قائم کئے رہنا۔ یہاں سے نکل گئے تو کسی ڈاکٹر کو بھی دکھا دیں گے۔"

رابعہ نے کہا "کیا تم نہیں چل رہے ہو؟"

میں نے کہا "میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔ جب تم لوگ پہنچ جاؤ گے۔"

رابعہ نے کہا "میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔"

"میں کروں گی" رابعہ نے کہا۔ اور وہیں بیٹھی رہی۔

میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے گل سے کہا "اچھا تم جاؤ۔ میں نے غالب کو سب سمجھا دیا ہے کہ کیا کرنا ہے۔"

"اور میں تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ بعد میں کچھ نہیں کرنا ہے۔" گل نے کہا "جب تک یہ وعدہ نہیں کرو گے میں بھی نہیں جاؤں گی۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں..."

"کتنی دیر کے بعد آؤ گے تم دونوں؟"

"زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں۔"

"آخر ساتھ کیوں نہیں چلتے؟"

"بحث میں وقت ضائع مت کرو۔ یہ کوئی مصلحت ہے" میں نے برہمی سے کہا "یہ پھل اور مٹھائی کا تھیلا اٹھا لو اور روانہ ہو جاؤ۔"

میں انہیں باہر جانے کے بعد تھانے کے عقبی حصے کی طرف سے آہستہ آہستہ خانہ بدوشوں کے ڈیرے کی طرف بڑھتا دیکھتا رہا۔ یہ شاید آدھے میل کا راستہ تھا مگر گاؤں کے باہر سے گزرتا تھا۔ انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ گاؤں کی ساری آبادی شاید تھانے دار کے گھر پہنچ چکی تھی۔ دوہرے قتل کی اس سنسنی خیز واردات کی خبر نے کھیتوں میں کام کرنے والوں کو بھی کھینچ لیا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا اور ہو کا عالم تھا۔

میں اب حوالات کے نگران کی وردی میں تھا جو میرے جسم کے لئے زیادہ آرام دہ ثابت ہو رہی تھی۔ نوجوان سپاہی کی تنگ وردی میں تو میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ رابعہ بنچ پر اکیلی بیٹھی ہوئی خلا میں دیکھ رہی تھی۔

میں نے کہا "ضدی لڑکی!"

اس نے جھکی ہوئی پلکیں اٹھا کے مجھے دیکھا "میں نے تم سے کہا تھا میں اکیلی کہیں نہیں جاؤں گی۔"

میں نے ہنس کے کہا "اکیلی! غالب، نازو اور گل کے ساتھ اکیلی!"

"میں تمہارے بغیر ہر جگہ اکیلی ہوں" اس نے آنسو پی کے کہا۔

"دیکھو اب رونا نہیں۔ میرے ساتھ رہنے کی یہی شرط ہے کہ مسکراتی رہو تاکہ میرے دل کو تقویت ملتی رہے" میں نے کہا۔ "میں ابھی دو منٹ میں آتا ہوں۔ حوالدار کو ایک خطبہ دے آؤں۔ تم خاموش بیٹھنا۔"

حوالات کی طرف جا کے میں نے کہا "موٹے! تم نے کچھ سنا؟"

www.paksociety.com

ہمارے ساتھیوں نے اپنا آدمی چھڑوا لیا ہے۔ تمہارے انچارج نے اسے اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا' ایک لاکھ میں سودا کیا تھا اس نے ہمارے دشمنوں سے اور وہ ایک لاکھ فقط مانگا تھا۔ وہ سودا کرنے والوں کے ساتھ بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے کہا کہ پیسہ لے آؤ اور اپنا آدمی لے جاؤ' وہ گئے تھے پیسہ لینے اور انہوں نے شام تک کا وقت مانگا تھا۔ سائن صاحب ادھر آیا اور ہمارے باقی ساتھی اس کے گھر پہنچ گئے۔ اس کی ماں اور بہن کی لاشیں چھوڑ گئے۔ بہن لال کو لے گئے۔ سائن بچ گیا اس لئے میں یہاں رک کے اس کا انتظار کر رہا ہوں ورنہ سب کے ساتھ نکل جاتا۔ یہ سب تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں میں کہ تمہاری غلط فہمی دور ہو جائے۔ پولیس آج تک ہم پہ ہاتھ نہیں ڈال سکی... اور آئندہ بھی نہیں ڈال سکتی۔ تم شکر کرنا کہ زندہ بچ گئے۔ ہم کسی سے رعایت نہیں کرتے لیکن بلاوجہ کسی کو مارتے بھی نہیں۔ تم نے ہمارے ساتھی کو چھڑانے کی جو غلطی کی تھی اس کی اتنی ہی سزا ہو سکتی تھی جتنی تم کو ملی۔ تھانے دار کا جرم ناقابل معافی ہے۔ جیسے ہی وہ ادھر آیا میں چلا جاؤں گا۔ اس کو قتل کئے بغیر میں نہیں جا سکتا۔ تم بھی اپنے دماغ سے سب کچھ نکال دو' ہم سے دوستی سے تمہیں بہت کچھ مل سکتا ہے۔ دشمنی تمہارے بس کی بات نہیں۔ تم بہت چھوٹے آدمی ہو۔ تمہارے اختیارات سے یہ مسائل دور ہیں۔ ہمارے متعلق کوئی غلط بات کی تو نقصان اٹھاؤ گے۔ اگلے پھیرے میں ہم تمہیں صاف کر جائیں گے۔ تمہارے خاندان سمیت۔ ورنہ انجام دے جائیں گے۔ سائن کے انجام سے سبق سیکھو۔ وہ بڑا ایمان دار اور فرض شناس بنتا تھا اس لئے اس کا حشر خراب ہوا..."

میں دس منٹ بولتا رہا۔ مقصد حوالدار کو دہشت زدہ کر کے اس کا حوصلہ ختم کرنا تھا۔ تاکہ وہ رہائی پانے کے بعد بھی خاموش رہے اور ہمارے خلاف کسی کارروائی میں فریق نہ ہو۔ پھر میں واپس لوٹ آیا۔ میں نے رابعہ کا ہاتھ پکڑا اور دبے پاؤں وہاں سے نکل آیا۔ حوالات میں دونوں قیدی یہی سمجھے ہوں گے کہ میں سائن کی واپسی کے انتظار میں وہیں موجود ہوں۔ معلوم نہیں کب تک انہوں نے انتظار کیا ہوگا کہ سائن کے قتل کئے جانے کی آوازیں سنائی دیں گی... اور معلوم نہیں کب انہیں قید کی اذیت سے نجات ملی ہوگی۔

باہر آتے ہی میں نے دیکھا تو غالب کے ساتھ نازو اور گلو بھی وہ دونوں کسی خیمے کی پناہ میں پہنچ چکے تھے۔ میری خواہش بھی یہی تھی کہ جتنا جلد ممکن ہو ہم سب اس جگہ سے دور چلے جائیں۔ ...گرد و نواح کے سارے علاقے میں شکاری ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ گزشتہ رات ہماری کارروائی سے دلاور اور تریوٹی کو بہت بڑا مالی صدمہ اٹھانا پڑا تھا۔ وہ اب کاروباری شریک اور ہمارے ایک سے دشمن تھے۔ یہاں دلاور کی اصل طاقت تریوٹی بن گیا تھا جس کی بستی میں وہی پوزیشن تھی جو [illegible] دلاور کی تھی۔ تریوٹی کے وسائل' اس کے تعلقات اور اس کے آدمی دلاور کی مدد کر رہے تھے۔ جتنے لوگ اس ایک رات میں مارے گئے تھے اس کے بعد پولیس کے پاس ان [illegible] گروہوں کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائی کرنے کا [illegible] ...ابھی تک پولیس در پردہ تریوٹی کو پورا تعاون فراہم [illegible] لیکن آج کے بعد پولیس کے ساتھ سرا فورسانی کے [illegible] حرکت میں آ جانا یقینی تھا۔ ان خبروں کی اشاعت کے بعد پولیس اور پبلک کا پولیس کمشنر اور صوبائی وزارت داخلہ [illegible] پڑھے گا تو وہ اسلحے کے اس ذخیرے کی تباہی اور اس [illegible] کے اسباب کی پردہ پوشی نہیں کر سکیں گے۔ انہیں بتانا پڑے گا اسلحہ کس کا تھا' کہاں سے آیا تھا' اس مندر کے ساتھ [illegible] خانے میں کیوں اکٹھا کیا گیا تھا اور اسے تباہ کرنے والے کون [illegible] اسلحہ جمع کرنے والے اسمگلر تھے تو وہ کس کے آلہ کار تھے انہوں نے یہ اسلحہ کس سے حاصل کیا تھا اور ان کے مقاصد [illegible] تھے؟ کیا وہ ملکی سالمیت کے خلاف کسی سازش میں مصروف [illegible] اور اگر اس میں کوئی بیرونی ہاتھ تھا تو اس سے جانب سے اب [illegible] وزارت داخلہ کیوں بے خبر رہی.... اس کارروائی کو [illegible] کسی گروہ سے منسوب کر کے ختم کرنا مشکل تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ شام تک سرکاری سطح پر کوئی بیان جاری ہونے کے بعد بڑی کارروائی ہوگی۔ اس سے پہلے بھی [illegible] دوسرے شہروں سے صحافی اور فوٹوگرافر پہنچنے شروع ہو جائیں [illegible] اور اس کے بعد ہمارا یہاں سے نکلنا زیادہ مشکل ہو جاتا [illegible] ہو سکتا تھا کہ اس خونریزی اور تباہی کے اسباب کا جائزہ لینے کے لئے دفاعی ماہرین آ جائیں اور یہ سارا معاملہ پولیس کے ہاتھ سے نکل کے ملٹری کی انٹیلی جنس تک پہنچ جائے یا پھر دونوں کا مشترکہ آپریشن شروع ہو۔ ہنگامہ بڑھے تو تحقیقات کے لئے کمیشن [illegible] کر دیا جائے جس کے سامنے سارے شواہد آ جائیں۔ [illegible] سائن کا بیان بھی لیں گے اور حوالدار کا بھی۔ رمانا' نازو کا بھی' بالک رام کے گاؤں میں مرنے والے سب لوگوں کے [illegible] بھی۔

ہر صورت میں اگر اس سے ہمارے لئے خطرات بڑھے تو خود تریوٹی اور دلاور کے لئے بھی مسائل کھڑے ہو گئے [illegible] انہیں فکر ہوگی کہ کہیں تحقیقات کی لپیٹ میں وہ خود نہ آ جائیں۔ وہ اپنے کاروبار کی پردہ پوشی پر مجبور ہوں گے [illegible] کریں گے کہ تحقیقات رکوا دیں یا کم سے کم اس کا رخ [illegible] دیں۔ انہیں اپنے کارندوں کو خبردار کرنا ہوگا کہ وہ فی الحال [illegible] سرگرمیاں معطل رکھیں اور اپنے سارے ٹھکانے بدل [illegible] پرانے اڈوں کو خالی کر دیں اور اسلحے کی ترسیل کو فوراً روک دیں' جب تک یہ معاملہ دب نہیں جاتا۔ ہر خیال [illegible]

[illegible] کو بھی اپنی آنکھیں [illegible] بھول [illegible] کے بعد [illegible] شوق کی چوٹی ہیں [illegible] قریب والوں کی [illegible] تک محدود ہو جاتی ہیں اور جب لوگ یہ بات بھول جاتے [illegible] سامنے میں الجھ جاتے ہیں تو پیشن خود سو جاتے [illegible] جاتا ہے۔ زندگی کے سارے کاروبار پھر اسی طرح چلتے [illegible]

[illegible] نے رابعہ کے ساتھ ابھی نصف فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ [illegible] خدشات درست ثابت ہونے لگے۔ میں نے دور سے موٹر سائیکل کو دیکھا جو گرد اڑاتی شور مچاتی سیدھی میری [illegible] آ رہی تھی۔ جب فاصلہ سو دو سو گز رہ گیا تو میں نے جانے سے [illegible] اخباری نمائندہ نظر آنے والے کو پہچان لیا۔

"[illegible] کچھ بھی سوال کرے۔ تم جواب مت دینا" رابعہ نے کہا۔

"کس کی بات کر رہی ہو؟" میں نے انجان بن کے کہا۔

"[illegible] آ رہا ہے' دیکھتے نہیں اس کے گلے میں کیمرہ ہے۔ [illegible] پولیس میں سمجھ کے بات ضرور کرے گا" رابعہ نے کہا۔

موٹر سائیکل میرے قریب آ کے رک گئی۔ گرد آلود پریشان [illegible] والے شخص نے دھوپ کا چشمہ اتار کے شیشوں پر پھونک [illegible] اور بولا "تم کچھ بتا سکتے ہو یہ کیا چکر ہے؟"

میں نے حیران ہو کے کہا "مجھے تو کوئی چکر نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"اچھا مجھے چکر دیتے ہو" وہ مجھے گھور کے بولا "میں لوٹنگ [illegible] رپورٹر ہوں۔"

"پھر میں کیا کروں' میں اس علاقے کا رہنے والا نہیں ہوں۔"

"پھر یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ بند ہو جانے والی موٹر سائیکل [illegible] لگا کے بولا۔

"اپنی بیوی کے میکے جا رہا ہوں" میں نے کہا "راستے میں تو [illegible] ایسے ہی سوال کرتا ہے عجیب و غریب۔"

"کیا تمہیں واقعی نہیں معلوم؟"

"کیا نہیں معلوم؟"

"کہ کل رات یہاں دہشت گردوں کا ایک گروہ پکڑا گیا [illegible] انہوں نے بہت زبردست تباہی پھیلائی ہے..."

"دہشت گرد' یہاں!"

"ہاں۔ میں دیکھ کے آیا ہوں' بہت بڑا اسلحے کا ذخیرہ تھا۔ [illegible] خود انہوں نے فرار ہونے سے پہلے تباہ کر دیا۔ کوئی [illegible] گروہ تھے جن کے درمیان رات بھر لڑائی ہوئی۔ [illegible] مارے گئے اور کتنے بچ کر نکل گئے۔ خیر' کچھ اندازہ ہے [illegible] کہاں ہے؟"

"[illegible] کسی نے کہہ دیا کہ یہاں تھانہ ہے۔"

"[illegible] پتا چلا تھا کہ ایک دہشت گرد پکڑا گیا۔ وہ یہاں لاک اپ میں بند ہے۔"

[illegible] نے کہا "یہاں لاک اپ کیسے ہوگا جب تھانہ چوکی کچھ بھی نہیں ہے۔"

اس نے مایوسی سے سر ہلایا "افواہیں بھی تو بہت پھیلاتے ہیں لوگ' خواہ مخواہ میرا وقت ضائع ہوا۔"

اس نے موٹر سائیکل موڑنے سے پہلے رابعہ کو گھور کے دیکھا جو منہ پھیرے کھڑی تھی۔ پھر وہ شہدوں کی طرح میری طرف دیکھ کے مسکرایا اور مجھے آنکھ مار کے ہوا ہو گیا۔

"شہدے لفنگے" میں نے چلا کے کہا۔ جواب میں مجھے اس کا قہقہہ سنائی دیا۔ موٹر سائیکل دھول اڑاتی واپس ہو گئی۔

"اس وقت بال بال بچے" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "کسی دن پولیس چوکی پہنچ جاتا تو سارا بھید کھل جاتا۔ حوالدار اور حوالات کا نگران رہا ہوتے ہی اسے ہمارے متعلق بتا دیتے۔"

"مشکل ہے۔ تم نے انہیں اتنا ڈرا دیا تھا۔"

"پھر بھی کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ان لوگوں پر۔ اخباری نمائندے کو دیکھتے ہی وہ شیر ہو جاتا۔ اور اخباری نمائندہ اسے فوراً بتا دیتا کہ ہم دونوں کس طرف جا رہے تھے اور ابھی کہاں گئے تھے۔"

"جیسے ہی اسے یہ معلوم ہوگا کہ وہ افواہ نہیں تھی بلکہ اسے ایک پولیس والے نے گمراہ کیا تھا' وہ واپس آئے گا۔"

"آنے دو یار۔ وہ کیا اور بھی بہت لوگ آئیں گے' اتنا عظیم کارنامہ سر انجام دیا ہے ہم نے' اس کی شہرت ہوگی تو اخبار والے' پولیس والے کیسے نہیں آئیں گے لیکن فوری طور پر ہمیں تھوڑی سی مہلت مل گئی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں سے نکل جائیں۔"

"سکندر' یہ اخباری نمائندہ کہہ رہا تھا کہ ایک دہشت گرد پکڑا گیا ہے۔"

"ہاں' میں بھی حیران ہوں کہ یہ خبر اتنی جلدی شہر تک کیسے پھیل گئی۔"

"سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب کوئی دہشت گرد پکڑا ہی نہیں گیا تو یہ خبر کس نے اخبار کو دی؟" رابعہ نے کہا "کیا وہ کسی اور کی بات کر رہا تھا؟"

"پکڑا تو صرف محسن گیا تھا۔"

"اس کا کوئی ثبوت نہیں' کہیں اندراج نہیں ہے۔ ایک پولیس پارٹی نے پکڑا' انچارج نے اسے چھوڑ دیا۔ راتوں رات ایک لاکھ میں سودا ہوا اور شکاری اسے لے گئے۔ وہ خود تو خبر دے نہیں سکتے کسی کو۔"

"تم نے اچھی بال کی کھال نکالی ہے عزیزہ۔ یہ نکتہ قابل غور ہے" میں نے کہا۔

"اس سے سائن مشکل میں آ سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"مرنا حوالدار اور دوسرے منظرین کا بیان اس کے خلاف

www.paksociety.com

جائے گا سب ہی اس کے دشمن ہیں۔"

"سائمن کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر اس نے صاف انکار کردیا تو اسے جھوٹا کون ثابت کرے گا۔ وہ کہہ سکتا ہے کون چمن لال۔ یہاں تو کوئی چمن لال نہیں۔ موٹا حوالدار خود کو سچا ثابت کرنے کے لئے کیا ثبوت پیش کرے گا؟"

"کیا وہ بتائے گا نہیں کہ تھانے دار کی بہن کو اور ماں کو قتل کرنے والے چمن لال کے ساتھی تھے۔ اسے تھانے دار نے ایک لاکھ روپے وصول کرنے کے لئے اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا۔ یہ کہانی تم نے ہی سنائی تھی اسے۔"

میں نے ہنس کے کہا "اچھا ہے اگر یہ کہانی وہ دوسروں کو سنائے گا اسی سے وہ جھوٹا بنے گا۔ خود پولیس یہ بات تسلیم نہیں کرسکتی کہ سائمن نے ایک لاکھ رشوت لے کر ایک دہشت گرد اور قانون کے مجرم کو چھوڑنا منظور کیا تھا۔ اعلیٰ افسران بھی جانتے ہیں کہ سائمن کو ایمانداری کا کتنا پرانا اور ناقابل علاج مرض لاحق ہے۔ حوالدار ایسی بات کرے گا تو خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارے گا۔ ایک طرف سائمن کی ہتک عزت کا انضباطی سوال لے گا تو دوسری طرف ہماری وارننگ کو نظر انداز کرنے کا رسک لے گا۔ ہم اسے بہت اچھی طرح سمجھا چکے تھے کہ اس نے زبان بند نہ رکھی تو نتائج کا بھی خود ذمے دار ہوگا۔"

"مجھے تو محسن کا خیال آتا ہے رہ رہ کے، وہ میری وجہ سے ہی پکڑا گیا تھا۔"

"تمہاری وجہ سے کیوں؟ تم نے کوئی غلطی کی تھی؟"

"نہیں۔ صورت حال کچھ ایسی ہو گئی تھی... کہ میں پکڑی جاتی، اگر وہ نہ پکڑا جاتا۔"

"یہی تو فائدہ ہے عورت ہونے کا۔ ہر جگہ۔ لیڈیز فرسٹ اگر مرنا ہو تو جینٹس فرسٹ" میں نے کہا۔

"وہ لوگ اب محسن کو اور شملا کو نہ جانے کہاں لے جا کے رکھیں گے" رابعہ اپنے خیالوں میں خود اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔

"فکر کرنے سے کچھ نہیں ہوگا 'ملنا قسمت میں ہوگا تو ملانے کی سبیل وہ خود پیدا کرے گا۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔"

ہم اب خانہ بدوشوں کے ڈیرے سے چند قدم دور تھے۔ ڈیرا آٹھ دس بوسیدہ خیموں پر مشتمل تھا۔ یہ خیمے اتنے نیچے تھے کہ کوئی اندر جانے کے بعد سیدھا نہیں کھڑا ہو سکتا تھا۔ یہ باقاعدہ خیمے بھی نہیں تھے۔ آگے پیچھے دس فٹ کے فاصلے سے دو ڈنڈے زمین میں گاڑ کے ایک لکڑی دونوں ڈنڈوں کے اوپر باندھی گئی تھی اور اس کے اوپر سے ترپال گزار کے دونوں جانب گڑی ہوئی کھونٹیوں کے ساتھ کھینچ کر باندھ دی گئی تھی۔ چنانچہ خیمے کا نچلا حصہ تو شاید دس فٹ چوڑا تھا لیکن اوپر اس کی چوڑائی بتدریج کم ہوتی جاتی تھی۔ خیمے دونوں طرف سے بند تھے۔ دیکھنے سے معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ کس خیمے کے اندر کیا ہے۔ خیمے ایک نیم دائرے میں لگائے گئے تھے۔

ہر خیمے کے باہر ایک گدھا یا خچر فاسح کھڑا ہوا گھاس کے تنکے سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور یقیناً ہم سے زیادہ مطمئن اور بے فکر تھا۔ دیگر ذرائع نقل و حمل میں دو بیل گاڑیاں تھیں جن کے اوپر گول چھت تھی۔ کھینچنے والے دونوں بیل غائب تھے اور وہیں آمنے سامنے بیٹھے جگالی کے مقابلے میں مصروف تھے۔ ایک بوڑھی عورت، ایک جوان عورت اور دو بچے خیموں کے باہر ساکت و صامت کھڑے ہمیں خوفزدہ اور کینہ پرور نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

رابعہ نے کہا "معلوم نہیں وہ کس خیمے میں گھس کر بیٹھ گئے ہیں۔"

"ابھی معلوم ہو جائے گا" میں نے اسے تسلی دی۔

درمیان والے بڑے خیمے سے ایک بوڑھا باہر آیا۔ اس کے سر کے چاروں طرف لمبے لمبے بالوں کی جھالر تھی۔ اس کی سفید مونچھیں لمبی اور کناروں پر ایسے پھیلی ہوئی تھیں کہ گویا اس نے ہونٹوں پر بورڈ لگا رکھا ہے۔ بالوں کی سفیدی سے اس کی عمر کا اندازہ ساٹھ برس ہوتا تھا مگر اس کی جسمانی صحت بہت سے جوانوں سے بہتر تھی۔ وہ اوپر ایک واسکٹ اور نیچے تہبند باندھے ہوئے تھا جو چوڑی دار پاجامے کی طرح اس کی ٹانگوں پر فٹ تھا مگر گھٹنوں سے ذرا نیچے ہی ختم ہو جاتا تھا۔

میں نے مسکرا کے رابعہ سے کہا "یہ سردار ہے۔"

یہ بات سن کے وہ خوش ہوا اور دانت نکالتا ہوا آگے آیا۔ اس نے کسی تکلف کے بغیر رابعہ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس سے چند ثانیے کے بعد مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جذبات کے اس مظاہرے میں اس کے بوسے نہیں ہوا۔ اس کے جسم سے کڑوے تیل، سڑی ہوئی مچھلی اور گندے انڈوں کی ملی جلی بو آ رہی تھی۔ میں نے اسے مسکراتے ہوئے برداشت کیا۔

"میں آج تک کسی وردی والے سے گلے نہیں ملا تھا" اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

"میں بھی کسی جپسی سردار کو گلے لگانے کے اعزاز سے آج تک محروم تھا" میں نے کہا۔

"ہم اور تم دوست ہیں" اس نے میرے سینے پر انگلی رکھ کے کہا۔

میں نے دل ہی دل میں کہا کہ ہاں 'جیب سب سے بڑا اور پکا رشتہ قائم کرتا ہے' لیکن زبان سے میں نے کہا "ہم لنگوٹیے یار ہیں" اور اس کی بے تکلفی کا جواب اس کے مذاق سے سینے پر ہاتھ مار کے دیا اور زور سے ہنسا۔

سردار کے حلق سے "ہیچ" جیسی آواز آئی اور کسی کے اں

دلیلی۔ اس کی اور سہلانے لگا۔ وہ اردو بھی پچیس فی صد الفاظ نیم جناتی زبان کے ملا کے بولتا تھا۔ اب اس نے سو فی صد جناتی زبان میں کچھ کہا جو یقیناً کوئی گالی تھی۔

"ہمارا دوست آیا ہے یہاں۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا اور دو انگلیاں اٹھا کے کہا "دو پولیس والا۔"

شملا نے وضاحت اور تردید کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔ "تم سب لوگ مجھے ان کے پاس لے چلو۔"

اس نے سر ہلایا اور ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے مڑ کر رابعہ کی طرف دیکھا اور بولا "بیوی اُدھر۔" اس نے بڑے خیمے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں نے اس میں جھانک کر دیکھا تو مجھے گل اور نازو نظر آئیں۔ گل زمین پر بچھے ہوئے میلے سے کالے ہونے والے چیتھڑوں سے بنے ہوئے بستر پر دراز تھی۔ نازو اس کے پاس چپ چاپ اور اداس بیٹھی تھی۔ خیمہ عجیب و غریب فضول سامان سے بھرا پڑا تھا۔

رابعہ نے اندر جا کے کہا "کیا ہوا نازو؟"

"ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ہوا" اس نے گل کی طرف دیکھ کے کہا "ان کے پاس بخار کا کوئی علاج ضرور ہے لیکن ابھی شروع نہیں ہوا۔"

"دیر کس بات کی ہے؟" میں نے کہا۔

"غالب کے اور سردار کے مذاکرات جاری ہیں" نازو نے کہا "خود سردار ہی ڈاکٹر بھی ہے۔"

"سردار!" میں نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے شخص کی طرف دیکھ کے کہا "کیا یہ سردار نہیں ہے؟"

نازو نے کہا "نہیں، وہ تو اسی سال کا بوڑھا ہے۔ یہ کچھ بھائی ہے۔"

"میرا باپ" مجھ سے گلے ملنے والے نے شرمندہ ہوئے بغیر کہا۔

"اچھا تو آپ ولی عہد بہادر ہیں" میں نے کہا "مستقبل کے سردار۔"

"پرنس آف ویلز" رابعہ نے کہا۔

خود کو سردار بتانے والے نے پھر اسی جناتی زبان میں کچھ کہا اور بولا "آؤ۔"

میں نے اس کی دعوت کو نظر انداز کرتے ہوئے نازو سے کہا "کیا پتا ہے ان لوگوں کا؟"

"بالکل غیر مہذب ہیں" نازو نے کہا "دیکھ لو ہم اکیلے بیٹھے ہیں لیکن ابھی تک کسی نے جھانک کر نہیں دیکھا۔"

"یہ معاملہ قبائلی ڈسپلن کا مسئلہ ہے۔ سردار کے ساتھ معاہدہ طے ہونے سے پہلے دوستی کا مظاہرہ سرکشی سمجھا جاتا ہو گا۔"

رابعہ بولی "تم نے تو اعلان کر دیا تھا کہ لنگوٹیے ہو۔"

میں نے مسکرا کے کہا "ہماری بات اور ہے۔ ہم دونوں سردار ہیں۔ چلو سردار جی، دیکھ لیتے ہیں تمہارے باپ کو بھی۔"

اصلی بڑا سردار صرف لنگوٹی باندھے فرش خاک پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا اور ایک بلائی شخص تھا۔ اس کی آنکھیں لال بوٹی تھیں۔ وہ چلم میں ڈال کے کچھ پی رہا تھا۔ یہ اسی کا اثر تھا۔ وہ حیرت انگیز طور پر اپنے ولی عہد سے مشابہ تھا۔ ایک سی بالوں کی سفید جھالر اور ایک سی بورڈ ٹائپ مونچھیں 'فرق صرف عمر کا تھا... اور مزاج کا۔ سردار نرم مزاج اور خوش اخلاق آدمی تھا۔ اس خیمے میں بھی کاٹھ کباڑ کی کمی نہ تھی۔

غالب اس کے سامنے اسی پوز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بھی وہیں تشریف رکھنے کی دعوت دی۔

"کیا نتیجہ رہا مذاکرات کا؟" میں نے کہا۔

"ابھی مذاکرات شروع ہی نہیں ہوئے" غالب نے دانت نکال کے بتایا۔

"اتنی دیر سے تم ایک دوسرے کو گھور رہے ہو بس؟"

"ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے" سردار نے کہا اور چلم میری طرف بڑھائی۔

میں نے معذرت کے بعد کہا "سردار، ہمیں مدد کی ضرورت ہے۔"

"کیا تم جیل سے بھاگے ہو؟ یا کسی کو قتل کر کے آئے ہو؟" سردار نے کہا۔

میں نے کہا "کیا اور کوئی سبب نہیں ہو سکتا۔"

سردار کی گفتگو میں بھی جناتی زبان کے الفاظ آتے تھے لیکن ان کا تناسب دس فی صد بھی نہیں تھا۔ اس نے ولی عہد بہادر کو دفع ہو جانے کا حکم اپنی قادری زبان میں دیا۔

سردار بولا "اگر تم مجرم ہو تو ہم تمہاری نہیں پولیس کی مدد کریں گے۔"

میں نے اس قانون پرست 'فرض شناس شہری کی طرف دیکھ کے غالب کی طرف دیکھا۔ بظاہر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم آسمان سے گرے تو کھجور میں اٹکے تھے اور کھجور سے گرے تو دلدل میں اتر گئے ہیں۔ تاہم ابھی مایوسی کا اظہار قبل از وقت تھا۔

میں نے کہا "ہم مجرم نہیں ہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تم پولیس والے بھی نہیں ہو۔ پھر کیا چکر ہے؟ اس کی ایک بیوی کو گولی لگی ہے۔ ضرور تم نے کسی پولیس والے کو قتل کیا ہو گا۔ اس کی گولی سے عورت کو زخم آیا۔ پھر تم نے اسے مار کے وردی اتار لی۔"

میں نے کہا "سردار، خواہ مخواہ کی باتیں فرض مت کرو۔ ہم جھوٹ نہیں بولتے۔"

"سب مجرم یہی کہتے ہیں" اس نے چلم کا کش لے کر کہا۔

"لعنت مجرم پر" میں نے بدمزگی سے کہا "ہم تمہیں نقد رقم

www.paksociety.com

بن کے ۔ تم سے ملت … نہیں … ہیں ہم ۔"

ایک ہم سردار کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کی صورت سے پشیمانی اتر آئی تھی "تم یہ … تمہارے … ؟"

"ہمارے پاس جتنا … سب تم کو نہیں دے سکتے … تم … نا ہونا چاہئے … نہیں … "

سردار نے میری بات پر … "… "

میں نے کہا "ایک … "

[illegible]

مجھے اس چالاک عورت سے … کی ایک خواہش پوری نہ کی … کہ وہ … چاہتی تھی … اسے دولت کی آرزو تھی اور وہ اور … بھی تھی چنانچہ اس نے دریا کو کوزے میں بند کرتے ہوئے اپنی خواہش ایک خاص کی کہ میں ہڈیوں اور پوشاک کو دولت میں … دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"مجھے مستقبل کی کیا پتا نہیں تھا مگر سردار کے رویئے نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں بھی دریا ہے کسی اسے کوزے میں بند کر دوں۔

میں نے کہا "سردار اپنے … مطالبات واپس۔"

چالاک سردار نے میری امید … پر پانی پھیر دیا "وہ سودا تو ہو گیا ہے … تم زبان دے کر پھر گئے نہیں۔"

"اچھا تو آخری بات یہ ہے کہ جہاں ہم کہیں وہاں ہمیں حفاظت کے ساتھ پہنچا دو" میں نے کہا۔

"دس ہزار روپے" سردار نے کوزہ توڑ کے دریا پھر بہا دیا۔

"ٹھیک ہے چودہ ہزار میں تم نے ٹھیکا لے لیا ہے" میں نے جھلا کے کہا۔

"ابھی تم سے بات ہوئی ہے اب اس سے ہو گی" اس نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔

سردار بہت عیار اور مکار آدمی تھا۔ اس نے تاڑ لیا تھا کہ ہمارے پاس پیسہ بہت ہے اور ہم مجبور بھی ہیں۔ چنانچہ وہ قدرت کے دیئے ہوئے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانے پر کمربستہ تھا لیکن مشتعل ہو کے ہمارا بنا بنایا کام بگڑ سکتا تھا "کیا ہر عورت بھی الگ معاہدہ کرے گی؟" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "بیوی کی بات شوہر کرتا ہے اس کی دو بیویاں ہیں۔"

"یعنی … میں اٹھائیس ہزار دوں؟" غالب نے چراغ پا ہو کے کہا۔

"… " غالب نے … "

[illegible]

"… " غالب نے کہا "یہ کسی دو بیوں … "

ولی محمد بہادر کو ہم سے جو … اور … نظر لگائے …۔ وہ … رات کی ساری کارروائی چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ … خطرناک اور کینہ پرور تھا۔ وہ … صاحب کا چالیس ہزار کا سودا کرتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی لالچ کی چمک آ گئی تھی۔ اس کے خیالات کا … اس کی صورت سے پڑھا جا سکتا تھا۔ وہ یقیناً فیصلہ کر چکا تھا کہ ہم سے اپنا حصہ الگ وصول کرے گا۔ وہ ہمیں بلیک میل کر سکتا تھا۔

لیڈیز کیمپ تک ہماری راہنمائی کرتے ہوئے اس نے کوئی بات نہیں کی اور بڑے معاندانہ طریقے پر مسکرا تا رہا … بھی جواب میں مسکرا کے اسے دھوکا دیتا رہا۔ ہم دونوں منافقت کر رہے تھے اور یہ بات جانتے تھے۔ جب وہ ہمارے ساتھ خیمے میں داخل ہونے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ بتانا ضروری نہیں تھا۔

ہمارے پاس جتنی رقم تھی اس میں سے کچھ مرحوم کو مان کے پاس رہ گئی تھی کچھ محسن کے پاس تھی …، … نظر آنے والا کلام لے گیا تھا۔ جو رقم ہمارے پاس تھی اس میں سے راما رائو نے اپنا حصہ وصول کر لیا تھا۔ اب تو ساڑھے چار لاکھ میں سے اڑھائی لاکھ کے قریب بچے تھے۔ نصف رقم میرے پاس تھی اور میرا کمر کے گرد کپڑے کی پیٹی میں لپیٹی ہوئی تھی … نے رکھی تھی۔

نازو نے بے چینی سے پوچھا "کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا سودا ہو گیا" غالب نے کہا "چالیس ہزار میں۔"

"چالیس ہزار!" رابعہ نے بے یقینی سے کہا۔

"چودہ ہزار اس کے" غالب نے … کہا۔

تو اب ایک بھوت ہیں" غالب نے جل کے کہا "تمہارے ابا کو کچھ نہیں کہہ رہا۔ دل میں بھتنی" اور فوراً کھسک گیا۔

رابعہ نے کہا "دیکھو جلدی سے بات ختم کرو۔"

ایک بار پھر ہم اصل سے وڈے سردار کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس نے رقم شمار کی اور پھر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ باری باری اس نے مجھے اور غالب کو گلے لگایا اور چوما۔ اس نے بھی وہی پر قیوم لگا رکھی تھی جو ولی محمد نے۔

اس نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ اب ہمارے لئے پریشانی کی کوئی بات نہیں رہی کیونکہ وہ ہماری ذمے داری قبول کر چکا ہے اور اب ہم پر لازم ہے کہ اپنے سارے معاملات اس پر چھوڑتے ہوئے اس کے احکامات کی اسی طرح تعمیل کریں جیسے اس کے قبیلے کے لوگ کرتے ہیں۔

خیمے سے باہر آ کے اس نے مقامی زبان میں کوئی اعلان نشر کیا۔ اس سے حالات ایک دم بدل گئے۔ خاموشی اور تناؤ نظر آنے والے خیموں میں … [illegible]

[illegible]

… کا یہ … اس میں … نہیں … انوکھی نہیں تھی … عام طور پر ان کی صحت اچھی نہیں تھی … ان کے چہرے … اور … لگتے تھے … بچے سب … عالم کی … تھی۔ جوان عورتیں بوڑھی لگتی تھیں بوڑھی قریب المرگ دکھائی دیتی تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس قبیلے میں صرف شیر خوار بچے تھے۔ زیادہ سے زیادہ چار پانچ سال کی عمر کے۔ پانچ سے پندرہ سولہ کی عمر کے لڑکے لڑکیاں مجھے بالکل نظر نہیں آئے۔

جب یہ بھان متی کا کنبہ ہمارے گرد جمع ہو گیا تو سردار نے

… اس کی ایک بیوی ہے۔ اٹھائیس ہزار دو بیویوں والے … کے ساتھ رابعہ بھی ہنس پڑی۔ باہر سے ولی محمد نے … انگریزی میں کہا "مرزا اس شخص سے ہوشیار رہنا" غالب نے سر ہلایا "یہ ایک کوبرا سانپ ہے۔"

"اس کی آنکھوں میں لالچ اور ہوس کی چمک دیکھی تم نے؟"

"میری ایک بیوی کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا اس نے … کر دوں گا۔ دونوں پر بری نظر ڈالی تو اندھا ہو جائے … بیوی کی بچے تنال" غالب نے نازو کو ڈانٹا۔

"میں ان لوگوں کے سامنے …" نازو نے بگڑ کے کہا۔

"ارے بے وقوف ہم نے تو کہا ہے کہ ہم زر خرید ہیں اور … اور سردار کی رائے تمہارے بارے میں بہت خراب … نے کہا "کہ بہو تھا روپ مرنے کی بات ہے بیوی کے … "

[illegible]

… نازو اور رابعہ … ہنس رہی تھیں۔

… ہے اندر کون ندر خرید ہے تو بتا دو" کس نے … غالب کے جوڑے کئے

… یہ دونوں صفات میرے مرحوم مستر علی تھیر

www.paksociety.com

ایک اور اعلان کیا۔ ان سب کی نظریں مجھ پر اور غالب پر جم گئیں۔ مجھے ان کی آنکھوں میں ناپسندیدگی کے جذبات کا عکس واضح نظر آیا۔ دونوں گنجے تو باقاعدہ شکل بگاڑ کے خاموش احتجاج میں مصروف تھے۔ وہ دونوں گنجے اس قبیلے کے نازنین سمجھے جاسکتے تھے۔ ان کے قد اونٹ جیسے اور جسم ہاتھی کی طرح تھے اور وہ اپنی شہزوری کو مشتہر بھی کرتے تھے۔ سرمنڈوانا بھی اسی پبلسٹی کا ایک حصہ تھا۔ انہوں نے لمبے نیکر یا چھوٹی پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ درحقیقت یہ پاجامے تھے جو گھٹنوں سے ذرا نیچے ختم ہو جاتے تھے... اوپر وہ صرف واسکٹ پہنے ہوئے تھے مگر اس کے سارے بٹن کھول کے وہ اپنے چٹان جیسے سینوں کی چوڑائی نمایاں کررہے تھے اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کے بیر بہادر کے کھڑے ہوتے وقت اپنے بازوؤں کی مچھلیوں کو بڑے فخر سے اچھالتے تھے۔

اعلان ختم ہوا تو اجتماع منتشر ہو گیا۔ میں نے سردار سے بچوں کی عدم موجودگی کے بارے میں سوال کیا تو اس نے سوچ کے جواب دیا اور کہا کہ وہ دنیا کو دان پن کا موقع فراہم کرنے کے لئے جاتے ہیں اور لوگوں کو خصوصاً گنہگار اور حاجت مند لوگوں کو انہی کے طفیل نیکی کا ثواب ملتا ہے اور اس کے بدلے میں لوگ وہ چیز دیتے ہیں جو ہاتھ کا میل ہے۔ سیدھے سادے اور سہل الفاظ میں... وہ بھیک مانگنے گئے ہوئے تھے۔

"باقی لوگ کیا کرتے ہیں؟"

"کام کرتے ہیں" سردار نے گول مول جواب دیا۔

"کیا کام کرتے ہیں؟"

"جو بھی مل جائے" اس نے جرح سے اکتا کے کہا "تم اب چلو میں تمہاری بیوی کو دوا دوں گا۔"

اس نے خیمے میں گل کے پاس بیٹھ کے گل کا معائنہ کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح کیا۔ اس کی آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ ناخن دیکھے دو پیروں کے تلوے ملاحظہ کئے۔

"یہ ٹھیک ہو جائے گی" اس نے کہا "پانچ سو روپے۔"

میں نے اسے گالی دینے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ اگر میں بمبئی کے سول سرجن کو لے کر آتا تو وہ شاید دو سو روپے بھی نہ مانگتا۔ مجھے اس کے علاج کی کامیابی بھی مشکوک لگتی تھی لیکن یہاں نہ کوئی اسپتال تھا نہ کیمسٹ۔ خود ہمارے پاس کوئی اینٹی بایوٹک دوا ہوتی تو میں ہرگز اسے اپنی ڈاکٹری نہ کرنے دیتا لیکن اب مجبوری کی شکل تھی۔ کچھ نہ کرنے سے بہتر تھا کہ اس قبائلی ڈاکٹر کو اپنی طبابت سے کچھ کرنے کا موقع دیا جائے۔

نازو نے اسے پانچ سو روپے پکڑا دیے تو وہ باہر چلا گیا۔

میں نے بے بسی سے کہا "ہم اس کے رحم و کرم پر ہیں۔ کہیں ہم نہ مارے جائیں اس لئے غصہ ٹھیک نہیں۔"

"یہ کیسے علاج کرے گا؟ وہی افریقی جادوگروں والے نسخے؟ الو کے کان لومڑی کی آنکھ اور چھپکلی کی دُم..."

"جب ہم کچھ نہیں کرسکتے تو وہ جو چاہے کرے" رابعہ نے کہا۔

"اور اگر... گل کو کچھ ہوا..."

"تو ہم پورے قبیلے سے نمٹ لیں گے۔ لیکن ان لوگوں کا اپنا ایک تجربہ ہے۔ یہ جڑی بوٹیاں استعمال کرتے آئے ہیں تمہارا باپ دادا کے صدیوں کے نسخوں پر قائم ہیں۔ میڈیکل سائنس پہلے بیماری پیدا کرتی ہے پھر اس کی دوا۔ پھر دوا کے ذیلی اثرات کی بیماریاں ہوتی ہیں اور ان کی دوا الگ اور ہر بیماری کے ساتھ اس کے علاج کا اسپیشلسٹ الگ..."

میں نے بھنا کے کہا "کیوں نہ اس بڈھے کو ڈاکٹر بنا کر ایلچی سرو سے بناوا جائے سب خرابیاں ٹھیک ہو جائیں گی۔"

نازو نے کہا "یہ مجھے شریف لوگ نہیں لگتے۔"

"ان کو ہم شریف لوگ نہیں لگتے" غالب نے ایک منطق اور فلسفیانہ سچائی بیان کی "زمین سے چاند اوپر لگتا ہے، چاند سے زمین۔ مگر نیچے کون ہے؟"

"ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ صرف پیسے کے لالچ میں ہماری مدد کررہے ہیں" میں نے کہا۔

"جب تک پیسہ ہے ہم پھینکتے رہیں گے۔ کتے کے سامنے ہڈی ڈالتے رہو تاکہ وہ خاموش رہے۔ اگر پھر بھی کوئے ! کوشش کرے گا تو گولی ماردیں گے۔"

"یہ لوگ لالچ میں ہماری جان کے دشمن ہو سکتے ہیں تو نیت خراب ہو جائے تو..."

"کیوں پریشان ہو رہا ہے ابھی سے یار" آخر ہم سب کے ریوالور بھرے ہوئے ہیں۔ ابھی انہیں معلوم نہیں لیکن ہم تو جانتے ہیں۔ ایک ایک کو چن چن کر ماردیں گے۔"

غالب کی باتوں نے میری پریشانی کو وقتی طور پر دور کردیا۔ کچھ میں مصروف عورتیں بار بار ہماری طرف دیکھ کے کوئی بات کہتی تھیں اور پھر ہنسنے لگتی تھیں۔ سردار نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تو مجھے بھوک لگ رہی تھی اور شاید دوسروں کی حالت بھی مختلف نہ تھی لیکن یہاں کوئی کھانے کو پوچھنے والا نہیں تھا۔

اچانک سردار ایک خیمے سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ پر ایک پیالہ تھا اور ایک بالٹی۔ گل کے پاس بیٹھ کے اس نے زخم کو بالٹی کے گرم پانی سے دھونا شروع کیا۔ پانی کا عجیب سا رنگ تھا اور اس میں سے جنے کے پانی جیسی بو آرہی تھی۔ میں اور غالب اس کارروائی کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔

زخم کو خشک کرنے کے بعد اس نے پیالے میں سے کوئی دوا اس پر لگا کے پٹی باندھ دی۔ پیالے کی آدھی دوا اس لیپ کو استعمال ہوگئی تھی۔ باقی دوا میں اس نے بالٹی والا پانی ملایا اور اسے اتنا چلایا کہ وہ ایک مکسچر بن گئی۔

"اس کو پلادو۔ تھوڑا تھوڑا۔"

"یہ ابھی دوا لگائی تھی وہی پلادیں" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ایک ایک ہی چیز پلاتے رہو" اس نے کہا "یہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "ہمیں کھانے کو کچھ ملے گا؟"

"ملے گا ایک آدمی کا سو روپے۔"

"ایک وقت کے کھانے کا!" میں نے چلا کے کہا۔ "کیا ہزار؟"

"اس میں کھانا شامل نہیں ہے۔ وہ تم کو یہاں سے نکالنے داری کا معاوضہ ہے۔"

"یہ جادو کہ یہاں اور کس کس چیز کے پیسے الگ ہوں گے" میں نے کہا۔

"جانیں گے" اس نے متانت سے کہا اور باہر چلا گیا۔ نہیں ہو گیا کیونکہ نازو اسے مزید پانچ سو روپے دے چکی تھی۔ اب وہ گل کو پانچ سو روپے والا مکسچر پلا رہی تھی۔ باہر کو جھانکنے کے لئے میں نے خیمے سے باہر جھانکا۔

"یہ تو ہمیں اکھاڑ رہے ہیں" میں نے کہا "کچھ کی تیاری ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے، ہمارے یہاں رکنے میں خطرہ ہے" غالب نے کہا۔

وہ لگ بھگ پانچ منٹ بعد نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے دو عورتیں تھیں۔ ایک نے دھڑ سے ہمارے سامنے چاولوں کی دیگچی رکھی دوسری نے دال کی پتیلی۔ وہی عورت نے ایک کھڑے کی طرف اشارہ کیا۔ سب واک آؤٹ کر گئے۔

"یہ پانچ سو روپے کا لنچ ہے" میں نے سر پکڑ کے کہا۔

"سو روپے پر ہیڈ میں یہاں اور کچھ نہیں مل سکتا" رابعہ نے کہا۔

"اور پلیٹ نہ چمچہ! کیا ہم براہ راست دیگچی میں منہ ڈال کے کھائیں گے؟" غالب نے کہا۔

"خدا نے ہاتھ کس لئے دیئے ہیں" نازو نے کہا۔

"ہم تو پوچھ رہی ہو۔ ہاتھوں کا جو استعمال تم کررہی ہو وہ اس" غالب نے کہا۔

رابعہ نے ایک دیگچی کے ڈھکنے میں چاول نکال کے میرے سامنے رکھے اور اس پر دال انڈیل دی "شوق فرمایئے۔"

"ایک وقت کی کوئی بات نہیں" میں نے سرد آہ بھر کے کہا "اگر یہ ہوا تو ہم بھوک اور فاقہ کشی سے ہلاکت قبول کرلیں گے۔"

غالب نے میرے ساتھ شامل ہوتے ہوئے کہا "حد ہے یہ کیا مہمان کے ساتھ تو چور ڈاکو بھی اچھا سلوک کرتے ہیں۔"

"ہم مہمان نہیں ہیں" نازو نے کہا "ان کے نزدیک ہم مجرم ہیں چنانچہ وہ ہمارے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کررہے ہیں۔"

رابعہ اور نازو نے دوسری دیگچی کے ڈھکنے کو استعمال کیا۔ انہوں نے دال چاول کے ملغوبے کو ہاتھ کی انگلیوں سے منہ تک لے جانے کے عمل میں مہارت کا ثبوت دیا۔ میں اور غالب مشکل میں گرفتار رہے۔ ایک بار ہم دونوں پلیٹ پر جھکے تو ہمارے سر ٹکرائے۔ ہماری انگلیاں آخر تک لتھڑ گئیں۔

غالب نے کہا "اگر ہم پلیٹ سے منہ لگا کے کھالیتے تو اچھا تھا۔"

میں نے کہا "یا پہلے چاول کھالیتے پھر دال پی لیتے۔"

"ایک اس سے بھی آسان طریقہ تھا۔ پانی جو ہم اب پئیں گے۔ اسی میں دال چاول گھول کے دو منٹ میں حلق سے اتار لیتے۔"

"عادتیں خراب ہو گئی ہیں تمہاری" رابعہ نے کہا "خدا کا شکر ادا نہیں کرتے کہ یہ بھی مل گیا۔"

"عادتیں نہیں دماغ خراب ہو گیا ہے۔ باپ دادا کیا ڈائننگ ٹیبل پر اور چمچے کانٹے سے کھاتے تھے" نازو نے کہا۔

"حد ادب گستاخ لڑکی، ہمارے آباؤ اجداد کو کچھ مت کہنا" ہم غصے میں تھر تھر کانپنے لگتے ہیں" غالب نے کہا۔

"یہ خانہ بدوش سمجھیں گے کہ شاید ڈانس کررہے ہیں" میں نے کہا۔

اچانک گل نے کہا "رابعہ باجی!"

میں اچھل پڑا۔ رابعہ مجھ سے پہلے لپکی پھر نازو اٹھی۔

"کیا ہوا گل؟" رابعہ نے اس پر جھک کے کہا۔

"مجھے پسینہ آرہا ہے پانی دیں مجھے" گل نے کہا۔

"تمہارا بخار اتر گیا ہے" رابعہ نے کہا۔

میں نے حیرانی سے غالب کی طرف دیکھا۔ صرف بیس منٹ میں اس دوا نے اثر دکھایا تھا جس کے اعجاز مسیحائی پر مجھے ذرا بھی یقین نہ تھا۔ رابعہ نے گل کو پانی پلانے سے پہلے اس جادوئی مکسچر کی ایک اور خوراک دی۔

"خوراک کا کوئی ٹائم بھی ہے" غالب نے کہا۔

رابعہ نے کہا "اس نے کہا تھا پلاتے رہو... اور یہ دوا ہی نہیں خوراک بھی ہے گل کے لئے۔"

"تمہیں کیا معلوم؟" میں نے کہا۔

"مجھے اس بڈھے نے خود بتایا تھا" رابعہ نے کہا۔

"پھر تو پانچ سو ٹھیک ہی لئے اس نے" میں نے کہا۔

سردار اسی وقت پھر آیا۔ اس نے گل کی حالت میں بہتری پر بے حد خوشی کا اظہار کیا۔

"کیا ہم جارہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں تم میرے ساتھ آؤ" اس نے مجھے اور غالب کو اشارہ کیا۔

اس نے ایک خیمے میں پہنچانے کے بعد ہمارے سامنے ایک

www.paksociety.com

بہت بڑی گٹھڑی کھول دی۔ اس میں ہر قسم کے بے ہودہ کپڑے تھے۔

"اپنے لئے لباس منتخب کرلو" اس نے اپنی نوے فیصد اردو ہندی میں کہا۔ اس کی جناتی بولی کے دس فیصد الفاظ کو سمجھنا ضروری نہیں تھا کیونکہ مطلب اس کے بغیر بھی واضح ہو جاتا تھا۔

میں نے غالب سے کہا "[illegible] آپ۔"

غالب نے کہا "ابھی نہیں [illegible] آپ کے ہوتے..."

سردار نے کہا "جلدی کرو، باقی کپڑے لے کے ادھر لے جائیں تمہاری بیویوں کے لئے۔"

میں نے کہا "اچھا تم جاؤ، پانچ دس منٹ تو لگیں گے۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس آ جائے۔"

میں نے کہا "پولیس... پولیس کہاں ہے، اور یہاں کیوں آئے گی؟"

"پولیس ہر جگہ پہنچ جاتی ہے" بڈھے نے باہر جاتے ہوئے کہا "خطرہ ہمارے لئے ہے۔"

میں نے فوراً غالب نے کپڑوں کے ڈھیر میں سے دو ایک بے ہودہ سلے کپڑے نکالنے کی کوشش کی مگر یہ کام [illegible] کپڑے تھے۔ جنھیں [illegible] قبول کرکے [illegible] میں شامل کر لیا گیا تھا۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] ایک [illegible] کرنے کا ایک [illegible]

[illegible] جوڑی اور لمبی [illegible] ایک [illegible] تھا۔ [illegible] گردن [illegible] کی کھال سے [illegible] گلے [illegible] ایک [illegible] کے [illegible] تیار [illegible] غالب مجھے دیکھ کر بہت ہنسا۔ مگر خود اس [illegible] کپڑے نکالے تھے وہ زیادہ بے ڈھنگے اور مضحکہ خیز تھے۔ اسے لائق جھنڈو جھاڑیوں والا وحشی پاجامہ مل گیا تھا۔ اس کے اوپر بغیر گلے کا جبہ تھا اور اس نے ایک لمبا ہرے رنگ کا کپڑا اپنے سر پر پگڑی کی طرح باندھ لیا تھا۔

یہ سب کپڑے میلے اور پھٹے پرانے تھے۔ ان میں نہ جانے کس کس کا میل پسینہ شامل تھا چنانچہ اب ہمارے جسموں سے بھی وہی بو اٹھ رہی تھی جو سردار اور دلی عہد کو گھیرے ہوئے تھی اور ہمیں سخت ناگوار گزری تھی۔ سردار پھر آیا تو اس نے ہمارے لباس پر اطمینان کا اظہار کیا مگر اس کا خیال تھا کہ یہ تبدیلی کافی نہیں۔ وہ ہمارے صاف ستھرے چہروں کو اور [illegible] غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے رقم کو اپنی [illegible] کے نیچے [illegible] تھا اور [illegible] اسی [illegible] کی جیب میں تھا۔

باہر اب سامان گدھوں پر لادا جا رہا تھا اور [illegible] اکھاڑے جا چکے تھے۔ سردار کو انہیں [illegible] پیش نہیں آئی تھی۔ وہ بستی بساتے اور اجاڑتے رہتے تھے۔ [illegible] شخص جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ [illegible] دیکھتے ہمارے سر کے اوپر سے بھی خیمہ غائب ہو گیا اور [illegible] آسمان کے نیچے کھڑے رہ گئے۔ پھر ایک بوڑھی عورت [illegible] اس نے ہمیں بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک [illegible] اور دو رنگ [illegible] ڈبے تھے۔ [illegible] میں سرسوں کا تیل [illegible] نے میرے چہرے، گردن اور ہاتھوں کے علاوہ [illegible] پر چپڑ دیا۔ اس نے رنگ والے ڈبوں میں سے بھی [illegible] شامل کیا تھا۔ جب یہی عمل غالب کے ساتھ ہوا تو [illegible] کی جلد کی رنگت کو بدل دیا تھا۔ ہمارا صاف [illegible] ہو گیا تھا اور اب ہم اسی قبیلے کے [illegible] ہو گئے تھے۔

[illegible]

"[illegible] سب لوگ [illegible] تھیں ہم سب بھی ایک [illegible] کر سکتے ہیں" غالب نے کہا۔

"ویسے دنیا ایک سرکس ہے جہاں سب اپنے اپنے کرتب دکھا رہے ہیں" میں نے کہا "کیا تم چل سکتی ہو؟"

گل نے اقرار میں سر ہلایا "تھوڑی سی کمزوری محسوس ہوتی ہے۔"

راجہ نے فوراً پیالہ آگے کیا "یہ باقی دودھ پی لو۔"

"جتنی ہو سکے فوراً کھالو" غالب نے کہا۔

"[illegible] چیز ہے [illegible] ذخیرہ لادی [illegible] تمہاری [illegible] اسی کو بطور خوراک استعمال کر لیں" میں [illegible] سردار ہے اس [illegible] سوال پوچھوں گا۔"

"[illegible] ہم اس فارمولے کو پیٹنٹ کرا کے مارکیٹ کریں [illegible] تمہاری چیزیں [illegible] ہم [illegible] غالب [illegible]"

[illegible] سر پیٹنے سے وہاں تک آ گئے ہو [illegible]

[illegible] نے کہا۔

[illegible]

"[illegible] جیب [illegible] بال [illegible]" [illegible] نے کہا۔

[illegible] "اپنے سر میں مٹی ڈال لو۔"

[illegible] نے کہا "اچھا..."

اس نے کہا "[illegible] یہ ضروری ہے [illegible] بال" [illegible] سر جھکایا پھر خفیف ہو کے دوسرے مردوں کی طرف اشارہ [illegible] "سردار نے کہا ہے۔"

"اس سے پوچھا کہ [illegible] کے کتنے بچے ہوں گے" میں نے [illegible]

[illegible] جاتے جاتے رک گیا "تم نے اسے کتنے پیسے دیے [illegible]"

میں نے سر میں خاک ڈالتے ہوئے کہا "تمہارے باپ نے [illegible] نہیں ڈالی تو ہم کیوں بنا رہے ہیں۔"

[illegible] نظر آنے لگا "اس نے سب میں برابر تقسیم کیا۔ مجھے [illegible] دوسروں کو۔ آخر میں اس کا بڑا بیٹا ہوں۔ میرا [illegible] ہونا چاہئے۔"

[illegible] نے حیران ہو کے کہا "سارا پیسہ بانٹ دیا اس نے؟"

غالب نے کہا "تمہیں مساوات کے اصول سے ذرا اختلاف ہے یا اس سے اختلاف ہے۔"

"تمہیں کیا ملا ہے مسٹر ولی عہد... اور کیا ملنا چاہئے۔"

"اس سے زیادہ تو میں نے کل خود وصول کرایا تھا" وہ بولا۔

"کس سے؟"

"ایک آدمی سے۔ وہ بھی تمہاری طرح مرد لگتا تھا، تم جیسا [illegible]"

گل نے کہا "ہم جیسا اور کون آ گیا یہاں، نام کیا تھا اس کا؟"

"نام" وہ سوچتے ہوئے بولا "کچھ بتایا تھا اس نے، میں بھول [illegible]"

"پھر تم نے کیا مدد کی اس کی؟" غالب نے کہا۔

"ہم نے ایسے ہی کپڑے نکال دیئے اسے، اور ایک گدھا [illegible] وہ راتوں رات بھاگ گیا۔"

"راتوں رات، یہ کب کی بات ہے؟"

"کل رات یا آج صبح، میں نے وقت نہیں دیکھا تھا۔"

اس سے پہلے کہ وہ [illegible] تا آگے سردار نے [illegible] اور وہ چلا گیا۔

"کیا یہ محسن کی بات کر رہا تھا؟" راجہ نے کہا۔

میں نے [illegible] میں سر ہلایا "محسن [illegible] ہے۔"

"ہو سکتا ہے" گل نے کہا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] کامیاب ہو جاتے۔"

"کاش تم [illegible] ہوتا" راجہ نے اصرار کیا۔

"[illegible]"

"پھر میں کیا [illegible] اس سے پوچھتا" میں نے [illegible]

ان کی صورتوں پر شکست آرزو کی اداسی چھائی تھی۔ مجھے اپنی بے رخی پر افسوس ہونے لگا۔ کیا حرج تھا انہیں چند دن خوابوں کے [illegible] سے بہلنے کا موقع دینے میں۔ تلخ اور ہولناک حقائق کا سامنا کرتے کرتے بالآخر آدمی خوش فہم امیدوں کا سہارا مانگتا ہے جیسے بچہ تھک جائے تو سونا چاہتا ہے۔

نیند نہ آئے تو ماں اسے لوری دیتی ہے۔ بڑا آدمی سکون آور گولی کھا لیتا ہے۔ اگر ان کے لئے اس خیال میں سکون تھا کہ محسن فرار ہو کے یہاں آیا تھا تو اس خیال کو چھیننے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر میں نے سوچا ایسا خیال کبھی حقیقت نہیں بنتا۔

تیاری کا آخری مرحلہ جاری تھا کہ جگہ زمین پر بچھ گئی۔ اس وقت تک سامان کی گاڑیاں بھی تیار ہو گئی تھیں۔

سردار بڑی افراتفری میں نمودار ہوا "چلو، اپنی بیوی کو گاڑی میں ڈالو، جلدی کرو۔"

غالب نے گل کو سہارا دے کر اٹھایا "تم اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟"

اس نے کہا "پولیس آ رہی ہے، چلو تم لوگ بھی۔"

میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر مجھے پولیس کا دور دور تک سراغ نہ ملا۔

"آخر کہاں ہے پولیس؟" میں نے کہا۔

"گاؤں میں۔ وہ ہمارے ڈیرے پر چھاپا مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اپنی بیویوں سے کہو ہماری بیویوں کے ساتھ جائیں۔ بولنے کی ضرورت نہیں، کوئی کچھ بھی پوچھے۔ ہماری عورتیں جواب نہیں دیتیں۔ صرف میں بات کرتا ہوں۔ مرد بھی نہیں بولتے۔"

www.paksociety.com

سردار نے مجھے کم سے کم الفاظ میں قبیلے کے پروٹوکول سے آگاہ کیا۔

یہ صورتِ حال تشویش ناک تھی۔ گاؤں تک پولیس کے پہنچ جانے کا مطلب یہ تھا کہ ہماری تلاش میں ہر جگہ چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ موٹا حوالدار اور اس کے ماتحت اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ ہم صحیح وقت پر گاؤں سے فرار نہ ہوتے تو وہیں دھر لیے جاتے۔ سائیں چھاپا مارنے والوں کو کیسے روک سکتا تھا کہ ہمیں گرفتار نہ کریں۔ اگر انہیں معلوم ہوا کہ ڈاکو بیجن لال کے ساتھی کچھ دیر پہلے اسی گاؤں میں موجود تھے تو گاؤں کی تلاشی لینے کے بعد وہ خانہ بدوشوں کے ڈیرے میں ہماری موجودگی کے امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

پہلے گل کو ایک بوڑھی عورت کے ساتھ بیل گاڑی میں لٹا دیا گیا۔ پھر بوڑھی عورت کو دوسری گاڑی میں شفٹ کر دیا گیا۔ گل کی دیکھ بھال رابعہ کے سپرد ہوئی۔ بوڑھی عورت کے پاس نازو کو بٹھایا گیا۔ دونوں بیل گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہوئیں تو اس میں چار عورتیں اور دو بچے بھی نظر آ رہے تھے۔ باقی عورتیں پیچھے رہیں۔ اگلی بیل گاڑی کو خود سردار نے روانہ کیا‘ دوسری گاڑی کو ولی محمد نے۔ باقی مرد گدھوں کے ساتھ دونوں جانب ایک قطار بنا کے چلنے لگے۔

میرے ہاتھ میں ایک شریف النفس گدھے کی لگام تھی اور میرے ساتھ چلنے والا ایک گنجا تھا۔ ہم گدھوں کے جلوس کی قیادت کر رہے تھے اور دو بیل گاڑیوں کے اور خواتین کے بالکل پیچھے تھے۔ غالب بالکل آخر میں تھا اور اس کے ساتھ دوسرا گنجا تھا۔ معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت ہم دونوں کا ہم سفر ان ٹارزن ٹائپ گنجوں کو بنایا گیا تھا۔ میں نے گنجے سے دوستانہ گفتگو کرنے کی کوشش سے پہلے کئی بار مسکرا کے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور نہایت حوصلہ شکن انداز میں غراتا رہا۔ مجھے اس کا بے سبب جارحانہ رویہ ایک چیلنج سا محسوس ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھے برداشت کرنے پر مجبور ہے لیکن موقع ملتے ہی یہ سرد جنگ ایک دم جنگِ عظیم میں ڈھل جائے گی۔ مجھے ٹارزن کے غرور آمیز حقارت سے رویے سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اپنی طاقت سے میرا حلیہ بگاڑ دینے کا یقین ہے۔ میں نے اس وقت کا تصور کیا جب اس کے یقین کی مٹی پلید ہوگی۔

اسی وقت پولیس نے دھاوا بول دیا۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان میں ایک سب انسپکٹر تھا‘ تین گھوڑوں پر مسلح پولیس والے تھے۔ ان کے کندھوں سے پرانی طرز کی بھاری بھرکم رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ آخری دو گھوڑوں پر دو دو افراد تھے۔ وہ اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے دونوں طرف آئے۔ سب انسپکٹر نے چلا کے ہمیں رک جانے کا حکم دیا۔ ابھی تک میں نے سر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا۔ جب بیل گاڑیاں رک گئیں تو گدھے بھی رک گئے۔ سب انسپکٹر نے گھوڑے پر گارڈ آف آنر کا معائنہ کرنے کے انداز میں سب کی صورتوں پر ایک نظر ڈالی۔

”سب کو ایک لائن میں کھڑا کر دو“ سب انسپکٹر نے اترتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ آنے والے سب لوگ پیدل یا پیچھے تھے۔ سردار نے بیل گاڑی کے کاک پٹ سے چھلانگ ماری‘ اپنی جناتی زبان میں کوئی حکم جاری کیا۔ اس کے ساتھ ہی سارے گدھے رائٹ ٹرن ہو گئے اور ان کے ساتھ چلنے والے ایک قطار میں آ گئے۔

”عورتوں کو باہر نکالو“ سب انسپکٹر نے ریوالور نکال کے کہا۔

سردار نے اس حکم کو اپنی زبان میں دہرایا۔ گل اور اس بوڑھی عورت کے سوا سب عورتیں ہمارے پیچھے قطار میں کھڑی ہو گئیں۔ مجھے ایک عجیب سی اعصاب شکن خاموشی کا احساس ہوا۔ میرے پیٹ میں مروڑ سا اٹھنے لگا۔ کیا ہم پہچان لیے جائیں گے؟ یہ سوال پہلے صرف ایک خوف زدہ کرنے والا خیال تھا۔

پھر میں نے پولیس کی ساری نفری کو دیکھا تو خوف ایک حقیقت بن کے میرے دل میں اپنے پنجے گاڑنے لگا۔ ان میں وہ دونوں سپاہی بھی شامل تھے جو حوالدار کے ساتھی تھے۔ باقی سب اجنبی چہرے تھے۔ حوالدار کے ماتحت ہمیں شناخت کر سکتے تھے مگر کیا وہ ایسا کریں گے؟ ہم نے انہیں رعایت دی تھی۔ مگر یہ رعایت تو ایسی ہی تھی جیسے کسی کو اختیار دے دیا جائے کہ وہ مرنے کے لیے کم تکلیف دہ طریقہ پسند کرے۔ قید میں تو وہ بھی رہے تھے‘ باندھا انہیں بھی گیا تھا۔

امید کا دوسرا پہلو اس احساس میں تھا کہ شاید یہ فوراً ہمیں شناخت کر لینے کے باوجود صرف ہماری دہشت کی وجہ سے خاموش رہیں۔ ہم نے انہیں بتا دیا تھا کہ... لیکن ہمارے گرفتار ہو جانے کی صورت میں ان کے لیے ڈر کی کوئی بات نہ رہے گی۔

سب انسپکٹر ایک ایک کی صورت غور سے دیکھ رہا تھا۔ گاؤں سے آنے والے دونوں سپاہی اس کی مدد کر رہے تھے۔

”کیا نام ہے تیرا؟“ اس نے قطار کے دوسرے شخص سے پوچھا۔

سردار نے جو تھانے دار کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا کہا ”پرشوتم۔“

تھانے دار نے ایک دم پلٹ کے اس کے تھپڑ مارا ”تو اس کا وکیل ہے؟ کیا یہ خود گونگے ہیں؟ میں جانتا ہوں گونگے کو بولنا سکھانا۔“

سردار پر تھپڑ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اس قسم کے سلوک کا عادی معلوم ہوتا تھا ”میری اجازت کے بغیر کوئی نہیں بولے۔“ تھانے دار نے اس کے دوسرا تھپڑ مارا ”ان کا تو باپ بھی بولے گا۔“

سردار نے اپنی زبان میں کوئی حکم صادر کیا۔ اس کے

تیسرے شخص نے اپنا نام خود بتایا۔ اس نے اپنے باپ کا نام بھی بتایا۔

”کیا کرتا ہے تو؟“

”محنت مزدوری‘ جو کام مل جائے۔“

تھانے دار نے اس کے منہ پر ہاتھ مارا ”ایسے کپڑے پہنتے ہیں محنت مزدوری کرنے والے۔“

”جو مل جاتا ہے پہن لیتے ہیں جناب۔“

اس کے بعد غالب تھا۔ میرا دل ایسے دھڑک رہا تھا کہ میں دوسروں کی حالت کا بھی اندازہ کر سکتا تھا۔ یہ مرحلہ بہت کٹھن تھا۔ سب ایک لمحے ایک لفظ اور ایک اشارے پر منحصر تھا۔ اگر شناخت کرنے والے صرف سر ہلا دیتے اور کہتے ”ہاں“ تو دوسرا مرحلہ فیصلہ کن جدوجہد کا ہوتا۔ میرا ہاتھ اپنے ریوالور تک پہنچنے کے لیے تیار تھا۔

میرا خیال ہے کہ صرف میں نے ہی نہیں‘ غالب اور رابعہ نے بھی ذہنی طور پر اس کی تیاری کر لی ہوگی کہ شناخت کا اشارہ دیکھتے ہی ریوالور نکال لیں گے اور اگر ضروری ہوا تو گرفتار ہونے سے پہلے تینوں ریوالوروں کی آخری گولی بھی کام آئے گی۔ پولیس کی اس نفری کو ہینڈز اپ کرانا آسان نہیں تھا لیکن ان میں سے ایک بھی مارا جاتا تو باقی ہتھیار ڈال دیتے۔ پہلے میرا نشانہ وہ شخص ہوتا جو ہمیں شناخت کرتا۔ اس کے بعد شاید سب انسپکٹر کیونکہ ریوالور صرف اسی کے پاس تھا‘ وہی ہمارے مقابلے پر آنے کی ہمت کر سکتا تھا۔ باقی سب رائفل سنبھالتے رہ جاتے۔ وہ محض تنخواہ ہی والے لوگ تھے۔

سب انسپکٹر غالب کے سامنے ٹھہر گیا۔ غالب کا چہرہ سپاٹ رہا۔ سب انسپکٹر نے اپنے ساتھ چلنے والے سپاہی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس شناختی پریڈ میں استغاثہ کے دو ہی گواہ اہم تھے۔ میری نظریں سپاہی پر جمی رہیں۔ وہ بڑے غور سے غالب کو دیکھ رہا تھا۔ ایک سیکنڈ‘ دوسرا سیکنڈ... ہر سیکنڈ لمبا ہوتے ہوئے میرے اعصاب پر دباؤ بڑھتا گیا۔ سپاہی بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا اور غالب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھ رہا تھا۔ میرے لیے شک کی گنجائش نہ رہی‘ اس نے غالب کو پہچان لیا تھا۔

”کیا ہو گیا؟ منہ سے کچھ بولو“ سب انسپکٹر نے کہا۔

میرا ہاتھ ریوالور کی طرف بڑھا مگر سپاہی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”بے چند ولد بے چند“ غالب نے کہا۔

سب انسپکٹر آگے بڑھ گیا۔ میں نے اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھ لیا اور اس سپاہی کی طرف دیکھا۔ میری اور اس کی نظریں ملیں اور مجھے اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ محسوس ہوئی۔ شاید یہ میرا وہم تھا... یا حقیقت تھی۔ کسی وجہ سے سپاہی نے شناخت کا اقرار نہیں کیا تھا۔ یہ وجہ ڈاکوؤں کی دہشت بھی ہو سکتی تھی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ دو پکڑے بھی گئے تو کیا ہوگا۔ ان کے دوسرے ساتھی آ جائیں گے۔ معلوم نہیں کتنا بڑا گروہ ہے۔ انہی کے ساتھی تھے وہ بھی جو سائیں صاحب کے گھر والوں کو مار گئے تھے۔

سب انسپکٹر عادت کے مطابق گالی گلوچ اور مار پیٹ کرتا میری طرف بڑھتا آ رہا تھا۔ میرے سامنے آ کے اس نے پھر شناخت کرنے والے کی طرف دیکھا۔ سپاہی نے مجھے غور سے دیکھا‘ اپنے ہاتھوں سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میرا پیغام بہت واضح تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سب انسپکٹر کو میں نے اپنا نام اننت لال ولد گردھاری لال بتا دیا۔ ہر شخص نے اپنا صحیح نام بتایا تھا یا نہیں۔ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ غالب نے بلا جھجک اور پورے اعتماد کے ساتھ اپنا نام بتایا تھا۔ تذبذب سے شک پیدا ہوتا‘ شاید میری طرح اس نے بھی پہلے سے نام اور ولدیت کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سب انسپکٹر مردوں کی شناختی پریڈ کے نتائج سے کچھ مایوس ہو گیا تھا۔ مفرور ملزم اگر مردوں میں نہیں تھے تو عورتوں میں کیسے ہو سکتے تھے۔ ہم نے پچاس فیصد نفسیاتی فتح حاصل کر لی تھی لیکن یہ مکمل فتح نہیں تھی۔

سب انسپکٹر ایک ایک عورت کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ اس کے ساتھ چلنے والا سپاہی انکار میں سر ہلاتا گیا۔ رابعہ کے بعد نازو کی باری آئی‘ پھر اس نے بیل گاڑی میں دیکھا۔

”یہ کون عورت ہے‘ اسے نکالو باہر۔“

سردار نے کہا ”اس کو اٹھانے سے خون کی الٹیاں آتی ہیں۔“

”کیوں‘ کیا ہوا اسے؟“

”ٹی بی ہے جناب“ سردار نے بڑی معقولیت سے کہا۔

”اور یہ بڑھیا؟“ اس نے بے دلی سے کہا۔ اب اس کی دلچسپی عملاً ختم ہو گئی تھی۔ اس نے ایک مختصر خطاب کیا۔

”دیکھو بڈھے‘ اس علاقے میں بڑے خطرناک مجرم پھر رہے ہیں۔“

سردار نے کہا ”ہمارا کیا کام ہے؟“

بیچ میں بولنے پر اسے ایک اور تھپڑ کھانا پڑا۔

”اگر تم نے ان کو کہیں بھی دیکھا ہو تو بتا دو۔ کسی نے بھی دیکھا ہو‘ جو ان کے بارے میں بتائے گا اسے انعام ملے گا‘ وہ اشتہاری مجرم ہیں۔“

”انعام کتنا ہے سرکار؟“ سردار نے کہا۔

”پچاس ہزار روپے“ سب انسپکٹر نے کہا ”ان کی تصویریں دیکھ لو۔“

میں نے سردار کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی لالچ کی چمک دیکھی اور آہستہ سے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا۔ عین اس وقت

www.paksociety.com

جب وہ میری طرف دیکھ رہا تھا میں نے اپنی جیب میں سے [illegible] کی ایک جھلک دکھائی۔ یہ اور ایسی [illegible] کی جیب میں غائب ہو گیا۔ ساری تصویریں قطار میں کھڑے ہوئے سب لوگوں کے ہاتھوں سے گزر کر میری طرف آ رہی تھیں۔ یہ تصویریں سب اخبارات میں شائع ہوئی تھیں اور کیسے حاصل کی گئی تھیں یہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

[illegible] کا اخبار تھا جس میں اوپر تین تصویریں ایک ساتھ تھیں [illegible] کی تصویریں تھیں۔ [illegible] غالب کی [illegible] تصویریں [illegible] تصویروں کے [illegible] واضح [illegible] تھا۔ میں نے [illegible] ولی عہد بہادر کھڑے ہوئے تھے۔

دوسرے اخبار میں رابعہ، نازو اور گل کی تصویریں تھیں۔ گل کی تصویر نے مجھے حیران کر دیا۔ میں اصلاً کی تصویر دیکھ کے شاید حیران نہ ہوتا کیونکہ گل ہمارے ساتھ بہت دیر سے شامل ہوئی تھی۔

اچانک ولی عہد نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "وہ بہت غور سے تصویریں دیکھ رہا تھا" "میں نے ٹھیک کہا تھا نا۔"

"چل بے اخبار دے۔" سب انسپکٹر نے ایک گالی دے کر کہا "پڑھنا آتا ہے جو ایسے دیکھ رہا ہے۔"

ایک سپاہی نے اخبار واپس چھین لیا۔ سب انسپکٹر تفتیش ختم کرنے کے بعد واپس جانے کے موڈ میں تھا۔ میں شناختی پریڈ ختم ہو جانے کے بعد بہت مطمئن ہو گیا تھا اور فوری طور پر میری توجہ ولی عہد کی طرف ہو گئی تھی۔ اس کی بات نے میرے ذہن میں ہلچل مچا دی تھی۔ کیا واقعی خیال ایک حقیقت ثابت ہو رہا تھا۔ ولی عہد نے جو کچھ کہا تھا گل کی تصویر دیکھ کر ہی کہا تھا۔ میں اور غالب تو اس کے سامنے تھے۔

میں اب چاہتا تھا کہ سب انسپکٹر جلد از جلد یہاں سے چلا جائے تاکہ میں اس سے وضاحت کے ساتھ پوچھوں۔۔ کہ اس نے کیا ٹھیک کہا تھا۔ لیکن اچانک میری نظر نے دوسرے سپاہی کو دیکھا جو موٹے حوالدار کا نائب تھا اور اسی سب انسپکٹر کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے براہ راست شناخت کی کارروائی میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن اس میں شک کی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ بھی ہمیں پہچانتا تھا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا اور اس کی صورت سے عدم اطمینان اور اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے ساتھی سے ناخوش ہے جس نے جھوٹ کا منہ بند کیا تھا اور جانتے بوجھتے ہمیں نہ پہچان کے اپنے فرض سے روگردانی کی تھی

چند سیکنڈ کے لیے ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی [illegible] اختلاف کی آنچ باقی تھی۔ دوسرا شخص [illegible] نے ایک نظر مجھے اور غالب کو دیکھا اور [illegible] کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس کے [illegible] زیر لبی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ [illegible] کی طرف [illegible]

سب انسپکٹر کے ساتھ [illegible] دماغ میں اتنا [illegible] معلوم اپنی اوقات بھول جاتے اور ان [illegible] واقعات کی بہت تاکید کر دیتے۔

اطمینان کی اس فضا کو ایک سپاہی کے عدم اطمینان نے خطرہ لاحق ہو گیا تھا جس کی نظر نے میرے اور غالب کے بہت سے راز کو نہیں کھایا تھا۔ وہ دھوکا کھاتا بھی کیسے؟ ہم نے کئی دن اس کو قید کی اذیت میں رکھا تھا اور اس نے ہمیں بہت قریب سے دیکھا تھا اور ہماری آواز بھی سنی تھی۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں غالب سے سوال کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے اور غالب کی نظر نے جواب دیا کہ ابھی کچھ مت کرو، صبر کے ساتھ انتظار کرو اور دیکھو۔ سپاہی اب اپنے افسر کو کچھ سمجھا رہا تھا۔

خانہ بدوشوں کا قبیلہ اس قانونی کارروائی کے ختم ہونے کے بعد خاموش اور ساکت تھا۔ میں رابعہ یا نازو سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ دیگر خواتین کے ساتھ الگ قطار میں کھڑی ہوئی تھیں۔

میں نے داہنی جانب کھڑے ہوئے ولی عہد بہادر سے کہا "اب انتظار کس بات کا ہے؟ چلو۔"

اس نے سرہلا کے کہا "چلو" اور اپنی زبان میں کوئی اشارہ کیا جس کے ساتھ ہی الگ الگ قطاروں میں خاموش اور بے حس کھڑے ہوئے مرد و عورتیں سب حرکت میں آ گئے اور آپس میں مل گئے۔ میں نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا۔ نازو میرے قریب تھی لیکن میری طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ بڑی ہوشیاری کے ساتھ غالب میرے پیچھے پہنچ گیا۔ رابعہ نے شاید یہ سمجھ کے کہ ہم سب کو یکجا نظر نہیں آنا چاہیے، اس بیل گاڑی کی طرف رخ کیا جس میں گل اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔

میں نے نازو کی طرف دیکھے بغیر کہا "یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں اپنے ساتھ لے جائے۔"

نازو نے مجھے مخاطب کیے بغیر جواب دیا "دوسرے سپاہی نے کام خراب کر دیا ہے۔ وہ سب انسپکٹر سے شکایت کر رہا ہے۔"

سب انسپکٹر کے سرہلانے اور خون آشام نظروں سے ہمیں گھورنے کا انداز یہ ظاہر کرتا تھا کہ شناختی پریڈ کا گھپلا اس کی سمجھ میں آ گیا ہے۔

"تم لوگ فکر مت کرنا" میں نے نازو کی طرف دیکھا "[illegible] کے ساتھ ہی رہنا۔"

غالب نے پیچھے سے کہا "ہاں شور ہنگامہ اور رونا دھونا مت شروع کر دینا۔"

سب انسپکٹر گھوڑے سے اتر آیا "کہاں جا رہے ہو تم سب؟ کس نے اجازت دی ہے تمہیں؟" وہ گرج کے بولا۔

خانہ بدوش اپنی اپنی جگہ پر رک کر سب انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگے۔

میں نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا "رابعہ اور گل کو بھی [illegible] بات [illegible]"

غالب نے کہا "رابعہ سے میں نے کہہ دیا ہے۔"

مجھے اس کی بات پر تعجب ہوا کیونکہ میں نے اسے رابعہ سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔

سب [illegible] پیٹھ کی طرف [illegible]

ایک بار پھر [illegible]

[illegible] "ہم نہیں ہو سکتے پھر دیکھو" سب انسپکٹر نے کہا۔

"کیا بات ہے سرجی؟"

"سر کے مجھ کو نہیں پہچانتے ہو؟"

سپاہی نے گھبراہٹ انداز میں سرہلا کے اثبات میں جواب دیا۔

"تم نے جھوٹ بولا تھا۔ دھوکا دینے کی کوشش کی تھی مجھے۔" سب انسپکٹر نے آگ بگولا ہو کے کہا "کیوں؟"

سپاہی کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کی بے سود کوشش کی۔ اعتراف جرم کے بعد اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

"تو کیوں جھوٹ بولا تھا تم نے؟ کیوں کوشش کی تھی ان کو بچانے کی؟" سب انسپکٹر نے دہاڑ کر کہا "کیا تعلق ہے تمہارا ان ڈاکوؤں سے؟ تم ملے ہوئے ہو ان سے؟"

"نہیں سر۔۔۔ یہ بات نہیں۔"

"شٹ اپ، جب تفتیش ہوگی تو ساری بات معلوم ہو جائے گی۔ ابھی تم خود کو معطل سمجھو۔"

"سر، میرا قصور معاف کر دیں، مجھے ڈر تھا کہ میں نے انہیں بتایا تو یہ میرے دشمن ہو جائیں گے۔ انہوں نے دھمکی دی تھی۔" سپاہی نے گڑگڑا کے کہا۔

"اگر ایسی بات تھی تو تم مجھے بتا سکتے تھے، پہلے ہی کہہ سکتے تھے، خاموشی سے اشارہ کر سکتے تھے۔" سب انسپکٹر نے جھلا کر کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا، تمہارا جرم بہت سنگین ہے۔ تمہاری وجہ سے اتنے خطرناک مجرم بچ کے نکل جاتے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ مجرم کی مدد کرنے والا کون ہوتا ہے؟ تم معطل ہی نہیں زیر حراست ہو۔"

"سر جی، غلطی ہو گئی، معافی دے دیں۔" سپاہی ہاتھ جوڑنے لگا۔

"دفع ہو جاؤ۔" [illegible] نے حکم دیا۔

خانہ بدوشوں کے قبیلے [illegible]

[illegible]

[illegible] ان کا [illegible]

[illegible] کتنا لیا تھا لالچی کتے؟" سب انسپکٹر کی یہ دہاڑ [illegible] سائیں سائیں کرتی رہی اور بڑھے سردار کے جسم پر لکیریں ڈالتی رہی۔ پورا قبیلہ دم سادھے اپنے سردار پر ہونے والے تشدد کا

www.paksociety.com

نقارہ کرتا رہا' کسی نے اس کی حمایت میں ایک لفظ بولنے کی جرأت نہیں کی- کسی نے اس کے لئے رحم کی درخواست نہیں کی-

"میں' سردار چیخا... میں دیتا ہوں... ابھی ادا کرتا ہوں" سردار نے تڑپتے ہوئے چیخنا چلانا جاری رکھا-

"اٹھو' فوراً... ورنہ میں کسی کو نہیں بخشوں گا" سب انسپکٹر نے اسے ٹھوکریں مار کے کہا-

میں اور غالب اس صورت حال میں آگے بڑھ کر کچھ کرتے تو اپنے جرم کی سنگینی میں اضافہ کرتے- ہماری گرفتاری اب یقینی تھی- ہم ریوالور نکال کے فائر کرتے تو اپنے جرائم کی فہرست میں دو چار قتل بڑھا لیتے لیکن پھر بھی ہم فرار نہیں ہو سکتے تھے- صورت حالات ایک دم بدل گئی تھی- جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے- خانہ بدوش اب ہماری مدد سے ہاتھ کھینچ چکے تھے- انہوں نے پناہ دینے کی جو قیمت وصول کی تھی وہ پولیس کا نذرانہ بن گئی تھی- قبیلے کے سب لوگ ہمارے دشمن ہو گئے تھے اور ان کے درمیان ہماری حیثیت زیر حراست مجرم جیسی ہو چکی تھی-

وہ شخص بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا جس نے ہماری گرفتاری کو یقینی بنانے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا- اس نے خود کو جرأت مند اور فرض شناس ثابت کر دیا تھا- اس کی مسکراہٹ میں فخر کے جذبات تھے اور ہمارے لئے نفرت اور حقارت تھی- وہ خوش تھا کہ اس نے اپنی اور دوسرے سب ساتھیوں کی ذلت کا بدلہ لے لیا-

سب انسپکٹر کی نظر کا اشارہ پا کے وہ بڑی شان سے سینہ تانے آگے بڑھا اور عین میرے مقابل آ گیا-

"تمہارا کہنا ہے کہ یہ دونوں ڈاکو ہیں-"

"میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی سر' انہوں نے جو کچھ تھانے میں کیا تھا..."

"وہ سب بعد میں بتانا" سب انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ دی "تمہارا بیان بھی ہو گا... اور باقی سب لوگوں کا بھی- میں چاہتا ہوں کہ تم انہیں اچھی طرح دیکھ لو-"

"انہوں نے حلیہ بدلا ہے سر' لیکن ان کا چہرہ وہی ہے- اگر یہ غلط ہو تو آپ سو جوتے ماریں مجھے..."

"اچھا ٹھیک ہے' انہیں اپنے ساتھ لے کر چلو" سب انسپکٹر نے ریوالور نکال لیا "خیال رکھنا' یہ فرار نہ ہو جائیں' اگر کوشش کریں تو گولی مار دینا-"

مجھے اور غالب کو قطار میں سے کھینچ کر نکال لیا گیا- اگر میں چاہتا تو ان چاروں کو چاروں شانے چت گرا دیتا جو مجھے اور غالب کو گرفتار کرنے کے لئے آگے بڑھے تھے مگر میں نے مزاحمت سے گریز کیا- مجھے امید تھی کہ راستے میں کہیں نہ کہیں مجھے ان کے خلاف اچانک کارروائی شروع کر دینے سے کامیابی کے بہتر مواقع حاصل ہوں گے- یہاں خود خانہ بدوش بھی پولیس کا ساتھ دینے [illegible] اتنے لوگوں سے بیک وقت مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا-

پولیس پارٹی کے پاس ہتھکڑیاں نہیں تھیں- انہوں نے خانہ بدوشوں سے رسیاں لے کر میرے اور غالب کے ہاتھ باندھ دیے اور پھر ہمیں گھوڑوں کے پیچھے ایسے باندھ دیا کہ یا تو گھوڑا ہم کو بھگا کے لے جا سکتا تھا یا ہم گھوڑے کو ساتھ بھگا کر لے جاتے- اکیلا کوئی نہیں بھاگ سکتا تھا- ہمارے ہاتھوں سے بندھی ہوئی رسیوں کے علاوہ گھوڑے کی لگام بھی سوار کے ہاتھ میں تھی چنانچہ مجموعی صورت حال یہ تھی کہ گھوڑا بھاگتا تو ہمیں اس کے پیچھے اتنی ہی رفتار سے دوڑنا پڑتا اور ہم بھاگتے تو سوار [illegible] اور پھر ہم گھوڑے پر سوار ہوتے تو اسے ہمارے ساتھ دوڑنا پڑتی- دیکھنے والے سمجھتے کہ ہم اسے گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں-

وہ نا تجربہ کار اور کسی حد تک بے وقوف لوگ تھے- انہوں نے ہمارے ہاتھ باندھ دیے تھے اور مطمئن ہو گئے تھے کہ مجرم گرفتار کر لئے- وہ سب مسلح تھے اور انہیں اپنی تعداد پر بھی بھروسہ تھا چنانچہ انہوں نے ہماری تلاشی بالکل نہیں لی- باقی سب کارروائی تھانے میں ہو گی' یہ فرض کرتے ہوئے انہوں نے گالی گلوچ اور مار پیٹ سے بھی گریز کیا- کسی چور یا جیب کترے کے مقابلے میں ڈاکو ایک عام پولیس مین کے لئے وی آئی پی سے کم نہیں ہوتا- ڈاکو کا نام ہی دہشت اور ہیبت کی علامت سمجھا جاتا ہے اور اسے ایک بہادر' بے خوف اور جان کی بازی لگانے والے مجرم کی حیثیت سے خوف آمیز احترام حاصل رہتا ہے-

گرفتاری دینے کے بعد میں نے ایک فلمی ڈاکو کی طرح دہاڑنا شروع کیا "میں ایک ایک سے نمٹ لوں گا' مجھے کون جیل میں رکھ سکتا ہے تھانے دار' میرے ساتھی..."

تھانے دار نے میرے منہ پر تھپڑ مارا "تیرے ساتھیوں کو بھی دیکھ لوں گا میں-"

میں نے ایک قہقہہ لگایا "تو دیکھے گا؟ تجھیں تھانے دار تو کیسے دیکھے گا' تیرا تو کریا کرم ہو چکا ہو گا- آنکھوں والے دیکھیں گے تیری بیوہ دیکھے گی' کالا منہ نیچے دیکھیں گے..."

تھانے دار نے میرے دوسرا تھپڑ مارا "میں نے تجھے پھانسی نہ لگایا تو لعنت میری تھانے داری پر' تیری لاش تین دن تک لٹکی رہے گی درخت سے- پھر گدھ کھا جائیں گے-"

میں نے غرا کے کہا "زیادہ مت بول تھانے دار' تمہیں اپنا [illegible] ہو کر مرا تیرے ساتھ بیوی بچوں کو بھی لے' ابھی تیرے ساتھ میری کوئی دشمنی نہیں- تو غلام ہے حکومت کا- اپنا کام کر' ہمارا کام ہم خود کر لیں گے-"

غالب نے اچانک گالیاں دینا شروع کیا- اس کا ہدف وہ پولیس مین تھا جس نے ہمیں شناخت کیا تھا- معلوم نہیں اس

ایسی کیا بات کہی تھی کہ غالب نے اشتعال کا [illegible] ضروری سمجھا-

"[illegible] سارے خاندان کو سزا ملے گی اس کی- تجھے رونے [illegible] نہیں بچے گا- ہم نے تباہ کیا تھا تجھے- اب تیار ہو جا خمیازہ [illegible] تیرے خاندان کے بچے بچے کو کاٹ کے نہ پھینک [illegible] نہیں [illegible] کی پیشاب ہے-"

اس سپاہی کا رنگ اڑ گیا تھا مگر وہ بے نیازی کے ساتھ مسکرایا-

"بہت بھونک رہے ہیں یہ کتے' انہیں لے کر چلو" تھانے دار نے ایک بید میرے اور غالب کے رسید کیا "ابھی ان کی [illegible] بھرتے ہیں- ذرا تھانے پہنچ جائیں' پھر دیکھیں [illegible] کتنا دم ہے' چلو تم لوگ-"

[illegible] سپاہی گھوڑوں پر ہمارے پیچھے رہے- خود ہمیں کھینچتے [illegible] گھوڑوں پر سوار آگے چلنے لگے- ہمیں شناخت کرنے والا [illegible] کھڑا ہوا تھا-

اچانک اس نے کہا "سر' یہ عورت بھی-"

میں رک گیا لیکن پھر مجھے جھٹکا لگا اور میں آگے قدم بڑھانے پر مجبور ہو گیا- اس سپاہی نے نازو کی طرف اشارہ کیا تھا-

سب انسپکٹر نے کہا "ہاں' یہ باتیں کر رہی تھی ان دونوں سے' میں نے دیکھا تھا- اسے بھی پکڑ لو-"

نازو چلائی "جھوٹ بکتا ہے یہ' میرا کوئی تعلق نہیں ان سے-"

تھانے دار نے گالیاں بکتے ہوئے نازو کے تھپڑ رسید کیا- "[illegible] بتائے گا یہ سب' جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا-"

اس کے ساتھ ہی میں نے سر گھما کے دیکھا تو پولیس والے [illegible] کھڑے تھے-

"عورتوں کو پکڑتے ہو نامرد" میں نے چلا چلا کے کہا اور [illegible] سوار پولیس مین کو پیچھے کھینچ لیا-

[illegible] اٹھا اور مجھ پر پل پڑا- گھونسے اور لاتیں مارتے [illegible] مجھے ایک نے ایک غلیظ گالی دی لیکن میں نے ضبط [illegible] ہوئے مقابلے کی کوشش نہیں کی- وہ پھر گھوڑے پر [illegible] میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن میں ایک [illegible] اسے ہلاک بھی کر سکتا تھا اور اس کی ٹانگیں بھی توڑ [illegible] اسے بازوؤں کے حلقے میں قید کر کے بے بس بھی [illegible] مگر یہ سارے داؤ میں نے تھانے دار کے لئے محفوظ [illegible] گھوڑے کے پیچھے چلتا گیا- غالب میرے ساتھ تھا- پیچھے نازو تھی جسے اسی طرح دست بستہ لایا جا رہا تھا- [illegible] تھانے دار تھا جو ریوالور ہاتھ میں لئے آ رہا تھا-

رابعہ اور گل کا گرفتاری سے بچ جانا میرے لئے باعث [illegible] تھا' باعث حیرت بھی اور باعث تشویش بھی- [illegible] بات یہ تھی کہ ہم سب گرفتار نہیں ہوئے- محسن اور شملہ پہلے ہی دشمنوں کی قید میں تھے' اب میرے اور غالب کے ساتھ نازو کو بھی پولیس نے پکڑ لیا تھا لیکن رابعہ اور گل بہرحال آزاد تھیں- مگر کیا ہم ان سے امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہماری رہائی کے لئے کچھ کریں گی؟ میں نے سوچا' نہیں- یہ خیال دل کو خوش رکھنے کے لئے بھی اچھا نہیں ہو سکتا- وہ عورتیں ہمیں پولیس کے قبضے سے کیسے چھڑا سکتی ہیں- جب کہ ان میں سے ایک بیمار اور زخمی بھی ہو- الٹا یہ ہو سکتا ہے کہ اس کوشش کے نتیجے میں وہ خود بھی گرفتار ہو جائیں-

رابعہ اور گل کے گرفتاری سے بچ جانے پر مجھے حیرت اس لئے تھی کہ نازو کو شناخت کرنے والا ہی انہیں بھی شناخت کر سکتا تھا- شاید نازو کے پکڑے جانے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اور غالب نے اس سے باتیں کرنے کی غلطی کی تھی- یہ سب نے ہی دیکھا ہو گا- رابعہ سے ہماری کوئی بات نہیں ہوئی تھی چنانچہ وہ کسی کی نظر میں نہیں آئی تھی اور نازو کی گرفتاری سے ذرا دیر پہلے وہ گل کے پاس چلی گئی تھی- گل کو کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا' ...سوائے انسپکٹر کے مگر وہ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا-

تشویش کا پہلو اس احساس میں تھا کہ اگر ہم رہائی حاصل کرنے کی کوشش میں ناکام رہے تو رابعہ اور گل کیا کریں گی؟ انہوں نے بڑے حوصلے کا اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا تھا- اگر وہ جذباتی ہو جاتیں تو ہمارے ساتھ ہی گرفتار ہو جاتیں- اس سے حاصل کچھ نہ ہوتا- اس میں خود غرضی کا کوئی پہلو نہیں تھا- دور اندیشی کا تقاضا یہ تھا کہ جو بچ سکتا ہو وہ خود کو ضرور بچائے- آزاد رہ کے کوشش تو کی جا سکتی ہے' خواہ اس کا انجام صرف ناکامی ہو' اسیری میں تو کوشش ہی ممکن نہیں-

میں نے پلٹ کے دیکھا تو خانہ بدوشوں کا قبیلہ ابھی تک وہیں موجود تھا- میرے دل میں مایوسی کی ایک لہر سی اٹھی- کیا اب رابعہ اور گل کو انہی کے ساتھ جانا پڑے گا؟ خانہ بدوش آج یہاں ہیں تو کل وہاں- ہم ان کا نیا ٹھکانہ کیسے تلاش کریں گے؟ رابعہ اور گل ان کے ساتھ کب تک رہیں گی اور کیسے رہیں گی؟ انہیں ہماری فکر ہو گی لیکن خانہ بدوشوں میں [illegible] ہے جو ان کی مدد کرے اور رابطے کا ذریعہ بن سکے؟

پھر مجھے قبیلے کے بڈھے سردار کا خیال آیا- وہ ایک لالچی اور چالاک آدمی تھا- اس نے سب انسپکٹر سے کہا ضرور تھا کہ وہ ہم سے وصول ہونے والی سب رقم پولیس کے حوالے کر دے گا لیکن بعد میں اس نے پولیس کو کچھ بھی نہیں دیا تھا- سب انسپکٹر کی توجہ ہماری گرفتاری کی طرف ہوئی تو بڈھے نے وہ معاملہ ہی گول کر دیا- ...شاید یہ سوچتے ہوئے کہ جب اتنی مار کھائی تو پھر رقم بچانے کی تھوڑی سی مار اور سہی- رقم دینے کا مطلب تو یہ ہوتا کہ چمڑی بھی گئی اور دمڑی بھی- وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا' اگر پولیس کو اس کی بات یاد آ جاتی تو وہ کیا کرتا؟

www.paksociety.com

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ پولیس اپنے تحفظات وصول کرنا بھول گئی۔ رقم بھی کم نہ تھی اور پولیس سب کچھ بھول سکتی ہے پیسہ لینا نہیں بھول سکتی۔ قبر میں بھی منکر نکیر کے سوال کا جواب دینے سے پہلے کہیں گے ضرور کہ پہلے کچھ چائے پانی کا خرچہ تو نکالو پھر دیں گے جواب۔

خیر... میں نے مایوسی کے جذبات کو جھٹک کے سوچا۔ اگر پولیس نے وہ رقم چھوڑ دی ہے تو رابعہ اور گل ان سے وصول کر لیں گی کہ تم وہ معاہدہ پورا کرنے میں ناکام رہے جس کی رو سے سب کو حفاظت اور سلامتی کے ساتھ یہاں سے نکالنا تمہاری ذمے داری تھی۔ خانہ بدوش ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ان دونوں کے پاس ریوالور ہیں۔ ان کے لئے سردار کی کنپٹی پر ریوالور رکھ کے اپنا مطالبہ منوانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

پولیس پارٹی کا سفر نامعلوم سمت میں جاری تھا۔ مجھے آہستہ آہستہ اپنی غلطی کا احساس پریشان کرنے لگا تھا۔ شاید مقابلہ کر کے نکل جانے کا وقت وہی تھا جب پولیس نے سب کو لائن اپ کر رکھا تھا۔ ہم اچانک ریوالور نکال لیتے [illegible]

[illegible]

"وہ پوچھیں گے کہ مفرور ملزم [illegible]"

"مفرور ملزم!" سب انسپکٹر نے طنز سے کہا "تمہارے [illegible] صاحب نے انہیں گرفتار کرایا تھا اور یہ حوالات سے نکل بھاگے تھے؟"

"یہ بات تو نہیں ہے سر..."

"واردات ہمارے علاقے میں ہوئی تھی۔ اس لئے..."

"واردات کہیں بھی ہوئی ہو۔ ملزموں کو میں نے گرفتار کیا ہے اپنے علاقے سے" سب انسپکٹر نے کہا "جا کے بتا دینا سائیں صاحب کو بھی۔ اور اس موٹے انچارج کو بھی۔ ان لوگوں کی ذمے داری میری ہے۔ وہ خود کسی قابل ہوتے تو ڈاکوؤں کو نہ جانے دیتے۔ اور ان کے ساتھ وہ سب کچھ نہ ہوتا جو تم نے بھی دیکھا تھا۔ ان کی جگہ میں ہوتا تو اتنی بے عزتی کے بعد مر جاتا۔ پولیس کی وردی پھر کبھی نہ پہنتا۔ تمہارا سائیں صاحب اپنی مال اور عزت کو بھی بچا نہیں سکا۔ اس کے بس کی بات نہیں ہے ڈاکوؤں سے نمٹنا۔ جاؤ سب کہہ دو ان سے۔"

ان دونوں کی حالت غیر ہو گئی۔ دوسرے پولیس والے ان کی طرف دیکھ کے مسکرا رہے تھے۔ یہ تمسخر اڑانے والی ذلت آمیز تھی۔ وہ سب جانتے تھے کہ پولیس کے ساتھ تھانے میں کیا سلوک کیا تھا۔ سب انسپکٹر نے سب کے سامنے ان کی عزت دو کوڑی کی کر دی تھی۔ وہ سر جھکا کے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے [illegible] جب وہ آ گئے تھے تو ان کی ہمت [illegible] چنانچہ انہیں گھوڑوں پر [illegible]

[illegible]

سب انسپکٹر نے سوال پر غور کیا اور بولا "تم یہ سب [illegible] ان سے کہو کہ ذہن رکھ جائیں۔ شاید ہمیں پھر ان کی [illegible] تفتیش کے لئے انہیں بلانا پڑے۔"

دونوں پولیس [illegible] کہا اور وہاں [illegible]

[illegible] قائم کرنے کے لئے [illegible] چار بج چکے تھے۔ اب [illegible]

[illegible] سب انسپکٹر تک پہنچ چکے تھے۔ نازو کے ہاتھوں [illegible] سب انسپکٹر نے تھام رکھی تھی [illegible] دونوں پولیس مین [illegible] سب انسپکٹر کی طرف گیا۔ اس [illegible]

[illegible] طرف [illegible] آہستہ [illegible] سب انسپکٹر [illegible] گردن میں ڈال دیا اور [illegible] سب انسپکٹر کی حالت [illegible] آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا اور [illegible] ہاتھ ہلانے سے قاصر تھا۔ نازو نے پھرکی بن کے اس کی دونوں ٹانگوں کو ناکارہ کر دیا تھا۔ وہ ہاتھوں کو استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ نازو اب اس کی کمر پر سوار تھی اور وہ دونوں ہاتھ زمین پر رکھے ہوئے اوندھا پڑا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو پکار رہا تھا اور انہیں گالیاں دے رہا تھا۔

سب انسپکٹر نے بھی نازو کو ایک کمزور اور نازک سی لڑکی سمجھ لیا تھا۔ وہ کیسے تصور کر سکتا تھا کہ [illegible] قیامت بن کے ٹوٹ پڑے گی تو اس کا اپنا مردانہ [illegible] جسمانی طاقت اور اسلحے کی قوت پر اعتماد خاک میں مل جائے گا۔

دونوں [illegible] کے باعث کچھ دیر بے یقینی اور ذہنی صدمے کی حالت میں [illegible] کھڑے رہے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنے [illegible] کرنے کے لئے پہنچتے نازو نے سب انسپکٹر پر [illegible] حاصل کر لیا تھا۔

"[illegible] نے قدم آگے بڑھایا" نازو نے غرا کے کہا۔ "[illegible] توڑ دوں گی۔"

[illegible] سب انسپکٹر کی پشت پر سوار رہتے ہوئے اپنے [illegible] کے بھرپور استعمال میں حیرت انگیز مہارت کا مظاہرہ کیا۔ اس کے گھٹنوں نے سب انسپکٹر کی کمر کو [illegible] تھا۔ اس کے پیروں کے پنجے مشینی انداز میں اوپر نیچے [illegible] اور جھٹکے دے رہے تھے سب انسپکٹر کی رانوں پر

تھے تھے۔ اس کی ٹانگیں بالکل مفلوج ہو گئی تھیں۔ وقفے وقفے سے نازو تھوڑا سا اوپر اٹھ کے گرتی تھی تو گھٹنوں کی کمر پر ضرب سے سب انسپکٹر کی کمر ٹوٹنے کے قریب ہو جاتی تھی۔ وہ درد کی شدت سے اچھلتا تھا تو نازو اس کی گردن کو کھینچ کے اور اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔

"چھوڑ [illegible]" "[illegible] پولیس مین [illegible]

[illegible]

"ارے میں مر جاؤں گا..." سب انسپکٹر نے [illegible] چلاتے ہوئے چیخ کر کہا "[illegible]"

[illegible] ہو کر اس کی کمر پر دونوں گھٹنے مارے۔ وہ ذبح کئے ہوئے بیل کی طرح ڈکرانے لگا۔ اس کے حلق سے اب خرخر کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ اس کے دونوں ماتحت انتہائی بے بسی سے دور کھڑے ہوئے صرف تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان کے پاس طاقت بھی تھی اور اختیار بھی تھا کہ وہ قانون کے مجرم کو گولی مار دیں۔ گولی چلانے کے لئے بندوق بھی تھی مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کچھ کرتے تو خود اپنے افسر کی موت کے ذمے دار ہوتے۔

ابھی تک میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا لیکن اب میں نے بھی تھوڑا سا تماشا دکھانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے بالکل نازو کے انداز میں اس پولیس والے کو گرا لیا جس نے مجھے پکڑ رکھا تھا۔ اس کو یقین آ چکا تھا کہ ہم دونوں صرف نام کے مرد ہیں اور وہ سب کچھ نہیں کر سکتے جو ایک لڑکی نے کر دکھایا۔ ہم کسی قابل ہوتے تو پہل بھی خود کرتے۔ اس نرم و نازک سی لڑکی کے ایکشن میں آنے تک دست بستہ غلاموں کی طرح نہ کھڑے رہتے۔

آدھے منٹ سے کم وقت میں یہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی۔ دوسرے پولیس مین کے ذہن یوں ہوتے ہی [illegible] کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے غالب کے سامنے ہتھیار ڈال دئے۔

"تم کیا چاہتے ہو؟ مجھے بتاؤ۔"

"ایسے نہیں۔ الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح سینے پر ہاتھ رکھ کے اور سر جھکا کے کہو کیا حکم ہے میرے آقا" غالب نے اب اس کو ایک لات رسید کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

وہ غالب کے مقابلے میں زیادہ طاقتور حریف تھا اور اگر لڑائی کا موقع ملتا تو وہ غالب پر بھاری پڑتا لیکن اب اس پر دہشت طاری تھی اور وہ ذہنی طور پر یہ تسلیم کر چکا تھا کہ غالب کسی طرح بھی کم نہ ہوگا۔

www.paksociety.com

"ڈاکو صاحب! ان کو چھوڑ دو۔" اس نے مخاطب کے ہاتھوں کی رسیاں رضاکارانہ طور پر کھولتے ہوئے کہا "ہم مجبور لوگ ہیں۔ نوکری کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آپ بادشاہ لوگ ہو، ہماری غلطی معاف کر دو۔"

غالب نے رہائی ملتے ہی اپنا ریوالور نکال لیا "خبردار! جو آئندہ بادشاہ کہا ہمیں، بادشاہ اب بہت مجبور اور بے اختیار ہو گئے ہیں۔"

میں نے اور نازو نے اپنے اپنے اسیروں کو آزاد کر دیا۔ غالب کے ہاتھوں میں ریوالور آجانے کے بعد ہمارے لئے زور آزمائی غیر ضروری ہو گئی تھی۔ صورت حال اب پوری طرح ہمارے کنٹرول میں تھی۔ غالب نے سب انسپکٹر کا ریوالور لے لیا تھا۔ سب انسپکٹر کو سیدھا کھڑا ہونے میں خاصی دیر لگی۔ اس کی کمر اور گردن اس حد تک پیچھے موڑی گئی تھی کہ ریڑھ کی ہڈی کا ہر مہرہ واپس اصلی پوزیشن میں آتے ہوئے درد سے فریاد کرتا تھا۔

غالب نے اس شخص کے دوسری لات ماری جس نے دو منٹ پہلے اسے آزاد کیا تھا "ایسے احمقوں کی طرح مت کھڑے رہو۔ آگے بڑھ کے پہلے ہاتھ جوڑ کر اپنی غلطی کی معافی مانگو، پھر ان کے ہاتھ کھولو۔"

سب انسپکٹر نے اسے آتش فشاں نظروں سے گھورتے ہوئے کہا "ہاں، اب اپنے کئے کی سزا بھگتو۔"

"میری کیا غلطی ہے سر۔"

سب انسپکٹر خود کم شرمندہ نہ تھا مگر وہ افسر تھا چنانچہ ماتحت پر غصہ اتار سکتا تھا "ہاں، غلطی تو تمہارے باپ کی تھی جس نے تمہیں پیدا کیا... یا اس کی تھی جس نے تمہیں پولیس میں بھرتی کیا، جھک مارنے کے لئے۔"

سپاہی میرے سامنے آ کے ٹھہر گیا۔ وہ منتظر تھا کہ میں اپنے دونوں بندھے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا کے اسے پیش کروں تو وہ رسیاں کھولے مگر میں نے دونوں ہاتھ ملا کے اس کے سر پر وار کیا۔ وہ نیچے گرا، پھر کھڑا ہو گیا۔

"ہم ہر معاملے میں لیڈیز فرسٹ کے اصول پر عمل کرتے ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے سر ہلایا "اور آپ کے لئے ہم نے اپنی جدوجہد آزادی کی ابتدا خود نہیں کی تھی۔ یہ موقع پہلے خاتون کو دیا تھا۔"

سب انسپکٹر کے دل سے دھواں اٹھا۔ ایک لڑکی سے پٹ کر اس کی افسرانہ شان کا گراف زیرو سے بھی نیچے جا چکا تھا۔ اب وہ اپنی خودی کو کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ کے بلند رکھنے میں مصروف تھا۔

"پہلا اصول ہے کہ ملزم کو گرفتار کرتے ہی اس کی تلاشی لو... سب ملزمان مسلح تھے اور تم انہیں تھانے لے جا رہے تھے۔ یہ تمہارے ساتھ اس سے بھی برا سلوک کرتے جو... اس موٹے ہاتھی کے ساتھ کیا تھا۔ وہ سب تو تمہیں بے غیرت کر [illegible] اتار کے حوالات میں بند ہو گئے۔"

غالب نے کہا "تم پر زیادہ برا وقت آنے والا [illegible] کرو گے؟"

میں نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "یہ تو سب [illegible] چلو بھر پانی مانگیں تو دے دینا، پانی نہ ہو تو بتا دینا۔"

پانی پانی ہونے کا انگریزی زبان میں کچھ اور مطلب [illegible]

سب انسپکٹر کا چہرہ احساس ذلت سے سرخ پڑ گیا۔

"یہ جو کچھ تم نے کیا ہے نا، یہ اچھا نہیں کیا۔" [illegible]

میں نے کہا "ہاں، یہ تو ٹھیک ہے، ہم نے بہت [illegible] تمہارے ساتھ۔"

"تم کیا سمجھتے ہو، ایسے بچ کے نکل جاؤ گے۔"

"اور اگر نکل گئے تو؟" غالب نے کہا۔

"خدا کی قسم مونچھیں منڈوا دوں گا۔"

نازو نے قریب جا کے اس کی مونچھوں کو بل دے کے [illegible] اصلی۔"

سب انسپکٹر کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ اس نے کہا "لڑکی!" اور ایک دم نازو کی کلائی پکڑ کے اسے جھٹک دیا۔

نازو کے لئے اتنی اشتعال انگیزی کا بہانہ کافی تھا۔ [illegible] دو منٹ میں سب انسپکٹر کو چار مرتبہ اوپر نیچے کیا اور گھما کے پھینک دیا۔

"بہت مان ہے ان مونچھوں پر" نازو نے ایک ہاتھ رکھ کے کہا "اب کیا خیال ہے، خود مونڈو گے یا میں [illegible] ہاتھ میں دے دوں؟"

سب انسپکٹر ایک سکتے کی حالت میں پڑا ہوا آسمان کو فریاد کناں نظروں سے دیکھتا رہا۔ یا شاید اسے زمین اور [illegible] گھومتے نظر آ رہے تھے کہ اس نے اٹھنے میں دیر لگائی۔ [illegible] کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ اس وقت کوئی اسے [illegible] تھما دیتا تو ہمیں شوٹ کرنے کے بجائے وہ خود کو گولی مار لیتا۔

غالب نے ان تینوں کی نگرانی نازو کو سونپی اور خود [illegible] لے گیا "اب کیا ہوگا ان کا؟"

میں نے کہا "ان کو اسی رسی سے باندھ کے لے جا [illegible]"

"کہاں؟" غالب نے کہا "یہ تو ہمیں تھانے لے [illegible] تھے، ہم انہیں لے کر کہاں جائیں گے؟"

"ہم واپس جائیں گے۔ پھر جب تک ہم [illegible] ساتھ خطرے کی حدود سے نکل نہیں جاتے، انہیں اپنے [illegible] رکھیں گے۔"

"خانہ بدوشوں کے قافلے میں تین پولیس والے [illegible] گے؟"

"تم کہاں پانچ" میں نے کہا "وہ دونوں بھی واپس آتے [illegible] تو قبیلے کی نقل و حرکت پر پابندی کے احکامات لے کر [illegible] گئے تھے۔"

"پانچ افراد کو باندھ کے گاڑی میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ یعنی [illegible] صرف دو ہیں اور وہ بھی سرپھروں کو لے جانے کے لئے [illegible] لائسنس استعمال ہو رہی ہیں۔"

"مرزا جی، تم نے کبھی گھوڑے پر سواری کی ہے؟"

"ہاں، جب چھوٹا تھا تو ایک بار شادیانے کے دولہا کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس کے بعد توبہ کی۔"

"کاش تم نے شہسواری سیکھی ہوتی۔"

"کرتے ہیں شہسواری میدان جنگ میں... اور مجھے کرنا [illegible] نہیں، خدانخواستہ میں ایمرجنسی پیش کر کے اپنا شوق پورا کر لوں گا۔"

"ہمارے پاس بہترین ٹرانسپورٹ تھی" میں نے گھوڑوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "ہم بھی ظلمات میں گھوڑے دوڑاتے نکل جائیں۔"

"گھوڑے میں بریک اور گیئر نہیں ہوتے۔ ایک بات [illegible] موٹر سائیکل کو اس لئے بھی گھوڑے پر فوقیت حاصل ہے کہ وہ لات نہیں مارتی، باقی سب صفات مشترک ہیں۔" غالب نے کہا۔

"سوال یہ ہے دوست کہ اس اصطبل کا کیا ہوگا۔"

"کیوں نہ ہم گھوڑے بیچ کر سو جائیں۔ آج اچھا موقع ہے اس محاورے پر عمل کرنے کا۔" غالب نے کہا "تجربہ ابھی بہت [illegible] ہے۔"

"تو صورت حال پر سنجیدگی سے غور نہیں فرمائے گا تو مجھے تمہیں نازو کے سپرد کرنا پڑے گا۔ وہ اس وقت تازہ دم ہے۔"

غالب نے کہا "نو پرابلم، کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم انہی گھوڑوں پر سوار ہو کے جائیں گے۔ ڈرائیور آگے بیٹھے گا۔ پیچھے ہم ہوں گے۔ گھوڑے کو ڈرائیور کنٹرول کرے گا، ڈرائیور کو ہم کنٹرول کریں گے۔"

"خانہ بدوش نہ پولیس والوں کو ساتھ رکھنے پر تیار ہوں گے نہ ان کے گھوڑوں کو۔ میری تجویز یہ ہے کہ ہم انہی کے [illegible] جائیں، جہاں بھی جانا ہو۔ ہم پانچ افراد ہیں، گھوڑے بھی [illegible] ہیں۔"

"یہ ایک اچھی تجویز ہے" غالب نے کہا "ہر گھوڑے پر دو [illegible] ایک اصلی شہسوار اور اس کے پیچھے بندوق [illegible]"

[illegible] نے کہا "ریوالور ہم سب کے پاس ہے۔ ہم سب کو [illegible] رکھ سکتے ہیں۔ راستہ ہمیں معلوم نہیں لیکن غلط [illegible] کون مرنا چاہے گا۔ انہیں فوراً معلوم ہو جائے گا [illegible]"

غالب نے کہا "یہ بالکل ٹھیک ہے، اگر ہم آج رات یہاں سے نکل گئے تو کل بمبئی میں ہوں گے، پھر کوئی خطرہ نہیں۔"

"فاصلہ تو ایک گھنٹے کا بھی نہیں ہے۔ بس ہم سڑک تک پہنچ جائیں۔ اس کے بعد گھڑ سواری کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"وہاں سے کوئی کار یا ٹیکسی مل جائے گی۔"

"جیسے ہی وہ دونوں پولیس مین آ جائیں، ہم نکل جاتے ہیں۔ رات ہونے کا انتظار بھی کیوں کریں؟" میں نے کہا "رابعہ اور [illegible] کو ساتھ لے کر اسی وقت چلے جانا بہتر ہے۔"

"سڑک تک تو ہم انہیں زبردستی لے جائیں گے اور یہ لوگ بھی مجبور ہوں گے خاموش رہنے پر مگر اس کے بعد؟"

"اس کے بعد؟" میں نے سوچ کے کہا۔

"ہاں، جیسے ہی ہم نے انہیں چھوڑا یہ لوگ شور مچا دیں گے اور پوری کوشش کریں گے کہ ہمارے لئے سب راستے بند ہو جائیں۔"

"یہ وقت آنے پر دیکھیں گے اور اس مسئلے کا حل بھی نکل آئے گا۔ ظاہر ہے ہم کوئی رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ہم کوئی ایسا انتظام پہلے کریں گے کہ خود محفوظ رہیں۔"

غالب نے گھڑی دیکھ کے کہا "ان دونوں نے بہت وقت لگا دیا۔"

میں نے کہا "فاصلہ تو زیادہ نہیں تھا۔ آ رہے ہوں گے خراماں خراماں۔"

غالب نے کہا "مجھے اخبار میں اپنی تصویریں دیکھ کے بڑی حیرانی ہوئی۔ ہم یہاں بھی اشتہاری مجرم قرار دئے جا چکے ہیں۔"

غالب کی بات پر مجھے کچھ اور یاد آ گیا۔ میں نے کہا "مرزا، اس اخبار میں ہم تینوں کی تصویریں دیکھنے کے بعد منجھے کا ردعمل عجیب تھا۔"

"کس منجھے کا؟"

"جو میرے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بہت طرف مسکرا کے دیکھا اور کہنے لگا کہ میں نے ٹھیک کہا تھا۔"

غالب چونکا "پھر تو نے اس سے پوچھا نہیں کہ آخر اس بات کا مطلب کیا تھا؟ کیا ٹھیک کہا تھا اس نے؟"

"یہ پوچھنے کی مہلت ہی کہاں ملی" میں نے کہا "میرا خیال تھا کہ پولیس چلی جائے پھر اس سے بات کروں گا اور پولیس بھی بس واپس جانے ہی والی تھی کہ اس خبیث نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔"

"کیا اس نے [illegible] محسن کے بارے میں کچھ کہا تھا؟"

"میرا اندازہ یہی ہے۔ ہماری تصویر دیکھ کے وہ ایسی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔"

"کیسی بات یار؟" غالب نے کہا "اگر بات اتنی ہی تھی جتنی تو نے مجھے بتائی ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس کا تعلق محسن سے ہوگا۔ کیا اس نے محسن کا نام لیا تھا؟ یا تصویر پر انگلی رکھ کے کچھ کہا تھا؟" غالب نے کہا "واضح اشارہ یا تو..."

www.paksociety.com

"نہیں، بالکل واضح طور پر اس نے تصویر کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا تھا" میں نے کہا۔

"پھر ممکن ہے اس بات کا تعلق ہم سے ہو۔"

"ہم سے!"

"ہاں۔ اس نے سردار سے یا کسی اور شخص سے کہا ہو گا کہ یہ لوگ مجرم ہیں۔ قاتل ہیں اور ڈاکو ہیں۔ جب پولیس آئی اور انہوں نے اخبار میں شائع ہونے والی تصویریں دکھائیں۔ تو آپ کی بات درست ثابت ہو گئی۔"

"تو نے مجھے پھر مایوسی میں مبتلا کر دیا ہے۔ بہت پُر امید ہو گیا تھا میں کہ اب محسن مل جائے گا۔"

"پُر امید تو میں بھی ہوں" غالب نے کہا "امید کے بغیر ہم اپنی جدوجہد کو جاری نہیں رکھ سکتے۔ امید پر دنیا قائم ہے۔"

میں نے کہا "خواہ مخواہ فلسفہ مت جھاڑو۔ میری امید محض خیالی نہیں ہے۔ خواہش کا نام نہیں ہے۔ اس بات کا ذکر سردار نے بھی کیا تھا کہ ہمارے جیسا ایک شخص رات کو یا صبح آیا تھا۔"

"یہ بات بھی سردار نے نہیں، اس کے بیٹے ولی عہد بہادر نے ہی کی تھی" غالب کچھ قائل ہو کے بولا "رات یا صبح سے اس کی مراد تھی رات کا آخری پہر، صبح ہونے سے بہت پہلے، جب رات ہی ہوتی ہے۔"

"ہاں۔ اس نے تسلیم کیا تھا کہ اس نے کپڑے دیئے تھے اور ایک گدھا دیا تھا جس پر بیٹھ کے وہ شخص روانہ ہو گیا تھا اور ولی عہد بہادر نے مدد کرنے کا سارا معاوضہ خود رکھ لیا تھا۔ اس وقت وہ نام، حلیہ کچھ نہیں بتا سکتا تھا مگر کیا اس وقت ہم سب کا یہ خیال نہیں تھا کہ وہ محسن ہو گا؟"

"ہاں۔ خیال تو تھا، مگر۔"

"پھر ولی عہد نے اس کی تصویر دیکھ کے جس طرح سر ہلایا تھا اس سے اور کیا ثابت ہوتا ہے؟"

"ثابت کچھ نہیں ہوتا۔ مگر اس خیال کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ وہ محسن تھا۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ ابھی ہم جائیں گے تو تجھ سے پوچھ لیں گے" غالب نے کہا۔

"اگر وہ محسن تھا تو گدھے پر بیٹھ کے وہ کدھر نکل گیا؟"

"جان بچا کے فرار ہونے والا سمت نہیں دیکھتا۔"

"پھر بھی، اسے ہمارا خیال نہیں آیا؟ اس نے یہ نہیں سوچا کہ ہم اسے کہاں تلاش کریں گے؟" میں نے کہا۔

"ہمیں کیا معلوم، اس نے ہماری تلاش میں کیا پاپڑ بیلے تھے" غالب نے ایک سرد آہ بھر کے کہا "جب وہ ملے گا تو معلوم ہو گا کہ ہم سے بچھڑ کے اس پر کیا بیتی۔ ویسے بے وقوف تو ہے نہیں، اور نہ بزدل ہے۔ ہمیں چھوڑ کے وہ کہیں نہیں جا سکتا۔ اسی علاقے میں کہیں چھپا ہوا ہو گا اور ہمارا سراغ لگانے کی فکر میں ہو گا۔ جیسے ہم اس کے لئے فکرمند ہیں۔"

دونوں گھڑ سواروں کی واپسی کی خبر گھوڑوں نے ہنہنا کے دی... میں اور غالب ان کے استقبال کے لئے ریوالور نکال کے چند قدم آگے چلے گئے۔ وہ جیسے ہی پہاڑی کی اوٹ سے نمودار ہوئے ہم نے انہیں سامنے آ کے روک لیا۔

ہمیں آزاد دیکھ کے اور ریوالور کا رخ اپنی طرف پا کے ان کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر گھوڑے پر سے اتر آئے۔

"ہم کو مت مارنا جی، ہم غریب لوگ ہیں" ان میں سے ایک نے اپنی رائفل مجھے پیش کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے نے بھی ہمت کی "کیا کریں سر، افسر جو حکم دیتے ہیں ماننا پڑتا ہے۔"

میں نے دونوں کی رائفلیں خالی کر کے پھینک دیں "تم کو اتنی دیر کیوں ہوئی واپسی میں؟"

"کیا دو میل آنے جانے میں ایک گھنٹا لگتا ہے؟" غالب نے بھی انہیں ڈانٹا "پیدل تو نہیں گئے تھے تم۔"

"وہ... سر... بات دراصل یہ ہے......"

"بات دراصل یہ ہے کہ حرام خوری کی عادت پڑ گئی ہے۔ گھومتے پھرتے سیر کرتے آ رہے تھے" میں نے کہا۔

"نہیں سر، ان کو تلاش کرنے میں دیر ہو گئی۔"

"کیا اتنی دیر میں پورا قبیلہ غائب ہو گیا؟؟"

"ہاں سر، بالکل غائب ہو گیا۔"

"کیا بکتے ہو!" میں نے کہا۔

"یہ بالکل سچ ہے" دوسرے نے کہا "ان کا کوئی پتا نہیں چلا۔"

غالب نے اس کی گردن دبوچ لی "تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے؟"

میں نے دوسرے کو جھنجوڑ کے کہا "تم راستے سے بھٹک تو نہیں گئے تھے، پاگل کے بچے۔"

"وہ... سر... پہلے ہم بھی یہی سمجھے تھے" وہ خوف سے کانپنے لگا۔ "مگر راستہ بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"ہم نے ادھر ادھر... سب جگہ دیکھ لیا۔"

"کہاں دیکھ لیا؟" میں نے کہا "اگر وہ گئے مشرق میں تو تم مغرب میں بھٹک کے لوٹ آئے ہو گے۔"

"نہیں جی، ایسی بات نہیں۔ ہم یہاں کے راستوں سے واقف ہیں۔ دن رات پھرتے ہیں" اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

میں اسے گھسیٹ کر سب انسپکٹر کے سامنے لے گیا "سنو، تمہارے یہ قاصد کیا خبر لائے ہیں۔"

"کہاں بھیجا تھا تم نے انہیں، اور یہ کہاں گئے تھے، ان سے پوچھو" غالب نے دوسرے کو بھی سب انسپکٹر کی طرف دھکیل دیا۔

انہوں نے پھر وہی دہرایا جو پہلے کہہ چکے تھے۔ سب انسپکٹر

کے سامنے بے بس ہو چکے۔ ان دونوں کا بیان ایک تھا مگر اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس نے ایک کے منہ پر تھپڑ رسید کیا "تو نے بے وقوف سمجھ رکھا ہے مجھے... اور ان سب کو۔"

وہ ہاتھ جوڑ کے گڑگڑانے لگا "آپ میری مائی باپ ہیں سر، جھوٹ کیوں بولوں گا آپ سے۔ قبیلے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔"

"ہم نے ہر جگہ تلاش کیا۔"

"ابے... کیا وہ بھوتوں کا قبیلہ تھا" سب انسپکٹر نے چیخ کے کہا "جنات تھے وہ کہ غائب ہو گئے۔ قسم خدا کی جھوٹ بولا مجھ سے تو زندہ گاڑ دوں گا۔"

مجھے پہلے بھی شک ہوا تھا کہ سب انسپکٹر مسلمان ہے۔ اس نے مونچھیں منڈوانے کی بات کرتے ہوئے خدا کی قسم کھائی تھی۔

"سر، آپ خود چل کے دیکھ لیں، اگر آپ کو مجھ پر یقین نہیں" اس کے ماتحت نے کہا "ہم تو خود حیران تھے۔"

"ہم نے دس کوس کا علاقہ چھان مارا" دوسرا بولا۔

سب انسپکٹر نے سر پہ ہاتھ مار کے کہا "خدا کے لئے کوئی عقل کی بات کرو۔ وہ ایک پورا قافلہ تھا۔ اس میں بیل گاڑیاں تھیں۔ کیا انہیں جادو کی طرح اڑا کر لے گئے وہ لوگ، کدھر گئے۔"

"بیل گاڑیاں... وہ تو ہیں سر۔"

میں نے اسے چونک کر دیکھا "کیا؟ بیل گاڑیاں تھیں۔"

"اور گدھے؟ قافلے میں جو اتنے بہت سے لوگ تھے" غالب نے کہا۔

وہ نفی میں گردن ہلانے لگا "اور کچھ نہیں، صرف بیل گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں اور بیل بھی بندھے ہیں۔"

یہ بہت پریشان کن خبر تھی لیکن اتنی ہی ناقابل یقین بھی لگتی تھی۔ سب انسپکٹر کی بات ٹھیک تھی کہ آخر تھے وہ انسان۔ جنات نہیں تھے کہ پلک جھپکتے میں غائب ہو گئے۔ قافلے میں سب ملا کے بیس سے کم نہیں مرد اور عورتیں شامل تھے۔ ان کے علاوہ تین چار بچے بھی تھے۔ ان کا ساز و سامان جو بھی تھا نصف درجن گدھوں پر لدا ہوا تھا۔ یہ سب لے کر وہ اتنی سی دیر میں اتنی دور نہیں پہنچ سکتے تھے کہ ان کا سراغ ہی نہ ملے۔

"میرا خیال ہے کہ ہم خود چل کے دیکھتے ہیں" میں نے کہا۔ "یہاں ان کے ساتھ سر کھپانے میں وقت ضائع ہو گا۔"

"صحیح بات کا پھر بھی پتا نہیں چلے گا" غالب نے کہا۔

"غالب، کیا وہ رابعہ اور گل کو بھی لے گئے ہوں گے؟" نازو نے جذباتی لہجے میں ایک احمقانہ سوال کیا۔

غالب نے بھی اس کی طرف دیکھا "نہیں، وہ انہیں چھوڑ گئے ہوں گے دہلی میں قطب مینار پر... اور خود چلے گئے ہیں۔ نازو اپ سیٹ ہے۔"

مگر اسے فوراً کھینچ کر دور لے گیا "یار، ابھی اس نے رونا شروع کر دیا تو چپ کرانا مشکل ہو جائے گا۔ بہت شدید تھکن، نیند کی کمی اور اعصابی دباؤ کا شکار ہے، اس کی حالت دیکھو۔"

"ہم کیا بہت تر و تازہ اور پُرسکون ہیں؟" غالب نے کہا۔

"ہم برداشت کر سکتے ہیں" میں نے کہا۔

"میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ یہ نئی پریشانی پیدا ہو گئی ہے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "پریشانی تو ہے لیکن ایک دوسرے کو پریشان کرنے سے کیا یہ پریشانی کم ہو جائے گی۔ ابھی جا کے دیکھ لیتے ہیں ہم خود کہ یہ معاملہ کیا ہے۔"

غالب نے سر کھجا کے کہا "اچھا میں اس سے معافی مانگ لیتا ہوں۔"

نازو سخت خفا بیٹھی تھی۔ اس نے کہا "میری طرف سے آپ بھاڑ میں جائیے۔"

"چلا جاؤں گا، پہلے یہ ناراضگی ختم کرو، دراصل وہ بات ہی اتنی فضول کی تھی تم نے۔ چلو اب مسکرا کے دکھا دو۔"

بات بنتے بنتے پھر بگڑ گئی "میں مسکرا کے دکھا دوں آپ کو، یہ دیکھئے" نازو نے دونوں ہاتھوں کی ایک ایک انگلی سے منہ پھاڑ کے سارے دانتوں کی نمائش کی۔ ایسے جبڑے چیرنے سے اس کے گال تک پھیل گئے تھے۔

"تم ایک بھتنی لگ رہی ہو" غالب نے کہا "میں غلط نہیں کہتا تھا کہ میرا سسرا ایک بھوت ہے۔"

"تم خود کیا ہو، اپنی شکل دیکھو جا کے آئینے میں، دیکھو" نازو نے ایک پتھر اٹھا کے پھینکا، کوشش کے باوجود غالب بچ نہ سکا۔ پتھر اس کی کمر میں لگا۔ ان کے درمیان بات چیت تک بند ہو گئی۔

میں نے اتنی دیر میں روانگی کی تیاری مکمل کر لی تھی اور پولیس پارٹی کو ہدایات بھی جاری کر دی تھیں۔ میں نے ان کی رائفلیں واپس کرنے سے پہلے میگزین خالی کر دئے تھے۔ سب انسپکٹر کو بھی میں نے خالی ریوالور واپس کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ اس اسلحے کی ہمیں قطعی ضرورت نہ تھی مگر اس کے بغیر ان کی نوکری خطرے میں پڑ جاتی۔

وہی دو سپاہی سب سے آگے رہے جو خانہ بدوشوں کے قبیلے کی تلاش میں ناکام رہے تھے۔ ان کے پیچھے والے سپاہی کے ساتھ غالب ریوالور لے کر بیٹھا تھا۔ پھر ایک سپاہی کے پیچھے نازو تھی جو اس اعزاز پر خاصا خوش نظر آتا تھا۔ اس نے گھوڑے کو پچکار کے آہستہ آہستہ بڑھایا۔

"آپ کو ڈر تو نہیں لگتا باجی؟" اس نے پلٹ کے نازو سے کہا۔

"تم سے؟ نہیں، بالکل نہیں" نازو نے کہا۔

"میرا مطلب تھا گھوڑے کی سواری سے۔ میں بڑا اچھا سوار ہوں۔ آپ کو گرنے نہیں دوں گا" اس نے کہا۔

www.paksociety.com

"اور اگر گھوڑا گر گیا تو کیا کرو گے؟" نازو شرارت پر آمادہ تھی۔

"نہیں جی گھوڑا بہت اچھا ہے۔"

"کبھی اس کی نظر ٹیسٹ کروائی ہے تم نے؟ دریا اور پہاڑ نظر تو آجاتے ہوں گے اسے؟"

"آپ میری کمر میں ہاتھ ڈال کے بیٹھ جائیں جی' پھر کوئی خطرہ نہیں..."

"تمہارا موڈ رومانٹک ہوتا جا رہا ہے' اٹھو پر لٹو ہو گئے ہو؟"

"نہیں جی۔" سپاہی بوکھلا گیا۔

غالب نے پلٹ کے کہا "ابے لٹو... تو پہ تو طرف مجرم ہو۔"

"میں تمہیں اچھی لگتی ہوں نا؟" نازو نے کہا۔

سپاہی نے پریشان ہو کے کہا "جی... آپ کیسی باتیں کرتی ہیں جی۔"

نازو نے کہا "ڈرتے کیوں ہو ہمت ہے تو بھگا کے لے جاؤ' جیسے راجا پرتھوی راج لے گیا تھا سنجوگتا کو۔"

غالب نے پھر پیچھے سر گھما کے کہا "لے جاؤ... لے جاؤ۔ جب بھگتو گے اس مصیبت کو تب پتا چلے گا میاں۔"

نازو نے اسے ڈانٹ کر کہا "کیا میں مصیبت ہوں؟"

سپاہی کے اوسان خطا ہو گئے "جی۔ میرا مطلب ہے نہیں جی' بالکل نہیں جی... لیکن آپ کسی اور کے ساتھ بیٹھ جائیں جی' مجھے معاف کردیں..."

"کیوں' کسی اور کے ساتھ کیوں بیٹھوں میں؟ جب مجھے تم اچھے لگتے ہو' انکار کرو گے تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ پھر میں تمہارا دل توڑ دوں گی۔ دل بائیں جانب ہوتا ہے نا' پسلیوں کے اندر... تو پہلے پسلیاں توڑنی پڑیں گی' پھر دل ٹوٹے گا۔ ایک ہاتھ مار کے میں سر کو بھی ناریل کی طرح توڑ سکتی ہوں' دل تو بہت نازک ہوتا ہے۔ تم نے دل کسی کو دیا تو نہیں ہے نا؟"

میں آخری گھوڑے پر سب انسپکٹر کے ساتھ تھا چنانچہ نازو کی ساری بکواس سن رہا تھا اور مسکرانے لگا تھا۔

اچانک سب انسپکٹر نے کہا "سکندر بخت' مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

میں ایسے اچھلا جیسے کسی نے مجھے راکٹ لانچر میں رکھ کے فائر کردیا ہو "تم... یہ نام کیسے جانتے ہو!"

"تمہارا نام تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ تم شیطان کی طرح مشہور ہو تو غلط نہیں ہوگا۔ سرحد کے دونوں طرف تم بہت سے لوگوں کے لئے درد سر بنے ہوئے ہو۔" سب انسپکٹر آصف جاہ نے میری پریشانی سے لطف اندوز ہو کے کہا۔

میں دم بخود بیٹھا رہا "تم نے پہچان لیا تھا مجھے؟"

"نہیں' تمہاری تصویر بہت مختلف ہے۔" وہ بولا "اگر یہ میک اپ نہ ہوتا تو شاید پہچان لیتا۔"

میں نے کہا "اگر تم میرا نام جانتے ہو تو دوسروں کے نام سے بھی واقف ہو گے؟"

وہ بولا "ہاں' غالب اور محسن کے نام میرے لئے نئے نہیں ہیں۔"

"کب سے سن رہے ہو تم یہ نام؟"

"بہت عرصے سے۔ پہلے میں بی ایس ایف میں تھا۔ بارڈر سیکیورٹی فورس میں۔ لاہور واہگہ کی سرحد پر میں نے تین برس بڑی مشکل سے گزارے۔ پاکستان کا ایک ایس پی تھا' سراج احمد۔"

میں نے کہا "تم سراج کو بھی جانتے ہو؟"

"سراج سے ہمارا براہ راست رابطہ تھا۔ میرا مطلب ہے ہمارے اعلیٰ افسروں کا' وہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔ اسمگلنگ روکنے کے لئے نہیں' وہ اسمگلنگ کرنے والوں کی مدد کرتے تھے۔ ان سے خوب رشوت لیتے تھے اور ان کا راستہ کھلا رکھتے تھے۔ وہاں اکثر تمہارا اور تمہارے کارناموں کا ذکر ہوتا تھا۔ ظاہر ہے اچھے الفاظ میں نہیں ہوتا تھا مگر میں سنتا رہتا تھا۔ تین مہینے بعد مجھے یہاں بھیج دیا گیا۔ سراج کی وجہ سے۔"

"سراج کی وجہ سے!"

"ہاں۔ ایک دن اس سے تلخ کلامی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں سب وطن دشمنوں اور غداروں کو گولی مارنے کی بات کر رہا تھا' خواہ وہ ہندوستان میں ہوں یا پاکستان میں ہوں یا کہیں اور۔ چور کی داڑھی میں تنکا' وہ مجھ پر گرم ہو گیا کہ ایک معمولی اے ایس آئی کو اتنی ہی بڑی بات کہنی چاہئے جتنی اس کی اوقات ہو۔ اس پر میں نے کہہ دیا کہ بڑے بڑے عہدوں والے بھی اپنے اختیار کے استعمال میں اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے اوپر کتنے بیٹھے ہیں۔ بس اس کے بعد میں ناپسندیدہ ہو گیا۔ جب تک میں وہاں تھا مجھے پاکستانی اخبارات مل جاتے تھے۔ ہم لوگ آپس میں خبروں کا تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ دونوں طرف کی سرحدی پولیس آپس میں رابطہ بھی رکھتی تھی۔ میں نے بہت کچھ سنا تھا اور پڑھا تھا۔ پھر مجھے یہاں بھیج دیا گیا تو وہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب اچانک تمہارا ذکر سننے میں آیا۔"

"کس سے سنا تھا ہمارا ذکر؟"

"پھر بتاؤں گا' ابھی وقت کم ہے۔ یہ سمجھ لو کہ میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا لیکن اس طرح کہ کسی کو شک نہ ہو۔ شک ہو گیا تو اس کا نقصان مجھے بھی ہوگا اور تمہیں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک میں نے تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی اور تمہاری ہر زیادتی برداشت کرتا رہا۔"

"آئی ایم سوری' مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"تمہیں معلوم ہونا بھی نہیں چاہئے۔ دوسروں کے سامنے تم یہی ظاہر کرتے رہو گے کہ نہ تم کچھ جانتے ہو میرے بارے میں نہ میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو جانتا ہوں۔ میرا پلان تم

...کر رہا ہے۔"

"کیا پلان تھا؟"

"میں تم کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ تمہیں بچانے کے لئے اور تمہاری مدد کرنے کے لئے میں نے ان دونوں سپاہیوں کو رخصت کر دیا تھا جو تمہارے دشمن تھے۔ میں نے تمہیں ان سے چھین لیا تھا۔ وہ جا کے شکایت کریں گے اور موٹا ناہر ناتھ ہنگامہ کرے گا۔ اس دوغلے کو معقولات ہے کہ میں نے ان کے مجرم چھپا لئے۔ وہ تو جلے کٹے بیٹھا ہو گا کہ کسی طرح تمہیں ایک زیادتی کے بدلے میں دس بار سزا دی جائے۔ وہ سب انتقام لینے کے لئے پوری تیاری کے ساتھ تمہارے منتظر تھے... سخت مایوس اور مشتعل ہوں گے... مگر ان سے میں نمٹ لوں گا بشرطیکہ تم بھی کچھ تعاون کرو مجھ سے۔"

میں نے کچھ متفکر ہو کے کہا "میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"دیکھو تم کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"تمہارے ساتھ..."

"ہاں' آج رات میں تم کو اپنے علاقے کے تھانے میں بند کروں گا۔"

میں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

اس نے کہا "کیا تم کو بھروسا نہیں مجھ پر؟"

میں نے کہا "مگر بھروسے میں کوئی رسک لینا... مشکل... بلکہ ناممکن ہے۔"

"کیوں؟ تم ڈرتے ہو کہ میں جھوٹ بول کے تمہیں گرفتار کروں گا اور پھر تمہاری گرفتاری پر میڈل اور انعام حاصل کرنے کی کوشش کروں گا؟"

میں نے کہا "اگر تم مخلص ہو تو گرفتار کئے بغیر اور تھانے کی حوالات میں بند کئے بغیر بہت کچھ کر سکتے ہو ہمارے لئے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ایسے میں کیا کر سکتا ہوں' تم نے مجھے بے بس کر دیا ہے۔ تم بھاگنا چاہتے ہو۔ موقع ملتے ہی تم مجھے اور سب کو کسی پاتال کے حوالے کر دو گے یا ہلاک اور زخمی کر کے نکل جاؤ گے۔ پھر میں تمہیں کہاں تلاش کرتا پھروں گا؟ تم سے دوبارہ رابطے کی کوئی صورت ہی نہیں رہے گی میرے لئے۔ تم آج نکل جاؤ تو کل نہ جانے کہاں چلے جاؤ گے۔ میں اپنے علاقے سے نہیں جا سکتا۔"

"ہم خود رابطہ قائم کریں گے تم سے۔"

"پھر کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ تمہارے فرار ہو جانے کے بعد مجھے معطل کر دیا جائے گا۔ میرے خلاف تحقیقات ہو گی' فرض سے غفلت برتنے کے الزام میں۔ میرے خیالات قوم پرستی کے اور میری نقل و حرکت کی نگرانی ہو گی۔ پولیس کی تحویل سے مجرم پہلے بھی بھاگتے رہے ہیں لیکن میرا کیس ذرا الگ ہے' میرا مسلمان ہونا بن جائے گا۔ خواہ مخواہ یہ شکوک پیدا

کئے جائیں گے کہ میں نے تمہیں فرار کے مواقع فراہم کئے۔ اسی لئے میں نے تمہیں اپنی تحویل میں لینے پر اصرار کیا تھا کہ تمہیں بھاگنے میں مدد دوں کیونکہ تم بھی مسلمان ہو۔ یہاں عام بات ہے۔ مسلمان سو فیصد قابل اعتماد اور محب وطن نہیں سمجھے جاتے... ان پر ہمیشہ شک کیا جاتا ہے۔"

"کیا تم اپنے طرز عمل سے یہ ثابت نہیں کر رہے ہو... کہ شک کرنے والے غلط نہیں کرتے۔"

"نہیں۔ اگر تمہارے عزائم سے میرے وطن کو ذرا سا بھی خطرہ لاحق ہوتا تو میں تمہیں دشمن سمجھتا اور کوئی رعایت نہ دیتا لیکن نہ تم بھارت کے خلاف ہو نہ بھارت کو نقصان پہنچانے والوں کے ساتھ ہو۔ تم اپنی جنگ لڑ رہے ہو' اپنے غداروں کے خلاف۔ مشرقی پاکستان کا معاملہ تمہارے گھر کا معاملہ ہے' میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے کسی صوبے میں علیحدگی پسند ایسے سر اٹھائیں تو ہماری حکومت اور ہمارے عوام بھی یہی کریں گے جو تم نے اور تمہاری حکومت نے کیا۔ میں اپنے وطن سے غداری نہیں کر رہا ہوں۔ ایک ایسے شخص کی مدد کر رہا ہوں جو میرے یقین کے مطابق مظلوم ہے' ظالموں سے لڑ رہا ہے' حق پر ہے اور باطل کے خلاف جہاد میں مصروف ہے۔ مجھے رشک ہوتا ہے تمہارے جذبے پر' تمہارے حوصلے پر اور تمہارے یقین پر۔ جس طرح تم چند لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور جو کچھ تم نے کیا' وہ حیرت انگیز اور قابل تعریف ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ جذبہ فنا ہو' یہ کام رک جائے' اس مقصد کو شکست ہو جائے۔ یہاں تک کہ تم میری وجہ سے مجبور ہو جاؤ کہ اپنے مشن کی ناکامی کو قبول کر لو۔ میں یہ الزام لے کر خود اپنی نظر میں مجرم بننا نہیں چاہتا۔"

میں نے کہا "کیا مجرموں کی مدد کر کے تم ایک جرم کا ارتکاب نہیں کرو گے؟"

"ہاں۔ یہ الزام آئے گا مجھ پر... کہ میں نے ادائے فرض میں کوتاہی کی۔ میں اس کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ جو تمہیں مجرم سمجھتے ہیں میں ان سے اختلاف رکھتا ہوں۔ میرے نزدیک تم مجاہد ہو' جو تم کر رہے ہو وہی عین فرض ہے۔ مگر یہ فرق نقطہ نظر کا ہے۔ میں یہاں کے قانون کو بدل نہیں سکتا' میں سب کو قائل بھی نہیں کر سکتا کہ میری سوچ ٹھیک ہے۔ چنانچہ مجھے اپنی سزا قبول کرنی ہو گی۔ مگر ابھی تم میرے ساتھ چلو۔"

"آخر تم کیوں چاہتے ہو کہ ہم خود کو تمہارے حوالے کردیں اور آج تمہارے ساتھ جا کے حوالات میں بند ہوں؟"

"میں تمہیں آج ہی رات وہاں سے نکال دوں گا۔"

"پھر اس سے کیا فرق پڑے گا؟ ہم ابھی بھاگ جائیں یا رات کو فرار ہوں' ہر صورت میں تم پر یہ الزام ضرور آئے گا۔"

"میں نے کہا نا' الزام سے میں نہیں ڈرتا' مگر یہاں میں پوری بات نہیں کر سکتا۔ سب دیکھیں گے اور سننے کی کوشش کریں گے۔

www.paksociety.com

"... میں ان دونوں لڑکیوں کا سراغ بھی لگا لوں گا جو تمہاری غلطی سے خانہ بدوشوں کے ساتھ چلی گئیں۔"

"وہ میری غلطی نہیں تھی' میرا فیصلہ تھا۔"

اس نے افسوس سے سرہلایا "اچھا ہوتا اگر تم انہیں بھی ساتھ رکھتے۔ مجھے کیا معلوم کہ تمہارے ساتھ اور کون تھا۔ اس نے ایک کو شناخت کیا تھا اور میں نے بھی تمہیں ایک ہی سے بات کرتے دیکھا تھا۔"

"ایک رات میں تم کیسے سراغ لگا لو گے ان کا؟"

"میں کوشش کروں گا' اس کے علاوہ بھی میں بہت کچھ کر سکتا ہوں تمہارے لئے۔"

"بتاؤ۔"

"بتاتا ہوں کہ تمہاری رہنمائی کر سکتا ہوں' تمہیں ضرورت کی ہر چیز فراہم کر سکتا ہوں۔"

"ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں' ہم اپنے وسائل خود پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ اور رہنمائی کے لئے ہمارے پاس اپنی عقل ہے اور خدا کی مدد پر انحصار کی عادت ہے۔"

اس نے جھنجلا کے کہا "وہ بھی ایسا ہی شخص تھا۔ اس کی مدد کی تھی میں نے۔۔ مگر وہ بھاگ گیا' اس نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا۔"

"وہ کون؟"

"تمہارا دوست۔۔ ساتھی۔۔ محسن اور کون۔"

اس سے پہلے کہ میں کسی ردِعمل کا اظہار کرتا' آگے آگے چلنے والوں نے لگام کھینچ کر گھوڑے روک لئے۔

"دیکھ لیں سر' یہی جگہ ہے وہ۔"

اب میں نے بھی چونک کر دیکھا تو مجھے وہ جنگل کا ڈیاں نظر آ گئیں۔ باتوں میں وقت کا احساس بھی نہیں ہوا تھا اور مسافت کا بھی۔ ورنہ میں اس جگہ کو پہلے ہی دیکھ لیتا' میں سب انسپکٹر آصف جاہ کی طرف متوجہ تھا چنانچہ میں نے بعد میں نازو یا غالب کی گفتگو بھی نہیں سنی تھی۔

میں ریوالور کے ساتھ گھوڑے پر سے اترا۔ نازو کو اتارنے کے لئے غالب نے ہاتھ بڑھایا مگر نازو نے انکار کر دیا۔

"میں اس کا ہاتھ تھاموں گی جو مجھے یہاں تک لایا ہے۔ میرا شریکِ سفر کہاں ہے؟" نازو نے کہا۔

بے چارہ سپاہی فوراً ہی گھوڑے سے اتر کے بھاگ گیا تھا۔ اسے واپس آنا پڑا۔ نازو نے اسے بہت پریشان کیا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے شریکِ حیات پر شریکِ سفر کو ترجیح دینے سے کیا ہوتا ہے؟" غالب نے چلا کے کہا۔

"کیا ہوتا ہے؟" نازو نے گھوڑے پر سے اتر کے کہا۔

"کچھ نہیں ہوتا" غالب نے متانت سے کہا اور اس جگہ کا معائنہ کرنے لگا جہاں سے خانہ بدوش ایسے غائب ہو گئے تھے جیسے انہیں زمین نگل گئی ہو۔

میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کے کہا "یہاں نہ گھنا جنگل ہے اور نہ پہاڑ۔"

"ہاں جی' ہم دور دور تک دیکھ سکتے ہیں۔"

غالب نے کہا "میں تھانے دار صاحب سے اتفاق کرتا ہوں۔ وہ جن بھوتوں کا قبیلہ تھا' گو مجھے بھی بھوت تھے مگر اصل تھے جو اب تک موجود ہیں کیونکہ یہ غائب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے' باقی سب بھوت تھے۔"

نازو نے کہا "تم سکندر کے جذبات سے کھیل رہے ہو۔"

"اچھا!" غالب نے خوش ہو کے کہا "وہ کیسے؟"

"رابعہ اور گل بھی تو غائب ہوئی ہیں۔"

"پھر تم ابھی تک کیوں موجود ہو یہاں؟" غالب نے کہا "ان کے ساتھ تمہیں بھی غائب ہو جانا چاہئے تھا۔"

آصف جاہ نے زمین پر بیٹھ کے کہا "وہ غائب نہیں ہوئے۔"

"کیا مطلب؟" غالب نے ادھر ادھر دیکھا "وہ مجھے تو نظر نہیں آ رہے ہیں؟ کیا میں اندھا ہو گیا ہوں؟"

آصف جاہ مسکرایا "یہ دیکھئے' ٹائروں کے نشانات ہیں مگر یہ ٹرک کے ٹائر ہیں۔ وہ بہت زیادہ گھسے ہوئے ہیں' جتنا تم گھسے ہوئے ہو۔ یہ ان کے نشان ہیں" اس نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا "آپ غور سے دیکھتے جایئے۔ زمین سخت ہے اس لئے نشان کچھ واضح نہیں ہیں مگر ہیں ضرور۔"

"میں کچھ زیادہ سراغرساں نہیں ہوں" میں نے کہا "سمجھاتے جائیں کہ یہ نتیجہ آپ نے کیسے اخذ کیا۔"

"دیکھئے' گھاس دبی ہوئی ہے کہیں کہیں سے۔ غور سے دیکھئے۔ یہ گھاس خشک ہے مگر سیدھی ہے۔ اس پر سے ٹرک گزرے ہیں اس لئے دب گئی ہے۔ کچھ دیر بعد سیدھی ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔"

غالب نے سرہلا کے کہا "میں نے تو پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔"

"تم نے تو ٹرک کا نمبر بھی نوٹ کر لیا ہو گا" نازو نے کہا۔

میں نے آصف جاہ کی ذہانت کا اعتراف کرتے ہوئے محسوس کیا کہ رابعہ اور گل سے بچھڑ جانے کا غم جو پہلے بوجھ کی طرح محیط تھا اب کچھ سمٹ کر ایک سبک گراں ہو گیا ہے۔ ان کے پھر مل جانے کی امید جو مایوسی کے گھپ اندھیرے میں ڈوب گئی تھی روشنی بن کے نظر آنے لگی ہے۔

میں نے کہا "کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ ایسا ہی ہوا ہو گا؟"

"میں انہیں جانتا ہوں" آصف جاہ نے کہا۔

"اس قبیلے کو؟"

"ہاں۔ اس قبیلے کو اور ایسے ہر قبیلے کو۔ یہ ان کا پرانا طریقۂ واردات ہے۔ یہ لوگ کسی جگہ خیمہ زن رہتے ہیں پھر اچانک اپنا کام دکھا کے غائب ہو جاتے ہیں۔"

"کیا کرتے ہیں یہ لوگ؟"

"چوری اور ڈکیتی۔ ان کی عورتیں گھروں میں جا کے دیکھتی بھالتی ہیں' بھیک مانگتے ہوئے گھر تاک کے پھرتے ہیں۔ ہر طرف سے رپورٹ ملنے کے بعد یہ لوگ گھروں میں جھاڑو پھیر جاتے ہیں۔ سونا چاندی نہیں چھوڑتے۔۔۔ اور ایسے غائب ہوتے ہیں کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔"

"لیکن ہم نے ان کے پاس کوئی ٹرک نہیں دیکھا تھا۔"

"یہی تو کمال ہے ان کا' وہ ٹرک کو چھپائے رکھتے ہیں۔ سفر کے لئے بیل گاڑیاں اور گدھے استعمال کرتے ہیں۔ ٹرک صرف واردات کے بعد اچانک کہیں سے لے آتے ہیں اور اس میں مالِ غنیمت کے ساتھ خود بھی چڑھ جاتے ہیں۔ ٹرک انہیں چالیس پچاس میل دور کسی بھی جگہ اتار کے پھر غائب ہو جاتا ہے۔ اس کا مال آہستہ آہستہ ٹھکانے لگاتے رہتے ہیں۔"

"ٹرک غائب کیسے ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"کہیں چھپا دیا جاتا ہے' جہاں ان کا ڈیرا ہو اس سے دو چار میل کے فاصلے پر درختوں میں یا کسی کھنڈر میں۔ بعض اوقات یہ بڑی فنکاری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ٹرک کے چاروں پہیے نکال کے لے جاتے ہیں' سیٹ نکال لیتے ہیں' لائٹس کھول لیتے ہیں' ایسا لگتا ہے کہ ٹرک کا صرف ڈھانچہ پڑا ہوا ہے۔ جو دیکھتا ہے یہ سمجھتا ہے کہ شاید پہلے کوئی حادثہ ہوا ہو گا۔ بچا لئے والے ہر کارآمد چیز نکال کے لے گئے۔ ٹرک تھوڑا زیادہ پرانا نہیں ہو تو اگر یہ اس کا رنگ و روغن کھرچ دیتے ہیں یا جلا دیتے ہیں اور کہیں سے کالا کر دیتے ہیں۔ اس سے ڈھانچہ واقعی حادثے میں تباہ شدہ نظر آتا ہے مگر جب ان کو ضرورت پڑتی ہے تو یہ چند گھنٹوں میں ٹرک کی ہر چیز پھر فٹ کر لیتے ہیں' قابلِ استعمال بنا لیتے ہیں۔"

غالب نے کہا "وہ انسانوں کے ساتھ گدھوں کو بھی اسی میں لے جاتے ہیں؟"

"انسانوں اور گدھوں میں کیا فرق ہے؟ ایک ہی طرح رہتے ہیں" آصف جاہ نے کہا۔

"بیل گاڑیاں کیوں چھوڑ گئے؟" نازو نے کہا۔

"تمہارے لئے" غالب نے کہا "اس کو ایک جوائی کار سمجھو' اس میں پٹرول کا خرچ نہیں ہوتا' توانائی بیل فراہم کرتا ہے۔"

"اور بیل بھی خرچ نہیں ہوتا؟" نازو نے اس سے اتفاق کیا۔

"یا تو یہ بیل گاڑی کہیں سے چرا کے لائے ہوں گے یا اپنے ساتھ چھوڑ گئے ہوں گے کہ موقع ملے تو بعد میں لے آئیں" آصف جاہ نے بتایا۔

آصف جاہ کی پُراعتماد باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ قبیلے کا سراغ بھی لگا لے گا۔ اس کی باتوں نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔۔ میرا دل اس پر اعتماد کے حق میں تھا اور دل کی دلیل یہ تھی کہ اس نے اعتماد کے اظہار میں پہل کی تھی اور اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ ہم سے کس حد تک واقف ہے۔ اگر اسے دھوکا دینا ہوتا تو وہ کوئی جھوٹ بولتا لیکن وہ نہ صرف یہ کہ میرا نام جانتا تھا اور غالب سے واقف تھا بلکہ وہ محسن کی مدد کر چکا تھا۔ اسے محسن کے بارے میں معلوم تھا۔ وہ رابعہ اور گل کو پھر ڈھونڈ سکتا تھا اور اس نے ہماری ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا تھا لیکن اس کی شرط بہت عجیب تھی۔ عقل یہ کہتی تھی کہ اس گھر میں قدم نہ رکھو جس کا دروازہ صرف ایک ہو۔ جو اندر جانے کے بعد بند ہو جائے تو پھر باہر آنا اپنے اختیار میں نہیں رہتا۔۔۔ خود کو دیدہ دانستہ پولیس کی تحویل میں دینا اور حوالات میں بند ہونے پر رضامند ہونا ایک خطرناک جوا بھی ہو سکتا تھا جس میں اپنی جیت کے واضح امکانات کسی بھی غیر متوقع صورتحال کے پیدا ہونے سے ہار میں ڈھل سکتے تھے۔

آصف جاہ نے میرے قریب آ کے آہستہ سے کہا "پھر کیا سوچا ہے تم نے؟ ابھی فیصلہ کر لو۔ میرے ساتھ چلو۔"

میں نے اچانک جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا "او کے شہزادہ آصف جاہ' میں ایک مسلمان کی حیثیت سے تمہاری نیت پر بھروسہ کرتا ہوں۔ میں ابھی اپنا ریوالور گرا تا ہوں۔ تم مجھے دھکا دے کر اٹھا لینا اور سب کو ہینڈز اپ کرا لینا لیکن ذرا ہوشیاری سے' میرے ساتھی بہت خطرناک ہیں' مخصوصاً وہ لڑکی۔"

"تم فکر مت کرو' ذرا سا قتل نہیں ہو گا۔"

غالب اور نازو بہت اطمینان سے بیل گاڑی میں ڈرائیونگ کے امکانات کا جائزہ لے رہے تھے اور انہیں کسی سے بھی کوئی اندیشہ نہ تھا۔ سب کا اسلحہ بے مصرف ہو چکا تھا اور ایک شکست خوردہ سپاہ کی طرح وہ ذہنی طور پر بھی مکمل اطاعت قبول کر چکے تھے۔

وہ آصف جاہ کی آواز پر چونک کر پلٹے تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میرا ریوالور آصف جاہ کے ہاتھ میں تھا جو اس نے میری پشت سے لگا رکھا تھا اور میں تصویرِ بے بسی بنا ہوا ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑا تھا۔

"بہت ہو گیا کھیل" آصف جاہ نے گرج کے کہا اور اپنے فطری انداز میں چند گالیاں بھی دیں "اب پانسہ پلٹ گیا ہے۔ چلو اپنے ہاتھ اٹھا لو' ذرا احتیاط کے ساتھ۔ میں قانونی طور پر گولی چلانے کا اختیار رکھتا ہوں' ایسے کسی مجرم کا کیس فوراً ختم ہو جائے تو مجھے خوشی ہو گی۔"

غالب اور نازو نے میرا اشارہ پا کے ہاتھ اٹھا دئے۔

"تم کیا منہ اٹھائے کھڑے ہو۔ الو کے پٹھو' اب کس کا ڈر ہے تمہیں؟" آصف جاہ نے بڑی روانی سے اپنے ماتحتوں کی

www.paksociety.com

شان میں ایک قصیدہ پڑھا جس میں ان کو آدمی کے سوا ہر دام چوپائے کی نسل قرار دیا گیا تھا۔
انہوں نے ایک دم کندھوں پر سے بندوقیں اتار کے اپنی اپنی جیب میں سے میگزین نکالے اور انہیں لوڈ کر لیا۔ شکست کے ایک دم فتح میں بدل جانے کی خوشی ایسی تھی کہ وہ سب بے مہار ہونے لگے تھے۔
ایک نے غالب کو گالی دے کر کہا "ابھی ٹھنڈا کرتا ہوں تجھے بہت گرم ہو کے بول رہا تھا تو۔"
دوسرا جذباتی ہونے والا شخص وہ تھا جس نے نازو کو اپنے گھوڑے پر بٹھانے کی غلطی کی تھی اور نازو نے اسے ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔
"کنجری، اب پتا چلے گا تجھے کہ..." وہ نازو کی طرف لپکا۔
"خبردار!" آصف جاہ نے کڑک کے کہا "سب اپنی جگہ پر... بالکل خاموش... کسی نے کوئی بدمعاشی دکھائی تو کھال کھینچ لوں گا اور زبان سے ایک بھی غلط لفظ نکلا تو زبان کھینچ لوں گا۔ بزدل نامرد اب بہادر بن رہے ہو۔"
ان سب کو سانپ سونگھ گیا۔
نازو نے آصف سے کہا "میرے لٹیرے مجرم ہو... بھاڑے کے ٹٹو۔"
اس نے کھا جانے والی نظروں سے نازو کو دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔
آصف جاہ نے حکم دیا "ان سب کی تلاشی لو..."
وہ پھر آگے بڑھے تھے کہ غالب [illegible]
"یہ لو" نازو نے اپنا ریوالور پھینک کے کہا [illegible] غالب نے اپنا ریوالور بھی لٹو کو تھما دیا "دو مرتبہ [illegible] لیتا ہے ایک بار میری طرف سے بھی۔"
میرا ریوالور آصف جاہ نے پہلے ہی ضبط کر لیا تھا۔ ہم اب بالکل خالی ہاتھ تھے اور اس کے رحم و کرم پر رہ گئے تھے۔ ابھی تک غالب یا نازو کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب کھیل ہے اور ایک جوا ہے جو میں نے ان سے مشورہ کے بغیر کھیلا ہے۔ اب مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ اعتماد رکھنے کے باوجود میں نے انفرادی فیصلہ کر کے اچھا نہیں کیا۔ مجھے مشورہ کر کے اتنا بڑا قدم اٹھانا چاہیے تھا۔ اگر اس کے نتائج میری توقع کے خلاف نکلے تو میں انہیں کیسے منہ دکھاؤں گا۔
لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم نے جیتی ہوئی بازی ہار دی تھی اور ہم پھر قیدی ہو گئے تھے۔ ہمارے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ کے ہمیں واپس لے جایا جا رہا تھا اور اس مرتبہ محافظ بہت چوکس تھے۔ انہوں نے ہمیں پیدل چلنے پر مجبور کیا اور خود گھوڑوں پر سوار اپنے اپنے اسلحے کا رخ ہماری طرف کئے ہمیں ہر طرف سے محصور رکھتے ہوئے چلتے رہے۔ ان کے عزائم بہت واضح تھے۔ وہ معمولی سی غلطی یا غلط فہمی کو بہانہ بنا کے ہمیں گولی مار دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہم سب کو ایک ساتھ چلنے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ جس ترتیب سے اب ہمارا سفر جاری تھا وہ کچھ یوں تھی کہ نازو کو سب سے آگے رکھا گیا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو پولیس مین تھے۔ پھر غالب تھا اور اس کے پیچھے بھی دو پولیس والے تھے۔ آخر میں میرے پیچھے خود آصف جاہ تھا۔
تھکن سے میری حالت خراب تھی۔ مجھے ایک ایک قدم بھاری پڑ رہا تھا۔ تھکن کے ساتھ اب بھوک کا احساس بھی شامل ہو گیا تھا۔ اتنا پیدل چلنے اور اتنی مشقت جھیلنے کے بعد جسم کی محفوظ توانائی کا ذخیرہ بھی خرچ ہو چکا تھا۔ اب مجھے ان [illegible] پر بھی رشک آ رہا تھا جو بڑی فراغت سے درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ چلتے چلتے میں نے ان سب لوگوں کا تصور کیا جو [illegible] نفیس ہاتھوں پر، ٹھیلیوں پر، چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں [illegible] کھا رہے تھے۔ چکن قورمے سے بریانی تک، کڑاہی گوشت [illegible] دال اور ماش کی سفید دال، بیسن کی روٹی اور اچار، [illegible] سرسوں کا ساگ اور مکھن۔ نہاری اور حلیم، [illegible] اور فش فوڈ۔ میں نے محسوس کیا کہ ہر نام کے ساتھ میرے منہ میں خوشبو بھی جاگ رہی ہے۔ مجھے اپنی [illegible] چند چیزیں یاد آئیں اور وہ جو رابعہ شوق سے کھاتی تھی، محسن کو کیا پسند تھا۔ میرے سارے خیالوں کا محور کھانے پینے کی اچھی اچھی چیزیں [illegible] تھیں۔ میرا خیال ہے کہ میں کھلی آنکھوں کے ساتھ سو رہا تھا۔ نیند میں چلتے ہوئے خواب میں سب دیکھ رہا تھا۔
غالب کی حالت مجھ سے بہتر نہیں ہو سکتی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس وقت مجھے کسی کا خیال نہیں آیا۔ میں نے نازو کے بارے میں بھی نہیں سوچا۔ محسن کو یاد نہیں کیا۔ [illegible] کا خیال نہیں آیا اور نہ رابعہ کا یا کل کا۔ میرے ذہن میں ایک خلا تھا۔ میں ایک مشینی انداز میں قدم اٹھا رہا تھا۔ میرے پاؤں میرے ارادے کے بغیر حرکت کر رہے تھے۔ میرا دل تو چاہتا تھا کہ [illegible] گر جاؤں اور سو جاؤں۔ شاید یہ آصف جاہ کی باتوں کا اثر تھا کہ میں احساس تحفظ کی آسودگی کا شکار ہو گیا تھا یا شاید وہ [illegible] تھی جو سب کچھ ہار دینے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ [illegible] چوری کا دھڑکا ہوتا ہے نہ رہزن کا۔ فکر اب بے سود تھی [illegible] جو چاہے کرے، دغا کرے یا وفا کرے... میرے [illegible] رہا تھا۔
بالآخر سفر تمام ہوا۔ معلوم نہیں وہ کتنی لمبی مسافت تھی۔ میں نے دائیں بائیں کچھ نہیں دیکھا۔ ہم کہاں سے [illegible] کہاں پہنچے، اس میں کتنا وقت صرف ہوا۔ میں نے [illegible] خدا کا شکر ادا کیا جب در زنداں کھلا۔ حوالات کے [illegible] والے دروازے کے پیچھے جاتے ہی میں فرش پر [illegible] بے خبر ہو گیا۔
[illegible] کسی نے مجھے زور زور سے ہلایا اور جھنجھوڑنا شروع کیا تو [illegible] آنکھیں کھول کے دیکھا۔ اس سے پہلے میں کئی بار [illegible] کے سو گیا تھا لیکن جگانے والے زیادہ ضدی تھے۔ [illegible] میرے چہرے پر ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کیا تو میں اٹھ [illegible]
میرے سامنے آصف جاہ کا چہرہ آ گیا "بس اب اٹھ جاؤ۔"
میں نے جماہی لے کر کہا "کیا وقت ہوا ہے؟"
"رات کے آٹھ بج رہے ہیں" آصف جاہ نے کہا۔
"اچھا۔ یہ کون سی جگہ ہے؟"
"یہ تھانے کے ساتھ ہی میرے گھر کا ایک کمرہ ہے۔"
میں نے سر جھٹک کے ادھر ادھر دیکھا "یہاں کیسے آ گیا میں؟ میں حوالات میں تھا۔ غالب اور نازو کہاں ہیں؟"
آصف جاہ نے کہا "وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ چلو اٹھو نہا دھو لو۔"
میں نے کہا "میں بھوک سے ہلاک ہونے والا ہوں۔"
"پہلے نہاؤ" اس نے مجھے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔
"یہ غسل آخری غسل تو نہ ہوگا" میں نے احتجاج کیا مگر اس نے مجھے دھکا دے کے ایک غسل خانے میں دھکیل دیا۔
"نہانے کے بعد تم میرے کپڑے پہن سکتے ہو" اس نے کہا۔
میں جب غسل خانے سے برآمد ہوا تو واقعی بدلا ہوا آدمی تھا۔ آدھی تھکن سونے سے دور ہو گئی تھی۔ باقی آدھی گرم پانی کے ساتھ بہہ گئی۔ آصف جاہ کے صاف ستھرے کپڑے [illegible] بڑے تھے لیکن اس وقت ڈھیلے ڈھالے [illegible] مجھے بہت آرام ملا۔
غالب اور نازو دوسرے کمرے میں بید کی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ غالب نے بھی آصف جاہ کے کپڑے پہن لئے تھے مگر نازو نے بہت خوب صورت لال جوڑا پہن رکھا تھا۔ سرخ ساٹن کی شلوار، سرخ قمیص جس پر زرد گلاب [illegible] اور لال دوپٹہ۔ نہا دھو کے نازو کا رنگ نکھر آیا تھا اور اس لال جوڑے میں [illegible] غالب پر نگاہ نہیں ٹھہر رہی تھی۔ نازو بہت عرصے کے بعد [illegible] اصل روپ میں سامنے آئی تھی۔ غالب تو تحیر [illegible] ہو گیا۔
"[illegible] کیا ہو گیا ہے آپ دونوں کو؟" نازو نے شرما کے کہا۔
[illegible] کہا "[illegible] جائے کم ہے [illegible] تم کو بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔"
"[illegible] ہم [illegible] سب ہیں" غالب نے کہا۔
"[illegible] اور شعلہ جوالہ [illegible] لگ رہی ہو" [illegible] غالب سے [illegible]"

"ہاں۔ اس کے علاوہ تم... چندرمہ... انار... لال مرچ بھی لگ رہی ہو" غالب نے کہا "یہ تینوں چیزیں مجھے پسند ہیں۔"
نازو ہنس پڑی۔ وہ ہنسنا چاہتی تھی اور ہنستے ہوئے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ مجھے رابعہ کی یاد آ گئی۔ اس کا وہ روپ یاد آیا جو میرے تصور میں ایک نقش دائم تھا۔ اس کی وہ نیلی ساڑھی جس پر زرد بسنتی پھول کھلے ہوئے تھے۔ میں اداس ہو کے رہ گیا۔ کب سے ہم سب بے سامان، بے گھر اور بے وطن تھے۔ راحت و آرام کے تصور سے بیگانہ تھے۔ زندگی کی ساری خوشیوں سے بے نیاز تھے۔ اچھے کپڑے، اچھی خوشبو، خوب صورت گیت، خوب صورت کتاب، اچھی سوسائٹی، اچھے ریسٹورنٹ، پیار کے جادو سے سلگتی شامیں، قرب کے لمحوں سے مہکتی چاندنی راتیں، یہ سب کہاں گئیں... آخر کہاں تک یہ سلسلہ چلے گا؟ پریشانی اور تلخی حالات کا، دربدری کا اور آزمائشوں کا، فاقہ کشی اور سخت جانی کا، جدائی کے کرب مسلسل کا، آلام و مصائب کا۔ ہم کب واپس گھر جائیں گے۔ کب اپنا گھر بسائیں گے؟ ویران گھر کے بند دروازے انتظار کرتے ہیں... وزیر خان کا گھر تو ازل کا پیاسا ہے۔
غالب نے کہا "کیا ہو گیا ہے تجھے بھائی؟"
میں نے چونک کر اسے دیکھا "کچھ نہیں، بس ایسے ہی طبیعت اداس ہو گئی تھی۔ قنوطیت کا دورہ پڑ گیا تھا" میں نے تخت سے مسکرا کے کہا۔
"شرم آتی ہے یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ رابعہ یاد آ رہی تھی۔"
میں نے ہنس کے کہا "ہاں وہ بھی... اور بھی سب یاد آ گیا جو تھا اور اب نہیں ہے۔ اچھے دن بھی اچھے خوابوں کی طرح ہوتے ہیں شاید۔ سارے خوابوں کی البم دیکھ رہا تھا۔"
"کیا فائدہ؟" غالب نے کہا۔
"فائدہ کیوں نہیں" نازو نے کہا "خواب نہ ہوں تو آدمی تعبیر کیسے مانگے۔ یہ خواب ہی تو اپنے مستقبل کا اثاثہ ہیں۔"
میں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ وہ عجیب لڑکی تھی، مایوس ہونا جانتی ہی نہ تھی۔ الٹا مجھے دلاسہ دے رہی تھی۔
"ہمارا میزبان کہاں ہے؟" میں نے کہا۔
"باہر گیا ہے ہمارے کھانے کے لئے۔"
"تمہارا اس سے تعارف ہوا؟"
"ہاں، ابھی بات ہوئی ہے" غالب نے کہا۔
"کیا تم بھی سو گئے تھے؟"
غالب نے اقرار میں سر ہلایا "یہاں پہنچنے تک میری قوت ارادی کا فیول ٹینک بھی خالی ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں میں راستے میں کیوں نہیں گرا تھا لیکن جب تم حوالات میں قدم رنجہ فرماتے ہی پڑ کے سو گئے تو بس اپنا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔ سلی کا تو پتا

www.paksociety.com

نہیں لیکن حوالات میں نیند آجاتی ہے' یہ دیکھ لیا۔"
"تمہیں کس نے اٹھایا؟"
"ان محترم خاتون نے" غالب نے نازو کی طرف اشارہ کیا۔
"یہ واقعی جن کی بچی ہے' اسے نیند نہیں آتی۔"
"نیند کیسے آسکتی تھی' خوف اور پریشانی سے برا حال تھا۔ تم دونوں نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا کہ یہ سب ڈرامہ ہے۔"
"لاحول ولا قوۃ' مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔"
"تمہیں معلوم تھا... ورنہ تم ایسی بے فکری سے نہ سوتے۔"
"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ایک بد صورت جھوٹ مجھ سے منسوب کردو۔ صرف سکندر کو علم تھا اس بات کا" غالب نے برہمی سے کہا۔
میں نے کہا "یہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے خود ہی آصف جاہ کی بات سن کے یہ فیصلہ کیا تھا مگر اس کا مشورہ مان لینا چاہئے' حالانکہ اس میں بہت بڑا رسک تھا۔ مجھے مشورہ کرلینا چاہئے تھا' یہ احساس... بعد میں ہوا۔"
"کیا واقعی اس نے تم سے ریوالور چھین لیا تھا؟" نازو نے کہا۔
میں نے ہنس کے کہا "کیا تمہیں شک ہے؟"
"ہاں' مجھے شک ہے اس میں۔"
"تمہارا شک بجا ہے' یہ موقع اسے خود میں نے فراہم کیا تھا پوری طرح مطمئن ہوجانے کے بعد۔"
"جب تم مطمئن تھے تو پھر رسک کیا تھا؟"
"رسک ہمیشہ رہتا ہے' معلوم نہیں کون جھوٹ ہے اور فریب ہے۔ اداکاری سے اور جعلسازی سے دوستی کی نقاب اوڑھ کر آجائے... دشمن جنگ میں ہر چال چل سکتا ہے" میں نے کہا۔
"میں جب حوالات میں اکیلی بیٹھی تھی تو بہت مایوس تھی کہ سب ختم ہوگیا۔ ایم آر ایس کے آخری تین شکاری بھی شکار ہوگئے..."
"یہ ایک مایوس ذہن کا تجزیہ تھا" غالب نے کہا "ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دشمن کا شکار شہلا کے سوا کوئی نہیں ہوا۔ وہ بھی اکیلی عورت تھی جس کو انہوں نے دھوکے سے پکڑلیا ورنہ بفضل خدا ایم آر ایس زندہ اور فعال ہے۔ گل اور رابعہ دشمن کی قید میں نہیں ہیں۔"
میں نے کہا "ہاں۔ وقتی طور پر ہم منتشر ہوگئے ہیں' محسن بھی قید میں نہیں ہے' ایک حادثے کے نتیجے میں ہم سے جدا ہوگیا تھا لیکن وہ اسی شدت سے ہماری جستجو کر رہا ہے جتنی اسے کرنی چاہئے اور ہم بھی کر رہے ہیں۔"
نازو نے کہا "ہم نے اسے تلاش کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔"
میں نے کہا "بی بی' میں نے یہاں آنے کا فیصلہ اس وقت کیا جب مجھے معلوم ہوا کہ آصف جاہ نے اس کی مدد کی تھی اور پھر اس سے ملانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔"
"اس نے یقین دلایا ہے کہ وہ رابعہ اور گل کو بھی تلاش کرے گا" نازو نے کہا۔
"تمہاری اس سے بات ہوئی تھی؟"
"ہاں۔ پہلے تو تین گھنٹے تک کسی نے خبر بھی نہیں لی تھی۔ میں زندگی میں پہلے کبھی اتنی پریشان نہیں ہوئی تھی اور نہ اتنی خوف زدہ' وہ لوگ بڑی گندی گالیاں بک رہے تھے۔"
"کیا آصف جاہ کہیں چلا گیا تھا؟"
"وہ کچھ دیر کے لئے گیا تھا۔ اور واضح الفاظ میں کہہ گیا تھا کہ کوئی ہمارے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کرے لیکن اس کے جاتے ہی سب پر شیطان سوار ہوگیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ حوالات کے قفل کی چابی ان کے پاس نہیں تھی ورنہ وہاں تک دست درازی..."
"کیسی باتیں کرتی ہو' ہم کیا مرگئے تھے!" غالب نے کہا۔
"تم دونوں مرے پڑے تھے" نازو نے خفگی سے کہا "مجھے بہت غصہ آرہا تھا' تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں بعد میں کیا ہوا' انہوں نے سامنے آکے مجھ سے کیا کچھ کہا' وہ کیسی کیسی لغو باتیں کرتے رہے' انتہائی بے شرم ہوگئے تھے وہ سب" نازو کا چہرہ لال پڑگیا تھا۔ اس کی زبان وہ سب کچھ تفصیل سے نہ بتاسکتی تھی جو اس نے دیکھا تھا اور برداشت کیا تھا' وہ ایک دم رونے لگی۔
غالب تڑپ کے اٹھا۔ میری موجودگی کی پرواکئے بغیر اس نے نازو کے سر کو سینے سے لگالیا اور اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو سمیٹنے لگا۔
"پاگل' اب رو رہی ہو' اس وقت سب اکیلے برداشت کرلیا۔ مجھے بھی نہیں بتایا' تمہارے حوصلے پر مجھے رشک آتا ہے۔"
لیکن وہ بند ٹوٹ گیا تھا جو نازو نے اپنے آنسوؤں کے سیلاب کو روکے رکھنے کے لئے باندھا تھا۔ وہ بہت بہادر اور نڈر بے خوف اور حوصلہ مند تھی لیکن اندر سے وہ بھی عورت تھی' نازک' کمزور اور بے بس' حباب جیسا شیشے کا دل رکھنے والی جو جذبات کی ہلکی سی آنچ سے پگھل جائے اور اشک بن کے بہہ جائے۔
اس کی فطرت اور مزاج کے تضادات کا یہ بھی ایک پہلو تھا۔ وہ مشتعل ہوئی تھی تو غالب کو اٹھا کے پٹخ دیا تھا اور پگھلی تھی تو اسی کے بازوؤں کی پناہ میں رو رہی تھی۔
چند منٹ میں یہ آنسوؤں کا دریا اتر گیا' اب وہ ترو تازہ اور مسکراتی ہوئی جھلملاتے ہوئے نظر آ رہی تھی اور اس کے چہرے پر جذبات کا گلابی اجالا تھا۔
"سچ بتاؤ" میں نے کہا "کیا واقعی اس وقت تمہیں رونا نہیں آیا تھا؟"
وہ آہستہ سے مسکرائی "جب وہ کمینے مجھے تنگ کر رہے تھے تو میں نے سوچا کہ ان کے کیا منہ لگنا' میں اپنے کان تو بند نہیں کرسکتی تھی۔ آنکھیں بند کر کے گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی تھی' بس اس وقت تھوڑا سا رونا آیا تھا' زیادہ نہیں۔"
"ہاں۔ کچھ آنسو بچا رکھے ہوں گے' اس وقت کے لئے جب تمہیں چپ کرانے والا بھی ہو" میں نے کہا۔
غالب نے کہا "یہ فائدہ ہوا سونے کا' وہ جتنے بھونک سکتے تھے بھونکتے رہے ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔"
"مجھے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ آدمی قید میں کتنا مجبور ہوتا ہے" نازو نے کہا "اسی بے بسی کا نام قید ہے جب آدمی اپنی مرضی سے کچھ نہ کرسکے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ باہر نکل کے ان سب کے جبڑے توڑ دوں اور ان کے سارے کس بل نکال دوں لیکن سلاخیں اور قفل درمیان میں حائل تھے۔ جب آصف جاہ واپس آیا تو میری جان اس عذاب سے چھوٹی۔"
"کیا وہ حوالات میں آیا تھا؟"
"ہاں۔ اس نے رات ہونے سے پہلے ہی باقی سب کی ڈیوٹی بدل دی تھی۔ کہ ان خانہ بدوشوں کا پتا چلاؤ صبح ہونے سے پہلے۔ گرفتاریاں ہونی چاہئیں۔ دونوں کو الگ الگ بھیج دیا۔ وہ بہت پریشان ہوئے تھے لیکن حکم ٹال نہیں سکتے تھے۔ تھانے میں ایک وہ رہ گیا تھا جس کی ڈیوٹی تھی۔"
غالب نے کہا "اس کے سامنے ہی تھانے دار صاحب حوالات میں آگئے تھے؟"
نازو ہنسی "نہیں بھئی' جو ایک بچا تھا وہ بھی سب کی طرح تھکا ہوا تھا اور تھانے دار صاحب نے اسے گولی دے دی تھی سلانے کی۔"
"گولی۔ نیند کی گولی' چائے میں گھول کے پلادی۔ وہ بالیقین آصف جاہ سات بجے کے بعد اندر آیا تھا۔ اس وقت حوالات میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں بہت ڈری کہ سپاہی تو کسی حد تک بے اختیار تھے اور اندر نہیں آسکتے تھے۔ یہ نہ جانے کیا کرے گا۔ وہ تالا کھول کے آیا تھا۔ میں نے کہا کہ تھانے دار صاحب میرے قریب مت آنا' تمہیں نہس کردوں گی۔ وہ ہنسنے لگا اور کہا' مجھے تو بہت پہلے آنا چاہئے تھا لیکن میں کیا کروں' ان کو رخصت کرکے آیا ہوں' میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی کچھ بتا سکے۔ اسی لئے آپ کو اتنی دیر تک یہاں تکلیف اٹھانی پڑی۔ مجھے پہلے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا لیکن پھر اس نے معذرت کرلی اور کہنے لگا کہ چلو میرے ساتھ۔"
"تم تو انہوں نے مجھے جگایا کہ دیکھو یہ ہوا مردود مجھے لینے آیا ہے کہ میرے ساتھ چلو" غالب نے کہا۔
"مجھے کیوں نہیں جگایا؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"آصف جاہ نے کہا کہ پہلے تم لوگ نہار دھولو' یہ اتنی دیر اور سولیں" غالب نے کہا۔
"یہ لال جوڑا کس کا ہے؟" میں نے کہا۔
"اس کی بیوی کا۔ وہ آج کل میکے گئی ہوئی ہے۔"
"مزہ آجائے اگر وہ آج ہی لوٹ آئے اور تمہیں دیکھ لے ان کپڑوں میں" غالب نے کہا۔
"یار' یہ شہزادہ کب واپس آئے گا' جب ہم سب بھوک سے دم توڑ چکے ہوں گے۔ کیا گھر میں کوئی بندوبست نہیں ہوسکتا تھا؟"
"میں نے تو کہا تھا کہ جو کچھ ہے میں پکالیتی ہوں لیکن اس نے کہا کہ ابھی تمہاری حالت ایسی نہیں کہ ہانڈی چولہا کرو ورنہ میں پکوان دکھاتا کسی تکلف کے بغیر" نازو نے کہا۔
آصف جاہ سوا نو بجے آیا تو اس کے پیچھے ایک داڑھی والا اندر آگیا جس نے چادر کو بغل کے انداز میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ دیہاتی وضع کے کرتے اور پاجامے میں تھا اور جوان آدمی تھا جس کی صحت قابل رشک تھی۔ اس کے بال لمبے اور کالے تھے اور تیل سے چمک رہے تھے۔ اس نے اپنی آنکھوں میں بڑی فراخ دلی سے سرمہ ڈالا تھا۔ اس کے پیچھے سفید لٹھے کے برقعے میں کوئی عورت تھی۔
مولوی نے بڑی قرأت کے ساتھ السلام علیکم کہہ کے چادر اتاری اور اندر سے برآمد ہونے والا ٹفن کیریئر زمین پر رکھ کے مجھ سے بغلگیر ہوگیا۔ میرے بعد اس نے غالب کو گلے لگایا۔ بے حد اپنائیت اور جوش و خروش کے ساتھ اس نے ہم دونوں سے مصافحہ بھی کیا۔
"یہ عنایت اللہ ہے' میرا بہنوئی" آصف جاہ نے کہا "اور یہ میری بڑی بہن ہے زینب۔"
زینب نے اتنی دیر میں اپنا برقع اتار کے رکھ دیا تھا۔ وہ بھی گوری چٹی اور صحت مند عورت تھی جو موٹاپے کی طرف مائل تھی۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ چالیس پینتالیس کے درمیان کیا۔ وہ بھی برقعے کے اندر برتن چھپا کے لائی تھی۔ جس کی ایک پتیلی میں دودھ تھا اور کاغذ کی چھتی ہوئی خرد بی میں سفید اجلا مکھن نظر آرہا تھا۔
اس نے بڑی محبت کے ساتھ نازو کو سینے سے لگا کے کئی بار چوما "خیر ہو' دے پتر' مجھے تو آصف نے بتایا کہ اپنے پاکستان سے مہمان آئے ہیں' اور خیر سے سب لاہور کے رہنے والے ہیں۔"
جب اس نے لاہور کو لہور کہا تو مجھے کوئی شبہ نہ رہا کہ وہ خود بھی لاہور کی رہنے والی ہوگی یا گردو نواح کی۔ شک مجھے آصف کے لہجے پر بھی ہوا تھا مگر اس کی اردو میں پنجاب کا اثر بہت کم رہ گیا تھا۔

www.paksociety.com

نازو نے چہرے پر سے تھوک صاف کرتے ہوئے کہا۔ "آپ بھی لاہور کی ہیں جی؟"

زینب نے ایک سرد آہ بھری "نہیں پتر، لاہور کے رہنے والے ہوتے تو ادھر کیوں کھپا، خوار ہوتے۔ اپنا گھر تو امرتسر میں تھا۔ جب پاکستان بنا تو سوچا تھا لاہور چلے جائیں گے۔ اپنے بہت لوگ تھے ادھر بھی لیکن سکھوں نے ماں باپ کو شہید کر دیا۔ ہم دو بہن بھائی بچ گئے۔ آصف تو بالکل اتنا تھا" اس نے دو ہاتھوں کے درمیانی فاصلے سے آصف کو تقریباً ایک لوٹے کے برابر ثابت کیا۔

"آپ بھی چھوٹی ہی ہوں گی" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے اتنی سمجھ تو نہیں تھی پتر کہ خود آصف کے ساتھ لاہور چلی جاتی۔ ایک ہندو تھا، رب اس کا بھلا کرے، اس نے ہمیں بوری میں ڈال کے ریڑھی پر رکھا اور ادھر سے نکال لیا۔ اچھے برے بندے سب جگہ ہوتے ہیں، وہ کون سا رشتے دار تھا ہمارا، بس ماں اس سے سبزی ترکاری لیتی تھی۔ اس نے ایک جاننے والے کے گھر پہنچوا دیا۔ وہاں سے بس تقدیر ہمیں آگے ہی آگے لے گئی۔ خیر چھوڑو، یہ تو بڑی لمبی کہانی ہو گئی، تم کھانا کھا لو ٹھنڈا ہو جائے سب۔"

آصف ہنسنے لگا "شکر ہے تجھے خیال تو آیا کہ یہ ہم ..."

"ہائے تو یہاں خیریت بھی نہ پوچھی ..."

زینب کو مسکراتے ہوئے ماں اور بڑی بہن ...

... پلیٹوں میں کھانا ڈال کے رکھنے لگی۔ زینب کی موجودگی میں ہم سب زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر تھے۔ میں نے خاصی کوشش سے کھانے کو حلق سے اتارنے کی رفتار پر قابو پایا ورنہ میرے پیٹ کا خلا تو تقاضا کرتا تھا کہ میں سب کچھ ایک ساتھ حلق کے راستے معدے میں ڈال دوں۔

اب زینب نے گفتگو کا دوسرا راؤنڈ شروع کیا جس کا مقصد ہم سے تفصیلی تعارف حاصل کرنا تھا۔ سب سے پہلے اس نے عام عورتوں کی طرح رشتوں کی انکوائری کی۔ آصف نے اپنے بہن بہنوئی کو ہمارے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا تھا سوائے اس کے کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں مگر یہ بات کسی کو بھی معلوم نہیں ہونی چاہئے ورنہ ہم مشکل میں پڑ جائیں گے کیونکہ ہمارے پاس ویزا لکھنؤ اور آگرہ جانے کا دیا تھا، ٹونک تو ہم آنے کے مجاز نہیں تھے۔

"خیر سے تیرا گھر والا کون ہے؟" زینب نے سادگی سے پوچھا۔

شاید اس سوال پر لقمہ نازو کے حلق میں اٹک گیا ہو گا۔ اس نے بڑی مشکل سے سر اٹھا کے غالب کی طرف دیکھا۔

"اچھا اچھا" زینب نے جواب کو سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ غالب بڑی ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا اور نازو کی بے بسی پر بہت خوش نظر آتا تھا۔

"کوئی بچی بچہ ہے؟" زینب نے کہا۔

"جی... جی نہیں" نازو نے نادم ہو کے جواب دیا اور ... کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

"اچھا، کب ہوئی ہے شادی؟" زینب نے کہا۔

"جی۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا" نازو نے کہا۔

"کتنا عرصہ ہوا ہے؟" زینب اپنے زنانہ حساب کتاب کے لئے شادی کے بعد گزرنے والے مہینوں اور دنوں کی تعداد جاننا چاہتی تھی۔

نازو بری طرح پھنس گئی تھی اور مجھے اندازہ تھا کہ وہ اندر ہی اندر کسی آتش فشاں کی طرح کھول رہی ہو گی۔ اس نے نوالہ نگل کے کہا "جی، یہی چھ سات مہینے ہوئے"

"ہائے..." زینب نے منہ پر ہاتھ رکھ کے بولی "چھ سات یا ... ابھی کون سے برس گزر چکے ہیں کہ یاد نہیں۔"

غالب نے بڑی مستعدی سے کہا "جی میں بتاتا ہوں، یہ ہے بے وقوف۔ حساب کتاب میں بھی اتنی ہی کمزور ہے جتنی ... آج ہوئے ہیں پورے سات مہینے سات دن۔"

"سات گھنٹے، سات منٹ اور سات سیکنڈ بھی بتاؤ" نازو نے اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھور کے کہا۔

"ناچیز غصہ نہیں کرتے" میں تو ... ویسے بھی شوہر کا بڑا مقام ہے 'تیرا مزاجی خدا ہے'" اس نے مجازی کو مزاجی بناتے ہوئے نازو کو بوکھلا کے رکھ دیا۔

"یہ بات کہاں سمجھتی ہیں جی آج کل کی لڑکیاں، ان کو تو فیشن کرنا آتا ہے اور باتیں کرنا" غالب نے کہا۔

زینب نے ہنستے ہوئے میری طرف اشارہ کیا "یہ کون ہے؟"

"یہ بھائی ہے میرا" غالب نے کہا۔

"شادی ہو گئی ہے؟" زینب نے کہا۔

ان کے بولنے سے پہلے میں نے نفی میں سر ہلا دیا "نہیں جی"

نازو نے فوراً کہا "بات تو پکی ہو گئی ہے۔ ہو جائے گی اب شادی بھی بہت جلد۔"

"اللہ کرے گا خیر سے" زینب نے کہا "ماں باپ ہیں؟"

نازو نے نفی میں سر ہلایا "سب اللہ کو پیارے ہو گئے"

"سب کے سب... تمہارے بھی؟" زینب نے افسوس سے کہا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ عنایت روزانہ ... جھومتا رہا۔ کبھی کبھی وہ آنکھیں بند کر کے لمبی سانس کھینچ کر نعرہ لگا کے کہتا تھا "فضل... فضل... یا رب فضل"

گفتگو کے دوران اس کی آواز پر ہم سب چونک جاتے لیکن اسے قطعی احساس نہیں ہوتا تھا۔ اس کی کیفیت بڑی عجیب تھی لیکن میں نے اس کے بارے میں سوال کرنے سے گریز کیا۔ جب زینب ہمارے لئے چائے ...

آصف نے کہا۔

"زینب کا گھر والا بہت پہنچا ہوا پیر ہے۔"

"پیر!" ... پکارا گیا۔

"ہاں، پیر عنایت کے عقیدت مند بہت ہیں، ہندو بھی اور مسلمان بھی" آصف جاہ نے کہا۔

اب غالب اور نازو بھی عنایت کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ ... قدرت کا کوئی عجوبہ ہے۔ اس نے آصف جاہ کی ... بھی کیا یا نہیں، اس کا پتا عنایت اللہ کی صورت سے نہیں تھا۔

"پیر جمعرات کو سائل حاضری دیتے ہیں۔"

"نذرانے بھی لاتے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

آصف نے کہا "نہیں، پیر عنایت صرف عنایت کرتا ہے۔ ... پیر عنایت کی عنایت سے سب کی مرادیں پوری ..."

میں پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا خدا سے خود دعا مانگنے والوں کے ... پوری نہیں ہوتی مگر میں نے آصف جاہ کے جذبات کا ... کرتے ہوئے اس پیر کا تمسخر اڑانے سے گریز کیا۔ ایسے پیر ... کے ساتھ ایسی ہی عقیدت رکھنے والے سادہ لوح انسان ... ہوتے ہیں۔ ان کی پیری مریدی کا سارا سلسلہ عموماً ایک ... کھیل ہوتا ہے جس کا مقصد سیدھے سادے لوگوں کے ... کرانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے سائیں ... کا پورا ڈراما دیکھا تھا اور سارے ہندوستان پاکستان کے ... کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا مگر ... نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے استغراق اور ... کی حقیقت کو سمجھے بغیر ایسا کہنا انتہائی نامناسب بات ... آصف جاہ کا بہنوئی بھی تھا اور اس کا گہرا جذباتی رشتہ ... احترام اور عقیدت کی بنیادوں پر مضبوطی سے استوار تھا۔

ہم کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ زینب ہمارے لئے ... والی بہت میٹھی چائے لے آئی۔

"تم لوگ کب واپس جاؤ گے؟"

"... ہوتے ہی" میں نے کہا۔

"ہائے اتنی جلدی۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا" وہ بڑے ... کے بولی۔

... نے کہا "اتنی محبت کے بعد زندگی کیا رہ جاتا ہے۔"

"... ٹھہر جاتے نا!" اس نے بڑی حسرت سے کہا۔

... شرمندہ ہو کے کہا "وقت نہیں ہے..."

"اصل بات تو میں نے پوچھی ہی نہیں، تم آصف کو کیسے ..." زینب نے کہا۔

"ہم کسی اور سے ملنے آئے تھے لیکن اس کے بجائے ... ملاقات ہو گئی" میں نے وضاحت کی "رات ہو گئی تھی اس لئے رک گئے۔"

زینب نے اپنا برتن سمیٹتے ہوئے کہا "اچھا پھر آنا اور اپنی گھر والی کو بھی لانا۔"

میں نے کہا "ضرور لاؤں گا۔"

"اور رات کو سونے سے پہلے دودھ گرم کر کے پی لینا ضرور۔"

اس کی بے لوث محبت کے مظاہرے نے مجھے اداس کر دیا۔ ایسے سادہ دل لوگ بھی ہیں اس دنیا میں جو کسی شک کے بغیر ہر جھوٹ کو تسلیم کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دنیا میں سب سچ بولتے ہیں۔ ہم نے اسے سب کچھ غلط بتایا تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ ہم کون ہیں اور کیا کرتے رہے ہیں تو شاید اسے یقین ہی نہ آتا۔ وہ چوہدری دلاور اور ترویدی یا ملوترا جیسے لوگوں کی دنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس کی اپنی دنیا بالکل مختلف اور محدود تھی۔ اگر ہم اسے اول تا آخر اپنی زندگی کے حقائق سمجھانے کی کوشش کرتے تو بھی نہ سمجھا پاتے۔ وہ سمجھتی کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ ایسا کیسے ممکن ہے کہ نازو جیسی سیدھی سادی نظر آنے والی لڑکی ایک ساتھ چار مردوں سے بھڑ جائے تو انہیں مار کے لٹا سکتی ہے اور ہاتھ مار کے ان کی ساتھ جیسی گردنیں توڑ سکتی ہے۔ اور ہم سب جو اتنے معصوم لگتے ہیں گزشتہ رات کیا قتل و خونریزی کا ایک ایسا معرکہ سر کر چکے ہیں جس میں مشین گن سے دستی بم تک بہت کچھ استعمال ہوا تھا۔

پیر عنایت نے کوئی وظیفہ پڑھ کے ہم پر پھونکا اور کہا "اللہ اپنا فضل کرے گا، کفار سے محفوظ رکھے گا۔"

اتنی دیر میں یہ واحد جملہ تھا جو اس نے بولا تھا۔ ہمارے لئے یہ بھی غیر ضروری تھا کیونکہ ہمارا راسخ عقیدہ یہی تھا لیکن اس کی بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ بطور خاص کفار کے خلاف تحفظ کی دعا سے یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے خطرہ صرف انہی سے لاحق ہے۔ حالانکہ ہم جس جنگ میں شریک تھے وہ کوئی معرکۂ کفر و اسلام نہیں تھا۔ ہماری جنگ غداروں سے تھی جن میں چوہدری دلاور، پنڈورا اور حاجی عبداللہ کے علاوہ بھی ہمارے بہت سے ہم وطن شامل تھے اور ان کا ساتھ دینے والے ترویدی یا ملوترا جیسے لوگ ہمارے دشمن اس لئے نہیں ہوئے تھے کہ ہم مسلمان تھے۔ یہ مذہب کی نہیں مفادات کی جنگ تھی، ہمارے دشمنوں کے لئے مالی مفادات کی اہمیت ایمان سے، جذبات، حب الوطنی سے، شرافت اور انسانیت کے اصولوں سے زیادہ تھی چنانچہ وہ ایک ہو گئے تھے۔ انہیں متحد کرنے والی قوت صرف دولت تھی جب کہ ہمارے مقصد کی سمت اس کے برعکس تھی۔

پیر عنایت نے ٹکٹکی باندھنے سے پہلے پھر مجھے اور غالب کو گلے لگایا۔ رات کے ساڑھے دس بجے وہ رخصت ہوئے تو مجھے پھر آصف سے بات کرنے کا موقع ملا۔

"آخر تم نے انہیں کیوں تکلیف دی..."

www.paksociety.com

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے ان کو تمہارے بارے میں کیوں بتایا؟" آصف نے میری بات کاٹ دی۔

"چلو ایسے ہی سمجھ لو۔"

"کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟ نہ تم نے انھیں کوئی بات سچ بتائی نہ میں نے۔" آصف نے کہا۔

"دیکھو نا، ہمیں خواہ مخواہ جھوٹ تو بولنا پڑا۔" غالب نے کہا۔

"ہم سچ کیسے بول سکتے تھے؟" نازو نے کہا۔

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "خیر پیر صاحب کو پتا چل گیا ہوگا ہمارے جھوٹ کا۔"

آصف کا رنگ کچھ متغیر ہوا "تم ان کا مذاق اڑا رہے ہو اس لئے کہ تم پیروں پر اعتقاد نہیں رکھتے۔"

"ہاں۔ اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا، ہم خدا سے دعا کرتے ہیں اور وہ ہماری بھی سنتا ہے" غالب نے کہا۔

"اپنا اپنا عقیدہ ہے۔ میں گناہ گار ہوں اور میں ڈرا ہوا تھا۔ میں نے پیر عنایت سے تمہارے لئے اللہ کا فضل مانگا تھا۔ مجھے اس کی دعا کی ضرورت تھی۔ تم نہیں جانتے پیر عنایت کی دعا کے اثر کو میں جانتا ہوں۔ اپنی اور تمہاری حفاظت کے لئے مجھے اس کی مدد حاصل ہو گئی۔ اب میں کچھ مطمئن ہوں" آصف جاہ نے کہا۔

"پھر تم نے اس سے کیوں جھوٹ بولا؟" غالب نے کہا۔

"میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔"

"تم نے جھوٹ سنا اور اس کی تردید نہیں کی اور اس کے بعد پیر صاحب کی دعا پر بھروسہ کرتے ہو اس کی مدد پر انحصار کر کے مطمئن ہو۔ بات تو تب تھی کہ تم اسے سب سچ بتا دیتے اور پھر دیکھتے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ خیر اب چھوڑو اس بات کو۔" میں نے کہا۔

لیکن آصف جاہ نے کہا "جیسے تم اپنے متعلق سچ نہیں بول سکتے تھے ایسے ہی میں بھی مجبور ہو گیا تھا کہ تمہارے جھوٹ کی پردہ پوشی کروں۔"

"تمہیں کس کا ڈر تھا؟ وہ تمہاری بہن تھی۔"

"ڈر تو ہمیشہ رہے گا۔ تمہارے جانے کے بعد بھی میں ڈرتا رہوں گا کہ کہیں میرا راز فاش نہ ہو جائے۔ مجھ پر یہ الزام نہ آ جائے کہ میں نے مسلمان دہشت گردوں کی مدد کی۔"

"مگر تم اس الزام سے کیسے بچو گے؟ تم جانتے ہو کہ تمہارے دشمن کون ہوں گے" میں نے کہا "وہ بہت بااثر اور طاقت ور لوگ ہیں۔ یہی فرد جرم عائد کریں گے وہ تم پر۔"

"ہاں شاید ایسا ہی ہوگا۔"

"تم ڈرتے تھے تو تمہیں کوئی ضرورت نہیں تھی ہماری مدد کرنے کی" غالب نے کہا۔

"یہ بھی تو ممکن تھا کہ میں کچھ نہ کرتا" وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "مجھے حکم ہوا تھا۔"

"حکم ہوا تھا؟ کس کی طرف سے؟" نازو نے کہا۔

"پیر صاحب کا حکم تھا" وہ سر جھکا کے بولا "پیر صاحب نے کہا تھا کہ تین مسافر آئیں گے۔ ان کے ساتھ ایک عورت [illegible] وہ راستہ بھول گئے ہیں جنگل میں۔ ان کو راستہ دکھانا۔ [illegible] طرف سے تمہاری آزمائش ہوگی پھر وہ اپنا فضل کرے گا۔"

میں دم بخود اس پولیس سب انسپکٹر کو دیکھتا رہا جس کے نزدیک اپنے معنوی اور پیر کے فرمان کی اہمیت اتنی زیادہ تھی [illegible] اپنے فرض کو قربان کرنے پر تیار ہو گیا تھا اور اس نے اپنی [illegible] کو ہی نہیں زندگی کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا۔ [illegible] عنایت میرے لئے بھی ایک پر اسرار شخص بن گیا۔ آخر [illegible] یہ بات کیسے کہہ دی گئی؟ اسے کیسے معلوم ہو گیا تھا ہمارے بارے میں؟ کیا یہ محض اتفاق تھا؟ اس نے ایک عام [illegible] تھی۔ آصف جاہ کو جنگل میں گھومتے پھرتے کہیں بھی چار مرد [illegible] سکتے تھے مگر اس نے تین مردوں کا ذکر کیا تھا اور ایک عورت [illegible] میں۔ غالب اور محسن تھے۔ عورت نازو تھی۔ محسن اسے [illegible] تھا ہم بعد میں۔ لیکن اس نے پیر صاحب کی بات کو ذہن [illegible] تھا اور وہ ہمارے درمیان رابطے کا ذریعہ بن گیا تھا۔

"ہم تو دو مرد ہیں، ایک عورت" غالب نے کہا۔

"تیسرا کل ملا تھا" آصف جاہ نے میری [illegible] کر دی "اور اس نے مجھے تمہارے متعلق بتایا تھا۔"

"کیا بتایا تھا؟"

"یہی کہ وہ تم سے بچھڑ گیا ہے اور اسے تمہاری تلاش [illegible] اسے یقین تھا کہ تم لوگ اسی علاقے میں ہو" آصف بولا۔

"اگر اس نے ہمارے متعلق بتایا ہوگا تو دو مردوں اور [illegible] عورتوں کا ذکر کیا ہوگا" نازو نے کہا۔

"ہاں، دو مرد اور تین عورتیں۔"

"پھر تمہارے پیر صاحب کی بات تو غلط ہو گئی [illegible] ہوں گے اور ایک عورت" نازو نے [illegible]

"غلط کیسے ہو گئی؟" آصف جاہ بولا "مجھے تو [illegible] ان کے ساتھ تم ایک عورت ہو" انھوں نے [illegible]

نازو لاجواب ہو گئی۔ میں نے اسے اشارے سے [illegible] کرنے کو کہا۔ پیر عنایت پر آصف جاہ کے اعتقاد [illegible] اور منطق دو دو کے بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ [illegible] اتفاق تھا کہ راجہ اور نگل کے جدا ہو جانے کے بعد [illegible] بات درست ثابت ہو چکی تھی۔

میں نے کہا "محسن تمہیں کہاں ملا تھا اور کیسے [illegible]"

اس نے کہا "میں اس علاقے میں گشت [illegible] ہوا تھا کہ کچھ دور بستی میں ڈاکوؤں نے بڑی تباہی [illegible] ان کی تصویر والا اشتہار بھیج دیا گیا تھا اور [illegible]

[illegible] حکم بھی ملا تھا۔ اس علاقے کی ساری پولیس کو الرٹ [illegible] کر دیا [illegible] ڈاکو جہاں ملیں انھیں زندہ گرفتار کرنے کی [illegible] کیا جائے۔ رات کے وقت میں نے شہر کی طرف سے [illegible] ایک گاڑی کو روکا۔"

"شہر کی طرف سے آنے والی یا شہر کی طرف جانے والی؟"

"شہر کی طرف سے آئی تھی" آصف جاہ نے کہا "میں نے روکنے کی کوشش کی تو انھوں نے رفتار بڑھا دی۔ میں نے گاڑی کا ایک ٹائر پھاڑ دیا۔ گاڑی جب رکی تو اس میں [illegible] آدمی نکلے۔ ان میں ایک تمہارا دوست محسن تھا۔"

"اور باقی دو کون تھے؟" نازو نے اوپر تلے چونک کر کہا۔

"وہ محسن کو واپس لا رہے تھے تاکہ وہ تمہاری گرفتاری میں [illegible]" آصف جاہ نے کہا۔

"ہماری گرفتاری میں محسن کیسے مدد کر سکتا تھا؟"

"انھوں نے محسن کو بے وقوف بنا کے دھوکا دینے کی کوشش [illegible] انھیں یہ تو معلوم ہی تھا کہ محسن کو پولیس نے پکڑا ہے [illegible] وہاں کو چھڑانے گئے [illegible]"

"مشہور شخصوں کے آدمی تھے؟" نازو نے سوال کیا۔

"نہیں" غالب نے اسے گھور کے دیکھا "وہ بھوت تھے اور [illegible] کے دوست تھے۔"

نازو نے نفرت اور برہمی کے ساتھ غالب کو دیکھا "فضول [illegible]"

"تم نے ایک فضول سوال کیا تھا" غالب نے کہا "اور اس [illegible] ہے کہ تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔ تمہیں نیند آ رہی [illegible]"

"مجھے نیند نہیں [illegible]" نازو نے الجھ کے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ تمہیں سو جانا چاہیے" میں نے [illegible] "دونوں کچھ نیند لے چکے ہیں۔"

"سو جاؤں گی جب مجھے ضرورت محسوس ہوگی" نازو نے کہا۔

"[illegible] تم آگے بتاؤ" میں نے کہا۔

آصف جاہ نے سر ہلایا "ان دونوں نے سازش سے [illegible] محسن کا سودا کر لیا۔ محسن انھیں پہچانتا [illegible] انھوں نے محسن کو اپنے ساتھ لے جانے [illegible] یقین دلایا کہ وہ بھی مسلمان ہیں۔ پھر انھوں نے تم [illegible] بتایا اور یہ ظاہر کیا کہ یہاں بھارت میں بھی [illegible] ہیں جو تم لوگوں کی مدد کریں گے۔ انھوں نے [illegible] اچھا سلوک کیا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ اس [illegible] کے ساتھ تم سب تک رسائی حاصل کر لیں گے۔ [illegible] کہتے اور تشدد کے ذریعے محسن سے کچھ پوچھنے کی [illegible] تم بھی کامیاب نہ ہوتے۔ شاید یہ بات وہ خود بھی [illegible] انھوں نے وقت ضائع نہیں کیا اور اسے جھوٹ کے جال میں گرفتار کر لیا۔ محسن نے انھیں بتا دیا کہ باقی سب لوگ اسی علاقے میں کہیں روپوش ہیں۔"

"کیا محسن کو معلوم نہیں تھا کہ وہ لوگ اسے سائنس سے دولاکھ میں خرید کر لے گئے تھے؟"

"نہیں۔ نہ سودا محسن کے سامنے ہوا تھا نہ اس کے سامنے ادائیگی کی گئی تھی۔ محسن تو صرف یہ جانتا تھا کہ اسے پولیس کی تحویل سے چھڑا کر اپنے ساتھ لے جانے والے دو افراد ہیں۔ محسن نے انھیں کبھی نہیں دیکھا تھا چنانچہ وہ پہلے تو یہی سمجھا تھا کہ اسے دلاور یا ترویدی کے آدمی لے جا رہے ہیں۔ بعد میں انھوں نے اپنے دوستانہ رویے سے محسن کے خدشات دور کر دیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ سب انسپکٹر کرسچن تھا اس لئے کام بن گیا۔ ہندو ہوتا تو کبھی نہ چھوڑتا۔ اپنا ہمدرد سمجھ کے محسن نے انھیں تم سب کے بارے میں بتا دیا۔"

میں نے کہا "کیا بتا دیا؟ اسے تو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں۔"

آصف جاہ نے کہا "اتنا ہی بتایا ہوگا جتنا اسے معلوم تھا۔ مثلاً یہ کہ تم سب لوگ کہاں ملو گے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اگر اسے یہ معلوم ہوتا تو وہ خود کیوں بھٹکتا پھرتا... سیدھا ہمارے پاس نہ آ جاتا۔"

"آخر وہ انھیں اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے کچھ تو کہا ہوگا ان سے کہ وہ اس کو ساتھ لے کر چل پڑے تھے۔"

میں نے سوچ کے کہا "ہاں یہ تم نے ٹھیک کہا۔ اگر وہ محسن پر اعتبار نہ کرتے تو اس کے ساتھ واپس لوٹ کر نہ آتے۔"

غالب ہنسنے لگا "میرا خیال ہے کہ انھوں نے محسن کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے لیکن محسن انھیں دھوکا دینے میں کامیاب رہا۔"

"کیا مطلب؟" نازو نے کہا۔

"مطلب یہ کہ انھوں نے محسن سے جھوٹ بولا لیکن اس جھوٹ میں کہیں کوئی بات ایسی تھی کہ محسن نے جھوٹ کو تاڑ لیا مگر وہ خاموش رہا اور یہ تاثر دیتا رہا کہ وہ بے وقوف بن گیا ہے اور ان پر پوری طرح اعتبار کرتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ محسن سے اسی طرح دو مردوں کا پتا ٹھکانا معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی محسن بھی یہ سمجھتا ہوگا کہ جان بچانے کے لئے اور وہاں سے نکلنے کے لئے جھوٹ کا سہارا لینا ضروری ہوگا۔ محسن نے انھیں اپنا ہمدرد اور ساتھی تسلیم کر لیا اور اعتماد کے ساتھ انھیں ہمارے بارے میں بتا دیا کہ کہاں ملیں گے۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ ہم اسی علاقے میں ہوں گے مگر خود اسے کہاں علم تھا ہمارے پروگرام کا۔ تاہم اس کے بغیر وہ دوست نظر آنے والے دشمنوں کو یہاں نہ لاتا۔ وہ صرف اس قید خانے سے نکلنا چاہتا تھا۔"

"اور یہاں پہنچ جانے کے بعد وہ کیا کرتا؟"

www.paksociety.com

"فرار ہونے کی کوشش کے سوا اور کیا کرتا۔ یہاں پہنچنے کے بعد محسن کے لئے یہ چانس لینا یقیناً بہتر تھا۔ اگر وہ ان سے تعاون نہ کرتا تو معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا ہوتا۔ اسے کہاں قید کر دیا جاتا۔ شاید وہ اسے آگے کہیں بھیج دیتے۔ پھر اس کے لئے اور ہمارے لئے زیادہ مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ اس نے عقل مندی کی کہ خود لوٹ کر اسی علاقے میں آ گیا جہاں اس کے اور ہمارے ملنے کے امکانات زیادہ تھے۔"

میں نے غالب کی بات سے اتفاق کیا "بالکل ایسا ہی ہوا ہو گا محسن کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہاں آنے کے بعد کسی موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔"

غالب نے کہا "موقع یا تو عقل تلاش کرتی ہے یا قدرت فراہم کرتی ہے۔"

آصف جاہ نے کہا "میں نے تو محسن کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا لیکن اس کے دونوں ساتھیوں کے چہرے اجنبی تھے۔"

"انہوں نے فرار ہونے کی کوشش بالکل نہیں کی تھی؟"

"کی تھی۔ لیکن جہاں وہ پکڑے گئے تھے وہاں سے گاڑی کے ساتھ فرار ہونا ممکن نہیں تھا۔ ہمارے پاس گھوڑے تھے۔ ہم انہیں جنگل میں ہی گھیر لیتے اور شاید یہ بات ان کی عقل میں بھی آ گئی تھی۔"

"آخر انہوں نے مقابلہ کیوں نہیں کیا۔ فائرنگ کیوں نہیں کی؟"

"گاڑی میں محسن کے علاوہ دو ہی آدمی تھے" آصف جاہ بولا۔ "ان میں سے ایک تو ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ فائرنگ نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے کو محسن کی فکر ہوگی کہ موقع سے فائدہ اٹھا کے وہ نہ بھاگ جائے۔ پھر میرے ساتھ چار سپاہی تھے جو چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ گاڑی کا ٹائر برسٹ ہو گیا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ مقابلہ بے سود ہو گا۔"

"اسلحہ کیا تھا ان کے پاس؟" غالب نے کہا۔

"ان دونوں کے قبضے سے ریوالور ملے تھے۔ کار میں ایک مشین گن بھی تھی۔"

"اگر وہ چاہتے تو ایک راؤنڈ میں تم سب کو صاف کر دیتے اور نکل جاتے" میں نے کہا۔

آصف جاہ نے اقرار میں سر ہلایا "محسن نے انہیں ایسا نہیں کرنے دیا۔ اس نے دونوں کو سمجھایا کہ بلاوجہ پانچ پولیس والوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بہت سنگین واردات ہوگی۔ اس کے علاوہ آس پاس کے سارے علاقے میں پولیس موجود ہے۔ وہ فائرنگ کی آواز سن کے آ جائیں گے۔"

"محسن نے بڑی دانش مندی سے کام لیا۔ مگر حیرت ہے کہ وہ مان گئے۔ وہ بڑے خون کے پیاسے لوگ ہیں۔"

"محسن کے اصرار نے انہیں مروا دیا" آصف جاہ بولا "محسن نے کہا کہ گرفت سے مرنے والے کو زہر دینے کی کیا ضرورت ہے ہم شریف آدمی نظر آتے ہیں۔ باتوں سے پولیس کو قائل کر سکتے ہیں کہ ہم ڈاکو نہیں ہیں۔ معزز لوگ ہیں اور پولیس سے قائل نہ ہو تو نوٹوں سے مان جاتی ہے۔ وہ مان گئے اور بچ گئے۔"

پہلے ان میں سے ایک ہاتھ اٹھا کے باہر آیا "تھانیدار صاحب گولی مت چلانا ہم شریف لوگ ہیں۔"

میں نے کہا "پھر تم نے بھاگنے کی کوشش کیوں کی تھی؟"

اس نے لجاجت سے کہا "نہیں جناب۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ میں نے تو گاڑی موڑتے ہی روک لی تھی۔"

"غلط فہمی کے بچے۔ بے وقوف سمجھتے ہو مجھے۔ ہمیں دیکھ کر تم اس وقت رکے ہو جب بھاگنے کے قابل نہیں رہے۔" میں نے کہا۔

دوسرا شخص بھی بڑی مظلوم صورت بنائے اترا "آپ بے حد ناراض ہو رہے ہیں تھانے دار جی۔ ہمارے پاس ساری کاغذات ہیں۔"

"وہ بھی برآمد ہو جائے گا" میں نے کہا "ابھی ایک گاڑی میں۔ اس نے پاؤں میں مہندی لگائی ہوئی ہے؟"

"وہ جی ذرا بیمار تھا..." پہلے نے کہا۔

"اوئے باہر لاؤ اسے۔ ہم بھی دیکھیں کیا بیماری لگی ہے اسے۔ ہمارے پاس ہر بیماری کا علاج ہے" ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

مجبوراً اس نے محسن کو باہر آنے کے لئے کہا "نیچے آ جاؤ بھی تاکہ تھانے دار جی کا شک دور ہو جائے۔"

محسن جب باہر آیا تو واقعی بیمار لگتا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی تو مجھے اس کی صورت آشنا سی لگی۔ پھر یاد آیا کہ اس کی تصویر میں نے اخبار میں دیکھی تھی اور وہ اس وقت بھی میری جیب میں موجود تھا۔ تاہم فوری طور پر میں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ میں پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ محسن کے دونوں ساتھی کون ہیں۔

"کون ہو تم لوگ؟" میں نے ٹارچ کی روشنی ان کے چہرے پر ڈال کے کہا۔

"ہم نے کہا نا جناب ہم شریف آدمی ہیں۔"

میں نے کہا "صورت سے کوئی چور نظر نہیں آتا۔ شریف آدمی آدھی رات کو جنگل میں گاڑی لے کر نہیں پھرتے۔ گاڑی کس کی ہے؟"

"ہماری... ذاتی گاڑی ہے" دوسرے نے کہا۔

"کاغذات ہیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ گاڑی تمہاری ہے؟" میں نے کہا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ان میں سے ایک نے کہا "ہمارے پاس تو نہیں ہیں کاغذات۔"

"پھر کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"گھر پر۔ منگوائے جا سکتے ہیں" دوسرے نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"گھر کہاں ہے؟ تم مجھے یہاں کے رہنے والے تو نہیں لگتے۔" جانتے تھی میں سر ہلایا "ہم یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں۔"

"شہر میں رہتے ہیں" دوسرے نے کہا "کوٹھی ہے ہم ساتھ لے کر کے دکھا سکتے ہو۔"

"ابھی تم میرے ساتھ چل کے حوالات دیکھو۔ کوٹھی اور گاڑی بعد میں دیکھیں گے" میں نے کہا اور سپاہیوں کو حکم دیا "پکڑ لو سب کو۔"

"تھانے دار جی۔ یہ آپ... بہت زیادتی کر رہے ہیں" پہلے نے بڑے لجاجت کے انداز میں کہا۔

میں نے کہا "تلاشی لو ان شریف زادوں کی۔"

انہوں نے سخت احتجاج کیا مگر سپاہیوں نے ان کی جیبوں میں سے ریوالور نکال لئے۔

"یہ ہے تمہاری شرافت کی سند" میں نے گرج کے کہا۔

"ہمارے پاس ان کے لائسنس ہیں..."

"کہاں؟ گھر پر ہوں گے کوٹھی میں" میں نے طنز سے کہا۔ "چور تم لوگ آخر؟ گاڑی میں اسلحہ لے کر کیوں پھر رہے تھے اور یہ کون ہے؟"

"یہ... بھائی ہے ہمارا..." پہلے نے محسن کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا یہ گونگا ہے؟ خود جواب نہیں دے سکتا" میں نے کہا۔

محسن نے فقط تذبذب میں سر ہلایا۔ وہ سخت مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ایک طرف پولیس کے ہاتھوں گرفتاری کا ڈر تھا تو دوسری طرف ان کے ہاتھوں مارے جانے کا۔ وہ ان کے ساتھ جانے میں زیادہ خطرہ محسوس کرتا تھا۔ ان کے ہاتھوں قتل ہو جانے کے امکانات زیادہ تھے چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں کے بیان کو جھوٹا نہیں کہا۔

"یہاں کسی کو تلاش کرنے آئے تھے" پہلے نے کہا۔

"اس جنگل میں، آدھی رات کو..."

"ہم جنگل سے گزر کے جا رہے تھے جی، جانا انہیں آگے تھا۔ راستے میں ہی معلوم ہوا کہ ہم ادھر آئے تھے۔ ہم رات تک ان کا انتظار کرتے رہے۔ پھر گاڑی لے کر نکلے۔ ان کی طرف نہ معلوم کیا بات ہوگئی تھی کہ انہوں نے اتنی دیر کیوں کی۔"

مجھے یہ پتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں لیکن میں ان کے بیانات خود انہی کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ محسن کو تو میں نے بعد میں پوچھنا تھا کہ اس کی مدد کروں لیکن سب کے سامنے وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اور میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ وہ ان کا کیسا ساتھی اور دوست ہے یا اس کے دشمن۔ محسن کی پریشانی اور خاموشی سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور یہ سوال اس سے براہ راست نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے کہا "کون ہیں تمہارے بھائی اور ساتھی؟"

"وہ... بزنس ہے ان کا ہمیں بھی" پہلے نے کہا۔

"تم دونوں آپس میں بھائی ہو؟"

"ہاں جی۔ میرا نام ہے موہن۔ یہ مجھ سے چھوٹا ہے سوہن" دوسرے نے کہا۔

"اور یہ..." میں نے محسن کی طرف اشارہ کیا "تم کون ہو سور کے بچے۔ ادھر آؤ... میرے سامنے۔"

محسن خاموشی سے آگے آ گیا "میں ان کے پتاجی کا بھائی ہوں اور میرا نام شیام کمار ہے۔" اس نے بڑے سکون اور اعتماد کے ساتھ کہا "آپ بلاوجہ ہمارا وقت ضائع مت کریں۔ اگر کوئی مدد نہیں کر سکتے تو ہمیں جانے دیں۔ آپ نے پہلے ہی ٹائر برسٹ کر کے اچھا نہیں کیا۔"

محسن کے جھوٹ پر میں حیران رہ گیا۔ میں نے عام تھانے داروں کی طرح محسن کی زبان درازی پر مشتعل ہو کے اسے گالیاں دے کے اس کے دو بید رسید کئے۔

"یہ گونگا ایک دم بولنے لگ گیا۔ تمہیں بتا رہا ہے کہ ہم نے اچھا نہیں کیا۔ اب جب ہم برا کریں گے تو پتا چلے گا۔"

"سب انسپکٹر! ہم کو کیا سمجھا ہے آخر تم نے؟ کیا ہم چور اچکے ہیں؟ ہم عزت دار کاروباری لوگ ہیں" محسن نے بڑی بے باکی سے کہا "تم جیسے ہمارے پاس ملازم ہیں۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے..."

میں نے اس کو اور گالیاں دیتے ہوئے کئی بید رسید کئے۔ "زبان چلاتا ہے۔ بھونکتا ہے کتے۔ ابھی تجھے بھی اندازہ نہیں ہے کہ میرے جیسے کتنے عزت داروں کی کھال ایک رات میں اتار چکا ہوں میں۔"

اب گاڑی میں سے اترنے والا پہلا شخص آگے بڑھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ صورت حال خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔

"تھانے دار جی! آپ ایک منٹ میری بات سن لیں" اس نے بڑی لجاجت کے ساتھ درخواست کی "صرف ایک منٹ..."

"جو کہنا ہے یہاں کہو۔ سب کے سامنے" میں نے غرا کے کہا۔

"آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں جناب عالی، میری عرض سن لیں پہلے پھر آپ کو اختیار ہے" اس نے میرے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ علیحدگی میں وہ کیا کہتا ہے میں گھوڑے سے اتر گیا "اگر ان میں سے کوئی اپنی جگہ سے ہلے تو گولی مار دو" میں نے سپاہیوں سے کہا۔

"سر جی! اس بے وقوف کی باتوں میں نہ جائیں" اس نے

www.paksociety.com

مجھے ایک طرف لے جا کے کہا "وہ بیمار ہے اس لئے دماغ خراب ہو رہا ہے اس کا۔"

"دماغ تو ایسے ٹھیک ہو جاتا ہے" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔

"چھوڑیں جناب' آپس کی بات ہے۔ آپ ہمیں جانے دیں۔ ہم غلط نہیں کہہ رہے ہیں' ہم آپ کو اس وقت اپنے ساتھ لے جا کے سب کچھ دکھا سکتے ہیں۔ گاڑی کے کاغذات' اپنی کوٹھی' کاروبار کی جگہ۔ دس آدمی ہمارے ضامن نکل آئیں گے۔ وہ ہمارے کہنے سے آپ کے سامنے ایک ایک لاکھ رکھ دیں۔"

"اچھا!" میں نے دلچسپی سے کہا "یہ بات ہے۔ ایک لاکھ تو بہت ہوتے ہیں۔"

"ایک لاکھ تو واقعی بہت ہوتے ہیں... لیکن آپ ہمارے معاملے میں ٹانگ نہ اڑائیں تو آپ کو مل سکتے ہیں۔"

"کب؟ اسی وقت۔"

"ابھی تو نہیں' لیکن صبح بینک کھلتے ہی۔ اس وقت ہم بہت ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ ہمارا وقت بہت قیمتی ہے۔"

اب میں نے ایک دم ترپ کا پتہ اس کے سامنے ڈال دیا۔ "تم میں سے ایک کو میں پہچانتا ہوں۔"

"کس کو پہچانتے ہیں آپ؟" وہ پریشان نظر آنے لگا۔

"اس کو جسے تم بیمار کہتے ہو۔ وہ شیام کمار ہرگز نہیں ہے۔ وہ مسلمان ہے۔ محسن نام ہے اس کا۔"

وہ یوں اچھلا جیسے اچانک میں نے اس کے کان پر رکھ کے پستول داغ دیا ہو۔ میں نے اس شدید ردعمل کو نوٹ کیا مگر انجان بن گیا۔

"تھانے دار جی' آپ... یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

میں نے مسکرا کے سرگوشی میں کہا۔ "میرے سامنے ڈراما مت کرو اس لئے کہ میں خود بھی ڈراما کر رہا تھا۔"

"ڈراما... کیسا ڈراما؟"

"میں نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ تم سب پاکستانی ہو اور یہاں کی پولیس بھی تمہیں اتنا ہی دہشت گرد سمجھتی ہے جتنا پاکستان کی پولیس۔" میں نے کہا۔

"لیکن... ہم... دہشت گرد نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "آہستہ بولو' مجھے سب معلوم ہے کہ تم کو مجرم اور دہشت گرد بنا دیا گیا ہے۔ درحقیقت تم سچے پاکستانی اور سچے انسان ہو۔ تم لوگ وطن کے دشمنوں کے دشمن ہو چنانچہ وہ تمہارے دشمن ہو گئے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

میرے لہجے نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا مگر ڈرتے ڈرتے۔

"تم بالکل فکر مت کرو' میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا" میں نے کہا "بس مجھے یہ بتا دو کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہم... تم پر کیسے اعتبار کر لیں؟" اس نے عیاری سے کہا۔

"میں تم کو... اور اس دوسرے شخص کو پہچانتا ہوں" میں نے رازدارانہ سرگوشی میں کہا "کیا تم سکندر بخت ہو؟"

اس نے ایک نظر مجھے بے یقینی سے دیکھا اور پھر کہا۔ "ہاں۔"

"گویا میرا اندازہ درست تھا" میں نے کہا "اگر تم سکندر بخت ہو تو پھر تیسرا آدمی صرف غالب ہو سکتا ہے۔"

اسے یقین آ گیا کہ میں واقعی ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا خیال چھوڑ چکا ہوں۔ اس احمق نے یہ نہیں سوچا کہ جب میں محسن کو پہچانتا ہوں تو پھر سکندر بخت اور غالب کو کیوں نہیں پہچانتا۔ تصویریں تو تینوں کی اخبارات میں ایک ساتھ شائع ہوئی تھیں۔

"بالکل ٹھیک اندازہ کیا تم نے سب انسپکٹر" اس نے گہری سانس لے کر اعتراف اور تعریف کے انداز میں کہا "میں مانتا ہوں کہ میں ہی سکندر بخت ہوں..."

ابھی جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ میرا ہاتھ گھوم کر اس کی کنپٹی پر پڑا۔ وہ اس حملے کے لئے تیار نہیں تھا چنانچہ لڑکھڑا کے نیچے گر گیا۔

میں نے اسے ایک سے ایک منتخب گالیاں دیتے ہوئے ٹھوکریں ماریں "سالے جعلساز' دھوکے باز' فریبی' آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے ہماری' ہم سب کو پہچانتے ہیں" میں نے کہا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ہمارے درمیان کیا بات ہوئی تھی اور اب اچانک کس مسئلے پر مذاکرات کی ناکامی سے صورت حال ایک دم پلٹ گئی ہے۔ محسن اور اس شخص کا دوسرا ساتھی حیران پریشان کھڑے ہوئے سب دیکھ رہے تھے مگر کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ ایک ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور چار بندوقوں کے دہانے ان کی جانب اٹھے ہوئے تھے۔

"پکڑ لو ان سب حرامزادوں کو' الگ الگ باندھ کے ڈال دو اسی گاڑی میں" میں نے حکم جاری کیا۔

انہوں نے مزاحمت کی واجبی سی کوشش کی مگر میرے سپاہی بہت مستعد ثابت ہوئے۔ انہوں نے تینوں کو بندوقوں کے کندے مار مار کے گرا دیا اور رسیوں سے باندھ دیا۔ ہتھکڑیاں تو ملتی نہیں ہیں۔ ہم مجرموں کو پکڑنے اور باندھنے کے لئے رسی بھی خود ہی فراہم کرتے ہیں۔

"تھانے دار' میں سمجھ لوں گا تجھ سے" پہلے والے نے کسی زخم خوردہ سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا "تجھے معلوم نہیں تو نے کس پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔"

دوسرے نے چلا کے کہا "ہم نے تیری [illegible]"

میں نے ان کی بکواس کا جواب زبان چلا کر نہیں دیا۔ وہ چلاتے رہے اور دھمکیاں دیتے رہے اور خطرناک نتائج سے ڈراتے رہے۔

باندھ کے گاڑی میں ڈال دیا۔ وہ مجرموں کو رسی سے باندھتے ہیں۔ کوئی مجرم کتنا ہی زور کیوں نہ لگائے' رسی کا ماہر ہی اسے کھول سکتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں کی انگلیاں تک نہیں ہلا سکتا۔ زیادہ خطرناک مجرموں کو وہ ایسے جکڑتے ہیں کہ اگر کوئی زور لگائے یا ہاتھ پیر ہلائے تو رسی کا حلقہ تنگ ہونے لگتا ہے اور وہ خود کو پھانسی دینے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ دم سادھ کر پڑے رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کار کا ٹائر بدل دیا گیا تھا مگر میرے سپاہی ڈرائیونگ نہیں جانتے تھے۔ ڈرائیونگ خود میں نے عرصہ ہوا چھوڑ دی تھی۔ میں نے اسی شخص کو ڈرائیونگ پر مجبور کیا جو چلا رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ ریوالور لے کر بیٹھ گیا۔ اپنا گھوڑا ایک سپاہی کے حوالے کیا اور ان سے کہا کہ تھانے کی جانب ساتھ ساتھ چلیں۔

مجھے اندازہ تھا کہ ان تینوں کی ایک دوسرے کے بارے میں پوزیشن کیا ہے۔ محسن کو اپنے ساتھ لے جانے والے افراد کے بارے میں مجھے کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ محسن کے ساتھی نہیں ہو سکتے۔ اس کے ساتھی بھی خود کو سکندر بخت نہ کہتے۔ محسن کی پریشانی اور خاموشی سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اصل بات کچھ اور ہے۔ اگر وہ محسن کے ساتھی ہوتے تو وہ ان کی وکالت کرتا اور مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ یہ سکندر بخت اور غالب ہیں مگر اس نے نہ تائید کی تھی نہ تردید۔ وہ دونوں محسن کے سامنے اپنی اصلیت ظاہر کرنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے دھمکیاں تو بہت دی تھیں مگر کسی بڑے آدمی کا نام نہیں لیا تھا۔ انہوں نے اپنا اصل نام اور پتہ نہیں بتایا تھا اور صرف یہی کہتے رہے تھے کہ صبح سب ٹھیک ہو جائے گا۔ صبح کون آکے توپ چلا دیتا۔ یہ وہ کیسے بتا سکتے تھے۔ اگر وہ تردید کرتے کہ وہ محسن کے ساتھی نہیں ہیں تو ان کا کھیل بگڑ جاتا۔ انہیں اپنی اصلیت ظاہر کرنے کی صورت میں اپنے مقصد سے دستبردار ہونا پڑتا۔

بعد میں معلوم ہوا۔ محسن تو پہلے ہی جانتا تھا کہ وہ اس کے دشمن ہیں اور کسی کے آلۂ کار ہیں مگر یہ بات انہیں معلوم نہ تھی اور وہ اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ محسن ان کے جھانسے میں گرفتار ہو چکا ہے اور بالآخر انہیں سکندر بخت اور غالب تک لے جائے گا۔ خود محسن نے ان کی یہ خوش فہمی دور نہیں کی تھی کہ وہ بھی پولیس کے مقابلے میں ان سے متفق تھا۔ آسان تو کچھ بھی نہیں تھا لیکن پولیس کو اپنی قوت کے باعث زیادہ خطرناک دشمن سمجھا تھا۔ پولیس کے مقابلے پر دوسری طرف صرف دو افراد تھے۔ ان سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوئی قدم اٹھانے کا موقع نہیں ملا ہوگا کہ درمیان میں پولیس آ گئی۔

محسن اس لئے خاموش رہا کہ وہ خود پولیس کی قید سے آزادی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دشمن بااثر اور قوی تھے' ان کا دعویٰ ٹھیک تھا کہ رات کو وہ کچھ نہیں کر سکتے مگر صبح انہیں کوئی قید میں نہیں رکھ سکے گا اور میری پیٹی اتر جائے گی۔ خود محسن نے اپنی آزادی کی سب امیدیں صبح سے وابستہ کی تھیں۔ جب اصل لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ایک معمولی سب انسپکٹر نے ان کے کام میں رخنہ ڈالا اور ان کے حکم کے غلاموں کو پکڑ لیا تو وہ صرف فون ملائیں گے اور اوپر سے کسی بڑے افسر کا حکم صادر ہوگا کہ سب کو چھوڑ دو اور خود وضاحت کرنے کے لئے حاضر ہو جاؤ کہ کیوں نہ تمہیں معطل کر دیا جائے۔ صحیح سلسلہ پھر وہیں سے شروع ہوگا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ نہ وہ جانتے تھے کہ محسن کے دل میں کیا ہے' نہ محسن کو اندازہ ہو سکتا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ وہ سب اپنے اپنے طور پر جو کچھ سوچ رہے تھے غلط سوچ رہے تھے لیکن یہ بات جانتے نہیں تھے۔

تھانے پہنچ کے میں نے حکم دیا "ان دونوں کو الگ الگ باندھ کے رکھو' اس کو حوالات میں ڈال دو" میں نے محسن کی طرف اشارہ کیا۔

"اور دوسرے کو؟" ایک سپاہی نے کہا۔

"اس کو ساتھ والے کمرے میں رکھو" میں نے کہا "یہ لوگ ایک دوسرے سے بات نہ کرنے پائیں' مسئلہ اس تیسرے کا ہے۔"

"اس کو اپنے گھر میں بند کر دیں جی؟"

"نہیں۔ میں اس کو گردوارہ صاحب کے حوالے کر دیتا ہوں... ان کی حویلی کے کسی کونے میں ضرور جگہ ہوگی۔ ورنہ اسے بیلوں کے ساتھ باندھ دیں گے۔"

میں نے کہا "چل بیٹا' گاڑی چلا۔"

"تھانے دار!" گاڑی چلانے والے نے میرے انتظام کے خلاف سخت احتجاج کیا "یہ اچھا نہیں کر رہا ہے تو' میں پھر بتا رہا ہوں۔"

میں نے اس کی گدی پر ہاتھ مارا "کتنی بار بتائے گا..."

اس نے گاڑی چلاتے ہوئے پلٹ کے گالی دی "تو جانتا کیا ہے آخر' دو کوڑی کے تھانے دار۔ تیرے جیسے تو ڈپٹی کے کتے ہیں' اس کے قدموں میں لوٹتے ہیں' اس کا تھوکا ہوا چاٹتے ہیں۔"

"ڈپٹی کیا چیز ہوتی ہے' کوئی کتے کی نسل ہے یہ بھی؟" میں نے کہا "بھونکنے والا ہے کہ کاٹنے والا؟"

"کیا تیرے بیوی بچے نہیں ہیں' اپنا نہیں تو ان کا خیال کر" اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی "ڈپٹی ایک ہاتھی ہے اور تو اس کے مقابلے میں..."

"چیونٹی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "مگر کیا چیونٹی ہی ہاتھی کی موت کا سبب نہیں بنتی۔"

www.paksociety.com

اب محسن سامنے نہیں تھا تو اس نے تریونی کا نام لے کر مجھے ڈرانے کی کوشش کی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ڈر گیا تھا۔ تریونی میری اور میرے بیوی بچوں کی بوٹیاں اپنے کتوں کے سامنے ڈال سکتا تھا۔ وہ میرے ساتھ اس سے بھی برا سلوک کر سکتا تھا۔

لیکن اس وقت میں نے کہا "اب میرے ساتھ جو بھی ہو۔ تمہارا یہ تریونی مجھے سولی چڑھا دے مگر میں کسی کو چھوڑنے والا نہیں ہوں، صبح افسر چھوڑ دیں تو ان کی مرضی۔"

آدھی رات کے وقت گرداور مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"کیا بات ہے تھانے دار جی؟" وہ آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔

"ایک بندہ لایا ہوں، اسے آج رات سنبھال کے رکھ لیں۔" میں نے کہا "صبح میں لے جاؤں گا۔"

"کون ہے یہ؟" گرداور نے حیران ہو کے کار کی طرف اور پھر میرے قیدی کی طرف دیکھا۔

"یہ اسلحہ لے کر جنگل میں پھر رہے تھے، انہوں نے بھاگنے کی اور مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی۔ جب پکڑے گئے تو مجھے دھمکیاں دے رہے ہیں کہ صبح میری ایسی کی تیسی کروا دیں گے۔ میرے خیال میں یہ وہی ڈاکوؤں کا گروہ ہے جس نے ادھر ابھی میں بہت مصیبت ڈال رکھی تھی۔ انہی کی گرفتاری کے لئے پولیس ہر طرف موجود ہے۔"

"تو ان کو تھانے میں کیوں نہیں رکھا؟" گرداور بولا۔

"تھانے میں دو کو رکھا ہے، الگ الگ۔ یہ ان کا سرغنہ معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"بکواس کرتا ہے یہ تھانے دار... میں نے اسے بہت سمجھایا مگر یہ میری ایک نہیں سنتا۔" وہ چیخ کر بولا۔

"مجھے ڈر ہے کہ کہیں ان کے ساتھی تھانے پر حملہ کرنے نہ آجائیں اسی لئے سب کو، الگ الگ رکھا ہے۔ آپ ذرا ہوشیار رہئیے..."

"گرداور صاحب، آپ میری بات سن لیں... ہم ڈاکو نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا جی میں چلتا ہوں۔ اس کا خیال رکھیں، فرار نہ ہو جائے۔ بندوق تو ہے آپ کے پاس، بے شک گولی مار دیں۔ میں اس کی گاڑی چھوڑ کے جا رہا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ گرداور کچھ کہتا میں واپس ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ بعد میں کیا ہوگا اور میں اس کے لئے بالکل تیار تھا۔ ابھی مجھے تھانے پہنچے ہوئے دس پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ گرداور کا بیٹا [illegible] آ گیا۔ اس نے مجھے گرداور کا پیغام دیا۔

"آپ کو فوراً بلایا ہے ابا نے۔"

"لیکن میں ابھی تو آیا ہوں ان سے مل کے۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ مگر انہوں نے کہا تھا کہ بہت ضروری کام ہے، تھانے دار جی کو ساتھ لے کر آنا۔"

میں بادل ناخواستہ اس کے ساتھ گیا۔ گرداور مجھے باہر ہی انتظار میں بے چینی سے ٹہلتا ہوا نظر آیا۔ وہ مجھے اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے کہا۔

"تھانے دار جی، یہ تم نے کیا غضب کر دیا، یہ کس کو..."

میں نے کہا "ڈاکو ہیں، میں نے بتایا تھا۔"

گرداور نے سر پہ ہاتھ مار کے کہا "یار، عقل کے گھوڑے کو لگام دو۔ کیوں اپنی تھانے داری کے پیچھے پڑے ہو۔ معلوم ہے کس کے آدمی ہیں؟ تریونی کے۔"

"یہ نام انہوں نے بھی لیا تھا، کون ہے تریونی؟"

"تم تریونی کو نہیں جانتے؟" گرداور نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔

اس نے مجھے بڑی تفصیل سے بتایا کہ تریونی کون ہے اور میرے غلط اقدام سے میری نوکری ہی نہیں زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔

میں نے ڈر کے کہا "آپ کو یقین ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہے ہیں؟"

"ارے یار، کیا ڈاکو اتنے بے وقوف ہوتے ہیں کہ رات کے وقت کار میں گھومتے پھریں؟" گرداور نے کہا "میری مانو، ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے، معاملے کو سنبھال لو۔"

"کیسے سنبھالوں؟" میں نے کہا۔

"انہیں چھوڑ دو۔" گرداور بولا۔

"چھوڑ دوں؟ گرداور جی، اگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ڈاکو تھے تو کیا ہوگا؟ آپ کا کچھ نہیں جائے گا، میری نوکری جائے گی۔"

گرداور نے کہا "تھانے دار، میری ساری زندگی کا تجربہ ہے کہ وہ ڈاکو نہیں ہو سکتے۔ چور ڈاکو اتنے اطمینان سے بات نہیں کر سکتے۔ اس کا کہنا ہے کہ ابھی میرے ساتھ چلو اور چل کے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ ابھی پتا چل جائے گا جھوٹ کا۔"

"وہ جانتا ہے کہ اس وقت ہم نہیں جا سکتے۔"

"کیوں نہیں جا سکتے؟ تم اس کی گاڑی میں چلے جاؤ۔ تمہارے لئے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس نے تو کہا ہے کہ تھانے دار اکیلا ہی چلا جائے اور یہ گاڑی بھی لے جائے اور جا کے تصدیق کرے۔ ایک گھنٹہ جانے کا اور ایک گھنٹہ آنے کا۔"

میں نے سوچ کے کہا "میں تو گاڑی نہیں چلا سکتا۔"

"اس کے ساتھ جو دوسرا آدمی پکڑا تھا تم نے، وہ ڈرائیور ہے، اسے لے جاؤ۔" گرداور بولا "لیکن میرے خیال میں یہ سب غیر ضروری ہے، وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ گاڑی کا نمبر چیک کر لو، معلوم ہو جائے گا کہ گاڑی کس کی ہے۔"

"یہ نمبر... جعلی نہیں ہے؟"

"نہیں، اصلی نمبر ہے۔" گرداور نے کہا "اس کا کہنا ہے کہ تم فون کر کے پوچھنا چاہو تو وہ ایک نہیں دس نمبر دے سکتا ہے۔"

"یہاں ٹیلی فون کہاں ہے؟"

"یار، نہیں ہے تو کیا ہوا، مین روڈ کتنی دور ہے۔ تم خود فون کر کے معلوم کر لو۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو پھر وہ یہاں کیوں پھر رہے تھے؟ کیا کام تھا اس جنگل میں؟ وہ بھی آدھی رات کے بعد۔ اور ان کے پاس کاغذ کا پرزہ تک نہیں ہے اپنی شناخت کے لئے۔"

"تم کو تھانے دار، تمہاری نوکری کتنی ہے؟"

"چھ سال... مگر..."

"اگر تم غور کرو، چھ سال میں تمہیں تجربے سے کچھ نہیں سکھایا تو تم کو علم ہونا چاہئے کہ پولیس ہر جگہ ٹانگ نہیں اڑا سکتی۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں اور ان کے "معاملات" ایسے ہوتے ہیں جو کسی قانون کے دائرہ اختیار میں نہیں آتے۔ کوئی نہیں پوچھ سکتا ان سے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے افسر بھی ان سے ڈرتے ہیں اور غلطی سے بھی ان کے کاروبار کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتے کیونکہ یہ بہت اونچے تعلقات رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ پولیس کمشنر ان کا اپنا آدمی ہوتا ہے۔"

"کیا تریونی واقعی اتنی بڑی چیز ہے؟" میں نے ڈر کے کہا۔

"ہاں یار۔ اب میں کیسے سمجھاؤں تمہیں۔ عقل سے کام لو، جانے دو۔" گرداور نے چڑ کے کہا "مجھے تو تمہارا خیال ہے، اپنے آدمی ہو اور آج تک کسی کو تم سے شکایت نہیں ہوئی۔ اس لئے میں نے کہا کہ پہلے مجھے بات کرنے دو، صبح تک یہ معاملہ بگڑ جائے گا۔"

میں نے کہا "آپ کی مہربانی گرداور جی، میں آپ کی ضمانت پر چھوڑ رہا ہوں۔"

گرداور نے گھبرا کے کہا "میں کون ہوتا ہوں کسی کی ضمانت دینے والا۔ تم مجھے بیچ میں مت لاؤ۔"

"جب آپ کہتے ہیں کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں تو پھر خود کیوں ڈر رہے ہیں؟"

"دیکھو یار، یہ قانونی معاملات ہیں۔ قانونی طور پر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں کسی کا ضامن بنوں۔ نہ میں تمہیں حکم دے سکتا ہوں اور نہ تم کسی سے ضمانت طلب کر سکتے ہو۔ میں نے تو ایک مشورہ دیا ہے جس میں تمہارا فائدہ ہے۔ میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا اگر تم میرے مشورے کے خلاف عمل کرو گے۔"

"ٹھیک ہے، تو آپ کی بات مان رہا ہوں۔ آپ ذمے دار ہیں۔ کل خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو آپ گواہی دیں گے، صرف آپ جانتے ہیں..."

گرداور نے پریشان ہو کے کہا "یار، بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ ایسی ویسی کوئی بات اول تو ہوتی نہیں، ہوئی تو تم پر کوئی الزام کیسے آ سکتا ہے۔ تم صاف انکار کر سکتے ہو کہ تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں، ان لوگوں کو تم نے کبھی دیکھا نہ پکڑا... سمجھ لو کہ آج رات کچھ ہوا ہی نہیں، یہ لوگ خاموشی سے نکل جائیں گے، میں انہیں سمجھاؤں گا کہ تمہاری دخل اندازی کو ایک غلط فہمی سمجھ کے نظر انداز کر دیں، اور وہ مان جائیں گے۔ دو گھنٹے ہی گزرے ہیں ابھی..."

"ابھی تو ڈیڑھ گھنٹا بھی نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔

"چلو یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے کی تاخیر سے ان کا کوئی کام نہیں بگڑا۔"

"کیسا کام؟ کیا آپ کو معلوم ہے وہ یہاں کیوں آئے تھے؟"

"نہیں یار، مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہاں وہ سیر و تفریح کے لئے نہیں آئے تھے۔ ہوگا ان کا کوئی کام، نہیں کیا۔"

"لیکن انہوں نے یہاں سے جانے کے بعد کوئی واردات کی، گاؤں میں ڈاکا ڈال دیا، کسی کو قتل کر دیا تو..."

"نہیں، ایسا نہیں ہوگا، اطمینان رکھو۔"

"ٹھیک ہے تو میں... آپ کا نام بھی لوں گا کہ آپ نے مجھے کہا تھا۔"

گرداور گھبرا گیا "نہیں، میرا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ میرا کوئی تعلق نہیں تمہارے معاملات سے۔ میری طرف سے تم بھاڑ میں جاؤ، مت چھوڑو انہیں، خود بھگت لینا بعد میں۔ اسے بھی لے جاؤ یہاں سے..."

میں نے کہا "اچھا... آپ خفا مت ہوں... میں ابھی آتا ہوں، ذرا اس کے ساتھی سے بھی پوچھ لوں۔"

"کیا پوچھو گے اس سے؟ اب تفتیش شروع کرو گے؟"

میں نے کہا "تفتیش نہیں، تصدیق کرنا چاہتا ہوں میں۔ آپ مجھے بتائیں، اس نے آپ کے سامنے کس کس کا نام لیا ہے، کس کس کا ٹیلی فون نمبر بتایا ہے۔ اگر یہ سب سچ ہوگا تو اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی یہ نام اور فون نمبر معلوم ہوں گے۔"

گرداور نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ وہ نام اور فون نمبر لکھوا دے۔ تم تصدیق کر لو۔ یا اس کے ساتھیوں سے کہو کہ وہ بھی نام اور فون نمبر بتائیں، پھر دونوں کو آپس میں ملا کے دیکھ لو۔"

چند منٹ بعد مجھے گرداور نے کاغذ کے ایک پرزے پر تین نام لکھ کے دئیے۔ ان کے سامنے چھ سات فون نمبر لکھے ہوئے تھے... ان میں ایک نام تریونی کا بھی تھا۔

میں واپس گیا اور میں نے وہ نام پتے محسن کو دکھائے، زیادہ بات کرنے کے لئے وقت نہیں تھا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا اور تم سب کے متعلق بھی جو کچھ میں جانتا تھا

www.paksociety.com

وہ اسے سنا دیا۔ ظاہر ہے وہ بہت حیران ہوا لیکن بالآخر اسے یقین آگیا کہ میں اس کی مدد کرسکتا ہوں۔ میں نے اسے حوالات سے نکالا اور باہر انتظار کرنے کو کہا۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے ایک گھوڑا دوں گا اور پولیس کی وردی۔ تاکہ وہ راتوں رات اس علاقے سے نکل جائے اور اسے کوئی نہ روکے۔ میں اسے ریوالور بھی دینا چاہتا تھا اور کچھ نقد رقم بھی۔ اس کو چھوڑنے کے بعد میں دوسرے شخص کے پاس گیا اور میں نے اس سے واجبی سی تفتیش کی۔ میں نے اس کے سامنے چند نام لئے جو مجھے کاغذی چیٹ پر لکھے ہوئے ملے تھے اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ ان لوگوں کے ٹیلی فون نمبر بتا سکتا ہے۔ اس نے سب نمبر بالکل ٹھیک بتائے۔

پانچ منٹ بعد میں باہر گیا۔ میرا خیال تھا کہ محسن میرا انتظار کررہا ہوگا لیکن وہ غائب ہوچکا تھا۔ اس نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ اچھا ہوتا اگر وہ گھوڑا لے جاتا۔ ریوالور اور پولیس کی وردی لے جاتا۔ میں اس کے تحفظ کے لئے سارا انتظام کررہا تھا مگر جانے کیوں اس نے میری مدد کی پیشکش سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ باہر نکلتے ہی فرار ہوگیا۔ میں نے دس منٹ کے بعد تھانے میں بند دوسرے قیدی کو آزاد کردیا۔

میں نے کہا "ایک غلط فہمی کی بنا پر میں نے تمہیں ڈاکو سمجھ لیا تھا۔"

وہ بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرایا "اچھا ہوا کہ تیری غلط فہمی جلدی ہی رفع ہوگئی۔"

میں نے کہا "ہم آنکھیں بند تو نہیں کرسکتے۔ اس علاقے میں جو کچھ ہو رہا ہے تم جانتے ہو۔"

اس نے کہا "لیکن تم کو دیکھنا چاہئے کہ شریف آدمی کون ہے۔ ایسے ہی ہر ایک کو نہیں پکڑ لینا چاہئے۔"

میں نے کہا "میں نے تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک تو نہیں کیا۔"

وہ تلخی سے مسکرایا "اور کیا اچھا سلوک کیا تھا تم نے؟ اتنا مارنے اور ذلیل کرنے کے بعد اب کہتے ہو...."

میں نے کہا "چلو یار، غلطی ہوگئی تھی بھول جاؤ۔"

ایک گھنٹے میں معلوم ہوگیا نا کہ ہم کون ہیں" وہ اکڑ کے بولا۔ "ایک رات گزر جاتی تو تیرا انجام خراب ہوتا تھانے دار۔"

میں نے کہا "ترویدی صاحب سے کچھ مت کہنا۔"

"معافی تو مانگنی پڑے گی تجھے ان کے سامنے جاکے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اچھا۔ اگر مقدر میں ذلت بھی ہے تو وہ بھی بھگت لیں گے۔ مگر تم سفارش کردینا کہ جیسے ہی مجھے معلوم ہوا کہ تم کس کے آدمی ہو میں نے تمہیں چھوڑ دیا تھا۔"

"میرے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟" اس نے بڑی نخوت سے کہا۔

میں نے کہا "ایک کو گرداور صاحب کے گھر بھجوا دیا ہے" میں نے۔ اس نے گرداور سے بات کی۔ پھر گرداور نے سمجھایا۔ جب بات ہوئی تو ساری بات کا پتا چلا۔ میں نے گرداور نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، الٹا سب کچھ دو۔ چنانچہ میں یہاں آگیا "تم اب آزاد ہو۔"

اس نے کہا "میرے ساتھ یہاں کوئی اور بھی تھا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اسے بھی چھوڑ دیا ہے میں نے۔"

وہ ایک دم چونکا "کہاں ہے وہ؟"

میں نے کہا "باہر تمہارا انتظار کررہا ہے۔"

اس نے مجھے ایک فحش گالی دی اور باہر کی طرف لپکا لیکن بے احتیاطی میں محسن بہت دور جاچکا تھا۔ وہ سخت اشتعال کے عالم میں چیختا چلاتا واپس آیا۔

"باہر کوئی نہیں ہے وہ بھاگ گیا۔"

"بھاگ گیا!" میں نے حیران ہوکے کہا "تمہیں چھوڑ کے بھاگ گیا۔"

اس نے مجھے ایک درجن غلیظ گالیاں دیں "یہ سب تیرا کیا دھرا ہے تھانے دار۔"

"میں نے کیا غلطی کی.... اگر اسے چھوڑ دیا" میں نے کہا۔ "میں مانتا ہوں کہ تمہیں پکڑ کے غلطی کی تھی میں نے۔"

"مگر وہ ہے کہاں؟" وہ چیخ کر بولا۔

"کیا وہ باہر نہیں ہے؟" میں نے حیران ہوکے کہا۔

"وہ باہر نہیں ہے" اس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔

میں نے ایک ہاتھ مار کے خود کو چھڑا لیا "میں نے اسے حوالات سے نکال دیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ میں باہر کھڑا ہوں۔ جاکے اچھی طرح دیکھو۔"

"اچھی طرح دیکھ لیا ہے میں نے" وہ اسی طرح چیخ کے بولا۔ "اگر وہ بھاگ گیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ تم تو دوست تھا تمہارا، کوئی قیدی نہیں تھا۔ بھاگ کر واپس آجائے گا۔"

وہ بکتا جھکتا میرے ساتھ گرداور کے گھر گیا۔ وہاں مزید یہ ہوا۔ وہ دونوں جو محسن کو پکڑ کے لائے تھے اپنی ساری کامیابی کے اچانک ناکامی میں بدل جانے سے سخت مشتعل تھے۔ وہ ساری خرابی کا ذمے دار مجھے سمجھ رہے تھے۔

گرداور نے کہا "یار اب اس میں تھانے دار کی کیا غلطی ہے؟"

"غلطی سب اس کی ہے" اس نے جاتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا۔ "وہ شخص چلانے لگا جو گرداور کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ "کیا عجیب بات کرتے ہو تم نے کہا تھا کہ سب کو چھوڑ دو۔ اس نے چھوڑ دیا" گرداور بولا۔

میں نے کہا "آپ خود ہی بتائیں جی کہ میں اور کیا کرتا۔ اگر میں نے انہیں پکڑا تو میری غلطی، چھوڑ دیا تب بھی غلطی۔"

ایک نے کہا "تو جھوٹ بکتا ہے تو نے اسے چھوڑا ہی نہیں، تو نے خود غائب کردیا ہے اسے" دوسرا بولا۔

میں نے کہا "میں ایک کو رکھ کے کیا کروں گا۔ جب چھوڑا تو دونوں کو چھوڑا تھا۔"

گرداور نے کہا "ہاں بھئی۔ تمہارا ساتھی زیادہ ڈرپوک تھا، باہر نکلتے ہی کہیں چھپ گیا.... یا واپس چلا گیا اکیلا ہی۔"

..... وہ دونوں جانتے تھے کہ اصل بات یہ نہیں ہے لیکن اب وہ گرداور کے سامنے اپنی بات سے مکر نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے محسن کو بھی اپنا ساتھی قرار دیا تھا۔ یہ بات انہوں نے میرے سامنے پولیس والوں کے سامنے بھی کی تھی اور اس کی تائید محسن نے بھی کی تھی۔

صرف میں جانتا تھا کہ وہ محسن ہے اور انہیں بتا چکا تھا کہ میں نے محسن کو شناخت کرلیا ہے چنانچہ ان کا مجھ پر شک کرنا بجا تھا کہ میں نے اسے فرار کا موقع فراہم کردیا۔

گرداور کے گھر سے روانہ ہونے کے بعد انہوں نے راستے میں بات چیت کی۔

"دیکھو تھانیدار، تم جانتے ہو کہ وہ ہمارا ساتھی نہیں تھا۔"

"تم کس کی بات کررہے ہو؟" میں نے کہا۔

"ہم محسن کی بات کررہے ہیں" وہ چلا کے بولا۔

"محسن تمہارا ساتھی نہیں تھا؟" میں نے سخت حیران ہوکر کہا "مگر یہ تو خود محسن نے اعتراف کیا تھا۔"

"وہ جھوٹ بول رہا تھا" دوسرے نے کہا۔

"تم لوگوں نے میرا دماغ خراب کردیا ہے" میں نے کہا۔ "کچھ پتا نہیں چلتا کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا۔ پہلے تم نے کہا کہ تم سب محسن کے ساتھی ہو، تم نے خود کو سکندر بخت کہا تھا اور اس کو غائب حالانکہ یہ جھوٹ تھا اور تم نے مان لیا تھا کہ یہ جھوٹ تھا۔ پھر تم نے گرداور کے سامنے اس سے بھی بڑا جھوٹ کہا۔"

"ہم نے گرداور کے سامنے جو کچھ کہا تھا سچ تھا۔"

"کیا واقعی وہ نام اور ٹیلی فون نمبر درست تھے؟"

"ہاں وہ سب ٹھیک تھے۔"

"تم واقعی ترویدی کے آدمی ہو؟"

"کیا تمہیں شک ہے؟" وہ چیخ کر بولا۔

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں تو سمجھا تھا کہ گرداور کو متاثر کرنے کے لئے خود کو ترویدی کا آدمی بتا رہے ہو، تمہارا مقصد صرف اپنا اعتبار قائم کرکے رہائی حاصل کرنا ہے۔"

انہوں نے مجھے ایک گالی دی "پاگل کے بچے، وہ سب نام اور نمبر ٹھیک تھے، جیسے چاہو تصدیق کرلو۔"

میں نے الجھن سا سر ہلایا "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم ترویدی کے آدمی ہو تو محسن تمہارا ساتھی کیسے ہوگیا!"

"وہ قیدی تھا، ہم اسے پکڑ کے لائے تھے۔"

میں نے کہا "میں نہیں مان سکتا، وہ قیدی ہوتا تو آزاد نہ ہوتا... نہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ نہ اسے کوئی اور مجبوری لاحق تھی۔ اس نے خود اپنی مرضی سے کسی دباؤ یا خوف کے بغیر کہا تھا کہ تم اس کے ساتھی ہو۔"

ظاہر ہے میرا مقصد صرف وقت ضائع کرنا تھا تاکہ محسن کو زیادہ سے زیادہ دور جانے کا موقع مل سکے۔ اس کے علاوہ میں خود اپنی جان بھی بچانا چاہتا تھا۔ میں انہیں یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ میں نے محسن کی مدد کی ہے۔ الزام میں نے انہی پر رکھ دیا کہ انہوں نے مختلف اور متضاد باتوں سے مجھے کنفیوژ کیا اور غلطی خود ان کی ہے کہ انہوں نے مجھے حقیقت نہیں بتائی۔ وہ سخت پریشان ہوئے۔ انہیں اب جواب دہی کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ ان کی اسکیم کامیاب تھی مگر عین وقت پر میری مداخلت نے ان کا سارا کام خراب کردیا تھا۔ وہ اب خوف زدہ تھے۔

"اب ہم باس کو کیا بتائیں گے؟" ایک نے کہا۔

دوسرے نے میری طرف دیکھا "بتا دیں گے کہ سب اس کا کیا دھرا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے گالی مت دو، میں خود ترویدی سے بات کرسکتا ہوں۔"

"تم... تم کیا بات کرو گے اس سے؟"

"میں اسے بتا دوں گا کہ تم نے سب کے سامنے خود کو محسن کا ساتھی بتایا تھا، تم نے خود کو سکندر بخت اور اس کو غائب کہا تھا۔"

ان کے اوسان خطا ہوگئے "کوئی ضرورت نہیں ایسا کہنے کی۔"

"مجھے کچھ تو بتانا ہی پڑے گا۔ میں وہی بتاؤں گا جو سچ ہے۔ اس کے گواہ بھی ہیں میرے پاس۔ خود گرداور جانتا ہے کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ غلط فہمی رفع ہوتے ہی میں نے تم سب کو چھوڑ دیا۔ نہ تم نے مجھے یہ بات بتائی تھی اور نہ گرداور کو.... کہ محسن تمہارا قیدی تھا۔"

اب انہوں نے محسوس کیا کہ میری پوزیشن بہت محفوظ ہے اور ترویدی مجھے مورد الزام قرار نہیں دے سکتا۔ الٹا میرے بیان سے وہ مجرم ثابت ہوتے ہیں اور محسن کے فرار ہونے کی ذمے داری انہی کی غلط بیانی پر عائد ہوتی ہے۔ انہوں نے مجھے سمجھا بجھا کے خاموش رہنے پر رضامند کرلیا۔

"تم اس معاملے سے بالکل الگ رہو۔ سمجھ لو کہ ہم تمہیں ملے ہی نہیں تھے" ایک نے کہا۔

دوسرا بولا "یہ بات گرداور کو بھی سمجھا دینا اور اپنے ماتحتوں کو بھی۔"

"آخر تم کیا کہو گے اپنے باس ترویدی سے؟" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"ہم کہہ دیں گے کہ محسن کو اس کے ساتھی چھڑا کے لے گئے۔ انہوں نے اچانک حملہ کر دیا تھا۔"

دوسرا بولا "کار میں گولی کا سوراخ ہمارے بیان کی تائید کرے گا۔"

"کیا ڈی آئی جی یہ بات مان لے گا اور اس طرح کیا تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا؟" میں نے کہا۔

"الزام اتنا زیادہ سنگین نہیں رہے گا۔ یہ ہماری غلطی نہیں سمجھی جائے گی۔"

"ہم گاڑی میں دو چار سوراخ کرلیں گے۔۔۔ اور ایک دوسرے کو تھوڑا بہت زخمی بھی، جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ ہم نے مقابلہ کیا تھا مگر ہم کچھ نہیں کرسکے۔ وہ ہماری مشین گن اور ریوالور بھی چھین کر لے گئے۔ ہم جان بچا کے فرار نہ ہوتے تو مارے جاتے۔"

باہمی مشورے کے بعد انہوں نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی ٹانگ پر اور بازو پر گولی چلائی۔ اس طرح کہ ہڈی پر چوٹ نہ آئے۔ زخموں پر کپڑے پھاڑ کر باندھے۔ چند گولیاں کار پر چلائیں جس سے اس کا ونڈ اسکرین پاش پاش ہوگیا اور ایک سائڈ کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد وہ گاڑی لے کر بھاگ گئے۔ مجھے ان کے ڈرامے پر بہت ہنسی آئی۔ وہ کیا مقصد لے کر آئے تھے اور کس طرح ناکام ہوگئے۔ ان کی ساری تدبیریں الٹی ہوگئیں اور وہ جال خود ان کے لئے مصیبت بن گیا جو انہوں نے بڑی عیاری سے دشمنوں کے لئے پھیلایا تھا۔ محسن کی رہائی کے لئے قدرت نے جو بندوبست کیا تھا اس میں میری حیثیت صرف وسیلے کی تھی۔ یہ خدا کا حسن انتظام تھا کہ میں بھی محفوظ رہا اور مجھے تمہاری مدد کرنے کا موقع بھی ملا۔"

آصف جاہ کی بات ختم ہونے کے بعد کچھ دیر ہم خاموش بیٹھے رہے۔ نازو کی نیند بھی اڑ گئی تھی۔ وہ بھی گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے آصف جاہ کو دیکھ رہی تھی۔ چار [illegible] اور دو شخصوں کے حصار میں اس کا وجود خدا کی غیبی امداد کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔

میں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ محسن یہاں سے فرار ہونے کے بعد ہی خانہ بدوشوں کے قبیلے میں پہنچا تھا۔"

"یہ بات تو مجھے نہیں معلوم تھی۔" آصف جاہ چونکا۔

میں نے کہا "ہاں۔ وہاں سردار کے بیٹے نے اس کو کپڑے دیئے تھے اور سواری کے لئے ایک گدھا بھی دیا تھا۔"

غالب نے کہا "مگر اس نے یہ کام راہ خدا میں نہیں کیا تھا۔ اس نے معاوضہ لیا تھا۔"

میں نے کہا "اس کے پاس پیسے کہاں سے آگئے تھے؟"

آصف جاہ نے کہا "سردار کے بیٹے نے کیا قیمت وصول کی تھی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ تو معلوم نہیں لیکن رقم کم نہیں تھی۔"

غالب نے کہا "ہم اور وہ آگے پیچھے تھے۔ پہلے وہ خانہ بدوشوں کے قبیلے میں پہنچا تھا۔"

نازو نے کہا "اگر وہ رک جاتا تو ہم مل جاتے۔"

غالب نے کہا "ایسا ہی یہاں بھی ہوا۔ ہم اس کے فرار ہوجانے کے بعد پکڑے گئے اور یہاں بھی اس کے بعد پہنچے۔"

"اب معلوم نہیں وہ کہاں ہوگا؟" نازو نے سوال کیا۔

"ہوگا اسی علاقے میں۔ وہ ہمیں تلاش کر رہا ہوگا۔"

میں نے کہا "تھانے دار صاحب! کیا تمہارے آدمی اس قبیلے کو تلاش کرلیں گے؟"

آصف جاہ نے کہا "میں نے تو انہیں فوراً روانہ کردیا۔ دم لینے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اپنے گھروں میں سو نہیں رہے ہوں گے؟"

"واقعی خانہ بدوشوں کی تلاش میں گھوڑے دوڑا رہے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"اور کیا صبح ہونے سے پہلے کوئی اطلاع آجائے گی؟" نازو بولی۔

آصف جاہ نے گھڑی دیکھی "ابھی ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ لوگ صبح پانچ بجے تک آسکتے ہیں۔ اس وقت تک کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "ہمارا اسلحہ کہاں ہے؟ جو تم نے ضبط کیا تھا۔"

"ابھی اس کی کیا ضرورت ہے۔ صبح جانے سے پہلے تمہیں مل جائے گا۔"

میں نے کہا "ہم ایسے بے فکر ہوکے نہیں سوسکتے۔ شاید غالب باری باری جاگتے رہیں گے۔"

آصف جاہ نے کہا "میں تھانے میں ہوں۔ کوئی آئے گا تو وہاں آئے گا۔ یہاں تمہیں کسی کا ڈر نہیں ہونا چاہئے۔ پھر بھی میں تمہیں ریوالور دے دوں گا۔"

تھانے میں وہ کانسٹیبل ابھی تک بے خبر سو رہا تھا جس کی وہاں نائٹ ڈیوٹی تھی۔ آصف جاہ کی دی ہوئی خواب آور دوا کا اثر پانچ چھ گھنٹے سے پہلے ختم نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے ہم کو اپنی حفاظت کے لئے ریوالور فراہم کئے۔ محسن کو قید کرکے یہاں لانے والے بھی اپنا اسلحہ آصف جاہ کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ اس میں ایک اسٹین گن بھی تھی جس کے بارے میں انہوں نے کہنا تھا کہ سکندر بخت کے ساتھی چھین کر لے گئے۔

آصف جاہ پولیس چوکی پر ہی رک گیا تھا۔ میں جب واپس آیا تو صرف غالب جاگ رہا تھا۔ پانچ منٹ میں نازو بھی نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے غالب سے

سونے کو کہا لیکن وہ کوشش کے باوجود نہ سو سکا۔ ہم نے کچن میں جاکے تیل کا چولہا جلایا اور چائے بنانے کے لئے پانی ابالا۔ فریج سے دیگر لوازمات تلاش کئے اور چائے پیتے ہوئے اس صورت حال کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

آصف جاہ کی مدد نے امید کے نئے چراغ روشن کردیئے تھے۔ مجھے تشویش اب بھی تھی مگر رابعہ اور گل کے علاوہ محسن سے ملنے کے امکانات میں مایوسی کا پہلو نہیں رہا تھا۔ خانہ بدوشوں کے قبیلے کے ساتھ وہ بہت زیادہ دور نہیں جا سکتی تھیں۔ آصف جاہ نے بتایا تھا کہ یہ قبیلے چالیس پچاس میل کے دائرے میں ہی چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ وہ خود اپنی حفاظت کرنے کی اہل تھیں۔ ریوالور ان دونوں کے پاس تھے اور ضرورت پڑنے پر وہ اس سے کام لینا بھی جانتی تھیں۔ قبیلے کے سردار نے دو ہزار روپے کی رقم یونہی نہیں لی تھی۔ اس نے ہمیں تحفظ فراہم کرنے کے لئے وصول کی تھی۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی کہ وہ قبیلے کے ساتھ ہی رابعہ اور گل کو بھی حفاظت میں رکھے۔ میں نے انہیں تاکید کی تھی کہ قبیلے کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ اگر پولیس ان کو تلاش نہ کرسکی تو ہم ڈھونڈ لیں گے۔ یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا مگر ہر جگہ کی موجودگی نے مشکل بنا دیا تھا۔

مجھے اصل پریشانی محسن کی طرف سے تھی کہ کہیں وہ پھر نہ پھنس جائے۔ اس نے آصف جاہ پر اعتماد نہ کرکے غلطی کی تھی۔ اگر وہ فرار ہونے میں عجلت سے کام نہ لیتا تو آصف جاہ کی مدد اس کے تمام مسائل حل کردیتی۔ وہ اپنا پتا چھوڑ جاتا یا اتنا ہی کہہ جاتا کہ بعد میں آصف جاہ سے رابطہ رکھے گا تو ہمارے لئے ایک دوسرے کا سراغ لگانا آسان ہوجاتا۔ ہم یہاں غیر معینہ مدت تک قیام نہیں کرسکتے تھے۔ صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے ہی ہمارا اس علاقے سے نکل جانا بہت ضروری تھا۔

باقی مسائل فی الحال پس منظر میں چلے گئے تھے۔ شہلا اب تک دشمنوں کے قبضے میں تھی اور اس کا سراغ بھی گم ہوگیا تھا۔ ہم نے چوہدری دلاور کو زبردست مالی نقصان پہنچایا تھا اور اس کے اسلحے کا بہت بڑا ذخیرہ تباہ کردیا تھا مگر ہم شہلا کو واپس حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس شکست کا خمیازہ بھی وہی بھگتے گی۔ ایک اور زخم کھانے کے بعد دلاور اور چوہدری کی آتش غیظ و غضب بھڑک اٹھی ہوگی۔ شہلا تو ان کے لئے ایک ٹرمپ کارڈ سے کم نہ تھا۔ باقی سب کارڈ ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ شہلا کو اور اس کے ٹھکانے کو پوشیدہ رکھنے کے لئے انہوں نے بڑی رازداری برتی تھی۔ انہیں ہرگز امید نہ ہوگی کہ ہم ان کی توقع کے مطابق شہلا کے یہاں بھی پہنچ جائیں گے۔

رات دو بجے کے بعد غالب بھی سو گیا۔ میں نے چائے اور کرسٹل کا جگ لیا اور ریوالور اپنے قریب رکھے جاگتا رہا۔ میرے خیالات کی لہر ہر سمت بھٹکتی رہی اور میرے تصور نے مجھے بہت پریشان کیا۔ جو میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا وہی مناظر بار بار سامنے آئے۔ وقت گزر گیا تھا لیکن ناخوشگوار واقعات اور مناظر کے نقوش ذہن پر ثبت کرگیا تھا۔ یہ تنہائی اور مایوسی کی کیفیت کا اثر تھا کہ میں زندگی کے خوب صورت لمحوں کی یاد سے دور رہا۔

صبح تین بجے کے قریب آصف جاہ آیا اور اس نے میری مایوسی میں اضافہ کیا۔

"خانہ بدوشوں کے قبیلے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ میرے آدمی ہر جگہ دیکھ آئے ہیں۔" اس نے کہا۔

میں نے کہا "چار پانچ گھنٹے میں انہوں نے سارا علاقہ کیسے چھان مارا؟ وہ بھی رات کے وقت۔"

اس نے کہا "میں بھی تم سے یہی کہنے والا تھا کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ خدا نے چاہا تو دن کے اجالے میں ان کا پتا چل جائے گا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس مرتبہ وہ زیادہ دور چلے گئے ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہارے شہسواروں نے مجبوری میں فرض پورا کیا ہوگا اور ایسے ہی دو چار میل کا چکر لگا کے لوٹ آئے ہوں گے۔"

"ہاں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کہیں بیٹھے گپ لگاتے رہے ہوں اور واپس آکے رپورٹ دے دی ہو کہ سب جگہ دیکھ لیا... کل... میرا مطلب ہے صبح ہونے کے بعد میں خود جاؤں گا۔ آس پاس کے سارے علاقے میں پولیس بہت سرگرم ہے۔ وہ ہر راستے کی نگرانی کر رہے ہیں۔ کسی نے اس قبیلے کو بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ ممکن ہے ان کے ٹرک کو روک کر چیک بھی کیا گیا ہو۔"

میں نے کہا "تم نے ہمیں سب کے سامنے گرفتار کیا تھا۔ اب تم اپنے ماتحتوں کو کیا بتاؤ گے ہمارے بارے میں؟"

آصف جاہ نے ہنس کے کہا "میری فکر مت کرو میں انہیں مطمئن کرنا جانتا ہوں۔"

"پھر بھی پتا تو چلے کہ تم کیا کہو گے؟"

"میں کہہ دوں گا کہ ڈی ایس پی صاحب نے ہیڈ کوارٹر سے معلوم کیا تھا کہ تمہیں کوئی پکڑا گیا ہو تو ان کے حوالے کردیا جائے... ہمارے پاس جو بندے تھے وہ ہم نے ان کی تحویل میں دے دیئے۔ ہمارا کام اور ہماری ذمے داری ختم ہوگئی۔ ڈی ایس پی نے سات میل دور اپنا کیمپ آفس قائم کرلیا ہے۔"

"کیا وہ معلوم نہیں کرسکتے؟"

"وہ بے چارے اتنی ہمت نہیں رکھتے کہ کسی ڈی ایس پی سے بات بھی کرسکیں۔" آصف جاہ نے کہا "انہیں کیا معلوم کہ ڈی ایس پی صاحب کا کیمپ آفس کہاں ہے اور وہاں کوئی ڈی ایس پی ہے۔ افسر صرف افسر سے بات کرتا ہے اور میں بھی افسر ہوں۔ تمہارے لئے چھوٹا سہی، سپاہیوں کے لئے بہت بڑا ہوں۔ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔"

www.paksociety.com

"تمہاری پوزیشن بہت نازک ہے اور اس کیس میں تمہارے ساتھ ہمارا بھی نام آیا ہے۔ تریپٹی اور راٹھور کو ذرا بھی شک ہوا تو وہ تمہارے لئے مشکلات کے پہاڑ کھڑے کردیں گے۔"

"اللہ مالک ہے" اس نے او پر دیکھ کے کہا۔

وہ واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی غالب اٹھ بیٹھا اور اس نے مجھے دو گھنٹے کے لئے سونے پر مجبور کردیا۔ پھر میری آنکھ کھلی تو پونے پانچ بجے تھے۔ نازو مجھ سے پہلے بیدار ہو چکی تھی اور باورچی خانے میں ایسے بیٹھی ہوئی تھی جیسے وہی اس گھر کی مالکن ہے۔ میں نے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کے غنودگی کو دور کیا اور تیار ہو گیا۔ رات بھر کے آرام نے ہم سب کو اتنا تازہ دم کردیا تھا کہ اب ہم ایک اور دن کے مسائل سے نمٹ سکتے تھے۔

جب ہم چائے پی رہے تھے اور مکھن کے ساتھ رات کی روٹی کھا رہے تھے تو آصف جاہ آگیا۔ وہ خاصا پریشان نظر آتا تھا۔

"تم لوگ تیار ہو؟"

میں نے کہا "کوئی بری خبر لائے ہو کیا؟"

وہ زبردستی مسکرایا "نہیں۔ میں نے ایک تانگہ منگوایا ہے۔"

"کس کا تانگہ ہے؟" میں نے کہا۔

"ہے ایک لڑکا' میرے کام کرتا رہتا ہے۔ میں نے اسے سب سمجھا دیا ہے' وہ تمہیں نکال کر لے جائے گا' بہت ہوشیار لڑکا ہے۔"

میں نے کہا "بھروسے کے قابل بھی ہے؟"

غالب نے کہا "تم نے کیا بتایا ہے ہمارے متعلق؟"

آصف جاہ مسکرایا "ایسی کوئی بات نہیں بتائی جو تمہارے لئے پریشانی کا باعث بنے۔ صرف یہ کہا ہے کہ میرے خاص آدمی ہیں جو برقعے اوڑھ کر تمہارے ساتھ جائیں گے۔"

"برقعے اوڑھ کر!" میں نے اور غالب نے ایک ساتھ کہا۔

"دیکھو' اس کے سوا کوئی صورت نہیں' پولیس قدم قدم پر بہت سخت چیکنگ کررہی ہے۔ تم کچھ بھی حلیہ بنالو' وہ پہچان جائیں گے۔ میرے پاس میک اپ کرکے تمہاری صورتیں بدلنے کا سامان تو ہے نہیں۔ صرف کپڑے بدل کے تم انہیں دھوکا نہیں دے سکتے۔ برقعے میں کوئی تمہیں چیک نہیں کرسکتا۔ مسلمان عورتوں کے معاملے میں پولیس کو بہت سخت ہدایات ہیں کہ لیڈی پولیس ساتھ لئے بغیر نہ ان کے گھروں میں جائیں اور نہ ہی ان کی تلاشی لیں۔ یہ مذہبی مسئلہ فوراً جذباتی مسئلہ بن جاتا ہے کہ مسلمان عورتوں کی بے پردگی ہوئی۔"

"اگر ان کے ساتھ لیڈی پولیس ہوئی پھر؟"

"مجھے معلوم ہے کہ لیڈی پولیس نہیں ہے۔ شاید کیمپ آفس میں ڈی ایس پی کے ساتھ کوئی لیڈی سرجن ہو لیکن ہر پارٹی کے ساتھ نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتی' ایک عورت دن رات جنگلوں میں کیسے بھٹک سکتی ہے۔ کہاں کہاں جاسکتی ہے۔ چنانچہ تم بالکل محفوظ رہو گے۔ ماجی خود ہی بات کرے گا۔"

"ماجی کون؟"

"ماجی وہ لڑکا ہے' اصل نام تو نذیر ہے مگر لوگ اسے ماجی کہتے ہیں' وہ تانگہ چرا کے لا رہا ہے۔"

میں نے چونک کر کہا "چرا کے کیوں؟"

"بات یہ ہے بھائی کہ اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ یہ قتل کا معاملہ ہے۔ اگر میں گاؤں کے کسی آدمی سے تانگہ منگواتا تو وہ پوچھتا کہ یہ تانگہ کہاں جائے گا۔ میں خواہ مخواہ رسک نہیں لینا چاہتا۔ کسی کو معلوم بھی نہیں ہونا چاہئے کہ میرے گھر سے تین برقع پوش عورتیں منہ اندھیرے کہیں گئی تھیں۔ یہاں کسی کے گھر کے معاملات کسی سے بھی پوشیدہ نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ میری بیوی میکے گئی ہوئی ہے۔"

"اگر یہ لڑکا ماجی پکڑا گیا تو کیا ہوگا؟" نازو نے کہا "چوری کا تانگہ ہوگا۔"

"صبح ہونے تک کسی کو بھی تانگے کی چوری کا پتا نہیں چلے گا۔ تم لوگ اس وقت تک بہت دور جاچکے ہوگے۔ ایک گھنٹے میں تانگہ تمہیں آٹھ دس میل دور لے جائے گا۔"

"رات کے وقت بھی؟"

"ہاں۔ میں نے کہا نا کہ وہ لڑکا بہت ہوشیار ہے۔ وہ اپنا حلیہ بدل کے آئے گا تاکہ اسے کوئی پہچان نہ سکے۔"

"وہ کیا جانے گا کہ سواریاں کس کے گھر کی ہیں؟" غالب نے کہا۔

"پیر عنایت کے گھر کی" آصف جاہ نے کہا "پیر عنایت کو اس علاقے کے لوگ واقف ہیں۔"

"کیا بعد میں معلوم نہیں ہوجائے گا۔"

"تم بعد کی فکر چھوڑ دو۔ پیر عنایت کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ کہہ دے گا کہ کسی نے میرا نام استعمال کیا تھا۔ میرے گھر سے کوئی عورت کہیں بھی نہیں گئی اور اس کو جھوٹا کوئی نہیں کہہ سکتا۔"

"ماجی واپسی میں پکڑا جائے گا۔"

آصف جاہ نے نفی میں سر ہلایا "وہ تانگہ واپس نہیں لائے گا۔ وہ دو چار دن بعد بھی آسکتا ہے۔ بس سے یا پیدل اور واپس آ کر ماجی کو کوئی شک نہیں کرسکتا۔ وہ بھی جاتا رہتا ہے کسی کو بتائے بغیر۔ اس کا پوچھنے والا کوئی ہے بھی نہیں۔ ماں باپ مرچکے ہیں۔ گاؤں میں کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا۔ لوگوں کے گھروں کی روٹیاں توڑتا ہے اور سب کے کام کرکے پال رہا ہے۔ اس سے کسی کو شکایت نہیں ہے۔"

"وہ تمہارے کام کیوں کرتا ہے؟"

"وہ سب کے کام کرتا ہے۔ اس کام کا میں نے انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں تھانے دار ہوں۔ ہاں تو سزا بھی دینے کا اختیار رکھتا ہوں۔"

"تو کیا تمہارا مخبر ہے وہ؟"

"یہی سمجھ لو۔ مخبری کے انتظام کے بغیر پولیس کام نہیں کرسکتی۔ اس لڑکے نے کبھی غلط اطلاع نہیں دی۔ میں نے کہا تھا کہ تانگہ کسی اور کا ہو اور گھوڑا کسی اور کا۔ تاکہ سارا نقصان ایک ہی کا نہ ہو۔"

میں نے کہا "ہم یہ نقصان پورا کردیں گے۔ تم ہماری طرف سے اپنی طرف سے دونوں کو معاوضہ ادا کردینا۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے تحقیق کی۔ میرا کام ہے رپورٹ درج کرنا' یہاں ایسی چوریاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ دن بعد میں گھوڑا اور تانگہ برآمد کرلوں گا" آصف جاہ بولا۔

"نقصان ہے؟"

"ماجی بتادے گا کہ اس نے تانگہ گھوڑا کہاں چھوڑا ہے۔ خواہ مخواہ فکر مت سوار کرو۔ جو میرا کام ہے مجھ پر چھوڑ دو" آصف جاہ نے کہا۔

نازو نے کہا "ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ برقعے کہاں سے آئیں گے۔"

"برقعے زینب لائے گی۔ ایک تو اس کا اپنا ہے۔ دوسرا بیٹی کا' تیسرا کہیں سے حاصل کرلے گی۔"

"زینب... کیا اسے معلوم ہو گا... کہ ہم اس طرح فرار ہو رہے ہیں؟"

"ہاں۔ اس کی مدد کے بغیر میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ میں اسے برقعے مانگنے جاتا' میری بہن پر بھروسہ کرو۔"

میں نے کہا "مجھے تو شرم آرہی ہے کیا سوچے گی وہ؟"

"وہ کچھ نہیں سوچے گی' اسے میں مطمئن کرلوں گا۔ رات جب میں کھانا لینے گیا تھا تو میرے جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اسے پہلے سے بتادوں۔ کیا تمہیں اس کے رویئے سے کچھ محسوس ہوا تھا کہ وہ تم پر شک کرتی ہے یا تمہیں اچھا نہیں سمجھتی؟"

دروازے کی کنڈی آہستہ سے بجی۔ آصف جاہ نے دروازہ کھولا اور زینب پھر اندر آئی۔ پیر عنایت اس کے پیچھے تھا۔ ان کے سامنے ہم سب شدت سے احساس جرم میں مبتلا ہوگئے۔ وہ بھلے لوگ تھے اور صرف اس لئے ہماری مدد کررہے تھے کہ آصف جاہ کے مہمان تھے۔ ہم نے ان سے خوب جھوٹ بولا تھا۔ شاید وہ جانتے تھے کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں مگر انہوں نے کوشش کی تھی کہ ہمیں شرمندگی نہ ہو۔

زینب نے برقعے اتار کے اندر سے ایک اور گٹھری برآمد کی۔ پیر عنایت نے ہمیں گلے لگایا اور ایک بار پھر ہم پر کچھ پڑھ کے پھونکا "اللہ اپنا فضل کرے گا' کفار سے محفوظ رکھے گا" اس نے کہا۔

"لو بیٹا' اب تو فٹ نکل جاؤ" زینت نے نازو کو برقعے پکڑا کے کہا "اور یہ تو نے جو لال نیلا جوڑا پہن لیا ہے۔ اللہ مبارک کرے مگر ابھی اس کو بدل دے۔ یہ راستے کے لئے ٹھیک نہیں' میں تم سب کے لئے پرانے کپڑے لائی ہوں۔ یہاں آصف کی بیوی کے کپڑے کم نہ ہوں ورنہ وہ پوچھے گی۔"

"اب دیر مت کرو" آصف جاہ نے کہا "کھڑے شرماتے رہو گے تو وقت نکل جائے گا۔"

باہر گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی تو وہ دروازے کی طرف لپکا "میرا خیال ہے کہ ماجی آگیا۔"

"ہم اب چلتے ہیں پتر" زینب نے نازو کا ماتھا چومنے کے بعد میری اور غالب کی پیشانی چومی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنے چھوٹے بھائی آصف جاہ کی پیشانی پر بڑی بہن کی مہر محبت ثبت کرتی ہوگی "اللہ خیر سے لے جائے' اپنی امان میں رکھے۔"

پھر اس نے ایک اور ایسی حرکت کی جس نے ہم سب کو جذباتی کردیا۔ وہ اپنے ساتھ سبز رنگ کے کپڑے میں سوا روپیا باندھ کے لائی تھی۔ اس نے ہم تینوں کے بازو پر امام ضامن باندھے "علی مشکل کشا تمہارے ساتھ' پاک نبی کا سایہ تم پر' پنج تن پاک کا صدقہ' جاؤ رب راکھا۔"

پیر عنایت نے پھر ہمیں گلے لگایا اور تیسری بار کچھ پڑھ کے ہم پر پھونکتے ہوئے وہی دعا کی "اللہ محافظ ہو' کفار سے بچائے۔"

نہ جانے کیوں ایک دم میرا سارا خوف دور ہوگیا۔ میرے دل کو عجیب سا سکون اور قرار حاصل ہوگیا۔ یہ نفسیاتی ردعمل تھا یا کچھ اور' حقیقت یہ ہے کہ میری ساری پریشانی اور تشویش ختم ہوگئی اور میں نے اپنے وجود میں اعتماد اور حوصلے کے ساتھ نیا ولولہ بیدار ہوتے محسوس کیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ آصف جاہ غلط نہیں کہتا تھا۔ شاید پیر عنایت پر اس کا اعتقاد بے سبب نہیں تھا۔

وہ دونوں جیسے آئے تھے ویسے ہی خاموشی سے چلے گئے۔ واپس جاتے ہوئے زینب کے سر پر برقع نہیں تھا۔ اس نے اندھیرے کی چادر کو اپنے تحفظ کا ضامن بنالیا تھا اور اس کے شوہر نے بھی بیوی کے یوں بے پردہ ہوجانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ کٹر مذہبی خیالات رکھنے والا آدمی تھا۔

زینب بھاری بھرکم' دراز قد اور صحت مند عورت تھی۔ اس کے کپڑے میرے اور محسن کے لئے بہت موزوں رہے۔ نازو کے لئے وہ اپنی بیٹی کے کپڑے لائی ہوگی کہ اس کے جسم پر فٹ آگئے۔ یہ دیہاتی وضع کے سلے ہوئے پرانے اور میلے کپڑے تھے جو عام حالات میں ہم دھوئے بغیر استعمال نہ کرتے لیکن اس وقت ان کپڑوں سے خلوص کی وہ خوشبو اٹھتی محسوس ہورہی تھی جو ہمارے تحفظ اور سلامتی کی ضامن تھی۔

مجھے اور غالب کو زنانہ کپڑوں میں دیکھ کر نازو کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا "ایمان سے تم وہ لگ رہے ہو" نازو نے کہا۔

www.paksociety.com

"وہ کون؟"

نازو نے دو ہتھیلیاں ملا کے تالی بجاتے ہوئے زنخوں کی نقل اتاری "اے وہی جو آجاتے ہیں آجاتی ہیں، جہاں موقع دیکھتے ہیں دیکھتی ہیں۔"

میں ہنس پڑا "ایسی باتوں سے ہمارے سوال پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔"

غالب نے تنتنا کر کہا "ہاں۔ شیر کو ٹکر پہناؤ یا غرارہ، یا کچھ مت پہناؤ، وہ شیر ہی رہتا ہے۔"

آصف جاہ نے دروازے کی اوٹ سے کہا "جلدی کرو، صبح ہونے والی ہے۔"

میں نے اور غالب نے برقع سر پر رکھا۔ اس کی لمبائی ہمارے قد کے مطابق نہیں تھی۔ میرا برقع ٹخنوں سے ایک فٹ اوپر رہا۔ غالب کے لئے زینب کسی اور کا برقع مانگ کر لائی تھی۔ یہ بھی اتنا ہی چھوٹا ثابت ہوا تاہم اس کے نیچے ہماری زنانہ شلواریں تھیں۔ میری شلوار گلابی رنگ کے سوتی کپڑے کی تھی اور غالب کی نیلی۔ دونوں پر بھدے پھول تھے۔ یہ پھول کسی دیوانے نے ایجاد کئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ قدرت نے ایسے بے ہنگم اور غیر متناسب پھول نہیں بنائے۔

"ذرا اپنی چال میں بھی نسوانیت کی جھلک پیدا کرو" نازو نے ایک مفید … "… جیسے اکڑ کے مت چلو، … تھانیدار کی طرح۔"

"… شاید کوئی نہ دیکھے، آواز تو … ہوگا؟"

غالب … "مسلمان پردہ دار عورتیں کسی غیر مرد سے بات ہی نہیں کرتیں۔"

میں نے مشین گن کو برقعے میں چھپا لیا اور ہم سب باہر نکلے۔ دروازے سے کچھ فاصلے پر تانگہ کھڑا ہوا تھا۔ کوچبان بڑے اسٹائل سے پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔

"تمہارے پاس پیسے ہیں؟" آصف جاہ نے کہا۔

"ہاں، تم کو ضرورت ہے؟"

آصف جاہ ہنسنے لگا "میں مذاق نہیں کر رہا تھا۔ گھر میں اتنی رقم رکھتا ہوں میں۔"

"میں بھی مذاق نہیں کر رہا تھا" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "تم نے بہت رسک لیا ہے ہماری خاطر، خدا تمہیں ہر مصیبت سے بچائے۔"

میں نے کہا "اگر تمہیں آئے تو اسے کہنا … کہ ہم سے حاجی صاحب کی معرفت رابطہ قائم کرے۔"

"کون حاجی؟"

"حاجی علی مراد کے مزار پر ان کا … مضافات سوات کے رہنے والے پاکستانی ہیں" میں نے کہا۔

"اگر ممکن ہوا تو ہم بھی تم سے معلوم کریں گے۔"

ہم خدا حافظ کہنے کے بعد تانگے میں سوار ہوئے تو صبح کے پونے چھ بجے تھے اور افق پر روشنی کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ میں اگلی سیٹ پر تھا اور … برقعے کی جالی میں سے باہر کا منظر دیکھتا جا رہا تھا۔ تاجی سترہ اٹھارہ سال کا لاابالی سا نوجوان تھا۔ اس نے سکھوں کے مخصوص انداز میں پگڑی باندھی تھی۔ وہ ایک نوجوان سکھ ہی نظر آتا تھا جس کی ابھی داڑھی … میں نے یہ بھی اندازہ کیا کہ اسے سگریٹ پینا نہیں آتا۔ وہ دھوئیں کو حلق سے نہیں اتار رہا تھا۔ اس نے زیادہ عمر کا نظر آنے کے لئے سگریٹ جلا کے تھام لی تھی۔

میں نے کہا "تاجی کیا سکھ سگریٹ پیتے ہیں؟"

وہ ایک دم اچھلا "ہیں جی کیا غضب کرتے ہو جی، آپ تو مروا دو گے۔"

میں نے کہا "ابھی کون سن رہا ہے؟"

"حد کرتے ہو جی، شہر میں دیواروں کے کان ہوتے ہیں۔ یہاں درختوں کے کان ہوتے ہیں۔ کیا واقعی سکھ سگریٹ نہیں پیتے؟"

"اب پیتے ہوں تو پتا نہیں، اب تو ہندو بھی بہت ماس کھانے لگے ہیں" میں نے کہا۔

اس نے سگریٹ پھینک دی "اچھا کیا آپ نے بتا دیا۔"

"اب تمہارا کیا نام ہے؟"

"بوٹا سنگھ، میرا ایک یار تھا بوٹا …"

"مر گیا؟"

"ہاں جی، اسے شیر نے کھا لیا۔"

میں حیران ہو گیا "شیر نے! … سرکس کا شیر تو آدم خور نہیں ہو سکتا۔"

"وہ سرکس کا شیر ہی تھا جو اسے کھا گیا تھا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ایسا ہوا تھا جی، یہاں ایک سرکس آیا تھا۔ بوٹا سنگھ سرکس کے مالک کی بیٹی پر عاشق ہو گیا۔ وہ اس کے ساتھ بھاگ جانا چاہتا تھا مگر عین وقت پر پکڑا گیا۔ سرکس کے مالک نے اس کے ٹکڑے کر دئیے… اور بس۔ شیر کھا گیا۔ بعد میں سرکس کے مالک کو پھانسی ہو گئی تھی… بوٹا سنگھ…"

ابھی یہ عجیب اور خوفناک داستان اختتام کو بھی نہ پہنچی تھی کہ میں نے سامنے سے صبح کے نیم روشن اندھیرے میں تاریک سایوں کو متحرک دیکھا۔ وہ سیدھے ہماری طرف ہی آ رہے تھے۔

میں نے کہا "تاجی یہ تو پولیس لگتی ہے۔"

"ہاں جی، پولیس ہی ہے۔ آپ فکر مت کریں" اس نے کہا۔

وہ گھوڑوں پر سوار پولیس کا دستہ تھا جس نے تانگے کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ اس میں چار کانسٹیبل تھے اور ایک ہیڈ کانسٹیبل ان کی کمان کر رہا تھا۔

"کہاں سے آ رہے ہیں؟" ہیڈ کانسٹیبل نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"… سے آیا جناب۔"

"کس گاؤں سے آئے ہو تم لوگ اور کس کے گھر سے؟"

"پیر عنایت کے گھر کی عورتیں ہیں جناب" تاجی نے کہا۔

اچانک حوالدار نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا "کتے کی نسل، ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے، کیا ہم تجھے جانتے نہیں۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں جی" تاجی نے کہا۔

"دیکھو … ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ڈاکو برقع اوڑھ کے علاقے سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔"

حوالدار کی بات سن کے میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ کیا یہ راز افشا ہو چکا ہے؟ آصف جاہ کی سازش ناکام ہو گئی ہے۔ کسی نے جس پر وہ اعتماد کرتا تھا اسے دھوکا دے کر اطلاع آگے پہنچا دی تھی۔

"نیچے اترو…" حوالدار نے دہاڑ کے کہا "مجھے معلوم ہے تم عورت کوئی نہیں ہے… نقاب ہٹاؤ ذرا چہرے سے۔"

پہلے میں اور میرے بعد نازو اور غالب تانگے سے اتر گئے۔ حوالدار نے اپنے ماتحت کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھے۔

ہمارے ساتھ ایک عورت نازو نہ ہوتی تو … حوالدار نتائج کی پروا کئے بغیر مسلمان … عزت دار خواتین کو مجبور کرتا کہ تم کو پردہ … ہٹانا ہوگا اور پردہ اٹھتے ہی بقول شاعر… مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے… والا سین ہوتا۔

نازو کی ذہانت اور ہمت نے صورت حال کو بگڑنے سے پہلے ہی سنبھال لیا۔ اس نے ایک دم بلند آواز میں چلانا شروع کیا۔

"ارے کم بخت… اللہ کی مار تجھ پر، بجلی گرے تجھ پر، جنازہ اٹھے تیرا، تو کون ہوتا ہے ہمارا پردہ ختم کرانے والا۔ ارے اللہ، ہم آج تک نامحرم نے چہرہ نہیں دیکھا، غیر مرد نے آواز نہیں سنی تھی۔ مردود تو کہاں سے آ گیا ہماری عاقبت خراب کرنے۔ ارے کیا اس ملک میں اب مسلمان عورتوں کی عزت و آبرو بھی محفوظ نہیں رہی۔ … پولیس برقعے چھینے گی مسلمان بہو بیٹیوں کے۔ … ہمیں ان ملعونوں شیطانوں سے۔" اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کے فریاد کی۔ وہ کسی بڑھیا کی طرح چیخ رہی تھی اور ایسی اداکاری کر رہی تھی کہ سپاہی گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔

نازو نے اپنا ہنگامہ جاری رکھا "ارے جان دے دوں گی … قریب تو آ ذرا، چاقو ہے میرے پاس۔"

حوالدار پریشان ہو گیا "کیا بولے چلی جا رہی ہے بڑھیا۔"

"ارے مرائی، تو نے کیا سمجھا ہے … ہم مسلمان جان دے سکتے ہیں، ایمان نہیں گنوا سکتے۔ اسی چاقو سے گلا کاٹ لوں گی اگر کسی نے ہاتھ بھی لگایا تو۔ تیری ماں بہنیں نہیں ہیں کیا جو تو پرائی بہو بیٹیوں کی عزت اتارتا پھرتا ہے۔ ارے جا، … پہلے اس وردی کو اتار، سرکار نے تجھے اختیار دیا ہے قانون کی حفاظت کا۔"

"ارے بھگوان، یہ کیا عورت ہے!" حوالدار نے سر پر ہاتھ مارا۔

"قسم خدا کی، تیری شکایت نہ کی پولیس کمشنر سے تو کہنا، میں خود پیر صاحب کے ساتھ وفد لے کر جاؤں گی۔ چیف منسٹر کے راستے میں برقع اتار کے لیٹ جاؤں گی کہ گاڑی گزارو مجھ پر سے۔ ایسے … آبرو کے جینے سے باز آئے ہم مسلمان۔ میں تو جلوس لے کر جاؤں گی گورنر ہاؤس…"

"ارے میری ماں" حوالدار نے ہاتھ جوڑ کے کہا "جا، بھگوان کے لئے معاف کر دے مجھے، بند کر اپنا ٹیپ ریکارڈر۔"

"نہیں۔ تو نے مسلمان عورتوں کو روک کر مسلمانوں کی عزت کو للکارا ہے۔ ارے ہم کفرستان میں رہتے ہیں تو کیا ہوا، بہو بیٹیوں کی آبرو کے لئے خون کی ندیاں بہا سکتے ہیں۔ ہمت ہے تو کہو ان کمبختوں سے کہ گولی چلائیں۔ بندوقیں لئے … عورتوں پر۔ نامرد، بے غیرت کہیں کے…"

حوالدار جس طرح گھوڑے پر سوار ہو کے بھاگا اور جیسے اس کے حکم پر بندوق لے کر ہمیں محصور کرنے والے بھاگے، وہ ایک دلچسپ منظر تھا۔ حوالدار کے لئے نازو سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ نازو کی بدزبانی، بدلگام اور بداطوار عورت کی طرح اس کے لئے جان کا عذاب بن گئی تھی۔ وہ اس کی گالیوں، کوسنوں اور بددعاؤں کی یلغار کے سامنے کیسے ٹھہر سکتا تھا۔ نازو کی دھمکیوں سے بھی اس نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ وہ کتنی سنگین اخلاقی، معاشرتی اور قانونی غلطی کا مرتکب ہو چکا ہے۔ اس خیال نے اسے بعد میں بھی پریشان کیا ہوگا کہ سچ مچ مسلمان عورتوں کا کوئی وفد بالا اعلیٰ حکام تک پہنچ گیا تو اس کا کیا بنے گا۔

وہاں تانگے میں سوار ہونے تک نازو کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی بلکہ مشین گن کی طرح فائر کر رہی تھی اور پولیس کے شہسوار سخت بدحواسی کے عالم میں روانگی اختیار کر چکے تھے۔ نہ ان کی وردیوں کا رعب کام آیا تھا اور نہ ان کی بندوقوں کی دہشت کا اثر ہوا تھا۔

جب وہ اتنی دور چلے گئے کہ ہماری آواز کے ان تک پہنچنے کا کوئی اندیشہ نہ رہا تو میں نے اور غالب نے ضبط و احتیاط کے تقاضوں کو چھوڑ کے بے اختیار ہنسنا شروع کیا۔ تاجی بھی تانگہ چلانے لگا۔

میں نے ہنستے ہنستے کہا "اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا میں۔"

غالب نے کہا "میرے بھی پیٹ میں بل پڑنے لگے تھے۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "عزیزہ گیا تو بہت پرفارمنس تھی تمہاری۔"
غالب نے کہا "جی چاہتا ہے کہ تمہارا منہ۔۔۔"
نازو نے مسکراہٹ کو دبا کے کہا "بدتمیزی مت کرو غالب۔"
"موتیوں سے بھردوں۔ بات تو سن لیا کرو پہلے' ویسے بدتمیزی بھی تم دل سے نہیں کر رہی ہو۔ اندر ہی اندر مسکرا رہی ہو گی' شرما بھی رہی ہو۔"
نازو نے اسے ڈانٹا "بکو مت۔"
"اچھا شرط لگاتا ہوں میں' نقاب اٹھاؤ ذرا" غالب نے کہا۔
میں نے کہا "نقاب اٹھانے کی بات مت کرنا' اس بے چارے حوالدار نے یہی بات کی تھی تو اسے کیا کچھ سننا پڑا تھا' کہیں وہ ٹیپ پھر نہ چلنے لگے۔"
ناجی نے کہا "دل خوش کردیا آپ نے باجی' اس حرامی نے بڑے زور کا تھپڑ مارا تھا' بدلہ لے لیا آپ نے۔"
"ناجی! کیا اس نے تمہیں پہچان لیا تھا؟" میں نے کہا۔
ناجی نے متفکر لہجے میں کہا "اس کی بات سے تو ایسا ہی لگتا تھا۔ خیر جی' اپنا کیا بگاڑے گا۔ پیر عنایت سے ٹکرائے گا تو خاک ہو جائے گا۔"
"تمہارا بہت اعتقاد ہے پیر صاحب پر" میں نے کہا۔
"لو جی' ابھی آپ نے خود بھی دیکھ لیا ہے۔"
"کیا دیکھ لیا ہے؟"
"پیر صاحب کی کرامت کو' آپ صاف بچ گئے" اس نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔
عقیدہ ایسی ہی چیز ہے۔ افریقہ کے وحشی قبائل کا جادوگر جب ملیریا بخار کا علاج اپنے منتروں سے کرتا ہے تو عقیدت مندوں کی عقل بھی اسے موثر تسلیم کرتی ہے لیکن مرض ختم نہ ہو اور مریض ختم ہو جائے تو تب بھی عقیدت کے جذبات بدلتے نہیں ہیں۔ عقل اس ناکامی کو شیطانی قوتوں اور مریض کی بداعمالی سے منسوب کر دیتی ہے۔
اگر میں اپنی عقل اور اپنے عقیدے کے حوالے سے بات کرتا تو ناجی کے جذبات مجروح ہوتے' مجھے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ پیر عنایت کے لئے اس کے احترام و عقیدت میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دھوکے فریب کی اس دنیا میں بہت سے جعلی پیروں نے بھی اپنا کاروبار شروع کر رکھا ہے مگر یہ کہنا غلط ہوگا کہ سب پیر جعلی ہوتے ہیں۔ ابھی مجھے پیر عنایت کے بارے میں کچھ معلوم بھی نہیں تھا۔ میری اس سے ملاقات سرسری نوعیت کی تھی۔ اس کا ایک مرید آصف جو تھا اور ناجی دوسرا۔ نہ جانے اس علاقے میں اس کی کرامات کے کتنے لوگ قائل تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فرصت ملی تو ناجی سے ان کرامات کا احوال سنوں گا۔

ناجی نے مین روڈ تک پہنچنے کے لئے سڑک کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ کھیتوں اور جنگلوں کے درمیان کسی کچے راستے پر تانگہ چلا رہا تھا اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ اپنا سراغ نہ چھوڑے۔ اس نے اب تانگے کے پائدان سے ایک چادر باندھ دی تھی جو نیچے لٹکی ہوئی زمین پر گھسٹتی آ رہی تھی۔ اس طرح کچی زمین اور مٹی پر بننے والے تانگے کے پہیوں اور گھوڑے کے سموں کے نشانات خود بخود مٹ رہے تھے۔
جب سورج نکلا تو ہم بہت دور پہنچ چکے تھے۔ تانگے کی رفتار کبھی کم ہو جاتی تھی تو ناجی کو نیچے اتر کر اور گھوڑے کی لگام پکڑ کر چلنا پڑتا تھا۔ وہ تانگے کو گڑھوں سے بچا کے یا کھیتوں کی منڈیریں چڑھا کے نکالتا تھا اور پھر کچے راستے پر لے آتا تھا۔ نہ گھوڑا بار کا تھا اور نہ تانگہ مگر اسے دونوں پر کنٹرول حاصل تھا۔ ہموار راستے پر وہ گھوڑے کو دوڑاتا تھا تو جھٹکوں اور ہچکولوں سے ہمارا برا حال ہو جاتا تھا۔ کئی مرتبہ نازو اچھل کر گرتے گرتے بچی۔ غالب نے اسے سنبھال لیا۔
ایک جگہ میں نے اس سے پوچھا "سڑک اب کتنی دور رہ گئی ہے؟"
"شاید آٹھ دس میل" اس نے سوچ کے کہا۔
"اور ہم کتنا فاصلہ طے کر چکے ہیں؟"
اس نے پھر غور کیا اور بولا "شاید آٹھ دس میل۔"
میں نے کہا "تمہارے گاؤں سے سڑک کا کتنا فاصلہ ہے؟"
اس نے تیسری بار کہا "آٹھ دس میل۔"
غالب نے جھنجلا کے کہا "تمہارے حساب سے تو ہم مین روڈ کو بھی آٹھ دس میل پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔"
ناجی نے دانت نکال کے کہا "ہم سیدھے تو نہیں جا رہے تھے۔ گھوم کے جا رہے ہیں۔"
"گھومتے پھرتے جا رہے ہیں" نازو نے کہا "صبح کی سیر صحت کے لئے مفید ہوتی ہے۔"
"مگر گھوڑے کی صحت پہلے ہی ہم سے بہت اچھی ہے" غالب نے کہا۔
"آپ ایسے سمجھو" ناجی نے وضاحت کی "یہ میری ناک ہے۔"
"اچھا!" غالب نے اس انکشاف پر حیران ہو کے کہا۔
"اب میں اسے یوں پکڑوں' سامنے سے' یا ایسے پکڑوں' پیچھے سے ہاتھ گھما کے" اس نے ناک پکڑنے کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
میں نے کہا "اس کے باوجود ہم ناک کی سیدھ میں جا رہے ہیں۔"
"اگر ہم ساری عمر ایک دائرے میں گردش کرتے رہیں تو بھی ناک کی سیدھ میں ہوں گے" نازو نے کہا۔
"لیکن کہیں پہنچ نہیں پائیں گے" غالب نے کہا۔

"جھٹکوں سے میرے جسم کا اندرونی انتظام سخت متاثر ہوا ہے۔ بار بار گڑھوں سے ٹکراتا ہے۔ گردے جگہ جگہ گھس جاتے ہیں' جگر شاید گھٹنوں میں پہنچ گیا ہے" غالب نے کہا۔
"کھایا پیا سب ہضم ہو گیا ہے" میں نے اس سے اتفاق کیا۔
"ناشتا کرو گے؟" نازو نے کہا۔
میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا "کیا ہے ناشتے میں؟"
"اس کی پروا نہ کرو' سب کچھ ہے" نازو نے کہا۔
غالب نے کہا "میرے لئے دو سلائس' مکھن' دو انڈے ہاف فرائی۔"
نازو نے ایک دم برقعے میں سے ہاتھ نکالا "یہ لو۔"
میں حیران رہ گیا "یہ پراٹھے اور مکھن۔"
"یہ لو انڈے" نازو نے مجھے ایک ابلا ہوا انڈا پکڑا دیا۔
غالب اسے بے یقینی سے دیکھ رہا تھا "تمہارے برقعے کے اندر کیا ہے؟"
نازو ہنسی "جادوگر بھی تو جیب میں سے سب کچھ نکال کے دکھاتے ہیں۔ رومال' کبوتر۔"
"تمہارے جادوگر ہونے میں کسی کو شک نہیں لیکن میں نے نہیں سنا کہ کسی نے جادو سے آج تک ناشتا برآمد کیا ہو۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو ہر ٹرین میں ڈائننگ کار کی جگہ ایک جادوگر تعینات ہوتا" غالب نے کہا۔
"تمہیں زینب کا شکر گزار ہونا چاہئے" نازو نے پراٹھے کو بلاجھجک استعمال کرتے ہوئے اس پر مکھن رکھ کے غالب کو تھما دیا۔
میں نے کہا "ناجی کے لئے بھی نکالو۔"
نازو نے کہا "تم اسے دے دو' میں اور دیتی ہوں تمہارے لئے۔"
"یہ زاد سفر اس نے کب پکڑا دیا تھا تمہیں؟" غالب نے کہا۔
"وہ اپنے ساتھ پوٹلی باندھ کے لائی تھی" نازو نے کہا۔ "شوہر کے لئے بھی کافی ہو گا۔"
میں نے پراٹھا اور مکھن ناجی کی طرف بڑھایا۔ اس نے پہلے تکلف میں انکار کیا پھر لے لیا۔ وہ ریاضت کا پلا ہوا جوان آدمی تھا۔ ابھی ہم نے آدھا پراٹھا بھی ختم نہیں کیا تھا کہ وہ فارغ ہو گیا۔ دوسرے پراٹھے کو بھی اس نے شکریے کے ساتھ قبول کیا اور ختم کر دیا۔ اس کی خوش خوراکی نے مجھے اور غالب کو رشک میں مبتلا کر دیا۔
ناشتا بالکل خشک تھا۔ ابلا ہوا انڈا میرے حلق میں ہی اٹک گیا تھا اور اچانک چائے کی طلب شدید ہو گئی تھی۔ ناجی نے راستے سے کچھ فاصلے پر ایک جھونپڑا دیکھا اور تانگہ روک کے اتر گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا لوٹا تھا۔

ہم سب نے ایک ہی ٹونٹی سے منہ لگا کے پانی پیا۔ کسی نے پانی میں جھانک کر دیکھا تک نہیں۔ حفظانِ صحت کے اور اسٹینڈرڈ کے سارے تقاضے اور سب تکلفات زندگی اس وقت یاد آتے ہیں جب فراغت ہو اور افراط ہو۔
سورج اب کافی بلند ہو چکا تھا۔ دھوپ میں تیزی آنے لگی تھی۔ مجھے برقعے کے اندر پسینہ آ رہا تھا اور نقل و حرکت محدود ہو جانے سے سخت الجھن محسوس ہو رہی تھی۔
"معلوم نہیں عورتیں اس غلاف میں کیسے رہتی ہیں!" میں نے کہا "کیسے چلتی پھرتی ہیں' دنیا بھر کے کام کرتی ہیں۔"
غالب نے کہا "میرا تو دم گھٹ رہا ہے اب۔"
نازو ہنسی "اتنی جلدی گھبرا گئے' یہ سوچو کہ تمہاری جان بچ گئی اس برقعے کی وجہ سے۔"
"اور اسی کی وجہ سے جان جائے گی۔ اگر چند گھنٹے اور گزارنے پڑے اس خیمے کے زنداں میں" غالب بولا۔
"فرض کرلو کہ یہ برقع نہیں کفن ہے جو تم سر سے باندھ کے نکلے ہو" نازو نے کہا "اس سے تمہارے جذبۂ جہاد کو تقویت حاصل ہو گی۔"
"سڑک پر پہنچتے ہی میں اس مصیبت کو اتار کے پھینک دوں گا۔"
"کیوں کفر بکتے ہو' پردے کو مصیبت قرار دے رہے ہو؟" نازو نے کہا۔
میں نے کہا "جب تک خطرہ باقی ہے ہم پردے میں رہیں گے۔"
"خطرہ تو ہمیشہ رہتا ہے' نہ رہے تو ہم خوش نہیں رہتے' فوراً کوئی بندوبست کر لیتے ہیں خطرے کا" غالب نے کہا۔
"کیا ہم اسی تانگے پر بمبئی تک جائیں گے؟"
"کوئی حرج بھی نہیں" میں نے کہا "دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم بس سے جائیں لیکن اس میں زیادہ رسک ہو گا۔"
"ہم کوئی ٹیکسی یا کار بھی لے سکتے ہیں" غالب بولا۔
"اگر پولیس چیکنگ ہو گی تو کاروں کو چیک کرے گی' تانگے میں بیٹھی ہوئی عورتوں پر کوئی نظر نہیں ڈالے گا۔ ستائیس کلومیٹر کا فاصلہ زیادہ نہیں' دو گھنٹے میں طے ہو جائے گا۔"
"پھر ایک گھنٹہ بمبئی کے شہر میں۔۔۔"
"نہیں' وہاں سینکڑوں ٹیکسیاں ہوں گی۔"
"آخر ہم جائیں گے کہاں؟" نازو نے کہا۔
میں نے کہا "آج سائیں کی بہن اور ماں کی آخری رسوم ہوں گی' اس نے بتا دیا تھا کہ چرچ کون سا ہو گا۔"
"وہاں پولیس بہت ہو گی" غالب نے کہا۔
"ہاں۔ اگر ہم وقت پر پہنچے تو ہمارے پہچان لئے جانے کے امکانات زیادہ ہوں گے" میں نے کہا "پولیس کے علاوہ چرچ کے

www.paksociety.com

اور یا راستے میں کہیں شکاری کتے بھی پھر رہے ہوں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ قبرستان میں بھی مل جائیں۔"

"ہم بھیس بدل کے جا سکتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم بار بار بھیس بدل کے ان کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ ہم ان سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ہم پہلے سے چرچ میں موجود ہوں اور چھپ کر دیکھتے رہیں۔"

غالب نے کہا "کیا چرچ اور قبرستان ایک ہی جگہ ہیں؟"

"معلوم نہیں' یہ تو وہاں جا کے پتا چلے گا۔"

"اگر قبرستان دور ہوا تو کیا ہم سب بھی جنازے کے جلوس میں شامل ہو کر جائیں گے؟"

"ہم دور رہ کے بھی پیچھے پیچھے چل سکتے ہیں' اور یہ بھی۔۔۔"

نازو نے میری بات کاٹ کے کہا "کوئی ادھر آ رہا ہے۔"

غالب نے کہا "ہاں' لگتا تو ایسا ہی ہے۔"

میں نے سر گھما کے پیچھے دیکھا۔ دور سے گرد کا ایک بگولا سا دکھائی دیتا تھا جو تیزی سے ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔

"یہ تو کوئی گاڑی ہے۔ غالباً جیپ" غالب نے کہا۔

"آگے کوئی گھوڑے پر سوار آ رہا ہے" نازو نے کہا۔

"کیا یہ لوگ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں؟" غالب نے فکرمند ہو کے کہا "ان کا رخ ادھر ہی ہے۔"

"اگر وہ ہمارے تعاقب میں ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ان کو روک تو نہیں سکتے" میں نے کہا "آنے دو۔"

"یہ شاید پولیس کی جیپ ہوگی" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "ناجی' تم بھی خیر سے ہو جاؤ۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' ہم سب سے نمٹ لیں گے۔"

ناجی نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔"

"کیا بات؟"

"یہ لوگ ہمارے پیچھے کیسے آ گئے؟" ناجی نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا "جو راستہ میں نے پکڑا تھا ان کو کیسے معلوم ہو گیا؟"

"کیا تم نے کسی کو بتایا تھا کہ تم کس طرف سے جاؤ گے؟"

"کیا میں پاگل ہوں جی۔ اگر میں بتاتا تو بالکل غلط بتاتا' کہتا مشرق کی اور جاتا مغرب میں" ناجی نے کہا۔

جیپ بالکل قریب آئی تو شک کی گنجائش ہی نہ رہی' اس میں پولیس تھی۔ جو شخص آگے آگے گھوڑے پر انہیں راستہ بتاتا آ رہا تھا وہ عام قسم کے کپڑوں میں تھا۔ اس نے جسم کے اوپر والے حصے پر چادر لپیٹ رکھی تھی جس میں اس کا چہرہ بھی چھپ گیا تھا۔

ناجی نے جیپ کو راستہ دینے کے لئے تانگے کو کچے راستے سے ہٹا کے کھیتوں میں اتار لیا۔

غالب نے کہا "سکندر' یہ تو عنایت ہے۔"

میں نے بلا ارادہ کہا "کون عنایت؟"

"پیر عنایت' حرامزادہ!" غالب نے اسے مشتعل ہو کے گالی دی "یہی لے کر آیا ہے پولیس کو۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ مجھے زینب جیسی عورت کے شوہر اور آصف جاہ کے بہنوئی سے ایسی دغا بازی کی امید نہیں تھی لیکن اب شبے کی کوئی بات نہیں رہی تھی کہ عنایت کی پیری فقیری سب ڈھونگ تھی۔ وہ ایک بے ضمیر دھوکے باز اور موقع پرست آدمی تھا جس کے مکر و فریب ظاہر نے خوش اعتقاد لوگوں پر جادو چلا رکھا تھا۔ ناجی کا کہنا ٹھیک تھا۔ ایسے کوئی ہمارے تعاقب میں نہیں آ سکتا تھا۔ پیر عنایت گھر کا بھیدی تھا جو سب کچھ جانتا تھا۔ معلوم نہیں اسے کیا لالچ تھا کہ وہ پولیس کو سیدھا ہمارے راستے پر لے آیا۔ یہ صرف لالچ کی بات ہو سکتی تھی۔ اسے کوئی مجبور نہیں کر سکتا تھا کہ ہمارا پتا بتائے۔ شاید اس کی پیری فقیری کا ڈراما چلانے میں پولیس مددگار رہتی تھی چنانچہ وہ پولیس کی مدد کرتا تھا۔

عنایت نے تانگے سے آگے نکلتے ہی گھوڑے کی لگام کھینچی اور گھوڑے کے رکتے ہی نیچے اتر گیا۔ پولیس کی جیپ تانگے کے پیچھے ٹھہر گئی تھی۔ اس میں سے ایک ساتھ تین پولیس والے کود کر اترے۔ ان سب کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں' چوتھے شخص کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور وہ ان کا افسر تھا۔ وہ عہدے کے لحاظ سے اے ایس آئی تھا۔

ناجی جتنا خوفزدہ تھا' اس سے زیادہ حیران تھا اور اس کی نظریں پیر عنایت پر جمی ہوئی تھیں "یہ کیا معاملہ ہے پیر جی؟" اس نے کہا۔

"معاملہ مجھ سے پوچھتا ہے سور کے تخم" پیر عنایت نے غرا کے کہا "کہاں لے کر جا رہا تھا اپنی ماں کے یاروں کو؟"

شاید ناجی نے پیر صاحب کی زبان سے کبھی ایسی مغلظات نہیں سنی تھیں۔ اس نے قدرے تیز ہو کر کہا "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں جی۔۔۔"

پیر عنایت نے ناجی کے سر پر مکا مارا "حرامی' ابھی سب معلوم ہو جائے گا تجھے۔ تھانے دار' پکڑو ان سب کو۔ ان برقعوں میں عورتیں نہیں مرد ہیں۔"

ناجی چلایا "پیر جی۔۔۔"

اس مرتبہ تھانے دار نے ناجی کے جھانپڑ مارا "اب جتنا آواز نکالی تو زندہ گاڑ دوں گا اسی جگہ۔"

پیر عنایت نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا "یہ جو آگے بیٹھا ہے' یہ ان کا سرغنہ ہے۔ دس کا دوسرا ساتھی پیچھے بیٹھا ہے۔ میں ان دونوں سے مل چکا ہوں۔ ہاں یہ عورت ہے' کمتی تو کیا ہے کہ۔۔۔"

"ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں" تھانے دار نے اس کی بات کاٹ

کر اور اپنے ریوالور کو بڑے جارحانہ انداز میں لہرایا "چلو نیچے اترو' تمہارا ڈراما ختم ہو گیا۔"

"پیر جی' یہ تم نے اچھا نہیں کیا" ناجی مشتعل ہو کے بولا۔ "اپنے مہمانوں کو دھوکے سے پکڑوا دیا۔"

"بکواس مت کر' میرا کوئی مہمان نہیں' یہ سب ملزم ہیں جو پولیس سے چھپ کر فرار ہو رہے تھے" عنایت نے کہا۔

"پیر جی' کچھ خدا کا خوف کرو' آخر آپ بھی مسلمان ہو' داڑھی داڑھی رکھ کے جھوٹ بولتے ہو" ناجی نے تڑپ کے کہا "اپنے ایمان سے کہو' کیا آپ نے اپنی بیوی کے کہنے پر کل رات اور آج صبح ان سے ملاقات نہیں کی تھی؟ کیا آپ ان کے لئے کھانا لے کر نہیں آئے تھے؟ یہ کپڑے کیا تمہاری بیوی زینب کے اور تمہاری بیٹی کے نہیں ہیں؟ یہ برقعہ کیا بی بی زینب کا نہیں ہے؟"

"یہ جھوٹ ہے" عنایت نے چیخ کر کہا "جھوٹ بکتا ہے۔"

ناجی نے بھی چیخ کر کہا "یہ سچ ہے سور کے بچے' جھوٹا تو ہے۔ مجھے آج پتا چلا کہ تو پیر نہیں' شیطان ہے' کافر۔"

پیر عنایت نے پھر اس کے مکا مارا "چور کی اولاد' میرے سامنے زبان چلاتا ہے' میرے منہ پر مجھے کافر کہتا ہے۔"

ناجی گرا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پیر عنایت کے منہ پر تھوک دیا "لعنت تیری صورت پر۔ اب مجھے تیری اصلیت معلوم ہو گئی ہے۔ میں سب کو بتا دوں گا۔ سارے گاؤں کو' ساری دنیا کو۔"

اے ایس آئی نے ریوالور کا رخ ناجی کی طرف کر دیا اور اسے گالی دے کر کہا "تو زندہ بچے گا تو کسی کو کچھ بتائے گا۔"

میں ابھی تک طے نہیں کر پایا تھا کہ ان حالات میں نئے چہرہ پوشی کا ڈراما جاری رکھنا چاہئے یا ختم کر دینا چاہئے۔ ہمارا راز فاش ہو گیا تھا اور جب چھپانے کو کچھ نہیں تھا تو ہمارا چھپنا بے مقصد تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ اے ایس آئی کا مقصد صرف ناجی کو ڈرانا اور دھمکا کے خاموش کرنا نہیں ہے' وہ سچ مچ اسے مارنا چاہتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی سفاک خونی چمک میں ایک قاتل کا جذبہ اتر آیا تھا۔

"ٹھہرو" میں نے چلا کے کہا اور اپنا برقع اتار کے اے ایس آئی پر پھینک دیا۔ برقع اس کے ہاتھ پر جا کر گرا اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر سے فائر ہوا مگر نشانہ چوک گیا۔ برقعے کے بوجھ سے اے ایس آئی کا ہاتھ کچھ جھک گیا تھا۔ گولی ناجی کے پیروں کے پاس کہیں زمین میں پیوست ہو گئی۔

میں تانگے ہی میں سے تانگے سے جست لگائی اور ناجی کو اپنے پیچھے لے لیا "یہ تم کیا کر رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"ہٹ جا۔۔۔ ورنہ تجھے بھی جان سے مار دوں گا" اے ایس آئی نے دانت پیستے ہوئے گھور کر پھر ریوالور لہرایا۔

لیکن اب اس کا لہجہ معتدل اور کھوکھلا تھا۔ اب وہ صرف ناجی کی جان لینے کا اختیار رہا تھا۔ وہ گھر گزر چکا تھا جب اس کو دست اجل نے ناجی کی جان لینے کا اختیار دے دیا تھا۔

میں نے کہا "قانون نے تمہیں مجرم کو گرفتار کرنے کا حق دیا ہے' تم سزائے موت نہیں دے سکتے۔ ایسا کرو گے تو قاتل بن جاؤ گے۔"

"مجھے قانون مت پڑھاؤ" اے ایس آئی دہاڑا۔

"مجھے بتاؤ کہ اس لڑکے کا جرم کیا ہے؟ یہی کہ اس نے پیر عنایت کے منہ پر سچ بول دیا ہے۔"

"تم کس منہ سے سچ کی بات کرتے ہو!" اے ایس آئی نے میرے سراپا کو طنز آمیز تمسخر سے دیکھا "سچے آدمی' ذرا اپنا چہرہ دیکھو اور پھر یہ حلیہ دیکھو' تم کو شرم بھی نہیں آئی۔"

"یہ ریاکاری اور منافقت کا لبادہ نہیں ہے" میں نے اس نفسیاتی حملے کو روکتے ہوئے کہا "شرم اسے نہیں آئی جو اپنی بدباطنی پر نیکی اور پارسائی کی نقاب ڈالے پھرتا ہے اور پیری فقیری کی آڑ میں ضمیر فروشی کرتا ہے۔"

اے ایس آئی نے اپنے ماتحتوں کی طرف دیکھا جو بندوقیں اٹھائے تانگے کو گھیرے کھڑے ہوئے تھے۔

اس نے کہا "دیکھتے کیا ہو' اتار لو انہیں گھسیٹ کر نیچے۔"

ایک پولیس مین آگے بڑھا اور اس نے نازو کی طرف ہاتھ بڑھا کے اسے برقعے سمیت کھینچنے کی کوشش کی۔ نازو کا ایک پاؤں حرکت میں آیا۔ ٹھوکر اس پولیس مین کی ٹھوڑی کے نیچے پڑی۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی اور وہ بے اختیار گالی دے کر پیچھے ہٹا۔

اے ایس آئی کا چہرہ غصے میں لال ہو گیا۔ اس نے متعدد گالیاں بکنے کے بعد کہا "میں لحاظ کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ سب کے سامنے عزت اتاروں گا کہ مٹی کی بھی دولتی چلاتی ہے۔ چلو سب مل کے کھینچ لو ان دونوں کو۔ برقع ہی نہیں کپڑے بھی اتار دو کنجری کے۔"

میں نے خاموشی سے ریوالور نکال لیا "ان میں سے کسی نے ہاتھ بھی لگایا اسے تو میں اس کے سر میں سوراخ کر دوں گا۔"

اے ایس آئی میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر بری طرح چونکا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں حیرانی نظر آئی۔ آہستہ آہستہ اس کی سوالیہ نگاہیں پیر عنایت پر جم گئیں۔

غالب پہلے خود اترا' پھر اس نے نازو کو ہاتھ تھام کے اتارا۔ تینوں پولیس مین ایک قدم پیچھے ہٹ گئے لیکن انہوں نے اپنی رائفلوں کا رخ نہیں بدلا۔

"مقابلے کا کوئی فائدہ نہیں" اے ایس آئی نے کہا "تم سب مارے جاؤ گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہتھیار ڈال دو اور خود کو قانون کے حوالے کر دو۔"

شاید غالب نے بھی پولیس کی بے بسی کا اندازہ کر لیا تھا۔ وہ بہت کم طاقت کے ساتھ حملہ آور ہونے کی غلطی کر چکے تھے۔ انہیں پیر عنایت نے نامکمل اطلاعات فراہم کر کے غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اب ان کے لئے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی

www.paksociety.com

بات تھی کہ وہ ہم سے ہتھیار چھین کر ہمیں گرفتار کرنے سے بھی قاصر تھے اور "سوہنی" کمرے کے واپس جانے کی سبکی برداشت کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتے تھے۔

غالب نے کہا "تم نے پولیس کو ہمارے پیچھے لگا کے کتنے نفل کا ثواب حاصل کیا پیر جی؟ اگر ہم گرفتار ہو جاتے تو تمہیں پولیس سے کیا انعام ملتا؟"

"یہ میرا فرض تھا، تم دشمن کے ایجنٹ ہو" پیر عنایت نے ڈھٹائی سے کہا۔

"سؤر کے بچے، تم پولیس کے مخبر ہو، انہی کے دم سے تمہارا کاروبار جاری ہے۔ شاید اس جعلی فقیری کے پردے میں تم نے بدمعاشی کے سارے دھندے چلا رکھے ہوں گے" میں نے اسے مشتعل کرنے کے لئے کہا۔

"تم چرس اور گانجا بیچتے ہو گے، عقیدت مند عورتوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کے انہیں بلیک میل کرتے ہو گے" غالب نے کہا۔

"اگر تمہارے عقیدت مندوں پر تمہاری اصلیت کھل جائے تو وہ تمہارا منہ کالا کر کے اور تمہیں ننگا کر کے گدھے پر بٹھائیں۔"

"تھانے دار، تم کیا کر رہے ہو آخر؟" پیر عنایت نے چیخ کر کہا۔ "تم انہیں پکڑتے کیوں نہیں؟ تمہارے ہاتھ میں بھی اسلحہ ہے، پھر ڈر کیوں رہے ہو؟"

پیر کی بات کا ردعمل وہی ہوا جو میں چاہتا تھا۔ تھانے دار کی غیرت جاگ اٹھی۔ اس نے جوش میں آ کے کہا "ڈرنے والے کی... میں تو ان... کو سلت دے رہا تھا۔ خون خرابا نہیں چاہتا تھا۔"

اس جملے میں متعدد بھاری بھرکم گالیاں شامل تھیں۔ غصے میں عقل مند آدمی کی عقل بھی ماری جاتی ہے۔ اے ایس آئی نے پاگل ہو کے ایکشن کا حکم جاری کر دیا۔

"آگے بڑھ کے پکڑ لو سب کو، جو مقابلہ کرے اسے گولی مار دو۔ ان دونوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے جو برقعے میں ہیں۔ اسلحہ ہوتا تو یہ بھی مقابلے پر آ جاتے برقعے سے نکل کے۔ عورت کو چھوڑ دو۔ مرد سے چٹ جاؤ سارے مل کے۔"

اس کے بعد چند منٹ میں سب کچھ ہو گیا۔ پانچ سات منٹ کی گفتگو کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہم جوابی کارروائی کے لئے تیار ہو جائیں اور پھر ایک واضح حکمت عملی اختیار کریں۔ آپس میں مشورے کی گنجائش نہیں تھی مگر ذہنی ہم آہنگی کے باعث ہم سب کی سوچ میں خاصی مطابقت آ گئی تھی اور عموماً ہم کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرتے ہوئے متحد قوت اور مربوط لائحہ عمل کا مظاہرہ کرتے تھے۔ میں نے موقع پا کے نازو کو ایسے اشارے کئے تھے جو دشمن کی نظر میں کوئی مفہوم نہ رکھتے تھے مگر نازو نے میری بات سمجھ لی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ تینوں پولیس والوں کے قریب ہو گئی تھی۔ پہلے وہ غالب کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی مگر پولیس والوں کے درمیان دو فٹ کی دوری تھی۔

غالب نے برقعے کے اندر سے مجھے بتا دیا تھا کہ ریوالور کا رخ کس سمت میں ہے۔ اس کے ہاتھ کی خفیف سی حرکت کے ساتھ ریوالور کی نالی کی پوزیشن واضح ہو گئی تھی۔ اے ایس آئی نے اپنی لاعلمی کا خود اعتراف کر لیا تھا۔ اسے پیر عنایت نے واقعی یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم سب مسلح ہیں۔ معلوم نہیں اس نے یہ جھوٹ بولنا کیوں ضروری سمجھا تھا۔ شاید یہ بات معلوم ہو جاتی تو اے ایس آئی اتنی محدود قوت کے ساتھ ہمارے تعاقب میں نہ آتا۔ پیر عنایت کیوں چاہتا تھا کہ پولیس ہر قیمت پر ہمیں پکڑے، مجھے اس کے جذبات میں ذاتی عناد کا انتقامی انداز جھلکتا محسوس ہوتا تھا۔ یہ فرض شناسی اور وطن کی سرزمین پر تخریبی عناصر کے خلاف قانون کی مدد کا جذبہ نہیں لگتا تھا اور بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا یہ تاثر بے بنیاد نہیں تھا۔

تینوں پولیس والے ایک ساتھ غالب کی طرف بڑھے۔ اے ایس آئی نے بھی اپنا ریوالور انتہائی جارحانہ انداز میں میری طرف اٹھا لیا جیسے وہ واقعی مرنے مارنے کے لئے تیار ہے۔ اس نے ہاتھ کی انگلی کو خطرناک انداز میں ٹریگر پر رکھ لیا تھا اور اب میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ مجھے چیلنج کرتا محسوس ہوتا تھا کہ ہمت ہے تو کرلو مقابلہ۔

تینوں پولیس والوں کی ساری توجہ غالب پر مرکوز تھی اور ان کو کسی حد تک یقین تھا کہ عورت خود کو اس جنگ سے الگ ہی رکھے گی مگر نازو اچانک درمیان میں حائل ہو گئی۔ اس نے پلک جھپکنے میں اپنا برقع اتار کے پھینک دیا۔ ایک لمحے کے لئے تینوں پولیس والوں کی نظریں خیرہ ہو گئیں۔ نازو کے حسن کا پہلا جلوہ بے حجاب اسی طرح اثر کرتا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے اور بندوق اٹھاتے، نازو نے انہیں الٹ پلٹ کے رکھ دیا۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔

پہلا شخص اس کی لات لگتے ہی گھوم کر زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ دوسرے کو اس نے ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا اور تیسرے پر پھینک دیا۔ ان کی رائفلیں ہاتھوں سے نکل کے پرواز کر گئیں۔ میں کچھ بھی نہیں کر رہا تھا اس لئے میں نے نازو کی معرکہ آرائی کا سارا منظر دیکھا۔ تینوں سپاہی اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ نازو نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ اس نے غیر ضروری اسلحہ استعمال کرنے سے گریز کیا تھا۔ یہ بات مجھے پسند آئی۔

اے ایس آئی نے بھی یہ سین دیکھا تھا اور اس کا پہلا تاثر بے یقینی کا تھا۔ اس کی فوج کے تین جوان دو ایک منٹ میں ڈھیر ہو گئے تھے۔ وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے ہاتھوں جس کی نزاکت کو دیکھ کر ایسی چابکدستی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مزید یہ کہ اس نے اسلحے کی قوت پر انحصار نہیں کیا تھا اور انہیں بری طرح شکست سے دوچار کرنے کے بعد اطمینان سے [illegible]

کا تھا۔ مجھے موقع ملا تھا کہ میں اے ایس آئی سے ریوالور چھین کر اسے بھی ماتحتوں کے ساتھ لٹا دوں مگر میں اس پہلوان کی [illegible] سے کھڑا رہا جس کے پیچھے ہی حریف کو چاروں شانے چت کرا دیتے ہوں۔ خود غالب نے بھی نازو پر بھروسا کرتے ہوئے دخل اندازی سے گریز کیا تھا۔ وہ ابھی تک برقعے میں ملفوف تھا حالانکہ کچھ دیر پہلے ہی وہ اس قید سے نجات پانے کے لئے بے چین تھا۔

اس نے برقعے کے اندر سے گولی چلائی اور اے ایس آئی کے ہاتھوں میں سے ریوالور نکل گیا۔ غالب کے نشانے کی مہارت سے ہم سب واقف تھے اور اس کے کمال کا مظاہرہ کئی بار دیکھ چکے تھے۔ اس وقت بھی غالب نے بڑی صفائی سے صرف ریوالور کو نشانہ بنایا۔ اے ایس آئی کے ہاتھ پر خراش تک نہیں آئی مگر وہ ایسے اچھلا جیسے گولی نے اس کی ہتھیلی میں سوراخ کر دیا ہے۔ زور زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے اس نے دور پڑے ہوئے ریوالور کو بے بسی سے دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ کو اور انگلیوں کو لیکن خون کہیں ہوتا تو نظر آتا۔ اب غالب نے بھی برقعے کو اتار کے آگے میں ڈال دیا۔

میں نے اے ایس آئی کا ریوالور اٹھا کے کہا "تمہاری قسمت اچھی ہے کہ ابھی تک اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے ہو۔ مقابلہ کرتے تو تمہاری لاش کون اٹھاتا؟"

اے ایس آئی خون آشام نظروں سے پیر عنایت کو گھور رہا تھا "سؤر کے تخم، تو نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے" اس نے ایک سانس میں پیر عنایت کا سارا شجرۂ نسب خراب کرتے ہوئے کہا "تو نے یہ سب کیوں نہیں بتایا تھا مجھے کہ یہ لوگ مسلح ہیں۔"

میں نے کہا "گویا میرا اندازہ درست تھا، تم واقعی غلط فہمی کا شکار ہے۔"

اے ایس آئی نے پھنکار کے کہا "میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا پیر۔"

پیر عنایت اور ناجی ایک طرف کھڑے ہوئے تھے اور پیر آہستہ آہستہ ناجی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اچانک ناجی نے چلانا شروع کیا۔

"اجی آپ کیا نہیں چھوڑیں گے، میں نہیں چھوڑوں گا اس کنجری کی اولاد کو" اس کے ساتھ ہی شائیں شائیں کی آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا کہ ناجی نے گھوڑے کا مزاج درست رکھنے کا چابک اتار لیا ہے اور پیر عنایت پر برسا رہا ہے۔

پیر عنایت کی حالت پہلے ہی خراب تھی۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ پولیس اس سے کس طرح اپنی شکست کا بدلہ لے گی۔ ناجی کے قہر و غضب کا طوفان اس پر اچانک نازل ہو گیا۔ پیر عنایت ہٹا کٹا، صحت مند آدمی تھا مگر ناجی بہت پھرتیلا تھا اور چابک کا استعمال جانتا تھا۔ بید کی چھڑی پر مضبوطی سے بندھا ہوا اندازاً تین فٹ لمبا چمڑے کا تسمہ اس پر بجلی کی طرح لہرا کے گرتا تھا۔ وہ ضرب سے بچتا تھا تو ناجی گھوم کے دوسری طرف سے وار کرتا تھا۔ شائیں کی آواز کے ساتھ ہی چابک پیر عنایت کی کھال پر چپک جاتا تھا اور اس سے پہلے کہ عنایت اسے پکڑے، وہ پھر لہراتا ہوا [illegible]۔

پیر عنایت ایک مضحکہ خیز ڈانس کر رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ آگے پیچھے جاتے تھے۔ کبھی جسم پر ابھار کی لکیریں کر دینے والی ضرب کی اذیت کو کم کرنے کے لئے، کبھی لہراتے چابک کو گرفت میں لینے کے لئے تو کبھی خود کو بچانے کے لئے۔ وہ اچھل رہا تھا اور ہر طرف گھوم رہا تھا مگر اس کے لئے ناجی کی چابکدستی سے کہیں پناہ نہ تھی۔

آہستہ آہستہ پیر عنایت کراہنے لگا۔ پھر چلانے لگا اور فریاد کرنے لگا۔ خدا رسول کے واسطے دینے لگا۔ معافیاں مانگنے لگا مگر ناجی کا ہاتھ نہ رکا۔ یہ اس پیر کی ذلت کی انتہا تھی جس کے قدم چومنے کے لئے نادان اور سادہ لوح عقیدت مند بے تاب رہتے تھے۔ یہاں صرف ناجی ہی نہیں وہ پولیس والے بھی اس کی شامت اعمال کا نظارہ کر کے تسکین حاصل کر رہے تھے جو اس کی غلط بیانی کے باعث ذلیل ہوئے تھے۔

میرے لئے اس نظارے میں بڑی عبرت کا سامان تھا۔ خدا کیسے عزت دیتا ہے اور کیسے ذلت! سر جھکانے والے جب سر اٹھاتے ہیں... جب فریب کا پردہ چاک ہوتا ہے اور آنکھیں روشنی میں اصلیت دیکھتی ہیں، باطل کا طلسم ٹوٹتا ہے اور بے رحم سچ سامنے آتا ہے تو غلام اپنے آقا کا سر قلم کر دیتے ہیں۔ مظلوم کی طاقت ظالم پر خدا کا قہر بن کے ٹوٹتی ہے۔ نخوت و تکبر کے جھوٹے خدا ذلت و رسوائی کے گڑھے میں گر کے انہی کے قدموں تلے روندے جاتے ہیں جو انہیں سجدہ کرتے تھے۔

اگر میں ناجی کو نہ روکتا تو شاید وہ پیر عنایت کی ہڈیوں پر سے گوشت اتار لیتا۔ مجھے اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ ناجی کے اس اشتعال کی بنیاد بھی انتقامی جذبات پر تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے پیر عنایت کی عداوت ذاتی تھی۔

میں نے ناجی کا ہاتھ پکڑ کے کہا "بس کرو، اسے قتل کر کے گناہ گار کیوں ہوتے ہو، کہیں یہ مر نہ جائے۔"

"آپ چھوڑ دیں جی مجھے۔ اس مردود کو مارنے کا بہت ثواب ہو گا۔ اگر اسے زندہ چھوڑ دیا گیا تو یہ ایسے ہی دنیا کو دھوکا دیتا رہے گا" ناجی بولا۔

میں نے کہا "ہم پیر جی کو اپنے ساتھ لے جائیں گے، پہلے اسے موقع دیں گے کہ یہ اپنے سارے جرائم کا اعتراف کرلے اور تائب ہو جائے۔"

"یہ توبہ کرے گا اور پھر مکر جائے گا... میں اس کے سارے کالے کرتوتوں سے واقف ہوں" اے ایس آئی نے کہا "آپ تو اسے میرے حوالے کر دو۔"

میں نے کہا "سب کچھ جانتے ہوئے بھی آج تک تم نے کچھ نہیں کیا تھا۔ میں کیسے مان لوں کہ آئندہ تمہارے اور اس کے درمیان یہ اشتراک عمل نہیں ہو گا۔"

www.paksociety.com

"ہم صرف اس کی وجہ سے ذلیل ہوئے" اے ایس آئی بولا۔ "میں نے اس کی کھال سے جوتے بنوا کے مردوں کو نہ دیئے تو اپنے باپ کا نہیں۔"

غالب نے کہا "اپنے مجرم کو ہم خود سزا دے سکتے ہیں۔"

پیر عنایت نے بڑی لجاجت سے کہا "لیکن میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا۔"

میں نے پلٹ کے پوری قوت سے اس کے منہ پر جوتا جڑ مارا۔ "کیا ضمیر فروشی سے بڑا کوئی جرم ہے؟ تو نے اپنا ایمان بیچا، خلقِ خدا کے اعتماد کو دھوکا دیتا رہا۔ تو نے دوستی کے پردے میں ہم سے دشمنی کی۔ غدار! تو نے رشتوں کی آبرو کو نیلام کر دیا۔ پھر پوچھتا ہے کہ میرا جرم کیا ہے۔"

مانو نے کہا "باقی مجرموں کے لئے کیا حکم ہے؟ کیا یہ بھی ساتھ جائیں گے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ہم جلوس لے کر نہیں جا سکتے۔"

"پھر ان کو یہیں گاڑ دیتے ہیں" مانو نے اپنا ریوالور اٹھایا جیسے وہ تینوں سپاہیوں کو قتل کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔

ایک سپاہی چلانے لگا "ہماری غلطی معاف کر دیں جی، ہم خود نہیں آئے تھے۔ یہ داڑھی والا ہمیں مجبور کر کے لایا تھا۔"

اس نے کہنی مار کے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے شخص کو اقرارِ جماعت میں شریک ہونے کا اشارہ دیا۔

دوسرے شخص نے فوراً اقرار میں سر ہلایا "ہاں جی، یہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم تو گشت کر کے واپس جا رہے تھے کہ پیر عنایت مل گیا۔ اس نے کہا کہ میرے ساتھ چل کے مجرموں کو پکڑ لو۔ ہم سے بھول ہو گئی۔"

اس نے تیسرے کو کہنی ماری کہ آگے تم بولو۔

تیسرا ہکلاتا تھا۔ اگر اسے مجبور نہ کیا جاتا تو وہ خاموش ہی رہتا۔ "ہمارے بال... بال بچے ہیں۔ چھ... چھوٹے چھوٹے۔ ہم کسی کو... نا... نا... نہیں بتائیں گے... کچھ بھی۔"

میں نے کہا "تھانے دار، کیا یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ تم کو مجبور کر کے لانے والا پیر عنایت تھا؟"

اس نے پیر عنایت کو پُرعناد نظروں سے دیکھا اور اقرار میں سر ہلانے لگا "یہ ٹھیک ہے۔"

"تم نے اس سے پوچھا تو ہوگا کہ وہ کون مجرم ہیں؟"

"ہاں، پوچھا تھا۔"

"پھر؟" میں نے اے ایس آئی کو تذبذب میں دیکھ کر کہا۔

"اس نے صرف یہ کہا کہ وہ سب پاکستان سے آئے ہیں اور اس علاقے میں غیر قانونی طور پر موجود ہیں۔ میں نے پوچھا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا ان کے بارے میں؟ اور تمہارا تو سالا بھی پولیس افسر ہے۔ تم نے یہ بات اسے کیوں نہیں بتائی؟ یہ کہنے لگا کہ سالے کو گولی مارو۔ اس نے ایمان بیچ دیا ہے اپنا۔ اس کو رشوت مل گئی ہے۔ وہ سب بھول گیا ہے کہ اس کا کیا فرض ہے اور کیا ذمے داری ہے۔ اس نے سب کو بے وقوف بنانے کے لئے انہیں پہلے حوالات میں رکھا۔ پھر اپنے گھر لے گیا اور یوں انہیں فرار ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ ان کو ایک لونڈا تانگے میں بٹھا کے لے گیا ہے۔ وہ لونڈا لاوارث ہے جس کے نہ ماں باپ ہیں اور نہ آگے پیچھے کوئی اور ہے مگر میرے سالے نے اسے بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ وہ چھوٹی موٹی چوریاں کرتا رہتا ہے مگر آج تو وہ گھوڑا بھی چوری کر کے بھاگا ہے اور تانگہ بھی۔ باقی سب مجرم عورتوں کے بھیس میں برقع اوڑھ کے فرار ہوئے ہیں۔ ان کو تم مقابلہ کئے بغیر ہی پکڑ لو گے۔"

غالب بولا "لیکن ہوا اس کے برعکس، مقابلہ کئے بغیر تم پکڑے گئے۔"

مانو نے کہا "تھانے دار جی کے دل میں یہ حسرت نہ رہ جائے۔ اگر یہ مقابلہ کرنا چاہیں تو میرے سامنے آ جائیں۔"

اے ایس آئی کا چہرہ شرم سے لال پڑ گیا۔ وہ ایک عورت کے چیلنج کو قبول نہ کرنے پر مجبور تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مقابلے کا انجام کیا ہوگا۔

اے ایس آئی کی بات پر غور کرنے کے بعد میں نے کہا "کیا تم ہمیں جانتے ہو؟"

تھانے دار نے نفی میں سر ہلایا "میں نے کبھی نہیں دیکھا تمہیں۔"

اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اس علاقے میں گشت کرنے والی پولیس پارٹی کو ہمارے متعلق کچھ معلوم نہ ہو۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی تلاشی لی تو ایک جیب میں سے اخبار کا وہ تراشہ برآمد ہو گیا جس پر میری، محسن کی اور غالب کی تصویر تھی۔

یہ سرکاری اشتہار تھا جس میں ہمیں دہشت گرد قرار دیا گیا تھا اور ہماری گرفتاری پر انعام کا اعلان تھا۔

میں نے اے ایس آئی کو وضاحت کا موقع دیئے بغیر ہی بے رحمی سے مارا۔ اس کے ماتحت سخت دہشت زدہ کھڑے کانپ رہے تھے۔ مانو کے ہاتھوں پٹنے کے بعد ان میں آنکھ ملا کے بات کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رہا تھا۔ اپنے افسر کی درگت بنتی دیکھ کے وہ زندگی سے مایوس ہو گئے۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ ہم عام قسم کے مجرم نہیں ہیں جن سے ان کا دیہات میں واسطہ پڑتا رہتا تھا۔

اے ایس آئی کے ناک اور منہ سے خون نکل رہا تھا اور وہ زمین پر پڑا ہوا ایسے کراہ رہا تھا جیسے اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ میں نے اس کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے تھے لیکن اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اسے کوئی مہلک چوٹ نہ آئے۔

میں نے ریوالور نکال کے کہا "تم پانچ سیکنڈ میں اپنے پیروں پر کھڑے نہ ہوئے تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔"

اے ایس آئی بڑی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر بزدل آدمی کی طرح اس نے بھی مکر و فریب اور جھوٹ کی مدد سے جان

بچانے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔ اب اس کے پاس کہنے کو بھی کچھ نہیں رہا تھا۔

میں نے غالب سے کہا "ان کا اسلحہ انہیں پیش کر دو مگر ناکارہ کرنے کے بعد" اور ان کو جانے دو واپس۔"

غالب نے تینوں رائفلوں کے میگزین نکال لئے اور پھر بار باری سے گھوڑے ناکارہ کر دیئے۔ بولٹ جام ہو جانے کے بعد اب یہ امکان بھی نہ رہا کہ رائفلیں پھر کبھی استعمال کے قابل ہوں۔ میں نے ریوالور خالی کیا اور اسے اٹھا کر دینے سے پہلے اس کا ٹریگر توڑ دیا۔

"ہم جانوروں کی طرح کسی کی جان لینے کے قائل نہیں، اس لئے تم واپس جا رہے ہو" میں نے کہا "اپنے ساتھ ہم صرف اس پیر کو لے جا رہے ہیں لیکن اسے بھی قتل کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ جب یہ واپس آ جائے تو تم اپنا حساب برابر کرتے رہنا۔ اب صرف ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ اگر تم سب کو اپنی جان اور اپنے خاندانوں کی سلامتی عزیز ہے تو جو کچھ ہوا اس کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ اگر ہمیں کبھی معلوم ہوا کہ تم نے اوپر شکایت کی ہے یا پیر عنایت کی بیوی اور اس کے بھائی کے خلاف کارروائی میں فریق بنے ہو تو ہم تمہیں بھی لے جائیں گے۔ ہمیں معلوم ہو جائے گا اور ہمارا راستہ روکنا بہت مشکل کام ہے۔ تم نے اخبار میں دیکھ ہی لیا ہوگا کہ ہم آج تک پکڑے نہیں گئے۔"

تھانے دار کا اور اس کے ماتحت سپاہیوں کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ انہوں نے اپنے لئے کو ذرا اتنی حد تک خطرناک بنا لیا تھا۔

اے ایس آئی نے سر ہلایا اور خاموشی سے اپنی شکست تسلیم کر لی۔

میں نے کہا "تمہاری جیپ ہم لے جا رہے ہیں۔"

مانو نے کہا "بھئی، ان سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ تھانے دار صاحب تو خود یہی کہنے والے تھے۔ یہ پیدل چلے جائیں گے۔"

غالب نے کہا "پیدل چلنے سے صحت ٹھیک رہتی ہے مگر میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

میں نے کہا "جو کہنا ہے کہہ ڈالو، اپنے تھانے دار صاحب بات کا برا نہیں مانتے۔"

"میں سوچ رہا تھا کہ کیا ہم ایسے کپڑے پہن کر جیپ میں بیٹھے اچھے لگیں گے۔"

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے مسکرا کے کہا۔ "اچھے تو نہیں لگیں گے مگر یہ بڑے مہمان نواز لوگ ہیں۔ یہ اپنے کپڑے بھی اسے دے دیں گے تمہیں۔"

تھانے دار کا منہ احتجاج کے لئے کھلا اور بند ہو گیا "اس ... کیا جائے گا۔ سرکاری جیپ اور سرکاری وردی..."

میں نے کہا "تمہارا خیال تھا کہ یہ لباس ہمارے لئے باعث شرم ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس وردی میں تم کو شرم آنی چاہئے۔ ... لباس بدل لیں۔"

تھانے دار کے لئے یہ ذلت ناقابلِ برداشت تھی "وردی تم لے لو مگر ہم یہ عورتوں کے کپڑے نہیں پہن سکتے۔"

مانو نے کہا "جتنی بہادری اور جوانمردی کا مظاہرہ تم نے آج کیا ہے، اس کے بعد تو تمہیں چوڑیاں بھی پہن لینی چاہئیں۔"

غالب نے سر ہلایا "چوڑیوں کے پیسے ہم دیں گے۔ واپس جا کے ان کپڑوں سے میچ کرتی ہوئی چوڑیاں خرید لینا۔"

ناجی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "ایک بات سن لیں میری جناب۔"

وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ چند قدم دور جا کے رک گیا "کیا بات ہے ناجی؟"

"دیکھیں جی، میں اس تھانے دار کو بھی جانتا ہوں اور یہ بھی معلوم ہے مجھے کہ اس وقت پیر عنایت آپ کے پیچھے نہیں، میرے پیچھے آیا تھا۔"

"تمہارے پیچھے!" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں جی۔ اس نے تھانے دار سے کہا تھا کہ پہلے ناجی کو گولی مار دینا، کوئی بات کئے بغیر۔ آپ نے بچا لیا مجھے ورنہ یہی ہوتا۔ پوری بات میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی صرف یہ کہنا تھا کہ ... بعد میں میرا کیا بنے گا۔ اگر مجھے واپس جانا پڑا تو یہ لوگ مجھے چھوڑیں گے نہیں۔ آپ نے زینب کی جان بچانے کا بندوبست کر لیا اور اس کے بھائی کو بھی بچا لیا... وہ کیا میں غریب..."

میں نے کہا "تمہارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ میں بھول گیا تھا تمہارا ذکر کرنا۔ اب سمجھاؤں گا انہیں۔"

ناجی نفی میں سر ہلانے لگا "یہ سمجھنے والے لوگ نہیں ہیں جی۔ ہو سکتا ہے یہ ابھی مجھے لے جانے کی کوشش کریں۔"

"زبردستی کون لے جا سکتا ہے تمہیں؟" میں نے کہا۔

"میں اب واپس نہیں جا سکتا جی، گیا تو یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مجھے معلوم ہے" ناجی نے کہا۔

"پھر تم کیا کرو گے، کہاں جاؤ گے؟"

"میں... میں آپ کے ساتھ..." اس نے ملتجی نظروں سے دیکھا۔

مجھے امید تھی کہ وہ یہی کہے گا۔ میں نے سختی سے کہا "نہیں ناجی۔ تم ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے۔"

اس کی صورت اتر گئی "اچھا جی، پھر میں... کہیں اور چلا جاؤں گا، زبردستی تو میں آپ کے ساتھ بھی نہیں جا سکتا۔"

میں نے کہا "دیکھو ناجی، تمہیں بالکل اندازہ نہیں ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ہمارا کوئی گھر نہیں ہے جہاں تم رہ سکو۔"

"یہاں میرا کون سا گھر تھا جی" وہ اداس ہو گیا تھا۔

"ہاں۔ لیکن بہت خطرہ ہے ہمارے ساتھ جانے میں۔ میں تم کو بعد میں سمجھاؤں گا" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے دوستانہ لہجے میں کہا "پہلے ہم انہیں رخصت کر دیں۔"

پولیس پارٹی کے ارکان میرے اور ناجی کے خفیہ ...

www.paksociety.com

سے غلط امیدیں وابستہ کر بیٹھے تھے اور یہ سمجھنے لگے تھے کہ ماجی ضرور لحاظ یا خوف کے باعث ان کے ساتھ بہتر سلوک کی سفارش کرے گا۔ ہم اجنبی اور بے مروت لوگ تھے مگر ماجی بہرحال اسی علاقے کا رہنے والا تھا اور وہاں کے کمترین طبقے میں شامل تھا جو پیدائشی طور پر محکوم و مظلوم سمجھے جاتے ہیں اور نمبردار سے تھانے دار تک سب کی جوتیاں کھاتے اور اٹھاتے ہیں۔

جب میں نے حکم جاری کیا "چلو بھئی... پارٹی پارٹی۔ اس برگد کے پیچھے جا کے اپنی اپنی وردیاں اتار دو" تو ان سب کی شکلیں رونے والی ہو گئیں۔

"ہمارا وقت ضائع مت کرو" غالب نے دھیں جھاڑا "کیا برگد کا درخت نظر نہیں آ رہا ہے؟"

میں نے کہا "جاتے وقت اپنے ساتھ ایک برقع لے جاؤ۔"

تھانے دار نے بے یقینی کے ساتھ مجھے دیکھا "صرف برقع؟"

"ہاں صرف برقع" میں نے کہا "اور کچھ نہیں۔"

"بیگم... تم نے اپنے کپڑے دینے کی بات کی تھی..."

"اس وقت تمہاری غیرت جاگ اٹھی تھی۔ تم نے جذباتی ہو کے میری اس پیشکش کو بڑی حقارت سے مسترد کر دیا تھا" میں نے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ برقعے بھی تین ہیں، جو دیر کرے گا اسے برقع بھی نہیں ملے گا۔"

"تاہم برقع پہننا لازمی کسی کے لیے نہیں ہے۔ جسے زنانہ لباس پہن کے ڈر ہو کہ اس کی جنس بدل جائے گی، وہ ایسے ہی ننگی بچاتا ہوا مردانہ وار چلا جائے" غالب نے کہا۔

تھانے دار نے اس رسوا کن حکم کی تعمیل میں سبقت لے جانے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ صرف برقع پہن کر رواں ہونے کا اعزاز پہلے اس کے تینوں ماتحتوں نے حاصل کیا۔ آخر میں کوئی برقع نہ رہا تو وہ کچھ پُرامید نظر آنے لگا کہ شاید اس کی وردی اور عزت محفوظ رہ جائے مگر نازو شرارت کے موڈ میں تھی۔ اس نے پیر عنایت سے چادر لے لی اور اس کے وسط میں سر کے سائز کا سوراخ کر کے تھانے دار کے لیے ایک خلعت فاخرہ ایجاد کر دی۔ جب اس نے چادر کے چاک میں سر ڈالا اور اس بتیر سی عبا کو دونوں طرف سے پکڑ کے چلنا شروع کیا تو اس کی حالت سب سے زیادہ مضحکہ خیز ہو گئی۔

وہ سب آگے پیچھے جا رہے تھے، پھر ایک دوسرے سے سو قدم کے فاصلے پر چل رہے تھے مگر ابھی تک ان میں سے کسی نے بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ غالب نے ان کے جوتے بھی اتروا لیے تھے اور برقعے ان کو اتنے چھوٹے تھے کہ گھٹنوں سے نیچے ان کو اپنی مردانہ پنڈلیاں چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔ شاید برقعے کے اندر بھی انہیں اپنی بے لباسی کا خیال شرم سے ڈوب مرنے پر مجبور کر رہا ہو گا۔ ان کی حالت زار پر سب سے زیادہ ہنسی نازو کو آ رہی تھی۔

غالب نے کہا "آخر کب تک... کبھی کبھی کرتی رہو گی؟ تمہاری ہنسی میں جلترنگ ہے لیکن طبلِ جنگ بج رہا ہو تو اسے کوئی نہیں سنتا۔"

نازو نے کہا "مجھے صرف تمہاری پٹے ڈھول جیسی ... سنائی دے رہی ہے۔ کیسے طبلِ جنگ ہو تم؟"

میں نے کہا "مرزا! وہ خبیث چابیاں لے گیا جیپ کی..."

مرزا غالب نے بند مٹھی کھول کے واسطہ ... "چابیاں تو میں نے بہت پہلے نکال لی تھیں۔"

"گڈ۔ چلو پھر دیر کیسی؟"

غالب نے کہا "پیر صاحب کی میت کیسے جائے گی؟"

پیر عنایت نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کے فریادی لہجے میں کہا "یا اللہ! تو ہی رحم ڈال ان ظالموں کے دل میں۔"

میں نے کہا "اب کوئی دعا قبول نہیں ہو گی پیرجی۔ خدا کی دی ہوئی مہلت سے تم نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ وقت گزر گیا جب تم دنیا و عقبیٰ کے لیے نیکی کا زادِ سفر جمع کر سکتے تھے۔"

غالب نے کہا "خدا نے تمہیں انسان بنایا تھا جو اشرف المخلوقات ہے اور عقل دی تھی نیکی بدی کے فرق کو سمجھنے کے لیے مگر تم نے شیطان کی اطاعت کی۔ تم پیری مریدی کا کاروبار کرتے رہے اور خلقِ خدا کو اپنی شعبدہ بازی اور کرشمہ سازی سے الّو بناتے رہے۔ اس وقت تمہیں خیال نہیں آیا کہ جھوٹ کی کھوکھلی بنیادوں پر استوار کی جانے والی عقیدے کی عمارت کتنی ناپائیدار ہے۔"

"شاعر نے بہت پہلے فرما دیا تھا کہ ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں... میں نے کہا "آخر کار خدا نے تمہارے فریب کا پردہ چاک کرنے کا فریضہ ہمیں سونپا۔"

"پھر تمہاری شامتِ اعمال خود تمہیں کھینچ کر ہمارے پاس لے آئی" غالب نے ریوالور کو پیر عنایت کی ناک سے چھو کر کہا "ورنہ ہم تو تمہیں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔"

پیر عنایت علی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "کیا... تم ... فیصلہ کر چکے ہو مجھے مارنے کا؟"

میں نے کہا "کیا اب بھی تم امید رکھتے ہو کہ تمہارے ساتھ رعایت کی جائے گی؟"

"اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

"خلقِ خدا کو فائدہ ضرور ہو گا" میں نے کہا اور اسے جیپ کی طرف دھکیل دیا۔

"دیکھو، میری ایک بات سن لو" پیر عنایت دہشت زدہ ہو کے چلایا۔

وہ جیپ میں بیٹھنے سے ایسے ڈر رہا تھا جیسے یہ ... لے جانے والی میت گاڑی ہے۔

"جو کہنا ہے راستے میں کہنا" میں نے اس کو جیپ کے پچھلے ... والے کھلے حصے میں اچھال دیا۔ پچھلے حصے میں ...

... تھیں۔ ان میں سے ایک پر میں پیر عنایت کے ... اور اس کے ہاتھوں میں گھوڑے کی لگام پکڑا دی۔ جیپ ... گھوڑے نے تھوڑی سی مزاحمت کی اور پھر پیچھے پیچھے ... لگا۔ اگلی سیٹ پر غالب نے ڈرائیونگ کی ذمے داری ... تھی اور اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی نازو محض اسے ... کرنے کے لیے ڈانٹ ڈپٹ کے انداز میں ہدایات جاری ... رہی تھی "یہ کیا ہے؟ سیکنڈ گیئر کیوں لگایا ہے؟ تھرڈ گیئر آخر ... کام آئے گا اور پھر گاڑی دائیں بائیں کیوں مل رہی ہے؟ ... لے رہی ہے؟ کیا اس کے انجن کو دمے کا مرض لاحق ... ہے پھر تم... دکڑھے کے دائیں طرف سے گاڑی گزار رہی ہے۔ ... بائیں طرف رہنا چاہیے تم کو۔ یہ ٹھیک ہے کہ بائیں ... درخت تھا مگر تم ہارن دیتے تو شاید وہ راستے سے ہٹ جاتا ... تم کو ہارن بجانا ابھی نہیں آتا؟ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم ... نہیں بجا سکتے۔ ایسے میری طرف دیکھنے کی ضرورت ... گاڑی چلاتے ہوئے راستے پر نظر رکھو۔ ابھی ابھی تم ... معصوم اور بے ضرر جانور کو کچل کے مار دیا ہے۔ وہ اللہ ... بھینس تھی۔ اللہ میاں کو کیا جواب دو گے حشر کے دن؟"

مجھے ہنسی بھی آ رہی تھی اور تعجب بھی تھا کہ غالب خاموش ... نازو کی فضول باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ عام ... ان کی لڑائی شروع ہونے میں دیر نہیں لگتی تھی۔ نازو کا ... اور حد سے زیادہ بولنا بھی اعصابی دباؤ کو ختم کرنے کی ... غیر شعوری کوشش تھی۔ وہ ہسٹیریا کا شکار ہو کے رو تی اور ... نہیں تھی۔ شاید وہ ثابت کرتی تھی کہ وہ عام لڑکی نہیں ... اس کا بے سبب ہنسنا اور مسلسل باتیں کرنا یا غالب سے لڑنا ... کا دورہ ہی ہوتا تھا۔ پھر جیسے جیسے وہ پُرسکون ہوتی جاتی ... اس کے رویے میں بھی متانت کا انداز اور معقولیت کا عنصر ... ہو جاتا تھا۔ گزشتہ چند ہفتوں میں پُرخطر حالات اور ... کا سامنا کرنے والی وہ اکیلی لڑکی تھی جس نے کسی بھی ... صنفِ نازک اور کمزور عورت ہونے کے احساس کو ... پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ رابعہ اور محسن ہم سے ... تھا۔ اس کا صدمہ مجھے بھی تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ... دینے والا خیال یہ تھا کہ وہ خانہ بدوشوں کے قبیلے کے ... ابھی ہوں گی محفوظ ہوں گی اور وہ قبیلہ جو ضرورت اور ... کے تحت نظر سے غائب ہو گیا ہے، ہم سے بھی کہیں نہ کہیں ... جائے گا۔ تلاش کرنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ پھر ... نہیں ملے گی؟ اس کا سراغ وہ ہوا دے گی جو رابعہ کے ... ہو کے گزرے گی تو اس کے وجود کی خوشبو سمیٹ لائے ... اور جیسے قطب نما کی سوئی ہر جگہ، سمت اور فاصلوں کے ... کرتے ہوئے شمال کی جانب ہو جاتی ہے، ویسے ہی میرا ... خود اس سمت میں چل نکلے گا جدھر سے رابعہ کی محبت ... لیکن ابھی میرے دل کو محسن کی طرف سے پُرتشویش ... اور شملہ کی طرف سے یاس آمیز دکھ کی اذیت نے اتنا

مجبور کر دیا تھا کہ میں صرف رابعہ... کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنی خود غرضی کے احساس سے شرمندہ ہو جاتا تھا۔

مین روڈ اب زیادہ دور نہیں رہی تھی لیکن میں نے راستہ بدل دینا بہتر سمجھا۔ پیر عنایت کی رہنمائی میں ہم تک پہنچ جانے والی پارٹی کو ہم نے ایسی ذلت دے کر رخصت کیا تھا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان سے زیادہ امید یہی تھی کہ وہ اپنی رسوا کن ناکامی کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے اور ان کی پوری کوشش ہو گی کہ ان کی ذلت کی تشہیر نہ ہو مگر انہیں راستے میں دوسری پولیس پارٹی مل گئی تو پھر انہیں سب بتانا ہی پڑے گا۔ ظاہر ہے اس کے بعد ہماری تلاش میں زیادہ تندی اور تیزی آ جائے گی۔ پولیس اس سارے علاقے میں چپے چپے پر موجود تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ آگے والوں کو خبردار کر دیا جائے کہ ہوشیار! مجرم اسی راستے پر بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ اور وہ مین روڈ پر گرفتاری کا تمام ساز و سامان لیے ہمارے استقبال کے لیے ہر طرف موجود ہوں۔

اس علاقے کے راستوں سے صرف ماجی ہی واقف تھا۔ اسے دل گرفتہ دیکھ کر میں نے کہا "استاد ماجی! کوئی ایسا راستہ پکڑو جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکے۔"

ماجی کا چہرہ پھر امید کی روشنی سے دمکنے لگا "آپ فکر مت کریں جی۔"

میں نے کہا "خدا نخواستہ ہمارے دشمن پیچھا کرنا چاہیں تو ان کے سارے اندازے غلط ہو جائیں۔"

"میں ایسا چکر دوں گا، سائیں کو گھن چکر بنا دوں گا" ماجی نے گھوڑے کو جیپ کے ساتھ ساتھ دوڑاتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ "ان کے باپ کو پتا نہیں چلے گا کہ ہم کدھر سے نکل گئے۔"

گھڑی دیکھ کر میں نے کہا "یہ بھی سمجھ لو کہ ہمارے لیے وقت کی بہت اہمیت ہے۔ دوپہر تک ہم بمبئی پہنچنا چاہتے ہیں۔"

"مین روڈ کی طرف سے؟" وہ سوچ کے بولا۔

"یہ کوئی ضروری نہیں۔ تم ہمارے لیڈر ہو، جس طرف سے چاہو لے جاؤ مگر راستہ محفوظ ہو۔"

ماجی نے یوں سر ہلایا جیسے ساری بات سمجھنے کے بعد اس نے یہ ذمے داری قبول کر لی ہے "میں گھوڑے پر آگے چلتا ہوں، آپ جیپ لے کر میرے پیچھے آئیں۔"

میں نے کہا "اس طرح تو ہم رفتار کم رکھنے پر مجبور ہوں گے۔"

ماجی ہنسا "سڑک پر جیپ کا مقابلہ گھوڑا نہیں کر سکتا لیکن یہاں گھوڑے کا ساتھ جیپ نہیں دے سکتی۔ آپ مجھے ذرا دیکھ لیں۔"

ماجی بلاشبہ اچھا شہسوار تھا۔ گھوڑے نے شروع میں تھوڑی بہت سرکشی دکھائی تھی لیکن ماجی نے کسی دشواری کے بغیر اسے اپنا مطیع و فرماں بردار بنا لیا تھا۔ جنگل کے ناہموار اور دشوار گزار کچے راستوں پر جیپ واقعی اس کی تیز رفتاری کا ...

www.paksociety.com

ویرانے میں ناکام رہی۔ ناجی بہت آگے نکل گیا تھا اور غالب اس بات پر بہت خفا تھا۔

رہی سہی کسر نازو نے پوری کر دی۔ اس نے کہا "کتنی شرم کی بات ہے کہ چالیس ہارس پاور کی جیپ ہے تمہارے پاس اور تم ایک ہارس پاور کے گھوڑے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"گھوڑے پر ناجی اکیلا ہے" غالب نے آنکھیں نکال کے کہا۔ "جیپ پر اتنی بڑی گناہوں کی گٹھڑی بھی رکھی ہوئی ہے۔"

غالب کا اشارہ پیر عنایت کی طرف تھا جو خود کو انتہائی مجبور اور بے بس سمجھتے ہوئے خاموش بیٹھا آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر آہیں بھرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے چہرے کی ناامیدی سے اندازہ ہوتا تھا کہ خود اسے بھی اپنی کسی دعا کے قبول ہونے کی امید نہیں۔ اس کے لئے تو دنیا میں ہی روز حساب آ گیا تھا۔ بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر۔ اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے اعمال کو دیکھتے ہوئے یہ حساب بے باق نہیں ہوں گے۔

ناجی کچھ دیر پہلے بہت افسردہ تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ نہ رکھنے کا فیصلہ سنا کے اس کا سب جوش و خروش ختم کر دیا تھا۔ اس نے بڑے خلوص کے ساتھ اپنی افادیت ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر میں نے قطعی غیر جذباتی بے رخی کے ساتھ اس کی درخواست مسترد کر دی تھی۔ احساس ناقدری کا رد عمل دل شکستگی اور مایوسی تھا۔ وہ مستقبل کی بے یقینی کے اندیشوں کا شکار ہو گیا تھا۔ جس کے پاس ماضی کی یادوں کے اثاثے میں صرف کھوکھلے اور بے نام رشتے ہوں... جو وقت کے ساتھ بدل جاتے ہوں اور جن کی بنیادیں پیار سے زیادہ رحم کے جذبات پر محسوس ہوں۔ جو ہمیشہ یہ سمجھتا آیا ہو کہ اسے التفات بھی خیرات میں ملتا ہے... وہ ایسے ہی سب کے سامنے امیدوں کا خالی کشکول لئے پھرتا ہے کہ شاید کوئی اس پر ترس کھائے بغیر اس میں تھوڑی سی اپنائیت ڈال دے۔ وہ محبت دے دے جس میں احسان کم نہ ہو۔ لیکن میں بھی مجبور تھا۔ میں ٹھکرائے ہوئے بے کس اور مظلوم ناجی کو ساتھ لے کر نہیں چل سکتا تھا اور پھر ناجی کے ترستے ہوئے دل کی پیاس بجھانے کے لئے میرے پاس پیار کا کوئی سمندر نہیں تھا۔

ایک گھنٹے میں ہم نے تقریباً بائیس میل کی مسافت طے کی تھی۔ راستہ ایسا تھا کہ جم کر بیٹھنے کے باوجود ہم سب ہچکولوں اور جھٹکوں سے زلزلے کی کیفیت میں تھے۔ درحقیقت وہ کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ پیدل یا گھوڑے پر سوار ہو کے بھی اس مسافت کو طے کرنا آسان نہ تھا۔ جیپ میں شاید کبھی کسی نے ادھر سے گزرنے کی کوشش ہی نہیں کی ہوگی لیکن ناجی میری ہدایات کو ذہن میں رکھتے ہوئے مشکل ترین راستے کا انتخاب کرتا تھا اور اسے بالکل احساس نہیں تھا کہ اس کے پیچھے پیچھے جیپ چلانا غالب کے لئے کتنی بڑی آزمائش ہے۔ اب نازو بھی خاموش ہو گئی تھی اور شاید میری طرح اس خیال سے پریشان تھی کہ اس راستے پر جو پھنس گئے یا ٹائی راڈ نکل گئے تو ہمیں اس موٹر کو اسی جگہ خیرباد کہنا پڑے گا۔ میں ناجی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اب ہم کہاں ہیں اور بمبئی تک کتنی مسافت باقی ہے لیکن وہ ہم سے کم سو گز اور بعض اوقات ایک فرلانگ آگے چل رہا تھا۔ میں چلاتا تب بھی آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچتی۔

آخر کار ناجی کو ایک ریلوے کراسنگ پر رکنا پڑا جہاں پھاٹک بند تھا۔ ہم ایک گاؤں کی آبادی کے باہر سے گزر آئے تھے اور دائیں جانب ریلوے لائن سیدھی کسی سمت جا رہی تھی۔ غالب کا تھکن سے برا حال تھا اور ہم سب یوں محسوس کر رہے تھے جیسے ہم بہت دیر سے کسی کنکریٹ مکسر میں تھے جو اب رک گیا ہے۔

"میں اس الو کے پٹھے پر سے جیپ گزار دوں گا کمبخت" غالب نے ہانپتے ہوئے آستین سے پسینہ صاف کیا۔

میں نے کہا "غلطی میری تھی۔ اسے کچھ مت کہو میں نے ہی اسے کہا تھا کہ جس راستے پر کوئی ہمارے پیچھے نہ آ سکے وہ راستہ اختیار کرے۔ واقعی اس طرف کون آ سکتا ہے۔"

غالب نے کہا "ہم تو انسان ہیں۔ خود گھوڑا پریشان ہو گا کہ جن سوار ہو گیا ہے۔"

نازو نے اسے تسلی دی "چلو آگے راستہ صاف نظر آ رہا ہے یہ غالباً شہر کے مضافات ہیں۔"

بائیں طرف سے ایک کالا انجن خالی بوگیوں کو دھکیلتا ہوا لا رہا تھا اور الٹا چل رہا تھا چنانچہ اس کی رفتار کم تھی۔ ناجی اپنے گھوڑے سمیت پھاٹک کے دوسری جانب موجود تھا۔ میں ریلوے لائن عبور کر کے اس کے پاس گیا۔

"تم راستہ تو نہیں بھول گئے ہو ناجی؟" میں نے کہا "آخر کتنی دور جانا ہے اب؟"

ناجی کے کپڑے پسینے میں تر تھے اور اسے بات کرنا بھی دشوار ہو رہا تھا "بس جی تھوڑا سا... یہ سڑک آ گئی۔"

میں نے کہا "بس تو تم گھوڑے کی جان بخشی کرو اور ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ ریس تم نے جیت لی۔"

نازو نے میرے پیچھے سے کہا "تم گھوڑے کی حق تلفی کر رہے ہو۔ ریس گھوڑے نے جیتی ہے اور وہ اپنا مقابلہ جاری رکھنا چاہتا ہے۔"

غالب بھی ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے جیپ سے اتر آیا تھا۔ اس نے ہنس کے کہا "ہاں دیکھنا ہے کہ پہلے کون گرتا ہے گھوڑا یا شہسوار۔ مسٹر ناجی! تم اگر گھوڑے ہوتے تو اس وقت تمہاری جذباتی کیفیت کیا ہوتی؟ کیا تم کو گھوڑے کی آنکھوں میں خون اترا ہوا نظر نہیں آتا؟"

ناجی نے بات سمجھے بغیر دانت نکال کے کہا "آپ تھک گئے ہو تو ہم تھوڑی دیر یہاں رک کے آرام کر سکتے ہیں" اس نے انگلی سے ایک پرانے طرز کی عمارت کی جانب اشارہ کیا جو شاید آدھا میل دور تھی۔

"یہ کیا ہے تمہارا میکہ یا سسرال؟" غالب نے کہا۔

"یہ ڈاک بنگلا ہے" ناجی نے مطلع کیا "یہاں جو چوکیدار ہے وہ پیر عنایت کا خاص مرید ہے۔ بہت خدمت کرے گا۔"

نازو نے کہا "وہ پیر کہیں بھاگ نہ جائے اتر کے۔"

ناجی چہکا "بھاگ کے کہاں جائے گا جی۔ اس سے تو چلا بھی نہیں جائے گا" اور گھوڑے پر جا کے میں اسے یوں گھیر لوں گا" ناجی نے چابک ہلا کے کہا۔

جب ٹرین گزر گئی تو ناجی نے گھوڑے کو تھپکی دی اور آزاد کر دیا لیکن گھوڑا پھر بھی وہیں کھڑا رہا۔ شاید اس کے لئے آزادی کا کوئی مفہوم اور تصور نہیں تھا کہ وہ خوشی کے اظہار میں اچھلتا کودتا اور پھر دوڑتا ہوا جنگل کی طرف نکل جاتا۔ اگر بعد میں کسی نے اسے لاوارث اور بے مہار پھرتا دیکھا ہو گا تو اس کے منہ میں اپنی ملکیت کی لگام ڈال دی ہو گی اور گھوڑے نے اس پر بھی کوئی احتجاج نہیں کیا ہو گا۔ جیپ کے روانہ ہونے تک وہ اسی جگہ موجود تھا اور اس وقت تک نظر آتا رہا جب تک جیپ ڈاک بنگلے میں داخل نہیں ہو گئی۔

برآمدے کے سامنے کچے راستے پر ایک خستہ حال گاڑی پہلے سے موجود تھی۔ خاکی رنگ کی پرانی وردی میں ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار گزشتہ رات قیام کرنے والوں کو رخصت کر رہا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک معنی خیز اور سارے راز کھولنے والی مسکراہٹ تھی۔ سلام کے لئے اٹھنے والے ہاتھ میں سو کا نوٹ اس کی فرد جرم کی طرح تھا جو مہمانوں نے خدمت گزاری کے معاوضے یا انعام سے زیادہ رشوت کے طور پر دیا تھا۔ خود مہمانوں کے چہرے اپنے احساس جرم و گناہ پر ندامت کی تصویر نظر آتے تھے۔ ایک کالی سوکھی عورت جس نے اپنی جوانی کو وقت کی مسافت طے کرتے ہوئے مال غیر کی طرح لٹایا تھا جذباتی بے کلی کے ساتھ اپنے ہونٹوں کو لپ اسٹک سے رنگنے اور آئینہ دیکھنے میں مصروف نظر آتی تھی کہ لبوں کی یہ لالی کسی رنگ اس کے اجڑے ہوئے چہرے کی رونق اور اس کی بے جان مسکراہٹ کا حسن بحال کر سکے گی۔ شب گزشتہ کی مجرم تنہائیوں کا رفیق ایک عمر رسیدہ اور شکست خوردہ چہرے والا شخص تھا جسے دیکھ کر خیال آتا تھا کہ اس نے ساری زندگی خواب دیکھنے اور خواہشوں کے سراب تلاش کرتے گزار دی تھی مگر [illegible] کے پرستان ٹوکیو کے نائٹ کلب اور سنگاپور کے [illegible] ناقابل حصول اس کی دسترس سے دور تھے۔ شاید وہ کوئی معمولی سرکاری افسر تھا اور یہ عورت صرف رشوت تھی جو اس نے کسی ٹھیکیدار سے ایک ناجائز بل پر دستخط کرنے کے لئے قبول کی تھی یا وہ خود کوئی چھوٹا موٹا ٹھیکیدار تھا جس نے تمام عمر [illegible] ہار کے آخر کار ایک سیکنڈ ہینڈ کار اور تھرڈ ریٹ [illegible] پر قناعت کر لی تھی۔

ہمیں کو دیکھتے ہی وہ بڑی عجلت میں فرار ہوئے۔ خود چوکیدار کی صورت پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں اور اس کی مسکراہٹ کافور ہو چکی تھی۔ اس کا سلام کے لئے اٹھنے والا ہاتھ تیزی سے نیچے آیا اور سو کا نوٹ اس کی جیب میں غائب ہو گیا۔ اس نے بڑی مستعدی سے اپنے چہرے پر ایک خوشامدانہ مسکراہٹ کا خول چڑھایا اور انتہائی عاجزی سے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ اسے غیر مشروط درخواست جاں بخشی بھی سمجھا جا سکتا تھا اور استقبال کا مودبانہ انداز بھی۔ باری باری اس نے مجھے اور غالب کو سلام کیا۔

"پرنام سرکار" پرنام ان داتا۔ پدھاریے "اندر آئیے مہاراج۔" پھر اس کی نگاہ پیر عنایت پر گئی اور وہ عقیدت کے جذبات سے بے قابو ہو کے اس کی قدم بوسی کے لئے لپکا۔ پیر عنایت کو اپنی ذلت سے زیادہ اپنے انجام کی فکر نے ادھ موا کر رکھا تھا مگر ایک مرید کے سامنے اس نے اپنی گردن کو بلند رکھنے کی پوری کوشش کی اور حسب عادت اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے اسے دعا دی۔

میں نے چوکیدار کو گردن دبوچ کے اٹھا لیا "تم مسلمان ہو؟"

"جی... جی سرکار" چوکیدار نے کانپتے ہوئے کہا۔

"مسلمان خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتا۔ تم اس شیطان کے پیروں پر سر رکھتے ہو" میں نے اسے جھٹک کے کہا "یہ پیر نہیں ایک مجرم ہے۔"

غالب نے کہا "اگر تم اس کے مرید ہو تو اس کے ساتھ ہی لٹکائے جاؤ گے۔"

چوکیدار کی حالت غیر ہو گئی "مگر حضور... میرا قصور... آہ... میری گردن ٹوٹ جائے گی سرکار۔"

میں نے اسے ایک اور جھٹکا دے کر چھوڑ دیا "اپنا قصور پوچھتا ہے بدمعاش۔ یہ ڈاک بنگلا کیا تیرے باپ کا ہوٹل ہے؟"

ڈاک بنگلا ریلوے کا تھا چنانچہ اس کی دیکھ بھال پر مامور چوکیدار کو ریلوے سے تنخواہ بھی ملتی ہو گی مگر اس نے سرکاری املاک سے آمدنی کے دیگر ذرائع پیدا کر لئے تھے۔ اب تنخواہ کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی لیکن یہ نوکری بہرحال اہم تھی جو ڈاک بنگلے میں ٹھہرنے والے غیر سرکاری مہمانوں سے سو سو کے نوٹ دلواتی تھی۔ ہم نے اسے جرم کرتے ہوئے پکڑ لیا تھا اور گرفتاری کے ساتھ ہی اسے ملازمت بھی ختم ہوتی نظر آ رہی تھی جس پر اس کی ساری خوشحالی کا دارومدار تھا۔ اس نے ایک دم نازو کے پاؤں پکڑ لئے کیونکہ وہی افسر کی [illegible] تھی۔ رو رو کے اس نے اپنی ہر خطا معاف کرانے کی کوشش کی۔ نازو پریشان ہو گئی کیونکہ وہ کسی صورت اس کے پاؤں چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا "مہاراج غلطی ہو گئی۔ آئندہ کے لئے توبہ میرے باپ کی توبہ۔ میرے بچوں پر رحم کریں۔"

نازو نے غالب کی طرف امداد طلب نظروں سے دیکھا۔ اگر وہ چاہتی تو ایک لات مار کے اسے دیوار پر پھینک سکتی تھی مگر چوکیدار آنسوؤں سے اس کے پاؤں دھو رہا تھا۔ [illegible]

www.paksociety.com

واسطے دے رہا تھا اور اس کے پیروں میں ایسے لوٹ رہا تھا کہ نازو کے لئے بے رحمی کا مظاہرہ کرنا بالکل ناممکن ہو گیا تھا۔

غالب نے اسے ڈانٹ کے کہا "ابے چل اٹھ، بہت ڈراما ہو گیا۔ اندر جا کے ہمارے لئے کچھ چائے پانی کا انتظام کر۔"

چوکیدار واقعی ڈراما کر رہا تھا۔ غالب کا حکم سنتے ہی وہ بڑی پھرتی سے اٹھا۔ اس کا رونا دھونا سب ایک دم رک گیا اور آنکھوں سے بہنے والے آنسو بھی یوں خشک ہو گئے جیسے اس نے آنسوؤں کا نلکا بند کر دیا ہو۔ اس نے ریسٹ ہاؤس کے دونوں کمرے کھول دیئے اور خود چائے بنانے کے لئے اندر غائب ہو گیا۔

ناجی نے دانت نکال کے کہا "یہ جھوٹ بول رہا تھا جی۔ نہ اس کی بیوی ہے نہ بچے، سالا ایکٹر ہے۔"

میں نے کہا "آخر مرید کس کا ہے؟ خیر! اب تم یہاں برآمدے میں ٹھہرو، کوئی بھی ادھر آئے تو فوراً بتانا۔"

"آپ فکر مت کرو جی" ناجی نے کہا۔

نازو اندر جاتے ہی ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ اس کا تھکن سے برا حال تھا۔ غالب اس کے سامنے پڑے ہوئے لوہے کے اسپرنگ اور جوٹ کے گدے والے بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس کے علاوہ کمرے میں ایک بھدی سی میز بھی موجود تھی اور یہ سارا فرنیچر برطانوی دور حکومت کی یادگار نظر آتا تھا۔ دوسرے کمرے میں اضافی چیز بڑی بڑی درازوں والی اونچی ڈریسنگ ٹیبل تھی جس کا بیضوی آئینہ دھندلا چکا تھا۔ بلند چھت والے نیم روشن کمرے میں اس کی چمک آسیب زدہ محسوس ہوتی تھی۔ شاید اس احساس کا سبب خانہ ویرانی کی وہ کیفیت تھی جو ریسٹ ہاؤس کے اندر میلی دیواروں اور بوسیدہ کڑیوں والی چھت سے عیاں تھی۔ چھت کے ایک گوشے میں چڑیوں نے گھونسلا بنا لیا تھا جس کے تنکے نیچے بکھرے ہوئے تھے اور فرش کے ایک حصے کو بیٹوں نے داغدار کر رکھا تھا۔

بھاری بھرکم آرام کرسی پر نیم دراز ہو کے میں نے پیر عنایت کو دیکھا۔ وہ ابھی تک کھڑا ہوا تھا۔ بیڈ کی ظاہری حالت بھی اتنی خراب تھی کہ وہ اس پر بیٹھنے سے گریزاں تھا۔ اپنے فریب کار پیشے کی ساری بدنمائی اور اپنے کردار کی تمام خرابیوں کے باوجود پیر عنایت نے اپنی ذات کو پاکیزگی اور طہارت کی اعلیٰ صفات سے منسوب کر لیا تھا اور اس کے نزدیک یہ بیڈ ناپاک تھا۔ میز اس کے لئے بہت چھوٹی تھی چنانچہ وہ کھڑے رہنے پر مجبور تھا۔

"آخر تم نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے؟" پیر عنایت نے کچھ دیر بعد کہا۔

میں نے کہا "تم جیسے کسی مجرم کے بارے میں مجھے سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تمہارا کیس ایم آر ایس کی عدالت میں سماعت کے لئے پیش ہو گا۔ تمہیں وہ سزا دی جائے گی جس کے تم مستحق ہو۔"

"کس نے دیا ہے تمہیں یہ اختیار؟ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا" پیر عنایت کی آواز لرز رہی تھی۔

"تم جیسے لوگوں نے جو قانون کا استحصال کرتے ہیں" میں نے کہا "اس کو کمزور سمجھ کے اس کا مذاق اڑایا ہے۔ یہاں اسے خرید لیتے ہیں اور موشگافی کی جنگ میں الجھا کے بے معنی اور بے وقعت بنا دیتے ہیں۔ ہم انصاف کرتے ہیں اور اپنے یقین کی بنیاد پر جو بھی فیصلہ کرتے ہیں وہ ہمارے ضمیر کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہمارا یہ نظام انصاف دنیا سے مختلف ہے کہ ہم سب سے اہم ضمیر کی گواہی کو اور اپنے ایمان کو سمجھتے ہیں۔ تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو گی۔"

"اور... سزا کیا ملے گی مجھے؟"

"تم زبان سے اقرار کرو یا نہ کرو اپنے جرائم کی نوعیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ تم خود غور کرو کہ لوگوں کے اعتماد کو جو کاری ضرب تم نے آج تک لگائی کیا نہیں کیا۔ تم نے مال و زر ہی نہیں، بے شمار عورتوں کی آبرو بھی لوٹی ہو گی۔ انہیں روحانی عقیدت کے جال میں پھانس کے بلیک میل بھی کیا ہو گا۔ مال دگنا کرنے کے بہانے ان سے سب کچھ ہتھیا لیا ہو گا۔ جن اتارنے کے نام پر ان کے سر سے چادر اور تن کا پردہ بھی اتار دیا ہو گا۔ اولاد نرینہ دینے کے نام پر تم نے انہیں رسوائی دی ہو گی۔ شاید تمہاری وجہ سے گھر اجڑے ہوں گے۔ ناموس کو زیادہ اہم سمجھنے والی عورتوں نے خاموشی سے جان دے دی ہو گی۔ تم جیسے جعلساز پیر یہی سب کچھ کرتے ہیں۔ کیا ان سب جرائم کی سزا موت سے کم بھی ہو سکتی ہے؟"

پیر عنایت کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا "تم۔ قتل کرو گے مجھے... تو کیا یہ انصاف ہو گا؟"

میں نے کہا "جی ہاں، ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ تم بھی جانتے تھے کہ تم کیا کر رہے ہو مگر تمہیں یہ خوش فہمی تھی کہ تم اپنے سادہ لوح اور احمق مریدوں کے درمیان اور عقیدت مندوں کے حصار میں بہت محفوظ ہو۔ آخرت کا خوف تمہیں تھا نہیں اور دنیا کے نظام انصاف سے تمہیں کبھی کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا لیکن اپنی اس وقت کی حالت پر غور کرو کہ تم کتنے بے بس اور مجبور ہو۔ ہم اگر تمہیں مار کے تمہاری لاش اسی ڈاک بنگلے میں چھوڑ جائیں تو ہمارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟ کون کرے گا تمہارے خون کا دعویٰ اور کس کے خلاف؟"

"یہ... یہ چوکیدار سب کو بتا دے گا۔ تم بچ نہیں سکو گے" پیر عنایت نے لڑکھڑاتی زبان اور کھوکھلے لہجے میں کہا۔

میں نے حقارت سے ہنس کے کہا "اگر وہ عقل سے کام لے تو ایک زندہ پیر کے مقابلے میں مردہ پیر سے زیادہ فیض حاصل کر سکتا ہے۔ وہ تمہارا شاندار مزار بنوا سکتا ہے اور خود سجادہ نشین ہو کے ہر سال تمہارے عرس کے موقع پر عقیدت مندوں کو اکٹھا کر سکتا ہے۔ وہ آدمی ہوشیار ہے۔ نوکری میں مفت کی لے رہا ہے اور اس ڈاک بنگلے سے بھی کما رہا ہے۔ گدی کا سلسلہ تو اس کی آئندہ نسلوں کے لئے بھی باعزت اور منافع بخش ذریعہ روزگار ہو گا۔ مگر ہم اسے یہ موقع فراہم نہیں کریں گے۔ اس طرح ڈھونگ کے فریب کا یہ کاروبار تمہارے مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا اور تم مرحوم و مغفور، خلد آشیانی، جنت مکانی، عنایت ربانی، پیر عنایت شاہ رحمتہ اللہ علیہ وغیرہ ہو جاؤ گے۔"

پیر عنایت کا چہرہ پُرامید نظر آنے لگا "کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ تم مجھے مارو گے نہیں؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہاں۔ ہماری مجبوری اور تمہاری خوش قسمتی یہ ہے کہ تم زینب کے شوہر ہو اور ہم احسان فراموشی کو کبیرہ گناہوں میں سے ایک سمجھتے ہیں۔ ہم برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے قائل ہیں مگر آصف جاہ کی نیکی کا بدلہ ایسے نہیں دے سکتے کہ اس کی بہن کو بیوہ کر دیں اور اس کی بھانجی کے سر پر باپ کا سایہ نہ رہنے دیں۔"

پیر عنایت کے چہرے پر اطمینان اور اعتماد کا رنگ نظر آنے لگا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے لبوں سے لو جھل رہنے والی مسکراہٹ میرا مذاق اڑا رہی ہے کہ میاں سکندر اعظم! کیسی ایم آر ایس کی عدالت اور کہاں کا تمہارا نظام انصاف! اصل بات یہ ہے کہ تم پیر عنایت کے وجود کو ختم نہیں کر سکتے اور اس کے طلسم کو توڑ نہیں سکتے۔ پائندہ صحبت باقی۔ کل پھر وہی زندگی کے معمولات ہوں گے، وہی پیری مریدی کے چکر، وہی مدتی محفل، وہی سادہ دل بندوں کے جذبات کی ارزانی اور وہی ہم جیسے سوداگروں کے کاروبار کی سود مند عیاری و عیاشی۔

اس اشتعال انگیز احساس کو دبا کے میں نے کہا "کیا زندگی ہر حال میں اس قابل ہوتی ہے کہ اس کی خواہش کی جائے؟"

پیر عنایت نے میرے سوال کا مقصد سمجھے بغیر کہا "جینا کون نہیں چاہتا؟ کیا تمہیں زندگی عزیز نہیں ہے؟"

میں نے کہا "مگر بہت سے لوگ خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔"

"وہ بزدل ہوتے ہیں، خودکشی حرام ہے۔"

میں نے کہا "کچھ ایسے مجبور بھی ہوتے ہیں جو مرنا چاہتے ہیں مگر مر نہیں سکتے۔ وہ موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں لیکن پھر بھی انہیں موت نہیں ملتی۔ تم بہت خوش ہو کہ سزائے موت سے بچ گئے لیکن کیا تم کو اندازہ ہے کہ آگے کیسی زندگی ملے گی تمہیں؟ میں بتاتا ہوں تمہیں۔ تم زندہ تو رہو گے مگر تمہاری زندگی لاکھوں کے لئے تماشائے عبرت ہو گی اور تمہارے لئے موت سے بدتر سزا۔ اس زندگی کا ہر دن تمہارے گناہگار ماضی کے ہر دن کا کفارہ ہو گا۔ تمہارا یہ پیری فقیری کا ڈراما اب یہاں نہیں چلے گا۔"

"تم مریدوں کے جذبات نہیں بدل سکتے۔"

میں نے کہا "بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہارے مرید اپنے جذبات میں کس حد تک مخلص تھے۔ مثلاً یہ چوکیدار۔"

چائے لے کر اندر آنے والے چوکیدار نے میز میرے سامنے رکھتے ہوئے سر اٹھا کے دیکھا "آپ نے مجھ سے کچھ کہا سرکار؟" اس نے چائے کی پیالی اور مٹھائی کی پلیٹ میز پر رکھ دی۔

میں نے کہا "چوکیدار! تمہارے خلاف بہت شکایات ملی ہیں کہ تم یہاں بدمعاشی کا اڈا چلا رہے ہو۔ یہاں بدکردار مرد اور عورتیں آتی ہیں۔ تم خود بھی ایک بدمعاش ہو۔"

چوکیدار کی حالت پھر غیر ہو گئی۔ وہ سچا ہوتا تب بھی اس الزام کی تردید کر کے بچ نہیں سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں پولیس کسی سے بھی ہر جرم کا اعتراف حاصل کر سکتی ہے۔ وہ خود تو تھا ہی مجرم۔

میں نے کہا "تم تھانے گئے ہو کبھی؟"

چوکیدار نے ہاتھ جوڑ کے کانپتے ہوئے کہا "خدا نہ کرے سرکار۔"

"تمہیں معلوم تو ہو گا کہ وہاں کھال میں بھس کیسے بھرا جاتا ہے اور کھال کیسے کھینچی جاتی ہے!" میں نے اطمینان سے چائے پیتے ہوئے کہا "جب تم اپنے ہر جرم کا اعتراف کر لو گے تو تمہیں کم سے کم سات سال تک جیل میں قید بامشقت کاٹنا ہو گی۔ اس نوکری کے ساتھ جتنی عیاشی کر رہے ہو تم، یہ سب ختم ہو جائے گی لیکن ایک صورت میں تم بچ سکتے ہو۔"

چوکیدار کا ارادہ اب میرے پاؤں پکڑ کے قسمیں کھانے اور واسطے دینے کا تھا مگر وہ جیسے ہی جھکا، میں نے کک مار کے اسے سیدھا کر دیا۔ وہ بلبلایا اور دیوار سے جا لگا۔ اس کی آواز پر غالب اور نازو بھی آ گئے۔

"ایسے کام نہیں چلے گا" میں نے کہا "یا تو ابھی چلو ہمارے ساتھ یا..."

غالب اور نازو نے دوسرے کمرے میں وہ سب کچھ سنا تھا جو میں نے عنایت سے کہا تھا۔ بیچ میں ایک دروازہ ہی تھا جو پورا کھلا ہوا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ میری آواز ان تک پہنچ رہی ہے۔ پھر بھی ان کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل ہو گیا کہ میرے ذہن میں کیا ہے۔ چوکیدار اور پیر عنایت سانس روکے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"یا... ایک قینچی لاؤ" میں نے چائے کی خالی پیالی رکھتے ہوئے کہا "اور اس پیر کے چہرے پر سے مکاری کا یہ سائن بورڈ ہٹا دو۔ اس دھوکے باز کی داڑھی مونچھیں صاف کر دو۔ شیو کرنے والا استرا ہے تو وہ بھی لے آؤ۔"

پیر عنایت چلایا "نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"میں کچھ نہیں کروں گا، جو کچھ کرے گا تمہارا مرید خاص کرے گا" میں نے کہا۔

"بدبخت، اللہ کا قہر نازل ہو گا تجھ پر" پیر عنایت نے چوکیدار سے مخاطب ہو کے کہا۔

لیکن دنیا دار مرید نے خلاف توقع بہت جلد فیصلہ کر لیا تھا۔ کسی تذبذب کے بغیر اس نے پیر عنایت سے کہا "مجھے معاف کر دینا پیر صاحب، میں مجبور ہوں" اور فوراً آلات صفائی لینے نکل گیا۔

غالب نے قہقہہ مارا۔ "دیکھا پیر صاحب! ایسے ڈرامے رچاتے ہیں یہ مرید۔ یہ تو گردن بھی کٹا دے تمہاری، داڑھی کیا چیز ہے۔ تمہاری پیری بھی فراڈ تھی اور اس کی عقیدت مندی بھی۔"

پیر عنایت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ "میں واپس جا کے کسی کو کیا منہ دکھاؤں گا؟"

غالب نے کہا۔ "تم واپس نہ جانا چاہو تو تمہاری مرضی۔ سال چھ مہینے کے لیے بمبئی چلے جاؤ اور فلمی دنیا میں عیش کرو۔ منہ پر کوئی اچھا سا میک اپ لگاتے رہو۔"

جاتے جاتے نازو نے کہا۔ "جب داڑھی پھر کاروبار کے لیے کافی محسوس ہو تو واپس چلے جانا، مریدوں سے کہہ دینا کہ اتنا یہ پہاڑ پر چلہ کاٹنے گیا تھا۔"

غالب نے کہا۔ "نقلی داڑھی سے بھی کام چلا سکتے ہو تم۔"

"مگر یہ مت بھولنا کہ ہم پھر آ جائیں گے کسی بھی دن۔ پھر مونڈ جائیں گے تمہیں۔" میں نے کہا۔

چوکیدار فوراً ہی لوٹ آیا۔ غالباً اسی ریسٹ ہاؤس کے کسی گوشے میں اس کا گھر بھی تھا جہاں سے اس کو قینچی استرا لانے میں دیر نہیں لگی۔ پیر عنایت کی آنکھوں سے ویرانی کے آثار عیاں تھے اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اسے جسمانی طور پر قابو کیے بغیر یہ کام ممکن نہیں ہوگا۔ وہ چوکیدار کو خون آشام نظروں سے گھور رہا تھا مگر چوکیدار اس سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ اس نے تمام سامان میز پر رکھ دیا اور میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی خاموش التجا کو سمجھنا مشکل نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عنایت کو پیر سے آدمی بنانے کا مشکل فریضہ کسی اور کو سونپ دیا جائے۔ وہ دبلا پتلا سوکھا چرخ سا شخص تھا جس کا بچنے کے خطرے ماڑے پر پلے ہوئے پیر سے مقابلہ ایسا ہی ہوتا جیسے شیر اور بکری کا مقابلہ۔ وہ پیر کی ریش مبارک کی جانب ہاتھ بھی بڑھاتا تو پیر اس کا حلیہ بگاڑ دیتا۔

اچانک میری نظر قینچی پر گئی۔ قینچی پرانی تھی۔ اگر اس پر کبھی پالش اور چمک دمک تھی تو برسوں کے استعمال کے بعد اس کے صرف آثار باقی رہ گئے تھے۔ کہیں کہیں اس پر زنگ کا رنگ بھی غالب آ رہا تھا مگر جس چیز نے مجھے متوجہ کیا تھا وہ خون کا رنگ تھا۔ میں نے اسے اٹھا کے غور سے دیکھا۔ یہ کسی ڈاکٹر یا جراح کی قینچی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تجربہ کار ہوں یا نا تجربہ کار اور گاؤں کے ہوں یا شہر کی فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے، اب اتنا شعور ضرور رکھتے ہیں کہ آلات جراحی کو صاف کر لیں۔ دیہات کے مرہم پٹی کرنے والے بھی گندے اور زنگ آلود اوزاروں کے استعمال سے ہونے والے نقصانات کو سمجھتے ہیں۔

"یہ قینچی اور استرا تم کہاں سے لائے ہو؟" میں نے کہا۔

"اپنے... کوارٹر سے سرکار... میرے ذاتی استعمال کے ہیں نا۔" چوکیدار نے پریشان ہو کے کہا۔

"تو قینچی پر یہ خون کے داغ کیسے ہیں؟"

چوکیدار کو میرے سوال سے پہلے ہی اپنی غلطی کا اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ جلدی میں قینچی کو صاف کیے بغیر اٹھا لایا ہے۔ "صاحب دراصل... ایک پھوڑا کاٹ دیا تھا میں نے، [illegible]"

وہ بدحواس تھا اور جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے کہا "اس پھوڑے کا کوئی نشان تمہارے جسم پر ہے؟"

"ہے تو سہی۔" اس نے گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھا۔

"مگر تم سب کے سامنے دکھا نہیں سکتے! ہے نا یہی بات؟ پھر چلو میرے ساتھ دوسرے کمرے میں۔" میں نے کہا اور جب چوکیدار اپنی جگہ سے نہیں ہلا تو میں نے اس کے ایک جھانپڑ مارا۔ وہ دیوار پر گرا اور ہائے ہائے کرنے لگا۔ نازو نے اسے پھر میری جانب دھکیل دیا۔

"پہلی بات تو یہ کہ تمہارے جسم پر کسی پھوڑے کا نشان نہیں ہو سکتا، تم نے جھوٹ بولا تھا۔ تمہارا دوسرا جھوٹ یہ تھا کہ خون پرانا ہے۔" میں نے اس کے دوسرا جھانپڑ زیادہ قوت سے مارا۔ "یہ تازہ خون لگتا ہے مجھے۔"

اس کی صحت پہلے ہی قابل رشک نہ تھی۔ دو بار چکرا کے دیوار سے لگنے کے بعد وہ نیچے گر گیا اور بھوں بھوں کر کے رونے لگا۔ ...میں خون کی پہچان میں مہارت کا کوئی دعویٰ نہیں رکھتا تھا لیکن چوکیدار کے جھوٹ نے مجھے اندھیرے میں تیر چلانے کا موقع فراہم کیا تھا اور یہ تیر نشانے پر جا لگا تھا۔

"پولیس والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہو سؤر کے بچے۔" میں نے اسے گریبان سے دبوچ کے اوپر اٹھایا اور پھر دیوار پر پھینک دیا۔ "میں تو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ خون مرد کا ہے یا عورت کا اور مقتول کی عمر کیا تھی۔ سچ بولو کس کو قتل کیا ہے تم نے؟"

"قتل!" چوکیدار کے حلق سے عجیب سی چیخ نکلی۔ "خدا کی قسم سرکار، میں نے کسی کو نہیں مارا، میرے بیوی بچے مر جائیں اگر یہ جھوٹ ہو۔"

میں نے غالب سے کہا۔ "ذرا اس کو دوسرے کمرے میں لے جا کے اس کے کپڑے اتارو اور پیچھے سے الٹا لٹکا کے اسے تب بولنا سکھاؤ۔ اس سے کہو کہ اپنے بیوی بچوں کو بھی بلا لے، جب تک وہ پیش نہ ہوں... الٹا۔"

غالب نے کہا "میرا خیال ہے سر، اس کو جیپ میں ڈال کے تھانے لے چلتے ہیں۔ وہیں آج رات سب معلوم ہو جائے گا۔"

چوکیدار شاید اچھا ایکٹر تھا۔ وہ فرش پر لمبا پڑا ہوا ہانپ رہا تھا اور پھڑک رہا تھا جیسے اس پر نزع کا عالم طاری ہو مگر غالب کی بات سنتے ہی وہ بڑی پھرتی سے اٹھا اور اس سے پہلے کہ نازو سنبھلتی، وہ پھر اس کے پیروں سے چمٹ گیا۔ "سرجی، مجھے معاف کر دیں، میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میرے کوئی بیوی بچے نہیں، میں آپ کو سب بتا رہا ہوں۔ بس آپ مجھے تھانے مت لے جائیں۔ میں مر جاؤں گا سرجی۔ آپ کو اپنے ماں باپ کی قسم۔"

"یہ کیا مصیبت ہے!" نازو نے جھنجلا کے کہا "پیچھے ہٹو، ذلیل انسان! مگر اب جھوٹ مت بولنا۔"

ماں باپ کے سر کی قسم دے کر چوکیدار نے بڑی چالاکی کا ثبوت دیا تھا اور ایک بار پھر نازو کو بے بس کر دیا تھا ورنہ وہ سر پکڑنے پر شاید وہ اسے فٹ بال کی طرح اچھال دیتی۔ چوکیدار کی جذباتی اپیل اپنا اثر دکھا گئی۔

نازو سے تھوڑی کی ضمانت حاصل ہوتے ہی وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں اب بھی کانپ رہی تھیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جو بالکل حقیقی تھے اور خوف کا نتیجہ تھے۔

اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "سرکار، وہ کوئی بہت خطرناک آدمی تھا۔ آج صبح صبح اچانک آ گیا تھا۔ معلوم نہیں کہاں سے وہ چھپتا ہوا یہاں پہنچا تھا اور دیوار پھاند کے اندر گھس آیا تھا۔ اس نے لات مار کے مجھے جگایا۔ میں برآمدے میں سو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔ اس کا دوسرا بازو زخمی تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ پولیس اس کو ہر جگہ تلاش کرتی پھر رہی ہے اور اگر میں نے اس کے بارے میں کسی کو کچھ بتایا تو وہ کسی دن پھر رات کو آ جائے گا اور مجھے سوتے میں گولی مار جائے گا۔ وہ ڈاکو تھا لیکن لگتا نہیں تھا۔"

چوکیدار کے بیان نے ہم سب کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ "یہ کیسے اندازہ کیا تم نے؟"

"اس نے کہا کہ زخم صاف کر کے پٹی باندھو۔" چوکیدار نے اپنا بیان جاری رکھا۔ "میں اسے اندر اپنے کوارٹر میں لے گیا۔ پہلے اس کی آستین کو قینچی سے کاٹ کے الگ کیا۔ کپڑا خون کے ساتھ چپک گیا تھا۔"

"زخم کس چیز کا تھا، چاقو کا یا گولی کا؟" غالب نے کہا۔

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا سرجی۔ زخم سے خون بہہ رہا تھا۔" چوکیدار نے کہا۔

"یہ تو دیکھا ہو گا تم نے کہ زخم معمولی ہے... یا گہرا۔" نازو نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"زخم گہرا نہیں تھا سرجی، ذرا سی بوٹی کٹ گئی تھی۔"

"زخم کس ہاتھ پر تھا اور کہاں؟" نازو نے کہا۔

"الٹے ہاتھ پر، کہنی سے ذرا اوپر۔" چوکیدار نے سوچ کے کہا۔ "میرے پاس کچھ نہیں تھا جی۔ میں نے اس کو بتا دیا تھا کہ مجھے پٹی کرنا بھی نہیں آتی لیکن ڈیٹول تھی میرے پاس۔ اس نے خود زخم دھو لیا۔ پھر اس نے کہا کہ اس پر کوئی بھی صاف کپڑا باندھ دو کہ اس سے خون رک جائے۔ اس نے مجھ سے کپڑے بھی مانگے۔ میرے کپڑے اس کو نہیں آ سکتے تھے۔ وہ آپ کے جیسا تھا جی۔ لیکن... میرے پاس کچھ کپڑے پڑے ہوئے تھے... جو یہاں لوگ بھول گئے تھے۔ کسی کی قمیص، کسی کا پاجامہ۔ ایک کوٹ بھی تھا۔ وہ میں نے اس کو دے دیا۔ اس نے مجھ سے ناشتہ بھی منگوا کے کھایا۔ درد کی گولیاں بھی تھیں میرے پاس۔ وہ میں نے اسے دے دیں۔ وہ بہت خوش ہوا، کہنے لگا چوکیدار، میرے کپڑوں کو جلا دینا یا کہیں گاڑ دینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے تم پکڑے جاؤ۔ اس وقت میرے پاس تم کو انعام میں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور جو ہے وہ تمہارے لیے بے کار ہے۔ اس نے جیب میں سے کچھ نوٹ نکال کے دکھائے اور بولا، اگر کام کے ہیں تو رکھ لو، بمبئی جا کے بدلوا لینا۔ میں نے لے لیے۔ چار نوٹ تھے۔"

میں نے کہا "وہ کیسے نوٹ تھے، کہاں ہیں وہ نوٹ؟"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ "پاکستانی نوٹ تھے سرکار۔ یہ دیکھ لیں۔ سو سو کے نوٹ تھے۔ میں نے سوچا، بمبئی جا کے بدلوا لوں گا۔ پاکستان جانے والوں کو ضرورت رہتی ہے۔"

میں ان نوٹوں کو ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ پھر میں نے وہ کاغذ کے پرزے غالب اور نازو کی طرف بڑھا دیے جو صرف پاکستانی کرنسی نہیں تھے۔ وہ محسن کی خیر دینے والے معتبر حوالے تھے۔ ان کے لمس میں محسن کے قرب کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ میں نے ایک دم چوکیدار کے دونوں شانے پکڑ لیے اور اسے زور زور سے ہلانے لگا۔ "وہ کہاں گیا... کہاں گیا؟ اپنے بارے میں اس نے تمہیں اور کیا بتایا؟"

چوکیدار بدحواس ہو گیا۔ "بس سرکار، سورج نکلتے ہی وہ چلا گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کدھر گیا۔ میرے پاس جو کچھ تھا میں نے دے دیا تھا بھیس بدلنے کے لیے۔ ایک کالا چشمہ تھا، ایک ٹوپی تھی اور چھتری تھی۔ وہ میری چادر بھی لے گیا تھا اور بوڑھوں کی طرح جھک کر چھتری کی مدد سے ایسے چل رہا تھا جیسے وہ دیکھ نہیں سکتا۔ اور ہاں، جاتے جاتے اس نے مجھ سے ایک عجیب سوال کیا... اس نے کہا کہ چوکیدار، تم نے اس علاقے میں کسی اجنبی کو دیکھا ہے؟ میں نے کہا کہ اجنبی تو اس وقت بھی کمرے میں سوئے پڑے ہیں اور آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ ساتھی ہیں میرے۔ تین عورتیں ہیں، دو مرد ہیں۔"

"پھر... تم نے کیا کہا؟" نازو نے تیز ہو کے چلاتے ہوئے کہا۔

"میں... میں نے کہا کہ نہیں۔ اور کیا کہتا میں سرجی۔" چوکیدار بولا "معلوم نہیں کون تھا وہ؟"

"پھر... وہ چلا گیا۔ اس نے کوئی پیغام نہیں دیا؟ کسی کے لیے بھی؟" غالب نے ایسے ہی کہا۔

"نہیں سرکار، میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اس نے کچھ کہا ہوتا تو میں آپ کو بتا دیتا۔ میرا خیال ہے آپ لوگ اسی کے پیچھے آئے تھے۔" چوکیدار نے کہا "اگر وہ آپ کو مل جائے... تو اسے مت بتانا یہ سب، ورنہ وہ مجھے مار ڈالے گا۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جو بیک وقت امید کی روشنی دیتا تھا اور ناامیدی کا اندھیرا۔ امید کہتی تھی کہ وہ اسی علاقے میں ہے اور ہم سے زیادہ دور نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی ہماری تلاش میں سرگرداں ہے اور یہ تو میری تلاش رائیگاں نہیں جا سکتی۔ وہ ہمیں ڈھونڈ لے گا یا ہم اسے پا لیں گے۔ پھر ناامیدی کا اس زوال،

www.paksociety.com

جاری آ جاتی تھی۔ آخر یہ امید محض دل کے بہلانے کے لیے خوش خیالی کے سوا کیا ہے؟ اسے ملنا محض حسنِ اتفاق کی بات ہے۔

سب سے پہلے غالب نے کہا "اب یہاں دیر کرنے سے نقصان ہوگا۔ وہ زیادہ دور چلا جائے گا۔"

میں نے کہا "جب تک وہ مل نہیں جاتا، دور اور نزدیک سب برابر ہے لیکن یہاں رکنے میں فائدے سے زیادہ نقصان کا احتمال ہے۔"

ماذو نے کہا "دوپہر ہو چکی ہے، اب چلو۔"

میں نے پیر عنایت کی طرف دیکھا۔ اس کی سزا کا مسئلہ وقتی طور پر فراموش کر دیا گیا تھا۔ اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے رابعہ اور گل کے ساتھ غائب ہو جانے والے خانہ بدوش قبیلے کی تلاش کا کام پولیس پر چھوڑ دیا تھا۔ آصف جاہ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ قبیلے کا سراغ لگا لے گا لیکن آصف جاہ کے پاس پولیس کی نفری محدود تھی اور اس کی عملداری کا علاقہ بہت وسیع تھا۔ مجھے اس کی نیت پر شک نہیں تھا مگر عملاً یہ ناممکن تھا کہ وہ سب کام چھوڑ کے صرف ایک خانہ بدوش قبیلے کی تلاش شروع کر دے۔ اس کے علاقے میں جرائم بھی ہوں گے اور اسے رسمی کارروائی بہرحال کرنا ہو گی۔ پھر آج کل تو اس علاقے میں پولیس ویسے ہی بہت سرگرم عمل ہے اور پولیس کے اعلیٰ افسران کی نگرانی میں دہشت گردی کے حالیہ واقعات کی تفتیش جاری ہے۔ آصف جاہ نے ہماری مدد کر کے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا اور اگر اس نے اپنے معمولی فرائض اور خصوصی احکامات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہماری خاطر اس خانہ بدوش قبیلے کی جستجو میں غیر ضروری دلچسپی کا مظاہرہ کیا تو وہ اپنی پوزیشن کو زیادہ مشکوک بنا لے گا۔ پیر عنایت اس معاملے میں ہماری زیادہ مدد کر سکتا تھا کیونکہ اس کے وسائل کی پوزیشن بہت بہتر تھی۔ اس کا حلقۂ اثر آصف جاہ کے دائرۂ اختیار سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ آصف جاہ صرف اپنے ماتحتوں سے کام لے سکتا تھا۔ سرکاری احکامات کو ماننے کے باوجود حرام خوری میں طاق اور کام چور پولیس کے اہلکار اس وقت تک کوئی کام نہیں کرتے جب تک خود انہیں اس کام سے فائدہ حاصل نہ ہو۔ لیکن پیر عنایت کے مرید "سرکاری اہلکار" نہیں تھے۔ وہ عقیدت مند اور اعتقاد رکھنے والے لوگ تھے جو اپنے پیر صاحب کے حکم پر نکل کھڑے ہوتے تو اس علاقے کے چپے چپے کو کھنگال سکتے تھے۔ پھر یہ ناممکن تھا کہ وہ قبیلہ روپوش رہ سکے۔ چوکیدار کو مثال بنا کے یہ فرض کرنا غلط تھا کہ سب مرید ایسے ہی منافق ہوں گے۔ زیادہ ایسے ہوں گے جو فرطِ جذبات میں اپنے پیر کے لئے تن من دھن سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔

غالب نے مجھے تذبذب میں دیکھ کے کہا "اب کچھ اور سوچا ہے پیر جی کے معاملے میں؟"

ماذو نے کہا "یہی بہتر ہے کہ انہیں انسان کا روپ دے کر

چلتا کرو۔ نیک کام میں دیر کیسی؟"

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پیر عنایت سے کہا "فرض کرو تمہیں معاف کر دیا جائے۔ تمہارا جرم غداری تھا۔ بہت سنگین جرم ہے، تم نے ہم سے دغا کی تھی۔"

غالب نے مجھے حیرانی سے دیکھا "اور دوسرے جرائم؟ وہ اس کی فردِ جرم میں پہلے سے موجود تھے۔ جن کا خود تم نے حوالہ دیا تھا۔"

میں نے کہا "اگر میں چشم پوشی سے کام لوں۔ جو کچھ اس نے خلقِ خدا کے ساتھ کیا، اس کی سزا دینا خدا پر چھوڑ دوں تو کیا تم اسے احسان مانو گے؟"

غالب نے برہمی سے کہا "کیا ضرورت ہے ایک ایسے شخص پر احسان کرنے کی جو نہ احسان کو مانتا ہو اور نہ محسن کو۔ جس کی فطرت میں فریب ہو اور خمیر میں خباثت۔"

میں نے کہا "یار! میں نے سوچا ہے کہ ہم ان معاملات میں کیوں ملوث ہوں۔ اس جیسے تو ہزاروں نہیں لاکھوں ہیں۔ اخلاقی اور قانونی جرائم میں ملوث افراد کی تعداد شاید کروڑوں تک پہنچ جائے۔ ہم ان سب کے خلاف جنگ کرنے تو نہیں نکلے ہیں۔ عوام کے اعتماد کو دھوکا دے کر انہیں لوٹنے والے چوروں میں تو بدعنوان سیاستدان، تاجر، جرائم پیشہ افراد کے مددگار، ڈاکٹر، وکیل، جعلی ڈگریاں چھاپنے سے جعلی دوائیں بنانے والے تک سب ہی شامل ہیں۔ ہم کس کس کو سزا دیں گے اور کیا یہ ہمارا کام ہے؟ کیا ہم یہ کام کر سکتے ہیں؟"

غالب اور ماذو نے میرے خیالات میں اس تبدیلی پر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر سر ہلایا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ تبدیلی بے سبب نہیں ہو سکتی اور اب یہ جاننا چاہتے تھے کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔

غالب نے میری پالیسی میں تبدیلی کی تائید میں بیان جاری کرنا ضروری سمجھا "خیال تو یہ بھی ٹھیک ہے آپ کا۔ ویسے بھی عفو و درگزر سے کام لینے کا حکم ہے۔ بھلائی بھی اسی میں ہے۔"

میں نے اس کے لہجے کے طنز کو نظر انداز کر دیا "پیر عنایت اپنے گناہ و ثواب اور نیکی بدی کا خود ذمے دار ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں، عنایت کو چھوڑنا کسی مجرم کو سزا دیے بغیر چھوڑنے کے مترادف ہے۔ اس سے جرم کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ یہ واپس جا کے پھر پیری مریدی سے لوگوں کو بے وقوف بنا کے لوٹنے کا دھندا شروع کر دے گا مگر ہمیں کیا؟ اسے اپنی قبر میں جانا ہے، ہمیں اپنی قبر میں۔"

پیر عنایت کو اب یقین آنے لگا تھا کہ میری سوچ میں یہ تبدیلی کوئی ڈراما نہیں ہے بلکہ ایک معجزہ ہے جس نے اس کی زندگی ہی نہیں عزت، رزق اور مستقبل کو بھی تحفظ فراہم کر دیا ہے۔

ماذو نے جز بز ہو کے کہا "مگر اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی ہمیں مروانے میں۔"

میں نے کہا "بس یہی ایک جرم ہے اس کا۔ لیکن میں اس سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ہم اسے معاف کر دیں تو یہ اس احسان کا بدلہ کیسے چکائے گا؟"

پیر عنایت کی قوتِ گویائی پورے اعتماد کے ساتھ لوٹ آئی۔ "ایک موقع دو اور مجھے آزما کے دیکھ لو۔ تم جیسے چاہو میں یقین دلاتا ہوں۔ میں اپنی غلطی کو، اپنے جرم کو، اپنے گناہ کو تسلیم کرتا ہوں اور تم سے معافی مانگتا ہوں۔ مجھے بتاؤ اس کا کفارہ میں کیسے ادا کروں۔ تمہارا احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا اور اس کے بدلے میں سب کچھ کروں گا۔"

میں نے کہا "خدا کو حاضر ناظر جان کے کہہ رہے ہو؟"

ماذو نے بگڑ کے کہا "کس شخص کی قسم پر اعتبار کرنے چلے..."

میں نے کہا "یہ کیسا بھی گنہگار ہو، کافر بہرحال نہیں ہے۔ یہ اٹھا کے وعدہ کرے گا۔"

پیر عنایت کا رنگ ذرا سی دیر کے لئے بدلا "کس بات کا؟"

میں نے چوکیدار سے کہا "مسلمان تم بھی ہو، تمہارے گھر قرآن مجید ضرور ہو گا، جا کے لے آؤ۔"

غالب نے کہا "یہ ٹھیک ہے، عنایت قرآن کو ہاتھ میں لے کر حلف اٹھائے گا۔ اگر جھوٹا حلف اٹھائے گا تو خدا کے قہر سے نہیں بچے گا۔ اس کے انجام سے دنیا عبرت پکڑے گی۔"

پیر عنایت نے حواس باختہ ہو کے کہا "آخر تم کیا چاہتے ہو؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔"

میں نے کہا "بہت معمولی سا کام ہے جو تم کر سکتے ہو، کوئی مشکل بات نہیں ہے۔"

ماذو کو میرے موقف سے شدید اختلاف تھا لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے ایک اور نکتہ اٹھایا "پیر عنایت نے ناجی کو قتل کرانے کی کوشش کی تھی۔ یہ ناجی کا بھی ... ہے۔ اس سے بھی پوچھ لو کہ وہ اسے معاف کرنے پر تیار ہے کہ نہیں۔"

میں نے کہا "یہ معاملہ واقعی قابلِ غور ہے۔ جتنی دیر میں چوکیدار آتا ہے میں ناجی سے بات کرتا ہوں۔"

ناجی چائے پینے اور مٹھائی کی پلیٹ صاف کر دینے کے بعد کمرے میں پاؤں پسارے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے کہا "ناجی، تمہاری پیر عنایت کے ساتھ دشمنی کا سبب کیا ہے؟"

اس نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی "کوئی خاص سبب تو نہیں، بس ایسا ہی آدمی ہے۔"

میں نے کہا "اس نے پولیس سے کہا تھا کہ پہلے تمہارا کام تمام کر دو۔ تم سے کچھ پوچھے بغیر۔ اور میں نے تمہیں بچا نہ لیا ہوتا تو اس وقت تم یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔ تمہاری لاش پڑی ہوتی جنگل میں۔"

ناجی کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا "پیر عنایت کی ایک لڑکی ہے۔"

میں پہلے حیران ہوا۔ پھر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "تو یہ چکر ہے! صورت سے تو بہت سیدھے سادے لگتے ہو تم۔ پیروں کی لڑکیاں..."

"وہ جی۔ ایسی کوئی بات نہیں" اس نے جلدی سے کہا۔

"پھر کیا بات ہے؟" میں نے کہا "تم خود بتاؤ۔"

"وہ جناب، وہ... محبت کرتی ہے مجھ سے۔"

"اچھا! اور تم کیا کرتے ہو؟ تم محبت نہیں کرتے؟" میں نے ہنس کے کہا۔

وہ شرمندہ ہو کے ہنسنے لگا "میں تو شادی کرنا چاہتا تھا اس سے... میں نے پیر عنایت سے کہہ دیا کہ ساری عمر غلامی کروں گا۔ ایسی کون سی غلط بات کی تھی جناب میں نے؟ کیا خرابی ہے آخر مجھ میں؟ ہر کام کر سکتا ہوں میں۔ ان پڑھ بھی نہیں ہوں اتنا۔ بس ایک گھر نہیں ہے۔ گھر والے اگر نہیں رہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ یہ تو اللہ کی مرضی کی بات ہے۔ گھر بنانے کے لئے ہی تو شادی کرنا چاہتا تھا میں۔ رہنے کو جگہ بنا لیتا۔ کما کر اسے کھلا بھی سکتا تھا اور بڑے آرام سے رکھنے کا وعدہ بھی کیا تھا میں نے لیکن اس نے مجھے بہت پٹوایا۔ اس کے حکم پر مجھے باندھ کے مارا گیا۔ وہ تو بس اللہ نے بچا لیا، عین وقت پر آصف جاہ صاحب آ گئے۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہی میرا علاج کرایا۔ اور یہ سچ ہے کہ وہ نہ ہوتے تو پیر عنایت مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔ بعد میں مروا دیتا لیکن میری وجہ سے وہ بہت پریشان تھا۔ اس نے پوری کوشش کی تھی کہ بیٹی کی شادی کر دے۔ بات بھی کی تھی کسی سے مگر ایک تو بیٹی نے صاف کہہ دیا کہ وہ سب کے سامنے ذلیل کرا دے گی۔ صاف انکار کر دے گی نکاح کے وقت۔ پھر اس کی ماں اڑ گئی۔ عنایت نے بیٹی کا رشتہ جس سے طے کیا تھا وہ بھی ایک جعلی پیر ہے۔ اس کی عمر خود پیر عنایت سے کسی طرح کم نہیں۔ ماں نے کہا کہ باپ کے گھر میں تو مجبوری تھی، وہ جاتی تو کہاں جاتی۔ لیکن شوہر کے ساتھ تمام عمر دھوکے فریب کی کمائی کھائے اور پھر اولاد کو کھلائے۔ یہ نہیں ہو گا۔"

"یہ سب تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"خود اس نے بتایا تھا مجھے۔"

"تم ملتے رہتے تھے اس سے، اتنی مار کھانے کے باوجود!" میں نے کہا۔

"وہ جی، پیر عنایت کا بس چلتا تو وہ خود مجھے گولی مار دیتا لیکن ایک تو بات کچھ پھیل گئی تھی اور اس کی بدنامی ہو رہی تھی۔ پھر خود زینب میرے حق میں تھی۔"

"اب میں سمجھ گیا۔ اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ تمہارا قصہ ہی پاک ہو جائے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری" میں نے کہا "خیر"

www.paksociety.com

اب خدا نے چاہا تو تمہارا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔"
"وہ کیسے جی؟" نائی نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔
"میرا خیال ہے کہ پیر عنایت تمہارا رشتہ منظور کرے گا۔" میں نے کہا۔
"یہ ناممکن ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا جی" وہ بے حد اداس اور دل گرفتہ ہو گیا۔
"محبت کرنے والے تو کبھی مایوس نہیں ہوتے" میں نے کہا اور سوچا کہ اسے ایک شعر سناؤں جو بہت حسب حال تھا۔

جو تجھ سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں
علاج گردش لیل و نہار رکھتے ہیں

مگر نائی کے لئے شعر کو سمجھنا مشکل ہوتا چنانچہ میں نے اس کا مفہوم واضح کر دیا۔
میں نے کہا "اس راستے پر چلنے والے کبھی راستے کی مشکلات سے نہیں گھبراتے۔ حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے جب تک دم میں دم ہے۔ اگر تم اتنی جلدی ہمت ہار بیٹھے ہو تو پھر میرا خیال ہے کہ یہ محبت نہیں تھی۔ بس تم کو وہ لڑکی اچھی لگی تھی۔ پھر کوئی اور اچھی لگے گی۔ اس عمر میں تو ہر لڑکی ہی اچھی لگتی ہے جو مسکرا کے دیکھ لے۔"
اس کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے کسی بدمعاش سے تھپڑ کھانے والے عزت دار مگر کمزور آدمی کا چہرہ "ایسا مت کہیں جی! اس کی خاطر میں جان بھی دے سکتا ہوں' صرف اس کی خاطر۔"
میں نے کہا "جان لینے کا حوصلہ نہیں رکھتے؟"
"کیا مطلب جی! ابھی پیر عنایت کو مار دوں؟"
میں نے ہنس کے کہا "میں نے ایسا کوئی مشورہ نہیں دیا۔ میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ فلاں کو قتل کر دو۔ اصل بات تو حوصلے کی ہے۔ محبت ہو تو ایسی ہو کہ راستے میں کوئی بھی دیوار آئے اسے گرا دے۔ میں ظالم سماج کی دیوار کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ کوئی بھی مشکل ہو۔ تم اگر سچی لگن رکھتے ہو تو تمہیں یہی سوچنا چاہئے کہ اس پر قابو پانے کے لئے مقابلہ کرو گے' آخری وقت تک۔ جب یہ طے کر لو کہ اسے حاصل کرنا ہے تو پھر سب کی ایسی تیسی۔"
وہ ہکا بکا میری صورت دیکھتا رہا "میری جگہ آپ ہوتے جی تو آپ کیا کرتے؟"
"میں کبھی میدان چھوڑ کے نہ بھاگتا' پیر عنایت کا باپ بھی مانتا میری بات۔"
"اس کے لئے آپ کیا کرتے؟"
"میں بہت کچھ کر سکتا تھا۔ میں بھوت بن کے چمٹ جاتا پیر عنایت کو' اس پر سفلی عمل کرا دیتا۔ اس سے بھی بڑے پیر کے پاس جاتا اور تعویذ لے آتا" میں نے کہا "وہ گانا سنا ہے تم نے۔ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ میں تو اپنی اور اس کی جان ایک کر دیتا۔"
نائی نے پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا "آپ ناراض تو نہیں ہوں گا... میں ایک بات پوچھوں؟ آپ نے محبت کی ہے کبھی؟"

میں اس بے وقوف نظر آنے والے دیہاتی لڑکے کی معصومیت پر حیران رہ گیا "ہاں۔ محبت سب ہی کو ہو جاتی ہے کسی نہ کسی سے۔ جو کم ہمت ہوں وہ بازی ہار جاتے ہیں۔"
"آپ نے بازی جیت لی ہے جی! اسی طرح" نائی کے لہجے میں رشک اتر آیا۔
"اسی طرح کیا مطلب؟ میری راہ میں کوئی حائل نہیں ہوا۔"
"ورنہ آپ کیا کرتے؟ سب کی ایسی تیسی کر دیتے؟" اس نے میرے ہی الفاظ میں اپنا مفہوم واضح کیا۔
"بالکل۔ اگر میرا کوئی رقیب ہوتا۔ رقیب سمجھتے ہو؟ جیسے تمہارے سامنے دوسرا پیر آ گیا تھا جس سے اس کے رشتے کی بات چلی تھی۔ میں اس کی بھی ایسی تیسی کر دیتا۔"
"اور اگر وہ لڑکی ہی آپ کا ساتھ نہ دیتی... پھر؟"
میں نے سوچ کے کہا "یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا ہوتا تو... میرا خیال ہے کہ میں اسے بھی نہ بخشتا۔"
"اس کی بھی ایسی تیسی کر دیتے؟" نائی دم بخود رہ گیا۔
"اور کیا۔ بھئی محبت ہو تو ایسی ہو کہ تم نہیں تو ہم نہیں اور ہم نہیں تو تم نہیں۔ اور ہم دونوں نہیں تو پھر کچھ نہیں۔ کیا یہ دنیا کیا وہ دنیا۔ کیا جنت کیا جہنم" میں نے برہمی سے کہا۔
اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں جذباتی ہو رہا ہوں۔ مجھے اپنے فلسفہ محبت کے حق میں اتنی شدت کے ساتھ دلائل دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ رابعہ کے معاملے میں میرے جتنے جذبات بھی تھے مگر نائی کے سامنے میرا رد عمل قطعی نامناسب تھا... شاید میں جذباتی انتشار کے باعث حد سے زیادہ حساس ہو گیا تھا... کیا یہ رابعہ سے دوری کا نتیجہ تھا یا اس قربت کا جو دوری سے زیادہ صبر آزما تھی۔ جب نظر کے سامنے کوئی نہ ہو تو خیال کو تصور سے بہلانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ مگر کوئی اتنے قریب رہ کے بھی اتنی دور ہو اور دوری ہی سب سے بڑی مجبوری بن جائے تو اعصاب ہی ساری اذیت جھیلتے ہیں۔
غالب نے اندر سے جھانک کے اور چلا کے کہا "یہ خاموش مذاکرات کب تک چلتے رہیں گے؟"
میں نے چونک کر کہا "نائی! تم فکر مت کرو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
میں اندر گیا تو نازو کی نظر کا سامنا نہ کر سکا جو احتجاجی انداز میں گھڑی دیکھ رہی تھی اور وقت کے بے سبب زیاں پر خفا تھی۔ تاہم میرے نزدیک یہ سب کچھ ضروری تھا۔
میں نے چوکیدار کے ہاتھ سے قرآن پاک لے کر چوما اور پیر عنایت کو تھما دیا "تمہاری باعزت رہائی کے لئے میری شرائط بہت معمولی ہیں مگر تم کو حلف اٹھا کے یہ آواز بلند وعدہ کرنا ہو گا۔"
"کیا وعدہ کرنا ہو گا؟" پیر عنایت نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔
"ایک تو تم اپنے مریدوں کی مدد سے اس قبیلے کا پتا چلاؤ گے

جو رابعہ اور گل کے ساتھ غائب ہو گیا ہے۔ تمہارے سیکڑوں بلکہ ہزاروں مرید ہوں گے۔ ان کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں" میں نے کہا۔
"مگر میں رابعہ اور گل کو نہیں جانتا" پیر عنایت نے کہا۔
"یہ سب تفصیلات تم آصف جاہ سے حاصل کر سکتے ہو" میں نے بگڑ کے کہا "بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم نے تعاون نہ کیا تو پھر تمہارے ساتھ وہی سلوک ہو گا جس کے تم مستحق ہو۔"
پیر عنایت نے آہستہ سے کہا "میں کب انکار کر رہا ہوں مگر پتا تو چلے۔"
"جب اس قبیلے کا سراغ مل جائے تو خاموشی سے رابعہ اور گل کو اس بنگلے میں پہنچا دو۔ اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر یہ کام آسانی سے ہو سکتا ہے۔ ان کی حفاظت اور سلامتی کی ذمہ داری تم پر ہو گی۔ پھر ہم انہیں لے جائیں گے یا تمہیں وہ [illegible] مل جائے گا۔ ہم کوئی بندوبست کر لیں گے' تمہاری ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔ کیا تم یہ کام کر سکتے ہو؟"
پیر عنایت نے اقرار میں سر ہلایا۔
میں نے کہا "ایسے نہیں' زبان سے اقرار کرو' جو میں کہتا جاؤں دہراتے جاؤ۔"
پیر عنایت بری طرح پھنس گیا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ قرآن کی قسم یا حلف اٹھانے یا حلف کے الفاظ میں ہیرا پھیری کرتے ہوئے حیلہ سازی کرے۔ میں نے قرآن پاک کو گواہ بناتے ہوئے اس سے جو حلف لیا وہ رابعہ اور گل کی بازیابی اور بہ حفاظت واپسی کو یقینی بنانے کے لئے کافی تھا۔ پیر عنایت کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے اپنی عزت اور آزادی کی جو قیمت ادا کی ہے... مجبوراً کی ہے مگر اس میں اتنی ہمت نہیں کہ بندوں کی حد سے بڑھ کر نعوذ باللہ خدا کو بھی دھوکا دے سکے۔
غالب اور نازو بہت مطمئن نظر آ رہے تھے۔ پہلے انہیں اندازہ نہیں تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ اب وہ کچھ محجوب بھی تھے۔ ان حالات میں یہی بہترین حکمت عملی تھی کہ دشمن سے سودا کر لو۔ اسے رعایت دو تو اس سے کچھ فائدہ بھی حاصل کر لو۔ پیر عنایت کو حلف کی زنجیروں میں باندھنے سے ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو جانے کی امید پیدا ہو گئی تھی اور اس ذہنی پریشانی سے وقتی طور پر نجات کے امکانات روشن ہو گئے تھے جو ہم سب کو رابعہ اور گل کی طرف سے لاحق تھی۔
پیر عنایت نے قرآن پاک واپس چوکیدار کے حوالے کر دیا۔ "کیا اب تم مطمئن ہو؟"
میں نے کہا "ایک وعدہ اور کرنا ہے تمہیں۔"
"تم میری مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو" پیر عنایت نے کہا۔
میں نے مشتعل ہو کے کہا "ہاں۔ وقت وقت کی بات ہے۔ جب ہم مجبور تھے تو تم نے اپنی پوزیشن سے پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

تم نے ہم سب کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ کسی لحاظ کے بغیر تم نے انہیں خون کے پیاسے دشمنوں کے حوالے کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ تم نے نائی کے قتل کی سازش کی تھی اسی بہانے۔ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ کسی طرح بھی جرم یا گناہ نہیں ہے۔ اس میں ہمارا فائدہ ضرور ہے لیکن تمہارا کوئی مالی یا جانی نقصان نہیں ہے۔ جو کچھ تم کرو گے اس میں کوئی پہلو غیر اخلاقی یا غیر قانونی ہے تو مجھے بتاؤ' اتنا مجھے احساس ہو رہا ہے کہ مجھے تم کو ایسے چھوڑنا نہیں چاہئے مگر مجبور تو میں ہوں۔"
پیر عنایت نے کہا "اچھا بتاؤ اور کیا کرنا ہو گا مجھے۔"
میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "تم اپنی بیٹی کے لئے نائی کا رشتہ منظور کرو گے۔"
پیر عنایت بھڑک اٹھا "ہرگز نہیں' یہ میں کبھی نہیں ہونے دوں گا۔"
میں نے سخت لہجے میں کہا "یعنی تمہیں اپنی سزا منظور ہے' ذلت و رسوائی منظور ہے۔"
"تم اپنی بات کرو' اس کی وکالت مت کرو۔ اس نے میری عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس کو معاف نہیں کر سکتا" پیر عنایت چلانے لگا۔
"وہ باعزت طور پر تمہاری بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہی درخواست کی تھی اس نے جس کے جواب میں تم نے اس کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ مجھے سب معلوم ہے عنایت" میں نے اس کے منہ پر ایک مکا رسید کیا۔
وہ اس مرحلے میں ایسے سلوک کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کا غصہ ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ شدید احساس ذلت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آج تک ہاتھ اسے سلام کرنے کے لئے اٹھتے رہے تھے اور سوالی بن کے اس کی بارگاہ میں پھیلتے رہے تھے۔ میرا پہلا ہاتھ تھا جو اس پر وار کرنے کے لئے اٹھا تھا... اس احساس کی ذہنی اذیت ہی پیر عنایت کے لئے کم نہ تھی۔
"دیکھو' اس کا میرا کوئی جوڑ نہیں ہے" پیر عنایت نے بڑی مشکل سے کہا۔
"تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ ایک شریف لڑکا ہے جو تم جیسے رذیل کی بیٹی کو قبول کر رہا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ باپ برا ہے مگر بیٹی بری نہیں ہے۔ یہ اس کی فراخ دلی ہے کہ وہ تمہاری دھوکے فریب کی زندگی کے ہر پہلو کو سمجھتا ہے مگر اس کے باوجود تمہیں ذلت نہیں عزت دے رہا ہے۔ یہ ایک نیکی ہو گی اگر وہ تمہاری بیٹی کو اپنے گھر لے جائے گا اور اسے عزت کے ساتھ رزق حلال کی وہ بابرکت زندگی دے گا جس سے وہ محروم ہے۔ تم کو یہ رشتہ منظور کرتے ہوئے خدا کا شکر گزار بھی ہونا چاہئے پیر عنایت۔"
پیر عنایت کے ذہن کو میری منطق نہیں بدل سکتی تھی۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔
میں نے کہا "اگر اب بھی تمہیں انکار ہے تو سمجھو تم نے

www.paksociety.com

حلف کے پابند نہیں رہے۔ جو تمہارا دل چاہے کرو۔ ہم بھی وہی کریں گے جو ہمیں کرنا چاہیے۔ میں تمہارا چہرہ اور سر مونڈ کے کالا کروں گا۔"

عنایت نے پیچھے ہٹتے ہوئے چیخ کر کہا "خبردار! جو کوئی میرے قریب آیا۔"

پیر عنایت نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جسمانی طور پر وہ مزاحمت کر سکتا ہے اور ہم یہ کام زبردستی نہیں کر سکتے لیکن دو منٹ بعد ہی اس کی ساری اکڑفوں نکل گئی۔ میں نے اسے نیچے گرا کے اس کے دونوں بازو لاک کر دیے اور اپنے ایک گھٹنے سے دبا لیا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی گردن دبا کے چہرہ فرش سے لگا دیا۔ وہ آنکھیں چلاتا رہا اور چلا چلا کے مجھے فحش گالیاں دیتا رہا لیکن میری گرفت سے رہائی نہ حاصل کر سکا۔ اگر وہ زور لگاتا تو اس کا بازو شانے پر سے اتر جاتا یا کہنی کے پاس سے ٹوٹ جاتا۔ ریڑھ کی ہڈی پر دباؤ کے باعث وہ شدید اذیت میں تھا۔

"سردار خاص، اپنا کام کرو" میں نے چوکیدار سے کہا۔ "پیر صاحب کو انسان بنا دو۔"

چوکیدار پر لرزہ طاری تھا۔ وہ اپنی عقل کے مطابق واقعات سے اصل حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اور خاصا کنفیوز نظر آتا تھا۔ یہ بات اس سے پوشیدہ نہیں رہی تھی کہ ہم پولیس کی وردی میں ضرور ہیں لیکن پولیس والے شاید نہیں ہیں۔ نازو کی زنانہ آواز پر بھی وہ حیران نظر آتا تھا۔ اس کی صورت کے نقوش کی نزاکت اور رعنائی تو پہلی ہی نظر میں دیکھنے والے کو حیران کرتی تھی۔ پولیس والے عموماً اپنے کردار کی بدی کی مناسبت سے بدصورت اور بدہیئت ہوئی جاتے ہیں۔ مردوں میں بھی اس قسم کا زنانہ حسن کہاں ہوتا ہے۔ چوکیدار ہمارے اور پیر عنایت کے درمیان اختلاف و عداوت کے اسباب بھی سمجھنے سے قاصر ہوگا اور ممکن ہے بہت سے ناموں کے ساتھ ہمارے رشتے کو سمجھنے کی کوشش بھی کر رہا ہو۔ مجموعی صورت حال سے وہ سخت وحشت زدہ تھا۔ جب پیر کو اپنی ساری روحانی قوت اور کرشماتی طاقت کے باوجود ایسی عبرت ناک اور رسوا کن شکست کا سامنا ہو تو مرید کا اپنے انجام سے لرزہ براندام ہونا لازمی تھا۔

میرے حکم پر وہ بری طرح چونکا۔ عدم تعمیل کی ہمت اس میں نہیں تھی مگر ذرا سی دیر کے لیے ایک گناہ کے یا جرم کے احساس نے اسے تذبذب میں مبتلا کر دیا۔ اس موقع پر نازو نے ایک بہت فیصلہ کن حربہ آزمایا۔ اس نے بڑی صفائی سے چوکیدار کو اٹھایا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، اسے گھما کے میری طرف پھینک دیا۔ چوکیدار کے حلق سے "ہو، ہو" کے سوا کوئی آواز نہ نکلی اور وہ دھم سے میرے قریب آگرا۔ اس نے چیخ ماری "ہائے میں مر گیا" اور ساکت ہو گیا۔

نازو نے اب ریوالور نکال لیا "ابھی مرو گے تم، اگر میرے

حکم تک گنجے سے پہلے نہ اٹھے۔"

اس کے بعد نا ممکن تھا کہ چوکیدار لیٹا رہتا۔ پیر اور مرید دونوں پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ ہم بام ترک غصہ ہیں۔ جسمانی طور پر ہمارا مقابلہ ناممکن ہے۔ اب معاملہ ختم کرنے کے لیے کوئی کی زبان استعمال کرنے کی نوبت آ گئی ہے تو کاہے کو ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور دیر کی صورت میں ان کا جان سے جانا لازمی ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے مرید نے سزا اٹھانے کے لیے لپکا تو پیر کی نظروں میں بھی دنیا تیرہ و تار ہو گئی۔

"مجھے منظور ہے۔ سور کے بچے، حرام زادو" اس نے فرش پر ماتھا مار کے روتے ہوئے اور گالیاں دیتے ہوئے اعلان کیا۔ "تمہارا سب کا بیڑا غرق ہو، شیطان کے چیلو۔۔ مجھے چھوڑ دو اب تو۔"

میں نے اسے آزاد کر دیا۔ اس کی حالت پر نازو کو ہنسی آ رہی تھی اور اس کی گالیوں پر غالب مشتعل ہو رہا تھا مگر میں نے ان دونوں کو روکا اور باقی کارروائی پوری کی۔ پیر عنایت کو حرف بہ حرف دہرانا پڑا جو میں نے کہا اور یوں نانی کا رشتہ پیر عنایت کی بیٹی سے طے ہو گیا۔ نانی بہت پہلے اندر آ گیا تھا اور سہما سہما ایک طرف کھڑا ہوا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پیر عنایت حلف سے روگردانی کرے گا نہیں سکتا اور نانی کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں رہی۔ وہ اب پیر عنایت کا داماد تھا اور اس کی حفاظت کی ساری ذمے داری خود سسر محترم نے قبول کر لی تھی۔ اس کے باوجود نانی بے اطمینانی کا شکار رہا۔

جب میں نے اسے مبارک باد دی تو اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔۔۔ نازو اور غالب کے چھیڑنے پر وہ رونے لگا۔

میں نے کہا "اب کیوں روتا ہے یار؟ تیرے سب معاملات ٹھیک ہو گئے۔ تم جاؤ اس کے ساتھ۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ آپ نہیں جانتے اسے۔"

نازو نے کہا "بھئی، یہ خسر ہیں تمہارے اب، انہوں نے اپنی فرزندی میں قبول کر لیا ہے تمہیں۔"

غالب نے بھی کہا "ہم نے پکا کام کیا ہے نانی، تم حلف کی حفاظت میں ہو۔"

پیر عنایت آگے بڑھا اور اس نے نانی کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "میں کتنا بھی کمینہ ہوں، کتنا بھی برا ہوں مگر اب تیرے ساتھ کوئی برائی کیسے کر سکتا ہوں بیٹا۔ اللہ کا قہر نازل نہیں ہوگا مجھ پر، اگر میں حلف اٹھا کے مکر گیا۔ ابھی تو صرف تو نے دیکھا ہے میری ذلت کا، پھر سارا جہاں دیکھے گا۔ قبر کا اور آخرت کا عذاب تو بعد میں ملے گا، پہلے اس دنیا میں رسوائی کی موت ملے گی مجھے۔ کوئی شک نہیں رہا مجھے اس میں۔"

وہ ایک دم دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔

نانی نے عادت کے مطابق اس کے پاؤں پکڑ لیے "مجھے …کر دیں جی، پیر صاحب۔"

عنایت نے اسے اٹھا لیا "نہیں، مجھ گنہگار کے پیر مت پکڑ … تو بار میرے منہ پر، مجھ روسیاہ کے منہ پر تھوک۔"

… معلوم نہیں یہ ایک عارضی جذباتی ردعمل تھا یا واقعی اس … سے گزر کے پیر عنایت کی عقل پر پڑا ہوا پردہ ہٹ گیا تھا … کے لیے یہ دل کے منقلب ہونے کے عمل کی شروعات … زندگی بھر گمراہی کے اندھیرے میں بھٹکنے والے کو بھی … کسی بھی غیر متوقع لمحے میں ہدایت کی روشنی اور … مستقیم کی طرف رہنمائی حاصل ہو جاتی ہے۔ کوئی نہیں … کس وسیلے اور حوالے سے دستیاب ہوگا، کس بہانے … گا اور کس روپ میں۔ لیکن توفیق کی ساعت یا اب آتی … ہے۔

… ایک دم صورت حال سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اب ہمیں اپنے … شرمندگی کا سامنا تھا۔

میں نے بے تکلف اس جگہ سے چلے جانے میں ہی بہتری … میں نے چوکیدار اور پیر عنایت سے ہاتھ ملا کے کہا "جو … ہوا اس کا مجھے افسوس ہے لیکن میں امید رکھتا ہوں کہ اس … سے ہی اچھائی کے اسباب پیدا ہوں گے اور میری خواہش … کہ ہم پھر کبھی ملیں تو ہمارے درمیان کوئی رنجش آج کے … سے نہ ہو۔ اور کوئی ایسی وجہ نہ ہو کہ ہم پھر دشمن بن کے … آئیں۔"

ایسی ہی کچھ باتیں نازو اور غالب نے کہیں۔ پھر ہم جیپ … کر نکل گئے۔ جیپ کو اب میں چلا رہا تھا۔ مجھے عقب نما … میں برآمدے کا پورا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ چوکیدار، پیر … اور نانی ایک ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان … اور رشتوں کی جذباتی نوعیت بدل گئی تھی اور میرے لیے … خیال میں بڑی طمانیت تھی کہ یہ رشتے بے آبرو نہیں ہوئے … پہلے سے زیادہ معتبر ہو گئے۔ پیر عنایت نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو … پلٹ کے دیکھا۔ غالب اور نازو نے پیچھے سے انہیں ہاتھ … الوداع کہہ دیا تھا۔ جیپ ڈاک بنگلے کے دروازے سے نکلی … اوجھل ہو گئے۔ ڈاک بنگلے میں ہمارا قیام ایک گھنٹا بھی … رہا تھا لیکن اس دوران میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ جن … کے بارے میں ایک خبر مل گئی تھی جو کوئی خبر نہ ملنے سے … اچھی خبر تھی۔ ہم نے رابعہ اور گل کے لیے تحفظ کی ایک … تلاش کرلی تھی۔ نانی جو پہلے بے گھر اور لاوارث تھا، اب … کی منزل پا چکا تھا۔ اور شاید پیر عنایت بھی اب پہلے والا … نہیں تھا۔

نازو نے پیچھے سے کہا "سر، آپ خفا ہیں مجھ سے؟"

میں نے ہنس کے کہا "تم سے کون خفا ہو سکتا ہے عزیزہ۔"

"نہیں سر، میں نے بہت افسوس، آپ احتجاجی مظاہرہ کیا … اس کے بجز کہ آپ اپنے اعلیٰ و ارفع ذہن کی قائدانہ صلاحیت کو

بروئے کار لاتے ہوئے کیا حکمت عملی وضع فرما رہے ہیں۔"

"اتنی مشکل اردو بولنے سے تمہارا گلا بیٹھ جائے گا" غالب نے کہا۔

"واقعی میں کبھی نہیں تھی۔" نازو نے اپنی بات جاری رکھی۔

"اچھا تو میں سرٹیفکیٹ دے دوں تمہیں ناسمجھ، ناقص العقل ہونے کا!" غالب بولا "سکندر کی طرف سے۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں کسی کے سرٹیفکیٹ کی" نازو نے بگڑ کے کہا "میں جو ہوں سو ہوں۔"

"ہاں، تم تو خود ایک سرٹیفکیٹ ہو، عورت ذات ہونا ہی تمہاری سند ہے۔"

"مجھے معلوم ہے تم کتنے بڑے افلاطون ہو۔ یہ سب مردوں کا کہا کیسا ہے۔ اپنی عقل کا خود ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں" نازو نے چڑ کے کہا۔

"آخر تم میرے سچ کا اتنا برا کیوں مانتی ہو؟" غالب نے کہا۔ "اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمہاری ناراضگی کے خیال سے میں جھوٹ بولتا رہوں ہر وقت۔"

میں نے کہا "آمین، خدا کرے یہ حق گوئی و بے باکی۔" غالب نے نازو کو سنانے کے لیے کہا "یار سکندر، میں تو شادی کے بعد بھی سچ بولتا رہوں گا۔ حالانکہ اکثر شوہر اس کا حوصلہ نہیں رکھتے۔"

میں نے ہنس کے کہا "بات حوصلے کی نہیں مرزا جی، کچھ ازدواجی سیاست کے تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ جاننا اچھا شوہر بننے کے لیے ضروری ہے کہ سچ اور جھوٹ میں کیا تناسب رکھا جائے۔ مثلاً جب بیوی محض گوارا لگ رہی ہو تو پچاس ساٹھ فیصد جھوٹ ملا کے کہو کہ تم تو جنت کی حور ہو، کوہ قاف کی پری دکھائی دے رہی ہو۔ اور کہیں کوئی ایسی خاتون نظر آ جائیں کہ آپ کے ہوش اڑ جائیں تو سو فیصد جھوٹ بولو بیوی سے کہ کیسی بدصورت عورت ہے اور کتنا اترا رہی ہے۔"

غالب بہت ہنسا "کیا سچے کی بات بتائی ہے استاد۔"

نازو نے کہا "میں بتاؤں گی رابعہ کو، آپ کے اقوالِ زریں۔"

"ارے ہم کیا ڈرتے ہیں کسی سے؟" میں نے کہا "بتا دینا، ہم بھی جھوٹ بول دیں گے ڈھٹائی سے کہ ایسی کوئی بات تو بالکل نہیں ہوئی۔"

"اور تم دیکھ لینا، رابعہ تمہاری نہیں مانے گی" غالب نے ہاتھ بڑھا کے کہا "لگاؤ شرط۔"

"اچھا اب سنبھل جاؤ، بڑی سڑک سامنے آ گئی ہے" میں نے کہا۔

ڈاک بنگلے سے شروع ہونے والی پگلی سی نیم پختہ سڑک ٹیک اور سڑک سے ملنے کے بعد بہت بہتر ہو گئی تھی اور میں نے جیپ کی رفتار کو اسی تک کلومیٹر تک بڑھا لیا تھا۔ اگرچہ ابھی تک کسی نے ہماری راہ میں حائل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن خطرہ

www.paksociety.com

اپنی جگہ موجود تھا اور اس امکان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ جس پولیس پارٹی سے یہ جیپ چھینی گئی تھی انہوں نے واردات کی اطلاع آگے دے دی ہو۔ اس کے امکانات بہت کم تھے کیونکہ جہاں ہم نے انہیں چھوڑا تھا وہاں سے رابطے کے وسائل بہت دور تھے۔ کسی پولیس جیپ کی تیز رفتاری پر کوئی شک نہیں کرتا اور اسے غلط بھی نہیں سمجھا جاتا۔ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ کوئی ایمرجنسی درپیش ہوگی۔ مجھے تیز رفتاری سے یہ فائدہ حاصل تھا کہ کسی کو بھی غور سے ہماری صورت یا جیپ کا نمبر دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔

مین روڈ پر آنے کے بعد بھی میں نے رفتار کم نہیں کی۔ میں نے سامنے سے آنے والی بہت سی پولیس کی گاڑیاں دیکھیں لیکن جیپ میں کسی کی صورت کی جھلک تک نہ دیکھ سکا ایسے ہی کسی نے ہماری طرف دیکھا ہوگا تو اسے صرف پولیس کی گاڑی نظر آئی ہوگی۔ دو جگہ میں نے اسی سمت میں جانے والی پولیس کی گاڑیوں کو اوورٹیک کیا تو ٹریفک کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا۔ میں نے اوورٹیک کرنے والی ایک بس کو سائڈ سے اوورٹیک کیا اور بہت آگے نکل گیا۔ پولیس کے علاوہ کوئی ایسی خطرناک اوورٹیکنگ کرتا تو اس کا لازمی چالان ہوتا۔

"اب کیا کریں، کہاں چلیں؟" میں نے شہر کی حدود میں کافی اندر داخل ہو جانے کے بعد کہا۔

غالب نے کہا "پہلے تو آپ ایزی ہو جائیں، رفتار کم کر دیں۔ ... یہ معلوم ہو کہ آپ معمول کی پیٹرولنگ ڈیوٹی پر ہیں۔ مجرموں کے تعاقب میں نہیں دوڑ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "اوکے۔ اب ہم صرف تمیں کلومیٹر کی رفتار سے جا رہے ہیں یہ طے کئے بغیر کہ ہمیں کس سمت میں جانا ہے۔"

"ہمیں سینٹ اینڈریوز چرچ جانا ہے" نازو نے کہا "اس کے ساتھ والے قبرستان میں ہی سائمن کی ماں اور اس کی بہن کو دفن کیا جائے گا۔"

"سائمن نے کہا تھا کہ چرچ میں آخری رسوم سہ پہر کے بعد ادا کی جائیں گی" میں نے کہا "ابھی تو صرف ایک بجا ہے۔"

"ہم عین وقت پر پہنچنے کا رسک کیسے لے سکتے ہیں؟" غالب نے کہا "ہمیں اسی وقت وہاں جا کے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد کوئی فیصلہ کرنا چاہئے۔"

نازو نے کہا "فیصلہ کیا کرنا ہے؟"

"یہی کہ ہم کہاں سے چھپ کر سب پر نظر رکھ سکتے ہیں۔ خود نظر آئے بغیر۔ ایسی کوئی جگہ ہے تو وہاں پہنچنے کا راستہ بھی ہے یا نہیں" غالب نے کہا "ایسا نہ ہو کہ عین وقت پر کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے اور ہم قریب بھی نہ جا پائیں یا جائیں تو معلوم ہو کہ سیدھے جال میں چلے گئے جو شکاری پہلے سے پھیلائے بیٹھے ہوئے تھے۔"

میں نے غالب کی دور اندیشی سے اتفاق کیا۔ ہم تو خیر اجنبی تھے، یہاں بہت سے لوگ بھی ہمیں صحیح راستہ سمجھانے کی کوشش میں ناکام رہے۔ پھر مجھے ایک بک اسٹال نظر آیا اور وہاں سے مجھے بمبئی شہر کی گائیڈ بک بھی مل گئی جس میں سڑکوں کا تفصیلی نقشہ تھا۔ ایسے نقشے ہر بڑے شہر میں بہ آسانی دستیاب ہوتے ہیں لیکن میرے علم میں لاہور یا کراچی کے بارے میں ایسی کوئی رہنمائی کرنے والی کتاب نہیں تھی جو کتابوں کی دکان پر مل جاتی ہو۔

نقشہ ہمارا دیکھا ہوا تھا چنانچہ تھوڑی سی جدوجہد اور جستجو کے بعد ہم اس جگہ کا تعین کرنے میں کامیاب ہو گئے جہاں ہم موجود تھے۔ بمبئی میں سڑکوں کی نشاندہی کرنے والے نمائی بورڈ بھی بہت نمایاں اور ہر جگہ موجود ہیں۔ باقی راستہ میں نے غالب کی ہدایات کے مطابق طے کیا جو پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا مجھے صرف نقشہ دیکھ کر بتاتا جا رہا تھا کہ کہاں مجھے دائیں جانب مڑنا چاہئے کہاں بائیں طرف اور کہاں سیدھا چلتے رہنا چاہئے۔ اس چکر میں آدھ گھنٹہ ضائع ہو گیا تھا اور غالب بہت محتاط تھا پھر بھی ایک جگہ کنفیوژ ہوا۔ یہ اتفاق تھا کہ ہم شہر کے دوسرے کنارے پر نہیں تھے ورنہ باقی وقت بھی تلاش میں ہی صرف ہو جاتا۔ سینٹ اینڈریوز چرچ اینڈ سمٹری کو ہم نے بیس منٹ میں دریافت کر لیا۔

سرخ پتھروں کا بنا ہوا چرچ جو طرزِ تعمیر اور خستہ حالی سے کم سے کم سو سال پرانا لگتا تھا ایک ایکڑ! کچھ زیادہ رقبے پر پھیلا ہوا تو ہم چار دیواری کے اندر بڑے وقار و تمکنت کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے مینار کی بلندی سرسبز درختوں کے اوپر نیلے آسمان کے پس منظر میں بہت نمایاں تھی اور چاروں طرف پھیلی ہوئی مادی زندگی کی گہما گہمی اور لوٹ کھسوٹ کی دوڑ دھوپ میں انسانوں کو سکون، طمانیت اور قناعت پسندی کا درس دیتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے گرد پھیلے ہوئے ہرے بھرے درخت بھی بہت پُرسکون نظر آتے تھے۔ کھلے ہوئے پھاٹک سے چرچ تک جانے والے راستے پر سرخ بجری اور سنگریزے بچھے ہوئے تھے اور اس کی حاشیہ بندی کے لئے اینٹوں کو ترچھا کر کے ایسے لگایا گیا تھا کہ دونوں طرف کنارے والی لائن نظر آتی تھی۔ اینٹوں پر اجلی سفیدی دھوپ میں چمک رہی تھی اور وہ راستہ کسی لمبی چوڑی کی طرح دکھائی دیتا تھا جس کے کناروں کو کسی نے بڑے اہتمام سے سفید ٹیپ لگا دی ہو۔ راستے کے دونوں جانب ہموار سبز گھاس کا فرش قالین کی طرح بچھا ہوا تھا۔

شاید کسی زمانے میں چرچ کے لئے آبادی سے ہٹ کے کسی پُرسکون قطعۂ اراضی کا انتخاب کیا گیا ہوگا مگر جب شہر پھیلا تو چرچ درمیان میں محصور ہو گیا۔ اب اس کی چار دیواری کے ہر طرف بسوں، ٹراموں، کاروں اور دوڑتے بھاگتے انسانوں کا شور تھا جو دن رات کے کسی بھی حصے میں بالکل ختم نہیں ہوتا تھا۔ اس پُرشور دنیا میں یہ سکون اور خاموشی کا جزیرہ ہم جیسے بھٹکے ہوئے انسانوں کو اندر آنے کی دعوت دیتا محسوس ہوتا تھا۔ ابھی تک کوئی آنے ایک پولیس جیپ کو چرچ کے دروازے پر دیکھ کے حیرت کا خاموش اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

غالب نے کہا "یہاں ابھی تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "بظاہر میری نظر بھی یہی دیکھ رہی ہے، کوئی چھپ کے بیٹھا ہو تو الگ بات ہے۔"

نازو نے کہا "مجھے تو قبرستان بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

میں نے کہا "شاید چرچ کے پیچھے ہو، کیوں نہ ہم اندر جا کے دیکھ لیں۔"

نازو نے کہا "اس طرح ... میرا مطلب ہے پولیس کا چرچ میں جانا کچھ معیوب سی بات نہیں ہے؟"

میں نے کہا "کسی بھی عبادت گاہ میں کسی کا غلط مقصد سے جانا معیوب بات ہے۔ ہم چرچ کا بھی اتنا ہی احترام کرتے ہیں جتنا مساجد کا۔"

غالب نے میری تائید کی "ہم تو ان لوگوں کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے ہیں جو چرچ کے ہی نہیں ساری انسانیت کے دشمن ہیں۔ جو پیشہ ور قاتلوں کو بے گناہ انسانوں کے قتلِ عام کے لئے اکساتے ہیں اور مسلح کرتے ہیں۔ کبھی سیاست اور کبھی مذہب کے نام پر نفرت کی آگ بھڑکاتے ہیں اور آدمی کے خون کی تجارت کو فروغ دے کر اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔"

"ہم تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں، اپنے لئے بھی اور ان بے نوا انسانوں کے لئے بھی جو مارے جا رہے ہیں۔ آئندہ بھی مارے جائیں گے، یہ جانے بغیر کہ ان کا جرم کیا ہے کیونکہ وہ کمزور ہیں اور اپنے مختار نہیں ہیں جتنے ان کو اس آگ میں ایندھن بنا کے جھونکنے والے۔ وہ انسان نہیں، صرف کسی گولی کے لئے انسانی ہدف ہیں۔ یہ ہدف دیوار نہیں ہو سکتی اور درخت نہیں ہو سکتے اور کھمبا بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ ضروری ہے کہ ہدف کا خون نکلے تاکہ پھر اس مظلوم خون کو شہید قرار دے کر نعشوں کی سیاست کی جا سکے۔ جلوس، ہنگامے اور ہڑتالیں خون کے بغیر غیر مؤثر ہیں۔"

غالب نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہاں یار۔ بے چارہ ایک وقت پیٹ بھر کر کھانے کے لئے مٹھی بھر چاول مانگنے والا کیسے بات کر سکتا ہے جو شہادت کی یا استحصال کی۔ شاید وہ ان الفاظ کا مطلب تک نہیں سمجھتا مگر اس کا خون بولتا ہے لیڈروں کی زبان سے۔"

"اگر تمہارے دل کا غبار نکل گیا ہو تو ہم اندر چلیں؟" نازو نے کہا۔

"سامنے سے جانا دور اندیشی کے تقاضوں کے خلاف ہوگا" غالب بولا "اگر کوئی شکاری پہلے سے ہمارے لئے چشم براہ ہوا تو نظر آ جائے گا کہ پولیس کی وردی میں پولیس نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کیسے تاڑ جائے گا؟ آج یہاں پولیس ہر طرف ہوگی۔ معاملہ ایک پولیس افسر کا ہے اور دوہرے قتل کی واردات تھی۔"

"ایسی صورت میں ہمیں پولیس ہی سب سے پہلے پکڑے گی" نازو نے کہا "یہاں منتخب افراد کی ڈیوٹی ہوگی اور ہم غیر منتخب افراد سب سے پہلے نظر آ جائیں گے۔"

میں نے کہا "ہم قائل ہوئے تمہاری دلیل سے لیکن اب وقت کہاں ہے کہ ہم لباس اور حلئے بدل سکیں۔ ابھی پولیس نظر بھی نہیں آ رہی ہے۔"

"یہ بات کچھ عجیب ہے، پولیس کو پہلے سے موجود ہونا چاہئے تھا" غالب نے کہا۔

"کہیں پروگرام بدل نہ گیا ہو" نازو نے کہا "وہ تو چلے گئے ہیں۔"

"کیا مطلب! آخری رسوم کسی اور جگہ نہ ہوں؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "رسوم تو اسی چرچ میں ہوں گی۔ ایک تو اس لئے کہ سائمن نے ہم سے یہی کہا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سائمن کی وابستگی اسی چرچ سے ہوگی۔ عقیدت کی بنیاد پر۔ ہاں یہ بات بعید از امکان نہیں ہے کہ آخری رسوم کی ادائیگی میں کچھ دیر ہو جائے۔ پوسٹ مارٹم اور دوسری قانونی کارروائیوں میں تاخیر ہو ہی جاتی ہے۔ ممکن ہے آخری رسوم ملتوی کر دی گئی ہوں۔"

"یہ پروگرام پہلے سے طے ہوتا ہے، اگر تبدیلی ہو تو سب کو مطلع بھی کیا جاتا ہے۔"

"پادری کو یقیناً معلوم ہوگا" نازو نے کہا "آثار ایسے ہی ہیں۔"

غالب نے سر ہلایا "سہ پہر کا مطلب ہے تین، ڈھائی بجے۔ ابھی تک کوئی بھی نہیں پہنچا۔"

"اوکے۔ ہم اندر جاتے ہیں اور پادری سے بات کرتے ہیں" میں نے کہا "چونکہ پولیس موجود نہیں ہے اس لئے ہم موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ تم دونوں ذرا غور سے چاروں طرف دیکھتے رہنا۔"

میں نے تائید یا تردید کا انتظار کئے بغیر جیپ کو بڑھا دیا اور پھاٹک میں سے گزار کے چرچ کی مرکزی عمارت کی سائڈ میں لے گیا۔ جیپ کے انجن نے اپنی آمد کا اعلان خود کر دیا تھا لیکن چرچ کے اندر سکوت کی کیفیت برقرار رہی۔ میں نے انجن بند کر دیا اور چند منٹ ہم نے خاموشی سے انتظار میں گزارے کہ شاید اندر سے کوئی نکل کے ہم سے ہماری آمد کا مقصد پوچھے۔

"کیا تم نے کچھ دیکھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں، میں نے نازو کو دیکھا تو یہ مجھے دیکھ رہی تھی" غالب نے شکایت کے انداز میں کہا "اور میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو ایک سوال تھا۔ بلکہ ایک حسرت تھی۔"

میں نے مسکرا کے کہا "کیا سوال تھا؟"

"دراصل نازو نے فلموں میں چرچ سے رخصتی کے مناظر بہت دیکھے ہیں نا، اس لئے جذباتی ہو رہی تھی۔"

نازو نے جھنجھلا کے کہا "تم نے سوال غلط پڑھا ہے ...

www.paksociety.com

رہی تھی کہ چرچ خالی ہے۔ تمہاری آخری رسوم ادا کی جائیں تو ہو جائیں ٹھیک وقت پر سب کو فراغت بھی ہے۔"

اس سے پہلے کہ غالب کچھ کہے "سفید لبادے" میں ایک پادری ایسے نمودار ہوا جیسے اس کا غیر مرئی وجود فضا سے نکل کے مجسم ہو گیا ہے اور اسی طرح پھر ہوا میں تحلیل ہو کے غائب ہو جائے گا۔ میں نے اسے کسی دروازے سے باہر آتے نہیں دیکھا تھا۔ نہ دروازہ کھلنے کی کوئی آواز سنی تھی اور نہ اس کے قدموں کی چاپ۔ جب اس پر میری نظر پڑی تو وہ چند قدم کے فاصلے پر تھا اور بے آواز قدموں سے سیدھا چلا ہماری طرف آ رہا تھا۔ وہ دبلا پتلا اور دراز قد شخص تھا جس کے سر پر گھنے سفید چاندی جیسے بال مصنوعی وگ کی طرح نظر آتے تھے۔ اس کے چہرے کی رنگت بھی بہت صاف تھی مگر وہ انگریز نہیں تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں کتاب مقدس کو سینے کے ساتھ تھام رکھا تھا اور اس کے لبوں پر ایک بہت شفیق اور مہربان مسکراہٹ تھی۔

"گاڈ بلیس یو" اس نے سینے پر صلیب بنا کے نرم لہجے میں کہا۔

"گاڈ بلیس یو فادر" میں نے اور غالب نے جیپ سے اتر کر احتراماً کہا۔ پھر نازو نے سر جھکا لیا اور پادری نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کیا ضرورت تمہیں خدا کے گھر میں لے آئی ہے؟ مجھے بتاؤ۔" اس نے انگریزی میں کہا "خدا سب کے کام کرتا ہے۔"

میں نے کہا "اس میں کیا شک ہے ہولی فادر۔ ہم تو صرف دنیا کے قانون کی عملداری قائم رکھنے کا فریضہ پورا کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ امید ہے آپ ہماری موجودگی پر معترض نہیں ہوں گے اور اسے چرچ میں دخل اندازی سے تعبیر نہیں کریں گے۔"

"اگر تم ڈیوٹی پر ہو تو شاید میں دخل اندازی کا مرتکب ہو رہا ہوں" پادری نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں سر" میں نے کہا "آپ کی اجازت ہی کافی ہے ہماری حوصلہ افزائی کے لئے۔ ہمیں یہ بتایا گیا تھا ہولی فادر کہ انسپکٹر سائمن کی وائف اور بہن کے لئے آج سہ پہر آخری رسوم ادا ہوں گی۔ شاید آپ کے علم میں ہو کہ انہیں درندہ صفت قاتلوں نے بڑی سفاکی سے قتل کر دیا تھا۔"

"او یس!" پادری نے جھرجھری لے کر اپنے سینے پر پھر صلیب بنائی "خدا ان کی روحوں کو سکون میں رکھے۔ انسپکٹر سائمن ایک ایماندار اور فرض شناس افسر ہے۔ یہ اس کی آزمائش ہے خدا کی طرف سے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خداوند کا پسندیدہ ہے۔"

میں نے کہا "مگر مجھے آخری رسوم کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔"

"بتانے والے تمہیں یہ بتانا کیوں بھول گئے کہ رسومات شام تک ملتوی کر دی گئی ہیں۔ سورج غروب ہونے تک۔"

میں نے کہا "محکمہ جاتی کارروائی میں اس قسم کی بھول چوک ہو جاتی ہے فادر۔ ایسی بات ہے تو ہم فی الحال اجازت چاہتے ہیں۔"

پادری کی نظر نازو پر تھی "یہ نوجوان پولیس افسر بہت کم عمر ہے... تمہارا کیا نام ہے آفیسر؟"

پادری نے کھل کر اپنے شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کی نظر نے تاڑ لیا تھا کہ نازو کوئی لڑکی ہے۔ اگرچہ اس سوال کا نازو نے خاصے اعتماد کے ساتھ جواب دیا تھا مگر اس کی آواز نے پادری کے شک کو تقویت پہنچائی۔ وہ جہاں دیدہ آدمی تھا اور لوگوں کے انسانوں کی پہچان تھی۔ تاہم اس نے اخلاقاً یا کسی مصلحت کے پیش نظر اپنے شکوک کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے فوراً جیپ آگے کر دی روانہ ہو جانے میں ہی عافیت جانی۔ پادری اس وقت تک وہیں کھڑا ہمیں دیکھتا رہا جب تک کہ جیپ چرچ کے گیٹ سے نہیں نکل گئی۔

"اوف! ایسی بال بال بچ گئے آج ہم" غالب نے باہر نکلتے ہی کہا۔

میں نے کہا "مس نازو! تمہارے لئے یہ رول قطعی نامناسب ہے۔ کوئی پولیس مین اتنا نازک اور خوب صورت نہیں ہو سکتا۔"

نازو نے خفت سے کہا "یہ رول میں نے کبھی اپنی مرضی سے نہیں لیا۔"

"تم کو یا تو لیڈی پولیس کی وردی میں ہونا چاہئے ورنہ پولیس مین بننے کی کوشش ہی نہیں کرنی چاہئے۔ تمہاری وجہ سے ہم بھی مشکوک ہو جاتے ہیں" میں نے کہا۔

"مردوں پر جب مصیبت آتی ہے کسی عورت کی وجہ سے آتی ہے" غالب نے کہا۔

"مجھے مصیبت کہا تو میں مصیبت ڈال دوں گی۔ ابھی رونے لگوں گی" نازو نے دھمکی دی۔

"تم جذباتی بلیک میلنگ پر اتر آئی ہو لیکن ہم وہ احمق نہیں ہیں جو عورتوں کے آنسو دیکھ کر پگھل جاتے ہیں" غالب نے اعلان کیا "رو کے دکھاؤ ذرا۔"

میں نے کہا "خدا کے واسطے موقع محل دیکھ کے لڑا کرو۔ میں پریشان ہو رہا ہوں کہ شام کو کیا ہو گا؟ پادری نے ہمیں صاف بتا دیا ہے کہ وہ ہماری حقیقت کو سمجھ گیا ہے۔ وہ ہنگامہ نہیں چاہتا تھا چنانچہ اس نے ایک موقع فراہم کر دیا ہے کہ سمجھدار کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ خیریت چاہتے ہو تو پھر یہاں آ کے یہ ڈرامہ نہ کرنا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ڈرامہ پھر نہیں کیا جا سکتا۔ اب کچھ اور سوچنا پڑے گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ جب پیٹ خالی ہوتا ہے تو دماغ بھی خالی ہونے لگتا ہے" غالب نے کہا۔

"میں فوراً اس جیپ سے اور اس منحوس لباس سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

"دونوں کام آسان ہیں۔ جیپ چھوڑی جا سکتی ہے کہیں اور۔ یہاں ریڈی میڈ کپڑوں کی بہت دکانیں ہیں" غالب نے کہا۔ مجھے سڑک کے کنارے ایک ورکشاپ کے گیٹ پر "مرو

تی" کا بورڈ نظر آیا۔ گیٹ بند تھا مگر اس کے سامنے بہت سی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے جیپ کو انہی کے ساتھ روک دیا اور چند منٹ بعد ہم ایک ٹیکسی میں تھے۔ ہمارا اندوختہ تقریباً ختم ہو رہا تھا لیکن نازو کے پاس اس کے اندازے کے مطابق ابھی پچاس ہزار اب بھی موجود تھے جو اس نے اپنی کمر کے گرد لپٹی ہوئی بیلٹ میں چھپا رکھے تھے۔ کسی نہ کسی طرح وہ اس بیلٹ کو بحفاظت اپنے ساتھ رکھنے میں کامیاب رہی تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے ہی اس نے یہ بیلٹ میرے حوالے کر دی تھی۔

پرانے طریق کار کے مطابق ہم نے ٹیکسی کو کئی بار چھوڑا۔ وہ تیسری ٹیکسی تھی جس نے مجھے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور پہنچایا۔ وہاں سے سب کے لئے کپڑے خریدنے کے بعد ہم چوتھی ٹیکسی میں سوار ہوئے اور اسے باندرہ چلنے کو کہا لیکن ٹیکسی نے تقریباً دو میل کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ میں نے اسے رکنے کو کہا اور نازو نے ٹیکسی ڈرائیور کو پیچھے سے ناک آؤٹ کر دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی جگہ کھسکا کے میں نے ڈرائیونگ سنبھالی اور پندرہ بیس منٹ کی جستجو کے بعد آخر کار ایک ایسی جگہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جہاں ہم ٹیکسی کو روک کے کپڑے بدل سکتے تھے۔ یہ ایک کھنڈر ہو جانے والے مکان کی باؤنڈری تھی جس کے باہر کسی تجارتی سینٹر کی تعمیر کرنے والی کنسٹرکشن کمپنی نے اپنا بورڈ لگا دیا تھا۔ شاید سال بھر بعد ہم پھر آتے تو اس جگہ کو پہچان نہ پاتے۔ اس کھنڈر کی جگہ جدید وضع کا کوئی شاپنگ پلازا نظر آتا۔ جب یہ کھنڈر ہو جانے والی عمارت تعمیر کی گئی ہو گی تو اسے کتنا جدید، خوب صورت اور قابل دید سمجھا جاتا ہو گا۔ میں نے باہر انتظار کرتے ہوئے سوچا۔

عمارت کے کھنڈر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ بہت جلد اس کو گرایا جانا تھا چنانچہ اس کی کھڑکیاں دروازے سب نکال لئے گئے تھے اور بجلی کاٹ دی گئی تھی مگر اندر غسل خانوں کے نل موجود تھے اور پانی کا کنکشن باقی تھا چنانچہ میں نے بھی موقع غنیمت جانا اور ہاتھ منہ دھونے گیا تو نہا کے نکلا۔ یہی غالب نے بھی کیا۔ نئے کپڑے پہن کے ایک بار پھر ہم نئی شخصیت اختیار کر چکے تھے۔ زندگی کے روپ اب صبح و شام بدل جاتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ہم اپنے انداز و اطوار بدل لیتے تھے۔ یہ سب کچھ اب کھیل ہو گیا تھا۔ ایک ایسا کھیل جس میں کوئی انوکھا پن تھا نہ سنسنی تھی اور نہ مسرت۔ یہ ضرورت کی تکمیل کا معمول ہو گیا تھا۔ ہم جس شکارگاہ میں پھر رہے تھے وہاں خطرے کو اسی طرح کم سے کم کیا جا سکتا تھا کہ ہم اپنی شناخت کو زیادہ عرصہ برقرار نہ رکھیں۔ ہمیں اس ہجوم میں گم ہونے کی آسانی بھی حاصل تھی جو بمبئی جیسے شہر کی سڑکوں کو آباد رکھتا ہے۔ تلاش کرنے والے شکاری ایک روپ سے آشنا ہوتے تھے تو ہم دوسرا روپ اختیار کر کے پھر محفوظ ہو جاتے تھے۔ اس پر ہجوم شہر میں ہر چہرے کو غور سے دیکھنا اور لاکھوں چہروں میں سے کسی ایک چہرے کو ڈھونڈ نکالنا ناممکن کام تھا لیکن جانے پہچانے مشتہر کرائے جائیں تو ناممکن کام صرف مشکل کام رہ جاتا ہے۔ سوٹ پہن کر مجھے بہت بڑا اعتماد ہو گیا کہ اب فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں۔ جب تو پولیس کو مل ہی جائے گی مگر وہ تین پولیس والے نہیں ملیں گے جن میں سے ایک بہت حسین اور نازک اندام تھا۔

چار بجے تک ہم ایک بہترین ریسٹورنٹ میں پر تکلف لنچ سے فارغ ہو چکے تھے۔ کافی پینے کے بعد سگریٹ جلاتے ہی مجھ پر قنوطیت کا شدید غلبہ ہوا۔ آسودگی کے ردعمل نے سب کو کچھ اداس کیا۔ ذہن کو تھوڑی سی فراغت ملی تو گزشتہ چوبیس گھنٹوں کے واقعات کی یاد تازہ ہو گئی۔ رابعہ اور گل کے خیال نے اور محسن کے بعد شملا کی یاد نے مجھے شرمسار کیا۔ معلوم نہیں کون کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ میں نے بڑے دکھ سے سوچا۔ ہم یہاں بہترین لباس پہنے بہترین لوگوں کے درمیان کتنے آرام سے بیٹھے ہیں۔ اس احساس سے میرا حلق کڑوا ہو گیا۔

میں نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا "جو کچھ ہم سب سوچ رہے ہیں اس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔"

"میں محسن اور شملا کے بارے میں سوچ رہی ہوں کیا وہ پھر ملیں گے؟" نازو نے کہا۔

"ہم سب پھر کب ساتھ ہوں گے، میں سوچ رہا تھا" غالب نے اعتراف کیا۔

"مت سوچو ایسی حوصلہ پست کرنے والی اور مایوسی پیدا کرنے والی باتیں" میں نے برہمی سے کہا "منفی سوچ صرف ناکامی کا احساس دلاتی ہے۔ عمل زندگی کی اساس ہے۔ ہمیں کچھ کرنا چاہئے۔"

"ہم دوبارہ اس چرچ میں گئے تو پہچان لئے جائیں گے" غالب نے کہا "اور ہمارا وہاں جانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ کیا وہ پادری ہم سے تعاون کرے گا؟"

"عام طور پر وہ دنیا کے جھمیلوں میں نہیں پڑتے۔"

"لیکن لوگ ان کے سامنے اپنے گناہ کا اور اپنے جرائم کا اعتراف کرنے جاتے ہیں۔ محض اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اور بعض اوقات ان سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے۔ وہ ان کی سنتے ہیں اور انہیں مشورہ بھی دیتے ہیں لیکن انہیں مجبور نہیں کرتے۔ ان کے راز کو راز رکھتے ہیں اور پولیس کو بھی کچھ نہیں بتاتے۔ چور، ڈاکو، قاتل سب ہی ان کے سامنے جا کے اکیلے میں انہیں سب بتا کے اپنا دل ہلکا کرتے ہیں۔ یہ ان کی ایک رسم ہے یا روایت ہے جس پر وہ آج بھی سختی سے کاربند ہیں۔"

غالب نے کہا "بے شک وہ دنیاداری معاملات میں نہیں پڑتے لیکن تعاون کرتے ہیں۔"

میں سوچ میں پڑ گیا "تمہارا مطلب ہے ہم اپنے اپنے بارے میں سچ بتا دیں کہ ہم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟"

"ہاں۔ اگر وہ تعاون پر آمادہ نہیں ہوگا تو ہمارا راز بھی افشا نہیں کرے گا۔ صاف کہہ دے گا کہ میں تم لوگوں کے لئے کچھ نہیں کرسکتا' تم چلے جاؤ۔"

"اور اس نے کہہ دیا سوری تو ہم کیا کریں گے؟ واپس لوٹ آئیں گے" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "پھر ہم ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکالیں گے۔"

غالب نے اسے پُرملامت نظروں سے دیکھا "ہم زبردستی کرسکتے ہیں اس بوڑھے کے ساتھ! اور وہ بھی چرچ میں؟ ہم پر دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کا احترام واجب ہے' بلکہ فرض ہے۔"

میں نے کہا "رائٹ۔ ہم زور زبردستی نہیں کرسکتے... ہمارے لئے دوسری صورت کیا رہ جائے گی؟"

"مجھے یقین ہے وہ ایک نیک کام میں تعاون سے انکار نہیں کرے گا" غالب نے کہا "اس کو لمبی کہانی سنانے کی ضرورت نہیں' ابتدا سے اب تک جو معاملات دلاور یا استاد پیڑو سے شروع ہوئے تھے اور تریوپتی تک آگئے ہیں ان کا اعادہ غیر ضروری ہوگا۔"

"پھر سنانے کو کیا رہ جائے گا؟" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا "ہم مختصراً کہہ سکتے ہیں کہ ہم دہرے قتل کی اس واردات کے محرکات سے واقف ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ہم دوبارہ دیکھ کر قاتلوں کو شناخت کرسکتے ہیں اور ہمیں ان کے آخری رسوم میں شریک ہونے کا یقین ہے۔ وہ غیر متعلق افراد نہیں ہیں چنانچہ وہ سائمن کے دوست اور ہمدرد بن کے آخری رسوم میں بھی شامل رہیں گے۔ ویسے پولیس کا بھی ایک آزمودہ نظریہ ہے کہ قاتل واردات کے بعد لاتعلق ہوکے چین سے نہیں بیٹھتا۔ وہ تفتیش پر نظر رکھتا ہے اور یہ دیکھتا رہتا ہے کہ معاملات کس نہج پر جارہے ہیں چنانچہ اکثر وہ جائے واردات پر بھی پھرتا ہے ورنہ آس پاس ضرور منڈلاتا ہے۔ خوف اور تجسس اسے مجبور کرتے ہیں' یہ جاننے کے لئے وہ اپنے پلان میں کس حد تک کامیاب رہا تھا اور اگر نادانستگی میں اس نے کوئی سراغ چھوڑ دیا تھا تو اسے اب کیسے مٹایا جاسکتا ہے۔ ہم پادری کو قائل کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ ہمیں ان قاتلوں کے چہرے چھپ کر دیکھنے کے مواقع فراہم کرے۔ کسی مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانا اور قانون کی مدد کرنا یقیناً ایک نیکی ہے۔"

"اس تجویز کی معقولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "ایک تجویز میری بھی ہے جو میں راستے میں بتاؤں گا۔ ابھی چلو یہاں سے۔"

باہر آکے نازو نے کہا "کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم ایک پرائیویٹ کار لے لیں کرائے پر۔"

"اس کے لئے کاغذات درکار ہوتے ہیں" میں نے کہا۔

"اگر ڈرائیور کے ساتھ کار لی جائے تو صرف ڈرائیور کا مطمئن ہونا ہی کافی ہے" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا "کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ یہ جو سامنے اتنی کاریں کھڑی ہوئی ہیں سب کرائے کے لئے ہیں۔"

"ٹیکسی کے مقابلے میں ایک پرائیویٹ کار یقیناً زیادہ بہتر ہوگی" میں نے بھی اس تجویز کو قبول کرلیا۔

ہر پرائیویٹ کار کا ڈرائیور چاہتا تھا کہ ہم اس کو خدمت کا موقع دیں۔ نہ جانے کیوں ان کا خیال تھا کہ ہم شہر میں اچھی اور سیر کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ایک پنجابی سکھ ڈرائیور کا انتخاب کیا جس کے ساتھ ہم بہتر تعلقات استوار کرسکتے تھے۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والوں میں کسی ہم زبان کا مل جانا شاید بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے۔ میری پنجابی پر سکھ ڈرائیور کا چہرہ کھل اٹھا۔

"ارے جی بادشاہو' اندر آؤ' شاہی سواری ہے جی۔ تہاڈے ورگیاں ایہاں لوکاں دے کھٹارے ایاں توں۔" اس نے بڑی مستعدی سے اپنی گاڑی کے دروازے کھول کر کہا "اے تو ڈی اپنی گڈی ہے۔"

ہم نے سردار جی کے جذبات کی قدر کی ورنہ درحقیقت دوسری کاروں کے مقابلے میں انہی کی گاڑی کو کھٹارا سمجھا جاسکتا تھا۔ دوسرے مدراسی' گجراتی اور بنگالی ڈرائیوروں نے ہمارے بغیر پسپائی اختیار کرلی۔ زبان کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے۔ اگر کوئی ان کا ہم وطن مل جاتا تو ان کو ترجیح دیتا۔ اگر میں روانگی کے بعد یہ کہتا کہ ہمیں صرف سینٹ اینڈریو کے چرچ جانا ہے تو ان کا سارا جوش وجذبہ سرد پڑ جاتا۔ شاید وہ ایک دم بے مروت ہوکے کہہ دیتے کہ اتنی دور جانا تھا تو سڑک پر سیکڑوں ٹیکسیاں پھر رہی تھیں' مجھے کیوں خوار کیا۔

"ہاں جی' اپنا دوست... کتھے چلنے" سکھ نے بڑی خوش دلی سے کہا "خیر ہال کتھوں آئے او' لگدے او اپنے جند عمر دے او۔"

میں نے تردید نہیں کی اور کہا "ابھی پہلے تو چلیں سینٹ اینڈریوز چرچ' اس کے بعد رات بارہ بجے تک بہت وقت ہے' سارا شہر گھومیں گے۔"

نازو نے میری ہتھیلی کو آگے بڑھایا "سردار جی' سانوں لٹ نہ لینا پولیس ورگے۔"

سردار جی اچھلے "او کڑیے' کیسی گلاں کرنی ایں' تیتھوں لٹ کے اسی کتنے امیر ہو جاواں گے۔"

نازو نے کہا "پھر بھی بتا دیں' کتنے پیسے لوں گے؟"

سردار جی نے مجروح لہجے میں کہا "او یار' اے کیہڑی گل اے؟ کیہا سوہنا روپ دتا اے رب نے' تے گلاں کیسی کردی اے۔ او بابا' جو تیرا دل کرے... جو تیری خوشی ہووے' دے چھڈیے۔"

میں نے کہا "سردار جی' ہم پانچ سو دیں گے' ہم بھی تو ٹورسٹ ہیں۔"

سردار جی کا چہرہ کھل اٹھا۔ پانچ سو ان کی توقعات سے کہیں

زیادہ تھے لیکن انہوں نے قبول کرتے ہوئے یہی ظاہر کیا جیسے پانچ سو تو بالکل نہ ہونے کے برابر ہے مگر وہ زبان کے رشتے سے مجبور ہیں اور از راہ التفات یہ بھی قبول کرلیں گے۔

ہم پھر جب سینٹ اینڈریوز چرچ پہنچے تو شام کے پانچ بجے تھے لیکن یہاں خانہ ویرانی کا ماحول بدلا نہیں تھا۔ ابھی تک نہ کہیں پولیس نظر آرہی تھی اور نہ آخری رسوم کے شرکا کی صورت۔

"یہاں تو وہی کیفیت ہے" غالب نے کہا "نہ آدم نہ آدم زاد۔"

"کہیں تدفین کل پر ملتوی نہ ہوگئی ہو" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "سب کچھ ہوسکتا ہے۔ قانونی معاملات خود اپنی راہ لیتے ہیں۔ کسی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ خود سائمن کا باپ آخر جانتا ہوگا۔ وہ خود بھی پولیس افسر ہے اور خواہ اس کی پامردی سے افسران بالا کتنے ہی ناخوش کیوں نہ ہوں' اسے سب کی ہمدردی حاصل ہوگی۔ پھر بھی دیر ہو رہی ہے تو مجبوری ہے۔"

میں نے سردار جی سے کہا کہ وہ گاڑی باہر لے جائیں اور انتظار کریں۔ ان کی صورت پر کچھ ناخوشی اور عدم اطمینان کے آثار جھلکنے لگے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ چرچ کے احاطے میں پارکنگ کی اجازت نہیں ہے اور مزید اطمینان کی خاطر انہیں ایڈوانس پانچ سو پیش کردئے۔

"آپ فکر مت کریں' ہم پچھلی دیوار سے کود کر فرار نہیں ہوں گے۔"

ایک خفت آمیز ہنسی کے ساتھ انہوں نے کہا "او نئیں یار' ایسی غلط گل کیہی اے توں" مگر پانچ سو فوراً جیب میں رکھ لئے۔ پھر وہ گاڑی کو ریورس گیئر میں واپس لے گئے۔

نازو نے برا مان کے کہا "ایسی بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر اسے اعتماد نہیں تھا ہم پر تو سو دے کر چھٹی کردیتے۔"

غالب نے بھی کہا "اگر وہ عقل مند ہوگا تو انتظار کیوں کرے گا۔ جاکے دوسری سواری اٹھائے گا۔"

میں نے کہا "اگر وہ نہ گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ پانچ سو میں ایک باعتماد کار ڈرائیور کی خدمات حاصل ہوجائیں' اور کیا چاہئے۔"

پُراسرار پادری پھر ایسے آیا کہ ہم سب چونک پڑے۔ ہم سب چرچ کے صدر دروازے کی طرف سے اس کے نمودار ہونے کی آس لگائے کھڑے تھے۔ وہ پیچھے سے نکل آیا۔

"ہیلو ایوری باڈی" اس نے عادتاً سینے پر صلیب بنائی "گاڈ بلیس یو۔ تم پھر آگئے؟"

میں نے پُرمتانت انداز میں اس سے ہاتھ ملایا "مجھے یقین تھا کہ آپ کی نگاہیں دھوکا نہیں کھائیں گی۔ آپ نے ہمیں پہچان لیا۔"

"اب کیوں آئے ہو؟" اس نے مسکرا کے اپنی ہوشیاری اور دانائی پر شیخی کے ساتھ والے اس خراج عقیدت کو قبول کیا "کیا مسئلہ ہے کہ تم یوں بھیس بدل بدل کے آرہے ہو؟"

میں نے کہا "ہم اعتراف کے لئے آئے ہیں۔"

"اعتراف! کیا تم کرسچن ہو؟" اس نے ہمیں غور سے دیکھا۔

"نہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کیا آپ کے سامنے کسی اور کا اعتراف کرنا ممنوع ہے؟ آخر ہم بھی اہل کتاب اور ایک خدا پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں' سب پیغمبروں کو برحق مانتے ہیں۔"

"تم ہندو نہیں ہو؟"

میں نے کہا "ہندو اہل کتاب تو نہیں ہوتے' ہم مسلمان ہیں۔"

اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہا "او کے' اندر آجاؤ... میں خدا کے گھر کا دروازہ کسی پر بند نہیں کرسکتا۔"

اس نے بلند وبالا مرکزی دروازہ کھولا۔ اس کے دونوں پٹ پرانی شیشم کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور ان پر ماہر ہاتھوں نے جو نقش ابھارے تھے وہ ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی احساس حسن کو اجاگر کرتے تھے۔ پالش سے چمکتا ہوا بھاری دروازہ کسی آواز کے بغیر کھلا اور ہمارے پیچھے ایک دھماکے سے بند ہوگیا۔ اس کی گونج عبادت گاہ کے ہال کی دیواروں کا نتیجہ تھی جو بلند اور سپاٹ تھیں۔ اندر کی چھت بیضوی اور درمیان سے اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ مرکز میں چھت کی بلندی تیس پینتیس فٹ سے کم نہ تھی۔ چاروں طرف دیوار کے اوپر والے حصے میں لمبوترے رنگین شیشوں والے روشندان ایک قطار میں بنے ہوئے تھے جن کی لمبی لمبی ڈوریاں انہیں کھولنے اور بند کرنے کے کام آتی تھیں۔ سارے روشندان بند تھے۔ دونوں جانب دیواروں پر نصب پیتل کی منقش لالٹینوں میں دودھیا بلب روشن تھے۔ ہال میں زیادہ سے زیادہ ڈھائی تین سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ درمیان سے گزرنے والے راستے کے دونوں طرف صاف ستھری' مضبوط بنچوں پر گرد کا ایک ذرہ نہ تھا۔ راستہ تھوڑا سا ڈھلان پر نشیب تھا اور اس پر سرخ رنگ کا دبیز قالین ڈال دیا گیا تھا چنانچہ ہم میں سے کسی کے قدموں کی چاپ بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ اندر کے ماحول میں ایک انوکھی ہیبت اور پُرتقدس خاموشی تھی جس کا بوجھل پن اعصاب پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔

پادری ہمیں منبر کے پیچھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ایک میز کے گرد چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میز پر تازہ پھولوں کا گلدستہ تھا۔ پادری نے ہم سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

"یس' اب کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟" پادری نے کہا۔

میں نے اتنی دیر میں تمہید کے لئے مناسب الفاظ کا انتخاب کرلیا تھا تاکہ اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہوئے مجھے عدم اعتماد کی جھجک کا احساس نہ ہو۔

www.paksociety.com

"ہولی فادر! یہ بات یقیناً آپ کے دل میں شک پیدا کرنے کے لئے کافی ہے کہ ہم پہلے پولیس کی وردی میں یہاں آئے تھے۔ جب کہ درحقیقت ہم پولیس کے اہلکار نہیں ہیں۔ اس خیال نے ہمیں اتنا شرمندہ کیا کہ اب ہم پھر آپ کے سامنے اصل روپ میں حاضر ہیں۔ دراصل ہم مجبور تھے' ہمارے لئے بھیس بدلے بغیر خود کو چھپانا مشکل تھا۔"

"تم کس سے چھپنا چاہتے تھے؟"

میں نے کہا "انہی دشمنوں سے جو دو محترم خواتین کے قاتل ہیں۔ میری مراد انسپکٹر سائمن کی والدہ اور بہن سے ہے۔"

"کیا تم ان کو پہچانتے ہو... اور جانتے ہو؟"

"یس ہولی فادر۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کے سوا کوئی ایسی وحشیانہ درندگی کا ثبوت نہیں دے سکتا اور ہمارے آخری رسوم میں شریک ہونے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم ان کو شناخت کریں۔"

"گویا تمہیں یقین نہیں ہے کہ قاتل یہی ہیں؟"

"اس میں شک کی گنجائش ضرور ہے لیکن بہت کم" میں نے کہا۔

پادری نے کہا "اگر بالفرض ایسا ہی ہے تو تم کیسے امید رکھتے ہو کہ وہ آخری رسوم میں شریک ہوں گے؟"

"خود کو بے گناہ اور معصوم ثابت کرنے کے لئے وہ سوگواروں میں شامل ہوں گے اور ہمدردی کا بھرپور مظاہرہ کریں گے" میں نے کہا۔

"پھر تم ان کو کیسے قاتل ثابت کرو گے؟"

میں نے کہا "پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم ان کو یہاں دیکھ لیں۔ ...مگر اس طرح کہ وہ ہمیں نہ دیکھ پائیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"اس لئے ہم پولیس کی وردی میں آئے تھے' لیکن پھر ہمیں خطرہ محسوس ہوا کہ پولیس ہمیں پہچان جائے گی جیسے آپ نے پہچان لیا تھا" میں نے کہا۔

"تم مرنے والوں کے ہمدرد اور دوست ہو' انسپکٹر سائمن بھی تمہیں جانتا ہو گا؟"

"اچھی طرح نادر" میں نے یقین کے ساتھ کہا "آپ اس سے تصدیق کرا سکتے ہیں کہ یہ سب سچ ہے اور اس کو ہمارے سامنے لا کے ہمارے بارے میں کچھ بھی معلوم کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ پہلے آئے گا تو میں اس کو یہاں بلاؤں گا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ ان دونوں عورتوں کو کیوں قتل کیا گیا تھا؟ اور تمہارا اس قتل میں دلچسپی لینا کیا معنی رکھتا ہے؟ تم پولیس کا کام خود کرنے کے لئے بے چین کیوں ہو؟" پادری نے کہا۔

"بات یہ ہے ہولی فادر' کہ ہمارے دو دشمن ہیں وہ درحقیقت شرافت اور انسانیت کے دشمن ہیں۔ وہ ہر بھیانک جرم کرنے کا حوصلہ اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بدمعاش اور دادا کہلانے پر فخر کرتے ہیں۔ جوئے خانے اور قحبہ خانے چلاتے ہیں' اسمگلر ہیں اور مجرموں کے سرپرست ہیں۔ آج کل وہ اسلحے کی ناجائز تجارت سے دولت کما رہے ہیں۔ یہ اسلحہ وہ باہر سے منگواتے ہیں اور مشرقی پاکستان بھیجتے ہیں جہاں تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں کی شورش کے باعث خانہ جنگی کی کیفیت ہے۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کتنا خوفناک شیطانی کاروبار ہے۔ جو اسلحہ وہاں کی منڈی میں دگنے چوگنے داموں پر بیچا جاتا ہے وہ پیشہ ور قاتلوں اور لوٹ مار کرنے والے غنڈہ عناصر کے ہاتھوں میں دے دیا جاتا ہے۔ اس سے وہاں خونریزی کا بازار گرم ہے۔ سینکڑوں ہزاروں بے گناہ' نہتے انسان روز موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ عورتیں بیوہ ہو رہی ہیں اور بچے یتیم۔ لیکن اس گروہ کو صرف اپنے منافع سے سروکار ہے۔"

"خدا ہم سب کو اپنی امان میں رکھے" پادری نے کہا "اگر یہ سب سچ ہے......"

"اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں ہے" میں نے کہا "ہم خدا کے گھر میں سچ بولنے کے لئے آئے ہیں۔"

"اوکے۔ تم مجھے ان کے نام بھی بتا سکتے ہو۔"

"ان کے ناموں کی کوئی اہمیت نہیں ہے' یہ لوگ گرگٹ کے رنگ بدلنے سے پہلے اپنا نام بدل سکتے ہیں۔ پھر بھی میں آپ کو چند نام بتاتا ہوں۔ چوہدری دلاور' استاد پیڈرو' حاجی عبداللہ تریونی۔"

"میں نے کوئی نام پہلے نہیں سنا!" وہ حیرت سے بولا۔

"آپ جس دنیا میں رہتے ہیں ہولی فادر' وہاں یہ نام کون لیتا ہے؟ آپ شرافت' نیکی اور راستی کی دنیا کے مکین ہیں" میں نے کہا۔

"پھر کیا تم انہی کی دنیا کے مکین ہو؟" پادری نے کہا۔ "تمہارے اور ان کے درمیان بھی کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہئے' اگر تم شریف آدمی ہو۔"

"ہم شریف آدمی ضرور ہیں... لیکن ہماری بدقسمتی کہہ لیجئے یا بے وقوفی... کہ ہم نے خود ان سے دشمنی مول لی۔ ہم ان کے کاروبار کو تباہ کرنے پر تل گئے اور انہیں ہم سے کافی نقصان ہوا۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ حسب توفیق سب کو برائی کے خلاف جنگ لڑنی چاہئے۔ اور بدی کو جڑ سے اکھاڑ کے پھینکا جا سکتا ہے' اگر انفرادی طور پر سب طے کر لیں کہ وہ عملاً برائی کا قلع قمع کرنے والوں کا ساتھ دیں گے۔ لوگ ذاتی نقصان سے ڈر جاتے ہیں اور خود غرضانہ سوچ رکھتے ہیں ورنہ معاشرے کی اجتماعی طاقت کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ پولیس جیسے ادارے بھی انہی کے زرخرید ہو گئے ہیں۔"

پادری بے حد متاثر نظر آنے لگا تھا اور آہستہ آہستہ میری بات میں روانی آتی جا رہی تھی۔ میں نے دس پندرہ منٹ تک فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھائے اور پادری کی حمایت حاصل

کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

"تمہارے خیالات بہت امید افزا ہیں مائی سن' خدا کبھی نیک بندوں سے مایوس نہیں ہوتا ورنہ تم جیسے بہادر نوجوان پیدا نہ کرتے" پادری نے کہا "میری دعا ہے کہ خدا تم کو اپنی امان میں رکھے اور اس جدوجہد میں کامیابی عطا کرے۔ بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

میں نے کہا "مجھے پورا یقین تھا کہ آپ سچائی کا ساتھ دیں گے۔ آپ جیسا کہ میں نے کہا' ہم نہیں چاہتے کہ وہ دشمن ہمیں شناخت کرے لیکن ہم ان کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے آنے کا ایک مقصد ہمیں تلاش کرنا بھی ہو۔ اگر ہم بھی ان آخری رسوم میں شریک ہوں تو ان پر نظر رکھ سکتے ہیں اور ان کی حرکات و سکنات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس حد تک قتل کی اس واردات میں شریک تھے۔"

"یہ بات میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ ان دو عورتوں کو مارنے کا کیا مقصد تھا؟ کیا وہ بھی ان کی دشمن تھیں؟"

میں نے کہا "وہ غلط فہمی میں ماری گئی ہیں' قتل وہ ہمیں کرنا چاہتے تھے۔"

"یہ بہت عجیب بات ہے۔ خیر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا تم چھپ کے انہیں دیکھتے رہو۔ یہ نہ ہو کہ خدا کے گھر میں بھی قتل و خون کی نوبت آ جائے۔ تم باہر تدفین کے وقت آ سکتے ہو" پادری نے کہا۔

"مسئلہ یہی ہے فادر' پھر وہ ہمیں دیکھ لیں گے اور پہچان لیں گے۔ ہاں اگر ہم ایسا بھیس بدل لیں کہ انہیں گمان تک نہ ہو... مثلاً ہم بھی چرچ کے نمائندے کی حیثیت سے موجود ہوں؟"

"آخر کیا مطلب ہے اس بات کا؟" پادری نے نرمی سے کہا۔

"اگر ایسا ہی راہبانہ لباس مل جائے۔ مجھے اور میرے ساتھی کو۔ اور اس لڑکی کے لئے نن کا لبادہ ہو تو ہمارا کام بہت آسان ہو جائے گا' ہم آپ کے بہت شکر گزار ہوں گے۔"

پادری نے پہلے تو اس تجویز کو صاف رد کر دیا لیکن میں نے اپنی کوشش جاری رکھی اور اسے دلائل دیتا رہا کہ اس طرح مدد کرنا نیکی ہے اور اس میں کوئی بات خلاف قانون نہیں ہو گی۔ آخر کار وہ مان گیا مگر اس نے شرط عائد کی کہ ہماری مدد کرنے سے پہلے وہ انسپکٹر سائمن سے تصدیق حاصل کرے گا۔ میں نے یہ شرط منظور کر لی۔

نو بجے کے قریب باہر کوئی گاڑی آ کے رکی۔ یہ لمبی سیاہ کار تھی جس میں سے یکے بعد دیگرے لکڑی کے بنے ہوئے دو تابوت اتارے گئے۔ اسی گاڑی سے افسردہ اور متفکر سے بے حال نظر آنے والا سائمن اترا۔ جنازہ گاڑی کے پیچھے بھی چند کاریں تھیں۔ جن میں سائمن کے عزیز و اقارب اور دوست رشتے دار تھے۔ دونوں تابوت اٹھا کے ایک خاموش جلوس کی صورت میں یہ سب لوگ چرچ کے اندر داخل ہو گئے۔ دونوں تابوت منبر کے پاس رکھ دیئے گئے۔ اگلی صف کی ایک بنچ پر سائمن بیٹھ گیا۔ کچھ لوگوں نے اس سے رسمی تعزیت کے الفاظ کہے اور پھر پیچھے والی بنچوں پر جا بیٹھے۔ سادہ کپڑوں میں چند پولیس والے آخر میں آئے۔ وہ بھی رسماً سائمن کے پاس گئے اور پھر مختلف مقامات پر جا بیٹھے جہاں سے وہ سب پر نظر رکھ سکتے تھے۔ ان کی وضع قطع بتاتی تھی کہ وہ پولیس کے لوگ ہیں۔ پھر جس طرح وہ اپنی عقابی نظریں ہر طرف ڈال رہے تھے اس سے بھی صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ آخری رسوم میں شرکت کے لئے نہیں قانونی کارروائی پوری کرنے کے لئے آئے ہیں۔

پادری نے سائمن کو اندر بلوایا۔ ہم سب ابھی تک اسی کمرے میں موجود تھے۔

"تم...!" سائمن نے مجھے اور غالب کو دیکھ کر حیرانی سے کہا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے اس سے ہاتھ ملانے کے بعد کہا "ہم اپنے مشن پر ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمارے وہ دشمن یہاں آئیں گے جن کو ہم تمہارے ساتھ ہونے والے ظلم کا ذمے دار سمجھتے ہیں۔"

"تم پاگل ہو اگر ایسا سمجھتے ہو" سائمن نے کہا "وہ یہاں کیسے آ سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "چوہدری دلاور یا تریونی اگر خود نہیں آئیں گے تو اپنے شکاری کتوں کو ضرور بھیج دیں گے' ان کو بھی ہم پہچانتے ہیں۔"

"وہ بھی تمہیں پہچانتے ہیں' یہ مت بھولو" سائمن نے کہا۔

"ہم اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہیں" میں نے کہا "اور ہولی فادر کو ہم نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ان کی مدد اور ان کی دعا ہمارے ساتھ ہے۔ تم انہیں صرف یہ یقین دلا دو کہ ہم غلط قسم کے لوگ ہیں اور نہ کوئی غیر قانونی یا غیر اخلاقی کام کر رہے ہیں۔"

"اس بات کی میں ضمانت دے سکتا ہوں کہ یہ لوگ بہادر' نیک اور دوستی کے قابل ہیں' ان کی مدد کرنا انسانیت کی فلاح کے لئے ضروری ہے" سائمن نے غیر متوقع طور پر ہمارے حق میں وہ گواہی دے دی اور وہ بھی بہت پرستائش الفاظ میں۔ اس کے بعد پادری کے لئے شک کی گنجائش ہی نہ رہی۔

میں نے سائمن کا شکریہ ادا کیا۔ وہ واپس جانے کے لئے مڑا اور رک گیا۔

"سکندر' مجھے امید ہے کہ اس موقع پر تم یہاں کسی کارروائی سے اجتناب کرو گے۔"

میں نے کہا "تم مجھ پر اعتماد رکھو' میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ حالات کی نزاکت کو نہ سمجھوں' موقع محل دیکھے بغیر کوئی ایسی ویسی حرکت کروں جس سے تمہیں ہی نہیں مجھے بھی شرمندگی ہو۔"

اس کے جانے کے بعد پادری نے کہا "میرے ساتھ آؤ۔"

www.paksociety.com

میں تم کو سمجھاتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہوگا۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ پادری کی مدد کے بغیر ہم نہ وہ لباس صحیح طور پر پہن سکتے تھے اور نہ اپنا کردار صحیح ادا کر سکتے تھے۔ چرچ کی ایک خادمہ نے پادری کی ہدایات کی روشنی میں ہمارے لئے ضرورت کا سب سامان فراہم کیا اور ہمیں تیار ہونے میں بھی مدد دی۔ اس اثنا میں چرچ کے اندر آخری رسوم شروع ہو گئی تھیں۔ پادری میز پر کتاب مقدس سے اقتباس پڑھ رہا تھا اور اس کی گونجتی ہوئی بارعب آواز ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ... آخر کار عبادت ختم ہوئی اور تابوت پر پھول رکھے گئے۔ کسی نے آرگن پر ماتمی دھن بجانی شروع کی اور تابوت اٹھانے والے آگے بڑھے۔ انہوں نے کندھے پکڑ کے تابوت اٹھائے اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چلنے لگے۔ سوگواروں کا یہ جلوس چرچ کے گرد گھوم کر پیچھے پہنچا جہاں ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے اور قبرستان میں ایک بھاری اداس اجالا بھی دم توڑ رہا تھا۔ جنازے کے پیچھے چلنے والوں کا ہجوم دیکھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ بعد میں بھی بہت لوگ آ گئے تھے اور وہ سب ... ممکن نہیں تھے۔ ان میں ساتھی ... افسران بھی تھے۔ اس کے پڑوسی بھی اور جاننے والے بھی۔ بالکل آخری وقت میں چرچ والا دروازہ کھول کے میں، غالب اور نازو بھی جلوس میں شامل ہو گئے۔ ہمارے لبادے سیاہ تھے اور ہمارے سروں پر سیاہ ٹوپیاں تھیں۔ نازو بھی سر تا پا سیاہ لباس میں تھی اور اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ سیاہی کے پس منظر میں اس کا رنگ زیادہ روشن نظر آنے سے گڑبڑ ہو سکتی تھی چنانچہ اس نے سامنے کے حصے پر اور کھلے ہاتھوں پر سیاہی مل لی تھی۔ ہمارے ہاتھوں میں عام کتابیں تھیں لیکن ہم ایسے چل رہے تھے جیسے مناجات پڑھتے جا رہے ہوں۔ سوگواروں کی بھیڑ نے خود ہمارے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ ہم سر جھکائے آگے بڑھتے گئے۔ سب سے آگے نازو تھی۔ اس حلئے میں کوئی اسے قریب سے دیکھ کے بھی شناخت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس کے پیچھے ہم بھی خود کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر کسی نے سرسری نگاہ ڈالی تو نازو کو دیکھنے کے بعد ہمیں غور سے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔

قطار میں بنی ہوئی قبروں کے درمیان ایک جگہ دونوں تابوت رکھ دیے گئے۔ سوگوار حلقہ بنا کے دور کھڑے ہو گئے۔ پادری نے کتاب مقدس سے مناجات کا ورد جاری رکھا۔ ہم تینوں اس سے چند قدم پیچھے سرنگوں کھڑے رہے اور کن انکھیوں سے ان سب کی صورتوں کو دیکھتے رہے جو ہمارے آس پاس موجود تھے۔ اچانک احاطے کے بیرونی دروازے کی طرف سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اس نے بہت پرانا میلا اور بوسیدہ سوٹ پہن رکھا تھا اور میلی کچیلی مسلی ہوئی ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس کا ہیٹ بھی مضحکہ خیز تھا مگر یہاں اس کا تمسخر اڑانے کی جرأت کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مخبوط، آہستہ آہستہ آگے آیا تو میں نے اس کے ہاتھ میں ایک سفید چھڑی دیکھی۔ وہ نابینا تھا اور بڑی مشکل سے قبروں کے درمیان راستہ تلاش کرتا آ رہا تھا۔ میرا دل پہلے تو دھڑکنا بھول گیا۔ پھر میں نے آہستہ سے منہ گھما کے غالب کی طرف دیکھا اور کہا۔ "محسن۔"

غالب نے سر کی خفیف سی حرکت کے ساتھ میرے خیال کی تائید کی اور یہی بات نازو کو بتائی۔

نازو نے بھی اقرار میں سر ہلایا اور مزید کچھ کہا۔ اس کی بات غالب کے ذریعے مجھ تک سرگوشی میں پہنچی۔ اس نے کہا تھا۔ "بڑے بھیا! جب میں نے اپنے دائیں جانب اور پیچھے دیکھا تو شک کی گنجائش بھی نہ رہی۔"

اگرچہ اس ہجوم میں ابھی تک مجھے کسی آشنا صورت کی جھلک تک دکھائی نہیں دی تھی لیکن اس سے میرے یقین میں کمی نہیں آئی تھی۔ محسن کا وہاں پہنچ جانا ہی میرے اندازوں کی درستی کا ثبوت تھا اور ان حالات میں یہ ایک منطقی نتیجہ تھا جو میرے ذہن نے رد عمل کی روشنی میں اخذ کیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے میدان جنگ میں ایک ہی فوج کے ایک ساتھ لڑنے والے فوجی دستے بکھر جائیں اور ان کے درمیان ہر قسم کا رابطہ بھی ختم ہو جائے تو وہ اپنی ذہنی تربیت، تجربے اور مشاہدے کو قیاس کی بنیاد بناتے ہوئے اپنی قوت کو ایک جگہ مرتکز کرنے کی حکمت عملی وضع کرتے ہیں۔ ظاہر ہے انہیں سوچنا پڑتا ہے کہ اس قسم کے حالات میں ہر دستے کا کمانڈر کیا کرے گا؟ دشمن اس صورت حال کو اپنے حق میں رکھنے کے لئے کیا اقدام کرے گا اور ان سب کو ملا کر دشمن کو ناکام بناتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے کس طرح ایک مربوط کارروائی کی پیش بندی کرنا ہوگی؟ اگر ان کے درمیان مکمل ذہنی ہم آہنگی، ایک سی پلاننگ کا اہلیت اور درست اندازے قائم کرنے کی صلاحیت چھٹی حس کی طرح موجود ہو تو وہ پھر متحد ہو جاتے ہیں اور دشمن کی "اسٹریٹیجی" انہیں منتشر نہیں رکھ سکتی۔

میں سمجھتا تھا کہ حادثاتی طور پر ہم سے جدا ہو جانے والے محسن کا ذہن کن خطوط پر سوچے گا۔ میرے خیال کو کسی حد تک حالات کی کسوٹی نے حقیقت ثابت کیا تھا۔ محسن بھی انہی راستوں پر محو سفر رہا تھا جن پر ہم چل رہے تھے۔ فرق صرف وقت کی عدم مطابقت سے پڑا تھا۔ کہیں وہ ہم سے پہلے پہنچ گیا تھا تو کہیں ہم اس سے پہلے جا پہنچے تھے۔ اس تلاش کی بہرحال ایک حد تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ وہ جگہ تھی جہاں سب شکاری اکٹھے ہو سکتے تھے۔ جیسے ہم پہنچنا چاہتے تھے ... ایجنٹ کمپنی کے زرخرید قاتلوں کا ٹولہ اور ان کے اشاروں کے غلام، خون آشام شکاری کتوں کا گروہ اس اجتماع کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی انہیں بھی امید ہوگی کہ ہم ایک ...

[illegible] میں چھپ کر یہاں پہنچنے کی کوشش ضرور کریں گے۔

مجھے دلاور اور ٹیوبی کے انتقامی جذبات کی شدت اور نئی ذلت کی اذیت کا بھی اندازہ تھا۔ وہ پے در پے ناکامیوں پر زخم خوردہ تھے۔ وہ متعدد بار ہزیمت کی رسوائی جھیل چکے تھے۔ مسلسل نقصانات کا صدمہ ان کو آتش زیر پا کرنے کے لئے کافی تھا۔ انہوں نے اپنے شیطانی کاروبار کو ہم سے خفیہ رکھنے کے لئے بڑے غیر معمولی حفاظتی انتظامات کا سہارا لیا تھا۔ ان کی تجارت کو پہلی شکست اس وقت ہوئی تھی جب بمبئی پہنچتے ہی ہم نے ان کا سراغ لگا لیا تھا۔ ان کے ٹھکانے معلوم کر لئے تھے اور ان کے نئے حواریوں کا پتا چلا لیا تھا۔ انہیں دوسری مایوسی کا سامنا اس وقت ہوا تھا جب ہم ان کے پھیلائے ہوئے جبر کے جال کو توڑ کے نکل گئے اور ان کی داروگیری کی ساکھ کو خاک میں ملا دیا۔ ہماری تیسری بڑی کامیابی یہ تھی کہ ہم نے ان کا بے حد قیمتی راز حاصل کر لیا اور اسے سمجھ کے ایک ایسے ٹھکانے تک جا پہنچے جس کو وہ انتہائی محفوظ اور ہمارے وہم و گمان کی دسترس سے باہر سمجھتے تھے۔ اگرچہ پہلے بھی ہم نے متعدد بار ان کے اسلحہ خانوں کو نیست و نابود کیا تھا مگر بالک رام کے انتہائی پوشیدہ اسلحے کے گوداموں کی تباہی کو ہماری اب تک کی سب سے بڑی کامیابی سمجھا جا سکتا تھا۔ اسے بچانے کے لئے دلاور اور ٹیوبی نے اپنی ساری قوت میدان جنگ میں جھونک دی تھی لیکن اتنے کشت و خون کے بعد بھی وہ اپنی کروڑوں کی سرمایہ کاری کو دھوئیں کا غبار بن کر اڑنے اور راکھ کا ڈھیر ہونے سے نہ بچا سکے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دشمنوں نے شملا کی اور اس کے بیٹے کی زندگی کو داؤ پر لگا کے یہ سمجھا تھا کہ اس جذباتی بلیک میلنگ سے وہ ہماری مزاحمت کا جذبہ اور مدافعت کا حوصلہ خرید لیں گے۔ یہ ترپ کا پتہ ابھی تک انہی کے ہاتھوں میں تھا لیکن اس سے انہیں ہاری ہوئی بازی جیتنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ ہر تازہ شکست انہیں احساس دلاتی تھی کہ اپنی ساری شہ زوری، بدمعاشی کی طاقت اور مال حرام کی قوت خرید کے باوجود وہ ابھی تک نامردوں کی طرح بے بس و لاچار ہیں۔ اپنی رسوائی کے ہر زخم کی اذیت جب ان کے فرعونی غرور کو پامال کرتی تھی تو وہ جنون اشتعال میں پاگل ہو جاتے تھے۔ وہ ہار مان کے بیٹھنے والے نہیں تھے۔ انہیں اب بھی یقین تھا کہ وہ گنتی کے چند سر پھروں کو ٹھکانے لگا کے انسانیت کے لہو کی تجارت کا کاروبار جاری رکھ سکتے ہیں اور تمام سابقہ نقصانات کی تلافی ممکن ہے۔ آخر یہ ایم آر ایس ہے کیا؟ بدی اور بدی کا شور ہے۔ قسمت ساتھ دے رہی ہے تو خود کو طاقت سمجھنے لگے ہیں۔ ان کی مجروح انا انہیں مجبور کر رہی تھی کہ وہ شکست سے بددل نہ ہوں بلکہ پہلے سے زیادہ تباہ کن قوت کے ساتھ ایم آر ایس کے جیالوں کو فنا کرنے پر تل جائیں اور انہیں سمجھا دیں کہ خوش قسمتی بھی آخر کار ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ چنانچہ یہ جنگ ابھی جاری تھی۔ ہم جان کی بازی ہارنے سے پہلے حوصلہ ہارنے کے قائل نہ تھے اور ہماری اصل طاقت یہ یقین تھا کہ ہم حق پر ہیں۔ اور یہ ایمان تھا کہ خدا بہت منصف مزاج ہے اور آدمی کی فلاح کے لئے حق کو باطل پر غالب رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ دنیا بہت پہلے بدی کی قوتوں کے تابع ہو جاتی اور یہاں سے نیکی کا وجود مٹ چکا ہوتا۔ نمرود کی خدائی باقی رہتی اور حسین کا نام لیوا باقی نہ رہتا۔

پادری نے کتاب مقدس کی تلاوت ختم کر دی تھی اور اب تابوت تدفین کے لئے لحد میں اتارے جا رہے تھے۔ ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ چرچ کے احاطے میں ساری مرکری لائٹیں روشن ہو گئی تھیں۔ ایک کھمبا عین میرے سامنے تھا جس کا روشنی پھیلانے والا بازو آگے نکلا ہوا تھا چنانچہ میں کسی حد تک اندھیرے میں تھا۔ محسن لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو چکا تھا لیکن اس نے آگے آنے سے گریز کیا تھا اور ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخوں کے سائے میں خود کو روشنی سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کالا چشمہ پہن رکھا تھا جو رات کو عموماً نابینا ہی لگاتے ہیں مگر میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی نظریں ہماری جستجو میں سرگرداں ہیں۔ کالے چشمے کے پیچھے اس کی آنکھوں کو حرکت کرتے نہیں دیکھا جا سکتا تھا لیکن وہ سر کو بھی دائیں بائیں گھما رہا تھا اور اس نے ابھی تک اشارے سے بھی شناسائی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

کیا محسن نے ہمیں پہچانا نہیں؟ میں نے حیرانی سے سوچا۔ یا وہ بھی میری طرح محتاط ہے؟ میں نے پہلے سوچا تھا کہ اسے دو انگلیوں سے وی فار وکٹری کا نشان بنا کے دکھاؤں۔ پھر میں نے اس جذباتی حرکت سے اجتناب کیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ صرف محسن ہی ہمیں تلاش نہ کر رہا ہو، سارے شکاری ہر طرف سے نگاہوں کا حصار قائم کئے اس انتظار میں ہوں کہ پہچان کا کوئی اشارہ ملے تو وہ سب کو ہوشیار کر دیں اور ہمارے لئے سب راستے بند ہو جائیں۔ ان جیسے لوگ چرچ کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے تذبذب کا شکار نہیں ہوتے۔

جب نازو نے زیر لب کہا تھا "بڑے بھیا" تو میں نے ان الفاظ کے مفہوم پر غور کرتے ہوئے اپنے چاروں طرف غور سے دیکھا تھا لیکن مجھے کسی گڑبڑ کا احساس نہیں ہوا تھا۔ سب لوگ سر جھکائے پادری کا خطبہ سن رہے تھے۔ ماحول ایک سوگوار سکوت میں ڈوبا ہوا تھا اور اگر کسی کے دل میں معاندانہ جذبات تھے تو اس کا اظہار صورت سے نہیں ہو رہا تھا۔ اگر اس ہجوم میں دوستوں کے درمیان دشمن بھی شامل تھے تو ان کے چہروں سے نقاب ہٹا کے دیکھنا محال تھا۔ شاید میں نے غلط سنا یا غلط سمجھا تھا۔ ممکن ہے نازو کے اصل الفاظ کچھ اور ہوں۔ یا ان الفاظ کا مطلب وہ نہ ہو جو میں نے سمجھا۔

نگاہ سامنے رکھتے ہوئے اور سر اٹھائے بغیر میں نے کہا "مرزا! نازو نے کچھ دیکھا ہے۔"

www.paksociety.com

میری آواز ایک سرگوشی تھی جسے صرف غالب کے کان ہی سن سکتے تھے۔

غالب نے کہا "دال میں کالا ہے" اور اسی طرح ساکت کھڑا رہا۔

میں نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا اور زیرلب دعا کے انداز میں کہا "کالا کیا مجھے تو دال بھی نظر نہیں آرہی ہے۔"

غالب نے سر جھکاتے ہوئے کہا "دائیں اور بائیں جانب... اور سامنے ایک سی مونچھوں والے۔"

میں نے کن انکھیوں سے مونچھوں کا جائزہ لیا۔ کم سے کم پچاس افراد با مونچھ تھے۔ مکھی مارکہ مونچھ سے لے کر تلوار مارکہ اور جھاڑ جھنکاڑ مونچھ تک ہر ڈیزائن موجود تھا۔ ان میں سے ایک جیسی مونچھوں والے تین افراد کا انتخاب مشکل کام تھا۔ ...معلوم نہیں نازو کی نظر نے پلک جھپکتے میں کیسے پہچان لیا کہ دشمن کون ہیں اور ان کی شناخت کی نشانی بھی دیکھ لی! میں مونچھ شناسی کے امتحان میں فیل ہونے کا اعتراف کرنے ہی والا تھا کہ دشمن نے خود اپنا راز افشا کر دیا۔

میں نے ایک شخص کو ایک قدم دائیں جانب آتے دیکھا۔ وہ ایسے دبے پاؤں اپنی جگہ سے کھسکا تھا کہ اس کے ساتھ خاموش اور باادب کھڑے ہوئے کسی بھی شخص کو یہ حرکت ناگوار نہ گزرے۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور پھر دائیں طرف سے آگے آ گیا۔ اس کے اور میرے درمیان مشکل سے چند فٹ کا فاصلہ تھا جو نامعلوم طریقے سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ اگر وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے آتا تو سب اس کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اس معیوب حرکت پر احتجاج بھی کرتے۔ احتجاج کی اسے کوئی پروا شاید نہ ہوتی۔ اس کا اصل مقصد اس طرح حرکت کرنا تھا کہ ہمیں معلوم نہ ہو۔ وہ بالکل اسی طرح آگے بڑھ رہا تھا جیسے دیوار پر رینگنے والی چھپکلی ساکت و صامت بھی نظر آتی رہتی ہے لیکن مکھی کو لقمہ بنانے کے لئے پیش قدمی بھی جاری رکھتی ہے۔ معلوم نہیں وہ شخص کتنی دیر سے دائیں بائیں آگے پیچھے ہوتا' کسی کو چھوئے بغیر اور کسی سے معذرت کئے بغیر اپنا راستہ بناتا ہماری طرف آرہا تھا۔

اس کی پُراسرار پیش قدمی کا احساس ہوتے ہی میری خطرے کا اعلان کرنے والی حس بھی جاگ اٹھی۔ میں نے اس شخص کی مونچھوں کو دیکھا اور پھر اپنے بائیں جانب نگاہ کی۔ اب مجھے ویسی ہی مونچھوں کا جوڑا فوراً نظر آگیا۔ یہ مونچھیں کیا تھیں 'بالائی لب پر دو بریکٹ تھے۔ آدھا ناک کے ایک طرف اور باقی آدھا دوسری طرف۔ درمیان سے لب کا جو حصہ عین ناک کے نیچے تھا' ...بالکل صاف تھا۔ میں نے بائیں طرف والے پر نظر رکھی تو یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ایسے ہی پُراسرار طریقے پر وہ بھی آہستہ آہستہ کھسکتا چلا آرہا ہے۔ تیسرے شخص کی تلاش اب آسان ہو گئی تھی۔ ایسی ہی مونچھیں بالکل میرے سامنے موجود تھیں۔

اس ٹریڈ مارک کے ساتھ میں نے مزید تین افراد دریافت کئے۔ ماتم گساروں میں مکمل رل مل گئے تھے مگر درحقیقت وہ برابر فاصلے پر ایک حلقے کی صورت میں مورچہ بندی کئے کھڑے تھے۔

میں نے زمین پر نگاہ رکھتے ہوئے کہا "ڈبل مونچھ گروپ کے سات ارکان ہیں۔"

غالب نے کہا "تو شمار کئے ہیں میں نے گیارہ ہو گئے۔"

"پھر اب کیا کرنا چاہئے؟"

"انتظار" غالب نے مختصراً کہا۔

"یعنی جب تک وہ قریب آکے بغل گیر نہ ہو جائیں۔" میں نے کہا۔

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میری کمر میں کوئی سخت چیز گڑ گئی جس کے بارے میں مجھے کوئی سوال کرنے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ میں ریوالور کی فولادی نال کے مرد ناک لمس سے آشنا تھا۔

کسی نے کہا "ول یو پلیز کیپ کوائٹ" (ازراہ عنایت خاموش ہو جائیے)

پادری نے پیچھے پلٹ کے دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ میں خاموش ہی ہوں لیکن مجھ سے خاموش رہنے کی درخواست نامے درشت لہجے میں کی گئی تھی۔ شاید اسے میرے پیچھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی ہوگی کہ وہ پھر سامنے متوجہ ہو گیا۔ ریوالور کی نال میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھنے لگی تھی اور میں پُرسکون رہنے کی کوشش میں ناکام تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی ڈبل بریکٹ مونچھ والا بڑی شرافت سے سر جھکائے مجھ سے تقریباً چپکا ہوا ہے تاکہ وہ ریوالور کو چھپا کے رکھ سکے۔ وہاں سب ہی ایک دوسرے سے لگے ہوئے کھڑے تھے چنانچہ اس کی یہ قربت کسی طرح بھی شکوک پیدا نہیں کر سکتی تھی۔

میں دعا کے ختم ہونے سے پہلے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ میرے سامنے بہت سے امکانات تھے جو ایک جیسے تاریک تھے۔ میں جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ جاتا اور اسے اٹھا کے آگے پھینک دیتا لیکن اس طرح جنگ کا آغاز ہونے کے بعد مونچھ بانکین کے سارے کمانڈوز کھل کر سامنے آجاتے اور آخری رسوم کا آخری منظر قتل و خونریزی اور مار دھاڑ سے بھرپور ایکشن میں ڈھل جاتا۔ گیارہ مونچھ والے اپنے آتشیں اسلحے کا فراخدلانہ استعمال کرنے پر کمربستہ تھے۔ ہمارا ان کے حصار کو توڑ نکلنا عملاً ناممکن تھا۔ ایسی احمقانہ کوشش کا انجام بھی غم گساروں کے لئے مرگِ ناگہاں ہوتا۔ اگلے دن ان سب کی آخری رسوم شاید مسلح پولیس کی حفاظت میں ادا کی جاتیں اور ان میں وہی شریک ہوتے جن کے لئے شریک نہ ہونے کا بہانہ کوئی نہ ہوتا اور وہ بلٹ پروف ماتمی لباس پہن کر آتے۔

مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ غالب اور نازو کے پیچھے بھی مونچھوں والا کوئی موت کا فرشتہ موجود ہے یا نہیں۔ بہت

میں نے سر کو تھوڑا سا دائیں جانب اور پھر بائیں جانب گھمایا تو حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ مونچھوں والے نو دس یا گیارہ نہیں تھے شاید ان کی اصل تعداد کہیں زیادہ تھی کیونکہ غالب اور نازو کے پیچھے بھی وہ پوری مستعدی کے ساتھ موجود تھے اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان سب کی ایک جیسی مونچھیں تھیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو سب سے جدا رکھنے لیکن آپس میں پہچان کا ذریعہ بنانے کے لئے یہ مونچھیں بنائی تھیں۔ یہ اصلی مونچھیں نہیں تھیں بلکہ آئی برو پنسل سے بنائی گئی تھیں۔ جیسے عورتیں اصلی بھویں صاف کرا کے (بزعم خود) خوب صورت بھویں بنا لیتی ہیں۔ دیکھنے والوں کو وہ بھی اصلی ہی نظر آتی ہیں۔ آئی برو پنسل کی ان مونچھوں کو بھی ایک نظر دیکھنے والا دھوکا کھا جاتا تھا کہ وہ بہت نفاست سے تراشی ہوئی باریک خط والی مونچھیں ہیں۔ ان سب کا لباس مختلف تھا اور چہروں کی ساخت مختلف تھی چنانچہ اس واحد قدرِ مشترک کو صرف انہی کی نظر دیکھ رہی تھی۔ یقیناً انہوں نے دوست اور دشمن میں امتیاز رکھنے اور ایک دوسرے کی پوزیشن سے باخبر رہنے کے لئے کی تھی مگر اس سے ایک بات واضح ہو گئی تھی۔ وہ سب ایک دوسرے کو صورت سے نہیں پہچانتے تھے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ نکلتا تھا کہ وہ یہاں کے نہیں ہیں۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ تریویدی نے ادھر ادھر سے منتخب افراد کو اس مشن پر یکجا کر دیا ہے جو ایک دوسرے سے ناواقف ہیں اور اگر بدقسمتی کے باعث ان کا پلان فیل ہو جاتا کسی غیر متوقع گڑبڑ کی وجہ سے کوئی مونچھ والا غلط ہاتھوں میں پڑ جاتا تو وہ دوسروں کے بارے میں کچھ نہ بتا پاتا کہ وہ کون تھے اور انہیں کس نے بھیجا تھا۔ پولیس انہیں مار مار کے وعدہ معاف گواہ بنا دیتی یا ہم لات کوٹ کر [illegible] کرا دیتے۔ جو بات کسی کو معلوم ہی نہ ہوتی وہ بتا کیسے۔ ایسی منصوبہ بندی چوہدری دلاور کا عیار ذہن ہی کر سکتا تھا۔ وہ سنسنی خیز اور چونکا دینے والے ڈرامائی منظر پیش کرنے میں ملکہ رکھتا تھا اور نقلی مونچھوں والی قاتل فوج کا آئیڈیا بھی ایک ایسا انوکھا ڈراما تھا جس میں کردار یہ نہیں جانتے تھے کہ ہدایت کار کون ہے۔ ان کٹھ پتلیوں کی طرح جن کو علم نہ ہو کہ انہیں حرکت دینے والا ہاتھ کس کا ہے۔ چوہدری دلاور نے یا تریویدی نے سامنے آئے بغیر انہیں احکامات دئے ہوں گے اور معاوضے ادا کئے ہوں گے۔ مختلف رابطوں اور وسیلوں کے ذریعے انہیں اس مشن کے بارے میں تفصیلات فراہم کی گئی ہوں گی۔ پھر انہیں اتنا پُرکشش معاوضہ پیش کیا ہوگا کہ وہ انکار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ اپنے انجان آقاؤں کے احکامات کے مطابق انجان لوگوں کے ساتھ مل کر ایک خفیہ مشن پر انجان لوگوں کو قتل کرنے آگئے۔ شاید انہیں بتایا گیا ہوگا کہ ناکامی کے نتائج کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے کامیابی کی صورت میں انعام بھی انہی کے لئے ہوگا۔ یہ سب جواری تھے جو ایک بہت بڑے انعام کے لالچ میں نتائج سے بے نیاز ہو کے جان لینے یا دینے کے لئے یہاں آ پہنچے تھے۔

ایک اور امکان یہ تھا کہ مونچھوں کی شناخت کا مضحکہ خیز اسٹائل اپنانا اس لئے ضروری سمجھا گیا تھا کہ وہ سب اپنے اصل چہرے بدل کے آئے تھے اور میک اپ میں ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے تھے چنانچہ انہوں نے صورتوں پر وہ نشان بنائے جو انہیں آسانی سے نظر آجائیں لیکن کسی اور کو شک میں مبتلا نہ کریں۔

میرا ذہن دونوں امکانات کو قبول کرتا تھا۔ سمجھ میں نہ آنے والی بات یہ تھی کہ نقلی مونچھوں والی اس ڈیتھ فورس نے ہمیں کیسے پہچان لیا؟ ان کے لئے ہم اتنے ہی اجنبی چہروں والے لوگ تھے جتنے مونچھ فورس والے ہمارے لئے۔ شاید انہیں ہم سب کی درجنوں تصویریں دکھا دی گئی ہوں گی۔ لیکن ہمارا اس وقت کا حلیہ ایسا تھا کہ محسن بھی دھوکا کھا گیا تھا۔ مگر محسن نے دھوکا نہیں کھایا تھا اور وہ جانتے بوجھتے انجان بن گیا تھا تو پھر یہ ممکن تھا کہ اس مجمع میں ہمارا دشمن کوئی پرانا شکاری بھی انجان بنا کھڑا ہو جو ہمیں اسی طرح پہچانتا ہو جیسے محسن۔ ایسا شخص چوہدری دلاور ہو سکتا تھا۔ استاد بیڈرو یا حاجی عبداللہ۔ حاجی اپنی بھاری بھرکم' ریچھ جیسی جسامت اور حلیے کے باعث چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ استاد بیڈرو اپنے کالے رنگ کو گورا نہیں کر سکتا تھا اور اپنے کانوں میں پڑی ہوئی پیتل کی مندریوں کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ ہاں چوہدری دلاور بھیس بدل کے ہماری نشاندہی کے لئے بنفس نفیس یہاں موجود تھا تو اس کو اتنی آسانی سے پہچاننا مشکل کام تھا۔ اس کی نظر دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔

تدفین کے مراحل ختم ہونے والے تھے اور ابھی تک میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا۔ میں سائرن کی والدہ اور بہن کی آخری رسوم میں خونریزی شامل کرنا نہیں چاہتا تھا اور میں پادری کے ساتھ کئے ہوئے وعدے سے بھی انحراف نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس بارے میں بھی کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ میری کمر سے لگے ہوئے ریوالور کی گولی کا راستہ کوئی مصلحت روک سکتی ہے۔ ان پیشہ ور قاتلوں کے نزدیک آخری رسوم کے احترام کی کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی تھی اور نہ عبادت گاہ کے تقدس کے خیال کی۔ وہ ایسی جذباتی مصلحتوں کے احساس سے ناآشنا لوگ تھے چنانچہ انہوں نے ہمارے باہر نکلنے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ وہ زیر دام آئے ہوئے شکار کو مہلت دے کر ناکامی مول لینے کا رسک لیتے تو جان سے بھی جاتے اور انعام سے بھی۔ شاید یہ بات ان کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دی گئی ہوگی کہ دشمن انتہائی عیار اور خطرناک ہے اور پل بھر میں نقشہ پلٹ دیتا ہے۔

میں نے آہستہ آہستہ سر کو پیچھے کی طرف گھمایا مگر میں اس شخص کی صورت نہ دیکھ سکا جو اپنے ریوالور کی نال کو خنجر کی طرح میری کمر میں گھونپ دینے پر آمادہ تھا لیکن میں نے ان دونوں کو دیکھ لیا جو غالب اور نازو کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے تھے۔

www.paksociety.com

یقیناً ان میں سے ایک نے ریوالور کو غالب کی پسلیوں سے لگا رکھا تھا اور دوسرے نے نازو کی کمر سے۔ وہ دونوں جسمانی طور پر صحت مند اور گٹھے ہوئے جسم کے مالک تھے۔ ایک نے ڈینم کی پتلون اور واسکٹ پہن رکھی تھی۔ دوسرا گرے چیک اور براؤن چیک والے کوٹ میں تھا۔ وہ دونوں ہاتھ سینوں پر باندھے کھڑے تھے اور دونوں کے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا مگر یہ ہاتھ بائیں بازو کے نیچے تھا۔

"اپنی نظر سامنے رکھو" میرے پیچھے کھڑے ہوئے مونچھ والے قاتل نے انگریزی میں غرا کے کہا۔

میں نے کہا "آگے کیا دیکھوں، میری نظر میں دنیا تیرہ و تار ہوگئی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے موت کا اندھیرا چھا گیا ہے۔ میں موت کے فرشتے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"خاموش ہو جاؤ ورنہ....."

"ورنہ کیا؟ تم مجھے دو مرتبہ قتل کرو گے؟ ایک بار ابھی اور پھر مقررہ وقت پر۔"

"تمہارے ساتھ دوسرے لوگ بھی مارے جائیں گے، ہمارا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔"

میں نے کہا "میرے مرنے کے بعد اگر ساری دنیا مر جائے تو مجھے کیا۔"

"یعنی تم چاہتے ہو کہ تمہیں آخری رسوم ختم ہونے سے پہلے ہی نکال کر لے جائیں۔ ٹھیک ہے، میں سب کو اکٹھا کر لیتا ہوں۔"

"آئی ایم سوری۔ میں چاہتا ہوں جہاں تم نے اتنا صبر کیا ہے تھوڑی... اور ٹھہر جاؤ تاکہ یہ تدفین مکمل ہو جائے" میں نے کہا۔

پادری نے پلٹ کر مجھے گھورا "ول یو پلیز۔ آل آف یو کم فارورڈ" (مہربانی کریں اور آپ سب لوگ آگے تشریف لے آئیں) یہ بات اس نے بالکل واضح اور بلند آواز میں کہی تھی اور سب نے سنی تھی۔

میں نے سر جھکا کے کہا "یس فادر" اور آگے بڑھ کے پادری کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ غالب اور نازو نے بھی پادری کے حکم کو تائید غیبی سمجھتے ہوئے تعمیل کی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ مونچھ فورس کے مستعد ارکان کی قوت فیصلہ مفلوج ہو گئی اور وہ وہیں کھڑے رہ گئے۔ معلوم نہیں انہوں نے کس طرح اپنے ریوالور چھپائے ہوں گے۔ اگر ہم اپنی مرضی سے ایک قدم بھی آگے بڑھاتے تو وہ بھی ایسے آگے بڑھ جاتے جیسے ہم یک جان دو قالب ہیں یا آپس میں گوند سے چپکے ہوئے ہیں۔ وہ پادری کے حکم پر عمل درآمد نہیں روک سکتے تھے کیونکہ غالباً انہیں آخری رسوم کے دوران خونریزی سے اجتناب کرنے کا سختی سے حکم دیا گیا تھا تاوقتیکہ ہم مزاحمت کرتے ہوئے خود انہیں مقابلے پر مجبور نہ کر دیں۔ انہیں یہ حکم بھی تھا کہ ہمیں قتل نہیں گرفتار کرانا ہے اور اسی لئے نقلی مونچھ والوں کی پوری بٹالین بھیجی گئی تھی۔ قتل کرانے کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ ہمیں چرچ کے اندر محصور کیا جاتا۔ اس کے لئے تدفین سے پہلے یا بعد کی شرط بھی غیر ضروری تھی۔ کوئی ایک پیشہ ور قاتل جس کا نشانہ درست ہوتا ہمیں صرف ایک ریوالور سے تین گولیاں چلا کے کسی بھی جگہ کسی بھی وقت ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ یہ پندرہ بیس افراد تھے یا اس سے بھی زیادہ۔ اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا مگر میں یہ بات سمجھ سکتا تھا کہ ان کا مقصد ہمیں زندہ سلامت گرفتار کر کے لے جانا ہے۔ وہ اور تربیت یافتہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ایک کے مقابلے میں ایک کی کوئی حیثیت نہیں اور وہ چار تو ہمارے ہاتھوں کسی بھی معرکہ آرائی کی ابتدائی تقریب میں ہی مارے جاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اتنے لوگ بھیج دیئے تھے جو ایک ساتھ ہم سے چمٹ جائیں تو ہمیں بے دست و پا کر دیں۔ وہ اس حقیقت کو بھی سمجھتے تھے کہ اس موقع پر چرچ میں کتنی پولیس فورس ہوگی۔ پولیس کے ساتھ چرچ میں براہ راست تصادم کے نتائج بہت سنگین ہو سکتے تھے۔ اخبارات میں واویلا مچ جاتا اور ہر طبقۂ فکر کے لوگ احتجاجی مظاہرے شروع کر دیتے تو حکومت کی مشینری نیچے سے اوپر تک حرکت میں آجاتی۔ یہی وجہ تھی کہ سب مونچھوں والے خاموشی سے لیکن بڑے منظم انداز میں ہمارے گرد حلقہ تنگ کرتے جا رہے تھے اور انہوں نے بروقت ہمارے پیچھے ریوالور کی موجودگی کا احساس دلا کے ہمیں خاموشی سے اطاعت پر مجبور کر دیا تھا اور انہیں اپنے آپریشن کے مکمل اور کامیاب ہونے کا یقین ہو چلا تھا کہ پادری کی مداخلت نے ان کا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔

پادری نے مجھ سے اور غالب سے کہا "آپ دونوں فوراً میرے سامنے آجائیں۔"

اس نے قبر میں اتارے جانے والے تابوت کے پیروں کی جانب اشارہ کیا تھا۔ میں نے اور غالب نے پھر تعمیل کی اور گھوم کر ان غنڈوں کے مقابل آگئے جو ہماری کمر سے ریوالور لگائے کھڑے ہوئے تھے۔

"تم میرے ساتھ رہو سسٹر" پادری نے نازو سے کہا اور اسے اپنے برابر کھڑا کر لیا۔

ہمارے گرد جمع ہو کے حصار کو تنگ سے تنگ تر کرنے والوں کی منصوبہ بندی دھری رہ گئی تھی اور ان کی ساری محنت پر پانی پھر گیا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے منتشر ہو رہے تھے اور ایک دوسرے کو واضح اشاروں سے ہمیں پھر گھیرنے کے لئے دوسری طرف آنے کا منصوبہ بنا رہے تھے مگر یہ اشارے صرف ہم ہی سمجھ سکتے تھے۔ باقی لوگوں کے لئے ان کی نقل و حرکت میں کوئی غیر معمولی یا شک و شبے والی بات نہیں تھی۔

ہم سب کے ہاتھوں میں جو کتابیں تھیں انہیں ہم احتیاط سے دونوں ہاتھوں میں تھام کر سینے سے لگائے رکھنے پر مجبور تھے حالانکہ وہ بائبل نہیں تھیں لیکن اس طرح ہم ضرورت پڑنے پر وہ ریوالور بھی نہیں نکال سکتے تھے جو ہمارے کپڑوں یا لبادوں کے نیچے پوشیدہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان کے استعمال کی نوبت نہیں

آئے گی مگر اب مجھے اپنا خیال غلط ثابت ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے غالب سے کہا "وہ موت کے فرشتے پھر آ رہے ہیں، انہیں قریب مت آنے دینا۔"

غالب نے کہا "اگر وہ مجھ سے چمٹے تو میں کیا کروں؟ پلٹ کے بتاؤں کہ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ یا منہ کے بل قبر میں گر جاؤں؟"

میں نے کہا "حرکت میں برکت ہے۔ ادھر ادھر ہوتے رہو جیسے تمہاری عبا میں بھڑ داخل ہو گئی ہے یا تمہاری ٹانگوں پر چیونٹیاں چڑھ گئی ہیں۔"

"اس سے انہیں کتنی دیر ٹالا جا سکتا ہے؟" غالب نے کہا۔ "اُف چیونٹیاں۔"

غالب نے یہ آخری الفاظ خاصی اونچی آواز میں کہے تھے۔ پیر کو زور زور سے زمین پر مارتے ہوئے اس نے جگہ بدلی۔ اس کی یہ کارروائی بہت موثر رہی۔ اس کے پیچھے پہنچ جانے والا مونچھ فورس کا جو رکن ہجوم کو چیر کر آگے آگیا تھا، پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ غالب کی ایک لات اس کے گھٹنے کی ہڈی پر بھی لگی تھی لیکن اس نے چوٹ کی اذیت کو برداشت کر لیا اور پھر غالب کی پشت پر اپنا دست شفقت رکھنے کے لئے بڑھا۔ غالب کے ہاتھ سے کتاب گر گئی۔

"اوہ مائی گاڈ!" اس نے اونچی آواز میں کہا اور ایک دم جھک گیا۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے کتاب کو اٹھایا اور جھاڑ کے چوما۔ وہ شخص ریوالور نکال چکا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے ریوالور کو اپنی بغل میں چھپا لیا اور ہاتھ باندھ کے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے اپنی طرف بڑھنے والے کو قریب آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ابھی وہ مجھ سے دو قدم دور تھا کہ میں نے بھی زمین پر پاؤں مارا، جیسے مجھے بھی کسی چیونٹی نے یا چیونٹے نے کاٹ لیا ہو۔ میں اتنی تیزی سے پیچھے ہٹا اور میری کہنی یوں حرکت میں آئی کہ وہ شخص سنبھل ہی نہ سکا۔ کہنی اس کے سینے پر لگی تھی۔ اس کا سانس رک گیا اور اس کے حلق سے "اوق" کی آواز کے سوا کچھ نہ نکلا۔ اس کا ہاتھ بھی ریوالور نکال چکا تھا مگر اس کو ریوالور چھپانے کی مہلت نہ ملی۔

"یہ کیا ہے؟" ایک شخص بڑی تیزی سے جھپٹا اور اس نے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ یقیناً سادہ کپڑوں میں کوئی پولیس مین تھا جس کی نظر اس وقت مجھ پر تھی۔

عین اسی وقت نازو نے پلٹ کر کسی شخص کے منہ پر طمانچہ مارا "بدتمیز، بیہودہ، گنہگار تو وہی... اتنی دیر سے تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔ کیا چاہتے ہو تم آخر؟ کیا تمہیں بالکل احساس نہیں کہ یہ خدا کا گھر ہے اور تم قبرستان میں کھڑے ہوئے ہو، نقلی مونچھیں بنا کے۔"

وہ شخص گال پر ہاتھ رکھے کھڑا ہی تھا کہ محسن نے اپنی نابیناؤں والی سفید چھڑی چلائی اور آگے بڑھنے کی کوشش میں اسے دھکا دے کر گرا دیا۔ "اوہ! سوری، کون تھا بھائی؟"

لیکن اب یہ ڈرامہ یوں نہیں چل سکتا تھا۔ ایک اور پولیس مین نے غالب کے پیچھے آجانے والے کو دبوچ لیا تھا کیونکہ وہ اس کی بغل میں دبے ہوئے ریوالور کو دیکھ چکا تھا۔

"ٹھہر جاؤ۔ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" پادری نے چلا کے کہا۔

"آپ ان کے ساتھ اندر جائیں ہولی فادر" سائمن نے پادری کے سامنے آکے کہا "یہاں کچھ غلط قسم کے لوگ مسلح ہو کے آگئے ہیں۔"

"مسلح ہو کے۔ او مائی ہولی گاڈ!" پادری نے سینے پر صلیب بنائی "کون ہیں یہ جہنم کے سزاوار لوگ جو عبادت گاہوں میں خون بہانا چاہتے ہیں۔ ان سے کہو مجھ پر گولی چلائیں۔"

"آپ جائیں پلیز" سائمن نے چلا کے کہا اور ریوالور نکال لیا "یہ لوگ آپ کا سرمن سننے والے نہیں ہیں۔ تم لوگ ادھر ٹھہرو، ہنگامہ ختم ہونے تک" اس نے ہم سے مخاطب ہو کے کہا۔

تدفین ختم ہو چکی تھی۔ ہنگامہ آرائی پر سہم کر منتشر ہو جانے والے اب اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ پولیس کے جو سپاہی سادہ کپڑوں میں تھے انہوں نے چرچ کی چار دیواری پر چڑھ کے مورچے بنا لئے تھے اور ان کے ریوالوروں کا رخ اندر کی طرف تھا۔ ہم آخری دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔

"یہ چرچ کے لوگ نہیں ہیں" ایک شخص نے ہماری طرف انگلی اٹھا کے کہا۔

"شٹ اپ" سائمن دہاڑا "تم کیا جانتے ہو؟"

"میں جانتا ہوں" اس شخص نے کہا۔ وہ اس مونچھ فورس کا کمانڈر معلوم ہوتا تھا جو بڑی تیزی سے پسپا ہو رہا تھا۔ ان کے متعدد ارکان عام لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو کے گیٹ سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے جہاں پولیس ایک ایک شخص کو چیک کر رہی تھی۔

ایک ساتھ تین افراد آگے بڑھ آئے "یس، یہ تینوں چرچ کے ممبر نہیں ہیں۔"

وہ سب مونچھوں کی شناختی علامت نہیں رکھتے تھے جو میرے لئے ایک حیران کن بات تھی۔ پھر اچانک میری نگاہ اس شخص پر گئی جس کو نازو نے تھپڑ مارا تھا۔ وہ بڑی بدحواسی کے عالم میں پیچھے ہٹ گیا تھا اور اب زمین پر سے کوئی چیز اٹھا رہا تھا۔ محسن نابیناؤں کی طرح راستہ بناتا ہوا گیٹ کی طرف جانے والا اس کے قریب سے گزر رہا تھا۔ میں نے ایک دم کہا "اسے دیکھو... وہ ریوالور اٹھا رہا ہے۔ وہ شخص۔"

مگر وہ شخص ریوالور نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس نے گھبرا کے میری طرف دیکھا اور رومال سے ناک صاف کرتے کرتے ایک دم

www.paksociety.com

گیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ مگر اس نے اتنی دیر میں آئل پوسے بنی ہوئی مونچھوں کو مٹا دیا تھا۔ اب میں نے سائمن سے الجھنے والوں کو غور سے دیکھا۔ وہ بھی اپنی مونچھیں صاف کر چکے تھے۔ شناخت کی اس علامت کو انہوں نے خطرے کا احساس ہوتے ہی سب سے پہلے مٹایا تھا۔

"تم ان کی تلاشی لو۔ ان کے پاس اسلحہ ہے" سائمن کے گرد جمع ہو جانے والے چاروں افراد اتنی آسانی سے قائل ہونے والے نہیں تھے "آخر تم کیوں ان کی حمایت کر رہے ہو اور ہماری بات کو کیوں اہمیت نہیں دے رہے ہو؟"

"تم کون ہوتے ہو مجھ سے یہ سوال کرنے والے؟" سائمن نے دہاڑ کے کہا۔

ایک شخص نے فوراً اپنا کارڈ نکال لیا "پریس رپورٹر فرام ٹائمز آف انڈیا۔"

دوسرے شخص نے کہا "میرا تعلق اے پی آئی سے ہے انسپکٹر سائمن۔"

تیسرے نے خود کو روزنامہ ویشنی سماچار کا کرائم رپورٹر کہا۔ "ہم اس اسٹوری کی کوریج کے لئے آئے ہیں۔"

میں نے اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا کہ وہ اپنی مونچھیں صاف کر چکے ہیں اور اسی مونچھ فورس کے ارکان ہیں جو ہماری گرفتاری پر مامور تھی۔ ان کی مونچھیں تھی ہی نہیں اور وہ جائز طور پر دوہرے قتل کی اس واردات میں دلچسپی لے رہے تھے۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ انہیں ہمارے پاس اسلحے کی موجودگی کا علم کیسے ہوا تھا؟ صرف ہماری صورت دیکھ کر اخباری نمائندے اتنا بڑا الزام کیسے لگا سکتے تھے اور اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے تھے کہ ہم چرچ سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتے۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ معلومات انہیں عین وقت پر دی گئی تھیں اور اس کا مقصد ایک مکمل شکست کا سد باب تھا۔ اگر مونچھ فورس ہمیں گرفتار کرنے میں ناکام رہے تو پھر پولیس گرفتار کر لے۔ اور بعد میں زیور پہنا کے مسٹر ترویدی کی خدمت میں پیش کر دے کہ سر آپ کے مجرم حاضر ہیں۔ آپ کی نالائق بھگوڑا فورس تو مونچھیں منڈوا کے بھاگ گئی تھی۔ انعام اب ہمیں ملنا چاہئے۔ اور ترویدی کہے گا کیوں نہیں ... ہم تمہاری وفاداری سے خوش ہوئے ...

سائمن اخباری نمائندوں کے اختیارات کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا اور ان کی معلومات کو ثبوت کے بغیر غلط بھی قرار نہیں دے سکتا تھا۔

"دیکھئے آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے" سائمن نے کہا۔ "کس نے کہی ہے آپ سے یہ بے سروپا بات؟"

ویشنی سماچار کے کرائم رپورٹر نے چوتھے شخص کی طرف دیکھا لیکن اس کا حوالہ دینے سے گریز کیا۔ شاید اس نے ہی ہمارا راز فاش کیا تھا مگر اخبار والوں سے درخواست کی تھی کہ اس کا نام نہ لیا جائے۔ اخبار والے ایسے ذرائع سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور قانوناً انہیں یہ حق حاصل رہتا ہے کہ اپنی معلومات کے ذریعے کو ظاہر نہ کریں۔ چوتھا شخص بڑی متانت کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اور میرے لئے شک کی قطعی گنجائش نہ رہی تھی کہ وہی اس مونچھ فورس کا سپہ سالار تھا۔ پھر میرے شک کو اس نے غیر ارادی طور پر یقین میں بدل دیا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور بلا ضرورت منہ صاف کیا۔ مجھے ہوا میں اسپرٹ جیسی بو کا جھونکا محسوس ہوا۔ اس نے اپنی مونچھوں کے نشانات مٹا دیئے تھے لیکن وہ اپنا چہرہ آئینے میں نہیں دیکھ سکتا تھا چنانچہ مزید اطمینان کے لئے اس نے پھر رومال سے اس جگہ کو رگڑ دیا تھا جہاں آئل پروپینٹس سے مونچھوں کا ڈیزائن بنایا گیا تھا۔

"کیا آپ کو اصرار ہے کہ یہ چرچ کے نمائندے ہیں" ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے نمائندے نے کہا۔

ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے نے زیادہ دور اندیشی کا ثبوت دیا۔ وہ پادری کی طرف لپکا جو تیز تیز قدم اٹھاتا چرچ کی طرف جانے والے راستے پر گامزن تھا۔ معلوم نہیں اس نے پادری کا راستہ روک کے کیا کہا مگر پادری اس کے ساتھ آنے پر مجبور ہو گیا۔ مجھے اس شریف آدمی کی پوزیشن خراب ہونے پر افسوس ہوا۔ اس نے ہماری مدد کی تھی اور اب پریشانی میں گرفتار تھا۔ اس نے جان بچا کے نکل جانا چاہا تھا مگر اخباری رپورٹر نے اس کوشش کو بھی ناکام بنا دیا تھا۔ خود سائمن کے لئے صورت حال اچانک قابو سے باہر ہو گئی تھی اور اگرچہ ابھی تک اس نے ہم سے کچھ نہیں کہا تھا مگر صاف ظاہر تھا کہ ساری خرابی کا ذمے دار وہ ہمیں سمجھتا ہے۔ ہم آٹھ دس فٹ دور تھے چنانچہ ابھی تک براہ راست سوالات کی زد میں نہیں آئے تھے۔

"فادر۔ میں آپ کو زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں" ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے نے کہا "لیکن اس گتھی کو آپ ہی سلجھا سکتے ہیں۔"

پادری نے خفگی سے کہا "آخر تمہیں کس نے اندر آنے کی اجازت دی؟"

"ہم کسی کی اجازت کے محتاج نہیں ہوتے فادر۔ جہاں بھی کچھ ہو ہم خود پہنچ جاتے ہیں اور یہی ہمارے پیشہ ورانہ فرائض کا تقاضا ہے" ویشنی سماچار کا نمائندہ بولا۔

"میرا مقصد ہرگز دخل دینا نہیں تھا۔ یہ اسٹوری بہرحال ایک نیوز ویلیو رکھتی ہے۔ اس میں کوئی زرد صحافت والی بات نہیں ہے" ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے نے کہا "اس معاملے میں پولیس بھی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھی۔"

"آپ صرف تصدیق یا تردید کر دیں کہ یہ تینوں چرچ سے متعلق ہیں یا نہیں ہیں؟" اے پی آئی کے نمائندے نے کہا۔

پادری کے لئے اب براہ راست جواب دینے سے گریز کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ اس کی نظریں ہمیں ملعون کرتی محسوس ہوتی تھیں کہ تم نے باتوں میں الجھا کے مجھے ایک ایسے کام پر مجبور کر دیا جس کا نتیجہ پریشانی اور پشیمانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تاہم اب وہ کسی صورت اپنی پوزیشن خراب کرتے ہوئے ہمیں تحفظ فراہم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

اس نے قطعی اور دوٹوک لہجے میں کہا "آئی ایم سوری جنٹلمین... لیکن ان تینوں کا چرچ سے کوئی تعلق نہیں۔"

ظاہر ہے اس بیان کے ساتھ ہی صحافیوں کے لئے ایک سنسنی خیز سرخی بن گئی۔ انہوں نے فاتحانہ نظروں سے سائمن کی اور ہماری طرف دیکھا۔ پھر انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"پھر یہ کون ہیں؟"

"انہوں نے چرچ کا لبادہ کیوں پہن رکھا ہے؟"

"یہ آپ کی موجودگی میں کیسے چرچ کی نمائندگی کر رہے تھے؟"

"اگر آپ کو معلوم تھا کہ یہ جھوٹے اور جعلی لوگ ہیں تو آپ نے احتجاج کیوں نہیں کیا تھا؟"

"آپ نے پولیس کو کیوں نہیں بتایا تھا؟"

پادری پرسکون رہا اور اس نے کسی کو جواب دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ آخر کار صحافیوں کو خاموش ہونا پڑا۔

"آپ کی خاموشی کا کیا مطلب لیا جائے ہولی فادر؟" ویشنی سماچار کا کرائم رپورٹر بولا۔

"مطلب نکالنا آپ لوگ جانتے ہیں۔ میں تو منتظر تھا کہ آپ کے سوالات ختم ہوں تو میں بھی کچھ کہوں" پادری نے مسکرا کے کہا "اور کہنا مجھے صرف اتنا ہے کہ آپ کے سب سوالات کا جواب میری طرف سے بھی نوجوان انسپکٹر سائمن دیں گے جن کی والدہ اور ہمشیرہ کی المناک وفات اس اجتماع کا سبب بنی۔ انہوں نے ہی مجھ سے ان تینوں کی مدد کے لئے کہا تھا اور ان کے ضامن بھی یہ ہوئے تھے۔ میں نے ہمیشہ قانون کا احترام کیا ہے اور قانون کی مدد کی ہے اس لئے میں آپ لوگوں سے بھی درخواست کروں گا کہ اس خبر میں میری ذات یا چرچ کے ارفع مقام کو بے سبب نہ گھسیٹا جائے۔ یہ ایک ناخوشگوار واقعہ تھا جس کا چرچ سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔

پھر اے پی آئی کا نمائندہ بولا "لیکن ہولی فادر! اگر اس واقعے کی تحقیقات کے لئے آپ کو گواہی دینی پڑے..."

"تو میں دوں گا۔ میں نے کہا نا کہ قانون کی مدد کرنا میرا فرض ہے" پادری نے اس کی بات کاٹ دی "وہاں بھی یہی کہوں گا جو میں اس وقت کہہ رہا ہوں۔ آپ لوگ مجھ سے غلط بیانی کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ اگر مجھے دس بار بھی بتانا پڑے گا تو میں ایک ہی سچ بتاؤں گا۔ سچ ایک ہوتا ہے اور اس کے روپ ہزار بھی نہیں ہو سکتے۔ تھینک یو جنٹلمین۔ گاڈ بلیس آل آف یو" پادری نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور واپس چل پڑا۔

"آپ مطمئن رہیں سر۔ آپ کی اور چرچ کی نیک نامی پر کوئی حرف نہیں آسکتا" ویشنی سماچار کے نمائندے نے کہا "یہ وعدہ میں سب کی طرف سے کر سکتا ہوں۔"

"تھینک یو۔ تھینک یو مائی سن" پادری نے پلٹ کر مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

"ظاہر ہے اب توپوں کا رخ میری طرف ہو گا" سائمن نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"انسپکٹر سائمن! ہمیں آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ تھا لیکن اس واردات کے بہت سے پہلو ابھی تک بے نقاب نہیں ہوئے" ویشنی سماچار کا نمائندہ بولا۔

"اتنی جلدی ہو بھی نہیں سکتے۔ ابھی تو تفتیش کا آغاز بھی نہیں ہوا۔ ابتدائی کارروائی باقی ہے" سائمن نے کہا "اور قبل از وقت میں اس معاملے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔"

"مجھے افسوس اس بات کا بھی ہے کہ آپ کا رویہ ابتدا ہی میں عدم تعاون کا اور کسی حد تک غلط اور جارحانہ تھا" ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے نے کہا۔

"آئی ایم سوری۔ میں ذہنی و جسمانی طور پر بہت اپ سیٹ ہوں۔ میں چوبیس گھنٹے سے سویا نہیں ہوں۔ جو کچھ میں نے پہلے کہا میری درخواست ہے کہ آپ اسے حذف کر دیں۔ میں آپ کے سب سوالات کا جواب دینے کے لئے تیار ہوں۔"

"او کے انسپکٹر۔ ان حالات میں ہم وہ سب آف دی ریکارڈ رکھتے ہیں۔"

"اس میں سے کچھ شائع نہیں ہو گا" اے پی آئی کے نمائندے نے کہا۔

"اب آپ بتائیں کہ کیا یہ صحیح ہے جو کچھ پادری نے کہا؟ کہ اس بھیس میں خود آپ انہیں چرچ میں لائے تھے" ٹائمز آف انڈیا کا نمائندہ بولا۔

"ہاں۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ انہیں میں لایا تھا۔"

"کیا یہ بھی درست ہے کہ ان لوگوں کے پاس اسلحہ ہے" ویشنی سماچار کا نمائندہ بولا۔

"ہاں۔ ہم سب مسلح ہیں" سائمن نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

"یہ کون لوگ ہیں؟ پولیس کے آدمی۔ ہم ان سے بات کر سکتے ہیں؟"

"ظاہر ہے پولیس کے آدمی ہیں" سائمن مسکرایا "کیا آپ لوگ انہیں ہر طرف نہیں دیکھ رہے ہیں سادہ لباس میں؟ لیکن

www.paksociety.com

آپ ان سے کوئی سوال نہیں کر سکتے۔"

"دو مخصوص لباس میں ایک عورت کو اور دو مردوں کو یہاں بھیجنے کی ضرورت اور مصلحت ابھی تک واضح نہیں ہوئی۔" اے پی آئی کا نمائندہ بولا "یہ یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"ان کا تعلق پولیس کے محکمے کے کس شعبے سے ہے؟" ویلش سماچار کا کرائم رپورٹر بولا۔

"ان کے نام اور عہدے کیا ہیں؟"

"دیکھیں۔ میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ میں ایک چھوٹا سا پولیس افسر ہوں، جس کی ڈیوٹی ایک دور افتادہ گاؤں میں تھی۔ سرکاری طور پر میں کوئی بیان دینے یا پریس کانفرنس کرنے کا مجاز نہیں۔ یہاں میں آپ سے اپنی ذاتی حیثیت میں بات کر رہا ہوں۔ یہ تینوں میرے معاون اور مددگار کی حیثیت سے آئے تھے۔ ان کا پولیس کے محکمے کی ملازمت سے کوئی تعلق نہیں۔ درحقیقت انہیں ایک خاص مقصد کے تحت یہاں لایا گیا تھا۔ یہ قاتلوں کو شناخت کر سکتے تھے۔"

"کیا پولیس کا خیال تھا کہ قاتل بھی یہاں موجود ہوں گے؟"

"اس کا امکان تھا" سائمن نے کہا "پولیس مفروضات قائم کر کے آگے بڑھتی ہے۔"

"کیا وہ پہچان لئے گئے؟" ویلش سماچار کا نمائندہ بولا۔

"نہیں۔ یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا" سائمن نے کہا۔

"پھر وہ دونوں کون ہیں جن کو ریوالور نکالتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا۔"

"یہ ابھی نہیں بتایا جا سکتا۔ میں خود بھی نہیں جانتا" سائمن بولا۔

ٹائمز آف انڈیا کا نمائندہ بولا "کیا یہ چشم دید گواہ ہیں؟ آخر ہم ان سے بات کیوں نہیں کر سکتے؟"

"اس لئے کہ فی الحال ان کی شناخت کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ ... اس سے تفتیش متاثر ہوگی اور قاتل ہوشیار ہو جائیں گے۔ ممکن ہے وہ فرار ہونے کی کوشش کریں۔ یا ان کی زندگی کے دشمن ہو جائیں اسی لئے ان کو چھپا کے یہاں لایا گیا تھا۔ لیکن یہاں سیکیورٹی کے انتظامات کا ذمے دار میں نہیں تھا۔ دیکھا جائے تو میرا اس وقت پولیس کے معاملات سے کوئی تعلق ہی نہیں کیونکہ میں ایک فریق ہوں۔ قتل کی ایف آئی آر میں مدعی میں ہوں۔ میں آخری رسوم میں ایک بیٹے کی یا بھائی کی حیثیت سے شریک تھا اور بس۔ آپ لوگوں کو یہ سب سوالات متعلقہ پولیس افسران سے کرنے چاہئیں۔ مگر پولیس تو اب جا چکی ہے۔"

"کیا۔ کون تھا متعلقہ افسر؟" ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے نے بے بسی سے کہا۔

"آپ لوگ معلوم کر سکتے ہیں۔ تفتیش کا نگراں کون ہے اور حفاظتی انتظامات کی ذمے داری کس کو سونپی گئی تھی۔ میں تو آپ لوگوں سے بھی زیادہ اجنبی ہوں ان معاملات میں... میری ڈیوٹی نہیں ہے یہاں۔"

"دیٹ از نان سنس۔ تم نے پہلے کیوں نہیں کہا؟"

"کیا نہیں کہا" سائمن نے کہا "تم خود میرے پاس آئے تھے... میں نے تمہیں نہیں بلایا تھا اور نہ کسی پریس کانفرنس کا دعوت نامہ بھیجا تھا۔"

"تم ہمارا وقت ضائع کرتے رہے۔ تم نے ہمیں روکے رکھا، ... فضول باتوں میں الجھایا۔"

"تم نے خود اپنا وقت ضائع کیا۔ میں نے صرف سوالات کے جواب دیے۔ ڈونٹ بلیم می، گو ٹو ہیل آل آف یو" سائمن نے کہا۔

"کیا؟ انسپکٹر سائمن... یہ مت بھولو..."

"شٹ اپ اینڈ گیٹ لاسٹ۔ جاؤ جو لکھنا ہے لکھو میرے خلاف یا چرچ کے خلاف۔ میں نہ تمہاری پروا کرتا ہوں اور نہ اس نوکری کی جس میں اپنی ماں اور بہن کو نہیں بچا سکا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس وردی پر اور ان قانون کی کتابوں کی بدولت ملنے والے اختیارات پر جو پولیس کا محکمہ صرف اپنی دہشت قائم کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس سے کسی شہری کی حفاظت نہیں ہوتی۔ انصاف کا بول بالا نہیں ہوتا۔ ذریعے وہ ہیں جو رشوت سے کوٹھیاں، کاریں اور بینک بیلنس بناتے ہیں اور اس ملازمت کو سونے کی کان سمجھتے ہیں۔ بس میں نے تم سب کو بے وقوف بنایا اور روکے رکھا تاکہ تم متعلقہ پولیس افسران سے بات نہ کر سکو۔ وہ بھی مجھ سے خوش نہیں ہیں کیونکہ ان کے سامنے بھی میں ایسے ہی بکتا رہتا ہوں۔ وہ بادل ناخواستہ ادائے فرض کے لئے آئے تھے اور دو گھنٹے جلدی چلے گئے۔ انہوں نے مجھ سے بھی کوئی بات نہیں کی اور تم سے بھی۔ اب تم جاؤ ان کے دفتر اور جو میں نے کہا یا کیا سب انہیں بتاؤ اور جو پوچھنا ہے ان سے پوچھو۔ آئی ڈیم کیئر نار دوات دے سے لیفڈ دو۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے خلاف محکمہ جاتی کارروائی کا آغاز کریں میں استعفیٰ دے رہا ہوں۔ ایسی کی تیسی ان کی تفتیش کی۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلے گا۔ کوئی قاتل گرفتار نہیں ہوگا۔ یہ جو آج پکڑے گئے تھے یہ بھی چھوٹ جائیں گے۔ میری ماں اور بہن کسی کی دشمن نہیں تھیں اور انہوں نے زندگی میں کسی کا برا تک نہیں چاہا تھا۔ جس نے بھی انہیں قتل کیا یا کرایا ان سب پر خدا کا عذاب نازل ہو۔ وہ تمام عمر رسوا ہوں۔ خدا کے گھر میں کسی کو بھی بددعا دینا گناہ ہے مگر میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ میرا دل کتنا دکھی ہے اس کا کوئی ذکر ہوگا تمہاری اس رپورٹ میں؟ جس کی نیوز ویلیو کا تم نے ذکر کیا تھا۔ جاؤ... دفع ہو جاؤ... ورنہ میں تم سب کو مار دوں گا یا خود کو شوٹ کر لوں گا" اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ اخباری نمائندوں کی گم ہو گئی تھی۔ وہ اپنے سارے پیشہ ورانہ فرائض بھول گئے اور دم بخود کھڑے تھے۔ ان کے سامنے جو شخص تھا وہ کوئی پولیس انسپکٹر نہیں تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو اندر سے لہولہان ... ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ بکھر چکا تھا۔ اس کے وجود کی عمارت ... اور یقین، احساس اور ایمان کے جن جذباتی سہاروں پر قائم ... وہ گر گئے تھے۔ وہ اپنی فطرت کے تقاضوں سے باغی ہو گیا تھا۔ ... اصول پرستی اور راستی کے آدرشوں کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ برائی کے خلاف جنگ میں اپنی ساری اچھائی کے ساتھ لڑتے لڑتے ہار گیا تھا۔ وہ انسانیت، اخلاق اور معاشرے کی کھوکھلی قدروں کا شکار ہو چکا تھا۔

پادری اس کی آواز پر باہر آیا۔ چرچ کی جانب سے اس کا ... پرسکون اور پرمتانت انداز میں اس گوشے کی طرف بڑھا جہاں سایۂ دیوار میں ہم سب خاموش کھڑے سائمن کو روتا دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے دکھ پر نہیں اس سارے نظام کی بے حسی اور بے بسی پر رو رہا تھا جس نے اس کو شکست دے دی تھی۔ اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ آدمی رشتوں کے بغیر کیسے جی سکتا ہے؟ سارے رشتے جذبات کے رشتے ہیں۔ وہ انسانوں کے رشتے ہوں یا حوالوں کے۔ عقیدوں کے، اصولوں کے اور نظریوں کے رشتے، یا ماضی و حال اور مستقبل کے رشتے۔ امیدوں کے اور خواہشوں کے رشتے، وقت کے اور زمین کے رشتے۔ ان رشتوں کے بغیر زندگی کا تصور ہی ممکن نہیں۔ آدمی ایک صحرا میں دفن گڑا ہوا بے مصرف پڑا ہوا پتھر نہیں ہے اور خلا میں سرگرداں مردہ چاند نہیں ہے۔

پادری نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "تم کو خداوند کی رحمت سے مایوس ہونا زیب نہیں دیتا۔ تم نے اس کی خوشنودی کے لئے غلط راستوں اور کج رو انسانوں سے سمجھوتا نہیں کیا۔ تم خوش قسمت ہو جس کو اس نے فلاح کے لئے چنا ورنہ تم وہ بھی ہو سکتے تھے جو تمہارے وجود کی نیکی سے شرمسار ہیں اور تمہاری استقامت سے خوفزدہ ہیں۔ آؤ خدا کے گھر کی پناہ میں۔ تم کو سکون اور آرام کی، صبر اور حوصلے کی ضرورت ہے۔"

سائمن نے پادری کے کندھے پر سر رکھ دیا تھا۔ کسی بچے کی طرح وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ اخباری نمائندے تذبذب اور ... کی کیفیت میں کھڑے ہوئے تھے۔ قبرستان ویران ہو چکا تھا۔ ... اس کی چاردیواری کے باہر کی دنیا میں رات اپنی ساری جلوہ ... رنگ و نور کی فراوانی اور پرکیف خلوتوں کی خوشبو کے ساتھ ... باش، خوش پوش اور خوش شکل مردوں اور عورتوں میں ... کے خوش رنگ پھول اور شوخ مسکراہٹوں کے شگوفے تقسیم کر رہی تھی۔

ہم سب ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے تھک گئے تھے۔ پھر ملامت خیالوں کی کسک میرے لئے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ سائمن نے میری مشکل آسان کر دی۔ اس نے اپنے ضمیر کا بوجھ اتار پھینکنے میں پہل کی تھی۔ اب ہماری باری تھی یا وہاں موجود اخباری نمائندوں کی جو اپنی خبر کی قبر پر کھڑے ہوئے تھے اور اس کی لوح کو کسی سنسنی خیز سرخی میں ڈھالنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ ان کی مشکل غالب نے آسان کی۔ اس سے پہلے کہ میں بولتا وہ آگے بڑھا۔

غالب نے کہا "آپ لوگ اب کیا سوچ رہے ہیں؟ جا کے ... خبر کے لئے سہ کالمی سرخی کیوں نہیں بناتے؟ ابھی تو آخری ایڈیشن پریس میں چلی جائے گی اور کل اس کی خبر ذرا دیر میں ... رہ جائے گی۔ آپ لوگ صحافی ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ صحافت کسے کہتے ہیں۔ کیا یہ ریاست کا چوتھا ستون ہے؟ کیا یہ ایک مقدس فریضہ ہے؟ یا یہ صرف اخبار بیچنے کا ذریعہ ہے؟ آپ لوگ ہم سے ہمارے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ ہم سے بات کرنے کے لئے بے چین تھے۔ اندر آئیے، میں آپ لوگوں کو ایک پریس کانفرنس میں مدعو کرتا ہوں۔ ایک اور "ایکس کلوسو" اسٹوری کے لئے۔ یہ اتنی ہی بڑی خبر بن سکتی ہے جتنی بڑی ہیروشیما پر ایٹم بم کے دھماکے کی خبر تھی۔ اس میں سب کچھ ہے۔ فکشن، ایکشن، سسپنس، سنسنی خیز انکشافات کا سلسلہ، دھماکہ کرنے والا مواد، انتقامی مشینری کو حرکت میں لا دینے والا اور حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ لانے والے واقعات، بڑے بڑے ناموں کے دیوتائی امیج کو بجلی سے اڑا دینے والا مسالہ... میں آپ لوگوں کو سب سچ بتا سکتا ہوں۔ اس شرط کے ساتھ کہ آپ اس سچ کو مسخ کئے بغیر اور سنسر کئے بغیر، اپنے کیریئر، کاروبار اور زندگی کو لاحق خطرات کی پروا کئے بغیر شائع کر دیں گے۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ رات کے تاریک خلا میں ایسے معلق رہا جیسے پھانسی کے اندھے کنوئیں میں کسی لاوارث ... انصاف کے نام پر قتل کر دیا گیا ہو۔

آخرکار ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے نے کہا "یہ ناممکن ہے۔ ایسا اب کہیں بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ ... بول سکتا ہے اور نہ لکھ سکتا ہے۔"

"کوئی سنتا ہی نہیں" اے پی آئی کے نمائندے نے مایوسی سے کہا۔

"اور نہ برداشت کرتا ہے۔ ہم صحافی نہیں خبریں بنانے والے ملازم ہیں۔ صرف وہی خبریں بنا سکتے ہیں جو کاروباری مفاد کے مالک کے لئے سودمند ہوں" ویلش سماچار کے نمائندے نے کہا۔

غالب نے کہا "میں بھی ایک صحافی تھا۔ اب میں ایک مجرم ہوں مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اب اس کے خلاف جرائم کی فہرست کتنی طویل ہے۔ میں تم سے حمایت یا جذباتی ہمدردی نہیں مانگ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مجبور لوگ ہو اور کسی کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا تم سچ سنو گے؟"

www.paksociety.com

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سوچ میں پڑ گئے۔

آخر کار دیش سماچار کا نمائندہ بولا "سچ لینے میں کیا ہے؟ کوئی فائدہ نہیں تو نقصان بھی نہیں۔"

"نقصان کیوں نہیں۔ صرف حق دل میں کھٹکتا ہے" کانٹے کی طرح "اے پی آئی کا نمائندہ بولا۔

"ہم اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتے کہ خلش مٹ جائے" ٹائمز آف انڈیا کا نمائندہ بولا "لیکن ہم تم سے سچ سننے پر تیار ہیں۔ آخر تم اس کا بوجھ کب تک اٹھائے پھرو گے؟ تم ہمارے فیصلے سے ہو۔ اپنا دل ہلکا کرنا چاہو تو کھل کے بات کرو۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ... ہم سے تمھیں فائدہ نہ ہو تو نقصان بھی نہ ہو۔"

"تمھارا وہ چوتھا ساتھی کہاں ہے؟" غالب نے کہا۔

"وہ ہمارا ساتھی نہیں تھا۔"

"اس نے تو ہمیں لائن دی تھی۔"

"شورش چھوڑ کے خود کیسے غائب ہو گیا؟ کسی کو پتا ہی نہیں چلا۔"

غالب نے کہا "وہ کسی اور کو ہیڈلائن دینے کے لیے نکل گیا۔ اسے کہیں اور جا کے کسی کے لیے خبر بنانی ہوگی۔ اس کے لیے حالات اور واقعات کا رخ بدلنا ہوگا۔ اپنے مفادات کے حق میں ... خیر اچھا ہی ہوا کہ وہ چلا گیا ورنہ میرا سچ کل جھوٹ بن کے شائع ہو جاتا۔"

چرچ کے اس کمرے میں جہاں ہم نے پادری کے سامنے اعتراف کیا تھا، میں نے، غالب نے اور نازو نے اخباری نمائندوں کے سامنے وہ حالات رکھے جو سائرن کی ماں اور بہن کی افسوسناک موت کا سبب بنے تھے۔ میں نے اختصار سے کام لیا اور غیر ضروری تفصیلات کو حذف کر دیا مگر بنیادی حقائق ان سب کے سامنے رکھ دیے۔ وہ سب ذہین، حساس اور باضمیر لوگ تھے۔ چوہدری دلاور کے ساتھ ذاتی عداوت سے شروع ہونے والے واقعات کا سلسلہ تریونی تک اور بالک رام تک پہنچا۔ وہ حیران و پریشان سنتے رہے۔ کسی نے اسے افسانہ طرازی نہیں کہا اور ہم پر مبالغہ آرائی کا الزام نہیں لگایا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ ملکی، برصغیر کی اور بین الاقوامی سیاست کا منظرنامہ ہے جس کو ان کا قلم بدل نہیں سکتا۔ وہ پس منظر کے حقائق سے بھی باخبر تھے چنانچہ انھیں ہماری بات سمجھنا مشکل نہ ہوئی۔ انھیں مشرقی پاکستان کی خانہ جنگی یا انتشار کی کیفیت کے محرکات کا علم تھا اور وہ جانتے تھے کہ اس شورش میں کتنا ہاتھ اپنوں کا ہے اور کتنا غیروں کا۔ وہ اسلحے کی عالمی منڈی کے ٹھیکے داروں کو پہچانتے تھے اور قلم کی سیاست کے سارے داؤ پیچ سمجھتے تھے۔ لیکن انھوں نے اعتراف کیا کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، کان جو کچھ سنتے ہیں اور عقل جو کچھ

سمجھاتی ہے، وہ لکھا نہیں جا سکتا۔ لکھا جائے تو شائع نہیں ہوتا اور شائع ہو جائے تو جھوٹ قرار دے دیا جاتا ہے اور "جھوٹے" کا منہ کالا ہوتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ سوائے اس کے کہ وہ سچ کو چھپا لیں۔ ایسے خطرات اور مضمرات سے خود بھی بچ جائیں اور ہمیں بھی محفوظ رکھیں۔ جھوٹ مت بولو، سچ بھی مت بولو، اگر اس سے نقصان ہو کیونکہ ہم سب کمزور، خود غرض اور بے بس انسان سقراط نہیں ہیں۔

جب وہ چلے گئے تو میں نے غالب سے کہا "کیا اب ہم بھی جا سکتے ہیں؟"

غالب نے گھڑی دیکھی "دس بجے ہیں، کیا وہ سکھ ٹیکسی ڈرائیور ابھی تک ہمارے انتظار میں باہر کھڑا ہوگا۔ اور محسن؟"

نازو نے کہا "اور ہمارے وہ دشمن بھی جو یہاں کچھ نہیں کر سکے تھے؟"

میں نے کہا "میں پادری کو دیکھتا ہوں۔ مجھے اس سے معافی مانگنی ہے۔"

غالب نے کہا "چھوڑو، اسے ہم سے کوئی گلہ نہیں ورنہ وہ کہتا..."

لیکن میں نے غالب سے اتفاق نہیں کیا۔ میں اسے تلاش کرتا ہوا اس کے رہائشی کوارٹر کی طرف گیا۔ اندر کی لائٹس آف تھیں۔ برآمدے میں ایک راہبہ دو زانو بیٹھی دعا مانگ رہی تھی۔ اسی نے مجھے بتایا کہ فادر سو چکے ہیں اور انھوں نے تاکید کی تھی کہ انھیں جگایا نہ جائے۔

"ان کے ساتھ ایک نوجوان تھا..."

"وہ بھی سو گیا ہے" راہبہ نے سرگوشی میں کہا "آہستہ بولو، فادر نے کہا تھا کہ اگر تم آؤ تو میں تمھیں بتا دوں کہ ان کا دل تمھاری طرف سے صاف ہے اور انھوں نے خدا سے دعا کی ہے کہ وہ تمھارے راستوں میں آسانیاں پیدا کرے۔ تمھارے پیروں کو راستے کے کانٹوں سے محفوظ رکھے اور تمھیں بھٹکنے سے بچائے۔"

میں نے راہبہ کے سامنے سر جھکا کے کہا "صبح ان کو بتانا کہ ہم بہت مقروض تھے۔ نیکی کے احسان کا یہ قرض باقی رہے گا۔ خدا نے توفیق دی تو شاید ادا ہو جائے ورنہ ان سے کہنا کہ اسے بھی معاف کر دیں۔"

میں واپس آیا تو غالب اور نازو نے لباس بدل لیے تھے۔ ہم دروازہ کھول کے باہر آئے اور رات کی وہ مسافت طے کرنے لگے جو چرچ کے احاطے میں بہت خاموش اور پُرسکون تھی۔ ہمارے قدموں کے نیچے وہی سرخ بجری بچھا راستہ تھا۔ وہی سبزہ تھا اور وہی درخت تھے مگر اس وقت ہر چیز نے سیاہ ماتمی لباس پہن لیا تھا... ہمارا یہاں آنا بے مقصد نہیں رہا تھا۔ حسب توقع یہاں بھی ملا تھا اور ہمارے لیے جال لے کر آنے والے شکاری بھی

بدلنے کے باوجود پہچانے گئے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم پہچانے گئے تھے۔

ایک بار پھر ہمارے سامنے وہی دنیا تھی جس میں زندگی نے بالا اجل بچھا رکھی تھی اور خطرات کا کھیل جاری تھا۔ پرانے حریف نظر سے اوجھل تھے لیکن ان کی موجودگی کا احساس پوری توانائی اور شدت کے ساتھ اندھیرے کی آہٹ میں موجود تھا۔ ان کی آنکھیں ہر سمت سے دیکھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

میں نے گیٹ سے باہر آتے ہوئے ریوالور نکال لیا "سردار جی کی گاڑی تو ہے مگر ذرا غور سے دیکھو، کہیں اس موچھ فورس کے ارکان تو گھات میں نہیں ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ صرف دو افراد کی گرفتاری کے بعد ڈر کے بھاگ گئے ہوں۔" غالب نے کہا "وہ سامنے نہیں آئیں گے لیکن پیچھا بھی نہیں چھوڑیں گے۔"

نازو نے کہا "محسن کہاں گیا؟ اس نے ہم سے ملنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

"ممکن ہے وہ محسن نہ ہو... ہماری آنکھوں نے ایسا دیکھا ہو۔"

"یہ کیا فضول بات ہے!" میں نے برہمی سے کہا "میں آنکھوں کے بغیر بھی اس کو دیکھ سکتا ہوں اور کوئی مجھے محسن بن کے دھوکا نہیں دے سکتا۔"

"شاید وہ انھیں بھی دھوکا نہیں دے سکا" غالب نے کہا۔ "وہاں آنکھوں والے اور بھی تھے۔"

نازو نے کہا "تمھارا مطلب ہے... وہ پھر پکڑا گیا؟"

سردار جی سیٹ پر سر رکھے خراٹے لے رہے تھے۔ میں نے انھیں جگایا تو وہ ہڑبڑا کے اٹھے "اوئے آ گئے ہو تسیں لوگ؟" انھوں نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "ان دونوں کا خیال تھا کہ تم نہیں ملو گے۔"

"لو جی... یہ بھی ہو سکتا ہے... ہاں بارہ بجے کے بعد آتے تو میں نہ ملتا" سردار جی نے کہا "ایک بات تو بتاؤ۔ آخر یہ کیا گول مال ہے، میرا مطلب ہے اتنی پولیس کیوں آئی تھی؟ بڑا رولا پڑ گیا تھا۔"

میں نے کہا "بمبئی میں گول مال چلتا رہتا ہے۔ بس ہم بچ کے نکل آئے، یہی کافی ہے۔"

غالب نے کہا "تم تو محفوظ رہے نا، کسی نے تم سے تو کچھ نہیں کہا؟"

"میں تو واہ گورو کی کرپا سے دور کیا تھا۔ جب پولیس دفع ہو گئی تو پھر آیا تھا" سردار جی نے گاڑی میں بیٹھ کے اسے اسٹارٹ کیا "مگر کے بارے سب دیکھتا رہا تھا۔ ان دو سو کتے چلتے۔"

میں نے کہا "چلو کسی ایسی جگہ... جہاں کچھ دیر آرام مل سکے۔"

غلط کوئی نہ ہوا ور کہا اچھا ہو۔"

"میری مانو تو بی فوڈ کھاؤ۔ واہ واہ مچھلی ملتی ہے ایک جگہ۔ ذرا دور ہے مگر آپ کے مطلب کی جگہ ہے۔"

نازو نے کہا "تم نے کسی ایسا کو دیکھا، بوڑھے کو۔ جس کے ہاتھ میں سفید چھڑی تھی؟"

"ہاں جی۔ ایک بڈھی مائی آئی تھی ہاتھ پھیلائے۔ چنگی طرح جانتا ہوں میں گوسے۔ وہ اندھی نہیں ہے" سردار جی نے کہا "شوقین گاڑی والوں کے پاس جا کے پوچھتی ہے مال چاہیے؟"

"بمبئی میں ایک بڈھے کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ وہ چرچ سے نکلا تھا" نازو نے کہا۔

"وہ... ہاں... لیکن وہ اسی اندھی کے ساتھ چل پڑا تھا۔ دونوں ہنسی مخول کر رہے تھے" سردار جی نے ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ بار بار پوچھنے کے باوجود وہ بڑے یقین کے ساتھ ایک ہی بات دہراتے رہے۔ غلط فہمی کا سوال ہی نہیں۔ وہ دونوں ساتھ ہی گئے تھے۔ وہ بڈھا اکثر اس کے ساتھ نظر آتا ہے۔ دونوں پرانے ساتھی ہیں، معلوم نہیں ان کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ہے یا صرف گناہ کے کاروبار کا۔

جب میں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے" تو یہ میرے مایوس ذہن کا ردعمل تھا۔ ایک خواہش تھی کہ کاش ایسا نہ ہو۔ اپنے یقین کو شکست سے بچانے کی کوشش تھی اور جھنجلاہٹ تھی۔

سردار جی نے گاڑی چلاتے ہوئے چمک کے کہا "لو جی۔ اپنی بمبئی میں دس سال سے تو گڈی چلا رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی بڑے پاپڑ بیلے تھے۔ ہم تو سڑک سڑک کی مخلوق کو پہچانتے ہیں... اس اندھی نے پتا نہیں کتنی بار لال بتی پر میری سواریوں سے بھی پوچھا ہے اور سب بندے بھی فرشتے تو نہیں ہوتے۔ دو بار کسی نے کہا کہ کدھر ہے مال۔ تو اندر جا بیٹھنے لگا ٹیکسی میں کہ میں لے چلتا ہوں۔ میں نے بے عزت کر کے اتار دیا کہ چل اٹھ دے دے چتر۔ کوئی اور ٹیکسی پکڑ" اس نے پھر چٹکی لے کر کہا۔ "معاف کرنا۔"

اب میرے پاس سردار جی کو جھٹلانے کے لیے کوئی دلیل نہ تھی۔ میرا دل اب بھی کہتا تھا کہ میں نے محسن کو پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی لیکن اندیشہ غالب کا درست ثابت ہو رہا تھا اور میرے لیے خود اپنا دعویٰ باعث شرمندگی ہونے لگا تھا۔ سردار جی خاصی رفتار سے ساحل سمندر کے کسی سی فوڈ ریسٹورنٹ کی طرف رواں تھے۔ غالب نے کہا "سردار جی، ذرا سوچ کے ایک بات بتاؤ، آج جو لوگ یہاں آئے تھے، ان میں سے کوئی ایسا تھا جسے تم نے پہلے بھی دیکھا ہو۔"

نازو نے کہا "ہاں۔ تم دور سے دیکھتے رہے تھے۔ کیا تمھیں سب کے چہرے دکھائی دے رہے تھے؟ کوئی ایسا چہرہ یاد کرو جو بعد میں بھی نظر آیا ہو۔ جب سارے لوگ چلے گئے تھے۔"

www.paksociety.com

سردار جی نے کہا "ہاں۔ ایک بندہ تھا ایسا۔ پر کوئی چنگا بندہ نہیں ہے وہ۔ پہلے باہر سے اندر دیکھتا رہا اس کے بعد غائب ہو گیا... وہ بات کرتے کرتے ہچکی لیتا تھا اور پھر کہتا تھا "معاف کرنا" لگتا تھا وہ پیتا رہا تھا۔"

"کیسے غائب ہو گیا؟ اندر چلا گیا یا کہیں اور چلا گیا؟"

"یہ تو میں نے نہیں دیکھا لیکن وہ بعد میں پھر نظر آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ ادھر کیا ہو رہا ہے اور میں نے اسے ٹالنے کے لئے کہہ دیا کہ مجھے نہیں معلوم۔ سور دا پتر۔ خود بھی طرح جانتا تھا سب کچھ اور پوچھ رہا تھا مجھ سے۔ بعد میں اس نے کہا کہ وہ جو تمہاری گاڑی میں آئے تھے وہ اندر ہی ہیں۔ تو میں نے کہا کہ جا میاں اپنا کام کر۔ تو وہ چلنے لگا اور میرے کندھے پر ہاتھ مار کے بولا۔ تمہاری شکل پر کیوں بارہ بج گئے ہیں۔ گھبراتے ہو تو۔ معاف کرنا" اس نے چوتھی بار کہا اور میں نے شراب کی بو محسوس کی۔

"کون تھا وہ شخص؟" میں نے کہا۔

"ہے ایک سوالی۔ پیسے لے کر بدمعاشی کرتا ہے۔ آپ نے کسی کے دانت تڑوانے ہوں۔ کسی کی عورت کو اغوا ہو۔ کسی کے گھر میں آگ لگوانی ہو تو اس کو پیسہ دیں۔ وہ اپنے باپ کے دانت توڑ دے۔ اس کی گھروالی کو اٹھا لائے۔ حرامی نمبر ون۔ یار کسی کا نہیں اور نہ وفادار۔ آج ایک سے مال لے کر جائے گا اس کے دشمن کا خانہ خراب کرنے۔ دوسرے دن وہ دشمن سے مل جائے گا۔ اس سے پیسے لے کر پہلے والے کا بیڑا غرق کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ وہ دونوں برباد۔ اس کے دونوں طرف سے وارے نیارے۔ مگر دیکھ لینا کسی دن ایسا حشر خراب ہو گا..."

میں نے کہا "سردار جی کوئی نام پتا بھی ہے اس کا؟ یا صرف قصے کہانیاں ہیں۔"

"نام ہے جی بیلی رام لیکن بلی کہتے ہیں سب۔ ہر ایک کو ٹکریں ہی مارتا پھرتا ہے بالکل بلی کی طرح۔ ٹھکانا نہیں معلوم لیکن کوئی ایسی ویسی بات ہے تو ہوا کا پتا چل جائے گا۔" سردار جی نے کہا۔

"کہاں سے۔ اور کیسے؟"

"میں جی اپنے بھی بندے۔ جس کا کہو اس کا اگلا پچھلا سارا ریکارڈ نکال لائیں... لیکن آپ کا اس سے کیا تعلق ہے جی؟ وہ کیوں پوچھ رہا تھا آپ کو... معاف کرنا۔"

"یہی تو ہم اس سے پوچھنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ تم کہاں لے جا رہے ہو ہمیں؟" میں نے کہا "یہ کون سی جگہ ہے؟"

گاڑی ایک پٹرول پمپ میں داخل ہوئی تھی لیکن پٹرول ڈلوانے کے لئے کسی پمپ کے سامنے ٹھہرنے کے بجائے عمارت کے گرد گھوم کر پیچھے پہنچ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوتا گاڑی رک گئی۔ ایک ساتھ اندھیرے سے چار افراد نکل آئے جن کے ہاتھوں میں خطرناک قسم کے خودکار آتشیں ہتھیار تھے۔ انہوں نے گاڑی کے چاروں دروازوں کو گھیر لیا۔

سردار جی نے ہم سے دغا کی تھی۔ انہوں نے ہمارا اعتماد حاصل کرنے کے بعد ہمیں دشمنوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ ہم اجنبی شہر کے راستوں سے ناواقف تھے۔ انہوں نے ہمیں باتوں میں الجھا لیا اور ہمیں احساس بھی نہ ہوا کہ مال تجارت کی طرح ہمارا سودا ہو چکا ہے اور اب ہمیں خریداروں کے حوالے کرنے کے لئے لایا جا رہا ہے۔ سردار جی نے ہماری ڈیلیوری دے دی تھی اور گاڑی روکتے ہی باہر نکل گئے تھے اور بڑی بے غیرتی کے ساتھ ہمارے دشمنوں کے پیچھے کھڑے دانت نکال رہے تھے۔

اچانک گاڑی کو ایک جھٹکا لگا، پھر دوسرا۔ اس کے دونوں اگلے ٹائروں سے ہوا بڑی آواز کے ساتھ خارج ہوئی۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے پیچھے والے ٹائر فلیٹ ہوئے اور گاڑی بیٹھ گئی۔

"کیا تمہیں باہر آنے کے لئے کہنا پڑے گا؟" ایک شخص نے غرا کے کہا۔

"اگر دماغ میں کوئی احمقانہ خیال ہے کہ تم کچھ کر سکتے ہو تو اسے نکال دو" دوسرے شخص نے نسبتاً شائستہ لہجے میں کہا اور انگریزی میں بات کی "آہستہ آہستہ باری باری باہر آ جاؤ۔"

تیسرے نے کہا "اگر چالاکی دکھائی تو..."

دوسرے شخص نے اسے ٹوک دیا "جب میں بات کر رہا ہوں تو تم کو بھونکنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

تیسرا شخص گالی دیتے دیتے رک گیا تھا۔ دوسرا شخص ان سب کے درمیان باس کی حیثیت رکھتا تھا لیکن وہ خود بھی کسی باس کے حکم پر ہمیں لینے آیا تھا۔ یہ بات سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے اس کی صورت دیکھی ہوئی لگی۔

"تمہاری کسی حرکت سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ تم مقابلے کا ارادہ رکھتے ہو" دوسرے آدمی نے کہا "اپنے ہاتھوں کو کنٹرول میں رکھو اور جیب سے دور رکھو۔ ورنہ تمہارے یہ ہاتھ ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہو جائیں گے۔ شاید تمہارے جسم کا حصہ نہ رہیں۔"

ہم اپنی کوتاہ اندیشی کے باعث اتنی آسانی سے گرفتار ہو گئے تھے۔ ہم دشمنوں کے حصار کو توڑ کر نکل آئے تھے تو بھروسہ کرنے کی غلطی کر بیٹھے تھے حالانکہ میدان جنگ اگر دشمن کا علاقہ ہو تو کسی پر بھی اعتبار کا رسک نہیں لینا چاہئے۔

سب سے پہلے میں باہر نکلا اور میں نے سردار جی سے کہا۔ "میرا خیال تھا سکھ بہادر قوم ہیں۔ پیٹھ میں خنجر نہیں گھونپتے۔ یاری کا نام بدنام نہیں کرتے۔"

"او چھڈو جی۔ سب سے بڑا یار پیسہ۔" سردار نے کہا۔

ہو گیا ہے۔ باپ بڑا نہ بھیا۔ بھیا سب سے بڑا روپیا۔ ہاں جی سب سے بڑا روپیا" وہ بے سری آواز میں گانے لگا۔

تازو اور غالب بھی پیچھے کے دونوں دروازوں سے نکل آئے۔ باقی تمام نظریں بھی سردار جی پر مرکوز تھیں "کسی دن یہ معلوم ہو جائے گا کہ سب سے بڑا کون ہے۔"

سردار جی نے قہقہہ مارا اور جیب سے ایک چپٹی سی بوتل نکالی۔

"اس سکھ کو اندر لے جاؤ اور اس کا حساب صاف کر دو۔"

"وہ جی۔ آپ نے میرے کو پانچ دینے تھے" سردار نے انگلیاں پھیلا کے کہا "ان کو تو دیں اپنے کرنل صاحب۔ رات ہی اور دینے ہیں۔ کوئی سفارش کریں یہ میرے ساتھ زیادتی کے ناتے۔"

"تم جاؤ۔ انہیں سب معلوم ہے" اس شخص نے کہا جسے ان کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا "تمہارا کام ختم ہو گیا۔"

دو افراد نے سکھ کو اباؤٹ ٹرن کرایا اور اسے پٹرول پمپ کی عمارت کے عقبی دروازے سے اندر لے گئے۔ ان کے تیور اچھے معلوم نہیں تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ حساب نہیں سردار جی کا قصہ پاک کر دیں گے۔ اس خیال کی تصدیق بھی فوراً ہو گئی۔ اندر سے سردار جی کے چلانے کی آواز آئی۔

"اوئے۔ اوئے بدبختو۔ اوئے مر گیا۔ اوئے تم کو رب دی... اچھا چھوڑو۔ میں نہیں اگلتا کچھ بھی۔ مجھے جانے دو" ان کی آواز میں دہشت تھی جو ایک دم موت کی وحشت میں بدل گئی۔ انہوں نے ایک چیخ ماری۔ پھر ایک فائر ہوا جو کسی سائلنسر لگے ہتھیار سے کیا گیا تھا۔ سردار جی کی آخری چیخ دبا دی گئی۔ انہیں ساتھ لے جانے والے دونوں افراد واپس آ گئے۔ کسی نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جو ہوا وہ پہلے سے طے تھا۔

ان میں سے ایک نے نوٹوں کی ایک گڈی آگے بڑھائی جو میرے اندازے کے مطابق پانچ ہزار کی تھی۔ کرنل نے یہ گڈی جیب میں ڈال لی۔ باپ بڑا نہ بھیا۔ سردار جی سب سے بڑا روپیا جس نے تم سے بھی دغا کی۔ میں نے سکھ کی قسمت کے بارے میں سوچا۔

پٹرول پمپ اور اس سے ملحق سروس اسٹیشن دونوں بند تھے۔ جب سردار جی نے گاڑی اندر موڑی تھی تو مجھے اندھیرا اور سناٹا دیکھ کر عجیب سا لگا تھا کیونکہ عام طور پر پٹرول پمپ بہت رونق دار اور آباد رہتے ہیں لیکن پھر میں نے دیکھ لیا کہ اس کے اندر داخل ہونے کے راستے کو رکاوٹوں کے ذریعہ بلاک کر دیا گیا تھا اور عمارت پر کپڑے کا بینر لگا دیا گیا تھا۔ اس پر ہندی میں کچھ لکھا ہوا تھا جو میں پڑھ نہیں سکا تھا لیکن اب مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ پٹرول پمپ تعمیر نو کے مراحل میں تھا۔ اس کے عقبی حصے میں دوسرا بینر نظر آ رہا تھا جس پر انگریزی میں کرم فرماؤں کو مطلع کیا گیا تھا کہ ہم معذرت خواہ ہیں۔ نئی انتظامیہ بہت جلد بہترین سروس کا آغاز کرے گی۔ یہ بینر یا تو ہٹا لیا گیا تھا یا ابھی لگایا ہی نہیں گیا تھا۔

کرنل نے کہا "انہیں باری باری اندر لے جاؤ۔"

سردار جی کے قاتل وحشی دو افراد نے مجھے اباؤٹ ٹرن کرنے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں دور دھکیل دیا "تم اتنی آسانی سے ہمیں نہیں مار سکتے جتنی آسانی سے تم نے اس سکھ ڈرائیور کو مار دیا" میں نے کہا اور اپنا ریوالور نکال لیا۔ وہ سب اسی طرح کھڑے رہے۔

"کوئی ہمارے قریب آیا تو مارا جائے گا" تازو نے کہا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں ریوالور نظر آیا۔

ریوالور غالب نے بھی نکال لیا تھا۔ سردار جی کے انجام کے بعد کسی خوش فہمی کی گنجائش تھی تو وہ کرنل کے احکامات سن کے ختم ہو گئی تھی۔ پہلے ہم صورت حال کا مشاہدہ کر رہے تھے اور قبل از وقت کسی نے بھی رسک لینے کی کوشش نہیں کی تھی مگر جب سردار جی کی طرح مجھے قتل کر دئے جانے کا فرمان صادر ہوا تو مقابلہ کئے بغیر باری باری مرنے کے خیال کو کسی کا ذہن قبول نہ کر سکا۔ یہ اتنا ہی ناممکن تھا جتنا اپنے مقصد سے منحرف ہو کے شکست قبول کرنا یا ایم آر ایس کے مشن سے تائب ہونا۔ اگر پہلے کبھی ایسی صورت حال سامنے آئی تھی تو اپنی فطرت اور مزاج کے تقاضوں کے مطابق ہمارا رد عمل ایک تھا اور ایک جیسا تھا کہ مرنا ہی پڑا تو دشمن کو مارتے مارتے بھی مار جائیں گے۔

خلاف توقع کرنل نے یا اس کے کسی ماتحت نے مشتعل ہو کے گولی نہیں چلائی اور کوئی مشترکہ کارروائی نہیں کی۔ وہ اپنے خطرناک ہتھیاروں کا رخ ہماری طرف کئے کھڑے رہے۔

پھر کرنل نے کہا "بے وقوفی کی بات مت کرو۔ ہم تمہیں قتل نہیں کر سکتے۔"

"کیوں قتل نہیں کر سکتے؟"

"اس لئے کہ ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا گیا۔ ورنہ کیا یہاں تمہیں گولی نہیں ماری جا سکتی۔ ہم تمہارے گاڑی سے اترنے کا انتظار بھی نہ کرتے اور تمہیں اندر ہی چھلنی کر دیتے" کرنل نے کہا۔

"پھر تم ہمیں کیوں اندر لے جانا چاہتے ہو؟" تازو نے کہا۔

"اندر تمہارے لئے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ آخر کب تک کھڑے رہو گے تم لوگ یہاں؟" کرنل نے کہا "تمہارے ساتھ ہمیں بھی کھڑا رہنا پڑے گا رات کے بارہ بجے تک۔"

"اور رات کے بارہ بجے کیا ہو گا؟" غالب نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم" کرنل نے سپاٹ لہجے میں کہا "مجھے صرف یہ حکم ہے کہ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دوں۔ میں نے

www.paksociety.com

اپنے طور پر چائے کا انتظام کیا ہے۔"
"تمہیں حکم دینے والا کون ہے؟" میں نے کہا۔
"میں ایسے سوالوں کا جواب نہیں دوں گا۔ آپ لوگ اندر چلیں پلیز۔ اور یہ ریوالور استعمال کرنے کی مت سوچیں۔ آپ لوگ خواہ مخواہ تین آدمی مار دوگے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ باقی بچ جانے والے تمہیں مار دیں گے" کرنل نے انتہائی سرد اور غیر جذباتی لہجے میں کہا۔
"مارے جانے والوں میں تم بھی ہو سکتے ہو کرنل" میں نے کہا۔
"ہاں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تم ابھی بے وقوفی نہیں کرو گے کہ خود اپنی موت کا سبب بنو۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ تمہیں بحفاظت اپنی تحویل میں رکھنے کے سوا میری کوئی ذمے داری نہیں اور یہ ذمے داری بھی بارہ بجے ختم ہو جائے گی۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد" اس نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا۔
کرنل کی عمر چالیس سال سے زائد تھی مگر وہ تیس سال کا نظر آتا تھا۔ عمر کی چغلی وہ تھوڑے سے سفید بال کھاتے تھے جو کنپٹی کے پاس سفید ہو چکے تھے۔ سر کے باقی بال سیاہ اور گھنے تھے۔ وہ میانہ قد کا رجیمہ اور اسمارٹ آدمی تھا جس کا چہرہ سپاٹ رہتا تھا۔ اس کے انداز گفتگو اور اطوار میں ایک دھیما پن تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی کام عجلت میں کرنے کا عادی نہیں۔ اس کی آنکھیں بھی سوچ میں ڈوبی ہوئی لگتی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ پلکیں نہیں جھپکاتا مگر غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ میرے یا عام آدمی کے مقابلے میں وہ بہت کم اور بہت دیر تک جھپکاتا تھا۔ وہ بھی اتنی تیزی کہ پتا نہیں چلتا تھا۔ اس کی آواز بھاری تھی اور وہ ہر لفظ کی ادائیگی میں تلفظ کا خیال رکھتا تھا۔ یقیناً یہ اس کی عادت تھی مگر محسوس یہ ہوتا تھا کہ اس کا یہ انداز تکلم فطری نہیں ہے اور یہ لہجہ مصنوعی ہے۔ ممکن ہے اس نے یہ مخصوص اور پُر تاثر انداز گفتگو خاصی مشق کے بعد حاصل کیا ہو۔ اس کی انگریزی میں کانونٹ کا رنگ غالب تھا۔ اگر وہ کبھی فوج میں کرنل رہا تھا تو اس کا تعلق ریگولر فورس سے نہیں ہو سکتا تھا ورنہ وہ اتنی کم عمری میں ریٹائرڈ ہوتا۔ اس میں بظاہر کوئی جسمانی نقص بھی نہیں تھا کہ اس کو میڈیکل گراؤنڈ پر پنشن دے دی گئی ہو۔ وہ شارٹ سروس کمیشن لینے والا میڈیکل کور یا ایجوکیشن کور کا کرنل ہو سکتا تھا۔ یا پھر آخری صورت یہی کہ اسے فوج سے واپس کر دیا گیا ہو۔
"میری وضاحت کے بعد سوچ بچار میں پڑنے کا مطلب ہے کہ تم مجھے قابل اعتبار نہیں سمجھتے" کرنل نے کہا۔
"کیا دشمن بھی قابل اعتبار بھی ہو سکتا ہے کرنل؟" میں نے کہا۔ "ہم تو اس غلطی پر پچھتا رہے ہیں کہ ہم نے اس سکھ ڈرائیور پر بھروسہ کیا۔"

"ہم تمہاری میزبانی پر لعنت بھیجتے ہیں" نازو نے کہا۔
کرنل نے افسوس سے سر ہلایا "تم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ تم انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"
وہ پلٹ کے خاموشی سے اندر چلا گیا۔ اس کے چلنے کا انداز بھی ایسا تھا جیسے اس کے قدموں کے نیچے سرخ قالین بچھا ہوا ہے اور وہ کسی سربراہ مملکت کی طرح دونوں جانب استادہ گارڈ آف آنر کا معائنہ کرتا جا رہا ہے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو اپنی پُر زور شخصیت کی طاقت سے کسی پر بھی نفسیاتی غلبہ حاصل کر سکتا تھا اور اس سے پورا فائدہ اٹھانے کا عادی تھا۔ وہ احساس برتری کا شکار تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ وہ حکم دینے کے لئے پیدا ہوا ہے اور حکم کی تعمیل کے لئے پیدا ہونے والی اکثریت کو اس کا یہ پیدائشی حق تسلیم کرنا چاہئے۔ اس کی صورت میرے ذہن میں ایک ناقابل فہم خلش پیدا کر رہی تھی۔
ہم چھ مسلح محافظوں کے نرغے میں تھے اور خود بھی اپنا ریوالور تانے کھڑے ہوئے تھے لیکن یہ ایک عددی حقیقت تھی کہ ہم صرف تین کو مار سکتے تھے جو ہمارے سامنے تھے۔ ہمارے پیچھے موجود تینوں افراد اس کے ساتھ ہی ہمارا سر اڑا سکتے تھے۔ وہ طے شدہ طور پر مرنے کے لئے تیار تھے کیونکہ یہ جاں نثاری ان کے عہد نامے کی ایک شرط تھی۔ انہیں جتنے مالی فوائد حاصل ہوتے رہے تھے وہ بے سبب نہیں تھے۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ وہ زندگی پر اپنے اختیار کو گروی رکھ چکے ہیں۔ ہم انہیں مار دیتے اور پھر وہ ہمیں مار دیتے۔ اس سے واقعی کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ زندگی کی مہلت کا ہر لمحہ غنیمت تھا جس سے امید وابستہ رکھی جا سکتی تھی کہ شاید قدرت کوئی موقع فراہم کر دے۔
ابھی میں نے ریوالور جیب میں رکھنے اور غالب اور نازو کو کرنل سے تعاون کے لئے آمادہ کرنے کا سوچا ہی تھا کہ مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ میں دائیں بائیں یا آگے پیچھے چاروں سمت میں ضرور دیکھ رہا تھا لیکن یہ بھول گیا تھا کہ اوپر نیچے کی دو سمتوں سے بھی آفات نازل ہو سکتی ہیں۔ کسی نے پیٹرول پمپ کی عمارت کے اوپر سے جال پھینکا۔ میرا فوری رد عمل پلٹ کر پیچھے اور ہاتھ پاؤں چلا کے جال کے پھندوں سے نجات حاصل کرنے کا تھا مگر چھت پر اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے ریوالور کا رخ اوپر کر کے جو فائر کیا اس سے آسمان میں سوراخ نہیں ہوا۔ جال پھینکنے والے نے رسی کھینچی اور مجھے گٹھری بنا دیا۔ میں نے آس پاس کھڑے ہوئے مسلح افراد میں سے کسی کو ہنستے سنا۔ غالباً یہ وہی تھا جس کو کرنل نے بھونکنے سے منع کر دیا تھا۔
تین چار منٹ میں تین گٹھریاں اندر پہنچا دی گئیں۔ ان میں میرے علاوہ غالب اور نازو بندھے ہوئے تھے۔ اندر ایک درمیانے سائز کا کمرا تھا جس میں اسٹیل کی میز کرسی رکھی ہوئی

شاید پیٹرول پمپ کے کیشیئر کی تھی جو اس پر بیٹھتا اور پیسوں کا حساب رکھتا ہوگا۔ میز کی سطح کا اصل رنگ تیل اور گریس کے دھبوں سے نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ فرش بھی چکنا اور بد نما تھا اور دیواروں پر بھی تیل کے داغ اور گریس بھری انگلیوں کے نشانات سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ کمرے کی فضا میں پرانا پیٹرول اور انجن آئل کی ملی جلی بو بس گئی تھی۔ مسلح محافظوں نے ہمارے اور اس کے پیچھے پوزیشن سنبھال لی۔
کرنل میز کے پیچھے والی ٹین کی کرسی پر ایسے بیٹھا تھا جیسے اپنی اسٹیٹ کے آفس میں بیٹھا ہو۔ اس کے سامنے ایک لکڑی کی بینچ اور ٹین کی دو کرسیاں تھیں۔ دائیں بائیں ہاتھ پر بھی رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کو روشن کرنے والی واحد ٹیوب لائٹ اس کے پیچھے دیوار پر نصب تھی۔ دوسری ٹیوب مسلسل جل بجھ رہی تھی۔ چائے کا سامان بڑے سلیقے سے رکھا گیا تھا۔ کپ چار تھے اور نشست کی ترتیب دیکھ کر رکھے گئے تھے۔ ہمیں اندر لانے کے بعد کسی دشواری کے بغیر ہمارے ہاتھوں سے ریوالور لے لئے گئے اور ہمیں کھول دیا گیا۔ کرنل نے کوئی حکم جاری نہیں کیا اور ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی تربیت یافتہ فورس کے ماتحت جوان وہی کر رہے ہیں جو انہیں کرنا چاہئے۔ اس نے ہماری تشریف آوری کے انداز پر کسی قسم کا طنزیہ یا مزاحیہ تبصرہ بھی نہیں کیا لیکن ہمارے سے ہمیں بیٹھنے کے لئے ضرور کہا اور سگریٹ پیتا رہا۔
میں نے بہتر سمجھا کہ اس مجلس کو قبول کرنے میں عافیت ہے۔ انکار و احتجاج کرنے سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بیٹھنے چائے سے انکار کرنے سے ہم خود اپنی نظروں میں تماشا بنیں گے۔ کرنل کسی انتشار سے محظوظ ہونے والا آدمی نہیں تھا۔ میں نے غالب کی طرف دیکھ کے سر ہلایا جو اشارہ تھا مزاحمت کا سلسلہ موقوف کرنے کا۔
"اگر ہم مختلف حالات میں ملے ہوتے تو میں تم سے مل کے خوش ہوتا۔ کرنل" میں نے آخری لفظ طنزاً کہا۔ میری نظر اپنی ہولی کے درمیان میں رکھی ہوئی غیر ملکی برانڈ کی بہترین سگریٹوں کو گئی۔
"حالات آدمی نہیں بناتا" کرنل نے کسی فلسفی کی طرح کہا "اپنی پسند کے مطابق چائے بناؤ۔ اس میں زہر نہیں ہے، خاطر جمع رکھو۔"
"کہیں سے تھوڑا سا بھی نہیں مل سکتا؟" میں نے اپنی مرضی کا اور ایک سگریٹ لے لی۔
"کیا کرو گے؟" کرنل نے کہا اور دلا مگر میری طرف بڑھا دیا۔
"تمہاری چائے میں ڈالوں گا" میں نے کہا لیکن کرنل مذاق پر مسکرایا تک نہیں۔
"خاتون! آپ یقیناً ان کی پسند سے واقف ہوں گی۔ میرے

لئے ایک چمچ چینی۔ نو ملک، تھینک یو" کرنل نے نازو سے مخاطب ہو کے کہا مگر اس کی طرف دیکھا نہیں۔
نازو کا چہرہ لال ہوا تھا مگر میں نے اسے پھر اشارے سے سمجھایا کہ فی الحال جذبات پر قابو رکھے۔ نازو نے باری باری سب کے لئے چائے بنائی اور ایک بااخلاق خاتون خانہ کی طرح سب کو پیش کی۔ ہم نے کھانے پینے کی چیزیں اٹھانے میں تکلف نہیں کیا۔ میں کرنل کو خاموشی سے چائے پیتے دیکھ رہا تھا کہ ایک دم وہ خلش دور ہو گئی جو اس کی صورت نے پیدا کی تھی۔ وہ چوتھا شخص تھا۔ حیچ میں اسی نے ہماری طرف انگلی اٹھا کے کہا تھا کہ یہ حیچ کے لوگ نہیں ہیں اور اسی نے تین اخباری نمائندوں کو اکٹھا کیا تھا لیکن بعد میں خود پُر اسرار طور پر غائب ہو گیا تھا لیکن اس وقت وہ ایک قطعی بدلی ہوئی شخصیت تھا۔
میں نے کہا "تم اس موقع فورس کو کمانڈ کر رہے تھے۔ کرنل میں نے تمہیں پہچان لیا۔"
"اگر تم باقی لوگوں کو بھی پہچان لیتے ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" کرنل نے کہا۔
"تمہارا وہ چہرہ، وہ انداز گفتگو، چال ڈھال کا وہ طریقہ اصلی تھا؟ یا یہ جو اب ہمارے سامنے ہے؟" غالب نے کہا۔
نازو نے تلخی سے کہا "شاید دونوں اصلی نہیں۔"
کرنل نے صرف انگلی اٹھا کے کہا "خاتون کی سوچ زیادہ حقیقت پسندانہ ہے۔"
"لوگ تمہیں کرنل کیوں کہتے ہیں؟" میں نے کہا۔
"اگر لوگ مجھے میرے اصلی نام سے پکارتے تب بھی تم یہ سوال کرتے۔ پھر تم یہ بھی پوچھ سکتے تھے کہ میرے والدین نے میرا نام کچھ اور کیوں نہیں رکھا۔ یہ احمقانہ بات ہوگی۔ اگر یہ میز ہے تو میں پوچھوں کہ اس کا نام بینچ کیوں نہیں ہے۔"
وہ عجیب آدمی تھا اور ہر لمحہ اس کوشش میں نظر آتا تھا کہ اپنے سامنے والے پر چھا جائے۔ اسے ذہنی و نفسیاتی طور پر کمتری کے احساس میں مبتلا کر دے۔ اس کا یہ رویہ جھنجلاہٹ پیدا کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ولاور یا ترویدی کی طرح غرائے۔ اکڑ فوں دکھائے، مذاق اڑائے میری بے بسی کا۔ مجھے ڈرائے دھمکائے اور خوف میں مبتلا کرے۔ مجھے ذلیل و خوار کرے اور مجھ سے پوچھے کہ اب کیا ارادہ ہے تاکہ میں جواب میں کچھ سب کچھ اس کے ساتھ کروں۔ لیکن وہ ان سب باتوں سے بے نیاز عجیب لاتعلقی کے ساتھ بالکل مطمئن بیٹھا تھا جب کہ میں سکون اور اطمینان سے محروم تھا۔ مجھے ولاور اور ترویدی، پنڈت یا عبداللہ کے مقابلے میں کرنل ایک بہت زیادہ خطرناک اور سفاک دشمن لگا۔ اس کی خاموشی اور بے نیازی کا اثر غالب اور نازو کے اعصاب پر بھی پڑ رہا تھا۔ ان کی نظر بار بار گھڑی پر جا رہی تھی۔

www.paksociety.com

ابھی صرف بیس منٹ گزرے تھے۔ ایک گھنٹا دس منٹ کا انتظار باقی تھا جس میں ہمیں ایسے ہی بیٹھے رہنا تھا۔ کرنل سے کوئی بات کرنا اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرنا اسے گالیاں دینا یا اس کا مذاق اڑانا سب بے کار تھا۔ حالات پوری طرح اس کے کنٹرول میں تھے اور اسے وقت کی سست رفتاری کا بھی احساس نہیں تھا۔

کرنل کے پیچھے اور میرے سامنے والی دیوار وہی تھی جس کے دروازے سے گزر کے ہم اندر آئے تھے۔ سرنگ کہیں میرے پیچھے تھی۔ دائیں جانب کی دیوار میں الماری جیسے کھلے شیلف مختلف ناموں کے انجن آئل اور بریک آئل کے ڈبوں' کار پالش اور ایسی ہی چیزوں سے بھرے ہوئے تھے جو عام طور پر پیٹرول پمپ سے ملتی ہیں۔ بائیں جانب کی دیوار تقریباً دس فٹ چوڑا اور تین فٹ اونچا خلا تھا جس کو شیشے سے بند کیا گیا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن میں ایسی پارٹیشن اسٹوڈیو اور پروڈیوسر کے کمروں کے بیچ میں ہوتی ہے جہاں سے پروڈیوسر اشارہ دیتا ہے۔ اس شیشے کی پارٹیشن کا مقصد بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دوسری طرف سروس اسٹیشن تھا جہاں گاڑیاں دھوئی جاتی تھیں اور ان کا آئل وغیرہ بدلا جاتا تھا۔ شاید منیجر اس کمرے میں بیٹھ کے کارکنوں پر نظر رکھتا تھا۔

اس شیشے کی دیوار کی موجودگی کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب دوسری طرف کا تاریک منظر یکلخت روشن ہو گیا اور وہ شیشے کی مستطیل کسی بہت بڑے ٹی وی اسکرین کی طرح نظر آنے لگی۔ مجھے اس کمرے کی مجموعی حالت کے پیش نظر یہ غیر معمولی طور پر صاف شفاف شیشہ اتنا ہی بے جوڑ لگا جیسے ٹاٹ میں مخمل کا پیوند لگتا ہے۔ اس پر کوئی داغ دھبہ نہیں تھا جو بڑی عجیب بات تھی کیونکہ دوسری طرف بھی جو کام ہوتا تھا وہ صاف ستھرا نہیں تھا۔ گاڑی اوپر اٹھا کے اس پر بڑے پریشر کے ساتھ تیل ملا پانی ڈالا جاتا تھا اور گاڑی کی باڈی کے نیچے کا سارا میل کچیل دھونے سے ہر طرف چھینٹے اڑتے تھے۔ ہر سروس اسٹیشن کی دیوار تیل سے سیاہ اور چکنی رہتی ہے مگر اس شیشے پر ایک دھندلا سا نشان تک نہیں تھا۔ یہ بالکل نیا شیشہ تھا جسے کسی خاص ضرورت کے لئے خشک اور نرم کپڑے سے یوں صاف کیا گیا تھا کہ اس پر لائن بھی نہ پڑے۔

یہ ضرورت فوراً واضح بھی ہو گئی۔ سکھ ڈرائیور کی لاش اس پلیٹ فارم پر نمودار ہوئی جو گاڑیوں کو جس کے ساتھ اٹھاتا ہے۔ اس کے نیچے گول ستون نما ہائیڈرالک پریس تھا۔ لاش کے کپڑے اتار لئے گئے تھے۔ پھر سروس اسٹیشن کی یونیفارم میں دو افراد پائپ لئے نمودار ہوئے اور انہوں نے لاش کی سروس شروع کی۔ شیشے کی وجہ سے پورے پریشر کے ساتھ نکلنے والے پانی کی شوں شوں بالکل سنائی نہیں دے رہی تھی اور یہ کسی خاموش فلم کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ ہم ایک ہی بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے جو سب کی نظر اس منظر کو بالارادہ دیکھ رہی تھی۔ سکھ ڈرائیور اچھا آدمی نہیں تھا اور جو کچھ اس نے ہمارے ساتھ کیا وہ بہت برا تھا مگر پھر بھی ہمیں اس کی لاش کے ساتھ یہ غیر انسانی سلوک دیکھ کر خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ آدمی کی نیکی بدی اس کی ذات کے ساتھ ہے۔ ہم اسے سزا دے سکتے تو ضرور دیتے' وہ مر گیا تو اس کا اور ہمارا حساب اوپر چلا گیا۔ روح کے بدن سے جدا ہوتے ہی وہ جزا و سزا کی اذیت و مسرت کے احساس سے ہی بیگانہ ہو گیا تھا۔ اب اس کی لاش کو جلا دو' چیلوں اور کتوں کے آگے ڈال دو یا عبرت کے لئے شہر کے چوک میں الٹا لٹکا کے رکھو۔ یہ صرف لاش کی بے حرمتی ہے اور کچھ نہیں۔

نازو نے کہا "میاں کرنل! کیا تمہارا غسل میت بھی ایسا ہی مشینی اور سائنٹیفک ہو گا؟"

غالب نے کہا "کیسی باتیں کرتی ہو۔ کرنل کے لئے موت نہیں ہے۔"

میں نے کہا "یہ سب تو ہمیں دہشت زدہ کرنے کے لئے ہے۔"

کرنل نے ایک سگریٹ جلائی اور پیکٹ مجھے پیش کیا "میں زیادہ پروا نہیں کرتا کہ میری لاش کا کیا بنے گا۔ یہ میرے وارثوں کا درد سر ہے کہ وہ ان طریقوں میں سے جو رائج ہیں کوئی بھی طریقہ اختیار کر لیں۔ تم نے سنا ہو گا ایک فرقے کے بارے میں۔ جو لاش کو مرنے کے بعد جانوروں کی ضیافت کے لئے رکھ دیتے ہیں۔ یہ سب سوچنے کی بات ہے ورنہ ان کے جذبات بالکل مجروح نہیں ہوتے۔"

"تم یہ ظاہر کرتے ہو کہ تمہارا انداز فکر کتنا غیر جذباتی ہے لیکن اس کی جگہ تمہاری ماں کی لاش ہوتی..." نازو نے کہا مگر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

میں نے تو پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ لاش کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ نازو کی نظر اب لاش پر گئی تو وہ بے دم ہو کے رہ گئی۔ پانی کے ساتھ آہستہ آہستہ لاش کے جسم پر سے گوشت اترنے لگا تھا۔ ریشہ ریشہ ہو کے اس کی بوٹیاں ایسے بہنے لگی تھیں جیسے واقعی وہ خاک کا پتلا تھا۔ محاورے کے مطابق نہیں بلکہ سچ مچ گلی ہوئی [illegible] جسم سے جدا ہو جانے والی مٹی پانی کے دھاروں کے ساتھ بہتی رہی [illegible] ہڈیوں کی سفیدی نمودار ہو گئی تھی۔ [illegible] یہ لگتا تھا کہ اس پلیٹ فارم پر صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ ایسے جیسے اسے کئی سال بعد قبر سے نکالا جائے۔

"یہ... یہ کیا ہے؟ پانی تو نہیں" نازو نے بمشکل تمام کہا۔

"نہیں۔ یہ ایک کیمیائی محلول ہے جس میں بہت سے تیزاب شامل ہیں" کرنل نے ایک اور سگریٹ نکال کے سلگائی

اور کہا۔ "ہر تیزاب گوشت کو جلا دیتا ہے مگر یہ مرکب زود اثر ہے۔ میں ایک ریسرچ کیمسٹ ہوں لیکن یہ میری ایجاد نہیں ہے۔ اس میں ہڈیاں بھی حل ہو جاتی ہیں مگر اس میں وقت لگتا ہے۔ ہڈیاں بچ رہیں گی۔ لیکن انہیں کرش کر لیا جائے تو دو گھنٹے میں اس محلول میں حل کر کے انہیں گٹر کے ٹب میں ڈالا جا سکتا ہے۔"

"یو باسٹرڈ۔ سن آف اے بچ" میں نے چیخ کر کہا اور کوشش کی کہ اس پر جھپٹ پڑوں لیکن مجھے احساس ہوا کہ میرے جسم کی حرکات میں فرق آ گیا ہے۔ میرا ہاتھ مجھے بہت بھاری لگا جسے تیزی سے نہ اٹھا سکا۔ یہ عجیب سی کیفیت تھی۔ اس کو غنودگی کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ میرے حواس پوری طرح کام کر رہے تھے اور میری ذہنی مستعدی میں بھی فرق نہیں تھا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے مجھے جسمانی طاقت فراہم کرنے والی بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہے۔ میری حالت آہستہ آہستہ چلنے والے پنکھے کی طرح تھی جسے بہت کم وولٹیج مل رہے ہوں۔ جب میں نے بات کی تھی تو میری آواز بھی ایک خاص حد سے زیادہ بلند نہیں ہوئی تھی حالانکہ میں چیخنا چاہتا تھا اور میرے حلق سے آواز کے نکلنے کی رفتار میں بھی کمی آ گئی تھی۔ میں مجموعی طور پر سلو موشن میں دکھائی جانے والی فلم کے کردار کی طرح مضحکہ خیز ہو گیا تھا۔

کرنل نے بہت ٹھہر ٹھہر کے اور رک رک کے کہا "تم نے کچھ کہا نہیں" "میں نے اسے ایک گالی بھی دی۔"

غالب نے آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے میز پر سے چائے دانی اٹھا کے کرنل پر مارنے کی کوشش کی مگر ایک محافظ جھپٹا اور اس نے آپ کو دھکا دے کر بینچ پر بٹھا دیا۔

ایک مضحکہ خیز لہجے میں غالب نے اسے چند نازیبا القابات سے نوازا۔ اس کی آواز ایسی ہوتی تھی جیسے گراموفون ریکارڈ کی چابی ختم ہونے سے رفیع کی آواز سہگل جیسی لیکن بے سری معلوم ہو جائے۔ نازو نے ہماری حالت دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

"یہ ایک بے ضرر سا نروس فوڈ ہے۔" کرنل نے کہا "یہ جسم کے RESPONSE کو بہت کم کر دیتا ہے۔ ابتدا میں اس کا اثر ایسا ہوتا ہے جیسے سکون آور گولیوں کی مقررہ مقدار سے چار یا پانچ گنا زیادہ کھا لی جائے لیکن باقاعدگی سے استعمال کے بعد یہ سسٹم میں جذب ہو جاتا ہے۔ اور جسم کے تمام افعال کو مرضی کے مطابق چلانے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔ جیسے پنکھے کا ریگولیٹر ہوتا ہے۔ جو پنکھے کی رفتار کو کم یا زیادہ کرتا ہے۔ یہ ایک ریگولیٹر ہے۔ یہ وہی... میرا جسم اس کے مثبت اثرات قبول کر چکا ہے۔ اب میں تمہارے سامنے اپنے رویے کو اپنی مرضی کے مطابق بدل سکتا ہوں۔ سنو... میڈیم پلاسٹ کر سکتا ہوں۔ قبرستان میں تم نے ایک میڈیم کنٹرول دیکھا تھا۔ یہ سب ذہن پر منحصر ہے۔ ذہن پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ آدمی حلیہ تو بدل لیتا ہے میک اپ سے لیکن رویہ نہیں بدلا جاتا چنانچہ پکڑا جاتا ہے۔ یہ میری ریسرچ کا حاصل ہے۔ ابھی تک میں نے اسے پیٹنٹ نہیں کرایا ہے۔ یہاں تو کچھ ملے گا نہیں۔ فوراً میرا فارمولا چرا لیا جائے گا۔ اور ممکن ہے اس پر پابندی لگ جائے۔ امریکا میں مجھے لاکھوں ڈالر کی رائلٹی مل سکتی ہے۔ میڈیکل ریسرچ میں اس کی بہت اہمیت ہو گی۔"

"شاید تمہیں دو نوبل پرائز ایک ساتھ مل جائیں" میں نے آہستہ آہستہ بولتے ہوئے ایسی آواز میں کہا جو میرے کانوں کو ہرگز اپنی آواز نہیں لگتی تھی "ایک سائنس اور میڈیسن کا۔ دوسرا اپنی ذہانت اور صلاحیت کو شیطانی کاموں کے لئے وقف کرنے کا۔"

حسب توقع اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے سر گھما کے دیکھا تو سردار جی کی جگہ اب ایک ڈھانچہ رکھا ہوا تھا۔ کاسۂ سر سے استخوانی پنجے تک مکمل۔ سفید چمکتی ہڈیوں کا پنجر۔ باپ بڑا نہ بھیا۔ بھیا سب سے بڑا روپیا۔ ڈھانچہ اٹھ کے گانے لگا۔ پھر پلیٹ فارم اوپر اٹھا۔ اوپر سے گیراج کی چھت نیچے آئی۔ ان سب کے لئے جو یہاں اپنی گاڑیاں دھلوانے آتے ہوں گے یہ ایک عام سروس اسٹیشن تھا۔ انہوں نے کبھی غور نہیں کیا ہو گا کہ گیراج کی چھت کے نیچے دوسرا پلیٹ فارم کیوں نصب ہے۔ ایسا منظر تو انہوں نے کسی ڈراؤنی دہشت ناک فلم میں بھی نہیں دیکھا ہو گا جو ہم دیکھ رہے تھے۔ آج سے پہلے ہم بھی یہ تصور نہیں کر سکتے تھے۔ شاید لاشوں کو غائب کرنے کا یہ پلانٹ حال ہی میں لگایا گیا تھا اور اسی لئے عارضی طور پر بند کر دیا گیا تھا کہ اس میں کرم فرماؤں کی بہترین "خدمت" کے لئے بہتر سہولتوں کا اضافہ کیا جا رہا تھا۔

اوپر نیچے کے پلیٹ فارم بڑی مشینی یکسانیت سے حرکت کرتے ہوئے قریب آئے اور آپس میں مل گئے۔ ان کے درمیان چند فٹ کی جگہ بھی نہ رہی۔ اگرچہ درمیان میں شیشہ تھا اور دوسری طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی' اس کے باوجود میرے دماغ کے اندر دھماکے ہو رہے تھے۔ لاش کی ہڈیاں چٹخ رہی تھیں' ٹوٹ رہی تھیں اور ریزہ ریزہ ہو رہی تھیں۔ کاسۂ سر جو مرکز تھا نیکی بدی کے خیالوں کا' محبت اور نفرت کے جذبات کا' زندگی پر غرور رکھتا تھا اور جسم کی ساری حرکت اور توانائی کنٹرول کرتا تھا۔ وہ دماغ جو احساس اور حواس کا سرچشمہ تھا۔ ہاتھ جو تمام عمر مصروف رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے گاڑی کے اسٹیئرنگ وہیل پر تھے۔ پھر نوٹ گن رہے تھے اور شراب کی بوتل کو حلق میں انڈیلتے رہے تھے۔ اور پاؤں جو حرکت کی علامت تھے' سب سرمہ ہو گئے۔ ایک ریسرچ کیمسٹ کی ایجاد سے... تھا۔

www.paksociety.com

ہونے کے لئے۔ وقت کم ہے۔ ہڈیوں کو دو گھنٹے سے کم میں حل ہو جانا چاہئے اس لئے ایک منٹ میں کرش کر دو۔ میں لیٹر کا کوئی ڈرم ہے؟ اس میں ڈالو سوار جی کو اور کرش بہا دو۔ اس محلول کے تیزابی اثرات کرش کو بھی صاف کر دیں گے۔ پلیٹ فارم نیچے چلا گیا۔ سوار جی غائب ہو گئے۔ جیسے جادوگر کسی بھی چیز کو غائب کر دیتا ہے۔

"یہ سب کچھ تم ہمیں اس لئے دکھا رہے ہو کہ ہم اپنے انجام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ یہ سمجھ لیں کہ جو اس سکھ کے ساتھ ہوا وہ ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ تمہاری بے پناہ تباہ کن ... کا اعتراف کرتے ہوئے مقابلے کا خیال چھوڑ دیں" میں نے آہستہ آہستہ کہا۔ میری قوت گویائی میرے خیالات کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ذہن بہت تیز اور آگے دوڑ رہا تھا۔ جذبات کے طوفان کی آتش فشانی اپنی انتہا پر تھی۔ غم و غصے کے ساتھ نفرت کے شعلے بھڑکتے جا رہے تھے اور میرے وجود میں اشتعال کا سمندر چڑھ رہا تھا مگر باہر سے میں ٹھنڈا اور پُرسکون تھا۔ میں چیخنا چلانا چاہتا تھا لیکن میری آواز دبی ہوئی تھی۔ یہ سب اس منحوس دوا کا اثر تھا جو میں نے جانے میں پی لی تھی۔ کرنل اس کا عادی تھا۔ میں اس کے پہلے تجربے کو بھگت رہا تھا۔

"یہ لوگ اپنا کام کر رہے ہیں" کرنل نے ایسی بے نیازی سے کہا جیسے یہ کوئی خاص بات نہیں اور سروس اسٹیشن پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ معمول کی کارروائی ہے۔

تقریباً پانچ منٹ کے بعد میں نے سکھ ڈرائیور کی گاڑی کو اوپر اٹھتا دیکھا۔ اس کے چاروں ٹائر اب بھی فلیٹ تھے۔ پھر رنچ، اسپینر اور اسکرو ڈرائیور اٹھائے چار افراد کی ایک ٹیم نمودار ہوئی اور انہوں نے بڑی فنی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ دو منٹ میں چاروں وہیل کھول کے الگ کر دئے۔ پھر انہوں نے وہ حصے کھول ڈالے جن پر وہیل فٹ کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد لائٹس کی باری آئی۔ پھر سیٹوں کی۔ وہ روبوٹس کی طرح کام کر رہے تھے اور ان میں ڈسپلن تھا۔ کوئی کسی سے نہیں پوچھتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کوئی کسی کو ہدایات نہیں دیتا تھا۔ ایک کام ختم ہوتے ہی ہر شخص دوسرا کام اپنے شروع کر دیتا تھا جیسے اپنے حصے میں آنے والے ہر کام کا پہلے سے علم ہے۔

آدھے گھنٹے بعد صرف کار کا ڈھانچہ رہ گیا۔ اس کے چاروں دروازے اور آگے پیچھے کے بونٹ تک ہٹائے جا چکے تھے۔ الگ کئے جانے والے سب پارٹس نہ جانے کہاں لے جائے جا رہے تھے۔ گاڑی میں اب کیا بچ گیا ہے ... ختم ہوئے تھے۔ میرا ذہن پوری طرح بیدار اور اس صورت حال سے پوری طرح آگاہ تھا مگر جسم نیم خوابیدہ تھا۔ شاید کرنل کی بھی یہی کیفیت تھی۔ غالب اور نادر بھی تھے۔ وہ بالکل چپ بیٹھے ٹکٹکی لگائے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ آخر میں انہوں نے انجن کو فاؤنڈیشن پر سے اتارا۔ ایک

زنجیر سے منسلک ہک نے جو چھت سے لٹک رہی تھی انجن کو اٹھا لیا اور کچھ آگے لے جا کے چھوڑ دیا۔ انجن ایک دھماکے سے فرش پر گرا جس نے دیواروں کو ہلا دیا۔ باقی ماندہ کار کو ہائیڈرالک پریس نے دبا کے ایسے چپٹا کر دیا کہ وہ ایک ٹوٹی پھوٹی فولادی چادر نظر آنے لگی۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں ویسے ہی دھماکے ہوئے جیسے سکھ ٹیکسی ڈرائیور کی ہڈیوں کے چٹخنے ٹوٹنے کی آواز کے تصور سے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں چلتی ہوئی کار بالکل زندہ نظر آتی ہے اور خراب ہو تو بیمار لگتی ہے۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے یہ کار کی لاش تھی جس کے اعضا تھے اور ہڈیاں تھیں اور پورا جسم تھا جو ہائیڈرالک پریس میں پس گیا۔ سکھ سردار اور اس کی گاڑی لوح جہاں سے حرف مکرر کی طرح مٹ چکے تھے۔ ان کا سراغ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغ رساں اور ایف بی آئی کے جاسوس، شرلاک ہومز اور کرنل فریدی، تمام حقیقی اور افسانوی کردار جو اپنی عقل اور ذہانت سے بڑے بڑے مجرموں کو پکڑ لاتے تھے، خواہ وہ آکاش پر ہوں یا پاتال میں، مل کر بھی دوہرے قتل کی اس واردات کے بارے میں تفتیش کرتے تو سر کھپاتے رہ جاتے۔ یہی جانا کہ کچھ نہ جانا میر۔ سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم۔

ٹھیک بارہ بجے باہر دو گاڑیاں آ کے رک گئیں۔ اس وقت تک ہم خاموش بیٹھے کرنل کو گھورتے رہے تھے اور بہت سوچنے کے بعد کچھ کرنے کی خواہش سے دستبردار ہو چکے تھے۔ ہمارے جسم کے تمام افعال میں سستی، بے حسی اور ناطاقتی پوری طرح شامل ہو چکی تھی اور یہ ایک خوف زدہ کرنے والا احساس تھا کہ ہم جزوی طور پر مفلوج ہو گئے ہیں۔ کرنل نے بھی ہم سے کوئی بات کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا لیکن وہ ایک لمحے کے لئے بھی غافل یا غیر مستعد نہیں ہوا تھا۔

دو اجنبی افراد اندر آئے جو شوفر نظر آتے تھے اور انہوں نے بہت مؤدبانہ انداز میں کرنل کو سیلوٹ کیا۔ پھر ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے براؤن پیپر کا ایک پیکٹ کرنل کے سامنے رکھ دیا۔ غالباً اس کے اندر نوٹ تھے اور یہ ہمیں گرفتار کر کے بحفاظت آگے پہنچانے کا معاوضہ تھا۔

کرنل نے نوٹوں کے بنڈل کو کھول کر نہیں دیکھا اور صرف سر ہلا دیا۔ "تم انہیں لے جا سکتے ہو۔"

"مسٹر ترویدی نے پیغام دیا ہے کہ اگر آپ مصروف نہ ہوں تو ساتھ ہی چلیں" دوسرے نے کہا۔

"یہ درخواست وہ ٹیلی فون پر مجھ سے براہ راست بھی کر سکتا تھا" ... نے کہا۔

میں نے نوٹ کیا کہ کرنل نے "پیغام" کے لفظ کو "درخواست" میں بدل دیا ہے حالانکہ پیغام کے متن میں بھی درخواست کا ہی انداز تھا۔ کوئی حکم نہیں تھا۔

... والے چند سیکنڈ خاموش کھڑے رہے۔

"تم جا سکتے ہو" کرنل نے مختصراً کہا اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

"چلو" پہلے شخص نے میری طرف دیکھ کے خاصے جارحانہ لہجے میں کہا۔

"کہاں؟" میں نے کہا۔

جواب دینے کے بجائے دو افراد نے مجھے جھنجھوڑ کے کھڑا کیا اور دروازے کی طرف دھکیلا۔ اگر مجھے اپنے جسم کا پورا اختیار ہوتا تو انہیں تمیز سکھانے کے لئے میں بہت ورزش کراتا۔ شاید نادر بھی ایک دو کو الٹ پلٹ کر دیتا مگر ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔ میری جسمانی حالت کی بہترین مثال اس شخص سے دی جا سکتی ہے جو پانی میں ہاتھ پیر چلانے کی کوشش کرے۔ کسی کو دھکا مارنا چاہے یا کسی پر جست لگانا چاہے تو مزاحمت آڑے آتی ہے ... اتنی تیزی سے حرکت نہیں کی جا سکتی جتنی تیزی سے خشکی پر یا ہوا میں کر سکتا ہے۔ اگر مجھے ... کم فولادی زرہ بکتر پہنا دئے جاتے تب بھی ایسا ہی ہوتا۔ ... رفتاری، چستی اور سیکنڈ کے سوویں یا ہزارویں حصے کی ... کی ضرورت جسمانی مقابلے میں مہارت کے مظاہرے ... ہے وہی مجھ میں بالکل مفقود تھی۔

ایک گاڑی مجھے اور غالب کو لے کر روانہ ہو گئی۔ اس کے ... شیشے تھے اور دروازے اندر سے نہیں کھولے جا سکتے تھے۔ ... ڈرائیور اور ہمارے درمیان شیشے کی پارٹیشن تھی چنانچہ ... تو سکتے تھے لیکن پیچھے سے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے ... ہم اس کے ... بیٹھے ہوئے مسلح شخص کی زد میں بھی نہیں ... تھے۔

غالب نے کہا "یہ لوگ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟"

میں نے کہا "جام شہادت پیش کرنے۔ ہم اپنے سفر آخرت پر روانہ ہیں۔"

"مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔ گڈ بائی اینڈ ... تمت بالخیر" غالب نے ... کہا۔

"ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا تھا۔ پھر رونا کیسا؟"

"میرا خیال ہے..."

میں نے اسے انگلی ہونٹوں پر رکھ کے خاموش کر دیا "کوئی ... بات مت کرنا۔"

"ان کی آواز تو ہم نہیں سن سکتے" غالب بولا۔

"مگر وہ سن لیں گے۔ ادھر ... ہو سکتے ہیں۔"

"اس حرامزادے ڈرائیور کی مونچھیں بھی نقلی ہیں" غالب نے ... دیر بعد کہا۔

ڈرائیور کے ردعمل نے ثابت کر دیا کہ میرا خیال درست ... نے چونک کر خاص برہمی سے پیچھے دیکھا جیسے وہ بتانا ... کہ میری مونچھیں اصلی ہیں۔"

غالب نے ہنس کے کہا "ٹھیک ہے۔ تم نے میری غلط فہمی دور کر دی۔"

ڈرائیور کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ڈرائیور کی غیر ارادی حماقت کے مظاہرے سے خوش نہیں ہے۔

یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ہماری منزل کا راستہ کیا ہے۔ ابھی تک شہر کی سب سڑکیں ایک جیسی لگتی تھیں۔ وہی بلند و بالا عمارات جن میں نیچے سے اوپر تک چھوٹے چھوٹے کابک نما فلیٹ تھے۔ وہی بھانت بھانت کی مخلوق۔ دوڑتی ہوئی گاڑیاں، پیدل چلنے والوں کا ہمہ وقت رواں ہجوم۔ ایک سی دکانیں، اسٹریٹ لائٹس اور نیون سائن۔ مشکل ہندی ناموں والی سڑکیں... یہ سب یاد رکھنا بہت مشکل تھا۔ برسوں یہاں رہنے کے بعد شاید ایسا ممکن ہوتا مگر ابھی تو ہم بے بسی سے باہر کی آزاد مخلوق کو دیکھتے جا رہے تھے جو ہماری حالت سے قطعی بے خبر ہمیں دیکھ تک نہیں سکتی تھی۔

اچانک کار نے زبردست بریک لگائے۔ پھر ایک خوفناک دھماکا ہوا اور میں اچھل کے اپنے سامنے والی شیشے کی پارٹیشن سے ٹکرایا۔ جھٹکا لگتے ہی غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ سامنے آ گیا تھا چنانچہ میں نے تصادم سے بچنے کی فضول سی کوشش بھی کی تھی۔ ...اس سے صرف اتنا فائدہ ہوا کہ صدمے کی شدت کو کسی حد تک ہاتھوں نے اور میرے جسم نے بھی جھیل لیا ورنہ صرف سر لگتا تو میں شیشے کی دیوار سے نکل کے ڈرائیور کی بغل میں گھس جاتا۔

شیشہ ٹوٹنے کی آواز بہت شدید تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ڈرائیور کے چلانے کی آواز سنی۔ اس نے کسی کو بہت بڑی گالی دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جو شور اٹھا وہ بھی میں نے سنا۔ غالباً کار کی ہیڈ لائٹس اور اس کا ونڈ اسکرین سب ٹوٹ گئے تھے۔ میں نے کار کے سامنے کوئی پہاڑ سا کھڑا ہوا دیکھا۔ یہ کوئی ٹرک تھا جو پانی یا تیل سپلائی کرنے میں استعمال ہوتا ہوگا۔ وہ کار کے راستے میں اس طرح حائل ہوا تھا کہ کار دونوں ٹائروں کے درمیانی حصے میں پھنس گئی تھی۔ ٹینکر کا چیسس لوہے کے گرڈروں کا بنا ہوا تھا جو اتنے موٹے تھے کہ ریل کی لائن جیسے لگتے تھے۔ ظاہر ہے ایک کار ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ باہر ایک ہجوم جمع ہونے لگا تھا اور ٹریفک رک گئی تھی۔

خود کو سنبھالتے ہی میں نے غالب کو دیکھا۔ "حادثہ ہو گیا ہے۔ تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"ایسے ہی خراشیں آئی ہیں۔" غالب نے رومال سے پیشانی صاف کی تو رومال کا رنگ لال ہو گیا۔

غالب نے کہا۔ "تیرا چہرہ بھی لال ہو رہا ہے۔ کیا زیادہ چوٹ آئی ہے؟"

www.paksociety.com

میں نے چہرے کو ہاتھ سے چھو کر دیکھا۔ خون کی نمی کے ساتھ میری انگلیاں سرخ ہو گئیں۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر پیشانی صاف کی۔ "شاید شیشہ ٹوٹنے سے خراشیں آئی ہیں۔" غالب نے پیچھے ہٹ کے دیکھا۔ "دوسری گاڑی تو نکل گئی ہوگی۔"

"ہاں۔ وہ کیوں رکے گا۔" میں نے کہا۔

"گویا نازو بھی گئی؟" غالب نے کہا۔

"ہم بھی پہنچ جائیں گے۔ ڈرائیور زیادہ زخمی نہیں ہوا ہے۔" ...میں نے کہا۔ "جو اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا وہ بھی بچ گیا۔"

"ہم موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔" "آگے سے نکل سکتے ہیں یا کسی کو آواز دے کر کہہ سکتے ہیں کہ باہر سے دروازہ کھول دے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "بے کار ہے۔ اس طرح ہم نازو سے بھی بچھڑ جائیں گے۔ بہتر ہے ہم ترپٹی سے مل لیں۔"

ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے باہر سے دروازہ کھول دیا۔

"باہر نکلو۔ جلدی۔" کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ میرا دل ایسے دھڑکا جیسے سینے کی دیوار کو توڑ دے گا۔ "محسن تم!"

"پیچھے سے اس آئل ٹینکر پہ چڑھ جاؤ۔" محسن نے کہا۔ "اندر اتر جاؤ۔"

غالب نے کہا۔ "مگر نازو؟ اسے وہ لے گئے ہیں۔"

سب نے ہجوم نے کار کے ڈرائیور اور اس کے ساتھی کو گھیر رکھا تھا۔ وہ دیوانہ وار چلا رہے تھے۔ مگر کچھ لوگ ان سے اس طرح چمٹ گئے تھے کہ ان کے لئے خود کو چھڑانا ناممکن ہو رہا تھا۔

"نازو کی فکر مت کرو۔" محسن نے بے رخی سے کہا۔ "باہر نکلو۔ ابھی مشکل سے روکا ہے انہیں ہم نے۔"

میں بھونچکا سا رہ گیا۔ "تم نے۔ یہ ٹینکر..."

محسن نے سر ہلایا اور مجھے گھسیٹ کر ٹینکر کے دوسری طرف لے گیا۔ وہاں ٹینکر کی باڈی کے ساتھ لوہے کی ایک سیڑھی سی نصب تھی۔ میں اس پہ چڑھ گیا۔ اوپر اس کا دو فٹ ڈھکنا کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ ٹینکر آدھا خالی تھا۔ جب میں اندر اتر گیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کمر تک آنے والے پانی میں کھڑا ہوا ہوں۔ میرے پیچھے پیچھے غالب آ گیا۔ باہر اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ کار کا ڈرائیور سب سے زیادہ بلند آواز میں چیخ رہا تھا اور گالیاں دے رہا تھا۔

"چھوڑ دو۔ مجھے کیوں پکڑ رکھا ہے تم نے... تمہاری... سور کے بچو! کتو! تم سب ملے ہوئے ہو۔ جان بوجھ کے... مجھے مارنے والا تھا۔"

کسی نے چیخ کر کہا "حرامی۔ غلط سائڈ سے آ رہا تھا۔ پیچھے ایک بچے کو مار کے بھاگا تھا۔"

"جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ ہے" ڈرائیور نے چیخ کر کہا۔

بیک وقت کئی آوازیں آئیں "یہ ٹھیک ہے ہم نے بھی دیکھا تھا حادثہ۔ ہم وہیں سے اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ ارے تھانے لے چلو" مجھے ان میں سے چند آوازوں پہ بنگالی لب و لہجہ کا گمان ہوا۔

ڈرائیور کے ساتھی نے چلا کے کہا "کون ہو تم لوگ؟ تم نے جان بوجھ کے راستہ روکا ہے ہمارا۔ تم سب کی... تم سب نے سازش کی ہے۔"

"ڈالی دیتا ہے سب کو شالا 'مارو شالے کو... مارو... مارو۔"

میں نے خود کو کہنیوں کے بل تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور باہر جھانک کے دیکھا۔ بہت سے لوگ ڈرائیور کو اور اس کے ساتھی کو مل کے مار رہے تھے۔ وہ سب کار اور ٹرک کو تھانے لے جانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

غالب نے نیچے سے کہا "یار! یہ کیا معاملہ ہے؟ راستے میں تو کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا۔"

"جب اتنے لوگ کہہ رہے ہیں تو پھر یہی سچ ہے" میں نے پھر نیچے اتر کے کہا۔

غالب اپنا چہرہ پانی سے دھو رہا تھا "مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ محسن کی کارروائی ہو سکتی ہے۔ ایسا زبردست پلان۔"

"اس کے ساتھ یہ دوسرے تماشائی کہاں سے آ گئے؟" میں نے بھی منہ دھو کے خراشوں کی جلن کو کم کیا۔

"انہوں نے جانتے بوجھتے کار ڈرائیور کو اور اس کے ساتھی کو پکڑا تاکہ وہ کار کی طرف نہ آئیں۔ انہیں کھینچ کر دور لے گئے۔"

"اب وہی شور مچا رہے ہیں کہ ڈرائیور کسی بچے کو مار کے بھاگا تھا۔ اور وہ اپنی گاڑی میں تعاقب کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب غلط ہے" میں نے کہا۔

"کیا غلط ہے؟"

"نہ حادثہ ہوا ہے۔ نہ کسی نے گاڑی میں پیچھا کیا۔ یہ لوگ ٹینکر پہ تھے اور انہوں نے جانتے بوجھتے خود ٹینکر کو کار سے ٹکرایا اور پھر نیچے اترتے ہی بھیڑیوں کی طرح ان دونوں سے چمٹ گئے۔"

غالب بولا "یعنی انہیں معلوم تھا کہ یہ دونوں ہمیں اغوا کر کے لے جا رہے ہیں؟"

"ظاہر ہے یہ محسن کا پلان تھا تو اس نے ہی سب کچھ بتایا ہوگا اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ قبرستان سے غائب ہونے کے بعد محسن بے خبر نہیں تھا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جتنی دیر ہم پیٹرول پمپ پہ رہے اس نے سارا بندوبست کر لیا۔"

غالب نے کہا "مگر کیسے؟ کہاں سے لایا وہ اتنے طرف دار۔

...یہ لوگ آخر؟"

میں نے کہا "یہ تو محسن ہی بتائے گا۔ بہرحال ڈاکٹر علی صاحب کی بھی تعریف کر دی محسن نے۔ ترپٹی کی اور وارڈ رکی..." "جو بتانے کی وہ اس کی تعریف کرنے سے کہیں زیادہ سخت تھی۔ پہلوانوں نے اس کے ہاتھ ملائے۔"

اسی وقت ٹرک کا انجن غرایا۔ پولیس آ گئی تھی اور انہوں نے ٹریفک کو رواں رکھنے کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ وہ سیٹیاں بجا رہے تھے اور کاروں کو اور دوسری گاڑیوں کو چلنے کی ہدایت دے رہے تھے۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ ٹرک کو ایک طرف لے جاؤ۔ ٹریفک رک رہی ہے۔"

"سب قصور اس کار والے کا ہے۔ یہ پیچھے حادثہ کر کے بھاگا تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے جناب" ڈرائیور نے چیخ کر کہا۔

ایک بار پھر کئی آوازوں نے اس کی تردید کی "ہم نے خود دیکھا تھا۔ ہم اسے پکڑ لیتے لیکن اس سے پہلے ہی یہ ٹرک میں گھس گیا۔"

"پکڑے رکھو ان دونوں کو" یہ حکم غالباً کسی پولیس افسر نے دیا تھا۔

پھر وہ شور دور ہونے لگا اور صرف ٹریفک کا شور رہ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ٹرک جائے حادثہ سے فرار ہو رہا ہے۔ کار اس قافلے میں نہ تھی کہ ٹرک کے ساتھ آتی۔

"کیا ٹرک خود محسن چلا رہا ہے؟"

"محسن ٹرک چلا سکتا ہے۔ زمین پہ دوڑنے والی ہر چیز چلا سکتا ہے" میں نے خوش دلی سے کہا "اور وہ جو اس کے ساتھی تھے، سب پیچھے رہ گئے" غالب کی عقل بھی حیران تھی۔

"میں دیکھتا ہوں باہر نکل کے" میں نے کہا اور پھر اس ٹینکر کی چھت کے سوراخ سے طلوع ہوا۔ ٹینکر کی اوپر والی چھت ڈھلوان تھی اور اس پہ توازن قائم رکھنا اس لئے آسان نہ تھا کہ ٹرک بہت رفتار سے جا رہا تھا۔ میں نے ڈھکنے کے کنارے پہ گرفت قائم رکھی اور ایک پاؤں لمبا کر کے ڈرائیور کی چھت پہ جمایا۔ ڈنڈے کو مضبوطی سے پکڑ کے میں کچھ نیچے آیا تو ڈرائیور کا چہرہ مجھے اس شیشے میں دکھائی دیا جو دائیں جانب باہر کی طرف لگا ہوا تھا۔ یہ محسن کا چہرہ تھا۔ وہ اوور ٹیک کرنے کے لئے ٹریفک کو دیکھ رہا تھا کہ اسے میری صورت نظر آئی۔ اس نے گردن نکال کے مجھے دیکھا۔

"اندر رکے رہو۔ کیا سرکس دکھا رہے ہو" محسن نے ایک نعرہ لگایا "ساری پسلیاں ٹوٹ جائیں گی۔"

میں نے چلا کے کہا "کوئی بات نہیں۔ بس دل نہ ٹوٹے جو پسلیوں کے اندر ہے۔"

پاس سے گزرنے والی بہت سی کاروں کے ڈرائیور بھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ محسن نے رفتار پھر بڑھا دی۔ میں نے دور سے کسی ٹریفک سارجنٹ کا سائرن سنا اور پھر اوپر چڑھ کے پانی میں ڈوب گیا۔

"ٹرک کی لگام محسن ہی کے ہاتھ میں ہے" میں نے بہت خوش ہو کے غالب کو اطلاع دی۔

"میں ڈوب مرنا چاہتا ہوں۔ چلو بھر سے زیادہ ہے یہ پانی۔ نازو کے بغیر میں کیسے جی سکتا ہوں۔"

"جیسے میں رابعہ کے بغیر جی رہا ہوں۔ اور شہلا کے بغیر محسن جی رہا ہے۔ امید کے سہارے کہ ہم پھر ملیں گے" میں نے کہا۔

"کتنے شرم کی بات ہے۔ ایم آر ایس کی سب خواتین قید میں ہیں۔ مرد آزاد پھر رہے ہیں۔ ہم فرار ہو گئے اپنی جان بچا کے... نازو کے لئے کسی نے کچھ نہیں کیا۔ آخر یہ محسن اتنا احمق کیوں ہے؟ لیڈیز فرسٹ کا اصول کیوں یاد نہیں رہا اسے؟" غالب نے بڑبڑانا جاری رکھا۔

میں نے کہا "ابھی سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس واٹر ٹینکر میں ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں؟"

آخر کار ٹرک رک گیا۔ میں نے سطح زمین کے نیچے رہنے والے کسی جانور کی طرح سر نکال کے باہر دیکھا تو ٹرک ایک ہائیڈرنٹ سے پانی لینے والے ٹرکوں کی قطار میں کھڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور ٹرک ہمارے پیچھے لگتا، میں اور غالب باہر نکل آئے۔ ہر ٹرک کا ڈرائیور اندر ہی بیٹھا ہوا تھا کیونکہ جیسے ہی ایک ٹینکر کو پانی مل جاتا تھا وہ قطار سے نکل جاتا تھا اور پیچھے والے سب ٹرک آگے بڑھ جاتے تھے۔ وہاں کم سے کم دو تین سو ٹرک تھے جو مختلف مقامات پر قطاروں میں کھڑے ہوئے تھے اور زمین سے دس فٹ اونچے پانی کے بڑے نلکوں سے پانی حاصل کر رہے تھے۔ میں حیران تھا کہ رات کو اتنے ٹرک پانی لے کر کہاں جا رہے ہوں گے۔ شاید ہوٹلوں اور بڑی بڑی کوٹھیوں کے انڈر گراؤنڈ ٹینک بھرنے کے لئے تاکہ اگلے دن پھولوں کو اور گھاس کے لان کو اور باغات کو سیراب کیا جا سکے۔ گاڑیاں دھوئی جائیں، باتھ روم کے شاور چلیں اور کتوں کو بھی نہلایا جا سکے۔ غربت نصیب خاک نشیں، بدبخت انسانوں کی لاوارث بستیوں میں بچے بوڑھے عورتیں اور مرد سوکھے نلکوں پہ ٹین کے ڈبے لئے پانی کی پتلی سی دھار تک پہنچنے کے لئے لڑ رہے ہوں گے...

غالب نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "حضرت! اب نکل چلئے ورنہ اس ٹرک کو بھرا جائے گا۔"

آگے والا ٹرک تھوڑا سا آگے کھسک گیا تھا اور ایک ٹرک احاطے میں داخل ہو رہا تھا۔ قطار کے آخر میں وہ ٹرک اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا جسے ہم نے سواری کے لئے استعمال کیا تھا۔ میں غالب اور محسن کے ساتھ پیچھے نکل گیا جہاں اندھیرے اور کچی والی زمین تھی اور دیوار کا ایک حصہ ٹوٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میری

www.paksociety.com

چلون پانی میں تر تھی اور پانی میرے جوتوں میں ہر قدم پر بول رہا تھا۔ باہر آتے ہی میں نے جوتوں کے تسمے کھول کے پانی باہر انڈیلا اور جرابوں کو نچوڑ کے پھر جوتے چڑھا لیے۔ اس وقت غالب اور محسن گلے مل کے نہایت نامناسب الفاظ میں دوستی کے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔

میری باری آئی تو میں نے بھی محسن کی کمر ٹھونک کر نہیں کی اور جواب میں اس سے بھی ایسی ہی شاندار گالیاں وصول کیں۔ شکوہ شکایت کا ایک غبار تھا جو ایک دم اٹھا لیکن اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم اس غبار کو صاف کرتے۔ ہم سڑک کے ایک کنارے پر چلنے لگے۔

محسن نے کہا "میں کہاں رہا اور تم کہاں رہے؟ میں نے کیا توپ چلا دی اور تم نے کیا جنگ ماری۔ یہ سب باتیں کریں گے فرصت ملنے پر۔ ابھی تو بس خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ مل گئے۔"

"یہ کیا ہوا؟ جمع ایک منفی ایک حاصل صفر" غالب نے کہا۔

"تو مازو کو رو رہا ہے نا۔ مت رو' وہ بھی مل جائے گی۔"

"کہاں؟ میدان حشر میں" غالب نے کہا "وہاں تو اور بھی بہت ہوں گی۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ مگر وہ حوران خلد ہمارے کس کام کی۔ ہم جہنمی لوگ۔۔"

میں نے کہا "یار! یہ تو پاگل ہو گیا ہے۔ تو تھا کہاں' قبرستان سے کہاں غائب ہو گیا تھا؟"

"غائب نہ ہوتا تو یہ سب کیسے کرتا۔ میں نے تو اس مونچھ برانڈ فورس کے سب ارکان کو تاڑ لیا تھا اور اندازہ کر لیا تھا کہ اس مرتبہ بچ کے نکلنا آسان نہیں ہوگا" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "مگر تو کسی اندھی کے ساتھ چلا گیا تھا۔ وہ خاتون کوئی نیک نام نہیں ہیں۔"

"ہاں یار' وہ عجیب اتفاق ہوا۔ اس کا ایک مجنوں ہے۔ عاشق جاں نثار۔"

"وہ اس کا بزنس پارٹنر ہے" میں نے اپنی معلومات کا اظہار کیا "دونوں مل کے مال فراہم کرتے ہیں۔ مال یعنی جسم فروش عورتیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ وہ بزنس پارٹنر تو ابھی بنا ہے۔ وہ چار سال پہلے۔ عاشق بہت پرانا ہے۔ مجھے تو اتفاق سے نظر آ گیا۔ میں خود نا جانا ہی کے فرار ہوا تھا۔"

"ہاں۔ ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے بتا دیا تھا۔"

"اس کی صورت تو نہیں مگر حلیہ سو فی صد میرا تھا۔ بس اسے دیکھ کے مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے کہا کہ آج شام کے لیے قبل کرا دے پروت ہو۔ وہ پہلے تو بہت بگڑا۔ پھر میں نے بیان علمی داخل کیا کہ میں اس عفت مآب حسینہ پر بری نگاہ تک نہیں ڈالوں گا بلکہ میرا مدعا کیا ہے؟ اور میں نے معقول نذرانہ پیش کیا تو وہ مان گیا۔ میں مجنوں کی جگہ اس اندھی کے ساتھ ہو لیا۔ وہ نازنین کے اپنی جگی میں سو رہا ہوگا۔ وہ مجھے پہچانتے کیا؟ اس لیے مجھ پر کسی کو شک نہیں ہوا" محسن نے کہا۔

"کیا یہ ٹھیک ہے کہ پیلی کو سب نظر آتا ہے؟" غالب نے محسن سے کہا۔

"ہاں۔ اس مجنوں کی بصارت بھی بہتر ہے لیکن اندھا بہرا یتیم وغیرہ بننا تو ایک پیشہ ورانہ ضرورت ہے۔ اصلیت کو جاننے والے کتنے ہوں گے؟ زیادہ سے زیادہ دس فیصد باقی نوے فیصد تو ترس کھا کے ہر روز کچھ دیتے ہی رہتے ہیں۔ بہت پیسہ ہے ان کے پاس لیکن اب بھیک مانگنا عادت یا مجبوری بن گئی ہے۔ میں نے ایک ہزار میں ڈبل رول کرنے کی اجازت لی تھی اور میرے لیے یہ سودا مہنگا نہیں رہا۔ میں کسی بھی بھیس میں جاتا تو پکڑا جاتا۔"

"کیا تو نے پہچان لیا تھا انہیں؟"

"جب دو مردوں نے پہچان لیا تھا تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں نہ پہچانتا؟" محسن بولا "اور میں نے یہ بھی تاڑ لیا تھا کہ تم دشمن کو دھوکا دینے میں ناکام رہے ہو چنانچہ میں نے باہر آ کے ان پر نظر رکھی۔ میں نے یہ اندازہ بھی کر لیا تھا کہ تم اس سکھ کی گاڑی میں وہاں پہنچے تھے۔ اور اس کی تصدیق بھی کر لی تھی۔ آخری رسوم کے ختم ہونے سے پہلے میں نے ایک اور گاڑی حاصل کی اور جب تم لوگ روانہ ہوئے تو میں پیچھے تھا۔ اندھی اس عرصے میں وہیں موجود رہی تھی۔ وہ کافی چالاک عورت ہے۔ اس نے مجھے رپورٹ دی کہ سکھ کی گاڑی میں بیٹھے دو افراد اس سے باتیں کرتے رہے تھے۔"

"اس سکھ نے بہت کم میں اپنی زندگی بیچ دی تھی" میں نے افسوس سے کہا۔

"لالچ ایسی ہی چیز ہے۔ اسے کہاں معلوم ہوگا کہ وہ اپنے ٹکوں سے پیمانہ جاں لے رہا ہے" غالب نے کہا۔

"پٹرول پمپ بند تھا چنانچہ میں سمجھ گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔ میں نے چھپ کر ان کی باتیں سنیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ قدرت نے مجھے کچھ کرنے کے لیے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دیا ہے۔"

میں نے کہا "تو نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ وہاں ان کے آدمی ہر جگہ موجود تھے۔"

"ہاں۔ خطرہ مول نہ لیتا تو کچھ کرتا کیسے۔" محسن نے کہا۔ "اس واٹر ٹینکر کا ڈرائیور سڑک کے کنارے ویرانے کی طرف کے پانی بہا رہا تھا۔ چابیاں اس نے گاڑی میں چھوڑ دی تھیں اور انجن تک بند نہیں کیا تھا۔ وہ چار منٹ میں وہ پھر روانہ ہو جاتا مگر افسوس کہ اسے دست قضا نے وہاں روکا تھا۔"

"تو نے مار دیا اسے؟"

"میرا ارادہ اسے مارنے کا نہیں تھا۔ میں نے اسے ناک

کرکے اٹھایا تھا مگر راستے میں دوسری طرف کا دروازہ نہ جانے کیسے کھل گیا۔ شاید اس کے ہاتھ کا دباؤ پڑنے سے۔ وہ باہر جا گرا۔ رفتار اتنی زیادہ تھی کہ اس کے بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میں رک بھی نہیں سکتا تھا۔ ورنہ اس وقت یہاں نہیں حوالات میں نظر آ رہا ہوتا۔ میں نے دروازہ بند کرنے کے بعد ٹینکر ادھر ادھر موڑ لیا۔ جب واپس پٹرول پمپ کی طرف آ رہا تھا ایک اور حادثہ پیش آ گیا۔ کچھ شدے قسم کے لونڈے ایک آدمی کو گھیر کر مار رہے تھے۔ ایک طرح کی گینگ وار تھی۔ مخالف گروہ کا کوئی آدمی ان کے علاقے میں آ کے اینڈ رہا تھا تو جھگڑا شروع ہو گیا۔ وہ آٹھ دس تھے۔ ان کا مقابلہ پہلے ایک کر رہا تھا۔ پھر دوسرا آ گیا۔ ڈنڈے اور ہاکیاں ایسے چل رہے تھے جیسے کشمیر وستان۔ ان دونوں کا سر پھٹ گیا۔ میں اترا تھا ان کی حمایت کرنے کے لیے۔ وہ سب ٹرک پر چڑھ گئے اور ان کے سرغنے نے بڑی بدمعاشی کے ساتھ مجھے حکم دیا کہ چلو۔ حیرت ہے اچانک میرے خیالات بدل گئے جس پر مجھے یقیناً شرم آنی چاہیے کہ میں نے مظلوموں کا ساتھ چھوڑ دیا اور ظالموں کے ساتھ ہو گیا۔ میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں واقعی ان کی داداگیری سے ڈر کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ انہیں پولیس کا ڈر تھا مگر میں انہیں علاقے کی حدود سے نکال کے دور لے گیا۔ پھر میں نے ان سے کام کی بات کی۔ بدمعاشی کے کام وہ بڑے شوق سے اور فخر سے کیا کرتے ہیں۔ میں نے انہیں سارا پلان سمجھانے کے بعد پیسے دے دیے۔ ہم اچھے خاصے دوست بن گئے تھے۔ جب ہم پٹرول پمپ سے کچھ دور انتظار کر رہے تھے تو میں نے انہیں کولڈ ڈرنک بھی پلائی اور انہوں نے کہا کہ آئندہ بھی ان کی خدمات کی ضرورت ہو تو وہ حاضر ہیں۔ غلطی مجھ سے اندازے کی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ تم سب کو ایک ہی گاڑی میں لے جایا جائے گا۔ وہاں دو گاڑیاں آ گئیں تو میں نے پہلے روانہ ہونے والی گاڑی کے پیچھے ٹینکر دوڑانا شروع کیا۔ وہ سب ٹرک کی باڈی پر چڑھے ہوئے اس چیز کو بہت انجوائے کر رہے تھے۔ موقع پاتے ہی میں نے کار کا راستہ روک دیا اس سے مجھے یا ٹرک کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ وہ سب حسب ہدایات کے مطابق چھلانگ مار کے اترے اور کار کے اگلے حصے میں بیٹھے ہوئے دونوں افراد سے چمٹ گئے۔ تم نے ان کا یہ تماشا ہی دیکھا ہوگا۔ میں نے کہا تھا کہ بس انہیں پکڑے رہنا جب تک ٹرک دور نہ چلا جائے۔"

"جبھی وہ خود نہ پکڑے گئے ہوں۔"

"میں نے انہیں دو سو اضافی دیے تھے کہ دونوں کو وہ تھیلوں میں ڈال کے تھانے لے جانا اور راستے میں ہی کہیں گرا دینا۔ یا جیسا مناسب سمجھو۔ انہوں نے وہ دو سو بھی رکھ لیے ہوں گے اور کھسک گئے ہوں گے۔ وہ بدمعاشی کے کام کے ماہر ہوں نہ ہوں' کھسکنے کے ماہر ہیں۔ یہ میں دیکھ چکا تھا اور پکڑے بھی گئے ہوں تو میری بلا سے" محسن بولا۔

"مازو کو لے جانے والی گاڑی کا ڈرائیور اب تک تریویٹی کو پوری رپورٹ دے چکا ہوگا۔"

"ذرا تریویٹی کو دوسری رپورٹ بھی مل جائے" محسن نے کلائی کی گھڑی دیکھ کے کہا "پھر اس پلان کے دوسرے حصے کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔"

"آپ اس ناچیز کو اس پاجامے کے بارے میں کچھ بتائیں گے" میں نے کہا۔

"ابھی سب تمہارے سامنے ہی ہوگا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ مسماۃ رابعہ اور مس ناگ منی کو تم لوگ کہاں چھوڑ آئے ہو؟"

"وہ بہت محفوظ ہاتھوں میں ہیں" میں نے کہا "اس خانہ بدوش قبیلے کے ساتھ جہاں سے تو کھڑے سے فرار ہوا تھا۔ قبیلہ بعد میں غائب ہو گیا اور انہیں ساتھ لے گیا۔ ابھی تک قبیلے کا سراغ نہیں ملا ہے۔"

"پھر وہ محفوظ کیسے ہوئیں؟"

"ہم نے اس کا بندوبست کر دیا تھا" میں نے کہا "خدا نے چاہا تو اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں وہ مل جائیں گی۔"

سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا میں رطوبت زیادہ ہوتی تھی مگر آج ہوا کا رخ بدلا ہوا تھا اور راجستھان کی طرف سے آنے والی خشک اور گرم ہوا سے میرے اور غالب کے کپڑے کی نمی بہت کم ہو گئی تھی۔ ہم واٹر ہائیڈرنٹ سے کافی دور آ چکے تھے مگر مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ ہم کس سمت میں جا رہے ہیں۔

اچانک محسن نے کہا "مجھے تم دونوں کی چال ڈھال بدلی ہوئی لگتی ہے۔ تم پہلے جیسے پھرتیلے اور چست نہیں رہے۔ کیا نمک کی کمی کے سبب سے ہے؟"

میں نے کہا "نہیں شیروانی صاحب۔ زندگی میں ہوتی رہتی ہے نا۔"

محسن چلتے چلتے رک گیا "کیا تم نے شراب پی رکھی ہے؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ اس حرام شے کا ہم نے نام تک نہیں لیا" غالب بولا۔

"واقعی تم سوتے سوتے' تھکے ہوئے اور پژمردہ سے لگتے ہو۔ تمہاری آواز بتاتی ہے کہ تم پر نشے کا اثر ہے" محسن نے کہا۔

میں نے اسے مختصراً کرنل کی ایجاد کے بارے میں بتایا "اس کا کہنا ہے کہ اس دوا کے باقاعدہ استعمال سے رویہ بدل جاتا ہے اور کنٹرول بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں اب پہلے سے بہتر محسوس کر رہا ہوں۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ایک بار کے استعمال سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ اثر عارضی ہوگا" محسن نے مطمئن ہو کے کہا "پھر کوئی بات نہیں" اس نے پھر گھڑی دیکھی۔

میں نے کہا "اور کتنی دیر انتظار کریں گے ہم؟"

www.paksociety.com

غالب نے کہا "وہ حرامزادے اپنی اس ناکامی کا بدلہ نازو سے لیں گے۔"

محسن نے کہا "مجھے افسوس ہے لیکن میں بیک وقت دو گاڑیوں کو نہیں روک سکتا تھا۔ تمہاری گاڑی پہلے روانہ ہوئی تھی، اس کا تعاقب کرنا زیادہ ضروری تھا۔ میرا خیال تھا کہ دوسری گاڑی پیچھے پیچھے آئے گی لیکن وہ شاید کسی دوسرے راستے سے نکل گئے۔"

"وہ نازو کو کہیں اور نہ لے گئے ہوں" غالب نے کہا "ہمیں کیسے معلوم ہوگا۔۔۔"

"ابھی معلوم ہو جائے گا" محسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے تسلی دی "پریشان ہونے سے کچھ حاصل ہوتا ہے تو میری طرف سے اجازت ہے آہیں بھرنے کی اور نالہ و فریاد کرنے کی۔"

میں نے کہا "اس غول بیابانی میں، جسے تو گھیر لایا تھا مجھے ایک بنگالی کی آواز بھی سنائی دی تھی۔"

"ہاں۔ اس کا ذکر کرنا تو میں بھول ہی گیا۔ وہ منو میاں تھے۔"

"منو میاں؟ کوئی بچہ ہے؟" غالب بولا۔

"بچہ ہی سمجھو۔ چوالیس سال کا" محسن بولا "اصل نام تو منیر الدین احمد تھا لیکن بنگال میں بھی لمبے ناموں کو مختصر کرنے کا ایک فارمولا ہے۔ شہید الدین ہو تو شہو میاں۔ محمد مجاہد علی ہیں مونو میاں۔ یہاں تک کہ اردو کے ایک شاعر ہیں قدرت الاسلام قدوائی۔ ان کا شارٹ کٹ کر لیا کدو میاں۔ یہ منو میاں کے ساتھیوں میں سے ہیں۔"

"اور منو میاں خود کیا چیز ہیں؟"

"یہ ایک بنگالی محب وطن ہے۔ پرانا مسلم لیگی" محسن نے کہا۔ "تقسیم ہند سے پہلے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا اتنا فعال رکن تھا کہ تین دفعہ جیل جا چکا تھا۔ مولوی تمیز الدین جو غلام محمد کی غیر آئینی سیاست کے نتیجے میں توڑی جانے والی اسمبلی کے اسپیکر تھے، اس پر بہت اعتماد کرتے تھے اور جس زمانے میں وہ سیاست سے کنارہ کش ہونے کے بعد ڈھاکا میں پریکٹس کر رہے تھے تو یہ ان کا نائب تھا۔ ان سے انتہائی عقیدت رکھتا ہے۔"

"ان جیسے صاحب کردار کم لوگ تھے" میں نے افسوس کے ساتھ کہا۔

"ہاں۔ خودداری کا یہ عالم تھا کہ پیدل کورٹ جاتے تھے اور ایک پرانا سوٹ پہنتے تھے۔ خاصی تنگی میں زندگی بسر کی لیکن اصول پر ڈٹے رہے اور غیر آئینی حکومت سے سمجھوتا نہیں کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب دس سال بعد پھر اسمبلی بنی تو ان کے ایمان اور اصول کا نقش لوگوں کے دل پر باقی تھا۔ وہ پھر بلا مقابلہ اسپیکر چن لئے گئے تھے۔ خواجہ ناظم الدین نے منو میاں کو بطور ایلچی استعمال کیا۔ وہ دو بار خصوصی پیغامات لے کر قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کبھی منو میاں سے سنو یہ واقعات۔ آج بھی وہ فرط جذبات سے آبدیدہ ہو جاتا ہے۔"

"تجھے کیسے مل گئے یہ منو میاں؟"

"منو میاں مشرقی پاکستان کی ایک محب وطن تنظیم کے خصوصی نامہ بر کی حیثیت سے ہماری جستجو میں تھے۔ انہوں نے ایم آر ایس کی جدوجہد کا ذکر سنا تھا۔ اخبارات میں ہمارے کارناموں کی تفصیل پڑھ کے وہ بے حد متاثر ہوئے تھے۔ ان کی تنظیم پاکستان کی وحدانیت اور مسلمانوں کی یک جہتی پر یقین رکھتی ہے اور تخریب کاروں کے خلاف گوریلا جنگ میں مصروف ہے۔ علیحدگی پسندوں کا سراغ لگانا اور ان کے منصوبوں کو ملیامیٹ کرنا ان کے مقاصد میں شامل ہے۔ وہ مشرقی پاکستان میں پی ایل او کی طرز پر خود کو منظم کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اب تک کئی مرکز قائم کر چکے ہیں لیکن ان کی رکنیت محدود ہے کیونکہ وہ بہت سخت شرائط پر اور بہت آزمانے کے بعد کسی کو تنظیم کا رکن بناتے ہیں۔ یہ سب انہی سے سنا۔ وہ ایم آر ایس سے رابطہ قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ دونوں کے درمیان اشتراک عمل سے پاکستان اور اسلام کے دشمنوں کے خلاف کارروائی کو تیز تر اور زیادہ مؤثر بنایا جا سکے۔ اس کے علاوہ وہ چاہتے تھے کہ ہم جو اسلحہ تباہ کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ تباہ نہ کریں بلکہ ان کے حوالے کر دیں۔"

"ایسا ہر جگہ ممکن نہیں ہوتا" میں نے کہا۔

"میں نے بھی یہی کہا تھا لیکن منو میاں نے کہا کہ ہم لوگ اسے ممکن بنا سکتے ہیں" محسن بولا۔

"تو نے ابھی تک بتایا نہیں کہ تیری ان سے ملاقات کہاں ہو گئی؟"

"منو میاں پاکستان پہنچے۔ بڑی مشکل سے پتا چلا پایا کہ ہم بمبئی جا چکے ہیں۔ یہاں آنے کے بعد چوری چھپے ہمارا سراغ لگانے کی کوشش کرتے رہے۔ کسی کے سامنے ہمارا نام لے کر تو پوچھ نہیں سکتے کہ سکندر بخت، محسن یا غالب کہاں ہیں۔ خود بھی ادھر لگے جاتے۔ اخبارات میں ہمارے کارناموں کی تفصیلات دیکھ کے بمبئی میں ہی رک گئے۔ اس امید میں کہ کبھی قسمت ضرور یاوری کرے گی۔ پولیس کے اشتہار بھی دیکھے تھے اخباروں میں۔ لیکن یہ خود اشتہاری مجرم ہیں۔ ایک دن حاجی علی کی درگاہ گئے۔ وہاں کسی سے سنا کہ پاکستان کے کوئی حاجی صاحب ہیں۔ سورت کے رہنے والے۔ ان کا ہوٹل بہت مشہور ہے۔ یہ وہاں گئے مگر ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی تاہم قدرت ملوانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ حاجی صاحب کی دکان پر وہی اخبار پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے تمہید کے طور پر کہا کہ "بمبئی بڑے جیالے لوگ ہیں"... اس پر حاجی صاحب نے انہیں غور سے دیکھا اور پھر سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے کہا "مجاہد ہیں۔ اللہ کی خاص نظر عنایت ہے ان پر" اور... منو میاں نے کہا "مگر پولیس تو انہیں مجرم سمجھتی ہے" حاجی صاحب نے غصے میں یا جذبات سے مغلوب ہو کے کہا

"پس تو تجھے بھی مجرم بنا دے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے ان کو مجاہد کہا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ مجرم لوگ نہیں ہیں" اس پر منو میاں کا حوصلہ بڑھا۔ انہوں نے کہا "حاجی صاحب۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ کوئی ترکیب بتائیے" اس پر حاجی صاحب انہیں اندر لے گئے اور بہت دیر تک پوچھ گچھ کرتے رہے کہ وہ پولیس کا مخبر یا ایجنٹ تو نہیں ہے۔ جب انہیں اطمینان ہو گیا کہ منو میاں خود بھی مجاہد ہیں تو انہوں نے بڑے فخر کے ساتھ بتایا کہ کس طرح ہم ان سے ملے تھے اور بعد میں بھی وہ رابطے کا ذریعہ بنے رہے مگر اب مدت سے کسی کی کوئی خبر نہیں۔ منو میاں نے کہا کہ "اچھا پھر ان میں سے کوئی آئے تو اسے میرا پتا دے دیں۔ میرا ان سے ملنا اشد ضروری ہے" حاجی صاحب نے پتا لے کر رکھ لیا۔ منو میاں بعد میں دو بار گئے اور مایوس لوٹے۔ اب اللہ کی قدرت دیکھو۔ بمبئی پہنچ کے میں پہنچا سیدھا حاجی صاحب کے پاس۔ اس امید میں کہ شاید تم نے ان کے پاس کوئی پیغام چھوڑا ہو۔ چیچ جانے کا خیال مجھے بعد میں آیا۔ حاجی صاحب کا جوش اور ولولہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ بضد تھے کہ میں ان کے پاس رک کر خدمت کا موقع دوں۔ میں نے بے وقت کی آمد کا عذر پیش کیا۔ انہوں نے مجھے منو میاں کے بارے میں بتایا کہ ان سے ضرور ملو۔ حاجی صاحب نے تین افراد کے نام بھی بتائے جو ہمارے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ سب بہت صاحب ایمان لوگ ہیں اور ہماری ہر طرح سے مدد کریں گے۔ خود حاجی صاحب ایک دستخط شدہ چیک دے رہے تھے ایک لاکھ کا۔ میں نے قبول نہیں کیا۔ اس پر تاریخ کوئی نہیں تھی۔ میں نے منو میاں کو تلاش کیا۔ وہ واقعی مجاہد ہے حالانکہ اب اس کی عمر چوالیس سال کے لگ بھگ ہے۔ کہتا ہے ہندوستان کے انتہا پسندوں کے ہاتھوں مارے جاتے تو کوئی دکھ نہ ہوتا۔ خود مسلمانوں نے ہی انہیں بائیس سال بعد مار دیا۔ وہ بچے جو پیدائشی طور پر بنگالی تھے صرف پاکستانی کہلانے کے جرم میں شہید کر دیے گئے۔ بیوی جو گھر بار چھوڑ آئی تھی، اس کے سارے خاندان کے لوگ ہندوستان میں ہی رہ گئے تھے۔ وہ ان علیحدگی پسندوں کی نفرت کا نشانہ بنی۔ رد عمل کے طور پر منو میاں پھر انتہا پسند ہو گئے۔ پہلے ظالم انگریزوں سے اور غاصبانہ عزائم رکھنے والے ہندوؤں سے جنگ تھی۔ اب غداروں کے خلاف کر رہے ہیں۔"

"یہ منو میاں بھی انہی میں شامل ہو گئے تھے؟ اس غول بیابانی کا جو ٹرک پر سوار تھا؟"

"ہاں۔ اس کار خیر میں وہ بھی شریک تھے لیکن اس کے بعد منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل درآمد کے لئے نکل گئے ہوں گے۔ منو ٹرک لے کر تمہارے ساتھ مجھے فرار ہونا تھا۔ منو میاں نے اغوا کر کے لے جانے والی گاڑی کو دیکھ لیا تھا۔"

"گاڑی کو دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"اس نے گھر بھی دیکھ رکھا تھا۔ منو میاں کے ساتھ ڈھاکا سے دو گورکھے بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کی حفاظت کے لئے۔" محسن بولا "سین شین۔"

میں نے ہنس کے کہا "سین شین۔ یہ نام ہیں ان کے؟"

"نام تو ہیں عماد الدین اور غفور الدین۔ دونوں جڑواں بھائی ہیں اور ان میں فرق بس اتنا ہی ہے جتنا سین شین میں۔ یہ ایک نقطہ بھی نظر نہ آئے اگر ایک جیسے کپڑے پہن کر سامنے آجائیں۔ سین شین کا نام تو میں نے دیا ہے انہیں۔ وہ بالکل برا نہیں مانتے۔ ایک نمونہ ہیں دونوں خدا کی قدرت کا۔ مشکل سے پانچ فٹ قد ہے۔ دبلے پتلے اور دیکھنے میں بڑے مسکین لیکن انتہائی تباہ کن۔ بندر کی طرح پھرتیلے۔ کھمبے درخت اور دیواروں پر ایسے چڑھتے ہیں کہ آدمی دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ادھر سے چھلانگ ماری۔ ادھر کودے۔ دیوار پھاندی اور چھت پر۔ وہاں سے منڈیر پر لٹکے کھمبے سے پھسل کر اترے اور غائب۔ دونوں ایک دوسرے کی ایسے مدد کرتے ہیں جیسے سرکس میں ایک ساتھ کام کرتے ہوں۔ آتشیں اسلحہ ہر قسم کا استعمال کر لیتے ہیں۔ ریوالور سے مشین گن تک اور دستی بم سے ڈائنامائیٹ تک۔ دیسی طریقے پر پائپ میں بارود بھر کے بم بنا لیتے ہیں۔ معلوم نہیں کس حد تک درست ہے یہ بات مگر ان کا دعویٰ ہے کہ ٹیلی فون یا بجلی کے کھمبے سے توپ بنا کے چلا لیں۔ منو میاں نے ان دونوں کی پرورش کی تھی۔ وہ ایک اسٹوری ہے۔ یہ دونوں بچے ماں باپ سے بچھڑ گئے تھے اور منو میاں کو مل گئے۔ منو میاں نے بہت کوشش کی لیکن ماں باپ کا پتا نہ چلا۔ وہ انہی کے بچوں کے ساتھ پلے بڑھے۔ پڑھنے لکھنے میں ہمیشہ پیچھے رہے مگر چکر باز ایک نمبر کے تھے۔ سوائے منو میاں کے جن کو وہ حقیقی باپ سے زیادہ عزت دیتے ہیں، کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ جب منو میاں کے اپنے بچے مارے گئے تو یہ اس لئے بچ گئے کہ گھر سے باہر تھے۔ انہوں نے بعد میں پتا چلا لیا کہ مجرم کون تھے اور ایک ایک کو بڑے پراسرار انداز میں ٹھکانے لگا آئے۔ خود منو میاں کو بھی شک نہیں ہوا کہ وہ کچھ کر رہے ہیں لیکن یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک دن منو میاں نے سختی سے پوچھا تو دونوں نے مان لیا کہ سب کو انہوں نے ہی مارا ہے اور یہ اعلان بھی کیا کہ وہ باقی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ منو میاں کی مار پیٹ اور دھمکی کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوا کہ وہ خود انہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ الٹا انہوں نے منو میاں کو قائل کر لیا کہ جو کچھ وہ کر رہے تھے یہی انصاف حاصل کرنے کا صحیح طریقہ ہے ورنہ دنیا میں انصاف بھی انہیں کو ملتا ہے جو اس کی قیمت چکا سکتے ہوں یا قانون کو اپنی مٹھی میں رکھتے ہوں۔ وہی ایم آر ایس والا نظریہ۔ یوں سمجھو کہ سین شین نے مشرقی پاکستان میں لاقانونیت کے خلاف جنگ لڑنے کے لئے مائٹ از رائٹ سوسائٹی کے اصول اپنائے اور اب وہ بھی

www.paksociety.com

میاں کو بلا جنگ کے نام پر کر رہے ہیں وہ تقریباً وہی ہے جو یہاں ہم کر رہے ہیں۔ وقت ہو گیا ہے اس لئے میں بات کو مختصر کرتا ہوں۔ میں تمہیں کو منو بھائی نے تریویدی کے گھر بھیج دیا تھا۔ نازو کی بحفاظت واپسی انہی کی ذمے داری ہے لیکن تھوڑا سا ڈراما ہمیں بھی کرنا ہے۔ چلو۔"

"چلو تو رہے ہیں اتنی دیر سے۔" غالب نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ ادھر ایک نائٹ پوسٹ آفس نظر آ رہا ہے۔ وہاں سے فون کریں گے۔"

"کس کو؟"

"اپنے چوہدری صاحب کو۔ یا ان کے نئے باپ تریویدی کو۔" محسن بولا۔ "نمبر میرے پاس ہے۔"

پوسٹ آفس میں رات کے ساڑھے بارہ بجے ویرانی تھی۔ ایک اونگھتے ہوئے کلرک نے فون ہماری طرف کھسکا دیا۔ "پیسے پہلے دے دو۔ کتنی دیر بات کرو گے؟"

میں نے اسے دس کا نوٹ تھما دیا۔ "لمبی بات ہوگی۔"

اس نے نوٹ جیب میں ڈال کے کہا۔ "چلو اطمینان سے بات کرو۔ میں ابھی آتا ہوں باتھ روم ہو کے۔"

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ تمہارے واپس آنے تک ہم پوسٹ آفس کو کہیں نہیں جانے دیں گے۔"

وہ دروازے سے نکلا اور سڑک پار کر کے ایک ایرانی ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ اس نے دوبار پلٹ کے ہماری طرف دیکھا اور بظاہر مطمئن ہو گیا کہ وہ آرام سے بیٹھ کے چائے پی سکتا ہے۔ چائے کے پیسے تو شاید وہ روزانہ اسی طرح بنا لیتا ہوگا۔ یہ کون چیک کر سکتا ہے کہ سرکاری ٹیلی فون کا رات بھر میں کتنا استعمال ہوا۔ محسن نے اتنی دیر میں نمبر ملا لیا تھا۔ "ہیلو۔ تریویدی ہے؟" الو کا پٹھا۔ اس شہر میں کتنے تریویدی ہیں۔ سیٹھ تریویدی۔ میں اس کا باپ بول رہا ہوں سکندر بخت۔ جا کے بتا دے اسے۔ وہ نہیں آیا تو پھر میں خود آتا ہوں۔" محسن نے انتہائی جارحانہ انداز میں بات کی تھی۔

"ڈر گیا سالا۔" محسن نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "اطلاع دینے گیا ہے۔"

تقریباً دو منٹ کے بعد تریویدی لائن پر آ گیا۔ محسن نے کہا۔ "تریویدی! باپ تجھ سے پوچھتا ہے..." محسن نے اسے ایک خوف ناک گالی دی۔ "تجھے معلوم ہے کہ کیا بات ہے۔ ابھی تک وہ دونوں کتے پہنچے نہیں ہوں گے جو بکتر بند گاڑی میں مجھے اور غالب کو اٹھانے کے لئے۔ میں نے اس لئے ان کو نہیں اٹھایا کہ تجھے معلوم ہو جائے۔ میں ان کی لاشیں بھی بھجوا سکتا تھا مگر پھر تجھے رپورٹ دیر میں ملتی۔"

میں دوسری طرف سے کی جانے والی گفتگو سننے کے لئے بے چین تھا۔ اس فون کی ایکس ٹینشن کاؤنٹر کے پیچھے ایک میز پر نظر آ رہی تھی۔ کلرک بادشاہ کی خفگی کی پروا کئے بغیر میں کاؤنٹر پھلانگ کے اندر کود گیا۔ ریسیور اٹھاتے ہی میں نے تریویدی کی آواز سنی۔ وہ غصے میں چلا رہا تھا۔ گالیاں بک رہا تھا اور دھمکیاں دے رہا تھا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ لڑکی ہمارے قبضے میں ہے۔"

"لیکن تم نہیں جانتے کہ تم ہمارے قبضے میں ہو۔" محسن نے اس کی بات کاٹ دی۔

جواب میں تریویدی نے پُر حقارت انداز میں ایک قہقہہ لگایا۔

"تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو۔ ذرا اپنی کوٹھی کے مشرقی حصے کی بالکونی سے باہر دیکھو۔ جاؤ دیکھو میں ہولڈ کرتا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "تار لمبا ہے تو فون اٹھا کے بھی لے جا سکتے ہو۔"

"کیا ہے وہاں؟" تریویدی نے شک آمیز لہجے میں کہا۔ "میں دیکھ لیتا ہوں۔"

محسن نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے مجھے آنکھ ماری اور مسکرایا۔ "...ابھی سب چوکڑی بھول جائے گا سالا۔"

"بکواس کرتے ہو تم۔" تریویدی بولا۔

"کیا تم بالکونی میں ہو؟ مشرق کی طرف دیکھ رہے ہو؟"

"ہاں۔ مجھے بلف کرتے ہو۔ اندھیرے سے مجھ کو ڈرانا چاہتے ہو۔"

"پھر دیکھو تریویدی۔ بارہ بج کر چالیس منٹ پر تمہیں ثبوت مل جائے گا کہ تم محصور ہو۔ چاروں طرف سے۔" محسن نے کہا "باقی تین طرف تم نہیں دیکھ سکتے لیکن مشرق کی طرف تمہاری نظر پورا منظر دیکھ سکتی ہے۔ ابھی تم ایک لائٹ دیکھو گے جو پہلے سبز ہوگی، پھر زرد اور اس کے بعد سرخ ہو جائے گی۔ ٹریفک سگنل کی طرح۔ پھر دس قدم کے فاصلے پر دوسری لائٹ اسی طرح نظر آئے گی۔ پھر مزید دس قدم کے بعد۔ کیا تمہیں کچھ نظر آیا؟"

"یہ... کیا ہے یہ آخر۔ کون لوگ ہیں یہ؟" تریویدی نے کہا۔

محسن نے قہقہہ مارا۔ "یہ سب موت کے فرشتے ہیں۔ یہ نقلی مصنوعی مونچھیں لگا کے نہیں آئے ہیں۔ ان کے پاس بہت خطرناک اسلحہ ہے۔ یہ ایک فائر کریں گے تو بالکونی کے شیشے توڑتا ہوا ایک چھوٹا سا آگ لگانے والا راکٹ تمہارے بیڈروم میں جا گرے گا اور اس کے پھٹتے ہی ہر چیز آگ پکڑ لے گی۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ مجھے ڈرانا چاہتے ہو۔" تریویدی نے چیخ کر فحش گالیاں بکتے ہوئے کہا۔

"سنو۔ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔ اگر پولیس سے رابطہ قائم کرنے میں وقت ضائع کیا تو میری بات ادھوری رہ جائے گی لیکن تمہارا کام تمام ہو جائے گا۔" محسن نے دہاڑ کر کہا۔

اچانک فون پر چوہدری دلاور آ گیا۔ شاید وہ بھی دوسرے فون پر ساری گفتگو سن رہا تھا اور اب اس کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ "واہ جی واہ۔ خیر سے آپ جو کل تک پہلے بھی تھے اب بھانڈ بھی ہو گئے۔ اپنے سکندر صاحب کو کیا اغوا کیا

کہ تم اس کی آواز میں بول رہے ہو۔"

ایک دم میں نے ریسیور اٹھا لیا اور محسن نے رکھ دیا۔ "خیر اپنے چوہدری صاحب بھی کن بھانڈ کر بولے۔ بڑی پہچان ہے آپ کو ماشاءاللہ سے۔ تم مرواؤ گے تریویدی کو دلاور۔ تمہارے بچے تو لاہور میں محفوظ ہیں۔ تریویدی کی بیٹی پہلے ماری جا چکی صرف تمہاری وجہ سے۔"

تریویدی نے بے بسی سے کہا۔ "دلاور! مجھے بات کرنے دو۔"

دلاور کی آواز آئی۔ "تم نہیں جانتے ان... کو۔" اس نے سب کے لئے ایک ہی گالی ارسال کی۔

اب پھر محسن نے کہا۔ "تریویدی! اپنی موت کو آواز مت دو۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ ایم آر ایس کی ڈیتھ فورس کس طرح تمہیں محصور کر چکی ہے۔ تمہارے باقی سب فون ڈیڈ پڑے ہیں۔ یہ بات ختم ہوئی تو یہ لائن بھی کٹ جائے گی اور باہر کی دنیا سے تمہارا رابطہ ختم ہو جائے گا۔"

"دلاور! دیکھو کیا یہ سچ ہے۔ وہ فون اٹھاؤ۔" تریویدی نے کہا۔ وہ اب نروس تھا۔

دور سے دلاور کی آواز آئی۔ "میں بتا رہا ہوں تمہیں کہ یہ بکواس کر رہا ہے۔"

تریویدی نے کہا۔ "پولیس سے رابطہ کرو۔ ایمرجنسی پولیس... کیا۔ لائن نہیں ہے۔ اچھا اندر جاؤ۔ میرے آفس کے فون سے۔" وہ دلاور سے بات کر رہا تھا مگر اس طرح کہ ہم بھی سن سکیں۔

"سب بیکار ہے تریویدی۔" محسن نے اس کی بات میں مداخلت کی۔ "اب یہی ایک لائن رہ گئی ہے۔ اس پر تم بات ختم کرو گے تو کچھ نہیں ہوگا۔ ریسیور رکھا تو لائن کٹ جائے گی۔ ثبوت چاہیے؟ اب تمہاری لائٹ بند ہونے والی ہے۔ بارہ بج کر پینتالیس منٹ پر... تمہارے گھر میں تین فیوز ہیں نا؟ تینوں فیوز بند ہو جائیں گے۔ تم اندھیرے میں ڈوب جاؤ گے۔"

تریویدی ایک دم چلانے لگا۔ وہ اپنے نوکروں کو آوازیں دے رہا تھا اور وحشت کی کیفیت میں ان کو گالیاں بک رہا تھا۔ "کہاں مر گئے سارے۔ سب سو جاتے ہیں اتنی جلدی اور سوتے ہیں تو گدھوں کی طرح سوتے ہیں۔ جنریٹر چلاؤ۔"

رات کے پونے ایک بجے یہ کہنا کہ سب سو جاتے ہیں اس کی بدحواسی کی دلیل تھا۔ پھر دن بھر کے تھکے ہارے ملازم آوازوں میں کیسے اٹھ کے آ سکتے تھے۔ ان کے سرونٹ کوارٹرز دور تھے کہ وہاں تک تریویدی کی آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔ دوسرا نوکر آ سکتا تھا جو رات کے وقت کوٹھی کے اندر رہتا ہو۔ چوکیدار تو باہر کے گیٹ پر موجود رہتا تھا۔

محسن نے آواز کو خوف ناک بنا کے ایک قہقہہ مارا۔ "تم بزدل ہو تریویدی۔ ابھی سے تمہارے اوسان خطا ہو گئے۔ خوف اور وحشت سے تمہارے اعصاب جواب دے گئے ہیں اور تمہاری عقل خبط ہو گئی ہے لیکن ابھی آخری موقع ہے۔ دلاور کی بات مانو گے تو یہ موقع بھی ہاتھ سے گنوا دو گے۔"

"کیا... کیا چاہتے ہو تم آخر؟" تریویدی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

دلاور چیخ کر بولا۔ "تریویدی! ان کی باتوں میں مت آؤ۔ ان کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔"

اب میں نے کہا۔ "دلاور! ایک شعر سنو۔ گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں۔ یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں۔ کیا اس کا ثبوت تمہارے گوریلوں کی ناکامی نہیں ہے جو مجھے غالب کو اغوا کرنے آ رہے تھے۔ کیا انہوں نے تمہیں نہیں بتایا کہ ان کا راستہ روکنے والوں کی تعداد کیا تھی؟ یہ تمہاری ادھر ادھر سے جمع کی ہوئی کرائے کی فوج نہیں ہے جو نقلی مونچھیں صاف کر کے بھاگ گئی تھی۔ یہ ایم آر ایس کے کمانڈوز ہیں۔ کم از کم چالیس افراد تریویدی کی کوٹھی پر ہر سمت سے یلغار کرنے کے لئے تیار ہیں جو آہستہ آہستہ قریب آتے جا رہے ہیں۔ صرف پانچ منٹ میں وہ سب کچھ تہس نہس کر کے بھاگ جائیں گے۔ کل پولیس کو کھنڈر میں سے تمہاری لاشیں ملیں گی۔"

"ٹھہرو۔ میری بات سنو۔" تریویدی چلایا۔ "مجھ سے بات کرو۔"

دلاور نے چیخ کر کہا۔ "تریویدی! ان کو کچھ بتایا تو ان کے پہنچنے سے پہلے میں تجھے گولی مار دوں گا۔ یہ دونوں جھوٹ بول رہے ہیں۔ ... یہ ان کی چالاکی ہے۔ صرف ایک ڈراما ہے۔ آخر وہ نازو کو کیوں نہیں بچا سکے تھے؟"

"دلاور! میں نے خود لائٹ سگنل دیکھے تھے۔ وہ ہر طرف موجود ہیں۔"

محسن نے کہا۔ "تریویدی! نازو کو چھوڑ دو۔ تمہاری جان بچ جائے گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ نازو کو لے جانے والی گاڑی ہم سے مس ہو گئی تھی لیکن اس کے لئے ہم پہلے سے تیار تھے کہ خدانخواستہ وہ کسی گاڑی کو نہ روک سکے تو ہمارے کمانڈوز کیا کریں گے۔ انہوں نے تمہاری کوٹھی کے گرد مورچہ بندی کر لی تھی اور ان کا پلان مکمل تھا۔ ناقابل شکست۔ وہ ایک ایک منٹ کے حساب سے بالکل ٹھیک جا رہے ہیں۔ ہماری ساری گفتگو بھی سن رہے ہیں۔ ادھر تم نے ریسیور رکھا ادھر لائن کٹ جائے گی اور ایکشن شروع ہو جائے گا۔ کوئی تمہاری مدد کے لئے نہیں آ سکے گا باہر سے اور جس نے ان کا راستہ روکا وہ مارا جائے گا۔ ہمارا مطالبہ اور کچھ نہیں ہے۔ نازو کو بحفاظت واپس پہنچا دو۔ اسی گاڑی میں جو اسے لے کر گئی تھی۔ ہم گاڑی کو پہچانتے ہیں اور ڈرائیور کو بھی۔"

"لیکن... اس کو کہاں پہنچانا ہوگا؟" تریویدی شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

www.paksociety.com

"گاڑی اسی راستے پر واپس جائے گی جس راستے سے ہماری گاڑی آئی تھی۔ ہم تمہیں بھی گاڑی کو روک کے نازو کو وصول کر لیں گے۔ تمہاری گاڑی واپس کر دی جائے گی۔ یہ خیال رکھنا کہ نازو کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہ کرے۔ اسے خراش بھی آئی تو اس کا خمیازہ تم کو بھی نہ بھی ادا کرنا پڑے گا۔"

"او کے۔ او کے۔ میں اسے واپس بھجوا رہا ہوں۔" تریویدی نے گھبراہٹ میں کہا۔

"جب وہ پہنچ جائے گی تو محاصرہ ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد تم پولیس کو انکل والوں کو یا ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کو جسے چاہو فون کرو۔ تمہاری یہ لائن چالو چھوڑ دی جائے گی۔" محسن بولا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے تھوڑی سی مہلت چاہیے۔" تریویدی بولا۔

"مہلت کس لئے؟"

"انہیں روانہ کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ ڈرائیور کو اٹھانا پڑے گا جو سو چکا ہے۔ وہ گاڑی نکالے گا گیراج سے۔ وہ دونوں گاڑیاں موجود نہیں ہیں اور اس وقت میں انہی ڈرائیوروں کو نہیں بلا سکتا۔ میری اپنی گاڑی آئے گی۔ میرا شوفر لے کر آئے گا۔ تم پہچانتے ہو نا؟"

"ہم پہچانتے ہیں۔" میں نے کہا۔

یہ مذاکرات بخیر و خوبی ختم ہونے والے تھے کہ ولاور نے بازی کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر ایک دھماکا کر دیا۔ اس نے محسن کو ایک گندی گالی دے کر کہا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تیری بیوی اور تیرا بیٹا میرے پاس ہیں۔ تریویدی کے پاس نہیں۔ انہیں کیسے بچاؤ گے تم؟"

میرا دل حرکت کرتے کرتے ایک دم ٹھہر گیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو بات اب تک ہم نے محسن سے چھپائے رکھی تھی وہ ایک غیر متوقع لمحے نے بڑی بے رحمی سے بتا دی تھی۔

محسن کا سکتہ آثار حیرت اور بے یقینی کا تھا۔ "کون... شملا؟" ولاور نے نفرت سے پھنکارتے ہوئے کہا۔ "کیا اور بھی کوئی بیوی ہے تمہاری؟ کسی اور شملا نے بھی جنم دیے ہیں تمہارے بچے؟ وہ بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہیں اپنے شیروانی صاحب۔ ایک چنگاری کافی ہے ان کا نام و نشان مٹانے کے لئے۔ اب دیکھتے ہیں کتنی ہمت ہے تم میں آگ لگانے کی۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" محسن نے کہا۔ "میں تمہاری چالاکی اور جھوٹ کو سمجھتا ہوں۔"

"میں چاہتا تھا کہ تم خود ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔ لیکن تم بھاگ گئے۔ خیر تمہاری نازو انہیں دیکھ چکی ہے۔ وہ بتا دے گی تمہیں۔ میرا جتنا نقصان تم کر سکتے تھے تم نے کر لیا۔ اب تم میرا راستہ نہیں روکو گے۔ اس بار تمہیں یہ بھی معلوم نہیں ہو گا کہ وہ کس ٹرک میں ہیں۔ تم راستہ معلوم کر لو۔"

"تمہارا... مطلب ہے شملا... اور میرا بیٹا۔ تم انہیں اغوا کر لائے ہو۔" محسن نے چیخ کر کہا۔ "تم بکواس کرتے ہو۔ بھوکے... ذلیل کتے... وہ لاہور میں ہیں۔"

ولاور نے قہقہہ مارا۔ "میں سمجھ گیا۔ تمہیں یقین اس لئے نہیں آ رہا ہے کہ کسی نے تمہیں بتایا ہی نہیں۔ تمہارے دوست چاہتے تھے کہ تمہارے ہی ہاتھوں انہیں مروا دیں۔ بھولے بادشاہ اس مرتبہ وہ اتفاق سے بچ گئے مگر اب اتفاق پر بھروسا مت کرنا۔ شملا ایک ٹرک میں ہو گی اور تمہارا بیٹا دوسرے ٹرک میں ہو گا۔ ان کے زندہ جسم تابوتوں میں بند ہوں گے اور مال کے درمیان کہیں رکھ دئیے جائیں گے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے دخل اندازی نہ کی تو وہ تمہیں چند روز بعد زندہ سلامت مل جائیں گے۔ کلکتہ کے ہوٹل گرانڈ کے منیجر کو پیغام مل جائے گا۔"

ریسیور محسن کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ وہ بت بنا کھڑا ہوا تھا اور اس کی نظریں خلا میں دیکھ رہی تھیں۔ کاؤنٹر پر بیٹھنے والا بابو چائے پی کر لوٹ آیا تھا اور بہت دیر سے ہماری گفتگو سن رہا تھا مگر اس نے کسی تجسس کا مظاہرہ کیا تھا نہ حیرانی کا۔ اس نے ریسیور اٹھا کے کریڈل پر رکھ دیا۔

میں اور غالب مجرم بنے ایک دوسرے سے بھی نظریں چرا رہے تھے۔

اچانک محسن ہنسا اور اس نے ہماری طرف دیکھا۔ "حرام زادہ۔ کیسا جھوٹ بول رہا تھا۔"

میں نے کاؤنٹر کلرک کے سامنے دس کا ایک اور نوٹ رکھا اور محسن کا ہاتھ تھام کے کہا۔ "چل یار۔ دیر ہو رہی ہے۔"

باہر آ کے محسن نے اپنا بازو چھڑا لیا۔ "ولاور جھوٹ بول رہا تھا نا؟"

غالب نے کہا۔ "تو نے تو کمال کر دیا یار۔ تریویدی کی ایسی تیسی کر دی۔ کیا واقعی..."

محسن نے چیخ کر کہا۔ "میرے سوال کا جواب دو۔ کیا ولاور نے جو کچھ بتایا ہے وہ جھوٹ نہیں ہے؟ کہتے کیوں نہیں کہ وہ بکواس کرتا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "کیا تو اسے سچا آدمی سمجھتا ہے یار؟"

محسن کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر ہنسنے لگا۔ "میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ شملا اور میرا بیٹا تو لاہور میں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس نے جھوٹ کے جواب میں جھوٹ بولنے کی کوشش کی مگر بھونڈا جھوٹ بکا اس نے۔ میرے جھوٹ کو تریویدی نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ معلوم ہے یہ سب کیسے ہوا؟ سیٹھ جمن کی مدد سے۔ ان کے پاس رنگ بدلنے والی ٹارچ ہے۔ اس کے سامنے کا شیشہ گھوم جاتا ہے۔ جیسے کیمرے کا لینس گھومتا ہے۔ پہلے سبز پھر زرد پھر لال سامنے آتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے لئے جو ان کے ساتھ تھے یہ ٹارچیں وہاں پیغام رسانی کے لئے استعمال کرتے تھے۔ یہ اسکیم انہی کی تھی۔ ٹیلی فون کی لائن کاٹنا تو ان کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ تریویدی کو ایک ہی پول پر سے سارے

رہ گئے ہوں گے۔ انہوں نے بس ایک لائن چھوڑ دی ہو گی۔ ٹیلی فون کا کھمبا کیا چیز ہے ان بندروں کے لئے۔ اس کے بعد دوسری طرف چلے گئے ہوں گے۔ تریویدی کی کوٹھی کے مشرقی حصے کی طرف شیشے کی بالکونی سے پہلے سین نے ٹارچ جلا کے سگنل دیا۔ پھر وہ دوڑ کر آگے چلا گیا اور مسٹر ثمین نے جو بیس قدم کے فاصلے پر موجود تھے اپنی ٹارچ روشن کر دی۔ اس کے بعد وہ جگہ بدلنے بھاگا مگر سین صاحب اتنی دیر روشنی چمکاتے رہے۔ تریویدی کو وہ اندھیرے میں بھاگ بھاگ کر آگے جاتے ہوئے کیسے نظر آ سکتے تھے۔ اس نے تو یہی دیکھا کہ ایک کے بعد ایک لائٹ سگنل مل رہا ہے اور واقعی ہر بیس قدم کے فاصلے پر کوئی موجود ہے۔"

محسن نے ایک قہقہہ مارا۔ اس کی ہنسی میں واضح طور پر ذہنی انتشار کی کیفیت تھی اور وحشت تھی۔ لاشعور میں جاگنے والے خوف کا اسٹرایا اسے اپنی گرفت میں لے رہا تھا جس کو اس نے وقتی طور پر دبا دیا تھا۔ جیسے تہ خانے کی آگ کا دھواں نیچے ہی نیچے بند جائے اور پھیلتا جائے مگر اوپر سے نظر نہ آتا ہو۔

ہم محسن سے زیادہ ڈرے ہوئے تھے۔ اس کا قہقہہ سن کے مجھے یوں لگا جیسے زلزلہ آنے والا ہے اور زمین پہلے سے کانپ رہی ہے۔ میں اس کے ساتھ نہ ہنس سکا۔ کوشش کے باوجود۔

محسن تیز تیز قدموں سے چلتا گیا اور بولتا گیا۔ "سین ثمین بہت بدمعاش ہیں۔ سب پہلے سے طے تھا کیونکہ وہ گوریلا جنگ لڑتے رہے ہیں۔ نام نیپال سے چلتے ہیں۔ انہوں نے منومیاں کے مشورے سے پانچ منٹ میں پورا منصوبہ بنا لیا تھا۔ تریویدی کا گھر اور آس پاس کا علاقہ وہ پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ انہیں جیسے ہی معلوم ہوا کہ گاڑی بارہ بجے ہمیں لے جائے گی وہ تریویدی کی کوٹھی کے باہر پہنچ گئے۔ انہوں نے دیکھ لیا ہو گا کہ ایک گاڑی آئی ہے دوسری نہیں آئی۔ بس انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ میں بھی وقت کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ لائٹ سگنل ملنے کے بعد ان میں سے کوئی چڑھا ہو گا بجلی کے پول پر۔ وہاں سے تریویدی کی کوٹھی تک خبری فیڈر کے چار تار گئے ہوں گے۔ تین فیز اور ایک نیوٹرل۔ انہوں نے نیوٹرل کو کاٹ دیا ہو گا کسی خطرے کے بغیر۔ وہ تار کٹ کے نیچے گر گیا ہو گا۔ اسے پھر جوڑنے میں وقت لگے گا اور یہ کام بجلی کمپنی والے ہی کر سکتے ہیں لیکن نیوٹرل کے بغیر تینوں فیز بے کار ہیں۔ تریویدی کی کوٹھی میں اندھیرا ہوا تو وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ فوراً شکست مان لی اس نے۔ خبیث کتنی جلدی راضی ہو گیا نازو کو واپس کرنے کے لئے۔ بس اسی جگہ ٹھہر جاؤ۔ اس کی کار اسی طرف سے آئے گی۔ سین ثمین نے کار کو باہر نکلتے ہی روک لیا ہو گا۔ وہ بھی ساتھ بیٹھے ہوں گے۔ ولاور نے عجیب بات کی تھی کہ نازو سب دیکھ کر آ رہی ہے۔ کیا دیکھا ہو گا نازو نے آخر؟ شملا اور میرا بیٹا تو لاہور میں ہیں اور تم لوگ مجھ سے کیسے جھوٹ بول سکتے ہو۔" وہ پھر دیوانوں کی طرح ہنسا۔ "سور کا بچہ کہتا تھا کہ تمہارے دوست تمہارے ہی ہاتھوں انہیں مروانا چاہتے تھے۔ انہوں نے تمہیں بتایا نہیں۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا نا؟ ...ایسی کوئی بات تم مجھ سے کیسے چھپا سکتے ہو۔"

پھر اچانک وہ چلتے چلتے رک گیا اور اس نے ایک پتھر اٹھا لیا۔ "...سکندر! بول حرام زادے۔ بولتا کیوں نہیں؟ تیری زبان کیوں چپ ہے؟ بتا مجھے کہ یہ جھوٹ تھا۔ رابعہ کی عزت کی قسم کھا کے کہہ کہ ولاور جھوٹ بول رہا تھا۔ ورنہ میں سر پھاڑ دوں گا تیرا۔"

اب سچ کے انکشاف کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔ سفاک حقیقت کا سورج سوا نیزے پر تھا۔ اس کے وجود کو جھٹلانا ناممکن تھا۔

میں نے محسن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا۔ ان آنکھوں کی کیفیت دیکھ کر مجھے خوف آیا۔ وہ پاگل ہو چکا تھا۔ دیوانگی اس کے انداز سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی عیاں تھی۔

"یہ جھوٹ نہیں تھا محسن" میں نے ایک لمبی گہری سانس لے کر کہا۔

محسن کا ہاتھ اوپر اٹھا رہا۔ خاموشی کا ایک بھیانک لمحہ آیا جو عذاب کی وہ ساری شدت رکھتا تھا جسے پھانسی کے اندھے کنویں میں لٹکا ہوا آدمی اکیلا جھیلتا ہے۔ پھر محسن نے ایک اور قہقہہ مارا۔

"یار تو بڑا حرامی ہے۔ مذاق کرتا ہے موقع محل دیکھے بغیر۔ کیا میں تیرا سر پھاڑ دوں؟"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ پتھر میرے ہی سر کے لئے تھا۔ جو یہاں پڑا ہوا منتظر تھا اس لمحے کا جب میں تیرا مجرم اور گنہگار ہو کے یہاں سے گزروں اور یہ تیرے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ تجھے اب کس کا انتظار ہے؟ میں اعتراف کر چکا ہوں اپنے جرم کا۔"

غالب نے کہا "اگر ولاور کہتا ہے تو ٹھیک کہتا ہے۔ ہم تیرے دوست نہیں دشمن تھے۔ ہم نے یہی چاہا تھا کہ شملا اور اس کے بیٹے کا قاتل تو کہلاتا۔ ہمارے دامن پر کوئی داغ نہ آتا۔ پہلا پتھر مجھے مار۔"

"دشمن ہو" آہستہ آہستہ محسن کا ہاتھ نیچے آ گیا "تم بھی۔ صدیوں پہلے جب سیزر کے دوست بروٹس نے اس کو خنجر گھونپا تھا تو سیزر بھی حیران رہ گیا تھا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا تھا "تم بھی۔ بروٹس..." اس سے زیادہ کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی لیکن اس سے زیادہ کہنا بھی غیر ضروری تھا۔ کہ صف دشمناں میں تم بھی شامل ہو۔ تمہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ باقی سب تو میرے سینے میں خنجر اتار سکتے تھے کیونکہ وہ دشمن تھے اور خون کے پیاسے تھے مگر تم... تم تو دوست تھے بروٹس۔ تم بھی!"

"تم بھی دشمن ہو؟" محسن نے پھر دہرایا "نہیں۔ ولاور جھوٹ بولتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کتے کا بچہ۔ میں قتل کر دوں گا اسے اگر اس نے تمہیں گالی دی۔ یہ گالی نہیں تو کیا ہے۔ وہ کہے کہ سکندر میرا دوست نہیں دشمن ہے۔ لیکن ایسی بات ہی

کہہ سکتا ہے جو پاگل ہو۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ہم پہلے دن سے دوست ہیں۔ اس دنیا میں اپنی زندگی کے آغاز سفر سے۔ یہ بات تو دشمن بھی جانتے ہیں۔ جیسے ہر شخص سورج کو جانتا ہے۔ جو اسے چاند کہے گا تو ظاہر ہے وہ پاگل ہو گا۔ پاگل کی بات کا کیا برا ماننا۔"

اس نے ایک قہقہہ لگایا اور بہت دیر تک ہنستا رہا۔

اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ دلاور کی بات سن کے محسن کا دماغ الٹ گیا ہے۔ وہ یقین کر چکا ہے کہ یہ بات غلط نہیں لیکن اس کے لاشعور میں دبا ہوا خوف اسے یقین سے روکتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس خبر کو جھوٹ سمجھے۔ اس کی خواہش ہے کہ یہ سچ نہ ہو۔ شعور اور لاشعور کی خانہ جنگی میں رزم گاہ اس کا وجود ہے۔ صدمے کا یہ اثر عارضی بھی ہو سکتا تھا۔ اگر شہلا مل جاتی۔ اگر اسے یقین دلایا جا سکتا کہ دلاور جھوٹ بول رہا تھا۔ مگر یہ مشکل تھا۔ شاید ناممکن تھا۔

میں نے محسن کو جھنجوڑا "یہ کیا ہو گیا ہے تجھے؟"

محسن کی ہنسی رک گئی "واقعی یار۔ یہ کیا ہو گیا تھا مجھے؟ غالب یار مجھے کیا ہو گیا ہے؟"

غالب نے کہا "ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ہوا۔"

وہ بولا "یہ تو ہو سکتا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں تو خود انہیں مار دوں۔ لیکن پاگل ہو کے بھی میں کیسے اتنا بڑا جھوٹ تسلیم کر سکتا ہوں کہ تم میرے ہاتھوں ان کو مروانا چاہتے تھے۔ کیا میں اتنا کمینہ ہوں کہ کوئی تم پر یہ الزام لگائے اور میں مان لوں۔ معاف کرنا یار، میں واقعی پاگل ہو گیا تھا۔ مرزا غالب، تمہارا ہی شعر ہے نا وہ کہ۔ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد۔ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا" اس نے قہقہہ لگایا اور وہ پتھر پھر اٹھا لیا جو وہ نیچے گرا چکا تھا "لو یہ پتھر میرے سر پر مارو۔۔۔ مارو۔"

فرط غم سے میرا دل پھٹنے والا تھا۔ اس کی حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی اور میرے ضمیر کو ایک غیبی آواز مسلسل کچوکے لگا رہی تھی۔ اس کے ذمے دار تم ہو۔ تم نے جھوٹ بولا۔ اس وقت تم سچ بول سکتے تو آج محسن تمہارے ساتھ ہوتا۔ وہ حقیقت کا سامنا کرتا لیکن تم نے ڈر کے جھوٹ کی آڑ میں پناہ لی۔ وہ جھوٹ ایک کینسر کی طرح پھیلتا رہا۔ اس کا علاج اب کون سے سچ کے تریاق سے کرو گے؟ غالب کی آنکھوں میں آنسو تھے جو محسن کے درد کا درماں نہیں ہو سکتے تھے۔

وقفے وقفے سے سڑک پر دونوں جانب سے گاڑیاں آ رہی تھیں۔ آدھی رات کے بعد ٹریفک بہت کم ہو چکی تھی لیکن بالکل ختم نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ایک اندیشہ یہ لاحق تھا کہ کہیں ہمیں مشتبہ انداز میں کھڑا دیکھ کر پولیس کی کوئی گشت کرنے والی پارٹی نہ آ جائے۔ محسن کا رویہ دیکھ کر وہ سمجھتے کہ ہم سب نشے میں ہیں۔ مجھے اس گاڑی کی فکر بھی تھی جس میں نازو کو واپس آنا تھا۔ دور سے آنے والی ہر گاڑی صرف چندھیا دینے والی روشنی ہوتی تھی۔ رات کے وقت گاڑی کا رنگ، ماڈل کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ نہ یہ پتا چلتا تھا کہ گاڑی کون چلا رہا ہے اور ونڈ اسکرین کے پیچھے کون ہے۔ یہ تینوں مجھے اور غالب کو نہیں جانتے تھے۔ اگر نازو آگے بیٹھی تو اس کی نظر ہمیں دیکھ لے گی۔ لیکن وہ پیچھے بیٹھی ہو، اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ تینوں میں سے کوئی ایک ہو گا۔ اگر انہوں نے محسن کو مس کر دیا۔۔۔

ایک گاڑی بہت تیزی سے آئی۔ قریب آ کے اس کی رفتار کم ہوئی۔ پھر ڈرائیور نے زبردست بریک لگائے اور گاڑی ہم سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ یہ تریوینی کی گاڑی نہیں تھی۔ جو شخص آگے سے اترا اسے بھی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اس کے انداز انتہائی جارحانہ تھے۔ تقریباً اس کے پیچھے پیچھے پولیس کی گاڑی آئی اور پچھلی گاڑی کے سامنے آ کے ٹھہر گئی۔

۔۔۔میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ وہ دیوانوں کی طرح ہنس رہا تھا۔

گاڑی سے اترنے والے تین پولیس والوں میں سے ایک ان کا افسر تھا۔ باقی دو نے کسی حکم اور کسی وجہ کو ضروری سمجھے بغیر اپنی رائفلوں کو ایسے اٹھا لیا جیسے ان کو سخت مزاحمت درپیش ہے۔ کار میں سے پہلے اترنے والا شخص ہمارے لئے اجنبی تھا مگر اس نے ہمیں شناخت کر لیا تھا۔ پولیس کی گاڑی اس کے پیچھے تھی اور شاید اس کے اشارے پر رکی تھی۔ اپنے انداز و اطوار سے وہ سادہ کپڑوں میں پولیس کا کوئی بڑا افسر یا فوجی لگتا تھا۔

جب کار کا دوسرا دروازہ کھول کے کرنل سامنے آیا تو مجھے جیتی ہوئی بازی ہارنے پر مایوسی اور تقدیر کے ہاتھوں تدبیر کی شکست کا شدت سے احساس ہوا۔

"یہی ہیں نا وہ لوگ کرنل؟" کار سے پہلے اترنے والے نے انگریزی میں سوال کیا۔ کرنل نے اقرار میں سر کو خفیف سی جنبش دی "مجھے معلوم ہے کہ تمہاری نظر عقاب سے زیادہ تیز ہے۔ تم شناخت میں غلطی نہیں کر سکتے تھے ایس پی۔"

جسے ایس پی کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا وہ اس تعریف پر مسکرایا "میں ان سب کی تصویریں بھی دیکھ چکا تھا۔"

کرنل نے کہا۔ "آج تم نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ پولیس والے کتنے ہی کاہل کیوں نہ ہوں، اگر وہ چاہیں تو مستعدی کے ساتھ وقت پر کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے مائی فرینڈ۔۔۔"

کرنل کا دوست ایس پی اگرچہ سیاہ فام اور کسی حد تک بدوضع تھا مگر وہ حیرت انگیز طور پر فٹ اور اسمارٹ تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی مگر وہ پچیس سے زیادہ کا نظر نہ آتا تھا۔۔۔ آدھی آستین کی سفید اسپورٹس شرٹ اور کالی پتلون سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی کمر پتلی اور سینہ چوڑا ہے۔ اپنے جسم کو اتنا متوازن اور متناسب رکھنے کے لئے وہ یقیناً ورزش یا باڈی بلڈنگ کرتا ہو گا۔

محسن جو پہلے دیوانہ وار ہنس رہا تھا، اب سنجیدہ ہو چکا تھا۔ شاید یہ خطرے کا احساس تھا جس نے اس کے حواس کو جھنجوڑ کر ایک جذباتی ہسٹریا کو ختم کر دیا تھا اور اسے صورت حال کی سنگینی کو

سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ہم بہت غلط وقت پر پکڑے گئے تھے۔ قصور ہمارا اپنا تھا۔ ہم نے تریوینی اور دلاور کے عیار ذہن کو بڑی غیر متوقع شکست دی تھی۔ پہلے محسن نے ایک کامیاب چھاپا مار کے ہماری اسیری کو آزادی سے ہمکنار کیا تھا اور اس سے پہلے کہ شکاری کچھ سمجھتے اور سنبھلتے، وہ ہمیں نکال کر لے جانے میں کامیاب رہے تھے۔ دوسری کامیابی ہم نے صرف چشم تصور سے دیکھی تھی مگر اس میں بھی شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ تریوینی مجبور ہو گیا تھا کہ نازو کو باعزت طور پر واپس کر دے۔

غلطی ہم سے یہ ہوئی تھی کہ ہم کرنل کو بھول گئے تھے۔ کچھ محسن سے ملنے کی خوشی تھی، کچھ اس کی سرگزشت میں دلچسپی اور انہماک کا نتیجہ تھا اور کچھ کامیابی کے غرور کا فطری ردعمل کہ ہم نے احتیاط کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا اور سر راہ گزر سب کی نظروں کے سامنے کھڑے نازو کو لانے والی گاڑی کا راستہ دیکھتے رہے۔

میدان جنگ میں ہر بھول چوک کا فائدہ حادثاتی طور پر بھی دشمن کو پہنچتا ہے۔ اگر ہم نے صرف اتنا کیا ہوتا کہ کسی درخت کے سائے میں یا کسی گوشۂ دیوار کے پیچھے رہتے تو شاید کسی کی نظر ہم پر نہ پڑتی مگر ہیڈلائٹس کی تیز روشنی میں ایس پی نے ہمیں دیکھ لیا تو یہ کمال اس کی عقابی نظر کا نہیں تھا، ہماری بے احتیاطی کی سزا تھی۔ انہوں نے ہمیں پیچھے دھکیل کر ایک دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

کرنل نے حقارت کے انداز میں کہا "یہ مسٹر سکندر بخت ہیں۔ یہ ان کے دوست مسٹر محسن اور یہ مرزا غالب۔" اس نے اپنے اطوار کی شائستگی میں فرق نہیں آنے دیا تھا۔

"میں ان سب سے بہت اچھی طرح واقف ہوں" ایس پی نے کہا "یوں سمجھ لو کہ مل چکا ہوں۔ یہ حیرت انگیز لوگ ہیں۔"

میں نے بلا ارادہ اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھا دیا۔ میں نے انگریزی میں کہا "کچھ دشمن بھی اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ عداوت میں بھی وضع داری کو ملحوظ رکھا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حالات نے ہمیں آمنے سامنے اور منافرت کی لکیر کے دونوں طرف کھڑا کر دیا ہے۔ اگر ہم ایک ہی طرف ہوتے تو۔"

ایس پی نے مصافحے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بظاہر وہ میری بات بھی غور سے سن رہا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا اور میرے بائیں گال پر ایسے پڑا کہ میرا گال دہکنے لگا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم ایک دہشت گرد ہو۔ غدار ہو۔ قاتل ہو اور مفرور مجرم ہو۔ اس کے باوجود تم کہتے ہو کہ ہم ایک ہی صف میں ہوتے۔ میں ایک ذمے دار پولیس افسر اور ایک امن پسند شہری ہوں۔"

"سوری" میں نے کہا۔ "مجھ سے اندازے میں غلطی ہو گئی۔

۔۔۔تم اور یہ کرنل۔ دونوں صرف مالک کے اشاروں پر دُم ہلانے والے وفادار کتے ہو۔ لیکن تمہارے مالک بد خصلت، بے ضمیر شیطان ہیں۔"

ایس پی مشتعل ہو گیا تھا مگر کرنل نے اسے روک لیا "یہ ان کی چالاکی ہے۔ تمہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ تمہیں مار پیٹ پر اکسانا چاہتے ہیں تاکہ اس صورت حال کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لئے کوئی موقع پیدا کریں۔ اور باتوں میں وقت ضائع کرنا جانتے ہیں۔ انگلش ہی نہیں فرنچ بھی بول لیتے ہیں اور اکثر اپنے انداز و اطوار سے امپریس کر کے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔"

"میرے ساتھ ایسی کوشش کا انجام صرف یہ ہو گا کہ ان کے سر میں ایک ایک سوراخ ہو جائے گا۔" ایس پی نے رعونت سے کہا اور اپنا ریوالور نکال لیا۔

"نہیں۔ خوش اسلوبی سے ہو جانے والے کام کو بدمزاجی سے خراب مت کرو۔ انہیں ساتھ لو اور چلو" کرنل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"ان کے کچھ اور ساتھی بھی تو آنے والے ہیں" ایس پی نے کہا۔

"جب وہ آئیں گے تو ان سے بھی نمٹ لیں گے" کرنل نے کہا "انہیں تو گاڑی میں ڈالو۔"

ایس پی کے مقابلے میں کرنل بہت زیادہ ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا۔ اس نے میری نیت کو سمجھ لیا تھا۔ میں واقعی بازی پلٹ دینے کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ سوچنے اور منصوبہ بندی کرنے کے لئے تھوڑی سی مہلت چاہتا تھا اور اپنے سب حریفوں کی طاقت کا اندازہ کر رہا تھا۔ مجھے اس وقت نازو کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ محسن اور غالب کسی میدان میں پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے لیکن اسلحے کے بغیر ان میں نہ اپنے دفاع کی صلاحیت تھی اور نہ مد مقابل پر غالب آ جانے کے لئے مؤثر جسمانی قوت۔ کرنل کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ جوڈو کراٹے سے بھی واقف ہو گا۔ اس کو میں ایک کوبرا سانپ سے زیادہ ہلاکت آفریں، بھیڑیے سے زیادہ خطرناک، چیتے سے زیادہ پھرتیلا اور آدم خور شیر سے زیادہ خون آشام سمجھنے پر مجبور تھا حالانکہ وہ اپنے اطوار سے انتہائی بے ضرر، معقول اور پُرسکون نظر آتا تھا مگر اس کی شخصیت پر ایک نہیں کئی پردے تھے اور ہر پردے کے پیچھے اس کی منفی ذہانت سے مسخ شدہ صورت ایک بھیانک حیوانی روپ رکھتی تھی۔ اس میں دلاور کی عیاری، چنگیز کی بے رحمی، حاجی عبداللہ کی منافقت اور تریوینی کی بدمعاشی کی صفات بھی اکٹھی ہو گئی تھیں اور وہ اپنی شیطانی ذہانت میں بھی ان سب سے بہت آگے تھا۔ وہ خوش اطوار، خوش لباس اور خوش شکل تھا اور بلاشبہ اپنی پُرکشش طلسماتی شخصیت سے دشمن کو ذہنی طور پر مفلوج کر سکتا تھا یا اسے ہپناٹائز کر کے اس حد تک اپنا مطیع کر سکتا تھا کہ اسے حکم دے تو وہ خود اپنے ہاتھوں اپنا

www.paksociety.com

گلا کاٹ دے۔ بہت کم وقت میں اس نے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اب تک ہمارے مقابل آنے والے سب دشمنوں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔

ایس پی کچھ اپنے سرکاری اختیارات اور کچھ اپنی جسمانی طاقت پر نازاں تھا۔ باقی تین پولیس مین صرف اسلحہ بردار حکم کے غلام تھے۔ نازو ساتھ ہوتی تو میں سب سے پہلے کرنل پر قابو پانے کی کوشش کرتا اور نازو کو ایس پی سے نمٹنے کا موقع دیتا۔ وہ ساڑھے چھ فٹ قد کا کالا دیو اپنی طاقت پر غرور کے باعث اس نازک اندام لڑکی کے ہاتھوں اسی طرح مارا جاتا جیسے روایت اور ضرب المثل کے مطابق چیونٹی سے مقابلہ کر کے ہاتھی مارا جاتا ہے۔ محسن اور غالب کچھ دیر تینوں پولیس والوں کے ساتھ... بہرحال مقابلہ کر سکتے تھے۔ پھر میں یا نازو ان کی مدد کے لئے پہنچ جاتے اور دو منٹ میں یہ مقابلہ ختم بھی ہو سکتا تھا مگر اب میں بیک وقت کرنل اور ایس پی سے بھڑ جاتا تو نتائج مختلف ہوتے۔

ریوالور نکالنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ شاید ہمارے ہاتھوں کی حرکت کا اندازہ کرتے ہی کرنل ریوالور نکال لیتا۔ وہ ایس پی کی طرح اشتعال اور عجلت میں کسی کے سر کا نشانہ کبھی نہ لیتا۔ وہ میرے یا محسن اور غالب کے ہاتھوں پر فائر کرتا اور نہ جانے کیوں مجھے یہ بھی یقین تھا کہ وہ فلمی کاؤبوائے اسٹائل میں تین فائر کرتا تو ہم تینوں کے ہاتھ سے ریوالور اڑ جاتے لیکن ہمارے ہاتھوں میں خراش بھی نہ آتی۔ آخر یہ کیا ہے؟ میں نے سوچا۔ کیا میں اس شخص کے ذہن کی مقناطیسی قوت سے مغلوب ہو رہا ہوں؟ میں کیوں ہر معاملے میں اس کی برتری اور فوقیت کو تسلیم کر رہا ہوں؟ جب کہ اس نے ابھی تک اپنی ہر غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو غیر معمولی ثابت نہیں کیا ہے۔

"اپنے چہرے دیوار کی طرف کر لو" ایس پی نے کہا "ایک دوسرے سے دور ہو اور اس خوش فہمی سے نکلو کہ میں نے تمہارے سر میں سوراخ نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو تم محفوظ ہو۔ میں تمہارے ٹخنوں کو یا گھٹنوں کو ناکارہ کر دوں گا۔ اگر تمہارے پنجے کاٹ دیے گئے یا گھٹنوں سے نیچے ٹانگیں نہ رہیں تو تمہاری زندگی فٹ پاتھوں پر دوسروں کے لئے بھیک مانگتے گزرے گی۔ میں تمہیں ایسے ٹھیکیداروں کے حوالے کر دوں گا جو معذور فقیروں کی آمدنی سے اتنے دولت مند ہو چکے ہیں کہ انتخابات لڑ سکتے ہیں۔ اور وہ بہت بڑے بدمعاش بھی ہیں۔"

"تم سے بھی بڑے؟" محسن نے دیوار کی طرف رخ کر کے کہا۔

"نہیں۔ میرے سامنے وہ ہاتھ باندھ کر آتے ہیں" ایس پی نے غرا کے کہا۔

غالب نے کہا "تمہارا حصہ پہنچانے؟ تمہاری اجازت کے بغیر بدمعاشی کے دھندے کیسے چل سکتے ہیں۔"

"ہاں۔ مگر یہ میری اجازت کی بات نہیں۔ اجازت اوپر سے بھی آتی ہے" ایس پی بولا۔

جہاں ہم اپنے ہاتھ دیوار پر رکھے کھڑے تھے وہ جگہ سڑک سے دور اور کچھ تاریکی میں تھی۔ سڑک پر دن کے وقت یہ کارروائی ہوتی تو شاید کوئی رکنے کی ہمت کرتا مگر رات کے وقت کسی گاڑی والے کو پولیس کے کام میں دخل اندازی کر کے خود کو مصیبت میں ڈالنے کا خیال نہیں آ سکتا تھا۔ اگر کسی نے اس پورے منظر کو غور سے دیکھا ہوگا تو یہی نتیجہ اخذ کیا ہوگا کہ پولیس نے تین مشتبہ افراد کو پکڑا ہے۔ جو چور، ڈاکو یا آوارہ گرد کچھ بھی ہو سکتے تھے۔ آدھی رات کے بعد کسی اخباری رپورٹر کے آ جانے کی امید بھی نہیں تھی۔ ایک پولیس مین میری جامہ تلاشی کے بعد میرا ریوالور اپنے افسر کی خدمت میں پیش کر چکا تھا۔ محسن اور غالب سے بھی اسلحہ برآمد ہو چکا تھا اور قانون کے لئے ہمارے خلاف کارروائی کو سند دینے کے لئے یہ ثبوت کافی تھے مگر یہ قانونی کارروائی نہیں تھی۔ قانون کے علمبردار ہمیں غیر قانونی طور پر پکڑ کے ٹریوپی کے سامنے دست بستہ پیش کرنا چاہتے تھے... قانون نچلی سطح کے لوگوں کے لئے ایک جال تھا۔ بہت اوپر کی سطح پر ٹریوپی جیسے لوگ وہ شکاری تھے جو اس جال سے کام لیتے تھے۔ یہ کمزور کے لئے اس کی کمزوری کی سزا تھا اور طاقتور کے لئے اختیار کا سرچشمہ۔

کرنل اور ایس پی ابتدائی کارروائی سے فارغ ہو جانے کے بعد شاید مطمئن تھے کہ یہ مرحلہ کسی قسم کی مزاحمت اور کشت و خون کے بغیر طے ہو گیا۔ تینوں پولیس مین پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن ابھی تک انہوں نے اپنی بندوقوں کا رخ ہماری سمت کر رکھا تھا۔ انہوں نے مجھے، غالب اور محسن کو ایک دوسرے سے اتنا دور کر دیا تھا کہ ہم رازداری کے ساتھ سرگوشی میں کوئی بات نہیں کر سکتے تھے۔ ان حالات میں وہ کیا سوچ رہے ہوں گے؟ اس کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ تھکن اور نیند کی کمی سے سب کی جسمانی حالت تباہ تھی۔ گرفتاری نے ذہنی طور پر بھی سب کو مایوسی کی بے بسی اور احساس شکست کی کم ہمتی میں مبتلا کر دیا تھا۔

خود میرا ذہن قوت فیصلہ سے محروم تھا اور خیالات کے انتشار نے میری سوچ کو بے سمت کر دیا تھا۔ کبھی مجھے خیال آتا تھا کہ ہمیں نتائج کی پروا کئے بغیر دشمنوں پر ٹوٹ پڑنا چاہئے۔ وہ پانچ ہیں اور ہم تین۔ پھر اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس خیال کو دوسرا خیال مسترد کر دیتا تھا کہ سوچے سمجھے بغیر مقابلے پر اتر آنا خودکشی کے مترادف ہوگا کیوں کہ وہ مسلح ہیں اور ہم خالی ہاتھ۔ اگر میں اچانک کرنل پر جا پڑوں یا ایس پی کو بے بس کر کے یرغمال بنا لوں؟ انہیں خبردار کروں کہ کسی نے ہمارا راستہ روکا تو میں ایس پی کی گردن توڑ دوں گا۔ کیا وہ ہمیں نکل جانے دیں گے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ادھر میں ایس پی کو مغلوب کروں ادھر کرنل جوابی کارروائی کرتے ہوئے محسن یا غالب میں سے کسی کو پکڑ لے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں کرنل یا ایس پی پر قابو پانے میں ناکام رہوں اور میری ناکامی کے نتیجے میں وہ دونوں مارے جائیں۔ پھر میں اکیلا رہ کے کیا کروں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میرے ہاتھوں کرنل یا ایس پی میں سے ایک ہلاک ہو جائے لیکن پولیس والے بھی خاموش تماشائی بنے تو نہیں کھڑے رہیں گے۔ اپنے افسر کو بچانے کے لئے انہوں نے فائرنگ کی تو گولی کسی کو بھی لگ سکتی ہے۔ ایسے دس کرنل اور سو ایس پی مرتے ہیں تو دنیا کو فرق نہیں پڑتا لیکن ایک غالب یا محسن کے مرنے سے میری دنیا میں امید، یقین اور اعتماد کا سورج نہیں رہے گا تو یہ دنیا کیسی ادھوری اور اندھیری ہو جائے گی؟ نہیں۔ مجھے انتظار کرنا چاہئے۔ سوچنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وقت کب موقع فراہم کرتا ہے اور اس موقع سے کب فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ اپنا کم سے کم نقصان ہو۔ ابھی نازو آ جائے گی۔ اس کے ساتھ منو بھائی بھی ہوں گے اور سیٹھ حشمت بھی۔ پھر ہم زیادہ قوت کے ساتھ ان سے نمٹ سکیں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ ابھی تک آئے کیوں نہیں؟ اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ آخر کرنل کو ہمارے بارے میں کس نے بتایا؟ کیسے اتنے کم وقت میں وہ پولیس کے ساتھ ہمارا تعاقب کرتا ہوا سیدھا یہاں آ پہنچا؟ اور اسے کیسے معلوم ہوا کہ اب اسی راستے سے نازو اور ہمارے دوسرے ساتھی آنے والے ہیں؟

خیالات کی منتشر افواج کو پھر منظم کرنے کے لئے مجھے سخت جدوجہد کرنی پڑی لیکن آخرکار میں ایک حکمت عملی وضع کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے اپنے ہاتھ دیوار پر سے اٹھائے اور آہستہ آہستہ پلٹ کے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"یہ کیا ہے؟" ایس پی نے غرا کے کہا "کس کی اجازت سے اپنی پوزیشن بدلی ہے تم نے؟"

میں نے اطمینان سے کہا "خود اپنی اجازت سے۔"

"شٹ اپ۔ پلٹ کے اسی طرح کھڑے ہو جاؤ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟ تم گولی مار دو گے" میں نے کہا "کیا تم سینے پر گولی مارتے ہوئے ڈرتے ہو؟ اس لئے کہ ہمیشہ پشت پر وار کرتے رہے ہو۔"

"مجھے مجبور مت کرو" ایس پی نے دہاڑ کر کہا۔

"تم پہلے ہی بہت مجبور ہو۔ تم سے زیادہ مجبور کون ہو سکتا ہے کہ ریوالور تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن تم کو گولی چلانے کی اجازت نہیں ہے ایس پی صاحب۔ عقل اور ہوش سے کام لو۔ ایک گولی چلا کے تم کیا کچھ گنوا دو گے؟ یہ بھی سوچ لو۔ تمہاری خدمات ہماری لاشیں لانے کے لئے حاصل نہیں کی گئی ہیں۔ تم کو جواب دہی مشکل ہو جائے گی اپنے آقاؤں کے سامنے" میں نے کسی ولن کے انداز میں ایک قہقہہ مارا "تم ایک زرخرید غلام کی طرح مجبور ہو۔ یو سن آف اے بچ۔ تم صرف بھونک سکتے ہو۔ کاٹنے کی کوشش کرو گے تو تمہارے گلے میں پٹہ ڈالنے والے ہاتھ تمہاری گردن دبوچ لیں گے۔"

ایس پی اتنا مشتعل ہو چکا تھا کہ درمیان میں کرنل حائل نہ ہوتا تو یا وہ مجھ پر گولی چلا دیتا یا خود مجھ پر حملہ کر دیتا۔ میں اس گولی کے ساتھ زندگی اور موت کا خطرناک کھیل کھیلنے کے لئے تیار تھا... نشانہ خطا جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن گولی ڈاج کر کے خود کو بچانے کی کوشش میں میری کامیابی کے امکانات ففٹی ففٹی تھے۔ میں دائیں یا بائیں غوطہ لگا کر خود کو بچاتے ہوئے ایک ہی جست میں ایس پی پر جا گرتا اور اسے دوسرا فائر کرنے کی مہلت نہ دیتا۔

کرنل نے کہا "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ لوگ تمہیں مشتعل کریں گے۔ اور تم اشتعال میں کوئی غلطی کرو گے تو اس سے پورا فائدہ اٹھائیں گے۔"

ایس پی نے شکایت اور احتجاج کے انداز میں کہا "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بے عزتی کو برداشت کروں۔ اپنے ماتحتوں کے سامنے۔"

"اس کا صرف ایک مطلب ہے کہ یہ جو کچھ کہیں اسے مت سنو اور نظرانداز کرتے رہو" کرنل نے کہا "تم کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ صبر کے ساتھ۔۔۔"

اب محسن اور غالب بھی اطمینان سے سیدھے کھڑے ہو گئے تھے۔ غالب نے کہا "ہم بھی بہت صبر کے ساتھ یہ سب کچھ برداشت کر رہے ہیں لیکن برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔"

محسن نے تائید میں سر ہلایا "ہمیں اتنا مجبور نہ کرو کہ ہم مرنے مارنے پر تل جائیں۔ ہم مصلحت پسندی کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اسے ہماری بزدلی یا کمزوری مت سمجھو۔"

میں نے کہا "اگر ہم نے مصلحت کے تقاضوں کو نظرانداز کر دیا تو فیصلہ چند منٹ میں ہو جائے گا۔ اسلحے کا فرق اتنا اہم نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں یا میرے ساتھیوں میں سے کوئی تمہارا اسلحہ چھیننے میں کامیاب ہو جائے اور خود مرنے سے پہلے تمہیں بھی ٹھکانے لگا دے۔ تین اور پانچ کی عددی قوت میں زیادہ فرق نہیں ہے مسٹر ایس پی۔"

کرنل نے کہا "او کے مسٹر سکندر بخت۔ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ بہتر ہوتا اگر تم فرار کا راستہ اختیار نہ کرتے۔ تم کو صرف مذاکرات کے لئے لے جایا جا رہا تھا۔ مجھے ٹریوپی نے بتایا کہ تم نے اسے ہراساں کیا اور اس لڑکی کو بھی واپس بلا لیا۔"

"ٹریوپی سے مذاکرات کرنے والے پر لعنت۔ مذاکرات وہاں ہوتے ہیں جہاں افہام و تفہیم کی گنجائش ہو۔ ہمارے مقاصد میں زمین آسمان کا فرق ہے اور مشرق و مغرب کی دوری ہے۔ میں جانتا ہوں وہ کیا کہے گا۔ تم اسے میرا جواب پہنچا دو کرنل۔ نہ ہم اس کی شرائط تسلیم کر سکتے ہیں۔ نہ اس کی کوئی پیشکش قبول کر سکتے ہیں۔ خواہ وہ کتنی ہی فراخدلانہ کیوں نہ ہو۔ ہم

www.paksociety.com

اس کی کسی دھمکی سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ جو وہ کر سکتا ہے کرے۔ جو ہم کرتے رہے ہیں وہ آئندہ بھی کریں گے۔" میں نے کہا۔

"میں ان مذاکرات میں فریق نہیں ہوں۔ اور نہ تمہارے معاملات میں۔ میں نے صرف ایک ذمے داری قبول کی تھی" کرنل بولا۔ "تمہیں تریوینی سے ملوانے کی۔ چنانچہ میں تمہیں اس کے سامنے ضرور لے جاؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہئے۔"

ایس پی نے کہا "لیکن باقی لوگ؟"

"مجھے اندیشہ ہے کہ انہیں خطرے کے احساس نے روک لیا ہے" کرنل بولا "ورنہ انہیں اتنی دیر نہ لگتی۔ شاید انہیں اپنے ساتھیوں کی گرفتاری کا علم ہو گیا اور وہ راستہ بدل کے فرار ہو گئے۔"

"مگر ان کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟"

"پہلی بات تو یہ کہ وہ بے وقوف نہیں ہیں۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہر شخص ایک چھٹی حس رکھتا ہے۔ خصوصاً وہ جو خطرات میں گھری ہوئی زندگی گزارے۔ ان سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے لئے اچانک حملہ کر دیں یا کوئی نئی چال سوچ کر آ جائیں۔"

ایس پی نے کہا "ٹھیک ہے۔ ان سے کہو کہ گاڑی میں بیٹھ جائیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "تم کیا روٹھ گئے ہو ہم سے؟ کہ خود نہیں کہہ سکتے۔"

کرنل نے جیب میں سے ایک پین ٹارچ قسم کی چیز نکالی۔ "مسٹر سکندر بخت! اس سے پہلے کہ تم فرار ہونے کی سوچ میں تم کو یاد دلا دوں کہ میں ایک ریسرچ کیمسٹ ہوں اور میرے لئے کسی کا نام نشان تک مٹا دینا ایک کھیل ہے۔ میں آدمی کو تیزابات بنا کے اڑا دوں یا محلول کی طرح ڈرم میں بھر دوں۔ اس کو مفلوج کر دوں یا بے ہوش کر دوں... عارضی طور پر یا ہمیشہ کے لئے۔ یہ بہت معمولی کام ہے مگر میں روایتی طریقے اختیار نہیں کرتا۔ اور نہ کشت و خون ریزی کے لئے اسلحہ استعمال کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہیں یہ جان کر افسوس ہوگا کہ میں دہشت زدہ نہیں ہوا۔"

"گاڑی میں بیٹھنے کے بعد تم نے پھر فرار ہونے کی احمقانہ کوشش کی تو میں تمہیں اعصابی طور پر ناکارہ کر دوں گا" کرنل نے اپنی بات جاری رکھی "جو چیز تم میرے ہاتھ میں دیکھ رہے ہو یہ ایک ریموٹ کنٹرول ہے۔ اس کے بہت سے فنکشنز ہیں۔ ایک بٹن دبانے سے اندر "مسٹرڈ گیس" بھر جائے گی۔ اسے نرو گیس یا اعصابی گیس بھی کہتے ہیں۔ یہ ویسے تو ہلاکت خیز ہوتی ہے مگر میں نے اس کی مقدار کو کم کر رکھا ہے اور اسے کچھ بے ضرر بھی بنا دیا ہے۔ تم تین چار دن بعد اس قابل ہو سکو گے کہ اپنی مرضی سے کچھ کر سکو۔ اپنے جسم کے تمام اعضا پر تمہارا کوئی کنٹرول نہیں رہے گا اور تم بالکل کسی نوزائیدہ بچے کی طرح پڑے رہو گے۔ ایک ہفتے بعد تمہاری ذہنی صلاحیت نارمل بھی ہو سکتی ہے مگر یہ بھی ممکن ہے کہ تمہاری یادداشت جزوی طور پر بحال ہو۔ یا دماغ کے کسی حصے پر اثرات ہمیشہ باقی رہیں۔ تم یقیناً نہیں چاہو گے کہ میں اس بٹن کو دبا دوں۔"

"اگر میں پھر یہ کہتا کہ میں دہشت زدہ نہیں ہوا تو یہ جھوٹ ہوتا۔ ہم سب کرنل کے سرد سفاک لہجے کو اور اس کی دھمکی کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔" اس نے ہمارے تصور میں ایک لرزہ خیز منظر بھر دیا تھا کہ ہم اپنے ہی جسم کی غلاظت میں فرش پر لوٹ رہے ہیں اور جانوروں کی طرح حلق سے بے معنی آوازیں نکال رہے ہیں۔ ہم بھوکے پیاسے پڑے ہیں مگر نہ ہاتھوں پر ہمارا اختیار ہے کہ کچھ کھا پی سکیں اور نہ ہم اس قابل ہیں کہ منہ میں ڈالی جانے والی چیز کو حلق سے اتار سکیں۔ ہم اپنی مرضی سے ایک انگلی نہیں ہلا سکتے۔ ایک لفظ ادا کرنے کے لئے زبان کو استعمال نہیں کر سکتے۔ جسم کے نظام اخراج پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں۔ اعصابی نظام تباہ ہو جانے کے بعد آدمی نالی میں کلبلانے والے کیڑے سے بھی زیادہ بے بس۔ مضحکہ خیز اور قابل رحم ہو جاتا ہے۔ دلاور اور تریوینی جیسے دشمنوں کے سامنے یوں تماشا بننے کی ذلت کا تصور کر کے ہی مجھے پسینہ آ گیا تھا۔

کرنل اپنی بات کا اثر دیکھ کر بہت خوش تھا۔ اس نے کہا۔ "اس ریموٹ میں ایک اور بٹن بھی ہے۔ اس سے گاڑی میں نصب بم کا دھماکا ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "اتنا کافی ہے کرنل صاحب۔ ہم نیک چلنی کی ضمانت دیتے ہیں۔"

ایس پی کے لبوں پر ایک پر تحقیر مسکراہٹ نمودار ہوئی "میں نے سنا تھا کہ تم بڑے حاضر جواب ہو۔ بہت دلچسپ اور پرمزاح باتیں کرتے ہو۔ بلکہ کہنے والے نے تو جوکر کہا تھا تمہیں۔ اب کہاں گئی تمہاری وہ بذلہ سنجی اور حس مزاح۔"

میں نے ایک آہ بھر کے کہا "یہ قصہ ہے تب کا کہ آتش جوان تھا"

ایس پی نے جہالت سے کہا "یہ آتش کون تھا؟ تمہارا کوئی ایسا ہی دوست۔ جوانی میں مرنے کے کام تو تم سب ہی کر رہے ہو"

ابھی اس کی احمقانہ بکواس جاری تھی کہ ایک طرف سے کوئی دھوتی پوش چیختا چلاتا نمودار ہوا۔ "ارے بچاؤ کوئی ہم کا ...! اے جالم ہم کا مارے ہے...."

وہ بالکل سوکھا سڑا فاقوں کا مارا ہوا لگتا تھا۔ اس نے دھوتی کے اوپر کچھ نہیں پہن رکھا تھا چنانچہ اس کے سیاہ بدن پر پسلیوں کا پنجر بھی جھانکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دوڑنے سے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اس کا سینہ دھونکنی کی طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ بھاگتا چلا آ رہا تھا اور کسی کے کچھ سمجھنے سے پہلے وہ ایس پی کے پاؤں سے لپٹ گیا "ہم کا بچاؤ سرکار۔"

ایس پی نے اسے ایک ٹھوکر ماری "ابے سیدھا کھڑا ہو کے بات کر۔"

اس کے تعاقب میں آنے والا بھی نادار نہیں تھا مگر نسبتاً خوشحال نظر آتا تھا۔ اس نے سفید ٹوپی اور پجامے پر سفید قمیص پہن رکھی تھی لیکن پاؤں سے وہ بھی ننگا تھا۔ وہ گالیاں بکتا اور ایک ہاتھ میں گز بھر کے ڈنڈے کو لاٹھی کی طرح گھماتا آ رہا تھا۔ "خبیث الحرام ہم تو وہ طبق روشن کر دیں تیرے۔ سرمہ کر دیں گے تیری ہڈیوں کا بدبخت۔ نمک حرام۔ ہماری شرافت کا خوب صلہ دیا تو نے۔"

مظلوم نے پھر واویلا مچایا "ارے یہ مار ڈالے گا ہم کا مائی باپ۔ دہائی ہے سرکار کی۔" وہ پھر ایس پی کے پیروں سے لپٹ گیا اور اس کے پیچھے چلا گیا "یہ راکشس ہے۔"

ایس پی نے ڈنڈا لے کر دوڑنے والے کو پکڑ لیا "ابے دادا گیری! ارادہ کیا بات ہے؟ کیا بدمعاشی ہے یہ؟"

"بندہ نواز آپ ہمیں خود ہی نمٹ لینے دیں۔" اس نے اپنی تیکھی آواز میں کہا "ہم اس کو ایسی سزا دیں گے" اس نے ڈنڈا گھما کے ایس پی کی آڑ میں پناہ لینے والے کو مارنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک دل دہلا دینے والی چیخ ماری جیسے ڈنڈا لگنے سے اس کا سر پھٹ گیا ہو حالانکہ ڈنڈا ایس پی کی ٹانگ پر لگا تھا۔

ڈنڈا چھین کر ایس پی نے اس کے ایک جھانپڑ دیا "الو کا پٹھا... سیدھی طرح منہ سے بات کر۔ تو بھی سامنے آ۔" اس نے پیچھے چھپ کر کانپنے والے کو گالی دی "خبردار جو کسی نے شور کیا۔"

کرنل نے پولیس والوں سے کہا۔ "تم ادھر ادھر مت دیکھو۔ اپنا کام کرو" پولیس والوں کی نظر گھومی تھی تو ان کی بندوقوں کا رخ بھی تھوڑا سا غلط ہو گیا۔ اب انہوں نے پھر نشانہ درست کیا اور بے حد مستعد نظر آنے لگے۔

فریادی کانپتا ہوا اور لرزتی آواز میں دہائی دیتا ہاتھ باندھے سامنے آ گیا "سرکار! ہم کا مار دے گا ای جالم... ای ہم پہ جھوٹا الجام لگاوت ہے۔ ہم چوری نا ہیں کیے...."

"دروغ گوئی اس کا شعار ہے حضور والا" مدعی نے متکبرانہ لہجے میں کہا۔ وہ ناک میں بولتا تھا اور اس کی آواز بھی زنانہ تھی۔ "ہم نے اسے کہا کہ سچ بتا دے ہماری اہلیہ کے طلائی زیورات کہاں ہیں۔ ہم کچھ نہیں کہیں گے تجھے۔ پہلی غلطی کا پردہ کر دینا شیوہ اسلاف رہا ہے۔ مگر یہ مانتا ہی نہیں سیاہ بخت' سیاہ رو۔"

"ہم کہتے ناہیں چرائے حجور۔ ہم سوگند کھائی کے بولت ہیں۔ مائی باپ۔" ایس پی نے سمجھ لیا کہ یہ چوری کا مقدمہ ہے۔ فریادی پر الزام تھا کہ اس نے مدعی کی بیوی کے زیور چوری کر لئے ہیں۔ ملزم قسم کھا کے کہتا تھا کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ فیصلہ تھانے والے آسانی سے کر سکتے تھے مگر ایس پی نے "حضور۔ سرکار۔ مائی باپ" جیسے خطابات وصول کرنے کے بعد خود ہی منصف کے اختیارات استعمال کر کے وہیں فیصلہ سنا دینا مناسب سمجھا۔

"کتنا کھرا تھا بے تیرا۔ جھوٹ بولا تو کھال ادھیڑ دوں گا..." اس نے مدعی کا ڈنڈا اسی کے رسید کرتے ہوئے کہا۔

وہ چلایا "یہ آپ کیا کرتے ہیں جناب عالی۔ ہمارا نقصان ہوا ہمیں ہی زدوکوب فرماتے ہیں۔ خدارا انصاف فرمائیے۔ ہمارا دس ہزار کا زیور اس نمک حرام نے غصب کر لیا۔ اس پر غضب آپ کی یہ جانبداری...."

ایک لمحے کے لئے تو ان کے مقدمے کی کارروائی نے مجھے بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان میں ایک ان پڑھ اجڈ اور تہذیب سے نا آشنا بھوکاری ٹائپ شخص تھا تو دوسرا لکھنوی تہذیب کا مرقع زبان کے شین قاف سے تعلیم یافتہ اور لباس سے خوشحال نظر آنے والا۔ اچانک میری نگاہ محسن کی طرف گئی اور مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے آنکھ ماری ہے۔ ابھی میں اس سگنل کا مطلب سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک دم سین بدل گیا۔

مظلوم اور فریادی بن کر آنے والے نے بڑی صفائی سے ہاتھ گھمایا اور میں نے ایس پی کو منہ پر ہاتھ رکھے چلاتے سنا۔ اسی وقت ظالم اور مدعی بن کر چوری کا مقدمہ پیش کرنے والا بھی حرکت میں آ گیا اور اس نے بھی بڑی پھرتی سے ہاتھ لہرایا۔ کرنل کے منہ سے ایک گالی نکلی اور اس نے بھی چہرہ چھپا کے شور مچانا شروع کیا تو میرے سامنے ساری صورت حال اظہر من الشمس ہو گئی۔ ظالم اور مظلوم کا کردار کرنے والے سکینا شیمنا تھے اور انہوں نے موقع پاتے ہی ایس پی کی اور کرنل کی آنکھوں میں مرچیں

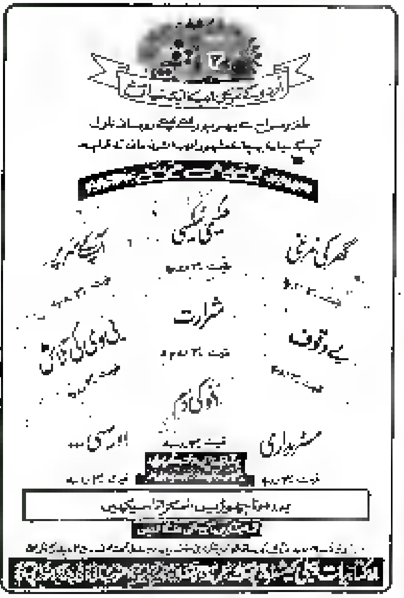

www.paksociety.com

ہوئی لال مرچیں جھونک دی تھیں۔

پہلے ریموٹ کرنل کے ہاتھ میں تھا مگر اب سبین یا شین میں سے کسی کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے اپنا ہی ڈنڈا چھین کر ایس پی کے سر پر مار دیا تھا اور دوسری ضرب کرنل کے سر پر لگانے کے لئے جست لگا کے پیچھے جا چکا تھا۔ میں نے ان کا صرف اتنا ہی ایکشن دیکھا جو مشکل سے دس بیس سیکنڈ کا کھیل تھا۔

پولیس والے رائفلوں کا رخ ہماری طرف کیے کھڑے تھے۔ پہلے تو وہ سمجھ ہی نہیں پائے تھے کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ پھر ان کے لئے مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ اپنی بندوقوں کا رخ ہماری طرف رکھیں یا دوسری طرف کریں جہاں ان کے افسران اعلیٰ پاگلوں کی طرح چلا رہے تھے اور چیخ چیخ کر گالیاں دیتے ہوئے یہ حکم بھی دے رہے تھے کہ انہیں گولی مار دو۔ ان کے لئے فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا کہ اگر ان دونوں بدمعاشوں کو گولی مارنے کے لئے انہوں نے پوزیشن بدلی تو کہیں ہم ان پر حملہ نہ کر دیں۔

میں نے ان کے تذبذب سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں کی۔ میں نے سب سے قریب کھڑے ہوئے پولیس مین پر جست لگائی اور اس کو ایک ایسی فلائنگ کک ماری کہ وہ دوسرے پر گرا۔ دوسرے لمحے اس کی رائفل میرے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ میں نے اس کو نال کی طرف سے پکڑ کر گھمایا۔ ابھی وہ اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ رائفل کا بٹ اس کے سر پر لگا اور وہ چیخ مار کے وہیں گر گیا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور میں اس کا بہتا ہوا خون دور سے بھی دیکھ سکتا تھا جس پر لہو کی سرخی سے بننے والی لکیریں نیچے کی طرف پھیلتی جا رہی تھیں۔

دوسرے سپاہی کو میری کک اتنی قوت سے لگی کہ وہ ہاتھ اٹھا کے تقریباً اڑتا ہوا گیا اور دیوار سے ٹکرا کے اپنے دم توڑتے ہوئے ساتھی پر گرا۔ خون سے اس کے ہاتھ لتھڑ گئے اور اس کا چہرہ رنگین ہو گیا۔ خوف اور دہشت سے وہ پاگلوں کی طرح چلایا اور ایک دم اٹھ کر دوڑا۔ ایسا لگتا تھا کہ اپنے ساتھی کے خون کی بو اور مہک نے ذہنی طور پر اس کا دماغی توازن بگاڑ دیا تھا۔ وہ چیختا ہوا بھاگا جا رہا تھا "یہ خون نہیں ہے۔ یہ خون نہیں ہے۔" اور زور زور سے اپنے ہاتھوں کو جھٹک رہا تھا اور چہرے کو رگڑ رہا تھا۔

تیسرے پولیس مین نے ایک فائر کیا تھا۔ پھر اس کی نظر نے اپنے ایک ساتھی کو دیکھا اور اس کے پاش پاش ہو جانے والے سر سے اُبلنے والے خون کے فواروں کو دیوار پر پڑتے دیکھا تو وہ خوف سے منجمد ہو گیا اور سبین یا شین میں سے ایک اس کے پیچھے جا پہنچا اور دوسرے نے اتنی پھرتی سے اس کو ٹکر ماری کہ وہ

حیران رہ گیا۔ تیسرا پولیس مین لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا تو ایک دم الٹ گیا اور اس کے پیچھے جو شخص تھا اس نے ایک دم اٹھ کے اس کی رائفل چھین لی۔

غالب اور محسن بھی خاموش تماشائی بنے نہیں کھڑے رہے تھے۔ محسن نے مجھ سے پہلے سبین شین کو پہچان لیا تھا۔ چنانچہ وہ بالکل تیار کھڑا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے کرنل کی اور ایس پی کی آنکھوں میں مرچیں جھونکیں، محسن نے کرنل پر حملہ کر دیا تھا۔ اس نے مجھے بعد میں بتایا کہ کرنل تقریباً اندھا ہو چکا تھا مگر زبردست قوت برداشت رکھتا تھا۔ وہ اس وقتی معذوری کو اپنی شکست کا سبب نہ بننے دیتا۔ آنکھوں سے بہنے والے پانی کے ساتھ مرچوں کا اثر کچھ کم ہوتا تو وہ آنکھیں کھول دیتا اور پھر اکیلا ہم سب پر حاوی ہو جاتا۔ چنانچہ محسن نے اس کی معذوری کو دوہرا کرنے کے لئے اس کی آنکھوں کو نشانہ بنایا اور پوری قوت کے ساتھ اپنی دو انگلیاں کرنل کی آنکھوں میں گھونپ دیں۔ اتنی دیر میں سبین یا شین میں سے ایک کی لاٹھی کرنل کے سر پر پڑ چکی تھی اور یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ کرنل کے قدم لڑکھڑا گئے۔

غالب نے دوسرے کے ساتھ مل کر ایس پی کو گھیر لیا تھا۔ محسن کی تقلید کرتے ہوئے اس نے بھی ایس پی کی آنکھوں میں دو انگلیاں گھونپ کے اپنا کام آسان کیا۔ پھر کرنل کی طرح ہاتھ پیر چلاتے ہی ایس پی چکرایا تو محسن نے لات مار کے اسے گرا دیا۔ یہ سب کچھ میں نے نہیں دیکھا کیونکہ میں خود مصروف تھا اور اتنی دیر میں تینوں پولیس والوں سے اسلحہ چھین چکا تھا۔

اچانک ایک کارڈ روم سے ہمارے پاس آ کے رکا اور میں نے اس میں سے ہاتھ کو پھیلا کے باہر نکلتے دیکھا۔ سبین اور شین نے کرنل کو اور ایس پی کو مقابلے کے قابل نہیں چھوڑا تھا لیکن وہ ابھی تک اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے تھے اور یہ جانے بغیر کہ مسلح پولیس فورس تو پہلے ہی کام آ چکی ہے "ان پر فائر کرو" چیخ رہے تھے اور انہیں گالیاں بکتے ہوئے ہمیں گولی مار ڈالنے کے احکامات دینے میں مصروف تھے۔ پہلے میں نے کرنل سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ بیشتر اس سے قبل کے میں نے اس کی کنپٹی پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ وہ کٹے ہوئے تنے کی طرح زمین پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ اب صرف ایس پی بچا تھا۔ ناور نے ایک ہاتھ مار کے اسے لٹا دیا اور وہ شہیدوں میں شامل ہو گیا۔

"مجھے کچھ دیر ہو گئی" اس نے ہاتھ مل کے کہا۔

"بس اب کرنے میں وقت لگ ہی جاتا ہے" غالب نے طنز سے کہا۔

میں کرنل کی جیب میں ہاتھ ڈال چکا تھا کہ پیچھے سے کسی نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ میں نے مڑ کے دیکھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات تیرہواں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

زندہ کرداروں پر مشتمل ایک روایت شکن سلسلہ

نئی سوچ نیا رنگ نیا لہجہ نیا آہنگ

احمد اقبال کے شہریار و شبنم فشاں قلم سے

آئینہ اور دلکش چہروں کا مہیب نظارہ، ناکردہ گناہوں کا سنگین کفارہ۔ نا آسودہ جذبوں کا پیچ و تاب۔ لمحوں کی خوشیاں، صدیوں کا عذاب۔ دامن تہذیب پر رسوائیوں کے داغوں کا قصہ۔ اندھیرے تقسیم کرنے والے روشن چراغوں کا فسانہ۔ معاشرے کے ان ناسوروں کی روداد جو گوشت پوست سے گزر کر ہڈیوں میں اتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلاد دن، سلگتی راتیں، آس و یاس۔ خوف و ہراس، تلخ حقائق، شیریں خواب۔

• •

"ہم نے نکال لیا ہے۔" فراری ہی کے نمودار ہونے والے نے اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے مجھے ایک ریوالور دکھایا جس پر سائلنسر بھی لگا ہوا تھا۔

"تم سکین ہو یا شمین؟" میں نے اٹھ کے اس سے ہاتھ ملایا۔

"ہم شفیع الدین ہیں۔" اس نے کہا "اب فوراً نکل چلیں۔ فائرنگ کی آواز سن کے لوگ بھاگ گئے ہیں مگر ایسا نہ ہو کہ پولیس آجائے۔"

"تم نے واقعی کمال کر دیا۔" میں نے کہا اور دوسرے شخص سے ہاتھ ملایا جو ایس پی کا ریوالور لئے کھڑا ہوا تھا۔

"ہم سمیع الدین ہیں۔" وہ بولا "ہم آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"یہ باتیں کرنے اور تعارف کرانے کی جگہ نہیں ہے۔" نازو نے کہا "چلو یہاں سے فوراً بھاگنے کی فکر کرو۔"

غالب نے کہا "میں تو خود کب سے کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ بھاگ چلو۔"

"غالب! ابھی کوئی آجائے گا۔" نازو نے برہمی سے کہا۔

غالب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے کہا "ایسے نہیں بولنا کہو ماشاءاللہ کوئی آ نہ جائے۔"

"کہیں شامت نہ آجائے تمہاری۔" میں نے کہا "یہ نہیں عاشقی کا یہ وقت۔"

سکین اور شمین بڑی پھرتی دکھا رہے تھے۔ انہوں نے پولیس والوں کی رائفلیں اس گاڑی کی ڈگی میں منتقل کر دی تھیں جس میں سے نازو اتری تھی۔ پھر انہوں نے کرنل کی کار کا بونٹ کھولا۔ سکین نے اندر سے تار کھینچے اور شمین نے اینٹ اٹھایا۔ سکین نے چابی جیب میں ڈالی اور شمین نے کار کے انجن میں سے تار کھینچ کے ایک جھٹکے میں۔ اس نے زنجیری جوڑ کیپ سے پلگ اور ڈسٹری بیوشن کوائل تک جانے والے پانچوں تار الگ کئے اور بونٹ چھوڑ دیا۔ پھر دونوں پولیس کی گاڑی کی طرف لپکے۔

میں نے غالب اور محسن سے کہا "تم اسے ڈگی میں ڈالو کرنل کو۔"

"اسے ہم کہاں لے جائیں گے؟" غالب نے کہا۔

"جہاں خود جائیں گے۔ ایس پی کو چھوڑا جا سکتا ہے لیکن کرنل جیسے خطرناک دشمن کو نہیں۔" میں نے کہا "گاڑی میں اور کون ہے؟"

نازو نے کہا "منو میاں ہیں، وہی گاڑی چلا کر لائے تھے۔"

"اچھا۔ بڑی خاموشی سے بیٹھے ہیں۔ گاڑی بھی بند نہیں کی۔" میں نے کہا اور گاڑی کی طرف بڑھا۔

منو میاں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ بیٹھ کر کہا۔ "السلام علیکم! میرا نام سکندر بخت ہے۔"

"ہمیں معلوم ہے میاں، ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم آپ کو روبرو دیکھ رہے ہیں آج۔" متو میاں نے بڑی چہک کر بڑی گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔

"میں آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں؟"

"میاں! شکریہ تو ہم کو ادا کرنا مشکل ہے۔ جو کچھ آپ ہمارے لئے کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔" وہ جذباتی ہو کے میرے ہاتھ چومتے ہوئے بولا۔ "وہ کتنا بڑا احسان ہے۔"

"متو میاں! ایسی باتیں مت کریں۔ ہم سب ایک ساتھ ہیں، ایک ہی مقصد کے لئے زندہ ہیں۔ کوئی کسی پر احسان نہیں کر رہا ہے۔ ہر شخص اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔ کسی کو شکریے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "آئندہ ایسی فضول رسمی باتوں سے گریز کریں۔ ورنہ غیریت کی بو آتی ہے۔"

ڈگی بند ہو چکی تھی۔ غالب... اور محسن نے پیچھے کے دروازے کھول کر بیٹھتے ہوئے کہا "جناب متو میاں! السلام علیکم" اور متو میاں نے پلٹ کر ان سے بھی انتہائی عقیدت مندانہ جذبات کے ساتھ مصافحہ کیا۔ پھر نازو نے انہیں چابی پکڑا دی اور غالب کے ساتھ ہی پیچھے کی سیٹ پر فٹ ہو گئی۔

"اب چلیں، باقی باتیں بعد میں" نازو نے کہا۔

"مگر وہ دونوں حسن اور شمین نظر نہیں آ رہے ہیں مجھے۔ انہیں بھی تو آنے دو۔"

"گاڑی میں جگہ نہیں ہے۔ وہ آجائیں گے۔" متو میاں نے بے نیازی سے کہا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

میں نے حیرانی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ حسن اور شمین کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ اپنا کام ختم کرتے ہی چھلاوے کی طرح غائب ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے درمیان اشتراک عمل اور ٹیم ورک کا ایسا مربوط سلسلہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا وہ ایک ہی سوچ کے کنٹرول ہونے والے دو مشینی پرزے ہیں۔ کس کو کب کیا کرنا ہے، یہ سب ایک میکانکی عمل تھا جس میں ایک کو دوسرے سے کچھ بھی کہنے یا پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔ زبان خاموشی میں وہ مصروف گفتگو رہتے تھے تو اس ٹیلی پیتھی کی زبان کو تیسرا نہ سن سکتا تھا اور نہ سمجھ سکتا تھا۔ جس پھرتی اور مستعدی کے ساتھ انہوں نے ہر کام کیا تھا اس میں مکمل ہم آہنگی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ظالم اور مظلوم کے ڈرامے کی طرح انہوں نے باقی کام بھی ریہرسل اور مشق کے بعد سر انجام دیئے تھے جبکہ درحقیقت ایسا نہیں تھا۔

جہاں صرف آدھا گھنٹہ پہلے ہم دیوار کی طرف منہ کئے اور ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے، وہاں اب وہ پولیس والے مردہ یا نیم مردہ پڑے ہوئے تھے۔ ان کے قریب ہی ایس پی لیٹا ہوا تھا۔ صرف ایک پولیس والے کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ مر چکا ہوگا۔ ایک دماغ الٹ جانے کے بعد فرار ہو گیا تھا۔ کرنل ہماری گاڑی کی ڈگی میں بند تھا۔ اس خطرناک کوبرا سانپ کو بے بس کرکے پکڑنے والے شکاری حسن اور شمین تھے۔ انہوں نے پھر ثابت کر دیا تھا کہ عقل ہمیشہ بھینس سے بڑی رہے گی۔

جائے واردات پر ہنگامے کا آغاز ہوتے ہی کاروں میں گزرنے والے اپنی اپنی جان بچا کے بھاگنے لگے تھے مگر بعد میں وہاں لوگوں کا جمع ہونا اور پولیس کا آجانا یقینی تھا تاہم ہمارے لئے اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ کار نامعلوم راستوں پر موڑ کاٹتی اس مقام سے دور ہوتی جا رہی تھی جہاں ایک معمولی سی غلطی نے ہمارے لئے بدترین ناکامی کے اسباب پیدا کر دیئے تھے۔ کار ہندوستان کی بنی ہوئی "ایمبیسڈر" تھی اور تقریباً نئی تھی۔

میں نے کہا "یہ گاڑی کس کی ہے؟"

متو میاں ہنسنے لگے۔ "اپنے پاس ہے تو پھر اپنی ہے۔ دہلی سے لی تھی میاں۔"

میں نے کہا "بستی میں کوئی پوچھتا نہیں؟"

"کیوں نہیں پوچھتا۔ سو بار پوچھے۔ ہم ویسے ہی تو نہیں لئے پھر رہے ہیں گاڑی کو۔ ہم مالک ہیں اس کے۔ کاغذات پر ہمارا نام لکھا ہوا ہے اور کاغذات اصلی ہیں۔ ملاؤ ہاتھ اسی بات پر۔"

ہاتھ ملا کے میں نے کہا "مجھے بھی بتا دیں کاغذات میں کیا نام ہے۔"

"میاں وہی جو اپنا نام ہے۔ منیر الدین۔ بس نام ہی صحیح ہے۔ نام سے زیادہ کوئی کچھ پوچھتا بھی نہیں۔ پتہ بدلتا رہتا ہے۔" متو میاں بولے "اور یہ گاڑی بھی خوب ہے۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے۔" وہ چوالیس سال کا عمر رسیدہ آدمی ہونے کے باوجود شوخ طبیعت تھا۔ باتیں کرتے ہوئے ہنستا بھی بہت تھا اور اچانک ہاتھ بڑھا دیتا تھا کہ "ملاؤ ہاتھ اسی بات پر" چنانچہ مخاطب اس کے ہاتھ پر رکھا ہاتھ مارنے یا اسے اپنا ہاتھ پیش کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

"میاں! چھ مہینے سے بس یوں سمجھ لو... کہ سب کی جورو ہے۔ سب کے کام آ رہی ہے اور ہے بھی سب کی۔ نہیں سمجھے؟ ملاؤ ہاتھ اسی بات پر۔"

میں نے اپنا ہاتھ آگے کیا تو انہوں نے اس پر اپنا بایاں ہاتھ چانٹے سے مارا "یہ دو مہینے شفیع کی رہی۔"

"شفیع کون؟" میں نے کہا۔

"اپنا شمین۔ نام تو اس کا شفیع الدین ہی ہے نا۔ اس وقت یہ کالی تھی اور بریلی کی رہنے والی تھی۔ پھر میاں، اس نے شفیع کو چھوڑ دیا اور سمیع کی ہو گئی۔" انہوں نے ایک مصنوعی سرد آہ بھری۔ "اور رنگ بھی اس کا ہو گیا ایک دم سفید اور بن گئی دلی والی۔ اور اب دیکھو کیسی لال ہو رہی ہے۔ نئی نویلی دلہن بنی ہوئی ہے میری دو مہینے سے۔ خاص بمبئی نگری کی ہو گئی ہے۔"

ان کی بات نے ہم سب کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ وہ گاڑی کا ذکر ایسے کر رہے تھے جیسے وہ کوئی داشتہ ہے جو ہر دو مہینے بعد یار بدل لیتی ہے۔ ہمیں ہنستا دیکھ کر وہ خود بھی بہت ہنسے۔

غالب نے کہا "نئی نویلی دلہن نخرے تو بہت کرتی ہو گی۔"

"میاں، بوڑھے مرد کی نوجوان جورو ہو تو بیچارا کیا کرے اگر نخرے نہ اٹھائے۔" متو میاں نے کہا اور پھر ایک ایسی بات کی کہ میں بھی جھینپ گیا۔ پیچھے نازو کو شاید پسینہ آگیا ہو گا مگر متو میاں بے تکلفی میں بڑھتے جا رہے تھے اور بگڑنا ان کی عادت معلوم ہوتی تھی۔ ایسی عادت بعض اوقات دوسروں کے لئے شرمندگی کا باعث بن جاتی ہے کیونکہ بات کرنے والے کو تو احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس نے بچوں یا عورتوں کی موجودگی میں یا بزرگوں کے سامنے کیا بک دیا ہے۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ متو میاں نے قہقہہ مار کے کہا۔ "ملاؤ ہاتھ اسی بات پر" اور مجھے مروت میں ان کی ایک بیہودہ بات پر بھی ہاتھ ملانا پڑا۔ انہیں بعد میں احساس دلایا جا سکتا تھا کہ وہ گفتگو کرتے ہوئے خواتین کی موجودگی کا خیال رکھیں۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں سب چلتا ہے لیکن گھر میں چھوٹے بڑے کے سامنے ستر کی پابندی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

فوری طور پر موضوع بدلنے کے لئے میں نے کہا۔ "آپ گاڑی کا رنگ اور نمبر بدلواتے رہتے ہیں؟"

"بدلواتے کیا رہتے ہیں۔ خود بدلتے رہتے ہیں میاں۔ ہم نے بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ محاورے کی بات نہیں۔ نرائن گنج میں متو پاپڑ والے کا نام آج بھی پوچھ لو۔ حالانکہ یہ بات کئی سال پرانی ہے۔ دس سال پہلے کی۔ پھر ہم ایک رنگساز کے پاس ملازم ہو گئے۔ وہ گاڑی پر رنگ کرتا تھا۔ پانچ سال بعد اپنا ورکشاپ کھول لیا۔"

"لیکن نمبر اور کاغذات کیسے بدل لیتے ہیں آپ؟"

"میاں! لوگ یہاں گھر کے سامان سے دھرم ایمان تک بدل لیتے ہیں۔ پارٹیاں بدلتے ہیں، ملک بدل لیتے ہیں۔ عورت بدل لیتے ہیں۔ محبوبہ، گرل فرینڈ، سیکرٹری، بیوی، داشتہ۔" وہ پھر پٹری سے اترنے لگے تھے "اور خریدنے والے ہر چیز خرید لیتے ہیں میاں۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ پیسے سے ہر کام ہو جاتا ہے۔"

گاڑی اسی وقت ایک پھاٹک کے سامنے رکی جس پر "ارجن داس الومینم" لکھا ہوا تھا۔ گیٹ کے دونوں جانب شیڈ جیسی عمارت کی بے رنگ اور خستہ حال دیواریں تھیں جن پر فلموں کے رنگین پوسٹر نہ جانے کب سے چپکائے جا رہے تھے۔ فیکٹری کے گیٹ پر ہندی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ شاید "داخلہ منع ہے" یا "کوئی جگہ خالی نہیں ہے" ایسے بورڈ اکثر کارخانوں کے باہر لٹکے ہوئے نظر آتے تھے۔

یہ کوئی صنعتی علاقہ نہیں تھا مگر آبادی کے درمیان ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے کارخانے خلاف قانون چل رہے تھے۔ رہائشی علاقوں میں کارخانوں کا سلسلہ پاکستان میں بھی قانونی پابندیوں کے باوجود چلتا تھا۔ بدمعاشی کے زور پر یا پیسے کے زور پر۔ محلے والے غریب لوگ ہوتے تھے۔ اعتراض کرتے تھے تو مالکان خود ان کی زبان بند کر دیتے تھے ورنہ پولیس یہ نیک کام کرتی تھی۔ کئی ان کے لائسنس گھریلو صنعت کے نام پر لئے جاتے تھے۔ بعد میں کچھ بھی ہوتا رہے، کوئی نہیں پوچھتا تھا کیونکہ پوچھنے والے خود شریک جرم ہوتے تھے اور ماہانہ بھتے وصول کرتے تھے۔ غیر قانونی کام نہ ہوں تو رشوت اور بھتے بند ہو جائیں چنانچہ قانون پر عمل درآمد کرانے کے ذمے دار خود قانون شکنی کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش تھے۔

یہ بھی ایک غریب طبقے کی بستی تھی۔ گاڑی جب گیٹ سے اندر چلی گئی تو اسے خود متو میاں نے بند کیا۔ فیکٹری کا احاطہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہاں المونیم کی کھڑکیاں اور دروازے بنتے تھے۔ سیدھے ہاتھ پر ایک کمرا دفتر کا تھا۔ اس کے بعد ایک گودام تھا جس میں تیار مال رکھا ہوا تھا اور خام مال بھی بھرا ہوا تھا۔ بائیں جانب ورکشاپ کے مختلف حصے تھے جن میں مشینیں نصب تھیں۔ کمرا صرف آفس کو کہا جا سکتا تھا۔ باقی سب کھلے شیڈ تھے جن پر سیمنٹ کی چادریں ڈال دی گئی تھیں اور درمیان میں عارضی دیواریں کھڑی کرکے مختلف سیکشن بنا دیئے گئے تھے۔

گاڑی سے باہر آ کے میں نے اوپر کھلا آسمان دیکھا اور ایک بار پھر تحفظ کے خیال کی مسرت نے مجھے زندگی کی خوبصورتی کا احساس دلایا اور میرا دل شکر گزاری اور احسان مندی کے جذبات سے بھر گیا۔ خدا میرا محافظ اور مددگار اور مجھے سلامتی کا راستہ دکھانے والا اور مجھے ہمت دینے والا تھا۔ اس نے کبھی مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ بے شک وہ ہمارا صبر آزماتا تھا مگر ہماری استطاعت کے مطابق اس نے ہمیں جدا کیا اور پھر ملا دیا۔ مصائب سے نبرد آزما ہونا سکھایا لیکن مصائب کو ہماری قوت برداشت میں رکھا یا پھر وقت ضرورت ہمیں اضافی قوت برداشت دی کہ ہم دل برداشتہ نہ ہوں۔ اس نے ہمیں کامیابیوں کے غرور سے بچانے کے لئے ناکامیوں سے روشناس کیا۔ وقت اور حوادث کی بھٹی میں پکنے اور تجربات و حوادث کی آگ میں جلنے کے بعد ہی ہم نے خام لوہے سے فولاد میں ڈھلنا سیکھا تھا۔

ایک پرسکون، خاموش رات کے سائے میں ہم سب خاموش ہو گئے تھے اور شاید ہم سب کے خیالات بھی ایک تھے۔ ان حالات میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی کو دوسرا کوئی خیال آئے۔ ہم سب اکٹھے ہو گئے تھے اور دوستوں کے درمیان تھے۔ دشمنوں کی دسترس سے دور تھے اور ایک مستقبل کا تصور کر سکتے تھے جس میں دوری ناکام ہو اور ناکامی دور ہو۔

ایسے وقت میں رابعہ کا خیال مجھ سے کیسے دور رہ سکتا تھا۔ میں نے اس کا متبسم اور پر امید چہرا اپنے تصور میں روشن کرنا چاہا مگر وہ اداس تھی اور خفا لگتی تھی۔ اس نے کوئی شکوہ نہیں کیا اور کوئی

www.paksociety.com

شکایت نہیں کی۔ بس ایک نظر مجھے دیکھا اور وہ سب کہہ دیا جو زبان سے تمام رات میں نہیں بتا سکتی تھی۔

جب منو میاں نے کہا "بھئی' یہ کیا۔ کوئی آسمان کی طرف منہ کئے کھڑا ہے' کوئی زمین کو گھور رہا ہے۔ میاں سکندر! یہ اختر شماری ہے یا اپنے مقدر کے ستارے کی تلاش۔"

میں نے چونک کر کہا "ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا۔"

"بھئی واہ! یہ تو شعر علامہ صاحب کا ہے۔" منو میاں پھڑک کر بولے "پہلا مصرعہ سناؤ۔"

میں نے کہا "دوسرا مصرعہ ہے۔ وہ خود فراخی افلاک میں ہے خوار و زبوں۔"

"اچھا ہے۔ خوب ہے۔ ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔" انہوں نے میری ہتھیلی پر ہاتھ مارا "اور میاں! تم کیا دیکھ رہے ہو؟ مٹی سے سونا بنانے کی سوچ رہے ہو یا دشمنوں کے عزائم کو خاک میں ملانے کی؟" وہ ایک دم محسن سے مخاطب ہو گیا۔

محسن گم صم اور تنہا تنہا سا کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر جذبات کا کوئی سایہ تک نہ تھا۔ نہ رنج و غم کا' نہ راحت و مسرت کا' نہ اطمینان و سکون کا۔ اس نے زمین پر جھک کے ایک مٹھی خاک اٹھائی اور اسے آہستہ آہستہ چھوڑ دیا۔ "یہ میرا وقت ہے۔ اور میں ہوں۔ اور میرے خواب ہیں۔ صرف ایک مشت خاک کی تگ و دو۔" اس نے اچانک قہقہہ مارا۔ میں سمجھ گیا کہ شملا کے خیال نے پھر اس کے خیالوں پر شبخون مارا ہے اور خطرہ ٹلتے ہی وہ پھر خوف کے پر آسیب صحرا میں شملا کو کسی سراب کی طرح تلاش کرنے نکل گیا ہے۔ منو میاں اس بات پر ہنسنا اور ہاتھ ملانا سب بھول گئے تھے۔

غالب نے نازو کو اشارہ کیا اور اس نے محسن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ایسی مایوسی کی باتیں تم پہلے تو نہیں کرتے تھے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

محسن کسی فرمانبردار بچے کی طرح اس کے ساتھ ہو لیا۔ "تمہیں معلوم ہے وہ خبیث ترویتی کیا کہہ رہا تھا مجھ سے ٹیلی فون پر؟"

نازو نے کہا "میں اس وقت وہیں تھی۔ اس کو دلاور نے یہ پٹی پڑھائی تھی کہ رابعہ یا شملا کے بارے میں ایسا جھوٹ بولو کہ ان مجاہدوں کے چھکے چھوٹ جائیں۔ رابعہ ہمارے ساتھ ہی ہے چنانچہ اس نے شملا کی بات کی تم سے۔"

ان کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے نازو کی ذہانت کی دل ہی دل میں داد بھی دی اور اس کے جھوٹ پر دکھ بھی محسوس کیا۔ آخر ہم کب تک سچ کو دھتکارتے رہیں گے' دھکے دیتے رہیں گے کہ وہ ہمارے سامنے نہ آئے۔ کب تک ہم جھوٹ کی ڈھال کے پیچھے منہ چھپائیں گے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس حقیقت کو غیر معینہ عرصے تک محسن سے چھپانا ممکن نہیں ہو گا۔ بہتر یہی ہے کہ اسے سچ بتا دیا جائے۔ مگر ابھی نہیں۔ آج رات وہ سکون سے سو جائے۔ کل وہ ذہنی و جسمانی طور پر اس قابل ہو گا کہ اس صدمے کی شدت کو برداشت کر سکے۔

احاطے کے سامنے والے حصے کو ایک رہائشی کوارٹر بنا دیا گیا تھا۔ اس میں ساتھ ساتھ تین کمرے تھے جو اندر سے ملے ہوئے تھے۔ تینوں کمروں کا ایک ایک دروازہ برآمدے میں بھی کھلتا تھا۔ اس برآمدے میں ایک طرف کچن تھا اور دوسری طرف باتھ روم۔ کسی بھی کوارٹر کا اس سے آسان نقشہ کیا ہو سکتا ہے۔ ایک کمرے میں منو میاں اپنے دونوں شاگردوں یا فرزندوں سین شین کے ساتھ مقیم تھے۔ دو کمروں کو انہوں نے پہلے سے ہمارے لئے مختص کر رکھا تھا یا اس حصے کو عام استعمال کا مہمان خانہ بنا دیا تھا۔ کمروں میں کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ تینوں کمروں میں والی تو وال کارپٹ بچھے ہوئے تھے اور گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ سبز رنگ کا قالین نیا نہیں تھا مگر اس کے نیچے ربڑ فوم کا انڈر لے بچھانے سے اس کی دبازت انتہائی آرام دہ ہو گئی تھی۔

میرے ذہن میں بہت سے سوالات تھے۔ مجھے نازو سے بہت کچھ پوچھنا تھا اور محسن سے بھی۔ میں منو میاں سے اس جگہ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن قالین پر گرتے ہی تھکن سے چور جسم اور پریشان ذہن کو ایسا سکون ملا کہ مجھے اپنا ہوش نہیں رہا۔ سونے سے پہلے میں نے سوچا تھا کہ موقع ملا تو میں نہاؤں گا اور اطمینان سے کچھ کھانے یا چائے پینے کے بعد سو جاؤں گا لیکن نیند نے بھوک کو شکست دے دی۔ وہ نیند بھی بے ہوشی سے کم نہ تھی۔ دس گھنٹے بعد مجھے منو میاں نے جھنجوڑنا شروع کیا۔ "میاں کیا سوتے ہی رہو گے۔ غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی۔ کہ دو بج گئے۔ ناشتا تو خیر گیا مگر کیا خواب میں پلاؤ قورمے کھا کے لنچ کرو گے؟ ہم تو فاقے سے نہیں مر سکتے تمہارے ساتھ ویسے جان حاضر ہے۔"

میں نے اٹھ کر جماہی لی۔ پھر ایک انگڑائی لی۔ آنکھیں ملیں اور ادھر ادھر دیکھا۔ منو میاں ریکارڈر کی طرح بجے چلے جا رہے تھے۔ مجھ سے کچھ دور نازو الٹی پڑی تھی۔ اس کے ساتھ غالب نے یوں زاویہ قائمہ بنا رکھا تھا کہ نازو کے سر کو اس کے پیر چھو رہے تھے۔ محسن دیوار میں گھس گیا تھا اور ان سب کی نیند اتنی گہری تھی کہ منو میاں کے شور سے کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔

میں نے کہا "یہ سب بھی ایسے ہی سو گئے تھے۔ کچھ کھائے پئے بغیر؟"

"میاں لہو سوار کا حال وہ جیلے کا۔ ملاؤ اسی بات پر ہاتھ" منو میاں نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ "ادھر تم اتنا قتیل ہوئے ادھر تمہاری قوم۔ ہم تو پوچھتے ہی رہ گئے کہ بھئی کچھ کھا لو۔ چائے یا کوئی لیکن جواب ندارد۔"

میں نے کہا "منو میاں! وہ کرنل۔ وہ تم نے نکالا یا نہیں؟"

"وہ تو رات کو ہی نکال لیا تھا۔ ایک پنجرے میں بند ہے۔" منو میاں بولے "بھاگ بھی نہیں سکتا اور مر بھی نہیں سکتا۔"

"اور سین شین کہاں ہیں؟ کسی کام سے گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کھانا بنا رہے ہیں بڑے شوق سے۔" منو میاں نے کہا "پورا دعوت کا انتظام کر لیا ہے۔"

میں نے کہا "کمال کے لوگ ہیں۔ ہر کام کر لیتے ہیں۔ مجھے محسن نے آپ سب کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ یہاں آپ لوگوں کا ملنا ہمارے لئے تائید ایزدی ہے۔"

"تم نے پھر شروع کر دیں نا غیروں والی باتیں۔ اب ہم بھی کہیں گے کہ تائید ایزدی تو ہمارے حق میں تم ہو۔" منو میاں بولے "خدا نے ہماری تلاش کو کامیاب کیا ورنہ ہم بہت مایوس ہو چلے تھے۔"

میں نے کہا "یہ جگہ کس کی ہے؟"

منو میاں نے کہا "ہم یہاں ہیں تو ہماری ہے ہمارے بعد کوئی بھی آئے۔ اپنی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے۔ یا دونوں ایک ساتھ رہیں۔ آخر وہ جو پہلے بھی تو رہتا تھا ایک جنی کے ساتھ۔"

میں نے انہیں ٹوک دیا۔ "آپ بھٹک جاتے ہیں۔ آخر یہ کیا مسئلہ ہے؟"

"کوئی مسئلہ نہیں میاں۔"

میں نے کہا "اکیلے میں تو کوئی بات نہیں۔ لیکن ہم بہت کم اکیلے ہوتے ہیں۔ ابھی صرف نازو ہے۔ شام تک رابعہ اور گل بھی آ سکتی ہیں۔ ان کی موجودگی میں۔"

"لاحول ولا قوۃ! ہم کیا سمجھتے نہیں یہ بات!" منو میاں نے آزردہ ہو کے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ انہیں سمجھانا فضول ہے۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پر کوئی بات کر جاتے ہیں جس کا انہیں احساس بھی نہیں ہوتا۔ آخر وہ انہیں غلط وقت پر غلط بات کرتے ہوئے ٹوکنا پڑے گا۔

"باہر کسی المونیم فیکٹری کا بورڈ لگا ہوا ہے۔" میں نے موضوع بدل کے کہا۔

"تو کیا یہ المونیم فیکٹری نہیں ہے؟ تم نے دیکھا نہیں۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ اس پر جو نام لکھا ہے' ارجن داس۔ کیا وہ مالک ہے؟"

"ہاں' مالک ارجن داس ہی ہے۔" منو میاں بولے "لیکن ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

"یہ ایک ہندو کی جگہ ہے جس پر آپ نے خود بھی قبضہ کر رکھا ہے اور ہمیں بھی یہاں لے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔

منو میاں ہنسے "میاں! ہم کچی گولیاں نہیں کھیلتے۔ کارخانے کے نام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مالک ہندو ہو گا۔ نام وہی چل رہا ہے مگر مالک بدل گیا ہے۔ اس کا یہ کارخانہ دولت کے مقدرے بازی کی نذر ہو گیا تھا اور بند پڑا تھا۔ انکم ٹیکس اور قرض خواہوں کے واجبات کی وصولی کے لئے اس کو نیلام کیا گیا۔ اتفاق سے ہم یہیں موجود تھے۔ ہم نے بھی بولی لگا دی ایک دوست کے نام سے اور ادائیگی کر کے قبضہ بھی لے لیا۔ ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ دن بھر میں جتنی بار ہاتھ ملانے کی ضرورت پیش آئے اس کا حساب رات کو فرصت ملتے ہی بے باق کر لیا جائے؟ دس بیس یا سو پچاس مرتبہ ہاتھ ملایا اور سو گئے۔" میں نے کہا۔

منو میاں نے قہقہہ مار کے کہا "یہ بھی اچھی رہی میاں۔ ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔" اور میں نے بلا ارادہ ہاتھ آگے کر دیا۔ یہ منو میاں کے فیضان صحبت کا اثر تھا۔

"آپ کا یہ دوست کون ہے؟ میرا مطلب ہے بھروسے کا آدمی ہے نا؟"

"لو۔ جس پر بھروسا نہ ہو وہ دوست کیسے ہوا؟ اگر یہ کہتے کہ ایک جاننے والے کا ہے یا میرے اموں سسر کے سمدھی کے نواسے کا ہے تو تم یہ سوال کر سکتے تھے۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ ہمارا ہے۔ تمہارا دوست سامنے آنا بھی نہیں چاہتا۔ ذرا ڈرتا ہے کیونکہ اسے بہرحال یہیں رہنا ہے اور کاروبار بھی کرنا ہے مگر وہ ہمارا' سب مسلمانوں کا اور تمہارا ہمدرد اور دوست ہے۔ اس نے کہہ دیا ہے کہ جب تک چاہو یہاں رہو۔ کارخانہ پہلے بھی بند پڑا ہوا تھا' اب بھی بند ہے' کسی کو ہمارے آنے جانے پر شک نہیں ہو سکتا۔ یہاں ویسے بھی شک کرنے کی فرصت کسے ہے۔"

"اور اگر ہماری وجہ سے تمہارے اس دوست پر کوئی مصیبت آئی؟"

"اچھا سوال ہے میاں' یہ میں نے بھی سوچا تھا۔ سوچا کیا تھا' اس سے پوچھا بھی تھا اور اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ منو میاں' اپنی ذمے داری پر کچھ بھی کرو۔ میں کچھ نہیں کہوں گا لیکن تم پکڑے گئے تو میں تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کروں گا۔ مجھے کہنا پڑے گا کہ کارخانہ تو دو سال سے بند اور لاوارث پڑا ہوا تھا۔ کوئی گھس کر بیٹھ گیا تھا تو میرا کیا قصور ہے۔ مجھے تو قبضہ لئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ اس وقت قبضہ دلانے والے سرکاری اہلکار بھی ساتھ تھے اور انہوں نے کسی کو دیکھا ہوتا تو نکال باہر کرتے۔"

"یہ بھلا کیا دوستی ہوئی؟"

"کسی کی مجبوری کو بھی سمجھا کرو میاں' اس نے پہلے بھی بہت مدد کی تھی۔ پھر نقد رقم خرچ کر کے یہ جگہ خریدی اور ہمارے حوالے کر دی ورنہ ہم کہاں چھپتے پھرتے۔ یہاں ہم بہت محفوظ ہیں۔ ہمارے ساتھ وہ کیوں پکڑا جائے؟ یہ تو نیکی کرنے والے کو دریا میں ڈالنے والی بات ہوئی۔ وہ باہر رہے گا تو ہمارے لئے بہت کچھ کر سکے گا۔ اندر ہو گیا تو اس کا خاندان اور کاروبار سب تباہ ہو جائے گا

www.paksociety.com

کیونکہ وہ مسلمان ہے اور کسی مسلمان پر اس سے زیادہ سنگین الزام کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ مشرقی پاکستان کے محب وطن مسلمانوں کا ہمدرد ہو یا مغربی پاکستان کے دہشت گردوں کا مددگار ہو۔ چلو میاں اب باقی باتیں ہوں گی بعد میں۔ تم فاقہ زدہ ہو۔ میں ابھی دیر میں سب کو اٹھاتا ہوں۔ تمہارے سائز کے کپڑے غسل خانے میں رکھ دیے ہیں۔ میرا خیال ہے ٹھیک ہی ہوں گے۔ ہم نے اندازے سے لیے تھے۔

میں منو میاں کے حسن انتظام کا قائل ہو گیا۔ انہوں نے محسن سے مشورہ کرتے ہوئے ہم سب کی ضرورت کے مطابق کپڑے خرید لیے تھے۔ ہمارے اپنے کپڑے نہ صرف یہ کہ بہت غلیظ اور میلے ہو چکے تھے بلکہ ہماری پہچان کا ایک حصہ بھی بنے ہوئے تھے۔ اب ہم بمبئی میں اپنے اصلی چہروں کے ساتھ بے خوفی سے نہیں گھوم سکتے تھے۔ گزشتہ شب کی واردات سے پہلے ہی ہماری تصاویر مشتہر ہو چکی تھیں اور اب یہ بات یقینی تھی کہ بمبئی کی پولیس کو بھی ہم اتنے ہی مطلوب ہوں گے جتنے کبھی لاہور کی پولیس کو عزیز تھے۔

مین اور شمن نے اپنے ماہر باورچی ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ وہ مغلئی کھانے نہیں پکا سکتے تھے مگر انہوں نے تین طرح کی مچھلی تیار کی تھی۔ جھینگوں والے چاول پکائے تھے جو چائنیز انداز کے "فرائیڈ رائس ود پران" کہے جا سکتے تھے۔ یہ مشرقی پاکستان میں رہنے کا اثر تھا کہ وہ مچھلی اور چاول اسپیشلسٹ ہی بن سکے تھے۔ نیند پوری کر کے اٹھنے کے بعد میری طرح سب کا بھوک سے برا حال تھا۔ محسن کھانے کے دوران بھی خاموش رہا۔ اس کا رویہ عجیب بجھا بجھا سا ہو گیا تھا۔ اس کی طبیعت کی فطری شوخی اور مزاج کا چلبلا پن۔ اس کی حاضر جوابی۔ غالب سے چھیڑ چھاڑ کی عادت اور زندہ دلی سب پر ایک بے نام سی اداسی کا پردہ پڑ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہے مگر میرے پوچھنے پر وہ ٹال گیا۔ اس نے کہا کہ یہ صرف تھکن کا اثر ہے مگر میں جانتا تھا کہ یہ تھکن نہیں اس کے دل کا آزار بن جانے والی خلش ہے جس سے وہ پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اگر وہ کہتا کہ میرا دل نہیں مانتا کہ تریوینی جھوٹ بول رہا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ہم پر اتنے بڑے جھوٹ کے شبہے کا اظہار بھی کرتا تو یہ دوستی کے خلوص کو گالی دینے کے مترادف ہوتا۔ نازو کی یقین دہانی نے اسے قائل کر لیا تھا مگر مطمئن نہیں کیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ منو میاں کے ساتھ برآمدے میں کرسی ڈال کے بیٹھ گیا۔ منو میاں بولتے رہے اور وہ سنتا رہا۔ میں اس کی دلی کیفیت اور اس کے جذبات کا اندازہ کر سکتا تھا۔ اس کے دکھ کو غالب بھی سمجھتا تھا اور نازو بھی جانتی تھی۔ ہم سب نے مل کے ایک جرم کیا تھا اور آج تک اس کو چھپانے میں کامیاب تھے مگر اب افشائے راز کو روکا نہیں جا سکتا تھا چنانچہ ہم سب ڈرے ہوئے تھے۔

نازو نے سب سے پہلے کہا "سکندر رات کو میں نے اس لیے جھوٹ بولا تھا۔"

"آہستہ بولو۔ مجھے معلوم ہے تم نے کیوں جھوٹ بولا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میں نے یہ حماقت کیوں کی تھی۔ کیوں چھپایا تھا حقیقت کو" میں نے کہا اور محسن کی طرف دیکھا مگر وہ اتنی دور تھا کہ ہماری گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔

"تم نے اس وقت گل کو بچایا تھا۔ تمہارا اور ہم سب کا خیال تھا کہ ایسا نہ کیا گیا تو وہ نانگ منی ہی رہے گی۔ ایک ڈاکو کی بہن۔ وہ کبھی گل بانو نہ بن سکے گی۔ اور یہ غلط نہیں تھا۔ یہ محسن کی چاہت ہی تھی جس نے نانگ منی کو زندگی کے نئے راستوں پر ہمارے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔" غالب بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مرزا غالب! اس وقت ایک زندگی کو بچانے کے لیے ہم نے ایک جھوٹ بولا تھا۔ پھر ہم اس جھوٹ کے جال میں پھنس گئے اور اس جھوٹ کو نبھانے کے لیے مسلسل جھوٹ بولتے رہے۔ ہم گل سے یہ بات چھپاتے رہے کہ محسن کسی اور کا ہے اور کبھی اس کا نہیں ہو سکتا۔ اب اسے بھی یقین آ گیا ہے کہ شملہ نام کی کوئی لڑکی محسن کی شریک حیات نہیں۔ اس کے بچے کی ماں نہیں اور اس یقین کے ساتھ وہ محسن کے دل میں اپنی جگہ بنانے کے لیے مرتوڑ کوشش کر رہی ہے۔ سوچو! جب اسے ہمارے جھوٹ کا علم ہو گا تو اس پر کیا بیتے گی۔ اب یہ ایک کی زندگی کا نہیں دو کی زندگی کا سوال بن گیا ہے۔"

نازو نے متفکر لہجے میں کہا۔ "مجھے وہ سب بتانا پڑے گا جو تریوینی نے کہا تھا۔" وہ غسل کے بعد کپڑے بدل چکی تھی اور گھٹنے پر ٹھوڑی رکھے اپنے پیروں کے ناخن ایک بلیڈ سے کاٹ رہی تھی۔

"اگر ہم نے اسے کچھ نہ بتایا تو وہ خود معلوم کر لے گا لاہور فون کر کے۔ اور وہ زیادہ بری بات ہو گی۔" غالب نے کہا "ہم اسے سچ بتا سکتے ہیں کہ ہم نے ایسا کیوں کیا تھا۔ یہ ہماری مجبوری تھی۔ ہماری جگہ وہ ہوتا تو وہ کیا کرتا؟"

"وہ بھی مجبور ہوتا۔" میں نے اس سے اتفاق کیا اور ایک گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کے لیٹ گیا۔

"تریوینی سے تمہاری ملاقات کیسی رہی۔" غالب نے کہا اور دوسرا گاؤ تکیہ لے کر لیٹ گیا۔

نازو ہنستی رہی۔ "بہت مختصر۔ مجھے اس کے سامنے حاضر کرنے والوں میں سے ایک نے میرا بازو پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کا بازو توڑ دیا۔ انہوں نے گالیاں بہت دیں مجھے مگر اب میں بھی عادی ہو گئی ہوں کہ کتے بھونکتے رہیں اور میں سنی ان سنی کرتی رہوں۔"

"تریوینی کے ساتھ ولاور بھی تھا۔"

"نہیں۔ ولاور وہاں نہیں تھا۔" نازو نے کہا۔ "حسب توقع تریوینی نے بھی بہت کوشش کی کہ یہ اچھا ہوا۔ یک نہ شد دو شد۔ ۔ ۔

شملہ کے ساتھ مجھے بھی بارود کے ڈھیر پر بٹھانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ مگر اسی وقت تمہارا فون آ گیا۔ پھر لائٹ چلی گئی۔ دیا گل ہو رہا تھا۔ یہ تو خود میں نے بھی دیکھا۔ شیشے کی دیوار سے لائٹس جلتی بجھتی نظر آ رہی تھیں۔ ایک کے بعد دوسری لائٹ جلتی تھی اور بالکل ایسا لگتا تھا جیسے ہر دس قدم کے فاصلے پر اندھیرے میں کوئی کھڑا ہے۔"

میں نے کہا "وہ صرف دو افراد کا کھیل تھا۔ سمن اور شمن کا۔ ایک لائٹ جلا کے بجھاتا تھا تو دوسرا جلاتا تھا۔ اتنی دیر میں پہلا دوڑ کر اس سے دس قدم آگے نکل جاتا تھا اور پھر لائٹ کا سلسلہ بنا تھا تو لگتا ہو گا کہ یہ تیسرا شخص ہے۔ پھر دوسرا بھاگ کر چوتھے شخص کی جگہ پہنچ جاتا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ یہ زبردست خوفزدہ کر دینے والا حربہ تھا۔ تریوینی بدحواس ہو گیا تھا۔ لائٹ جاتے ہی اس کا سارا دم خم جواب دے گیا۔ وہ بدمعاش ضرور بنا ہوا ہے لیکن اپنی دولت کے بل پر۔ کسی حد تک ہر سرمایہ دار اپنی طاقت کے غرور کو جائز سمجھتا ہے۔ تریوینی وہ بدمعاش نہیں ہے جو صرف بدمعاش ہوتے ہیں۔ وارداتیں کرتے ہیں، گروہ بناتے ہیں اور جیل جا جا کے دادا کے منصب عالیہ پر فائز ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ کاروباری آدمی ہے جو سہاروں کے بغیر ہوا لگا ہوا غبارہ ہو جاتا ہے۔ ٹیلی فون ۔ ۔ ۔ بہت کامیاب ڈراما تھا۔ صرف ایک کمی تھی۔ اگر وہ اس کا فون پولیس سے یا ولاور سے رابطہ قائم کرتا تو یہ لائن بھی کٹ جاتی۔"

سمن ہمارے لیے چائے لے کر آیا تو وہ خاموش ہو گئی۔ منو میاں نے چائے منگائی اور محسن کے لیے چائے باہر ہی لے گئی تھی چنانچہ سمن کے جاتے ہی نازو نے اپنی بات پھر شروع کی۔

"بس اس نے افراتفری میں ٹیلیفون کو ہاتھ لگایا۔ ڈرائیور کو جگایا اور گاڑی نکالنے کو کہا کہ مجھے واپس لے جائے۔ میں وہ گالیاں نہیں دہرا سکتی جو اس نے آپ سب کو دی تھیں۔"

"تم نے اس سے کچھ نہیں کہا؟"

"میں نے؟" نازو ہنسی "سنو گے تو جل جاؤ گے۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے کیوں واپس بھیج رہے ہو۔ اس کنگال لوٹے میں مجھے اس محل میں اپنی داسی بنا کے رکھ لو۔ اس نے مجھے گالیاں دیتے ہوئے کہا کہ وہ تو تیرے ساتھ ہے۔ اس سے کہہ کہ تجھے ایسا ہی محل بنا دے۔ بنوا سکتا ہے وہ۔ اگر شرافت سے ہماری بات مان لے۔ میں بتا کے دوں گا۔ میں نے کہا کہ کوئی مارو اس افریقی بندر جیسے منہ والے کو۔ میں تو تم پر مرمٹی ہوں۔ تمہارا اس کا کیا مقابلہ۔ تم ایک جینٹلمین ہیرو ہو۔ یہ کل میرے نام کر دو۔"

غالب نے کہا "کیا تمہیں یہ خطاب دیے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا؟"

"میں نے کہا تھا نا جل جاؤ گے۔ بس میں تو اسے جلا رہی تھی۔"

"یعنی حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ جینٹلمین ہیرو میں ہوں اور ۔ ۔ ۔"

"مطلب آپ نکالتے رہیں۔" نازو نے جھنجھلا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "اس نے چلتے وقت مجھ سے کہا کہ میں لعنت بھیجتا ہوں اس دن پر جب میں نے تمہاری منحوس شکل دیکھی اور ولاور سے بات کی۔ میری بیٹی جیتی بھی تھی میرے پاس تھی۔ اب میرے پاس صرف راکھ ہے اس کی۔ میرے کروڑوں خاک میں مل گئے۔ میں برباد ہو گیا۔ دیوالیہ ہو گیا۔ خیر یہ آخری بازی ہے۔ اگر اس میں میرا مال نہ آیا تو شملہ کی اور اس کے بیٹے کی جان جائے گی۔ باؤ پھر کوشش کر دو انہیں بچانے کی۔ میں نے بھی اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ میں خود آگ لگا دوں گا بارود میں۔ سب کو مار ڈالوں گا۔ ولاور کو بھی اور اس کی ساری چنڈال چوکڑی کو بھی۔ پھر میں خود بھی مر جاؤں گا۔ اس کے بعد میں جی کے کیا کروں گا۔ سیٹھ تریوینی سڑکوں پر بھیک مانگے گا۔ میرا بال بال قرضے میں بندھا ہوا ہے۔ جائیداد کی اینٹ اینٹ رہن رکھی جا چکی ہے۔ میرے پاس اپنا کچھ نہیں رہا۔ سب اس حرامزادے کے چکر میں پڑنے کی سزا ہے۔ وہ ولاور کا دشمن ہو رہا تھا یا گل بن میں۔"

میں نے کہا "وہ بری گت ہے۔ یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ شملا کو بچالیں اور تریوینی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا اور اس سے پہلے ولاور اینڈ کمپنی کو ختم کرتے ہیں۔ اب تو ایک طرح سے وہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔"

غالب نے کہا "کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ ولاور نے اسے تباہ کر دیا مگر وہ خود ابھی تک تباہ نہیں ہوا؟"

"وہ بندوق تریوینی کے کندھے پر رکھ کے چلا رہا تھا" میں نے کہا "تریوینی کے کاروبار کی نوعیت مختلف تھی مگر وہ لالچ میں آ گیا۔ باتوں سے ولاور نے اسے بے وقوف بنا لیا ہو گا کہ ایک کروڑ لگاؤ اور ہفتہ دس دن بعد دو کروڑ لے لو۔ نقصان ولاور نے بھی اٹھایا تھا مگر اتنا بڑا نہیں۔ اور اس نقصان میں دوسرے بھی شریک تھے جن کو تریوینی چنڈال چوکڑی کہہ رہا ہے۔ خیر یہ بتاؤ کہ اور کیا کہا اس نے؟"

"اور کیا کہتا۔ زیادہ وقت تو اس نے گالیاں بکنے اور شراب پی پی کر تمہیں کوسنے میں صرف کیا" نازو ہنسی "وہ اپنے آپ کو، ولاور کو اور تمہیں۔ اور ان سب کو گالیاں دیتا رہا جو اس کی تباہی کے ذمے دار تھے، اس کے نالائق ساتھی۔ بانکے رام جیسے وحشی۔"

"اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے کچھ پتا چلے کہ اب مال کس راستے سے اور کب جائے گا؟" میں نے کہا۔

"شراب وہ بالکل پاگل بھی نہیں ہوا تھا۔ ایسی بات اس کے منہ سے نکل جاتی تو پھر باقی کیا رہتا۔ وہ مجھے بھی گولی مار دیتا اور خود بھی وہیں مر جاتا۔ بعد میں تو مجھے اس کی وحشت اور دیوانگی سے خوف آنے لگا تھا لیکن میں بھی بالکل تیار تھی کہ ایسی ویسی کوئی بات

www.paksociety.com

ہوئی تو میں تریوینی کا وہیں کام تمام کر دوں گی۔ اس کے بعد کچھ بھی ہو، تریوینی کے کتے میرے بوٹیاں کھا جائیں۔"

"یہ بہت احمقانہ خیال تھا" غالب نے برہمی سے کہا "تم کیا سمجھتی ہو؟ وہ تمہیں مار ڈالتے۔ وہ تمہاری بوٹیاں کھاتے رہتے لیکن تم کو مرنے نہ دیتے۔"

"فضول مت بولا کرو۔ میں اکیلی تھی اور مجھے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ بچ کے واپس آ سکوں گی یا نہیں۔ اور کیا کرتی میں اگر اسے مارنے کا نہ سوچتی؟" نازو نے احتجاجاً کہا اور پھر ایک دم اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ وحشت کے ایک صبر آزما مرحلے کا مقابلہ کرتے ہوئے اس نے اپنا تمام حوصلہ پہلے ہی ہار دیا تھا۔ وہ ذہنی و جسمانی طور پر نارمل نظر آ رہی تھی مگر اس کے لاشعور میں خوف کا آسیب تھا جو کسی کمزور لمحے میں اس کو دبوچ لینا چاہتا تھا۔ اور غالب کی بات جذبات کی اس چٹان کو لڑھکانے کا بہانہ بن گئی جس نے اشکوں کے سیلاب کو روک رکھا تھا۔ اسے ایک ٹھیس بہت تھی۔

ظاہر ہے اس کے بعد غالب نے اسے ستایا اور میں نے بھی اسے سمجھایا کہ غالب کا مقصد ہرگز اس کی دلآزاری نہیں تھا۔ سارا قصور اعصابی کشیدگی کا اور جذباتی دباؤ کا تھا کہ ہم سب اپنے رویئے معتدل اور متوازن رکھنے میں ناکام تھے۔

"دیکھو میں شاعری تو کر نہیں سکتا کہ روتے ہوئے تمہاری کالی آنکھیں ساون کی گھٹا لگتی ہیں۔ اور آنسو تمہارے رخساروں پر ایسے لگتے ہیں جیسے صبح دم برگ گل پہ قطرۂ شبنم۔ یہ اتنا خوب صورت منظر ہوتا تو میں کہتا کہ روتی رہو شام تک۔ یا میں اشکوں کے یہ گوہر آبدار پلکوں سے چن سکتا تو شام کو ان موتیوں کے ہار تمہارے گلے میں ڈال دیتا۔"

میں نے کہا "مرزا! یہ جدید شاعری ہے۔"

غالب نے کہا "اچھا یار، غلطی سے شاعری ہو گئی۔ میں تو اسے صرف یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ روتے ہوئے یہ ذرا بھی اچھی نہیں لگتی۔"

"اچھی نہیں لگتی تو مت دیکھو میری طرف" نازو نے خفگی سے کہا۔

"مگر تم روتی ہو تو میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے" غالب نے کہا۔

"کیا ہونے لگتا ہے؟" نے کہا "اپنڈی سائٹس۔ یرقان کا ٹٹس۔"

غالب نے سوچ کے کہا "بچپن میں ایک قربانی کے بکرے کو میں نے دادا جان کی کوئی معجون کھلا دی تھی۔ آدھا پاؤ کے قریب۔ اور پھر تین دن برا ساتھ کا پانی پلا رہا تھا۔ اس کی جو حالت ہوئی تھی بس ویسی ہی حالت۔"

نازو روتے روتے ایک دم ہنس پڑی "شرم نہیں آتی۔"

"شرم تمہیں آنی چاہئے۔ روتے روتے ہنسنے کا مطلب یہ ہے کہ سب ایکٹنگ تھی۔ ویسے ہی کہہ دیتا تھا کہ میرا دل چاہ رہا ہے تم مجھے مناؤ۔ میرے سامنے ہاتھ جوڑو۔ ناک سے لکیریں نکالو۔ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں تمہیں خوش دیکھنے کے لئے۔"

میں نے اس کی تائید کی "ہاں۔ اگر عورتیں اس ڈرامے سے خوش ہوتی ہیں تو کوئی حرج نہیں انہیں یوں بیوقوف بنا کے اپنا کام نکالنے میں۔"

"یار، اس جذباتی مخلوق کو عقل کی لاٹھی سے جدھر چاہو ہانک دو۔ آخر یہ بھی تو ہمارا استحصال کرتی ہیں۔ عشوہ و غمزہ و ادا سے کیا ہم بے وقوف بنتے ہیں؟"

"قطعی نہیں۔ ہم تو صرف یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مر گئے۔ قتل ہو گئے۔"

نازو نے کہا "اچھا سکندر! میں بتاؤں گی رابعہ کو۔"

میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا "رابعہ۔ زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا۔ میں جا رہا ہوں۔ وہ مجھے بلا رہی ہے۔"

غالب نے کہا "میں بھی ساتھ چلوں گا۔ ایک اکیلا دو گیارہ۔"

"اور تین ایک سو گیارہ" نازو نے کہا۔

میں نے اسے روک دیا "جو کام گیارہ آدمی کر سکتے ہوں اسے ایک سو گیارہ صرف سرکاری دفاتر میں کرتے ہیں۔ تم ایک زیادہ مشکل کام کر سکتی ہو یہاں۔"

نازو سمجھ گئی "جی نہیں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں محسن کے سامنے تم سب کے جھوٹ کا اعتراف کروں۔"

"کیا تم نے جھوٹ نہیں بولا تھا؟ بچی کی بچی۔"

میں نے کہا "ہمارے جھوٹ کا نہ سہی، تم اپنے جھوٹ کا اعتراف کر لو۔ دیکھو نازو! یہ ذرا نازک کام ہے۔ دلجوئی اور غمگساری۔ ہمدردی۔ مسیحائی۔ یہ عورت بہتر طور پر کر سکتی ہے۔"

"چلو چلو۔ باتوں سے بے وقوف مت بناؤ" نازو نے بگڑ کے کہا "ایسا ہی ہے تو اپنی ان سے کہنا۔ وہ وکیل بھی ہیں۔ سولہ کل سے بھی قائل کر لیں گی اور تمہیں جھوٹ کے الزام سے بری کرا لیں گی۔ بلکہ سچا ثابت کر دیں گی۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے تم انکار نہیں کر رہی ہو دل سے۔"

غالب نے کہا "ویسے بھی عورت کی نا ہی کی ہاں ہوتی ہے۔"

منو میاں برآمدے میں بیٹھے اپنی سوانح حیات کا کوئی قصہ ہوشربا بڑے ذوق و شوق سے سنا رہے تھے اور انہیں محسن کی شکل میں ایک بہت اچھا سامع میسر آ گیا تھا جو نہ صرف یہ کہ اس داستان عشق کو صبر کے بغیر سن رہا تھا بلکہ ان کی ہر بات پر ہاتھ ملانے پر بھی تیار تھا۔ یہ صرف میں اندازہ کر سکتا تھا کہ محسن کے کان منو میاں کی آواز ضرور سن رہے ہیں لیکن اس کا دماغ کہیں اور ہے۔ اس کے تصور میں منو میاں کی اسٹوری والی ہیروئن نہیں ہے۔ شملا

ہے۔ اس کا اشتہاک معنوی ہے اور وہ محض مروت میں بندھا بیٹھا ہے۔

"آپ کدھر چل دئے میاں۔ آپ سے تو بڑے اہم امور پہ تبادلہ خیال کرنا تھا" منو میاں ہمیں دیکھتے ہی چہکے۔

میں نے کہا "ہم ایک بہت ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ امید ہے دو تین گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔"

منو میاں کا چہرہ متفکر ہو گیا "کیسے جاؤ گے؟"

میں نے کہا "آپ کی وہ لال پری کہاں ہے؟"

"مگر کیا تمہیں راستہ معلوم ہے؟" "تم پکڑے نہ جاؤ۔ بہت سخت چیکنگ ہو رہی ہے۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" غالب نے کہا۔

"سکین شین گئے تھے بازار۔ وہی رپورٹ لائے ہیں" منو میاں بولے۔

"لیکن ہمارا جانا بے حد ضروری ہے۔ ہم نے وعدہ کیا تھا اور اگر ہم نہ پہنچے تو بڑی خرابی ہو جائے گی۔ وہ نہ جانے کیا سمجھیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خود ہمیں ڈھونڈنے کے لئے نکل کھڑے ہوں۔"

"اچھا۔ تو پھر یوں کرو کوئی ٹیکسی لے لو۔ لینے کا مطلب سمجھے ہو نا؟" وہ ہنسے۔

میں نے کہا "بہت اچھی طرح۔"

"تو پھر ذرا اسی بات پر ہاتھ۔ باہر نکلتے ہی جو پہلی ٹیکسی ملے وہ پکڑ لو۔ جسے ڈرائیور کی وردی فٹ آ جائے وہ گاڑی چلائے۔ دوسرا نظر ہی نہ آئے۔ پولیس سمجھے گی کہ خالی ٹیکسی ہے۔ ویسے بھی ان کی نظر آج لال گاڑیوں پر ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ اپنی لال پری کو پھر سیاہ کر دیں۔ آج رات" انہوں نے منہ کالا کرنے کے بارے میں ایک اور لغو بات کی اور خود ہی بہت ہنسے مگر میں ان سے ہاتھ ملانے کے بجائے کچھ اور پیچھے ہو گیا۔

میں نے کہا "کرنل کہاں ہے ایک نظر اسے بھی دیکھ لیں۔"

"پنجرے میں بند ہے" منو میاں نے فخریہ انداز میں بتایا۔

کرنل واقعی ایک پنجرے میں تھا۔ یہ الومنیم کا پنجرہ کس نے بنوایا تھا اور کس مقصد کے لئے بنوایا تھا، یہ پوچھنا غیر ضروری تھا۔ الومنیم میں زنگ نہیں لگتا۔ شاید کسی شوقین نے اپنے گھر میں کسی خطرناک پالتو جانور کو رکھنے کے لئے اس کا آرڈر دیا ہوگا۔ تین سوت سے زیادہ موٹے الومنیم کے تاروں کے بنے ہوئے آدھے انچ کی جالی والے پنجرے میں کرنل واقعی کسی خونخوار بھیڑئیے کی طرح غرا رہا تھا جیسے شکاری جنگل سے پکڑ کر لائے ہوں۔

"آخر یہ کیا ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ کوئی غیر انسانی سلوک نہیں کیا تھا" اس نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔

غالب نے کہا "تم نے بالکل ٹھیک کیا تھا۔ انسانوں کے ساتھ انسانوں جیسا ہی سلوک کرنا چاہئے۔"

"ہم بھی تمہارے ساتھ وہی سلوک کر رہے ہیں جس کے تم مستحق ہو۔ تم انسان نہیں ہو، ایک ایسے درندے ہو جو اب تک نہ جانے کتنے انسانوں کا خون پی چکا ہے اور ان کی ہڈیاں چبا چکا ہے۔ تم نے ہمارے سامنے ہی ایک ٹیکسی ڈرائیور کو اس کی گاڑی سمیت نگل لیا تھا۔ پانچ ہزار روپے بچانے کے لئے نہیں، صرف اس لئے کہ وہ ایک گواہ تھا جو ہمیں پہچان سکتا تھا۔ اس وقت نہیں پہچانتا تھا مگر بعد میں کبھی وہ اخبار دیکھتا اور اسے ہماری تصویر نظر آ جاتی تو وہ دو جمع دو کو چار کر کے بہت سے درست نتائج اخذ کر لیتا جو شاید تمہارے حق میں غلط ہوتے۔ وہ پولیس کو بتاتا کہ چرچ میں کر ڑ کے بعد کیا ہوا تھا۔ اس سے پہلے تم نے کتنے انسانوں کو تیزاب میں حل کیا اور ہڈیوں سمیت ذرم میں پھینک دیا۔ یہ ہم نہیں جانتے اور جاننا بھی نہیں چاہتے۔ لیکن سردار جی تمہارا پہلا شکار نہیں تھے۔ تمہاری ریسرچ کیمسٹری انسانیت کی فلاح کے لئے اور بہتر زندگی کے لئے نہیں تھی۔ دنیا میں سیکڑوں ہزاروں ریسرچ کیمسٹ دن رات اس دنیا کو زیادہ خوبصورت دنیا بنانے اور انسان کو اشرف المخلوقات کی زیادہ قابل فخر، زیادہ پرمسرت اور طویل تر زندگی دینے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ تم نے اس علم کو ایک آدم خور عفریت بنا دیا ہے۔ کیا کبھی تمہیں خیال آیا کہ کسی دن یہ عفریت تمہیں ہی نہ نگل جائے؟"

"تم مجھے مار ڈالو گے؟" وہ بے یقینی سے بولا۔

میں نے کہا "تم کو زندہ چھوڑ کے ہم خود اپنی نظر میں مجرم ہو جائیں گے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"میں تمہارے لئے بہت کار آمد ثابت ہو سکتا ہوں۔ میری مدد سے تم۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ہم شیطان سے مدد مانگ کے خدا کے قہر کو دعوت دیں؟ ہم اپنی مدد آپ کرتے ہیں چنانچہ خدا ہماری مدد کرتا ہے۔ تم دیکھو اس نے کس طرح تمہیں ہماری تحویل میں دیا۔ اب کہو شیطان سے، تمہیں بچائے۔" وہ مایوس ہو کے خاموش ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے اپنی سزائے موت کے فیصلے کو قبول کر لیا ہے اور یہ بھی سمجھ لیا ہے کہ اس کی کوئی اپیل منظور نہیں ہوگی۔

میں اور غالب باہر نکلے تو سہ پہر کے ساڑھے تین بجے تھے۔ بستی میں کوئی بہت عمر رسیدہ ہندو مر گیا تھا۔ اس کی ارتھی کسی بارات کی طرح دھوم دھام سے جا رہی تھی۔ مرنے والے کے ورثا بیٹے، پوتے، نواسے نئے کپڑے پہنے خوش خوش ساتھ چل رہے تھے۔ بہت لمبی عمر پا کے زیادہ سے زیادہ لواحقین چھوڑنے والے کی موت پر روتا کوئی نہیں۔ اس کی خوشی بے باقاعدہ خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ہم بھی اس جلوس میں شامل ہو گئے جس کے آگے سنکھ اور گھنٹیاں بجانے والے بڑی لے اور سُر میں "رام نام ست ہے" گا رہے تھے۔ سامنے سے آنے والی گاڑیاں احتراماً ایک سائڈ پر رک جاتی تھیں اور جلوس کے گزرنے

www.paksociety.com

تک کھڑی رہتی تھیں۔

میں نے غالب کے کان میں کہا "ہم شمشان گھاٹ جانے کے ارادے سے تو نہیں نکلے تھے۔"

غالب نے کہا "یہ تو ایک اچھا چانس ملا ہے اپنے آپ کو کیمو فلاج کرنے کا۔ ہمیں کوئی بھی شک کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ ویسے بھی کوئی ٹیکسی ابھی تک نہیں آئی ہے۔"

غالب کی بات ختم ہونے سے پہلے ٹیکسی آ گئی۔ ڈرائیور نے ٹیکسی کو ہمارے دائیں ہاتھ پر دیوار سے لگا دیا اور جلوس کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ اگر یہ کسی مسلمان کا جنازہ ہوتا اور ٹیکسی ڈرائیور مسلمان ہوتا تو اتر کے چند قدم کندھا بھی دیتا۔

میرے سوال نے ٹیکسی ڈرائیور کو بوکھلا دیا "کدھر جائیں گا۔"

"جدھر اپنا مرضی ہوئیں گا۔ تم کو بھاڑا دیں گا" میں نے بمبئی کی زبان اور لہجے میں کہا۔

"تم سالا نرک میں جانے کا واسطے بولیں گا تو ادھر ٹیکسی نہیں جاتا۔ اپنا تو سالا اُدھا سسرالی بھی ہے ادھر" ڈرائیور نے ایک چیخنا سی بولی سے گھونٹ لے کر کہا "ویسے میرا پاس شوٹنگ کی بات ہے تو اپن ایک گھنٹا کا بھاڑا لیں گا بیس روپیہ۔ بولو ہاں یا نہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ایک دم ہاں" اور دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

غالب نے کہا "ابھی تم بھی یہ چسکی لگا کا چھوڑ دو ورنہ تم سالا ٹیکسی گزاریں کا کسی دیوار کے بیچ میں سے یا بس کے نیچے سے کسی کھمبے پر چڑھ جائے گا۔"

ڈرائیور قہقہہ مار کے ہنسا "لو تم بھی یہ پھوکٹ میں۔ اپن کو بھی پھوکٹ میں ملا ہے۔ ابھی ایک ہیرو ہیروئن بیٹھا تھا۔ اس کو چھوکری کا ایسا نشہ ہوا کہ سالا بوتل بھول گیا۔"

میں نے کہا "اپنا تو نہیں چلتا۔"

ڈرائیور نے مجھے حیرانی سے دیکھا "یہ اصلی جانی واکر ہے۔"

غالب نے کہا "کوئی مارد جانی واکر کو۔ اپن جب بولا کہ یہ ٹیکسی چلاتا تو لفڑا کاہے کو کرتا۔ ابھی چالو کرو اپنا کھٹارا۔"

"خالی پیلی میرا ریس کا بھیجا پوری والی کہ ریکا شو قیمتی کریں گا؟ اپنا پاس بھی ایک دم فسٹ کلاس مال ہے۔ کرسچین۔ پارسی، پنجابی، سکھ، بنگالی۔ سولہ سال کا سولہ روپیہ ساٹھ سال کا ساٹھ پیسہ" وہ ٹیکسی چلاتے ہوئے قہقہہ مار کے ہنسا "مال کتنا ہے پاکٹ میں؟"

میں نے کہا "تمہاری کوئی بہن ہے؟ جوان۔ کنواری ہو تو کیا بات ہے۔ پکا سولہ روپیہ۔"

"اپن کا واسطے ساٹھ پیسہ والا مال۔ تمہاری ماں زندہ ہے؟" غالب نے کہا۔

اس نے یوں سر گھما کے دیکھا جیسے پہلے وار کے بعد سانپ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ ایک گالی دے کر اس نے ٹیکسی روکی اور چیخ کر بولا۔ "اترو نیچے۔" وہ کچھ نشے میں تھا چنانچہ اس کو اپنے ہوش و حواس پر تو قابو تھا مگر اپنے جذبات پر اختیار نہ تھا "اپنا ماں کو گالی دیتا ہے تجھے۔"

میں نے جواب میں اس کے خون کے رشتوں کو ایک ایسی گالی سے رسوا کیا کہ اس کا خون کھول اٹھا اور وہ دروازہ کھول کر نیچے اترا اور پھر پیچھے کا دروازہ کھول کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ غالب میرے اشارے پر دوسرے دروازے سے باہر نکلا اور میں نے ڈرائیور کو اندر کھینچ لیا۔ ڈرائیور کے سر کو سیٹ پر دبا کے میں نے اس پر اپنا وزن ڈال دیا اور اس کی آواز کو دبانے کے لئے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ وہ تڑپا مگر میری گرفت سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکا۔ پیچھے کا دروازہ بند ہوتے ہی غالب نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ میں نے اسے سیٹ کر سیٹ کے برابر کر دیا اور خود اس پر سوار ہو گیا۔

جس سڑک پر یہ کارروائی ہوئی تھی وہ زیادہ آباد نہیں تھی مگر اس میں ایک منٹ بھی صرف نہیں ہوا تھا۔ ... صرف یہ کر ٹیکسی ڈرائیور اتر کے پیچھے گیا اور پیچھے سے ایک شخص آگے آ کے اس کی جگہ بیٹھ گیا۔ جو کچھ ٹیکسی کے اندر ہوا وہ کسی کو نظر آ ہی نہیں سکتا تھا۔

ڈرائیور کمزور نہیں تھا مگر میں نے اسے خاص پیشہ ورانہ انداز میں قابو کر رکھا تھا۔ نہ وہ اپنا ہاتھ ہلا سکتا تھا اور نہ پاؤں۔ اس کے لئے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا کیوں کہ میرے گھٹنے سے اس کا سر سیٹ پر دبا ہوا تھا۔ دس منٹ کے بعد غالب نے ٹیکسی کو ایک شکستہ دیوار سے گزار کے روک دیا۔ وہ ایک ویران احاطہ تھا۔

میں نے کہا "ابھی بول کیا بولتا ہے" اور ہاتھ اس کے منہ پر سے ہٹا لیا۔

اس نے ہانپتے ہوئے رک رک کر بڑی مشکل سے کہا "ابھی سالا..... اگر..... تیرا معاملہ فٹ ہے اس کا ساتھ۔ تو سولہ روپیہ کا بات کاہے کو کرتا ہے۔ رکمنی کا اپن بھی لیتا ہے۔"

"رکمنی؟ کون رکمنی؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"اپنا بہن سالا اور کون۔ اس کا عاشق ہو گیا ہے تو۔ یا گاہک ہے؟ بول۔"

غصے سے ایک لمحے کے لئے میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔ میں نے اس کی گردن مروڑ دینے کا سوچا۔ پھر غالب کی آواز نے مجھے اس انتہائی اقدام سے روک لیا۔

"اپنی سگی بہن کا بھی دلال ہے تو۔ کمینے..... بے غیرت!"

میں نے کہا "چھوڑو غالب یہ غیرت اور حمیت کا مطلب ہی نہیں سمجھتا۔ اس کی دنیا میں رشتے اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ کسی اور کی بہن کے سولہ وصول کرتا ہے تو اپنی بہن کے بیس۔ شاید اس لئے کہ وہ زیادہ خوبصورت ہو گی۔"

"اس سے پوچھو کہ ماں کی عزت کیا واقعی یہ ساٹھ پیسے ... دیتا ہے؟"

میں نے بالوں سے پکڑ کے اس کا سر سیٹ پر مارا "ماں کچھ نہیں کہتی؟ بہن اور ماں سے۔"

سیٹ پر منہ لگنے سے اس کو چوٹ نہیں آئی تھی مگر وہ چلانے لگا "رام قسم ہم کو ای رنڈی نے اس لائن پر ڈالا۔ میرے کو بھی اور رکمنی کو بھی۔ ابھی میرے کو نہیں مالوم وہ کدھر گیا۔"

"ایک بہن ہے تمہاری اور اس سے بھی تم دھندا کراتے ہو؟" میں نے بڑے دکھ سے کہا۔

"ہم نہیں کراتا..... وہ سالا ہم کو مجبور کیا۔ اس کا دھندا کوئی اور کرتا تھا۔ اکھا پیسہ وہ مار رہا تھا۔ رکمنی کو پانچ دیتا تھا۔ دس خود رکھتا تھا۔ وہ بولا کہ تیری وجہ سے میرا نقصان ہوتا ہے۔ تو کیسا بھائی ہے۔ ہم کو بہت شرم آیا۔ ابھی ہم اس کا بیس لیتا اور سب اس کو دیتا ہے۔ میرے کو کیوں مارتا ہے بابا۔"

میں نے زندگی میں کبھی نیکی اور شرافت کے رشتوں کی ایسی رسوائی کا تصور نہیں کیا تھا۔ ایک عورت نے بھائی سے صرف اس لئے گلہ کیا تھا کہ وہ اس کے جسم کی پوری قیمت خود کیوں نہیں لیتا۔ اور بھائی کو یہ سن کر غیرت نہیں آئی تھی کہ وہ جسم فروش بہن کا گھونٹ ہے۔ اسے واقعی "شرم" آئی تھی کہ وہ بہن کا اتنا سا کام نہیں کر سکتا۔ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہاں واقعی عورت کی عفت و عصمت کے الفاظ بے معنی تھے اور رشتوں کی حرمت..... اور تقدس کا کوئی وجود نہ تھا۔ خود اس کی ماں ایک طوائف تھی جس کے بارے میں وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے۔ اس کے جنم دیے ہوئے اسی کے نقش قدم پر چل رہے تھے تو انہیں کوئی احساس گناہ یا پشیمانی نہیں تھی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔

وہ کانپتا ہوا اٹھا "کیا بات ہے؟ اپن غلطی کیا۔ چل میرے کو معافی دے میرے باپ۔ پر، کچھ تو بیٹے گالی دیا میرا ماں کو۔"

"کیا کسی عورت کے لئے طوائف سے بڑھ کر کوئی گالی ہو سکتی ہے؟"

"ابھی تو کیا بولتا ہے یار۔ طوائف اپنا واسطے تو نہیں تھا۔ اپنا ماں اپن کو پیٹ میں رکھا۔ پیدا کیا اور پالا..... اپن کا واسطے وہ ماں ہے۔ اس کو گالی مت دو۔"

اس کی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ اس کے الفاظ کا مطلب ہمارے لئے کچھ اور تھا، خود اس کے لئے کچھ اور۔ ہم دو مختلف دنیاؤں کے رہنے والے تھے جو مکمل اجنبی تھے اور اگر ہمارے درمیان کوئی تعلق قائم ہو سکتا تھا تو صرف سکہ رائج الوقت سے۔ ہم اس کی ٹیکسی کا بھاڑا دیتے یا اس کی بہن کا پیسہ۔ واحد اہم چیز تھا۔ اخلاقی اقدار کے اعتبار سے ہمارے درمیان زمین آسمان کی دوری تھی۔ شاید اس جہان میں ایسے کئی جہان آباد تھے جن میں رہنے والے ہم جیسے ہی انسان نظر آتے تھے مگر وہ ایک دوسرے کو صرف دیکھتے تھے، پہچانتے نہیں تھے اور جانتے نہیں تھے اور ایک دوسرے کی زبان سے نا آشنا تھے۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "تمہاری ایک بہن ہے بھائی ہے کوئی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اپن صرف رکمنی کو جانتا ہے اس نے اپنا ساتھ نہیں چھوڑا۔ باقی لوگ کو پتا نہیں ماں کدھر چھوڑا۔ ابھی تو کدھر لے جاتا ہے یار میرے کو.....؟"

"تم کو ڈرنے کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "تم کو پیسہ چاہئے نا۔ جتنا مانگو گے مل جائے گا" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے نوٹ نکالے اور اس کے سامنے ڈال دیے۔

"صاف بول یار۔ کیا مانگتا ہے تو؟ کون ہے تو؟" وہ نوٹوں کو ہاتھ لگائے بغیر بولا۔

میں نے کہا "ہم جیل سے بھاگے ہوئے ہیں۔ ہمیں یہ ٹیکسی چاہئے اور یہ وردی۔"

وہ ہاتھ جوڑنے لگا "ارے میرے باپ، تو جدھر بولے گا میں تیرے کو لے کر جائے گا۔ رام قسم کسی سے کچھ نہیں بولے گا۔ پر تو اپنا ٹیکسی مت لے۔"

میں نے سوچ کے کہا "ٹھیک ہے۔ تم گاڑی چلاؤ۔ ہم میں سے ایک ڈکی میں چھپ کر بیٹھے گا۔ دوسرا بالکل تمہارے پیچھے ہو گا۔ اور اس کے ہاتھ میں ہو گا یہ ریوالور۔ یہ ایک دم اصلی ریوالور ہے اور اس کی گولی چلنے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔"

اس نے ہکلا کے کہا "ابھی..... اس کو ادھر کر لے بابا..... پھوکٹ میں مر جائیں گا ہم، اگر گولی چل گیا۔ میں تیرے کو بولا نا کہ جدھر بولے گا جائے گا۔"

میں نے کہا "پونا جانے والی سڑک پر بائیں جانب ایک سیمنٹ فیکٹری ہے۔ ادھر ایک ریلوے لائن بھی جاتی ہے اندر تک۔"

اس نے ایسے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو میں سمجھ گیا۔

"سیمنٹ فیکٹری کے قریب ریلوے کا ایک ریسٹ ہاؤس ہے ڈاک بنگلہ۔"

اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نظر آنے لگے "تم دیکھا ہے تو ٹھیک ہے۔ مگر دیکھو یار، تیرے کو ماں کا قسم۔ اپن کو ادھر لے جا کر مرڈر مت کرنا۔ ہاں" وہ ہاتھ جوڑ کر گھگیانے لگا۔

میں نے کہا "مرڈر کرنا ہو تا تو یہاں شروع کر دیتے۔"

"بس تم چالاک یا بہادر بننے کی کوشش مت کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔ راستے میں کوئی بھی روکے تو رکنا نہیں ہے" غالب نے کہا۔ "پولیس روکے تب بھی نہیں۔"

برا لگی، بے غیرت آدمی بزدل بھی ہوتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ہماری ہدایات کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ چند منٹ بعد ہم

www.paksociety.com

وہاں سے روانہ ہوئے تو میں ڈگی میں تھا۔ غالب آگے اور پیچھے کی سیٹوں کے درمیان کی خالی جگہ پر لیٹا ہوا تھا۔ ہم دونوں کے لئے ایک ہی جسمانی اذیت کی قوتِ برداشت کا امتحان تھا۔ میں ڈگی میں ٹائر اور جیک، فالتو پرزوں اور آئل کے ڈبے جیسی چیزوں کے درمیان سمٹا پڑا تھا اور پیٹرول ٹینک کے عین اوپر ہر جھٹکے کے ساتھ اچھل رہا تھا۔ پیٹرول کے بخارات کی بو سے میرا دماغ خراب ہو رہا تھا اور میں تازہ ہوا کے لئے ایک سوراخ سے ناک لگائے پڑا تھا جہاں سے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ نظر آتی تھی۔

غالب کی حالت کا میں تصور کر سکتا تھا۔ آگے پیچھے کی سیٹوں کے درمیان ہر کار کی چوڑائی کے رخ پیر رکھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ اس جگہ میں پھنس کر لیٹنا وہ بھی ہاتھ میں ریوالور پکڑ کے۔ یہ بہت مشکل کام تھا۔ اسے ٹیکسی ڈرائیور پر نظر بھی رکھنی تھی کہ وہ گڑبڑ نہ کرے اور اسے یہ احساس بھی دلاتے رہنا تھا کہ وہ غافل نہیں ہے۔

کافی دیر تک ٹیکسی چلتی رہی اور میں ٹریفک کی آوازوں کے ملے جلے شور سے اندازہ کرتا رہا کہ ہم ابھی تک آبادی میں ہیں۔ پھر یہ شور کم ہو گیا، یہاں تک کہ کبھی کبھار گزرنے والی کسی گاڑی کی آواز سنائی دیتی بھی بند ہو گئی۔ ٹیکسی رک گئی اور غالب نے دروازہ کھول کر مجھے ڈگی کی قید سے آزاد کیا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ میں غالب کے ساتھ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے لگا۔ میری کمر بھی ٹیڑھی ہو گئی تھی اور میرا سارا جسم ایسے درد کر رہا تھا جیسے کسی نے مجھے گھونسوں سے کوٹا ہو۔

دن کے اجالے میں اس راستے کو پہچاننا دشوار نہ تھا جس پر ہم نے گزشتہ روز ایک پولیس جیپ میں سفر کیا تھا۔ ڈرائیور کا رخ سیمنٹ فیکٹری کی طرف تھا مگر ڈاک بنگلا اس سے پہلے ہی پڑتا تھا۔ میں نے اس کی عمارت کو دور سے ہی دیکھ کر پہچان لیا اور ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی کو گیٹ سے اندر لے جائے۔

گاڑی کے رکنے کی آواز پر چوکیدار باہر آیا۔ ہماری صورت دیکھتے ہی اس کا ہاتھ سلام کے لئے اٹھ گیا "آپ آ گئے جی۔ بہت اچھا ہوا۔"

میں نے کہا "پیر عنایت آیا تھا؟"

"پیر صاحب بھی تشریف لائے تھے کل رات کو۔ اور۔"

اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ اندر سے گل نمودار ہوئی۔ اس نے ہماری آواز سن لی تھی۔ اس نے ایک چیخ ماری۔ "بھائی جان" اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ کچھ کہے بغیر اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

میں نے کہا "گل، اے گل! یہ کیا دیوانگی ہے۔ کیا ہوا ہے تجھے؟"

غالب کی نظر ٹیکسی ڈرائیور پر تھی جو احمقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا ہوا تھا۔ میں گل کو کھینچ کر اندر لے گیا۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی اور میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

میں نے گل کو سختی سے جھنجوڑ کے کہا "گل! منہ سے بتاؤ کیا بات ہے۔"

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ رابعہ باجی۔۔۔" اس نے بڑی مشکل سے کہا اور پھر رونے لگی۔

"کیا ہوا ہے رابعہ کو؟" میں نے پھر اسے جھنجوڑا۔

چوکیدار نے میرے پیچھے سے کہا "سر جی! وہ رات کو۔ پیر صاحب دونوں کو یہاں چھوڑ گئے تھے۔ وہ دو بجے تشریف لائے تھے اور فوراً ہی واپس چلے گئے تھے۔ میں نے دونوں کو ایک ہی کمرے میں سلا دیا تھا۔ چائے وغیرہ بھی بنا کے دی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ آپ بے فکر ہو کے سو جائیں۔ میں جاگ رہا ہوں۔ لیکن ان کے سونے کے بعد میری بھی آنکھ لگ گئی۔ پھر جناب! آج دس بجے تک بھی اندر نہیں گیا۔ میں نے سوچا انہیں سونے دوں۔ دس بجے میں نے دیکھا تو یہ اکیلی سو رہی تھیں" اس نے گل کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے گل کی طرف دیکھا "گل۔۔۔"

گل نے آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں اٹھا کے مجھے دیکھا اور اقرار میں سر ہلایا "یہ مجھے اپنے سرہانے ملا تھا" اس نے تکیے کے نیچے سے ایک لفافہ نکالا۔

لفافے پر میرا نام تھا مگر یہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس میں رکھا ہوا کاغذ نکال لیا۔

"یہ۔۔۔ میں نے کھول لیا تھا۔۔۔ میں بہت پریشان ہو گئی تھی۔۔۔" گل نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

رابعہ نے اپنے خط میں لکھا تھا۔

میری جگہ میرے خط کو پا کے تم کو یقیناً مایوسی ہو گی، صدمہ ہو گا اور شاید غصہ بھی بہت آئے گا۔ اگر میں تمہیں کچھ بتائے بغیر چلی جاتی تو تم اور تم سب بہت پریشان ہوتے لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ حالات کی مجبوری کچھ ایسی ہے کہ فی الحال میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ میں کوئی بہانہ نہیں کر رہی ہوں، جھوٹ نہیں بول رہی ہوں اور نہ کسی کے جبر یا دباؤ کے باعث ایسا کر رہی ہوں۔ میں تمہاری اور اس محبت کی جو مجھے تم سے ہے، قسم کھا کے تمہیں یقین دلانا چاہتی ہوں کہ فکر یا تشویش کی کوئی بات نہیں۔ یہ ہو سکتا تھا سکندر کہ کوئی دشمن میری کنپٹی پر ریوالور رکھ کے مجھ سے یہ سب لکھوا لیتا لیکن ایک بار نہیں دس بار گولی مار کے بھی وہ مجھ سے جھوٹی قسم نہیں لے سکتا تھا۔

تم یقیناً جاننا چاہو گے کہ میں نے اچانک ایسا فیصلہ تمہیں کچھ بتائے بغیر کیوں کیا۔ اور اگر تم سے جدا ہونے کے بعد کوئی ایسی بات ہو گئی تھی تو اب بتانے میں کیا قباحت ہے۔ اچانک کچھ نہیں ہوا سکندر۔ ایک ضرورت کا احساس مجھے بہت پہلے سے تھا۔ میں تذبذب کا شکار تھی۔ پہلے مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ تمہیں اور تم سب کو اپنے فیصلے میں شریک کروں یا نہ کروں۔ بہت سوچنے کے بعد میں نے استخارہ کیا اور مجھے اشارہ ملا کہ ابھی کسی کو کچھ بتانا مناسب نہیں اور مجھے یہ قدم بلا تاخیر اٹھانا چاہئے اور اسی میں بہتری ہے میری یا تمہاری یا ہم سب کی۔ ابھی تو میں واپس جا رہی ہوں۔ شاید کوئی میری بات نہ سمجھ سکے۔ ممکن ہے تم بھی اسے دماغ کی خرابی کہو۔ لیکن مجھے یہ غیب کا اشارہ لگتا ہے۔ اسے میں چھٹی حس اس لئے نہیں کہوں گی کہ یہ اس سے زیادہ طاقتور آواز تھی جس کے خلاف میری عقل کے دلائل اور جذبات کی مزاحمت سب بے کار ثابت ہوئے۔ ایسا ایک بار نہیں متعدد بار ہوا۔ میں نے رات کو خواب میں یہ آواز سنی۔ معلوم نہیں کون تھا جو کہتا تھا۔ جاؤ واپس لوٹ جاؤ۔ ظاہر ہے یہ خواب تھا۔ مگر سکندر! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک ہی خواب بار بار دکھائی دے۔ وقفے وقفے سے میں نے چار مرتبہ یہ خواب دیکھا کہ میں کسی پہاڑ کی چوٹی پر تنہا کھڑی ہوں اور میرے چاروں طرف ایسے ہی پہاڑوں کی چوٹیوں کا سلسلہ ہے۔ تا حدِ نظر۔ اور پہاڑوں پر برف ہی برف ہے۔ کہیں کوئی درخت، کوئی پرندہ، کوئی آواز۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ سب برف کے بنے ہوئے پہاڑ ہیں۔ بالکل سفید! اور اوپر نیلا آسمان ہے۔ ایک پہاڑ کے پیچھے سورج غروب ہو رہا ہے یا شاید طلوع۔ رباب۔ اور پس منظر کی اس روشنی میں مجھے ایک ہیولا سا نظر آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تم ہو۔ بہت دور ایک پہاڑ کی چوٹی پر ہاتھ پھیلائے کھڑے ہو اور غالباً یہ تمہاری ہی آواز ہے۔ پھر اچانک گھپ اندھیرا پھیل جاتا ہے اور تم غائب ہو جاتے ہو۔ ہر مرتبہ خواب اسی طرح ختم ہوا اور میں نے خوف سے کانپتے ہوئے باقی رات گزاری۔ میں نے خواب کو صرف واہمہ اور خیالوں کا سراب سمجھ کے ٹالنا چاہا۔ سوچا، تم سے کہوں مگر کہہ نہ سکی۔ تم بھی کہتے کہ خواب کا کیا ہے۔ خواب تو صرف خواب ہوتے ہیں۔ فرائیڈ کہتا ہے کہ نا آسودہ خواہشوں کی تصویر ہے اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ۔۔۔ یہ سب میں بھی جانتی ہوں لیکن کیا مجھے کوئی بتا سکتا ہے کہ ایک خواب کسی نے دوسری بار، تیسری بار اور چوتھی بار ایسے دیکھا ہو جیسے ایک ہی فلم کا کوئی حصہ ہو کہ ہر شو میں ہر روز سب کچھ وہی رہے۔ کچھ بدل بھی کیسے سکتا ہے۔ اسی بات نے مجھے خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ تم جانتے ہو میں توہم پرست، شکی مزاج یا نفسیاتی مریض نہیں ہوں اور تقدیر کے لکھے کو خدا کی رضا سمجھ کر قبول کرنا میرے ایمان کا ایک حصہ ہے جتنا تمہارا۔ چنانچہ جو ہونا ہے وہ ہو گا۔ لیکن اس کے باوجود میں وہم میں مبتلا ہو گئی۔ شک میں پڑ گئی! سمجھو کہ میرا یقین متزلزل ہونے لگا۔ میں نے سوچا کہ یہ خواب آخر کس کا اشارہ ہے اور اشارہ ہے تو اس کو سمجھنے کے لئے مجھے کیا کرنا ہو گا۔ ابھی میں کچھ طے نہیں کر پائی تھی کہ پرسوں رات جب میں خانہ بدوشوں کے خیمے میں سوئی تھی یا یوں سمجھو کہ آنکھیں کھولے لیٹی تھی اور سوچ رہی تھی کہ (یہ میں تمہیں بتاؤں گی کہ کس کے بارے میں کیا سوچ رہی تھی) اچانک میرے کانوں نے ایک آواز سنی۔ جاؤ واپس لوٹ جاؤ۔ میں گھبرا کے اٹھ بیٹھی اور میں نے گل کو بھی جگا دیا۔ وہ بھی جاگ ہی رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس نے کچھ سنا۔ گل نے کچھ نہیں سنا تھا۔ ابھی ہم باہر کی خاموشی پر کان لگائے بیٹھے تھے کہ وہ آواز پھر آئی۔ میں اچھل پڑی لیکن مجھے بڑی حیرت ہوئی جب گل اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس نے پھر کچھ بھی نہیں سنا تھا۔ میں نے کہا کہ گل، ابھی کوئی کہہ رہا تھا۔ جاؤ واپس لوٹ جاؤ۔ بالکل سکندر کی آواز میں۔ گل پریشان ہو گئی۔ اس نے کہا کہ باجی آپ سو جائیں۔ آیت الکرسی پڑھ کے۔ اس نے جو سوچا ٹھیک ہی سوچا۔ وہ سمجھی کہ یہ دوری کی مجبوری کا صدمہ ہے جس نے میرے اعصاب پر برا اثر ڈالا ہے۔ میں اس سے کیا کہتی۔ رات کے شاید دو بجے میری آنکھ لگی ہی تھی کہ پھر وہ خواب شروع ہو گیا۔ پانچویں بار۔ لیکن خواب کے آغاز میں ہی کسی نے مجھے جھنجوڑ کر کہا۔ جاؤ واپس لوٹ جاؤ اور میں چیخ مار کے اٹھ بیٹھی۔ گل بھی اٹھ گئی۔ میں نے اسے کہا کہ ابھی یہاں کوئی تھا۔ میرا خیال ہے سکندر آیا تھا۔ گل بیچاری تقریباً رونے پر آ گئی۔ اس نے کہا کہ باجی، پریشان کیوں ہوتی ہیں۔ شاید آپ کو ڈر ہے کہ سکندر بھائی نہیں آئیں گے مگر اب چند گھنٹوں کی بات ہے، پھر وہ آ جائیں گے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ نہ آئیں۔ دیکھیں، کتنے کم وقت میں پیر عنایت نے ہمیں تلاش کر لیا اور وعدے کے مطابق یہاں پہنچا گیا۔ مگر اس کی باتوں سے میری تسلی نہیں ہوئی۔ اور اس وقت میں نے گل کے سونے کے بعد استخارہ کیا اور فیصلہ کر لیا۔ اس وقت صبح کے چھ بجے ہیں۔ اجالا ڈاک بنگلے کی کھڑکیوں کے دھندلے شیشوں پر اتر آیا ہے۔ گل سو رہی ہے اور میں یہ خط چھوڑ کے جا رہی ہوں۔ اگر یہ میری غلطی ہے تو مجھے معاف کر دینا۔ ناراض مت ہونا اور دل برا مت کرنا۔ بدلا کچھ نہیں ہے۔ نہ میں، نہ تم، نہ وقت جو ہمارے عہدِ محبت کا امین ہے۔ کل کا وقت، آج کا وقت اور آنے والا وقت۔ سب وہی ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم میرے ساتھ ہو۔ تصور میں اور یادوں میں تم سے جدا نہیں ہو رہی ہوں۔ بس ایک کام پڑ گیا ہے۔ مجھے بھی نہیں معلوم کہ وہ کیا کام ہے۔ وہ کام ختم ہوتے ہی میں لوٹ آؤں گی۔ پہلے بھی ایسا ہوا ہے۔ تم ایک طرف نکل گئے۔ میں دوسری طرف چلی گئی۔ نادرہ سے غالب اور شملا سے محسن جدا ہوا۔ کام تو کام ہے۔ اس سے محبت کو کیا۔ فاصلے تو قرب کی آرزو کو زندہ رکھتے ہیں۔ میں پہلی فرصت میں تم سے رابطہ قائم کر لوں گی۔ خود تمہیں تلاش کر لوں گی، تم دنیا سے چھپ سکتے ہو مجھ سے تو نہیں چھپ سکتے۔ تم اپنا سفر جاری رکھو۔ اسی حوصلے اور لگن کے ساتھ ورنہ میں سمجھوں گی کہ تم سکندرِ اعظم نہیں تھے۔ ایک عام مرد تھے جس نے ایک عام عورت کی خاطر اپنے مقصد، اپنے مشن، اپنے مستقبل اور اپنی کامیابی سب کو قربان کر دیا۔ تم دنیا فتح کر سکتے تھے مگر

www.paksociety.com

اپنے خوابوں کے جال سے نہ نکل سکے۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے پیچھے نہیں آؤ گے، آگے جاؤ گے۔ میں تمہیں آگے ملوں گی۔ پیچھے نہیں۔ میں تمہارے استقبال کے لئے اس منزل پر پہلے سے موجود ہوں گی جو میری، تمہاری اور ہم سب کی منزل ہے۔ میرے یقین کی لاج رکھو گے نا؟ میں تمہیں باتوں سے نہیں بہلا رہی ہوں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ بہت جلد میں تم سے آملوں گی۔ اسی دنیا میں، اسی زندگی میں۔ تب تک کے لئے تم کو اللہ کی امان میں دیا۔ معلوم نہیں میں اپنی بات تمہیں سمجھا سکی یا نہیں۔ لیکن تم سمجھ لو تو پھر سب کو سمجھا دینا۔ تمہاری پاگل۔ پاگل۔ پاگل۔ رابعہ۔

میں نے اس خط کو ایک بار پڑھا، پھر پڑھا۔ اس کے ہر لفظ کو بار بار پڑھا۔ یہاں تک کہ سب کچھ میرے دل پر نقش ہو گیا۔ میرا دل ایک پتھر کی سل بن گیا تھا جس پر رابعہ نے بڑی بے باکی سے وہ سب کچھ لکھ دیا جو میرے لئے ناقابل فہم تھا۔ خط مجھ سے گل نے لیا۔ پھر غالب کو دے دیا اور غالب نے پھر مجھے پکڑا دیا۔ میں ایک تاریک خلا میں سرگرداں رہا جس میں ہر سمت پاگل کر دینے والی آوازوں کا شور تھا۔ وہ آخر کیوں چلی گئی۔ کیسے چلی گئی۔ کہاں چلی گئی۔ واپس کا کیا مطلب ہے۔ کیا وہ لاہور چلی گئی۔ اکیلی۔ لاہور میں کیا تھا۔ کون تھا اسے لاہور بلانے والا۔ کیا واقعی وہ پاگل ہو چکی تھی۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن اس انتہا کو پہنچ گیا تھا کہ وہ آوازیں سننے لگی تھی۔ جو لاشعور میں دبی ہوئی تھیں۔ وہ گھبرا گئی تھی اس سفر مسلسل سے اور مصائب و آلام کے دائم و قائم سلسلے سے۔ مگر وہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے ڈرتی تھی۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی کہ اسے کوئی آواز بلاتی ہے۔ مگر یہ بات نہیں سمجھ سکتی تھی کہ یہ اس کے اندر کی آواز ہے۔ وہ اس کا اعتراف بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اسے خود اپنے اندر کی آواز مجبور کرتی ہے۔ چناں چہ لاشعور کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے اس نے میری آواز سنی تھی۔ اور کسی کی آواز اتنی معتبر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا خواب ایک تکرار تھا۔ اسی آواز کی بے وجود تصویر تھا۔ کبھی تصویر سامنے آتی تھی، کبھی آواز۔ پھر خیال آتا تھا کہ رابعہ نے اصل بات مجھ سے چھپائی۔ لیکن دل نہیں مانتا تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ بولے گی۔ حالات، مجبوری، آواز غیب، اشارہ، استخارہ۔ کیا سچ ہے کیا غلط ہے؟ کیا قابل اعتبار ہے اور کس کے لئے کس زاویے سے کیا سچ ہے۔ میرے لئے آج یہ سچ ہے کہ دو گھنٹے بعد سورج غروب ہو جائے گا۔ مگر آج ابھی کسی قطب شمالی پر رہنے والے کے لئے یہ سچ ہے کہ سورج تین مہینے یا چار پانچ مہینے بعد غروب ہو گا۔ چناں چہ رابعہ نے جو کچھ مجھے سمجھایا اور میری سمجھ میں نہ آسکا۔ وہ خود اسی کی سمجھ میں آنے والی بات تھی جو اس نے قطعیت کے ساتھ قبول کی۔

رابعہ کی آواز بار بار میرے کانوں سے ٹکراتی تھی۔ ناراض مت ہونا اور دل برا مت کرنا۔ بدلا کچھ نہیں ہے۔ نہ میں، نہ تم، نہ وقت۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم میرے ساتھ ہو۔ تم اپنا سفر جاری رکھو۔ میں تمہیں آگے ملوں گی، پیچھے نہیں۔ یہ آوازوں کا بھنور تھا جس میں میرا خیال اور میرا تصور معدوم ہو رہا تھا۔ بار بار وہی آوازیں آتی تھیں اور ان آوازوں کا وجود اتنا حقیقی ہوتا جا رہا تھا جیسے رابعہ میرے سامنے کھڑی ہوئی مجھ سے یہ سب کہہ رہی ہے۔ شاید ایسے ہی اس نے میری آواز سنی ہو گی۔ میں نے سوچا۔ میرے یقین کی لاج رکھو گے نا؟ بولو سکندر، وعدہ کرو تم اپنا سفر جاری رکھو گے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں تم سے آملوں گی۔ اسی دنیا میں۔ اسی زندگی میں۔ تم بھی وعدہ کرو کہ مجھے پاگل نہیں سمجھو گے۔ حالاں کہ میں پاگل ہوں۔ تمہاری پاگل، پاگل، پاگل رابعہ۔

"پاگل؟" میں نے زور سے کہا اور ہنس پڑا۔ "میں بھی پاگل ہوں۔"

گل نے ایک چیخ ماری۔ "سکندر بھائی!" اور پھر مجھ سے چمٹ کے رونے لگی۔

میں نے کہا "تجھے کیا ہوا ہے؟ کیا تو بھی پاگل ہو گئی ہے؟"

غالب نے کہا "میرا خیال ہے کہ...... یہاں رکنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ وہ واقعی چلی گئی ہے۔"

"میں نے کب کہا ہے۔" میں نے کہا "کہ میں اس کی تلاش میں مجنوں کی طرح صحرا اور جنگل کی خاک چھاننے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے اس کے یقین پر یقین ہے۔ وہ جھوٹ بول سکتی ہے تم سے؟ یا تم سے؟"

غالب نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور اس کا رنگ جو شاید میری حالت دیکھ کر اڑ گیا تھا، بحال ہونے لگا۔ اس نے کہا "گل! کیا یہ سب ٹھیک ہے؟ جو رابعہ نے بتایا ہے۔"

گل نے آنسو پونچھ کے کہا "کیا؟"

"یہی جو رابعہ نے لکھا ہے کہ اس نے تمہیں بتایا تھا..."

"ہاں۔ انہوں نے پوچھا تھا کہ سکندر کی آواز نہیں سنی تم نے۔ باہر بالکل سناٹا تھا۔ کوئی آہٹ بھی ہوتی تو میں سن لیتی۔ مگر باجی کا اصرار تھا کہ کسی نے بہت بلند آواز میں کہا ہے۔ باجی واپس لوٹ جا۔ میرے انکار پر وہ خفا ہونے لگی تھیں۔ نیند کی گولیاں ہوتیں تو میں انہیں زبردستی کھلا دیتی۔ وہ سب تھکن کا اثر تھا۔ وہ بہت پریشان تھیں۔ سارا دن یہی سوچتی رہتی تھیں کہ اب کیا ہو گا؟ میں بہت تسلی دیتی تھی انہیں کہ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن اندر سے میں بھی ڈری ہوئی تھی۔ انہوں نے ذکر تک نہیں کیا مجھ سے کہ وہ اتنا بڑا فیصلہ کر چکی ہیں" پھر رونے لگی۔

"گل! اس نے جو کیا۔ شاید اسی میں بہتری تھی۔ اس نے لکھا ہے..."

"سارا قصور میرا ہے۔ مجھے نیند بہت آتی ہے۔ باجی کہتی تھیں

گل بڑی خوش قسمت ہو تم کہ جب چاہتی ہو سو جاتی ہو۔ جتنا وقت نیند میں گزر جاتا ہے اس اذیت سے تو نجات مل جاتی ہے جو ہم ان خانہ بدوشوں کی قید میں برداشت کر رہے ہیں۔ رات بھی پتا نہیں وہ کب تک جاگتی رہیں اور آیت الکرسی پڑھ پڑھ کے ان پر پھونکتی رہیں۔ پھر پتا نہیں کب سو گئیں۔ مجھے نہیں معلوم انہوں نے خط کیسے لکھا۔ کاغذ اور قلم کہاں سے لیا۔ لفافہ کہاں سے آیا۔ مجھے تو چوکیدار نے جگا کے پوچھا ان کے بارے میں تو مجھے یقین نہیں آیا۔ پھر میں نے خط دیکھ لیا......"

"اچھا اب چلو" غالب نے کہا "معلوم ہو جائے گا کہ وہ واپس لاہور ہی گئی ہے۔ اور وہ کہاں جا سکتی ہے۔ واپسی کا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہو سکتا۔ ہم فون کر کے منظر سے پوچھ لیں گے۔"

غالب نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ میرے ذہن میں ابھی تک ایک خلا تھا جس میں کبھی یکلخت رابعہ کا چہرہ روشن ہو جاتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اندھیرے میں غائب ہو جاتی تھی اور آوازوں کی بازگشت رہ جاتی تھی۔ پاگل۔ پاگل۔ معلوم نہیں پاگل کون ہے۔ یہ دنیا جو مجھے پاگل سمجھتی ہے یا دنیا جسے میں پاگل سمجھتا ہوں۔ رابعہ، میں، محسن۔ سب پاگل ہی تو ہیں۔

میں واپسی کے سفر میں سارا راستہ سوچتا آیا۔ سوچنے کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ رابعہ نے بڑی سادگی و پرکاری سے مجھے وعدوں کی اور یقین دہانیوں کی، محبت پر اعتماد کی اور اعتبار کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔ میں اسے جھوٹا نہیں کہہ سکتا تھا۔ حوصلہ نہیں ہار سکتا تھا۔ اس کے پیچھے نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ اگر میں نے صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑا۔ چیخا چلایا اور اس پر خفا ہوا تو وہ مجھ سے خفا ہو جائے گی۔ اس کا دل ٹوٹ جائے گا کہ اتنی التجاؤں کے باوجود سکندر نے میرے یقین کی لاج نہیں رکھی۔

مجھے معلوم نہیں واپسی کے سفر میں کیا ہوا۔ ایک جگہ رک کر غالب نے ٹیکسی ڈرائیور کو ادائیگی کی۔ اس نے بہت سے نوٹ اسے دیے تھے اور شاید یہ بھی کہا تھا کہ آج کے بعد وہ اس ملاقات کو بھول جائے ورنہ ہم نے ٹیکسی کا نمبر دیکھ لیا ہے۔ ہم پھر بھی دیکھ لیں گے۔ پھر اس نے دوسری ٹیکسی پکڑی تھی۔ آخری بات مجھے یہ یاد ہے کہ سورج غروب ہو رہا تھا جب ہم نے پیدل چلنا شروع کیا اور "ارجن داس الوینم" کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔

نازو نے باری باری ہم سب کی صورت دیکھنے کے بعد کہا۔ "رابعہ کہاں ہے؟" کسی نے اس کو جواب نہیں دیا۔ گل روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں بھی رو سکتا۔ میں نے سوچا۔ لاوا جو میرے سینے پر چٹان کی طرح رکھا ہوا تھا۔ آنسوؤں سے پگھل کے بہہ جاتا۔ اس سے بھی اچھا ہوتا اگر میں پاگل ہو جاتا۔ احساس سے بیگانہ ہو جاتا، مر جاتا۔

نازو نے چلا کے کہا "غالب! بتاتے کیوں نہیں۔"

غالب نے رابعہ کا خط اس کو پکڑا دیا "اندر جا کے پڑھو۔ اور چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں۔ گل کو بھی سمجھا دو کہ عقل سے کام لے۔"

میں نے کہا "وہ رابعہ کو رو رہی ہے۔"

"رابعہ کوئی مر نہیں گئی ہے۔ وہ کچھ دن کے لئے واپس چلی گئی ہے اور بس" غالب نے برہمی سے کہا۔ ہم سب اندر جا کے کمرے میں ایسے بیٹھ گئے جیسے میت والے گھر میں سوگوار بیٹھتے ہیں۔

محسن نے سامنے آ کے کہا "رابعہ کہاں چلی گئی۔ لاہور؟"

غالب نے کہا "واپس کا مطلب اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"مگر کیوں؟ کیا وہ شملا کو لائے گی اپنے ساتھ؟ اور میرے بیٹے کو" محسن نے خوش ہو کے کہا "چلو یہ اچھا ہوا۔ آج سارا دن میں کوشش کرتا رہا مگر لاہور کی لائن نہیں ملی۔"

"تم فون کرتے رہے۔ کہاں سے؟" غالب نے کہا۔

"آفس میں فون ہے" محسن بولا "متو میاں نے تالا کھول دیا تھا۔"

میں نے کہا "شملا کا کون سا فون نمبر ہے....؟"

"میں اپنے یار عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کو فون کرتا رہا۔ لائن مل جاتی تو وہ بتا دیتا" محسن نے کہا "تم لوگ خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہو۔ مجھے اعتبار ہے تم پر کہ تم نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ حرام زادہ تریویدی جھوٹ بول رہا تھا۔ نازو نے بھی یہی بتایا تھا۔ اسی لئے تو میں فون کر رہا تھا۔ میں شملا سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں اسے یہ نمبر دے دیتا تو وہ منظر کے گھر سے بات کر لیتی۔"

"محسن! یہ کیا بے وقوفی ہے" میں نے کہا "کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ ٹیلی فون پر بات دوسرے بھی سنتے ہیں۔ اور انڈیا پاکستان کے درمیان گفتگو سنسر بھی ہوتی ہو گی۔ آج کل حالات ایسے ہی ہیں۔ سب کو مروانا چاہتے ہو تم۔"

غالب نے کہا "پولیس سیدھی یہاں پہنچ جائے گی اور ہمیں معلوم بھی نہیں ہو گا۔ تم نے کال بک کروائی ہو گی؟"

محسن نے گھبراتے انداز میں سر ہلایا "ہاں۔ انٹرنیشنل ٹرنک کال تو بک کرائے بغیر نہیں ہو سکتی۔ مگر میں بے وقوف نہیں ہوں۔ میں نے اپنا نام نہیں بتایا۔ میں نے کہا کہ "ارجن داس الوینم" کا نمبر ہے۔ خود ارجن داس بات کریں گے۔ آپریٹر کو کیا معلوم۔"

"چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ کال ملی نہیں۔ ورنہ تم بات کرتے شملا سے تو سب کا بیڑا غرق ہو جاتا" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "فوراً کینسل کراؤ کال۔"

"کال کینسل کرا دوں؟" محسن سوچ میں پڑ گیا "خیر تم کہتے ہو تو میں متو میاں سے کہتا ہوں۔ وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔"

"سین شین کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"ان کو شومیاں نے کہیں بھیجا تھا۔ ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے" محسن نے کہا۔

ان کے جانے کے بعد میں اور غالب کمرے میں تنہا رہ گئے۔ دھوپ لیے چپ رہ گئی تھی اور نازو کے سامنے بیٹھی دیوار کو گھور رہی تھی۔ نازو خط ہاتھ میں لئے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی اپنے سامنے والی دیوار پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

"میں یہ نہیں مان سکتی" اس نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا "اس میں ضرور دشمنوں کی کوئی چال ہے۔"

میں دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا "چال کیا ہو سکتی ہے؟ میں رابعہ کی تحریر پہچانتا ہوں"

"تحریر کی بات نہیں۔ یہ سوچو کہ ایسا وہ کیوں کرے گی؟ اس نے مجبور ہو کے یہ قدم اٹھایا ہوگا۔ تحریر تو میں بھی پہچانتی ہوں۔ اس میں کوئی جعلسازی نہیں ہے۔"

"مجبوری کا تو رابعہ نے اعتراف کیا ہے۔ اپنی مجبوری بتا دی ہے"

نازو نے نفی میں سر ہلایا "اصل مجبوری کچھ اور تھی جس پر رابعہ نے ایک خواب کا پردہ ڈال دیا۔"

"تم یہ کہہ رہی ہو کہ رابعہ نے جھوٹ بولا ہے جانتے بوجھتے" غالب بولا۔

"یہ خواب والا واقعہ اور سکندر کی آواز سنائی دینے والا معاملہ غلط ہے یہ صرف ہمیں مطمئن کرنے کے لئے ہے۔"

"یہ رابعہ کا نفسیاتی مسئلہ بھی تو ہو سکتا ہے" غالب نے کہا۔ "نروس بریک ڈاؤن۔"

"نہیں، یا تو تحریر جبر کے تحت حاصل کی گئی ہے۔"

میں نے کہا "فضول باتیں مت کرو۔ اس نے قسم کھائی ہے اور وہ جھوٹی قسم نہیں کھا سکتی۔ اس نے لکھا ہے کہ کوئی اسے دس بار گولی مار کے بھی جھوٹی قسم نہیں کھلا سکتا تھا۔"

"سکندر! جبر کا مطلب صرف جسمانی تشدد ہی تو نہیں ہوتا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے بلیک میل کیا گیا ہو۔ اس کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کے۔ ہر شخص کسی نہ کسی پہلو سے کمزور ہوتا ہے۔"

"رابعہ کو ایسی کسی کمزوری کا سامنا نہیں ہو سکتا" میں نے کہا۔

"کیوں؟ کیا تم، تمہاری زندگی، تمہارے تحفظ کی ضمانت یہ رابعہ کی کمزوری نہیں بن سکتے؟" نازو نے کہا "فرض کرو اس سے خفیہ طور پر رابطہ قائم کیا گیا ہو۔ اسے بتایا گیا ہو کہ دشمن تمہارے خلاف قاتلانہ عزائم رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایم آر ایس کی طاقت تم ہو۔"

"وہ غلط سمجھتے ہیں" میں نے بگڑ کے کہا۔ نازو کے دلائل مجھے پریشان کر رہے تھے۔

"ایسا تم سمجھتے ہو" نازو نے چبا کے کہا "دشمن کے نزدیک لیڈر ہی سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہوگا کہ سکندر کو ختم کر دو۔ ایم آر ایس بکھر جائے گی۔ ختم نہیں ہوگی تب بھی کمزور پڑ جائے گی۔ پھر اس کو ختم کرنا مشکل نہیں رہے گا۔ فرض کرو۔۔۔"

"کیا فرض کرو فرض کرو لگا رکھی ہے" غالب نے جھنجھلا کے کہا۔

"آخر تم لوگ میری بات سنتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو؟" نازو نے برہمی سے کہا "اگر غلط ہو میری بات تو مسترد کر دینا مگر سننے میں کیا حرج ہے کیا تمہیں اندیشہ ہے کہ میری دلیل کا مقابلہ تمہارے جذبات نہیں کر سکتے؟ مفروضات غلط بھی ہوتے ہیں لیکن سچ بھی ثابت ہو جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "نازو کو اپنی بات کہنے دو۔"

نازو نے کہا "سکندر! فرض کرو انہوں نے تنظیم کو توڑنے کے لئے نفسیاتی حربے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہو۔ وہ طاقت سے ہمیں شکست نہیں دے سکے۔ اب انہوں نے سوچا ہو کہ ایک ایک کر کے ان سب کی قوت مدافعت ختم کر دو۔ اکٹھے رہیں گے تو ان کی طاقت اتنی ہی ہوگی جتنی لکڑیوں کے گٹھے کی ہوتی ہے۔ ہر لکڑی کو الگ توڑا جا سکتا ہے۔ بوڑھے لکڑہارے کی کہانی یاد ہے نا؟ اتفاق میں برکت والی۔ پہلے انہوں نے شہلا کو اٹھا لیا تھا۔ محسن کو توڑنے کے لئے۔ ان کا خیال تھا کہ محسن کی جذباتی شکست اس کی ایم آر ایس سے علیحدگی کا سبب بن جائے گی۔۔۔"

"مگر ایسا نہیں ہوا" غالب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ایسا اس لئے نہیں ہوا کہ ہم نے یہ بات محسن کو پتا نہیں چلنے دی۔" نازو نے کہا "یہ بات اسے معلوم ہو جاتی تو شاید۔۔۔"

"ہرگز نہیں۔ محسن کو میں جانتا ہوں" میں نے کہا۔

"اور تمہیں میں جانتی ہوں" نازو نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "تمہیں محسن بھی جانتا ہے۔ لیکن تم اپنے آپ کو نہیں جانتے۔ محسن بھی اپنے آپ کو نہیں جانتا۔ یہ سب قیاس آرائیاں غلط بھی ہو سکتی ہیں کہ محسن کے لئے شہلا کے مقابلے میں اس مشن کی زیادہ اہمیت ہے اور وہ محبت کو فرض پر قربان کر سکتا ہے۔ ایسا موقع ابھی آیا ہی نہیں۔ آج اسے بتا کے دیکھو۔ صاف واضح الفاظ میں بتا دو کہ تمہاری بیوی اور تمہارا بچہ کب سے دشمنوں کے قبضے میں ہیں۔ وہ ان کو بارود اور اسلحے کے ڈپو پر لٹا کے کس طرح اپنے مال تجارت کے تحفظ کی ضمانت کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اور گزشتہ بار تو وہ اتفاق سے بچ گئے تھے۔ شاید قدرت کا مقرر کردہ وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ لیکن اگلی بار یا اس سے اگلی بار یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری کوئی کامیابی ان کے وجود کو دھوئیں میں تحلیل کر دے۔ محسن کو بتا کیوں نہیں دیتے اگر تمہیں اتنا ہی اعتماد ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟"

میں نے پہلے تو غور ہی نہیں کیا تھا مگر جب میں نے غالب کو اشارے کرتے دیکھا تو ایک دم مجھے بھی نازو کی غلطی کا احساس ہو گیا۔ جو بات آج تک کسی نے گل کے سامنے نہیں کی تھی وہ

شدید جذباتی موڈ میں نازو نے صاف کہہ دی تھی۔ میں اور غالب خاموش بیٹھے گل سے نظریں چراتے رہے مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ گل کو معلوم ہو چکا تھا کہ شہلا کون تھی۔ کسی بھی لڑکی کے لئے اس سے بڑا جذباتی سانحہ کیا ہو سکتا ہے کہ وہ جس پر محبت کے حق ملکیت کا دعوے رکھتی ہو وہ اچانک کسی اور کی ملکیت ثابت ہو جائے۔ ہم سب نے مل کے اسے بھی دھوکا دیا تھا۔ محسن بھی اس کا نہ تھا۔ یہ ایک سنگدلانہ مذاق تھا۔ ایک بہت بے رحم کھیل تھا جو ہم سب کے ساتھ محسن نے بھی اس کے جذبات کے ساتھ کھیلا تھا۔

لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ گل نے نازو کی پوری بات سکون سے سنی تھی اور اب بھی پُرسکون تھی۔ اس نے درمیان میں ایک بار بھی نازو کو ٹوک کر نہیں پوچھا تھا کہ یہ تم محسن کی کس بیوی کا اور کون سے بچے کا ذکر کر رہی ہو؟ کیا میں نے جس شہلا کا ذکر سنا تھا یہ وہی محسن کی بیوی شہلا ہے؟ کیا واقعی محسن شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ ہے؟ کیا تم سب یہ بات جانتے تھے؟ تم یہ بھی جانتے تھے کہ میں محسن کو اپنا سمجھتی ہوں۔ اس کی چاہت کا دم بھرتی ہوں۔ پھر تم نے مجھے دھوکے میں اور اندھیرے میں کیوں رکھا؟ بولو۔ نازو، غالب، سکندر......

لیکن اس کی آنکھوں میں کوئی شکوہ نہیں تھا۔ کوئی گلہ نہ تھا۔ اس نے نازو سے سب کچھ ایسے سنا تھا جیسے یہ کوئی انوکھی اور نئی بات نہیں۔ کوئی انکشاف نہیں۔ خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم جیسے ہم سب مل کے اس کی دلداری کا بھرم رکھتے تھے ایسے ہی وہ ہم سب کی دوستداری کا پاس کرتی تھی ورنہ سچ بھی کہیں چھپانے سے چھپتا ہے۔ اسے سب معلوم تھا۔

ایک مجرم خاموشی کے آزار سے بچنے کے لئے غالب نے کہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انہوں نے رابعہ کو بھی ایسے ہی اٹھا لیا ہو جیسے شہلا کو اٹھایا تھا۔"

میں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر وہ رابعہ کو لے جاتے تو گل کو بھی لے جاتے۔"

اچانک گل نے کہا "گل کو لے جاتے تو کیا فرق پڑتا۔ نہ گل کسی کی زندگی ہے اور نہ گل کی زندگی کسی کی ہے۔"

یہ ایک زہر میں بجھا ہوا خنجر تھا جو گل نے بڑی بے رحمی سے میرے دل میں اتار دیا تھا۔ یہ ایک ایسا تیر تھا جس کو اس نے کھینچ رکھا تھا اور اپنے خیالوں کی کمان سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا ہدف ہم ہوں گے مگر آج خود ہم نے کسی احساس شرمندگی اور اظہار ندامت کے بغیر اس کے سامنے اپنے جھوٹ کا پردہ چاک کر دیا تھا تو یہ تیر خود ہی نکل گیا تھا۔ ذہن میں آنے والا خیال الفاظ کے روپ میں ڈھل کر اس کی زبان پر آ گیا تھا۔ اس نے بھی ایک سچ بول دیا تھا کہ میرا مقابلہ شہلا سے یا رابعہ سے کیوں کرتے ہو۔ ان کو وہ محبت میسر ہے جس کی آبرو کے لئے زندگی کی بازی لگائی جا سکتی ہے اگر جیت گئے تو کیا کہنا ہار کے بھی تو بازی مات نہیں۔ شہلا کے لئے محسن جان دے سکتا ہے۔ رابعہ کے لئے سکندر جان دے سکتا ہے اور نازو کے لئے غالب۔ گل کے لئے کون ہے جان دینے والا۔ پھر اس کی جان کی قدر ہی کیا۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے کہا "گل! تمہاری زندگی بھی اتنی ہی اہم ہے ہم سب کے لئے..... یہ تم نے کیسے سمجھ لیا ہے کہ....."

گل نے کہا "مجھے معاف کر دیں سکندر بھائی! میں نے بہت گھٹیا بات کی ہے۔ آپ سب لوگوں کی محبت کو گالی دی ہے میں نے مجھے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔"

غالب نے کہا "مجھے معلوم تھا کہ یہ بات چھپائی نہیں جا سکتی۔ ایک نہ ایک دن تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم جھوٹ بول رہے تھے۔ لیکن ہم سب کا خیال تھا کہ یہ جھوٹ ضروری ہے۔ تمہاری بہتری کا ایک پہلو تھا اس میں۔ لیکن وہ بعد میں ایک ایسی غلطی بن گیا جس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں رہی۔ ہم سب ڈرتے رہے کہ اب تمہیں سچ کیسے بتائیں۔"

"یہ غلط نہیں ہے گل کہ رشتے اہم ہوتے ہیں، ان کی نوعیت نہیں۔ مجھے میری ماں زیادہ چاہتی تھی یا رابعہ زیادہ چاہتی ہے۔ مجھ سے میرے باپ کو زیادہ محبت تھی یا محسن کو ہے۔ یہ میں ناپ تول کے کیسے بتا سکتا ہوں۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ان سب سے میرے جذبات کا رشتہ ٹوٹ جائے تو میری زندگی میں خلا پیدا ہو جائے گا جو شاید کبھی پُر نہ ہو۔ تم مانو یا نہ مانو، مگر تم نے ہم سب کے دل میں جگہ بنالی ہے۔ تم ہمارے گھر اور ہمارے خاندان میں ہو۔ تمہاری جگہ خالی ہوگی تو اس کا احساس ہم سب کو اتنی ہی شدت کے ساتھ ہوگا جتنا رابعہ، شہلا یا نازو کے نہ ہونے کا یا میرے، غالب کے اور محسن کے نہ ہونے سے۔ کوئی اور اس جگہ کو پُر نہیں کر سکتا۔ خدا کے لئے ایسا مت سوچو کہ تمہاری زندگی کسی کے لئے اہم نہیں ہے۔"

ان سب دلائل کے باوجود ذہن کا گل کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور اب جو غلط بھی نہ تھے میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور تھا کہ میں حقیقت سے آنکھیں چرا رہا ہوں اور گل کی بات کا رخ بدل رہا ہوں۔ اس کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ دشمن مجھے اس لئے نہیں لے جا سکتے کہ میں کسی کی کمزوری نہیں ہوں۔ جیسے شہلا کو انہوں نے محسن کی کمزوری سمجھ کے اٹھایا تھا۔ ایسے ہی وہ رابعہ کو بھی لے جا سکتے ہیں کیوں کہ وہ میری کمزوری ہے۔ اور نازو کو لے جا سکتے ہیں جو غالب کی کمزوری ہے مگر گل کسی کی کمزوری نہیں ہے۔ اس کو اغوا کر کے وہ کس کو جذباتی طور پر کمزور کرنے کا سوچیں گے؟

نازو بالکل خاموش تھی اور اس کی یہ خاموشی اس کے اعتراف جرم سے کم نہ تھی۔ اس نے بھی گل سے جھوٹ بولا تھا اور اس جھوٹ کو نبھانے میں ہمارے ساتھ مسلسل جھوٹ بولتی

www.paksociety.com

رہی تھی۔ عذر گناہ بدتر از گناہ۔ اب اس کے سوا ہم کیا کر سکتے تھے کہ ہمارے بیچ سے محسن کو بھی نقصان ہوتا اور گل کو بھی۔ لیکن بیچ کسی پھوڑے کی طرح پکتا گیا تھا جو آخر کار پھوٹ گیا تھا۔ اب اس سے خارج ہونے والے مواد کی کراہیت کو چھپانا ممکن ہی نہ تھا۔ اب یہی بہتر تھا کہ اسے نشتر لگا کے چھیڑ دیا جائے اور سارے مواد کو خارج کر دیا جائے۔

نازو نے اچانک کہا "گل! تم کو۔۔۔ یہ کیسے معلوم ہوا۔۔۔ میرا مطلب ہے کب۔"

گل تلخی سے مسکرائی "کیا عشق چھپانے چھپتا ہے؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا اور کب معلوم ہوا کہ میں محسن کو چاہنے لگی ہوں؟ میں نے تو بہت کوشش کی تھی چھپانے کی، پھر بھی تم سب کو پتا چل گیا۔ کیسے، کیوں اور کب۔ یہ سب غیر اہم ہے۔ میں نے بھی جان لیا تھا کہ محسن کی بے نیازی اور تغافل کے انداز میں کسی اور کی محبت کا ردعمل ہے۔ تم نے شملا کا نام آتے ہی انجان بنتے اور محسن سے اس کے تعلق کی پردہ پوشی کی۔ میں نے اسی سے سمجھ لیا تھا کہ شملا کے سوا میری محبت کا راستہ روکنے والی کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ پھر میں نے محسن کی زبان سے سن لیا۔ سوتے میں 'جاگتے میں' بالکل غیر ارادی طور پر اس نے اپنا راز افشا کر دیا۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا مجھے۔ میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ میں محسن کے دل سے شملا کی محبت کو نہیں نکال سکتی۔ بالکل اسی طرح جیسے، خود باتم میرے دل سے اس کی محبت کا نقش نہیں مٹا سکتے۔ جو ہے سو ہے۔ کیوں کا کیا سوال۔ یہ بھی فضول بات ہے کہ ایسا ہونا چاہیے اور ویسا نہیں ہونا چاہیے۔ میں چاہوں کہ شملا کو محسن سے یا محسن کو شملا سے پیار نہیں کرنا چاہیے اور ان کے رشتے کو دیکھتے ہوئے مجھے محسن کی محبت کے پاگل پن میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ تو میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم جو چاہو سمجھو، جو چاہو کہو۔ میں مجبور ہوں۔ اتنی ہی جتنے تم سب ہو۔ اتنی ہی بے بس ہوں جتنے محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ تم محبت میں سب کچھ پالو گے۔ میں سب کچھ کھو دوں گی خوشی خوشی۔"

میں نے کہا "دیکھو گل! اب سب اگر محسن نے سنا تو کیا ہوگا؟ کیا سمجھے گا وہ؟"

گل نے روتے روتے کہا "بھائی سکندر! میں بھی تمہاری طرح شملا کی زندگی اور اس کی سلامتی چاہتی ہوں۔ میں تم سے زیادہ فکرمند اور آزردہ ہوں کہ خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو کہیں الزام میری چاہت پر نہ آ جائے کہ میں نے ایسا چاہا تھا۔ خدا کی قسم میں اتنی ذلیل نہیں ہوں۔ میں بھی نہیں چاہتی کہ محسن کو کچھ معلوم ہو۔ آپ سب بھی مجھ پر رحم کریں۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولی "پھر کبھی یہ بات نہ کریں۔ نہ مجھ سے اکیلے میں، نہ کسی کے سامنے۔ مجھے معلوم ہے محسن کتنا دکھی ہے۔ میں اس کے دکھ میں اضافہ کرنا نہیں چاہتی۔ میں نے تو چاہا تھا کہ اس کے سب دکھ لے لوں۔ شملا کی جگہ میں چلی جاؤں مگر۔۔۔ وہ نہیں مانے۔"

اس بات نے ہم سب کو چونکا دیا "کون نہیں مانا؟" غالب نے کہا۔

"وہی۔ جنہوں نے شملا کو قید کر رکھا ہے اور وہ کون۔۔"

"تم۔ تم نے ان سے بات کی تھی؟" میں نے کہا۔

گل نے اقرار میں سر ہلایا "تم اسے غلطی کہو، نافرمانی یا بے وقوفی۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ میں نے جو کیا تھا ٹھیک تھا۔ میں نے زوبی سے بات کی تھی۔"

میں بھونچکا رہ گیا "تم نے اسے فون کیا تھا؟"

"ہاں۔ فون بھی کیا تھا اور پیغام بھی بھجوایا تھا ڈاک سے کہ وہ شملا کو چھوڑ دے۔۔۔ اس کی جگہ میں آنے کے لئے تیار ہوں۔"

"تمہارا کیا خیال تھا۔ وہ مان جائے گا؟" میں نے بے بسی سے کہا "جتنا تمہیں محسن کا خیال ہے اتنا ہی انہیں بھی ہوگا کہ۔۔"

"میں نے۔۔ محسن کے حوالے سے بات نہیں کی تھی۔ میں نے تو کہا تھا کہ شملا ایک ماں ہے۔ اس کے ساتھ ایک معصوم بچہ ہے جو کچھ نہیں جانتا اور کچھ نہیں سمجھتا۔ اس پر رحم کرے۔"

"بے وقوف لڑکی! وہ رحم کے لفظ کو بھی نہیں سمجھتے، کسی رشتے کی حرمت کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک شملا ایک عورت ہے جس پر زیادہ درندگی کے ساتھ جسمانی تشدد کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ماں بھی ہے جس کے سامنے اس کے بچے کو الٹا لٹکایا جائے یا کند چھری سے ذبح کیا جائے تو وہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کی قوت مزاحمت جواب دے جائے گی۔ وہ دشمنوں کی آلہ کار بننے پر مجبور ہو جائے گی۔ اور گل! وہ ایک بیوی بھی ہے۔ اگر اس کے شوہر کے سامنے۔۔۔"

نازو نے کہا "رابعہ بھی تو ایک عورت ہے۔ ایک محبت کرنے والی عورت۔"

"تم جانتی ہو کہ اس نے کیسی کیسی ذلت آمیز اذیت برداشت کی تھی اور خود میں نے وہ سب کچھ دیکھا تھا اپنی آنکھوں سے۔ غالب سے پوچھو کہ اس پر کیا بیتی تھی" میں نے غصے سے کہا۔

"غالب سے مت پوچھو۔ مجھ سے پوچھو۔" نازو نے کہا۔

"ابھی تک میں نے تمہیں اپنا سرکاری ترجمان مقرر نہیں کیا۔" غالب نے احتجاج کیا۔

"تمہارے انکار سے کچھ نہیں ہوتا" نازو نے ترخ کے کہا۔

غالب نے میز پر مکا مارا "انکار کا حق مجھے اس وقت بھی حاصل رہے گا جب قاضی پوچھے گا کہ قبول کیا؟ حالانکہ میرا سسر ایک بھوت ہے مگر میں اس سے بھی نہیں ڈرتا۔"

"کر دینا انکار۔ پروا کس کی ہے میری جوتی۔"

"بابا، میں نے کب کہا ہے کہ تمہیں قبول کرنے سے انکار کروں گا۔ تم ابھی پوچھ کے دیکھو۔" غالب نے کہا "ویسے یہ بے شرمی کی بات کیوں کہ پیغام لڑکے والے دیتے ہیں، بابا کا پوچھنا بنتا ہے۔"

نازو آگ بگولا ہو کے اٹھی ہی تھی کہ میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے بٹھا دیا "لڑائی سے لڑائی نکالنا تم دونوں کو آتا ہے۔ پتا نہیں تم دونوں کا گزارا کیسے ہوگا۔"

"ایسے ہی ہوگا جیسے جیلر کا قیدی کے ساتھ ہوتا ہے" غالب نے کہا "کیوں نازو؟"

"مجھ سے کیوں پوچھتے ہو، جا کے پوچھو اس سے جو یہ قید قبول کر رہا ہے۔" نازو بگڑ گئی۔

"پھر وہی الٹی بات۔ قیدی میں نے اپنے آپ کو کہا تھا۔ جیلر تو بن سکتی ہو تم۔ بلکہ جلاد تک بن سکتی ہو" غالب بولا "دل توڑنے سے زیادہ گردن توڑنا آتا ہے تمہیں۔"

نازو ہنس پڑی۔ "سکندر کا دل رونے کو چاہتا ہے اور تم مذاق کر رہے ہو۔"

میں نے چونک کے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ! اپنی لڑائی میں مجھے مت گھسیٹو۔"

نازو نے کہا "میرا خیال ہے سکندر کہ رابعہ حوصلہ ہار گئی۔ کسی نے اسے دہشت زدہ کیا۔ تمہارا نام لے کر دھمکی دی کہ تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن وہ واپس چلی جائے تو تمہیں زندہ سلامت اس کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ اسے کسی نہ کسی طرح یقین دلایا گیا ہوگا کہ یہ محض دھمکی نہیں ہے۔ سو وہ ڈر گئی۔ اس نے بہتر یہی سمجھا کہ واپس لوٹ جائے۔"

"یہ ناممکن ہے" میں نے کہا۔

"ناممکن کوئی لفظ نہیں۔ جو آج ناممکن ہے وہ کل ممکن بھی ہو سکتا ہے" نازو نے قطعی بے رخی سے کہا "رابعہ بہرحال عورت تھی، کوئی پتھر کی چٹان نہیں تھی۔"

"خود تم کیا ہو؟ مجھے بتاؤ اگر ایسا تمہارے ساتھ ہوتا" میں نے غصے سے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں کہ کب تک میرے اعصاب میرا ساتھ دیں گے۔ میں بھی بشر ہوں۔ ہار سکتی ہوں" نازو نے صاف کہا۔ "میں کوئی دعویٰ نہیں رکھتی ناقابل شکست ہونے کا۔ آج زبان سے دعوے کرنا آسان ہے۔ کل جب عملاً کچھ کرنا پڑا تو میں کیا کروں گی۔ یہ میں نہیں جانتی۔"

"لیکن میں جانتا ہوں۔ تم غالب کو خود گولی مار سکتی ہو" میں نے کہا۔

"جیسے تم رابعہ کو مار سکتے ہو" نازو نے طنز سے کہا "یہ تو کی بات؟ باتیں کرنا تو واقعی بہت آسان ہے۔"

غالب کسی سوچ میں غرق تھا۔ اس نے اچانک کہا "اگر ایسا ہے تو معلوم ہو جائے گا۔ رابعہ ہمت ہار گئی ہے تو وہ سکندر کو بھی ہم سے چھین کر لے جانے کی کوشش کرے گی۔ اس کے ارادوں کی راہ میں جذباتی خلفشار حائل کر دیں گی۔ ایک طرح سے وہ دشمن کی آلہ کار بن جائے گی۔"

نازو نے کہا "یہ قطعی ضروری نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ رابعہ خود کو سکندر کے راستے سے ہٹا لے۔ اس کی زندگی سے نکل جائے تاکہ اس کے لئے کوئی مشکل نہ رہے۔ وہ اپنی محبت کو اور اپنے ارمانوں کو قربان کر سکتی ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اس میں سکندر کی بہتری ہے۔ اگر وہ سکندر کا ساتھ نہیں دے سکتی تو اس کا راستہ کیوں روکے۔ سکندر کو صدمہ ایک ہی بار ہوگا۔ آخر کار وہ رابعہ کو بھول جائے گا۔"

میں نے کہا "نازو! خدا کے لئے اتنی بے رحم مت بنو۔ میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔"

نازو نے کہا "وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے۔ مگر دیکھو، مجھے غلط مت سمجھو۔ میں بھی عورت ہوں اور اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے کے باوجود میں یہ بھی جانتی ہوں کہ مجھ میں کتنی طاقت ہے۔ رابعہ تمہاری طاقت بھی بن سکتی ہے تو تم سے اپنی طاقت منوا بھی سکتی ہے۔ ابھی تو بات صرف اتنی ہے کہ وہ چلی گئی ہے، اپنی مرضی سے یا کسی اور کی مرضی سے۔ حقیقت کیا ہے۔ اصل اسباب کیا ہیں، رابعہ کس حد تک مجبور تھی۔ کیا کسی نے اسے بلیک میل کیا یا کوئی تمہیں بلیک میل کرنا چاہتا ہے جو اس نے خود کو کمزور پا کر یک طرفہ طور پر فیصلہ کر لیا کہ اس کا الگ ہو جانا ہی سب کے مفاد میں ہے۔ یا کوئی اور بات ہے، اس کا پتا چل جائے گا۔ اچھی بات یہ ہے کہ تم کمزور نہیں پڑے۔"

نازو کی بات اب میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ شاید اصل بات رابعہ نے مجھ سے اور ہم سب سے چھپائی۔ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔ یعنی وہ جھوٹ بہتر ہے جس میں بہتری ہو بہ نسبت اس سچ کے جس میں خرابی ہو۔ اس نے اپنی مجبوری کے لئے ایک ایسا جذباتی عذر تلاش کر لیا جسے ہم عقل کی دلیل سے مسترد نہ کر سکیں۔ وہ واپس جانا چاہتی تھی کیوں کہ وہ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ اس کی موجودگی ہمارے لئے مسائل پیدا کر رہی ہے مگر رابعہ اس حقیقت کا اعتراف ہم سب کے سامنے کیسے کر سکتی تھی کہ بزدل، بے وقوف لڑکی! اتنی جلدی ہمت ہار گئی۔ اب وہ کیا کرے گی؟ لاہور میں بیٹھ کے میری راہ دیکھے گی؟ میری سلامتی کے ساتھ واپسی کے لئے دعائیں مانگے گی۔ رات رات بھر جاگ کے کاٹے گی اور اپنی تنہائی سے باتیں کرے گی۔

رنج اور صدمے کے ساتھ میرا غصہ بڑھ رہا تھا۔ آخر اس نے مجھ پر بھروسا کیوں نہیں کیا۔ میں اسے زبردستی ساتھ نہ رکھتا۔ وہ صاف کہہ سکتی تھی کہ سکندر میں تھک گئی ہوں۔ مجھ میں اور ہمت نہیں ہے آگے جانے کی۔ مجھے واپس جانے دو۔ ایسی بزدل اور کم حوصلہ لڑکی سے کیا بعید۔ وہ انتظار بھی نہ کر سکے۔ مایوس ہو کے ان

www.paksociety.com

سب خوابوں سے دستبردار ہو جائے جو اس نے میرے ساتھ دیکھے تھے۔ صرف اسے یہ حق حاصل نہیں تھا کہ ان خوابوں سے تعبیر چھین لے۔ ان پر میرا بھی حق تھا۔

پھر رابعہ کی آواز نے میرے خیالات کی رو پلٹ دی۔ اس نے کہا ”سکندر! تم کیا سوچ رہے ہو؟ ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟ تم مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہو‘ حوصلہ ہار رہے ہو ابھی سے۔ تم کو میرے وعدوں پر اعتبار نہیں رہا۔ میں نے کہا تھا کہ میں پھر ملوں گی۔ اسی دنیا میں‘ اسی زندگی میں۔ تم اپنا سفر جاری رکھو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

میں شرمندہ ہو گیا۔ عدم اعتماد کا مظاہرہ رابعہ نے نہیں کیا تھا‘ میں کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس کے ساتھ وہی ہوا ہوگا جو اس نے لکھا ہے مگر یہ بات میری عقل میں نہیں آسکتی‘ کسی کی عقل میں نہیں آسکتی۔ اس لئے کہ یہ عقل کی نہیں جذبات کی بات ہے۔ ای ایس پی۔ چھٹی حس۔ ٹیلی پیتھی۔ بہت سی باتیں انسانی تجربے کا حصہ ہیں مگر ناقابل فہم۔

غالب نے کہا ”سوچنے کی بات یہ ہے کہ رابعہ نے واپس جانے کے لئے راستے کی مشکلات کو کیسے نظرانداز کیا۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ پاسپورٹ نہ نقد رقم۔ وہ اکیلی کیسے جائے گی۔“

بانو نے کہا ”وہ آئی بھی تو اکیلی تھی۔ راستہ نکالنا اور وسائل پیدا کرنا اسے آتا ہے۔ وہ جس راستے پر چپکے آئی تھی اسی راستے پر اسی طرح واپس کیوں نہیں جا سکتی۔“

محسن منہ لٹکائے اندر آیا اور میرے قریب بیٹھ گیا ”گل کیوں اداس ہے؟“

بانو نے آہ بھر کے کہا ”بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا۔“

”کیا واپس چلی گئی؟“ محسن بولا ”اداس تو بلبلے کو ہونا چاہئے۔“

غالب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا ”بلبلے کی حالت زار کہتی ہے۔ تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے۔“

محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کے شگفتگی سے کہا ”یار! ہم بلبل کے وارنٹ نکلوا دیں گے یا تصویر لگوا دیں گے اخبار میں کہ بلبل کسی بھی آشیاں میں ہو فوراً لوٹ آئے۔ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اس کے بغیر بلبلے کی حالت خراب ہے۔“

بانو نے کہا ”اور ہم بہار کو بھی واپس لے آئیں گے۔ سدا بہار پھول اور پودے ہوں گے تو بہار جائے گی کیسے۔“

محسن نے سب کو ہنستے دیکھ کر کہا ”تم بھی مسکراؤ گل نو بہار‘ ورنہ میں کرتا ہوں گدگدی۔“

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ یکلخت وہ پرانا محسن بن گیا تھا۔ شگفتہ مزاجی‘ شوخی اور زندہ دلی کا پیکر۔ میرا خیال تھا کہ وہ کال کینسل کرا کے آئے گا تو اس کا موڈ زیادہ خراب ہوگا۔

گل مسکرانے لگی ”بھائی سکندر کو جتا دو تو مانیں۔“

”میں جتا دوں گا‘ پھر مانو گی؟ بولو“ محسن نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

گل نے گڑبڑا کے کہا ”کیا؟“

”جو بھی میں کہوں“ محسن نے شرارت سے کہا۔

گل کا رنگ گل لالہ جیسا ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے ہم سب کی خاطر محسن نے اپنے غم پر بے حسی کا پردہ ڈال دیا ہے اور دکھ کو اپنے دل کی دیواروں میں قید کر لیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے گل نے محسن کی چاہت کو اپنے دل کی دیواروں میں قید کر دیا تھا کیوں کہ وہ اپنے غم کے بارے میں سب کو اذیت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ پھر کیا میں ہی اتنا بے بس و لاچار ہوں کہ اپنے دل کا درد نہیں چھپا سکتا اور ان سب کی خاطر ہنس نہیں سکتا جو مجھے افسردہ دیکھ کے افسردہ ہو جاتے ہیں۔ رابعہ کے خیال نے کہا۔ یاد کرو اس وقت میں نے تمہیں کیا کہا تھا جب تم زنداں کی دیوار کے دوسری طرف تھا‘ مایوس اور دل گرفتہ بیٹھے تھے۔ جدا ہیں آج اگر ہم تو کل ہم ہوں گے۔ یہ چند روزہ جدائی تو کوئی بات نہیں۔ اور تم خوش ہو گئے تھے پھر آج کیوں منہ لٹکائے بیٹھے ہو۔

میں ہنسنے لگا۔ محسن ہنسنے لگا‘ پھر گل ہنسنے لگی۔ ہنسی علاج غم ہے۔ فراریت‘ ایوں لوگ سارے غم بزعم شراب کی خود فراموشی میں ڈبوتے ہیں اور خود بھی ڈوب جاتے ہیں۔ چاہنے والوں کو سب کچھ سہنا پڑتا ہے۔ کبھی اپنے لئے کبھی اپنوں کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ دل کا لہو آنکھ سے آنسو بن کر ٹپکنا چاہے تو اس کا راستہ روکنے کے لئے ہونٹوں پر مسکراہٹ کو مسلط کرنا پڑتا ہے اور اسی طرح ہنسنا پڑتا ہے جیسے محفل میں سب خندہ زن ہوں۔ یہ کوئی نہ سمجھے کہ اس ہنسی کے پیچھے کیا ہے۔ کتنا جبر ہے اور کتنا صبر‘ کتنا اختیار ہے اور کتنا انتشار‘ کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ۔

منو میاں نے اچانک قدم رنجہ فرما کے رنگ محفل بدل دیا۔ ”بھئی آج تو خوب رونق ہے۔ سبحان اللہ! یہ خاتون کون ہیں جن کی آنکھوں میں ساری مستی حشیش کی سی ہے۔“

گل کی آنکھیں رونے سے لال ہو رہی تھیں۔ چنانچہ منو میاں نے میر کے شعر کو حسب حال کرتے ہوئے شراب کی جگہ چرس ڈال دی اور پھر اپنی بات پر خوب ہنسے۔

غالب نے کہا ”یہ گل ہے۔“

”صرف گل۔ چہ خوب۔ رنگت میں گل لالہ۔ صورت میں گل نرگس۔“

غالب نے کہا ”یہ گل بانو ہے۔“

”اچھا اچھا۔ اور بھئی وہ کہاں ہیں“ منو میاں بولے ”سکندر اعظم کو فاتح اور مفتوح بنانے والی۔ محبت کی عدالت میں مدعی اور مدعا علیہ۔ ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔“

غالب نے ان کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ پر تپاخ سے ہاتھ

مارا۔ اتنی قوت سے کہ منو میاں کا ہاتھ لال ہو گیا ہوگا ”وہ میکے چلی گئی ہے کچھ دن کے لئے۔“

منو میاں نے پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا ”بھئی کیوں ہم بوڑھوں پر طاقت آزماتے ہو۔ اللہ کرے زور شباب اور زیادہ مگر اس کے لئے جو۔۔۔“

ان کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے کہا ”وہ منکر نکیر کہاں ہیں؟“

”وہ ایک اہم کام سے گئے ہیں۔ کچھ معلومات ایسی ملی تھیں کہ تصدیق ضروری تھی“ منو میاں ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

”معلومات کہاں سے حاصل ہوتی ہیں آپ کو؟“ میں نے کہا۔

غالب نے بھی سر ہلایا ”اور یہ کس قسم کی معلومات ہیں؟“

”ایک طرح سے ہمارا اور تمہارا کام بالکل ایک ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہم مشرقی حصے میں سرگرم عمل تھے۔ تم مغربی حصے میں۔ دشمن بھی ہمارے وہی تھے جو تمہارے۔ تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندوں کے خلاف مزاحمت کرنے والے منظم ہو گئے ہیں۔ مکتی باہنی جیسی تنظیموں کے خلاف البدر اور الشمس جیسی تنظیمیں ہیں۔ فرق صرف وسائل کی کمی کا ہے۔ دہشت گردوں اور تخریب کاروں کو باہر سے وافر امداد مل رہی ہے پیسے کی صورت میں بھی اور اسلحے کی شکل میں بھی۔ ہم کس سے مانگنے جائیں؟ بس خدا سے ہمت مانگتے ہیں۔ وہی مسبب الاسباب ہے۔ وسائل بھی پیدا کر دیتا ہے۔ ہمارے مقابل کرائے کے لوگ ہیں۔ لالچی اور بے ضمیر۔ صرف پیسے کے لئے لڑنے والے۔ وہ بہادر کیسے ہو سکتے ہیں۔ انہیں جان پیاری ہے۔ پیسہ انہوں نے جینے کے لئے لیا ہے‘ مرنے کے لئے نہیں۔ ایک بار نہیں سیکڑوں بار ایسا ہوا کہ ہمارے سامنے اگر سیکڑوں تھے تو ہمارا شمار درجنوں میں کیا جا سکتا تھا مگر وہ بلا مقابلہ بھاگ کھڑے ہوئے اور جو پکڑے گئے انہوں نے بڑی ڈھٹائی سے کہا کہ ہمیں معلوم ہے تم پکڑو گے تو قتل نہیں کرو گے پھر ہمیں کیا ضرورت ہے تمہاری گولی کا نشانہ بننے کی۔“

”گویا وہ دونوں طرف کے غدار ہیں؟“ میں نے کہا۔

”کیا یہ بات انہیں معلوم نہیں جو معاوضے پر ان کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور انہیں اسلحہ فراہم کرتے ہیں؟“ غالب نے کہا۔

”کیوں نہیں معلوم۔ لیکن وہ ہر محاذ پر موجود نہیں رہ سکتے۔ قید ہو جانے والے بھی بک سکتے ہیں اور بلا مقابلہ بھاگ جانے والے بھی کہ دشمن کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ ہم نے تو ڈٹ کے مقابلہ کیا مگر اسلحہ ختم ہو جانے کے بعد ہم کیا کرتے۔“

”اور وہ یقین کر لیتے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”نہ یقین کریں تو کیا کریں؟ انہیں خود گولی مار دیں؟ میدان جنگ سے فرار ہونے والے سپاہی کی طرح ان کا کورٹ مارشل تو ہو نہیں سکتا“ منو میاں بولے۔

”وہ اسلحہ استعمال ہی نہیں کرتے تو پھر کیا کرتے ہیں؟“

”کچھ ہمارے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ باقی وہ دوسروں کو بیچ دیتے ہیں۔ کبھی ہمارے ایجنٹ خرید لیتے ہیں تو کبھی پھر دشمن کے ایجنٹ لے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہر جگہ ایسا ہو رہا ہے۔ لوگ مار بھی رہے ہیں اور مارے بھی جا رہے ہیں۔ ہماری قوت بھی منتشر ہے۔ وہ بستی بستیوں پر حملے کرتے ہیں۔ راہ چلتے لوگوں کو مار جاتے ہیں۔ کشتیوں پر فائرنگ کرتے ہیں اور چھپ کر پلوں پر سے گزرنے والی لاریوں کے مسافروں کو بھون ڈالتے ہیں۔ ہم بھی تاک میں رہتے ہیں اور غداروں کو چن چن کے مارتے ہیں۔ لیکن کبھی وہ اکٹھے ہو کے آتے ہیں اور غیر متوقع طور پر محصور ہو جانے کی نوبت آجائے تو پھر ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ بعض اوقات ہمیں اطلاع مل جاتی ہے۔ بعض اوقات ان کے اندازے غلط ہو جاتے ہیں یا ہم انہیں غلط اطلاعات کے جال میں پھنسا کے گھیر لاتے ہیں۔“

”اچھا شکاری کون ثابت ہو رہا ہے؟“

”اچھا شکاری وہ ہے جس کی تقدیر اس کے ساتھ ہو“ منو میاں نے کہا ”ورنہ ہر تدبیر دھری رہ جاتی ہے۔“

”آپ لوگ کس تنظیم سے منسلک ہیں؟“

”منسلک ہم کسی سے نہیں اور سب سے ہیں“ منو میاں بولے ”مقصد کو دیکھا جائے تو ہم سب کے ساتھ ہیں۔ طریقہ کار ہمارا اپنا ہے۔ ہم دوسروں کی مدد بھی کرتے ہیں اور خود بھی مدد مانگ لیتے ہیں ضرورت پڑنے پر۔ اس قسم کے تعاون کے بغیر کام نہیں چلتا۔ بس ہم سیاست میں الجھنا نہیں چاہتے اور مصلحت دیکھ کر کام کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیتے۔“

”پھر بھی کتنے لوگ ہیں جو آپ کا حکم مانتے ہیں؟ آپ کی منصوبہ بندی کے مطابق کام کرتے ہیں؟“

”بہت ہیں‘ ہر جگہ ہیں۔ سب ایک دوسرے کو نام سے نہیں جان سکتے اس لئے نمبر سے پہچانتے ہیں۔ نمبر بدلتے رہتے ہیں اور بہت خفیہ رکھے جاتے ہیں ورنہ دشمن ہماری صفوں میں شامل ہو جائے۔ غلط قسم کے لوگ نکال بھی دیئے جاتے ہیں۔ ہم تین یہاں آئے ہوئے ہیں لیکن باقی سب سے ہمارا رابطہ قائم ہے۔ مقررہ وقت پر میں ایک شخص سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔ وہ مجھے اہم معاملات کی مختصر رپورٹ دیتا ہے اور مجھ سے ہدایات لیتا ہے۔“

”وائرلیس؟“

”ظاہر ہے۔ ہمارے پاس شارٹ ویو ٹرانسمیٹر ہیں اور ریڈیو ریسیور۔ ان کی رینج ایک ہزار سے پندرہ سو میل کے درمیان تک ہے۔ ہم مخصوص فریکوئنسی پر بات کرتے ہیں۔“

”لیکن یہ گفتگو تو کسی بھی ریڈیو پر کوئی بھی سن سکتا ہے“ میں

www.paksociety.com

نے کہا۔
"ایک تو ہم فریکوئنسی بدلتے رہتے ہیں" منّو میاں نے کہا۔ "دوسرے یہ گفتگو خفیہ زبان میں ہوتی ہے۔ ہر بار ہم یہ کوڈ بھی تبدیل کر دیتے ہیں۔"
غالب نے کہا "آپ کو کیسے معلوم ہوتا ہے کہ جو معلومات آپ کو فراہم کی جاتی ہیں وہ درست ہیں اور اپنے ہی ساتھی کی فراہم کردہ ہیں۔ آج کل کسی بھی کوڈ کو سمجھنا کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ دشمن آپ کو گمراہ کرنے کے لئے آپ کی خفیہ زبان میں غلط معلومات فراہم کر دے۔"
"ایسے امکانات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، خواہ وہ ایک فیصد ہوں یا دس فیصد۔ کوئی بھی سسٹم سو فیصد قابلِ اعتماد نہیں ہوتا لیکن ابھی تک ایسا ہوا نہیں۔ یہ کام ناممکن نہیں مگر بہت مشکل ہے۔ ہم خود اپنی عقل سے بھی تو پیغام کو سمجھتے ہیں اور مندرجات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ مثلاً کل ہی ہمارے ایک ساتھی نے اطلاع دی کہ یہاں سے اسلحے کی ایک کھیپ مال گاڑی کے ذریعے روانہ کی جا رہی ہے۔ تاریخ اور جگہ کے بارے میں معلومات حاصل کی جا رہی ہیں۔ اس سے پہلے پیغام ملا تھا کہ اسلحے کی خالی پیٹیاں دھوکا دینے کے لئے پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ ٹرکوں پر لوڈ کر کے بھیجی جائیں گی۔ اس ڈرامے کی پوری ریہرسل ہو چکی ہے۔"
میں نے حیران ہو کے کہا "تمہیں بے وقوف بنانا چاہتے ہیں۔"
غالب نے سر ہلایا "ہم تو واقعی گمراہ ہو جاتے۔ ٹرکوں کے پیچھے چل پڑتے۔ بعد میں معلوم ہوتا کہ ان میں کچھ بھی نہیں ہے۔"
"یہ بات یہاں کس نے معلوم کی اور کیسے؟" میں نے کہا۔
منّو میاں مسکرائے "ساری معلومات وہیں حاصل ہو جاتی ہیں جہاں مال وصول کرنے والے بیٹھے ہیں۔ ان کے پیچھے ہم نے اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ غدار شامل ہو گئے ہیں۔ وہ درحقیقت ہمارے ساتھ ہیں مگر ان کا اعتماد حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے درمیان کچھ کالی بھیڑیں بھی ہیں۔ ان کو ففتھ کالم سمجھ لو کہ وہ دل سے ان کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ ان کے مخالف ہیں مگر کسی مجبوری کی وجہ سے کھل کر ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے۔ ان لوگوں سے حاصل ہونے والی معلومات پر ہم آنکھ بند کر کے اعتبار نہیں کرتے۔ پہلے تصدیق کر لیتے ہیں لیکن بعض اوقات خود ہماری چھٹی حس یا ہمارا وجدان رہنمائی کرتے ہیں۔"
میں نے کہا "میں سمجھ گیا آپ کے طریقِ کار کو۔ لیکن اب مجھے یہ بتائیے کہ کیا خود آپ کے درمیان کالی بھیڑیں اور ان کے چھوڑے ہوئے جاسوس نہیں ہیں؟"
"کیوں نہیں ہیں۔ میں نے کہا نا کہ ہم انہیں پکڑ لیتے ہیں تو ان کی چھٹی کر دیتے ہیں۔"
"کیسی چھٹی؟ صرف خارج کر دیتے ہیں انہیں؟" غالب نے کہا۔
"کبھی دکھائیں گے تمہیں یہ تماشا بھی" منّو میاں بولے۔
"منّو میاں! آپ ہم پر اعتماد نہیں کرتے؟"
"... منہ بنا کے "توبہ توبہ! آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ ہم تو آپ کے پرستار ہیں۔ بہت ادنیٰ خادم ہیں۔"
"پھر آپ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ آپ اپنے ساتھیوں کو نمبر کیسے دیتے ہیں۔ ان کی شناخت کیسے کرتے ہیں اور آپ کے درمیان پیغام رسانی کی خفیہ زبان کیا ہے۔"
"ہم آپ کا امتحان لیتے ہیں۔ ابھی جو پیغام ہم نے آپ کو بتایا یہ ہمارے دوست ڈی ایف نے بھیجا تھا۔"
"ڈی ایف" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔
نازو نے کہا "نمبر چھیالیس۔"
منّو میاں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا مگر کہا "لائن ٹھیک ہے مگر جواب غلط۔"
غالب نے کہا "چونسٹھ؟"
منّو میاں ہنسے "ایک ہی لائن پر جا رہے ہو دونوں۔"
غالب نے آہ بھر کے کہا "کاش ایسا ہوتا۔ ہم تو ریل کی پٹڑیوں کی طرح چل رہے ہیں ساتھ ساتھ مگر ہمیشہ ہی دور۔"
نازو نے کہا "کانٹا بدل تو۔ کوئی نہ کوئی لائن مل جائے گی۔"
میں نے کہا "چھوڑیئے ان کی باتوں کو۔ آپ بتائیے منّو میاں کہ اصل نمبر کیا تھا۔"
"اصل نمبر تھا بانوے۔ مگر تم کس طرح اندازے لگا رہے تھے؟"
"ہم بھی یہ خفیہ زبان استعمال کر چکے ہیں۔ انگریزی زبان کے چھبیس حروف ہیں جو چھبیس اعداد کے طور پر استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ نمبر چار ہے ڈی۔ نمبر چھ ہو گیا ایف۔ نازو نے چھیالیس بتایا تھا۔ میں نے سوچا شاید نمبر الٹا چلتا ہو۔"
"ابھی نمبر سیدھا چل رہا ہے۔ پچھلے مہینے الٹا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی پچھلے مہینے نمبر کو تین سے ضرب دے کر اصل نمبر حاصل ہوتا تھا۔ اس ماہ دو سے ضرب دینا ہے۔ اب تم یوں سمجھ لو کہ ہم نے سب کو مستقل نمبر دے رکھے ہیں۔ ہر ماہ ہر دوست کو صرف اتنا بتا دیا جاتا ہے کہ ضرب دو یا ضرب تین یا جمع دس یا منفی پانچ۔ سب کو ایک ہی کوڈ پر عمل کرنا ہوگا۔ نمبر چھیالیس نے جب پیغام بھیجا تو نمبر دیا ڈی ایف۔ ہم نے اصل نمبر معلوم کر لیا۔ بانوے۔ گزشتہ ماہ کوئی ڈی ایف بتاتا تو اس کا مطلب ہوتا نمبر ایک سو اڑتیس۔ ہم فوراً چیک کر لیتے ہیں کہ وہ کون ہے اور اس نے کہاں سے پیغام دیا ہے۔ اس طرح ہر ماہ نمبر بدل جاتا ہے لیکن اصل نمبر وہی رہتا ہے۔ اگر آئندہ ماہ "تقسیم دو" ہو جائے تو ڈی ایف کا مطلب ہوگا نمبر تئیس۔"
"ویری گڈ" غالب نے کہا "نمبروں کی شناخت تو ہو گئی۔ کیا

پیغام رسانی بھی ایسے ہی ہوتی ہے؟ اے بی سی کی جگہ ایک دو تین کے اعداد کی مدد سے۔"
"نہیں۔ اس کے لئے ہماری اپنی ڈکشنری ہے۔ کس لفظ کا مطلب کیا ہے۔ یہ صرف چند لوگ سمجھتے ہیں۔ دوست صرف اطلاع دے سکتے ہیں۔ اسے کہیں پہنچانے کے لئے ریڈیو ٹرانسمیٹر پر جو زبان استعمال کی جاتی ہے اسے یا تو پیغام بھیجنے والا جانتا ہے یا پیغام وصول کرنے والا۔ مثلاً کرسی کا مطلب اگر میز ہے اور میز کا مطلب چارپائی ہے تو یہ ڈکشنری میں رہا ہوا ہے۔"
"پیغام ملنے کے بعد آپ ڈکشنری نکال کے مطلب دیکھتے ہیں؟"
"ڈکشنری یہاں ہے" منّو میاں نے سر کو انگلی سے بجا کے کہا۔ "ایسے بہت زیادہ الفاظ نہیں ہیں۔ بس ایک ہزار الفاظ سے کام چلتا ہے۔ جیسے 'بادام' چھوارے مختلف سائز کی گولیاں ہیں۔ سیب کا مطلب ہے دستی بم۔ انڈا ہے پستول تو مرغی مشین گن۔"
غالب ہنس پڑا "توپ کیا ہے؟ ہاتھی۔"
"ہاتھی کا مطلب ہے ٹرک۔ مگرمچھ ہے لانچ۔ ٹرین کے لئے سانپ۔ ہوائی جہاز کے لئے کبوتر اور کار کے لئے گھوڑا۔"
منّو میاں کی بات ابھی جاری تھی اور ہم سب ہنس رہے تھے کہ سین اور شین نمودار ہوئے۔ انہوں نے ایک آواز میں سب کو سلام کیا۔
"ہم کھانا بازار سے لے آئے ہیں" سین بولا۔
"اور ایک اہم خبر بھی" شین نے کہا۔
"ہمارے پیچھے کوئی لگ گیا تھا" سین نے کہا۔
منّو میاں کھڑے ہو گئے "تم سے کس نے کہا تھا کہ بازار میں گھومتے پھرو؟"
سین نے شین کی طرف اشارہ کیا "اس نے بولا تھا بمبئی بریانی لے چلو۔"
شین نے اسے گھور کے دیکھا "تو نے نہیں کہا تھا۔"
منّو میاں نے کہا "کم بخت۔ یہ بتاؤ پیچھا کرنے والے کہاں ہیں؟ تم کو کیسے احساس ہوا کہ وہ تمہارا تعاقب کر رہے ہیں؟ پولیس کے لوگ تھے یا کوئی اور؟"
اسی وقت گیٹ کے اوپر ایک انسانی ہیولا نمودار ہوا۔ گیٹ کھلوا کر اندر آنے کے بجائے وہ اوپر چڑھ کے خاموشی سے اندر کودنا چاہتا تھا۔
یہ میں نے نہیں دیکھا کہ گیٹ کے اوپر چڑھ کر اندر کودنے کی تیاری کرنے والے نے کس کو اور کیا اشارہ کیا تھا۔ لگتا ایسا تھا کہ اس کے پیچھے بھی کچھ لوگ ہیں جن کو وہ منتظر رہنے کا حکم دے رہا ہے۔
میں نے چلا کے محسن اور غالب کو ہوشیار کیا مگر وہ پہلے ہی مستعد ہو چکے تھے۔ ان میں غالب کو ریوالور سے نشانہ لینے میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ غالباً اس نے کمرے کی دیوار کے پیچھے بنی ہوئی کھڑکی کی پتلی منڈیر کے اوپر سے فائر کیا۔
گیٹ پر چڑھے ہوئے شخص نے چھلانگ لگا دی تھی اور کوئی چیز احاطے کے اندر پھینکی تھی۔ اگر وہ گولی کا نشانہ نہ بنتا تو وہ چیز شاید میرے سامنے آ کے گرتی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ گولی اس کے شانے میں لگی تھی جس سے اس کا ہاتھ گھوم گیا اور آتش گیر دستی بم بائیں طرف ورکشاپ کے اس حصے میں جا گرا جہاں مشینیں نصب تھیں۔
اندازہ میں نے بھی کر لیا تھا کہ اس نے چھت سے پھول نہیں پھینکے ہوں گے۔ میں جہاں کھڑا ہوا تھا وہیں لیٹ گیا اور دھماکا ہوا تو میں بم کے ٹکڑوں سے اور اڑتی ہوئی کرچیوں سے محفوظ رہا۔
ورکشاپ میں شعلہ سا بھڑکا تھا اور بیک وقت کئی جگہ چراغ سے جل اٹھے تھے۔ آگ لگانے والے اس بم میں کوئی ایسا کیمیائی محلول تھا کہ اس کے چھینٹے جس چیز پر پڑے اس نے آگ پکڑ لی۔ فاسفورس بھی ایک ایسا ہی عنصر ہے جو خشک ہو تو ہوا میں آگ پکڑ لیتا ہے چنانچہ اسے پانی میں ڈال کر رکھنا پڑتا ہے لیکن اس کے علاوہ بہت سے مرکبات ہیں جو زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں۔
اندر گرنے والا پھر اٹھ کے دروازے کی طرف لپکا تھا۔ اس نے شانے میں گولی کے پیوست ہو جانے کے باوجود ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس نے جان ہتھیلی پر رکھ کے گیٹ کو اندر سے کھولنے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ اس کی ناکامی کا اثر دوسرے ساتھ آنے والوں پر یہ پڑتا کہ وہ پسپائی قبول کر لیتے۔ پہلا مرحلہ گیٹ کو کھولنے کا تھا۔ اندر داخل ہو کے قبضہ کرنے کا مرحلہ اس کے بعد آتا تھا۔
میں لڑھک کر ایک ستون کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ وہاں سے جوابی کارروائی کرنا زیادہ آسان تھا۔ میں نے اطمینان سے ریوالور نکال کے اس شخص کا نشانہ لیا جو گیٹ کھولنے کی دیوانہ وار کوشش میں مصروف تھا۔ اس کی کھوپڑی اڑا دی۔ تاہم اسی اطمینان کی وجہ سے اسے ایک سیکنڈ مل گیا۔ ممکن ہے اسے آدھا سیکنڈ ملا ہو یا چوتھائی لیکن بعض اوقات سیکنڈ کے سویں یا ہزارویں حصے میں بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ کوئی کسی کی ایک نگاہ کا ایک برقِ تبسم کا شکار ہو جاتا ہے تو کوئی قضا کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے اجل کے تیر کا۔ کوئی ایک غلط قدم اٹھا کے اور کوئی صحیح فیصلے میں تاخیر کر کے خود اپنے حق میں تباہی کو مقدر کر لیتا ہے۔
مرتے مرتے بھی اندر آنے والے نے کنڈی کو کھینچ لیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے لئے کامیابی کا دروازہ کھول دیا تھا اور جان دے کر فرض ادا کرنے کی ایک قابلِ تقلید مثال قائم کر دی تھی۔
میں نے غالب سے کہا "یہ تو پورا لشکر معلوم ہوتا ہے۔"
غالب نے پیچھے سے کہا "اپنی جگہ سے مت ہلنا۔ تمہاری یہ پوزیشن سب سے بہتر ہے۔"
"محسن کہاں ہے؟"

www.paksociety.com

"میں دائیں جانب ہوں۔ گل میرے ساتھ ہے" محسن نے کہا۔

پہلے کسی جیپ کا انجن غرایا پھر گیٹ ایک دھماکے سے ٹوٹا۔ جیپ یوں سامنے آئی جیسے گھنے جنگل میں جھاڑ جھنکار کی باڑھ سے اچانک گھات میں بیٹھا ہوا چیتا دہاڑ کے جست لگاتا ہے۔ اس سے پہلے میں نے کسی جیپ کے انجن کی آواز نہیں سنی تھی۔ یہ غالباً ان کی تیاری تھی کہ جیپ کو خاموشی سے دھکیل کر گیٹ تک لے آئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہمارے کان کوئی آواز سنیں۔ حملہ اچانک اور اتنا شدید ہو کہ ہمیں سنبھلنے کا بھی موقع نہ ملے۔ اگر میری نظر گیٹ پر چڑھنے والے کو نہ دیکھتی تو ایسا ہی ہوتا۔ اس نے رسک لیا تھا جس میں اس کے لئے کامیابی اور ناکامی کے امکانات برابر تھے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم اپنی باتوں میں غرق ہوتے کہ وہ کسی کی نگاہ میں نہ آتا اور پیچھے سے دروازہ کھول دیتا مگر اس پر کسی کی نظر پڑ جانا بھی عین ممکن تھا۔

جیپ کا سامنے والا حصہ بلڈوزر کی طرح تھا۔ اس کے بمپر کی جگہ دو انچ کے قریب موٹے فولادی پائپ تھے جو ایک شکنجے کی شکل میں انجن کے اور دونوں ہیڈ لائٹس کے سامنے فٹ ہوئے تھے اور دونوں سائڈ سے اس طرح ویلڈ کر دیئے گئے تھے کہ جیپ کسی دیوار سے بھی ٹکرا جاتی تو انجن محفوظ رہتا۔ اس قسم کی بکتر بند گاڑی جیسی جیپوں میں پھرنے والے اپنی بدمعاشی کو مشتہر کرتے ہیں اور سڑک پر ہر گاڑی والے کو چیلنج دیتے پھرتے ہیں کہ ہے کوئی ہم سے ٹکرانے والا۔ ہر کار والا ہی نہیں بس والا بھی ان سے بچتا ہے اور خود کو ان سے بچاتا ہے۔

ہم نے ایک ساتھ جیپ پر فائر کئے۔ دوسروں کا مجھے علم نہیں لیکن میں نے ٹائروں کو نشانہ بنایا تھا۔ میٹل شیلڈ کے پیچھے ٹینک تھا چناں چہ محفوظ تھا۔ اگر میرا نشانہ خطا نہ جاتا تو جیپ آگے نہ بڑھ پاتی۔ جیپ میں بیٹھے ہوئے افراد نے دونوں طرف سے فائر کھول دیئے تھے۔

جیپ احاطے کے درمیان میں پہنچی تھی کہ دو دھماکے ہوئے۔ اس کے دونوں اگلے ٹائر برسٹ ہو گئے تھے۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک کو نشانہ بنانے کا دعوے کر سکتا تھا۔ دوسرا کسی اور کی گولی نے برسٹ کیا تھا۔ انہوں نے ساری لائٹس پہلے ہی راؤنڈ میں گل کر دی تھیں۔

گولیاں میرے دائیں بائیں اور اوپر نیچے سے گزر رہی تھیں اور ستون سے ٹکرا رہی تھیں لیکن میں اس کے پیچھے رہنے کی وجہ سے محفوظ رہا تھا۔ مجھے متو میاں اور ان کے دونوں ساتھیوں سیمن اور شمین کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ محسن اور غالب برابر فائرنگ کا جواب دے رہے تھے۔ غالباً گل اور نازو ان کا اسلحہ دوبارہ لوڈ کرنے میں مدد کر رہی تھیں۔

جیپ کا ونڈ اسکرین ابھی تک سلامت تھا جو ایک تعجب خیز بات تھی۔ میں نے نشانہ لے کر اس پر گولی چلائی تب بھی کچھ نہیں ہوا۔ یہ ناممکن تھا کہ گولی پانچ سو جوڑے "شیشے" پر نہ لگی ہو۔ غور کرنے پر ایک ساتھ مجھے متعدد انکشافات کی شرمندگی کا سامنا ہوا۔

جیپ میں ونڈ اسکرین تھا ہی نہیں۔ اندھیرے نے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شفاف شیشے کے پیچھے بھی اندھیرا ہے۔ اس کو فریب نظر بھی سمجھا جا سکتا تھا اور واہمۂ خیال بھی۔ ہم عام چیزوں کو مکمل صورت میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں چناں چہ ونڈ اسکرین کے بغیر کسی جیپ کا تصور بھی محال تھا۔ خصوصاً ایک ایسی جیپ کا جس پر ہر سمت سے فائرنگ ہو رہی ہو۔

مجھ پر دوسرا انکشاف یہ ہوا کہ ہماری طرف آنے والی گولیاں اس جیپ میں بیٹھا ہوا کوئی بھی شخص نہیں چلا رہا ہے۔ ہم زاویۂ سمت کے فرق کو محسوس نہ کر سکے۔ گولیاں چلانے والے جیپ کے پیچھے تھے۔ وہ شاید گیٹ کے باہر سے فائرنگ کر رہے تھے مگر احاطے کے اندر دونوں جانب سے چلائی جانے والی گولیوں کی آوازیں اس طرح گونج رہی تھیں کہ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اگر جیپ میں کوئی ہوتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ تین طرف سے آنے والی گولیوں میں سے ایک بھی اسے نہ لگتی۔

دراصل جیپ ایک ڈمی تھی۔ اس کا صرف ڈھانچہ تھا جو گیٹ توڑنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا اور اسے شاید پیچھے سے کسی دوسری گاڑی نے ٹکر ماری تھی کہ وہ گیٹ توڑتی ہوئی اندر آئی اور احاطے کے وسط میں پہنچ کے خود ہی رک گئی۔ اس کے ٹائر برسٹ ہونے سے صرف اتنا فرق پڑا کہ جیپ نے مزید چند گز کا فاصلہ طے نہیں کیا۔

ورکشاپ کے حصے میں آگ پوری طرح پھیل چکی تھی۔ اس کی روشنی نے سارے احاطے میں اجالا کر دیا تھا۔ میں باہر آبادی میں خوف و ہراس اور ہلچل کے آثار دیکھ سکتا تھا اور بدحواسی میں جان بچا کے بھاگنے والوں کی چیخ پکار سن سکتا تھا۔

اچانک گیٹ پر ایک زبردست دھماکا ہوا۔ کوئی بڑی اذیت سے چلایا۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ بند ہو گئی۔ میں نے آگ کی طرف سے ایک سایہ سا گیٹ کی جانب جھپٹتے دیکھا۔

"یہ متو میاں ہیں" محسن نے چلا کے کہا "گولی مت چلانا۔"

میں نے کہا "متو میاں کیا خودکشی کرنا چاہتے ہیں؟"

غالب نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ بھاگ گئے۔"

غالب کا خیال ٹھیک تھا۔ میں نے ایک گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ یہ فاسٹ ویگن کی مخصوص گھن گرج تھی۔ ہولناک خاموشی میں ایک پُرکرب چیخ مار کے کسی نے کہا "ارے نصیبو۔ رکو۔۔۔" مگر اس کا جواب ایک گولی نے دیا۔ گیٹ کے باہر ایک اور بم کا دھماکا ہوا۔

میں نے ستون کی اوٹ سے نکل کے جیپ تک دوڑ لگائی۔ لیکن جیپ میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے پچھلے حصے میں سیٹیں تک نہیں تھیں لیکن ڈرائیور کی جگہ ایک پتلا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا

صرف آدھا دھڑ سیٹ پر رکھا ہوا تھا۔ کمر سے نیچے کا حصہ بنانا غیر ضروری سمجھا گیا تھا۔ باقی جسم بھی بناوٹ کے اعتبار سے اُف! جسم کا حجم تھا۔ اس میں تناسب یا توازن کا حسن پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی کیوں کہ اس کے وجود کا مقصد صرف فریب نظر کا تاثر دینا تھا جس میں وہ کامیاب رہے تھے۔ ایک بہت بڑے تکیے جیسے دھڑ کے ساتھ دو لمبے پتلے کاؤ تکیے لگا دیئے گئے تھے۔ ان سب میں روئی بھری ہوئی تھی۔ اوپر جو سر رکھا گیا تھا وہ بے حد حقیقی تھا۔ اس کے نقوش میں زندگی تھی اور دست قدرت کی صناعی کا سارا کمال تھا۔ یہ کمال اس کے بند ہونٹوں کھلی آنکھوں ناک اور کانوں کی ساخت میں اور بالوں میں نظر آتا تھا اور اس کی خاموشی زبان حال سے پکار رہی تھی کہ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُرغرور تھا۔

میرے پیچھے سے گل نے چیخ ماری "یہ۔۔۔۔۔ یہ تو"

میں نے پلٹ کے اسے ڈانٹا "ہوش میں رہو گل۔ یہ صرف کسی انسان کا سر ہے۔ یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

محسن اور غالب گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ صرف نازو ابھی تک کمرے سے نہیں نکلی تھی۔ شاید وہ اسے ہدایت کر گئے تھے کہ باقی سب کو کور کرے۔ گل کی چیخ پر وہ بھی آ گئی۔

"کیا ہوا؟"

میں نے پتلے کو اٹھانے کی کوشش کی تو اس کا سر جو تکیے پر رکھ کے چپکا دیا گیا تھا لڑھک کر نازو کے پیروں میں چلا گیا۔ دوسری چیخ نازو نے ماری اور چھلانگ مار کے دور جا کھڑی ہوئی۔

محسن نے واپس آ کے کہا "کیا تماشا ہو رہا ہے یہاں؟"

میں نے کہا "تماشا تو ختم ہو گیا۔ اب خواتین بے ہوش ہونا چاہتی ہیں۔"

"خبردار! جو اس وقت کسی نے ایسی حرکت کی۔ باہر ایک قیامت مچی ہوئی ہے۔ پولیس بھی آنے والی ہوگی۔ فائر بریگیڈ کو بھی اطلاع مل چکی ہوگی۔"

میں نے کہا "یہ غالب وہاں کیا کر رہا ہے؟"

"وہ متو میاں کو واپس لانے گیا ہے۔ ان کا جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت بالکل آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا تھا" محسن نے کہا "وہ بم انہوں نے ہی پھینکا تھا جس نے دشمنوں کو فرار ہونے پر مجبور کیا۔ دوسرا بم مارنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ وہ گیٹ پر چلے گئے تھے۔ بھاگتے بھاگتے دشمن انہیں مار جاتے تو کیا ہوتا؟"

"بہت بڑی کامیابی ہوئی ان کی" میں نے کہا۔

"اب تیسرا بم جیپ پر پھینکنے کے لئے پیچھے بھاگے تھے کہ سب کو ختم کروں گا کہ غالب نے روک لیا" محسن بولا۔

غالب اور متو میاں ایک دوسرے سے سخت خفگی کا اظہار کرتے ہوئے واپس آ رہے تھے۔

"ہم ان کو چھوڑنے والے نہیں تھے۔ مگر آپ نے ہمیں نہیں چھوڑا۔ بہت افسوس کی بات ہے۔"

"دماغ خراب ہے آپ کا۔ یہ ہے افسوس کی بات" غالب نے کہا۔

"وہ ایک لاش چھوڑ گئے ہیں" محسن نے کہا۔

"اور ایک لاش کا صرف سر" میں نے زمین پر پڑے ہوئے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"اب دیر مت کرو۔ تم لوگ نکل جاؤ" متو میاں بولے۔

"نکل کے کہاں جائیں؟"

"سیمن شمین کے ساتھ جاؤ۔"

"اور تم؟"

"میں کیسے جا سکتا ہوں۔ میری فیکٹری پر غنڈوں نے حملہ کیا۔ مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ مجھے پولیس کو رپورٹ لکھوانی ہے" متو میاں نے کہا۔

دور سے فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کی گھنٹی سنائی دینے لگی۔

"سیمن شمین ہیں کہاں؟" میں نے کہا۔

"ارے چلو باہر" متو میاں نے آفس بلاک کی طرف منہ کر کے ہانک لگائی۔

وہ دونوں ایک کھڑکی کھول کے ایک ساتھ کودے اور دوڑتے ہوئے آئے۔ ان کے ہاتھ میں لوہے کے پائپ کے ایک فٹ لمبے ٹکڑے تھے۔ یہ عام استعمال میں آنے والے آدھے یا پونے انچ قطر کے پائپ تھے۔

"یہ کیا ہے؟" غالب نے کہا۔

"یہ بم ہے" سیمن نے پائپ اسے پیش کیا۔

"ابھی ایسا ہی بم مارا تھا استاد نے" شمین بولا۔

استاد نے انہیں ڈانٹا "بک بک میں وقت ضائع مت کرو' ان سب کو لے کر جاؤ۔ ہم بعد میں آ جائیں گے۔"

"کہاں جائیں استاد؟" سیمن نے کہا۔

"چاچا کے گھر یا ماما جی کے اڈے پر" شمین بولا۔

"ماما جی کے پاس لے جاؤ" متو میاں نے سوچ کے کہا۔

اب دروازے کے سامنے ایک ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ وہ زمین پر پڑی ہوئی لاش کو دہشت زدہ نظروں سے گھور رہے تھے اور اس خون کو دیکھ رہے تھے جو بہہ کر زمین میں جذب ہو گیا تھا۔ فائر بریگیڈ کی آوازیں بالکل قریب آ چکی تھیں۔ کسی نے چلا کے کہا "ہٹو۔ ہٹو۔ راستہ دو۔"

"یہی وقت ہے نکلنے کا" میں نے غالب سے کہا۔ غالب نے نازو کا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف لپکا۔ محسن نے گل کے ساتھ اس کا تعاقب کیا۔ گیٹ کے سامنے کھڑے ہوئے کچھ لوگ خوف زدہ ہو کے ایک طرف ہو گئے۔ ابھی تک کسی نے گیٹ کراس کر کے فیکٹری میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کی تھی۔ وہ غریب اور لاوارث لوگ تھے جو بستی شہر میں اس قسم کا تماشا دیکھتے تھے تو یہ

www.paksociety.com

سمجھتے تھے کہ فلم شوٹنگ ہو رہی ہے یا بدمعاشوں کے دو گروہ آپس میں ٹکرا گئے ہیں۔ ہر صورت میں وہ دخل اندازی سے گریز کرتے تھے۔

متو میاں نے اچانک زمین پر پڑا ہوا سر اٹھایا اور اس کو سین یا شین میں سے کسی کے ہاتھ ہوتے "پائپ بم" کے ساتھ باندھ کر آگ میں اچھال دیا۔ ایک دھماکے سے ورکشاپ کی چھت گر گئی۔ یہ اندازہ کرنا میرے لئے مشکل نہ تھا کہ بم نے اس بے نام شخص کے سر کے پرخچے اڑا دیئے ہوں گے اور آگ نے اسے جلا کے خاک کر دیا ہوگا۔ متو میاں نے جیب میں رکھے ہوئے سوئی کے دھڑ کو بھی اسی طرح نذر آتش کیا اور میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔

ورکشاپ کی آگ جس حد تک پھیل سکتی تھی پھیل چکی تھی۔ اس آگ نے مشینری کو اور ورکشاپ کے شیڈ کو مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا لیکن اب اس کے شعلے پہلے کی طرح نہیں بھڑک رہے تھے۔ آس پاس کی آبادی کو لاحق خطرہ ٹل گیا تھا۔

جب فائر بریگیڈ والے آئے تو مجمع نے خود ہی راستہ چھوڑ دیا مگر عین درمیان میں پڑی ہوئی لاش اپنی جگہ موجود رہی۔ فائرمین یا ڈرائیور نہ لاش کے اوپر سے گاڑی گزار سکتے تھے اور نہ حکم کے بغیر لاش کو ہٹا کے ایک طرف کر سکتے تھے۔ پیچھے کی کسی گاڑی سے اتر کر آنے والے افسر نے صورت حال کا معائنہ کیا اور ماتحتوں کو حکم دیا کہ وہ گاڑیاں لاش کے اوپر سے لے جائیں "ایسے کہ نہ کوئی پہیہ لاش کو چھوئے اور نہ خون لگے۔" وہ بڑے بڑے ٹرک تھے جن کے پہیوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔

جب پہلی گاڑی آگے بڑھی تو دم بخود کھڑے ہوئے مجمع کی نظر پہیوں پر اور اس جگہ پر رہی جہاں پر لاش پڑی تھی۔ سین اور شین نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور غالب اور محسن کو ہاتھ سے اشارہ کر کے وہ دروازے کی طرف چلنے لگے۔ غالب اپنے ساتھ بازو کو کھینچ کر لے گیا تھا اور اس کے برعکس محسن کو گل نے کھینچا تھا ورنہ وہ میرے ساتھ مطمئن کھڑا ہوا تھا۔

"تم کیا میرا منہ دیکھ رہے ہو؟" متو میاں بولے "تم بھی نکل جاؤ ورنہ تفتیش کی زد میں آ جاؤ گے۔"

آگ بجھانے والے عملے نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ وہ متو میاں سے پوچھ رہے تھے کہ پانی کا ٹینک کہاں ہے۔ کچھ پائپ کھول رہے تھے اور کچھ فائر ہائیڈرنٹ تلاش کر رہے تھے۔ میں باہر جانے کے لئے آگے بڑھا ہی تھا کہ فائر بریگیڈ انچارج نے مجھے روک لیا۔

"جب پانی ہی نہیں ہے تو ہم آگ کیسے بجھائیں؟"

میں نے اسے مشورہ دیا "پھونک مار کے بجھا دو۔"

"آگ کسی وقت بھی لگ سکتی ہے۔ فیکٹری کے قریب کہیں پانی ہونا چاہئے" وہ خفا ہو کے بولا۔

میں نے کہا "سمندر زیادہ دور نہیں ہے ویسے تو..."

"اے مسٹر! تم مذاق کر رہے ہو بجائے مدد کرنے کے۔ تم جیسے مالک پہلے حفاظتی انتظامات کو نظر انداز کرتے ہیں۔"

میں نے دانت نکال کے کہا "میں مالک نہیں ہوں۔"

"مالک نہیں ہو تو پھر یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ بگڑ کے بولا۔

"جو تم کر رہے ہو یعنی ہم دونوں کچھ نہیں کر رہے ہیں صرف وقت ضائع کر رہے ہیں" میں نے کہا "میں تو اب چلتا ہوں۔ تم بھی جانا چاہو تو جاؤ۔ آگ بجھانے کی کوشش کا اب کیا فائدہ۔ اب بچا ہی کیا ہے بجھانے کے لئے۔"

کسی فائرمین نے نعرہ لگایا "مل گیا ہائیڈرنٹ۔"

انچارج فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے گیٹ سے گزرتے ہوئے اس لاش کو دیکھا جو الٹی پڑی رہ گئی تھی۔ یہ سب سے پہلے کود کر اندر آنے والے کی لاش تھی۔ ایک اور لاش کچھ آگے سڑک کے کنارے پڑی ہوئی تھی۔ یہ اس بدبخت کی لاش تھی جسے انہوں نے مار دیا تھا کیونکہ وہ ان کا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہا تھا اور پیچھے رہ گیا تھا چنانچہ اسے زندہ نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ بے جرم کمتری کی سزا مرگ مفاجات۔ کمزور کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔

ایک موٹر سائیکل سوار نے مجھ سے کہا "آخر یہ سب کیسے ہوا؟"

میں نے کہا "اچھا سوال کیا ہے تم نے۔ میں یہی معلوم کرنے جا رہا ہوں۔ واپس آ کے جواب دوں گا۔"

اس نے تڑاخ کے کہا "ادھر آؤ۔ کون ہو تم؟ میرے ساتھ زبان چلاتے ہو۔ معلوم ہے میں کون ہوں؟"

میں نے اطمینان سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟"

اس کے اکھڑ اور فرعونیت کے انداز میں فرق آ گیا "میں اسپیشل پولیس میں ہوں۔ اس وقت ڈیوٹی پر نہیں ہوں ورنہ بتاتا تمہیں۔"

"میں بتاتا ہوں تمہیں۔ میں ڈیوٹی پر ہوں۔ بک بک کرو گے تو میں لحاظ بھی نہیں کروں گا کہ ہم ایک ہی محکمے میں ہیں۔ جاؤ میرے کام میں مداخلت مت کرو" میں نے آنکھیں نکال کے کہا۔

اس نے برا سا منہ بنایا مگر فوراً روانہ ہو گیا۔ زبانی دعوے ہم دونوں نے کئے تھے مگر اس کے پاس یقیناً کوئی ثبوت بھی ہوگا۔ اگر معاملہ شناختی کارڈ طلب کرنے تک پہنچ جاتا تو نقصان مجھے نہ ہوتا۔ وہ مارا جاتا۔ مخالف سمت سے سائرن کی آواز سن کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ غالب یا محسن میں سے کسی کا دور دور پتا نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس مجمع سے نکلنے کے بعد میرا انتظار کریں گے۔ متو میاں نے انہیں ماما جی کے گھر بھیجا تھا۔ بستی میں کسی دوا کا پتا تو پوچھا جا سکتا ہے لیکن کوئی اپنے ماما جی کا گھر پوچھتا پھرے تو لوگ اسے پاگل خانے پہنچا دیں گے۔

اچانک سین یا شین میں سے کسی نے پیچھے آ کے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

میں نے چونک کے کہا "تم کہاں سے ٹپک پڑے؟"

اس نے کہا "ہم ادھر تھے" اور ٹیلی فون کے ایک کھمبے کی طرف اشارہ کیا۔

"تم سین ہو یا شین؟" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"جو بھی آپ سمجھ لیں" وہ عیاری سے بولا۔

"باقی سب لوگ کہاں ہیں؟"

"وہ تو پہنچ بھی گئے ہوں گے اپنی گاڑی میں۔"

"اپنی گاڑی کہاں تھی؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"باہر ہی تھی۔ کیا آپ کی جیب میں دس روپے ہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "مجھے موقع ہی نہیں ملا۔"

"پھر ہم بس میں چلتے ہیں" اس نے کہا "رک جائیں بس آ رہی ہے۔"

"بس کا کرایہ ہے" میں نے کہا "اور یہ تو بتاؤ کہ جانا کہاں ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو۔"

"آپ مجھ پر نظر رکھیں" اس نے سامنے آ کے رکنے والی بس کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔ جو لوگ قطار میں کھڑے ہوئے تھے انہوں نے شور مچایا۔ ان سے زیادہ احتجاج اترنے والوں نے کیا۔

"ارے چھوکرا کیا کرتا ہے؟ پہلے اترنے دے" کنڈکٹر نے اسے روکنے کی ناکام کوشش کی لیکن وہ بندر کی طرح اچھلتا لوگوں کی ٹانگوں میں سے گزرتا اور سب کو دھکیلتا اندر پہنچ چکا تھا۔ میں قطار میں بہت پیچھے تھا اور مجھے یقین تھا کہ میری باری آنے سے پہلے ہی بس روانہ ہو جائے گی اور میں اس اجنبی شہر کی سڑکوں پر لاپتا رہ جاؤں گا۔

بس میں سوار ہونے کے لئے میں نے بھی قطار سے نکل کر آگے جانے کی کوشش کی مگر ایک خوفناک مونچھوں والے نے مجھے کالر سے پکڑ کر اپنے پیچھے کر دیا۔ اگر میں چاہتا تو اس کی مونچھیں پکڑ کے اسی طرح اسے اپنے پیچھے کر دیتا مگر نظم و ضبط کی پابندی کرنے والے سب لوگوں سے لڑنا مشکل تھا اور غلط تھا۔

میں دوڑ کر کھڑکی کے پاس پہنچا اور سین یا شین کو تلاش کیا۔ وہ ایک موٹی لڑکی کے پہلو میں بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس نے اشارہ کیا کہ میں اندر آ جاؤں تو وہ سیٹ میرے لئے خالی کر دے گا لیکن اندر پہنچنا ہی سب سے مشکل کام تھا۔

میں نے کہا "یار مجھے پتا تو بتاؤ۔"

بس تھوڑا سا کھسکی۔ اس نے کھڑکی سے منہ نکال کر کہا "میں اگلے اسٹاپ پر اتر جاؤں گا۔"

میں بس کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا "بے بندر کی اولاد! سیدھی طرح پتا کیوں نہیں بتاتا۔"

اس نے کسی جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر پھینکا اور بولا "یہاں معلوم ہو جائے گا۔"

کاغذ کا وہ پرزہ اڑتا ہوا سڑک پر آیا۔ بس کی اور میری ریس ختم ہو گئی۔ اب میں منتظر تھا کہ ٹریفک میں وقفہ آئے تو وہ کاغذ کا پرزہ اٹھاؤں مگر ہر گزرنے والی گاڑی اس کو روندتی جا رہی تھی اور ہوا کا ہر جھونکا اسے مجھ سے دور کر رہا تھا۔ سر دھڑ کی بازی لگا کے اور کسی گاڑی کے نیچے گھس کر اس پرزے کے حصول کی کوشش خودکشی کے مترادف ہوتی۔ میں صبر اور ضبط سے کام لیتے ہوئے مناسب موقعے کا منتظر رہا اور آخر کار وہ پرزہ کسی تتلی کی طرح میرے ہاتھوں میں آ گیا۔

میں نے پرزے پر غور کرنے کے بجائے اسے جیب میں رکھا اور اگلے بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک بس اسٹاپ سے دوسرے اسٹاپ کا فاصلہ کتنا ہوگا؟ میں نے چلتے ہوئے سوچا۔ زیادہ سے زیادہ دو فرلانگ۔ میں سڑک کے کنارے پر اور ٹریفک سے بہت دور فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ چنانچہ میرا کسی گاڑی کے نیچے آ جانا اتنا ہی بعید از قیاس تھا جتنا کسی بحری جہاز سے ٹکرا جانا۔ اس کے باوجود ایک کار نے مجھے پیچھے سے ٹکر مار کے سڑک پر پھینک دیا۔

وہاں فٹ پاتھ نہیں تھی۔ اس کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا تھا یا توڑ دیا گیا تھا۔ یہ بائیں جانب سے آنے والی ٹریفک کے لئے بس روڈ کا شارٹ کٹ تھا ورنہ شاید انہیں بہت آگے جانا پڑتا۔ ایسے راستے لوگ ہر جگہ بنا لیتے ہیں اور مرمت کرنے والے بھی تھک کر ہار مان لیتے ہیں۔

مجھے حادثے سے قبل کسی نے چلا کر خبردار کیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا جس کی نظر نے غیر متوقع خطرے کو مجھ سے پہلے دیکھ لیا تھا۔ جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو سڑک کی جانب سے کار کسی پاگل کتے کی طرح میری جانب بڑھ رہی تھی۔ کار کو بائیں جانب مڑنا ہی تھا تو ڈرائیور پر لازم تھا کہ ہارن دیتا اور انڈیکیٹر جلاتا لیکن اس نے یہ فیصلہ اچانک کیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ پیچھے آنے والی کئی گاڑیوں نے زبردست بریک لگا کر تصادم سے بچنے کی کوشش کی۔ ایک زیادہ تیز رفتار گاڑی کے ڈرائیور نے اسٹیئرنگ پورا بائیں طرف گھما دیا اور خود کو بچا کر نکلنا چاہا مگر اس کی گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ فٹ پاتھ ٹوٹی ہوئی نہ ہوتی تو کار کا ایکسل ٹوٹ جاتا یا ٹائی راڈ کھل جاتے۔ اس گاڑی نے مجھے سائڈ سے ٹکر ماری۔

میں تھوڑا سا اوپر اچھلا اور پھر فٹ پاتھ سے نیچے گرا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ بائیں طرف سے آنے والی کسی گاڑی نے مجھے نہیں کچلا۔ ٹکر مارنے والی گاڑی پھر ٹریفک میں شامل ہو کے سب کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ چوٹ میری دائیں ٹانگ اور دائیں کہنی پر آئی تھی لیکن چوٹ سے زیادہ مجھ پر حادثے کے نفسیاتی شاک کا اثر تھا۔ مجھے یہ احساس تھا کہ ابھی ابھی موت مجھ سے چھو کر گزری ہے۔ وہ گاڑی ایک انچ آگے ہوتی تو اس کے پہیے مجھے کچل دیتے۔ نیچے گرنے کے بعد مجھے دن میں تارے ہی نظر آ سکتے تھے مگر میں نے بہت سے چہرے دیکھے جو مجھ پر جھکے ہوئے تھے

www.paksociety.com

اور میں ان سب کے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کچھ تشویش کا اظہار کر رہے تھے، کچھ مجھے خوش قسمت قرار دے رہے تھے کہ مجھے خراش تک نہیں آئی، کچھ ٹکر مار کے غائب ہو جانے والی کار کے ڈرائیور پر خفا تھے اور کچھ مجھے مفید قانونی اور طبی مشورے دے رہے تھے۔ پھر ایک شخص نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مجھے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد دی۔

اس نے انگریزی میں کہا "تم کو فوراً کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے۔"

میں نے کپڑے جھاڑ کے کہا "اس کی کوئی ضرورت نہیں...!"

"ضرورت ہے" وہ زور دے کر بولا "چوٹ کا پتا بعد میں چلتا ہے۔"

میں نے کہا "میں درد کا احساس ختم کرنے والی گولیاں کھا لوں گا۔"

"لیکن اس سے زیادہ اے ٹی ایس کا انجکشن ضروری ہے۔ سڑک پر گرد اور لید میں ٹیٹنس کے جراثیم ہوتے ہیں" میرے مشفق و مہربان نے مجھے سمجھایا "چلو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں' اپنی گاڑی میں۔"

اس نے میری ایک نہیں سنی اور میری کلائی پکڑ لی۔ میں اس کو سختی سے جھڑکتا تو اس کے پُرخلوص جذبات مجروح ہوتے۔ رائے عامہ اسے فرشتہ قرار دے چکی تھی اور بہت سے لوگ مجھ پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ میں اس کی بات مان لوں۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔

وہ غالباً بنگالی تھا۔ پست قد' سانولے رنگ اور مختصر وجود کے ساتھ اس کی شخصیت دبی ہوئی محسوس ہوتی تھی مگر اس نے بہترین تراش کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے جوتے پالش سے چمک رہے تھے' اس کے ہاتھ پر سنہری رولیکس گھڑی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ کار والا تھا' چناں چہ مجمع عوام میں اس کا ہمدردانہ رویہ اور انسانی شرافت کا اظہار ایک خاص اہمیت اختیار کر گیا تھا۔

اس کی کار بالکل نئی بھی نہ تھی اور پرانی بھی نہیں تھی۔ یہ عام کار تھی جو خواص بھی کسی کمپلکس کے بغیر استعمال کرتے تھے۔ پھر مجھے ایک مفید خیال آیا۔

میں نے کہا "آپ بلاوجہ زحمت کر رہے ہیں...!"

اس نے وہی مخصوص جملہ بولا جو اس قسم کی صورتِ حال میں بولا جاتا ہے "زحمت کیسی۔ یہ تو میرا اخلاقی فرض ہے۔"

"دراصل مجھے ایک جگہ جانا تھا۔" میں نے کہا "اور جس شخص کے ساتھ جانا تھا وہ اگلے بس اسٹاپ پر میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ مایوس ہو کے چلا گیا تو میرے لئے پتا تلاش کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ میں یہاں اجنبی ہوں۔"

حسب توقع اس نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو جہاں جانا ہے میں پہنچا دوں گا۔"

"پھر بھی مجھے اسٹاپ پر دیکھ لینا ضروری ہے۔ ورنہ وہ شریف آدمی انتظار میں سوکھتا رہے گا۔"

"او کے۔ ہم بس اسٹاپ کی طرف چلتے ہیں" وہ میرے ساتھ بیٹھ کے بولا۔ اس کی کار ایئر کنڈیشنڈ تھی۔

کار ابھی منتشر ہونے والے مجمع کو پیچھے چھوڑ کے چند قدم ہی گئی ہوگی کہ مجھے دال میں کالا نظر آنے لگا۔ ڈرائیور بار بار اوپر لگے ہوئے ویو مرر میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ سیاہ رنگ کی ایک کیڈلک بڑی بردباری سے ہماری کار کے پیچھے چل رہی تھی۔ اتنی بڑی اور طاقتور گاڑی چند سیکنڈ میں آگے نکل سکتی تھی۔ یہ عوامی کار اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ پاتی۔ سڑک پر اوور ٹیک کرنے کے لئے جگہ بھی بہت تھی۔

کار اچانک رک گئی "دیکھو کیا تمہارا دوست یہاں ہے؟"

بے اختیار میری نگاہ بس اسٹاپ کی طرف چلی گئی۔ پیکو کا شیین میں سے وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ ابھی میں نے کار سے اترنے کا سوچا ہی تھا کہ بیک وقت اس کے تینوں دروازے کھلے اور بند ہو گئے۔ کار کا ڈرائیور بدل گیا۔ پیچھے والی سیٹ پر دو افراد آ بیٹھے۔ دروازے پھر بند ہوئے اور دو سیکنڈ بعد کار پھر روانہ ہو گئی۔

میں نے مشتعل ہو کے کہا "آخر یہ سب کیا ہے؟"

"تمہاری بے وقوفی" ڈرائیور نے خوش دلی کے ساتھ کہا "اب آرام سے بیٹھے رہو۔"

پیچھے بیٹھنے والے ایک شخص نے میری کھوپڑی کو ریوالور کی نال سے بجا کے کہا "گڑبڑ کرے گا تو ہم تیرے کو ناک آؤٹ کرے گا۔ مسٹر اسمگلر تھڈرے۔ تمہارا سر توڑ دیں گا۔"

دوسرے نے بھی یہی حرکت کی "پھر اسمگلر تھڈرے گریٹ اللہ دنیا کو کیسے فتح کریں گا۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر دس سے الٹی گنتی شمار کی۔ جذبات کی تند آندھی اور اشتعال کی لہر کا زور توڑنے کے لئے یہ پرانا نسخہ کارگر ثابت ہوا۔ میں نے ان تینوں کی صورتیں دیکھنے سے پہلے گاڑی کو دیکھا۔ اس کے دروازے صرف باہر سے کھولے جا سکتے تھے اور شیشے اتارے ہی نہیں جا سکتے تھے کیونکہ اسے ایئر کنڈیشنڈ کر دیا گیا تھا۔ نہ میں سڑک پر چھلانگ لگا سکتا تھا اور نہ شور مچا کے کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا۔

نیا ڈرائیور زیادہ پُراعتماد اور پُرسکون تھا کیوں کہ اس کی حفاظت کرنے والے پیچھے موجود تھے۔ ڈرائیور نے میرے سوال کا بہت معقول جواب دیا تھا۔ میں صرف اپنی بے وقوفی کی وجہ سے پکڑا گیا تھا۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ اور سب انتظامات کر کے آئے تھے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر انہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس وقت میں ان کو اس سڑک پر پیدل چلتا ہوا ملوں گا۔ اگر میں بس میں بیٹھ جاتا تو وہ کیا کرتے؟ شاید مجھے بس سے اترتے ہی گرفتار کر لیتے۔ انجام ہر صورت میں یہی ہوتا تھا۔

جس نے بھی یہ منصوبہ بندی کی تھی اس کی ذہانت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ اس کے سب اندازے سو فیصد درست ثابت ہوئے۔ جیسا اس نے سوچا تھا بالکل ویسا ہی ہوا۔ متو میاں کے کارخانے پر ایک بھرپور حملہ کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ہم اس محفوظ ٹھکانے سے نکل کر فرار ہوں۔ یہ وہی طریقہ تھا جو شکاری اپنے شکار کو کسی غار یا بل میں سے نکالنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ وہ غار کے دہانے پر لکڑیاں اور جھاڑ جھنکار جلا کے اندر دھواں چھوڑتے ہیں تو شکار بدحواس ہو کے باہر نکلنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اتنی ہی آسانی سے پکڑا جاتا ہے جیسے میں پکڑا گیا تھا۔ حملہ آور ہمیں مارنا چاہتے تو رات کی خاموشی میں آتے اور اپنا کام کر جاتے مگر انہوں نے طے شدہ جنگی حکمتِ عملی کے تحت ہمیں مقابلے پر اکسایا۔ ایک ڈمی کو جیپ میں بٹھا کے آگے کرنا تاکہ ہم اس پر اپنا اسلحہ ضائع کریں' اس پلان کا سب سے کامیاب حصہ تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے اس ڈرامے کا ہدایت کار چوہدری ولاور کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

مقابلے میں مارے جانے والے تربیتی کے آدمی تھے۔ وہ پیدل مجبت جن کی حیثیت سیاست کی بساط پر پیادوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جو اسی لئے آگے رکھے جاتے ہیں کہ مارے جائیں۔ ان کی جان کی اگر کوئی قیمت ہوتی ہے تو انہیں موت کے مشن پر بھیجنے سے پہلے ہی ادا کر دی جاتی ہے اور وہ مجبوریوں کے مارے ہوئے لوگ اس حقیری رقم کے لئے بھی جان کی بازی لگا دیتے ہیں کیوں کہ وہ مجبور ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے ان سے زیادہ مجبور لوگوں کی قطار ہوتی ہے جو چاہتے ہیں کہ ان سے یہ موقع چھین لیں۔ موقع کوئی نہیں گنواتا۔ جان گنوانے میں جاتا ہی کیا ہے۔ یہ زندگی جو ویسے بھی جینے کے قابل نہیں تھی۔ موت آنے کی صورت میں دس ہزار نقد سکہ رائج الوقت سے کتنے خواب' کتنی خوشیاں اور کتنی امیدیں خریدی جا سکتی ہیں۔ جینے کے کتنے بہانے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کتنے سہارے مل جاتے ہیں۔ اور جو زندہ رہے یقیناً خوش قسمتی پر نازاں ہوں گے۔

اچانک ایک گاڑی نے اوور ٹیک کیا اور آگے آگے چلنے لگی۔ میرے خاموش خیالات کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا تو میں نے ایک جھلک غالب اور نازو کی دیکھی۔ وہ اس کی پچھلی سیٹ پر بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔

میں پھر اس ذہن کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گیا جس نے بڑی خوبصورتی سے معمولی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا اور پورا منصوبہ بڑی دور اندیشی کے ساتھ مرتب کیا تھا۔ ایک ایک سیکنڈ کے حساب سے کب' کہاں' کیا ہوگا اور کیسے ہوگا کہ شبہ پیدا نہ کرے اور حقیقت کا جزو بھی خود اپنی جگہ حقیقت نظر آئے۔ ایسی باریک بینی اور دور رس نگاہ صرف ایک شخص کی ہو سکتی تھی جس نے پہلے بھی بہت سے کامیاب ڈرامے کئے تھے۔ اس ڈرامے کے ہر سین میں مجھے چوہدری ولاور کی ہدایت کاری کا کمال نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا ہوگا کہ پہلے تو انہیں وہاں سے نکالو۔ پھر ایک ایک کو الگ الگ اٹھا لو۔ یہ دیکھو کہ وہ کس راستے سے فرار ہوتے ہیں۔ ہر راستے پر ان کا انتظار کرو۔ وہ اکٹھے فرار نہیں ہوں گے۔ جو سامنے آتا جائے پکڑتے جاؤ۔ اس نے تربیتی سے کہا ہوگا کہ مجھے چند ہوشیار آدمی دے دو جو یہ کام کر سکیں اور چند بے وقوف جن کی زندگی اس منصوبے کی کامیابی پر قربان کی جا سکے' باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔

جس سوال کا میرے ذہن میں کوئی جواب نہ آتا تھا یہ تھا کہ ولاور یا تربیتی نے متو میاں کے ٹھکانے کا سراغ کیسے لگایا؟ کیا وہ متو میاں کی خفیہ سرگرمیوں سے بھی واقف تھے اور سین' شیین کو پہچانتے تھے؟ اگر ایسا تھا تو پھر وہ ماما جی کو بھی جانتے ہوں گے۔ ایک سے دوسرے کا سراغ لگانا مشکل نہیں ہوتا۔ سین اور شیین نے اس شبے کا اظہار کیا تھا کہ شاید کوئی ان کے پیچھے لگ گیا تھا۔ شکاری نہ جانے کب سے تاک میں ہوں گے اور خاموشی سے پل پل کی خبر آگے پہنچا رہے ہوں گے۔ پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیانے کے' لیکن ہماری نظر نے نہ دیکھا۔ خیر اپنے چوہدری صاحب' بازی ابھی ختم نہیں ہوئی۔

گاڑی نامعلوم راستوں پر چلتی جا رہی تھی۔ شہر کے بازار اور پُررونق علاقوں سے گزرنے کے بعد اب ہم کسی پُرسکون اور پوش رہائشی علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ اپنے دائیں جانب سے میں سمندر کے پھنکارنے کی آواز سن رہا تھا اور ہوا میں بس جانے والی مچھلیوں کی بو کو محسوس کر سکتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ سفر کسی بھی وقت ختم ہونے والا ہے۔

آگے اب بھی وہی گاڑی تھی جس میں غالب اور نازو پڑے ہوئے تھے۔ شاید نازو نے مزاحمت کی تھی یا غالب نے مقابلہ کیا تھا کہ ان دونوں کو ناک آؤٹ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے افسوس سے سوچا۔ کیا گل اور محسن نے بھی کوئی جذباتی غلطی کی ہوگی؟ سوچے سمجھے بغیر طاقت کا مقابلہ طاقت سے نہیں کرنا چاہئے۔ جب طاقت کا توازن اس حد تک اپنے خلاف ہو تو پھر عقل کی سپاہ پر انحصار کرنا چاہئے۔ حالات پر نظر رکھتے ہوئے اس موقعے کا انتظار کرنا چاہئے جو تقدیر کی یاوری سے اچانک بھی مل جاتا ہے مگر کبھی اس کے لئے بہت صبر کرنا پڑتا ہے۔

گل اور محسن شاید تیسری کار میں تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو سیاہ کیڈلک غائب ہو چکی تھی۔

"پیچھے مُنڈی گھما کر اپنا تھوبڑا دیکھتا ہے کیا؟" ایک شخص نے ریوالور کی نال سے دبا کے میرا چہرہ گھما دیا۔

www.paksociety.com

دراصل تمہاری صورت دیکھ کر مجھے کوئی یاد آ گیا۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"کون؟"

"ایک کتا تھا میرے نوکر کے پاس۔ لومڑی کی شکل کا۔"

"کتا ہوتا ہے میرے کو....." وہ بگڑ کے بولا۔

"نہیں۔ تم ابھی پاگل کہاں ہوئے ہو۔ وہ تو پاگل ہو کے مر گیا تھا۔ بالکل اس طرح غراتا تھا جیسے تم....."

شاید وہ میرے سر پہ ریوالور کا دستہ مارنا چاہتا تھا مگر اس کے ساتھی نے روک لیا "ارے چھوڑ! تیرے کو کیا بولا تھا اپنا سیٹھ نے۔ اپنا مغز ٹھنڈا رکھنا۔"

میں نے کہا "سیٹھ تریویدی کی کیڈلک کہاں گئی۔ پہلے تو پیچھے ہی تھی؟"

"سیٹھ تریویدی کی کیڈلک!" ان دونوں نے ایک ساتھ چونک کر اور مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ہنس کے کہا "تمہارا کیا خیال ہے میں تریویدی کو نہیں جانتا؟ مجھے معلوم ہے اس کی کتنی کوٹھیاں ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔ اس کے پاس کتنی گاڑیاں ہیں۔ کس میک اور رنگ کی اور ان کے نمبر کیا ہیں۔ میں تو اس کے کتوں تک کو جانتا ہوں۔ ان میں سے کتنے پالتو ہیں اور کتنے فالتو۔ جو مارے گئے وہ فالتو تھے اور تم پالتو ہو۔"

"تو اپنا بھونکنا بند کرے گا یا نہیں۔ ابھی میرے کو غصہ آ گیا تو تیرے مغز میں گولی ڈال دوں گا۔"

"نا ممکن" میں نے اپنی بات جاری رکھی "تم اس کے اشارے پر چلتے ہو۔ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے اس لئے کہ تم پالتو ہو۔ فالتو کتوں کو وہ مروا تا رہتا ہے۔"

"دیکھ تو بڑا دلیر نظر آتا ہے مگر....."

میں نے کہا "تمہیں تو میرا نام بھی نہیں معلوم لیکن میں تمہارے سیٹھ تریویدی کے بارے میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کے کتنے باپ ہیں؟ ان میں سے کتنے اصلی ہیں کتنے نقلی اور کتنے جدی پشتی کہلاتے ہیں؟"

آگے والی گاڑی اچانک ایک گیٹ کے سامنے ٹھہر گئی۔ اس میں سے ایک شخص اتر کے آگے گیا اور بٹن دبا کے اس نے انٹرکام میں کچھ کہا۔ شاید داخلے کی اجازت سے پہلے اپنی شناخت کرانا حفاظتی انتظامات کا ایک حصہ تھا۔ اس علاقے میں رہنے والے سب ہی اپنی زندگی کو لاحق حقیقی اور تصوراتی خطرات کے خلاف اپنا دفاع مضبوط رکھتے ہیں۔ مسلسل جدوجہد شب و روز کی تگ و دو، جوڑ توڑ اور ہیرا پھیری سے چوری اور سینہ زوری تک کامیابی کے لئے سب کچھ کرنے کے بعد جو لاکھوں اور کروڑوں کے مالک تھے۔ ائیر کنڈیشنڈ لمبی لمبی کاروں میں گھومتے تھے اور محلوں میں رہتے تھے وہ اپنی بہت قیمتی زندگی کی حفاظت ضروری سمجھتے تھے اور ایک بے وقعت مشت خاک ہو جانے کے تصور سے اتنا ڈرتے تھے کہ اپنی ذات کو بدخواہوں اور حاسدوں کی دسترس سے دور حفاظتی حصاروں میں مقید رکھتے تھے اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ دولت سے حیاتِ جاودانی کا نسخۂ کیمیا خرید لیتے اور لازوال شباب کی ضمانت حاصل کر لیتے اور اس تلخ حقیقت کو بھول سکتے کہ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ بڑھاپے کی پیش قدمی جاری ہے اور آخر کار انہیں مرنا پڑے گا۔

گیٹ کا الیکٹرانک قفل کھل گیا تو اس کے فولادی پٹ وا ہو گئے۔ پہلی گاڑی اندر چلی گئی۔ گیٹ پھر بند ہو گیا۔ ہماری گاڑی جو پیچھے رکی ہوئی تھی گیٹ پہ پہنچی تو ڈرائیور اتر کے آگے گیا۔ جاتے وقت وہ چابی نکال کر لے گیا اور اس نے کار کے دروازے کو بھی باہر سے لاک کر دیا۔ اپنی سیٹ سے ڈرائیور کی سیٹ پر پہنچنا اور دروازے کو باہر ہاتھ نکال کر کھولنے کے بعد تین مسلح افراد کی فائرنگ سے بچتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش کرنا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا مکا مار کے گاڑی کی چھت پھاڑنا اور شگاف سے کسی پرندے کی طرح پرواز کر جانا چنانچہ میں آرام سے بیٹھا رہا۔

ڈرائیور نے گیٹ پر لگے ہوئے انٹرکام کا بٹن دبا کے اپنی آمد کا اعلان کیا۔ شاید کسی نامعلوم جگہ پر موجود کسی کیمرے کی خفیہ آنکھ نے تاریکی میں ہم سب کی صورتوں کا عکس اتارا اور اندر کسی مانیٹر اسکرین پر پیش کیا۔ ڈرائیور اور انٹرکام کے درمیان ہونے والی گفتگو میں نہ سن سکا۔ میں نے اتنی دیر میں آس پاس کے دوسرے گھروں کا جائزہ لیا جو ایک جیسے خالی شاندار، سنسان اور اونچے اونچے درختوں کے حصار میں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ میرے سامنے والے گیٹ پر کوئی نمبر نہیں تھا اور کسی کے نام کی تختی نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہاں رہنے والے خواص کے حلقے میں خود اپنی شناخت رکھتے تھے اور عوام کے لئے نام و پتے کو مشتہر کرنے سے گریز کرتے تھے۔

گیٹ دوسری بار کھلا تو ڈرائیور نے گاڑی کو بڑی احتیاط سے گزارا۔ میں نے دیکھا کہ فولادی پٹ صرف اتنا ہی وا ہوئے تھے جتنی گاڑی کی چوڑائی تھی۔ دونوں جانب ایک ایک انچ سے زیادہ جگہ نہ تھی۔ اس گیٹ سے کسی کا تیزی سے گزرنا ممکن ہی نہ تھا۔

محض اپنے تجسس کو رفع کرنے کے لئے میں نے پوچھا "اگر گاڑی کسی طرف سے گیٹ کو چھو لیتی تو کیا ہوتا؟"

ڈرائیور مسکرایا "وہیں پھنس جاتی۔ گیٹ دونوں طرف سے آگے بڑھ کے گاڑی کو پکڑ لیتے اور جام ہو جاتے۔ یہ راستہ شرافت سے اور آرام سے گزرنے والوں کے لئے ہے۔ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی فرار ہونا چاہے یا ایک دم اندر گھسنے کی کوشش کرے تو اس کی گاڑی پھنس جائے گی۔ اس طرح گاڑی کی اسکیننگ بھی ہو گئی۔"

"کیا ہو گیا؟" میں نے انجان بن کے پوچھا۔

"یہ دیکھ لیا گیا کہ گاڑی میں کون ہے اور کیا ہے۔ جب گاڑی واپس جائے گی تو گیٹ پورا اتنا ہی کھلے گا۔ نہ زیادہ نہ کم۔"

گاڑی اب ایک جنگل سے گزر رہی تھی جو در حقیقت باغ تھا۔ ایک فرلانگ سے زیادہ فاصلہ طے کر چکی تھی مگر ابھی تک مجھے کسی عمارت کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ سڑک اچانک گہرائی میں اترنے لگی اور ایک سرنگ میں داخل ہو گئی جو زمین کی سطح سے زیادہ نیچے نہیں تھی۔

ایک موڑ کاٹنے کے بعد چڑھائی شروع ہوئی اور کار سرنگ سے نکل کے ایک کوٹھی کے پورچ میں ٹھہر گئی۔ میرا یہ اندازہ غلط نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم جس گیٹ سے داخل ہوئے تھے یہ اس کے سامنے سڑک کے دوسری جانب کی کوئی کوٹھی ہے تاہم میں نے اپنے خیال کا اظہار نہیں کیا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ یہاں میری ملاقات تریویدی سے اور دلاور سے ہو گی۔ گزشتہ بار ہم نے "مذاکرات" کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ کرنل نے ہمیں خصوصی انتظامات کے ساتھ روانہ کیا تھا مگر پہلے محسن نے ہمیں چھڑا لیا تھا۔ دوسری کوشش کو سیمی اور شمین کی مداخلت نے ناکام بنا دیا تھا۔ انہوں نے کرنل کی اور ایس پی کی آنکھوں میں دھول کے بجائے لال مرچیں جھونک دی تھیں۔ چنانچہ مذاکرات نہ ہو سکے تھے۔ غالباً اس کے بعد ہمیں بلوانے کی ذمے داری دلاور نے قبول کر لی تھی اور اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ مذاکرات کے لئے کتنے بے چین ہیں۔ یہی سب سوچ کے میں بھی خاموش ہو گیا تھا اور میں نے راستے میں کسی جگہ مرنے مارنے اور بھاگ جانے کے قرار ہونے کے امکانات پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اگر مذاکرات کے پس پردہ ان کے عزائم کچھ اور نہیں ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ ایک اور امتحان ہی سہی۔

ڈرائیور میرے لئے دروازہ کھولے ہوئے تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے والے دونوں خونخوار گوریلے بھی اپنی توپوں کا رخ میری جانب کئے کھڑے تھے مگر خاموش تھے اور ان کے رویے میں ایک نمایاں تبدیلی یہ آئی تھی کہ وہ باادب باملاحظہ ہوشیار نظر آنے لگے تھے۔

میں کار سے یوں اترا جیسے ایوانِ صدر کے عشائیے میں شرکت کے لئے آنے والا کوئی سربراہِ مملکت پرچم والی گاڑی سے اترتا ہے۔ میں نے خود پر متانت اور وقار کی شائستہ مسکراہٹ طاری کی اور شوفر سے کہا "تھینک یو۔ میرے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ ادھر تشریف لائیے آپ" شوفر نے طنز کے ساتھ مگر مہذب لہجے میں کہا۔

برآمدے کی چند سیڑھیوں کے بعد دروازہ تھا جو میرے قریب پہنچنے پر کھل گیا اور میرے اندر داخل ہوتے ہی بند ہو گیا۔ میں نے خود کو ایک مختصر راہداری میں پایا۔ میرے قدموں کے نیچے سرخ قالین تھا اور سر کے اوپر ایک فانوس روشن تھا۔ اس کے بعد ایک ہال یا لاؤنج تھا جہاں میری رہنمائی کے لئے کالے سوٹ اور سفید قمیص پر کالی بو لگائے ہیڈ بٹلر ٹائپ ایک شخص پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مجھے خاصے افسوس سے دیکھا۔ وہ کسی وی آئی پی کے استقبال پر مامور کیا گیا تھا لیکن میں اپنے حلیے سے وی ایف پی لگتا تھا۔ سو یری فنی پرسن۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا میں نے اسے گلے لگا لیا "ارے گلن خان! تم یار کتنے بدل گئے ہو۔ تم لیکن دیکھ لو ہم نے پھر بھی پہچان لیا تمہیں۔"

اس شخص کی صدمے اور حیرت سے حالت غیر ہو گئی "جی وہ میں....."

"ہاں ہاں۔ تم اپنے چچا خلیل خان فاختہ کے منجھلے بیٹے ہو نا۔ جن کا دماغ چل گیا تھا۔ کیوں کہ تم کسی کرسٹان چھوکری کے ساتھ بمبئی بھاگ گئے تھے..... فلموں میں کام کرنے کے لئے....."

"جی سر..... میں وہ نہیں ہوں۔ میرا نام جوزف ہے۔"

"اچھا تو مذہب بھی بدل لیا تم نے اس کرسٹان کے لئے اسی نے رکھا ہو گا یہ نام بھی۔ مگر خیر بھئی! بڑی خوشی ہوئی۔" میں نے اس سے پُرجوش معانقہ جاری رکھا۔

جوزف نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور گھبرا کے بولا "آپ ادھر آئیے" اس نے آگے بڑھ کے ایک دروازہ کھول دیا۔

اچانک میں نے خود کو ایک ہال جیسے کمرے میں پایا جس کی زیبائش و آرائش واقعی ایوانِ صدر کے ڈرائنگ روم سے کم نہ تھی۔ اس کے آخری گوشے میں جہاں دو دیواریں ملی تھیں شفاف شیشے سے سمندر کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا اور پرائیویٹ بیچ پر پھیلا ہوا سرسبز باغ اس منظر کو زیادہ دلفریب بناتا تھا۔

ایک نیم دائرے میں لگے ہوئے بید کے صوفوں پر وہ چاروں بیٹھے ہوئے تھے۔ تریویدی، چوہدری دلاور، حاجی عبداللہ اور کرنل۔ ان سب کی صورتوں کے تاثرات مختلف تھے۔ تریویدی کے اعصاب سب سے زیادہ کشیدہ تھے وہ تقریباً نروس بریک ڈاؤن کا شکار تھا۔ اس کے لئے ناممکن تھا کہ وہ اپنے دل میں میرے خلاف اٹھنے والے نفرت اور عداوت کے جذبات کو چہرے پر ظاہر نہ ہونے دے۔ اس کے ہونٹ سختی سے بند تھے۔ آنکھیں سکڑ گئی تھیں اور وہ دونوں ہاتھوں سے صوفے کے بازوؤں کو پکڑے منجمد بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے تیور صاف بتاتے تھے کہ اس کا اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں اور اگر میں نے ہاتھ بڑھایا تو شاید ایک بے ساختہ ردِعمل کے طور پر وہ مجھے گالی دے گا اور کہے گا کہ لعنت تم سے ہاتھ ملانے والے پر۔ اسے میرے نکتۂ نظر سے باقی سب پر ترجیح دی جا سکتی تھی کیوں کہ وہ منافق نہیں تھا۔ اس کا ظاہر اور باطن ایک تھا۔ وہ اگر دشمن تھا تو دوست نہیں نظر آتا تھا۔

چوہدری دلاور کا چہرہ ہمیشہ کی طرح سپاٹ تھا۔ کوئی اندازہ نہیں

www.paksociety.com

کر سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کیا کرے گا۔ وہ اٹھ کر ہاتھ ملائے گا یا میں ہاتھ بڑھاؤں گا تو وہ میرے منہ پر طمانچہ مار دے گا۔ وہ کدورت اور کینے، نفرت و عناد اور بغض بھرے دل میں بھڑکنے والے شعلوں کا کوئی عکس اپنی صورت کے آئینے پر عیاں نہیں ہونے دیتا تھا۔

حاجی عبداللہ سب سے بڑا منافق تھا۔ چناں چہ اس کا قراقلی ٹوپی سے ڈھکا ہوا خشخشی بالوں والا سر، ماتھے پر سجود ریزی کی شدت سے نظر آنے والا نشان، گھنی داڑھی اور بھاری بھرکم جسم کے ساتھ شرعی لباس اسے بندۂ مومن ثابت کرتے تھے مگر اس کا باطن تمام شیطانی صفات سے مزین تھا۔ اس کی زبان الحمدللہ اور ماشاءاللہ کہتے نہیں تھکتی تھی مگر اس کا ہر فعل اللہ کے عذاب کو دعوت دیتا تھا۔ اس کی انگلیاں تسبیح کے دانے گھماتی رہتی تھیں مگر اس کے ہاتھ دنیاوی جرم و گناہ کی ہر آلائش میں بھرے ہوئے تھے۔ وہ بڑا متقی اور پرہیزگار نظر آتا تھا مگر وہ قانون اور انسانیت کا دشمن اور ایک خطرناک مجرم تھا۔ اس کے عجز و انکساری کا پردہ اس کی سفاکی اور شقی القلبی کو چھپا لیتا تھا۔ اس وقت وہی ایک شخص تھا جو اپنے لبوں پر دوستانہ خوش آمدید کہنے والی مسکراہٹ سجائے بیٹھا تھا حالاں کہ موقع ملتا تو وہی سب سے پہلے میرے دل میں خنجر اتارتا۔

چوتھا شخص ایک نیا دشمن تھا جس سے میرا تعارف ہی انتہائی لرزہ خیز اور خوف و دہشت سے لہو کو رگوں میں منجمد کر دینے والے حالات میں ہوا تھا اور اس نے اپنے پُرسکون غیر جذباتی انداز سے مجھ پر ایک نفسیاتی غلبہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ اس وقت بھی وہ پُرسکون ہی تھا۔ ایسے کوبرا سانپ کی طرح جو کنڈلی مارے بیٹھا ہو اور اندھیرے میں نظر بھی نہ آتا ہو۔ اس کے انداز میں ایک لاتعلقی اور بے نیازی شامل تھی۔ جیسے وہ غیر جانبدار ہو۔ نہ کسی کا دوست نہ دشمن۔

مجھے قریب پا کر صرف حاجی عبداللہ اٹھا "السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ" اس نے بڑی قرأت کے ساتھ کہا اور پھر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "بھئی میاں سکندر، سبحان اللہ! بڑی لمبی عمر پائی ہے۔ ابھی ہم سب یاد ہی کر رہے تھے تمہیں۔"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "نہ میں تمہارے سلام کا جواب دوں گا کیوں کہ تم ایک منافق ہو اور نہ تم سے ہاتھ ملاؤں گا۔ کیوں کہ تم میرے نہیں میرے وطن کے بھی دشمن ہو۔"

حاجی عبداللہ کی مسکراہٹ میں خفت شامل ہو گئی۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے ہوا۔ پھر وہ خود بھی بیٹھ گیا "چلو میاں، جیسے تم خوش۔ ہم تو بھٹکوں کے ساتھ عفو و درگزر کے قائل ہیں۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا "حدیث نبوی ہے...."

میں نے کہا "دیکھو حاجی۔ میں یہاں تم سے درسِ قرآن لینے اور احادیث سننے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ میرے سامنے اتنی بے غیرتی کے ساتھ اپنے پاپی پن کو مت اچھالو۔"

اب دلاور نے کہا "چھوڑ یار حاجی، تو بے موقع کرتا ہے ہر بات۔ چلو اب اپنے سکندر صاحب، آپ بھی غصے سے ذرا ٹھنڈے ہو جاؤ اور بیٹھو ادھر۔"

"بیٹھنے سے پہلے میں جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں کس حیثیت میں لایا گیا ہے؟ اگر مجھے اس بین الاقوامی مجرموں کی عدالت میں مجرم بنا کر پیش کیا گیا ہے تو...."

دلاور طنز سے مسکرایا "او یار۔ کس...... نے کہا ہے کہ تم مجرم ہو۔ بس تمہارا یہی مسئلہ ہے کہ ایک دم ڈائیلاگ بولنے لگتے ہو۔ بڑے بڑے دوست کہتے پر تم خفا ہی ہو جی۔ مہمان تم ہو گے نہیں۔ شاید پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں پیو گے اپنے دشمن کے گھر میں۔ ہے نا جی، پر بیٹھو تو سہی۔ کوئی گل بات ایسے تو نہیں ہو سکتی نا۔"

میں دو میں سے ایک خالی صوفے پر بیٹھ گیا "کوئی بھی بات کرنے سے پہلے مجھے یہ بتا دیا جائے کہ میرے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟"

ترویدی پھٹ پڑا "بکواس بند کرو۔ کیا سمجھتے ہو تم آخر خود کو۔ کیا تم اس پوزیشن میں ہو کہ شرائط منوا سکو۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "کیا اب بھی تمہیں شک ہے ترویدی؟ ابھی ہوش نہیں آیا ہے تمہیں؟ اتنا نقصان اٹھانے کے باوجود تمہارا غرور باقی ہے؟ کوئی بات نہیں، وقت آئے گا جب تمہاری ساری بدمعاشی کی طاقت کا یہ کھیل ختم ہو جائے گا۔ آج تم کتے کی طرح بھونک رہے ہو، کل دم ہلاتے آؤ گے قدموں کی خاک چاٹنے کے لئے۔"

"دلاور! روک لو اس...... کو۔ یہ حد سے زیادہ بڑھ رہا ہے" ترویدی نے غضب ناک ہو کے کہا "میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تم کو کہنا چاہئے کہ میں عزت برداشت نہیں کر سکتا۔ ہر عزت دار کے سامنے تمہارے اندر کا بے عزت انسان ننگا ہو جاتا ہے۔ جو ایک تھرڈ ریٹ بدمعاش سے بمبئی کی داداگیری تک پہنچ کر خود فریبی کے خیال میں پناہ ڈھونڈتا ہے کہ اس کی بھی عزت ہے" میں نے کہا۔

"پلیز جنٹلمین!" کرنل نے ہاتھ اٹھا کے کہا "ایسے لڑ کر اور ایک دوسرے کو ذلیل کر کے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہو گا۔"

"مفید مقصد؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہاں۔ مذاکرات میں معقولیت کا رویہ اختیار کرنا سب کے لئے ضروری ہے" کرنل نے کہا۔

میں نے دلاور کی طرف دیکھ کے کہا "کیا مجھے یہاں کسی مذاکرے میں شرکت کے لئے لایا گیا ہے؟ مذاکرے کا موضوع کیا ہے؟"

دلاور نے پہلو بدل کے کہا "غصہ ہے اپنے سکندر صاحب، ہم تو کہتے ہیں گل بات کیا جی۔ آپس میں بیٹھ کے معاملات طے کر لیں۔ اب اس کو تم بے شک مذاکرات کا نام دے دو۔"

حاجی نے سر ہلایا "جزاک اللہ! کیا جامع بات کی ہے چوہدری صاحب نے۔ افہام و تفہیم سے باہمی تنازعات...."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ہمارے مفادات میں کوئی بات مشترک نہ تھی نہ ہو گی۔ آگ اور پانی میں کیسی افہام و تفہیم۔"

"ہم اختلافات کی نوعیت کو سمجھ لیں تو سب نہ سہی بہت سے مسائل حل کر سکتے ہیں۔ کوشش کر سکتے ہیں ایک دوسرے کی پوزیشن کو سمجھنے کی۔ سارے ترپ کے پتے تمہارے ہاتھ میں نہیں ہیں مسٹر سکندر بخت، تم نہیں کہہ سکتے کہ نقصان صرف ہمارا ہو گا۔ اگر جنگ میں دونوں فریق برابر ہوں تو نہ کسی کی جیت ہوتی ہے نہ کسی کی ہار۔" کرنل نے اپنے پُرسکون انداز میں کہا۔

مجھے اندازہ تو سب کے رویے سے ہی ہو گیا تھا کہ وہ سب مل کے مجھ سے بات چیت کے لئے کتنے بے چین ہیں مگر کرنل کی زبان سے یہ سن کر میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ وقت نے انہیں ایک سبق تو سکھا دیا تھا کہ نہتے اور کمزور دشمن کو بھی تنہا اور کمزور مت سمجھو۔ کل تک وہ دھمکیوں کی زبان میں بات کرتے تھے کہ تباہ کر دیں گے، مٹا دیں گے، فنا کر دیں گے اور ہمارے انجام کو درسِ عبرت بنا دیں گے۔ اس سے بھی پہلے وہ وقت تھا جب اپنی قوت خرید پر ناز کرتے ہوئے انہوں نے ہمارے ضمیر کا سودا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہماری حب الوطنی، قانون کی بالادستی پر ہمارے یقین اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار پر ہمارے ایمان کی بولی لگائی تھی۔ وہ پہلی شکست تھی جو انہیں دولت کو سب سے بڑی طاقت سمجھنے کی غلطی کر کے اٹھانا پڑی تھی۔ پھر انہوں نے اپنی بدمعاشی اور اسلحے کی طاقت آزمائی تھی۔ قتل و خونریزی، ظلم اور تشدد کے سارے انسانیت سوز حربے آزمانے کے بعد آج انہوں نے مجھے برابر کا فریق تسلیم کر کے اور مذاکرات کے لئے بلوا کے اپنی دوسری شکست کا بھی اعتراف کر لیا تھا کہ وہ طاقت کے استعمال سے بھی اپنی جیت کو یقینی نہیں بنا سکے تھے۔

میں نے اطمینان سے صوفے پر بیٹھ کے کہا "اول تو میں ان مذاکرات کی حیثیت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ مذاکرات باہمی رضامندی سے ہوتے ہیں جب کہ یہاں آنے میں میری رضامندی کا کوئی دخل نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں زبردستی لانے پر مجبور تھے مگر سوچو" چوہدری دلاور نے کہا "اپنے سکندر اعظم صاحب، اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ تیں ہی، اگر تمہارا کوئی ٹھکانا ہوتا۔ وہ کیا ہے تمہاری ایم آر ایس۔ اس کا کوئی ہیڈ کوارٹر ہوتا تو ہم آ جاتے۔"

"ایم آر ایس" ترویدی نے نفرت اور حقارت سے کہا "یہ سب تمہیں شروع میں نرمی برتنے کا نتیجہ ہے کہ آج تم اکڑ فوں دکھاتے ہو اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کرتے ہو۔ سرحد کے اس پار سے تمہاری دہشت گردی کا دائرہ یہاں تک پھیل گیا ہے اور تمہارے جنونی حامی ہر جگہ پیدا ہو گئے ہیں۔"

میں نے جانتے بوجھتے ہوئے اپنے لہجے میں فرعونیت کا غرور پیدا کرتے ہوئے کہا "ہاں ترویدی، اب پچھتانے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب تو زور وقت سے ہو کہ آنے والا ہنگامہ، ایم آر ایس اب کوئی معمولی قوت نہیں رہی۔ ہم تمہارے مضبوط سے مضبوط قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے ہیں۔ اس وقت بھی تمہیں کیا معلوم کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ تم جو اپنے حفاظتی حصاروں میں بیٹھے ہو کتنے غیر محفوظ ہو...."

"دیکھو، بہت زیادہ امپریس کرنے کی کوشش مت کرو، ہم ایک دوسرے کی حقیقت سے واقف ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ سب مذاکرات......"

"کیا مذاکرات اور کیسے مذاکرات" میں نے کرنل کی بات کاٹ دی "کیوں کروں میں تم سے مذاکرات۔ میں تو تمہارے بارے میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تم اصلی کرنل ہو یا جعلی۔ میں نے صرف ایک بار دیکھا ہے تمہیں اور وہ بھی ایک بھیانک خونی واردات کرتے ہوئے۔ تم سب نے مل کے مجھے محصور کر لیا ہے۔ ایک آدمی کے مقابلے پر تم چار ہو۔ تم مجھے دہشت زدہ کر کے دبانا چاہتے ہو۔ تم نے میرے ساتھیوں کو نہ جانے کہاں لے جا کر رکھا ہے۔ ان کی عدم موجودگی میں مذاکرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

کرنل کی صورت اتر گئی۔ کوشش کے باوجود وہ خفت کی جھنجھلاہٹ کو نہ چھپا سکا۔ حاجی عبداللہ اور ترویدی کی عزت میں پہلے ہی دو کوڑی کی کر چکا تھا۔ میرے اس جارحانہ انداز نے ان کے غرور آمیز اعتماد کو بہت کم کر دیا تھا اس سے مجھے ایک نفسیاتی غلبہ حاصل ہونے لگا تھا۔

"یار اپنے سکندر اعظم بڑے جلال میں ہو جی۔ لگتا ہے تم نے تو ہندوستان بھی فتح کر لیا ہے" چوہدری دلاور نے کہا "وہ کیا کہتے ہیں سیانے، چھوٹا منہ بڑی بات۔ مذاکرات کا سن کے تم بانس پر چڑھ گئے ہو جی۔ چلو، منع کرو مذاکرات کو۔ سیدھی طرح بتاؤ کہ اب کیا چاہتے ہو۔"

میں نے سوچ کر کہا "واہ چوہدری صاحب، اتنی دیر بعد پوچھ رہے ہیں۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں اور کیا۔"

"اکیلے جاؤ گے؟" دلاور مسکرایا۔

"نہیں۔ غالب اور نازو میرے ساتھ آئے تھے بلکہ آگے آگے آئے تھے۔ محسن اور گل بھی ہوں گے۔ میں سب کی غیر مشروط رہائی چاہتا ہوں۔ ورنہ۔"

"ورنہ کی بات مت کرو۔ تم کچھ نہیں کر سکتے" ترویدی نے بگڑ کر کہا۔

دلاور نے اسے روک دیا "سکندر، ایک نام اور شامل کر لو ان

www.paksociety.com

میں۔ تم شملا کو بھی واپسی میں ساتھ لے جا سکتے ہو۔"
میں سنبھل کر بیٹھ گیا "غیر مشروط طور پر۔"
دلاور نے دو وقفے لیتے میں کہا "ایسا بھی ہو سکتا ہے۔" بظاہر یہ ایک مثبت جواب تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے اس نے جواب کو بھی ایک سوال بنا دیا تھا یا وہ میری نادانی پر طنز کر رہا ہے کہ اپنے سکندر صاحب۔ ہوش کے ناخن لو۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے تم خود سوچو۔

میں نے کہا "نہیں چوہدری صاحب، آپ کی ذات سے ایسی نیکی اور دریا دلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ آپ کی فطرت اور آپ کے مزاج کے خلاف ہوگا اگر آپ دشمن کو رعایت دیں اور اس کے خلاف استعمال ہونے والا ٹرمپ کارڈ اسے لوٹا دیں یا اپنی غیر اخلاقی حرکت پر پشیمانی کے احساس نے آپ کی سوچ بدل دی ہو۔ کھل کے بات کرو دلاور کہ تم نے کیا سوچا ہے۔ شرائط پر سمجھوتا نہ پہلے ہوا ہے اور نہ کبھی آئندہ ہوگا۔ میں شملا کی واپسی کے لئے تمہاری پیشکش کو مسترد کرتا ہوں۔ خدا نے توفیق دی تو ہم اسے خود چھڑا کے لے جائیں گے۔"

مشکل یہ ہے کہ تم دماغ سے نہیں دل سے سوچتے ہو" دلاور نے برہمی سے کہا "کیا تمہاری جگہ محسن ہوتا تو انکار کرتا۔"

میں نے میز پر مکا مار کے کہا "ہاں۔ وہ بھی تمہاری اس مہربانی کے جواب میں تم پر لعنت بھیجتا۔ شکریہ ادا کرنے کے بجائے وہ تم پر تھوک دیتا۔ میں شرط لگانے کو تیار ہوں۔ اسے بلا لو۔"

افسوس کہ وہ دونوں ہمارے ہاتھ سے نکل گئے" تریوینی نے کہا۔

میں نے کہا "افسوس سے زیادہ یہ تمہارے لئے پریشانی والی بات ہونی چاہئے۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھے ہوں گے۔"

تریوینی کا رنگ اڑ گیا جس سے مجھے یقین آگیا کہ محسن اور گل واقعی محفوظ ہیں اور یہ اندازہ بھی ہوا کہ تریوینی پر کس حد تک ہمارے نام کی دہشت سوار ہے۔ وہ واقعی ڈر گیا تھا کہ کہیں ایم آر ایس اس کے ناقابل تسخیر سمجھے جانے والے قلعے کی اینٹ سے اینٹ نہ بجا دے۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہاں موجود ہونے کے باوجود باقی سب نے مذاکرات میں ترجمانی کے اور فیصلے کے اختیارات چوہدری دلاور ہی کو دے رکھے ہیں۔ وہ اگر کچھ کہتے تھے تو محض اس لئے کہ انہیں ڈمی نہ سمجھ لیا جائے۔ ایک طرح سے دلاور قائد ایوان تھا تو میں قائد حزب اختلاف۔ میں نے کہا "جتنا غیر محفوظ میں ہوں اتنے ہی تم بھی ہو تریوینی!"

"دیکھو جی، اچھے سکندر صاحب!" چوہدری دلاور نے اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا "میں جانتا ہوں تم سب کتنے ضدی اور سر پھرے ہو۔ دوسروں کا نقصان تو خیر کیا ہی ہے تم نے خود اپنے آپ کو بھی تباہ کر لیا ہے۔ جی جی۔ صرف اس چکر میں۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے غیرت۔ ضمیر، اصول پرستی وغیرہ۔۔۔۔ لیکن ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔۔۔۔"

"سودا نے سر میں حد کیا اور سرحد کیا۔۔۔۔"

"پہلے میری بات سن لو۔ اپنی فارسی بعد میں بولنا۔ خیر سے ہم سب پڑھے لکھے اَن پڑھ ہیں۔ آپ کے مقابلے میں ایک، شعر نہیں پڑھ سکتے" اس نے باقی تینوں کی طرف دیکھ کر کہا "مگر اپنی بات سمجھا سکتے ہیں۔ یہ معاملہ اب بہت لمبا ہو گیا ہے۔ صلح صفائی کے لئے میں نے پہلے ہی ہر طرح سے کوشش کی مگر تم نے تو دشمنی پر کمر باندھ لی ہے۔ سب سے بڑھ کر تمہیں شکوہ تھا اس زیادتی کا۔۔۔۔ جو تمہارے والد مرحوم وزیر خان کے ساتھ ہوئی۔"

میں نے مشتعل ہو کے کہا "وہ صرف زیادتی تھی؟۔۔۔۔"

"او جی، پہلے عرض میری سن لو۔ تھوڑا حوصلہ رکھو۔ میں نے کوئی ساری رات تقریر نہیں کرنی ہے اپنے سکندر اعظم صاحب" چوہدری دلاور نے میری بات کاٹ دی "دیکھو یار، کتنی پرانی ہو گئی وہ بات۔ ہم نے تو معافی تلافی بھی مانگ لی تم سے۔ اب تمہارے گوڈے پکڑنا یا ہاتھ جوڑ کے ناک سے لکیریں نکالنا ہی رہ گیا ہے تو وہ مشکل ہے۔ ہاں تلافی کے لئے ہم حاضر ہیں۔ جی جی۔ آپ بولو۔ جو میرے اختیار میں ہے وہ ضرور ہوگا۔"

میں نے کہا "خود کو قانون کے حوالے کرو اور اپنے ہر جرم کا اعتراف کر لو جس میں وزیر خان کا قتل بھی شامل ہو۔"

وہ ہنسنے لگا "او بھولے بادشاہو اگر میں نے اسے قتل کیا ہوتا تو میں کہتا بسم اللہ۔ جی جی۔ آخر اپنا بھی یار تھا وہ۔ غصے مت ہونا۔ تم تو بچے ہو۔ سامنے کھڑے ہو کے بات کرنا بھی آگیا ہے تمہیں۔ قد بھی مجھ سے اونچا نکل گیا ہے تمہارا اور خیر سے تم کمزور دشمن بھی نہیں ہو۔ مگر اس سے تم بڑے تو نہیں ہو جاتے۔۔۔"

میں نے کہا "بڑائی کیا صرف عمر سے ہوتی ہے اور ہوتی ہے تو تم نے کتنا لحاظ رکھا بڑے چھوٹے کے خون کا۔ شاید اب تم چچا کی حیثیت سے بھی اپنے رشتے کا حق مانگو گے۔ تم بہت بے غیرت ہو دلاور!"

دلاور کا چہرہ سرخ پڑ گیا "تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ مجھے پھانسی چڑھا لو گے تو یہ بھول ہے تمہاری۔ زیادہ سے زیادہ میں یہ کر سکتا ہوں کہ تمہارے باپ کے قاتل کو تمہارے حوالے کر دوں۔"

"اس کے قاتل تم ہو۔" میں نے اسے گالی دے کر کہا "یہ نیا چکر مت چلاؤ میرے جذبات کا رخ موڑنے کے لئے۔ تم دنیا کو دھوکا دے سکتے ہو مگر مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

"خدا کی قسم سکندر! میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔"

"بکواس بند کرو۔ تم اس جرم میں برابر کے شریک تھے۔ خنجر اٹھانے والا ہاتھ کسی کا بھی ہو جو اس ہاتھ میں خنجر دیتا ہے وہ حالات پیدا کرتا ہے، سازش کرتا ہے اور فرمان صادر کرتا ہے۔ اصل قاتل تو وہی ہوتا ہے۔ حکم کی تعمیل کرنے والا مجبوری کا عذر پیش کر سکتا ہے مگر تم اس دلیل کی آڑ بھی نہیں لے سکتے کہ خدا نے تو سب کو عقل دی ہے۔ جس نے بھی جرم کیا وہ مجبور نہیں مختار تھا۔ اس نے نتائج کو سمجھتے ہوئے اپنی مرضی سے سودا کیا تھا۔"

دلاور نے ہاتھ اٹھا کے کہا "ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ تم کو منظور نہیں تو نہ سہی۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم اپنے باپ کے قاتل کو خود سزا دینا چاہتے ہو۔ دنیا کی کسی عدالت میں تم اسے مجرم ثابت نہیں کر سکتے لیکن تم بھی جانتے ہو اور میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ وزیر خان کو چندو نے قتل کیا تھا۔ وہ خود بھی تمہارے سامنے اعتراف کرے گا اپنے جرم کا۔ اور خود کو تمہارے حوالے کر دے گا۔"

اس کی عیاری اور مکاری کا احمقانہ کھیل مسلسل میرے اشتعال میں اضافہ کر رہا تھا "آخر بات کیا ہے؟ کیا غلطی کی ہے چندو نے کہ تم اسے میرے ہاتھوں سزائے موت دلوانے پر تل گئے ہو۔ اتنی فرمانبرداری سے تمہارے لئے جان دینے والا تو چندو بھی نہیں ہے۔ کس مجبوری کے شکنجے میں کسا ہے تم نے اسے کہ وہ میرے سامنے گردن جھکا کے اعتراف جرم کرنے کے لئے تیار ہو گیا؟"
۔۔۔ میں نے تلخی سے کہا "کوئی اور بات کرو دلاور، یہ ڈرامہ نہیں چلے گا۔"

دلاور نے ایک گہری سانس لے کر افسوس سے سر ہلایا جیسے واقعی اس کو اپنی فراخدلانہ پیشکش کے یوں مسترد کئے جانے کا دکھ اور میری نادانی کا رنج ہے۔

"اچھا چھوڑو۔ دوسرا مسئلہ تھا تمہاری جائیداد کا۔ جی جی" دلاور نے کہا "تم کو بڑی شکایت تھی کہ میں نے۔۔۔۔۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے۔ بڑا مشکل سا لفظ ہے۔۔۔۔ ہاں۔ حق وراثت۔ اس سے محروم کر دیا تھا۔ اب تو وہ بات ہی ختم ہو گئی۔ ساری جگہ مل گئی تم کو جہاں وہ فیکٹری تھی اور اس پر ہسپتال بھی کھڑا ہو گیا تمہارے والد کے نام پر۔ وزیر خان چیریٹیبل ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل۔"

اچانک مجھے یوں لگا جیسے دلاور نے مجھے گالی دے دی ہے۔ ایسی گالی جس نے وزیر خان کی روح کو بھی تڑپا دیا ہوگا۔ میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب میں لندن میں عیش کر رہا تھا اور میرے پیچھے دلاور نے وزیر خان کو کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا تھا۔ وزیر خان کاغذات میں کوٹھی اور کارخانے کا مالک تھا لیکن عملاً وہ فقیر تھا۔ وہ اپنے ایک پرانے نوکر کے گھر میں نوکر بن کے رہتا تھا اور اپنی لاعلاج بیماری کے لئے خیراتی شفاخانے جا کر لائن میں کھڑا رہتا تھا۔ سب نے اثر ڈالا پہلے پانی سے بھری ہوئی شیشیاں اور اسپرین کی گولیاں کھا کھا کے مر گیا۔ آج اسی کے نام پر خیراتی شفاخانہ چل رہا ہے۔ فخر کی بات ہے یا شرم کی۔

میرے دماغ میں بجلی سی چمکی اور عقل کا فیوز اڑ گیا۔ میں نے دلاور کو ایک ایسی گالی دی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دی تھی۔ دلاور نے میرے جذبات کے سوئے ہوئے آتش فشاں میں ڈائنامائٹ لگا کے نادانستگی میں ایک چنگاری پھینک دی تھی۔ جب یہ آتش فشاں پھٹا تو اس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

میں نے چیخ کر کہا "تو نے اسے بے کسی کی موت مار دیا۔۔۔ آج بات کرتا ہے خیراتی شفاخانے کے نام کی۔ وہ نام تو کتبہ ہے اس کی قبر کا۔ تیری ذلالت کا اشتہار ہے۔ میں تجھے کتے کی موت ماروں گا دلاور، اور تجھے کتے ہی کھائیں گے۔"

کرنل نے چلا کے کہا "شٹ اپ یو باسٹرڈ۔" کرنل کی گالی نے جلتی پر تیل چھڑک دیا۔ میں ایک دم اٹھا۔ کرنل میرے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر اسے دفاع کی مہلت بھی نہ ملی۔ میں نے اس کے پیٹ پر لات ماری اور وہ صوفے سمیت پیچھے جا گرا۔ پھر میں نے درمیان کی میز تریوینی پر الٹ دی اور خود دلاور پر جا پڑا۔

مجھے اس وقت ہوش آیا جب کرنل نے فائر کیا۔ شاید اس سے پہلے کرنل نے چلا کے کچھ کہا تھا جو میرے کانوں نے ضرور سنا تھا۔ لیکن وقت پر میں نے دلاور کو چھوڑ دیا ورنہ میں اس کا گلا دبائے رکھتا تو کرنل کی گولی مجھے لگتی۔ میں نے الٹی قلابازی کھائی اور پھر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔

تب اس مذاکرات کی ایسی کی تیسی ہو گئی تھی۔ تریوینی کے چلاتے ہی ایک ساتھ چار محافظ دوڑتے ہوئے آگئے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں خود کار رائفلیں تھیں۔ وہ چمکتے سیاہ فولادی جسموں والے عجم کے غلام تھے جو اپنے آقا کے ایک اشارے پر مرنا بھی جانتے تھے اور مار دینا بھی۔ تریوینی نے کرنل کے ریوالور والے ہاتھ کو پکڑ لیا تھا۔ خود چوہدری دلاور کھڑا ہو جانے کے بعد اپنی سانس درست کرتے ہوئے اسے ہاتھ سے اشارہ کر رہا تھا کہ وہ رک جائے۔

میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے ایک چھوٹی سی لکڑی کی میز اٹھالی لیکن یہ ایک بہت کمزور ڈھال تھی۔ اس سے میں ان جاہلوں کے حملے کو نہیں روک سکتا تھا جو قاتلانہ عزائم کے ساتھ آگے بڑھتے آرہے تھے اور مجھے ایک کونے میں محصور کر چکے تھے۔

اچانک ایک زبردست چھناکا سنائی دیا اور سمندر کے رخ کا پورا منظر پیش کرنے والی شیشے کی دیوار کا ایک حصہ گر گیا۔ کوئی چیز راکٹ کی طرح اندر آئی اور حاجی کے پیروں کے قریب گر گئی۔ وہ پہلے ہی اس دھماکا خیز صورت حال سے لرزہ براندام تھا۔

اس نے کہا "یا اللہ" اور منہ کے بل گر گیا۔ کرنل کے ساتھ تریوینی بھی بے اختیار پیچھے ہٹا۔ پھر کرنل نے بھی صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کرتے ہوئے سب کو چلا کے منہ کے بل فرش پر لیٹ جانے کے لئے کہا۔ میری نظریں اس چیز پر جم کے رہ گئی تھیں جو مجھ سے صرف چند فٹ دور پڑی ہوئی تھی اور میں ہر گزرتے ہوئے لمحے کی صدائے مرگ سن رہا تھا لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔

www.paksociety.com

حاجی عبداللہ نے بڑی قرأت کے ساتھ پہلے کلمہ پڑھا اور پھر کہا "اِنّا للہ وانّا الیہ راجعون۔"

ایک لمحے کے لئے وہ بھی بدحواس ہو گئے تو چاروں طرف سے مجھے گھیر چکے تھے۔ انہوں نے وحشت زدہ نظروں سے پہلے درمیان میں گرنے والی چیز کو دیکھا اور پھر ان سب کو جو زمیں بوس ہو چکے تھے۔ انہوں نے کرنل کا حکم سُنا پھر حاجی کی آواز سُنی جو آخری وقت میں خدا کو یاد کر رہا تھا۔ ایک لاشعوری خوف نے انہیں بھی یقین دلا دیا کہ کسی نے دستی بم اندر پھینک دیا ہے۔

صورت حال کی مضحکہ خیزی مجھ پر واضح ہو چکی تھی۔ وہ نہ دستی بم تھا اور نہ دھماکے سے پھٹنے والی کوئی چیز۔ وہ غالباً ایک پتھر تھا جس پر کاغذ لپٹا ہوا تھا اور یہ پتھر کسی نے باہر سے اندر پھینکا تھا اتنی قوت اور مہارت کے ساتھ کہ اس نے شیشے کی دیوار کو چکنا چور کرتے ہوئے اندر تک راستہ بنا لیا تھا۔

اس وقت میرے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ ایسا کس نے کیا اور کیسے کیا۔ قدرت نے مجھے مہلت کے چند لمحے عطا کئے تھے اور اس مہلت سے فائدہ اٹھانا میری قوت فیصلہ اور فوری عمل کرنے کی صلاحیت پر منحصر تھا۔ میرے گرد کھڑے ہوئے محافظ ذرا سی دیر کے لئے غافل ہو گئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ میں کسی محافظ سے اسلحہ چھین کر پانسہ پلٹ دیتا یا چھلانگ مار کے شیشے کی دیوار کے خلا سے فرار ہونے کا فیصلہ کرتا، دلاور نے آگے بڑھ کے وہ پتھر اٹھا لیا۔

"یہ بم نہیں ہے اپنے کرنل صاحب" اس نے تمسخر اڑانے والے طنزیہ لہجے میں کہا "اٹھو جاؤ خیر سے، خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

کرنل کی ساری اداکاری کا پول کھل گیا تھا۔ وہ اپنے غیر معمولی پُرسکون رویے سے اور اطمینان آمیز انداز گفتگو سے خود کو انتہائی مضبوط اعصاب کا مالک ظاہر کرتا تھا۔ وہ ایک فوجی بھی رہا تھا، نہ میدان جنگ میں اس سے زیادہ پُرخطر حالات کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان سے توقع کی جاتی ہے کہ عام شہری کے مقابلے میں وہ گولہ بارود اور بم جیسی چیزوں کی بہتر شناخت کرتے ہوئے ان کی ہلاکت خیزی کی قوت سے نمٹنا بھی جانتے ہیں۔

کرنل اٹھا تو اس کی صورت پر خفت کے ذرا بھی آثار نہ تھے۔ چند سیکنڈ میں وہ پھر ایک ایکٹر بن چکا تھا "میں نے تو دیکھ لیا تھا مگر احتیاط کی عادت اب فطرت بن چکی ہے" اس نے متانت سے کہا۔

دلاور معنی خیز انداز میں ہنسا "کرنل، ہم جانتا ہے آپ ایکشن کور میں تھے۔"

کرنل نے اسی متانت سے کہا "ہاں۔"

"جتنا عرصہ تم نے فوج کی ملازمت میں گزارا شاید اس دوران میں کوئی جنگ بھی نہیں ہوئی تھی؟"

کرنل نے اس سے نظر ملائے بغیر کہا "میں آفیس سوچ نسخے پر ریٹائرمنٹ لے چکا تھا۔ ورنہ......"

"ورنہ کیا؟ تم کلاس روم سے میدان جنگ میں پہنچ جاتے اور دشمنوں کے چھکے چھڑا دیتے۔ توپوں کے گولے اور دستی بم تو بنگلی پر دبا کے ادھر ادھر پھینک دیتے......"

کرنل نے ایک سگریٹ سلگا کے سر کو پُر حقارت انداز میں جھٹکا جیسے اس طرح مذاق اڑانے سے خود دلاور کا ذہنی دیوالیہ پن ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت متاثر نہیں ہوتی۔

اب ترپاٹھی بھی پھر صوفے پر بیٹھ چکا تھا اور حاجی عبداللہ بھی کندھے پر پڑے ہوئے رومال سے منہ صاف کرتے ہوئے شرمندگی کی گرد صاف کرتا نظر آ رہا تھا۔

"ماشاء اللہ سے اپنے حاجی صاحب آ چوہدری" دلاور نے بھر بیٹھتے ہوئے کہا "آج تو کلمہ بھی پڑھ لیا تھا آپ نے کہ بچ گئے۔ ہم وقت پہنچ آ گیا تو......"

"بس میاں! بہت ہو چکا مذاق" حاجی نے لاتعلقی سے ہنستے ہوئے کہا "تم بھی نام کے دلاور ہو۔ ہم جانتے ہیں۔"

ترپاٹھی نے جھنجلا کر کہا "فضول باتیں کرنے سے بجائے دیکھو یہ کیا ہے۔ کس کا پیغام ہے؟"

"پیغام ہونا ضروری ہے؟" دلاور نے پتھر کے اوپر سے کاغذ اتارتے ہوئے کہا "کچھ اور نہیں ہو سکتا؟"

"اور کیا اس طرح کسی نے مٹھائی بھیجی ہوگی؟" ترپاٹھی بولا۔

"افسوس! کسی نے باہر دیکھنے کی زحمت نہیں کی" حاجی نے کہا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں" کرنل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "پتا تو چلے یہ حرکت کس کی تھی......"

"جس نے یہ حرکت کی وہ سامنے پوزیشن کر نہیں کھڑا رہے گا۔ اطمینان سے دیکھو۔ تصویر اتار لیا گولی مار دو" کرنل بولا۔

میں ایک کونے میں کھڑا ہوا تھا اور چاروں طرف مسلح غلام مجھ سے پانچ چھ فٹ دور ایک نیم دائرے میں مجھ پر ٹوٹ پڑنے کے لئے تیار تھے۔ اشتعال کی وہ لہر گزر چکی تھی جس نے مجھے پاگل کر دیا تھا اور ایک بار پھر میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت لوٹ آئی تھی۔ وہ وقت بھی گزر چکا تھا جب میں صورتحال کو اپنے حق میں بدل سکتا تھا۔ اب میں واقعی کسی عدالت میں پیش کئے جانے والے مجرم کی طرح تھا لیکن مجھے سزا دینے کا اختیار رکھنے والے میرے دشمن کو نظر انداز کئے بیٹھے تھے۔

دلاور نے پتھر پر لپٹے ہوئے کاغذ کو غور سے دیکھا۔ غیر ارادی طور پر اس کا ایک ہاتھ کاغذ کی شکنوں کو دور کرنے میں مصروف رہا۔ پھر اس نے وہ کاغذ ترپاٹھی کی طرف بڑھا دیا۔ میں نے صورت کے تاثرات کا مشاہدہ کرتے ہوئے پیغام کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی مگر دلاور کا چہرہ ہمیشہ کی طرح جذبات سے عاری رہا۔

ترپاٹھی کا رنگ بدلتا دیکھ کے میرا حوصلہ بڑھا۔ میرے اس خیال نے یقین کی صورت اختیار کر لی کہ یہ پہلا پتھر ایم آر ایس کی طرف سے ایک الٹی میٹم ہوگا۔ کہ ہمارے دوستوں کو چھوڑ دو ورنہ بد سے بدتر کے لئے تیار رہو۔ ترپاٹھی نے کہا تھا کہ گل اور محسن ان کے ہاتھ نہیں آئے۔ اگر یہ بات سچ نہ ہو تب بھی مزمیاں ایجنڈ کمپنی سے توقعات وابستہ کی جا سکتی تھیں۔ سین اور شین فتنہ ساماں ہیں۔ بظاہر تو امید نہیں کہ کسی کو ہمارے اغوا کر کے یہاں لائے جانے کی خبر بھی ہو مگر اللہ کارساز ہے۔ کیا پتا سین شین یا گل اور محسن میں سے کسی نے دور سے کچھ دیکھ لیا ہو۔

وہ کاغذ حاجی کے ہاتھوں سے گزر کے اب کرنل کے پاس پہنچ چکا تھا اور دلاور کے سوا سب ہی تشویش میں مبتلا نظر آتے تھے۔ دلاور ایک ہاتھ میں پتھر کو تولتے ہوئے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس کا ہاتھ گھوما اور اس نے بڑی تیزی سے پلٹ کے وہ پتھر مجھ پر کھینچ مارا۔

مجھے اس کی پھرتی اور نشانے کی مہارت پر حیران ہونے کا موقع بھی نہ ملا۔ اس کی یہ حرکت اتنی غیر متوقع تھی کہ میں خود کو بچانے کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا۔ پتھر گولی کی طرح آیا اور میرے ماتھے پر لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں جگنو سے اُڑے۔ بے اختیار میرا ہاتھ پیشانی کی طرف گیا اور میں نے کسی گرم سیال کے لمس کو انگلیوں پر اور پھر اپنے ہونٹوں پر محسوس کیا۔ پتھر پھینکتے ہوئے دلاور نے مجھے وہی گالی دی تھی جو میں نے کچھ دیر پہلے اسے دی تھی۔

میں جہاں کھڑا ہوا تھا وہیں گر گیا تھا کیوں کہ کچھ دیر بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں انہی محافظوں کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔ بے ہوشی کا یہ وقفہ مختصر ہی ہوگا۔ یہ میرا اندازہ تھا۔ وہ سب اسی طرح بیٹھے ہوئے تھے اور ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھے چکر آنے لگے۔

"اسے یہاں لاؤ" دلاور نے کہا۔

مجھے دونوں طرف سے بازو پکڑ کے اٹھا لیا گیا۔ میں نے خود کو چھڑا کے اپنے پیروں پر چلنے کی کوشش کی مگر انہوں نے مجھے گھسیٹ کر صوفے پر ڈال دیا۔ میرا سر کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور میری بائیں آنکھ سے اوپر پیشانی کی کھال پھٹ رہی تھی۔ شاید زخم پر خون جم گیا تھا۔ خون کی سرخی میرے الٹے ہاتھ کی آستین پر بھی نظر آ رہی تھی۔ اس سے میں نے چہرہ صاف کیا تھا۔

"تم نے بہت غلط حرکت کی تھی۔ ایسی بے وقوفی کی میں تم سے توقع نہیں کر سکتا تھا" دلاور نے ناگواری سے کہا۔

"تمہاری توقعات پر ہم پہلے کب پورے اترے ہیں!" میں نے سر کو دبا کے کہا "تمہارے نزدیک تو وہ سب بے وقوفی ہے جو ہم کر رہے ہیں۔"

"میں اس پتھر کے بجائے تم کو گولی بھی مار سکتا تھا......"

"پھر کیا ہمت نہیں پڑی؟" میں نے کہا "اگر حسرت ہے دل میں اور ہمت ہے تو اپنا شوق اب پورا کر لو۔ یہاں کون ہے تمہیں روکنے والا؟"

"میاں، شکر کرو شکر الحمدللہ" حاجی نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ "سمجھو دوسری زندگی ملی ہے تمہیں۔"

میں نے کہا "اب بے شمار ابوجہل، خدا ایک ہی زندگی دیتا ہے اور جب تک وہ نہ چاہے نہ مجھے گولی مار سکتی ہے اور نہ گولا۔ ایک کے بعد دوسری زندگی کا تصور ہندو رکھتے ہیں رام داس۔"

"رام داس؟" حاجی کا ہاتھ تسبیح پر رک گیا۔

"ہاں۔ عبداللہ کو ہندو اور کیا کہیں گے؟ تم نے خود کو ان کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اپنا دین ایمان ان کے پاس گروی رکھ دیا ہے۔ تم ان کے زر خرید ہو پنڈت رام داس" میں نے کہا۔

"حاجی! پلیز شٹ اپ" دلاور نے کہا "تم وقت ضائع کر رہے ہو۔"

حاجی غصے میں سرخ چہرہ لئے اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔

ترپاٹھی نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھ کے کہا "ہاں۔ وقت کم ہے۔"

پہلے کرنل نے اسے گھور کے دیکھا پھر دلاور نے۔

ڈاکٹر بی ایم ناز
کی شہرہ آفاق کتاب
ازدواجی نفسیات
کی چند کاپیاں پرانے اسٹاک سے مل گئی ہیں
[illegible]
چند ہی کاپیاں موجود ہیں۔ آج ہی آرڈر دیجیے
قیمت ـــ ۱۰۰/ روپے محصول ڈاک ۱۴/
مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس [illegible]

www.paksociety.com

میں نے اس کے کہا "کتنی صاف دلی ہے تمہیں میرے دوستوں نے؟"

"یہ غلط فہمی ہے ان کی اور تمہاری" اپنے سکندر اعظم صاحب۔ ...چوہوں کی طرح تیر چھینکنا اور بات ہے" دلاور نے بے رخی سے کہا۔ "ان میں ہمت ہے تو کچھ کر کے دکھائیں۔ سامنے آ کے....."

"سامنے بھی آ جائیں گے وہ، اگر تم نے ان کے پیغام کو محض کھوکھلی دھمکی سمجھ کر نظر انداز کیا" میں نے اپنے اندازے سے جو تیر چلایا تھا وہ نشانے پر لگا تھا۔

تریویدی نے مایوس ہو کے کہا "دلاور! اس کے ساتھ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔"

"کیا کرو گے پولیس سے؟" دلاور نے کہا۔

"یہ..... یہ کھلی دھمکی ہے" اس نے کاغذ لہرا کے کہا "ہم اپنے لئے تحفظ مانگنے کا حق رکھتے ہیں۔"

دلاور نے حقارت سے اسے دیکھا "یہ صرف کاغذ کا ایک پرزہ ہے۔ تم اس سے ڈر گئے ہو؟"

"مگر جو کچھ اس میں کہا گیا ہے....."

"تم کیا بتاؤ گے پولیس کو؟ کہ یہ کس کی تحریر ہے۔ اور کیا وہ یقین کر لیں گے تمہاری بات کا؟" دلاور نے کہا۔

کرنل نے تائید میں سر ہلایا "اور یقین کر بھی لیا تو کیا وہ اپنا توپ خانہ بھیج دیں گے تمہاری حفاظت کے لئے؟ مجھے تو حیرت ہے کہ تم جیسا آدمی پولیس کو بلانے کی سوچنے لگا ہے جس کے نام کی دہشت سے دہشت گرد ڈرتے ہیں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں آخر؟"

"...کچھ بھی ہوا ہے... تم جانتے ہو" تریویدی نے مشتعل ہو کے کہا "اور یہ بھی جانتے ہو کہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"اچھا تو پھر ہمیں ہی نمٹنے دو تمام مسائل سے۔ تم آرام سے بیٹھو" دلاور نے کہا۔

میں نے کہا "ہاں مسٹر تریویدی! تم بلاوجہ اپ سیٹ ہو۔ تمہارے دوست اپنے ساتھ تمہیں بھی مروانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں پھر تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی تو کچھ نہیں ہوا۔ بس تمہارا ایک جہاز غرق ہوا ہے۔ کاروبار کا بیڑا غرق ہوا ہے۔ بیٹی ہاتھ سے گئی۔ تمہاری دادا گیری گئی۔ اب کسی دن جان بھی جائے گی....."

"یہ تمہاری خام خیالی ہے...." دلاور نے تلخی سے کہا۔

"تم بھی اردو بولنے لگے ہو خیر سے اپنے چوہدری صاحب" میں نے کہا۔

"میں جانتا ہوں تمہارے حربے سکندر! تم مجھے مشتعل نہیں کر سکتے" دلاور مسکرایا "یہ ہر وقت ہمارے اختیار میں تھا اور آج بھی ہے کہ تمہیں بدترین عذاب کے ساتھ مار دیں۔ خود تمہارے سورماؤں کے سامنے۔ اور پھر انہیں بھی ختم کر دیں....."

"لیکن تم جانتے ہو کہ ہم میں سے کوئی موت سے ڈرنے والا نہیں ہے" میں نے اس کی بات کاٹ دی "تم کو اپنے انجام کا خوف روک لیتا ہے۔ تم سکندر بخت کو مار کے ایم آر ایس کو نہیں ختم کر سکتے۔"

"ایم آر ایس کی کیا حیثیت ہے؟" دلاور نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"میں بتاؤں تمہیں؟" میں نے کہا "یہ پہلے صرف میرا نام تھا۔ پھر اس نام کو محسن نے اختیار کر لیا۔ اس کے بعد یہ راجہ کا نام بن گیا۔ پھر غالب، نازو اور گل۔ استاد شیدی سے ڈاکٹر محمد علی تک یہ نام سب کے لئے ایک عہد کی زنجیر بن گیا۔ حلقہ در حلقہ زنجیر پھیلتی رہی اور مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی یہاں تک کہ اس زنجیر کا سلسلہ ایک طرف مغربی پاکستان کی سرحدوں تک پھیلا ہوا ہے تو دوسری طرف مشرقی پاکستان تک اتنا طویل ہو گیا ہے۔ اب یہ ایک نام نہیں، ایک طاقت ہے۔ جو پہلے ایک لہر تھی اب ایک طوفان ہے۔ مجھے زعم کہ تنہا تھا میں انجمن میں۔ یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں۔ سمجھو، بڑا مسئلہ....."

"میاں! ماشاءاللہ سے بڑی فصاحت ہے کلام میں" [illegible] میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا "لیکن مبالغہ آرائی میں ہزاروں کی تعداد پر قناعت کیوں کر لی؟ لاکھوں کہہ دیتے۔"

دلاور نے سر ہلایا "خیر سے اپنے سکندر صاحب کو عادت ہے مذاق کرنے کی۔ ڈائیلاگ بھی خوب بولتے ہیں اور اچھا شعر کرتے ہیں کہ واہ واہ۔ ابھی علامہ صاحب کا کیسا مصرعہ نکال لیا انہوں نے۔ بس حساب میں ذرا کمزور ہو گئی۔ ایک اور ایک دو گیارہ ہوتے ہیں یہ تو ہم جانتے ہیں۔ چلو ان کی خاطر ایک سو گیارہ مان سکتے ہیں۔ مگر یار، تم تو ثابت کرنا چاہتے ہو کہ ایم آر ایس ایک سو گیارہ ڈویژن فوج ہے اور اس کے ایک سو گیارہ جرنیل جن کے پاس ایک سو گیارہ توپیں ہیں جو ایک منٹ میں ایک سو گولے چلاتی ہیں۔ تو اس مذاق پر کسی کو ہنسی بھی نہیں آئے گی۔"

میں نے اپنی متانت برقرار رکھتے ہوئے دلاور کے تمسخر والے لہجے اور تحقیر انداز گفتگو پر صرف مسکرانا ہی کافی [illegible] "اگر یہ مذاق تھا چوہدری صاحب تو پھر حقیقت تم بتاؤ۔ تمہارے ذرائع اطلاعات بہت وسیع ہیں۔ تمہیں پل پل کی خبر ملتی رہتی ہے۔ میری مبالغہ آرائی کے جواب میں تم اپنے دوستوں کو صحیح تعداد... وہ کتنے افراد تھے جنہوں نے سر راہ تمہیں اغوا کر کے لے جانے... کا راستہ روک لیا تھا اور کرنل صاحب کے خصوصی انتظام کی ایسی تیسی کر دی تھی؟ یہ بھی سوچو کہ انہیں اطلاع کیسے ملی اور انہوں نے فوراً جوابی کارروائی کے لئے پلان کیسے کر لیا؟ یہ ایک دن کا کام تو نہیں تھا۔ اس کے بعد کرنل اور ایس پی کی آنکھوں میں مرچیں جھونک کر اور ان کی مسلح سپاہ کو شکست دے کر لے جانے والے کتنے تھے؟ تریویدی! تم کو بھی اندازہ ہوا، تمہارے محل کا محاصرہ کرنے والے افراد کی کیا تعداد تھی جنہوں نے تمہاری بجلی کی اور ٹیلی فون کی ہر لائن کاٹ دی تھی اور تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ ہر طرف موجود تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے کتنے غنڈوں کی فوج بھیجی تھی؟ اس کا کیا حشر ہوا؟ کیا ان کا مقابلہ کرنے والے دو چار ہی تھے؟ نہیں دلاور! آزمانا چاہو تو آزما کے دیکھ لو۔ ہر قدم پر میرے ساتھی موجود ہیں اور وہ ہر جگہ پہنچ بھی سکتے ہیں۔ صرف گنتی کی بات نہیں 'ہم' اپنے پیچھے مغربی پاکستان کے محاذ کو بھی خالی چھوڑ کر نہیں آئے ہیں اور اب ہمارا رابطہ مشرقی پاکستان کے مجاہدوں سے بھی ہے۔ ان کا پیغام تم تک پہنچ چکا ہے۔ میں تم کو چیلنج کرتا ہوں۔ ہمت ہے تو اس پیغام کو مجھ سے چھپانے کے بجائے مجھے پڑھ کر سناؤ اور پھاڑ کے پھینک دو۔"

حاجی عبداللہ اور تریویدی پر یقیناً میرے پُر اعتماد انداز نے خوف طاری کر دیا تھا۔ کرنل اور دلاور نے خوف کو ظاہر نہیں ہونے دیا تھا مگر جس خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ انہوں نے میری پوری بات سنی تھی وہ از خود ان کی سوچ کے منفی پہلو کی آئینہ دار تھی۔ میں نے ثابت کر دیا تھا کہ ایم آر ایس اب واقعی ایک ناقابل تسخیر منظم فوج ہے۔ حالات اور واقعات کی شہادت میرے ہر دعوے کے سچ کا ثبوت تھی۔ اس حقیقت کو تسلیم نہ کرنا خود دلاور کے لئے ممکن نہ تھا کہ ان کے پاس پیسے کی قوت تھی اور ہمارے پاس ایک جذبہ تھا۔ کرائے سے خریدی ہوئی وفاداری کا ایمان کی طاقت سے کیا مقابلہ۔ ایم آر ایس سب سودائی تھے جو سر بکف اور کفن بردوش پھرتے تھے۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ نہ دنیا میں سرخروئی کی خواہش نہ مال و متاعِ جہاں کی آرزو۔ نہ موت کا ڈر نہ زندگی باعث شرمندگی۔

دلاور نے آخر کار میرا دیا ہوا چیلنج قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سب کے سامنے یہ اس کے وقار کا اور انا کا مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ مجھ سے مرعوب ہو جاتا تو دوسروں کو نفسیاتی طور پر احساس شکست ہوتا۔ ...شاید وہ ہمت ہار بیٹھتے۔ دلاور کا ساتھ چھوڑ کے الگ الگ اپنے مفادات کے تحفظ کو ترجیح دینے کا خیال انہیں مغلوب کر لیتا۔ ان سب کے درمیان خلوص اور دوستی یا مقصد کی وہ اجتماعی سوچ نہیں تھی جس نے ہم سب کو اکٹھا کیا تھا۔ ہمارے درمیان انتشار یا نااتفاقی کے امکانات سرے سے معدوم تھے کیوں کہ ہم اپنے مادی مقاصد کے حصول کی جنگ نہیں لڑ رہے تھے۔ ہمارے حریف صرف کاروباری اشتراک کے منفعت بخش مقاصد کو پیش نظر رکھتے تھے۔ مل کر کاروبار کرنے میں فائدے کی جگہ نقصان کا احتمال اور جان کا خطرہ ہو تو پھر اشتراک جائے بھاڑ میں۔ اس مرحلے پر دلاور نہیں چاہتا تھا کہ وہ مایوس اور بد دل ہو کے الگ ہو جائیں اور وہ اکیلا رہ جائے۔

اس نے وہ کاغذ تریویدی کے ہاتھ سے چھین کر میری طرف بڑھایا "یہ لو اپنے سکندر اعظم۔ دیکھ لو کیا فرماتے ہیں تمہارے جرنیل۔ یہی ہیں نا۔ ان سب کی....."

گالی کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے کاغذ پر پنسل سے لکھی ہوئی تحریر کو دیکھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کسی بچے کا خط ہے جو ابھی لکھنا سیکھ رہا ہو۔ غالباً یہ دائیں ہاتھ سے لکھنے کے عادی کسی شخص نے بائیں ہاتھ میں پنسل پکڑ کے لکھا تھا۔

"ہم سب جانتے ہیں اور سب دیکھ رہے ہیں۔ اپنی سلامتی چاہتے ہو تو ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمارے دوستوں کو سلامتی کے ساتھ ان کی خواہش اور ہدایت کے مطابق رخصت کر دو۔"

عبارت کے آخر میں ایک لفظ تھا جو بظاہر بے معنی نظر آتا تھا۔ دلاور نے اور اس کے سب ساتھیوں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ پیغام بھیجنے والا اپنے اصل نام کی جگہ خود کو کانا دجال یا لال بجھکڑ بھی لکھ سکتا تھا۔ اگر اس نے اوٹ پٹانگ نام لکھ دیا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مگر یہ لفظ اوٹ پٹانگ اور بے معنی نہیں تھا۔ یہ فرانسیسی زبان کا لفظ تھا جو اردو میں لکھا گیا تھا۔ اس کا مطلب تقریباً وہی تھا جو محسن کا۔ احسان کرنے والا۔ یہ محسن کا پیغام تھا، خواہ بھیجنے والا محسن یا حسین میں سے کوئی ہو۔ اس کی چالاکی نے میرا دل خوش کیا اور میرے اعتماد کو دوچند کر دیا۔

میں نے کاغذ کو بڑی احتیاط سے موڑ کے گول کیا اور کچھ دیر اسے اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان گھماتا رہا۔ اس طرح ایک لمبی سی پتلی ڈنڈی بن گئی۔ جیسے کولڈ ڈرنک پینے کا اسٹرا۔

میں نے یہ چھڑی دلاور کو پیش کرتے ہوئے کہا "یہ لیجئے اپنے چوہدری صاحب۔ ابھی آدھا گھنٹا ہے۔"

دلاور بھڑک اٹھا۔ یہاں اس کے جواب کا اقتباس بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے حکم پر چاروں محافظ ایک ساتھ مجھ پر پل پڑے۔ انہوں نے مجھے رائفلوں کے کندوں سے مارا اور پھر اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے گئے۔ چوٹوں کی تکلیف بہت زیادہ تھی لیکن میں بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ میرے حق میں بہتر یہی تھا کہ مقابلہ نہ کروں اور جان بچاؤں جبکہ میں نے پہلے ہی راؤنڈ میں ناک آؤٹ ہو جانے کو ترجیح دی۔ بے ہوش آدمی پر جسمانی تشدد کوئی نہیں کرتا۔

میں نے بیک وقت دلاور اور تریویدی کو چلاتے سنا۔

دلاور نے کہا "اسے تہہ خانے میں ڈال کے واپس آؤ۔"

تریویدی نے کہا "تو مجھے ڈال دینا۔"

"تم فوراً سب کو اکٹھا کرو۔ ان سے کہو باہر جا کے چاروں طرف دیکھیں۔ درختوں میں اور جھاڑیوں میں۔ چھت پر۔ کہیں کوئی بھی نظر آئے اسے گولی مار دیں۔ پوچھے بغیر۔"

"پولیس کو بھی بلا لینا چاہئے" تریویدی نے کہا۔

"بلا لو۔ اگر تم ان پر بھروسہ کر سکتے ہو....." دلاور نے کہا۔

"میں ایس پی سے بات کرتا ہوں" یہ آواز کرنل کی تھی۔

"مگر اپنے انتظامات کا جائزہ لیتے تو اچھا تھا۔"

"مگر وہ بھی کر لوں گا۔ گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات

نہیں" آر کل نے کہا "سب ہو جائے گا۔"

یہ آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ چار میں سے دو محافظوں نے مجھے بازو پکڑ کے یوں اٹھا رکھا تھا کہ میرا دھڑ زمین سے اوپر تھا مگر پیر فرش پر رگڑتے جا رہے تھے۔ میں نے ایک آنکھ ذرا سا کھول کر دیکھا تو باقی دو مجھے اپنے پیچھے نظر آئے۔ وہ بڑے تاملانہ انداز میں مجھ پر خود کار رائفلیں تانے ہوئے تھے۔ وہ قریب ہوتے تو میں ٹانگ اڑا کے انہیں منہ کے بل گرا دیتا مگر وہ مجھ سے چند قدم دور تھے۔ میں نے ایکشن کو تہ خانے میں پہنچنے تک ملتوی کر دیا۔ تہ خانے سے نیچے جانے والا زینہ ان سے نمٹنے کے لئے موزوں ترین جگہ ہو سکتی تھی یا پھر تہ خانہ۔ میں طے کر چکا تھا کہ انہیں زنجیریں پہنانے کا موقع فراہم نہیں کروں گا۔ مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ کیا اس تہ خانے میں غالب اور نازو کو بھی قید کیا گیا ہے۔

وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے دو کمروں سے گزرے اور ایک لمبے اونچی چھت والے کاریڈور میں طلوع ہوئے۔ اس کے آخری سرے میں زینہ اوپر بھی جا رہا تھا اور نیچے بھی۔ وہ مجھے اسی طرح کھینچتے گئے۔ زینے سے نیچے جاتے ہوئے میرا سر نیچے ہو گیا۔ میری ٹانگیں اوپر کی تین سیڑھیوں پر رہیں اور مجھے لے جانے والے مجھ سے بھی ایک سیڑھی نیچے رہے۔ ہر سیڑھی پر میرے پاؤں دھڑ سے لگتے تھے اور انہیں بھی سنبھل کے اگلا قدم اٹھانا پڑتا تھا۔ آخر میں آنے والے محافظ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ زینے کی چوڑائی میں ان کے لئے دائیں بائیں حرکت کرنے کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔

مجھے یہ موقع غنیمت لگا۔ میں نے پوری قوت کے ساتھ دونوں ٹانگوں کو اوپر اٹھایا اور پیچھے پلٹ گیا۔ یہ ہوا میں الٹی قلابازی تھی جو اس لئے آسان ہو گئی تھی کہ مجھے کندھوں کے پاس سے اٹھانے والوں نے سہارا فراہم کر دیا تھا۔ میرے دونوں پاؤں پلٹ کر ان کے شانوں پر لگے تو وہ میرا ہاتھ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور ایک دم آگے جھکے۔ پھر میرا وزن ان پر آ گیا اور وہ منہ کے بل گرے تو آخری سیڑھی پہ عین سر کے بل گرے اور الٹ کر تہ خانے کے فرش پر چت ہو گئے۔ ان کے اوپر سے گزر کے میں نے بھی تہ خانے میں لینڈ کیا اور یہ سب کچھ مشکل سے دو تین سیکنڈ میں ہو گیا۔ میرا کوئی فعل غیر ارادی نہیں تھا۔ میں پہلے سے طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ چنانچہ میں گرتے ہی پلٹ کے ایک طرف ہو گیا۔

میرے پیچھے آنے والے مسلح محافظ ایک لمحے تک تو سمجھ ہی نہ سکے کہ یہ اچانک کیا ہو گیا۔ جب ان پر صورت حال واضح ہوئی تو وہ فوراً یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کیا اب انہیں بلا تامل فائر جھونک دینا چاہئے۔ تامل کی وجہ یہ تھی کہ میں اور ان کے دونوں ساتھی گڈمڈ ہو چکے تھے اور وہ فائرنگ کرتے تو حساب کے قاعدے کی رو سے دو تہائی امکانات یہ تھے کہ اپنے ہی ساتھیوں کو ہلاک کر دیں گے۔ ایک تہائی خطرہ میرے لئے تھا۔

اسی تذبذب نے انہیں فائر کرنے سے روکا اور وہ خود مجھ پر حملہ آور ہونے کے لئے ایک ساتھ دوڑے۔ انہیں یقین ہوگا کہ نیچے تہ خانے کے ہموار میدان جنگ میں وہ چاروں بندوقوں کے کندے مار مار کے دوسری بار مجھے بیچ ناک آؤٹ کر لیں گے۔ لیکن ان کے یقین میں پہلی گڑبڑ تو یہ ہوئی کہ ان کے زخمی ہونے والے ساتھی فوراً نہ اٹھ سکے۔ ان کا سر اتنی قوت کے ساتھ سنگین فرش پر لگا تھا کہ وہ وہیں لیٹے رہے اور شاید اندھیرے میں گول چکر والے جھولے پر بیٹھے تارے دیکھتے رہے۔ دوسری گڑبڑ کے ذمے دار وہ خود تھے۔ ان کو تنگ راستے پر آگے پیچھے ہونا چاہئے تھا۔ ایک ساتھ دوڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آپس میں ٹکرائے۔ ایک نے شاید دوسرے کے پاؤں پر پاؤں رکھ دیا تھا۔ وہ چلایا "اے میرا پاؤں۔"

جس کا پاؤں دب گیا تھا اس نے ضرور پیر کو جھٹکا ہوگا تاکہ اس تکلیف سے چھٹکارا پائے۔ پاؤں دبانے والا اپنے ساتھی کے اسی ایک پیر پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کا دوسرا پاؤں آگے بڑھ چکا تھا چنانچہ وہ ہوا میں معلق رہ گیا اور زمین کی کشش نے اسے کھینچ لیا۔ اس کے ساتھی نے پاؤں تو چھڑا لیا مگر جھٹکے سے اور تصادم سے وہ بھی حرکت کا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔

میں نے یہ سب زینے کی دیوار کے گوشے سے سر نکال کر دیکھا تھا۔ چند سیکنڈ بعد جب باقی دونوں محافظ بھی نیچے پہنچے تو میں ان کے استقبال کے لئے تیار تھا اور ہنگامی صورت حال نے میرے بدن میں فاضل بجلی بھر دی تھی۔ میں نے ایک کے سر پر بوٹ کی بھرپور ٹھوکر ماری اور دوسرے کی گردن پر ہاتھ مارا۔ پہلا تو دیوار سے سر ٹکرا کے گرا اور ساکت ہو گیا۔ دوسرے کی گردن میری توقع سے زیادہ نازک ثابت ہوئی۔ مجھ سے بھی آگے گرنے والے جھومتے جھامتے اٹھنے کی تیاری کر رہے تھے کہ میں نے انہی کی رائفلوں کے بٹ مار کے انہیں پھر لٹا دیا۔

اسی وقت پیچھے سے کسی نے کہا "بیوٹی فل۔"

میں نے نازو کی آواز پہچان لی اور پلٹ کے دیکھا "تھینک یو لیڈی۔ آپ بھی کم خوبصورت نہیں ہیں۔"

نازو نے کہا "میں آپ کے ایکشن کی تعریف کر رہی تھی۔"

اس کے ساتھ بندھے ہوئے غالب نے کہا "مجھے تم بھی خوبصورت لگ رہے ہو۔"

دس فٹ لمبے چوڑے اس تہ خانے کی تعمیر کا مقصد ہرگز کسی کو اسیر رکھنا نہیں تھا۔ یہ ایک انڈر گراؤنڈ قسم کا خفیہ بیڈ روم سمجھا جا سکتا تھا مگر اس کی تزئین و آرائش کا انداز بے حد پُراسرار اور خطرناک لگتا تھا۔ یہ ایک ایسا عشرت کدہ تھا جس میں گناہ کی پرچھائیوں کے پیچھے گھناؤنے کاروبار کا عکس نظر آتا تھا اور اس کی مجرم خاموشی میں مجبور عصمتوں کی نوحہ خواں سسکیاں سنائی دیتی تھیں۔ اس کی دیواریں آئینوں سے سب ڈھکی تھیں اور چھت کے مختلف زاویوں پر آویزاں روشنی ہر منظر کو فروزاں کرتی تھی۔ تو کہیں پوشیدہ کیمروں کی نگاہ اسے محفوظ کرتی جاتی تھی۔ میں نے یہ سب ایک نظر میں دیکھا اور سمجھا، کسی دشواری کے بغیر۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا، سب جان لیتا۔

غالب اور نازو پہلے سے وہاں موجود تھے چنانچہ وہ بھی اس زیر زمین عقوبت خانے کے رسوا کن اسرار و رموز کو سمجھ چکے تھے اور اس وقت کے تصور سے خوفزدہ تھے جو کسی بھی لمحے انسانی درندوں کی شکل میں شرافت اور انسانیت کی لاش کو تار تار کرنے کے لئے آ سکتا تھا۔

"اب کیا سوچ رہے ہو سکندر! جلدی کرو۔" نازو نے جھنجلا کے کہا۔

غالب نے کہا "نازو ان کی جیت کے بعد فلسفی غالب آ گیا ہے۔"

میں نے چونک کے اور خفت سے سر کھجا کے انہیں دیکھا، وہ زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ بڑے عجیب طریقے سے جکڑے ہوئے تھے۔ غالب کے دونوں ہاتھ نازو کی کمر کے گرد تھے اور نازو کے ہاتھ غالب کی کمر کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ پھر انہیں الگ الگ زنجیر میں ڈال کے تالے لگا دئیے گئے تھے۔ عام زندگی میں وہ بھی اس انداز میں اتنی دیر تک یک جان دو قالب نہ رہے ہوں گے۔ ایک زنجیر نے ان کے پیروں کو باندھ رکھا تھا اور وہ چھت کے وسط میں نصب آئینے کے عین نیچے بیڈ پر ایسے پڑے ہوئے تھے کہ نازو کا شرم سے برا حال تھا اور غالب کا خفت سے۔ انہیں یہاں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی ورنہ ذہنی اذیت کے ساتھ جسمانی اذیت بھی برداشت کی حد سے گزر جاتی۔ وہ کروٹ تک نہیں لے سکتے تھے۔ کروٹ لینے کے لئے انہیں ایک دوسرے کے اوپر سے گزرنا پڑتا۔ انہیں باندھ کر یہاں ڈالنے والوں کے ذہن میں نہ جانے کیا غلیظ منصوبہ تھا جو پورا نہ ہوا۔ ورنہ انہیں کسی کا نہ تھا۔ نازو اور غالب کتنا بھی چیختے چلاتے، ان کی آواز کوئی نہ سنتا۔

"معاف کرنا یار" میں نے تالوں کو دیکھ کر کہا "ان کی چابیاں میرے پاس نہیں ہیں۔"

غالب نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ "چابیاں ان کی جیب میں ہیں"

نازو نے گردن کے اشارے سے کہا "وہ جو دیوار کے ساتھ پڑا ہے۔ بھوری داڑھی والا۔ تالے اسی نے لگائے تھے۔"

میں نے سر ہلا کے کہا "تم لوگ..... واقعی چاہتے ہو کہ تمہیں..... الگ کر دیا جائے؟"

نازو نے بگڑ کے کہا "شرم آنی چاہئے تمہیں....."

میں نے حیران ہو کے کہا "مجھے؟ کمال ہے۔ یعنی میں نے کیا کیا ہے۔" اور بھوری داڑھی والے کی جیب سے چابی نکال لی۔

غالب نے کہا "الو کے پٹھے! تجھے مذاق کی سوجھ رہی ہے۔ ابھی وہ آ جائیں گے اوپر سے۔"

میں نے ایک تالا کھول کر ان دونوں کے پاؤں آزاد کر دئیے۔

"قید تو ہم بھی کئی بار ہوئے" میں نے تو بھر کے کہا "لیکن کوئی ایسا دل والا دشمن کبھی نہ ملا۔ کہ ایسے اسیر کرتا۔"

نازو نے ہاتھ چھوٹتے ہی آزاد ہوتے اس نے اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے مجھے نشانہ بنا لیا۔ میں اس کے حملے کے لئے تیار نہ تھا۔ پلک جھپکتے ہی اس نے مجھے اٹھا کے نیچے پھینک دیا اور ہاتھ جھاڑ کے بیڈ سے اتر آئی۔

میرے چوٹوں سے بدحال جسم کے لئے یہ صدمہ بھی کم نہ تھا مگر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"زبان کا مقابلہ ہاتھ سے کرنا تو بڑی بے اصولی کی بات ہے عزیزہ" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "چلئے مرزا غالب۔ اٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی۔ ہتھیار اٹھانے کا وقت آ گیا۔"

ہتھیار انہوں نے پہلے ہی اٹھا لئے تھے۔ ایک محافظ کی خود کار رائفل نازو کے ہاتھ میں تھی اور دوسرے کی غالب کے ہاتھ میں۔ وہ ابھی تک ایک دوسرے سے ہی نہیں آئینوں سے بھی نظریں چرا رہے تھے۔

"تمہیں ہے کچھ اندازہ کہ یہاں کتنے لوگ ہیں؟"

میں نے کہا "سارے شکاری اور بقلم خود موجود ہیں۔"

"باہر جانے کا راستہ ہے کوئی؟" نازو نے کہا۔

"راستہ بنانا پڑے گا۔ ویسے فکر کی اب کوئی بات نہیں۔ میں نے انہیں لڑنے پر مجبور کر دیا ہے ورنہ وہ تو مذاکرات پر اڑے ہوئے تھے۔ ہماری سپاہ نے باہر کہیں مورچے سنبھال لئے ہیں۔" میں نے کہا۔

غالب نے اوپر سے آنے والے راستے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "باہر کہاں؟"

"اور انہیں کیسے معلوم ہوا؟" نازو بولی۔

"کیا معلوم ہوا؟"

"یہی کہ ہم یہاں ہیں؟" نازو نے جھلا کے کہا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"پھر تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ باہر موجود ہیں؟" نازو کے بجائے غالب نے کہا۔

"وہ کون؟"

"ہماری سپاہ اور کون!" غالب چلا کے بولا۔

"وہ۔ اچھا۔ میں سمجھ گیا۔ دراصل ان کا ایک پیغام آیا تھا" میں نے کہا۔

"آخر تم یہاں وقت کیوں ضائع کرنے پر تلے ہوئے ہو؟" غالب نے کہا "سیدھی طرح بات کیوں نہیں بتاتے۔"

میں نے کہا "کون سی ٹیڑھی بات کی ہے؟ وقت میں اس لئے ضائع کر رہا ہوں کہ وقت ہے۔ ابھی پانچ منٹ اور ضائع کر سکتا ہوں میں۔"

"اور پانچ منٹ کے بعد کیا ہوگا؟"

www.paksociety.com

"یہ بھی مجھے معلوم نہیں" میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا۔

نازو نے مجھے غور سے دیکھا "غالب! مجھے یہ کسی بوٹ کا اثر لگتا ہے۔ ایسی بہکی بہکی باتیں....."

میں نے کہا "نشے میں بھی تو بہک جاتا ہے آدمی۔"

"اچھا نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ" غالب نے کہا "بھاڑ میں جاؤ۔"

"اچھا۔ میں بھاڑ میں جاتا ہوں۔ اتنی دیر میں تم ایسا کرو کہ ان محافظوں کے کپڑے خود پہن لو" میں نے کہا "دو منٹ اور چالیس سیکنڈ باقی ہیں۔"

ان کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا مگر پہلے غالب ایک محافظ کو کھینچ کر لے گیا۔ وہ بیڈ روم سے ملحق باتھ روم میں غائب ہو گیا تو میں دوسرے کو گھسیٹ کر اوپر زینے میں لے گیا۔ جب میں نیچے آیا تو نازو نے تیسرے کی وردی پہن ڈالی تھی۔

غالب نے باتھ روم کا دروازہ بجا کے کہا "میں آجاؤں؟"

میں نے کہا "آجاؤ یار۔ تم سے کوئی پردہ ہے۔"

"پردے کے بچے۔ باہر سے کنڈی کھول..."

کنڈی نازو نے لگائی تھی۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ اوپر کہیں ایک دھماکا ہوا۔

غالب نے باہر آتے ہی کہا "یہ کیا تھا؟"

میں نے کہا "دھماکا" اور اوپر دوڑا۔

اوپر سے چیخ پکار کے ساتھ گالیوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ دلاور نے کسی سے کہا "وہ چار دلے..... کیا نیچے ہی دفن ہو گئے!"

اوپر آتے ہی میں نے دھوئیں اور بارود کی بو محسوس کی۔ ایک شخص بڑی خطرناک قسم کی مشین گن لئے دلاور کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس نے مجھے پہچاننے میں غلطی کی لیکن دلاور ایک کھلے دروازے میں غوطہ مار گیا۔ اس نے میری وردی کے باوجود میرا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ میں نے خودکار ریوالور کا راؤنڈ چلا کے مشین گن کے ساتھ آنے والے کو چھلنی کر دیا۔

غالب اور نازو ابھی تک میرے پیچھے تھے۔ میں نے غالب سے کہا "تم زینے سے اوپر جاؤ۔ دیکھو اوپر کون ہے؟"

غالب دوڑتا ہوا اوپر چلا گیا۔

"میں بھی اوپر جاؤں؟" نازو نے کہا۔

"خبردار! پھر کوئی باندھ کے ڈال دے گا" میں نے کہا "تم پیچھے سے جاؤ۔ اس دروازے کو کھولو۔"

"کیسے کھولوں؟ میرے پاس چابی نہیں ہے" نازو نے مجھے چڑانے کے لئے کہا "تمہارے پاس ہے؟"

"چابی نہیں ہے۔ عقل بھی نہیں ہے کیا؟ گولی مار دو" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"کسے گولی ماروں؟" نازو میری بات سمجھ لینے کے باوجود وہیں کھڑی رہی۔

"غالب کو" میں نے ہنس کے کہا اور نیچے پڑے ہوئے شخص کی مشین گن اٹھالی "سمجھ لو کہ یہ دروازہ نہیں غالب ہے۔"

نازو ہنس پڑی۔ اوپر سے غالب نے نہ جانے کس پر ایک راؤنڈ چلایا۔ نازو نے اس کے ساتھ ہی دروازے کا قفل اڑا دیا اور باہر نکل گئی۔ میں مشین گن اٹھا کے اس کمرے میں گھس گیا جس میں دلاور غائب ہوا تھا لیکن وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ غالباً وہ فرار ہو رہے تھے۔ اوپر سے پھر فائرنگ کی آواز آئی۔ ایک اور کار کا انجن غرایا۔ کوئی بری طرح چیخنے لگا۔ ریوالور کے ایک فائر کے ساتھ ہی اس کی آواز بند ہو گئی۔

مشین گن لے کر میں ایک سے دوسرے کمرے میں گیا مگر اب کہیں کوئی نہ تھا۔ جہاں مذاکرات ہو رہے تھے وہاں ملبے کے ایک ڈھیر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پتھر پھینکنے والوں نے مہلت تمام ہوتے ہی اسی راستے سے دستی بم اندر پھینک دیا تھا۔

اوپر سے غالب نے چلا کے کہا "وہ بھاگ گئے۔"

میں نے سر اٹھا کے پیچھے دیکھا تو غالب ایک بالکنی میں کھڑا ہوا تھا "سب بھاگ گئے؟"

"ہاں۔ دو کاروں میں" غالب نے اوپر سے ہی جواب دیا۔

"اور آپ نے کچھ نہیں کیا؟"

"میں نے فائر کئے تھے۔ اگر آواز تمہارے کانوں نے نہیں سنی تو ابھی وقت ہے۔ بڑے کان لگوا لو۔ مثلاً گدھے کے" غالب نے کہا۔

"اگر تمہارا نشانہ خطا ہو گیا تو تم بھی یہ آنکھیں بدلوا لو۔ چمگادڑ کی آنکھیں لگوا لو" میں نے جوابی مشورہ دیا۔

"کاریں بلٹ پروف تھیں" غالب نے مجھے مطلع کیا۔

"بہت خوب۔ اب آپ نیچے تشریف لائیں گے یا میں نازو کو بھیجوں۔ کہ آپ کو منالائے" میں نے کہا۔

نازو نے اس کے پیچھے آ کے کہا "چلو نیچے کودو۔ اسی جگہ سے" اور اسے دھکا دیا۔

"ارے..... کیا کرتی ہو۔ خواہ مخواہ خودکشی کرانا چاہتی ہو میری" غالب نے برہمی سے کہا "تاکہ بعد میں کہتی پھرو کہ غالب نے میری خاطر جان دے دی۔ میرے اشارے پہ۔"

سامنے والے گیٹ کے اوپر سیمن یا شمین میں سے کوئی نمودار ہوا۔ اس کے پورے بتیس دانت نظر آرہے تھے۔

میں نے خوشی سے چلا کے کہا "شاباش۔ تم نے تو کمال کر دیا سیمن۔"

"میں شمین ہوں" وہ اندر کود کے بولا۔

"اچھا... تو پھر سیمن کہاں ہے؟"

دھم سے کوئی میرے سامنے گرا "میں سیمن ہوں۔"

میں نے اوپر دیکھا "کیا تم اس پیڑ سے لٹکے ہوئے تھے؟"

"ہاں۔ ہم نے ہی تو وہ پتھر پھینکا تھا۔ ہم سب دیکھ رہے تھے"

سیمن نے گلے میں پڑی ہوئی دوربین دکھائی۔

"کمال ہے۔ لیکن پتھر وہاں تک پہنچا کیسے؟" میں نے کہا۔

اس نے دوربین کے ان فیتوں کو کھینچا جو اسے گلے یا شانے پر لٹکانے کے کام آتے ہیں۔ فیتے ربڑ کے تھے اور سیمن نے ان فیتوں سے غلیل کا کام لیا تھا۔ اس نے زمین پر سے ایک اور پتھر اٹھا کے غلیل کی عملی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

"مگر سارے بھاگ گئے خفیہ راستے سے" سیمن نے افسوس کے ساتھ سر ہلایا "ایک آدمی زخمی ہوا تھا۔ اسے مار کے لاش چھوڑ گئے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ زمین دوز راستہ ہے۔ وہ دوسری طرف جا نکلے ہوں گے مگر تم نے کیسے پتا چلا لیا ہمارا؟"

"ہم کو محسن بھائی نے ٹریولنگ کی گاڑی دکھا دی تھی۔ کالے رنگ کی لمبی سی گاڑی تھی۔ ہم نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ یہاں آ کے وہ غائب ہو گئی تھی۔ دوبارہ یہاں نظر آئی" سیمن نے کہا "ہم نے آس پاس مورچے سنبھال لئے تھے۔"

"محسن اور گل اب کہاں ہیں؟" نازو نے پوچھا۔

شمین نے کہا "باہر گاڑی میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "چلو تم سب لوگ جاؤ۔ میں اور سیمن بعد میں آئیں گے۔"

"بعد میں کیوں؟" نازو نے کہا۔

غالب نے بھی اعتراض کیا "تم دو کو یہاں چھوڑ کے ہم کیسے جا سکتے ہیں۔"

"کچھ کام ہے؟" میں نے کہا۔

"ایسا کیا خفیہ کام ہے؟ ہمیں بھی تو پتا چلے" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی۔"

نازو احتجاجاً وہیں دھرنا مار کے بیٹھ گئی "یہ بات ہے تو پھر میں بھی تمہاری ہر بات ماننے کی پابند نہیں۔ کرلو جو کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا "بغاوت؟"

"ہاں بغاوت" وہ چلا کے بولی "جب اعتماد ہی نہیں تم کو تو پھر ہم کیوں مانیں تمہیں اپنا لیڈر۔"

میں نے کہا "دیکھو دیر مت کرو۔ فائرنگ کی آوازیں سب نے سنی ہوں گی۔ ایسا نہ ہو کہ پولیس آجائے۔"

نازو اسی بے نیازی سے بیٹھی رہی اور گھاس کا تنکا توڑ کے چباتی رہی "تم بھی بیٹھو۔ تازہ گھاس کھاؤ" اس نے غالب سے کہا اور ہاتھ پکڑ کے اسے زبردستی بٹھا دیا۔

"جس کا ٹیکسی ہے اس نے بولا تھا دیر مت کرنا" شمین پریشان ہو کے بولا۔

"کس کی ٹیکسی لے کر آئے ہو تم؟"

"ایک یار ہے" شمین نے مطلع کیا "گاڑی میں بیٹھا ہے۔"

میں نے غالب اور نازو کو قائل کرنے کے لئے ایک اور دلیل پیش کی "گاڑی میں تین افراد پہلے سے موجود ہیں۔ مزید پانچ کیسے بیٹھ سکتے ہیں؟ بہتر ہے کہ تم تینوں جاؤ۔"

نازو اور غالب بھرے بیٹھے رہے۔ باہر سے کار نے ہارن دیا۔

میں نے ہنس کے کہا "یار یہ کیا بچوں والی حرکت ہے! میں سیمن کے ساتھ اس زمین دوز راستے سے جاؤں گا اور دوسری کوٹھی کے راستے باہر آجاؤں گا۔ بس اتنا سا کام ہے۔"

"اور اگر آپ درمیان میں ہی کہیں اٹک گئے؟ سرنگ سے ہی نہ نکل سکے۔ یا سرنگ سے نکلنے کے بعد دھر لئے گئے پھر؟ وہ سب اسی راستے سے گئے ہیں۔ سرنگ کے دوسرے کنارے پر ان کی ساری فوج موجود ہوگی" غالب نے کہا۔

"اگر میں کوئی خطرہ دیکھوں گا تو واپس آجاؤں گا" میں نے وعدہ کیا۔

"آخر ضرورت کیا ہے یہ پنگا لینے کی؟"

"میں ذرا نقشہ سمجھنا چاہتا ہوں۔ یہ اندازہ کرنا چاہتا ہوں کہ کیا شملا دوسری کوٹھی میں ہو سکتی ہے۔ جہاں سے ہم داخل ہو کے زمین دوز راستے میں اترے تھے اور یہاں آنکلے تھے۔"

"یہ پتا چلانا آسان نہیں ہوگا سکندر" غالب نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں دور سے اندازہ کروں گا۔"

"کیا دیواروں کا ایکسرے کرو گے؟" نازو نے کہا "یا کسی چھٹی حس سے کام لو گے؟"

"خدا کے لئے بحث مت کرو۔ میں نے وعدہ کیا ہے نا کہ کوئی خطرہ مول نہیں لوں گا۔ تم لوگ جاؤ۔ پلیز نازو! وہ لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ سیمن میرے ساتھ ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں" میں نے بے بسی سے کہا "اب تم کیا چاہتی ہو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑوں۔"

نازو اٹھ کھڑی ہوئی "ہاتھ نہ جوڑو یار۔ میں کسی ڈرامے بازی سے متاثر نہیں ہوتی۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"کیا..... میرے ساتھ؟"

"ہاں۔ یہ چار آدمی ایک گاڑی میں جائیں۔ ہم چار بعد میں دوسری گاڑی پکڑ لیں گے" نازو نے کہا۔

"دیکھو! جب ضرورت ہوتی ہے تو میں خود تمہیں ساتھ رکھنے کو ترجیح دیتا ہوں لیکن ابھی کوئی ضرورت نہیں ہے تمہاری۔ میں صرف راستہ دیکھنے جا رہا ہوں۔ راستہ صاف نہ ملا تو واپس۔ میرا ارادہ کسی سے لڑنے بھڑنے کا یا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا راستہ بنانے کا ہرگز نہیں ہے۔ ایسی ویسی کوئی بات ہوئی تو میں الٹے قدم واپس....."

"بشرطیکہ اتنی دیر میں واپسی کے راستے بھی بند نہ ہو گئے۔"

www.paksociety.com

نازو نے غصے سے کہا۔

باہر سے کار کا ہارن مسلسل کئی بار سنائی دیا۔ پھر محسن کا چہرہ گیٹ پر نمودار ہوا۔

"غالب کے بچے! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

غالب نے کہا "دیکھو گھاس کتنی عمدہ ہے۔ پھول کتنے اچھے ہیں۔ آؤ تم بھی گھاس کھاؤ۔"

محسن نے کہا "یار ن! گلا بیٹھ گیا چلاتے چلاتے۔"

میں نے کہا۔ "غالباً کچھ سننے کو تیار نہیں۔"

"کون کچھ سننے کو تیار نہیں؟"

"غالب کی غالبا" میں نے کہا "غالب کیا کرے؟"

غالب نے کہا "میرے نام پر مت جاؤ۔ در حقیقت میں مغلوب ہوں۔"

"تف ہے تجھ پر۔ تو نے مردوں کا نام بدنام کر دیا ہے۔ میں ہوتا تو ایک ہاتھ مارتا ایسا کہ سیدھی ہو جاتی" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "غالب ایک چیز بھی سیدھی نہیں ہوتی" خواہ اسے بارہ برس نلکی میں ڈال کے رکھو۔"

نازو غصے میں اٹھی اور دروازے کی طرف چل پڑی "تم خود کتے کی دم۔ تمہیں سنتے میری تو بھاڑ میں جاؤ" وہ بولی۔ غالب اس کے پیچھے دوڑا۔

میں نے ہنستے ہوئے اطمینان کا سانس لیا اور سیمین کے ساتھ زمین دوز راستے کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں سے یہ راستہ شروع ہوتا تھا وہیں ایک شخص الٹا پڑا ہوا تھا۔ یہ شخص غالب کی فائرنگ سے مجروح ہوا تھا۔ جاتے جاتے وہی اس کو مار گئے تھے جن کا وہ نمک خوار تھا۔ اس کی اکڑی ہوئی لاش کو پلٹ کر میں نے جیبوں کی تلاشی لی لیکن مجھے کچھ بھی نہ ملا۔

زیرِ زمین راستے کا نشیب آہستہ آہستہ بڑھتا تھا۔ یہ سیمنٹ کا بنا ہوا پختہ راستہ سطح زمین سے تقریباً چھ فٹ نیچے تھا اور اس کی چوڑائی اتنی ہی تھی کہ اس میں سے ایک کار گزر جائے۔ دن کا اجالا اس کے دہانے سے حصے کو روشن کرتا تھا۔ آگے گھپ اندھیرا تھا۔ ایک لمحے کے لئے [illegible] سرنگ درمیان میں سے بند نہ ہو۔ کسی مشینی نظام سے آہنی دروازے کو بجلی کے تار یا بارودی سرنگیں لگا کے اسے دامِ اجل نہ بنا دیا گیا ہو۔ یہ نہ ہو کہ اندھیرے میں ہم کسی گڑھے کو نہ دیکھ پائیں یا کوئی ہم پر اچانک حملہ کر دے۔ میں نے سوچا کہ شاید نازو ٹھیک ہی کہتی تھی۔ مجھے واپس لوٹ جانا چاہئے لیکن واپسی کا مطلب سیمین کے سامنے اپنے خوف کا اعتراف کرنا تھا۔ مجھے شکست تسلیم کرتے ہوئے شرم آئی اور میں خدا کا نام لے کر آگے بڑھنے لگا۔

میں نے اندھیرے میں راستہ تلاش کرنے اور محفوظ رہنے کے لئے پیش قدمی کا وہی طریقہ اختیار کیا جو نابینا کرتے ہیں۔ میں اپنے ہاتھ آگے پھیلا کے اور مشین گن سے فرش کو محسوس کرتے ہوئے چلا گیا۔ اس احتیاط نے مجھے بھی بچا لیا اور سیمین کو بھی۔ فرش میں تین جگہ گہرے غار تھے۔ جیسے کھلے ہوئے گٹر۔ معلوم نہیں میں کسی مین ہول میں گر جاتا تو میرا کیا حشر ہوتا اور میں کتنی گہرائی میں جا کے گرتا۔ کار کی ہیڈ لائٹس میں یہ کھلے ہوئے مین ہول صاف نظر آ جاتے ہوں گے تو کار کے پہیے ان کے دونوں جانب سے گزر جاتے ہوں گے۔

یہ راستہ تقریباً سو فٹ لمبا تھا جو ہم نے دس پندرہ منٹ میں طے کیا۔ پھر ایک موڑ آیا۔ روشنی اس کے دوسرے کنارے سے آ رہی تھی مگر مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ باہر نکلنے کا راستہ مضبوط فولادی سلاخوں والے دروازے نے بند کر دیا ہے۔ آہنی سلاخوں میں کرنٹ بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے سیمین کا مشورہ قبول کرتے ہوئے واپسی اختیار کی۔ پندرہ منٹ بعد ہم باہر نکلے اور گیٹ سے گزر کے سڑک پر آ گئے۔ سیمین نے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو روک لیا "امام چال بار" اس نے کہا اور اپنے ساتھ مجھے بھی اندر گھسیٹ لیا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے غصے سے پلٹ کر دیکھا "دکھتا نہیں یہ ڈاؤن ہے۔ اپنا ٹیکسی بند کرنے کا ٹائم ہے۔"

اچانک اس نے مجھے دیکھا اور اس کی نظر میرے چہرے پر جم گئی "میں نے تم کو دیکھا ہے۔ پر کدھر؟"

میں سمجھ گیا کہ اس نے مجھے نہیں میری تصویر کو دیکھا ہو گا۔ ٹالنے کے لئے میں نے کہا "کسی فلم میں دیکھا ہو گا۔"

"فلم میں؟" وہ کنفیوز ہونے لگا۔

"ہاں۔ میں نے بہت سی فلموں میں سائیڈ رول کئے ہیں۔"

"ایک دم بنڈل" اس نے چٹکی بجا کے کہا "تیرا فوٹو تھا اخبار میں۔ اکھا بمبئی کے انگریزی گجراتی اخبار میں۔"

میں نے ریوالور نکال کر کہا "بالکل ٹھیک۔ میری گرفتاری کا انعام بھی ہے لیکن آج تک کوئی لے نہیں سکا۔ تم بھی کوشش مت کرنا ورنہ تیرے ہاتھ اور چھٹی دودھ ہو جائے گی۔"

حیرت انگیز ہمت اور پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے میرے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا اور میری کلائی کو جھٹکا دے کر چیخ مارا "سالا دودھوا کی اولاد....."

ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ٹیکسی ڈرائیور کے پیروں کے قریب گرا۔ خلافِ توقع وہ ایک قوی دشمن ثابت ہوا تھا۔ اگر ریوالور اس کے ہاتھ میں آ جاتا تو شاید وہ بلا جھجک مجھے گولی مار دیتا۔

میں نے جوڈو میں اپنی پیشہ ورانہ مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کی گردن کو بازو کے شکنجے میں کس لیا اور اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس نے مزاحمت کرتے ہوئے دونوں ہاتھ گھمائے۔ ایک ہاتھ سیمین کے منہ پر لگا۔ وہ پاگل کی طرح چلائی۔ ڈرائیور کی لات دروازے پر لگی۔ دروازہ کھل گیا۔ پیچھے سے آنے والا ایک تیز رفتار سائیکل والا کھلے دروازے سے ٹکرا کے سڑک پر لیٹ گیا۔

سائیکل اس کے اوپر گری۔

میرے اور ڈرائیور کے درمیان سیٹ حائل تھی۔ آگے والی دونوں سیٹوں کی بیک اونچی تھی اور درمیانی جگہ سے ڈرائیور کو کھینچ کر پیچھے لانے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ دونوں اگلی سیٹوں کے درمیان بری طرح پھنس گیا تھا۔ اس کے سر کو میں نے گردن دبوچ کے قابو میں کر لیا تھا لیکن اس کی اوپر اٹھی ہوئی ٹانگیں دھم دھم چھت پر بج رہی تھیں۔

سائیکل سوار کے گرتے ہی راہگیر اور لوگ بھی آ گئے تھے اور ٹیکسی کے اندر ہونے والی جنگ کو بند کروانے کے لئے کوشاں تھے۔ کچھ لوگ شور مچا رہے تھے "ارے ارے چھوڑو۔ کیوں دشمن ہو رہے ہو ایک دوسرے کی جان کے۔ اے بھائی صاحب! آپ ہی مان جائیں۔ ڈرائیور! ارے بھائی بند کرو مار پیٹ۔ آخر ہوا کیا ہے؟"

میں ڈرائیور کو کھینچ کر ناک آؤٹ کرنا چاہتا تھا اور اس کوشش میں ڈرائیور کی لات ایک کے منہ پر لگ چکی تھی اور دوسرے کے پیٹ میں۔ صورتِ حال میرے لئے خطرناک ہو گئی تھی۔ میں ڈرائیور کو چھوڑتا تو وہ چلا چلا کے سب کو بتا دیتا کہ میں کون ہوں اور میں اسے مار ڈالتا تو لوگ مجھے جانے نہ دیتے۔ اس کے علاوہ مجمع بڑھتا جا رہا تھا اور پولیس کسی بھی وقت نمودار ہو سکتی تھی۔

اس وقت سیمین نے بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ وہ ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اترا اور آگے جا کے اس نے بڑی ہوشیاری سے ریوالور کے اوپر ایک کپڑا ڈال دیا۔ پھر اس نے دونوں ٹانگیں پکڑ کے ڈرائیور کو سیٹ کے اوپر سے گزار دیا اور پوری طرح میری تحویل میں دے دیا۔

"اس بدمعاش نے ہمیں لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ یہ دیکھیں" سیمین نے کہا "اس ریوالور سے۔"

اس نے کپڑا ہٹا کے ان سب کو ریوالور کا دیدار کرایا جو ٹیکسی کے اندر اپنا سر ڈال چکے تھے۔

"چھونا مت۔ اس پر انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ ہم اس کو تھانے لے جا رہے ہیں۔"

میں نے اتنی دیر میں ایک ہاتھ مار کر ڈرائیور کو بے سدھ کر دیا تھا۔ وہ بڑا سخت جان حریف ثابت ہوا تھا اور اسے پوری طرح زیر کرنے کی جدوجہد میں میرا سانس پھول گیا تھا۔ سیمین نے فوراً ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔

"کوئی گواہ ساتھ چلے گا؟" اس نے کہا۔

ایک دم سارے خدائی فوجدار اور صلح صفائی کرانے والے رفوچکر ہو گئے۔ سرِ راہ کسی بھی معاملے میں دخل در معقولات کی عادت عام بات ہے لیکن تھانے جا کے عملاً قانون کی مدد کرنے اور گواہی میں ملوث ہونے سے وہ بھی گریز کرتے ہیں جو قانونی ذمے داریوں کے موضوع پر کالم لکھتے ہیں اور عوام کو بھاشن دیتے پھرتے ہیں کہ معاشرے سے جرائم کی بیخ کنی کے لئے قانون سے تعاون کرنا کتنا ضروری ہے۔ دراصل کالم لکھنے یا تقریر کرنے کے پیسے ملتے ہیں اور مفت میں گواہی دینے کا انجام خواری کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

سیمین نے ٹیکسی چلا دی تھی کہ موٹر سائیکل پر ایک پولیس کا سب انسپکٹر نمودار ہو گیا۔ ٹیکسی کے مجمع سے نکلتے ہی اس نے بھی موٹر سائیکل قریب لا کے سیمین سے کہا "گاڑی روکو ایک سائیڈ میں۔"

سیمین نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی "بات کیا ہے تھانے دار جی....."

"بات کے بچے۔ بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا" سب انسپکٹر نے مشتعل ہو کے کہا "ٹیکسی لے کر فرار ہو رہا ہے....."

سیمین نے پھر رفتار کم کی "ٹیکسی میری ہے۔"

"بکواس مت کر۔ وردی اور بیج کیوں نہیں ہیں؟ کاغذات ہیں تیرے پاس؟" سب انسپکٹر نے کہا "مجھے معلوم ہے ڈرائیور پیچھے پڑا ہے۔"

"ہم اسے تھانے ہی لے جا رہے ہیں....." میں نے کہا "اس نے ہمیں لوٹنے کی کوشش کی تھی۔"

"بکو مت۔ تھانہ تو گزر گیا۔ آگے تمہارے باپ کا تھانہ ہے کوئی....." اس نے مجھے گالی دے کر کہا۔

سیمین نے اسے جوابی گالی سے نواز کر کہا "اچھا تو پھر تو بھی آ جا ہمارے ساتھ" اور ٹیکسی کا ایکسیلیٹر دبا دیا۔ ٹیکسی کا انجن غرایا اور رفتار کی سوئی ساٹھ سے ستر اور پھر اسی نوے تک پہنچ گئی مگر موٹر سائیکل نے چند منٹ میں آ لیا۔

میں نے سیمین سے کہا "ہم اس کی موٹر سائیکل سے بچ نہیں سکیں گے۔ بہتر ہے کہ اس سے نمٹ لیا جائے۔"

"آپ دیکھتے جائیں سر" سیمین نے کہا۔

سب انسپکٹر نے کہا "میں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔"

ادھر اس کا ہاتھ ریوالور نکالنے کے لئے جیب کی طرف بڑھا ادھر سیمین نے اسٹیرنگ گھما دیا۔ ٹیکسی مڑ کے دائیں طرف گئی اور اس کی سائیڈ موٹر سائیکل سے ٹکرائی۔ دو پہیوں والی کسی بھی سواری کا توازن بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ موٹر سائیکل اس تصادم کی تاب نہ لا سکی اور سڑک پر گر گئی۔

میں نے موٹر سائیکل کے ساتھ سب انسپکٹر کو بھی کچھ دور سڑک پر پھسلتا دیکھا۔ سیمین نے اسے ایک ساتھ ولدیت کو غلط کرنے والی دو گالیاں دیں اور ٹیکسی کو یوٹرن دے کر واپس جانے والی سڑک پر موڑ لیا۔ یہ ایک غیر قانونی اور خطرناک حرکت تھی۔ دوسری طرف سے ٹریفک بہت تیز آ رہی تھی اور سڑک کو تقسیم کرنے والی گرین بیلٹ میں یہ کٹ اچانک ہی آ گیا تھا۔ سیمین کو سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ یہ کٹ نکل جاتا تو شاید اسے ایک

www.paksociety.com

میل آگے چوک تک جانا پڑتا۔ ٹیکسی اچھلتے اچھلتے بچی اور کئی گاڑیاں بریک لگا کے یا لہرا کے ٹیکسی سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گئیں۔ ان کے ڈرائیوروں نے سیمن کو روبیت قافیے سے آزاد گالیاں سنائیں مگر سیمن گالیاں کھا کے بے مزہ تک نہیں ہوا۔ اس نے اپنی بالکل اور بے اندازہ ... ڈرائیونگ جاری رکھی اور سارے قواعد و ضوابط کی ایسی تیسی کر دیا۔ ایک جگہ اس نے ون وے ٹریفک کے خلاف ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کیا پھر شارٹ کٹ لینے کے لئے راؤنڈ اباؤٹ کا چکر کاٹے بغیر دائیں جانب مڑ گیا اور ایک چوک سے لال بتی کی پروا کئے بغیر گزر گیا۔ اسے اس کی خوش قسمتی ہی کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی ٹریفک پولیس نے اس کا راستہ نہیں روکا۔

پندرہ منٹ کے بعد اس نے اعلان کیا "اب کوئی خطرے کی بات نہیں رہی۔"

میں نے اطمینان اور سکون کا سانس لے کر کہا "تم نے تو بہت کوشش کی خودکشی کرنے کی۔ اور اپنے ساتھ مجھے مروانے کی۔ لیکن میری کوئی نیکی کام آ گئی۔"

"ابھی میرا تمہارا ٹائم پورا نہیں ہوا تھا دنیا میں۔ ٹائم پورا ہو جائے تو کوئی بھاگ کے کہاں جا سکتا ہے" مسٹر سیمن نے کسی فلسفی کی طرح کہا "جہاں جائے گا موت پہلے سے وہاں موجود ہوگی۔"

"یہ بتاؤ کہ اب ہم ماماجی کے گھر سے کتنا دور ہیں؟"

"پہلے سے زیادہ سر" وہ بولا۔

میں نے کہا "پھر اس ٹیکسی کو چھوڑ دو کہیں۔"

اس نے ایک دم بریک لگا کے ٹیکسی کو سائیڈ میں روک لیا۔ "میں بھی یہی سوچ رہا تھا سر۔ یہ دیکھیں۔" اس نے نوٹوں کی ایک گڈی لہرائی۔

میں بھونچکا رہ گیا "یہ اتنے سارے نوٹ....."

سیمن نے کہا۔ "یہ پورے دس ہزار ہیں۔ اور ایسی چار گڈیاں ابھی اندر پڑی ہیں۔" اس نے گلوز کمپارٹمنٹ کھول کر دکھایا۔

"پچاس ہزار!" میں نے حیرانی سے کہا "ایک ٹیکسی ڈرائیور کے پاس اتنی دولت کہاں سے آ گئی۔"

"اور سر! یہ بھی دیکھئے کہ اس نے کتنی بے پروائی سے اس کو کہاں ڈال رکھا تھا" سیمن بولا "اس کی جگہ میں ہوتا تو سیٹ کے نیچے چھپاتا یا ڈگی میں دبا کے رکھتا۔"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے یہ رقم کسی کی امانت ہو۔ یہ کسی کو پہنچانے جا رہا ہو۔ کیا پتا اس نے اپنا گھر یا بیوی کا زیور بیچا ہو۔ بیٹی کی شادی کرنے کے لئے۔"

سیمن نے نفی میں سر ہلایا "سر! آپ جذباتی ہو رہے ہیں۔ یہ ایسا شریف آدمی نہیں تھا۔ بدمعاش تھا۔"

"اس لئے کہ اپنا دفاع کرنے کے لئے اس نے ہمارا مقابلہ کیا

تھا" میں نے کہا۔

"نہیں سر۔ یہ بھی دیکھئے" اس نے سیٹ کے نیچے سے ایک ریوالور نکال لیا۔

میں نے کہا "کمال ہے! اتنی جلدی تم نے تلاشی بھی لے ڈالی۔"

"مجھے رقم دیکھ کر شک ہوا تھا سر" وہ بولا "تلاشی ابھی کہاں لی ہے۔ یہ تو ایسے ہی سیٹ کے نیچے ہاتھ مارنے سے مل گیا۔ کیا معلوم ڈگی میں سے کیا نکلے گا۔"

میں نے ڈرائیور کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ڈرائیونگ لائسنس پر اس کا نام دھرمیندر ولد کاشی ناتھ لکھا ہوا تھا لیکن اس کے پتے کی جگہ "معرفت جیون پرشاد ایم پی اے" لکھا ہوا تھا۔ وہ ... پر رہتا تھا۔ یہ پتا از خود خبردار کر رہا تھا کہ اسے ... نام ٹیکسی ڈرائیور نہ سمجھے۔ وہ ایک ایم پی اے کا آدمی ہے ... کی ایک جیب میں سے جو نوٹ بک برآمد ہوئی اس میں ... صوبائی اور مرکزی اسمبلی کے ارکان کے تھے۔ باقی نام میرے لئے اجنبی تھے مگر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ سب صاحبان اختیار و اقتدار کے حوالے سے تھے۔

انہی بااثر لوگوں کی فہرست میں تریویدی کا نام دیکھ کر میں چونکا۔ اس کا پتا اور فون نمبر سب ٹھیک تھے۔ میں نے اس نوٹ بک کو جیب میں رکھ لیا۔ اندر کی جیب سے نکلنے والے پرس میں دو ہزار سو روپے تھے اور ایک لفافہ تھا جسے تہہ کر کے بڑی احتیاط سے رکھا گیا تھا۔ میں نے لفافہ نکال کے روشنی کے رخ پر دیکھا تو مجھے بائیں جانب نیچے والے کونے میں جیون پرشاد کا نام نظر آیا جو ... سرخ رنگ کے ابھرے ہوئے حروف میں بہت نمایاں تھا۔

لفافے کے اندر سے جو خط نکلا وہ بھی جیون پرشاد ایم پی اے کے لیٹر ہیڈ پر لکھا گیا تھا۔ اس پر نام اور پتا دائیں جانب تھے اور بائیں کونے پر مرکزی اسمبلی کا مونوگرام تھا۔ لیٹر ہیڈ کا اور لفافے کا ایک ہی کاغذ تھا جو بہت قیمتی تھا۔

خط انگریزی میں تحریر کیا گیا تھا اور اس پر کوئی تاریخ نہیں تھی مگر خط اور لفافے کی حالت سے ظاہر ہوتا تھا کہ ... زیادہ پرانا نہیں۔ لفافہ اور خط اگر چند دن اسی طرح جیب میں رہتے تو آلودہ ہو جاتے اور میلے نظر آتے۔

خط میں لکھا تھا۔

ڈیئر مسٹر تریویدی۔

تمہارا کام ہو گیا ہے۔ اس کے لئے مجھے ریلوے کے منسٹر صاحب کے پی اے سے فون کروانا پڑا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ریلوے پر کتنا بوجھ ہے اور اتنے کم وقت میں کوئی کام کرانے کے لئے صرف سفارش ہی کافی نہیں ہوتی۔ اوپر والے تو مان گئے تھے مگر نیچے والے ٹالنے کے ماہر ہیں اور جب تک ان کے منہ میں ... نہ ڈالی جائے یہ راستہ نہیں دیتے۔ راستہ بنانے کے لئے جو

خرچ کرنا پڑا اس کی وصولی میں آپ سے لوں گا۔ آپ کی طرف سے تو ایک لاکھ تک خرچ کرنے کا اختیار حاصل تھا مگر میں مال مفت دل بے رحم کا قائل نہیں ہوں۔ آپ کے پچاس ہزار بچ گئے۔ ریلوے کے کمرشل کارگو آفیسر نے "فوری ضرورت" کے حوالے سے خواجہ سیمنٹ والوں سے وہ بوگیاں لے لی ہیں۔ یہ تو دیکھنا پڑتا ہے کہ پارٹی ... ہے اور مال کیا ہے ورنہ عین وقت پر کسی کی بکنگ منسوخ کرنے میں خطرہ رہتا ہے کہ وہ اپیل نہ کر دے۔ اخبار میں اشتہار یا خبر لگوا دے یا مشتعل ہو کر شور مچا دے۔ خیر اب آپ فکر نہ کریں۔ میں نے سارے کام خوش اسلوبی سے طے کروا دیے ہیں۔

یہ خط لانے والا دھرمیندر میرا خاص آدمی ہے۔ اس کو پچاس ہزار نقد دے دیں۔ چیک نہیں چلے گا۔ ہم تو ہمیشہ خدمت کے لئے تیار ہیں۔

میں نے خط کو دوبارہ پڑھا اور سوچ میں پڑ گیا۔ تریویدی نے کسی ایم پی اے کی معرفت ریلوے پر دباؤ ڈال کے فوری ضرورت کے لئے مال گاڑی کی دو بوگیاں حاصل کر لی تھیں اور یہ پچاس ہزار اسی "خدمت" کا معاوضہ تھا۔ دھرمیندر یہ رقم تریویدی سے لے کر آ رہا تھا اور جیون پرشاد ایم پی اے کو پہنچانے جا رہا تھا کہ ہم نے اس کا راستہ کاٹ دیا۔ اس کا برا ہم ہونا برحق تھا۔

خط سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ بوگیاں کس تاریخ کے لئے حاصل کی گئی ہیں لیکن اس میں "اتنے کم وقت" کا حوالہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ تریویدی نے دو تین دن کے اندر کسی گڈز ٹرین پر جگہ مانگی ہوگی۔ عام طور پر ریلوے کی بکنگ چند ماہ ایڈوانس میں چلتی ہے اور پھر بھی جگہ اسے ہی ملتی ہے جو زیادہ ضرورت مند ہو اور اپنی ضرورت کے مطابق زیادہ نذرانہ پیش کر دے۔ انڈے، پھل اور مچھلی جیسے ضائع ہونے والے مال کی ترسیل میں چوبیس گھنٹے کی تاخیر بھی کاروباری آدمی کو تباہ کر دیتی ہے۔ تاہم سیمنٹ ایسی چیز نہیں تھی جسے روکنے سے زیادہ نقصان کا احتمال ہو۔ معلوم نہیں خواجہ سیمنٹ والوں پر یہ نزلہ کیوں گرا مگر جیسا کہ مشہور ہے نزلہ بر عضو ضعیف۔ شاید وہی سب سے کمزور تھے یا متعصب ہندو انتظامیہ کے نزدیک کسی مسلمان کے کاروبار کو نقصان پہنچانا کار ثواب تھا اور حب الوطنی تھی۔ خواجہ سیمنٹ کے نام سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے مالک مسلمان ہوں گے۔

اس خط نے میرے رگ و پے میں جوش و خروش کی سنسنی پھیلا دی تھی۔ اب یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ تریویدی نے کس دن کے لئے بکنگ حاصل کی ہے۔ بوگی نمبر وغیرہ سب کا خواجہ سیمنٹ کی بوگیاں منسوخ کرنے والوں سے یا خود خواجہ سیمنٹ والوں سے پتا چل سکتا تھا۔

میں نے پہلے سوچا کہ اس خط کو غائب کر دوں۔ رقم بھی مار لوں تاکہ بالواسطہ طور پر ہم جیون پرشاد کو بھی اپنے شکنجے میں کس لیں۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ٹیکسی ڈرائیور کو جان سے مار دوں اور اس

خط کی فوٹو اسٹیٹ کاپی پولیس کے اعلیٰ حکام سے اخبارات تک سب کو بھیج دوں۔ جیون پرشاد تو سیاست داں تھا۔ آئندہ انتخابات تک اس کی پوزیشن محفوظ تھی اور خراب ہو جاتی تب بھی عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے اس کے پاس بہت وقت تھا اور اس کے شاطر ذہن میں ان گنت چالیں تھیں لیکن تریویدی نہیں بچ سکتا تھا۔ دھرمیندر کے قتل کا اس پر براہ راست الزام آ جاتا۔ پولیس اسے قتل عمد کے جرم میں گرفتار کرتی تو چالان میں یہ لکھا جاتا کہ اس نے پہلے جیون پرشاد کے ذریعے بوگیاں حاصل کر لیں اور ایک لاکھ دینے کا وعدہ بھی کیا مگر کام ہو جانے کے بعد اس نے پچاس ہزار بھی بچانے کی کوشش کی۔ اس نے دھرمیندر کو راستے میں مروا دیا اور رقم اس کے آدمی واپس لے گئے۔ جیون پرشاد کو اس نے اطلاع دے دی ہوگی کہ میں نے تمہارے آدمی کو رقم دے دی ہے اور وہ رقم لے کر روانہ ہو چکا ہے۔

اس کیس میں تریویدی کو سزا ہوتی یا نہ ہوتی اس کا فیصلہ برسوں بعد عدالت عالیہ میں ہوتا تھا۔ اپنی دولت کے بل پر وہ بہترین وکیل کر سکتا تھا اور ہر قسم کے جھوٹے شاہد لا سکتا تھا جو اسے بے قصور ثابت کر دیں چنانچہ خط اور رقم لے جانے کا کوئی فوری فائدہ نہیں تھا۔

"آپ کس سوچ میں پڑ گئے سر؟" سیمن نے کہا۔

میں نے کہا "مسٹر سیمن۔ جو چیز جہاں تھی وہیں رکھ دو۔ بالکل اسی حالت میں۔ اس طرح کہ ہوش آنے پر اسے شک بھی نہ ہو کہ ہم نے کسی چیز کو دیکھا ہے یا چھیڑا ہے۔"

سیمن نے مایوسی سے کہا "یہ پچاس ہزار....."

میں نے کہا "ان کو بھی واپس گلوز کمپارٹمنٹ میں رکھ دو۔ ریوالور کو اچھی طرح کپڑے سے صاف کرو تاکہ اس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات باقی نہ رہیں۔ جس چیز کو بھی تم نے چھوا ہے اسے صاف کر دو۔ میرا ریوالور مجھے دے دو۔ جلدی کرو۔ ڈرائیور ہوش میں آنے والا ہے۔"

میں نے نوٹ بک اپنی جیب سے نکال کے واپس ڈرائیور کی جیب میں رکھی۔ خط کو اسی طرح پرس میں ڈالا اور پرس کو اندر کی جیب میں رکھ دیا۔ ہر طرح سے مطمئن ہو جانے کے بعد میں نے چند منٹ انتظار کیا کہ دھرمیندر ہوش میں آ جائے۔ میں یہ رسک نہیں لینا چاہتا تھا کہ خالی ٹیکسی میں اسے بے ہوش پڑا دیکھ کر کوئی راہ گیر یا پولیس والا مال پر ہاتھ صاف کر جائے اور ہمارا بنا بنایا کام خراب کر دے۔ تریویدی کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ اس کا راز اب راز نہیں رہا۔ اگر ہم پچاس ہزار لے جاتے تو وہ سمجھتا کہ ہم نے خط بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ لیکن ہم کسی بھی چیز کو چھوئے بغیر نکل گئے تو اس کے دل کو تھوڑا سا اطمینان حاصل رہے گا کہ ہم افراتفری میں فرار ہو گئے تھے کیوں کہ پولیس ہمارے پیچھے لگ گئی تھی۔ ہم ایک سب انسپکٹر کو ہلاک کرنے کے بعد اپنی جان بچانے کی فکر میں تھے

www.paksociety.com

چناں چہ ٹیکسی کو سڑک کے کنارے چھوڑ کر بھاگ جانے کے سوا ہمارے ذہن میں کوئی خیال ہی نہیں آیا۔ بعد میں جب ٹیکسی ڈرائیور جاگے گا کہ ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی تو اس کو ریلوے کی بکنگ کینسل کرانے کا خیال نہیں آئے گا۔ محض شک کی بنا پر وہ اتنا بڑا قدم نہیں اٹھائے گا۔ اتنی مشکل سے بوگیاں حاصل کرنے کے بعد اپنا پیسہ اور جیون پرشاد کی کوشش کے رائیگاں جانے کا احساس اسے روک لے گا۔ وہ یہ سوچنے پر بھی مجبور ہوگا کہ کینسل کرانے کے بعد دوبارہ بوگیاں نہ جانے کب ملیں گی اور کس کی وساطت سے۔ اگر وہ مطمئن رہا تو ایسا قدم ہرگز نہیں اٹھائے گا۔

ڈرائیور نے ہوش میں آنے کے بعد آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا۔ سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر بیٹھتا یا شور مچاتا، میں نے سیمین کو اشارہ کیا اور ہم ٹیکسی سے نکل بھاگے۔

ہمارے بھاگنے کا انداز بالکل چوروں جیسا تھا۔ میں دھرمیندر کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ ہر مجرم کی طرح ہم بھی خوف زدہ ہیں۔ وہ تقریباً پون گھنٹا بے ہوش رہا تھا اور میں نے اس کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو آدھا گھنٹا پیچھے کر دیا تھا۔ اگر اس کے ذہن میں وقت کا حساب آیا تو وہ سمجھے گا کہ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان صرف پندرہ منٹ حائل رہے۔ وہ اندازہ کرے گا کہ جہاں اس کی ہم سے ملاقات ہوئی تھی اس جگہ سے یہ جگہ کتنے فاصلے پر ہے جہاں اب ٹیکسی موجود ہے۔ تو یہی سمجھے گا کہ ہم ٹیکسی کو مسلسل دوڑاتے رہے اور جیسے ہی ہمیں احساس ہوا کہ ڈرائیور کو ہوش آنے والا ہے ہم ٹیکسی چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

مجھے دھرمیندر سے یہ اندیشہ بہرحال نہیں تھا کہ ہوش میں آتے ہی وہ ٹیکسی لے کر ہمارے تعاقب میں دوڑے گا۔ کسی بھی شخص کو بے ہوشی سے ہوش میں آنے کے بعد پوری طرح مستعد ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک کی بات نہیں تھی کہ پھر اس کا فطری ردعمل کیا ہوگا۔ وہ سب سے پہلے یہ دیکھے گا کہ اس کی دولت محفوظ ہے یا نہیں۔ وہ اپنے ریوالور کو چیک کرے گا اور آخر میں چیزوں کو سب کچھ اپنی جگہ موجود پا کے وہ خدا کا شکر ادا کرے گا کہ جان بچی اور مال بھی نہیں گیا ورنہ ہمارا کیا تھا' اسے قتل کر کے کہیں بھی چھوڑ جاتے اور مال غنیمت پر قبضہ کر لیتے۔ وہ سمجھے گا کہ ہم صرف اس کے انکار پر مشتعل ہوئے تھے۔ ہمارا مقصد اسے مارنا یا لوٹنا ہرگز نہیں تھا۔ چناں چہ اس بات کا بھی قوی امکان تھا کہ وہ اس حادثے یا ہم سے ملاقات کا کسی سے ذکر ہی نہ کرے۔

ایک فرلانگ کی ریس سیمین نے جیت لی۔ اس کے دوڑنے کا انداز ضرور مضحکہ خیز تھا لیکن اس کے پیر مشین کی طرح حرکت کرتے تھے اور یہ مشین بہت تیز چلتی تھی۔ کچھ لوگوں نے اس منظر کو خاصی دلچسپی سے دیکھا کہ ساڑھے چار فٹ کے بونے کے پیچھے ایک چھ فٹ کا آدمی بھاگتا جا رہا ہے مگر اسے پکڑ نہیں پا رہا ہے۔

کسی نے بھی ہم سے نہیں پوچھا کہ معاملہ کیا ہے۔ کوئی گڑبڑ ہوتی تو میں اس کے پیچھے خاموشی سے کیوں بھاگتا۔ میں پکڑو پکڑو کا شور مچاتا تاکہ آگے والے سیمین کو پکڑ لیں لیکن ایک شخص ضرورت سے زیادہ مستعد ثابت ہوا۔ وہ سیمین سے لپٹ گیا۔

"سالا پاکٹ مار۔ بھاگ کے کدھر جائیں گا۔"

میرا دل بیٹھ گیا۔ میں یہ سمجھا کہ پکڑنے والا بھی سیمین کی فنکارانہ صلاحیت کا شکار ہوا ہوگا اور واردات کے بعد سیمین کو پکڑنے میں ناکام رہا ہوگا لیکن آج اس نے پھر سیمین کو پہچان لیا ہے۔

میں نے کہا "ارے بھائی صاحب! کیا بات ہے؟"

اس نے سیمین کو قابو میں رکھنے کے لئے کشتی لڑتے ہوئے کہا۔ "ابی آپ ہم سے پوچھتے ہو کہ کیا بات ہے....."

"اور کس سے پوچھوں؟ تم نے ہی تو پکڑ رکھا ہے اسے....." میں نے خفگی سے کہا۔

اس نے سیمین کو چھوڑ دیا "کیا یہ تمہارا پاکٹ مار کے نہیں بھاگا تھا؟" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

سیمین نے اس کی اور اس کے والد صاحب کی شان میں ایک مرصع قصیدہ پڑھا "ابے تو خود شکل سے پاکٹ مار لگتا ہے سالے چور کی اولاد....."

میں نے کہا "جاؤ یار۔ ایسے ہی ٹانگ مت اڑایا کرو بلاوجہ ہر معاملے میں۔ کسی روز ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔"

وہ سٹپٹا کے احمقوں کی طرح ان لوگوں سے مخاطب ہو گیا جو اس پر ہنس رہے تھے "یار کیسا لفڑا ہے سالا۔ ابھی اپن کیا تفتیش کیا۔ آئندہ میرا باپ کا توبہ۔ اپن کا سامنے کوئی مرڈر کر کے جاتا ہے تو جائے" وہ بڑبڑاتا ہوا روانہ ہو گیا۔ تماشائی بھی چل پڑے تو میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے نو بج رہے تھے "بہت وقت ضائع ہو گیا استاد" چند قدم چلنے کے بعد میں نے کہا "ہم سے پہلے منو میاں پہنچ گئے ہوں گے ماما جی کے گھر۔ باقی لوگ بھی پریشان ہوں گے ہمارے لئے۔"

سیمین نے پرس کھول کر دیکھا "مگر ٹیکسی کے پیسے نہیں ہیں۔ پتا نہیں کس کمبخت پر غلطی سے ہاتھ پڑ گیا تھا۔ سات روپے لے کر پھر رہا تھا"

"بس میں سات ہزار لے کر کون پھرے گا؟" میں نے کہا۔

"بڑا دھوکا ہے دنیا میں سر" اس نے افسوس سے کہا "نمائش ہی نمائش رہ گئی ہے۔ ذرا پرس کو دیکھیں کتنا پھولا ہوا ہے۔ مگر میں بھی دھوکا کھا گیا۔ صرف تصویریں تھیں....."

"تم پہلے چیک کرتے ہو مال کو؟" میں نے ہنس کے کہا "اب ایسا کرتے ہیں کہ ٹیکسی ادھار پکڑ لیتے ہیں۔"

"ادھار کون کرے گا سر؟"

"بھئی ہم اسے بتائیں گے نہیں کہ جیب خالی ہے۔ ماما جی کے گھر پہنچ کے دے دیں گے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ٹھیک ہے سر۔ ابھی یہ بھی تو پتا نہیں کہ ہم پچاس ہزار نقد پر لات مار آئے ہیں۔ وہ سمجھے گا ہم نے ذرا ہوائی رکھی ہے۔"

رات کے پونے دس بجے ٹیکسی کسی ریلوے اسٹیشن کے عقبی حصے میں بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے کوارٹروں کے پاس رک گئی۔

سیمین نے کہا "میں ابھی دو منٹ میں آیا۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے اسے روکنے کی بے سود کوشش کی "بابا ہم انتظار نہیں کر سکتا۔"

سیمین غائب ہو چکا تھا۔ میں نے کہا "پیسے لینے کے لئے تم کو انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ بغیر پیسے لئے جانا چاہو تو میں اتر جاتا ہوں"

"کیا مطلب؟"

میں نے کہا "وہ گھر سے پیسے لانے کے لئے گیا ہے"

"تمہاری جیب میں پیسے نہیں تھے ٹیکسی پکڑ لی! واہ بھوکے نواب اور کڑکے شہزادے" ڈرائیور نے کہا "ٹیکسی راستے میں خراب ہو جاتی تو تم کیا کرتے؟"

"یہ ہم نے طے نہیں کیا تھا مگر کچھ نہ کچھ ضرور کرتے۔ تم سے کہتے اللہ کے نام پر کرایہ معاف کر دو۔ یا صبح تک انتظار کرتے کہ تمہاری ٹیکسی ٹھیک ہو تو گھر جائیں۔"

ڈرائیور ہنس پڑا۔ اسی وقت سیمین نے اس کی خدمت میں بھاڑا پیش کیا۔ اس نے جاتے جاتے پھر کہا "خوش رہو کڑکے نواب اور بھوکے شہزادے۔ تم کو خوش رہنا آتا ہے۔"

سیمین کے ساتھ دو رویہ کوارٹروں کی قطار کے درمیان تنگ گلی میں چلتے ہوئے میں نے کہا "یہ ماما جی کس کے ماما ہیں؟"

"وہ جگت ماما ہیں۔ ان کا اصلی نام مجھے بھی نہیں معلوم سر" سیمین نے کہا "سب ماما جی کہتے ہیں۔"

تنگ گلی کے درمیان مشکل سے دو ہی فٹ جگہ تھی مگر اس میں بھی کسی نے مرغی کا ڈربہ باہر رکھ دیا تھا تو کسی نے بکری باندھ رکھی تھی۔ دونوں طرف چارپائیوں کی قطاریں کسی ہسپتال کے اوپن ایئر وارڈ کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ سوا چھ فٹ کی چوڑائی میں دو چارپائیاں لمبائی کے رخ نہیں بچھائی جا سکتی تھیں چناں چہ ایک چارپائی کے بعد دوسری چارپائی مخالف سمت کے کوارٹر کی تھی۔ ان کے درمیان چھ انچ اونچی جگہ خالی تھی جس میں سے میں بار بار گھوم کر زگ زیگ طریقے پر گزر رہا تھا۔

دو کمروں والے آخری کوارٹر کے بعد بھی جھونپڑیوں کا لامتناہی طویل سلسلہ تھا جتنا کوارٹروں سے پہلے۔ یہ جھونپڑیاں بھی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔ سارے کوارٹروں کی حالت زار سے مکینوں کی مفلسی ٹپکتی تھی اور سرکار کی عدم دلچسپی ظاہر ہوتی تھی جسے ان کوارٹروں کو صاف ستھرا رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ صفائی ان لوگوں کے لئے ایسی عیاشی تھی جس کے یہ متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے پاس باتھ روم تھے تو پانی نہیں تھا۔ بارش سے ملنے والا پانی بمشکل تمام منہ دھونے یا کھانے پینے کی ضرورت پوری کرتا تھا۔ فالتو پانی خریدنے کی ان کے بجٹ میں گنجائش نہیں ہوتی تھی کہ یہ ہر روز نہا بھی سکیں۔

ماما جی کا کوارٹر اندر سے نسبتاً صاف ستھرا تھا اور سامان نہ ہونے کی وجہ سے کشادہ بھی لگتا تھا۔ اس کے دونوں کمروں میں دریاں بچھی ہوئی تھیں اور فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ماما جی کے چند کپڑے دیوار پر کھونٹیوں سے لٹکے ہوئے تھے۔ باورچی خانے میں چند برتن ان کا کل اثاثہ تھے۔

غالب اور محسن سر کے نیچے تکئے رکھے جوتوں سمیت دری پر لیٹے ہوئے چھت کو گھور رہے تھے۔ نازو اور گل دوسرے کمرے میں سر جوڑے گپ لگا رہی تھیں۔

"تم کہاں رہ گئے تھے؟" غالب نے بے زاری سے کہا۔

"ہم انتظار میں ہول رہے تھے" محسن بولا۔

"یہ کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ تم مجھے چھوڑ کے بھاگ آئے تھے" میں نے جوتوں سمیت دری پر بیٹھ کے کہا "منو میاں ابھی نہیں پہنچے؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "کہیں وہ کسی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔ پولیس دو لاشوں کی اور دھماکوں کی تحقیقات تو کرے گی"

"ان کے پاس سے خانہ تلاشی میں بہت کچھ برآمد ہو جائے گا" محسن بولا "شمین نے بتایا ہے کہ وائرلیس ٹرانسمیٹر اور بم بنانے کا سامان، دوربین اور کیمرے وغیرہ سب وہیں ہیں۔"

"پولیس ایک فیکٹری کے مالک پر ہاتھ نہیں ڈالے گی۔" میں نے کہا "اس کے علاوہ منو میاں تجربہ کار آدمی ہیں۔"

"تریوینی ان سے بڑا کھلاڑی ہے۔ وہ اس کے ہی آدمی تھے جو وہاں حملہ آور ہوئے تھے" غالب نے کہا۔

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"اور کون ہو سکتا ہے۔ بے شک وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہے لیکن تریوینی کے لئے اپنی شکست کو فتح میں بدلنا کیا مشکل ہے۔ وہ منو میاں کو گرفتار کروا سکتا ہے۔ اس نے پولیس کو بتا دیا ہوگا کہ وہاں کون لوگ چھپے ہوئے ہیں۔"

"اگر ایسا ہوتا تو پولیس خاموشی سے چھاپا مار سکتی تھی" میں نے کہا "ہم سب گرفتار ہو جاتے۔"

"پہلے اس نے خود ہی کوشش کی کہ ہمارا نام و نشان مٹا دے۔ یہ بڑا بھرپور حملہ تھا لیکن ہم بچ کر نکل آئے۔ پھر انہوں نے تمہیں، غالب اور نازو کو راستے سے اٹھا لیا۔ اور اس بار پھر ہم نے تائید ایزدی سے ان کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔ یہ تریوینی اینڈ کمپنی کے لئے ایک اور شکست کا صدمہ ہے۔ وہ انتقام کی آرزو میں پاگل ہو رہا ہوگا۔ احساس ذلت نے اسے ہمارے خون کا پیاسا بنا دیا ہے۔ اب وہ پولیس سے کام لے سکتا ہے" غالب نے کہا "پولیس اس کے پیسے کی غلام ہے اور اس کا اثر رسوخ بھی کم نہیں۔ کسی قانونی جواز کے بغیر بھی وہ منو میاں کو گرفتار کر سکتے ہیں۔ تلاشی لینے پر جو اسباب برآمد ہوگا وہ ان کے

www.paksociety.com

خلاف ہر سنگین الزام عائد کرنے کے لئے کافی ہے۔"

غالب اور محسن کے دلائل کو بے بنیاد سمجھ کر نہیں ٹالا جا سکتا تھا۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا "اچھا ہوتا اگر وہ بھی ہمارے ساتھ ہی نکل آتے۔ خیر پریشان ہونے سے کیا ہوگا۔ یہ بتاؤ کہ وہ ماماجی کہاں ہیں جن کا ذکر ہم کلکتے بھر سے سن رہے ہیں؟ ہمارے میزبان اور صاحب خانہ۔"

غالب نے کہا "وہ ڈیوٹی پر ہیں۔ ابھی ہماری ملاقات بھی نہیں ہوئی۔"

میں نے کہا "کوئی غائبانہ تعارف بھی نہیں؟"

"سنا ہے جوانی میں بڑے انقلابی تھے۔ منو میاں کے والد کے ساتھ بنگال کی مارکسی تحریک میں شریک رہے اور برسوں جیل میں گزارے۔ ہمیشہ ایک ہی جیل میں رہے اور اکثر ایک ہی کوٹھری میں۔"

"اب کیا کرتے ہیں؟"

"قلیوں کے ٹھیکے دار ہیں۔ ان کی مرضی اور رضا کے بغیر کوئی قلی بھرتی نہیں ہو سکتا۔ اسے بیج بھی نہیں ملتا۔"

"کوئی بھتہ وصول کرتے ہیں ان سے؟"

غالب نے افسوس کے ساتھ کہا "ایسا آدمی بھتہ وصول کرے گا؟ انہوں نے بھتے بند کروائے۔ جو پہلے ٹھیکیداروں کی معرفت افسروں سے اکثروں تک سب کو ملتے تھے۔ قلی روز کی آمدنی کا دس فیصد دینے پر مجبور تھے۔ اب ماماجی کو تم ان کی یونین کا غیر منتخب یا غیر سرکاری صدر سمجھ لو۔ ان کے ہوتے کوئی دوسرا تو آ نہیں سکتا چناں چہ وہ ہیں تا حیات صدر۔ انتظامیہ اور قلیوں کے درمیان ایک مضبوط پل۔ نہ انتظامیہ ان سے مشورے کے بغیر قلیوں کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتی ہے اور نہ وہ قلیوں کے حقوق پر سودے بازی کے قائل ہیں۔ وہ قلیوں میں نظم و ضبط قائم رکھتے ہیں۔ ان سے وہ ڈسپلن اور قواعد و ضوابط کے مطابق کام کراتے ہیں اور کسی کو کسی پر زیادتی نہیں کرنے دیتے۔ بیماری کے معاملے میں نہ اجرت کے مسئلے پر۔ انتظامیہ ان سے ڈرتی بھی ہے اور ان کا احترام بھی کرتی ہے۔ قلیوں کے تو وہ ماماجی ہیں۔ سب بھائیوں پر ایک سی سختی اور ایک سی شفقت۔ سب کے مسائل کا حل تلاش کرنے میں ہر وقت سرگرداں۔ خود تو شادی کی نہیں۔ ساری عمر تجرد کی زندگی گزار دی۔ اب ہر کنبہ ان کا کنبہ ہے۔ وہ چھوٹے بڑے سب کے ماماجی ہیں۔"

"یہ تو بڑا تفصیلی تعارف ہو گیا" میں نے کہا۔

"شمین ہمارے ساتھ تھا۔ اسی نے بتائی ہیں ساری باتیں" غالب نے کہا۔

"اب کہاں ہے وہ؟" میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

"ہمارا سامان لینے گیا ہے ریلوے اسٹیشن تک۔ آتا ہی ہوگا" غالب نے کہا۔

"سمین اور شمین بڑے فنکار ہیں" میں نے کہا "میرے دیکھتے دیکھتے اس نے اتنی صفائی سے بس کے کسی مسافر کی جیب کاٹی۔"

"ملا کیا سر؟ سات روپے اور یہ تصویریں" اس نے بلیک اینڈ وائٹ تصویریں درمیان میں ڈال دیں۔

"تم ایسی تصویریں ساتھ لئے پھر رہے ہو؟" غالب نے ان تصویروں کو دیکھ دیکھ کر محسن کو پاس کرتے ہوئے کہا۔

"تصویریں اس شخص کے صاحب دل ہونے کی دلیل ہیں، صاحب ثروت نہیں تھا تو کیا" محسن نے کہا۔

سب تصویریں پورنوگرافک تھیں۔ میں نے سمین سے کہا "انہیں سنبھال کے رکھو۔ ایسے ہر جگہ مت نمائش لگاؤ۔ ہمارے ساتھ خواتین بھی ہیں۔"

"تم لوگ بس سے آئے تھے؟" غالب نے کہا۔

"سمین تو مجھ سے ٹیکسی کا کرایہ مانگ کے لے گیا تھا" محسن بولا۔

"وہ دوسری ٹیکسی تھی۔ پہلی ہم نے چھوڑ دی تھی۔ اس وقت ہم دونوں کی جیب خالی تھی۔ مگر یہ بات دونوں نہیں جانتے تھے۔"

سمین نے آہ بھر کے کہا "اس ٹیکسی کو چھوڑتے وقت ہم خالی جیب نہ رہے تھے۔ ہماری ہر جیب میں دس دس ہزار ہوتے لیکن سمین نے کہا کہ بیٹا پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ پچاس ہزار ایسے ہی چھوڑ آئے۔"

غالب اور محسن نے ایک ساتھ چونک کر مجھے دیکھا "یہ پچاس ہزار کا کیا معاملہ ہے؟"

میں نے انہیں سارا معاملہ بتا دیا۔ ایک دم ان کی ساری بیزاری دور ہو گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور ان کے اشتیاق کی کیفیت دیکھ کر نازو اور گل نے محسوس کیا کہ کوئی غیر معمولی مسئلہ زیر بحث ہے چناں چہ وہ بھی شریک گفتگو ہو گئیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ کوئی حتمی لائحہ عمل مرتب کرتے شمین ڈنر لے کر آ گیا۔ ابھی نازو اور گل نے اس عوامی ڈنر کو دوسرے کمرے میں دسترخوان پر لگایا ہی تھا کہ ماماجی بھی آ گئے اور ہم سب شریک طعام ہو گئے۔

ماماجی کا ہم سے غائبانہ تعارف ہو چکا تھا لیکن ماماجی صرف منو میاں کو یا ان کے دونوں فرشتوں کو جانتے تھے۔ ہم نے اپنا تعارف خود کرایا لیکن تفصیل سے گریز کرتے ہوئے صرف یہ کہ ہم بھی منو میاں کے ساتھی ہیں۔

ماماجی کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہی ہو گی۔ ان کے جسم کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے جوانی میں وہ پہلوانی کرتے ہوں گے۔ اب ان کا جسم گوشت کا بے ہنگم پہاڑ بن گیا تھا لیکن وہ بہت زندہ دل آدمی تھے۔ گرج میں بات کرتے تھے۔ اپنے دبنگ لہجے سے کسی کو بھی خاموش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور بڑے جلالی بزرگ نظر آتے تھے لیکن اتنے ہی خوش مزاج اور زندہ دل تھے۔ وہ سفید کرتا پاجامہ پہنتے تھے۔ ان کا سر بھی سفید تھا۔ فرنچ کٹ داڑھی بھی سفید تھی یہاں تک کہ گھنی بھویں بھی سفید تھیں۔ اس عمر میں بھی چشمہ نہیں لگاتے تھے اور سیدھا چلتے تھے۔ سر پر [illegible]

جالی دار ٹوپی صرف سوتے وقت اتارتے تھے اور تہجد گزار تھے۔ سجدہ ریزی کی نورانی علامت ان کی پیشانی پر نمایاں تھی۔

کھانے میں بھی انہوں نے ہم جوانوں کو مات کر دیا۔ ہم سب ہی بھوک سے بے حال تھے لیکن ان کی خوش خوراکی کا ساتھ نہ دے سکے۔ بچا کھچا اپنے پیٹ میں ڈال کے انہوں نے گرج دار ڈکار لی اور تین گلاس پانی حلق میں انڈیل کر بولے۔

"اب وہ اپنا منو نہیں آیا؟"

سوال شمین سے کیا گیا تھا چناں چہ اس نے کہا "ماماجی اب کچھ ایسی بات ہو گئی کہ۔۔۔"

"کیا بات ہو گئی تھی؟ کل کے تماشے اور لڑکی کا کیا نام بتایا تو نے اپنا۔۔۔ پھول؟"

"جی گل۔۔۔"

"اچھا گل ہی سہی۔ تو گل بیٹا! چائے بنانا آتی ہے تو جا شاباش۔ سب کے لئے اچھی سی چائے بنا خوب گرم گرم۔ اور تو بھی سن" انہوں نے نازو کو روک لیا "ادھر حقہ رکھا ہے ہمارا۔ اس کو تازہ کر کے چلم بھر لا۔ کبھی کیا ہے یہ کام؟ کوئلے وہیں انگیٹھی میں دہکا لینا۔ تمباکو کا ڈبا بھی وہیں ہے۔ میرے پیچھے بڑے بابا کی تصویر والا۔"

نازو اور گل کھی کھی کر کے ہنسنے لگیں۔

گل نے کہا "مجھے چائے بنانا نہیں آتی مگر میں حقہ تازہ کر سکتی ہوں۔"

نازو نے کہا "مجھے چلم بھرنا نہیں آتا۔ چائے بنا لیتی ہوں۔"

"ہو ہو ہو۔۔۔" ماماجی جیسے تو گوشت کے پہاڑ میں جیسے زلزلہ آ گیا "خیر آپس میں مل کے کام کر لو" پھر وہ گاؤ تکیے کے سہارے فرش پر دراز ہو گئے "ہاں بھئی۔ اب کہو کیا بات ہو گئی۔"

میں نے کہا "اجازت ہو تو میں عرض کروں ماماجی؟"

انہوں نے خلال کرتے ہوئے کہا "بھانجے! ایسا لکھنؤ سے آیا ہے تو۔ اب ہم سے ہماری زبان میں بات کر۔ ہاں۔ اور یہ کیا حرکت کر رہا ہے تو" وہ گرج کر بولے۔

میں نے حیران ہو کے کہا "جی؟"

"جی کے بچے۔ ماں باپ نے چھوٹے بڑے کا ادب لحاظ تمیز کچھ نہیں سکھائی۔ ہمارے سامنے دھواں چھوڑ رہا ہے ناک منہ سے۔ کیا باپ کے سامنے بھی سگریٹ پیتا تھا؟"

گھبراہٹ اور شرمندگی سے میرا برا حال ہو گیا "جی۔۔۔ میں معافی چاہتا ہوں" میں نے سگریٹ کو زمین پر مسل دیا۔

غالب اور نازو نے میری حالت پر سب سے زیادہ دانت نکالے۔ انہوں نے کسی سے مجھے ایسی ڈانٹ پڑتے نہ دیکھی تھی۔ اپنے مرحوم والد وزیر خاں کے سامنے واقعی میری مجال نہ تھی کہ میں سگریٹ پیوں۔ ادب احترام کے یہ پرانے اصول پرانی وضع داریوں کے ساتھ ختم ہو رہے تھے۔ پھر بھی بیشتر شریف گھرانوں کے لڑکے ابھی بزرگوں کے ساتھ اتنے بے تکلف نہیں ہوئے تھے۔ سگریٹ محسن نے بھی نکالی تھی مگر وہ ڈانٹ سے بال بال بچ گیا۔ نازو نے نظر بچا کے مجھے زبان چڑائی اور انگوٹھا دکھایا۔ اور اسی پر بس نہیں کی۔ اس نے شرارت کی نیت سے کہا "ماماجی! یہ بری عادت چھڑا دیں ان سے۔۔۔"

"چل لڑکی۔ اپنا کام کر" ماماجی نے اسے بھی ڈانٹ لگائی۔ "ارے ہم تو خود اس بری لت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہم کس منہ سے کہیں کہ سگریٹ مت پیو۔ اس نے پلٹ کر کہہ دیا کہ تم بھی حقہ چھوڑ دو۔ تو کیا عزت رہ جائے گی ہماری"

اب میری اور محسن کی باری تھی۔ ہم نے بڑی دلی مسرت کا اظہار کیا مگر نازو ہماری طرف دیکھے بغیر ہی غائب ہو گئی تھی۔ میں نے ماماجی کو منو میاں کے ٹھکانے پر حملے کی تفصیلی رپورٹ دی۔ درمیان میں گل نے حقہ لا کے ان کے سامنے رکھا۔ انہوں نے ایک گڑگڑاتا کش لینے کے بعد کہا "جیتی رہو" اور پھر میری طرف متوجہ ہو گئے۔

ساری بات سن کے انہوں نے کہا "ہوں" اور پھر سوچ میں غرق حقہ گڑگڑاتے رہے۔

"اس منو کا باپ بھی ایسا ہی ٹیڑھا تھا۔ ہم بھی اب سیدھے ہوئے ہیں جب جوانی کے کس بل نکل گئے۔ اتنا سمجھایا اسے کہ بیٹا وہ اور زمانہ تھا۔ سیاست میں شرافت تھی اور اصول تھے۔ انگریز کتنا ہی متعصب کیوں نہ ہو، انصاف کے معاملے میں کینہ نہیں تھا۔ کینہ نہیں رکھتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ مخالفت کو برداشت کرنے کا ظرف رکھتا تھا۔ سیاسی حریفوں کو دبانے کے لئے کالے قوانین کا سہارا نہیں لیتا تھا۔ ان پر ملک کے عام قوانین کے تحت کھلی عدالتوں میں مقدمات چلتے تھے۔ اپیل کی اجازت پریوی کونسل تک تھی۔ خصوصی اختیارات والی خصوصی عدالت یا ٹریبونل کہاں ہوتے تھے۔ اخباروں کے لئے بھی عام عدالتوں میں عام قانون کے تحت کارروائی ہوتی تھی۔ اب تو سیاست میں وحشت گردی ہے۔ مخالفت کو ختم نہیں کر سکتے تو مخالف کو ختم کر دو۔۔۔"

بہت سے معاملات میں اصولی اختلافات رکھنے کے باوجود میں خاموش رہا۔ میں اس وقت کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بحث سے ان کی سوچ کو اور ان کے نظریات و عقائد کو بدلا نہیں جا سکتا تھا جو چالیس پچاس سال کے تجربات کا حاصل تھے۔ انہوں نے اپنے وقت کی بہت سی اچھی روایات کا ذکر کیا جو اب افسانۂ فردا ہو گئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ سیاست میں مروت، بردباری اور اصول پرستی نہ ہو تو پھر کسی شریف آدمی کو اس چکر میں پڑنا ہی نہیں چاہئے۔

"پہلے سیاست تھی خدمت کے لئے۔ اب یہ ہے نفع بخش پیشہ" ماماجی نے گویا دریا کو کوزے میں بند کیا۔ نازو چائے لے آئی تھی۔ پیالی سے شڑپ کر کے ایک چسکی لینے کے بعد انہوں نے عادتاً دعا دی "جیتی رہو۔"

"کہاں بچ گئے منو میاں نہیں لوٹے" میں نے تشویش سے

کہا۔

"۔۔۔ ابھی معلوم کرتے ہیں؟" ماماجی نے کہا "تم تو اب یوں کرو۔۔۔ یا تو ہم جاتے ہیں۔"

"آپ اس وقت اکیلے جائیں گے؟" ہمیں نے کہا۔

"آدمی اکیلا کب ہوتا ہے بیٹا۔ اس کا خدا ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے" ماماجی نے کہا "یہ بندہ ہی ہے جو اسے بھول جاتا ہے۔ پھر مجھے کس کا ڈر ہے۔ جب حالات مخالف تھے تب تو مارا نہیں کسی نے۔ اب وقت آجائے تو اور بات ہے۔ بیٹھے بیٹھے بھی دل ساتھ چھوڑ جائے......"

"میں آپ کے ساتھ چلوں؟" غالب نے کہا۔

"میں بھی..." محسن نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ میں باہر سے کسی کو ساتھ لے جاؤں گا" انہوں نے ڈانٹ کر کہا "تم دونوں برآمدے میں لیٹ جاؤ" انہوں نے سین شین سے کہا "ایک کمرے میں تم دوسرے میں لڑکیاں۔"

یہ فرمان جاری کرنے کے بعد ماماجی اپنے بھاری بھرکم وجود کو سمیٹ کر اٹھے اور چپل پہن کر روانہ ہو گئے۔ ان کا قد بھی شاید چھ فٹ سے زیادہ ہی تھا چنانچہ وہ دروازے سے گزرتے تھے تو اس میں پورے سماجاتے تھے۔

ہم سب ان کی شاندار شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسے دور کے نمائندہ بزرگ تھے جن کی نسل کو بدلتے وقت نے شکست دے دی تھی۔ ان کی عمر کے بڑے "نوجوان پوتوں اور نواسوں کی نظر میں مضحکہ خیز "اولڈ مین" تھے جن کے درمیان ڈبل جنریشن گیپ تھا۔ تقسیم کے بعد ہندوستان کے قصبوں اور دیہاتوں سے ہجرت کرکے آنے والے ادھر دہلی، بمبئی اور کلکتہ جیسے شہروں میں پہنچے تھے تو ادھر لاہور اور کراچی میں۔ اس سے اگلی نسل نے کانونٹ میں تعلیم پائی تھی اور ناجائز ذرائع سے آجانے والی دولت کی آسائشوں سے مستفید ہونے کے لئے انہوں نے مشرقی روایات اور وضع داریوں کو رجعت پسندی کا الزام دے کر اپنی تہذیب سے خارج کر دیا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ ماماجی نے شادی کی ہوتی تو اپنے خاندان میں بیٹوں اور بہوؤں، پوتوں اور نواسوں کے درمیان ان کی حیثیت وہی ہوتی جو سمندر میں روشنی کے مینار کی ہوتی ہے۔ بیٹے خود جوان بیٹوں کے باپ ہو جاتے مگر اپنے باپ کے سامنے سگریٹ نہ پیتے۔ بہوئیں ان کے سامنے سر پر آنچل رکھ کے آتیں۔ پوتے اور پوتیاں ان سے پرانے وقتوں کے قصے شوق سے سنتے اور ان کے پاؤں دباتے ہوئے ہنستے کھیلتے اور شرارتیں کرتے۔ مزید تیزی کرتے تو ان کے ہاتھ سے پٹتے۔ ہر فیصلے پر عمل درآمد سے پہلے ان کی توثیق ہوتی اور اس فیصلے سے انحراف کی جرات کوئی نہ کرتا۔

یہ بڑے دکھ کی بات تھی کہ ایسا شخص جو کسی خاندان کا مثالی سربراہ ہو سکتا تھا، خاندان جیسی نعمت سے بھی محروم تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اپنے مرحوم والد وزیر خان بہت یاد آئے۔ اگر وہ زندہ ہوتے اور اسی گھر میں ہوتے۔ میرے اور رابعہ کے اور ہمارے بچوں کے ساتھ۔ تو ایسے ہی ہوتے۔ رابعہ کا خیال آیا تو میرے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ کیا وہ واقعی اسی گھر میں واپس پہنچ گئی ہے جو وزیر خان کا گھر تھا؟ پھر ان سے چھین لیا گیا اور ایک عرصے بعد رابعہ...... نے میرے ماضی کی امانت دار اس گھر کو اپنے مستقبل کا خواب بنا کے پھر حاصل کر لیا۔ اس امید میں کہ ایک نہ ایک دن وہ گھر پھر آباد ہوگا۔ اب وہ وہاں کیا کرے گی؟ ہر شام یادوں کے چراغ جلا کے بیٹھے گی اور ہر رات پلکوں پر آنسوؤں کے دیے جلا کے انتظار کرے گی۔ دعائیں مانگے گی اور خواب دیکھے گی۔ کب تک؟ آخر کب تک؟ کوئی حد ہے تو کہاں ہے اس ہجر کے صحرا کی۔

محسن نے کہا "مختصراً اس خط کا مضمون یہ تھا" میں چونکا۔ "کام کی بات اس میں ایک ہی تھی۔ ہمیں معلوم کرنا ہوگا کہ خواجہ سیمنٹ کی ترسیل کے لئے کون سی بوگیاں بک ہوئی تھیں۔ کس تاریخ کے لئے اور کہاں کے لئے۔"

غالب نے کہا "یہ معلومات ماماجی زیادہ آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "ہاں۔ قلیوں کا براہ راست ریلوے بکنگ کلرکس سے رابطہ رہتا ہے۔"

"یہ معلومات حاصل کر لینے کے بعد ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا؟"

"ہم دیکھیں گے کہ اس پر کیا مال جا رہا ہے۔"

محسن بولا "لوڈنگ کے وقت ہمیں کون قریب پھٹکنے دے گا۔"

میں نے کہا "ماماجی کے اتنے سارے بھانجے کس مرض کی دوا ہیں۔ آخر انہی میں سے کوئی لوڈنگ کرے گا۔"

"وہ کوئی شریف بھانجا نہیں ہوگا۔ اس کا انتخاب بہت دیکھ بھال کے کیا جائے گا۔ اسے معاوضہ بھی بہت دیا جائے گا اپنا منہ بند رکھنے کا۔ اور جان سے مار دینے کی دھمکی الگ ہوگی۔"

نازو نے کہا "خود ماماجی کو وہاں جانے سے کون روک سکتا ہے۔"

"ان سے کچھ بعید نہیں۔ بیٹھے رو جیسے لوگ کسی ماماجی کی وفاداری تسلیم نہیں کرتے۔"

"یہ کوئی بحث کی بات ہے؟" ہمیں نے کہا "کسی طرح بھی ہم معلوم کر لیں گے کہ اب کیا مال لادا گیا ہے۔ پھر؟"

غالب نے کہا "پھر ہم وہی کریں گے جو پہلے کرتے آئے ہیں۔"

"مال گاڑی پر ڈرائیور اور کنڈکٹر گارڈ وغیرہ کے علاوہ کوئی عام آدمی نہیں چڑھ سکتا" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "اس کا کیا مطلب ہے؟ مال گاڑی میں جانے والے مال کے ساتھ کوئی محافظ نہیں جائے گا۔"

نازو نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ چوبیس گھنٹے نگرانی کریں گے۔"

"سوال یہ ہے کہ کیسے؟"

میں نے کہا "یا تو ان کے محافظ مال کے ساتھ ہی بند ہو جائیں گے۔ چھپ کر یا رشوت دے کر سوار ہوں گے اور اندر بیٹھ کر پورا سفر طے کریں گے۔"

"یہ بہت لمبا سفر ہے" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن اسلحہ لے جانے والی بوگی کو وہ چھت تک تو پیک نہیں کریں گے۔ اس میں ایک دو افراد کے لئے ضرور جگہ بنائیں گے جو محدود جگہ میں اٹھ بیٹھ سکیں اور آرام کر لیں۔ ان کے لئے وافر مقدار میں کھانے پینے کا سامان بھی رکھا جا سکتا ہے۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ اور بھیا سارا کھیل تو پیسے کا ہے۔ گارڈ راستے میں انہیں باہر نکل کے تازہ دم ہونے یا حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کے مواقع بھی فراہم کر سکتا ہے۔"

"اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اس ٹرین میں گارڈ بھی انہی کا آدمی ہوگا۔ زور یا زر کی مدد سے وہ اس کو قابو میں رکھیں گے۔ ایسی صورت میں ہم تو گاڑی پر نہیں سوار ہو سکتے۔"

"گاڑی پر سوار ہونا قطعی ضروری نہیں" محسن نے کہا۔

"میں نے کہا "گاڑی کو راستے میں کہیں بھی روکا جا سکتا ہے۔"

"اتنے لمبے سفر میں درجنوں چھوٹے بڑے اسٹیشن آئیں گے۔ سیکڑوں سگنل اور پٹری بدلنے والے کانٹے۔ ہم کسی جگہ موقع محل دیکھ کر کوئی پلان بنائیں گے۔"

"اور موقع محل دیکھنے کے لئے آگے آگے چلیں گے؟"

"گاڑی کے آگے؟ کون دوڑے گا؟" نازو بولی۔

"تم میرا ساتھ دو تو میں دوڑ سکتا ہوں" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "ہم گدھا گاڑی کی بات نہیں کر رہے ہیں۔"

گل اور محسن ہنسنے لگے۔ میں نے کراچی میں جس گدھا گاڑی کو دیکھا اس میں دو گدھے نظر آئے۔ گاڑی ایک کھینچتا تھا، دوسرا فقط ساتھ رہتا تھا۔ کسی نے مجھے بتایا کہ گدھا اس وقت تک نہیں چلتا جب تک گدھی ساتھ نہ ہو۔ معلوم نہیں یہ کس حد تک درست تھا مگر یہ بات غالب اور نازو پر چپک کے رہ گئی۔

"تم سب جلتے ہو" نازو نے جھینپ کر کہا۔

غالب نے اس کا ساتھ دیا "ہاں۔ اپنا ساتھ دینے والا تو کوئی ہے نہیں" وہ دونوں ہم سب کے مقابلے میں متحد ہو گئے تھے جو سب سے زیادہ آپس ہی میں لڑتے تھے۔ بات مذاق کی تھی مگر مجھے شدت سے احساس ہوا کہ واقعی ہم وہ گدھے ہیں جو اپنی اپنی گاڑی اکیلے ہی کھینچنے پر مجبور ہیں۔ میں بھی اور محسن بھی۔ اسی وقت میری نظر گل پر گئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اپنے پیر کے انگوٹھے کو مسل رہی تھی۔ اس نے ہونٹوں سے کچھ نہیں کہا مگر میں نے اس کے دل کی آواز کو صاف سنا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ تم تو اکیلے نہیں ہو محسن۔ میں ساتھ ہوں تمہارے۔ لیکن اس نے الفاظ کا گلا گھونٹ دیا۔ ایک سنگین اور سفاک حقیقت کا سامنا ہم میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

محسن کا چہرہ ایک دم سپاٹ ہو گیا تھا۔ جذبات سے عاری اور بے حسی کا مظہر۔ ایک پتھر چہرہ۔ اس کو دیکھ کر میں ڈر گیا۔ مجھے اپنی بے چینی ڈرانے لگی۔ محسن جانتا ہے۔ اس کو حالات نے، مشاہدے نے، اعتراف مجرمانہ و مدح گوئی نے، اس کی چھٹی حس نے اور اس کے دل نے سب بتا دیا ہے۔ وہ شخص اس لئے انجان بنا رہتا ہے کہ ہم اپنی نظر میں خود شرمسار نہ ہوں۔ اس نے دل کو پتھر کر لیا ہے اور آنکھوں سے ٹپکنے والے دل کے لہو کے سامنے بے حسی کی دیوار چن دی ہے۔ پہلا صدمہ یقیناً بہت شدید تھا جس نے اس کو پاگل کر دیا تھا مگر پھر اس نے ہماری صورتوں پر ندامتوں اور ملامتوں کا دکھ دیکھا تو وہ سنبھل گیا اور اس نے نوشتہ تقدیر کو قبول کر لیا۔ زندگی میں پھر شملا سے ملنا لکھا ہوگا تو وہ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے اور کئی سرحدیں عبور کر کے بھی مل جائیں گے اور مقدر میں جدائی کے سوا کچھ نہیں تو پھر ہم انتظار کریں گے تیرا قیامت تک۔

پتا نہیں غالب کے خیالات کی رو کس سمت میں بہہ رہی تھی لیکن اچانک ایک ہی وقت میں ہم دونوں کا خاموش ہو جانا بھی اعتراف جرم کے مترادف ہونے لگا تھا۔

میں نے کہا "یار میں سوچ رہا تھا کہ ٹرین پر رہنے کے بجائے وہ اس کے ساتھ ساتھ رہنے کو ترجیح دیں گے۔"

ظاہر ہے میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا مگر میرا یہ فی البدیہہ جھوٹ کام کر گیا۔

"تمہارا مطلب ہے سڑک پر رہتے ہوئے؟" نازو بولی۔

"ہاں۔ عموماً ہر ریلوے لائن کے ساتھ سڑک چلتی ہے۔ راستے میں درمیانی فاصلہ کم زیادہ ہو جاتا ہے مگر جو سامان مال گاڑی سے اتارا جاتا ہے اسے اندرونی علاقے تک روڈ ٹرانسپورٹ کے بغیر نہیں پہنچایا جا سکتا۔ سڑک اسی لئے ہوتی ہے" میں نے کہا۔

"یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے" محسن نے کہا "کسی ٹرک میں ان کا محافظ دستہ ٹرین کے ساتھ چلے تو دور رہ کے بھی وہ نگرانی کر سکتے ہیں۔"

"یہ سب مفروضات ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں، یہ دیکھنے کے بعد ہی ہم اپنی منصوبہ بندی کر سکتے ہیں۔ ماماجی کے ذریعے یہ معلوم کرانے میں تو کوئی حرج نہیں کہ بوگیاں کون سی ہیں اور کس ٹرین کے ساتھ جائیں گی۔ لیکن باقی تمام معاملات ایسے ہیں کہ خود ہمیں ان پر نظر رکھنی ہوگی تاکہ یہ پتا چلے کہ سامان کس طرح پیک ہوا ہے۔ کس نے لوڈ کرایا ہے اور اس کے ساتھ کون جا رہا ہے۔"

"یہ ہم خود کیسے دیکھیں گے؟"

"نکالیں گے کوئی صورت" میں نے کہا "قریب جانے کی۔"

"قریب جانے کی" نازو نے کہا "اب آپ حد سے زیادہ خود اعتمادی کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ اتنے بھیس بدل چکے ہیں ہم کہ اب جس بھیس میں جائیں گے پہچانے جائیں گے۔ ان کی نظر میں ہمارے سب بہروپ ہیں۔ کب تک دھوکا کھائیں گے وہ۔"

"تمہاری دوراندیشی پر مبنی خیالات سے تمہاری ذہانت ثابت ہوتی ہے" غالب نے کہا۔

"میں بہت پہلے خود کو ذہین ثابت کرچکی ہوں۔"

"لیکن اس پر کبھی انعام نہیں ملا تمہیں جو آج میں دینا چاہتا ہوں۔"

"لاؤ دو۔" نازو نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

"یہاں سب کے سامنے؟" غالب نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا۔

ظاہر ہے ایسے جواب پر نازو کا ردعمل کیا ہو سکتا تھا۔ پہلے تو اس کا رنگ شرم سے گلابی ہوا۔ پھر ہم ہنسنے لگے تو غصے سے لال ہوگیا۔ اس نے ایک دو ہتڑ کے غالب پر جست لگانے کی کوشش کی مگر غالب کو امید تھی کہ ایسا ہی ہوگا۔ وہ بالکل تیار تھا۔ میرے کندھے پر سے دوسری طرف کود گیا مگر نازو نے پلٹ کر اس کی ٹانگ پکڑی اور واپس کھینچا تو میں اور وہ ایک ساتھ الجھ گئے۔

"لاحول ولا قوۃ۔ تم تو بالکل پاگل ہو چکی ہو نازی بیگم۔ خطرناک قسم کی پاگل" غالب نے اٹھنے کے بعد کہنی سہلاتے ہوئے کہا "آدمی کو ذرا خواہ مخواہ کاٹنے کو دوڑتی ہو۔"

"خواہ مخواہ؟" نازو نے برہمی سے کہا۔

"اور کیا۔ ہر بات کا الٹا سیدھا مطلب خود نکالتی ہو۔ پھر دست درازی مجھ پر کرتی ہو۔"

"مت کیا کرو ایسی باتیں۔ جن کا الٹا مطلب نکلے۔"

"کیا الٹی کھوپڑی ہے۔ مطلب تم نکالتی ہو یا میں پیدا کرتا ہوں؟" غالب نے چلا کے کہا "انعام کا کیا مطلب ہوتا ہے آخر۔ میں ایک روپیہ انعام میں دینا چاہتا تھا۔ ایک ہی روپیہ تھا میرے پاس۔"

"تو سب کے سامنے کیا تھا؟"

"مجھے شرم آتی تھی تمہیں چار چونیاں دیتے ہوئے۔ ان میں سے بھی دو کھوٹی تھیں" غالب نے کہا۔

ان کے لڑنے پر ہمیشہ سب کو ہنسی آتی تھی۔ اس وقت بھی ہنستے ہنستے سب کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ پھر مجھے اچانک حسین اور ثمین کی عدم موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے کہا "وہ دونوں کیسے خاموشی سے غائب ہوگئے؟"

محسن نے کہا "ہاں یار۔ ہم باتوں میں لگے رہے۔ پتا ہی نہیں چلا وہ کب کھسک گئے۔"

"کہیں باہر نہ سو رہے ہوں" غالب بولا۔

"ماموں نے حکم دیا تھا' صحن میں سونے کا۔ ان کے حکم کی خلاف ورزی کون کرسکتا ہے" میں نے کہا "پھر بھی دیکھو تو شاید باہر چارپائیوں پر لیٹ گئے ہوں۔"

باہر کی چارپائیاں خالی تھیں۔ شاید یہ دونوں بستر ماموں نے اپنے لئے اور منو بھائی کے لئے رکھے تھے مگر اب وہ دونوں ہی نہیں' حسین' ثمین بھی غائب تھے اور ہم ان کا انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ انتظار ایک مشکل کام تھا کیوں کہ سب پر تھکن غالب تھی۔

نازو اور گل پہلے اپنے دوپٹے کی مچھر دانی تان سمٹ سمٹا کے اور گٹھڑی بن کے پڑ گئیں۔ اصغر، کری اور محسن کے ساتھ پھر تھے۔ کچھ دیر ہم بھی ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر لیٹ کر کان پر بھن بھن کرنے والے مچھروں کو بھگانے کے لئے ہاتھ چلاتے رہے۔

میں نے کہا "یار' کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ منو میاں کو پکڑ لیں اور ماموں جائیں انہیں چھڑانے تو وہ بھی گرفتار ہو جائیں۔"

"ماموں کی عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔ وہ مکمل پارٹی تحریک کے زمانے سے زیر زمین رہنے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آئیں گے۔" میں نے کہا "شیر کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔"

"مجھے تو شک ہے کہ حسین ثمین بھی ادھر ہی پہنچے ہوں گے اپنے استاد کی خبر لینے۔"

"پولیس منو میاں سے ہمارا پتا معلوم کرسکتی ہے۔"

"ناممکن۔ وہ ایسے آدمی نہیں ہیں" میں نے کہا۔

"پولیس زبان کھلوانے کے طریقے جانتی ہے۔"

"یار' ہر شخص پر وہ طریقے کارگر نہیں ہوتے" میں نے چڑ کے کہا "بہت ہوتے ہیں ایسے لوگ جن کی قوت ارادی ناقابل شکست ہی رہتی ہے۔ مرتے دم تک۔ خواہ ان کو قیمہ کرنے والی مشین میں ڈال دیا جائے یا روڈ رولر کے سامنے۔ جسم کی شکست ارادے کی شکست نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ میرا خیال ہے کہ منو میاں اس میدان کے پرانے کھلاڑی ہیں جو ناکامی کی سوت اور اس سے پہلے دشمن کی قید میں اذیت کے خیال کو نظرانداز نہیں کرتے۔ چنانچہ اس وقت کے لئے آخری علاج اپنے پاس رکھتے ہیں۔ جب امید کی آخری کرن بھی بجھ جائے۔ دانتوں کے کسی خلا میں کوئی قاتل زہر ان کو قید حیات سے ہی نجات دلا دیتا ہے۔"

مجھے احساس ہوا کہ میں اکیلا ہی بول رہا ہوں۔ محسن اور غالب سو چکے تھے۔ تنہائی ہوئی تو دل کے دروازے پر رابعہ کے خیال نے دستک دی اور اس کا تصور ذہن کے دریچے سے روشنی بن کر اتر آیا۔ کھلی کھڑکی سے تاریک کمرے میں اترنے والی چاندنی کی طرح۔ اس نے وہی نیلی ساڑی باندھ رکھی تھی جس پر شوخ زرد پھول ستاروں کی طرح جگمگاتے تھے۔ اس نے آرائش لب و رخسار میں بھی اہتمام سے کام لیا تھا سو اپنی آنکھوں میں کاجل بھر کے اور کالے ریشم کی گھٹا جیسے بالوں کو شانوں پر پھیلا کے آئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سب اس نے کیوں کیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا یہ انداز دلبری دیکھ کے میں اپنے ہوش کھو بیٹھوں اور اپنی خفگی بھول جاؤں مگر میں اتنی آسانی سے اسے معاف کرنے والا نہیں تھا۔ میں کیسے بھول سکتا تھا کہ اس نے اچانک مجھے بتائے بغیر ایک ایسا فیصلہ کرلیا تھا جس کا سارا عذاب صرف میرے دل پر ٹوٹا۔ آج تک میں ان

سوالوں کے جواب سے نہیں نکل سکا کہ رابعہ نے ایسا کیوں کیا؟ کیا سوچ کے کیا؟ اپنی مرضی سے کیا یا مجبوری میں؟ بے ہوشی میں کیا یا دیوانگی میں؟

رابعہ نے کہا "بہت ناراض ہو مجھ سے۔ میری طرف دیکھو گے بھی نہیں؟"

میں اپنا منہ دوسری طرف کئے کھڑا رہا۔ حالاں کہ میرے ضبط کا یہ امتحان بہت سخت تھا اور میری قوت مدافعت ایسے ختم ہوتی جا رہی تھی جیسے آگ میں برف پگھلتی ہے۔ برف میرا دل تھا اور اس کے قرب کی آگ سے پگھل رہا تھا۔

جب اس نے پیچھے سے میرے گلے میں اپنے بازو حمائل کئے تو میں ہار گیا۔ میں نے تڑپ کر پیچھے دیکھا اور اس کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں سمیٹنا چاہا مگر وہ ہوا کے دوش پر بہت دور چلی گئی۔

"آؤ میرے ساتھ چلو" وہ ہاتھ پھیلا کے بولی۔

میں نے بیتاب آگے بڑھا "کہاں؟"

"اپنے گھر۔ جو ہماری منزل ہے۔ جہاں میں ہوں" اس کے ہونٹوں پر بڑی اجلی مسکراہٹ تھی۔ اس کے حسن کے ہوشربا انداز نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ اس کے وجود سے پھوٹنے والی خوشبو میرے حواس پر چھا گئی تھی۔ میں اور آگے بڑھا۔ وہ اور پیچھے ہٹ گئی۔ پیچھے کچھ بھی نہیں تھا۔ بس خلا تھا۔ تاریک خلا جس میں میرا اور اس کا جسم تیرتا جا رہا تھا۔ اوپر آسمان تھا یا اس نے اپنا آنچل پھیلا دیا تھا۔ یہ الف لیلیٰ کی کسی کہانی کا طلسم تھا کہ ہم ساتھ ساتھ اڑتے جا رہے تھے۔ اب اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا تھا اور میں اس کے ریشمی لمس کی نرمی اور دل گداز حرارت کو محسوس کرسکتا تھا۔ ایسا ایک بار پہلے بھی ہوا تھا۔ میں نے سوچا۔ کب اسی طرح میں نے رابعہ کے ساتھ پرواز کی تھی؟

رابعہ نے کہا "نیچے دیکھو کیا ہے۔"

میں نے بچوں کی طرح خوش ہو کے کہا "یہ تو راوی ہے۔ اور ادھر وہ مقبرہ جہانگیر کے مینار ہیں نا؟ اور ادھر یہ اتنا بڑا میدان۔ یہ اقبال پارک ہے۔ وہ مینار پاکستان۔"

اس نے کہا "اپنا گھر کہاں ہے؟"

میں نے کہا "یہی تو ہے اپنا گھر۔ اپنا شہر۔ اپنا وطن۔ سب ایک ہی ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ناممکن ہے۔"

اندھیرے کے باوجود میں سب دیکھ رہا تھا۔ لاہور کی سڑکیں' بازار اور گلیاں۔ میکلوڈ' بیڈن روڈ۔ ہال' ٹمپل روڈ' مزنگ اور ڈال ٹاؤن سب ایسے نظر آرہے تھے جیسے اندھیرے سینما ہال کے پردے پر فلم چل رہی ہو۔ پھر اچانک وہ گھر آگیا۔ اس میں وزیر خان ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ شکل سے بالکل وہی شان اور اعتماد۔ وقار اور تمکنت۔ محبت آمیز شفقت کی نرم روی۔ وہ ابھی ابھی نماز سے فارغ ہوئے تھے۔ صبح کی نماز وہ شبنم سے بھیگی ہوئی گھاس پر پڑھتے تھے۔ اس کے بعد سورج نکلنے تک ہاتھ میں تسبیح لئے ٹہلتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ میں اٹھ کر باہر آجاتا تھا۔

اپنے اسی پرانے مخصوص لہجے میں انہوں نے کہا "بھئی یہ کیا طریقہ ہے سکندر میاں۔ بہت بے پروا ہوگئے ہو تم۔ کہاں چلے جاتے ہو ہماری بچی کو اکیلا چھوڑ کے۔"

میں نے ندامت سے سر جھکا کے کہا "جی۔ میں...."

"دیکھو اس نے کیسے خوبصورت پھول کھلائے ہیں" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "تم نے بتایا ہوگا اسے کہ تمہیں یہ گہرے رنگ برنگے چمپا کے پھول اچھے لگتے ہیں۔ وہ ہے کہاں؟ اندر چلی گئی ناشتا بنانے۔ بھئی سکندر میاں۔ اتنے اچھے نصیب ہیں ہمارے کہ ہم سوچتے ہیں خدا سے کیا کہیں۔ الفاظ تو بڑے کم ظرف ہوتے ہیں۔ شکر گزاری کے جذبات کا اظہار بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور ہم تو بھئی سخت شرمندہ ہیں اپنے خدا سے۔ ہم نے بڑا گلہ شکوہ کیا تھا۔ وہ اسی آزمائش کی بات تھی۔ خیر۔ اس نے بھی معاف کر ہی دیا اور پھر انعام دیا۔ وہ ہے ہماری۔" انہوں نے ایک گہری دکھ بھری سانس لی "کاش ہم اس کے لئے کچھ کرسکتے۔ جا ہی دے سکتے اسے۔ دیکھو وہ کتنی اداس اکیلی بیٹھی ہے۔"

اور میں نے پلٹ کے دیکھا تو رابعہ گھر کے بند دروازے کے باہر برآمدے کی دو سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں چہرے پر انتظار سجائے۔ آنکھوں میں ادھورے خواب لئے۔

میں نے کہا "رابعہ' یہاں کیوں بیٹھی ہو اندھیرے میں؟"

اس نے کہا "روشنی کہاں سے لاؤں؟"

میں نے کہا "اندر چلو...."

"اندر بھی اندھیرا ہے" وہ مایوسی سے بولی "مجھے ڈر لگتا ہے اکیلے جاتے ہوئے۔ مجھ سے یہ دروازہ بھی نہیں کھلتا۔ اس کی ایک چابی تمہارے پاس بھی تو ہے نا۔ جب تک دونوں چابیاں نہ لگائی جائیں اس کا قفل نہیں کھلے گا۔"

میں نے اپنی ہر جیب میں دیکھا۔ چابی کہاں گئی؟ اکیلی رابعہ اس گھر کا دروازہ کیسے کھول سکتی ہے؟ پھر کیا وہ دروازے پر ہی بیٹھی رہے گی؟ انتظار تو آدمی کو پتھر کر دیتا ہے۔ چابی کہاں گئی؟ میری چابی کہاں گئی؟ میں سخت بدحواس اور پریشان تھا۔

جب محسن نے مجھے جھنجوڑا تب بھی میں یہی کہہ رہا تھا۔ چابی کہاں گئی؟ میری چابی کہاں ہے؟

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر غالب سو رہا تھا۔ محسن پھر لیٹ گیا۔ شاید اس نے مجھ سے کچھ پوچھا تھا مگر میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ کیسا عجیب خواب تھا۔ دل دکھانے والا۔ کتنی پرانی یادوں کے آموختے سے بنا ہوا۔ ہر یاد کے ساتھ ایک زخم کا رشتہ تھا۔ وزیر خان کی ہڈیاں بھی اپنے بے نشان مدفن میں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ اس کے قاتل بے خوف پھر رہے ہیں۔ اس کے گھر کی دیواریں سوگوار ہیں۔ کیسے سب ناآسودہ خواہشوں نے ایک ہی خواب میں جگہ بنائی۔ میں نے وزیر خان کو لان میں ٹہلتا دیکھ لیا۔ ان کے ساتھ رابعہ کو دیکھ لیا۔ ان کے منہ سے رابعہ کی تعریف سن لی۔ یہ احساس

www.paksociety.com

مجھے یقین سا تھا کہ وہ رابعہ جیسی بہو پا کے کتنے خوش ہوتے۔

اس وقت صبح کے پونے پانچ بج رہے تھے۔ نہ جانے کہاں سے میرے کانوں میں فجر کی اذان کی آواز آئی۔ دل کی عجب سی کیفیت تھی۔ اپنے والد کو خواب میں دیکھنا حقیقی زندگی کا ایک واقعہ لگتا تھا۔ اور میرے کان ابھی تک ان کی آواز سن رہے تھے۔ آج یہ کتنی پرانی بات ہو گئی تھی۔ مجھے ان کی موت کا صدمہ ناقابل برداشت محسوس ہوتا تھا لیکن وقت نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ میں نے عہد کیا تھا کہ ان کے قاتلوں کو بے نقاب کروں گا اور قانون نے انہیں سزا نہ دی تو میں خود دوں گا مگر میں یہ عہد بھی بھول گیا تھا۔ پھر میں نے عہد کیا تھا کہ اس مدفن بے نشاں کا سراغ ضرور لگاؤں گا جہاں ان کی لاش کو قبر سے چوری کر کے لے جانے والوں نے دفن کیا تھا۔ مگر یہ عہد بھی گردش حالات کی نذر ہو گیا تھا۔ ان حالات کی یہ تقاضا کرتے تھے کہ میں ذاتی انتقام کے جذبات کو ملک و قوم کے وسیع تر مفاد پر قربان کر دوں۔ پہلے ان دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچاؤں جو میرے وطن کی سالمیت کے خلاف دشمنوں کی سازش میں شریک ہو گئے ہیں اور یوں وزیر خان کے بے گناہ لہو کی پکار فرض کی پکار میں دب کے رہ گئی۔

وطن کی مٹی مجھ پر فرض سے کوتاہی کا الزام عائد نہیں کر سکتی تھی مگر وزیر خان کی مٹی فریاد کناں تھی کہ میں نے اس کا قرض نہیں چکایا۔ وزیر خان کی ہڈیاں کسی گمنام جنگل کے کسی ویران اور بے نام و نشاں مدفن سے فریاد کرتی تھیں کہ ہمیں اپنی قبر میں لوٹا دو جو ہماری ابدی آرام گاہ تھی۔ ابھی تک میں یہ بھی معلوم نہ کر سکا تھا کہ ان کی لاش کو قبر سے نکالنے والے کون تھے اور اسے کہاں لے گئے تھے۔

یہ میری روح کی خلش تھی اور دل مضطر کی کسک تھی جو اس وقت میرا آزار بن گئی۔ میں نے اٹھ کے وضو کیا اور اندازے سے قبلے کی سمت کا تعین کر کے خدا کے سامنے حاضر ہو گیا۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا مگر پہلے متعدد بار ہوا تھا کہ حضوری کی کیفیت ایک وارفتگی کا نتیجہ بن گئی تھی۔ از خود میں ایک انسانی یا وجدانی انداز میں سجدہ ریز ہوا تھا۔

میں نے خدا سے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کیا اور اس کی رحمت مانگی۔ وزیر خان کے لئے دعائے مغفرت کی اور التجا کی کہ وہ مجھے حوصلہ اور استطاعت دے کہ میں وزیر خان کا وارث بنوں۔ اس کے نام و نسبت کا سلسلہ آگے بڑھاؤں اور اس کے خوابوں کے ساتھ اپنے ارادوں کی تکمیل کر سکوں۔

ہمیشہ کی طرح میں پُرسکون ہو گیا اور وہ بے کلی جو آنکھ کھلنے کے بعد خواب کے اثرات سے طاری تھی دور ہو گئی۔ میں نے کچن میں جا کے چائے بنانے کا اسباب تلاش کیا اور ابھی چولہا جلا ہی رہا تھا کہ نازو آگئی۔

"کیا نیند نہیں آئی؟" اس نے جمائی لے کر کہا۔ اس کی نیم باز آنکھوں میں ابھی تک نیند بھری ہوئی تھی۔

میں نے جھوٹ بولا "ابھی آنکھ کھلی ہے۔ تم کیوں اٹھ گئیں؟"

"آوازیں سن کر۔ میں سمجھی وہ لوگ آگئے۔"

میں نے کہا "ان میں سے تو کوئی بھی واپس نہیں آیا۔"

نازو نے کہا "چلو ہٹو میں بناتی ہوں چائے۔"

میں نے کہا "نہیں تم بیٹھو۔ آج میں بھی دیکھ لوں کہ کہیں چائے بنانا بھول تو نہیں گیا۔"

اس نے اپنی انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کی اور ایک سرکنڈوں کے بنے ہوئے موڑھے یا اسٹول پر بیٹھ گئی "مجھے آثار اچھے نہیں دکھائی دیتے۔ پہلے ماما جی گئے پھر یہ سب گئے۔ چھ سات گھنٹے ہو گئے۔ ابھی تک کسی کی کوئی خبر نہیں۔"

"میرا خیال ہے....."

"مجھے معلوم ہے تمہارا خیال" نازو نے میری بات کاٹ دی۔ "تم خود جا کے دیکھنا چاہتے ہو۔ لیکن میں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔"

میں نے کہا "لڑکی! کیا میں تم سے اجازت لینے کا پابند ہوں؟ تم یہ بھول رہی ہو کہ میں ایم آر ایس کا سربراہ ہوں۔"

"مگر میں سکندر سے بات کر رہی ہوں" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "صرف اپنی طرف سے نہیں' رابعہ کی طرف سے بھی۔ اور ان سب کی طرف سے بھی" اس نے کمرے میں سونے والوں کی طرف اشارہ کیا۔

"آخر ہم کب تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے انتظار کریں گے؟"

"ابھی صرف چھ گھنٹے گزرے ہیں۔ ایک دن بھی نہیں ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ صبح آجائیں۔"

"صبح اور کب ہو گی۔ سورج نکلنے والا ہے" میں نے سلور کی کیتلی میں چائے کی پتی ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے رات کو وہ کہیں چھپ گئے ہوں۔"

میں نے ہنس کے کہا "اس بات سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ وہ سب پکڑے گئے ہوں گے۔ پھر کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہوئے ہوں گے۔ اس کے بعد دشمنوں کی نظر سے بچنے کے لئے کہیں پناہ لینے پر مجبور ہوئے ہوں گے اور جب تک دشمنوں کی طرف سے خطرہ ٹل نہیں جاتا وہ چھپے رہیں گے۔"

"ایسا بھی ہو سکتا ہے۔" نازو نے سوچ کے کہا۔

میں نے پیالی میں چائے ڈال کے نازو کے سامنے رکھ دی۔ "اس میں چینی خود ڈالو۔ وہ نہیں ہے۔ میں تو ایسے ہی پیوں گا۔"

"مجھ پر چائے پینا کوئی فرض نہیں ہے۔"

"میں نے بنائی ہے تو پھر پینی پڑے گی" میں نے کہا۔

"اچھا کوشش کرتی ہوں" نازو نے کہا "ایک بات تو بتاؤ۔"

"کوئی راز کی بات ہے؟ غالب کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ کیسا لڑکا ہے؟"

نازو نے مذاق کو نظر انداز کر دیا اور بولی "کیا وہ بات محسن کو

معلوم ہو گئی ہے جو تم سب نے چھپائی تھی۔"

میں نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ سب جانتا ہے" نازو نے کہا۔

"ہم سب کا یہی خیال ہے" میں نے کہا۔

"پھر وہ..... کچھ کہتا کیوں نہیں؟"

میں نے کہا "وہ کہے گا بھی نہیں۔ اس نے نوشتہ تقدیر' برضائے الٰہی' اپنی تیرہ بختی یا بے رحمی حالات' کچھ بھی کہو۔ اسے قبول کر لیا ہے۔ معلوم نہیں اس میں صبر و ضبط کی اتنی طاقت کہاں سے آئی۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو پاگل ہو جاتا۔"

"کیا یہ صبر و ضبط یا پاگل پن کی بات نہیں ہے؟ کیوں کر رہا ہے وہ اپنے آپ پر یہ جبر؟ وہ روتا کیوں نہیں؟ چلاتا کیوں نہیں؟ ہم پر خفا کیوں نہیں ہوتا؟ اس کے دل سے اٹھنے والا دھواں اندر بھرتا جا رہا ہے۔ یہ غبار آنسوؤں میں ڈھل کے نکل جائے تو آدمی محفوظ رہتا ہے ورنہ بکھر جاتا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ کے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ باہر سے پتھر کا آدمی نظر آنے والا اندر سے تو پتھر نہیں ہو سکتا۔"

"اندر سے وہ بھی شیشے کا آدمی ہے" میں نے اتفاق کیا۔

"کیا میں یہ بات چھیڑوں؟"

میں نے چائے کی پیالی نیچے رکھ دی "خدا کے لئے ایسا مت کرنا۔ ابھی میں کسی قیامت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس آتش فشاں کو خاموش ہی رہنے دو۔"

"مجھے گل پر ترس آتا ہے لیکن میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔"

"وہ کب چاہتی ہے کہ اس کے لئے کوئی کچھ کرے۔ اسے بھی اپنے حال پر چھوڑ دو۔"

"میں بہت مایوس ہوں۔ ہر طرف سے مایوسی کی دیواریں مجھے اور اونچی محسوس ہوتی ہیں" نازو نے کہا "اب تو ایسا لگتا ہے..."

میں نے کہا "بولو' رک کیوں گئی ہو۔ کیا کیسا لگتا ہے؟"

"کہ کسی دن میں بھی ہار مان لوں گی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہار جانے میں ہی سکون ہے اور عافیت ہے۔"

میں نے کہا "رابعہ نے ہار نہیں مانی تھی۔"

"پھر وہ کیوں واپس چلی گئی؟"

"ابھی میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے" میں نے بے بسی سے کہا۔

"اب بھی مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ یہ سب بے کار ہے' کچھ حاصل نہیں ہو گا اس سے۔ ہم شملا کو نہیں بچا سکیں گے۔ وہ ہمارے بالکل بچنا پر قربان ہو جائے گی۔ وہ بھی اور اس کا بیٹا بھی۔ آخر کار ایک دن یہ خیال میرا یقین بن جائے گا۔ جس دن ایسا ہو گا اس دن میں بھی پیچھے ہٹ جاؤں گی۔ میں اپنے دامن پر ان کے خون کا رنگ نہیں دیکھوں گی۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ تم میرا حوصلہ بھی ڈاؤن کر رہی ہو۔ دیکھنا ہی ہے تو محسن کی طرف دیکھو۔ اس کا حوصلہ دیکھو۔ یہ تو بڑی خود غرضی ہو گی' اگر ہم سب اپنی ذات کی شکست سے ڈرنے لگے اور مستقبل پر یقین سے محروم ہونے لگے۔ ایک منٹ کے لئے فرض کر لو کہ رابعہ کم حوصلہ تھی اور اس نے مشکل جیت کے مقابلے میں آسان ہار کو منتخب کر لیا ہے تو کیا مجھے یہ سمجھنا چاہئے کہ رابعہ نے ٹھیک کیا؟ نہیں۔ اس نے ٹھیک کیا ہوتا تو میں اس کا ساتھ دیتا۔ افسوس مجھے صرف اس بات کا ہے کہ وہ میرے لئے کوئی جواب نہیں چھوڑ کے گئی جو میں دوسروں کو دے سکوں۔ لیکن تم ایسا کرو گی تو تمہیں بھی مایوسی ہو گی۔ غالب تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔ وہ ہمارے ساتھ آگے بڑھ جائے گا۔ ہم آگے چلتے جائیں گے امید کے سورج کے ساتھ ساتھ۔ اور چونکہ دنیا گول ہے اس لئے آگے جانے کے باوجود ہم ایک دن پھر پیچھے پہنچ جائیں گے۔ وہیں جہاں سے چلے تھے....."

صحن کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور ماما جی اندر آگئے۔ میں اور نازو ہڑبڑا کے اٹھے۔ ماما جی کی صورت پر ہمارے سوال کا جواب تحریر تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ میرے اندازوں کی نفی کر دیں۔

میں نے کہا "ماما جی! خیریت ہے نا؟"

نازو نے کہا "کیا ہوا ماما جی؟"

ماما جی صحن میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ خالی خالی نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا "مجھے چائے لا دے بٹیا۔ بہت تھک گیا ہوں میں۔"

ان کی آواز نے غالب اور محسن کو بھی بیدار کر دیا تھا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے باہر آئے اور سوالیہ نشان بن کے کھڑے ہو گئے۔

"بھئی..... وہ اپنا منو تو تیسرے سے بچ گیا" ماما جی نے کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا۔

"کیا وہ گرفتار ہو گیا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ پولیس نے دھر لیا تھا۔ تخریب کاری اور دہشت گردی کے الزام میں" ماما جی بولے "بڑی تیاری کے ساتھ پہنچے تھے وہ۔ وارنٹ وغیرہ لے کر۔ اور ان کو سب معلوم تھا۔"

"کسی نے مخبری کی ہو گی" محسن بولا۔

غالب بولا "کسی نے کیا' وہی حرام زادے ہیں۔ دلاور اور تریوٹی۔"

"پولیس نے سب برآمد کر لیا۔ جتنا سامان تھا وہاں۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ منو کو لے جا چکے تھے۔"

"پھر آپ نے کیسے بچایا ان کو؟"

"میں نے کہاں بچایا۔ میں دخل دیتا تو وہ مجھے بھی لے جاتے۔ باہر کے معاملات سنبھالنے والا کوئی نہ رہتا" ماما جی نے کہا "وہ تو اس کے دونوں بیٹے بڑے بھیا لے گئے تھے۔"

"حسین اور حسن؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ کیسے چھوٹے چھوٹے بولے سے تھے۔ کارٹون۔ مگر کیا حوصلہ تھا ان کا۔ مجھے شرم آئی اپنے اتنے بڑے ڈیل ڈول پر۔ وہ

www.paksociety.com

جان پر کھیل گئے۔ جیسے ہی انہیں پتا چلا کہ منو کو پولیس اپنے ساتھ لے گئی ہے انہوں نے آپس ہی میں سب طے کر لیا۔ مجھ سے انہوں نے صرف اتنا کہا کہ ماماجی "آپ قریب مت آئیں۔ گاڑی کے ساتھ پولیس اسٹیشن سے دور انتظار کریں۔ منو کے خلاف جو بھی کارروائی ہوئی صبح ہوگی۔ وہ اعلیٰ افسران کو مطلع کرتے کہ دہشت گردی اور تخریب کاری میں ملوث ایک بڑا پاپی پکڑا گیا ہے جو مشرقی بنگال میں گوریلا جنگ لڑنے والوں کے لئے اسلحہ وغیرہ لے کر آیا تھا۔"

"کیا وہ منو میاں کو پہچان گئے تھے؟"

"یہ واقعی عجیب بات ہے۔ انہوں نے ابھی تفتیش شروع بھی نہیں کی۔ سب پہلے سے معلوم تھا ان کو۔ کسی نے بتایا ہوگا۔ پولیس نے انہیں لاک اپ میں بند کر دیا تھا اور وہ ضبط شدہ اسباب کی فہرست بنا رہے تھے کہ سین شین نے حملہ کر دیا۔"

میں بھونچکا سا رہ گیا "سین شین نے تھانے پر حملہ کر دیا؟"

"ہاں بھئی۔ وہ تو قیامت بن کر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے ایک کے بعد ایک دستی بم پھینکے۔ باہر والوں کو پہلے صاف کر دیا۔ پھر اندر جا کے فائر کھول دیا۔ نہ جانے کہاں سے وہ ایک مشین گن لے آئے تھے۔ میں نے تو صرف دھماکے سنے اور فائرنگ کی آواز سنی۔ انہوں نے کسی کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور چار منٹ میں لاک اپ کا گیٹ توڑ کے منو کو باہر نکال لیا۔ میں گاڑی لئے دور کھڑا ہوا تھا کہ منو دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے ایک بوری اٹھا رکھی تھی جو اس نے گاڑی میں ڈال دی اور مجھ سے کہنے لگا کہ ماماجی تم جاؤ۔ میں پہنچ جاؤں گا ورنہ۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "گیارہ ساڑھے گیارہ تک تو سین اور شین یہاں تھے۔"

"رات بارہ بجے کے قریب پولیس نے وہاں اپنی کارروائی مکمل کی تھی" ماماجی نے کہا "میں باہری تھا کیوں کہ گیٹ پر بھی پولیس کا پہرہ تھا۔ انہوں نے گیٹ کے سامنے جمع ہونے والوں کو بھگا دیا تھا۔ پھر بھی کچھ لوگ دور کھڑے کانا پھوسی کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ پاکستانی جاسوس پکڑے گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہاں وہ کیا لینے آئے تھے؟ ایک شخص نے کہا کہ یہاں بھونے کا کارخانہ تھا۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں۔ یہ ان کا خفیہ ہیڈ کوارٹر تھا۔ ان کا تعلق بنگال سے ہے۔ تیسرے کا کہنا یہ تھا کہ وہ مغربی پاکستان سے آئے ہوئے تخریب کاروں کا گروہ تھا جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ حقیقت کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ پھر بھی میرے لئے شک کی گنجائش نہ رہی کہ منو مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اسے چھڑانے کے دو ہی طریقے تھے۔ یا تو پولیس کو بھاری رشوت دی جائے اور وہ منو کو نکل جانے دیں۔ اپنی کارگزاری کی رپورٹ میں لکھیں کہ تخریب کار فرار ہو گئے لیکن تخریب کاری میں کام آنے والا سامان پکڑا گیا۔ اگر لاکھ دو لاکھ ہوتے تو شاید میں یہ طریقہ آزماتا۔ کامیابی پھر بھی مشکوک تھی۔ پولیس کی نوکری کر رہی تھی سالا بھی سب ہوتے ہیں مگر غدار سب نہیں ہوتے۔ یہ بہت سنگین تھا۔ ان میں سے ایک بھی ڈر جاتا یا اڑ جاتا تو وہ مجبور ہو جاتے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہوا تھا وہ آس پاس کے رہنے والوں نے دیکھا تھا۔ دوسرا طریقہ منو کو زبردستی چھڑانے کا تھا جو میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں باہر ہی کھڑا پریشان ہو رہا تھا۔ دونوں پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ صرف اتنا معلوم کریں کہ پولیس منو میاں کو کہاں لے کر جاتی ہے۔ باقی ہم کر لیں گے۔ سین نے کہا کہ ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آتے ہیں۔ آپ اسی جگہ... میں پولیس کے پیچھے پیچھے گیا اور پھر واپس آیا۔ سین اور شین گاڑی میں آئے تھے۔ گاڑی انہوں نے میرے حوالے کی اور کہا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے قریب آنے کی ضرورت نہیں۔ منو میاں بھی میرے پاس پہنچ جائیں گے۔ اور اس کے بعد جو ہوا وہ میں بتا دیا ہے۔"

"مگر وہ دونوں کہاں گئے؟ سین اور شین؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ... شہید ہو گئے" ماماجی نے کہا۔

"شہید ہو گئے؟" ایک ساتھ ہم سب نے کہا۔

"ہاں۔ منو نے کچھ ایسی ہی بات کی تھی۔ میں نے بھی اس سے یہی سوال کیا تھا تو وہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کے اور دعا کے ہاتھ اٹھا کے بولا۔ ماماجی "اللہ سے دعا کریں۔" میں نے کہا ان کے بارے میں... تو وہ بگڑ گیا کہ ماماجی کیسی باتیں کرتے ہو۔ مرتے ہیں لوگ عام طریقے سے۔ وہ تو زندہ ہیں۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شہید کو مت کہو۔ وہ تو زندہ ہیں۔"

ماماجی نے اقرار میں سر ہلایا "یہی مطلب تھا اس کا۔"

سین اور شین کی صورت میری نظروں میں پھر رہی تھی۔ ان سے میری شناسائی کا دور بہت مختصر تھا لیکن اتنے کم وقت میں انہوں نے ہم سب کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ دونوں بڑے شوخ، زندہ دل، سب کے خدمت گزار، مجسم انکسار۔ انتہائی تیز طرار اور جاں نثاری میں پیش پیش رہنے والے تھے۔ انہوں نے اپنی اقدار پہلے ہی ثابت کر دی تھی۔ موت کے سامنے سینہ سپر ہو کے انہوں نے تحمل بہادری کا ایک ایسا کارنامہ سرانجام دے گئے تھے جس کے سامنے ہمارے سب دعوے ہیچ تھے۔ شہادت ان کی عظیم کامیابی...

میں نے کہا "کچھ لوگ اپنی زندگی کی حرارت میں پتنگے ہوتے ہیں۔ وہ شعلہ تھے۔ جل کے خاک ہوئے اور خاک ہو گئے۔"

"ٹیپو سلطان نے کہا تھا۔ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔" محسن بولا۔

غالب نے کہا "انہوں نے اس قول کو سچ کر دکھایا۔ ہم اتنی بے خوفی سے مرنے نہ جاتے۔ یہی سوچتے رہتے کہ یہ بہادری ہے یا اقدامِ خودکشی۔"

بہت سب سوگوار ہو گئے تھے اور یہ ضروری تھا کہ اس ماتمی فضا کو ختم کرنے کے لئے موضوع بدلا جائے۔

میں نے کہا "آپ کو منو میاں نے کچھ نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟"

"نہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس بوری میں وہ سب سامان ہوگا جو پولیس نے ضبط کر لیا تھا۔ وہ اس کو کسی محفوظ جگہ پہ چھپانے گیا ہوگا۔"

"کیا یہ جگہ محفوظ نہیں ہے؟" نازو نے کہا۔

ماماجی نے کہا "ارے بیٹا! ہر جگہ محفوظ ہے اگر خدا حفاظت کرنے والا ہے اور وہ ہاتھ کھینچ لے تو پھر کوئی بھی جگہ محفوظ نہیں۔ مگر تم فکر مت کرو۔ پولیس یہاں نہیں آ سکتی۔"

نازو نے خفت سے کہا "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"اچھا چھوڑو یہ بات۔ تم سب کیا منہ لٹکائے کھڑے ہو۔ ارے جاؤ ہاتھ منہ دھو کے کچھ ناشتا وغیرہ کرو۔" ماماجی نے ایک ساتھ سب کو ڈانٹا "بھئی ہم جوان تھے تو اور بات تھی مگر اب بھی صبح اٹھ کے سب سے پہلے خدا یاد آتا ہے پھر پیٹ۔"

گل نے کہا "دل نہیں چاہ رہا ہے۔"

اس کی شامت آ گئی "لو۔ اس بالشت بھر کی لڑکی کو دیکھو۔ دل کی بات کرتی ہے ہم سے۔ ارے پاگل! اس دل کے چکر میں مت پڑنا۔ بڑا خوار کرتا ہے یہ آدمی کو۔ بھلا پیٹ کا دل سے کیا تعلق ہے؟ دو دن کھانے کو نہ ملے تجھے تو پتا چلے کہ معاملہ دل کا نہیں۔ ابھی تو تیرے پیٹ میں رات کا کھانا پڑا ہوگا... کل تک کچھ مت کھا پھر تیرا یہی دل سو پیاز اور سو جوتے بھی کھانے کو تیار رہے گا۔"

گل کی شکل رونے والی ہو گئی۔ محسن نے اس کے کان میں کہا۔ "روئے گی تو ماماجی مارین گے۔"

میں قریب تھا اس لئے میں نے یہ بات بھی سن لی۔ گل مسکرانے لگی۔ ماماجی دروازے تک گئے اور انہوں نے کسی کو آواز دے کر بلایا۔ جیب سے دس کا نوٹ نکال کے دیا اور کہا "جا ذرا گرم گرم حلوہ پوری لے کر آ۔ دوڑتا جا اور دوڑتا ہوا آ۔"

وہ دبلا پتلا کوئی لڑکا تھا۔ اس نے کہا "لو ماماجی۔ میں یوں گیا طوفان میل کی طرح اور یوں آیا۔" پھر اس نے انجن کی طرح سیٹی ماری اور بھاگ گیا۔

میں نے ماماجی کو اندر لے جا کے ان سے فوری توجہ طلب معاملات پر بات کرنے کے لئے اس مہلت سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ ہم اپنے مشن کے بارے میں انہیں بریف کریں۔ میں نے کچھ ضروری تفصیل نکال دی اور کہا۔

"منو میاں کا اور ہمارا مشن ایک ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں سے لڑ رہے ہیں اور ہم اپنے وطن کے غداروں سے۔ پاکستان کے کچھ جرائم پیشہ افراد اور اسمگلر بیرونی طاقتوں کی مدد سے اسلحہ برآمد کرتے ہیں اور مشرقی پاکستان اسمگل کر دیتے ہیں۔ ہوائی جہاز کے ذریعے یہ کام ہو نہیں سکتا چناں چہ وہ بحری اور زمینی راستے استعمال کرتے ہیں۔ ہم نے ایک گروہ کے بہت سے زخائر راستے میں ہی تباہ کر دئیے لیکن ان کا یہ دھندا ختم نہیں ہوا۔ وہ ہماری جان کے دشمن ہو گئے لیکن خدا نے ابھی تک ہمیں محفوظ رکھا ہے۔ انہوں نے سرحد کے ادھر اور ادھر کی پولیس کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا ہے چناں چہ ہم چھپ کر رہنے پر مجبور ہیں۔ اب تازہ ترین مسئلہ یہ ہے کہ وہ اسلحے کی ایک کھیپ مال گاڑی کے ذریعے روانہ کر رہے ہیں جو غالباً کلکتہ جائے گی۔ اس کے لئے ایک ایم این اے جیون پرشاد نے بمبئی کے ایک کروڑ پتی بدمعاش ترلوچنی کو دو بوگیاں دلوائی ہیں۔ یہ بوگیاں خواجہ سیمنٹ والوں کے نام پر بک ہوئی تھیں لیکن اچانک "دفاعی ضروریات" کا بہانہ کر کے ان کی بکنگ منسوخ کر دی گئی ہے۔ ظاہر ہے وہ احتجاج بھی نہیں کر سکتے۔"

ماماجی حیرت سے یہ سب کچھ سن رہے تھے "کمال ہے! تم کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"بس ماماجی، معلوم ہو ہی گیا۔ سمجھ لیں ذرا تیز نظری سے" میں نے کہا اور انہیں مختصراً گزشتہ رات کے واقعات بھی سنا دئے۔

ماماجی نے سر ہلایا "اچھا تو پھر اب کیا چاہتے ہو؟"

"سب سے پہلے تو یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ خواجہ سیمنٹ والوں کی بوگیاں کس تاریخ میں منسوخ ہوئی ہیں اور کس ٹرین کے ساتھ کہاں جا رہی تھیں۔"

ماماجی نے کہا "یہ تو میں تم کو ابھی دو گھنٹے بعد بتا دوں گا۔ ذرا بابو آ جائیں۔"

"کون بابو؟" غالب نے کہا۔

"کلرک بابو جو بکنگ کرتے ہیں۔ کیوں ماماجی؟" میں نے کہا۔

ماماجی نے میری معاملہ فہمی کو سراہا کے تعریف کی سند دی۔

"اس کے علاوہ" میں نے کہا "یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ اس مال گاڑی کے ساتھ گارڈ کون ہوگا اور انجن ڈرائیور کے علاوہ ٹرین کے ساتھ سفر کرنے والے عملے میں کون شامل ہوگا۔"

ماماجی نے کہا "یہ بھی شیڈول دیکھ کے پتا چل جائے گا۔"

"شیڈول دیکھتے وقت ایک بات کا خیال رکھیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ عملے میں تبدیلی کی گئی ہو۔ پہلے کوئی اور جا رہا ہو۔ پھر اچانک سب کو بدل دیا گیا ہو" میں نے کہا۔

"سب کو؟" ماماجی نے کہا۔

"جی سب کو۔ وہ کوشش کریں گے کہ ٹرین پر ان کا زر خرید عملہ جائے جو ان کو راستے میں وہ مراعات دے جو عام طور پر گارڈ نہیں دیتے۔ مثلاً یہ کہ ایک آدمی کو انجن ڈرائیور کے ساتھ رہنے کی اجازت مل جائے دوسرے کو گارڈ کے ساتھ مسلح بیٹھنے کی۔ وہ پوری کوشش کریں گے کہ ان کے مسلح محافظ ٹرین کے ساتھ جائیں۔ آپ سب کے نام لکھ لائیں۔ جو پہلے جا رہے تھے ان کے اور جو اب جا رہے ہیں ان کے بھی۔"

ماماجی نے کہا "یہ بھی ہو جائے گا۔ اور کچھ؟"

www.paksociety.com

میں نے کہا "ہمارے سوالات کی فہرست تو بہت لمبی ہے۔ یہ بتایئے کہ ہم کس طرح ٹرین پر جا سکتے ہیں؟"

"اگر ان کے آدمی ہوں گے ٹرین پر۔ تو تمہیں کوئی قریب بھی نہیں پھٹکنے دے گا" ماماجی بولے۔

"کیا انہیں کوئی پتا نہیں چلے گا؟ میرا مطلب ہے مال گاڑی میں عملے کے علاوہ کوئی سفر کر رہا ہو تو کیا راستے میں پوچھ گچھ نہیں ہوتی کہ یہ غیر متعلقہ افراد کون ہیں؟"

ماماجی ہنسنے لگے "پوچھ گچھ کرنے والے تو خود اپنے آدمی بٹھا دیتے ہیں کہ اسے فلاں گاؤں یا قصبے کے اسٹیشن پر اتار دینا۔ تقریباً سب ہی انجن ڈرائیور اور گارڈ اپنے ساتھ دو چار سواریاں لے جاتے ہیں اور ان سے کرایہ وصول کر لیتے ہیں۔ اس گاڑی میں مسافروں کا سفر کرنا جرم ہے مگر یہاں سب چلتا ہے۔ اگر خطرے کی بات ہو تو اسٹیشن آنے سے پہلے ان سواریوں کو پلیٹ فارم کے دوسری طرف اتار دیتے ہیں جہاں وہ ٹرین کی روانگی تک چھپے رہتے ہیں اور ٹرین روانہ ہوتی ہے تو لپک کے چڑھ جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اگر ہم ٹرین پر نہیں جا سکتے تو پھر کوئی ایسی ترکیب نکالئے کہ ہم ان دو بوگیوں کی لوڈنگ دیکھ سکیں۔"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ میں تم کو لے چلوں گا۔"

"ماماجی اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے سب جاننے والے دشمن دیاما بولی طرح چوکس ہوں گے۔ وہ ہر طرف سے نگرانی کر رہے ہوں گے اور ہم نظر آئے تو پکڑے جائیں گے۔ آس پاس پولیس بھی بہت ہوگی"

میں نے کہا "وہ خاص طور پر ان بوگیوں کے آس پاس سادہ کپڑوں میں پولیس لگوا چکے ہوں گے۔"

"پھر تم ہی بتاؤ" ماماجی نے کہا۔

"قلی تو سب آپ کے بھانجے ہیں۔ سب بھانجے ایک جیسے تو نہیں ہو سکتے۔ کچھ حرامی بھی ہوں گے۔"

ماماجی ہنسنے لگے "ہاں۔ ایک سے ایک بڑھ کر حرامی موجود ہے مگر میرے ساتھ کسی کا حرامی پن نہیں چلتا۔"

"آپ یہ معلوم کریں کہ مال کون لوڈ کرے گا۔ مال آئے گا ٹرکوں پر اور اس کے لئے وہ خود قلیوں کا انتخاب کریں گے یا ہو سکتا ہے کہ اپنے مزدور لائیں۔"

"باہر کا کوئی مزدور اندر کسی قلی کی جگہ لوڈنگ کرنے کا کام نہیں کر سکتا۔"

محسن نے کہا "ماماجی! زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ مزدور انہی کے ہوں گے۔"

ماماجی نے نفی میں سر ہلایا "اندر کون جانے دے گا انہیں؟ بمبئی کا گورنر بھی حکم دے تو قلی نہیں مانیں گے۔ سارے قلی دیوار بن کے راستہ روک لیں گے۔"

"بس تو آپ اس کے لئے تیار رہیں۔ جب ان کے مزدور سامان اتارنے لگیں تو آپ اپنے سارے بھانجوں کو کہیں کہ وہ ان کے سامنے دیوار بن جائیں" غالب نے کہا "ظاہر ہے وہ مجبور ہو جائیں گے آپ کی بات ماننے پر۔ پھر آپ خود قلی دیں ان کو۔"

میں نے کہا "وہ قلی ہوں گے ہم۔"

"تم لوگ کیسے؟"

میں نے کہا "قلی تو آپ ہی بھرتی کرتے ہیں نا۔ ایک وردی اور بیج دلوا دیں ہمیں بھی۔"

"میں بھرتی نہیں کرتا' سفارش کرتا ہوں۔ بھرتی کرنے والا افسر میری مانتا ہے مگر اپنے نہیں اور سکتا کہ میں خود بیج دینا شروع کر دوں" ماماجی نے کہا۔

"اچھا۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر اپنے کسی قابل اعتماد بھانجے سے وردی اور بیج ادھار لیں۔ جس کی باری ہو۔ معاوضہ اسے مل جائے گا لیکن اس کا سارا کام ہم کریں گے۔ وہ یہاں بیٹھ کے انتظار کریں۔"

"دو بوگیوں کو لوڈ کرنے کے لئے کم سے کم دس قلی درکار ہوں گے" ماماجی نے کہا۔

"ان میں تین ہم شامل ہو گئے تو کسی کو کیا پتا چلے گا؟"

"دوسرے قلی تو سمجھ جائیں گے۔ وہ سب ایک دوسرے کو نمبر سے جانتے ہیں۔"

"آپ ان کو سمجھا نہیں سکتے؟" میں نے کہا۔

ماماجی کچھ دیر سوچتے رہے پھر انہوں نے سر ہلایا "اچھا میں ذرا ان کا پتہ نہ چلے۔ مگر یہ سوچ کہ تمہارے دشمنوں نے پہچان لیا تمہیں پھر؟"

"تب بھی آپ کچھ تو کرا ہی لیں گے" میں نے کہا۔

ماماجی ہنسنے لگے "تم لوگ جو کام کر رہے ہو' ایسی جوانی میں ہم نے بھی بہت کئے۔ لڑکیاں ہمارے ساتھ بھی ہوتی تھیں۔ اور ہم کام کرتی تھیں۔ ٹرین کی پٹری پر بم باندھنے سے وردی بم پھینکنے تک۔ لیکن ہم ان کو ہر جگہ ساتھ نہیں لئے پھرتے تھے پھر آج کل زمانہ بھی وہ نہیں۔ انسان اور درندے میں کوئی فرق نہیں رہا۔"

میں نے کہا "ہم بھی سمجھتے ہیں اس فرق کو' لیکن ہم کیا کریں' مجبوری ہے۔ انہیں ہم چھوڑ نہیں سکتے۔"

"اور ہم چھوڑنا بھی چاہیں تو وہ کب ہمیں چھوڑتی ہیں" غالب نے کہا۔

ایک ساتھ منو میاں اور طوفان میل اندر آ گئے۔ طوفان میل تو وہی لڑکا تھا جو حلوا پوری لینے گیا تھا۔ وہ بیچ بیچ دوڑتا ہوا آیا تھا اور ہانپ رہا تھا۔ اس نے ہمیں غور سے دیکھ کر کہا "دیکھا ماماجی! کتنی جلدی آیا ہوں میں۔"

ماماجی نے اسے ایک روپیہ دیا "جا عیش کر" اور وہ سیٹی بجاتا ہوا بھاگ گیا۔

ہم سب منو میاں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ بہت تھکے ہوئے اور شکست خوردہ سے نظر آ رہے تھے۔

"معاف کرنا ہمیں کچھ دیر ہو گئی" انہوں نے کمرے میں دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھنے کے بعد یوں کہا جیسے یہ معمولی تاخیر تھی۔

میں نے کہا "ماماجی نے ہمیں بتا دیا ہے۔"

"ہم سب کو بڑا دکھ ہوا۔ وہ بڑے اچھے لڑکے تھے" غالب نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"کوئی اور بات کرو" منو میاں نے چڑچڑے پن سے کہا۔ شاید یہ ذکر بھی ان کو دکھ دیتا تھا۔

میں نے فوراً بات بدل دی "آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

"مجھے وہ سب سامان چھپانا تھا۔ اللہ کا شکر ہے ان کے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگا۔ میں سب سمیٹ لایا بوری میں" منو میاں بولے۔

"کہاں چھوڑا ہے وہ سب سامان؟"

"ہے ایک جگہ۔ ہم اپنا سب سامان ایک ہی جگہ نہیں رکھتے تھے کہ کبھی جان بچا کے بھاگنے کا وقت آ جائے تو ہم خالی ہاتھ نہ رہ جائیں" منو میاں نے کہا۔

میں یہ پوچھتے پوچھتے رہ گیا کہ کیا رات کو معین' شمیم اسی دوسرے ٹھکانے سے سٹین گن اور دستی بم وغیرہ لے کر تھانے پر حملہ آور ہوئے تھے۔

منو میاں نے اچانک ریوالور نکال لیا۔ ان کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی جیسے پُر آسیب مرگھٹ میں بد روحیں۔ وہ زندگی سے برگشتہ تھے۔ جو کچھ اس دنیا نے انہیں دیا تھا۔ تجربات و حوادث کی شکل میں' اسے وہ اپنے لہو کا تاوان دے کر لوٹانا چاہتے تھے۔ وہ مایوسی کی اس انتہا کو پہنچ چکے تھے جہاں تسخیر کائنات کا عزم رکھنے والا' پہاڑوں سے بلند حوصلہ رکھنے والا اور امید کو نا قابلِ شکست یقین سے وابستہ رکھنے والا بھی ہمت ہار جاتا ہے۔

منو میاں کے ارادے کو ہم سب نے ہی سمجھ لیا تھا مگر ان کے ہاتھ سے ریوالور چھین لینے کی کوشش میں نازو کامیاب رہی۔ وہ اسی وقت گل کے ساتھ اندر آئی تھی۔ گل نے چائے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی اور نازو کے ایک ہاتھ میں وہ سلور کی کیتلی تھی جس میں چائے ابالی گئی تھی۔

اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے منو میاں کے ہاتھ پر کیتلی ماری۔ ریوالور منو میاں کے ہاتھ سے نکل کے اڑتا ہوا چھت کی طرف گیا اور پھر نیچے آیا تو غالب نے کیچ کر لیا۔ منو میاں کے ہاتھ کی کلائی ٹوٹنے سے رہ گئی تھی مگر انہیں سخت چوٹ آئی تھی۔ تکلیف سے زیادہ یہ اپنی بزدلانہ کوشش میں ناکامی کا ردِ عمل تھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں اور محسن بھی ان سے ریوالور لینے کے لئے ہی جھپٹے تھے۔ نازو نے قریب ہونے کا فائدہ اٹھایا مگر اس سے زیادہ یہ نازو کی حاضر دماغی تھی کہ ریوالور پر نظر پڑتے ہی اس نے منو میاں کے ارادے کو سمجھ لیا تھا۔

میں نے منو میاں کو جھنجھوڑ کے کہا "کیا آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ کیا حرکت کرنے والے تھے آپ؟"

منو میاں نے مظلوم صورت بنا کے ہم سب کی طرف دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

"مجاہد کو ایسی حرام موت زیب نہیں دیتی" محسن نے کہا۔ "ساری عمر لڑتے رہے اور اب خود اپنی جیت کو ہار میں بدلنا چاہتے تھے۔"

ماماجی کا چہرہ سب سے زیادہ دکھی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے آئے اور منو میاں کے پاس بیٹھ گئے۔

"منو! مجھے معلوم ہے تو کتنا دکھی ہے" انہوں نے نرمی سے کہا۔ "لیکن دکھ کا یہی علاج کرنا تھا تو پہلے کرتا۔ جب تو اکیلا رہ گیا تھا۔ جب تیرے بیوی بچوں کو انہی لوگوں نے شہید کیا تھا جن پر تو اعتبار کرتا تھا۔ تجھے یاد ہے تیری کیا حالت تھی؟"

منو میاں نے ندامت سے سر کو اقرار میں ہلایا۔

"آج تو ہم سب کو اکیلا کرنا چاہتا تھا" ماماجی نے کہا "وہی دکھ ہمیں دینا چاہتا تھا جو تو نے جھیلا تھا؟ ہم کیا دشمن ہیں تیرے کہ تو بدلہ ہم سے لے گا؟ پورے خاندان سے بدلہ لے گا؟"

"خاندان۔۔۔ میرا ہے کوئی خاندان؟" منو میاں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیوں۔ میں کون ہوں؟ تیرا کچھ نہیں لگتا میں؟ کیا تیرے باپ کی جگہ نہیں ہوں میں؟ انکار کر دے اگر ہمت ہے تو۔ اور دیکھ' کیسے رشتے ملاتا ہے خدا۔ ان بھائیوں کو دیکھ۔ کیسے جیالے بھائی مل گئے ہیں تجھے۔ ان کو دیکھ۔ کیسی قابلِ فخر بہنیں ہیں تیری" ماماجی نے ہم سب کی طرف باری باری دیکھا۔

منو میاں سر جھکائے بیٹھے رہے۔ آخر کار انہوں نے سر اٹھایا۔ "مجھے معاف کر دینا۔ ماماجی۔ تم سب۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔"

ماماجی نے مسکرا کے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ "چل اب جا کے ہاتھ منہ دھو۔ ناشتا کر۔ پیٹ خالی ہو تو دماغ بھی خالی ہو جاتا ہے۔"

موضوع بدلنے کے لئے میں نے کہا "آج بہت سے کام نمٹانے ہیں۔"

محسن نے بھی میرا مدعا سمجھ لیا "بھاڑ میں گئے کام۔ پہلے پیٹ پوجا۔"

"تم لوگ آج باہر مت نکلنا" منو میاں نے کہا "پولیس بہت زیادہ دباؤ میں ہے۔ کئی افسر معطل ہو چکے ہیں اور صوبائی ہوم سیکریٹری کو وضاحت کے لئے دہلی طلب کیا گیا ہے کہ آخر یہ کیا تخریبی سرگرمیاں اچانک شروع ہو گئی ہیں اور تخریب کار ابھی تک پکڑے کیوں نہیں گئے۔"

ناشتے کے بعد ماماجی نے کہا "میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے میں واپس آؤں گا۔ تم خود کچھ مت کرنا۔"

میں نے کہا "ہم آپ کی واپسی کا انتظار کریں گے۔"

منو میاں رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ ان کو پولیس نے مارا بھی بہت تھا اور اس کے بعد تھانے کے اندر کی معرکہ آرائی میں بھی ان کو زخم آئے تھے۔ معین اور شمیم کی موت کے صدمے نے ان کو توڑ کے رکھ دیا تھا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ تنہا

www.paksociety.com

دھوکے زخموں پر دوا لگائیں مگر وہ راضی نہیں ہوئے۔
"یہ تو کچھ بھی نہیں سکندر میاں۔ ایسے تو بہت مرتبہ ہوا کہ ہم جنگلوں میں چھپتے پھرے۔ کئی کئی دن درختوں کے پتے تک کھائے، مٹی کیچڑ میں پڑے رہے۔ جنگل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی جنگل ہی ہے۔ میں کیا گھبراؤں اور کیسے ان معمولی خراشوں کی فکر کروں جب کہ میرے دو شیر جوان خون میں لت پت پڑے ہیں۔ لاوارث اور بے گور و کفن۔ ان کے جسم جھلس گئے ہیں اور گولیوں سے چھلنی ہو گئے ہیں۔ میں زندہ ہوں۔ اتنا بوڑھا ہو گیا ہوں صدمات جھیلتے جھیلتے۔ سب مرتے جاتے ہیں۔ میں ہر بار بچ جاتا ہوں۔ آخر موت کو مجھ سے کیا دشمنی ہے! یہ کس گناہ کی سزا دے رہا ہے خدا مجھے کہ میں اپنی آنکھوں سے ان سب کو مرتا دیکھوں جو مجھ سے محبت کرتے ہوں۔ جن سے مجھے محبت ہو۔ نحوست ہے میرے وجود میں۔ جو میرے ساتھ تعلق رکھتا ہے کوئی رشتہ قائم کرتا ہے۔ وہ مر جاتا ہے!"
منو میاں نے ہم سے کہا تھا کہ حسین یا شمین کا ذکر نہ کریں جس سے انہیں دکھ ہوتا ہے مگر دکھ کے اس آتش فشاں سے پھٹ نکلنے والے لاوے کو دبانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ انہوں نے خود ہی دلِ صد چاک کر کے ہمارے سامنے رکھ دیا اور اس کے ہر زخم پر خون کے آنسوؤں میں بھیگے ہوئے جراحت کے پھول نچھاور کرنے لگے۔ ان کا درد ایک رکا ہوا سیلاب تھا۔ جب بند ٹوٹ گیا تو صبر و ضبط کے سارے بند بھی ٹوٹ گئے۔
ہم سب سنتے رہے اور انہیں پھوٹ پھوٹ کر روتا دیکھتے رہے۔ وہ سب کچھ بھرا پڑا رہتے تھے۔ حسین کیا تھا اور شمین کیا تھا۔ بچپن سے اب تک انہوں نے کیسے آداب فرزندی نبھائے۔ ان کا کتنا خیال رکھا۔ ان کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ صرف جان نچھاور کرنا باقی تھا سو انہوں نے یہ بھی کر دکھایا۔
ماما جی رو کے تھکنے سے بھی پہلے لوٹ آئے۔ اس وقت تک منو میاں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے سو چکے تھے۔ وہ نیند میں بھی بے چین تھے مگر جسم کے لئے آرام کا یہ وقفہ غنیمت تھا۔
"منو سو گیا؟" ماما جی نے گہری سرد آہ بھر کے کہا۔ "بے چارہ بد نصیب۔ پھر اکیلا ہو گیا۔"
میں نے سرگوشی میں کہا "آہستہ بولیں۔ ابھی بہت رو کے سوئے ہیں۔"
ماما جی نے کہا "تمہارا اندازہ ٹھیک تھا۔ گڈز ٹرین کے گارڈ اور ڈرائیور کو بدل دیا گیا ہے۔"
"آپ تو سب کو جانتے ہوں گے۔ جو گارڈ اور ڈرائیور اب جا رہے ہیں وہ کیسے آدمی ہیں؟"
ماما جی نے سر ہلایا "انہی کے جیسے۔ ایک نمبر حرامی ہیں دونوں۔ کئی بار معطل بھی ہو چکے ہیں مگر ان کے پیچھے کوئی طاقتور ہاتھ ہے۔"
میں نے سوچ کے کہا "اگر بوگیاں جیون پرشاد ایم ایل اے کی کوشش سے منسوخ ہونے کے بعد انہیں ملی ہیں تو غلہ بھی اسی نے اپنی مرضی سے رکھوایا ہوگا۔"
"جیون پرشاد کا بھی اس کاروبار میں حصہ ہوگا؟"
"حصہ نہ سہی کمیشن ضرور ہوگا" محسن بولا۔
"یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے" ماما جی نے کہا۔
"آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ پہلے کون جا رہا تھا اس ٹرین کے ساتھ؟"
"ہاں۔ ان کے نام روسٹر میں لکھے ہوئے ہیں۔ بابو نے بتایا کہ وہ آج ہی واپس آئے تھے۔ ان کو بتایا گیا کہ ڈیوٹی بدل گئی ہے چنانچہ پرسوں وہ دوسری ٹرین پر جائیں گے۔ کل کا دن ان کے لئے آف ہے۔"
"انہوں نے احتجاج نہیں کیا؟"
"احتجاج کی کیا بات ہے اس میں۔ ڈیوٹی لگانے والے اپنی مرضی سے ادھر ادھر کرتے رہتے ہیں۔"
"یہ گاڑی پرسوں کس وقت روانہ ہوگی؟"
"صبح ساڑھے پانچ بجے" ماما جی نے کہا "خواجہ سیمنٹ والوں کی بوگیاں پہلے درمیان میں تھیں۔ اب ایک انجن کے پیچھے لگائی جائے گی۔ دوسری گارڈ کے ڈبے سے پہلے۔"
میں نے کہا "ایک شروع میں اور ایک آخر میں۔ مجھے یہی ڈر تھا۔ انجن ڈرائیور اور گارڈ کے ساتھ وہ اپنے آدمی بٹھائیں گے۔"
محسن نے اچانک کہا "ماما جی! آگے پیچھے کوئی ایسی بوگی ہے جس میں مویشی جا رہے ہوں۔"
"ہوگی۔ ایک بوگی تو ضرور ہوگی۔ گائے بھینسوں کے لئے۔ سنا ہے کسی نے ایک اسپیشل بوگی اپنے ریس کے گھوڑوں کے لئے بھی بک کرائی ہے۔"
میں نے محسن کی بات کا مقصد سمجھ لیا تھا۔ مویشیوں والے ڈبے میں انسانوں کا چھپ کے سفر کرنا نسبتاً آسان تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خطرہ بھی تھا کہ دشمن اس ڈبے پر خاص نظر رکھیں گے۔ اس امکان کو وہ بھی نظرانداز نہیں کریں گے کہ ہم اس ڈبے سے تخریبی کارروائی کا آغاز کر سکتے ہیں۔
"ریس کے گھوڑے لے جانے والی بوگی کون سی ہوگی، کیا یہ پہلے معلوم ہو سکتا ہے؟"
ماما جی نے کہا "یہ تو کل دن میں ہی پتا چل جائے گا۔ گھوڑے رات کو سوار ہوں گے۔ رات کے وقت ہی باقی سامان بھی لدا ہوگا۔"
"انہوں نے صحیح ٹرین کا انتخاب کیا ہے۔ رات کے وقت لوڈنگ کا کام زیادہ رازداری کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔"
"تم لوگوں کے لئے میں نے وردی اور بیج کا بندوبست کر لیا ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ تم پکڑے جاؤ گے۔ تمہارے چہرے قلیوں والے چہرے نہیں ہیں" ماما جی بولے۔
میں نے کہا "ماما جی! اب آپ نے ایک نئی بات بتائی ہے۔ ریس کے گھوڑوں کے ساتھ بھی دو چار خدمت گار سائیس

ٹرینر وغیرہ جا رہے ہیں۔ ممکن ہے کوئی ڈاکٹر بھی جائے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ ذمے داری ہم کیوں نہ قبول کر لیں۔"
"کون سی ذمے داری؟"
"گھوڑوں کی ماما۔ گھوڑے بیچارے راستے میں کیا مانگیں گے۔ وہی اپنا چارا۔ چارا ہم ڈال دیں گے۔"
"ابھی کل کا دن بھی باقی ہے ماما جی" غالب نے جوش سے کہا۔ "آپ اپنے تعلقات استعمال کریں اور پتا چلائیں کہ ان گھوڑوں کا خیال رکھنے والے کتنے لوگ جائیں گے۔ وہ کون لوگ ہیں۔ ان کے نام پتے اگر مل جائیں...."
"تمہاری فرمائشوں کا معاملہ مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ خیر کوشش کرتے ہیں" ماما جی نے کہا "لیکن ان کی جگہ تم لوگ کیسے لو گے؟ یہ بھی سوچا ہے۔"
"ہم بھی کوشش کریں گے ماما جی" میں نے کہا "یہ کام کوئی اتنا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ میں، غالب اور نازو گھوڑوں کے ساتھ سفر کر سکتے ہیں۔ میں محافظ۔ غالب سائیس اور نازو ویٹرنری سرجن۔"
"کیوں نازو؟"
"میں گدھوں کے ساتھ سفر کر رہی ہوں۔ گھوڑے بھی ان کے کزن ہی ہوتے ہیں" نازو نے کہا۔
"تم نے اپنا اپنا کام اپنی مرضی سے چن لیا۔ میں اور گل کیا گھوڑوں میں شامل ہوں گے؟" محسن نے کہا۔
"ہو تو سکتے تھے مگر وہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے برا مانیں گے" غالب نے کہا۔
میں نے کہا "میاں محسن حسن خان شیروانی! آپ کو مرنے کا کوئی تجربہ ہے؟"
"بھائی سکندر اعظم! آپ کیا بھول گئے کہ ہم ایک ساتھ مرتے تھے اور اکثر مرتے تھے۔ ایک باقاعدہ پروگرام کے تحت بھی [illegible] اس پر" محسن بولا "اور آج بھی مرتے ہیں۔"
کسی ارادے کے بغیر اس نے یہ بات کہتے ہوئے گل کی طرف دیکھا اور گل کا رنگ ایک دم بدلا۔ مایوسی اور پژمردگی کے باوجود اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ خود فریبی کے طلسم سے دل کو بہلائے رکھنا چاہتی ہے کہ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی۔ مذاق میں یا جھوٹ میں، محسن کے تو سہی [illegible] مرتا ہوں۔
میں نے کہا "میں فوت ہونے کی بات کر رہا تھا۔ فرض کریں آپ فوت ہو جائیں۔"
گل نے خوفزدہ لہجے میں کہا "سکندر بھائی! ایسا مذاق مجھے اچھا نہیں لگتا۔"
محسن نے کہا "سکندر مذاق کب کر رہا ہے۔"
میں نے بھی کہا "مذاق کی کون سی بات ہے اس میں۔ فرض کریں یہاں کلکتے کا رہنے والا کوئی کرسچن فوت ہو جاتا ہے۔ اس کا نام پیٹر یا یوسف مسیح کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اب اس کی میت کو تابوت میں رکھ کے کلکتہ لے جانا ہو تو اسی مال گاڑی سے۔ پھر؟"
"پھر کیا؟ تابوت ہوائی جہاز میں جا سکتے ہیں تو مال گاڑی میں کیوں نہیں جا سکتے؟" محسن بولا۔
ماما جی نے نفی میں سر ہلایا "بہت مشکل طریق کار ہے اس کے لئے خصوصی اجازت نامہ چاہئے اور میڈیکل رپورٹ کہ لاش کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔"
میں نے کہا "ہمارے ملک میں۔ میری مراد انڈیا اور پاکستان دونوں سے ہے۔ ہر قاعدہ اور ضابطہ اس لئے بنایا جاتا ہے کہ کوئی اس کی خلاف ورزی کرنا چاہے تو شوق سے کرے۔ بس متعلقہ حکام کو راضی کرے۔ راضی کرنے کے لئے کوئی پاپڑ نہیں بیلنے پڑتے اور لوہے کے چنے نہیں چبانے پڑتے۔ صرف نوٹ خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ جیسا کام ویسے دام۔ یہ ایک عام اصول ہے۔ ایک تابوت لے جانے میں گارڈ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہ اجازت نامہ نہیں ہے۔ اجازت وہ خود دے سکتا ہے۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ کے معاملات کو نظرانداز کرنا بھی اس کے دائرہ اختیار میں ہے۔ پیسہ دینے کے علاوہ اس کی منت سماجت بھی کی جا سکتی ہے۔"
محسن نے کہا "کیا [illegible] بھی ساتھ جائے گی؟"
"یہ کیسی باتیں شروع کر دی ہیں تم لوگوں نے؟" گل نے برہمی سے کہا۔
"تم چپ کرو" محسن نے اسے ڈانٹا "تمہیں کیا معلوم کام کیسے ہوتے ہیں۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔"
ماما جی نے کہا "یار کچھ مجھے بھی تو سمجھاؤ۔"
میں نے کہا "ماما جی! یہاں کرسچن کافی ہیں۔ ایسی دکانیں بھی ہوں گی جہاں سے "کفن باکس" یا تابوت ملتے ہوں گے۔ آپ ایک تابوت کا بندوبست کریں۔ زیادہ قیمتی نہ ہو لیکن جتنا بڑا مل سکے بہتر ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم باہر نہیں نکل سکتے اور اس مرحلے پر کوئی رسک لینا مناسب بھی نہیں۔ کوئی ایسی جگہ ہے جہاں سے گل یہ تابوت اٹھا کے ریلوے اسٹیشن پہنچایا جا سکے، عین گاڑی کی روانگی کے وقت؟"
ماما جی نے کہا "تابوت میں کون ہوگا؟"
محسن نے کہا "میں۔"
میں نے کہا "تابوت میں سوراخ ہوں گے پیچھے کی طرف۔"
"جب تابوت فرش پر رکھا جائے گا تو سوراخ بند ہو جائیں گے" غالب نے اعتراض کیا۔
"تابوت کے چاروں کونوں پر ایک ایک انچ کے پائے لگوائے جا سکتے ہیں۔ یہ کام ہم خود کر لیں گے آج رات۔ سوراخ بھی کر لیں گے اور پائے بھی لگا لیں گے۔ بس آپ تابوت کسی ایسی جگہ

www.paksociety.com

بیٹھ جائیں جہاں ہم اپنا کام کسی قسم کی مداخلت کے ڈر سے بے نیاز ہو کے کر سکیں" میں نے کہا۔

ماما جی کچھ دیر سوچتے رہے پھر انہوں نے کہا "ٹھیک ہے۔ لیکن یہ کام تم اپنی ذمے داری پر کرو گے۔"

"اب آپ کے ذمے تین کام ہیں" میں نے انگلیوں پر گنتے ہوئے کہا "نمبر ون۔ یہ معلوم کریں کہ گھوڑے کس کے ہیں اور ان کے ساتھ کتنے لوگ جا رہے ہیں' وہ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ نمبر دو۔ ایک کنگ سائز تابوت خاموشی سے کہیں پہنچانا ہے اور رات کو ہمیں یہاں سے نکال کر لے جانا ہے۔ تابوت والا کام آج ہی ہو جانا چاہئے۔ دیگر معلومات بھی اگر آج ہی حاصل ہو جائیں تو اچھا ہے۔"

"تیسرا کام کیا ہے؟"

"تیسرا کام ہے ایک اچھے سے میک اپ مین کا بندوبست۔ جو آج رات پھر اپنا کام کرے اور صبح معاوضہ لے کر رخصت ہو جائے۔ تم لوگوں کے پاس اب کتنی رقم ہے؟"

سوال نازو اور گل سے کیا گیا تھا۔ انہوں نے دوسرے کمرے میں جا کے مشورہ کیا اور واپس آ کے بتایا "ایک لاکھ چالیس ہزار۔"

"میک اپ مین کو دس ہزار تک دیے جا سکتے ہیں۔"

ماما جی نے حیرانی سے کہا "پاگل ہو گئے ہو کیا۔ ایک ہزار بھی بہت ہیں۔"

میں نے کہا "آپ پیسے کو مت دیکھیں۔ کام ایسا ہو کہ ہم بھی ایک دوسرے کو نہ پہچان پائیں۔ باقی معاوضہ راز داری کا ہے۔"

غالب نے کہا "آپ کے بھانجے بھی آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔"

ماما جی نے نفی میں سر ہلایا "یہ ایسے کام نہیں ہیں جو میں کسی بھانجے کے سپرد کر دوں۔ سب مجھے خود ہی کرنا پڑے گا۔ کام بہت سے بتا دیئے ہیں تم نے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے ابھی روانہ ہو جانا چاہئے۔"

"شام تک آپ کی واپسی کی امید ہے؟"

"انشاءاللہ۔ لیکن دیکھو' تم خود کچھ مت کرنا۔ میں پھر بتا رہا ہوں کہ باہر تمہارے لئے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ جو لڑکا صبح ناشتا لایا تھا' وہ کھانا بھی لا دے گا۔ یہاں سے تیسرے کوارٹر میں رہتا ہے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو اسے بلا لینا۔"

ماما جی کو میں نے چند دواؤں کی مختصر سی فہرست کے ساتھ بڑے اصرار سے پچیس ہزار روپے دیئے مگر انہوں نے صرف پانچ ہزار رکھے اور رخصت ہو گئے۔

سارا پلان میرے ذہن میں تھا۔ اس کی تفصیلات پر ہم نے دن بھر غور کیا۔ گل اور نازو کو اس پلان سے بالکل اتفاق نہیں تھا مگر اس کی وجہ عقلی نہیں جذباتی تھی۔ کہا تھا پھر اسٹیشن سے منگوایا تھا۔ دن کا باقی حصہ ہم نے سو کے اور ستو میاں نے رو کے گزارا۔ ہوتے ہی انہیں کچھ قرار آ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ چند دن میں بم بنانے کا سامان' ایک مشین گن اور دو وائرلیس ٹرانسمیٹر بھی تھانے سے واپس نکال لائے تھے۔ ضرورت پڑنے پر یہ چیزیں پھر جائیں گی۔

ماما جی رات کو آئے تو اپنی دن بھر کی کارگزاری پر بہت خوش تھے۔ وہ ریلوے کے اپر کلاس کے ویٹنگ روم میں نماز پڑھ کے آئے تھے۔ چائے پینے اور حقے کے دم لگانے کے بعد انہوں نے دن بھر کی روداد کا خلاصہ پیش کیا۔

"میاں! ایک تو ایسی خبر ہے کہ تم سن کے اچھل پڑو گے۔ معلوم ہے وہ ریس کے گھوڑے کس کے ہیں؟ پی ایم ایل اے جیون پرشاد کے۔"

"سب ایک ہی سلسلہ ہے۔ ایک پنتھ دو کاج۔ فرق یہی ہے کہ جیون پرشاد کے مال کی نوعیت میں فرق ہے مگر دونوں کے لئے لاکھوں کا مال ہے۔ دونوں کے محافظ ایک ساتھ ہوں گے تو ان کی طاقت دگنی ہو جائے گی۔"

"گھوڑوں کے ساتھ ایک محافظ اور ایک ڈاکٹر جا رہا ہے۔ محافظ ایک نوکر بھی ہے۔ وہ گھوڑوں کے ساتھ کل صبح ہی روانہ ہو کے دوپہر تک وہاں پہنچ جائے گا جہاں سے گھوڑوں کو مال گاڑی میں سوار کیا جائے گا۔ گھوڑے چالیس فٹ لمبے' ہر طرف سے بند ڈبے میں ہوں گے جسے اسی طرح کرین سے اٹھا کے ٹرین پلیٹ فارم ٹائپ بوگی پر رکھ دیا جائے گا۔ در اصل ریس کے گھوڑے پہلے بھی بمبئی اور کلکتہ کے درمیان آتے جاتے رہے ہیں" اس لئے معلومات حاصل کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ گھوڑوں کی تعداد پانچ ہو گی اور وہ ایک زرد رنگ کے کنٹینر میں ہوں گے جو جیون پرشاد کی ملکیت ہے اور گھوڑوں کے لئے ہی بنایا گیا ہے۔ ہر گھوڑے کے لئے اس میں الگ خانہ ہے۔ درمیان میں چار فٹ کی دیوار ہے۔ ایسے کنٹینر عام طور پر بھاری مشینری وغیرہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور بحری جہازوں پر بھیجا جانے والا سامان ان میں بند کر کے رکھا جاتا ہے تاکہ خراب یا چوری نہ ہو۔ اس کنٹینر کو ایک ٹرک کھینچ کر لائے گا۔ تم نے دیکھا ہو گا' سامان شہروں کے درمیان لانے لے جانے کے لئے ٹریلر استعمال ہوتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا" میں نے کہا۔

"اس چالیس فٹ لمبے کنٹینر کے آخری حصے میں گھوڑوں کے ساتھ جانے والے عملے کے لئے آٹھ فٹ چوڑا کیبن ہے جس میں چار افراد کے سونے کے لئے اوپر نیچے بینچ ٹائپ سیٹیں ہیں۔ ایک کونے میں باتھ روم ہے۔ اس کیبن کا راستہ اندر سے گھوڑوں والے حصے میں کھلتا ہے مگر گھوڑوں کو چڑھانے اور اتارنے کے لئے پیچھے والا دروازہ استعمال ہوتا ہے۔ اب ستو ساتھ جانے والوں کی بات۔ ڈاکٹر بھی پرانا ملازم ہے۔ مویشی ڈاکٹر ہے۔ لیکن ایک عورت بھی ان کے ساتھ جائے گی جو اوپر کے سارے کام کرتی ہے۔"

میں نے کہا "پھر تو کام بن گیا۔ میں لے سکتا ہوں محافظ کی جگہ۔ غالب بن جائے ڈاکٹر اور نازو اس کی مددگار۔ مگر ابھی یہ ایک خیال ہے۔ اس پر عمل در آمد یقیناً آسان نہیں ہو گا۔"

"میری تو سمجھ میں آتا نہیں کہ تم یہ کام کیسے کرو گے؟" ماما جی نے پریشانی سے کہا۔

"ایک بات اور بتائیں۔ کیا اس ٹرین کے گارڈ اور ڈرائیور انہیں جانتے ہیں؟ جیون پرشاد ایم ایل اے کے گھوڑوں کو اور ان کے خدمت گاروں کو۔"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ جانتے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ جانتے ہوں" ماما جی نے کہا۔

"تابوت کا کیا بنا؟"

"تابوت رکھا ہوا ہے ایک خالی مکان میں۔ میک اپ مین بھی رات نو بجے آ جائے گا۔ چل کے دیکھ لو۔ اور میک اپ مین سے بھی بات کر لو" ماما جی نے کہا "اسے جو سمجھانا ہے خود ہی سمجھا دو۔"

ستو میاں نے جو بہت دیر سے خاموش تھے' مایوسی سے کہا۔ "میرے لئے کوئی کام نہیں رہا؟"

میں نے کہا "ستو میاں! سب سے اہم ذمے داری آپ کو سونپی جائے گی۔ ہمارے جانے کے بعد۔ میرا مطلب ہے' اگر ہم ٹرین پر سوار ہو کے نکلنے میں کامیاب رہے تو پھر آپ کا کام شروع ہو گا۔ اور وہ ایسا کام ہے جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔"

ستو میاں کا چہرہ امید کی روشنی سے منور ہو گیا "ایسا کون سا کام ہے؟"

میں نے کہا "اطمینان رکھیں۔ میں آپ کو سب بتا دوں گا۔"

ہم رات کے کھانے کے بعد نکلے۔ اندھیرا اس وقت ہمیں تحفظ فراہم کر رہا تھا اور ماما جی ہمیں کسی محفوظ راستے سے لے جا رہے تھے۔ ہم ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر دوسری طرف ہو گئے اور نیچے اتر کے ایک سڑک پر آ گئے۔ یہ دو تین میل کا فاصلہ ضرور ہو گا جو ہم نے ایک گھنٹے میں طے کیا۔ پھر ماما جی نے ایک ویران نظر آنے والے گھر کا قفل دروازہ کھولا اور ہم باری باری اندر داخل ہو گئے۔ ماما جی نے دروازہ بند کر کے لائٹ جلائی۔

مکان میں ایک ہی کمرا تھا جس کے وسط میں تابوت بند رکھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر والے حصے میں ایک فٹ چوڑا اور ایک فٹ لمبا شیشہ بڑی صفائی سے فٹ کیا گیا تھا جس میں سے لاش کا چہرہ دیکھا جا سکتا تھا۔ گل کے ساتھ اب نازو بھی دہشت زدہ نظر آنے لگی تھی۔

میں نے محسن سے کہا "ذرا لیٹ کے دکھاؤ اپنے تابوت میں۔"

گل نے احتجاجاً زرد لہجے میں کہا "ایسا مت کرو۔"

میں نے پلٹ کے اسے دیکھا اور درشتی سے کہا "دیکھو گل! اگر اتنا کمزور دل ہے تمہارا تو تمہیں آنا ہی نہیں چاہئے تھا ہمارے ساتھ۔ ہم اس قسم کی جذباتی حماقت کا روگ نہیں پال سکتے۔ زندہ آدمی اگر قبر میں بھی لیٹ جائے تو مردہ نہیں کہلاتا۔ میں تم پر بھروسہ کروں یا نہ کروں: ابھی بتا دو۔ یہ کام تو تمہیں محسن کے ساتھ مل کے کرنا تھا۔ اور یہ بہت اہم ذمے داری ہے۔ اس پر ہمارے پلان کی کامیابی کا انحصار ہے۔"

گل شرمندہ نظر آنے لگی "مجھے معاف کر دیں سکندر بھائی۔ میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔"

محسن نے ہنس کے کہا "ارے پاگل! یہ تو کھیل ہے' ایک دلچسپ کھیل۔ میں ابھی لیٹتا ہوں۔ یہ دیکھو" وہ ایک دم تابوت کا ڈھکنا اٹھا کے لیٹ گیا۔

غالب نے کہا "کیا میں اور سکندر منکر نکیر کی طرف سے چند سوالات کر سکتے ہیں؟"

محسن باہر نکل آیا "یار! اس میں بستر لگا دیں ورنہ میری تو کمر تختہ ہو جائے گی۔"

"تمہیں زیادہ نہیں' دو تین گھنٹے ہی اندر گزارنے ہیں" میں نے کہا "کل رات ہم جب تم کو اس میں بند کریں گے تو تمہارے لئے پانی کی ایک بوتل اور بسکٹوں کا ایک پیکٹ رکھ دیا جائے گا۔ تمہارا چہرہ کافی بدلا ہوا ہو گا۔ گل تمہاری بیوہ کی حیثیت سے ساتھ جائے گی۔ یہ اس کی اداکاری اس کا کام ہے۔ بظاہر تابوت کی پیچوں سے بند ہو گا لیکن در حقیقت سب چھوٹے پیچ ہوں گے جو اوپر والے ڈھکنے کی لکڑی میں ہی رہ جائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ تابوت کو گارڈ والے ڈبے میں ہی رکھا جائے گا۔ جب ٹرین شہر کی حدود سے باہر نکل جائے گی تو موقع پاتے ہی گل تمہیں سگنل دے گی اور تم ڈھکنا کھول کے باہر آ جاؤ گے۔ ریوالور کے ساتھ۔ پھر گارڈ کو قابو کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہونا چاہئے۔"

"تابوت کو اٹھا کے کون لے جائے گا؟"

میں نے ماما جی کی طرف دیکھ کے کہا "اس کا انتظام بھی کر لیں گے کچھ نہ کچھ۔ دوسری طرف بھی غالب اور نازو شری جیون پرشاد کے گھوڑوں کی رکھوالی سنبھال لیں گے۔"

"ان تینوں کا کیا کرو گے؟"

"اگر انہوں نے مزاحمت کی تو ہم انہیں ناک آؤٹ کر دیں گے۔ اگر انہیں مارنا پڑ جائے تو یہ بھی جائز ہے" میں نے کہا۔

"راستے میں کہیں بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ان کے لئے یہ کوئی نیا کام نہیں۔ وہ

www.paksociety.com

گھوڑوں کے ساتھ آنے جانے رہتے ہیں۔ راستے میں کسی کو چیک کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ گھوڑے بگھی سے سوار ہوں گے تو گنگنے میں آنا رکنے جائیں گے۔ ہجڑ کی طرح۔ اگر پلان کے مطابق تم نے گارڈ پر قابو پالیا اور ہم بھی اپنے مقصد میں کامیاب رہے تو پھر مسئلہ رہ جانے گا صرف انجن ڈرائیور کا۔"

"گارڈ اور انجن ڈرائیور کے ساتھ بھی تو زیبی کے محافظ ہوں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ انہیں تو فوراً مار دیا جائے۔ جنگل میں فائر کی آواز کوئی نہیں سنے گا۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ گارڈ اور ڈرائیور کی قوت مزاحمت دم توڑ دے گی۔ پھر وہ رہنمائی کریں گے جیسا ہم کہیں گے۔"

"ہمارے جانے کے بعد منو میاں کا کیا کام رہ جائے گا؟ ان کے لئے کون سی سب سے اہم ذمے داری ہے؟" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "وہ زیبی سے اور جیون پرشاد سے رابطہ قائم کریں گے اور...."

میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک ساتھ چونک کر سب نے دروازے کی طرف اور پھر ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں دیکھتا ہوں" ماما جی نے کہا اور آگے بڑھ کے دروازہ کھولا۔ ایک پادری اندر آگیا۔

اس نے سینے پر صلیب بنا کے کہا "مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہاں خدا نے کسی جسم کی روح کو اپنے پاس طلب کر لیا ہے" وہ تابوت کی طرف بڑھا۔

تابوت ہم سب کے درمیان کھلا ہوا اور خالی پڑا تھا۔

اس سے پہلے کہ پادری آگے بڑھ کر تابوت میں جھانکتا، ماما جی نے اس کا راستہ روک لیا۔

"اے بھائی پادری صاحب! آخر کس نے بلایا ہے تمہیں یہاں؟" ماما جی نے کہا۔

پادری حیران ہو کے بولا "کیا یہاں کوئی بھی اللہ کو پیارا نہیں ہوا؟" اس نے ہم سب کو غور سے دیکھا۔

"ہم میں سے کون ہے جو تم کو ایک لاش نظر آتا ہے؟" میں نے کہا۔

"اور کیا تابوت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کوئی فوت ہو چکا ہے؟" محسن بولا۔

"پھر تم ایسے کیوں کھڑے ہو؟ لواحقین کی طرح رونی شکل بنا کے" پادری نے کہا۔

غالب نے کہا "تابوت کے پاس کھڑا رہنے کون خوشی سے قہقہے لگا سکتا ہے فادر؟"

"آئی ایم سوری۔ کسی نے مجھے گمراہ کیا" پادری نے افسوس سے سر ہلایا اور واپس جانے کے لئے پلٹا۔

"شاید کسی نے آپ کے ساتھ مذاق کیا۔"

"مگر ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا" وہ جاتے جاتے رک گیا۔

"ہونی... دنیا میں بہت کچھ ہو رہا ہے۔ جو پہلے کبھی نہیں ہوا" میں نے کہا "اگر آپ اخبار پڑھتے ہیں تو آپ کو سب معلوم ہوگا"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "مگر یہ تابوت کس کے لئے ہے؟"

محسن نے کہا "یہ کیسا عجیب سوال ہے۔ کیا قبرستان کی قبر دیکھ کر کوئی بتا سکتا ہے کہ وہاں کس کی قبر بنے گی؟"

غالب نے سر ہلایا "اور کھدی ہوئی قبر دیکھ کر کوئی بتا سکتا ہے کہ اس میں کون دفن ہوگا؟"

"میں سمجھ گیا" پادری نے ملول ہو کے سر ہلایا "شاید تمہارا کوئی عزیز یا دوست فوت ہونے والا ہے۔"

میں پادری کی فضول باتوں سے تنگ آگیا تھا "ممکن ہے ہم سے ہی کوئی فوت ہو جائے۔"

نادر اور گل نے برا ماننے ہوئے مجھے گھورا مگر غالب نے دلیل دی "آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔"

"یہ بہت غلط ہوگا" پادری نے نصیحت کے انداز میں کہا "تم میں سے کوئی خودکشی کرنا چاہتا ہے.... زندگی خدا کی امانت ہے۔"

"امانت کے بچے جا تے ہو یا... " ماما جی بگڑ گئے۔

پادری کا چہرا افسردہ ہو گیا "ورنہ کیا تم مجھے مار کے باہر ڈال دو گے؟"

میں نے نرمی سے کہا "آپ بلاوجہ دخل اندازی کر رہے ہیں اور ہمارا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ بہتر ہے آپ تشریف لے جائیں ورنہ ہم آپ کو اٹھا کے باہر پھینک دیں گے۔ معذرت کے ساتھ۔"

"اچھا تو پھینک دو" پادری وہیں دھرنا مار کے بیٹھ گیا "پہلے تو خود اور پھر گھر آئے مہمانوں کو باہر پھینکنے کی دھمکی دیتے ہو۔"

ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پادری کا توازن خراب معلوم ہوتا تھا۔ پہلے وہ تسلیم کر چکا تھا کہ کسی نے اس کے ساتھ مذاق کیا ہوگا۔ اب کہہ رہا تھا کہ اسے ہم نے بلایا تھا۔ وہ کوئی مشکوک فرد نہ تھا لیکن اس کو جسمانی طور پر اٹھا کے پھینکنے کا نتیجہ ہنگامہ آرائی کی صورت میں نکلتا اور ہم چاہتے تھے کہ سب خاموشی اور رازداری کے ساتھ ہو رہا تھا اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔

"اے میاں لاٹ پادری!" ماما جی نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دئیے "خدا کے لئے اٹھ جاؤ... نے تمہیں نہیں بلایا۔ مسلمان ہیں۔ مریں گے تو ہماری نماز جنازہ کوئی مولوی پڑھائے گا۔ اس وقت بھی تمہاری ضرورت نہیں ہوگی....."

وہ اچانک ہنس پڑا "ارے ماما جی۔ آپ کی نظر بھی دھوکا کھا گئی۔ اب اندر جینے دو جلوہ لگوا لیجئے۔"

"ارے تو! جنے کی اولاد" ماما جی نے حیرانی کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا "ارے لیڈر! ارے باز..."

پادری اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنا چغہ اتار دیا۔ چغے کے نیچے وہ قمیص پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس کی داڑھی بھی مصنوعی تھی اور سر کے بالوں کی وگ کے نیچے اس کا سر درمیان سے بالکل صاف تھا۔ ہم سب ہکا بکا کھڑے اس کی ظاہری حالت میں رونما ہونے والے انقلاب کو دیکھتے رہے۔

ماما جی نے مسکرا کے کہا "میاں یہ ہے میک اپ مین جسے میں نے بلایا تھا۔ بڑے کمال کا آدمی ہے۔"

محسن نے کہا "کمال کے اس مظاہرے کے بعد تو کسی تعریف کی ضرورت باقی نہیں رہی۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا "بھئی مان گئے تمہیں استاد۔ تم نے تو ماما جی کو بھی چکر میں ڈال دیا!"

وہ خوش ہو کے ہنسا "ہم نے سوچا تھوڑی دل لگی ہی سہی۔"

"مگر یہ بہت خطرناک مذاق تھا" محسن نے کہا "جس کے نتائج کا تمہیں اندازہ نہیں۔"

غالب نے محسن کی تائید کی "اچھا ہوا کہ بات زبانی جمع خرچ تک محدود رہی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ایک پادری پر کوئی ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ میں نے بھی یہ بھیس اس لئے بدلا تھا کہ میرا راستہ کوئی نہ روکے۔ ریلوے کالونی کے گیٹ پر مشکوک افراد کو روک لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم تو مشکوک نظر نہیں آتے۔"

اس نے کہا "مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کوئی جان پہچان والا نہ مل جائے۔ بیس سال سے فلم انڈسٹری میں جھک مار رہا ہوں۔ کامیابی کی لاٹری ابھی تک نہیں نکلی۔ سب قسمت کے کھیل ہیں" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

"قسمت کو الزام کیوں دیتا ہے" ماما جی نے کہا "تو نے دل لگا کے کبھی ذرا کام کیا ہے تماشائی کے بیگن۔ ادھر سے ادھر لڑھکتا پھرتا ہے اب یہ تیری عادت ہے۔"

"یہ تو آپ نے ٹھیک کہا" وہ اداس ہو کے بولا "عادتیں خراب ہیں! در مستقل مزاجی نہیں ہے۔ یہ بھی تو تقدیر کی خرابی ہے۔"

"اب چل زیادہ بن مت۔ باتیں مت بنا" ماما جی نے کہا اور پھر ہم سے مخاطب ہو گئے "اس کا نام ہے یوسف خان اور اتفاق سے یہ بھی پشاور کا رہنے والا ہے۔ کتنے یوسف خان ہوں گے آج کل پشاور میں؟ شاید سیکڑوں۔ کیا وہ سب دلیپ کمار بن سکتے ہیں؟"

"اسی لئے تو کہتا ہوں ماما جی کہ سب کھیل تقدیر کے ہیں" یوسف خان نے کہا "دلیپ کمار کے کیا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے۔"

"سرخاب کا پر اس نے خود اپنی محنت اور صلاحیت سے لگایا" ماما جی نے کہا۔

میں نے مسکرا کے کہا "کیا تم بھی گھر سے دلیپ کمار بننے نکلے تھے؟"

"ہاں۔ ایسا تھا ایکٹر بنے۔ مگر کون سا کام ہے۔ مرا ہے... کہ... کوئی ایسی بات نہیں۔ سب ہی بچے سے لے کر جاتے ہیں اتفاق ہے... سازاور سٹوڈیو کا مالک محبوب بھی پہلے لائٹ مین تھا۔ تقدیر کے سامنے ایک ارادہ ہوتا ہے اور ایک حیلہ ہوتی ہے بڑے گن تھے اس میں۔ یہ ہمت نہ ہارتا تو کچھ بھی بن سکتا تھا مگر ہوا یہ کہ دو سال بھی جم کر اس نے کوئی ایک کام نہیں کیا۔ چھوٹے موٹے رول ملنے شروع ہوئے تو یہ ایک فوٹوگرافر کے ساتھ ہو گیا۔ کیمرہ مین بننا بھی کیسا آسان کام ہے۔ ڈیڑھ سال بعد اس نے پٹری بدل لی۔ ستار نوشاد کے پاس جا کر گیا۔ بانسری بجا لیتا تھا۔ انہوں نے رکھ لیا مگر سال بھر کے بعد کسی سازندے ریکارڈسٹ کی نوکری پر مر مٹا اور اس کا شاگرد ہو گیا۔ در اصل اس پاگل کو کسی نے یہ الٹی پٹی پڑھادی تھی کہ بمبئی میں کامیابی کے لئے حسین صاحب نے ضرورت بڑی ہے اور یہ حسین صاحب ہی تلاش کرتا پھرا۔ ایکٹر عارضی سہارے اس کی بربادی کا سبب بن گئے۔ اپنے دوست بنجر بنانے انڈسٹری میں جتنے دشمن بنا لئے۔ اب دو سال سے میک اپ مین بنا ہوا ہے۔"

"کس کی وجہ سے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بتا بھئی کس کی وجہ ہے؟" ماما جی نے اس کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارا۔

"مار دیا ماما جی۔ کندھا ہی توڑ دیا۔ وجہ بس اپنا شوق ہے اور کیا" وہ کندھا سہلاتے ہوئے بولا۔

"ابھی ایک سال رہا ہوں گا" ماما جی نے کہا "صاف کیوں نہیں بتاتا کہ ایک میک اپ آرٹسٹ کی بہن کے چکر میں پڑ گیا تھا اور ابھی تک میک اپ سے بھیس بدل بدل کر ملنے جاتا ہے اس سے ورنہ اس کا شوہر تیا پانچا کر دے۔"

غالب نے کہا "شادی ہو چکی ہے اس کی؟"

"ہاں۔ بڑا خونخوار قسم کا سکھ ہے اس کا شوہر۔ بھائی نے شادی کر دی تھی کہ یہ چکر ختم ہو جائے گا۔ وہ سکھ ہے یہ مسلمان۔"

"ماما جی! عشق کا کیا مذہب اور کیا ذات۔ عشق تو بس ہے" یوسف خان نے آہ بھری "دیکھ لو شادی سے کوئی فرق نہیں..."

www.paksociety.com

پڑا۔"

میں نے متاثر ہو کے کہا "یوسف خان! اگر یہ واقعی عشق تھا تو پھر تم نے اس سے شادی کیوں نہیں کر لی؟"

محسن نے بھی کہا "ہاں۔ تم اسے مسلمان کر سکتے تھے۔"

"میں اس کے لئے خود سکھ بن جاتا" غالب نے کہا۔

یوسف خان نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا! "یہ بات آپ لوگ نہیں سمجھو گے۔ جب شادی ہو جائے تو پھر عشق کہاں رہتا ہے۔ عشق تو نام ہے جدائی کا۔ صرف آرزو کا۔ ایک تڑپ کا۔ اسے دیکھنے کی تڑپ۔ اس سے ملنے کی تڑپ۔ اس کی خاطر جان کی بازی لگانے کی تڑپ۔ شادی تو بہت آسان کام تھا۔ یہ عشق بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ عشق ہے۔"

ہم سب دم بخود کھڑے یوسف خان کے عشق کی گہرائی کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عام لوگوں کی طرح ہم نے بھی اس کے عشق کو سطحی نظر سے دیکھا تھا مگر یوسف خان جس عشق کی بات کر رہا تھا اس کا حاصل جسموں کا ملاپ نہیں تھا۔ یہ عشق کا مادی روپ نہیں تھا۔ یہ ایک ماورائی جذبہ تھا۔ عشق حقیقی کی طرح۔ یہ تصوف کا فلسفہ تھا جس کو بیان کرنے والا کوئی صوفی نہیں تھا بلکہ ایک عام آدمی تھا۔ دنیا کی نظر میں ناکام مگر خود اس ناکامی کو اپنی کامیابی سمجھ کے شاد کام۔ دنیا بھی کیا عجائب خانہ ہے۔ کیا "تماشا گاہ" ہے۔ ہر قدم پہ سامان حیرت بھی ہے' نیرنگی قدرت بھی اور اہل بصارت کے لئے اسباب بصیرت بھی۔

ماما جی بھی کچھ متاثر نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے کہا "اچھا بھئی یوسف خان! تیری بات اپنے پلے تو پڑی نہیں لیکن تمہاری بات دھیان سے سن لے آگے بعد میں گڑبڑ نہ ہو۔ ہاں میاں سکندر! تم بتا دو اسے سارا کام۔"

میں نے کچھ تذبذب کے ساتھ کہا "ماما جی! ہم یوسف خان پہ بھروسہ کر سکتے ہیں نا؟"

ماما جی نے خفگی سے کہا "تمہیں مجھ پہ بھروسہ ہے یا نہیں؟"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ماما جی۔" میں نے کہا۔

"کوئی اور ماما جی کر یہ بات' مجھے پہلے بھی دیکھا تھا تم نے"

ماما جی کا غصہ کم نہیں ہوا "میں کون سا انجانا ماما ہوں تم سب کا۔ پھر آنکھ بند کر کے کیوں چلے آئے تھے میرے گھر میں؟"

"وہ۔۔۔ منو میاں آپ کو جانتے تھے۔۔۔؟"

"تم منو میاں کو جانتے تھے؟" ماما جی نے کہا۔

"وہ میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ۔۔۔۔۔"

"چھوڑو مطلب کی بات" ماما جی نے میری بات کاٹ دی۔ "سکندر میاں! یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے میں نے۔ ساری زندگی ایسے ہی گزاری ہے جیسے تم اب گزار رہے ہو۔ دوست دشمن میں تمیز کرنا آتا ہے مجھے۔ کھوٹے کھرے کی پہچان رکھتا ہوں۔ کوئی دھوکا نہیں دے سکتا مجھے۔ اور تم ڈر رہے ہو کہ میں تمہیں دھوکے میں نہ رکھوں۔ میرے منہ پر شک کی کالک ملتے ہو۔"

معاملہ بڑی مشکل سے رفع دفع ہوا۔ میں نے ہی نہیں میرے ساتھ غالب اور نازو' گل اور محسن نے بھی ان سے معافی مانگی تب کہیں جا کے ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

میں نے یوسف کو اپنے پورے پلان سے آگاہ کر دینا بہتر سمجھا۔ "ٹھیک اب ہم سب کا ہو گا۔ کیسے ہو گا' یہ فیصلہ تم خود کرو۔ ہم ایک مال گاڑی کے ساتھ جائیں گے۔ مال گاڑی میں ایک تو ڈرائیور ہوتا ہے سب سے آگے اور ایک ہوتا ہے گارڈ سب سے پیچھے۔"

"تو آپ لوگ ڈرائیور اور گارڈ بننا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ ذرا صبر سے کام لو۔ ہم انجن ڈرائیور کیسے بن سکتے ہیں؟ گارڈ بھی نہیں بن سکتے۔ اس لئے کہ یہ کام ہم نے کبھی نہیں کیا۔ ہمارا مقصد اس مال گاڑی پر قبضہ کرنا ہے۔"

"مال گاڑی پہ۔۔۔۔۔ قبضہ؟" یوسف بھونچکا سا گیا۔

"ہاں۔ ہم اسے ہائی جیک کریں گے" غالب نے کہا۔

"جیسے ہوائی جہاز ہائی جیک ہوتے ہیں" محسن بولا۔

"مگر۔۔۔ تم اسے لے کر کہاں جاؤ گے؟ اور کیسے لے جاؤ گے آخر؟ جہاز تو کسی بھی جگہ اتارا جا سکتا ہے لیکن پٹڑی کے بغیر ریل تو نہیں چل سکتی۔"

"یار' یہ تمہارا درد سر نہیں ہے کہ ہم ٹرین کو سڑک پر دوڑاتے ہیں یا اڑا کے لے جاتے ہیں۔ تم پوری بات سن لو گے تو سمجھ جاؤ گے" میں نے کہا "ٹرین کی سب سے آگے اور سب سے پیچھے والی بوگی میں۔ یعنی انجن کے پیچھے والی اور گارڈ کے ڈبے سے اگلی۔ اس میں شاید کچھ لوگ ہوں گے جن سے ہمیں نمٹنا پڑے گا۔ چناں چہ گارڈ کے ڈبے میں یہ تابوت جائے گا۔ تابوت میں یہ مُردہ ہو گا۔ اور یہ اس مُردے کی بیوہ۔ ہم گارڈ کو رشوت دے کر یا کسی اور طرح راضی کر لیں گے کہ وہ تابوت کو لے جانے کی اجازت دے۔"

"کہاں تک؟"

"ہم راستے میں کسی جگہ کا نام بتا سکتے ہیں جو زیادہ دور نہ ہو" میں نے کہا "ٹرین کے روانہ ہوتے ہی مُردہ خود تابوت میں سے نکل آئے گا۔ اس کی بیوہ موقع پاتے ہی گارڈ بابو کو ناک آؤٹ کر دے گی اور پھر مُردے سے کہے گی کہ اٹھو مُردے۔"

یوسف دانت نکالنے لگا "یہ تو بہت مشکل اور خطرناک کام ہے۔ فرض کرو مُردے نے انکار کر دیا۔ کہ ابھی تو قیامت نہیں آئی۔ صور اسرافیل کی آواز نہیں سنی میں نے۔۔۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا "خطرے کی اس میں کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے پکا بندوبست کیا ہے کہ مُردہ گھبرا کے ہی اٹھ کھڑا ہو۔ تم تو بس مُردے کا ایسا میک اپ کرو کہ وہ ذرا بھی زندہ نظر نہ آئے۔ اور اس کی بیوہ واقعی بیوہ لگے۔"

"میں سمجھ گیا۔ یہ کام کب ہوتا ہے؟"

"کل۔ شام کے بعد۔" میں نے سوچ کے کہا "ٹرین علی الصبح ساڑھے پانچ بجے روانہ ہو گی۔ ہم رات بارہ بجے کے بعد تابوت ٹرین پر چڑھانا چاہتے ہیں۔ تمہیں کتنا ٹائم لگے گا اس کام میں؟"

"میرا اندازہ دو گھنٹے۔ میں آٹھ نو بجے یہ کام شروع کر سکتا ہوں" یوسف نے محسن اور گل کے چہروں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"اہم بات یہ ہے کہ شیر دل صاحب جو خالص پٹھان نظر آتے ہیں' بالکل اینگلو انڈین دکھائی دیں۔ محسن خان نہیں بلکہ رابرٹ۔ اور یہ خاتون۔ گل بانو۔ کوئن میری یا وکٹوریہ۔ تم بمبئی کی اس رنگ دار انگریز کی نقال اقلیت سے بخوبی واقف ہو۔ جیسا ان کا چہرہ' لباس اور حلیہ ہوتا ہے' ایسا ہی اس کا بنا دو۔"

"مس گل بانو کو اینگلو انڈین اردو آتی ہے؟"

میں نے گل کی طرف دیکھا "آ جائے گی کل تک۔ زبان کو بگاڑ کے بولنا کیا مشکل ہے۔ سدھارنا مشکل ہوتا ہے۔"

"اب آپ فرمائیں اپنے بارے میں۔"

"صبح ہم قلی بن کے پھرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس اپنی وردی ہو گی' بیج ہو گا۔ بس ہماری شکلیں قلیوں جیسی نہیں ہیں۔ وہ تم بنا دو" میں نے کہا "ہم بنگالی نظر آئیں یا مدراسی۔ بس وہ نظر نہ آئیں جو ہم ہیں۔ ہمارے دشمن بہت تیز نظر رکھتے ہیں اور بہت چوکس ہیں۔ وہ ہمیں نہ پہچان پائیں۔"

"ہمارا کیا خاک کمال ہو گا' اگر کسی نے آپ کو پہچان لیا۔"

"تم صرف اپنے کمال کی بات کر رہے ہو۔ یہ ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ہم پہچانے گئے تو سمجھو پکڑے گئے اور پکڑے گئے تو مارے گئے" میں نے کہا۔

"اگر ہم مارے گئے تو تم بھی مارے گئے" غالب نے کہا۔

"چناں چہ تمہارے لئے بھی یہ کمال کا نہیں زندگی اور موت کا سوال ہی ہے" محسن نے کہا۔

"کیوں خواہ مخواہ دھمکیاں دیتے ہو۔ کیا میں سمجھتا نہیں کہ تم کیا کر رہے ہو۔ اور تمہاری مدد کر کے میں کیا کر رہا ہوں؟ یہ کھیل تماشا نہیں' کوئی ڈراما نہیں ہو رہا ہے۔ جس کے لئے آپ سب میک اپ کرا رہے ہو" یوسف خفا ہونے لگا۔

میں نے کہا "اگر تم سمجھتے ہو تو بہت اچھی بات ہے۔"

"تم اسے دھمکی نہیں' حقیقت کا اظہار یا اعتراف سمجھو" غالب نے کہا۔

"میں صبح کس وقت آؤں؟" یوسف نے سر ہلایا۔

"صبح سات آٹھ بجے" میں نے کہا "کیوں ماما جی؟"

ماما جی چونکے "ہاں۔ یہ وقت ٹھیک ہے۔ دس بجے سے پہلے تو ہم جا نہیں سکتے۔"

محسن نے کہا "اگر یہ کام ابھی ختم ہو جائے تو کیا یہ بہتر نہ ہو گا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ صبح دوبارہ آنا نہیں پڑے گا" یوسف نے کہا۔

"تم سامان لائے ہو میک اپ کا؟"

"ہاں۔ وہ سب چھپا کر لانے کے لئے ہی تو میں نے بھیس بدلا تھا" یوسف نے کہا۔

"ایک بات اور سمجھ لو" میں نے کہا "اسی ٹرین پر ایک ڈبے میں کچھ گھوڑے جائیں گے۔"

"ریس کے گھوڑے" محسن نے وضاحت کی۔

"گھوڑوں کے ساتھ تین افراد ہوں گے۔ ایک ٹرینر۔ دوسرا ان کا ڈاکٹر اور ایک خادم یا اسسٹنٹ۔ ان تینوں کی جگہ ہم لینے کا ارادہ رکھتے ہیں" میں نے اپنی' غالب اور نازو کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا ہمارے قلیوں والے چہرے چل جائیں گے؟"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں" یوسف نے کہا "میں نے تو ان کے چہرے نہیں دیکھے۔"

"ان کے چہرے تو ابھی ہم نے بھی نہیں دیکھے" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا ہو گا۔۔۔"

"کل دیکھیں گے" میں نے کہا "اگر قلیوں کی وردی اتار کے لباس بدلنے سے کام چل گیا تو چلا لیں گے۔"

غالب نے کہا "یہ بہت بڑا رسک ہے۔"

محسن نے بھی کہا "ہاں۔ ضروری نہیں کہ ٹرین پر جانے والے گارڈ اور انجن ڈرائیور۔ یا دوسرے محافظ ان سے ناواقف ہوں۔"

میں نے کہا "خیال تو ٹھیک ہے تمہارا۔ نہ وہ اتنا احمق ہے اور نہ تم ذہین۔ وہ ٹرین پر سب اپنے آدمی بھیج رہے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے نہ ملوا دیں۔ وہ سب صورت آشنا ہوں گے۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانتے ہوں گے۔ ان کے درمیان کوئی اجنبی ہو گا تو سب کو نظر آ جائے گا۔"

"جناب یوسف خان صاحب!" محسن نے کہا "آپ ایسا کریں' کل کا دن ہمارے ساتھ ہی گزاریں تاکہ جب اور جہاں آپ کی ضرورت پڑے آپ دستیاب ہوں۔"

"بالکل ٹھیک ہے" غالب نے کہا "چہ اکارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔"

"کیا۔۔۔ کیا بولا آپ نے؟"

ماما جی نے سر کھجایا "میاں' فارسی ہم نے بھی نہیں پڑھی"

"مطلب یہ ہوا اس کا کہ ایسا کام عقل مند آدمی نہیں کرتا جس پر بعد میں پچھتانا پڑے" غالب نے بڑی متانت سے کہا۔

"یہ بات کہنے کے لئے فارسی بولنا ضروری تھا؟" محسن نے کہا۔

"ہم پر کوئی رعب نہیں پڑا" نازو نے کہا جو بہت دیر سے چپ تھی "معلوم ہے تم کتنے عالم فاضل ہو۔"

www.paksociety.com

"یہ جہالت کا کیمیکل ہے۔" غالب نے کہا "جس میں تم سب مبتلا ہو گئے ہو۔"

میں نے کہا "یوسف! تم مجھ سے بات کرو۔"

"آپ حکم کریں۔"

"تمہیں کل کوئی مصروفیت تو نہیں ہے؟"

"ہوئی تو میں ٹال دوں گا۔" وہ بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ کوئی مصروفیت نہیں ورنہ تم یقین کے ساتھ کہتے۔" غالب نے کہا۔

"ایسا ہی سمجھ لیں۔" یوسف نے جھینپ کر کہا۔

"بس تو تم صبح آجاؤ۔" میں نے کہا۔

"کہاں آجاؤں؟"

"ماما جی کا گھر تو ضرور دیکھا ہو گا تم نے۔"

وہ ہنسنے لگا "اپنا ایک ہی تو گھر ہے یہاں۔ اپنے ماما جی کا گھر میں پہنچ جاؤں گا۔"

"اب پہنچ جاؤں گا نہیں، ابھی چل۔ تیرے کون سے نو دس بچے واپسی کا انتظار کریں گے۔" ماما جی نے اس کے شانے پر عادت کے مطابق اپنا بھاری ہاتھ مارا۔

"ہائے ماما جی۔ دوسرا کندھا بھی توڑ دیا۔" وہ شور مچانے لگا۔

"اب ٹھیک ہو گئے ہیں دونوں کندھے۔ برابر ہیں دونوں طرف سے۔" ماما جی نے کہا۔

نازو نے کہا "کتنا اچھا ہوتا اگر آپ حضرات کی عقل شریف میں یہ بات پہلے آجاتی۔"

"اس سے کیا ہوتا؟" غالب نے کہا۔

"یہ ہوتا کہ ہم آرام سے گھر بیٹھ کے سب معاملات طے کر لیتے۔ یہاں ایک ٹانگ پر کھڑے نہ رہتے۔" نازو نے کہا۔

"اگر تمہاری عقل شریف میں یہ بات آجاتی کہ دو ٹانگوں پر کھڑے رہنے میں کوئی قباحت نہیں تو کتنا اچھا ہوتا۔" غالب بولا۔

"ہم نے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔" محسن نے غالب کا ساتھ دیا "تم اپنی مرضی سے ایک ٹانگ پر کھڑی رہیں۔"

"تم تابوت پر بیٹھ بھی سکتی تھیں۔"

"شرفا اور اعلا قدروں میں کوئی معیوب بات نہیں۔"

غالب نے محسن پر ہاتھ رکھ کے کہا "آپ کے اس پسندیدہ صوفے کے بغیر یہ تابوت صرف لکڑی کا ایک صندوق ہے۔"

گل کی صورت پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے "جو منہ میں آتا ہے بکتے چلے جاتے ہو۔"

نازو نے اسے کھینچ لیا "چھوڑو۔ ان کے منہ مت لگو۔"

"اگر آپ لگنا چاہیں تو ہمیں خوشی ہو گی۔" محسن نے کہا۔

غالب نے قہقہہ مار کے کہا "محاورے کے مطابق نہیں، عملاً منہ لگنا ہمیں ہماری خواہش کے مطابق ہو گا۔"

یوسف اس چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہو رہا تھا جس میں غصہ تھا پیار کے انداز کے ساتھ۔ برہمی تھی ادائے ناز کے ساتھ۔ لیکن ماما جی پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ وہ ہماری بے تکلفی پر ناخوش تھے۔

"میاں! یہ چھچھورپن زیب نہیں دیتا تمہیں۔" انہوں نے دلاری میں کہا "چلو اب لڑائی اور آپس میں بے تکلفی کی حد بھی ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔"

میں نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہا "بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ میں بھی ان دونوں کو یہی سمجھاتا ہوں۔"

محسن اور غالب وضعیت سے پیچھے چلتے رہے۔ گل اور نازو ان سے بھی چند قدم پیچھے تھیں۔

"میں بھی ان دونوں کو یہی سمجھاتا ہوں۔" غالب نے کہا۔

"اور میں بھی۔" محسن بولا "مگر آج کل کی لڑکیاں۔ توبہ! نہ شرم نہ حیا۔ دیکھ لینا قیامت انہی کی وجہ سے آئے گی۔"

"جب آئے گی یہ بھی بتا دو۔" نازو نے کہا۔

"ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی۔" غالب نے ڈانٹا۔

"خواتین چھپاتی ہیں اپنی عمر۔" جب سے آج تک انٹرویو میں اپنی تاریخ پیدائش بتائی ہے؟" محسن نے کہا۔

"اور کچھ نہیں چھپاتے؟" گل نے کہا۔

"چھپاتے ہیں۔" غالب نے اعتراف کیا "بیوی سے اصل آمدنی۔ رات کو دیر سے لوٹنے کے اسباب۔۔۔"

"اور وہ سامان جو مرنے کے بعد نکلتا ہے۔ چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط۔" محسن نے کہا۔

"بس بس۔ تم اپنی بات کرو۔" نازو نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا "تمہارے پاس سے نکلیں گی اپنی ہی تصویریں جو اخباروں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مطلوب ہے۔ گرفتاری پر انعام۔ اشتہاری مجرم جیسے عنوانات کے ساتھ۔"

"اور عدالتوں کے سمن۔ وارنٹ۔" گل نے کہا۔

ماما جی نے دوبارہ کچھ نہیں کہا۔ غالباً انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ "ناقابل اصلاح" لوگ ہیں۔ چکنا گھڑا، ان پر نصیحت کا وہی اثر ہوتا ہے جو چکنے گھڑے پر پانی کا ہوتا ہے۔ وہ سب سے آگے تیز تیز قدم اٹھاتے چلے گئے۔ میں رفتار بڑھا کر ان کے ساتھ ہو گیا۔ ہمارے اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ دل لگی کے لئے یا اعصابی کشیدگی کم کرنے کے لئے غالب اور محسن کی گل اور نازو سے لڑائی جاری تھی۔

نہ جانے کتنی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ ان کی آوازیں خاموش ہو گئی ہیں۔ خاموشی ان کے مزاج کے خلاف تھی اور وہ اتنے پیچھے بھی نہیں رہ سکتے تھے کہ ان کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچتی۔ جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔

"معلوم نہیں یہ سب لوگ کہاں رہ گئے۔" میں نے تشویش کے ساتھ کہا۔

ماما جی نے کہا "پریشان کیوں ہوتے ہو۔ آجائیں گے۔ کوئی بچے تو نہیں کہ راستہ بھول جائیں۔"

میں نے کہا "میں دیکھ کے آتا ہوں۔ آپ چلیں۔"

"اچھا۔ میں چلتا ہوں۔"

میں چند قدم ہی واپس گیا تھا کہ مجھے یوسف مل گیا۔ وہ اکیلا تھا۔

"باقی سب کہاں رہ گئے؟" میں نے کہا۔

"وہ ادھر ریلوے لائن کے پار بنگالی کا پان کھانے کے لئے گئے ہیں۔ ایک نیم چیز ہے۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "کون؟ بنگالی یا اس کا پان؟"

وہ ہنسنے لگا "دونوں۔ سالا نشہ ڈالتی ہے اس میں۔ جو ایک بار کھا لیتا ہے روز پہنچ جاتا ہے۔ اس بہانے اپنا اصل دھندا خوب چلاتا ہے۔"

"اصل دھندا کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"بمبئی میں اصل دھندا کیا ہے، تم نہیں جانتے؟ یہ جو سیکڑوں ہزاروں لڑکیاں ہر سال یہاں فلموں کی ہیروئن بننے پہنچتی ہیں اور ایکسٹرا بھی نہیں بن پاتیں، وہ کیا کرتی ہیں؟ خیر چھوڑو۔ تمہیں کیا ضرورت ہے جاننے کی۔ تم ہماری لائن کے آدمی ہی نہیں ہو۔ چلو ہم چلتے ہیں۔ تمہارے ساتھی آگئے۔" یوسف نے کہا۔

میں نے یوسف سے کہا "مجھے تمہاری زندگی پر رشک آتا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"ہر فکر سے آزاد ہو تم۔ نہ گھر نہ بیوی بچے۔ نہ گزرے ہوئے دن کا غم نہ آنے والے دن کا مسئلہ۔ جہاں چاہا چلے گئے۔ جو ملا کھا لیا۔ جو ہاتھ آیا پہن لیا۔ جس پر دل آیا اس کے لئے زندگی کا راستہ بدل لیا۔ جہاں تک ساتھ رہا چلتے رہے۔ پھر کہیں کسی بھی موڑ پر قدم کسی اور منزل کی طرف اٹھ گئے تو پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔"

"یار! تجھ میں اور گل کے کتے میں کوئی فرق نہیں۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"یہ کیوں سمجھتے ہو تم؟"

"بے مقصد زندگی کو میں اور کیا سمجھوں؟ آدمی جئے تو کسی مقصد کے لئے۔ مرے تو کسی مقصد کے لئے۔ کوئی موت ہو زندگی کی۔ اپنا اختیار ہو زندگی پر۔ ورنہ ایسے کوئی نہیں جی سکتا۔ دسویں جماعت کی کتاب میں ایک شعر پڑھا تھا میں نے۔ نہ اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی سے گئے۔ لائی حیات آگئے موت لے چلی چلے گئے۔ شاید غالب کا شعر ہے۔"

اگرچہ اس نے ذوق کے شعر کا ستیاناس کر دیا تھا مگر وہ اپنا مفہوم بیان کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ میری بات کا مقصد اسے لفظوں میں جتانا نہیں تھا مگر وہ مایوس اور افسردہ نظر آنے لگا تھا۔

"تم سب کی زندگی میں مقصد کی اہمیت ہے۔" وہ بولا "اور یہ مقصد ہے کامیابی۔ میں ناکامیوں کے راستے پر چل رہا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارے ساتھ قدم ملا کے چلوں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"تم جس ٹرین کو پکڑنے کی کوشش کرنا چاہتے ہو وہ نکل چکی ہے۔" میں نے اسے دوٹوک اور صاف الفاظ میں حقیقت سے آگاہ کر دینا بہتر سمجھا "صرف خواہش کی کمند ڈال کے آدمی اس وقت کو اسیر نہیں کر سکتا جو گزر چکا ہو۔ ہر کام کے لئے ایک وقت اور ہر وقت کے لئے ایک کام ہے۔ تم جو کام کر رہے ہو۔ وہی ٹھیک ہے تمہارے لئے۔ یہ کام ہم نہیں کر سکتے۔"

ماما جی کے گھر میں منو میاں انتظار کرتے کرتے سو گئے تھے۔ تھکن مجھ پر بھی غالب تھی۔ میں اور ماما جی ایک طرف بیٹھ کے باتیں کرنے لگے۔ یوسف میرے رونے سے دل شکستہ ہو کے غالب اور محسن کی پارٹی میں شامل ہو گیا تھا اور وہ دونوں کرید کرید کر اس پرانے مجنوں کی داستان عشق سن رہے تھے جس کا ہر باب کسی نئی لیلیٰ کے نام سے شروع ہوتا تھا۔ نازو اور گل کا ہنس ہنس کے برا حال تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم عام لوگوں کی طرح ایک خاندان کے افراد ہیں جن کے سامنے روز مرہ زندگی کے مسائل کے سوا کوئی پریشانی نہیں۔ فرمودۂ غالب کی صداقت نے مجھے قائل کر لیا۔ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج۔ ہم سب مصائب و آلام، حادثات و آفات اور پرخطر حالات کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ بھولتے کچھ نہیں تھے مگر انہیں ہر وقت یاد کر کے خوف زدہ رہنے، مایوس ہونے، رونے دھونے اور اندیشوں میں مبتلا ہو کے پریشان ہونے کو لاحاصل سمجھنے لگے تھے۔ آج ہی مسٹر اور مسز شمیم شہید ہو کے ہمارا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ ہم ایک معرکہ آرائی کے بعد دام اجل سے نکلے تھے۔ اسی شہر میں کہیں شملا اپنے بیٹے کے ساتھ ہم سب کی راہ تک رہی تھی۔ یا شاید موت کی آرزو کر رہی تھی۔ اور بے بس تھی۔ آنے والا دن زیادہ دور نہیں تھا جس کے دامن میں نئے خطرات کا چیلنج تھا اور عشق کے نئے امتحاں تھے۔ مگر یہاں ہم سب کتنی بے فکری سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ شاید عزم و حوصلے کو شکست و ریخت سے بچانے کے لئے ایک متوازن رویہ ضروری تھا۔ زندگی کے ایک پلڑے میں رنج و غم ہوں تو دوسرے میں مسکراہٹیں اور ہنسی ڈال دو۔ فرصت کشاکش غم دوراں سے جب ملے جب بھی کوئی فرصت کی ساعت نایاب حاصل ہو تو قہقہے لگاؤ۔ گاؤ۔ رنگ، خوشبو اور گیت سمیٹو اور محبت کرو۔

معلوم نہیں کب مجھے نیند آگئی۔ صبح باتوں کی آواز سن کے میں جاگا تو دن نکلنے والا تھا۔ ماما جی اور منو میاں گل کی چارپائیاں صحن میں ڈالے بیٹھے تھے۔ محسن اور غالب کے علاوہ یوسف بھی سے کچھ

www.paksociety.com

فاصلے پر بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ ساتھ کے دوسرے کمرے میں گل اور نازو بھی سو رہی تھیں۔
میں باہر نکلا تو منو میاں نے کہا "آؤ بھئی سکندر، ہم تو ہیں بوڑھے لوگ۔"
"ہاں۔ سوئے جتنا سونا تھا جوانی میں" ماما جی بولے۔
میں نے شرمندگی سے کہا "اول تو آپ بوڑھے نہیں ہوئے ابھی۔ آدمی حوصلے سے جوان رہتا ہے۔"
"مدہوشی کی نیند جسم کو آتی ہے" منو میاں بولے "اور جسم کو رفتہ ضرور شکست دیتا ہے۔"
میں نے کہا "صرف بدبختی ہے ہماری۔ بری عادتوں نے آرام سحرخیزی سے دور رکھا ورنہ آپ کی طرح ہم بھی اپنے دن کا آغاز خدا کے سامنے سر جھکا کے کرتے۔"
"میں سوچ رہا ہوں کہ اب میرا یہاں کوئی کام نہیں رہا۔ مجھے واپس لوٹ جانا چاہئے" منو میاں بولے۔
"آپ ہمیں چھوڑ جائیں گے؟"
"چھوڑ کے تو میں اپنے ساتھیوں کو آیا تھا۔ اور... چھوڑ کے جاؤں گا اپنے دو شہید بیٹوں کو" وہ آبدیدہ ہو گئے۔
"ابھی آپ کا کام ختم تو نہیں ہوا..." میں نے بات آگے بڑھائی۔
"نہیں میاں سکندر۔ میں یہاں آیا تھا تم سے رابطہ قائم کرنے۔ تم سے رابطہ ہو گیا۔ اب میں واپس جاؤں گا۔ تم سے وہاں ملاقات ہو گی جہاں میرے لاکھوں ساتھی غداروں اور وطن فروشوں کے خلاف ہر محاذ پر لڑ رہے ہیں۔ مجھے بمبئی میں نہیں ان کے درمیان ہونا چاہئے۔"
"آج ہمارا بھی آخری دن ہے بمبئی میں۔ کل ہم بھی روانہ ہو جائیں گے" میں نے کہا "ہماری منزل تو ایک ہی ہے۔"
"ہاں۔ مگر راستے جدا ہیں" منو میاں نے کہا "تم میرا ساتھ نہیں دے سکتے اور میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔"
ان کی دلیل معقول اور قائل کرنے والی تھی "اگر آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو مجھے آپ کی راہ میں حائل ہونے کا حق نہیں؟"
"اچھا تو پھر اللہ حافظ" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
میں بوکھلا گیا "ابھی... اسی وقت..."
وہ ہنسے "اور کیا جانے سے پہلے میرے اعزاز میں الوداعی دعوتیں اور تقریبات ہوں گی... ہار پھول اور بینڈ باجے کے ساتھ رخصت کرو گے مجھے!"
میں نے کہا "میرا مطلب ہے کہ اچانک۔ کسی تیاری کے بغیر"
"تیاری کیسی۔ ہم سے پہلے جو گئے انہوں نے کیا تیاری کی تھی؟ اپنا رخت سفر تو بس اپنا یہی جنون ہے جس نے تمام عمر سرگرداں رکھا۔ کہیں تھک کر بیٹھنے کی نوبت آئی تو تقدیر نے اسباب سفر پیدا کر دئیے۔ چلاں چلو ہم چلتے ہیں۔ زندگی رہی تو پھر ضرور کہیں ملیں گے۔"

میرا دل رنج سے بوجھل ہو گیا "آپ... ان سب سے نہیں ملیں گے؟"
انہوں نے ترتیلی میں سر ہلایا "نہیں تو نکل جانا چاہتا ہوں منہ اندھیرے سے بھی نہ ملتا۔ کسی سے رخصت لینا اور کسی کو رخصت کرنا ایک مشکل کام ہے۔ ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ آخری ملاقات نہ ہو" منو میاں نے کہا۔
"آپ کو ناامید نہیں ہونا چاہیے" میں نے کہا۔
وہ کچھ دیر سوچتے رہے جیسے میری بات کا جواب دینا بھی چاہتے ہوں اور نہیں بھی۔ پھر انہوں نے ہاتھ ملائے بغیر دروازے کی طرف قدم بڑھائے اور جاتے ہوئے پٹ بھیڑ گئے۔ میرے لئے یہ یقین کرنا محال تھا کہ وہ ایک لمبے سفر کے لئے نکلے ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ چند منٹ کے لئے کسی کام سے گئے ہیں اور ابھی آ جائیں گے۔ انہیں ہزار میل سے زیادہ کی مسافت درپیش تھی۔ ہر قدم پر خطرات کا سامنا تھا۔ دشمنوں کی سرزمین بھی ان کی دشمن تھی اور اس سرحد کے پار ہوائے وطن میں بھی خانہ جنگی کے بادل تھے۔ بارود کا دھواں تھا اور خون کی بو تھی۔ نفرت اور تعصب کی زہر آلود فضا تھی۔ اجنبی چہرے تھے اور اپنوں کی بدلی ہوئی نگاہیں تھیں۔ وہ پھر بھی واپس جا رہے تھے۔ خالی ہاتھ۔ اکیلے محض اپنے یقین اور ارادے کے ساتھ۔
میں نے کہا "ماما جی! یہ پہنچ جائیں گے مشرقی پاکستان"
ماما جی زبردستی مسکرائے "میاں! آدمی تو چاند پر پہنچ گیا ہے۔"
"ان کے پاس ٹکٹ کے پیسے بھی تھے؟"
"ہوں گے یا نہیں ہوں گے۔ میں نے تو پوچھا نہیں" ماما جی بولے "پوچھنا بے کار ہوتا۔ اصل چیز تو ہے نیت۔ باقی اللہ مسبب الاسباب ہے۔"
نازو آنکھیں ملتی باہر آئی "کیا بات ہے؟ صبح صبح منہ لٹکائے کیوں بیٹھے ہو؟"
میں نے کہا "منو میاں چلے گئے"
"کہاں چلے گئے؟" گل نے پیچھے سے آ کے کہا۔
"واپس۔ مشرقی پاکستان۔"
نازو ہنس پڑی "کون سی فلائٹ لی؟"
میں نے کہا "یہ ہماری اور تمہاری مجبوریاں ہیں فلائٹ! ٹرین۔ بس یا کوئی بھی سواری، تیاری اور رہنما دست۔ آزاد لوگ تو بس چل پڑتے ہیں۔ سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے۔ یہ بات تم نہ سمجھو۔ اس کی شکل نصیب۔"
رفتہ رفتہ محسن اور غالب بھی اٹھے اور انہیں بھی بڑی مشکل سے میری بات پر اعتبار آیا۔ پہلے سب یہی سمجھتے رہے کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ سب کے چہروں پر جذبات کا ایک ہی رنگ تھا۔ بے یقینی کا رنگ۔ کیا یوں بھی کوئی جاتا ہے! ایسے بھی کوئی جاتا ہے!
سب کے دل بجھ سے گئے تھے۔ کوئی ناشتا کرنے کے موڈ میں نہیں تھا لیکن ماما جی نے سب کو ڈانٹ لگائی۔

"ارے یہ کیا نحوست پھیلا رہے ہو تم سب مل کے۔ منو گیا ہے کام سے۔ کوئی دنیا سے تو نہیں چلا گیا۔ ایسی شکلیں تو کسی کو دفن کر کے واپس آنے والوں کی بھی نہیں ہوتیں۔ اس کی ہمت اور جذبے کو اپنی کم ہمتی اور مجبوری سمجھو۔ کھانا پینا چھوڑ دیا، ہنسنا بولنا چھوڑ دیا۔ ارے اچھا سوچو اس کے لئے۔ امید رکھو کہ پھر اس سے ملاقات ہو گی۔ منو ناامید نہیں تھا جس کے پاس امید رکھنے کے لئے کچھ نہ تھا" وہ کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے تھے اور ہم شرم سے سر جھکا کے سب سننے پر مجبور تھے۔
ماما جی کے ڈر سے سب نے ناشتا کیا اور خواہش نہ ہونے کے باوجود پیٹ بھر کے کھایا۔ آہستہ آہستہ ہماری مصنوعی بشاشت اور جھوٹی ہنسی میں حقیقت کا رنگ گہرا ہونے لگا۔ دکھ کے احساس کو ہم نے ایسے مٹا دیا تھا جیسے پنسل سے لکھی ہوئی عبارت کو ربڑ سے گھس کر مٹاتے ہیں۔ اس کا نقش ہلکا پڑ جاتا ہے اور دوسری عبارت کے نیچے دب جاتا ہے مگر ختم تو نہیں ہوتا۔ جب یوسف نے ہمارا میک اپ شروع کیا تو منو میاں کی عدم موجودگی کا خیال بھی ذہن سے ایسے ہی اوجھل ہو گیا۔
ساڑھے آٹھ بجے کسی نے دستک دی اور ماما جی نے دروازے پر جا کے ایک بنڈل وصول کیا۔
"لو بھئی تمہاری وردیاں" انہوں نے بنڈل ہماری طرف اچھال دیا "دیکھ لو سائز ٹھیک ہیں یا نہیں۔"
میں نے بنڈل کھول کر قمیضوں کی نیم پرانی اور میلی وردیاں نکالیں اور اندازے سے اپنے لئے ایک منتخب کی۔
"کیا آپ نے آرڈر پر بنوائی ہیں؟" میں نے کہا۔
"تمہارے سائز کے اعتبار سے منگوائی تھیں۔ تھوڑا بہت فرق تو ہو گا" ماما جی نے کہا۔
"یہ وردیاں کس کی ہیں؟" غالب نے کہا۔
"کسی کی ہوں۔ تمہیں کیا؟" ماما جی نے کہا۔
"یہ نہ ہو کہ ہم شکل قلیوں کے تین جوڑے کہیں اکٹھے ہو جائیں" محسن نے کہا۔
"یہ قلی گاؤں گئے ہوئے ہیں" ماما جی نے کہا۔
"پھر وردیاں کیسے ملیں؟"
"بس کسی طرح مل ہی گئیں" ماما جی نے کہا۔
"ہمیں پہچانتے تو ہوں گے دوسرے قلی؟"
"ہاں۔ لیکن تم ذرا احتیاط کرنا۔ ایک تو پلیٹ فارم پر مت جانا۔ کسی بھی پلیٹ فارم پر۔ زیادہ قلی وہیں ہوتے ہیں جہاں مسافر گاڑیاں آتی ہیں۔ وہاں پر کچھ فارغ بھی بیٹھے ہوتے ہیں۔ وہ آتے جاتے لوگوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی کینٹین کی طرف مت جانا جہاں سب کھانا کھانے اور چائے پینے کے لئے آتے ہیں" ماما جی نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔
میں نے کہا "ہاں گودام کی طرف تو جانا پڑے گا۔"
"تو ضرور جاؤ۔ لیکن بلا ضرورت کسی سمت مت جانا۔ وہاں قلی

ہمارا مال اتارنے اور لادنے میں مصروف رہتے ہیں اس لئے کوئی بھی کسی کی طرف نہیں دیکھتا۔ وردی سب کی ایک ہے اور قلی ہیں ہزاروں۔ صورت سے سب ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے۔ اصل چیز ہے نمبر والا بیج۔ اس پر کسی کی نظر پڑنے کا امکان بہت ہی کم ہے۔ قلی بھی دوسرے قلی کا نمبر نوٹ نہیں کرتا۔ اس بات کا امکان اور بھی کم ہے کہ کوئی نمبر دیکھے تو اسے یاد آ جائے کہ یہ نمبر کس کا تھا۔ اس لئے تم نوے فیصد محفوظ ہو۔"
"یعنی دس فیصد خطرہ ہے پکڑے جانے کا؟"
"وہ تو میں نے کم بتایا۔ خطرہ ایک فیصد ہو یا پچاس فیصد، خطرہ ہی ہوتا ہے۔ تم اجنبی ہو۔ کبھی قلی نہیں رہے۔ ان کے طور طریقے اور قاعدے ضابطے کچھ نہیں جانتے۔ اس لئے جو کام کرنا ہے کم سے کم وقت میں دور رہ کے نمٹاؤ۔ اپنا چہرہ چھپانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کوئی ٹوکرا یا کریٹ اٹھا لو۔ ریلوے کے ہر افسر سے بچو۔ خاص طور پر ریلوے پولیس سے۔"
"آپ بالکل پریشان نہ ہوں" میں نے کہا "اب صرف یہ بتا دیں کہ وہ مال گاڑی کس جگہ سے روانہ ہو گی؟"
"ستائیس نمبر پلیٹ فارم سے" ماما جی نے کہا۔
"اور ان کا مال وہیں اتارا جائے گا؟"
"ہاں۔ پلیٹ فارم کے باہر گودام ہیں۔ لوڈ ہونے والا سب مال وہاں پہنچ چکا ہو گا" ماما جی نے کہا۔
گل اور نازو خاصی فکرمند نظر آ رہی تھیں۔ میں نے انہیں تسلی دی "ہم دوپہر تک واپس آ جائیں گے۔ گھبرانا مت۔"
"جھوٹی تسلی صاحب۔ مری یار میں تم نہ آنسو بہانا" غالب نے کہا۔
نازو نے کہا "تم اگر دوپہر تک نہ آئے تو...؟"
"بھئی کیوں نہیں آئیں گے" میں نے کہا۔
"اور دوپہر تک نہ آئے تو شام تک آ جائیں گے" غالب نے کہا "اپنی مرضی کے مالک ہیں۔"
"شام تک بھی نہ آئے تو؟" گل نے کہا۔
محسن نے جھلا کے کہا "تو جھولی لے کر باہر نکل جانا دونوں۔ گلی گلی چلانا۔ ہائے محسن۔ ہائے غالب۔ عجب الٹی کھوپڑی ہے تمہاری۔ بابا! ہم کیسے وعدہ کر جائیں کہ بارہ بج کر ستاون منٹ پر ضرور آ جائیں گے۔"
"اتنی پابندی وقت کے ساتھ تو ہم دلہن لے کر بھی حاضر نہیں ہوں گے" غالب نے کہا "دو چار گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا۔"
"مشکل ہوتی ہے انتظار کی بھی" نازو نے جھلا کے کہا۔
"اچھا میں نہ آؤں تو قاضی سے کہنا کسی سے بھی نکاح پڑھوا دے" غالب نے بھی جھلا کے کہا اور فوراً میرے پیچھے آ گیا۔ "قاضی کو ہی قبول کر لینا..."
نازو نے جوتی کھینچی مگر گل نے ماما جی کی طرف اشارہ کر کے اسے روک دیا۔ ماما جی ناخوش ہونے کے باوجود منہ پھیر کر مسکرا رہے تھے۔ میں نے کہا "ہم کوشش کریں گے کہ جلد از جلد واپس

www.paksociety.com

آجائیں۔ نہ آئیں تو جو تمہارا جی چاہے کرنا۔ ہم زیادہ دور نہیں جا رہے ہیں۔ ہوں گے اسی علاقے میں۔"

"ہم کو پکڑے نہ گئے" غالب نے کہا "اور لے جانے والے کہیں اور نہ لے گئے۔"

"ہم تلاش کر لیں گے" گل نے کہا۔

"تلاش خاک کرو گی۔ دونوں بچھڑ جاؤ گی اور جب ہم آئیں گے تو پتا چلے گا کہ آپ غائب ہیں۔ گھر میں بیٹھو آرام سے" محسن نے کہا۔

"ہم اکیلے کب تک انتظار کریں گے؟" گل نے کہا۔

"اور انتظار کرنے میں کیا ہمارے لئے کوئی پریشانی نہیں؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "دیکھو ماما جی تمہارے پاس ہیں۔ اگر ہمارا سراغ لگانا ہوگا تو یہ کام بھی ماما جی تم دونوں سے بہتر طریقے پر کر سکتے ہیں۔ تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں۔ عورت کا صحیح مقام گھر ہے۔ خبردار جو قدم باہر رکھا۔ ٹانگیں توڑ دوں گا۔ بہت ہوا لگ گئی ہے باہر کی۔" غالب نے کہا اور فوراً باہر نکل گیا۔

میں اور محسن ہنستے ہوئے اس کے پیچھے گئے۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے نازو کے چلانے کی آواز سنی "واپس تو آؤ گے نا۔ تمہیں آ کے تو دیکھنا...."

غالب دبے پاؤں واپس آیا اور دروازے سے سر نکال کے بولا "یہ تو ری بات ہے کہ جو بچے اسکول سے غیر حاضر ہیں وہ بنچ پر کھڑے ہو جائیں۔"

وہ غصہ مار کے روٹھا۔ نازو نے تو واقعی احمقانہ بات کی تھی لیکن اس حماقت کا تعلق اس کے جذبات سے تھا۔ غالب کی ہنسی نے اس کی خفت کو غصے میں بدل دیا۔ معلوم نہیں اس نے کیا چیز پھینک کر ماری تھی۔ کوئی لوٹا تھا یا کٹورا جو ٹن سے دروازے پر لگا تھا۔ اس وقت تک غالب ہم سے بھی آگے نکل چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہم بھی ہنس رہے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو دروازے کے باہر کھڑے ماما جی مسکراتے ہوئے نازو کو اندر جانے کا کہہ رہے تھے۔

ریلوے لائنوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم مال گوداموں کی طرف بڑھتے گئے۔ میک اپ کے بعد ہمارے چہرے حیرت انگیز طور پر بدل گئے تھے۔ رہی سہی کسر قلی کی وردی نے پوری کر دی تھی۔ اب مجھے پورا یقین تھا کہ ہمارے دشمن ہمیں بالکل شناخت نہیں کر سکتے۔

ریلوے گودام تقریباً ایک میل دور تھے اور وہاں سے آنے جانے والی ہر سڑک پر سیکڑوں ٹرک رواں تھے۔ یہ ٹرک بمبئی کی بندرگاہ پر اترنے والے مال کو اندرون ملک لے جانے والی مال گاڑیوں تک لاتے تھے اور برآمد کے لئے مال گاڑیوں سے آنے والے مال کو بندرگاہ پہنچاتے تھے۔

پلیٹ فارم بہت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور ان کے درمیان لمبی لمبی مال گاڑیوں کے ہزاروں ڈبے کھڑے ہوئے تھے۔ قلیوں کا ایک جم غفیر تھا جو ان ٹرینوں کے درمیان پلیٹ فارموں پر، گوداموں میں اور ریلوے لائنوں کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ بوریاں اور کریٹ ڈھونے والے یہ مزدور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ بوجھ اٹھا کے اپنی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے میں مصروف تھے۔ شاید کوئی خوش ہو کے انعام میں ایک روپیہ بھی دے جائے یا انہیں نوکری کے لئے منتخب کر لے تو روزگار مستقل ہو جائے۔ مزدوری کا کیا ہے۔ کبھی ملی کبھی نہ ملی۔ اس کوشش میں وہ اپنا خون پسینہ ایک کر رہے تھے۔ انہیں قطعی احساس نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھ کتنا ظلم کر رہے ہیں۔ انسان تو پھر انسان ہے، مشین بھی اعتدال کے ساتھ استعمال نہ کیا جائے تو وہ جواب دے جاتی ہے... جس کا کام ایک مشین نہیں کر سکتی مگر وہ مزدوروں نے انجام دے رہے تھے صرف اس انعام کی امید میں جو غیر یقینی تھا۔ حق کے طور پر زائد اجرت طلب کرنے کا ان میں حوصلہ نہ تھا۔

ہم ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کے چل رہے تھے لیکن ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل نہیں تھے۔ اس افراتفری میں کسے فرصت تھی کہ ہماری طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھتا۔ اچانک گل نے ایک خالی کریٹ اٹھا لیا جو کسی نے بے کار سمجھ کے پھینک دیا تھا یا بعد میں لے جانے کے لئے بینچ کے نیچے رکھ دیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بھی ٹوکری کا خیال آیا۔ ایک پھول والے کی دکان پر بہت سے خالی ٹوکرے رکھے ہوئے تھے۔

"میں ایک ٹوکرا لے لوں؟" میں نے کہا۔

"پھوکٹ میں لے لوں" دکاندار میری طرف جھپٹا اور مجھ سے ٹوکرا چھین لیا "چار آنے نکال۔"

میں نے اسے جیب سے ایک روپیہ نکال کے دیا اور باقی واپس لے کر چل پڑا۔ یہ پچیس پیسے تھے۔ عادت کے مطابق اب بھی لوگ چار آنے اور آٹھ آنے ہی کہتے تھے۔ پچاس پیسے یا پچیس پیسے نہیں کہتے تھے۔

ٹوکرا میرے کندھے پر تھا اور اس سے مجھے کئی فائدے حاصل ہوئے تھے۔ میں زیادہ قلی نظر آنے لگا تھا۔ میرا چہرہ ایک طرف چھپ گیا تھا اور مجھ پر دھوپ بھی نہیں پڑ رہی تھی۔ پھر چار آنے میں یہ تینوں فائدے غالب نے بھی حاصل کئے۔

ہم ایک گھنٹے تک ستائیس نمبر پلیٹ فارم تلاش کرتے رہے۔ اگر ہم کسی سے پوچھتے تو یہ بڑی غلط بات ہوتی۔ قلی سے زیادہ پلیٹ فارم کے بارے میں کون جانتا ہے۔ مشکل یہ تھی کہ پلیٹ فارم ترتیب میں نہیں تھے۔ دو نمبر کے بعد سات آ گیا۔ پھر گیارہ نمبر کے بعد تین۔ پھر اچانک میں نے ستائیس نمبر دیکھا۔ وہاں ایک بہت لمبی مال گاڑی کھڑی ہوئی تھی اور پلیٹ فارم کے ایک سرے

سے دوسرے سرے تک ہر قسم کے سامان کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ چند بوگیوں میں سامان رکھا جا چکا تھا اور انہیں ریلوے والے سیل کر رہے تھے۔ کیا یہی وہ ٹرین ہوگی؟ میں نے سوچا۔ ابھی اطمینان سے سمجھنے باقی تھے۔ ریلوے کا کوئی بابو ہی بتا سکتا تھا کہ یہ کل صبح ساڑھے پانچ بجے جانے والی مال گاڑی ہے یا اس ٹرین کی روانگی کے بعد دوسری مال گاڑی آئے گی؟ آئے گی تو کب آئے گی؟ مگر میں یہ بات کسی سے پوچھ کے شک پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے خاموشی سے پلیٹ فارم پر اپنا سفر جاری رکھا اور ڈبے کی جالی میں سے ٹرین کی طرف دیکھتا رہا۔ سب سے پیچھے والی بوگی کا دروازہ بند تھا مگر مقفل نہیں تھا۔ مجھے وہاں کوئی ایسا چہرہ دکھائی نہ دیا جس کا وفادار لور ریلوے کے ساتھ تعلق ثابت ہوتا۔ یہ محض ایک امکان تھا کہ شاید ٹرین کے ساتھ جانے والا کوئی ایسا شخص ہو جسے میں نے پہلے بھی ان کے ساتھ کبھی دیکھا ہو۔ اب آہستہ آہستہ میں پہلے ڈبے کی طرف جا رہا تھا۔

آخری بوگی پلیٹ فارم سے باہر تھی۔ اس کے آگے ابھی کوئی انجن نہیں تھا۔ میں تھک چکا تھا اور مجھے پیاس بھی لگ رہی تھی۔ ایک واٹر کولر کا اسٹاپ دیکھ کے میں نے اس سے پانی پیا اور پھر وہیں ستانے بیٹھ گیا۔ دراصل میں غالب اور محسن سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی گھوم پھر کے میری طرف ہی آ رہے تھے۔

میرے آس پاس چند قلی ہاتھ سرہانے رکھے سو رہے تھے۔ میں ان سے کچھ فاصلے پر واٹر کولر کے پیچھے والی جالی سے ٹیک لگا کے بیٹھا مگر وہاں کولر سے خارج ہونے والی گرم ہوا آ رہی تھی۔ میں سائڈ پر آ گیا۔ چند منٹ بعد غالب نے بھی پانی پیا اور بڑی لاتعلقی کے ساتھ میرے قریب آ بیٹھا۔

محسن کے آنے کے بعد میں نے کہا "یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"مجھے بھی کوئی نظر نہیں آیا" غالب نے کہا۔

"ابے یار بیڑی پی" محسن نے کان پر لگی ہوئی بیڑی مجھے پیش کی۔ ایک قلی نے کروٹ بدلتے ہوئے ہمیں دیکھا اور پھر سو گیا۔

"اگر اس ٹرین پر سامان ہوتا تو آس پاس محافظ موجود ہوتے" غالب نے کہا۔

"میں نے سب سے پیچھے والی بوگی کو دیکھا تھا۔ اس میں تالا ہی نہیں تھا" میں نے کہا "وہ اسلحہ لوڈ کرانے کے بعد بوگی کو کھلا نہیں چھوڑ سکتے۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا "وہ بوگیاں سیل کر دی جائیں گی۔"

اسی وقت ہاتھ گاڑی پر ٹوکریٹ لادے ایک قلی عین ہمارے سامنے آ کے رک گیا۔ اس نے بوگی کی بھاری کنڈی کھسکا کے کھولی اور پرانی طرز کے بند ہونے والا آہنی دروازہ تیز آواز کے ساتھ پیچھے کر دیا۔ بوگی کے وسطی درمیانی حصے میں آٹھ فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا خلا نمودار ہو گیا۔ اس میں سے بوگی کے اندر کا نیم روشن حصہ

نظر آتا تھا۔ گل نے باری باری سب کریٹ اس راستے سے اندر کھسکائے اور پھر خود بھی اوپر چڑھ گیا۔ وہ کریٹ آگے لے جا کر ترتیب سے جمانے میں مصروف تھا۔

"یہ کریٹ زیادہ بھاری نہیں تھے" میں نے کہا۔

"میں بھی یہی دیکھ رہا تھا" محسن بولا "ان میں اسلحہ ہوتا تو یہ قلی انہیں اتنی آسانی سے اوپر نہیں چڑھا سکتا تھا۔"

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ مال گاڑی پہلے جائے گی۔"

غالب نے کہا "شک کی کیا بات ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ٹرین روانہ ہونے والی ہے۔"

"تم نے معلوم کیا تھا کسی سے؟"

"نہیں۔"

"پھر کیا ٹائم ٹیبل دیکھا تھا؟"

"نہیں۔"

"تو کیا الہام ہوا ہے؟" محسن نے جھلا کے پوچھا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک انجن اسی پٹری پر آ رہا ہے۔ انجن لگنے کے بعد گاڑی کل صبح تک کھڑی نہیں رہ سکتی" غالب نے کہا۔

انجن نے پٹری بدلی اور ساتھ والی لائن پر ہو گیا۔

محسن نے غالب کو آڑے ہاتھوں لیا "شاید انجن پاگل ہو گیا ہے۔"

"غالباً انجن ڈرائیور کی نظر کمزور ہے۔ اسے سامنے کھڑی ہوئی مال گاڑی نظر نہیں آئی۔ نشانہ خطا ہو گیا" میں نے کہا۔

"وہ پھر کوشش کرے گا۔ ابھی واپس جائے گا اور دوسری دفعہ صراط مستقیم پر آئے گا۔"

غالب نے ایک ڈوری اٹھا کے کہا "اس کا اگلا حصہ کون سا ہے اور پچھلا کون سا؟"

"غالباً یہ سوال جلیبی کے بارے میں کیا جاتا ہے کہ وہ کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے" محسن نے کہا۔

غالب نے ڈوری کے دونوں سرے گھما کے پکڑ لئے "میری چھٹی حس کہتی ہے کہ تم سیدھے کو الٹا اور اول کو آخر سمجھ رہے ہو۔"

چند منٹ بعد مجھے اور محسن کو شرمندہ ہونا پڑا جب خاصے شور کے ساتھ مال گاڑی کے ڈبے آپس میں ٹکرا کے تھوڑا سا پیچھے ہو گئے۔ انجن اس کے دوسرے کنارے پر لگ گیا تھا۔ جسے ہم نے آخری بوگی فرض کیا تھا وہ پہلی ہو گئی تھی اور پہلی بوگی اب آخری تھی۔

جس قلی کی نیند خراب ہوئی تھی وہ اٹھ بیٹھا "کیا شور مچا رکھا ہے؟ سونے بھی نہیں دیتے" اس نے آنکھیں نکال کے کہا۔

"یہ بیڈ روم ہے تیرا؟" غالب نے بھی اکڑ لہجے میں جواب دیا۔ "اور شور کم ہو رہا ہے۔"

"تم کیوں بیٹھے ہو یہاں؟ مزدوری دیکھو کہیں جا کے"

www.paksociety.com

"کیوں؟ یہاں مزدوری نہیں مل سکتی؟" غالب نے کہا۔
"یہ ٹرین تو جا رہی ہے" قلی بولا۔
"اس کے بعد دوسری جائے گی" غالب نے کہا۔
"وہ جائے گی کل صبح۔ ایک بجے کے قریب" قلی نے کہا "تم کو باتیں کرنی ہیں تو کہیں اور جا کے کرو۔"
"تو کہیں اور جا کے سو جا" غالب اس سے ہار ماننے پر تیار نہیں تھا۔
"ارے میرے بھائی!" قلی ہاتھ جوڑ کے بولا "کل بھی میں نے رات بھر مزدوری کی۔ اس سے پہلے بھی ایک رات اور آج رات بھر ہم سب کی مصیبت ہے" اس نے بائیں سونے والوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
میں نے ہمدردی سے کہا "ارے یار، معاف کرنا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا۔"
وہ میری ہمدردی سے متاثر ہوا "اسے تو بخار بھی ہو گیا ہے اور خود میری سب ہڈیاں درد کر رہی ہیں مگر مجبوری ہے۔"
"ہاں بھیا" میں نے کہا "مزدوری کا نام ہی مجبوری ہے۔ نہ کریں تو کیا کریں۔ کیا دن کو کام نہیں ملتا تمہیں؟"
محسن نے اسے بھی ایک بیڑی پیش کی "کیا رات کو بہت پیسہ ملتا ہے؟"
اس نے بیڑی لے کر کہا "مزدوری تو زیادہ دے رہے ہیں مگر ہمت بھی تو ہو نہ ری میں۔ میں تو کل رات بھی سوچ رہا تھا کہ انکار کر دوں۔"
"تو کیا زبردستی کون مزدوری کرا سکتا ہے؟"
اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "زبردست سب کچھ کرا سکتا ہے بھائی۔ اس نے کل رات بھی بڑا ظلم کیا اپنے ساتھ۔ رات بھی اس کی حالت خراب تھی۔ میں نے تو صبح بھی کہا تھا کہ آج تو مت جا مگر اس نے بات نہیں مانی میری۔ رات بھر کے سو روپے چھوڑنا بھی تو مشکل ہے۔"
"ایک رات کے سو روپے؟" میں نے سخت حیرانی کا اظہار کیا۔
"آج تو دو سو کی امید ہے" وہ بولا "سو روپے انعام کے بھی ملیں گے۔ لیکن یہ کیسے جائے گا بیچارا؟ میں تو خیر مر کے بھی کچھ کر لوں گا۔"
اس نے اپنے سوئے ہوئے ساتھی کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے دیکھا اور افسردہ ہو گیا "بہت تیز بخار ہے۔"
"تو اسے اسپتال کیوں نہیں لے جاتے؟"
"کون سے اسپتال؟" وہ بولا "سرکاری اسپتال؟ [illegible] وہاں سے نکال باہر۔"
"تو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جا۔ دو دن میں اس نے دو سو کمائے ہیں" میں نے کہا۔

قلی دکھ سے سہلانے لگا "ڈاکٹر پیسے لے گا۔ دس روپے تو ہو جائیں گے۔ یہ چار سو پورے کرنا چاہتا ہے۔"
میں نے کہا "کیا کسی کا قرض ادا کرنا ہے؟"
"ہاں۔ بیٹی کی شادی کے لیے سود خور مہاجن سے پانچ سو لیے تھے۔ ہر مہینے پچاس روپے بیاج کے دیتا ہے۔ اصل رقم اتنی کی اتنی ہے۔ بیٹی تو سکھی ہے اپنے گھر میں مگر باپ کو دیکھو۔ بڑی مشکل ہے بیچارے کے لیے۔ بیاج نہ دے تو مہاجن گردن پکڑ لیتا ہے۔ سوچ رہا ہے بھگوان نے تو چار سو اکٹھے مل گئے ہیں۔ ہم نے کہا کل بار سو ہم سے لے لینا۔ غریب کی جان چھٹ جائے گی اس قرض کے عذاب سے۔"
جو پہلے میری دلچسپی تھی وہ اب ہمدردی میں بدل گئی تھی۔ میں نے کہا "تم لوگ اچھے یار ہو۔ مل کے سارا قرض ادا نہیں کر دیتے۔ ایسے تو یہ مر جائے گا......"
"یہ نہیں مر سکتا بھائی" قلی نے میری بات کاٹ دی "جس پر قرضہ ہو اسے کون مرنے دیتا ہے۔ پھر بھی مر گیا تو قرضہ وصول کرنے والے بیٹی کے گھر پہنچ جائیں گے۔ جوائی کو پکڑ لیں گے۔ ہم اس سے زیادہ نہیں کر سکتے۔ آخر ہمارے بھی بچے ہیں۔"
"آج رات کوئی اور اس کی جگہ مزدوری کرنے چلا جائے تو نہیں ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔
"وہ نہیں مانیں گے۔"
"کون نہیں مانے گا؟" میں نے کہا۔
"جن کا کام ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ سارا کام اب تم کرو گے۔ کسی اور کو مت لانا۔"
"ایسا کیا کام ہے؟" محسن نے کہا۔
"کام تو مزدوری کا ہے۔ پرسوں رات ایک گودام سے مال ٹرک پر لادا تھا۔ کل رات یہاں اتارا۔ آج رات مال گاڑی پر لادنا ہے" قلی نے کہا۔
میں نے کہا "کیا لادا جائے گا؟" اور اس کے سرہانے سے پہلے ایک چھوکرے کو آواز لگائی "اے! باہر لا!"
چھوکرا آواز پر لپکا اور تار کے ایک پنجرے میں لٹکے ہوئے چائے کے گلاسوں میں سے چار ہمارے سامنے رکھ گیا۔ مجھے اب سو روپے رات کی اس مزدوری کے پیچھے گڑبڑ محسوس ہو رہی تھی اور میں قلی کے دل میں شک پیدا کیے بغیر اس معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ چائے کی پیشکش دوستانہ رشتوں کی تمہید تھی۔
"تم نئے آئے ہو کیا؟" قلی نے دوستانہ تعلقات استوار ہو جانے کے بعد کہا۔
"ہاں۔ نیا ہی سمجھو یہاں" میں نے گول مول بات کی۔
"پہلے کہاں تھے؟" وہ سڑپ سڑپ کر کے چائے پینے لگا۔
"پٹنا میں۔ ادھر جھگڑا ہو گیا تھا۔ اپنی کرامتی نے ادھر بلا لیا" غالب بولا۔

ماتی کے حوالے کے بعد کسی شک وشبے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ "تم پرچے والے کہاں کے ہو۔ دلی کے؟"
میں نے کہا "تم نے کیسے جانا؟"
"زبان سے۔ میں غازی آباد کا ہوں" وہ بولا۔
میں نے محسن اور غالب کا تعارف کرایا "یہ بھی میرے ساتھ ہی آئے تھے۔ یہ مراد نگر کا ہے۔ یہ میرٹھ کا۔"
"ایک ساتھ آئے تھے کس چکر میں؟" وہ ہنسا۔
"چکر مت پوچھو" محسن نے کہا۔
"فلموں میں کام کرنے آئے ہو گے دلی سے بمبئی اور کس لیے آتا ہے کوئی۔"
"مطلب یہ کہ تم بھی آئے تھے ہیرو بننے مگر بن گئے قلی" میں نے کہا "ہماری طرح۔"
"اسی کو کہتے ہیں مقدر" غالب نے آہ بھری۔
میں نے کہا "کیا تم انہیں جانتے ہو؟"
"کس کو؟"
"جہاں تم مزدوری کر رہے ہو؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا "نام تو نہیں معلوم۔"
"پھر تم کو کیسے موقع مل گیا؟"
"ایک نوجوان آیا تھا ادھر۔ اس نے کہا کہ رات کو کام کرنے کا ہے۔ سو روپے روز ملے گا۔ ہم نے کہا کہ پہلے کام بتاؤ۔ بمبئی میں بہت خطرا ہے۔ سو روپیہ دے کر کوئی بولے کہ رات بھر......"
جو بات اس نے کہی وہ یہاں بیان نہیں کی جا سکتی۔
میں نے ہنس کے کہا "پھر؟"
"اس نے کہا کہ بابا لوڈنگ کا کام ہے۔ وہ ہم تینوں کو لے گیا گودام۔"
"گودام کہاں تھا؟"
"پتا نہیں کہاں تھا۔ ہم تو موٹر میں بیٹھ کے گئے تھے اس کی" قلی نے کہا "وہ راستے میں سمجھاتا رہا کہ اس کام کے بارے میں ہم کسی کو کچھ نہ بتائیں۔"
"مگر تم تو بتا رہے ہو" میں نے کہا۔
وہ ہنسنے لگا "تم اچھے آدمی ہو۔ دل میں درد ہے تمہارے ورنہ کون کسی کی جگہ بیگار قبول کرتا ہے۔"
باہر والا چائے کے خالی گلاس اٹھانے کے لیے آیا تو میں نے کہا "چار چائے اور لا۔ اور بسکٹ بھی۔"
غالب نے کہا "ہم تو پرچے والے بھی ایک ہی جگہ کے ہیں۔"
"ہاں۔ دلی۔ پھر غازی آباد۔ مراد نگر اور میرٹھ" وہ بولا۔
میں نے کہا "پھر تم نے رات بھر لوڈنگ کی؟"
"ہاں۔ بڑے بھاری بکس تھے۔ لگتا تھا سب میں لوہا بھرا ہوا ہے۔ گودام والے بار بار کہتے تھے آہستہ اٹھاؤ۔ جیسے اندر شیشہ ہے کہ ٹوٹ جائے گا۔ لکڑی کے بکس تھے مگر وہ ایسے رکھواتے تھے جیسے مٹی کے ہوں۔ دھیرے دھیرے۔ نزاکت سے۔ بار بار بولتے تھے کہ خبردار کوئی پیٹی نہ گرے۔ سنبھل کر چلو۔ احتیاط سے اٹھاؤ۔ پتا نہیں کیا تھا ان میں۔ پوری رات لگ گئی اپنی تو۔ صبح وہ موٹر گاڑی میں یہاں چھوڑ گیا اور سو سو روپے دے گیا۔ ساتھ ہی کہہ گیا کہ رات کو اسی جگہ ملنا۔"
"وا بھئی۔ عیش ہو گئی تمہاری تو" میں نے بے تکلفی سے کہا۔ "موٹر میں گئے تھے مزدوری کرنے۔ کیسی موٹر تھی؟"
"بڑی شاندار" وہ خوش ہو کے بولا "کالے رنگ کی بس لمبی سی۔ اندر سے بالکل ٹھنڈی۔ لگتا تھا سڑک پر نہیں چل رہی [illegible] تیر رہی ہے۔ گانے لگے ہوئے تھے۔"
"دوسری رات بھی وہی موٹر آئی تھی؟" غالب نے یوں پوچھا جیسے وہ رشک میں مبتلا ہو گیا ہے۔
"ہاں۔ وہی موٹر تھی۔ وہی ڈرائیور۔ بڑا اچھا آدمی تھا۔ سگریٹ بھی پلائی اس نے راستے میں۔ کل رات مال اتارنا تھا اس لیے دیر نہیں لگی۔"
میں نے بے وقوفوں کی طرح سر کھجا کے کہا "یار، یہ بات اپنی سمجھ میں نہیں آئی۔"
"کون سی بات؟"
"ایک رات میں مال چڑھایا۔ دوسری رات میں اتار لیا۔"
وہ ہنسنے لگا "ارے چڑھایا تھا کسی کوٹھی میں۔ اتارا یہاں اپنے گودام میں" اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔
میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر میں نے کہا "یار! اس رات جب کوٹھی میں ٹرک لوڈ ہو گئے تھے تو وہ گودام کے لیے روانہ کیوں نہیں ہوئے؟ اگلی رات پہنچے گودام۔"
"یار اب یہ ہمارا کام تو نہیں ہے نا۔ خواہ مخواہ کی باتیں پوچھتے ہو نا یار؟ اپنا کام کیا۔ پیسے لیے۔ موٹر میں بیٹھے اور واپس۔ لیکن آج تو سچی بات ہے کہ سو روپے بڑے مشکل لگ رہے ہیں۔"
"بہت نہیں ہے؟" میں نے کہا۔
"ہاں یار۔ اور آج کام بھی زیادہ ہے۔ گودام سے مال گاڑی تک لانا اور چڑھانا۔ [illegible] ہو گیا۔"
"ڈبل اجرت [illegible]"
اس نے پھر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا "اجرت تو دے رہے ہیں انعام کی امید ہے۔ لیکن انعام کا کیا بھروسہ۔ ان کی نیت بدل جائے۔ مزدوری دے کر کہیں بھاگ جائیں۔"
میں نے کہا "یار، ایک بات کہوں؟ تم ہو اپنے شہر کے، غلط مت سمجھنا۔"
باہر والا چائے اور بسکٹ رکھ کے غائب ہو چکا تھا۔ اس نے بسکٹ کھاتے ہوئے کہا "کہو یار۔"
میں نے کہا "آج کی اجرت تم ابھی لے لو ہم سے۔ تمہاری جگہ ہم چلے جاتے ہیں۔"

www.paksociety.com

اس نے مجھے غور سے دیکھا "یہ کوئی چکر والی بات ہے؟"
میں نے جلدی سے کہا "کوئی چکر والی بات نہیں۔"
"اگر وہ رات کو نہ آیا۔ پھر؟ تمہارے پیسے تو گئے ہیں!"
"وہ نہ آیا۔۔۔ تو تم واپس نہیں کرو گے؟"

وہ مجھے انتہائی سادہ دل یا بے وقوف سمجھنے پر مجبور تھا "اب آج ہم ملے ہیں۔ کل کی کسے خبر کہاں ڈھونڈو گے تم ہمیں اور ہم نے پہچاننے سے انکار کر دیا تمہیں۔ پھر؟ یا ہم نے خرچ کر دئیے پھر؟"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

وہ ہنسنے لگا "نئے ہو نا بمبئی میں" اس لئے بھروسہ کر رہے ہو۔ ہمارے بمبئی میں سب کچھ ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ ایسے ایسے چکر باز پڑے ہیں یہاں۔ ابھی واسطہ نہیں پڑا تمہارا۔"

میں نے کہا "چلو ہمارا تمہارا حساب برابر۔ مل گئے تو ہماری قسمت۔ نہ ملے تو تم پر کوئی قرض نہیں۔ جب ہوں تب دے دینا۔ چھ سو ہم قلیوں سے لے لو اور آج ہمیں جانے دو۔"

وہ شک میں مبتلا ہو گیا تھا جو ایک قدرتی بات تھی۔ اس نے ہمیں پہلی دفعہ دیکھا تھا اور ہمارے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ ایک قلی دوسرے قلی کو اپنے بارے میں کوئی بات غلط نہیں بتاتا۔ بتاتا ہے تو وہ غلط آدمی ہوتا ہے یا اس کے مقاصد غلط ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں یہ آ رہا تھا کہ ہم نے بھی اس سے دوستی کا رشتہ استوار کیا تھا تو اس کے پیچھے کوئی غرض مندی کا جذبہ تھا۔ یہ ملاقات اتفاقیہ نہیں تھی اور نہ ہمارا حسن سلوک بے سبب تھا۔ قلی کی زندگی کیا ہوتی ہے اور مالی طور پر وہ کتنا آسودہ ہوتا ہے یہ وہ بھی جانتا تھا اور اس نے ہمیں بھی بتایا تھا۔ ہمدردی وہ بھی رکھتا تھا مگر دوستی کے رشتے کا بھرم رکھتے ہوئے وہ پچاس روپے سے زیادہ قربان نہیں کر سکتا تھا۔ ہم جیسے حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے والے اس نے کہاں دیکھے ہوں گے جو چھ سو روپے پھینک دیں اور کہیں کہ جاؤ اپنے مسائل حل کرو۔ جیسے ہمارے لئے اپنے کوئی مسائل نہیں۔ پھر نہ ضمانت نہ واپسی کی شرط۔ ایسے سخی کیا قلی ہوتے ہیں!

میں نے اس کے تذبذب کو سمجھ لیا تھا "کیا بات ہے؟" میں نے کہا "کس سوچ میں پڑ گئے؟"
وہ چونکا "کچھ نہیں۔"
"پھر میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا؟"
"وہ۔۔۔ شاید یہ نہیں ہو سکتا۔ جو تم چاہتے ہو۔"
"ہم چاہتے ہیں یا نہیں؟" محسن نے کہا۔
"میرے چاہنے کی بات نہیں۔ وہ۔۔۔ انہوں نے کہا تھا کہ کسی سے ذکر مت کرنا۔۔۔ وہ تمہیں۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ تم پر اعتبار نہ کریں۔"
"تم کہہ سکتے ہو کہ ہم بھروسے کے آدمی ہیں۔ اپنا بھائی بتا سکتے ہو" غالب بولا۔

"بھائی۔۔۔ میں۔۔۔ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ کہیں گے کہ تم خود کیوں نہیں چلے" وہ گھبرا کے بولا۔

"اچھا تم کچھ مت کہنا۔ تم غائب ہو جاؤ۔ صرف اسے بھیج جاؤ جو بخار میں جلتا ہے۔ یہ بتا دے گا کہ تم سب بیمار پڑ گئے ہو۔ یہ کہ تم نے دو راتیں جاگ کر گزاری تھیں اور دن میں بھی مزدوری کرتے رہے تھے۔ آرام نہیں کیا تھا۔ ہر شخص بیمار ہو سکتا ہے اگر وہ دو دن اور دو راتیں اتنی سخت محنت کا کام کرے۔ اس میں نہ ماننے والی کوئی بات نہیں۔۔۔"

"ایک بات کہوں؟" اس نے میری بات کاٹ دی۔
"ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کہو۔"
"میرا خیال ہے تم قلی نہیں ہو" وہ بولا۔
میں نے غالب اور محسن کی طرف دیکھا "تو پھر ہم کون ہیں؟"
"مجھے نہیں معلوم۔ لیکن تمہارا مقصد کسی کی مدد کرنا معلوم نہیں ہوتا۔ تم کچھ اور چاہتے ہو" اس نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا اور اٹھنے لگا "مجھے معاف کرو۔"

اب میرے لئے زبردستی کے سوا چارہ نہ رہا۔ میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے بٹھا لیا "تم سمجھدار آدمی ہو" اس لئے اب جو کچھ میں بتانے والا ہوں۔ وہ غور سے سنو۔ تمہارا اندازہ بالکل درست تھا۔ ہم واقعی قلی نہیں ہیں۔"

"وہ سب جھوٹ تھا جو تم نے کہا؟" اس نے پریشانی سے ہم سب کی طرف دیکھا "نہ تم میرٹھ کے ہو" نہ تم غازی آباد کے اور نہ مراد نگر کے۔"

میں نے اعتراف کے طور پر سر ہلایا "ہم پولیس کے آدمی ہیں۔"
اس کا رنگ اڑ گیا "پولیس۔۔۔" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔
"گھبراؤ نہیں۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا" میں نے اسے تسلی دی "ہم چند مجرموں کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ سونے کی اسمگلنگ کرتے ہیں۔۔۔"
"سونے کی اسمگلنگ۔۔۔" اس کے حلق سے مری مری آواز نکلی۔
"ہاں۔ ان صندوقوں میں سونا تھا" اس لئے وہ اتنے بھاری تھے" میں نے کہا "وہ پیلی کیڈلک کار تھی جس میں تم کو لے جایا گیا تھا۔ اس کا مالک بمبئی کا ایک مشہور سیٹھ ہے جو پہلے دادا گیری کرتا تھا۔ زیدی کا نام سنا ہے کبھی؟"
وہ تقریباً اچھل پڑا "سیٹھ زیدی۔ نہیں جناب۔"
میں نے سنجیدہ ہو کے کہا "نہیں کا کیا مطلب ہے؟ ہم تو اس کار کا نمبر بھی بتا سکتے ہیں۔"
حقیقت یہ ہے کہ مجھے کار کا نمبر یاد نہیں تھا مگر محسن نے اس وقت خوب مدد کی۔ اس نے کار کا نمبر بتا دیا۔
"یہی نمبر تھا نا؟ تم نے دیکھا بھی تھا" محسن بولا۔
اس کے لئے اقرار میں سر ہلانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا

"آپ بھی کچھ رہے تھے۔"
میں نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ہم تو بہت دن سے دیکھ رہے تھے۔ سو دن چور کے پورے ہو گئے۔ ایک دن کوتوال کا آن گیا ہے۔ اب تم نے قانون کی مدد نہ کی تو خود بھی مجرم بن جاؤ گے۔"

"ہم قلی ہیں مائی باپ۔ مزدوری کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔ جو پیٹ دیتا ہے اس کی صورت پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کون ہے" اس کا لہجہ ایک دم رقت آمیز ہو گیا جو کسی بھی غریب کا تھانے دار کے سامنے خود بخود ہو جاتا ہے۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ وہ میرے ملک کے ان لاکھوں محکوم، مجبور اور مظلوم انسانوں میں شامل تھا جو جبر و استبداد کی چکی میں دن رات پستے چلے آتے ہیں۔ آباؤ اجداد کے زمانے سے غلامی اور غربت پر قانع ہیں اور اتنی ہمت نہیں رکھتے کہ کسی زبردست کے سامنے سر اٹھا کے بات کریں۔ بد معاش سے تو بہت ہی ڈرتے ہیں۔ وہ پولیس والے سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتے کہ تم قانون کے نمائندے ہو تو اپنی شناخت کا ثبوت پیش کرو۔ کیوں کہ پولیس بھی ایسے توہین آمیز سوال پر مشتعل ہو جائے تو ان کے لئے جینا مشکل کر دے۔

میں نے اس کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا "فکر مت کرو۔ نہ تمہارا نام کہیں آئے گا نہ کوئی تم سے کچھ پوچھے گا۔ ان سے ہم نمٹ لیں گے" میں نے بہتر سمجھا کہ اسے ریوالور کی ایک جھلک دکھا دوں تاکہ اسے میرے پولیس آفیسر ہونے کا یقین آ جائے۔ کسی قلی کے پاس ریوالور کا ہونا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا غریب کی جھونپڑی میں ہاتھی کا ہونا۔

"جناب عالی۔۔۔ وہ۔۔۔ کہیں بعد میں ہماری شامت نہ آ جائے" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے کہا "ذرا تم ایک بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ایسے لوگ جرم کے گواہ کو نہیں چھوڑتے۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ تم سے انہیں کوئی خطرہ نہیں۔ وہ پہلے بھی مال لاتے لے جاتے رہے ہیں اور اسی طرح قلی پکڑتے رہے ہیں۔ تم میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ تم نہ ملتے تو وہ کسی اور کو سو روپے میں بٹھا کر لے جاتے۔ ہاں پیسے دے کر وہ اتنا اطمینان ضرور حاصل کر لیتے ہیں کہ قلی کسی سے بھی کوئی بات نہ کرے۔ قلی اس لئے خاموش رہنا پسند کرتے ہیں کہ اس مزدوری میں سے بھتہ نہ دینا پڑ جائے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ تم نے تین دن میں چار سو روپے کمائے ہیں تو کیا تمہیں بھتہ نہیں دینا پڑے گا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ اس کی حالت میں ایک افسوس ناک انقلاب آ چکا تھا۔ اس کا دوستانہ رویہ اور پر اعتماد انداز رخصت ہو چکے تھے۔ وہ ناکردہ جرم میں پکڑے جانے والے کی طرح بدحواس تھا۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے نوٹ نکالے "ہم نہیں چاہتے کہ تمہارا کوئی نقصان ہو۔ اس لئے یہ رکھو۔"
"نہیں حضور" وہ ہاتھ پیچھے ہٹانے لگا۔
"بے وقوف مت بنو۔ یہ پولیس کی مدد کرنے کا معاوضہ ہے" میں نے کہا "کیا تمہیں پیسے کی ضرورت نہیں؟ تمہارے اس دوست کو علاج کے علاوہ اپنا قرض ادا کرنا ہے۔ چلو رکھو یہ اپنے پاس۔"

اس نے نوٹ یوں لئے جیسے کسی کو یقین ہو کہ بجلی کے تار میں کرنٹ ہے مگر وہ اسے چھو کر دیکھنے پر مجبور ہو۔
"یہ۔۔۔ یہ تو چھ سو روپے ہیں" وہ ہکلایا۔
"ہاں۔ قلیوں کے پانچ پانچ سو" میں نے کہا "اب انہیں فوراً جیب میں ڈال لو ورنہ کوئی لے اڑے گا۔"
"بھگوان خیر کرے۔ آج تک سنا نہیں "پولیس نے کسی کو اپنے کام کے لئے کچھ دیا ہو۔"
"ہم وہ پولیس والے نہیں ہیں۔ نارکوٹکس کنٹرول بورڈ کے لوگ ہیں" میں نے کہا۔
وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا۔

اسے سمجھانے کے لئے میں نے کہا "سیٹھ زیدی ایسے ہی سیٹھ بنا ہے۔ یہاں سے ہیروئن بھیجتا ہے" باہر سے سونا منگواتا ہے۔ اب سمجھ میں آئی بات؟ میں اپنی جیب سے کچھ نہیں دے رہا ہوں۔ انہی جیسے لوگوں کا مال ہے۔ اب تم اپنے ساتھی کے لئے کسی ڈاکٹر کا انتظام کرو۔ پچاس روپے میں ڈاکٹر اسے یہاں آ کے بھی دیکھ سکتا ہے۔ اسے سب سمجھا دینا۔ ہم رات کو پھر آئیں گے۔"

اس نے ہمت کر کے کہا "سرکار! اس کو جانے دیں۔ گھر میں خود نہ جاؤں گا رات کو۔"
غالب نے کہا "ابھی تم کہہ رہے تھے کہ وہ نہیں مانیں گے"
"اس کی جگہ میں لیٹ جاؤں گا جناب بیمار بن کے۔ اس سے تو بات بھی نہیں ہو گی۔"
"اور تمہارا تیسرا ساتھی؟" میں نے رضامندی ظاہر کرنے کے لئے سر ہلایا۔
"وہ [illegible] کرتا ہے مگر میں اسے سمجھا دوں گا۔"
"ٹھیک ہے جیسے چاہو کرو۔ بس ایک بات مت بھولنا کہ اتنے بڑے مجرم پولیس کو دھوکا نہیں دے سکے تو تم کیا ہو۔"
وہ کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا "توبہ میرے باپ کی جو میں کسی کو کچھ بتاؤں۔ لیکن مجھے تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑے گا۔"
"جھوٹ؟ کس سے؟" محسن نے کہا۔
"اپنے دوستوں سے۔ میں ان کو پانچ سو نہیں دے سکتا۔ شک میں پڑ جائیں گے۔"
"پھر کیا کرو گے؟" غالب بولا۔
"میں ان کو دو دو سو روپے دوں گا اور کہوں گا کہ وہ سو ڈالا

www.paksociety.com

آیا تھا۔ انعام دے گیا ہے اور بتا گیا ہے کہ آج رات کوئی کام نہیں اس لئے وہ نہیں آئے گا۔ ہم انتظار نہ کریں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "یہ بالکل بالکل ٹھیک ہے۔"

"پھر یار تم کیا سوچ رہے ہو۔ مجھے خیر رکھو۔ نہیں کہا۔ مگر مجھو اس کا قرضہ ضرور ادا ہونا چاہئے" میں نے کہا۔

اس نے اطمینان کا سانس لیا "تب تو میں اور بھی سو دے دوں گا۔ تب کہیں کے تو سیدھے سو رہے ہوں گا۔"

وہ اب لالچ کے جال میں پھنس گیا تھا۔ دوستی کے جذبات پر دولت کی فطری طلبی قوت غالب آ گئی تھی۔ اس کے لئے ہزار بارہ سو بھی ایک خزانے سے کم نہیں تھے جہاں جہاں اس کا ظرف بھی دور ہو گیا تھا اور وہ غداری کے لئے پوری طرح تیار تھا۔

"ہم رات کے ڈیڑھ بجے آئیں گے" میں نے کہا۔

"وہ کس وقت آیا تھا کل؟" غالب نے کہا۔

"نو بجے کے بعد" وہ بولا "تب نے تو دیکھا ہوگا؟"

"ہاں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو۔"

غالب نے فوراً اپنی غلطی محسوس کر لی۔

"ممکن ہے ہم پہلے ہی آ جائیں۔ تمہارا نمبر ہے سات سو بیس۔ ان کے نمبر بتاؤ؟" میں نے کہا۔

"یہ آٹھ سو بائیس ہے" اس نے بیمار کے بیج کو سامنے نمایاں کر کے کہا۔

بیمار نے آنکھیں کھول کے دیکھا اور بولا "کیا ہے؟"

اس کے نمبرے ساتھی کا بیج دیکھتے ہی نظر ڈرا تھا۔ اس کا نمبر گیارہ سو چوبیس تھا۔

"پانی ... سپاہی لا رے مجھے" بیمار قلی نے کراہتے ہوئے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "میرا آخری سے وقت آگیا۔"

"میں ابھی تجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتا ہوں" نمبر سات سو بیس نے کہا۔

وہ کراہا۔ "میں مرنے والا ہوں۔ پانی دے دے تھوڑا سا۔"

"ارے تو جیئے گا سو سال تک" سات سو بیس نے کہا۔

ہم نے اپنے اپنے ٹوکرے اٹھائے اور کہا "اچھا یار، ہم چلیں۔ اب کچھ مزدوری کر لیں۔ رام رام۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا۔ واپس جانے کے بجائے ہم نے وہیں سے ریلوے لائن کے ساتھ چلنا شروع کیا۔ ہمارے سیدھے ہاتھ پر ایک جنگلا تھا جو باہر کی سڑک کو ریلوے یارڈ سے الگ کرتا تھا۔ اس کا ایک حصہ توڑ کے باہر نکلنے کا راستہ بنا لیا گیا تھا۔

ہم بھی جنگلے کے درمیان سے گزر گئے اور کسی گیٹ سے داخل ہونے کے بجائے اس چور دروازے سے براہ راست مال گوداموں کے علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر گودام ایسی ہی کوئی بہت بڑی عمارت تھا جو کسی ہوائی اڈے پر رکھے ہوئے جہازوں کے ہینگر کی طرح نظر آتی تھی۔ ان کے دیوپیکر فولادی گیٹ کھلے ہوئے تھے اور گیٹ کے سامنے والے پلیٹ فارم پر ٹرک یوں کھڑے ہوئے تھے کہ ان کا رخ مخالف سمت میں تھا اور پیچھے کا کھلا حصہ پلیٹ فارم کے برابر آ جاتا تھا۔ ہر گودام کے سامنے یہ ٹرک قطار میں تقریباً ملے ہوئے کھڑے تھے اور گودام سے ٹرک تک سامان لانے یا ٹرک سے سامان اتار کے گودام میں پہنچانے والے مزدور کمر پر بوجھ اٹھائے دوڑتے ہوئے تیز تیز قدموں سے مسلسل پھیرے لگا رہے تھے۔ سامان بک کرانے والے اور سامان چھڑانے والے مختلف کھڑکیوں کے سامنے جمع تھے اور ان کی مشکل کو آسان کرنے والے ایجنٹ بہت مستعد تھے۔

گودام کی دیوار کے سائے میں اس وقت بھی بہت سے لوگ سوئے ہوئے تھے۔ بمبئی میں سونے کی جگہ بھی اتنی مشکل سے ملتی ہے جتنی مشکل سے سونے کے لئے وقت ملتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ شفٹوں میں کام کرتے ہیں اور شفٹوں میں سوتے ہیں۔ یہ رات کی شفٹ میں کام کرنے والے تھے جو اس وقت زمانے بھر کے شور و غل سے بے نیاز گہری نیند میں کھوئے ہوئے تھے۔ جب دن کی شفٹ والے کام سے فراغت پا کے لوٹیں گے تو یہ ان کے لئے جگہ خالی کر دیں گے اور خود فکر روزگار کے لئے نکل کھڑے ہوں گے۔

ہم ایک بینچ کے پیچھے جمع ہو گئے۔ بینچ پر بھی کوئی سو رہا تھا اور اس کے نیچے کی سایہ دار جگہ پر بھی۔ ہمارے سامنے تھوڑے فاصلے میں درجن بھر افراد چادریں تانے ایک قطار میں لیٹے ہوئے تھے۔

دوپہر کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے اور ہم اپنے حق میں ایک اہم کامیابی کے لئے راستہ ہموار کر چکے تھے۔ قلی نمبر سات سو بیس کا ملنا ایک ایسا اتفاق تھا جسے ہم تائید ایزدی سے منسوب کر چکے تھے۔

"میرا دل چائے پینے کو چاہتا ہے۔" محسن نے کہا۔

"دوبارہ چائے پینے کے بعد بھی؟" غالب نے کہا۔

"وہ کوئی چائے تھی؟"

"یہاں ایسی ہی چائے ملے گی۔ اسپیشل انٹرنیشنل ریلوے اسٹیشن برانڈ" میں نے کہا۔

"ماما جی نے کیا کہا تھا۔ کسی کینٹین میں مت جانا" غالب نے یاد دلایا "یہ گھبرا رہا ہے تو باہر والا چھوکرا حاضر ہے۔"

میں نے کہا "اس گھپلے کی سزا کوئی ... جو چائے کہلاتی ہے جانے تو وہ بھی نہیں ہوگی مگر ... وہ گرم مشروب ہے۔"

غالب نے چلا کے کہا "او ئے باہر والا! تین دودھ پتی اسپیشل۔ ایک دم کڑک۔ جلدی۔"

باہر والا بمبئی میں ہر جگہ پائی جانے والی مخلوق ہے۔ جہاں لوگ جمع ہوں گے وہاں باہر والا چھوکرا ضرور نظر آئے گا۔ ایک ساتھ دونوں ہاتھوں میں چار چار اسٹینڈ اٹھائے ہوئے وہ ہوٹل کے آس پاس دوڑتے رہتے ہیں۔ ہر اسٹینڈ میں چار یا چھ گلاس ہوتے ہیں۔ پانی پینے والے عام گلاس نصف اور وہ بھی نصف خالی۔ مگر تواتر کے ساتھ ہی چائے حاضر کرنے اور گلاس خالی ہوتے ہی پیسے وصول کرنے کے لئے نازل ہونے میں ان کا جواب نہیں۔ ان کی پھرتی اور مستعدی پر حیرت ہوتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی چائے طلب کرے اور پیسے دیئے بغیر یا گلاس سمیت غائب ہو جائے۔ ساتھ ساتھ بنے ہوئے ایرانی ہوٹلوں کے باہر والوں کے درمیان ہر وقت ایک مقابلہ جاری رہتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ چائے کے آرڈر لینے کا۔ نہ انہیں کوئی بھی نہیں روکتا۔ غالباً وہ کمیشن بیس پر رکھے جاتے ہیں۔ برائے نام تنخواہ اور کمیشن۔ مجھے ان کی جسمانی صحت کی خستہ حالی اور اخلاقی زبوں حالی دیکھ کر افسوس ہوا تھا۔ اتنی کم عمر میں یہ بچے کمانے کی مشین بنا دیئے گئے تھے اور اس بچپن سے محروم تھے جو معصومیت کے قہقہے بکھیرنے اور تتلیوں کے پیچھے بھاگنے اور امید مستقبل کے آسمان پر خوابوں کی رنگین پتنگ کو اونچا اڑانے اور خود اس کے ساتھ اڑنے کا نام ہوتا ہے۔

محسن نے اچانک کہا۔

"قدرا کی درین کاموشی سے پوچھئے احوال
کہ آگ لگتے کو جا نہیں پھیری مل جائے"

غالب نے کہا "کبھی ناممکن بات بھی ممکن ہو جاتی ہے۔ یہ ذہنی اذیت برمحل شعر ڈھونڈتا ہے اور ٹھیک ڈھونڈتا ہے۔"

محسن نے مشتعل ہو کے کہا "کیا حادثہ تمہارے ساتھ بھی پیش نہیں آیا؟"

"میں نے دیوان غالب لکھ دیا ہے۔ تم نے کیا لکھا ہے؟" غالب نے متانت سے کہا۔

"میں مرثیہ لکھوں گا تمہارا۔ اور نادر کو پیش کروں گا۔"

"یار بہت ہے تو یہ کام آج ہی کر کے رکھو۔ انعام بھی آج ہی مل جائے گا" غالب نے کہا۔

"سب کو اپنے جیسا مت سمجھو۔ مرد کی تو ایک نظر ہی کافی ہوتی ہے عورت کو قدموں میں گرانے کے لئے۔"

"مجھے معلوم ہے" غالب نے کہا "تم اپنی بات کرو۔"

باہر والا چائے لے کر نہ آتا تو یہ جنگ چلتی رہتی۔ رفعت ... نے کہا "اب گودام میں جا کے کچھ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ رات کو دیکھ لیں گے۔"

غالب نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا "ہاں۔ ہم ان کو دیکھیں گے اور وہ ہمیں۔ اگر پہچانے گئے تو ان کے بہت خوش ہوں گے۔"

"ان کے مقابلے میں رات کو اس کا امکان کم ہوگا۔"

محسن نے کہا "قلی نمبر سات سو بیس ڈبل ایجنٹ بن گیا تو دوسری طرف سے بھی انعام وصول کر سکتا ہے۔"

"میں اس کی جگہ ہوتا تو یہی کرتا" غالب بولا۔

"مگر وہ ایک معمولی قلی ہے" میں نے کہا "دریا میں رہ کے مگر مچھ سے بیر نہیں رکھے گا۔ ہم پولیس والے ہیں۔"

"کیا اس نے واقعی یہ مان لیا ہے؟"

میں نے کہا "میں نے اسے ریوالور دکھا دیا تھا۔"

"ہر ریوالور رکھنے والا شخص پولیس مین نہیں ہوتا۔" غالب نے کہا۔

"راست... مگر وہ موت کا نامہ بر ضرور ہوتا ہے۔ فریق اول کے بارے میں اسے کوئی شبہ نہیں ہوگا کہ وہ مجرم ہیں۔ ان کا طریقہ واردات بھی ایسا تھا۔ خلاف معمول اور پراسرار۔ عام شریف لوگ رات کے اندھیرے میں خبروں کو کار میں بٹھا کے نہیں لے جاتے۔ نہ اتنا معاوضہ دیتے ہیں اور نہ رازداری کی تاکید کرتے ہیں۔ ہم نے براہ راست نہیں بتایا مگر آخر کار تسلیم کر لیا کہ ہم کون ہیں۔ اس نے پولیس کا آدمی نہ سمجھا تو پھر یہ سمجھے گا کہ ہم بھی ان کی ٹکر کے مجرم ہیں اور ہماری دھمکی کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔"

باہر والا چائے کے پیسے لینے آیا تو اس نے کہا "تم کو ادھر بلا رہا ہے" اس نے ہوٹل کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے .... کون بلا رہا ہے؟" میں نے حیران اور پریشان ہو کے کہا۔

"اپن کو نہیں معلوم۔ جا کے دیکھو۔" باہر والا مختصر بات کر کے دوڑ گیا۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟" محسن بولا۔

"کہیں کسی کو غلط فہمی نہ ہوئی ہو" غالب نے کہا۔

"کسی نے ... پہچان تو نہیں لیا؟" میں نے وہ بات کہہ دی جو سب کے دل میں تھی مگر کہنا کوئی نہیں چاہتا تھا "ٹھہرو میں جا کے دیکھتا ہوں۔ تم باہر سے نظر رکھو۔"

لمبے سرنگ جیسے تنگ و تاریک ہال میں پرانے گھسے ہوئے ریکارڈ اونچی آواز میں بجائے جا رہے تھے۔ ریڈیو پیالیوں اور برتنوں کے شور میں چیخ چیخ کر باتیں کرنے والوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ میں نے اس کونے سے اس کونے تک دیکھا۔ پھر مجھے ایک ہاتھ اوپر اٹھا ہوا نظر آیا جو مجھے بلا رہا تھا۔

میں نے تیزی سے قریب جا کے کہا "یوسف!"

"ہاں یار۔ اتفاق سے نظر پڑ گئی تم پر۔"

"تم کیا کر رہے ہو یہاں؟ اور یہ بڑی غلط حرکت کی ہے تم نے" میں نے برہمی سے کہا "تم نے تو تقریباً راز فاش کر دیا ہے میرے اس بہروپ کا۔"

"مجھ پر کیوں خفا ہوتے ہو یار۔ ... کوئی اپنی مرضی سے آیا ہوں" یوسف نے کہا "گھنٹہ بھر ہو گیا تم کو ڈھونڈتے ہوئے۔ ابھی

www.paksociety.com

تھک گیا تھا تو چارپائی پہ جا بیٹھا۔"
"ایسی کیا آفت آگئی تھی؟"
"آفت تو یار وہ لڑکی ہے۔ توبہ توبہ۔ اس نے تو میرا ملبہ کر دیا تھا" یوسف نے ہاتھ جوڑ کے منہ اوپر اٹھایا "زندگی تھی کہ اللہ نے بچا لیا۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا "تم نازو کی بات کر رہے ہو۔ کیا کیا ہے اس نے؟"

"اس نے... میرے کو ایسے اٹھایا جیسے مداری لوگ ڈگڈگی کو اٹھاتا ہے۔ اور ایسے ہلایا جیسے میں ڈگڈگی ہوں اور چارپائی پہ پھینک دیا۔ اللہ کا شکر ہے فرش پر نہیں پھینکا ورنہ اپنا جنازہ اسی چارپائی پر اٹھتا۔ ایسی ظالم حسینہ" یوسف نے پھر دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔

مجھے ہنسی بھی آرہی تھی اور غصہ بھی تھا "آخر ہوا کیا تھا؟ تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت تو نہیں کی تھی۔"

"یہ کیا بولتے ہو اپنے سکندر بھائی۔ میرا مزاج تو بچپن سے عاشقانہ ہے مگر قسم خدا کی ابا بھی نہیں کہ کسی کی عزت کا خیال نہ ہو۔ وہ تو اس نے کہا کہ میرا میک اپ کرو ابھی اور میرے کو کرسچین چھوکری بنادو' مجھے جانا ہے فوراً۔"

"کہاں جانے کا ارادہ تھا اس کا؟"

"میں نے پوچھا تو بولی کہ سسرال جانا ہے۔ تم کو کیا۔ لڑکی ہے کہ کوئی۔ میں نے کہا کہ تم کو تمہارا گھر والا کیا بول کے گیا تھا کہ گھر میں بیٹھو۔ باہر جاؤ گی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ کیا میں نے غلط بولا تھا۔"

"نہیں" میں نے ہنستے ہوئے کہا "مگر تم کو یہ کہنا نہیں چاہئے تھا۔"

اس نے اپنے سر پہ ہاتھ مارا "مجھے کیا معلوم تھا بابو کہ وہ کیا بلا ہے۔ وہ تو جب میں چارپائی پہ لیٹا چھت کو گھورتا ہوا دیکھ رہا تھا تب میری سمجھ میں آیا۔ اللہ میری توبہ۔"

میں نے ہنسی پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور کہا "بابا ماجی موجود نہیں تھے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہی نہیں تھے تو یہ لفڑا ہوا۔"

"ماماجی کہاں گئے؟"

"ہم ہی نے کہیں بھیجا تھا۔ ایسی چکر باز چھوکری ہے' میرے کو ابھی تک چکر آرہے ہیں" وہ بولا۔

"آگے بتاؤ۔"

"آگے کیا بتاؤں۔ میں نے میک اپ کر دیا۔ اس نے پتا نہیں کس کے کپڑے پہنے اور چلی گئی۔ وہ جو دوسری لڑکی ہے گل' اس نے بھی روکا تھا۔ بہت منع کیا تھا۔ وہ بہت شریف اور معصوم لڑکی ہے۔ خیر معصوم تو یہ بھی نظر آتی ہے مگر....." اس نے پھر کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"وہ کچھ بتا کے نہیں گئی کہ کہاں جا رہی ہے؟" مجھے اب نازو پر غصہ آنے لگا تھا۔

"وہی تو بتانے لگا تھا میں۔ اس نے بولا تھا کہ جاؤ انہیں تلاش کرو۔ ان سے کہنا کہ میں گھوڑے اور گدھے دیکھنے جا رہی ہوں۔ کیا مطلب ہوا اس بات کا؟ میری تو ہمت نہیں پڑی کہ اس سے پوچھتا۔ میرے کو پھر ڈگڈگی بنا دیتی۔"

"بے وقوف لڑکی" میں نے بے اختیار کہا۔ مجھے اس پر سخت طیش آرہا تھا۔ اس احمقانہ خودسری کے نتیجے میں اپنے ساتھ وہ ہمارے لئے بھی پریشانی کے اسباب پیدا کر سکتی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ زبوچی کے ریس کے گھوڑوں کا پتا چلانے نکلی ہے مگر کسی سے مشورہ کئے بغیر اس کا اکیلے نکل جانا بہت غلط حرکت تھی۔

میں نے یوسف سے کہا "تم جاؤ واپس۔ گل سے کہنا پریشان نہ ہو۔ ہم کو پیغام مل گیا ہے اور اب ہم صورت حال کو سنبھال لیں گے' گل اکیلی ہوگی۔"

یوسف کھڑا ہو گیا۔ میں اس سے پہلے ہی نکل آیا۔ کسی نے ہماری گفتگو نہیں سنی تھی۔ وہاں جتنے لوگ موجود تھے سب اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ غالب اور محسن کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے کے بعد میں نے انہیں تلاش کر لیا۔

"کون تھا؟ تم بہت جلدی میں ہو" غالب نے کہا۔

"یوسف تھا" میں نے کہا "پیغام لے کر آیا تھا۔"

"کس کا؟"

"اس کا جس کے تم گھر والے ہو" اس وقت تک میرا غصہ کافی حد تک کم ہو چکا تھا۔ "وہ نکل گئی گھر سے۔"

"کون۔ نازو۔"

"اور کون" میں نے کہا "بڑی دھمکی دے کر آئے تھے کہ قدم گھر سے نکالا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ ہمارے روانہ ہوتے ہی وہ بھی چلی گئی۔"

"مگر کہاں؟" غالب نے پریشان ہو کے پوچھا۔

میں نے جواب میں وہ سب بتا دیا جو مجھے یوسف کی زبانی معلوم ہوا تھا۔ وہ یوسف کی حالت زار تھی اور اس کا انداز بیاں تھا جس پر مجھے ہنسی آ گئی تھی۔ میری بات سن کے کوئی بھی نہیں ہنسا۔

"یہ تو بہت غلط حرکت کی اس نے" غالب نے کہا۔

"صرف غلط حرکت کہتے ہو تم اسے۔ یہ ایک احمقانہ غلطی ہے اور میرے نزدیک جرم ہے" میں نے بگڑ کے کہا۔

محسن نے میری تائید کی "ڈسپلن کی خلاف ورزی کو جرم ہی سمجھا جائے گا۔ یہ لڑکی پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اکیلی ہی ساری دنیا کو فتح کرے گی۔"

"اسی خوش فہمی کے سنگین نتائج کا خمیازہ کسی دن سب کو بھگتنا پڑے گا" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے" غالب نے سنجیدہ ہو کے کہا "تم کو اختیار ہے کہ اسے جو چاہے سزا دو۔ اس نے سرکشی اور بغاوت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایم نو ایس کی عدالت میں اس پر بھی مقدمہ چلاؤ اور اسے گولی مار دو۔"

محسن نے حیرانی سے غالب کو دیکھا "تم نے برا مانا ہے ہماری بات کا۔ خود سوچو کہ ایسے سب اپنی اپنی کرنے لگے تو تنظیم کی ایسی تیسی ہو جائے گی۔ ساتھ رہ کے اگر صلاح مشورہ بھی نہیں کرنا تو پھر سب جائیں اپنے اپنے راستے۔ جس کا جو دل چاہے کرے۔"

"تمہیں بس یہ غم ہے کہ ڈسپلن خراب ہو گیا۔ نازو کی کوئی فکر نہیں ہے" غالب نے جذباتی ہو کے کہا۔

"خواہ مخواہ ہمیں ایموشنل کرنے کی کوشش مت کرو کہ صرف تم ہی نازو سے محبت کرتے ہو" محسن نے برہم ہو کے کہا "ہم کیا جذبات سے عاری اور بے مروت لوگ ہیں جو دوستی کے رشتے کا نام بدنام کرتے ہیں۔"

میں نے انہیں سمجھانے کے لئے کہا "مرزا جی! کیا دوستی میں کوئی ڈسپلن نہیں ہوتا؟ لحاظ اور مروت' ایثار اور قربانی' وفاداری اور جاں نثاری کے لئے کیا خود کو جذباتی ڈسپلن کا پابند نہیں کرنا پڑتا۔ کیا رشتوں میں ڈسپلن نہ ہو تو وہ قائم رہ سکتے ہیں۔ بڑوں کے ساتھ عزت کا سلوک اور چھوٹوں سے شفقت کا اظہار۔ میاں بیوی کے حقوق و فرائض کا تعین۔ سماجی تعلقات کی وضعداری اور رکھ رکھاؤ۔ یہ سب ڈسپلن ہے۔ دنیا کے اور آخرت کے تمام معاملات ڈسپلن کے متقاضی ہیں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا" غالب نے شرمندہ ہو کے کہا۔

"چلو چھوڑو یہ بات" میں نے کہا "قصور نازو کا بھی نہیں۔ اس کی جذباتی سرکشی میں بھی نیک نیتی اور خلوص کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ بس یہ اس کی فطرت ہے۔"

محسن نے کہا "تمہاری بات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس غلطی پر بھی تم اس سے باز پرس نہیں کرو گے؟"

میں نے کہا "یار وہ بہت زود رنج اور حساس ہے۔ آخر ہے تو ایک لڑکی۔ ہم اس سے لڑ سکتے ہیں' اس کا کورٹ مارشل نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی اچھا ہوتا ہے جس کے دل میں جو ہے منہ پر صاف کہہ دے' بہرحال ختم۔ چلو پہلے تو اسے تلاش کریں۔"

"کہاں جا کے تلاش کریں؟" محسن نے کہا "وہ کیسے تلاش کریں!؟ اس نے تو حلیہ ہی بدل رکھا ہے۔"

"وہ خود ہمیں دیکھ لے گی" میں نے کہا۔

لیکن ایک گھنٹے سے زیادہ اس علاقے میں الگ الگ پھرنے کے بعد ہم دوبارہ ملے تو پہلے سے زیادہ مایوس تھے۔ نازو کا کوئی پتا نہ تھا۔ صبح کی ٹاپ گاڑی سے جانے والے ریس کے گھوڑے ابھی تک ریلوے سٹیشن تک پہنچے ہی نہیں تھے۔

"مجھے ایک کنٹینر نظر آیا لیکن اس کے اندر نا جو جانے والی ٹیکسٹائل مل مشینری تھی" غالب نے رپورٹ دی "کسی نے مجھے اندر جھانک کر دیکھنے سے روکا بھی نہیں۔"

"میں نے بھی مویشیوں کا ایک وفد دیکھا جو اسی ٹرین سے جانے والا تھا۔ اس میں گائے بھینسوں کے ساتھ بکریاں تھیں مگر گھوڑے جیسا کوئی جانور نہیں تھا" محسن بولا۔

"وہ ریس کے گھوڑے عام جانوروں کے ساتھ جائیں گے بھی نہیں۔ الگ بوگی میں ہوں گے" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ابھی وہ گھوڑے پہنچے ہی نہیں" غالب نے کہا "ورنہ چالیس فٹ لمبا کنٹینر ایسی چیز نہیں کہ نظر نہ آئے۔"

"نازو بھی جھک مار کے واپس چلی گئی ہوگی" محسن نے کہا۔

"بس ہم بھی واپس چلیں۔ ابھی کوئی کام نہیں یہاں" غالب بولا۔

اچانک مجھے اپنے بائیں طرف ایک عجیب سی ہلچل اور بے چینی کا احساس ہوا۔ بہت سے قلی کام چھوڑ کے کھڑے ہو گئے تھے اور ایک دوسرے سے چلا چلا کے کچھ پوچھ رہے تھے۔ ہمارے قریب ہی ایک بہت لمبے تڑنگے قلی نے دوسرے قلی کو دھکا دیا۔

"تو کدھر بکا ہے"

دوسرا قلی سکھ تھا۔ اس کی پگڑی کھل گئی "ہم دیا! سچے دا گورو کی سونہہ" اس نے پگڑی اٹھا کے پھر اپنے سر کے بالوں پر رکھ لی "ہم ایسی گل کریں گے مرنے والی۔"

وہ اپنی مادری پنجابی کے الفاظ کو بمبئی کی بولی میں بلا ارادہ شامل کر رہا تھا۔ لمبے تڑنگے قلی نے کہا "ہم چل کے دیکھتے ہیں۔"

"تم بھی چلو ہیں بال" سکھ نے کہا "ایک منٹ____"

مگر دوسرے قلی نے اسے ایک منٹ کی مہلت بھی نہ دی اور وہ دونوں پگڑی باندھتے ہوئے دوڑے۔ ایک اور قلی سے جو صرف نیکر پہنے ہوئے تھا ان سے کچھ پوچھا۔ اس کا سیاہ بدن دھوپ اور پسینے میں چمک رہا تھا۔ میں نے چند اور قلیوں کو بھی بھاگتے دیکھا۔

اسپورٹس زندگی کے بارے ایک کوچہ گرد و نورد کی سرگزشت
بابر زمان خان کی آپ بیتی جگ بیتی
سب رنگ میں شائع ہونے والا مقبول ترین سلسلہ
بازی گر
قیمت
ایڈوانس بکنگ کے لئے رابطہ فرمائیں

www.paksociety.com

"کیا ہنگامہ ہے آخر؟" محسن نے کہا۔

"قلیوں کا معاملہ ہے کوئی" غالب نے کہا "ہوا ہو گا کوئی فساد۔ یا کوئی ٹرین سے کٹ کے مر گیا ہو گا۔"

ہم ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ماماجی کے کوارٹر کی طرف جا رہے تھے۔ مختلف اور دور دور تک پھیلی ہوئی پٹریوں کو عبور کرتے بہت سے قلی بھی ادھر ہی آ رہے تھے۔ کچھ قلی ہمارے پاس سے دوڑتے ہوئے گزر گئے۔

میں نے ایک کو روکنے کی کوشش کی اور پوچھا "کیا بات ہے؟"

اس نے جنوبی ہند کی کسی زبان میں جو کچھ کہا اس کا ایک ہی لفظ میری سمجھ میں آیا اور وہ لفظ تھا "ماماجی"۔

"اس نے ماماجی ہی کہا تھا نا؟" محسن بولا۔

"کسی اور اردو سمجھنے والے سے پوچھتے ہیں" میں نے کہا۔

دوسرا قلی جسے غالب نے روکا، بنگالی تھا۔ اس نے احتجاجی نعرے کے انداز میں کہا "غنڈہ لوگ مالک کا سور دیا۔ فس قلی چلانے کے سور کا اندر گولی مورا" اس نے دو انگلیاں اٹھا کے اور آنکھیں وحشت سے پھیلا کے کہا۔

ہم اپنی جگہ سن ہو گئے۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ جو میں نے سنا وہ سچ ہے۔ اس نے اپنے لب و لہجے میں کہا تھا کہ غنڈوں نے حملہ کر کے انہیں مار دیا۔ پستول سے دو گولیاں ان کے سر میں ماریں۔ غالب اور محسن نے بھی بنگالی کی بات سمجھ لی تھی۔

"کیا ماماجی کو گولی ماری۔ کس نے؟"

"غنڈوں نے۔ بنگالی نے کہہ دیا تو" محسن بولا۔

"غنڈوں نے...... کیسے ہو سکتا ہے..... ان کا غنڈوں سے کیا تعلق ہے؟"

میں نے کہا "ان کا تعلق ہم سے تو تھا۔"

"اور انہیں سزا ملی ہے اس تعلق کی...؟"

"ایسا ہی لگتا ہے مجھے" میں نے کہا "منگاڈی مسلسل ہمارے تعاقب میں تھے۔ ایک جگہ سے ہم فرار ہو گئے تھے مگر منو میاں پکڑ لئے گئے تھے۔ ان کو سکن شین نے دہشت گردوں سے رہا کرا لیا تھا اور خود مارے گئے تھے۔ ہم سب کو ماماجی نے ہی تو پناہ دی تھی۔ کیا یہ کم سنگین جرم تھا؟"

"او میرے خدا!" محسن نے اپنا سر پکڑ لیا "کیا انہیں منو میاں اور ماماجی کے تعلق کا علم تھا؟"

"دشمن کو کبھی بے خبر نہیں سمجھنا چاہئے۔ ہم نے تو کوئی احتیاط بھی نہیں کی تھی۔ نہ جانے کتنے لوگوں نے ہمیں دیکھا ہو گا۔"

"منگاڈی وہاں کل بھی تھی۔ شاید یوسف بھی ہو گا" محسن نے پُر وحشت لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے نادر بھی وہاں پہنچ گئی ہو" غالب نے کہا۔

ہم سب ایک جیسے پریشان کن خیالات تھے۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت ہمارا حلیہ دوسروں سے مختلف نہیں تھا اور قلیوں کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔ درمیانی فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ چند منٹ میں ہم نے وہ ہجوم دیکھ لیا جو ماماجی کے دروازے پر جمع ہو چکا تھا۔ شبہے کی اب کوئی گنجائش نہ رہی تھی کہ بنگالی نے مصدقہ اطلاع فراہم کی تھی۔

جیسے جیسے یہ خبر پھیل رہی تھی قلی کام چھوڑ کے اسی طرف کا رخ کر رہے تھے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی دروازے کے سامنے دو ڈھائی سو قلی اکٹھے ہو گئے تھے۔ آگے جانے کا راستہ نہ تھا مگر میں خوفزدہ، صدمے سے بے حال اور مشتعل لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔

اس طرح بہ زور بازو سب کو دھکیل کر راستہ بنانے میں مجھے بہت سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے قلی بھی اتنے ہی مضطرب نظر آتے تھے لیکن وہ میرے دلی اضطراب کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ زور زبردستی پر احتجاج کرنے والے سب ہی تھے۔ چند ایک نے مجھے جسمانی طور پر روکنے کی بے سود کوشش بھی کی۔ میرے کپڑے پھٹ گئے اور میرا راستہ روکنے والے مجھے گالیاں دیتے رہ گئے۔

محسن اور غالب کو بھی اندازہ تھا کہ اس ہجوم کو چیر کر آگے پہنچنے کے لئے طاقت ہی کام آئے گی۔ شرافت سے کوئی راستہ نہیں دے گا۔ وہ میرے پیچھے رہے اور کسی کی گالی گلوچ کی پروا کئے بغیر سب کو دھکے دے کر ایک طرف کرتے ہوئے آگے پہنچنے میں کامیاب رہے۔

تاہم ہماری یہ طاقت آزمائی رائیگاں ہی گئی۔ پولیس ہم سے پہلے وہاں پہنچ گئی تھی اور انہوں نے قلیوں کو دروازے سے آگے گزرنے سے روک دیا تھا۔ شروع میں پہنچنے والوں کو انہوں نے ڈنڈے سے بھگانے کی کوشش ضرور کی تھی مگر ہجوم بڑھنے لگا تو انہوں نے محسوس کیا کہ تشدد سے صورت حال بے قابو ہو جائے گی۔ ان کے ساتھ ایک جونیئر افسر آیا تھا جو پرانے "ان پڑھ" ترقی پانے والے افسروں کے مقابلے میں کچھ ذہین اور محتاط قسم کا تھا۔ اسے بہت جلد اندازہ ہو گیا تھا کہ مقتول ماماجی سب قلیوں کے ماماجی تھے اور اس کے سیکڑوں بھانجوں کے دل ہمدردی سے بھیجے جا سکتے تھے۔ قوت کے مظاہرے سے اشتعال کے پھیل جانے کا امکان تھا۔ وہ ہڑتال بھی کر سکتے تھے۔ مگر توڑ پھوڑ پر اتر آتے تو ریلوے کا بہت نقصان ہوتا۔ لاٹھی چارج، آنسو گیس کے استعمال یا فائرنگ کی نوبت آجاتی تو معاملہ بہت سنگین ہو جاتا۔ وہ خود کچھ بھی کرنے کا مجاز نہیں تھا۔ وہ غلطی سے لاٹھی چارج کا حکم دے دیتا تو بعد میں تحقیقاتی کمیشن اسی پر ساری ذمہ داری عائد کر دیتا۔

جب میں آگے پہنچا تو وہ ہاتھ جوڑ کے قلیوں کے جذبات ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا "بھائیو! کچھ میری نوکری کا خیال

کرو۔ میں خود مجبور ہوں۔ میں کسی کو اس وقت تک آگے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا جب تک تفتیش مکمل نہ ہو جائے۔"

"ماماجی کو مروا دیا گیا ہے" کسی نے چیخ کر کہا۔

"ہو نہیں مروانے والے قلیوں کے دشمن ہیں۔"

پولیس کے سب انسپکٹر نے کہا "دیکھو جب تفتیش ہو گی تو سب سامنے آ جائے گا۔"

"کچھ سامنے نہیں آئے گا۔ سب چھپا لیا جائے گا" کسی اور نے چیخ کر کہا۔

"ماماجی کی لاش ہمارے حوالے کرو۔"

بیک وقت کئی آوازیں آئیں "لاش ہمارے حوالے کرو۔"

"ہم ارتھی لے کر پولیس کمشنر کے پاس جائیں گے" کوئی دہاڑا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی تائید کی۔

"ریلوے منتری کے پاس جائیں گے" ایک اور مشتعل شخص نے کہا اور اس کی تجویز کی حمایت میں بھی بہت سی آوازیں اٹھیں۔

سب انسپکٹر نے پھر صورت حال کو کنٹرول میں کیا "بھائیو! ایسا مت کرو۔ تم سارے سراغ مٹا دو گے تو جنہوں نے یہ کیا ہے وہ بچ جائیں گے۔ مجھے تم سب کے دکھ کا احساس ہے۔ میں بھی غریب قلی کا بیٹا ہوں۔ میرے سورگباشی پتاجی کی موت سے بھی ایسے ہی آدمی تھے۔ وہ مزدور یونین کے صدر تھے اور مالکوں نے انہیں بھی مروا دیا تھا اور پولیس نے کہا تھا کہ یہ ایک دُر گھٹنا تھی۔ مزدور تمہاری طرح کرودھ میں آ گئے تھے۔ انہوں نے مل کو تباہ کرنے اور آگ لگانے کی کوشش کی تھی۔ اس سے کچھ بھی پراپت نہیں ہوا۔ سوائے نقصان کے۔ پولیس کی فائرنگ سے اور لوگ مارے گئے۔ مالکوں نے ان سب کو ختم کروا دیا جو بعد میں میرے پتا کی جگہ لے سکتے تھے۔ ان سب کو اپرادھی بنا دیا گیا جو نردوش تھے۔ پولیس نے انہیں چن چن کے نشانہ بنایا۔ ایک میری ماں ہی ودھوا نہیں ہوئی۔ میں ہی اناتھ نہیں ہوا۔ بہت سے پریوار اجڑ گئے تھے۔ یونین میں مالکوں کی مرضی کے لوگ آ گئے تھے۔ حالانکہ وہی ہتھیارے تھے۔ کیا تم بھی یہی چاہتے ہو؟ قانون کو اپنے ہاتھ میں لو گے تو اپنے ساتھ انیائے کرو گے۔"

مشتعل مزدور ایک دم خاموش ہو گئے۔ اچانک ان کے جذبات کے تند و تیز دھارے نے اپنا رخ بدل لیا۔ وہ پولیس کے دشمن ضرور تھے مگر ان کے سامنے کھڑا ہوا سب انسپکٹر انہیں اپنے جیسا مظلوم لگا۔ وہ ایک مزدور کا بیٹا تھا اور ان کو ہمدردی میں صحیح مشورہ دے رہا تھا۔

معلوم نہیں کہ پولیس سب انسپکٹر کی کہانی میں حقیقت کتنے فیصد تھی اور سیاست کتنے فیصد۔ اگر یہ افسانہ طرازی تھی تو بلاشبہ وہ سیاست دانوں سے زیادہ ذہین آدمی تھا اور غلط محکمے میں آ گیا تھا۔ وہ الفاظ سے وہ کام لے سکتا تھا جو پولیس ڈنڈوں اور گولیوں سے نہیں لے سکتی تھی۔ وہ بپھرے ہوئے ہجوم کو قابو میں کرنے کے لئے ان کے جذبات کی آتش فشانی کو سرد کرنے کا ہنر جانتا تھا۔

"جو بھی تفتیش کرنے والے آئیں گے جنہیں [illegible] کرنے کے لئے وہ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے لے جائیں گے۔ اس کے بعد لاش آپ لوگوں کے حوالے کر دی جائے گی۔ میری پرارتھنا ہے کہ آپ ان کے کام میں خلل نہ ڈالیں۔ ماماجی کا کریا کرم آپ اپنی مرضی سے کریں۔ جیسے چاہیں کریں۔ آپ نے میری بات سنی۔ اس کے لئے آپ کا ہمدرد منصب دار۔ اب آپ میں سے تین قلی آگے آ جائیں۔"

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے جو تین قلی آگے بڑھ گئے تھے ان میں ایک میں بھی تھا۔

سب انسپکٹر نے ہم پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور بولا "تم ان لوگوں کو آگے نہیں آنے دو گے۔ یہ سب تمہارے مترا ہیں۔ میری بات مان لیتے ہیں تو تمہاری بھی مانیں گے۔ میں اندر جا رہا ہوں۔"

میرے ساتھ آگے جانے والوں میں سے ایک تو محض جوشیلا تھا مگر دوسرا لیڈر بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے ہجوم کو مخاطب کر کے ایک جذباتی تقریر شروع کر دی۔ اس نے ماماجی کی تعریف کی کہ وہ کتنے عظیم آدمی تھے۔ کتنے بے غرض لیڈر تھے اور قلیوں کے حقوق کے لئے کس طرح جدوجہد کرتے رہے۔ پھر اس نے کہا کہ ماماجی مرے نہیں۔ شہید ہیں کیوں کہ ان کا مشن زندہ ہے اور ہم ان کے کام کو جاری رکھیں گے وغیرہ وغیرہ۔ وہ ماماجی کی جگہ یونین کی قیادت سنبھالنے کے پروگرام پر عمل درآمد شروع کر چکا تھا اور جذبات کی رو میں بہہ جانے والے مزدور اس کی بات توجہ سے سن رہے تھے۔ بہت سے اب رو رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔

موقع پاتے ہی میں پلٹا اور گھر کے اندر گھس گیا۔ پولیس سب انسپکٹر کے ساتھ ابھی علاقے کے تھانے سے جو نفری آئی تھی اس میں ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل شامل تھے جو فی الحال کچھ بھی نہیں کر رہے تھے۔ انہیں قتل کی تحقیقات کرنے والی خصوصی ٹیم کا انتظار تھا۔

دالان میں سب سے پہلے میری نظر یوسف کی لاش پر پڑی۔ وہ الٹا پڑا ہوا تھا اور اس کے سر سے بہنے والا خون فرش پر ایک بدنما داغ کی صورت میں جم گیا تھا۔ ماماجی کی لاش کمرے اور برآمدے میں ایسے پڑی ہوئی تھی کہ ان کا آدھا دھڑ دروازے سے باہر تھا۔ شاید انہوں نے جان بچا کے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن قاتلوں نے پیچھے سے ان کے سر میں دو گولیاں اتار دی تھیں۔ اس بات کا واضح امکان نظر آتا تھا کہ یوسف کے سر میں وہ گولی لگی جو ماماجی کے سر کا نشانہ لے کر چلائی گئی تھی۔ ماماجی پر مسلسل فائر کئے گئے تھے۔ دو گولیاں سامنے والی دیوار میں بھی پیوست نظر آ رہی تھیں۔ یوسف کے جسم پر ایک نظر ڈالنے سے مجھے تشدد کی کوئی علامات نظر نہیں ملی تھیں لیکن ماماجی واضح طور پر تشدد کا نشانہ بنے تھے۔ ان

www.paksociety.com

کا ایک ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا ورنہ کہنی سے اوپر کا حصہ یوں مڑا ہوا نہ ہوتا۔ ان کے چہرے پر ضربات کے نیل تھے اور ایسے زخم تھے جیسے ان کے منہ پر کانٹے دار ڈنڈے سے ہی کر کے مارے گئے ہوں۔

سب انسپکٹر مجھے دیکھتے ہی بگڑ گیا "کیا ہے؟ کس کی اجازت سے اندر آیا ہے تو؟"

"شما کرنا مہاراج" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "آپ سے صرف ایک بات پوچھنا تھی۔"

"باہر نکالو اس حرام زادے کو" سب انسپکٹر اب ایک روایتی قسم کا خود دماغ پولیس مین بن چکا تھا۔

دو پولیس والے آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے اپنی لاٹھیوں سے باہر ہانکنے کی کوشش کی۔

میں نے کہا "سرکار۔۔۔"

"سرکار کا بچہ" ایک پولیس والے نے مجھے دھکا دیا۔ اس کے ساتھی نے لاٹھی اٹھائی تھی ماری نہیں۔ اس نے صرف گالیاں دینے پر اکتفا کی۔

"دیکھو میں جانتا ہوں تمہیں تھانے دار" میں نے اونچی آواز میں کہا "تم نے ابھی جھوٹ بولا ہے سب۔ میری بات سن لو نہیں تو میں تمہارا پول کھول دوں گا۔"

عام حالات میں کوئی قلی کسی تھانے دار کے سامنے یوں بولنے کی کوشش کرے یا اس کو جھوٹا کہے تو اس کا انجام عبرتناک ہوتا ہے مگر اس وقت میری دھمکی کام کر گئی۔ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ سب انسپکٹر نے عیاری سے کام لیتے ہوئے قلیوں کے غیظ و غضب کی آگ کو جھوٹی ہمدردی سے دبا دیا تھا۔

"تم سب ادھر لاؤ اسے" سب انسپکٹر نے ایک گالی دے کر کہا۔

پولیس والوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ سب انسپکٹر بڑی نخوت سے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں کینہ اتر آیا تھا۔

"تو مجھے جھوٹا کہے گا" اس نے شانوں سے میرے ایک بید رسید کی "جھوٹ میں کیا ہو گا یہ سوچا ہے۔۔۔"

"آپ یہ سوچ کہ ابھی کیا ہو گا" میں نے بے خوفی سے کہا۔ "اور بعد میں تم کیا بگاڑ لو گے میرا؟ ماماجی مر گئے تو کیا ہوا۔ میں تو زندہ ہوں۔ ان کی جگہ لینے والا۔ تم ہاتھ ڈال کے دیکھو مجھ پر۔ ساری گاڑیاں نہ رک جائیں تو رستم نہیں کہنا کتا۔ یہ سب جو ماماجی کے ساتھ تھے میرے ساتھ ہوں گے۔"

سب انسپکٹر نے میری بات پر غور کیا اور میرے اعتماد سے قائل ہو گیا کہ میری بات کو فی الحال نظر انداز کرے۔ مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ تاہم اس نے اپنی خودی کو بلند رکھا اور اپنے ماتحتوں کے سامنے شان سکندری میں فرق نہیں آنے دیا۔

"فضول باتیں چھوڑ۔ کیا کہنا تھا تجھے؟"

"رات ماماجی کے گھر میں کچھ مہمان تھے۔"

"تجھے کیسے معلوم ہوا؟" انسپکٹر نے کہا۔

"میں رات کو ان سے ملنے آیا تھا" میں نے کہا "ان میں ایک لڑکی تھی۔"

"تو جانتا ہے اسے؟"

"یوسف نام ہے اس کا" میں نے کہا "فلموں میں ایکسٹرا کا کام کرتا تھا۔ دو لڑکیاں تھیں اس کے ساتھ۔ کل ہی آئی تھیں۔"

"لڑکیاں! کیا وہ بھی ایکسٹرا تھیں؟"

"پتا نہیں۔ ماماجی نے اس سے کہا تھا کہ تم فکر مت کرو۔ ایک ہفتہ نہیں ایک مہینہ رہ سکتی ہیں میرے پاس۔"

"لیکن یہاں تو اور کوئی نہیں تھا" انسپکٹر سوچ میں پڑ گیا "پہچان لو گے انہیں؟"

"ہاں جی۔ پھر دیکھا تو پہچان لوں گا" میں نے کہا "آپ کو کیا معلوم نہیں کہ وہ کہاں گئیں؟"

"ابے الو کے پٹھے! مجھے معلوم ہو تو اب تک انہیں پکڑ نہ لایا ہوتا۔"

"شاید وہ بھاگ گئیں" میں نے کہا۔

"یہ تو لمبا ہی چکر ہے" انسپکٹر بولا "مجھے یہ کام کسی عورت کا نہیں لگتا۔ مگر عورت بیچ میں ہو تو بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ قتل اس وجہ سے ہوا ہو گا۔ صورت سے کیسی لگتی تھیں کیا؟"

"صورت سے تو بھی سیدھی سادی لگتی تھیں۔ اور ماماجی کا دشمن تو تھا نہیں۔ نہ مال و دولت کی خاطر کوئی ان کو قتل کر سکتا تھا۔ انہوں نے تو شادی بھی نہیں کی تھی۔ بڑی سادہ زندگی گزارتے تھے۔"

"سب سامنے آ جائے گا جب تفتیش ہو گی۔ سیدھے سادے نظر آنے والے ہی تو ہوتے ہیں بدمعاش۔ تم باہر ٹھہرو۔ ہم قتل کی تفتیش کرنے والے تھانے دار کو بتاتا۔ تمہارا بیان اور گواہی بہت اہم ہے۔"

"آپ فکر مت کریں جی۔ میں تو خود اس لئے آیا تھا" میں نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"تم جاؤ گے بھی کہاں۔ تمہارا نمبر لکھ لیا ہے" سب انسپکٹر نے مجھے باور کرایا کہ اس واردات کی تفتیش کے بعد بھی میرے اور اس کے تعلقات ختم نہیں ہوں گے۔

"وہ جناب۔۔۔ ایک بات اور۔۔۔ آپ کو اطلاع کس نے دی تھی واردات کی؟"

"کوئی عورت تھی۔ اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔"

"آپ لوگ گم نام کال پر آ گئے۔ کمال ہے! اگر یہ شرارت ہوتی تو۔۔۔"

"زیادہ افلاطون بننے کی ضرورت نہیں۔ رستم کی اولاد ہیں ہم بھی کام کرنا جانتے ہیں اور جھوٹ سچ کی پہچان رکھتے ہیں۔ وہ لڑکی رو رہی تھی اور ہسٹریا میں مبتلا تھی" سب انسپکٹر نے کہا۔

"یہ وہی لڑکی نہ ہو" میں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

سب انسپکٹر نے برا سا منہ بنایا۔ شاید اس کا نظریہ بھی یہی تھا مگر ایک معمولی قلی کے ساتھ اس کا ہم خیال ہونا اس کی شان افسری کے خلاف تھا "یہاں تو کوئی ایسی عورت نہیں ملی۔ خیر تم اس کا حلیہ لکھوا دینا۔"

صورت حال کسی حد تک مجھ پر واضح ہو چکی تھی۔ دل کو اب اطمینان حاصل تھا کہ قتل ہونے والوں میں نازو بالکل شامل نہیں ہے۔ تاہم یہ اطمینان اس وقت تک ادھورا تھا جب تک ان دونوں کے بحفاظت اور خیریت کے ساتھ ہونے کا ثبوت نہ ملتا۔ اس امکان کو یکسر مسترد کرنا مشکل تھا کہ ماماجی اور یوسف کے قاتل جاتے ہوئے انہیں ساتھ نہ لے گئے ہوں۔

باہر مجمع اب پہلے سے کہیں زیادہ ہو گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہاں چار پانچ سو قلی جمع تھے۔ یہ سب جذباتی جوشیلے اور ماماجی سے زیادہ عقیدت رکھنے والے لوگ تھے۔ ان سے دس گنا تعداد میں قلی اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ یا تو انہیں خبر ہی نہیں تھی کہ ماماجی کا خون کر دیا گیا ہے یا وہ غیر جذباتی، خود غرض اور اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ تھے۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ ارے کیا ماماجی نہیں ہوں گے تو دنیا کے کاروبار رک جائیں گے۔ کوئی اور آ جائے گا ان کی جگہ لیڈری کرنے۔ ماما جاہاں کے۔ قلی تو قلی رہے گا۔ ایسی بہت سی باتوں کے پیچھے آدمی اپنی بے حسی کا جواز رکھتا ہے۔

پہلا مقرر اس مجمع کے سامنے اپنی فصاحت و بلاغت کے دریا بہا کے الگ ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ ایک اور شعلہ نوا پیشہ ور قسم کا مزدور لیڈر آ گیا تھا جو ماماجی کے خون سے مزدوروں کی تاریخ لکھنے کا عزم کر رہا تھا اور اس واردات کے ناطے تاریخ کے ان ادوار سے ملا رہا تھا جب زبردست نے آواز حق کو دبانے کے لئے اسی طرح انسانیت کا خون بہایا تھا۔ مزدور کچھ سمجھ رہے تھے یا نہیں سمجھ رہے تھے مگر خاموش کھڑے رہنے پر مجبور تھے۔

مجھے دیکھتے ہی ہجوم میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی۔ میں اندر جا کے نازو، زرین اور چشم دید صورت حال کی خبر لانے والا واحد شخص تھا۔ میں نے گڑبڑ پھیلانے کے لئے اس آتش نوا مقرر کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جو اپنی لیڈری چمکانے کے لئے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

میں نے اس کے قریب جا کے کہا "بڑے بھائی! ان سے کہہ دو کہ جان بچا کے بھاگ جائیں۔ سب انسپکٹر نے سب کو بے وقوف بنایا تھا۔ اس نے امن و امان کی شکایت تاکہ صورت حال ظاہر کی ہے۔ پولیس کمشنر نے مسلح پولیس کے دستے روانہ کرائے ہیں۔"

شعلہ نوا مقرر کے لئے یہ بہت دھماکا خیز مواد تھا۔ وہ گلا پھاڑ کے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔

"بہت لوگ مارے جائیں گے بڑے بھائی۔ معلوم نہیں کتنی لاشیں گریں گی اور کتنے زخمی ہوں گے۔ باقی کو پولیس نقض امن کے الزام میں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ خود مجسٹریٹ ساتھ آ رہا ہے۔"

"ہم بزدل نہیں ہیں" مقرر نے چیخ کر کہا۔

"یہ بہت ظالم افسر مشہور ہے۔ اس نے وارانسی میں بھوک ہڑتال کرنے والے مزدوروں کے کیمپ پر گولی چلوا دی تھی" میں نے اپنے اعتماد کے ساتھ سفید جھوٹ بولا جیسے مجھ سے زیادہ محرم راز کوئی ہے ہی نہیں "اس نے دھنی رام کو مار ڈالا تھا۔"

"کون دھنی رام؟" مقرر کچھ کنفیوز ہوا۔

"وہ کیلاش کپور راونڈری والا یونین کا صدر۔ جس کی موت کو خودکشی بنا دیا گیا تھا۔"

اپنی کم علمی کا اعتراف کرنا مقرر کے لئے مشکل تھا۔ اس نے فوراً کہا "اچھا! یہ وہی ہے؟"

میں نے گرم لوہے پر ضرب لگائی "اور سب سے بڑا جھوٹ اس نے یہ بولا ہے کہ اس کا باپ مزدور تھا۔ اس کا باپ ہریانہ میں ڈی ایس پی ہے اور اس کا چچا جو اس کا سسر بھی ہے ایک ایم پی اے ہے۔ [illegible]۔ مجھے یہ سب معلوم تھا اور میں اسے کہیں بتانے کے لئے اندر گیا تھا۔"

مقرر کے لئے اتنا آتش گیر مواد کافی تھا۔ میں پیچھے ہٹ کے عوام میں شامل ہو گیا۔ نسبتاً اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر میں نے غالب اور محسن کو تلاش کر لیا تھا۔ وہ آگے ہی موجود تھے لیکن پہلی صف میں نہیں تھے۔ میں نے مجمع میں چنگاری ڈال دی تھی۔ مقرر اب چیخ چیخ کر عوام کو بتا رہا تھا کہ ان کے خلاف کیسی سازش کی گئی ہے مگر وہ ثابت کر دیں گے کہ مزدور غریب ضرور ہوتا ہے دغا باز اور مکار نہیں ہوتا۔ بزدل نہیں ہوتا۔ وہ سینے پر گولی کھا سکتا ہے۔ جہاں اس کا خون پسینہ گرتا ہے اس مٹی سے حق اور صداقت کی فتح کا نیا سورج طلوع ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب الفاظ تھے۔ کھوکھلے بے معنی الفاظ۔ وہ خوب صورت لفظ فریب جال جو پیشہ ور شکاری لیڈر آج بھی ہر جگہ سادہ دل عوام کا جذباتی استحصال کرنے، انہیں سنہرے خواب اور سبز باغ دکھا کے پھانسنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور خود ان کی لاشوں پر قدم رکھتے کامیابی کی منزل کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔

کچھ قلی مسلح پولیس کے آنے کی اطلاع ملتے ہی کھسکنے لگے تھے مگر زیادہ تعداد ان کی تھی جو مقرر کے آتشیں الفاظ سے آتش فشاں بن گئے تھے۔ میں نے انتشار اور افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غالب اور محسن کو بھی اپنے ساتھ پیچھے کھینچ لیا۔ مشتعل ہجوم اب پولیس کے خلاف نعرے لگاتا آگے بڑھ رہا تھا اور سیاست کے داؤ پیچ سے کام لے کر مجمع کو پرسکون رکھنے والا سب انسپکٹر اچانک اپنی کامیابی کو ناکامی میں بدلتا دیکھ کے پریشان تھا۔

اس دھکم پیل میں باہر نکلنے کے لئے راستہ بنانا دشوار کام تھا مگر

www.paksociety.com

ہم آخر کار ان "بدنصیب" لوگوں میں شامل ہوگئے جو ایک بے بنیاد اطلاع پر جائے واردات سے بخیر و عافیت رخصت ہو جانے کو غنیمت سمجھتے تھے۔ بعد میں مجھے کسی ٹی کا ایک ٹوکن بھی ملا میں نے فوراً اپنا ٹوکن اتار کے پھینک دیا اور دوسرا نمبر لگا لیا۔ سب انسپکٹر کو بعد میں ضرور معلوم ہو گیا ہوگا کہ آگ لگانے والا وہی رستم تھا جو خود کو ماماجی کا جانشین کہتا تھا۔ ممکن ہے اس نے مجھے ہجوم میں تلاش بھی کیا ہو مگر اس وقت تک ہم بہت دور جا چکے تھے۔

"گل کا کچھ پتا چلا؟" محسن نے موقع پاتے ہی میرے قریب آ کے کہا۔

میں نے کہا "نہیں۔"

غالب جو مجھ سے بھی آگے تھا، رک گیا اور اس نے یہی سوال پھر کیا۔

میں نے کہا "اتنا میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جب پولیس آئی تھی تو گھر میں نہ گل تھی اور نہ نازو۔ اندر صرف ماماجی اور یوسف کی لاشیں پڑی ہیں۔"

"یوسف! وہ بھی مارا گیا؟" غالب اور محسن نے ایک ساتھ کہا۔

"ہاں۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں۔"

"ہمارے دامن پر بے گناہوں کے خون کا قرض بڑھتا جا رہا ہے۔" محسن نے بڑے دکھ سے کہا۔

غالب نے اس کی تائید کی "دونوں کی موت کے ذمے دار ہم ہیں۔"

میں نے کہا "کیا ہم جانتے تھے کہ وہ ــــ اس طرح مارے جائیں......"

"پھر بھی۔ ہم یہاں نہ آتے تو ــــ"

"کیسے نہ آتے ہم یہاں۔ کیا ہم نوشتہ تقدیر کو بدل سکتے تھے؟ غیب کا علم تھا ہمارے پاس؟ تم چودھری دلاور کو ذمے دار کیوں نہیں سمجھتے جس نے ہمیں اس جنگل میں اترنے پر مجبور کیا۔ اور دلاور ہی کیوں؟ تم انہیں ذمے دار کیوں نہیں سمجھتے جو مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی اور انتشار کے بیج بو چکے تھے۔ ملکی اور عالمی سیاست کے شیطان شاطروں کو ذمے دار کیوں نہیں سمجھتے؟"

"یہ دلائل درست ہیں دوست۔ لیکن میں اپنے احساس کو کیا کروں، وہ کسی دلیل سے مطمئن نہیں ہوتا۔" غالب نے کہا۔

"جس نے بھی ہماری مدد کی گویا موت کو دعوت دی" محسن بولا۔

"یہ بحث تم نے ہی شروع کی تھی" میں نے برہمی سے کہا۔

"اچھا یار! جس نے بھی شروع کی تھی۔ ختم کرو یہ بات۔ تم اندر کیا لینے گئے تھے؟" غالب نے کہا۔

"ظاہر ہے گل اور نازو کی خبر لینے گیا تھا۔"

"نازو تو شاید قسمت سے بچ گئی ہو" محسن بولا "اچھا ہی ہوا کہ وہ گھر سے نکل گئی تھی۔"

"ابھی کیا پتا۔ امید تو گل کے بارے میں بھی ہے کہ وہ نکل گئی؟" میں نے کہا

"وہ کیسے؟" محسن نے ذرا امید لہجے میں کہا۔

"پولیس سب انسپکٹر کا کہنا ہے کہ واردات کی اطلاع کسی لڑکی نے دی تھی جو بہت خوفزدہ اور نروس تھی۔"

"وہ گل تھی؟"

"اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ یہ صرف میرا خیال ہے۔" میں نے کہا "میرا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے قاتل اسے پکڑ لے گئے ہوں۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جب شکاری اندر آئے ہوں تو وہ کہیں چھپ گئی ہو اور ان کے جانے کے بعد وہاں سے فرار ہو کے اس نے پولیس کو فون کیا ہو؟" محسن بولا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے" میں نے کہا "مگر گل کو آخر کیا ضرورت تھی پولیس کو اطلاع دینے کی؟ فون کہاں سے کیا ہوگا اس نے؟"

"شاید کسی پبلک کال آفس سے۔"

"تو کیا وہاں کسی نے اس کو نہیں دیکھا ہوگا؟ اس کی بات نہیں سنی ہوگی؟" میں نے کہا۔

"تم نے کیا بتایا پولیس کو؟"

میں نے جو کچھ کہا تھا وہ انہیں بتا دیا۔

"اگر گل کو فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا تو وہ کہاں گئی ہوگی؟" غالب نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔

"اگر میں یہ بتا سکتا تو تمہیں سیدھا اس کے پاس نہ لے جاتا؟" محسن بولا۔

"کسی کی چھٹی حس کچھ نہیں بتاتی؟" غالب مایوس ہو کے بولا۔

"ہم صرف قیاس کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے وہ اسی علاقے میں کہیں چھپی بیٹھی ہو۔ ممکن ہے وہ ہمیں تلاش کرنے نکل کھڑی ہوئی ہو۔ ممکن ہے وہ بھی گھوڑے کو ڈھونڈنے چلی گئی ہو۔ اس امید میں کہ وہاں نازو مل جائے گی تو وہاں سے واپس جانے سے روک لے گی۔ امکانات لامحدود ہیں۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ وہ عقل سے کام لے۔"

"عام آدمی بھی پریشان ہو تو عقل سے کام نہیں لے سکتا۔ کہاں ایک عورت۔"

میں نے کہا "یار، وہ عورت نہیں ہے۔ وہ ناگ منی تھی۔ ایک ذات ... ہے۔ زندگی کی دشوار راہوں میں اپنے بھائی شبیر کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ ہراساں ہونے والی لڑکی نہیں ہے۔ نازو اور گل دونوں ہی غیر معمولی حالات میں غیر معمولی ہمت اور ذہانت کا مظاہرہ کرنے کی اہل ہیں۔ یہ ہم بارہا دیکھ چکے ہیں۔ گل اگر سوجھ بوجھ سے کام لے تو سیدھی وہاں پہنچ سکتی ہے جہاں ہم کل رات گئے تھے اور نہ رات بھر جائیں گے۔ وہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہم یقینی طور پر مل سکتے ہیں۔ اس کے لئے رات تک انتظار ضرور کرنا پڑے گا۔"

غالب نے چٹکی بجا کے کہا "اب میری چھٹی حس بھی کہتی ہے۔"

"یہی تو نہیں تمہاری چھٹی حس کی" محسن نے کہا "جو تم سے زیادہ مردار اور کاہل ہے۔"

"اگر گل وہاں گئی تو وہاں آنا جانا ہوا ہوگا۔" غالب نے کہا۔

محسن نے پھر اس پر طنز کیا "پھر کیا ہوا؟ وہ دروازے پر بیٹھ کے رونا شروع کر دے گی۔ یہاں تک کہ فرشتہ غیب بن کے کوئی خدا کا نیک بندہ اس کی مشکل کشائی کے لئے چابی لے کر نمودار ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "مرزا جی! وہ ناگ منی تھی۔ تالے کھولنا شاید نہ جانتی ہو مگر توڑنا ضرور جانتی ہوگی۔ دروازے اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے۔ وہ دروازہ توڑ دے گی۔"

غالب نے کہا "خدا کرے ایسا ہی ہو۔ کیوں نہ ہم ابھی جا کے دیکھ لیں۔"

"نازو کو واپس جانے سے کیسے روکا جائے؟ یہ بھی سوچو۔"

"اس میں ذرا بھی عقل ہوگی تو ادھر کا رخ نہیں کرے گی۔ اسے دور سے ہی گڑبڑ نظر آ جانی چاہئے۔" میں نے کہا۔

"اور نظر نہ آئی تو؟ خاتون کو حد سے زیادہ خود اعتمادی کا مرض بھی لاحق ہے" محسن نے کہا۔

"ہم نہیں روک سکتے اسے۔" غالب نے کہا۔

"کہاں، کب اور کیسے؟" محسن بولا "کچھ پتا ہے وہ کدھر سے تشریف لائیں گی اور کب تک۔"

میں نے کہا "یار، وہ بھی ادھر ہی آئے گی۔ کیوں نہ ہم ایک بار پھر دیکھ لیں۔ ہم خطرے سے بہت دور آ گئے ہیں۔"

"چلو۔ لیکن اب میں خود کو کہیں محفوظ نہیں سمجھتا۔ ہمارا بھیس بدل کے پھرنا اور کہیں بھی جا چھپنا ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہتا" محسن بولا "کچھ پتا نہیں اس وقت بھی کون ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے۔"

"ماماجی کے وحشیانہ قتل سے تو یہی ثابت ہوتا ہے" غالب نے کہا "ممنو میاں کا اور خود ماماجی کو شاید یقین تھا کہ ان کے ٹھکانے تک ہمارے دشمنوں کی رسائی نہیں ہو سکتی مگر یہ یقین غلط تھا۔"

"میں نہیں مان سکتا کہ وہ ہر جگہ اور ہر وقت ہم پر نظر رکھتے ہیں۔" میں نے کہا "یہ کیسے ممکن ہے یار! بمبئی کا اتنا بڑا شہر ہے، لاکھوں کی آبادی ہے۔ اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی خبر نہیں رکھی جا سکتی۔ کتنی بڑی انٹیلی جنس فورس ہے آخر ان کی؟ اور اگر تمہاری بات درست ہے تو وہ کیوں خاموشی سے ہمارا پیچھا کرتے ہیں، اس وقت بھی ہمارے تعاقب میں ہیں تو انہیں انتظار کس کا ہے؟ ہمیں پکڑ کیوں نہیں لیتے۔ گولی کیوں نہیں مار دیتے۔ ہمارے آگے پیچھے کتنے لوگ چل رہے ہیں۔ کس پر شک کیا جائے؟"

"مگر یہ کیسے ہوا آخر۔ ہم بال بال بچ گئے۔ گھر میں ہوتے تو مارے جاتے" محسن نے کہا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ کوئی مخبری کرتا رہا۔ کسی نے ہمارے بارے میں دلاور اینڈ کمپنی کو اطلاع دے دی۔ مثلاً پولیس نے۔"

اچانک محسن خود بھی رک گیا اور ہاتھ بڑھا کے ہمیں بھی روک لیا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا تو مجھے زرد اور سرخ دھاریوں والا ایک کنٹینر نظر آیا جو چالیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا تھا۔ ایک مستطیل فولادی باکس جو دیوہیکل ٹرالر کے اوپر لدا ہوا تھا۔ بین الاقوامی جہاز راں کمپنیاں بھی مال لانے لے جانے کے لئے ایسے ہی کنٹینرز استعمال کرتی ہیں۔ چھوٹے بیس فٹ لمبے ہوتے ہیں لیکن یہ بڑا کنٹینر تھا اور کچھ دیر پہلے وہاں موجود نہیں تھا جہاں اب نظر آ رہا تھا۔

غالب نے کہا "کیا یہ وہی ڈبا ہے جس میں گھوڑے جائیں گے؟"

"ذرا اس سوال کا جواب بھی عنایت فرمائیے" محسن بولا۔

"قریب جا کے دیکھ لیتے ہیں۔ قریب سے بھی یہ ویسا ہی نظر آئے گا جیسا دور سے نظر آ رہا ہے۔"

غالب نے کہا "ہم کسی سے پوچھ سکتے ہیں۔"

"مثلاً حیوان پرستا و انیمل لورز سے فون کر کے۔ یار مرزا! میں محسوس کر رہا ہوں کہ آج کل ہر احمقانہ بات کرنے کا ٹھیکا تم نے لے رکھا ہے۔"

"جیسے ہم سخن ہوں ویسی ہی بات کرتا ہوں میں۔ عقل کی بات کہاں سمجھو گے تم" غالب نے کہا۔

"سنو! فلسفے سے کچھ نہیں ہوگا" میں نے کہا "صورت حال اس وقت یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی عارضی ٹھکانہ بھی نہیں رہا۔ نہ کوئی ساتھ دینے والا ہے اور نہ کوئی گھر۔ ابھی بجے ہیں سہ پہر کے تین۔ اگر خوش قسمتی سے ہمیں قلی نمبر سات سو بیس کی سفارش پر لوڈنگ کا کام مل گیا ــــ"

"موجودہ حالات میں اسے خوش قسمتی نہیں مناسب الفاظ کہو!" محسن بولا۔

"میں امید پرستی نہیں چھوڑ سکتا" میں نے کہا "حادثات تو ہماری زندگی کے معاملات میں شامل ہیں۔ شام تک ہمیں کہیں نہ کہیں وقت گزارنا ہوگا۔ ہم یوں کرتے ہیں کہ پہلے تو کھانا کھا لیں حالانکہ مجھے بھوک نہیں ہے۔"

بھوک غالب اور محسن کو بھی نہیں تھی۔ آج کا دن ہمارے لئے مسلسل صدمات اور توقعات کی شکست کے اسباب لے کر طلوع ہوا تھا۔ سب سے پہلے صبح ہوتے ہی اچانک ممنو میاں رخصت ہوئے اور ایسے گئے کہ اپنا پتا ٹھکانہ بھی بتا کر نہیں گئے۔ پھر نازو نی

www.paksociety.com

تھا اور کسی سے مشورہ کئے بغیر ایک ایسے مشن پر روانہ ہو گئی جس میں اس کی کامیابی کے امکانات کو محض خوش فہمی سمجھا جا سکتا تھا۔ ماماتی اور یوسف کے بہیمانہ قتل کے بعد انو کی گمشدگی آخری سانحہ تھی جس نے ہم سب کا سکون چھین لیا تھا۔ ایسے میں کھانے کا خیال ہی وحشت انگیز تھا لیکن میں نے غالب اور محسن کو کھانے پر مجبور کیا۔ کھانا جسم کی ضرورت تھا اور جسم کو توانائی کی ضرورت تھی۔

"آگے کا کچھ بھروسہ نہیں، پھر کچھ ملے نہ ملے" میں نے کہا۔ "ابھی فرصت تو ہے۔"

"میرے ذہن میں ایک خلا ہے، میں مایوسی کا شکار ہو رہا ہوں۔" غالب نے کہا۔

"ذہن اور جسم کے اعصاب کو انتشار سے بچاؤ، یہ وقتی اثر ہے۔ ابھی انو مل جائے یا گل نظر آ جائے تو سب پھر ٹھیک ہو جائے گا" میں نے کہا "یہاں بیٹھ کے کچھ کھاتے ہیں، کچھ سوچتے ہیں۔"

ہم ٹریلر سے سو گز دور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ قریب کھڑے ہوئے ایک موبائل ریسٹورنٹ کے گرد اس وقت بھی کھانے والوں کا ہجوم تھا حالانکہ دوپہر کے کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ یہ ایک پرانا ٹرک تھا جس کے پچھلے حصے کو کسی نے چلتا پھرتا ریسٹورنٹ بنا دیا تھا۔ ایک شخص بہت سی پتیلیوں کے درمیان بیٹھا بڑی پھرتی سے دال چاول نکال رہا تھا۔ سالن روٹی کے مقابلے میں دال چاول کی مقبولیت کا سبب صرف اس کی کم قیمت تھی ورنہ اس کے پاس قیمہ اور قورمہ بھی تھا۔ اس ٹرک کے ایک کونے میں ریسٹورنٹ کے مالک کا لڑکا مسلسل چائے تقسیم کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بڑی مشاقی سے ایک ٹونٹی کھولتے تھے اور کپ میں چائے کی مقررہ مقدار پوری کرتے ہی ٹونٹی بند کر دیتے تھے۔ لڑکا کپ آگے بڑھا کے اسی ہاتھ سے پیسے وصول کرتا تھا اور ایک صندوقچی میں ڈال دیتا تھا۔

کھانے کے بعد چائے پینے اور سگریٹ ختم کرنے تک ہم سب اپنے اپنے خیالات میں غلطاں رہے۔ ہم سب ایک دوسرے سے اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کر رہے تھے اور باہر بن کن خیالات کے خلاف اپنے اپنے طور پر ایک دفاعی جنگ لڑ رہے تھے۔ ہم سب کی نظر بار بار اس ٹریلر کی طرف اٹھ جاتی تھی جو بظاہر بالکل لاوارث کھڑا ہوا تھا۔ ٹریلر میں ڈرائیور کی جگہ بھی خالی تھی اور اگر ان کنٹینرز میں گھوڑے تھے تو وہ بھی اکیلے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی ہوتا تو ابھی تک نظر ضرور آتا۔

"مجھے آہستہ آہستہ یہ احساس ہو رہا ہے کہ ہم اس مرغی سے انڈے کی آس لگائے بیٹھے ہیں جو کڑک ہے" غالب نے کہا۔

"یا شاید مرغی ہی نہیں ہے، مرغا ہے" محسن بولا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ یہ کسی اور کا ٹریلر ہے...... اور اس میں وہ گھوڑے ہی نہیں ہیں جن کا سراغ لگانے کے لئے نادر گل تھی" میں نے کہا۔

"یہی تو فلسفیانہ بات مگر تم سمجھ گئے" غالب بولا۔

"آخر کچھ تو فائدہ ہوا ہماری صحبت کا" محسن نے کہا۔

میں خود تذبذب کا شکار تھا اور یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم نے ابھی اپنا وقت ضائع کیا ہے۔ بس میری چھٹی حس تھی جو کہہ رہی تھی کہ ہم نے اندازوں میں کوئی غلطی نہیں کی کیونکہ ابھی تک اس پورے علاقے میں دوسرا کوئی کنٹینر نہیں پہنچا تھا۔ عام طور پر گھوڑے ریلوے کی عام بوگیوں میں اسی طرح بھیجے جاتے تھے جیسے دوسرے مویشی لیکن یہ خاص گھوڑے تھے چنانچہ ان کے لئے خاص انتظامات کئے گئے تھے۔ ماماتی کی فراہم کردہ اطلاعات درست تھیں تو یہی وہ کنٹینر ہو سکتا تھا جس میں جیون پرشاد ایم ایل اے کو اپنے ریس کے گھوڑے روانہ کرنے تھے۔ ایک ویٹرنری ڈاکٹر ایک فیڈر اور ایک نرس یا خادمہ کے ساتھ۔ ابھی ان میں سے کسی نے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی، یہاں تک کہ کنٹینرز میں گھوڑوں کی موجودگی کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔

اچانک مجھے ایک ایسا خیال آیا جو بہت پہلے آنا چاہئے تھا۔ میں نے کہا "شہر یار صاحب! آپ گھوڑے پہچانتے ہیں۔"

محسن نے سر کھجا کے کہا "دیکھئے، ظاہری صفات تو اس کے برعکس ہیں مگر میں آپ کی درخواست کو رد بھی نہیں کر سکتا۔"

"اور مرزا غالب، آپ بھی عقل سے پیدل ہیں" میں نے کہا۔

"اگرچہ یہ انکشاف ہے میرے لئے پھر بھی آپ کا دل رکھنے کے لئے میں مان لیتا ہوں۔ خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم" غالب نے کہا۔

محسن بولا "خلاف "تم بھی بتا دو کہ تم ہمیں گالیاں کیوں دے رہے ہو۔"

میں نے کہا "یار خود ہی سوچو، اتنا بڑا ٹریلر اور کنٹینرز جیون پرشاد کے گھر جائے گا گھوڑے لانے کے لئے۔ شہر کی اکثر سڑکوں پر دن کے وقت بھاری گاڑیوں کا گزرنا منع ہے۔"

غالب اور محسن نے بات سمجھ لی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو غصے سے دیکھا مگر دھنائی سے ہنسنے لگے "مجھے زنجیر بہت پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔" محسن بولا۔

"اور مجھے اس سے بھی پہلے یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی" غالب نے کہا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا "مرزا جی، اب تم اکیلے ڈیوٹی دو گے۔ بہ حال رات سے پہلے پہلے گھوڑے بھی پہنچ جائیں گے اور ان کے خدمت گار بھی۔"

"میں بس دیکھتا رہوں، تم لوگ کہاں جا رہے ہو آخر؟"

"میری چھٹی حس فرماتی ہے کہ نادر انہی کے ساتھ آئے گی" میں نے کہا۔

محسن نے بڑی عقیدت سے کہا "پیر و مرشد، میری ساتویں حس بھی یہی عرض کرتی ہے۔"

یہ بات کچھ عرصے بعد اس نے مذاق میں کہی تھی۔ وہ جب بھی اپنی ساتویں حس سے میری چھٹی حس کی تائید کرتا تھا تو گویا اپنے اور میرے وجدان، ذہنی ہم آہنگی اور سوچ میں مطابقت کا اعلان کرتا تھا۔ کہنے کو یوں بھی کہا جا سکتا تھا کہ یہ نیلی جیتی تھی کہ جو بات میرے دماغ میں آتی تھی وہ زبان کے اظہار سے پہلے اس کے شعور اور ادراک تک پہنچ جاتی تھی۔

"محسن چاہئے کہ ماماتی کے کوارٹر کی طرف۔"

محسن نے گھبرا کے کہا "میں اپنی ساتویں حس کی حمایت واپس لیتا ہوں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔"

"تو بات تو سن لے پہلے" میں نے کہا "میں ادھر اس لئے نہیں جا سکتا کہ وہاں وہ خبیث سب انسپکٹر ہو گا جو مجھے دیکھ چکا ہے۔ میرا حلیہ ہی درست ہو رہا تھا مگر مجبور تھا۔ میرے غائب ہو جانے کے بعد تو اس نے مجھے صف مجرماں میں شامل کر دیا ہو گا اور میری باقاعدہ تلاش کی جا رہی ہو گی۔"

"دوبے چارہ مفت میں پکڑا جائے گا جس کا یقین تھا۔"

"نہیں۔ میں نے اپنا نام رستم بتایا تھا۔ اگر کوئی رستم ملا تو اس کا نمبر مختلف ہو گا" میں نے کہا "تم کو پہچاننے والا کوئی نہیں۔ ہو سکتا ہے اس وقت بھی پولیس وہاں موجود ہو مگر ضابطے کی کارروائی کے بعد لاشیں تو پولیس لے جا چکی ہو گی۔"

"تم ہو شیار۔ چھوڑ آئے تھے اس کے بعد معلوم نہیں وہاں کتنا ہنگامہ ہوا ہو گا۔"

"تو ابھی ختم ہو چکا ہو گا اب تک۔ کوارٹرز کو پولیس نے سیل کر دیا ہو گا مگر ماماتی کے بھانجے تو آتے رہیں گے۔ جس کو بھی خبر ملے گی وہ ادھر کا رخ کرے گا۔ اور ظاہر ہے آس پاس رہنے والوں سے ہی سارے حالات کا پتا چلے گا۔ زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ وہاں شکاری بھی تاک میں ہوں کہ ہم میں سے کوئی نظر آئے۔"

غالب نے کہا "مشکل ہے۔ وہ مایوس ہو کر لوٹ گئے ہوں گے کہ ہم بھاگ کر نکل گئے۔ ہنگامے کے بعد ہماری واپسی کی توقع کیسے رکھ سکتے ہیں۔"

"بھاگے جاتا ہوں" محسن نے کہا "کہا سنا معاف کرنا۔"

غالب نے تفنن میں سر ہلایا "بھائی، ابھی سے تمہارا کہا سنا کیسے معاف کر دوں، تم تو آئندہ بھی بہت کچھ کہو گے مجھے۔"

میں نے کہا "تم کو یہاں اس لئے چھوڑا جا رہا ہے مرزا غالب کہ اندھی نظر تمہیں ہر حال میں سب سے پہلے دیکھ سکتی ہے۔ تم اسے اندھیرے میں بھی نظر آ جاؤ گے ویسے میرا مشورہ ہے کہ اندھیرا ہونے لگے تو روشنی میں جا بیٹھنا۔"

"تم کیا بیٹھنے کے لئے رخصت ہو رہے ہو کہ اپنا وصیت نامہ سنا رہے ہو" غالب نے کہا "ذرا اپنی تو آتے گا؟"

"میں جا کے گل کو دیکھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ فرار ہو کے وہیں پہنچی ہو۔ وہاں ہم دونوں نہیں آئیں گے۔"

"دل کے بہلانے کے لئے تو یہ خیال اچھا ہے۔ مگر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ اس خونی بھیڑیوں کے گروہ نے ایک کمزور لڑکی کو بخش دیا ہو" غالب نے کہا "وہ اسے ساتھ لے گئے ہوں گے۔"

"بس ایک موہوم سی امید اس خیال سے بندھی ہے کہ پولیس کو اطلاع دینے والی کوئی عورت تھی جو ہسٹیریا کا شکار تھی۔"

"وہ کوئی پڑوسن کی عورت بھی ہو سکتی ہے۔ جو عورت بھی خونریزی کا ایسا منظر دیکھے گی وہ ہسٹیریا میں مبتلا ہو جائے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گل کے ساتھ شکاری وہاں تمہارے استقبال کے لئے موجود ہوں" غالب نے کہا۔

محسن نے بھی اس کی تائید کی "یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ماماتی یا یوسف سے سب کچھ اگلوا لیا ہو۔"

میں نے کہا "یوسف کا میں نہیں کہہ سکتا مگر ماماتی ایسے نہیں تھے کہ اتنی آسانی سے اپنی جان کے بدلے ہماری زندگی کا سودا کر لیتے۔ بے شک تشدد کے طریقے مؤثر ثابت ہوتے ہیں اور مضبوط سے مضبوط قوت ارادی رکھنے والا شکست کھا جاتا ہے مگر انہیں اتنا وقت نہیں ملا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ صرف ماماتی کو قتل کرنے آئے تھے۔ یوسف خواہ مخواہ ہی مارا گیا۔ محض وہاں موجود ہونا اس کا جرم بن گیا۔"

"موجود تو گل بھی تھی۔"

"شاید وہ چھپ گئی ہو، اس لئے بچ گئی ہو۔ خیر تم فکر مت کرو، میں احتیاط سے کام لوں گا" میں نے کہا۔

شام کے ساڑھے چار بجے سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ اپنے آپ کو آنے جانے والے سب لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ رکھوں۔ جس خالی کوارٹر میں خالی تابوت رکھا ہوا تھا وہاں تک پہنچنے کے لئے میں نے لمبا راستہ اختیار کیا حالانکہ وہ جگہ مشکل سے دس منٹ کی مسافت پر تھی۔ جب بھی میرے سامنے کوئی گلی آ جاتا تھا میں جھک کر زمین پر کوئی چیز تلاش کرنے لگتا تھا۔ اس طرح میں اپنا چہرہ نہیں تو بھی چھپا لیتا تھا۔ لیکن میں اپنے کان ان کی گفتگو پر رکھتا تھا کہ شاید کسی سے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔

اس کوارٹر کے بالکل سامنے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر ایک بڑا ٹینک تھا جس کے نیچے فقیر نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ گلی کوچوں اور ہر قسم کے کاٹھ کباڑ کے ساتھ وہ نہ جانے کب سے وہاں مقیم تھا۔ اس کے الجھے ہوئے لمبے لمبے بال، جھاڑ جھنکاڑ داڑھی، بدبودار جسم کی غلاظت، چرس کے نشے میں لال آنکھیں اور جنونی چہرہ اس کو دیوانہ ثابت کرتے تھے اور وہ شخص اس قابل تھا کہ اسے فوراً پاگل خانے

www.paksociety.com

عقل کھا جائے مگر محرومیوں کے مارے ہوئے، مجبوریوں کے شکست خوردہ، مایوس اور بے بس انسانوں نے اس کے وجود سے عقیدت کے جذبات وابستہ کر کے اسے ایک مجذوب کی حیثیت عطا کر دی تھی۔

میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ وہ مٹھی بند کر کے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں ہوا کے رخ پر بیٹھا ہوا تھا چنانچہ سارا دھواں منتشر ہونے سے پہلے میری طرف آتا تھا۔ چرس کی ناگوار بو نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس کے پیچھے جا بیٹھوں۔ ملنگ کی آنکھیں بند تھیں اور اس کا خیال تھا کہ وہ اکیلا ہے۔ اس کا کل اثاثہ ایک بدصورت، زنگ خوردہ پرانا ٹین کا صندوق تھا اور ایک لوٹا۔

میری نگاہ سامنے کوارٹر کے دروازے پر تھی۔ میری موجودگی میں ملنگ کے پاس دو حاجت مند آئے۔ ان میں سے ایک ریس کے گھوڑے کا نمبر معلوم کرنا چاہتا تھا۔

"اب چھوڑ دے یہ دھندے، گھوڑے کی اولاد۔" نشے میں دھت ملنگ نے گرج کے کہا۔

اس نے ملنگ کے پیر دباتے ہوئے کہا "چھوڑ دیں گا بابا صاحب، ایک دم چھوڑ دیں گا۔"

ملنگ نے اس کے لات رسید کی "کب چھوڑے گا؟ جب دنیا چھوڑ دے گا، گدھے کے بچے۔"

"نہیں بابا صاحب، ابھی ایک بار اپنا لک اور آزمائے گا، صرف ایک بار۔" وہ پھر اٹھ کے ملنگ کے پاؤں پڑ گیا "اپن بولا نا آخری بار ہے بابا صاحب۔"

"یہ تو پہلے بھی کہا تھا تو نے... سؤر کے بچے۔" ملنگ بولا۔

"ہم بھی اپنا باپ کا قسم بابا صاحب، اپنا سب کچھ لگا دیا ہے اس بار۔ تھوڑا مہربانی کرو۔"

"کیا لایا ہے اب، میرے پاس بچا ہی کیا ہے چٹنے کے بچے۔" ملنگ نے اسے چوتھے والد سے منسوب کرتے ہوئے کہا۔

ملنگ کی باتوں نے مجھے تھوڑا سا حیران کیا۔ ایک تو عام طور پر ایسے فریب کار ملنگ کسی کو نیکی کا مشورہ نہیں دیتے۔ وہ کسی علت میں پڑا ہو تو اسے برائی چھوڑ کے راہ راست پر چلنے کی ترغیب دینا ان کے اپنے کاروباری مفادات کے خلاف ہوتا ہے۔ مگر وہ اس عقیدت مند کو ریس کی لت چھوڑنے کی کہہ رہا تھا۔ دوسری عجیب بات یہ تھی کہ بابا صاحب کے ساتھ عقیدت مند کے پرانے کاروباری تعلقات تھے۔ ظاہر ہے وہ پہلے بھی نذرانہ لاتا رہا تھا اور اس شوق میں تباہ ہو چکا تھا مگر ایک بار بھی بابا صاحب اپنی روحانی قوت سے اس گھوڑے کا نمبر نہیں بتا سکے تھے جس کو ریس جیتنی تھی۔ عقیدت مند اندھے ہوتے ہیں ورنہ ایک ہی جگہ بار بار لٹنے نہ جائیں۔ شاید کبھی ایسا اتفاق ہوا ہو گا کہ بابا جی نے نشے میں کچھ بک دیا ہو گا اور کسی نے اپنے طور پر کوئی نمبر نکال کے داؤ لگایا ہو گا تو وہ گھوڑا جیت گیا ہو گا۔ اس سے بابا جی کا کاروبار چمک اٹھا ہو گا۔

میرے سامنے عقیدت مند نے ایک تھیلی نکال کے ملنگ کے قدموں میں ڈال دی۔

"چوری کا مال لایا ہے حرامی کے بچے۔" ملنگ نے دھاڑ کے اس کو دوسری لات رسید کی اور تھیلی پھینک دی۔

حاجت مند لڑھک گیا اور پھر اٹھ بیٹھا "قسم اللہ کا بابا، گھر والی کا اکھا گہنا ہے۔ اس کا مرضی سے لایا ہوں۔ میں بولا کہ سالی دل چھوٹا مت کر، اپن تیرے کو پیلا کر دے گا سونے سے۔"

ملنگ نے تھیلی میں ہاتھ ڈالا اور زیور نکال کے گنا۔ اس میں سے تقریباً آدھا اس نے واپس تھیلی میں ڈال دیا "یہ اپنی مت رکھانا مجھے، تیری گھر والی پر رحم آ گیا ہے۔ سمجھا۔ تیرے نصیب میں کچھ نہیں تھا۔ اس کے مقدر سے ملے گا تجھے۔ نام بتا اس کا؟"

"کلثوم بائی بابا صاحب۔" عقیدت مند فرط مسرت سے کانپنے لگا۔

"کل کو بھول جا، بائی کو چھوڑ دے۔" ملنگ نے آنکھیں بند کر کے کہا "بائی حرف اس کے ہیں۔ جا۔" اس نے عقیدت مند کے لات ماری۔

"تین۔" وہ خوشی سے چلایا "بابا صاحب، تین بار لات مارا اور آج تین تاریخ۔" وہ اب اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا "سو پر تین لگا کو۔"

جب وہ اپنی بیوی کا آدھا زیور ریس میں ہارنے چلا گیا تو بابا صاحب نے باقی آدھا زیور اپنے پیچھے والے ٹرنک میں ڈال لیا۔ ٹرنک بڑی ہوشیاری سے زمین میں اس طرح دفن تھا کہ صرف اس کا ڈھکن زمین کی سطح سے چند انچ اوپر رہ گیا تھا۔ ملنگ اس پر گدا بچھا کے سوتا تھا اور اسے تکیے کی جگہ استعمال کرتا تھا۔ مجھے اس شخص کے حال پر بہت دکھ ہوا جو سب کچھ گنوانے کے بعد بیوی کا زیور تک چھین لایا تھا۔ اس نے یقیناً جھوٹ بولا ہو گا کہ وہ زیور بیوی سے پوچھ کے لایا ہے۔ بیویاں کتنی ہی مجبور اور بے وقوف کیوں نہ ہوں وہ تحفے میں بھی اپنے شوہر کے جوئے کی لت، شراب کی عادت یا طوائف کے کوٹھے پر قربان نہیں کرتیں۔ ایک اچھا گھر اور اپنا زیور۔ اس شخص کا اور اس جیسے لاکھوں انسانوں کا مقدر بننا چاہتا تھا۔ اپنے لیے بھی اور اپنے خاندان کے لیے بھی۔ جو محنت کیے بغیر دولت کی دیوی کے پیچھے جھولی پھیلائے پھرتے ہوں کہ انہیں کسی مدفون خزانے کا پتا بتا دے۔ ان کے نام کوئی لاٹری نکل آئے یا جیپر جاز کے ان کے خراب خانے کو دولت سے بھر دے۔ یہ ہر تقدیر ساز، مرشد جو دولت کی دیوی کے ایجنٹ بنے بیٹھے ہیں، انہی جیسے احمقوں کو لوٹتے رہتے ہیں اور خود دولت مند ہوتے جاتے ہیں۔ بیوی کا زیور ہارنے کے بعد جب اس کے پاس ہارنے کو زندگی کے سوا کچھ نہیں رہے گا تب بھی اسے شکوہ نہیں ہو گا بابا صاحب سے۔ نصیب اپنا بخت برا، کوئی کیا کرے۔

اپنا نقصان بابا صاحب سے پورا کرنے آ جائے۔ جو محنت کی ہمت نہیں رکھتے وہ بابا صاحب کی روحانی قوت سے برگشتہ ہونے کی ہمت کہاں رکھتے ہیں۔

میرا کام تو کوارٹر نے کا نمبر پوچھنے آیا تھا۔ بابا صاحب نے اسے بھی تنخ نجس جانوروں کی ولدیت قرار دینے کے علاوہ گئی گزری گالیاں دینے کے بعد کہا تھا "دفع ہو جا ورنہ تیرے بتیسی دانت بھی توڑ دوں گا۔" اور اس نے بہت خوش ہو کے حساب لگایا تھا کہ اس کے کتنے دانت ٹوٹ چکے ہیں اور کتنے باقی ہیں۔ اس کے نزدیک یہی خوش نصیبی کے نمبر کی ضمانت تھی۔

مجھے اس مکار بابا صاحب کی لوٹ کھسوٹ پر سخت طیش آ رہا تھا اور ممکن ہوتا تو میں صندوق کی جگہ اسے گاڑ کے اس کا سارا مال انہی کو لوٹا دیتا جو بابا صاحب کو گالیوں اور لاتوں کے بدلے نذرانے دے گئے تھے۔ مگر ایسے ہزاروں لاکھوں دھوکے باز اس بدقسمت ایشیا میں ہی نہیں یورپ اور امریکا میں بھی خوابوں کے بیوپار پے ہوئے تھے اور خوش نصیبوں کے جال پھیلائے شکار پکڑ رہے تھے۔

مجھے وہاں بیٹھے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ میں گھٹنوں میں سر دیئے ایک کھمبے سے ٹیک لگائے لاتعلق بیٹھا تھا مگر بابا صاحب نے تاڑ لیا کہ وہاں میری موجودگی بے سبب نہیں ہے۔

"تو کیا چاہتا ہے؟ ادھر مت... قریب آ۔" بابا صاحب نے جھوم کے کہا۔

میں نے کہا "میں جائزہ لے رہا تھا کہ میں بھی یہی دھندا شروع کر دوں تو میری کامیابی کے کیا امکانات ہیں۔"

بابا صاحب کے لیے یہ ایک جھٹکا تھا "کیا بکتا ہے؟"

"بمبئی میں بزنس کے لیے بہت سرمایہ چاہیے، تھوڑی سی عقل۔" میں نے کہا "جس سے بے عقل لوگوں کی جیب کا مال اپنی جیب میں آ جائے۔ تمہاری جگہ اچھی ہے دھندے کے لیے۔ مجھے دو گے؟"

بابا صاحب کی آنکھیں کھل گئیں "تو خریدے گا یہ جگہ! اتنی کیا اوقات ہے۔" اس نے حقارت سے کہا۔

"مجھے گالی مت دینا۔ میں کوئی مرید نہیں ہوں تمہارا۔ بزنس کی بات کرنے آیا ہوں۔ منہ مانگی قیمت دوں گا۔"

بابا صاحب کی صورت پر اب پریشانی اور خوف کی علامات واضح تھیں "ایسے تو کیا جانے قیمت کیا ہوتی ہے۔ نیچے سے اوپر تک سب کو دینا ہوتا ہے۔ علاقے والوں سے پولیس والوں تک اور پورے تین ہزار دیئے تھے جگہ کے پانچ سال پہلے۔"

"روز کی آمدنی کتنی ہو جاتی ہے؟" میں نے خالص کاروباری لہجے میں سوال کیا۔

اس نے گھبرا کے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

میں نے کہا "میں انکم ٹیکس والا نہیں ہوں۔ جب سودا ہو رہا ہے تو پھر..."

"کون سالا کر رہا ہے سودا تم سے۔" وہ بگڑ کے بولا "جا ڈبار، کام کر اپنا۔"

میں نے کہا "میرے حلیے پر مت جاؤ۔ پیری فقیری کے علاوہ شعبدے بازی اور جادو کے کمالات میں سات سال کا تجربہ ہے میرا۔"

"مجھے بیس سال ہو گئے ہیں۔" اس نے حقارت سے یوں کہا جیسے میں ایک طفل مکتب ہوں۔

"پھر تمہارا کیا ہے؟ کہیں بھی اڈا جما سکتے ہو۔ بولو اب کتنے مانگتے ہو۔"

اس سے پہلے کہ وہ مجھے جواب یا کوئی گالی دیتا، میری نظر سامنے والے کوارٹر کی طرف اٹھی۔ غافل میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہوا تھا اور ملنگ کے ساتھ باتیں کرنا تو محض وقت ضائع کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ اس کا وقت بھی اور اپنا بھی۔ دراصل کوارٹر کا غیر مقفل دروازہ دیکھ کر مجھے آس بندھ گئی تھی کہ گل اندر ہی کہیں بیٹھی ہے لیکن گل کا چہرہ مجھے ایک لمحے کے لیے سامنے والے کوارٹر میں نظر آیا تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ گل نے دروازہ کھول کے ادھر ادھر دیکھا تھا اور پھر بند کر لیا تھا۔

"تم کل آ کر نگاہ نیت سوچ کے رکھنا۔" میں نے جاتے جاتے کہا "ویسے فراڈ کی ایک سے ایک شاندار اور کامیاب اسکیم ہے میرے پاس، کبھی پکڑے نہیں جاؤ گے۔"

وہ میری باتوں سے بدحواس ہو گیا تھا۔ اسے شک تھا کہ میں خفیہ پولیس کا آدمی ہوں یا ایسے ہی کسی ادارے کا جو اس کے کاروبار اور آمدنی پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس کی نظر سے بچنے کے لیے میں گھوم کر اس کوارٹر تک گیا جہاں میری نظروں نے گل کے چہرے کی جھلک دیکھی تھی۔ میں سیدھا جاتا تو ملنگ اس کوارٹر کو میری رہائش گاہ سمجھ لیتا۔

دروازے پر دستک دینے سے پہلے میں تذبذب کا شکار ہو گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ میری نظر کا دھوکا ہو۔ میں نے کسی اور کو گل سمجھ لیا ہو۔ اتنی دور سے صورت کی معمولی سی مشابہت بھی نظر کا فریب ہو سکتی تھی۔ میں دستک دے کر یہ بھی نہیں پوچھ سکتا تھا کہ کیا مسماۃ گل بانو عرف گل یہاں تشریف رکھتی ہیں۔ پھر مجھے ایک طریقہ سوجھ گیا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا اور کسی کو قریب نہ پا کے اونچی آواز میں کہا "آگ لگ گئی۔ اے آگ لگی" اور دروازے کے دور جا کھڑا ہوا۔ کوئی بھی میری آواز سن کے کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ میں دراصل گل بانو کو پکار رہا ہوں۔ سوائے گل بانو کے۔ میں بالکل لاتعلقی کے انداز میں دوسری طرف دیکھ رہا تھا کہ میرے کانوں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ میں نے آہستہ آہستہ سر گھما کے

www.paksociety.com

دیکھا۔ گل بڑی بے چینی سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھے
میری آواز سے پہچان لی تھی۔ میری صورت دیکھتے ہی اس کا چہرہ امید کی
روشنی سے منور ہو گیا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔

"اندر آجائیں بھائی سکندر! مجھے یقین تھا کہ آپ ہی آئیں گے" اس کے لہجے میں اعتماد کے ساتھ مسرت تھی۔

اندر جا کے میں نے کہا "یہ گھر کس کا ہے؟"

"اندر ایک بوڑھا لیٹا ہے' بیمار ہے اور بے چارے کو نظر بھی کچھ نہیں آتا" اس نے دروازہ بند کر دیا اور سرگوشی میں بولی۔

"تم کیسے آگئیں یہاں؟"

"اور کیا کرتی۔ کہاں جاتی؟" گل نے کہا۔

"یہ ساتھ والا کوارٹر بھی تو تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم یہاں چھپی بیٹھی ہو۔"

"دروازے میں تالا پڑا ہوا ہے۔"

"کہاں' مجھے تو کوئی تالا نظر نہیں آیا۔"

"پیچھے کی طرف ہے" گل نے کہا۔

"تم نے مجھے مایوس کیا گل۔"

"کیوں؟" اس کی شکل اتر گئی۔

"میں نے بڑے دعوے سے کہا تھا کہ تالا کیا چیز ہے، تم دروازہ توڑ سکتی ہو" میں نے کہا "ایسے حالات میں کسی بھی گھر میں گھستے ہوئے ڈر نہیں لگا تمہیں؟"

"وہ... دراصل ... میں یہاں آئی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ دیوار پھاند کے اندر کود جاؤں۔ اتنی دیر میں ایک بچہ بھاگا بھاگا آیا اور بولا "دیدی' جلدی سے چلیں کے کاکا کو دیکھ لو' ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ منوما دیدی کہیں گئی ہے۔" اس سے پہلے کہ میں فیصلہ کرتی' وہ میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچنے لگا اور میں مجبور ہو گئی۔ یہاں آ کے پتا چلا کہ بچہ محلے کا تھا' کھانا لے کر آیا تھا۔"

"یہ منوما دیدی کون ہے؟"

"بڈھے نے مجھے بتایا کہ لاوارث لڑکی ہے۔ اس کے ساتھ رہتی ہے اور اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کبھی جب اسے کام مل جاتا ہے تو وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ آج رات بھی وہ نہیں آئے گی..."

میرے ذہن میں سوال یہ آیا تھا کہ آخر منوما دیدی کیا کام کرتی ہے جو ہر روز نہیں ملتا مگر ملتا ہے تو اس کی رات باہر گزرتی ہے۔ گل سے یہ سوال پوچھنا اس لئے مشکل تھا کہ اسے جواب دینا زیادہ مشکل ہو جاتا۔

"میں نے بڈھے کو کھانا کھلا دیا ہے۔ کہا کہ میں منوما کی ایک سہیلی ہوں۔ وہ دیکھ تو سکتا نہیں۔"

"کیا بڈھا سن بھی نہیں سکتا؟"

"اونچا سنتا ہے۔ اکیلا پڑا مرنے کی دعائیں کرتا رہتا ہے۔ پہلے اس نے بیوی کو چھوڑ دیا تھا۔ بعد میں بچے اس کو چھوڑ گئے۔ کہتا ہے مجھے اپنے اعمال کی سزا مل رہی ہے۔"

"یہ بتاؤ' تم کو معلوم ہے ماماجی کے گھر میں ہمارے جانے کے بعد کیا ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ پہلے تو نازو چلی گئی۔ میں نے بہت روکا مگر وہ کہنے لگی تم فکر مت کرو' مجھے کچھ نہیں ہوگا' یہ کام میرے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔"

"کہاں گئی تھی وہ؟ تمہیں تو بتایا ہوگا۔"

"اس نے کہا تھا کہ میں جیون پرشاد سے ملنے جا رہی ہوں۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "مجھے یہی ڈر تھا۔ پھر غالب اور محسن سے بات تو نہیں کی تھی مگر میرا اندازہ یہی تھا۔ میں نے پوری کوشش کی تھی نازو کو سمجھانے کی' مگر ... جانتے ہیں بھائی سکندر۔"

"ہاں' وہ کسی کی نہیں سنتی۔ اگر اسے جیون پرشاد کا ... سوجھی تھی تو اسے ذکر تو کرنا چاہئے تھا ہم سے..."

"وہ... اس کا کہنا تھا... کہ آپ لوگ مخالفت کریں گے" گل نے کہا۔

"حمایت ہم کیسے کر سکتے تھے۔"

"اس کا خیال تھا کہ آپ لوگوں کے منصوبے میں رسک زیادہ ہے۔ کامیابی کے امکانات کم ہیں۔"

"بے وقوف لڑکی' جہاں رسک لینا ضروری ہو وہاں لینا ہے۔ اب کیا ضمانت ہے کہ خود اس کے لئے کوئی رسک نہیں؟ وہ کیوں نہیں سمجھتی کہ وہ ایک جوان اور خوب صورت لڑکی ہے" میں نے مشتعل ہو کے کہہ دیا۔

گل کا رنگ لال ہو گیا "اس نے کہا تھا... کہ میں اپنا ... کر سکتی ہوں' تم فکر مت کرو۔"

"یہ کہنا بہت آسان ہے" میں نے بگڑ کے کہا۔

"پلیز بھائی سکندر' آہستہ بولیں' بڈھا جاگ اٹھے۔"

"تم نے کہا تھا کہ وہ بیمار ہے اور دیکھ نہیں سکتا۔"

"ہاں۔ مگر معذور تو نہیں ہے۔"

میں نے ایک گہری' لمبی سانس لے کر نازو کے خلاف ... کے خیالات کو خارج کیا اور پھر ایک سے دس تک الٹی گنتی کی۔ غصے سے پرسکون ہو جانے کے بعد بھی مجھے سوچنا پڑا کہ بات کیسے شروع کروں جو گل کو جذباتی بحران میں مبتلا کر ... بظاہر وہ پرسکون تھی اور خوف یا دہشت کے احساس سے ... نظر نہیں آتی تھی۔

میں نے کہا "گل... وہ..."

اس نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا "کیا بات ہے بھائی؟ آپ کچھ کہتے کہتے رک گئے... سب خیریت ہے نا؟ غالب محسن...؟"

میں نے کہا "ان کو کچھ نہیں ہوا۔"

"پھر وہ ہیں کہاں؟"

"ایک تو نازو کے انتظار میں رہ گیا ..."

... سے اس نے اشارہ کیا جہاں غالب تھا "زرد سرا گھر کی ... حالات کا اندازہ کرنے کے لئے۔"

... کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے بازو کے انگوٹھے سے ... نظر بچا کے کہا "بھائی سکندر... وہ... مجھے ..."

... کیا "کس کو..."

"... شیطان' یوسف زر ادر کے۔"

... محسوس کیا کہ خون میری کنپٹی میں جمع ہو گیا ہے اور ... "یوسف... کیا اس نے..."

... میری بات کا مطلب سمجھ لیا اور جلدی سے بولی۔ "... کوئی بات نہیں ہوئی۔ دراصل آپ چلے گئے تو وہ مجھ ... کرتا رہا جن کا کوئی سر پیر نہیں تھا مثلاً اس ... جگہ میں پڑ گئی ہو تم۔ بمبئی کی فلمی دنیا میں رہا تھا ... اگر چاہو تو ... میں نے اسے سمجھا دیا کہ میں ... معاف کیا کیونکہ یہ اس کی پہلی گستاخی تھی جو اس نے ... غلطی کے باعث کی۔ مگر ... کے سامنے وہ ایسی بات نہ ... ایک بار تو اس نے ... کی طرح بھاگ کے ... کی طرح ... اور تم ... جسم کی ایک ہڈی بھی سلامت نہیں رہے گی۔ اس کے بعد وہ ... باتیں پوچھنے لگا۔ ہمارا ارادہ کیا ہے۔ کب تک ... اور ... سے ہماری کیا دشمنی ہے ... مجھے ہوا تھا کہ اس نے یہ سب معلوم کرنے کے لئے میرا ہی انتخاب کیوں کیا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب اور کوئی موجود نہ تھا۔ میں بتانا بھول گئی کہ ماماجی کسی کام سے تھوڑی دیر کے لئے کہیں چلے گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ میں ایک گھنٹے تک لوٹ آؤں گا۔ میں نے اسے بہت سی باتیں بتائیں جو سب غلط تھیں۔ میں بے وقوف بن کے اسے بے وقوف بناتی رہی۔ وہ سمجھا کہ میں کچھ نہیں سمجھی۔ اس نے کرید کرید کر پوچھا اور میں نے بھی شک نہیں ہونے دیا کہ جو معلومات میں اسے فراہم کر رہی ہوں وہ سب جھوٹ پر مبنی ہیں۔ چند منٹ بعد اس نے مجھ سے کاغذ قلم مانگا۔ میں نے پوچھا کہ کیا کرو گے تو کہنے لگا 'ایسے فارغ بیٹھنا تو مشکل ہے' ایک خط کیوں نہ لکھ لوں' میرا ایک دوست ہے لندن میں ... اس کا خط آیا تھا۔ اس نے شکایت کی تھی کہ میں خط کا جواب نہیں دیتا۔ اس بات کو بھی ایک مہینہ ہو گیا۔' میں نے اسے ایک کاپی اور ... فراہم کر دی اور ... بیٹھی رہی۔ پھر چائے بنا کے لائی۔ اسے بھی دی اور خود بھی پی۔ اس نے خط لکھ لیا اور کہنے لگا کہ میں ذرا ڈاک خانے تک ہو کے آتا ہوں' تم ماماجی کو آنے دو پھر چلے جانا۔ اس نے کہا ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈاک نکل جائے۔ اس بات نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ جس خط کا جواب کسی نے ایک مہینے تک نہ لکھا ہو اس کو پوسٹ کرنے میں اگر ایک گھنٹے کی تاخیر ہو جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر یہ کہ اسے یہاں کے ڈاک خانے کے بارے میں کیسے معلوم ہوا کہ ڈاک نکلنے والی ہے۔ اس کا شک بھی مجھے احساس جرم سے ہوا تھا۔ میں نے کہا "یوسف' کیا واقعی یہ خط تم نے اپنے لندن والے دوست کو لکھا ہے؟" وہ گھبرا گیا اور بولا "ہاں' تمہیں شک کیوں ہے؟" میں نے کہا "میں یہ خط پڑھنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا "مگر یہ تو ہندی میں ہے۔" میں نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم ہندی نہیں جانتے۔ ہم سب ہندی کے علاوہ بنگالی بھی جانتے ہیں۔ لکھ بھی سکتے ہیں' پڑھ بھی سکتے ہیں اور بول بھی سکتے ہیں۔ لاؤ یہ خط دو۔" اب اس کی حالت خراب ہو گئی۔ اس نے کہا "بی بی' ... کے خط ہیں۔ ان میں ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو عورتوں کے پڑھنے کی نہیں ہوتیں۔" اس کے بعد میں نے ایک دم ریوالور نکال لیا اور کہا "اگر تم نے خط میرے حوالے نہ کیا تو میں تم کو گولی مار دوں گی۔" اس نے سمجھ لیا کہ میں مذاق نہیں کر رہی ہوں اور اب اس کا بچنا مشکل ہے۔ بچنے اس نے حملہ کر کے مجھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش کی مگر ... کے علاوہ شراب نے اور دوسری بری عادتوں نے اسے ڈھیلا کر دیا تھا۔ میں نے بڑی آسانی سے خود کو بچا لیا اور غصے میں اس کو ایک لات بھی ماری۔ وہ دیوار سے ٹکرا گیا۔"

میں نے کہا "شاباش! تم نے تو ثابت کر دیا ہے کہ تم کسی طرح بھی نازو سے کم نہیں ہو" اور اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

وہ مسکرائی "افسوس تو یہ ہے بھائی سکندر کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔"

"کیا اس نے خط نہیں دیا تمہیں؟"

گل نے نفی میں سر ہلایا! "جب اس نے محسوس کیا کہ اب اس کی غداری اور ضمیر فروشی کا راز فاش ہونے والا ہے تو اس نے دو صفحات کے خط کو گولی بنا کے منہ میں رکھ لیا اور چبا کے نگل گیا۔ یہ بہت مشکل کام تھا۔ کاغذ اس کے حلق میں پھنس گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا سانس رکنے لگا تھا مگر وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے مجھے مشتعل کر دیا۔ وہ میری ناکامی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ جب میں نے ریوالور اٹھایا تو وہ اٹھ کر بھاگا مگر میں نے اسے گولی مار دی۔ سر میں۔ اور میں کیا کرتی بھائی سکندر؟"

"تم نے بہت اچھا کیا۔ تمہاری ذہانت اور ہمت پر مجھے بھی فخر ہے گل بانو۔ اور میرا خیال ہے تمہارے بھائی کی روح بھی بہت مطمئن ہوئی کہ تم نے اس کے ساتھ ... کی لاج رکھ لی اور اسے اپنے آخری فیصلے پر شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔ اس نے تم کو ہمارے حوالے کر کے کیا تھا۔"

گل رونے لگی "بھائی سکندر!" اس نے بڑی مشکل سے کہا اور پھر میرے سینے سے لگ گئی "کیا ہوتا' اگر آپ لوگ نہ ہوتے۔ میں کہاں جاتی۔ بچ کیا ہوتی' بھائی کے ساتھ میں خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔ اکیلی عورت تو اکیلی ہی ہوتی ہے' ... ہو۔"

www.paksociety.com

رہتا ہے۔ ان بھی تیرا ہم بھی تیرے۔ شانتی سے یہاں رہو اور ہماری سیوا کرو۔ میوا ضرور ملے گا۔ ساذو نے شکریہ ادا کرنے کی جذباتی اداکاری کے بعد عرض کی کہ مجھے ایک بار صرف ایک دن کے لئے راجے پور جانا ہوگا۔ جیون پرشاد نے اپنے شوفر کو حکم دیا تھا کہ وہ ائرکنڈیشنڈ کار نکالے مگر ساذو نے انکار کردیا۔ انہوں نے ایرکلاس ائیرکنڈیشنڈ سے بھیجنے کی پیش کش کی۔"

"کیا وہاں ہوائی جہاز نہیں جاتا؟"

"نہیں۔ ساذو کو ضرور یہ سب معلوم ہوگا؟" اس نے ڈر کے کہا "کہہ رہا کہیں زمین پر بھی نہیں جا سکتی۔ لالہ جیون پرشاد تو رنجیدہ ہوگئے۔ اس کی ادائے معصومیت پر۔ انہوں نے کہا کہ اچھا آج رات ہم تمہیں بھجوا دیں گے۔ اس نے کسی عورت کو بلوایا۔ وہ بھی بقول ساذو پہنچا نہیں تھی۔ وہ گھوڑوں کے ڈاکٹر اور ٹرینر کے ساتھ جا رہی تھی۔ ان کی خدمت کے لئے۔"

"گھوڑوں کی خدمت کے لئے؟"

"احمقانہ سوالات سے گریز فرمایئے" محسن بولا "وہ ساذو کو اپنے ساتھ لے گئی۔ ساذو ایک شاندار کار میں وہاں پہنچی جہاں اس کا مجنوں خاک بسر سراپا انتظار بنا بیٹھا تھا۔ کار میں سے دو حضرات اور دو خواتین برآمد ہوئیں۔ ان میں ساذو کو شامل رکھ کے وہ بیہوش ہونے ہونے بچا۔"

"گھوڑے برآمد نہیں ہوئے؟"

"کار میں سے ___ نہیں۔ وہ پہلے ہی آ چکے تھے۔ چار ملازمین کے ساتھ۔ ہر گھوڑے کا ایک نوکر الگ ہے۔"

میں نے کہا "ان کے تو کتوں کے بھی نوکر ہوتے ہوں گے۔"

"اب صورت احوال یہ ہے کہ ساذو اس سیلون کے اندر ہے اور رنگا باہر۔"

"کون سا سیلون؟"

"وہی کنٹینر یار ___ اس کا ایک حصہ خواب گاہ بھی تو ہے اور وہ سارا ائیرکنڈیشنڈ ہے" محسن بولا۔

"یہ سب تجھے کیسے معلوم ہوگیا؟"

"خود ساذو نے بتایا۔"

"وہ کہاں مل گئی تجھے؟" میں نے کہا۔

"اس نے یہاں پہنچتے ہی دیکھ لیا تھا کہ اس کا دیوانہ وہیں مجسم کشش انتظار ہے۔ جب کار چلی گئی تو اس نے کہا کہ میں ابھی ایک گھنٹے میں آتی ہوں۔ مجھے کچھ ضروری کام یاد آگیا ہے اور جیون پرشاد جی سے ایک بات بھی کہنی ہے جو میں بھول گئی تھی۔ ٹرینر تو احمق ہے۔ یہ ساذو کی رائے ہے۔ ڈاکٹر کچھ عیاش طبع ہے مگر اس کے ساتھ ہے پاسبان عقل۔ وہ لڑکی آج کل اس کی محبوبہ کے عہدے پر فائز ہے۔ ڈاکٹر کے بس میں ہوتا تو وہ فوراً اسے برطرف کرکے ساذو کی اس عہدے پر تقرری کر دیتا مگر شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا مشکل کام ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کاٹتا ہے۔ یہ ساذو کا کام ہے۔

جیون پرشاد کی سیکرٹری ہے۔ چنانچہ ساذو محفوظ ہے مگر رنگا غیرت اور غصے سے برا حال ہے۔ ان کی ایک لڑائی ہو چکی ہے۔"

"اس کا نتیجہ کیا نکلا؟"

"غالب کچھ ... مجھ سے بھی باتیں کرتا رہا۔ جلتے ہوئے ... کی شکایت ... ساذو پیار سے فکرتا ہے" محسن نے کہا "محبت کرنے میں بھی۔"

"جی نہیں" ہم اب رنگا سے اسٹیشن جا رہے ہیں۔ قلی نمبر سات سو بیس کے پاس۔ ایسا نہ ہو کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے" محسن بولا "غالب وہیں آجائے گا۔"

قلی نمبر سات سو بیس اسی جگہ کمبل اوڑھے اکیلا لیٹا ہوا جہاں دن میں اس کا ساتھی بخار میں جلتا پڑا ہوا تھا۔

"اچھا ہوا آپ آگئے۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ جلد نہ آجائے" اس کی پریشانی میں ذاتی مالی نقصان کی فکر کو زیادہ دخل نظر آتا تھا۔

میں نے کہا "تمہارے دوست کا کیا حال ہے؟"

اس نے کہا "میرا حال خراب ہے۔ سو کچھ لو کتنا تیز بخار ہے" میں نے ہاتھ لگا کے دیکھا تو واقعی اس کا بدن تپ رہا تھا۔

"بخار کیسے چڑھا لیا تم نے؟"

"اس کے بھی کر ہیں جی" وہ بولا۔

میں نے پھر پوچھا "تمہارے دوست کا بخار اترا یا نہیں؟"

"سرکار!" اس نے رونی شکل بنا کے کہا "اسے تو اسپتال لے گیا تھا۔ واپس نہیں ملا۔"

"کون سے اسپتال؟" میں نے کہا۔

"سرکاری اسپتال۔ اور ہم غریب کہاں جا سکتے ہیں۔"

"غریب کے بچے! تم اسے کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس لے جانے میں ... تو کہا تھا کہ ڈاکٹر کو یہاں لے آنا۔ اسے ایسی ہی بیماری تھی کہ اسپتال میں داخل کرانا ضروری تھا۔ تم اسے پیسے دے دیتے تو ٹھیک ہو جاتا۔ کیا تم اسے سرکاری اسپتال کی ... پر ڈال آئے؟ کیا دوا ملے گی اسے وہاں اور کون پوچھے گا اسے مر جانے گا وہ۔ یہی ہے تمہاری دوستی" اسی کا نام ہے یاری؟ تم اس کا حصہ مارنے کے لئے ..."

محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "آپ جذباتی ہوں۔ کام کی بات کریں۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اچھا تمہارا کام ... یہ لو اپنا معاوضہ۔ ہمارے ساتھ کوئی گڑبڑ مت کرنا۔"

"آپ بالکل فکر نہ کریں سرکار" رحمت ڈرا ہوا تھا ... کیا مجال ..."

میرے ذہن میں یوسف کی بے وفائی کی یاد کا زخم ابھی تھا۔ کون کس کے چہرے پر اعتبار کرے ...

... کس کے خلوص پر شک کرے اور کس کے ایمان میں کھوٹ ... جانے ... کی دنیا ہے۔ غریب تری کی نوبت مزاحمت بھی کم ہوتی ... نیت لگوادے اس کے ہاتھ رنگا اور آخرت سب بیچ ... گیا ہے"

میں اور محسن اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ میں نے اسے طے شدہ معاوضے سے بھی زیادہ ادا کر دیا تھا اور اس مرتبہ میرے علاوہ محسن نے بھی اسے ریوالور کا دیدار کرا دیا تھا تاکہ اس کے ذہن سے فوری طور پر ... خیالات رفع ہو جائیں۔ غالب کچھ دیر بعد آیا بیزار بھی بہت تھا۔

میں نے کہا "اس قسم کی صورت حالات میں روایت یہ ہے کہ پٹھان ... خود کشی کرلیتے ہیں۔"

محسن نے میری تائید کی "فرہاد نے سر میں تیشہ مار لیا تھا"

میں نے آہ بھر کے کہا "او ... عورت کی ذات بڑی ناقابل اعتبار ہے۔ آج کا مذاق کل کی حقیقت بن سکتا ہے۔"

"ہاں یار۔ جیون پرشاد کے پاس بہت دولت ہے اور ایک شہنشاہ نے ... کے شیریں کو خرید لیا تھا نور جہاں کا ... کو قتل کروا دیا تھا۔"

غالب نے مسکرا کے کہا "میں نے خودکشی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے لیکن آپ دونوں کا نام اس فہرست میں لکھ لیا ہے۔"

"کون سی فہرست میں؟"

"مقتولین میں آپ کا نمبر دوسرا ہوگا۔ سکندر اعظم کا نمبرا۔"

"پہلا پھر کس کا ہوگا؟ سابق ساذو کا ہوگا۔"

"پہلا جیون پرشاد کا ہے۔ ساذو سے تو میرا عقد اسی دن ہوگا جس دن تم دونوں کا سوئم ہے۔"

اچانک قلی نمبر سات سو بیس نے کہا "وہ آرہا ہے۔"

ہم سنگین اور مظلوم صورتیں بنا کے بیٹھ گئے۔ پتا نہیں اس نے کس کی طرف اشارہ کیا تھا مگر جب وہ قریب آ کے ہمارے سر پر کھڑا ہو گیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔

اس وقت میں نے خود کو اس بے وقوف چوہے کی طرح محسوس کیا جو اپنے ساتھ دوستوں کو بھی چوہے دان میں پھنسانے کے لئے لے آیا ہو۔ میرے سامنے جیون پرشاد کا خط لے جانے والا وہی کالیا ڈرائیور موجود تھا جس کو میں ناک آؤٹ کر کے بھاگ گیا تھا۔ ان کے لبوں کی معنی خیز مسکراہٹ کہتی تھی کہ پہلی بار تو یہ تماشا تم نے موقع سے فائدہ اٹھا لیا تھا۔ آج کیا کرو گے؟

پہلے تو اس خیال سے میری روح فنا ہوگئی تھی کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ ایسا ہو جاتا تو ہمارے سارے پروگرام کا ملبہ ... اپنے آپ کو ٹارزن سے کم نہیں سمجھتا تھا اور میں بھی ... خاطر میں لانے والا نہیں تھا۔ وہاں مار دھاڑ سے بھرپور ... کیا جاتا جس کے بعد ہم فرار پر مجبور ہوتے اور اس ... ہاتھ سے نکل جاتے۔

جب اس نے قلی نمبر سات سو بیس کی جانب رخ کیا تو میں نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔

"یہ کیا لمبا لیٹا ہوا ہے؟ چل اٹھ۔ کہاں ہیں تیرے دونوں ساتھی؟" اس نے تھانے داروں کے لہجے میں کہا۔

قلی نمبر سات سو بیس نے نقاہت سے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "مائی باپ آج کل مشکل ہے ___"

"کیا مشکل ہے؟" وہ غرایا۔

"آج مجوری مشکل ہے۔ بڑے زور کا تپ چڑھا ہے۔"

"ابھی ایک منٹ میں سارا تپ نکل جائے گا ___" ڈرائیور نے ایک گالی دے کر بولا۔

"آپ دیکھ لو حجور ___ جاڑا بخار ہے ___ ہم آپ سے جھوٹ بولیں گے ___ اپنی مجوری کون چھوڑتا ہے جی ___"

ڈرائیور نے تصدیق کے لئے اس کا ہاتھ تھام کے دیکھا اور اس کے ماتھے پر ناگواری کے آثار شکنوں کی صورت میں نمودار ہوگئے۔

"اور ان دونوں کو کیا ہوا؟ حیف یا کینسر۔"

"توبہ توبہ ___ ان کو بھی جاڑا بخار ہوا ___"

"ایک ساتھ ___" ڈرائیور نے بگڑ کے کہا۔

"وہ جی ___ ساتھ ہو رہتے ہیں ہر وقت ___ ایک ہی جگہ۔ کھاتے پیتے بھی ساتھ ہیں ___ مجبور بہت ہیں۔"

"سالے مرجاتا تو میرا کام ختم کرکے مرتے" وہ فکر مند ہوگیا۔

"سرکار ___ مجھے بھی بڑی جرورت تھی پیسے کی۔ میں ان کو لایا ہوں" اس نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

"یہ کون ہیں؟" اس نے پلٹ کر غور سے ہماری صورتوں کا جائزہ لیا۔

"بھروسے کے آدمی ہیں جی۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ یہ تم بھی مجوری مجھے دیں گے۔"

ڈرائیور پھر اس کی طرف پلٹا "یہ کیا حرامی پن ہے!"

"نہیں جی ___ کچھ ان کو مل جائے گا کچھ مجھے۔ آپ کا تو کوئی نقصان نہیں ہے" سات سو بیس نے منت کرتے ہوئے کہا۔

"مگر میں ان پر بھروسہ کیسے کرلوں ___"

"جیسے آپ نے مجھ پر کیا تھا حجور ___ دس سال سے جانتا ہوں میں ان کو ___" قلی نمبر سات سو بیس نے کہا "ہمارے گاؤں پاس پاس ہیں۔ یہ دونوں تو بھائی ہیں سگے۔ مگر بیچارے گونگے بہرے ہیں۔"

اس نے مجھے اور محسن کو بھائی بنا دیا تھا اور نوٹس دیئے بغیر گونگا بہرا بھی۔ اس کی اداکاری بھی اچھی تھی اور حکمت عملی بھی۔

"اور یہ نمبرا؟" ڈرائیور نے کہا۔

"یہ ان کے ساتھ رہتا ہے۔ راجکمار ہے نام اس کا۔"

www.paksociety.com

وہ ہنس پڑا "راجکمار ۔۔۔۔۔ راوے ۔۔۔ کون سی ریاست کے راجہ کا تعلق ہے تو؟"

غالب نے عاجزی کے ساتھ دانت نکالتے ہوئے خود کو رنے ورسے کا حق بھی ثابت کیا۔

"اور تیرا کیا نام ہے؟"

قلی نمبر سات سو تیس نے کہا "جواب نہیں سکتا حجور ۔۔۔۔ میں نے بتایا ناکہ دونوں گونگے بہرے ہیں۔"

"پیدائشی طور پر؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "یہ چھوٹے تھے تو ان کو گونگا ہو گئے تھے۔"

"کیوں؟"

"ہاں جی ۔۔۔۔" غالب نے گلے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یہاں سے گلے پھول گئے تھے۔"

اس نے یوں سر ہلایا جیسے سب کچھ سمجھ گیا ہو۔ "یہ تو بڑی مشکل ہو جاتی ہوگی۔ کون چلائے گا ان کو اپنی بات سمجھانے کے لیے؟"

"میں سمجھا دوں گا جی۔" غالب نے کہا "یہ تو بھگوان نے گربھ کی سزا دی ہے۔ سرکاری اسپتال میں آپریشن ہوا۔ مرنے سے بچ گئے مگر آواز بند ہو گئی۔ اشارے سے بات کا جواب دے سکتے ہیں۔"

وہ کچھ نرم پڑا "کتنی عمر تھی ان کی جب آپریشن ہوا تھا؟"

"یہ سات سال کا تھا، یہ نو سال کا ۔۔۔۔"

"یہ کیا نام نہیں ہیں ان کے؟" ڈرائیور نے کہا۔ اس کے لہجے میں اب پہلے والی تلخی اور رعونت نہیں رہی تھی۔ غالباً ہمارے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا اس کے دل پر اثر ہوا تھا۔

"یہ سورج لال ہے۔ یہ چندر کمار۔"

"واہ شکلیں تو دیکھو سورج لال اور چندر کمار کی ۔۔۔۔ جیسے سیانے پنڈت سے جنم پتری بنوا کے اماں ابا نے نام نکلوائے ہوں گے۔ اور اس نے زائچہ دیکھ کے کہا ہوگا کہ دنیا میں چاند سورج کی طرح ہوگا ان کا جیون۔ چلو اٹھو۔"

ہم سب بڑی پھرتی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے ہمارے نمبروں کو غور سے دیکھا "تمہیں اس نے بتا دیا ہے نا کہ کیا کام ہے؟"

میں نے اور محسن نے اقرار میں سر ہلایا اور غالب نے کہا۔ "سب سمجھا دیا ہے اس نے مائی باپ۔"

ڈرائیور نے سو سو کے دو نوٹ نکال کر قلی نمبر سات سو تیس کی طرف پھینک دیے "یہ لے تیرا حصہ۔ اب خبردار جو ان سے کچھ لیا۔"

"بھگوان کمس رکھیں ۔۔۔۔ سکھی رکھیں ۔۔۔۔" قلی نمبر سات سو تیس نے نوٹ جھپٹ لیے۔

اس نے غالب سے کہا "یہ بیچ میں آنے والے کسی کا حق ضرور مارتے ہیں۔ اب محنت تم کرو گے تو نہ مجھے یہ کمانا ہے بھی، مفت کی کھانے والے۔ تم کو پوری اجرت ملے گی۔ کام ذرا محنت کا ہے مگر مزدوری بھی اچھی ملے گی۔" "دو دو سو۔"

غالب نے کہا "آپ کی کرپا ہے جی ۔۔۔۔ کام کی آپ بالکل فکر مت کریں۔"

"وہ تو مجھے پتا چل گیا تھا۔ مگر ایک بات کی ہے مجھے۔ ان کو تو زبان ہی نہیں ملی، یہ کیا بولیں گے۔ تم راز کو راز رکھ سکتے ہو؟ لوگوں کے بیچ میں بیٹھ کے زیادہ بکواس کرنے کی عادت تو نہیں ہے تمہاری؟"

غالب نے کانوں کو ہاتھ لگایا "مگر صاحب آپ تو جی کیا بات بول رہے ہو جی۔"

"آج تم جو کچھ دیکھو گے سنو گے یا کرو گے اس کا ذکر کسی سے نہیں کرنا ہے۔ ادھر نہیں ہے۔ تم کسی کو قتل نہیں کرنا ہے نہیں، کچھ لوٹ اور لاش اٹھانے کا کام بھی نہیں کرو گے" ڈرائیور نے ہنسا "تم کو صرف مزدوری کرنی ہے۔ سامان کو گودام سے اٹھا کے مال گاڑی تک لے جانا ہے۔ محنت سے کام لو گے تو تین چار گھنٹے کی محنت ہے۔ بس کسی سے بھی ذکر مت کرنا کہ تمہیں کتنی مزدوری ملی ہے۔ کوئی اس کے بارے میں پوچھے تو بس انجان بن جانا ہی بہتر ہوگا۔ سمجھ لو تم نے ہمیں دیکھا ہی نہیں۔"

"میں سمجھ گیا حجور۔"

"اب ان دونوں گونگے بہروں کی جوڑی کو بھی سمجھا دے۔ تیری بھاشا تو سمجھتے ہوں گے؟"

غالب نے انگلیوں سے بے معنی اشارے کیے اور ہم احمقوں کی طرح سر ہلاتے رہے۔ ڈرائیور نے غالب کے اشاروں کو گونگے بہروں کی زبان سمجھتے ہوئے اہمیت نہیں دی۔ اگر وہ پوچھ بیٹھتا کہ یہ زبان تم نے کس سے سیکھی اور کب سیکھی تو غالب کے لیے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ ظاہر ہے یہ ایک بین الاقوامی اشاروں کی زبان ہے۔ مورس کوڈ کی طرح۔ اسے سیکھنا پڑتا ہے اور وہ بھی باہر ہے۔ مگر ڈرائیور کو یہ خیال ہی نہیں آیا۔ وہ تیز مزاج تو تھا مگر زیادہ شکی مزاج نہیں۔ ورنہ شاید اتنی آسانی سے ہمیں قبول نہ کرتا۔

گودام تک کا باقی فاصلہ ہم نے خاموشی سے طے کیا۔ صرف ایک بار غالب نے محسن کو بڑے غلط قسم کے اشارے کیے اور محسن نے گونگوں کی طرح بے معنی آوازیں نکال کے غالب کو جواب دیا۔ دونوں نے اپنا اپنا مطلب خود اخذ کیا۔

"کیا بات ہے؟" ڈرائیور نے کہا۔

"یہ کہتا ہے بھوک لگی ہے۔ ابھی کام کیا نہیں، کھانے کو مانگتا ہے۔"

ڈرائیور نے سوچ کے کہا "کہتا تو یہ ٹھیک ہی ہے۔ بعد میں کہاں فرصت ہوگی۔ خیر ابھی کھانے کا بھی کرتے ہیں کچھ۔"

گودام کا بھاری فولادی پھاٹک بند تھا اور باہر لمبی گھنی مونچھوں والا ایک سکھ خاکی وردی میں ملبوس توند نکالے خود کار گن لیے کرسی پر بیٹھا تھا۔

اس نے ہم تینوں کو غور سے دیکھا اور بولا "اوئے یہ کیا نمونے لے آیا ہے آج؟"

ڈرائیور نے کہا "مجبوری تھی۔ وہ کمبخت بیمار پڑ گئے ہیں ایک ہی بار میں۔"

"اوئی شہزادے ہیں شہزادے۔ کام کیا کرتے ہیں بڑے حرام کی کمائی کا، کسی کا بچا اٹھالیا کسی کا بستر۔ کیا نام ہے تیرا اوئے؟"

غالب نے کہا "ہم کو نیند آ گیا تو ہم تمہیں کدھر کسی کے سردار تھا؟"

"خوشامد کے بوجھ تلے تیرا سر پھاڑ دوں۔" شور دے چھوڑے سردار جی ہنس کے اٹھے۔

"ہم بھی پیٹ پھاڑ دیں گے۔" غالب نے کہا۔

ڈرائیور نے بیچ میں ٹوک کے کہا "یہ کیا بکواس ہے۔ کام کرنے آئے ہو یا لڑنے؟ سردار جی، چلو اٹھو دروازہ کھولو۔"

"ابھی دروازہ نہیں کھل سکتا۔" سردار جی نے رکھائی سے کہا۔

"کیوں؟"

"حکم ہے سیٹھ صاحب کا۔ ان کے آنے سے پہلے کوئی اندر نہیں جا سکتا۔" سردار نے کہا۔

مشتعل ہونے کے باوجود ڈرائیور بے بس تھا۔ اس نے ہم سے مخاطب ہو کے کہا "چلو جاؤ تم لوگ اتنی دیر میں کھانا کھا کے فارغ ہو جاتے ہیں؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا اور جھینپ کر مسکرانے لگا۔ اس نے دس کا ایک ایک نوٹ ہم سب کو تھما دیا۔

"جاؤ۔ مگر دور مت جانا۔ سیٹھ لوگ آنے ہی والے ہوں گے۔"

"بھگوان کریں سرکار۔ ہم روٹی لا کے ادھر بیٹھ جاتے ہیں۔"

غالب نے کہا "بلکہ یہ ہوٹل کے ادھر میں کھانا لے آتا ہوں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" ڈرائیور نے مطمئن ہو کے کہا اور سگریٹ سلگا کے ادھر ہی ٹہلنے لگا۔ وہاں اس کے بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

میں اور محسن اندازے سے اتنی دور جا کے گودام کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گئے جہاں سے ہماری آواز کسی کے کانوں تک نہ پہنچے۔ بظاہر ہم دونوں اپنے سامنے خلا میں دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے لیکن ذہن میں مشورے کی یہ جگہ بہت مناسب تھی۔ ہم نے فوراً بیچ میں بات کی اور سرگوشیاں کرتے رہے۔

"یہ کون سیٹھ لوگ آنے والے ہیں؟"

"وہی ہوں گے۔ ان میں سے کوئی ایک یا دو۔" محسن بولا۔

"ان سے معاملہ گڑبڑ ہو سکتا ہے۔ ڈرائیور نے تو اس لیے کچھ نہیں کہا کہ اس کی اور ہماری صرف ایک ملاقات ہوئی ہے۔ اب تک اس نے زیادہ غور بھی نہیں کیا۔ وہ اور آیا تو فوراً پہچان لے گا۔"

"اف اس کی آنکھوں پر شعور کی جھلی چڑھ جانے کا لا سوتیا اکارہ ہے" محسن بولا "اس کی عقل پر پتھر پڑ جائیں۔"

"پیچھے کوسنے دینے سے کام چلتا تو ہماری نماز تو روز ہی قبول ہوتی۔ یہ بتا کہ اس خبیث نے پہچان لیا تو کیا ہوگا؟"

"یار میں کیا بتاؤں کیا ہوگا۔ کوئی علم غیب ہے میرے پاس۔ ظاہر ہے کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ ہم کہیں سوری ہم غلطی سے آ گئے تھے۔ اور وہ کہے کہ اچھا جاؤ پھر ایسا مت کرنا۔"

"ہماری جیب میں ریوالور بھی ہیں۔"

"کیا کریں۔ مشین گن تو جیب میں رکھ نہیں سکتے نہ توپ۔"

"مجھے ایک بات سوجھ رہی ہے۔ میں سردار جی کے رویے سے کھٹک گیا ہوں۔ ریلوے کے گودام پر خود ریلوے والوں کا پہرا ہوتا ہے اور وہ کسی سیٹھ کے غلام نہیں ہوتے۔"

"بالکل ٹھیک۔ یہ سیٹھ کے پیسے کے غلام ہوتے ہیں۔"

"سردار جی نے اس ڈرائیور جیسے چالاک اور تیز شخص کی بات نہیں مانی۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

"اس کا مطلب ہے کہ یا تو سردار جی احمق ہیں یا ڈرائیور صاحب گدھے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ سخت حفاظتی انتظامات کا مسئلہ ہے۔ اور اگر یہاں کنارے کے مطابق یہ منہ پر نہیں مار سکتا تو ہم کیا مار سکتے ہیں۔ ہماری تلاشی لی جائے گی۔"

"سرچ وارنٹ کے بغیر یہ کام غیر قانونی ہوگا۔"

"قانون کے بچے! میں ایک ہاتھ ماروں گا ابھی ۔۔۔۔"

"یہ بھی غیر قانونی ہوگا۔ زیر دفعہ تین سو تینتیس ۔۔۔۔"

"ٹھیک ہے بکواس بند۔ ذرا سنجیدہ ہو سکتے ہیں" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کوئی بھی ہاتھ میں یہ آلہ لے کے کھڑا ہو گیا تو جامہ تلاشی کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔"

"جس آلے کا آپ حوالہ دے رہے ہیں وہ صرف یہ بتاتا ہے کہ سامنے سے گزرنے والے کی جیب میں دھات کی کوئی چیز ہے۔ یہ چیز ایک پیسے کا سکہ بھی ہو سکتی ہے۔ اگر احتیاط برتنا ہی ہے تو بھی اس سے پہلے کہ وہ ہم پر دست درازی کریں، ہم خود سب سکے اور جیب میں موجود ہر چیز انہیں پیش کر کے انہیں مطمئن کر دیں گے۔"

"ہر چیز میں اسلحہ بھی شامل ہوگا؟"

"انہیں کیسے خیال آ سکتا ہے کہ قلیوں کے پاس کھانے کے لیے روٹی کے پیسے تو ہیں نہیں ۔۔۔۔"

"بھیا! خیال بڑی باؤلی چیز ہے۔ بقول شاعر

نہیں آتی تو ان کی یاد تو برسوں نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

www.paksociety.com

"یہ فریج میں اردو شعر کا ٹکڑا کیوں لگا رہا ہے۔ سن لے گا کوئی تو کہے گا کہ قتل ہوا یا علی قلی خان۔" محسن بولا "مگر خیال کے بارے میں آپ کے خیال سے میرا خیال اچانک مطابقت اختیار کر گیا ہے۔ میں ہتھیار ڈالنے کا سوچ رہا ہوں۔"

"کہاں ڈالنے کا؟"

"جیب سے نکال کے ہم ہتھیار جرابوں میں رکھ سکتے تھے لیکن ہوتے ہی نہیں ہیں تو جرابیں کہاں۔ پھر بھی ایک ترکیب ہے۔ ہم انہیں پنڈلی سے باندھ لیتے ہیں۔ ٹخنوں سے ذرا اوپر۔"

"باندھنے کے لئے بھی تو کوئی چیز ہو۔ اور یہ کام ان کے سامنے ہوگا کیسے؟"

"غالب روٹی لے کر آ رہا ہے۔ ہم مل کر بیٹھیں گے تو ان کی طرف پیٹھ ہوگی۔" محسن نے کہا "کیا آس پاس کوئی رسی کا یا تلی کا ٹکڑا نہیں ہے؟"

"ہم قمیص کے دامن سے پٹی پھاڑ سکتے ہیں۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "ان کو شک ہو جائے گا کہ اچانک تینوں کے دامن کیسے چاک ہو گئے۔ ازار بند بہتر رہے گا۔"

"کیا مطلب ـــــ پجامے ہاتھ سے پکڑ لیں؟"

محسن نے مجھے افسوس سے دیکھا "ذرا اپنے گریبان میں جھانک کے دیکھئے کہ کتنا ازار بند فالتو ہے۔ کمر سے گرہ لگا کر کرتے ہوئے فاضل ٹکڑا نکالنے کی کتنی گنجائش ہے۔"

"گنجائش ہر ازار بند میں ہوتی ہے۔ ہم پچھلے عہد کے لوگ ہیں۔" میں نے اپنے گریبان میں جھانک کے کہا "یہ اچھی تجویز ہے۔"

"فاضل حصہ کاٹنے سے پہلے مضبوط گرہ لگا لیں۔" غالب نے روٹیاں درمیان میں رکھنے کے بعد کہا "ورنہ"

"ورنہ کیا۔ گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں" محسن بولا۔

کھانا کھاتے ہوئے ہم نے اپنی اسکیم کو مزید قابل عمل بنایا۔ باری باری ہم سب اٹھ کر چند قدم دور گئے اور دیوار کی طرف ایسے منہ کر کے بیٹھ گئے جیسے سب بیٹھتے ہیں۔ جلتی ہوئی سگریٹ سے ہم نے ازار بند کے فاضل ٹکڑے الگ کئے جو چند سیکنڈ کا کام تھا۔ پھر واپس آ کے ایک دوسرے کو تحفظ فراہم کرتے ہوئے ریوالور اپنی اپنی پنڈلی سے باندھ لئے۔ اس کے لئے ہم نے ازار بند کے ٹکڑے کو ٹخنے کے بک سے گزارا تاکہ اس کے کھل کر گرنے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ پنڈلی کے سب سے پتلے حصے پر ایک بل دینے کے لئے ہر ایک کے پاس جو ایک ڈیڑھ فٹ کا ازار بند تھا وہ کافی ثابت ہوا۔ رسک اب بہت کم رہ گیا تھا۔ اگر وہ جسمانی طور پر ہماری تلاشی لیتے تو اوپر سے نیچے ہاتھ مار کر دیکھنے سے انہیں کچھ نہ ملتا۔ تلاشی لینے والے اتنا جھک کر قدموں کے انداز میں کچھ نہیں دیکھتے۔

ہم کھانے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ تریویدی اور کرنل نمودار ہوئے۔ وہ ایک ہی گاڑی میں وہاں پہنچے تھے۔ غالباً ڈرائیور نے انہیں ہمارے بارے میں بتایا تھا کہ ان کی نظریں مشکوک انداز میں ہماری طرف اٹھیں۔ شاید وہ [illegible] مطمئن ہو گئے اور انہوں نے [illegible] میں ملاحظہ فرمانا ضروری نہ سمجھا۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی رکھنے والا ہر شخص اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظرانداز کرنے کی غلطی کرتا ہے۔ [illegible] وہ ڈرائیور کی بات ختم [illegible] نظر آنے لگا اور وہ سوچتا کر آخر خود کچھ [illegible] میں حق بجانب تھا۔

"چلو اب جلدی مت کرو۔" کرنل نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا

"اب تک تو آدھا کام ہو جاتا کرنل صاحب" ڈرائیور بولا۔

"پھر ہوا کیوں نہیں؟" کرنل بولا

"کیسے ہوتا؟ دروازے جو بند تھے۔ ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے سب ایک گھنٹے سے۔" ڈرائیور نے شکایت کو تھوڑی سی مبالغہ آرائی سے زیادہ موثر بنا دیا۔

"ابھی کیوں بیٹھے تھے۔ دروازہ کھلوا کے کام شروع کرا دیتے تم۔"

"جی نہیں کرنل صاحب۔ اس کے لئے آپ کی اجازت درکار تھی۔ سردار جی نے کہا کہ آپ کا یہی حکم ہے" ڈرائیور بولا

"میں نے ایسا کوئی احمقانہ حکم نہیں دیا۔"

"میں نے سب تمہارے سپرد کر دیا تھا" تریویدی بولا۔

"او موتیاں والیو! اپنے بہادر صاحب نے کہا تھا" سردار جی بولے۔ اسے آخرکار صفائی پیش کرنے کا موقع ملا۔

"کون بہادر صاحب؟"

"غالباً اس کی مراد دلاور سے ہے" تریویدی بولا اور سردار جی کو ڈانٹنے لگا "کتنی بار بتانا پڑے گی تمہیں یہ بات کہ ان کا نام بہادر نہیں دلاور ہے بہادر نہیں"

"بس جی بندہ بشر غلطی کرتا ہے ــــ اب یاد رکھوں گا۔" سردار جی نے کہا

"گزشتہ بار بھی یہی کہا تھا تم نے۔ چلو دروازہ کھولو۔"

ڈرائیور نے اب مالکوں کے نمائندے کی حیثیت سے [illegible] ڈانٹتے ہوئے حکم دیا اور پھر ہماری طرف پلٹا "کیا تم نے سنا نہیں سنا کیا خاک ہو گا ان بہروں نے!" وہ خود ہی جھنجلا کے بولا۔

غالب کے اشارے پر ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ سردار جی نے پچیس تیس فٹ اونچا تھا ہے کا پھاٹک کھولنے کے لئے ایک فیوز کیبنٹ کو کھولا اور کوئی لیور اونچا کر دیا۔ اتنے بھاری دروازوں کو دھکیل کر کھولنا ناممکن تو نہیں مگر مشکل ضرور ہوتا ہے۔ ایک [illegible] نے یہ کام بڑی خوبی سے سر انجام دیا۔ دونوں پٹ ایسے ہو گئے جیسے کسی نے ڈوری سے پردے کھینچ دیئے ہوں۔

میرے اندیشے اس وقت درست ثابت ہوئے جب [illegible] گیٹ میں واقعی ہاتھی جیسا کوئی آ کر کھڑا ہو گیا۔ [illegible]

فون تریویدی کے ہاتھ میں تھا اور اس کا رابطہ کار میں لگے ہوئے ٹرانسمیٹر سے تھا جس کا انٹینا پورا باہر نکلا ہوا تھا۔

کرنل کے ہاتھ میں اسلحے کا سراغ لگانے میں استعمال ہونے والا ہینڈل ڈی ٹیکٹر تھا جو ائرپورٹ اور حساس نوعیت کی تنصیبات سے گزرنے والوں کو چیک کرنے کے لئے دیواروں یا دروازوں میں ہی نصب ہوتا ہے۔ اگر ریوالور ہماری جیب میں ہوتے تو یقیناً وہ ہماری تلاشی لیتے۔ میں نے سب سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی جیب میں کوئی سکہ تک نہ رکھیں تاکہ ہم صاف گزر جائیں۔ کرنل کے ہاتھ میں اس آلے کی بلندی ہمارے گھٹنوں سے اوپر تک ہی محدود رہی۔ وہ آلے کو ہاتھ میں اوپر اٹھاتا تھا تو اس سے خارج ہونے والی نظر نہ آنے والی شعاعیں ہمارے نچلے دھڑ سے ٹکراتی تھیں اور وہ ہاتھ سیدھا کر لیتا تھا تب بھی ٹخنوں سے اوپر بندھے ہوئے ریوالور محفوظ تھے۔ چنانچہ میرے مطمئن ذہن کو اس وقت شدید جھٹکا لگا جب آلے نے چیخنا شروع کر دیا۔ چیخ کے لئے اردو میں کوئی متبادل لفظ موجود نہیں جو اس کا بالکل صحیح مفہوم بتا سکے۔ یہ آواز ایسے تھی جیسے بہت گرم تیل والے توے پہ پانی کے چھینٹے پڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔

"یہ کیا ہے تمہارے پاس؟" کرنل نے محسن سے کہا مگر وہ سیدھا گزرتا چلا گیا۔

ڈرائیور جو ہمیں لایا تھا، مسکرا دیا۔ "بہرے ہیں کرنل صاحب۔ ابھی بتایا تھا آپ کو میں نے۔"

کرنل نے محسن کی شرٹ کی جیبوں کو ٹٹولا اور محسن کو آگے دھکیل دیا۔ "پنسل کے بٹن ہیں۔ میں سمجھا کوئی سکہ ہوگا۔"

"پھر دیکھ لیں کہیں بم نہ ہو۔"

"شٹ اپ! تم اپنی اوقات میں رہو۔ سمجھے" کرنل آپے سے باہر ہو گیا۔

اس کے اور ڈرائیور کے درمیان تعلقات کی سرد جنگ شاید پہلے سے جاری تھی۔ "میں نے کون سی غلط بات کی ہے کرنل صاحب؟"

وہ معصوم صورت بنا کے بولا۔ وہ ایک ایم ایل اے کا ڈرائیور تھا اور محض ڈرائیور ہی نہیں تھا محرم راز درون خانہ بھی تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو جیون پرشاد ایم ایل اے اور تریویدی کے درمیان رابطے کا ذریعہ نہ بنتا۔ جیون پرشاد اس پر پورا اعتماد کرتا تھا اور جیسے شہ کا منہ لگا مصاحب بگڑ جاتا ہے ایسے ہی وہ کرنل کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ کرنل اس کے ساتھ وہی سلوک روا رکھتا ہوگا جو ملازموں کے ساتھ رکھا جاتا ہے اور اس سے بھی کمال تابعداری کی توقع کرتا ہوگا مگر ڈرائیور رعب میں آنے والا نہیں تھا۔ تریویدی نے بروقت مداخلت کی۔ "اسٹاپ اٹ کرنل! مجھے جانا بھی ہے۔"

"تم جاؤ۔" کرنل نے ناخوشگوار لہجے میں کہا "میں موجود رہوں گا یہاں۔ کام ہو جائے گا۔"

تریویدی نے کہا "کام خراب نہ ہو جائے۔ تم دونوں تو سانپ بچھو کی طرح ہو جاتے ہو ایک دوسرے کی موجودگی میں۔ میرا خیال ہے تم بھی جاؤ۔"

وہ ہوائی جہاز کے ہینگر جتنا بڑا گودام تھا۔ اس کی چھت شاید چالیس فٹ اونچی ہوگی۔ لمبائی دو سو فٹ اور چوڑائی سو فٹ۔ بیس ہزار اسکوائر فٹ جگہ میں اگر بیس بلب بھی ہوتے تو ناکافی تھے کیونکہ چھت بہت بلندی پر تھی۔ وہاں چاروں کونوں میں سو سو واٹ کے چار بلب آویزاں تھے اور ہوا میں جھول رہے تھے۔ اس سے گودام میں برائے نام اجالا تھا۔ اور سائے متحرک نظر آتے تھے تو لگتا تھا پوری عمارت ہل رہی ہے۔ تریویدی کا مشورہ قبول کرتے ہوئے کرنل بھی رخصت ہو گیا تھا۔ گودام کے دوسرے کنارے پر بھی دروازہ تھا اور اس کے درمیانی حصے میں اسباب سے لدے ہوئے ٹرک کھڑے ہوئے تھے جو روانہ ہونے کے لئے تیار تھے یا صبح ان لوڈ ہونے کے لئے۔ اس ایک گودام میں اتنا سامان سما سکتا تھا جو دس مال گاڑیوں پر لوڈ ہوتا لیکن گودام کا بیشتر حصہ خالی تھا۔ اسباب اس کی چاروں دیواروں کے ساتھ ساتھ الگ الگ ڈھیر کی شکل میں پڑا ہوا تھا۔

ڈرائیور نے غالب سے کہا "یار، تم ان گونگے بہروں سے کہو کہ یوں منہ اٹھا کے نہ چلتے جائیں، اشارہ دیکھیں۔"

غالب نے میرے اور محسن کے کندھے پر ہاتھ مار کے متوجہ کیا

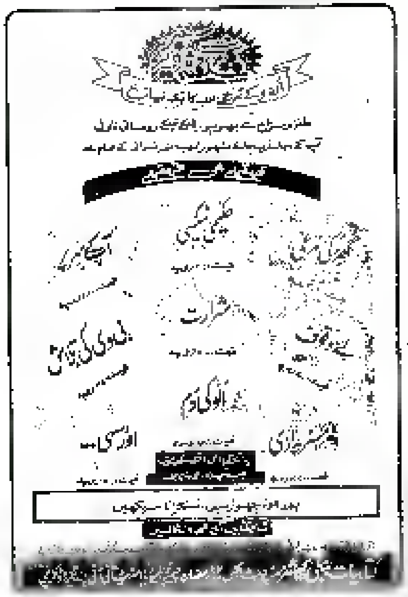

www.paksociety.com

اور ڈرائیور کے حکم کی تعمیل میں بائیں طرف چلنے کو کہا۔ کرنے کے بلب کے نیچے لکڑی کے چھ فٹ لمبے بالکل تابوت کی شکل کے ایک جیسے باکس رکھے ہوئے تھے میں پریشان ہو گیا۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی سو سے کم نہیں تھی اور اگر ان میں اسلحہ تھا تو ایک باکس کو ایک تنومند آدمی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اگر ایک وقت میں دو آدمی مل کے ایک باکس لے جاتے تو میرا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات سب کے ذہن میں تھی۔

ڈرائیور نے غالب کے تذبذب کو تاڑ لیا "گھبرا گئے؟"

"صاحب جی! یہ کتنے بکسے ہیں؟ سو تو ہوں گے۔"

"سچ ہی ہیں" ڈرائیور بولا۔

میں نے کہا "چوراسی پھیرے ہو جائیں گے؟ ایک رکشے میں دو بکسے نہیں جا سکتے۔ چار تنومند ہوتے تو ......"

اس نے کہا "یہ بے راہ اتفاق لگی! کیا میں تمہیں آدمی نہیں لگتا؟ ایک یہ چاند سورج کی جوڑی ہے۔ دوسری راجہ اور راج کماری۔"

وہ اپنے مذاق پر قہقہہ مار کے ہنسا۔

کرنل نے اوپر سے کہا "لطیفے مت سناؤ ایک دوسرے کو، کام کرو۔"

"کیا ہنسنا بھی منع ہے کرنل صاحب؟" ڈرائیور نے پلٹ کے جواب دیا اور زیر لب اسے ایک گالی دی "سالے کی سب کرنلی نکال دوں گا کسی دن ...... کے راستے سے۔ چلو بے تم دونوں۔" اس نے مجھے اور محسن کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔

غالب میرے نزدیک تھا۔ اس نے میرے ساتھ مل کے ایک باکس اٹھا لیا۔ اس کے دونوں کناروں پر لمبائی کے رخ موٹی رسی کے ہک تھے جن پر چمڑے جیسی ربڑ لگی تھی۔ لوہے کے ہک ہوتے تو باکس کو اٹھانا زیادہ مشکل ہوتا۔ اس کے کنارے انگلیوں میں گڑ جاتے۔

باکس کا وزن ایک من تو ضرور ہو گا جو میری توقع سے کم ہی تھا۔ باکس عام چیڑ کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے جو ہلکی بھی ہوتی ہے اور سستی بھی۔ کسی باکس کے سیدھے الٹے کا پتا نہیں چلتا تھا کیونکہ ڈھکن الگ نہیں تھا اور نہ اسے کنڈوں میں قفل ڈال کے بند کیا گیا تھا۔ باکس بیچ درمیان سے کھلتا تھا۔ اور اسے بڑی مہارت سے بند کیا گیا تھا۔ ڈھکن کا نچلا حصہ بھی ڈھکن کے برابر ہی تھا۔ لمبائی نچلے والے حصے پر بغیر سر والی نوکیلی کیلیں گاڑی گئی تھیں اور پھر اوپر والا حصہ ان کیلوں پر رکھ کے دبا دیا گیا تھا۔ کیلیں اوپر والے حصے کے تختوں میں پیوست ہو گئی تھیں۔ اب باکس کو بیچ میں سے کسی اوزار سے درمیانی جھری کو چوڑا کر کے اٹھایا جا سکتا تھا اور اوپر کھینچ کر پھر اوپر نیچے کے حصوں کو الگ کیا جا سکتا تھا۔

دونوں حصوں کی درمیانی جھری کے چاروں طرف جتنی باکس کی لمبائی اور چوڑائی کے رخ پر دو انچ چوڑا سخت چپکنے والا ٹیپ تھا جس نے جوڑ کو بھی چھپا لیا تھا اور ایک طرح سے باکس کو سیل بھی کر دیا تھا۔ جہاں ٹیپ کے دونوں کنارے ملتے تھے وہاں ایک گول کاغذ کی سیل تھی جس پر کسی نے دستخط کئے تھے مگر اس سے بڑھ نہیں پڑھا جاتا تھا۔ اگر راستے میں کوئی باکس کھولنے کی کوشش کرتا تو اس کے لئے ٹیپ ہٹانا ضروری ہوتا اور دستخط شدہ کاغذ کی سیل پھاڑے بغیر ٹیپ کا کنارا نظر تک نہیں آ سکتا تھا۔ اگر کوئی احتیاط سے اس کاغذ کی سیل کو ہٹانے کی کوشش کرتا تو شاید نشان رہ جاتا۔

صرف اوپر کے حصے پر کالے رنگ میں لکھے ہوئے انگریزی کے حروف سے باکس کے سیدھے الٹے کا پتا چلتا تھا۔ یہ لفظ بھی ہاتھ سے نہیں لکھے گئے تھے بلکہ کٹے ہوئے اسٹینسل پر رنگ پھیر کر چھاپ دیئے گئے تھے۔ عین درمیان میں "FOR DEFENCE USE" کی عبارت خبردار کرتی تھی کہ کوئی باکس کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ یہ سب جھوٹ تھا۔ وہ صحیح باکس دفاعی مقاصد کے استعمال کے لئے تھے اور نہ ان میں جنگی سامان۔ مگر کس میں ہمت تھی کہ اسے چیلنج کرتا؟ خود فوجی بھی ان کو دیکھتے تو کوئی اہمیت نہ دیتے۔ فوج ایک بہت بڑی اور ملک گیر تنظیم ہے۔ دفاعی ضرورت کا سامان ہزار قسم کا ہو سکتا ہے اور ادھر سے ادھر آتا جاتا رہتا ہے۔ باکس کے اوپر والے حصے پر دائیں جانب اسٹیکر لگا ہوا تھا اس پر شیشے کا جام بنا ہوا تھا۔ یہ ایک عالمی نشان ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس باکس یا کارٹن کا اسباب ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ چنانچہ اسے احتیاط سے اٹھایا اور رکھا جائے۔ دوسری طرف ایک تیر بنا ہوا تھا جس کا رخ اوپر کی جانب تھا اور اس کا مطلب تھا کہ باکس کو اس رخ پر سیدھا رکھا جائے۔

پہلا پھیرا ہم نے دس منٹ میں مکمل کر لیا۔ مال گاڑی کا ڈبہ عام قسم کا تھا جو سب سے آگے تھا اور پلیٹ فارم سے بہت دور تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے ایک ریلوے لائن کو بھی عبور کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ دس منٹ کے اس پھیرے نے مجھے اور غالب کو تھکا دیا۔

"سر! کیا یہ سب تابوت یہاں تک لانے ہوں گے؟" غالب نے فریادی لہجے میں کہا۔

میں نے افسوس سے جواب دیا "فرض کرو لانے ہیں۔ پھر؟"

"تو آخری تابوت میں مجھے بھی رکھ دینا ......"

"تم مایوسی میں روشن پہلو کو نظر انداز کر رہے ہو۔"

"اتنی محنت سے ہلاک ہونے میں روشن پہلو کہاں ہے؟"

"یہ تم یہ سوچو کہ ہم تو صرف باکس لائیں گے۔ باقی تو محسن اور وہ ڈرائیور اٹھائیں گے۔ یعنی یہاں تک صرف جتنے باکس لانے ہوں گے باقی تو سب آخری بوگی میں رکھے جائیں گے جو بالکل گودام کے سامنے ہے۔ یعنی صرف اتنا وہ جتنے باکس ہم یہاں تک لائیں گے ہم ......"

لیکن ریاضی کے قاعدے پر مبنی یہ خوش فہمی کا سبق اس وقت اچانک ختم ہو گیا جب میں نے ڈرائیور اور محسن کو آخری بوگی تک جا کے لوٹتے دیکھا۔

انہوں نے اپنے لئے قریب کی بوگی کا انتخاب کر لیا تھا۔ ڈرائیور صاحب کو اپنے لئے آسان کام منتخب کرنے کا حق حاصل تھا۔

غالب نے مجھے خون آشام نظروں سے دیکھا "کیا اب بھی کوئی روشن پہلو نظر آتا ہے آپ کو؟"

میں نے متانت سے کہا "سرنگ کے آخری حصے میں بہرحال روشنی ہے۔ کام ختم ہو جانے کے بعد آرام کرنے میں کتنا لطف آئے گا۔"

غالب نے غرا کے کہا "ایسا ہی جتنا غسل خانے میں مر جانے والے کو تابوت میں سے دنیا کو الوداع کہہ کر آتا ہے۔"

ڈرائیور اور محسن دوسرا باکس اٹھا کے لے جا چکے تھے اور ہم ابھی دوسرا باکس اٹھانے پہنچے تھے۔

"مرزا جی! ایک خیال مجھے پریشان کر رہا ہے۔"

"اگر کہیں کسی تابوت میں شملہ نہ ہو" غالب نے کہا۔

"بالکل ٹھیک سمجھا تم نے۔"

"وہ ایسے تابوت میں کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔ جو ائر ٹائٹ ہو۔"

"لیکن فرض کرو ان میں کوئی ایسا باکس ہو جس میں نیچے کی طرف چند سوراخ ہوں ہوا کے لئے۔ اور اندر شملہ کے ساتھ اس کا بیٹا خواب آور انجکشن کے اثر سے بے ہوش پڑے ہوں تو ہمیں کیسے معلوم ہو گا؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے ہمیں معلوم نہیں ہو سکتا۔" غالب نے کہا۔

"یعنی ہم خود ہی انہیں اٹھا کے لے جائیں گے اور اس تمام گولہ بارود کے ذخیرے میں رکھ دیں گے اپنے ہاتھوں سے یا خود محسن اپنی بیوی اور بچے کا تابوت اٹھا کے اسلحے کے ڈھیر پر رکھ دے گا۔"

غالب نے کہا "کیا آپ روشن پہلو پر نظر نہیں رکھ سکتے؟"

"پھر وہی بات یار۔ اس احساس کی اذیت میں روشن پہلو کہاں ہے؟"

"یہ اول تو مجھے اس کا امکان بہت کم نظر آتا ہے کہ وہ شملہ اور اس کے بچے کو ایسے باکس میں لے جائیں۔ تم نے تو دیکھا تھا انہیں بچے کے تابوت میں۔ اب وہ ایسے ہی باکس میں لے جانا چاہیں گے تو وہ باکس ائر ٹائٹ نہیں ہو گا۔ اس میں تازہ ہوا کے لئے سوراخ ہوں گے۔ اس کے نچلے حصے میں۔"

"ہم نیچے کی سطح کو ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھ سکتے ہیں۔"

"اگر بدقسمتی سے وہ باکس محسن نے ڈرائیور کے ساتھ مل کر اٹھایا تو کیسے پتا چلے گا؟"

"اس سے اتنا تو معلوم ہو جائے گا کہ باکس پہلے ڈبے میں نہیں ہے۔ آخری ڈبے میں ہے۔"

غالب نے تلخی سے سر ہلایا "اتنی دیر تک کسی خواب آور دوا کا اثر باقی نہیں رہتا۔ بین کے جانے میں آنکھ تو کھلے باقی آپ اور یہ

باکس تو یہاں گزشتہ رات سے موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شملہ کو وہ بعد میں لائیں گے بالکل آخری وقت میں جب ٹرین کی روانگی کا وقت ہو جائے گا۔" غالب نے کہا۔

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس کی دلیل نے میرے دل کو اس فکر سے بھی نجات دلا دی کہ کہیں شملہ کے تابوت کو اٹھانے والا خود محسن نہ ہو۔

جب ہمارا تیسرا پھیرا تھا تو محسن اس ڈرائیور کے ساتھ پانچ پھیرے کر چکا تھا۔

"حرام خوری مت کرو" ڈرائیور نے ہمیں پھیرے کے لئے جاتے وقت کہا۔

"حرام خوری کون کر رہا ہے جی" غالب نے کہا۔

"اور پھر یہ کیا ہے؟ تم نے تین باکس پہنچائے ہیں اتنی دیر میں دم چھنالے جا رہے ہیں۔"

"اچھا جی آپ اس کو ادھر لے جاؤ آخری بوگی میں اور پھر رکھو ......"

"بکواس مت کرو ذرا تیز چلو گے تو مر نہیں جاؤ گے۔ میں صرف اس لئے مدد کر رہا ہوں کہ وقت کم لگے۔ مجھے تمہاری مزدوری میں سے حصہ تو نہیں ملے گا" ڈرائیور نے مشتعل ہو کے کہا۔

"اچھا جناب آپ بیٹھ جائیں آرام سے۔ ہم نمٹا دیں گے سارا کام" غالب نے میرے اشارے پر ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"غلطی مجھ سے ہوئی۔ ایک اور کو لے آتا تو خود ہاتھ میں ہنٹر لے کے کھڑا رہتا۔ کام نمٹا تو آدھا بانٹ دیتا اور پھر جو حرام خوری کرتا اس کی کھال ادھیڑ دیتا۔" ڈرائیور نے کہا لیکن اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ "چل بے اٹھا" اس نے محسن کو گالی دے کر کہا۔

شکل سے وہ بدمعاش نظر آتا تھا اور تیز مزاج بھی تھا مگر وہ دل کا اتنا برا نہیں تھا۔

میں نے غالب سے کہا "اس سے بیکار پنگا لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"یار بات ہی الٹی کی تھی اس نے۔ کیا فاصلہ نظر نہیں آتا اسے؟" غالب نے کہا۔

"جو حاکم ہو یا مالک ہو اس کی الٹی بات کو بھی اس کے منہ پر الٹا کہنے سے صرف اس کی ناراضگی حاصل ہوتی ہے۔ کام نکالنے کے لئے ......"

"ہمارا کون سا کام رک جائے گا اگر یہ ناراض ہو گیا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ جان چھٹے۔ اب کیا فائدہ اس مزدوری کا۔ جو معلوم ہونا تھا ہو گیا" غالب نے کہا۔

میں نے غور کیا تو مجھے اس کی بات پھر ٹھیک لگی۔ اس گودام میں داخل ہونے کا مقصد پورا ہو جانے کے بعد ہمارے لئے جسمانی مشقت لاحاصل تھی۔ دو سو ڈبے کی خاطر خود کو تھکانا کوئی عقلمندی

www.paksociety.com

نہ تھی۔

غالب نے کہا "یہ پتا چل گیا کہ شملا اس وقت یہاں موجود نہیں ہے۔ صندوقوں میں کیا ہے یہ ہم دیکھ نہیں سکتے۔ یہ مال کن کن بوگیوں میں رکھا گیا ہے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے۔ ہمیں اب چلنا چاہئے ورنہ دوسری طرف کام خراب ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "درست فرمایا آپ نے۔ سارے باکس ڈھونے میں ڈھائی تین گھنٹے لگ جائیں گے کم سے کم۔ اور بج جائیں گے رات کے بارہ۔ گاڑی تو روانہ ہوگی صبح ساڑھے پانچ بجے مگر ہمیں دو ڈھائی بجے رات سے پہلے دو کام نمٹانے ہیں۔ پہلے محسن کے تابوت کو گارڈ کے پاس رکھوانے کے لئے جانا ہے۔ وہاں ہم اس لباس فاخرہ میں نہیں جا سکتے۔ گارڈ تب ہی قائل ہوگا جب ہم صورت اور حلئے سے بھی سچ مچ کے لواحقین نظر آئیں۔ اور اس کام سے فارغ ہو کر ہمیں نازو کے پاس پہنچنا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ پہلے ہم نازو کی مدد کریں۔" غالب نے کہا اور ہم نے چوتھے باکس کو بوگی میں دھکیل دیا۔

"نازو کو مدد کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "اپنی حفاظت کی وہ خود اہل ہے۔ ہم پہلے دوسرے کام ختم کریں گے اور پھر ایک ہی بار نازو کے پاس جائیں گے تو وہیں قیام کریں گے۔"

"اور اتنی دیر میں گھوڑے بھی مال گاڑی پر پہنچا دیے گئے تو پھر؟"

"پھر کیا۔ ہم مال گاڑی پر پہنچ جائیں گے" میں نے کہا۔

"اس میں گڑبڑ نہ ہو جائے۔ ہم پہلے تابوت اٹھا کر لے جائیں گے۔ اس وقت گارڈ ہمیں دیکھ لے گا۔ پھر ہم ہی گھوڑوں کے ساتھ نظر آئیں تو اسے فوراً شک ہو جائے گا کہ دال میں کالا ہے۔ آخر وہ ہے تو اسی کا آدمی۔ دلاور اور ترویجی کا شمار خاص طور پر کسی اور کی ڈیوٹی بدل کے لایا گیا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن ہم ابھی سے گھوڑوں کے ڈاکٹر اور ٹرینر بن گئے تو..."

"تو کیا۔ اصل ڈاکٹر اور ٹرینر کو باندھ کر اندر ڈال دیتے ہیں۔ اور پھر چلتے ہیں تابوت لے کر اپنے محسن شیروانی مرحوم اور ان کی بیوہ کے ساتھ" غالب نے کہا۔

"یہ تو وہی بات ہوئی۔ کان کو ادھر سے پکڑو یا ادھر سے۔ کیا پھر گارڈ نہیں دیکھے گا۔ ابھی صرف نو بجے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نیون پرشاد یا اس کا کوئی آدمی کسی کام سے آ جائے۔ مثلاً گھوڑوں کی خیریت معلوم کرنے۔ بارہ بجے کے بعد یہ خطرہ نہیں رہے گا۔ ابھی ہو آتا ہے آئے۔ نازو کو خود نیون پرشاد نے ساتھ لیا ہے۔ اچھا ہے وہ دیکھ جائیں گے کہ سب ٹھیک ہے" میں نے کہا اور غالب نے مجھ سے اتفاق کیا۔

ہم واپس گودام میں پہنچ چکے تھے لیکن اگلا باکس اٹھانے کے بجائے ہم دونوں ایک باکس پر بیٹھ گئے۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ بوگیوں کا سامان تو نہیں تھا" میں نے کہا۔

غالب نے سر ہلایا "ہاں۔ ایک بوگی کے کونے میں سما جاتا۔"

"پھر انہوں نے دو بوگیاں حاصل کرنے کا تکلف کیوں کیا؟"

"لیکن جب خالی جگہ میں محافظ سونے کے لئے آئیں گے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "کتنے محافظ آئیں گے ایک بوگی میں۔ جتنی خالی جگہ بچی ہے اس میں تو دس آدمی لمبے لیٹ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان بوگیوں میں دوسرا اسباب بھی بھرا جائے گا۔"

"وہ کیوں؟"

"اصل مال کو چھپانے کے لئے۔ کچھ فالتو کرنے کے لئے بھوسہ بھی بھر سکتے ہیں" میں نے کہا اور سگریٹ جلائی۔

غالب نے کہا "درانت۔ ان کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔"

"اور میں ہوتا تو معلوم ہے کیا کرتا؟" میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا "میں خواجہ سیمنٹ والوں کی خدمت میں حاضر ہوتا اور کہتا کہ جناب میں وزارت دفاع کی طرف سے ایک پیغام لایا ہوں۔ اشد ضرورت کے تحت ہم نے آپ کی ریزرویشن منسوخ کرا کے دو بوگیاں حاصل کر لی تھیں جن پر آپ کو سیمنٹ بھیجنا تھا مگر اب صورت حال کچھ ایسی ہے کہ ہمارا شیڈول بدل گیا ہے اور بہت تھوڑا سامان جا رہا ہے۔ آپ اگر چاہیں تو اپنا سیمنٹ بھی بک کرا لیں تاکہ آپ کا نقصان نہ ہو۔ تاہم اس کے لئے آپ کو کسی قسم کا معاوضہ وزارت دفاع کو ادا نہیں کرنا ہوگا۔ یہ محض خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے ہے' اس کوفت پر جو آپ کو ہوئی" محسن کو آتا دیکھ کر میں خاموش ہو گیا۔

اچانک ڈرائیور نے چیخ کر مجھے ایک گالی دی اور دیوانہ وار میری طرف دوڑا۔ میرے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر زمین پر ڈال کر پیروں سے مسلتے ہوئے اس نے میرے ایک ہاتھ بھی رسید کر دیا۔ میں نے گونگوں کی طرح احتجاج کیا اور چلانے لگا۔

غالب کو جس بہانے کی ضرورت تھی وہ ڈرائیور نے فراہم کر دیا تھا "کیا بات ہے بھئی۔ کیا غلطی ہے اس غریب کی؟"

"غریب کے بچے..." ڈرائیور نے مزید گالیاں دیتے ہوئے کہا "سگریٹ پیتے ہو یہاں۔"

"کیا ہوا اگر ذرا دم لینے کو سگریٹ پی لی۔"

"سگریٹ پینا منع ہے یہاں" ڈرائیور نے چلا کے کہا۔

"تو پہلے بتانا تھا۔ گالیاں دینے کی کیا ضرورت ہے؟" غالب گرم ہو کے بولا۔

"تمہیں معلوم نہیں ہے یہ بات؟" ڈرائیور نے اس کے بھی ایک ہاتھ مار دیا "کس گودام میں سگریٹ پینے کی اجازت ہے؟ آگ لگ گئی تو نقصان تمہارا باپ..."

"بس صاحب! بہت ہو گئی۔ اب تم باپ تک پہنچ گئے ہو"

غالب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "مجبوری پر لعنت"

"مجھے پتا ہے اپنے باپ کا حرامی" ڈرائیور نے ہاتھ چھڑا کے غالب کو دھکا دیا۔ اس کے لئے غالب کی سرکشی ناقابل برداشت تھی۔

"حرامی۔ تیرا باپ حرامی" غالب نے چلا کے جواب دیا۔ وہ بپھر ہی گیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ مار مار کے غالب کا بھرکس نکال دیتا میں اور محسن اس کے سامنے آ گئے۔

"اپنی سمجھا ہے تو۔ ہم کمینوں کی عزت نہیں ہے۔ تو نے خرید لیا ہے ہمیں۔ اپنے پاس رکھ اپنی مجوری۔ اور یہ لے جو تو نے پیسے دیئے تھے" غالب نے سو کا نوٹ اس کی طرف پھینک دیا "ہم مار کھائیں گے۔ گالیاں کھائیں گے تیری۔"

وہ ایک دم سنبھل گیا اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا مگر اس کے لئے یہ بھی بہت مشکل تھا کہ وہ اپنی ناک نیچی کر کے ایک قلی سے کہے کہ سوری۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔

"ہم جا رہے ہیں" غالب نے کہا اور ہمیں چلنے کا اشارہ کیا۔

اس نے ہمارا راستہ روک لیا "محسوب۔ تم ایسے نہیں جا سکتے کام ختم کئے بغیر۔"

"کسی اور سے کرا لے کام" غالب نے کہا "اور ہم ابھی جا کے سب کو بتاتے ہیں کہ تو نے کیسی گندی گالیاں دی ہیں ہمیں اور مارا ہے ہمیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں تیرا کام کرنے کون آتا ہے۔ کل سے ساری قلی ہڑتال پر نہ چلے جائیں تو کہنا۔"

ڈرائیور کی حالت غیر ہو گئی "میں گولی مار دوں گا تمہیں۔"

"ارے جا۔ تو کیا گولی مارے گا" غالب نے حقارت سے کہا اور باہر جانے کے لئے آگے بڑھا۔

"تو کیا ادھر روک لو اس.... کو" ڈرائیور نے ایک گالی دے کر کہا اور ایک دم ریوالور نکال لیا "گولی مار دو اگر ان میں سے کوئی بھی باہر قدم رکھے۔"

میں نے ایک دم ڈرائیور کے ریوالور والے ہاتھ پر ہاتھ مار دیا۔ اس وار کے لئے وہ بالکل تیار نہ تھا۔ اس کا ریوالور ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ کلائی پکڑ کے درد سے چلانے لگا۔ وہ کمزور حریف نہیں تھا مگر صورت حال ایک دم اس کے قابو سے باہر ہو گئی تھی۔ غالب کی دھمکی نے اس کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔ اسے یہ کام وقت پر ختم کرانا تھا۔ اگر واقعی قلی اس کے غلط رویئے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تو اس ہنگامے کا ذمے دار وہی سمجھا جاتا۔

وہ یہاں فائرنگ نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی گولی نشانہ چوک جانے سے کسی اسلحے کے باکس میں لگ جاتی تو پورا گودام ایک دھماکے سے اڑ جاتا اور خود اس کے پرخچے اڑ جاتے۔ وہ مار پیٹ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شور سے لوگوں کو متوجہ کرتا اور مجمع لگ جاتا تو اس کا کام رک جاتا۔

کمانڈر بھی اس صورت حال میں گھبرا گئے تھے۔ کسی قلی کو گولی مارنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کے لئے ہم سب کو زبردستی روکنا بھی مشکل تھا۔

"ارے یار کیا ہوا؟ موتیاں والیو" سردار جی نے مداخلت کرانے کے لئے کہا "ارے چھوڑو غصہ۔"

"ہٹ ہمارے راستے سے سکھ کی اولاد" غالب نے اسے دھکیل کر ایک طرف کیا اور باہر نکل گیا۔

سردار جی نے غصے میں رائفل اٹھائی مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا "سو روپے پر چلے گئے۔"

"تم الو کے پٹھے ہو۔ تم نے انہیں روکا کیوں نہیں؟"

"کیسے روکتا جی۔ آپ تو بولتے ہو گولی مار دو۔ پھانسی آپ چڑھو گے میری جگہ؟" سردار جی نے آگ بگولا ہو کے کہا۔

ڈرائیور نے اب اپنی خودی کو بالائے طاق رکھا اور ہمارے پیچھے دوڑا "بات سنو۔ چلو مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کرو۔ تم سب میرے باپ اور میں حرامی" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔

غالب نے نفی میں سر ہلایا "اب جا کسی اور کو لے آ۔"

"لے آؤں گا۔ مگر تم ایک مہربانی کرو۔ یہ لو اپنی مزدوری۔ تم جاؤ' میں زبردستی کام کیسے لے سکتا ہوں تم سے" ڈرائیور نے کانپتے ہاتھوں سے سو سو کے نوٹ نکالے۔

"پھر مجبوری کیوں دے رہا ہے؟" غالب بولا۔

"تم کسی سے ذکر مت کرنا' بس جو ہو گیا اسے بھول جاؤ۔" ڈرائیور نے کہا۔

www.paksociety.com

"زر سوٹ دے رہا ہے۔ وہ بھی اتنی خوبصورت۔ گالیاں اور مار کھانے کی بس اتنی ہی قیمت۔"

"اچھا پانچ پانچ سو لے لو۔ مگر بس اپنی زبان بند رکھو۔ کسی اور سے یہ سب مت کہو۔ ایسا نہ ہو ہنگامہ کھڑا ہو جائے۔"

"وہ تو ہو گا۔ تو نے کیا سمجھا تھا۔ تیرے باپ کے نوکر ہیں ہم پولیس بھی ہاتھ لگائے تو ہم ہڑتال کر دیں۔ تو کون ہوتا ہے پھر؟"

ڈرائیور سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ غالب اسے پوری طرح بلیک میل کر رہا تھا اور ہم اس صورت حال میں غالب کی اداکاری سے پورا لطف لے رہے تھے۔ اس نے پانچ پانچ ہزار کی رقم پر "عزت" کا سودا کیا۔

"کمبخت اور جو آئندہ کسی قلی کو گالی دی" غالب نے پندرہ ہزار سمیٹ کر جیب میں رکھے۔ پھر نکالے اور ہمیں پانچ پانچ ہزار روپے دے کر اشاروں کی زبان میں سمجھایا کہ ہم اس بے عزتی کا اور گالم گلوچ کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ پندرہ ہزار کا نقصان ڈرائیور کو محض اپنی بدمزاجی کے باعث برداشت کرنا پڑا تھا مگر اس نے ہم سے جان چھڑا کے خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ بات تھانہ تک نہیں پہنچی ورنہ لالہ اور نوجوان اس کی کھال میں بھس بھروا دیتے۔

گودام سے بہت دور آ جانے کے بعد ہم پر ہنسی کا دورہ پڑا۔

"کیا یاد رکھے گا سالا۔ لینے کے دینے پڑ گئے" غالب بولا۔

"ساؤتھ افریقہ والوں کی دھری رہ گئی" میں نے کہا۔

"قلیوں نے سارا غرور خاک میں ملا دیا اور بلیک میل کر کے لوٹ بھی لیا" محسن بولا۔

"سب وقت کی بات ہے۔ وہ مجبور تھا اس وقت ورنہ وہ خود کیا کم سر پھرا بدمعاش تھا۔ اور اسے تو جیسے بدمعاشوں سے جن کا شمار جیسے بااثر لوگوں تک کی حمایت حاصل ہے۔"

"اب اس کی طرف پینتیس ہزار رہ گئے؟" میں نے کہا۔

"وہ کس حساب میں بھیا؟"

"ایک بار میں نے اسے ٹیکسی میں بال کٹ کیا تھا تو اس کی جیب میں سے وہ لفافہ نکلا تھا جس میں سارا ایمان تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پچاس ہزار بھی تھے جو میں اس لئے چھوڑ آیا تھا کہ اسے شک نہ ہو۔ اس میں سے پندرہ ہزار وصول ہو گئے۔ باقی پینتیس ہی بچے۔"

"یار زندہ صحبت باقی۔ پھر کبھی ضرورت کے وقت لے لیں گے۔"

"آج رات تو میرا ارادہ ایک اور بدمعاش کو سبق سکھانے کا ہے" میں نے کہا۔

"سبق سکھانے کے لئے وقت ہو گا؟"

"اور ہم سارے زمانے کو سبق سکھانے کے لئے نہیں نکلے ہیں۔"

میں نے کہا "مگر یار کوئی راستے میں آ جائے تو اس کو کیسے چھوڑ دیں؟ فطرت اپنی اور بیچ کے نکل جائیں یہ تو ہو نہیں سکتا۔"

"کون ہے آخر وہ؟" محسن بولا۔

"رات کو بتاؤں گا۔ ابھی بس چلتے ہو" میں نے کہا۔

"ابھی رات کے سوا نو بجے ہیں۔ دس بجے تک بازار کھلے ہیں" غالب نے کہا۔

"کیا لانا ہے بازار سے؟" محسن بولا۔

"یہ کپڑے نہیں بدلنے ہیں کیا؟ جو کچھ ہمارے پاس تھا سب ماما جی کے گھر میں جل گیا۔"

"خدا بھلا کرے قلی کا۔ وہ کام کی چیزیں نکال لائی مگر کپڑے تو واقعی نہیں ہیں ہمارے پاس اور ہمیں کم سے کم بھی دو دو جوڑوں کی ضرورت ہو گی" میں نے کہا "ایک وہ جو ہم تابوت لے جاتے وقت سوگواروں کی حیثیت سے زیب تن کریں گے اور دوسرے وہ جو اس کے فوراً بعد گھوڑوں کے ڈاکٹر اور نرسوں کے پہنیں گے۔"

"دونوں بالکل مختلف ہونے چاہئیں۔"

"نو پرابلم" میں نے کہا "سوگواروں کے لباس سیاہ ہوں گے ڈاکٹر اور نرس کے سوٹ اور جدید وضع کے۔"

"سوگوار ہونے کے لئے بھی ایک کالا لباس لینا مت بھولنا۔"

ایک ٹیکسی نے ہمیں ایک جدید شاپنگ سنٹر میں پہنچایا۔ ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے ہم نے قلیوں والی وردی اتار کے پھینک دی تھی جو صبح ہم نے اپنے کپڑے اتارے بغیر پہن لی تھی۔

"ہمیں ایک جنازے میں شریک ہونے کے لئے ماتمی سیاہ سوٹ چاہئیں دوست" میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

ٹیکسی والا حیران ہو کر بولا "اس وقت رات کو۔"

میں نے کہا "تابوت ہوائی جہاز کے نو بجے روانہ کیا جانا ہے۔ مجبوری ہے۔ ہمیں ابھی کچھ دیر پہلے معلوم ہوا ہے۔"

"اس وقت تو مشکل ہے۔ یہ سب ہوٹل، ریسٹورنٹ، ویڈیو کیسٹ وغیرہ کھلے ہیں۔ ڈیپارٹمنٹل اور سپر اسٹور بند ہو چکے ہیں۔"

میں نے کہا "پھر کیا ہم اسی لباس میں جائیں؟"

"یہ تو بڑی غلط حرکت ہو گی" محسن بولا۔

"مجبوری میں سب چلتا ہے سر" ٹیکسی والا بولا۔

میں نے افسوس کے ساتھ نفی میں سر ہلایا "چل سکتا تو ہم بھی چلا لیتے۔ تم تو بمبئی کے چپے چپے سے واقف ہو۔"

"جی سر۔ بیس سال ہو گئے ادھر ٹیکسی چلاتے ہوئے" ڈرائیور بولا۔

"ہم تو اجنبی ہیں" میں نے کہا "تمہیں ضرور کوئی ایسی جگہ معلوم ہو گی۔"

"بات یہ ہے سر کہ عام استعمال کی چیزیں تو آپ کو کسی ہوٹل

کے اندر شاپنگ آرکیڈ سے بھی مل جائیں گی۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ کپڑے بھی ملتے ہیں یا نہیں۔ لیکن..."

"لیکن کیا" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "کوشش کرنے میں کیا حرج ہے تم چل کے دیکھ لیجئے نا۔"

ڈرائیور نے پلٹ کر ہماری صورتوں کو غور سے دیکھا اور بولا۔ "میرا ایک دوست ویٹر ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔"

"ہم کچھ اور کہنا چاہتے تھے" محسن بولا۔

"تو سر یہ تو بڑی بات۔ مگر یہ سب ہی ہوٹلوں کے بیرے کرتے ہیں" وہ بولا۔

"کیا کرتے ہیں؟"

"چھوٹی موٹی چوریاں۔ بعض اوقات موقع مل جاتا ہے کسی چیز پہ ہاتھ صاف کرنے کا۔ کبھی مسافر سامان بھول بھی جاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی آتے ہیں جو نشے میں یا حد سے زیادہ خوش ہو کے انعام میں دے جاتے ہیں۔"

"کیا دے جاتے ہیں؟"

"ہر چیز۔ شراب کی بوتل، پرفیوم، زیور۔"

"ہمیں ایسی کسی چیز کی ضرورت نہیں" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ اچھے خاصے سوٹ" ڈرائیور نے کہا "باتھ روم میں بھول جاتے ہیں یا لانڈری والے کے پاس۔ کبھی ڈرائی کلین ہونے کے لئے بھیجتے ہیں اور اچانک جانا پڑ جاتا ہے۔ بعض اوقات یاد نہیں رہتا انہیں..... یہ سوٹ ان کے کسی کام کے نہیں ہوتے۔ ہوٹلوں کے اور لانڈری میں کام کرنے والوں کے وارے نیارے ہیں۔"

میں نے کہا "دوست! پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا۔"

"لیکن آپ کو چاہئیں کالے سوٹ۔"

"ہم دوسرے بھی لے سکتے ہیں۔ قیمت دے کر۔ تم اپنے دوست کے پاس چلو فوراً" میں نے کہا۔

"وہ تو ہے سر۔"

"ہم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

"پتا نہیں ہوتا نا سر کوئی مسافر پھر آ جائے جس کا سوٹ لانڈری میں گم ہوا ہو" وہ بولا۔

"ایسا ہونا تو بہت مشکل ہے۔ نہ ہونے کے برابر ہیں امکان" میں نے اسے تسلی دی۔

"جب تری کے دن آنے ہیں تو سب ہونے لگتا ہے جو ناممکن نظر آتا ہے۔"

"ہمارا نہ آج تک کوئی سوٹ گم ہوا ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہم ایسے کسی ہوٹل میں کبھی ٹھہرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے" غالب نے کہا۔

اس بات نے ڈرائیور کا اعتماد بحال کر دیا۔ وہ سیدھا ہمیں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں لے گیا اور ٹیکسی پارک کر دی۔

"آپ ادھر بیٹھیں۔ میں اسے لے کر آتا ہوں۔"

"زبردست کرنا۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔"

"ایک کام تو ہوا" غالب نے کہا۔

"دوسرے کی تکمیل بھی اللہ پیدا کرے گا" محسن نے کہا "اگر یہ ڈرائیور نہ ملتا تو ہم مارے جاتے۔"

"ہم کیوں مارے جاتے۔ لیکن بے قصور مارے جاتے جن کے ہم کپڑے اتروا لیتے" غالب بولا۔

میں ہنس پڑا "ہاں۔ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہمیں۔"

ٹیکسی ڈرائیور ایک بیرے کے ساتھ نمودار ہوا۔ جس نے ساری بات کر لی ہے سر۔ ایک ہزار روپے کا ایک سوٹ ہو گا۔"

میں نے کہا "ایک ہزار پرانے سوٹ کے۔"

"تو نئے سوٹ مل سکتے ہیں اس قیمت میں" محسن بولا۔

"آپ کی مرضی جناب۔ آپ نئے سلوا لیں" ٹیکسی ڈرائیور کے بجائے بیرے نے کہا۔ وہ بہت عیار شخص تھا۔

"اچھا یار روٹھتے کیوں جا رہے ہو۔ کہاں ہیں سوٹ؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "نذرانہ بازار والے تم کو سو روپے بھی نہ دیتے۔"

"ضرورت مند کے لئے انتظار کرنا پڑتا ہے سر" بیرے نے کہا۔

"دن میں کوئی ضرورت مند تمہیں پانچ سو دیتا۔"

"ابھی تو رات ہے سر" بیرے نے سمجھ لیا تھا کہ فوری ضرورت نہ ہوتی تو ہم اس کے پاس کیوں آتے۔

"اچھا چلو۔ لے کر تو آؤ۔ ہم دیکھ لیں سوٹ کیسے ہیں" میں نے کہا "وقت ضائع مت کرو۔"

"آپ پیچھے آ جائیں اس کے ساتھ سر" اس نے ایک انتہائی منافع بخش سودا بڑی ہوشیاری سے طے کر لیا تھا چنانچہ اس کے لبوں پر کامیابی کی فخریہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کوئی ڈیڑھ میل کا چکر کاٹا اور ہوٹل کے احاطے کو طے کرتا ہوا عقبی حصے میں پہنچا۔ بیرے نے اندر ہی اندر سے شارٹ کٹ لے کر یہ فاصلہ طے کیا تھا۔ ہمارے پہنچنے کے چند منٹ بعد وہ بھی آ پہنچا۔

"میرا مال ہوتا تو میں آپ کے ساتھ رعایت کرتا سر مگر مال ہے کسی اور کا۔ ایک لانڈری والا ہے" بیرے نے کہا۔

"پھر تو یہ فضول باتیں" میں نے کہا "سوٹ دکھاؤ۔"

میرا خیال ہے کہ اس نے نظروں سے ہماری پیمائش کر لی تھی کیوں کہ تینوں سوٹ عین ہمارے سائز کے مطابق تھے۔ شاید پہن کر انہیں ایسی کا فرق رہ جاتا۔ کسی اور کے سوٹ ہمارے جسم پر اس طرح فٹ نہیں آ سکتے تھے جیسے ہمارے اپنے آرڈر پر سلوائے ہوئے کپڑے۔ مگر میرا اندازہ یہ تھا کہ سوٹ نہ کسی کو بہت تنگ ہوں گے نہ بہت ڈھیلے۔

www.paksociety.com

"دے دو اسے تین ہزار" میں نے کسی ادب چی کی طرح کہا جو اپنے سیکریٹری کیفیٹیریا کو ساتھ رکھتا ہو۔
محسن نے اسے تین ہزار پکڑا دیئے "ڈسکاؤنٹ بھی نہیں دو گے یار۔ کتنی دیر سے چل کے آئے ہیں۔"
"چل کے کہاں سر۔ ٹیکسی میں آ رہے ہو آپ" اس نے مکاری سے مسکرا کے کہا اور نوٹ جیب میں رکھ کے غائب ہو گیا۔
"میں شرمندہ ہوں سر۔ میں نے آپ کو لوٹ لیا۔"
"مرا اس نے ہے تو شرمندہ تم کیوں ہو؟" میں نے کہا۔
"دوستی کا بھی لحاظ نہیں کیا اس نے۔"
"دوست وہ تمہارا ہے، ہمارا نہیں۔ ہم تو صرف گاہک تھے اس کے لئے" محسن بولا۔
"جن کو تم پھانس کر لائے تھے" غالب نے کہا۔
غالب کی بات غلط نہ تھی۔ ڈرائیور نے اس سے پہلے ہی کمیشن وصول کر لیا ہوگا اور وہ طے کر کے آئے ہوں گے کہ ایک سوٹ کے ایک ہزار لیں گے۔ اس میں سے ڈرائیور نے آدھا ضرور وصول کئے ہوں گے ورنہ وہ کیا دی ہوگی کہ میں گاہکوں کو کہیں اور لے جاتا ہوں۔
ڈرائیور نے مجروح جذبات کے بھرپور تاثر کے ساتھ پیچھے پلٹ کے دیکھا "ایسی غلط بات مت کریں سر۔ میں آپ کو پھانس کر نہیں لایا تھا۔ ٹیکسی آپ نے خود روکی تھی۔ میں نے آپ کو روک کر ٹیکسی میں نہیں بٹھایا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ سوٹ چاہئیں۔ میں نے نہیں پوچھا تھا کہ کیا آپ کو سوٹ خریدنے ہیں۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو دوست" میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "ہمارا یہ دوست غصے میں الٹا سیدھا بہت کہہ گیا۔"
"تمہارا ذاتی اس سودے میں کوئی کمیشن نہیں" محسن نے کہا۔
"تم نے تو مدد کی ہماری۔ احسان کیا ہم پر" غالب طنز سے بولا۔
"میں نے تو سوچا تھا آپ کا دوسرا مسئلہ بھی حل کر دوں مگر آپ لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں تو مجھے کیا ضرورت ہے۔"
میں نے غالب اور محسن کو غصے سے دیکھا اور ان کو آنکھ مار کے بڑبڑایا کہ "تم دونوں کا دماغ خراب کیوں ہو رہا ہے آخر۔ لعنت بھیجو پیسے پر۔ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ایک شریف آدمی ہماری خاطر کتنی پریشانی اٹھا رہا ہے۔ اگر یہ مدد نہ کرتا تو ہم کہاں جاتے۔ کیا کرتے۔ کون جانتا ہے بستی میں ہمیں، جس کے سامنے ہم اپنی ضرورت بیان کرتے۔"
باری باری غالب اور محسن نے ٹیکسی ڈرائیور سے معذرت کی اور اس "شریف آدمی" نے فوراً انہیں معاف کر کے اپنے فراخدل ہونے کا ثبوت دیا۔
میں نے کہا "دوست، اب یہ بتاؤ کہ دوسرا مسئلہ کیسے حل کیا ہے تم نے؟"

اس نے کہا "اس دیہاڑے مجھے ایک نیا پتا بتایا ہے جہاں ہر قسم کے کپڑے کرائے پر مل جاتے ہیں۔ عروسی جوڑے بھی۔"
"اتنی رات گئے ہم میں سے کوئی شادی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا" محسن نے کہا۔
"کیوں کہ ابھی تک تو کسی نے دلہن ہی منتخب نہیں کی ہے۔"
"اس کے پاس باقی تقریب کے لئے بھی لباس ہوگا۔ مردانہ بھی اور زنانہ بھی" ڈرائیور نے کہا۔
"کیا اس کی دکان کھلی ہوگی؟"
"نہیں۔ اس کے گھر جانا پڑے گا" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔
"وہ گھر پر بھی رکھتا ہے۔ آدمی کے زائچے؟"
"یہ تو گھر جا کے ہی معلوم ہوگا۔ ہو سکتا ہے اسے اٹھانا پڑے۔ اس کی دکان قریب ہی ہے" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "مگر یہ بات میں پہلے سے بتا دوں سر۔ اس وقت وہ عام ریٹ پر کپڑے نہیں دے گا۔ ارجنٹ ریٹ لگائے گا۔ یہ تو دھندا ہے سر۔ ارجنٹ سروس اسپتال کی ہو یا ٹھیکیدار کی، ڈبل چارج کرتے ہیں سب۔"
میں نے کہا "میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔"
"اس کے علاوہ وہ ضمانت بھی رکھے گا۔ نقد رقم۔"
"کتنی رقم؟"
"مجھے نہیں معلوم سر" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "میں نے تو شادی کے لئے کرائے پر جوڑا لیا تھا۔ آخری رسوم کے لئے۔"
"شادی بھی آخری رسوم ہوتی ہیں۔ انسان کی آزادی کی" غالب نے فلسفیانہ نکتہ بیان کیا۔
"اور جن کو ہم آخری رسوم کہتے ہیں، وہ دنیا کے جنجال سے نجات کی افتتاحی تقریبات ہوتی ہیں" محسن نے کہا۔
ڈرائیور اس فلسفے کو سمجھا نہیں، سمجھا مگر وہ دوستانہ طریقے سے ہنسا "آپ لوگ کرسچین ہیں۔ بڑا آسان ہے آپ کے لئے شادی کرنا بھی اور مرنا بھی۔ کرائے کے کپڑے پہنے، گرجا میں پادری نے شادی کی اور چھٹی کر دیا۔ دس پندرہ یا چالیس پچاس مہمان آ گئے اور گھنٹہ بھر میں تقریب ختم۔ نہ دعوت، نہ جہیز، نہ جوڑے اور زیور۔ بعد میں مرضی ہوئی تو یار دوستوں کی دعوت کر دی ورنہ دولہا دلہن نکل گئے ہنی مون پر۔ ہمیں تو رسمیں مار دیتی ہیں۔ شادی کو کھانا، ولیمہ، بری، جہیز، منہ دکھائی۔ اور تو اور اس کے بعد بھی ان رسموں کا خرچہ۔ پیچھے رہ جانے والے کچھ نہ کریں تو بدنامی۔"
اس معاشرتی برائیوں کے خلاف اس کی حقیقت پسند مشاہدات و تاثرات پر مبنی تقریر اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ ٹیکسی ایک محلے میں جا کے نہیں رکی۔ وہ محلہ بھی عجیب اور ایک نظر میں بہت غلط تاثر دیتا تھا۔ لڑکے لڑکیاں بے پروا سے کھڑے تھے۔ یوں کہ لڑکے نے لڑکی کو تھام رکھا تھا۔ گھبرانے والے کھڑے تھے فٹ پاتھوں پر سب کے بیچ میں بیٹھے تھے بڑے وعظ سے عشق کر رہے تھے۔ بعض شدت جذبات سے

بے تاب ہو جاتے تھے تو کسی دوسرے کو تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ یہ کرسچین علاقہ تھا جہاں کے رہنے والے ذہنی طور پر اپنے آپ کو یورپ کا ہم نسل سمجھتے تھے۔ اور روشن خیال ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جاہلوں کو ان کے مذہب نام ہم مذہب ان کے خلاف صرف نفرت اور تعصب رکھتے تھے کیونکہ وہ کالے تھے اور غیر مہذب قوم کے فرد تھے۔
ٹیکسی ڈرائیور ایک مکروہ شکل کے بڈھے کو گھر سے نکال لایا۔ بڈھا حبشی نظر آتا تھا۔ اس کے کالے سر کی چندیا کے گرد سفید بالوں کی جھالر تھی اور وہ غالباً سوتے سے اٹھ کر آیا تھا۔ اس لئے آنکھیں لال تھیں یا وہ شراب کے نشے میں تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ہماری ضروریات سے آگاہ کر دیا تھا۔
"سب ملیں گا۔ ڈبل ریٹ پر۔ سو روپے ایک ڈریس کا۔ جو کل صبح نو بجے تک۔ شام کو لائیں گا تو دو سو۔ اپن تم کو نہیں جانتا۔ تین ہزار ایک ڈریس کا ضمانت رکھے گا۔ ضمانت سمجھتا ہے؟ سیکیورٹی ڈپازٹ۔ تم بھاگ جائیں گا تو اپن کیا کریں گا۔"
"ہم بھاگ جائیں تو تمہارے ڈریس ہوا ہو گئے۔ تین کی جگہ دس کے پیسے ہوں گے تمہارے پاس" غالب نے کہا۔
میں نے فوراً تین ہزار نکال لئے کہ کہیں غالب کی آشفتہ بیانی سے بڈھا بھی نہ بگڑ جائے "یہ تین ہزار ضمانت۔"
"اور بھاڑا۔ تین سو" اس نے نوٹ جیب میں ڈال کے ہاتھ پھیلا دیا "تین سو اور نکالو اور آگے ہو جاؤ۔ ہمارا واسطے جگہ بناؤ۔ ہم تمہارا ساتھ چلے گا۔"
"کہاں؟ قبرستان" غالب نے کہا "اتنا پیسہ لے کر کہیں مُردے یا بردہ میں تو لوٹ لیں تم کو۔"
"ہم دکان پر جانے گا بابا۔ کیسا الٹا بات بولتا تم" وہ غالب کے ساتھ فٹ ہو کے بولا۔
رات کے دس بجے یہ مرحلہ سر ہوا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ جیسے بھی ہوا کام ہو گیا اور ہمارا کیا گیا۔ مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ تاہم مجھے شدت سے احساس ہوا کہ پیسہ کس طرح آدمی کے احساس غیرت اور ان تمام نیک جذبات پر حاوی آ جاتا ہے جن میں رحم دلی، ہمدردی، شرافت، وضع داری، احسان اور انسانیت کے تمام اوصاف شامل ہیں۔ وہ دوسرے انسان کی مجبوری، بے بسی اور ضرورت کو اپنے مفادات کے فروغ کے لئے استعمال کرتے ہوئے ان تمام صفات کو یکسر فراموش کر دیتا ہے اور جذبات کے احساسات سے عاری ہو کے صرف اس پیسے کو یاد رکھتا ہے جو وہ کسی بھی صورت حال کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہوئے حاصل کر سکتا ہے۔ وہ مرتے ہوئے آدمی کی ماں یا بیوی یا بیٹی سے اس دوا کے لئے، جو اس کی جان بچا سکتی ہے، چار گنا دام بھی طلب کر سکتا ہے اور دس گنا بھی، کیونکہ اس سے اس کی زندگی بچائی جا سکتی ہے۔ اہم صرف وہ عناصر رہ جاتے ہیں۔ خریدار کی قوت خرید اور ان کے درمیان طلب کی شدت۔ جو زیادہ ضرورت مند ہو یا زیادہ دولت مند، وہ زندگی خرید لے ورنہ مُردے کو بے کفن گاڑ دے۔ قبر کی زمین مہنگی لگے تو سمندر میں پھینک دے۔ اس کی بلا سے جو کرنا، کفن کا دھندا کرتا ہے۔ دھندا تو دھندا ہے بابا۔
ٹیکسی والا اپنے دیہاڑی سے کمیشن کما چکا تھا چنانچہ اب اس کی مستعدی ٹپ کی خاطر نہیں تھی۔ میں نے اسے ٹپ دیا بھی نہیں اور جہاں اسے چھوڑا وہاں سے دوسری ٹیکسی پکڑی۔ تیسری ٹیکسی چھوڑ کے ہم پیدل اس گھر تک پہنچے جس میں اکیلی گل خوف سے قریب مرگ تھی۔
میری آواز پر اس نے پڑوس کے گھر میں سے جھانکا "اُف بھائی سکندر۔ آج تو آپ نے دو گھنٹے لگا دیئے۔"
میں نے کہا "بی بی! ہم آئندہ بھی دیر کریں گے۔ تم بس دیکھتی جاؤ۔ آگے آگے ہوتا ہے کیا۔"
"پورا شعر یوں ہے کہ... ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا" غالب نے کہا۔
گل مسکرانے لگی "بڈھا تو۔ گیا کوئی کھانے۔"
"تم نے کچھ کھایا؟"
"ہاں۔ جو کھانا ام کے لئے آیا تھا محلے کے کسی گھر سے وہی کھا لیا تھا۔"
"وہ کافی ہوا تمہیں؟" میں نے کہا۔
"اس سے زیادہ اہم یہ سوال ہے کہ وہ کھانا لانے والا کون تھا؟ کافر یا مسلمان" محسن بولا۔
میں نے کہا "میں فتویٰ تو نہیں دے سکتا لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، ہندو کے گھر کا کھانا بھی کھایا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ پاک ہو اور اس میں حرام چیز شامل نہ ہو۔"
"دال چاول تھے۔ ان میں کیا حرام حلال۔"
"دال ایک غیر اخلاقی خوراک ہے۔ خراب اللہ تمہیں معاف کرے۔ اس نے صورت میں حرام حلال کا پابند نہیں کیا اپنے بندے کو۔"
میں نے کہا "گل اور دوسرے کوارٹر میں ہم کیسے جائیں گے۔ دیوار پھاند کے؟ چابی تو اب ہے نہیں ہمارے پاس۔"
"ظاہر ہے دروازے سے تو شریف آدمی آتے ہیں" غالب نے کہا۔
میں نے کہا "تو پھر تم آگے چلو۔ سب سے کم شریف تم ہو۔ ہم خود کچھ نہیں کریں گے۔ تمہاری تقلید کریں گے۔"
باری باری ہم درمیانی دیوار سے ساتھ والے گھر میں اتر گئے۔ آخری شخص میں تھا جس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کے گل کو قدم رنجہ فرمانے کے لئے کہا۔ اس نے جوتے اتار کے دیوار پر سے دوسری طرف پھینک دیئے۔
میں نے غالب کے ہنسنے کی آواز سنی "بھئی واہ۔ کیا نشانہ پایا

www.paksociety.com

ہے قانون نے۔ اندر حجرے میں نہ چلا یا تھا۔"

"یہ تیر تمہیں سوجھی ہے اندھے" محسن بھنا کے بولا "جو ہر روز کھاتا ہے تو اس سے"

"قسم خدا کی۔ وہ تو ہے میرے بازو کی جو آبی۔ نیت بھی کہ سے ایسی تو اس کا سر توڑ دوں۔ دست درازی اور چیز ہے محبت میں ہوتی رہتی ہے مگر عورت سر پر جوتی کھینچ مارے۔ ایسی ذلت۔ توبہ توبہ۔ خودکشی کرلوں اسی دن سے۔"

اب میں بھی دوسری طرف اتر گیا تھا۔ محسن کی ضد غالب کی بیوائی سے غصے میں بدل گئی تھی۔ گل کی جوتی اچانک ہوا میں اڑتی ہوئی نکلی تھی اور اس کے سر پر تو نہیں لگی تھی مگر سر سے چھو کر نیچے گر گئی تھی۔ گل اب محسن کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔

"مجھے معاف کر دو۔ مجھے کیا معلوم تھا۔"

"تمہارا کیا قصور ہے گل۔ اگر مقدر میں جوتے کھانے لکھے ہوں تو آسمان سے جوتے برستے ہیں" غالب نے کہا جس کا ہنسی سے برا حال تھا۔

محسن نے کہا "گل اس کو بخش دو۔ میں نے تمہیں کچھ کہا ہے؟"

"نہیں۔ غلطی تھی یہ میری۔ مجھے پہلے دیکھنا چاہیے تھا۔ تمہیں تیاری میں گل ہونے کے قریب ہو گئی۔"

"چلو اگلی بار دیکھ کے اور نشانہ لے کر مارنا اس کے سر پر" محسن نے اس کے کندھے پر محبت سے ہاتھ رکھ کر کہا "اب ایسی رونی شکل مت بناؤ۔"

"یہ سب اداکاری ہے مہربانی صاحب۔ پہلے تو۔۔۔"

میں نے غالب کو ڈانٹا "یار مرزا" وہ بیچ بیچ میں بولنے لگی تو تم ستاؤ گے اسے۔ چلو اندر۔ ختم کرو یہ بیہودگی۔"

خالی تابوت وہاں اسی طرح رکھا ہوا تھا جیسے ہم نے چھوڑا تھا۔ یکلخت سب کو چپ لگ گئی۔ سب تابوت کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگے۔ مذاق میں یا اداکاری کے لئے بھی موت کا سوانگ رچانے میں خوف اور دہشت کا ایک آسیب پوشیدہ رہتا ہے جو اس وقت اچانک سب کے سامنے آ گیا تھا۔ ماحول کی اعصاب شکن کشیدگی کو ختم کرنے کے لئے ایک بار پھر میں نے تابوت کا معائنہ کیا۔ "سب ٹھیک ہے۔ میں چیک کر رہا ہوں۔"

محسن سے پہلے میں تابوت میں لیٹ گیا اور محسن سے کہا کہ وہ ڈھکن بند کر دے۔ میرے چہرے کے عین اوپر شیشہ تھا جس میں سے مجھے ان سب کے ہونق چہرے نظر آ رہے تھے۔ وہ سب ایسے کھڑے تھے جیسے سچ مچ کسی میت کو دیکھ رہے ہوں۔ پھر شاید محسن کو اس احمقانہ صورت حال کا احساس ہوا۔

اس نے کچھ چہک کے کچھ کہا جس پر غالب قہقہہ مار کے ہنسا اور گل بھی مسکرانے لگی۔

"چلو بھئی اصل مردے۔ غیر کی جگہ رقیبانہ قبضہ ہو گیا تھا" غالب نے کہا "جگہ خالی ہو گئی۔"

"حکومت کی کرسی پر رقیبانہ قبضہ ہوتے تو سنا تھا۔ مُردوں سے بھی یہ کام شروع کروا دیا" محسن بولا۔

باہر نکل کے میں نے کہا "ہمارا میک اپ مین تو آ گیا۔"

"بیچارا مفت کھوا سے" گل نے خفگی سے کہا۔

"اب مُردے کا میک اپ بھی کون کرے گا۔ ایسے ہی کام چلانا پڑے گا" میں نے کہا "تم تیار ہو گل؟"

"جی۔۔۔" گل نے کچھ تذبذب کے ساتھ کہا۔

"دیکھو یہ سب ایسا ڈرامہ ہے جس میں کسی کی اداکاری ذرا بھی خراب ہوئی تو سب کا کام خراب ہو جائے گا۔"

"کام تمام ہو جائے گا" غالب نے لقمہ دیا۔

"تم کو ایک نادار بیوہ کا پورا کردار پیش کرنا چاہیے یہ ہم نے چھوڑ رکھے ہیں۔ بہت بڑا امتحان ہے یہ مگر اس پر ہمارے مشن کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہے" میں نے کہا۔

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں بھائی سکندر" گل نے نئے عزم کے ساتھ کہا اور لباس بدلنے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

محسن نے تیسرے کمرے کی عدم موجودگی میں غسل خانے کا رخ کیا۔ جب گل تیار ہو کے آئی تو چند لمحے کے لئے میری نظریں بھی خیرہ ہو گئیں۔ کالے لباس میں اس کا سپید شہابی رنگ ایک دم نمایاں ہو گیا تھا اور اس کی گردن واقعی مرمریں نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی زردی میں سیاہی کے اس غم انگیز تاثر نے رعنائی کا بالکل انوکھا انداز پیدا کر دیا تھا جو میں نے بھی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"ایسے۔۔۔ کیا دیکھ رہے ہیں آپ دونوں؟" وہ شرما کے لال ہو گئی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔

"یہ کالا لباس تم کو نظر بد سے بچائے گا" غالب نے کہا "ورنہ ایسی حسین بیوہ تو صوفیہ لارین بھی نہیں بنی تھی۔"

"فلم نور جہاں میں نے بھی دیکھی تھی" میں نے غالب سے اتفاق کیا "گل نے اسے پیچھے چھوڑ دیا۔"

"چلیں اب اتنا بھی مت بنائیں مجھے" گل نے کہا۔ مگر یہ وہ بات ہے جو ہر حسین عورت اپنے حسن کی تعریف سن کے "شکریہ" کے طور پر کہتی ہے کہ آپ نے ٹھیک کہا۔

محسن کالا سوٹ پہن کے اور کالی ٹائی لگا کے آیا تو وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا "گل! تم تو قیامت ڈھا رہی ہو۔ کیا بنے گا اس بیچارے کا مرزا کا۔"

"مجھے تو اندیشہ لاحق ہو گیا ہے کہ کہیں اس کا الٹا اثر نہ ہو جائے۔"

"میں اس کی آنکھیں نہ نکال دوں اگر وہ گل کو بری نظر سے دیکھنے کی جرأت بھی کرے" محسن نے کہا۔

مگر سب سے زیادہ محسن کی زبان سے تعریف کے الفاظ سن

کے خوش ہوئی تھی جو ایک فطری بات تھی۔ محسن کا اس کے حسن کو خراج تحسین پیش کرنا گل کے لئے مختلف جذباتی معنی رکھتا تھا۔ اس کی دوسری بات نے گل کو اتنا بے قرار کیا کہ ہم نہ ہوتے تو شاید محسن کے سینے سے لگ جاتی۔

اب اس نے محسن کا بازو تھام کے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "یہ کیسی باتیں کرنے لگے تم؟"

میں نے غالب کی طرف اور غالب نے میری طرف دیکھا کیوں کہ ہم گل کی طرف نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ محسن نے نرمی سے اپنا بازو چھڑا لیا "ایک مردے کے اتنا قریب مت آؤ کنواری بیوہ"

"کنواری بیوہ" کچھ عرصہ پہلے ریلیز ہونے والی شبنم ذرا کی فلم تھی۔ گل تعجب کر کے ہنسی اور مسکرانے لگی۔

"اچھا دوستو۔۔۔"

"کوئی الوداعی ڈائیلاگ بولا یا دردناک شعر سنایا تو جنازہ ماروں گا آپ کے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "چل لیٹ ورنہ میں لٹاتا ہوں ٹانگ مار کے۔"

○...☆...○

ہم نے محسن کو زندہ دبا دیا ہے۔ پھر وہ تابوت میں لیٹ گیا۔

تابوت کے ڈھکنے میں چاروں کونوں پر باریک کیلوں کو پہلے ہی ٹھونک دیا گیا تھا۔ ڈھکنے کو دبا کے ہم نے ان کیلوں کے نوکیلے سرے نچلے حصے میں دبا دیے۔ تابوت بند ہو گیا۔

"اس میں۔۔۔ بچے سوراخ ہیں نا ہوا کے لئے؟" گل نے اپنی اضطراری کیفیت چھپانے کے لئے کہا۔

"کیا تم نے خود دیکھے نہیں تھے؟" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا۔

تابوت کے شیشے میں سے محسن کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس سین کو مختصر کرنے کے لئے غالب سے کہا "چلو مرزا کی تابوت اٹھاؤ۔"

"یار! ہم دو ہی اتنا وزن اٹھا کے جائیں گے؟"

"کیا کریں۔ مجبوری ہے۔"

غالب نے کہا "اور کوئی طریقہ نہیں اس مردے کو ڈھونے کا؟"

"اس وقت کیا ہو سکتا ہے دوسرا طریقہ!" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یار یہ جگہ کافی دور ہے۔"

"جگہ تو واقعی دور ہے" میں نے کہا "پہلے خیال نہیں آیا۔"

"کیوں نہ کہیں سے کوئی گاڑی لے آئیں۔ ابھی زیادہ رات تو نہیں ہوئی۔"

"ہاں۔ تھوڑی رات باقی ہے" میں نے کہا۔

"شاید کوئی گدھا گاڑی یا ریڑھی مل جائے۔"

گل نے اچانک کہا "ایک ریڑھی ہے تو سہی۔ مگر۔۔۔"

"مگر کیا؟"

"وہ دروازے کے اندر ہے۔ چا بکنے اور ٹوٹے ہوئے لالٹین۔ ساتھ والے کرائے دار نے پیچھے دیوار کے ساتھ کھڑی کی ہوگی۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" غالب نے کہا۔

"ایک مونگ پھلی بیچنے والا ہے۔ وہ روز رات کہیں لاتا ہے بڑھے کے لئے اس نے بتایا۔ وہ خود بھی وہیں سو رہا ہو گا۔"

میں نے اور غالب نے ایک دوسرے سے نظروں ہی نظروں میں مشورہ کیا اور محسن کو باہر نکالنے کا اشارہ کیا۔ میں اور غالب ریڑھی لینے چلے گئے۔

"کیا کرنا ہے۔ ریڑھی مانگنی ہے، خریدنی ہے یا چرانی ہے؟"

"تمہی اگر سیدھی انگلیوں سے نکل سکے تو اچھا ہے۔ ورنہ وہ جانے گا کہ یہ کالے سوٹوں والے ریڑھی کیوں مانگ رہے ہیں۔ کسی کی لاش لے جانا چاہتے ہیں۔ کیا کسی کو قتل کر کے آئے ہیں۔ کسی مشکل میں پڑ جانے کا احساس غالب کو تھا تو وہ ریڑھی بیچے گا بھی نہیں۔"

میں نے کہا "بس پھر ریڑھی اٹھا لاتے ہیں۔"

"اور اگر وہ فوراً اٹھ گیا؟"

"تو اسے پھر لٹا دیں گے۔ مجبوری ہے یہ بھی۔ ایک ریڑھی کتنے میں ملتی ہے؟"

"میرا باپ ڈاکٹر تھا۔ میں نے بھی سب کام کئے ہیں لیکن ریڑھی دھکیلنے کی سعادت حاصل نہیں کی۔"

"دس بارہ ہزار روپے رکھ دیں گے اس کی جیب میں۔ دو ہزار رکھ دیں گے۔ کون سے ہماری جیب سے جا رہے ہیں۔ پندرہ ہزار میں سے آٹھ ہزار سات سو بچے ہیں۔"

ریڑھی وہیں موجود تھی جہاں گل نے بتایا تھا مگر اس کو چرانا ناممکن تھا۔ ریڑھی والے نے اس کے فریم سے زنجیر یوں گزاری تھی کہ ہر پہیہ لپیٹ میں آ گیا تھا۔ زنجیر کو اس نے ایک تگڑے تالے کے ساتھ قفل سے جوڑ رکھا تھا۔ کراچی میں ریڑھی بھی بہت قیمتی چیز ہے۔ ایک دلی پھیری دکان کا مالک خوش نصیبوں میں شمار ہوتا ہے۔ لے جانے والے اس کے پہیے بھی نہ چھوڑتے کیوں کہ یہ سائیکل کے پہیے تھے۔ ماڈرن ٹیوب کے ساتھ۔

میں نے اور غالب نے ریڑھی کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ زنجیر نے صدا دی اور ریڑھی کا مالک ایک دم اٹھ بیٹھا۔ مجھے ایک دم اندازہ ہو گیا کہ اس نے شور مچانے کے لئے منہ کھولا ہے۔ پلک جھپکنے ہی میرے ہاتھوں نے اس کو دبوچ لیا اور اس کی چیخ تو کیا آواز تک نہ نکل سکی۔

"دیکھو ہم یہ ریڑھی لے جا رہے ہیں۔ اس لئے کہ ہمیں ضرورت ہے۔ ہم اپنی ضرورت نہیں بتائیں گے۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہم تمہیں اس کی قیمت دے کر جائیں گے۔ جانے رفت تم کو مالک ثروت کر جائیں گے۔ ناک آؤٹ سمجھتے ہو؟ بے ہوش کر جائیں

www.paksociety.com

گے؟ ماریں گے نہیں۔ ہم بلاوجہ کچھ نہیں مارتے۔ کسی کا حق بھی نہیں۔ اب یہ بتاؤ کہ ریڑھی کی کیا قیمت لو گے؟ ایک ہزار۔"
اس نے نفی میں سر ہلایا۔
"دو ہزار کافی ہوں گے؟" میں نے کہا "ہمیں نہیں معلوم کہ ریڑھی کتنے میں بنتی ہے یا یہاں کتنے میں ملتی ہے۔"
اس نے میرے بیان کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہوئے پھر نفی میں سر ہلایا۔
"اوکے۔ تین ہزار۔ اب تم نے نفی میں سر ہلایا تو میں خود تمہارے سر کو ایک سو اسی درجے گھما کے پیچھے کی طرف کر دوں گا۔ خواہ اس کوشش میں تمہارا منکا ٹوٹ جائے۔ تم بھی بہت ستا رہے ہو ہمیں خبیث" میں نے کہا اور اس کی کنپٹی پر آہستہ ہاتھ مار کے اسے بے حس و حرکت کر دیا۔
تین ہزار روپے اس کی جیب میں رکھتے ہوئے میں نے جیب میں سے وہ چابی نکال لی جو ریڑھی کو آزاد کر سکتی تھی۔ اسے سونے کے انداز میں لٹا کے میں اور غالب ریڑھی لے گئے۔ آدھی رات کے وقت ہماری اس کارروائی کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔
معلوم نہیں ہماری عدم موجودگی میں محسن اور گل کے درمیان کیا بات ہوئی تھی۔ گل کی صورت دیکھ کے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے ہیں۔ آنسوؤں کی نمی اس کی آنکھوں میں رہ گئی تھی۔ محسن کچھ جھنجھلایا ہوا سا لگتا تھا۔ میں نے مزید کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور غالب بھی انجان بن گیا۔
جب ہم تابوت کو ریڑھی پر رکھ کے روانہ ہوئے تو گل نے ریڑھی کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ ریڑھی کو میں پیچھے سے دھکیل رہا تھا اور غالب آگے سے کھینچ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اور پورے احترام کے ساتھ۔ کچھ دور جانے کے بعد ہمیں بہت سے لوگوں نے دیکھا۔ ان میں قلی بھی تھے اور عام افراد بھی مگر کسی نے ہم سے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ سب احتراماً راستہ دیتے گئے۔ صرف دو افراد نے سینے پر صلیب بنائی جو یقیناً کرسچین تھے۔
گل باقاعدہ رو رہی تھی اور یہ اداکاری نہیں تھی۔ کچھ اس کے جذبات پہلے ہی سے بے قابو تھے۔ وہ رونا چاہتی تھی اور ضرورت نے اسے جواز فراہم کر دیا تھا۔
میں نے دل میں کہا "تم خوب جانتی ہو غم یہ کام نہیں کر سکتا۔"
غالب نے کہا "گلیسرین کے بغیر تو [illegible] بھی نہیں کر سکتی۔ حالانکہ اداکاری اس پر ختم ہے۔"
گل نے چھینکیں کرتے ہوئے رومال سے آنکھیں صاف کیں اور بولی "رومال میں گلیسرین ہے۔"
"گلیسرین کہاں سے آئی؟" میں نے حیرانی سے کہا۔
"بڑھیا کے گھر میں تھی۔ سردی میں ہاتھ پاؤں پھٹ جائیں تو لگاتے ہیں" گل نے کہا "اس کا بھی کوئی ہو گا رونے والا۔"

"چلو تمہارا کام تو بن گیا" میں نے کہا۔
"گل اس کے بغیر بھی رو سکتی تھی۔ ماڈل کے سوا ہر لڑکی رو سکتی ہے۔"
"[illegible] بھی رو سکتی ہے" میں نے کہا "شرط لگا لو۔"
شرط لگانے سے پہلے ہم پلیٹ فارم کے آخری حصے سے شروع ہونے والے فولادی جنگلے تک پہنچ گئے تھے۔ یہاں آمد و رفت درمیان کے اس راستے سے جاری تھی جو دو سلاخیں نکال کے عوام نے خود اپنی سہولت کے لیے بنا لیا تھا۔ ایسا ہر جگہ ہوتا ہے۔ لوگ لمبا چکر کاٹ کے سیدھے راستے سے جانے کے بجائے کہیں بھی ایک شارٹ کٹ پیدا کر لیتے ہیں۔ دیوار ہو تو اینٹیں نکال کے اور جنگلا ہو تو سلاخیں نکال کے۔ انتظامیہ جتنی بار چاہے اس راستے کو بند کرے، راستہ بند نہیں ہوتا۔
لیکن یہ راستہ صرف اتنا تھا کہ اس میں سے ایک وقت میں ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا۔ ریڑھی اس راستے سے نہیں گزاری جا سکتی تھی اور اس مقصد کے لیے ہم صحیح راستہ اختیار کرتے تو چیکنگ کرنے والوں کے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا کہ لاش کس کی ہے۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ۔ این او سی۔ کلیئرنس۔ ریلوے کا اجازت نامہ۔ بکنگ کی رسید اور نہ جانے کیا کچھ پیش کرنا ضروری ہوتا۔
میں نے اور غالب نے تابوت کو یہاں سے مال گاڑی تک تو اٹھا کے لے جانے کا فیصلہ کیا۔ گارڈ کا ڈبا مال گاڑی کے آخر میں لگایا جا چکا تھا اور درمیانی فاصلہ مشکل سے سو گز تھا۔
اور اب رش میں صورت حال مختلف ہو گئی۔ ہم سے متعدد افراد نے "مرحوم" کے بارے میں پوچھا۔ چند ایک خدا ترس قسم کے لوگوں نے اپنے ہی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ تابوت اٹھوانے میں ہماری مدد کی جیسے راہ چلتے لوگ جنازے کو کندھا دینا کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔
گارڈ اپنے ڈبے میں نہیں تھا۔ ایک کیبن میں اس کا بستر لگا ہوا تھا جس پر وہ آرام کر سکتا تھا۔ اس سے ملحق کچن اور باتھ روم تھے جو اتنی ہی چوڑائی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے بنائے گئے تھے۔ بیڈ کے سامنے کا حصہ خالی تھا۔ ہم نے تابوت وہاں رکھا اور گل کو روتا چھوڑ کے باہر کے کھلے حصے میں آ گئے۔
اسی وقت گارڈ نمودار ہوا۔ کالے سوٹوں میں ملبوس دو افراد کو اپنی سفری قیام گاہ میں بلا اجازت موجود پا کے وہ حیران بھی ہوا اور مشتعل بھی۔ وہ چھ فٹ قد کا بھاری جسم والا آدمی تھا "کون ہو تم لوگ؟" اس نے اوپر آ کے کہا۔
میں نے بڑی سوگوار آواز میں شائستگی سے کہا "میرا نام رابرٹ ہے۔ مرحوم کا بھائی ہوں میں" اور ہاتھ آگے بڑھا دیا۔
اس نے مجبوراً مصافحہ کیا "کون مرحوم؟"
"میرا نام البرٹ ہے۔ میں مرحوم کی بیوہ کا بھائی ہوں" غالب نے بھی لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور ہاتھ آگے بڑھایا۔

لیکن اتنی دیر میں گارڈ نے مرحوم کو بھی دیکھ لیا تھا اور اس کی بیوہ کو بھی۔
"ڈیم اٹ۔ یہ کس کی اجازت سے یہ تابوت یہاں رکھا گیا ہے؟" اس نے پہلے درشت لہجہ اختیار کیا تھا مگر پھر اسے فوراً اپنی غلطی کے احساس نے روک لیا ہو گا۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔ آئی ایم سوری۔"
"سر! آپ کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے" میں نے لجاجت سے کہا۔
"آپ کو خدا نے درد مند دل دیا ہے اور یہ انسانیت کے رشتے سے ایک اخلاقی فریضہ ہے۔ جس کی ادائیگی میں آپ جیسا نیک دل کوتاہی برتنے کا سوچ بھی نہیں سکتا" غالب نے کہا۔
خوشامد اور تعریف سے پتھر بھی موم ہو جاتے ہیں۔ وہ کیسے متاثر نہ ہوتا۔ اس کے اور ہمارے درمیان گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ چنانچہ سب تہذیب کے دائرے میں تھے۔
"جنٹلمین پلیز! میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ کی مدد کر سکتا تو ضرور کرتا۔ یہ اخلاقی بات نہیں ہے۔ ریلوے کے قوانین مجھے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر آپ دو تین دن پہلے آتے تو میں تابوت کو مال گاڑی سے لے جانے کے لیے آپ کو خصوصی اجازت نامہ بھی دلوا دیتا۔"
"سر! ہم مجبور نہ ہوتے تو ایسا غلط کام نہ کرتے جس سے آپ کی پوزیشن پر حرف آ جائے" میں نے کہا۔
غالب نے کہا "یہ کوئی معاشی مجبوری نہیں ہے۔"
میں نے کہا "ہم ٹرک میں رکھ کے بھی تابوت کو لے جا سکتے تھے۔"
"پھر کیا بات ہے؟"
"بات صرف اتنی سی ہے کہ اس وقت کوئی ٹرک وہاں جانے کے لیے تیار نہیں۔ وہ صبح کی بات کرتے ہیں اور ہم صبح تک انتظار نہیں کر سکتے" میں نے کہا۔
"ٹرک والوں میں انسانیت اور ہمدردی کا جذبہ نہیں ہے۔ ہم نے تو پچاس کلومیٹر کے پانچ ہزار تک پیش کیے تھے" غالب نے افسوسناک انداز میں سر ہلایا۔
"پانچ ہزار!" گارڈ حیرت سے سکتے میں آ گیا۔
میں نے سمجھ لیا کہ جو پانسہ ہم نے پھینکا تھا وہی ہمارے حق میں پلٹ گیا ہے۔ "ہاں۔ وہ جگہ مشکل سے چالیس پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔"
"پھر کون احمق تھا جس نے انکار کیا؟"
"ہم احمق نہیں کہہ سکتے انہیں۔ ان کے پیٹ بھرے ہوئے تھے اور دل شرافت سے خالی ہیں" میں نے کہا "جس کو پیسے کی ضرورت ہو گی وہ کیوں انکار کرے گا۔"

"پیسے کی ضرورت کس کو نہیں ہے۔ آخر ٹرک کیوں جا رہے ہیں یہ لوگ؟"
میں نے کہا "کچھ وہمی بھی ہیں۔ صاف تو کسی نے نہیں کہا مگر دوسرے نے یہ بتایا کہ وہ مردے ڈھونا نہیں چاہتے۔ یہ نحوست کا کام ہے اور ان کے ٹرک میت گاڑی نہیں ہیں۔"
"وہ لوگ بھولے ہوئے ہیں کہ ایک دن سب کو مرنا ہے۔" غالب نے کہا۔
"خیر ہم ہمدردی تو کسی کو نہیں لے جا سکتے تھے۔ ایک شخص نے دانائی کی کہ آپ کی طرف بھیج دیا۔"
"میری طرف؟ کون تھا وہ؟"
"میرا مطلب تھا اس مال گاڑی کی طرف۔ باقی سب ڈبے تو بند تھے اور سیل ہو چکے تھے۔ ہم نے تابوت یہاں رکھ دیا۔ آپ سے اجازت بھی نہیں لی۔"
اس سے پہلے کہ وہ اپنے محدود اختیارات کی بات کرتا، میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ ریلوے کے قواعد و ضوابط اس کی اجازت نہیں دیتے مگر رات کے وقت آپ کو بھلا کون چیک کرنے آئے گا؟ آپ کے ذاتی کمپارٹمنٹ میں۔ اور آ جائے تو کیا وہ ایک نیکی کرنے کے جرم میں رپورٹ کرے گا آپ کی؟ آپ اسے قائل بھی کر سکتے ہیں اور خاموش بھی۔"
غالب نے پانچ ہزار روپے نکالے "مجھے معلوم ہے کہ آپ معاوضہ نہیں لیں گے مگر ہو سکتا ہے کہ راستے میں آپ کو کسی کا منہ بند کرنا پڑے۔ کتنے لوگوں کا منہ صرف پیسہ بند کرتا ہے۔"
میں نے کہا "پلیز! یہ آپ رکھ لیں۔"
پانچ ہزار کے نوٹ دیکھتے ہی گارڈ کی آنکھوں میں مدھم سی چمک پیدا ہوئی تھی مگر وہ ایک دم اپنی بات پلٹ کے یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ پیسہ دیکھ کر وہ ریلوے کے قواعد و ضوابط کو بھول گیا ہے۔
اس نے کہا "میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میری نوکری داؤ پر لگ جائے گی لیکن دوسری طرف میں انکار کر کے خود اپنی نظر میں گر جاؤں گا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرے گا کہ میں نے سفرِ آخرت پر ایک انسان کی راہ میں روڑا اٹکایا۔ میں یہ رسک لوں گا۔ مجھے یہ بتا دیں کہ تابوت کو کہاں اتارنا ہو گا؟"
"یہ وہ خاتون آپ کو بتا دیں گی۔"
اس نے نوٹوں کی گڈی ہاتھوں میں پکڑ کے یہ ظاہر کیا کہ وہ کتنا شرمسار اور مجبور ہے "میں اتنا ذلیل نہیں ہوں کہ اس نیک کام کا معاوضہ لوں۔ لیکن یہاں سے روانہ ہونے میں ابھی چار گھنٹے باقی ہیں ابھی۔ راستے کا مسئلہ تو بعد میں پیدا ہو گا۔ یہاں بہت سے لوگ آئیں گے چیک کرنے۔ لالچی افسر اور ان کے چمچے۔ جو مفت میں سفر کرتے ہیں اس گاڑی میں گارڈ کے ساتھ۔ آپ کا کہنا بالکل ٹھیک ہے۔ ان کا منہ ایسے ہی بند کیا جا سکتا ہے۔"
میں نے کہا "میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں؟"

www.paksociety.com

"کوئی بات نہیں مسٹر البرٹ۔"
"میں رابرٹ ہوں" میں نے کہا۔
"آپ کا یہ احسان......"
"پلیز ڈونٹ مینشن اٹ مسٹر رابرٹ۔"
"البرٹ میرا نام ہے" غالب نے کہا۔
"سوری۔ میں تھوڑا سا کنفیوز ہوا۔ اب آپ لوگ مطمئن رہیں" اس نے نوٹ جیب میں ڈال لئے "کسی کو نہ کچھ ہی نہیں دوں گا میں۔"
غلطی سے اس نے دل کی بات کہہ دی تھی اور اعتراف کر لیا تھا کہ وہ رقم اپنے پاس رکھے گا۔ جب کوئی آئے گا ہی نہیں تو اعتراض کون کرے گا۔
غالب نے کہا "اچھا مسٹر اس فرشتہ صفت شخص کی مدد سے ہمارا مسئلہ حل ہو گیا۔ خداوند یسوع مسیح اس کی حفاظت کے ضامن ہوں" اس نے جیسے بر مطلب بتائی۔
گل نے ایک چیخ ماری اور غالب کے سینے سے لگ کے رونے لگی "کاش میں بھی مہربان ڈیوڈ کے ساتھ۔"
"او نو! تم کو بچوں کے لئے زندہ رہنا ہے۔ ڈیوڈ کی نشانیوں کو سنبھالنا ہے" میں نے کہا۔
گل میرے سینے سے لگ کے بھی روئی اور گارڈ اس دردناک جذباتی منظر کو ایک تو احترام غمناک خاموشی سے دیکھتا رہا۔ گارڈ کے ڈبے کے پاس چند افراد رک گئے تھے مگر انہیں گارڈ نے اشارے سے چلتا کر دیا۔
"کیا تماشا ہو رہا ہے یہاں۔ چلو چلتے پھرتے نظر آؤ۔"
میں اور غالب آنسو پونچھ کے گارڈ سے مصافحہ کر کے اور ایک بار پھر ممنونیت کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد نیچے اترے اور سر جھکا کے روانہ ہو گئے۔ ہمارے لئے رونا مشکل کام تھا مگر یہ مشکل قتل کے مجرموں میں بھیجے ہوئے رومال نے آسان کی۔ گارڈ نے ہماری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو حقیقی غم و الم کا غماز سمجھا تو غلط نہیں سمجھا۔ ہمارا پورا ڈرامہ کامیابی سے پیش کیا گیا تھا۔ واپسی پر ہم پھر اس جنگلے کے درمیان سے گزرے تو رومی وہیں موجود تھی۔
غالب نے کہا "کیا اسے واپس لے جائیں؟"
"کیوں؟ اب کیا ضرورت ہے پھر اس کو مر جانے کی؟"
"اچھا ہے اسے ریڈمی بھی واپس مل جائے۔ رقم بھی مل جائے۔"
"رقم پر مجھے یاد آیا کہ مجھے ایک اور بندہ خبیث الزماں سے متعلق کا قرض وصول کرنا ہے" میں نے کہا۔
"کیا قرض تم اکیلے وصول کرو گے؟"
"ہاں۔ اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ تم جا کر نازو کی طرف۔ امید ہے تمہارے پہنچتے ہی وہ ڈاکٹر اور نرس کا بندوبست کر دے گی۔ تم

تیار ہو جانا۔ میں اگر وہاں نہ پہنچا تو براہ راست ٹرین پر آ جاؤں گا۔"
"انہی کپڑوں میں؟ جو گارڈ دیکھ چکا ہے۔"
"میں پچھلی طرف سے آؤں گا" میں نے کہا۔
"یہ رومی تو واپس لے جاؤ۔"
"لاحول ولا قوۃ۔ تم کو رومی کی اتنی فکر کیوں ہے؟ [illegible]
اسے قیمت دے چکے، وہ بھی مل جائے گی۔ تو رومی کی [illegible] ہم اسے یہاں چھوڑ دیں یا بستی کے جیب کترے کو دے دیں یہ ہماری مرضی۔ رہے صبح مل ہی جائے گی اسے" میں [illegible] بائیں جانب مڑ گیا۔
غالب کو دائیں طرف جانا تھا۔ بڑا مرحلہ کسی [illegible] سر ہو گیا تھا۔ مال گاڑی کے گارڈ پر قبضہ پا لیا اب [illegible] تھا اور یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ گارڈ ہی مال گاڑی کو چلنے کی اجازت دیتا ہے اور روکتا ہے۔ اس کا تعاون حاصل ہو جانے کے بعد مال گاڑی راستے کے ہر چھوٹے موٹے اسٹیشن سے [illegible] جانے کی اور کسی کو شک بھی نہیں ہو گا کہ چوری [illegible] ہو گئی ہے۔ گارڈ کے تعاون کے بغیر یہ کام اس لئے مشکل [illegible] گارڈ کے فرائض کی نوعیت سے ناواقف تھے اور [illegible] نہیں تھا کہ کس اسٹیشن سے گزرنے کا مقررہ طریقہ کار کیا ہے۔
اگلے چار گھنٹے خطرے سے یکسر خالی نہیں تھے۔ [illegible] کرنل تو سب بے پروا واقع ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے [illegible] انتظامات کو کافی [illegible] سے باقی معاملات ان پر چھوڑ دئیے [illegible] کو وہ قابل اعتماد سمجھتے تھے یا خرید چکے تھے۔ مگر ولادر ایک [illegible] اعتبار دشمن تھا۔ ایک ایسا عیار [illegible] جس کے بارے میں [illegible] کوئی کر سکتا ہی ناممکن تھا جتنا نوشتہ تقدیر کو پڑھنے کے بعد [illegible] کے معمولات کو مرتب کرنا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ [illegible] کے وقت وہ اچانک آ سکتا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ سب ٹھیک [illegible] دراصل ہمیں جتنا ولادر کھٹکتا تھا اتنا ڈیوڈ یا کرنل نہیں [illegible] تھے۔ ان کے ساتھ ہمارے دو دن [illegible] کا تجربہ اتنا طویل [illegible] جتنا ولادر کے ساتھ۔ اس کے علاوہ ولادر کے مقابلے میں [illegible] بھی تھے۔ احمق اگر نہ کہا جائے تو نسبتاً کم عیار و مکار ضرور تھے۔
میں ریلوے لائنوں کے درمیان چل رہا تھا۔ کئی بار [illegible] سے مجھ پر ریلوے انجن کی پیشانی پر ایک آنکھ کی طرح نصب [illegible] چندھیا دینے والی روشنی پڑی۔ میں پٹڑی بدلتا گیا اور آخر [illegible] صاحب کے ٹھکانے پر جا پہنچا۔ اس نے اوس سے بچنے کے [illegible] اپنے اوپر چادر کا خیمہ سا بنا لیا تھا۔ بابا صاحب [illegible] خزانے پر سانپ بن کے سوئے پڑے تھے۔ میں نے قریب [illegible] اسے جگایا۔
"اے بابا صاحب ہم آ گیا۔"
وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ کالی رات میں [illegible] کالے سوٹ [illegible] دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ "کک ... کک ... کون

آ گیا؟"
"ہم بولا نا کہ ہم آ گیا۔ ایکسٹرا ڈیوٹی۔"
"کون ... کون ایک نمبر؟ کہاں سے آیا ہے؟"
"جدھر تم بھیجا تھا ہم کو۔ گلڈ کا پاس سے" میں نے اوپر انگلی اٹھا کے کہا "ابھی گاڑ تیرے کو بلانے کا واسطے میرے کو بھیجا" میں نے ریوالور نکال لیا۔
"کیا ... کیا بکتا ہے؟" وہ ہکلانے لگا۔
"ہم کو گاڑ بولا ادھر ایک مرا پڑا ہے۔ ایک آدمی والا فراڈ کرتا ہے۔ پبلک اس کو جنت سمجھتا مگر وہ ولادر کا دن ہے۔ اس کو لانا مانگتا۔"
"ہے بھگوان ... یہ آدھی رات کو کیا بلا چمٹ گئی" وہ تھر تھر کانپنے لگا "جا بھائی جا۔ فقیروں کو مت چھیڑ۔ ہم نے کیا بگاڑا ہے تیرا۔"
"تم ہمارا دانت بگاڑا۔ ہمارا ناک بگاڑا۔ ہمارا دانت ایک دم الجبت۔ ہم اس سے بڑا الجبت۔ تیرا بات میں آ گیا اور کھا مال تیرے کو دے دیا۔"
"پیسہ وصول کرنے آئے ہو تو یار جان لینے کی بات کیوں کرتے ہو! میں سمجھ گیا۔ تم نے اور تمہاری بیوی نے کچھ نذرانہ دیا ہو گا۔ کتنا مال تھا؟ زبان سے بات کرو۔ میں سب واپس کر دیتا ہوں۔"
"لاٹ کیسے واپس کرے گا اپنا دانت کا۔ اس نے خودکشی کیا۔ آتم ہتھیا۔ سوئی سائیڈ۔ اور ابھی ہم تیرا سوئی سائیڈ کرنے کو مانگتا۔"
اس نے چلانے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے ریوالور کی نال اس کے حلق تک اتار دی۔ وہ ایسے ساکت ہو گیا کہ اپنا سانس تک روک لیا۔
"ٹھنڈی ہو آئیں گا یا زبان ہلائیں گا تو یہ سوئی سائیڈ ہو جائیں گا۔ خودکشی سا ہاتھ انگلی تو لگا رہے مگر اپن اس کو دبا کے مرڈر نہیں کریں گے۔ سامنے سے گولی جائیں گا تو پیچھے سے نکلیں گا۔ تیرا بازی پنکچر ہو جائیں گا تو تیرا آتما کا پھونک بھی نکل جائیں گا۔ تو ایک دم فلیٹ ہو جائیں گا ٹائر کا مانک۔ ابھی میں تیرے سے پوچھے گا کہ کیا مانگتا ہے! جان کہ مال۔ سالا زندہ رہے گا تو مال بہت۔ سارا دنیا کا ایڈیٹ لوگ آئے گا تو مال بھی آئے گا۔ لیکن ہوا نکل گیا تو تیرا ارتھی میں جتنا لوگ آئے گا سالا چھوڑ کے نہیں جائے گا۔"
اسے بولنے کا موقع دینے کے لئے میں نے ریوالور کو واپس کھینچ لیا "ابھی اپن بہرا نہیں ہے اور آہستہ کا بات ہے اس لئے زور سے بولنے کا نہیں ہے۔ ایسا ٹھیک بات کریں گا جیسے تیرا باپ ہے سامنے۔ کیا سمجھا ... ورنہ ...."
اس کی زبان ہرے رام کرشنا کا ورد کر رہی تھی اور سارا اس کا پوپلا جسم لرز رہا تھا۔ موت کو اتنا قریب پا کے اس کے دل میں مال و زر کی رغبت ختم ہو گئی تھی اور اگر کسی چیز کی اہمیت تھی تو صرف زندگی

کی۔
اس نے کہا "تو جب میرے کو مت مار۔ یہ سب لے جا۔ جتنا تیرا دل چاہے لے جا۔"
"ابھی بولا نا بول کتنا ہے۔ تیرے کو پیسہ پیسہ معلوم ہو گا۔ تو روز گن کر دیکھتا ہو گا۔ ایک دم ٹھیک بول۔"
"ساٹھ ... ساٹھ ہزار کو اٹھارہ ہزار نو سو چوہتر روپے ... نقد" اس نے تھر تھرانی زبان میں بالکل صحیح ٹوٹل بتایا "گن کر دوں گا۔"
"زیور کا بول۔"
"زیور کیا کرے گا تو ... نقد لے جا" کام آئے گا" وہ خوشامد پر اتر آیا "زیور بیچے گا تو پکڑا جائے گا۔ ہے بھی تھوڑا۔"
میں نے سرد سفاک لہجے میں کہا "بکس کھول حرامی کا بچہ نہیں تو ابھی پھونک نکالتا ہے تیرا۔"
اس نے بڑی پھرتی سے ایک اینٹ ہٹائی اور نیچے سے چابی نکال کے زمین میں چھپا ہوا ایک فولادی سیف جیسے صندوق کا تالا کھول دیا۔
"یہ لے ... سب نقد ..." اس نے سو سو کے علاوہ چھوٹے نوٹوں کی گڈیاں برآمد کرتے ہوئے کہا۔ آدھی تجوری خالی ہو گئی اور میرے سامنے نوٹوں کا ڈھیر لگ گیا۔ اتنے بڑے ڈھیر کو لے جانے کا مسئلہ فوری طلب تھا۔
"کوئی تھیلا ہے میرے کو" میں نے کہا۔
"تھیلا کہاں سے لا دوں۔ یہ چادر لے جا۔ اس میں باندھ لے۔ ہے بھگوان کیا کلجگ ہے۔ ڈاکو لوٹنے لگے ہیں فقیروں کو۔"
میں نے اس کے منہ پر ریوالور مارا "اپن کو ڈاکو بولتا ہے سالا۔ تو خود کیا ہے۔ چل یہ سو والا نوٹ ڈال اس چادر پہ۔ چھوٹا والا چھوڑ۔ دس والا بھی ڈال۔"
آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے اور خون اس کے ہونٹ کے کٹے ہوئے کنارے سے ٹپک رہا تھا لیکن وہ میرے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور تھا۔ اس کی ٹارچ سے میں نے تجوری میں روشنی ڈالی تو اس کی گہرائی دیکھ کے حیران رہ گیا۔ اس کے نچلے حصے میں شاید ایک فٹ تک سونے کے کنگن، جھمکے، بالیاں اور ہار بھرے پڑے تھے۔ یہ شاید بیس سیر سے زائد سونا تھا۔ سب مجبور ضرورت مند اور مایوس عورتوں کا اثاثہ۔ جو کوشش کر کے ہار گئی تھیں۔ دعاؤں کے اثر پر یقین سے محروم ہو گئی تھیں۔ کسی دیوی دیوتا کی کرپا مانگتے مانگتے تھک گئی تھیں اور نہ جانے کیسے اس بابا صاحب کے پاس ٹلنے کے لئے آ گئی تھیں۔ بدقسمتی نہیں، عقل سے محرومی اور عقیدے کی کمزوری ہوتی ہے جو انسان کی شامت اعمال بن جاتی ہے۔ پورے ہندوستان پاکستان میں ایسے سینکڑوں ہزاروں فراڈ بابا صاحب لوگوں کی آرزوؤں کے سودے کرتے تھے۔ ارمانوں کو پورا کرنے کی ضمانتوں کے بدلے ان سے عزت آبرو کے نذرانے

www.paksociety.com

تک وصول کر رہے تھے۔

کاش میرے پاس وقت ہوتا اور میرے لئے یہ ممکن ہوتا کہ یہ سب زیورات ان بے وقوف اور مجبور عورتوں کو واپس کر سکوں۔ میں نے دکھی دل سے سوچا۔ ان میں سے کچھ مائی کی انتہا کو پہنچ کے مر بھی چکی ہوں گی۔ بہرصورت یہ تمام زیور میرے کسی کام کا نہیں تھا۔ میں اس بوجھ کو کہاں اٹھائے پھر سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے خزانے میں سے اتنا زیور اٹھا لیا جو نازو، گل، رابعہ یا شہلا پہن سکتی تھیں۔ آرائش حسن کے لئے نہیں، ایسی ضرورت میں کیش کروانے کے لئے جب مالی وسائل کی کمی سے دیگر مسائل پیدا ہو رہے ہوں۔ عورت کا زیور اس کے جسم پر ہو تو ہر وقت ساتھ رہنے والے بینک سے کم نہیں ہوتا۔

بابا صاحب نے اس وقت مجھے غافل سمجھنے کی غلطی کی۔ وہ ایکدم اٹھ کے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ شاید وہ مجھ سے ریوالور چھین لینا چاہتا تھا۔ میں نے پلٹ کے اس پر ریوالور کے دستے کا بھرپور وار کیا۔ اس نے ایک دردناک آواز نکالی اور منہ کے بل گرا تو اس کا سر سیدھا کھلی تجوری میں چلا گیا۔ وہ عجیب منظر تھا۔ گردن سے نیچے تک وہ تجوری کے منہ میں پھنسا ہوا تھا اور اس کے دونوں بازو بھی سینے تک اندر چلے گئے تھے۔ باقی دھڑ باہر رہ گیا تھا۔ وہ ٹانگیں چلا رہا تھا مگر خود کو کھینچ کے باہر نکالنے سے قاصر تھا۔

اس کی گھٹی گھٹی آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ مجھے واسطے دے رہا تھا اور میری منت سماجت کر رہا تھا کہ میں اسے کھینچ کر نکالوں لیکن اچانک میرا دل پتھر ہو گیا تھا۔ میں نے اسے ایک عبرت ناک موت مرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ سونے چاندی کے زیورات میں چہرہ چھپ جانے سے یقیناً اس کا دم گھٹ رہا ہوگا۔ وہ ایک فولادی شکنجے میں ایسا پھنسا تھا کہ اس کے لئے سانس لینا بھی دشوار ہو گیا تھا۔

ابھی میں چادر کی پوٹلی اٹھا کے روانہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی ٹانگیں ساکت ہو گئیں اور عجیب بے ڈھنگے انداز میں پیچھے کی طرف مڑ کے لٹکنے لگیں۔ اس کی کمر بھی پیچھے کی طرف کمان کی طرح مڑ گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا یا مر چکا تھا۔ اگر وہ زندہ تھا تب بھی اس حالت میں زیادہ دیر نہیں جی سکتا تھا۔

بابا صاحب کا ڈیرہ ایک تاریک مقام تھا اور آدھی رات کے وقت وہاں سے کوئی بھی گزرنے والا نہیں تھا۔ چادر کے سائبان کے نیچے وہ نظر بھی نہیں آتا تھا اور صبح ہونے سے پہلے اس کی عبرت ناک موت کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ جاتے وقت مجھے وقت کی تنگی کا شدت سے احساس رہا۔ صرف دو گھنٹے اور ہوتے تو میں غالب اور محسن کے ساتھ واپس آتا اور ہم سارا زیور سمیٹ کے لے جاتے۔ اصل حقداروں تک تو یہ مال کسی صورت نہیں پہنچ سکتا تھا مگر یہ ہو سکتا تھا کہ ہم فاقہ کش، غربت کے مارے ہوئے الم نصیبوں کی کسی بستی میں جا کے اس خزانے کو یوں تقسیم کر دیں کہ سینکڑوں گھرانوں میں خدا کی طرف سے چھپر پھاڑ کے ملنے والی دولت ان کی تقدیر بدل دے۔ ان کے مقدر کی نسل بعد نسل چلنے والی تیرہ بختی کو ختم کر دے۔ شاید تم سے تم ہو گھروں میں ہم وہ زیور اپنے ڈال سکتے تھے کہ کسی کو خبر نہ ہو مگر صبح وہ اٹھ کر دیکھتے تو انہیں یقین نہ آتے کہ آخر کار خدا نے اور بھگوان نے ان کی سن لی ہے۔ اب وہ جدوجہد کر سکتے ہیں کوئی کام دھندا کر سکتے ہیں۔ سر کے اوپر چھت ڈال سکتے ہیں۔ موت کو دھتکار سکتے ہیں جو علاج سے محرومی کو بہانہ بنا کے آگے بڑھتی آ رہی تھی۔ کاش ایسا ہو سکتا! میں نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔

رات کے ایک بجے میں اس جگہ پہنچا جہاں جیون پرشاد ایم ایل اے کے ریس میں دوڑنے والے خاص گھوڑوں کو لے جانے والا ٹریلر کھڑا ہوا تھا۔ ٹریلر کے آس پاس خاصی گہما گہمی تھی۔ ایک بہت لمبی فولادی بازو والی دیوہیکل کرین سے اس فولادی کنٹینر کو اٹھایا جا رہا تھا جس میں گھوڑے بند تھے۔ کنٹینر کے چاروں طرف فولادی رسے ڈال دئے گئے تھے اور کرین آپریٹر بہت بلندی پر اپنے کیبن سے سگنل کے ہدایات دینے میں مصروف تھا۔

بہت سے لوگ صرف تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان میں مجھے نہ غالب نظر آیا اور نہ کہیں نازو کی شکل دکھائی دی۔ وہ کنٹینر کے اندر تھے تو اپنے کیبن میں بند ہو چکے تھے اور جب تک کنٹینر کو اٹھا کر ریل کی کھلی بوگی میں نہ رکھ دیا جاتا میری ان سے ملاقات ممکن نہیں تھی۔ اس سے مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ میں بھی تماشائیوں کے ساتھ کھڑا رہ کے تماشا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سب قلی اور مزدور ٹائپ لوگ تھے۔ جن میں رات کے وقت آوارہ گرد اور فقیر ٹائپ لوگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ شریف اور معزز لوگ اس وقت اپنے اپنے گھروں میں سو رہے تھے یا ہوٹلوں، کلبوں اور ساحلی نشاط گاہوں پر رات کا لطف اٹھا رہے تھے۔ میں کالے سوٹ اور ٹائی سے شریف اور معزز لگتا تھا چنانچہ وہاں مس فٹ تھا۔

میں نے مناسب سمجھا کہ وہاں سے کھسک جاؤں۔ صبح ہوتے ہی اس علاقے کی تشہیر ہو جائے گی۔ ایک ریڑھی والا رو رو کر ذکر کرے گا جو کالے سوٹوں میں تھے مگر اس سے ریڑھی چھین کر لے گئے تھے (مگر تین ہزار روپے وصول کرنے کی بات گول کر جائے گا) پھر جب بابا صاحب اپنی تجوری میں سر کے بل گڑے، دولت کے ڈھیر میں مدفون ملیں گے تب بھی کوئی نہ کوئی ضرور کہے گا کہ اس نے آدھی رات کے بعد ایک کالے سوٹ والے بابو کو ادھر ہی جاتا دیکھا تھا۔ ایسے گواہ تو بہت ہوں گے جو بتا سکیں گے کہ دو کالے سوٹوں والے ایک تابوت کو ریڑھی پر رکھ کے کہیں لے جا رہے تھے اور ان کے ساتھ کالے کپڑوں میں ملبوس ایک بہت خوبصورت عورت روتی جا رہی تھی۔ مزید تفتیش کی گئی تو تابوت کا مال گاڑی تک پہنچنا بھی ثابت ہو جائے گا۔

میں اس مجمع کو گواہ بنانے کی غلطی کر چکا تھا اور وہاں سے کھسکنے ہی والا تھا کہ کسی نے مجھے کہنی ماری۔

میں نے سر گھما کے دیکھا تو وہ پچیس تیس سال کی اور دلفریب خدوخال رکھنے والی سانولے رنگ کی کوئی کرسچین عورت تھی جس نے اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اسکرٹ کے بلاؤز کا گلا اتنا کھلا ہوا تھا کہ میری نظر کا بھٹک جانا قدرتی بات تھی۔ اس کا جسم گداز تھا اور نگاہوں میں خمار تھا۔ وہ سگریٹ پی رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس مسکراہٹ کا مطلب کیا ہے۔

"تم یہاں کیوں وقت ضائع کر رہے ہو؟" وہ انگریزی میں بولی۔

"اور مجھے کہاں وقت ضائع کرنا چاہئے؟" میں نے کہا۔

وہ زیادہ شوخی سے مسکرائی "وقت تب ضائع ہوتا ہے جب آدمی کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہو۔ وہ اکیلا ہو اور اس کا گھر ہو تو وہ گھر نہ جانا چاہتا ہو۔"

"تم نے بالکل صحیح تجزیہ کیا۔۔۔۔"

"تو پھر آؤ میرے ساتھ۔ تمہارا وقت ضائع نہیں ہوگا۔" اس نے بے تکلفی سے میری بانہوں میں بانہیں ڈال کے مجھے کھینچا۔

میں نے مزاحمت نہیں کی "تمہارا پیسہ ضائع ہوگا۔"

وہ کھلکھلا کے ہنسی "میں یقین دلاتی ہوں کہ تمہیں پیسہ ضائع ہونے کا احساس بھی نہیں ہوگا۔ کیا ہم کسی بار میں چلیں؟"

میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا "میں غم کو شراب میں ڈبونے کا قائل نہیں۔"

"میں تمہارا غم غلط کر سکتی ہوں۔ کیا غم ہے تمہیں؟"

"مجھے یہ غم ہے" میں نے سوچ کے کہا "کہ میں غریب کیوں ہوں اور میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک کیوں نہیں ہے۔ جب کہ اس شہر میں میرے جیسے دو ہاتھوں اور دو ٹانگوں والے لاکھوں روپے جوئے میں ہار رہے ہیں۔ کیوں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اتنی دولت کہاں اور کیسے صرف کریں۔"

وہ ایک دم رک کے مجھے گھورنے لگی "کیا تم مذاق کر رہے ہو؟"

"اگر میں مذاق کر سکتا تو اتنا غمزدہ کیوں نظر آتا!"

"تمہارے پاس واقعی صرف یہ خالی پاکٹ والا سوٹ ہے اور کچھ نہیں ہے؟"

میں نے کہا "تم کو یقین نہیں آتا تو تم میری تلاشی لے کر دیکھ لو۔"

"یو ڈیم فول! تم نے میرا وقت ضائع کیا" وہ بگڑ کے بولی۔

"ضائع کرنے کے لئے تمہارے پاس اب وقت کے سوا بچا ہی کیا ہے۔ یہ جسم بھی وقت کا ایک حصہ ہے جو ساتھ ساتھ ضائع ہوا۔ بہت جلد تم کسی میرے جیسے خالی جیب والے سے بھی سہارا مانگو گی تو وہ ہاتھ کھینچ لے گا۔"

"شٹ اپ۔ اپنا سرمن مت سناؤ مجھے۔ میں تو کبھی تھی تم معزز نظر آتے ہو۔۔۔۔"

"میں معزز ہوں" میں نے اصرار کیا "یہ لباس تم دیکھ سکتی ہو مگر میری عزت نفس۔۔۔۔"

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی وہ میرا ہاتھ جھٹک کر جا چکی تھی۔ میں نے ایک قہقہہ مارا اور اس نے پلٹ کر مجھے ایک ایسی گالی دی جو کوئی شریف عورت نہیں دے سکتی تھی۔ مگر وہ شریف عورت ہی کب تھی۔ میں نے تو محض اس لئے اس کا ساتھ قبول کیا تھا کہ وہاں موجود سب لوگ مجھے دیکھ رہے تھے اور وہ سب بعد میں کہہ سکتے تھے کہ میں ایک بدقماش عورت کے ساتھ کہیں رات بسر کرنے چلا گیا تھا۔

اس عورت سے جان چھڑا کے میں چند قدم ہی واپس گیا تھا کہ میں نے پیچھے سے اس کی آواز سنی۔

"اب کیا ہے؟" میں نے رک کے کہا۔

"کیا واقعی تم اتنے قلاش ہو۔ کہ ایک جام تک نہیں پی سکتے؟" اس نے قریب آ کے افسردگی سے کہا۔

"میری جیب میں ایک لاکھ نقد ہوتے تب بھی میں جام کا نہ سوچتا" میں نے کہا۔

"کیوں؟ تم مسلمان تو نہیں ہو۔"

میں نے کہا "بیشتر غیر مسلم بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگاتے۔"

"تم نے میری آخری امید بھی ختم کر دی" وہ اداسی سے بولی۔ "اب میں کیسے گھر جاؤں؟"

میں نے کہا "اگر وہ تمہارا گھر ہے۔ تو تمہیں وہاں جانے سے کون روک رہا ہے؟"

"یہ خیال کہ۔۔۔۔ آج مجھے ماں کے لئے انجکشن لے کر جانا تھا۔ بہت مہنگا انجکشن ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر بھی سوچے سمجھے بغیر ایسی دوائیں کیوں لکھتے ہیں جو کوئی خرید نہیں سکتا۔ اور معلوم نہیں ماں، یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کیوں جئے جا رہی ہے۔ اگر اسے میرا ذرا بھی خیال ہوتا تو کب کی مر گئی ہوتی۔ اب دیکھو نا، خود میرے لئے کتنا مشکل کام ہے زندہ رہنا۔ پھر اپنے ساتھ میں اسے بھی زندہ رکھوں۔ صرف اس لئے کہ اس نے مجھے پیدا کیا تھا۔ یہ احسان تھا تو مجھے اس کی سزا کیوں۔۔۔۔"

وہ نشے میں تھی لیکن سچ بول رہی تھی۔ میرے دل میں دکھ کا ایک کانٹا چبھ گیا۔

"کیا بیماری ہے تمہاری ماں کو؟"

"ہڈیوں کی ٹی بی ہے اسے" وہ بولی "اور اس کے پھیپھڑوں میں بھی پانی اتر آتا ہے۔ معدے میں السر ہے۔ اتنی بیماریوں کے ساتھ اتنے دکھ اٹھا کے جینے میں کیا ہے۔ کہ وہ زندگی سے چمٹی ہوئی ہے۔ سکھ تو ساری زندگی میں بھی دیکھا نہیں مگر یہ دکھ جھیلنے سے کیا مرجانا اس کے لئے باعث سکون نہیں ہوگا؟"

میرے پاس تقریباً سات لاکھ روپے تھے اور میرے ساتھ

www.paksociety.com

ایک ایسی عورت چل رہی تھی جس کو معاشی مجبوریوں نے یا استحصال کرنے والی خواہشوں نے وشیا بنا دیا تھا۔ میرے جیسے شریف آدمی کا اس کے ساتھ چلنا بھی کچھ لوگوں کے نزدیک گناہ ہوگا۔ مجھ پر لازم تھا کہ میں اسے دھتکار دوں۔ اس سے کوئی ہمدردی نہ رکھوں کیوں کہ وہ گناہگار تھی اور میں ۔۔۔ کیا میں فرشتہ تھا؟ میں نے زندگی میں کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ نیتوں کا بھید تو صرف خدا جانتا ہے کہ کس نے کب کوئی ایسا کام کیا جو گناہ تھا مگر گناہ شمار نہ ہوا۔ اور کس نے کیا نیکی کی جو اس کے نامۂ اعمال میں بدی لکھی گئی۔

ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ میں وہ سب اسے دے دوں جو میرے پاس تھا مگر پھر میں نے اس انتہائی جذباتی اقدام سے اجتناب کیا۔ میں نے سوچا کہ شاید کچھ دیر پہلے جو کچھ میں سوچ رہا تھا خدا نے اس کے لئے مجھے ایک موقع فراہم کر دیا ہے۔ پھر میرے احساس میں احتیاط اور اعتدال، عقل، ہوش اور حقیقت پسندی کا خیال شامل ہو گیا۔ کیا معلوم یہ عورت کس حد تک سچ کہہ رہی ہے۔ ایک مرد کو ترغیب کے جال میں پھنسانے کی کوشش میں ناکامی کے بعد وہ ایک انسان کی شرافت کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش تو نہیں کر رہی ہے کہ اگر وہ برائی پر خرچ نہیں کرتا، عورت اور شراب دونوں سے دور رہتا ہے تو کارِ ثواب سمجھ کے جیب خالی کر دے۔ جسم کی طلب کو نظر انداز کر سکتا ہے تو ضمیر کے اطمینان کے لئے ہی مال نکالے۔ وہ اپنی باتوں سے بڑی تیکھی اور چالاک عورت نظر آتی تھی اور اس کا انکار کرنے کے باوجود وہاں میرے پیچھے آنا بے مقصد نہیں ہو سکتا تھا۔

"یہ وقت تم کسی اور گاہک کو پھانسنے میں استعمال کرو تو شاید تمہیں خالی ہاتھ گھر نہ لوٹنا پڑے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب کوئی نہیں ملے گا۔ بزنس کا وقت ختم ہو چکا ہے۔"

"مجھ سے باتیں کر کے کیا ملے گا؟"

"کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی دل اداس تھا۔ تم اچھے آدمی ہو یا کم از کم مجھے اچھے لگے۔ سوچا کچھ باتیں ہی کر لوں۔ بہت دیر تک خاموش بھی نہیں رہ سکتی میں۔ آج تو جس سے بات کی وہ پھاڑ کھانے کو دوڑا۔ رہے تم اگر یہ محسوس کرتے ہو کہ میرے ساتھ چلنا تمہارے لئے رسوائی کا سبب بن سکتا ہے یا تم کو جلدی ہے تو جاؤ۔"

میں نے کہا "میں اب گھر واپس جا رہا تھا۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور ہنس پڑی "تم کو جھوٹ بولنا نہیں آتا۔"

میں نے کہا "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ میں نے بہت جھوٹ بولے ہیں زندگی میں۔"

"گھر ہوتا تمہارا تو تم سڑک پر لاوارث نہ پھرتے۔ اور پھرتے تو پھر میری طرح پھرتے۔ کسی شکار کی تلاش میں۔ نشے میں مدہوش، آوارہ گردوں کی طرح۔ مگر تم ہوش مند آدمی ہو اور حلئے سے ہی نہیں صورت سے بھی معزز لگتے ہو۔ میں انسانوں کو خریدتی ہوں یہ ہر روز۔ اپنا جسم بیچ کر۔ مجھے انسانوں کی کافی شناخت ہو گئی ہے۔" وہ مسکرائی۔

کچھ دیر پہلے میں سوچ رہا تھا کہ اگر بابا صاحب کی دولت تقسیم کی جا سکتی تو کم سے کم سو گھر خوشحال ہو جاتے۔ سات لاکھ اگر ستر ضرورت مندوں میں تقسیم کرتا تو ہر ایک کو دس ہزار ملتے۔ بمبئی میں محنت کرنے والے کو دس ہزار مل جائیں تو اس کے لئے کامیابی کے دس دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہ سب رقم اس ایک ضرورت مند عورت کو دینے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اس کی ماں کی بیماری کے لئے سو روپے ہر روز درکار تھے۔ ماں کا گھر اور یہ رشتہ اس کی ضرورت تھے اگر اسے دولت مل گئی تو وہ مجبوریوں کی زنجیر توڑ کے اپنے خوابوں کی تعبیر خریدنے نکل جائے گی اور شاید کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔

میرا ذہن یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ میں اسے کتنا پیسہ دوں اور اس سے یہ ضمانت کیسے حاصل کروں کہ وہ اس پیسے کو بے جا نہیں لٹائے گی۔ شراب اور عیش کے اسباب پر خرچ نہیں کرے گی۔ میرے پاس وقت ہوتا تو میں ایک لاکھ کسی بینک میں ڈال دیتا اور بینک کو ہدایت کر دیتا کہ ہر ماہ اسے ایک بندھی رقم دے دیا کرے۔

اچانک مجھے ایک ایسا شخص یاد آیا جو یہ ذمے داری قبول کرنے کا اہل تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے دو بجنے والے تھے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"وشیا" وہ بولی "اور یہی نام ٹھیک ہے۔"

"شٹ اپ۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم عزت سے رہنا چاہتی ہو۔"

وہ ہنس پڑی "تم شادی کرو گے مجھ سے؟ ایسے کئی الّو کے پٹھے ملے ہیں مجھے جو نشے میں اتنے جذباتی ہو جاتے تھے کہ ایسی ہی باتیں کرنے لگتے تھے۔"

"میں نشے میں نہیں ہوں۔ جلدی بولو۔ تم وشیا کی طرح رہنا چاہتی ہو تو جاؤ۔ میرے اور تمہارے راستے الگ ہیں۔ مگر تم عورت بننا چاہتی ہو تو میرے پاس تھوڑا سا وقت ہے تمہیں ایک موقع فراہم کرنے کے لئے۔ آگے خدا کی مرضی۔ میں یہ بھی معلوم کرنے بھی نہیں آؤں گا کہ بعد میں تم نے زندگی کو کیسے رکھا۔ مقدس کتاب کی طرح۔ یا پورنوگرافی کے البم کی طرح۔"

"کیا کرو گے آخر؟"

میں نے کہا "اسی جگہ موجود رہنا۔ میں ابھی دس منٹ میں آتا ہوں۔"

آدھی بنگلے سے گزر کے میں سیدھا مال گاڑی تک گیا اور درمیانی بوگی کے نیچے سے گزر کے دوسری طرف چلنے لگا۔ مال گاڑی

کی لمبائی کے ساتھ تاریکی میں کسی نے مجھ پر غور نہیں کیا۔ گھوڑوں کو لے جانے والا کنٹینر کھلی بوگی پر رکھا جا چکا تھا۔ پلیٹ فارم کی طرف بہت سے لوگ اس تماشے کو محض وقت گزاری کے لئے دیکھ رہے تھے۔

اچانک غالب نے مجھے پکڑ لیا "کہاں رہ گئے تھے آپ اور اب اس طرح منہ اٹھائے کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے گھبرا کے غالب کو دیکھا اور پھر اطمینان کا سانس لیا۔ "تم نے مجھے ڈرا دیا تھا یار۔ سب ٹھیک ہے نا؟"

"سب ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا تھا یہاں۔"

میں نے اسے بوگی پکڑانے سے پہلے اس میں سے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال لیں "یہ لو اسے سنبھال کے رکھو۔"

"یہ کہاں سے آ گیا یہ مال؟"

"میں ابھی آتا ہوں۔ ٹرین کے پاس رکنا۔"

غالب نے مجھے پکڑ لیا "جب تک بتاؤ گے نہیں کہ اب کہاں جا رہے ہو، میں جانے نہیں دوں گا۔ کوئی تک ہے اس وقت آپ کے اکیلے جانے کی۔ وقت اتنا کم رہ گیا ہے۔"

"تم بھی تنگ کرتے ہو۔ میں اس سے بہت پہلے لوٹ آؤں گا" میں نے کہا۔

"تمہاری یہ خوش فہمی ہم سب کو نہ مروا دے۔ جانا تو ہر ایک کا اپنی مرضی سے۔ زندگی چاہیے تو جہنم میں جاؤ۔ مگر ابھی اتنا اپنے اختیار کی بات نہیں لگتی۔"

"میں کسی خطرناک جگہ پر ٹانگ اڑانے نہیں جا رہا ہوں۔ بھروسہ رکھو مجھ پر" میں نے کہا۔

"اچھا یہ کالا سوٹ تو بدل لو۔ وہاں بھی تم ہی نمایاں تھے۔ جب کنٹینر کو کرین سے اٹھایا جا رہا تھا تو تم تماشائیوں میں کھڑے تھے" اس نے ایک بنڈل مجھے تھما دیا۔

"تم نے دیکھا تھا؟ نازو نے بھی دیکھا ہوگا۔"

"اسی سے تو اطمینان ہو گیا تھا۔ مگر اب پتا نہیں آخری وقت میں کیا سوجھ گئی ہے تمہیں۔ خیریت راس نہیں آتی تمہیں۔ کوئی پنگا ضرور لے بیٹھتا ہے......"

میں نے کہا "یار تمہارے سر عزیز کی قسم میں پنگا نہیں لے رہا ہوں۔ کپڑے کہاں بدلوں؟ بجز اب تم سے کیا شرم۔ تم ایسے لنگوٹیے ہو۔ مجھ پہ یہ سوٹ بہت جچ رہا ہے۔ تم کیا ہو آخر؟ ڈاکٹر یا نرس؟"

"میں ڈاکٹر ہوں۔ مجھے نرس کے ساتھ رہنا ہے۔ گھونٹوں سے تم نٹ سکتے ہو؟ اس لئے نرس کا عہدہ تمہیں مبارک ہو" وہ بولا۔

"یہ کالا سوٹ......"

"اسے لے جاؤ اپنے ساتھ۔ کہیں پھینک دینا۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ نازو کے پاس۔ اسے بتا دینا کہ میں ساڑھے تین چار بجے تک ضرور آ جاؤں گا۔ خواہ میری راہ میں ہمالیہ حائل ہوں یا سمندر" میں نے زینے کے نیچے گھستے ہوئے کہا۔ میرا سر فولادی چھت کے کسی کونے سے ٹکرایا۔ بوگی کے نیچے پہیوں کے علاوہ کیا کچھ ہوتا ہے یہ آج میں نے پہلی بار تفصیل سے دیکھا تھا۔

وہ وہیں کھڑی ہوئی تھی۔ گھورنے والوں کی نظروں سے بے نیاز۔ گھورنے والے سب قلی مزدور ٹائپ لوگ تھے۔

"تم صرف کپڑے بدلنے گئے تھے؟" وہ حیران ہو کے بولی۔

"تمہیں یقین تھا کہ میں واپس آؤں گا؟" میں نے اس کے سوال کا جواب گول کر دیا "میں نہ آتا تو تم کیا کرتیں؟"

"پتا نہیں۔ میں نے نہیں سوچا تھا" وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ "سوچنا چاہیے تھا مجھے۔"

بمبئی میں رات کو ٹیکسی کا ملنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا اور وہ پیسے ضرور زیادہ مانگتے ہیں مگر کہیں جانے سے انکار نہیں کرتے۔

"سینٹ اینڈریوز چرچ" میں نے کہا "مجھے واپس میں ٹرین پکڑنی ہے۔ جتنی تیز چل سکتے ہو چلو۔"

"ڈرے گا تو نہیں۔ اپن جٹ کا مالک جائیں گا اور گولی کا مالک آئیں گا" ڈرائیور بولا۔

"ڈرنے کی کیا بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نہ کہ حادثے میں مر جائیں گے" میں نے کہا۔

وہ ہنسا اور ٹیکسی کو چند منٹ میں خالی سڑک پر لے آیا۔ اس کے بعد ٹیکسی نے رفتار پکڑی تو حوصلہ رکھنے کے باوجود کئی بار میں دہشت زدہ ہوا۔ کسی موڑ پر ٹائر چیختے تھے تو لگتا تھا کہ ٹیکسی الٹ جائے گی لیکن میں اب اس کے سامنے اپنی بزدلی کا اعتراف کرنا نہیں چاہتا تھا۔ رات کے وقت سڑکیں نسبتاً خالی تھیں چنانچہ اسے اپنی مہارت اور بے خوفی کے مظاہرے کا پورا موقع مل رہا تھا اور وہ بہت خوش تھا۔ بار بار قہقہہ مارتا تھا اور تعریف طلب نظروں سے میری طرف دیکھتا تھا۔ خصوصاً اس وقت جب وہ ٹیکسی کو الٹنے سے بچا لیتا تھا۔ کئی بار میں اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت پر گرا اور وہ مجھ پر گری۔

"یہ ... یہ نشے میں ہے۔ اسے روکو" وہ سخت خوف زدہ ہو کے بولی۔

"ایسی کوئی بات نہیں" میں نے کہا "اگر پیرس یا روم کے ڈرائیوروں سے تمہارا واسطہ پڑے تو پھر تمہیں اندازہ ہو گا کہ خطرناک ڈرائیونگ کیا ہوتی ہے۔"

"تم پیرس اور روم جا چکے ہو؟"

"لندن سے آدمی کہیں بھی جا سکتا ہے۔"

"اس وقت چرچ کیا لینے جا رہے ہو؟"

"روشنی۔ ہدایت۔ نائب" میں نے کہا۔

"کس کے لئے؟"

"جسے بھی ضرورت ہو" میں نے گول مول جواب دیا "تم اب تو نام بتا دو اپنا۔"

"سونا" وہ ابرو کھینچتے ہوئے بولی "کیا تمہارے بھی بہت سے نام

www.paksociety.com

ہیں؟"

"یہ شک تمہیں کیوں ہوا؟"

"تمہارے پُراسرار رویے سے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم شاید بین الاقوامی سطح کے مجرم ہو۔ تمہارا تعلق مافیا سے ہے یا کسی ایسی ہی تنظیم سے۔ تم ضرورت مندوں اور مجبوروں کو تلاش کرتے رہتے ہو۔ خصوصاً میری جیسی عورتوں کو۔ جو عزت اور رتبے کے ڈھکوسلوں پر یقین نہ رکھتی ہوں اور خریدی جا سکتی ہوں۔ بیچی جا سکتی ہوں۔ اب بتاؤ چرچ بھی تمہارا کوئی خفیہ ٹھکانہ ہے؟"

اس کی باتوں پر مجھے سخت ہنسی آ رہی تھی مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔ "ہو سکتا ہے۔"

"مجھے معقول معاوضہ ملے تو میں ہر کام کر سکتی ہوں۔ جان کی بازی لگا سکتی ہوں۔ مارے جانے کا مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا کیونکہ جیت یقیناً میری زندگی کا رخ بدل دے گی۔"

"اور اگر زندگی کا رخ دوسری طرف بدلنا پڑے؟ ایک باعزت، پُرسکون زندگی کی طرف جس میں ضمیر پر نہ احساسِ گناہ کا بار ہو نہ دل میں شرمندگی کا کانٹا۔"

وہ کھل کے ہنسی "ایسا خواب میں پہلے دیکھتی تھی۔ اب حالات سے سمجھوتا کر چکی ہوں۔"

ٹیکسی چرچ کے احاطے میں داخل ہوئی اور ایک دم رک گئی۔ میں الٹ کر سامنے گیا اور میرا سر چھت سے ٹکرایا۔ سوزانے قہقہہ مار کے ہنسا۔

"تم کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" میں نے اترتے ہوئے کہا۔

"یہی اوھر فرام سے لینا ہے" وہ ٹیکسی سے اتر کے گھاس کے تختے کی طرف بڑھا "تم موج کرو۔ جب جی چاہے آؤ۔" اس نے مجھے آنکھ ماری اور بے شرمی سے ہنسا۔

خون کی گرمی میرے سر تک چڑھ گئی تھی مگر میں نے سوما کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لیا "اس کی برداشت کرو۔"

"ہوا کرے گی میری ٹیکسی عورت سے!"

"ٹیکسی والے کچھ نہیں، تم صرف عورت ہو۔ کم سے کم یہاں اپنے آپ کو ذلیل مت کرو۔ آخر یہ خدا کا گھر ہے" میں نے نرمی سے کہا۔

تبھی صحن میں پادری کو گھر کے برآمدے سے اترتے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ پہلے بھی اسی طرح کسی پُراسرار روح کی مانند نمودار ہو چکا تھا۔

"گاڈ بلیس یو۔ خدا کا یہ عاجز بندہ اس کے مہمانوں کو خوش آمدید کہتا ہے" اس نے شفقت سے مسکرا کے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر سوما سے۔

"ہولی فادر! میں مدد چاہتا ہوں۔ اس عورت کے لیے۔"

"کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ان کی مدد کرتا ہے جو خود اپنی مدد کرتے ہیں" پادری نے کہا۔

"کچھ لوگ بھٹک جاتے ہیں۔ گر جاتے ہیں۔ ان کو سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ سوما ہے۔ شرافت کے راستے پر چلنا چاہتی ہے۔ میرے پاس وقت ہوتا تو میں اس کے ساتھ جاتا۔ دو گھنٹے بعد چلے جانا ہے۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ میرا کوئی دوست نہیں تھا جس پر میں اعتبار کر سکتا اور سوما کو اس کے حوالے کر جاتا۔ یہ آپ رکھ لیں" میں نے ایک لاکھ کے نوٹ اسے تھمائے جو ایک رومال میں بندھے ہوئے تھے۔

"تم غلط جگہ آ گئے بیٹا۔ یہ نیکی کی دکان نہیں ہے۔"

"آپ مجھ سے ایسی توقع نہ رکھیں کہ میں خدا کے [illegible] بخشنے کے لیے نوٹوں پر انحصار کرنے کا گناہ کروں گا۔ یہ امانت ہے۔ مگر اس میں سے سوما کو حسب ضرورت دیتے رہیں۔ فادر آپ قبول کر لیں تو میں بہت مطمئن واپس جاؤں گا۔ اگر سب میں سوما کے حوالے کر دیتا تو مجھے اندیشہ تھا کہ یہ اپنی خواہشوں کو نظر انداز کرے گی اور یہ پیسہ اسے گناہ کی دلدل سے نکالنے کے بجائے ڈبونے کا سبب بن جائے گا۔ اس کا باپ بیمار اور یہ خود بھی بیمار ہی ہے۔ اس کی روح کے زوال کا وہاں اگر [illegible] ہے تو یہاں۔ اسی لیے میں آپ کے پاس آ گیا۔ اپنے بارے میں خود آپ کو تفصیل سے بتا دے گی۔ مجھے اجازت دیں۔"

پادری نے مجھ سے ہاتھ ملایا "خدا مجھے توفیق اور استقامت دے کہ میں اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہو سکوں۔"

سوما نے کہا "تم جا رہے ہو؟"

"میں نے بتایا تو تھا تمہیں کہ مجھے جانا ہے۔ [illegible] چرچ کی [illegible] کر تمہیں جا رہا ہوں۔ [illegible] زندگی کے دن بتانے کے لیے نہیں لایا ہوں یہاں۔"

"تم بالکل آزاد ہو میری بچی۔ آنے کے لیے بھی اور جانے کے لیے بھی۔"

"فادر کو اپنے بارے میں وہ سب کچھ بتا دو جو تم نے مجھے بتایا تھا۔" میں نے کہا اور پھر پادری سے مخاطب ہوا "بدقسمتی سے کبھی آپ کو یہ معلوم ہو کہ اس نے جھوٹ بولا تو ہدایت پانا اس کے اختیار میں نہیں اور یہ پیسہ بھی ضائع ہو [illegible] ہے تو مہربانی سب رقم میری طرف سے چرچ کو عطیہ سمجھ لیں۔ میری خواہش ہے کہ خدا ایسا وقت نہ لائے۔"

"سنو!" سوما میرے پیچھے دوڑی "یہ تم کیا کر رہے ہو، کیوں؟" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں نے کہا "سوما، واپس جاؤ۔"

وہ رک گئی "کیا تو بتا جاؤ کہ پھر کب آؤ گے؟"

میں نے پلٹ کے کہا "کبھی نہیں۔ سوچے میں غیب کا علم نہیں جانتا۔ کیا پتا حسنِ اتفاق سے پھر کہیں ہمارے راستے مل جائیں۔"

جب میں ٹیکسی میں بیٹھا تو میرے دل میں متضاد جذبات کا تلاطم تھا۔ ایک طرف سکون تھا تو اس کے ساتھ ہی خلش بھی۔ زندگی نے ساتھ ادا کی تھی اور میں خود کو اتنا ہلکا محسوس کرتے ہوئے مدح کے بوجھل پن کا شکار تھا۔ جب ٹیکسی گیٹ سے نکلی تو میں نے سوما کو دیکھا۔ غالباً وہ پادری کے بازو پر سر رکھے وہ آنسو بہا رہی تھی جو اس نے برسوں سے حسن کی چٹان کے پیچھے روک رکھے تھے۔

ڈرائیور بھی اب خاموش تھا "کبھی اپنا کو ماف کرنا صاحب، اپنا غلط بات بولا تھا۔"

میں نے کہا "میں نے بھی جھوٹ بولا تھا کہ میں ڈرتا نہیں۔ میں زندہ سلامت واپس پہنچنا چاہتا ہوں۔ ٹیکسی کو جمبو جیٹ کی طرح مت چلاؤ۔"

میں پھر ریلوے اسٹیشن کے علاقے میں پہنچا تو رات کا نو بجے کا پہر تھا لیکن وہاں وقت کے صرف دو ہی مدوجزر تھے۔ ایک اجالے کا دوسرا اندھیرے کا۔ گھڑی پر نظر ڈالے بغیر یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ رات کے نو بجے ہوں گے یا ساڑھے تین۔ سوداں کی رونق اور ہما ہمی ایک ہی سطح پر رہتی تھی۔

میں اطمینان سے چلتا ہوا پلیٹ فارم تک گیا۔ وہیں ایک دکان سے میں نے سگریٹ خریدی تو دکان والے نے رازداری سے کہا۔

"فارن کا سگریٹ سر۔ کارٹن۔ ٹرپل فائیو۔"

میں نے رئیسانہ شان سے کہا "دے دو" اور قیمت ادا کرنے کے بعد یہ بھی نہیں دیکھا کہ دکان والے نے کیا واپس کیا ہے۔ میں ٹکٹ کے ٹوٹے ہوئے سے گزرا اور ریل گاڑی سے کچھ فاصلے پر چلنے لگا۔ گارڈ جس نے پانچ ہزار بہت خوش ہو کے جیب میں رکھے تھے اب سیل کیے جانے والے ڈبوں کو چیک کر رہا تھا۔

اچانک میں نے نازو کو دیکھا۔ وہ ایک [illegible] سر والے شخص کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور بڑی ادا سے اٹھلاتی ہوئی آ رہی تھی۔ میں ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہ دونوں میرے سامنے سے گزرے۔ ہندوستانی لیڈروں جیسے لباس کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ جیون پرشاد ایم ایل اے ہوگا۔ حالانکہ کوئی اسے سلام نہیں کر رہا تھا مگر وہ دلی کی جنتا کو خواہ مخواہ جھک جھک کے پرنام کرتا جا رہا تھا۔

"جیب جی۔ آپ کشٹ نہ کریں دیوی جی۔"

"کشٹ کی کون سی بات ہے اس میں" نازو نے کہا۔

"میں دیکھنے آیا تھا کہ جنتا کا کوئی کارن تو نہیں ہے" جیون پرشاد نے چند قدم کے فاصلے پر رک کے کہا "سنا تھا پاکستان سے جو شرنارتھی آئے ہوئے ہیں، ان کی منڈلی میں مندو کنیا [illegible] بھی شامل ہے۔"

نازو ہنسی "آپ دیکھنے آئے تھے کہ کہیں میں بھی ان میں سے تو نہیں ہوں۔"

"رام رام۔ ایسی باتیں مت کریں۔ میں تو شکل کی صورت سے پہچان لیتا ہوں" وہ بولا "آپ تو [illegible] کی رہنے والی ہیں...."

"پھر شروع کرنے والے ہیں آپ بھائی۔"

"اف۔ کیا کروں دیوی جی۔ راج نیتی کے دھندے میں الجھ کے میں تو ہمیں دھرم بھی بھول گیا۔ عادت بگڑ گئی ہے میری۔ خیر اس [illegible] کا ادھار بھی آپ ہی کریں گی۔ کیا کرکے واپس آنے میں دیر مت کرنا۔"

"کرپا تو آپ کی ہے جی کہ مجھ ابھاگن کو اپنے چرنوں میں جگہ دی ورنہ ایسا دھرمی اور دھرم کے پجاری تو کتوں کی طرح میرے پیچھے لگ گئے تھے" نازو نے کہا اور میں دل ہی دل میں اس کی ذہانت سے بھرپور اداکاری کو سراہنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے واقعی جیون پرشاد پر الو کی لکڑی پھیر دی تھی۔

"جب ڈاکٹر آنے والا رہو حرام کا جنا۔ ٹھاکرتا دیوی میں اپنی اصلی بھاشا بولتا ہوں تو تھوڑا سا بے لگام ہو جاتا ہوں۔ نہرو جی کی بات کر رہا تھا میں۔ انہیں بتایا کہ میں نے فوراً گھنٹا انکار کیا۔"

"کوئی خاص بات کہنی ہو تو مجھے بتا دیں۔"

"نہیں۔ بس یہی سمجھانا تھا کہ ہوشیار رہیں۔ منہ بند نہ کھولیں اپنے۔ کہیں بچے بلانے میں لگ جائیں اور گھونٹوں کو بھول جائیں۔ جائے بچے کیا اپنے گھر چلے گئے؟" اس نے گھڑی دیکھی "میں اب چلتا ہوں۔ اور ضرورت ہو کسی چیز کی تو بتا دو۔"

"بہت دھنیہ واد آپ کا سر۔"

"پھر وہی سر۔ بھئی جیون کہو ہمیں، جیون" جیون پرشاد نے کہا۔

"اچھا جیون" نازو نے پرنام کے لیے ہاتھ جوڑے اور وہ [illegible] مطمئن ہو جانے والا جیون پرشاد بادل ناخواستہ باہر گیا مگر جاتے ہوئے بھی مڑ مڑ کے دیکھتا رہا۔ نازو پلٹ کے جانے لگی تو میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

"یہ منظر غالب دیکھ لیتا تو کم سے کم ایک خون ضرور ہو جاتا" میں نے کہا۔

"غالب اس سے زیادہ خون جلانے والے سین دیکھ چکا ہے" نازو نے مسکرا کے کہا "جیون پرشاد بہت ہی خبیث ہے۔ بڑھاپے میں بالکل سٹھیا گیا ہے۔"

"سٹھیا نہیں گیا ہے، تم نے اسے دیوانہ کر دیا ہے۔ اس بیچارے کا کیا قصور" میں نے کہا "ایسے کسی سے التفات کا اظہار کرو گی تو یہی ہوگا۔ اتنی رات کو یہ کیسے آ پہنچا؟"

"تخریب کاروں کا تو بہانہ تھا۔"

"پھر کیا گھونڈوں کو دیکھنے آیا تھا؟" میں نے انجان بن کے کہا۔

"وہ مجھے دیکھنے آیا تھا" نازو جھنجھلا کے بولی "اس کے دل کو قرار نہیں مل رہا تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی اسے۔ [illegible] اب لیڈر بنا پھرتا ہے۔"

"تم نے خود اس کے لیے جال پھیلایا۔ وہ پھنس گیا ہے تو اسے

www.paksociety.com

گالیاں دے رہی ہو" میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ بروقت میں نے اسے دیکھ لیا۔" غالب دوسری طرف سے اتر گیا اور میں نے اسے بڑی مشکل سے جھوٹ بول کے ٹالا کہ ڈاکٹر اور نرسز کیبن میں چائے پینے گئے ہیں۔ چائے کا انتظام تو کیبن میں بھی ہے۔ مگر اس وقت وہ زیادہ فکرمند نہیں ہوا کہ اسے مجھ سے اکیلے میں باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ جی چاہتا تھا ایک ہاتھ مار کے اسے بھی لٹا دوں سب کے ساتھ۔ لیکن اسے بہت لوگوں نے آتے دیکھا تھا۔ ان میں گارڈز اور ڈرائیور بھی شامل ہیں جو اس کے زر خرید غلام ہیں۔ واپس جاتا بھی دیکھا ہوگا سب نے۔ میں اسی لئے ساتھ گئی تھی کہ گارڈز اور ڈرائیور دیکھ لیں۔ بعد میں شک کی گنجائش ہی نہ رہے" نازو نے کہا اور اوپن پلیٹ فارم ٹائپ بوگی پر چڑھ گئی۔

زرد رنگ کا کنٹینر اس کے درمیان میں رکھا ہوا تھا۔ نازو ایک چھوٹے سے دروازے کا قفل کھول کے اندر داخل ہوئی "اس کے ساتھ ہی دوسری جانب سے غالب اوپر چڑھ آیا۔

"رخصت کر آئیں اپنے اس پرستار جان نثار چڑیمار کی شکل والے کو" غالب نے کہا۔

"حسد میں تم کچھ بھی کہو مگر وہ ایک ایم این اے ہے جو کسی دن وزیر بھی بن سکتا ہے۔"

"ہونے کو وہ سلطان بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے عقد کی درخواست کرے" غالب نے جل بھن کے کہا۔

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں اس درخواست کو قبول کرلوں" نازو نے کہا۔

غالب نے چلا کے کہا "مگر اس سے پہلے وہ قتل ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں ہو سکتا۔ بس اس وقت جھگڑا نہیں ہو سکتا۔ یہ بتاؤ کہ جن کو تم نے چائے پینے بھیج دیا تھا وہ کہاں ہیں؟"

نازو نے ہنس کے کہا "سو رہے ہیں۔"

غالب نے کہا "انگریزی کے محاورے کا اردو ترجمہ پیش ہے۔ سوئے ہوئے کتوں کو سونے دو۔"

"مگر وہ کہاں سو رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اصطبل میں" نازو نے کہا "بعد میں دیکھ لینا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ سو رہے ہیں۔ یہ ابدی نیند تو نہیں؟" میں نے کہا۔

"میں نے انہیں ایک ایک سکون آور انجکشن لگایا تھا۔ جو ویسے تو گھوڑوں کے لگایا جاتا ہے۔۔۔۔"

میں اچھل پڑا "گھوڑوں والا انجکشن انہیں لگا دیا؟"

غالب نے کہا "وہ ہنہناتے ہوئے اٹھیں گے۔"

میں نے کہا "یہ مذاق کی بات نہیں۔ گھوڑے اور آدمی میں تو بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"مگر وہ انجکشن ایک ہی تھے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے کہا۔

"مجھے خود ڈاکٹر نے بتایا تھا۔"

"کمال ہے گھوڑوں کو بھی سکون بخش انجکشن لگائے … ہیں" میں نے کہا۔

"کیا گھوڑوں کا بھی نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے؟ … ذہنی اور اعصابی امراض لاحق ہوتے ہیں۔ مثلاً عشق۔۔۔"

"جب گدھوں کو ہو سکتا ہے تو گھوڑے تو پھر اعلیٰ نسل کے ہیں" نازو نے غالب کی طرف دیکھ کے کہا "دراصل … حریف گھوڑوں کے لئے جیون پرشاد نے ایک سازش … بنایا تھا کہ ریس شروع ہونے سے پہلے ان گھوڑوں کو کمزور کر دیا جائے جن سے خطرہ تھا کہ وہ جیت سکتے ہیں۔ ان کو … کا انجکشن لگانے سے مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکتے تھے۔"

"کیا وہ سلیم عمن سے گھوڑے پر اثر ہوتا ہے؟"

"جیون پرشاد کا خیال تھا کہ ہوگا۔ ڈاکٹر تحریری اعتراض … کے شیطانی ذہن کو خراج تحسین پیش کر رہا تھا کہ … دماغ میں کیا زبردست خیال آیا ہے۔ ڈاکٹر نے تسلیم کیا … ہوگا مگر ہوگا۔ جیون پرشاد بھی بس اتنا ہی اثر چاہتا … تھوڑا سا سست ہو جائے تو کافی ہے۔"

"لیکن ریس کے گھوڑوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ پہرا … چوکس رہتا ہے کہ کوئی انہیں نقصان نہ پہنچا دے۔"

"ڈاکٹر اور نرسز کا خیال تھا کہ جیون پرشاد نے کسی … نرسز کا تعاون حاصل کر لیا ہے۔ زور یا زر کی مدد۔۔۔"

"زور یا زر یا دونوں کی مدد سے" غالب نے اس کی با… دی "یہ ترمیم ضروری ہے۔"

میں نے کہا "تم نے وہی انجکشن انہیں لگا کے ثابت … چاہ کن را چاہ درپیش۔"

غالب نے کہا "اس میں یہ ترمیم کی جائے کہ "چاہ کن … درپیش۔"

"تم باہر جا کے ٹہلو اور آنکھیں کھلی رکھو۔ آخر … کوئی آنہ جائے" میں نے کہا۔

"آخری وقت میں صرف فرشتۂ اجل آتا ہے اور … نہیں ٹال سکتا۔" غالب نے کہا "میں اس وقت ٹہلنے کے … بھی نہیں ہوں۔ سو گھنٹے سے ٹہل ہی رہا تھا تمہارے انتظار …"

نازو نے کہا "تم آ کے پھر کہاں چلے گئے تھے؟ …"

میں نے کہا "بعد میں بتاؤں گا۔ غالب سے بھی کہنا … نے۔"

غالب لیٹ رہا تھا مگر میں اسے کھینچ کر باہر لے آیا … کھلے حصے سے ایک طرف بمبئی شہر کی روشنیاں … تھیں۔ دوسری طرف وہ پلیٹ فارم تھا جو تقریباً سنسان تھا۔

… کے انتظامات تقریباً مکمل ہو چکے تھے۔ جن کا سامان تھا وہ … چکے تھے اور سامان چڑھانے والے قلی بھی … مکمل ہو چکی تھی۔

… پلیٹ فارم کے آخری کنارے پر لمبائی کے رخ سیکڑوں قلی … ایک دوسرے کے متوازی یوں سو رہے تھے … زندہ انسان نہیں کسی حادثے میں مرنے والوں کی … ٹرین کو خفیف سا جھٹکا لگا۔ اس کو شنٹ کرکے جانے … سے لگا دیا گیا تھا۔ جس گلی ہوگی پر؟ مڑتے ہوئے … میدان میں تھی پھر بھی پلیٹ … سے آگے تھی یہ ساری … تھی کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک کچھ پتا …

میں نے کہا "مرزا جی! کیا سوچ رہے ہو؟"

… محسن کے بارے میں سخت اور خطرناک … اس کا ابھی اسے مزید ایک گھنٹا مُردے کی طرح ساکت … گزارنا ہے۔"

"کسی کو شک تو نہیں ہوا؟"

"نہیں۔ شک کیوں ہوگا۔ اس کی آنکھوں پر پانچ ہزار کی پٹی … تھی ہم نے بعد میں اس نے تابوت کے اوپر چادر ڈال … دی تھی۔"

"کیا تم پھر گئے تھے؟"

"ہاں ایسے ہی ٹہلتا ہوا نکل گیا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کل … کیا حال ہے۔"

"اور گارڈ نے تمہیں دیکھ لیا پھر؟"

"میں پلیٹ فارم پر نہیں تھا۔ دوسری طرف تھا۔ میرے … بھی وہ نہیں تھے۔"

"صورت تو وہی تھی۔"

"صورت پر کون دھیان دیتا ہے۔ میں تھا بھی اندھیرے میں۔ … اتفاق سے اس وقت گارڈ بھی موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ چاہے مسٹر کل بھی مزے سے مرغے پر موجود تھے۔ … مطلب ہے گارڈ کے ڈبے کے سامنے کھلے تھے پر۔ اس نے بھی … میں نے قریب جا کے کہا "تمہیں …" وہ … تابوت پر کپڑا پڑا ہوا تھا۔ کل نے … سرکاری افسروں کے پیچھے اور مفت سفر کرنے کے خواہش مند … معاملے کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ آج بھی آئے تھے مگر … سب کو رخصت کر دیا کہ جیون پرشاد ایم این اے کا … ہے۔"

"… سے بات نہیں ہوئی؟"

"بات کیسے ہوتی۔ چادر ہٹا کے میں نے اشاروں کی زبان میں … تھا اور کہا تھا کہ بس تھوڑی دیر کی آزمائش اور … تکلیف میں ہوگا۔ مگر مجھے دیکھ کے مسکرایا۔ کروٹ

بھی تو نہیں لے سکتا وہ۔ کپڑا ڈالنے سے اتنا فائدہ ہوا کہ وہ آنکھیں کھول سکتا تھا۔ کل نے نگاہ پلیٹ فارم پر رکھی اور گارڈ ادھر آنے لگا تو میں پھر دوسری طرف اتر گیا۔"

"اصل بات کا ہمیں ابھی تک علم نہیں۔"

"تمہاری مراد شملا سے ہے؟"

"ہاں۔ وہ کہاں ہے؟ اگر وہ اس ٹرین پر ہوتی تو نظر نہ آتی؟" میں نے کہا۔

"ہم نے ٹرین کی ہر بوگی میں دیکھا بھی نہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ پوری مال گاڑی ان کی نہیں ہے۔ دو بوگیوں میں کافی جگہ تھی۔"

غالب نے چونک کر کہا "میں تو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ تمہارا اندازہ ٹھیک تھا۔"

"کیسا اندازہ۔۔۔؟"

"ان بوگیوں میں خواجہ سیمنٹ والوں نے اپنا مال بھر دیا ہے۔ ان کے ٹرک عین وقت پر پہنچ گئے۔ کل نے ایک شخص کو گارڈ سے باتیں کرتا سنا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بوگیوں کی منسوخی سے ان کا بہت بڑا نقصان ہو جاتا۔ وہ کسی پروجیکٹ کے لئے سپلائی کا ٹھیکہ لے چکے تھے۔ شاید ٹھیکہ ہی منسوخ ہو جاتا۔ وہ ریلوے سے نقصانات کی تلافی کا کیس کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ سب ٹھیک ہو گیا۔ کسی نے فون کرکے کہا کہ آپ چاہیں تو وہی بوگیاں لی جا سکتی ہیں۔"

"مرزا غالب! مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ ڈراما تھا۔"

"ڈراما تو چل بھی رہا ہے۔ تم کس سین کا حوالہ دے رہے ہو؟"

میں نے کہا "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ دلاور اینڈ کمپنی نے دو بوگیاں کیوں بک کرائی تھیں۔ اگر سامان اتنا ہی تھا کہ ایک بوگی کے آدھے حصے میں آ جاتا۔ تو ایک بوگی بھی کافی ہوتی۔"

غالب سوچ میں پڑ گیا "کیا مقصد ہو سکتا ہے اس کا؟"

"مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں یہ خوف لاحق تھا کہ ہم یا ہمارے ایجنٹ ان کے مال کا سراغ لگا لیں گے۔ خواجہ سیمنٹ والوں کی بوگیاں منسوخ کرانے سے لے کر جوزاہی تابوت نما بکس لوڈ کرانے تک سب ایک ڈراما تھا۔ تاکہ ہماری توجہ اس طرف مبذول کرا دی جائے۔"

"تمہارا مطلب ہے ان میں اسلحہ نہیں تھا؟"

"ممکن ہے تھوڑا بہت آتش گیر اور دھماکہ خیز مادہ ہو۔ جس سے بوگیاں تباہ ہو جائیں۔ نقصان ہو رہے گا یا خواجہ سیمنٹ والوں کا۔ سیمنٹ ویسے بھی دھماکے کی شدت کم کر دے گا۔ اصلی مال کسی دوسری بوگی میں ہوگا۔"

غالب نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا "پیر و مرشد! آپ کا یہ خیال کسی الہامی کیفیت کا نتیجہ ہے۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ بالکل ایسا ہی

www.paksociety.com

ہوا ہے۔ انہوں نے وہ شک نہیں لیا۔ دھوکا دینے کے لیے قلیوں نے مال لوڈ کرایا اور گودام تک لے آئے۔ گودام سے یہ مال سب کے سامنے اٹھایا گیا اور سب دیکھ میں ان کی توقعات کے مطابق ہوا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ تم نے قلیوں سے معلومات حاصل کرلیں اور گودام تک جا پہنچے۔"

"کیا انہوں نے انہیں پہچان لیا ہوگا؟"

"نہیں۔ پہچانا کسی نے بھی نہیں۔ لیکن تم نے ان کے رویے پر غور کیا؟ شہ وہاں تریوینی رکا اور نہ کرنل۔ اتنی اہم ذمے داری وہ ڈرائیور کو سونپ کر چلے گئے اور اس ڈرائیور نے بھی کتنی آسانی سے دوسرے قلیوں کو تبدیل کرلیا تھا۔ شاید اس وقت جب ہم وہ باکس لوڈ کررہے تھے۔ داور اور تریوینی اپنے گھر میں مطمئن بیٹھے ایک ایک منٹ کی رپورٹ حاصل کررہے تھے۔ انہوں نے اپنا مال رات میں ہی لوڈ کرا دیا ہوگا۔ اس وقت جب ٹرین واشنگ لائن پر تھی۔ وہ بوگیاں وہیں سے بھر کے اور سیل ہو کے آئی ہوں گی۔ سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ یہ کام داور نے اپنی نگرانی میں کرایا ہوگا۔ ہم بے وقوف بنے۔ اب اتنی لمبی ٹرین میں ان دو بوگیوں کا پتا چلانا تو ناممکن ہے۔"

"گارڈز کو معلوم ہوگا۔"

"مشکل ہے۔ داور جیسا شخص کسی کو راز دار بنانے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔" میں نے کہا "رازداری کا سب سے بہتر طریقہ خاموشی ہے۔ اس مرتبہ داور نے یہی کیا۔ اس نے خاموشی سے سب کچھ کرلیا۔ حفاظتی انتظامات کے ہنگامے کے بغیر اور احتیاطی تدابیر کے بغیر۔ یہ ممکن ہے کہ وہ بوگیاں کسی گمنام سے اسٹیشن پر لوڈ کی گئی ہوں اور واشنگ لائن سے بننے والی ٹرین میں لپیٹ لگا دی گئی ہوں کہ کسی کو پتا بھی نہ چلا ہو۔ سوائے ان کے جن کا تعاون بہرحال ضروری تھا۔ داور کی یہ چال کامیاب رہی۔ ہم لگے بندھے اور بھیس بدل کے اس کے مال کا سراغ لگاتے رہے مگر صرف گمراہ ہوئے۔ یہی وہ چاہتا تھا۔"

غالب نے سر پر ہاتھ مارا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ خیال آپ کو اتنی دیر سے کیوں آیا؟"

"اس لیے کہ دیر آید درست آید" میں نے کہا۔

"پھر اب کیا ہوگا؟ فرض کرو وہ مال اس ٹرین پر نہ ہو۔ آپ کی دو بوگیوں کو خاموشی سے لوڈ کرانے والا نظریہ بھی غلط ہو۔ یہ ایک مفروضہ ثابت ہوا۔"

"اگر ٹرین کی روانگی تک شملا کو نہ لایا گیا تو پھر واقعی ہمیں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔"

"اتنی خواری کے بعد؟"

"یار یہ تو جنگ ہے۔ شطرنج کا کھیل۔ ایک چال چلنے سے پہلے حریف کی چال کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ اندازہ غلط ہو تو بھی نباہ ہو جاتی ہے مگر اس کے بعد اگلی چال اور دو ... تو اس سے اگلی چال کے لیے سوچنا بھی ... کو اس وقت ذہن میں رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے جب شہ کی بازی ہو جائے اور بازی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ داور ... اب ہم سامنے آئے بغیر سب معلوم کرسکتے ہیں ... تعداد میں برابر تھے۔ پھر بمبئی میں ایسے واقعات پیش آئے ... ہماری قوت کے لامحدود ہونے کا یقین آگیا ... گئے چند افراد ہیں جن کو ہم پہچانتے ہیں ... ہمارے سامنے نہیں آنے دیا۔ سوائے ان تین افراد کے ... ہمیں غلط راہ پر ڈالتے رہے تھے۔ تریوینی ... ڈرائیور۔ لیکن ان سب پر فریب اقدامات کے باوجود ... کے تحفظ کی ضمانت سے دست بردار نہیں ہوگا ... کے بیٹے کی زندگی کو ضرور داؤ پر لگائے گا ... اور رازداری کے باوجود ہم کسی طرح اس کے ... کامیاب ہو جائیں تو ہماری راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ حائل رہے۔"

غالب نے سر ہلا کے کہا "یہ ایک منطقی نتیجہ ہے ... اختلاف نہیں کرسکتا۔ اگر شملا اور اس کے بیٹے کو ... جائیں گے۔" اور ... گے اس مرے کا کیا ہوگا؟"

"اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔ ہم ٹرین کے بعد کہیں بھی اتر سکتے ہیں۔ بریک تو گارڈز بھی لگوا سکتا ہے۔"

"ابھی آدھا گھنٹا ہے اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہماری ... رائیگاں گئی۔ محسن بلا وجہ تابوت میں لیٹا اور گل نے مرحوم کے لیے آنسو بہائے۔"

"کیوں نہ ہم ایک راؤنڈ لگا کے دیکھ لیں۔ میں ٹرین کی طرف جاتا ہوں۔ تم گارڈ کے ڈبے کی طرف جاؤ۔"

"اس وقت کہاں جانے کی باتیں ہو رہی ہیں؟" نازو نے آ کے کہا "ٹرین روانہ ہونے والی ہے۔"

"پھر کیا ہوا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ٹرین چل دی۔ ہم آجائیں گے اگلی گاڑی سے۔"

نازو نے چڑ کے کہا "اگلی گاڑی سے آنے کی کیا تک ہے؟"

"ہاں اب جیون پرشاد مل گیا ہے جس کے ... کے گھوڑے ہیں۔ جنتوں کو شک لیلیٰ بھی عزیز تر ہے۔"

میں نے کہا "ہم دیکھ رہے ہیں کہ شملا کیوں نہیں ... ٹرین کیسے مس ہو سکتی ہے مس نازو۔ کیا ہم ایک ... سے بھی نہیں رہ سکتے؟"

"ارے تو ہم روانگی کے ایک گھنٹے بعد بھی پکڑ لیں ... مجھے بیٹھنا پڑا تو دوڑتے ہوئے آجائیں گے" غالب نے کہا۔

"... چلے جائیے تو ضرور بھاگو گے۔ شملا پاگل تھا۔"

"... سر پر ایک بھوت ہے" غالب نے کہا۔

"... تو تھے نا؟" نازو نے چلا کے کہا۔

"... تم جو بار بار اپنے مرحوم پاپا کی طرف کیوں لے جاتی ہو میری ... چار سسر بھی ہو سکتے ہیں۔ تمہیں کیا معلوم ان میں ... بھوت ہے؟" غالب نے جاتے جاتے کہا۔

میں اس وقت تک مخالف سمت میں روانہ ہو چکا تھا اور میری نظریں اس پلیٹ فارم پر کسی غیر معمولی نقل و حرکت کی تلاش میں تھیں ... انجن کی ہیڈلائٹ سے اندھیرے میں ایک روشن لکیر بنی تھی۔ اس کے آگے سگنل تھا جس کی لائٹ ابھی سرخ ہی تھی۔

میرا اندازہ کسی کو شک میں مبتلا نہیں کرسکتا تھا۔ انجن کے گارڈ اور ڈرائیور کو معلوم تھا کہ ہم کون ہیں اور ان کے علاوہ وہاں صرف قلی بیٹھے ہوئے پڑے تھے۔ اس پلیٹ فارم پر ٹی اسٹال تھے اور ... قسم کی چیزیں روزمرہ کی بیچنے لئے پھرتے ہیں۔ مسافر بردار کوئی ... یہاں سے روانہ تک نہیں ہوئی تھی۔

میں غور سے ہر بوگی کو دیکھتا جا رہا تھا مگر وہ سب ایک جیسی تھیں۔ ... رنگ کے فولادی ڈبے جو ہر طرف سے بند تھے۔ ایک کھلے پلیٹ فارم جیسی بوگی پر چند پرائیوٹ کاریں لدی ہوئی تھیں۔ چار بوگیاں کسی آئل کمپنی کی تھیں۔ سلور کلر کی گول بوگیوں پر ٹینک کا نمبر بھی تھا اور کمپنی کا نام بھی۔ میں ان کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اچانک مجھے معمولی سی گڑبڑ کا احساس ہوا۔

میں نے آہستہ سے سر گھما کر دیکھا تو تیل لے جانے والی ایک بوگی کے اوپر والے گول ڈھکنے کو ہٹا کے کوئی شخص باہر آیا تھا۔ اس نے بہت احتیاط کے ساتھ ڈھکنا دوبارہ بند کیا اور پھر سائیڈ میں لگی ہوئی سیڑھی پر قدم جماتا اترنے لگا۔

شک تو مجھے اس کا سایہ دیکھ کر ہی ہو گیا تھا۔ آج تک میں نے ... سے کسی آدمی کو برآمد ہوتے نہ دیکھا تھا۔ اگر اس میں ... بھرا ہوتا تو وہ شخص صاف ستھرا نہ نکلتا۔ مٹی کے تیل، پیٹرول یا لبریکنٹ (چکناہٹ والے تیل) سے اس کے کپڑے تر ہوتے ... بھرے ہوئے ٹینک میں کوئی اترے گا ہی کیوں؟

... یہ ہوئی کہ میں چلتے چلتے رک گیا۔ اگر میں اسے دیکھنے کے بعد نظر انداز کر دیتا اور بے نیازی سے انجن کی طرف چلتا رہتا تو وہ شک میں مبتلا نہ ہوتا۔ جب وہ میری طرف بڑھا تو میں نے اپنی غلطی کو محسوس کرتے ہوئے آگے جانے کی کوشش کی اور اطمینان سے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ مجھے اس کے پیچھے آنے کی کوئی پروا نہیں ہے مگر وہ تیزی سے آیا اور پھر میرے ساتھ چلنے لگا۔

"کون ہو تم؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے غرا کے کہا۔

میں نے رک کر اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا "تم کون ہو مجھ سے اس لہجے میں یوں سوال کرنے والے؟" میں نے مشتعل ہوئے بغیر متانت سے کہا۔

"میں تمہارا باپ ہوں۔"

میں نے اطمینان سے سگریٹ کا آخری کش لیا اور اسے جوتوں سے مسل کے ایک دم اس کی گردن دبوچ لی "میں بدتمیزی کرنے والوں کو سزا دیتا ہوں۔ میرے اس سوٹ نے تم کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے شاید کہ میں بدمعاشی نہیں کرسکتا۔"

اس نے خود کو چھڑانے کی اور حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے دھکیل کر ایک بوگی سے لگا دیا۔

"تمہارا سر میں ناریل کی طرح توڑ سکتا ہوں۔ اس بوگی مار کے اگر تمہاری لاش کو نیچے پٹڑی پر ڈال دیا جائے تو سارے پہیے تمہارے ٹکڑوں کا قیمہ بناتے ہوئے گزر جائیں گے۔"

"میں... میں نے صرف یہ پوچھا تھا" اس کی حالت غیر ہوگئی۔

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے" میں نے کہا۔

لیکن دفع ہونے کے بجائے اس نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔ اس نے چیخ کر مجھے گالی دی اور بولا "جلدی بول... ورنہ تیری لاش پٹڑی پر نظر آئے گی۔"

میں انجن کے قریب تھا۔ دو بوگیوں کا فاصلہ اتنا نہیں تھا کہ ڈرائیور کے کانوں تک یہ آواز نہ پہنچتی۔ اس نے جھانک کر دیکھا اور وہیں سے چلایا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

ڈرائیور کی آواز پر وہ ہوش میں آگیا ورنہ مجھے یقین تھا کہ وہ گولی چلا دے گا۔ غصے نے اسے پاگل کر دیا تھا۔

میں نے بھی اب چیخ کر جواب دیا "میں جیون پرشاد ایم ایل اے کا آدمی ہوں۔ اس کے گھوڑوں کا انچارج..."

انجن ڈرائیور چھلانگ مار کے دوڑا "کیا بات ہے؟"

میں نے غصے میں ڈرائیور سے کہا "کون ہے یہ پاگل کا بچہ؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ اس ٹرین پر جیون پرشاد ایم ایل اے کے تین خاص آدمی جا رہے ہیں۔ ایک ڈاکٹر، ایک ٹرینر اور ایک نرس۔"

اس نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ اچانک اسے اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا اور وہ پریشان تھا "تم یہ بات شرافت سے پہلے ہی بتا دیتے۔"

"کیوں بتا دیتا؟" میں نے چلا کے کہا "یہ تو اب تم بتاؤ گے کہ تم نے میرے ساتھ یہ بدمعاشی کی جرات کیسے کی!"

"چلیں سر! جانے دیں اس کو۔" انجن ڈرائیور نے مصالحانہ کردار ادا کرتے ہوئے کہا "ٹرین روانہ ہونے والی ہے۔ آپ

www.paksociety.com

آرہا ہے۔"

"جب تک یہ معافی نہیں مانگے گا میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ زین کھڑا رہا۔"

"آپ کیوں مرنا چاہتا ہے۔۔۔" ڈرائیور نے اسے گالی دی۔

اس نے بیہودہ لہجے میں کہا "سر۔۔۔ غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیں مجھے۔"

"اس شریف آدمی کی وجہ سے معاف کرتا ہوں تمہیں۔ جاؤ دفع ہو جاؤ اب" میں نے کہا اور اس کی طرف دیکھے بغیر واپس ہو گیا۔

سگنل کی لائٹ سبز ہو گئی تھی۔ میں اس کھلی ہوئی تک پہنچا ہی تھا جس پر نازو پریشان کھڑی تھی کہ میں نے مخالف سمت سے غالب کو دوڑتا کے آتا دیکھا۔ زین آہستہ آہستہ کھسکنے لگی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور غالب کو اوپر کھینچ لیا۔

"یار غضب ہو گیا" غالب نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔ اس کی صورت پر وحشت برس رہی تھی۔

میں نے اور نازو نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"آخر منہ سے کچھ بولو۔ کیا غضب ہو گیا؟" نازو نے جھلا کے کہا۔

"یار وہ کرنل۔۔۔ وہ پھر آیا تھا" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "کیا۔۔۔ بھی۔۔۔ بات سامنے آ گئی؟"

"پتہ نہیں۔۔۔ وہ اکیلا نہیں تھا" غالب کے چہرے پر ملال اور افسردگی سے زیادہ مایوسی غالب تھی۔

"کیا ملا وہ ایجنٹ کمپنی میں سے کوئی۔۔۔"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا "وہ۔۔۔ غالباً شملا کو لایا ہے۔"

میں نے کہا "غالباً کیا۔ جو تم نے دیکھا ہے وہ بتاؤ۔"

"میں نے تو ایک تابوت کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ اسے وہ قلی اٹھا کے لائے تھے" غالب نے کہا "کرنل آگے آگے تھا۔ اس نے تابوت کو وہیں رکھوا دیا۔ گارڈ کے ڈبے میں۔"

"او مائی گاڈ" میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

نازو کا رنگ اڑ گیا "تمہارا مطلب ہے کہ وہاں ایک ساتھ ایک ہی جگہ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ کیوں نہیں ہو سکتا آخر؟" غالب نے بے خیالی میں کہا۔

ہم سب خاموش ہو گئے۔ یہ دکھ اور اذیت کے احساس کا انوکھا تجربہ تھا اور قدرت کی ستم ظریفی کا نرالا نمونہ کہ میاں بیوی پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے تھے مگر ایک دوسرے کی خبر نہ تھی۔ ہزاروں میل کی مسافت ختم ہو جانے کے باوجود احساس کے فاصلوں میں برقرار تھی۔ شملا بھی زندہ تھی اور محسن بھی اور ان کا بیٹا بھی ان کے ساتھ تھا۔ مگر طویل جدائی کی عقوبت کا صلہ یہ قربت تھا جس میں کسی کے لئے راحت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ اگر ان میں سے ایک کو قتل بھی ہو جاتا کہ دوسرا اس کے اتنا قریب ہے تو شاید وہ سب کچھ بھول جاتے۔ یہ کہ مصلحت کے کیا تقاضے ہیں کس صبر و ضبط کے مظاہرے کا طلب گار ہے اور صورت حال کی نزاکت ان سے کیا قربانی مانگتی ہے۔ وہ ایم آر او کی امید مشن کو ہم سب کو بھول کر اور ساری زنجیریں توڑ کے بیوی اپنے شوہر کی آغوش محبت میں گم ہو جاتی۔ باپ اپنے بیٹے سے لپٹ جاتا اور وہ بھی جدا نہ ہوتے۔ خواہ چند لمحوں کے درد کی آگ کے بجھنے سے پہلے ہی انہیں موت آ لیتی۔ ایسی موت کو یقیناً ترجیح دیتے۔ لیکن اب احتیاط اور احساس کی ڈور اس خیال سے بندھی ہوئی تھی کہ شملا اپنے اپنے تابوت میں الگ الگ۔ قید حیات کے ایک عرصے کا سارا عذاب اکیلے جھیل رہے ہیں۔ ممکن ہے شملا سو رہی ہو اور اس کا بیٹا بھی اپنی ماں کے ساتھ وہ سزا کاٹ رہا ہو جو اس کے مقدر میں پیدائش کے روز اول سے لکھی گئی تھی۔ عمر کی معصومیت نہ سیاست کے اسرار و رموز کو سمجھتی تھی نہ تجارت کے معاملات سود و زیاں کو۔ یہ عمر صرف پیار مانگتی ہے۔ شفقت اور محبت مانگتی ہے۔ مگر تعلیم، تجارت اور کھلونے مانگتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس محسن اور شملا کے بیٹے کو ملا تھا تو وہ دکھ جو اس کی ماں نے جھیلا۔ وہ صدمات جو ایک عورت کی حیثیت سے برداشت کئے۔ وہ ظلم جو محسن کی بیوی کہلانے کے جرم میں روا رکھے گئے۔ بچہ شریک تنہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ قدرت کی طرف سے اسے کتنی مہلت عطا ہوئی ہے اور وہ بھی دوسرے بچوں کی طرح عمر کے مرحلے طے کرتا ہوا صحافی یا پروفیسر یا سائنس داں۔ ڈاکٹر یا انجینئر بنے گا یا آغاز ہی میں زندگی کا کوئی حادثہ اسے وجود سے پھر عدم کی جانب بھیج دے گا۔

جب ٹرین نے جھٹکا لیا تو میرے خیالات کی رو بھی ایک دم ٹوٹی۔ میں نے نازو کو خاموشی سے روتے دیکھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے گر کے گالوں پر پھسلتے جا رہے تھے اور وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے دیکھ ہی نہیں رہا ہے۔

"نازو! رو رہی ہو" میں نے کہا "اچھا ہے رو لو ہم تو نہیں سکتے۔"

"او شٹ۔ رونے سے کیا ہو گا؟" غالب نے تلخی سے کہا۔

"کاش! میں محسن کو بتا سکتی کہ اٹھو۔ دیکھو تمہاری شملا تمہارے پاس ہے۔ تمہارا بیٹا۔۔۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"وہ اب بھی اتنے ہی دور ہیں جتنا مرنے والا زندگی سے ہوتا ہے" غالب نے کہا "ایسا کیوں ہو گیا مقدر! یہ تو بڑا ظلم ہے کم از کم ایک بار تو انہیں ہم ملنا چاہئے۔ یہ تو ہونا چاہئے۔"

"کچھ نہیں ہو سکتا دوست۔ کوئی ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ ابھی وہ کچھ نہیں جانتے چنانچہ آگہی کا سارا۔۔۔

محسن کو بھی یقین ہو گا کہ وہ اکیلا ہے۔ وہ اس کے جیل سے نکل گیا ہے۔ انہیں خیال ہو گا صرف اپنی ذمے داری کا۔ اتنا ہے کہ اپنا کام خوش اسلوبی سے کرنے کا۔ شاید اس وقت محسن کے ذہن میں شملا کا خیال تک نہیں ہو گا۔ اور اسی طرح شملا کو اگر خواب میں بھی محسن کو ہی دیکھ رہی ہو گی کیوں کہ تم بے ہوشی ہے" میں نے کہا۔

غالب اور نازو کے چہرے کچھ پرسکون ہونے لگے۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی "ابھی وہ سب بے خبری کے عالم میں ہیں۔ سوچو ان پر کیا گزرتی اگر وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے۔ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے یا ایک دوسرے کی آواز سن سکتے مگر مل نہ سکتے۔ شاید وہ پاگل ہو جاتے۔ میری اور رابعہ کی بھی بہت مختلف ہے اور تمہاری بھی۔ محسن اور شملا کیسے ملے اور پھر ایسے بچھڑے کہ آج تک محض آس کے سہارے جیتے رہے۔ اگر وہ ایک ہی زنداں میں ہوتے۔ آمنے سامنے یا درمیان دیوار ہوتی۔ تو وہ سر پھوڑ کے مر جاتے مگر دیوار نہ گرا پاتے۔ خدا کا شکر ہے کہ محسن کچھ دیکھ نہیں سکتا اور کچھ سن بھی نہیں سکتا۔"

"اگر کرنل کی جگہ میں ہوتی تو کیا ہوتا؟" نازو نے جھرجھری سی لے کر کہا۔

"یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ شملا کو کرنل نہیں پہچانتی" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "پہچانتی نہیں، مگر جانتی تو ہے۔ اس کو سب معلوم ہے۔"

غالب ایک دم متفکر ہو گیا "کہیں وہ بے وقوفی میں کوئی جذباتی حرکت نہ کر بیٹھے۔"

"حالت تو اس کی وہی ہو گی جو میری ہوتی۔ اس نے پہلی بار شملا کو دیکھا ہو گا۔ اور محسن کے بیٹے کو۔ ہم سب مارے جائیں گے اگر اس نے محسن کو کچھ بتایا۔ یا انہیں ملوانے کی کوشش کی" نازو بھی تشویش میں مبتلا ہو گئی۔

"مجھے اس پر بھروسہ ہے کہ وہ ایسی حماقت نہیں کرے گی" غالب نے کہا "وہ تمہاری طرح جذبات کی رو میں بہہ جانے والی لڑکی نہیں ہے۔"

"دوسرے لفظوں میں تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو کہ میں جذبات سے اتنی مغلوب ہو جاتی ہوں کہ عقل سے کام نہیں لے سکتی؟" نازو نے غالب کو گھور کے دیکھا۔

"نازو پلیز" غالب نے متانت سے کہا "ہر شخص وہی کچھ استعمال کرتا ہے جو اس کے پاس ہو۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ عقل نہیں ہے میرے پاس؟"

"میں نے ایک عام اصول بیان کیا ہے" غالب نے کہا "تم اگر ذاتی طور پر محسوس ہو تو میں کیا کروں۔ مطلب تم بات ٹال رہی ہو۔"

"بلاوجہ غلط بات کیوں کرتے ہو؟"

"تم الٹا مطلب کیوں نکالتی ہو؟" غالب نے کہا "میں اپنے سسر کو بھوت کہتا ہوں تو تم برا مان جاتی ہو کہ میرے والد کو کہا ہے۔ خواہ مخواہ۔"

"بس شروع ہو گئی تو تو میں میں" میں نے کہا "معلوم نہیں تم دونوں کی زندگی ایک ساتھ کیسے گزرے گی۔"

نازو نے ایک دم پینترا بدل لیا "آپ فکر نہ کریں۔ ویسے مست ہوں جیسی بھی گزرے گی آپ سے اچھی ہی گزرے گی۔"

غالب کا چہرہ کھل اٹھا "اور کیا۔ بھلا وہ بھی کوئی زندگی ہوتی ہے کہ ایک مشرق کی دیوار کو گھور رہا ہے اور دوسرا چھت کو دیکھ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گونگے بہرے بیٹھے ہیں۔"

نازو نے کہا "جہاں دو برتن ہوں گے آواز تو ہو گی۔"

"بس جو برتن خالی ہو گا وہ زیادہ بولے گا" غالب نے پھر نازو کو چھیڑ دیا۔

"خدا کے لئے" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "ابھی تم رو رہی تھیں محترمہ۔ اور محترم آپ بھی تشویش میں مرے جا رہے تھے۔ ایک دم سب کچھ بھول گئے۔ مجھے تو تم دونوں ہی خالی برتن لگتے ہو۔"

غالب نے کچھ شرمندہ ہو کے سر کھڑکی سے نکالا اور بولا "ابھی تو بستی ہی چل رہا ہے۔"

نازو نے کہا "بستی نہیں چل رہا ہے۔ گاڑی چل رہی ہے۔"

میں نے اسے گھور کے دیکھا "اس سے زیادہ تمہاری زبان چل رہی ہے۔ چلو اندر چل کے مجھے ان دونوں سے ملواؤ۔ ہو اب ہم ہی۔"

"یعنی انہیں ہم سے ملواؤ" غالب نے کہا۔

چالیس فٹ لمبا فولادی کنٹینر اندر سے دس فٹ چوڑا اور دس فٹ اونچا تھا۔ جس حصے کو الگ کر کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والوں کے قیام کی جگہ بنا دی گئی تھی وہ لمبائی اور چوڑائی میں دس فٹ تھا۔ باقی تیس فٹ کی جگہ گھوڑوں کے لئے تھی۔ لمبائی کے رخ تین فٹ چوڑی راہداری تھی جس کے ایک جانب تو فولادی دیوار تھی۔ دوسری طرف چھ کیبن بنا دیئے گئے تھے۔ ہر کیبن کو دوسرے سے بالکل الگ کرنے کے لئے درمیان میں فولادی چادریں ویلڈنگ سے جوڑی گئی تھیں۔ غالباً ایک گھوڑے کو دوسرے سے بالکل الگ رکھنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ کبھی ایک بیمار ہو جائے تو دوسرے محفوظ رہیں۔ ہر گھوڑے کے لئے پانچ فٹ چوڑا اور آٹھ فٹ لمبا کیبن تھا جس میں ان کی ضروریات کے مطابق ہر چیز فراہم کی گئی تھی۔

نازو نے بیچ کا دروازہ کھولا اور پیچھے سے کاریڈور میں چلنے لگی۔ یہ گھوڑے بہت قیمتی تھے چنانچہ کنٹینر باہر سے بھی مقفل تھا اور اندر ہر گھوڑے کے کیبن کا دروازہ بھی۔ ریس کے گھوڑے

www.paksociety.com

مجھے کسی طرح بھی تانگے کے گھوڑے سے مختلف نہیں لگتے تھے کیوں کہ نہ مجھے ریس کا شوق تھا اور نہ شہسواری کا کہ میں ان کی نسلی صفات اور "خوبصورتی" کو سمجھ سکتا۔ ایک گھوڑے پر ہی کیا منحصر۔ عام ترین تو کبوتر یا بازکی بھی اعلیٰ و ادنیٰ اقسام میں فرق کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے گھوڑے دیکھنے میں کسی اشتیاق کا مظاہرہ نہیں کیا۔

نازو نے کہا "ان میں سے ہر گھوڑا لاکھوں کا ہے۔"

"گھوڑا لاکھوں کا ہو سکتا ہے۔ مگر میرے جیسے ہمہ صفت موصوف اور عیش نوجوان کی کوئی قدر نہیں۔ افسوس!" غالب نے کہا۔

"یار اپنا موازنہ گھوڑے سے مت کرو" میں نے کہا۔

"گھوڑے برا مانیں گے" نازو ہنسی اور چابی سے آخری کیبن کا قفل کھولنے لگی۔ ہوا کے لئے کوئی گزرگاہ نہیں تھی جتاں چہ دروازہ کھلا تو مجھے شدید حبس اور بو کا احساس ہوا۔ کیبن بہت صاف رکھے جاتے ہوں گے مگر پھر بھی ایک گھوڑے کے جسم سے خارج ہونے والے سارے مواد کی بو اس فضا میں رچ بس گئی تھی۔ کیبن ائر ٹائٹ نہیں تھے اس لئے گھوڑے دم گھٹنے سے ہلاک نہیں ہوتے تھے لیکن میرے خیال میں انہیں زیادہ تازہ ہوا کی ضرورت تھی۔ روشنی کے لئے آگے والی بوگی سے تار کا کنکشن لیا گیا تھا اور اس سے چوتیس وولٹ کے دو سارے بلب جل رہے تھے جو عام مسافر گاڑیوں کے ڈبوں کو روشن رکھتے ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اس کیبن میں کوئی گھوڑا نہیں تھا۔ فرش پر دو افراد انتہائی مضحکہ خیز انداز میں کرخت مشتعل بیٹھے تھے ان کے جسم پر ایک انڈرویئر کے سوا کچھ بھی نہیں تھا مگر اس سے بھی زیادہ ہنسی ان کے چہرے دیکھ کر آتی تھی جو سیاہی سے کالے کر دیئے گئے تھے۔

"یہ تمہاری حرکت تھی؟" میں نے کہا۔

نازو نے سر ہلایا "ہاں۔ میں نے انہیں اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ یہ کسی کو منہ دکھا سکیں۔ ویسے بھی یہ باہر نہیں نکل سکتے تھے۔"

"لیکن یہ شور مچا سکتے تھے۔ اندر سے کیبن کی دیوار بجانا شروع کر دیتے پھر؟" میں نے کہا۔

"نہیں باندھ کے ڈالا تھا" غالب نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"باندھا تو تھا" نازو نے کہا "یہ دستیاں تم نہیں اتری ہیں کیا؟"

"ایک ڈائیلاگ بولوں۔ اگر اجازت ہو؟"

"بولو بولو" میں نے کہا۔

"ایسے باندھا تھا جیسے مجھے پیار کی زنجیر سے باندھ کے بے بس کر دیا ہے۔ آزاد کیسے ہو گئے؟"

نازو نے کہا "ہنسی سے پوچھ لو میں نے دونوں کے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ دیے تھے اور پاؤں بھی۔"

میں نے کہا "یہ بہت قربانی ہے دار قسم کے لوگ لگتے ہیں بہر طرح بتلی بھی ہیں" غالب نے کہا۔

نازو مسکرائی "میں نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ حلق سے نکالی بار بار آوازوں پر گھٹے مارے تو سب سے پہلے تمہاری آواز کانوں تک پہنچے گی اور میں فوراً آ کر تمہیں پھر سلا دوں گی۔ ... صاحب کو معلوم ہے کہ میں ... لڑتی ہوں۔ انہوں نے ... ہوئے دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "ان میں سے ڈاکٹر کون ہے اور وزیر کون ہے؟"

"تمہارا کیا اندازہ ہے؟" نازو بولی۔

"ایک جیسے لباس فاخرہ میں ان کی مظلوم صورتوں کے تاثرات بھی ایک جیسے ہو گئے تھے مگر ان میں سے ایک زیادہ سنجیدہ، بردبار اور مہذب لگتا تھا۔ دوسرا چھچھورے کے رائج ... اور باکسر ٹائپ شخص تھا۔"

میں نے پہلے شخص کو ڈاکٹر قرار دیا اور دوسرے کو گورنر۔

"غلط" نازو ہنسی "الٹا چیتا ہے تم نے۔"

میں نے کہا "چہرے دیکھ کے دھوکا ہو جاتا ہے۔"

"اور اس کی سب سے زیادہ تباہ کن مثال تمہارا چہرہ ہے تمہارا نام بھی ہے" غالب نے کہا۔

میں نے ڈاکٹر سے کہا "تم کچھ نہیں بولو گے؟"

اس نے انگریزی میں جواب دیا "میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تم لوگ وہی کرو گے جو تمہارا دل چاہے گا۔ ... مرضی ہے یا اختیار میں کچھ ہوتا تو ہم یہاں اس طرح نہ ہوتے۔"

میں نے کہا "اگر تم تعاون کرو گے..."

"تعاون۔ مائی فٹ۔ زبردستی تم سب کچھ کرا سکتے ہو" اس نے میری بات کاٹ دی "لیکن وہ تعاون نہیں ہو گا۔ میں نکلتا نہیں ہوں۔ مجھے کوئی شکایت بھی نہیں ہے اس شخص سے جو ... باس ہے۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے؟"

"آئی ڈونٹ کیئر کہ وہ کیا کرتا ہے اور کیا نہیں کرتا۔ میرا اس کی سیاسی، کاروباری یا اخلاقی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ... کا وہ مجھے معاوضہ دیتا ہے اور جو کام میں کرتا ہوں وہ ... ہے۔ میں اس معاوضے سے بہت خوش ہوں اور بہت ... بھی۔ تم جیسے لوگوں کو تعاون کی بات کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔ میں تم سے تعاون کروں؟ لعنت ہے مجھ پر" ڈاکٹر ایک دم ... پڑا۔

میں نے کہا "اصولی طور پر میں تم سے اتفاق کرتا ہوں ... ہماری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ ان کی وضاحت ضروری نہیں ... بس اتنا جان لو کہ ہمارا یہ وعدہ ہے کہ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ خاموش بیٹھے رہو۔"

"میں خاموش ہی بیٹھا تھا۔ تم نے مجھے بولنے پر مجبور کیا" ڈاکٹر نے کہا اور گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔

"تم سالا گھوڑے چوری کرے گا؟" منسٹر نے زیادہ بے باد ... اور ... میں بات کی۔

"نہیں۔"

"پھر کیا ان کو مارے گا؟"

میں نے پھر نفی میں سر ہلایا "گھوڑوں نے ہمارا کیا بگاڑا ہے کہ ہم انہیں ماریں گے۔"

منسٹر حیران نظر آنے لگا "بابا پھر یہ سب کیا ہے۔ کس کا نوکر ہے تم؟ فیروز بھائی کا۔"

"کون فیروز بھائی؟"

"جس کا بلیک گولڈ اور کا ... بیٹا جیتا تھا لاسٹ مانتھ۔ اس لئے کہ ایکا ... گورنر اور چیف نہیں تھا۔ ابھی اس کا کوئی چانس نہیں۔"

میں نے کہا "نہ ہم کسی فیروز بھائی کو جانتے ہیں اور نہ کسی ریس کے گھوڑے کو۔"

وہ کنفیوز نظر آنے لگا "ابھی یہ لفڑا ہے۔"

میں نے کہا "کوئی لفڑا نہیں۔ آرام سے یہاں بیٹھو۔ چاہو تو سو جاؤ۔ تمہارے کپڑے بھی واپس مل جائیں گے۔ بھوک پیاس لگی ہے تو بتاؤ۔"

"مجھے چائے اور سگریٹ چاہئے" ڈاکٹر نے سر اٹھا کے کہا "مل سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں۔ میں تم دونوں کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری تم سے یا تمہارے گھوڑوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ نہ ہم اس قبیلے کے فرد ہیں۔ بس تم اپنی اور ہماری مجبوری کو سمجھتے ہوئے یہاں خاموش بیٹھے رہو۔ چالاک یا بہادر بننے کی کوشش کرو گے تو مارے جاؤ گے۔ یہ لڑکی ہی کافی ہے ایک ہاتھ مار کے تمہارا کام تمام کرنے کے لئے۔ تمہاری گردن ٹوٹ جائے گی۔"

منسٹر کا ہاتھ بے اختیار اپنی گردن پر گیا۔

"یہ مجھے بھی خاصی مضبوط گردن لگتی ہے تمہاری۔ دیکھنے میں یہ لڑکی بھی بہت معصوم صورت اور بے ضرر نظر آتی ہے۔ اس لئے تقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی جان بچاؤ۔"

"ہم کوئی خطرہ مول لینے کے عادی نہیں ہیں" غالب نے ریوالور نکال کے دکھایا اور جھوم کے پھر جیب میں رکھ لیا۔ یہ بہت عمدہ اور خالص ... کہا جا سکتا ہے۔ اللہ ڈرامائی تاثر تھا۔

نازو نے پھر دروازہ مقفل کیا اور ہم واپس چلنے لگے "یہ تو بہت کام سے نکلے" غالب نے مایوسی سے کہا۔

"بد معاش نہیں ہیں تو اس لئے ڈر گئے" نازو بولی۔

"پھر بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ دشمن کو کمزور سمجھنے والا مارا جاتا ہے۔ کیا پتا وہ حد سے زیادہ مکار اور عیار ہوں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر نے بھی صاف بات کی۔ منسٹر بھی اب کچھ مطمئن ہے۔ تم ان کے کپڑے واپس کر دو اور چائے تو خیر سب کے لئے بناؤ۔"

میں اور غالب واپس اپنے کیبن میں پہنچ کے ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ اس کیبن میں سونے کے لئے اوپر نیچے تین فٹ چوڑے تختے لگے ہوئے تھے دو ایک طرف۔ دو دوسری طرف۔ تیسری طرف کا نصف حصہ کچن سمجھا جا سکتا تھا جو چار فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا تھا۔ اتنا ہی بڑا دوسرا حصہ باتھ روم تھا۔ کچن کے ایک کونے میں مٹی کے تیل کا چولہا رکھا ہوا تھا اور اوپر بنے ہوئے شیلف میں برتن تھے۔ چائے کافی بنانے کا سامان تھا اور کھانے پینے کی مختلف چیزوں کے علاوہ سگریٹ اور شراب تک موجود تھی۔ جیون پرشار ایم ایل اے کے ملازم بھی عیش کر رہے تھے اور کیوں نہ کرتے۔ سرکاری عہدے کے اختیارات تھے۔ اسمگلنگ کی آمدنی تھی۔ ریس میں گھوڑے دوڑتے تھے تو صرف جیتنے کے لئے۔ ناجائز آمدنی کے سارے در کھلے ہوئے تھے اور مال حرام میں سے سب کو ان کی توقع سے بڑھ کر مل رہا تھا۔

ٹرین اب کافی تیز رفتاری سے چل رہی تھی لیکن ابھی تک بمبئی کے مضافات کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ گڈز ایکسپریس معلوم ہوتی تھی کیوں کہ تھانہ اور کلیان کے اسٹیشنوں سے رکے بغیر گزر گئی تھی۔ غالب نے جیب سے ایک نقشہ نکالا۔

"یہ کہاں سے آیا؟"

"یہیں سے ملا ہے" غالب نے کہا "ابھی کلیان۔ شاہ پور اور ریولالی تک پہنچی ہے۔ اس کے بعد ناسک۔"

"ریولالی اور ناسک کے درمیان ہم اپنا کام کر سکتے ہیں" میں نے نقشے پر غور کر کے کہا۔

"کیا محسن کو ہمارا ایکشن پلان معلوم ہے؟"

"نہیں۔ اسے تو بس گارڈ کو کنٹرول کرنا تھا۔"

"کہاں پہنچ کے۔ کتنی دیر بعد؟" غالب نے کہا۔

"میں نے اس کو سمجھا دیا تھا کہ جلدی نہ کرے۔ پچاس کلو میٹر کے بعد..."

"اسے کیسے اندازہ ہو گا کہ ٹرین پچاس کلو میٹر دور آ چکی ہے؟"

"یار اب وہ اتنی بے وقوف بھی نہیں ہے" میں نے کہا "دو اسٹیشن گزر گئے ہیں۔ اس نے دیکھ لیا ہو گا کہ ہم کتنی دور ہیں اس مقام سے جہاں سے چلے تھے۔"

"پچاس کلو میٹر کا فاصلہ طے ہو گا دو گھنٹے میں۔" غالب نے گھڑی دیکھی "اس وقت تک سورج نکل آئے گا۔"

"ہاں۔ تقریباً ساڑھے سات بجے ہوں گے۔"

www.paksociety.com

"پہل کون کرے گا؟"
"ظاہر ہے کہ گل ہی پہل کرے گی۔ وہ موقع محل دیکھ کے ریوالور نکال لے گی اور محسن کو حکم دے گی کہ تابوت سے نکل آؤ۔" میں نے کہا "گولی کے سامنے کوئی نہیں ٹھہرتا۔ گارڈ نے ہوشیار بننے کی کوشش کی تو گل اسے مار دے گی۔ رعایت یا تکلف کی گنجائش ہی نہیں۔ اس کی لاش ویسے ہی نیچے گر جائے گی ورنہ وہ اٹھا کے پھینک دیں گے۔ پھر گاڑی روک لیں گے بریک لگا کے۔"
"اس وقت تک ہم کچھ نہیں کریں گے؟"
"گاڑی رک جائے گی تو ڈرائیور خود اتر کے آئے گا۔ اور بھی جتنے لوگ ساتھ ہیں سب ہی اتر کے دیکھیں گے کہ بلاوجہ ٹرین جنگل میں کیوں کھڑی ہو گئی ہے۔ پھر ہم ان سے نمٹ لیں گے۔"
میں نے کہا "چلو باہر نکل کے تازہ ہوا میں بیٹھتے ہیں۔"
غالب نے سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا "ہمارے اور محسن کے درمیان کوئی رابطہ نہیں۔ یہ غلط ہے۔"
"رابطہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ ہمارے پاس دو عدد وائرلیس سیٹ ہیں مگر گل انہیں چھپا کے ساتھ نہیں رکھ سکتی۔"
"ایک وائرلیس تابوت کے اندر رکھا جا سکتا تھا۔ محسن باہر نکلتے ہی ہم سے بات کر لیتا۔ ہمیں بتا دیتا کہ اس نے گارڈ پر قابو پا لیا ہے۔" غالب نے کہا "ہم اسے ہدایات دے سکتے تھے۔"
"ہاں۔ یہ پلاننگ کی غلطی ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔
"مجھے تو ایک اور خیال پریشان کر رہا ہے۔"
"وہ کیا؟" میں نے کھلی بوگی کے فرش پر بیٹھ کے کہا۔
"کہیں ایسا نہ ہو کہ محسن پروگرام کے مطابق تابوت سے نکلے تو شملا کو دیکھ کر سب بھول جائے اور ہوش کھو بیٹھے۔"
میں نے کہا "اگر اس دوسرے تابوت میں واقعی شملا ہو گی تو ظاہر ہے اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اچھی بات یہ ہے کہ محسن اکیلا نہیں ہے۔ پاسبان عقل کی طرح گل اس کے ساتھ ہے۔"
نازو نے چائے لا کر دی تو ہم خاموشی سے پینے لگے۔ رات کے آخری پہر میں دور دور تک اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بمبئی شہر کی روشنیاں بھی افق کے پیچھے رہ گئی تھیں۔ ٹرین کی رفتار کا اندازہ میں نے تیس چالیس کلومیٹر فی گھنٹہ کیا۔ کھلی بوگی بہت لمبی تھی جہاں چھ چالیس فٹ کا کنٹینر رکھنے کے باوجود اس پر کافی جگہ بچ گئی تھی جو کسی پختہ آنگن کی طرح تھی۔ صبح کی نم آلود خنک ہوا میں چائے پیتے ہوئے میں نے خود کو بہت پرسکون محسوس کیا اگرچہ اس سکون کے پیچھے ایک پر آزار تصور تھا جس کا نقش مٹائے نہ مٹتا تھا۔ میں نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا پھر بھی میں دیکھ سکتا تھا کہ محسن اور شملا کس طرح دو تابوتوں میں ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے ہیں۔ زندہ ہونے کے باوجود مردوں کی طرح۔ شملا نہیں جانتی کہ اس نے محسن کو پا لیا ہے جو بہت پہلے ہمارے ساتھ نکلا تھا تو لوٹ کے گھر جانا ہی بھول گیا تھا۔ صرف اس کا خیال تھا اور امید تھی جس نے شملا کو زندہ رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ محسن کو نہیں معلوم کہ اس نے شملا کی زندگی دشمنوں کے پاس کب سے گروی رکھی ہے اور وہ دونوں مصائب کے ہر استحصال سے گزر کے آخر کار اس تک پہنچا ہے۔ حقیقت بھی بعض اوقات کتنی افسانوی اور ناقابل یقین ہوتی ہے۔
"مرزا جی!" میں نے کہا "مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ہم وقت ضائع کر رہے ہیں یہاں بیٹھ کے۔"
غالب نے کہا "پھر ایسا کرتے ہیں کہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔"
"یار! کہیں معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "چل ہم دیکھتے ہیں کہ صورت حالات کیا ہے۔ اگر گارڈ کے ڈبے میں کرنل بھی ہوا تو وہ بہت خطرناک دشمن ہے۔ شاید سب سے زیادہ خطرناک۔"
"کیا اس پر گولی اثر نہیں کرتی؟"
"اگر اس نے گل کو یا محسن کو پہچان لیا۔ تو ان کے کچھ کرنے سے پہلے ہی وہ کچھ کر بیٹھے گا۔ شملا اور اس کا بیٹا یرغمالی ہیں۔ اب تک محسن نے انہیں اس حالت میں نہیں دیکھا۔ کرنل عیار ہے۔ وہ محسن کو بیوی اور بچے کی جھلک دکھا کے پاگل کر سکتا ہے۔ پاگل پن میں اس سے سب کچھ کروا سکتا ہے۔ اس کے ہاتھوں ہم کو مروا سکتا ہے۔ ہمیں مروا سکتا ہے۔"
"ناممکن۔ محسن ایسا نہیں کر سکتا۔"
"وہ محسن نہیں ہو گا" ایک دیوانہ ہو گا جو کہ کرنل کے حکم کی تعمیل کرے گا۔ صرف بیوی بچے کی جان بچانے کے لئے وہ اس کی ہر شرط مان سکتا ہے۔" میں نے کہا "اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا ہے مرزا جی۔ کہ تابوت میں شملا اور اس کے بیٹے کو کرنل نے کسی خاص انتظام کے ساتھ سلایا ہو۔ کہ کوئی اور انہیں اٹھانا چاہے تو خود دنیا سے اٹھ جائے یا ان کی جان اپنے ہاتھوں سے لے لے۔ محسن باہر نکلتے ہی شملا کو دیکھے گا۔"
غالب ایک دم کھڑا ہو گیا "یہ بات تمہیں بہت پہلے سوچنی چاہئے تھی۔ اور سوچ لی تھی تو بتا دینی چاہئے تھی۔"
"ابھی وقت ہے۔ ہم اندھیرے سے فائدہ اٹھا کے زینے کے اوپر چلتے ہوئے آخر تک جا سکتے ہیں اور آخری بوگی کے اوپر سے جھانک کر گارڈ کے ڈبے میں ہونے والی سب کارروائی دیکھ سکتے ہیں۔"
نازو نے چلا کے کہا "پاگل ہو گئے ہو تم دونوں۔"
"سکندر کا تو مجھے علم نہیں، لیکن میں ضرور پاگل ہو گیا ہوں ایک لڑکی کے پیچھے" غالب نے کہا۔
"کون ہے وہ لڑکی؟" میں نے نازو کو چھیڑنے کے لئے کہا۔
"ہے ایک بھوت کی بچی" غالب نے کہا۔
لیکن نازو لڑنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ غم زدہ اور پریشان

"یہ فضول باتیں مت کرو۔ تم چلتی گاڑی کی چھت پر چڑھ کے مرنے کی سوچ رہے ہو۔ خودکشی کا کوئی آسان طریقہ کیوں اختیار نہیں کرتے۔"
غالب نے کہا "آسان طریقوں سے کئی بار مر چکے ہیں ہم لوگ۔"
میں نے اس کی تائید کی "ہاں۔ کبھی اس پر کبھی اس پر۔ اب اور کسی پر نہیں مر سکتے۔ چلو یار۔"
نازو نے ایک بار پھر ہمیں سمجھانے کی کوشش کی "غالب! تمہیں میری قسم۔ مت جاؤ۔ ان قیدیوں کو جانے دو۔ میں ایسی فضول قسموں کو نہیں مانتا جو آدمی ہوش میں نہ اٹھائے" غالب نے بے رخی سے کہا "تمہیں بھی میری قسم ہے جو آگے ایک لفظ کہا۔"
نازو خاموش ہو گئی۔ اس کی صورت کے تاثرات میں اس کے جذبات کا سارا تلاطم، دل کا سارا درد اور احساس کی تمام اذیت کے ساتھ بے بسی کا تمام عذاب شامل ہو گیا تھا۔ شاید اس کی جگہ رابعہ ہوتی تو وہ بھی مجھے روکنے کے لئے ایسے ہی آنسوؤں سے اور قسموں سے کام لیتی۔
اس سے پہلے کہ وہ رو پڑتی، میں نے نازو کے سر کے بالوں کو چھیڑ کے کہا "اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں ہے پاگل۔ ٹرین کی رفتار بہت کم ہے اور چھت پر چلنے کے لئے بہت جگہ ہوتی ہے۔ آدمی گر جائے تب بھی چھت پر ہی رہتا ہے۔ پھر اٹھ کے کھڑا ہو سکتا ہے۔"
"یہ کوئی پل صراط نہیں ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز" غالب نے کہا۔
جذبات کا سرکش ریلا ضبط کا بند توڑے بغیر گزر گیا تھا۔ نازو نے ایک گہری سانس لی اور غالب کی طرف دیکھا "تم ہو بہت کمینے۔ قسم کو مانتے بھی نہیں اور ساتھ ہی قسم دیتے ہو۔"
"قسم کو تم تو مانتی ہو نا" غالب نے کہا "کتنی اچھی بات ہے کہ تم کمینی نہیں ہو۔ کتنا غلط ہوتا اگر دو کمینے اکٹھے ہو جاتے زندگی بھر کے لئے۔"
میں نے کہا "ہاں۔ وہ جو شعر ہے نا کہ۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ وہ تو بس شاعر کا فریب خیال ہے۔ دو دیوانے اکٹھے ہوں گے تو ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑیں گے۔ پھر سر پھاڑ دیں گے۔ خوب خاک گزرے گی۔ ایک دیوانہ ہو تو دوسرے کو ہوشیار ہونا چاہئے۔"
"یعنی رابعہ ہوشیار ہے اور تم دیوانے ہو۔ ادھر میں ہوشیار ہوں اور یہ..."
"اب پیچھے جاؤ چھت سے ورنہ......" نازو نے اس کا مطلب سمجھ کے جملہ پورا ہونے سے پہلے کہا۔
"ورنہ کیا۔ میری جگہ تم چلی جاؤ گی؟ جاؤ اگر ہمت ہے تو۔"
"ہمت تم سے کم ہے کیا؟" نازو فوراً تیار ہو گئی۔
میں نے اسے بڑی مشکل سے اندر بھیجا۔ پھر میں اور غالب بوگی کے آخری حصے تک گئے۔ اس سے اگلی بوگی تک پہنچے بغیر ہم چھت پر نہیں چڑھ سکتے تھے۔ غالب نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں نے توازن برقرار رکھتے ہوئے دونوں بوگیوں کو ملانے والے بمپرز پر قدم رکھا اور دوسرا ہاتھ بڑھا کے اگلی بوگی کے ایک ہک کو تھام لیا۔ پھر میں نے ایک ہاتھ بڑھایا اور غالب کو کھینچ لیا۔ باری باری ہم نے ایک سے دوسرے ہک پر قدم رکھا اور چلتی ہوئی بوگی کی چھت پر چڑھ گئے۔ مال گاڑی ایک ہی رفتار سے چلتی جا رہی تھی۔ اگر اس وقت ڈرائیور بریک لگا دیتا تو شاید جھٹکے سے ہم دونوں بوگیوں کے بیچ میں گرتے اور پھر جو کچھ ہوتا اس کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی تھا۔
مال گاڑی میں میرے اندازے کے مطابق تیس چالیس بوگیاں تھیں اور ہم نے اپنا سفر درمیان سے شروع کیا تھا چنانچہ ہمیں پندرہ بیس بوگیوں کی چھت پر سفر کرتے ہوئے آخر میں لگے ہوئے گارڈ کے ڈبے تک پہنچنا تھا۔ سب دائیں بائیں جھول رہے تھے اور ان پر سیدھا چلنا مشکل کام تھا۔ ہر بوگی اوپر سے بالکل سیدھی نہیں تھی۔ اس کا درمیانی حصہ کچھ اوپر اٹھا ہوا تھا اور چھت دونوں جانب قوس کی شکل میں ڈھلی ہوئی تھی۔
ہم نے ایک بوگی کا فاصلہ طے کر کے دوسری بوگی تک پہنچنے کے لئے چھلانگ ماری اور بڑی مہارت کے ساتھ اپنا توازن برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ آٹھ بوگیوں کے بعد اچانک آئل ٹینکر آ گیا۔ یہ ایک گول بوگی تھی اور اس کی چھت پر تیل ہی تیل تھا جو گرد شامل ہونے سے گریس کی طرح ہو گیا تھا۔ غالب نے پہلے چھلانگ لگائی۔ میں نے اسے قدم جمانے کے بجائے پھسلتا دیکھا......
غالب نے بڑی پھرتی سے سائڈ میں لگے ہوئے فولادی زینے پر ہاتھ ڈال دیا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو شاید میں اپنی آنکھوں سے اس کی موت کا وہ بھیانک منظر دیکھتا جسے میں زندگی کی آخری سانس تک تصور سے کسی طرح بھلا نہ پاتا۔ وہ چلتی ٹرین سے گرتا تو سر کے بل سلیپروں یا ان کے دونوں جانب بچھے ہوئے پتھروں سے ٹکراتا اور اس کا جیتا جاگتا وجود ایک شکستہ ہڈیوں کا مجموعہ اور پچکے ہوئے لہو آلود جسم کا انبار بن جاتا جسے میں ہر پل اپنی نظروں سے دور ہوتا دیکھتا رہتا اور کچھ بھی نہ کر پاتا۔ اس کی لاش وہیں اپنی بے کسی پر نوحہ خواں اور بے حسی یاران وطن پر شکوہ کناں پڑی رہتی۔ نہ جانے کون اس کی لاوارث لاش اٹھاتا اور کہاں کس عقیدے اور دستور کے مطابق سپرد خاک کرتا یا جلا کے راکھ کرتا۔ ہمیں کبھی معلوم نہ ہوتا۔
حقیقت یہ ہے کہ ایک پل میں پر وحشت خیالوں کا جو ریلا میرے ذہن سے گزرا اس نے زندگی پر میرے یقین کی بنیادوں کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے جو کچھ سوچا اور محسوس کیا وہ ایسا ہی تھا جیسے

www.paksociety.com

عمراً میں نے اپنی آنکھوں سے ہوتا دیکھا ہے۔ مجھے زندگی کی بے ثباتی کے بارے میں بہت سے لوگوں کا کہا ہوا یاد آیا۔ یک نفس بھی نہیں فرصت ہستی غالب۔ آدمی بلبلا ہے پانی کا۔ اک مشت خاک ہے کہ تماشا کہیں جسے......

غالب نے تالی بجا کے کہا "اے بھائی! کیا ہو گیا ہے تجھے۔ جام کیوں ہو گیا؟"

میں چونکا "وہ.... کچھ نہیں۔ کچھ ایسے ہی سوچ رہا تھا" میں نے کہا "تو ڈر گیا ہے کیا؟"

میں نے ایک جست لگائی اور غالب کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "ہاں یار میں واقعی ڈر گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے واقعی خوف نے مجھے منجمد کر دیا تھا۔ جب تو پھسل گیا تھا...... میں بتا نہیں سکتا کہ میرے ذہن میں کیسے کیسے عذابناک خیالات اس ایک لمحے میں آ کے گزر گئے۔"

غالب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "اس ایک لمحے کے لئے تو ہم سب کو تیار رہنا چاہئے۔ ہر جگہ۔ ہر وقت۔ ہم میں سے کون دست قدرت کی تحریر میں زندگی کی ضمانت کے ساتھ گھر سے نکلا تھا...... چل آ جا۔ وہ لمحہ ٹل گیا۔ اب آگے نظر رکھ۔ آنے والا ہر لمحہ اس سے زیادہ صبر آزما ہو سکتا ہے۔"

ہم نے سنبھل سنبھل کے کول آئل ٹینکر کے عین وسط میں رہتے ہوئے اگلی بوگی تک سفر کیا۔ ٹرین کی رفتار سے ہمیں بہت مدد ملی جو نہ کم ہو رہی تھی اور نہ زیادہ۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ہوائی جہاز میں کیپٹن "اٹینشن" سیٹ کر کے اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے۔ ایسے ہی مال گاڑی کے انجن کا ڈرائیور بھی رفتار وغیرہ کو متعین کر کے سکون سے بیٹھا ہوا ہے۔

ایک بوگی پر سے گزرتے ہوئے ہمیں تین چار منٹ لگ جاتے تھے چنانچہ جب ہم آخری بوگی تک پہنچے تو افق پر صبح صادق کا اجالا بڑھ گیا تھا۔ یوں بھی ساحلی افق نسبتاً کم تاریک ہوتا ہے۔ ٹرین کے دونوں جانب غیر آباد علاقے میں کہیں کہیں کھیت کھلیان اور کہیں اکا دکا مکان نظر آ جاتے تھے۔ سحر خیز دیہاتی منہ اٹھا کے گزرتی ہوئی ٹرین کو اور پھر اس کی چھت پر ہمیں مخالف سمت میں رواں دیکھ کر حیران ضرور ہوتے ہوں گے کیوں کہ ایسا تماشا روز کہاں نظر آتا ہے۔

گارڈ کی بوگی پر چھلانگ مارنے سے پہلے میں نے کہا۔ "مرزا جی! تمہارے کان کچھ سن سکتے ہیں؟"

"ہاں۔ چند آوازوں کے سوا۔ مثلاً چیونٹی کی آواز۔ میرے کان سب سن سکتے ہیں۔"

"یار اتنی خاموشی کیوں ہے؟"

"خاموشی" مرزا غالب نے بڑے دکھ سے کہا "دوست تو بہرا ہو گیا ہے اگر اتنا شور بھی نہیں سن سکتا۔"

"مجھے محسن اور گل کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے" میں نے بہتر سمجھا کہ اس کی بات کو نظر انداز کر دوں۔

"مجھے تو گارڈ اور راجہ کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی ہے" غالب نے اسی غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"یار اب تک محسن نکل آتا اپنے تابوت سے۔ تو کیا وہ بس خاموش بیٹھے؟"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک وہ مدفون ہے اور اس بیچارے کو موقع نہیں ملا ہے۔"

"نہیں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ گارڈ ابھی تک خیر و عافیت ہے" میں نے کہا "زندہ ہے۔ ہوش میں ہے اور جاگ رہا ہے۔"

"جاگ رہا ہے" منہ کالا تھا۔"

"ہم چھت پر کودیں گے تو کیا وہ چونکے گا نہیں؟ کہ یہ دھما کا تھا۔"

"اس کو چونکنا چاہئے۔ اور باہر نکل کے دیکھنا چاہئے کہ یہ پر اڑنے والی مخلوق اتری ہے یا خدائی مخلوق۔ اور جب وہ باہر آئے تو محسن گل بانو کی ناقص عقل میں بھی یہ بات آ جانی چاہئے کہ اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا۔ لیکن دوست! ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ ہمارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا اور اپنے سوچنے سے تو آ جائے گا کوئی اسپیشن۔"

"او کے۔ اب جو ہو سو ہو" میں نے کہا اور گارڈ کے اوپر کود گیا۔ تقریباً ایک ساتھ ہم نے ریوالور نکالے اور چھت پر لیٹ کر چھپکلی کی طرح رینگتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں نے کنارے سے سر نکال کر دیکھنے سے پہلے چند سیکنڈ انتظار کیا کہ شاید کوئی پکارے کہ کون ہے اوپر؟ مگر کسی کی آواز سنائی نہ دی تو میں نے گردن دراز کر کے نیچے دیکھا۔

گارڈ کے ڈبے کا کھلا پلیٹ فارم خالی پڑا ہوا تھا۔

میں نے غالب کے کان میں آہستہ سے کہا "یار یہ کیا ہو رہا ہے؟"

غالب نے میرے کان میں جواب دیا "عجیب بات ہے یار! کہ کوئی حوصلہ افزا نہیں ہوا۔"

"کیا یہ ہو سکتا ہے کہ گارڈ بابو سو گئے ہوں اور گل کی آنکھ لگ گئی ہو؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "یہ ناممکن ہے۔ نہ ٹرین کا گارڈ سو سکتا ہے۔ اور نہ گل کو ایسے وحشتناک ماحول میں نیند آ سکتی ہے جب کہ وہ دو تابوتوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔"

"ہاں۔ اس کے لئے تو یک نہ شد دو شد والی بات ہو گئی ہے" میں نے کہا "ایک محسن کو تابوت میں دیکھنا ہی کم اذیت ناک نہ تھا کہ دوسرے تابوت میں شملا آ گئی۔"

غالب نے آخر کار وہ بات کہہ دی جو میرے دل میں بھی تھی مگر میں کہتے ہوئے ڈرتا تھا "مجھے معاملہ گڑبڑ نظر آنے لگا ہے"

میں نے صرف تائید کے طور پر سر ہلایا۔

"تم مشورہ لو گے یا حکم دو گے۔ تمہارا ڈبل رول ہے۔ ایک دست نگاہ کا اور ایک مشن کمانڈر کا ورنگ"

"آتش نمرود میں کودنے کے لئے نہ کسی کے مشورے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ حکم کی" میں نے کہا اور چھت پر سے بوگی کے فرش پر چھلانگ مار دی۔

میرے قدموں نے فرش کو چھوا ہی تھا کہ میں اسپرنگ کی طرح اچھل کر گھوما اور ریوالور کا رخ اس حصے کی طرف کر کے کھڑا ہو گیا جہاں میرے یقین کے مطابق گارڈ کو گل اور محسن کو شملا اور اس کے بیٹے کو ہونا چاہئے تھا لیکن ایک گارڈ کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ گارڈ بھی فرش پر الٹا پڑا تھا اور یقیناً مر چکا تھا۔ وہ تابوت جس میں ہم نے محسن کو لٹایا تھا اب کھلا پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف بھی ایک تابوت تھا جسے میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔

دراصل شیشے کا وہی تابوت تھا جس کے اندر میں نے کچھ عرصہ پہلے شملا کو اور اس کے بیٹے کو خواب آور دواؤں کے زیر اثر ساکت و صامت دیکھا تھا۔ یوں جیسے وہ سو نہیں رہے تھے بلکہ مر چکے تھے۔ یہ بہت پرانی بات ہو گئی تھی مگر مجھے آج بھی اس دن کا تصور لرزا دیتا تھا جب اس کے اور میرے درمیان فولادی سلاخیں حائل تھیں۔ اس طرح کہ میں شملا اور اس کے بیٹے کو بے بسی سے دیکھا رہنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نہ انہیں چھڑا سکتا تھا نہ آواز دے کر بیدار کر سکتا۔ وہ تابوت میں قید تھی اور میں اسے قید کرنے والوں کی قید میں تھا۔

لیکن آج وہی شیشے کا تابوت میرے سامنے خالی پڑا ہوا تھا اور اس کا صرف نصف حصہ سلامت تھا جس سے میں نے اسے پہچانا۔ باقی نصف ٹوٹے ہوئے شیشے کی صورت میں بکھر گیا تھا۔ گارڈ ان شیشے کی کرچیوں کے اوپر اور دونوں تابوتوں کے درمیان تھا۔

میں نے اسے پلٹ کر غور سے دیکھا۔ وہ صرف بے ہوش تھا۔ غالب نے کہا "یہ زندہ ہے۔ میں نبض دیکھ چکا ہوں۔"

میں نے کہا "مرزا! یہ کیا ہو گیا؟ یہ سب کیا ہے۔"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا" غالب نے کہا جو مجھ سے زیادہ پریشانی میں مبتلا تھا "آخر سب لوگ کہاں گئے؟"

"اس تابوت میں شملا تھی" میں نے کہا "یہ وہی تابوت ہے جس میں غالب اس کا بیٹا بھی تھا۔ اسی تابوت میں...."

"اگر محسن بھی تابوت سے نکل گیا تھا۔ تو پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ کہاں گیا وہ۔ کیا انہیں اغوا کر لیا گیا ہے؟"

میرے پاس اس کے ہر سوال کا جواب دوسرا سوال تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے میرے ہر سوال کا جواب اس کا وہی سوال تھا۔ شاید کسی نے ہمیں اپنی گرفت میں لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہم ادھر بے فکری سے بیٹھے جاتے چھتے تھے اور یا لکل مطمئن تھے کہ سب ہمارے پلان کے مطابق ہو رہا ہے لیکن دوسری طرف کیا ہو گیا تھا اس کی ہمیں کوئی خبر نہ تھی۔ اب مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ مجھ سے کیسی خوفناک غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے اور محسن کے درمیان کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ حالانکہ یہ ہو سکتا تھا۔ غالب نے تجویز کیا تھا کہ ہم ایک واکی ٹاکی محسن کے تابوت میں رکھ سکتے تھے۔ پھر شاید کوئی ہمیں ضرور بتا دیتا کہ صورت حال قابو سے کیسے باہر ہو گئی ہے۔ کیا شملا کو اور اپنے بیٹے کو دیکھ کر محسن کا دماغ الٹ گیا تھا اور اس نے عالم وحشت میں تابوت توڑ کے شملا کو نکال لیا تھا؟ اگر ایسا ہوا تھا تو پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ شملا تو اسے محو خواب ملی ہو گی اور اس کا بیٹا بھی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ ان کو بغل میں دبا کے ٹرین سے کود کر بھاگ گیا ہو۔ اگر شملا ہوش میں ہوتی تب بھی یہ ناممکن تھا۔ گارڈ کو کس نے ناک آؤٹ کیا تھا؟ اگر یہ کام گل نے کیا تھا تو وہ خود کہاں غائب ہو گئی؟ کیا محسن کی شملا کے لئے دیوانگی دیکھ کر وہ اتنی مایوس ہو گئی کہ اس نے اپنی تمام محرومیوں کا علاج زندگی سے محروم ہونا سمجھ لیا اور...... نہیں۔ یہ سب مفروضات اور اندیشے غلط تھے بے بنیاد تھے اور غیر منطقی تھے۔ ہم محسن کو جانتے تھے شملا کو اور گل کو جانتے تھے۔ ان میں سے ایک پاگل ہو جاتا اور عقل و ہوش سے بیگانگی کا مظاہرہ کرتا تو باقی دو اسے سنبھال لیتے۔

غالب بھی خاموش تھا اور میں اس کی صورت پر اس کے خیالات کا ہر تاریک سایہ یوں دیکھ سکتا تھا جیسے اندھیری رات میں انسان کی نظر بادلوں کے سرمئی اور کالے رنگ کا ہر شیڈ دیکھ سکتی ہے۔

"اس کو ہوش میں لانا ضروری ہے۔ صرف یہی بتا سکتا ہے ساری بات" غالب نے کہا

"ہاں۔ بات تو یہی ہے۔ ابھی تو ہو نہیں سکتی" میں نے بے خیالی میں سر ہلایا "پھر بھی......"

"ٹرین تو کہیں رکی بھی نہیں ہے۔"

"وہ چلتی گاڑی سے نہیں کودے ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے"

"گڑبڑ وہیں ہو گئی۔ روانگی سے پہلے۔"

میں نے کہا "دیکھ یار! پانی لا۔ چھینٹے مار اس کے منہ پر۔"

غالب نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک واٹر کولر سے گلاس بھر لایا۔ اسی وقت ٹرین کی رفتار میں کمی آ گئی۔

"ٹرین رکے گی یہاں؟"

"ایسا ہی لگتا ہے" میں نے کہا اور کنارے سے سر نکال کے آگے دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے کچھ نظر نہ آیا۔

"کیا کوئی سگنل ہے؟" غالب نے چلو بھر کے گارڈ کے چہرے پر چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا۔

"نظر تو نہیں آیا ابھی تک۔"

"ابھی ایولانی تو نہیں آ سکتا" غالب نے کہا۔

"مجھے کیا معلوم" میں نے کہا "ہم نے نہ شاہ پور گزرتا دیکھا

www.paksociety.com

اور نہ کھمباں کا اسٹیشن۔"

گارڈ تھوڑا سا کراہنے لگا "اسے ہوش آرہا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے ایک سگنل کی لال روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ آؤٹر سگنل ہوگا۔"

گاڑی کی رفتار بتدریج کم ہو رہی تھی۔ فولادی پہیوں پر بریک لگنے سے پیدا ہونے والی چرچراہٹ کی آوازیں بلند ہو گئی تھیں۔

"گارڈ اب ہوش میں آبھی گیا تو اس کے حواس اتنی جلدی بحال نہیں ہوں گے۔"

"پھر کیا کرنا چاہیے؟" غالب نے کہا۔

"ہمیں یہ تختہ صاف کر دینا چاہیے۔ اور اس تابوت کو بھی پھینک دینا چاہیے" میں نے کہا "اگلا اسٹیشن آنے سے پہلے۔"

"اسٹیشن آنے سے پہلے؟"

"ہاں۔ ورنہ معاملہ مشکوک نظر آئے گا" میں نے کہا اور تابوت کا نصف حصہ اٹھا کے دوسری پٹڑی پر پھینک دیا جو ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ایک چھناکا ہوا اور وہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اتنی دیر میں غالب نے وہ تابوت کھینچ لیا جس میں ہم نے محسن کو بند کیا تھا۔ اس نے تابوت کو بھی پٹڑی پر پھینک دیا۔ میں ہاتھ پر ایک کپڑا لپیٹ کر شیشہ سمیٹنے لگا۔

"کوئی ٹرین آرہی ہے سامنے سے" غالب نے کہا

"تابوت کو دوسری طرف ڈالنا تھا۔ عقل مند آدمی۔"

"یہ خیال نہیں رہا۔ تم نے جو کیا ویسا ہی میں بھی کر بیٹھا" غالب نے پریشانی سے کہا "اب کیا ہوگا؟ ٹرین الٹ تو نہیں جائے گی۔"

"لکڑی کے ایک باکس سے؟ نہیں" میں نے کہا "کتنی دور ہے ابھی ٹرین؟"

"پتا نہیں۔ بس روشنی نظر آرہی ہے۔"

"ہو سکتا ہے اسٹیشن پر رکی ہوئی ہو" میں نے شیشے کی کرچیوں کے ڈھیر کو باہر کی جانب کر دیا۔

"دیکھو یار کہیں ہاتھ نہ کٹ جائے۔ جھاڑو یا برش جیسی کوئی چیز نہیں ہے کیا؟"

"نظر تو نہیں آئی۔ تلاش کرنے میں وقت ضائع ہوگا۔ میں نے گارڈ کے کپڑے ہاتھ پر لپیٹ دیے ہیں" میں نے کہا اور احتیاط کے ساتھ بڑے ٹکڑے اٹھا کر پھینکنے کے بعد چھوٹی کرچیوں کو پیر سے کھسکا کے نیچے گرا دیا۔ صرف باریک باریک ذرات اور دور دور تک کونوں میں چپکے ہوئے چھوٹے ٹکڑے باقی رہ گئے تو میں نے ہاتھ پر لپٹے ہوئے کپڑوں کو کھول دیا۔ یہ گارڈ کے ذاتی استعمال کے کپڑے تھے۔ سلیپنگ سوٹ کا پجامہ اور قمیص۔ شیشوں کی وجہ سے کٹ جانے کے بعد یہ استعمال کے ناقابل ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں جھاڑن کی طرح فرش پر رگڑ کے باقی صفائی بھی کر دی۔ اب گارڈ کے قریب

میں شک پیدا کرنے والی کوئی چیز نہیں رہی تھی۔ اسی وقت گاڑی جھٹکا لے کر رک گئی۔

"یہ گاڑی کیوں کھڑی ہو گئی ہے آخر؟"

"میرا خیال ہے کہ پہلے وہ گاڑی گزرے گی جو اسٹیشن پر کھڑی ہوئی ہے" غالب نے کہا "وہ کوئی مسافر گاڑی ہوگی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ بڑا اسٹیشن ہوگا ورنہ مسافر گاڑی دیر تک نہ رکی رہتی" میں نے غور سے اس تیز روشنی کو دیکھا جو ایک مسلسل روشنی تھی اور ساکت محسوس ہوتی تھی۔ یہ انجن کی لائٹ تھی۔ اس کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"اگر یہ مسافر ٹرین ہوئی تو ظاہر ہے لائن پر تابوت دیکھ کر رک جائے گی۔"

میں نے کہا "مال گاڑی ہوئی تب بھی رک جائے گی۔"

"بشرطیکہ ڈرائیور کی نظر سے پٹڑی پر کوئی چیز دیکھی اور بریک لگانے میں کامیاب رہا۔ ورنہ......"

"ورنہ کیا؟ پرخچے اڑ جائیں گے تابوت کے۔ انجن کے آگے جو ایک جالی سی ہوتی ہے اور وہ گائے بھینس کو بھی پہیوں کے نیچے نہیں آنے دیتی۔ گھسیٹتی ہوئی آگے لے جاتی ہے" میں نے کہا "تابوت کسی بھینس سے زیادہ بڑا اور وزنی تو نہیں۔ وہ بھی کب سے ٹوٹ گیا ہوگا۔"

"پھر بھی ڈرائیور دیکھے گا تو سوچے گا کہ کیا چیز ہے جو اسے دکھی گئی تھی" غالب نے کہا۔

"اب دیکھتا ہے تو دیکھے۔ اس کو اندازہ ہو ہی جائے گا کہ وہ لکڑی کا خالی باکس تھا یا تابوت تھا۔ کوئی کٹی ہوئی لاش ملتی تو معاملہ سنگین ہوتا۔ اس فضول سی چیز کے لیے تفتیش نہیں کی کیونکہ نقصان کوئی نہیں ہوا۔"

تابوت کوئی دو فرلانگ پیچھے رہ گیا تھا۔ میں نے مال گاڑی کے انجن کو دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے صرف روشنی دکھائی دی۔ اندھیرے جنگل کے دونوں جانب پھیلی ہوئی تھی۔

"مرزا جی! اگر یہ ٹرین بھی اسٹیشن پر رکی تو کیا ہوگا؟" غالب نے کہا۔

"کیا ہوگا؟"

"میں کبھی ریلوے گارڈ نہیں رہا۔ میں کیا جانوں۔"

"اتفاق سے ان چیزوں کے ساتھ کبھی ایسا ہوا کہ ماں باپ ڈاکٹر تھے اور میں ایم آر والوں کے چکر میں پڑنے سے پہلے" غالب بولا "مجھے بھی نہیں معلوم کہ گارڈ کے فرائض کیا ہوتے ہیں اور اسے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

میں نے گارڈ کی طرف دیکھا جو ہوش کی طرف واپس آرہا ہے گارڈ تھا۔

"فرض کرو اسٹیشن پر مال لوڈ کیا گیا یا اتارا گیا۔ تو وہ کاغذی کارروائی ہوگی۔"

"خبیث اتنی دیر کیوں لگا رہا ہے آخر ہوش میں آنے میں" غالب نے جھک کر اس کے منہ پر آہستہ آہستہ تھپڑ مارے "ارے اٹھو۔ بہت ہو گیا آرام۔"

میں نے چٹکی بجا کے کہا "مرزا! تم چیک تو کرو کہ اس کی بے ہوشی اصلی ہے یا محض اداکاری۔"

غالب نے تلاش کر کے شیشے کا ایک چھوٹا سا نوکیلا ٹکڑا اٹھایا۔ اس کی نوک سے غالب نے گارڈ کی ناک کو چھوا کر اس کا کوئی ردعمل تو نہیں ہوا۔

میں نے کہا "دیر ضرور ہے۔ اس کے گزرنے تک ٹرین چل پڑے گی۔"

غالب نے مایوسی سے سر ہلایا "جھوٹ سرتا پا ہے اور فاسق تر ہے۔"

اسی وقت مجھے خیال آیا کہ کہیں گارڈ نے وہ بات تو نہیں سن لی جو میں نے غالب سے کہی تھی۔ وہ قیمت کے لیے تیار تھا اس لیے ابھی تک نہیں تو کہے بیٹھے کی چبھن کو برداشت کر گیا۔ میں نے اس کے پھٹے ہوئے کپڑوں کا ایک دھاگا کھینچ کر بل دیا اور دبے پاؤں گارڈ کے قریب جا کے دھاگا اس کی ناک میں ڈال دیا۔

اس کا RESPONSE بالکل نارمل تھا۔ ایک عام آدمی کی طرح نیند میں ہوتا اس نے سر کو دائیں بائیں جھٹکا لیکن آنکھیں نہیں کھولیں۔ غالب نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

ساتھ والے ٹریک پر تیز روشنی پڑ رہی تھی اور وہ ٹرین قریب آتی ہوئی ٹرین کے شور میں ہونے والے مسلسل اضافے کو محسوس کر رہا تھا۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ٹرین ہمارے قریب سے گزرنے والی تھی۔

میں اٹھ کھڑا ہوا "ایسے تو پتا نہیں چلتا یار۔ اب تو صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں اس کے کپڑے پہن لیتا ہوں" میں نے گارڈ کو سنانے کے لیے صاف اونچی آواز میں کہا اور نگاہ اس کے چہرے پر مرکوز کر دی۔

غالب میری بات کا مدعا سمجھ گیا "اور اس کا کیا ڈسپوزل ہوگا؟"

"فالتو چیزوں کا ڈسپوزل کیا ہوتا ہے؟ اسے ہم پھینک دیں گے ٹرین کے سامنے۔"

"ڈرائیور دیکھ لے گا۔"

"یار میں آنے والی ٹرین کی بات نہیں کر رہا تھا۔ تم بھی احمق ہو" میں نے کہا۔

اسی وقت مسافر ٹرین دندناتی ہوئی ہمارے قریب سے گزر رہی اور اس کے شور میں میری آواز دب گئی۔ مسافر گاڑی کے باہر کی لائٹ روشن تھی مگر کھڑکیوں کے پیچھے اندھیرا تھا جس کا مطلب

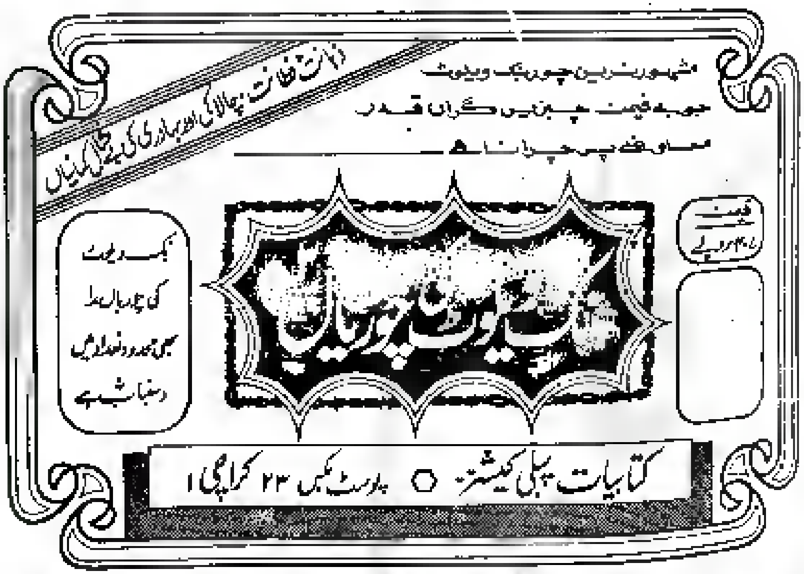

www.paksociety.com

تھا کہ سب مسافر لائٹ بجھا کے سو رہے ہیں۔ جو نہیں سو سکتے ہوں گے وہ بھی خاموش لیٹنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔

مال گاڑی نے ایک جھٹکا لیا تو میں نے پیچھے ہٹ کے دیکھا۔ آؤٹر سگنل کی روشنی سبز ہو گئی تھی۔

غالب کی نظر دم بدم دور ہونے والی مسافر گاڑی پر تھی۔ پھر اس نے بڑی مسرت کے ساتھ اعلان کیا "ٹرین نہیں رکی۔"

"شکر ہے۔ نوبت تو پڑ نہ گیا ہوگا" میں نے کہا اور گارڈ کے کپڑے اتارنے لگا "ٹرین ذرا اسپیڈ پکڑ لے تو اس کو نیچے گرا دیں گے۔ بعد میں آنے والی کوئی گاڑی اس کا قیمہ بنا دے گی۔"

میری بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ گارڈ ایک دم اٹھ بیٹھا۔

"بڑی جلدی ہوش آیا" غالب نے ایک لات مار کے اسے ایک غلیظ گالی دی۔

گارڈ کراہنے لگا "مجھے مت مارو۔"

"اور پھر کسے ماریں؟" غالب نے اس کی پسلیوں میں دوسری ٹھوکر ماری۔ "سور کے بچے! اکڑ کر رہا تھا۔ سیدھا کھڑا ہو جا۔"

وہ اٹھتے ہوئے لڑکھڑایا مگر سنبھل کے کھڑا ہو گیا اور پتلون کے بٹن بند کرنے لگا "دیکھو۔ تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کروں گا۔ جب گاڑی اسٹیشن پر رکے گی۔ مجھے ٹرین دینا بھی ہوگا اور لینا بھی۔ ہر اسٹیشن پر یہ کام تم نہیں کر سکو گے۔"

"اگر کام اتنا ہی ہے تو ہم کر لیں گے" میں...

"تمہیں کوئی نہیں جانتا" وہ ہانپتے ہوئے بولا "اگر تم نے ایک اسٹیشن گزار دیا تو اگلے اسٹیشن پر ٹرین کے پہنچنے سے پہلے تمہارے استقبال کی پوری تیاری ہوگی۔ تمہارے وہ ریوالور تمہیں نہیں بچا سکیں گے۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا اور غالب نے میری طرف۔ شاید گارڈ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ جان کے خوف نے اسے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"اچھا تو پھر تیار رہو جاؤ" میں نے کہا "اسٹیشن پر کسی کو تمہاری صورت سے یا حالت سے کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔"

غالب نے اسے دھکیل کر باہر کھڑا کر دیا "ہم اندر سے تم پر نظر رکھیں گے۔ کوئی آئے تو اس سے ہندی یا انگریزی میں بات کرنا۔"

"میری گولی کا نشانہ تمہارا سر ہوگا" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "میں دل کو نشانہ بناؤں گا۔"

"اگر تمہاری زبان سے ایک بھی غلط لفظ نکلا۔ یا تمہاری کسی حرکت پر ہمیں شک ہوا تو...."

"میں وعدہ کر چکا ہوں۔ اس لیے کہ نوکری کی تھوڑی سی تنخواہ کے لیے میں مرنا نہیں چاہتا۔ تیس سال گزر گئے اب تو پنشن ہونے والی ہے" وہ گڑگڑانے لگا۔

میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا طمانچہ مارا "بے مطلب بن کے الو مت بناؤ ہمیں۔ تم ریلوے کے ملازم نہیں تربیتی کے زر خرید غلام ہو۔ جتنی پنشن تمہیں ریلوے دے گی اس سے کہیں زیادہ تم کو مل چکا ہو گا۔ اور پھر بھی ملتا ہو گا۔ سب معلوم ہے ہمیں۔"

ٹرین ایک اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچ چکی تھی اور رکنے ہی والی تھی۔ میں اور غالب دروازے کے دونوں طرف چھپ کر کھڑے ہو گئے۔

"گارڈ پریشان ہو گی" غالب نے آہستہ سے کہا۔

"جانے دو اسے۔ تسلی دے آؤ گلے لگا کے" میں چڑ گیا "میں تو اس کی پریشانی کا کوئی علاج ہے نہیں۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم کوئی مٹھائی کریم لانے نہیں گئے تھے۔ کتنی دیر کھڑی ... کام میں۔ یہ بتا کے نہیں آئے تھے۔"

غالب شرمندہ نظر آنے لگا تو مجھے افسوس ہوا کہ میں نے بلاوجہ اس سے اتنے سخت لہجے میں بات کی۔

"آئی ایم سوری یار" میں نے ایک گہری سانس لی "بڑا نروس ٹینشن ہے۔"

غالب سر ہلا کے مسکرایا "میں نے برا تو نہیں مانا۔"

"اسٹیشن سے نکل جائے گاڑی۔ پھر اس سے پوچھیں گے روانگی سے پہلے یا بعد میں کیا ہوا تھا۔"

"آسانی سے کچھ بتانے والا نہیں لگتا یہ شخص" غالب نے کہا۔

"مشکل طریقے بھی ہیں ہمارے پاس۔ اور کیا جا سکتا ہے؟"

"اپنی ہڈی پسلی ایک کروائے گا یا جان سے جائے گا۔"

"مسکندر! اسے مارنا نہیں ہے ابھی۔ جب تک ہم ہیں۔ اس کے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی......"

میں نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے خاموش کر دیا۔ ہمارے قریب آ رہا تھا اور پتا نہیں کون سی بھاشا میں شور کر رہا تھا۔

"چلا آ کیوں ہے؟ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے" اس لیے خود اتر کے نہیں آیا" گارڈ نے کہا۔

آنے والا لائن مین کسی وردی میں تھا اور ... تھا۔ "ابھی اپن کو نہیں معلوم تھا۔ تم کیسے آ گیا پھر؟"

"میری مرضی۔ بھیجنے والوں کی مرضی" گارڈ نے ... کہا۔

"ابھی کس کا ہے کو کر رہا ہے۔ اپن تم کو کل دیکھا ... تھا۔ ایسا ماتھ پوچھا" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں ... پھر ڈاک لے کر چلا گیا۔

میں نے قدرے بلند آواز میں پوچھا "ٹرین یہاں کتنی دیر رکی رہے گی؟"

گارڈ نے پلٹ کے دیکھا "دس منٹ۔"

میں نے غالب سے کہا "تم جا کے باہر دیکھو... بلکہ ابھی کے پاس ٹھہرو۔"

"میں جا کے واپس بھی آ سکتا ہوں...." ...

"ہے ابھی مت بتانا۔ جو ہم نے یہاں دیکھا ہے۔"

کیا فائدہ؟ کتنی دیر چھپا سکتے ہیں آخر ہم یہ بات" غالب نے ... پلیٹ فارم پر اتر گیا۔

گارڈ نے کہا "کیا میں اندر آ جاؤں؟"

"نہیں۔ جب تک ہم اسٹیشن کی حدود سے نہیں نکلتے تم باہر ... معلوم نہیں کون کس وقت آ جائے۔"

"... نہیں آئے گا۔ مجھے چکر آ رہے ہیں۔ میں اتنی دیر کھڑا نہیں رہ سکتا" وہ چلا کے بولا "اگر جاؤں گا یہاں بے ہوش ہو کے"

"... اندر آ جاؤ لیکن تم نے چکر دینے کی کوشش کی تو..."

"بار بار مت دھمکی دو۔ مجھے معلوم ہے کہ میری زندگی کی تمہارے لیے کوئی اہمیت نہیں" وہ اندر آ کے بنچ پر گر گیا۔

"تمہارے آقاؤں کے نزدیک کیا اہمیت ہے انسانی زندگی کی؟" میں نے کہا "وہ دن رات تھوک کے بھاؤ زندگی کے بدلے موت کا سودا کرتے ہیں۔ اور جتنے بے آسرا، بے قصور اور بے زبان لوگ ان کی ہوس کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں ان کے ہر قطرہ خون کی قیمت ان کی تجوریاں بھرتی جا رہی ہیں۔"

وہ مجھے حیرانی سے دیکھتا رہا "تم کیوں سر کھپاتے ہو ایسی فضول باتوں میں۔ کوئی کیا کرتا ہے اور کیا نہیں کرتا اس کے متعلق سوچنے سے کیا ملتا ہے۔ تم پڑھے لکھے اور ذہین، باہمت اور نوجوان آدمی کس چکر میں پڑ گئے ہو۔"

"یہ بات تم جیسے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔"

"میں تمہارے مقابلے میں جاہل اور بے وقوف آدمی ہوں۔ پاگل بھی ہوں۔ تم یہ تحقیر بھی کر سکتے ہو۔ لیکن ایسی بھی کچھ باتیں ہیں جو تم نہیں سمجھتے۔ بہت بعد میں سمجھو گے، جب بہت نقصان اٹھا لو گے۔ اچانک تم کو احساس ہوگا کہ تم نے اپنا وقت اور اپنی نسل ضائع کی۔ اس دنیا کو تم سیدھے راستے کی طرف ایک ... میں کامیاب نہیں ہو گے۔ کتے کی دم سیدھی کرنے کی کوشش اگر کامیاب ہو جائے جو ناممکن ہے۔ تو اس سے حاصل کیا ہوگا؟ تمہیں یا دنیا کو کیا مل سکے گا۔ اگر دم ٹیڑھی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"شٹ اپ" میں نے چلا کے کہا "میں اپنے اصول اور نظریات اور اپنا فلسفہ حیات سمجھانے نہیں آیا ہوں۔ سمجھ لو ہم پاگل ہیں۔ مگر انسانی تہذیب کا وجود ایسے ہی پاگلوں کے دم سے ہے جو انسانوں کی منڈی نہیں سمجھتے۔ ارتقاء کو سمجھتے ہو؟ حیوان سے انسان بننے کا عمل جو کروڑوں برس سے جاری ہے اور ابھی ختم نہیں ہوا ... اسی کا مرہون منت ہے جو سوچتے ہیں جسم کی حد سے ... جسم کی طلب محدود ہے۔ عیش و عشرت کی زندگی۔ شان و شوکت، دولت اور غرور۔ دماغ کی سرحدیں لامحدود ہیں۔ ماضی سے مستقبل تک زمین سے کائنات کی انتہا تک۔ یہ ٹرین جس پر تم سفر کر رہے ہو کسی شراب و شباب کے رسیا شہزادے نے نہیں بنائی تھی۔ وہ بھی پاگل تھا۔ تم سوئچ دبا کے لائٹ جلا لیتے ہو۔ بلب کا موجد بھی پاگل کہلاتا تھا۔ گراہم بیل بھی پاگل سمجھا جاتا تھا جس نے ٹیلیفون بنا کے یہ چھوڑا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور خاموش ہو گیا کیوں کہ ٹرین چلنے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں تھک گیا تھا۔ میرے اعصاب پر شکست کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ پرسکون رہنا میرے اختیار کی بات نہیں رہی تھی۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی اتنا بولنے کی اور چلانے کی اور ایک گارڈ کو وہ بات سمجھانے کی جو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ گارڈ کی طرح عام آدمی کی سوچ اپنی ذات کے تعلق تک محدود رہتی ہے۔ وہ خود، بیوی بچے، خاندان اور اس کا گھر۔ نہ وہ معاشرے کی ٹھیکیداری چاہتا ہے نہ مذہب کی اور نہ سیاست کی۔ وہ محنت کرتا ہے۔ کماتا ہے۔ جائز ناجائز کے چکر میں نہیں پڑتا۔ خود غرضی کے ساتھ اپنے مفادات کا تحفظ کرتا ہے اور بقاء کی جدوجہد میں کولہو کے بیل کی طرح ایک محدود دائرے میں گردش کرنے کو ہی زندگی سمجھتا ہے۔

غالب ابھی تک واپس نہیں آیا تھا مگر یہ میرے لیے تشویش کی بات نہیں تھی۔ میں اکیلا ہی گارڈ سے نمٹ سکتا تھا اور وہ سب کچھ معلوم کر سکتا تھا جو اس کے سوا کوئی بتانے والا نہیں تھا۔ بظاہر

www.paksociety.com

گارڈ نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ مزاحمت نہیں کرے گا۔ دلاور اور زبیری سے خدمات کا معاوضہ وہ پہلے ہی وصول کر چکا ہو گا۔ ان خدمات میں دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے جان دینا شامل نہیں ہو سکتا تھا جبکہ اس کی پوزیشن بالکل محفوظ تھی۔ وہ بعد میں کہہ سکتا تھا کہ میں اکیلا ان سب کے سامنے کیا کرتا۔ انہوں نے جبر اور تشدد سے کام لیا اور مجھے مجبور کر دیا۔

ٹرین کی رفتار بڑھنے لگی تھی کہ غالب نے چھلانگ مار کے ڈنڈے کو پکڑا اور اندر آ گیا۔

"یہ ذرا رسکی تھا۔ اگر یہ ہاتھ سے نکل جاتا تو کیا ہوتا؟" میں نے کہا۔

"اس سوال کا جواب تو پرائمری کے بچے بھی دے سکتے ہیں" غالب نے افسوس سے سر ہلایا "میں یہاں ریلوے لائن پر پڑا ہوتا۔ یا گاڑی کے پیچھے دوڑ رہا ہوتا۔"

میں گارڈ کی طرف متوجہ ہو گیا کیونکہ پلیٹ فارم کی حدود ختم ہو گئی تھی۔ غالب شاید دوڑ لگا کے آیا تھا۔ وہ میرے سامنے گارڈ کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"تمہارے پاس وقت کم ہے" میں نے کہا "اس لئے جو بات آسانی سے بتا سکتے ہو اس کے لئے مشکل میں مت پڑنا۔"

"جو معلوم کرنا ہو وہ ہم لاش سے بھی معلوم کر لیتے ہیں" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

گارڈ نے سر پر ہاتھ لگا کے چوٹ کی جگہ کو محسوس کیا اور بولا۔ "میرے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ جس کو میں نے مُردہ سمجھا تھا وہ اچانک تابوت سے نکل آیا۔ میرا تو ہارٹ فیل ہو جاتا مگر اس کے اٹھنے سے پہلے ہی لڑکی نے ریوالور نکال لیا تھا اس لئے میں سمجھ گیا کہ وہ بے ہوش تھی اور نہ کوئی مرا تھا۔ غصہ آنے کی تو بات تھی۔ میری جگہ تم ہوتے تو سوچتے کہ اس زندہ ہو جانے والے مُردے سے مصافحہ کرتے۔ میرا ہاتھ پہلے بھی زیادہ رہتا ہے۔ میرے منہ سے گالی نکل گئی اور میں نے زنجیر کھینچ کر ٹرین رکوانے کی کوشش کی۔ عادت کے مطابق۔ لیکن اس لڑکی نے میرے سر پر ریوالور مار دیا۔ اس سے تو زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی مگر میں چکرا کے گرا تو پیچ کا یہ کونا بھی اسی جگہ لگا جہاں ریوالور کا دستہ پڑا تھا۔ بس میں بے ہوش ہو گیا اور ہوش میں آیا تو تم دونوں سامنے تھے۔"

میں نے اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ بہت بڑی سادہ اور مختصر بات تھی مگر اس میں ہمارے کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا۔ ایسا تو ہونا تھا۔ ہمارا پلان یہی تھا مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا اس کے بارے میں گارڈ نے کوئی بات اشارتاً بھی نہیں کی تھی۔

میں نے سوالات کو ذہن میں ترتیب دیتے ہوئے کہا "وہ دونوں کہاں گئے؟"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ میں تو..."

"جھوٹ بک رہے ہو تم" میں نے ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کا گلا دبوچ لیا۔

اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگیں "نہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔"

میں نے اس کی گردن پر گرفت سخت کر دی "وہ چلتی گاڑی سے نہیں کود سکتے تھے۔"

اس کا سانس رکنے لگا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔

غالب نے کہا "جب ہوش میں آئے تو تمہیں کچھ اندازہ تھا کہ ٹرین بھمبھی سے کتنے فاصلے پر تھی یہ خوشگوار واقعہ کتنی دیر بعد پیش آیا؟"

"تقریباً آدھے گھنٹے بعد" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"آدھے گھنٹے کا مطلب ہے ٹھیک کتنے بجے؟"

"نہیں۔ ساڑھے پانچ بجے۔ ٹرین پانچ بجے روانہ ہوئی تھی" گارڈ نے کہا۔

"تمہیں بیس پچیس سال ہو گئے ریلوے کی نوکری کرتے ہوئے تجربے کے ساتھ تم ٹرین کی رفتار کا اندازہ آسانی سے کر سکتے ہو۔ ٹرین کتنی دور آ گئی تھی؟"

"میرا خیال ہے تیس چالیس کلومیٹر۔ اس وقت رفتار کم تھی تو اتنی ہی ہو گی شاید۔"

"اس شخص نے تابوت سے نکلنے کے بعد تم سے کوئی بات نہیں کی تھی؟"

گارڈ نے نفی میں سر ہلایا "بات کرنا تو میں کب سنتا۔"

میں نے کہا "اس نے دوسرے تابوت کو دیکھ کر بھی کچھ نہیں کہا تھا؟"

"دوسرا تابوت!"

میں نے اس کے منہ پر مکا مارا "انجان مت بنو۔ دوسرا تابوت بھمبھی میں ہی رکھوا دیا گیا تھا۔"

گارڈ کا ہونٹ کٹ گیا تھا اور دانتوں سے خون رس رہا تھا "شیشے کا باکس تھا۔ تابوت نہیں تھا" اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

"اس میں کون تھا؟"

"کوئی بھی نہیں۔ خالی باکس تھا۔"

میں نے دوسری مرتبہ پھر اس کے منہ پر مکا مارا۔ اس کے منہ والے دانت ہلنے لگے اور درد کی شدت سے چلانے لگا۔ ہاتھ منہ پر رکھ کے اس نے خون کے بہاؤ کو روکنے کی کوشش کی۔

سب سے بڑا مسئلہ وقت کی کمی کا تھا۔ کچھ دیر میں سوچتا رہا کہ ہم اب بھی کیا کر سکتے تھے۔ ابھی اندھیرا ہمارے لئے رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اگلا اسٹیشن پر پہنچنے سے پہلے ہمیں اپنا کام ختم کرنا تھا۔ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں۔

گارڈ مزید کچھ بتانے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا یا شاید اتنا ہی جانتا تھا۔ اگر وہ کچھ چھپا رہا تھا تو اس سے سچ اگلوانے کے مؤثر طریقے آزمائے جا سکتے تھے مگر عمل کرنے کا وقت تھا۔ تشدد کروا کے ہم خود اپنے لئے وہ مسائل پیدا کر سکتے تھے جو آخر کار ہمارے منصوبے کی ناکامی کا سبب بن جاتے۔

میں نے غالب کو دیکھا تو وہ بھی گارڈ پر نظر رکھے کسی سوچ میں تھا۔ "بتاؤ تم کیوں اپنی زندگی کے دشمن ہو رہے ہو۔"

اس نے تلخی سے کہا "بابا تم خود اپنی زندگی کے دشمن نہیں ہو! جو کچھ تم کر رہے ہو یہ جینے کے ڈھنگ تو نہیں ہیں۔ جا کے دیکھو زندہ دل لوگ اس وقت کیا کر رہے ہیں۔ ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں سے لے کر اپنی خواب گاہوں تک... کہاں کہاں وہ کس کس کی آغوش میں سمائے ہوئے ہیں۔ راحت اور آسودگی کے احساس کی دولت کے ساتھ..."

میں نے اس کے سر پر مکا مارا۔

وہ چکرا کے گرا اور پھر کھڑا ہو گیا "میں... صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہر شخص کے جینے کا انداز الگ ہے اور اپنا ہے۔ چنانچہ اب بھی ہم سب اپنی اپنی موت مریں گے اپنے وقت پر۔ ارادہ میں نہ تم میری موت کے وقت کا تعین کر سکتے ہو اور نہ یہ جانتے ہو کہ مجھے موت کیسے آئے گی۔ اس طرح میں... کیا کہہ سکتا ہوں کہ..."

"فلسفی کی اولاد" میں نے پھر اس کے مکا مارا اور اس کا سر ٹرین کی دیوار سے ٹکرایا "زندگی اور موت کے اسرار و رموز مت سمجھاؤ ہمیں۔ یہ بتاؤ کہ شیشے کا خالی تابوت کس نے رکھوایا تھا اور کیوں؟"

"مجھے ان سے بھی پانچ ہزار ملے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ تم کوئی سوال نہیں کرو گے" وہ بولا "صرف خاموش رہنے کے پانچ ہزار دئے تھے انہوں نے۔ پھر مجھے کیا ضرورت تھی ان سے نام پتا پوچھنے کی اور شیشے کے باکس بنوا کے میرے پاس رکھوانے کا مقصد معلوم کرنے کی۔ جب میں ایک لاش والا تابوت لے جانے پر تیار ہو گیا تھا تو اس خالی تابوت پر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا جس میں کوئی بھی نہیں تھا۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا تو وہ بھی الجھن میں مبتلا نظر آیا۔ گارڈ سچ بول رہا تھا یا جھوٹ بولنے کا ماہر فن تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس نے تابوت خالی ہی رکھوا دیا ہو۔ غالب نے بھی بہت دیکھا تھا۔ اس نے تابوت لانے والوں کی صورت دیکھی تھی اور دور سے تابوت کے اندر کچھ نظر آنا محال تھا۔

میں نے غالب کی طرف دیکھا "کیا یہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو؟"

غالب نے سر ہلایا "ابھی اس کی بات مان لینے کے سوا چارہ نہیں۔"

"یار کرو تم نے کیا دیکھا تھا؟"

غالب کا چہرہ سپاٹ رہا "صرف تابوت میں قریب جانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اور دور سے اندھیرے میں کیا نظر آ سکتا تھا۔"

"اور کیا... فی الحال ہم مان لیتے ہیں کہ تابوت خالی تھا اور یہ بھی چال ہو گی دشمنوں کی۔ وہ چاہتے ہوں گے کہ جب تابوت لایا جائے تو ہم دیکھ لیں۔ لیکن اس کے حصول کی کوشش کریں تو یہ ہوا کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش ثابت ہو۔"

"وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔"

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے مرزا جی کہ انہوں نے شملا کو اور محسن کے بیٹے کو کہاں رکھا ہو گا۔"

"وہ اسی ٹرین کی کسی بھی بوگی میں ہو سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "کسی بھی بوگی میں۔ مال گاڑی تو بہت لمبی ہے پچاس بوگیاں تو ہوں گی اس میں۔"

"اس میں باون بوگیاں ہیں" گارڈ بولا۔

میں نے اس اطلاع کو نظر انداز کر دیا "ان کے پاس تو بس دو تین بوگیاں ہیں۔"

"وہ بوگیاں تو انہوں نے اپنا مال بھیجنے کے لئے حاصل کی تھیں" غالب نے کہا "خواجہ سیٹھ والوں کی بکنگ منسوخ کرا کے۔ لیکن اس ڈرامے کا مقصد ہمیں گمراہ کرنا بھی تو ہو سکتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہم ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور ان کی تمام نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کے ہر کام اور ہر منصوبے کی تفصیل جان لیتے ہیں اور کسی نہ کسی ذریعے سے ہمیں سب معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔"

"شک تو مجھے بھی ہے کہ سب سے آگے اور پیچھے والی بوگیوں میں کچھ نہیں ہو گا۔ یہ محض دھوکا دینے کی کارروائی ہے" میں نے اس سے اتفاق کیا "اصل مال کسی اور بوگی میں ہو گا غالباً اسی [illegible] میں..."

"جس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔"

"لیکن گارڈ صاحب تو جانتے ہوں گے۔"

"میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ کون سی بوگی کس کی ہے اور اس میں کس قسم کا سامان ہے لیکن یہ ضمانت نہیں دے سکتا کہ سامان وہی ہو گا جو ظاہر کیا گیا ہے۔ میں کسی باکس یا پیٹی، بوری یا بلٹی کو کھول کے نہیں دیکھتا۔ دیکھ بھی نہیں سکتا" گارڈ نے کہا۔

"وہ فہرست کہاں ہے۔ جس میں بوگیاں بک کرانے والوں کے نام ہیں۔"

گارڈ نے کاغذات کا ایک پلندہ مجھے تھما دیا جو ایک شیلف پر رکھا ہوا تھا "تم کیا پڑھو گے اس تحریر کو۔ کاربن کاپی ہے اور دھندلی بھی

www.paksociety.com

ریلوے والوں کے ہاتھ کی۔ عدالت کے منشی اور تھانے کے محرر یا ڈاکٹر کے نسخے کی طرح یہ بھی ایسی زبان ہے۔۔۔"

غالب نے کہا "اچھا بک بک مت کرو۔ تم پڑھ کے بتاؤ۔"

"جب تمہیں ہندی نہیں آتی" گارڈ نے کہا "تو پھر تمہیں کیسے معلوم ہوگا کہ میں نے وہی پڑھا ہے جو لکھا ہوا ہے؟"

میں مشتعل ہو کے اسے جان سے مار دیتا مگر غالب نے مجھے روک لیا۔ گارڈ پہلے ہی زخمی تھا اور معمولی مار بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ فضول بولنے سے باز نہیں آرہا تھا۔ دو منٹ میں اس کی ساری ہڈیاں توڑ کے اسے چلتی گاڑی سے نیچے پھینکا جا سکتا تھا مگر ابھی ہمیں اس کی ضرورت تھی۔

"ہم ہر بات کو چیک کریں گے" غالب نے کہا "ہم تم پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ اس لئے بہتر ہے۔۔۔"

"کہ تم سے تعاون کروں؟" گارڈ نے غالب کی بات کاٹ دی۔ "ٹھیک ہے سرکار میں تعاون کروں گا اپنی جان بچانے کے لئے۔ مجھے بہت کم امید ہے کہ تم میری جان بخشی کرو لیکن کوشش مجھے ضرور کرنی چاہئے زندہ رہنے کی۔"

میں نے کہا "تم فہرست کو چھوڑو ٹرین روکو۔"

"ٹرین روکوں؟ یہاں۔۔۔" وہ بوکھلا گیا۔

"ہاں۔ اسی جگہ۔ بریک لگاؤ" میں نے اسے گالی دے کر کہا۔ "ہم تلاشی لیں گے۔"

"پوری ٹرین کی؟" غالب نے کہا۔

"لیکن کیسے۔۔۔ سب بوگیاں مقفل ہیں۔ سیل لگی ہوئی ہے سب پر" گارڈ پریشان ہو کے بولا۔

"سیل اور قفل توڑنا آتا ہے ہمیں۔"

"اسٹیشن بہت قریب ہے" گارڈ نے کہا۔

میں نے کہا "کون سا اسٹیشن؟ کیا وہاں گاڑی رکے گی؟"

"نہیں۔ بہت چھوٹا سا قصباتی اسٹیشن ہے۔"

"بس تو پھر گاڑی کو اسٹیشن پر روک لو" میں نے ایک نیا خیال آتے ہی کہا "اسٹیشن کا عملہ کتنے افراد پر مشتمل ہے؟"

"تین چار افراد ہوں گے۔ اسٹیشن ماسٹر، بکنگ کلرک بھی ہے۔ وہ لائن مین۔ ان میں سے ایک کانٹا بدلتا ہے۔ شاید کوئی جنگلی چپراسی بھی ہوگا صفائی کا کام کرنے کے لئے۔ چار سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔"

"ان کا رابطہ اگلے اسٹیشن سے ہوگا۔ وہ انھیں گائیڈ کرتے رہتے ہوں گے کہ مخالف سمت سے آنے والی ٹرین کے لئے کون سی لائن خالی ہے۔"

"ویسے تو اگلے اسٹیشن والوں کو معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی کلیرنس ضروری ہوتی ہے کہ غلطی سے بھی حادثہ نہ ہو" گارڈ نے کہا۔

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "اب کلیرنس ہماری مرضی سے دی جائے گی۔ تمہارا کام ختم۔"

گارڈ کا چہرہ لمحے بھر کے لئے فق ہوا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہمارا منصوبہ کیا ہے۔

"ایسا مت کرو، بہت سے بے گناہ مارے جائیں گے۔ ٹرینوں کی آپس میں ٹکر ہوگی" وہ چلایا۔

میں نے کہا "ہزار دو ہزار بے گناہ دنیا میں ہر روز مارے جاتے ہیں۔ جنگ میں لڑنے والے کم مرتے ہیں بے گناہ شہری زیادہ ہوتے ہیں۔ زلزلہ آئے یا سیلاب، بارش نہ ہونے سے قحط پڑے، ایٹم بم گرے۔ ہر صورت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بوڑھے، عورتیں، بچے سب بے گناہ ہی مرتے ہیں لیکن یہ تو ازل سے ہو رہا ہے اور ابد تک ہوتا رہے گا۔ خواہ تم اسے نوشتۂ تقدیر کہو یا قدرت کی ستم ظریفی۔ مگر تم ہونی کو انہونی نہیں کر سکتے۔"

[illegible] "تم قتل کر رہے ہو ابھی۔۔۔" وہ چیخ کر کہا "نہیں، میں یہ نہیں کرنے دوں گا۔ تم مجھے۔۔۔ مگر میں اس گھناؤنے منصوبے میں تمہاری مدد نہیں کروں گا۔ تم اس ٹرین کو کسی مسافر گاڑی سے لڑانا چاہتے ہو۔"

"یہ ضروری تو نہیں کہ سامنے سے مسافر گاڑی ہی آرہی ہو" غالب نے میرے پلان کو سمجھنے کے بعد کہا "اگلے ایک گھنٹے میں سامنے سے کتنی گاڑیاں آئیں گی؟"

"جس حساب سے گاڑیاں کراس کرتی رہی ہیں اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کم سے کم دو" میں نے کہا۔

"ان میں سے چھ سات مسافر گاڑیاں ہوں گی۔ ایک مال گاڑی اور ایک آئل ایکسپریس" گارڈ نے کہا جو اب کچھ مطمئن نظر آنے لگا تھا۔

"آئل ایکسپریس؟ تیل لے جانے والی تیز رفتار گاڑی؟" میں نے کہا "اس کا کیا ٹائم ہے؟"

"اگر لیٹ نہ ہو تو سوا آٹھ۔۔۔ ساڑھے آٹھ کے درمیان وہ یہاں سے گزرے گی۔"

"اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے" میں نے کہا "تم بریک لگاؤ گے یا میں تمہارا کام تمام کر کے یہ کام کر لوں۔"

گارڈ نے ایمرجنسی بریک لگائے۔ گاڑی کی رفتار ایک دم کم ہو گئی۔ ویکیوم کی آواز کے ساتھ ہی لوہے کے پہیوں کی رگڑنے کی کرخت آواز سنائی دینے لگی۔ پہیے جام ہو کے لائن پر پھسلتے جا رہے تھے اور لوہے کی رگڑ سے ریلوے لائن پر چنگاریاں اڑنے لگی تھیں۔

غالب نے جھانک کر باہر دیکھا "صرف ایک پلیٹ فارم اور ایک یا دو کمروں کی چھوٹی سی عمارت ہے۔ صرف ایک شخص پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا ہے۔ اب دوسرا بھی نکل آیا ہے۔"

میں غالب کی رننگ کمنٹری سن رہا تھا مگر گارڈ کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش

میں میرے ریوالور پر جھپٹا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر پاتا میرا دوسرا ہاتھ جس میں ریوالور تھا۔ ضرب اس کے چہرے کے بجائے پھر اس کے پاس آکر لگی۔ ایک جھٹکے سے وہ پیچھے گیا اور دیوار سے ٹکرا کر بیٹھا۔ میرا خیال ہے کہ نیچے گرنے سے پہلے ہی اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے اسے ریلوے لائن سے لڑھک کر نیچے کی جانب ایک گڑھے میں گرتے دیکھا جہاں وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس کا سر اتنا پیچھے کی طرف مڑا ہوا تھا کہ مضحکہ خیز لگ رہا تھا اور یہ ثبوت تھا اس بات کا کہ اس کی گردن ٹوٹی ہوئی ہے۔

میں نے کہا "غالب صاحب! ایکشن کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

"یہ ایک دم پروگرام کیسے بدل گیا؟"

"کوئی پروگرام نہیں بدلا" میں نے کہا۔

"اسٹیشن پر گاڑی رکوانا ہمارے پلان میں شامل نہیں تھا؟" غالب نے کہا۔

"گاڑی جنگل میں کھڑی ہو یا اس ویران اسٹیشن پر کیا فرق پڑتا ہے۔"

"نازو کو بھی لانا ضروری تھا۔"

"اسے خود معلوم ہو جائے گا۔ جلدی کیا ہے" میں نے کہا۔ "پچھواڑے کے اطمینان سے چلتے جاؤ۔ اسٹیشن کے عملے کو میں قابو کر لیتا ہوں۔ تم نازو کے ساتھ مل کے ٹرین کے ڈرائیور کو ساتھ لے آؤ۔"

"ٹرین ڈرائیور پیچھے دیکھ رہا ہے" غالب بولا "کہیں اسے شک نہ ہو جائے۔"

"شک ہونے دو۔ وہ ٹرین لے کر فرار نہیں ہوگا اور نہ ٹرین چھوڑ کر" میں نے پلیٹ فارم پر کودتے ہوئے کہا۔

آگے میں نے نازو کو پلیٹ فارم پر اترتے دیکھا۔ شاید اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ عمل کی گھڑی آ گئی۔

پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے دونوں افراد میں سے کون اسٹیشن ماسٹر تھا اور کون لائن مین۔ یہ ان کی صورت دیکھ کر نہیں بتایا جا سکتا تھا۔

"تم سیدھے نکل جاؤ" میں نے غالب سے کہا "وہ دیکھو ڈرائیور اتر کے آرہا ہے۔ آگے کہیں کانٹا بدلنے والا ملے گا، تم اسے پکڑ لاؤ۔ نازو کو اپنے ساتھ لے جاؤ اگر چاہو۔"

"میں ایسا ضرور چاہوں گا" غالب نے کہا۔

میں اطمینان سے چلتا ہوا اس دھوتی والے کی طرف بڑھا جو ٹرین کے رکنے پر اور گارڈ کے نظر نہ آنے پر حیران پریشان نظر آ رہا تھا۔ وہ چالیس پینتالیس سال کا [illegible] شخص تھا۔

"تم اسٹیشن ماسٹر ہو؟" میں نے کہا۔

اس کے ساتھی نسبتاً صحت مند اور جوان لڑکے نے تیز لہجے میں کہا "اور نہیں تو کیا تم ہو؟"

میں نے جملہ پورا ہوتے ہی اس کے منہ پر ایسا چانٹا مارا کہ وہ بھونچکا رہ گیا۔ اسے قطعی امید نہ تھی کہ میرا ردعمل اتنا شدید بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا گال طمانچے سے لال پڑ گیا تھا۔

"تم نے کس سے بھونکنے کو کہا ہے؟" میں نے کہا۔

وہ ابھی تک گال پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا جہاں میری چار انگلیوں کے واضح نشان نظر آرہے تھے "مجھے کیا کہا تم نے؟"

میں نے اس کو آگے بڑھتا دیکھا اور اس کے دوسرے گال پر دوسرے ہاتھ سے زیادہ بھرپور طمانچہ مارا "تم بلاوجہ بھونکنے والے کتے ہو" میں نے صاف لہجے میں کہا۔

"ارے! یہ سب کیا ہے؟ کاہے کی مارا ماری ہے" دھوتی والا اسٹیشن ماسٹر بدحواس ہو کے بولا "کون ہو تم آخر اور گارڈ بابو کہاں ہیں؟"

"وہ پرلوک گئے ہیں" میں نے یوں کہا جیسے وہ کسی کام سے گئے ہیں اور لوٹ آئیں گے "بڑی مشکل سے بھیجا انہیں ہم نے۔"

وہ [illegible] کھا کے حوصلہ ہار جانے والا لڑکا اب مجھے کینہ پرور نظروں سے گھور رہا تھا اور یہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ حلیے سے اور انداز گفتگو سے تو میں بدمعاش نہیں لگتا۔ مگر میرے جیسے ڈیل ڈول والے شخص سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کی خاطر لڑنا کس حد تک گھاٹے کا سودا ہو سکتا ہے۔ میری قوت کا اندازہ اس نے تھپڑوں سے ضرور کر لیا ہوگا۔ میرے جارحانہ عزائم تعارف کے انداز سے ہی واضح ہو گئے تھے۔ اس نے آخر کار بے عزتی کو پی جانے کا غیر جذباتی فیصلہ کیا۔ سوائے ایک شخص کے کسی نے یہ بے عزتی نہیں دیکھی تھی لیکن اس کی جوابی کارروائی کا انجام کیا ہوگا۔ یہ سمجھنا اس کے لئے مشکل نہ تھا۔

"میں پوچھتا ہوں جی کہ یہ گاڑی یہاں کیوں رکی ہوئی ہے؟" اسٹیشن ماسٹر نے کہا "اور اسے کیوں مار رہے ہو تم؟"

میں نے کہا "اسے بات کرنے کی تمیز سکھانا ضروری تھا۔ گاڑی یہاں میں نے نہیں روکی۔ گارڈ بابو نے رکوائی ہے۔"

"پر کیوں جی؟" وہ بولا "یہاں تو اسٹاپ نہیں ہے اس کا۔ سگنل بھی کھلا ہوا ہے۔ گارڈ بابو خود کہاں ہیں آخر؟"

اب میں نے ایک چانٹا اسٹیشن ماسٹر کے بھی رسید کیا "ابھی بتایا تھا کہ وہ پرلوک گئے ہیں۔ کیا تم بھی جانا چاہتے ہو؟"

اس نے ایک چیخ ماری "ارے مار دیا" منہ پر اتنے زور کا چانٹا مار دیا جی۔ اسے تو کیا کھڑا منہ دیکھ رہا ہے میرا۔"

"وہ اپنا منہ دیکھ رہا ہے" میں نے کہا "اس کے دونوں جبڑے ہل گئے ہیں نا۔ لو وہ آپ کے ڈرائیور صاحب بھی آ گئے۔ ان سے پوچھو گاڑی کیوں روک دی انہوں نے۔ کہیں ان کا ارادہ بھی پرلوک جانے کا نہ ہو۔"

"سب کو پرلوک بھیج کے خود کیا نرک میں جاؤ گے" لڑکا غصے سے بولا "میرے ابا کو کیوں مارتے ہو۔"

میں نے کہا "یہ حرامی تمہارا بیٹا ہے۔"

www.paksociety.com

"حرامی بولا جی" اسٹیشن ماسٹر اچھلا "ابھی تو سن رہا ہے سب چپ چاپ۔ یہ تیری ماں پر الزام لگاتے ہیں جی، تیرے باپ کو مارتے ہیں۔ تو اصلی حرامی ہے۔ ابھی میرے کو معلوم ہو گیا جی۔"

میں نے اسے گھما کے کہا "اندر چلو منحوس کے بچے۔"

لڑکا ایک دم پلٹ کے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اس کے پیٹ میں مکا مارا۔ وہ بلبلا کے دہرا ہو گیا اور زمین پر لوٹنے لگا۔ میں نے اسے کھینچ کر پیروں پر کھڑا کر دیا۔ اسٹیشن ماسٹر کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور اپنے بیٹے کو بھی سنبھال رہا تھا۔

دوسرے میں نے نازو کو اور غالب کو دیکھا۔ وہ ڈرائیور کو ہانک کر لا رہے تھے۔ ڈرائیور نے اسٹیشن ماسٹر اور اس کے بیٹے کی پٹائی کا پورا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ گھنی سیاہ داڑھی والا بھاری بھرکم شخص تھا جو بڑے اطمینان سے مسکراتا ہوا آ رہا تھا۔ نازو اور غالب اس کے پیچھے کسی بات پر آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ ریوالور غالب کے ہاتھ میں ضرور تھا لیکن خانہ پری کے انداز میں۔ اگر ڈرائیور اچانک پلٹنے کی کوشش کرتا تو شاید ریوالور اس سے چھین سکتا تھا۔ پھر نازو کو ہی ڈرائیور سے نمٹنا پڑتا۔

ایک مختصر سے کمرے میں ایک میز کے ساتھ دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دیوار پر ایک الماری نصب تھی۔ شاید اس میں ٹکٹ ہوں گے یا کاغذات۔ باپ بیٹا دونوں مل کے یہاں سارے فرائض انجام دیتے ہوں گے۔ اکا دکا ٹرین پر سوار ہونے کے لئے آس پاس کے علاقے سے دیہاتی آ جاتے ہیں تو انہیں ٹکٹ دینا اور کوئی یہاں اترے تو اس سے ٹکٹ لینا، مال سوٹی چیک کرنا، حساب کتاب رکھنا اور ریلوے کے قواعد و ضوابط کے مطابق ریلوے اسٹیشن کے جملہ امور نمٹانا اسٹیشن ماسٹر کا کام تھا مگر اس نے اپنی سہولت کی خاطر لڑکے کا نام بھی عملے میں شامل کر لیا تھا اور اسے لائن مین کی حیثیت سے تھوڑی بہت تنخواہ بھی مل جاتی تھی۔ وہ افسوس ناک حد تک بزدل اور کمزور لڑکا تھا۔ اس نے طیش میں آ کے حملہ تو کر دیا تھا مگر ایک مکے میں اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک ہائے ہائے کر رہا تھا اور باقاعدہ رو رہا تھا۔ اس کا باپ اب اسے تسلی دے رہا تھا۔ "ابھی چپ کر جا جی، اتنا کاہے کو روتے ہو جی۔ یہ ظالم لوگ پتا نہیں کہاں سے آ گئے ہماری جان کے دشمن۔ ان سے لڑنا بے کار ہے جی۔ یہ مار ڈالیں گے۔"

میں نے کہا "بند کرو اپنی بک بک، سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"

وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ اس کا بیٹا بھی سیدھا کھڑا ہو گیا۔ باہر سے غالب اور نازو کے لڑنے کی آواز اب صاف سنائی دے رہی تھی۔ نازو خفا تھی کہ اسے بتائے بغیر ہم نے منصوبہ بدل دیا اور اتنی دیر تک اس کی خبر بھی نہیں لی۔

"کیا ہوتا اگر پہلے تمہیں بتا دیتے۔" غالب نے ڈرائیور کے پیچھے اندر آتے ہوئے کہا "ہر بات عورتوں کو بتانے کی نہیں ہوتی۔"

"ہو بھی سب کے سامنے بتاؤں تمہیں....." نازو بگڑ کے بولی۔

"بس" میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا "باقی لڑائی فرصت سے کر لینا۔"

ڈرائیور خود اسٹیشن ماسٹر کے قریب پہنچ کے رک گیا تھا اور اب تک مسکرا رہا تھا۔

میں نے کہا "آپ بہت خوش نظر آتے ہیں۔"

"خوشی کا مقام ہے" اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ "مدت سے آرزو تھی، اللہ نے آج پوری کی۔"

"رحمت علی ہم سے غائبانہ متعارف ہیں" غالب نے کہا "اور ہمارے عقیدت مندوں میں شامل ہیں۔"

"بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا آپ کے بارے میں مکرو صاحب" ڈرائیور نے کہا اور مصافحے کے لئے آگے بڑھا کر ہاتھ ملانے کے بعد اس نے عید ملنے کے انداز میں مجھے تین بار سینے سے لگایا۔ یہ سب کچھ اسٹیشن ماسٹر نے بڑے دکھ کے ساتھ دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں رحمت علی کے لئے وہی نفرت تھی جو ایک متعصب ہندو کے جذبات کی ترجمانی کرتی تھی۔ اس کی نظر میں رحمت علی غدار تھا۔ شاید ہر مسلمان ناقابل اعتبار تھا۔ تاہم وہ ہمارے تعلقات کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر تھا اور شاید یہ سوچ رہا تھا کہ رحمت علی کو میرا نام پہلے سے معلوم تھا تو یہ چکر کیا ہے۔

میں نے کہا "رحمت علی، کیا انجن خراب ہو گیا ہے؟"

وہ چونکا "انجن؟" پھر اس نے میرا مطلب سمجھ لیا "ہاں جناب، انجن بالکل خراب ہو گیا ہے۔"

غالب نے کہا "زمانہ ہی بڑا خراب ہے۔ انجن کا کیا قصور۔"

میں نے کہا "ہاں، اولاد تک خراب ہو گئی ہے۔ اس میں بھی اولاد کا کیا قصور ہے۔"

"میں آپ کے ساتھ ان کو نہیں دیکھ رہا ہوں" جن کا نام آپ کے ساتھ ہی آتا ہے۔ جیسے منکر نکیر کا" رحمت علی بولا۔

"محسن..... پیچھے رہ گیا ہے" میں نے کہا "کچھ کام تھا" اور اسٹیشن ماسٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تمہارے علاوہ کتنے آدمی اور کام کرتے ہیں یہاں؟"

"آدمی تو میں اکیلا ہوں جی" وہ بولا "باقی ایک نمونہ تو یہ رکھا ہے جی آپ کے سامنے۔ شرم آتی ہے اس کو بیٹا کہتے۔ چار جماعتوں کے بعد بڑا عالم فاضل ہو گیا تھا جی، اس لئے نام لکھوا دیا اس کا صفائی کرنے والوں میں۔ تھا بھی یہ جنگلی بننے کے لائق جی۔"

"تم رہتے کہاں ہو؟" میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر مجھے کوئی بنگلہ یا کوارٹر نظر نہ آیا۔ اسٹیشن کے آگے پیچھے سب ویرانہ تھا۔

"ادھر اپنا گھر ہے جی" اس نے اشارے سے بتایا "ہو گا یہاں سے آدھا پونا میل دور۔"

"گھر میں اس کے علاوہ کون ہے؟"

"چندو ہے جی۔ بیٹھا ہو گا پریشان کہ گاڑی کیوں رک گئی، سگنل تو ڈاؤن ہے۔"

غالب اور نازو کی طرف دیکھا "جاؤ بھئی، چندو کو بھی ..... پریشانی دور کرو اس کی۔"

غالب اور نازو کے جاتے ہی میں نے رحمت علی سے کہا "کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں اس لائن پر چلتے؟"

"..... سال جناب!" وہ بولا۔

"پھر تو تمہیں سب گاڑیوں کے بارے میں معلوم ہو گا کہ کون سی گاڑی کب گزرتی ہے یہاں سے۔"

"بالکل معلوم ہے جناب۔ ابھی بس دس منٹ میں فاسٹ ..... گزرے گی....." اس نے جیسے ریلوے ٹائم ٹیبل پڑھنا شروع کر دیا جس میں متعدد اپ ڈاؤن ٹرینوں کے نمبر آتے تھے۔

میں نے کہا "بس بھئی، سارے دن کا نہیں پوچھا ہے میں نے....."

اسی وقت زمین میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی اور چند منٹ میں ..... ایکسپریس دندناتی گزر گئی۔ جب پھر خاموشی ہوئی تو میں نے اسٹیشن ماسٹر کی طرف دیکھا۔

"تم بے کار کیوں کھڑے ہو جی؟ ٹرین کا انجن خراب ہو گیا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں جی۔ آپ کی مرضی کے بغیر بول کا بھی تو ..... آپ لوگ۔ بڑا بھاری ہاتھ ہے جی آپ کا۔ اس جیسے تو بہت ..... بھگوان نے۔ لیکن میں تو ایک ہی باپ ہوں سب کا۔ ابھی آنکھوں دیکھتا ہوں جی۔"

"ان حالات میں جو تم کو کرنا چاہیے وہ کرو" میں نے کہا۔ "اطلاع بھیجو آگے یا پیچھے کہ مال گاڑی یہاں کیوں رکی ہوئی ہے۔"

اس نے دیوار پر لگے ہوئے قدیم وضع کے فون کا ریسیور اتار کے ایک ہینڈل گھمانا شروع کیا۔ یہ مواصلاتی رابطے کا ذریعہ ..... ریلوے کے علاوہ فوج میں بھی استعمال ہوتے دیکھا تھا لیکن ..... سے قاصر تھا کہ اس نظام کو مطلوبہ نمبر ڈائل کرنے کے لئے کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔

کئی بار ہینڈل گھمانے کے بعد آخر کار کسی نے اس کے ..... کا جواب دیا۔ اتنی دیر میں غالب اور نازو بھی لوٹ آئے تھے۔ شاید مس چندو انہیں باہر نکلتے ہی مل گیا تھا۔ وہ لائن مین سے ..... ایک فلمی ہیرو تھا جس نے ریلیپ کمار اسٹائل میں بال بنا رکھے تھے۔ براؤن جینز کی پتلون اور آدھی آستین کی رنگین ..... میں وہ بڑی شان سے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس کا رنگ توے جیسا کالا نہ ہوتا تو شاید وہ فلمی دنیا میں داخلے کی کوشش ..... مگر اس کے رنگ کی انڈسٹری کو بالکل ضرورت نہیں تھی۔ ..... اب رنگین بن رہی تھیں اور کوئی ایکسٹرا تک کالا نہیں تھا۔

"ابھی میں اور کیا بک رہا ہوں" اسٹیشن ماسٹر نے فون میں ..... ہوئے کہا "آپ سنو بھی تو میری بات۔ انجن خراب ہو گیا ..... کیا جی..... ابھی مجھے کیا معلوم..... میں نے معائنہ نہیں کیا ..... کا..... ابھی میں کیا بتاؤں..... بس کھڑا ہو گیا ہے..... نہیں جی

..... بالکل نہیں چلتا..... ہل بھی نہیں سکتا ہی اپنی جگہ سے..... ٹرین؟ اتنی ٹرین کیا بغیر انجن کے کھینچ دوں..... وہ بھی کھڑی ہے اسٹیشن پر..... ہے رام..... آخر میں کیا کروں..... کیسے سمجھاؤں جی تمہیں..... لو بات کر لو رحمت سے، رحمت ڈرائیور سے۔"

ریسیور رحمت علی کو تھما کے وہ ہانپنے لگا۔ غالب نے کہا "تم بغیر فون کے بھی بات کر سکتے تھے۔ آواز تو پہنچ ہی جاتی۔"

اسٹیشن ماسٹر نے ماتھے پر ہاتھ مارا "ایک دم بہرا ہے جی۔ علاج بھی نہیں کراتا۔ ایک بات کو دس بار کہنے سے سمجھتا ہے پھر بھی غلط سمجھتا ہے۔ میں فون کرتا ہوں جی تو دس منٹ ..... ہے مجھے۔"

"..... نے کیا کہا ہے؟"

"کچھ نہیں جی، وہ بھی کیا کرے گا۔ آگے بتا دے گا۔ یہاں فالتو انجن کس کے پاس ہے۔ دو تین گھنٹے تو لگ جائیں گے دوسرا انجن آتے آتے۔"

اب رحمت علی چیخ چیخ کے انجن کی خرابی کے بارے میں تفصیلات بتا رہا تھا اور اعلان کر رہا تھا کہ گاڑی اس وقت تک کھڑی رہے گی جب تک دوسرا انجن نہیں آ جاتا۔ آج آئے یا کل۔ اس نے دھڑ سے ریسیور دیوار پر دے مارا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے" میں نے کہا "کہ ہمارے پاس دو تین گھنٹے ہیں۔"

"کس لئے جی" اسٹیشن ماسٹر بولا "کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

"پہلے ..... بتائیے کہ یہ کیا اسٹوری ہے" چندو نے کسی ہیرو کی طرح ..... بولا "تم ٹرین کے گارڈ تو نہیں ہو۔ اور یہ لڑکی..... اس کو تم نے کہاں دیکھا ہے؟"

میں نے کہا "نازو۔ اس کو بتاؤ۔"

نازو نے بڑی ادا سے کہا "میرے چندا۔ تم نے مجھے خوابوں اور خیالوں میں دیکھا ہو گا۔ ہے ایسی بات؟"

"ضرور تم فلموں میں کام کرتی ہو۔ ہم سمجھ گئے۔ یہ کسی نئی فلم کا یونٹ ہے۔ کوئی شاٹ لینے آئے ہو تم لوگ لیکن اور سب کہاں ہیں۔ کیمرا مین..... تم کون ہو۔ ہدایت کار..... اور تم کیا ہو۔ خیر معلوم ہو جائے گا" اس نے نازو کی طرف ہاتھ بڑھایا "ہم بمبئی جانے ہی والے تھے۔ بمبئی خود چل کے ہمارے پاس آ گئی۔ ہم چندو کمار ہیں، منڈی رو۔"

نازو نے مسکرا کے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کے بعد وہی ہوا جس کے لئے میں اور غالب تیار تھے۔ نازو نے ایک جھٹکے سے ہیرو کو اوپر اٹھایا۔ ہوا میں ایک چکر دیا اور اچھال کے چھوڑ دیا۔ وہ میرے قدموں میں آ گرا اور چند لمحے سیدھا لیٹا بے حس و حرکت پڑا چھت کو گھورتا رہا۔ خود اسٹیشن ماسٹر اور اس کے نالائق فالتو سپوت کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے تھے۔ اتنا عجیب اور ناقابل یقین منظر انہوں نے عملی زندگی میں کہاں دیکھا ہو گا۔ فلموں میں شاید دیکھا ہو مگر وہ سب کیمرے کا کمال ہوتا ہے۔

میں نے چٹکی بجا کے کہا "چلو ہیرو کھڑے ہو جاؤ فوراً اور سرے

www.paksociety.com

ثبات کے لئے۔ امید ہے پوری اسٹوری تمہاری سمجھ میں آ گئی ہوگی۔"

وہ بڑی مشکل سے کراہتا ہوا اٹھا "ہائے ہم تو مر گئے۔ کچھ نہیں بچا۔ ساری ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔"

"دل ٹوٹ گیا، خواب ٹوٹ گئے" نازو نے کہا "اب کچھ یاد آیا کہ مجھے پہلے کہاں دیکھا تھا۔"

چندو دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ اس کی نظر نازو پر جم کے رہ گئی تھی۔ اس کے حسن کی آب و تاب ہی کم خیرہ کن نہ تھی۔ پھر اچھے خاصے فلمی ہیرو کو جنگلوں میں اٹھا کے وہ رہی سہی کسر پوری کر دیتی تھی اور ذوی کی عقل خبط ہو جاتی تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ حقیقت ہے۔"

"نازو۔ تم ہیرو کو لے جاؤ۔ اسے سگنل دینے کے لئے موجود رہنا چاہئے۔ ورنہ دونوں طرف سے آنے والی گاڑیاں باہر ہی رک جائیں گی۔ معمول کے مطابق ہر ٹرین کو سگنل ڈاؤن ملنا چاہئے۔ میں اور غالب اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ ہیں" میں نے کہا۔

"آؤ میرے کالے چاند" نازو نے ہاتھ بڑھا کے کہا "ہم ان سب سے دور چلے جاتے ہیں جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ ہو۔ اور میں اچھی طرح سمجھا دوں کہ تم ہیرو ہو یا زیرو۔"

چندو ہاتھ جوڑنے لگا "ہمیں معاف کرو۔ ہم زیرو بھی نہیں۔ ہماری بہن ہو تم۔ ہماری اماں ہو۔"

لیکن نازو نے اسے کھینچ کے اٹھا لیا اور گھسیٹ کر باہر پھینک دیا۔ وہ گرتے ہی اٹھا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے نزدیک اب جان بچانے کی یہی ایک صورت تھی۔ مگر وہ مشکل سے چند قدم دوڑا تھا کہ نازو نے نشانہ لے کر فائر کیا۔ وہ ایک چیخ مار کے پلیٹ فارم پر گر گیا۔

اسٹیشن ماسٹر نے اچھل کے چلانا شروع کیا "مرڈر ہو گیا جی۔ ہائے ہائے کوئی ایک دم مار دی جی۔ کیسا ظلم ہے جی۔"

میں نے اسے ڈانٹ کر اپنے ریوالور کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ "مرڈر اب ہو گا جی" اگر تم نے حلق سے کوئی بھی آواز نکالی۔"

اس نے ایک ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ نازو نے چندو کو ڈرانے کے لئے فائر کیا ہو گا۔ وہ اسے گولی مارنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ چند سیکنڈ بعد جب نازو نے اسے لات مار کے اٹھنے کو کہا تو اسے یقین آیا کہ گولی اس کے کان کو چھو کے گزر گئی تھی۔ اس کا آدھا کان اڑ گیا تھا اور زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ چندو کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور آواز کانپ رہی تھی۔ اور اسے زندہ بچ جانے کی اتنی خوشی نہیں تھی جتنا ایک کان سے محرومی کا صدمہ تھا۔ رنگ تو بھگوان نے جیسا دیا تھا بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ اب ایک کان بھی کم ہو گیا تھا چنانچہ اس کے فلمی مستقبل کے خواب بھی تاریکی میں ڈوب گئے تھے۔ وہ کان پر رومال رکھ کے رو رہا تھا۔ نازو نے اسے حکم دیا کہ اسے دوسرا کان عزیز ہے تو رونا دھونا بند کرے اور آگے چلے۔ اس نے فوراً تعمیل کی۔

"یہ خاتون نے کوئی عقل مندی نہیں کی تھی" میں نے کہا "نشانہ خطا ہو جاتا تو۔"

"یہ ایک حاسدانہ بیان ہے" غالب نے کہا "ورنہ تم کو اس کے نشانے کی تعریف کرنی چاہئے۔ کتنی صفائی سے کان اڑایا ہے اس نے۔"

"نہ اس کا نشانہ کبھی اتنا اچھا تھا اور نہ میرا۔ یہ محض اتفاق ہے۔ چند سوت کا فرق بھی ہو جاتا تو گولی سر میں گھس جاتی" میں نے کہا "تمہاری بات اور ہے۔"

باہر اب صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ میں نے اسٹیشن کے دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو مجھے ایک چائے کی کیتلی اور کچھ برتن نظر آئے۔ یہ ایک امید افزا بات تھی۔

"تمہارا یہ عالم فاضل بیٹا اور کیا کر سکتا ہے؟ کچھ چائے وغیرہ کا انتظام۔"

"کیوں نہیں جی۔ آپ حکم کرو" اسٹیشن ماسٹر بولا "ایسی چائے تو سورگ میں بھی نہیں ملے گی۔"

لڑکا بڑی پھرتی سے اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے کہا "چائے پلا کے ہمیں سورگ پہنچانے کی کوشش مت کرنا۔ ہم زہر سے مرنے والے نہیں ہیں۔"

"ڈر سے مر جاتے ہیں البتہ" غالب نے سہلا دیا۔

"آپ کیسی باتیں کرتے ہو جی۔ رام رام۔"

میں نے کہا "چائے پہلے تم خود پیو گے پھر ہم پئیں گے۔"

یہ محض ایک دھمکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایسی کوشش نہیں کر سکتے۔ انہیں زہر کہاں دستیاب ہو گا۔ پھر ان کی حالت ایسی تھی کہ زہر ہوتا تب بھی وہ زہر دینے کی ہمت کہاں سے لاتے۔

میں نے اسٹیشن ماسٹر سے ریلوے ٹرینوں کے بارے میں ضروری معلومات لیں۔ تصدیق رحمت علی کرتا گیا۔ کون سی ٹرین کب آئے گی۔ کس رفتار سے کہاں ہو گی۔ کون سی جگہ مال گاڑی کو سامنے سے آنے والی ٹرین سے ٹکرانے کے لئے موزوں ترین ہے۔ اسٹیشن کے آگے کہاں موڑ ہے۔ کہاں چڑھائی یا ڈھلان ہے۔ کہاں ندی نالے کا پل ہے۔

پل اڑانے والی کارروائی ہر اعتبار سے ہمارے مقاصد کے لئے بہتر تھی۔ اس میں جانی نقصان کم سے کم تھا۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا لیکن تباہی مکمل تھی۔ رحمت علی نے اس پلان پر عمل درآمد کے سلسلے میں بڑی مفید رہنمائی کی۔ اس نے کاغذ پر ایک نقشہ بنا کے واضح کیا کہ اگلے اسٹیشن سے ساڑھے آٹھ بجے نکلنے والی آگرہ ایکسپریس آٹھ بج کر پچاس منٹ پر ایک برساتی دریا کا پل عبور کرے گی۔

"اگر یہاں سے مال گاڑی آٹھ چالیس پر نکلے تو دس منٹ بعد اسے بھی پل پر پہنچ جانا چاہئے" اس نے کہا۔

"جگہ تو خیر یہ ٹھیک ہے" میں نے کہا "پہنچ جانا چاہئے والا مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے۔"

غالب بولا "بہت کچھ ہونا چاہئے دنیا میں۔ مگر ہوتا نہیں ہے۔"

"کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا" اس نے یوں کہا جیسے مشاعرے میں نظم پڑھ رہا ہے۔

"میں کوشش کروں تو اس ٹرین کو اڑا کے لے جا سکتا ہوں یا چلو بھر پانی میں غرق کر سکتا ہوں" غالب نے کہا۔

وہ پٹ پٹ ہنسنے لگا "آپ مذاق کیوں سمجھ رہے ہیں میری بات۔ بزرگوں نے کہا ہے وہ کر کے بھی دکھا سکتا ہوں جناب!"

"یہ بھی ممکن ہے رحمت علی کہ ایک چھوٹے سے پل پر دونوں طرف سے دو گاڑیاں ایک ساتھ داخل ہوں۔ چند سیکنڈ کا فرق بھی ہو تو ورنہ کوئی ایک ٹرین پل کو عبور کر جائے گی۔" غالب نے کہا "ہر ٹرین کی رفتار کیا ہو گی؟ پل کی لمبائی کتنی ہے؟"

"ڈاؤن ایکسپریس کی رفتار رہو گی پچیس میل کی بہتر" رحمت علی بولا "وہ پل ہے تقریباً ایک فرلانگ۔"

"پھر تو سوال بہت آسان ہو گیا" غالب نے کہا "اب اپنی ٹرین کی لمبائی اور پھر دونوں ٹرینوں کی مجموعی لمبائی معلوم کرو۔ پھر یہ دیکھو کہ آٹھ بج کر پچاس منٹ پانچ سیکنڈ پر تمہاری ٹرین پل کا کتنا حصہ طے کر چکی ہو گی اور عین اسی وقت مخالف سمت سے آنے والی آگرہ ایکسپریس پل پر کہاں ہو گی۔ تصادم کس جگہ کتنے سیکنڈ کے بعد ہو گا؟"

میں نے سر کھجا کے کہا "یار مرزا تم بعض معاملے کو زلف یار کی طرح طول دے کر الجھاتے ہو۔ اس سوال کا جواب تو کمپیوٹر بھی نہیں دے سکتا۔ تم یہ بتاؤ رحمت علی کہ پل پر سے گزرنے میں ایک ٹرین کو کتنا وقت لگتا ہے۔"

"پوری ٹرین گزر جائے گی..... چار منٹ میں" اس نے سوچ کے جواب دیا۔

"چار منٹ تو بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر ادھر سے آنے والی ٹرین دو منٹ بھی لیٹ ہو گئی تو۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم پل پر گاڑیاں لڑانے کے امکانات کو بھول جائیں اور آسان کام کریں" غالب نے کہا۔

"آسان کام کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہمیں کہیں بھی ہو جانے دو تصادم۔ جگہ کا تعین نہ کیا جائے۔" غالب نے کہا "دونوں گاڑیاں بے قابو ہوں گی اور کنٹرول ہمارے ہاتھ میں۔ پھر بھی یہ مشکل تھا....."

رحمت علی جوش میں آ گیا "آپ کمال بات کرتے ہیں جناب! میں نے چند سال ذرا شوخی کی ہے۔ یہ مشکل گھوڑا میرا غلام ہے۔ بہت اشاروں پر چلتا ہے۔"

"بالکل چلتا ہو گا بھائی رحمت علی۔ لیکن دوسرے گھوڑے کی لگام تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

"اس کے علاوہ" میں نے کہا "تصادم کے وقت تمہارا جائے واردات ـــ"

"جانے حادثہ" غالب نے میری تصحیح کی۔

"تم کو جائے حادثہ سے دور رہنا چاہئے۔ انجن کے اندر نہیں؟" میں نے کہا "ورنہ تمہارا نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔"

"شہادت کی موت کا اعزاز چھیننا چاہتے ہیں آپ مجھ سے" وہ دکھی لہجے میں بولا۔

"میرے نزدیک یہ خودکشی ہوگی" میں نے کہا "جو حرام ہے۔"

"ناگزیر خطرے کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دینا بہادری ہے جانتے بوجھتے آنکھیں بند کر کے اور عقل سے کام لئے بغیر موت کو گلے لگانا بے وقوفی" میں نے یہ بھی کہا "یہاں تمہارا جان دینا قطعی بے مقصد اور غیر ضروری ہے رحمت علی۔"

وہ مایوس نظر آنے لگا "زندہ رہ کے میں کیا کروں گا جناب عالی۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم مرنا چاہتے ہو کسی بہانے" میں نے کہا "تو مگر کیوں۔ مسلمان کی زندگی خدا کی امانت ہے اور یہ امانت خدا نے اسے بے مقصد گنوانے کے لئے نہیں دی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو تم پر فرض بنتا ہے کہ اپنی زندگی کی حفاظت کرو۔ اسے ناکارہ اور فضول چیز سمجھ کے ضائع مت کرو۔ کیا معلوم آگے کب قدرت کی طرف سے تمہیں کوئی عظیم ذمے داری سونپ دی جائے۔ ایک زندگی کو بے رحم اور بے مقصد گنوا دو گے تو کسی عظیم تر مقصد کی خاطر شہادت پانے کے لئے دوسری زندگی کہاں سے لاؤ گے میرے بھائی!"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "شاید آپ نے ٹھیک ہی کہا صاحب۔ مجھے موت کی آرزو کرنا چھوڑ دینا چاہئے اور جینے کی کوشش کرنی چاہئے مگر کوشش کے لئے خواہش کی شرط ہے اور جینا بہت مشکل ہو گیا ہے میرے لئے۔ موت کے تصور میں مجھے اپنی نجات محسوس ہوتی ہے۔ بڑا سکون ہے اس خیال میں۔"

"وقت کم ہے رحمت علی" اس لئے میں تم سے ابھی یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم ایسا کیوں سوچتے ہو۔ فی الحال خودکشی کا خیال چھوڑ دو اور جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ غور سے سنو۔"

اس نے بے دلی سے کہا "میں سن رہا ہوں جناب!"

"سامنے سے آنے والی ڈاؤن ایکسپریس تمہارے اندازے کے مطابق ٹھیک آٹھ بج کر پچاس منٹ پر یہاں ہو گی" میں نے پنسل سے نقشے پر نشان لگا کے کہا "جہاں سے پل شروع ہوتا ہے۔"

"ٹھیک کی جگہ جملے میں تقریباً کا لفظ شامل کیجئے" غالب نے کہا "دو چار منٹ آگے پیچھے ہو سکتے ہیں کیونکہ گھڑیوں میں اور عورت ذات کی رائے میں ہمیشہ اختلاف پایا جاتا ہے۔"

"ٹرین جب اگلے اسٹیشن سے روانہ ہو گی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا" رحمت علی بولا "یہاں گھنٹی بجے گی۔ اس کے ٹھیک دس منٹ بعد ٹرین پل پر ہو گی۔"

"لہٰذا اب ہونی تو یہ چاہئے بات" میں نے کہا "میں یہ چاہتا ہوں کہ تم پونے سات سے پہلے ہی اس مال گاڑی کو پل پر لے جاؤ اور بالکل بیچ میں روک دو۔"

www.paksociety.com

غالب نے کہا "جب یہ ٹرین یہاں سے روانہ ہوگی تو کیا اگلے اسٹیشن پر گھنٹی نہیں بجے گی؟"

"بجنے کی گھبراہٹ سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آؤٹر جنگل سے نکل کر ٹرین پٹری بدل لے گی" رحمت علی بولا "اور اسی ٹریک پر رک جائے گی جس پر آٹھ کل ایکسپریس کو آنا ہے۔ وہ لائن تو خالی ہوتی ہے اس لئے سامنے سے آنے والی ٹرین پوری رفتار سے گزر جاتی ہے۔"

"اگر ڈرائیور نے ٹرین کو دیکھ لیا... تو کیا وہ بریک لگا کے گاڑی روک نہیں لے گا؟"

رحمت علی نے نفی میں سر ہلایا "مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ دور سے تو اندازہ ہوتا نہیں کہ ٹرین کس پٹری پر ہے اور یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ ٹرین کھڑی ہوئی ہے یا چل رہی ہے۔ بہت قریب آکے جب یہ انکشاف ہوتا ہے تو ایمرجنسی بریک لگانے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "صرف رفتار کی بات نہیں۔ آٹھ کل ایکسپریس کا MOMENTUM بہت ہوگا یعنی وزن اور رفتار۔ فٹ بال کو آپ روک سکتے ہیں مگر اتنی ہی رفتار سے ٹھوس لوہے کی گیند آئے تو اسے دیوار بھی نہیں روک سکتی۔ وہ دیوار گرا دے گی۔"

"اللہ بھلا کرے آپ کا... آپ سمجھ گئے" رحمت علی بولا۔ "اب ایک نظر نقشے پر ڈالئے۔ یہ دیکھئے، یہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے مشکل سے سو فٹ اونچی۔ گھراؤ کی وجہ سے ریلوے لائن گھوم کر آتی ہے اور پہاڑی یہیں برساتی ندی کے کنارے پر ہے۔ پہاڑی کے موڑ سے پُل کا فاصلہ سو گز بھی نہیں۔ موڑ کاٹتے وقت ٹرین کی رفتار کم نہیں ہوتی کیونکہ موڑ معمولی ہے۔ ڈرائیور کو ٹرین اس وقت نظر آئے گی جب انجن موڑ کاٹ کے سامنے آئے گا اور اس وقت وہ کچھ بھی نہیں کر پائے گا۔"

میں نے کہا "اگر ٹرینوں کا تصادم پُل پر ہوگیا تو پھر ہماری کامیابی بھرپور ہوگی۔ پُل بکھر جائے گا اور سارے ڈبے ایک ساتھ نیچے جا گریں گے۔"

"پُل کی بلندی کیا ہے؟" غالب نے کہا۔

"ایک سو بارہ فٹ" ڈرائیور رحمت علی نے کہا۔

"ابھی تقریباً ایک گھنٹا چالیس منٹ ہیں ہمارے پاس" میں نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا "اسٹیشن ماسٹر صاحب، آپ بتائیں ریلوے کی سرکاری گھڑی کا وقت کیا ہے؟"

اسٹیشن ماسٹر چپ چاپ بیٹھا ہماری ساری گفتگو بڑی بے بسی کے ساتھ سن رہا تھا۔

میری بات پر وہ چونکا "اپنی گھڑی میں پانچ منٹ اوپر ہوگئے ہیں جی۔"

"سات بج کر پانچ منٹ" میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ اپنی اپنی گھڑیاں ملالو۔ چائے پیو اور چلو۔"

اسٹیشن ماسٹر کے لڑکے نے چائے کی کیتلی ہمارے درمیان رکھ دی تھی۔ کپ نہایت بدوضع اور غلیظ تھے۔ ان کے کنارے ٹوٹے ہوئے تھے اور ایک دو کے کنڈے بھی نہیں تھے مگر یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ لڑکے نے ہر کپ میں چائے انڈیلی اور پھر خود ایک طرف بیٹھ کے چسکی لگانے لگا۔ اس نے چائے کے تمام اجزاء پانی میں ڈال کے خوب ابالے تھے چنانچہ یہ وہی لذیذ، خوش رنگ گاڑھا مشروب تھا جسے دیہات میں چائے سمجھ کے پیا جاتا ہے۔ باپ بیٹا سخت پریشان تھے کہ عین ان کے سامنے بیٹھ کے وطن دشمن ایک تخریب کاری کی واردات کا پروگرام بنا رہے تھے اور ان کا ساتھ ایک غدار بھی دے رہا ہے مگر وہ کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ انہیں جان کی فکر پڑی ہوئی تھی کہ کہیں جاتے جاتے ہم انہیں مار نہ جائیں۔

باہر وقفے وقفے سے ٹرینوں کے گزرنے کا شور ہوتا تھا اور چند منٹ بعد پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ چائے ختم کرتے ہی مجھے سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی۔ رحمت علی نے مجھے سگریٹ کی ڈبیا پیش کی۔

"یہ آپ کے لائق تو نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "ضرورت میں سب چلتا ہے" اور ایک سگریٹ جلا کے ڈبیا اسے واپس کردی "اب تم انہیں سنبھالو، ہم بوگیوں کی تلاشی لیں گے۔"

"ان کی آپ فکر نہ کریں" رحمت علی بولا۔

"ریوالور کی ضرورت ہوگی تمہیں؟"

"بالکل نہیں، مُکا مار کے میں ناریل توڑ دیتا ہوں یہ تو کھوپڑیاں ہیں" وہ بولا۔

باہر نکل کے غالب نے کہا "رحمت علی کا مسئلہ کچھ ذاتی ہے۔ وہ ہمارا ساتھ اس لئے دے رہا ہے کہ اس طرح وہ اپنے انتقام کی تسکین کرسکتا ہے۔"

"کچھ ایسی ہی بات نظر آتی ہے" میں نے کہا "فرصت میں سنیں گے اس کی کہانی۔"

"یعنی اسے بھی ساتھ رکھیں گے ہم"

میں آخری بوگی کی طرف چلتا رہا "ہاں... ابھی تو ساتھ رہے گا وہ بھی اور کہاں جائے گا۔"

"جہاں چاہے جائے۔ ہم اس کی ذمے داری قبول نہیں کرسکتے" غالب نے کہا۔ "ہمارا ساتھ دے کر اس نے اپنا مستقبل داؤ پر لگا دیا ہے۔ وہ ایک مجرم اور غدار سمجھا جائے گا اور موت سے نہیں بچ سکے گا۔"

میں نے ہنس کے کہا "ہاں، اگر وہ کسی کے ہاتھ آیا۔ ورنہ مرحوم سمجھا جائے گا اور پنشن کا حقدار ہوگا کیونکہ فرض ادا کرتے ہوئے مارا گیا۔"

"اسٹیشن ماسٹر اور اس کا بیٹا چشم دید گواہ ہیں۔ انہوں نے سب دیکھا ہے اور سنا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ انہیں بھی ختم

کر دینا چاہئے۔ وہ رحمت علی کے خلاف بیان دیں گے تو ہمارا ذکر بھی کریں گے۔"

"کیا انہیں معلوم ہوگیا کہ ہم کون ہیں؟"

"ابھی معلوم نہیں تو بعد میں ہو جائے گا۔ جب حادثے کی انکوائری ہوگی" غالب نے کہا "چندو تیسرا گواہ ہوگا۔ ان تینوں کو مار دینے سے فائدہ یہ ہوگا کہ حادثے کو تخریب کاری کوئی نہیں کہے گا۔ سمجھا جائے گا کہ غلطی کانٹا بدلنے والے کی تھی۔"

"کچھ لوگ اور بھی ہیں جو حادثے کے اسباب کو سمجھتے ہوئے مثبت بیان دے سکتے ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے نفی میں سر ہلایا "سمجھنے کی حد تک ٹھیک ہے۔ والد اور انجینئر کو معلوم ہو جائے گا۔ ترلوچن اور جیون پرشاد کو بھی معلوم ہو جائے گا مگر وہ ہمارے خلاف بیان دیں گے تو گویا خود اپنے خلاف بیان دیں گے۔ اسلحہ قانونی طور پر نہیں جا رہا ہے۔ تفتیش کرنے والوں کے لئے اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں ہوگا کہ ساری تباہی گولہ بارود کی وجہ سے ہے۔ اس کی کون ذمے داری قبول کرے گا۔ وزارتِ دفاع کا نام استعمال کرنے والے کیسے سامنے آسکتے ہیں۔"

غالب نے سر ہلایا اور گارڈ کے ڈبے میں چڑھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید گارڈ کے پاس بوگیوں کے قفل کھولنے والی چابیاں ہوں گی مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر چابیاں تھیں تو وہ گارڈ کی لاش کے ساتھ ہی گر گئی ہوں گی۔

اب تالے توڑنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ غالب نے پہلی بوگی کا قفل توڑنے کے لئے فائر کیا تو اس بات کا خیال رکھا کہ گولی پلٹ کر نہ آئے اور بوگی میں سوراخ کر کے بھی داخل نہ ہو۔ اگرچہ مجھے یقین تھا کہ اسلحہ اسی آئل ٹینکر میں ہوگا جس میں سے میں نے ایک آدمی کو اترتے دیکھا تھا لیکن کسی دوسری بوگی میں اسلحے کی موجودگی کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"اس میں تو بوریاں ہیں" غالب نے پہلی بوگی کا گیٹ کھول کے جھانکا "غالباً پیاز ہے... اور آلو۔"

"ٹھیک ہے آگے چلو۔"

غالب نے کہا "یار سکندر، وہ شیشے کا تابوت کیوں خالی تھا؟"

"میں کیا بتا سکتا ہوں؟"

"کہیں انہوں نے... شملا کو تابوت سے نکال کے کسی لانچ یا بوگی میں تو قید کر دیا ہو۔"

"اگر ایسا ہوگا تو معلوم ہوجائے گا۔"

غالب نے ڈبے میں سر ڈال کے آواز دی "شملا!"

میں نے کہا "مرزا جی... عقل کی بات کرو۔ کیا وہ ہوش میں ہوگی اور آزاد ہوگی کہ تمہاری پکار سن کے جواب دے۔"

"مفروضات سے امید وابستہ کرنے میں کیا نقصان ہے یار... کیا پتا وہ جواب میں شملا کہے میں یہاں ہوں غالب... ناممکن تو نہیں ہوتا۔"

میں نے دوسری بوگی کا تالا توڑا۔ اس میں اور اگلی دس بوگیوں میں مختلف نوعیت کا سامان بھرا ہوا تھا۔ پھر کئی بوگیاں آئیں جن پر گاڑیاں اور بلڈوزر لدے ہوئے تھے۔ سفید اور سبز رنگ کے پتھروں کی چٹانیں تھیں جن کو تراشنے کے لئے کارخانوں میں بھیجا جا رہا تھا۔

ہر بوگی کھولتے وقت ہم پُرامید اور پُراشتیاق نظروں سے اندر دیکھتے تھے، غالب چلا کے شملا کو آواز دیتا تھا لیکن ابھی تک یہ تلاش بے سود ثابت ہوئی تھی۔ میں کچھ مایوسی کا شکار تھا۔

"ہم دو آدمی اتنی بڑی ٹرین کی تلاشی نہیں لے سکتے مرزا جی۔"

میں نے کہا "کیا پتا کس بوگی کے کس کونے میں اسلحہ رکھا ہوا ہے۔ اسلحہ کیا آلو پیاز کی بوریوں کے درمیان نہیں ہو سکتا اور کیا شملا ان کے پیچھے نہیں ہو سکتی۔"

غالب نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتا تھا کہ میری بات کی تردید نہیں کی جا سکتی۔ ہر بوگی میں اندھیرا تھا اور ہماری نظر آخری کونے تک نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ ہم ہر بوری کو کھول کر دیکھیں۔ اگر ایکس رے مشین بھی ہوتی تب بھی اس تمام اسباب کو اندر سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ وقت کی کمی کا احساس الگ ہمارے اعصاب پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ ہم دوڑ دوڑ کے تالے توڑ رہے تھے اور سرسری نگاہ ڈال کے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

جیون پرشاد کے گھوڑے زندہ تھے مگر ان کے ساتھ جانے والے ڈاکٹر اور ٹرینر مرے پڑے تھے۔ وہ غالباً نازو کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ مجھے نازو سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ میں ان کے بارے میں پوچھ سکتا۔

غالب تیل کے ٹینکر کی سیڑھی پر چڑھ چکا تھا۔ ایک مسافر بردار ٹرین ساتھ والی ریلوے لائن پر سے گزر گئی۔ سورج اب کافی اوپر اٹھ چکا تھا اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ اِکا دُکا سائیکل سوار، پیدل چلنے والے اور گدھوں گھوڑوں پر سوار لوگ نظر آنے لگے تھے۔ ان کے لئے مال گاڑی میں دلچسپی کی کوئی بات نہ تھی اور اس کا وہاں کھڑے رہنا بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

میں اگلی بوگی میں جھانک رہا تھا کہ غالب اتر آیا "اسی میں ہے سارا مال" وہ بڑے جوش سے بولا۔

"کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"سب کچھ، رائفلیں اور مشین گنیں۔ دستی بم۔ میں نے آخر تک دیکھ لیا۔"

"آخر تک کیسے دیکھ لیا؟" میں نے کہا "اوپر دو فٹ قطر کے ایک ڈھکنے سے کیا نظر آیا ہوگا۔"

"سورج کی روشنی کافی تھی۔ میں اندر اتر گیا تھا" غالب نے کہا "آخر تک واقعی نہیں گیا مگر جہاں تک میں دیکھ سکتا تھا اسلحہ بھرا ہوا ہے۔ یہ تیل کی بوگی ایک بم سے کم نہیں ہے۔"

www.paksociety.com

"اندازہ تو رات کو ہی ہو گیا تھا" میں نے کہا۔
"اب باقی بوگیوں کو دیکھنا ضروری ہے کیا؟"
میں نے کہا "کیا ہم صرف اسلحے کے ذخائر تلاش کر رہے تھے' شملا کو نہیں؟"
غالب شرمندہ نظر آنے لگا "شملا۔ ہاں' اسے بھی تلاش کرنا ہے۔ میں بھولا تو نہیں تھا۔"
"غالب' اگر وہ نہ ملی۔۔۔"
"تو یہ تلاش جاری رہے گی۔ ہم امید سے کیسے دستبردار ہو سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔
"یہ بات نہیں۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ اگر وہ ٹرین پر موجود ہونے کے باوجود موجود نہ ملی۔ ہم اسے دیکھ نہ سکے۔ وہ خود مجبوری اور معذوری کے باعث کسی طرح اپنی موجودگی کا احساس دلانے میں ناکام رہی۔۔۔ تو؟"
طویل خاموشی کے بعد غالب نے کہا "تو کیا؟"
"کیا خود ہم ذمہ دار نہیں ہوں گے اس کی موت کے اور اس کے معصوم بچے کی ہلاکت کے۔ یہ احساس جرم تو تمام عمر کا آسیب بن جائے گا کہ ہم کوتاہی کے مرتکب ہوئے تھے۔ ہم نے اچھی طرح دیکھا ہوتا تو انہیں تلاش کر سکتے تھے۔"
"اس کے لئے تو ایک پورا دن بھی ناکافی تھا۔"
"کم سے کم ٹارچ ہوتی ہمارے پاس تو ہر بوگی کے تاریک گوشوں میں بھی جھانک لیتے۔ میری قوت فیصلہ کمزور پڑتی ہے یہ سوچ کر کہ کہیں ہماری نظر نے انہیں مس نہ کر دیا ہو۔" میں نے کہا۔
غالب نے چٹکی بجائی۔ "ٹارچ تو ہے گارڈ کے ڈبے میں' ابھی لے کر آتا ہوں۔"
"غالب! وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ کیا تم پھر پہلی بوگی سے شروع کرو گے؟" میں نے پریشان ہو کر کہا۔
"تم آگے چلو' میں ٹارچ کی روشنی میں جھانک کر دیکھنے میں زیادہ وقت نہیں لگاؤں گا۔" وہ واپس گارڈ کے ڈبے کی طرف سرپٹ بھاگا۔ خالی پلیٹ فارم کی خاموشی میں اس کے قدموں کی آواز بھی مجھے بھیانک لگی۔
یہ بڑی اداس صبح تھی۔ غم و الم کے احساس کا سارا بوجھل پن ماحول میں بس گیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں اچانک ہم سب بچھڑ گئے تھے۔ ایک ساتھی محسن اور گل غائب ہو گئے تھے' پتہ نہ جانے بخیر۔ ان کے بارے میں آخری اطلاع دینے والا وہی گارڈ تھا جس کی لاش پیچھے ایک نالی میں پڑی رہ گئی تھی۔ اس نے جو بتایا تھا اس کے مطابق گل اور محسن کو اپنے پلان پر عمل درآمد تک کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ انہوں نے گارڈ کو ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس سوال کے جواب میں ان گنت ڈرانے والے مفروضات قائم کئے جا سکتے تھے لیکن یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ شملا اور اس کے بیٹے کا نہ ملنا ایک اور معما تھا۔ گارڈ نے مرتے دم تک اعتراف نہیں کیا تھا کہ وہ بیٹے کے

تابوت میں تھے۔ بظاہر وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ جھوٹ بول کر اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا تھا۔
ایک ایک کر کے میں تابوت توڑ آگیا۔ [illegible] رہی۔ تنگ ہوئے پرندے فضا میں گردش کرتے رہے اور شور مچاتے رہے۔ غالب دوبارہ ہر بوگی کو ٹارچ کی روشنی میں [illegible] ہوا آ رہا تھا۔ ہمارے پاس اب پچیس منٹ تھے۔ [illegible] چالیس منٹ۔ ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ دھوپ تیز [illegible] فضا کی خنکی ختم ہو چکی تھی اور فولادی بوگیاں سورج کی تپش منعکس کرنے لگی تھیں۔
میں نے اچانک اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے رحمت علی کو آتے ہوئے دیکھا۔ وہ دوڑتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔
"منظور صاحب' انجن آ رہا ہے۔" [illegible] نے قریب پہنچنے سے پہلے ہی چلا کے کہا۔
"کون سا انجن؟" میں نے بے خیالی میں کہا۔
"کمال کرتے ہیں آپ۔ آپ نے ہی تو اطلاع بھجوائی تھی اس مال گاڑی کا انجن خراب ہو گیا ہے۔" وہ [illegible] "پچھلے اسٹیشن سے کوئی انجن روانہ کیا گیا ہے۔ کسی مال گاڑی کو روک لیا گیا ہے لائن کلیئر کرانے کے لئے۔"
"میں سمجھا نہیں۔ یہ لائن کلیئر کرانے کے لئے پچھلے اسٹیشن پر تو مال گاڑی روکی گئی ہے۔"
"ایسا ہی ہوتا ہے جناب۔ پیچھے والے اسٹیشن پر اس گاڑی کو سائیڈ لائن پر لگا دیا گیا ہوگا۔۔۔۔ تاکہ مین لائن پر سے یہ مال گاڑی ہٹ جائے۔ جلدی کریں ورنہ ہمارے جھوٹ کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔"
"تمہارا مطلب ہے' ہم ابھی سے گاڑی لے کر چلے جائیں۔"
میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی اور پھر ان بوگیوں کو دیکھا جو ابھی بند پڑی تھیں۔
"کیا فائدہ دیر کرنے سے۔ میں انجن کی طرف جاتا ہوں۔" رحمت علی نے کہا۔
"رحمت علی۔ ابھی آئل ایکسپریس کے آنے میں آدھا گھنٹہ ہے۔"
"دس پندرہ منٹ کا تو راستہ بھی ہے۔" وہ بولا۔
"درمیان میں کوئی مسافر گاڑی تو نہیں آ جائے گی؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کے بعد وہی تیل لانے والی گاڑی آنے کی ساعت ہے۔"
"اور پیچھے سے؟"
"پیچھے سے جو گاڑی آئے گی وہ یہاں رکی رہے گی کہ [illegible] ڈاؤن نہیں ملے گا اسے۔"
میں اس کے ساتھ چلتا گیا "ہم ان دونوں کو ایسے ہی [illegible] آئے۔ وہ فون کر دیں گے۔"
"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں جناب!"

"[illegible] تم نے"
[illegible] ان کے سر توڑ دیئے ہیں۔ میں نے دونوں کو [illegible] میں انہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا جناب!"
[illegible] اور انجن پر چڑھ گیا۔
"اچھا تم گاڑی چلاؤ۔ مگر دیکھو' آؤٹر سگنل پر دو لڑکی ہوں گی' چندو کے ساتھ۔ ان کو لینا ہے۔" میں نے کہا۔
[illegible] میں نے غالب کو اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ "وقت نہیں رہا مرزا جی' سب بوگیوں کو دیکھنے کا۔"
"پیچھے تو سب دیکھ آیا ہوں میں۔"
"بس۔ چڑھ جاؤ گاڑی پر۔ ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی" میں نے کہا۔
آگے انجن نے وسل دی۔ میں اور غالب پھر بھاگے اور اسی کھلے ہوئے پلیٹ فارم جیسی بوگی پر کود گئے جس پر جیون پرشاد کے [illegible] لے جانے والا کنٹینر رکھا ہوا تھا۔ ٹرین آہستہ سے کھسکی۔
"یہ تو برا ہوا یار" غالب نے کہا "کتنی بوگیاں رہ گئیں۔"
"پانچ" میں نے کہا "اب بوگیوں کی تعداد سے کیا فرق پڑتا ہے اگر ایک بھی رہ جاتی تو احساس کی شدت کم نہ ہوتی۔ یہ خیال پیچھا کرتا رہتا کہ کہیں شملا اسی میں تو نہیں تھی۔"
"خدا کرے کہ وہ دشمنوں کی قید میں ہو۔"
"کیسی عجیب ہے یہ دعا۔ جو عام حالات میں بددعا تھی لیکن اب سوال ہے ان کی زندگی کا تو ہم چاہتے ہیں کہ وہ قید میں ہی زندہ رہیں" میں نے کہا۔
"قید سے کبھی رہائی بھی ہو سکتی ہے لیکن خدانخواستہ۔۔۔" اس نے دوبارہ خدانخواستہ کہا' فقرہ پورا نہیں کیا۔ شاید میری صورت دیکھ کر وہ ڈر گیا۔
آؤٹر سگنل کے قریب گاڑی آہستہ ہوئی اور رک گئی۔ میں نے ناذو کو اشارہ کیا اور اپنی طرف بلایا لیکن وہ چندو کو ہدایات دینے میں مصروف تھی۔ سگنل ڈاؤن کے بغیر ریلوے لائن لاک رہتی تھی اور پوائنٹ بدلا نہیں جا سکتا تھا اور جب تک پوری ٹرین گزر نہ جائے سگنل پھر اپ نہیں ہو سکتا تھا۔ گاڑی پھر آگے بڑھی اور اس کے پہیے شور مچاتے ہوئے دوسری لائن پر اترنے لگے۔ آخری بوگی کے گزرنے تک ناذو کافی پیچھے رہ گئی تھی اور میں اسے ہاتھ ہلاتا دیکھ رہا تھا۔ سگنل اب بھی ڈاؤن تھا۔ چندو نے لیور کھینچا اور سگنل کا بازو اوپر اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی ناذو کا ہاتھ بھی اٹھا اور چندو بھاگتا ہوا [illegible] گیا۔ ناذو نے ہاتھ لہرایا اور گارڈ کے آخری ڈبے پر چڑھ گئی۔ ٹرین کی رفتار بہت کم تھی مگر اس کے باوجود ناذو کا چلتی گاڑی پر دوڑ کے سوار ہونا ایک خطرناک حرکت تھی۔ ریلوے لائن پر دوڑنا یوں بھی آسان نہیں ہوتا۔ اس کا پاؤں کسی پتھر پر پھسل سکتا تھا یا ان فولادی تاروں میں الجھ سکتا تھا جو ٹریک کے ساتھ ساتھ سگنل تک [illegible] اوپر چل رہے تھے۔

غالب نے بے حد مشتعل ہو کے اسے گالی دی "الو کی پٹھی۔ ضرورت سے زیادہ اعتماد میں ہی ماری جائے گی کسی دن۔ جب ڈرائیور گاڑی روک رہا تھا تو جلدی کس بات کی۔"
اسے دوڑ کر چڑھتا دیکھ کر میرا سانس بھی رکنے لگا تھا مگر میں نے غالب کو تسلی دی "چلو مرزا جی۔ کچھ نہیں ہوا۔ ٹیک اٹ ایزی۔"
"مزید حماقت ملاحظہ ہو" وہ برہمی سے بولا۔
میں نے پیچھے دیکھا تو ناذو ایک ہاتھ سے ڈنڈے کو پکڑ کے باہر جھول رہی تھی اور دوسرا ہاتھ لہرا رہی تھی۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ اندر ہو جائے مگر اس کا الٹا اثر ہوا۔ وہ ایک ٹانگ بھی باہر جھلانے لگی۔ وہ غالب کو پریشان کرنے کے لئے ایسا کر رہی تھی مگر خون میرا بھی خشک ہو رہا تھا۔
"اس کا جواب تو یہ ہے کہ میں بھی سر کے بل لٹک کر کوئی کرتب دکھاؤں" غالب نے کہا۔
"بہتر ہے کہ تم ادھر مت دیکھو" میں نے کہا "یہ ظاہر کرو کہ تمہیں خاک بھی پروا نہیں۔"
"اچھا۔ مگر یار' میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔"
"کیا خیال ہے' ان گھوڑوں کو چھوڑ نہ دیں؟" میں نے غالب کی توجہ ہٹانے کے لئے کہا "ان بے زبان جانوروں نے تو کوئی گناہ نہیں کیا۔"
"اندر کا دروازہ کیسے کھولو گے۔ چابی تو خاتون کے پاس ہے۔ اف' یار یہ مرے گی" وہ سر پیٹ کر بولا۔
"وہ تو نہیں مرے گی مگر لگتا ہے تم چھلانگ مار دو گے اور مر جاؤ گے بلاوجہ" میں نے کہا۔
ٹرین اب اچھی خاصی رفتار سے جا رہی تھی۔ وہ ریلوے اسٹیشن بہت پیچھے رہ گیا تھا جہاں ہم نے دو گھنٹے گزارے تھے۔ زندگی کے سفر میں ایسے کتنے گمنام اسٹیشن آتے ہیں جہاں سے آدمی پھر کبھی نہیں گزرتا۔ کچھ عرصہ وہ یاد کا نقش بن کے خیال میں رہتے ہیں پھر خیال پر بھی وقت کی گرد جم جاتی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر' اس کا بیٹا اور چندو آج صبح سورج نکلنے سے پہلے زندگی کے آنے والے بہت سے دنوں' ہفتوں' مہینوں اور سالوں کے بارے میں کسی شک وشبہے کا شکار نہ تھے کہ یہ ان کے مستقبل کا حصہ ہوں گے' مگر مستقبل کی مسافت اچانک یوں ختم ہو گئی تھی جیسے ریلوے اسٹیشن پر کوئی لائن بند ہو جاتی ہے۔ آگے راستہ روکنے والے بمپر آ جاتے ہیں۔ ان کی لاشیں دریافت کے وقت کا انتظار کر رہی تھیں۔ ٹرین میں بھی دو لاشیں پڑی تھیں۔ اُن کی چتا ایک گھاٹ پر جلائی جائے گی۔
"پل آ گیا" غالب نے کہا۔
میں نے چونک کر دیکھا تو مجھے پل کے شہتیروں کا فولادی ڈھانچہ نظر آیا۔ گاڑی کے بریک لگنے سے رفتار کم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے انجن کو پل کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ پل کے دونوں جانب ندی خشک پڑی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی [illegible] میں دو

www.paksociety.com

ٹرینوں کا ملبہ بھی پڑا ہوگا۔ پل کے شہتیر تنکوں کی طرح بکھر چکے ہوں گے۔ آگ اور دھوئیں کے بادل ہماری ایک اور فتح کا عنوان بنیں گے یا شملا کے لیے تحفۂ مرگ؟ وہ ایک نام تھا۔ ایک چہرہ تھا۔ ایک بار تھی اور ایک پورے عہد جذبات کا ٹکڑا تھا جس کی خلش میرے دل میں نوکِ خار کی طرح رہتی۔ پھر اتنا کہ وہ بن گئی اور میں احساس کے ناقابل بیان کرب کا شکار ہو گیا۔ کہیں اس کامیابی کے رنگ میں شملا اور اس کے بچے کے لہو کی سرخی نہ شامل ہو جائے۔ میرے دامن پر وہ داغ نہ آ جائے جو نہ میرے آنسو دھو سکیں اور نہ پچھتاوے۔ میں ان کا قاتل کہلانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے خدا مجھے اس الزام سے بچانا۔

زرین اب پل پر رکی ہوئی تھی۔ اس کا آدھے سے زیادہ حصہ پل سے پیچھے تھا لیکن انجن درمیان تک پہنچ گیا تھا۔ دُور تک ریل کی پٹڑی دھوپ میں دو چمکتی لکیروں کی طرح دکھائی دیتی تھی جو پہاڑی کے موڑ پر غائب ہو جاتی تھی۔ مٹیالے زرد رنگ کی بنجر پہاڑی نے پیچھے کے منظر کو چھپا رکھا تھا۔ قرب و جوار کا سارا علاقہ ایسا ہی نیم صحرائی بنجر زمین پر محیط تھا جس میں کہیں کہیں کانٹے دار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان میں برساتی ندی کا گول کنکروں والا فرش موزیک کا دلکش نمونہ لگتا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ڈھائی بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اگلے پندرہ بیس منٹ میں ہمارا اس جگہ سے دور بھاگ جانا ضروری تھا۔ میں نے نازو کو پٹڑی کے سلیپروں پر لمبے لمبے قدم رکھتے دیکھا۔ وہ کسی بچی کی طرح کودتی آ رہی تھی جو کھڑکی سے لنگڑی پالا کھیل رہی ہو۔ زمین پر کوئلے یا چاک سے خانے بنا کے کھیلا جانے والا لڑکیوں کا کھیل جس میں کبھی ایک ٹانگ پر خانے عبور کرنا پڑتا ہے تو کبھی آنکھوں پر پٹی باندھ کے۔ وہ قطعی متفکر یا پریشان نظر نہ آتی تھی۔ اس کے برعکس غالب ابھی تک بے دم تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب ان کی لڑائی ضرور ہوگی لیکن میں نے کسی کو بھی نہیں روکا۔ میں جلد کے انجن ڈرائیور کی طرف چلنے لگا جو خود بھی نیچے اتر کے میری طرف آ رہا تھا۔

"ہم اس پہاڑی پر سے تماشا دیکھیں گے" اس نے بڑی مسرت سے کہا۔

"یہ تماشا تو نہیں ہے رحمت علی" میں نے کہا۔

"کچھ بھی ہے جناب۔ میرے لیے تو اس میں بڑی خوشی ہے۔ خدا نے مجھے آپ کے کسی کام آنے کی سعادت بخشی۔ اور اپنا بدلہ لینے کا موقع بھی فراہم کیا" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا "ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ اچانک رحمت آ گیا۔ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ اس سے پہلے ایسا کوئی خیال بھی نہیں تھا میرے دل میں۔"

"تم کیسے جانتے تھے ہمیں؟"

"کس سے سنا تھا۔ اخباروں میں پڑھا تھا۔ آج کل ... مسلمان بڑے عذاب میں جلتا ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کس کا ساتھ دیں۔ کس کو الزام دیں۔ ہم بھارت میں رہتے اور بھارتی شہری ہیں۔ ہمیں اس ملک سے وفادار رہنا چاہیے۔ یہاں کیا سلوک ہوتا ہے ہمارے ساتھ۔ ہم ... ہم دوسرے درجے سے بھی کم تر شہری سمجھے جاتے ہیں ... رویہ تو ہمیشہ سے متعصبانہ رہا ہے مگر سرکاری ... غضب نہیں ہونے چاہئیں اور ہمارے ساتھ ظلم ہو ... ملنا چاہیے۔"

میں نے حیران ہو کے کہا "تم اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہو..."

"ڈگری تو کوئی نہیں لی میں نے ڈب کی دعا سے ... آنکھوں سے دیکھا ہے اور سمجھا ہے۔"

"ڈگری تو محض کاغذ کا ایک ٹکڑا ہوتی ہے۔ جو سب ... ہے جسے بھی ملے" میں نے کہا "ضروری نہیں کہ اس کے ساتھ ... بھی آ جائے۔"

"ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں خود مسلمان ... مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ انہیں بے وطن کر دیتے ہیں اور غدار قرار دے کر دھتکار رہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ وہ بنگالی نہیں ... ہیں یا بنگالی زبان نہیں بول سکتے۔ وہ اس زمین کے بیٹے نہیں ... سونار بنگلہ وطن ہے۔ کتنے دکھ اور افسوس کی بات ہے ... کی اہمیت مذہب سے زیادہ ہے۔ اسلام کا رشتہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور یہ لوگ جو اسلام کے نام پر گھربار چھوڑ کے ... پاکستان پہنچے تھے قریب باعث تیس سال بعد ان کی زبان ... جرم بنا دی گئی ہے۔ ان حالات میں بھارت کے مسلمان کے ... وہ ساہیرے دخل اندازی کرنے والوں کو یا خود گھر والوں کو ... ہی یہاں ہماری وفاداریوں پر شک کیا جاتا ہے۔ ہم حق کے ... کہہ سکتے کہ بھارت کو پاکستان کے تخریب کار اور علیحدگی پسند ... کی مدد نہیں کرنی چاہیے اور جارحیت سے گریز کرنا چاہیے۔ ... ناممکن ہے کہ ہم ہندوؤں کی طرح پاکستان کی خانہ جنگی پر خوشی کا اظہار کریں کیونکہ پاکستان دشمن ہے بھارت کا۔"

"پاکستان کسی کا دشمن نہیں۔"

"میں تو سرکاری پروپیگنڈے کی بات کر رہا تھا۔ اس میں ... جاتا ہے۔ مسلمان نہ ادھر کے نہ اُدھر کے۔ ہمدردی بھی دکھائیں کس کے ساتھ۔"

غالب اور نازو کی لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ اس کا پتا دونوں کی صورت پر پھیلی ہوئی معمولی خفگی سے چلتا تھا۔

"رحمت علی کا خیال ہے کہ ہمیں پہاڑی کے اوپر سے یہ تماشا دیکھنا چاہیے" میں نے کہا "مگر میں یہ خطرہ مول لینے کے خلاف ہوں۔"

"مشرقی ... کی کیا بات ہوگی اتنے فاصلے پر؟"

"تم نے ... رحمت علی! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس مال ... میں ... اسلحہ اور گولہ بارود لدا ہوا تھا؟"

"اسلحہ اور گولہ بارود۔ اب مذاق کر رہے ہیں۔"

"مذاق میں ضرور کرتا ہوں۔ اکثر کرتا ہوں لیکن موقع محل دیکھ کر۔ مذاق کی بات نہیں ہے" میں نے کہا "تصادم صرف ٹرینوں کا نہیں ہوگا اس کے بعد جو دھماکے ہوں گے وہ بہت خوفناک ہوں گے۔ موڑ کے فاصلے پر وہ جگہ قطعی غیر محفوظ ہے۔"

"تب نے میری مانو تو" "ہمیں واپس جانا چاہیے اور ... ہم بھی ادھر جا رہے ہیں" نازو نے کہا۔

"بات سنو۔ انجن پر جا کے ... جہاز" غالب نے کہا۔

"مرو میرے دشمن" نازو جلے بھنے لہجے میں بولی۔

"نازو ... ہم آگے نہیں جا سکتے کیونکہ وہ سب کہیں پیچھے ہی ہم سے جا ملے ہوئے تھے" میں نے کہا "وہ خود اترے تھے یا انہیں اتارا گیا تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم کرنا ہے۔"

"ہم جہاں ہیں وہ جگہ ... " نازو نے کہا۔

میں نے پریشان ہو کے گھڑی دیکھی "دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں ہیں ہمارے پاس۔"

"ہم دوڑ کے کتنا فاصلہ طے کر سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دو فرلانگ" غالب مایوسی سے بولا۔

"وہ بھی مشکل ہے۔ کوئی اتنا نہیں دوڑ پائے گا۔ سوچنے تو چار موٹر کو نہیں ہونے مگر کسی کو عادت نہیں ہے اور یہ راستہ بھی بہت خراب ہے۔"

"سکندر۔ گھوڑے ذخیرہ میں لائے ہیں۔ ریس کورس کے گھوڑے یہاں بھی تو دوڑ سکتے ہیں" نازو نے کہا۔

"رائٹ" میں نے چٹکی بجا کے کہا "چلو فٹافٹ دروازہ کھولو۔ دو گھوڑے کافی ہوں گے۔ جلدی کرو۔"

نازو پٹڑی سے اوپر چڑھی اور اندر چلی گئی۔ میں اس کے پیچھے گیا کیونکہ غالب اس سے قطعی تعاون کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس نے نازو کی بہترین تجویز کو بھی بادل ناخواستہ قبول کیا تھا۔ غالب کو گھڑسواری نہیں آتی تھی۔ مگر ضرورت ایک مجبوری بن گئی تھی اور میرے فیصلے سے اختلاف بھی ممکن نہ تھا۔

ہم دو گھوڑوں کے ساتھ باہر آئے تو گھوڑوں کو نیچے اتارنا ایک مشکل مرحلہ ثابت ہوا۔ خطرہ یہ تھا کہ اوپر سے جست لگانے والے گھوڑے اگر زمین کے پتھروں پر توازن قائم نہ رکھ سکے تو ان کی ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ ایک گھوڑے کے ساتھ یہی ہوا۔ اس کی جگہ مجھے تیسرا گھوڑا اتارنا پڑا۔

"رحمت علی تم بیٹھے ہو کبھی گھوڑے پر؟" میں نے کہا۔

"بیٹھا تھا جناب! سہرا باندھ کے۔ بہت پرانی بات ہے" وہ بولا۔

"اچھا تم میرے ساتھ بیٹھ جاؤ" میں نے کہا۔

"اس لنگڑے گھوڑے کا کیا ہوگا جناب؟"

"ویسے تو انہیں گولی مار دی جاتی ہے۔ مگر ہم اسے چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کی زندگی ہوئی تو یہ ہمارے ساتھ جانا۔"

"ساڑھے تین بج گئے ہیں" رحمت علی میری مدد سے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا۔

میں نے اتنی دیر میں گھوڑے کو لگام ڈال دی تھی "مرزا جی کھڑے کیوں ہو؟" میں نے چلا کے کہا۔

رحمت علی نے چونک کر کچھ سننے کی کوشش کی "یہ ... یہ آواز سن رہے ہیں آپ۔"

میرے کان ابھی تک کوئی آواز نہیں سن پائے تھے مگر میں سمجھ گیا کہ رحمت علی نے آنے والی ٹرین کی سرسراہٹ کو فضا میں محسوس کر لیا ہوگا۔ ہوا کے ارتعاش میں پہچان لیا ہوگا۔ چند سال تک ایسی ہی آوازیں سننے والے کانوں کا تجربہ اس کی چھٹی حس بن گیا تھا۔

نازو گھوڑے کی باگ تھامے مسکرا رہی تھی اور اس مسکراہٹ کا مقصد غالب کا تمسخر اڑانا اسے چڑانا اور اس کی مجبوری سے لطف لینا تھا۔ وہ نازو کے پیچھے بیٹھنے پر مجبور تھا۔

"چلو اب تم سے سست دکھاؤ۔ بعض اوقات سواری کام نہیں آتی۔ ... کرنی پڑتی ہے" نازو بولی۔

"سکندر۔ میں تمہارے ساتھ بیٹھوں گا۔"

"مگر میں تو کسی اور کے ساتھ نہیں بیٹھوں گی" نازو نے یوں کہا کہ غالب کی جگہ پتھر بھی ہوتا تو پگھل جاتا۔ پلک جھپکنے میں اس کا غصہ کافور ہو گیا اور اس نے نازو کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ نازو نے ہلکا سا جھٹکا دے کر اسے اٹھایا اور اپنے پیچھے بٹھا لیا۔

"ڈرنا نہیں" نازو نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

"تمہارے ساتھ تو میں مرنے سے بھی نہیں ڈرتا۔ کیا ہے ڈائیلاگ" غالب نے کہا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سب عشق بھول گیا۔ نازو نے گھوڑے کو دوڑانا شروع کیا تو غالب چلانے لگا۔

"ارے نازو! اے نازو کی بچی۔ آہستہ۔ ارے میں کہیں نیچے جا پڑوں گا بھوت کی بچی۔ یہ بچہ قلابات نہیں ہے۔"

جواب میں نازو کا ایک کھنکتا ہوا قہقہہ سنائی دیا۔ اس نے گھوڑے کی رفتار اور بڑھا دی۔

غالب شور مچانے لگا "ارے کوئی بچاؤ۔ یا اللہ یہ کیسی بلا چمٹ گئی ہے مجھ سے۔"

رحمت علی ہنسنے لگا "تمہارا دوست الٹی بات کر رہا ہے۔ چمٹا ہوا تو خود ہے۔"

میں نے کہا "دونوں پاگل بچے ہیں۔"

www.paksociety.com

رحمت علی نے کہا "جب آدمی محبت کرتا ہے تو ایسے ہی بچہ بن جاتا ہے۔ خواہ اس کی عمر کچھ بھی ہو۔"

میں نے پلٹ کر اسے دیکھا "تمہیں کس نے بتائی ہے یہ بات۔"

"عمر کے تجربے نے" وہ بولا "زندگی کے اس راستے سے میں گزر چکا ہوں، جس پر آپ لوگ چل رہے ہیں۔ تمہارا ساتھ کسی نے نہیں دیا اس راستے پر؟"

میں نے دکھ کی ٹیس کو دل کے اندر محسوس کیا۔ میں اسے کیا بتاتا "مجھے بتانا اور کیوں بتاتا کہ میرا ساتھ چھوڑ کے بھی کوئی ہر لمحہ میرے ساتھ ہے۔ خیالوں میں اور نگاہوں" "خلوت میں اور جلوت میں۔ روز روشن میں اس کے تصور سے قربت ہے۔ شب ماہتاب میں اس کے احساس کی راحت ہے۔"

"میں نے سنا تو تھا۔ کوئی لڑکی تھی.... نام مجھے یاد نہیں آرہا ہے کیا وہ مر گئی؟"

میں نے تڑپ کے اور چلا کے کہا "ایسی بات مت کہو۔ اگر وہ مر جاتی تب بھی میرے لئے زندہ رہتی۔ ابھی تو وہ زندہ ہے۔"

"معاف کرنا جناب۔ میرا مقصد آپ کا دل دکھانا نہیں تھا" رحمت علی شرمندہ ہو گیا۔

میں نے ایک گہری سانس لی "خود میں بھی تو اسی لئے زندہ ہوں کہ مجھے واپس جانا ہے۔ رابعہ کے پاس۔ وہ میرے گھر میں میرا انتظار کر رہی ہے۔ صبح سے شام تک اور شام سے اگلی صبح تک اس نے ہر لمحے کو میری یاد کے چراغوں سے روشن کر رکھا ہے۔"

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے آپ سے اور رابعہ کے تصور سے باتیں کر رہا ہوں۔ یہ محبت کی دیوانگی تھی جس نے ذرا سی دیر کے لئے مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔ میں نے رابعہ کے خیال کو جھٹلایا اور نادرہ کی طرف دیکھا۔ وہ بہت آگے نکل گئی تھی اور اب رک کر ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

دس منٹ میں ہم پل سے بہت دور آچکے تھے اور خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا "پونے نو۔ ابھی تک۔"

میرے الفاظ لبوں پر ہی تھے کہ فضا لرز اٹھی۔ پہلے ایک دھماکا سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے قیامت خیز دھماکے نے تصدیق کر دی کہ گولہ بارود کا ذخیرہ اڑ گیا ہے۔ پھر مسلسل کئی چھوٹے دھماکے ہوئے جو شاید پل کے ٹوٹنے اور بوگیوں کے نیچے گرنے سے پیدا ہوئے تھے۔ پھر دوسرا زبردست دھماکا ہوا جس سے ہمارے قدموں کے نیچے کی زمین بھی کانپ گئی۔ گھوڑے بدک کر بھاگے اور ہم کچھ نہ کر سکے۔ وہ ایک ساتھ اور پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے جارہے تھے اور انہیں پکڑنے کی کوشش کرنا بھی بے کار تھا۔

جہاں پل تھا وہاں اب دھوئیں کا ایک بادل سا نظر آنے لگا تھا۔ گہرے سیاہ مرغولے مسلسل بلند ہو رہے تھے اور یہ بادل پھیلتا جا رہا تھا۔ ہم سب اس بادل پر نظریں جمائے کھڑے تھے اور اپنے تصور سے ایک ہی منظر دیکھ رہے تھے۔ یہ سائی ندی کا پل غائب ہو چکا تھا۔ اس کے فولادی شہتیروں کو سنبھالنے والے ستون ٹوٹ کر گر گئے تھے۔ شہتیر اور شکستہ بوگیاں ایک دوسرے پر گر کر ڈھیر ہو گئے تھے۔ لکڑی کے تختے دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ ایل اے کے چار بہترین گھوڑے "ان کے ساتھ جانے والا اور تیز سب پرزہ پرزہ ہو کے بکھر گئے تھے۔

غالب نے خود کلامی کے انداز میں کہا "گولہ بارود سے لدی ہوئی بوگیاں تھیں۔"

میں چونکا "ہم نے تو ایک ہی دریافت کی تھی۔"

"مگر دوسری بھی تھی تو آگے یا پیچھے" غالب نے اصرار کیا۔

"ہاں۔ دوسری کو ہم دیکھ نہ سکے۔ وقت کم پڑ گیا تھا۔"

"وقت کون کم کرتا ہے" غالب نے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ اس کے خیالات کی رو کس سمت میں جا رہی ہے۔ اس کو احساس جرم نے شکار کر لیا تھا۔ اور میں اس سے کیا اختلاف کر سکتا تھا۔ ہم نے وقت کی کمی کے باعث آگے کی بوگیوں کو نہیں دیکھا تھا۔ انہی میں سے ایک میں اسلحہ اور گولہ بارود تھا۔ شاید اسی میں شملا بھی اور محسن کا بیٹا تھا۔ دشمنوں نے ان کو اپنے مال کے ساتھ بطور ضمانت رکھا تھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں یہ بات بتادی تھی۔ اسے محض دھمکی قرار دے کر ہم احساس کی اذیت سے چھٹکارا نہیں پا سکتے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ انہوں نے ایسا ہی کیا ہو۔ وقت جاری رہا۔ وقت ہمارے ساتھ تھا اور ہم وقت کے ساتھ تھے۔ شاید شملا کے لئے وقت ختم ہو گیا تھا۔ اور اس کے بیٹے کے لئے وقت اتنا ہی تھا۔ وقت احساس کا نام ہے۔ وقت زندگی کا نام ہے۔ وہ زندگی سے محروم ہو کے احساس سے بھی بیگانہ ہو گئے تھے مگر ہم زندہ تھے۔

نادرہ نے کہا "ایسا نہیں ہو سکتا۔"

غالب نے سپاٹ لہجے میں کہا "ایسا ہو بھی سکتا ہے۔"

"میرا دل نہیں مانتا۔"

رحمت علی نے کہا "کیا ہوا۔ آپ سب اچانک رنجیدہ کیوں ہو گئے۔ کس کی بات کر رہے ہیں آپ...."

میں نے کہا "کچھ نہیں مرزا جی۔ اس جذباتی مایوسی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کیا کوئی تقدیر سے لڑ سکتا ہے" "ہم نیت اور ارادے سے نہ مجرم ثابت ہوتے ہیں نہ گنہگار۔ ہم ان کی زندگی کے لئے لڑ رہے تھے اور جب تک امید باقی رہے گی ہم یہ کوشش کریں گے اور یہ بھی کہ ایک دن انہیں موت کے منہ سے بھی نکال لائیں گے۔ ابھی ایک اندیشے کو یقین کی بنیاد مت بناؤ۔ بہت امکان ہے اس بات کا کہ وہ اسی بوگی میں نہ ہوں گے۔"

"ہم مانتا ہے۔ یہ زیادتی ہے"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "تو تم ہمت نہ ہارو۔" رحمت علی بھی یہی صورت دیکھ رہا تھا تو ہم غالب کی۔ اس کے سوال کا کسی نے بھی جواب نہیں دیا تھا چنانچہ وہ کچھ سمجھے بغیر خاموش ہو گیا۔ پھر ذرا دیر بعد کہا "رحمت علی۔ تم میرے دوست محسن کے نام سے واقف ہو گے؟"

"بہت اچھی طرح جناب!"

"اس کے بیوی بچوں کو دشمنوں نے پکڑ لیا تھا۔ اور یرغمال بنا رکھا تھا۔"

"بیوی بچوں کو ساتھ لے کر کیوں نکلے تھے" رحمت علی نے پوچھا۔

"انہیں پتہ نہیں تھا۔ بیوی بچے لاہور میں تھے۔ دشمنوں نے انہیں اغوا کیا اور یہاں لے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ ہمیں بلیک میل کر سکیں گے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ اس مال گاڑی میں گولہ بارود کے ساتھ وہ بھی ہوں گے۔ محسن کے بیوی بچے۔ انہوں نے ہمیں چیلنج دیا تھا کہ اب ہمت ہے تو کچھ کر کے دکھاؤ۔"

رحمت علی کا چہرہ سرخ ہو گیا "اللہ کا عذاب نازل ہو ان پر۔ وہ انسانیت کے مرتبے سے اتنا گر گئے ہیں۔"

"وہ انسان نہیں شیطان ہیں۔ اس مرتبے تک وہ کبھی پہنچے ہی نہیں تھے تو گرتا کیا" میں نے کہا۔

وہ تڑپ کے بولا "مگر اللہ کو یہی منظور تھا جناب تو..."

"نہیں۔ ابھی ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی" میں نے جلدی سے کہا "وہ بڑے عیار اور جھوٹے لوگ ہیں۔ ایک امکان کی وجہ سے ہم کچھ دل گرفتہ تھے۔ زیادہ امکانات یہ ہیں کہ دشمنوں نے انہیں اپنا نہیں رکھا ہوگا۔ بعد میں پھر جگہ وہ ہماری مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے" نادرہ نے آنسو پونچھ کے اور مسکرا کے کہا۔ جھوٹ بول رہی تھی ورنہ یہ مسکرانے کا موقع ہی نہیں تھا۔ میں نے اس کے جھوٹ کو سچ کی طرح قبول کر لیا۔

"رحمت علی! تم اس علاقے سے کس حد تک واقف ہو" میں نے کہا۔

"زیادہ نہیں۔ میں خود تو ناگپور میں رہتا ہوں۔ بمبئی آنا جانا رہتا ہے لاری میں اس سڑک پر" وہ بولا۔

"تو کیا تم ہماری رہنمائی نہیں کر سکتے" میں نے کہا "خیر چلو تم ہمارے ساتھ۔ یہاں کب تک کھڑے رہیں گے۔"

"آپ لوگ اب کہاں جائیں گے" وہ میرے ساتھ چل پڑا۔

"ابھی کچھ طے نہیں کیا" میں نے کہا "فوری طور پر ہمیں کوئی ایسی جگہ چاہیے جہاں ہم ایک دو دن کے لئے روپوش ہو جائیں۔"

"پھر آپ میرے ساتھ ناگپور چلیں جناب۔ ادھر کچھ دور چل کے سڑک آجائے گی" رحمت علی بولا۔

"فی الحال ہم اس پیشکش کو قبول نہیں کریں گے۔ ہمیں اس علاقے میں اپنے ساتھیوں کو تلاش کرنا ہے۔"

"اس علاقے میں کہاں؟"

"وہ بمبئی سے روانہ تو ہمارے ساتھ ہی ہوئے تھے۔ راستے میں کہیں اتر گئے یا کر گئے۔ کوئی حادثہ پیش آگیا یا کوئی اور بات ہو گئی۔ بس وہ غائب ہو گئے مگر ہم معلوم کر لیں گے کہ انہیں کس راستے پر بھیجا گیا۔"

نادرہ اور غالب ہم سے چند قدم پیچھے تھے اور آہستہ آہستہ نہ جانے کیا باتیں کرتے آرہے تھے۔ وہ بیگ غالب کے ہاتھ میں تھا جس میں ہمارا سب سرمایہ تھا۔ نقد رقم کے علاوہ جواہرات تھے اور موتیوں کے چھوڑے ہوئے اکثر کام سیٹ۔ تقریباً ایک میل چلنے کے بعد غالب نے بیگ مجھے دے دیا۔ ابھی تک سڑک کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ دھوپ میں تیزی آگئی تھی اور پیچ دار راستے پر سفر مشکل ہوتا جارہا تھا۔ ہم سب بھوکے بھی تھے اور پوری رات جاگنے کے بعد آرام کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔

رحمت علی نے کہا "ایسے تو بہت مشکل ہو جائے گی جناب آپ کے لئے۔"

میں نے کہا "ہم مشکلات کے عادی ہیں۔ جو کچھ تم نے کیا وہ بہت کافی ہے۔ تمہیں سڑک پر چھوڑ کے تم بس سے ناگپور چلے جانا یا جہاں بھی تمہیں جانا ہو۔"

"مجھے اب کہیں نہیں جانا" وہ بولا "میں تو حادثے میں مر چکا۔ رحمت علی ڈرائیور کا دنیا میں کون تھا جو اسے روئے۔ میں اب آپ کے ساتھ ہوں۔"

میں نے کہا "ہم تمہیں ساتھ نہیں رکھ سکتے۔"

"سمجھا تو آپ میرے ساتھ رہیں" وہ بولا "اگر میں بار ہوں آپ پر تو پھر یوں سمجھ لیں، آپ مجھ پر بار نہیں ہوں گے۔"

"تم عجیب آدمی ہو" "کیا زبردستی ہمیں ساتھ لے جاؤ گے؟ یا زبردستی ساتھ رہو گے" میں نے برہمی سے کہا۔

"تنخواہ نہیں چاہیے جناب۔ ابھی تو کسی کو معلوم نہیں۔ ناگپور جا کے بینک سے ایک ایک پائی نکلوا لیتا ہوں آج ہی۔ چالیس ہزار سے اوپر ہی ہوں گے۔ آپ کے کام آئیں گے۔"

میں نے کہا "اس بیگ کو کھول کے دیکھو۔"

رحمت علی نے بیگ کھول کے دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں "اتنی دولت اٹھائے پھر رہے ہیں آپ اپنے ساتھ۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہ ہاتھ کا میل ہے ہمارے لئے۔ اگر تم چاہو تو یہ سب لے جاؤ۔ تمہارے کام آئے گا۔"

اس نے بیگ مجھے تھما دیا "وہ دیکھیں جناب۔ سڑک آگئی۔ یہاں سے ہم کسی بس میں بھی سوار ہو سکتے ہیں۔"

"ہم بس میں سفر نہیں کریں گے" غالب نے ساتھ آکے کہا "بیا

www.paksociety.com

یہاں کوئی بس اسٹاپ ہے؟"

"بس اسٹاپ تو نہیں ہے۔ مگر جگہ ہو تو ہاتھ کا اشارہ دیکھ کے ڈرائیور گاڑی روک لیتے ہیں" رحمت علی نے کہا۔

"ہاتھ کے اشارے سے تو کار کو بھی روکا جا سکتا ہے" غالب نے کہا "کیوں نہ کار میں چلیں۔"

"اس حالت میں کون ہمارے لئے کار روکے گا" وہ بولا۔

غالب نے نازو کی طرف دیکھا "کار کیا چیز ہے۔ نازو کا اشارہ ہو تو یہ کائنات رک جائے گردش شام و سحر رک جائے۔"

نازو مسکرائی۔ اس نے غالب کی بات کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ سڑک سے کچھ فاصلے پر میں، غالب اور رحمت علی ایک درخت کی اوٹ میں ٹھہر گئے۔ نازو سڑک پر جا کھڑی ہوئی۔ چند منٹ بعد ایک بس نمودار ہوئی۔ نازو کے قریب آ کے آہستہ ہوئی۔ جنگل بیابان میں نازو جیسی لڑکی کو اکیلا کھڑا دیکھ کے ڈرائیور کا حیران ہونا جائز تھا مگر نازو نے اسے ہاتھ کے اشارے سے رخصت کر دیا۔

وقفے وقفے سے دو بسیں گزر گئیں۔ پھر تین ٹرک گزرے۔ چار کاروں میں جگہ نہیں تھی اس کے باوجود ایک شریف آدمی نے اپنی فیملی کے ساتھ نازو کو بیٹھنے کے لئے کہا۔

رحمت علی نے کہا "ایسے کب تک کھڑے رہیں گے جناب!"

غالب نے بھی سر ہلایا "آج نازو کا جادو نہیں چلا۔"

اسی وقت ایک ٹرک جو بڑی تیز رفتاری سے آ رہا تھا، بریک لگائے اور اس کے ٹائر جام ہو گئے۔ سڑک پر دو کالی لکیریں بناتے ہوئے ٹرک یوں نازو کے سامنے رکا کہ وہ چھلانگ مار کے ایک طرف نہ ہوتی تو اس کے نیچے کچلی جاتی۔ نازو کی بدحواسی پر ڈرائیور نے قہقہہ مارا۔

"ارے جنگل کی ہرنی۔ ہم سے کاہے کو ڈرتی ہے۔ ہم کوئی شکاری ہیں" وہ نیچے اتر کے بولا "ہم تو شوقین ہیں شوقین۔ کیا سمجھی۔"

وہ مکروہ شکل کا پکا کٹا بدمعاش نظر آنے والا شخص تھا۔ اس کی لال آنکھیں اور بڑی بڑی مونچھیں، بھاری بھرکم جسم اور چہرے پر کرخت نقوش کسی کو بھی خوفزدہ کر سکتے تھے مگر نازو کو نہیں۔ وقتی صدمے کے بعد اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور اندازہ بھی کر لیا تھا کہ ٹرک ڈرائیور کے عزائم کیا ہیں۔

"دور رہو مجھ سے" نازو نے پیچھے ہٹتے ہوئے خوف کی اچھی اداکاری کی "اکیلی لڑکی کو دیکھ کے غنڈہ گردی کرنا چاہتے ہو۔ شرم آنی چاہئے تمہیں۔"

وہ گلا پھاڑ کے ہنسا۔ بے جان کے اس کا حوصلہ دو چند ہو گیا تھا کہ لڑکی حسین ہی نہیں تنہا بھی ہے۔

"ارے جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔ آخر کس کا انتظار تھا تمہیں۔ ہمارے سوا کون آئے گا تمہاری مدد کرنے۔ آؤ ہمارے ساتھ چلو۔ جنگل کی ہرنی۔ تم بھاگ کیوں رہی ہو۔ بھاگ کے کہاں جاؤ گی۔ ہم سے بچ کے جا سکتی ہو تم۔ ہم شیر ہیں، جنگل کے بادشاہ۔ تم جنگل کی ہرنی۔" وہ نشے میں بول رہا تھا پھر اس نے ہچکی بھی لی تھی۔

میں اور غالب بڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک ایک قدم پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔ وہ بیک وقت اس کی شوق کو بھی ہوا دے رہی تھی اور اس کو مشتعل بھی کر رہی تھی۔ مسکرا کے اسے آگے بلاتی تھی اور خود پیچھے ہٹ جاتی تھی۔

رحمت علی نے کہا "کمال کرتے ہو آپ بھی جناب!"

میں نے کہا "خاموش ہو کے دیکھو..."

"کیا دیکھوں جی۔ میرا تو خون کھول رہا ہے..."

غالب نے ہنس کے کہا "کبھی شکاری کو شکار ہوتے دیکھا ہے۔ ہرنی کے ہاتھوں جنگل کے بادشاہ کی درگت بنتے دیکھی ہے؟"

نازو اسے سڑک سے کافی دور لے گئی۔ وہ بار بار جھپٹتا تو نازو اسے قریب آنے کا موقع دے کر اس کی گرفت سے تڑپ کر نکل جاتی تھی۔ اب اس کی جھنجلاہٹ اس بار سائی سے غیظ و غضب میں ڈھل گئی تھی۔ وہ دیوانہ وار حملے کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ آخر کار اس کے ہاتھوں میں یوں آ جائے گی جیسے باز کے پنجے میں ننھی سی چڑیا۔

پھر اچانک کھیل ختم ہو گیا۔ نازو نے پینترا بدلا تو اس کی لڑکی وہ فلائنگ کک ماری کہ وہ سر کے بل ڈرائیور زمین پر چت ہو آیا۔ اس کا نشہ ہرن ہو گیا ہو گا مگر وہ پھر بھی سمجھ نہ پایا کہ اس نے جنگل کی ہرنی کو شیرنی کی طرح جھپٹتے دیکھا تھا۔ وہ آسمان کو گھورتا رہا اور پھر اٹھا ہی تھا کہ نازو نے دوسری فلائنگ کک ماری۔

"اٹھو جنگل کے بادشاہ!" نازو نے کہا۔

وہ بری طرح کراہ رہا تھا "تم ... تم کیا ہو... بلا..."

"میں جنگل کی ہرنی ہوں" نازو نے کہا اور اسے بالوں سے جھٹکا دیا۔ وہ اٹھا تو نازو کے ہاتھ بجلی کی طرح چلنے لگے۔ اس کی چیخوں سے جنگل گونجنے لگا۔ نازو نے اس کے دونوں بازو توڑ دیئے تھے جو اس نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اوپر اٹھائے تھے لیکن یہی وہ ہاتھ تھے جو اسے ہوس کا شکار بنانے کے لئے بڑھے تھے۔

رحمت علی دم بخود کھڑا تھا۔ نازو کی نزاکت کا معمول کا وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا مگر یہ انتہا تھی۔ وہ بیگنڈے جیسے مضبوط مالک اور خود کو بدمعاش سمجھنے والا گرانڈیل مرد ایک دھان پان لڑکی کے ہاتھوں مٹی کے کھلونے کی طرح ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ڈرائیور کی صورت ہی اتنی بھیانک تھی کہ عام آدمی مقابلہ کرتے ہوئے وحشت میں مبتلا ہو جاتا۔ اب وہ ساکت حس و حرکت پڑا تھا۔ ہم سے پچاس قدم کے فاصلے پر۔

نازو تیزی سے ہماری طرف آئی "اس کا کیا کرنا ہے؟"

میں نے کہا "تمہارا شکار ہے، جو تم چاہو کرو۔"

رحمت علی نے ڈرتے ڈرتے کہا "کہیں وہ مر گیا ہے؟"

"مرا تو نہیں، مر جائے گا" نازو بے نیازی سے بولی۔

غالب نے کہا "پھر کیا انتظار کریں اس کے مرنے کا۔ اسے ٹرک میں ڈال لیتے ہیں۔ کہیں بھی چھوڑ دیں گے۔"

"لیکن اب اسے ڈھونا پڑے گا۔ اچھی مصیبت ہے۔ کرے کوئی" غالب نے کہا "آخر اتنی دور لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اور کیا سڑک پر دکھاتی یہ تماشا۔ آتے جاتے سب لوگ رک جاتے" نازو نے کہا "میں نے تو نہیں روکا تھا اسے۔ اس کی موت اسے کھینچ لائی تھی یہاں۔"

میں نے غالب کو سمجھایا "ہم اسے یہاں چھوڑ کے بھی تو نہیں جا سکتے۔ ہوش میں آتے ہی وہ پولیس پولیس چلانے لگے گا۔"

میں نے ٹرک ڈرائیور کی ٹانگیں پکڑیں۔ غالب اور رحمت علی نے ہاتھ پکڑ کے اٹھایا اور اسے ٹرک تک لے آئے۔ سڑک سنسان دیکھ کے نازو نے اشارہ کیا اور ہم نے اسے اٹھا کے پیچھے ڈال دیا۔ اس کا وزن ڈھائی سو پونڈ سے کسی طرح کم نہ تھا۔

ابھی تک میرے ذہن میں اس جگہ سے دور چلے جانے کے سوا کوئی پروگرام نہ تھا۔ ڈرائیونگ میں نے سنبھالی۔ غالب نے نازو کے ساتھ پیچھے سوار ہونے کو ترجیح دی چنانچہ رحمت علی میرے ساتھ آ بیٹھا۔

ٹرک بالکل نیا بھی نہیں تھا مگر بہت اچھی حالت میں تھا اور اس کے فیول میٹر کی سوئی ٹینک کو فل بتا رہی تھی۔ سڑیل کے ٹینک کا حال پتا ہونے سے میٹر کچھ غلط ہو جاتا ہے۔ ایک چوتھائی ٹینک خالی ہو تب بھی کانٹا نیچے نہیں آتا اور پھر ایک دم آخر میں پہ آ جاتا ہے۔ ہم چالیس پچاس لیٹر بھی بہت تھے اور تین چار سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے لئے کافی تھے۔

ٹرک اسٹارٹ کرنے کے بعد میں نے رحمت سے کہا کہ وہ سگریٹ جلا کے مجھے دے۔ اس نے دو سگریٹ جلائے اور ایک مجھے تھما دیا۔

"رحمت علی!" میں نے کچھ پرسکون ہونے کے بعد کہا "تم نے کیا بہانہ کیا تھا، جس کی بنا پر تم نے ہمارا ساتھ دیا۔"

"میرا جب میں نے نہیں بتایا تھا" وہ بولا۔

"وہ کیا بات ہے جو..."

"کس جناب آپ سے کیوں چھپاؤں گا۔ میں انتقام لینا چاہتا تھا" رحمت علی نے کہا۔

"کس سے؟"

"زمانے سے" وہ بولا "میرے والد نے اٹھائیس سال سروس کی تھی ایمانداری کے ساتھ۔ پہلے لوگ عام طور پر ایماندار ہی ہوتے تھے۔ ریٹائرمنٹ سے دو سال قبل ان کے اور ریلوے کے نئے افسروں کے درمیان ایک تنازعہ بن گیا۔ نئے افسروں کی نظر میں ان کی ایمانداری پہلے ہی کھٹکتی تھی۔ وہ کسی کی سفارش پر اپنے ساتھ کسی مفت خورے کو سفر کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ان افسروں کے دوست، بھانجے بھتیجے اور جاننے والے بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے خواہش مند ہوتے تھے یا لوئر کلاس کے ٹکٹ پر اپر کلاس میں بیٹھنا چاہتے تھے۔ راستے میں ڈائننگ کار سے مفت کھانا مانگتے تھے اور والد صاحب کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتے تھے۔ انتہا یہ تھی کہ میں ٹکٹ لے کر اس گاڑی میں بیٹھتا تھا جس میں گارڈ وہ خود ہوتے تھے۔ صرف ایک بار میں نے ڈنڈی مارنے کی کوشش کی۔ یہ سوچا کہ کچھ پیسے بچ جائیں گے تو ایک قمیص بنوا لوں گا۔ میرے پاس کالج جانے کے لئے ایک ہی قمیص تھی۔ راستے میں چیکر آیا تو میں نے والد صاحب کا نام بتا دیا اور وہ سرہلا کے گزر گیا مگر جیسا کہ میں نے کہا، پرانے وقتوں کے سب لوگ ہی ایماندار تھے۔ چیکر کو شک گزرا کہ میرے بلا ٹکٹ سفر کرنے کا علم میرے والد کو نہیں ہے۔ وہ وضع دار تھا مگر عناد کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے والد صاحب سے ذکر کیا اور کہا کہ قانونی معاملہ تو بعد میں آتا ہے، میری اخلاقی ذمے داری ہے کہ آپ کو اولاد کی غلطی سے آگاہ کر دوں۔ کیونکہ میرے بھی بچے ہیں اور آج ایک بچے کو چھوڑ دیا گیا تو کل وہ دوسرے کے سامنے ... بات بڑے فخر سے کرے گا کہ ریلوے تو میرے باپ کی ہے اور پھر سب یہی کرنے لگے تو ریلوے کہاں رہے گی۔ والد صاحب نے ان لوگی کا شکریہ ادا کیا اور مجھے بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں پولیس کے ہاتھوں پکڑوا دیا۔ ریلوے مجسٹریٹ نے قاعدے ضابطے کے مطابق مجھ پر سو روپے جرمانہ کیا جو اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ یہ جرمانہ میری والدہ نے ادا کیا۔ والد تو چاہتے تھے کہ میں چند روز جیل میں گزاروں تاکہ مجھے قانون کا احترام کرنا آ جائے مگر ماں کو فکر تھی بدنامی کی۔ سارے زمانے کو معلوم ہو جائے گا کہ گارڈ صاحب کا بیٹا سزا یافتہ ہے۔ ابھی سے جیل کاٹ رہا ہے۔ کل کون جانے چور بنے گا یا ڈاکو۔ اور بدنامی ہوگی تو پھر لڑکیوں کے رشتے نہیں ہوں گے۔ بڑی دور کی سوچتے تھے پہلے کے لوگ۔ آج کوئی قتل کرے یا ڈاکا ڈالے اور جیل کاٹ آئے تب بھی معززہی رہتا ہے، اگر اس کے پاس کار اور کوٹھی ہو۔ پروفیسر اگر جوتیاں چٹخاتا پھرے تو معزز نہیں۔ خیر جناب، سو روپے تو ماں نے نکال کر دے دیئے مگر ہم نے دو مہینہ فاقہ کشی میں کاٹا۔ والد قرض لینے کے قائل ہی نہ تھے۔ ادھار سودا تک نہیں لیتے تھے۔ اب ایسے لوگ احمق کہلاتے ہیں۔ بینک سے، حکومت سے یا کسی ادارے سے قرض لے کر ہضم کر جانا یا معاف کرا لینا عقلمندی کی دلیل ہے۔ اس پورے مہینے ہم نے ایک وقت کھایا۔ اور ظاہر ہے جتنی ذہنی اذیت میں نے برداشت کی وہ بہت سخت سزا تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ایک ٹکٹ نہ لے کر میں نے پورے خاندان کو شرمندگی ہی نہیں دی ان کے منہ کا نوالہ بھی چھین لیا ہے۔ چھوٹے بھائی بہنوں کو ایک آنہ روز جیب خرچ ملتا تھا وہ بند کر دیا گیا۔ دودھ بند کر دیا گیا۔ چائے بند کر دی گئی۔ صرف میری وجہ سے ایسا ہوا۔ یہ احساس چند روز جیل

www.paksociety.com

میں رہنے کی سزا سے کہیں زیادہ تکلیف دہ تھا۔ میرا شرمندہ ہونا یا کسی سے معافی مانگنا بے کار تھا۔ اس سے وہ سو روپے واپس نہیں آسکتے تھے جو ان کی چھوٹی چھوٹی راحتوں اور خوشیوں کے ضامن تھے۔ مختصر کرتا جناب، میں بات لمبی کر بیٹھا۔ بتانا صرف یہ تھا کہ میرے والد کتنے ایماندار تھے۔ پرانے سینئر افسر بھی انہی جیسے تھے چنانچہ ان کا احترام کرتے تھے اور نئے کم ظرف، چھوٹے افسروں کی شکایات والد صاحب کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں لیکن پھر بدقسمتی سے ایک انتہائی متعصب ہندو ڈویژنل افسر ان کے سر آگیا جو بہت گھٹیا خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔"

"تم خاندانی نجابت کے فلسفے پر یقین رکھتے ہو کہ عالی نسب لوگ ہی شریف اور ایماندار ہوتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا جناب!" رحمت علی بولا "دراصل غربت، جہالت اور حالات کی سختی نے اس کو ایک نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ اس کی ماں کا کردار بہت عجیب تھا۔ وہ کئی بار بچوں کو چھوڑ کے کسی کے ساتھ بھاگ گئی اور پھر کچھ دن بعد لوٹ آئی۔ کبھی ایک ہفتے بعد۔ کبھی ایک مہینے بعد۔ ایک بار تو سنا ہے کہ وہ ایک بچہ ساتھ لے کر آئی تھی۔"

"کمال ہے! اس کا شوہر اتنا بے غیرت تھا۔"

"بس جی۔ میں تو سنی سنائی بتا رہا ہوں۔ حقیقت کا علم تو خدا ہی کو ہے۔" رحمت علی نے کہا "وہ شوہر بس نام کا تھا۔ کام بھی کوئی نہیں کرتا تھا اور گانجا بھی پیتا تھا۔ بیوی سب خرچہ اٹھاتی تھی۔ معلوم نہیں کیسے۔ شوہر کو بھی کچھ نہیں کہتی تھی۔ لوگ کچھ کہتے تھے تو وہ سینہ تان کے سامنے آجاتا تھا کہ میری بیوی پر کسی نے انگلی اٹھائی تو چھرا گھونپ دوں گا۔ یہ سب میرے بچے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ پھر نہ جانے کس نے عورت کو قتل کر دیا۔ پولیس نے شوہر کو بھی قربانی کا بکرا بنا کے پھانسی چڑھوا دیا۔ بچے لاوارث ہو گئے اور ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے نہ جانے کہاں کہاں گئے۔ پھر ایک کو دوسرے کی خبر نہیں ملی۔ رشتے دار تھے مگر کسی نے انہیں اپنا سمجھ کے قبول نہ کیا تھا۔ یہ ڈویژنل افسر زمانے کی ذلت اٹھا کے اور ٹھوکریں کھا کے بھی نہ جانے کیسے پڑھ لکھ گیا۔ تاہم بچپن کی ساری تلخی اس کی ذات میں شامل تھی اور اس نے دنیا سے انتقامی رویہ اختیار کر لیا تھا۔ اذیت پسندی اس کی فطرت میں شامل تھی اور وہ کسی کی نیک نامی سے خاص طور پر الرجک تھا۔ والد صاحب کی نیک نامی کا چرچا کچھ زیادہ تھا۔ سو وہ ان کا دشمن ہو گیا اور اس کے بعد اپنی انتہائی کارروائی شروع کر دی۔ انجام یہ ہوا کہ برطرفی کے خوف سے والد صاحب نے ایک سال کی چھٹی لے لی جو ریٹائرمنٹ سے متصل مل جاتی ہے۔ اس کے باوجود وہ پنشن نہ وصول کر سکے۔ ان کے خلاف شکایات کے پرانے دفتر کھولے گئے۔ ان شکایات میں بے بنیاد الزامات شامل کر لئے گئے۔ میری دو بہنوں کے رشتے ٹوٹ گئے۔ کچھ بدنامی کے باعث، کچھ اس لئے کہ شادی کے اخراجات کے لئے پیسہ نہ تھا۔ فاقہ کشی کا ایک طویل دور خودکشی پر ختم ہوا۔ آپ یقین کریں گے کہ [illegible] کے پیسے بھی نہیں تھے۔ محلے والوں نے یہ خرچہ اٹھایا۔ [illegible] نے چھوڑ ہی دیا تھا۔ نوکری کہیں ملتی نہ تھی۔ [illegible] ہو گئے۔ اماں تو عدت کا زمانہ پورا ہونے سے پہلے ہی [illegible] رخصت ہو گئیں۔"

وہ خاموش ہو گیا تو میں نے کہا "یہ تو بہت پرانی بات ہو گئی۔ اکیس بائیس سال بعد بدلہ لینے کا خیال کیوں آیا تمہیں؟"

"بدلہ تو میں دس سال سے لے رہا تھا" وہ بولا "سب سے پہلے تو میں نے اس ہندو افسر کو تلاش کیا۔ وہ بھی ریٹائر ہو کے ایک شہر میں ٹھاٹھ سے رہنے لگا تھا۔ اسے اتنی پرانی بات یاد بھی نہیں تھی۔ میں نے ایک رات اس کے گھر کو باہر سے تالے لگا کے سارے دروازے بند کر دیئے۔ کھڑکیوں میں لوہے کی گرل تھی۔ وہ بچ کے نکل ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر میں نے اطمینان سے اپنی گاڑی میں سے پٹرول کھینچ کر نکالا اور گھر کو چاروں طرف سے آگ لگا دی۔ بھاگتے ہوئے میں نے کار کو بھی نہیں چھوڑا۔ سب اور لوگوں نے فائر بریگیڈ کو بلایا تو میں وہیں موجود تھا اور مجمع میں شامل رہا۔ میرے سامنے اس کی جلی ہوئی لاش نکالی گئی۔ اس کے بیوی بچوں کی لاشیں لائی گئیں۔"

"تم اتنے سفاک نظر تو نہیں آتے" میں نے کہا "عورتوں اور بچوں کو بھی معاف نہیں کیا۔ وہ تو بے قصور تھے۔"

"بے قصور تو ہم سب تھے۔ میری بہنیں بھی" وہ بولا "[illegible] بھائی تھے۔ پانچ بہنوں کے علاوہ۔ اب مجھے بھی معلوم نہیں کہ کہاں ہے۔ جیسے اس ہندو افسر کو علم نہیں تھا کہ اس کے بھائی کہاں گئے۔ مگر ان کی بات اور تھی۔ ان کا وجود [illegible] کا کسی سے خون کا رشتہ نہیں تھا۔ [illegible] تھا تو وہ لوگ اسے ظلم [illegible] کرتے تھے۔ وہ ایک خاندان کے افراد نہیں تھے۔ بھان متی کا کنبہ تھا۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ لیکن ہم سب ایک ماں باپ کی حقیقی اولاد تھے۔ ہمیں صرف ان کی ایمانداری اور شرافت ورثے میں ملی۔ بھائی کو میں تلاش کر رہا ہوں اور کر لوں گا۔ ایک بہن مجھے ریل میں بھیک مانگتی نظر آئی تھی۔ لوگ دھتکار رہے تھے کیونکہ وہ کوڑھ میں مبتلا تھی۔ وہ سب سے [illegible] اس لئے میں نے پہچان لیا اسے۔ اور بعد میں [illegible] کرا دیا۔ دوسری کو بھی میں نے ٹرین پر ہی دیکھا تھا [illegible] انداز میں۔ اس میں بڑی بہن کی جھلک تھی۔ وہ ایک [illegible] اور اس کے انداز بتاتے تھے کہ وہ بکا ہوا ہے۔ وہ شخص [illegible] ساتھ تھا۔ وہ بھی شراب پی رہا تھا اور میری بہن کو بھی پلا رہا تھا۔ [illegible] نے دونوں کو وہیں مار دیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ بہنوں کی صورت آج بھی میری نظروں میں گھومتی [illegible]

[illegible] دوسری طوائف۔ تیسری، چوتھی اور پانچویں کے بارے میں [illegible] سوچتا ہوں تو اس کے سوا خیال ہی نہیں آتا کہ وہ بھی [illegible] کے ساتھ اپنے گھر میں آباد نہیں ہوں گی۔ یہ سب [illegible] لئے ہوا کہ وقت پر میرے والد انہیں رخصت نہ [illegible] اس سے پہلے وہ خود حرام موت مر گئے۔ اس سب کا ذمے دار ایک شخص تھا۔ اس نے میرے پورے خاندان کو تباہ کیا۔ میں نے اس کے خاندان کو عبرت ناک انجام سے دوچار کیا۔ ریلوے کا محکمہ اس سازش میں شریک تھا۔ ایک افسر کی دشمنی سے اتنا نقصان نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر نیچے والے اور اوپر والے سب بدل [illegible] کسی نے ان کی اڑتیس سال کی خدمت گزاری کا لحاظ نہیں رکھا۔ کیا ملا میرے والد کو ریلوے کے ساتھ ایمانداری کا؟ [illegible] سو روپے کا جرمانہ ریلوے کے خزانے میں گیا۔ سو جلا [illegible] سازوں کو کچھ کے فائدہ ریلوے کو پہنچاتے رہے۔ میں نے ریلوے ملازمت ہی اس لئے کی تھی۔ جب سے میں بھرتی ہوا، پہلے میں [illegible] تھا جناب! اس وقت سے آج تک میں مسلسل نقصان پہنچا رہا ہوں اس محکمے کو اپنے والد کا سارا حساب برابر کرنے کے لئے۔"

میں نے کہا "رحمت علی۔ میں اسے انتقام نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک نفسیاتی مریض ہو۔ تخریبی رجحانات رکھنے والے۔"

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا "یہ غلط ہے جناب!"

"یہ بالکل ٹھیک ہے" میں نے کہا "تم کہہ سکتے ہو کہ وہ ہندو افسر قصوروار تھا مگر کیا تم اس کا جرم کسی عدالت میں ثابت کر سکتے تھے؟"

"نہیں۔ مگر میرا ضمیر مطمئن تھا۔۔"

"تمہارا ضمیر اس معاملے کو خدا کے انصاف کی عدالت میں چھوڑ کے مطمئن نہیں ہو سکتا تھا" میں نے اس کی بات کاٹ دی "کیا تمہیں یوم مکافات عمل پر یقین نہیں۔ تمہارے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ ظلم کرنے والے اس جرم میں اجتماعی طور پر شریک تھے اور انہوں نے بالواسطہ طور پر جرم کیا۔ تم براہ راست جرم کے مرتکب ہو گئے۔ ہر قتل کا تم اعتراف کر چکے ہو۔"

"اگر دنیا کے نظام انصاف کو دیکھا جائے تو۔۔۔"

"آخرت کے حساب پر تو تمہارا اعتقاد ہی نہیں تھا ورنہ تم یہ سب کچھ کیوں کرتے" میں نے برہمی سے کہا۔

"مجھے اپنے جذبات پر اختیار نہیں تھا۔"

"لیکن تم عقل سے کام نہیں لے سکتے تھے۔ یہ پاگل پن ہی تو [illegible]" میں نے کہا "تم خود سوچو کہ ذاتی انتقام کا کوئی اخلاقی [illegible] تم کہہ سکتے ہو کہ تمہاری جدوجہد کسی نیک مقصد کے لئے ہے۔ زیادتی، ظلم یا ناانصافی اکیس بائیس سال پہلے ہوئی تھی [illegible] تم آج تک [illegible] سے بدلے لے رہے ہو۔ تمہارا باپ ٹیلی فون کے محکمے میں ہوتا تو تم کھمبے اکھاڑتے پھرتے۔ تار کاٹتے یا ٹیلی فون ایکسچینج تباہ کرتے۔۔"

وہ مشتعل ہو کے بولا "آخر تب بھی تو۔۔۔"

"نیومت۔" میں نے دہاڑ کے کہا "ہم اپنی ذات کے لئے نہیں لڑ رہے ہیں۔ یہ جہاد ہے۔ اس کا ایک مقصد ہے۔ میں اپنے ملک اور اپنی قوم کے دشمنوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوں۔ محاذ جنگ پر لڑنے والے فوجی بھی میرے ساتھ ہیں۔ میں نے اپنے باپ کے قاتل سے بدلہ نہیں لیا۔ موقع ملنے کے باوجود اسے خود نہیں مارا۔ میں اسے ایک نہ ایک دن اسی نظام انصاف کے ہاتھوں تختہ دار پر پہنچاؤں گا جس کو اس نے بے بس سمجھ رکھا ہے۔"

"آپ نے غلط سمجھا ہے مجھے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ یہ سب مجھے دیر سے معلوم ہوا۔ تم کو واقعی غلط سمجھا تھا میں نے ورنہ میں تمہاری مدد کی پیشکش ہی قبول نہ کرتا۔ ہمیں ضرورت بھی نہیں تھی تمہاری مدد کی۔ تم اس ملک کے شہری ہو تو تمہیں اس ملک سے وفادار رہنا چاہئے۔ اس ملک کے قانون کی بالادستی کو تسلیم کرنا چاہئے۔ میں جانتا ہوں کہ دلاور میرے باپ کا قاتل ہے مگر اس کی وجہ سے میں اپنے ملک کو نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا جو میرے قومی مفاد کے منافی ہو۔ مگر تم یہی کر رہے ہو۔ جس ملک کے خزانے سے تنخواہ لے رہے ہو۔ جس محکمے کی کارکردگی کے ذمے دار ہو اسی کے خلاف ہر کام کر رہے ہو۔ تمہارے جذباتی دلائل نے مجھے وقتی طور پر متاثر کر لیا تھا لیکن اب میری نظر میں تمہاری حیثیت ایک ایسے مجرم کی ہے جس کو فوراً قانون کے حوالے کر دینا چاہئے۔"

احساس ذلت سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا "یہ سب تمہارے ساتھ ہوتا پھر میں پوچھتا تم سے جرم اور گناہ کا فلسفہ۔"

میں نے ٹرک روک دیا "ابھی وقت ہے رحمت علی۔ میں تمہیں ایک موقع دیتا ہوں۔ جاؤ خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ اگر تم میرے ملک میں ہوتے تو اس اعتراف کے بعد میں خود تمہیں سزا بھی دے سکتا تھا۔ مگر ایک تو تم نے خواہ مخواہ احسان کا بار ڈال دیا ہے مجھ پر۔۔۔"

"میں بھی پکڑوا سکتا ہوں تم سب کو۔۔۔" وہ نیچے اترتے ہوئے چیخ کر بولا۔

"جاؤ تم بھی شامل ہو جاؤ ان سب میں جو ہمارے دشمن ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں دشمن سمجھتے ہوئے گولی مار دوں۔" میں نے کہا اور ٹرک کو آگے بڑھا دیا۔

پیچھے غالب اور نانڈ کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے اور رحمت علی کے درمیان کیا گفتگو ہوئی چنانچہ ٹرک رکا تو انہوں نے حیرانی سے رحمت علی کے اتارے جانے کا منظر دیکھا۔

"یہ کیا ہوا؟" غالب نے کہا۔

"ٹھیک ہوا جو بھی ہوا" میں نے غصے میں کہا اور ٹرک کو آگے

www.paksociety.com

بیٹھا دیا۔ ایک میل کے بعد سڑک دو شاخوں میں تقسیم ہوگئی۔ میں نے ٹرک کو بائیں جانب موڑ لیا اور دو میل بعد ایک کنارے پر روک دیا۔

"خیریت کیا ہوئی" غالب نے نیچے اترتے ہی پوچھا۔

"ابھی بتاتا ہوں" میں نے کہا "پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ اس وقت ہم کہاں ہیں؟"

"بھارت کی سرزمین پر۔ ایک نامعلوم سڑک پر۔ ضلع اور تحصیل معلوم کرکے بتا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہارا اندازہ کیا کہتا ہے۔ ہم اس مقام سے کتنی دور ہیں جہاں گل اور محسن اترے ہوں گے یا اتارے گئے ہوں گے؟"

غالب نے سر کھجایا "میری چھٹی حس جغرافیے میں بہت کمزور ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ دس میل ادھر یا ادھر۔"

"سبحان اللہ! آپ تو ہمیں اسی جگہ لے آئے۔ اب ایسا کرتے ہیں کہ میں چلتا ہوں دس میل شمال کی جانب اور آپ جائیں جنوب کی سمت" غالب نے کہا "نازو کو مشرق کا علاقہ سونپ دیں پھر بھی مغرب کا کیا ہوگا؟"

نازو نے انگلیوں پر حساب لگا کے کہا "یہ کوئی چار سو مربع میل کا علاقہ ہوا۔"

میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کے کہا "ہو سکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو۔ لیکن جتنا سفر ہم نے ٹرین میں کیا تھا اتنا ہی واپسی کا سفر بھی تھا۔ اور یہاں سے ریلوے لائن بھی دور نہیں ہو سکتی۔ خیر پہلے تو یہاں سے چلو۔"

"کہاں چلیں۔ مجھ سے اب نہیں چلا جاتا" نازو بولی۔

میں نے کہا "تھوڑی سی ہمت اور کرو۔ اس ٹرک کے قریب رکے رہنے میں خطرہ ہے۔ کسی آبادی کے قریب پہنچ جائیں تو پھر کسی کے مہمان ہو جائیں گے۔"

غالب نے کہا "یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے۔"

میں نے کہا "دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ اور آگ چولھے کی ہو یا بھٹی کی، کسی آبادی کا پتا دیتی ہے۔"

ہم نے کھیتوں کے بیچ سے شارٹ کٹ اختیار کیا اور درختوں کے ایک جھنڈ سے گزرے تو ہمارے سامنے ایک اینٹوں کا بھٹہ آگیا۔ دھواں اس کی چمنی اگل رہی تھی۔ بھٹے میں کام کرنے والے مزدور عورتوں اور مردوں نے ہمیں حیرانی سے دیکھا۔ ان کا نگراں ایک خوں خوار قسم کا موالی ٹائپ آدمی تھا۔ بھٹے کے عقب میں ایک کار بھی موجود تھی۔

میں نے نمستے کے انداز میں ہاتھ باندھ کے کہا "تم مالک ہو؟"

"مالکوں سے کیا کام ہے تمہیں؟" وہ نازو کو گھور کے بولا۔

"یہ ہم مالکوں کے سوا کسی کو نہیں بتا سکتے۔"

اس نے نظر جما کے مجھے دیکھا "تم کون ہو؟"

میں نے کہا "اسسٹنٹ کمشنر ہوں ناسک کا۔ میری گاڑی خراب ہوگئی تھی۔ دھواں دیکھ کر ادھر چلا آیا۔"

اس کا رویہ ایک دم بدل گیا "آئیے مالک... بڑے اتفاق سے آج آگئے" اس نے بڑی شرافت سے کہا اور آگے چلنے لگا "میں یہاں منیجر ہوں۔"

بھٹے کے پیچھے کمرا بنا ہوا تھا۔ یہ مالک کا آفس تھا۔ پیچھے مجھے دوسرا کمرا نظر آیا مگر اس کا دروازہ بند تھا۔ ہم بیٹھ گئے۔ باہر کے مقابلے میں یہ جگہ [illegible] تھی۔ منیجر نے بڑی نرمی سے دروازے پر [illegible] ماری۔

"کیا بات ہے؟" اندر سے کسی نے جھنجھلا کے کہا۔

"سرکار... مہمان آئے ہیں۔"

"ان سے کہو دفع ہو جائیں۔ میرا کوئی مہمان نہیں آ سکتا" اسی شخص نے دہاڑ کے کہا۔

میں نے دروازے کے قریب جا کے کہا "اگر تم باہر نہ آئے تو مجھے اندر آنا پڑے گا۔"

مجھے پہلے ہی شک تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میری بات کے جواب میں چوڑیاں کھنکنے کی آواز آئی اور کوئی عورت دبی آواز میں کچھ بولنے لگی۔ مرد نے اسے "شٹ اپ" کہا اور دروازہ کھول کے باہر آگیا۔ وہ ایک جوان آدمی تھا۔ اس نے صرف [illegible] رکھی تھی "ہو وانٹس آر یو۔۔۔" [illegible] میں نے انگریزی میں کہا "اگر تم انسانیت کا جامہ پہن کر آؤ تو میں بتاؤں۔"

وہ ایک دم واپس ہو گیا اور چند منٹ بعد پھر برآمد ہوا تو لباس میں تھا۔ وہ بھاری بدن کا پستہ قد آدمی تھا جس کی آنکھ میں عیش پرستی کی بے حیائی جھلکتی تھی۔ لیکن اپنے سامنے اسسٹنٹ کمشنر کو دیکھ کر وہ ساری عیاشی بھول گیا تھا۔ اب صورت پر خفت کے ساتھ پریشانی جھلک رہی تھی۔ پھر اندر سے ایک عورت ساڑھی ٹھیک کرتی اور ہاتھوں سے بالوں کو سنوارتی نکلی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ایک مشہور ایکٹریس تھی جس کی شہرت کا آفتاب گہنا رہا تھا۔ اسے بڑی مایوسی ہوئی جب ہم نے شاندار ماضی سے کسی جذباتی وابستگی کا اظہار نہیں کیا اور پہچانا تک نہیں۔

"میرا نام مہتا ہے۔ جی پی مہتا" بھٹے کے مالک نے کہا "ان کو تو آپ نے پہچان ہی لیا ہوگا۔ اگر آپ فلمیں دیکھتے ہیں۔"

"سوری۔ میں یہ بکواس اور گھسی پٹی فارمولا فلمیں دیکھنا پسند نہیں کرتا" میں نے انگریزی میں کہا "آپ جیسے لوگوں کے لئے وقت کہاں ہوتا ہے ہمارے پاس۔ یہ میرے دوست

اسسٹنٹ پولیس کمشنر بمبئی۔ اور یہ ان کی دھرم پتنی ہیں۔"

انہوں نے باری باری ہاتھ جوڑے اور صوفوں پر بیٹھ گئے۔ مہتا نے منیجر کو آواز دے کر بلایا اور اسے چائے کا بندوبست کرنے کو کہا۔

پھر اسے اپنی بد تہذیبی کا احساس ہوا "سوری! مجھے پوچھ لینا چاہئے تھا کہ آپ کیا پئیں گے۔ چائے یا کافی؟"

"مل جائے تو کافی ورنہ چائے" میں نے کہا۔

"کافی میں کچھ وقت لگے گا" وہ معذرت آمیز انداز میں بولا۔

"پھر چائے ہی ٹھیک ہے" میں نے کہا۔

"مسٹر مہتا" میں نے منیجر کے جاتے ہی کہا "غالباً میں نے اپنے بارے میں نہیں بتایا۔ میں نیا اسسٹنٹ کمشنر ہوں۔ پچھلا ابھی ایک ہفتہ پہلے چارج لیا ہے میں نے۔ اس سے پہلے میں شملہ میں تھا۔"

"ہم آپ کے خادم ہیں جناب۔۔۔"

میں نے کہا "ایک معمولی سی انکوائری بھی تھی۔ ہم نے سوچا ادھر آئے ہیں تو اسے بھی نمٹا دیں۔ ویسے ہم ادھر شکار کھیلنے نکلے تھے۔ بد قسمتی سے گاڑی خراب ہوگئی۔ دوسری جیپ کو ہم نے ایک کام سے شہر بھیج دیا تھا۔"

انکوائری کے نام پر مہتا کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ ہر کاروباری شخص کہیں نہ کہیں ہیرا پھیری یا قوانین کی خلاف ورزی ضرور کرتا ہے خواہ وہ ٹیکس بچانے کا معاملہ ہو، کم اجرت دے کر زیادہ کام لینے کا، بچوں سے مشقت کا یا غنڈہ گردی کا۔

"کس قسم کی انکوائری ہے سر؟ میں تو بہت قانون کے دائرے میں رہ کے کام کرتا ہوں" مہتا نے کہا۔

"مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ سات سال میں میری پوسٹنگ مختلف مقامات پر رہی ہے۔ مجھے سب کے دھندوں کی وسعت کا اندازہ ہے" میں نے کہا "جس کے ہاتھ جتنے لمبے ہوتے ہیں اتنا ہی اس کی غیر قانونی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے مسٹر مہتا۔ اور یہ تو آپ کے رویے پر منحصر ہے کہ آپ کس حد تک قانون کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات ہاتھی اسمگل کر دیا جاتا ہے اور ایک بکری خریدنے پر قانون رسید طلب کرلے تو کیس بن جاتا ہے۔"

مہتا نے اطمینان کا سانس لیا کہ "ہم تعاون" مانگنے والے قانون پرست اور قرض شناس شخص ہیں۔

پھر اس نے راز دارانہ لہجے میں کہا "ہم نے دنی معاملہ اٹھایا [illegible]"

"بھٹے کے مزدوروں کا" میں نے کہا "وہ ایک معاملہ ہے۔"

"بڑے احسان فراموش لوگ ہیں۔ میں تو نمک حرام کہوں گا کہ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں" مہتا کا حوصلہ بڑھ گیا تھا "اب پچاس فیصد مہنگائی الاؤنس کا مطالبہ محض مجھے بلیک میل کرنے کے لئے تھا۔ میں تیس سے چالیس فیصد پر آیا تو انہوں نے بچوں سے مشقت لینے کا معاملہ کھڑا کر دیا حالانکہ ان کے حرامی بچوں کو میں نے کام کرنے کے لئے نہیں بلایا تھا۔ یہ خود لاتے ہیں انہیں اور آدھی اجرت۔۔۔۔۔"

میں نے کہا "ان سب معاملات پر بات ہو جائے گی۔ پہلے ایک اور بات۔ یہ بھٹہ کب سے چلا رہے ہیں آپ؟"

"ساٹھ سال ہوگئے۔"

میں نے ہنس کے کہا "اتنی عمر ہے آپ کی؟"

"میرے دادا نے یہ کام شروع کیا تھا۔ پھر والد صاحب نے سنبھالا۔ اب وہ بوڑھے ہوگئے ہیں۔"

"یہ سب کچھ اپنے وقت میں انہوں نے بھی کیا ہوگا جو اب آپ کر رہے ہیں جوانی میں" میں نے کہا اور اس اداکارہ کی جانب دیکھا جس کے پندار کو احساس ناقدری سے پہلے ہی ٹھیس پہنچ چکی تھی۔

غالب نے کہا "آپ شکار کے بھی شوقین ہیں؟"

مہتا نے سنبھل کے کہا "جی۔ سیزن کی بات ہے۔"

"سیزن یا موڈ اور موقع؟" غالب نے کہا۔

فلمی اداکارہ نے اپنی سخت تذلیل محسوس کی مگر صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر وہ مسکرا رہی "موقعے اور موڈ سے آپ فائدہ نہیں اٹھاتے؟ میرا خیال ہے کہ شکاری اچھا ہو تو اس کا نشانہ بھی وقت کے مطابق صحیح جگہ پر لگتا ہے۔ اس وقت آپ خوب آئے" ایکٹریس نے کہا۔

مہتا نے اسے آنکھوں کے اشارے سے روکا مگر وہ نشے میں تھی۔

"مہتا ڈارلنگ۔ اتنے معزز اور با اختیار مہمانوں کو تم نے کہاں بٹھا رکھا ہے۔ انہیں اندر لے جاؤ۔ اپنے گھر مدعو کرو۔ یہ انکوائری وغیرہ سب ختم کر سکتے ہیں" وہ ہنسی "کیا خیال ہے مسٹر کپتان! کیا آپ کو بھی کچھ گھسی پٹی فارمولا فلمیں پسند نہیں۔ میری فلمیں۔"

مہتا نے سخت لہجے میں کہا "تم اندر جاؤ" اور پھر اسے بازو سے پکڑ کے اندر لے گیا، اس کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ اندر سے میں نے اس کی آواز سنی "تم کیوں برباد کرنا چاہتی ہو مجھے۔"

"اس لئے کہ تم نے مجھے برباد کیا ہے۔"

"بکواس بند کرو ورنہ۔۔۔۔۔"

"ورنہ کیا۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔ انکوائری۔۔۔"

اس کے بعد عورت خاموش ہو گئی۔ اس کا جملہ "انکوائری"

www.paksociety.com

کے لفظ پر ختم ہو گیا۔ میں نے کان لگا کے کوئی آہٹ سننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ غالب اور نازو نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان کا سوال میرے ذہن میں بھی تھا کہ کیا مجھے دروازہ کھول کر اندر جھانکنا چاہئے اور اپنا یہ شک رفع کر لینا چاہئے کہ ممتا نے اس زبان دراز عورت کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا ہے جو اچانک موقعے سے فائدہ اٹھا کے عملاً اس کا مستقبل تباہ کرنے پر تل گئی تھی۔

ٹھنڈے دماغ سے کام لیتے ہوئے میں نے فوری طور پر کچھ نہ کرنے کا فیصلہ کیا کیوں کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ میری دخل اندازی سے اس عورت کو پھر زندگی نہیں مل سکتی تھی اور اگر کچھ بھی نہیں ہوا تھا تو دخل اندازی بے مقصد تھی۔

ممتا واپس آیا تو اس کی صورت پر اس کے جرم کی تحریر بہت واضح پڑھی جا سکتی تھی مگر وہ اس پر ایک پُر فریب مسکراہٹ کا پردہ ڈالنے کی ناکام جدوجہد میں مصروف تھا۔

"شی واز ڈرنک" اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا اور تھوڑی سی پھول جانے والی سانس پر قابو پانے کے لئے پانی پینے لگا۔

"تم نے نشہ اتار دیا اس کا؟" میں نے کہا۔

وہ پھر نروس ہوا "وہ ہاں۔ شی از کوائٹ نارمل۔ آپ بتائیے میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"مسٹر ممتا! اس بھٹے سے اینٹوں کی سپلائی کہاں تک ہوتی ہے؟"

"بہت دور دور تک۔ ہماری ایک گڈوِل ہے پرانے تعلقات ہیں اور بس۔ بستی تک اس علاقے میں یہ ایک ہی بھٹہ تھا اب تو درجنوں ہیں مگر اولڈ از گولڈ۔ لوگ یہ بات سمجھتے ہیں" وہ ہنسا۔

"آس پاس کے علاقے میں تمہارے نام کو جاننے والے لوگ کتنے ہیں؟ میرا مطلب ہے واقفیت کا دائرہ کتنے فاصلے تک ہو گا۔ دس میل ادھر یا ادھر؟"

"زیادہ ہی ہو گا" وہ سوچ کے بولا "ممتا کا نام ہر اینٹ پر نقش ہے جو دس میل کے دائرے میں آج سے پچاس سال قبل بھی لگی ہو گی۔"

"اس بھٹے پر کام کرنے والے افراد کی تعداد کیا ہے؟ ان میں مرد کتنے ہیں، عورتیں کتنی ہیں اور بچے کتنے؟"

وہ گھبرا گیا "یہ سب مجھے زبانی تو یاد نہیں۔ منیجر بتائے گا۔ رسوتی والا معاملہ تو......"

میں نے کہا "میں نے ابھی انکوائری شروع نہیں کی مسٹر ممتا۔ اور اس کی اتنی جلدی بھی نہیں ہے مجھے۔"

ممتا کے چہرے پر سکون نظر آنے لگا "میں چائے لاتا ہی ہو گا سر۔ اس کے علاوہ کسی چیز سے آپ شوق کرنا چاہیں تو بلا تکلف کہیں سر۔"

میں نے کہا "یہ مزدور بھی آس پاس کے دیہات سے آتے ہوں گے؟"

"جی سر! مستقل کام نہیں کرتے یہ لوگ۔ آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"بہت دور دور سے آتے ہوں گے؟"

وہ کنفیوز نظر آنے لگا "روزگار کا مسئلہ ایسا ہی ہے۔"

میں نے کہا "میں ایک بات معلوم کروانا چاہتا ہوں ان کے ذریعے۔"

ممتا کا رنگ اڑ گیا "میں بتا سکتا ہوں آپ کو سر ... ویسے کیسی...؟"

"نہیں۔ یہ کام ایسا ہی ہے" میں نے کہا "اس کی ضرورت ہے اور فوری ضرورت بھی۔ ان لوگوں سے کہو کہ یہ اپنے گاؤں یا قصبے جا کے ایک مرد اور ایک عورت کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ لوگوں سے پوچھیں کہ کسی نے کچھ دیکھا تو بتائیں۔ کل صبح تک جہاں سے بھی یہ انفارمیشن ملے [illegible] اور ہمیں خاموشی سے بتا دیں۔ کسی اور کے سامنے کوئی بات نہ کریں۔"

"کس عورت اور مرد کے بارے میں معلوم کرنا ہے سر؟ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ آپ حکم کریں۔" ممتا نے کہا "نام اور پتا بتائیں یا کوئی تصویر ہے تو دیں۔ میں سب کو دکھا دیتا ہوں۔"

"ایسے نہیں۔ تم باری باری سب کو بلاؤ" میں نے کہا "میں ان سے بات کروں گا۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے سر۔ یہ جنگلی اور غیر مہذب لوگ اس قابل نہیں ہیں......"

میں نے سخت لہجے میں کہا "کیا میں اسے تمہارا انکار سمجھوں؟"

"بالکل نہیں۔ ہرگز نہیں سر۔ آپ چائے پی لیں بس۔"

"چائے پیتے ہوئے بھی بات کی جا سکتی ہے" میں نے کہا۔

ممتا بادلِ ناخواستہ اٹھا اور باہر گیا۔

غالب نے کہا "اس نے ابھی ابھی ایک خون کیا ہے۔"

نازو نے سر ہلایا "ہاں۔ اس عورت کا گلا گھونٹ کر۔"

میں نے اقرار میں سر ہلا کے انہیں خاموش رہنے کا [illegible] کیوں کہ ممتا [illegible] آ رہا تھا۔ اس نے مزدوروں کو [illegible] طلب کر لیا تھا۔ وہ دروازے کے باہر ہی رک گیا اور [illegible] کی طرح [illegible] ہر مزدور کا نام لے کر بلانے لگا۔

پہلا مزدور ایک بوڑھا تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ اس کا [illegible] دیکھ کر مجھے اپنے آپ سے شرم محسوس ہوئی۔ ہم کتنے آرام [illegible] صوفے پر بیٹھے حکم چلا رہے تھے۔ رعب جھاڑ رہے تھے [illegible] دھڑلے سے جھوٹ بول رہے تھے۔ ہمارے پاس ایک [illegible]

دکھاوا تھے جو ہم نے خون پسینہ بہا کے نہیں کمائے تھے۔ ہم جوان [illegible] تھے۔ وہ بوڑھا بھٹے میں ساری زندگی جھونک چکا تھا اور ابھی تک اس کا مقدر غلامی کی ذلت، مجبوری کی مشقت اور [illegible] تھی جو اس نے ورثے میں پائی تھی۔

میں نے کہا "بابا جی! کتنا عرصہ ہو گیا مزدوری کرتے؟"

سوال سمجھنے میں اسے کچھ دیر لگی۔ پھر وہ آہستہ سے بولا "کچھ پتا نہیں جی۔"

"ساری عمر مزدوری ہی کی ہے اس نے" ممتا نے وضاحت کی۔

"رہتے کہاں ہو؟"

"اپنے کنبے کے ساتھ اپنے گھر میں جی" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"گھر کہاں ہے بڈھے۔ گاؤں کا نام بتا" ممتا نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

بڈھے نے کانپتے ہوئے کہا "پھل وری جناب!"

"سات آٹھ میل دور ہے" ممتا نے کہا۔

میں نے کہا "بابا جی۔ آج تمہاری چھٹی۔ گھر جاؤ۔ کل تک اپنے گاؤں میں سب سے معلوم کرو کہ آس پاس کسی مرد یا عورت کی لاش تو نہیں ملی ہے۔"

"کوئی..." بڈھے کی حالت غیر ہو گئی۔

"کوئی لاش نہیں ملی تو کیا کوئی گرفتار ہوا ہے۔ جوان خوب صورت عورت ہے۔ ان کے جیسی" میں نے نازو کی طرف اشارہ کیا "اور مرد بھی اچھا جوان ہے۔ کسی نے ان کو دیکھا ہو۔ اجنبی چہرے گاؤں میں فوراً پہچان لئے جاتے ہیں۔"

بڈھا کچھ خوف میں مبتلا تھا اور کچھ ذہنی طور پر نارمل نہیں تھا۔ وہ ہر بات کو بہت دیر سے سمجھتا تھا لیکن "جی حضور" اور "جی جناب" پہلے کہہ دیتا تھا۔ قصور اس کا نہیں تھا۔ اس نے تمام عمر کیا کیا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو معطل بنا دیا تھا کیوں کہ مزدوری کے کام میں دماغ کہیں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ زندہ رہنے کے لئے ہاتھ پیر سلامت ہوں اور جسم سختی جھیل سکتا ہو تو سارے کام چل جاتے ہیں۔ عقل اور ذہانت کے استعمال کی نہ ضرورت تھی اور نہ اجازت۔ ان حالات میں ذہن کی صلاحیت کو زنگ لگ جانا ایک فطری عمل تھا۔

ایک بار گل اور محسن کے بارے میں تفصیل سے سب بتانے [illegible] تکلیف وہ کام اس شخص کے سپرد کر دیا تھا جو [illegible] حاضر کر رہا تھا۔ میرے سامنے اس نے اپنے انداز میں [illegible] آسانی سے سمجھ لی اور تعمیل کا عہد کر کے [illegible] رخصت ہو گئے۔ انہیں آج کے دن کی چھٹی پوری تنخواہ کے ساتھ مل گئی تھی اور میں نے مفید معلومات فراہم کرنے والے کے لئے سو روپے کے خصوصی انعام کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ سو روپے ہمارے لئے کچھ نہیں تھے مگر ان کے لئے قارون کا خزانہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان میں سے ہر شخص یہ سو روپے حاصل کرنے کے لئے پوری کوشش کرے گا۔

ممتا نے میرے چھٹی کے اعلان پر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ حاکم مجاز کے سامنے وہ بھی "جی حضوری" پر مجبور تھا۔ وہ ہر طرح سے "تعاون" کر کے اپنی جان اس انکوائری سے چھڑانا چاہتا تھا جس کا راز خود اس کی زبان نے فاش کر دیا تھا۔ ہمیں تو کسی رسوتی کے نام سے منسوب کسی اسکینڈل کی خبر نہ تھی مگر اب میں قیاس کی بنیاد پر حقائق کا پورا ڈھانچہ استوار کر سکتا تھا۔ رسوتی۔ رسیلی بائی۔ شیریں جان۔ ایسے بہت سے نام اس عورت کے تھے، جس نے جبر کی قربان گاہ پر اپنا جسم ہر جگہ اور ہر دور میں بھینٹ چڑھایا۔ طاقت رکھنے والے کی ہوس کی نذر کیا یا دولت مند کے سامنے کوڑیوں کے مول بیچا۔ دامنِ عصمت کو تار تار دیکھا مگر اسے بھی نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کیا۔ اور اس کے خلاف آواز اٹھائی تو پھر اپنے جسم کی آبرو کا غرور بھی خاک کیا۔ جسم ایک مشت خاک ہی تو تھا۔ یہی رسوتی کی کہانی ہوگی۔ یہی اس عورت کا انجام تھا جو ممتا کو تباہ کرنے کی دھمکی دے رہی تھی۔

چائے کے ساتھ معاملہ فہم منیجر نے وافر لوازمات فراہم کئے تھے۔ یہاں کیک پیسٹری تو مل نہیں سکتی تھی۔ اس نے حیرت انگیز طور پر کم [illegible] میں مرغیاں دستیاب کرائی تھیں۔ پراٹھے بنوائے تھے۔ اُبلے ہوئے انڈے اور مکھن کے ساتھ چائے کے علاوہ ایک [illegible] تھی۔ ہم نے ہر چیز کے ساتھ انصاف کیا مگر شائستگی اور قرینے سے۔ ہم جیسے حاکم لوگ ندیدوں کی طرح ٹوٹ پڑتے تو ہمارا رعب اور دبدبہ کم ہو جاتا۔

سب مزدور چھٹی کر کے چلے گئے تو بھٹے کے آس پاس مکمل خاموشی کا راج ہو گیا۔ ممتا کو کیسے شک ہو سکتا تھا کہ وہ خود اپنی بدبختی کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اسے یقین آ چکا تھا کہ اب وہ ہم سے تمام معاملات طے کرائے گا۔ ہم ویسے ہی افسر تھے جیسے عام طور پر ہوتے ہیں۔ ہماری خدمت کر کے اور ہم سے تعاون کر کے وہ مستقبل کے لئے بھی یہ ضمانت حاصل کر سکتا تھا کہ جس رسوتی کو چاہے اپنی خواب گاہ میں طلب کرے، جب چاہے اس کی آواز کو دبا دے اور جہاں چاہے اسے دبا دے۔

دوسری سگریٹ جلا کے میں نے گھڑی دیکھی تو دوپہر کے ساڑھے گیارہ بجنے والے تھے۔ پیٹ بھر جانے کے بعد آسودگی کے ساتھ ہی غنودگی نے یلغار کی تھی۔ غالب تو باقاعدہ اونگھنے لگا تھا۔ پھر نازو اس کو اپنی چٹکیوں سے بیدار کر رہی تھی اور گھورتی تھی تو ممتا صرف مسکراتا تھا۔ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل۔ مرحوم نے اپنے پتی ورتا کا خیال نہیں رکھے گی تو اور کون

www.paksociety.com

رکھے گا۔

اچانک میں نے کہا "مسز ممتا یہاں باتھ روم تو نہ ہوگا" اور اٹھ کے دروازے کی طرف بڑھا۔

اس سے پہلے کہ ممتا مجھے روکتی میں دروازہ کھول کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ ممتا میرے پیچھے لپکا۔ اس کی بدحواسی اور پریشانی کا یہ حال تھا کہ دروازے سے گزرنے کی کوشش میں وہ چوکھٹ سے ٹکرا گیا۔

"وہ ـــ باتھ روم" اس نے آخری دیوار میں نظر آنے والے دروازے کی جانب اشارہ کیا "چلے جائیں۔"

اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں نے واردات کا پورا نقشہ دیکھ لیا تھا۔ ایک تخت جیسے بیڈ پر وہ عورت پڑی ہوئی تھی جس کی شہرت کا گہنایا ہوا سورج نصف صدی سے غروب ہو گیا تھا۔ وہ جو لاکھوں کروڑوں دل کی دھڑکن تھی اب اپنے دل کی دھڑکن سے بھی محروم ہو چکی تھی۔ پھر بھی یوں لگتا تھا کہ وہ سو رہی ہے۔ ممتا نے اسے ایک منٹ میں زندگی کی ہر اذیت، ہر احساس ذلت یا ماضی کے عذاب اور بے بسی کے ایام کے دکھ سے نجات دلا دی تھی۔

میں نے مسکرا کے کہا "یہ سو گئی۔ اب تو فرصت ملی تھی اس سے بات کرنے کی۔"

ممتا نے کہا "جی ـــ وہ باتھ روم ـــ ہاں۔ عجیب عورت ہے یہ بھی ـــ بدتمیز۔ پہلے نشے میں بولتی رہی فضول" وہ بار بار چینے لگا۔

"اب ـــ بڑے سکون سے سو رہی ہے۔ مشکل ہے اس کا جاگنا۔"

"کیا یہ ممکن ہے اس کا پھر اٹھنا؟" میں نے کہا۔

ممتا کا رنگ زرد پڑ گیا "نہیں ـــ ناممکن کیوں؟ گر میں عادت جانتا ہوں اس کی۔ آپ لاکھ اٹھائیں، ہوش ہی نہیں آئے گا اسے چار چھ گھنٹے تک ـــ نشے کا اثر ہے گا۔"

میں باتھ روم میں گیا اور دروازہ بند کرنے کے بعد ایک جھری سے جھانکتا رہا۔ ممتا نے بڑی پھرتی سے لاش کو دوسرے پہلو پر لٹا دیا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اور ایک بازو کمبل سے باہر کر دیا تھا۔ یوں جیسے سوتے میں اس نے کروٹ لی ہے۔ میرے بعد غالب اور پھر نازو نے باتھ روم جا کے آتے ہوئے اس منظر کا "ایکشن ری پلے" دیکھا۔ وہ دونوں بھی جب باتھ روم میں گئے تو انہیں اداکارہ ایک کروٹ پر لیٹی نظر آئی تھی مگر واپسی پر اس کا پہلو بدل گیا تھا۔ ان دونوں نے بھی جھری سے جھانک کر ممتا کی یہ کارروائی دیکھی تھی۔

جب ممتا مطمئن ہو کے میرے سامنے بیٹھ گیا کہ اس نے بڑی چالاکی سے قتل کے جرم پر خفیہ کا پردہ ڈال دیا ہے تو میں نے اسے نظر جما کے دیکھا۔ وہ نروس ہو کے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ خشک کرتے ہوئے مسکرایا۔

"مسز ممتا : یو آر انڈر اریسٹ" میں نے کہا۔

وہ یوں اچھلا جیسے میں نے پن نکال کر دستی بم اس کی گود میں ڈال دیا ہو "جی ؟"

میں نے کہا "جی۔ تم نے اسے گلا گھونٹ کے مار ڈالا ہے۔"

غالب نے کہا "ورنہ وہ تمہیں تباہ کر دیتی۔"

نازو نے کہا "مگر تباہ تو کر دیا ہے اس نے تمہیں مر کے بھی۔"

ممتا کا چہرہ احساس شکست کی تصویر بن گیا۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی اور وہ یوں لمبے لمبے سانس لینے لگا جیسے اس پر دل کا دورہ پڑنے والا ہے۔

میں نے کہا "میں نے دیکھا تھا تمہیں لاش کی پوزیشن بدلتے۔"

غالب اور نازو نے بھی یہ بات دہرائی۔

"کوئی عورت جو نشے میں شور مچا رہی ہو اچانک خاموش نہیں ہوتی۔ لیکن اسے خاموش کیا جا سکتا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ ماضی کی نامور اداکارہ تھی یا صرف رسوتی۔"

میں اس اداکارہ کا نام نہیں لوں گا کیوں کہ بعد میں اس کی موت کے اسباب بدل دیے گئے تھے۔ اخبارات میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق اپنی زندگی کے آخری لمحات میں وہ معمول کے مطابق اپنے گھر کے اندر بنے ہوئے مندر میں پوجا کر رہی تھی کہ ان پر دل کا دورہ پڑا اور کار میں ہسپتال جاتے ہوئے ......

اس کے نام کی جگہ میڈم استعمال کیا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا "میڈم کا قتل ہمارے سامنے ہوا ہے۔ ہم اس جرم کے چشم دید گواہ ہیں۔ اور ہماری گواہی تمہیں تختہ دار تک پہنچا سکتی ہے۔"

ممتا کا حوصلہ جواب دے گیا "بھگوان کے لئے مجھے بچا لیں سر۔ آپ کے سوا یہ بات کوئی نہیں جانتا۔ میں اس کا تاوان ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ جو سزا دینا چاہیں آپ خود دے دیں۔ ساری عمر غلام رہوں گا آپ کا۔"

میں نے نازو سے کہا "اندر سے ٹیپ ریکارڈر اٹھا لاؤ۔"

نازو نے غالب کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھا مگر صرف اداکاری تھی۔ "تم اٹھا لاؤ" وہ شوکارے کر بولی۔

غالب بہادر شوہر کی طرح مسکرایا "مجھ سے تو ڈرتی تھیں ہو۔ بے جان لاش سے ڈر لگتا ہے۔ ابھی وہ بھوت تو نہیں بنی میرے ستر کی طرح۔"

نازو نے اسے غصے سے دیکھا مگر خاموش رہی۔

"آپ ۔ میرا بیان ریکارڈ کریں گے؟" ممتا نے خشک حلق تر کر کے تھوک نگل کے کہا۔

"ہاں۔ تم نے تمام عمر غلام رہنے کا وعدہ کیا ہے نا۔ یہ وہ غلامی کی زنجیر ہو گا جسے تم کبھی نہ توڑ سکو گے۔"

ممتا نے بے بسی سے کہا "سر! ایسا ظلم مت کریں۔"

میں نے اس کے منہ پر چانٹا مارا "مجھے ظالم کہنے والے تم کون ہو؟ کس نے مارا تھا میڈم کو؟ قاتل کون ہے؟"

ممتا نے خوف کا تھوک نگل کے کہا "معاف کریں سر۔ غلطی ہو گئی مجھ سے۔ میرا مطلب نہیں تھا۔ آپ جو چاہیں مانگ لیں ـــ پچاس لاکھ۔"

میں نے اس کے دوسرے گال پر تھپڑ رسید کیا۔ وہ صوفے پر گر گیا "اتنی ہی قیمت ہے تمہاری جان کی؟"

"سر ـــ دس لاکھ ـــ" وہ ہکلانے لگا "اس سے زیادہ نہیں ہے میرے پاس۔"

غالب نے ٹیپ ریکارڈر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس میں لگا ہوا ٹیپ دوبارہ چل چکا تھا۔ میں نے اسے واپس چلایا اور پھر کسی وجہ کے بغیر آن کر دیا۔ میڈم کی آواز نے ایک دھماکا کیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ فلمی گانوں کا کیسٹ ہوگا۔ غالب اور نازو میں سے کوئی بھی اس دھماکے کے لئے تیار نہ تھا۔ تو ممتا بے اختیار اچھلا اور اس نے ٹیپ ریکارڈر پر حملہ کیا۔

میرے ایک دھکے نے اسے واپس صوفے پر پہنچا دیا۔ پھر میں نے ریوالور نکال لیا "سنو مسز ممتا۔ یہ موت کی آواز ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ممتا کے لئے یوم حساب پہلے ہی آ چکا تھا۔ آخر کار ایک عورت نے اسے تمام عمر کے گناہوں کی سزا دینے کے لئے وہ جال پھیلا دیا تھا جسے خود ممتا کی نظر نہ دیکھ سکی۔ حالاں کہ وہ بڑا عیار شکاری تھا مگر میڈم نے اسے بھی شکار کر لیا۔ اسے یقین تھا کہ ممتا اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ان کے درمیان عدم اعتماد کی فضا پہلے سے موجود تھی اور کوئی ایسی بات ہو چکی تھی کہ وہ اپنی جان خطرے میں محسوس کرتی تھی۔ یہاں آنے تک بھی اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال موجود تھا کہ شاید ممتا اپنی کمین گاہ میں بیٹھ کے اسے شکار کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ اس کی سلطنت تھی جہاں صرف اس کے حکم کے غلام تھے اور یہاں کسی دوسرے کی مداخلت کا کوئی امکان نہ تھا۔

خطرے کو محسوس کرتے ہوئے بھی اس نے یہاں آنا قبول کیا مگر اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہوئی۔ ممکن ہے وہ آنے سے پہلے کسی کو بتا گئی ہو کہ وہ کس کی ساتھ کہاں جا رہی ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اسے عین وقت پر خود حفاظتی کے انتظامات کی طرف سے غفلت کا احساس ہوا اور موت چھپی نظر آنے لگی تو اس نے ایک آخری کوشش کے طور پر وہ حرکت کی جس سے خود ممتا بھی بے خبر رہا۔ اس کی بہت سی گفتگو اس میں ریکارڈ ہو چکی تھی۔ اگر ممتا کو موقع ملتا تو وہ اس ٹیپ کو بھی ضائع کر دیتا لیکن ہم اس کی نامناسب اطلاع کے تحت پہنچے اور میڈم نے مرنے کا جو عہد کیا تھا وہ پورا ہوا۔

ٹیپ میں تقریباً بیس منٹ کی گفتگو تھی جو ہمارے آنے سے پہلے کی ریکارڈ ہوئی تھی۔ میڈم کے آخری لمحات کی صوتی تصویر اس میں شامل نہیں تھی۔ اس وقت جب ممتا اس کا گلا گھونٹ رہا تھا، اس کے لئے ٹیپ ریکارڈ کو چلانا ممکن ہی نہ تھا۔ یہ کام اس نے بڑی صفائی سے ایسے وقت میں کیا تھا جب ممتا کو بالکل پتا نہیں چلا اور وہ چلتے ہوئے ٹیپ کی سرسراہٹ بھی نہ سن سکا۔ جانتے بوجھتے میڈم نے ایسے سوال یا جواب کیے تھے جو ممتا کے اعتراف جرم کے بیان حلفی سے کم نہ تھے

بات بہت معمولی تھی اور آغاز سے انجام تک اس کہانی میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ شوقین مزاج ممتا نے آخر کار فلمی دنیا کی ایک نامور اداکارہ کے عشق میں "کامیابی" حاصل کی تھی۔ اس وقت جب وہ ممتا جیسے خریداروں کی دسترس میں آ گئی تھی۔ وہ وقت گزر گیا تھا جب میڈم فلمی دنیا کے افق کا روشن ستارہ تھی اور اسے چھونے کی آرزو رکھنے والے دیوانے کہلاتے تھے۔ وقت کی گردش نے اس کو پستی میں دھکیلا تو ممتا نے اسے تسخیر کیا۔ اس کامیابی کے پیچھے ممتا کی دولت بھی تھی، اس کی عیاری بھی اور میڈم کی ناکامی کے دور کی کمزوری بھی۔ اس نے میڈم کو سبز باغ دکھائے تھے کہ وہ فلم بنائے گا جس میں اس کے مقابل دلیپ کمار ہوگا یا شمی کپور۔ اور یہ فلم باکس آفس پر ہٹ ہوگی تو میڈم پر تقدیر پھر مہربان ہو جائے گی۔ جب یہ وعدہ جھوٹا ثابت ہونے لگا تو جہاں دیدہ اور محروم گزیدہ میڈم نے اپنے ترکش کا آخری تیر نکالا۔ اس نے ممتا کو بلیک میل کرنے کے لئے کہا کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے چناں چہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے ورنہ نتائج بھگتنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس کی ازدواجی اور کاروباری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ ممتا نے ہرجانہ ادا کر کے جان چھڑانے کی کوشش کی مگر میڈم کا مطالبہ بہت بڑا تھا۔ وہ ممتا کو رعایت دینے پر بھی آمادہ نہ تھی چناں چہ اس کا یہی انجام ہونا تھا۔

تب میں نے اپنے قبضے میں کرنے کے بعد کہا "اب کچھ تمہیں کہنا ہے۔"

"وہ مجھے بلیک میل کر رہی تھی۔ اور اب ......"

"اب ہم کر رہے ہیں؟" میں نے کہا "اوکے۔ تم تیار ہو جاؤ۔ کتنا ادا کرنے کے لئے کتنا صاحب یہ آپ کا مجرم ہے۔"

غالب اٹھا "میں فون کر کے پولیس کی نفری طلب کرتا ہوں۔ اور اخباری نمائندوں کو بلاتا ہوں۔"

"مجبوری۔ میرے بھیا کے سوا یہ خبر کوئی نہیں دے گا۔ یہ ان کی ایکس کلوسیو اسٹوری ہوگی۔ ان کے کیریئر کا سب سے بڑا دھماکا۔"

"پلیز سر۔ ایک منٹ۔ میری بات سن لیں۔"

"تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔" میں نے کہا "تم اپنا اعتراف جرم ریکارڈ کرا دو۔ جو کچھ پہلے ہوا وہ اور وہ سب جو آج ہمارے سامنے ہوا۔ یہ ہمارا وعدہ ہے کہ ہم اس ٹیپ کو استعمال نہیں کریں گے۔ میرا مطلب ہے پولیس کی حد تک۔"

"لیکن تم میرا خون چوستے رہو گے تمام عمر میں تمہارے مطالبات پورے کرتا رہوں گا۔ جتنا کماؤں گا تم لے جاؤ گے۔ پھانسی چڑھ جانے کی دھمکی الگ رہتی ہو گی۔ تو سرا میں یہ گھاٹے کا سودا نہیں کروں گا۔ تم مجھے گرفتار کرا دو۔ صرف رسوائی اور پریشانی کے خیال سے ڈر لگ رہا تھا۔ اس رقم سے میں فیصلہ اپنے حق میں حاصل کر لوں گا۔ اچھے سے اچھا وکیل سب کچھ کر لیتا ہے۔ میں گوارا کر سکتا ہوں اپنی دلی میں موجودگی کے ثبوت

www.paksociety.com

شہادت سب غائب کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "مسٹر ممتا جائے واردات پر رنگے ہاتھوں پکڑا جانے والا قاتل کچھ نہیں کر سکتا۔ فکر نہ کرو ٹس ہماری موجودگی میں لئے جائیں گے۔ اور پولیس تمہیں یہاں سے اسسٹنٹ کمشنر پولیس کی موجودگی میں لے جائے گی۔ تو تم آج خود کو وہاں میں کیسے ثابت کرو گے؟ دراصل تم نے غلط سمجھا ہے۔ ہمیں نہ پانچ لاکھ کی ضرورت ہے نہ دس لاکھ کی۔"

"پھر۔۔۔ کیا چاہتے ہو تم؟"

حالات کے پلٹا کھاتے ہی ممتا نے پروٹوکول کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اس کے انداز تخاطب میں نیاز مندی کے بجائے کی جگہ بدتمیزی اور سرکشی نے لے لی تھی۔ "وہ سر" کے بجائے ایک دم "تم" پر آگیا تھا۔

میں نے کہا "تم اور بھی بہت کچھ کر سکتے ہو ہمارے لئے صرف ایک بار نہیں۔ جب بھی ضرورت پڑے۔ ساری عمر غلام کیا کرتا ہے خدمت کے سوا۔ چنانچہ تمہیں خدمت کے مواقع ملتے رہیں گے۔ اور تم ہمارے بہت سے کام کرو گے۔"

وہ کچھ نہیں سمجھا "کیسے کام؟"

"تمام زندگی کے کام۔ جو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ کوئی کام ناممکن یا مشکل نہیں ہوگا" میں نے گول مول جواب دیا "کسی کام میں نہ تمہاری زندگی کو خطرہ لاحق ہوگا نہ عزت آبرو کو۔ شاید پیسہ بھی خرچ نہ ہو۔"

معلوم نہیں اس نے میری بات سے کیا نتیجہ اخذ کیا مگر اچانک وہ مطمئن نظر آنے لگا "ٹھیک ہے۔ مگر میں کوئی اقبالی بیان ریکارڈ نہیں کراؤں گا۔"

میں نے کہا "ویسے تو میڈم کی تم سے گفتگو کا یہ ٹیپ کافی ہے۔ ہمیں منٹ میں تمہارے کرتوت اور ارادے واضح ہو گئے تھے۔"

"عدالت میں ٹیپ کی ہوئی گفتگو کو مستند ثبوت تسلیم نہیں کیا جاتا۔۔۔"

"لیکن عدالت اسے مسترد بھی نہیں کرتی۔ سائنسی طریقے موجود ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آواز ملزم کی ہے یا کسی اور کی۔ اور یہ کہ ٹیپ میں ردو بدل کیا گیا ہے یا نہیں۔ اس کے بعد یہ مستند ثبوت ہو جاتا ہے" میں نے کہا۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے غالب سے کہا کہ وہ ممتا کا خیال رکھے اور خود اندر چلا گیا جہاں میڈم کی لاش سرو پڑی ہاری تھی۔ بیڈ روم میں عیش و عشرت کے سب لوازمات موجود تھے میں نے ایک بیڈ سائڈ ٹیبل کی درازوں کو کھول کر دیکھا۔ اس میں میڈم کی جیولری رکھی ہوئی تھی۔ دوسری دراز میں مجھے کیمرا مل گیا۔ حسب توقع اس میں استعمال شدہ فلم موجود تھی۔ ممتا یقیناً خود کو بلیک میل ہونے سے بچانے کے لئے حفظ ماتقدم کے طور پر یہاں آنے والی نیک نام، نیک دل اور نیک چلن عورتوں کی ایسی

تصویریں ضرور اتار لیتا ہوگا جو بعد میں ڈھال کی طرح استعمال ہوں اور کوئی اس کے لئے گڑھا کھودے تو وہ تمہارے کر [illegible] گڑھے کے کنارے کھڑا ہو اور یہ رسوائی کا وہ گڑھا [illegible] ہے جو کھودا تھا۔ یا ممکن ہے وہ اس طرح خود بلیک میلنگ کرتا اور ہر عورت سے وہ سب مع سود وصول کر لیتا ہو جو اس نے عشرت خانے میں پھیلانے اور سبز باغ لگانے میں صرف کیا تھا۔

تاہم یہ صرف میری خیال آرائی تھی۔ وصولی ضرورت نے پوری کر دی تھیں۔ اس میں چار تصویریں باقی تھیں۔ کیمرہ اپنے جیکٹ میں چھپا کے میں واپس آگیا۔

"مسٹر ممتا! آپ ایک منٹ کے لئے اندر تشریف لائیں گے؟" میں نے کہا "ذرا اس لاش کو دیکھئے۔"

ممتا سخت پریشان تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے کرنا [illegible] کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

"کیا ہوا ہے لاش کو؟" وہ لاش پر جھک کر بولا۔

"اسے پلٹ کر دیکھو" میں نے کہا "پھر اندازہ ہوگا تمہیں۔"

اس نے کندھے پکڑ کے لاش کا رخ بدلا۔ اسی وقت میں نے پہلی فوٹو لی لیکن فلیش استعمال نہیں کیا۔ اندر کم روشنی تھی مگر ایک دھندلی تصویر اتاری جا سکتی تھی۔ شٹر کی آواز کو دبانے کے لئے میں نے دروازے کو ٹھوکر ماری تھی اور کیمرا فوراً پیچھے کر لیا تھا۔

ممتا نے چونک کر مجھے دیکھا مگر میں سیدھا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ممتا کا دماغ پہلے ہی ماؤف تھا اور اس کی عقل بھی اس وقت ساتھ چھوڑ رہی تھی جب ممتا کو اس کی رہنمائی کی زیادہ ضرورت تھی لیکن ایسا اکثر ہوتا ہے۔ سخت پریشانی میں دماغ کام نہیں کرتا۔

"مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا" وہ بولا۔

میں نے کہا "اچھا اس لاش کو اٹھا کے باہر لے آؤ۔"

وہ مجھے گھورنے لگا "کیوں؟"

"کیا اسے یہیں چھوڑ جاؤ گے؟ واپس اس کے گھر نہیں پہنچاؤ گے۔" میں نے کہا۔

"یہ کام [illegible]"

"بعد میں [illegible]"

"تمہارے جانے کے بعد۔" وہ بولا "میں تدبیر کر لوں گا۔"

"اپنے خلاف ایک اور گواہ پیدا ہونے دو گے؟ جو تمہارا راز دار ہے" میں نے کہا "ابھی وہ ہے بھی نہیں اور ہم جا رہے ہیں۔ اسے اپنے ساتھ لے کر۔"

"مجھے ساتھ لے کر۔۔۔۔ کہاں؟"

"تمہارے گھر" میں نے کہا۔

"میرا گھر تو تھانے سے آگے ہے۔ سندھ گاؤں میں گھر میں بیوی وہاں کیسے لے جا سکتا ہوں۔ وہاں میرے بیوی بچے اور ملازم ہیں۔"

"وہ ہم سے مل کے خوش ہوں گے۔ ان کی عزت افزائی کہ حکام نے ان کے غریب خانے میں قدم رنجہ فرمایا۔ صاحب

سر ابھی ضرور ہو گا اس کمرے میں۔"

"مجھے ایک سر اسمان خانہ ہوگا" غالب نے کہا۔

"بلکہ [illegible] تو کیوں [illegible] چاہتے ہو تم ان سے؟"

"ہم تمہارا فیصلہ [illegible] چاہتے ہیں۔ ہمارا تعلق تو اب ہم رہے گا۔ تم نہ بتانا بھی ہو۔ نہیں اس لئے فضول باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔ ہم نے کہہ دیا ہے کہ تمہارے ساتھ جانا ہے تو جانا پڑے گا تمہیں۔ میڈم کے زیورات بھی نکال لو۔"

اس نے مجبوراً لاش کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا۔ اسی وقت میں نے فلیش کے ساتھ تصویر لی۔ اس نے چلا کے مجھے گالی دی اور لاش پھینک دی۔ میں نے لاش کی اس پوزیشن کی تیسری تصویر بنائی جس کے پس منظر میں ممتا کا پریشان حال وحشت زدہ چہرہ جرم کی ماری ہوئی نالائقی کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ پھٹی آنکھیں۔ کھلا ہوا منہ پسینے میں ڈوبا ہاتھ جن میں میڈم کا زیور بھی تھا۔

اس نے عالم دیوانگی میں لاش کے اوپر سے چھلانگ مار کے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے اسے یوں لات ماری جیسے گول کیپر دور سے آنے والی فٹ بال کو کک مار کے واپس کرتا ہے۔ وہ پلٹ کے لاش پر گرا اور مجھے چوتھی بہترین تصویر اتارنے کا موقع مل گیا۔ وہ اب غصے میں پاگل ہو کے گالیاں بک رہا تھا۔ اقبالی بیان سے زیادہ خطرناک یہ تصویریں تھیں۔ ایک تصویر وہ سب بتاتی ہے جو ایک ہزار الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بیس منٹ کا ٹیپ اور چار تصویریں ممتا کو موت کے اندھے کنوئیں میں لٹکانے کے لئے گردن میں پڑے ہوئے پھندے سے کم نہ تھیں۔

میں کیمرے کو بچانے کے لئے پیچھے ہٹ گیا اور نازو کو آگے آنے کا اشارہ کر دیا۔ روایتی بدمعاش و حرم پتی کا کردار کامیابی سے ادا کرنے والی نازو آگے بڑھی اور اس نے دو منٹ میں ممتا کے سارے کس بل نکال دیے۔

اب وہ دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا تھا اور اس کی حالت پاگلوں سے بدتر تھی "تم۔ تم جھوٹے ہو۔ تم میں سے کوئی سرکاری افسر نہیں۔ کون ہو تم آخر؟"

میں نے کہا "کیا میں مسٹر ممتا سے کہوں کہ وہ تمہیں یہ بات اچھی طرح سمجھائیں جو ابھی تک تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ تمہاری عقل ٹھکانے آ جائے گی تو تم فضول سوالوں سے گریز کرو گے اور صرف ہمارا حکم مانو گے۔ اس لئے کہ تم غلام بن چکے ہو ہمارے تمام عمر کے لئے۔ اور غلام صرف تعمیل کرتے ہیں۔"

وہ بمشکل سے اٹھا اور پھر لاش اٹھانے لگا تو میں نے اسے روک دیا "اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ شو ختم ہو گیا۔ تمہیں اجازت ہے کہ اپنے منیجر کو طلب کر کے یہ لاش اس کے حوالے کرو۔ سراغ مٹانا چاہو تو مٹا دو۔ تمہارا منیجر لگتا تو ہے تجربہ کار ہے۔ وہ کرے گا یہ کام۔ لاش کو خوش اسلوبی سے ٹھکانے لگانے کا۔"

"یہ کام میں خود کروں گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ہم کہیں نہیں جا رہے ہیں۔ کل تک تم بھی ہمارے ساتھ یہیں رہو گے۔"

اس نے سر پہ ہاتھ مارا "ہے بھگوان۔ یہ کس جنجال میں پھنسا دیا مجھے۔"

میں نے کہا "اس سے پہلے بھگوان کب یاد آئے تھے تمہیں؟"

غالب نے کہا "یہ الزام لگا کے تم بھگوان کو اور زیادہ خفا کر رہے ہو۔"

"منیجر اپنے کوارٹر میں ہوگا" وہ بولا۔

غالب نے کہا "میں اسے بلا کے لاتا ہوں۔ اچھی طرح سمجھا بھی دوں گا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔"

"اب ہم باہر بیٹھ کے دوستانہ ماحول میں گپ شپ کریں گے تاکہ منیجر کو شک نہ ہو۔ کہ خدانخواستہ ہمارے درمیان کوئی کشیدگی پائی گئی ہے" میں نے کہا۔

"خدا نخواستہ! کیا تم مسلمان ہو؟"

"اگر میں گارنٹی [illegible]"

"تم وہ نہیں ہو۔ جو نظر آتے ہو" ممتا نے جھنجھلا کر کہا "تمہارے نام اور کام سب پراسرار ہیں۔"

"بالکل تمہاری طرح" میں نے کہا "ظاہر اور باطن کا فرق ہی تو ایک بڑے آدمی کو بڑا آدمی بناتا ہے۔ خواہ وہ سیاست داں ہو یا صنعت کار، سماجی کارکن یا دانشور۔ اگر اصل روپ سامنے آ جائے تو ان میں سے بیشتر فرشتے نظر آنے والے شیطان ثابت ہوں۔"

غالب لوٹ کے آیا تو منیجر اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ہم پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور اندر چلا گیا۔ ٹنک اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا اور پریشانی اس کے انداز سے عیاں تھی مگر مالک کے حکم کو بلاچون و چرا بجا لانا اس کی فطرت بن چکی تھی۔

"میڈم کو ان کے گھر پہنچانا ہے۔ اس طرح کہ کسی کو کچھ پتا نہ چلے" ممتا نے کہا "انہی کی گاڑی میں جاؤ اور گاڑی کو دروازے پر چھوڑ کے لوٹ آؤ۔ آج کل تو دروازے پر گورکھا بھی نہیں ہوتا۔ ہو سکے تو گاڑی اندر لے جاؤ۔"

میں نے کہا "یہ جو باہر کھڑی ہے میڈم کی گاڑی ہے؟"

منیجر نے نفی میں سر ہلایا "نہیں سر۔ میڈم کی گاڑی پچھلے پیچھے کھڑی ہے۔ نظر نہیں آئی۔"

"شام تک تم واپس آ جاؤ گے" ممتا نے کہا۔

"مشکل ہے سر۔ یہ کام رات کو ہی ہوگا۔ دس بجے کے بعد۔" منیجر بولا "دیر بھی ہو سکتی ہے۔"

"چلو تم صبح آ جانا" میں نے کہا "جلدی مت کرنا ورنہ تم بھی پھنس جاؤ گے اور ممتا صاحب بھی مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

ممتا نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر میری نظر کا اشارہ سمجھ کے خاموش ہو گیا "جانے سے پہلے سب صاف کر جاؤ۔ کوئی ثبوت نہ رہے میڈم کی یہاں موجودگی کا۔"

www.paksociety.com

"آپ فکر نہ کریں سر" منیجر بولا۔

"مجھے امید ہے تم ایسا کوئی کام نہیں کرو گے جس سے مسز ہنا کی عزت یا زندگی خطرے میں پڑے۔ کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بھی نہیں کہ یہ زخمی ہوا ہمارے سامنے ہوا۔ ہم سرکاری افسر بھی مجبور ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں ہنا صاحب کے خلاف گواہی دینی پڑے۔ تم تو بس یہ سمجھو کہ ہم یہاں آئے ہی نہیں تھے۔"

"لیکن سر! آپ کو اتنے مزدوروں نے دیکھا تھا۔ آپ نے بات کی ہے ان سے" منیجر بولا۔

"مزدوروں کی کون سنتا ہے۔ نہ کوئی پوچھے گا ان سے" میں نے کہا "ہم خود یہاں نہیں تھے آج۔ زخمی ہوتے ہی چلے گئے تھے۔ ہنا صاحب اپنی جان بچانے کا انتظام خود کر لیں گے۔"

"جان بچانے کا انتظام؟" وہ بولا۔

"ہاں۔ گواہ، ثبوت جس سے ثابت ہو گا کہ یہ تو دہلی میں تھے یا یہاں سے سیکڑوں میل دور۔ اب تم جاؤ" میں نے کہا۔

منیجر نے ہر کام بڑے سلیقے سے کیا اور میڈم کی لاش اٹھا کے لے گیا۔ اب یہاں ہنا کے علاوہ صرف ہم تھے اور ہمارے لئے اگلے دن تک پناہ کی ضمانت تھی۔ فوری طور پر ہمیں کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سوائے آرام کے۔ جتنا ہم نے کھایا تھا اس سے زیادہ بچا یا تھا جسے رات کو پھر کھایا جا سکتا تھا۔

ہنا سخت سہما ہوا تھا اور غالباً اس اندیشے میں مبتلا تھا کہ کہیں ہم اسے قتل نہ کر دیں۔ ہم کسی رسوتی یا میڈم کے وارث نہ ہوں جو اس کے بے گناہ لہو کا انتقام لینے آئے ہوں۔ خود اسے تو میڈم یا رسوتی کا نام بھی یاد نہ ہو گا جو اس کی زندگی میں ایک دروازے سے داخل ہو کے دوسرے دروازے سے نکل گئی تھیں۔ گمنامی اور رسوائی کی جانب یا وجود سے عدم کی طرف۔

"اب ہم بھی آرام کریں گے ہنا جی اور تم بھی آرام کرو" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور ایک دم اس کے سر پہ ریوالور مار دیا۔ وہ کراہ کر صوفے پر لڑھک گیا۔

بنگلے کے مالک کی حیثیت سے ہنا کا قبضہ اسی جگہ پر تھا۔ یہ جگہ آبادی سے دور تھی اور بڑی سڑک سے اتنے فاصلے پر تھی کہ بلا ضرورت ادھر کسی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس گوشۂ عافیت کو ہنا نے اور اس سے پہلے شاید اس کے باپ نے اور دادا نے ایک پرائیوٹ عشرت کدہ بنا رکھا تھا۔ باہر کا کمرا آفس تھا اور اندر کا خواب گاہ۔ ٹیوب ویل کو چلانے کے لئے بجلی بھی یہاں لگا کے حاصل کی گئی تھی۔ اسی سے پنکھے اور ایئر کنڈیشنر چلتے تھے۔ اندر ایک دیوار کے ساتھ چھوٹا سا فریج بھی تھا۔ باتھ روم کے لئے پانی اوور ہیڈ ٹینک سے فراہم ہوتا تھا۔ اس کی موٹر کا کنکشن بھی ٹیوب ویل سے تھا۔

دروازہ بند کرنے کے بعد ہم نے باری باری غسل کیا۔ خواب گاہ میں مہمانوں کے لئے ضرورت کے لوازمات فراہم کئے گئے تھے ان کے فٹ نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ … ایک سوتی ساڑی باندھی اور وہیں پڑ کے سو گئی جہاں … میڈم محو خواب تھیں۔

غالب نے اور میں نے بھی نہانے کے بعد … کے لا تعلق محل پر بحث کو التوا میں رکھا جائے۔

میں نے کہا "پہلے تم سو جاؤ۔ میں شام تک جاگ سکتا ہوں"

اس نے کہا "جی حضرت! پہلے آپ" اور فوراً لیٹ گیا "میرا مطلب تھا پہلے آپ جاگ لیں۔"

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے غالب کی طرف دیکھا "کیا کریں اب؟"

"بجنے دو گھنٹی۔ فون کرنے والا خود ہی جھک مار کے رکھ دے گا۔" میں نے کہا۔

"لیکن یہ کاروباری اوقات ہیں۔"

"اچھا تو پھر آرڈر نوٹ کرلو" غالب نے کہا۔

میں نے ریسیور اٹھا کے کہا "یس ہنا کے ابا ابا ہی … ہوں"

"ہنا سنز؟" کسی نے کہا۔

"ہاں۔" میں نے ریسیور پہ رومال رکھ کے کہا۔

"یہ آواز کو کیا ہوا ہے تمہاری ہنا؟"

"زکام" میں نے جملے کے بجائے لفظ سے کام چلایا۔

"اچھا۔ میں وہ ایک لاکھ کا آرڈر کنفرم کر رہا ہوں۔ ایک … کا نام ہے۔"

"اچھا۔" میں نے کہا۔

"تم تو سخت بیمار لگتے ہو۔" بات کرنے والا ہنسا "… ہے اور الفاظ بھی کم نکل رہے ہیں حلق سے۔ کیا بخار ہے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔

"اچھا یار۔ ضروری بات تھی اس لئے ڈسٹرب کیا۔ … تم"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ریسیور کریڈل پر رکھنے … بجائے اٹھا کے رکھ دیا "نہ ہو گا بانس نہ بجے گی بانسری"

"محاورے کو جدید حالات کے مطابق بنا دینا چاہئے کہ نہ … فون نہ بجے گی گھنٹی" غالب بولا۔

"مگر تمہیں نیند نہیں آ رہی ہے تو بار … مجھے سونے دو۔" … جماہی لے کر کہا۔

"یار ایسا کیوں نہ کریں ….. ہنا جی کو بند کر دیا جائے … روم میں۔ اور تم بھی سو جاؤ۔"

میں نے کہا "خیال تو اچھا ہے۔ مگر پہلے دیکھ لوں کہ پیچھے سے تو نہیں نکل جائے گا۔"

باتھ روم میں صرف ایک روشن دان تھا جس میں … گرل لگی ہوئی تھی۔ خالی ہاتھوں سے اس گرل کو توڑنا ناممکن تھا۔ پھر میں نے خود کشی کے امکانات پر غور کیا اور … تک ہٹا دئیے۔ کپڑے نکال لئے کہ کہیں وہ تولیے کو ازار بند … سے پھانسی کا پھندا نہ بنا لے۔ حالانکہ اب اس کے امکانات معدوم تھے۔

آخری کام میں نے یہ کیا کہ ہنا کے کپڑے بھی اتار لئے اور اسے باتھ روم میں بند کر کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی۔ اب وہ دروازہ توڑے بغیر باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ اگر وہ ایسی کوشش کرتا تو کنڈی ٹوٹنے سے پہلے ہم اس کا سر توڑ دیتے۔ ان انتظامات سے فارغ ہوا تو میں نے غالب کو گہری نیند میں دیکھا۔ مرغن کھانے سے مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ میں فریج سے پانی کی بوتل نکال ہی رہا تھا کہ کسی نے دروازہ بجایا۔

میں نے دروازے کے قریب جا کے کہا "کون ہے؟"

"میں ہوں ہنا جی" کسی نے باہر سے کہا "گھر سے کھانا لایا ہوں۔"

اب دروازہ کھولنا ہی پڑے گا … تھا۔ میں حیران بھی تھا کہ گھر کے کسی ذاتی ملازم نے میری آواز کو ہنا کی آواز کیوں سمجھ لیا۔

"ابھی ٹھہر جاؤ دو منٹ" میں نے کہا۔

"اچھا مالک" اس نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ نوکر ہے اور میرے اس خیال کی تصدیق بھی کر دی کہ میری آواز ہنا کی آواز سے ملتی ہے لیکن میں سامنے جاتا تو بھانڈا پھوٹ جاتا اور نوکر واپس جا کے … بیان … کر دیتا کہ پتا نہیں کون تھا جو ہنا جی کی آواز میں بول رہا تھا۔

میں نے نازو کو جگایا۔ وہ اتنی گہری نیند میں تھی کہ اسے ہوش میں لانے کے لئے مجھے اس پر پانی ڈالنا پڑا۔

"اف! کیا ہو گیا اب؟" وہ بولی۔

"کچھ نہیں ہوا۔ باہر ایک شخص کھڑا ہے"

"کھڑا رہنے دو" وہ جھنجھلاتے ہوئے بولی۔

میں نے اسے جھنجھوڑا "وہ کھانا لایا ہے گھر سے"

"کھاؤ تم۔ مجھے بھوک نہیں ہے"

"نازو!" میں نے اسے دروازے کی طرف گھسیٹا "دروازہ کھول کے کھانا لے لو۔"

اس سے پہلے کہ وہ سمجھتی میں نے کنڈی کھول کے اسے سامنے کر دیا اور خود دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔

ملازم شاید مالک کے دفتر میں خوبصورت اجنبی چہرے دیکھنے کا عادی تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں کہا اور ایک ٹفن کیریئر آگے بڑھا دیا۔ نازو نے اسے وصول کر لیا جیسے اسی نے کھانے کا آرڈر دیا تھا۔ … نے دروازہ بند کیا اور اسے پیچھے کھینچ …

"اتنا سا کام تم خود نہیں کر سکتے تھے" وہ جماہی لے کر بولی۔ "مجھے جگانا ضروری تھا۔"

میں نے کہا "سوری۔ مجھے واقعی خیال نہیں آیا کہ یہ بہت … تم پھر سو جاؤ۔"

نازو نے مجھے بے وقوفوں کی طرح دیکھا اور پھر جا کے بستر پر گر گئی۔ میرا خیال ہے کہ کھانا لیتے وقت بھی وہ پوری طرح جاگ نہیں رہی تھی۔ اس کے ذہن کا صرف ایک حصہ جاگ رہا تھا۔ نیند میں چلنے والے کی طرح اس نے کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا تھا اور میرا کہا بھی مانا تھا مگر اس کا جسم نیند میں تھا۔

میں نے کھانے کو سنبھال کے رکھ دیا اور صوفے پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ کیا میری تلاش کامیاب ہو گی؟ صبح تک کلی اور محسن کے بارے میں کوئی خبر ملے گی؟ ابھی باہری۔ جب تک ہم ہنا کے ساتھ تھے اور ہنا ہمارا غلام تھا ہم خطرات سے کسی حد تک محفوظ تھے مگر اس کے بعد؟ کل اگر کسی نے بھی ان کا پتا نہ دیا تو کیا ہو گا؟ سفر ختم ہو جائے گا۔ جدوجہد بے معنی ہو جائے گی۔ ہم ناکامی اور پشیمانی کے احساس کا زخم لے کر لوٹ جائیں گے؟

نیند نے مجھے حوصلہ شکن اور مایوس کن خیالوں سے بچا رکھا۔ میں نے کوئی خواب بھی نہیں دیکھا جس کی تعبیر کوئی امید کی کرن دیتی۔ ابھی میں سو ہی رہا تھا کہ دھماکوں سے میری آنکھ کھل گئی۔

میں ہڑبڑا کے اٹھا۔ غالب مجھ سے پہلے بیدار ہو گیا تھا اور اس شور پر سخت برہم تھا جو ہنا نے باتھ روم میں برپا کر رکھا تھا۔ وہ دروازے پر مکے مار رہا تھا اور ہمیں آوازیں دے کر قید سے رہائی مانگ رہا تھا۔

غالب نے کہا "یہ کیا ہنگامہ ہے؟"

جواب میں ہنا نے اسے ایک گالی دی "کمینا۔۔۔ مجھے اندر کیوں بند کیا ہے؟"

غالب نے کہا "اگر تم خاموش نہ ہوئے تو تمہیں نیند کی ایک اور خوراک دینی پڑے گی۔ بند کرو یہ شور۔"

"میں باہر آ کے خاموش بیٹھ جاؤں گا۔۔۔ مجھے یہاں سے نکالو" ہنا نے چلا کے کہا۔

اب مجھے اٹھ کے جانا پڑا۔ میں نے کنڈی کھولی اور اس سے پہلے کہ ہنا پنجرے میں بند ہو جانے والے چوہے کی طرح باہر نکلنے کی کوشش کرتا میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"تم ایسا سلوک کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ؟ بلا وجہ تم نے میرے سر پہ مارا۔۔۔"

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں رحم دلی کروں؟"

"نہیں" وہ چلایا "میں مر جاؤں گا۔ میرے سر میں بہت سخت درد ہے"

ریوالور نکال کے میں نے کہا "ہم سونا چاہتے ہیں خبیث! تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ آرام سے بیٹھے رہو ورنہ میں تمہیں باندھ کے ڈال دوں گا اور تمہارے منہ میں کپڑا ٹھونس دوں گا۔ پھر ایک آرڈر … کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ … ہاتھ ذرا … تھا۔ یہ نہ ہو کہ غصے میں۔۔۔"

www.paksociety.com

وہ ہاتھ جوڑنے لگا "میں بھگوان کی سوگند کھاتا ہوں۔ اب تمہیں بولوں گا۔ بس مجھے اسپرین لا دو۔ سر درد سے مری جا رہی ہے اور بیٹھنے کے لئے کرسی دے دو۔"

غالب نے اسے دونوں چیزیں فراہم کر دیں اور وہ کسی قیدی کی طرح بیٹھ کر بے صبری بل رکھ کے بیٹھ گیا جس نے سزا کو تاگزیر سمجھ کے قبول کر لیا ہو اور دیوار زنداں سے سر پھوڑنے کو بے سود سمجھ کے اپنی اسیری کے احساس سے مفاہمت کر لی ہو۔

پھر میں جاگا تو رات ہو چکی تھی۔ غالب اور نازو سر جوڑے آہستہ آہستہ باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ مہتا اب باہر کرسی والے بیٹھا تھا۔ نازو بہت تر و تازہ اور چاق و چوبند نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں منہ دھو چکے تھے اور مہتا کی آزادی کا سبب کسی ضرورت ہی تھی۔

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی تو اس میں آٹھ بج رہے تھے۔ آٹھ گھنٹے کی نیند نے میری تمام تھکن دور کر دی تھی۔

مہتا نے کہا "اگر میں نو بجے تک گھر نہ پہنچا تو میرے گھر والے آ جائیں گے یہاں۔"

میں نے انگڑائی لے کر کہا "آنے دو۔ ان سے بھی مل لیں گے۔"

غالب نے کہا "فون تمہارے گھر میں بھی ہو گا۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "فون تو کیا ہو گا انہوں نے بھی۔ اور بھی بہت سے لوگوں نے۔"

غالب ہنسا "آج فون خراب تھا تمہارا۔ لیکن اب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اپنے گھر والوں کو اطلاع کر دو کہ آج رات تم گھر نہیں آؤ گے۔ تمہیں ایک ضروری کام سے بمبئی جانا پڑ گیا تھا۔ اور یہ کال بھی تم بمبئی سے کر رہے ہو۔"

وہ غالب کو اور پھر مجھے گھورتا رہا "آخر کیا مقصد ہے تمہارا؟ کون ہو تم لوگ۔ مجھے تم پاگل بھی نہیں لگتے۔ جیل سے بھاگے ہوئے مجرم بھی نہیں ہو تم۔ پھر تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ وہ معزز عورت کون ہیں جن کی تمہیں تلاش ہے؟"

"یہ تمہیں بعد میں معلوم ہو گا" غالب نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا "میری محرم ہتی ان کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لئے باہر جانا چاہتی ہے۔ کھلی ہوا میں۔"

میں سمجھ گیا کہ غالب کا مقصد مہتا کو باہر بھیجنا ہے "جاؤ بھئی مہتا۔ انہیں بھی جھٹکا دکھاؤ۔ یہ بتاؤ کہ انہیں کیسے جتی ہیں۔ لیکن خبردار! کوئی شرارت مت کرنا۔ غلط خیال بھی مت لانا دل میں ورنہ یہ تمہارا بھیجا بٹھا دیں گی اور بچے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گی۔"

نازو مسکرا کے کھڑی ہو گئی "آؤ۔ تم بھی بہت دیر بند رہے ہو۔ تازہ ہوا کھا لو۔"

مہتا وہیں بیٹھا خون کے گھونٹ پیتا رہا "مجھے معاف کرو۔"

نازو نے لات مار کے اس کی کرسی الٹ دی۔ پھر مہتا کو بال پکڑ کے اٹھایا اور اس کے چیخنے چلانے کی پروا کئے بغیر دوسرے کمرے میں دھکیل دیا۔ وہ دہلیز سے ٹھوکر کھا کے گر پڑا۔

"جلدی سے فون کرو" نازو نے کہا "نمبر غلط نہ ہو۔"

مہتا بڑی مشکل سے اٹھا اور ریسیور اٹھا کے اپنے گھر کا نمبر ملانے لگا۔ نازو موت بن کے اس کے سر پر سوار رہی۔

"بالکل ایسے بات کرنا جیسے روزانہ کرتے ہو" نازو نے [illegible]

مہتا نے ہیلو کہا تو نازو نے ریوالور بھی نکال لیا۔ ظاہر ہے کہ بعد مہتا نے لفظ بہ لفظ اس کے حکم کی تعمیل کی اور اپنے گھر والوں کو مطمئن کر کے ریسیور رکھ دیا۔ نازو نے ریوالور جیب میں رکھا اور اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

"معلوم نہیں یہ کس قسم کا کھیل ہے۔ مگر مجھے ایسا لگتا ہے میں کسی شیطانی چکر میں پھنس گیا ہوں" مہتا نے کہا۔

"یہ انکشاف بہت دیر سے ہوا تم پر۔ اس چکر میں تو جواز اور دولت ہاتھ میں آتے ہی پڑ چکے تھے" غالب نے کہا۔

"خود کو قانون کے حوالے نہ کر کے میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ پھانسی چڑھ جانا بہتر ہوتا شاید۔"

نازو نے اسے باہر کی طرف دھکیلا "تمہاری یہ خواہش بھی پوری کی جا سکتی ہے۔ بس تم ایک رسی فراہم کر دو گے۔ باقی کام ہمارا۔"

"اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے" غالب نے کہا "ورنہ خود چلنے تک جیل میں سڑو گے۔ ایک عدالت سے سزا، دوسری میں اپیل۔ پھر تیسری میں اپیل۔ رحم کی درخواست اور سزائے موت پانے والوں کے ساتھ کال کوٹھری میں دن رات موت سے پہلے ہزار بار مرنا۔ اس سب سے بچ جاؤ گے۔"

مہتا نے چیخ کر اسے گالی دی "تم دھوکے باز اور جعلساز، کوئی دہشت گرد ہو۔ خطرناک قسم کے۔"

"تم ہوا کھا کے آؤ۔ اس کے بعد پھانسی کی ترکیب بتائیں گے تمہاری" غالب نے کہا اور نازو نے اسے باہر دھکیل دیا۔

میں نے کہا "کیا منصوبہ بندی کی ہے کچھ تم نے؟"

"خاندانی منصوبہ بندی" غالب بولا۔

"وہ کھیل از وقت ہے" میں نے کہا "مہتا کو ہوا خوری کے لئے کیوں ایکسپورٹ کیا ہے؟"

"یہ اللہ میاں کی تار برقی برائے پیغام رسانی وصولی" غالب نے فون کی طرف اشارہ کیا "اس کے سامنے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔"

"واقعی۔ یہ خیال تو مجھے بہت پہلے آنا چاہئے تھا۔ شاید آیا تھا لیکن میں اس وقت سو رہا تھا" میں نے کہا۔

"چنانچہ یہ خیال نے میرے دماغ سے رجوع کیا۔ خواب مت کرو۔ نمبر ملاؤ۔ ہم یہاں پوری رات رہنے کا خطرہ نہیں لے سکتے" غالب نے کہا۔

"رات کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟"

"کیا پتا وہ بدمعاش منیجر آ جائے [illegible]"

غالب نے کہا "آنے کو کوئی میڈم بھی آ سکتی ہے اور خود ہاتھ کی گھروالی آ سکتی ہے۔ سن گن لینے۔ اسے تو سارا دن کے پھیلن معلوم ہوں گے۔"

"بے یار یہ بیویاں۔ اللہ میاں کی گائے سے زیادہ معصوم لگتی ہیں۔ انہیں کہاں پتا چلتا ہے مردوں کے چکر کا۔"

"چپل وہنے دے بھائی۔ تریا چلتر ایسے ہی مشہور نہیں ہوا۔ یہ جتنی بھولی بنتی ہیں اتنی ہی مکار ہوتی ہیں۔ وہ بیوی ہی کیا جسے شوہر کی رگ رگ کا پتا نہ ہو" غالب نے کہا۔

"پہلے تریویدی سے بات کی جائے۔"

"پتا ہے۔ مگر اس کا نمبر آبزرویشن پر ہو گا۔ فوراً معلوم کر لے گا کہ فون کہاں سے کیا گیا تھا اور صبح ہونے سے پہلے اس پورے علاقے کا محاصرہ کر لیا جائے گا۔"

"پتا ہے" میں نے کہا۔

"تم لاہور فون کرو" غالب نے کہا "یہ لو ڈائریکٹری۔ آپریٹر کو اپنے یار منظر کا نمبر دو۔"

میرا دل لاہور کے نام پر دھڑکا "رابعہ سے بات کرنے میں کیا حرج ہے؟"

"حرج ہے۔ انڈیا، پاکستان کے درمیان بات چیت ٹیپ کی جاتی ہو گی۔ خصوصاً آج کل کے حالات میں۔ منظر کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ رابعہ کسی مشکل میں نہ پڑ جائے۔"

"منظر مشکل میں نہیں پڑ سکتا تو رابعہ کیوں پڑے گی؟" میں نے کہا "دونوں دو الگ ہیں آخر۔"

"مگر رابعہ اتنا عرصہ روپوش رہی ہے۔ اس کا نام تمہارے نام کے ساتھ منسوب تھا۔ ہر معاملے میں۔ ممکن ہے وہ ابھی گمنامی کی زندگی گزار رہی ہو۔ کسی کو پتا ہی نہ ہو کہ وہ واپس لاہور آ گئی ہے۔ اس کے خلاف پرانے دفتر نہ کھل جائیں۔ اگر بے قراری بے اختیار نہیں تو پہلے منظر سے بات کرو۔ اس کا مشورہ ہو تو رابعہ سے بھی تھوڑا سا نال تھوڑا ہی کر لینا" غالب نے کہا۔

اس کی بات معقول تھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کے انٹرنیشنل ٹرنک ڈائلنگ کا نمبر ملایا اور اسے عبدالودود منظر، بار ایٹ لاء کے گھر کا نمبر دیا۔ پھر ہم انتظار کرنے لگے۔

"اس کال کا بھی پتا چل جائے گا" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مگر کارروائی فوراً نہیں ہو گی۔ ممکن ہے بعد میں مہتا سے پوچھا جائے۔ اس کا جواب ہم دے دیں گے۔ تم منظر سے گپ شپ مت کرنا زیادہ۔ مختصر بات کرنا۔"

"اب آپ مجھے ٹیلی فون پر گفتگو کے آداب مت سکھایئے" میں نے کہا۔

"میں تو اس سے کہتا ہوں کہ تریویدی کو فون کرے" غالب نے اپنی بات جاری رکھی "تریویدی سے پوچھے کیا حال ہے۔"

"حال تو ہمیں معلوم ہے پتلا ہو گا۔"

"پھر وہ پوچھے کہ اب وہ شملہ کو اور اس کے بیٹے کو کہاں حفاظت رکھے گا۔ یہاں تو اسے ہمت نہیں پڑی۔"

"ہمت نہیں پڑی؟"

"ہاں۔ ایسے ہی کہنا پڑے گا۔ براہِ راست اس سے [illegible] کہنا تو حماقت ہو گا کہ اس زمین پر وہ تھے ہی نہیں۔ اس [illegible] بے خبری اور بے عملی ظاہر ہو جائے گی۔ ہم تو دعویٰ کریں گے کہ وہ زمین پر ہوتے تو ہم انہیں ایسے نکال لے جاتے جیسے مجوب کی ایک ادا نے نازوں لے جاتی ہے۔ یا پولیس سو مجرموں کے درمیان سے ایک بے گناہ کو لے جاتی ہے۔"

گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اٹھایا "آپ کی کال ہے لاہور کے لئے۔ پی پی کال فار مسٹر منظر ایڈووکیٹ۔"

"بار ایٹ لاء" میں نے تصحیح کی۔

"کون بات کرے گا؟" آپریٹر بولی۔

"مسٹر مہتا آف مہتا سنز" میں نے کہا۔

"ریسیور رکھ دیں" آپریٹر نے کہا "کال آ رہی ہے۔"

"میں سخت جذباتی ہو رہا ہوں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "میں بھی نروس ہوں۔ یار سب پوچھ لینا اس سے کہ کس حال میں ہیں یاران وطن۔ اپنا نازک ایس [illegible]"

گھنٹی پھر بجی اور میں نے غالباً پاکستان کے آپریٹر کی آواز سنی۔

"لاہور بات کریں۔"

پھر منظر نے کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "میں مہتا بول رہا ہوں۔"

"بھائی کون مہتا؟" وہ حیران اور پریشان تھا۔

"ابے تیرا باپ۔ الو کے پٹھے" میں نے چلا کے کہا۔

"ابے تو ہے۔" وہ چلایا اور فرطِ جذبات میں اس نے جواب میں مجھے نصف درجن گالیاں دیں مگر میرا نام نہیں لیا۔

غالب نے ریسیور مجھ سے چھین لیا "اور میں تیرا دوسرا باپ ہوں" غالب چیخ کر بولا اور پھر قہقہہ مار کے ہنسا۔ شاید اسے بھی منظر نے اتنی ہی گالیاں دی ہوں گی۔

ریسیور پھر میں نے چھین لیا۔ "یار پہلے مجھے تو بات ختم کرنے دے" منظر کی آواز نے جلاوطنی کے احساس کو یکلخت عذاب ناک بنا دیا تھا اور وطن کی یاد نے دل میں آگ لگا دی تھی۔ مجھے صرف غالب کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو نظر آ رہے تھے۔ خود اپنے آنسوؤں سے میں بے خبر تھا جو شدتِ جذبات میں بہہ نکلے تھے۔

"ابے تو رو رہا ہے بھوتنی کے" میں نے منظر کی آواز سنی۔ وہ خود بھی گلوگیر لہجے میں بات کر رہا تھا "تیرا کہاں ہے؟ میرا تیسرا باپ محسن۔"

میں نے خود پر قابو پا کر کہا "وہ اس وقت ہمارے ساتھ نہیں ہے۔"

"اور کون ہے؟"

"نازو ہے" میں نے کہا "باہر ہے ابھی۔"

"اور شملہ۔ اس کا بیٹا؟"

www.paksociety.com

"وہ بھی ہمارے ساتھ نہیں ہے۔"

"ہم سمجھا وہ محسن کے ساتھ ہوں گے۔ اے یار! کتنا عجب لگ رہا ہے آج تمہاری آواز سن کے۔ میں تو بھول چکا تھا تمہیں کہ مر گئے یا زندہ ہو۔ بڑے زلیل کمینے لوگ ہو تم سب..." اس نے کچھ اور نفیس گالیاں دیں۔

میں نے کہا "منظر یار! ہم واپس آئیں گے، بہت جلد۔"

"میں تو اب سے مت آنا۔ گھر اب خیر سے ویران ہو رہا ہے۔ کچھ پتا تو چلے کہاں ہو۔ زندہ ہو کہ نہیں۔ عدم آباد سے بھی کبھی آجاتی ہے روح ان کے آسکتے ہو تم۔ تم نے تو حد کر دی۔ میرے خواب میں بھی نہیں آئے۔"

"اب بند کر اپنی بکواس۔ لائن نہ کٹ جائے کہیں۔ یہ بتا رابعہ کا کیا حال ہے؟"

"اس کے حال مستقبل کو گولی مار۔ میرا تو خیال ہے کہ میں اسے سمجھا کر مجھ سے شادی کر لے۔ چھوڑے تمہاری واپسی کا انتظار۔"

"تمہیں ابھی قتل کر دوں گا فون پر۔"

"یار تو جلد کر۔ تیرا کام ہم کرتے ہیں۔ آخر دوست کس کام آتے ہیں۔ سب بچوں کے نام تیرے نام پر رکھوں گا۔ وعدہ۔ ورنہ یاد رکھ تیرے ویران گھر میں بھٹکتی ہوئی روح ہے۔ تیری یاد میں دیواروں سے سر ٹکرا کے مر جانے کی کسی روح۔"

"وہ اکیلی رہ رہی ہے وہاں؟" میرا دل کٹ گیا۔

"سالی پاگل ہو گئی ہے۔ میں نے کتنا سمجھایا کہ میرے گھر آجائے مگر اس کی رہی ایک بات۔ میں اس گھر میں ان کی واپسی کا انتظار کرتی رہوں گی۔ ایسی کی تیسی ان کی۔ انہیں کہاں فرصت۔"

"تم ابھی بات کرا دو اس سے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ زخم سی رہی ہے۔ تو ادھیڑنا چاہتا ہے" منظر نے برہمی سے کہا "ایک بار بات کر کے تجھے کیا ملے گا؟ وہ سوراخوں زندگی رہے گی۔ اب مہربانی کریں اس کے حال پر۔ آتش فشاں کو مت چھیڑیں ورنہ لاوا ابلنے لگا تو جل کے مر جائے گی وہ۔ میں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ وزیر خان ٹرسٹ کو سنبھال لو۔ اپنی پریکٹس میں دل لگاؤ۔ مگر وہ تارک الدنیا ہو گئی ہے۔" منظر نے کہا۔

"کیا کرتی رہتی ہے اکیلے میں؟"

"مشہور فلمی گانے گاتی ہے۔ مثلاً۔ تو کون سی بدلی میں مرے چاند ہے آجا۔ جو تنی کے۔ تیری تصویر سامنے رکھ کے تیرے نام کی مالا جپتی رہتی ہے۔"

غالب نے پھر ریسیور مجھ سے چھین لیا "یار تم فضول باتوں میں لگ گئے۔ مجھے یہی ڈر تھا۔ اسے سمجھایا بھی تھا کہ پہلے کام کی بات کرنا۔ پھر کوئی اور بات۔ تجھے کچھ معلوم ہے ماذو کے بھائی کے بارے میں۔ سید اکرام شیخ۔ سابق سب انسپکٹر۔ ہاں وہ کراچی میں ٹیکسی چلا رہا تھا۔ وہیں چھوڑ آئے تھے ہم اسے۔ نہیں۔ پھر اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ محسن۔ ہاں۔ ان کا پتا چلا ہے اور یہ کام تجھے کرنا ہے۔ پہلے بات سن۔ ایک نمبر لکھ۔ بمبئی کے ایک بجرا نمبر ہے۔ رزویئر۔ ولادر اسی کے ساتھ ہے۔"

غالب نے اسے کیا کہا اور کیا نہیں کہا۔ میں نے کچھ نہیں سنا کیونکہ میں رابعہ کے خیال میں گم تھا۔ میری آنکھیں اسے اپنے آبائی گھر میں دیکھ رہی تھیں۔ اداس اور تنہا مگر پر عزم اور پر امید۔ منظر کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ تیرے ویران گھر میں بھٹکتی روح ہے۔ تیری یاد میں دیواروں سے سر ٹکرا کے مر جانے کی کسی دن۔ میں اسی گھر میں ان کی واپسی کا انتظار کرتی رہوں گی۔

غالب نے ریسیور رکھ کے ایک لمبی گہری سانس لی "تم سا منظر سے کہا ہے کہ ایک گھنٹے بعد ہم پھر کال کریں گے۔"

میں نے ریسیور اٹھا لیا "اس وقت تک میں رابعہ سے بات کر لوں۔"

غالب نے فون اٹھا کے پیچھے کر لیا "ہرگز نہیں۔ مجھے منظر نے کہا ہے کہ تجھے رابعہ سے بات نہ کرنے دوں۔"

"وہ کون ہوتا ہے..." میں نے مشتعل ہو کے کہا۔

"وہ ٹھیک کہتا ہے۔ رابعہ تنہا ہے مگر پرسکون ہے۔ اس نے جدائی کے احساس سے مفاہمت کر لی ہے۔ صبر کرنا اور امید رکھنا سیکھ لیا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں اس کے جذبات میں آگ لگانے کی۔ ظلم کرنے کے بجائے ظلم سہنا سیکھو۔ ورنہ یہ محبت نہیں خود غرضی ہو گی۔ ابھی تک تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ رابعہ ہے کہاں۔ کیا یہ کم اطمینان کی بات ہے کہ وہ اپنے گھر میں ہے۔ تمہارے گھر میں ہے۔ اور انتظار کر رہی ہے۔ تم بھی انتظار کرو دوست، اچھے وقت کا۔"

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "میں اس خود فریبی کے احساس سے دل کو نہیں بہلا سکتا۔"

"یہ خود فریبی ہے؟ رابعہ کی محبت کو رسوا مت کرو۔ وہ بھی امید اور یقین کے سہارے پر زندہ ہے۔ اسے تم خود فریبی کہتے ہو؟"

مجھے غالب کی بات نے شرمندہ کر دیا تھا۔ کچھ دیر ہم خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وہ اٹھا اور باہر چلا گیا۔ اب ٹیلی فون میرے سامنے اور میری دسترس میں تھا۔ ڈائل کے اعداد کو چھونے کی خواہش میری انگلیوں میں سنسنی پیدا کر رہی تھی۔ وہ رابعہ کا نہیں میرا اپنا نمبر تھا۔ یہ پہلے وزیر خان مرحوم کا فون نمبر تھا۔ ایک بار وہ گھر میرے بچپن سے جوانی تک کی یادوں کا امین تھا فروخت ہو گیا تھا۔ کئی سال اس کے در و دیوار میری واپسی کے انتظار میں رہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج رابعہ میری منتظر ہے۔ پھر رابعہ نے وہ گھر میرے لئے خرید لیا۔ میرا ماضی پھر میرے مستقبل سے مل گیا۔ میری زندگی اس کے بغیر نامکمل رہتی...

باذر کی آواز پر میں چونکا "مہتاجی کو آرام سے بٹھا دیا۔ وہ تھک گئے ہیں۔"

میں نے مہتاجی کو سخت اشتعال کے عالم میں اور... دیکھا۔

"بڑا مہاراج۔ بھوک لگی ہو تو بھوجن بنواؤں؟ آپ کے گھر سے آیا رکھا ہے۔"

وہ میرے سامنے بیٹھ گیا "وہ کیسٹ اور فلم کا رول مجھے دے دو۔ تم لوگ زبردستی سب کچھ کروا سکتے ہو۔ سارے کام۔ مار پیٹ کر کے اور گولی مارنے کی دھمکی دے کے۔ تو اس کیسٹ اور فلم کو رکھ کے کیا کرو گے؟"

میں نے کہا "مہتاجی! آج تو خیر ہم زبردستی کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ کل جب ہم چلے جائیں گے تو تم زبردست ہو جاؤ گے۔ اپنی دولت، طاقت اور اثر و رسوخ کو استعمال کر کے تم ہمیں پھنسانے کی کوشش کرو گے۔ اس وقت یہی دو چیزیں تو بچائیں گی ہمیں۔ اور ہمارے درمیان پیار و محبت کا رشتہ بھی انہی کے دم سے برقرار رہے گا۔"

"تم یہ کم از کم اتنا تو بتا دو کہ میری جان کب چھوڑو گے اس عذاب سے۔ ہوا کیا ہے؟ بدلہ بھی ہے اس کی۔ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ تم نے مجھے قربانی کا بکرا بنا لیا۔"

"بگاڑا کسی کو ہمارے کام آنا تھا۔ بدبختی نے تمہارے پاس بھیج دیا۔ تمہاری بدبختی۔ ورنہ ہم تو کبھی اس راستے سے نہ پہلے گزرے نہ آئندہ گزریں گے۔ ہم تمہارا نام تک نہیں جانتے تھے جیسے تم ہمارا نام نہیں جانتے۔"

"پھر یہ کس قصور کی سزا ہے؟"

"کیسی سزا؟ ہم نے تو تمہیں سزا سے بچا لیا۔ تمہارے ہر جرم کی پردہ پوشی میں تمہاری مدد کی۔ رسوتی کا معاملہ تو پہلے کا تھا لیکن تم نے میڈم کو ہمارے سامنے قتل کیا اور ہم نے اس جرم کا سراغ مٹانے میں تمہاری مدد کی۔ تمہارے دوست بھی اعانت کرتے۔ اس طرح ہم تو خود شریک جرم ہو گئے۔ دراصل میڈم سے ہمیں کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ کوئی شریف اور بے گناہ عورت نہیں تھی۔ ایسی عورتوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے اس لئے ہم نے قانون کی شکنی تمہاری مدد کی۔ تمہارا گلہ ناجائز ہے مسٹر مہتا۔"

وہ کاجواب نظر آنے لگا "پھر بھی میں مصیبت میں پڑ گیا ہوں جس سے نجات کی صورت نظر نہیں آتی۔ اب تو مجھے یقین آنے لگا ہے کہ تم جانے وقت مجھے قتل کر جاؤ گے۔"

"تمہیں قتل ہی کرنا ہوتا تو آج کا دن بھی تمہاری زندگی میں شامل نہ ہوتا" میں نے کہا "اس وقت تمہیں پرلوک سدھارے اس اولے گئے ہو جاتے مگر ایک تو ہم بے مقصد کوئی کام نہیں کرتے۔ دوسرے ہمیں تمہاری مدد کی آئندہ بھی ضرورت پڑ سکتی ہے اس لئے تمہیں موت کے خوف کو دل سے نکال دینا چاہئے۔ گناہ بے لذت کرنے والے احمق ہوتے ہیں یا نفسیاتی مریض۔ اگر تم سے ذرا بھی خطرہ محسوس کرتے ہم تو پہلی فرصت میں تمہارا کام تمام کر جاتے لیکن ایسی کوئی بات نہیں۔ جب تک میڈم کا ٹیپ اور چند تصویریں ہمارے پاس ہیں تم دوستی کرو گے جو ہم کہیں گے۔"

"ورنہ کیا تم یہ ثبوت لے کر عدالت میں حاضر ہو جاؤ گے؟" وہ

جاسوسی ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ

انسان کی ترقی و
تہذیب کے حیات افروز واقعات
صدیوں سے زندہ ایک پراسرار شخص
کی آپ بیتی، ہنوا جس کی دوست
تھی، معتمد رجس کے بچے آغوش تھا اور
تھا آگ اس کے بدن کو چھو بھی نہ سکتی تھی۔

وہ کہانی جس نے اپنے وقت میں مقبولیت کے
کے ریکارڈ توڑ دیے

صدیوں کا بیٹا

پانچ حصوں میں مکمل

قیمت فی حصہ ۵ روپے * ڈاک خرچ فی حصہ ۱۴ روپے

مکمل سیٹ منگانے پر قیمت صرف ۲۰۰ روپے، ڈاک خرچ معاف۔ صرف ۲۰۰ روپے کا منی آرڈر روانہ فرمائیں۔ یہ رعایت صرف منی آرڈر ارسال کرنے پر ہی مل سکے گی

www.paksociety.com

مظفر سے بولا۔

"تمہارے دشمن بھی تو ہوں گے ممتا" میں نے کہا "اسی طرح میڈیم کے چاہنے والے ہوں گے۔ وکیل اور منتری بھی ایسے کیس تلاش کرتے پھرتے ہیں جن سے ان کی شہرت سارے ہندوستان میں ہو جائے اور یہ ایسا ہی کیس ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم فضول باتوں کو دماغ سے نکال دو۔ اور تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم بعد کے واقعات کو بھول جاؤ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ چند دن بعد ڈی کل ہی پولیس، ملٹری انٹیلی جنس یا سی بی آئی والے پوچھ گچھ کے لئے آئیں۔ ظاہر ہے تم ان سے سفید جھوٹ نہیں بول سکتے۔ تم ان کو وہ سب بتا دو جو ہم نے کہا تھا۔ ہمارے نام بتا دو جو کچھ ہم نے کیا۔ مزدوروں سے کیا کہا اور کس طرح انہیں چھٹی دی۔ بس" اس کے بعد ہم کمائی کے رخصت ہو گئے تھے اور تم اپنے کام سے دہلی یا بمبئی چلے گئے تھے۔"

"دہلی جانے میں وقت لگتا ہے۔"

"تو ناگپور چلے جاؤ۔ بمبئی چلے جاؤ" میں نے کہا "کل صبح تمہارا منیجر رپورٹ لکھوا دے یا تم خود یہ کام کرو مگر تمہاری بہتری اسی میں ہے۔ پولیس کو سوچا اس کے بھی رپورٹ ضرور لکھوا دو کہ رات کو تمہارے دفتر میں کوئی آیا تھا۔ چیزیں الٹ پلٹ دیکھنے سے تم نے اندازہ لگایا انہوں نے تمہارے گھر سے آنے والا کھانا بھی کھایا تھا مگر اور کچھ لے کر نہیں گئے۔ روپیہ پیسہ آفس میں ہوتا ہی نہیں۔ ظاہر ہے نقصان کوئی نہ ہو تو پولیس رپورٹ نہیں لکھتی مگر رپورٹ ہی تمہیں پریشانی سے بچائے گی۔"

وہ حیرانی سے مجھے دیکھتا رہا "آخر تم ہو کیا چیز؟"

"پولیس بہت تفصیل سے بتائے گی تمہیں" میں نے کہا۔

"مگر پولیس مجھے کیوں پریشان کرے گی؟"

"وہ پوچھیں گے کہ انہوں نے فون پر کیا باتیں کی تھیں اور کس سے۔ تم لاکھ انکار کرو وہ مانیں گے نہیں۔"

"آخر کیوں...؟"

"وہ سمجھیں گے کہ تم ہمارے خوف سے کچھ نہیں بتا رہے ہو" میں نے کہا "لیکن تمہاری رپورٹ ثبوت ہوگی کہ تمہیں واقعی کچھ معلوم نہیں۔ تم بمبئی میں تھے اور ہم رات کو چوروں کی طرح یہاں صرف اس لئے آئے تھے کہ فون استعمال کریں۔ ہم چور نہیں تھے اس لئے لے کر کچھ بھی نہیں گئے۔"

غالب اور نازو لڑتے ہوئے اندر آ گئے۔

"ہر بات میں عورت کو ناقص العقل کہنے سے کیا ملتا ہے تمہیں؟ مردوں کے احساس کمتری کو تسکین ملتی ہے شاید۔"

"سچ ہمیشہ کڑوا لگتا ہے" غالب نے کہا "ورنہ تم کیوں چراغ پا ہوتی ہو۔ تم سے کچھ کہا تھا میں نے؟"

"اور کون تھا وہاں...؟"

"ایک بھوت تھا۔ تمہیں نظر نہیں آیا۔ مگر وہ شریر میرے" غالب نے کہا۔

"اگر مجھ سے بات نہیں کر رہے تھے تو میری طرف کیوں دیکھ رہے تھے؟" نازو نے کہا۔

"تم بھی کمال کر رہی ہو مجھے۔ اور دیکھنے سے کیا نظر لگ جاتی ہے تمہیں ایسی کون سی حور پری ہو تم۔"

نازو نے جل کے کہا "پھر کیوں دیکھتے ہو میری صورت؟"

"نہیں دیکھوں گا۔ پھر یہ مت کہنا پرائی عورتوں کو تکتے پھرتے ہو" غالب نے کہا "بابا مرا ہوگا تو وحید رحمان پر مرتے ہوں گے۔"

"جاؤ مرو" نازو نے جھنجھلا کے کہا "میں بھی جا رہی ہوں ممتا کے ساتھ۔"

میں تو خیر عادی تھا ان کی نوک جھونک کا جو محبت کے چونچلوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھی مگر ان کی باتوں نے ممتا کو بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔ نازو کی زبان پر اس کا نام آیا تو وہ چونکا۔

"سنا نہیں تم نے... چلو میرے ساتھ" نازو چلا کے بولی۔

ممتا فوراً کھڑا ہو گیا "میں کب انکار کر رہا ہوں... جی۔"

"اتنا ہی برا ہوں میں تو واپس مت آنا" غالب نے کہا۔

"نہیں آؤں گی" نازو نے چلا کے کہا۔

"اچھا یہ تو بتاتی جاؤ" غالب نے روتی آواز میں کہا "شرادھ مسلمان کروگی شادی کے لئے یا خود ہندو ہو جاؤ گی؟"

نازو کے لئے مسکراہٹ کو روکنا مشکل ہو گیا "بڑے ڈھیٹ ہو تم بھی۔ شرم نہیں آتی۔"

"پہلے آتی تھی اب نہیں آتی" غالب نے ہنس کے کہا۔

میں نے کہا "جیسے کتا بلی گھاس کھاتے ہیں ہاضمہ درست رکھنے کے لئے ایسے ہی تم دونوں کی لڑائی ہے۔"

"آخر تم کتا کسے کہہ رہے ہو اور بلی کسے؟ ان کا تو یہ مشغلہ ہے" غالب نے میز پر مکا مار کے کہا "جب کہ ہماری سچی محبت ہے۔ اور نہیں ہے تو ہو گی۔"

"اب کیا خیال ہے لاہور چلیں؟"

غالب نے ریسیور اٹھا کے نمبر ملایا اور آپریٹر کو پھر منظر کا نمبر دیا "ارجنٹ کال پلیز" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"اگر محسن پاگل کا پتا چل گیا تو ہمارا پروگرام کیا ہوگا؟ اور ... مل تو کیا ہوگا؟" غالب بولا۔

میں نے کہا "ہر صورت میں ہم ممتا جی کے ساتھ جائیں گے ان کی گاڑی میں۔"

"کہاں جائیں گے؟ یہ بھی ارشاد ہو۔"

"پہلی صورت میں پاگل یا محسن کا پتا چلانے اور ان سے رابطہ قائم کرنے کے لئے" میں نے کہا "وہ پولیس کی تحویل میں ہوئے یا ہسپتال میں ہے۔ دونوں جگہ ممتا جی کا اثر و رسوخ ہمارے کام آئے گا۔ وہ اس علاقے کے معززین میں شامل ہیں۔ پولیس کو قائل کر سکتے ہیں کہ جن کو غلط فہمی کی بنا پر پکڑ لیا گیا ہے وہ ان کے پرانے دوست ہیں۔ قائل کرنے کے لئے پیسہ خرچ کرنا پڑے یا کسی اوپر والے سے کہلوانا پڑے۔ ممتا کے لئے کچھ مشکل نہیں ہوتا ہے۔ خدانخواستہ وہ ہسپتال میں ہوئے تو دیا... بھی ممتا ہی مدد کرے گا۔"

"اور اگر کچھ پتہ نہ چلا...؟"

"پھر ہم ممتا کی گاڑی میں ناگپور چلے جائیں گے۔"

"ناگپور ہی جانا تھا تو رحمت علی کے ساتھ جاتے۔ اس کو خواہ مخواہ ناراض کر کے بھگا دیا۔"

"خواہ مخواہ نہیں یار۔ وہ گھٹیا انسان تھا۔ پاگل نظر نہیں آتا تھا مگر ذہنی مریض" میں نے کہا "بے ضمیر اور..."

"لاحول ولا قوۃ!" غالب نے کہا "بھائی! آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔ وہ برا تھا تو اپنے لئے۔ ہمارے ساتھ تو کوئی برائی نہیں کی تھی اس نے۔"

"برے آدمی کی مدد بھی بری۔"

"یہ عجیب منطق ہے۔ اگر کوئی آدمی مدد کی پیشکش کرے تو کیا اس سے پہلے کریکٹر سرٹیفکیٹ طلب کریں؟ یہ پوچھیں کہ تم بدضمیر یا آوارہ ہو اور نفسیاتی مریض تو نہیں ہو۔ وہ ایسا آدمی تھا جو اپنی جان پر بھی کھیل جاتا ہمارے لئے" غالب نے کہا۔

"بس یار مجھے اچھا نہیں لگا۔ قومی غدار اور وطن دشمن نہیں ہونا چاہئے۔ ویسے تو چوہدری نثار اور حاجی عبداللہ جیسے لوگ بظاہر پاکستانی ہیں۔ عزت دار بھی سمجھے جاتے ہیں مگر ان کو ہم کیا سمجھتے ہیں؟"

"ان کا رحمت علی سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔"

"کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ وہ ایک ہی کام کر رہے ہیں سب۔ جس ملک کے شہری ہیں اسی کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ رحمت علی جیسے غداروں کی وجہ سے سب مسلمانوں کی وفاداری پر حرف آتا ہے سب بدنام ہوتے ہیں۔"

غالب نے کچھ نہیں کہا۔ پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی اور میں نے ... منظر کی آواز سنی۔

"سالے رونمبر کیا تھا۔ معاف کرنا یار۔ غلطی سے سالا کہہ دیا تجھے اس طرح تو رابطہ بحال ہو گئی میری... خیر۔"

"جنوری صاحب نمبر ٹھیک تھا۔ کیا ہوا؟"

"غالب ہوا۔ ایک شخص نے خواہ مخواہ گالیاں دیں۔ وہ تو کسی تھانے کا نمبر تھا۔ یار تم تو خیر دنیا میں آتے ہی ذلیل و خوار ہونے کے لئے تھے۔ پہلے عشق میں خوار ہوئے۔ اب کافروں کے ملک میں ذلیل ہو رہے ہو۔ مجھے یہاں کا کوئی تھانے دار گٹے کا نچ کہتا تو میں صبح اسے کاٹ لیتا پاگل ہو کے..."

میں نے ہنس کے کہا "تم نے غلط ملا دیا ہوگا آپریٹر نے۔"

"نہیں۔ وہ کیا نام ہے اس بھوتنی والے کا۔ ترویدی۔ ہاں اس کا نمبر دل گیا ہے۔ وہ کوئی بڑی توپ چیز ہے کیا؟" منظر بولا۔

"ہاں۔ اپنے چوہدری للا در کا بھارتی ایڈیشن ہے۔"

"اسی لئے آپریٹر نے بیچ میں کہا کہ آپ کو سیٹھ ترویدی سے بات کرنی ہے۔ میں ملا دیتا ہوں دوسرا نمبر۔"

"آپریٹر یہ سن رہا تھا ساری گفتگو؟"

"ہاں یار۔ یہ کچھ ہوتے ہیں نسلی حرامزادے..."

"تم خود حرامزادے" بیچ میں آواز آئی۔

مجھے بے اختیار ہنسی بھی آئی اور یہ احساس بھی ہوا کہ ٹیلی فون پر ... گفتگو کرنا کس حد تک غلط اور خطرناک کام تھا۔ اب آپریٹر اور منظر کے درمیان ناقابل اشاعت مکالمے شروع ہو گئے تھے اور بات انڈیا پاکستان کی جنگ بن گئی تھی۔

جب آپریٹر نے کہا "میں لائن کاٹ دوں گا۔"

اور منظر نے کہا "بھوتنی کے ... تمہاری پردھان منتری کی ناک کاٹ دوں گا دہلی جا کے۔ بڑی خوفناک ہے۔"

تو میں نے کہا "خدا کے واسطے بھائی آپریٹر صاحب! جتنی گالیاں دینی ہوں مجھے دے لو۔ یار منظر، کام کی بات کر۔ تیری بات ہوئی ترویدی سے؟"

"میں بتاتا ہوں جی ترویدی صاحب سو رہے تھے" آپریٹر نے کہا۔
"کسی نے کہا کہ صبح بات کرنا۔"

میں نے کہا "منظر... ہیلو منظر..."

"جی! اس کی تو نانی کاٹ دی میں نے۔ آپ کو بات کرنی ہے ترویدی صاحب سے تو بتاؤ۔ میں صبح آٹھ بجے تک ڈیوٹی پر ہوں" آپریٹر بولا۔

میں نے اسے پنجابی میں ایک درجن مرصع اور ناقابل فہم گالیاں دے کر کہا کہ جو کام منظر کو کرنا تھا اب وہ میں کروں گا اور دھڑ سے ریسیور رکھ دیا۔ پھر مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔

"یہ کیا بات ہوئی" غالب حیران ہو کے بولا۔

میں نے اسے ساری بات بتائی تو پہلے وہ بھی ہنسا اور پھر فکرمند ہو گیا "اس کا مطلب ہے سانپ تو مرا نہیں۔ لاٹھی ٹوٹ گئی یار جی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ معلوم کچھ نہیں ہوا۔ بات مشہور ہو گئی۔"

"یہ آپریٹر تو اب بھی بات نہیں کرائے گا منظر سے۔ بلکہ مجھے امید ہے کہ آئندہ رات کے وقت فارغ ہوگا تو جنگ چھیڑ دے گا۔"

www.paksociety.com

کسی دن کوئی پاکستان کا ٹور بنا تو ہم بھی اس میں شریک ہو جائے گا۔"

"صبح ڈھائی بجے کے بعد پھر کوشش کی جا سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ گیارہ بجے سے پہلے کہاں اٹھتا ہوگا" میں نے کہا "اور ہم اتنی دیر یہاں انتظار نہیں کر سکتے۔"

"کیا ہم نارمنڈ نکل جائیں گے۔ ابھی کیا وقت ہوا ہے؟"

میں نے کہا "دس بجے ہیں۔ صبح تک آرام کرتے ہیں۔ ڈیڑھ بجے تک جھنجھورے پہنچ جائیں گے اور کوئی کام کی بات ہوئی تو معلوم ہو جائے گی۔ ورنہ یہاں ٹھہرنے کا فائدہ؟"

"ناگپور جا کے کیا کریں گے ہم؟"

"کچھ نہیں۔ وہاں سے آگے جائیں گے۔ مشرقی پاکستان کی طرف" میں نے کہا "ہمیں اس خطرے والے علاقے سے نکلنا ہے۔ ناگپور سے ہم ٹرین پکڑیں گے کلکتہ کے لئے اور کلکتہ سے ڈھاکا۔"

"لیکن ہم تین...؟" غالب نے مایوسی سے کہا۔

"مجھے امید ہے کہ گل اور محسن یہاں نہ ملے تو وہاں شاید مل جائیں گے" میں نے کہا "محسن کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ ڈھاکا پہنچنے کے بعد منو میاں کو تلاش کرنا، ان کے ذریعے پھر رابطہ قائم ہو سکتا ہے۔"

غالب نے سر ہلایا "کاش، محسن کی عقل بھی انہی خطوط پر کام کرے۔"

"ایسا تو اکثر ہوتا ہے۔ میرے اور اس کے سوچنے کا انداز ایک ہو گیا ہے۔ اتنی طویل رفاقت ہے ہماری کہ ہمارے ذہن میں ایک ہی بات آتی ہے اور ایک ہی وقت میں۔"

"یعنی اس وقت محسن جہاں بھی ہوگا یہی سوچ رہا ہوگا" غالب نے کہا "میں تاریخ اور وقت نوٹ کر لیتا ہوں۔ محسن ملے گا تو اس سے پوچھوں گا۔"

"کیا تمہارے اور نازو کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہیں ہے؟"

غالب نے سوچ کے کہا "ہمارے درمیان وہی ہم آہنگی ہے جو کرکٹ کی گیند اور بیٹ میں ہوتی ہے۔ ایک کے بغیر دوسرا بے کار ہے مگر بیٹ چوکے چھکے مارنا چاہتا ہے۔ بال وکٹ لینا چاہتی ہے۔"

"واہ کیسا انداز بیاں ہے۔ بیسویں صدی کے عشق میں ڈوب دونوں نے بالکل نیا انداز اختیار کیا ہے۔ باکس آفس کی کامیاب فلم والا۔ حسن، عشق، رقص، مذاق اور مار دھاڑ سے بھرپور سنسنی خیز فلم بے مثال" میں نے ہنس کے کہا۔

"تمہیں بھوک نہیں لگی؟"

"بھوک سے زیادہ چائے کی طلب ہے" میں نے کہا "کتنے افسوس کی بات ہے کہ حتا کے پاس سب کچھ ہے مگر چائے نہیں۔"

"یہاں نہ سہی۔ آس پاس کہیں چائے ضرور ملتی ہوگی" غالب نے کہا "ابھی معلوم ہو گا۔"

"رائٹ۔ آخر ہم مہمان ہیں اور وہ میزبان ہے۔ اس کا اخلاقی فرض بنتا ہے کہ ہماری ہر خواہش پوری کرے۔" ابا واسطے غالب اٹھا ہی تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ وہ پھر بیٹھ گیا۔ اس کا بھی خیال تھا کہ یہ نازو ہوگی۔ دستک دوبارہ سنائی دی تو غالب نے کہا۔

"آپ کیا لینے گئی ہو؟ وہ جو بچے تھے وہ سامنے والی دکان اپنی بیچ آئے۔"

میں نے کہا "ابھی دیکھ آؤ۔ دکان کھلی ہوئی ہے۔"

باہر سے کسی نے دبی ہوئی آواز میں کہا "ابو صاحب جی..." میں اور غالب چونک کر اٹھے۔ یہ مردانہ آواز تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی آواز کو دبا کے بول رہا ہے۔ ہم نے ایک ساتھ ریوالور نکال لئے۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ ڈگ بڑھایا۔

اسی وقت باہر سے نازو نے کہا "کون ہو تم؟ ہاتھ اوپر اٹھاؤ ورنہ گولی مار دوں گی۔"

"بیگم صاحب جی... میں... میں ہوں" کوئی دہشت زدہ آواز میں چلانے لگا۔

میں اور غالب باہر نکلے تو اپنے سامنے ہمیں وہی بڈھا نظر آیا جسے آج دن میں سب سے پہلے طلب کیا گیا تھا اور اسے بڑی مشکل سے محسن اور گل کا حلیہ بتا کے سمجھایا گیا تھا کہ وہ ان کے بارے میں جہاں سے بھی ممکن ہو معلومات ہم تک پہنچائے۔

"تم... بابا جی۔" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا "ہاں جی... کچھ بتانے آیا تھا" اس نے کانپتے ہوئے کہا۔

میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا اور حوصلہ افزا لہجے میں کہا "کیا بتانے آئے ہو بابا؟ جلدی بولو۔"

اس نے باری باری غالب کو اور مجھے دیکھا "مجھے... سو روپے ملے گا صاب جی۔ آپ نے کہا تھا۔"

"بالکل ملے گا۔ اندر آؤ" غالب نے کہا "بتاؤ کیا خبر لائے ہو؟"

وہ تذبذب میں جگہ پر ہی کھڑا رہا "سو روپیہ..."

میں نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کے اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا "لو۔ پہلے انعام لے لو، اگر بات فضول ہوئی تو ہم واپس بھی لے لیں گے۔ کیا معلوم کیا ہے تم نے؟"

بڈھے کے کچھ بولنے سے پہلے غالب نے کہا "یار، یہ نازو کہاں ہے؟ اس کی آواز تو سنی تھی ہم نے۔"

"وہ ہوگی کہیں آس پاس ہی" میں نے کہا اور ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

نازو کو بالآخر غالب کی نگاہ نے تلاش کیا۔ وہ برگد کے ایک بے ڈھنگے اور پھیلے ہوئے درخت کے نیچے موجود تھی۔ برگد کی داڑھی جیسی جڑیں ہر طرف شاخوں سے لٹک کے زمین کے سینے میں اتر گئی تھیں اور یوں اصل تنے کے گرد متعدد چھوٹے تنوں کی افزائش نے ایک ابھری ہوئی سی کوٹھڑی کردی تھی جس کے اوپر برگد کے پتوں کی گھنی چھت تھی۔ یہ دست قدرت کا فطری انداز حسن تھا۔ زیب اور تناسب کی قیود سے بالاتر، تجریدی مصوری کے کسی فن پارے کی طرح۔ نازو اس کے اندھیرے میں ایک سایہ بن کے ساکت کھڑی ہوئی تھی۔ جتنا اس کے سامنے تنے سے ٹیک لگائے چوکنا نظر آتا تھا۔

میری نظر نے دوسری طرف ایک سائے کو متحرک دیکھا۔ وہ ایک درخت سے دوسرے درخت تک بے آواز قدموں سے چلتا اور پھر کچھ دیر اندھیرے کی پناہ میں درخت کے پیچھے بے حس و حرکت کھڑا رہتا تھا۔ غالباً اسے نازو نے بھی دیکھ لیا تھا اور گولی مارنے کی دھمکی بڈھے کو نہیں اس پراسرار انداز میں پیش قدمی کرنے والے کو دی گئی تھی۔

"کون ہے ادھر" میں نے بھی ریوالور نکال لیا اور ڈگ بڑھایا "سامنے آ جاؤ ورنہ گولی سے بچ نہیں سکو گے۔"

بڈھے نے شور مچایا "صاحب جی ایسا ظلم مت کرو۔ وہ بیٹا ہے میرا۔"

میں نے حیران ہو کے کہا "تمہارا بیٹا...؟"

"ہاں جی میرے ساتھ آیا ہے۔"

"تمہارے ساتھ آیا تھا تو ایسے چھپ کے کیوں کھڑا ہوا ہے؟" غالب نے کہا۔

"وہ در اصل جی..." بڈھے کی صورت پر دکھ اور شرمندگی کے تاثرات نظر آنے لگے "اس کو شک تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ انعام زیادہ ہے مگر میں کم بتا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "انعام کم ہو یا زیادہ۔ اسے کیا۔"

"وہ جی... اس نے بھی بڑی محنت کی ہے۔ میں تو بڈھا آدمی ہوں۔ سب کام میرے بیٹے نے کیا ہے۔"

میں نے کہا "بابا تم جھوٹ بول رہے ہو۔ سب کام اس نے کیا ہے تو وہ ڈر کیوں رہا ہے؟ خود انعام لینے کے لئے آگے کیوں نہیں آیا؟"

غالب نے کہا "چلو اندر بیٹھو۔ پھر بتاؤ معاملہ کیا ہے۔"

میں نے کہا "نازی جی تم ذرا بڑے میاں کے ہونہار سپوت پر نظر رکھو ایسے کہ اسے پتا نہ چلے اور وہ کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کرے۔"

"تم فکر مت کرو۔" غالب نے کہا اور نازو کی طرف چلا گیا۔

بڈھے نے میرے اصرار کے باوجود کرسی یا صوفے پر بیٹھنا قبول نہیں کیا۔ "ہم مالکوں کے برابر بیٹھ جائیں؟ غلام ایسی حرکت نہیں کرتا جناب۔"

مجھے اس کی سوچ پر افسوس ہوا۔ یہ صدیوں اور نسلوں کی غلامی کا عطا کردہ احساس کمتری تھا جس نے انسانی مساوات اور عزت نفس کے خیال کو ان کے لئے ناقابل قبول بنا دیا تھا۔ انہوں نے اس حقیقت کو بھی عقیدے اور ایمان کا حصہ بنا لیا تھا کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں اور شاید خدا نے ہی انہیں ایسا بنایا ہے۔ ایک مالک جو عزت رکھتے ہیں۔ اچھا کھاتے پیتے ہیں اور با اختیار ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو ذلت اٹھاتے ہیں، ظلم سہتے ہیں فاقہ کشی اور بے توقیری برداشت کرتے ہیں۔ اس ذہن کو بدلنا کون سا سہل ہے۔ اب ان کے لئے عزت کو قبول کرنا اتنا ہی مشکل ہو گیا تھا جتنا کسی دوسرے مذہب کے عقیدے کو تسلیم کرنا۔ یا یہ سوچنا کہ وہ اگر خواہش کرے اور کوشش کرے تو انسان بن سکتا ہے۔

میں نے کہا "بابا جی کیا معلوم ہوا ہے آپ کو۔ آرام سے بتائیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ کام کی بات ہوئی تو انعام پانچ سو بھی ہو سکتا ہے۔"

"پانچ سو" اس نے بڑی مشکل سے کہا اور پلٹ کے دروازے کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ ڈرتا ہو کہ یہ بات کوئی سن لے گا۔ پھر ایک دم وہ میرے پیروں میں گر گیا۔

میں نے تڑپ کر کہا "کیا ہوا بابا جی۔ اٹھو۔"

مگر وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ "مائی باپ ان داتا پانچ سو نہیں۔ بس تین سو دے دو مجھے۔ بچن... اس کو نہ معلوم ہو۔"

"کس کو۔ تمہارے بیٹے کو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں کل لے لوں گا۔ بعد میں لے جاؤں گا۔ ابھی کچھ مت دو مجھے۔ گالیاں دے کر اور دھکے دے کر نکال دو مجھے بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "وہ کیوں...؟"

"وہ... وہ سب چھین لے گا مجھ سے۔ وہ اسی لئے تو آیا ہے میرے ساتھ۔" بڈھے کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ "میری بچی بچ جائے گی سرکار۔ اس کی عزت بچ جائے گی۔ وہ اپنے گھر کی ہو جائے گی۔"

تھوڑا سا کریدنے پر ساری بات معلوم ہوئی۔ بڈھے کی بچی سولہ سال کی ہو چکی تھی اور اس کا بیاہ بھی ہو سکتا تھا مگر بڈھے کو شادی کے اخراجات پورے کرنے کے لئے پانچ سو روپے کی خطیر رقم کی فراہمی کا مسئلہ درپیش تھا۔ وہ بڑی مشکل سے چرا کے اور چھپا کے دو سو روپے جمع کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا نشہ کرتا تھا اور اپنے ساتھ باپ کی کمائی کو بھی ٹھکانے لگا دیتا تھا۔ اس کی بیوی دن میں بنگلے پر کام کرتی تھی اور شام کو منیجر کے گھر چلی جاتی تھی۔ ایسا کئی سال سے ہو رہا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک ڈیڑھ روپیہ گھر لاتی تھی تو سب کو گزر اوقات کے لئے کچھ دے جاتی تھی۔ کبھی اناج کبھی پرانے کپڑے جوتے۔ اسی نے دو لڑکیاں بھی جنی تھیں جن کو اس کے غیرت مند شوہر نے گلا گھونٹ کے مار دیا تھا اور زمین میں دفن کر دیا تھا۔ اب بڈھے کو اندیشہ تھا کہ یہی سب کچھ اس کی بچی

www.paksociety.com

کے ساتھ بھی ہوگا۔ کیونکہ وہ زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کی شادی نہ ہوئی تو وہ کب تک گھر میں محفوظ رہے گی۔ خود اس کا بھائی اسے بیچ ڈالے گا۔ بڈھے کی بات سمجھنا آسان نہ تھا مگر میں مطلب نکالتا رہا۔ اس دکھ بھری کہانی نے میرے دل کو خون کے آنسو رلا دیئے مگر ایسی لاکھوں کروڑوں کہانیاں تھیں جو ہر قدم پر پرانی قبروں کے کتبوں کی طرح خاموش تھیں مگر پکار رہی تھیں کہ ہماری بھی سنو۔ مگر اتنی فرصت کسے اور فرصت ہو تو ضرورت کسے کہ ہر آنسو ہر سسکی ہر فریاد کی لے اور جور کی کراہ سے اس کا دکھ پوچھے۔

میں نے بڈھے کو اٹھایا اور کہا "تم جیسا چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔ میں تم کو پورے پانچ سو دوں گا اور تمہارے بیٹے کے سامنے۔"

"نہیں جناب۔" وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔

میں نے اسے تسلی دی۔ "میری بات سن لو پہلے۔ کتنے دن میں بندوبست کرلو گے تم شادی کا۔"

"بس دو دن۔ دو دن بعد میں اس کو شوہر کے حوالے کردوں گا۔ میری ذمے داری ختم۔"

"تم نے انتخاب کرلیا ہے۔ میرا مطلب ہے کس سے کرو گے اس کی شادی۔ اور کیا وہ شادی کے بعد حفاظت کرسکے گا اپنی بیوی کی عزت کی۔ شادی تو تمہارے بیٹے نے بھی کی تھی۔"

"وہ ایسا نہیں ہے سرکار۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ تمہارا بیٹا چار دن بعد گھر آئے گا۔ بہن کی رخصتی کے بعد۔" میں نے کہا "تم کسی خوف کے بغیر اس کی شادی کرو۔"

اس کو کچھ اطمینان حاصل ہوا۔ "بھگوان سکھی رکھے آپ کو۔ مگر چار دن آپ کیسے روکو گے اسے۔"

"یہ ہمارا کام ہے۔ کہو تو تھانے میں بند کرادیں۔"

"ضرور کرادیں جناب۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ چار دن کے لئے کیا مہینہ بھر کے لئے بند کرادیں تاکہ اس کی نشے کی لت بھی چھوٹ جائے۔" بڈھا منت کرنے لگا۔

"وہ سب ہوجائے گا۔ اب تم بتاؤ کیا خبر لائے ہو۔" میں نے کہا۔

"یہاں چار کوس دور گیا تھا کل۔" بڈھے نے کہا "اور بھی سب پوچھتے پھر رہے تھے لیکن ابھی تک کسی کو کچھ نہیں معلوم۔ جس لڑکے کو میں بیٹی دینا چاہتا ہوں اس کے باپ نے بلایا تھا مجھے۔ وہ لڑکا ریلوے میں قلی ہے۔ اچھا کما لیتا ہے۔ اس کا باپ بھلا مانس ہے ... وہ بات توڑنا نہیں چاہتا مگر ... بھی نہیں ..... کرسکتا۔ اس نے مجھے مہلت دی۔ یہ آخری بار ہے۔ اگر ایک مہینے میں کچھ نہ کیا میں نے تو پھر وہ لڑکے کا بیاہ دوسری جگہ کردے گا۔ رشتوں کی کوئی کمی نہیں اور نہ داج دینے والوں کی۔ پتا نہیں کس کی بات کر رہا تھا کہ وہ لڑکے کو بالکل نئی سائیکل بھی دیں گے۔ شریف آدمی ہے جی ورنہ یہاں کون پروا کرتا ہے کسی کی۔ سو زبان دے کر پھر جاتے ہیں لوگ۔ میں نے پھر وعدہ کرلیا تھا کہ مہینے بھر میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوجائے گا۔ بھگوان نے میری سن لی آپ کو بھیج دیا۔"

"اگر ہم نہ آتے تو تم کیا کرتے۔"

"پتا نہیں جی۔" وہ سوچ کے بولا "لیکن یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ آپ نہ آتے۔ جب بھگوان کی یہی مرضی تھی۔"

"خیر آگے بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"اس سے باتوں باتوں میں پتا چلا کہ ریلوے لائن کے پاس ایک تو کسی کی لاش ملی تھی۔ ریلوے کا گارڈ تھا وہ۔ ... نے مار کے پھینک دیا تھا۔ کہتے ہیں اسی گاڑی کا ذرا ... تھا جو ... ٹکر ہوئی تھی۔"

"گاڑیاں ٹکرائی ہیں کہیں؟" میں نے انجان بن کے پوچھا۔

"ہاں سرکار۔ مال گاڑی تھی ایک۔ دوسری ... گاڑی۔ پل پر دونوں ٹکرا گئیں۔ پل بھی ختم ہوگیا۔" بڈھے نے ... مجھے اطلاع دی۔ "وہاں پولیس بھی بہت آئی تھی۔ لائن کے ... نظر آیا اسے پکڑ لیا۔ اس کی میرے جوائی کی قسمت اچھی تھی ... اس دن ڈیوٹی پر نہیں گیا تھا۔ جاڑا بخار میں پڑا رہا تھا اور ... کے اسپتال کی پرچی تھی اس کے پاس۔ پولیس نے اس علاقے ایک عورت کو بھی پکڑا ہے۔"

میں چونکا۔ "عورت۔"

"ہاں جی۔ ہے تو شاید ویسی ہی جیسی آپ نے بتایا تھا۔ میں نے دیکھا نہیں مگر سنا ہے بہت سندر ہے۔ مشہور یہ ہوگیا ہے کہ کسی ڈاکو کی بہن ہے۔ خود بھی ڈاکو ہے۔"

میرے تجسس اور اضطراب نے ہیجان اور پریشانی کی صورت اختیار کرلی۔ "ڈاکو کی بہن؟"

بڈھے کا چہرہ مایوسی سے زرد پڑنے لگا۔ "ہاں جی لیکن صاحب دیکھا کچھ نہیں۔ مجھے پتا تھا اس کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ مجھے کوئی انعام نہیں دو گے آپ۔"

میں نے کہا "انعام ضرور ملے گا۔ ... جو تم مانگو گے ملے گا۔ اپنے جوائی کو تم بھی سائیکل دینا۔ موٹر سائیکل کار، ہوائی جہاز مانگے دینا۔"

وہ ڈر گیا۔ "مجھ سے غلطی ہوگئی۔ سرکار۔" وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا "بابا جی اور کیا سنا ہے تم نے سب بتاؤ۔"

بڈھا سوچ کے بولا "اور بس جی۔ اس عورت کو پولیس ساتھ لے گئی تھی۔"

میں نے کہا "کچھ معلوم ہے وہ کیسے ملی تھی پولیس کو ... پھر رہی تھی ... یا بے ہوش پڑی ہوئی۔ کہیں چھپی ہوئی۔"

"وہ چھپی ہوئی تھی۔ ایک کیبن میں سرکار۔ پٹڑی کے ساتھ ایک پرانا کیبن ہے جہاں کوئی نہیں رہتا۔ اس کے اندر وہ ... پولیس نے پکڑ لیا۔"

... سانس رکنے لگا تھا۔ "اس کا ... نام وغیرہ معلوم ہوا۔"

... میں سرہلانے لگا۔

... میں نے کہا "وہ ناگ منی تو نہیں تھی؟"

"... ناگ منی۔"

"... ڈاکو شیش ناگ کی بہن۔" میں نے کہا۔

"آپ جانتے ہو اسے حضور ..."

"... تھی وہ۔" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم جناب۔ نہ میں شیش ناگ کو جانتا ہوں اور اس کی بہن ناگ منی کو۔" وہ بولا۔

میرا ذہن تیزی سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ... ہو گئی تھی۔ بھارتی پولیس کے لئے وہ آج بھی ناگ منی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ شیش ناگ ڈاکو اور اس کی بہن نے مل کر سرحد کے دونوں جانب اپنی دہشت پھیلا رکھی تھی۔ یہ ہمارے لئے پرانی بات ہوئی تھی۔ پولیس کو کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ ناگ منی اب گل بانو ہے اور اتنی ہی شریف لڑکی ہے جتنی اس معاشرے میں کسی بھی غیرت دار گھر کی بیٹی ہوسکتی ہے۔ انہیں تو شاید یہ بھی علم نہیں تھا کہ شیش ناگ مارا جاچکا ہے۔ پولیس کے ریکارڈ میں ان بھائی بہن کے سارے کارنامے زندہ تھے اور وہ آج بھی پولیس کو مطلوب تھے۔ برسوں پرانی بات ہوتی تو شاید کسی کے ذہن میں ناگ منی کا چہرہ نہ رہتا لیکن سرحد پار پاکستان میں شیش ناگ کے مارے جانے کی خبر ابھی غیر مصدقہ تھی یا پھر یہاں پہنچی نہیں تھی۔ ناگ منی کی تصویر دیکھنے والوں نے اسے فوراً شناخت کرلیا ہوگا۔

میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ جیب سے ہزار روپے نکال کے میں نے کہا "بابا جی۔ یہ لو۔ اس کو اپنا انعام سمجھو۔ اپنی بیٹی کا جہیز بنانا ... اس سے بیٹی کی شادی کرو۔ اپنے داماد کو نئی سائیکل خرید کے دو۔ خدا کرے اس کا نصیب اچھا ہو۔"

بڈھا رونے لگا۔ اس کے حلق میں الفاظ پھنس گئے۔ میں نے کہا "یہ لو۔ چھپا کے رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ایک ہزار کی خاطر تمہاری جان لے لے۔"

"جان لے گا تو اپنا ہی بیٹا لے گا۔"

"وہ ہمارے ساتھ ہوگا یا جیل میں۔ تم اس کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جاؤ۔" میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

اس نے والہانہ انداز میں میرے ہاتھ چومے۔ اس کے آنسو میرے ہاتھوں کو گیلا کرنے لگے۔ پھر وہ میرے پاؤں چومنے لگا اور اپنی زبان میں وہ سب دعائیں دینے لگا جو اس کے دل سے نکلی تھیں۔ میں نے اس کی اور اپنی گفتگو عام فہم زبان میں بیان کی ہے ورنہ اس کے اور میرے درمیان استعمال ہونے والے الفاظ مختلف تھے۔ ... کمیونیکیشن گیپ تھا۔ تاہم اس نے میرا اور میں نے اس کا مطلب آسانی سے سمجھ لیا تھا۔ جب لوگ ایک کی بات سمجھنا چاہیں تو الفاظ کے بغیر بھی سمجھ لیتے ہیں اور نہ سمجھنا چاہیں تو الفاظ کے مفہوم کو بھی الگ کرلیتے ہیں۔

میں نے بڈھے کو اٹھا کے مشکل سے چپ کرایا اور پھر غالب کو آواز دی۔ غالب اور نادر بالکل فارغ تھے چنانچہ لڑ رہے تھے جو ان کے پیار کا انداز تھا۔ میری آواز پر ان کی چیخ پکار بند ہوگئی۔

ممتا ان کے ساتھ ہی آگیا تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ مجھے گل کے گرفتار ہوجانے کا خدشہ ہے تو ان کی صورت پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"اب کیا ہوگا۔ اگر پولیس نے اسے ڈاکو سمجھ لیا ہے تو پھر وہ ... سے پہرے میں ہوگی۔" غالب نے کہا۔

"اور اتنی بڑی کامیابی کی خبر نیچے سے اوپر تک پہنچادی گئی ہوگی۔ اعلیٰ افسران نے اخبار والوں کو بھی بتادیا ہوگا کہ وہ ناگ منی کو پکڑ چکے ہیں...." نادر بولا۔

میں نے کہا "ممکن ہے ابھی یہ سب نہ ہوا ہو وہ تصدیق کئے بغیر اعلان نہیں کرسکتے۔" میں نے کہا "اور اگر اسے پولیس کے قبضے سے چھڑانا ہے تو اس کے لئے آج کی رات ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ صبح معاملہ ہمارے بس سے باہر ہوجائے گا۔"

"... تو شاید اس وقت بھی ہمارے بس سے باہر ہی ہے۔" ... نے کہا۔

"ہم جانیں لے سکتے ہیں۔ کوشش کئے بغیر مایوسی گناہ ہے" میں نے کہا۔

"تم ڈاکو ہو" ممتا اچانک بولا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور سرہلادیا "اور کیا سمجھ رہے تھے تم ہم یاتری ہیں۔ کاشی جارہے تھے۔"

"سالی ناگ منی کا نام تو سنا تھا میں نے" وہ بولا۔

غالب نے اس کے منہ پر مکا مارا "دیکھو گے تو ہوش اڑ جائیں گے تمہارے۔ عزت سے نام لو اس کا۔"

ممتا نے کہا "کیا وہ سردار ہے تمہاری؟"

میں نے کہا "سردار اس کا بھائی ہے۔ شیش ناگ اور اس علاقے میں تم جیسے لڑکے پیچھے میں نے نہیں دیکھے جن کا یہ نام سن کے پیشاب خطا نہ ہوتا ہو۔"

ممتا اب واقعی دہشت زدہ نظر آنے لگا تھا "دیکھو میں مدد کرسکتا ہوں تمہاری۔ لیکن۔"

"لیکن کیا...؟"

"مجھ سے بس اتنا وعدہ کرو کہ آئندہ مجھے تم سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "اگر تم نے واقعی مدد کی ہماری تو آئندہ تمہیں کسی سے بھی خطرہ لاحق نہیں رہے گا۔ کس کی مجال ہے جو ڈاکو شیش ناگ کے دوست کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔"

"بس تو پھر چلو۔ ہم معلوم کرتے ہیں کہ ناگ منی کو کس نے پکڑا ہے اور کہاں رکھا ہے۔ ہوسکتا ہے ہم اسے چھڑالیں۔" ممتا نے کہا۔

"کیسے؟ اگر تمہارا خیال ہے کہ پیسہ چل جائے گا تو پھر یہ خیال غلط ہے" میں نے کہا "ناگ منی جیسی عورت کو چھوڑنے کا خطرہ

www.paksociety.com

میں بھی ایس پی سے کم نہیں۔"

"ویسے پی صاحب" میں نے فخر سے کہا "اس کو تم یہاں رکھوا دو ہفتے بھر کے لئے۔ ایک ہفتے سے پہلے یہ نکلنے نہ پائے اگر ضروری ہو اور اس کے نشے کا علاج ہو جائے تو مہینہ بھر داخل رکھیں اپنے کلینک میں۔"

ستا نے سر ہلایا "اس کا تو ایسا علاج ہوگا کہ اس کی آنے والی نسلیں یاد رکھیں گی" اور کار سے اتر گیا۔ نازو اور غالب اس کے ساتھ اتر گئے۔

وہ میرے پاؤں پڑ کے رونے لگا۔ "جناب عالی۔ مجھے یہاں مت چھوڑیں یہ بہت ماریں گے مجھے۔"

میں نے بے رحمی سے کہا "اچھا ہے تمہاری سب دھول جھڑ جائے گی۔ کسی اور کی مانتے کہاں تھے تم باپ کی زندگی عذاب کر دی تھی تمہارے نشے نے۔"

"یہ مجھے مار ڈالیں گے....." وہ دہشت سے کانپنے لگا۔

"زندگی کیا ہے تمہاری۔ تمہارے لئے محض شرمندگی اور مجبوری۔ دوسروں کے لئے عذاب اور مصیبت" میں نے کہا۔ "مر گئے تو فائدے میں رہو گے تم بھی۔ سب کی جان چھوٹ جائے گی۔"

اس نے ایک دم دروازے کی طرف پلٹ کے ہاتھ بڑھایا اور بھاگنے کی کوشش کی مگر میری گرفت سے نہ نکل سکا۔ نشے نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا ورنہ وہ مجھ سے کم عمر جوان آدمی تھا اور دیکھنے میں بھی تندرست لگتا تھا۔ اس نے میری کلائی پر دانت گاڑنے کی کوشش کی اور پھر دوسرے ہاتھ سے میرا منہ نوچنے لگا۔ میں نے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر دروازے پر دے مارا۔ وہ چلایا "ہائے رام" اور ساکت ہو کے مجھ پر گر گیا۔

اسی وقت اندر سے ایک بدحواس شخص برآمد ہوا جو سوتے سے اٹھ کے آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ستا نکلا اور پھر غالب اور نازو۔ اندر اب روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔

ستا نے کہا "اس حرام زادے کو بند رکھو اور جب تک میں نہ کہوں اسے چھوڑنا نہیں ہے۔"

"آپ کا جیسا حکم ستا جی" چوکی سے آنے والا مجھے سلام کرتے بولا۔

"یہ بھاگ گیا تو سمجھو تمہاری خیر نہیں۔"

میں نے کہا "اس کی نشے کی عادت چھوٹ جائے تو اسے بھی چھوڑ دینا۔ یہ نہ ہو کہ تم خود اسے نشہ دیتے رہو۔"

"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے سر" اس نے بے سدھ پڑے ہوئے جوان آدمی کو گھسیٹ کے اتار لیا "جی اندر رکھتے ہیں ہم نشہ کیا چیز ہے۔"

ستا نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی اور بولا "چلو کچھ تو فائدہ ہوا یہاں آنے کا۔"

میں نے کہا "کیا معلوم ہوا؟"

"وہ عورت شام کو پکڑی گئی تھی۔ کیا نام ہے اس کا۔ ہاں ناگ منی" ستا بولا "ابھی جل گاؤں کے تھانے میں پہنچا دیا گیا ہے اسے۔"

"یہ جل گاؤں کہاں ہے؟"

"وہیں جا رہے ہیں ہم" ستا بولا "انسپکٹر سورج پانڈے انچارج ہے وہاں۔ ایک خبر اچھی آ رہی ہے۔"

نازو نے گھبرا کے کہا "کیا مطلب....."

ستا نے حیرانی سے کہا "تمہیں تو ہم سے زیادہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ حرامی پولیس انسپکٹر کیسے ہوتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ تفتیش کے نام پر۔"

"اگر اس نے کوئی زیادتی کی ہوگی تو آج اسے معلوم ہو جائے گا کہ شریفوں کے مقابلے میں ڈاکو کیا ہوتے ہیں" غالب نے غصے سے کہا۔

"کیا وہ ایمان دار اور فرض شناس ہے؟" میں نے فکر مند ہو کے پوچھا۔

ستا ہنسنے لگا "میں نے یہ تو نہیں کہا تھا۔"

"پھر کوئی فکر کی بات نہیں" میں نے نازو کو تسلی دی "تم بے فکر رہو ناگ منی کے بھنڈی کا۔ یا اس کے ساتھ کا۔ سمجھدار اور تجربہ کار پولیس والے ڈاکوؤں کو وی آئی پی سمجھتے ہیں اور ان کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کیا دے گی اسے۔ تھوڑی سی رقم اور تعاون طلب کر کے وہ اتنا فائدے میں رہے گا کہ چاہے تو نوکری چھوڑ دے۔"

"تم خود چھڑاؤ گے اسے؟ ڈاکو کی حیثیت سے اپنا تعارف کرا کے کیا یہ کام مجھے کرنا ہے؟" ستا بولا "ہو سکتا ہے کہ وہ انسپکٹر سورج پانڈے کے ہاتھ میں نہ رہا ہو۔"

میں نے کہا "اگر کوئی خرابی نہ ہو تو تمہیں اختیار ہے کہ جیسے چاہو اس مسئلے سے نمٹ سکتے ہو مگر خرابی کی صورت میں ہم معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔"

"اس سے کیا ہوگا۔ مزید نقصان....."

"ایک مرحلہ ایسا بھی آ جاتا ہے" میں نے کہا "خواہ مخواہ بھی ہو جب عقل کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جذبات کی پکار سننی پڑتی ہے اور اس وقت نفع نقصان کا خیال نہیں آتا۔"

"مجھے امید ہے کہ وہ نوبت نہیں آئے گی۔ میں تمہاری ناگ منی کو خطرات کی حدود سے نکال لوں گا اور جہاں تم کہو گے پہنچا دوں گا۔ اس کے بعد تو میری ذمے داری ختم ہو جائے گی" ستا نے کہا۔

میں نے غالب کی طرف دیکھا اور سر ہلایا "مسٹر ستا اگر تم نے یہ سب کر لیا تو پھر تمہارے لئے بھی کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا۔ وہ ٹیپ اور تصاویر تمہارے حوالے کر دیں گے جن کی موجودگی کو تم پھانسی کا پھندا اپنی گردن میں محسوس کرتے ہو۔"

"ابھی تک ہم نے کوئی [illegible] نہیں ہے کہ تمہیں شک باقی رہے؟" غالب نے کہا

"یہ عورتوں والا وعدہ ہے؟" ستا بولا۔

"وعدہ تو بس عورتوں کی" نازو نے میرے یا غالب کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہا "ہر معاملے میں تم مردوں نے آپ کو معتبر کیا۔ عورتوں کا وعدہ قابل اعتبار نہیں ہوتا۔"

ستا مسکرانے لگا "شریمتی جی۔ آپ ان عورتوں میں شامل نہیں ہیں۔ میں آپ کے وعدے کی ضمانت قبول کرتا ہوں۔"

ہمارے اور ستا کے درمیان اس معاہدے نے کشیدگی کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی مدد پر انحصار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس کی ایمبیسیڈر کار میں ریڈیو بھی تھا۔ میں نے خبریں سننے کی خواہش ظاہر کی تو غالب نے اسے آن کر دیا۔ آکاش وانی سے رات ساڑھے دس بجے کا بلیٹن چند منٹ بعد شروع ہوا۔ مال گاڑی اور آئل ٹینکر کے تصادم کی مختصر خبر میں تخریبی کارروائی کا امکان ظاہر کیا گیا تھا اور یہ کہ اعلیٰ حکام تفتیش کر رہے ہیں مگر کسی گرفتاری کا تذکرہ نہیں تھا۔ مال گاڑی کے گارڈ اور قریبی اسٹیشن کے عملے کی لاشوں کے ملنے کا بھی کوئی ذکر نہیں تھا۔

خبروں کے بعد کلاسیکی موسیقی نشر ہونے لگی اور میں اپنے خیالات کے گرداب میں کھو گیا۔ میرے کان ابھی تک اس نوجوان کی دردبھری آواز سن رہے تھے جس کو ہم نے نشہ چھڑانے کے لئے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ نازو پر اس کی فریاد و فغاں کا زیادہ اثر ہوا تھا مگر اس کا باپ بالکل متاثر نظر نہ آتا تھا۔ پیسہ کس طرح انسانی رشتوں کو بے آبرو کرتا ہے اور کیسے قربتوں کو فاصلوں میں بدل دیتا ہے۔ یہ خاندان اس سفاک حقیقت کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ باپ کو فکر نہیں تھی کہ بیٹے کو پولیس تشدد سے مار ہی نہ ڈالے کیونکہ اس کے دل میں بیٹے کی محبت پہلے ہی مر چکی تھی۔ بیٹے کے لئے اس کی جوانی ایک بہت بڑی رقم کا چیک تھی جسے کیش کرانے کی تاریخ قریب آ گئی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کیسی عصمت اور کیسی عزت۔ اصل مسئلہ پیسہ تھا۔ جو کسی طرح ہاتھ نہیں آتا تھا۔ اس کے حصول کے لئے دو ہی ذرائع تھے۔ غیر قانونی یا غیر اخلاقی۔ غیر قانونی کام کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا تھا جس میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس نے اپنی بیوی کے جسم کو رہن رکھوا دیا تھا اور اس کی فراہم کردہ ضروریات زندگی کے بارے میں بے غیرتی کے احساس سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ اب ان سب کے وجود جرم و گناہ کی ایک دلدل میں ڈوبے ہوئے تھے مگر انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان کے لئے یہی زندگی تھی۔

کار اچانک رک گئی "ایک ایک کپ چائے پی کے آگے چلتے ہیں" ستا نے کہا۔

کسی نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا۔ وہ سڑک کے کنارے بنا ہوا عام سا چائے خانہ تھا جہاں رات کے ساڑھے گیارہ بجے بھی ٹرک اور مسافر بسوں کی موجودگی سی رونق تھی۔ آمنے سامنے چائے خانے کے ایک درجن سے زیادہ ریسٹورنٹ اور تنور تھے جن کے باہر لکڑی کی بوسیدہ کرسیوں اور وہاں کی چارپائیوں پر مسافر اور ٹرک ڈرائیور کھانے پینے میں مصروف تھے۔ وہیں پان سگریٹ کے کیبن بھی نظر آ رہے تھے۔ بہت سے لوگوں نے کار کو دلچسپی سے دیکھا۔ دلچسپی کا اصل سبب نازو تھی جو اگلی سیٹ پر رونق افروز تھی۔ جب میں سگریٹ لینے گیا تو وہ پیچھے بیٹھی تھی۔ ایک مدراسی لونڈے نے دوڑ کے آرڈر لیا اور اپنے حریف "باہر والوں" کو شکست دے کر فخر سے اکڑتا ہوا چلا گیا۔ وہاں جتنے ریسٹورنٹ تھے اس سے کہیں زیادہ باہر والے تھے چنانچہ مقابلہ سخت تھا اور کامیاب وہی تھا جو زیادہ مستعد تھا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے ستا سے پوچھا "اب اور کتنی دور جانا ہے؟"

اس نے گھڑی دیکھی "میرا خیال ہے آدھے گھنٹے میں جل گاؤں پہنچ جائیں گے ہم۔"

"تم اس علاقے سے واقف ہو نا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" ستا نے کہا۔

"میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ ہم راستوں سے ناواقف ہیں۔ تم راستہ بھولنے کی غلطی مت کرنا۔"

"مجھے مرنا ہوتا تو میں تمہارے ساتھ اتنی دور کیوں مرنے آتا" ستا نے کہا "مگر تم کیسے ڈاکو ہو کہ تمہیں راستوں کا بھی پتا نہیں۔ عام راستے عام لوگ جانتے ہیں۔ ڈاکو تو ان راستوں سے بھی واقف ہوتے ہیں......"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "یہ ہمارا علاقہ نہیں ہے اور اسی لئے ناگ منی پولیس کے ہتھے چڑھ گئی۔"

"تمہارا علاقہ کون سا ہے؟"

میں نے کہا "راجستھان کی سرحد اور تھرپارکر کے دونوں جانب۔"

"معلوم نہیں کیوں میرا دل یہ بات نہیں مانتا کہ تم لوگ ڈاکو ہو" ستا نے کہا۔

"دل کی بات مت مانو۔ ہماری بات مان لو گے تو فائدے میں رہو گے" غالب نے اسے مشورہ دیا۔

اسی وقت مدراسی چھوکرا آ گیا "صاحب جی۔ ابھی اپن ایک بات پوچھیں گا۔ ناراج مت ہونا۔"

میں نے کہا "پوچھو۔"

"اپن تم کو بھی دیکھا ہے اور بائی جی کو بھی پر سالا یاد نہیں پڑتا کون سا فلم تھا" وہ سر کھجا کے بولا "بائی جی کا نام...... ہے نا؟"

اس نے ایک مشہور فلم اسٹار کا نام لیا تھا "بالکل پہچانا تم نے" غالب بولا۔

چھوکرے کا چہرہ کھل اٹھا "ابھی اپن شرط جیت گیا صاحب۔ بیس روپے ہو اپنے۔ سالا ابھی نکال دیں کا پتا نکلیں تو"

اس نے غالباً شرط ہارنے والے کو مطلع کیا کہ بدعہدی کی صورت میں وہ کیا کر سکتا ہے۔

ستا مسکرانے لگا "چائے کے وہ روپے چھوڑ دیے پھر بھی فائدے میں رہا۔"

www.paksociety.com

ضرور کریں گے۔ ایسے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے نہیں پکڑے جاؤ گے۔"

ایک کانسٹیبل نے قریب آ کے کہا "ممتا جی کو بلاتے ہیں ڈی ایس پی صاحب۔"

ممتا نے کہا "تم چلو۔ ہم مشورہ کر کے آتے ہیں۔"

پولیس اس لئے محتاط تھی کہ کہیں ڈاکو تھانے پر حملہ نہ کر دیں مگر ممتا نے گاڑی اندر کی طرف لے جا کے روک دی تو ان کے لئے شک و شبے کی کوئی بات نہ رہی کہ ہم فرار ہونے والے نہیں ہیں ورنہ باہر ہی رک جاتے۔

کانسٹبل کے پیچھے پیچھے ہی ممتا اترا۔ پھر میں باہر نکلا اور ہم ایک ساتھ پولیس اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوئے۔ ممتا نے اپنے معزز اور بااثر ہونے کا اعلان بھی کر دیا تھا اور پولیس پر کیس کی دھمکی دے کر تھوڑی سی ہلچل بھی مچا دی تھی چنانچہ اندر جاتے وقت کسی نے میری تلاشی نہیں لی ورنہ ریوالور برآمد ہو جاتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔

اندر داخل ہوتے وقت میرا دل دھڑکنا بھی بھول گیا تھا وہ صرف ایک لمحہ تھا جس میں صورت حال ایک دم پلٹ سکتی تھی۔ اگر ڈی ایس پی مجھے پہچان لیتا تو اس کا رد عمل فوری ہوتا اور پھر میرے لئے اس کو قابو کرنا ضروری ہو جاتا۔

ڈی ایس پی جوان آدمی تھا اور صورت سے ہی احمق آدمی لگتا تھا۔ جو قابلیت سے زیادہ سفارش کی بنیاد پر بھرتی ہوا ہو۔ اس کے چہرے پر تھکن بیزاری اور کوفت کے آثار تھے جیسے وہ کئی راتوں کا جاگا ہوا ہو۔ اس نے مجھ پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور ہاتھ کے اشارے سے ہمیں بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس کمرے میں تھانوں کی مخصوص فضا تھی۔ سہمی ہوئی۔ پر آسیب اور دہشت ناک۔ پرانی میز کے گرد چھ بھدی کرسیاں جمع کر دی گئی تھیں۔ میلے میز پوش پر چائے کے خالی کپ رکھے ہوئے تھے اور ایک ٹیلی فون پڑا تھا۔ میں اس کرسی پر بیٹھ گیا جو ٹیلی فون کے قریب تھی۔ اس کا تار میرے پیروں سے چھوتا ہوا گزر رہا تھا۔ انسپکٹر میرے بائیں ہاتھ پر رہا۔ ممتا سامنے اور ڈی ایس پی دائیں طرف۔

"اگر آپ اغوا کی رپورٹ لکھوانا چاہتے ہیں مسٹر ممتا تو اس کے لئے اتنے چراغ پا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اگر تمہارے خاندان کی کسی عورت کو پولیس یوں پکڑ لیتی تو میں دیکھتا کہ تم کتنے خوش ہو" ممتا نے پلٹ کر کہا۔

"پولیس نے؟" ڈی ایس پی چونکا۔

"ہاں پولیس نے اور یہ بات معلوم ہوتے ہی میں چل پڑا۔ میں صبح ہونے کا انتظار نہیں کر سکتا" ممتا نے میز پر مکا مارا "میں ابھی اسی وقت ہری چند سے بات کروں گا۔ وہ الو کا پٹھا ایم پی اے ہوگا تمہارے لئے۔ میرا بچپن کا دوست ہے" اس نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا "ساری بات اس کے سامنے ہوگی۔"

"ایک منٹ ایک منٹ" ڈی ایس پی نے فون پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بات میرے سامنے بھی ہو سکتی ہے پہلے مجھے تو کچھ خبر ہو کہ یہ قصہ کیا ہے۔ آخر میں ایک ذمے دار افسر ہوں جا کر ہم ایکشن ہو تو میں بھی ایکشن لینے کا اختیار رکھتا ہوں۔ ہری چند کو بعد میں بلانا۔"

"تم سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہو۔ مجھے تو پتہ ہے تمہارے ماتحت تم کچھ نہیں کرو گے" ممتا نے کہا۔

"دیکھو تم حد سے بڑھ رہے ہو....."

"نہیں۔ میں حد سے بڑھ رہا ہوں؟" ممتا نے چیخ کے کہا "تم میرے خاندان کی عورت کو اٹھا لائے ہو۔ میری خالہ زاد بہن کو"

"یہ کیا بکواس ہے" ڈی ایس پی دھاڑا "تمہارے سامنے کھڑے ہیں سب لوگ۔ جو باہر ہیں انہیں بھی بلا لو۔ پھر مجھے بتاؤ کس پر شک ہے تمہیں۔"

"شک کی بات نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے اسے کہاں رکھا ہے" ممتا بولا۔

انسپکٹر نے اپنے افسر کے کان میں کچھ کہا۔

"تم اس عورت کی بات تو نہیں کر رہے ہو۔ ناگ منی کی؟" ڈی ایس پی بولا۔

"میں کسی ناگ منی کو نہیں جانتا۔"

"ڈاکوؤں کے گروہ کی ایک عورت کو ہم نے آج شام ضرور گرفتار کیا ہے اور وہ اس وقت بھی تھانے میں موجود ہے۔ مگر اس کا آپ جیسے معزز شخص کے خاندان سے تعلق نہیں ہو سکتا" ڈی ایس پی نے کہا۔

"کہاں سے پکڑا ہے تمہارے جیالے سپاہیوں نے اسے؟" ممتا نے کہا۔

"وہ چھپی ہوئی تھی۔ ایک کھنڈر میں" انسپکٹر نے کہا۔

"ایک پرانے متروک ریلوے کیبن میں؟ یہ مجھے بھی معلوم ہوا ہے" ممتا نے کہا "آخر تم نے کیسے فرض کر لیا کہ وہ ڈاکو ہے کیا اس کو ڈاکہ ڈالتے دیکھا تھا کسی نے؟ وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی؟"

"ممتا صاحب۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ اسے کون نہیں جانتا" ڈی ایس پی بولا "اس کا بھائی شیش ناگ تھا۔ وہ ابھی مفرور ہے۔ ناگ منی نے بھائی کے ساتھ مل کر ڈکیتی کی ان گنت وارداتیں کی ہیں۔ پتا نہیں کتنے انسانوں کا خون کیا ہے۔ جب پولیس کا گھیرا یہاں ان کے گرد تنگ ہونے لگتا تھا تو وہ پاکستان بھاگ جاتے تھے اور کچھ عرصے بعد جب صورت حال وہاں بگڑتی تو لوٹ کر اس علاقے میں وارداتیں شروع کر دیتے تھے۔"

"ڈی ایس پی صاحب۔ کیا اس عورت نے مان لیا ہے کہ وہ ناگ منی ہے؟ اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا ہے؟"

"ہاں۔ اور یہ بھی مان لیا ہے کہ شیش ناگ اس کا بھائی ہے" ڈی ایس پی نے کہا۔

"تم تشدد کر کے کیا نہیں منوا سکتے۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں" ڈی ایس پی بولا "مجھے خدشہ

سمجھا گیا تھا مگر میرے آنے سے پہلے ہی وہ سب مان چکی تھی کسی نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اس وقت تک اور وہ ذرا سی بھی خوف زدہ نہیں تھی۔ شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھی اور ان پولیس والوں کو دھمکی دے رہی تھی کہ اب اس کا بھائی آتا ہی ہوگا۔ وہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا اسی لئے ناگ منی کو بہت دور اس تھانے میں شفٹ کر دیا تھا۔"

ممتا نے سر پر ہاتھ مارا "ہے بھگوان۔ آخر میں کیا کروں اس پگلی کا۔"

انسپکٹر نے ڈی ایس پی کی طرف دیکھا "وہ پاگل نہیں ہے سر۔ پورے ہوش و حواس میں ہے۔ اس نے خود کو ناگ منی تسلیم کیا سب کے سامنے۔"

"یہی تو پاگل پن ہے اس کا۔ تم پوچھ کر دیکھو کیا جھانسی کی رانی ہو تو وہ کہتی ہاں۔ میں انگریزوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔ تم کہو کہ ملکہ نور جہاں ہو تو وہ کہتی کہ ہاں۔ اب جہانگیر آتا ہی ہوگا۔ تم سب کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈلوا دے گا۔ وہ پڑھی لکھی اور اچھی لڑکی ہے مگر اس پر دورے پڑتے ہیں تو وہ گھر سے نکل جاتی ہے اسے تہ خانے میں بند رکھا جاتا ہے اور ہر وقت نگرانی بھی ہوتی ہے خطرناک پاگل نہیں ہے اس لئے زنجیروں سے باندھ کے نہیں رکھا جاتا۔ چنانچہ جب بھی موقع ملے تو سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل جاتی ہے۔ سب کو معلوم ہے یہ بات۔ لوگ پہلے بھی اسے کئی بار جنگلوں اور مرگھٹوں سے پکڑ کر لائے ہیں۔"

ڈی ایس پی کی نظر میں اب بھی شک تھا "ممتا صاحب یہ کیا کہانی سنا رہے ہیں آپ۔"

"آپ کا مطلب ہے جھوٹ بول رہا ہوں میں" ممتا بھڑک اٹھا "ناگ منی کو اپنے خاندان میں شامل کرنے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ وہ میرا بھی نام روشن کرے اور میرے باپ کا بھی۔ آپ کا دماغ خراب ہے کیا۔ چور ڈاکو سے لوگ رشتہ توڑتے ہیں یا جوڑتے ہیں۔"

انسپکٹر زیادہ حیران تھا "پھر اس نے اقبالی بیان کیوں دیا؟ آپ تو جانتے نہیں کسی ناگ منی کو۔ نام اس نے کہاں سے سن لیا تھا؟"

"اس نے تم سے سنا ہوگا یا ممکن ہے پہلے سے معلوم ہو اسے۔ اس اقبالی بیان کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ ایک ذہنی مریضہ ہے سارا گاؤں جانتا ہے۔ ہری چند کو بلا لیں۔ وہ جانتا ہے یہ بات۔"

"تو کیا وہ ناگ منی کو..... میرا مطلب ہے آپ کی بہن کو پہچانتے ہیں" ڈی ایس پی نے کہا۔

"کمال ہے۔ بہت اچھی طرح۔ بچپن کے دوست ہیں ہم تیسری کلاس سے اکٹھے پڑھتے رہے کالج تک۔ ایک ہی محلہ بھی تھا۔ اب وہ مصروف ضرور ہو گیا ہے پھر بھی ملتا رہتا ہے۔ پرمیلا میں دلچسپی بھی تھی اسے۔"

"کون پرمیلا؟"

"میری کزن پاگل خالہ زاد بہن۔ بچپن میں حد سے زیادہ ذہین تھی۔ کچھ لوگ ذہنی طور پر پسماندہ ہوتے ہیں۔ پرمیلا اپنی عمر سے بہت آگے تھی۔ اس کی باتیں لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ بے حد حساس اور زود رنج تھی۔ بعد میں سنکی اور خبطی ہو گئی تھی۔ تصور میں جو کچھ دیکھتی تھی اسے حقیقت سمجھ کے قبول کر لیتی تھی اور دوسروں کے سامنے ایسے بتاتی تھی جیسے آپ بیتی ہو۔ مشہور ہو گیا تھا کہ اس پر سایہ ہے۔ آسیب ہے۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی نفسیاتی علاج کے بارے میں نہیں سوچتا۔ ہم نے بھی صرف سنا ہے کہ سائیکاٹرک کلینک ہوتے ہیں بڑے شہروں میں....."

ڈی ایس پی نے پریشان ہو کے کہا "ممتا صاحب میں پوری کیس ہسٹری نہیں سن سکتا اور اس عورت کو آپ کے حوالے بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ مجھے بھی یقین ہے کہ وہ ناگ منی ہے۔ ہم اس سے شیش ناگ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔"

"یعنی تفتیش شروع کر دی ہے تم نے اپنے اچھی روایتی طریقوں سے" ممتا کا چہرہ لال ہو گیا "کیا بتایا ہے اس نے تمہیں؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں بتایا۔ مگر بتائے گی" انسپکٹر نے یقین کے ساتھ کہا۔

"ڈی ایس پی صاحب۔ کچھ عقل سے کام لیں۔ اگر وہ شیش ناگ جیسے ڈاکو کی بہن ہوتی تو یہاں اس کھنڈر میں کیا کام تھا اس کا؟ اس کا پورا گروہ ہے تو وہ اکیلی کیسے رہ گئی تھی؟"

"یہ سب معلوم ہو جائے گا۔"

"کوئی اسلحہ وغیرہ ملا اس کے پاس سے؟" ممتا نے کہا۔

"نہیں۔ اسلحہ تو نہیں ملا لیکن آپ پہلے اس کی تصویر دیکھ لیں" ڈی ایس پی نے کہا۔

پولیس انسپکٹر نے ایک فائل آگے بڑھا دی۔ اس میں ناگ منی کے علاوہ اس کے بھائی شیش ناگ کی بہت سی تصاویر تھیں۔ یہ تمام اخبارات کے تراشے تھے جن میں وارداتوں کی تفصیل تھی اور مختلف عدالتوں کے جاری کردہ وارنٹ تھے۔ یہ سب ہندی میں تھے چنانچہ میں کچھ نہ پڑھ سکا تاہم اس فائل کو دیکھنے کے بعد ممتا کے لئے شک کی کوئی بات نہ رہی کہ ہم نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ غلط تھا۔ ہمارے بارے میں اس کا یقین بالکل ہو گیا تھا۔

"کمال ہے۔ بہت مشابہت ہے" اس میں اور پرمیلا میں مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ڈی ایس پی صاحب کہ جسے آپ نے گرفتار کیا ہے وہ ناگ منی نہیں میری خالہ زاد بہن پرمیلا ہے۔"

ڈی ایس پی نے نفی میں سر ہلایا "صرف آپ کے کہنے سے میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ ابھی تو خود آپ نے بھی نہیں دیکھا اسے کیا پتا وہ آپ کی خالہ زاد بہن نہ ہو۔ سچ مچ ڈاکو ناگ منی ہو۔"

"آپ اس کو بلائیں..... یا مجھے لے چلیں اس کے پاس" ممتا

www.paksociety.com

نے فائل رکھ دی۔
ڈی ایس پی نے سر ہلایا "ذرا یہاں لاؤ اسے۔"
انسپکٹر تذبذب کی کیفیت میں کھڑا رہا "یہاں؟ سر۔۔۔ ہم نے اسے اپنے باندھ رکھا ہے۔۔۔۔۔۔"
"اوکے۔ ممتا صاحب کو لے جاؤ اندر۔"
ممتا کے ساتھ میں بھی اٹھا تھا مگر پھر ڈی ایس پی نے مجھے اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤں "تم کیا ہو اس کے۔"
"بھائی" میں نے بے اختیار کہا "چھوٹی بہن ہے پرمیلا سر۔"
اس تمام عرصے میں جب ڈی ایس پی اور ممتا گفتگو کر رہے تھے میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ کبھی اچانک امید حاوی آنے لگتی تھی، پھر مایوسی کے اندھیرے میں امید کی آخری کرن بھی ڈوب جاتی تھی میں کل کا تصور کرتا تھا تو مجھے محسن اور شملا کا خیال آتا تھا۔ صرف کل ہی بتا سکتی تھی کہ ان پر بعد میں کیا گزری مگر کل زنجیروں میں جکڑی پڑی تھی اور یکی نہیں۔ وہ اعتراف جرم بھی کر چکی تھی۔ ایک عورت پر تھانے کی دہشت ہی اتنی ہوتی ہے کہ وہ تشدد سے بچنے کے لیے سب کچھ کر سکتی ہے۔ کل نے زیادہ بہادری کا ثبوت دیا تھا مگر اس کے مقابل تفتیش کرنے والے سفاک وردی والوں کا غول تھا۔ معلوم نہیں انہوں نے اس پر کیا مظالم توڑے تھے۔
ممتا کے چلانے کی آواز پر میں چونکا "پرمیلا۔ پاگل۔ یہ کیا حال کر دیا ہے ان ظالموں نے تیرا۔"
میں تڑپ کر اٹھا مگر ڈی ایس پی نے گرج کے کہا "بیٹھ جاؤ۔ کیا نام ہے تمہارا۔"
میں نے اسے وہی نام بتا دیا جو ممتا کو بتایا تھا۔ ڈی ایس پی نے ایک فاش غلطی کی تھی۔ اگر وہ پہلے کل سے پوچھ لیتا کہ ممتا کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ پرمیلا کس کا نام ہے اور اس کا بھائی کون ہے تو سارا جھوٹ کھل جاتا۔ اب ممتا نے اسے سب کچھ خود ہی بتا دیا تھا۔
"میرا نام بھی ممتا نہیں اگر ایک ایک کو جیل میں نہ ڈلوا دیا میں نے پرمیلا" وہ چلا رہا تھا اور میں رات کے سناٹے میں اس کی آواز صاف سن رہا تھا "تو فکر مت کر۔ تیری اور میری ماں سگی بہنیں تھیں۔ تیرا بھائی بھی آیا ہے میرے ساتھ۔"
میں نے پہلی بار کل کی آواز سنی "میں یہاں کیسے آ گئی بھیا" وہ رو رہی تھی اور سخت وحشت زدہ معلوم ہوتی تھی۔
"رو مت۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب میں سب ٹھیک کر لوں گا۔" ممتا نے کہا "میں ابھی ہری چند کو بلاتا ہوں فون کر کے آخر وہ کس دن کام آئے گا۔ ایم پی کی اولاد۔ دیکھتا ہوں کیا کرے گا تجھے اس حال میں دیکھ کر۔۔۔۔"
جب وہ پھر میرے سامنے آیا تو ممتا کی حالت واقعی ایسی تھی کہ میں نے اس کی اعلیٰ اداکارانہ صلاحیت کا اعتراف کیا۔ وہ غصے میں آگ بگولا ہو رہا تھا اور بری طرح ہانپ رہا تھا۔
"فون ملاؤ۔ ابھی اسی وقت" اس نے پولیس کو اور پولیس کے لہجے کو بے نقط سناتے ہوئے کہا "ہری چند ابھی بات کرے گا تم سیکریٹری سے۔"
اب انسپکٹر اور ڈی ایس پی بھی پریشان نظر آنے لگے تھے انہیں احساس ہو رہا تھا کہ غلط فہمی کے باعث وہ کسی اور کو سمجھ کے پکڑ لائے تھے۔
"بات یہ ہے ممتا جی کہ ہم تو اس وقت ہری چند صاحب سے بات نہیں کر سکتے" ڈی ایس پی نے کہا "آپ بات کریں لیکن مت بتائیں کہ آپ تھانے سے بات کر رہے ہیں۔ ہم اجازت نہیں دے سکتے۔"
"بکواس بند کرو۔ اس وقت میں اور کہاں جا کے فون کروں اور جب بات تھانے کی ہے۔ میں یہاں موجود ہوں تو ... رہے ہو" ممتا نے فون چھین لیا۔
مگر اس وقت تک میں اپنی کارگزاری دکھا چکا تھا اور ایک تار جوڑتے سے رگڑ کے یوں توڑ چکا تھا کہ وہ دیکھنے میں ٹوٹا ہوا نہیں لگتا تھا۔ پلاسٹک کے اندر سے تار عام طور پر ٹوٹ جاتا ہے بیرونی انسولیشن لچک کے باعث برقرار رہتی ہے۔ میرے ذہن کے ایک گوشے میں یہ خوف موجود تھا کہ ہماری حقیقت کھل جانے کا باعث نہ بن جائے لیکن اس سے زیادہ میری کارروائی کا مقصد تھانے کا باہر کی دنیا سے رابطہ منقطع کرنا تھا۔ ناگزیر حالات میں اگر کل کو بزور بازو نکال کے لے جانا پڑتا تو اس سے پہلے بہت ... ہوتی۔ ٹیلیفون کی عدم موجودگی میں تھانے کے اندر پیش آنے والے واقعات کا علم دنیا کو صبح اس وقت ہوتا جب ہم ... چکے ہوتے۔
"آپ خود جا کے ہری چند صاحب کو بلا لائیں" ڈی ایس پی نے کہا "میں پولیس کمشنر کو ساری صورت حال بتا کے ... حاصل کرتا ہوں۔"
ممتا اٹھ کھڑا ہوا "اوکے۔ تم بھی جانتے ہو تو ... چند یہاں بھی آ جائے گا۔"
"تم نمبر ملاؤ پولیس کمشنر کا" ڈی ایس پی نے فون اپنے ... انسپکٹر کے سامنے رکھ دیا۔
"فون۔۔۔۔ فون تو ڈیڈ ہے سر" انسپکٹر نے یوں کہا جیسے ... کے ڈیڈ ہونے کا ذمے دار وہ خود ہے۔
"چیک کرو کہیں سے لائن تو ڈس کنکٹ نہیں ہو گئی" ... ایس پی نے برہمی سے کہا "کسی نے لائن کاٹ دی ہو ... الرٹ کر دو۔"
تھانے دار باہر دوڑا حالاں کہ پہلے اسے اندر ... چاہیے تھی مگر اسے خیال ہی نہیں آیا کہ کوئی اتنے ... موجودگی میں فون کو یوں ڈیڈ کر سکتا ہے کہ کسی کو خبر تک نہ ... کا دھیان باہر گیا اور اس نے چیخ کر حکم دیا کہ پول سے تھانے ... اور آگے کی لائن چیک کی جائے اور کوئی مشکوک حالت میں ... آئے تو اسے شوٹ کر دیا جائے۔ مشکوک حالت کیا ہوتی ... والوں کی لغت میں وہ اصطلاح ہے جس کا مطلب اپنی ... کے مطابق لیا جا سکتا ہے۔ اس وقت کوئی آتا کلی فون ... کا استعمال کرتا نظر آتا تو وہ مشکوک قرار پاتا۔
"... تو ٹھیک ہے سر" انسپکٹر نے باہر سے آتے ہوئے کہا۔ ... برآمدے میں کھڑے ہوئے تھے۔
"... گاڑی میں وائرلیس سیٹ ہے۔ اس کے ذریعے پولیس ... سے رابطہ کرو" ڈی ایس پی بولا۔
"... تو معاملہ خراب ہوتا جا رہا ہے۔" ممتا نے کچھ پریشان ہو کر کہا۔
"... ہری چند۔۔۔۔"
"... ایک ایم پی ہے۔ یہاں اس کا بہت اثر و رسوخ ہے مگر بات کمشنر تک پہنچ گئی تو پھر وہ بھی بے بس ہو جائے گا۔ پولیس ... براہ راست ہوم سیکریٹری یا وزیر داخلہ سے بات کر کے ہری ... بات ماننے سے انکار کر سکتا ہے۔ یہ کسی عام مجرم کا معاملہ ... حقیقت یہ ہے کہ اس نے پہلے ہی اعتراف بھی کر لیا ... کیس ڈاک بھی ہے۔"
"... جلدی بولو کیا کرنا ہے۔"
"... بتاؤں۔ مگر تو ہری چند کو بلا چکے ہیں" ممتا نے تذبذب ... کے ساتھ کہا۔
"... یقین ہے کہ وہ تمہیں مایوس نہیں کرے گا اور فوراً ... پڑے گا تمہارے ساتھ۔"
"... نہیں۔ اب وہ پہلے والا ہری چند تو ہے نہیں۔ وہ وٹ آوٹ ... کر کوشش کرنے میں کیا جاتا ہے ہمارا" ممتا نے کہا۔
"... ایسی کوشش سے کچھ حاصل نہیں جس کی کامیابی ... " میں نے کہا۔
"پھر۔ اور تو کوئی صورت نہیں۔۔۔"
"ہے۔ بہت ہی آزمودہ طریقہ ہے" میں نے کہا "جب سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلتا تو ٹیڑھی انگلیوں سے نکلتا ہے۔"
"... مطلب۔۔۔" وہ گھبرا کے بولا۔
"مطلب تم خود سمجھ لو گے۔ بس خاموشی سے دیکھتے رہو کہ ہم ..." میں نے کہا۔
... وہ تھانے کی دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی کار میں سے نازو ... کی نظر ہم پر تھی اور میں ان کے دلی اضطراب کا بخوبی ... سکتا تھا کہ شاید ہمیں برآمدے میں بے مقصد کھڑا ہوا دیکھ ... ہمارے مشن کی ناکامی کا اندازہ کیا۔ وہ اتر کے نہیں ... اتنے فاصلے سے بات بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے ... کار کی کھڑکی سے نکالا اور دو انگلیوں سے انگریزی حرف ... بنایا۔ نازو کا ہاتھ اندر غائب ہو گیا۔
... سوال تھا کہ کیا تم مقصد میں کامیاب رہے؟ میں نے ... اور جواب میں ایک انگوٹھا دکھایا جس کا یہ مطلب ... کامیابی ہوئی۔

انسپکٹر پھر باہر آیا "ڈی ایس پی صاحب پوچھ رہے ہیں کہ آپ لوگ کیوں وقت ضائع کر رہے ہیں۔"
میں نے کہا "ہم مشورہ کر رہے ہیں۔"
"ڈی ایس پی صاحب نے بھی مشورہ کر لیا ہے" انسپکٹر نے طنز آمیز تمسخرانہ انداز میں کہا "پولیس کمشنر صاحب سے۔"
"اور انہوں نے کیا فرمایا ہے؟" میں نے بھی انسپکٹری کے لہجے میں کہا۔
"انہوں نے کہا ہے کہ گورنر بھی آ جائے تو پوری تصدیق اور تفتیش کے بغیر ہاگ منی کو نہ چھوڑا جائے اور اگر انہیں یقین ہے کہ وہ کوئی اور نہیں تو صبح اسے بمبئی بھیج دیا جائے۔ اس کے لئے علاقے کی ساری نفری کام لی جائے۔"
میں نے کہا "اچھا جناب۔ پھر ہم بھی صبح تک انتظار کرتے ہیں۔"
ممتا نے کہا "صبح ہری چند بھی ساتھ چلے گا۔ تم لوگ معاملے کو آگے بڑھانا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ بہتر تھا کہ یہ بات یہیں ختم ہو جاتی۔ بعد میں مت کہنا کہ تمہیں صاحب نے مروا دیا۔"
ہم پھر اندر گئے اور اسی اعتماد کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ہم نے اپنی صورت یا رویے سے شکست خوردگی یا مایوسی کی علامت تک ظاہر نہیں ہونے دی۔
ڈی ایس پی مسکرا رہا تھا "کیا بات ہے۔"
"بات کچھ نہیں" ممتا نے کہا "تم نے بہت جلدی کی اپنے افسر اعلیٰ سے احکامات حاصل کرنے میں۔ ظاہر ہے اس وقت ہری چند بھی تمہیں قائل نہیں کر سکتا۔ اب تو جو ہوگا صبح ہوگا اور بمبئی جا کے ہوگا۔"
ممتا کی بات جاری ہی تھی کہ میں نے ریوالور نکال لیا۔
"بمبئی بہت دور ہے اور صبح بھی دور ہے" میں نے کہا "جلدی اگر ڈی ایس پی صاحب کر سکتے ہیں تو ہم ان سے زیادہ جلد باز ہیں۔"
ایک لمحے کے لئے انسپکٹر اور ڈی ایس پی کو بے یقینی نے دم بخود کر دیا۔ میری یہ حرکت ان کے لئے اتنی غیر متوقع تھی کہ وہ پلک جھپکانا بھی بھول گئے تھے۔
"یہ۔ یہ کیا ہے" آخر کار ڈی ایس پی نے کہا۔
"یہ ریوالور ہے" میں نے اسے مطلع کیا "بالکل ویسا ہی جیسا تمہاری جیب میں ہوگا یا تمہارے انسپکٹر نے اپنی کمر سے باندھ رکھا ہے۔ اس کے اندر گولیاں بھی ویسی ہی ہیں اور اگر یہ کسی کے دل جگر میں اتر جائیں تو وہ ڈائریکٹ پرلوک کی فلائٹ پکڑ لیتا ہے۔"
"ممتا صاحب۔ واٹ از دس۔ آپ جانتے ہیں اس کا انجام" ڈی ایس پی نے برہمی سے کہا۔
ممتا کی صورت پر بھی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ اسے مجھ سے یہ امید ہرگز نہ تھی کہ میں ڈی ایس پی پر ریوالور تان لوں گا۔ اس نے مجبوری میں ہمارا ساتھ دیا تھا اور پھر ہمارے درمیان ایک سودا

www.paksociety.com

ہوگیا تھا جو جانے بانس کے لئے ضروری تھا۔ اس نے ہمارا ساتھ دے کر خود کو قانون کے خلاف محاذ آرائی میں شریک کرلیا تھا۔ اگر گل آسانی سے نکل آتی تو کچھ بھی نہ ہوتا مگر اب وہ دونوں طرف سے مشکلات کے شکنجے میں پھنس گیا تھا۔ اس کے جرائم کا ثبوت ہماری تحویل میں تھا اور خود اس نے غلط بیانی سے کام لے کر قانون کی تحویل سے ایک خطرناک مجرم کو چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے جو بیان دیا تھا اس کا گواہ انسپکٹر ڈی ایس پی کے علاوہ اس تھانے کا پورا عملہ تھا۔ یہ جھوٹ ظاہر ہو جانے کے بعد بھری چند اس کو پہچاننے سے بھی انکار کرسکتا تھا۔ ممتا کو اس علاقے میں رہنا تھا اور بدبختی یا شامت اعمال نے اس کے پورے خاندان کی عزت کو خاک میں ملانے کا اہتمام کر دیا تھا۔ اس کے اپنے بیان کی رو سے ناگ منی اس کی خالہ زاد بہن ثابت ہوئی تھی تو میں خالہ زاد بھائی۔

"یہ۔ بے وقوفی مت کرو" ممتا نے بھی ہکلا کر کہا "تم پاگل ہوگئے ہو کیا۔"

میں نے کہا "شٹ اپ۔ اپنی جان بچانی ہے تو تم بتادو ڈی ایس پی کو کہ ہم تمہیں زبردستی یہاں لائے تھے اور تم جھوٹ بولنے پر اس لئے مجبور ہوئے تھے کہ ہم نے تمہیں تمہارے خاندان سمیت ملیامیٹ کرنے کی دھمکی دی تھی۔"

"یہ۔ یہ ٹھیک ہے ڈی ایس پی صاحب" ممتا کا ایک دم نروس بریک ڈاؤن ہوگیا "اس نے صبح سے پکڑ رکھا ہے مجھے......"

"ٹیک اٹ ایزی مسٹر ممتا" ڈی ایس پی بولا "مجھے پہلے ہی شک تھا۔ میں سب سمجھ گیا ہوں۔"

"یہ اچھا ہے کہ تم نے سمجھنے میں دیر نہیں لگائی۔ اب اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ حلق سے آواز نکالی تو یاد رکھنا کہ میرا یہ ہتھیار ایسی آوازوں سے بہت الرجک ہے۔ خود گولی چل جائے گی۔ نہ تمہارا کوئی ماتحت اس گولی کو تمہارے دل میں اترنے سے پہلے روک سکتا ہے اور نہ تمہارے پولیس کمشنر کا حکم۔"

وہ چند سیکنڈ بعد آہستہ آہستہ اٹھے اور دیوار سے لگ کے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ممتا کو حکم دیا کہ ان کے ریوالور نکالے اور میری طرف میز پر ڈال دے۔

"ریوالور ہاتھ میں آجائے تو یہ مت سمجھنا کہ تم اسے استعمال بھی کرسکو گے" میں نے ممتا سے کہا "شیش ناگ گولیوں کی بوچھاڑ سے گزرا ہے مگر اس کے جسم پر آج تک خراش نہیں آئی۔"

"تم شیش ناگ ہو۔" انسپکٹر نے دہشت زدہ ہو کے کہا۔

"جب میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں اس کا بھائی ہوں۔ تمہیں اسی وقت سمجھ لینا چاہئے تھا کہ ناگ منی کا بھائی شیش ناگ کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا" میں نے حقارت سے کہا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا سر" انسپکٹر نے ڈی ایس پی کی طرف دیکھ کے فریاد کی۔

"تم نے یہ نہیں کہا تھا ایڈیٹ" ڈی ایس پی گرج کے بولا۔

"آپ نے غور سے دیکھا ہوتا سر تو آپ خود بھی [illegible] کرتے۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی ہے اور......"

"ممتا نے کہا تھا کہ گل اس کی بہن ہے" ڈی ایس پی نے [illegible] غلطی کا اعتراف کرنے کے انداز میں کہا "اس کے [illegible] کہا گیا تھا میں۔"

میں نے ان دونوں کے ریوالور اٹھا کے جیب میں ڈال لئے پھر آگے بڑھ کے میں نے ڈی ایس پی کو اپنی طرف [illegible] ریوالور کی نال اس کی گدی پر رکھ دی۔

"اپنے اس ماتحت کو حکم دو کہ میری بہن کو فوراً یہاں لے آئے" میں نے کہا

احمق نظر آنے والے ڈی ایس پی نے [illegible] سینے پر کہنی ماری اور پھر ایک ٹانگ پیچھے اٹھا کے [illegible] میری ٹانگوں کے درمیان ضرب لگائی۔ سینے پر لگنے والی ضرب ہی میرا سانس روکنے کو کافی تھی۔ دوسری چوٹ نے میرے وجود میں [illegible] آتش فشاں دہکا دیا مگر میں نے ہمت سے کام لیا۔ اگر اس وقت [illegible] ہمت ہار دیتا تو شاید زندگی کی بازی ہار دیتا۔ میں نے اس کے [illegible] سر پر ریوالور کا دستہ مارا اور وہ وحشت کے عالم میں گر گیا۔

اپنے افسر کو حرکت میں دیکھ کر انسپکٹر کی غیرت نے [illegible] مارا۔ اس نے چلا کے کسی کو آواز دی اور مجھ پر ٹیلی فون کھینچ مارا۔ میں نے سر تو بچالیا مگر فون میرے کندھے پر لگا اور پھر کھڑکی کے [illegible] پر۔ شیشہ ٹوٹتے ہی رات کا سکوت منتشر ہوگیا۔ انسپکٹر کو میں نے ایک لات مار کے الٹ دیا اور وہ میز کے اوپر سے دوسری طرف گرا۔ ابھی وہ اٹھا بھی نہ تھا کہ میں نے دوسری لات مار کر میز الٹ دی اور میز کا کنارا اس کے سر پر لگا۔ پھر وہ میز کے ساتھ ہی [illegible] ہوگیا۔

باہر سے نازو کی آواز کے ساتھ دو فائر ہوئے اور کوئی [illegible] کے کرب میں چیخنے لگا۔ سب انسپکٹر دوڑتا ہوا اندر آیا اور اندر کا نقشہ دیکھ کر دروازے میں ہی منجمد ہوگیا۔

میں نے اسے ریوالور سے اشارہ کیا "اندر آجاؤ۔ [illegible] رکھنا۔ ممتا۔ اس سے ہتھیار لے لو۔"

لرزہ براندام ممتا نے حکم کی تعمیل کی۔

"میری بہن کو لاؤ" میں نے سب انسپکٹر کو حکم دیا "تالے [illegible] کی۔ چابیاں کس کے پاس ہیں۔"

سب انسپکٹر نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے انسپکٹر کی طرف [illegible] کیا۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور میں اس کی [illegible] میں وہی دہشت دیکھ رہا تھا جو شیش ناگ کے نام سے منسوب [illegible] اسے ہلاک ہوئے زمانہ گزر چکا تھا مگر نام کی دہشت زندہ [illegible] میں اس سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

باہر کی صورت حال کے بارے میں مجھے کوئی تشویش نہیں تھی۔ غالب اور نازو بہ آسانی سب سے نمٹ سکتے تھے اور غالباً وہ انجام کو پہنچ چکے تھے کیوں کہ باہر بالکل سکون تھا۔ سب انسپکٹر نے چابیاں نکالنے کے لئے اپنے افسر کو میز کے نیچے سے نکالا اور اس کی پتلون کی بیلٹ کے ساتھ بندھا ہوا چابیوں کا ایک گچھا اس کی پتلون کی بیلٹ کے ساتھ تھا۔ پھر وہ میرے آگے آگے چلنے لگا۔

تھانے کی عمارت تین کمروں اور ایک برآمدے پر مشتمل تھی۔ برآمدہ پچھلے حصے میں تھا جس کو سلاخیں لگا کے حوالات میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ دو کمروں میں دفتر قائم تھے۔ بہت سی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور وہاں دن میں ڈیوٹی دینے والے عملے کے دو افراد سوئے پڑے تھے۔

حوالات میں اندھیرا تھا اور بدبو تھی۔ گل اس کے فرش پر نیم برہنہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ سب انسپکٹر نے بلب جلایا تو اس نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور ایک چیخ مار کے اٹھ بیٹھی۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں تھیں۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور آنکھوں کے نیچے گہرے نیل پڑے ہوئے تھے۔ تفتیش کرنے والوں نے اپنی فطرت کی درندگی اور بے حیائی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے لباس کو بھی تار تار کردیا تھا۔ میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ پولیس کے محکمے میں جانے والوں میں یہ تبدیلی آخر کیوں آجاتی ہے اور کیسے۔ اس سے پہلے وہ ہمارے اور آپ جیسے عام لوگ ہوتے ہیں جو کسی پر ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔ جن کی نظر میں پرائی بہو بیٹیوں کے لئے احترام ہوتا ہے اور قانون کا خوف۔ پھر آہستہ آہستہ ان کے قلب بدلتے ہیں۔ وہ بے حسی کے ساتھ انسان پر تشدد کے انسانیت سوز حربے آزماتے ہوئے کچھ محسوس نہیں کرتے۔ شاید اس سے لطف اندوز ہونے لگتے ہیں۔ ہر عورت ان کے سامنے فقط وہ مخلوق ہو جاتی ہے جس پر ظلم میں لذت کا عنصر بھی شامل کیا جاسکتا ہے اور وہ جو قانون کی محافظت کا حلف اٹھاتے ہیں وہی سب سے بڑے قانون شکن ہو جاتے ہیں۔

یکلخت میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے اے ایس آئی سے چابی چھین لی اور اسے کئی بار اٹھا اٹھا کے لوہے کی سلاخوں پر مارا۔ میری زبان نے اسے جو گالیاں دیں وہ میری آتش غضب کی محض چنگاریاں تھیں۔ اصل آگ تو شاید گل پر یہ تشدد روا رکھنے والوں کا خون بھی نہیں بجھا سکتی تھی۔

"تمہارا وہ افسر ذلیل کتا۔ بے ضمیر شیطان۔ اس نے کہا تھا کہ ناگ منی نے خود ہی سب کچھ مان لیا ہے۔ کسی نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہ پولیس کو دھمکیاں دے رہی تھی۔"

انسپکٹر کی چیخوں سے تھانہ گونجنے لگا "میں نے کچھ نہیں کیا۔ آپ پوچھ لیں" وہ چلانے لگا مگر میں پاگل ہوگیا تھا۔ میں نے اس کی ایک نہیں سنی۔ اس کا سر پھٹ گیا اور چہرہ سلاخوں پر لگنے سے مسخ ہوگیا۔ آخر کار وہ گرا تو پھر نہ اٹھا۔

ممتا نے کانپتے ہوئے کہا "چلو۔ دیر مت کرو۔ یہ مرگیا تو خواہ مخواہ قتل کا الزام آجائے گا۔"

میں نے پھنکارتے ہوئے کہا "میں ایسے دس کتوں کو مار کے بھی سمجھوں گا کہ اپنی بہن کے جسم پر لگے ہوئے ایک زخم کا حساب بھی برابر نہیں ہوا ہے۔"

حوالات کا تالا کھول کے میں اندر گیا تو گل مجھ سے زنجیروں سمیت لپٹ گئی۔ اس عقوبت خانے میں فولاد کی بے رحم کھنک کے ساتھ اس کی دیوانگی آمیز ہسٹریائی چیخوں نے مجھے بھی رلا دیا۔

"بس میری جان۔ میری بہن۔ بس۔ میری بہادر بہن مت رو۔ مجھے کچھ دیر ہوگئی" میں نے اس کے ماتھے کو بالوں اور آنسو بھری آنکھوں کو پیار سے چومتے ہوئے کہا۔ اچانک اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہو گئیں اور دانت آپس میں جڑ گئے۔ میں نے چابیوں کے گچھے میں سے ہتھکڑی کی چابیاں تلاش کیں۔ اس کے بعد بیڑیوں کو کھولا اور پھر بے ہوش گل کو اٹھا کے باہر لے گیا۔

شور سن کے سونے والے اٹھ گئے مگر جب انہوں نے میری دیوانگی دیکھی اور اپنے افسر کی حالت دیکھی تو وہ پھر دم سادھ کے لیٹ گئے۔ میں نے لات مار کے ایک کو جگایا اور اس کی چادر چھین لی۔ اس چادر میں گل کو لپیٹ کر میں اس کمرے تک آیا جہاں انسپکٹر اور ڈی ایس پی ابھی تک بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔

میں ایک صراحی سے پانی انڈیل رہا تھا کہ ممتا چلایا مگر پلٹ کر دیکھنے اور سنبھلنے سے پہلے ہی ایک ڈنڈے کی ضرب میرے سر پر پڑی۔ میں نے اندھیرے میں ہاتھ پھیلائے اور سہارا لینے کی کوشش کی۔ یہ ڈی ایس پی تھا جو موقع کے انتظار میں سانس روکے پڑا ہوا تھا اور اس نے میرے سر پر لکڑی کا سیاہ رولر مارا تھا۔ گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں آگے جھکا۔ بے اختیار میں نے چیخ کر غالب کو آواز دی۔ پھر دوسرا ڈنڈا میری گردن کے پیچھے پڑا اور میں صراحی پر الٹ گیا۔ آخری آواز جو میں نے سنی وہ ڈی ایس پی کی گالیاں تھیں۔

میں ہوش میں آیا تو سب کچھ وہی تھا۔ میں وہیں لیٹا ہوا تھا جہاں گرا تھا اور نازو میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھی۔ میرے لاشعور میں ہنگامی صورت حال کے خطرات کا خوف تھا جس نے مجھے اتنے کم وقت میں پھر ہوش کی دنیا میں کھینچ لیا تھا۔ آنکھیں کھولتے ہی میں اٹھ بیٹھا اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کے کھڑا ہوگیا۔ زمین میرے قدموں کے نیچے متحرک لگتی تھی اور میری ٹانگیں میرے جسم کے بوجھ سے لڑکھڑا رہی تھیں۔ نازو نے مجھے سہارا دیا اور کرسی پر بٹھا دیا۔

پانی کے دو گھونٹ پی کر میں نے کہا "اس حرامزادے نے

www.paksociety.com

اچانک پیچھے سے حملہ کر دیا۔ غلطی میری تھی۔"

"چلو تم نے اتنا تو کیا کہ غالب کو پکار لیا۔ ہم نے تمہاری آواز سن لی تھی۔"

"غالب کہاں ہے؟" میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

"وہ مورچہ سنبھالے بیٹھا ہے۔" مازو نے کہا۔

گل بدستور بے ہوش پڑی تھی۔ میری نظر اور آگے گئی تو مجھے ڈی ایس پی نظر آیا۔ اس کا سر ایک دیوار پر ٹکا ہوا تھا اور اس کے خون کے چھینٹے اوپر تک نظر آ رہے تھے۔ مازو نے گولی مار کر اس کا خاتمہ کر دیا تھا۔ انسپکٹر کی پوزیشن نہیں بدلی تھی لیکن اس کی بے ہوشی میں کوئی شک نہیں تھا۔ اس کا دوبارہ ہوش میں آنا ممکن ہی نہ تھا۔ میز گرنے سے اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ ان کی لاشیں دیکھ کر میرے لبوں پر ایک مسکراہٹ آ گئی۔ میرے دل میں لگی ہوئی آگ کچھ سرد پڑ گئی۔

ممتا کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ہم تو فرار ہو جائیں گے بعد میں اس تمام کشت و خون کا خمیازہ وہ بھگتے گا کیونکہ اس نے شبنم باگ کو اندر بٹھایا تھا ورنہ پولیس کا پہرا توڑ کے کوئی جن بھی باگ مٹی کو نہیں لے جا سکتا تھا۔ وہ اتنا دہشت زدہ تھا کہ ہم سے کچھ کہتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا کہ کہیں ہم اس وحشت کے عالم میں اسے بھی ٹھکانے نہ لگا دیں۔

"اب کیا کرنا ہے؟" مازو نے کہا۔

"کیا کر سکتے ہیں ہم سوائے فرار ہونے کے۔ ہمارے پاس صبح تک کا وقت ہے۔" میں نے میز کی درازوں کو کھینچ کر کھولتے ہوئے اور اسباب باہر پھینکتے ہوئے کہا۔ آخر کار مجھے اسپرین مل گئی۔ میں نے پانی کے ساتھ چار گولیاں نگل لیں اور باقی جیب میں ڈال لیں۔

باہر جا کے میں نے غالب سے چارج لیا۔ وہ تھانے کی باقی نفری کو دیوار کے ساتھ ایک قطار میں لٹا کے ان کے سر پر ریوالور لئے کھڑا ہوا تھا۔

"تم جا کے گل کو اٹھا لاؤ۔" میں نے کہا "یہ ریوالور مجھے دے دو۔"

"کیسے نکلیں گے ہم؟" غالب نے کہا "اس حلیے میں اور ممتا کی گاڑی میں....."

میں نے کہا "سوائے پولیس کی وردی پہن کر نکلنے کے ہمارے پاس اور کوئی طریقہ نہیں۔ ابھی یہی کرو۔ آگے چل کے دیکھیں گے۔ گاڑیاں دونوں لے لو۔ ممتا کی اور ڈی ایس پی کی۔ عملے کو حوالات میں بند کر کے آفس کو باہر سے تالا لگا دو۔"

آدھے گھنٹے میں یہ سب کام ختم ہو گیا۔ حوالات میں چار پولیس مین بے بسی سے بیٹھے رہ گئے۔ ہم نے ان کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کے چابیاں جیب میں ڈال لی تھیں۔ اس حوالات میں لاشوں کو بھی منتقل کر دیا گیا تھا اور جاتے جاتے غالب نے ٹیلی فون کو تار سے الگ کر کے زمین پر دے مارا تھا۔

ڈی ایس پی کی وردی استعمال کے قابل نہیں رہی تھی۔ میں نے وردی انسپکٹر کی پہنی اور کندھوں پر نشانات ڈی ایس پی کے لگا لئے۔ غالب اور مازو نے سپاہیوں کی وردی پہنی مگر ممتا کو [illegible] لباس بدلنے پر مجبور نہیں کیا۔ اسے بعد میں اپنے بیان میں کہنا تھا کہ شبنم باگ ڈاکو نے جبراً اور دھمکی سے اس کو مجبور کیا تھا کہ وہ ان کی مدد کرے۔ ممتا اس علاقے کا معزز ترین آدمی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہی عذر آخر کار اس کی جان بچائے گا۔

ممتا نے اپنی کار کی ڈرائیونگ سنبھالی اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر مازو نے گل کو گود میں لٹائے رکھا۔ آگے غالب [illegible] کی جیپ کا سائرن آن کیا اور اس کی چھت پر نصب نیلی بتی گھومنے لگی۔ رات کے دو بجے ہم نے واپسی کا سفر اختیار کیا [illegible] سمت پھیلی ہوئی ویرانی اور خاموشی ہمارے ساتھ تھی [illegible] خطرات کے عفریت ہمارے تعاقب میں دوڑتے رہے [illegible] والے لمحے کا خوف ہماری راہ میں حائل رہا۔ غالب نے جیپ کی رفتار کو اسی میل پر رکھا اور ممتا نے اسی رفتار سے جیپ کا تعاقب کیا۔

ایک بار پھر ہم اس چیک پوسٹ سے گزرے جہاں آتے ہوئے ہمارے کاغذات دیکھے گئے تھے۔ اب وہاں موجود پولیس والوں نے دور سے سائرن کی آواز سن لی تھی اور اندھیرے میں گھومتی ہوئی نیلی روشنی دیکھ لی تھی چنانچہ وہ بے حد مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک ساتھ سلیوٹ کیا اور جیپ گولی کی طرح گزر گئی۔ [illegible] رفتاری میں وہ ڈی ایس پی کی صورت کیسے دیکھ سکتے تھے۔ ہماری معلومات تھی کہ دن کے اجالے میں شاید کسی اجنبی چہرے کی ایک جھلک بھی شکوک پیدا کر دیتی۔ وردی اور [illegible] ایس پی کی جیپ میں ڈی ایس پی کے سوا کون ہو سکتا تھا۔

مین روڈ پر آ جانے کے بعد میں نے کہا "مرزا جی، اب جلد از جلد اس جیپ اور ان وردیوں سے نجات پانا ضروری ہے۔"

غالب نے ایک دم بریک لگائے اور جیپ روک [illegible] حکم" وہ نیچے اتر کے بولا۔

ممتا نے بھی گاڑی روک لی تھی۔ میں اور غالب اس کی طرف چلے تو اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ [illegible] گلو خلاصی کے لئے ہمیں کیا کرنا ہو گا۔ اسے تو کچھ پوچھنے کا موقع [illegible] اور نہ کچھ کہنے کا۔ میں نے اچانک ریوالور مار کے اس کو ناک آؤٹ کیا اور جیپ میں ڈال دیا۔

اب غالب نے ممتا کی کار کو دوڑانا شروع کر دیا اور [illegible] گھنٹے میں ہم تیس چالیس میل دور نکل گئے۔

"اس میں فیول ختم ہونے والا ہے" غالب نے کہا [illegible] دو۔ یہ بڑی نیچرل سی بات ہو گی کہ ڈاکو ممتا کو مار کے اس کی کار لے گئے۔ جہاں فیول ختم ہوا وہاں وہ گاڑی بھی چھوڑ دی [illegible] طرح ممتا کی مجبوری اور بے گناہی شبہ سے بالاتر ہو جائے گی۔"

مازو نے کہا "یہ تو ہوش میں آنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔"

"فکر مت کرو۔ پہلے ہم خطرے کی حدود سے نکل جائیں۔ پھر علاج بھی کر لیں گے۔"

گاڑی نے ایک جھٹکا لیا تو میں سمجھ گیا کہ پیٹرول ختم ہو چکا ہے۔ [illegible] کے بعد دوسرا جھٹکا لے کر انجن کھانسنا شروع ہو گیا۔ غالب نے گاڑی کو سڑک سے اتار کے کھڑا کر لیا۔

"فکر مت کرو۔ ہم دوسری گاڑی کا بندوبست کرتے ہیں۔" میں نے [illegible] سڑک پر اتر کے کہا۔

ہم نے دو گاڑیوں کو روکا مگر ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے [illegible] ہم نے رسمی طور پر کاغذات چیک کئے اور انہیں جانے دیا۔ تیسرا نشانہ کار کا مارا تھا۔ ہم نے گاڑی روک کے اس سے کاغذات طلب کئے تو وہ اکڑ گیا۔

"میں ڈاکٹر ہوں۔"

"اس وقت تم ایک ڈرائیور ہو" میں نے کہا "ڈرائیونگ کے لئے بھی لائسنس ہونا چاہئے جیسے میڈیکل پریکٹس کے لئے۔"

اس نے گاڑی کے کاغذات پہلے ہی پیش کر دیئے تھے جو بالکل ٹھیک تھے مگر ڈرائیونگ لائسنس کے معاملے میں وہ مار کھا گیا۔

"دیکھو، دراصل میں جلدی میں گھر سے نکلا تھا۔ ایک مریض کو دیکھنے گیا تھا اس لئے لائسنس ساتھ لینا بھول گیا تھا۔"

"اب مریض کو دیکھ کر واپس گھر جا رہے ہو؟"

"ہاں" ڈاکٹر نے کہا۔

"پھر ہم ساتھ چلتے ہیں۔ گھر پر تو ہو گا نا لائسنس" میں نے دروازہ کھول کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آج مان جائیں" وہ گھبرا کے بولا "تم چالان کر سکتے ہو میرا۔ بیٹ نوٹ۔"

مگر بیٹ آؤٹ ہونے کی بجائے غالب بھی پیچھے بیٹھ گیا "گاڑی چلاؤ" میں نے غرا کے کہا "اور چلو تھانے۔"

وہ ایک دم گھبرا گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا "حضور، معمولی سی بات کو بڑھانے کا فائدہ۔ یہ لو" اس نے جیب سے [illegible] نکالا۔

ہم نے پولیس والوں کی طرح بے شرمی سے خوشی کا اظہار کیا "ایسا ہو سکتا ہے کہ معاملہ آپس میں طے ہو جائے لیکن یہاں نہیں۔ سڑک پر لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

ڈاکٹر حیران ہوا کیونکہ انکار کا [illegible] گزرنے والی گاڑیوں کے سوار مجھے [illegible] "جیسی مرضی تمہاری" اس نے ڈرتے ہوئے کہا اور ساتھ سڑک سے ہٹ کر دور چلا گیا۔

"[illegible] چابیاں مجھے دو" میں نے ایک جگہ رک کے ہاتھ بڑھایا۔

"کیا مطلب ہے۔"

مطلب سمجھانے کے لئے میں نے اس کے سر پر ریوالور مارا اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ چابی لینے کے بعد مجھے اس کے کپڑوں کا خیال آیا۔ مجھے احمد کی پگڑی محمود کے سر والا محاورہ بھی یاد آیا اور میں نے دس منٹ میں اس کو ڈی ایس پی بنا کے خود اس کے کپڑے بھی پہن لئے۔

غالب نے اتنی دیر میں گل اور مازو کو ڈاکٹر کی کار میں شفٹ کر دیا تھا۔ میں نے ڈی ایس پی کی وردی والے ڈاکٹر کو ممتا کی کار میں ڈالا اور ڈاکٹر کی کار کو واپس موڑ لیا۔

"یہ ہم نے کچھ ٹھیک نہیں کیا۔ آئندہ یہ ڈاکٹر کبھی رات کے وقت کسی مریض کو دیکھنے کے لئے نہیں جائے گا" میں نے کہا۔

"وہ ڈاکٹر نہیں تھا" غالب نے سوچ کے کہا۔

"یہ کیسے معلوم ہوا تمہیں؟"

"ڈاکٹر جب ایمرجنسی میں کسی مریض کو دیکھنے جاتے ہیں تو خالی ہاتھ نہیں جاتے۔ اسٹیتھوسکوپ کے علاوہ ان کے پاس ایک میڈیکل بیگ ہوتا ہے۔"

"میڈیکل بیگ ہو گا گاڑی میں۔"

"نہیں۔ آگے پیچھے کہیں بھی نہیں ہے۔ ڈکی میں تو ہونے سے رہا" غالب نے کہا۔

میرا احساس شرمندگی کچھ کم ہوا "پھر خواہ مخواہ رعب جھاڑ رہا تھا۔"

"صرف ڈاکٹروں اور اخبار والوں سے پولیس رعایت کرتی ہے۔ ڈاکٹر ہمیں کبھی رشوت پیش نہ کرتا" غالب بولا اور اس کا گلوز کمپارٹمنٹ کھول کے دیکھنے لگا۔

اندر سے بہت کچھ نکلا۔ غالب نے سامنے والی لائٹ جلائی اور کاغذات کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ ایک البم اور ایک نوٹ بک کے صفحات پلٹتا جا رہا تھا اور سر ہلا رہا تھا۔ نوٹ بک میں چند وزیٹنگ کارڈز بھی تھے۔

"یہ تو کمال کا آدمی تھا بھئی" غالب بولا "تم بھی دیکھو۔"

"میں گاڑی چلانے کے وقت صرف سڑک پر دیکھتا ہوں۔ تم ویسے ہی بتا دو۔"

"مجھے دکھاؤ کیا ہے" مازو نے پیچھے سے کہا۔

"یہ چیز عورتوں کے دیکھنے کی نہیں ہوتی۔ آرام سے بیٹھو" غالب نے اسے ڈانٹا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا "اس ریسرچ کے نتیجے میں جو میں نے ابھی کی ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ ایک بلیک میلر تھا۔"

"اتنے کم وقت میں ریسرچ مکمل ہو گئی" میں نے کہا۔

"اگر تمہیں ایک نوٹ دیا جائے تو تم کتنی دیر میں ریسرچ کر کے بتاؤ گے کہ وہ سو کا نوٹ ہے یا پچاس کا؟ کس ملک کی کرنسی ہے اور اصلی ہے کہ نقلی" غالب نے کہا "البم میں کچھ تصاویر ہیں۔ نام اور تاریخ کے ساتھ۔ نوٹ بک میں کچھ رقمیں درج ہیں۔ ان میں مجھے

www.paksociety.com

رہی نام نظر آئے اور کچھ رقوم کی تفصیلات اور دیگر حوالے۔"

میں نے گاڑی کو ناگپور سے پہلے ایک بغلی سڑک پر موڑ لیا۔ سنگ میل سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ ناگ پور بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت صبح کے چار بجے تھے اور ابھی ہمارے اطراف میں رات پوری طرح محیط تھی۔ ذخر شب کا چاند نکل آیا تھا چنانچہ میں ہیڈ لائٹس بجھا کے گاڑی چلا رہا تھا۔ سڑک پر تقریباً پانچ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے ایک بورڈ دیکھا یہ کوئی زرعی فارم تھا۔

میں نے کار کو کچے راستے پر اتار دیا اور زرعی فارم کے پیچھے لے گیا۔ پھر میں اور غالب اتر کے راہیں گئے اور سامنے سے زرعی فارم میں داخل ہوئے۔ تین طرف بھینسوں کے لئے نیچی چھت والے شیڈ بنے ہوئے تھے۔ چوتھی طرف ایک مکان کے عقبی حصے کی کھڑکیاں تھیں۔ یہ غالباً زرعی فارم کے مالک یا منیجر کا گھر تھا۔ دائیں جانب سے ایک گلی سی سامنے والے حصے کی طرف جاتی تھی۔ اندر خاموشی تھی اور تاریکی۔ میں اور غالب چوروں کی طرح گلی سے گزرے جو شاید پانچ فٹ چوڑی تھی۔ اس میں لمبائی کے رخ ایک ڈوری بندھی ہوئی تھی جس پر کپڑے دھو کر سوکھنے کے لئے ڈالے گئے تھے۔

میں نے غالب کو روک لیا "پہلے کپڑے بدل لیں یہاں پھر کسی اور گھر میں جا کے پناہ لیں۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا "ہم ایسے پولیس کے کپڑوں میں کوئی بھی ہمیں خوش آمدید نہیں کہے گا۔"

میں نے اطمینان سے نازو اور گل کے لئے کپڑوں کا انتخاب کیا۔ ساری بلاؤز اور پیٹی کوٹ۔ اس علاقے کا عام پہناوا یہی تھا غریب عورتیں چولی گھاگھرا استعمال کرتی تھیں۔ شلوار قمیص کا استعمال نہ ہونے کے برابر تھا۔

"میرے لئے تو یہی نائٹ سوٹ ملا ہے۔"

میں نے کہا "رات کے وقت نائٹ سوٹ ہی پہنا جاتا ہے سوٹ کہاں ملے گا۔"

ہم جس طرح دبے پاؤں گئے تھے اسی طرح واپس نکل آئے۔ بھینسوں کے ڈکرانے کے سوا وہاں کوئی آواز نہ تھی۔ اگر کوئی چوکیدار تھا تو رات کے آخری پہر میں کہیں لمبی تان کے سو گیا تھا۔ غالب نے تو نائٹ سوٹ وہیں بدل لیا تھا اور پولیس کی وردی جنگل میں دبا کے لے دیا تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وردیوں کو اس علاقے میں پھینکنا مناسب نہیں۔ دو چار کپڑوں کی چوری سے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر اسی جگہ پولیس کی وردیاں بھی پڑی ہوئی ملیں گی تو ہمارے راستے کی نشان دہی ہو جائے گی۔ جس گاؤں کے ایک تھانے میں ڈی ایس پی سمیت تین افسروں کا قتل اور شیش ناگ کا ایلی بسن ناگ منی کو چھڑا لے جانا ایسے واقعات نہیں تھے کہ پولیس رسمی کارروائی پر اکتفا کرتی۔ ناگ منی کے پکڑے جانے کی اطلاع بمبئی کے پولیس کمشنر تک پہنچ چکی تھی۔

نازو نے کار کے پیچھے رہ کے ساری پابندی کی اور ہم ادھر دوسری طرف کیے پُرسکون رات کے افق کو دیکھتے رہے اور لمبے لمبے سانس لے کر اپنے اعصاب کے لئے فضا سے سکون کشید کرتے رہے۔ میں نے ایک سگریٹ جلائی مگر وہ مجھے اتنی بدذائقہ لگی کہ میں نے ایک کش لے کر پھینک دی۔

گل کی بے ہوشی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ غالب کا خیال تھا کہ اتنا تشدد برداشت کرنے کے بعد یہ بے ہوشی کا وقفہ جسمانی توانائی کی بحالی کے لئے ضروری تھا اور جیسے ہی ہم کہیں رکنے کے قابل ہوئے گل کو ہوش میں لانے کے لئے کسی دوا کی نہیں صرف گرم چائے یا دودھ ہی کافی ہو گا۔

"گرم چائے کا نام مت لے بھائی" میں نے کہا اور اپنے ہاتھ پھیلا کے دائیں بائیں گھما کے جسم پر طاری ہونے والی تھکن اور سستی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ میں نے بہت تیز گاڑی چلائی تھی اور دو گھنٹے میں زیادہ سو میل کا فاصلہ ضرور طے کیا تھا۔ اب ذمے داری میں نے غالب کو سونپی۔

"دو چار میل کے بعد یہ گاڑی بھی چھوڑ دیں گے ہم" میں نے کہا۔

"اور اس کے بعد؟"

"ہم ناگپور کی مضافات میں ہوں گے" میں نے کہا "ہمارے حق میں یہی بہتر ہے کہ شہر میں داخل ہونے سے گریز کریں۔ کیا پتہ بعد میں جل گاؤں کے تھانے میں کیا ہوا۔ ممکن ہے کوئی ضرورت کے تحت گشت کرتا ہوا پہنچا ہو تو اس نے سب کو [illegible] یہ پولیس کے لئے انتہائی ذلت آمیز شکست ہی نہیں اپنے فرائض میں کوتاہی کی ایسی مثال ہے جس پر پولیس کمشنر سب کو برطرف کر دے گا۔ وہ پوری کوشش کریں گے کہ ہمیں پھر پکڑ لیں۔"

"اب یہ ناممکن ہے۔"

"ناممکن کچھ نہیں ہوتا مرزا جی اگر تقدیر ساتھ چھوڑ دے" میں نے کہا "ہم جگہ جگہ اپنی نشانیاں چھوڑ کے آ رہے ہیں۔ [illegible] جیب میں ملتا پڑا ہوا ہے۔ اس کے بعد جس سے ہم نے کار چھینی تھی وہ بھی کہیں تو فریاد لے کر جائے گا۔ یہ کار دریافت ہوئی تو ثابت ہو جائے گا کہ ہم ناگپور میں ہیں۔"

"پھر کیوں نہ اس کار کو غائب کر دیں۔"

"کیسے غائب کر دیں۔ جادو سے؟" نازو نے کہا۔

"جادو آتا مجھے تو اب تک تمہیں غائب کر چکا ہوتا" غالب نے کہا "یا خود غائب ہو جاتا اور پھر ایسے آتا کہ تمہارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی۔"

"یہ گاڑی کو آگ لگا کے تباہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اگر چھپانے کے لئے کوئی جگہ مل جائے۔"

"مل جائے گی" غالب نے کسی بوڑھ کر کی ما [illegible] ایک [illegible] ہو گا۔"

[illegible] ابھی ایک کچے راستے پر اتر گئی۔ ایک فرلانگ دور کسی کسان کا گھر نظر آ رہا تھا۔ اس کا کچا احاطہ خاصا وسیع تھا اور گارے [illegible] پانچ فٹ اونچی بد وضع دیوار حفاظت کے لئے نہیں [illegible] کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس میں دس فٹ جگہ کو [illegible] کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔

غالب نے گاڑی روک دی "خواتین یہاں اتر جائیں"

"میں اکیلی گل کو نہیں اٹھا سکتی" نازو نے کہا۔

"چلی لڑکی۔ زبان چلانے کے سوا بھی کچھ کر سکتی ہو تم" غالب نے نیچے اتر کے کہا۔

"سوچ نہیں ہے ورنہ میں بتاتی تمہیں" نازو نے کہا "میں بہت کچھ کر سکتی ہوں مگر۔"

میں نے گل کو کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے لٹا دیا "ہم ابھی آتے ہیں۔ [illegible]" میں نے کہا۔

اس وقت گل نے کراہ کے کہا "بھائی سکندر۔ مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔"

نازو نے خوش ہو کے کہا "گل۔ دیکھو میں نازو ہوں۔" میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا "میں کہیں نہیں جا رہا ہوں۔ گل ہم سب تمہارے پاس ہیں۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں اٹھنے لگا تو گل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "تم جا رہے ہو"

میں نے کہا "نہیں۔ میں تمہارے پاس ہوں۔"

"وہ پھر پکڑ لیں گے مجھے؟" گل کانپنے لگی۔

"یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ خدا کے لئے کچھ ہمت سے کام لو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ نازو تمہارے پاس ہے"

"مگر تم کہاں جا رہے ہو" گل چلائی۔

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "گل۔ میں چائے لینے جا رہا ہوں تمہارے لئے۔ وہ دیکھو سامنے ہوٹل ہے۔ گرم گرم اسٹرونگ چائے پی کر طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تمہاری۔"

نہ جانے اس نے اندھیرے میں کیا دیکھا اور کیا سمجھا لیکن یہ جھوٹ کام کر گیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ غالب اتنی دیر میں کسان کو بیدار کر چکا تھا۔ صبح کے ساڑھے چار بجے تھے اور وہ عمر رسیدہ کسان ویسے بھی اٹھنے ہی والا تھا۔

گل کی آواز پر وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔ اس نے [illegible] سب دیکھنے میں مقامی بولی میں کہا "یہ کون عورتیں ہیں بابو [illegible]"

غالب نے کہا "یہ ہمارے ساتھ ہیں۔ ایک بیوی ہے میری اور [illegible] بہن ہے"

"بیمار لگتی ہے"

"ہاں۔ اس کو ناگپور لے جا رہے تھے کہ گاڑی خراب ہو گئی" غالب نے کہا۔

"گاڑی تو خیر ہم رکھ لیں گے" وہ بولا "حفاظت بھی کریں گے مگر آپ شہر کیسے جاؤ گے؟"

میں نے کہا "صبح دیکھیں گے کوئی سواری مل جائے" اس نے افسوس سے سر ہلایا "اور صبح تک کیا اس کو یہاں لٹائے رکھو گے زمین پر۔ کھلے آسمان کے نیچے"

غالب نے کہا "اور کہاں لے جائیں۔ یہاں کوئی ہوٹل تو ہے نہیں۔"

"ارے بابو۔ ہم اس خراب گاڑی کو رکھ سکتے ہیں تو کیا بیمار عورت کو نہیں رکھ سکتے" دیہاتی نے کہا "ہمارا گھر چھوٹا ہے مگر دل اتنا چھوٹا نہیں ہے۔ آپ کی شان خراب نہ ہو تو اندر آ جاؤ۔ غریب کے گھر میں۔ صبح ہم خود چھوڑ آئیں گے تمہیں جہاں بولو گے۔"

شرمندہ ہو کے میں نے گل کو اٹھایا اور ہم چاروں اس دیہاتی کے پیچھے پیچھے گھر کے کچے آنگن سے گزرے۔ اس کا کچی دیواروں والا مکان دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ہمارے داخلی انداز سے اس کا سارا خاندان اٹھ گیا تھا۔ چار ہکا بکا بچے اور ایک بدحواس عورت صبح سے پہلے نمودار ہونے والے مہمانوں کو دیکھ رہے تھے۔ میلے کچیلے بچے نیم برہنہ تھے۔ عورت جوانی میں بوڑھی ہو گئی تھی اور بکھرے بالوں کے ساتھ بھتنی نظر آتی تھی۔ افلاس اور تنگی حالات کے ساتھ صرف بدصورتی جنم لیتی ہے خواہ وہ احساس کی ہو۔ اظہار کی یا وجود کی۔

سب بچے جو ایک کمرے میں خشک گھاس کے فرش پر محو خواب تھے اب دوسرے کمرے میں اکٹھے ہو چکے تھے اور یہ کمرا معزز مہمانوں کے لئے وقف کر دیا گیا تھا جس کی کل کائنات مٹی کا ایک گھڑا اور طاق میں رکھے ہوئے چند برتن تھے۔ گل کو گھاس پر لٹانے کے بعد میں نے اور غالب نے باہر کا رخ کیا اور گاڑی کو دھکا لگاتے ہوئے صحن میں لے آئے۔ کسان کے سب بچوں نے اس دلچسپ اور سنسنی خیز کام میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ ان کے گھر میں ایک کار کا آنا ایسا ہی تھا جیسا کسی فقیر کی جھونپڑی میں راجہ کا مع تخت کے اتر آنا۔

ہم نے گاڑی کو آخری گوشے میں بھوسے کے ڈھیر کے پاس کھڑا کیا تو سب بری طرح ہانپ رہے تھے

غالب نے کہا "ہم شہر سے مستری لے آئیں گے کل پرسوں تک۔ پہلے ہمیں اس کو ہسپتال لے جا کے داخل کرانا ہے۔ اس وقت تک تم گاڑی کا خیال رکھو گے۔"

"آپ بالکل فکر مت کرو جی۔"

"گاڑی بہت نازک اور قیمتی چیز ہوتی ہے" غالب نے کہا "کسی نے اس کو بلاوجہ چھیڑا تو..."

"مجال ہے کسی کی جو قریب بھی آ جائے۔"

"تمہارے بچے..... کسی کو کچھ نہ بتائیں تو اچھا ہے۔ ورنہ ہر

www.paksociety.com

شخص اسے دیکھنے آئے گا تو تمہارے لئے اس کی حفاظت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ کس کس کو منع کرو گے تم۔ بہتر یہ ہو گا کہ تم اس کے اوپر کچھ ڈال دو۔ تاکہ یہ باہر سے نظر ہی نہ آئے۔"

"ترپال ہے میرے پاس" وہ بولا۔

میں نے ایک ہزار روپے نکال کے آگے بڑھا دیئے "یہ بہت بڑی ذمے داری ہے۔ گاڑی کو چھونے بھی نہ پائے کوئی۔"

اس نے ایک بار پھر ہمیں یقین دلایا کہ اگر بچوں نے کسی سے کچھ کہا تو وہ ان کی زبان جلا دے گا اور جھپٹ کر ایک ہزار مٹھی میں دبا لئے۔ پھر اس نے بہ آواز بلند اپنی اولاد کے سامنے اعلان کیا کہ کسی نے بھی باہر کوئی بات کی تو وہ کیا کرے گا۔ دھمکی میں زبان جلانے سے کہیں زیادہ سنگین نتائج کا ذکر تھا مگر ناقابل اشاعت زبان میں۔

ترپال ہمارے سامنے ہی گاڑی پر پھیلا دیا گیا تھا۔ یہ غالباً کھلیان کو بارش سے بچانے کے کام آتا تھا۔ کار بھی اب بھوسے کا ایک ڈھیری لگتی تھی۔ اس کچے گوبر اور گھاس کی بو والے تاریک کمرے میں پہنچ کے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں تعاقب کرنے والے شکاری کتوں سے بچ کے اپنے گھر کے محفوظ حصار میں داخل ہو گیا ہوں جہاں وہ میری بو تک نہیں پا سکتے۔ سکون اور طمانیت کے ناقابل بیان احساس نے سب کو مغلوب کر لیا تھا۔ میں نے اور غالب نے اپنے جوتے موزے اتارے اور دیوار سے ٹیک لگا کے پاؤں پھیلا دیئے۔

ہماری خواہش پر کسان کی بیوی نے چائے بنائی۔ یہ دیسی شکر اور خالص تازہ دودھ کی چائے تھی جس کا ہر گھونٹ مفرح تھا۔ میں نے جیب سے اسپرین نکال کے گل کو دی اور پھر گرم پانی منگوایا۔ نازو نے گرم پانی میں کپڑا بھگو کے گل کے چہرے اور جسم کو صاف کیا۔ وہ کراہتی رہی اور روتی رہی۔ صادق اور اس کی بیوی حیران پریشان ہونے کے باوجود خاموش رہے۔ یہ ایک ہزار روپے ان کو کتنے مہنگے پڑ سکتے ہیں اس کا ابھی انہیں کوئی اندازہ نہ تھا۔

ہم نے صبح کا اجالا پھیلنے تک آرام کیا پھر کسان کی بیوی نے تھوپ کے بھاری بھرکم پراٹھے بنائے اور گھر کے خالص مکھن کا پیالہ بھر کے ہمارے سامنے رکھ دیا۔ وہ ہمیں لسی پلانے کے موڈ میں تھی مگر ہم نے اسی صحت بخش توانائی سے بھرپور چائے کو ترجیح دی جس کے پہلے دور نے ہماری تھکن بھی زائل کی تھی اور کچھ پیٹ بھی بھر دیا تھا۔

نازو نے جذباتی ہو کے کہا "کیسے مہمان نواز لوگ ہیں کہ بچھے جا رہے ہیں۔"

غالب نے کہا "یہ سب ایک ہزار سکہ رائج الوقت کا کمال ہے۔"

"یہ ان کے خلوص پر تہمت ہے" نازو نے کہا "تم جیسے شہری ان سادہ دل لوگوں کو زر خرید سمجھ لیتے ہیں۔"

"صادق اب آدھے شہری ضرور ہیں۔ تمہیں شاید وہ شہر کے قریب رہتے ہیں" میں نے کہا۔

"اتنا ہی مہمان نواز ہوتا تو ایک ہزار پر یوں نہ جھپٹتا جیسے چیل گوشت پر جھپٹتی ہے" غالب نے کہا "یا تم جیسی فضول لڑکیاں میرے جیسے ہمہ صفت ہیرو پر جھپٹتی ہیں۔"

نازو نے بھی جل بھن کے کہا "جھپٹتی ہے میری جوتی۔"

"بابا میں نے تم سے تو کچھ نہیں کہا۔ تم کیوں بولنے لگ رہی تھیں۔"

"فضول لڑکی تو کہا ہے مجھے۔"

"سچ بولنا میری عادت ہے" غالب نے کہا "اور سچ کڑوا ہوتا ہے۔"

"تم سے زیادہ فضول آدمی ہے کوئی۔"

"ہاں۔ میرا سسر تھا" غالب نے کہا "آج کل بھوت بن کے میرے پیچھے پھرتا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "کیوں پیچھے پیچھے پھرتا ہے؟"

"کہتا ہے خدا کے لئے میری بھتیجی بیٹی سے شادی کر لو۔ مجھ کہاں چڑیل ہے وہ۔"

نازو نے چراغ پا ہو کے کہا "بتاؤں تمہیں کیا ہوں میں۔"

"ابھی تم تو نازو ہو۔ نازک اندام۔ ناز آفریں۔ نازنی بیگم۔ تمہاری بات تو نہیں کر رہا تھا" غالب نے دانت نکال کے کہا۔

"باہر چلو پھر بتاؤں گی تمہیں" نازو نے دانت پیس کے کہا۔

کسان فیملی ہماری گفتگو بہت غور سے سن رہی تھی۔ میں نے بھی کام کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ باہر سورج طلوع ہو رہا تھا مگر کمرے میں ابھی تک لالٹین جل رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ پناہ کے لئے یہ جگہ بری نہیں مگر ہماری روپوشی کسان کے گھر میں شک پیدا کر سکتی تھی۔ ویسے بھی یہ بہت مشکل نظر آتا تھا کہ اس کے بیوی بچے صبح دم کار میں آنے والے مہمانوں کا کہیں بھی ذکر نہ کریں۔ کار وہاں دو چار دن بالکل محفوظ تھی مگر نواح کے سب لوگ اس کا دیدار کر جاتے۔ پولیس کا کھوج لگاتے ہوئے یہاں تک پہنچنا بھی تقریباً ناممکن تھا۔ شاید انتظار کرنے کے بعد کسان پریشان ہو گا اور کسی کے مشورے پر پولیس کو ہمارے بارے میں کچھ بتانے پر مجبور ہو گا۔ اس وقت نہ جانے ہم کہاں ہوں گے۔

میں نے روانگی کا ارادہ ظاہر کیا تو کسان نے کہا کہ اس کی ایک بیل گاڑی بھی ہے مگر ہم تانگے میں جانے کو ترجیح دیں تو تانگہ بھی حاضر کر سکتا ہے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ بستی سے تانگہ لے آیا۔

"چار سو روپے میں مانا ہے" وہ عیاری سے بولا۔

"کتنی دور ہے شہر یہاں سے؟" میں نے کہا۔

"پانچ چھ کوس تو ہو گا۔"

"چار سو تو بہت زیادہ ہیں۔" میں نے کہا "خیر"

"پچاس روپے اور دے دیں۔"

"ارے کس بات کے۔"

"چائے کھانے کے" کسان نے کہا۔

میں نے نازو کی طرف دیکھا "ہم نے پانی بھی پیا تھا۔ اس کے پیسے نہیں لگائے تم نے اور کمرے کا کرایہ۔"

وہ ڈھٹائی سے بولا "آپ کی مرضی ہے سو دے جائیں۔ بڑے جوان اور دیاوان ہیں۔"

"دیکھی ان کی سادہ دلی۔ نیک نیتی اور مہمان نوازی" غالب نے نازو سے کہا جو سخت خفا نظر آتی تھی۔

تانگے میں روانہ ہونے کے بعد نازو نے کہا "اچھا ہے بعد میں اس نے ایک ہزار جوتے لگائے اور ایک ہزار پیاز کھائے۔"

تانگے والے نے کہا "بڑا بدمعاش ہے یہ بی بی۔ اب دیکھو نا یہ گھوڑا میرا۔ مجھ سے بھی آدھے پر سودا کیا اس نے۔ دو سو مفت میں لے لئے۔ ورنہ کہتا تھا کہ دوسرے تانگے والے سے بات کروں گا۔"

میں نے کہا "کاروبار میں یہی ہوتا ہے۔"

"دوست بھی بناتا ہے" وہ گالی دے کر بولا۔

میں نے کہا "دوستی اور بیوپار ایک ساتھ نہیں چلتے۔ یہ بتاؤ تال پور کتنی دور ہے یہاں سے۔"

"ویسے تو تال پور میں ہی ہو آپ لیکن کوئی خاص جگہ بتاؤ۔"

میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "وہ جو کچہری کے پیچھے کا علاقہ ہے۔ میں نام بھول رہا ہوں۔"

اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر بیٹھا۔ کچہری کس شہر قصبے میں نہیں ہوتی۔ تانگے والے نے سر ہلایا "میں سمجھ گیا۔ اب جو صاف راستہ ہے جی۔ وہ ذرا لمبا ہے۔ اس پر موٹریں گاڑیاں چلتی ہیں۔ دوسرا پرانا راستہ۔ اس پر تانگے آخر تک جا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "پھر تم پرانے راستے پر ہی چلو۔"

"کون سے ہسپتال جاؤ گے؟"

میں نے کہا "ابھی تو کسی کے گھر جانا ہے۔"

"پتا ہے آپ کے پاس۔"

"ہے بھائی۔ تم کیوں پریشان ہو" میں نے کہا۔

اس کے بعد وہ نہیں بولا۔ تانگہ بہت ٹوٹی پھوٹی سڑک پر چلتا رہا جس پر موٹر سائیکلیں اور رکشا بھی آ جا رہے تھے۔ میں گل کو سنبھالے پیچھے بیٹھا تھا تاکہ سامنے کہیں پولیس ہو تو سب سے پہلے مجھ پر نظر نہ آئے۔ غالب اور نازو کو جل مکوؤں کے تھانے میں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ غالب اپنے ٹائٹ سوٹ میں خود کو مضحکہ خیز محسوس کر رہا تھا مگر اور کسی کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہاں اس سے زیادہ عجیب و غریب کپڑے پہننے والے ہر طرف پھر رہے تھے۔ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی نہ فرصت تھی اور نہ

ایک بازار سے گزر کے میں نے تانگہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ وہ چار سو لے کر رخصت ہو گیا تو میں نے گل کو سہارا دے کر کچھ اور پیدل چلنے پر مجبور کیا۔ ہم کسی سے کچھ پوچھے بغیر ایک گلی میں گھس گئے۔ میری نظر پرانے مکانوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ متوسط طبقے کی ملی جلی آبادی تھی اور ہندو ناموں کے ساتھ کہیں کہیں مجھے مسلمانوں کے نام بھی دروازوں کی تختی پر نظر آ گئے۔

گلی ایک اور سڑک کا شارٹ کٹ ثابت ہوئی میں نے وہاں سے دوسرا تانگہ پکڑا اور اسے ریلوے اسٹیشن چلنے کو کہا مگر تانگہ ابھی دو فرلانگ ہی چلا ہو گا کہ میں نے اسے روک لیا اور دس روپے دے کر رخصت کر دیا۔ مجھے ایک مسجد کے ساتھ بنے ہوئے مکان پر "حافظ قاری عادل شاہ نکاح خواں" کا بورڈ نظر آ گیا تھا۔

غالب نے کہا "میں ابھی تک بے مقصد بھٹکنے کا مقصد نہیں سمجھا۔"

"سمجھو گے کیسے۔ اس کے لئے عقل چاہئے" نازو نے کہا۔

"ایک محاورہ ہے کہ چھاج بولے سو بولے۔ چھلنی کیا بولے جس میں تو سو چھید" غالب نے کہا۔

میں نے مدرسے میں چند طالب علموں کو دیکھا جو قرأت کے ساتھ تلاوت کر رہے تھے اور اللہ کا نام لے کر دروازے پر دستک دے دی۔

اندر سے برآمد ہونے والے ساٹھ سال کے گھنی سفید داڑھی والے شخص نے مجھے غور سے دیکھا اور میرے سلام کا جواب دیا۔

"میں نے پہچانا نہیں آپ کو۔"

"آپ نے مجھے کبھی دیکھا ہی نہیں حافظ صاحب" میں نے کہا "ہم مسافر ہیں۔ مشرقی پاکستان سے جان بچا کے آئے ہیں۔"

"یہاں۔ تال پور میں کس کے پاس آئے تھے" وہ حیران ہو کے بولا۔

"جن کے پاس آئے تھے وہ ملے نہیں۔ خواتین ساتھ ہیں ورنہ آپ کو زحمت نہ دیتے۔ مسجد میں ٹھہر جاتے یہ بتا دیں کہ شرفا کے لئے یہاں کوئی سستا اور اچھا ہوٹل ہے۔"

"سستا اور اچھا... یہ تو متضاد باتیں ہیں۔ اگر سستا ہو گا تو اس قابل نہیں ہو گا کہ وہاں شریف عورتوں کے ساتھ کوئی ٹھہر سکے" حافظ جی نے کہا۔

میں نے کہا "میری بہن بیمار ہو گئی ہے سفر میں۔ اس کے ٹھیک ہونے تک ہم آگے نہیں جا سکتے۔"

"آگے کہاں؟"

"جانا تو پاکستان ہی ہے قاری صاحب بڑے دھکے کھاتے یہاں تک پہنچے تھے۔ پیسہ بھی ہے ہمارے پاس مگر ہم اجنبی ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں ٹھہریں۔"

"دیکھو میاں۔ تمہارا مسئلہ تو میری سمجھ میں آ گیا" انہوں نے عادتاً داڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہا "لیکن.... میرا یہ گھر تو بہت چھوٹا

بے دردی میں تمہیں سر آنکھوں پر۔ ہاں۔ ایک صورت ہے۔"

میں نے کہا "وہ کیا؟"

"یہاں ایک گھر خالی ہوا ہے۔ اس کا مالک مکان بھی ویسے تو مسلمان ہی ہے مگر پیسے اور لین دین کے معاملے میں ذرا سخت ہے۔ تم ویسے بھی اجنبی ہو مگر میں کہوں گا تو شاید وہ تمہیں اس گھر میں ٹھہرنے کی اجازت دے دیں۔"

میں نے کہا "آپ کی بڑی عنایت ہوگی قاری صاحب۔ ہم بس دو چار دن قیام کریں گے اور انہیں شکایت کا کوئی موقع نہیں فراہم کریں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔ وہ کرایہ لے گا پورے مہینے کا چار سو روپیہ۔"

میں نے کہا "ہم دے دیں گے۔ ہوٹل سے تو بہتر ہے کہ شرفا کے محلے میں رہیں۔"

"بس تو پھر آؤ میرے ساتھ۔ اللہ کارساز ہے۔ مجھے تم شریف آدمی لگتے ہو اور مصیبت زدہ ہو مگر دنیا کا چلن بہت بگڑ گیا ہے میاں۔ جس پر کوئی اعتبار کرے وہی دھوکا دے جاتا ہے۔ کون سچا ہے کون جھوٹا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہر روز آجاتے ہیں نئے لوگ اپنی دکھ بھری کہانی لے کر۔ سیلاب میں گھر بہہ گیا۔ کسی نے جیب کاٹ لی۔"

میں رک گیا "دیکھئے۔ اگر بالواسطہ طور پر آپ یہ کہنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہم بھی بھیک مانگنے والے ہیں اور۔۔۔۔۔"

انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "میاں میں اپنی بات بتاؤں۔ میں نے ستر سال گزار دیئے دنیا میں انسانوں کو پرکھتے۔ جو بچے مجھ سے پڑھتے رہے اب ان کے بیٹے پوتے یہاں دین کا علم حاصل کرنے آتے ہیں۔ میں صورت پر جھوٹ سچ شرافت اور مقارات کو پڑھ لیتا ہوں۔ تم پر شک ہوتا تو تمہاری ذمے داری قبول کر کے ساتھ نہ چل پڑتا۔ وہیں تم سے معذرت کر لیتا۔ چلو۔"

میں نے شرمندہ ہو کے پھر ان کے ساتھ چلنا شروع کیا۔ گل اگرچہ سب کا ساتھ دے رہی تھی مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ رات سے اب تک نہ اسے آرام ملا تھا اور نہ علاج۔ اس نے ایک گاڑی سے دوسری گاڑی میں جھٹکے کھاتے سینکڑوں میل طے کئے تھے۔ پھر تانگے میں اور اب پیدل چلنے سے اس کی رہی سہی جسمانی قوت مدافعت بھی جواب دے چلی تھی۔

جب حافظ صاحب ایک مکان کے سامنے رکے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ مالک مکان نے اوپر سے جھانک کے دیکھا اور پیش امام کو دیکھ کر فوراً نیچے آگیا۔ مکان دینے کی بات پر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"کسی اجنبی کو مکان دے دوں؟ حافظ جی۔ کسی مصیبت میں نہ ڈال دینا۔ بعد میں پولیس آجائے کہ یہاں پاکستانی جاسوس چھپے ہوئے ہیں۔"

"خدا کا خوف کرو۔ ان کی حالت دیکھو ذرا۔ بے چارے لٹ پٹ کے یہاں پہنچے ہیں" حافظ جی نے کہا "تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں لا سکے۔ ہم اور تم بھی غیروں جیسا سلوک کرنے لگیں تو ان کے ساتھ تو یہ کہاں جائیں گے۔"

"آپ کہتے ہو تو۔ آپ کی ذمے داری پر میں گھر کھول دیتا ہوں لیکن کرایہ پھر کہاں سے دیں گے یہ لوگ اگر خالی ہاتھ بھاگ کر آئے ہیں؟"

"کرایہ دیں گے ہم" میں نے کہا "کچھ زیور ہے۔"

غالب نے کہا "میری بیوی کا زیور ہے۔"

"اور میری بہن کا" میں نے کہا۔

"نا بھائی۔ نقد کی بات ہے۔ چوری کے الزام میں نہ پکڑا جاؤں میں۔ نیکی گلے پڑ جائے۔"

میں نے نقد رقم اس کے ہاتھ پر رکھ دی "بڑے افسوس کی بات ہے۔ کیا ہم صورت سے چور نظر آتے ہیں۔ ہم تو اس لئے بچا رہے تھے کہ ضرورت کی چیزیں خرید لیں۔ تم کو سب [illegible] ہوں گے۔ ہم زیور بیچنے گئے تو۔"

حافظ جی نے میری کندھے پر ہاتھ رکھا "میاں اللہ پر بھروسہ رکھو۔ صاحبوں کا تو کام ہی یہ ہے۔ زیور رکھ کے ادھار دیا ہے۔ آرام سے بیٹھو جاؤ پھر یہاں فکروں میں پڑنا۔"

دو کمروں کے اس گھر میں جو سرائے محمد علی کے پیچھے اندر واقع تھا مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے ماضی کے آسیب سے نکل کر محفوظ مستقبل کی جانب پہلا قدم بڑھا رہا ہوں۔ میدان جنگ سے موت و زیست کی کشمکش۔ خطرات کے خلاف معرکہ آرائی دور کی رزم گاہ میں ثابت قدمی کی جدوجہد۔ سب سے دور یہ ایک جگہ ہے جہاں عافیت ہے اور سکون کی ضمانت ہے۔ یہ جانے احساس تھا۔ کیا یہ علامت تھی اس بات کی کہ میں ذہنی طور پر تھک گیا ہوں۔ مایوسی مجھ پر غالب آنے لگی ہے اور میں شکست خیال سے مفاہمت کرنا چاہتا ہوں۔ جنگ تو ابھی جاری تھی وہ ابھی تمام نہیں ہوا تھا۔ یہ میری منزل بھی نہ تھی۔ پھر یہ احساس کیوں۔ کم ہمتی اور شکست خوردگی کے جذبات کی یلغار کیوں۔ اداسی کا بوجھ کیوں۔ کیا اس لئے کہ آغاز سفر میں جو ساتھی تھے ایک ایک کر کے چھوڑ گئے تھے۔ آخری آدمی وہ تھا جو میرا دایاں ہاتھ تھا۔ محسن لاپتا تھا۔ گل بیمار تھی۔ شہلا تھی ایک الزام تھی جس کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ رابعہ میری [illegible] چھوڑ گئی تھی۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھا تو ان سب کو یاد کر کے میرا دل بھر آیا جو میری روداد میں شریک تھے مگر منزل تک نہ پہنچ پائے۔ استاد [illegible] ایس ایس پی رضوی صاحب تک اور [illegible] تک [illegible] جو مختلف ادوار کی پرچھائیں بن گئے تھے۔

ضبط کا بند ٹوٹا تو سیل اشک مجھے بہا کر لے گیا اور [illegible] ڈپریشن کے دورے نے میرے وجود کو ناامیدی کے گرداب میں [illegible] رہا۔

غالب اور نازو پریشان ہو گئے تھے کہ آخر مجھے کیا ہو گیا ہے۔ خود گل مجھے تسلی دے رہی تھی مگر میں اپنے آنسوؤں کو روکنے میں ناکام تھا۔

"یار سکندر۔ یہ اچانک کیا ہو گیا تجھے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ میں خود بھی نہیں جانتا کہ اس مایوسی اور خوف کا کیا سبب ہے" میں نے آخر کار خود کو سنبھالا "پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا [illegible]۔ ہم ہار گئے۔ مجھے جدوجہد بے معنی لگنے لگی۔ مستقبل سراب کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ جس کے پیچھے ہم دیوانوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔"

"یہ سب اعصابی دباؤ کا نتیجہ ہے" غالب نے فیصلہ دیا "ایک دن رات آرام کرنے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے سر ہلایا "خدا کرے ایسا ہی ہو۔ اب تو میرا دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ دوں۔ یہیں سے واپس چلا جاؤں۔ ہم چوہدری وناواہ پیڈو اور تریونی جیسے لوگوں سے کبھی نہیں جیت سکیں گے۔ ان کا اتنا بھی نقصان ہو جائے۔ وہ برداشت کرتے رہیں گے۔ ان کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔"

غالب کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ نازو کی صورت پر ناامیدی کی پرچھائیاں نظر آنے لگی تھیں اور گل خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ اپنی باتوں سے میں نے ان کو مایوس کیا تھا۔ وہ میرے پیچھے چلتے تھے۔ رہنمائی کے لئے میری طرف دیکھتے تھے۔ میں راستے کا پتا بتاتا تھا اور منزل کا نشان دیتا تھا۔ میرے بغیر وہ صحرا کی بے سمت ویرانی میں بھٹکنے والے مسافر کی طرح تھے۔

میں نے کہا "دوستو۔ مجھے معاف کر دو۔ جو کچھ میں نے کہا بھول جاؤ کیونکہ وہ غلط تھا۔ پاگل پن کا دورہ تھا۔ بوجھ برداشت کی حد سے بڑھ جائے تو آدمی لڑکھڑا کے گر جاتا ہے۔ میں بہرحال انسان ہوں۔ فولادی اعصاب نہیں رکھتا۔"

"ایسا ہی کسی دن میرے ساتھ ہوگا۔ تو سب کے ساتھ ہوا۔ نروس بریک ڈاؤن" غالب نے کہا۔

"میں تمہیں ناقابل شکست سمجھتی تھی سکندر" نازو بولی۔

"کوئی آدمی ناقابل شکست نہیں ہوتا۔ بڑے سے بڑے پہاڑ کو بھی زلزلے سے دراڑیں پڑ جاتی ہیں" میں نے کہا "پھر بھی۔ مگر آج اپنی اس کیفیت کو خود نہیں سمجھ سکا۔ یاد ماضی نے اس طرح کبھی میرے احساس کو شکست نہیں دی تھی۔"

غالب نے کہا "اب ہم اس وقت تک یہاں رہیں گے جب تک نارمل نہیں ہو جاتے۔"

"کیا اس وقت ہم نارمل نہیں ہیں؟" نازو نے کہا۔

"نہیں۔ ہم پاگل پن کے قریب ہیں" غالب نے کہا "ہم پہلے محسن کو تلاش کریں گے۔ شہلا کا پتا چلا لیں گے۔"

"کیسے؟ ابھی تو محسن کا بھی پتا نہیں" نازو نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے" گل نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بے حس و حرکت بیٹھی مقابل کی دیوار کو گھور رہی تھی۔

"کیا معلوم ہے؟" نازو نے کہا۔

گل نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

"گل۔ ادھر دیکھو۔ مجھے بتاؤ کیا معلوم ہے تمہیں؟" میں نے کہا "محسن کہاں ہے۔"

وہ چونکی "میں۔ مجھے نہیں معلوم۔"

"مگر ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں معلوم ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگی "نہیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔"

اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ ذہنی صدمے کی شدت ہی کم نہ تھی کہ اسے فرار میں ہمارے ساتھ سفر کی صعوبت برداشت کرنی پڑی۔ ہم سب عجب بے سروسامانی کی کیفیت میں خالی فرش پر خالی ہاتھ اور خالی ذہن لئے بیٹھے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے دشوار گزار پہاڑوں کی بلندی کا جان لیوا سفر اچانک ختم ہو گیا ہے۔ آگے کچھ نہیں۔ محض خلا ہے جس کی گہرائی اور وسعت کو عبور کئے بغیر آگے بڑھنا ممکن ہی نہیں رہا۔

ہم کہاں سے چل کر کہاں آ گئے۔ کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ اس ویران گھر کے سرد سفاک سناٹے میں ہمت کیوں ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ میں نے سوچا۔ کیا اتنا ہی حوصلہ تھا میرا زاد راہ۔ امید کی اتنی ہی روشنی تھی۔ نہیں۔ اس پڑاؤ کو منزل نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہم سب کو آگے جانا ہے۔ پھر ایک مرکز پر اکٹھا ہونا ہے اور ایک مقصد حاصل ہونے تک جدوجہد کو جاری رکھنا ہے۔

میں نے کہا "مس نازو۔ تمہارے پاس کیا ہے۔"

اس نے مجھے حیران ہو کے دیکھا "کیا ہے؟"

"ہاں۔ دنیاوی مال و متاع کا کیا حساب ہے۔ کتنا ہاتھ کا میل ہے اور کتنا سیم و زر۔"

اس نے کہا "پیر صاحب کی عنایت سے ہم لکھ پتی ضرور ہیں۔ جو کچھ ہے اس بیگ میں ہے۔"

میں نے بیگ کھول کے دیکھا۔ اس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے اور وہ سب زیور جو میں نے ایک جعلی پیر کو سزا دینے کے لئے چھینے تھے۔ یہ دولت بہت بڑا سہارا تھی۔ ہم صورت سے لٹے پٹے نادار اور غریب الوطن نظر آتے تھے مگر ہمارے پاس اسلحہ بھی تھا اور ہم اپنا دفاع کرنا جانتے تھے۔ ہم حالات کا مشکل ترین دور گزار چکے تھے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم نئے عزم کے ساتھ پھر اپنی منزل کی جانب گامزن نہ ہوں۔ میری وقتی مایوسی نے سب کو دل گرفتہ کر دیا تھا۔ اب میں ہی انہیں پھر نیا حوصلہ دے سکتا تھا۔

"ابھی گیارہ بجے ہیں" میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی "تم یہاں ٹھہرو۔ میں اور غالب بازار جا کے ضرورت کا کچھ سامان لاتے ہیں۔ کھانا تو خیر پکا پکایا بھی آجائے گا مگر سونے کے لئے بستر اور پہننے کے لئے کچھ کپڑے۔"

www.paksociety.com

اوپر سے مالک مکان نے نیچے آ کے دروازہ بجایا۔ زینے کا دروازہ اندر ہی کھلتا تھا۔

"معاف کرنا اس وقت حافظ جی کے سامنے کوئی بات نہیں ہو سکی" وہ بولا "کرائے کی رسید کس کے نام سے بناؤں۔"

میں نے کہا "میرے نام سے بنا دیں۔ شرافت علی خان"

"ولد؟" وہ بولا اور رسید بک میں کچھ لکھنے لگا۔

میں نے کہا "لطافت علی خان۔"

اس نے رسید پھاڑ کے میری طرف بڑھا دی "یہ رسمی سی کارروائی تو کرنی ہی پڑتی ہے" وہ بولا "یہاں بھی دستخط کر دیں۔"

"یہ کیا ہے؟"

"کرایہ نامہ۔ گیارہ مہینے کا" وہ بولا "خالی کرنے سے پہلے ایک مہینے کا نوٹس دینا ہوگا۔"

میں نے دستخط کرنے کے بعد کہا "سمجھ لیں کہ میں نے نوٹس دے دیا۔ ہم مہینہ بھر کیا ایک ہفتہ بھی نہ رہیں شاید۔"

"وہ کیوں۔ مکان پسند نہیں آیا یا کرایہ زیادہ ہے؟"

میں نے کہا "دیکھئے۔ ہم تو ایک عزیز کے پاس قیام کرتے مگر وہ گئے ہوئے ہیں عمرہ کرنے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے ہم پاکستان چلے جائیں ان کی واپسی سے پہلے ہی۔"

"اچھا اچھا.... میرا نام اصغر علی ہے۔ میرا بھی آدھا خاندان کراچی میں ہے" وہ بولا "ابھی تم لوگوں کے پاس کچھ بھی نہیں۔ خیر میں بستر بھجوا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "اس کی ضرورت نہیں۔ ہم خرید لیں گے سب"

"کیا کرو گے چند دن کے لئے گھر گرہستی کا سامان لے کر۔ بس ناشتا آتا ہی ہوگا۔ بعد میں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ میری بیوی ذرا مزاج کی تیز ہے مگر دل کی اچھی ہے۔ چاہو تو عورتوں کو اوپر بھیج دو نہانے دھونے کے لئے۔ اور ہاں۔ برا مت ماننا۔ مجبوری کی بات اور ہے۔ حافظ جی بھی شاید اسی لئے کچھ نہیں بولے کہ تمہارے حالات ہی ایسے تھے۔ ظاہر ہے جان بچا کے بھاگے ہو۔ اللہ سب کو برے وقت سے بچائے۔ مگر یہ جو خواتین کا لباس ہے نا۔ یہ مسلمان گھروں میں...."

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ دراصل وہاں سب یہی پہنتے ہیں اس کے علاوہ ہم مجبور تھے اپنی شناخت چھپانے پر.... ان کو برقعے پہنا کے نہیں لا سکتے تھے۔"

وہ انتہائی باتونی شخص لین دین کے معاملے میں جیسا بھی تھا برا آدمی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے ایک بیٹے زبیر اور سالے کے بچوں نے گرد کی پروا کئے بغیر زمین پر بستروں کے ڈھیر لگا دیئے۔ پھر اس کی بیوی ناشتے کے ساتھ نازل ہوئی اور اس نے کسی نہ کسی بات پر سب کو ڈانٹا۔ جوتے اتارو۔ ہاتھ دھو کے آؤ۔ ٹھنڈک سے ناشتا کرو۔ جوان ہو کے اتنا کم کھاتے ہو۔ اس لڑکی کو کیا ہوا ہے۔ کچھ نہیں۔ صرف تھکن ہے تو پھر ہائے ہائے کیوں کر رہی ہے۔ ابھی لے کر جاتی ہوں میں اسے ڈاکٹر کے پاس۔ دور نہیں جانا۔ یہ گلی کے موڑ پر دکان ہے۔ اللہ نے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ چلو تم لیٹ جاؤ۔ میں ڈاکٹر کو یہیں بلا لیتی ہوں اور تم نے ابھی تک مجھے تو بتایا ہی نہیں کہ یہ کون ہے۔ تمہاری بیوی.....

ذرا سی دیر میں اس نے ہمارے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے۔ وہ ایسی عورت تھی جو گھر میں جنوں اور بھوتوں کی فوج کو بھی کنٹرول کر سکتی تھی اور کسی چھوٹے بڑے کی مجال نہ تھی کہ اس کی بات ٹال دے۔ ہم سب نے اس کا غصہ اور اس کی تیز مزاجی بھی اس لئے برداشت کی کہ وہ بہرحال جو کچھ کہہ رہی تھی اور کر رہی تھی ہمارے دکھ درد کو سمجھتے ہوئے نیک دلی سے ہماری بھلائی کے لئے کر رہی تھی۔ یہ اس کی عادت یا فطرت تھی کہ وہ بڑی بہن یا ماں کی طرح اپنے پرائے سب کی دیکھ بھال کی ذمے داریاں خود سنبھال لیتی تھی اور سب کی فکریں مول لے کر نہ جانے اس کو کیا خوشی ملتی تھی۔

صرف ایک گھنٹے بعد ہم سب سو چکے تھے۔ ڈاکٹر نے گل کا معائنہ کر کے اسے دوا دے دی تھی۔ گل نے خود کو ایک کمبل کے نیچے چھپائے رکھا تھا تاکہ وہ اس کے جسم پر تشدد وغیرہ کی علامات نہ دیکھ سکے۔ چہرے کی خراشوں اور ہاتھ پیروں کی سوجن کو اس نے طویل سفر کا نتیجہ سمجھ کے قبول کر لیا تھا۔ گل کو ٹمپریچر بھی تھا۔ خاتون خانہ نے بہت ڈانٹ ڈپٹ کے بعد ڈاکٹر کو انجکشن لگانے پر مجبور کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر وہ مسکرا کے ٹال گیا کہ یہ ایسے ہی بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔

رات کو خاتون خانہ پھر طوفان کی طرح نازل ہوئیں اور انہوں نے چلانا شروع کیا "ارے غضب خدا کا سارا دن گزر گیا۔ رات ہو گئی۔ کیا اٹھو گے نہیں حشر تک۔ اندھیرا کئے پڑے ہو سب۔ کیسی نحوست پھیلا رکھی ہے۔ دن میں بھی تم نے منہ دھویا نہ کسی نے نہانے دھونے کی تکلیف کی۔ ذرا حالت دیکھو اپنی۔ سب بھوت بنے ہوئے ہو۔ اٹھو نہا دھو کے کپڑے بدلو۔ میں نے سب کے لئے کپڑے نکال لئے ہیں اور اس لڑکی کو دوائی دوسری خوراک دی تھی شام پانچ بجے۔ نو بج گئے ہیں۔ کھانا نہیں کھاؤ گے۔ میں انتظار کر رہی ہوں اوپر۔"

میں نے سر پکڑ کے غالب سے کہا "یار یہ کیا مصیبت ہے اعصاب پر سوار ہو گئی ہے۔"

نازو نے کہا "شرم نہیں آتی۔ وہ بے چاری اتنا خیال کر رہی ہے۔"

غالب نے کہا "میری ساس لگتی ہے بالکل۔ مسز بھوت۔"

نازو اس وقت گل کی طرف متوجہ تھی "کیا حال ہے تمہارا؟"

گل مسکرائی "بہت ٹھیک ہے پہلے سے۔ بالکل یوں لگتا ہے جیسے اپنے گھر میں پہنچ گئی ہوں۔"

نازو نے اداس ہو کے کہا "میری ماں بھی ایسے ہی کرتی تھی ذرا سی بات پر اتنی پریشان ہو جاتی تھی۔ میرا بھائی تو بہت چڑ جاتا تھا کہ ہم اتنے بڑے ہو گئے لیکن تم بچہ سمجھتی ہو۔"

"ماں تو بچہ ہی سمجھتی ہے.... اور ٹھیک ہی سمجھتی ہے۔" گل نے کہا "ایک بھائی میرا بھی تھا۔"

میں نے کہا "لیڈیز۔ خدا کے واسطے پرانے قصے مت چھیڑو۔ جذباتی ہونے کے لئے یہ کوئی وقت نہیں اور بہت سے مسائل ہیں ہمارے سامنے۔"

رات کے کھانے کے بعد گل اور نازو کو مالک مکان کی بیوی کی طلب کی ہوئی زنانہ پریس کانفرنس سے خطاب کرنا پڑا۔ یہ سب ان کے لئے قطعی غیر متوقع تھا مگر محلے میں مشرقی پاکستان سے جان بچا کے آنے والوں کی خبر پھیل چکی تھی اور خواتین جہاں بے حد ہمدردی اور غم گساری کے اظہار کے لئے بے تاب تھیں وہیں مشرقی پاکستان کے حالات جاننے کے لئے بھی اتنی ہی بے چین تھیں۔ گل اور نازو کو انہوں نے چشم دید گواہ سمجھتے ہوئے ان سے کیا کچھ پوچھا۔ یہ ہمیں فوری طور پر معلوم نہ ہو سکا کیونکہ ہم خود بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہو گئے تھے۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ ہمیں یوں مہاجر بنا کے انصار کے سامنے پیش کیا جائے گا تو ہم پہلے سے تیاری کر لیتے اور اپنے حالات ایک سے بیان کرتے۔ گل نے تو یوں جان بچائی کہ وہ بیماری کے باعث بول نہیں سکتی مگر نازو کو ایک جھوٹ چھپانے کے لئے سو اور سو کو چھپانے کے لئے سو جھوٹ بولنے پڑے۔ تاہم اس نے سنی سنائی اور اخباروں کی اطلاعات کو بتا بتا کے عورتوں کو خاصا مطمئن کر دیا۔

ایک کمرے میں جسے مردانہ حصے کی بیٹھک کہا جا سکتا تھا کھانے کے بعد مالک مکان نے مجھے دو افراد سے متعارف کرایا۔ دونوں مسلمان تھے اور مشرقی پاکستان کی صورت حالات پر اتنی ہی تشویش میں مبتلا تھے جتنے مغربی پاکستان کے مسلمان۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مغربی پاکستان کے ذرائع ابلاغ سرکاری پالیسی کے مطابق تصویر کا ایک رخ پیش کر رہے تھے اور حالات کو مٹھی بھر شرپسندوں، تخریب کاروں اور علیحدگی پسند عناصر کی کارروائی قرار دے رہے تھے جو بھارت اور دیگر صیہونی طاقتوں کی پشت پناہی سے محب وطن پاکستانیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے تھے جب کہ بھارت میں اسے بنگالیوں کی جدوجہد آزادی سے تعبیر کیا جا رہا تھا اور اسے مشرقی پاکستان کی اکثریت پر مغربی پاکستان کی اقلیت کے تسلط کا نتیجہ قرار دیا جا رہا تھا۔ وہاں عموماً مجیب الرحمٰن کے نقطہ نظر کی تشہیر ہو رہی تھی اور یہ بھی مشہور تھا کہ مغربی پاکستان کی فوج نہتے عوام کے خون سے ہولی کھیل رہی ہے۔ مکتی باہنی جیسی تنظیموں کو پی ایل او کی طرز پر جبر و استبداد کے خلاف اور بنگالیوں کے غصب شدہ حقوق کی خاطر جدوجہد کا علمبردار سمجھا جا رہا تھا۔

میں نے اور غالب نے اپنے اپنے طور پر اس منفی اور یک طرفہ پروپیگنڈے کے اثرات کو زائل کرنے کی پوری کوشش کی مگر یہ اندازہ ہوا کہ سرکاری مشینری نے ذرائع ابلاغ سے زہریلا پروپیگنڈا کر کے ذہنوں کو اس حد تک مسموم کر دیا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت بھی مغربی پاکستان کے حکمرانوں کی غلط پالیسی اور آمرانہ طرز عمل کو اس سیاسی انتشار کا ذمے دار سمجھتی ہے اور ان کا خیال ہے کہ یہ مشرقی پاکستان کے سیاسی و معاشی استحصال کا نتیجہ ہے۔

بحث نہ جانے کب تک چلتی۔ حاضرین کی تعداد دو سے بڑھ کر دس ہو گئی تھی۔ گیارہواں شخص اچانک ہمارے لئے پریشانی کا سبب بن کر [illegible] میں آیا تھا۔ وہ مشرقی پاکستان کا ہی رہنے والا تھا اور جب اس نے ہم سے ذاتی نوعیت کے سوالات شروع کئے تو ہمارے لئے بات بنانا مشکل ہو گیا۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ ہم ڈھاکہ میں کہاں تھے، کب پہنچے تھے، کہاں سے آئے تھے، تعلیم کہاں سے حاصل کی، کون سے کالج میں پڑھا، کاروبار کیا تھا اور ہم فلاں فلاں کو ضرور جانتے ہوں گے۔

میں نے تھکن اور نیند کا بہانہ کر کے بڑی مشکل سے جان چھڑائی مگر وہ شخص شک میں مبتلا ہو گیا تھا اور اس نے دوسروں کو بھی شک میں ڈال دیا تھا۔ خود مالک مکان فکر مند نظر آنے لگا تھا کیونکہ اس کی نظر میں ہمارا سچ پہلے جتنا معتبر نہیں رہا تھا۔ ابھی محفل برخاست ہو رہی تھی کہ حافظ صاحب آ گئے اور "السلام علیکم" کہہ کے بیٹھ گئے۔ پریشانی کے آثار ان کی صورت پر بھی ہویدا تھے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے خود ہی کہا "میاں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو ہمیں بتا دو۔"

میں نے کہا "جی۔ میں سمجھا نہیں۔"

"سمجھا تو میں بھی نہیں" وہ بولے "ایک طرف تم مجھے کوئی دھوکے باز نہیں لگتے۔ تمہاری گفتگو اور شائستگی تمہارے عالی نسب اور تعلیم یافتہ ہونے کی دلیل ہے۔ تمہارے ساتھ شریف خواتین ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ میں تم پر یقین نہ کروں۔"

مالک مکان کی نگاہ اب مجھ پر جم گئی تھی اور اس کی نظر میں جو سوال تھا اس کا جواب اعتراف جرم کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم اپنے جھوٹ کو اول تا آخر تسلیم کر لیں اور اسے ضرورت کا جواز فراہم کرتے ہوئے اصل حقیقت بیان کر دیں اور پھر خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔

میں نے کہا "آخر بات کیا ہے حافظ جی؟"

"بات بڑی خطرناک ہے میاں" وہ بولے "دوپہر کے بعد ایک شخص میرے پاس آیا تھا۔ اس نے تمہیں میرے دروازے پر دیکھا تھا۔ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ پولیس کا مخبر ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ حافظ جی۔ وہ کون لوگ تھے جن سے آپ بات کر رہے تھے۔ دو مرد تھے اور دو عورتیں۔ میں نے کہا "میاں تم سے مطلب؟" وہ کہنے لگا "حافظ جی اور کوئی ہوتا تو میں پولیس کو پہلے بتاتا مگر آپ پیش امام ہیں۔ عمل چاہے نہ کیا ہو مگر قرآن آپ ہی سے پڑھا تھا میں نے۔ جمعے کے جمعے اور عید تو عید آپ کے پیچھے نماز بھی پڑھ لیتا ہوں اس لئے پوچھ رہا ہوں کیونکہ میرا خیال ہے ان کی وجہ سے آپ مصیبت میں پڑ جائیں گے" میں نے کہا "میاں خدا خدا کرو۔ وہ بے چارے لٹ پٹ کر آنے والے

www.paksociety.com

لوگ ہیں۔ مشرقی پاکستان سے بس تن کے دو کپڑے لے کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے" وہ کہنے لگا "یہی تو غلط ہے حافظ جی" جھوٹ بولا تھا انہوں نے آپ سے۔"

حافظ جی اپنی بات کا رد عمل دیکھنے کے لئے خاموش ہوئے تو ہمارے مالک مکان نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے چباتے لہجے میں کہا "وہ ٹھیک کہہ رہا تھا حافظ جی۔ انہوں نے جھوٹ بولا تھا آپ سے بھی اور مجھ سے بھی۔"

حافظ جی کی صورت پر دکھ کے جذبات دیکھ کر مجھے ندامت اور پریشانی ہونے لگی۔ زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی میرے اور غالب کی صورت پر ہمارا جرم صاف پڑھا جا سکتا تھا۔

میں نے کہا "اور کیا بتایا تھا اس نے"

حافظ جی نے ایک گہری سانس لی "اب یہ کیوں پوچھتے ہو میاں؟ کیا خود تمہیں اندازہ نہیں کہ اس نے کیا کہا ہو گا؟ افسوس کہ تم نے ہم پر بھروسہ نہ کیا۔ ہم سے بھی غلط بیانی کی۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہم تمہیں پناہ دینے سے انکار نہ کرتے لیکن خود مشکل میں نہ پڑتے۔ اب بتاؤ ہم کیا کریں۔ تم مسلمان ہو۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان ہو اور مجاہد ہو۔ اگر تم کو پولیس کے حوالے کرتے ہیں تو خود کو کیا منہ دکھائیں گے اور خدا کو کیا منہ دکھائیں گے کہ ہم نے حق کے مقابلے میں باطل کا ساتھ دیا اور زبان سے بھی جہاد نہ کیا۔ دوسری طرف ہماری عزت کے خاک میں ملنے کا ڈر ہے۔"

مالک مکان کی حالت غیر ہونے لگی تھی "تو کیا یہ واقعی پاکستانی جاسوس ہیں حافظ جی۔"

"جاسوس، نہیں میاں۔ یہ بڑے دلیر لوگ ہیں۔ حق کے راستے پر چلنے والے محب وطن جنہوں نے اپنا عیش و آرام، مال و دولت، رشتے ناتے سب ایک عظیم مقصد پر قربان کر دیئے۔ یہ دیکھو۔"

انہوں نے بغل میں سے چند اخبارات نکالے اور سامنے پھیلا دیئے۔ ان میں سے بیشتر ہندی کے اخبار تھے۔ انگریزی کے دو اور اردو کا ایک اخبار تھا۔ سب میں ہم تینوں کی تصویر تھی۔ میرے ساتھ محسن اور غالب پولیس کو مطلوب تھے۔ ہمیں پاکستانی دہشت گرد اور جاسوس قرار دیا گیا تھا اور ہمارے بارے میں اطلاع فراہم کرنے والے کے لئے دس ہزار روپے کے انعام کا اعلان تھا۔ مجھے مالک مکان کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ دلچسپی کی جھلک محسوس ہوئی۔ اچھے برے لوگ کہاں نہیں ہوتے اور پیسہ تو چیز ہی ایسی ہے کہ محبت اور ایمان میں خلل ڈال دیتا ہے۔ ہمارے لئے ابھی راستے بند نہیں ہوئے تھے۔ ایک امید کا دروازہ حافظ جی کی ذات تھی جو ہمارے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔ دوسرا راستہ ہم بزور بازو بنا سکتے تھے لیکن ہر صورت میں ہمیں پناہ دینے والوں کے لئے کوئی پناہ نہ تھی اگر حافظ جی مشکل میں نہ پڑتے تو مالک مکان پڑ جاتا جس نے ہمارے ساتھ نیکی ہی کی تھی۔

خاموشی کے ایک طویل اعصاب شکن وقفے کے بعد میں نے ہمت کر کے کہا "آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے حافظ جی۔"

"پولیس اسٹیشن جانے کا" حافظ جی نے سر جھکا لیا۔ مالک مکان نے اطمینان کا سانس لیا "بالکل ٹھیک۔ انہیں پولیس کے حوالے کر کے ہی بچ سکتے ہیں ہم۔"

حافظ جی نے سر اٹھایا "تم غلط سمجھے میاں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ یہ فیصلہ تو میں نے اسی وقت کر لیا تھا جب وہ شخص میرے پاس آیا تھا۔ یہ اخبارات وہی لایا تھا اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد میرے لئے انکار کرنے کی گنجائش نہ رہی تھی کہ میں نے انہیں نہیں دیکھا مگر میں نے اسے جھوٹ سے ٹال دیا۔ میں نے کہا کہ "ہاں۔ یہی تھے جو مجھ سے مسجد میں قیام کی اجازت مانگ رہے تھے مگر میں نے کہا کہ عورتوں کے ساتھ یہ ناممکن ہے۔ پھر وہ چلے گئے۔"

"آپ نے میرے گھر کا پتا نہیں بتایا" مالک مکان بولا۔

"نہیں" حافظ جی نے کہا۔

"مگر لوگوں نے تو دیکھا تھا اور ابھی یہاں سارا محلہ جمع تھا" مالک مکان نے کہا۔

"اللہ مالک ہے میاں۔۔۔"

"حافظ جی میرے بیوی، بچے ہیں" مالک مکان رونے پر آ گیا۔

"وہ تو میرے بھی ہیں۔ اس خبیث نے یقین کیا تو یا نہیں۔ اس وقت تو پتا نہیں چلا۔ وہ کہہ گیا تھا کہ حافظ جی بعد میں مجھے کچھ مت کہنا۔ میں نے تمہیں خبردار کر دیا ہے۔ آگے تم جانو تمہارا کام" میں نے اسے ڈانٹا بھی تھا کہ کیا ہمیں جھوٹا سمجھتا ہے کہ ایسی بات کرتا ہے؟" اور اس نے معافی مانگ لی تھی۔ ہم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ یہ سب جانتے ہیں۔"

"لیکن آج تو جھوٹ بول دیا آپ نے"

"نہیں۔ یہ جھوٹ اس سچ سے زیادہ پسندیدہ ہے خدا کے نزدیک جس سے مسلمانوں کو نقصان ہو اور وہ بھی کافروں کے ہاتھوں۔ ان کے مقصد کا زیاں ہو اور راہ حق پر چلنے والوں کی قربانیاں رائیگاں جائیں۔ اگر اللہ نیتوں کو دیکھتا ہے اور آخر کار یہ سوال۔ سو دلوں کے بھید جانتا ہے تو وہ میرے جھوٹ کو بھی معاف کرے گا۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا کہ انہیں پولیس کے حوالے کرواؤں۔ میں نے اس شیطان کو گمراہ کر دیا اور کہا کہ وہ لوگ مجھ سے مایوس ہو کے کہیں اور چلے گئے تھے۔"

"حافظ جی۔۔۔" مالک مکان نے کچھ کہنا چاہا۔

"مجھے اب پولیس اسٹیشن طلب کیا گیا ہے" حافظ جی نے اس کی بات کاٹ دی "جو تھانے دار کا آدمی پیغام لے کر آیا تھا وہ بھی مسلمان تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ حافظ جی۔ ان کو گھر سے نکالو جن کو آپ نے چھپا رکھا ہے تو آپ کے خلاف کچھ نہیں

نے کہا کہ میں نے گھر میں کسی کو بھی نہیں چھپا رکھا ہے"

"آپ اس وقت جائیں گے۔"

"اب جانا تو پڑے گا" حافظ جی نے کہا "یہی بہت غنیمت ہے کہ مجھے ہتھکڑی ڈال کے نہیں لے گئے اور خانہ تلاشی کے لئے نہیں آئے۔ مجھے اللہ عزت رکھنے والا ہے۔"

"معلوم کریں گے حافظ جی" مالک مکان نے کہا "اور مجھ سے نہیں ہے ابھی۔ میں تو صاف بتا دوں گا کہ انہیں آپ نے بھیجا تھا۔ سارا محلہ ان کے جھوٹ کا گواہ ہے۔"

میں نے اتنی دیر میں فیصلہ کر لیا تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہو گا۔ میں نے لہجے میں کہا "آپ بھی بتا دیں پولیس کو حافظ جی کہ ہم ... ہمارے لئے خود کو مشکل میں نہ ڈالیں۔"

غالب نے سر جھکا کے کہا "یہ بات چھپ نہیں سکتی۔ ابھی نہیں تو کل معلوم ہو جائے گا پولیس کو۔ پھر آپ زیادہ مجرم ہو جائیں گے۔"

میں نے تو بھر کے کہا "ہمیں آپ سے کوئی شکایت نہیں اور ... آپ لوگوں نے تو نیکی ہی کی تھی ہمارے ساتھ۔ آگے ... کو منظور ہے وہ ہو گا۔"

میں نے اور غالب نے دلائل سے حافظ جی کو قائل کر لیا کہ وہ پولیس کو سچ بتا دیں۔ کوئی بات نہ چھپائیں تاکہ ان کی عزت محفوظ رہے۔ یہی اطمینان ہم نے مالک مکان کو دلایا کہ جب ہم خود کو پولیس کے حوالے کر دیں گے تو وہ بھی محفوظ ہو جائے گا۔ اس نے حافظ جی کی بات مان کے اور ہمارے جھوٹ کو سچ سمجھ کے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔

"میرا تو خیال ہے کہ حافظ جی پہلے نہ جائیں" غالب نے تجویز پیش کیا "یہ پہلے جا کے پولیس کو بتا دیں کہ وہ پاکستانی دہشت گرد ان کے گھر میں موجود ہیں۔ اس طرح انہیں دس ہزار کا انعام بھی مل سکتا ہے۔"

پھر بھی حافظ جی صرف یہ کہنے چلے جائیں کہ انہیں کچھ معلوم نہیں وہ کون تھے۔ انہوں نے تو ایک گھر کا پتا بتایا تھا جو رہنے کے لئے خالی تھا۔ تاہم وہ انہیں شناخت کر سکتے ہیں۔ حافظ جی کا ... دس ہزار کا انعام پکا ہو جائے گا۔"

"اس کے اور تو ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ جو کچھ انہوں نے کیا اس کے بدلے میں کم از کم سرکار سے دس ہزار تو دلوا سکتے ہیں۔"

حافظ جی نیک آدمی تھے اور اگر ہم انہیں مجبور اور قائل نہ کرتے تو وہ ہمیں بچانے کے لئے خود بخود مصیبت میں پڑنا منظور کر لیتے۔ مالک مکان کی نیت کے بارے میں غالب کو اور مجھے کوئی شبہ نہ تھا کہ وہ دس ہزار کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کو پیسہ اپنے ایمان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ یہ لحاظ ... کی بیوی نے بھی تقاضا کیا تھا کہ لالچ کی بات نہ ہو تو وہ خود بھی ... تھا۔ جیسا کہ حافظ جی نے کہا تھا وہ پیسے کے معاملے میں

خوف!
ایک ایسا مسئلہ جس سے ہر شخص دوچار ہے
خوف سے آدمی پریشان ہوتا ہے۔
خوف سے آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔
خوف سے زندگی ناکام ہو جاتی ہے۔
خوف سے ازدواجی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔
خوف سے آدمی خودکشی کر لیتا ہے۔
خوف دیمک کی طرح زندگی کو چاٹتا رہتا ہے۔
شرم بھی خوف ہی کا ایک پہلو ہے اور اتنا ہی خطرناک
اس روگ کے بارے میں جاننے کے لئے ممتاز نفسیاتی ادیب اسلام حسین کی کتاب

خوف و شرم
اور اس کا سدِ باب
کا مطالعہ کیجیے
اور ان کمزوریوں سے نجات حاصل کر کے
کامیاب اور خوش و خرم زندگی گزارئیے
مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس ۹۴۲ کراچی ۱

www.paksociety.com

یہودی تھا۔ چناں چہ ہم نے اسے لالچ کے جال سے ہی شکار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

حافظ جی کے رخصت ہوتے ہی میں نے محسوس کیا کہ اندر سے عورتوں کی باتیں کرنے کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی ہیں۔ غالباً وہ بھی ہماری باتیں سن چکی تھیں اور جذبات کی نوعیت یکسر بدل چکی تھی۔ نہ وہ مالک مکان رہے تھے نہ ہم کرائے دار۔ نہ وہ میزبان تھے اور نہ ہم مہمان۔ ہمدردی کے جذبات برہمی میں بدل گئے تھے کہ ہم نے غلط بیانی سے انہیں بھی مصائب کی دلدل میں دھکیل دیا۔

مالکہ مکان باہر آئی اور آتے ہی ہم پر گرجنے برسنے لگی اس کے پیچھے نازو اور گل مجرم صورت بنائے داخل ہوئیں اور چپ چاپ کھڑی ہو گئیں۔ خاتون خانہ کو حق حاصل تھا کہ جتنا چاہیں بولیں مگر ہمارے پاس وقت کی کمی تھی۔

میں نے گھڑی دیکھ کر کہا "آپ کی تقریر کا وقت ختم ہو گیا خاتون۔ محترم آپ کو کچھ کہنا ہے؟"

خاتون نے مجھے چند زنانہ گالیوں سے نوازا اور پھر روئے سخن اپنے مجازی خدا کی طرف کر لیا جو اس مصیبت کے ذمے دار تھے۔

انہوں نے کہا "بھئی بیگم۔ یہ خود کو پولیس کے حوالے کرنے پر تیار ہیں۔ ہم جا رہے ہیں تھانے۔ انعام کے دس ہزار ملیں گے۔"

میں نے ریوالور نکال لیا "دس کیا بیس ہزار ملیں گے مگر وہ انعام ہم دیں گے۔"

مالک مکان "ہائیں ہائیں" کرتے پیچھے ہٹے "یہ کیا.....؟"

ان کی بیوی نے ایک چیخ ماری مگر نازو نے ان کا منہ پیچھے سے ہاتھ بڑھا کے بند کر دیا۔

میں نے کہا "ان کو فی الوقت باندھ کے ڈال دو کچن میں یا باتھ روم میں۔"

مالک مکان نے کانپتے لرزتے کہا "یہ۔ یہ کیا کر رہے ہو تم۔ اچھا صلہ دے رہے ہو۔"

میں نے انہیں غسل خانے کی طرف دھکیلا "ویسے ہی خاموش رہنا پسند کریں گے آپ یا....."

وہ سمجھے میں گولی مارنے کی دھمکی دے رہا ہوں "میں جاتا ہوں۔ خدا کے لئے میرے بچوں کو یتیم مت کرو۔"

غالب نے کہا "بیوی کے بیوہ ہونے کی فکر نہیں ہے۔"

"شوہر تو مل جاتا ہے۔ باپ کہاں ملتا ہے" وہ بولے۔ "صاحب خانہ بدحواسی میں کہہ گئے مگر یہ بات ان کی اہلیہ کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ نازو نے انہیں کچن میں ڈال دیا تھا۔ دہشت سے وہ خود ہی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ بچے سب سوئے پڑے تھے۔ میں نے تین ہزار روپے میزبان کی جیب میں ڈالے اور معذرت کے ساتھ ان کو ناک آؤٹ کر دیا۔ چلتے چلتے میں نے نازو سے کہا کہ ان کی بیوی کو بھی خدمت گزاری کا کچھ صلہ دے آئے اور اس نے زیورات کے بوجھ میں سے دو بھاری کنگن نکال کے خاتون کے ہاتھوں پہ رکھ دیئے۔ غالباً اس تحفے کو وصول کرنے کے بعد انہوں نے ہماری [illegible] خطائیں معاف کر دی ہوں گی۔

ان کے بچے سوئے پڑے تھے۔ رات کے ایک بجے ہم [illegible] ہوئے حالانکہ صبح ہمارا خیال کچھ اور تھا۔ ہم یہاں [illegible] قیام کرنا چاہتے تھے۔ گل اور نازو نے ساریاں اتار کے شلوار [illegible] پہن لئے تھے اور ہم نے بھی صاحب خانہ کے کپڑے [illegible] تھے۔

"معلوم نہیں تھانہ یہاں سے کتنی دور ہو گا" غالب نے [illegible] کے دروازے کو مقفل کرتے ہوئے ویران گلی میں ادھر ادھر [illegible]

"پولیس زیادہ دیر نہیں لگائے گی" میں نے کہا۔

"پہلے تو مالک مکان کو جانا تھا" غالب نے کہا۔

"ہاں مگر حافظ جی کب تک انتظار کریں گے۔ چلو اب گلی [illegible]" میں نے کہا۔

گل اور نازو برقعے میں تھیں۔ دونوں مالک مکان کے [illegible] تھے۔ ایک کچھ بڑا تھا اور اس کا نسواری رنگ بھی [illegible] دوسرا [illegible] کریپ کا تھا۔ گلی کافی لمبی تھی۔ ہم بار بار پلٹ کر دیکھتے رہے اور تیزی سے آگے بڑھتے گئے۔ اس وقت ہمیں لگتا تھا کہ کوئی ضرور شور مچا دیتا یا ہمارے پیچھے لگ جاتا [illegible] جب تک تیز قدم اٹھا سکتے تھے اٹھا رہے تھے۔

ایک جگہ گل نے ہانپتے ہوئے کہا "بھائی سکندر ذرا آہستہ چلو۔ میں کیسے دوڑوں تمہارے ساتھ۔"

نازو نے بھی کہا "میں الجھ کے گروں گی منہ کے بل۔"

"ضرور گرو۔ پھر خود ہی اٹھنا" غالب نے کہا "ہم کو اٹھانے والے۔ اللہ ہی اٹھائے گا۔"

"اب جانا کدھر ہے۔ یوں منہ اٹھا کے چلتے جا رہے ہیں سب" گل نے کہا "کیا ہو کا عالم ہے۔ تانگہ ٹیکسی کچھ نہیں۔"

میں نے پیچھے دیکھ کر کہا "پولیس آ رہی ہے جیپ [illegible] تو انتظار کر لو۔"

گل نے پلٹ کے دیکھا "آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا مجھے۔"

آخر کار گلی ختم ہوئی اور اچانک ہم نے خود کو ایک [illegible] کے سامنے پایا۔ آخری شو ختم ہو چکا تھا اور بیشتر تماشائی [illegible] تھے لیکن سواریوں کے انتظار میں دو تانگے اس وقت بھی [illegible] تھے۔ ایک میں دو سواریاں بیٹھی تھیں اور وہ "درگاہ۔ درگاہ" صدا لگا کے مزید دو سواریوں کو متوجہ کر رہا تھا۔ دوسرا تانگہ بالکل خالی تھا۔

پوچھے بغیر میں نے اس سے کہا "درگاہ چلو۔" [illegible] تھیں چناں چہ وہ چل پڑے روانہ ہو گیا۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ کس درگاہ کی بات کر رہا ہے مگر میں اس کے سامنے [illegible] لاعلمی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ بعد میں معلوم ہوا [illegible] حضرت [illegible] الدین رحمتہ اللہ علیہ کے مزار والے علاقے کی طرف جا رہا تھا [illegible] ملا تھا۔

[illegible] تانگہ دو تین میل دور نکل آیا تو میری جان میں جان آئی ایسا [illegible] ہوا تھا کہ ہم اپنے جھوٹ کی وجہ سے پکڑے گئے تھے اگر [illegible] وہ شخص نہ آتا جو [illegible] میں عمر گزار چکا تھا تو ہمارا راز [illegible] آخر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ یہ بھی بعد میں پتا چلا کہ [illegible] خواتین کے سامنے نازو نے بالکل مختلف واقعات بیان کئے تھے۔

اب سوال یہ تھا کہ کیا ہم درگاہ پر رات بسر کر سکیں [illegible] تانگے والے نے پوچھا کہ کہاں جانا ہے تو اسے کیا بتاتا میں اس مشکل سے بچنے کے لئے میں نے تانگے کو عین درگاہ کے سامنے رکوا لیا۔ وہاں بہت رونق تھی اور اندر سے قوالی کی آواز آ رہی تھی۔ مجھے بالکل یاد نہ تھا کہ آج دن کیا ہے اور تاریخ کیا مگر درگاہ کی رونق دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ جمعرات ہے اور ہم بہ آسانی عقیدت مندوں میں شامل ہو سکتے ہیں۔ یہاں پولیس کے ہماری تلاش میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اندر مردوں کے بیٹھنے کا انتظام بالکل الگ تھا چناں چہ میں نے گل اور نازو سے کہا کہ وہ خواتین میں شامل ہو جائیں مگر ایک طرف رہیں جہاں سے وہ ہمیں دیکھ لیں۔ ہم خود درمیانی حد کے قریب ہو گئے۔

قوالی تقریباً ڈھائی بجے تک جاری رہی۔ میں اور غالب کھسکتے کھسکتے آگے چلے گئے تھے تاکہ پیچھے سے کوئی نگاہ ڈال کے ہمیں دیکھنا چاہے تو ہم نظر نہ آئیں۔ ہمیں ننگے سر دیکھ کر ایک لڑکا ہماری طرف [illegible] جس نے گلے میں ٹوپیاں لٹکا رکھی تھیں جس میں تبرکات کے [illegible] ٹوپیاں بھی تھیں۔ میں نے اور غالب نے فوراً ایک جیسی ٹوپیاں سر پر رکھ لیں اور لڑکا پیسے لے کر چلا گیا۔ وہاں ہم جیسے [illegible] بہت سے تھے جن پر ایک جیسی سفید ٹوپیاں تھیں۔

غالب نے سر جھکائے ہوئے سرگوشی میں کہا "آج رات [illegible] بچ جائیں گے۔ اب یہاں سے نکل کے کہاں جائیں گے؟"

میں نے کہا "جہاں تقدیر لے جائے۔"

غالب نے کہا "صبح تک شہر کی ہر طرف سے ناکہ بندی ہو جائے گی۔ ہم تو محصور ہو گئے ہیں ناگ پور میں۔"

اس وقت ایک شخص نے نعرہ لگایا اور قوالوں کے سامنے حال [illegible] میں اور غالب دونوں ادھر متوجہ تھے کہ ایک شخص نے بالکل قریب آ کے مجھے کہنی ماری۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے معنی خیز انداز میں آنکھ [illegible] کے مسکرایا۔ میری سٹی گم ہو گئی۔ اپنی مونچھوں اور چہرے کے [illegible] نقوش سے وہ کوئی شریف آدمی نہیں لگتا تھا۔ میں نے [illegible] کو اس کی طرف متوجہ کیا تو وہ پھر مسکرایا۔

"میں نے پہچان لیا ہے تمہیں" وہ میری طرف جھک کے بولا۔

"کیا... کیا مطلب۔ کون ہو تم؟"

"ہم تو نہیں جانتے تمہیں" غالب نے کہا۔

"غور سے دیکھو۔ پہچان جاؤ گے" وہ کچھ اور میرے قریب آ گیا۔

میں نے کہا "میں ان سب کو نہیں پہچان سکتا۔ جو مجھے جانتے ہیں۔"

"تم سکندر ربخت ہو نا؟" وہ سرگوشی میں بولا۔

انکار کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"اور یہ جو تمہارے ساتھ بیٹھا ہے۔ محسن ہے؟"

اب میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ صرف مجھے پہچانتا ہے۔ وہ غالب کو محسن سمجھ رہا تھا۔ اس سے یہی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ ان دونوں کو اس نے نہیں دیکھا۔ اگر اس نے مجھے اخباروں میں شائع ہونے والی تصاویر سے پہچانا ہوتا تب بھی وہ ایسی غلطی نہ کرتا۔ محسن اور غالب کی صورتوں میں تو بہت فرق تھا اور ہم تینوں کی تصویریں ایک ساتھ شائع ہوتی رہی تھیں۔

غالب نے کہا "اگر میں محسن ہوں۔ پھر؟"

"پھر یہ کہ تمہارا یہاں آنا خالی از علت نہیں ہو سکتا۔ تم ضرور چھپنے کے لئے اس محفل میں شامل ہوئے ہو" وہ بولا۔

"اس سے یہ نتیجہ اخذ مت کرنا کہ ہم محصور ہو گئے ہیں اور ہم نے یہاں آ کے غلطی کی ہے" میں نے کہا۔

"توبہ توبہ۔ یہاں آنے والا محفوظ ہو جاتا ہے۔ محصور نہیں" وہ بولا "اسے غلطی کہنا بھی غلطی ہے۔"

میں نے کہا "ہم مسلح ہیں۔"

اس نے کہا "کیسی باتیں کرتے ہو۔ یہاں اسلحے کا کیا کام۔ نہ تم پر گولی چلا سکتا ہے کوئی اور نہ تم کسی پر۔"

میں خاموش رہا۔ میرا خیال تھا کہ یہ اس کا عقیدہ ہے تو مجھے اس کی تردید کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چلانے والوں نے تو مسجدوں اور معبدوں میں گولیاں برسا کے عبادت گزاروں کو شہید کیا ہے اور خانہ کعبہ کی حرمت تک کا خیال نہیں کیا۔

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" غالب نے کہا۔

"کچھ نہیں۔ میں تو یہاں قوالی سننے آتا ہوں۔ ہر جمعرات کو۔ آج تم کو دیکھا تو یقین نہیں آیا۔ کہاں کراچی کہاں ناگ پور" اس نے کہا۔

قوالی اب پورے عروج پر تھی اور قوال حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کا عارفانہ کلام گا رہے تھے۔ سننے والوں پر وجد طاری تھا۔

میں نے کہا "تم کراچی میں تھے۔ کس کے ساتھ تھے؟"

"تمہارے دشمنوں کے ساتھ" غالب نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا "میں وہاں ٹیکسی چلاتا تھا۔ تمہارا بھی ایک یار تھا اکرام شیخ۔ وہ بھی ٹیکسی ڈرائیور تھا۔"

www.paksociety.com

"تم اکرام شیخ کے ساتھی ہو" میں نے مضطرب ہو کے کہا "یہاں کیا کر رہے ہو۔ کب آئے وہاں سے؟"

اس نے کہا "یہاں میرا بڑا بھائی پولیس میں ہے۔"

میرا خون خشک ہونے لگا۔ "پولیس میں ہے؟"

"ڈرو نہیں۔ میں تمہیں اس کے حوالے نہیں کروں گا۔ میں آیا تھا ماں کی بیماری کا سن کے۔ وہ بے چاری تو مرحوم ہوا اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ میں واپس نہ جا سکا۔ بھائی نے روک لیا۔"

"اکرام شیخ سے کب ملے تھے؟"

"یہاں آنے سے پہلے ملاقات ہوئی تھی آخری بار۔ بہت حالت خراب تھی اس کی۔"

میرا دل بیٹھنے لگا "کیوں۔ کیا ہوا اسے۔"

"بیمار تھا وہ" غالب نے کہا۔

"نہیں۔ ایک تو بہن کو یاد کر کے روتا تھا۔ کہتا تھا ایک ہی بہن تھی جس کا میں اکلوتا بھائی تھا۔ مجھے یہاں چھوڑ کے چلی گئی واپس آنے کا کہہ گئی تھی۔ اب میں کہاں جاؤں۔ کیسے جاؤں۔ پتا نہیں وہ زندہ ہے کہ نہیں۔"

میرا دل بھر آیا "وہ زندہ ہے بالکل ٹھیک ہے۔ تمہارے پاس کوئی پتا ہے اکرام شیخ کا؟"

"ہاں۔ وکیل باڑے کی ایک دکان کا پتا ہے۔ اس کو ایک خط ڈال دو۔ وہ تم سب کو بھی بہت یاد کرتا ہے۔ کہتا ہے میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ یہاں رک گیا۔ سب سے بچھڑ گیا۔ ایک لڑکی اس کے پیچھے پاگل ہے مگر وہ تم سب کے لئے پاگل ہے۔ کہتا ہے جب تک سب کا پتا نہیں چلے گا اور سب واپس نہیں آئیں گے میں اپنا گھر بسا کے نہیں بیٹھ سکتا۔"

میں نے کہا "کون ہے وہ لڑکی؟"

"ایک لیڈی ڈاکٹر ہے۔ شہناز۔ تم نہیں جانتے؟" وہ حیران ہو کے بولا۔

"ہمارا تو پھر اس سے رابطہ ہی نہیں ہوا۔ ہمیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا" غالب نے کہا۔

"خیر ہے ایک لیڈی ڈاکٹر۔ پیدائشی طور پر کچھ معذور تھی اس کے دونوں پیروں کے پنجے مڑے ہوئے ہیں اور گھٹنے تک ٹانگوں میں بھی خم ہے۔ ماں باپ غریب تھے ورنہ بچپن میں علاج ہو جاتا تو آپریشن سے یہ نقص دور ہو سکتا تھا۔ اکرام اسے ایک بار کہیں لے کر گیا تھا رات کے وقت۔ راستے میں کچھ فلمی صورت حال ہو گئی۔ کورنگی سے پہلے چار افراد نے ٹیکسی روک لی اور انہیں لوٹنے کی کوشش کی۔ اکرام نے خاموشی سے سب کچھ دے دیا اور اس لیڈی ڈاکٹر نے بھی اپنی گھڑی اتار دی۔ سونے کی دو چوڑیاں اور بندے بھی رہے دیئے مگر اس کے بعد انہوں نے میڈیکل بیگ لے جانے کی کوشش کی۔ ان جاہلوں کا خیال تھا کہ اس میں اصل مال ہے۔ شہناز نے انکار کیا اور اکرام بھی اڑ گیا تو وہ بدمعاشی پر اتر

آئے اور پھر اس کے بعد جو ہوا وہ بھی فلموں میں ہوتا ہے۔ ہمیں کہاں معلوم تھا کہ اکرام شیخ پہلے پولیس افسر تھا اور [illegible] بھائی ہے۔ اس نے مار مار کے چاروں کا بھرکس نکالا [illegible] زخمی ہوا۔ مگر پھر ٹریفک آ گئی اور پولیس کی ایک گشتی [illegible] گئی۔ وہ سب پکڑے گئے۔ اب جیل کاٹ رہے ہیں۔ [illegible] نے..... اسپتال میں اکرام شیخ کا خود علاج کیا اور دن رات [illegible] کرائے۔ جب اسے اکرام شیخ کے اصل حالات کا علم ہوا تو اس نے اکرام شیخ کو بہت سمجھایا کہ وہ ٹیکسی چلانا چھوڑ دے۔ وہ اس کے لئے اچھے سے اچھی نوکری کا بندوبست کر سکتی ہے اور اس کے لئے اپنا فلیٹ دے سکتی ہے۔ جو خالی پڑا ہے مگر وہ کہاں مانتا تھا۔ اس کو کیسے بتا سکتا تھا کہ وہ کیوں ٹیکسی چلاتا ہے لیکن [illegible] اس نے بتا دیا۔ اب روز اسے گھر سے کلینک لاتا ہے اور رات کو گھر چھوڑ آتا ہے۔ اور بس۔"

"اس ڈاکٹر شہناز کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے؟"

"ہے کیوں نہیں۔ ماں بھی ہے اور باپ بھی۔ اس کی [illegible] عزت کرتے ہیں اور بالکل بیٹا سمجھتے ہیں اپنا۔ مگر وہ ان کے پاس [illegible] رہنے کو تیار نہیں اور نہ کوئی احسان لینے پر۔ وہ تو صبح سے شام تک وہیں کھڑا رہتا ہے۔ بندرگاہ پر۔"

"اس نے تمہیں سب بتا دیا تھا۔"

"ہاں۔ ہم ایک ساتھ رہتے تھے۔ بھروسے کے آدمی [illegible] میں تو مجھے کیوں بتاتا۔ جب میں آ رہا تھا تو رو رہا تھا۔ کہتا تھا کہ میری بہن ملے یا سکندر اور محسن ملیں تو ان سے کہنا کہ اپنی [illegible] دیر۔ میں بالکل اکیلا ہوں یہاں۔ حالانکہ خود اسے معلوم [illegible] ہمارا ملنا ناممکن ہوگا۔ مگر دیکھو۔ اللہ کیسے اسباب پیدا کرتا ہے۔ سب بابا تاج الدین کی کرامت ہے۔ کہ تم یہاں آ گئے اور میرے پاس آ بیٹھے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اسے کرامت کہو یا معجزہ یا خدا کی [illegible] کہ اس نے ادھر ادھر کے سب در بند کئے مگر وہ در کھلا رکھا [illegible] سے گزر کے ہمیں یہاں پہنچنا تھا۔ آلام و مصائب بھی ایک [illegible] تھے۔ ہمارا فرار ہونا بچ نکلنا اور وہ سب جو ہوا اسی ایک [illegible] رسائی کا سبب بنا۔ اس کے رموز کو بندہ کیا جانے۔" میں نے [illegible]

غالب نے کہا "تم نے اپنا نام تو بتایا نہیں اب تک۔"

"غلام نبی" وہ بولا "محمد علی سرائے کے پاس رہتا ہوں۔ [illegible] ختم ہو جائے تو میرے ساتھ چلو۔"

"محمد علی سرائے۔ وہاں تو ہم نہیں جا سکتے۔"

"میرے گھر میں کوئی خطرہ نہیں۔"

"سب سے بڑا خطرہ خود تمہارا بھائی ہے۔ وہ ضرور پہچان [illegible] گا ہمیں" میں نے کہا "آج بھی ہم پولیس کے ہاتھوں گرفتار [illegible] ہوتے بال بال بچے ہیں۔ پولیس ہمیں تلاش کر رہی [illegible] ہونے والی ہے۔"

"اچھا تو میں کہتا ہوں وہ کرو۔ قوالی ختم ہوئی تو لنگر بٹے گا۔ دیگیں کھلنا ہے نا" وہ بولا "تم سیدھے نکل جانا۔ ادھر سمت رش ہو گا۔"

میں نے کہا "غلام نبی۔ ہمارے ساتھ وہ بھی ہیں نازو اور گل"

"گل یا نازو کون ہے۔"

"ہے ایک لڑکی۔ تم نہیں جانتے۔ وہ ادھر عورتوں میں بیٹھی ہے برقعے میں۔"

"مجھے بتاؤ کیسے برقعے ہیں۔"

"ہم کیا عورتوں میں گھس کے تلاش کریں گے۔"

"اچھا تم انہیں بلاؤ۔ کیسے بلاؤ گے۔ ان سے کہو کہ باہر میرا رکشا کھڑا ہے باہر۔ اس میں بیٹھ جائیں اور برقعے اتار کے گھے رہ دیں۔ میں تمہیں لا دوں گا جو رکشا میرے رکشا کے پیچھے کھڑا ہو گا اس میں سوار ہو جانا۔"

میں نے غالب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"شاید وہ اس طرح تمہارے رکشا میں بیٹھنے پر تیار نہ ہوں۔" میں نے کہا "میرا مطلب ہے اکیلی۔"

"ساری بات اعتماد کی ہے" غالب نے کہا "ہم نے تو بچا یا بھی نہیں تھا تمہیں۔ کیسے مان لیں کہ جو تم کہہ رہے ہو....."

"میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا لیکن آپ خود سوچو کہ میں نے ذرا بھی چالاکی دکھانا کیا کوئی اجنبی بتا سکتا تھا۔ جو آپ کو جانتا بھی نہ ہو۔ اکرام شیخ کے بارے میں بھی کیا میں نے جھوٹ بولا ہے؟ جب والے کا تو تصدیق ہو جانے کی حد میں نے جو بتایا ہے تمہیں کیا وہ بھی غلط ہے اور میں تمہارا دشمن ہوتا تو اتنی باتیں کیوں کرتا تم سے؟ یہ تو بڑا اچھا موقع تھا۔ تم یہاں سے نکل بھی نہیں سکتے۔ دس منٹ میں تم کو پکڑ کے کئی لوگ پولیس کے حوالے کر دیں گے۔"

اس کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اور غالب نے طے کیا کہ اس میں رسک ہے تو تنہ ہونے کے برابر اور اتنا رسک ہمیں بہر حال لینا پڑے گا۔ رسک تو ہمارے یہاں بیٹھے رہنے اور یہاں سے نکلنے میں بھی تھا۔ یہ موقع اگر تقدیر نے فراہم کیا تھا تو اس کو گنوانا کوئی عقلمندی کی بات نہ تھی۔ خطرہ محسوس ہوا بعد میں تو اس سے نمٹا جا سکتا ہے۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے خواتین کے حصے کی طرف دیکھا مگر وہاں ایک اژدھام تھا اور سینکڑوں عورتوں کے درمیان گل اور نازو کے کالے نسوانی برقعوں کو تلاش کرنا آسان نہ تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ ہمیں دیکھ لیں گی میں نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کے ایسا اشارہ کیا جیسے کوئی اپنے گھر کی خواتین کو دیکھ کر انہیں اٹھنے کی کہہ رہا ہو۔ سب وہ آگے پیچھے اٹھیں اور دروازے کی طرف بڑھیں تو شہناز نے غلام نبی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اشاروں کی مدد سے اپنا مطلب واضح کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس اجنبی پر بھروسہ کریں

اور جیسا وہ کہے ویسا ہی کریں۔

دس منٹ بعد غلام نبی پھر نمودار ہوا تو اس کی بغل میں دو برقعے تھے۔ اس نے ہمیں اپنی طرف بلایا اور ایک گلی کی طرف بھیج دیا جس میں اندھیرا تھا اور مختلف کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ ہم وہاں سے برقع پوش کے غلام نبی کے تعاقب پر باہر آئے۔ اس نے راستہ صاف دیکھ کے کہا تھا کہ نکل آؤ۔ میں نے اور غالب نے اپنے مردانہ جوتے اتار کے بغل میں دبائے تھے۔ ہمارے ننگے پاؤں کی طرف تو شاید کسی کا دھیان نہ جاتا مگر برقعے کے ساتھ مردانہ جوتے سب کی نظر میں آتے۔

باہر گل اور نازو ٹھیک ہر طرف سے بند رکشا میں چھپی بیٹھی تھیں۔ ایسے باپردہ رکشا مسلمان گھرانوں کی عورتوں کو درگاہ تک لانے لے جانے کے لئے چادر باندھنے کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ ہم پیچھے والے رکشا میں بیٹھے ہی تھے کہ قوالی اچانک ختم ہو گئی اور مؤذن کی صدا بلند ہوئی۔ میں اور غالب آپس میں بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح ہمارے مرد ہونے کا راز فاش ہو جاتا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ تقدیر نے ہمیں تماشائے عبرت کیوں بنا لیا ہے اور ہمارے سفر کو بے سمت کیوں کر دیا ہے۔ وہ مقصد جس کی خاطر ہم نے ہر قربانی دی۔ ہر الزام برداشت کیا اور ہر مصیبت جھیلی۔ اس میں یہ غیر متوقع رکاوٹیں کیوں پیدا ہو رہی ہیں۔ ہمارا جذبۂ جہاد۔ جوش و خروش اور ولولہ۔ ہمارا نظم و ضبط اور ہماری کامیابی کے عناصر میں اعتدال کیوں نہیں رہا۔ وہ متحرک منظم قوت جو ایم آر ایس تھی یکلخت بے سرو سامان کیوں ہو گئی ہے۔ راستے بند کیوں نظر آنے لگے ہیں اور ہم ذہنی انتشار کا شکار کیوں ہیں۔ یہ قافلہ پھر کب جادۂ پیما ہو گا۔

رکشا اچانک رک گیا۔ غلام نبی نے ایک بند دروازے پر دستک دی۔ معلوم نہیں وہ کون سا محلہ تھا اور کون سی گلی تھی اور وہ کس کا گھر تھا۔ ہم تو یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم جہاں سے چلے تھے تقدیر ہمیں پھر وہیں تو نہیں لے آئی ہے۔

اپنے طور پر میں ہر طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لئے تیار تھا۔ شاید ہم سب تیار تھے۔ دروازہ کسی عورت نے کھولا اور غلام نبی اس سے آہستہ آہستہ باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے ہمیں بلا لیا۔ ہمارے اندر داخل ہو جانے کے بعد گل اور نازو آئیں۔ ہم کچھ دیر ڈیوڑھی کی تاریکی میں کھڑے رہے۔ جب ہماری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو ہمیں اپنے سامنے پرانی سیڑھیاں نظر آئیں۔ غرارے میں ملبوس ایک عورت کے پیچھے چلتے ہوئے ہم اوپر کی منزل پر پہنچے۔ یہ بہت پرانا بنا ہوا خستہ حال مکان تھا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے اس عورت کو دیکھا جو شاید غلام نبی کی بیوی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی مہندی اور اس کے لب و عارض کی حیا آلود شادابی اور اس کی آنکھوں کی پھول کھلاتی مسکراہٹ بتاتی تھی کہ وہ نئی نویلی دلہن ہے۔

www.paksociety.com

"یہ بیوی ہے میری۔ شاداں۔ اور یہ" اس نے میری طرف دیکھا "سکندر بادشاہ ہیں۔ یہ اپنے یار اکرام کی بہن ہے۔ اس سے چھوٹی ہے۔ اکرام میرے ساتھ کراچی میں ٹیکسی چلاتا تھا۔ میں نے بتایا تھا نا۔ اور یہ...... "وہ کچھ کنفیوز ہوگیا اور سر کھجا کے ہنسنے لگا۔

میں نے کہا "یہ میری بہن ہے گل بانو اور یہ غالب ہے۔ اسے تم میرا بھائی سمجھ لو۔"

"میں جب ماں کو دیکھنے آیا تھا تو وہ اتنی زیادہ بیمار نہیں تھی۔ مگر پتا نہیں کیوں بہت مایوس تھی۔ اب سوچتا ہوں کہ ماں کو کیسے معلوم ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر تو بہت پُر امید تھے مگر اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے دن پورے ہوگئے ہیں۔ اس نے پہلے سے بندوبست کر رکھا تھا۔ میرے تو خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ اس نے سولوں کو بلا کے نکاح پڑھوا دیا۔ میں انکار کیسے کرتا۔"

"کر دیتے" شاداں بولی۔

"تجھے دیکھنے کے بعد تو بالکل گنجائش نہیں رہی تھی" وہ بولا "اچھا اب جو بات میں نے سمجھائی تھی وہ تیری عقل میں آگئی ہے یا نہیں۔"

"میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں" شاداں بولی۔

"چل پھر انہیں آرام کرنے دے کچھ دیر۔ اندر والے کمرے میں۔" وہ بولا۔

شاداں مشکل سے سولہ سترہ برس کی لڑکی تھی جو صورت کے بھولے پن سے بچی سی لگتی تھی۔ وہ بہت حسین تو نہیں تھی مگر قبول صورت تھی اور اس کی صورت پر فخر و مسرت، انداز محبوبی و دلداری اور انگ انگ سے پھوٹنے والی وہ سرمستی کے جذبات تھے جو ایک دلہن کے حسن کو خیرہ کن بنا دیتے ہیں۔ وہ اٹھلاتی ہوئی آگے بڑھی اور ہم نے اس کی تقلید کی۔ غلام نبی بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔

اندر والا کمرا ان کی خواب گاہ تھا بلکہ حجلۂ عروسی تھا جس کی چمک دمک ابھی باقی تھی۔ اس کی چھت رنگ رنگ کے کاغذوں کے پھولوں، چمکیلی بیلوں اور سنہرے اور روپہلے ستاروں سے سجی ہوئی تھی اور دیواروں پر بھی کاغذی پھولوں کی رنگین لڑیاں لہرا رہی تھیں۔ کمرے میں دلہن کا نیا جہیز سجا ہوا تھا۔ خوب صورت ڈبل بیڈ، الماری، سنگھار میز اور دوسرا سامان بڑے نفاست سے آرائش کے انداز میں رکھ دیا گیا تھا۔

گل اور نازو جھجکتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ میں اور غالب ایک نئے صوفے پر بیٹھ کے بوٹ کھولنے لگے۔

"یہ کون ہے؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "اس کا بھائی پولیس میں ہے۔"

"تو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ سیدھے تھانے چلے جاتے" نازو بولی۔

غالب نے کہا "تم مذاق سمجھ رہی ہو۔ غلام نبی نے خود شک ظاہر کیا تھا۔"

"یہ غلام نبی آخر کہاں سے آٹپکا۔ پہلے تو دیکھا نہ سنا اور اس کے ساتھ چلے آئے۔"

"خدا کو یہی منظور تھا" میں نے ایک آہ بھر کے کہا "تم چاہو تو اسے بابا تاج الدین کی کرامت بھی کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے ہی ہمیں وہاں بلوایا اور ملا دیا۔ کسی نہ کسی کو ہماری نجات کا وسیلہ بننا تھا۔"

غالب نے کہا "کیا اس کا پولیس مین بھائی بھی اسی گھر میں رہتا ہے۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "یہ تو نہیں پوچھا ہم نے۔ میرا خیال ہے وہ الگ رہتا ہوگا۔ اس گھر کی حالت سے تو ظاہر نہیں ہوتا کہ یہاں بڑا اِن فضل ربی کو دخل ہے۔"

"کیا پتا وہ سچے رہتا ہو یا ایماندار آدمی ہو۔ رشوت نہ لیتا ہو" غالب نے کہا "میری مانو تو غلام نبی سے کہو ہمیں ناک پورے تک لا دے۔ ہم یہاں چھپ کر کب تک بیٹھے رہیں گے۔ آج کل کر جب بھی موقع ملے۔"

"یہاں سے نکل کے جائیں گے کہاں۔ واپس؟"

"واپس کیوں۔ ہم ڈھاکا جائیں گے" میں نے کہا "وہاں محسن کے ملنے کی امید ہے۔"

گل نے سر ہلایا "یہ کہا تھا اس نے کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے کہ ہم جدا ہو جائیں تو گھبرانا نہیں۔ ڈھاکا پہنچ جانا۔ ہوٹل شاہ باغ کے سامنے ہر روز صبح آٹھ سے نو بجے تک دیکھنا گیا اس کے مین گیٹ کے بالکل سامنے سڑک کے دوسرے کنارے پر دیکھنا۔ کسی کھمبے پر کوئی کاغذ کا ٹکڑا چپکا ہوا ملے گا۔ اس پر تمہارے رابطے کی جگہ اور وقت لکھ دوں گا اور ملاقات نہ ہو سکی تو پیغام بدل دوں گا۔ نئی جگہ اور نیا وقت بتا دوں گا یا جیسا بھی ہوا ہر پیغام فرنچ میں ہوگا۔ سکندر سمجھ لے گا۔ اگر تم پہلے پہنچ جاؤ تو کرنا۔ میں کھمبا تلاش کر لوں گا۔"

میں غالب اور نازو اسے حیرانی سے دیکھتے رہے۔

"کب کہی تھی محسن نے تم سے یہ بات۔"

"اسی رات۔ جب وہ میرے ساتھ تھا۔ مال گاڑی کے آخری ڈبے میں" گل نے کہا۔

"تابوت سے نکلے بغیر وہ بات کیسے کر سکتا تھا۔"

میں نے کہا "گل۔ ابھی تک تم نے کچھ نہیں بتایا تھا اور ہم نے بھی تم سے اس لئے کچھ نہیں پوچھا تھا کہ تمہاری ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ لیکن اب وقت ہے۔ بتاؤ اس رات کیا ہوا تھا۔ شروع سے بتاؤ۔"

"شروع سے" وہ سوچ کر بولی۔

"ہاں۔ ہم نے تو تمہیں پولیس کے قبضے سے چھڑایا تھا اور تمہیں حل یاد نہیں! اکو ناک میں سمجھ کے گرفتار کیا تھا۔ تم تہیں میں سوئی ہوئی تھیں۔ سوال یہ ہے کہ پہنچی تھیں تم۔"

گل نے کہا "مجھ سے محسن کہہ گیا تھا کہ یہیں میری واپسی کا انتظار کرنا۔"

"وہ خود کہاں گیا تھا؟"

"پتا نہیں۔ یہ بتاؤ کہ جب ہم چلے گئے تھے اس کے بعد کیا ہوا تھا" میں نے کہا "کوئی ایک شیشے کا تابوت لایا تھا۔"

گل نے اقرار میں سر ہلایا "وہ تابوت لانے والے ایک تو کرنل تھا۔ اس کے ساتھ چوہدری دلاور تھا۔"

"نازو۔ تمہیں یقین ہے۔ میرا مطلب ہے اچھی طرح دیکھا تم نے۔ پہچان لیا تھا اسے؟"

"اس میں شک و شبہ کی کون سی بات ہے۔ کیا میں نے اسے دیکھا نہیں تھا پہلے؟" گل نے کہا۔

"دونوں خود اٹھا کے لائے تھے تابوت؟"

"نہیں۔ وہ ساتھ آئے تھے" گل نے کہا۔

"اچھا تابوت میں کیا تھا۔ کون تھا؟"

گل نے نفی میں سر ہلایا "کوئی نہیں۔ تابوت خالی تھا۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"میں نے تو دیکھا تھا۔ اور میں بھی حیران ہوئی تھی کہ اس میں دونوں نہیں ہیں۔ شملا اور اس کا بیٹا۔ محسن نے بھی دیکھا تھا بعد میں اور مجھ سے پوچھا تھا۔"

"کیا پوچھا تھا؟"

"یہی جو تم نے پوچھا" گل بولی "وہ بہت دیر تک خالی تابوت کو دیکھتا رہا تھا۔ بڑی عجیب نظروں سے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی اس وقت محسن کی کیا حالت تھی۔ مجھے خوف آنے لگا تھا اس کی صورت دیکھ کے۔ وہ...... عجیب ہوگیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے گارڈ کو ناک آؤٹ کر دیا تھا اور محسن تابوت میں سے اٹھا تھا۔"

"کرنل اور چوہدری دلاور کی باتیں سن کے تم نے کوئی اندازہ نہیں کیا تھا؟" میں نے کہا "آخر شملا کو اور اس کے بیٹے کو اس تابوت سے نکال کے وہ کہاں لے گئے تھے اور خالی تابوت وہاں چھوڑنے کا مقصد کیا تھا۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ انہوں نے گارڈ سے کہا تھا کہ اس کا خیال رکھے۔ شیشے کو کچھ نہ ہو۔ جب ضرورت پڑے گی اس کو لے جائیں گے۔ ان کی صرف ایک بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید انہیں آگے کسی نشانی رکھنا کیا تھا۔ کرنل نے پوچھا تھا کہ وہ آگئے ہیں نا اور چوہدری نے کہا تھا کہ ان کی خدمت کرو۔ پھر وہ چلے گئے تھے۔"

"ان کی مراد یقیناً شملا سے ہوگی" نازو نے کہا "بعد میں وہ پھر انہیں اس تابوت میں ڈالنا چاہتے ہوں گے۔"

میں نے اور غالب نے اس خیال کی تردید نہیں کی۔ گل کا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا اور ٹھیک بھی۔ اگر انہیں واقعی آگے رکھا گیا تھا تو شک کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے ہم نے انہیں خود مار ڈالا۔ ٹرین کے ٹکراتے ہی ان کا وجود آگ اور دھوئیں میں تحلیل ہوگیا ہوگا۔ چوہدری دلاور نے تو صاف کہا تھا کہ انہیں ضمانت کے طور پر ساتھ رکھا جائے گا۔ اسلحے کے ذخیرے پر محسن کی شملا ہوگی اور ان کی محبت کی نشانی وہ بچہ ہوگا جو اپنے باپ کی صورت سے اتنا ہی نا آشنا تھا جتنا باپ اس کی صورت سے۔ جس نے ان سے رشتوں کے نام تو سنے ہوں گے مگر اس کے چچا اور ماموں اور پھوپی کون ہیں اور کہاں ہیں۔ یہ جاننے کے لئے اس کے پاس فرصتِ عمر بہت کم تھی۔

کیا واقعی ہم نے شملا کو اپنی کامیابی کی بھینٹ چڑھا دیا ہوگا۔ یہ تصور بھی احساس کے لئے سزا تھا۔

میں نے کہا "گل۔ سوچ یاد کرو۔ کوئی ایسا وقفہ تو نہیں آیا تھا جب تم پر نیند غالب آگئی ہو یا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھائی سکندر۔ وہاں نیند آسکتی تھی مجھے۔" گل نے کہا "موت آسکتی تھی مگر نیند نہیں۔ میرا کیا حال تھا اکیلے رہ جانے کے بعد۔ آپ کو کیا معلوم۔ خوف اور وحشت سوار تھی مجھ پر۔ پھر جب وہ خالی تابوت رکھ گئے تو بھی۔ میں نہ جانے کیسے بے ہوش نہیں ہوئی۔ ایک خیال تھا کہ مجھے محسن کو بچانا ہے۔ اسے نکالنا ہے۔"

"اچھا اس نے باہر آنے کے بعد کیا پوچھا۔ کیا کہا تم سے یاد کر کے بتاؤ؟ کیا اس نے شملا کا نام لیا تھا؟"

"نہیں۔ نام تو نہیں لیا۔ مگر وہ بار بار کہتا رہا کہ گل۔ اس میں تو کوئی نہیں۔ یہ خالی کیوں ہے گل....."

"اس کا مطلب ہے اسے سب معلوم تھا" میں نے دکھی دل سے کہا "وہ سب جو ہم اس سے چھپاتے رہے تھے۔"

گل نے اقرار میں سر ہلایا "جب میں کچھ نہیں بولی تو اس نے مجھے دیوانوں کی طرح جھنجوڑا اور چلانے لگا کہ گل تم کو ضرور معلوم ہوگا۔ تم چھپا رہی ہو مجھ سے۔ اور میں نے اس کی قسم کھا کے کہا کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تو اس نے یقین بھی کر لیا میری بات کا۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ پھر کہنے لگا کہ میں آگے جا کے دیکھتا ہوں۔ سکندر اور غالب سے پوچھتا ہوں۔ میں نے کہا کہ چلتی ٹرین میں کیسے جاؤ گے ان کے پاس تو وہ کہنے لگا میں چھت کے اوپر چلتا ہوا جاؤں گا۔ مگر میں نے اسے روک لیا۔ پھر ایک جگہ ٹرین رکنے لگی تو اس نے دوسری طرف اشارہ کیا۔ ایک طرف تو پلیٹ فارم تھا۔ دوسری طرف جنگل تھا۔ اس نے کہا "وہ دیکھو گل" اور میں نے دیکھا تو مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ میں نے کہا "کیا ہے؟" محسن نے کہا "ایک عورت تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ اور وہ دونوں ہے

www.paksociety.com

پکڑے لے جا رہے تھے۔ زبردستی۔"

میں نے کہا "اور تمہیں یقین ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

گل نے کہا "بھائی سکندر، سچ ہو تو مجھے نظر نہ آ۔ اس نے نام تو نہیں لیا شملا کا۔ مگر اس کے حواس پر اور اعصاب پر شملا سوار تھی۔ اور اپنا بیٹا۔ وہ ہوش میں نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں اسے جھوٹے خواب دکھا رہی تھیں۔ وہ صرف اس کا تصور تھا اور دھوکا تھا اس کے خیالوں کا۔ مگر وہ ایک دم اٹھ کے بھاگا۔ پھر میں کیا کرتی۔ میں اس کے پیچھے بھاگی ایک جگہ میں نے اسے جا لیا۔ وہ جنگل میں کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا "ابھی تو یہاں تھے وہ۔ کہاں چلے گئے؟" میں نے کہا کہ محسن، پاگل مت بنو۔ واپس چلو۔ گاڑی نکل جائے گی۔ اس نے کہا کہ گاڑی نکل کے کہاں جائے گی۔ اور ہنسنے لگا۔ تم جاؤ اگر تمہیں گاڑی کے نکلنے کا ڈر ہے۔ مگر میں اس کے ساتھ رہی۔ میں نے ٹرین کی وسل سنی اور ٹرین کو روانہ ہوتے ہوئے سنا۔ اس وقت اچانک محسن کو ہوش آ گیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کے واپس دوڑا مگر اتنی دیر میں ٹرین دور نکل گئی تھی۔ ہم پٹڑی پر اس کے پیچھے پیچھے نہیں بھاگ سکتے تھے۔ ہم پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میں بہت تھک گئی تھی۔ اچانک ایک بڑا کیبن آ گیا۔ پٹڑی سے کافی دور ایک کمرا تھا جو پہلے کبھی استعمال ہوتا ہو گا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم یہاں ٹھہر جاؤ۔ میں آگے جاتا ہوں۔ ٹرین زیادہ دور نہیں جا سکتی۔ سکندر اور غالب کو معلوم ہو گا کہ ہم ٹرین پر نہیں ہیں تو وہ ٹرین کو روک لیں گے۔ سوچے بھی پروگرام کے مطابق ٹرین کو تباہ کرنے کے لئے کوئی جگہ ہے۔ چند میل نہ گیا ہو گا جبکہ اس نے زبردستی مجھے وہاں بٹھا دیا اور کہہ گیا کہ میں اس جگہ سے نہ ہلوں۔ وہ واپس آ کے مجھے لے جائے گا۔" گل بات کرتے کرتے رونے لگی تھی۔

میں نے کہا "رونے سے کچھ نہیں ہو گا۔ چلو اچھا ہوا اتنا تو معلوم ہو گیا کہ وہ ہمارے پیچھے ہی نکلا تھا۔ ہو سکتا ہے پیچھے پیچھے آ جائے اور نہ آیا تب بھی اس نے خود ہی صورت تیار کی تھی پھر چلنے کی۔"

غالب نے سر ہلایا "میرا خیال ہے کہ اب یہاں سے نکلیں تو سیدھے ڈھاکا چلیں۔"

"محسن اکیلا رہے گا تو پاگل ہو جائے گا۔"

"اب بھی کیا کم ہے اس کی ربوائگی" گل نے کہا "تم لوگ ایسے ہی اس کے سامنے انجان بنے رہے۔ تمہارا دل رکھنے کو وہ بھی چپ رہا ورنہ اسے سب معلوم تھا۔ اس نے انتہائی صبر اور ضبط کا مظاہرہ کیا۔"

"اب تو یہ خیال بھی آ رہا ہے مجھے کہ کہیں محسن نے لاہور فون کر کے سب معلوم نہ کیا ہو" نازو بولی۔

"مجھے تمام عمر شرمندہ رہنا پڑے گا کہ میں نے اسے اندھیرے میں رکھا۔ اگر شملا مل جاتی تو کچھ نہ ہوتا۔ لیکن اب تو [illegible] احساس کی اذیت کم نہیں ہے کہ ہم نے محسن کو شملا سے [illegible] اور ہم نے ہی انہیں ملنے نہ دیا۔ خود اپنے ہاتھوں [illegible] دی۔"

"ابھی تصدیق کہاں ہوئی ہے کہ شملا اسی ٹرین پر تھی" میں نے کہا "محسن نے اسے ٹرین سے اتر کے جاتے دیکھا تھا۔"

"وہاں تو گل کے کہنے کے مطابق یہ فریب خیال تھا۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جو محسن نے دیکھا تھا وہ نظر کا دھوکا نہیں تھا" غالب بولا "اس سے پہلے کہ گل آ کے دیکھتی وہ غائب ہو گئی۔ کیوں گل؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟"

گل نے سوچ کے آہستہ سے کہا "چند سیکنڈ میں اس کا [illegible] ہو جانا مشکل تھا۔"

"مگر ناممکن نہیں" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ ناممکن نہیں کہہ سکتے۔ آگے جنگل تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ محسن نے اس کی ایک جھلک دیکھی۔ اور پھر مجھے دکھانے کی کوشش کی۔ اسی وقفے میں وہ سب نگاہ سے اوجھل ہو گئے ہوں۔ وہ کتنی دیر تک دیکھتا رہا تھا۔ اور کتنی دیر غور کرنے کے بعد اس نے مجھے متوجہ کیا تھا۔"

غالب نے کہا "پھر یہ بھی تو ضروری نہیں کہ وہ عورت شملا ہو۔ اور اس کی گود میں جو بچہ تھا وہ محسن کا بیٹا ہو۔ ایسے زمانے میں بہت سے لوگ نظر آ جاتے ہیں ڈھونڈنے جانے سے۔ محسن کو دھوکا بھی ہو سکتا ہے مگر شملا نہ ہو۔"

"کیا اس نے ان دونوں مردوں کے بارے میں کچھ بتایا تھا جو اس عورت کے ساتھ تھے؟" میں نے پوچھا۔

گل نے کہا "نہیں۔ ان کے بارے میں تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔"

"اگر وہ دلاور اور رابنز کمپنی کے لوگ ہوتے تو محسن کسی کا نام لیتا" غالب نے کہا۔

"ایسے کام خود دلاور یا زبیدی جیسے لوگ نہیں کرتے اور ان کے سب کارکنوں کو ہم نہیں جانتے" میں نے کہا۔

"پھر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ راستے میں شملا کو اتار کے وہ کہاں لے جا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ ان کی چالاکی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے شملا کو اسی ڈبے کے تابوت میں اسٹیشن پہنچایا۔ مقصد یہ ہو گا کہ ہم [illegible] لیں۔ پھر وہاں خالی تابوت چھوڑ دیا اور اسے کسی [illegible] ہمیں دھوکا دینے کے لئے۔ ان کو ڈر ہو گا کہ ہم [illegible] تو کہیں ایسا نہ ہو کہ حملہ کر کے شملا کو بھی نکال لے جائیں [illegible] ایسا کرنے تو ہمیں مایوسی ہوتی۔ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے کہ انہوں نے اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے اسے [illegible] ہے۔ ایک چیلنج بنانے کے۔ کہ اب ہمت ہے تو ڈھونڈ کے دکھاؤ۔"

"پھر اسے اتار کیوں لیا انہوں نے۔"

"یہی تو چالاکی ہو گی ان کی۔ انہوں نے پلیٹ فارم کی طرف نہیں بلکہ دوسری طرف سے اسے غائب کر دیا۔"

"مگر کیوں۔"

"پھر کسی موقع پر استعمال کرنے کے لئے اس ٹرمپ کو محفوظ رکھنے کے لئے جو کچھ وہ کر سکتے تھے کر چکے تھے۔ وہ ہمیں یقین دلا چکے تھے کہ شملا کی زندگی داؤ پر ہے۔ اس کے بعد شملا کو قربان کرنا ضروری نہیں رہا تھا۔ اس ٹرمپ کارڈ کو پھر کسی جگہ کھیلا جا سکتا تھا۔ دلاور جیسے عیار لوگوں کے ذہن کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔"

غالب نے کہا "کیوں نہ ہم زبیدی سے پوچھ لیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے وہ بتا دے گا؟" میں نے کہا "وہ کم تو نہیں ہے دلاور سے۔ پھر بھی اس کے رد عمل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"

"کیا فون ہے یہاں؟"

"ہوا بھی تو زبیدی سے بات کیسے ہو گی۔ ہمیں تو اس کا پرانا نمبر معلوم ہے۔"

"آپریٹر خود نیا نمبر ملا دے گا۔ میں غلام نبی کو بلاتا ہوں۔" غالب نے کہا اور دروازے کے قریب جا کے اسے آواز دی۔

غلام نبی نیچے سے دوڑا ہوا آیا "جی۔ آپ کیا غضب کرتے ہیں جناب۔ میں نے تو آپ کو چھپا کے رکھا ہے۔"

میں نے کہا "کیا تمہارا بھائی بھی اسی گھر میں رہتا ہے؟"

"ہاں جی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت وہ موجود نہیں تھا اور بھابی ابھی سو رہی ہے" وہ بولا۔

"تم نے اپنی بیوی کو بھی سمجھا دیا ہے۔"

"سمجھا دیا ہے جناب بہت اچھی طرح۔ لیکن آپ لوگ اس کمرے سے باہر نہ نکلیں۔ ذرا آواز بھی نہ آئے آپ کی۔ نیچے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"اور کوئی اوپر آ گیا۔ پھر؟"

"اوپر کوئی نہیں آتا۔ تمہارے کمرے کے ساتھ ہی غسل خانہ بھی ہے۔ شاراں ناشتا لا رہی ہے سب کے لئے۔"

میں نے کہا "غلام نبی۔ تم نے اکرام شیخ کی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔"

"آپ مجھے اپنا دوست نہیں سمجھتے؟" وہ بولا۔

"دوست نہ سمجھتے تو تمہارے ساتھ کیوں آتے۔ اور تو سب دشمن ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "غلام نبی۔ یہاں کہیں فون ہے۔"

"فون۔ نیچے ہے۔ لائن اوپر بھی ہے۔ کس سے بات کرنا چاہتے ہیں آپ؟"

"بمبئی میں سیٹھ زبیدی سے" میں نے کہا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا "یہ فون بند سائیڈ ٹیبل کے اندر ہے میں جوڑ دیتا ہوں۔ دراصل بھائی کے فون آتے ہیں تو ہماری نیند خراب ہوتی ہے۔ سو فون ان کے ہوں تو ایک ہمارا ہوتا ہے۔"

"جہاں جب تم فون الگ کر کے رکھ دیتے ہو۔"

"اور کیا کروں۔ اس کی گھنٹی تو بند ہوتی نہیں۔ اب آپ نمبر ملائیں گے تو گھنٹی نیچے بھابی کے کمرے میں بھی ٹن ٹن کرے گی۔ تو میں تار الگ کرتا ہوں نیچے جا کے۔ بھابی کے کمرے کا سوئچ آف کرتا ہوں۔ ورنہ وہ سب سن لے گی۔"

"ایسا ہی سوئچ تم بھی لگوا لیتا" نازو نے کہا۔

غلام نبی مسکرایا اور نیچے چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ پھر نمودار ہوا اور اس نے بیڈ سائڈ کی ایک دراز میں سے فون نکال کے نیچے سے آنے والے تار سے جوڑ دیا۔

"جلدی سے بات کر لیں۔ بھابی کا کوئی بھروسہ نہیں ابھی اٹھے گی تو شور مچا دے گی کہ فون ڈیڈ ہے۔ اسے خبط ہے فون گھمانے کا۔ صبح سب سے پہلے تو میکے میں ایک ایک کی خیریت پوچھتی ہے لمبے لمبے۔ میری بیوی بہت جلتی ہے۔"

"اس کا بھی دل چاہتا ہو گا۔"

"ہاں۔ مگر فون کہاں ہے ان کے گھر میں" غلام نبی بولا۔

"بمبئی کا کوڈ یاد ہے" میں نے کہا۔

غلام نبی کوڈ بتا کے پھر نیچے بھاگ گیا۔ سو بے حد مصروف نظر آ رہا تھا۔ اس گھر میں پہلے ان کی ماں بھی ہوگی مگر اب اوپر کی منزل چھوٹے بھائی کے تصرف میں تھی اور نیچے کی منزل بڑا بھائی استعمال کر رہا تھا۔ وہ خود بھی پولیس افسر تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اس کی بیوی سب کی افسر ہے۔ غلام نبی بھی اس سے ڈرتا تھا۔

بمبئی کا نمبر ملتے ہی میں نے آپریٹر کو نمبر دیا کہ سیٹھ زبیدی کا نمبر ہے۔ ارجنٹ کال ملاؤ۔

چند منٹ بعد گھنٹی بجنے لگی۔ صبح صبح لائنوں پر رش نہیں تھا۔

آپریٹر نے کہا "ان کا یہ نمبر نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اگر نمبر بدل گیا ہے تو مہربانی کر کے نیا نمبر ملا دو۔"

شاید یہ انکسار آپریٹر کو پسند آیا۔ اس نے "اچھا" کہا اور میں پھر ریسیور رکھ کے انتظار کرنے لگا۔ گھنٹی دوسری بار بجی۔

"سیٹھ زبیدی سے بات کریں۔"

مجھے بہت کم امید تھی کہ اتنی صبح زبیدی سے بات ہو سکے گی۔ دوسری طرف سے اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں "ہیلو" کہا۔

"مسٹر زبیدی" میں نے کہا "میں تمہیں اور دلاور کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔"

وہ جیسے چونک کر بولا "کون۔ محسن۔ تم نے کل بھی فون کیا تھا۔ سو مجھ میں پھر بتانا چاہتا ہوں تمہیں کہ مجھے اس حرام زادے کا کچھ پتا نہیں۔ وہ مجھے مل جائے تو تم سے پہلے میں خود اسے کتے کی موت مار دوں۔"

www.paksociety.com

میں نے اس انکشاف کی حیرت پر قابو پالیا کہ محسن پہلے بھی تریویدی سے بات کر چکا تھا "آخر کیوں تریویدی۔ تم بڑے اچھے دوست تھے آپس میں....."

"دوست۔ اس لفظ کے کوئی معنی نہیں ہیں میری لغت میں۔ نہ کبھی کوئی میرا دوست ہوا ہے نہ میں کسی کا دوست ہوں۔"

"صرف دشمن بنائے ہیں تم نے؟"

"مطلب کی بات کرو۔ میں ایک کال کا انتظار کر رہا تھا اس لئے جاگ رہا تھا" تریویدی بولا "تم سے تو میں بعد میں نمٹوں گا پہلے مجھے دلاور مل جائے۔ اس نے مجھے تباہ کر دیا۔ میں اچھا بھلا بزنس مین تھا۔ اس نے مجھے دہشت گردوں کے کاروبار میں ڈال دیا۔"

"فیصلہ تمہارا اپنا ہوگا تریویدی۔ تم بچے نہیں ہو کہ اس نے تمہیں مجبور کر دیا تھا۔"

"ہاں۔ لالچ نے اندھا کر دیا تھا مجھے کہ اس کاروبار میں ایک کے سو بنانے کی بات میری سمجھ میں آگئی۔ نقصانات کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔"

"تریویدی۔ میری پوزیشن بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔ مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس میں میرا مستقبل تباہ ہو جائے گا" میں نے بڑے دکھی لہجے میں کہا۔

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "اب کیوں روتے ہو۔ میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ تمہاری بیوی بچے ضمانت ہوں گے ہمارے تحفظ کی۔ مگر تمہارے ان دوست کہلانے والے دشمنوں نے تم کو بے خبر رکھا۔ میرا بہت بڑا مالی نقصان ہوا مگر اس سے میں غریب نہیں ہوا۔ میں سب کسر نکال لوں گا سال بھر میں۔ تم اپنے بیوی بچے..... کہاں سے لاؤ گے۔ مجھ سے نہیں اس سکندر اعظم کی اولاد سے پوچھو کہ اس نے کون سی دنیا فتح کر لی۔ اپنا اس..... کو تو چپکے سے واپس بھیج دیا۔"

"رابعہ اپنی مرضی سے گئی تھی" میں نے اس کے نام کے ساتھ دی جانے والی اشتعال انگیز گالی کو نظر انداز کر دیا۔

"ایسا ہی کہتا ہوگا وہ تمہیں۔ مگر یہ سازش تھی۔ اس نے بے وقوف بنایا تم سب کو۔ وہ سب کو مروا دے گا اور خود بڑی شان سے واپس لوٹ جائے گا۔ تم کو کہیں بھی چھوڑ دے گا راستے میں۔ تم سب پاگل ہو کہ اس کی باتیں سن لیتے ہو۔ وہ ہٹلر ہے۔ اسی کی طرح سفاک اور بے رحم۔ اس نے بھی جرمن قوم کو دیوانہ کر رکھا تھا۔ مگر حاصل کیا ہوا اسے.....؟"

"تم مجھے بدگمان کرنا چاہتے ہو اس سے؟"

"معلوم ہوتا ہے اب بھی تمہاری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ تم یہ بات اس سے پوچھ کے دیکھو کہ اس زمین پر تمہارے بیوی بچوں کی موجودگی کا اسے علم تھا یا نہیں۔ وہ کہے گا کہ نہیں حالانکہ اسے سب معلوم تھا۔ پھر اس نے ان کے اور تمہارے بارے میں سوچا کیوں نہیں ٹرینوں کو اڑانے سے پہلے۔ اس لئے کہ خود اس کے لئے اپنی کامیابی زیادہ اہم تھی۔ تم سب ہوتے اس زمین میں تب بھی وہ پروا نہ کرتا۔ سب کو اسی طرح موت کے گھاٹ اتار دیتا اور اپنی فتح کا سہرا اپنے سر سجا لیتا۔ میری مانو تو اب بھی وقت ہے۔ واپس چلے جاؤ اپنے گھر۔ اس احمقانہ جدوجہد سے کچھ حاصل نہیں۔ تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ رائی سے پہاڑ نہیں ٹل سکتا۔ جہاں بین الاقوامی سیاست کے گھوڑے دوڑ رہے ہوں کیا وہاں چیونٹی راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔"

میں خاموشی سے سب سن رہا تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ میری اور تریویدی کی گفتگو کے بارے میں دوسروں کو کچھ معلوم ہو۔ اپنی طرف سے تریویدی نے محسن کو مجھ سے بدظن کیا تھا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ محسن زندہ تھا اور محفوظ تھا۔ اس نے کہیں سے تریویدی کو فون کیا تھا اور اس سے دلاور کے بارے میں پوچھا تھا۔ دکھ کی بات یہ تھی کہ اب وہ ذاتی انتقام کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ہماری کامیابی کا عنوان شملا اور اس کے بیٹے کا بے گناہ لہو ہے۔ جو سب جانتے ہوئے بھی انجان بنا رہا تھا۔ اس امید میں کہ آخر کار ہماری کوششوں سے ان کی جان بچالی جائے گی مگر یہ امیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔ اب شاید وہ میرا دوست بھی نہیں رہا تھا۔ جب وہ دوبارہ فون کرے گا تو تریویدی اسے بتائے گا کہ وہ سکندر اعظم تھا جس نے محسن بن کے فون کیا تھا۔ پھر وہ محسن کو مزید بدظن کرے گا۔

لائن کٹ گئی تھی مگر میں ریسیور کان سے لگائے کھڑا ہوا اپنے ہی خیالوں کی بازگشت سن رہا تھا۔

گل نے مجھ سے کہا "بھائی سکندر کیا ہوا؟" میں نے ریسیور رکھ دیا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ میرے پاس اس کو بتانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اسے جواب دیتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سچ بولنا ممکن نہیں اور ان سب سے جو میرے دوست تھے اور مجھ پر اعتماد رکھتے تھے جھوٹ بولنا اس سے زیادہ ناممکن تھا۔

اچانک نیچے کوئی عورت چلانے لگی۔ پھر کسی اجنبی مرد کی آواز نے اسے خاموش کر دیا۔ میں نے دروازے سے کان لگا کے سنا۔

"شور مت کرو۔ میں دیکھتا ہوں" مرد بولا۔

"غلام نبی۔ بولتا کیوں نہیں....." عورت چلائی۔

"آپ کو وہم ہو گیا ہے بھابی....." غلام نبی نے کہا "اوپر کوئی نہیں ہے۔"

"تو جھوٹ بکتا ہے" عورت نے کہا۔

میں نے گھبرا کے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو پتا چلا دروازہ باہر سے بند تھا۔ شاید مقفل تھا۔ کوئی اوپر آ رہا تھا۔

غالب اور نازو کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ انہوں نے کمرے کے [illegible] کوئی کھڑکی، دروازہ یا روشن دان تلاش کرنے کی کوشش کی مگر فرار کے سب راستے مسدود تھے۔ کھڑکی میں آہنی سلاخیں تھیں اور غسل خانے کا روشن دان چھوٹا ہونے کے علاوہ دوسری منزل کی انتہائی بلندی پر تھا۔

غلام نبی چلانے لگا "رک جاؤ بھیا۔ اوپر دوست ہیں میرے۔ بلی ہے۔"

"کیا؟" یہ غالباً غلام نبی کے بھائی کی آواز تھی "ابھی تو کہہ رہا تھا کہ اوپر کوئی نہیں ہے۔"

"وہ..... دراصل پردہ دار لوگ ہیں۔"

"کون لوگ ہیں؟ انہیں اس طرح چھپا کے کیوں رکھا ہوا ہے تم نے؟" غلام نبی کے بھائی نے شکی لہجے میں کہا۔

"میرا دوست ہے۔ اور اس کی بیوی۔"

"بیوی یا کوئی لڑکی؟ جسے وہ بھگا کے لایا ہوگا اور تو نے اسے میرے ہی گھر میں چھپنے کی اجازت دے دی" غلام نبی کے بھائی نے غصے سے کہا "مجرم بنا دے گا تو ایک پولیس افسر کے گھر میں ہے۔"

"ارے یہ بے وقوف بنا رہا ہے تمہیں۔ نہ کوئی دوست نہ کسی کی بیوی" غلام نبی کی بھابی نے چلاتے ہوئے کہا "وہ تو پتا نہیں کون لوگ ہیں۔ دو مردوں کی آواز خود سنی ہے میں نے۔ فون پر بات کر رہا تھا ایک تو۔ اس کا نام محسن ہے۔"

"ٹیلی فون بھی کیا تھا؟"

"صبح صبح ٹرنک کال کی تھی آپ کے مہمانوں نے" غلام نبی کی بھابی نے طنز سے کہا "بمبئی کے کسی سیٹھ تریویدی کو۔ وہ پتا نہیں کس دلاور کو گالیاں بک رہا تھا کہ اس نے مجھے دہشت گردی کے کاروبار میں ڈال دیا۔ بہت نقصان ہو گیا میرا۔ میں اسے مروا ڈالوں گا اور کسی سکندر اعظم کا نام بھی لیا تھا اس نے جس نے ٹرینوں کو اڑا دیا۔"

"یہ کیا بکواس ہے" غلام نبی کے بھائی نے کہا۔

"ارے میں نے خود سنا ہے اپنے کانوں سے۔ وہ تو جب میرے کمرے میں گھنٹی ٹرن ٹرن کرنے لگی تو میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں نے کہا یہ اتنی صبح کون بیٹھ گیا فون ملا کے۔ پہلے ہی بل کم نہیں آتا۔ بھرنا تو ہمیں پڑتا ہے۔ ایک ایک لفظ سنا تھا میں نے۔"

میں اور غالب دروازے کے پیچھے دم سادھے سب کچھ سن رہے تھے۔ اس میں کوئی شک کی گنجائش نہ تھی کہ ہمارے ستارے گردش میں تھے اور ہم سر پر ایک آفت سے بچتے تھے تو دوسری گلے پڑ جاتی تھی۔ ٹیلی فون کو استعمال کرنا ایک فاش غلطی ثابت ہوا۔ اس کی ایکس ٹینشن پر غلام نبی کے انسپکٹر بھائی کی بد مزاج بدخو بیوی نے میری اور تریویدی کی ساری باتیں سن لی تھیں اور جتنی یاد رہی تھیں وہ اپنے شوہر کے کانوں میں ڈال دی تھیں۔ اب غلام نبی کے پاس نہ جھوٹ کا سہارا تھا نہ کوئی اور بہانہ۔

"میں کہتا ہوں ہٹ جا میرے راستے سے۔ میں سب سمجھ گیا ہوں غلام نبی۔"

"آپ میری بات تو سنیں۔"

"کیا سنوں میں تیری بات۔ تو ان دہشت گردوں کو کہاں سے لایا ہے؟ کتنے پیسے لئے ہیں ان کی مدد کرنے کے؟"

"خدا کی قسم بھیا....."

غلام نبی کے بھائی نے اسے چند گالیوں سے نوازا "قسم کھانے سے کچھ نہیں ہوگا..... یہ تو سوچ کہ ہم بہت بڑی مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔ دہشت گرد کسی کے یار نہیں ہوتے۔ وہ اس گھر کو تباہ کر سکتے ہیں۔ مجھے اور تجھے مار کے بھی نکل جائیں گے وہ۔ اور میری پوزیشن کا خیال ہے تجھے؟ میں ایک پولیس افسر ہوں۔ جان نہ گئی میری تو نوکری چلی جائے گی۔ جیل ہو جائے گی مجھے۔ میری وجہ سے کتنے مسلمان پولیس افسروں کی وفاداری مشکوک ہو جائے گی۔ سب کہیں گے کہ یہ مسلمان بھروسے کے قابل ہیں ہی نہیں۔ یہ سب پاکستان کے ایجنٹ ہیں دل سے" غلام نبی کا بھائی اب اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ راستے سے ہٹ جائے۔

میں نے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا۔ غلام نبی واقعی اپنے بھائی کے سامنے دیوار بنا ہوا تھا اور ہاتھ پھیلائے سینہ تانے کھڑا ہوا تھا۔

"بھیا! آپ پہلے مجھے گولی ماردیں۔ تاکہ مجھے شرمندگی نہ ہو یا میں جن کو بابا تاج الدین رحمت اللہ علیہ کی درگاہ سے اپنے گھر لایا تھا' ان کے ساتھ بد عہدی کا الزام آئے مجھ پر" غلام نبی اب رونے لگا تھا۔

"آپ اس کے ٹسوے بہانے پر مت جائیں جی" غلام نبی کی بھابی نے کہا "یہ تو خود پاکستانی ایجنٹ ہے۔ میں تو اسی لئے کہتی تھی کہ اسے مت رکھو۔ واپس بھیج دو پاکستان۔ ماں کی بیماری ہم نے بھگتی۔ یہ آیا مٹی ڈال کے دودھ بخشوانے۔ ہم تو پہلے ہی پھنس گئے ہیں اس کی شادی کر کے۔ کسی کو پتا چل گیا....."

اس وقت ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ غلام نبی کے بھائی نے اپنی بیوی کی زبان بند کرنے کے لئے خالص مردوں والا فارمولا استعمال کیا۔ اس نے بیوی کے ایک جھانپڑ رسید کیا "بھونکنا بند کر۔ بہت دیر سے بولے چلے جا رہی ہے اری کمبخت۔ یہ چھوٹا بھائی ہے میرا۔ اس کے باپ کی جگہ ہوں میں۔ ماں نے مرتے وقت اسے میرے حوالے کیا تھا۔ مگر تو پہلے دن سے دشمن ہو رہی ہے اس کی۔ سمجھتی ہے یہ مکان کا حصہ بانٹے گا۔ کہاں سے آگیا۔ تیرے بھائی کے نام کر دوں مکان؟"

اس کی بیوی نے روتے دھوتے کہا "مجھے کیا جی۔ میں کون ہوتی ہوں صحیح مشورہ دینے والی۔ جو تمہارے جی میں آئے کرو۔"

"چل نیچے جا۔ اور خبردار جو اب تیری آواز بھی سنی میں نے" غلام نبی کے بھائی نے گرج کے کہا "ہمارے گھر کی بات ہے ہم نمٹ

www.paksociety.com

لیں گے۔"

غلام نبی اس کایا کلپ سے بہت مطمئن اور مسرور نظر آتا تھا۔ "بھیا! مجھے تو حکم ہوا تھا بابا تاج الدین کا۔ انہوں نے خواب میں آ کے کہا تھا کہ غلام نبی، تیرے دو مہمان ہمارے پاس بیٹھے ہیں۔ انہیں اپنے گھر کیوں نہیں لے جاتا۔"

"اچھا! یہ...... یہ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا تو نے کہ بابا تاج الدین کا حکم ہے" سب انسپکٹر کو ان سے انتہائی عقیدت معلوم ہوتی تھی۔

"یہ ٹھیک ہے کہ وہ پاکستان سے آئے ہیں۔ مگر بھیا دہشت گرد نہیں ہیں۔"

"اچھا۔ پہلے میں ان سے مل لوں، پھر فیصلہ ہوگا" غلام نبی کے بھائی نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

جھکے جھکے میری کمر اکڑ گئی تھی۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور ان کے دستک دینے سے پہلے ہی دروازہ کھول دیا اور وہ سیدھے چلتے ہوئے اندر آ گئے۔

غلام نبی کا بڑا بھائی اس سے بالکل مختلف تھا۔ صورت شکل میں بھی اور ڈیل ڈول میں بھی۔ اس کی خاص پولیس اسٹائل کی توند تھی، مونچھیں تھیں اور کینہ توز آنکھیں تھیں۔ وہ کچھ دیر ہم سب کو گھورتا رہا اور ہم سب مجرم بنے کھڑے اس کے فیصلے کا انتظار کرتے رہے۔ یہ فیصلہ ہمارے خلاف ہوتا تو اس کے آثار پہلے نظر آ جاتے اور فیصلے کے اعلان سے پہلے ہم عدالت کو بے بس کر دیتے۔ اس نے بات تو عقل مندی کی کی تھی کہ دہشت گرد کسی کے یار نہیں ہوتے اور اس گھر کو بھی تباہ کر سکتے ہیں مگر حماقت کا ثبوت یہ دیا تھا کہ ہم سے مذاکرات کرنے آ گیا تھا۔ ہم جیسے لوگ مذاکرات نہیں فیصلے کرتے ہیں اور فیصلے بھی وہ جو یک طرفہ طور پر ہمارے مفادات کے حق میں ہوں۔

"میں سمجھ گیا" آخرکار اس نے کہا "تم دونوں کو اچھی طرح پہچان گیا۔"

میں نے کہا "گویا تعارف کی ضرورت نہیں" اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

غالب نے بھی کہا "آپ کا اسم شریف؟" اور آگے بڑھا۔

"محمود۔ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ میں بھی الو کا پٹھا ہوں غلام نبی کی طرح" وہ پیچھے ہٹ کے بولا۔

"فرض کرنے کی کون سی بات تھی اس میں! آخر تم اس کے بڑے بھائی ہو" میں نے کہا۔

"مگر میں بے وقوف نہیں ہوں۔"

"ہاں۔ صورت سے بھی نہیں لگتے" میں نے اتفاق کیا اور ایک دم اس کے پیچھے جا کے دروازہ بند کر دیا۔

وہ تیزی سے گھوما "یہ...... یہ کیا حرکت ہے۔"

میں نے کہا "اب ہم اطمینان سے بیٹھ کے بات کر سکتے ہیں۔"

"مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی" اس نے مشتعل ہو کے ریوالور نکال لیا۔

میں اطمینان سے دروازے کے سامنے کھڑا رہا "اب کے ہم بات کریں گے۔ تم سنو گے اور صرف اتفاق کرو گے۔ اختلاف کی اجازت نہیں ہوگی۔"

"تم کون ہوتے ہو......" اس نے دہاڑ کے کہا اور مجھے ایک گالی دی۔

میں نے متاثر ہوئے بغیر اسی پُرسکون انداز کو برقرار رکھا۔ "پہلے ہم مہمان تھے اس گھر میں۔ گھر تمہارا اور غلام نبی کا ہے۔"

نازو نے روہانسی شکل بنا کے اور قریب آ کے کہا "تھانیدار جی! چلو غلطی ہو گئی۔ اب جانے دو جی۔"

اس نے حقارت اور طنز سے کہا "غلطی ہو گئی۔ کس سے؟"

"تم سے" میں نے کہا "آنے سے پہلے تم نے بھی نہیں سوچا تھا کہ جانا دوسرے کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔"

وہ میری طرف متوجہ تھا جب نازو نے اس کی کلائی پر اپنی کڑی ہتھیلی ماری۔ اس نے بلبلا کے نازو کو ایک گالی دی لیکن اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ وہ اب دوسرے ہاتھ سے مضروب کلائی کو پکڑے کھڑا تھا۔ نازو اس کے ریوالور کو گرنے سے پہلے جھپٹ کے دور جا کھڑی ہوئی تھی اور یہ سب پانچ سیکنڈ سے بھی کم وقت میں ہو گیا تھا۔

"اب آپ ہمارے مہمان ہیں" میں نے کہا "اس گھر میں ہم آپ کے مہمان۔ اس کمرے میں آپ ہمارے مہمان۔"

"گویا ہم دونوں بیک وقت میزبان بھی اور مہمان بھی۔"

غالب نے ایک کرسی آگے بڑھائی "پدھارئیے۔"

وہ چالاک آدمی تھا۔ اس نے فوراً ہی محسوس کیا کہ بازی الٹ گئی ہے اور اب وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تو اس نے گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا۔ اس کے چہرے کی خشونت میں نرمی جھلکنے لگی۔ وہ مسکرانے لگا اور پھر بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ غلام نبی کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آنے لگے۔

"آپ لوگ بھی اب بیٹھ جائیں۔ غلام نبی! تم نے کچھ خاطر تواضع کی اپنے دوستوں کی۔"

"خاطر تواضع تو آپ کرتے" غالب نے کہا "اگر یہ لڑکی آپ کو موقع دیتی۔"

وہ ہنسا "بھئی بڑا کرارا ہاتھ مارا تھا۔ میں تو سمجھا ہڈی ہی ٹوٹ گئی ہوگی۔ غالب اور سکندر کو تو پہچان لیا میں نے۔ تمہارا کیا نام ہے؟"

"غالبہ" میں نے کہا۔

"غالبہ کیا؟" وہ بولا۔

"یہ اس لڑکی کا نام ہے" میں نے کہا "پورا نام مع ولدیت، خاندانی القاب و آداب کے ساتھ ایک میٹر لمبا ہے اس لئے یاد نہیں رہتا۔"

بخت کے باوجود ہنسا "اچھا۔ نہیں بتاتا تو مت بتاؤ مگر اب طرف سے دل صاف کر لو۔ تم غلام نبی کے دوست ہو اور بابا تاج الدین کے مہمان تو میرے لئے باعث رحمت۔"

میں نے کہا "تمہاری بیوی کا خیال مختلف ہے۔"

"وہ...... وہ کچھ نہیں کرے گی۔ میری مرضی کے بغیر۔ تم نے بے وقوفی کی یہاں سے فون پر بات کی۔ اس نے سب سن لیا۔ ...... خیر یہ بتاؤ کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں۔"

"بھنڈار اس لا رہی ہے ناشتہ" غلام نبی نے کہا۔

"گڈ۔ ویری گڈ۔ اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے پہلے معلوم ہو جاتا تو میں غلام نبی کو بھی اجازت نہ دیتا کہ تمہیں یہاں لائے۔ تمہاری وجہ سے ہم بڑی مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم جلد از جلد رخصت ہو جاؤ۔ کسی چیز کی ضرورت ہے تو بے تکلف بتا دو" وہ اٹھنے لگا۔

غالب نے کہا "ضرورت صرف آپ کی ہے اور آپ جا رہے ہیں۔ یہ تو بڑی غلط بات ہے۔"

"مجھے ڈیوٹی پر جانا ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "تھانیدار جی۔"

"میرا نام انعام نبی ہے۔"

"جب تک ہم یہاں ہیں آپ بھی کہیں نہیں جائیں گے۔ بہتر ہوگا اگر آپ اپنی زبان دراز بیوی کو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھا دیں کہ اس کی ذرا سی بے وقوفی خود اسے بیوہ کر سکتی ہے" میں نے کہا۔

انعام کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اس کو اندازہ ہو گیا کہ ہم اتنی آسانی سے فریب دوستی کھانے والے لوگ نہیں ہیں۔

"اپنی بیوی کو بھی یہاں بلا لو" غالب نے کہا "ورنہ ہم اسے خود اٹھا لائیں گے۔"

"اس سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم بچ کے نہیں نکل سکتے۔" انعام نے کہا "آخر کب تک قید میں رکھو گے تم ہمیں۔"

"تمہاری مراد قید حیات سے تو نہیں ہے؟" غالب نے کہا۔ "تمہیں قید حیات سے بھی آزاد کر سکتے ہیں ہم۔ ابھی تک ہم نے اس گھر کا نمک نہیں کھایا ہے اس لئے نمک حرامی کا الزام بے جا ہوگا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں۔ ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کا کیا انجام ہو سکتا ہے!"

"کیا کرو گے آخر تم۔ مجھے مار دو گے؟"

"اگر یہ ناگزیر ہوا۔ یہ بقا کی جنگ ہے انعام اور اس میں تم ہمارے ساتھ نہیں ہو۔ ہمارے مقابل آ گئے ہو۔ خود اپنی مرضی سے۔"

"میری کوئی مرضی نہیں۔ حالات نے پہلے ہی مجھے اور تمہیں ایک دوسرے کی دشمنی ورثے میں دے دی تھی" وہ بولا۔

"ورثے میں؟" غالب نے کہا۔

"ہاں ورثے میں" وہ بولا "تم میرے ہی ہم عمر ہو۔ جب ہم پیدا ہوئے تھے تو ہمارے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ تھا۔ صدیوں پرانا تہذیبی رشتہ اور مذہبی رشتہ۔ تمہارے اور میرے آباء اجداد اسی زمین کا حصہ ہیں۔ ہم ہندوستانی تھے اور مسلمان تھے۔ مگر اس کے بعد تم ایک نئی سرحد عبور کر گئے۔ یہ فیصلہ تمہارے والد نے کیا تھا۔ میرے والد کا فیصلہ اس کے برعکس ہوا۔ میں اور تم ان کے فیصلوں میں نہ فریق تھے اور نہ شریک، چنانچہ آج مسلمان ہونے کے باوجود تم پاکستانی ہو اور میں بھارتی۔ اس حقیقت کو نہ میں نظر انداز کر سکتا ہوں نہ تم۔"

"تم نے مان لیا کہ ہم دشمن ہیں۔ تمہاری صاف گوئی مجھے پسند آئی" میں نے کہا۔

"میں مجبور ہوں۔"

"ہم بھی مجبور ہیں" غالب نے کہا "ہم دشمن کو رعایت دینا خودکشی کے مترادف سمجھتے ہیں۔"

"لیکن تم تھوڑی سی رعایت حاصل کر سکتے ہو۔ ایک اس لئے کہ تم غلام نبی کے بھائی ہو۔ دوسرے ہم بلاوجہ کسی کی جان لینے کے قائل نہیں۔ تم اپنی زندگی کا سودا بھی کر سکتے ہو" میں نے کہا۔

"سودا؟" وہ تلخی سے مسکرایا "زندگی کا سودا؟"

"ہاں۔ ہم اپنی زندگی کی تھوڑی بہت قیمت ادا کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا "ہم تو نکل ہی جائیں گے، خواہ تم کو سودا منظور ہو یا نہ ہو۔ مگر تم اس پیشکش سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ تمہاری زندگی بچ جائے گی۔ تمہاری بیوی کا سہاگ اجڑنے سے بچ جائے گا۔ تمہارے بچے اگر ہیں تو وہ یتیم نہیں کہلائیں گے اور اس کے علاوہ تمہیں اتنا مل جائے گا جو تم ساری عمر کی کمائی جمع کر کے بھی نہیں حاصل کر سکتے۔"

غالب نے کہا "تم ایماندار ہو غالباً۔ اور فرض شناس بھی؟"

"حرام نہیں کھاتے" نازو بولی۔

"اسی لئے تمہارا گھر بہت چھوٹا سا ہے۔ وہ بھی خود تم نے نہیں بنایا۔ تمہارے والد کی نشانی ہے۔ اس میں بھی آدھے کے مالک ہو تم۔ تمہارے پاس نہ شان و شوکت کے اسباب ہیں نہ کوٹھی نہ کار۔ تم نے دیکھا تو ہوگا کہ دوسرے تمہارے جیسے تھانیدار کتنے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رہتے ہیں۔"

"سب معلوم ہے مجھے۔ مگر میں وہ سب نہیں کر سکتا جو دوسرے تھانیدار کرتے ہیں۔ میرے والد حافظ تھے۔ ایک مسجد میں بچوں کو درس دیتے تھے۔ جو درس انہوں نے مجھے دیا وہ میری گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ میں اپنی فطرت کو بدل نہیں سکتا۔ جب بھی میرے دل میں ایسا کوئی خیال آتا ہے۔ دو تین ایسے موقعے آئے تھے جب میری نیت ڈانواں ڈول ہو گئی تھی۔ تو وہ رات کو خواب میں آ گئے اور انہوں نے مجھے بہت شرمندہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ تو میری قبر میں انگارے بھرنا چاہتا ہے بدبخت۔ مجھے سکون سے پڑا رہنے

www.paksociety.com

دے۔ اور میں نے اپنی ماں سے کچھ بھی نہیں کہا تھا مگر نہ جانے کیسے انہیں بھی معلوم ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ "انعام! رات تیرے ابا کو خواب میں دیکھا تھا میں نے۔ وہ بہت دکھی تھے۔ کہتے تھے کہ اپنے بیٹے کو سمجھاؤ۔" بس اس کے بعد میری ہمت نہیں پڑی۔ وہ بڑے سنہری مواقع تھے۔ میں لکھ پتی ہو جاتا۔ وہ سب میرے پاس ہوتا جو دوسروں کے پاس ہے۔ تم کیا سودا کرو گے مجھ سے۔"

غلام نبی نے پہلی بار لب کھولے "بھیا! ان کو جانے دیں۔ یہ کوئی مجرم نہیں ہیں۔ نہ دہشت گرد۔"

"مجھے سب معلوم ہے لیکن..."

شاداں کے آنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ شاداں نے باہر سے دستک دی "دروازہ کھولیں جی۔"

میں نے کہا "کیا بات ہے؟"

"میں شاداں ہوں۔ ناشتا لائی ہوں۔"

میں نے دروازہ کھول کے کہا "معاف کرنا۔ میں آواز پہچان نہیں سکا تھا۔ تمہاری بھابی کیا کر رہی ہے؟"

"رو رہی ہے" شاداں نے ڈرتے ڈرتے ناشتے کی ٹرے درمیان میں رکھ دی۔ کمرے کے اندر کا نقشہ دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی تھی کہ صورتِ حال غلام نبی کے قابو سے باہر ہو چکی ہے۔ میں نے ریوالور تو جیب میں رکھ لیا تھا مگر میرے ساتھ غالب اور نازو بڑے جارحانہ انداز میں چوکس کھڑے ہوئے تھے۔ صرف گل تھی جو بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی مگر وہ بھی خوف زدہ تھی۔ کرسی پر بیٹھا ہوا انعام اپنے چہرے سے جھنجلاہٹ، بے چارگی اور احساسِ شکست کے جذبات کو چھپانے سے قاصر تھا۔

غلام نبی نے کہا "شاداں! بچے کا خیال رکھنا۔"

شاداں نے واپس جاتے جاتے پلٹ کر حیران نظریں اٹھائیں۔ "کیا خیال رکھوں جی؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ تم اپنی بھابی کو اوپر بھیج دو۔"

انعام نے احتجاجی انداز میں سر اٹھایا مگر پھر کچھ سوچ کے خاموش ہو گیا۔

"نیچے کسی کا بھی فون آئے، کوئی بھی گھنٹی بجا کے کسی کو بلائے، دروازہ مت کھولنا" میں نے کہا "فون کا ریسیور اٹھا کے نیچے رکھ دو۔ جو آئے اس سے کہہ دو کہ گھر پر کوئی نہیں ہے۔"

اس نے غلام نبی کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا اور غلام نبی نے سر ہلایا "پریشانی کی کوئی بات نہیں شاداں۔"

ناشتے میں پوریاں تھیں اور حلوا تھا۔ گل نے سب کے لئے چائے بنائی۔ ایک اعصاب شکن بوجھل خاموشی کی دیوار ہمارے اور ان دونوں بھائیوں کے درمیان حائل رہی۔ غلام نبی کی رازداری سے ہماری مدد کرنے کی اسکیم بری طرح فیل ہو گئی تھی۔ اب ایک طرف وہ بھائی تھا جو اس کے لئے باپ کی جگہ تھا۔ وہ بھائی کو مجبور نہیں کر سکتا تھا کہ اپنا فرض نہ ادا کرے اور ایمان بیچ دے۔ دوسری طرف دوستی کے تقاضے تھے اور مہمان کی خاطر کے اخلاقی تقاضے تھے۔ وہ بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ [illegible] کیفیت انعام کی تھی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ہماری راہ میں [illegible] ہونے کی کوشش کرنا خود کشی کے مترادف ہے۔ ہم واقعی [illegible] مار کے اپنا راستہ بنا لیں گے۔ اس کی بیوی، اس کے بھائی اور بھائی کی نئی نویلی دلہن۔ سب ہمارے لئے اپنی جان بچانے کے مقصد سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتے اور وہ خود کو شدید دباؤ میں محسوس کرتا تھا۔ ایمان داری اور فرض شناسی کو اس نے ہمیشہ مقدم رکھا تھا۔ وہ بڑے سے بڑے لالچ کے جال میں گرفتار نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ مسئلہ لالچ کا نہیں تھا۔ اپنی زندگی کا تھا اور ان جذباتی رشتوں کا تھا جو اسے جان سے زیادہ عزیز تھے۔ جن کے بغیر وہ زندہ رہتا تو اس کی زندگی محض احساسِ جرم و پشیمانی کے بارِ گراں کا عذاب اٹھائے گزرتی۔ وہ [illegible] اور مجبوریوں [illegible] کے دو پلڑوں میں تولنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ان کے درمیان توازن برقرار رکھنے میں ناکام تھا۔ آہستہ آہستہ جذبات کا پلڑا نیچے جھک رہا تھا۔

ہم نے خاموشی سے حلوا پوری کھائے اور چائے پی۔ شاداں نے بڑے سلیقے اور محنت سے ناشتا بنایا تھا۔ پہلے ہم سب بھوکے تھے مگر اب اچانک بھوک مر گئی تھی اور ناشتا صرف ایک جسمانی ضرورت کی تسکین کے لئے کیا گیا تھا۔

انعام کی بیوی ایک بار پھر اوپر آئی تو اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا مگر اس کے ماتھے پر ظاہر ہونے والے بل اس کی برہمی کا پتا دیتے تھے۔ اس کی آنکھیں رونے سے لال ہو رہی تھیں۔ سب کے سامنے شوہر نے اس کی تذلیل کی تھی اور بے عزتی کا یہ احساس بھی اس کے وجود میں دبے ہوئے غصے کی خبر دیتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اپنے شوہر کی اصول پرستی اور ایمان داری کے ساتھ وہ بادلِ ناخواستہ اور خود پر جبر کر کے گزارہ کر رہی تھی۔ شوہر سے محبت کرنا، اس کا حکم ماننا اور اس سے وفادار رہنا تو ایک ذمے داری تھی جو معاشرے، مذہب اور قانون نے اس پر عائد کر دی تھی اور اس نے نوشتۂ تقدیر جان کے قبول کر لی تھی مگر اس کی زندگی میں وہ خوشی مفقود تھی جو ارمانوں کے پورا ہونے اور خواہشات کی تکمیل سے ملتی ہے۔ اس نے ضرور یہ خواب دیکھے ہوں گے کہ ایک تھانیدار کی بیوی بن کے وہ عیش کرے گی۔ دولت کی دیوی اس کے گھر کی باندی ہو گی۔ وہ شوہر کے اختیارات کو بھی اپنی مرضی سے کیش کرا سکے گی اور استعمال کرے گی مگر اس کے یہ خواب پورے نہیں ہوئے تھے۔ اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو۔ حسرتوں نے زخموں کو روگ بنا دیا تھا اور وہ چڑچڑی، بد مزاج اور بد خو ہو گئی تھی۔ یہ احساسِ محرومی کا ردِ عمل تھا جس نے اسے سب سے بیزار کر دیا تھا۔ اس حد تک کہ اسے خوش رہنے سے نفرت ہو گئی تھی۔

اپنے اندازے کو آزمانے کے لئے میں نے اس عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا جو انعام کی بیوی نے روز و شب اپنے حالات کی اسیر تھی۔ جو مجبوریوں کے حصار میں سسکنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی اور اپنی خواہشات کا گلا گھونٹتے رہنے کے لئے زندہ تھی۔ ایک عام عورت جو زندگی سے پیار و محبت، محبت کرنے والا شوہر اور بچے تو مانگتی ہی ہے مگر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہتی ہے۔ زیورات، اچھے اچھے کپڑے۔ شوق کے بازاروں میں وہ خود کو وسائل کی حد کا پابند نہیں کر سکتی اور وسائل ہوں تو ان کا شوق بے لگام ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا "بھابی! مجھے بہت افسوس ہے، انہوں نے آپ کے ساتھ زیادتی کی۔"

میرے طرزِ تخاطب نے غلام نبی اور انعام کو حیران کیا مگر انعام کی بیوی کا ردِ عمل بہت شدید ہوا۔

"تمہیں کیوں افسوس ہے؟" وہ بھڑک کے بولی "جب انہیں افسوس نہیں۔ اور یہ سب ہوا کس کی وجہ سے؟"

انعام نے کہا "چلو چھوڑو..."

وہ فوراً جذبات سے گلوگیر ہو گئی "کیا کیا چھوڑوں۔ سب کچھ تو چھوڑ دیا تمہارے لئے۔ اب یہ نوبت آ گئی ہے... کہ بس اپنا [illegible]" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "کوئی خوشی تو ملی نہیں۔ عزت بھی نہیں رہی اب تو۔ آج غیروں کے سامنے ہاتھ اٹھایا ہے۔ کل اپنوں کے سامنے جوتے مارو گے۔"

"خواہ مخواہ رائی کا پہاڑ مت بناؤ" انعام نے بگڑ کے کہا "ہزار بار کہا ہے کہ زبان مت چلایا کرو سب کے سامنے۔ میں شوہر ہوں تمہارا یا غلام؟"

میں نے غلام نبی کو آنکھ سے اشارہ کیا اور اس نے میرا مطلب سمجھ لیا۔ اس نے آگے بڑھ کے کہا "بھابی! سارا قصور میرا ہے۔ آپ مجھے ایک کے بدلے دو تھپڑ مار لیں۔ اپنے دوستوں کو گھر بلانے سے پہلے میں آپ کو بتا دیتا تو یہ کچھ نہ ہوتا۔"

"تم آتا نہ ہمارے گھر میں تو بڑا اچھا ہوتا۔ ساری عمر تو ماں [illegible] آپ بھی نہ آتا تو کیا اس کا جنازہ اٹھتا۔ پہلے ہی کیا تھا [illegible]...... پھر بھی شادی کر دی تیری۔ آدھا گھر دے دیا [illegible] یاد نہ ہو تو [illegible] ہو رہا ہے ہمارا...... یہ تیرے دوست [illegible] مجھے معلوم ہے سارا فساد انہی کا ہے۔"

"نہیں بھابی۔ یہ دوست ہیں۔ بڑے اچھے دوست ہیں [illegible] پاکستان سے آئے ہیں" غلام نبی نے کہا۔

"مگر ہم خالی ہاتھ نہیں آئے ہیں" میں نے کہا "ہم آپ کے لئے بھی تحائف لائے ہیں۔"

غالب نے نازو کی طرف دیکھا "ایسے کیا منہ دیکھ رہی ہو [illegible] بھابی کو ان کی چیز دے دو۔"

نازو سے پہلے گل نے بیگ میں سے زیورات نکال لئے تھے۔ یہ ایک جعلی پیر نے سادہ لوح عورتوں کو خواہشوں کے فریب دے کر ٹھگ لئے تھے۔ سونے کا یہ ڈھیر اس کے کام کا نہیں تھا مگر اس کی ہوس ایک اندھا کنواں تھی جس نے آخر کار خود اس پیر کو نگل لیا تھا۔ یہ زیورات ابھی تک ہمارے لئے بھی ایک بوجھ بنے ہوئے تھے۔ ان کا اس سے بہتر کوئی مصرف نہیں ہو سکتا تھا۔

زیورات کی چمک دیکھتے ہی انعام کی بیوی کی صورت کا رنگ بدل گیا۔ اس کی تمام افسردگی ایک پُر تجسس اشتیاق میں ڈھل گئی۔

انعام نے کہا "سمجھ گیا! جو کوئی چیز لی۔ یہ رشوت دینا چاہتے تھے مجھے۔"

میں نے کہا "آپ نے انکار کر دیا، آپ کی مرضی۔ مگر یہ بھابی کے تحائف ہیں۔"

غالب نے کہا "ہم بڑی دور سے لے کر آئے ہیں۔"

میں نے کہا "تحفے اور رشوت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ رشوت میں ہم لاکھوں دے سکتے تھے۔ نقد" میں نے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

گل نے بیگ مجھے تھمایا "یہ دیکھو۔ اس میں کتنی رقم ہے۔ یہ سب ٹھکرا کے تم نے واقعی ثابت کر دیا ہے کہ تم ایمان دار ہو۔"

غالب نے کہا "لیکن بھابی کے لئے اور شاداں کے لئے ہمارے گھر والیوں نے جو کچھ بھیجا ہے، یہ ان کا حق ہے۔"

"تمہارے گھر والے!" انعام نے کہا۔

"ہاں۔ ہم غلام نبی کی شادی میں تو شریک نہیں ہو سکے مگر......" میں نے گل کے نکالے ہوئے بینگل، بندے اور چوڑیاں انعام کی بیوی کے سامنے دونوں ہاتھوں پر رکھ کے پیش کئے۔

اس کی نگاہیں ان بھاری اور بیش قیمت زیورات پر جم کے رہ گئی تھیں اور وہ اپنے شوہر کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی جو دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں اور اس کی بیوی ہماری باتوں کے جال میں پھنس گئی ہے مگر وہ ہماری تردید کیسے کرتا۔ کیسے ثابت کرتا کہ نہ ہمارا گھر ہے اور نہ گھر والے۔ یہ بات تو شاید خود اسے بھی معلوم نہ ہو گی۔ ہم غلام نبی کے دوست تھے، اگر وہ ہمارے بیان کو غلط قرار دیتا تو جائز ہوتا۔

"یہ...... یہ تو بہت بھاری ہیں" انعام کی بیوی نے ہاتھوں سے زیورات کو تولنے کے لرزیدہ لہجے میں کہا "بہت قیمتی ہیں۔"

میں نے عاجزی سے کہا "جی۔ بس چھوٹے بھی ہیں، اگر آپ کو پسند ہیں تو......؟"

انعام کی بیوی کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا تھا "بہت...... یہ بہت اچھے ہیں" اس نے فوراً بینگل کو پہن لیا۔

انعام نے چلا کے کہا "الو کی پٹھی۔ واپس کر دے یہ سب۔"

"کیوں؟" انعام کی بیوی پوری طرح سونے کے جال میں گرفتار ہو چکی تھی "تحفہ واپس کر دوں؟"

"تحفہ نہیں ہے یہ۔ رشوت ہے۔"

www.paksociety.com

"تم کتنے رہو اسے رشوت ــ وار" انکی نے انگی دور سے میرے لئے کوئی چیز بھیجی ہے" اس نے بندے بھینچتے ہوئے کہا "تمہارے تو کسی دوست کو چاندی کا چھلا تک دینے کی توفیق نہ ہوئی کبھی۔ خود کانوں میں آویزے پھرتے ہیں۔ سب اپنے گھر والوں کے لئے کرتے ہیں۔ ایک تم ہو۔"

میں نے فوراً کہا "بھابی۔ اگر یہ ایمان دار ہیں تو آپ کو فخر کرنا چاہئے ان پر۔"

"خالی فخر کو کیا کروں۔ اپنے دل پر تو صبر کا پتھر رکھے بیٹھی ہوں۔ دنیا کو کیا منہ دکھاؤں۔ سب کہتے ہیں میاں خانہ دار ہے۔" اس نے زیور کو آئینے میں دیکھا۔

"کہہ دو سب سے کہ وہ رشوت لینے والا خانہ دار نہیں ہے۔" انعام چراغ پا ہو کے بولا۔

"میرے کہنے سے مانتا ہے کوئی۔ میں تو کہتی رہتی ہوں مگر سب پیچھے پیچھے کیا باتیں کرتے ہیں مجھے معلوم ہے۔ سب کہتے ہیں کہ انعام بہت کنجوس ہے۔ بہت چالاک ہے۔ نقد جمع کرتا جا رہا ہے یا فرضی ناموں سے جائدادیں خرید رہا ہے۔ نیک نامی الگ کما رہا ہے، دولت الگ۔"

غالب نے اس موقع پر نازو کو پھر اشارہ کیا اور اس نے دوسرا تحفہ شاداں کے لئے نکال لیا۔ یہ زیورات بھی کم قیمتی نہ تھے۔ شاداں جھجکی مگر غلام نبی کی نظر کا اشارہ پا کے آگے بڑھی اور اس نے خالص مشرقی انداز کی نئی دلہن کی طرح سلام کر کے تحفہ قبول کر لیا۔

انعام کی بیوی اب اپنا سب غصہ اور بے عزتی بھول چکی تھی اور یہ بھی فراموش کر بیٹھی تھی کہ اس کے گھر میں ہماری حیثیت کیا ہے۔

"تمہارے گھر والے تو بہت امیر لوگ ہوں گے کیا کرتے ہیں وہ؟" اس نے حسد سے شاداں کے زیورات کو دیکھا۔

"یہی۔ سونے کا کام" میں نے کہا۔

"اچھا۔ سنار ہو تم لوگ۔ پھر تو سونا بھی خالص ہوگا؟"

"یہ جھوٹے ہیں" انعام چلایا "پاگل کی بچی۔ تو خود بھی مصیبت میں پھنسے گی مجھے بھی مروائے گی۔ میں کہتا ہوں اب بھی واپس کر دے یہ سب کچھ۔"

"نہیں۔ میں کچھ واپس نہیں کروں گی۔"

"دیکھ۔ پھر سوچ لے۔ یہ میری مرضی کے خلاف کر رہی ہے تو۔" انعام نے ایک مرد کے اقتدار کا ترپ کا پتا نکال لیا "تیری زندگی گزر جائے گی ان زیورات کے ساتھ۔"

انعام کی بیوی کو سانپ سونگھ گیا۔

"ٹھیک ہے۔ رکھ لے یہ زیور اور چلی جا ان کے ساتھ۔"

"ان کے ساتھ کیوں؟ میرا اپنا گھر نہیں ہے کیا" وہ ایک دم پھٹ پڑی "تم کیا چاہتے ہو تو کیوں کسی سمت بار سن لی میں نے تمہاری یہ بات۔ اور نہیں سن سکتی یہ دھمکی۔ تم پیچھا چھڑانے کے بہانے تلاش کر رہے ہو کب سے۔"

"بھابی گئیں تو ہم بھی جائیں گے" غلام نبی نے کہا "ہم اس گھر میں نہیں بیٹھیں گے۔ تم اکیلے خوش رہو۔"

یہ صورت حال بڑی غیر متوقع تھی۔ انعام نے رشوت لینے سے انکار کر دیا تھا اور ہماری دوسری چال کا سلسلہ بسانے گھر کو اجاڑ رہی تھی۔ رشتوں کی بنیاد ہلا رہی تھی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ ہم انعام نبی کو باندھ کر اپنے ساتھ لے جاتے۔ اس سے پہلے کہ ہم یہ چال واپس لیتا یا نئی حکمت عملی اختیار کرتا اچانک انعام جھنجلا پڑا۔

"نہیں۔ خدا کے لئے ایسا مت کرو" انعام نے کہا "مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔"

انعام کی بیوی نے پسپائی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو گا۔ جا کے بیٹھ جانے کی دھمکی تو محض دھمکی ہوتی ہے۔ زیورات کی خاطر شوہر کو کہاں چھوڑتی ہے۔ یہ غلام نبی تھا جو انعام کی استقامت کو ناکامی میں بدل رہا تھا۔ شاید اسے بھائی سے اتنی ہی محبت تھی کہ وہ اکیلا رہ جانے کے خیال سے ڈر گیا۔ اس کے ساتھ ہی انعام کی بیوی نے پھر جارحانہ رویہ اختیار کر لیا اور آخر کار انعام نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔

"تم لوگ یہ چاہتے ہو تو پھر یوں ہی سہی۔ انعام کا ایمان ہوتا اس کی خطا تھا تو پھر آج سے وہ بھی اپنا ایمان بیچ کھائے گا۔ گناہ تمہارے سر" انعام نے چیختے چلاتے ہوئے کہا "تم لوگ عشرت کی زندگی گزارو کہ سب ملیں گے۔ میں تو عزت کے بدلے رشوت کا سودا کرتا ہوں۔ خود اپنے باپ کی قبر میں انگارے بھرتا ہوں۔ لاؤ کتنی رشوت دے رہے ہو تم مجھے۔"

میں نے کہا "یہ رشوت نہیں ہے۔"

"نہیں۔ مجھے رشوت چاہئے" پاگلوں کی طرح اس نے میرے ہاتھ سے بیگ چھین لیا "کتنی رقم ہے اس میں؟"

"مجھے۔ مجھے نہیں معلوم۔"

انعام نے بیگ اپنی بیوی کی طرف پھینک دیا "یہ بھی سنبھال لے۔"

انعام کی بیوی کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے کانپتے لبوں سے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔ نبی کو بھی احساس جرم و ندامت نے گھیر لیا تھا اور وہ مرجھا گیا تھا۔

"تم بتاؤ۔ کیا چاہتے ہو تم؟"

میں نے دل کڑا کر کے کہا "ہم بحفاظت باہر سے نکلنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ باہر سے کہاں جاؤ گے؟"

"یہ ہم نہیں بتا سکتے۔" میں نے کہا۔

"مت بتاؤ۔ بھاڑ میں جاؤ" اس نے کہا اور فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کسے فون کر رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"ٹیکسی منگوا رہا ہوں تمہارے لئے" انعام نے کہا "زندہ تمہیں تم کو دھوکا دینے کی غلطی نہیں کر سکتا میں۔ مرنا نہیں چاہتا۔"

"تم ہمارے ساتھ چلو گے" میں نے کہا اور ریوالور نکال لیا۔

"ظاہر ہے" وہ فون گھماتے ہوئے بولا "شاداں بچے جا کے پیچھے ٹھیک سے بیٹھو۔"

"ٹیکسی کی گاڑی میں جائیں گے ہم؟" میں نے کہا۔

"ایمبولینس میں" انعام نے کہا "اور کوئی صورت نہیں تمہارے شہر سے نکلنے کی۔ سارے راستوں پر سخت چیکنگ ہو رہی ہے۔ تم کسی بھی بھیس میں جاؤ پکڑے جاؤ گے۔"

انعام نے نمبر ملا کے ریسیور اپنی بیوی کو تھما دیا "ان سے کہو کہ میرے شوہر پر دل کا دورہ پڑا ہے۔"

انعام کی بیوی نے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور لے لیا۔ "ہیلو۔ ہیلو۔ میں سب انسپکٹر انعام نبی کی بیوی بول رہی ہوں۔ ان کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ فوراً ایمبولینس چاہئے۔ ایڈریس لکھ لیں۔"

"اب سنو غور سے کہ تمہیں کیا کرنا ہے" انعام نے ریسیور بیوی کے ہاتھ سے لے کر رکھ دیا۔

"مجھے معلوم ہے" میں نے کہا "ڈرائیور کے ساتھ یہ لڑکی بیٹھے گی" میں نے نازو کی طرف اشارہ کیا "پیچھے ہم سب ہوں گے۔ تم شاداں اور دلہن کے سب سے آگے بیٹھے رہو گے۔"

"اور تم شاداں اور دلہن کے ریوالور لئے بیٹھے رہو گے۔"

"ہاں۔ بعد میں جو تمہارا دل چاہے کرنا" میں نے کہا۔

"اس کے سوا ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ رحمت گل ہمارے گھر میں گھس آئے تھے۔ ہم نے جو کچھ کیا اپنی جان بچانے کے لئے کیا۔ تم میری فکر مت کرو۔"

"تم بس اپنی بیوی کو بھی سمجھا دو۔"

"وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے کہ اسے کچھ سمجھانا ضروری ہو۔ سب دیکھ رہی ہے اور سن رہی ہے" انعام نے تلخی سے کہا۔

"غلام نبی! مجھے افسوس ہے۔"

"تم سے زیادہ مجھے افسوس ہے" اس نے کہا "میں تمہیں اپنے ساتھ لایا۔ ہمارا گھر اب بھی وہ گھر نہیں ہوگا جو تمہارے آنے سے پہلے تھا۔"

"کیا ہم تمہیں بند کر جائیں؟ تمہاری بھابی اور بیوی کے ساتھ؟"

"کوئی ضرورت نہیں اس کی۔ ہم تمہارے واپس آنے تک خاموش رہیں گے۔ وعدہ کرو کہ تم بھیا کو——"

میں نے کہا "اگر تم اعتبار کر سکتے ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا بھائی تمہیں واپس مل جائے گا۔ بالکل صحیح سالم اور خیر و عافیت کے ساتھ۔"

انعام کی بیوی سب سے زیادہ پریشان تھی۔ اسے احساس تھا کہ یہ صورت حال اس کے طعنے نے پیدا کی ہے۔ اسے اپنے لالچ پر افسوس ہو رہا تھا۔ روتے روتے اس نے کہا "ارے بھیا۔ تم سب لے جاؤ۔ انہیں چھوڑ جاؤ۔ میں غصے میں تھی۔ پاگل ہو گئی تھی لالچ میں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ سب اپنے پاس رکھو۔"

"نہیں۔ میں کچھ نہیں رکھوں گی" اس کے جذبات کا دھارا اچانک الٹا بہنے لگا تھا۔ اس نے نیکلس اتار کے میری طرف پھینکا۔ پھر بندے اتارے "یہ لو۔ سب لے جاؤ۔ بس انعام کو چھوڑ جاؤ۔" اس نے بیگ بھی اٹھا کے غالب کو تھما دیا۔

"ہم دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتے" میں نے کہا۔

وہ زار و قطار رونے لگی "انعام! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہارا کہا نہیں مانا۔"

انعام نے کہا "اچھا۔ چلو رونا دھونا بند کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہیں عقل آ گئی۔ غلام نبی! خیال رکھنا اپنی بھابی کا۔ یہ کوئی اور بے وقوفی نہ کر بیٹھے۔"

"آپ فکر نہ کریں بھیا۔"

"میں آ جاؤں گا تھوڑی دیر میں" اس نے ہماری طرف دیکھ کر کہا "تمہیں فون کروں گا۔"

"میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گی۔ ساتھ چلوں گی تمہارے۔" انعام کی بیوی نے کہا اور انعام سے لپٹ گئی۔

انعام نے اسے بڑی مشکل سے الگ کیا "نہیں۔ تم گھر میں رہو۔"

"نہیں۔ میں ساتھ جاؤں گی۔"

"پاگل عورتوں کا ہر جگہ ساتھ جانا ممکن نہیں ہوتا۔ تمہاری وجہ سے میرے لئے زیادہ مسائل پیدا ہوں گے" انعام نے اسے سمجھانا چاہا مگر وہ کچھ سننے پر تیار نہ تھی۔ بلاشبہ اس عورت کا دوسرا روپ سامنے آیا تھا جس کی نظر میں ساری دنیا کے زر و جواہر کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اگر اہمیت تھی تو صرف اپنے شوہر کی زندگی کی۔

"ایمبولینس میں اتنی جگہ نہیں ہو گی" انعام نے کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔"

اسی وقت باہر سے ایمبولینس کا سائرن سنائی دیا اور ہم سب مستعد ہو گئے۔

"چلو۔ تم آگے چلو" میں نے ریوالور جیب میں رکھا مگر اپنا ایک ہاتھ بھی اسی جیب میں رکھا۔ انعام کی بیوی نے اسے ایک طرف سے پکڑ لیا۔ نازو نے دوسری طرف سے۔

www.paksociety.com

میں نے غلام نبی سے کہا "مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہئے؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ سب اچھا نہیں ہوا۔ ایک دوست کی حیثیت سے میں کچھ نہیں کر سکا۔ تمہارے کسی کام نہ آسکا۔"
میں نے کہا "تم نے کوشش ضرور کی۔"
اس نے کہا "اپنے یہ تحفے واپس لے جاؤ۔ اور یہ ساری دولت بھی۔ اس کی نحوست سے خدا تمہیں محفوظ رکھے۔"
میں نے افسوس سے کہا "اگر تم ایسا سمجھتے ہو......"
"کیا تم نے دیکھا نہیں۔ ہمارا گھر برباد ہو جاتا۔ اگر ہم یہ قبول کر لیتے۔ میرے بھائی کا ایمان سب سے بڑی چیز ہے۔ وہ بک جاتا تو ہماری عاقبت بھی خراب ہوتی اور دنیا میں بھی کیا رہتا ہمارے پاس اگر یہ رشتے نہ رہتے۔"
میں نے وہ بیگ اٹھالیا "اچھا۔ خدا تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ تمہاری محبتوں میں اضافہ کرے۔ لاؤ مجھے کوئی تالا دے دو۔"
"تالے کا کیا کرو گے؟"
"ہم باہر سے تالا لگا کے جائیں گے۔ انعام خود آ کے تالا کھولے گا۔ اس وقت تک تم انتظار کرو گے۔"
اس کی بیوی نے مجھے ایک تالا پکڑا دیا "باہر سے ٹیلی فون کا تار بھی کاٹ جانا۔"
اس معصوم لڑکی کے طنز نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ میں گل کے ساتھ تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ دروازے کو مقفل کر کے میں نے چابی جیب میں ڈال لی۔ اس وقت تک انعام ایمبولینس کے پچھلے حصے میں اسٹریچر جیسے بیڈ پر لیٹ چکا تھا۔ نازو نے آگے ڈرائیور کے ساتھ جگہ سنبھال لی تھی۔ میں اور گل پیچھے چڑھ گئے اور دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اسٹریچر کے دونوں جانب بھی بنچیں تھیں جن پر ضرورت کے وقت دو مریض اور لٹائے جا سکتے تھے۔ یہ فاکس ویگن کی مائیکرو بس تھی جس میں جگہ کی کمی نہیں ہوتی۔
انعام کے ایک طرف گل اور انعام کی بیوی تھیں۔ میں غالب کے ساتھ دوسری طرف بیٹھ گیا۔ انعام کی بیوی کی نظریں اب مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ احساس پشیمانی کا دورہ ختم ہوا تھا تو اس پر خوف اور دہشت کے جذبات غالب آنے لگے تھے۔
"تم لوگ کہاں لے جاؤ گے ہمیں؟" وہ بولی۔
"ایسے ہی کچھ دور" میں نے کہا۔
"اور اس کے بعد؟"
"ہم اپنے راستے چلے جائیں گے۔ تم اور انعام واپس اپنے گھر" میں نے کہا۔
ایمبولینس سائرن بجاتی ناگپور کے بازاروں اور سڑکوں پر سے گزر رہی تھی اور اپنا راستہ بناتی جا رہی تھی لیکن میں باہر کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایمبولینس کی کھڑکیوں کے شیشوں پر سفید پردے پڑے ہوئے تھے۔
انعام نے کہا "کیا اب میں اٹھ کے بیٹھ سکتا ہوں؟"
غالب نے کہا "تمہیں پوری آزادی ہے۔ بیٹھو لیٹو یا کھڑے ہو جاؤ۔"
"وہ لڑکی آگے بیٹھی ہے کیا اسے معلوم ہے کہ ایمبولینس کو کس راستے سے کہاں لے جانا ہے؟"
میں نے سر ہلایا "اس کی مرضی کی بات ہے۔"
"اگر ڈرائیور نے اس کی بات نہ مانی تو معاملہ بگڑ جائے گا" انعام نے تشویش سے کہا۔
"وہ منوالے گی۔ تم جانتے نہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔ ایک معمولی سا تجربہ ہوا تھا تمہیں مگر اس سے کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اتنی ہی آسانی سے صرف ایک ہاتھ مار کے ڈرائیور کی گردن بھی توڑ سکتی ہے۔ وہ چاہتی نہیں تھی ورنہ تمہاری کلائی بھی سلامت نہ رہتی" میں نے کہا۔
انعام کی بیوی نے کہا "ڈرائیور کو مار دے گی تو گاڑی کیا اس کے فرشتے چلائیں گے؟"
میں نے کہا "یہ گاڑی کیا چیز ہے۔ وہ تو ٹینک اور ہوائی جہاز تک سب کچھ چلا سکتی ہے۔ اس کا نشانہ غضب کا ہے۔ ریوالور ہو، مشین گن ہو۔"
"اور مشین گن نہ ہو تو اس کی زبان......"
گاڑی ایک دم رک گئی۔ غالب کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک ساتھ ہم دونوں نے ریوالور نکال لئے۔ پھر میں نے درمیان کا پٹ ہٹا کے دیکھا۔ ڈرائیور اور نازو کے درمیان نہ جانے کیا بات ہوئی تھی۔ ڈرائیور جوان تھا۔ شاید اس نے نازو کے حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔
پھر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ نازو نے ریوالور نکالا اور ڈرائیور نے بہادری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ریوالور چھیننے کے لئے نازو کو پکڑنا چاہا اور نازو نے بڑی پھرتی سے اس کے سر پر ہاتھ مارا۔
میں چھلانگ مار کے نیچے اترا۔ سڑک نسبتاً ویران تھی۔ میں نے ڈرائیور کی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور ڈرائیور کو کھینچ کے کندھے پر اٹھالیا۔ اسے میں نے پیچھے شفٹ کیا اور اسٹریچر پر ڈال دیا۔ میرے سوار ہوتے ہی ایمبولینس پھر روانہ ہو گئی۔
انعام کی بیوی کی آنکھیں خوف سے پھٹی جا رہی تھیں۔ وہ ڈرائیور کے سر سے بہنے والے خون کو دیکھ رہی تھی اور اپنے شوہر کے بازو سے چمٹی ہوئی تھی۔
"کیا...... یہ مر گیا ہے؟"
میں نے کہا "نہیں۔ مارا کیا تمہارا شوہر، واپسی میں اسے بھی اٹھا کے لے جانا پڑے گا۔ اگر یہ اس وقت تک زندہ رہا۔"
"مر گیا تو اس کی لاش پھینک جائیں گے ہم بے وقوف"

غالب نے کہا "غلط فہمی میں مارا گیا۔"
اب انعام بھی کچھ متفکر نظر آنے لگا تھا۔ ہم نے ثابت کر دیا کہ ہم کس حد تک خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کے گھر تمام شرافت اور انکساری سے کام لے رہے تھے۔ یہ رسمی کا سا مظاہرہ نازو نے کیا تھا جو ایک دھان پان سی لڑکی تھی۔ صرف چند پہلے میں نے اس کے بارے میں جو کہا تھا وہ سچ ثابت ہو گیا۔
"تم چاہو تو اس کے سر پر پٹی باندھ دو" میں نے کہا "تاکہ خون بہنا بند ہو جائے۔ ویسے زخم گہرا نہیں ہے۔"
انعام کی بیوی نے کوئی حرکت نہیں کی۔ یہ کام گل نے کیا۔ ایمبولینس کے اندر مرہم پٹی کا پورا سامان موجود تھا۔
پردہ ہٹا کے میں نے باہر جھانکا تو ایمبولینس پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی اور شہر کے مضافات بھی ختم ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے اور ڈرائیونگ کیبن کے درمیان والے شیشے پر دستک دی اور نازو نے پلٹ کے دیکھا تو میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا "اب تم ڈرائیونگ کرو گے۔ میں تمہارے ساتھ بیٹھوں گا" میں نے کہا۔
انعام نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ نازو پیچھے چلی گئی تو اس نے کہا "میری تو کوئی بات نہیں۔ کسی کو شاید معلوم بھی نہیں ہو گا کہ میں گھر سے غائب ہوں۔"
"ہم اسی لئے تالا لگا آئے تھے تاکہ تمہارے خیر خواہ آئیں تو [illegible] بغیر لوٹ جائیں۔"
"لیکن اس ایمبولینس کی گمشدگی تمہارے لئے مسائل پیدا کر سکتی ہے" انعام نے کہا "عام طور پر ایمبولینس گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں واپس پہنچ جاتی ہے۔"
"ایمبولینس کا ٹائر پنکچر ہو جائے یا بریک ڈاؤن ہو جائے تو واپسی میں دیر بھی ہو سکتی ہے" میں نے کہا "اور کیا یہ ممکن نہیں کہ ایمبولینس ڈرائیور جب واپس جا رہا ہو تو راستے ہی میں کوئی اور ضرورت مند اسے روک لے۔ یا اس کی ضرورت کسی جائے حادثہ پر محسوس ہو۔"
"ہاں۔ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مگر پھر بھی ایک حد ہے" انعام نے کہا "پھر ایمبولینس سینٹر سے معلوم تو کیا جائے گا کہ آخر ایمبولینس کہاں گئی۔ جو انسپکٹر انعام کو گھر سے ہسپتال لے جانے کے لئے بلائی گئی تھی۔ اور جب یہ معلوم ہو گا کہ میں دل کے امراض کے ہسپتال میں نہیں ہوں بلکہ کسی بھی ہسپتال میں نہیں ہوں اور میرے گھر سے فون پر بھی رابطہ نہیں ہو گا تو ایمبولینس کی تلاش بھی شروع ہو گی اور میری بھی۔"
میں نے بے نیازی سے کہا "چار پانچ گھنٹے ہیں ابھی۔"
"جو بات میں بتانا چاہتا تھا وہ کچھ اور تھی۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ راستے میں چیکنگ کتنی سخت ہو رہی تھی۔ یہ ایمبولینس اسی لئے گزر گئی کہ اس کا سائرن چلا رہا تھا اور اس کے اوپر لائٹ گھوم رہی تھی۔ اس کا سراغ فوراً مل جائے گا۔"
"جس سڑک پر ہم جا رہے ہیں یہ کہاں جاتی ہے؟"
"سڑک کہیں نہیں جاتی۔ اس پر سفر کرنے والے کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ ہر سڑک دوسری سڑک سے ملی ہوئی ہے۔ اور یہ تم پر منحصر ہے کہ تم دائیں بائیں مڑتے جاؤ تو ہندوستان سے پاکستان تک جہاں چاہو پہنچ جاؤ۔"
میں نے سورج کو دیکھ کر کہا "ہم بمبئی سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا تمہارے پاس کوئی نقشہ ہے؟"
"میرے پاس؟ کیا یہ میری کار ہے؟"
میں نے سر کھجا کے کہا "تمہارے ذہن میں تو ہو گا۔"
"ہاں۔ میں تھوڑی بہت رہنمائی کر سکتا ہوں اور ایک نقشہ بنا کے دے سکتا ہوں جس کی مدد سے تم سمت کا تعین کر سکو گے اور کسی سے راستہ پوچھے بغیر کسی منزل تک پہنچ جاؤ گے۔"
میں نے کہا "برطانیہ بلکہ پورے یورپ کو میں نے سڑک کے راستے کئی بار دیکھا تھا۔ نہ کبھی مجھے کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ نہ ہم راستہ بھولے۔ نقشے عام ملتے ہیں اور نہ ملیں تب بھی مسافروں کی رہنمائی کے لئے ہر سڑک پر سائن نظر آتے رہتے ہیں۔"
اس نے کچھ حیرانی سے مجھے دیکھا "یہاں صرف فاصلہ بتانے والے پتھر ہوتے ہیں۔ سنگ میل۔ ان پر عموماً تین چار اہم قصبوں یا شہروں کا فاصلہ ہو گا۔ کہیں سڑک کسی اور سڑک سے ملے گی تو تیر کا نشان بھی ہو گا۔ جیسا یہ نظر آ رہا ہے۔"
"ہم اس سڑک پر چلتے جائیں تو شام تک اندور پہنچ سکتے ہیں۔"
میں نے کہا "اوکے۔ ٹھیک ہے۔ یو ڈرائیو۔ گاڑی یہاں روک دو۔ امید ہے یہاں سے تمہارے لئے واپس جانا مشکل نہیں ہو گا۔ کیا تمہاری بیوی گاڑی چلا سکتی ہے؟"
سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ اسے سوچ کے جواب دینے کی مہلت نہ ملی اور اس نے سر ہلا کے کہہ دیا "ہاں۔"
"پھر یہ گاڑی تمہاری بیوی لے آئے گی۔ تم جاؤ۔"
"یہ کیا بدمعاشی ہے؟" وہ بگڑ کے بولا۔
"یہ ہماری شرافت ہے کہ تمہیں وعدے کے مطابق واپس بھیج رہے ہیں۔ زندہ سلامت اور بخیر و عافیت۔"
"مگر تم میری بیوی کو لے جاؤ گے۔"
"تم مرد ہو۔ پیدل بھی چل سکتے ہو۔ کچھ دور۔ کہیں نہ کہیں تم کو سواری مل جائے گی یا کوئی لفٹ دینے کے لئے رک جائے گا۔ اس عورت کو اپنے ساتھ کیوں گھسیٹتے ہو۔ وہ آرام سے گاڑی میں پہنچ جائے گی" میں نے کہا۔
"تم ڈرتے ہو کہ میں نیچے اترتے ہی اپنا وعدہ بھول جاؤں گا اور تمہارا تعاقب شروع ہو جائے گا۔"
"تم سمجھتے ہو تو پھر پوچھتے کیوں ہو؟ ہم ایک فیصد کا رسک بھی

www.paksociety.com

نہیں لے سکتے" میں نے کہا "کوئی غلط قدم اٹھانے سے پہلے اپنی بیوی کو مت بھولنا۔ ہم اتنے شریف ہیں کہ اسے سگی بہن کی عزت دیں تو اتنے بے رحم بھی ہیں کہ دشمن کا ایک سمجھ کے مار دیں۔ چلو اب اترو اور روانہ ہو جاؤ۔" میں نے کہا اور گاڑی کو موڑ لیا۔

شاید انعام کا ارادہ اپنی بیوی سے کچھ کہنے سننے کا ہو گا مگر میں نے اسے مہلت ہی نہ دی۔ اس کے اترتے ہی میں نے گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔ اس نے ضرور مجھے گالیاں دی ہوں گی اور چیخ چیخ کر دی ہوں گی۔ میں نے اسے بیک ویو مرر میں پیچھے دوڑتے پتھر اٹھاتے اور ایمبولینس پر مارتے دیکھا۔ ایمبولینس کے پچھلے حصے میں انعام کی بیوی نے بھی کہرام مچایا ہو گا مگر میں پلٹ کر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ درمیان میں شیشہ تھا اور پردے دوسری طرف پڑے ہوئے تھے۔ پچھلے حصے کی کوئی آواز بھی شیشے کی دیوار سے گزر کے مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔

جہاں میں نے انعام کو اتارا تھا وہ ایک ویران علاقہ تھا اور اس سڑک پر آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ غالباً یہ متروک راستہ تھا۔ کسی نئی سڑک کی تعمیر کے بعد لوگوں نے خود ہی ادھر سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔ وجوہات بہت سی ہو سکتی تھیں۔ عام طور پر نئے راستے فاصلے کم کرنے کے لئے نکالے جاتے ہیں مگر اس سڑک کے دونوں طرف کی زمین کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ علاقہ سیلاب کی زد میں آتا تھا یا نشیب میں ہونے کی وجہ سے بارشوں کا ریلا ادھر ہی سے گزرتا تھا۔ شاید برسات میں راستہ بند ہو جاتا ہو گا۔ بعد میں متبادل راستہ بنایا گیا ہو گا۔

تقریباً دو میل چلنے کے بعد میں نے گاڑی کو یو ٹرن دے کر واپس موڑا اور آہستہ آہستہ اسی سڑک پر آ گیا جہاں میں نے انعام کو اتارا تھا۔ دائیں طرف کی سڑک خالی پڑی تھی اور وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سڑک کو عبور کیا اور مخالف سمت میں روانہ ہو گیا۔ یہ ایک چوراہا سا تھا جہاں سے سڑکیں دونوں طرف نکلتی تھیں۔

مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ میں جس سڑک پر گاڑی دوڑا رہا ہوں وہ ہمیں کہاں پہنچائے گی۔ فاکس ویگن کا طاقتور انجن گرج رہا تھا اور اس کے عام کار سے بڑے پہیے رفتار کو مسلسل بڑھانے میں پوری طرح معاون تھے۔ یہ پتلی سی سڑک بھی خستہ حالی کا شکار تھی۔ اس پر نوکیلے پتھر ابھرے اور گڑھے سب کچھ تھا مگر ایمبولینس کے ٹائر بھی تنے تھے چناں چہ میں جھٹکوں کی پروا کئے بغیر چلتا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ پیچھے بیٹھنے والوں کا کیا حال ہوا ہو گا مگر میں رفتار کم نہیں کر سکتا تھا۔

کسی حد تک میں انعام کو یہ تاثر دینے میں کامیاب رہا تھا کہ میں انتہائی احمق بھی ہوں۔ کسی اجنبی ملک میں کوئی بھی شخص عقل سے کام لے تو راستے سے بھٹک کے گم نہیں ہو سکتا۔ ریگستان کی بات اور ہے۔ جہاں سڑکیں ہر طرف رگوں کے جال کی طرح بچھی ہوں وہاں سمت کا تعین کر کے چلنے والا غلطی نہیں کر سکتا۔ انعام کے ذہن میں یہی ہو گا کہ ہم اس کی بیوی کو اغوا کر کے اندرون کی طرف لے گئے ہیں جب کہ ہم صرف دو میل کے فاصلے سے لوٹ آئے تھے اور اب مخالف سمت میں رواں تھے۔

مجھے اس وقت بڑی طمانیت حاصل ہوئی جب اچانک وہ سڑک ختم ہوئی اور ایک صاف ستھری ہموار سڑک آ گئی۔ دونوں جانب سے ٹریفک آ جا رہی تھی۔ سمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے گاڑی کو دائیں جانب موڑ لیا۔ میرے اندازے کے مطابق بمبئی اسی سمت میں تھا۔

میری نظر اسپیڈو میٹر پر تھی۔ گاڑی ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی تھی۔ اس کے فیول ٹینک کی سوئی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ٹینک تین چوتھائی سے زیادہ خالی ہو چکا ہے۔ ایک چوتھائی بھرے ہوئے فیول ٹینک کے ساتھ ہم زیادہ سے زیادہ چالیس پچاس میل کا سفر کر سکتے تھے۔

ایک برساتی ندی کے پل پر میں نے گاڑی روک دی۔ اس ندی میں پانی کا وجود ایک نالے کے برابر رہ گیا تھا اور میری نظر نے نیچے ایک ٹرک دیکھ لیا تھا۔ ٹرک کا ڈرائیور یا کلینر اسے دھو رہا تھا اور اس کے قریب ہی کوئی اپنی جیپ بھی چھوڑ گیا تھا۔ عام طور پر اس جگہ گاڑیاں دھونے والے محنت کر کے کچھ کما لیتے ہیں۔

نیچے اترنے سے پہلے میں نے انعام کی بیوی سے کہا "بھابی..."

جواب میں اس نے مجھے ایک درجن گالیاں دیں اور وہ سب کہا جو مجھ سے پہلے غالب، نازو اور گل سن چکے تھے۔

میں نے کہا "آپ کی خفگی بجا ہے۔ میں آپ سے معافی مانگ سکتا ہوں ہاتھ جوڑ کے لیکن ہماری مجبوری......"

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری مجبوری۔ یہاں کیوں لائے ہو آخر مجھے؟" وہ چراغ پا ہو کے بولی۔

میں نے چابیاں اس کی طرف بڑھا دیں "انعام نے کہا تھا کہ آپ ڈرائیو بھی کر سکتی ہیں۔ یہ کار تو نہیں ہے مگر مجھے امید ہے کہ آپ چلا لیں گی۔ چالیس پچاس میل کے اندر جو پٹرول پمپ آئے وہاں سے ٹنکی ضرور فل کرا لیں۔ اس کے لئے ہم پیسے چھوڑ جائیں گے۔ یہ راستہ بمبئی کی طرف ہی جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کسی سے پوچھے بغیر بھی آپ شام تک بمبئی پہنچ جائیں گی۔"

"بمبئی جا کے کیا کروں گی میں؟"

"وہاں سے آپ اپنے گھر فون کر دیں یا ناگپور پہنچ جائیں کل۔ مجھے نہیں معلوم لیکن ہو سکتا ہے آگے کہیں سے آپ کو راستہ ناگپور جانے والی سڑک مل جائے۔ ہم یہاں سے جنگل کی طرف جا رہے ہیں۔"

"تمہارا بیڑا غرق ہو۔ اتنی لمبی ڈرائیو کروں گی میں؟ میں نے تو دو سال سے ہاتھ بھی نہیں لگایا گاڑی کو" وہ شور مچانے لگی۔

"پھر آپ ایسا کریں کہ راستے میں کہیں پولیس سے مدد لیں۔ ان کو بتا دیں کہ آپ انسپکٹر انعام کی بیوی ہیں۔ وہ خود آپ کو گھر پہنچا دیں گے۔ اس تکلیف کے لئے جو آپ کو ہوئی ہم بہت شرمندہ ہیں۔ ہمیں جنگل پہ رحم نہ آتا ہو تو......"

"تم خاک شرمندہ ہو۔ شرم ہوتی تو ڈوب مرتے بہت پہلے۔ تم آوارہ گرد زمانے بھر کے ایسے دنیا کو پریشان نہ کرتے۔ شریف گھروں میں گھس کے مار پیٹ نہ کرتے۔ اور تو اور لڑکیاں تک بے مہار پھر رہی ہیں۔ جب دیکھو ہاتھ میں پستول۔ مار دھاڑ میں مردوں سے آگے۔"

"اب یہ تقریر چھوڑیں۔ ہم کیا کر رہے ہیں یہ ہم جانتے ہیں۔" میں نے کہا "فوراً روانہ ہو جائیں۔ یہ نہ ہو کہ ہمارے جانے کے بعد کوئی گاڑی سمیت لے جائے۔"

اس نے خوف زدہ ہو کے ڈرائیور کی جگہ سنبھالی اور ڈرتے ڈرتے کہا "یہ... بہت بڑی گاڑی ہے۔"

میں نے کہا "حوصلہ رکھیں۔ اعتماد سے کام لیں۔ اس کا چلانا بھی اتنا ہی آسان ہو گا جتنا کسی کار کا۔"

اس سے پہلے کہ وہ روانہ ہوتی، غالب نے کہا "ایک بات کہوں اگر برا نہ مانیں تو۔"

اس نے نفرت سے ہم سب کی صورتوں کو دیکھا "برائی کے سوا تم نے کچھ کیا ہے۔ برا ماننے کی بات کرتے ہو۔"

غالب نے کہا "آپ وہ تحفے قبول کر لیں۔"

"لعنت تم پر اور تمہارے تحفوں پر۔ میری تو مت ماری گئی تھی۔ تم نہ جانے کس کا گلا کاٹ کے لائے ہو گے وہ سب۔ میرا گھر اجڑ جاتا۔ تم اپنی گھر والیوں کو پہنانا۔ گھر میں ان جیسی ہوں تو انہیں دینا۔" اس نے غصے سے کہا اور ایک دم گیئر ڈال دیا۔ گاڑی جھٹکا لے کر بند ہو گئی مگر اب وہ حالات کا مقابلہ کرنے پر آ گئی تھی۔ اس نے گاڑی کو پھر اسٹارٹ کیا۔ گاڑی کچھ دور شرابی کی طرح ڈولتی لہراتی گئی مگر ہر ایمبولینس کی طرح اس گاڑی کی حالت بہتر تھی اور اس کو کنٹرول کرنا بہت آسان تھا۔ جب گاڑی سیدھی دوڑنے لگی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"اب آگے جانا ہے یا پیچھے؟" غالب نے کہا۔

میں نے انگلی سے اشارہ کیا "نیچے۔ تم ذرا اس کو باتوں میں لگاؤ۔"

ہم ڈھلوان سے سنبھل کر نیچے اترے۔ ٹرک دھونے والے نے خوش دلی اور حیرت کے ساتھ ہمیں دیکھا مگر اپنے کام میں مصروف رہا۔ ٹرک سے فارغ ہو کے وہ جیپ کے ٹائر دھو رہا تھا۔

"یہ ٹرک کس کا ہے؟" غالب نے ٹرک کو لات مار کے کہا۔

لڑکا بیزار ہو کے بولا "میرا ہے۔ ابھی بولو۔ لات مارنے سے کیا ٹوٹ جائے گا؟"

"ہمیں کرائے پر چاہئے" غالب نے اس کے سامنے جا کے کہا۔

"تین دن کے لئے۔"

"تین دن...... کہاں جانے کو ہے؟"

"تین دن میں ہماری مرضی ہم جہاں چاہیں جائیں یا کہیں نہ جائیں۔"

"ٹرک میں بیٹھ کے قوالی گاتے رہیں" نازو نے کہا۔

میں نے نظر بچا کے ٹرک کی چابیاں نکال لیں۔ پھر میں جیپ کی طرف گیا "یہ جیپ کس کا ہے؟" میں نے جیپ کو لات ماری۔

"یہ میرے باپ کا ہے۔" وہ بگڑ گیا "ابھی جیپ والا آئیں گا تو بولو وہ آ گیا۔"

جیپ والا کرائی ٹائپ شخص تھا مگر وہ مراٹھی ثابت ہوا۔ اس نے لڑکے کا بیان سنا اور پھر [illegible] والی زبان میں کہا۔ اس کی نظر گل اور نازو پر بھی ہوئی تھی اور وہ غالباً ہمیں ٹورسٹ سمجھ رہا تھا۔ ٹرک دھونے والا لڑکا نہ جانے کہاں روانہ ہو گیا تھا۔

"ابھی بولو جی۔ ہم آ گئی۔ جیپ کو لات مارتے بے زبان کو؟"

اس نے غصے میں کہا "اپن کو مارو گی تو بولے۔"

میں نے کہا "جیپ تمہاری ہے؟"

"اپنی آپ کو میں بولتی ہے اپنا۔ آپ کیا جیپ سے پوچھتی۔ بے زبان ہے۔"

میں نے کہا "ہمیں جیپ چاہئے کرائے پر۔ دو گے یا پیٹو گے اس بے زبان کو؟"

اس کا منہ حیرت سے کھل گیا "اپن ڈرائیور ہوتی۔ بھاڑا لگتی۔ آپ بولتی کدھر جانے کو مانگتی۔"

میں نے پل کے نیچے سے دریا کو دیکھا جس کے دونوں کناروں پر گول کنکریوں کا بستر سا بچھا ہوا تھا "ندی کا سیر کرتی ہم" میں نے اشارے سے واضح کیا کہ ہم پانی کے ساتھ ساتھ ندی کے پیٹے پر سفر کرنا چاہتے ہیں۔

"ادھر آگے جنگل۔ پہاڑ ہوتی جی۔ دو میل بعد۔ شکاری لوگ آتی۔ اپن سب کو لے جاتی۔ ادھر سڑک ریسٹ ہاؤس۔" اس نے واضح کیا کہ وہ ہمیں سیدھے راستے سے بھی لے جا سکتا ہے۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "ادھر سے جاتی۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "ایک ہزار" اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا۔ اور اس وقت بہت حیران ہوا جب ہم نے سودا پانچ سو سے شروع نہیں کیا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔

ہم جیپ میں بیٹھ گئے۔ جیپ نے برساتی ندی کے پیٹ پر دوڑنا شروع کیا۔ اس کی رفتار زیادہ نہیں تھی مگر اس کے باوجود جھٹکوں سے سب کا برا حال تھا۔ اس کے پہیوں کے نیچے گول کنکریاں پھسل رہی تھیں۔ ٹپ کے ادھر ادھر ہو رہی تھیں۔ اڑ کے جیپ کی باڈی سے ٹکرا رہی تھیں اور خاموشی میں یہ شور بہت زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔

آہستہ آہستہ ہم اس جگہ سے دور ہوتے گئے۔ ندی کے

www.paksociety.com

کنارے جو پہلے ایک فرلانگ دور تھے کچھ سمٹ گئے۔ درمیان میں سرکنڈے نمودار ہو گئے۔ پانی کے متعدد دھارے نالیوں کی صورت میں دونوں طرف سے ندی میں شامل ہوتے گئے اور جہاں پانی کی چمک سی دھار تھی وہاں تقریباً پچاس گز چوڑی ندی کا بہاؤ بن گیا۔ فاصلے کے ساتھ ساتھ کنارے بلند ہونے لگے۔ اونچی گھاس اور سرکنڈے گھنے ہو گئے اور ندی کا پاٹ سو گز سے بھی بڑھ گیا۔ ندی نے کئی موڑ کاٹے تھے۔ چٹان، چھ وہ جگہ نظر سے اوجھل ہو چکی تھی جہاں سے ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

دو میل سے زیادہ دور آنے کے بعد ڈرائیور کچھ پریشان ہونے لگا۔ اس نے واضح کیا کہ آگے راستہ غیر محفوظ ہے۔ پانی بہت زیادہ ہو جائے گا اور گھاس کے جھنڈ راہ میں حائل ہو جائیں گے۔ میں نے اس کی سنی ان سنی کر دی۔

"ابھی چلتے جاؤ" میں نے کہا۔

ایک فرلانگ کے بعد اس نے جیپ روک دی۔ اب میں پانی کے بہاؤ کی آواز سن سکتا تھا۔ آگے کہیں پانی نشیب میں گر رہا تھا۔ پانی کے راستے میں چٹانیں نمودار ہو گئی تھیں اور ان سے ٹکرا کے جھاگ اڑانے والا پانی ہماری احمقانہ ہمت پر مشتعل نظر آتا تھا۔

"آگے جاتی تو رام نام ست ہے" ڈرائیور نے کہا "تم آتم ہتیا کیوں کرتی ہے؟"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا "اوپر جانے کا راستہ تو ہوگا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ جیپ ہوتی۔ جنگلی کو پھر نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "ادھر دیکھو۔ یہ زیادہ چڑھائی تو نہیں ہے اور تمہاری جیپ فور وہیل ڈرائیو ہے۔"

اس نے فریادی لہجے میں کہا "اپن آپ کو بولتی تو سیدھا جاتی۔ ادھر سے جیپ گرتی تو بے زبان گاڑی سب ٹوٹ جاتی۔ اپنا کام سب ختم ہو جاتی۔"

میں نے کہا "دو ہزار لے کر چلو گے؟"

"دو ہزار؟" وہ چکر میں پڑ گیا "تب ابھی دے گی۔ اپن ڈرتی۔ تم اُدھر جا کے گولی مارتی۔"

میں نے ہنس کے کہا "یار! رقم ابھی لے لو۔ یہ لو پورے دو ہزار۔ ہم شریف آدمی ہیں۔ خواتین ہیں ہمارے ساتھ۔"

"کون....." وہ گھبرا گیا۔

"یہ عورتیں۔ جنگلی" میں نے وضاحت کی۔

اس نے دو ہزار جیب میں ڈالے اور پھر ایک نعرہ لگایا۔ "یا علی مدد!" اس کے ساتھ ہی جیپ چڑھائی کی جانب لپکی۔ اس نے جیپ کو ڈبل گیئر میں ڈالا۔ جیپ تیس چالیس درجے کی بلندی پر چڑھنے لگی۔ ٹائروں کے نیچے گھاس پھوس اور جھاڑیاں کچلے جا رہے تھے لیکن بہت جلد مجھے جیپ چلانے والے کی چالاکی کا اندازہ ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ادھر سے اوپر جانے کا راستہ ہے۔ شاید وہ پہلے بھی ایڈونچر کے شوقین شکاری ادھر سے لے گیا ہو۔ وہ بڑی مہارت سے پگڈنڈی جیسے راستے تلاش کرتا جا رہا تھا اور جیپ کو درختوں کے بیچ میں سے نکالتا ہوا کسی پریشانی کے بغیر آگے لے جا رہا تھا۔

ابھی ہم نے نصف بلندی طے کی تھی کہ میں نے اسے جیپ روک دینے کا حکم دیا۔ اس نے جیپ روک دی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید ہم گرد و پیش کے نظارے سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں مگر میرے ذہن میں کچھ اور تھا۔

"کیوں نہ یہاں ایک دن گزار لیں ہم" میں نے کہا۔

غالب نے میرے خیال کی تائید کی "بہت محفوظ جگہ ہے۔"

سڑک پر سے گزرنے والوں کی نظر یہاں پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ ہم اپنے پیچھے عقل کو چکرا دینے والے سراغ چھوڑ کر آئے تھے۔ سب سے پہلے تو ناگپور کی پولیس نے مانکجی کے بیان پر ہماری تلاش شروع کی ہو گی۔ ممکن ہے وہ بابا تاج الدین کی درگاہ تک ہمارا سراغ لگا لیں مگر وہاں سے ہم کہاں گئے، یہ کوئی معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد انعام نبی کے گھر سے ہمارا پھر سراغ ملے گا اور پولیس اس ایمبولینس کو تلاش کرے گی جس کا سائرن بجاتے اور لائٹ چمکاتے ہم اتنے کڑے پہرے اور اتنی سخت چیکنگ کے باوجود سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گئے تھے۔ انعام کے بیان کی روشنی میں ہمارا تعاقب کرنے والے اندور کی طرف جائیں گے اور اس کے لئے پرانا راستہ استعمال کریں گے مگر سو پچاس میل کے بعد ان کو احساس ہوگا کہ ادھر سے کوئی ایمبولینس نہیں گزری۔ شاید اندور پہنچ کے انہیں پتا چلے کہ ہم وہاں نہیں پہنچے۔ ہم نے واپسی پر جہاں انعام کی بیوی کو چھوڑا تھا وہیں سے ایک سڑک جبل پور کی طرف جاتی تھی اور ہم نے انعام کی بیوی کو بار بار کہا تھا کہ اب ہم جبل پور جا رہے ہیں تاکہ یہ بات اس کے ذہن میں بیٹھ جائے۔ تلاش کا اگلا مرحلہ پولیس کو جبل پور کی طرف لے جائے گا اور یہ مرحلہ زیادہ دشوار ہوگا۔ انہیں یہ نہیں معلوم ہوگا کہ ایمبولینس چھوڑنے کے بعد ہم نے کیا ٹرانسپورٹ استعمال کی۔ کسی سے کار چھینی، بس میں سفر کیا، ریل گاڑی میں یا پیدل۔ اس بات کا ایک فیصد امکان تھا کہ کوئی تفتیش کرتا ہوا اپل کے پیچھے تک جائے اور ٹرک دھونے والے لڑکے سے معلوم کرے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اتنا بتا سکے گا کہ ہم کسی جیپ والے سے بات کر رہے تھے۔ اس نے ہمیں جیپ میں دریا کے ساتھ ساتھ جاتے نہیں دیکھا تھا۔ بفرض محال کوئی ادھر نکل پڑتا تو میل دو میل کے بعد مایوس ہو کے لوٹ جاتا۔ اس راستے پر سیدھا کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ آگے دریا کا راستہ موت کا راستہ تھا۔

چٹان، چھ اور جنگل کے حصار میں ہم خود کو اتنا ہی محفوظ سمجھ سکتے تھے جتنا کسی زیر زمین پناہ خانے میں، جو اوپر سے نظر بھی نہ آتا

"جب میں نے وہاں ڈیرا ڈالنے کا خیال ظاہر کیا تو جیپ چلانے والے نے مجھے یوں دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔ پھر اسے یقین آیا کہ میں سیریس ہوں تو وہ چلانے لگا۔

"ادھر رہ کے بولتی ایسی بات۔ ابھی اپن واپس جاتی۔ تم اپن کو نہیں روکتی۔"

میں نے ریوالور نکال لیا "مگر یہ بے زبان چیز تم کو روکتی۔"

اس کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا اور ہاتھ جوڑنے لگا "اپنا مرتی۔ مال مر جاتی۔ ایک دم سب خلاص ہو جاتی۔ بال بچہ۔ اپن کماتی اور سب کھاتی۔"

میں نے ریوالور جیب میں رکھ کے اسے تسلی دینے کے لئے دوستانہ انداز میں کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"رامن۔ آپ کیوں پوچھتی جی؟"

میں نے کہا "رامن۔ ہم ڈاکو ہیں۔"

اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا "ڈاکو....."

"ہاں۔ خطرناک ڈاکو۔ بہت لوگوں کو مارا ہم نے۔ روز دس بارہ ڈاکے ڈالتے ہیں۔ پانچ چھ آدمی اوسطاً ہلاک کر دیتے ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے بھی ریوالور نکال کے ہوا میں اچھالا اور کاؤ بوائے اسٹائل میں کیچ کرنے کی کوشش کی مگر ریوالور نیچے گر گیا۔ پھر یہی کرتب نادرہ نے کامیابی سے دکھایا۔ رامن کی وہ حالت ہو گئی جو کسی آدمی کی خود کو آدم خور شیروں میں گھرا ہوا پا کے ہو سکتی ہے۔ وہ رونے لگا۔ عجیب مضحکہ خیز انداز میں۔

میں نے کہا "رامن! تم کیوں ڈرتے ہو؟"

"مرنے سے سب ڈرتی جی۔"

میں نے کہا "ہمارا کوئی ارادہ نہیں تم کو مارنے کا۔ ہم تمہیں بہت پیسہ دیں گے۔ اگر تم ہماری مدد کرو۔ مدد نہیں کرو گے تو ایک ایک گولی سب ماریں گے۔ یہاں، یہاں اور یہاں" میں نے سر، گردن اور دل کو انگلی سے چھو کے بتایا۔

"ہم مدد کرتی جی" وہ لرزتی آواز میں بولا "اور کسی کو کچھ نہیں بولتی۔"

میں نے کہا "دیکھو۔ ہم یہاں پولیس سے چھپنے کے لئے آئے ہیں۔ پولیس ہر جگہ ہمیں تلاش کر رہی ہے مگر وہ اس جگہ نہیں پہنچ سکتی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

وہ بولا "ادھر نہیں آتی جی۔ ہم پکا بات بولتی۔"

میں نے کہا "یہ دیکھو۔ اس بیگ میں کیا ہے۔"

اس نے بیگ میں جھانکا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور اسے ہمارے ڈاکو ہونے کے بارے میں کوئی شک نہ رہا۔ نوٹ اور اتنے ڈھیروں سونے کے زیورات اس نے پہلے کسی کے پاس نہ دیکھے ہوں گے۔ حیرت اسے ہو گی تو شاید ہمارے حلیے اور ہمارے شریفانہ انداز و اطوار پر۔ ہم خود بھی مہذب اور معزز لگتے تھے اور ہمارے ساتھ جو "جنگلی" تھی وہ بھی ڈاکو سے زیادہ فلمی ہیروئن لگتی تھی۔

میں نے کہا "تم اس میں سے جتنا چاہو لے سکتے ہو لیکن شرط یہ ہے کہ کل تک تم ہماری مدد کرو گے۔ ہمارے سب کام کرو گے۔ چھوٹے چھوٹے کام جو ہم خود نہیں کر سکتے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا تھا مگر رضامندی کے آثار پہلے ہی اس کی صورت پر عیاں تھے۔ اس جیسے بہت سے غریب لوگ ساری زندگی ایسے ہی خواب دیکھتے گزار دیتے تھے کہ غیب سے کوئی انہونی بات ہو۔ کہیں دفینہ مل جائے۔ کوئی لاٹری نکل آئے۔ کوئی لکھ پتی حسینہ عین فلمی انداز میں مہربان ہو جائے یا کوئی کروڑپتی لاوارث انہیں بیٹا بنا لے۔ محنت کرتے کرتے ان کے جسم شل ہو جاتے تھے اور حوصلے ختم ہو جاتے تھے مگر حاصل ان خوابوں کی خیرات کے برابر بھی نہیں ہوتا تھا۔ رامن کے لئے اچانک وہ معجزہ ظہور میں آ گیا تھا جو اس کی تقدیر بدل سکتا تھا۔ بے شک اس میں خطرہ بھی تھا مگر اتنا نہیں جتنا تقدیر بدلنے کے لئے بینک میں ڈاکا ڈالنے والوں یا کسی سیٹھ کی تجوری خالی کرانے والوں کے لئے ہوتا ہے۔

اس نے کہا "اپن بہت ڈرتی جی۔"

میں نے کہا "ڈرنے کی کوئی بات نہیں تمہارے لئے۔ اگر تم خدمت کرو گے تو انعام ملے گا۔ ہمارے بارے میں کسی کو کچھ بتایا تو مارے جاؤ گے۔ صرف ایک دن کی بات ہے۔ ایک دن میں تم کو دس ہزار مل سکتے ہیں۔"

"کتنا بولتی آپ۔ دس... ہزار بولتی آپ؟"

"ہاں۔ دس ہزار کم ہیں کیا؟"

"آپ پھر بولتی جی۔ دس ہزار" اس نے ناقابل یقین لہجے میں دہرایا اور بیگ میں دیکھنے لگا "یہ سب دس ہزار ہوتی؟"

"یہ تو بہت زیادہ ہیں" میں نے ہنس کے کہا "مگر تم اچھا کام کر کے زیادہ انعام بھی لے سکتے ہو۔"

"ہم کرتی۔ سب کرتی جی۔ آپ بولتی۔ ہم ایک دم کرتی۔ آپ حکم کرتی۔ یا آپ حکم کرتی۔ یا آپ" وہ باری باری ہم سب کی طرف گھومتا گیا۔

میں نے کہا "شاباش۔ اب دیکھو! ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ کہیں سے کھانے پینے کا سامان مل سکتا ہے۔"

"آپ کیا کھاتی جی۔ ہم لاتی۔ ادھر دس میل پیچھے سب ملتی۔ ہم جیپ میں جاتی۔"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ جیپ یہیں رہے گی۔ تم جیسے چاہو جاؤ۔ بے شک ٹیکسی میں جاؤ۔ پیسے ہم دیں گے۔ کھانا لاؤ سب کے لئے۔ ہم چائے بنا لیں گے۔ ادھر کافی ملے تو کافی لاؤ۔ برتن چولہا سب خریدو۔ ہم رات کو ادھر سوئیں گے۔ ہم سب کے لئے مکمل بستر لاؤ۔ سگریٹ لاؤ۔"

www.paksociety.com

وہ حیران ہونے لگا "اتنا سامان لاتی۔ بہت پیسہ خرچ ہوگی۔"
"تم پیسے کی فکر مت کرو" میں نے کہا۔
اچانک اسے کچھ اور خیال آیا "اگر آپ جیپ لے کر بھاگ جاتی تو سیٹھ ہم کو اندر کرواتی۔ پولیس بہت مارتی۔ ہم مر جاتی جی۔"
میں نے کہا "تم جیپ کی چابیاں لے جاؤ۔ اس کے تار نکال کے لے جاؤ۔ اس کے بغیر تو جیپ نہیں چل سکتی نا۔ ایک بات اور سمجھ لو۔ ہماری گرفتاری پر انعام ہے۔ بہت سے لوگ اس انعام کے چکر میں پڑ گئے تھے۔ ان کی لاشیں گدھ اور کتے کھا گئے۔ جتنا تم کو پولیس دے گی اس سے زیادہ ہم دے سکتے ہیں مگر کسی کو ہمارے بارے میں بتا کے تم بچ نہیں سکتے۔ تمہارا سارا خاندان۔۔۔"
وہ ہاتھ جوڑنے لگا "ہم ایسا نہیں کرتی جی۔"
میں نے کہا "اچھا تو پھر جاؤ۔ اور دیکھو ایسا نہ ہو کہ تم سامان اٹھاکے لاؤ تو تمہارے پیچھے پولیس لگ جائے۔"
"اپن بہت چالاکی کرتی جی۔ پولیس کو بالکل معلوم نہیں ہوتی جی" اس نے ہمیں یقین دلایا۔
"جب تم واپس آؤ تو پہلے سیٹی بجانا دوبار۔ دور سے۔ ہم چھپ کر دیکھیں گے" میں نے کہا "اگر گڑبڑ ہوئی تو ہم گولی ماردیں گے سب کو۔"
رامن نے واپسی کے بجائے اوپر جانے کا کوئی راستہ تلاش کیا اور دیکھتے دیکھتے گھنے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوگیا۔ گل اور نازو جیپ میں بیٹھی ہوئی تھیں اور غالب گھوم پھر کے آس پاس کا علاقہ دیکھ رہا تھا۔
"رامن دھوکا نہیں دے گا" غالب نے کہا۔
"ہاں۔ مجھے بھی بھروسہ ہے اس پر ورنہ میں اسے اکیلا نہ جانے دیتا" میں نے کہا۔
"پھر کیا خود ساتھ جاتے؟"
"نہیں۔ نازو کو بھیجتا۔ پولیس والے ہم تینوں ہی کو پہچانتے ہیں جن کی تصویریں شائع ہوئی ہیں۔ انہیں معلوم تو ہے کہ ہمارے ساتھ عورتیں بھی ہیں مگر ان عورتوں کی ابھی تک کوئی بھی تصویر شائع نہیں ہوئی ہے اس لئے وہ نسبتاً محفوظ ہیں۔"
"پھر تو نازو کو ساتھ بھیج دینا چاہئے تھا۔ خیر میں اب کہہ دیتا ہوں اس سے۔ وہ پیچھے لگ جائے" غالب نے کہا "ابھی رامن زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔"
وہ پلٹ کے جیپ تک گیا جو کچھ فاصلے پر سرسبز پتوں والے درختوں اور گھنی جھاڑیوں کے درمیان کھڑی ہوئی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ رامن نہ جانے کس طرف سے نکل گیا ہوگا۔ اسے جنگل کے پرپیچ راستوں کا علم تھا۔ یہ نہ ہو کہ نازو خواہ مخواہ اس کے پیچھے بھٹکتی پھرے۔
جیپ کے قریب پہنچ کے میں نے دیکھا کہ اس میں صرف گل ہے جو پچھلی والی سیٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔

نازو کہاں گئی؟" میں نے کہا۔
غالب مسکرا دیا "رامن کے ساتھ۔ ابھی اس نے ہمیں بھی نہیں بتایا۔ شاید وہ چھپ کے ہماری باتیں سن رہی تھی۔"
میں اور غالب جیپ کی اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئے "ان حالات میں اور کچھ نہیں کرسکتے تھے ہم" میں نے کہا "بڑی بری طرح محصور ہوگئے تھے۔"
"ہاں۔ اب تو ڈر لگتا ہے یہاں بھی۔"
گل نے پیچھے سے کہا "جب تک خطرہ ٹل نہیں جاتا۔ کم سے کم چوبیس گھنٹے تو پولیس بہت مستعد رہے گی۔ وہ آس پاس کے علاقے کو چھان ماریں گے۔ دیکھا نہیں راستے میں ہر گاڑی کو کس طرح چیک کیا جا رہا تھا۔"
"میں نے نہیں دیکھا۔"
"میں نے ناکا بندی کا ذکر تو اکثر سنا ہے لیکن دیکھا پہلی بار کہ پولیس نے واقعی راستے بلاک کردیے تھے۔ عام طور پر بڑی بڑی کاروں والے نکل جاتے ہیں۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ پورے صوبے کی پولیس لگادی گئی ہے۔ ایک ایک کار کو، ہر بس کو، ہر مسافر کو وہ بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔"
"یہ تو ہمیں ایمبولینس کا فائدہ ہوگیا۔ اور کوئی بھی گاڑی ہوتی روک لی جاتی۔ ایمبولینس دیکھ کے جس کسی کو بھی خیال آتا ہے کہ نہ جانے کس کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ فوراً راستہ مل جاتا ہے کہ ایک منٹ کی تاخیر بھی نہ ہو۔"
"بھائی سکندر۔۔۔" گل نے کہا اور خاموش ہوگئی۔
"کیا بات ہے گل؟"
"وہ۔۔۔ محسن کا کچھ پتا نہیں چلا؟"
"صرف یہ معلوم ہوا ہے کہ اس نے ٹریویلی کو فون کیا تھا۔ دلاور کا پتا پوچھنے کے لئے" میں نے کہا۔
"کیا اسے معلوم ہوگیا ہے کہ۔۔۔"
"ہاں۔ اسے یقین آچکا ہے کہ آخر کار اس کی بیوی شہلا اور اس کا بیٹا، دلاور کے شیطانی منصوبے پر قربان ہوگئے ہیں۔ وہ اسی زمین پر تھے" میں نے افسردگی سے کہا۔
"مگر محسن نے کسی عورت کو دیکھا تھا۔"
"پتا نہیں کون تھی وہ۔ اب تو مجھے بھی شک نہیں رہا کہ ہم انہیں بچانے کی کوشش میں ہار گئے" میں نے کہا "یہاں دلاور جیت گیا۔ اس نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ اس نے ہمارے ہاتھوں کو شہلا کی مظلوم محبت کے لہو سے رنگ دیا۔ وہ معصوم بچہ جس نے باپ کی شفقت اور محبت کا مطلب کبھی سمجھا ہی نہیں تھا، باپ کو سرخرو کر گیا اور ہمیں شرمندہ۔"
"سکندر بھائی ایسا کیوں ہوا؟" گل رونے لگی۔
غالب نے کہا "کون جانتا تھا کہ ایسا ہوگا۔ حالانکہ اس کا خطرہ ہر وقت موجود تھا۔ پھر بھی دل کو خیال تھا کہ۔۔۔ ہمیں"

تھا اب بھی دل کہاں مانتا ہے کہ شہلا نہیں رہی۔"
پھر رنج میں ڈوبی ہوئی خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں صرف رونے کی گونج رہی گھر میں اور غالب، شہلا کے تصور اور اس کی عکس کو اپنے ماضی کے دھندلائے ہوئے آئینے میں دیکھنے پر مجھے وہ وقت یاد آیا جب وہ پہلی بار ملی تھی۔ کس طرح ہم نے برائی اور بدبختی کی دلدل سے نکالا تھا اور کیسے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے وجود کی پاکیزگی یوں عیاں ہوگئی تھی جیسے پانی سے دھلتے ہی مٹی میں لت پت ہیرے کی آب و تاب نگاہوں کو حیران کردیتی ہے۔ اور کتنا مختصر مگر یادوں سے کتنا معمور تھا جب اس نے ہمیں اور ہم نے اسے اپنا لیا تھا اور اس نے محسن کو جیت لیا تھا۔ رابعہ سے پہلے اور نازو سے پہلے اس نے محسن کو اپنی تقدیر کا مالک بنا دیا تھا اور اپنے جسم و جاں سونپ دیئے تھے۔ پتا نہیں اسے جلدی کیوں تھی۔ شاید وہ اپنی تقدیر سے ڈرتی تھی جس کے تاریک سائے اسے اپنے تعاقب میں محسوس ہوتے تھے اور شاید اس کا خوف بے جا بھی نہیں تھا۔ ان تاریک سایوں نے خود اسے نگل لیا تھا۔ محسن کو اس سے نہیں چھینا تھا تو اسے محسن سے چھین لیا تھا۔ اتنے طویل صبر آزما انتظار اور ہجر کے عذاب بے حساب کے بعد۔ اتنی دعاؤں کے بار اور لوٹ آنے کے بعد اور محسن کے پیچھے اتنا عرصہ نذرانہ جاں لے کر پھرنے کے بعد۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوئی تھی۔ کبھی اس کی زبان پر حرف شکایت نہ آیا تھا۔ اس نے محسن سے ایک بار بھی نہیں پوچھا تھا کہ تم لوٹ کر آؤ گے یا نہیں آؤ گے۔ ہم سے شکوہ نہیں کیا تھا کہ تم مجھے میرا محسن لوٹا کیوں نہیں دیتے۔
سکتا ہوا وقت ہمارے دل کے ہر زخم پر نمک پاشی کرتا گزرتا گیا۔ اس دور کی تڑپ ہم نے استاد نیازی کی موت پر بھی محسوس کی تھی لیکن اس دکھ میں خود اپنے جرم پر ندامت کی کسک شامل نہ تھی۔ نیازی کو ہم سے جدا کرنے والے ہمارے دشمن تھے اور اگر انہوں نے اسے تیر کے نشانہ بنالیا تھا تو ہم کسی طرح خود کو مورد الزام نہیں سمجھتے تھے۔ مگر شہلا کو ہم نے جانتے بوجھتے اور سمجھتے ہوئے گویا اپنے مقصد کی کامیابی پر قربان کیا تھا۔ بے شک ہم شکست کی ذلت گوارا کر سکتے تھے۔ کوئی سمجھوتا نہیں کرسکتے تھے اور شہلا کی جگہ رابعہ ہوتی تب بھی آگے بڑھنے والے قدم پسپائی قبول نہ کرتے مگر ایک احساس تھا کہ شاید ہم سے کہیں کوتاہی ہوئی۔ ہماری کوشش کی ناکامی نے کسی کی تباہی کردی تھی۔ بہت کچھ جو ہم کرسکتے تھے نہ کرسکے۔ الجھن یہ تھی کہ ہم خود اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے کسی سوال کا کوئی جواب نہ رکھتے تھے۔ کون سی کوتاہی، کیسی ناکامی؟ اور کوشش میں کیا کمی تھی جو ہمارا قصور سمجھی جائے؟
جب خاموشی میں ایک سسکی گونجی تو میں اور میرے ساتھ چونکے۔ پچھلی سیٹ پر روتے روتے سو جانے والی گل اٹھ کر اور ہاتھ میں لے کر نیچے اترے اور مختلف سمتوں میں کی اوٹ سے دیکھنے لگے۔ دوسری سسکی کے بعد پتوں

کی اور شاخوں کی حرکت نظر آئی اور ایک پیڑ کے پیچھے سے رامن نمودار ہوا۔
اس کے سر پر ایک گٹھڑی تھی۔ ایسی گٹھڑی جسے دیکھ کر کوئی شک میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔ اس کے وزن کو اٹھاکے گھنے جنگل میں ناہموار اونچے نیچے راستے پر قدم جماکے چلنا مشکل کام تھا مگر رامن ادھر ادھر کی شاخوں کو تھام کے آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھتا آرہا تھا۔ ٹین کا ایک ڈبا اس کے شانے پر رسی سے بندھا جھول رہا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں کینوس کا پرانا تھیلا تھا۔
وہ قریب آیا تو میں نے سامان اتروانے میں اس کی مدد کی اور اس کی پیٹھ ٹھونکی "شاباش۔ تم نے تو کمال کردیا۔"
اس نے ہانپتے ہوئے کہا "اپن مر گئی۔ اتنا وزن اٹھاتی۔ اپنا کمر ٹوٹ جاتی۔"
وہ ہائے ہائے کرتا ہوا دھپ سے بیٹھ گیا اور ہمیں گٹھڑی کھولتا دیکھتا رہا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے سامان کا انتخاب کیا تھا۔ مٹی کے تیل کا چولہا گٹھڑی کے اندر چادروں میں لپٹا ہوا تھا اور بالکل نیا تھا۔ تیل اس نے الگ لیا تھا اور ٹین کے ڈبے کو رسی کے ساتھ کندھے پر لٹکا کے لایا تھا۔ چادروں میں سے ڈبل روٹیاں، مکھن، چینی اور خشک دودھ کے علاوہ چائے کی پتی کا ڈبا اور کافی سب موجود تھے۔
"کسی نے تمہیں خریداری کرتے دیکھ کر کچھ پوچھا تو نہیں؟"
"اپن گھر کے لئے سب لیتی جی" رامن نے کہا۔
"اور یہ سب تم اتنی دور سے کیسے لائے؟" غالب نے کہا۔
"سب اپنا یار ہوتی جی۔ ادھر سے ٹرک میں جاتی۔ ادھر سے جیپ میں آتی۔ اپنا یار بھی جیپ چلاتی۔ کار چلاتی ایک سیٹھ کا۔"
"تم بہت ہوشیار تو نہیں ہو" میں نے کہا "تمہارے دوست نے پوچھا نہیں کہ گھر کا سامان ادھر کہاں لے جا رہے ہو؟"
"اپنا گھر ادھر ہوتی جی۔ اوپر ریسٹ ہاؤس کا باورچی۔ ایک کھولی" اس نے اوپر کی طرف اشارہ کیا "وہ گھر کا دروازہ تک سامان لاتی۔ ادھر سے ہم اٹھاتی۔ ابھی اپن سارا حساب لکھتی" اس نے جیب سے ایک کاغذ برآمد کیا۔
"یہ کیسا حساب ہے؟"
"خرچہ ہوتی جی۔ چار سو چالیس اور چار۔ اپن سب لکھتی۔ پانچ سو میں کتنا بچتی؟ پچاس کا نوٹ اور چھ۔۔۔" اس نے جیب سے چھپن روپے نکالے۔
میں نے ہنستے ہوئے کہا "یہ رکھو اپنے پاس۔ اور یہ لو پانچ سو جو تم نے خرچ کئے۔ تمہارے دو ہزار پورے۔"
اس نے سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا "ابھی اپن چائے بناتی۔"
میں نے کہا "تم چائے بنالو گے؟"
"اپن سب کرلی جی" اس نے سنے چولہے۔۔۔
اس کی پتیاں برابر کرتے ہوئے کہا اور پھر بڑی احتیاط سے۔۔۔

www.paksociety.com

روشن کیا۔ پھر اس نے ایک نئی سلور کی کیتلی اٹھائی اور پانی لینے چلا گیا۔ دریا کا قدرتی پانی بہت صاف تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم سب چائے پی کے تازہ دم ہو چکے تھے اور ہم سب پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ رامن نے خود کو بھروسے کے قابل ثابت کر دیا تھا مگر میں نے جاگتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ ایک خطرہ نادیدہ دشمنوں کا تھا۔ میں اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ رامن وہ بیگ لے کر بھاگ جائے جس میں دس ہزار سے کہیں زیادہ کا مال تھا۔ غریب، فاقہ کش اور سخت حالات جھیلنے والے رامن جیسے کسی بھی لڑکے کا ایمان کسی عابد و زاہد کی طرح نہیں ہوتا کہ شیطان اسے ورغلانا بھی چاہے تو نہ ورغلا سکے۔ انعام کی صورت میں اسے صرف دس ہزار کی امید تھی۔ سالاکھوں لے کر وہ بھاگ جاتا پھر ہمیں گرفتار کرا دیتا اور اپنے گھر والوں سمیت غائب ہو جاتا تو ہم کہاں اس کا سراغ لگاتے۔

آہستہ آہستہ دن ڈھلنے لگا۔ رامن کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی اردو انتہائی ناقص تھی چنانچہ اسے باتیں کرنے میں بہت دشواری پیش آتی تھی۔ میں بہرحال اس کی ٹوٹی پھوٹی اردو گرامر سے مفہوم اخذ کر لیتا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا۔ "رامن! تم یہاں کب سے ہو؟ میرا مطلب ہے کیا ساری زندگی اسی جگہ گزاری ہے۔ یہی کام کرتے رہے ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا "اپنا باپ چور ہوتی جی۔"

میں بھونچکا رہ گیا "چور تھا تمہارا باپ؟"

"پھر ڈاکو بن جاتی۔ آپ کا مافک" وہ بولا "پکڑا جاتی تو جیل جاتی۔"

میں نے سخت شرمندگی محسوس کی مگر اب اس کے سامنے صفائی پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"اپن کا ماں بہت کام کرتی۔ اپن پڑھتی۔ پھر ماں بیمار ہو جاتی۔" اس نے اداسی سے کہا "اپن کام کرتی۔"

"کیا بیماری تھی تمہاری ماں کو؟"

"ٹی بی ہوئی جی" وہ بولا "ابھی ڈاکٹر بھی نہیں آتی۔ وہ بولتی رامن۔ تیرا پیسہ پھوکٹ میں جاتی۔ اس کو مرنے دے۔"

"تمہارا مطلب ہے وہ اتنی بیمار تھی کہ اس کے علاج پر خرچ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ پیسہ ضائع ہو جاتا تمہارا؟" میں نے ہمدردی اور دکھ کے ساتھ کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا "سب بولتی رامن" تیرا ماں اس مہینے مر جاتی۔ پھر دوسرا مہینے ایسا مافک بولتی۔ ابھی چھ مہینے ہوگئی۔ وہ نہیں مرتی سالی۔"

میں نے کہا "ماں کو گالی دے رہے ہو رامن۔ جس نے تمہیں محنت کر کے پالا۔ چور ڈاکو نہیں بننے دیا۔ تمہاری خاطر کام کرتے کرتے خود بیمار پڑ گئی۔ تم چاہتے ہو وہ مر جائے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "وہ بھی بولتی" مرنے کو مانگتی۔ اس کو بہت دکھ ہوتی۔ کیا کرتی جی۔ روتی اور بس۔ اس کو زہر نہیں ملتی سکتی۔ اس کو سکھ ہوتی۔ اپن کو بھی" وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ وہ ماں کو دکھ دیکھ کر کڑھتا تھا مگر سوائے رونے کے اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بیٹے سے اس کی ماں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ وہ بھی موت کی دعائیں مانگتی تھی مگر اس کا عذاب ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ رامن کے لئے یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ زہر دے کر اسے سکون کی نیند سلا دے چنانچہ اس نے ...ت کو سب کے سکون، خاص ماں اور سب کی نجات دہندہ کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ اس غیر جذباتی سوچ یا بے حسی کا سبب اپنی مجبوریاں تھیں جن کا علاج اس کے پاس نہیں تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ ایک چور ڈاکو کا بیٹا بھی اپنے باپ کی طرح اس معاشی جبر کے خلاف بغاوت کے طور پر ڈاکو نہیں بنا۔ اس نے مایوسی کی انتہا کو پہنچ کے یہ نہیں کیا کہ زبردستی سے اپنی ماں کے لئے جینے کا حق چھین لیتا۔ اس کی صحت خریدنے کے لئے پیسہ اہم تھا تو پیسے والوں کی گردن دبوچ لیتا۔ کتنا مجرم ایسے ہی عذر رکھتے ہیں مگر یہ تصویر کا دوسرا رخ تھا۔ اسے باپ کے راستے نے مایوس کیا تھا۔ وہ باپ کے راستے پر چلنے سے نفرت کرتا تھا۔ شاید یہ نفرت ماں کی تربیت کی عطا کردہ تھی اور اس کا نتیجہ توکل۔ اس مایوسی کی صورت میں سامنے آیا تھا جو عام طور پر غریب اللہ کی مرضی نصیب کا لکھا اور اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا سمجھ کے قبول کر لیتا ہے۔

میں رامن کو زندہ دیکھتا رہا۔ مجھے اس سے ہمدردی بھی تھی اور اس پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ آخر اتنی بزدلی کے ساتھ اس نے ماں کی ممتا سے محرومی کیوں قبول کر لی تھی۔ اس نے موت کے خلاف جدوجہد اتنی آسانی سے کیوں ختم کر دی۔ مگر میں اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں اسے ایک لاکھ دیتا تب بھی بے کار تھا۔ اس مرحلے پر دولت کی طاقت بھی کسی ٹی بی کے مریض کو موت کی سرحد سے کھینچ کر واپس نہیں لا سکتی تھی۔ شاید کسی بہت بڑے وی آئی پی ہسپتال میں جہاں ماہرین کی توجہ اور ہر علاج کی سہولت ملتی ہے یا بیرون ملک ایسا ہو سکتا تھا مگر کسی رامن کی ماں وی آئی پی نہیں ہوتی اور بیرون ملک اگر علاج کے لئے جاتے ہیں تو صرف سیاست داں۔

بہت دیر بعد رامن نے کہا "آپ کے لئے چائے بناتی جی؟"

میں نے چونک کر جنگل میں اترتی شام کو دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اجالا تھا۔ اچانک اندھیرے نے ہر سمت سے یلغار کی تھی۔ لوٹ کر آشیانوں میں آنے والے پرندوں کے شور سے جنگل گونج رہا تھا۔ اس شور میں دریا کے بہنے کی آواز دب گئی تھی۔

"بناؤ اور تم بھی میرے ساتھ پیو" میں نے پھولوں کو دیکھا۔

www.paksociety.com

بیٹے کہا "زہریلا تنے بچھو کہاں سے آ گئے؟"

وہ ہنسنے لگا "ابھی تو اور آئی جی۔ زمین سے سانپ بچھو نکلتی رات کو۔"

سانپ بچھو؟ میں نے کہا۔

"بہت سانپ ہوتی اور مرتی" وہ چولہا جلا کے بیٹھ گیا "بھوکی رات ادھر سے پکڑتی۔ اتنا لمبا ہوتی۔ اور اتنا" اس نے پہلے دونوں ہاتھوں کی مدد سے لمبائی بتائی اور پھر ایک انگلی دکھائی۔

"زہریلے سانپ ہوتے ہیں۔ کاٹ لے تو آدمی مر جاتا ہے۔"

وہ پھر ہنسنے لگا "ہم کو بہت کاٹی جی۔ اپن نہیں مرتی۔ کالا کوبرا کاٹی تو آدمی مرتی۔ وہ ہم نہیں دیکھی۔"

ویسے جنگل کی ویرانی میں رات گزارنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اڑنے والے کیڑے مکوڑے تو دن میں بھی تھے مگر کم تھے۔ اب تو بے خوف ناک قسم کے مچھروں نے یلغار کر دی تھی۔ سانپ اور بچھو کے ذکر نے بھی مجھے پریشان کر دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ حشرات الارض بھی اب چہل قدمی کے لئے نکلیں گے۔ سانپ اتنے خطرناک نہیں ہوتے مگر ہمیں کیا معلوم کہ کون سا سانپ بے زہر ہے چنانچہ اسے کاٹنے کا موقع ملے تو ہم زہر کے اثر کا خیال بھی ذہن میں نہ لائیں۔

میں نے گل، غالب اور مانو پر چادریں ڈال دیں تاکہ وہ ان مچھروں اور دوسرے اڑنے والے کیڑوں سے محفوظ ہو جائیں۔ یہاں کسی کو ملیریا بھی ہو جاتا تو ہم کیا علاج کرتے۔

"تم نے بتایا نہیں کہ اور کیا کام کرتے رہے ہو؟"

اس نے مجھے چائے پیش کی "اپن ہر کام کرتی۔ بمبئی کے گیراج میں مستری اپن کو دو روپیہ دیتی۔ استاد کا پاس بہت فلم سٹار آتی جی اور نرگس بہت جاتی۔ اپن کو حسرت ہے پوری لے جاتی۔ ادھر سب آتی۔ پھر وہ اپن کو دادا برمن کا پاس جانے کا بولتی۔ سوراحول کا واسطے۔"

"کس کے واسطے؟"

"راحول۔ سو دادا برمن کا بیٹا۔ وہ اپن کو پڑھاتی۔۔۔۔"

وہ بمبئی کے واقعات سناتا رہا۔ موسیقار ایس ڈی برمن کے گھر میں نوکر کی حیثیت سے اس کا جو وقت گزرا تھا وہ اسے بے اختیار آتا تھا اور وہ اس پورے گھرانے کو فرشتہ قرار دیتا تھا۔ مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ رامن کو ہیرو بننے کا بالکل شوق نہیں تھا وہ گانا چاہتا تھا۔ اس کی آواز اچھی تھی اور اسے یقین تھا کہ دادا برمن کے زیر سایہ اس کی تربیت ہوتی تو وہ گانے لگے گا۔ اس نے بڑے فخر سے بتایا کہ کئی بار وہ کورس بوائے کی حیثیت سے ریکارڈنگ میں شریک ہو چکا تھا۔

"پھر تم نے یہ شوق ترک کیوں کر دیا؟" میں نے کہا۔

"شوق ختم نہیں ہوتی جی۔ اپنا باپ ختم ہوتی۔ جیل سے نکلی اور ادھر کام کرتی۔"

"تمہارا باپ اگر ڈاکو تھا تو لوٹ کا مال بھی گھر لاتا ہوگا۔ تمہاری ماں کو دیتا ہوگا۔"

"اپنا ماں نہیں لیتی جی۔ اس سے جھگڑا کرتی۔ وہ سب شراب جوئے میں اڑاتی۔ چھوکری لوگ پر خرچ کرتی اور ماں کو بہت مارتی۔ ایک روز ماں اس کو خلاص کرتی۔"

"کیا؟ تمہاری ماں نے مار دیا اسے؟ قتل کر دیا؟"

"اور کیا کرتی جی۔ اپن تو بولا بہت اچھا کرتی۔ ماں سات سال جیل کاٹی۔ اپن اس سے ملنے جاتی۔ کام کرتی۔ چھوٹا بہن کا خیال کرتی۔ چھوٹا بھائی کو پڑھاتی۔"

"اتنی سی عمر میں یہ سب ذمے داریاں سنبھال لی تھیں تم نے؟" میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"ادھر سے ماں آتی تو ٹی بی ہوتی۔ چھوٹا بھائی ایک دم باپ کا مافک ہوتی۔ سالا چور بن جاتی۔ ماں اس کو نکال دیتی۔ بہن کا سودا کرتی وہ۔"

میں نے کہا "کون۔ کس نے یہ سودا کیا؟ تمہاری ماں نے؟"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا "وہ سالا اپنا بھائی۔ وہ کسی موالی کو لاتی۔ سو ہزار میں بات کرتی۔ اپن سب سن لیتی۔ رات کو۔۔۔"

"رات کو کیا؟"

"کچھ نہیں جی" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا "تم نے انہیں مار دیا۔"

وہ چونکا "اپن۔۔۔ اور کیا کرتی۔ ماں اور بہن کا ساتھ ادھر سے بھاگ آئی۔ ابھی چار سال ہوتی۔"

"یہ چار سال پرانی بات ہے۔ اس وقت کیا عمر ہے تمہاری؟"

"تیس سال" وہ بولا "اپن کو اور عمر کوئی نہیں جانتی۔"

"کوئی یہ نہیں جانتا کہ تم پہلے کیا تھے۔ تم نے ضرور اپنا نام بھی بدل لیا ہوگا۔ مگر رامن! تم بہت بے وقوف ہو۔ کیا تم ہر ایک کو یہ بات بتا دیتے ہو؟ کیوں بتاتے ہو۔ کیا ضرورت ہے کسی سے کہنے کی کہ تمہارا باپ چور ڈاکو تھا۔ اور تمہاری ماں قتل کے جرم میں سات سال جیل کاٹ چکی ہے۔ اور تم خود دو قتل کر چکے ہو۔"

"دو نہیں جی۔ ایک۔ اپنا اس موالی کو مارتی۔"

"اور کسی دن تمہارا بھائی پھر آ گیا۔ اس نے تمہیں تلاش کر لیا تو کیا ہوگا؟ تم پکڑے جاؤ گے۔"

"اپنا اس حرامی کو بھی خلاص کرتی۔"

میں نے کہا "رامن! سوچو تم جیل چلے گئے تو تمہاری بہن کا کیا ہوگا؟ ماں تو مر جائے گی۔ اس طرح ہر ایک سے کہتے پھرو گے یہ باتیں تو۔۔۔۔۔"

"سب کو نہیں بولتی جی۔ آپ کو بولتی۔"

"مجھے بھی کیوں بتایا یہ سب۔ کیا میں دوست ہوں تمہارا یا ہمدرد؟" میں نے کہا "میں ڈاکو ہوں۔"

"نہیں جی۔ آپ ڈاکو نہیں ہوتی۔ ہم جانتی۔"

"میں ڈاکو نہیں ہوں۔ تمہیں کس طرح معلوم ہو سکتی ہے یہ بات؟" میں نے کہا۔

"اپن جانتی ڈاکو کیسا ہوتی۔ چور کیسا ہوتی۔ اپنا تو سالا باپ بھی چور ڈاکو ہوتی۔" اس نے کہا۔

"تم خطرناک حد تک سمجھ دار ہو" میں نے کہا "بیس سال کی عمر میں تم نے زندگی کے جو تجربات حاصل کر لئے ہیں وہ لوگ ساری عمر گنوا کے بھی حاصل نہیں کرتے۔ کیا تمہاری بہن کی شادی ہو گئی ہے؟"

"وہ ابھی انکار کرتی۔"

"پھر سوچو رامن" تم ہی تو ان کا سہارا ہو۔ مگر ان کی خاطر جینا ہے۔ جیل نہیں جانا ہے" میں نے کہا "تم نے اپنے باپ کے اور بھائی کے راستے پر چلنا قبول نہیں کیا۔ تم نے ان سے ہر تعلق کو ختم کر دیا۔ ایسے ہی اپنے ماضی سے رشتہ توڑ لو۔ کبھی مت بتاؤ کسی کو اپنے بارے میں کوئی سچائی۔"

"پھر کیا بتاتی جی؟"

"یہ کہو کہ تم ایک عزت دار باپ کے بیٹے ہو۔ تمہارا باپ کلرک تھا یا ٹیچر تھا۔ مزدور تھا۔ تمہاری ماں اسی وقت بیوہ ہو گئی تھی جب تم چھوٹے تھے۔ اس نے محنت کر کے تمہیں پالا۔ اپنے لئے عزت حاصل کرو بے وقوف' خواہ وہ جھوٹ بول کے ملے۔ اس سچ سے کیا فائدہ جو تمہارے لئے ذلت و رسوائی کا سبب بنے اور تمہارا مستقبل بھی اتنا ہی داغ دار ہو جتنا تمہارا ماضی۔ یہاں سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ جھوٹی عزت حاصل کر لیتے ہیں اور ساری عمر جھوٹ کے سہاروں پر آگے بڑھتے ہیں۔ پھر تم سچ کیوں بتاتے پھرتے ہو دنیا کو۔"

"اپن کسی کو نہیں بتاتی جی۔"

"پھر دی یلت۔ مجھے بھی کیوں بتایا؟ میری بات کو پلے باندھ لو رامن۔ اپنے ماضی کو بھول جاؤ۔ جیسے تم باپ کو اور بھائی کو بھول گئے ہو۔ ان سے تعلق ختم کر لیا ہے تم نے۔ صرف آگے دیکھو۔ مستقبل پر نظر رکھو۔ تمہاری ماں بھی مر جائے گی۔ بہن اپنے گھر چلی جائے گی۔ پھر تم اکیلے رہ جاؤ گے دنیا میں۔ رشتوں کے بغیر۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میرا اور تمہارا صرف ایک رات کا ساتھ ہے ورنہ شاید میں تمہاری مدد کرتا۔ مجھے بتاؤ کہ عزت سے' محنت سے زندہ رہنے کے لئے تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے۔ پیسے کی؟ کتنا پیسہ چاہئے تم کو؟ بولو۔"

وہ ہنسنے لگا "اپن کا ایک ٹیکسی ہوتا تو اپن رو رہا تا۔ رو ہے تا بس۔"

میں نے کہا "شیخ چلی کی طرح خواب مت دیکھو۔"

"کس کا خواب۔ یہ کون شیخ ہوتی؟"

میں نے کہا "چھوڑو اسے۔ یہ بتاؤ ٹیکسی کتنے میں مل جاتی ہے؟"

"پیسا گاڑی دیسا دام۔ نئی تیس ہزار میں ملتی۔ بیس میں اچھا گاڑی ملتی۔ دس میں چلاؤ کھٹارا۔"

میں نے کہا "سنو۔ میں تم کو تیس ہزار دے کر جاؤں گا پورے تیس ہزار۔ یہ بتاؤ تم جھوٹ بول کے مجھے اُدھر تو نہیں لے جا رہے ہو۔"

وہ ایک دم بوکھلی نظر آنے لگا۔ "کیسا مانگ بات بولتی جی۔"

میں نے کہا "یہ شد و بعد میں تم کہتے پچھ کہ میں نے اسموشنا کے تیس ہزار وصول کر لئے۔"

"یہ اسٹوری نہیں ہوتی جی۔ آپ میرے ساتھ چلتے دو راستے سے دو میل پر اپنا کھولی میں ماں ہوتی۔ اپنا بہن ہوتی۔"

میں نے کہا "مجھے یقین آ گیا ہے۔ تم اتنی بڑی رقم کی ذمہ داری کر سکو گے؟ شناخت تو نہیں کرو گے یہ رقم۔ ایسا نہ ہو کہ تم ٹیکسی خریدنے کے بجائے کسی اور چکر میں پڑ جاؤ۔ یا کوئی تم سے رقم چھین لے۔ ٹیکسی ہی چھین لے۔ اور ٹیکسی تم کہاں چلاؤ گے؟ بمبئی میں۔ وہاں پکڑے نہ جاؤ تم۔"

"اپن مدراس جاتی۔ اپنا گھر۔ سال ہوتی۔"

"اچھا اچھا۔ تمہاری ماں کی خواہش ہے کہ بہو لے کر آئی تم بھی جاؤ۔ تم اسے ضرور لے جاؤ۔ اور کچھ نوکر نہیں بچے تو ماں کے لئے۔ بہن کی شادی ضرور کرا دو۔"

"ہم ٹھیک بولتی جی۔ آپ ڈاکو نہیں ہوتی" وہ پھر رونے لگا۔ "پھر آپ کون ہوتی جی؟ اتنا پیسہ کدھر سے لاتی؟ اپن کو کیوں دیتی جی؟"

میں نے کہا "میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ مگر یہ سمجھ لو کہ تمہارے لئے اپنی زندگی یا قسمت کو بدلنے کا ایک موقع ہے جو قدرت نے فراہم کیا ہے۔ اس کو ضائع مت کرنا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم اپنے باپ کی طرح چور ڈاکو نہیں عزت دار آدمی ہو گے۔ تم سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوگی مگر دس بیس سال بعد یہ دنیا تم کو سلام کرے گی جس نے تم سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ اب جو میں نے کہا ہے وہ یاد رکھنا۔ کبھی کسی کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ بس ماں اور بہن کو ساتھ لو اور کسی کو کچھ بتائے بغیر مدراس چلے جاؤ۔ یہاں رہو گے تب بھی لوگ پوچھیں گے کہ یہ نئی ٹیکسی کیسے لی۔ جو باتیں میرے اور تمہارے درمیان ہوئی ہیں یہ بھی کسی کو مت بتانا۔ یہ بھی مت کہنا کہ ٹیکسی تم نے کیسے خریدی۔ وہ کون تھا جو تم کو اتنی رقم دے گیا تھا۔ ورنہ تم کو مصیبت میں پڑ جاؤ گے اور ہم بھی۔"

"اپن وعدہ کرتی جی۔"

"یہ رونا بند کرو۔ میرے ساتھیوں کو بھی کچھ مت بتانا۔ خود بتاؤں گا بعد میں" میں نے کہا۔

یہ اپنے دوستوں پر عدم اعتماد کا اظہار نہیں تھا جس پر شرمندگی محسوس کرتا۔ میں رامن کو آزمانا چاہتا تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میری نصیحت پر کس حد تک عمل پیرا ہوتا ہے۔

اندھیرا اب اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کی صورت کے خدوخال بھی واضح طور پر نہیں دیکھ سکتے تھے حالانکہ وہ مجھ سے دس بارہ فٹ کے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ جیپ دور تھی جہاں چھ تاریکی کا حصہ بن چکی تھی۔ پرندوں کے غول بھی شب بسری کے لئے آشیانوں میں پناہ لے چکے تھے اور اس کے ساتھ ہی ویران رات کا سناٹا جنگل میں گونجنے لگا تھا۔ اس میں دریا کی روانی کا شور زیادہ بلند محسوس ہوتا تھا اور جھینگروں کا کورس ایک عجیب تاثر پیدا کر رہا تھا جیسے خوفناک تنہائی کا نوحہ۔

میں نے کہا "اندھیرا ہو گیا۔ یہاں تو کچھ نظر نہیں آتا۔"

وہ سمجھا کہ میں شکایت کر رہا ہوں۔ وہ سب کچھ لے آیا تھا مگر موم بتی یا لالٹین لانا بھول گیا تھا "اپن کا سفر خراب ہوتی جی۔ لائٹ کا واسطے کچھ نہیں لاتی۔"

میں نے کہا "روشنی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ خواہ مخواہ کوئی دیکھے گا تو ادھر آ جائے گا۔"

"روشنی میں جانور نہیں آتی۔ ابھی ہم لکڑی جلاتی۔"

میں نے کہا "رہنے دو۔ ایسے کون سے خطرناک جانور ہیں یہاں۔"

"گیدڑ ہوتی۔ بھیڑیا ہوتی۔ آدمی اکیلا سوتی تو کھاتی۔" اس نے متفکر ہو کے کہا۔

میں نے کہا "اول تو ہم اکیلے نہیں ہیں۔ اور ہم میں سے کوئی نہ کوئی جاگتا رہے گا۔ پھر بھی گیدڑ یا بھیڑیے نے ادھر کا رخ کیا تو مارا جائے گا۔"

میں نے بار بار گھڑی دیکھی۔ وقت جیسے منجمد ہو گیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے میں تھک گیا تھا اور نیند کا غلبہ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ نو بجے میں نے محسوس کیا کہ اب غالب کو جگا دینے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ سات آٹھ گھنٹے کی نیند پوری کر چکا تھا اور باقی رات جاگ کر گزار سکتا تھا۔

میں نے غالب کو بیدار کیا تو نازو بھی اٹھ گئی "مجھے تو مچھر کھا گئے" اس نے ہاتھوں اور پیروں کو ملتے ہوئے کہا۔

"ایسی چیز ہر روز کہاں ملتی ہو گی انہیں" غالب نے کہا "مجھے تو کسی نے نہیں کاٹا۔"

میں نے کہا "چلو اب جگہ دو مجھے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔"

"وقت کیا ہوا ہے؟"

"نو بجے ہیں۔ چائے پی لو بنا کے اور ایک دوسرے کا سر کھاؤ" میں نے کہا اور خود کو سر سے پیر تک چادر میں لپیٹ کر پڑ گیا۔

میری آنکھ اس وقت کھلی جب رات کے اندھیرے میں صبح کے اجالے کی ہلکی سی رمق شامل ہونے لگی تھی۔ پرندوں کے شور سے جنگل گونج رہا تھا۔ جیپ میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے اوندھے کلائی کی گھڑی دیکھی تو پانچ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔

جہاں میں رامن کے ساتھ بیٹھا رہا تھا وہاں اب گل' غالب اور نازو گھیرا بنائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے خشک لکڑیوں کا الاؤ سا روشن کر رکھا تھا اور کیمپ فائر کے مزے لے رہے تھے۔

میں نے کہا "یہ آگ کیا لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے جلا رکھی ہے؟"

غالب نے کہا "لوگوں سے زیادہ جنگل کے دوسرے جانور بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ آپ تو خواب خرگوش میں تھے یا گھوڑے بیچ کے سو رہے تھے مگر یہاں بھیڑیے اور گیدڑ آ گئے تھے۔"

نازو نے کہا "اف! کیسے اندھیرے میں چمکتی تھیں ان کی آنکھیں۔ میرا تو خون خشک ہو جاتا تھا۔"

گل نے اس کی تائید کی "اتنا ڈر مجھے پہلے کبھی نہیں لگا۔"

غالب نے کہا "ایک تو خود کشی پر آمادہ تھا۔ میں ضبط سے کام نہ لیتا تو مارا جاتا۔"

میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا "رامن کہاں ہے؟"

غالب نے کہا "وہ گھر چلا گیا تھا۔ صبح آئے گا۔"

"اس نے اپنے بارے میں کچھ بتایا؟"

"نہیں۔ ہم نے بہت پوچھا۔ کہنے لگا۔ جی غریب کی کیا تا لف ہوتی۔ گزر جاتی' جیسے سب کی گزرتی۔ بتا رہا تھا کہ باپ کہیں کلرک تھا۔ وہ مر گیا تو ماں نے محنت کر کے پالا۔ دو بھائی ہیں اور ایک بڑی بہن ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں نے یہی کہا تھا اس سے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری بات اس نے سمجھ لی اور مان لی۔

"تم نے کیا کہا تھا؟" نازو حیران ہو کے بولی۔

"چائے پلاؤ تو بتاؤں" میں نے انگارے سے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔

نازو نے کہا "کافی پی لو۔ ہم نے ابھی پی ہے۔"

کافی پیتے ہوئے میں نے انہیں رامن کے بارے میں بتایا۔ نازو اور گل پر حسب توقع شدید جذباتی دورہ پڑا۔ نازو نے تجویز پیش کر دی کہ ہم رامن کو ساتھ لے چلیں۔

میں نے کہا "اس کی ماں کے ساتھ۔ جو بستر مرگ پر ہے؟"

"ایک بہن بھی ہے اس کی" غالب نے کہا۔

"انہیں بھی گھسیٹے پھریں ساتھ۔ خود تو خوار ہیں انہیں بھی خوار کریں؟" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "انہیں مدراس چھوڑتے ہوئے نکل جائیں۔"

"کچھ پتا ہے مدراس کہاں؟ شمال میں ہے کہ جنوب میں" غالب نے کہا "بس یہ ٹھیک ہے جو سکندر نے کیا۔"

"پیسہ یہاں ان کے کسی کام نہیں آئے گا۔"

"پیسہ ہر جگہ کام آتا ہے۔ انسانوں سے زیادہ" غالب نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔ آج ہم خالی ہاتھ ہوتے تو خود کو کتنا بے سہارا محسوس کرتے۔ اب امید تو ہے کہ ہم سہارے خرید سکتے ہیں" میں نے کہا "وسائل پیدا کر سکتے ہیں۔"

"اس جنگل میں کب تک قیام رہے گا؟"

www.paksociety.com

"میں سمجھتا ہوں کہ ادھر سے اُدھر بھاگے پھرنے کی فوری ضرورت کوئی نہیں ہے۔ ہم اچانک ہر طرف سے گھر گئے تھے۔ خوش قسمت ہیں کہ یہاں اکٹھے بیٹھے ہیں اور محفوظ ہیں۔ کم سے کم دو دن......"

"دو دن! یہاں؟" گل نے کہا۔

"یہاں کرنے کو بھی کچھ نہیں ہے" نازو نے کہا۔

"کرنے کو بہت کچھ ہے۔ اگر تم چاہو" غالب نے کہا۔

"مثلاً کوّے اڑاؤں۔ چڑیاں ماروں۔ یا درخت کاٹوں۔" نازو نے کہا۔

"ابھی آرام کرو۔ باتیں کرو مجھ سے۔ فرض کرلو کہ ہم ایک فلم یونٹ ہیں جو یہاں لوکیشن شوٹنگ پر آیا ہے۔ میں اور تم مرکزی کردار ہیں۔ باقی یہ کہ دریا کا کنارا ہے۔ ڈائیلاگ مجھے بھی یاد ہیں بہت۔ اور ہو گا بھی کچھ اثر ہو سکتا ہے۔"

"تم ایڈونچر کی شوٹنگ کیوں نہیں کراتے۔ دریا میں.... جہاز کے ساتھ تیرتے جاؤ اور بہر کے قبل آبشار کے ساتھ گرو کسی چٹان پر۔ ایسے کہ چٹان پاش پاش ہو جائے" نازو نے کہا۔

"ایسی باتوں سے تم ہمیشہ میرا دل پاش پاش کرتی ہو مس نازو۔" غالب نے کہا۔

"اور تم ایسے ڈھیٹ ہو کہ پھر جوڑ لیتے ہو اس کے ٹکڑے اٹھا کے" نازو نے مسکرا کے کہا۔

صبح کا اجالا پھیلنے تک ہم باتیں کرتے رہے اور اصولی طور پر اتفاق رائے ہو گیا کہ جب تک اس علاقے میں پولیس کی دوڑ دھوپ ختم نہیں ہو جاتی ہمارا غائب رہنا ہی تحفظ کا ضامن ہو گا۔ دو دن میں ہمارا کہیں سراغ نہ ملا تو پولیس یہ سمجھنے پر مجبور ہو گی کہ ہم پھر انہیں چکمہ دے کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر یہ درد سر ہو جائے گا دوسرے علاقے کی پولیس کا اور یہاں ہمارے لئے کچھ آسانی پیدا ہو جائے گی۔ پھر ہم بھیس بدل کے نکلیں گے تو سیدھے ڈھاکا جائیں گے۔ سب سے زیادہ اہم کام محسن کو تلاش کرنا ہے۔ اس کے بعد یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہمارے کرنے کے لئے کیا ہے۔

اس جنگل میں قید تنہائی کاٹنے کا خیال میرے لئے بھی کم پریشان کن نہ تھا مگر باہر کے خطرات کا تصور کرتا تھا تو مجھے اسی مجبوری کو قبول کرنے میں عافیت محسوس ہوتی تھی۔ ہم نے ایک پورا دن سوتے' باتیں کرتے گزار دیا تھا مگر دوسرا دن اور پھر آنے والی رات ایسے ہی کاٹنا ضروری تھا۔

رامن کا لایا ہوا ڈبل روٹی مکھن کا اسٹاک صبح کے ناشتے میں ختم ہو گیا۔ میں نے اسے دوبارہ بازار بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ نازو اور گل کا خیال تھا کہ وہ رامن کے گھر جا کے اس کی ماں کو دیکھ آئیں مگر میں نے انہیں روک دیا۔ ہمارا اس جگہ سے زیادہ دور جانا احتیاط کے تقاضوں کے خلاف تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں کسی کی ان پر نظر پڑ جاتی اور کوئی خواہ مخواہ کے تجسس میں مبتلا ہو جاتا تو خود پیچھے لگ جاتا یا رامن سے پوچھنا شروع کر دیتا کہ یہ کون تھیں۔ کہاں سے آئی تھیں۔

رامن جب بازار جا رہا تھا تو نازو نے اسے خاصی لمبی فہرست بنا دی تھی کہ یہ بھی لیتے آنا اور وہ بھی۔

میں نے کہا "چاٹ اور گول گپے۔ دوپہر کے لئے قورمہ بریانی۔ کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو؟"

"جب وہ بازار جا ہی رہا ہے...... تو کیا حرج ہے۔"

میں نے کہا "کیا ہم پکنک پر آئے ہیں؟"

"آئے تو نہیں مگر اسے پکنک بنا لیں تو قید اور مجبوری کا احساس کچھ کم ہو جائے گا" نازو نے کہا۔

"میں بھی اپنی پسند کا مینو بتا دوں" غالب نے کہا "چکن کارن سوپ۔ فرائیڈ پراون...... آئس کریم۔"

رامن کبھی ایک کی صورت دیکھتا تھا کبھی دوسرے کی۔ آخر کار اس نے کہا "ادھر دال ملتی۔ آلو کی ترکاری ملتی اور مچھی۔"

میں نے ہنس کے کہا "تو بس یہی لے آؤ۔ ایک اور چیز زیادہ ضروری ہے۔ کہیں سے اخبار مل جائے تو ضرور لے آنا۔"

غالب نے کہا "یار کوئی ریڈیو پیدا کرو کہیں سے۔"

رامن نے کہا "ریڈیو تو جیپ میں ہوتی جی۔ اخبار میں لاتی۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے کہا "کمال ہے تم نے یہ بھی نہیں دیکھا مرزا جی کہ ریڈیو فٹ تھا جیپ میں۔"

"حیران ہوں کہ ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں" غالب نے نازو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ویسے بھی ریڈیو دیکھنے کی نہیں سننے کی چیز ہوتی ہے۔"

میں نے ریڈیو کو آن کیا۔ عام کار کے ریڈیو کی طرح یہ بھی اے ایم ایف ایم ریڈیو تھا یعنی طویل فاصلے کی نشریات وصول نہیں کر سکتا تھا جو شارٹ ویو پر موصول ہوتی ہیں۔ اس سے مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ شارٹ ویو بینڈ ہوتا تو میں پاکستان کی نشریات سن سکتا تھا۔ لاہور' کراچی یا اسلام آباد کی آواز صاف سنی جا سکتی تھی۔ بیرونی ممالک کے لئے ریڈیو پاکستان کے پروگرام الگ تھے۔ ان سے ملکی اور بین الاقوامی صورت حالات کا پتا چل سکتا تھا۔

میڈیم ویو پر بی بی سی واحد اسٹیشن تھا جو ہمیں پاکستان کی خبریں بھی فراہم کر سکتا تھا اور دنیا کی بھی...... لیکن اس کا اردو پروگرام رات کو ہوتا تھا۔ اس وقت نہ جانے کس زبان میں پروگرام جاری تھا۔ ریڈیو پر پانچ اسٹیشن پہلے سے سیٹ تھے' جیسے کہ عام طور پر ہوتے ہیں۔ میں نے ایک ایک بٹن کو دبایا۔ تین اسٹیشن خاموش تھے یا موصول نہیں ہو رہے تھے۔ چوتھے پر آواز کم تھی مگر پانچویں کی نشریات بالکل صاف سنی جا سکتی تھیں۔ اس وقت ہندی میں خبریں جاری رہی تھے۔

غالب بھی میرے ساتھ آ بیٹھا تھا اور ہم نے ہندی بلیٹن سے جو کچھ سمجھا وہ ہمارے لئے خاصا مایوس کن تھا۔ مشرقی پاکستان کی صورت حال کا اثر مغربی پاکستان کی سرحدوں پر بھی پڑنے لگا تھا اور بظاہر دونوں ممالک کے درمیان جنگ شروع ہونے والا تھا۔ مگر آل

انڈیا ریڈیو نے مشرقی پاکستان کے حالات کی جو تصویر کھینچی تھی وہ ایسی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہاں پاکستانی افواج اور مشرقی پاکستان کے رہنے والوں کی براہ راست کھلا جنگ چل رہی ہے جس میں پاکستانی فوج کو بہت نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ ایک خبر کے حوالے سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ پاکستان کی فوج نے آزادی مانگنے والے بنگالیوں کا قتل عام بند نہ کیا اور ان پر اپنے مظالم جاری رکھے تو بھارت فوجی مداخلت پر مجبور ہو جائے گا کیوں کہ وہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر بنگالیوں کے حقوق کی پامالی اور نہتے عوام کے خلاف فوج کی کارروائی کے خلاف ہے۔

میں اور غالب یہ بکواس سن کر حیران رہ گئے۔

"یہ ہمارا داخلی معاملہ ہے" غالب نے برہمی سے کہا "اگر ہم اپنے ملک میں تخریب کاروں سے نمٹنے کے لئے فوج کی مدد لیتے ہیں تو بھارت کو کیا پریشانی ہے۔ اس کے اپنے ملک میں یہ صورت حال ہوتی تو کیا وہ خاموش تماشائی بنے رہتے؟ آسام اور کیرالہ میں کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "مرزا جی! یہ سب بہانے ہیں۔ سیاست کے میدان میں شکاری تو سپر پاورز ہیں۔ ہم جیسے ممالک اور ان کے عوام کی کیا حیثیت ہے؟ صرف شکار کی۔ افریقہ اور ایشیا کے غریب ممالک ان کی شکار گاہیں ہیں۔"

"مشرقی پاکستان کی صورت حال اتنی خراب کیسے ہو سکتی ہے؟"

میں نے کہا "دشمن کبھی حوصلہ افزا خبر نہیں دے گا۔" یہ تو پروپیگنڈا ہے۔ اسے غنیمت سمجھو۔"

ہندی کے بعد انگریزی بلیٹن شروع ہوا تو خبروں کا انداز بدل گیا۔ نقطۂ نظر اب بھی وہی تھا کہ بنگالی اپنی آزادی کے لئے جنگ لڑ رہے ہیں اور دنیا بھر کی جمہوریت پسند قوتوں کا اور اقوام متحدہ کا یہ فرض ہے کہ پاکستانی فوج کے ہاتھوں ہونے والے قتل عام کو رکوائے۔ انگریزی کی خبروں میں جذباتی عنصر کچھ کم تھا۔ مبالغہ آرائی میں بھی توازن تھا مگر اس سے مشرقی پاکستان کے حالات کی ابتری کا تاثر زیادہ منطقی انداز میں سامنے آتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک جاہل آدمی کسی واقعے کو بیان کرتے ہوئے سخت جذباتی ہو جاتا ہے۔ غصے میں گالیاں بکتا ہے۔ قسمیں کھاتا ہے کہ یہ سچ ہے اور دلیل کی جگہ چلا کے بات منوانے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر شک بھی ہو جاتے ہیں اور مان بھی لیتے ہیں۔ مگر ایک پڑھا لکھا آدمی دلیل کے ساتھ منطقی انداز میں اور قطعیت کے ساتھ ملاقات بھی کرتا ہے تو زیادہ مستند سمجھی جاتی ہے۔

ہندی کا بلیٹن عام آدمی کے لئے تھا۔ اس کے جذبات کا رخ حکومت کی پالیسی کے مطابق موڑنے اور اسے یکطرفہ سوچ کا مواد فراہم کرنے کے لئے۔ انگریزی جاننے والا پڑھا لکھا آدمی تھوڑا بہت تجزیہ کرتا ہے اور انگریزی کے بلیٹن کو غیر ملکی نمائندے اور مشن کے ارکان بھی سنتے ہیں چنانچہ انگریزی میں وہی نقطۂ نظر ایسے پیش کیا گیا تھا کہ غلط بیانی نہ لگے۔

ساچار ختم ہوئے تو کسی متعصب سیاسی مبصر نے مشرقی پاکستان کے حالات کا تجزیہ شروع کیا جو خبروں سے زیادہ گمراہ کن اور اشتعال انگیز تھا۔ غالب نے غصے میں ریڈیو آف کر دیا تھا مگر میں نے پھر کھول دیا۔

"اگر تم یقین کرتے ہو تو یہ پروپیگنڈے کی کامیابی ہے اور یقین نہیں کرتے تو مشتعل ہونے کا کوئی جواز نہیں" میں نے کہا۔ "سننے میں کیا حرج ہے۔"

"میں کیوں سنوں فضول بکواس!"

"اس لئے کہ اور کچھ ہے نہیں سننے کو" میں نے کہا "ورنہ میں بھی گانے سننا پسند کرتا۔"

"اس سے ڈپریشن ہو جائے گا مجھے۔ بلڈ پریشر ہائی ہو جائے گا اور مورال ڈاؤن" غالب نے کہا۔

"اس کا مطلب تو یہی ہے کہ تم متاثر ہو رہے ہو اور اسے بکواس سمجھ کے نظر انداز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو۔"

"مجھے خبر چاہئے۔ خالص خبر۔ جو غیر جانبداری سے دی جائے" غالب نے کہا "وہ کہاں سے ملے گی؟"

"میرا خیال ہے کہیں سے بھی نہیں۔ ریڈیو پاکستان بھی... بہرحال سرکاری ادارہ ہے۔ سرکاری پالیسی کا ترجمان ہے۔ اور جو کام یہاں آکاش وانی کرتا ہے' اس کے برعکس ہمارے ذرائع ابلاغ کرتے ہیں۔ اور انہیں کرنا چاہئے۔ یہ جنگ کا نفسیاتی محاذ ہے جس میں عوام شریک ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ رائے عامہ ہی حکومت کی اصل طاقت ہوتی ہے۔ اسے بہرحال حکومت اپنے حق میں رکھتی ہے۔"

اچانک تبصرہ ختم ہو گیا اور مقامی خبروں کا بلیٹن نشر ہونے لگا۔ ہم بے دلی سے سن رہے تھے کہ ایک خبر نے ہم کو چونکا دیا۔ خبریں پڑھنے والی نے شدھ ہندی میں جو کچھ کہا اس کا اردو مفہوم کچھ یہ تھا۔ جیسا کہ پہلے خبر دی جا چکی ہے' مغربی پاکستان کی سرحد عبور کرکے بھارت میں داخل ہو جانے والے دہشت گردوں کے ایک اور گروہ کا سراغ لگا لیا گیا ہے۔ اس کے سرغنہ سکندر بخت عرف کبیر خان کو گزشتہ روز ایک سادھو کے بھیس میں سفر کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ اس کی نشاندہی پر دوسرے دو تخریب کاروں کو رات گئے ایک خفیہ ٹھکانے پر چھاپا مار کے گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں سے ایک محسن شیروانی حکومت پاکستان کے ایک سابق ڈپٹی سیکریٹری کا بیٹا ہے۔ دوسرا مرزا غالب ایک مشہور صحافی تھا۔ یہ مغربی پاکستان سے اسلحہ اسمگل کرکے بھارت کے راستے مشرقی بنگال پہنچاتے تھے۔ ان کے ساتھیوں میں کچھ خوب صورت' جوان لڑکیاں بھی شامل ہیں جن کے بارے میں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وہ تربیت یافتہ کمانڈو ہیں اور ان میں سے ایک بدنام ڈاکو شیش ناگ کی بہن ناگ منی ہے۔ اپنا نام اور حلیہ بدل کے یہ گروہ مختلف وارداتوں میں ملوث رہا ہے اور گزشتہ روز انہوں نے ایک

www.paksociety.com

ایمبولینس پر قبضہ کر کے پولیس کی ناکہ بندی کو ناکام بنا دیا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی ساتھی عورتیں ابھی ناگپور کے آس پاس ہی چھپی ہوئی ہیں۔ تینوں گرفتار ہونے والے اشتہاری مجرم ہیں اور ان کی تصویریں اخباروں میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ عوام کو خبردار کیا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی اجنبی عورت کو تصدیق کئے بغیر گھر میں جگہ نہ دیں ورنہ وہ شریک جرم تصور کئے جائیں گے۔ اگر کسی عورت کی نقل و حرکت مشکوک ہو تو اس کی اطلاع فوراً قریبی تھانے میں دیں۔

اس کے فوراً بعد مقامی انتظامیہ کی جانب سے جاری ہونے والا پریس نوٹ سنایا گیا اور وہی اعلان جو خبروں میں شامل تھا۔

میں اور غالب دم بخود' سکتے کی کیفیت میں بیٹھے تھے۔ ہم نے خبر' اعلان اور پریس نوٹ کا ایک ایک لفظ یوں سنا تھا کہ تقریباً ازبر ہو گیا تھا۔ شک و شبے اور ابہام کی قطعی گنجائش نہ تھی۔ ہم دونوں نے جو سنا تھا' ناقابل یقین اور بے بنیاد ضرور تھا مگر غلط نہیں سنا تھا۔

اگرچہ اس کے بعد ریڈیو سے سنگیت سبھا شروع ہو گئی تھی مگر خود میں نے ریڈیو بند کر دیا۔

غالب نے کہا "یہ سب کیا ہے سکندر؟ ہم پکڑے جا چکے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اور ہمیں معلوم ہی نہیں ہے۔ ہے نا کمال کی بات۔"

"یار' یہ پاگل ہو گئے ہیں یا میں پاگل ہوں۔ کہیں میرے کانوں نے غلط تو نہیں سنا تھا۔ ریڈیو سے ایسا احمقانہ' بے بنیاد جھوٹ ایک سرکاری پریس نوٹ کی صورت میں کیسے نشر ہو سکتا ہے!"

میں نے کہا "جیسے ابھی ہوا۔ اور ہو سکتا ہے یہ ہر ایک گھنٹے بعد یا دن میں کئی بار نشر ہو۔ آپ بلاوجہ خفا ہو رہے ہیں۔ جو بات بے بنیاد ہے وہ جھوٹ ہے اور جھوٹ ہے تو احمقانہ ہے۔ عاقلانہ جھوٹ یا بے بنیاد سچ تو کوئی چیز ہوتی نہیں۔"

"یار' یہ چکر کیا ہے آخر؟"

"چکر کچھ نہیں۔ اس کو کہتے ہیں EYEWASH۔ اُردو میں مفہوم ہو سکتا ہے آنکھوں میں دھول جھونکنا۔"

"کس کی آنکھوں میں؟ خود اپنی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے بھارت سرکار۔"

"یار بھارت سرکار کیا چیز ہے۔ یہ مقامی انتظامیہ کا چلایا ہوا چکر ہے' جو اس نے پولیس اور تفتیشی اداروں کی طے شدہ پالیسی کے مطابق چلایا ہے۔ اس ایک جھوٹ سے کتنے فوائد حاصل ہوں گے۔ ایک تو رائے عامہ پر بڑا اچھا اثر پڑے گا کہ تفتیشی ادارے کتنے مستعد ہیں۔ اطمینان حاصل ہو گا کہ تخریب کار اور دہشت گرد پکڑے گئے۔"

"کیسے پکڑے گئے؟ کہاں پکڑے گئے؟"

"یہ کون پوچھے گا؟"

"اخبار والے۔ غیر ملکی نمائندے۔" غالب نے کہا۔

"ابھی انہیں کسی پریس کانفرنس کی دعوت نہیں دی گئی۔ اور کبھی نہیں دی جائے گی۔ تفتیش ملٹری انٹیلی جنس یا سی بی آئی والے اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ وہ نتائج کو خفیہ رکھ سکتے ہیں۔"

"مگر مجرم کو عدالت میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ تفتیش کے لئے بھی ریمانڈ تو لینا پڑتا ہے۔"

"یار مرزا! تم صحافی ہونے کے باوجود احمقانہ باتیں کر رہے ہو۔ کس ملک میں خصوصی قوانین نہیں ہوتے؟ ملکی دفاع اور سلامتی کے نام پر استثنائی نوعیت کے کالے قانون آخر کب کام آتے ہیں؟ ایسے ہی ہنگامی حالات میں۔ ایسے ہی مجرموں کے معاملات سے نمٹنے کے لئے۔ بغیر مقدمہ چلائے نظر بند رکھنا یا جرم بتائے بغیر کسی کو حراست میں لے کر غائب کر دینا کیا مشکل ہوتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک کہا آپ نے۔ مگر اس اعلان کا مقصد ہمیں دھوکا دینا بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہم کیسے دھوکا کھا سکتے ہیں؟ ہمیں معلوم ہے کہ محسن ڈھاکا میں ہے اور ہم بیٹھے ہیں آمنے سامنے۔"

"اس کا مقصد ہمیں یہ تاثر دینا ہو سکتا ہے کہ اب پولیس اور دیگر تفتیشی اداروں نے ہماری تلاش ختم کر دی ہے۔ ہم ایزی ہو کر پھریں۔ کہیں روپوش ہوں تو نکل آئیں۔ کہ اب ڈر کیسا" غالب نے کہا۔

"ہاں' یہ مقصد ہو سکتا ہے۔ وہ چانس لے سکتے ہیں کہ ہم خود کو باخبر رکھنے کے لئے ریڈیو سنتے ہوں گے تو یہ اعلان بھی سن لیں گے۔"

غالب نے کہا "حالانکہ ہمیں نہ فرصت تھی نہ ضرورت۔"

"ضرورت تو تھی مگر وسائل کہاں تھے۔ کبھی کہیں سے اخبار مل جاتا تھا تو دیکھ لیتے تھے۔ ویسے ہمیں ریڈیو رکھنا چاہئے تھا اپنے ساتھ۔ کوئی بھی چھوٹا سا پوکٹ ریڈیو ہوتا۔ اچھا اور طاقتور ہو تو شارٹ ویو پر پاکستان کی آواز سنتے رہتے۔"

"اب پہلا کام یہی کرنا ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ کیا ہے' یہ بھی تو معلوم ہو" غالب نے کہا "دونوں جانب کی سن کے کسی حد تک اوسط کے فارمولے سے صحیح خبر اخذ کی جا سکتی ہے۔"

"بی بی سی خاصا قابل اعتبار ہے۔"

"سمجھا جاتا ہے مگر میں نہیں مانتا" غالب نے کہا۔

"ہمیں کیا ضرورت ہے جانب داری کی؟ ان کی ساکھ اچھی ہے تو خراب کیوں ہو۔"

"ساکھ بھی ایک سیاسی اصطلاح ہے۔ اور ایک مغالطہ بھی ہے" غالب نے کہا۔

ہماری اس بحث کو رامن نے ختم کیا۔ وہ بڑے پُراسرار طریقے پر نمودار ہوا اور اس نے اسباب کا ڈھیر نازو اور گل کے حوالے کر دیا جو دریا کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھی تھیں پاؤں پانی

میں جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔

میں اور غالب جیپ سے اتر گئے۔ ہم نے رامن کی بغل میں اخبار دیکھ لیا تھا مگر ہم دونوں کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہ ہندی میں چھپا ہوا تھا۔

"تم ہندی اخبار اٹھا لائے۔ انگریزی نہیں ملا۔"

رامن نے نفی میں سر ہلایا "آپ نہیں بولتی۔"

اس کا مطلب تھا کہ آپ نے کہا نہیں تھا۔ میں نے کہا "اب بتاتے ہو؟"

اس نے پھر نفی میں گردن ہلائی "ادھر انگریزی کوئی نہیں آتا" پھر جیسے اس کو اچانک کوئی بات یاد آ گئی "گیسٹ ہاؤس میں انگریزی اخبار آتی۔ دوپہر کے بعد۔"

"دوپہر کے بعد۔ اتنی دیر سے؟" میں نے کہا۔

"بہت دور سے آتی" رامن نے کہا۔

میں بہت گھٹیا کاغذ پر انتہائی ناقص طریقے پر شائع ہونے والے آٹھ صفحے کے اس اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈال رہا تھا مگر میرا اصل مقصد خبر پڑھنا نہیں بلکہ تصویریں دیکھنا تھا۔ آخری صفحے پر ایک ہی خبر کے ساتھ تین تصویریں دیکھ کر میں چونکا۔ میرے ساتھ غالب بھی چونکا اور ایک ساتھ ہم نے رامن کو دیکھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"رامن! تم ہندی پڑھ سکتے ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "اپنا آٹھ جماعت پڑھتی۔"

"تم نے یہ خبر بھی دیکھی ہو گی؟" غالب نے کہا۔

"ابھی آپ دیکھتی تو اپن دیکھتی" وہ بولا۔

میں نے کہا "کیا مطلب! اخبار لینے کے بعد تم نے پڑھا نہیں تھا؟"

"اپن کو جلدی ہوتی۔ اخبار لے کر بغل میں دبائی۔ سودا لیتی اور واپس آئی" اس نے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ اس نے یقیناً اخبار پڑھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کے نزدیک نہ اخبار کی کوئی اہمیت تھی اور نہ دنیا بھر کی ان خبروں کی جن کا اس کی زندگی کے معمولات پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ دنیا کے کس حصے میں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے' اس کی فکر وہ کیوں کرے گا جس کو کھیتی کرنی ہے یا ہل چلانا ہے یا بس ٹرین چلانی ہے۔ لوہا کوٹنا ہے یا سونے کے زیور بنانے ہیں۔ رامن کی زندگی پر ایک معمولی واقعہ زیادہ اثر انداز ہو سکتا تھا جس کی دنیا کی نظر میں کوئی اہمیت نہ ہو۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے یا کوئی مفت میں دریا کے پانی سے نہانے دھونے دے۔ اس کی ماں مر جائے یا بہن بھاگ جائے۔

میں نے کہا "رامن! تم نے یہ سرخی تو پڑھ لی ہو گی اب؟"

"ہاں پڑھتی جی۔"

"اچھا۔ یہ پوری خبر ہمیں پڑھ کے سناؤ۔"

رامن نے مجھ سے اخبار لے لیا۔ اخبار دیکھ کر نازو اور گل بھی قریب آ گئی تھیں اور جھک کر میری' غالب اور محسن کی تصویروں کو دیکھ رہی تھیں۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟" نازو نے کہا۔

"مبارک ہو۔ ہم پکڑے گئے" غالب نے خوش دلی سے کہا۔

نازو نے کہا "اچھا۔ آپ نے ہندی پڑھ لی؟ پھر تو واقعی مبارک ہو۔"

میں نے کہا "یہ مذاق نہیں ہے۔ ابھی ریڈیو پر بھی سنا ہے ہم نے۔"

گل نے پریشانی سے کہا "کیا سنا ہے؟"

غالب نے کہا "جو تم اب سنو گی۔ چلو رامن! پڑھو۔"

رامن نے پڑھنا شروع کیا۔ وہ رک رک کے پڑھ رہا تھا لیکن اخبار کی ہندی زبان وہ بھاشا نہیں تھی جو آکاش وانی بولتا تھا۔ یہ اُردو ہی تھی جس کو رسم الخط بدل کے انہوں نے ہندی کا نام دے دیا تھا۔ ہم پوری خبر پہلے ہی سن چکے تھے چنانچہ رامن غلط پڑھتا تو ہم اس کے چھانپڑ رسید کرتے اور اس کا دماغ اس حد تک درست کر دیتے کہ وہ پھر ایسی غلطی نہ کرتا۔ لیکن رامن کو میں نے گزشتہ رات نہیں ہزار کے جال میں قید کر لیا تھا اور یہ اتنا مضبوط جال تھا جسے وہ تو کیا کوئی اور بھی آسانی سے نہیں توڑ سکتا تھا۔ وہ حب الوطنی اور فرض شناسی یا قانون سے تعاون کے چکر میں پڑتا تو اسے اپنی زندگی میں پہلی بار ملنے والی سب سے بڑے خواب کی تعبیر سے محروم ہونا پڑتا۔ پولیس کا وعدہ ناقابل اعتبار تھا۔ وہ اسے انعام نہ دینے کے لئے ہمارا ساتھی بھی قرار دے سکتے تھے۔

خبر پڑھنے کے بعد وہ خود بھی حیران پریشان کھڑا رہا "ایسا جھوٹ ہوتی اخبار میں جی۔ پھر آپ اخبار کیوں پڑھتی؟" اس نے ایک منطقی سوال کیا۔

میں نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ جواب بھی اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ جسے وہ جھوٹ سمجھتا ہے وہ باقی دنیا کے لئے جھوٹ نہیں ہے اور حکومت کے اعلان کو جھوٹا کہنے والا شرپسند کا نام پاتا ہے۔ جوتے کھاتا ہے اور جیل میں سڑتا ہے۔

گل اور نازو نے بھی اس بے بنیاد اعلان کے بارے میں بہت سے غیر ضروری سوالات کئے۔ رامن ہم سب کی صورتیں دیکھتا رہا۔ ڈاکو کے نام سے وہ آشنا تھا مگر تخریب کار کیا ہوتا ہے اور دہشت گردی کیا ہوتی ہے' یہ اس کی عقل میں آنے والی باتیں نہیں تھیں۔ وہ مجھے بتا چکا تھا کہ ہم ڈاکو نہیں ہو سکتے۔ اس خبر سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ ہم کون ہیں مگر یہ نہیں کہ ہم کیا کرتے ہیں اور کیوں کرتے ہیں۔ وہ انجان بن رہا تھا تو یہ اس کی اداکاری نہیں تھی۔

اخبار کے ایک کونے میں سرکاری اعلان بھی شائع ہوا تھا جس میں عوام کو دہشت گردوں کی ساتھی عورتوں کے بارے میں

www.paksociety.com

خبردار کیا گیا تھا۔ اس میں ان عورتوں کا جو حلیہ بیان کیا گیا تھا وہ کسی بھی عورت کا ہو سکتا تھا۔ انھیں جوان، خوبرو اور پرکشش کہا گیا تھا مگر زیادہ زور ان کے خطرناک اور تربیت یافتہ کمانڈو ہونے پر دیا گیا تھا۔

"یہ بھی کیا لطیفہ ہے" غالب نے تلخی سے کہا "کہ ہمارے نامۂ اعمال میں چوہدری دلاور کا جرم لکھ دیا گیا ہے۔"

"اور ہماری نیکی اس نے اپنے کھاتے میں لکھوالی ہوگی۔" میں نے کہا "اسلحہ وہ اسمگل کر رہا تھا۔ الزام ہم پر۔ دہشت گردوں کی اور تخریب کاروں کی مدد وہ کر رہا تھا۔ مجرم ہم۔ پولیس اس کی مدد کرتی رہی۔ اب بھی کر رہی ہوگی۔ وہ نیک نام تھا۔ واپس جا کے بھی نیک نام ہی ہوگا۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ پاکستان لوٹ گیا ورنہ یوں کہاں غائب ہو سکتا تھا۔" غالب نے کہا۔

"کیا ثبوت ہے کہ ترویدی سچ بول رہا تھا؟"

"اس کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا ایسے جھوٹ سے؟ واقعی دلاور کی وجہ سے اس کا بہت نقصان ہوا تھا۔"

"گولی مارو ان دونوں کو۔ اپنی فکر کرو۔ یہ سوچو کہ اب یہاں سے کیسے نکلیں گے؟" نازو نے کہا "اس جنگل میں ڈیرا ڈال کے بیٹھے ہیں کل سے۔"

میں نے کہا "یہ بھی ضروری تھا۔ ہم پکڑے جاتے تو جیل میں اتنے آرام سے نہ بیٹھے ہوتے۔ پولیس تو کچھ لے کر چھوڑ بھی دیتی ہے اور ان سے مقابلے میں تھوڑا بہت چانس ضرور ہوتا ہے کامیابی کا مگر اب ہم عام مجرم نہیں رہے۔ ہمیں حوالے کر دیا جاتا ملٹری انٹیلی جنس کے۔ اور ان کی تفتیش کے طریقے......"

غالب نے کہا "چھوڑو یہ بات۔ بس خدا کا شکر ہے کہ ہم آزاد ہیں اور کچھ کر سکتے ہیں۔"

"لیکن ہم کچھ نہیں کر رہے ہیں" نازو بولی۔

"آج رات ہم نکل جائیں گے۔" میں نے کہا "اب یہ مت پوچھنا کہ کیسے اور کب۔ کوئی صورت ضرور نکل آئے گی۔"

رامن ہمارے اور باہر کی شکاری دنیا کے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔ اس نے دوپہر سے کچھ پہلے ہمیں انگریزی کا اخبار لا کے دیا اور یہ خبر بھی سنائی کہ ریسٹ ہاؤس میں کچھ ولایتی فقیر آ کے ٹھہرے ہیں۔ ان میں دو عورتیں بھی ہیں۔

"ولایتی فقیر؟" میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے ہپی؟"

"اپن خود دیکھتی ہے۔ ایک دم فقیر کا مافک" رامن نے کہا۔ "مرد لمبا بال رکھتی۔ عورت اپنا مافک۔ عورت نیکر پہنتی اور بنیان۔ مرد عورت جیسا لگتی۔ عورت مرد جیسا۔ اور پتی ولایت والا اور ڈانس کرتی۔ ان کا اتنا بڑا گاڑی، جس میں سب کچھ ہوتی۔ سونے کا جگہ۔ کھانے کا جگہ۔"

میری دلچسپی بڑھ گئی "یہ ہپی تو نہیں ہو سکتے مرزا جی۔ وہ گاڑی لے کر کہاں پھرتے ہیں۔ ایسے ہی نکل کھڑے ہوتے ہیں خالی ہاتھ۔ اور یہ کالیا کاروان کی بات کر رہا ہے۔"

"لیکن ان کے فقیرانہ حلیے۔"

"یار! ہے وہ فقیر لگتے ہوں گے۔ ممکن ہے وہ ٹورسٹ ہوں۔ وہ لوگ ایسے ہی پھرتے ہیں۔ نہ لباس کی پروا، نہ حلیے کی۔ دیکھنا چاہیے ریسٹ ہاؤس جا کے۔ بات کرنی چاہیے۔"

غالب نے کہا "ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔"

"پہلے یہ تو پتا چلے کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں" میں نے کہا "انگریز ہیں، امریکن یا کوئی اور۔"

"مگر اس سے فائدہ؟" غالب نے پھر کہا۔

"اس میں نقصان بھی کیا ہے؟" میں نے کہا "میں اکیلا جاؤں گا۔"

"اکیلا کیوں؟" گل نے کہا۔

"اس لئے کہ ادھر کوئی فرنچ نہیں جانتا۔ محسن جانتا تھا اور ہماری فرنچ وہ کام کر جاتی تھی جو انگلش نہیں کر سکتی تھی" میں نے کہا۔

ہم نے رامن سے مزید تفصیلات پوچھیں تو اس نے سوچ کے بتایا کہ وہ غالباً انگریزی نہیں بولتے۔ آٹھویں تک اس نے بھی انگلش پڑھی تھی اور ان کی گفتگو میں اس نے انگریزی کا ایک لفظ نہیں سنا تھا۔ اس نے بڑے وثوق سے بتایا کہ وہ انگریزی سے قطعی نابلد نہیں ہے۔

"وات یور نیم سہائی نیم رامن" اس نے اپنی زبان دانی کا مظاہرہ کیا "واشنگ کار سر۔ من سوئپ اور کی۔ ادھر سے بہت ٹورسٹ گزرتی۔ ہم سب سے بات کرتی۔ سب کا خدمت کرتی۔ انعام لیتی۔ گڈ مارننگ۔ بریک فاسٹ۔ لنچ۔ ڈنر۔ چکن۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "بس رامن۔ ہم نے مان لیا کہ تمہیں اچھی خاصی انگریزی آتی ہے۔ کیا تم نے ان سے بات کی تھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اپن آپ کا سروس کرتی۔"

میں نے کہا "اچھا۔ تم جا کے ان سے پوچھو۔ کار واشنگ؟ دیکھو وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ جتنی انگریزی بول سکتے ہو بولو۔ اور پھر ہمیں آ کے بتاؤ۔"

غالب نے کہا "ان سے پوچھنا۔ ویئر یو گو سر۔"

"ویئر یو گو۔ آپ کدھر جاتی؟" رامن نے سر ہلایا۔

"ٹھیک۔ پھر پوچھنا۔ وات یو ڈو سر۔ ٹورسٹ سر۔"

وہ جانے لگا تو میں نے کہا "رامن! ایک بات بتاؤ۔" وہ رک گیا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"یہ خبر پڑھنے کے بعد تمہارے خیالات تو نہیں بدلے؟ میرا مطلب ہے تم کو ڈر نہیں لگتا ہم سے۔"

"آپ گڈ مین ہوتی سر" وہ بولا "آپ کو ہم یاد رکھتی۔ تب

رامن کا لائف بنائی۔ بہت دیالو ہوتی۔ ہم آپ سے نہیں لیتی۔ آپ کا واسطے بھگوان کا دیا مانگتی۔ بھگوان آپ کو خوش رکھتی۔"

"ہم کو احساس ہے کہ ہماری مدد کر کے تم نے رسک لیا ہے؟ بہت خطرے میں ڈالا ہے خود کو۔"

"اپن ادھر سے بھاگ جاتی۔ آپ ہم کو ٹیکسی خریدنے کا واسطے پیسہ دیتی۔"

"کیوں نہیں۔ وہ ہمارا وعدہ ہے" میں نے کہا "اس سے زیادہ کے مستحق ہو تم۔ ان حالات میں جو کچھ تم نے کیا ہے اس کے بعد زیادہ بھی مانگ سکتے ہو۔"

"اپن کچھ نہیں مانگتی صاحب۔ آپ بہت دیتی۔ اپن کیا دیتی؟ اپنا جان دیتی۔ ضرور دیتی۔"

"زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے رامن۔"

"اپنا مافک لائف ایک دم کنڈم ہوتی۔ آپ نیا لائف دیتی اپن کو۔ آپ بہت گریٹ ہوتی۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے کہا "آدمی کتنی کم قیمت چیز ہے۔ صرف تیس ہزار میں رامن نے خود کو بیچ دیا ہے۔ وہ جان بھی دینے کو تیار ہے ہمارے لئے۔"

"یہ تیس ہزار کی بات نہیں، احسان کی بات ہے۔ اس کے لئے نیکی کا قرض سب سے بڑا ہے جس نے اس کو ایک گھناؤنے ماضی سے نجات دلا کے ایک خوش حال، باعزت مستقبل کی امید دلائی ہے۔ شاید اس کے بعد آنے والی نسلوں کو ورثے میں ملے والی بدنصیبی کے بدلے خوش نصیبی دی ہے۔"

رامن آدھے گھنٹے میں لوٹ آیا۔ میں نے اتنی دیر میں سوچ لیا تھا کہ ان حالات سے کس طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ رامن نے اطلاع دی کہ وہ انگریز نہیں ہیں تو میں نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

"وہ انکار کرتی۔ نو کار واشنگ۔"

"جب وہ انگریز نہیں ہیں تو انھوں نے تمہاری بات کیسے سمجھی اور جواب کیسے دیا؟"

"ہم گاڑی کی طرف اشارہ کرتی کہ ایسے دھوتی۔ وہ انگلی ہلائی۔ وہ گردن ہلاتی۔ ایک ہم بولتی۔ ایک ہنستی۔ وہ سب پاگل ہوتا سر۔ ہم کو مارتی۔"

میں نے کہا "اچھا تم مجھے ان کے پاس لے چلو۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "وہ بہت خراب لوگ۔ وہ بدمعاش لوگ ہوتی۔ چرس پیتی اور ڈانس کرتی۔ کپڑا کے بغیر۔"

میں نے حیرانی سے کہا "ننگے ناچ رہے تھے نشے میں؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "ریسٹ ہاؤس میں ننگا کرتی۔"

میں نے کہا "اچھا میں دیکھ لوں گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے بدمعاشوں سے نمٹنا آتا ہے۔"

بادل ناخواستہ رامن آگے آگے چلنے لگا۔ بھرا ہوا ریوالور میرے پاس تھا اور اس کے بغیر بھی میرے لئے خوف کی کوئی بات نہ تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ ہپی ہوتے تو اتنے ساز و سامان کے ساتھ نہ پھرتے۔ ٹورسٹ ہوتے تو ہپیوں جیسی حرکات نہ کرتے۔ دوسرے ممالک سے ریسرچ اسکالر اور سرکاری وفود بھی آتے رہتے تھے مگر وہ بہت پڑھے لکھے اور مہذب اطوار کے مالک ہوتے تھے۔

ریسٹ ہاؤس کا راستہ ایک پگڈنڈی کی صورت میں اوپر جا رہا تھا۔ رامن کی مدد کے بغیر بھی میں وہاں پہنچ سکتا تھا کیوں کہ ریسٹ ہاؤس اس پہاڑی جیسے بلند حصے کی انتہائی بلندی پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ سرکاری نقشے کے مطابق بنی ہوئی تین یا چار کمروں کی عمارت تھی جس پر زرد رنگ تھا۔ اس کے چاروں طرف لکڑی کی ڈھلوان چھت اور برآمدہ تھا۔ ارد گرد کے علاقے کو صاف کر کے گھاس لگا دی گئی تھی۔ برآمدے کے گملوں میں پھول بھی نظر آ رہے تھے۔

ہم ریسٹ ہاؤس کے پچھلے حصے میں تھے۔ سامنے والے حصے تک آنے والی سڑک نشیب کی جانب ایک فرلانگ کے بعد مین روڈ سے مل جاتی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے سامنے ایک سفید رنگ کی اسٹیشن ویگن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے درمیانے سائز کا کاروان تھا۔ یعنی وہ ڈبا جو چار پہیوں پر چلتا تھا اور اسٹیشن ویگن سے جوڑ دیا گیا تھا۔ اس کو چھوٹا سا متحرک گھر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ عام طور پر اس میں چار چھ افراد کے لئے اوپر تلے سونے کی برتھ ہوتی ہیں۔ مختصر سا کچن ہوتا ہے اور باتھ روم۔

رامن مجھے باہر سے ہی راستہ دکھا کے واپس بھاگ گیا۔ معلوم نہیں اس کے ساتھ ان غیر ملکیوں نے کیا بدتمیزی کی تھی کہ وہ پھر سامنے جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اندر سے مجھے ریکارڈ پلیئر پر تیز موسیقی کی اور ہذیانی ہنسی کی آواز سنائی دی۔

میں نے دروازے پر انگلی مار کے کہا "ہیلو۔"

موسیقی کے ساتھ ہی شور ختم ہوا اور ایک سفید فام گوریلا ٹائپ شخص ہاتھ میں بیئر کا ٹن لئے نمودار ہوا۔ وہ چالیس سال کا فربہ بدن شخص تھا اور اس نے صرف انڈرویئر پہن رکھا تھا۔

اس نے غصے میں اشارے سے کہا "گو۔ گو" جس کا مطلب تھا کہ میں دفع ہو جاؤں "بلیک مین۔"

اس کی آواز پر ایک عورت نمودار ہوئی جس کا لباس دیکھ کر میری نظریں جھک گئیں۔ وہ بھی شاید تیس سال کی تھی۔ اس کے چہرے پر اس زندگی کی چھاپ صاف نظر آتی تھی جو اخلاقی قیود سے آزاد تھی مگر اس کا بدن اب بھی دلکش تھا۔

میں نے فرنچ میں آزمانے کا فیصلہ کیا "میں دخل اندازی پر معذرت خواہ ہوں۔"

عورت کے لبوں پر ایک خوش گوار حیرت کے آثار نمودار

www.paksociety.com

ہوئی "یہ تو فرنچ بناتا ہے۔"
"فرنچ جانتا ہے تو کیا اسے باپ بنا لوں اپنا" مرد نے بدتمیزی سے کہا۔
"کیا چاہتے ہو تم؟" عورت نے کہا۔ اس کی نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ مجھ میں دلچسپی لینے پر مجبور ہے "اچھا اندر آجاؤ۔ اس کی بات کا برا مت مانو۔ یہ ایسے ہی بات کرتا ہے مگر دل کا بہت اچھا ہے۔"
"شکریہ میڈم مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہاں کچھ مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔" میں نے سر جھکا کے کہا اور مرد کی طرف دیکھے بغیر اندر چلا گیا۔ اندر دوسرا مرد اور دوسری عورت جس انداز سے ڈانس کر رہے تھے وہ شہوت خیز تھا۔ یہ اعضا کی شاعری سے زیادہ جسم کے حیوانی جذبوں کا اظہار تھا۔
مرد نے اطالوی میں کچھ کہا۔ اس کے ساتھ ڈانس کرتی ہوئی عورت ناگواری سے الگ ہو گئی اور اس نے جرمن میں بات کی۔ میں نے قیام انگلستان کے دوران سب یورپی ممالک دیکھے تھے اور فرنچ تو باقاعدہ سیکھی تھی مگر اطالوی اور جرمن کے علاوہ سوئس اور آسٹرین زبانوں کو فرق سے شناخت کرنا مجھے خود ہی آگیا تھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اردو جاننے والا فارسی اور عربی سیکھے بغیر سمجھے "اندازہ کر سکتا ہے کہ بولنے والا کس زبان میں بات کر رہا ہے۔ یا پاکستان کا رہنے والا چاروں زبانوں کو سن کے بتا سکتا ہے کہ وہ کس صوبے کی زبان ہے۔ شاید بنگالی اور مدراسی کو بھی پہچان سکتا ہے۔
"یہ جین کو پسند آگیا ہے" پہلے مرد نے کہا "حالانکہ اس کی جیب میں کچھ نہیں ہوگا جین کو دینے کے لئے۔ الٹا یہ جین سے ہی کچھ مانگے گا۔"
جین نے خفگی سے کہا "میری مرضی میں کسی سے کچھ نہ لوں اور....."
دوسرے مرد نے کہا "ہاں کیوں نہیں۔ مگر ہمارا گزارا کیسے ہوگا؟"
میں بھونچکا رہ گیا۔ تاہم میں نے اپنے جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیا اور نرمی سے کہا "میں بھکاری نہیں ہوں۔ بہت پیسہ ہے میرے پاس۔"
اچانک ان سب کا رویہ بدل گیا۔ دوسری عورت نے زیادہ شوخی اور بے حیائی سے کہا "پھر جین میں کیا ہے۔ مجھے دیکھو۔"
دوسرے مرد نے کہا "مگر یہ زیادہ پیسے لیتی ہے۔"
"جین بھی بری نہیں" پہلے مرد نے کہا "تم اس کتے کی باتیں مت سنو۔ جتنے پیسے ہیں تمہاری جیب میں اس کے مطابق سودا کرو۔ تم دونوں کو بھی خرید سکتے ہو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"
"ہمیں کیوں اعتراض ہوگا" دوسرے مرد نے کہا۔
میں نے کہا "حضرات اور خواتین! جہاں تک پیسے کا تعلق ہے تو پیسہ میرے پاس واقعی اتنا ہے کہ میں تم سب کو خرید لوں۔ مگر پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون لوگ ہو۔"
"ہم ٹورسٹ ہیں۔ دنیا گھومنے نکلے ہیں۔" پہلے مرد نے کہا۔
"چھ مہینے پہلے روم میں ملے تھے۔"
"مشترکہ سرمائے سے ہم نے یہ گاڑیاں خریدیں اور اس کے بعد ساری دنیا کا سفر کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ ہم آدھی دنیا گھوم چکے ہیں۔"
"باقی آدھی دنیا دیکھنے کے بعد روم میں اپنا سفر ختم کریں گے اور اپنے اپنے راستے پر چلے جائیں گے۔"
"اور اس سفر کے اخراجات ایسے ہی پورے کرتے ہو؟" میں نے کہا "خود کو بیچ کے؟"
"اور کیا ہے ہمارے پاس" پہلے مرد نے کندھے ہلا کے کہا "ہم کوئی کام کرنے کے قابل نہیں۔ اس لئے آپس میں طے کر لیا تھا کہ مرد لوگوں سے بھیک مانگیں گے اور عورتیں....."
"اور اس میں شرم کی کوئی بات نہیں تمہارے لئے؟" میں نے کہا "کوئی غیر اخلاقی بات نہیں؟"
پہلا مرد ہنسنے لگا "اگر تمہاری جیب میں دس روپے ہوں تو مجھے ایک روپیہ دینے سے تم غریب نہیں ہو جاؤ گے اور نہ تمہاری صحت پر کوئی اثر پڑے گا۔ لیکن ایک روپیہ میری ضرورت ہے۔ اس کے لئے میں تم سے کہوں تو اس میں شرم کی کون سی بات ہے۔ آرٹ ہی آدمی کے کام آتا ہے اور وہ مدد کے لئے بھی آرٹ کی ہی درخواست کر سکتا ہے۔"
"دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تم دس روپے میں خوشی خرید لو جین سے یا ماریا سے" دوسرے مرد نے کہا "دس روپے ان کی قیمت ہے۔"
"ہم سب کی" جین نے مداخلت کی۔
"اوکے۔ ہم سب کی۔ اس میں اخلاقیات کہاں آتی ہیں۔ یہ معاشیات کا مسئلہ ہے۔"
اگرچہ میں ان کے فلسفہ حیات کو انسانیت سوز سمجھتا تھا مگر ایک تو میں بحث اور دلیل سے ان کی سوچ نہیں بدل سکتا تھا دوسرے میں یہاں تبلیغ و اصلاح کے لئے نہیں آیا تھا۔ مجھے اپنا کام نکالنا تھا اور اسی شیطانی قبیلے کے ساتھ اپنے نکلنے کی تدبیر نکالی تھی۔ اب یہ کام مجھے بہت آسان نظر آتا تھا۔
میں نے مسکرا کے کہا "میں سمجھ گیا۔ اور میں تیار ہوں۔"
"کس کے لئے تیار ہو؟" جین نے پُراُمید نظروں سے مجھے دیکھا۔
میں نے کہا "ایک میں ہوں، ایک میرا دوست ہے۔ ہم دونوں کی بات کرو۔ مجھے جین پسند ہے۔ ظاہر ہے میرے دوست کو ماریا پسند کرنا ہوگا۔ ایک پوری رات کی قیمت کیا ہوگی۔"
مردوں نے حیرت سے گول گول نظریں گھما کے عورتوں کی طرف دیکھا "پوری رات! کیا تم بہت امیر ہو؟"
میں نے مسکرا کے کہا "فضول سوالات مت کرو۔ قیمت بتاؤ۔ اگر تم ان کے ایجنٹ ہو۔ ورنہ انہیں بات کرنے دو۔"

جین نے مسکرا کے کہا "میں تیار ہوں۔ تم کچھ بھی دو۔"
"ڈونٹ بی اپ سیٹ۔ تم جذباتی ہو رہی ہو کیوں کہ یہ خوب صورت ہے اور تمہارا ہم زبان" مرد نے کہا۔
"شٹ اپ نان سینس۔ تم نہ میرے شوہر ہو نہ باس اور نہ پمپ" جین نے کہا "میں اپنے معاملات طے کرنے کے لئے آزاد ہوں۔"
"جین میں دو ہزار لوں گی تمہارے دوست سے" ماریا نے کہا "تمہیں کم ملیں گی۔"
میں نے ان کے درمیان کاروباری یا جذباتی رقابت اور تعصب کو ختم کرنے کے لئے کہا "ٹھیک ہے۔ میں جین کو ایک ہفتے کے لئے لیتا ہوں۔ اور ماریا کو اپنے دوست کے لئے۔"
ایک دم وہ سب خاموش ہو کے مجھے گھورنے لگے۔ مردوں کو جیسے ایک کالے آدمی کے سامنے کمتری کی شرمندگی تھی۔ جین کی آنکھوں میں خوشی نظر آتی تھی مگر حیران بھی۔ ماریا کا رد عمل کچھ نہیں تھا۔
ٹام نے کہا "تمہارا دوست کہاں ہے؟ پیسہ کہاں ہے؟"
ماریا نے حیرت سے کہا "کیا تم کسی ریاست کے پرنس ہو؟" پھر وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوئی "برٹ! یہ مجھے کوئی دھوکے باز لگتا ہے۔"
برٹ نے انتہائی جارحانہ لہجے میں اعلان کیا کہ دھوکے باز کا وہ کیا کر سکتا ہے۔ یہ ایک ناقابل اشاعت بات تھی۔
میں نے کہا "میں ابھی واپس آتا ہوں۔ پیسے لے کر اور اپنے دوست کے ساتھ۔"
ٹام نے مجھے گالی دی "مسٹر کالے کتے! یہ عورتیں سفید فام ہیں۔ ان پر عاشق ہونے یا ان پر قبضہ جمانے کی کوشش مت کرنا ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ ہم یہاں ایک ہفتہ نہیں رک سکتے۔"
برٹ نے اس کی تائید میں سر ہلایا "اس لئے صرف آج رات کی بات کرو۔ اس کے علاوہ دوبارہ سوچنے پر میں محسوس کرتا ہوں کہ معاوضے پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ یہ قیمت بہت کم ہے۔"
"بہت کم ہے" ٹام نے کہا "اس کو ڈبل کر دو۔"
"صرف ڈبل!" میں نے طنز اور حقارت سے کہا "تین گنا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ میں ڈبل پر راضی ہو جاؤں تو تم پھر سوچنے لگو۔"
جین نے کہا "تم میرے معاملے میں....."
"شٹ اپ۔ یہ سب کا معاملہ ہے اور یہ طے ہو گیا تھا کہ ہم سب کا مفاد مشترک ہوگا۔ کوئی کسی کو دھوکا نہیں دے گا۔ اور اگر اختلاف ہوا تو فیصلہ میں کروں گا" ٹام نے کہا۔
جین نے بے بسی سے میری طرف دیکھا اور خاموش ہو گئی۔
"میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم اور تمہارا دوست....."
میں نے کہا "ایک منٹ۔ تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم کہاں جا رہے ہو۔"
"ہم یہاں سے کلکتہ جائیں گے گھومتے پھرتے" جین نے کہا۔
"اسی صورت میں ہم تمہارے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ ایک ہفتہ یا اس سے زیادہ اگر دل چاہے۔"
ماریا نے کہا "بالکل رہ سکتے ہو۔"
برٹ نے بھی سر ہلایا "جگہ ہے ہمارے پاس۔"
ٹام نے اپنے ساتھیوں کی طرف غصے سے دیکھا "تم انہیں دن رات اپنے ساتھ رکھو گے؟"
"کیا حرج ہے اگر یہ اس کی قیمت دیں۔"
میں نے کہا "اس کے علاوہ میں تمہاری بہت مدد کر سکتا ہوں۔ مجھے انگریزی بھی آتی ہے اور ہندوستانی بھی۔ تمہیں کہیں کوئی مسئلہ پیش آیا تو میں نمٹ لوں گا۔"
ماریا نے کہا "یہ کام کا آدمی ہے برٹ۔ یہ ہمارے کاروبار میں بھی مددگار ثابت ہوگا۔ تم تو خیر اپنا کام بلا روک ٹوک آسانی سے کر لیتے ہو مگر ہمیں مشکل پیش آتی ہے۔ یہ مقامی لوگوں میں جا کے ہمارے لئے آمدنی کے ذرائع تلاش کر سکتا ہے۔"
ماریا کی بات پر میرا خون کھولنے لگا۔ وہ مجھے اپنا دلال بنانے کی بات کر رہی تھی کہ میں اس کے لئے گاہک پھانس کے لا سکتا ہوں۔ مگر اس وقت میں ضبط سے کام لینے پر مجبور تھا۔
"یہ سب تو ٹھیک ہے۔ مگر وہ جو اپنی اور اپنے دوست کی بات کی تھی تم نے" ٹام بولا "کیا تم ایک ہفتے کے پچاس ہزار دو گے؟"
جین چلائی "ٹام! تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟"
ماریا نے بھی کہا "ٹام! یہ زیادتی ہے۔"
مگر میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا "مجھے منظور ہے۔ آخری بار۔ اب تم اپنی زبان سے پھرے تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔"
ٹام بے شرمی سے ہنسنے لگا۔ "مار دو گے۔ کالا سانپ کاٹ لے یا کالا کتا۔ میری موت اگر ایسی ہی ذلت آمیز ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم کب تک آؤ گے؟"
"رات ہونے سے پہلے" میں نے کہا۔
ان سے سودا کرنا ایک انتہائی اذیت دہ فعل تھا۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آرہی تھی مگر یہ موقع ٹھنڈے دماغ سے کام لینے کا تھا۔ اس جگہ سے نکلنے اور سیدھے کلکتہ پہنچنے کے لئے ہمیں اس شیطانی قبیلے کے ساتھ سفر کرنے میں جہاں بہت سے اخلاقی معاملات میں خود پر جبر کرنا تھا وہیں صبر سے کام لے کر یہ بھی دیکھنا تھا کہ ان حالات میں یہ موقع گنوانا عقلمندی نہیں سمجھا جا سکتا۔
میرا باقی وقت پہلے غالب کو قائل کرنے میں صرف ہوا اور اس کے بعد گل اور نازو کو سمجھانے میں کہ وہ غلط نہ سمجھیں۔ وہ سب نہیں ہوگا جو میں نے کہا ہے۔ "ہمیں ایک بار ان کے ساتھ سفر کا موقع مل جائے" اس کے بعد ہم معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ وہ غیر ملکی ہیں اور انہیں سفارتی قوانین کے تحت وہ تحفظ حاصل ہے جو ہر غیر ملکی کو ہوتا ہے۔ پولیس انہیں نہیں پکڑ سکتی اور

www.paksociety.com

ان کے ساتھ ہمارے نکل جانے کے امکانات بہت روشن ہیں۔
"لیکن وہ سب کچھ ہمیں دیکھنا تو پڑے گا' جو وہ کرتے ہیں۔"
نازو نے تجزیہ کرتے ہوئے کہا "ان میں تو شرم و حیا ہے نہیں۔"
میں نے کہا "تم اپنی آنکھیں بند رکھ سکتی ہو۔ چادر تان کے سو سکتی ہو یا بہری ہو بھی سکتی ہو۔"
"مگر وہ شراب پی کر بد مستی کریں گے۔"
میں نے کہا "نہیں۔ وہ کچھ نہیں کریں گے۔ اور جو کچھ کریں گے آگے اسٹیشن ویگن میں کریں گے۔ کاروان پیچھے ہوگا اور اس میں صرف ہم ہوں گے۔ میں آگے رہوں گا۔ ہو سکتا ہے جمن اور ماریا پیچھے تمہارے ساتھ ہوں۔"
غالب نے سر ہلایا "تھوڑا کچھ میری سمجھ میں آ رہا ہے۔"
میں نے کہا "یہ صرف پیسہ چاہتے ہیں۔ پیسہ ہم ان کے سامنے پھینک دیں گے۔ اور انہیں کچھ کئے بغیر پیسہ ملے گا تو یہ ہماری بات مانیں گے۔"
"ہر بات؟"
"جو بات نہیں مانیں گے وہ ہم منوا لیں گے" میں نے کہا۔
طے شدہ پروگرام کے مطابق میں غالب کے ساتھ واپس گیا تو وہ ہمیں دیکھ کر ایسے خوش ہوئے' جیسے ہم خلاف توقع آ گئے تھے۔ وہ شاید دیر کی وجہ سے مایوسی کا شکار ہو رہے تھے۔
میں نے رئیسانہ شان استغنا کے ساتھ دس ہزار روپے ٹام کی طرف پھینک دیئے "یہ رکھ لو ابھی۔ دس ہزار ہیں۔"
اس نے نوٹوں کی طرف لالچ کے ساتھ ہاتھ بڑھایا اور پھر واپس کھینچ لیا "ابھی کا کیا مطلب؟ باقی چالیس ہزار؟"
میں نے کہا "جب ہم آ جائیں گے تو دیں گے۔"
برٹ ہنسنے لگا "تم آ گئے ہو اور کہتے ہو آئیں گے۔ آنا اور کیسے ہوگا؟"
میں نے کہا "کچھ مصروفیات ایسی ہیں کہ آج رات ہم شاید نہ آئیں۔ کل تمہارے ساتھ ہی روانہ ہو جائیں۔"
"جیسی تمہاری مرضی" ٹام نے رقم اٹھالی۔
"تم کس وقت روانہ ہونے کا ارادہ رکھتے ہو؟" میں نے کہا۔
"صبح کسی وقت" ٹام نے کہا۔
جمن نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "اچھا بیٹھو تو سہی۔ بولو کیا پیو گے؟"
میں نے ہاتھ چھڑا کے کہا "آج کچھ نہیں" اور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔
ماریا نے زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ کیا اور غالب کے بارے میں ایک ایسا سوال کیا جس کا مطلب غالب سمجھ لیتا تو اس کی حالت غیر ہو جاتی۔
میں نے کہا "میرا دوست صرف انگلش سمجھتا ہے۔"
"ہم انگلش نہیں جانتے" برٹ نے کہا۔
"پھر کام کیسے چلاتے ہو؟"

"ایک کتاب ہے۔ اس میں انگریزی کے جملے لکھے ہوئے ہیں۔ عام استعمال کے۔ ہندوستانی زبان کی ایک کتاب بھی تھی مگر بے کار ہے۔ ہر جملے کا مطلب انگریزی میں لکھا ہوا ہے" ٹام نے کہا۔
"کتاب کی مدد سے تم میرے دوست سے اظہار محبت تو کر سکتی ہو۔" میں نے ماریا سے کہا۔
ماریا نے فوراً وہ کتابچہ اٹھایا جو عام طور پر ہر ملک میں زبان نہ جاننے والے سیاحوں کی سہولت کے لئے شائع ہوتے ہیں۔ اس میں فرانسیسی کے مقابل انگریزی کے جملے لکھے ہوئے تھے مگر یہ ہر روزمرہ زندگی میں زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم والا مسئلہ در پیش نہیں ہوتا۔ اس میں ہوٹل' بازار' بس اسٹاپ' ٹرین' ٹیکسی سروس اور ذاتی تعارف کے بارے میں جملے درج تھے یا غیر کی کسی حسینہ سے اظہار عشق کے لئے مکالمات شامل نہیں کئے گئے تھے۔ ماریا کو خاصی مایوسی ہوئی۔
ٹام نے کہا "تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ تم کیا کرتے ہو؟"
"میں عیش کرنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ عیش کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"عیش کے لئے پیسہ کہاں سے لاتے ہو؟"
"وہ خود آتا ہے۔ باپ دادا کی زمینداری ہے۔ کاروبار ہے" میں نے گول مول جواب دیا۔
"گویا تم کچھ نہیں کرتے؟" ٹام نے حسد سے کہا۔
"بتایا نا کہ عیش کرتا ہوں۔ یہ کوئی آسان کام ہے؟"
جمن ہنسنے لگی "بہت خوش قسمت ہو تم۔"
میں نے کہا "جی نہیں۔ میرے خیال میں تم خوش قسمت ہو۔ ہر قسم کی فکر سے آزاد ہو۔"
"اس آزادی کی بہت بڑی قیمت ادا کرتے ہیں ہم۔ سارے رشتے توڑ کے۔ خود کو قتل کر کے" جمن نے کہا اور کچھ افسردہ ہو گئی۔
"تم ایسی جذباتی لڑکی ہو کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم کسی دن ہمارا ساتھ چھوڑ جاؤ گی۔"
"ایک نہ ایک دن ہم سب الگ ہو جائیں گے۔ یہ ساتھ عارضی ہے۔ زندگی بھر کا ساتھ نہیں ہے" جمن نے کہا "روم سے شروع ہونے والا سفر روم پر ختم ہو جائے گا۔"
"تو چلی مت جانا۔ اس کے بعد زندگی ختم نہیں ہو جائے گی' دنیا ختم نہیں ہو جائے گی" ٹام نے کہا۔
میں نے کہا "ایک بات بتاؤ۔ تم پیسہ کہاں خرچ کرتے ہو؟"
"ضروریات پر" برٹ نے کہا "گاڑی بغیر پٹرول کے نہیں چلتی۔ اس کی دیکھ بھال الگ ہے۔ پھر کھانا پینا۔ ہوٹل بہت مہنگے ہیں۔ شراب ملتی ہی نہیں۔ اور بلیک سے خریدنی پڑتی ہے۔ ہر ملک میں اتنی آمدنی بھی نہیں ہوتی۔"

ہوٹل کے ہندوستانی فقیروں کو خیرات دیتے ہیں۔ ہم کہیں اپنا ہیٹ زمین پر رکھ کے گھنٹوں کھڑے رہیں تب بھی لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ہم ہیٹ میں سے خرگوش نکالنے والے مداری نہیں بلکہ بھیک مانگ رہے ہیں۔ وہ ہمیں دیکھتے رہتے ہیں یا ہیٹ کو۔ اور جب انہیں بتایا جائے کہ اس میں روپے ڈالو تو وہ ہنسی کے مارے بل پڑتے ہیں۔ ہم سے کام نہیں کراتے" ٹام نے شکوہ کیا۔
برٹ نے کہا "پھر بھی سو پچاس روپے بن جاتے ہیں۔ مگر اصل میں تو جمن اور ماریا کی کمائی سے کام چل رہا ہے۔"
ماریا نے حقارت سے کہا "خاک کام چل رہا ہے۔ بڑے شہروں میں بہت پیسہ ہے۔ جس ہوٹل میں ہم ٹھہرے سب وہاں بہت کمایا۔ چھوٹے شہروں میں کچھ نہیں۔ یہاں خوش قسمتی سے تم مل گئے ہو تو ہمت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ کلکتہ پہنچ کے پھر پیسہ ملے گا مگر ہمیں تو وہاں پہنچنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسی لئے پڑے ہیں یہاں فقیروں کی طرح اس تھرڈ کلاس ریسٹ ہاؤس میں۔"
"جہاں سب کچھ ہے مگر ریسٹ نہیں ہے" ٹام بولا۔
میں نے کہا "اچھا۔ ہم صبح صبح آ جائیں گے۔"
ماریا نے غالب کو گرسنہ نظروں سے دیکھا "اس کے ساتھ میرا کیسے گزارا ہوگا؟ اس کے منہ میں تو زبان ہی نہیں ہے۔"
"کر لینا کسی طرح" برٹ ہنسنے لگا۔
واپس آتے ہوئے میں نے غالب کو اس گفتگو کا خلاصہ سنایا جس میں وہ ایک خاموش فریق تھا۔ اس کی غصے اور شرم سے بری حالت ہو گئی۔
"یار سکندر! یہ تو بہت ہی بے شرم ہیں۔ اتنی بے حیا تو ہماری طوائفیں بھی نہیں ہوتیں" غالب نے کہا۔
"ایک نوجوان کا معاشرہ ہی بے راہروی کا شکار ہے۔ یہ اس معاشرے سے بھی باغی ہیں۔"
"اگر ہمارے ساتھ نازو اور گل ہیں۔ مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے یہ سوچ کر کہ ان کے سامنے ایسی ویسی کوئی بات ہوتی تو کیا ہوگا؟"
میں نے کہا "صبح صاف بات ہو جائے گی کہ ہمارا اصل مقصد کیا ہے۔ ہم کاروان میں ہوں گے اور پچاس ہزار کو اس کا کرایہ سمجھا جائے۔ جمن اور ماریا کا نہیں۔"
"لیکن یہ بات وہ مانیں۔"
"انہیں پیسے کی جتنی ضرورت ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ ناممکن ہے کہ وہ انکار کریں" میں نے کہا "اس کے علاوہ ہم یہ بات روانہ ہونے سے پہلے نہیں بتائیں گے۔ راستے میں بتائیں گے۔"
رامن کو ہم نے رات کے کھانے کے بعد چالیس ہزار روپے دیئے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور میرے ہاتھ چومنے لگا اور پاؤں پکڑنے لگا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ ہم واقعی اسے اتنی بڑی رقم دے دیں گے۔ بس ایک امید تھی جس کی خاطر اس نے ہمارا ہر کام کیا اور ہمارا وفادار رہا۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس کے دل میں

ہمیں پولیس کے حوالے کرنے کا خیال بھی آیا تھا مگر وہ ڈر کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ وہ حد درجہ جذباتی ہو رہا تھا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ہمیں فرشتہ رحمت بھگوان کا اوتار اور جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے ہم سے وعدہ کیا کہ ہمارے جانے کے بعد اپنی ماں اور بہن کے ساتھ مدراس روانہ ہونے میں دیر نہیں کرے گا۔
"تم نے دیر کی تو خطرے میں پڑ جاؤ گے" میں نے کہا "یا پولیس آ جائے گی ہمیں تلاش کرتی ہوئی۔ تم کو کیا معلوم کہ تمہیں کسی نے آتے جاتے دیکھا تھا یا نہیں۔"
"اپن کو کوئی نہیں دیکھتی تھی۔"
میں نے کہا "پھر تمہارے پاس اتنی بڑی رقم ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو وہ تمہیں قتل بھی کر سکتا ہے۔ ورنہ یہ وضاحت کیسے کرو گے کہ اتنی دولت تم نے کہاں سے حاصل کی؟ تم پر شک کیا جائے گا کہ تم نے کہیں چوری ڈاکے کی واردات کی ہے یا کسی کو قتل کر کے اس سے چھینی ہے یہ رقم۔ اس لئے خاموشی سے نکل جاؤ۔"
اس نے رقم گنے بغیر رکھ لی تھی۔ اگر میں اسے بتاتا کہ یہ تیس ہزار نہیں چالیس ہزار ہیں تو شاید وہ پھر زائد رقم کی واپسی پر اصرار کرتا۔ گل اور نازو بھی اس کے لئے جذباتی ہو رہی تھیں۔
"بڑا اچھا لڑکا تھا۔ ہمارے ساتھ رہتا تب۔"
میں نے کہا "بی بی مانو! اپنی زندگی پر اس کا اختیار باقی رہنے دو۔ یہ زیادہ خوش رہے گا۔"
گل نے زیورات میں سے وہی نیکلس نکالا جو ہم نے انعام نیا کی بیوی کو رشوت میں دینے کی ناکام کوشش کی تھی۔
"یہ لو۔ یہ ہماری طرف سے اپنی بہن کو دے دینا۔"
وہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا "نہ۔۔۔ ہم نہیں لیگا۔"
"جب تمہاری بہن کی شادی ہو تو ہماری طرف سے اس کو تحفہ دے دینا" نازو نے کہا۔
"نہیں جی۔ اپن غریب آدمی ہوتی۔ اتنا اپن کا پاس ہوتی تو پولیس پکڑ لیگی۔ چور سمجھتی۔"
گل نے کہا "بے وقوف۔ اسے چھپا کے رکھنا۔ دو تین ہزار بھی تو چھپا کے رکھو گے تم۔"
میں نے کہا "ہاں۔ مدراس پہنچ جانے کے بعد تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ تم اپنی ٹیکسی چلاؤ گے تو غریب آدمی نہیں رہو گے۔ پھر تم کہہ سکو گے کہ یہ تم نے بنوائے ہیں۔"
ہمارے بہت مجبور کرنے پر وہ مان گیا۔ بہت رونے دھونے کے بعد وہ بڑی مشکل سے رخصت ہوا۔ گل اور نازو نے اس کے جانے کے بعد تھوڑے سے آنسو بہائے۔ خود میں اور غالب بھی اداس تھے۔ رامن کا سارا ماضی ہمارے سامنے تھا مگر اس کا مستقبل کیا ہوگا' یہ ہم نہیں جانتے تھے۔ کیا ہماری کوشش سے اس کی زندگی کا راستہ بدل جائے گا؟ وہ اپنی ماں کو اس کی آخری خواہش کے مطابق مدراس میں اس کے آبائی وطن تک پہنچانے میں کامیاب

www.paksociety.com

ہوگا؟ وہ ٹیکسی خریدے گا۔ اور جیسا کہ اس نے کہا تھا' ایک سے دو' دو سے چار بنالے گا۔ کسی دن وہ امیر آدمی ہوگا؟ اپنی بہن کو عزت سے رخصت کرسکے گا؟ ہمارے رخے ہوئے تحائف کے ساتھ۔ یہ ایسے سوال تھے جن کا جواب وقت دے سکتا تھا مگر اس کے اور ہمارے وقت میں وہ فاصلے حائل تھے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے تھے۔ ہم کبھی نہ جان سکیں گے کہ جو ہم نے چاہا تھا وہی ہوا یا نوشتۂ تقدیر وہی رہا جس سے رامین لڑنا چاہتا تھا۔

ہمارا دن کھاتے اور سوتے گزرا تھا۔ رات گئے تک ہم آگ جلا کے بیٹھے رہے۔ چائے اور کافی پیتے رہے اور فرصت کے ان لمحات کو اپنی شیرازہ بندی کے مسائل پر غور کرنے اور اپنے آنے والے کل کے حالات کا اندازہ کرنے میں گزارتے رہے۔ وہ رات بہت غنیمت تھی۔ ہم نے اتنی باتیں کرلیں کہ دل کا سارا غبار نکل گیا۔ ہم نے گزر جانے والے وقت کو اور بچھڑ جانے والوں کو یاد کیا اور اپنے سود و زیاں کا موازنہ اپنی کامیابی اور ناکامیوں سے کرتے رہے۔ ایک نئے عزم اور نئے لائحہ عمل کے ساتھ ہم صبح پھر سفر کی اگلی منزل کا ارادہ لے کر نکلے۔

ہم نے رامین کو تاکید کردی تھی کہ وہ ان ولایتی فقیروں پر نظر رکھے اور وہ رات کو کسی وقت ہمارے دل بیزار ہو کر فرار ہونے کی کوشش کریں تو انہیں فوراً مطلع کرے۔ وہ ہمیں صبح ریسٹ ہاؤس کے دروازے پر ملا۔ رات بھر جاگتے رہنے اور رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ رخصتی کا الوداعی منظر پھر دہرایا جائے چنانچہ میں نے ہاتھ ہلا کے اسے جانے کو کہا۔

گل اور نازو ہماری ہدایات کے مطابق کاروان میں گھس کر بیٹھ گئیں۔ اس کا سائز اندر سے کسی درمیانی کمرے کے برابر تھا۔ دائیں اور بائیں طرف لمبائی کے رخ اوپر نیچے دو دو فٹ چوڑے تین تین بیڈ لگے ہوئے تھے۔ نیچے والے بیڈ فولڈ ہو جاتے تھے۔ آگے والے حصے میں کچن اور باتھ روم کے خانے نظر آرہے تھے۔ ٹرین کے ڈبوں کی طرح پانی کا ذخیرہ چھت پر بنے ہوئے ٹینک میں تھا۔

میں اور غالب ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوئے تو اچانک ایک چوکیدار قسم کا شخص سامنے آگیا۔

"اے بھیا! کہاں گھسے جات ہو۔"

میں نے فرنچ میں کہا "اس اُلّو کے پٹھے کو سمجھاؤ کہ ہم ان کے ساتھی ہیں۔"

غالب نے کہا "مجھ سے بات کرو۔ یہ ہندوستانی نہیں جانتا۔ ہم مسٹر برٹ اور مسٹر ٹام کے ساتھ ہیں۔ ان کے ساتھ ہی جانا ہے ہمیں۔"

"ہم تو کل ناہیں دیکھت ہیں تم کو۔ بدیسی لوگان کے سنگ" اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"تم نے تو بہت کچھ نہیں دیکھا۔ صرف پیسہ دیکھا اور اس ریسٹ ہاؤس کو اپنے باپ کا گھر سمجھتے ہوئے ان سفید چمڑی والے بدمعاشوں کو یہاں رنگ رلیاں منانے کی اجازت دے دی" غالب نے اسے ڈانٹنا شروع کیا۔ "وہ کچھ بھی کریں۔ شراب پئیں اور نشے میں دھما چوکڑی مچائیں۔"

چوکیدار کا رنگ اڑ گیا "ہمار۔۔۔۔ اے مطلب ناہیں۔۔۔"

"مطلب کے بچے۔ تم نے کتنا پیسہ وصول کیا ہے ان سے؟ یہ بات تمہارے محکمے کو معلوم ہو جائے۔ یا کوئی پولیس کو بتا دے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ پھر کیا بنے گا تمہارا؟"

چوکیدار گڑگڑانے لگا "غلطی ہوئی گوا صاحب جی۔ معافی دئی دیو ہم کا۔"

غالب کی فراخ دلی کے مظاہرے سے پہلے ٹام اندر سے نمودار ہوا۔ اس نے صرف انڈرویئر پہن رکھا تھا اور اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ یہ غالباً رات کو بہت زیادہ پینے اور جاگنے کا نتیجہ تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کے ہیلو کہا۔

میں نے کہا "یہ چوکیدار ہمیں روک رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہم تمہارے ساتھی نہیں ہیں۔"

"ان انڈین کالے کتّے کو صحیح جگہ ٹھوکر مارو۔ یہی علاج ہے ایسے لوگوں کا جو اپنی اوقات بھول جائیں" ٹام نے غرا کے کہا۔ مگر مجھ سے پہلے یہ کام خود اس نے کیا۔

"دفع ہو جاؤ لالچی کتّے۔ تم کو پانچ سو ہم نے بھونکنے کے لئے نہیں دئے تھے" اس نے چوکیدار کو دھکا دے کر اور چیخ کر کہا۔ پانچ سو کا اشارہ اس نے پانچ انگلیاں دکھا کے کیا تھا چنانچہ چوکیدار نے فرنچ بھی سمجھ لی۔ دھکے سے وہ گرتے گرتے بچا مگر اس کے بعد بڑی بدحواسی میں باہر نکل گیا۔

برٹ بھی جاگ اٹھا تھا اور اب دونوں لڑکیوں کو جگانے کے لئے ان پر جگ سے ٹھنڈا پانی ڈال رہا تھا۔ وہ جاگ رہی تھیں اور اس کھیل سے لطف اندوز ہونے کے باوجود ہنس ہنس کے برٹ کو فحش گالیاں بک رہی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

انہیں نہا دھو کے کپڑے بدلنے اور انسانوں کی جون میں آنے میں تو کچھ گئے۔ اب وہ خاصے مختلف نظر آرہے تھے اور حلیے سے ولایتی فقیر بھی نہیں لگتے تھے۔ ماریا اور جینی کا لباس ہمارے لحاظ نظر سے اب بھی قابل اعتراض تھا اور بہت کم تھا مگر نہ ہونے سے بہرحال بہتر تھا۔ ان کا اسباب سفر بہت مختصر تھا۔ خیمے اور سلیپنگ بیگ انہوں نے نکالے ہی نہیں تھے۔ ریسٹ ہاؤس کے بیڈ روم میں انہیں زیادہ آرام ملا تھا۔

نو بجے ہم نے کہا "تم لوگ بہت وقت ضائع کر رہے ہو۔"

"ہمارے پاس ضائع کرنے کے لئے بہت وقت ہے" ماریا نے سادگی سے کہا "ساری عمر ضائع کی ہے ہم نے۔"

"تم نے دیکھا کہ ہم گھڑی نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ گھڑی آدمی کو وقت کا غلام بنا دیتی ہے" جینی بولی۔

میں نے کہا "لیکن ہم نے اپنی زندگی کے معمولات کو گھڑی کی سوئیوں کے تابع کر رکھا ہے۔ ہم وقت پر ہر کام کرنے کے عادی ہیں۔ وقت پر کھاتے ہیں' وقت پر سوتے ہیں اور جاگتے ہیں۔"

"تت تت۔ صرف اپنی مرضی سے وقت پر پیدا نہیں ہو سکتے اور گھڑی دیکھ کر مر نہیں سکتے" ٹام نے افسوس سے کہا۔

"اگر تم آدھے گھنٹے میں روانہ ہو جاتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ یہ معاہدہ منسوخ" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا "اتنی رقم میں ہم اپنی گاڑی خرید سکتے تھے۔ تمہیں نقصان ہوگا۔ بلکہ جینی کو اور ماریا کو۔"

برٹ نے کہا "اوکے۔ ہم آدھے گھنٹے میں چلتے ہیں لیکن تمہارا نظام الاوقات دوران سفر ہم پر لاگو نہیں ہوگا۔"

میں نے کچھ سوچ کے کہا "ٹھیک ہے۔ تم آزاد ہو مگر ہم وقت کے پابند رہیں گے۔"

چوکیدار دوڑ کے دوڑتے ناشتے کی ٹرے لایا۔ اس میں ڈبل روٹی' مکھن' انڈے اور چائے کا خصوصی اہتمام دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ آدمی دیس میں ہو یا پردیس میں' اگر قوتِ خرید رکھتا ہے تو گھر جیسا آرام بھی حاصل کرسکتا ہے۔ ناشتے کے بعد ٹام نے نقشہ نکالا اور وہ سڑکوں کے جال میں سرخ پنسل کے نشان لگے ہوئے راستے پر انگلی رکھے سفر کے اگلے مرحلے کی تفصیلات طے کرنے لگے۔

جینی نے صوفے پر مجھ سے چپک کے کہا "تم بھی ڈرائیو کرسکتے ہو؟"

میں نے کچھ دور ہٹ کے کہا "میں نے کبھی گاڑی نہیں چلائی۔ اس کام کے لئے میرے پاس شوفر ہے۔"

وہ پھر کھسک کے میرے نزدیک ہوگئی "تم بہت پُراسرار آدمی ہو۔ مگر تم اتنا ڈرتے کیوں ہو مجھ سے؟ میں پسند کرتی ہوں تمہیں۔"

میں نے کہا "پسند تو میں بھی کرسکتا ہوں تمہیں اگر تم تھوڑا سا شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے دن دھاڑے مجھ پر دست درازی نہ کرو۔"

وہ ہنس پڑی "دوستی یا تعلق میں دن رات کیا۔۔۔۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب ٹام اور برٹ نے نقشہ سمیٹ کر کوچ کا اعلان کیا۔

"میں اور برٹ باری باری گاڑی چلائیں گے" ٹام نے کہا۔ "ایک ایک گھنٹا۔ دو گھنٹے بعد ہم کہیں بریک کریں گے۔ ڈرنکس کے بعد پھر دو گھنٹے سفر ہوگا۔ اس کے بعد لنچ۔"

"لنچ۔ ڈرنکس" ماریا نے حقارت سے کہا "ڈرنکس کا مطلب ہے وہی گھٹیا گندے چائے خانوں کا قہوہ۔ لنچ کا مطلب ہے دال چاول۔ یا بکرے کا واہیات گوشت۔ میں ترس گئی ہوں پورک' بلازٹ اور۔۔۔۔"

"شٹ اپ" ٹام نے کہا "آج ہم چھ سات گھنٹے سفر کریں گے اور پھر رات کو کہیں اسٹاپ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا ہندوستانی بولنے والا دوست ہماری بہت مدد کرسکتا ہے۔"

"کس معاملے میں؟" میں نے کہا۔

"کسی جگہ قیام کی اجازت دلوانا۔ یہ ایک مسئلہ ہے۔ مقامی لوگوں کے ذریعے ضروریات حاصل کرنا۔ میں نے سنا ہے کہ اس علاقے میں جنگلی شور بہت ہیں۔"

میں نے کہا "میرا دوست کسی بھی معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرے گا۔ اپنا سفر پہلے کی طرح جاری رکھو' جب ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے۔ ہم تمہارے مسائل حل کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ عیش کرنے آئے ہیں۔"

"اچھا۔ پھر تم عیش کرو" برٹ نے تلخی سے کہا "تم دونوں جینی اور ماریا کے ساتھ پیچھے کاروان میں رہو۔"

میں نے کہا "ابھی ہم سب ساتھ رہنے کو ترجیح دیں گے۔ گپ شپ کے لئے۔"

"گپ شپ" ماریا ہنس پڑی "تمہارا گونگا دوست کیا اشاروں کی زبان میں بات کرے گا۔"

پھر اس نے جو اشاروں کی زبان استعمال کی اس کا مفہوم انتہائی لغو تھا مگر غالب نے ہمت سے کام لیا اور شرمانے کے بجائے ماریا کو دلچسپی سے دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ روانگی سے قبل ہی ان پر کاروان میں گل اور نازو کی موجودگی کا راز افشا ہو۔ ریسٹ ہاؤس سے باہر آتے وقت ان کے ہاتھوں میں صرف دو بیگ تھے۔ جینی اور ماریا انہیں کاروان میں رکھنا چاہتی تھیں۔

میں نے جینی سے بیگ لے لیا "لاؤ یہ مجھے دے دو۔" اس نے میرے لہجے کی نیازمندی کو میرے عاشقانہ جذبات کی ترجمانی سمجھا اور مسکراتے ہوئے مجھے اس خدمت کی سعادت بخشی۔ پھر غالب نے ماریا پر واضح کیا کہ وہ اس کے نازک ہاتھوں کو بیگ اٹھانے کی مشقت اٹھاتے نہیں دیکھ سکتا اور یوں ہم نے بیگ جلدی سے کاروان میں رکھے اور پھر اسٹیشن ویگن میں آ بیٹھے۔

ٹام نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور برٹ اس کے ساتھ بیٹھا تو مجھے اور غالب کو پچھلی والی سیٹ پر جینی اور ماریا کے ساتھ سمٹ کے بیٹھنا پڑا۔ جینی مجھ میں گھسی جارہی تھی اور ماریا نے غالب کی جان عذاب میں ڈال رکھی تھی۔ آبادی سے باہر آنے تک ہمارا طوعاً و کرہاً سب کچھ برداشت کرتے رہنا ضروری تھا۔

اب ہم واپس جارہے تھے۔ اسی راستے پر جس پر ہم نے ایمبولنس ڈرائیو کی تھی اور پھر انعام کی بیوی کو روانہ کردیا تھا۔ تقریباً دس میل کے بعد وہ قصبہ بھی گزر گیا جہاں سے رامین ہمارے لئے کھانے پینے کا سامان لاتا رہا تھا۔ سڑک اسی بازار سے نکلی جس کے دونوں طرف دکانیں تھیں۔ کچھ دیہاتی وضع کے لوگوں نے گوری میموں کو اور اسٹیشن ویگن کے پیچھے بندھے ہوئے کاروان کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

بازار کے ختم ہوتے ہی میں نے پولیس کو سڑک کے درمیان

www.paksociety.com

دیکھا۔ ٹام نے انہیں ایک گالی دی۔

"کیا یہاں بھی پاسپورٹ چیک ہو گا؟"

برٹ نے کہا "آخر کیا سمجھتے ہیں یہ ہمیں؟ ہم ٹورسٹ ہیں۔ صورت سے چور ڈاکو بھی نہیں لگتے۔"

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ریوالور نکالوں اور ٹام سے کہوں کہ وہ سب اپنے پاسپورٹ دکھائیں مگر ہمارے بارے میں صرف اتنا کہیں کہ دوست ہیں اور دہلی سے ہمارے ساتھ ہیں۔ ریوالور نکالنا بھی آسان کام نہ تھا کیوں کہ مجھے ایک طرف سے دروازے نے اور دوسری طرف سے جیمن نے دبا رکھا تھا۔

اچانک پولیس والے ہٹ گئے اور ایک سب انسپکٹر قسم کے افسر نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی کو گزر جانے کی اجازت دی۔ غالباً اس نے فرنٹ سیٹ پر دو گوروں کو دیکھ لیا تھا۔ ان میں سے ایک گاڑی چلا رہا تھا۔ ممکن ہے اس نے پچھلی سیٹ پر دو میموں کو بھی دیکھا ہو اور مطمئن ہو گیا ہو کہ ان غیر ملکیوں کے ساتھ کوئی مجرم نہیں ہو سکتا۔ ہمیں ایک نفسیاتی تحفظ یوں حاصل ہوا کہ کسی کی نظر نے ہمیں غور سے نہیں دیکھا۔

میں نے خود کو جیمن کے پیچھے اس طرح چھپا لیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا میں سیٹ کے پیچھے والے حصے میں سے کوئی چیز اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یوں میرا چہرہ ذرا سی دیر کے لئے دوسری طرف ہو گیا تھا۔ جیمن تھوڑا سا آگے ہوئی تو اس کے بال میرے چہرے پر آ گئے۔ یہی طریقہ مرزا غالب نے بھی اختیار کیا تھا۔ اچانک امیا کے التفات کے جواب میں غالب نے خود کو اس کی آغوش کے سپرد کر دیا تھا اور کچھ دیر غالب کا چہرہ بھی امیا کے چہرے اور اس کی زلف کے سائے میں روپوش ہو گیا تھا۔

جب خطرے کی سرحد گزر گئی تو میں نے غالب سے کہا "کیا خیال ہے۔ اب خواتین کو زنان خانے میں بھیج دیں؟"

"واقعی آپ کا دل چاہتا ہے......" غالب نے کہا۔

"اگر نانو یہاں ہوتی تو آپ کو یک جان دو قالب ہو کے پناہ لینا بھی بہت مہنگا پڑتا" میں نے کہا "اسے زیادہ بے تکلف مت ہونے دو۔ وہ تم سے پہلے اسے مار ڈالے گی۔"

غالب نے کہا "کوئی بات نہیں۔ تمہاری جیمن تو بچ جائے گی۔"

جیمن اپنا نام سن کے مسکرائی۔ وہ ہماری گفتگو سے کوئی مطلب اخذ کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

ٹام نے کہا "یہ بد تہذیبی ہے۔"

"کیا بد تہذیبی ہے؟"

"اس طرح اپنی زبان میں باتیں کرنا۔"

"کیا تم اپنی مادری زبان میں باتیں کرنے کو ایک غیر مہذب حرکت سمجھتے ہو؟" میں نے کہا۔

"جب دوسرے کوئی زبان نہ سمجھتے ہوں اور درمیان میں مشترک زبان کا رشتہ موجود ہو......"

"اپنا یہ فلسفہ بند کرو۔ ہم ایک غیر مہذب قوم ہیں تمہاری نظر میں مگر تم کتنے مہذب ہو' یہ میں جانتا ہوں۔ سارا یورپ دیکھا ہے میں نے۔ کیا تم کسی انگریز کو انگلش جاننے کے باوجود انگلش کا جواب دیتے ہو؟ نہیں۔ تم ہر غیر ملکی سے صرف فرنچ میں بات کرتے ہو' خواہ وہ سر پٹخ کے مر جائے۔"

برٹ نے حیرانی سے مجھے دیکھا "تم یورپ کیا کرنے گئے تھے؟"

میں نے کہا "عیش کرنے۔ میں بتا چکا ہوں کہ عیش کرنے کے سوا میں کچھ نہیں کرتا۔ اب ذرا گاڑی کو ایک طرف روک لو ڈیئر مسٹر ٹام۔ چند منٹ کے لئے۔"

ٹام نے کہا "کیوں؟ کیا ہوا؟"

میں نے کہا "گاڑی روکو گے تو کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔"

"میں سمجھ گیا۔ تم پانی بہانا چاہتے ہو" برٹ نے کہا "دیکھو یہ انگریزی محاورہ استعمال کیا ہے میں نے۔"

ٹام نے گاڑی ایک طرف روکی تو میں دروازہ کھول کے نیچے اتر گیا۔ سکون اور آزادی کی گہری لمبی سانس لے کر میں نے کہا۔ "پلیز! آپ دونوں پیچھے چلی جائیں۔"

جیمن اور امیا نے قدرے حیرانی اور ناگواری سے مجھے دیکھا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ ہمیں بہترین کمپنی فراہم کر رہی ہیں اور ہم یقیناً ان کی قربت سے بہت لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔

"جیمن! پلیز۔ کیا تم نے سنا نہیں؟" میں نے کہا۔

"آخر کیوں۔ یہاں......"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "جگہ تنگ ہے۔ ہم اس طرح لمبا سفر نہیں کر سکتے۔"

ٹام اور برٹ مسکرائے "تم انہیں گود میں بٹھا سکتے تھے۔"

میں نے کہا "تمہارا مشورہ نہیں مانگا ہے میں نے۔"

امیا نے برہمی سے کہا "تم خود چلے جاؤ پیچھے۔ عجب مرد ہو تم بھی۔"

برٹ نے... انتہائی تحقیر کے ساتھ کہا "یہ ہندوستانی کالے ہیں..."

میں نے اس کے بال پکڑ کے اس کا سر ڈیش بورڈ پر مارا۔ "دوبارہ کسی ایشیائی کے لئے اپنے باپ کا نام استعمال مت کرنا" میں نے کہا "سفید سور"

ٹام مجھے ایک گالی دے کر اترا اور میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر منجمد ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے برٹ بھی سر پکڑے سکتے کی حالت میں بیٹھا رہا۔ جیمن اور امیا ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ غالب دوسری طرف پوزیشن سنبھال چکا تھا اور دوسرا ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔

"یہ...... یہ کیا ہے؟" آخر کار ٹام نے ہمت کی۔

"یہ۔ اسے انگریزی میں ریوالور کہتے ہیں۔"

"خدا کے لئے۔ یہ کیسا مذاق ہے۔ اگر تم نے برا مانا ہے کسی بات کا تو میں معافی مانگ لیتا ہوں" ٹام نے کہا۔

برٹ نے کہا "ایسا نہ ہو گولی چل جائے۔"

برٹ چالاک آدمی ثابت ہوا۔ اس نے ایک دم میرے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا۔ مجھے قطعی امید نہ تھی کہ وہ جوڈو کراٹے کے داؤ بھی جانتا ہو گا۔ اس کی ضرب میری کلائی پر یوں پڑی کہ ریوالور خود بخود میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ میں نے بہت تاخیر سے اپنا ردعمل ظاہر کیا تھا چناں چہ ضرب سے تو نہ بچ سکا مگر پھر بھی میری کلائی نہیں ٹوٹی۔

ایک درجن فحش گالیوں کے ساتھ برٹ نے مجھ پر حملہ کیا۔ ٹام اسی وقت میرا ریوالور اٹھانے کے لئے لپکا تھا۔

غالب نے کہا "خبردار!"

مگر اس سے پہلے ہی میری لات نے ٹام کو الٹ دیا۔ پھر میں برٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے دوسرے وار کو میں نے جھکائی دے کر بچایا ورنہ اس کی کھڑی ہتھیلی میری گردن پر تھی۔ اس وار کو میں نے شانے پر جھیلا اور پھر جھک کر برٹ کے پیٹ پر لات مارنے کے لئے دائیں پیر کی ایڑی پر گھوم گیا۔

اب اس کو حیران ہونے کا موقع نہیں ملا۔ لات پیٹ پر پڑتے ہی وہ دوہرا ہوا تو میں نے گھٹنا اٹھا کے اس کی ٹھوڑی پر مارا اور پھر دونوں ہاتھوں کی مدد سے اس کو الٹ کے زمین پر دے مارا۔

"اتنا کافی ہے مسٹر برٹ" میں نے کہا "اندازہ تو کر لیا ہو گا تم نے کہ ریوالور ہاتھ میں نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھر کسی جگہ ہم فیصلہ کن مقابلہ کریں گے۔"

برٹ کپڑے جھاڑ کے کھڑا ہو گیا۔ اب میں ان سب کی نگاہوں کا مرکز بن گیا تھا۔ غالب نے مجھے میرا ریوالور پھر پکڑا دیا۔ گاڑی کے رکتے ہی گل اور نانو نے بھی سمجھ لیا ہو گا کہ اب کیا ہو گا لیکن میری ہدایات کے مطابق انہوں نے دخل در معقولات سے گریز کیا اور اپنی موجودگی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"چلیں آپ دونوں پیچھے" میں نے یوں کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو "جیمن! تم اچھی لڑکی ہو۔"

"مجھ میں کیا برائی ہے؟" امیا نے نیچے اتر کے تلخی سے کہا اور لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے گئی۔ جیمن بھی خوف زدہ تھی مگر میرے لہجے نے اسے کچھ تقویت عطا کی۔ وہ زبردستی مسکرائی اور سہارا کے امیا کے ساتھ ہو گئی۔

کاروان میں داخل ہونے کے چند سیکنڈ بعد میں نے ان کی چیخ سنی "کون... کون ہو تم؟" امیا نے کہا۔

پھر جیمن کے چلانے کی آواز آئی "یا میرے خدا۔"

ٹام نے کہا "کاروان میں کون ہے؟"

برٹ نے کہا "لڑکیوں کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی تو......"

"تو تم کیا کرو گے؟" میں نے کہا "خودکشی کر لو گے غیرت میں؟

مسٹر برٹ! کاروان میں ویسی ہی دو لڑکیاں ہیں۔"

"لڑکیاں......" انہوں نے ایک ساتھ کہا۔

"ہاں۔ ہمارے ساتھ تھیں۔" میں نے کہا۔

"تم نے ہم سے پوچھے بغیر' ہمیں بتائے بغیر......"

میں نے کہا "شٹ اپ۔ گاڑی چلاؤ۔ جیسی پہلے چلا رہے تھے۔ اور برٹ تم ابھی آگے بیٹھ جاؤ۔ جیسے کوئی بات نہیں ہوئی۔"

اس نے مجھے خون آشام نظروں سے گھورا۔ پھر اسٹیئرنگ وہیل کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ ٹام بھی ڈرائیور کی جگہ سنبھالنے کے لئے بڑھا۔

چند منٹ بعد ہم پھر اپنا سفر شروع کر چکے تھے۔

میں نے کہا "ٹام! اب میں تم کو بتاؤں گا کہ یہ سب کیوں ضروری تھا' جو ہم نے کیا۔ لیکن اس سے پہلے ایک بات بہت اچھی طرح سمجھ لو۔ میں تمہارے بالکل پیچھے ہوں' موت کے فرشتے کی طرح۔ غلطی میں نہیں کروں گا۔ مگر تمہاری غلطی کو معاف بھی نہیں کروں گا اور اس سے پہلے کہ تمہیں پتا چلے' تم مر چکے ہو گے۔ برٹ! یہ تم بھی سن رہے ہو نا؟ ریوالور کے فائر کی آواز کوئی نہیں سنے گا۔ لیکن گردن کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز بالکل صاف سنائی دے گی۔ اسے جو زندہ رہے گا۔"

ٹام اور برٹ کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ نظریں سڑک پر جمائے میری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ غور سے سن رہے تھے۔

"تم سب غیر ملکی ہو۔ فرنچ میں بھی جانتا ہوں لیکن ہمارے پاس پاسپورٹ صرف یہ ہے" میں نے ریوالور لہرایا "یا پھر یہ ہیئت۔ ہم کلکتہ تک تمہارے ساتھ جائیں گے۔ شاید آگے بھی۔ اور یہ سفر مسلسل ہو گا۔"

"خدا کے لئے مجھے ایک بات سمجھاؤ" ٹام نے کہا "جب تم غیر ملکی نہیں ہو۔ تم انڈین ہو۔ تو تمہیں پاسپورٹ کی کیا ضرورت ہے؟"

برٹ نے بھی سر ہلایا "تم کو کیا مجبوری ہے کہ ہمارے ساتھ ایسے سفر کرو؟ تم بس یا ٹرین سے یا ہوائی جہاز سے بھی سفر کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا "اگر مجبور نہ ہوتے بے وقوف آدمی' تو کیا ہم تمہیں پچاس ہزار دیتے؟ ہم واقعی ہوائی جہاز سے جاتے۔ ان عورتوں سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں جن کو ہم عورت کیا' طوائف بھی کہیں تو طوائف کے نام پر گالی ہے۔ ہمارے یہاں طوائف کتنی بھی آبرو باختہ کیوں نہ ہو' ایسی اخلاق سوز......"

"اب تم اپنا یہ فلسفۂ حیات رہنے دو" ٹام چڑ کے بولا۔

"ہاں۔ کام کی بات کرو" برٹ نے کہا "کیوں زبردستی ہمارے ساتھ جانا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "اس لئے کہ تم غیر ملکی ہو اور تمہیں یہاں کے قوانین سے تحفظ حاصل ہے یعنی DIPLOMATIC

www.paksociety.com

IMMUNITY تم کو پولیس ہاتھ نہیں ڈال سکتی جب تک کہ تم کسی سنگین نوعیت کے جرم میں براہ راست ملوث نہ ہو جاؤ اور اس کے لئے بھی تمہارے سفارت خانے کو مطلع کرنا ضروری ہوتا۔"

"یہ سب معلوم ہے ہمیں۔"

"تو ہم بھی تمہارے اس تحفظ کی ضمانت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ ہم پولیس کو مطلوب ہیں۔ بھارتی حکومت کو مطلوب ہیں۔"

حیرت سے ٹام اور برٹ کا منہ کھلا رہ گیا "کیا... ایسا کیا جرم کیا ہے تم نے؟"

میں نے کہا "ہم اس کی تفصیل میں نہیں جائیں گے۔ خطرہ یہ تھا کہ ہم بھیس بدل کر بھی باہر جاتے تو کہیں نہ کہیں پکڑے جاتے۔"

"تو... یہ پولیس..."

"ہاں۔ وہ ہمارے ہی استقبال کے لئے مستعد تھے۔ تمہیں دیکھ کر انہوں نے گاڑی کو روکا نہیں اور تلاشی نہیں لی۔ آگے بھی ایسا ہی ہوگا۔"

"کہاں تک؟"

"شاید۔ اس سے بھی آگے" میں نے کہا۔

"مگر ہم آگے نہیں جا رہے ہیں۔" ٹام بولا۔

"تم آگے جا رہے ہو۔ ڈھاکا تک ہمارے ساتھ" میں نے اسے یقین دلایا۔

"ہر جگہ ایسا نہیں ہوگا۔ کہ پولیس خود راستے سے ہٹ جائے" ٹام بولا۔

"اس لئے میں تم کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ تمہیں چیکنگ اور تلاشی کی صورت میں کیا کرنا ہوگا" میں نے کہا "بات میں کروں گا کیوں کہ میں فرنچ اور انگلش جانتا ہوں۔ ان کی جرح کا جواب دے سکتا ہوں۔"

"تمہارا ساتھی وہ ہندوستانی ہے؟"

"وہ خاموش رہے گا۔ یا سامنے ہی نہیں آئے گا۔ میں یہ بتاؤں گا کہ تم ٹورسٹ ہو۔ کہاں کہاں سے گھومتے پھرتے آ رہے ہو۔ میں تمہارا دوست اور گائیڈ ہوں۔ بنگ ہندوستان میں تمہاری میزبانی کر رہا ہوں۔ کیوں کہ میں تمہاری ترجمانی کر سکتا ہوں۔ اور میں بہت مشہور، بہت دولت مند آدمی ہوں۔ تم سب اپنے اپنے پاسپورٹ دکھا سکتے ہو کہ ہم دو مرد ہیں اور ہمارے ساتھ دو ہم سفر عورتیں..."

"مگر عورتیں چار ہیں!"

"کوئی ایسی ویسی صورت حال سامنے آئی تو دیکھنے والوں کو دو ہی نظر آئیں گی" میں نے مسکرا کے کہا "چار پاسپورٹ ان کو قائل کرنے کے لئے کافی ہوں گے۔"

"میں سمجھا نہیں باقی دو کہاں رہیں...؟"

"وہ چھپ جائیں گی۔ سامان کے نیچے یا برتنوں کے پیچھے۔

اس کاروان میں بہت جگہ ہے۔ پولیس اندر جھانک سکتی ہے اندر داخل ہو کے تلاشی نہیں لے سکتی۔ ممکن ہے میرا یہ دوست بھی ڈکی میں غائب ہو جائے" میں نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے معلوم نہیں میں اتنا جھوٹ بول سکتا ہوں یا نہیں۔ اس میں بہت خطرہ ہے" ٹام بڑبڑایا۔

"جھوٹ میں بولوں گا" تم صرف تائید کرو گے۔ اور معاملہ صرف میری شناخت کا رہ جائے گا تو چار غیر ملکی سیاحوں کی گواہی کافی ہوگی۔"

"مگر میں یہ سب کچھ کیوں کروں؟"

"اس لئے کہ تم نے پچاس ہزار روپے لئے ہیں" میں نے کہا۔

"وہ اس کام کے نہیں تھے۔"

"پھر تم سوچ لو۔ تم کو صرف سہولت کے اور میرے بیانات کی تائید کے عوض اتنی بڑی رقم مل رہی ہے۔ کیا تم اس سے محروم ہونا پسند کرو گے؟ میرے لئے وہ سب واپس لینا مشکل نہیں ہے۔"

"مجھے سوچنا پڑے گا" ٹام نے کہا۔

"میرے لئے تو یہ بھی مشکل نہیں" میں نے اپنی بات جاری رکھی "ہم تم سے سب کچھ چھین لیں۔ تمہیں شوٹ کر کے تمہاری لاشیں کہیں بھی دبائی جا سکتی ہیں۔ اور تمہارے پاسپورٹ ہم استعمال کر سکتے ہیں۔ اس رقم سے ہم جعل سازوں کی خدمات حاصل کر لیں گے جو کسی بھی پاسپورٹ پر کسی بھی شخص کی تصویر لگانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ فوٹو سٹنگ یونٹ ہوتے ہیں ان کے پاس۔"

برٹ نے وحشت زدہ ہو کے ٹام کی طرف دیکھا "یہ ایسا کر سکتے ہیں ٹام۔ ان کے پاس مہلک ہتھیار ہیں۔"

میں نے کہا "اور ہم قتل نہ کریں، تمہیں ایسے ہی ناک آؤٹ کر کے سامان میں ڈال دیں تب بھی کام چل جائے گا۔ کسی غیر ملکی سیاح کا قتل بہت سنگین مسئلہ بن جاتا ہے۔ چار افراد کا قتل ہوا تو قیامت آ جائے گی۔ مگر قیامت تم سب کی لاشیں دریافت ہونے سے پہلے نہیں آئے گی۔ اور لاشوں کے دریافت ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ نہ ہونے کے برابر۔ ہم لاشوں کو ٹھکانے لگاتے رہے ہیں بڑی کامیابی سے۔"

"آخر... تم کون لوگ ہو؟ تم مجھے صورت سے چور ڈاکو یا سزا یافتہ مجرم نہیں لگتے... تم پڑھے لکھے ہو۔ فرنچ اور انگلش بولنے والے ہو۔ یورپ تک دیکھ چکے ہو اور تمہارے پاس پیسہ بھی بہت ہے" ٹام بولا۔

میں نے کہا "اندازے مت لگاؤ۔ ہم ہیں انا قوانین قسم کے دہشت گرد ہیں۔ کسی بھی گوریلا تنظیم یا حکومت کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ معاوضہ منہ مانگا ملے۔ اور ہماری کامیابی کا راز یہی ہے کہ ہم ایسے نظر نہیں آتے۔ کہیں نمایاں نہیں ہوتے بلکہ عام آدمی دکھائی دیتے ہیں۔"

"آل رائٹ۔ تم نے ہمارے لئے انکار یا انتخاب کی گنجائش تو کچھ نہیں چھوڑی۔ ہم اس کرنے پر مجبور ہیں۔" برٹ نے کہا "مگر تم بہت بڑا رسک لے رہے ہو۔"

"ہم رسک کے بغیر ایک منٹ نہیں رہ سکتے۔"

"فرض کرو ہم جھوٹا وعدہ کر لیں اور عین وقت پر پولیس کی پناہ میں چلے جائیں" ٹام نے کہا۔

"پولیس تمہیں نہیں بچا سکتی۔ وہ جہاں بھی ملیں گے تعداد میں تین ہوں گے؟ چار، چھ یا آٹھ دس۔"

"اور وہ بھی مسلح ہوں گے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہیں مہلت ہی کہاں ملے گی اپنا اسلحہ استعمال کرنے کی" میں نے کہا "وہ صرف ہمیں محصور کریں گے تو پیچھے سے مشین گن کا ایک برسٹ سب کو لٹا دے گا یا ایک دستی بم..."

"مشین گن... دستی بم..." برٹ بوکھلا گیا۔

"اور کیا۔ وحشت کرو صرف یہ کھلونے لئے پھرتے ہیں؟"

میں نے اپنا ریوالور دکھا کے کہا "اصل دھوکا تو وہ عورتیں دیتی ہیں جو بہت بے ضرر اور معصوم نظر آتی ہیں مگر وہ انتہائی خطرناک اور پیشہ ور قسم کی قاتل ہیں۔ تم دیکھو گے انہیں تو حیران رہ جاؤ گے۔ سب سامان انہی کے پاس ہے۔ ہم اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے تھے اس لئے ہم نے رات کے وقت تمہارے کاروان میں چھپایا تھا۔ اگر تم نے پولیس یا ملٹری سے بھی مدد مانگی تو پھر ہم جان پر کھیل جائیں گے۔ ہم زندہ کسی کے ہاتھ آنا قبول نہیں کرتے۔ تم سب سے پہلے مارے جاؤ گے۔ باقی تمہارے بعد ہلاک ہوں گے۔ اگر ہم میں سے بھی کوئی ہلاک ہوا تو اس کی قسمت۔ اس کی پروا ہم نہیں کرتے گزشتہ پانچ۔ نہیں ساڑھے چھ سالوں میں ہمارے گروپ کے صرف دو افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ تم سے کم دو درجن مقابلوں میں۔ اور ہمارے مقابلے میں جو مارے گئے وہ کسی طرح بھی سو سے کم نہیں ہوں گے" میں نے غالب سے مخاطب ہو کے کہا "ان کی تو ہوا خراب ہو رہی ہے۔ ذرا تم وہ انگلینڈ انڈیا کے پنجرہ کا لفظ استعمال کرنا۔ میں نے کہا ہے کہ ہم سو افراد کو ہلاک کر چکے ہیں۔ تمہارا اصرار ہے کہ تعداد دو سو سے کم نہیں۔"

برٹ نے اشارہ دیکھ لیا تھا اور وہ دم بخود بیٹھا تھا۔

"میرے دوست کا خیال ہے کہ میں نے تعداد کم بتائی تھی اور ہمارے مقابلے میں دو سو کے قریب دشمن ہلاک ہوئے" میں نے کہا۔

"کیا واقعی وہ تمہارے دشمن تھے؟" ٹام نے طنز سے کہا "تم تو کرائے کے قاتل ہو۔"

"دشمنی کا تعلق جذبات سے رہتا ہے" میں نے فلسفیانہ استدلال اختیار کر لیا "یہ ممکن ہے کہ تم اپنے باپ کے قاتل کو بھی معاف کر... اور تمہارے جذبات بدل جائیں۔ لیکن اس کے

برعکس تم لوگ میرے لئے اجنبی ہو۔ تم نے میرا کہنا مانا تو میرے دل میں تمہارے خلاف جو جذبات پیدا ہوں گے وہ دشمنی کے خیال پر مبنی ہوں گے۔ ظاہر ہے آپ کسی کو دوست سمجھتے ہوئے ہلاک نہیں کر سکتے۔"

"کیا یہ سارا فلسفہ اور مسئلہ عورتوں کو بھی سمجھانا ضروری نہیں ہوگا؟" ٹام نے کہا۔

برٹ نے کہا "جین اور ماریا سمجھدار ہیں۔"

ٹام نے برا سا منہ بنایا "سمجھدار! ہر عورت ہسٹریا میں مبتلا ہو کے مصیبت پیدا کر دیتی ہے۔ عقل ہونے کے باوجود وہ عقل کے استعمال پر اختیار سے محروم ہو جاتی ہے۔"

میں نے کہا "آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ ان کو یہ سب سمجھا دیا گیا ہوگا۔ سمجھانے والی بھی عورتیں ہیں اور سمجھنے والی بھی۔ چناں چہ اب تک تمام معاملات پر اتفاق رائے ہو گیا ہوگا۔"

"اگر تم مطمئن ہو تو مجھے کیا" ٹام نے کہا۔

"تم کو مزید کوئی سوال کرنا ہے تو کر سکتے ہو" میں نے کہا۔

"کیا ہم کھانے پینے اور سونے کے معاملے میں اپنی مرضی کے مالک ہوں گے یا اس کے لئے بھی تم اپنا آرڈر جاری کرو گے؟" ٹام بولا۔

میں نے غور کرتے ہوئے کہا "سوال کے تین حصے ہیں۔ کھانا ہم اور تم ایک ساتھ کھائیں گے۔ جو ہم کھائیں گے وہ تم کھاؤ گے۔ پینے کا معاملہ مختلف ہے۔ ہم چائے کافی سے آگے نہیں

www.paksociety.com

جا سکتے ہیں۔"

"کیا تم مسلمان ہو؟" برٹ بولا "وہ شراب نہیں پیتے۔"

"دنیا کے بیشتر لوگ شراب نہیں پیتے۔ انڈیا میں بھی شراب کی مخالفت ہے۔ پھر بھی میں یہ بتاتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں" میں نے کہا "ہمارے مذہب میں شراب کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ مت پوچھنا کہ کیوں۔ کوئی میرے مذہبی عقیدے پر منفی جرح کرے تو میں اس کے دانت توڑ کر ہتھیلی پر رکھ دیتا ہوں۔ بہر حال تم کو اعتدال میں رہتے ہوئے پینے کی اجازت ہوگی۔"

"اعتدال کی حد کیا ہوتی ہے؟"

"جب تک شراب پی کر تم انسان رہتے ہو' حیوان نہیں بنتے اور عقل و ہوش سے محروم نہیں ہوتے۔ یہ خود تمہیں بھی اندازہ ہوگا کہ کون کتنی قوت برداشت رکھتا ہے" میں نے کہا "اب تمہارے سوال کا تیسرا حصہ۔ سونے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ تم جب چاہو سو سکتے ہو۔ اکیلے' الگ الگ اور اسی لباس میں۔"

"اس لباس میں! یہ سفری لباس ہے۔ اس میں تو مجھے نیند ہی نہیں آئے گی" ٹام نے احتجاج کیا۔

"تو مت سوؤ" میں نے مختصراً کہا "ویسے میرا خیال ہے کہ نیند تختہ دار پر بھی آجاتی ہے۔ دیگر مسائل نفسیاتی ہیں۔ جسم آخر کار خود سو جاتا ہے۔"

برٹ بولا "تم کمانڈر یا دہشت گرد سے زیادہ فلاسفر ہو۔"

"ہم بظاہر عام لوگ ہیں مگر عام لوگوں سے بہت مختلف ہیں" میں نے کہا "اوسط ذہانت اور ہمت رکھنے والا ہمارے برابر نہیں آ سکتا۔ تم اگر چاہو تو اس سفر کو پہلے کی طرح تفریحی سمجھ سکتے ہو اور انجوائے کر سکتے ہو۔ اگر تم یہ فرض کر لو کہ ہم صرف تمہارے نئے ساتھی ہیں۔ مگر اس کے برعکس تم ذہنی کشیدگی' اعصابی اور جسمانی دباؤ میں رہے تو تمہارے لئے واقعی سفر تکلیف دہ ہوگا۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ ٹیک اٹ ایزی۔ ہم بلاوجہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ معاوضہ ہم پہلے ہی ادا کر چکے ہیں۔ شکر گزار بعد میں ہوں گے۔"

برٹ مسکرایا اور اس نے ہاتھ آگے بڑھا کے مجھ سے مصافحہ کیا۔ "اب ہم دوست ہیں۔ جو ہوگی بھگت لیں گے ایک ساتھ" پھر اس نے غالب سے بھی ہاتھ ملایا۔ کشیدگی کو مزید کم کرنے کے لئے میں نے بھی ریوالور جیب میں رکھ لیا اور غالب نے بھی۔ اس کے بعد برٹ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔

ٹام نے کہا "مجھے ایک ڈرنک کی ضرورت ہے تاکہ میں بھی کچھ پرسکون ہو جاؤں اور تم سے ہاتھ ملا سکوں۔"

میں نے کہا "اگر ڈرنک تمہارے پاس ہے تو شوق پورا کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"بوتلیں وغیرہ پیچھے کاروان میں ہیں" ٹام نے کہا۔

"پھر تھوڑا سا انتظار کرلو۔ ہم کو پروگرام کے مطابق تقریباً دو گھنٹے بعد رکنا ہوگا" میں نے کہا۔

سفر کا پہلا مرحلہ بخیر و عافیت طے ہوا۔ دو گھنٹے بعد ہم نے سڑک کے کنارے ایک مختصر قطعۂ زمین پر پڑاؤ کیا۔ ایک گھنٹے کے اس وقفے میں غالب نے گل اور نازو کو وہ سب بتا دیا جو ہمارے درمیان طے پایا تھا۔ انہوں نے کاروان کے مختصر کچن میں گیس کا چولہا جلا کے کافی بنائی اور غالب کو جینی اور ماریا کے بارے میں اپنے تاثرات سے آگاہ کیا۔ ظاہر ہے یہ تاثر خوشگوار نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے درمیان بات چیت بھی اشاروں کی زبان تک محدود رہی تھی۔ تاہم جینی اور ماریا نے عدم تعاون کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ گل اور نازو کے ہاتھوں میں ریوالور دیکھ کر جتنی دہشت زدہ ہوئی تھیں' اس سے زیادہ حیران۔ یہ سب مجھے غالب نے بعد میں بتایا۔

میں ان چاروں کے ساتھ رہا۔ ان سب نے ایک ہی بوتل سے منہ لگا کے پی اور مجھے بھی پیش کی مگر میں نے انکار میں سر ہلا کے سگریٹ جلالی۔

جینی کا رویہ بھی اب معاندانہ نہیں رہا تھا۔ اس نے جھنجلاہٹ سے کہا "کیا تم اسی طرح ہمارے سر پر سوار رہو گے؟"

میں نے کہا "خاتون! آپ کا سر بہت خوب صورت ہے مگر سواری کے لئے نہیں ہے۔"

برٹ ہنس پڑا "اس کا مطلب تھا...."

"مطلب میں سمجھ گیا ہوں مسٹر برٹ" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں۔"

"پھر تم کچھ دیر کے لئے ہمیں تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟" ٹام بگڑ کے بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں پھر کہتا ہوں کہ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتا کہ تم لوگ بلاوجہ ہمارے خلاف جذباتی ہو کے کوئی سازش کرو۔"

"ہم صرف تھوڑی دیر کھلی فضا میں ٹہلنا چاہتے ہیں" برٹ نے کہا "ہم فرار نہیں ہو سکتے۔"

"ہاں۔ تم فرار نہیں ہو سکتے" میں نے اس سے اتفاق کیا "مگر ٹہلتے ہوئے میں تمہارے ساتھ رہوں تو کیا حرج ہے؟ میں تمہاری گفتگو سنوں گا مگر دخل اندازی نہیں کروں گا۔ ہاں تم نے جنگل کی خلوت میں روانہ ہونے کی کوشش کی تو میں ضرور ٹانگ اڑاؤں گا۔"

وہ چاروں جنگل میں ادھر سے ادھر گھومتے رہے اور ایک دوسرے کو پریشانی کا ذمے دار قرار دیتے رہے۔ مردوں نے عورتوں کو بتا دیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ گل اور نازو نے انہیں کچھ نہیں سمجھایا تھا۔ مسئلہ وہی تھا کہ دونوں فریق الگ الگ زبان بولتے تھے۔

تیس منٹ بعد غالب دو کافی کے مگ لئے نمودار ہوا۔ اس نے

ایک مگ مجھے تھما دیا۔ اس کے پیچھے گل اور نازو کاروان سے اتریں تو ٹام اور برٹ کے قدم رک گئے۔ ان کے نزدیک آنے تک وہ حیرت میں ڈوبے رہے۔

"یہ... تمہارے ساتھی ہیں؟" ٹام نے کہا "یہ تو بہت خوب صورت ہیں۔"

میں نے کہا "میں اسے کیا سمجھوں؟ نظریاتی اعتراف حقیقت۔ کیا خوب صورت لڑکی خطرناک نہیں ہوتی؟"

"ہوتی ہے مگر دوسری طرح" ٹام بولا۔

"تمہارا مطلب ہے دہشت گرد نہیں ہو سکتی؟"

"فلموں میں ہو سکتی ہے" ٹام بولا۔

میں نے کہا "تمہاری زندگی کا یہ تجربہ کسی ایڈونچر فلم سے کم تو نہیں۔ خیر اب تمہارے پہرے دار بدل رہے ہیں۔ میں اپنے دوست سے کچھ مشورہ کروں گا۔ یہ لڑکیاں تمہارے ساتھ رہیں گی۔"

برٹ نے کہا "کیا ہم ان کے ساتھ جنگل میں آگے تک جا سکتے ہیں؟"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا مگر عمداً انجان بن گیا "ضرور جاؤ مگر دیر مت کرنا" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

جب وہ کچھ دور نکل گئے تو غالب نے کہا "وہ سور کا بچہ ٹام اپنے ساتھی کو آنکھ مار رہا تھا۔"

"میں نے دیکھ لیا تھا۔ لیکن اچھا ہے' گل اور نازو کے بارے میں ان کی غلط فہمی رفع ہو جائے۔ میں بتاتا تو وہ مزہ نہ آتا جو تجربے کے بعد آئے گا" میں نے کہا۔

میں اور غالب اطمینان سے ٹہلتے رہے۔ سڑک پر سے گزرنے والی بسوں اور دوسری گاڑیوں کے مسافر ہماری گاڑی اور اس کے پیچھے بندھے ہوئے کاروان کو تو دیکھ سکتے تھے مگر ہم ان کی نظر سے اوجھل تھے۔ اس علاقے میں ملے جلے درخت تھے۔ کچھ بلند قامت کچھ پست قد۔ درمیان میں جھاڑیاں بھی اگی ہوئی تھیں اور خودرو پودوں کی بہتات اس علاقے میں بارش کی فراوانی کو ظاہر کرتی تھی۔ اس وقت بھی بادل چھائے ہوئے تھے اور آثار بارش کے تھے۔ آگے گہرے سیاہ بادلوں میں بجلی چمک رہی تھی اور دوپہر کے وقت بھی جنگل میں غروب آفتاب کے بعد کا سماں تھا۔

میں اور غالب پورے پلان پر نظر ثانی کر چکے تھے' تمام امکانات کا جائزہ لے چکے تھے اور اس صورت حالات سے پوری طرح مطمئن تھے۔ "شام تک سفر بلا روک ٹوک جاری رہا تو ہم خطرات سے خاصے محفوظ ہو جائیں گے" میں نے کہا۔

غالب کی نظر جنگل کی طرف تھی "یہ لوگ کتنی دور چلے گئے ہیں؟ کسی کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔"

"سنائی دے گی" میں نے غالب کو تسلی دی "ٹام یقیناً زیادہ خباثت پسند ہے۔ امید ہے اسی کی فریاد پہنچے گی ہمارے کانوں تک۔"

"بھائی صاحب! اگر ان کے پاس ریوالور ہوتے پھر! ہم نے کون سی تلاشی لی تھی۔"

میں نے کہا "تلاشی لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی ورنہ ضرور لیتا۔ تم نے ان کی صورت دیکھی تھی اس وقت جب میں نے ریوالور نکالا تھا؟ جس کے پاس ریوالور ہو اس کی حالت اتنی غیر نہیں...."

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی ٹام کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ فرنچ میں شور مچا رہا تھا "ہائے۔ میری ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ اف۔ میری پسلیاں۔ برٹ! سور کے بچے۔ اس شیطان کو منع کرو کسی طرح...." اس نے ایک چیخ ماری "یہ میری بات ہی نہیں سمجھتی۔ اسے سمجھاؤ۔ میں معافی مانگتا ہوں۔"

غالب نے ہنس کے کہا "الو کا پٹھا۔"

میں نے کہا "تھیوری اور پریکٹیکل میں یہی فرق ہوتا ہے۔ اب ان میں سے کوئی گل کے ساتھ بھی غیر محتاط رویہ اختیار نہیں کرے گا۔" چند منٹ کے بعد ٹام لنگڑاتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ برٹ تھا جو اسے سہارا دے کر لا رہا تھا۔ ٹام گالیاں بک رہا تھا مگر مجھے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ نازو اور گل ان کے پیچھے بڑے سکون سے چلتی آ رہی تھیں اور آپس میں یوں باتیں کر رہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

میں نے بھی بہتر سمجھا کہ کسی سے کوئی سوال نہ کیا جائے۔ اندازہ مجھے پہلے ہی ہو گیا تھا کہ ٹام کا یہ حشر اس کی غلط فہمی کے باعث ہوا تھا۔ اس نے نازو کو ایک نازک لڑکی سمجھ کے خود کو قوی مرد ثابت کرنے کی کوشش کی ہوگی۔

"چلو بھئی' واپس اپنی اپنی جگہ" میں نے کہا "ہمیں بارش شروع ہونے سے پہلے روانہ ہو جانا چاہئے۔"

برٹ نے کہا "وہ...... آئی ایم سوری۔ ٹام نے...."

میں نے کہا "کچھ زیادہ پی لی ہوگی۔ کوئی بات نہیں۔ اس کا نشہ اتر گیا ہے۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔ اب تمہاری باری تو نہیں مگر ڈرائیونگ تمہیں کرنی پڑے گی۔"

ہم گاڑی کے قریب پہنچے ہی تھے کہ میری نظر پیچھے سے آنے والی جیپ پر گئی۔ گل اور نازو اس وقت تک کاروان میں غائب ہو گئی تھیں۔ میں نے غالب کو خبردار کیا "تم فوراً چھپ جاؤ مرزا۔ یہ پولیس ہے" میں نے کہا "ٹام! ہوشیار رہو اور برٹ! تمہیں یاد ہے میں نے کیا سمجھایا تھا؟ ہم اب فرار بھی نہیں ہو سکتے۔"

جیپ ہمارے قریب آ کے رک گئی۔ اس میں سے چھ مسلح پولیس والے کود کر اترے اور انہوں نے ہمارے چاروں طرف پوزیشن سنبھال لی۔ پھر ایک گٹھری سی باہر گرا دی۔ گٹھری پر خون کے سرخ دھبے تھے۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ یہ راسن تھا۔

ایک پولیس مین نے ٹھوکر مار کے راسن کو پیروں پر کھڑا کر دیا۔ لیکن وہ کھڑا رہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ پھر گر گیا۔

www.paksociety.com

برٹ نے ہراساں ہو کے میری طرف دیکھا اور پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

ٹام کی نظروں میں تشویش تھی "اس لڑکے کو کیوں مار ڈالا ہے انہوں نے؟ اور ہمیں کیوں گھیر لیا ہے....؟"

میں نے کہا "مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ تمہاری طرح میں بھی کچھ نہیں جانتا۔"

پولیس والے نے پھر رامن کو ٹھوکر ماری "اٹھ.... کنجری کی اولاد۔ نہیں تو...." اس نے گالیوں کی گردان کرتے ہوئے کہا مگر اس کا رامن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ تھوڑا سا تڑپا اور ساکت ہو گیا۔

پولیس والوں کی ٹیم کا کپتان ایک پھول والا اے ایس آئی تھا۔ اس کی صورت پر پولیس کی طویل نوکری کے سارے نحس اثرات عیاں تھے۔ شاید وہ کانسٹیبل بھرتی ہوا ہو گا تو اٹھارہ بیس سال کا آٹھ جماعت پاس لڑکا ہو گا۔ اب اس کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔ تیس سال یا اس سے زیادہ دورِ ملازمت میں وہ ترقی کی صرف اتنی ہی منزلیں طے کر پایا تھا کہ ریٹائر ہو تو خود کو سابق افسر کہہ کر تسکین حاصل کرتا رہے۔ وہ بھدے، بے ڈول جسم کا مالک تھا۔ جاہل، کاہل اور غبی نظر آتا تھا اور روایتی طور پر بدنام پولیس والوں کی طرح موٹے پیٹ والا تھا۔

اس نے اشارے سے اپنے ماتحت کو روک دیا "ابھی اس کو تھوڑی دیر صبر کرنے دو۔ ضرورت پڑے گی تو اس کی لاش کو بھی جلادی کے لئے کھڑا کر دیں گے۔"

میں نے غصے میں کہا "آخر یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ۔ اور کس اختیار کے تحت؟ کس کی اجازت سے؟ کیوں محصور کیا ہے تم نے ہمیں۔ اس طرح مسلح ہو کے؟ جیسے ہم ٹورسٹ نہیں جیل سے بھاگے ہوئے مجرم ہیں۔ تم کو....."

انسپکٹر نے میرے منہ پر تھپڑ مارنے کی کوشش کی "بکواس مت کر۔ اپنی بھاشا بول۔"

میں نے اس کی کلائی پکڑ لی "میں قانون کا احترام کرتا ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں۔"

وہ میری سخت گرفت میں چلانے لگا "چھوڑ مجھے نہیں تو....."

میں نے اسے ایک سخت جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ ٹام اور برٹ بھی اب میرے ساتھ احتجاج میں شامل ہو گئے تھے اور ہم تینوں کی فریاد اس کے سر پر سے گزرتی جا رہی تھی۔

میں نے چیخ کر کہا "کھولو ہمیں۔ کتوں سے کہ گولیاں چلائیں اگر ہمت ہے۔ ہم غیر ملکی ہیں اور اگر ہمارے ساتھ کسی قسم کی زیادتی ہوئی تو ہم سفارت خانے کے ذریعے اپنی حکومت کو مطلع کریں گے۔"

"تم ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے ہمیں" ٹام نے بھی چیخ کر کہا۔

برٹ نے اے ایس آئی کے بالکل سامنے جا کے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "ہمیں سفارتی تحفظ حاصل ہے سمجھے؟"

تھانے دار سمجھا تو خاک نہیں مگر بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ برٹ کے چھ فٹ سے نکلتے قد کے مقابل ساڑھے پانچ فٹ کے تھانے دار کو سر اٹھا کے دیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ کچھ کنفیوز نظر آنے لگا تھا۔

اس نے انگریزی میں کہا "تم انگریزی نہیں سمجھتے مگر تمہارے ساتھ کچھ مفرور مجرم ہیں...."

"کیا کہتا ہے؟" ٹام نے کہا۔

میں نے لاعلمی کے اظہار میں منہ بنا کے کندھے اچکائے اور غالب کی طرف متوجہ ہوا "تم بات کرو اس سے راجہ صاحب۔"

برٹ نے اتنی دیر میں اپنا پاسپورٹ نکال لیا تھا اور اسے تھانے دار کی آنکھوں کے سامنے لہرا دیا تھا "یہ دیکھ سکتے ہو تم؟"

ٹام نے اس کی تقلید کی اور اپنا پاسپورٹ برٹ کو تھما دیا "یہ بھی دیکھو۔ اور دیکھو گے؟"

وہ پیچھے کاروان تک گیا اور اپنے ساتھ دونوں خواتین کو لے آیا۔ انہوں نے بھی پاسپورٹ ہلا کے غصے میں چیخنا چلانا شروع کیا تو تھانیدار کچھ پریشان سا ہو گیا۔

"کیا مصیبت ہے یہ؟" اس نے اپنے ساتھی اور نائب حوالدار سے کہا "یہ تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ سارے ہی انگریز ہیں۔"

حوالدار نے کہا "وہ جو پیچھے ہے، وہ مشکوک لگتا ہے۔"

تھانے دار نے غالب کو اشارہ کیا "تم آگے آؤ۔"

غالب نے آگے بڑھ کے کہا "ہم سے ادب کے ساتھ بات کرو سمجھے۔ شرافت سے۔ ہم راجہ جے سنگھ ہیں۔ پنجاب کے شکشا منتری کے پریوار سے سمبندھ ہے ہمارا۔"

"کیا سمبندھ ہے؟" تھانے دار ایک دم چوکنا ہو گیا۔

"وہ سمدھی ہیں ہمارے چاچا کے۔ آگے جا رہے ہیں وہ بھی" غالب نے راجے مہاراجوں کی طرح رعب اور دبدبے سے کہا۔

"خود... شکشا منتری؟"

"ہاں خود شکشا منتری۔ بڑے تاؤ۔ اور یہ انہی کے مہمان ہیں سارے" غالب نے اسی شان سے کہا۔

تھانے دار متاثر ہو گیا تھا مگر اس کا نائب بہت کائیاں تھا۔ اس نے کہا "راجہ صاحب! پھر اتنی دیر سے آپ خاموش کیوں تھے؟ آپ کو معلوم تھا کہ یہ ہندوستانی نہیں سمجھتے اور ہم ان کی زبان نہیں سمجھتے۔ اس کے باوجود آپ چپ کھڑے سنتے رہے۔"

غالب نے بے نیازی سے کہا "جب تک کوئی ہم سے بات نہ کرے ہم بھی دخل نہیں دیتے۔"

غالب کے جواب نے اسے مطمئن نہیں کیا "اپنے مہمانوں کی مدد کرنا تو آپ کا ہی کام ہے۔ یہ کسی مشکل میں [illegible] سمجھنے کی وجہ سے تب بھی آپ نہیں بولیں گے [illegible]"

"کیا بات بڑھ بھی سکتی تھی۔ ہم گرفتار کر لیتے تو نہیں...."

غالب نے تھانے دار سے کہا "تمہارا یہ سپاہی بہت زیادہ بے وقوف ہے یا ضرورت سے زیادہ سیانا؟ اسے بتاؤ۔ کیا تم ہمیں گرفتار کرنے کی غلطی کرو گے؟ اس کا اختیار ہے تمہارے پاس۔ آخر ہم شکشا منتری کے....."

"راجہ صاحب! آپ خود تو شکشا منتری نہیں ہیں" حوالدار نے اس کی بات کاٹ دی "اور ہمیں تو پنجاب کے چیف منسٹر کا نام بھی نہیں معلوم۔"

اب تھانے دار کی ہمت بڑھی "یہ بالکل ٹھیک کہتا ہے راجہ صاحب! ہم تو بس اپنے صوبے کی بات جانتے ہیں۔ شکشا منتری کا نہیں پتا۔ ہم تو اپنے چیف منسٹر اور وزیر کو پہچانتے ہیں۔ جب وہ آتے ہیں تو ہمیں پہلے سے معلوم ہوتا ہے۔ اور کوئی ایسے کچھ بھی کہہ دے۔"

"کیا مطلب؟" غالب نے گرج کے کہا "تم کو نظر نہیں آتے یہ غیر ملکی۔ ان کے پاسپورٹ دیکھو۔ چیک کرو۔ یہ عورتیں مفرور مجرم ہیں؟ یا یہ خود..... کیا ہم مجرم لگتے ہیں تمہیں؟"

"آپ.... تو نہیں" تھانے دار نے بڑی مشکل سے کہا "مگر دیکھیں، ہمیں یہی معلوم ہوا تھا۔"

"کیا معلوم ہوا تھا؟"

"یہی کہ ان غیر ملکیوں کے ساتھ کچھ مجرم نکل بھاگے ہیں۔ چار دہشت گرد ہیں۔ دو مرد اور ان کے ساتھ دو عورتیں۔"

"چار مجرم۔ ہم چھ آدمی تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔ ان میں پانچ غیر ملکی ہیں۔ چار مجرم ملا کے نو آدمی تو ہونے ہیں یا نہیں تھانے دار" غالب نے کہا۔

تھانے دار نے امداد طلب نگاہوں سے اپنے ماتحت کی طرف دیکھا۔ اس کے لئے حساب کا یہ سادہ سوال بھی مشکل بن گیا تھا۔

حوالدار نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے راجہ صاحب۔ مگر وہ اندر بھی تو ہو سکتے ہیں۔ کیا ہم دیکھ لیں؟"

"کیا؟ تلاشی لو گے؟" غالب نے غصے میں لال پیلا ہو کے کہا "وارنٹ لائے ہو؟ میرے مہمانوں کو بے عزت کرو گے میرے سامنے۔ مجھے بے عزت کرو گے ان کے سامنے؟"

"یہ بے عزتی کی بات نہیں راجہ صاحب" حوالدار میری توقع سے زیادہ سمجھدار اور خطرناک ثابت ہو رہا تھا "آپ جیسے بڑے لوگوں کو تو قانون کی مدد کرنی چاہئے۔ ہماری کیا مجال کہ بلاوجہ آپ جیسے معزز لوگوں کا راستہ روکیں مگر ہمیں معلوم ہوا تھا....."

"کیا معلوم ہوا تھا۔ یہ کہ ہم مجرموں کی مدد کر رہے ہیں؟" غالب جز بز ہو کے بولا "میرا خیال ہے کہ تمہیں تو معاف نہیں کرنا چاہئے۔ میں کل ہی رپورٹ کروں گا صوبے کے ہوم سیکریٹری کو۔ ہوم منسٹر کو۔ ان کو اچھی طرح معلوم ہے میرا نام۔ جو بھی ٹائمز آف انڈیا پڑھتا ہے وہ راجہ جے سنگھ کا نام جانتا ہے۔"

تھانے دار کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں "وہ سر.... میں آپ سے معافی مانگتا ہوں.... دراصل ہمیں جو اطلاع کی تھی....."

"کیسے ملی تھی؟ کس سے ملی تھی؟ کس نے نام لیا تھا ہمارا؟"

"نام نہیں لیا تھا سر" حوالدار بولا۔

"تم چپ کرو" تھانیدار نے اسے ڈانٹ کر کہا "جب افسر بات کر رہے ہوں تو ماتحت کو بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ بات یہ ہے سر! اس لڑکے نے بتایا تھا کہ چاروں اشتہاری مجرم ریسٹ ہاؤس سے غیر ملکیوں کے ساتھ نکل گئے ہیں۔"

"اس نے... اس لاش نے؟" غالب نے حقارت اور نفرت سے کہا "تم نے اس کا جو حشر کیا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ایسے تو کسی سے کچھ بھی کہلوایا اور منوایا جا سکتا ہے۔ اگر کبھی آزمانا ہے تو ہمارے علاقے میں آ کے دیکھو۔ ہم بھی بہت کچھ معلوم کر لیں گے۔ ان تمام چوریوں کا اعتراف کرا لیں گے تم سے جو گزشتہ ایک سال میں ہو چکی ہیں۔ خواہ تمہارے پاس مقابلے کے ہزار گواہ اور دلائل یہ ثابت کرنے کے لئے کہ تم وہاں سے ہزار میل دور تھے۔ یہ سب تو بعد میں ہو گا۔ جب معاملہ عدالت میں جائے گا۔"

حوالدار نے پھر ہمت کی "راجہ صاحب! اگر یہ ابھی آپ کے سامنے کھڑا ہو جائے اور کہے....."

"پاپی! ہمارے سامنے بھی تمہارا طوطا وہی سبق پڑھے گا جو تم نے رٹایا ہے" غالب نے کہا "ہم تو چلے جائیں گے۔ بعد میں پھر اس کی کھال ہو گی اور تمہارا بھس بھرنے کا آلہ۔"

"راجہ صاحب۔ اسے یا ہمیں کسی غیر ملکی یا کسی عزت دار بے گناہ پر الزام لگانے سے کیا ملے گا؟"

غالب نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا! "یہ ہم سے پوچھتے ہو کہ کیا ملے گا۔ ہم اس دیش کے باسی ہیں جس دیش میں گنگا بہتی ہے۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ کس تھانے میں کون سی گنگا بہہ رہی ہے اور بہتی گنگا میں کون کون ہاتھ دھو رہا ہے۔ کون ڈبکی لگا رہا ہے اور کون غرق ہو رہا ہے۔ خیریت چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔"

غالب نے یہ آخری جملہ اچانک بلند آواز میں یوں بولا کہ تھانے دار چونک پڑا۔ وہ سخت تذبذب کا شکار تھا اور اس کی قوتِ فیصلہ مفلوج ہو رہی تھی۔ وہ باعزت طور پر اس دلدل سے نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کرنے میں ناکام تھا۔ اگر وہ اپنی غلطی پر معافی مانگ کے واپس چلا جاتا تو یہ بھی اپنے ماتحتوں کے سامنے اچھا نہیں لگتا تھا اور اس سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ کہیں اس کے غلط فیصلے سے فائدہ اٹھا کے مجرم نہ نکل جائیں۔ دوسری طرف وہ ہم پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کہیں راجہ صاحب اور غیر ملکی سیاحوں کو حبسِ بے جا میں رکھنے کا جرم اس کی برطرفی کا سبب نہ بن جائے اور اسے تھانے دار کی وردی کے بجائے جیل کے قیدی کا

www.paksociety.com

لباس زیب تن نہ کرنا پڑے۔ وہ راجہ صاحب کے رعب دبدبے سے بھی انتہائی متاثر نظر آتا تھا جتنا اپنے زہین اور ہاہمت ماتحت کے دماغ سے۔

بلاشبہ حوالدار اپنے افسر کے مقابلے میں ہوشیار تھا مگر میرے معاملے میں وہ بھی دھوکا کھا گیا۔ یا تو اس نے میری تصویر نہیں دیکھی تھی۔ یا پھر تصویر اتنی پرانی ہو چکی تھی کہ اس کا میرے موجودہ حلیے سے مماثل ہونا اتفاق لگتا تھا۔ ایک ایسا اتفاق جس پر کوئی بھی سنجیدگی سے غور نہ کرتا ہو۔ میرا لباس بھی عجیب تھا اور میرے چہرے پر بے ہنگم داڑھی تھی جو دوسرے ہم سفروں کے جھاڑ جھنکار حلیے سے زیادہ میل کھاتی تھی۔ پھر میری رواں فرنچ میں شور مچانے اور دو مردوں کے میرے ساتھ چلانے سے بھی اداکاری میں حقیقت کا رنگ نمایاں ہو گیا تھا۔ اطالین، جرمن، فرنچ اور سوئس سیاحوں کے اس گروپ کو زبان کی بنیاد پر کسی قومیت سے منسوب کرنا مشکل تھا۔ وہ ایک سے لگتے تھے اور پولیس والوں کے لئے انگریز تھے۔ میرا اور اطالوی کا رنگ بہت صاف گندمی تھا اور میں بھی نہ انگریزی جانتا تھا نہ ہندوستانی۔ روسی دوں کی موجودگی الگ جذباتی مسئلہ بن گئی تھی۔ ان کے ملبوس کی بے حجابی نگاہوں کو دعوت دید دیتی تھی اور ان کے مرمریں تراشے ہوئے بدن انکا سپاہیوں کی نظروں کو خیرہ کرتے تھے۔

تھانے دار کی قوت مزاحمت یکلخت ختم ہو گئی ”چلو دو اوپس سب“ اس نے پورے اختیارات کے ساتھ حکم دیا۔

حوالدار نے احتجاج کے لئے منہ کھولا ”لیکن سر......“

”تم کون سی زبان سمجھتے ہو سر کے بچے!“ تھانیدار نے گرج کے کہا ”سنا نہیں میرا حکم۔“

”اس کی سر!“ حوالدار نے تلخی سے کہا ”سن لیا حکم۔“

تھانے دار نے راجہ صاحب سے کہا ”سوری سر۔ وہ دوسرے لوگ ہوں گے جن کے ساتھ مجرم کسی اور طرف نکل گئے۔ ہم تلاش کر لیں گے۔“

غالب نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”ابھی ہم تو سب تمہارے سامنے ہیں۔ تم چاہو تو دیکھ لو اندر بھی۔“

غالب نے گویا کھیلا تھا مگر بازی جیتنے کے بعد۔ تھانے دار نے کہا ”نہیں راجہ صاحب۔ ایسی غلطی نہیں کر سکتا میں۔ کل کو آپ بھی لکھ ماریں گے میرے خلاف کہ میں نے وارنٹ کے بغیر تلاشی لی۔ میں تو مارا جاؤں گا۔ آپ کی تسلی ہو جائے گی۔ میری کون سنے گا۔“

غالب نے ہاتھ آگے بڑھایا ”نہیں بھئی۔ جب ہم نے خود ہی اجازت دے دی تھی تو پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ مگر خیر تمہاری مرضی۔ ہمیں کوئی شکایت نہیں تم سے۔ تم نے اپنا فرض ادا کیا۔ لیکن اپنے دائرہ اختیار کے اندر رہ کے۔“

چار پولیس والے واپس گاڑی میں سوار ہو چکے تھے مگر وہ منتظر تھے کہ تھانے دار صاحب کی بات ختم ہو تو وہ اپنی بات کریں۔ وہ

رامن کو اٹھانے اٹھاتے رک گئے تھے۔

”کیا ہوا۔ کھڑے کیوں ہو؟“ تھانے دار نے کہا۔ جو راجہ صاحب سے مصافحہ کرنے کے بعد مجھ سے اور آخر میں یورپی گورے گورے ہاتھوں کو تھامنے کا اعزاز حاصل کر آیا تھا اور خاصا مطمئن تھا۔

”یہ۔ مر گیا ہے جی۔“

”مر گیا؟“ تھانے دار نے خفگی سے کہا ”کیوں مر گیا؟“

رامن کی موت کا غم کے میرے دل میں بھی دکھ کا ایک باب سا لوٹ گیا تھا۔

غالب نے کہا ”ہم بتائیں یہ کیوں مر گیا۔ تم نے رات بھر اس کو الٹا لٹکایا ہو گا ننگا کر کے۔ اسے آگ پر جھوٹا ہو گا اور برف میں دبایا ہو گا۔ اس میں مرچیں بھری ہوں گی تم نے اور رات غلاظت کھلائی ہو گی۔ پانی میں غوطے دیے ہوں گے اور اس پر کودتے رہے ہو گے تم سب۔ یہ ایک لڑکا تھا۔ غریب اور کمزور۔ تنکا ہوتا تو وہ بھی ٹوٹ جاتا۔ پتھر ہوتا تو بکھر جاتا۔ تم نے وحشیانہ تشدد کیا اس پر اور اسے مار ڈالا۔ اب تم ہی پوچھتے ہو کہ یہ کیوں مر گیا۔ یہ سب تمہارے ساتھ ہوتا تو تم مرنے سے پہلے بھی اجازت مانگتے تم لوگوں سے.... ہم اس کے بارے میں ضرور لکھیں گے۔ آئی جی آف انڈیا میں پوری رپورٹ دیں گے۔ تصویر کے ساتھ۔ کیمرا“ اس نے تام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

تام نے گلے میں لٹکا ہوا کیمرا غالب کو پکڑا دیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ تصویر بناتا رامن کے فریب کا پردہ چاک ہو گیا۔

”یہ زندہ ہے جناب۔ مکر کر رہا تھا حرامی۔ سانس روک لیا تھا اس نے“ تھانیدار نے رامن کو ٹھوکر مار کے کہا۔

عین اسی وقت فلیش چمکی۔ وہ منظر کیمرے نے محفوظ کر لیا جس میں دو پولیس والے رکوع کی حالت میں جھکے ہوئے رامن کو تشویش سے دیکھ رہے تھے اور تھانے دار اسے بڑی سفاک مسکراہٹ کے ساتھ ٹھوکر مار رہا تھا۔ رامن کا زخموں سے چور کمزور و ناتواں بدن ایک گٹھڑے میں لپٹے ہوئے چیتھڑے کے ساتھ زمین خاک پر پولیس کی بربریت کا ثبوت بنا پڑا ہوا تھا اور خود اپنی فریاد تھا۔ خوش قسمتی گفتگو بے زبانی بے زبان میری۔

تھانے دار نے پریشان ہو کے کہا ”راجہ صاحب!“

غالب نے دوسری تصویر بنائی جس میں جیب کا نمبر بھی صاف نظر آیا ہو گا۔ اب پولیس والوں کی اور تھانے دار کی صورت کے تاثرات بالکل مختلف تھے۔ پہلے فلیش کی چمک نے جیب میں بیٹھے ہوئے حوالدار کو بھی سر نکال کے جھانکنے پر مجبور کر دیا تھا چنانچہ دوسری تصویر میں اس کی شکل بھی آئی ہو گی۔

”اب تم لے جاؤ اسے۔ راستے میں مار کے کہیں ڈال دو اس کو یا سو بار اسے زندہ اور زندہ کرتے رہو۔“

تھانے دار نے کہا ”راجہ صاحب! ایسا مت کریں۔ ہم سب

ڈر کے مر جائیں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کو چھوڑ دوں گا۔“

”تمہارے وعدے پر اعتبار کر کے ہم بھی وعدہ کر لیں کہ نہ کچھ سمجھے گے نہ یہ تصویر تمہارے خلاف استعمال کریں گے تو اسے ہم نظر آتے ہیں ہم شکل سے۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم اس کو ہی نہیں اس کے پورے خاندان کو نہیں بخشو گے۔ تم اس کی ماں اور بہن کو اٹھا ہی چکے ہو گے۔“

”نہ اس کی ماں ہے راجہ صاحب نہ بہن۔ یہ تو ایک عادی مجرم ہے۔ جب کیرا تھا پہلے پھر چور بن گیا۔“

”تمہاری مہربانیوں سے۔ تمہارے ساتھ رہے گا تو ایک دن ڈاکو بنے گا اور قاتل بھی“ غالب نے تلخ لہجے میں کہا ”ہم رگ رگ سے واقف ہیں تم لوگوں کی۔ خود ہمارے علاقے میں کتنا ظلم کرتی ہے پولیس اور فریاد بھی ہم تک نہیں پہنچنے دیتی۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ بزرگی کی وجہ سے پولیس پر حرف آ جائے تو بعد میں اس سے بچے بدلہ لیا جاتا ہے۔“

اچانک اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے کہا ”ہاں ایک صورت میں ہم وعدہ کر سکتے ہیں۔ کہ تمہارے خلاف کچھ نہیں ہو گا۔ اور ہمارا وعدہ کسی سیاست دان کا وعدہ نہیں۔ تمہارا وعدہ نہیں۔ ایک راجپوت کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اس کی آن ہوتا ہے۔ یہ آن ٹوٹ نہیں سکتی۔“

تھانے دار نے پُر امید لہجے میں کہا ”میں سمجھا نہیں آپ کی بات جناب!“

”اسے ہم لے جائیں گے۔ اس کا خود علاج کرائیں گے اور اگر واقعی اس کا گھر بار نہیں ہے تو پھر یہ ہمارے خادموں میں شامل ہو کے ہمارے محل میں رہے گا۔ اصطبل میں یا گیراج میں۔ باغ میں یا جہاں اچھے لوگ کام کرتے ہیں وہاں یہ بھی کچھ تو کر ہی لے گا۔“

تھانیدار نے سر ہلایا ”جیسی آپ کی مرضی سر۔ آپ لے جائیں۔ لیکن یہ بڑا چھوٹا لڑکا ہے۔ کہیں آپ کو ہمارے خلاف نہ کر دے۔“

”اب ہم نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ یہ لڑکا ہمیں مجبور نہیں کر سکتا۔ ہمارا قول تمہیں دیا ہے اس سے پھر جائیں۔ یہ جھوٹ بولے یا سچ تم کو کچھ نہیں ہو گا۔“

جیپ سے سر نکال کے حوالدار نے کہا ”سر جی ذرا ایک منٹ میری بات بھی سن لیں۔“

تھانے دار نے پلٹ کے دیکھا اور با دل ناخواستہ جیپ تک گیا۔ حوالدار نے اس سے آہستہ آہستہ کچھ کہا۔ تھانے دار نے پلٹ کے رامن کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر بحث کرتے رہے۔ رامن کو دیکھنے کے بہانے میں اس پر جھک گیا اور اس کی نبض دیکھنے لگا۔ انہیں کیسے شک ہو سکتا تھا کہ میں ہندوستانی سمجھ لیتا ہوں۔ میں نے اپنے کان ان کی سرگوشی پر لگا رکھے تھے۔

”سمجھی نا میں...... یہ حرامی ضرور بتائے گا اپنی بہن کے بارے

میں۔ ماں تو خیر مر گئی۔“

”مگر میں نے پہلے ہی راجہ صاحب کے کان میں یہ بات ڈال دی ہے کہ یہ جھوٹ بولتا ہے۔“

”راجہ بہت کائیاں ہے۔ وہ سچ معلوم کرا لے گا۔“

”او یار۔ راجپوت کی آن....“

”مرنا یہ نہ ہو کہ اسی آن پر آپ اور ہم سب قربان ہو جائیں۔“ حوالدار بولا۔

”مگر کیسے؟“

”راجہ صاحب کے پاس تصویریں ہیں۔ یہ گواہ ہیں۔ رامن کے بیان کی حیثیت الگ ہو جائے گی۔“

”پھر کیا کروں میں“ تھانیدار جھنجلا کے بولا۔

”آپ راجہ صاحب سے معافی مانگ لیں۔ کہ ایک مجرم کو ان کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ ہم کیا جواب دیں گے واپس جا کے۔“

”ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ فرار ہو گیا۔ یا مر گیا۔“

”اور بعد میں کیس بن گیا اس کی بہن کا۔ اور ماں کی موت کا۔ خود اس کا۔ تو ہم کیسے بچائیں گے خود کو؟ راجہ صاحب کو جھوٹا کون کہے گا۔ اور ہم سچ کو کیسے جھوٹ ثابت کریں گے۔ تصویر کی کوئی بات نہیں۔ ہم انکار کر سکتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندہ تھا۔ اور اسے زندہ بھی رکھ سکتے ہیں۔ اس کی زبان تو نہیں کھلے گی نا ہمارے خلاف۔ راجہ صاحب کے پاس جا کے وہ شیر ہو جائے گا۔ تو ہری مصیبت گلے میں پڑ جائے گی۔“

”یار! میں اب کیسے کہوں۔ جاؤ تم بات کرو۔“

”کیوں۔ اب افسر نہیں رہے آپ؟ اس وقت تو حکم چلا رہے تھے جب میں نے بولنے کی کوشش کی تھی تو مجھے چپ کرا دیا تھا۔“

”پھر اب بھی تم چپ رہو۔ جو میں کر رہا ہوں ٹھیک ہے۔“ تھانے دار مشتعل ہو گیا۔ ماتحت کے طنز سے اس کی خفت اور شرمندگی ایک دم غصے میں ڈھل گئی۔

”چلو اسے اٹھاؤ۔ آرام سے اور پیچھے لٹاؤ۔“ تھانیدار نے حکم دیا۔

میں نے حوالدار کو زیر لب گالی دیتے سنا ”ایسے کم عقل اور کم ہمت افسری مرواتے ہیں۔“

دونوں سپاہیوں نے رامن کو یوں اٹھایا جیسے کارپوریشن والے گلی سے آوارہ کتے کی لاش اٹھاتے ہیں۔

میں نے فرنچ میں جینی سے کہا ”تم جا کے دروازہ کھولو اور دیکھو کہ وہ دونوں سامنے نظر تو نہیں آ رہی ہیں۔“

”وہ سامان میں چھپی ہوئی ہیں“ جینی نے کہا ”لیکن ان کے ہاتھوں میں ریوالور ہیں۔“

میں نے تشویش سے غالب کی طرف دیکھا اور اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ دونوں سپاہیوں سے پہلے ہی وہ کاروان کا دروازہ

www.paksociety.com

کھولنے کے لئے آگے بڑھ گیا۔

"ہاں بھئی۔ ادھر سے آؤ آرام سے" اس نے کہا "سامان یہ لٹا دو۔ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔"

یہ آخری بات ہیک۔ وقت سیاحوں کو مخاطب کر کے کہی گئی تھی اور گل اور ناز و سے بھی وہ ممکن تھا کہ وہ اسباب کے ڈھیر سے جھپ کر دیکھتی رہیں اور پولیس کی شکل نظر آتے تو بلا وجہ انھیں چنڈراپ کرانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوں۔

آخر کار پولیس والوں کی اسٹیشن ویگن ناپ جیپ لوٹ گئی اور ہمیں سکون کا سانس لینے کی مہلت ملی۔ یہ سب تھانے دار کی کم ہمتی اور کم عقلی تھی جیسا کہ اس کے ماتحت حوالدار نے کہا تھا ورنہ ہم اتنی آسانی سے گلو خلاصی نہ کرا پاتے۔

غالب نے کہا "شکر ہے بد حو کو ٹلا دیا۔"

میں نے کہا "مگر یار۔ میرا دل مطمئن نہیں ہے۔ وہ حوالدار مجھے خطرناک لگتا ہے۔ بعد میں موقع ملا تو وہ اپنے شکوک کا صاف اظہار کرے گا اور ممکن ہے اعلیٰ افسران کے سامنے بولنا شروع کر دے کہ تھانے دار صاحب ڈر گئے ورنہ ان سب کو ساتھ لا کے تصدیق کی جا سکتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں یا سچ۔ فرض کی ادائیگی میں بعض اوقات ناخوشگوار حالات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ سچے ہوتے تو ان سے معافی مانگی جا سکتی تھی۔"

"وہ اپنے افسر کی شکایت کرے گا؟"

"یار اتنا فرق ہے ایک حوالدار میں اور ایک بھولی دا ہے اے ایس آئی میں۔ حوالدار بھی کوئی نیا تجربہ کار اور احمق نوجوان نہیں تھا۔ بہت جلد وہ بھی اسی عہدے پر ہوگا۔ اس کی بات کو افسر بھی اہمیت دیتے ہوں گے۔ خصوصاً وہ افسر جو تھانے دار کی نااہلی کے ریکارڈ سے واقف ہوں گے۔"

"اس کا مطلب ہے ہمیں راستہ بدل لینا چاہیے؟"

میں نے کہا "اتنے بڑے کارواں کے ساتھ ہم گمنام راستوں پر بھی چھپ نہیں سکتے۔ پولیس چاہے تو ہیلی کاپٹر سے بھی دیکھ سکتی ہے۔ سفید اسٹیشن ویگن اور سفید کارواں جنگل میں صاف نظر آ جائیں گے۔ پیچھے ہر طرف سے گاڑیاں ہمارے راستے روک لیں گی۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"پھر اب کیا کریں؟"

میں نے کہا "ابھی تو ناز و اور گل کو آل کلیئر کا سگنل دو تاکہ وہ راحت کو سنبھال لیں۔ میرا خیال ہے کارواں میں فرسٹ ایڈ کا سارا سامان ہوگا اور سب دوائیں ہوں گی۔ ایسے دنیا کی سیاحت کرنے والے ہر چیز ساتھ رکھتے ہیں۔"

"وہ چاروں آپس میں سر جوڑے کیا کانفرنس کر رہے ہیں۔ ہمارے خلاف کوئی سازش؟" غالب نے کارواں میں داخل ہو کے کہا۔

میں نے کہا "میں ان کی سازش سے نمٹ لوں گا۔"

مجھے قریب آتا دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے۔ نام مجھے ان میں سب سے زیادہ کینہ اور کینہ پرور بھی نہیں لگا۔ بے وقوف بھی تھا اور ناداں دشمن ہی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ وہ سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اپنا نقصان نہیں دیکھتا۔ سب کو پریشان کرتا ہے۔ برٹ نسبتاً ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا مگر اس کی عادت کسی پر حکم چلانے کی نہیں تھی۔ چنانچہ نام اگر غلط راستے بھی دکھاتا تو وہ خاموش رہتا تھا۔ جین اور ماریا صرف لڑکیاں تھیں۔ خوب صورت لڑکیاں جن کے جسم ہی ان کا سارا اثاثہ تھے۔ وہ اپنی عقل کو کبھی استعمال کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتی تھیں اور شاید اس کی اہل بھی نہیں تھیں۔

"چلو دوستو۔ بلا ٹلی" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"یہ بلا نازل ہی کیوں ہوئی تھی؟" نام نے کہا۔

"کوئی بلا کسی سے پوچھ کے نازل نہیں ہوتی۔ اگر تم سوچتے بیٹھ جاؤ کہ زلزلہ کیوں آیا تو ملبے میں دب جاؤ گے اور سیلاب کی وجہ دریافت کرتے رہو گے تو بہہ جاؤ گے۔ اچھی بات یہ ہے کہ ہم عقل سے کام لے کر بچ گئے ورنہ ان کی غلطی....."

"مجھے یقین ہے وہ غلط فہمی کی بنا پر نہیں آئے تھے" نام نے میری بات کاٹ دی۔

"جہنم میں جائے تمہارا یقین اور تم" میں نے کہا "میں تمہاری بات کو اہمیت نہیں دیتا۔ تمہیں کیا معلوم کہ ہمارے درمیان کیا بات ہو رہی تھی۔ پھر تم نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا؟"

"پھر تم نے اس مردہ گدھے کی لاش کیوں رکھی؟"

میں نے نام کے منہ پر باکسنگ کا پنچ مارا۔ وہ لڑکھڑا کے پیچھے گرا اور منہ پر ہاتھ رکھ کے سہلانے لگا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور منہ سے خون جاری تھا۔ اس کے جبڑے ٹوٹے نہیں تھے مگر دانت ضرور ہل گئے تھے۔ اس نے مجھے خون آشام نظروں سے گھورتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو گالی دی "خاموش کھڑے دیکھ رہے ہو تم!"

میں نے کہا "یہ سمجھ دار لوگ ہیں۔ اسی لئے ابھی تک محفوظ ہیں۔ تم کو میں آخری بار تنبیہ کرتا ہوں کہ کسی بھی پاکستانی، ہندوستانی یا ایشیائی کے بارے میں بات کرتے ہوئے کوئی غلط لفظ منہ سے نہ نکالو ورنہ اگلی مرتبہ میں تمہارا منہ نہیں گردن توڑ دوں گا۔ اب اس سے پہلے کہ میں تمہیں لات مار کے اٹھاؤں تم خود اٹھو اور گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"

برٹ نے اپنے ساتھی کی مدد کی اور اسے ڈرائیونگ سیٹ پر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ ان کے لئے سب سے بڑی مشکل یہی تھی کہ میں ان کی زبان سمجھتا تھا جبکہ وہ میرے سامنے کوئی ایسی بات کر سکتے تھے اور نہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کر سکتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس ہم اردو یا انگریزی میں کچھ کہتے تھے تو وہ بے بسی سے منہ تکنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

جین اور ماریا واپس کارواں میں چلی گئیں اور برٹ نے گاڑی

آگے بڑھا دی۔ پچھلی نشست پر اب میں اکیلا تھا۔ میں نے ٹانگیں پھیلا کے سگریٹ بنا لیا۔

"کوئی حرکت کرنے سے پہلے دیکھ لینا کہ میں واقعی سو رہا ہوں یا تم نے مار دیا ہوں" میں نے کہا "یا مر گیا ہوں۔"

"تم اتنی آسانی سے اکیلے مرنے والے نہیں ہو" نام بڑبڑایا۔

میں نے ہنس کے کہا "تم دعا کرو۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ باقی تین رہ جائیں گے اور ان میں سے ایک لڑکی بچ گئی تو بھی تم چاروں سے نمٹ لے گی۔"

برٹ نے کہا "کیا تم بتاؤ گے کہ پولیس کیوں آئی تھی؟ وہاں سے کیا بات ہوئی؟"

میں نے کہا "سوری۔ میں اس موضوع پر بات کرنا پسند نہیں کروں گا۔"

"یہ پوچھنے میں کوئی حرج ہے کہ اس لڑکے کو پولیس تمہارے پیچھے کیوں کر رہی تھی؟ وہ انتہائی زخمی حالت میں تھا۔"

"حرج تو ہے" میں نے کہا "تم غور کرو تو تمہیں نام کا جبڑا سوجا ہوا نظر آ جائے گا مگر شرافت سے بات کی ہے تم نے۔ اس لئے ایک جواب حاضر ہے۔ وہ میرا کزن ہے۔ پولیس نے بڑی مشکل سے ہمیں تلاش کیا اور اسے ہم تک پہنچایا۔ بڑی فرض شناس اور خدمت خلق کرنے والی پولیس ہے ہماری۔ خدا ترس اور ایمان دار۔"

"اس میں کیا شک ہے" برٹ نے طنز سے کہا۔

"اب تمہارے تجسس کو رفع کرنے کے لئے میں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میرا یہ کزن کیسے زخمی ہوا۔"

"وہ ہمیں معلوم ہے۔"

"تمہیں غلط معلوم ہوا ہے" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ وہ جنگل سے گزر رہا تھا۔ اچانک اس پر ایک آدم خور شیر نے حملہ کر دیا۔ چوں کہ وہ میرا کزن ہے اس لئے شیر کو کچھ گدھا سمجھتا ہے۔ اس نے مقابلہ کیا اور اتنی مار مار کے شیر کی ہڈیاں توڑ دیں۔ اس میں خود بھی معمولی سا زخمی ہوا۔"

برٹ سامنے دیکھتا رہا۔ نام ایک رومال منہ پر رکھے بار بار کھڑکی سے تھوکتا رہا۔ انہوں نے میری فضول گوئی پر کسی قسم کے تبصرے سے گریز کیا۔

"نام! کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں نے جھوٹ بولا ہے؟"

نام نے مجھے گھور کے دیکھا "میرا دماغ خراب نہیں ہے۔"

"پہلے ثابت کرو کہ دماغ ہے تمہارے پاس" میں نے کہا۔

"اوکے۔ دماغ بھی نہیں ہے میرے پاس۔ تم میرا دوسرا جبڑا توڑنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو بہانے تلاش مت کرو" وہ بگڑ کے بولا۔

"تم مجھے بہانے باز کہہ رہے ہو۔ خیر۔ اس وقت میں قدرِ ندامت اور پشیمانی کے ردعمل کا شکار ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ اپنے صدمے کی تلافی کیسے کروں۔ میرے دل میں رحم دلی اور دوستی کے جذبات اُبل رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے ایک اور مکا مارو اور میرا جبڑا ہلا دو۔ اس طرح ہم پھر پرانی دوستی کی سطح پر آ جائیں گے۔" میں نے کہا۔

نام خون کے گھونٹ پی کے میری باتوں کو نظر انداز کرتا رہا۔ برٹ اسے ضبط سے کام لینے کی تلقین کے طور پر دوستانہ انداز میں ہاتھ سے تھپکی دے چکا تھا۔

ایک گھنٹے بعد جب ہم پچاس کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ طے کر چکے تھے ہمارا گزر ایک قصبے سے ہوا۔ وہاں سے سڑک دائیں اور بائیں جانب دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ برٹ نے نقشہ دیکھتے ہوئے دائیں طرف والی سڑک کا انتخاب کیا تھا مگر میں نے اسے بائیں طرف چلنے کا مشورہ دیا۔

اس نے حیرانی سے کہا "مگر یہ سڑک....."

میں نے کہا "یہ نقشہ مجھے دے دو۔ تمہیں اس کے مطابق نہیں میری ہدایات کے مطابق چلنا ہوگا۔"

"تمہیں معلوم ہے یہ راستہ کہاں لے جائے گا؟"

"ہر راستہ کسی منزل کی طرف ضرور جاتا ہے" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا "اور منزل ہم بدلتے رہتے ہیں۔ سیاحت کا صحیح لطف ہی تب آتا ہے جب آدمی لکیر کا فقیر نہ ہو۔ بلکہ بے مہار اونٹ ہو۔ جدھر جی چاہا نکل گئے۔ راستہ گم کرنے میں بڑا ایڈونچر ہے۔"

"تمہارے لئے ہوگا۔ ہم ایک پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق چل رہے تھے" ٹام نے کہا "کہ ہمیں کس وقت کہاں ہونا چاہیے۔ اور کب واپس پہنچنا چاہیے۔"

"وہ سب بھول جاؤ" میں نے مشورہ دیا "سفر میں ایسے غیر متوقع حادثات پیش آ جاتے ہیں تو پروگرام بدل جاتا ہے۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح ہماری مرضی کے خلاف ہمیں کہیں زبردستی لے جانا اغوا کہلائے گا۔ اغوا بہت سنگین جرم ہے۔"

"ہم اس سے کہیں زیادہ سنگین جرائم کا ارتکاب کر چکے ہیں اور اس ملک کے قانون کو تم سے بہتر سمجھتے ہیں۔"

"کیا ہے اس ملک کا قانون؟" نام نے کہا۔

"وہی جو ساری دنیا میں رائج ہے۔ اس وقت بھی رائج تھا جب تمہارے دادا پردادا جانوروں کی طرح غاروں میں رہتے تھے۔ اور آج بھی ہے جبکہ اکیسویں صدی کی جانب گامزن مہذب انسان نے خلا کو تسخیر کر لیا ہے۔ یہ ہے لاٹھی اور بھینس کا قانون۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ انگریزی میں کہتے ہیں مائٹ از رائٹ۔ چنانچہ.... یہ جو اقوام متحدہ ہے نا اس کی سلامتی کونسل میں سب لاٹھی والے شامل ہیں۔ بڑے اور طاقت ور ممالک۔ سپر پاورز۔ جو وہ کہتے ہیں وہی درست قرار پاتا ہے۔ جو وہ چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے۔ وہ نہ چاہیں تو انصاف بھی نہیں ہوتا اور کشمیر یا فلسطین کے رہنے

www.paksociety.com

والوں کے حق کی بات پروپیگنڈا کی تلوار بن جاتی ہے۔ تم سفید فاموں نے ایک وائٹ از رائٹ سوسائٹی بنائی ہے چنانچہ مستند ہے تمہارا فرمایا ہوا۔ یہاں ہم نے ایک وائٹ از رائٹ سوسائٹی بنائی ہے جس کے ہم سب معزز اراکین ہیں اور جو ہم کہتے ہیں وہ صحیح ہوتا ہے۔ وہی قانون ہوتا ہے اور انصاف کا پیمانہ بھی۔ اس لئے بالیڈیز ٹام ڈک اینڈ ہیری۔ ظلم یا حق اور انصاف کی بات مت کرو۔ سمجھو کہ ہم سپر پاورز ہیں اور تم افریقہ ایشیا کی تیسری دنیا کے ممالک ہو۔"

ٹام اور برٹ اس سچ کے زہر کو خاموشی سے پینے پر مجبور تھے۔ گاڑی اب کسی بے نام سڑک پر رواں تھی اور اس راستے پر آہستہ آہستہ درختوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ سڑک تنگ، ٹوٹی پھوٹی اور ویران تھی۔ اس پر اتنی بڑی لینڈ روور اور کاروان کو چلانا بہت مشکل کام تھا۔ آدھے گھنٹے میں ہم نے اس سڑک پر کوئی آتی جاتی ریڑھا یا پیدل گاڑی گزرتے نہیں دیکھا تھا۔ اور میں سوچنے لگا تھا کہ کہیں اس راستے پر آ کے ہم نے کوئی غلطی تو نہیں کی۔ ایسا نہ ہو اچانک ہم کسی خطرناک یا ممنوعہ علاقے میں داخل ہو جائیں۔

سڑک اچانک ختم ہو گئی۔ گھنا جنگل جو ہمارے دائیں بائیں ساتھ تھا سامنے بھی آ گیا۔ ایک بہت بڑے درخت کے گرنے سے راستہ مسدود ہو گیا تھا۔ درخت شاید کئی مہینے پہلے گرا ہو گا۔ یہ اس کے تنے کا ایک حصہ تھا۔ دوسرا حصہ ابھی تک تنے کے ساتھ پیوستہ تھا مگر تنے کے ساتھ ہی جھک گیا تھا۔ درخت کے آس پاس جھاڑیوں اور خودرو گھاس کے اگنے سے سڑک غائب ہو گئی تھی اور اگر آگے کہیں پھر شروع ہوتی تھی تو وہ بھی نظروں سے اوجھل تھی۔ سیدھے یا الٹے ہاتھ کی طرف سے راستہ کاٹ کے نکلنا بھی مشکل تھا۔ اسٹیشن ویگن اور کاروان کو گزارنے کے لئے جتنی جگہ درکار تھی وہ درختوں کے درمیان کہیں نہ تھی۔ درخت بہت قریب ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور ان کے بیچ کا خلا بھی جھاڑ جھنکاڑ سے بھرا ہوا تھا۔ اس گھنے جنگل سے آدمی پیدل گزر سکتا تھا یا پھر جیپ میں گھوم پھر کے راستے کی تلاش جاری رکھ سکتا تھا۔

"اب کیا حکم ہے مسٹر رائٹ؟" ٹام نے تلخی سے کہا۔

"تم مسٹر رائٹ اور تمہارا ساتھی مسٹر رائٹ" برٹ نے ٹام کے لہجے کی تلوار تلخی کو مذاق کا رنگ دے دیا۔

میں نے نیچے اتر کے گردو پیش کا جائزہ لیا اور سگریٹ کا مرغولہ چھوڑتے ہوئے کہا "یہ جگہ ہمیں پسند آئی۔"

کاروان سے غالب باہر نکلا "کیا ہم راستہ بھول گئے ہیں؟"

میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا "ہم سب صراط مستقیم سے بھٹک گئے ہیں۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔ میری نظر تو بس قیامت کی نشانیاں دیکھ رہی ہے مرزا غالب۔ رامن کا کیا حال ہے؟"

"ممکن ہے وہ بچ جائے۔ ممکن ہے وہ مر جائے۔"

"گویا تیسری صورت کوئی نہیں" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔

ٹام اور برٹ گاڑی سے اتر آئے تھے اور حیرت سے ساتھ ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ آغاز سفر سے پہلے انہوں نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ وہ کہیں اس طرح بے اختیار بھی ہو جائیں گے۔ وہ سیر کے لئے نکلے تھے اور سمجھتے تھے بے فکری سے اپنے پروگرام کے مطابق بڑھتے جا رہے تھے کہ یہ محض اتفاق ہے کہ وہ لالچ کے جال میں پھنس گئے۔ اب تشدد اور دہشت کا شکار تھے اور انہیں یہ بھی یقین کرنا مشکل ہوگا کہ کبھی بچ کر وہ آزادی سے اپنے سفر پر روانہ ہو سکیں گے۔ ان حالات میں یہ خدشات بے بنیاد نہ تھے کہ ہم انہیں اس ویرانے میں مار کے دفن بھی کر جائیں گے اور کسی کو کبھی کچھ معلوم نہیں ہوگا۔

جین اور ماریا باہر آئیں تو خوف سے ان کی حالت غیر تھی۔ وہ ہم سے بچ کر ٹام اور برٹ کے ساتھ جا کھڑی ہوئیں۔

"یہ کیا ہے آخر۔ ہم کہاں ہیں؟" جین نے کہا۔

"جہنم میں۔ شاید اس سے بھی بدتر جگہ ہے" ٹام نے کہا۔

"یہ لوگ یہاں کیوں لائے ہیں ہمیں؟" ماریا نے کہا۔

"بے وقوف عورت!" ٹام نے چلا کے کہا "دیکھتی نہیں یہ کتنی اچھی جگہ ہے۔ سرسبز و شاداب، پرسکون اور الگ۔ دفن ہونے کے لئے ایسی جگہ کسے میسر آتی ہے۔"

"شٹ اپ ٹام!" برٹ نے کہا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم غلط سمجھ رہے ہو" جین بولی۔

"نہیں۔ میں بالکل ٹھیک سمجھا ہوں۔ اب ان کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ ہمیں قتل کر دیں" ٹام نے کہا "کیونکہ ہم سب کچھ جان گئے ہیں۔ ان کے لئے خطرہ بن گئے ہیں۔ یہ سڑک پر ہمیں قتل کر کے ہماری لاشیں......"

"خدا کے لئے ٹام......" ماریا چلائی۔

"لاشیں کہاں پھینکتے؟ یہاں ہمیں لانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ قتل کر کے گاڑ دیا جائے" ٹام نے اپنی بات جاری رکھی۔

غالب نے کہا "کیا فرمایا ہے انہوں نے؟"

میں نے مسکرا کے کہا "فرماتے ہیں کہ ہم انہیں یہاں قتل کر کے دفن کرنے کے لئے لائے ہیں۔"

اب گل کے ساتھ مانو بھی کاروان سے باہر آ گئی تھی "کیوں بلاوجہ انہیں دہشت زدہ کرتے ہو۔ بتا دو کہ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں" غالب نے کہا۔

"ابھی سے کیسے بتا دوں" میں نے کہا "کیا پتا انہیں سچ مچ مارنا پڑ جائے۔"

"یار! جب آدمی کو موت سامنے نظر آنے لگتی ہے تو وہ موت سے بھی نہیں ڈرتا۔ مرنے سے پہلے مارنے کی سوچتا ہے۔ اور خطرناک ہو جاتا ہے" غالب نے کہا۔

"ہم انہیں یقین نہیں دلا سکتے کہ ہمارے ارادے بہت نیک ہیں" میں نے کہا۔

"کوشش تو کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا۔ کوشش کر رہا ہوں میں" اور پھر ان سے مخاطب ہو گیا۔

"حضرات اور خواتین!" میں نے کہا "میرے ساتھی یہ چاہتے ہیں کہ میں تم سب کو اپنی نیک نیتی کا یقین دلاؤں۔ یہ بتاؤں کہ ہم یہاں صرف اس لئے آئے ہیں کہ تعاقب کرنے والوں کی نظر سے اوجھل ہو جائیں۔ ہم سڑک پر چلتے رہتے تو آگے ہر قدم پر نئی مشکل کا سامنا ہوتا۔ کہیں نہ کہیں ہم گرفتار ہو جاتے۔ ابھی ایک پولیس پارٹی ناکام لوٹ گئی۔ دوسری زیادہ قوت اور وسائل کے ساتھ نکلی تھی۔ وہ ہیلی کاپٹر کی مدد سے ہمیں تلاش کرتے یا آگے کہیں پورے بندوبست کے ساتھ گھیرے میں لے لیتے۔ یہ جگہ ایسی ہے کہ یہاں کوئی ہم تک آسانی سے براہ راست نہیں پہنچ سکتا۔"

"تم نے ایسا کیا جرم کیا ہے کہ پولیس تمہیں گرفتار کرنا چاہتی ہے؟" ٹام نے کہا۔

"غالباً میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس موضوع پر کسی بھی سوال کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ تم جو چاہو فرض کر سکتے ہو۔ کسی وجہ کے بغیر پولیس کسی کا پیچھا نہیں کرتی" میں نے کہا "تم اپنے دماغ سے فضول خیالات کو دور رکھو اور صرف تعاون کرو تو میں وعدہ کر سکتا ہوں کہ بہت جلد تم بخیر و عافیت اپنا سفر پھر شروع کر سکو گے۔"

"تم اور تمہارا وعدہ!" ٹام نے تلخ لہجے میں کہا۔

میں نے اسے کالر سے پکڑ کر کھینچ لیا اور ایک اڑنگے کے زمین پر دے مارا "مجھے جھوٹا کہہ رہے ہو تم؟ کیا میں ڈرتا ہوں تم سے کہ جھوٹ بولوں گا؟ کیا تمہیں شوٹ کر دینا میرے لئے مشکل ہے؟ کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے میرا اگر میں تم سب کو یہاں گاڑ جاؤں۔ مگر جو وعدہ کرتا ہوں پورا کرتا ہوں۔ جب میں بتا رہا ہوں کہ بہت جلد تمہیں آزاد کر دیا جائے گا تو تمہیں یقین کرنا چاہئے۔"

برٹ نے ٹام کو سہارا دے کر اٹھایا "تم کو اس کی بات پر اتنا مشتعل نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تیز مزاج ہے۔ احمق ہے۔ میں یقین کرتا ہوں تمہاری بات کا اور تمہیں یہ بھی یقین دلا سکتا ہوں کہ نہ ہماری طرف سے عدم تعاون کا مظاہرہ ہوگا اور نہ دشمنی کے جذبات کا۔ اپنی جان بچانے کے لئے ہم تمہاری ہر ممکن مدد کریں گے۔ آگے تمہاری مرضی۔"

"برٹ! تم سمجھدار آدمی ہو۔ اگر تمہارے وہی حالات ہوتے جو ہمارے ہیں تو شاید تم اتنے ٹھنڈے دماغ سے کام نہ لیتے۔ تم بھی مار کے اپنی جان چھڑاتے۔ اپنے دماغ پر کوئی بوجھ نہ رکھتے۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ ہم وہ بے ضمیر پیشہ ور مجرم نہیں کہ جو کسی کو قتل کرتے ہوئے اتنا بھی نہیں سوچتے جتنا کسی درخت کی ٹہنی سے ایک پتہ توڑتے ہوئے۔ تم سب کو قابو میں رکھو۔ میں پھر تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ حالات ایسے نہیں رہیں گے۔ آخر کار ہم اپنے راستے پر چلے جائیں گے اور تم اپنی مرضی سے کہیں بھی جا سکو گے۔"

"ٹھیک ہے۔ ایک وعدہ میں بھی کرتا ہوں۔ ہم کبھی کسی کے سامنے تم سے ملاقات کا اعتراف نہیں کریں گے اور نہ خود کسی سے تمہارے بارے میں کچھ کہیں گے۔ جب تک ہم واپس وطن نہیں پہنچ جاتے" برٹ نے کہا۔

"آل رائٹ۔ اب اس سے پہلے کہ بارش شروع ہو، درختوں سے شاخیں توڑ کے اسٹیشن ویگن کی اور کاروان کی چھت پر پھیلا دو۔ سائیڈ میں لگا دو۔"

"تم اسے کیموفلاج کرنا چاہتے ہو۔ میں سمجھ گیا۔"

"ہاں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری تلاش کے لئے ہیلی کاپٹر ضرور استعمال ہوں گے۔ اس وقت بادل ہیں اور زیادہ بلندی سے نیچے کا منظر دھند اور غبار میں صاف نظر نہیں آ سکتا۔ وہ کم بلندی پر رہ کے دوربین سے دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ انہیں جنگل میں کوئی سفید دھبہ بھی نظر نہیں آنا چاہئے۔ گھنے درختوں کے درمیان یقیناً مشکل یا ناممکن کام نہیں۔"

ہم نے یہ کام ان کے ساتھ مل کے بہت کم وقت میں پورا کیا۔ اس سے مجھے یہ اطمینان حاصل ہو گیا کہ فوری طور پر ہماری تلاش میں کامیابی ممکن نہیں رہی۔ ابھی تک ہم نے جس راستے پر سفر کیا تھا اس پر ہم بہت سے سراغ چھوڑ آئے تھے۔ انہی کی مدد سے پولیس نے رامن کو پکڑ لیا تھا اور پھر اس سے تشدد کے ذریعے معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ہمیں بہت سے لوگوں نے چار غیر ملکیوں کے ساتھ دیکھا ہوگا۔ وہ سب ہماری نشاندہی کر سکتے تھے اور ایک نااہل تھانے دار کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے بعد اس بات کے امکانات بڑھ گئے تھے کہ اب اعلیٰ سطح پر تحقیقاتی ادارے ہماری تلاش کے لئے نئی حکمت عملی وضع کریں گے۔ ان کے لئے ہمارے راستے کا تعین کرنا آسان ہوگا اور جب اس راستے پر ہمارا سراغ نہیں ملے گا تو وہ آس پاس کا سارا علاقہ چھان ماریں گے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ایک اسٹیشن ویگن اور اتنے ہی بڑے کاروان سمیت روپوش ہونا عملاً ناممکن کام ہے۔

ہم اپنے کام سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ گہرے کالے بادل جھک پڑے اور موسلادھار بارش نے ہمیں کاروان کے اندر پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ کاروان کسی پختہ کمرے کی طرح تھا۔ اندر ہم بالکل محفوظ رہے۔ گل نے مختصر سے کچن میں گیس کا چولہا جلا کے کافی بنائی اور لنچ میں ہم نے پھر ناشتے کا بچا ہوا سامان استعمال کیا۔ اندر کم جگہ ہونے کے باوجود ہم دو گروہوں میں بٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ جین اور ماریا بوتل سے منہ لگا کے پی رہی تھیں اور نشے کی خود فراموشی میں سارے غموں کو بھلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

www.paksociety.com

آہستہ آہستہ وہ فکر فردا اور غم دوش سے بیگانہ ہو گئیں اور زور زور سے ہنسنے لگیں اور باتیں کرنے لگیں۔ اچھی بات یہ تھی کہ میرے سوا کوئی ان باتوں کا مطلب نہیں سمجھ رہا تھا ورنہ صورت حال خراب ہو جاتی۔ نشے نے ان کی زبانوں کو آزاد کر دیا تھا اور ان کی تمام منتشر محسن فاشی کے گھیرے میں آتی تھی۔ تام بھی پی رہا تھا مگر نشے نے اسے اتنا سنجیدہ کر دیا تھا کہ وہ مغموم نظر آتا تھا۔ اس نے دونوں لڑکیوں کو چپ کرانے کی کوشش کی۔

"کیوں ہنسی آ رہی ہے تمہیں؟ بہت انجوائے کر رہی ہو اس صورت حال کو؟"

برٹ نے اسے روک دیا "انہیں مت ٹوکو' اس طرح یہ ایزی ہو جائیں گی۔ انہیں ریلیکس کرنے دو۔"

تام کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے "معلوم نہیں کوئی کیسے ریلیکس کر سکتا ہے' جب موت سامنے ہو اور قاتل آزاد ہوں۔ معلوم نہیں میں گھر سے نکلا ہی کیوں تھا۔"

"معلوم نہیں تم پیدا ہی کیوں ہوئے تھے" جیمن اس کا مذاق اڑانے لگی "کون سا گھر تھا تمہارا تام؟"

تام نے کہا۔ "ہم شادی کر لیتے تو ہمارا گھر ہوتا۔ ہم کبھی گھر سے نہ نکلتے۔ تم دونوں نے انکار نہ کیا ہوتا تو آج میں یہاں بیٹھا قسمت کو نہ رو رہا ہوتا۔"

"پھر میں اپنی قسمت کو روتی" جیمن نے ہنس کے کہا۔

رامن دونوں طرف کی نشستوں کے درمیان ساکت لیٹا ہوا تھا اور اس کی حالت بتدریج بگڑتی جا رہی تھی۔ ہم اس کے لئے جو کچھ کر سکتے تھے کر چکے تھے۔ اگر فوری طور پر اسے انتہائی نگہداشت کے کسی وارڈ میں رکھا جاتا تو شاید وہ بچ سکتا تھا مگر یہاں وہ کاروان کے فرش پر لیٹا ہچکولے کھا رہا تھا اور پولیس کے تشدد کا عذاب جھیلنے کے بعد سفر کی صعوبت برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

میں نے کئی بار اس سے پوچھنا چاہا کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ ہونے والے وحشیانہ مظالم کے بارے میں کچھ بتائے۔ یہ بتائے کہ پولیس نے اسے کیسے پکڑا تھا۔ اس کی بہن کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ اور وہ اب کہاں ہے۔ اس کی ماں کیسے مر گئی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں بند رہیں اور لب خاموش رہے۔

رات کو کسی وقت وہ خاموشی سے مر گیا۔ ہمیں بالکل پتا نہ چلا کہ اس تن داغ داغ کے زنداں سے روح نے کب آزادی حاصل کی اور رامن کے لئے دنیاوی عذاب کب ختم ہوا۔ ایک بار اچانک میں نے محسوس کیا کہ سانس کی آمد و رفت کی علامات مفقود ہیں اور نبض دیکھنے سے مجھے اس کی موت کا یقین آ گیا۔ اس کا بدن ابھی تک گرم تھا۔ شاید ایک منٹ پہلے یا چند سیکنڈ پہلے وہ زندہ تھا۔

اس کی موت نے گل اور نازو کے اعصاب کو جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ صدمہ مجھے اور غالب کو بھی تھا مگر ہم نے گل اور نازو کو تسلی دینے کے لئے خود رونے سے اجتناب کیا۔ تام اور برٹ کے ساتھ دونوں لڑکیاں بھی ہمیں تعجب سے دیکھتی رہیں۔ ان کے لئے رامن جیسے کسی بے مایہ اور لاوارث شخص کے لئے آنسو بہانا بھی آنسوؤں کا زیاں تھا۔

میں نے تام اور برٹ کو اشارہ کیا "چلو اٹھو۔ ہمیں اس کی تدفین کرنی ہو گی۔"

تام نے غصے سے کہا "اس وقت۔ بارش میں۔"

میں نے کہا "تم مٹی کے بنے نہیں ہو کہ پانی میں گھل جاؤ گے۔"

"کیا ضرورت ہے آخر اس کی...."

"جب تم مرو گے تو تمہیں دفن کرنا نہ کرنا تمہارے ان لواحقین کی مرضی ہو گی۔ ابھی یہ میری مرضی کی بات ہے۔ اگر تم شرافت سے نہ اٹھے تو میں تم کو بھی اس کے ساتھ دفن کر دوں گا۔"

میں نے دہاڑ کے کہا۔

وہ بادل ناخواستہ اٹھے۔ شدید بارش میں ہم نے ایک جگہ تلاش کی جو درختوں کے نیچے تھی۔ وہاں ایک گڑھا پہلے سے موجود تھا۔ ہم نے رامن کو اس میں لٹایا اور اس کے اوپر مٹی' گھاس اور خاشاک اور پتھر پھیلا دئے۔ یہ آخری رسوم نہ ہمارے عقیدے کے مطابق تھیں اور نہ رامن کے مذہب کے مطابق مگر ہم نے اس کی لاش کو جنگلی جانوروں کی دستبرد سے محفوظ کر دیا تھا۔

ہم بھیگے ہوئے تھکے ہوئے بوجھل دل کے ساتھ واپس آئے اور پھر خاموش بیٹھ گئے۔ گل اور نازو آنسو بہا کے چپ ہو گئی تھیں مگر ہماری طرح ڈیپریشن کا شکار تھیں۔ رامن کی موت کے جذباتی صدمے نے ان سے قوت برداشت چھین لی تھی اور ماحول کی عجیب وحشت ان کے حوصلے پست کر رہی تھی۔ باہر بارش کا شور تھا مگر اندر سکوت تھا۔ اور ہم سب اپنی اپنی سوچ کے آزار میں بند تھے۔ آخر کار گل نے اس سکوت کو ایک فقرے سے ختم کیا۔

"بھائی سکندر! کیا ہم بھی...."

"بھی کیا؟" میں نے کہا "جو کہنا ہے کہہ دو۔"

"نہیں۔ کچھ نہیں" وہ سر جھکا کے ایک ہاتھ کے ناخن صاف کرنے لگی۔

"میں سمجھ گیا گل۔ تم پوچھنا چاہتی ہو کہ ہم یہاں سے کب نکلیں گے اور کیسے۔ نکل کے کہاں جائیں گے۔ آگے یا واپس اسی راستے پر' جس پر چل کے ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔"

"واپس کیسے جا سکتے ہیں ہم" غالب نے کہا۔

"جیسے رابعہ چلی گئی" نازو نے کہا۔

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "یہ تم کہہ رہی ہو نازو۔ کیا میں نے روک رکھا ہے تمہیں؟ تم جب چاہو جا سکتی ہو۔ اکیلی یا غالب کے ساتھ۔ مگر مجھے آگے جانا ہے۔ میں اکیلا بھی جاؤں گا۔ محسن میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ میں اس کے بیوی بچوں کو نہ بچا سکا تو کیا کم ہے۔ محسن کو کیسے چھوڑ جاؤں میں...."

"میں آپ کے ساتھ ہوں بھائی سکندر" گل نے کہا۔

"تو کیا میں نازو کے ساتھ واپس جا رہا ہوں؟" غالب نے برہمی سے کہا "یہ جانا ہے تو جائے۔ جہنم میں جائے۔"

نازو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اسٹریس سے مغلوب ہو گئی تھی۔ "دیکھو ذرا ہم اس وقت کہاں ہیں' کیا ہیں۔ کہاں گیا وہ مقصد جو بہت عظیم تھا؟ کہاں ہے ہمارا عزم اور حوصلہ؟ ہم اپنی جان بچاتے پھر رہے ہیں۔ ہر طرف سے شکاری آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں اور ہم بھاگتے رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم مقابلہ کریں اور مارے جائیں۔ آخر کب تک اس بزدلی کے ساتھ جئیں گے ہم۔ فرار کے راستے بھی تو بند ہوتے جا رہے ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس وقت نازو کو تسلی اور دلاسے کی ضرورت ہے۔ یہ شدید مایوسی کا رد عمل تھا کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف باتیں کر رہی تھی۔

"یہ لڑکی کیوں رو رہی ہے؟" جیمن نے کہا۔

میں نے اسے سختی سے جھڑک دیا "تم اسے سنبھالو جو تمہارے سامنے بیٹھا آنسو بہا رہا ہے۔ ہماری فکر مت کرو۔"

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ اپنے ساتھ ہمیں بھی مروا دیا تم نے" ماریا نے چیخ کر کہا اور شراب کی خالی بوتل میرے سر پر مارنے کے لئے پھینکی "تم منحوس شیطان...."

میں نے ایک جھانپڑ مار کے اسے واپس کر دیا۔ وہ تام پر گری اور تام نے اسے سنبھال لیا "کم آن بے بی۔ ان لوگوں سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مجھ سے بات کرو۔ بولو تم کرو گی مجھ سے شادی جب ہم واپس جائیں گے۔"

"ہم کبھی واپس نہیں جائیں گے مجھے معلوم ہے" ماریا نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

غالب نے اب نازو کو خاموش کرانے کی کوشش کا آغاز کر دیا تھا۔ اس نے نازو کے آنسو پونچھے اور اسے تسلی دینے لگا۔

"نازو' میری جان۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بہت جلد۔ یہ تو ہوتا ہے زندگی میں۔ ناکامی کے بغیر کامیابی کا تصور ہی ممکن نہیں۔ آزمائش کا یہ دور کچھ طویل ضرور ہو گیا ہے مگر اس سے بددل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں تو اپنے حوصلے کا سرمایہ ایسے ہی آڑے وقت میں استعمال کرنا چاہئے۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "بہت جلد ہم سب بچھڑے ہوؤں سے مل جائیں گے۔ سوچو' ہم نے کیسے کیسے معرکے سر کئے تھے۔ کہاں کہاں وطن کے دشمنوں کو شکست دی تھی۔ ان کی بے پناہ طاقت کے غرور کو خاک میں ملایا تھا۔ اپنی ہر کامیابی کا شمار کرو اور سوچو کہ کیا ہم خسارے میں رہے؟ کچھ لوگ ہم سے ضرور بچھڑے۔ بڑے اچھے لوگ تھے سب۔ استاد نیازی سے لے کر شملا تک۔ ثمن' بانک جیسے ڈاکو سے لے کر اس معصوم بچے تک جو شملا اور محسن کی محبت کا ثمر تھا۔ مگر ان کی موت بھی کتنی اچھی تھی۔ ایک مقصد کی خاطر جان دی سب نے۔ اور یہ مقصد ان کے جذبے سے عظیم تھا۔ وہ سب شہید ہوئے۔ ان کو مردہ مت سمجھو۔ وہ ہمارے درمیان نہ سہی ہمارے ساتھ ضرور ہیں.... اور ہمیشہ رہیں گے۔"

پھر غالب نے کہا "دیکھو یہ گل کتنی پرسکون ہے اور پرامید ہے۔ حالانکہ یہ پہلے [illegible] تھی۔ گل بازو بن کے اس نے کیا پایا' یہ اس سے پوچھو۔ ہم سب نے کچھ کھو کے بہت کچھ پایا ہے۔ اور جو پایا ہے اسے سفر کے اس مرحلے پر گنوا نہیں سکتے۔"

"یوں سمجھو کہ سفر کی پہلی منزل ہم نے بہت پہلے پا لی تھی جب ہم نے اپنے وطن کی سرحد عبور کر کے دشمن ملک کی زمین پر قدم رکھا تھا۔ دوسرا مرحلہ ہم طے کر چکے ہیں۔ ہم نے رلاور اور ترویتی کے اتحاد کو انتشار میں بدل دیا ہے۔ ان کی ہر مذموم کوشش کو ناکام بنا کے۔ اتنے وسائل اور اتنی قوت رکھنے والے اسلحے کی ایک بھی کھیپ مشرقی پاکستان نہیں پہنچا سکے۔ انہوں نے کروڑوں کا نقصان اٹھایا اور ہمیں اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ مگر آج کامراں کون ہے؟ ترویتی رو رہا ہے کہ رلاور نے اسے تباہ کر دیا۔ رلاور کا سب سے بڑا دشمن وہ خود ہے۔ اور رلاور رلا رہا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ ان حقائق کا اعادہ ناامیدی کی دھند صاف کر رہا ہے اور مایوسی کے رد عمل کا بوجھل پن ختم کر رہا ہے۔ آہستہ آہستہ نازو کا اور اس کے ساتھ گل کا چہرہ مستقبل پر یقین کی روشنی سے منور ہونے لگا۔ جذباتی کمزوری کی جس لہر نے نازو کو احساس شکست سے دوچار کیا تھا وہ گزر چکی ہے۔ نازو کی کیفیت ڈراؤنا خواب دیکھنے والے جیسی تھی جو آنکھ کھلنے کے بعد خدا کا شکر بجا لاتا ہے کہ وہ محض خواب تھا اور زندگی تو وہی ہے۔ جینے کے قابل' پرکشش اور ایک مقصد' مقصد کے لئے جدوجہد اور جدوجہد کے انعام کا سلسلہ۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی "یہاں سے ہمارے سفر کا تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اب ہم مشرقی پاکستان پہنچ کے اس جہاد میں شریک ہوں گے جو ہمارے ہم وطن غداروں کے خلاف کر رہے ہیں۔ بیرونی مداخلت کار' تخریب پسند اور علیحدگی کے جذبات کی آگ بھڑکانے والوں کے خلاف۔ ان کے خلاف جنہوں نے روز اول سے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ آج بھی مسلم قومیت کے اجتماعی شعور سے خائف رہتے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ کہیں اسلام کا رشتہ اتنا مضبوط نہ ہو جائے کہ مسلم ممالک کا بلاک سب سے بڑی سپر پاور بن جائے۔ اس رشتے کو سبوتاژ کرنے کے لئے وہ ساری دنیا میں سرگرم عمل ہیں۔ وہ اسرائیل کے ہاتھوں عربوں میں انتشار پیدا کرتے ہیں۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کو الگ کرنا چاہتے ہیں۔ ایران عراق کے درمیان شط العرب کا جھگڑا ہو یا کشمیر کا مسئلہ۔ سب کی زد میں مسلمان ہی آتے ہیں۔"

www.paksociety.com

غالب نے کہا "بس چند دن میں ہم مشرقی پاکستان میں ہوں گے اور پھر منظم ہو کے سرگرم عمل ہو جائیں گے۔ وہاں محسن بھی ہو گا اور ہمارے میاں ہوں گے۔ ہمارے ساتھ ہزاروں نہیں لاکھوں کروڑوں ہوں گے۔ جیسے ہم یہاں اکیلے اور بے سہارا تھے، ایسے وہاں بے بس نہیں ہوں گے۔ جیسے یہاں چھپتے پھرتے ہیں اور مسلسل فرار کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ایسا وہاں نہیں ہو گا۔"

میں نے کہا "اور یہ فرار بھی جنگ کا حصہ ہے۔ ہر فوج کو کسی نہ کسی محاذ پر پسپا بھی ہونا پڑتا ہے۔ پسپائی کا مقصد اگر موت کا خوف ہو یا جنگ سے منہ موڑنا ہو تو وہ بزدلی ہے مگر اس کا مقصد پھر منظم ہو کے نئی حکمت عملی کے ساتھ دشمن پر حملہ کرنا ہو تو یہ عقل مندی ہے۔ جانتے بوجھتے موت کے منہ میں جانا بھی خودکشی کے مترادف ہے اور خودکشی حرام ہے۔ ہم خودکشی نہیں کر سکتے۔ اپنا دفاع کرتے ہوئے خود کو محفوظ رکھنا اس وقت ہمارا واحد مقصد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ان کے نرغے کو توڑ کے نکل جائیں گے اور پھر سب اسی مرکز پر اکٹھے ہو جائیں گے جہاں سے ہماری جدوجہد کا آخری مرحلہ شروع ہو گا۔"

"نہیں۔ آخری مرحلہ اس کے بعد آئے گا۔ کہا فتح کے بعد۔ جب ہم گھر لوٹیں گے۔ واپس وطن جائیں گے آپ کے گھر۔" غالب نے کہا۔

نازو نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا "مجھے بہت شرم آ رہی ہے۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ لڑکیوں کو بے شرم نہیں ہونا چاہئے" غالب نے کہا۔

"معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔ پاگل ہو گئی تھی میں کہ میں نے ایسی بات کہہ دی" نازو نے کہا۔

"پاگل ہو کے کبھی ہم سے بھی کوئی پاگل پن کی بات کہہ دو" غالب نے آہ بھر کے کہا "دل ہمارا بھی بہت اداس ہے۔"

وہ نازو کو چھیڑنے کے لئے ایک دم غیر سنجیدہ ہو گیا تھا اور اس ماحول کی کیفیت کو بدلنے کی یہ کوشش بہت بروقت تھی۔

گل نے کہا "مجھ پر بھی پاگل پن کا دورہ پڑنے ہی والا تھا۔"

غالب نے کہا "چلو اب تم شروع ہو جاؤ۔ تمہاری باری ہے"

میں نے ہنس کے کہا "ہاں۔ تم بھی شوق پورا کر لو۔"

گل مسکرائی "آپ پھر لیکچر دیں گے۔"

"وہ تو ضروری تھا۔ جیسا مرض ویسی دوا" میں نے کہا۔

"اچھا ہوا لیکچر کے ٹیکسٹ سے ہی خاتون کو شفا ہو گئی ورنہ انجکشن دینا پڑتا" غالب نے اپنے ہاتھ کو تھپڑ کے انداز میں اٹھا کے کہا "ہسٹریا کے علاج کا یہ مجرب نسخہ کبھی ناکام نہیں ہوا۔ کچھ ہوتے ہیں لاتوں کے بھوت۔"

نازو نے اسے لال لال آنکھوں سے دیکھا "مثلاً تم۔"

غالب نے کہا "میں ایک بھوت کا داماد ضرور ہوں۔ خود بھوت نہیں ہوں۔ اور میرے محترم سسر بھوت..."

"یہ کیا ہر وقت بھوت کہتے رہتے ہو میرے والد کو" نازو بگڑ گئی۔

"لاحول ولا قوۃ۔ تم کیوں زبردستی گلے پڑ رہی ہو میرے۔ میں نے مان میں تمہارا مہمان کی طرح۔ مان نہ مان میں ہوں سسر کی بیٹی کا۔ تمہارے والد کا کب نام لیا ہے میں نے" غالب نے کہا۔

"بے وقوف مت بناؤ مجھے۔"

"تمہیں جیسا بنایا ہے خدا نے بنایا ہے۔ اور ابھی تم خود پاگل تسلیم کر چکی ہو" غالب نے کہا "تم پاگل ہی نہیں ایک خطرناک پاگل ہو۔"

"میں باہر بھیج دوں گی بارش میں۔"

اسی وقت بجلی چمکی اور زبردست کڑاکا ہوا۔

غالب نے کہا "اس وقت میری بیگم کام آتی ورنہ بجلی مجھ پر گرتی۔ گستاخ لڑکی۔"

جینی اور ماریا بے سدھ ہو کے سو گئی تھیں اور نہایت بے ہنگم طریقے پر تام اور برٹ کے اوپر پڑی ہوئی تھیں۔ ہم پک جھپکائے بغیر انہیں دیکھ رہے تھے۔ برٹ نے اس سے پوری جینی کی جان چھڑا دی تھی۔ آؤٹ نہیں ہوا تھا مگر پوری طرح ہوش میں بھی نہیں تھا۔ صرف برٹ کا رویہ متوازن تھا۔ وہ ظاہری اخلاق سے سگریٹ پی رہا تھا مگر کبھی کبھی اچانک ہماری طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ جیسے ہماری گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ نازو کو روتے دیکھ کر پھر غالب سے لڑتے دیکھ کر اور ہمارے بدلتے موڈ کو دیکھ کر وہ کچھ حیران تھا اور کچھ پریشان۔ پریشان اس لئے کہ وہ ہمارے عزائم سے اپنے مستقبل کا اندازہ کرنے میں ناکام تھا۔ ہم یہ ضرور جانتے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ وہ صرف خوف اور بے یقینی کے عذاب میں مبتلا تھے۔ ہم انہیں کب تک اپنے ساتھ رکھیں گے۔ ان سے کیا کام لیں گے۔ انہیں کہاں کہاں لے جائیں گے اور آخر کار ماردیں گے یا چھوڑ دیں گے۔ ان میں سے کسی کے پاس اندازے کی بنیاد پر بھی ان سوالات کے جواب حاصل کرنا مشکل تھا۔

جنگل میں سیلاب آگیا تھا۔ طوفانی بارش کا ریلا درختوں کی شاخوں اور پتوں کے سائبان سے اترنے والا پانی زمین پر جھاڑیاں پودوں، خس و خاشاک اور سوکھے پتوں کو بہا کر لے جا رہا تھا۔ بجلی کی خیرہ کن چمک بار بار کھڑکیوں کے شیشے اجالا کرتی تھی اور اس کے بعد گرج کے شور سے شیشے بج اٹھتے تھے۔ میرا خیال ہے کئی بار کہیں بجلی گری۔ میں اور غالب ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ نازو اور گل ہم سے چپکی بیٹھی تھیں۔ گرج چمک کے اس طوفان سے وہ بہت سہمی ہوئی تھیں اور ان کے ذہن پر تشنج کی سی کیفیت بھی تھی۔

میں نے کئی بار پردہ ہٹا کے دیکھا تو تاریکی، بارش کی دھند اور شیشوں کی بیرونی سطح پر بہتے پانی کے دھاروں سے مجھے کچھ نظر

آیا۔ ایک بار میں نے غالب سے کہا کہ چلو جنگل کی بارش میں سیر کا تجربہ کرتے ہیں اور نہا کے آتے ہیں۔ تو نازو اور گل نے ہمیں پکڑ لیا۔ بیٹھے بیٹھے وقت گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے ایک بار نازو سے پھر کافی لانے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔

"سلنڈر کی گیس ختم ہو جائے گی تو کیا کریں گے اور کافی بھی ہی اتنی ہے کہ دو بار کافی ہو گی۔"

"چائے تو ہو گی" غالب نے کہا۔

"چینی اور دودھ کے بغیر ہو گی۔ آرام سے بیٹھے رہو۔ ابھی رات کافی ہے۔ کھانے کے لئے بھی کچھ کرنا ہو گا۔ یہ بارش تو نہ جانے کب تک چلے گی" نازو نے کہا۔

"خدا کرے یہ کبھی ختم نہ ہو" غالب نے کہا۔

"تاکہ ہم آرام سے سیلاب بہا کے لے جائے" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "یہ بارش بھی تائید ایزدی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"بھئی ایسے موسم میں کون تلاش کرے گا ہمیں؟" میں نے کہا، "موسم صاف رہتا تو شاید ہمیں چھپنے اور خود کو کچھ دفاع کرنے کی مہلت بھی نہ ملتی۔ کچھ دیر میں رات ہو جائے گی۔ اندھیرے میں وہ ہیلی کاپٹر سے سرچ لائٹ ڈال کر بھی دیکھیں گے تو انہیں کچھ نظر نہیں آئے گا۔"

"صبح کیا ہو گا؟"

"یہ صبح دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔

رات کے کھانے کے لئے ہمیں کاروان کے ذخیرۂ خوراک میں سے ڈبے ڈھونڈنے پڑے۔ روشنی کے لئے ہم گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر سکتے تھے مگر ڈر یہ تھا کہ کھڑے کھڑے ہی پٹرول نہ ختم ہو جائے۔ کاروان کے اندر ایک لائٹ تھی جو بیٹری سے جلتی تھی چارج نہ ہونے کے سبب آہستہ آہستہ اس کی روشنی بھی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔

میں نے اور غالب نے ہر ڈبے پر لکھی ہوئی عبارت کو غور سے پڑھا کہ کہیں غلطی سے حرام چیز نہ کھا جائیں۔ ان کے ذخیرے میں پورک کے ڈبے بھی تھے۔ ہم نے نمکین مچھلی کے ڈبے کھولے۔ ان میں سارڈین اور شرمپ مچھلیوں کے تلے تھے۔ بنز بہت اور پنیر کے ڈبے نازو نے کھولے۔ جینی اور ماریا بے بسی سے اس زاد راہ کو ہم اجنبی قزاقوں کے ہاتھوں لٹتا دیکھتی رہیں جو انہوں نے بچا بچا کے رکھا تھا۔ تام کے شور کو ہم نے اہمیت ہی نہیں دی۔ پورک کے ٹن ہم نے ان کی طرف پھینک دیئے۔

کھانے کے بعد نازو کی مہربانی سے کافی مل گئی۔ بارش اب بھی جاری تھی مگر گرج چمک کے بغیر۔

میں نے کہا "رات کو کیا ہو گا؟"

"جو ہر رات ہوتا ہے۔ بقول فلمی شاعر۔ جاہلی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سو جا" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "میرا مطلب تھا کیا ہم انہی کے ساتھ سوئیں گے؟"

"جینی اور ماریا سے پوچھ لو۔ برٹ اور تام کو تو اعتراض نہیں ہو گا" غالب نے کہا "میرا خیال ہے گل اور نازو کو بھی اعتراض نہیں ہو گا۔"

گل نے تنتنا کر کہا "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ لوگ۔"

"او گل کیا مطلب۔ میں ایسی کوئی بات نہیں کر رہا ہوں مس گل بانو۔ میں تو صرف یہ پوچھ رہا تھا کہ کیوں نہ مردانہ اور زنانہ خواب گاہیں الگ الگ رکھی جائیں۔"

"ہر خواب گاہ میں ایک کو جاگتے رہنا پڑے گا۔ سب ایک جگہ ہوں گے تو صرف ایک جاگے گا۔ پھر دوسرا۔"

"زنانہ ڈبے میں اندیشۂ نقص امن کا مجھے کوئی امکان نظر نہیں آتا" میں نے کہا "یہ لڑکیاں اتنی بہادر نہیں ہیں کہ رات کے وقت اس موسم میں نکل جائیں۔ فرار ہونے کے لئے۔"

"ہم پر حملہ تو کر سکتی ہیں" گل نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "اتنی ہمت بھی نہیں ہے ان میں۔ اور انہیں ویسے بھی ہوش کہاں ہو گا۔ ابھی پیتے پیتے خود ہی غافل ہو کے پڑ جائیں گی۔"

"مجھے تو نیند نہیں آئے گی" گل نے کہا۔

"اچھا پھر یوں کرتے ہیں کہ ان چاروں کو باندھ کے ڈال دیتے ہیں۔ ایک ہی جگہ مگر الگ الگ" غالب نے کہا "پھر ہم بھی چین سے سو جائیں گے۔"

"پارٹنر پہلی بات تو یہ ہے کہ کس چیز سے باندھیں گے؟ دور دور کیسے رکھیں گے؟ اور اگر رات کو ایک آزاد ہو گیا تو سب کو کھول دے گا" میں نے کہا "ہم چاروں نہیں سو سکتے۔"

"یہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر کیسے فرار ہو سکتے ہیں؟"

"جب موت کا ڈر ہو تو فرار ہونے والا صرف موقع تلاش کرتا ہے" میں نے کہا۔

"ان سے گاڑی کی چابیاں لے لو۔ سب نقد رقم لے لو بلکہ پاسپورٹ بھی لے لو" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "یہ تجویز اچھی ہے۔ مگر اس پر عمل کرنے کے بعد بھی ہم سب کا بے فکری سے سو جانا خلاف احتیاط ہے۔ ایک کو ضرور جاگنا پڑے گا۔"

نازو نے کہا "باری باری سب جاگ لیں گے۔ دو دو گھنٹے۔"

میں نے کہا "باری باری سے میری مراد تھی میں اور غالب۔ خواتین کا اس انتظام سے کوئی تعلق نہیں۔"

"ہم اس قابل نہیں سمجھتے ہمیں؟"

"اہلیت کی بات نہیں۔ آپ جاگ سکتی ہیں اور جس پر نظر کرم ہو اسے جگا کے رکھ سکتی ہیں۔ اس کی آنکھوں سے نیند اڑا سکتی ہیں۔ نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی

www.paksociety.com

ہیں..." غالب نے کہا "نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔"

"تم کو بھی نشہ ہو گیا ہے" نادر ہنسنے لگی۔

"ہاں۔ کم سے کم دس اشعار پڑھ سکتا ہوں بس کہ مجھے نشہ کیوں ہو گیا ہے۔" غالب نے کہا "مگر کیا فائدہ" تم کو کیا معلوم شعر کیا ہوتا ہے۔"

"شیر جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے۔ چوہا گھر میں رہتا ہے" نادر بولی۔

میں انہیں چھوڑ کے ٹام اور برٹ کی طرف متوجہ ہو گیا "تم لوگ کہاں سونا پسند کرو گے؟"

"تمہارے ساتھ قبر میں" جینی نے تلخی سے کہا۔

ٹام ہنسنے لگا "یہ جگہ قبر سے کم ہے کیا۔ مگر جس کو تم مرا سمجھ رہی تھی وہ مردہ ہے۔"

"شٹ اپ!" میں نے کہا "اپنی جیب میں سے ہر چیز نکال کے میرے حوالے کر دو۔ گاڑی کی چابیاں۔ نقدی۔ پاسپورٹ۔"

برٹ نے احتجاج کیا "یہ سب کیا ہے؟"

"حفاظتی انتظام" میں نے کہا۔

"ہم بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔"

میں نے کہا "میں تمہارے دل کا حال نہیں جانتا۔ میرے لئے اپنا اطمینان ضروری ہے۔"

"اطمینان!" ٹام نے طنز سے کہا "اگر ہم فرار ہو سکتے تو خالی ہاتھ بھی فرار ہو جاتے۔"

"میں ایسی نوبت نہیں آنے دوں گا۔ کسی نے یہ احمقانہ کوشش کی تو اس کی لاش جنگل میں پڑی رہ جائے گی۔ چلو جلدی کرو۔" میں نے ہاتھ پھیلا کے کہا۔

"تم ایک مکار دھوکے باز ڈاکو ہو" ٹام نے وہ رقم میری طرف پھینک دی جو ہم نے اسے صبح دی تھی۔

"یہ تمہاری امانت ہے۔ تمہیں واپس مل جائے گی۔"

برٹ نے چابیاں میری طرف اچھال دیں "گاڑی ان کے بغیر بھی اسٹارٹ ہو جاتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں پلگ کے تار بھی نکال کے اپنے پاس رکھوں گا" میں نے کہا "پاسپورٹ۔"

"ہم پاسپورٹ نہیں دے سکتے" ٹام نے چیخ کر کہا۔

"اگر میں پاسپورٹ لے سکتا ہوں" میں نے سکون سے جواب دیا "خواہ اس کوشش میں مجھے تمہاری جان ہی کیوں نہ لینی پڑے۔"

ٹام کا رنگ فق ہو گیا "تم بہانے ڈھونڈ رہے ہو۔ اور کچھ نہیں۔ کسی نہ کسی بات پر تم مشتعل ہو کے ہمیں مار ڈالو گے اور الزام بھی ہمیں دو گے کہ مشتعل کرنے کے ذمے دار ہم تھے۔ تم جواز پیدا کرو گے تاکہ خود اپنے ضمیر کو مطمئن رکھ سکو۔"

میں نے کہا "اگر تم یہ سب سمجھتے ہو تو پھر دیر کیوں کر رہے ہو مسٹر ٹام؟ ایک بات اور۔ جنگ میں ضمیر کچھ نہیں کہتا۔ زندگی اور موت کا مسئلہ ہو تو دشمن کو قتل کرنا جرم بھی نہیں کہلاتا۔"

برٹ نے اپنا پاسپورٹ نکال کے کہا "بحث سے کیا فائدہ ٹام۔ تعاون کرو تاکہ انہیں موقع نہ ملے۔"

ٹام نے پاسپورٹ میری طرف پھینک دیا "تعاون سے کچھ نہیں ہو گا۔ تم دیکھ لینا یہ موقع پیدا کر لیں گے اور موقع نہ ملا تب بھی چھوڑیں گے نہیں۔"

جینی اور ماریا سے پاسپورٹ لے کر میں نے غالب کو تھما دیئے "اب تم دونوں اسٹیشن ویگن میں چلو۔"

"یہاں کیا ہے؟" ٹام نے کہا۔

برٹ نے بھی کہا "اور پیچھے چھ افراد کے سونے کی جگہ ہے۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا تو اس نے رضامندی کے انداز میں سر ہلایا "اگر یہ شرافت سے سوتے رہیں تو ٹھیک ہے۔ ہم میں سے ایک جاگتا رہے گا۔ دوسرا اسٹیشن ویگن کی پچھلی سیٹ پر جا کے سو جائے۔"

دائیں طرف کی تین برتھوں پر میں نے ٹام کو سب سے اوپر رکھا۔ پھر برٹ کو۔ سب سے نیچے والی برتھ پر گل رہی۔ دوسری جانب اوپر کی جگہ ماریا کو دی گئی۔ درمیان میں جینی رہی اور سب سے نیچے نادر۔ ٹام اور ماریا اس گروپ میں زیادہ جارحانہ رویہ رکھتے تھے اور ان کی آپس میں بھی نہیں بنتی تھی۔ گل اور نادر کو ہم نے زبردستی کرتے ہوئے سونے پر مجبور کر دیا۔ اسباب سفر کے میڈیکل باکس میں سے سکون آور گولیاں بھی مل گئیں۔ جن کے بعد صرف میں اور غالب جاگتے رہ گئے۔ ہمارے لئے سونے والوں کے درمیان فرش پر اتنی ہی جگہ بچی تھی کہ ہم دیوار سے ٹیک لگا کے اور پاؤں پھیلا کے بیٹھ جائیں۔

میں نے غالب سے کہا "تم بھی سو جاؤ اسٹیشن ویگن میں۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "ابھی نیند نہیں آ رہی ہے۔ تم چلے جاؤ۔"

میں وہیں فرش پر لیٹ گیا۔ باہر بارش پھر تیز ہو گئی تھی۔ اندر بیٹری سے جلنے والی لائٹ اتنی کم ہو گئی تھی کہ اس کا اجالا موم بتی کی روشنی کے برابر بھی نہیں رہا تھا۔ میرا ذہن بھی خیالات کے انتشار میں مبتلا تھا اور سکون آور گولیاں بھی مؤثر ثابت نہیں ہو رہی تھیں۔ آدھے گھنٹے تک میں آنکھیں بند کئے سوچ کے راستوں کی ناکا بندی کرتا رہا اور ہر سمت سے یلغار کرنے والے تشویش انگیز اندیشوں کو دور بھگاتا رہا۔ آخر کار نیند غالب آئی اور پانچ گھنٹے بعد غالب نے مجھے اٹھایا تو میں بڑی مشکل سے جاگا۔ میں نے بارش کے ٹھنڈے پانی سے منہ پر چھینٹے مارے اور سگریٹ جلا کے بیٹھ گیا۔ غالب پڑتے ہی سو گیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یوں خاموش اکیلے بیٹھ کے رات کا ایک ایک پل شمار کرنا اور صبح کے انتظار میں وقت کاٹنا کتنا مشکل کام ہے۔

اس جنگل میں بارش کے پتوں پر گرنے سے اور پانی کے بہنے

سے جو شور پیدا ہو رہا تھا وہ بھی ویرانی کے سکوت اور جمود کو ختم کرنے میں ناکام رہا تھا۔ میری تنہائی کے حصار میں ہر سمت سے خیالوں کے قیدی شبخون مارتے رہے۔ میں رابعہ کے تصور کو ذہن سے نکالتا تھا تو حسن کا مظلوم چہرہ سامنے آ جاتا تھا۔ شملا کی فریاد عدم آباد کی پہنائیوں سے سنائی دینے لگتی تھی۔ پھر ولادو کی شیطانی ہنسی کی فاتحانہ بازگشت سب پر غالب آ جاتی تھی۔ میرے ماضی کے دکھ اور مستقبل کے اندیشے کسی امید کے چراغ کو روشن رکھنا نہیں چاہتے تھے اور میں مایوسی کے گھپ اندھیرے میں بے بسی سے بھٹکنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

رات کے آخری پہر میں بارش تھم گئی تو جنگل کا سناٹا زیادہ بھیانک ہو گیا۔ میں نے کاروان کے دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے کھولا اور باہر آ گیا۔ کھلے دروازے سے میں اندر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ میرے قدموں کے نیچے خنک پتھریلی زمین تھی اور اوپر سے درختوں کی چھت مسلسل برس رہی تھی۔ خنک ہوا نے مجھے بڑی فرحت دی اور میں نے بھیگے ہوئے جنگل کی خوشبو کو محسوس کیا۔ اس میں مٹی، خودرو گھاس اور پتوں کی مہک شامل تھی۔

اچانک میں نے ٹام کو سر اٹھاتے دیکھا۔ وہ کاروان کے اندر سونے والوں کی صورتوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کیا کرتا ہے میں تھوڑا سا ایک طرف ہو گیا اور دروازے کے قبضے کی جھری سے اندر جھانکتا رہا۔ ٹام کو یقین آ گیا تھا کہ اس کے سوا سب خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔ اس نے کاروان کا کھلا دروازہ دیکھ کر یہی سمجھ لیا ہو گا کہ میں کسی ضرورت سے باہر گیا ہوں یا شاید اسٹیشن ویگن میں جا کے سو گیا ہوں۔ اس نے موقعے سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ خاموشی سے نیچے اترا اور دبے پاؤں کاروان کے آخری حصے میں بنے ہوئے کچن کی طرف گیا۔ فرش پر بیٹھ کے وہ نہ جانے کیا کرتا رہا۔ جب وہ اٹھا تو پراسرار روشنی میں مجھے اس کی صورت پر ایک سفاک مسکراہٹ نظر آئی۔ وہ پلٹا تو میں نے اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھا۔ یہ ریوالور اس نے کسی خفیہ خانے سے برآمد کیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ میں گھوم کے کاروان کی سائیڈ میں ہو گیا۔

ٹام نے اسٹیشن ویگن کا رخ کیا تو میں کاروان کی آڑ میں آگے بڑھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ سب سے پہلے میرا کام تمام کرنا چاہتا ہے۔ میں اسٹیشن ویگن میں سو رہا ہوتا تو وہ ریوالور کا دستہ مار کے مجھے ناک آؤٹ کر دیتا اور پھر میرا گلا گھونٹ کے سب سے خطرناک دشمن سے نجات پا لیتا۔ اس کے بعد وہ واپس کاروان کی طرف جاتا اور غالب کو سوتے میں ہی گولی مار دیتا۔ فائر کی آواز سے نادر اور گل کے جاگ اٹھنے میں پھر کوئی خطرہ نہ ہوتا۔

ٹام اسٹیشن ویگن میں جھانکنے سے اسے مایوسی ہوئی۔ وہ باہر آیا اور لوٹ کر کاروان کی طرف گیا۔ دوبارہ غور سے دیکھنے پر بھی اسے سونے والوں میں میری صورت نظر نہیں آئی تو وہ چوکنا ہو کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں اس کی ایک ایک حرکت کا مشاہدہ بڑی دلچسپی سے کر رہا تھا اور منتظر تھا کہ وہ اپنی عقل درست کر کے کسی سمت میں دوڑا ہے تو میں ٹانگ اڑا کے اسے منہ کے بل گرا دوں۔

شاید اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ میری عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باقی سب لوگوں کو ناک آؤٹ کر دے یا اسے ڈر ہو گا کہ میں زیادہ دور نہیں جاؤں گا اور عین وقت پر نمودار ہو کے اس کو دور سے ہی شوٹ کر دوں گا۔ رات کے اندھیرے میں اور جنگل میں اس کی نظر ہر طرف مجھے تلاش کرنے سے قاصر تھی۔ ممکن ہے اسے یہ خیال بھی ہو کہ نقد رقم اور پاسپورٹ کے بغیر اس کے فرار ہونے کا کوئی فائدہ نہیں اور یہ چیزیں میرے ہی پاس ہوں گی۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر واپس اسٹیشن ویگن کی طرف گیا۔ میں کوئی آہٹ کئے بغیر دوسری طرف سے آگے بڑھا۔ بڑی ہوشیاری اور خاموشی سے ٹام نے کاروان کو اسٹیشن ویگن سے الگ کیا۔ دونوں کو منسلک رکھنے والے فولادی کنڈے کی آواز نے کسی کو بیدار نہیں کیا۔

اب میں سمجھ چکا تھا کہ ٹام گاڑی لے کر فرار ہو جانا چاہتا ہے۔ شاید اس کے پاس ڈپلی کیٹ چابیاں تھیں اور اس نے یہ جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس میں اس کی کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے مگر وہ امید کے سراب میں بھٹکا تھا۔ جنگل کے راستوں پر اندھیرے اور بارش سے پیدا ہونے والی کیچڑ میں وہ گاڑی کو کہاں دوڑاتا اور کیسے دوڑاتا۔ گاڑی کسی پانی سے بھرے ہوئے گڑھے میں پھنس جاتی یا اچانک بند ہو جانے والے راستے پر کسی درخت سے ٹکرا جاتی۔ یہ کوئی صاف سڑک نہیں تھی جس پر وہ چلاتا جاتا اور اسے کوئی پکڑ نہ پاتا۔

میں نے اسے گاڑی میں بیٹھ جانے کا موقع فراہم کیا۔ اس نے آخری بار ادھر ادھر خوف زدہ نظروں سے دیکھا اور پھر ایک دم اوپر چڑھ گیا۔ میں نے لپک کے دوسری طرف سے دروازے کا رخ کیا اور ابھی وہ سوئچ میں چابی لگا ہی رہا تھا کہ میں بھی دوسرے دروازے سے اوپر پہنچ گیا۔

ٹام کو اچانک اپنی ناکامی کے احساس سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ چند منٹ میں وہ آزادی حاصل کر لے گا۔ اور کسی سڑک تک پہنچ جانے کے بعد امداد لے کر واپس لوٹے گا۔ اس وقت تک مجرم یعنی ہم تو فرار ہو چکے ہوں گے مگر ان کے ساتھی شاید مل جائیں گے۔ وعدہ معاف ہوں۔ اور ہم بھی گاڑی کے بغیر فرار ہو کے کہاں جائیں گے۔ صبح تک گرفتار ہوں گے یا مارے جائیں گے۔

اس کا رد عمل بہت شدید تھا۔ دیوانگی آمیز اور اس مایوسی کا

www.paksociety.com

آئیڈیا وار جب آدمی مرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ مگر ہارنے کے بعد اس نے ایک دم ریوالور نکال کر مجھ پر فائر جھونکنے کی کوشش کی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وقت کم ہے اور درمیانی فاصلہ بھی کم ہے۔ دوسرے لمحے وہ چابیاں گاڑی چھوڑ کے پیچھے کود گیا اور ایک دم بھاگا۔ اسے یقین تھا کہ میں تعاقب میں آؤں گا۔ چند قدم کے فاصلے سے اس نے گولی چلائی تو نشانہ ونڈ اسکرین کا شیشہ لیا جس کے پیچھے میں موجود تھا۔ اس نے دوسرے دروازے کی جانب فائر کیا تھا جہاں اس کے اندازے کے مطابق مجھے موجود رہنا چاہئے تھا۔

میں گولی سے بچنے کے لئے جہاں بیٹھا تھا وہیں غوطہ مار گیا تھا۔ پہلے فائر کے بعد میں نے سر اٹھا کے دیکھا تو ام اندھیرے میں غائب ہو رہا تھا۔ میں نے اس کا متحرک سایہ چند ہی قدم دور دیکھا اور کھڑکی سے ہاتھ نکال کے اس کا نشانہ لیا۔ میں باہر نکل کے اس کا تعاقب کرتا اور وہ اسے دوڑ کر شوٹ کرنے کی کوشش کرتا تو میں بھی کھلے میدان میں اس کا نشانہ بن سکتا تھا۔

میرے فائر کی آواز کے ساتھ ہی ام کی دلخراش چیخ سے جنگل کا سکوت درہم برہم ہو گیا۔ میں نے اسے اچھل کر گرتے دیکھا مگر اس کے باوجود آگے اس کی طرف نہیں لپکا۔ وہ زخمی یقیناً ہوا تھا مگر کس حد تک، یہ اندازہ اس کی چیخ سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ گولی اس کی ٹانگ میں یا سینے میں لگی ہو۔ سینے پر لگنے والی گولی بعض اوقات صرف پسلیوں کو توڑتی ہے، دل کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ شدید زخمی حالت میں بھی انسان فوراً نہیں مرتا۔ گولی سر یا گردن میں لگے یا دل میں پیوست ہو جائے تو موت فوری اور یقینی ہوتی ہے۔ بصورتِ دیگر موت کی طرف پیش قدمی کرنے والا زخمی سانپ سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔

گولیاں چلنے کی آواز سن کر کاروان میں سونے والے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے تھے۔ ام کی چیخ نے انہیں بہت کچھ بتا دیا ہو گا مگر میں اپنے ساتھیوں کو خطرے سے دور رکھنا چاہتا تھا۔

"کوئی باہر نہ آئے۔" میں نے چیخ کر کہا۔

غالب نے چلا کے کہا "تم ٹھیک ہو؟"

"میں نے ام کو حتمی طور پر موت مار دیا ہے۔"

"مگر تم....."

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم نے مار دیا اسے....." ماریا نے ہسٹریائی میں چلا کے مجھے گالی دی۔ پھر شاید نازو نے اسے خاموش کر دیا۔

"ام کہاں ہے؟" غالب نے کہا۔

"سامنے کہیں پڑا ہے" میں نے کہا "تم باہر مت آنا ورنہ ممکن ہے وہ فائر کر دے۔ میں دیکھ لیتا ہوں۔"

"یہ کیا پاگل پن ہے؟" نازو نے چلا کے کہا "کیا وہ تم پر فائر نہیں کرے گا؟ تم سامنے جاؤ گے....."

میں نے کہا "میں سامنے نہیں جاؤں گا" تم باقی سب کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھو۔"

پھر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ انجن ایک مرتبہ غرا کے خاموش ہو گیا۔ دوسری بار میں نے لمبا سیلف دیا اور انجن نے اس وقت جان پکڑا جب مجھے بیٹری کے بیٹھ جانے کا اندیشہ لاحق ہو رہا تھا۔ انجن کو ریس دے کر میں نے ہیڈ لائٹس آن کر دیں اور تاریک جنگل کی وسعت میں اپنے سامنے دیکھا۔ ام کہیں بھی نہیں تھا۔

گاڑی کے دروازے بند کر کے میں نے اسے آگے بڑھایا اور اسی سمت میں موڑا جدھر ام فرار ہوا تھا۔ اس کی لاش بھی کہیں نہ تھی اور وہ خود بھی غائب تھا۔ شاید وہ زخمی حالت میں خود کو گھسیٹ کر کسی جھاڑی کے پیچھے لے گیا تھا اور اب گھات لگائے بیٹھا تھا۔

میں نے واشر چلا کے شیشہ صاف کیا اور پھر کھڑکی سے سر نکال کے زمین پر خون تلاش کرنے کی کوشش کی۔ گاڑی آہستہ آہستہ آگے سرک رہی تھی۔ اس کے پہیوں کے نیچے کیچڑ اور پانی تھا۔ بارش کا پانی پگڈنڈی جیسی نالیوں میں جمع ہو کے نشیب کی جانب اپنا راستہ بنا رہا تھا۔ اس میں لہو کی سرخی کا محسوس ہونا بہت مشکل تھا۔

ام کو میں نے اس وقت دیکھا جب اگلے پہیوں نے پانی کو کاٹا اور گاڑی اس کے اوپر سے گزری۔ جھٹکے سے ام کا ایک ہاتھ اٹھا اور پانی سے باہر گر گیا۔ میں نے بریک لگا کے گاڑی روک لی ورنہ پیچھے والے پہیے بھی اس کی لاش کو دبا کے گزرتے۔

وہ ایک نالے میں گرا تھا۔ پانی اس کی لاش کو ٹھنڈا کرتا ہوا گزر رہا تھا۔ یہ پانی کی گزرگاہ تھی جو برسوں میں تھوڑا سا پھیل کے چھوٹے سے نالے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ ام کی لاش اس میں سیدھی پڑی تھی اور اس پر سے گاڑی کا ایک ہی پہیہ گزرا تھا۔ دوسرے پہیے کو پانی سے گزرتے ہوئے شدید جھٹکا لگا تھا۔

میں نے ہیڈ لائٹ آف نہیں کی اور انجن بھی بند نہیں کیا۔ دور کاروان سے سر نکال کے جھانکنے والے غالب نے مجھے اترتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے چلا کے کہا "سکندر! کیا ہے؟"

میں نے ہاتھ ہلا کے کہا "ام کی لاش۔"

میں ہیڈ لائٹس کے اجالے میں تھا۔ غالب نے میرے ہاتھ کی حرکت کو صاف دیکھا ہو گا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے پیچھے لڑکی آنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر غالب نے اسے ڈانٹ کر روک دیا۔

میں نے بہتے پانی کے قریب پنجوں کے بل بیٹھ کے ام کی لاش کو دیکھا۔ اس کا ہاتھ پانی سے باہر تھا اور وہ خود ایک فٹ گہرے نالے میں تھا۔ شفاف پانی میں اس کا بے حس و حرکت جسم الٹا پڑا ہوا تھا۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی۔ زخم سے نکلنے والا خون پانی کے ساتھ بہتا جا رہا تھا۔

"کیا اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی؟" غالب نے میرے قریب بیٹھ کے کہا۔

"اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ یہ اسی کا ریوالور ہے" میں نے کہا۔

"ریوالور اس کے پاس!"

"اس نے کسی خفیہ خانے سے نکالا تھا" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ انجن کو چلتا چھوڑ کے میں نے ہیڈ لائٹ بند کی اور گاڑی کو ریورس گیئر میں واپس لے گیا۔ غالب نے یہ فاصلہ پیدل طے کیا۔

میں پھر کاروان میں پہنچا تو مجھے اپنے سامنے برٹ کے علاوہ جینی اور ماریا کے زرد چہرے نظر آئے۔ برٹ اپنے جذبات پر قابو رکھنا جانتا تھا مگر دونوں لڑکیاں ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں جلاد ہوں۔ جو پھانسی کے تختے کا لیور کھینچتا ہے یا فائرنگ اسکواڈ کو اشارہ دیتا ہے یا تلوار اور گلوٹین کو جسم سے روح کا رشتہ منقطع کرنے کا حکم جاری کرتا ہے۔ کامل بے حسی کے ساتھ۔

میں نے چابیاں اوپر اٹھا کے کہا "یہ دیکھو۔ ڈپلی کیٹ چابیاں۔ ان کی مدد سے وہ فرار ہونا چاہتا تھا۔"

میں نے چابیاں ان کی طرف اچھال دیں "جاؤ۔ تم بھی کوشش کرو۔ اور کہیں کوئی ریوالور چھپا رکھا ہے تو نکال لو" میں نے ریوالور انہیں دکھا کے کہا۔

جینی اور ماریا سہم کر برٹ سے چمٹ گئیں۔

"کس کا ہے یہ ریوالور؟" میں نے دہاڑ کے کہا۔

"ام..... ام نے لیا تھا۔ ایک ہندوستانی سے۔ اس کا مقصد صرف اپنی حفاظت کرنا تھا" برٹ نے کہا۔

میں نے آگے بڑھ کے اسے کھینچ لیا "اور یہ بات تم جانتے تھے مگر تم نے مجھے نہیں بتائی۔ کیوں؟"

میرے ایک بھرپور گھونسے نے اسے کاروان کی دیوار پر دے مارا۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔

جینی چلائی "خدا کے لئے اسے مت مارو۔ اس کو چھوڑ دو۔"

ماریا نے لپک کے برٹ کو اٹھایا "اسے بتا دو..... کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔"

برٹ مشکل سے اپنے پیروں پر کھڑا ہوا۔ "مجھے..... صرف اتنا ہی معلوم تھا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ ام نے ریوالور کہاں چھپا کے رکھا تھا۔"

میں نے اس کے دوسرا گھونسا مارا "یہ میں پوچھ سکتا تھا اس سے....."

"اس نے..... منع کر دیا تھا مجھے" برٹ نے کہا "اس نے کہا تھا..... یہ امید کا آخری سہارا ہو گا۔ جو موقع ملتے ہی کام آئے گا۔"

"ہاں۔ دیکھو کیسا زبردست موقع ملا اسے آخر کار۔ اس کی لاش کو دیکھو۔ وہ کیچڑ میں دھنسا ہوا ہے۔ اس کا سر پاش پاش ہو گیا ہے۔ اسی ریوالور کی گولی سے جس کو وہ امید کا آخری سہارا سمجھتا تھا۔ اس کا جسم چھلنی ہو گیا ہے۔ اسی گاڑی کے نیچے آ کے جس میں وہ فرار ہونا چاہتا تھا۔ میں نے خبردار کیا تھا تمہیں کہ چالاک اور بہادر بننے کی کوشش نہ کرنا۔ اس کا انجام برا ہو گا۔"

"ام بدقسمت تھا" برٹ نے کہا۔

"وہ بے وقوف تھا۔ احمق اور پاگل تھا۔"

"ہاں۔ مگر بدقسمتی نے اسے مروا دیا۔ ورنہ احمق اور پاگل ہونے سے فرق نہ پڑتا" برٹ نے کہا۔

"اب آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اپنے دماغ سے فضول جذباتی اور گمراہ کرنے والے خیالات کو خارج کر دو۔ صرف اسی صورت میں زندگی کی امید رکھ سکتے ہو تم کہ میرے وعدے پر اعتبار کرو۔ ام نے اعتبار نہیں کیا تھا۔ اس کا خمیازہ بھگت لیا۔ تمہیں دھوکا دے کر فرار ہونے یا ہم سے دغا کرنے کی کوشش کرو گے تو تمہارے لئے کوئی چانس نہیں ہو گا۔ ایک فیصد بھی نہیں۔ بصورتِ دیگر تمہارا انجام یہ نہیں ہو گا۔ میرا خیال ہے تمہارے سامنے ایک سبق ہے۔ تم زندگی کے لئے چانس لینے کی کوشش ضرور کرنی چاہئے۔ موت کے لئے نہیں۔"

"کیا۔ ام ایک ڈرک....."

"جیو۔ جو چاہو کرو۔ بس خودکشی مت کرو۔ یہ میرا دوستانہ مشورہ ہے۔ دشمن ہونے کے باوجود دے رہا ہوں" میں نے کہا۔

غالب نے گل اور نازو کو بھی بٹھا دیا تھا جو رات کو سونے کے لئے کھول دیے گئے تھے۔ پھر اٹھا کے ادھر کر دیے گئے تھے۔ ہم آمنے سامنے دو بنچوں پر ایک دوسرے کے مقابل اور بہت قریب تھے مگر ام کی لاش جیسے ہمارے درمیان آ گئی تھی۔ عدم اعتماد کی فضا میں عداوت کا زہر گھل گیا تھا۔

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ اب کسی کے سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نازو خود ہی کافی بنانے کے لئے اٹھ گئی۔

غالب نے کہا "فائرنگ کی آواز بہت دور تک سنی گئی ہو گی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ رات کی گرج چمک کے بعد یہ سکوت بھی زیادہ گہرا ہے۔ میرا خیال ہے اجالا پھیلنے سے پہلے ہم نکل جائیں۔"

"نکل کے کہاں جائیں؟ کھلی جگہ میں اپنے آپ کو دشمن کی نظر میں عیاں کر دیں؟" غالب بولا۔

میں نے کہا "یہ نہ ہو وہ آواز کی سمت میں بڑھتے ہوئے یہاں آ جائیں۔ پھر نکلنے کے راستے بھی نہ رہیں۔"

"کیوں نہ ہم اس گاڑی کو اور کاروان کو یہاں ایسے ہی چھوڑ جائیں؟" نازو نے کہا۔

"یہ تجویز اچھی ہے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "پھر ان کا کیا ہو گا۔ یہ ساتھ چلیں گے

www.paksociety.com

ہمارے؟"

گل نے کہا "اور ہم کیا پیدل جائیں گے؟"

"نہیں۔ ٹیکسی منگوا لیتے ہیں" نازو نے زور سے کہا۔

گل جھینپ کر مسکرانے لگی۔

میں نے کہا "ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم انھیں بھی ساتھ رکھیں۔ مگر یوں قافلے کی صورت میں سفر کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ ہم اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں کسی بھی طرح۔ ان کے ساتھ مسائل بڑھ گئے ہو جائیں گے۔ انھیں بھی خاموش رکھنا اور تعاون پر مجبور کرنا آسان نہیں ہوگا۔ کہیں نہ کہیں انھیں موقع مل جائے گا۔"

"پھر کیا انھیں بھی؟ ٹام کے ساتھ..."

میں نے کہا "نہیں یار۔ ایسے قتل نہیں کر سکتے ہم۔"

"انھیں ایسے ہی چھوڑ دیا تو یہ خطرہ بھی بن سکتے ہیں ہمارے لئے۔"

میں نے کہا "یار اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ انھیں ناک آؤٹ کر کے یا باندھ کے ڈال جائیں۔"

"اگر کوئی ادھر نہ آیا تو یہ بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔" گل نے کہا۔

"اور اگر ہوش میں آنے کے بعد گاڑی لے کر ہمارے پیچھے چل پڑے..." نازو نے کہا۔

"تم کافی بولڈ خاموشی سے" غالب نے اسے ڈانٹا "مردوں کی بات میں دخل دینے سے ہزار بار منع کیا ہے۔"

"لیکن یہاں تو تم لوگ باتیں کر رہے ہو" نازو نے پلٹ کے کہا۔ گل ہنسنے لگی۔

اس سے پہلے کہ غالب اس بے عزتی کا بدلہ لیتا میں نے اسے روک دیا "بھائی صاحب! ادھر۔ میری طرف رکھیں اپنا روئے سخن۔ جذبات پر قابو رکھیں۔"

"خاتون بھی زبان پر قابو رکھیں" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "ہم گاڑی کو ناکارہ کر جائیں گے۔ تار نکال لیں گے۔ پٹرول بہا دیں گے اور ٹائر فلیٹ کر دیں گے" میں نے کہا "ان کا سب کیش اور پاسپورٹ ہمارے قبضے میں ہوں گے۔ ہم انھیں سمجھا کے جا سکتے ہیں کہ اسی جگہ انتظار کریں۔ کوئی ان کی مدد کرنے والا ضرور آئے گا۔ ہم کسی کو بھیج دیں گے۔ وہ پاسپورٹ بھی دے جائے گا اور نقد رقم بھی۔ اگر یہ لوگ یہاں سے چلے تو نقصان انہی کا ہوگا۔"

"گریٹ آئیڈیا" غالب نے نازو سے کافی لیتے ہوئے کہا "اس پر عمل درآمد میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔"

میں نے کہا "تاخیر کیوں ہوگی۔ بس کافی پی کے چلتے ہیں۔"

"کہاں اور کس طرف یہ بھی سوچنا چاہئے" نازو نے کہا۔

"ہم چلتے ہیں۔ تم بیٹھ کے سوچو۔ جب سوچ لو تو روانہ ہو جانا" غالب نے کہا "کوئی جلدی نہیں۔ خوب غور کرو۔"

نازو نے برا منا کے کہا "کوئی غلط بات کی ہے میں نے؟"

"کون ناز کر سکتا ہے تمہیں غلط۔ کم سے کم میں یہ گستاخی نہیں کر سکتا کہ تمہارے سامنے سچ بولوں" غالب نے کہا۔

"یعنی سب جھوٹ بولتے رہے ہو آج تک؟"

"بالکل۔ مگر اسے بھی سچ مت سمجھنا" غالب نے کہا۔

نازو میری طرف متوجہ ہو گئی "اگر انھوں نے تمہاری بات نہ مانی۔ اور یہاں سے چل پڑے ہمارے پیچھے۔"

میں نے ہاتھ پھیلا کے کہا "ان کی مرضی۔ ہمارے ہاتھ لگ گئے تو ہم نہیں چھوڑیں گے۔ لوگوں کے ہاتھ لگے تو وہ نہیں چھوڑیں گے۔ رائے عامہ ان آوارہ گردوں کے سخت خلاف ہے۔ انھیں جاسوس، منشیات فروش اور خارش زدہ کتے سے زیادہ قابل نفرت سمجھا جاتا ہے۔ پولیس نے پکڑ لیا بغیر پاسپورٹ کے تو جیل جائیں گے۔ یہ سب میں انھیں اچھی طرح سمجھا دوں گا۔"

جین، ماریا اور برٹ پیچھے کے بعد زیادہ افسردہ ہو گئے تھے اور آہیں بھر کے ٹام کو یاد کر رہے تھے۔ وہ جیسا بھی تھا ان کا ایک شریک سفر تھا جو اچانک دیار غیر میں ان کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ ان کی نظریں بار بار کھڑکی سے اس طرف دیکھتی تھیں جہاں اندھیرے میں ٹام کی لاش پر سے بارش کا پانی گزر رہا تھا۔ وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ دعائے مغفرت کے وہ قائل نہ تھے۔ تدفین اور آخری رسوم کی ادائیگی ممکن نہ تھی۔ انھیں اس کی لاش کو اسی جگہ اسی حالت میں چھوڑ کے جانا تھا۔ تمام عمر یاد رکھنے کے لئے ایک دل سوز خیال کا نقش ان کے ذہنوں میں محفوظ ہو چکا تھا۔

جب میں نے انھیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ سراسیمہ ہو گئے۔

"ایسا مت کرو۔ ہم تمہارے ساتھ چل سکتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "تمہارے دوست کی بے وقوفی کے بعد یہ ممکن نہیں رہا۔ ہم صرف اپنے تحفظ کی ذمے داری اٹھا سکتے ہیں، تمہاری نہیں۔ تمہارے ساتھ ہونے سے صرف خطرات کے بوجھ میں اضافہ ہوگا۔"

برٹ نے کچھ دیر بعد کہا "آخر ہم کب تک اس نامعلوم شخص کا انتظار کریں گے جو ہمارے پاسپورٹ اور نقد رقم لائے گا۔"

میں نے کہا "آج شام تک یا کل صبح تک۔ یا کل شام تک۔ اس سے زیادہ نہیں۔ جیسے ہی کوئی بھروسے کا آدمی ملا ہم اسے بتا دیں گے کہ تم کہاں ہو۔"

"بھروسے کا آدمی کیسے تلاش کرو گے تم؟ کسی کی صورت پر لکھا ہوا نہیں ہوتا کہ وہ بھروسے کے قابل ہے یا نہیں... اور تم نے اتنی نقد رقم دو گے وہ بدل گیا تو؟ تمہارا بھی نقصان اور ہمارا بھی۔"

میں نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا "یہ سب کچھ سوچ لیا ہے ہم نے۔ سوچے سمجھے بغیر ہم کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ تم صرف اپنی حد تک سوچو۔ تم کو اسی جگہ رک کر انتظار کرنا ہوگا۔"

برٹ نے کندھے ہلا کے مجبوری اور بے بسی کا اظہار کیا "کیا کر سکتے ہیں اس کے سوا ہم۔ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ تم پر اعتبار کرنا بھی خطا ہے۔"

میں نے برٹ کی بات غالب کو بتائی تو وہ بھی سوچ میں پڑ گیا "یہ تو اس نے ٹھیک کہا ہے۔ آدمی کتنا بھی بھروسے کے قابل کیوں نہ ہو، پچاس ہزار اس کے حوالے کریں گے تو وہ سیدھا اپنے گھر جائے گا۔ ادھر کیوں آئے گا وہ۔"

نازو نے کہا "اور وہ ہوگا کون؟ ہم تو کسی کو بھی نہیں جانتے۔"

میں نے کہا "ایک طریقہ ہے۔ فرض کرو ہم اپنے اس نامہ بر کو کچھ نہ بتائیں۔ بس ایک بنڈل اس کے حوالے کر دیں اور کہہ دیں کہ فلاں جگہ لے جاؤ، جہاں کچھ غیر ملکی بیٹھے ہیں۔ وہ انعام دیں گے ایک ہزار روپے۔ کسی غریب فاقہ کش یا دیہاتی کے لئے ایک ہزار رقم بہت بڑا انعام ہے۔"

"اور اگر اس نے پیکٹ کھول کے دیکھ لیا۔ تجسس آدمی کو ورغلاتا ہے اور شیطان بہکاتا ہے" غالب نے کہا۔

"یار تم لوگ ادھر ادھر کی بہت سوچتے ہو۔ کچھ اپنے دماغ کو بھی تکلیف دے لیا کرو۔ ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔ ہم پیک دیتے وقت سمجھا سکتے ہیں کہ اس میں زہریلے سانپ یا بچھو ہیں اور یہ غیر ملکی جنگل میں ریسرچ کر رہے ہیں ایسے ہی جانوروں پر۔ کون ہمت کرے گا پیکٹ کھولنے کی" میں نے کہا۔

"ویری گڈ باس۔ اور کوئی سوال نہیں۔ کیا ہم رخت سفر باندھ لیں؟" غالب نے کہا۔

"بالکل باندھ لو۔ جو چیز کام کی ہو ضرور لے لو لیکن یہ یاد رکھو کہ ہمیں پیدل چلنا ہے۔ نہ جانے کب تک اور کہاں تک۔ ہم بوجھ نہیں ڈھو سکتے۔"

اسباب سفر کا انتخاب گل اور نازو نے کیا۔ میں نے اور غالب نے تخریبی کارروائی کی۔ سب سے پہلے میں نے اسٹیشن ویگن کا بونٹ کھول کے ڈسٹری بیوٹر کیپ اتار لیا۔ اس کے ساتھ ہی پلگ تک جانے والے تمام تار آ گئے۔ احتیاطاً مزید احتیاط کی خاطر میں نے اس کا روٹر بھی نکال لیا۔ غالب نے چاروں پہیوں کی ہوا نکالی۔ صرف دو پہیوں کی ہوا نکال دینا بھی کافی تھا مگر میری طرح وہ بھی احتیاط در احتیاط کے اصول پر عمل کر رہا تھا۔ ٹائروں سے نکلنے والی ہوا کی تیز آواز سے میرے کان خراب ہونے لگے تھے۔

غالب نے کہا "بچپن میں بڑا مزہ آتا تھا اگر کبھی موقع مل جاتا تھا کسی گاڑی کی ہوا نکالنے کا۔ ہمارے گھر ایک بہت موٹا شخص آتا تھا۔ اس سے زیادہ موٹا آدمی میں نے پھر کہیں نہیں دیکھا..... پتا نہیں وہ کون تھا۔ وہ ہمیشہ رات کو بہت دیر سے آتا تھا۔ اور پھر بہت دیر تک بیٹھتا تھا۔ میری ماں اس سے بہت تنگ تھی۔ اسے رات کو جاگنے بھی بار بار چائے بنانی پڑتی تھی۔ ابا پتا نہیں کیوں اسے برداشت کرتے تھے۔ ماں کی مدد ہم نے کی اور ایک بار اس کی گاڑی کی ہوا نکال دی۔ اگلے دونوں پہیوں کی۔ ایک ٹائر بدلنا بھی اس کے لئے کم عذاب نہ تھا۔ وہ بھینسے کی طرح ہانپنے لگا اور اس کے لئے جھکنا، جھک کر جیک لگانا، جیک کو گھمانا اور وہیل کھولنا سب..... مشکل کام تھے۔ اس رات وہ پیدل واپس گیا۔ ان کو گالیاں دیتا ہوا جو اس کی کمینگی کے ذمے دار تھے۔ اندر ہم معصوم بچے سوتے رہے اور اس کی بک بک سن کے منہ دبا کے ہنستے رہے۔"

"تم جمع کا صیغہ استعمال کر رہے ہو" میں نے کاربوریٹر کے آگے سے پٹرول لائن کو الگ کرتے ہوئے کہا اور پٹرول کو زمین پر پتلی سی دھار کی صورت میں بہتا ہوا دیکھتا رہا "اور کون تھا تمہارے ساتھ؟"

"میرا ایک بھائی تھا۔ بعد میں مر گیا تھا۔ ہم نے ایسا کئی بار کیا تو وہ سمجھ گیا۔"

"آواز نہیں پہنچتی تھی اس کے کانوں تک؟"

"تم نے دوبارہ کنٹونمنٹ کا گھر تو دیکھا تھا۔ بہت بڑا بنگلہ تھا۔ اور وہ گاڑی سڑک پر کھڑی کرتا تھا۔ اس کی گاڑی بہت بڑی تھی اور نا اہل موٹاپے کے باعث وہ اسے تیزی سے موڑ کے گیٹ سے گزار نہیں سکتا تھا جہاں چہ دوبار گیٹ توڑ چکا تھا۔ باہر سے گھر میں اندر ڈرائنگ روم کے بند دروازے کے پیچھے ہوا نکلنے کی آواز کیسے پہنچ سکتی تھی۔ اماں کو بھی معلوم نہیں تھا ورنہ مہمانوں کے ساتھ ایسی بد سلوکی پر ہمیں سخت سزا ملتی۔ ابا تاڑ گئے تھے مگر وہ انجان بنے رہے ہاں کبھی ہم رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے تو وہ ہماری کھال میں بھس بھر دیتے۔"

جب ہوا ختم ہو گئی اور پٹرول بھی ختم ہو گیا تو میں نے برٹ سے کہا "ہم ہوا بھرنے والا پمپ بھی لے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ" میں نے ڈسٹری بیوٹر کیپ کی نمائش کی "یہ سب تمہیں کل تک واپس مل جائے گا۔ جو شخص بھی یہ پیکٹ لائے اسے ایک ہزار بطور انعام بخشش دینا۔ اگر زیادہ دینا چاہو تو تمہاری مرضی۔ ایک ہزار ہم چھوڑ جائیں گے تمہارے پاس۔"

"کوئی پاگل ہوگا جو پیکٹ لائے گا" برٹ بولا۔

"ہم اسے بتائیں گے کہ اس پیکٹ میں خطرناک زہریلے سانپ ہیں اور تم لوگ ان پر ریسرچ کے لئے یہاں بیٹھے ہو۔ اس طرح وہ پیکٹ کھولے گا نہیں۔ سارا وزن تمہارے پمپ کا ہوگا یا پچاس ہزار کے نوٹوں کا۔ گاڑی کے تار اور پاسپورٹ تو ایسے ہی ہیں۔ تاہم اپنے نجات دہندہ کو تم اس کی محنت کا صلہ ضرور دینا۔ کیا پتا وہ کہاں سے آئے گا۔ اور اب ہمیں اجازت دو۔ صبح ہونے والی ہے۔ امید ہے اور خدا سے دعا ہے کہ ہماری ملاقات پھر نہ ہو۔"

"آمین" برٹ نے تلخی سے کہا "میری دعا یہ بھی ہے کہ خدا تم کو اس ظلم کی سزا دے جو تم نے ہم پر روا رکھا۔"

"خدا بڑا نا شاید نہ تھے۔ وہ خود بہت انصاف پسند ہے اور

www.paksociety.com

دلوں کے بھید جانتا ہے" میں نے کہا۔

ہم روانہ ہوئے تو وہ عجیب منظر تھا۔ آسمان پر بادل چھٹ رہے تھے اور مشرق کی طرف سے نکلنے والے سورج کی کرنوں نے ان میں شفق رنگ بھر دیا تھا۔ آشیانوں میں رات بھر سہمے رہنے والے طیور دن کے اجالے کو خوش آمدید کہتے ہوئے فضا میں پرواز کر رہے تھے اور اپنے بھیگے پروں کی طاقت پرواز بحال کر رہے تھے۔ نیچے درختوں سے اب بھی بارش کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ کہیں کہیں گڑھوں میں بھرا ہوا پانی باقی تھا۔ اس ندی یا نالے میں بھی پانی کی روانی نہ رہی تھی جس میں نام گرا تھا۔ اس کی لاش ابھر کر سامنے آ گئی تھی اور اکڑ چکی تھی۔

ہم نے اسٹیشن ویگن اور جیپ پر جو شاخیں بچھائی تھیں وہ طوفانی ہوا سے اڑ گئی تھیں مگر اس سے زیادہ ٹوٹے ہوئے پتے ایک سبز چادر کی طرح چھت کی گیلی سطح پر چپکے رہ گئے تھے۔ گل نے ایک تھیلے میں سامان خورد و نوش بھرا تھا اور چند دوائیں ڈال لی تھیں۔ دوسرے تھیلے میں نازو نے نقد رقم، اسلحہ اور ڈائری رکھا تھا۔

میں نے کہا "ایک بار پھر سمجھ لو۔ اگر تم نے ہمارا تعاقب کیا تو ہم تمہیں شوٹ کر دیں گے۔ تمہیں ہمارے بارے میں کسی کو کچھ بتانے کا صرف نقصان ہوگا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم پھر تمہیں تلاش کر لیں۔ ورنہ کچھ نہیں ہوگا۔ کل تم پھر اپنی مرضی سے جہاں چاہو گے جا سکو گے۔"

"اگر نام بچ جاتا تو ہم تمہیں معاف کر دیتے اور سب کچھ بھلا کے دوستوں کی طرح خدا حافظ کہتے" ماریا نے تلخ لہجے میں کہا "لیکن اب میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی منحوس صورت کے ساتھ جتنی جلدی دفع ہو جاؤ اتنا ہی اچھا ہے۔ تاکہ میں سکون سے سانس لوں۔"

میں نے کہا "نام نے اپنی بے عقلی سے خودکشی کی۔ اس کی لاش کو درس عبرت سمجھنا اور زندہ رہنے کی کوشش کرنا۔"

نازو کا بیگ میں نے اٹھا لیا اور گل کا بیگ غالب نے۔ پانی اور کیچڑ سے بچتے ہم درختوں کے درمیان سے راستہ بناتے بڑھتے گئے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اب برٹ ہمارے پیچھے نہیں آئے گا۔ اب وہ اکیلا مرد تھا۔ جین اور ماریا اسے مرنے نہیں دیں گی۔ وہ خود بھی نام کی طرح شعلہ مزاج نہیں تھا۔

ہمارے حلیے کسی طرح بھی ان بدبخت آوارہ گردوں سے کم خراب نہ تھے۔ میری اور غالب کی داڑھی کے اور سر کے بال الجھے ہوئے تھے۔ ہم نے ایک مدت سے حجامت نہیں کرائی تھی اور شیو نہیں کی تھی۔ میں نے اور غالب نے برٹ اور نام کے فل بوٹ پہن لئے تھے جو بہت بھاری تھے مگر اس وقت ہمارے پیروں کو کیچڑ اور پانی سے بچا رہے تھے۔ ہماری پتلونیں پھٹی تھیں اور قمیصوں کو جسم سے جدا ہوئے زمانہ ہو گیا تھا۔ نازو اور گل کا حسن بھی سختی حالات اور درماندگی کا شکار تھا۔ ان کے چہرے خشک اور کملائے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں بھی پتلون پہننے کا مشورہ دیا تھا مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا اور دیہاتی عورتوں کی طرح بستر کی ایک چادر کو دھوتی کی طرح باندھ کر ترجیح دی تھی۔ دھوتی پر جین یا ماریا کا اسکرٹ نہیں پہنا جا سکتا تھا چنانچہ انہوں نے بھی مردانہ قمیص پہن کر دوسری چادر ایسے لپیٹ لی تھی کہ اس وضع قطع میں کسی کو بھی اجنبیت محسوس نہیں ہو سکتی تھی۔

تقریباً ایک فرلانگ دور آ جانے کے بعد غالب نے کہا "یار کیا خیال ہے، میں واپس جا کے انہیں دیکھ آؤں؟"

"کیسے جاؤ گے واپس؟" گل نے کہا۔

"چھپ چھپا کے۔ پتا تو چلے وہ کیا کر رہے ہیں۔"

"اور واپسی کا راستہ بھول گئے پھر؟" نازو نے کہا۔

"تمہارے تصور کو ذہن میں رکھ کے چلتا رہوں گا۔ میرا دل ایک قطب نما ہے اور تمہارا خیال وہ سوئی جو ہمیشہ ایک ہی سمت میں رہتی ہے۔ جدھر تم رہتی ہو" غالب نے کہا۔

نازو کا چہرہ اندرونی مسرت سے روشن ہوا۔ پھر گل ہنسی تو اس کی روشنی میں گلابی رنگ شامل ہو گیا "چلو جاؤ۔ فضول باتوں میں جواب نہیں تمہارا بھی" اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

غالب گیا اور بیس منٹ میں لوٹ آیا "سب ٹھیک ہیں۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھ لیا ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "اس کا مطلب ہے خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

اسی وقت آسمان سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے نازو کا ہاتھ پکڑا اور غالب نے گل کو کھینچا۔ ہم سمٹ کر ایک گھنے درخت کے تنے سے چمٹ گئے۔ میں نے ایک شاخ کو ہاتھ بڑھا کر نیچے جھکا لیا۔ پھر غالب نے دوسری شاخ کو کھینچ لیا اور ہمارے سامنے بھی ہریالی آ گئی۔ ہیلی کاپٹر کی پھٹ پھٹ واضح ہو گئی تھی۔ اوپر نیلے آسمان کو دھوپ نے روشن کر دیا تھا۔ ہیلی کاپٹر کسی دیو ہیکل سفید پرندے کی طرح پر پھڑپھڑاتا ہمارے اوپر سے گزرا۔

"یہ ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے" گل نے کہا۔

"کیا پتا۔ ہیلی کاپٹر ویسے بھی پھرتے رہتے ہیں" غالب نے اسے تسلی دینے کے لئے کہا۔

"مگر صبح صبح" نازو نے کہا۔

"ہم تو شاید نظر نہ آئیں... مگر اسٹیشن ویگن اور وہ کاروان نظر آ جائیں گے" میں نے کہا۔

"ابھی ہم زیادہ دور بھی نہیں ہیں" گل نے کہا۔

"مگر ہیلی کاپٹر دوسری طرف گیا ہے" غالب نے کہا۔

"اگر یہ ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے تو پتا چل جائے گا۔ ہیلی کاپٹر پھر آ جائے گا" میں نے کہا۔

ہم آدھا گھنٹا وہیں کھڑے رہے۔ میں نے اور غالب نے شاخوں کو چھوڑ دیا تھا اور خود کو چھپانے کے لئے قریب ہی دوسری

جگہ تلاش کی تھی۔ یہ دو درختوں کے ملنے سے بن جانے والی قدرتی چھت تھی۔ ہم ہیلی کاپٹر کی آواز پر کان لگائے منتظر رہے اور آدھے گھنٹے بعد پھر روانہ ہو گئے۔

چلتے چلتے دو گھنٹے گزر گئے تو سب پر تھکن طاری ہونے لگی۔ دھوپ نے جنگل میں شدید حبس پیدا کر دیا تھا۔ اور گیلی زمین سے اٹھنے والے بخارات بھی ہمارے جسموں پر پسینہ بن کے بہنے لگے تھے۔

آخر کار نازو نے کہا "آخر ہم جا کدھر رہے ہیں؟"

میں نے کہا "مشرق کی طرف۔"

"جدھر مشرقی پاکستان ہے" غالب نے کہا۔

"غلط۔ وہ ہمارے مغرب میں ہے۔"

"کہیں بھی ہو۔ کیا پیدل جائیں گے وہاں تک" نازو جھنجھلا کے بولی اور وہیں بیٹھ گئی۔ مجبوراً گل بھی رک گئی۔

"اچھا بھئی۔ تمہارا اور ہمارا ساتھ یہیں تک تھا" غالب نے اس سے مصافحہ کر کے کہا "ہم ناک کی سیدھ میں چلتے رہے تو دنیا کا چکر لگا کے ادھر سے آئیں گے۔ دوسری طرف دیکھتی رہنا۔"

نازو نے مصافحے کے بعد اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا اور اسے ایک جھٹکا دے کر زمین پر لٹا دیا "اب ناک کی سیدھ کیا ہے؟"

"عالم ارواح" غالب نے آسمان کو تکتے ہوئے کہا "چلو یہاں نہ سہی وہاں ملیں گے۔"

میں نے ایک صاف جگہ دیکھ کر بیگ رکھ دیا "گل ہم اس طرف سے آئے تھے۔ اب مخالف سمت میں جانا ضروری ہے۔"

نازو نے کہا "اس طرح کہاں پہنچیں گے۔ یہ سوچنا ضروری نہیں؟"

"اب سوچتے ہیں عزیزہ۔ تم کوئی ٹھنڈا مشروب پلا سکتی ہو مسافروں کو؟" میں نے سگریٹ سلگا کے کہا۔

"بریک فاسٹ کا ٹائم ہے۔ ناشتا کراؤ بیس منٹ کے اندر اندر" غالب نے ڈانٹ کر کہا۔

"کیا کھائیں گے سرکار ناشتے میں؟" نازو نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

"یہی جو دستیاب ہے۔ گھاس پھونس۔ آب و ہوا۔ دھوپ کے دھکے وغیرہ وغیرہ۔ جو نصیب میں ہیں۔"

"میں تھرماس بھر لائی تھی" گل نے سادگی سے کہا "بیگ میں ہے۔"

"اچھا۔ یہ تو کمال کر دیا تم نے مس گل ناز" غالب نے بیگ کھول کے تھرماس نکالتے ہوئے کہا "تم ہو ایک بے حد سلیقہ شعار اور دوسروں کا خیال رکھنے والی لڑکی۔ ان کی طرح نہیں جو ہر وقت ہاتھ پھاڑ کھانے کو دوڑتی ہیں یا ناریل سے بدمعاشی کے جوہر دکھاتی ہیں۔ اللہ تمہیں جنت میں جگہ دے۔"

"میرے مرنے کی دعا کر رہے ہیں۔"

"بھئی مرنا تو سب کو ہے۔ پہلے سے بکنگ کرا رہا تھا تمہاری۔ ویٹنگ دعا اب یہاں تک کہ تمہیں مثالی شوہر ملے۔ مثال تو خیر یہاں مگر مجھ سے بھی اچھا ہو" غالب نے ایک پیک گھونٹتے ہوئے کہا "واہ واہ۔ اس وقت دل سے دعا نکلی ہے تمہارے لئے۔"

"بہت سے تنگ ہو گئی" نازو نے کہا "کھانے کی چیز لی ہے نا۔"

میں نے دوسرے تھیلے میں سے زیور اور نکالے اور سب میں تقسیم کرائے "سب کو اپنی حفاظت کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔"

غالب نے مجھے گرم کافی کا مگ دیا اور بسکٹوں کا پیکٹ کھول کر سامنے رکھ دیا۔ میں اس وقت بیگ میں سے نکلنے والے پاسپورٹ دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے نام کا پاسپورٹ تھا اور اس کی تصویر۔ پہلے کبھی مجھے کسی کے پاسپورٹ کو چیک کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور میں نے اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ اچانک میری نظر پاسپورٹ کے اندراجات پر رک گئی۔

"مرزا جی! یہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"اگر آپ کی نظر نام کی روح کو دیکھ رہی ہے تو میں کیا بتاؤں۔ مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا ہے سوائے پاسپورٹ کے۔"

"پاسپورٹ میں نام کا نام کچھ اور ہے۔"

"نام ذکی یا ذکری۔ اردو میں کہتے ہیں امرا غیرا یا نتھو خیرا۔" غالب نے کہا "نام میں کیا رکھا ہے۔"

میں نے پاسپورٹ اس کی طرف پھینک دیا "خود ملاحظہ کرو" میں نے کہا اور دوسرا پاسپورٹ کھول لیا۔

غالب نے کہا "یہ تو واقعی گڑبڑ ہے۔ نام انگریز تھا نہیں۔ اس کا باپ انگریز نہیں ہو سکتا۔"

"باپ کیوں نہیں ہو سکتا؟" نازو نے کہا۔

"اگر ہوتا تو نام تھوڑی بہت انگریزی ضرور سمجھتا۔ اس نے تو خود کو جرمن یا اطالین بتایا تھا اور یہ پاسپورٹ لندن کا ہے۔"

میں نے کہا "تاریخ پیدائش دیکھو۔ اور یہ دوسرا پاسپورٹ برٹ کا ہے۔ یہ بھی جعلی ہے۔"

"جعلی ہے! تم نے کیسے شناخت کر لیا؟" نازو بولی۔

میں نے کہا "یہ دونوں پاسپورٹ دو بھائیوں کے ہیں۔ البرٹ ہارڈ اور ٹریور ہارڈ۔ ولدیت ایک ہے۔ تاریخ پیدائش میں چار سال کا فرق ہے لیکن رہائش کا پتا ایک ہے۔ دیکھو۔"

غالب نے دوسرا پاسپورٹ بھی لے لیا "زبردست جعلسازی ہے یہ تو۔ مسٹر شرلاک ہومز۔ آخر اصل افراد کہاں ہیں؟"

"یہ آپ معلوم کریں ڈاکٹر واٹسن" میں نے کہا "میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پاسپورٹ چرا کے تصویریں بدلی گئی ہیں۔"

دونوں پاسپورٹ اب نازو اور گل کے زیر مطالعہ تھے اور وہ خالص زنانہ انداز میں ہائے اور اوئی کے ساتھ اس پر حیرت سے بھرپور اظہار خیال کر رہی تھیں۔ میں نے پانی اور پاسپورٹ نکالے۔

www.paksociety.com

"یہ انتہائی پیچیدہ، پُراسرار اور سنسنی خیز کیس تھا جو میں نے حل کرلیا ہے۔ ڈاکٹر واٹسن" میں نے شرلاک ہومز کی طرح تبصرہ کیا۔ "میرے مشاہدے کی تفصیل یہ ہے کہ سب پاسپورٹ ایک وقت میں ایک ہی جگہ سے حاصل کئے گئے۔ کیوں کہ یہ ایک ہی فیملی کی ملکیت ہیں۔ اس میں دو خواتین کی تصویریں بھی بدلی گئی ہیں جو ان بھائیوں کی بیویاں رہی ہوں گی۔"

"تمہیں کیا مطلب، پاسپورٹ نہ رہے تو بیوی بہرحال بیوی رہتی ہے۔" غالب نے کہا۔

"پیٹی ایلیمنٹ اور سوہن ٹرایو۔ واقعی" غالب نے کہا "کاش یہ بات پہلے معلوم ہو جاتی۔"

"پھر کیا ہوتا؟" نازو نے کہا۔

"پھر یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ نام اور ولدیت کی اصلیت کیا ہے اور وہ لڑکیاں کون ہیں۔"

"ان کی اصلیت تو دیکھ چکے ہیں ہم" میں نے کہا۔

"ان سے پوچھا جا سکتا تھا کہ پاسپورٹ انہوں نے کیسے حاصل کئے۔ لندن میں اس فیملی سے بیچے تھے یا یہاں کسی سے خریدے تھے۔ کیا وہ فیملی بھی کہیں دوران سفر لٹی تھی......"

"چھوڑو ان باتوں کو۔ کہاں تک مفروضات قائم کریں گے ہم۔ اس کی تو نہ حد ہے نہ حساب۔ صرف کمال فن کو دیکھو۔ کسی نے کتنی مہارت سے تصاویر بدلی ہیں۔"

"یہ کسی پروفیشنل کا ہی کام ہوگا۔ جعل سازی کے دھندے کرنے والے ہر جگہ ہوتے ہیں" غالب نے کہا۔

"یہاں بھی ہوں گے۔ بھارت دیش میں بھی" میں نے کہا۔

غالب نے ایک نعرہ لگایا "سمجھ گیا میں استاد۔ تصویریں پھر بدلی جا سکتی ہیں۔"

"ہاں۔ ان کی جگہ ہم لے سکتے ہیں۔"

"مگر وہ انگریز تھے۔ میرا مطلب ہے سفید فام" نازو نے کہا۔

"ہم کون سے کالے ہیں۔ اور رنگ بدلنا تو گرگٹ کو بھی آتا ہے۔ ہمارے لئے ولایتی بننا کیا مشکل ہے؟" میں نے کہا۔

"وہی ال کرواتی بنانے میں ہمارا جواب نہیں" غالب بولا۔

"وہ انتظار کریں گے۔ اور کرتے رہیں گے۔"

غالب نے ایک قہقہہ مارا "یقین بھی بعض اوقات کتنا غلط ہوتا ہے۔ وہ مطمئن تھے کہ پاسپورٹ واپس مل جائیں گے۔ ہماری نظر فرق کو نہیں دیکھے گی۔ حالانکہ یہ نظر کا نہیں عقل کا مسئلہ تھا۔"

اس انکشاف کے ساتھ ہی کہ پاسپورٹ کسی اور کے ہیں جن پر اپنی تصویریں لگا کے وہ اور اس کے ہم سفر دنیا گھوم رہے تھے، میرے ذہن میں بہت سی کہانیاں گردش کرنے لگی تھیں۔ شاید ان کا جرم اتنا ہی تھا کہ انہوں نے پاسپورٹ بدلوائے تھے مگر سوال یہ تھا کہ کیوں؟ یورپی ممالک میں پاسپورٹ کا حصول کوئی مشکل کام نہیں جیسا کہ ہمارے ملک میں ہے۔ تصدیق و تفتیش کے مراحل میں الجھا کے سرکاری اہلکار ضابطے کی کارروائی اس وقت تک پوری نہیں ہونے دیتے جب تک کہ درخواست دینے والا چکر کھا کر پریشان نہ ہو جائے اور انہیں نذرانہ پیش کرکے جان نہ چھڑالے۔ نام اور ولدیت کو اپنی شناخت چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر ان کے اصل پاسپورٹ کھو جاتے تو ان کے سفارت خانے بڑی مستعدی کے ساتھ انہیں فوراً ڈپلیکیٹ جاری کر دیتے۔ کیا وہ بھی مجرم تھے؟ مجرم تھے تو ان کا جرم کیا تھا، یہ بات ناقابل فہم تھی کہ محض پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے انہوں نے چار افراد کے ایک کنبے کا صفایا کر دیا ہو۔ ابھی تک وہ کسی جیل کے پیچھے نہیں گئے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستان میں تھے جہاں سب چلتا ہے۔ اگر گم ہو جانے یا چوری ہونے والے پاسپورٹ کے بارے میں کوئی رپورٹ برطانیہ کے وزارت داخلہ کے پاس تھی تو اس کا ریکارڈ دنیا کے ہر ملک میں نہیں تھا۔

"اب کس سوچ میں پڑ گئے؟" غالب نے کہا "کیا ان سے کئے ہوئے وعدے کا خیال ستا رہا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ایسے لوگوں سے کیا ایفائے عہد۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟"

"وہ بھی ہماری طرح ہی تھے۔ بس یہ بات ذرا دیر سے معلوم ہوئی۔"

"انہوں نے مدد بہرحال کی تھی ہماری۔"

"صرف پیسے کے لالچ میں۔ یا مجبور ہو کے؟"

"پاسپورٹ نہ سہی یہ رقم انہیں پہنچا دیتے ہم تو اچھا تھا" میں نے کہا "اور مجھے اپنے وعدے کا خیال تھا۔"

"ان کی فکر چھوڑو۔ وہ خود نمٹ لیں گے اپنے مسائل سے۔" غالب نے کہا "یہ پیسہ کب تک ساتھ دے گا ان کا؟ شراب پی کر چند دن میں اڑا دیں گے۔ ان کی زندگی نہ سنورتی نہ سدھرتی۔ وہ جس راستے پر چل رہے ہیں وہ انہیں کسی خوابوں کی جنت تک نہیں پہنچائے گا۔ وہ اپنے اعمال کے جہنم میں ہی جئیں گے اور مریں گے۔"

"مگر یہ گاڑی کا سامان ہے۔ تو انہیں واپس ملنا چاہئے جو ہم زبردستی لے آئے ہیں۔ اس کے بغیر گاڑی ناکارہ ہو جائے گی ان کی۔ پیٹرول تک بہا دیا تھا ہم نے۔ اب ہم محفوظ ہیں تو انہیں مصیبت میں گرفتار رکھنے کا کیا فائدہ" میں نے کہا۔

"اچھا پھر جیسی تمہاری مرضی؟" غالب نے کہا۔

نازو نے میری حمایت کی "ہاں یہ تو بہت ظلم ہوگا ان پر۔ مجرم ہیں یا کچھ اور ہمیں کیا۔"

گل نے کہا "میں تو کہتی ہوں سب لوٹا دو انہیں۔ کیا کریں گے ہم جعلی پاسپورٹ رکھ کر۔ پاسپورٹ ویسے ہی بن جاتے ہیں۔ تھوڑا سا پیسہ خرچ ہوتا ہے۔"

"ان کے یہ برطانوی پاسپورٹ ہیں۔ انڈین نہیں۔ ان کی عزت اور وقعت کو ختم کیا جائے۔ بھارتی پاسپورٹ کے مقابلے میں ان کی وہی حیثیت ہے جو روپے کے مقابلے میں ڈالر کی۔" غالب نے کہا۔

"مگر اس پر نام بھی ولایتی ہے" نازو نے کہا "ہم اپنی صورت بدل سکتے ہیں مگر لہجہ نہیں۔"

"میں تو ایسے فرفر انگریزی بھی نہیں بول سکتی جیسے آپ سب لوگ بول لیتے ہیں" گل نے جھینپ کر کہا۔

"چلو سب کی یہی رائے ہے تو پاسپورٹ بھی واپس کر دیں گے" میں نے کہا "ابھی تو چلو۔"

ایک بار پھر ہم نے سامان سمیٹ لیا۔ جنگل اب چھدرا ہو گیا تھا اور اس میں انسانی قدموں نے برسوں میں جو راستے بنا دئے تھے وہ نمایاں ہونے لگے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم ایک کچی سڑک پر پہنچے۔ اس کی گیلی زمین پر ٹانگوں اور بیل گاڑیوں کے گزرنے سے نالیاں سی بن گئی تھیں۔ یہ تازہ نظر آنے والے نقش تھے۔ گزشتہ رات کی موسلا دھار بارش نے پرانے نقش مٹا دئے ہوں گے۔

ہم نے وہیں رک کے انتظار کیا۔ کچھ دیر بعد ایک بیل گاڑی نمودار ہوئی جس پر کوئی محرابی چھت تھی۔ یہ چھت ہٹائی بھی جا سکتی تھی اور ضرورت کے مطابق اسے مال لے جانے یا مسافر لے جانے کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

قریب آکے بیل گاڑی خود ہی رک گئی۔ اس میں بریک کا تو کار نظام نہیں تھا۔ یہ ڈرائیور اور بیل کے درمیان مکمل ذہنی ہم آہنگی کا نتیجہ تھا کہ بیل اپنے مالک کے دل کی بات سمجھ لیتا تھا۔

اس نے عجیب و غریب اردو ہندی ملا کے سوال کیا تھا جس کا مطلب میں نے یہ نکالا "کہاں جاؤ گے جناب؟"

میں نے کہا "تم کہاں جا رہے ہو؟"

اس نے دانت نکال کے عام فہم زبان میں کہا "ہم تو ہری پور لوٹ کر جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "پہلے اتنی مشکل زبان کیوں بول رہا تھا؟"

اس نے کہا "وہ یہاں کی بولی ہے۔"

میں نے کہا "ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ ناگپور سے چلے تھے۔ راستے میں بارش نے آلیا۔"

"ناگپور سے؟" وہ حیران ہو کے بولا "وہ تو ادھر سے بہت دور ہے۔"

"ضرور ہوگا۔ اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے؟"

"ہم ناگپور نہیں لے جا سکتے آپ لوگاں کو" اس نے بیل کی طرف دیکھا اور بیل اسٹارٹ ہو گیا۔

"ارے بھائی رکو" میں نے کہا "تم ہمیں کہاں پہنچا سکتے ہو؟ ہمیں بس کسی سڑک یا ریلوے اسٹیشن تک لے جا سکتے ہو ہمیں؟ پیسے دیں گے ہم۔"

بیل پھر رک گیا "سڑک جس پر لاریاں چلتی ہیں وہ تو ہے ادھر سے دو میل۔ اور گاڑی پر چڑھنا ہے تو پانچ میل ادھر ہری پور کا اسٹیشن ہے۔ رات کو ملے گی گاڑی اندور جانے کے لئے۔"

"رات تک کوئی ٹرین نہیں؟" میں نے اپنا بیگ اندر رکھا اور گل کو بیل گاڑی میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔

"گاڑیاں تو بہت آتی ہیں۔ لیکن سب گزر جاتی ہیں بغیر رکے" بیل گاڑی والے نے کہا "صبح گیارہ بجے بھی ایک گاڑی اندور سے آتی ہے مگر وہ تو نکل جائے گی۔"

"ہائے۔ گیارہ بجنے والے ہیں" غالب نے بیٹھنے کے بعد کہا۔

"پھر کیا خیال ہے؟ ہری پور جاؤ گے تو سو روپے۔ ورنہ ندی تک پہنچانے کے پچاس روپے" وہ بولا۔

"کوئی ندی بھی ہے یہاں؟"

"ہاں۔ دو میل کے بعد ندی ہے۔ اس کے پار سڑک ہے۔" بیل گاڑی والے نے کہا۔

"اس پر پل بھی ہوگا۔"

"پل بہت دور ہے۔ یہاں کشتی سے ندی پار کرلو" اس نے ہمیں انجان سمجھتے ہوئے مشورہ دیا۔

"تمہارا کون سا گاؤں ہے؟" میں نے کہا۔

"ادھر ہری پور۔ ابھی بتایا تھا آپ کو۔ گاڑی وہیں سے ملتی ہے" وہ بولا۔

میں نے سوچ کے کہا "بہتر تو یہی ہو کہ ہم گاڑی سے جائے۔ مگر دن کہاں گزاریں گے؟"

غالب نے کہا "سارا دن ریلوے پلیٹ فارم پر تو نہیں بیٹھ سکتے۔"

"وہاں بیٹھ کے کیا کرو گے۔ کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں ملے گا" وہ بولا "کوئی بھی نہیں ہوگا اس وقت تو۔"

"گاؤں میں ہے ایسی کوئی جگہ؟"

"میرے گھر چلو۔ رات کو گاڑی کا ٹائم ہوگا اس سے پہلے ہی اسٹیشن پہنچانا میرا کام" وہ بولا۔

ایک گھنٹے بعد ہم اس گاؤں میں پہنچے جو ہری پور کہلاتا تھا۔ معلوم نہیں ہندوستان میں اور کتنے ہری پور ہوں گے۔ ایک ہری پور ضلع ہزارہ میں بھی تھا اور وہاں پاکستان ٹیلی فون انڈسٹری تھی۔ یہ گاؤں اس کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا۔ وہ ڈھائی سو گھروں کی آبادی میں ہماری آمد نے خاصی ہلچل پیدا کی مگر بیل گاڑی والا سادہ دیہاتی تھا اور ہم جیسے مہمانوں کی آمد اس کے لئے باعث عزت تھی۔ اس کی بیوی اور ماں نے سارا دن ہماری خدمت کی۔ ہم نے دن آرام کرتے گزارا۔ شام کو غسل کے بعد ہم کپڑے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے لئے ہمیں جھوٹ پہ جھوٹ بولنا پڑا کہ ہمارے کپڑے گاڑی میں تھے اور گاڑی ناگپور سے آئی تھی واپس چلی گئی۔ ہماری کہانی میں بہت سقم تھے مگر انہوں نے کوئی

www.paksociety.com

جرح نہیں کی اور یہ بات کا صدق دل سے یقین کرتے رہے۔

وہ ایک عام سا گاؤں تھا جہاں کسی بھی مہمان یا اجنبی کی آمد وقتی طور پر تھوڑی سی ہلچل پیدا کرتی ہے۔ چند بچوں نے بیل گاڑی کا تعاقب کیا۔ انہیں بیل گاڑی والے نے بھگا دیا۔ تاہم ان کی زبانی یہ خبر آس پڑوس کے گھروں تک پہنچ گئی۔

بیل گاڑی ایک کچے اینٹوں کے بنے ہوئے مکان کے احاطے میں داخل ہو کے رک گئی۔ احاطے کی دیوار کچی تھی اور مکان کا نصف حصہ زیر تعمیر نظر آتا تھا۔ شاید اس کو پکا کرانے کا تعمیراتی کام مالی وسائل کی کمی کے باعث رک گیا تھا۔

بیل گاڑی سے اتر کے میں نے کہا "یار تم نے مہمان تو بنا لیا مگر میزبانوں کا نام ہمیں ابھی تک نہیں معلوم۔"

"اجیت سنگھ ہے جی میرا نام ---" وہ بولا۔

"یعنی تم سکھ ہو؟" میں نے اس کے حلیے کو حیرانی سے دیکھا۔

"میں پکا سکھ ہوں۔ مگر ماں کہتی ہے کہ میرا ایمان خراب ہو گیا ہے کیوں کہ میں نے کیس کٹوائے ہیں۔ کرپان اور کنگھی بھی نہیں رکھتا۔ کڑا نہیں پہنتا۔ صرف کاچھے کا سکھ رہ گیا ہوں۔ کاچھا تو سب ہی پہنتے ہیں۔ باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ میں گوردوارے بھی نہیں جاتا۔ کیوں کہ جا نہیں سکتا" وہ بولتا رہا اور بیلوں کو کھولتا رہا۔

گل، نازو اور غالب میرے ساتھ ہی اتر آئے تھے۔ اندر سے نمودار ہونے والی ایک بوڑھی اور دوسری جوان عورت حیرت اور تجسس کے ساتھ دور کھڑی ہمیں دیکھ رہی تھیں۔

میں نے کہا "اجیت سنگھ! ہم نہیں چاہتے کہ ہمیں عجوبہ سمجھ کے سارا گاؤں دیکھنے آئے۔ ہم اجنبی انسان ہیں۔"

"لوگ یہاں مہمان کو عجوبہ سمجھ کے دیکھنے نہیں آتے۔ ہاں ملنے آتے ہیں" اجیت سنگھ نے کہا "تم نہیں ملنا چاہتے تو مرضی تمہاری۔ میں منع کر دوں گا۔"

میں نے وضاحت کی "ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔ ساری رات جنگل میں چلتے رہے ہیں۔ ہمیں آرام کی ضرورت ہے اور کوئی بات نہیں۔"

اس نے سر ہلایا اور بولا "تو تمہیں بی بی اور بے بے سے ملا دیں۔"

بی بی بڑی خوب صورت مٹیار تھی اور گاؤں میں رہنے والی کا رکھ رکھاؤ شہری عورت سے مختلف تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ گل اور نازو کو جپھے سے لگایا جیسے وہ پرانی سہیلیاں ہوں۔ مگر بے بے نے انہیں بادل نخواستہ سر پر ہاتھ رکھ کے دعا دی اور اندر چلی گئی۔

اجیت سنگھ بھی بہت تندرست اور جوان آدمی تھا اور کسی طرح بھی دیہاتی نہیں لگتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے شک ہوا کہ اس کا حسن سلوک ظاہر کا پردہ ہے اندر کی بات کو چھپانے کے لئے۔

یہ اندر کی بات کیا تھی؟ اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

اس نے اپنی بیوی سے کہا "یہ مسافر ہیں۔ رات تک ٹھہریں گے۔ رات کی گاڑی سے جالندھر چلے جائیں گے۔"

بے بے نے یہ سب دروازے کے پیچھے سے سنا اور باہر نکل کے کہا "یہ ہیں کون؟"

"تجھے کیا نظر آتے ہیں بے بے؟ انسان یا جن؟"

بے بے نے بگڑ کے کہا "ارے کس دھرم کے ہیں؟ کہیں یہ مسلوں کو تو نہیں لے آیا ہے گھر میں۔"

"مسلے ہوں یا کرسٹان۔ دو وقت کی روٹی کھائیں گے۔ تیرا دھرم خراب نہیں کریں گے۔ زیادہ مت بول" بیٹے نے ماں کو جھاڑ کے کہا۔

"میں روٹی کا انتظام کرتی ہوں" اجیت سنگھ کی بیوی نے کہا۔ ان کے درمیان ساری گفتگو پنجابی میں ہوئی تھی جو ہم سب نے سمجھی تھی۔

اجیت سنگھ پھر ہم سے مخاطب ہو گیا "تم بھی اب ہاتھ منہ دھو آؤ۔ نہانا دھونا ہے تو ادھر پیچھے جگہ ہے۔ ہاتھ کا نلکا چلاؤ اور نہاؤ۔ کپڑے شپڑے بدلو۔"

کمرے میں دو چارپائیاں تھیں۔ ایک پر گل اور نازو لیٹی تھیں۔ دوسری پر میں اور غالب۔ اجیت سنگھ دروازے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اچانک میں نے اس کے بالوں کو دیکھا جو کٹے ہوئے تھے اور ہیئر کٹ نے مجھے چونکا دیا۔ یہ کٹ [illegible] تعلق کو ظاہر کرتا تھا۔ اجیت سنگھ کا رویہ اب مجھے پہلے سے زیادہ پُراسرار نظر آنے لگا۔

وہ بات کرتے وقت دیکھتا ہماری طرف تھا مگر لگتا یوں تھا جیسے اس کا ذہن کچھ اور سوچ رہا ہے۔ اس کی بات چیت کا انداز بھی شہری تھا۔ اس نے پہلے مقامی بولی میں کچھ کہا تھا اور پھر اپنا لہجہ بھی بدل دیا تھا۔ دوسری حیران کن بات یہ تھی کہ اس نے ہم سے کچھ پوچھا ہی نہیں تھا۔ نہ ہمارا نام اور نہ یہ کہ آپس کا تعلق کیا ہے، تم کام کیا کرتے ہیں اور ایسا حلیہ کیوں بنائے ہوئے ہیں۔ سب سے اہم سوال بھی اس نے نظر انداز کر دیا تھا کہ ہم شکاری ہیں تو ہمارے ہاتھ میں بندوق کیوں نہیں اور ہم ناگپور سے جنگل کے راستے نکل گئے تھے تو واپس ناگپور کیوں نہیں جاتے؟ جالندھر کیوں جانا چاہتے ہیں؟

جب گل اور نازو غسل کر کے آ گئی ہوئی تھیں تو میں نے چارپائی پر لیٹے لیٹے کہا "اجیت سنگھ! تم کیا کرتے ہو؟"

"کھیتی باڑی جو باپ دادا کرتے آئے ہیں؟" اس نے گول مول جواب دیا۔

"کھیتی باڑی تو نہیں کرتے تم" غالب نے کہا۔

وہ چونکا "یہ آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"تمہارے لہجے سے، تمہاری باتوں سے اور تمہارے

ہے" میں نے کہا "کیا تم فوج میں ہو؟"

اس نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اقرار میں سر ہلا دیا۔ "ٹھیک پہچانا تم نے۔ میں فوجی ہوں۔ آج کل چھٹی پر ہوں۔"

"چھٹیوں میں بیل گاڑی چلاتے ہو؟" میں نے مذاق میں کہا۔

"اپنی ضرورت کے لئے نہیں چلاتا۔ دوسروں کو ضرورت ہے تو انکار نہیں کر سکتا" وہ بولا۔

"جب تمہاری چھٹی ختم ہو جائے گی تو بیل گاڑی کون چلائے گا؟ بیل کیا کریں گے؟"

"بیل آرام کریں گے یا ہل چلائیں گے۔ گاڑی کھڑی رہے گی۔ ابا یا بے بے کو کہیں آنا جانا ہوگا تو کام آئے گی۔" وہ بولا۔

"کون لے جائے گا انہیں؟"

"بہت لوگ ہیں۔ چاچے ماے ان کے پتر۔ وہی ہماری زمین پر بھی ہل چلاتے ہیں۔ ماں بیوہ ہے۔ اس کو ساری فصل مل جاتی ہے۔ مزارعے ہوں تو حصہ مانگیں۔" وہ بولا۔

"تم نے ابھی تک ہمارے بارے میں کچھ نہیں پوچھا؟ نہ نام نہ مذہب۔ کیا ہمارا صرف انسان ہونا کافی ہے؟"

"مذہب سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔ تم غلط بھی بتا دیتے اگر ماں پوچھتی" وہ بولا "وہ غیر سکھ کو گھر میں برداشت نہیں کرتی۔"

میں نے اچانک پنجابی میں کہا "سکھ تو نہیں ہیں ہم اور کرسٹان بھی نہیں ہیں۔"

وہ پھر چونکا "تم نے ساری بات سن کے سمجھ لی تھی؟"

"ہاں۔ تم شاید جالندھر یا امرتسر کے ہو" میں نے کہا۔

"اور تم لاہور کے؟" وہ بولا۔

میرے اور اس کے اندازے کی بنیاد وہ فرق تھا جو لاہور اور جالندھر یا امرتسر کے پنجابی الفاظ اور لب و لہجے میں ہے۔ درمیانی فاصلہ صرف تیس پینتیس میل ہونے کے باوجود مقامی لوگ اس فرق کو نوٹ کر لیتے ہیں۔

گل اور نازو نہا کے آئیں تو میں اور غالب انہیں دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ وہ چوڑی دار ریشمی قمیص اور ہیچ کرتی ہوئی شلواریں پہن کے پھر اپنے اصل انداز حسن میں نمودار ہوئی تھیں۔ غرض کہ ان کے رنگ و روپ میں پرانی چمک آ گئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے یہ کپڑے اجیت سنگھ کی بیوی سے لئے تھے لیکن مجھے یہ بات پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

اجیت سنگھ ہمارے سر پر سوار تھا "یار اب خیر سے تم بھی نہا دھو کے آ جاؤ تو روٹی شروع کی جائے۔"

میں نے اور غالب نے کل رات پہلے ہی آرام کیا تھا اور مسلسل سفر میں جکڑے رہنے والے پاؤں آزاد ہو کے بڑی راحت محسوس کر رہے تھے۔ سردی کے موسم میں ٹھنڈے پانی سے نہانے کی گل اور نازو کو تاب رہی تھیں مگر نہانا ضروری تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ٹھنڈے پانی سے ٹھٹھر کے بدن کسی حد تک گرم ہو گا۔

اجیت سنگھ نے گل سے کہا "لحاف کھول کے آرام سے بیٹھو۔ سردی دور ہو جائے گی۔"

تھوڑی سی جھجک کے ساتھ گل اور نازو نے ایک ہی لحاف میں پناہ لے لی اور گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑ کے خشک کرنے لگیں۔ میں نے دل میں ایک انجانی سی بے چینی محسوس کی۔ گاؤں کے اس گھر میں ہمارے ساتھ برتے جانے والے تکلفات اس درجہ شہری تھے کہ مصنوعی لگتے تھے۔ اس سے پہلے بھی ہم نے دیہات کے گھروں میں قیام کیا تھا مگر وہاں کسی نے ہمارے لئے ہماری ضرورت کے مطابق انتظام نہیں کیا تھا بلکہ جو کچھ تھا وہ حاضر کر دیا تھا۔ اصل چیز ان کا جذبہ تھا جو میزبان کے تھے۔ جو سادگی اور خلوص کا مظہر تھا۔ یہاں سادگی مفقود تھی تو کہیں خلوص بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اور غالب نے غسل کرتے ہوئے اداکاری کے فارمولے پر عمل کیا۔ پہلے میں ہینڈ پمپ چلاتا رہا اور وہ اس کے سامنے گرنے والی موٹی دھار کے نیچے بیٹھا جسم کو لال صابن سے دھو دھو کے سارے میل کو بہاتا رہا۔ پھر میری باری آئی۔

میں نے موقع پاتے ہی اپنے خدشات کا اظہار کر دیا "مرزا! یہ آدمی کچھ پراسرار ہے۔"

"پراسرار اور خطرناک" غالب نے سردی سے بچتے بچاتے ہوئے کہا "باہر سے کچھ اور نظر آتا ہے جبکہ اندر کا آدمی کچھ اور ہے۔"

"تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ کوزے کو دریا میں بند کر دیا" میں نے نہاتے ہوئے کہا "ذرا توجہ سے ہینڈل چلا بچے۔ بندہ نہا رہا ہے آپ کا بھوت سر پر نہیں۔"

اس نے کہا "جسم کو گرم کرنے کے لئے اچھی ورزش ہے" اور زیادہ قوت ایمانی کے ساتھ پمپ چلانے لگا۔

"میری اس پر نظر ہے اچھے مرزا صاحب" میں نے کہا۔

"کہیں پر چاقو کرپان نہیں ہے اس کے پاس مگر بغل پر نظر ہے تمہاری تو....."

"لاحول ولا قوة۔ میں اجیت سنگھ کی بات کر رہا تھا۔"

"میں بھی غافل نہیں ہوں۔ حیرت کی بات ہے اس نے تمہارے کہنے پر بھی نام نہیں پوچھے۔ بات گول مول کر گیا" غالب نے کہا "وہ اتنا بڑا فلسفی تو ہو نہیں سکتا کہ کہے 'نام میں کیا رکھا ہے۔' اس کے رویے سے ایک منطقی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ کیا؟ ٹھیک ہے۔ میں نہا چکا۔ آپ بازو چلائیں یار ہے ہیں" میں نے کہا۔

"وہ ہمارے نام پہلے سے جانتا ہے" غالب نے کہا۔

میرے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی "واقعی؟ یہ ہو سکتا ہے مرزا۔ بڑا وزن ہے تمہاری بات میں۔ پھر اب کیا کریں؟"

"کھانے کے ڈکار لیں اور لمبی تان کے سو جائیں" غالب نے کہا "فی الحال [illegible] اور [illegible] اس گاڑی [illegible]

www.paksociety.com

گے۔"

"ہو سکے تو ہمیں تہہ خانے چلے جانا چاہیے" میں نے کہا "خوب!"

"سونے میں آپ کی عقل منجمد ہو رہی ہے۔ میرا مطلب تھا کہ ہم اپنے شکوک کو ظاہر نہ ہونے دیں۔ ورنہ بدستور احمق اور نشے کا شکار ثابت کرنے رہیں۔ یہ جانے کہ ہم محتاط ہو گئے ہیں اور اپنے رفاع کی طرف سے فکر مند ہیں۔ سوتے وقت ایک آنکھ کھلی رکھیں۔"

"مشکل کام ہے" میں نے کہا "ایک آنکھ سے سونے اور دوسری سے جاگنے کا تجربہ کبھی نہیں کیا۔ رنجیت سنگھ کر سکتا تھا۔"

"اجیت سنگھ کے ہاتھوں جھٹکا ہو جائے گا سب کا۔" غالب نے کہا۔

اسی وقت اجیت سنگھ نمودار ہوا۔ اس کے پاس مردانہ شلوار قمیص کے دو جوڑے تھے۔ صاف دھلے ہوئے اور استری کیے ہوئے۔

"یہ پہن لو بھائی" اس نے فخر سے اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "پرانے کپڑے ادھر ہی چھوڑ دو۔ بی بی دھو کے ڈال دے گی۔"

میں نے کہا "تم نے تو حد کر دی یار۔ اب بیوی کو کیوں تکلیف دیتے ہو۔ ہمارے کپڑے وہ بھی دھو کے ڈال سکتی ہیں۔"

"تمہاری گھروالیاں" غالب نے کہا "ان کپڑوں کی ضرورت بھی نہیں تھی کچھ۔"

خلاف توقع کھانے کا مینو وہ نہیں رہا جو غالب نے بتایا تھا۔ ہمارے سامنے گندم کی روٹی، توری کی بھجیا اور دہی رکھا گیا اور بعد میں چائے سرو کی گئی۔ کسی حیرت کا اظہار کیے بغیر ہم نے ڈٹ کے کھایا اور اس کی مہمان نوازی کے ممنون ہوتے رہے۔ اس کی بیوی کچھ جھجکی بھی نظر آئی۔ وہ خاصی خوش مزاج اور بے باک عورت تھی۔ غالباً اسے اجیت سنگھ نے سیٹ اپ کر دیا تھا۔

میزبان کی خواہش پر ہم نے فوراً سونے پر بھی رضامندی ظاہر کی۔ ایک چارپائی پر گل اور رنا دو تو فوراً سو گئیں۔

میں نے اور غالب نے دروازے کے بند ہو جانے کے بعد اندھیرے میں کانا پھوسی جاری رکھی۔

"ہم لیٹے لیٹے کچھ نہیں کر سکتے" غالب نے کہا۔

"پھر کیا کریں، انہیں اور زوز کو لیاں چلاتے ہوئے نکل جائیں۔ جب تک اجیت سنگھ کچھ نہ کرے۔"

"اسے کچھ نہیں کرنا ہو گا۔ سوائے پولیس کو بلانے کے۔" غالب نے کہا "اور میرا خیال ہے وہ جا چکا ہے۔"

اس کا خیال فوراً غلط ثابت ہو گیا۔ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ میں نے روشنی کی لکیر کو چوڑا ہوتے محسوس کیا۔ کمرے میں اجالا پھیل گیا۔ میں نے ایک آنکھ کو تھوڑا سا کھول کے دیکھا۔ اجیت سنگھ اندر آ چکا تھا اور اس نے دروازہ پھر بند کر دیا تھا۔ دروازے سے

چوں تک نہیں کی تھی۔ وہ غور سے ہر دیکھ رہا تھا کہ ہم سو چکے ہیں یا نہیں۔ ہم نے حلق سے ایسی آوازیں نکالیں جو بعض لوگ سوتے میں نکالتے ہیں۔

اجیت سنگھ آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا خم دار چمکیلا چھرا تھا۔ کرپان۔ مجھے خیال آیا۔ جو شاید اس کے باپ کی ہو گی لیکن آج بھی ہماری گردنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ سکتی تھی۔

وہ دبے پاؤں بیگ کی طرف بڑھا۔ دونوں بیگ چارپائی کے نیچے کھسکا دیے گئے تھے جس پر میں اور غالب دراز تھے۔ وہ مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر گھٹنوں کے بل بیٹھا اور بیگ کھینچنے لگا۔ میں نے انتظار کیا اور اس نے جیسے ہی بیگ اٹھانے کا ارادہ کیا میں نے اسے یوں دبوچا کہ وہ حلق سے آواز تک نہ نکال سکا۔

غالب میرے ساتھ ہی چھلانگ مار کے اٹھا۔ اس نے اجیت سنگھ کی کرپان چھین لی اور اسے ہوا میں لہرایا۔

میں نے کہا "دیکھ کے وار کرنا میرا ہاتھ نہ کٹ جائے گردن کے ساتھ ہی۔"

غالب نے کہا "فکر مت کرو۔ میرا ہاتھ بہت صاف ہے اور کرپان بھی دو دھارا ہے۔"

اجیت کی آنکھوں میں دہشت پھیل گئی تھی۔ غالب نے کرپان اٹھائی اور وار کیا مگر عین اس وقت جب کرپان اس کی گردن کو چھونے والی تھی غالب نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

"بازخون بہے گا۔ کپڑے الگ خراب ہوں گے۔"

میں نے سر ہلایا "ٹھیک ہے۔ ایسے ہی ٹھنڈا کر دیتا ہوں میں گردن توڑ کے۔"

"میزبان کچھ کہنا چاہتا ہے۔ شاید اس کی کوئی آخری خواہش ہو" غالب نے کہا۔

اجیت نے نفی میں سر ہلانے کی کوشش کی۔ اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ میری گرفت کسی عام فرد کی گرفت نہیں ہے۔ وہ خود اچھا خاصا تندرست جوان تھا مگر میں نے اسے یوں دبایا تھا کہ وہ سانس لینے کے سوا کوئی حرکت کرنے سے قاصر تھا۔

"ہمیں اندازہ ہو چکا ہے تمہارے ارادے کا۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ تم بہت چالاک ہو۔ تم پہچان چکے تھے ہمیں اور اب تک انجان بنے رہنے کی اداکاری کر رہے تھے۔ تم یا تو فائدہ اٹھانا چاہتے ہو یا اپنا فرض ادا کرنے کی سوچ رہے ہو۔ دونوں صورتوں میں نقصان تمہارا ہو گا۔ ہم کسی کے ہاتھ آنے والے لوگ نہیں ہیں۔ تمہارے گھر کا نمک نہ کھایا ہوتا تو تمہیں اتنی رعایت بھی نہ ملتی۔ جب تک لوگوں کو معلوم ہو گا کہ تم تمہاری بے بے اور بی بی سب دنیا سے کوچ کر چکے ہو ہم اتنی دور نکل جائیں گے کہ تمہارے رونے والے چاچے ماسے کا خیال بھی وہاں تک نہ پہنچتا۔"

"اجیت سنگھ کو موقع دو ایک۔"

میں نے آہستہ آہستہ اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا۔ پھر اسے آزاد کر دیا۔ وہ اٹھا اور ایک ہاتھ سے گردن ملنے لگا۔

"تم پولیس کو اطلاع دو گے تو انعام کب ملے گا؟ پتا نہیں ملے گا یا نہیں کچھ نہیں جانتے۔ ہم سے سودا کر لو۔ ہم اپنی آزادی کی قیمت بھی ادا کریں گے۔ نقد اور اسی وقت" میں نے کہا۔

"کتنی... چالیس ہزار..." وہ بولا۔

"چالیس ہزار" میں نے کہا "مگر اس کے بعد تمہاری زندگی بھی اسی طرح ہمارے قبضے میں ہو گی جب ہماری رقم تمہاری جیب میں۔ ہمیں ذرا بھی شبہ ہوا تو ہم رقم واپس لے لیں گے تمہیں مار کے۔ لالچی آدمی کو مرنا ہے۔ اگر تم نے یہ سوچا کہ پہلے ہم سے چالیس ہزار لے کر پھر پولیس سے بھی بیس ہزار وصول کرنے کی گنجائش ہے تو تمہیں یہ خیال بھی مہنگا پڑے گا۔ ادھر تمہارے دماغ میں یہ خیال آیا ادھر اتنا تمہارے سر سے نکلی۔ ایک ہاتھ مار کے گردن کیسے توڑی جاتی ہے کہو تو تم پر تجربہ کر کے دکھاؤں؟ مگر تم خود سمجھ گئے ہو کہ اب کسی کی گردن فالتو ہے نہیں۔"

"نہیں... وہ سمجھو... میں..." اس نے بڑی مشکل سے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "بہت کمینہ آدمی ہوں میں۔ تم کو مہمان بنا کے لایا... میں تمہاری... زندگی کا سودا کرنا چاہتا تھا... صرف بیس ہزار میں... مگر میں کیا کروں، میں بہت مجبور ہوں۔ وہ ہی راستے تھے میرے سامنے۔ یا تو میں کسی ڈاکا ڈالوں یا کسی کی جان لے لوں۔ اپنی یا راج کی۔"

"یہ راج کون ہے؟" میں نے کہا۔

وہ بے حد غمگین، شرمندہ اور خوف زدہ سر جھکائے بیٹھا ہوا فرش کو گھور رہا تھا "راج! میری رجنی۔ میری بیوی۔"

"اسے مارنا کیوں ضروری تھا۔ اس کو مار کے تمہارا مسئلہ کیسے حل ہو گا؟"

"اس لیے... کہ مسئلہ وہ خود ہے" اس نے سر اٹھا کے ایک آہ بھری "ابھی کتنے دن ہوئے ہیں ہماری شادی کو۔ رجنی برہمن ہے ذات کی۔"

"برہمن! اور تم سکھ۔"

"ہاں۔ ہاں ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ نانک ہوں میں۔ میں نے ایک لڑکی کے لیے باپ دادا کا دھرم چھوڑ دیا۔ شادی سے پہلے میں ایسا نہیں تھا۔ میں پورا سکھ تھا۔ یہ کرپان میری ہے۔ انبالہ میں نوکری تھی، جب رجنی مل گئی مجھے۔ اور بس۔ پھر جو ہونا تھا وہی ہوا۔ نہ دھرم اسے روک سکا نہ مجھے۔ اس کے باپ نے ضرور خودکشی کر لی ہو گی۔ خالص برہمن باپ تھا۔"

"کرلی ہو گی کیا مطلب؟ تمہیں معلوم نہیں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "رجنی مجھے بنارس میں ملی تھی۔ وہ کمبھ کے میلے میں آئی تھی۔ میں ایسے ہی گیا تھا۔ کاشی اور متھرا دیکھنے کا شوق تھا۔ آگرہ اور فتح پور سیکری بھی گیا تھا۔ ایک مہینے کی چھٹی جو ہر سال ملتی ہے، میں ایسے ہی گزارتا تھا۔ میں اور رجنی کاشی سے بھاگے۔ باپ اس کی شادی ساٹھ سال کے کسی کائستھ برہمن سے کرنا چاہتا تھا۔ وہ طے کیے بیٹھی تھی کہ گنگا میں ڈوب کے مر جائے گی۔ بس بھگوان نے یار آگرہ بنا کے مجھے بھیج دیا۔ میں انبالہ چھاؤنی سے آیا تھا، لوٹ کر وہاں بھی نہیں گیا۔ اب میں بھگوڑا ہوں۔"

"تم DESERTER ہو؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے ڈر تھا کہ پکڑا جاؤں گا۔ رجنی کا باپ تلاش کرے گا مجھے، حالاں کہ یہ ناممکن تھا۔ اس نے مجھے دیکھا ضرور تھا، میرا نام بھی معلوم تھا اسے مگر اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ صرف نام سے کسی کو سارے بھارت میں کون تلاش کر سکتا ہے۔ مگر رجنی مجھ سے زیادہ ڈری ہوئی تھی، پھر میں کیا کرتا۔ میں اسے ادھر اُدھر لے کر پھرا۔ ملٹری پولیس مجھے تلاش کرتی ہوئی یہاں بھی آئی۔ یہاں کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ وہ واپس چلے گئے۔ ایک مہینے بعد میں آیا، رجنی کے ساتھ۔ ماں سے جھوٹ بولا کہ چھٹی لے کر آیا ہوں۔ اس نے کہا کہ جھوٹ مت بول۔ تجھے تو ملٹری والے پوچھتے پھر رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ وہ تو پرانی بات ہے۔ میں نے سچ کہا تھا تو ڈیوٹی پر۔ اب وہ مہینے کی چھٹی ملی ہے۔ ماں بے بہت ہو شیار ہیں۔ وہ تاڑ گئے تھے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ میں نے انہیں سچ بتایا تھا۔ ماں ایک ہے مگر وہ بے وقوف ہے۔ رجنی کے کہنے پر میں نے اس سے دوسرا جھوٹ یہ بولا تھا کہ وہ سکھ ہے، سردار چرن سنگھ کی بیٹی۔ مگر یہ جھوٹ بھی کچھ دن میں کھل گیا۔ رجنی کو ہمارے دھرم رواج کا کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ ماں نے بہت شور کیا۔ ظاہر ہے اس کی نظر میں مجرم اس کا بیٹا نہیں یہ عورت تھی جس نے اسے باپ دادا کے دھرم سے دور کر دیا۔ ماں کی مجبوری یہ ہے کہ اس کا میں ایک ہی بیٹا ہوں۔ باپ نے جب نکال دیا تھا تو اس نے ہی مجھے واپس بلا لیا تھا۔ میرے واپس آنے کے چند دن بعد باپ مر گیا، اچھا ہوا۔ ورنہ بعد میں وہ بھی رجنی کر نا بر رجنی کے بچے نے کیا ہو گا۔ اب دیکھو کہ تقدیر کیا چیز ہے۔ مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ رجنی کو کمبھ کے میلے سے ایک سکھ کے گھر میں لے آئی اور جب یہ سارا تماشا ہو گیا، میں اور رجنی اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگے۔ مستقبل کی باتیں کرنے لگے۔ آنے والے بچے کا استقبال کرنے اور اس کی زندگی کے خواب دیکھنے لگے۔ میں نے کچا مکان گرا کے پکا مکان بنوانے میں اپنی ساری جمع پونجی لگا دی تو اچانک ایک دن رجنی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ گاؤں کے وید حکیم کچھ نہ بتا سکے۔ میں اسے امرتسر لے گیا اور وہاں میری دنیا برباد ہو گئی۔ تقدیر نے مجھے سب کچھ دے کر میرا سب کچھ چھین لیا... مجھے پتا چلا کہ رجنی زیادہ سے زیادہ چھ مہینے جیے گی۔ چار مہینے بعد تو اسے ماں بننا تھا۔ وہ مجھے اپنی نشانی دے کر چلی جائے گی۔ کیا پتا اس سے پہلے ہی" وہ

www.paksociety.com

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جوان آدمی یوں روتا ہے تو یقین آتا ہے کہ ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی۔ سارا کھیل تقدیر رچاتی ہے۔ انسان تو بس کھلونا ہے۔

میں نے کہا "گیا یہ سب......"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ابھی نہیں۔ وہ خوش ہے کہ یہ سب تخلیق کے عمل میں شامل ہے۔ اس کا دکھ اور عذاب بھی اس بچے کی جدوجہد کا حصہ ہے۔ مگر کب تک۔ وہ آخر کار اسے ہار جائیں جائے گا۔ اس نے عورتوں کو ماں بنتے دیکھا ہوگا۔ مرتے بھی دیکھا ہوگا۔"

غالب نے کہا "اس کا علاج کوئی نہیں ہے؟"

"سنا ہے باہر ہوتا ہے۔ ایک لاکھ ہوں تو اس کی جان بچ جائے گی" وہ بولا "چالیس پچاس میں یہ سب بیچ سکتا ہوں میں۔ اپنی زمین، یہ مکان اور بیل۔ لیکن ماں ایسا کہاں ہونے دے گی۔ وہ خود اپنے بھائی کے گھر میں بھی رہ سکتی ہے مگر اس عورت کی خاطر وہ مرم کے بعد باپ دادا کی ہر نشانی بک جائے، بیٹا اپنی زندگی تباہ کر لے، یہ ناممکن ہے۔ وہ تو چاہے گی کہ رجنی کل کی مرتی آج مر جائے۔ چالیس پچاس میں کچھ ہوتا تو میں ماں کی پروا نہ کرتا۔ رجنی کو بچا لیتا مگر ایک لاکھ کرنا مشکل تھا۔ ناممکن تھا میرے لئے۔ چاچا پاپا بھی اس معاملے میں میری مدد نہ کرتے۔"

"اسی لئے تم ہماری زندگی بیچ رہے تھے؟"

"ہاں۔ پہلے میں پہچانا نہیں تھا تمہیں، پھر تم نے ناگپور کا ذکر کیا۔ تمہاری بات مجھے جھوٹ لگی۔ تم شکاری نہیں تھے۔ شکاری ایسے خالی ہاتھ دو عورتوں کے ساتھ جنگلے نہیں پھرتے اور اس طرح میں نہیں ہوتے۔ ناگپور سے جل کے کوئی یہاں تک بھٹکتا ہوا کیسے آ سکتا ہے۔ اور آ جائے تو وہ آگے اندور جانے کی بات کیوں کرے گا۔ پھر مجھے یاد آ گیا۔ میں نے تمہاری تصویریں دیکھی تھیں۔ اخبار میں بھی پڑھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری لاٹری نکل آئی ہے۔ بے رحم قسمت مجھ پر دوبارہ مہربان ہو گئی ہے۔ بیس ہزار اور ہو جاتے تو میں ایک لاکھ کے قریب پہنچ جاتا۔ باقی کے لئے میں نے چوری کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنے ہی گھر میں۔ میں چاچے اور ماما کے گھر سے ان کی بیویوں کے زیور اور اپنی ماں کا سب زیور اکٹھا کر لیتا اور بھاگ جاتا۔ بعد میں جو ہوتا میری بلا سے۔ میں لوٹ کر واپس نہ آتا اگر میں اپنی رجنی کو بچا لیتا۔"

"بینک میں کیا تھا تمہارے خیال میں؟"

"میرا خیال تھا کچھ رقم ہوگی۔ وہ میں قبضے میں کر لوں گا۔ کچھ اسلحہ ہوگا اسے بھی بعد میں بیچ دوں گا۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ گل اور مادو گہری نیند میں تھیں جانے کب انہوں نے کچھ بھی نہیں سنا تھا۔

میں نے کہا "اجیت سنگھ! تم ہمیں خاموشی سے نکال دو۔ اب ہم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ ہم ٹرین سے نہیں جائیں گے۔ آج رات دریا پار کرنے کی کوئی صورت ہے؟"

"رات کو پوری موٹر بوٹ لینی پڑے گی اور کرایہ بھی دگنا ہوگا" وہ بولا۔

"کتنا کرایہ ہوگا؟"

"پانچ سو۔ شاید کوئی چار سو میں مان جائے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم ہمارے ساتھ دریا تک جاؤ گے۔ موٹر بوٹ میں روانہ ہونے سے پہلے ہم تمہیں چالیس ہزار دیں گے۔"

"وہاں جا کے تم مکر گئے تو..... تمہارا کیا بھروسہ۔ تم مجھے مار دو اگر" اجیت نے کہا۔

"بھروسہ تو کرنا پڑے گا تمہیں۔ رجنی کے لئے۔"

"رجنی کے لئے" اس نے دہرایا "اچھا میں چلوں گا۔"

"تم اب گھر سے باہر نہیں جاؤ گے۔ نہ اپنی بیوی کو اور ماں کو جانے دو گے۔ تم سب کو ہماری نظروں کے سامنے رہنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اگر تم نے ہمیں پہچان لیا ہے" غالب نے کہا "تو تمہیں یہ بھی جان لینا چاہئے کہ ہمارے ساتھ دغابازی کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔ اور کوئی ہماری راہ میں حائل ہو کے ہمارا راستہ نہیں روک سکتا۔ ہمیں دشمنوں کی لاشوں پر سے گزر جانے کی عادت ہوتی ہے۔ دشمن ایک ہو یا دس ہوں، اس سے ہمیں فرق نہیں پڑتا۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا "ہم ابھی تک اسی لئے آزاد ہیں کہ ہمیں گرفتار کرنے والوں نے ہماری شرافت کا غلط مطلب سمجھا اور ہماری طاقت کا غلط اندازہ کیا۔"

"میں یہ غلطی نہیں کروں گا" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "کس وقت جانا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "ٹرین کس وقت جاتی ہے؟"

اجیت سنگھ نے کہا "ساڑھے آٹھ بجے۔"

"پھر یہی وقت ٹھیک رہے گا۔"

"مگر تم نے ابھی کہا تھا کہ تم ٹرین سے جانا نہیں چاہتے۔" اجیت بولا۔

میں نے کہا "ہم فیصلہ بدل سکتے ہیں جتنی بار چاہیں۔ اس کے علاوہ کیا ساڑھے آٹھ بجے کشتی سے دریا پار کرنے میں کوئی حرج ہے؟"

"نہیں حرج کیسا..... جیسی تمہاری مرضی" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"جاتے ہوئے دروازہ مت بند کرنا۔"

"اچھا..... مگر وہ جو تم نے کہا ہے نا..... کہ باہر کوئی نہ جائے تو یہ مشکل ہے" اجیت سنگھ نے کہا "رجنی تو ویسے بھی نہیں جا سکتی۔ مگر ماں کو روکنا مشکل ہوگا۔ میں نہیں جاؤں گا تو پھر ماں کو جانا ہی پڑے گا۔"

میں نے کہا "اچھا پھر میں باہر بیٹھوں گا۔"

اجیت نے میرے لئے ایک چارپائی درخت کے نیچے ڈال دی۔ باہر فضا بہت پرسکون تھی۔ دوپہر کی دھوپ میں نیلا آسمان روشن نظر آتا تھا اور ہوا میں بڑی راحت بخش خنکی شامل ہو گئی تھی۔ میرے لئے لیٹ کر آنکھیں کھلی رکھنا مشکل ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ شام تک غالب کو سونے کا موقع دوں گا اور پھر خود سو جاؤں گا۔ مگر ہوا یہ کہ میری آنکھ لگ گئی اور میں اس وقت جاگا جب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

اجیت سنگھ نے مجھے اٹھایا "رات کو پیڑ کے نیچے نہیں سونا چاہئے۔"

میں ہڑبڑا کے اٹھا۔ مجھے شدت سے اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔ شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ہم سب سو گئے تھے۔ یہ غلطی ہو سکتی تھی۔ باقی سب نے مجھ پر بھروسہ کیا تھا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ اگر اس غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اجیت کچھ کرنا چاہتا تو اسے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ سب نقدی لے سکتا تھا اور والٹے پر قبضہ کر کے کسی پریشانی کے بغیر ہمیں پولیس کے حوالے کر سکتا تھا۔ اگر آنکھ کھلنے پر ہمیں معلوم ہوتا کہ ہر طرف سے پولیس کی رائفلوں کا رخ ہماری طرف ہے اور ہم اب جان دے کر بھی گرفتاری سے نہیں بچ سکتے۔ یہ سوچ کر ہی میرے وجود میں سرد لہر دوڑ گئی۔

اجیت نے مسکرا کے کہا "اطمینان رکھو۔ کچھ نہیں کیا میں نے۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔"

میں نے سکون کی گہری سانس لی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ میری اس مجرمانہ کوتاہی سے ناقابل تلافی نقصان نہیں ہوا۔ اجیت سنگھ نے بدعہدی نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ ہم پہلے ہی اس کے حق میں فرشتۂ رحمت ثابت ہو چکے تھے۔ وہ ہمارے خیر سگالی کے جذبات کا خون کرنا نہیں چاہتا تھا ورنہ پیسہ تو اس کی دسترس میں تھا۔

باہر کافی خنکی تھی۔ اس کے مقابلے میں اندر کی فضا گرم تھی۔ جب میں نے غالب کو جگایا تو وہ حیران ہوا۔

"رات ہو گئی کمال ہے۔ تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔ کچھ دیر خود بھی سو جاتے۔"

میں نے ندامت سے سر کھجا کے کہا "خود مجھے اجیت نے جگایا ہے ابھی۔ میں جاگنے کی پوری کوشش کرتا رہا پھر پتا نہیں کیسے سو گیا۔"

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی نا؟"

"نہیں۔ آج تو بس خدا نے ہی بچا لیا" میں نے کہا۔

"ہمیشہ خدا ہی بچاتا ہے" غالب نے کہا "ہم نہیں بھی کر کے سو رہتے ہیں۔"

"دراصل سب بہت تھکے ہوئے تھے۔ غسل کے بعد صاف ستھرے کپڑے، اچھا کھانا اور آرام دہ بستر تو نیند کیسے نہ آتی۔ مجھے تو خود یہ حیرت ہے کہ دن کی گرمی میں چارپائی پر سو گیا۔ ابھی ٹھنڈ تھی باہر۔ مجھے احساس بھی تھا....."

"اچھا چھوڑو یار۔ ہم سب انسان ہیں آخر۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی" غالب نے کہا "آخر ہوا تو سب ٹھیک ہے۔ اب انہیں بھی اٹھا دینا چاہئے۔"

"ہاں۔ رات کے وقت نکل جائیں گے تو محفوظ رہیں گے۔" میں نے کہا "پہلے میرا خیال تھا کہ اجیت کو کچھ بتانا نہیں چاہئے۔ ہمارا ارادہ ہو ٹرین سے جانے کا تو کہنا یہ چاہئے کہ کشتی سے جائیں گے۔"

"اچھا کیا۔ اجیت سنگھ نے خود کو بھروسے کے قابل ثابت کر دیا ہے" غالب نے کہا۔

"ہم کشتی سے جائیں گے" میں نے کہا "ٹرین میں چیکنگ ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی اتنے مسافروں میں سے کوئی پہچان لے یہ خطرہ بھی ہے۔"

غالب نے گل اور مادو کے اوپر سے رضائی کھینچ لی "اٹھو۔ صور اسرافیل کی آواز سنائی نہیں دی کیا؟"

"یہ کیا بدتمیزی ہے" مادو نے بگڑ کے کہا۔

"آہ۔ اتنا اچھا خواب دیکھ رہی تھی میں" گل نے بال سمیٹ کر کہا۔

"بیچ میں بول پڑے یہ صور اسرافیل صاحب" مادو نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔

رات کے کھانے میں اجیت سنگھ کی بیوی نے خاصا تکلف کیا تھا۔ شاید اجیت سنگھ اپنے شکرگزاری کے جذبات کا اظہار مہمان نوازی کی صورت میں کر رہا تھا۔

اس نے رازداری سے میرے کان میں کہا "میں نے مرغی روسٹ کرائی ہے۔"

میں نے کہا "مگر ہم نہیں کھا سکتے کیونکہ تم نے جھٹکا کیا ہوگا۔"

"میں تو بچا رہا ہوں تھی۔ مسجد کے مولوی صاحب سے ذبح کرا کے لایا تھا۔ ماں کو نہیں معلوم" وہ بولا "ورنہ وہ نہ کھاتی۔"

"اور تمہاری بیوی؟"

"وہ اپنی طرح ہے۔ بڑی ضرورت مند" وہ ہنسنے لگا۔

رات تقریباً نو بجے کے بعد ہم نے پھر سفر کی تیاری کی۔ اجیت کی ماں اس وقت سو چکی تھی۔ گاؤں میں سب ہی اس وقت سو جانے کے عادی تھے۔ ہمارے اصرار کے باوجود اجیت سنگھ ان کپڑوں کی قیمت لینے پر راضی نہیں ہوا جو ہم نے پہن رکھے تھے۔ رجنی کو دیکھ کر مجھے دکھ ہوا۔ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ تھوڑی سی خوشی کے بعد قدرت اسے کتنی بڑی سزا دینے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اس زندگی کی توانائی سے بھرپور، خوب صورت اور محبت کرنے والی عورت کو دیکھ کر موت کا خیال آ ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لئے یہ خیال ضرور آیا کہ کہیں اجیت سنگھ کی کہانی جھوٹی تو نہیں تھی اور اس نے ہمدردی حاصل کرنے کا ڈراما تو نہیں رچایا تھا۔ پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اول تو وہ اداکاری نہیں تھی۔ اس

www.paksociety.com

کے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر چالیس ہزار کی اس احسان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہ تھی جس کا مظاہرہ اجیت سنگھ نے کیا تھا۔ اگر ہم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ رجنی کی زندگی کو بچانے کے لئے ہم اسے تعاون کے طور پر چالیس ہزار دیں گے تو اس نے بھی ہمیں ہماری زندگی بخش دی تھی۔ یہ چالیس ہزار اگر برٹ اور اس کے ساتھ سفر کرنے والوں کے پاس ہوتے تو وہ اس کی شراب پی جاتے۔ اب وہی رقم ایک زندگی کو بچانے کی کوشش کا حصہ بنے گی۔ یہ احساس بھی ہمارے لئے باعث طمانیت تھا۔ بیل گاڑی روانہ ہوئی تو گلیوں میں پھرنے والے ننگے بچے دور تک اس کے ساتھ بھاگتے ہوئے آئے۔ اجیت سنگھ نے انہیں دھتکار کر بھگا دیا۔ ہم دن بھر روپوش رہے تھے اور آرام بھی کر چکے تھے۔ مجھے یقین آنے لگا کہ ہمارا تعاقب کرنے والے مایوس ہو کے بیٹھ گئے ہوں گے اور آج رات کے سفر میں ہمارے لئے خطرہ بہت کم ہوگا۔

اجیت سنگھ نے کہا "اب کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "دریا پر چلو۔ ہم کشتی سے جائیں گے لیکن کوئی پوچھے تو یہ مت بتانا کہ کہاں اسٹیشن جا رہا ہوں۔"

غالب نے کہا "اگر کسی نے پوچھا کہ کسے چھوڑنے جا رہے ہو تو...."

"میں بتادوں گا کہ مہمان ہیں" اجیت سنگھ نے کہا۔

"ایسا نہ ہو کہ ہماری وجہ سے بعد میں تم پر مصیبت آ جائے۔ کون مہمان تھے کہاں سے آئے تھے۔ ان سب سوالات کا جواب سوچ سمجھ کے دینا" میں نے کہا۔

"آپ میری فکر مت کرو" اجیت سنگھ نے کہا اور بیلوں کو ہانکنے لگا۔

اندھیرے میں کچے راستے پر ہچکولے کھاتی بیل گاڑی کسی نامعلوم سمت میں رواں رہی۔ ہم اجیت سنگھ پر یقین کئے بیٹھے رہے کہ وہ ہمیں اس منزل تک پہنچا دے گا جہاں سے اگلی منزل کا سفر شروع ہوگا۔ جیسے ہوائی جہاز کے مسافر بحراوقیانوس پر سے رات کو گزرتے ہوئے اس یقین کے ساتھ سوتے رہتے ہیں کہ پائلٹ جاگ رہا ہے اور انہیں نیویارک ہی پہنچائے گا حالانکہ نہیں۔ وہ باہر نہیں دیکھ پاتے کسی راستے کا تعین نہیں کر سکتے اور پائلٹ بھی ان کے سامنے نہیں ہوتا۔

آخر کار بیل گاڑی دریا کے کنارے پہنچ گئی۔ گھاٹ تک تھوڑا سا فاصلہ ہمیں پیدل طے کرنا تھا جہاں قطار میں بہت سی کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ان کشتیوں پر اندھیرا تھا اور دریا کے کنارے پر کشتی چلانے والوں کی مختصر بستی بھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہم اجیت سنگھ کے ساتھ چلتے گئے۔

"تم جانتے ہو کسی کشتی والے کو؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ جاننے والا کون سی رعایت کرتا ہے" وہ بولا۔

"میرا مطلب تھا کہ کوئی بھروسے کا ہو۔"

"ملنے ملانے سے کیا؟ اچھا، وہ بھی بھروسے کا آدمی ہوگا۔ یہاں تو سب کا ایک ہی دھندا ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ رات کو بھی لوگ جاتے رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے پھر تم ہی بات کرنا" غالب نے کہا۔

"پہلے ایک بات اور سن لو" میں نے کہا "تمہیں ہمارے جانے کے بعد ایک کام کرنا ہوگا صبح کسی وقت۔"

"کیا کام ہے؟" وہ رک گیا۔

میں نے اسے وہ پیکٹ تھما دیا جس میں برٹ کی گاڑی کے تار تھے ایئر بیگ تھا اور ان سب کے پاسپورٹ تھے "تمہیں وہ جگہ یاد ہے نا جہاں سے ہم بیل گاڑی میں بیٹھے تھے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "یہ کیا ہے؟"

"اس میں کچھ سامان ہے۔ تم چاہو تو کھول کے بھی دیکھ سکتے ہو مگر کوئی چیز تمہارے کام کی نہیں ہے" میں نے کہا "یہ سب تم کو ایک جگہ پہنچانا ہے۔ میں تم کو اندازے سے سمجھا سکتا ہوں، ٹھیک نقشہ بنا کے نہیں دے سکتا۔ اس جنگل میں ہمارے کچھ ساتھی بیٹھے ہیں۔ چند غیر ملکی ہیں۔ ایک مرد اور دو عورتیں۔"

"غیر ملکی.... آپ کے ساتھی؟" وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

"ساتھی مت سمجھو۔ ہم نے ان کے ساتھ سفر کیا تھا ان کی گاڑی میں" میں نے کہا۔

"زبردستی۔ ہم نے انہیں مجبور کر دیا تھا" غالب نے وضاحت کی "پھر ایک جگہ ہم انہیں چھوڑ کر چل پڑے۔ اس خیال سے کہ وہ ہمارا پیچھا نہ کریں، ہم نے ان کی گاڑی کی ہوا نکال دی تھی اور تار بھی ساتھ لے آئے تھے۔ اس پیکٹ میں تار ہیں اور روپے ہیں۔ ان کے پاسپورٹ ہیں۔ ہم نے کہا تھا سب واپس کر دیں گے۔"

"مگر وہ تو بہت غصے میں ہوں گے" اجیت سنگھ بولا۔

"ہاں۔ غصے میں تو ہوں گے۔ سارا دن انتظار کرتے رہے ہوں گے کہ کوئی آئے ان کا سامان لے کر تو وہ جنگل سے نکلیں۔ رات کو بھی انتظار کریں گے۔ ہم نے کل شام تک کا وعدہ کیا تھا کہ کوئی یہ انہیں پہنچا دے گا۔ ان کے بغیر وہ کہیں نہیں جا سکتے۔ تم ہمارا یہ کام کر سکتے ہو؟"

"کر تو سکتا ہوں" وہ سوچ میں پڑ گیا "لیکن انہیں پہلے تو تلاش کرنا مشکل ہوگا۔ خیر میں پہنچ جاؤں گا۔ مگر ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں۔"

میں نے کہا "وہ خالی ہاتھ ہیں۔ ان کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں ہے۔ پھر اس میں بھی بہتر یہ ہوگا کہ تم اکیلے نہ جاؤ کسی کو اپنے ساتھ لے جانا۔ ان کی گاڑی میں پٹرول بھی نہیں ہے۔ وہ فوراً روانہ نہیں ہو سکتے۔ کوئی جائے گا کہیں سے پٹرول لانے کے لئے۔ تم ان کی راہنمائی کر دینا اگر ممکن ہو۔ وہ اجنبی ہیں اس ملک میں۔"

"مرد ایک ہے اور وہ بھی تم سے زیادہ تگڑا نہیں ہے مگر تم کسی دوست کے ساتھ جاؤ تو اچھا ہے۔ دو افراد کے لئے انہیں تلاش کرنا بھی آسان ہوگا" غالب نے کہا "اور تمہارے لئے خطرہ نہیں رہے گا۔"

میں نے کہا "ویسے اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں، میں یقین دلاتا ہوں۔ بس یہ کام ہے بہت ضروری۔"

پھر میں نے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور وہ پچاس ہزار روپے نکال لئے جو ہم نے ٹام اور برٹ کو دے کر واپس لے لئے تھے۔

"یہ پچاس ہزار ہیں۔ امید ہے تم باقی رقم کا بندوبست کر لو گے" میں نے کہا۔

مگر اسی وقت نازو نے کہا "ہمارے زیور دے دو اسے۔ ہمارے کس کام کے۔ اگر انہیں بیچ کے یہ رقم پوری کرے گا تو اسے چاچا ماں کے زیورات نہیں چرانے پڑیں گے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے" میں نے کہا اور بیگ میں ہاتھ ڈال کے زیور نکالنے لگا۔ یہ سب ایک جنگلی بھیڑیے کا مال تھا جو اس نے معصوم اور سادہ لوح لڑکیوں سے چھینا تھا اور ہمارے لئے بھی بوجھ بنا ہوا تھا۔

اجیت سنگھ کی عجیب حالت تھی "یہ پچاس ہزار.... مگر آپ نے تو چالیس کی بات کی تھی...."

"چلو رکھ لو۔ چالیس پچاس سے کیا فرق پڑتا ہے" غالب نے کہا۔

"نہیں جی.... دس ہزار زیادہ کیوں لوں؟ فرق کیسے نہیں پڑتا؟" وہ ہکلانے لگا۔ کیونکہ اس کی عقل خبط ہو چکی تھی۔ جس دنیا میں دس روپے کے نوٹ کی خاطر آدمی کا گلا آدمی کاٹ رہا ہو، معصوموں کے سودے ہو جاتے ہوں اور بچوں کی معصومیت فروخت ہوتی ہو، وہاں ہم دس ہزار کے لئے کہہ رہے تھے کہ اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اسے پیسے کی ضرورت تھی۔ وہ انکار نہیں کرنا چاہتا تھا مگر انکار پر مجبور تھا۔ اس پر احسان کا بار بڑھتا جا رہا تھا۔

جب نازو نے زیورات کا ڈھیر اس کے سامنے کیا تو وہ ایسے خوف زدہ ہو کے پیچھے ہٹ گیا جیسے غلطی سے نازو نے اس کے سامنے سانپوں بھری پٹاری کھول دی ہو۔

"نہیں۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ مجھے جانے دو۔ اپنا پیسہ بھی رکھو۔ یہ چوری کا مال ہوگا۔ مجھے جیل جانا پڑا تو رجنی مر جائے گی۔"

میں نے اسے پکڑ لیا "بے وقوفی کی بات مت کرو۔ یہ سب ہمارا ہے۔ ہم نے وعدہ کیا تھا تم سے چالیس کا۔ دس ہزار ہم اپنی خوشی سے دے رہے ہیں۔ تم نے ہماری زندگی بچائی ہے۔ ہماری مدد کی ہے اور تم ضرورت مند ہو۔ تم نے تو کہا تھا کہ رجنی کے لئے تم چوری کرنے کا سوچ رہے تھے۔ ڈاکا ڈالنے کو تیار تھے، پھر ڈرتے کیوں ہو؟"

"میں یہ زیور نہیں لوں گا" وہ بضد رہا "ایسا نہ ہو رجنی کو کچھ ہو جائے.... مجھے پتا نہیں یہ کیسا زیور ہے۔ کسی کا گلا کاٹا تھا تم نے کہ مار کے حاصل کیا تھا؟"

مجبوراً میں نے اسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ ہمیں یہ زیور اور نقد مال کہاں سے ملے تھے۔

"یہ ہمارے لئے بے کار ہیں" نازو نے کہا۔

"بے کار کیسے ہو گئے؟ یہ سب نہ ہوتا تو آپ سب لوگ پار کیسے اترتے۔ مجھ سے سودا کیسے کرتے۔ اسے آپ رکھو۔ آپ کے کام آئے گا بعد میں" وہ بولا۔

کچھ دیر کی بحث کے بعد نازو اور میں اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اس نے زیور اس شخص کی طرح قبول کیا جس نے زندگی میں ملنے والی پہلی بھیک کو جیب میں رکھا ہو۔ اب احسان مندی سے زیادہ شرمندگی کے جذبات غالب تھے۔ وہ افسردہ تھا اور ندامت کا شکار تھا۔ اس کے پاس نہ ہمت تھی اور نہ الفاظ تھے کہ وہ ہمارا شکریہ ادا کر سکتا۔

"چلو اب کسی کشتی والے سے بات کرو" میں نے کہا۔

"آپ پھر کبھی آؤ گے ادھر....؟" وہ بولا۔

"مشکل ہے۔ مگر کیا پتا قسمت لے آئے۔ ہمیں امید ہے کہ تم جلد از جلد رجنی کو باہر لے جاؤ گے اور علاج سے وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

یہ بات کہتے ہوئے مجھے راسن کا خیال آیا۔ کتنی دکھ بھری تھی اس کی زندگی اور موت۔ ہم نے تو چاہا تھا کہ اس کو بدبختی کے گرداب سے نکال لیں۔ اس کی ماں واپس اپنے وطن کی مٹی دیکھے اور اسی مٹی کی ہو جائے۔ اس کی بہن با آبرو زندگی گزارے اور وہ خود ایک ٹیکسی کا مالک ہو۔ اس سے دوسری خریدے۔ مگر اس کی ہر آرزو خاک شدہ۔ راسن کی بدبختی نے ہماری خواہش کو شکست دی.... خدا کرے اجیت سنگھ کے ساتھ ایسا نہ ہو۔ ہماری خواہش پھر ناکام نہ ہو۔

رات کے ساڑھے نو بجے تھے جب ہم نے اسے الوداع کہا۔ وہ ہم سب سے گلے مل کے رویا اور ہماری کشتی کے روانہ ہونے کے بعد بھی کنارے پر کھڑا ہاتھ ہلاتا رہا۔ پھر اندھیرے میں اس کا وجود تحلیل ہو گیا۔ کشتی دریا کی خاموش موجوں کے سینے پر چل پڑی۔ اس کا ملاح ایک بوڑھا آدمی تھا اور اس کا ساتھ دینے والا جوان بیٹا تھا۔ وہ بڑی محنت سے چپو چلاتے رہے۔ اگر ہم موٹر بوٹ لیتے تو بہت کم وقت میں دریا کو عبور کر لیتے جس کا پاٹ میلوں میں سمٹ کر چند فرلانگ تک محدود ہو گیا تھا لیکن وہ بڑھا مشقت برداشت کرنے لگا تو مجھے اس پر رحم آ گیا۔ تیز رفتاری کے اس دور میں وہ مالی مشکلات کا شکار تھے۔ سب موٹر بوٹ اور لانچ میں سفر کرتے تھے۔ خصوصاً رات کے وقت لوگ کم سے کم وقت میں حفاظت کے ساتھ دریا پار کرنا چاہتے تھے۔ پانچ سو کی رقم اس کے لئے اتنا بڑا خزانہ تھی کہ وہ تڑپ کر ہمارے پاؤں پڑ گیا تھا کہ ہم اسے خدمت کا موقع دیں۔

www.paksociety.com

آدھا راستہ بڑی مشکل سے ایک گھنٹے میں طے ہوا۔ کشتی کو دریا کے بہاؤ کے خلاف لے جانا بڑی مشقت طلب کام تھا۔ اپنی پوری کوشش کے باوجود باپ بیٹا کشتی کو سیدھا نہیں لے جا سکتے تھے۔ وہ ترچھے رخ جا رہے تھے جہاں دریا کے پاٹ کی اصل چوڑائی سے دگنا فاصلہ طے کر رہے تھے۔ یہ کشتی چلانے والوں کا اپنا اندازہ تھا کہ وہ کہاں سے روانہ ہوں گے۔ بہاؤ کے ساتھ کتنا ترچھا جائیں گے اور دوسرے کنارے پر کس جگہ اتریں گے۔

میں نے ایک گھنٹے بعد کہا "بابا جی! تم بہت تھک گئے ہو گے کچھ آرام کر لو۔"

"آرام.... " بڈھا ہانپتے ہوئے بولا "کیسی باتیں کرتے ہو سرکار.... ناؤ آگے نکل جائے گی۔"

"آگے کہاں؟" میں نے کہا۔

"جہاں.... آپ کو اترنا ہے اس سے آگے۔ بہاؤ کو دیکھ رہے ہو۔"

میں نے کہا "تمہارا بیٹا اور تم باری باری کشتی چلاؤ۔"

اس نے کہا "ناؤ آگے چلی جائے گی۔"

میں نے کہا "جانے دو۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "جانے دوں.... کہاں اترنا تھا آپ کو سرکار؟"

میں نے کہا "جہاں سب اترتے ہیں.... اس سے آگے میل دو میل سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

غالب نے کہا "ہم پیدل آ جائیں گے سیر کرتے ہوئے۔"

اس کی سمجھ میں ہماری بات نہیں آئی کہ ہم گھاٹ پر کیوں اترنا نہیں چاہتے اور اتنی رات کو اندھیرے میں پیدل چل کے واپس گھاٹ تک آنے میں کون سی تفریح ہے۔

"سرکار! ہمیں واپس آنا مشکل ہو گا۔ اتنی دور جانا آسان ہے۔ واپسی میں بہاؤ کے خلاف آنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا تم نے محنت واقعی زیادہ ہو گی۔ خیر ہم دو سو روپے دے سکتے ہیں۔"

اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ پھر خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے ایک دم چپو اٹھا لیے۔ اس کا بیٹا جو خاموشی سے ساری گفتگو سن رہا تھا کشتی کھینچ رہا۔ کچھ دیر دم لینے کے بعد بڈھے نے پھر چپو سنبھالے اور اس کا بیٹا رک گیا۔ ان کی عمروں میں شاید بیس سال کا فرق ہو گا مگر صحت کے لحاظ سے باپ بہتر تھا۔ بیٹا بلاوجہ ہنستا تھا اور کسی بات کا جواب نہیں دیتا تھا۔

"یہ گونگا ہے" اس کے باپ نے کہا "اور اس کو بددعا بھی لگی ہے۔"

"کس کی بددعا؟"

"ایک فقیر کی۔ اس کی عقل خراب ہے۔ کوئی بات نہیں سمجھتا۔" بڈھے نے کہا "آٹھ برس کا ہو گیا ہے سرکار۔ مگر بچے سے زیادہ نادان ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ ذہنی طور پر ابنارمل ہو گا۔ ذہنی پسماندگی ان غریب لوگوں کے نزدیک آسیب ہے یا فقیر کی بددعا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ وہ نیم پاگل اور ناکارہ تھا لیکن ناکارہ بھی نہیں کام کا مددگار تھا۔ اس کی جسمانی صحت ٹھیک تھی باپ کے لیے یہ کافی تھا۔

ڈھائی تین گھنٹے بعد ہم جہاں دریا کے کنارے پر اترے وہاں مکمل ویرانی تھی۔ دریا کے خشک پاٹ پر کنکروں کا فرش تھا جس پر چل کے ہم نے ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کیا۔ پھر جھاڑیوں اور کچھ سے گزرے اور آخر کار اس سڑک تک پہنچے جو دریا کے پاٹ سے بہت دور چلی گئی تھی۔ اس پتلی سی سڑک پر گھنے درخت ایک قطار میں لگائے گئے تھے۔ ان کے نیچے گھاس تھی جو خشک ہو گئی تھی۔ ہم نے اس پر پاؤں رگڑ کے جوتے صاف کیے اور پھر گھاٹ کی مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔

رات کے ایک بجے ہم نے سامنے سے آنے والی بس کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ ہم بس کو رکنے کا اشارہ کرتے بس ڈرائیور نے ہمارے قریب آ کے بریک لگا دیے۔ سوتے ہوئے مسافر جاگ کر کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانکنے لگے۔

میں نے آگے بڑھ کے پوچھا "کہاں جا رہی ہے بس؟"

ڈرائیور نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا "آپ بولو کدھر جاؤ گے؟"

میں نے کہا "ہم تو اندور جائیں گے۔"

"تو پھر جاؤ" ڈرائیور بولا اور بس آگے بڑھ گئی۔ کچھ مسافر ہنس پڑے۔

"الو کا پٹھا" میں نے کہا "ایسی کون سی بات کہہ دی تھی آخر میں نے" مگر نہ جانے کیا ہوا بس کچھ دور جا کے رک گئی۔

اس بار غالب آگے گیا "یہ مذاق کا کون سا وقت ہے؟"

ڈرائیور نے مسافروں کو دیکھا "سوچی۔" الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ مذاق اس نے کیا تھا" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

"میں نے تمہارے سوال کا جواب دیا تھا" میں نے کہا۔

"کیا یہ بس اندور نہیں جاتی؟" غالب نے کہا۔

"یہاں سے کوئی بس اندور نہیں جاتی" ڈرائیور نے کہا "تم وحشی ہو کیا پہلے ادھر نہیں آئے؟"

"نہیں۔ اور دوبارہ آئیں گے بھی نہیں" میں نے کہا "یہاں ہر ملا ہے تم جیسا۔ سیدھی طرح بات نہیں کرتا۔ الٹا جواب دیتا ہے۔"

اس نے کہا "بابوجی! غصہ مت کرو۔ چلو جیسے ابھی میں سمجھا تا ہوں تمہیں۔ عورتوں کو آگے بھیج دو۔ چلو خود بھی آ جاؤ ادھر چلی ہے اور مرتے آئے۔"

اس نے دو مسافروں کو کھسکا کے ہم سب کو اپنے قریب جگہ فراہم کی۔ بس پھر چل پڑی۔ یہ دوسری جنگ عظیم کے دور کی بس تھی جس میں پگڑیوں، مونچھوں اور دھوتیوں والے دیہاتی بھرے پڑے تھے اور ان سب کی نظر ہم پر جم کے رہ گئی تھی۔ دو چار عورتیں بھی اونگھتے اونگھتے جاگ اٹھی تھیں۔ بس کے اندر مسافروں کے علاوہ ایک بکری بھی استادہ تھی اور دائیں بائیں سر گھما کے مسافروں سے اظہار الفت کر رہی تھی مگر کوئی اس بے تکلفی کا برا نہیں مان رہا تھا۔

"یہ تو آپ کو قسمت سے جگہ مل گئی" ڈرائیور نے کہا "ورنہ یوں تو کھڑے رہتے سڑک پر۔ کسی بس میں جگہ نہ ملتی نہ اندر نہ باہر چھت پر۔ خیر اب یہ بتاؤ کہ آپ کہاں سے ہو؟"

میں نے کہا "دریا پار سے۔"

غالب نے کہا "ہری پور سے لالہ جی کے گھر سے۔"

"اچھے لالہ روپا ناتھ جی کے گھر سے" ڈرائیور بولا "گاڑی نہیں بھیجی انہوں نے؟"

میں نے کہا "گاڑی خراب نہ ہوتی تو ہم اس بس میں نظر نہ آتے۔ مجبوری تھی۔"

ڈرائیور نے مونچھوں کو تاؤ دیا اور اب گل کے بجائے نازو کو گھورنے لگا "لالہ جی نے یہ نہیں بتایا کہ اندور کتنی دور ہے اور وہاں جانے کے لیے تین بار بسیں بدلنی پڑتی ہیں۔"

"بتایا تھا" میں نے کہا "اب تم یہ بتاؤ کہ ہمیں کہاں تک لے جاؤ گے اور آگے ہم کون سی بس پکڑیں استاد۔"

"یہ ہوئی نہ بات۔ لاؤ کرایہ نکالو" ڈرائیور استاد کا خطاب پا کے خوش ہو گیا تھا۔

کرایہ وصول کر کے اس نے ہمیں بڑی وضاحت سے بتایا کہ ہمیں کہاں اترنا ہو گا۔ پھر کس وقت کون سی بس ملے گی اور اندور لے جانے والی بس ہمیں کس وقت اندور پہنچائے گی۔ ہمیں کس بس میں کتنا کرایہ ادا کرنا ہو گا۔

باری باری گل اور نازو کو گھورنے کے علاوہ استاد اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا تھا۔ سگریٹ کو اس نے بند مٹھی میں دبا رکھا تھا اور جب وہ کش لیتا تھا تو اپنے ہاتھ کو حقے کی نے فرض کر کے شوں سے اندر سانس کھینچتا تھا۔ دھوئیں کو کافی دیر اپنے سینے میں روک کے ناک سے نکالتا تھا اور دار طلب نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کی نظر ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہر جگہ تھی سوائے سڑک کے۔

ساڑھے تین بجے ایک سنسان بس اسٹینڈ پر سارے مسافر اتر گئے۔ ان میں سے بیشتر وہیں برآمدے جیسی جگہ میں پڑ کے سو گئے۔ وہ ریسٹ ہاؤس نما تھا اور ان مسافروں کو غالباً صبح سے پہلے کوئی بس نہیں پکڑنی تھی۔ چند مسافر دوسری طرف لپکے۔ ان میں سے ایک نے ہمیں بھی اشارے سے بتایا کہ اب وہ بس آگے لے جائے گی۔ ڈرائیور نے اسے ڈانٹ کے بھگا دیا اور خود ہمیں اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے دوسرے ڈرائیور سے مذاکرات کیے اور ہمارے معزز ہونے کا یقین دلا کے رخصت ہوا۔ سپرد ہم پہ تو یہ خوش رہا۔

دوسرے ڈرائیور نے ہمیں بادل ناخواستہ معزز تسلیم کیا۔ وہ بھی اس لیے کہ ڈرائیور برادری کے ایک فرد نے ہماری سفارش کی تھی ورنہ اپنی نظر میں اس کے لیے اپنے سوا کوئی معزز نہ تھا۔ اس سے ہمارے تعلقات تمام راستے سابقہ ڈرائیور کی طرح خوش گوار نہ ہو سکے۔ میری اور غالب کی خوش خلقی اور انسان دوستی کے جذبات بالکل کام نہ آئے۔ میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی۔ ہم جیسی کے آگے بین بجانے سے عاجز آ گئے تو آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ڈرائیور کے نزدیک ہم شہری تھے اور غالباً وہ ہر شہری کو پڑھا لکھا، مکار، چالاک، بے شرم اور بے دھرم سمجھتا تھا۔ جب ہم آپس میں انگریزی بولنے لگے تو کشیدگی بڑھ گئی۔

دوسری بس کے شریک سفر بھی کم دیہاتی نہ تھے۔ ان کا ہکا بکا ہو کے ہمیں دیکھنا فطری سی بات تھی مگر ان میں سے کوئی بداخلاق نہیں تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک عورت کے بچے کی طبیعت بگڑ گئی اور اس نے الٹی کی تو میرے جوتے خراب ہو گئے۔ عورت بچے کو بھول کے مجھ سے معافی مانگنے لگی "سرکار! غلطی ہو گئی" وہ ہاتھ جوڑ کے بولی۔

میں نے کہا "نہیں۔ یہ کیا کر رہی ہو۔ بچے کو سنبھالو۔ کس بات کی معافی مانگ رہی ہو؟"

"آپ کے جوتے.... " وہ جوتوں کو صاف کرنے لگی۔

میں نے کہا "جوتے خراب ہو گئے تو کیا۔ دھل جائیں گے۔ اس میں تمہاری کیا غلطی ہے۔ چلو چھوڑو۔"

نازو نے رومال سے بچے کا منہ صاف کیا کیوں کہ جس کپڑے سے وہ عورت جوتے صاف کر چکی تھی اسی سے بچے کا منہ صاف کرنا چاہتی تھی۔ "یہ گندا کپڑا پھینک دو" نازو نے کہا اور اسے اپنا رومال دے دیا "ابھی یہ تو اور بیمار ہو گا یہ۔"

میں نے کہا "تم نے دوا میں رکھی تھیں نا؟"

گل نے اقرار میں سر ہلایا "بچوں کی دوا تو کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "دستوں اور قے کی گولیاں ہیں؟ ایک گولی دے دو۔ کام چل جائے گا ابھی۔"

گل نے ایک پیکٹ سامنے تھما دیا۔ میں نے اس میں سے ایک گولی نکال کر عورت کو دی "یہ اسے پانی کے ساتھ دے دو۔ صبح ڈاکٹر کو دکھا دینا۔"

یکایک فضا بدل گئی۔ ڈرائیور شرمندہ نظر آنے لگا۔ ہم سب کی نظر میں نیکی کے فرشتے بن گئے۔ دیہاتی ہمارے رویے سے متاثر ہونے لگے۔ اس دیہاتی عورت کا شوہر تو بندۂ بے دام ہو گیا تھا۔ غالباً بچے کو کسی چیز سے الرجی ہو گئی تھی۔ بس میں پٹرول کی بو سے بہت سے بڑے لوگ بھی متلی محسوس کرتے ہیں۔ صرف آدھے گھنٹے بعد نڈھال بچہ ٹھیک ہو کے مسکرانے لگا اور کھیلنے لگا تو میں ڈاکٹر صاحب بن گیا۔ ہر زبان پر ڈاکٹر صاحب کے دست شفا کا ذکر تھا۔ بس ایک گولی دی اور بچہ ٹھیک۔ کمال ہے یہ تو۔

www.paksociety.com

دو گھنٹے کے سفر کے بعد جب یہ بس اپنے سفر کے آخری اسٹاپ پر پہنچی تو ڈرائیور نے ہمیں چائے پر مدعو کیا۔ وہاں مجھے کوئی چائے خانہ نظر نہیں آرہا تھا مگر بس اسٹینڈ کے پچھلے حصے میں اسٹاف روم تھا۔ وہاں اس نے خود چائے بنا کے پیش کی کیوں کہ اندور جانے والی بس کے آنے میں ایک گھنٹا تھا۔ اسٹاف روم میں دو کلینر سو رہے تھے جن کو ڈرائیور نے باہر نکال دیا اور ہم نے وہاں پون گھنٹا بڑے آرام سے گزارا۔ اسٹاف روم کے ساتھ باتھ روم بھی تھا۔ اور چائے جیسی بھی تھی' صبح کے سرد موسم میں اپنا کام دکھا گئی۔

ہم اندور جانے والی بس میں سوار ہوئے تو بالکل تازہ دم تھے۔ یہ بس بھی بہت بہتر تھی اور بس میں ہماری سیٹ آگے پیچھے تھی۔ آگے والی سیٹ پر نازو کھڑکی کے ساتھ تھی اور اس کے برابر غالب تھا۔ میرے ساتھ گل تھی اور کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی۔ ہمارے بیگ سیٹوں کے نیچے محفوظ تھے۔

روانگی کے ایک گھنٹے بعد سورج نکلا تو ہم سب مبہوت بیٹھے اس منظر کی دلکشی کے ہر لمحے میں کھوئے رہے۔ آسمان کا رنگ دیکھتے دیکھتے آتشیں سے سنہرا ہو گیا۔ پرندوں کے پرے فضا میں پرواز کرتے نظر آنے لگے۔ بس کی بند کھڑکیوں کے باہر یقیناً سردی تھی مگر اندر کی فضا مسافروں کے جسم کی حرارت سے گرم تھی۔ دھند گہری ہوئی تو سورج کا زرد گولا ایسے افق پر طلوع ہوا جیسے چودھویں شب کا چاند ہو۔ پھر آہستہ آہستہ دھند چھٹنے لگی اور چاندنی جیسی دھوپ کا رنگ نکھر آ گیا۔ اجلی سفید دھوپ میں دیہی زندگی کے نقش ابھرنے لگے۔ کھیتوں میں ہل چلانے والے' بستے اور تختیاں لٹکا کے اسکول جانے والے بچے' گھروں میں معمولات سرانجام دینے والی عورتیں' صبح دم روانہ ہو جانے والی برات جس میں عورتوں مردوں سمیت بیس پچیس افراد شامل تھے۔ کفن دار پگڑی باندھے اور گلے میں ہار ڈالے دولہا سب سے آگے شہنائی جیسا ایک ساز بجانے والے کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ عورتوں نے لال پیلے چھینٹ کے لہنگے اور رنگ برنگی چنریاں اوڑھ رکھی تھیں۔ یہ منظر گزر گیا تو سڑک کے کنارے پولیس کے اہلکار کسی کو ہتھکڑی ڈالے نظر آئے۔ پھٹے کپڑوں والا خستہ حال ملزم ننگے پاؤں تھا اور سردی یا خوف سے کانپ رہا تھا۔

ہم سب خاموش تھے۔ بس خاصی رفتار سے رواں تھی اور ہمیں ایسا لگتا تھا کہ خطرات کی وہ دلدل جس میں ہم مدت سے پھنسے ہوئے تھے بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ ایک بار پھر تحفظ اور سلامتی کے احساس نے ہمارے دلوں میں امید اور حوصلے کی دبی ہوئی چنگاری کو روشن کر دیا تھا۔ مایوسی اور ناکامی کا خیال ماحول کی دھند کی طرح چھٹ رہا تھا اور مستقبل پر یقین کی دھوپ پھیل رہی تھی۔

ابھی تک کہیں بھی کسی بس کو روک کر چیک نہیں کیا گیا تھا۔ شاید رات کے وقت قانون کے محافظ زیادہ مستعد نہیں رہتے۔ دن کے اجالے میں کیا ہوگا' یہ بہت جلد معلوم ہونے والا تھا۔ ہم اس راستے سے بھٹک کر بہت دور نکل آئے تھے جس پر ہمارے پیچھے لگے ہوئے شکاری ہر سراغ سے ہماری منزل کا تعین کر لیتے تھے۔ اب ہم دور افتادہ اور گمنام راستوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے تھے اور ایسے علاقے میں پہنچ گئے تھے جہاں ابھی تک ہمارے افسانے نہیں پہنچے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے شہر کی سڑک پر جان بچا کے بھاگنے والا پرانے شہر کی گلیوں میں گھس جائے اور اس کا تعاقب کرنے والے ان بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہ جائیں۔

دس بجے بس رکی اور مسافر اتر گئے۔ آس پاس اور بھی بہت سی مسافر بسیں مختصر قیام کے لئے آرہی تھیں اور روانہ ہو رہی تھیں۔ ڈرائیور نے ہمیں مطلع کیا کہ یہاں ناشتا ملتا ہے' اس کے بعد بس دوپہر کے کھانے تک کہیں نہیں رکے گی۔

"ہم بھی کچھ کھا لیں۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "باہر بہت لوگ ہیں۔ ناشتا یہیں منگوا لیتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کوئی تاڑ لے تو اچھا خاصا پُرسکون سفر پھر جان بچانے کے لئے فرار کی کوشش کی نذر ہو جائے۔ کسی کو اشارہ کر کے بلا لو۔"

ہماری طرح بس میں بیٹھے رہنے والے دو ہی مسافر تھے۔ ایک بہت بوڑھا شخص تھا اور دوسری کوئی مسلمان عورت جو پردے کی سخت پابند تھی اور شٹل کاک برقعے کے اندر روپوش بیٹھی تھی۔ غالب کے اشارے پر پہلے ایک اخبار والا آیا۔ اس کے پاس سب ہندی کے اخبار تھے۔

"انگریزی اخبار نہیں ملے گا؟" میں نے کہا۔

"کون سا اخبار؟" وہ بولا۔

"ٹائمز آف انڈیا۔ اسٹیٹس مین۔۔۔ یا کوئی اور۔"

"کل کا ملے گا" وہ بولا "ادھر شام کو آتا ہے۔"

میں نے کہا "کل کا ہی لا دو۔ اور ذرا چائے والے کو بھیج دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

ناشتے سے پہلے وہ اخبار لے آیا اور گزشتہ روز کے اخبار کے دو روپے لے گیا۔ اس کے پہلے صفحے کی خبریں پڑھ کر میری نظروں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ الفاظ آپس میں گڈمڈ ہونے لگے اور حروف کی سیاہی یوں بہنے لگی جیسے کاغذ پر لہو پھیل گیا ہو۔

میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا "مرزا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟ آخر یہ سب کیا ہے؟"

میرے لہجے کی وحشت نے غالب کو سراسیمہ کر دیا۔ اس نے اخبار مجھ سے چھین لیا۔

"مرزا' یہ سب جھوٹ ہوگا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ آخر۔۔۔ یہ سب' مرزا۔۔۔"

غالب نے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ جھوٹ ہے' محض

پروپیگنڈا۔ سرکاری اطلاعات۔"

نازو نے کہا "ایسے چلاؤ مت۔ لوگ نہ جانے کیا سمجھیں گے۔ آخر یہاں سب ہی اخبار پڑھ رہے ہیں۔ دیکھو باہر۔"

میں نے باہر دیکھا۔ بنچوں اور کرسیوں پر ناشتا کرنے والے اور چائے پینے والے بھی ہندی اخبار پڑھ رہے تھے۔ پڑھ کے سنا رہے تھے اور سننے والے بڑے انہماک سے بھارتی فوج کی فتوحات اور پیش قدمی کے شاندار افسانے سن رہے تھے۔ مغربی پاکستان کی سرحد پر لڑائی چھڑ گئی تھی۔ ہندوستانی فوجیں مشرقی پاکستان میں داخل ہو گئی تھیں۔ شیخ مجیب کی اپیل پر بھارتی ہائی کمان نے لبیک کہا تھا اور مشرقی پاکستان کے نہتے عوام کو پاکستانی فوج کے مظالم سے نجات دلانے اور بنگالیوں کی جدوجہد آزادی کو کامیاب بنانے کے لئے ہر طرف سے حملہ کر دیا تھا۔ صورت حال اتنی سنگین تھی کہ مشرقی پاکستان کے ہر شہر' قصبے اور گاؤں میں جنگ ہو رہی تھی۔ ہندوستانی اخبار یہ بتا رہے تھے کہ بنگالیوں کے جذبۂ حریت کو فتح حاصل ہو رہی ہے اور پاکستانی فوج محصور ہوتی جا رہی ہے۔ اور بنگلہ دیش کی تشکیل کے خواب کو تعبیر مل رہی ہے۔ بھارتی افواج کی مدد سے' ہندو سرمائے سے اور ایک بین الاقوامی سازش کے تحت مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کرنے والے کامیاب ہو رہے تھے۔

غصے کا آتش فشاں میرے اندر پھٹ پڑا۔ میں نے اس اخبار کو پھاڑ دیا "بکواس کرتے ہیں یہ سب اخبار والے۔"

غالب نے اخبار مجھ سے چھین لیا "سکندر! ہوش میں آؤ۔ ایسے جذبات کا مظاہرہ ہمارے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟" میں نے خود کو سنبھال کے کہا۔

"اخبار میں جو کچھ ہے' سب جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہوگی" غالب نے کہا "مثلاً یہ خبر تو سب کے حوالے سے دی گئی ہے کہ مغربی پاکستان کی سرحد پر جنگ چھڑ گئی ہے' یہ غلط نہیں ہو سکتا۔"

"اور مشرقی پاکستان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے؟"

"یہ بھی تصدیق طلب ہے۔ اگر انڈین آرمی پہنچ گئی ہے بنگال میں تو خونریزی لازمی ہے" غالب نے خبروں پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا "اب یہ خانہ جنگی نہیں' دو ملکوں' دو قوموں کی جنگ ہے۔ انہیں کیا حق پہنچتا ہے ہمارے ملک کے داخلی معاملات میں دخل دینے کا۔"

"حق' ناحق اور باطل کی بات مت کرو۔ یہ انٹرنیشنل سوسائٹی ہے" میں نے تلخی سے کہا "غدار جب ہمارے درمیان ہیں تو ہم دوسروں کو کیا کہیں۔ خانہ جنگی کب سے چل رہی تھی۔ اب خود انہوں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ اپنے دشمنوں کو بلا لیا ہے مدد کے لئے تو۔۔۔"

ناشتے والا ایک ٹرے لے کر آیا مگر اب بھوک کسی کو نہیں تھی۔ سب مایوس اور دل شکستہ تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم ہار گئے۔ دلاور جیت گیا۔ ہماری سب جدوجہد رائیگاں گئی۔ ہر قربانی ضائع ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں شہید ہونے والوں کے لہو کی آبرو مٹ گئی۔۔ قومیت پر یقین رکھنے والوں کا ایمان بک گیا۔ دل کی ہر دھڑکن تکرار کرتی تھی۔ ناممکن۔ ناممکن۔ ناممکن۔ عقل فریاد کرتی تھی کہ دوش زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔ حشر بپا ہو گیا۔ تم اب بھی ہوش میں نہیں آئے تو کب آؤ گے؟ حقیقت سے آنکھیں چرانے سے کیا ہوگا؟ کب تک نہ مانو گے تم کہ جو نہیں ہونا تھا وہ ہو گیا۔ ایسا تم نہیں چاہتے تھے۔ تمہارے کروڑوں ہم وطن۔ اسلام کے نام لیوا۔ پاکستان بنانے والے۔ وہ سب نہیں چاہتے تھے مگر انٹرنیشنل سوسائٹی۔ امریکا' روس۔ اقوام متحدہ۔ یہودی اور اسلام دشمن عناصر' پاکستان کے وجود کو تسلیم نہ کرنے والے سب ایک ہو گئے تھے۔

باہر والا آیا اور ناشتا جوں کا توں واپس لے گیا۔ اس نے چائے کے پیسے وصول کئے "کھانا پینا نہیں تھا تو کیوں منگوایا؟" اس نے کہا اور نیچے اتر گیا۔ مسافر پھر بس میں آ بیٹھے' بس پھر چل پڑی۔ گل اور نازو کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بار بار آنکھیں صاف کرتی تھیں۔ میرا دماغ گرم ہو رہا تھا۔ میں چیخ چیخ کے رونا چاہتا تھا مگر ضبط کرنے پر مجبور تھا۔ میرے آس پاس لوگ اس صورت حال پر تبصرے کر رہے تھے۔ وہ سب بھارتی تھے۔ ان کے لئے یہ خبر اچھی خبر تھی۔ وہ خوش تھے۔ بھارتی فوجیں فتح حاصل کر رہی ہیں۔ بنگالی حریت پسندوں کی مدد کر رہی ہیں۔ پاکستان کے دو ٹکڑے ہو رہے ہیں۔ مغربی پاکستان نے بہت ظلم کیا۔ بہت استحصال کیا بنگالیوں کا۔ شیخ مجیب ان کا نجات دہندہ ہے۔ اندرا گاندھی نے کہا ہے کہ ہم مظلوموں کے ساتھ ہیں۔ مظلوم کی پکار کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بنگالیوں پر پاکستانی فوج کے انسانیت سوز مظالم کو خاموش تماشائی بن کے نہیں دیکھ سکتے۔

ہم [illegible] برداشت کرتے رہے۔ ہم نے اخبار کی ایک ایک سطر کو کئی بار پڑھا۔ بس میں ریڈیو بھی تھا۔ لوگ ہر ایک گھنٹے بعد نشر ہونے والا بلیٹن سننا چاہتے تھے۔ ڈرائیور بھی بھارتی تھا۔ سب کے ساتھ وہ بھی بڑھ چڑھ کے بول رہا تھا۔ وہ سب پاکستان کو گالیاں دے رہے تھے۔ پاکستان کے دشمنوں کے درمیان ہم چاروں ایسے تھے جیسے بھوکے بھیڑیوں کے درمیان خرگوش۔ اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ ہم کون ہیں تو وہ پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے خود ہماری تکا بوٹی کر ڈالتے۔ اگر انہیں یہ احساس

www.paksociety.com

ہو جاتا کہ ہم جذباتی طور پر ان کے ساتھ نہیں تو دشمن قرار پاتے۔

گل اور نازو کو روتا دیکھ کر ایک شخص نے کہا "کیا بات ہے بھائی؟"

میں نے کہا "ہم برباد ہو گئے ہیں۔ ہمارا سب کچھ لٹ گیا ہے۔"

غالب نے فوراً کہا "ہمارا خاندان مٹ گیا ہے۔"

"کسی حادثے میں؟" ایک اور شخص نے کہا۔

"ہاں۔ بہت بڑا حادثہ تھا" میں نے کہا "کچھ نہیں بچا۔"

اب میں رو سکتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے میرے الفاظ کا مطلب وہ سمجھا جو میرا مطلب نہیں تھا سو مجھے تسلی دینے لگے۔ غالب، نازو اور گل کو تسلی دینے لگے۔ حادثے کی تفصیلات پوچھنے لگے۔ ہم انہیں کیا بتاتے۔ تنگ آ کے انہوں نے ہمیں ہمارے حال پہ چھوڑ دیا۔

شام کو ہم لاہور پہنچے۔ اب یوں لگتا تھا کہ ہمارے کرنے کو کچھ نہیں رہا۔ ہمارا عزم اور حوصلہ، جوش اور ولولہ شکست کے احساس میں زائل ہو گیا تھا۔ ہم اچانک خطرے کے وجود سے بے نیاز ہو گئے تھے۔

بہت دیر تک ہم بس اسٹینڈ کی گہما گہمی میں خاموش کھڑے رہے اور سوچتے رہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ میں چاہتا تھا کہ کچھ نہ سوچوں۔ میں اپنے خیالوں کے عذاب سے اور احساس کی اذیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں سو جاؤں۔ لمبی نیند۔ اتنی لمبی کہ جب آنکھ کھلے تو احساس بھی مر چکا ہو۔ مجھے خواب آور گولیوں کی پوری شیشی کھانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں زہر کھا کے لیٹ جانا چاہتا تھا۔ کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ میری زندہ رہنے کی خواہش مر چکی تھی۔

غالب نے کہا "اب کیا کریں؟"

میں نے کہا "اب کرنے کو کچھ نہیں رہا۔ ہمیں مر جانا چاہیے۔"

نازو نے کہا "ایسی باتیں مت کرو۔ ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے۔"

میں نے کہا "شکست یا نہیں ہے۔ دھوکا ہے۔ فریب ہے۔ تقدیر نے کیا ہے ہماری تقدیر میں۔"

"تقدیر ہی سب کچھ کرتی ہے۔"

ہمارے چاروں طرف مصروف انسانوں کی دنیا تھی جن کو اپنے اپنے کاروبار، روزی کے سوا کسی کی فکر نہ تھی۔ سب معمول کے مطابق اپنا کام کر رہے تھے۔ اکثریت ان کی تھی جو نہ ملک کی سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے اور نہ عالمی سیاست سے۔

کہاں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ اس کی انہیں پروا نہ تھی۔ انہیں شام کی روٹی دال اور آنے والے دن کا زیادہ خیال تھا۔ ان کے لیے گھر اور بیوی بچے زیادہ اہم تھے جن کی پرورش کا بار وہ اٹھاتے تھے۔ امریکا کیا چاہتا ہے، روس کیا کر رہا ہے، ہندوستان پاکستان کے درمیان کون ہے۔ وہ سوچتے بھی نہیں تھے۔ وہ عام لوگوں سے سنتے تھے کہ جنگ ہو رہی ہے تو فکرمند ہو جاتے تھے کہ جنگ کہیں بھوک اور بے روزگاری نہ لائے۔ وہ جنگ نہیں چاہتے تھے مگر انہیں بھی یہ اطمینان حاصل تھا کہ ہندوستان کا پلہ بھاری ہے۔ اور یہ بات بتانے والے اخبار پڑھ رہے تھے، بحث کر رہے تھے۔ کیا سچ ہے کیا غلط ہے۔ سٹہ کھیل رہے تھے۔ شرطیں لگا رہے تھے۔ پیش گوئیاں کر رہے تھے۔ سیاسی پنڈت اور دانشور ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں اظہار خیال کر رہے تھے۔ تجزیے اور تبصرے پیش کر رہے تھے۔

ہم چاروں کچھ نہیں کر رہے تھے۔ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔

غالب نے کہا "یہاں سے تو چلو۔"

"کہاں چلیں؟" نازو نے کہا۔

"کہیں تو جائیں گے۔ یہاں کھڑے رہیں گے کیا؟" غالب نے کہا "اس سے کیا ہوگا۔"

"پھر کیا واپس چلیں؟" نازو نے کہا۔

"نہیں، ہم آگے جائیں گے" غالب نے کہا۔

"کیا لے گا آگے جا کے؟"

"محسن ضرور ملے گا" گل نے کہا "وہ انتظار کر رہا ہوگا ہمارا۔"

اچانک مجھے بھرا ہی حوصلہ مل گیا۔ راستہ مل گیا۔

"ہاں۔ محسن کو ساتھ لیے بغیر ہم کیسے واپس جا سکتے ہیں" میں نے بیگ اٹھا لیا "ہم ڈھاکا جائیں گے۔"

"کیسے جائیں گے ڈھاکا جو اب تو دونوں میں جنگ ہو رہی ہے۔" غالب نے کہا۔ ہم سب ایک سڑک پر چلنے لگے۔

"کہیں راستہ ضرور ہوگا۔ ورنہ ہم میدان جنگ سے گزر کے جائیں گے۔ یہاں سے نکلنا پہنچنا تو مشکل نہیں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "ہاں۔ اصل مسئلہ سرحد عبور کرنے کا ہے۔"

"میرا خیال ہے..... تم لوگ واپس جاؤ" میں نے کہا "میں اکیلا جا کے اسے لے آؤں گا۔"

"ہم سب ساتھ ہیں اور ساتھ رہیں گے" غالب نے گویا فیصلہ سنا دیا "لیکن ابھی چلو۔ کہیں بیٹھ کے سوچتے ہیں کہ ان حالات میں ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔"

ساری رات اور دن بھر سفر کرنے کے بعد سب کا تھکن سے برا حال تھا۔ جسمانی اذیت میں ذہنی عذاب شامل ہونے سے شکست سب کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ ایک چوک پر ہم سب رک گئے۔

نازو نے کہا "میں تو اب کھڑی بھی نہیں رہ سکتی۔ گر جاؤں گی بے ہوش ہو کے۔"

گل نے کچھ نہیں کہا مگر اس کی خاموشی نے سب بتا دیا۔ وہ رکے بغیر آگے جانا چاہتی تھی ڈھاکا تک جہاں محسن تھا۔

میں نے کہا "ہم کسی ہوٹل میں ٹھہر سکتے ہیں۔"

"ہاں۔ تھوڑا بہت سرمایہ ہے ہمارے پاس۔ نقد بھی دس بارہ ہزار اور زیورات بھی ہیں۔"

"انہیں ابھی رہنے دو" میں نے کہا "سونا وہ کرنسی ہے جو ہر سرحد کے پار چلتا ہے۔ ہمیں نہ جانے کہاں کیش کرانا پڑے۔ اب تو ہم سرحد کے ادھر بھی خطرے میں ہیں اور ادھر بھی۔"

ایک اجنبی شہر میں پھرتے ہوئے ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہ آیا کہ کوئی ہمیں پہچان جائے گا۔ کوئی ہماری طرف متوجہ بھی نہیں تھا۔ اگر کوئی دیکھتا تھا تو گل اور نازو کی خوب صورتی کو، ہم کسی کی نگاہ غلط انداز کے بھی لائق نہ تھے۔ اپنے حلیوں سے ہم بکھر بال بچے تھے اور آج اتنے عرصے بعد ہمارا کوئی لاہور کا جاننے والا ملتا تو شاید ہمیں پہچان بھی نہ پاتا۔ ہمارے بال اتنے لمبے ہو گئے تھے کہ ہپی نظر آتے تھے۔ داڑھی چہرے پر پھیل کر مونچھوں سے مل گئی تھی۔ سفر کی گرد میں بکھرے بالوں کے ساتھ ہم اجڈ اور جنگلی لگتے تھے جبکہ گل اور نازو کی موجودگی ہمارے ساتھ بہت لوگوں کے لیے افسوس یا رشک و حسد کا سبب بنی تھی۔

ہم نے ایک راہ گیر سے کسی ہوٹل کا پتا پوچھا تو وہ خود اجنبی نکلا۔ دوسرا اپنا مقامی آدمی تھا۔ اس نے پہلے تو مصافحہ کیا۔

"پنجاب سے آئے ہو خیر سے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "ہاں" اس نے ہمارے لباس سے اندازہ کیا تھا کہ ہمارا تعلق پنجاب سے ہوگا مگر میں اس تعلق کی بنیاد پر زیادہ اپنائیت کا مظاہرہ کرنے اور بود و باش سے متعلق معلومات کا تبادلہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

وہ بھی جلدی میں تھا "ایک تو ہیں اونچے ہوٹل....."

میں نے کہا "ذرا نیچے آ جاؤ۔"

وہ مسکرایا "ٹھیک ہے تمہارے ساتھ۔ تم زمیں دار ہوٹل چلے جاؤ۔ وہ تمہاری ٹکڑ برادری کا ہے۔ اگلے چوک سے دائیں ہاتھ۔"

"آؤ کا پتا" غالب نے اس کے جانے کے بعد کہا "ہم اسے ... لگے تھے۔"

میں نے کہا "غالباً ہمارے جھاڑ جھنکاڑ بالوں سے۔"

"شکر ہے کہ یہی کہاں ہے ہمارے سر پر؟ اور بال اتنے تو نہیں بڑھے ہیں کہ کیس نظر آتے ہوں" غالب نے خفگی سے کہا۔

زمیں دار ہوٹل میں ایک ریشے نائب شخص نے ہمیں باری باری گلے لگایا اور خوش آمدید کہا۔ مگر اسے معلوم ہوا کہ ہم سکھ نہیں ہیں، مسلمان ہیں تو اس کا جذبۂ ایمان سرد پڑ گیا۔

"سکھ ہو نہیں تو نظر کیوں آتے ہو؟" اس نے بالکل بنکوں والا سوال کیا "اپنا نام پتا لکھوا اس رجسٹر میں۔ ساتھ ساتھ لوگے کمرا آمنے سامنے۔ پانچ سو ابھی جمع کرا دو۔"

ہم نے فرضی نام پتے درج کیے اور ساتھ ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ کمرے دیکھنے کے بعد ان کمروں کے پیچھے رہنے لگے۔ میں کمرے کے پیچھے بھی تقریباً دو فٹ چوڑا چھجا تھا جو دراصل پچھلی منزل کے کمرے کی کھڑکی اور دروازوں کے اوپر تھا۔ ایمرجنسی میں ہم پچھلی طرف سے بھی رابطہ رکھ سکتے تھے۔ گو امکان بہت کم تھا کہ ایسی ہنگامی صورت حال پیدا ہو۔ کمرے کشادہ اور آرام دہ تھے۔

رات ہو گئی تھی۔ تھکن مٹانے کے لیے باری باری سب نے گرم پانی سے غسل کیا۔ پھر گل اور نازو ہمارے کمرے میں آ گئیں۔ سب کے دل بوجھل تھے اور ذہن پریشانی کا شکار تھے۔ مستقبل کے بارے میں سب فکرمند تھے۔ مگر یوں لگتا تھا جیسے سب اس موضوع پر بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ایم آر ایس کے ایکشن کی بے یقینی کی باد سموم اڑا لے گئی تھی اور جو دو چند آزمائش، مصائب و آلام، دربدری اور غریب الوطنی کا محدود نقصانات اور قربانیوں کے طویل دور کا اختتام ہماری توقعات کے اعتبار سے ہوا تھا کہ اس صدمے نے ذہنوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ بے یقینی کے اس خلا سے نکلنا کیسے ہوگا؟ یہ سوال اپنا جواب مانگتا تھا مگر ابھی کوئی اس قابل نہ تھا کہ سوچ اور کچھ کہے۔ کوئی ایسی بات جو شکست خوردہ دلوں کے درد کو درماں فراہم کر سکے۔ جو مداوے کی تجویز دے کرے۔

غالب نے کہا "یار صورت حال اچانک اتنی خراب نہیں ہو سکتی۔ چند دنوں میں۔"

میں نے کہا "حالات بہت تیزی سے بگڑ رہے تھے۔"

"اگر ہم ریڈیو پاکستان سن سکتے۔ یا ابھی تو؟" غالب نے گھڑی دیکھی "ابھی تو دکانیں کھلی ہوں گی۔ کیوں نہ چل کر ایک ریڈیو خرید لیں۔"

"چلو۔ کچھ کھانے کو بھی لے آئیں گے۔"

نازو نے کہا "کھانے کو یہاں بھی مل جائے گا۔ ریڈیو پر خبریں سن کے کیا ہوگا۔ حقیقت بدل جائے گی؟"

گل نے کہا "ہم اکیلے نہیں رہیں گے۔ تم دونوں کہاں جا رہے ہو۔ یا تو ہمیں بھی ساتھ لے کر چلو۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "اچھا غالب رہے گا یہاں۔ میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ سردار جی سے پوچھ لوں گا کہ ریڈیو کہاں سے مل سکتا ہے۔ انھیں ہدایات بھی دے دوں گا کہ ہم چھوٹے کا گوشت نہیں کھاتے۔ دال سبزی پر گزارا کر لیں گے۔ ابھی چائے بھیج دیں گے۔"

نازو نے کہا "یہ سب آپ روم سروس والوں سے کہہ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہاں کوئی بٹن نظر آ رہا ہے کال بیل کا؟ مجھے خود ہی جانا پڑے گا۔"

غالب نے کہا "یار یار، انھیں بولتے وقت دیر مت کرنا۔"

ہوٹل زیادہ بڑا نہیں تھا۔ تین منزلہ عمارت میں شاید پچاس ہی کمرے ہوں گے۔ ہر منزل پر آمنے سامنے دس کمرے تھے۔ پانچ ایک طرف اور پانچ دوسری طرف۔ سردار جی نے جس طرح ہمیں انتخاب کا حق دیا تھا اس سے تو یہی پتا چلتا تھا کہ بیشتر کمرے خالی ہوں گے مگر ایسا نہیں تھا۔ گراؤنڈ فلور اور فرسٹ فلور کے سب کمروں میں لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم سیکنڈ فلور پر تھے۔ ہمارے کمروں کے نمبر دو سو پانچ اور دو سو چھ تھے جس سے یوں لگتا تھا کہ ہوٹل میں دو سو سے زیادہ کمرے ہوں گے۔ مگر ہر ہوٹل میں کمرے کے نمبر کا پہلا عدد فلور کی نشان دہی کرتا ہے۔

میں فرسٹ فلور سے گھوم کر نیچے پہنچنے ہی والا تھا کہ میرے کانوں نے سردار جی کی آواز سنی۔ یہ آواز زینے کے دائیں طرف ایک روشن دان سے مجھ تک پہنچ رہی تھی جو تقریباً میرے سامنے تھا اور اس میں سے مجھے سردار جی خود بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنے آفس کے پیچھے والے بیڈ روم میں تھے اور ٹیلی فون پر کسی سے لڑ رہے تھے۔

"اوئے پاگل دے پتر، میں ٹھیک بول رہا ہوں۔ ہاں یار ایک بار نہیں دو بار غلطی ہوئی تھی مجھ سے۔ نشے میں بھول چوک ہو جاتی ہے مگر اس وقت نشے میں نہیں ہوں میں۔ واہگورو دی سوں۔ او کھوتے تو مانتا کیوں نہیں میری بات۔ میں جو کہہ رہا ہوں کہ وہی دونوں ہیں۔ بالکل ٹھیک پہچانا ہے میں نے۔ تیری ترقی ہو جائے گی۔"

سردار جی نے اسے ایک ناقابل اشاعت گالی دی۔

"تو دیکھ میری بات مان۔ اپنی نفری لے کر فٹافٹ آ جا۔ پکڑ لے سب کو۔ میرا کیا نا کر دے اس کی حرامی۔ بار بار وہی بات۔ میں نے صبح سے ہاتھ نہیں لگایا دارو کو۔ بے شک تو آ کے یہ بھی دیکھ لے۔ تو اتنا بڑا افسر ہے پولیس کا۔ چار بندے بھیج دے۔ میرا کیا جاتا ہے۔ غلط ہو گا تو واپس چلے جائیں گے۔ لیکن دیکھ انعام سارا مجھے دلوانا۔ اگر میری بات ٹھیک ہو۔ تو کیا کرے گا؟ ساڈا ای تے زیادہ مال بنا لیتا ہے……" انھوں نے مزید دو گالیاں دے کر فون رکھ دیا۔

میں الٹے پاؤں واپس گیا۔ شک کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی۔ سردار جی نے ہمیں پہچان کے پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔ ہمارے پاس فرار ہونے کے لئے بہت کم وقت تھا۔

غالب مجھے غور سے دیکھ کے بولا "کیا ہوا؟ کوئی مل گیا؟"

"ہاں۔ سردار جی نے…… پولیس کو فون کیا ہے" میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے کہا۔ اور انھیں وہ سب بتا دیا جو میں نے اتفاق سے سن لیا تھا۔

گل اور نازو کا رنگ اڑ گیا "یا میرے خدا! کیا اب واپسی کے راستے بھی بند ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا "بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ یہ وقت مایوسی کے بھنور میں مبتلا ہونے کا نہیں ہے۔ کون کہتا ہے راستے بند ہیں۔ راستے آدمی خود بناتا ہے اور بند راستے کھولے بھی جا سکتے ہیں۔"

گل نے کہا "بھائی سکندر! ہم نکلیں گے کیسے؟"

غالب نے کھڑکی سے باہر جھانکا "ادھر سے کود جائیں۔ مگر سڑک پہ بہت ٹریفک ہے۔"

میں نے دیکھا تو مجھے ایک تنگ سی سڑک پر تانگوں اور سائیکلوں کے ساتھ پیدل چلنے والوں کا اژدہام نظر آیا۔

"سامنے سے ہمیں کون نکلنے دے گا" میں نے کہا۔

"سامنے سے جائیں گے تو کتنے لوگ راستہ روکنے والے ہوں گے؟ یہ سردار جی اور دو چار دوسرے؟" غالب نے کہا "بازار کی طرف اترے تو مجمع گھیر لے گا۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ ہم ادھر سے جاتے ہیں جدھر سے آئے تھے۔ اپنے اپنے ریوالور تیار رکھو۔ نازو کوشش یہ کرنی ہے پہلے کہ فائرنگ کی نوبت نہ آئے ورنہ آواز باہر بھی سنی جائے گی اور ہوٹل میں بھی۔ بیگ اٹھاؤ۔ اور……"

ابھی میری بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے غالب کی طرف دیکھا۔ ایک ساتھ ہم دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ ریوالور سے میں نے نازو کو اشارہ کیا کہ دروازہ کھولے۔ گل باتھ روم میں غائب ہو گئی۔

نازو نے کہا "کون ہے؟"

"ملازم۔" دروازے کے پیچھے سے آواز آئی۔

یہ ایک لفظ میری سماعت پر بم کا دھماکا بن کے گرا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چودھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

شکاری

معاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت پوست
کے گھناؤنے انسان ہیں، جو بستیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک
کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے راستے میں
موت کی بستی میں گھر رہے تھے۔ چلتے دن، سلگتی راتیں
آس و یاس، خوف و ہراس، شب بیس خواب تلخ حقیقتیں

زندہ کرداروں پر مشتمل روایت شکن سلسلہ

نئی سوچ، نیا رنگ، نیا لہجہ، نیا آہنگ
احمد اقبال کے شعلہ بار و شبنم افشاں قلم سے

بتانے والے نے اپنا نام داؤد ہی بتایا تھا مگر یہ آواز مجھے چوہدری داؤد کی نہیں لگتی تھی۔ یہ بات بھی بعید از امکان تھی کہ جہاں اس کے خیال کا گزر بھی ناممکن محسوس ہوتا تھا وہاں وہ خود آ گیا ہو۔ ہم نے اپنے پیچھے کوئی نشان منزل نہیں چھوڑا تھا اور خود بھی اصلی راستے سے بھٹک کے اس طرح یہاں پہنچے تھے کہ داؤد کی طرح بھی ہمارا سراغ لگانے نکلتی تو منزل مقصود سے زیادہ پیچ اور دشوار گزار راہوں پہ جا کے کدھر نکل جاتی۔

جب دوسری بار دستک ہوئی تو میں نے ثاقب کے قریب جا کے سرگوشی میں کہا "یہ داؤد نہیں ہو سکتا۔"

ثاقب نے سر ہلایا "آواز سے تو نہیں لگتا۔ مگر آواز کا کیا ہے بدلی بھی جا سکتی ہے۔"

"او بھئی کیا ہے۔ اندر آ کے کیوں سو گئے۔ واہ بھئی واہ ایسا بھی کیا ہوا" باہر سے آواز آئی۔

ثاقب نے میرے اشارے پر دروازہ کھول دیا اور فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ ہوٹل کا مالک سکھ اندر آیا اور حیرانی سے ثاقب کو دیکھنے لگا جو انتہائی جارحانہ انداز اختیار کئے کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ سردار جی کی نظر ہم پر پڑتی میں نے اور ثاقب نے اپنے ہتھیار چھپا لئے۔ آہٹ پر سردار جی ایک دم پلٹے۔

"او یار کیا ہو گیا آخر۔ بھئی میں بندہ ہوں کوئی بھوت نہیں ہوں۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو سب کی شکلوں پہ......"

"ہاں جی، کچھ ہوئے ہیں؟" میں نے کہا۔

سردار جی کا موڈ خراب ہو گیا "اب تو قابو کر کے پکڑا۔ مگر آپ تو میرے گھر تھا جب تو سر اور داؤد جی سے آپ مجھے اپنا ہی نہیں گئے۔"

میں نے کہا "تو تمہارا نام داؤد ہے؟"

"داؤد تھی یار بتایا ہوں۔"

میں نے کہا "سردار جی! ابھی تم کسے فون کر رہے تھے؟"

سردار جی نے رازدارانہ لہجے میں کہا "پولیس کو۔ تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے کہا "سب سنا تھا میں نے...... آخر کیا چاہتے ہو تم؟"

اس نے کہا "او بے یار ہو گئے ہو۔ میں کوئی ڈرتا تو نہیں ہوں۔"

ثاقب نے کہا "ہم بھی ڈرتے نہیں ہیں۔"

سردار جی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے کہا "شش..... یہ آواز سنی تم نے؟"

میں نے ثاقب کی طرف اور ثاقب نے میری طرف دیکھا۔ سردار جی واقعی کچھ سننے کے لئے دیوار سے کان لگائے بیٹھے تھے۔ ساتھ والے کمرے میں ایک آہٹ سی سنائی دی۔ پھر کسی نے دبے دبے لہجے میں کچھ کہا۔ یہ کسی مرد کی آواز تھی۔ اس کی بات کا جواب کسی عورت کی چوڑیوں نے دیا۔ چوڑیوں کی کھنک کو جس نے دبا لیا۔

"یہ سنا تم نے؟" سردار جی نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے اپنی داڑھی کے برش سے صفائی بھی کر دی۔

"کیا ہے یہ معاملہ آخر؟"

"ان دونوں میں کا مرا ... میری ہی مت ماری گئی تھی کہ انہیں یہاں جگہ دے دی۔ پچھتا رہا ہوں" سردار جی ہاتھ ملنے لگے۔ "اب کیا کروں میں۔ کسی بدنامی ہوئی جب پولیس آنے کی طرح میں خود تو ان پر ہاتھ ڈال نہیں سکتا۔ وہ مجھے لمبا ڈال دیں گے۔"

میں نے کہا "ان لوگوں کی بات کر رہے ہو؟"

غالب نے کہا "کون ہے ساتھ والے کمرے میں؟"

"وہی بدمعاش۔ اگروال۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے جیل سے بھاگ گیا ورنہ لٹکا دیا جاتا۔ یہ عورت اس کی یار خود بھی بڑی تیز ہے۔ اسے نکال کے لے گئی اگروال کو جیل میں سے۔ نکلے ہیں اور کمیں میں سے نہیں... بہت مشکل کام تھا مگر اس نے جان کی بازی لگا دی۔ ایک نہیں دو سپاہیوں کی جان گئی تھی بندے تو وہیں مار دیے۔ اس کے بعد دو اگروال نے مارے۔ ایک کی بیوی بچی تھی۔ ایک کے گھر میں رات بھر رہے تھے۔ اب میری باری ہے۔ واہگورو نے مجھے کیوں مروایا..."

میں نے کہا "سردار جی! حوصلے سے کام لو۔ تم ابھی تک تو زندہ ہو۔ پولیس اسے ابھی پکڑ کے لے جائے گی اور اس عورت کو بھی۔"

"ہائے ہائے۔ یہ سب تو ٹھیک ہے پر اس کے بعد کیا ہوگا؟ ان کے بندے مجھے کب چھوڑیں گے" سردار جی نے کانپتے ہوئے کہا "جب ان کو پتا چلے گا کہ میں نے پکڑوایا تھا اگروال کو۔"

مجھے اور غالب کو صورت حال سمجھ میں آ گئی تھی مگر سردار جی کی بدحواسی دیکھ کے ہنسی بھی آ رہی تھی۔

"ایسی ہی بات تھی تو خبر نہ دیتے پولیس کو۔"

"کیسے نہ بتاتا۔ بعد میں پتا چل جاتا تو پولیس تھانے لے جا کے الٹا لٹکا دیتی مجھے بھی۔ ساتھی بنا دیتی اس کا۔ الزام آ جاتا کہ میں نے اس کی مدد کی۔ اسے چھپایا۔ ہوٹل کا تو بیڑا غرق ہو جاتا۔ واہگورو... دونوں طرف سے مروایا۔"

میں نے اچانک ایک فیصلہ کر کے کہا "کیا تم چاہتے ہو کہ الزام تم پر نہ آئے اور اس سے جان بھی چھوٹ جائے؟"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے جی۔"

میں نے کہا "ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم ایسا کرو کہ پولیس کو نہ آنے دو۔"

"کیسے نہ آنے دوں؟ خود بلایا ہے میں نے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔"

"جب وہ آئیں تو تم انہیں واپس کر دو۔"

"کمال کرتے ہو میرے ساتھ" وہ کمرے میں ٹہلنے لگا "میں تو چاہتا تھا کہ وہ ادھر تمہارے کمرے سے کھڑکی کے چھجے کی طرف جائیں اور کھڑکی سے ساتھ والے کمرے میں داخل ہوں۔ یا ان کو گرفتار کر لیں۔ اب پتا نہیں وہ کیا کرتے ہیں۔ میں کیا جانے کیا تھا۔"

میں نے کہا "سردار جی! پولیس مقابلہ ہوا یعنی دو طرف سے فائرنگ ہوئی تمہارے ہوٹل کی۔ کل خبر آئے گی کہ اگروال کو پناہ دے رکھی تھی۔ پھر کون شریف آدمی آئے گا یہاں؟ اور تم تو... ہوٹل کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔"

غالب نے کہا "ضرورت ہوئی تو اگروال کے ساتھی تم کو تو ختم کرتے جائیں گے۔"

"واہگورو" وہ ماتھا پیٹنے لگا "اب میں کیا کروں؟"

میں نے کہا "تم آرام سے جا کے ٹھنڈا پانی پیو۔ جب پولیس آئے تو صاف انکار کر دو کہ تم نے کسی کو فون نہیں کیا۔ کسی نے تمہارے ساتھ بے ہودہ مذاق کیا ہے۔ تمہارے ہوٹل میں اگروال کا کیا کام۔ یہاں شریف لوگ ہیں سب۔"

"اگر انہوں نے کہا... کہ اس کمرے میں کون ٹھہرا ہے؟"

"کوئی بھی ہو۔ انہیں یہ اختیار حاصل نہیں کہ کسی گمنام کال پر تمہارے ہوٹل کی تلاشی لیں اور ان کو چیک کریں جو یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ رجسٹر میں کیا نام لکھوایا ہے اگروال نے؟"

"مسٹر اینڈ مسز رام ناتھ ہوشیار... جرائی نہ ہو تو..."

میں نے کہا "تم جاؤ۔ پولیس آنے ہی والی ہوگی۔ آرام سے ان کو ٹال دو۔ ورنہ یاد رکھو کہ میں ابھی افسرانِ بالا سے اور اخبار والوں سے بات کرتا ہوں۔"

"مرنے دو انہیں" غالب نے کہا۔

"اور پھر؟ اس کا کیا ہوگا؟ اگروال..."

"اس کے بعد ہم نمٹ لیں گے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔" میں نے کہا "کتنی دیر ہوئی ہے اسے یہاں آئے ہوئے؟"

"بس تم آئے ہو تم سے ذرا دیر پہلے یہ آئے تھے۔ میری تو ست ماری گئی تھی کہ انہیں پہچانا نہیں۔"

"پہچان لیتے تب بھی تم انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اب اگر جان بچانی ہے اور بدنامی سے بچنا ہے تو جو ہم کہہ رہے ہیں وہی کرو۔ ورنہ بعد میں کچھ نہیں ہوگا" میں نے کہا۔

سردار جی نے بے بسی سے ہمیں دیکھا "تم... کیا کرو گے آخر؟"

میں نے کہا "سب ٹھیک کر لیں گے ہم۔ تم جاؤ۔"

جب میں نے اسے دھکیل کر کمرے سے نکال دیا تو نازو جو ابھی تک خاموش تھی ایک دم پھٹ پڑی۔

"یہ کیا حماقت ہے۔ آپ کیا کریں گے؟ اور آپ کو یہ چیلنج دینے کی ضرورت کیا ہے آپ کو کچھ کرنے کی۔ سردار جی سے کیوں اتنی ہمدردی ہو گئی ہے آپ کو۔ اس کی خاطر آپ اگروال جیسے مجرم کے ساتھ کیوں الجھنا چاہتے ہیں؟"

غالب نے کہا "کوئی فل اسٹاپ بھی لگاؤ گی؟ عقل کے گھوڑے کو اور زبان کی قینچی کو روکو نادان لڑکی۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا "ہم نے بلاوجہ چیلنج نہیں لیا ہے۔ پولیس یہاں آ جاتی اور ہمارے کمرے سے گزر کے جاتی تو کیا خیال ہے ہماری اشکال پر غور نہ فرماتی؟ اگروال تو بعد میں پکڑا جاتا یا نہ پکڑا جاتا، ہم پہلے دھر لیے جاتے۔ یہ سب پولیس کو دور رکھنے کے لئے ضروری تھا۔"

"خوب! گڑھے سے بچنے کے لیے آپ نے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ اور اس پر اصرار ہے کہ بہت عقل مندی فرمائی ہے آپ نے۔ ناک کو الٹی طرف سے پکڑتے سنا تھا۔ ... اسے ایک پکڑنا اس کو کہتے ہیں۔"

میں نے بھی کہا "سردار جی کو منع کر دیتے۔ کمال تھا۔"

نازو نے کہا "اب گرفتار بھی ہوں گے پولیس کے ہاتھوں اور یا اگروال کے ہاتھوں مارے بھی جائیں گے..... لیکن یہ پولیس حساب میں وہ بچ جائے اور ہم پکڑے جائیں۔"

"کیا فضول بولے جا رہی ہو؟" میں نے جھنجھلا کے کہا "کیا ہمارے منع کرنے سے پولیس مان جاتی؟ نہ ہم ابھی تک پکڑے گئے ہیں اور نہ مارے گئے ہیں۔ میں اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ بس تم وہی کرو جو میں کہوں۔"

"یاد رکھیں فرمائیں" غالب نے سر ہلایا "تم پر صرف اطاعت فرض ہے۔ اگر کر سکتی ہو۔"

میں نے کہا "ہماری ناک ہے ہم جیسے چاہیں پکڑیں۔ تمہاری ناک تو محفوظ ہے نا؟"

نازو برا سا منہ بنا کے اور منہ پھلا کے بیٹھ گئی۔ کچھ دیر ایسی ہی خاموشی تھی۔ تقریباً دس منٹ بعد سردار جی پھر نمودار ہوئے۔

"ارادہ! پولیس تو خیر رفع ہو گئی" انہوں نے خاصی بے اطمینانی کے ساتھ کہا "مگر یہ بلا کیسے دور ہوگی؟"

میں نے کہا "آہستہ بولیے۔ جیسے آپ ہر آہٹ پر کان لگائے بیٹھے ہیں ایسے ہی وہ بھی دوسری طرف ہمہ تن گوش ہوگا۔"

"کیا ہو گا؟ ہمہ تن گوش..." سردار جی گھبرا گئے۔

"میرا مطلب ہے وہ بھی سن رہا ہو گا کہ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے کہیں۔ مجرم زیادہ ڈرتا ہے۔ اس کے کان ہی نہیں جسم بھی ... خوف..."

"کیا! پا مد ہے تم کیا بول جاتے ہو۔"

میں نے گہری سانس لے کر کہا "آپ یہ بتائیں کہ اس نے یہاں آنے کے بعد کسی سے بات تو نہیں کی؟ کوئی اس سے ملنے تو نہیں آیا؟"

سردار جی نے نفی میں سر ہلایا "فون نیچے سے بات کرے گا تو مجھے پتا چل جائے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ آج رات وہ کچھ نہیں کرے گا" ... "آرام کرے گا۔ صبح یہاں سے نکل جائے گا۔"

"واہگورو کرے..." سردار جی نے دعا کی۔

"یا پھر آج اپنے ساتھیوں سے رابطہ قائم کرے گا۔ انہیں یہ اطلاع دے گا کہ وہ کہاں ہے۔"

"تو ہمارے ڈاکو اکٹھے کر کے لے گا یہاں" سردار جی نے گھبرا کے کہا "میرے ناس کے لئے۔"

میں نے کہا "گھبرائیں نہیں۔ صبح تک ہم بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھے رہیں گے۔"

"کیا کرو گے آخر تم؟ مجھے تو لگتا ہے کہ خود بھی مارے جاؤ گے اور مجھے بھی مروا دو گے۔ بڑی غلطی کی میں نے تمہاری بات مان کے۔ تم تو عقل سے ہی پیدل لگتے ہو۔ تم کیا کرو گے؟" سردار جی نے افسوس سے سر ہلایا۔

غالب نے کہا "ہماری شکل پر مت جاؤ۔ یہ عقل کا کام ہے۔"

نازو بولی "ہاں۔ اگر یقین نہیں ہے تو سر توڑ کے دیکھ لیں۔ کتنی عقل بھری ہوئی ہے اندر۔ اگر بھوسہ نکلے تو میرا کہا۔"

غالب نے کہا "تم اس کی باتوں پر مت جاؤ۔ اس کا پیٹ خالی ہے اس لئے بھوسے کی بات کر رہی ہے۔"

میں نے کہا "ہمارے لئے کھانا بھیج دو۔ ہم گوشت نہیں کھاتے۔ دال سبزی ملے گی؟"

"بالکل ملے گی۔ پوریاں تازہ تازہ اور آلو کی بھجیا" سردار جی بولے "مگر اس کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

میں نے کہا "کھانے کے بعد سوچیں گے۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہوں تو دماغ بھی کام نہیں کرتا۔"

"اچھا جو رب دا واہگورو کی مرضی" سردار جی ٹھنڈی سانس لے کر بولے "میرے ساتھ ہی مرنا تھا یہاں آ کے۔"

میں نے کہا "ایک بات اور کہیں سے ریوالور مل سکتا ہے؟ کوئی گن ہے تو..."

"اس وقت تو مشکل ہے۔ صبح خرید لانا۔"

میں نے کہا "ذرا ریڈیو بی بی سی سنتا تھا۔ جنگ کی کیا صورت حال ہے کچھ پتا نہیں چلا۔"

"ہتھیار... جنگ تو ختم ہوئی۔ اب کیا رہ گیا ہے سننے کو۔ ویسے میں ابھی بجلی کا ریڈیو لا دیتا ہوں" سردار جی نے کہا۔

میرا دل دھک سے رک گیا "جنگ ختم ہو گئی؟"

"ہاں جی واہگورو کی کرپا سے" وہ بولے "پتا نہیں بنانے چلا تھا کیا مگر بھارتی جوانوں کا خراب کر دیا ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں سردار جی کی بات کو سمجھتا، دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اور غالب چونک گئے۔ کسی نے باہر سے سردار جی کو پکارا "بلادر سنگھ!"

"کون ہے بھئی؟ کیا مصیبت پڑ گئی؟" سردار جی نے دروازہ کھول کے کہا اور گھبرا کے بولے "آپ... ڈسٹی صاحب۔"

"میں پوچھ رہا تھا جا چا تم سب یہاں ہو" کسی نے درشت لہجے میں کہا۔

"نہیں جی... میں ذرا آرڈر لینے آیا تھا... کھانے کا" سردار جی نے بات ٹالی۔

"میں بھی کھانے کی بات ہی کرنا چاہتا تھا۔ کیا ملے گا اس وقت؟ مرغی روسٹ چاہیے مجھے۔"

"مل جائے گی۔ بالکل مل جائے گی۔ تھوڑا ٹائم لگے گا۔"

www.paksociety.com

قدرتی طور پر میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے سردار جی کے پیچھے سے اگروال کو دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ بہت مختصر اور منحنی سا عینک والا آدمی تھا۔ ڈاکٹر سے زیادہ کسی ساہوکار کا منشی یا کلرک نظر آتا تھا مگر اس کے لہجے میں بڑی کھنک اور گرج تھی۔ میں نے نادر کو آگے آنے کا اشارہ کیا اور ہوٹی سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا "ہوٹی صاحب! آپ ساتھ والے کمرے میں ہیں؟"

"ہاں، کوئی اعتراض ہے تمہیں؟" وہ غرایا۔

"اعتراض... جی نہیں۔ میرا نام شیام سندر ہے۔ پروفیسر شیام سندر۔ آئیے میں آپ کو اپنی بیٹی سے ملواؤں۔ یہ موہنی ہے۔"

میرے اشارے پر نادرہ آگے بڑھ آئی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے نمسکار کیا۔ ہوٹی نے ناگواری سے جواب دیا اور نادرہ کو گھورتا ہوا واپس اپنے کمرے میں گھس گیا۔

میں نے کہا "سردار جی! اب جاؤ یار۔ ہم بھی بھوکے بیٹھے ہیں۔ کب آئے گا بھوجن؟ بار بار کہتے ہو..... کام لگ گئے۔ کیا صبح دو بجے کھلاؤ گے۔"

میں نے عمداً اونچی آواز میں بات کی تھی تاکہ اگروال بھی سن لے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتا اور کسی کو اپنی صورت نہیں دکھانا چاہتا۔ میرے خواہ مخواہ کے تعارف کا بھی اس نے برا مانا تھا اور خاصی بداخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا مگر میں نے موقع سے فائدہ اٹھالیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ نادرہ کو دیکھ لے۔

سردار جی کے جانے کے بعد نادرہ نے کہا "یہ کیا غلط حرکت کی تھی آپ نے؟ کیوں ملوایا مجھے اگروال سے؟"

"جتنی اچھا پاپا کو ہے۔ تمہیں تو آٹوگراف لینے چاہئیں اس کے" میں نے کہا "ایسے لوگوں سے روز کہاں ملاقات ہوتی ہے۔"

غالب نے کہا "سکندر! یہ سردار جی نے کیا کہا؟ اس کی تھی کہ جنگ ختم ہوگئی؟"

میں نے کہا "ان کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ نہ ان کے چاہنے سے کچھ ہوتا ہے۔ انہوں نے وہی کہا تھا جو آکاش وانی نے بتایا ہوگا۔ باقی ان کے دل کی بات تھی۔ جھوٹ تھا۔"

"جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا۔ تم خود جا کے ریڈیو لے آؤ اس سے" غالب نے کہا "مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"

"مرزا جی! حالات انتہائی تشویش ناک ہیں۔ یہ تو مجھے بھی اندازہ ہو رہا ہے" میں نے کہا "مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اب تو ہر گھڑی خبر کے لئے بیدار رہنا چاہئے۔"

"ابھی خبر سننے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" نادرہ نے کہا۔

"حقیقت سے آنکھیں بند رکھنے سے بدلتی نہیں" میں نے کہا "عالمی سیاست کے شاطروں کی نظر میں پاکستان کا وجود کھٹکتا تھا۔ ان کے ساتھ ملا ہوا دشمن بھی تیار تھے...... یہ تو ہونا ہی تھا۔"

وہیں لڑکا منہ اٹھائے اندر آیا اور ایک انتہائی قدیم ریڈیو میز پر رکھ گیا "یہ اپریل کا ماڈل ہے۔ کھڑکی سے باہر لٹکانا" اس نے جاتے جاتے کہا۔

میں نے ریڈیو کو آن کیا...... یہ والو والا ریڈیو تھا۔ جالی پر اس کے گرم ہونے میں تو وقت لگا۔ غالب نے اتنی دیر میں تار کو بجایا کے کھڑکی سے باہر نکال دیا۔ میں نے بینڈ بدلا اور سوئی کو آہستہ آہستہ گھمانے لگا۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ ریڈیو پاکستان کی نشریات شارٹ ویو میں کس میٹر بینڈ پر سنی جاسکیں گی۔ انگریزی اور اردو کی سروس متعدد میٹر بینڈ پر بہت سے اسٹیشن صاف ریسیو ہو رہے تھے۔ ان میں سے ریڈیو پاکستان کی آواز سننا مشکل کام تھا۔ میں نے انیس اور بتیس میٹر بینڈ کو بھی آزمایا۔ ہر جگہ آکاش وانی سنائی دیتا تھا یا بی بی سی۔ یہ کوئی عربی کے اسٹیشن تھے مگر اردو کا ایک لفظ سننے کی کوشش رائیگاں گئی۔ میری گھڑی میں مغربی پاکستان کے وقت کے مطابق آٹھ بجنے والے تھے اور یہ خبروں کے بلیٹن کا وقت تھا۔ آٹھ بجے میں نے ایک بار پھر بی بی سی لگا دیا۔

بی بی سی کے اردو بلیٹن کی خبروں سے صورتِ حالات کی سنگینی مزید نمایاں ہوگئی۔ یوں لگتا تھا کہ سازشی عناصر کامیاب ہوچکے ہیں۔ اور اب مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ خبروں کے بعد "جہاں نما" کے تبصرے نے جو تصویر پیش کی وہ انتہائی مایوس کن تھی۔ بھارتی فوج نے تربیت یافتہ گوریلوں اور مکتی باہنی کی مدد سے پاکستانی فوج کی مزاحمت ختم کر دی تھی۔ مغربی پاکستان عملاً الگ ہوچکا تھا۔ مشرقی پاکستان میں کوئی حکومت نہیں تھی اور راج تھا تو مجیب الرحمان کا۔ اقوام متحدہ سے کی جانے والی اپیلوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور ہم سیاسی محاذ کے بعد فوجی محاذ پر بھی شکست کھا چکے تھے۔

بلیٹن ختم ہوا تو میں نے ریڈیو بند کر دیا۔ ہم سخت مایوس، دل گرفتہ اور پریشان بیٹھے رہے۔ بی بی سی کو جھٹلانے سے بھی اب کچھ نہیں ہوتا تھا۔ دل گواہی دیتا تھا کہ تاریخ نے ایک اور عبرت ناک باب رقم کر دیا ہے۔ اب نہ پچھتانے سے کچھ حاصل ہوگا نہ رونے دھونے سے۔ نہ بحث کرنے سے کہ یہ سیاست دانوں کی غلطی تھی، فوجی کارروائی کا شاخسانہ تھا یا ہمارے اعمال کی سزا۔ وقت کا فیصلہ بہرحال ہمارے خلاف گیا تھا۔

غالب نے ایک آہ بھر کے کہا "سکندر! اب کیا ہوگا بہاریوں کا؟"

"یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔"

"وہ سب تو محبِ وطن تھے اور قومی نظریے پر یقین رکھتے تھے اور پاکستان کی سالمیت کی خاطر ہر قربانی دے رہے تھے۔ وہ کہاں جائیں گے۔ کیا وہ پھر ہجرت کریں گے؟ پھر اپنا سب کچھ لٹا کے دوسرے پاکستان جائیں گے..... اور ہماری فوج......"

میں نے کہا "مرزا غالب! مت سوچو یہ سب کچھ۔ یہ ہمارے سوچنے کی بات ہی نہیں۔ ہم تو صرف ایک دشمن سے لڑ رہے تھے۔

چودھری دلاور اینڈ کمپنی سے۔ ہم بنگال کی سیاست کے فریق نہیں تھے۔ ہمارے سامنے صرف ایک مقصد تھا کہ دلاور اینڈ کمپنی کے جرائم کی راہ میں دیوار بن جائیں۔ اسے بے گناہ انسانوں کے لہو کی قیمت نہ وصول کرنے دیں۔ پاکستان کے دشمن کی مدد کرنے والے غداروں کے اس ٹولے کو تباہ کر دیں۔ اس مقصد میں ہم ناکام نہیں رہے۔ ان حالات پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں تھا جو ملک ٹوٹنے کا سبب بنے۔ آئندہ بھی ہمارے اختیار میں کچھ نہیں ہوگا۔ سیاسی فیصلے کرنے والے دوسرے لوگ ہیں جن سے ہم باز پرس تک نہیں کرسکتے۔ یہ بہت بڑا صدمہ ہے مگر ہم اسے کروڑوں پاکستانیوں کی طرح برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔"

"ہاں، سوچنے اور فکر کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ جو ہونا تھا ہوگیا۔ اب بحث سے کیا ملے گا؟ سوائے تلخی کے اور بے مقصد دل آزاری کے" نادرہ نے کہا۔

"ہمیں تو اب واپسی کا سوچنا چاہئے۔ محسن کا پتا نہ ہوتا تو ہم یہیں سے لوٹ جاتے۔ مگر وہ ڈھاکا میں ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ ہم ڈھاکا ضرور جائیں گے۔ ہم اسے ساتھ لئے بغیر واپس نہیں جاسکتے" میں نے کہا۔

نگی کے افسردہ چہرے پر تھوڑی سی چمک آئی "معلوم نہیں وہ اس وقت کہاں ہوگا۔"

"نہیں سرکار، مگر بیٹیا اسے شدت سے انتظار ہوگا" غالب نے کہا۔

"ہم اسے تلاش کر لیں گے نگی۔"

"وہ بالکل اکیلا کتنا مایوس ہوگا۔ اس نے تو سب کچھ گنوا دیا۔" نادرہ نے دکھی لہجے میں کہا۔

"ہم سب کے دکھ اور عذاب سانجھے ہیں" میں نے بڑی آہ سے کہا "کس نے کیا کھویا اور کیا پایا اس کا حساب الگ نہیں ہے۔"

"اب حساب کر کے احساسِ زیاں کے سوا کیا ملے گا؟" غالب نے کہا۔

"میں نے سود و زیاں کے خیال کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے جو پایا وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو ہم نے گنوایا" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "یہ نفع نقصان کا سودا ہی نہیں تھا۔ بس ایک سودائے سر تھا۔"

میں نے کہا "فائدے کا خیال ہوتا تو دلاور کی پیشکش قبول کرنے میں بہت فائدہ تھا۔ وہ منہ مانگی قیمت دے رہا تھا جو کروڑوں سے کم نہ تھی۔ مگر میں اپنے باپ کا مظلوم لہو بیچ سکتا تھا نہ اپنے وطن کی آبرو۔ ایک حساب تو بے باق ہوا۔ ہم نے دلاور کو بہت نقصان پہنچا کے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ دوسرا حساب ابھی باقی ہے۔ میرے والد مرحوم وزیر خاں کے قاتل ابھی زندہ ہیں۔ اب یہ میری اور اس کی ذاتی جنگ ہے۔"

سردار جی کھانے کے ساتھ خود بھی آگئے۔ اپنی پریشانی میں انہوں نے ہماری پریشان حالی پر غور ہی نہیں کیا۔

"سپولو جی کھاؤ" انہوں نے کھانے کے برتن فرش پر رکھے اور خود بھی آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔

فرش پر بہت پرانا قالین تھا۔ ہم نے ایک پرانے اخبار کو دسترخوان کے طور پر استعمال کیا۔

"اس حرامی کو شک ہوگیا ہے" سردار جی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "حالانکہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"کیا شک ہوگیا ہے؟" میں نے کہا۔

"جب پرکی رات بھی میں تھا" سردار جی نے اپنی داڑھی کو کھجا کے کہا "مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ تم وہاں کیا لینے گئے تھے؟ ساتھ والے کمرے میں۔ میں نے کہا کہ میری مرضی۔ ہوٹل کا مالک میں ہوں اور وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں میرے سسرال کے لوگ۔"

"یہ کیوں کہا آپ نے؟" نگی گھبرا کے بولی۔

"اور کیا کہتا کڑی۔ بس یہ بات زبان پر آگئی وہ میں نے کہہ دی" سردار جی بولے "اب اگر تم سے کچھ پوچھے تو میری بات کا خیال رکھنا ورنہ......"

"وہ پھر گیا تھا تمہارے پاس؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ بوتل مانگ رہا تھا۔ وہ بھی ولایتی" سردار جی نے شکایت کی "میں نے کہا نہیں ہے۔ میں نے دی تو اس نے قورمے مارے میرے منہ پر۔ سمجھو تھپڑ ہی مار دیا۔ کہنے لگا چیتے چاہئیں رکھ کر مجھے اصلی ولایتی لاکے دو۔ میں نے بھی ہزار رکھ لئے ہوئے۔ جاتے جاتے کہہ گیا کہ مجھی سرگی نہ ملی تو آدھے گھنٹے میں تو تمہیں بھون ڈالوں گا۔"

"پھر آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟" غالب نے کہا۔

"جی، آپ کے بیٹھے ہوں یا روز۔ آدھا گھنٹا تو ہوگیا۔ اب جا کر دیکھا ہے خود نکلنا ہی لے گا۔ وہ بھی بڑا سور زادہ ہے۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ اس کے سر پہ جوتیاں مارے گا۔ اچھا ہے اس کا دماغ درست کردے" سردار جی نے کہا۔

غالب نے کہا "اگر وہ آپ کو تلاش کرتا ہوا یہاں آگیا تو پھر؟"

میں نے کہا "ہاں۔ صرف خانساماں کے قتل سے اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اور اس نے سچ مچ آپ کو بھون کے رکھ دیا۔ یہ ڈاکٹر ایسا کر سکتے ہیں۔"

"اوا ہو! کیا تم کچھ نہیں کرو گے" سردار جی نے خوف زدہ لہجے میں کہا "یا تم تو مذاق کر رہے تھے۔"

میں نے کہا "اب آپ ایسا کریں اگروال کے پاس جائیے اور اس سے کہیں کہ مرغی کا بندوبست نہیں ہوا۔"

"کیا.....؟" سردار جی کا رنگ اڑ گیا۔

"ہاں۔ وہ ہیں نہیں۔ یہ بھی کہہ دیں کہ مرغی ملی نہیں یا جو مرغی تھی وہ عین وقت فوت ہوگئی یا بھاگ گئی۔ یا موہنی اپنی

www.paksociety.com

محل فرشتہ سے ملنے چلا گیا۔"

"آرزو! یہاں میرا خون کراتے ہو۔ ابھی تو میرے بچے بھی نہیں ہوئے۔ میں کنوارا ہوں" سردار جی نے فریاد کی۔

میں نے کہا "آپ پڑھا لیں اس سے۔ باقی ہم پر چھوڑ دیں۔ یہ لڑکی فوراً آپ کی مدد کے لیے پہنچ جائے گی۔"

"یہ.... یہ کالی....؟" سردار جی نے بے یقینی کے ساتھ نازو کو دیکھا "اسے کہاں سے لائے ہو میرے ساتھ؟ خود مرد ہو کے پیچھے رہ گئے۔ کچھ شرم کرو...."

ثاقب نے کہا "ہم یہاں شرم کرتے رہیں گے۔ آپ ہماری فکر مت کریں۔"

میں نے کہا "اگر آپ نے ہماری بات نہیں مانی تو پھر آپ جانیں اور آپ کے ڈاکو دوست۔"

سردار جی نے پھر نازو کو دیکھا اور کچھ حیران ہوئے کہ خود نازو نے احتجاج نہیں کیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا۔ میں جاتا ہوں۔ جو کرے گا رب۔"

چند سیکنڈ کے بعد انہوں نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ بجایا اور میں نے ان کی آواز سنی۔

"ہرشی بابا! مرزا جان آ گیا" ہرشی بابا....

"ہائے کالا! مرزا جان آ گیا۔ تیرے باپ کے ساتھ۔"

"ارے۔ سو روپے چپ۔ داڑھی تیری جھرمٹ میری" سردار جی کو دھکا دیا گیا۔

نازو لپک کے دروازے تک گئی "ارے ہرشی صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کو شرم نہیں آتی؟"

"تو چپ کر۔ آ گئی بچی" انگروال نے مشتعل ہو کے کہا۔

نازو فوراً ان کے درمیان حائل ہو گئی "یہ کیا تماشا کر رہے ہیں آپ ہرشی جی! یہ آپ کے باپ کے برابر ہیں" نازو نے سردار جی کی داڑھی کو انگروال کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی اور اس دھکم پیل میں انگروال سمیت کمرے کے اندر پہنچ گئی۔ میں اپنے کمرے کے دروازے کی اوٹ سے سب دیکھ رہا۔ سردار جی اپنی داڑھی سمیت نکل گئے۔ غالباً اس فلور پر ہمارے سوا کوئی اور نہیں ٹھہرا ہوا تھا ورنہ اتنا شور سن کے لوگ نکل آتے۔

انگروال کی کالی کلوٹی ایک دم ختم ہو گئی۔ سردار جی کی فریاد بھی یکلخت خاموشی میں ڈھل گئی تو میں نے اس کمرے میں قدم رکھا۔

کمرے میں ایک عورت خوف سے سمٹی بیٹھی تھی اور اتنی حیران تھی کہ اسے اپنے بے لباس جسم کی طرف توجہ دینے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ خود سردار جی دم بخود کھڑے تھے اور اپنی منتشر داڑھی کو سہلاتے ہوئے کبھی نازو کو دیکھتے تھے کبھی فرش پر ساکت پڑے ہوئے انگروال کو۔ نازو ایسے کھڑی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا تو سردار جی پلٹ گئے۔ عورت نے ایک دم چادر کھینچی اور ستر پوشی کی۔

"کون ہو تم؟" وہ چلائی "نکل جاؤ۔"

میں نے کہا "شور مت مچاؤ۔ ورنہ...."

"مجھے دھمکی مت دو۔ تم نہیں جانتے یہ کون ہے۔" عورت ہسٹریا میں مبتلا ہونے لگی تھی۔

"سب جانتے ہیں ہم۔ یہ انگروال ہے۔ تم بتاؤ تمہارا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟" میں نے کہا۔

عورت نے اچانک تکیے کے نیچے ہاتھ مارا مگر اس کے قریب کھڑی ہوئی نازو نے اسے دیکھ لیا اور پستول نکالنے کی مہلت نہیں دی۔ وہ ایک جست میں اس کے اوپر جا گری۔ عورت چلائی مگر نازو نے اس کی کلائی تھام کے جھٹکا دیا۔ پستول اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکل کر فرش پر گر گیا۔ وہ کسی شیرنی کی طرح نازو سے لڑنے لگی جس کی کچھار میں داخل ہو کے شکاری نے شیر کو ہلاک کر دیا ہو۔ وہ مارشل آرٹ تو نہیں جانتی تھی مگر اس میں بلا کی پھرتی تھی۔ نازو کی جگہ کوئی اور ہوتی تو وہ اس کی آنکھیں نوچ لیتی۔ اس کے لمبے ناخنوں والے ہاتھ اور دانت نازو کو گھائل کرنا چاہتے تھے اور وہ اپنے جسم کی ساری توانائی کے ساتھ نازو کو ختم کرنا چاہتی تھی۔

نازو کے لیے یہ صورت حال بالکل نئی اور پریشان کن تھی کہ اس سے مقابلہ کرنے والی ایک خوب صورت جوان عورت تھی جس کے تن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی مگر اسے پروا نہ تھی۔ نازو اسے مغلوب کر کے خاموش رکھنا چاہتی تھی مگر یہ ممکن نہ رہا تو اس نے ایک کاری ضرب لگا کے اس عورت کی مزاحمت ختم کی۔ پھر وہ بیڈ سے اتر آئی۔ میں نے آگے بڑھ کے اس پر چادر ڈال دی۔

نازو کا چہرہ خراشوں سے بھر گیا تھا اور اس کے بازو پر دانتوں سے کاٹے کے نشان تھے جن سے خون رس رہا تھا۔

سردار جی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے حلق سے ایک گھٹی گھٹی آواز نکالی "شاباش شیرنی! شاباش۔ لوگ یار میں تو سمجھا تھا...."

"لوگ اکثر غلط سمجھتے ہیں" میں نے کہا "آپ کا کوئی قصور نہیں سردار جی۔"

ثاقب نے نازو کو سنبھال لیا "پاگل ہو تم بھی۔ اسے کیوں اتنا موقع دیا۔ دیکھو کیا حال کر دیا ہے اس نے تمہارا۔"

نازو تکلیف کے باوجود مسکرائی "کچھ نہیں ہوا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتی تھی۔"

"نہیں۔ ایسی عورت پر ترس کھانا اپنے قتل کی دعوت دینے جیسی عقل مندی ہے۔" "میں چھوڑتی ورنہ مرنا تھا۔"

میں نے کہا "چلو اسے اپنے کمرے میں لے چلو۔ اس کی

مرہم پٹی کرو۔ پانی سے تو تم ہی صاف کر دو۔ صبح انجکشن لگوانے پڑیں گے۔ ثاقب ہی جائے گا۔"

"انجکشن۔ میں نہیں لگواتی کوئی انجکشن" نازو بولی۔

"میں ڈاکٹر کو بلا لیتا ہوں ابھی۔ وہ دوائی دے جائے گا۔ مگر اسے یہ مت بتانا" سردار جی نے خشک حلق کو تھوک نگل کے تر کیا۔

"پھر بھی انجکشن تو لگیں گے" میں نے کہا "انسان کا کاٹا ہے یا خود آدمی۔ گوشت کھانے والے جانوروں کے دانتوں میں ایک ہی زہر ہوتا ہے۔"

نازو نے دروازے سے نکلتے نکلتے کہا "میں نے کہہ دیا نا کہ میں نہیں لگواؤں گی انجکشن۔"

"تمہارا تو باپ بھی لگوائے گا پورے چودہ انجکشن" ثاقب اسے کھینچ کر لے گیا۔ کمرے میں صرف سردار جی رہ گئے اور دو ساکت پڑے ہوئے جسم۔ سردار جی کچھ بدحواس لگ رہے تھے۔ انہوں نے کانپتے ہوئے کہا "اب.... اس کا کیا ہے؟ کیا یہ مر گیا؟"

میں نے جھک کر انگروال کو دیکھا "نہیں۔ یہ زندہ ہے۔"

"زندہ ہے؟" وہ بلبلائے "اگے۔ یہ تو اور بھی بڑا مسئلہ ہے۔ یہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔"

"پھر کیا خیال ہے اسے مار دوں؟" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ لاش.... اس سے بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔ پکڑے گئے تو پھانسی ہو جائے گی۔"

"اسے چھوڑا تو کسی دن یہ تمہیں پھانسی لگوا دے گا۔" میں نے کہا۔

"ارے واہگورو۔ آخر کیا کروں میں؟ چھوڑوں تو مرتا ہوں نہ چھوڑوں تو مرتا ہوں" سردار جی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "حوصلہ رکھیں سردار جی۔ آپ کا نام دلاور سنگھ ہے آخر۔ سنگھ تو شیر کو کہتے ہیں نا۔ دلاور شیر کیا اتنے ڈرپوک ہوتے ہیں۔ اب آپ کی جان صرف ایک صورت میں بچ سکتی ہے۔"

"وہ کیا....؟"

"آپ سمجھ لیں کہ یہاں یہ انگروال کبھی آیا تھا نہ آئے گا۔ آپ کے ہوٹل میں جو مسٹر اور مسز ہرشی ٹھہرے تھے انہیں کوئی نہیں جانتا۔ کوئی انہیں پوچھتا ہوا نہیں آئے گا۔ آپ صبح ان کو چیک آؤٹ کرا دیں۔ وہ رات بھر ٹھہرے اور صبح چلے گئے۔ آپ کو نہیں معلوم کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور کہاں گئے۔ رجسٹر میں جو اندراج ہے وہ غلط ہے تو اس کے ذمے دار آپ نہیں۔ دستخط انہوں نے آپ کے سامنے کیے تھے اور بس۔ تصدیق شناختی کارڈ آپ کا کام تھا اور نہ آپ کر سکتے تھے۔ وہ عورت اس کی بیوی تھی یا کوئی اور آپ کو کیا معلوم۔ لیکن یہ سب پوچھنے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔"

"اور انگروال؟"

"کون آئے گا؟ کیا کسی کو معلوم ہے کہ انگروال یہاں آیا؟"

"مجھے.... مجھے کیا معلوم۔"

"جب اس سے ملنے کوئی نہیں آیا نہ اس نے کسی سے بات کی اور نہ کوئی پیغام آیا کسی کا۔ تو اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔"

"کچھ نہیں۔" سردار جی نے کہا "اس سے یہ بھی تو پتا نہیں چلتا کہ انگروال یہاں آنے سے پہلے کس کس سے ملا تھا۔ کیا پتا اس نے اپنے کسی آدمی کو اطلاع کر دی ہو کہ آج رات وہ کہاں ہو گا۔"

میں نے کہا "مشکل ہے۔ لیکن ایسا ہوا تو صبح تک کوئی اس سے ضرور رابطہ قائم کرے گا۔ خود آئے گا یا فون کرے گا۔"

"میں کیا کروں؟ اگر کوئی آ گیا۔"

"کوئی نہ پولیس سے کہا ہے۔ یہاں انگروال کا کیا کام۔ گواہی کی ضرورت پڑے تو ہم حاضر ہیں" میں نے کہا "ہم بتا دیں گے کہ ساتھ والے کمرے میں کون تھا۔"

"تم بتاؤ گے؟" سردار جی اچھلے۔

"میرا مطلب تھا کہ تمہارے بیان کی تائید کرتے ہوئے ہم بالکل یہی بیان دیں گے" میں نے کہا "کہ مسٹر اور مسز ہرشی دونوں بیمار تھے۔ مگر بچوں کی طرح لڑ رہے تھے۔ دونوں کا جھگڑا رات چار اور پانچ بجے کے درمیان۔ مسٹر ہرشی گئے تھے اور ان کی بیگم رہ گئیں۔ آگے سے کہتی تھیں۔ روز آ کر خبر لے جانا۔ ہوٹل سے آ گئے تھے۔ ہماری ملاقات ہوئی تھی۔"

"واہگورو خوش رکھیں۔ تم تو بہت سیانے بھی ہو۔ اب کچھ فرماؤ۔ انہیں میں کیسے غائب کروں" سردار جی نے طنز سے کہا۔

میں نے کہا "ان کو ہم غائب کر دیں گے۔ اور آپ خود بھی غائب ہو جائیں گے۔"

سردار جی نے غصے میں سر ہلایا "کہاں لے جاؤ گے آخر تم انہیں۔ جہاں لے جا کے چھوڑو گے وہاں سے یہ سیدھے میری گردن دبانے آ جائیں گے کہ وہ تمہارے سسرال میں تھے یار تھے۔"

"یہ واپس نہیں آئیں گے۔"

"او یار کیسے نہیں آئیں گے۔ تم انہیں تھانے میں جمع کرا دو گے تب بھی کچھ نہیں ہو گا۔ یہ پھر جیل سے نکل آئے گا اور خود نہ آیا تو اپنا کوئی بندہ بھیج دے گا" سردار جی نے مایوسی سے کہا اور پھر سرگوشی کے انداز میں بولے "اس کا تو بس ایک ہی طریقہ ہے۔"

میں نے انجان بن کے پوچھا "وہ کیا؟"

"دونوں کو خلاص کر دو۔"

"اس کا مطلب ہے آخر آپ کا؟ انہیں قتل کر کے ہم بھی مجرم بن جائیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"قتل؟ یہ قتل تو نہیں ہو گا۔ اس کی سزا ہی ہے۔ یہ سزا .... سے قرار دے دو۔ آخر کسی دن اس کو پھانسی لگنا تھا۔ چلتے قتل اس

www.paksociety.com

نے کئے ہیں ان کی یہ سزا بھی کم ہے۔ اور یہ عورت۔ اس کو بھی تو سزائے موت ہونی چاہئے کم سے کم۔ یہ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ اگر انہیں زندہ چھوڑ دیا گیا تو یہ ظلم ہوگا۔ پتا نہیں اور کتنے مارے جائیں گے ان کے ہاتھوں۔ کتنے بچے لاوارث ہوں گے، کتنی عورتیں بیوہ ہوں گی۔"

میں نے حیرانی سے سردار جی کو دیکھا۔ وہ اس وقت ایک پاگل منصف کی طرح لگ رہے تھے۔ "اگر آپ اسے قانون کے الفاظ سمجھتے ہیں تو ان کی سزا پر عمل در آمد آپ خود کریں۔ یہ آپ کے مجرم ہیں اور آپ کی عدالت نے ہی انہیں سزائے موت کا مستحق سمجھا ہے۔"

سردار جی نے کچھ دیر سوچا "اچھا۔ ٹھیک ہے۔ اگر میں نے ان کو مارا تو یہ مجھے مار دیں گے۔ مجھے اپنے دفاع کا حق بھی حاصل ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں یہ حق مانگنے سے نہیں ملتا۔ جینے کا حق کوئی عدالت نہیں دلا سکتی" میں نے کہا "اگر کسی کو قتل کیا جائے یا اس کے کسی ساتھی نے آپ کی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تو قانون آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ آپ جتنی چاہیں درخواستیں دیں۔ ہاں آپ خود بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ پاگل کتے، سانپ یا بچھو کو مارنا جرم بھی نہیں اور پاپ بھی نہیں۔ معاشرے کا بھی حق ہے آپ پر کہ کوئی خرابی سامنے ہو تو اسے دور کریں۔"

سردار جی میرے دلائل کے بغیر بھی فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔ چند سیکنڈ بعد انہوں نے سر اٹھا کے کہا "تم جاؤ۔"

"میں چلا جاؤں؟"

"ہاں۔ کوئی کام ہو تو پھر بتا دینا" سردار جی نے سپاٹ لہجے میں اور خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میں دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ غالب اور گل نے نادر کے زخم دھو کر پاؤڈر لگا دیا تھا۔

"کیا ہوا؟" غالب نے میری صورت کو غور سے دیکھا۔

"کچھ نہیں" میں نے کہا "اگروال مر گیا۔ اور وہ بھی۔"

نادر نے بے یقینی سے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا "دیکھ لو جا کے۔ مگر اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ انہوں نے خود اپنے لئے موت کا انتخاب کیا ہے۔"

"کیا پہیلیوں میں بات کر رہے ہو" نادر بولا۔

"یہ خیال ہے وہ ہوش میں آ گئے تھے۔ سردار جی نے کہا کہ انہیں پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔ میں دو لاور لئے کھڑا تھا۔ ظاہر ہے اگروال کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ جیل سے فرار نہ ہوتا تو صبح اسے پھانسی ہو جاتی۔ اس نے کہا کہ جیل جا کے پھانسی لگنے سے وہ اسی وقت مرنے کو بہتر سمجھے گا۔ زندگی اگر ختم ہونی ہے تو موت کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ مزید الزامات کے ساتھ انتظار کا عذاب جھیلنے سے کیا فائدہ۔ اس نے مجھ سے اور سردار جی سے اجازت لی۔ اپنے سامان میں سے کوئی گولی نکالی۔ ایک خود کھائی اور ایک اس عورت کو دے دی۔ یہ لوگ ایسی چیزیں ساتھ رکھتے ہیں۔"

غالب نے کہا "میں دیکھ آؤں جا کے۔"

گل اور نادر نے میری بات کا یقین کر لیا تو میں نے کہا "اب یہ ہے کہ تم دونوں سو جاؤ۔ سکون آور گولیاں کھا کے۔ اور دروازہ بند کر لو۔"

"اور تم؟"

"ہم دونوں لاشوں کو ٹھکانے لگا دیں" میں نے کہا۔

"تم کیوں پڑتے ہو اس چکر میں ظفر؟" نادر نے کہا۔

گل نے کہا "سردار جی کو اپنے معاملات سے خود نمٹنے دو۔"

میں نے کہا "یہ ہمارا معاملہ بھی ہو گیا ہے۔ ہم سردار جی کی مدد کریں گے۔ پھر سردار جی ہماری مدد کریں گے۔"

جب میں واپس گیا تو سردار جی سکتے کے عالم میں کھڑے تھے۔ ان کے ماتھے پر سردی میں بھی پسینہ چمک رہا تھا اور وہ بار بار اپنے ہاتھوں کو رگڑ رہے تھے۔ اگروال اب سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ کرن لال اور اس کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔

"اوہ یار..... یہ میرے بس کی بات نہیں" سردار جی نے شرمسار لہجے میں کہا۔

"تم نے..... کچھ نہیں کیا؟"

سردار جی نے نفی میں سر ہلایا "میں..... میں کام کا آدمی نہیں۔ اندر سے پاگل..... ہوں" انہوں نے اپنی ذات کے لئے ایک نامناسب لفظ استعمال کیا "میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "اچھا۔ پھر ہمیں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ یہ بتاؤ گاڑی ہے تمہارے پاس کوئی؟"

"ایک..... جیپ ہے۔ گاڑی سمجھو یار۔"

"چلتی ہے نا یا ناکارہ تو نہیں؟" میں نے کہا۔

"میں روز اس پر سامان لاتا ہوں۔ بس اسٹارٹ دھکے سے ہوتی ہے۔"

غالب نے کہا "اور سوچو کیسے ہے۔ اگر آس پاس کوئی گھنا درخت یا جنگل ہو؟"

"اب ایسی بات بھی نہیں۔"

میں نے کہا "اس وقت پیچھے کی پوزیشن کیا ہے؟ کتنے مسافر ہیں ہوٹل میں اور کاؤنٹر پر کون ہے؟"

"کوئی نہیں۔ دن میں آتا ہے ایک لڑکا۔ شام چھ بجے چلا جاتا ہے۔" سردار جی نے کہا "آٹھ کلاس میں پڑھتا ہے۔ ماں ہے ایک بیمار۔ باپ نہیں ہے۔ اس کا خرچہ پورا کر دیتا ہوں میں....."

"یہ سب کس نے پوچھا تھا؟" میں نے کہا "کون ہو گا اس وقت باہر، اگر ہم ادھر سے جائیں۔"

"اس وقت..... چوکیدار آتا ہو گا۔ کیا پتا کوئی مسافر آ جائے..... رضوان مرغی لے کر آیا تھا۔ وہ میں نے لی اور اس کو چھٹی کر دی۔ شاید وہ ملاقی کر رہا ہو گا۔"

میں نے سوچ کے کہا "اچھا۔ پیچھے سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟"

سردار جی نے نفی میں سر ہلایا "ادھر سے راستہ ہوتا تو سامان نہ آتا جاتا ناجائز ارادے لئے۔"

"پھر تو ابھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان کے ہوش میں آنے کا انتظار کرو" میں نے کہا "پھر انہیں باہر لے جائیں گے ہم۔ تم تو ان کی اداکاری کر لینا ہوگی۔ ایکٹنگ۔"

"ایکٹنگ۔ میں نے تو کبھی نہیں کی یار۔"

میں نے کہا "کوئی مشکل رول نہیں ہوگا۔ چار پانچ بجے اپنی گاڑی نکالو۔ اس کی چابی میرے حوالے کرو۔"

روشنی پھیلنے لگی تھی۔ دروازے پر وہ چوکیدار کو دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ اس کے سر اور داڑھی کے سب بال سفید تھے اور وہ گاڑی کو شناخت کرنے کے لئے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے اور گول شیشوں والے چشمے کو ناک پہ ٹکا کے دیکھتا تھا۔ ایک لاٹھی کے سوا اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور یہ لاٹھی بھی وہ نشانی سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ یعنی بڑھاپے کا سہارا تھی۔

میں نے کہا "یہ بابا خاک چوکیداری کرتا ہو گا۔"

"کام کوئی نہیں" سردار جی نے تسلیم کیا۔

"پھر اسے کیوں رکھا ہوا ہے؟"

"کہاں جائے گا اس بڑھاپے میں۔ رات کو دروازہ بند کرتا ہے۔ صبح کھول دیتا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں کرنا پڑتا اسے۔ بدلے میں دو وقت روٹی کھاتا ہے اور سال میں دو جوڑے لیتا ہے۔ میرے سوا دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ خدا سے سود پہ نہیں دیتا ہوں میں۔"

"تمہارا کوئی رشتہ ہے اس سے؟" میں نے کہا۔

"بڑا گہرا رشتہ ہے۔ باپ ہے میرا" سردار جی نے کہا۔

میں اچھل پڑا "والد صاحب تھے تمہارے؟"

"ہاں جی۔ اور یہ جو رضوان ہے نا۔ یہ بیٹا ہے، بھائی ہے۔ اس کی دادی بڑی ظالم تھی۔ گھر کا سارا کام کرواتی تھی اس سے۔ مگر یہ لڑکا تو آج اس کے کام آ رہا ہے۔ چار سو تنخواہ لگتی ہے۔"

میں نے کہا "کمال ہے سردار جی۔ جو پہلے ہوں نے کیا اب وہی کام کر رہے ہو۔ باپ کو دروازے پہ بٹھا رکھا ہے۔ بھائی کو بھی ملا لیا ہے۔"

"اچھا ہے نا۔ اس طرح انہیں احساس نہیں ہو گا کہ مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں اور میرے دروازے پہ پڑے ہیں۔ کام کرتے رہنا۔ اپنا حق سمجھ کے سب لیتے ہیں۔ کسی اور کو کیوں دوں، وہی دونوں کو دے دیتا ہوں۔"

میں نے اس کے فلسفے سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کے نزدیک رشتوں کی جذباتی اہمیت کوئی نہیں تھی۔ اس نے باپ اور بھائی کو کاروباری تعلق کی زنجیر میں باندھ دیا تھا اور ایک ضرورت کو رشتوں کی بنیاد بنایا تھا۔ تاہم یہ اس کا اپنا فعل تھا اور میں تو ان معاملات میں فرق کرنا نہیں چاہتا تھا۔

باہر نکل کے ہم نے عمارت کے گرد پورا چکر لگایا۔ گاڑی عقبی سمت میں کھڑی ہوئی تھی۔ یہ واقعی عجیب چیز تھی۔ کسی کار کی باڈی کو ٹرک کا روپ دے دیا گیا تھا۔ اب نہ یہ کار تھی اور نہ اسے ٹرک سمجھا جا سکتا تھا۔ یہ تبدیلی بھی بڑے بھونڈے طریقے سے کی گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ خود سردار جی نے ہی یہ کام بھی کیا ہو گا۔ بعد میں میرے پوچھنے پر انہوں نے تسلیم کیا کہ کار اور ٹرک کی مخلوط نسل کے والد وہی ہیں۔

"یہ دھکا لگانے والا مسئلہ تو بڑا ہے" میں نے کہا۔

"دھکا تو لگانا پڑتا ہے۔ رات بھر میں بیٹری ٹھنڈی ہو جاتی ہے" سردار جی نے کہا "اس وقت تو ہاتھ لگاتے ہی چل پڑے گی۔"

میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا "اچھا۔ لاؤ چابی۔"

"دیکھو یار۔ گاڑی لے کر بھاگ تو نہیں جاؤ گے؟" انہوں نے بادل ناخواستہ چابی مجھے دی۔

مجھے سخت غصہ آیا "اگر ایسی بات ہے تو پھر خود کرو۔ ہم جا رہے ہیں اسی وقت۔ رکھو اپنی چابی۔"

"او یار خفا کیوں ہوتے ہو۔"

میں نے کہا "حد کرتے ہو تم بھی۔ تمہاری دو لاشیں سنبھال رہے ہیں ہم۔ انہیں چھوڑ دیں گے اور اس بے ہودہ چیز کے ساتھ غائب ہو جائیں گے۔" حقارت سے میں نے گاڑی کے ایک لات رسید کی۔ گاڑی کے اندر کوئی چیز ٹوٹ کر گری۔

سردار جی نے مجھے منایا "او یار غصہ مت کر۔ میں واقعی سنکی ہوں۔ بادشاہ بچے ہو تم میرے۔"

"اس گاڑی کو دروازے کے سامنے لے کر چلو" میں نے کہا۔

"اچھا میں خود ڈرائیو کرتا ہوں۔"

گاڑی چلنے میں اتنی مشکل نہیں تھی جتنی دیکھنے میں نظر آتی تھی۔ میں نے اسے ہوٹل کے گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر روک دیا۔

"اب ہمیں پرانے میلے کپڑے دو۔ اپنے یا والد صاحب کے یا بھائی صاحب کے" میں نے کہا "حلیہ بدلنے کے لئے۔ ان کپڑوں میں ہم شریف آدمی نظر آتے ہیں۔"

"تو کیا ہم شریف آدمی نہیں لگتے؟"

میں نے کہا "ہمیں ڈھاٹے باندھنے کے لئے چادریں بھی دو۔ لال رنگ کی دوشالہ ہو گی۔ تمہیں ہے تو منگوا دو اور پہن آ جاؤ۔"

سردار جی نے سر کھجایا "تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "سب تمہارے سامنے ہی ہوگا۔ دیکھتے جاؤ۔"

اوپر جا کے میں نے غالب کو اپنی اسکیم سمجھائی تو وہ پریشان نظر آنے لگا "یار یہ خطرناک کام ہے۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "ہم اس وقت بھی خطرے میں ہیں اور انگروال ہمیں نکال سکتا ہے۔ ہم سردار جی کی مدد کے بغیر نہیں جا سکتے۔ وہ کمرے میں ہیں۔ ہم انگروال سے سودا کریں گے۔"

انگروال ہوش میں آنے لگا تھا۔ اس کی کنپٹی پر زیادہ کاری وار ہوا تھا۔ وہ بدستور آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ سردار جی بھی نمودار ہوئے تو ان کے پاس دو اضافی ٹیلے ہو رہے تھے جن میں سے بلاؤ آ رہی تھی۔ میں نے اور غالب نے انہیں اپنے کپڑوں کے اوپر ہی پہن لیا۔ احاطے باندھ کر ہم بھی ڈاکو نظر آنے لگے۔

ہوری ہدایات کے مطابق سردار جی نے انگروال کے کمرے میں مزاحمت کا منظر تیار کر لیا۔ میں نے سرخ روشنائی ان کے کپڑوں پر اچھے ڈال دی کہ دیکھنے والے کو خون نظر آئے۔ یہ خون دل کے اوپر تھا اور قالین پر بچھا ہوا تھا۔ ہاتھ میں ریوالور پکڑ کے میں اور غالب انتظار کرنے لگے کہ انگروال ہوش میں آئے۔

ہوش میں آتے ہی اس نے ہماری صورت دیکھی تو اس کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے سر کو جھٹکا اور آنکھیں ملیں۔

"کون..... کون ہو تم....."

میں نے ریوالور اس کی کنپٹی سے لگا دیا اور آواز کو بھاری بنا کے کہا "تمہاری موت انگروال۔"

غالب نے بھی ڈرامائی لہجے میں کہا "آج مرنا تھا تجھے انگروال۔ تو موت سے بھاگ کے آیا تھا۔"

"صبح ہو گئی ہے۔ تیار ہو جا۔ پھانسی تو نہ دی تو کیا ہوا..... ہم آ گئے ہیں۔"

"تم..... تم ہیں کیسے معلوم ہوا..... کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں گا۔" انگروال نے خود کو سنبھال لیا۔

میں نے دل ہی دل میں قہقہہ لگایا "میں تمہاری لاش کو جیل سے باہر آتا دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر وہ تجھے نکال لائی۔ ہم سائے کی طرح تیرے پیچھے تھے انگروال۔"

"تم..... تم راج ہو؟" انگروال نے مجھے غور سے دیکھا "تم سمجھتے ہو میں نے دھوکا کیا تھا سب کے ساتھ۔"

میں نے اس کے لات ماری "اب صفائی پیش کرنے کا وقت نہیں رہا....."

وہ گڑگڑانے لگا "دیکھو۔ میں تمہارا حصہ دے دوں گا۔ لیکن یہ کون ہے؟"

"یہ میرا خاص آدمی ہے۔ جیسے یہ تیرا خاص آدمی بن گیا تھا۔"

میں نے سردار جی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تم غلط سمجھے۔ یہ تو ہوٹل کا مالک تھا۔ اسے کیوں مارا تم نے؟" انگروال بولا۔

"چپ رہو..... ہمارے ساتھ چل" میں نے اسے ٹھوکر دے کر کہا "تمہارا کام نہیں ہے تمہارے پاس۔"

"میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ مگر آرام سے بات کرو تم تو ہے۔ میرے ساتھ سودا کرو گے تو فائدے میں رہو گے۔ مجھے مار کے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ اپنے اس خاص آدمی سے کہو ریوالور کا رخ دوسری طرف کر لے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چل جائے۔" انگروال نے کہا اور اب پہلے سے زیادہ پُراعتماد نظر آ رہا تھا۔

یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ انگروال نے مجھے دلاج کیوں کہا۔ یہ چوری کی واردات میں شامل ہونے والا کوئی تھا۔ یقیناً اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کہیں دھوکا کیا تھا اور مال غنیمت میں سے انہیں حصہ نہیں دیا تھا۔ چوری ڈاکے میں شریک افراد عام طور پر ایک دوسرے کے ساتھ بے ایمانی نہیں کرتے مگر ایسا لگتا تھا کہ کسی واردات میں لمبا مال ہاتھ لگا تو انگروال کی نیت میں فتور آیا اور وہ سب کا حصہ پی گیا۔ اسے اپنے کسی ساتھی دلاج کی طرف سے ہی زیادہ اندیشہ ہو گا کہ وہ صبر کر کے خاموش نہیں بیٹھے گا۔

میں نے کہا "دھوکا مت کرنا ہمارے ساتھ انگروال۔"

انگروال نے کہا "دھوکا میں نے پہلے بھی نہیں کیا تھا۔ بس مجھے موقع نہیں ملا تھا۔ میں پھنس گیا تھا۔ تمہارا مال محفوظ ہے۔"

"کہاں؟"

"نیپال میں" انگروال نے کہا "میرے ساتھ نیپال چلو۔"

"نیپال! تیرا دماغ خراب ہو گیا۔ تجھے معلوم نہیں ہے کہ نیپال کہاں ہے" میں نے کہا "کیسے جائیں گے ہم نیپال؟"

"وہ سب انتظام کر لیا ہے میں نے۔ میں نے کیا ہے کچھ بھی کیا سب روبی نے کیا ہے۔ پھانسی گھاٹ سے باہر آنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ روبی نے مجھے ہی بلایا۔ چال چلایا" میں خود حیران ہوں۔ مجھے سے اوپر تک سب کے سامنے اس نے دونوں چیزیں دکھا دیں۔ دولت بھی اور اپنی محبت بھی۔ بڑی ہوشیاری سے اس نے سب بند ہو جانے والے دروازوں کے بیچ سے میرے لیے راستہ بنایا۔ صبح سویرے ایک گاڑی آئے گی ہمیں لینے۔"

"کون ہو گا اس گاڑی میں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ روبی جانتی ہے۔ گاڑی تو ہمیں یہاں سے لے جائے گی۔ شہر سے باہر ایک ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کے ہم نکل جائیں گے۔ نیپال تک کلیئرنس مل چکی ہے۔"

"ہیلی کاپٹر کس کا ہے؟" میں نے کہا۔

"پرائیویٹ کمپنی کا ہے۔ کرائے پر حاصل کیا ہے۔ ایک غیر ملکی فلم ساز ہے جو لداخ اور نیپال میں لوکیشن دیکھنے آیا ہوا ہے۔ روبی نے اسی کے نام سے ہیلی کاپٹر بک کرایا ہے۔"

"وہ فلم ساز کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ اس میں۔ وہاں سے رہ گئے جائے گا۔ روبی نے اس کو مکیرن میں لے کے یہ کام کیا۔ بڑی ہوشیار لڑکی ہے۔"

میں نے کہا "نیپال جا کے کیا ہو گا؟"

انگروال نے کہا "تمہیں تمہارا حصہ مل جائے گا۔ میں غائب ہو جاؤں گا۔ میں یہاں رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ تم بے فکر رہو۔ میں بہت دور رہوں گا۔"

میں نے کہا "کیا ہم ملک نہیں جا سکتے؟"

"جا سکتے ہو..... مگر....."

"مگر کیا تھیں..... ہم ملک جا کیں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ تم اپنا کام ختم ہونے پر ہمیں پکڑوا دو گے۔"

انگروال نے بے بسی سے کہا "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ہم اعتبار نہیں کرتے تم پر۔ تم ہمارے ساتھ رہو گے۔ ہم نہیں جائیں گے تمہارے ساتھ۔"

"ہیلی کاپٹر کا روٹ اپنی مرضی سے نہیں بدلا جا سکتا۔ اس کے لیے منظوری لینی پڑتی ہے۔ احتیاط کرنا پڑتی ہے۔ سوال اٹھیں گے ان والوں کو۔"

"روبی بہت ہوشیار لڑکی ہے۔ تم نے ہی کہا تھا۔ کیا یہ کام اس کے لیے مشکل ہو گا؟" میں نے کہا۔

انگروال خاموش ہو گیا۔ یہ انتہائی غیر متوقع کامیابی ہمارے مسائل کے حل کا نقطۂ آغاز ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر ہم ہیلی کاپٹر میں کاٹھمنڈو پہنچ جاتے تو ہمارا کام بہت آسان ہو جاتا۔

"روبی کو اطلاع۔ وہ کب سے سو رہی ہے؟" میں نے کہا۔

"روبی..... بے ہوش ہے" انگروال نے کہا۔

"کیوں بے ہوش ہے؟" میں نے کہا۔

"مار پیٹ ہو گئی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں بہت خطرناک لوگ ہیں" انگروال بولا "دہشت گرد ہیں سارے۔ وہ مرد اور دو عورتیں۔ میں نے تو انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔"

"کیسے پہچان لیا تھا؟" میں نے اپنی آواز سے خوف ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"اخبار میں تصویریں دیکھی تھیں میں نے" انگروال بولا "ان کی گرفتاری پر انعام ہے۔"

"مگر تم لے نہیں سکتے" میں نے کہا "تمہاری گرفتاری پر بھی انعام تھا۔"

"ہاں۔ مگر جس نے لیا تھا وہ اب کہاں ہے؟" انگروال شرارت سے بولا۔

"اس بار انعام کی رقم دگنی ہو جائے گی" میں نے کہا۔

"انگروال بار بار دوستی میں دھوکا نہیں کر سکتا۔ ایک بار میں نے تمہارا کیا تھا۔ اب ہے نیکی نہیں کروں گا" وہ بولا۔

مجھے احساس تھا کہ سردار جی سیدھے ساکت لیٹے لیٹے تھک گئے ہوں گے۔ ان کے ذرا سا ہلنے سے ہمارا بنا بنایا کھیل خراب ہو جاتا۔ یہ ضروری تھا کہ ہم اس کمرے سے چلے جائیں یا سردار جی کو یہاں سے ہٹا دیں۔ صبح ہونے میں ابھی دیر تھی۔ میں سردار جی کو اپنے نظر ثانی شدہ پروگرام سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے سکون آور گولی کھا لے۔ روبی ان کے لیے ناقابل تلافی ثابت ہوا ہو گا۔ وہ جاگ رہی ہو گی۔

شاید دیوار سے کان لگائے بیٹھی ہوں گی اور دوسرے کمرے میں ہونے والا تشدد سننے کی کوشش کر رہی ہوں گی۔

"میں اس لاش کو لے جاتا ہوں۔ تم روبی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو" میں نے کہا "خیال رکھنا کہ میرا یہ ساتھی میرے اشارے پر چلنے والا شخص ہے۔ یہ خود کچھ نہیں سوچتا۔ جو میں کہتا ہوں وہی کرتا ہے۔ تم نے کوئی غلطی کی تو یہ تمہیں نشانہ بنانے میں غلطی نہیں کرے گا۔"

غالب نے ریوالور کو کھوپڑی سے لگانے میں اچھال کر پھر کھینچ کر لیا اور مہارت کے اس کامیاب مظاہرے پر میری طرف ... داد طلب نظروں سے دیکھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مظاہرہ ناکام نہیں ہوا اور اپنا ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

"کہاں لے جاؤ گے تم اسے؟" انگروال نے کہا۔

میں نے ہماری بھرکم سردار جی کو اٹھاتے ہوئے کہا "اس وقت کون ہے دیکھنے والا۔ کہیں بھی چھپا دوں گا۔"

میرے باہر آنے کے بعد جب غالب نے دروازہ بند کیا تو میں نے سردار جی کو پیروں پر کھڑا کر دیا اور انہیں خاموشی سے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ معمولی سی دستک پر کمل نے دروازہ کھول دیا۔

"اُف۔ اتنی دہشت ناک رات میں نے پہلے کبھی نہیں اٹھائی" میں نے کہا "جاؤ دن تم لو سردار جی۔"

"او یار تم نے بڑی مشکل میں پھنسا دیا تھا مجھے" سردار جی نے کانوں کو ہاتھ لگایا "ایک چیونٹی چڑھ گئی تھی گردن پر۔ تا مرادا اوپر سے نیچے تک چڑھتی رہی۔ شکر ہے وا گرو کا ناک میں نہیں گئی۔"

میں نے کہا "ساری باتیں تم نے سن لی ہوں گی؟"

"ہاں۔ مگر یہ کیا بات کی تھی اس نے تمہارے بارے میں؟" سردار جی نے ہم سب کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا "کیا راز ہے....."

"اس نے ٹھیک ہی کہا تھا" میں نے کہا "لیکن تم کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے تمہاری مدد کا وعدہ کیا تھا۔ صبح ہم بھی چلے جائیں گے ان کے ساتھ۔ انہیں ابھی دوسرا کرام۔"

سردار جی نے ہاتھ جوڑے "ارے یارو مجھے معاف کرو۔ واگورو تمہیں خوش رکھے۔ تم انگروال کے بھی باپ ہو۔ بس میری جان بخشی کر دی تم نے بھی اور انگروال نے بھی۔ یہی کافی ہے۔"

"امید ہے بعد میں تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے" میں نے کہا۔ "یہ قتل کی واردات ضرور لے جائے گی تمہیں۔ کبھی نہ کبھی ہم بھی پھر آ جائیں گے۔"

"میرے باپ کی بھی توبہ۔ میں بالکل نہیں بولوں گا" وہ بولا اور ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف بڑھا "میں جاؤں؟"

میرا اشارہ پاتے ہی وہ بھاگ گیا۔ جب اس نے انگروال کو پکڑوانے کے لیے پولیس کو فون کیا ہو گا تو اسے قطعی اندازہ نہیں ہو گا کہ وہ کسی نئی بلائی آفات میں گرفتار ہو سکتا ہے اپنی.....

www.paksociety.com

سے اس نے خود کو ہر طرف سے محصور کر لیا [illegible]
بابا [illegible] مشکل سے واپس بھیجا [illegible] گیا اور اکروال سے نجات کے چکر میں [illegible] آمادہ کیا۔ اگر وہ [illegible] کرتا اور خاموش رہتا تو ہم سب صبح ہوتے ہی اپنی اپنی راہ لیتے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے گل اور نازو کو اپنے اور اکروال کے درمیان ہونے والی گفتگو سنا دی۔

"خدا نے چاہا تو شام تک ہم گلگت پہنچ جائیں گے۔ اور اگلے دن [illegible]....."

"لیکن اکروال کو معلوم ہو جائے گا کہ تم اس کے ساتھی نہیں ہو" نازو نے تشویش سے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟" میں نے کہا۔

گل نے کہا "وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"ہم کیا کم خطرناک ہیں" میں نے کہا "اس نے خود ہی سب کچھ اگل دیا۔ اب وہ بچ کے نہیں جا سکتا۔ ہم اس کے ساتھ [illegible] جائیں گے ورنہ کوئی نہیں بچ پائے گا۔ [illegible] کی کشتی کے مسافر ہوں وہ ڈوبتے ہیں تو ساتھ ڈوبتے ہیں اور پار اترتے ہیں تو ساتھ۔"

"وہ کہیں دھوکا نہ دے رہا ہو۔"

"ایسی بات ہوتی تو اسے تو ویسے ہی جیل سے فرار ہو کر صبح آرام سے چیلاس چلا جاتا۔ اب اس کے پاس کون سا راستہ کھلا ہوا ہے۔ وہ ہمارا ساتھ نہیں دے گا تو کہاں جائے گا اور کیسے جائے گا؟" میں نے کہا "صبح گاڑی آ جائے گی۔"

"اور گاڑی میں اس کے ساتھی بھی ہوئے تو....."

"پھر کیا۔ اگر وہ مقابلہ کرنا چاہیں گے تو ہم مقابلہ کریں گے ورنہ کچھ نہیں ہوگا۔ ان کے ساتھ ہم بھی خاموشی سے نکل جائیں گے۔ [illegible] ہماری ملاقات سے۔"

"ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے انکار کر دیا [illegible] اکروال ہے....." نازو سوچ میں پڑ گئی۔

"بابا [illegible] تو بہت تجربہ ہو [illegible] مسافروں سمیت ہوائی جہاز کو اغوا کر لیتے ہیں۔ وہ ایک بار آ گیا تو پھر جہاں ہم چاہیں گے جائے گا" میں نے کہا "اب تم سب بے فکر ہو کے سو جاؤ۔ خطرے کی کوئی بات نہیں رہی۔ صبح ہونے میں ابھی [illegible] ہیں۔ صورت حال پوری طرح ہمارے قابو میں ہے۔"

میں لوٹ کر اکروال کے کمرے میں گیا تو تالب ابھی [illegible] اور خاصا مستعد کھڑا تھا۔ اکروال کی کوشش سے عورت ہوش میں آ چکی تھی اور [illegible] تک کمرے میں ہماری موجودگی کا سبب اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

دو بار وہ اکروال سے پوچھ چکی تھی "یہ کون لوگ ہیں؟ تمہارے ساتھی..... یہ کیسے آ گئے..... اور وہ موٹی بچی کہاں ہے؟"

اس کا خون پی جاؤں گی میں....."

اکروال نے کہا "ساتولی ہوش میں آ..... یہ لے ایک [illegible] پی لے....."

اکروال نے جسے ساتولی کہا تھا وہ کھلے ہوئے [illegible] انتہائی تیکھے نقوش والی جوان عورت تھی جس کی ملاحت [illegible] کے خدوخال میں بلا کی جوانی کشش تھی۔ اپنے [illegible] بڑی بڑی آنکھوں سے وہ ایک خوب صورت [illegible] ہی نظر آتی تھی۔ اس کے بھرپور جسم کی آتش فشانی [illegible] کہیں زیادہ محسوس ہوتی تھی جو اس نے [illegible] لیا تھا۔ اکروال کے [illegible] عورت [illegible] کے احساس سے کوئی فرق پڑا تھا ورنہ کسی [illegible]

"ہم کسی ڈاکو کے ساتھی نہیں ہیں" میں نے اپنے [illegible] چھپانے والی چادر کی نقاب ہٹا دی۔

تالب نے میری تائید کی "ڈاکو تمہارے مقابلے میں [illegible] ہیں۔ [illegible]"

اکروال اپنی جگہ پر چونک گیا "تم..... [illegible]؟"

میں نے کہا "ہاں۔ ہم وہی ہیں جن کو تم نے [illegible] ہمیں [illegible] ہے کہ پہچان لیا۔"

عورت چلانے لگی "کیا چاہتے ہو آخر تم....."

میں نے کہا "اکروال! اپنی ساتولی کا منہ بند رکھو ورنہ....."

تالب نے میری بات کاٹ دی "ہم اس کو [illegible]"

ساتولی نے [illegible] کی تھی۔ اس [illegible]

ساتولی کا چہرہ لال ہو گیا تھا مگر اکروال نے اسے [illegible] پر مجبور کر دیا۔ "خدمت کر ساتولی۔ یہ بھی ہم جیسے ہی ہیں۔ [illegible] ہمارے ساتھی ہی رہیں گے۔"

"تمہارے ساتھی" ساتولی نے احتجاج کیا۔

میں نے کہا "صرف کچھ حد تک [illegible] جیل پہنچ کر [illegible] اکروال [illegible] کچھ نہیں [illegible] جاتے رہتے....."

"میں سمجھ گیا۔ تم آرام سے [illegible] دھمکیاں مت دو" اکروال نے کہا۔

ہم آرام سے [illegible] اکروال نے چپکے چپکے ساتولی کو [illegible] سمجھا دیا [illegible] قبول کر لیا۔ صبح تک رات کی مسافت یوں طے ہوئی [illegible] تالب نے سو کے گزارے۔ پھر میری باری آئی۔ اکروال اور ساتولی ہماری موجودگی سے بے نیاز تھے [illegible] سوتے تھے جیسے ہمارے آنے سے پہلے سوتے تھے۔

آٹھ بجے میں نے نیچے جا کے [illegible] سواری کو [illegible] انہوں نے [illegible] کا [illegible] دکھایا اور پھر سو گئے۔ گل اور نازو نے [illegible]

ہونے کے بعد جانے والی [illegible] اس سے [illegible] اندھیرا ہی تھا اور [illegible] میں تم اور [illegible] اور اکروال کے درمیان [illegible] ہی تھی۔

مشرق کے افق پر سرخی نمودار ہونے لگی تھی کہ ایک جیپ [illegible] کے دروازے سے کچھ دور آ کے ٹھہر گئی۔ [illegible] کے مطابق جس کے [illegible] سوار [illegible] تھے۔ میں اور اکروال اسی کے اندر بیٹھے ہوئے تھے اور اس کی [illegible] نازو اپنی [illegible] گزشتہ کی [illegible] ساتولی کے ساتھ [illegible] ساتولی کے عزائم [illegible] نازو [illegible] کے انجام [illegible] دل کے جذبات کا اظہار [illegible] آزادی سے کرتی تھی اور [illegible] کی طرح برداشت کر رہی تھی جو شوہر کے [illegible] اس کا وہاں موجود رہنا اس لیے ضروری [illegible] سب انتظامات اسی نے کیے تھے اور وہی آنے والوں کو [illegible] تھی۔

جیپ کے [illegible] ساتولی نے کہا "اکروال کی گاڑی ہے" اور [illegible] نازو اسے [illegible]

"یہ..... تو پولیس کی جیپ ہے" اکروال نے [illegible] سے کہا "[illegible] کسی پولیس والے [illegible]"

"میرا ہاتھ چھوڑو" ساتولی نے بگڑ کے کہا [illegible] اکروال کو پیار سے [illegible] کر دی تھی۔

"احتیاط کیا ختم ہے؟" نازو نے [illegible] تلاش کر لیا [illegible]"

"[illegible] ہو جائے گا" میں نے کہا۔

اکروال نے [illegible] "ایسے نہیں چلے گا۔"

میں نے کہا "کیا نہیں چلے گا [illegible]"

"ساتولی والا کیوں نہیں چلے گی۔" اکروال بگڑ کے بولا "ہم [illegible] ہیں۔ اس کے بدلے....."

"ہم بھی شرافت سے کام لے رہے ہیں ورنہ اب تک [illegible] کر رہے ہیں۔ اس [illegible] کو [illegible] بغیر ہی لے جا سکتے تھے ہم" میں نے [illegible] کہا۔

اکروال اور ساتولی دونوں چپ ہو گئے۔ وہ [illegible] ان کے اور [illegible] قتل بھی کرتے رہے ہوں گے مگر اب ان کے [illegible] دہشت گرد اور تخریب کار کا خطاب پانے والے [illegible] کے مقابلے میں [illegible] سمجھے جاتے ہیں۔

ساتولی نے کہا "یہ پولیس کی وردی میں اپاہج آدمی ہے۔ تم [illegible] اس سے بات کرو۔"

اکروال نے کہا "[illegible] جیپ ملی پولیس کی سواری [illegible] سیدھے جیل لے جائیں مجھے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو؟ وردی تو ہماری حفاظت کے لیے ہے۔ کیا [illegible] پولیس [illegible] آئے گی؟ [illegible]"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ اب ہم اتر کے اس گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔"

ہم ایک ساتھ اترے اور جیپ میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیور کی [illegible] کی وردی میں بیٹھے ہوئے شخص کو حیرت [illegible] تھی [illegible] ہم سب کی صورتیں اس کے لیے اجنبی تھیں مگر وہ ساتولی کو پہچانتا تھا۔

وہ بولا "یہ اور کون آ گیا ہے تمہارے ساتھ؟"

نازو نے کہا "ہم گرو کی [illegible] کرنے جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ گرو ہے اور میں [illegible] گرو کا باپ سمجھو تم مجھے۔"

میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اس کی گھگی بندھ گئی "یہ..... کیا [illegible] ہے..... ساتولی..... [illegible] ہیں۔ مجھے پتا ہوتا تو [illegible]"

"گاڑی [illegible]" ساتولی بھڑک گئی "اور خاموشی سے گاڑی لے کر چل۔"

میں نے کہا "گرو [illegible] دو مسافر اور بھی ہیں۔ ہم انہیں چھوڑ کے کیسے جا سکتے ہیں؟"

"مسافر [illegible] انہیں لے آؤں اگر اجازت ہو؟" نازو بولی۔

"لے آؤ۔ اجازت ہے گرو۔"

"یہ بھی گرو ہے تمہاری اور ساتولی بھی" ڈرائیور بولا جو اصل صورت حال سے قطعی بے خبر تھا۔

"ہم سب ایک دوسرے کے گرو ہی ہوتے ہیں۔ [illegible]" میں نے کہا "[illegible] کون [illegible] اور کون [illegible]"

اکروال نے کہا "[illegible] میں آپ کی [illegible]"

میں نے کہا "ہاں۔ اس سے خون [illegible] ہے اور [illegible] لیکن اوقات [illegible] ہو جاتی ہے۔ [illegible] زیادہ [illegible] ہو جاتا ہے [illegible] زیادہ ہو تو۔"

"اتنے لوگ کیسے آئیں گے جیپ میں؟" ڈرائیور بولا۔

میں نے کہا "گرو [illegible] دل میں ہونی چاہیے۔ پھر اس میں تمہاری بارات بھی سما سکتی ہے اور گرو کی بارات بھی۔ تم دیکھنا ابھی [illegible] ہم سب تمہارے دل میں سما جاتے ہیں۔"

تالب اور گل بیگ سمیت نمودار ہوئے۔ انہوں نے بیگ درمیان میں رکھے اور خود اکروال کے دائیں بائیں فٹ ہو گئے۔ ساتولی ان کے بیچ میں [illegible] ہو گئی۔

میں نے مسکرا کے ڈرائیور کو دیکھا "تم [illegible]"

www.paksociety.com

کرن دیکھو کوئی آ رہا ہے۔ بہت جلد ہے ابھی۔"

ناز... شہر سے کوچ کرتے۔ راہ و راست پر"

میں نے کہا "شہزادی کو معلوم ہے کہ راہ و راست ... سے راستے ہوا اس کی تحریر سیدھا ٹرک میں لے جائے گی۔"

ڈرائیور نے کوئی اشارت کی تو میں نے تھوڑا سا پکڑ لیا اور اپنے ریوالور کا رخ ان کے دل کی جانب کر لیا۔ باہر خاصی سردی تھی اور کھلی جیپ سے اندر آنے والی ہوا میرے جسم کی ایک ساخت کو سن کر رہی تھی۔ بازار ابھی بند تھے اور سڑکوں پر ٹریفک بھی برائے نام تھی۔ صبح دم ایک اجنبی شہر کا نظارہ میرے لئے انوکھا تجربہ تھا۔ اس سفر میں نہ جانے ایسے کتنے مقام آئے تھے جہاں سے گزرتے ہوئے میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ زندگی میں پھر کبھی ادھر سے گزر ہو نہ ہو۔ شاید کبھی نہیں۔

جیپ خاصی تیز رفتاری سے نامانوس راستوں کو طے کرتی جا رہی تھی۔ میں نے بہت سے ایسے مناظر دیکھے جو میری آنکھوں کو اپنے شہر اور اپنے وطن کی یاد دلاتے تھے۔ ... والے راستے، اخبار فروش، سڑک کے کنارے لگتے ٹھیلے ... اسکول جانے کے لئے تیار کھڑے ہوئے بچے۔ چائے کی دکانوں سے اٹھنے والی خوشبو۔

جیپ شہر سے باہر نکل آئی تو میں نے کہا۔ "کرن! سردار جی کیوں باہر نہیں نکلے؟ ہم سے ملے بھی نہیں۔"

"ان کی حالت خراب تھی ان کی" ... انجام کا سوچ موت کے ... طاری ہو گئی تھی۔ میں ... قتل کی کہ آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ تو ہمیں مقدر میں تھا....."

"کس سردار جی کی بات کر رہے ہو تم؟" اگروال بولا۔

مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا کیونکہ ہوٹل کے مالک کو تو ہم بطور لاش پیش کر چکے تھے۔ میں نے کہا "کرن! اس ہوٹل کو تم ایک ... سمجھو۔ یہاں ہر چوکیدار کی کے اصل منصب پر فائز تھے وہ سردار جی کے والد ماجد تھے اور جو ... کے فرائض سرانجام دیتے تھے وہ ان کے برادر کلاں تھے بڑے بھائی۔ میرا کرن! اس کی بات کر رہا ہے کہ قسمت کو روتے تھے۔"

"قسمت کو تو میں بھی رو رہا ہوں کہ تم سے مل گئے۔"

"قیامت کہو کرن ... یہ دیکھو سورج نکل آیا ہے اور یہ نیا دن ہے۔ جس کے بارے میں تم نہیں جانتے تھے کہ دیکھو گے یا نہیں۔ اگر سانولی کا مشن ناکام ہو جاتا تو سوچو اس وقت تم کہاں ہوتے؟ تمہاری ... سر لاش ... پر سے اتاری جا چکی ہوتی اور کسی چارپائی پر پڑی ہوتی۔ ... گردن اور ... زبان کے ساتھ۔ ڈاکٹر تمہاری موت کا سرٹیفکیٹ ... اور باہر شاید سانولی بھی ہوتی تمہاری لاش لینے کے انتظار میں۔ شام تک تم راکھ ہو جاتے۔ کتنے خوش نصیب ہو تم کہ زندوں میں شامل ہو، مُردوں میں نہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ یہ دوسرا جیون ہے میرا۔" اگروال نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔

"ہر بات ویسی ہی ہوگی جیسا پہلا جیون تھا۔ تم خوب کمائی لٹاؤ گے اور عیش کرو گے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تمہیں نہیں معلوم۔ سانولی نے مجھے اس قبر سے باہر نکالا ہے۔ جان کی بازی لگا کے اور اپنا سب کچھ پر لگا کے۔ کہ خیال یہی کہ ہم شادی کریں گے اور ایک نئی زندگی آغاز کریں گے ... نئے نام سے۔ پرانے جیون کی کوئی بات اس جیون میں نہیں ہوگی۔ تم دیکھ لینا۔"

میں نے کہا "اگر سانولی تمہارے لئے اتنا ... سکتی ہے تو تم بھی سانولی کے لئے سب کچھ کرنا چاہتے ہو لیکن تمہارے ... ڈاکے ڈالتی تھی؟"

اگروال بولا "تم نے سانولی جیسی عورت نہیں دیکھی ... بھی۔ بہت بڑے باپ کی بیٹی تھی یہ۔"

"تھی کیا مطلب..... اب نہیں ہے؟"

"نہیں۔ اب نہیں ہے۔ وہ سب رشتے اس نے توڑ دیئے میری خاطر" وہ بولا "اس گھر سے تعلق ختم کر لیا تو ... رہتی۔ ہاں کیوں نہ کہتی۔ اس وقت ایم اے کے آخری ... تھی..... اب تک ایم اے کر چکی ہوتی۔ کہیں پروفیسر ہوتی۔"

میں حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ عشق کا ایک اور انوکھا روپ میرے سامنے آیا تھا۔ اگروال جیسے شخص کی ذات میں سانولی نے کیا دیکھا؟ اس کی کون سی خوبی تھی جس نے اسے دیوانہ کر دیا؟ ایک ... کے لئے ایک ڈاکو سے عشق کی مجبوری کیا تھی؟ فلموں اور رومانی ناولوں کے ہیرو تو بڑے خوبرو، وجاہت و ذہانت کا ... لباس اور خوش مزاج، اخلاق و کردار کا مثالی نمونہ اور تمام اعلیٰ صفات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ کبھی شاعر، کبھی مصور، اکثر ڈاکٹر یا انجینئر۔ مگر اگروال تو ایک عادی مجرم تھا۔ ڈاکو اور قاتل۔ غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ تھا اور صورت شکل سے بھی اسے ... کے ساتھ رکھ کر دیکھو تو لنگور خدا کی قدرت ... یاد آتی تھی۔ لیکن یہی تو عشق ہے۔ اسی لئے کسی نے اسے ... اختیاری کا نام عشق ہے۔ جب عقل کا پہرہ اٹھ جاتا ہے ... ہو اور جذبات کے سامنے کسی مصلحت کی اہمیت نہ رہے۔

اگر جیپ اچانک نہ رک جاتی تو یہی داستان عشق کے ... کروا دیتی اور بہت کچھ پوچھتی۔ یہ کہ سانولی اسے ... وہ سانولی کیسے ہو گیا۔ سانولی جیسے اس کے رنگ میں رنگ ... ورنہ ان ... ایم اے میں پڑھنے والی ایک لڑکی کس طرح اسے جیل کی دیواروں ... کراکے موت کے منہ سے ... لیا اور اگر وہ اپنے مقصد میں ناکام ہو جاتی تو کیا کیا نہ ہوتا.....

ہم کھیتوں کے درمیان ایک سپاٹ میدان میں کھڑے۔ نہ جانے کب شہر ختم ہوا تھا اور سڑک کے بعد کچا راستہ آیا

میں اپنے خیالوں میں گم ہوا تھا۔ میں نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ کھیت ہمارے دائیں بائیں ... فاصلے پر تھے اور ان کے پیچھے درختوں کا ... افق پر نیلے رنگ کی ... کرتا تھا۔ سامنے زمین بالکل ہموار تھی کچھ گیان تھیں اور ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ فضا میں خوشگوار ... تازگی تھی اور دھوپ کی تمازت کے ساتھ لطیف ہوا کی مہک تھی۔

"ہیلی کاپٹر یہاں آئے گا" جیپ کے ڈرائیور نے کہا۔

"کس وقت آئے گا؟" اگروال نے ... نظروں سے آسمان کی ویرانی و وسعت کو دیکھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"تو سمجھو ابھی پانچ منٹ باقی ہیں" سانولی نے کہا۔

"اب میں چلتا ہوں" ڈرائیور نے کہا۔

"پانچ منٹ رک نہیں سکتے؟" سانولی نے اسے گھور کے دیکھا۔

"اب میرا کوئی کام نہیں....."

سانولی نے کہا "تمہیں کیا معلوم۔ ہیلی کاپٹر نہ آیا تو ہم واپس جائیں گے۔"

"کیا اس کا بھی امکان ہے؟" اگروال نے تشویش سے کہا۔

"ممکن ہے!" سانولی نے تلخی سے کہا "کوئی ایسا تھا ہم اس صورت میں بھی پکڑے جائیں گے۔ پولیس کا ... تھا....."

"تم ... کر رہی ہو ...؟" ثاقب ...

"اور کیا کروں؟ فرشتہ رحمت کہوں" سانولی چڑ گئی "صرف بدقسمتی ہے۔ ... تمہیں کیا ہوگا۔"

"ہیلی کاپٹر کا کریش نہیں ہوگا" ثاقب بولا۔

سانولی نے اسے گھور کے دیکھا "تم تسلی دے رہے ہو؟"

"ہاں میں تسلی دے رہا ہوں" ثاقب نے کہا۔

سانولی پھر ڈرائیور کی طرف متوجہ ہوئی "یہاں سے تو ہمیں واپسی کے لئے سواری بھی نہیں مل سکتی۔ ہیلی کاپٹر آجائے پھر تم چلے جانا۔"

"ہیلی کاپٹر آ گیا" ثاقب نے کہا۔

ہیلی کاپٹر کی مخصوص آواز میں نے بھی سن لی تھی اور سب کے ساتھ میری نظریں بھی مشرق کے روشن افق پر ایک سیاہ دھبا دیکھ رہی تھیں جو رفتہ رفتہ بڑا ہو رہا تھا۔ چند منٹ میں ہیلی کاپٹر ہمارے سر پر آ پہنچا اور پھر نیچے اترنے لگا۔ اس کی آواز بہت زیادہ نہیں تھی لیکن خاموشی میں محسوس زیادہ ہو رہی تھی۔

ہیلی کاپٹر نے زمین کو چھوا تو آس پاس کے پودے تیز ہوا سے جھکنے لگے۔ پھر اس کا انجن بند ہو گیا مگر اوپر والا پنکھا گھومتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کی رفتار بھی کم ہوتی اور کاک پٹ میں بیٹھا ہوا پائلٹ ... اترا ... قریب آنے تک اس کا ... باقی رہا۔

اس نے ... تعارف کرانے کے بعد کہا "آپ میں سے ... کون ہے؟"

میں نے کہا "کوئی بھی نہیں....."

اس نے سنجیدہ ہو کے کہا "مجھے کسی ... کو ... لے جانا تھا!"

"کسی وجہ سے وہ خود نہیں آ سکا۔ ہم تینوں اس کی جگہ" میں نے کہا۔

"تم..... اس قیمت کے ادا کرو گے؟"

میں نے کہا "ہم اس ہیلی کاپٹر کے مسافر ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم کون ہیں۔"

ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور بولا۔ "میرے پاس اس اجازت نامے کی ... ہے....."

میں نے آگے بڑھ کے وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور پھاڑ کے پرزہ پرزہ کر دیا "بھول جاؤ اس اجازت نامے کو۔"

وہ سخت پریشان نظر آنے لگا "یہ کیا حرکت ہے اور آخر تم لوگ کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "تمہاری کمپنی سے یہ ہیلی کاپٹر کرائے پر حاصل کیا گیا ہے۔"

"اور کرایہ ادا کیا جا چکا ہے" سانولی نے کہا "پھر یہ سوال جواب کس لئے؟ رسید رکھتے ہو تم۔"

سانولی نے اپنے گریبان کے خفیہ خانے سے ایک کاغذ نکال کے اس کی طرف پھینک دیا۔ "چار مسافر یہاں سے نیپال جائیں گے۔ ان کے نام پتے اور پیشے، قومیت، مذہب اور ذات کے بارے میں تصدیق کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔"

پائلٹ اس کے دبنگ لہجے سے مرعوب ہو گیا اور اس کی رواں انگریزی سے بھی۔ اس نے رسید اٹھا کے سر ہلایا۔

"رائٹ میڈم۔ مجھے بتادیں وہ چار افراد کون ہیں۔ مجھے تو یہاں سات آدمی نظر آ رہے ہیں۔"

"ایک آدمی واپس جائے گا" سانولی نے کہا "جس کو تم لے جاؤ گے۔"

پائلٹ نے انکار میں سر ہلایا "کرایہ چار کا ادا کیا گیا ہے"

"تم دو افراد کا اضافی کرایہ لے سکتے ہو۔"

"میں بس کنڈکٹر نہیں ہوں کہ جتنے مسافر چاہیں چڑھ جائیں انہیں ٹکٹ دیتا جاؤں" پائلٹ نے کہا "کرایہ لکھا گیا ہے اور رسید دی گئی ہے۔ مجھے یہ اختیار حاصل نہیں ہے۔"

"تم احمق ہو یا ضدی" سانولی نے بگڑ کے کہا "فالتو بات ... کہ ہم سے خود بات کرو۔ کرایہ لو اور جیب میں رکھو۔ کمپنی رکھے رسید ہے کیا؟"

پائلٹ خاموش ہو کے کچھ سوچنے لگا "لیکن میڈم..... جہاز میں چار افراد کی جگہ ہے..... اگر ایک میرے ساتھ بیٹھ جائے....."

www.paksociety.com

"اب تم اپنے درمیان فیصلہ کرلیں گے۔" اس نے [illegible] کی فہرست [illegible] نہیں نے کہا۔

اگروال نے ایک سوٹ کیس کھولا۔ اس میں نوٹ ہی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ پائلٹ کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ اگروال نے ایک گڈی اس کی طرف بڑھادی۔

"یہ پانچ ہزار ہیں......"

پائلٹ نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ پھر پیچھے کھینچ لیا۔

"یہ بات ہے یہ نقلی نوٹ نہیں ہیں۔"

"تمہیں یہ کام نظر آرہا ہے" وہ بولا۔

"تمہارا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے" میں نے کہا "[illegible] لیکن تمہارا [illegible] کا کام ہے اسے چھوڑ دو۔"

"میں کسی مشکل میں تو نہیں پڑ جاؤں گا؟" وہ بولا۔

"مشکل میں تم پڑ چکے ہو" میں نے ریوالور نکال لیا۔ "اب مشکل سے نکلنے کا طریقہ یہی ہے کہ تم ہم سے تعاون کرو۔ اپنی جان بچاؤ اور ہم سے جو فائدہ حاصل کرسکتے ہو کرلو۔"

غالب نے کہا "کمپنی کچھ نہیں کرسکتی۔ وہ تمہیں کسی طرح مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتی۔ تم نے کوئی غلط کام کیا ہی نہیں۔ اور اگر کیا تو مجبوری تھی۔ تم اکیلے تھے۔ چھ کا مقابلہ کیسے کرسکتے تھے؟ کمپنی نے تمہاری زندگی کو داؤ پر لگا کر منافع کمایا۔ تم نے کمپنی کا جہاز بھی بچایا اور اپنی زندگی بھی۔ اس پر تو انعام ہونا چاہئے کہ تمہیں انعام ملے۔"

پائلٹ کا رنگ اڑ گیا "تم...... انسپکٹر ہو...... یا مفرور مجرم...... میں نے تمہیں دیکھا ہے...... مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ کہاں۔ شاید تصویر......"

میں نے ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا "اگر کچھ یاد آرہا ہے تو ابھی وقت ہے اسے بھول جاؤ۔ اور پھر کبھی یاد نہ کرنا۔ اگر تمہیں یاد آیا تو اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کمپنی کو دوسرا پائلٹ مل جائے گا مگر تمہیں دوسری زندگی نہیں ملے گی۔ تمہاری بیوی کو تو شاید دوسرا شوہر مل جائے گا مگر تمہارے بچوں کو دوسرا باپ نہیں ملے گا۔"

غالب نے کہا "سمجھداری سے کام لو۔ موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ ایسے مواقع ہر روز نہیں آتے۔ جب کوئی غیر متوقع ہو کے [illegible] دماغ سے کام لے تو قسمت سے ادھورے خوابوں کی تعبیر اور خواہشوں کی تکمیل ممکن ہو جاتی ہے۔"

اگروال نے کہا "اس وقت ہمارے اور تمہارے سوا یہاں کوئی نہیں ہے جو بعد میں تمہارے خلاف گواہی دے اور تم پر ضابطے کی خلاف ورزی کا الزام لگے۔ یہ لو مزید پانچ ہزار۔ اب چلو۔"

اس نے دس ہزار لے لئے اور خالی خالی نظروں سے ہماری صورتوں کو دیکھتا رہا "یہ تم واپس بھی تو لے سکتے ہو۔ ایک گولی خرچ کرکے اپنا پیسہ بچا سکتے ہو۔ میری جان کی کیا اہمیت ہوتی [illegible] گئے۔"

میں نے کہا "ہم صلح اور احترام سے کام لیتے ہیں۔ [illegible] سب کے لئے ایک کرا ہے۔ [illegible] چاہئے۔ ہو سکتا ہے [illegible] خیال کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ [illegible] کیا ضرورت ہے تم کو رشوت پیش کرنے کی یا [illegible] کرنے کی؟ ہم تمہیں ویسے ہی [illegible] سکتے ہیں۔ تم [illegible] خوف زدہ ہو۔ اس وقت بھی میرے ریوالور میں [illegible] ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھروسہ کرتا ہوں تم پر" [illegible] جیب میں ڈال لی "لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ یہ [illegible] پہنچ کے کیا ہوگا [illegible] جائے گے۔ یہ چھوڑے میں تمہارے پاس؟"

میں نے پورے اعتماد سے کہا "ہاں۔ [illegible] سب [illegible] گئے۔"

"ایئر پورٹ پر میں کیا وضاحت کروں گا کہ وہ [illegible] سے اور چار کیسے مسافر کہاں آگئے ہیں؟"

میں نے کہا "تم قبل از وقت اور بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو۔ [illegible] وہاں کے معاملات ہم پر چھوڑو۔ اپنی جان بچانے کے لئے تم کچھ بتاؤ [illegible] اعتراض نہیں ہوگا۔"

"اب تم شرافت سے چلو گے یا ہم دوسرا طریقہ [illegible] تم پائلٹوں کے بھوت [illegible] کے؟" غالب نے کہا۔

پائلٹ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولا "[illegible] حضرات [illegible] ہیں۔"

ناذر نے کہا "مجھے تو اندیشہ ہے کہ تم راستے میں [illegible] کرادو گے۔"

پائلٹ تلخی سے مسکرایا "ہاں۔ [illegible] یہ اختیار میرے پاس ہے۔ لیکن میں بزدل آدمی ہوں۔ ورنہ [illegible] انکار کردیتا اور بہادری کی موت قبول کرلیتا۔ میں ابھی بھی [illegible] ورنہ یہ دس ہزار دینے والے کے منہ پر کھینچ مارتا۔ [illegible]"

ایک ایک کرکے سب ہیلی کاپٹر میں سوار ہونے لگے۔ [illegible] کے ساتھ میں نے ناذر کو بٹھایا۔ اس کے پیچھے چار [illegible] نے اگروال کے ساتھ اور غالب نے ساوتری کے ساتھ جگہ [illegible] لی۔ کچھ کو آخری حصے میں اسباب پر بیٹھنا پڑا۔ ریوالور ہم سب کے پاس تھے مگر سب معاملات افہام و تفہیم سے طے ہو جانے کے بعد کسی کو ضرورت نہ تھی کہ اسلحہ ہاتھ میں رکھے۔

ہیلی کاپٹر پر سوار ہونے والا آخری شخص میں خود تھا۔ میں [illegible] پولیس کی وردی میں ملبوس شخص سے ہاتھ ملایا۔

"کیا تم واقعی پولیس میں ہو؟"

اس نے [illegible] مسکرایا "میں نے پہچان لیا ہے تمہیں۔ [illegible] کوئی بات نہیں۔ غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے" میں [illegible]

[illegible] تم کیا پسند کروگے۔ میں تم کو [illegible] کرکے لمبا [illegible] دوں کہ جیپ کے چاروں پہیوں کی ہوا نکال دیا [illegible]

وہ چونکا "کیا...... یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

میں نے اپنی بات دہرائی "میں جیپ کی تلاشی بھی لوں گا۔"

"کیا کرو گے؟"

میں نے کہا "فضول باتوں کا جواب دینے کے لئے وقت نہیں ہے میرے پاس۔"

[illegible] راستے میں حائل ہو گیا "میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا" اس نے [illegible] ریوالور نکال لیا۔

"اجازت کے بچے!" میں نے اس کے ایک بھرپور ہاتھ رسید کیا۔ اسے ریوالور اٹھانے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ [illegible] زمین میں [illegible] پھر وہ خود بھی زمین پر گر گیا۔ میں نے اس کے ریوالور کی گولیاں نکال کے جیب میں ڈالیں اور ریوالور اس کے قریب پھینک دیا۔

جیپ کے [illegible] سے مجھے ایک ننھا فون ملا مگر وہ حقیقت میں وائرلیس فون تھا اور اس ریڈیو کے ساتھ منسلک تھا جو [illegible] پر نظر آرہا تھا اور ایک نظر میں عام سا ریڈیو لگتا تھا۔ [illegible] کے پیچھے سے دوسرا ریوالور برآمد ہوا اور مجھے کوئی شک نہ رہا [illegible] اس شخص کے عزائم کچھ اور تھے۔ اس نے ساوتری سے بھی [illegible] کے فرار میں مدد دینے کا معاوضہ وصول کرلیا تھا۔ لیکن دوسری طرف اس نے فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے فرار کی [illegible] کو ناکام بنانے کا بندوبست بھی کرلیا تھا۔ غالباً ہماری ساری [illegible] پولیس افسران سب [illegible] تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ [illegible] سامنے نکلنے [illegible] بات کی [illegible] ہیلی کاپٹر کے پائلٹ [illegible]

میں نے وائرلیس فون کو [illegible] کر ناکارہ کیا اور جیپ کی باڈی [illegible] اسے استعمال کے ناقابل بنادیا۔ ہیلی کاپٹر میں میرا انتظار کرنے والے یقیناً اس کارروائی کو حیرانی سے دیکھ رہے ہوں گے۔ جب [illegible] کی ہوا نکالنے کے بعد میں ہیلی کاپٹر پر سوار ہوا تو فکر [illegible] کے آثار اگروال کی صورت سے نمایاں تھے۔

"تم نے دیکھا۔ ہمارا آدمی غدار تھا" میں نے کہا۔

ساوتری کا رنگ بدل گیا "میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"اسے تو بتایا ہی نہیں تھا" اگروال نے تلخی سے کہا۔

"[illegible] دس ہزار" ساوتری نے کہا "اس کے پاس وہ......"

اگروال نے کہا "وقت تم [illegible] ہو۔ چلو۔"

[illegible] نے اشارہ کیا اور چند منٹ میں ہیلی کاپٹر فضا [illegible] اگر پولیس [illegible] سب [illegible] تھی تو پھر وہ دور سے پیچھے کیوں نہیں آئے؟ وہ آواز کا تعاقب کرسکتے تھے اور ہمیں کہیں بھی [illegible] روک کے گرفتار کرسکتے تھے۔

غالب نے پائلٹ سے ایک [illegible] لے کر [illegible] پکڑوا دیا "مجھے تو کوئی بھی کہانی نہیں بنتی۔"

میں نے [illegible] اس سے لے کر کہا "[illegible] مجھے بھی نہیں [illegible] کوئی خیال [illegible]"

ساوتری [illegible] ہوئے تھا "تمہیں فرض سے [illegible] میں [illegible] کردیا ہے۔ وہ ایسا آدمی نہیں تھا۔"

اگروال نے اس کی تائید کی "تم نے اسے بلا وجہ مارا۔ اگر وہ مخبری کرتا تو ہم ہوٹل کے دروازے پر ہی دھر لئے جاتے۔"

"ہوٹل پر رات کوئی بتایا ہو جاتا" ساوتری نے کہا۔

شاید یہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ابھی تک کسی نے ہمیں بھی [illegible] نہیں روکا تھا۔ ہیلی کاپٹر آزادی سے پرواز کررہا تھا اور [illegible] پولیس کی کوئی حرکت دکھائی نہ دیتی تھی۔

میں نے کہا "اس کے پاس وائرلیس فون تھا۔"

"اس کے پاس نہیں تھا۔ جیپ میں تھا" ساوتری نے تلخی سے کہا "وہ اگر کیا کرتا۔ اسے نکال کے پھینک دیتا۔ ایک [illegible] کی جیپ ہے۔ وہ تو صرف ذرا [illegible] رہا تھا۔"

میں نے کہا "چلو اچھا ہی ہوا کہ میں نے اسے جان سے نہیں مارا۔"

"اسے مارنے کی بھی کیا ضرورت تھی؟" ساوتری برہم ہو گئی۔

"میں نے اسے موقع دیا تھا کہ جیپ کی ہوا نکال دے۔ مگر اس نے مجھ پر ریوالور نکال لیا تھا" میں نے کہا "میرا مقصد صرف اس کو کچھ دیر روکنا تھا۔"

"تم نے تو [illegible] اگر وہ تمہاری بات مان لیتا اور [illegible] ہیلی کاپٹر پر فائر کردیتا تو تم اس کا کیا بگاڑ لیتے۔ وہ نہ چاہتا تو ہم ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کے فرار نہیں ہو سکتے تھے" ساوتری نے [illegible] سے کہا "لیکن اب تمہاری وجہ سے وہ کسی مصیبت میں پڑ جائے گا۔ رات بھر کی ڈیوٹی دینے کے بعد وہ وقت پر واپس نہ پہنچا تو کچھ نہ ہو گا۔"

میں نے خفت سے کہا "آئی ایم سوری۔"

"سوری کہنے سے اب کیا ہوتا ہے۔ تم نے اس کی پوزیشن مشتبہ بنادی۔ وہ کیا بتائے گا کہ وہ اس طرف جیپ لے کر کیوں آیا تھا۔ جیپ کے سب ٹائروں کی ہوا کیسے نکل گئی۔ وائرلیس فون کیسے تباہ ہو گیا۔ ریوالور کس نے چھین لیا۔"

غالب نے کہا "وہ جھوٹ بول کے اپنی جان بچالے گا۔"

"اور اس نے سچ بولا تو پھر؟"

"ہمارے ساتھ وہ خود بھی مارا جائے گا" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "ہاں۔ اس کا جرم بھی کم سنگین نہیں ہے۔ اسے دس ہزار بہت مہنگے پڑیں گے اگر اس نے سچ بولا۔"

www.paksociety.com

کنٹرول نے کہا "چلو اب چھوڑو یہ بحث۔ آگے کی فکر کرو۔"
میں نے پائلٹ سے کہا "تمہارا کنٹرول ٹاور سے رابطہ ہے؟"
اس نے سر ہلایا "ہاں۔ ضرورت پڑنے پر میں ان سے بات کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے امید ہے کہ تم انھیں صرف اپنی خیریت کی خبر دو گے۔ کیا تم نے انھیں روانگی کی اطلاع دے دی تھی؟"

"ہاں۔ کنٹرول سے خیریت کے بعد پرواز کر سکتا تھا۔"

"تمہارا کیا روٹ ہو گا؟" "یہ بھی معلوم ہے تمھیں؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ میں اپنی مرضی سے ہر جگہ نہیں اتر سکتا۔ راستے میں جتنے ایئرپورٹ آئیں گے وہاں مجھے اجازت نامہ دکھانا پڑے گا۔

"ظاہر ہے۔ میں اپنی مرضی سے ہر جگہ نہیں اتر سکتا۔ راستے میں جتنے ایئرپورٹ آئیں گے وہاں مجھے اجازت نامہ دکھانا پڑے گا۔ انھیں بھی پہلے سے اطلاع مل جائے گی اور ہر کنٹرول ٹاور مجھے لینڈ کرنے کے لیے ہدایات دے گا۔"

"کیا تمہارا لینڈ کرنا ضروری ہو گا؟"

وہ مسکرایا "نیپال تک نان اسٹاپ فلائٹ نہیں ہو سکتی۔ مجھے راستے میں دو بار فیول لینا پڑے گا۔ میرے روٹ پوسٹ پر ہی فیول ملے گا۔"

"اور اگر تمھیں راستہ بدلنا پڑے؟"

"آخر کیوں بدلنا پڑے....."

"فرض کرو کوئی بھی ہنگامی صورتِ حال پیدا ہو جائے۔ آگے کا موسم خراب ہو۔ طوفان آنے والا ہو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "محکمۂ موسمیات والوں سے جھوٹ نہیں بولا جا سکتا۔ وہ زیادہ جانتے ہیں۔ میں اس جرم کا مقصد ابھی تک نہیں سمجھا۔"

"مطلب بہت واضح ہے۔ ہم نیپال نہیں جا سکتے۔ تم اب اپنا رخ کلکتہ کی جانب کر لو" میں نے کہا۔

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یار کیوں نہیں ہو سکتا" غالب بولا "اچھا بھلا آدمی کسی بھی لمحے پاگل ہو سکتا ہے۔ ہم تو پہلے ہی تھوڑے بہت پاگل ہیں۔"

"اسے انکساری کی کیا ضرورت ہے" نازو بولی "آپ کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ پورے پاگل ہیں' دیوانے ہیں۔"

"یہ بھی بتا دو کہ کس کے" غالب نے یوں کہا کہ نازو جھینپ کر باہر دیکھنے لگی۔

میں نے کہا "پائلٹ صاحب' اس مشکل کا حل بھی آپ ہی نکالئے۔ یہ کیسے ہو گا۔ کس طرح ہو گا۔ کس کی اجازت سے ہو گا۔ یہ سب سوچنا آپ کا کام ہے۔ ہم نے تو بتا دیا کہ نیپال نہیں جانا' کلکتہ جانا ہے۔ آخر ہم نے ہیلی کاپٹر کرائے پر لیا ہے۔ کوئی شیڈول فلائٹ تو ہے نہیں۔ ہمارا پروگرام بدل گیا یا کوئی مجبوری پیش آ گئی۔ تم کیا زبردستی ہمیں نیپال لے جاؤ گے؟"

پائلٹ تشویش میں مبتلا ہو گیا "مجھے کمپنی سے بات کرنی پڑے گی۔ کنٹرول ٹاور کی معرفت۔"

"ضرور کرو۔ تمہاری گفتگو ہم بھی سنیں گے۔ اگر وہ تمہارے کہنے سے قائل نہ ہوئے تو ہم کر لیں گے" میں نے کہا۔

"یہ بہت مشکل اور لمبا طریق کار ہے۔"

"کیا اجازت ملنے تک ہم فضا میں چکر کاٹتے رہیں گے؟ تم رخ بدلو اور ہماری بات کراؤ" میں نے کہا۔

پائلٹ نے مجبوراً وائرلیس پر رابطہ قائم کیا۔ چند منٹ بعد کنٹرول ٹاور نے جواب دیا "کیا مسئلہ ہے؟"

"یہ لوگ فلائٹ کو نیپال کے بجائے کلکتہ لے جانا چاہتے ہیں" پائلٹ نے کہا۔

"کون لوگ؟ کیا انھوں نے ہائی جیک کر لیا ہے ہیلی کاپٹر؟" کنٹرول نے کہا۔

"نہیں۔ انھوں نے چارٹر کیا تھا ہیلی کاپٹر کو۔ مجھے کمپنی سے اجازت نامہ دلوانا ہے" پائلٹ نے کہا۔

کنٹرول ٹاور نے آخر کار اس کا رابطہ کمپنی سے کرا دیا۔ وہاں کوئی تیکنیشن بیٹھا ہوا تھا جو پائلٹ کی بات سمجھنے پر آمادہ نہیں تھا۔

"آخر یہ چکر کیا ہے؟ کیوں جانا چاہتے ہیں یہ کلکتہ؟ نیپال میں کیا ہے' قیامت آ رہی ہے....."

میں نے پائلٹ کے ہاتھ سے مائکروفون چھین کر فرنچ میں بولنا شروع کیا "کون ہوتے ہو تم مجھ سے وجہ پوچھنے والے۔ میں نیپال جاؤں' کلکتے یا جہنم میں۔ مفت تو نہیں جا رہا ہوں۔"

وہ بوکھلا گیا "تم..... کون ہو؟ انگریزی میں بات کرو۔"

میں نے کہا "مجھے انگریزی نہیں آتی بے وقوف ورنہ میں فرنچ کیوں بولتا۔ بہتر ہے تم فرنچ میں بات کرو۔"

"تمہارے ساتھ کوئی انگریزی بولنے والا نہیں ہے؟" وہ پریشان ہو گیا۔

میں نے مائکروفون غالب کے حوالے کر دیا۔ اس نے وضاحت کی "بھئی یہ وہی غیر ملکی فلمساز ہیں جو انڈیا میں مختلف لوکیشن دیکھتے پھر رہے ہیں اور حکومت کی طرف سے ان کو سہولت فراہم کی جا رہی ہے۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ ایک فلم ساز ادھر ہے۔ اس کو بھی سرکار کی سہولیات حاصل ہیں۔ یہ دوسرا کہاں سے آ گیا؟"

"کیا بھارت آنے والے فلمسازوں کی تعداد پر پابندی ہے؟" غالب نے کہا "ایک وقت میں دو نہیں آ سکتے؟ اور یہ تو آنے والے ہیں....."

"مگر وہ دراصل کیا تھا۔ آج ہی صبح میری بات ہوئی ہے۔"

"تم بہت عقلمند آدمی ہو" غالب نے طنز سے کہا "تم ایک فلمساز کو ایک آدمی سمجھتے ہو۔ بھائی! فلم ساز کا پورا یونٹ ہوتا ہے جس میں بہت سے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ پروڈیوسر سے رائٹر تک..... تم اس چکر میں نہ پڑو اور صرف ضابطے کی کارروائی پوری کرو۔ سمجھے؟"

"سمجھ گیا سر۔"

"پائلٹ کو کلکتے تک کلیئرنس دو" غالب نے کہا۔

"میں ابھی سب کراتا ہوں" وہ بولا "لیکن سر! چارجز....."

"وہ ہم کلکتہ پہنچ کر ادا کر دیں گے" غالب نے کہا۔

"لیکن فیول چارجز اور لینڈنگ چارجز وہاں کیش وصول کیے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم وہ دے دیں گے۔"

"مجھے ابھی بتا دیں کہ اس ہیلی کاپٹر کو کلکتہ سے آگے یا واپسی کے لیے بھی بک کیا جائے....."

غالب نے کہا "ہاں۔ ابھی ہیلی کاپٹر ہمارے پاس ہی رہے گا۔ حساب بعد میں ہو جائے گا۔"

"آپ ان کے ساتھ ہیں سر؟"

"میں سرکاری ترجمان ہوں" غالب نے کہا "انھیں صرف فرنچ آتی ہے نا؟"

"آپ اسے سمجھا دیں کہ آہستہ بات کرے اور شرافت سے۔ جیسے اپنی فرنچ کی مشین گن نہ چلائے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ یہاں انگریز بہادر کا راج تھا اور ہم غلام زادے انھی کی بولی سمجھتے ہیں۔"

غالب ہنسا "اب بھی آزاد نہیں سمجھتے تم خود کو؟"

"آزادی کیا ہوتی ہے؟ آزادی صرف حاکموں کو ملی ہے جو پہلے بھی اپنی مرضی سے حکومت کرتے تھے' آج بھی کر رہے ہیں۔ کسان' مزدور اور کلرک کو کیا ملا اس آزادی سے؟" وہ خاصے باغیانہ خیالات رکھتا تھا اور اس کے لہجے میں تلخی حالات کا زہر تھا۔

غالب نے مائکروفون پھر پائلٹ کو دے دیا "اب تو کوئی پریشانی کی بات نہیں رہی؟"

پائلٹ نے نفی میں سر ہلایا "میرا کام صرف ہیلی کاپٹر اڑانا ہے ورنہ مجھے اس کی تنخواہ ملتی ہے کمپنی سے۔ کمپنی اجازت دے تو میں کہیں بھی جا سکتا ہوں۔"

پھر وہ غالب سے ہماری فلم سازی کے پروگرام کی تفصیلات پوچھتا رہا اور غالب نے فراخ دلی سے جھوٹ بولتے ہوئے اس پر انکشاف کیا کہ بھوانی جنکشن کی طرح اس فلم پر کروڑوں ڈالرز کی لاگت آئے گی اور اس میں ہالی ووڈ کے کتنے نامور ستارے شامل ہوں گے۔ وہ ہکا بکا سنتا رہا اور شاید یہ سوچتا رہا کہ ہمارے فلم ساز ادارے سے تعاون کے نتیجے میں اس کو بھی فلم میں چانس مل سکتا ہے یا نہیں۔

میں چند قدم دور گل اور نازو کے ساتھ بیٹھا رہا۔ ڈکروال اور سانولی آپس میں نہ جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ ہمیں یہاں تک لانے والی جیپ کا ڈرائیور بے مقصد پڑا رہا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد غالب نے تالی بجا کے ہمیں متوجہ کیا اور اپنی طرف بلایا۔

پائلٹ کو کلکتہ تک کلیئرنس مل گئی تھی مگر ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ایئرپورٹ چارجز ہم سے کیش وصول کرے اور فلائٹ کے دوران اپنے روٹ کا خاص خیال رکھے۔ علاقے کے گرد و نواح میں فوجی صورتِ حال خاصی نازک تھی اور ملٹری ایکٹیویشن کی وجہ سے شیڈول کی فلائٹس بھی متاثر ہو رہی تھیں۔ "بغیر شیڈول کے کسی فضائی حدود میں داخل ہونا غلط فہمی کی بنا پر مداخلت بھی سمجھا جا سکتا ہے" پائلٹ کو بتایا گیا "ویسے تو روٹ کی کلیئرنس مل گئی ہے لیکن کوئی پوچھے تو اسے آرام سے سب بتا دو۔ کوئی روکے یا اتارنے کی کوشش کرے تو فوراً تعمیل کرو۔"

غالب نے کہا "اس سے پوچھو کہ مشرقی پاکستان کی کیا صورتِ حال ہے؟"

غالباً کنٹرول میں اس کی آواز سن لی گئی "صورتِ حال اب کیا ہوئی۔ پوری طرح ہمارے کنٹرول میں ہے۔"

"کیا مطلب؟" غالب نے مائکروفون لے لیا۔

"مطلب یہ کہ اب کوئی مشرقی پاکستان نہیں۔ بنگلہ دیش ہے" اس نے بڑی مسرت' جوش اور جذبے کے ساتھ کہا۔

"اچھا! کیا مزاحمت ختم ہو گئی؟"

"معلوم ہوتا ہے سر کہ آپ فلم سازی کے چکر میں حالاتِ حاضرہ سے بالکل بے خبر رہے ہیں۔ اخبار وغیرہ تک نہیں پڑھتے۔"

"ہاں۔ کچھ ایسی ہی مصروفیت رہی....."

"مزاحمت عملاً ختم ہو چکی ہے سر۔ کہیں کہیں مقامی جھڑپوں کا سلسلہ ہے۔ اصل جنگ ڈھاکا کے آس پاس تھی۔ وہاں محاصرہ بہت تنگ ہو گیا ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ باقی دنیا کیا کر رہی ہے آخر اور اقوام متحدہ....."

وہ قہقہہ مار کے بولا "دنیا بھی تماشا دیکھ رہی ہے سر اور اقوام متحدہ بھی۔ ہمارے معاملے میں کون دخل دے گا۔ یہ سب تو پہلے سے طے تھا۔ ڈھاکا بھی آج شام تک خالی ہو جائے گا۔ ہماری بہادر سینا نے قبضہ کر لیا....."

کنٹرول ٹاور میں بیٹھا ہوا کوئی قوم پرست ہندوستانی مزے لے لے کر مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی آواز ہم تک ایک چھوٹے سے اسپیکر کے ذریعے پہنچ رہی تھی جس کا تعلق پائلٹ کے ہیڈ فون سے ہوتا ہے۔ اس کی آواز میرے دل

www.paksociety.com

کے زخموں پر نمک پاشی کر رہی تھی۔ شکست کی اذیت سب کے چہروں سے عیاں تھی اور پائلٹ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس میں دکھ یا پریشانی کی کون سی بات ہے۔ خود اس کے لئے بھی یہ اچھی خبر تھی۔

آخر کار میرے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔ میں نے مائیکروفون اس کے ہاتھ سے چھین کر آف کر دیا "بند کرو اپنی بکواس۔ اور چلو۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "تم...... ہندی جانتے ہو؟"

"میں سب کچھ جانتا ہوں" میں نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ "لیکن تم کچھ نہیں جانتے۔"

پائلٹ کی نظر ریوالور پر جم گئی "یہ...... یہ سب کیا ہے؟ کون لوگ ہو آخر تم؟"

میں نے کہا "تمہارے لئے صرف مسافر۔ اس سے زیادہ جاننے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ......"

"ورنہ کیا؟ تم گولی مار دو گے مجھے؟" پائلٹ برہمی سے بولا "پھر کیا کرو گے؟ یہ زمین پر چلنے والی گاڑی نہیں ہے۔"

"یہ جہاز ایک چھپر ہے" میں نے خطرناک لہجے میں کہا "اور میں جیٹ طیارے تک اڑاتا رہا ہوں۔ امید ہے تم مجھے چیلنج نہیں کرو گے۔ میں تمہاری لاش اسی جگہ چھوڑ کر یہ ہیلی کاپٹر لے جا سکتا ہوں۔"

پائلٹ کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا اور بولا۔ "تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ بین الاقوامی قوانین......"

"اچھی طرح جانتا ہوں میں تمام بین الاقوامی قوانین کو۔" میں نے بیزار ہو کر کہا "کیا ان قوانین پر کسی نے مشرقی پاکستان میں عمل ہونے دیا؟ ساری اخلاقی اور سیاسی اقدار کا جنازہ نکل گیا......"

غالب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "اس بیچارے کی تو کوئی غلطی نہیں تھی اس میں۔"

"پھر اس سے کہو کہ فضول بھونکنے کی غلطی نہ کرے" میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

ہیلی کاپٹر کے پائلٹ پر اب تمام صورتِ حال روشن ہو چکی تھی چنانچہ اس کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ سیاسی دہشت گردی کا شکار ہو چکا ہے اور ہم اسے ہائی جیک کر کے لے جا رہے ہیں۔ عقلمندی سے کام لیتے ہوئے اس نے ہیڈ فون سر پر چڑھایا اور ہیلی کاپٹر کو اسٹارٹ کیا۔ ہمارے سر کے اوپر ایک بہت بڑا پنکھا تیزی سے گھومنے لگا۔ پھر ہیلی کاپٹر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا۔ پائلٹ نے کنٹرول کو روانگی کی اطلاع دی اور پھر مائک آف کر دیا۔

اب ہم فضا کی بیکراں وسعت میں محوِ پرواز تھے اور اوپر سے زمین کو کسی پرندے کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے۔ انجانی بستیاں، گھنے جنگل، ویرانے، ندی نالے گزرتے جا رہے تھے۔ کبھی اچانک سیاہ فیتے کی طرح زمین پر پھیلی ہوئی سڑک نظر آ جاتی تھی جس پر چلنے والی گاڑیاں کھلونوں کی طرح لگتی تھیں۔

میں ہیلی کاپٹر کے ڈائل پر اس کی بلندی، ہوا کا دباؤ، رفتار اور بہت کچھ دیکھ سکتا تھا لیکن اس ہوائی راستے کو نہیں دیکھ سکتا تھا جس پر ہم پرواز کر رہے تھے۔ زمین کے راستوں کی طرح فضا میں بھی ہوائی جہازوں کے لئے مخصوص خطوط پر سفر کرنا لازمی ہے مگر ان نظر نہ آنے والے خطوط کو صرف پائلٹ سمجھتا ہے۔ میں نے جھوٹ بولا تھا کہ میں پرواز کا تجربہ رکھتا ہوں لیکن میرے جھوٹ کے پُراعتماد انداز نے پائلٹ کو شک میں مبتلا نہیں ہونے دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ غلط سمت میں پرواز کر کے اپنی جان گنوانے کی حماقت نہیں کر سکتا۔ صحیح سمت کا کچھ اندازہ میں سورج سے بھی کر سکتا تھا جو اب ڈھلنے لگا تھا چنانچہ اب ہمیں سورج کو اپنے پیچھے رکھتے ہوئے آگے بڑھنا تھا۔ سورج ہماری طرف آ رہا تھا اور ہم سورج کی طرف جا رہے تھے یوں وقت کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ ساجد اور دونوں بیٹھے بیٹھے سو گئے تھے۔

شام ساڑھے چار بجے پائلٹ نے ہم سے کہا "اپنی اپنی گھڑیاں آدھا گھنٹہ آگے کر لیں۔"

میں نے کہا "یہ مقامی وقت ہے؟"

پائلٹ نے سر ہلایا "کلکتہ پہنچ کر گھڑیوں کو پھر آدھا گھنٹہ بڑھانا ہو گا۔"

"اس وقت ہم کہاں ہیں؟"

"جبل پور قریب ہے۔ مجھے یہاں سے فیول لینا ہو گا۔"

میں نے کہا "اس میں کتنا وقت لگے گا؟"

"تقریباً ایک گھنٹہ" پائلٹ نے کہا۔

"مجھے امید ہے کہ تم کوئی ناخوشگوار صورتِ حال پیدا نہیں ہونے دو گے" میں نے کہا۔

"اور مجھے امید ہے کہ اس سفر کے بعد تم مجھے واپس جانے دو گے۔ میری آزادی کو پراوک کے سفر پر روانہ نہیں کرو گے۔ اسی امید پر میں تم سے پورا تعاون کر رہا ہوں۔ اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ...... جو کچھ ہمارے درمیان ہوا...... اس کا کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔"

"یہ بھی تمہارے مفاد میں ہے" میں نے کہا "بات صرف کی نہیں۔ مستقبل کے تحفظ کی ہے۔"

"مجھے اپنے بچوں کے مستقبل کے تحفظ کی فکر نہ ہوتی تو شاید میں اتنا مجبور اور کمزور ثابت نہ ہوتا۔" اس نے ایک آہ بھری۔

"زندگی نے ایسی ہی مجبوریوں کی بیڑیاں ہم سب کو پہنا دی ہیں" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

غالب نے کہا "یہ دنیا پہلے ہی مختصر تھی۔ اب فاصلے اتنے گھٹ گئے ہیں کہ آج کہیں پیچھے رہ جانے والا کل کہیں بھی پھر مل سکتا ہے۔"

"مسئلہ ہم نہیں" میں نے کہا "اور اس لئے تم نہیں رکھتے کہ پھر تم سے ملیں مگر یہ ناممکن نہیں ہے۔ ہم گمنام لوگ ہیں۔ تم ایک نام یاد رکھتے ہو۔"

پائلٹ نے کہا "اسی لئے میں ڈر گیا تھا۔ میں یہ مان رہا ہوں کہ تم ایک فلم ساز ادارے کے نمائندے تھے۔ تم کو خیال آیا تھا کہ پھر تمہارا پروگرام بدل گیا اور تم کلکتہ چلے گئے۔ بس۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں اب جہاز کو نیچے اتار رہا ہوں۔"

"ضرور اتارو۔ بس یہ مت بھولنا کہ ہم مسلح ہیں۔"

اس نے افسوس سے سر ہلایا "تم اعتبار کرنا نہیں جانتے۔"

"ہم باتوں سے مار نہیں کھاتے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم ہمارا اعتماد حاصل کر لو اور پھر دھوکا دو" میں نے کہا "تم اپنی بات کا ثبوت اپنے عمل سے دو گے۔"

مجھے کوئی جواب دئے بغیر وہ کنٹرول ٹاور سے مخاطب ہو گیا اور چند منٹ بعد اسے لینڈ کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ ایک پرائیویٹ ائرفیلڈ تھا جس پر بہت سے چھوٹے بڑے طیارے کھڑے ہوئے تھے۔ بعد میں پائلٹ نے مجھے بتایا کہ یہ جبل پور کی آرڈیننس فیکٹری کا ہوائی اڈہ تھا جو بعد میں سول ایوی ایشن کو دے دیا گیا۔

"جب تک جہاز میں فیول بھرا جائے گا اور ضابطے کی کارروائی ہو گی اس وقت تک ہم کیا کریں گے؟" نادر نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے پائلٹ کی طرف دیکھا "کیا ہم یہیں بیٹھے رہیں گے؟"

"نہیں ریفرشمنٹ لوں گا" وہ بولا "آپ لوگ بھی چاہیں تو ریسٹورنٹ میں کچھ کھا پی سکتے ہیں۔ بہت اچھا ریسٹورنٹ ہے۔"

"ہم...... یہیں انتظار کریں گے" اگروال نے کہا "میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"خطرہ تو ہم بھی مول نہیں لے سکتے" میں اس کی بات پر سوچ میں پڑ گیا "اس مرحلے پر کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔"

"گاڑی لے کر تو آدمی بھاگ جاتا ہے۔ ہیلی کاپٹر کے ساتھ فرار کی کوشش کا بھی تصور نہیں" غالب نے کہا۔

"مسٹر پائلٹ، کیوں نہ ریفرشمنٹ یہاں منگوائے جائیں؟" میں نے کہا۔

"اترنا تو مجھے پڑے گا" وہ زچ ہو کر بولا "لاگ بک میں انٹری ہو گی اور مجھے سائن بھی کرنے ہیں۔ فیول اور لینڈنگ چارجز ادا کر کے رسید لینی ہے اس کے لئے کوئی یہاں نہیں آئے گا۔"

"پھر تو مجبوری ہے۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔

پائلٹ نے مجھے ناگواری سے دیکھا مگر خاموش رہا۔ میں ایک ہاتھ جیب میں ڈالے اس کے ساتھ ساتھ ایپرن پر چلتا رہا۔ میرے اس ہاتھ کی گرفت میں ریوالور تھا لیکن میرا رویہ انتہائی دوستانہ تھا۔ اس نے پہلے کاغذی کارروائی مکمل کی۔ پھر ادائیگی کر کے فارغ ہوا تو ہم ریسٹورنٹ میں گئے۔ ہر جگہ اس نے میرا تعارف فلم ساز کی حیثیت سے کرایا اور میں نے فرنچ میں خوش خلقی اور انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ افسوس میں انگریزی سے نابلد ہوں۔ صرف پائلٹ جانتا تھا کہ یہ جھوٹ ہے اور وہ ہندی میں بھی نہیں بول سکتا۔ لوگ مجھ سے ملتے تھے تو بڑے متاثر نظر آتے تھے اور میرے وحشیانہ حلئے کو اس لئے نظر انداز کر دیتے تھے کہ ان کی نظر میں ایک جینئس اپنی وضع قطع میں رسوم و قیود سے بالاتر ہوتا ہے۔

تاہم ایک جگہ قسمت نے مجھے بچا لیا۔ ریسٹورنٹ کا منیجر کسی زمانے میں "ائر فرانس" میں اسٹیورڈ کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکا تھا چنانچہ فرنچ بھی جانتا تھا اور فرانس بھی دیکھ چکا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں محسن کے ساتھ میں ہر ویک اینڈ پر انگلش چینل کراس کر کے پیرس چلا جاتا تھا اور چار سال کے عرصے میں ہم نے فرانس کے علاوہ جرمنی، آسٹریا، ہالینڈ اور سوئٹزرلینڈ کی بھی خوب سیاحت کی تھی۔ ان یورپی ممالک کے درمیان ویزے کی قید نہیں تھی چنانچہ ویک اینڈ پر دو دن کی چھٹی میں ہزاروں گاڑیوں میں لوگ ادھر سے ادھر آتے جاتے رہتے تھے۔ یہی تجربہ میرے کام آیا۔

منیجر نے پہلے تو مجھے اپنی فرنچ سے امپریس کیا اور پھر فلم سازی کے موضوع پر آ گیا۔ اس نے باقی سب لوگوں کے لئے چائے، کافی اور کھانے پینے کا سامان ہیلی کاپٹر میں بھیج دیا تھا مگر خود ہمارے ساتھ شریک ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے ہی کمرے میں مدعو کر لیا تھا۔ اب پائلٹ احمق بنا بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔

منیجر نے مجھ سے بہت کچھ پوچھا۔ "فرانس میں میرا قیام کہاں ہے۔ میں نے کتنی فلمیں بنائی ہیں۔ ان فلموں میں کسے کاسٹ کیا تھا۔ اور میرے تعلقات فلمی صنعت میں کس کس سے ہیں۔" اس نے صوفیہ لارین اور بریجٹ باردوت کے حوالے سے ایسے ذاتی سوالات کئے جن کا جواب نہ اثبات میں دیا جا سکتا تھا اور نہ انکار میں۔

میں بڑے سکون سے اس باتونی شخص کو بھگت رہا تھا اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ باتوں کے ساتھ ساتھ منہ بھی چلتا رہے۔ میری نظر ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں پر بھی تھی۔

اچانک منیجر نے کہا "کیا تم انڈین ہو؟"

میں نے چونکے بغیر کہا "انڈین؟...... میں فرنچ ہوں۔"

"نیشنلٹی لی ہو گی تم نے یا تمہارے والدین نے۔ تم پیدائشی طور پر فرنچ ہو گئے۔"

"میں اس سوال کا مقصد نہیں سمجھا۔"

"مقصد کچھ نہیں۔ تم نسلاً یورپی نہیں ہو۔ تمہارا تعلق اسی علاقے سے رہا ہو گا۔ تمہارا لہجہ بھی یہی بتاتا ہے۔"

میں نے اعتراف کیا "بالکل صحیح اندازہ ہے تمہارا۔"

"مجھے تمہاری صورت بھی دیکھی ہوئی لگتی ہے" منیجر اپنے

www.paksociety.com

انداز ے کی پہلی کامیابی پر مسرور ہو کے بولا "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے فلمسازی سے پہلے اداکاری کی ہو۔ اسکرین کے سوا کہاں دیکھ سکتا تھا میں....."

میں نے کافی کا آخری گھونٹ حلق سے اتارا اور کھڑا ہو گیا۔ "یہ بھی بالکل ٹھیک ہے۔ مگر وہ فلمیں ایسی نہیں تھیں کہ انڈیا میں ان کی نمائش کی جائے۔ کچھ ڈاکومنٹری تھیں۔ یا آرٹ موویز....."

پاکٹ میرے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور بل کی ادائیگی کرنے کے موڈ میں تھا لیکن منیجر نے بڑے اصرار کے ساتھ انکار کیا۔

"آپ مہمان تھے میرے۔ میری خوش قسمتی....."

اسی وقت ایک ویٹر نمودار ہوا جو نیلی کاپٹر میں اشیائے خورونوش لے کر گیا تھا۔ اس نے منیجر کے کان میں کچھ کہا۔

"کیا ..... اگروال....." منیجر نے چونک کر کہا "تمہارا دماغ خراب ہے یا نظر....."

"سر! آپ خود چل کر دیکھ لیں" ویٹر نے بڑے یقین کے ساتھ کہا "اخبار کی تصویر سے ملالیں۔"

اب پاکٹ نے میری نظر کا اشارہ پا کے کہا "کیا بات ہے منیجر صاحب۔"

"سر..... اس نیلی کاپٹر میں ..... اور کون ہے؟" ویٹر نے کہا۔ "مجھے شک ہے....."

"کیا شک ہے....." پاکٹ نے تیز لہجے میں کہا۔

"شک..... یہ ہے کہ ڈاکو اگروال اس میں موجود ہے" ویٹر نے بے خوفی سے کہا "شک کیا یقین ہے۔"

"ڈاکو اگروال کون ہے؟" پاکٹ نے خفگی سے کہا "اور اس کا میرے نیلی کاپٹر سے کیا کام؟"

اب منیجر نے ایک اخبار اٹھا کے پاکٹ کے سامنے رکھ دیا۔ "یہ اس شخص کی بات کر رہا ہے۔ کہتا ہے اس نے خود دیکھا ہے۔"

پاکٹ کی نظریں تصویر پر جم گئی تھیں اور وہ اخبار میں دیئے گئے سرکاری اشتہار کا متن پڑھ رہا تھا۔ میں اس کی صورت پر رونما ہونے والے تغیرات کا مشاہدہ کر رہا تھا اور یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ اب مجھے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ پاکٹ کو موقع دینا چاہیے کہ وہ خود صورت حال سے نمٹ لے اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرے۔ وہ اقرار کرتا تو اس جرم میں اپنے ملوث ہونے کا اعتراف کرتا۔ بعد میں اس کے لئے سخت مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ اسے ڈاکو اگروال کے فرار کی سازش میں شریک سمجھا جاتا اور وہ کبھی ثابت نہ کر پاتا کہ اس کا ڈاکو اگروال سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نہ اس نے اگروال کو اس نیلی کاپٹر میں نکال لیجانے کا بھاری معاوضہ وصول کیا تھا۔ وہ تو اگروال کو پہچانتا بھی نہیں تھا۔ پولیس یہ سب نہ مانتی اور اس سے سب کچھ منوا لیتی۔ اس کی نوکری بھی جاتی اور جیل جانے سے بچنے کے چکر میں وہ کنگال ہو جاتا۔ یہ جرم اتنا سنگین تھا کہ پولیس اس کے ساتھ سارے خاندان کو تفتیش میں

شامل کر لیتی اور اسے یقیناً معلوم تھا کہ ایسے معاملات میں زیر تفتیش افراد کا کیا حشر کیا جاتا ہے۔

پاکٹ نے فوراً خود کو سنبھال لیا "تم نے ٹھیک کہا تھا اس شخص کی آنکھیں بھی خراب ہیں۔"

"سر! ایسی بات مت کریں۔"

"شٹ اپ۔ اپنے جہاز کے مسافروں کو تم سے بہتر میں جانتا ہوں؟" پاکٹ نے اخبار پھینک دیا "یہ کوئی اور شخص ہے۔"

"یہ وہی شخص ہے" ویٹر اڑ گیا "اسی لئے وہ نیچے نہیں اترا۔"

"نیچے تو کوئی بھی نہیں اترا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے مسافر ہیں۔ تین عورتیں ہیں۔ ایک یہ ہیں۔ ان کے دوسرے ساتھی ہیں۔"

"پھر وہ کس کا ساتھی ہے؟"

اب میں نے مداخلت کی۔ میں نے فرنچ میں کہا "آخر یہ کیا شور ہے؟ کس بات پر بحث کر رہے ہیں آپ سب لوگ؟"

منیجر نے اخبار مجھے دکھا کے کہا "اس ویٹر نے اپنی آنکھوں سے ڈاکو اگروال کو نیلی کاپٹر میں دیکھا ہے۔"

میں نے حیران ہو کے کہا "ڈاکو..... یہ کیا بکواس ہے۔ وہ سب میرے ساتھی ہیں، میری مدد کر رہے ہیں۔ جہاز میں نے چارٹر کیا ہے۔"

منیجر نے سر کھجا کے کہا "اچھا..... اگر میں خود ان سب سے مل کر تصدیق کر لوں....."

"اس کے لئے تم کو پاکٹ کی اجازت کی ضرورت ہو گی۔ تم تلاشی لینے کے مجاز نہیں۔ اس سے بات کرو" میں نے کہا۔

منیجر نے پاکٹ کی طرف دیکھا "میں خود دیکھوں گا۔"

"تم کون ہوتے ہو" پاکٹ بگڑ گیا "کیا قانونی اختیار ہے تمہارے پاس۔ تم ایک ریسٹورنٹ کے منیجر ہو۔ پولیس افسر نہیں۔"

"جب تمہیں یقین ہے کہ وہ اگروال نہیں تو پھر ڈرتے کیوں ہو؟" منیجر نے کہا۔

"ڈر کا کون الو کا پٹھا ہے۔ یہ میری عزت کا سوال ہے۔ اگر میں اس وقت تمہارے گھر میں گھس کر چوری کا مال برآمد کرنے کی کوشش کروں تو تم مجھے اجازت دو گے؟ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے مصدقہ ذرائع سے اطلاع ملی ہے۔ تم اتنا سنگین الزام عائد کر سکتے ہو مجھ پر؟ اور میرے مقابلے میں ایک ویٹر تمہارے لئے زیادہ قابل اعتبار ہے؟ یہ انسلٹ ہے میری۔"

"نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں۔"

"گولی مارو یار کو۔ میں یار نہیں ہوں تمہارا۔ ایک ذمے دار پاکٹ ہوں۔ اس کے علاوہ تم کو یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ تمہاری ایک احمقانہ حرکت سے کتنے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ یہ ایک غیر ملکی فلم ساز ادارے کی چارٹر فلائٹ ہے۔"

"مجھے تو اس کے بھی غیر ملکی ہونے میں شک ہے" منیجر نے

دیکھ کر بولا۔

"ٹھیک ہے تو پھر بلالو پولیس کو۔ بعد میں خود بھگتنا جب سفارت خانے والے آجائیں گے اور یہ معاملہ پہنچ جائے گا بہت اوپر۔ وزارت خارجہ اور داخلہ تک۔ یہ سرکاری مہمان ہیں منیجر صاحب۔ ان کے ساتھ پنگا مت لو۔"

یکلخت منیجر کو احساس ہو گیا کہ اپنی حدود سے تجاوز کر کے وہ مصیبت میں پڑ سکتا ہے۔ وہ محض شک کی بنیاد پر اتنا بڑا قدم اٹھانے سے ڈر گیا۔ اس نے ویٹر کو جھاڑا۔

"چلو اپنا کام کرو۔ اگروال کی اولاد....."

"سر..... وہ اگروال نہیں تو پھر اس کا جڑواں بھائی ضرور ہے۔" ویٹر نے طنز آمیز تمسخر کے ساتھ کہا "آپ خود دیکھ لیجئے....."

"دفع ہو جاؤ" منیجر نے گرج کے کہا "مت دیکھا کرو اتنی فلمیں کہ ہر جگہ فلمی اتفاق نظر آنے لگے۔ پاگل ہو جاؤ گے۔"

ظاہر ہے کہ ویٹر پاگل نہیں تھا۔ یہ اس کی نظر کا بھی قصور نہیں تھا اور کوئی فلمی اتفاق بھی نہیں تھا۔ لیکن ایک پاکٹ اور ایک فرنچ بولنے والے کے سامنے اس کی کیا اوقات تھی۔ وہ غیر معتبر ٹھہرا اور دھتکار دیا گیا۔ ہم منیجر کی معذرت قبول کر کے اور اس کی میزبانی کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہو گئے۔ تاہم اب میرے دماغ میں خطرے کی لال بتی روشن ہو گئی تھی اور میرا سارا اطمینان رخصت ہو گیا تھا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اگر بعد میں اس شوریدہ سر ویٹر نے منیجر کو قائل کر لیا کہ وہ اپنے یقین میں کس حد تک حق بجانب تھا تو ممکن ہے منیجر اپنے شک سے پولیس کو آگاہ کر دے۔ قانون کی مدد کے لئے شک کا اظہار کوئی جرم نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسے بے جا الزام تراشی نہیں قرار دیا جا سکتا اور نہ ہتک عزت۔

میں نے نیلی کاپٹر کے پرواز کرتے ہی اپنے خدشات سے غالب کو اور اگروال کو آگاہ کیا۔

اگروال گالیاں بکنے لگا "مجھے بھی اس ویٹر کی باتوں نے شک میں ڈال دیا تھا۔"

سانول نے سپاٹ لہجے میں کہا "اسے واپس جانے ہی نہیں دینا چاہئے تھا۔ تم نے میری بات نہیں مانی۔"

"اسے ہم کیسے روک سکتے تھے؟" نازو نے کہا۔

"اسے مہمان بنا کے رکھنا ضروری نہیں تھا۔ جہاز کے اڑتے ہی ہم اسے کہیں بھی گرا دیتے۔ شہر سے باہر کسی جنگل میں۔"

"اس سے ہم زیادہ مصیبت میں پڑتے" نازو نے کہا۔

"یہ بحث مت کرو۔ سوچو کہ اب کیا ہو گا۔"

پاکٹ نے ہیڈ فون اتار کے رکھے اور پلٹ کے بولا۔ "تمہارے ساتھ کیا ہو گا۔ جو ہو گا میرے ساتھ ہو گا۔ تم سب تو عادی اور پیشہ ور مجرم ہو۔ جیب کاٹا یا گلے کاٹا۔ اور پھر جیل کاٹنا

سب آسان کام ہے تمہارے لئے۔ مارا تو میں گیا۔ مجھے بھی تمہارا ہی ساتھی سمجھ لیا جائے گا۔"

"کیا تم اپنا بے گناہی ثابت نہیں کر سکتے؟" اگروال بولا۔

"ثابت؟ ثابت تو سب بعد میں ہو گا۔ پہلے تو میری ہڈیاں چٹخا چور کر دے گی پولیس۔ میری کھال میں بھس بھر دے گی کہ تم نے اگروال کو فرار میں مدد دی۔ کتنا پیسہ لیا اور کہاں ہے وہ پیسہ۔ میرا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا جب اخبار میں میرے نام کے ساتھ میرے کارنامے کا ذکر آئے گا۔ میرا گھر برباد ہو جائے گا" پاکٹ غم و غصے کے جذبات سے اتنا مغلوب تھا کہ رونے کے قریب ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "فکر مت کرو۔"

"اور کیا کروں۔ خودکشی کر لوں؟" وہ چلانے لگا "میرے ساتھ دھوکا ہوا۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی کام خلاف قانون نہیں کیا تھا۔ کتنا سنگین الزام آ گیا مجھ پر۔ تم نے جھوٹ بول کے نیلی کاپٹر حاصل کیا اور زبردستی کی میرے ساتھ۔ تم سب....."

میں نے ڈانٹ کے کہا "بکواس بند کرو اپنی اور میری بات سنو۔ مجھے احساس ہے کہ تم پر بلاوجہ مصیبت آ گئی ہے لیکن ابھی تک کچھ ہوا نہیں ہے۔ پھر یہ قبل از مرگ واویلا کس لئے؟ تمہیں الزام سے بچا لیں گے ہم۔"

"مگر کیسے؟" وہ فریادی لہجے میں بولا۔

"کنٹرول ٹاور سے بات کرو" میں نے کہا "ان کو بتاؤ کہ تمہارے نیلی کاپٹر کو اگروال اور اس کے ساتھیوں نے ہائی جیک کر لیا ہے۔ انہوں نے دھوکے سے جہاز کو چارٹر کیا تھا اور تمہیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ مسافر کون ہیں۔ پھر اگروال نے ریوالور نکال لیا۔"

"میرا نام لینے کی ضرورت نہیں" اگروال نے کہا۔

"بکو مت۔ ہم سب کے بچنے کی یہی ایک صورت ہے۔"

"مجھے مروا کے؟" وہ چیخ کر بولا۔

"تم تو ویسے بھی مرنے والے تھے۔ اب زندگی کے دوسرے چانس کو اپنی بے وقوفی سے ضائع مت کرو" میں نے کہا "ورنہ میں تمہیں مار کے نیچے پھینک دوں گا۔ تمہیں بھی اور تمہاری اس پاگل محبوبہ کو بھی جس نے اپنی عزت، آبرو اور زندگی سب تمہاری خاطر داؤ پر لگا دی ہے۔ اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دنیا کو بھی تم جیسے شخص کے اس انجام پر افسوس نہیں ہو گا۔ خوشی ہو گی۔ اور اس سے ہمارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ اس کے بعد کوئی ہمارے پیچھے نہیں آئے گا۔ تمہاری لاش مل جائے گی اور نیلی کاپٹر کا پاکٹ ہمیں کہیں بھی چھوڑ کے واپس چلا جائے گا۔ یہ بتانے کے لئے کہ کس طرح اپنی بہادری، حاضر دماغی اور پھرتی سے کام لیتے ہوئے اس نے ڈاکو اگروال کو موقع پاتے ہی نیچے دھکیل دیا۔ جو عورت اس کے ساتھ تھی وہ خود ہی اس کے پیچھے کود گئی۔ پھر پاکٹ

www.paksociety.com

کو سزا نہیں ملے گی' انعام ملے گا۔ اس کی بدنامی نہیں ہوگی' عزت افزائی ہوگی۔ میڈیا تعریف ہوگی۔ یہی ایک طریقہ ہے جس میں تمہارے سوا ہم سب کے لئے تحفظ اور سلامتی کی ضمانت ہے۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میں ایسا ہی کروں۔"

سانولی کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ مجھ سے نفرت کے جذبات اتر آئے تھے "آخر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

پائلٹ کا ردعمل اس کے برعکس اطمینان کا تھا۔ "اگروال جیسے ڈاکو کا ارادہ ہوتا تو وہ اصرار کرتا کہ میں ..."

اس نے بے بسی سے کہا "میں کسی کا دشمن نہیں ہوں۔ اور نہ مجھے قانون اور فرض کی خاطر اپنی جان قربان کرنے کا شوق ہے۔ مجھے معلوم ہے یہاں اس کا کسی کو صلہ نہیں ملتا۔ مرنے والا مر جاتا ہے۔ رونے والوں کو ایک میڈل دے کر سب بھول جاتے ہیں۔ بعد میں کہتے ہیں کہ وہ بے وقوف تھا جس نے ملک و قوم' اصول اور انسانیت کے لئے جان دی۔"

"ٹھیک ہے مسٹر پائلٹ۔ تمہاری جان کو کچھ نہیں ہوگا" میں نے کہا "اب تم کنٹرول ٹاور سے رابطہ کرو اور میری ہدایات کے مطابق عمل کرو۔"

پائلٹ نے پھر جبل پور کے کنٹرول ٹاور سے مواصلاتی رابطہ بحال کیا اور انہیں فلائٹ کو دوبارہ اپنی پوزیشن سے آگاہ کیا۔

"ہیلو کنٹرول' میں بہت مشکل میں پڑ گیا ہوں۔"

"کیا بات ہے؟ انجن میں خرابی ہوگئی ہے کوئی؟"

"نہیں۔ تقدیر کی خرابی ہے۔"

"پھر بھگوان سے رجوع کرو۔"

میں نے لہجہ اور آواز بدل کے کہا "ڈائیلاگ مت بولو۔"

"یہ.... یہ کون ہے؟" کنٹرول نے کہا۔

"یہ ڈاکو اگروال ہے" پائلٹ نے خوف زدہ لہجے میں کہا "جو کل جیل سے فرار ہوگیا تھا۔"

"اس کو بتادو کہ اگروال کو پھانسی نہیں دی جاسکتی" میں نے غرا کے کہا "اگروال موت کو بھی شکست دے سکتا ہے۔"

"لگتا ہے یہ اگروال ہے .... یہ تمہارے ہیلی کاپٹر میں کیسے پہنچا؟" کنٹرول سے بات کرنے والا بدحواس ہو کے بولا۔

"بتادو اسے کہ اگروال کہیں بھی پہنچ سکتا ہے" میں نے اونچی آواز میں کہا۔

پائلٹ نے کہا "دیکھو..... اگروال نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ہیلی کاپٹر لیا تھا۔ فرضی نام سے۔ میں تو اسے نہیں پہچانتا تھا۔ پرواز کے بعد انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں فلائٹ شیڈول بدل دوں۔ نیپال کے بجائے کلکتہ چلوں۔ میں کیا کرتا؟!"

میں نے خوف ناک آواز میں کہا "ہماری مرضی کے خلاف کچھ کرتا تو تیری لاش بھی نہ ملتی۔"

"اگروال .... مسٹر اگروال .... آپ مجھے پائلٹ سے بات کرنے دیں" کنٹرول نے کہا "بڑی مہربانی ہوگی۔"

"میں مجبور تھا جبل پور میں اترنے پر۔ وہاں سے ابھی فیول لینا تھا میں نے" پائلٹ نے کہا۔

"اس وقت کیوں نہیں بتایا تھا تم نے....؟"

میں نے بات کاٹ کے کہا "ہماری مرضی کے بغیر یہ ایک لفظ بھی بول سکتا تھا؟"

پائلٹ نے کہا "ان کا ایک آدمی میرے ساتھ تھا۔ اور وہ مسلح تھا۔"

میں نے کہا "ہمارے پاس دستی بم ہیں۔ اور مشین گن۔"

کنٹرول ٹاور سے بولنے والا خاصا پرسکون آدمی تھا اور اس صورت حال سے نمٹنے کی کوشش میں کامیاب تھا "مسٹر اگروال! اگر آپ خود سب کچھ بتانا چاہتے ہیں تو ہم تیار ہیں۔"

"ہاں۔ سب سن لو اچھی طرح" میں نے ڈاکو کے خطرناک لہجے میں کہا "اب ہم اسے پھر نیپال کی طرف لے جارہے ہیں۔ خبردار جو کسی نے ہمارا راستہ روکا۔ سب کو بتادو کہ ہم پائلٹ کو بھی گولی ماردیں گے اور جہاز بھی تباہ کردیں گے۔ پولیس کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہمارا۔ ہم ہیلی کاپٹر کو جہاں چاہیں گے لے جائیں گے۔"

پائلٹ نے کہا "میں کچھ نہیں کرسکتا۔ مجھے نیپال کے لئے کلیئرنس چاہئے۔ راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ان کی ہر مانگ پوری کی جائے۔ ورنہ یہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

"تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک رہے گا" کنٹرول نے کہا۔

"نہیں کوئی ائیرپورٹ پر روکنے کی غلطی نہ کرے۔ ورنہ بہت لوگ ہلاک ہوں گے۔ اگروال ایسے ہاتھ نہیں آئے گا کسی کے" میں نے اسی لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" کنٹرول نے کہا "ایمرجنسی میں کلیئرنس دی جارہی ہے۔"

"میں پھر درخواست کرتا ہوں کہ کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے ورنہ میں مارا جاؤں گا" پائلٹ بولا "ضرورت پڑنے پر میں رابطہ کروں گا۔"

جب اس نے مائیکروفون بند کیا تو میں نے کہا "گڈ۔ تم میری توقع سے زیادہ سمجھدار ثابت ہورہے ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ تم نے بلف کھیلا ہے۔ تم نیپال کی طرف جانا نہیں چاہتے" پائلٹ نے کہا۔

"رائٹ۔ ہم اپنی منزل نہیں بدلیں گے۔ تم ہیلی کاپٹر کا رخ کلکتہ کی جانب رکھو اور ہمیں پوزیشن بتاتے جاؤ" میں نے کہا۔

"اب اندازاً کتنا سفر باقی ہے؟"

اس نے گھڑی دیکھی اور پھر ایک چارٹ پر نظر ڈال کے بولا "اگر ہم اسی رفتار سے چلتے رہے تو شاید چار پانچ گھنٹے میں دم دم پہنچ جائیں گے۔ کلکتہ کا ائیرپورٹ ہے.... رات آٹھ بجے۔"

"اور اگر ہم رفتار بڑھادیں؟"

"ایک گھنٹہ نکالا جاسکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ زیادہ رفتار پر فیول بھی زیادہ خرچ ہوگا۔ جتنا فیول ہمارے پاس ہے وہ کافی ہونا چاہئے ورنہ راستے میں کہیں اترنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "نو۔ اب کہیں اترنے کا کوئی سوال نہیں۔"

اس کے بعد خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں ہم سب اعصابی کشیدگی میں مبتلا آسمان اور زمین کے نظاروں میں خطرہ دیکھتے رہے۔ وہ خطرہ جو بظاہر کہیں بھی نہ تھا مگر کسی بھی لمحے کہیں سے بھی اچانک نمودار ہوسکتا تھا۔ اوپر پھیلے ہوئے نیلے آسمان پر تیرنے والے بادلوں میں سے۔ اجلی دھوپ میں سے یا زمین کی مٹیالی اور سرسبز فضا میں سے۔ میں خلا کو دیکھ رہا تھا اور کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ سوائے تاریک امکانات کے۔ کہیں اچانک فوجی طیارے نہ نمودار ہوجائیں اور ہیلی کاپٹر کو نیچے اترنے پر مجبور نہ کردیں۔ اب تک فضا کی وسعت کو کھنگالنے والے دیکھ چکے ہوں گے کہ ہیلی کاپٹر کا رخ نیپال کی جانب نہیں ہے۔ پائلٹ کو زمین سے بھی نشانہ بنانے کی دھمکی دی جاسکتی ہے اور اترنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ قانون کی طاقت اور اختیار رکھنے والے اس قسم کی صورت حال میں کیا کریں گے؟ کیا وہ ایک مفرور مجرم کو نکل جانے دیں گے جس نے نظام انصاف کے مضبوط حصار کو ریت کی دیوار سمجھ کر گرادیا ہے۔ یہ پورے نظام انصاف کے منہ پر طمانچہ تھا کہ وہ کسی ملزم سے زیادہ طاقتور نہیں ہے۔ اس سے حکومت کی عزت پر حرف آتا ہے۔ پھر کیا وہ ایک ہیلی کاپٹر اور ایک مجبور پائلٹ کو اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے قربان کردیں گے۔ ایک آدمی اہم ہے یا ایک نظام کی شکست۔

شاید میری طرح غالب بھی خیالات کے وحشت میں سرگرداں تھا۔ نازو اور گل اپنی اپنی امیدوں کے گلشن کو مایوسی کی خزاں اور باد سموم سے بچانے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ وہ ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کے راستوں پر گم کردہ راہ مسافروں کی طرح بھٹک رہی تھیں۔ اور سب کے خیالوں کا محور ایک ہی تھا۔ اب کیا ہوگا؟ کل کیا ہوگا؟ جو تھا نہیں ہے' جو ہے نہ ہوگا۔ وہ سب کہاں ہیں جو ہم سفر تھے۔ جو اپنی تقصیر سے بے خبر تھے۔ جو مٹ گئے ہیں غبار ہو کر فریب راہ کا شکار ہو کر۔

میں نے محسوس کیا کہ اچانک ہم سب کی شخصیت کی دیواروں میں رخنے پڑ گئے ہیں۔ مایوسی اور عدم اعتماد کی بزدلی اور احساس محرومی کے ہم بدل گئے ہیں۔ ہم وہ نہیں رہے جو بھی گردش ایام اور تلخی حالات کی انتہا میں بھی یقین سے محروم نہیں ہوئے تھے۔ ستم ہائے روزگار اور گردش دوراں جن کے لبوں سے مسکراہٹ' انداز سے شوخی اور اطوار سے زندہ دلی نہیں چھین سکتی تھی۔ ہم بدترین مشکلات اور آزمائشوں کے حصار میں قید ہوجاتے تھے تب بھی ہنستے کھیلتے نظر آتے تھے۔ ہمارے دشمن اس شوخی گفتار سے چراغ پا رہتے تھے۔ ہمیں جو کرتے تھے اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے تھے کہ ہم کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ پریشان ہونا ہی نہیں جانتے۔

لیکن اب شاید شکست نے ہمارے اعصاب کو توڑ دیا تھا اور ایک دوسرے کی رفاقت کا احساس بھی ہمارے دل سے احساس زیاں کو مٹانے میں ناکام تھا۔ ہم مستقبل میں روشنی دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوگئے تھے یا وقتی طور پر اندھیرے کی پناہ لینے پر مجبور ہوگئے تھے۔ چنانچہ ہم سب خاموش تھے۔ نہ غالب کسی بہانے نازو کو چھیڑ رہا تھا۔ نہ نازو اس پر ادائے ناز سے مشق ستم کی خواہاں نظر آتی تھی۔ میں بھی رابعہ کے خیال اور اس کے تصور کی رعنائی سے بہت دور تھا اور وہ میری یادوں سے گریزاں تھی۔ شاید ایک گل تھی جس کے لئے وقت کے ہر لمحے کے ساتھ کم ہونے والا فاصلہ جذبات کی آتش شوق کو جگا رہا ہو۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ کب سے وہ محسن کو مقصود و مطلوب بنائے خاموشی سے اپنی محبت کے ساتھ قید تنہائی کاٹ رہی تھی۔ وہ پہلے بھی مجبور تھی۔ آج اس کی مجبوری میں اذیت بھی شامل ہے۔ وہ محسن سے کیسے کہے گی کہ اب تو میرے اور تمہارے درمیان شملا نہیں ہے۔ وہ ایسا سوچے گی تو خود اپنی نظر میں گر جائے گی۔ محبت بھی اتنی خود غرض نہیں ہوئی۔ حقائق کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں' جذبات کو شکست نہیں دے سکتے۔ گل اپنی شرمندگی کے باوجود اس خیال سے دامن نہیں چھڑا سکتی کہ اب وہ محسن کو اپنا سکتی ہے۔ اسے جیت سکتی ہے۔ شملا کی یادوں کے جال سے نکال کے اپنی دنیا میں لاسکتی ہے۔

سات بجے کے قریب سورج غروب ہونے لگا تو میں نے نیچے دیکھا۔ منظر کچھ بدلا ہوا لگتا تھا۔ دور افق کے ساتھ ہی سمندر کی لکیر مل رہی تھی مگر نیچے زمین کا رنگ گہرا سبز ہوگیا تھا۔

"یہ خلیج بنگال ہے" پائلٹ نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔

"گویا ہم بنگال کی سرحد کے قریب ہیں۔"

پائلٹ نے اقرار میں سر ہلایا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ سفر کسی کی مداخلت کے بغیر خیر و عافیت کے ساتھ پورا ہوگیا تھا اور اب ہم اپنی منزل کی قربت کو محسوس کرسکتے تھے۔ اوپر کی پرسکون فضا کو دیکھ کر یہ خیال ہی نہیں آتا تھا کہ نیچے زمین پر فساد جاری ہے اور سیاست کے شکاری' انسانوں کے خون سے تاریخ کا وہ باب لکھ رہے ہیں جو آنے والے وقت کے مورخ کو حیران کرے گا۔ یہ سب کیسے ہوا اور کیوں ہوا؟! اسلام کے نام پر متحدہ پاکستان کہلانے والے دو ملکوں میں کیسے بٹ گئے؟ مسلمانوں نے اپنے ہم وطن مسلمانوں کے خلاف ہتھیار کیوں اٹھائے؟! اس نفرت کا بیج کس نے بویا اور کس نے نفرت کی اس کھیتی کو پروان چڑھایا؟! ایسے ان گنت سوال ہوں گے جن کا صحیح جواب کسی کے پاس نہیں ہوگا۔ جواب تو بہت ہوں گے' تاویلیں بہت ہوں گی۔ اسباب و علل کی دنیا میں عقل کے گھوڑے دوڑانے والے ہر زاویے سے کوئی دلیل یا جواز

www.paksociety.com

لے آتے ہیں مگر جج وہ صرف جج ہوتا ہے اور کسی وکیل کا محتاج نہیں ہوتا۔ ابھی تھا نہیں جاتا اور تسلیم نہیں کیا جاتا۔ تاریخ اس لئے سب سے زیادہ مظلوم ہے کہ اس کے ساتھ کوئی مورخ انصاف نہیں کرتا۔ غیر جانب داری سے واقعات کا ریکارڈ شاید صرف خدا کے پاس ہوگا۔

پائلٹ نے کہا "مجھے اب ایئر ٹریفک کنٹرول ٹاور سے کلیئرنس لے لینی چاہئے۔"

میں نے چونک کر کہا "نہیں۔ انہیں اطلاع دینے کی ضرورت نہیں۔"

پائلٹ نے پریشانی سے کہا "لیکن یہ وار زون ہے۔ ہم بغیر اطلاع کے چپ چاپ نہیں نکل سکتے۔ ہمیں اب تک ٹریس کر لیا گیا ہوگا۔"

میں نے کہا "جہاز کو نیچے لے جاؤ۔ جہاں تک ممکن ہو۔"

"یہاں؟" پائلٹ نے چیخ کر کہا "جنگل میں؟"

"کوئی صاف جگہ تلاش کرو" میں نے کہا "کوئی میدان یا کھیت۔ یا گراؤنڈ۔"

ہیلی کاپٹر نیچے اتر آیا۔ ابھی اندھیرا پوری طرح غالب نہیں آیا تھا مگر بلندی سے سطح زمین پر گہرے سائے پھیل چکے تھے۔ میں نے دوربین سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ پائلٹ بہت کم بلندی پر تھا اور نیچے دیکھتے ہوئے موزوں جگہ تلاش کر رہا تھا۔ میں نے بہت سے گاؤں دیکھے جن کے درمیان تالاب تھے یا جھیلیں اور ندی نالے تھے جو ان جھیلوں سے نکلتے تھے یا ان میں شامل ہو جاتے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی اور جگہ جگہ پل نظر آ رہے تھے مگر ابھی تک اس علاقے میں نہ فوجی گاڑیاں نقل و حرکت کرتی دکھائی دی تھیں، نہ جنگ کے آثار..... نظر آئے تھے کہیں سے دھواں نہیں اٹھ رہا تھا اور دھماکوں کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اچانک مجھے گھنے درختوں کے ختم ہوتے ہی ایک ہموار قطعہ زمین نظر آیا۔ میں نے پائلٹ کو دوربین دی اور اسے حکم دیا کہ وہ ہیلی کاپٹر کو اس جگہ اتارنے کی کوشش کرے۔ اسی وقت بڑی آواز کے ساتھ دو فوجی طیارے ہمارے اوپر سے گزرے۔ ان کی گھن گرج نے گل اور نازو کو دہشت زدہ کر دیا۔

"جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ہم سے کوئی شناخت کرانے کو کہے یا دشمن سمجھ کر نشانہ بنا لے" میں نے کہا۔

ہیلی کاپٹر ایک دم نیچے آ گیا۔ میں دوربین سے آس پاس کے علاقے کا جائزہ لے رہا تھا۔ میدان کے چاروں طرف کچے جھونپڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں رہنے والے گھروں سے نکل کے منہ اٹھائے آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ ہموار قطعہ زمین دھان کے کھیت تھے۔

پائلٹ نے کہا "ہیلی کاپٹر یہاں نہیں اتر سکتا۔"

"کیوں نہیں اتر سکتا؟" میں نے کہا۔

"اس کے پہیے کیچڑ میں دھنس جائیں گے۔ زمین نرم ہے اور اس میں پانی کھڑا ہوگا" پائلٹ نے کہا "تم ایسے ہی کود جاؤ۔ بلندی زیادہ نہیں ہے۔ میں ہیلی کاپٹر کو اسی جگہ رکھوں گا۔"

"لیکن۔ میں پچیس فٹ سے ہم کیسے کود سکتے ہیں؟" میں نے کہا "اور یہ دو عورتیں.....؟"

"کچھ نہیں ہوگا" پائلٹ نے کہا "دھان کے کھیت اور نرم گیلی مٹی میں چوٹ نہیں آتی۔"

"سوچا تو جا سکتا ہے" میں نے کہا "کوئی اور جگہ دیکھو۔"

"اتنا وقت نہیں ہے" وہ چلانے لگا "ابھی ابھی جو فوجی طیارے گزرے تھے انہوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا ہوگا۔"

ہیلی کاپٹر اب فضا میں اپنی جگہ پر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے اوپر والے پنکھے کے بلیڈ گھومنے سے تیز ہوا نیچے آ رہی تھی اور وہاں کے پودوں میں لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔

میں نے غالب کی طرف دیکھا تو اس نے تائید میں سر ہلایا اور بولا "ہم یہ موقع گنوا نہیں سکتے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ چلو پہلے تم۔"

غالب نے ہیلی کاپٹر کے دروازے میں رک کر دیکھا اور نیچے چھلانگ لگا دی۔ میں نے اسے وہاں کے کھیت میں سیدھا اترتے دیکھا۔ کیچڑ میں کودنے سے اس کے سب کپڑے خراب ہو گئے تھے مگر خود اسے نرم زمین کی وجہ سے جھٹکا نہیں لگا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کے اشارہ کیا۔

"ایک زنانہ بنڈل پھینک دو" اس نے چیخ کر کہا مگر میرے کانوں تک اس کی آواز انجن کی پھٹ پھٹ کے شور میں مشکل سے پہنچی۔

"چلو نازو۔ ہیرو نیچے بانہیں پھیلائے کھڑا ہے" میں نے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں کر سکتا تمہارا ہیرو" نازو نے کہا اور بلا جھجک دروازے سے کود گئی۔ غالب واقعی اسے کیچ نہیں کر سکا کیونکہ وہ غالب کے اوپر گری تھی پھر وہ دونوں دھان کے کھیت میں گرے تھے۔ ان کی حالت ایک جیسی خراب ہو گئی تھی۔ کھیت میں پانی کھڑا ہوا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک کیچڑ میں بھر گئے تھے اور اب ان کی زبانی جنگ چھڑ چکی تھی مگر آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

گل نے چھلانگ مارتے ہوئے سخت بزدلی کا مظاہرہ کیا۔ مجبوراً میں نے اسے اٹھا کے نیچے پھینکا اور غالب نے اسے منہ کے بل کیچڑ میں گرنے سے تو بچا لیا لیکن وہ خود کو نہ سنبھال سکا۔ نتیجہ یہ کہ وہ دوسری بار گل کے ساتھ کیچڑ میں گرا۔ پھر میں نے ہیلی کاپٹر میں رکھا ہوا سامان نیچے گرایا۔ اب ساتولی کی باری تھی لیکن اس نے صاف انکار کر دیا "پہلے اگروال اترے گا۔ مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔"

میں نے کوٹ پکڑ لیا "چلئے اگروال صاحب۔"

مجھے حیرانی ہوئی جب اگروال نے نفی میں سر ہلایا "میرا کوئی ارادہ نہیں ہے یہاں اترنے کا۔"

"پھر کیا ہے تمہارا ارادہ؟"

"میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ تم جاؤ" وہ بولا "میرے اور تمہارے راستے پہلے ہی الگ تھے۔ تم زبردستی میری راہ میں حائل ہوئے۔ اب نہ تمہیں میری ضرورت ہے نہ مجھے تمہاری۔"

پائلٹ نے پریشان ہو کے کہا "اگروال! مجھے اکیلا واپس جانے دو۔"

"تمہارے ساتھ میرا معاہدہ یہ تھا کہ تم ہمیں نیپال پہنچاؤ گے" ساتولی نے کہا۔

"لیکن خود تم نے نیپال کے بجائے کلکتہ......"

"ہم نے نہیں۔ ان لوگوں نے تمہیں مجبور کیا تھا" اگروال نے کہا۔

"میں اب نیپال نہیں جا سکتا۔"

"نیپال کیوں نہیں جا سکتے؟ تمہارے لئے سب راستے کھلے ہوئے ہیں" اگروال بولا "جیسے تم نے پہلے راستہ بدلا تھا ایسے ہی اب پھر بدل دو۔ ہم ادائیگی کریں گے۔"

"بات ادائیگی کی نہیں۔ میں خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اگر میں نے خود کو سول پولیس یا فوجی حکام کے حوالے نہ کیا تو مارا جاؤں گا۔ فوجی طیارے پیچھے لگ جائیں گے۔ یہ ہیلی کاپٹر کیسے مقابلہ کر سکتا ہے فوجی جہازوں کا؟ وہ اسے مار گرائیں گے اگر میں نے اترنے سے انکار کیا" پائلٹ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ابھی کسی نے نہیں دیکھا ہے تمہیں۔"

"تمہیں کیا معلوم...اور اگر تم مرنا چاہتے ہو میرے ساتھ تو چلو۔ میں بتا رہا ہوں کہ جہاں بھی مجھ سے کہا جائے گا ہیلی کاپٹر اتار لوں گا۔ پھر تم فرار بھی نہیں ہو سکو گے۔ تمہیں پولیس یا ملٹری گرفتار کر لے گی" پائلٹ نے کہا۔

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ اس چانس کو مت گنواؤ۔"

اگروال اپنی بات پر قائم رہا "میں اسے چانس نہیں سمجھتا۔ تمہارے ساتھ رہنے میں زیادہ خطرہ محسوس ہوتا ہے مجھے۔ اس کا امکان کم ہے کہ ہیلی کاپٹر کا راستہ کوئی روکے۔ میں یہاں اتر گیا تو پھنس جاؤں گا۔ میرا نیپال جانا ہی بہتر ہے۔ وہاں پورا بندوبست ہے ہمارا۔"

"اب میں زبردستی نہیں کر سکتا تمہارے ساتھ" میں نے کہا اور نیچے کود گیا۔ پائلٹ چلاتا رہ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اگروال کو اٹھا کے باہر پھینک دوں لیکن میرے لئے وقت اہم تھا اور میں اگروال کو اپنے ساتھ اضافی خطرہ سمجھتا تھا۔ ہم تو خیر مطلوب تھے ہی، ہم سے زیادہ اگروال کی جان کے طلب گار وہ تھے جو اسے دوبارہ تختہ دار پر کھڑا کرنا چاہتے تھے۔

میرے قدم زمین پر لگے تو پانی اور کیچڑ کے چھینٹے اڑ کر میرے چہرے تک آ گئے۔ میرے جوتے کیچڑ میں دھنس گئے تھے اور زور لگا کے میں نے اپنے پاؤں اس دلدل جیسی زمین سے نکالے اور اوپر دیکھا۔ ہیلی کاپٹر کے انجن کی آواز زیادہ ہو گئی تھی اور وہ دوبارہ بلندی کی جانب اٹھ رہا تھا۔

غالب نے کہا "اگروال نہیں آیا؟"

"نہیں۔ وہ ساتولی کے ساتھ نیپال جا رہا ہے۔ ہم نے ان کا ہنی مون خراب کر دیا تھا" میں نے کہا۔

"پائلٹ مان گیا؟"

"پائلٹ کی انہوں نے ایک نہیں مانی۔ پائلٹ خود کو مقامی حکام کے حوالے کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنی جان بچائے۔ اگروال اڑ گیا کہ جیسے کلکتہ آئے تھے ویسے ہی نیپال چلو۔ کوئی مداخلت نہیں کرے گا اور فلائٹ چارجز ہم ادا کریں گے" میں نے کہا "ہمیں کیا۔ ہماری طرف سے جہنم میں جائے۔"

نازو نے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا "پھر اس کا سامان کیوں اتارا تم نے؟ ہیلی کاپٹر میں ہی رہنے دیتے۔"

میں نے چونک کر کہا "اگروال کا سامان؟"

"ہاں۔ یہ بریف کیس ہمارا نہیں ہے جو تم نے پھینک دیا تھا" نازو نے کہا "ہمارے تو یہ دو بیگ تھے۔"

"کیا ہے اس میں؟" میں نے نازو کے ہاتھ سے بریف کیس لے لیا "تم نے دیکھا؟"

نازو نے نفی میں سر ہلایا اور اوپر اٹھ کے واپس جاتے ہوئے ہیلی کاپٹر کو دیکھتی رہی۔

"یہ تو مقفل ہے" میں نے کہا۔

"اتنی جلدی کیا ہے؟ بعد میں دیکھ لیں گے۔ پہلے یہاں سے تو نکلو" غالب بولا "رات بھر اس موسم میں ہم یہاں نہیں کھڑے رہ سکتے۔ کیچڑ اور پانی میں۔"

گل نے بھی کہا "ہم سب بھوت بن گئے ہیں۔ لوگ نہ جانے کیا سمجھیں گے۔"

"کون لوگ؟" نازو نے کہا۔

"کہیں تو رات گزاریں گے۔ کسی بستی میں" گل بولی۔

"آبادی چاروں طرف ہے" میں نے کہا "کسی سمت بھی نکل چلو۔ آؤ میں تمہارا ہاتھ پکڑ لیتا ہوں۔ نازو کو غالب سنبھال لے گا۔"

ابھی ہم نے پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا تھا کہ فضا پھر فوجی طیاروں کی گھن گرج سے گونج اٹھی۔ اس بار دو جیٹ طیارے ایک ساتھ گزرے تھے۔ پھر ان کے پیچھے دو طیارے آئے۔ اس وقت تک ہیلی کاپٹر ہماری نظر سے اوجھل ہو چکا تھا مگر یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ فوجی طیارے بھی اسی سمت میں گئے تھے جدھر وہ ہیلی کاپٹر گیا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ ہیلی کاپٹر ان جاروں کی نظر سے اوجھل رہے۔

ہم کیچڑ میں قدم جماتے دھان کے پودوں کے درمیان سے راستہ بناتے چند قدم دور ہی گئے تھے کہ ہم نے فضائی خاموشی میں شیلنگ کی بھیانک آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک

www.paksociety.com

دھماکا ہوا اور ہم سب بے اختیار رک کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

"میرا خیال ہے کہ انھوں نے ہیلی کاپٹر کو مار گرایا" میں نے افسوس سے سرہلایا۔

غالب نے کہا "ہاں۔ دھماکا ہیلی کاپٹر کے پھٹنے کا تھا۔"

"شیلنگ نے اس کے پرخچے اڑا دیے ہوں گے" نازو بولی۔

"بے چارہ پائلٹ!" گل نے کہا "اس خبیث اگروال کی وجہ سے مارا گیا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ پائلٹ نے اترنے سے انکار کیا" غالب نے کہا "اور فرار ہونا چاہا۔"

"ہاں۔ راستہ روکنے والے شناخت مانگتے ہیں۔ پھر اترنے کا حکم دیتے ہیں اور وارننگ کے بغیر فائر نہیں کرتے۔"

"پائلٹ اتنا بے وقوف تو نہیں تھا" غالب بولا۔

"پتا نہیں کیا ہوا۔ اگروال نے اس کے ساتھ زبردستی کی۔ یا اسے مجبور کردیا کسی طرح" میں نے کہا "اسلحہ تو اگروال کے پاس تھا نہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے مواصلاتی رابطے کا نظام تباہ کر دیا ہو۔ مثلاً ٹیلی فون کے تار توڑ دیے ہوں۔ پائلٹ کے لئے جواب دینا، اپنی شناخت کرانا اور اترنے پر آمادگی کا اظہار کرنا ممکن ہی نہ رہا ہو۔"

"اگروال ہمارے ساتھ آجاتا تو زندہ رہتا" گل بولی۔

"بات یہ ہے بی بی کہ موت کا ایک دن معین ہے" میں نے گل کا ہاتھ تھام کے چلتے ہوئے کہا "عدالت نے کل کا دن معین کیا تھا اور یہ طے کیا تھا کہ اسے پھانسی دے کر دنیا سے رخصت کیا جائے مگر قدرت کا فیصلہ مختلف تھا۔ اگروال کی زندگی کے اڑتیس چالیس گھنٹے باقی تھے اور اسے ہیلی کاپٹر پر فوجی طیاروں کی فائرنگ سے ساتھیوں کے ساتھ ہلاک ہونا تھا۔ رفعت، مقام، موت کا طریقہ سب دنیا کی عدالت کے فیصلے کے تابع نہیں تھے جیسا جو ہونا تھا وہی ہوا جو نوشتۂ تقدیر تھا اور بدلا نہیں جاسکتا تھا۔ پائلٹ بھی مرنا نہیں چاہتا تھا مگر دیکھو موت اسے کہاں لے آئی۔ آج صبح اس کے ذہن میں یہ خیال تک نہ تھا کہ وہ نیپال کے بجائے کلکتہ جاتا ہے جہاں سے واپسی پر فرشتۂ اجل سے ملاقات ہوگی اور اس کے ہیلی کاپٹر کو فوجی طیارے مار گرائیں گے۔ اس نظام الاوقات کو بھلا کون بدل سکتا ہے۔ بڑے عجیب اور ناقابل یقین طور پر انسان خود وہاں جاتا ہے جہاں اس کو مرنا ہو۔ کسی ارادے اور مرضی کے بغیر۔"

میں اکیلا بول رہا تھا۔ باقی سب پر اس حادثے کا اثر تھا۔ اس ماحول اور اپنی حالت نے انھیں تشویش اور فکر میں مبتلا کر رکھا تھا۔ دھان کے کھیت میں کیچڑ سے لت پت جوتوں اور چہروں کے ساتھ گیلے کپڑوں اور اوپر تک مٹی میں لتھڑے ہوئے ہم چاروں ایک ہاری ہوئی فوج کے بے حوصلہ اور تھکے ہوئے سپاہی تھے۔ ہم اپنے مرکز اور مقصد سے بچھڑ گئے تھے اور اب واپسی کے راستوں کی تلاش میں دشمن سے بچتے ہوئے زندگی کی جدوجہد جاری رکھنے پر مجبور تھے۔ اب ہمارے سامنے کوئی لائحۂ عمل، کوئی مستقبل کا پلان اور آنے والے وقت کا کوئی نقشہ نہیں تھا۔ اگلے لمحے، آنے والے دن اور ماہ و سال میں کیا ہوگا؟ ہم کہاں ہوں گے؟ ہوں گے یا نہیں ہوں گے؟ یہ سب سوچنا بھی بے کار تھا۔ اس وقت اگر الہ دین کے چراغ کا جن ہمارے سامنے آکے کہتا کہ کیا حکم ہے آقا۔ تو سب کا ایک ہی جواب ہوتا۔ محسن سمیت ہم سب کو واپس وہیں پہنچا دو جہاں سے ہم چلے تھے۔ دل کے خوش رکھنے کو شاید یہ خیال اچھا ہے کہ ہم نہیں ہارے۔ ہم نے دلاور اینڈ کمپنی کو ہر محاذ پر شکست دی یہاں تک کہ وہ پسپا ہو کے فرار ہوگیا۔ سیاسی جنگ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا۔

دھان کے کھیت ختم ہوتے ہی ہم نے خود کو کچے جھونپڑوں اور بانس کے مکانوں کی ایک بستی کے مقابل پایا۔ بستی کے بہت سے لوگ جیسے ہمارے ہی انتظار میں تھے۔ پندرہ بیس افراد ایک ہجوم کی شکل میں خاموش کھڑے ہمیں یوں دیکھ رہے تھے جیسے ہم اڑن طشتری کے ساتھ زمین پر اترنے والی خلائی مخلوق ہوں۔

وہ سب غریب، فاقہ کش لوگ تھے۔ ان کے سیاہ، ناتواں جسم مفلسی کی منہ بولتی تصویر تھے۔ مرد، عورتیں، بچے سب ہڈیوں کے ڈھانچے تھے۔ مردوں نے جسم کے زیریں حصے پر گھٹنوں تک ایک کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ آٹھ دس سال کی عمر کے بچے اس تکلف کے بھی عادی نہ تھے۔ عورتوں نے دو چار گز موٹی کپڑے کو پیچھے سے اوپر تک یوں لپیٹا تھا کہ آنچل کی حد تک ان کے جسم کو عریانی کے الزام سے بچا لیتا تھا تاہم ان کے شانے اور کمر اس "لباس" سے باہر تھے۔ ہونے کی عیاشی کا متحمل کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ اندھیرے میں سالت و صامت کھڑے ہوئے لوگوں کی نظریں ہم پر تھیں اور سب خاموش تھے۔ ہمارے قریب پہنچ جانے کے باوجود ان کے سکوت اور جمود میں فرق نہ آیا۔

پھر بھیڑ کو چیر کر ایک سفید دھوتی اور سفید چھوٹی داڑھی والا شخص آگے آیا جو ٹخنے کی واسکٹ کے ساتھ ہوائی چپل بھی پہنے ہوئے تھا۔ ظاہر ہے اس کا تعلق امراء کے طبقے سے تھا اور وہ سردار قسم کی چیز ہو سکتا تھا۔ مجمع میں سے کسی نے کیا کہا، یہ تو میں نہ سمجھا مگر عبدل کا نام میری سمجھ میں آگیا۔ آگے آنے والا عبدل تھا گویا مسلمان تھا۔ عبدل میاں یا عبداللہ یا عابد علی کی عرفیت عبدل ہی ہو سکتی تھی۔

میں نے خوش اخلاقی سے ہاتھ بڑھا کے کہا "السلام علیکم۔"

عبدل کی متانت ایک دم دوستانہ مسکراہٹ میں بدل گئی۔ اس نے خالص بنگالی لہجے میں "وعلیکم السلام" کہا اور مجھ سے ہاتھ ملا کے بنگالی میں کچھ پوچھنے لگا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا مگر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ ہماری تشریف آوری کے اغراض و مقاصد کے علاوہ ہم سب کی اس حالت کے اسباب جاننا چاہتا تھا اور رسمی تعارف مانگتا تھا۔ میں نے جواب میں اردو بولی۔ اس نے ادب سے پیچھے کرنے کا اشارہ کیا اور میں نے اقرار میں سرہلایا۔ وہ بنگالی بولتا رہا میں اردو۔ اور کمال کی بات یہ ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کا مفہوم ڈھونڈھا سمجھ لیا اور یہ جان لیا کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہیں۔ ہمارے درمیان انسانیت کا رشتہ تھا اور مذہب کا اور ہم ایک ہی خطۂ زمین کے باسی تھے چنانچہ کسی ایک فریق کی جانب سے دوستانہ رویے کا جواب نفرت اور دشمنی کے جذبات نہیں ہو سکتے تھے۔

عبدل نے ہمیں ہاتھ سے اشارہ کیا اور خود آگے آگے چلنے لگا۔ بھیڑ چھٹ گئی اور کچھ لوگ ہمارے پیچھے ہو لئے۔ باقی اپنے گھروں میں غائب ہو گئے۔ وہ بنگالی ہی بول رہے تھے مگر ان کا لہجہ قدرے مختلف تھا۔

غالب نے کہا "اگر ہم اس طرح افریقہ کے کسی علاقے میں پہنچ جاتے تو سوال جواب کے بغیر ہمارا سوپ بنانے یا ہمیں درست کرنے کی کارروائی کا آغاز ہو جاتا۔"

میں نے کہا "یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ افریقی پہلے جیسے وحشی اور غیرمہذب تو ہم خود نہیں رہے۔"

"کچھ علاقوں میں اب بھی سفید فاموں کو اسپیشل ڈش سمجھا جاتا ہے" غالب بولا۔

"وہ بھی نفرت کا ردعمل ہے۔ سفید فاموں نے ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک روا رکھا ہے۔ جب انھیں موقع ملتا ہے تو وہ بھی کم نہیں کرتے۔ اپنا انتقام لیتے ہیں۔"

"ہم اس وقت کہاں ہیں؟" نازو نے کہا۔

"اپنی زمین پر اور قید حیات میں۔ تمھیں کیوں شک ہو رہا ہے کہ یہ عالم خواب ہے یا ہم کسی نامعلوم سیارے پر اتر گئے ہیں" غالب بولا۔

"میرا مطلب تھا، یہ بھارت ہے، پاکستان یا بنگلہ دیش؟"

غالب نے سر کھجا کے کہا "بغیر نقشے کے اس سوال کا جواب تو علم جغرافیہ کا موجد بھی نہیں دے سکتا۔"

گل نے کہا "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ معلوم نہیں یہ کون لوگ ہیں۔ نہ یہ ہماری بات سمجھتے ہیں نہ ہم ان کی۔"

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں سمجھ گیا ہوں" میں نے کہا۔ "یہ ہمیں مہمان کا درجہ دے چکے ہیں۔"

"کیا پتا آج رات مہمان رکھیں یا چودھویں رات کا چاند نکلنے تک، اور پھر کسی دیوتا کی خوشنودی کے لئے ہمیں بڑی عزت و احترام کے ساتھ قربان کر دیں؟" غالب نے کہا "یا ہمیں شیر کے سامنے ڈال دیا جائے اور ہم شیر کو ہلاک کر دیں تو یہ ہمیں دیوتا مان لیں۔"

"کیا الٹی سیدھی ہانک رہے ہو" نازو بولی۔

"میں نے دو فلموں میں ایسا ہوتے دیکھا تھا۔ اور دو ناولوں میں بھی پڑھا تھا" غالب نے کہا۔

عبدل اچانک ایک جھونپڑے کے سامنے رک گیا اور اشارے سے اس نے ہمیں اندر جانے کو کہا۔ جھونپڑے کی دیواریں سرکنڈوں اور بھوسہ ملی مٹی سے بنائی گئی تھیں اور اسے ایک گول کمرا فرض کیا جاسکتا تھا جس کی بلندی مشکل سے آٹھ فٹ تھی۔ اس کے اوپر گولدار مخروطی چھت تھی اور ایک دروازے کے سوا روشنی یا ہوا کے آنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

میں جھک کر دروازے سے گزرا اور گھپ اندھیرے میں کھڑا اپنی آنکھوں کو اندر کے ماحول سے آشنا کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ میرے بعد غالب، گل اور نازو بھی اندر آگئے۔

"یہ لوگ کیا سمجھ رہے ہیں آخر؟ کیا ہم اندھیرے میں دیکھنے والی مخلوق ہیں؟" غالب نے کہا "الو ہیں ہم؟"

"اگر تم الو ہو تو بہت بڑے الو ہو" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "کچھ صبر کرو۔ میں جائزہ لے رہا ہوں۔"

"کسی کنویں میں مت اتر جانا یا کسی اژدھے کی دم پر پاؤں مت رکھ دینا" غالب بولا۔

اسی وقت باہر سے ایک شخص مشعل کے ساتھ نمودار ہوا۔ لوہے کے ایک پائپ کے اوپر شعلہ روشن تھا۔ اس نے پائپ کو اندر کی دیوار کے ایک سوراخ میں پھنسا دیا اور واپس لوٹ گیا۔ اب ہم اس گول کمرے کے فرش پر بچھی ہوئی خشک گھاس کے فرش کو دیکھ سکتے تھے۔ گھاس، مٹی اور سرکنڈوں کی بو میں اب مشعل کے جلنے سے پیدا ہونے والی بو بھی شامل ہو گئی۔

نازو نے کہا "مجھے اس بو سے وحشت ہو رہی ہے۔"

گل نے سرہلایا "اگر ہم رات بھر اندر رہے اور یہ مشعل بھی جلتی رہی تو میرا دم گھٹ جائے گا۔"

نازو نے کہا "اور اگر رات کو اس گھاس پھونس کے بستر پر سونا پڑا تو اس میں چھپے ہوئے نہ جانے کتنے زہریلے کیڑے کاٹیں گے۔"

اب پھر گل نے کہا "رہنے کی ایسی جگہ ہے تو کھانے کو پتا نہیں کیا ملے گا!"

غالب نے بگڑ کے کہا "میں بتاؤں کیا ملے گا؟ روسٹ کئے ہوئے مینڈک، چھپکلی کا سوپ اور سانپ کے انڈوں کا آملیٹ۔"

نازو نے ابکائی لے کر کہا "مت کرو ایسی باتیں۔"

غالب نے کہا "نخرے مت دکھاؤ زیادہ۔ پسند نہیں ہے سب تو چلی جاؤ۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں۔"

میں نے کہا "جانے سے پہلے فون کر کے ریزرویشن کرا لینا۔"

"تمھارا حلیہ اور تمھاری صورتیں بھی ایسی ہیں کہ فائیو اسٹار ہوٹل والے بہت خوش ہوں گے دیکھ کے" غالب نے جوتے اتارتے ہوئے کہا اور پھر ایک کیچڑ میں لتھڑا ہوا بوٹ نازو کو دکھایا۔ "یہ تم ہو۔ اور یہ تم" اس نے دوسرا بوٹ گل کے سامنے

www.paksociety.com

کیا۔
اب میں بھی جوتے اتار کے بیٹھ چکا تھا اور اگرچہ میرا تھکن سے برا حال تھا اور دل یہی چاہتا تھا کہ خود کو گھاس کے نرم بستر پر گرا دوں اور آنکھیں بند کر لوں مگر یہ دیکھنا بھی ضروری تھا کہ ہمارے ساتھ میزبان کیا اندازِ میزبانی اختیار کرتے ہیں۔ روشنی میں مجھے دوسروں کے چہرے دیکھنے کا موقع ملا تو اپنی صورت کا تصور کر کے مجھے ہنسی بھی آئی اور دکھ بھی ہوا۔ ہم انسانوں سے زیادہ کوئی انسان نما مخلوق لگتے تھے۔ ہم سب کے بالوں میں، سر پر، ہاتھوں پر اور کپڑوں پر کیچڑ جم کر خشک ہو گئی تھی۔ ہمارے جوتوں کی طرح پاؤں بھی مٹی میں بھرے ہوئے تھے اور اس حلیے میں ہمارے اصلی چہرے پہچانے بھی نہیں جاتے تھے۔ غالب کے سر اور داڑھی کے بال آپس میں مل کے گارے سے چپک گئے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم تہذیب اور انسانیت کو بھول کر آبادی سے دور کئی ماہ جنگل میں جانوروں کے ساتھ زندگی گزارتے رہے ہیں۔ یہ بڑے دکھ کی بات بھی تھی کیوں کہ ہم سب زندگی کی اعلیٰ قدروں کے پرستار، شرافت اور شائستگی، وضع داری اور رکھ رکھاؤ، نفاستِ حسن اور لطافتِ آسائش اور تکلفات کے عادی تھے۔ گردشِ حالات ہمیں کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔

گل اور نازو بھی ڈرتے ڈرتے گھاس پر بیٹھ گئی تھیں اور اپنے چہرے سے اور بالوں سے مٹی جھاڑ رہی تھیں۔

نازو نے کہا "میں واقعی ایسی ہی لگ رہی ہوں گل، جیسا کہ غالب نے مثال دے کر بتایا تھا۔"

گل مسکرائی "تمھیں کیسے اندازہ ہوا؟"

"تمھیں دیکھ کر" نازو بولی۔

دروازے میں ایک سر نمودار ہوا۔ جب جھک کر اندر آنے والا سیدھا ہوا تو میں نے اپنے مقابل ایک اجنبی کو دیکھا۔ گل اور نازو اسے دیکھ کر ڈر گئیں۔ چھ فٹ قد کا تندرست و توانا شخص ان سب لوگوں سے مختلف تھا جن کو ہم دیکھ چکے تھے۔ اس کا سر گنجا ہوا اور جسم کی مناسبت سے بہت چھوٹا لگتا تھا مگر اس کے ہاتھ پاؤں بڑے بڑے اور وحشیانہ تھے۔ اس نے وہی گھٹنوں تک پہنچ کر ختم ہو جانے والی ہاف دھوتی باندھ رکھی تھی اور اوپر سوتی واسکٹ پہن رکھی تھی جس کے بٹن نہیں تھے چنانچہ اس کے سیاہ بدن کا ہر حصہ نمایاں تھا۔ اس کی آنکھیں لال تھیں اور وہ مسلسل ہمیں گھور رہا تھا۔

غالب نے آہستہ سے کہا "یہ کیا چیز ہے؟"

میں نے کہا "یہ تو کل ٹارزن ہے۔"

"اس سے پوچھو ایسے کتنی دیر گھورتا رہے گا ہمیں" نازو نے کہا۔

ٹارزن کے لب ہلے "کون ہو تم لوگ؟"

اس کی زبان سے اردو سن کر میں نے کہا "ہم بالکل تم جیسے انسان ہیں۔ تم دیکھ سکتے ہو۔"

"کہاں سے آئے ہو؟ یہ لڑکیاں کہاں لے جا رہے ہو؟ بیچنے کے لئے؟" وہ غرایا۔

میں نے کہا "یہ ہماری شریکِ حیات ہیں۔ اس لفظ کا مطلب سمجھتے ہو تم؟ زندگی کی ساتھی۔ اور کوئی اپنی زندگی کے ساتھی کو کسی قیمت پر نہیں بیچتا۔"

وہ مجھے گھورتا رہا اور اپنے اطوار سے مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش میں مصروف رہا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے سامنے جا کے میں نے کہا "مثال کے طور پر تمہارا یہ پیٹ" میں نے اس کے پیٹ میں انگلی کو خنجر کی طرح گھونپ کے کہا "اور تمہارے یہ بازو، یہ ناک۔" میں نے اس کی ناک کو چٹکی سے پکڑ کے ہلایا "یہ سب تمہاری زندگی کے ساتھی ہیں۔"

اس نے مجھے دھکا دیا۔ پھر ایک گالی دی۔ میں سنبھلنے کے لئے تیار تھا چنانچہ ایک قدم ہی پیچھے ہٹا تو میرے قدم جمے رہنے سے جھٹکا اسے بھی لگا۔ گالی کو میں پی گیا۔

"اپنی ناک بچ گئے؟" میں نے کہا۔

اس نے پھر مجھے گالی دی اور آگے بڑھا۔ وہ مشتعل ہو گیا تھا اور میں اس کے غصے کی آگ پر کچھ تیل چھڑک کے اسے نازو کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے میں نے کہا "جنگلی ریچھ کی اولاد، تیرے باپ نے کیا تیری ماں کو بیچا تھا؟"

اس نے مکا گھمایا مگر میں جھک کر وار بچا گیا۔ میرے اشارے پر نازو نے اس کی ٹانگ پکڑی اور ایک جھٹکا دیا تو وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے اس کی کمر پر بیٹھ کر آرم لاک لگا دیا اور اس کی گردن کو ایسے زاویے پر موڑ دیا کہ وہ اذیت سے چلانے لگا۔ میں نے اسے اٹھنے کا موقع دیا۔ وہ ہانپتا ہوا اٹھا۔

میں نے کہا "اب کچھ سمجھ میں آیا کہ ہم کون ہیں؟ نہیں سمجھے تو بتا دو۔ میں تم کو ٹانگ سے گھسیٹ کر باہر لے جاؤں گا اور سب کے سامنے مار مار کے تمہاری ہڈیاں توڑ دوں گا۔"

وہ پھر جست لگا کے آیا مگر میں ایک طرف ہو گیا۔

"میری بات نہیں سمجھتا یہ بن مانس۔ تم سمجھاؤ اسے" میں نے نازو سے کہا "مگر دیکھو۔ سختی سے نہیں۔"

نازو اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے مشتعل کرنے کے لئے نازو نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا اور جب اس نے چہرہ نازو کی طرف کیا تو نازو نے اس پر تھوک دیا۔ وہ غصے میں پاگل ہو کے گالیاں بکتا ہوا نازو پر حملہ آور ہوا۔ نازو کے ہاتھ حرکت میں آئے۔ اس کے نازک بدن میں بھری ہوئی تباہ کن قوت ایک دم بیدار ہو گئی۔ اس نے ایک بھرپور وار اس کے بازو پر کیا۔ وہ بلبلایا اور بازو کو تھام کے کراہنے لگا۔ نازو نے گھوم کے لات ماری جو اس کی ٹانگ پر لگی۔ وہ وہیں گر گیا۔ نازو کا اگلا ہاتھ اس کے دوسرے بازو پر پڑا۔ میرے

دیکھتے دیکھتے نازو نے اس کی دوسری ٹانگ بھی بے کار کر دی۔ وہ اب درد سے بلبلا رہا تھا اور فرش پر لوٹ رہا تھا لیکن پوری کوشش کر رہا تھا کہ اپنی آواز باہر نہ جانے دے۔

میں نے اس کے پاس بیٹھ کے کہا "اب بھی تم سمجھو اور کسی وجہ کے بغیر آدمی کو آدمی کا دشمن نہیں ہونا چاہئے۔ تو اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔ ورنہ یہ تماشا باہر سب کے سامنے ہو گا تو تمہاری کیا عزت رہ جائے گی؟ سب دیکھیں گے کہ تم ایک کمزور عورت کے ہاتھوں پٹ رہے ہو۔ یہ واقعی تمہاری ہڈیاں توڑ سکتی ہے۔ گردن توڑ سکتی ہے۔"

وہ دہشت میں مبتلا ہو گیا تھا اور آہستہ آہستہ خود کو سنبھال رہا تھا۔ اس نے درد سے مفلوج ہو جانے والے ہاتھوں اور پیروں کو مالش کر کے اور ہلا جلا کے اس قابل کر لیا تھا کہ اٹھ کر بیٹھ سکے اور بات کر سکے۔

میں نے کہا "اب پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟ یہ کیا جگہ ہے اور یہ سب جو اس بستی میں ہیں کس قبیلے کے لوگ ہیں؟"

اس نے سر ہلایا "یہ سب ماہی گیر ہیں۔ پہلے یہی کام کرتے تھے۔ مچھلیاں پکڑنے کا۔"

"اب کیا کرتے ہیں؟"

"میں نے ان کو دوسرے کام پر لگا دیا ہے" وہ بولا "جس میں انھیں زیادہ پیسہ ملتا ہے۔"

غالب بولا "تم نے۔ تم کیا سردار ہو اس قبیلے کے؟"

"سردار تو وہ بڈھا ہے جو تمہیں یہاں لایا تھا۔ مگر یہ میری مانتے ہیں۔"

"کیوں؟ ایسا کیا جادو کیا ہے تم نے۔"

"پیسہ ان کو مجھ سے ہی ملتا ہے۔ یہ سب پیسے کے غلام ہیں" وہ بولا "ان کا سردار بھی۔ وہ میری حفاظت کرتا ہے۔ میں اس کی حفاظت کرتا ہوں۔ اور اسے فائدہ بھی بہت ہے مجھ سے۔"

"کیا فائدہ؟ کیا کرتے ہو تم؟" میں نے کہا۔

"پہلے اپنا نام تو بتا دو" غالب نے کہا۔

"میں.... نوبل ہوں۔ نور الحسن نام تھا" وہ بولا "یہاں کلکتہ سے آیا تھا۔ اس علاقے میں...."

"چپ کیوں ہو گئے؟ کیا کرتے تھے تم یہاں؟"

"کچھ۔ خرید و فروخت" وہ نازو اور گل سے نظر چرا کے بولا۔ "پھر میں نے سردار کو اس لائن پر لگا دیا۔ وہ مجھے اطلاع دیتا تھا کہ مال کہاں ہے کیسا ہے۔ کس قیمت پر مل سکتا ہے۔"

میں نے نفرت سے کہا "تم بردہ فروش ہو۔ وہ بڈھا بھی اور تم بھی۔ تمہیں تو سب کے سامنے لے جا کے مار دینا چاہئے۔"

"اعتراف جرم کرانے کے بعد۔"

"تم غریب لوگوں کی بہنوں اور بیٹیوں کی تجارت کرتے ہو۔ بے غیرت آدمی" میں نے کہا۔

"میں کیا۔ سب کرتے ہیں۔ یہ لوگ خود کیا کم ہیں۔ اپنی بیویاں تک بیچ آتے ہیں کلکتہ جا کے۔ میں ان کو زیادہ قیمت دیتا تھا اور اسی جگہ۔ انھیں بازار جا کے خراب ہونے سے بچا لیتا تھا۔ کلکتہ میں بدمعاش [illegible] کی عورتیں بھی چھین لیتے ہیں اور ان دھندے میں بند کرا کے مار کھواتے ہیں پولیس سے۔ بڑی مشکل سے جان بچا کے واپس آتے تھے یہ لوگ ورنہ جیل میں پڑے رہتے تھے۔ میں نے ان کی مدد کی۔ انھیں دلالوں کے ظلم سے بچایا۔"

اس قبیلے کی معاشرتی اقدار اور انسانیت اور اخلاق کے نام پر داغِ ذلت تھیں مگر یہ قصور تھا معاشی مجبوریوں کی اس انتہا کا جہاں بھوک، مفلسی اور احتیاج کے تقاضے عزت نفس، رشتوں کی تقدیس اور غیرت و حمیت کے جذبات پر حاوی آجاتے ہیں۔

میں نے نوبل کو گردن دبوچ کے اوپر اٹھایا "تم اپنی خباثت کو نیکی قرار دے رہے ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم شیطان نہیں، ان بے تنگ و نام لوگوں کے لئے فرشتہ رحمت بن کے آئے ہو۔ تو کیا ہونا چاہئے تمہارے ساتھ؟"

وہ منت سماجت کرنے لگا "مجھ سے غلطی ہوئی۔"

"اپنی غلطی کی سزا بھی تو بتاؤ" میں نے اس کی گردن دبا کے جھٹکا دیا اور اسے دیوار سے لگا دیا۔

اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں "مجھے معاف کر دو خدا کے لئے۔"

"خدا کے لئے؟" میں نے دباؤ اور بڑھا دیا "اتنی جلدی خدا یاد آگیا۔ میں تو تم کو باہر سب کے سامنے ننگا کر کے درخت سے الٹا لٹکاؤں گا اور کوڑے مار مار کے تمہاری کھال کے چیتھڑے بکھیر دوں گا۔"

اس کا سانس رکنے لگا "ایسا مت کرو۔ میری بات سن لو...؟"

غالب نے کہا "ایک موقع دو اسے یار۔"

میں نے اسے چھوڑ دیا "بول۔ کیا کہتا ہے ذلیل کتے۔"

اس نے اپنی سانس درست کی "میں.... میں سب کچھ کر سکتا ہوں تمہارے لئے۔ تم جب تک چاہو یہاں رہو۔ سب تمہاری خدمت کریں گے۔ تمہارے ایک اشارے کے غلام ہوں گے۔ بس مجھے ان سب کے سامنے ذلیل مت کرو۔ ورنہ یہ وحشی لوگ ہیں۔ یہ تمہارے دشمن ہو جائیں گے۔ ان کے پاس زہریلے سانپ ہیں اور زہر میں بجھی ہوئی سوئیاں ہیں۔ زہریلے تیر ہیں۔ یہ جس کے دشمن ہو جائیں اس کو بڑی اذیت کے ساتھ ہلاک کرتے ہیں۔ لیکن یہ مجھ سے ڈرتے ہیں۔"

"ایسی کون سی طاقت ہے تمہارے پاس؟"

"پیسے کی طاقت" وہ بولا "یہ مجھے اپنی خوشحالی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ پہلے ان کی عزت دو کوڑی کی تھی۔ میں نے انھیں عزت کی صحیح قیمت وصول کرنا سکھایا۔ یہ پرانے طریقوں سے ماہی گیری کرتے تھے۔ میں نے ان کو مچھلیاں پالنا سکھایا۔ گہرے سمندر سے

www.paksociety.com

مچھلی پکڑنے کے لئے ناؤ تیار کرانے پر لگوائی۔ ان کی عورتوں کو گھر میں کرنے کے کام دیا کرتے۔ جو مچھلیاں یہ پکڑتے ہیں وہ میں خرید لیتا ہوں اور خود منافع پر کلکتہ لے جاتا ہوں۔ ان کی عورتیں جو چیزیں تیار کرتی ہیں وہ بھی میں لیتا ہوں۔ مگرمچھ کی کھال کے جوتے اور لیڈیز ہینڈ بیگ۔ مچھلی کی ہڈیوں کے سگریٹ ہولڈر' نمائشی چیزیں اور بانس کی تیلیوں کی چٹائیاں۔ یہ بھی کلکتہ میں اچھے دام بک جاتی ہیں۔ لیکن یہ خود کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کے سب معاملات میری مدد سے چلتے ہیں۔ میں نے ان کو منظم کیا' تربیت دی' پیسہ کمانا سکھایا اور اس میں مجھے پانچ سال لگے۔"

"اور جتنا پیسہ تم نے ان لوگوں کی محنت سے خود حاصل کیا' اس سے زیادہ ان کی بہو بیٹیوں کو بیچ کے کمایا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی کیا میں نے۔ مگر دیکھو ایسا تو پہلے بھی ہوتا تھا۔ اگر میں چلا جاؤں گا تب بھی ہوگا۔ ان کی بیٹیاں جوان ہونے سے پہلے ہی کلکتہ کے عیار دلالوں کے ہاتھ لگ جاتی تھیں۔ آٹھ نو سال کی عمر میں وہ کسی بھی لڑکی کو سو پچاس روپے میں لے جاتے تھے اور دو چار سال بعد اس کو پانچ دس ہزار میں بیچ دیتے تھے۔ بردہ فروشوں کے ہاتھ۔ وہ دس بیس ہزار میں انہیں باہر بھجوا دیتے تھے۔ باہر جانے سے پہلے ان کے ساتھ یہاں کیا ہوتا تھا' یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔"

"تم نے یہ کاروبار ختم کرا دیا....؟"

"نہیں۔ لیکن میں نے ان کو احساس دلایا کہ وہ بہت گھاٹے میں ہیں۔ انہیں یہ سب کرنا ہے تو.... پورا فائدہ اٹھائیں۔ اب یہ کم عمر لڑکی کسی کے حوالے نہیں کرتے۔ جب وہ بڑی ہو جاتی ہے....."

"تو پانچ ہزار میں تم خرید لیتے ہو ان سے" میں نے نفرت سے کہا۔

اس نے سر جھکا لیا "میں انہیں پانچ ہزار تو نہیں دے سکتا مگر پانچ سو' ہزار ضرور دیتا ہوں۔ پہلے سے دس گنا۔ میرے یا تمہارے چاہنے اور کوشش کرنے سے برائی ختم نہیں ہو سکتی۔ میں نے ان کی حالت ضرور بہتر بنادی ہے۔ اب کلکتہ کے دلال یہاں نہیں آتے۔"

"تم ان کے پاس جاتے ہو۔ تم دلالوں کے دلال بن گئے ہو" میں نے کہا "اس کے باوجود تم ان کے نجات دہندہ ہو۔"

نوبل نے کہا "یہ لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ تم ان سے پوچھ لو' یہ تمہیں بتائیں گے کہ پانچ سال میں ان کے لئے کیا کچھ کیا ہے میں نے۔"

"مگر انہیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ان سے کیا وصول کیا ہے تم نے" غالب نے کہا "انہیں پانچ سو دے کر پانچ ہزار تم کماتے ہو۔ تم نے انہیں زر خرید غلام بنا لیا ہے۔ خیر۔ چھوڑو یہ باتیں۔ ابھی تو ہم تھکے ہوئے ہیں۔ پہلے ہمارے نہانے دھونے کا' پھر کھانے پینے کا اور اس کے بعد آرام کا بندوبست کرو۔"

"سب ہو جائے گا۔" وہ مطمئن نظر آنے لگا۔

"بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ تم ہم سے زیادہ چالاک شخص ہو۔ نہ دھوکے سے اور نہ طاقت سے تم ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ لیکن ہمیں شک بھی ہوا کہ تم کوئی سازش کر رہے ہو تو تمہارا ساتھ وہی ہوگا جو میں بتا چکا ہوں۔ اس کے بعد ہم ان بستی والوں سے بھی نمٹ لیں گے۔ اگر تم ان پر کنٹرول حاصل کر سکتے ہو تو ہم یہ کام بہتر طور پر کرنے کے اہل ہیں۔ تمہیں تو پانچ سال لگے۔ ہم پانچ دن میں انہیں بندۂ بے دام بنا لیں گے۔ ہمارے پاس دولت بھی ہے' طاقت بھی اور عقل بھی۔ تمہاری بغیر کھال کی لاش کو ہم تین دن درخت سے لٹکا کے رکھیں گے اور یہی لوگ جو روز تمہیں سجدہ کرتے ہیں اس پر تھوکیں گے۔"

اس کا جسم دہشت سے کانپنے لگا۔ "میں نے وعدہ کیا ہے۔ جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہوگا۔"

"تمہاری سب دولت جو تم نے پانچ سال میں کمائی تھی تمہارے لئے کفن اور دو گز زمین بھی فراہم نہ کر پائے گی" میں نے کہا۔

اس جھونپڑے کے باہر جسے اب سرکاری گیسٹ ہاؤس کا درجہ حاصل ہو گیا تھا' قبیلے کے سردار کے علاوہ بھی بہت سے لوگ جمع تھے مگر وہ اندر ہونے والی کارروائی سے بے خبر تھے اور ہماری گفتگو کا ایک لفظ نہیں سمجھ رہے تھے۔

نوبل نے باہر جا کے انہیں ہاتھ کے اشارے سے مطمئن کیا اور اپنی حاکمانہ' پُر وقار مسکراہٹ کے ساتھ یقین دلایا کہ سب ٹھیک ہے۔ میں اس کے ایک طرف کھڑا ہوا تھا اور غالب دوسری طرف۔ اس نے لوگوں سے خطاب کرنے کے بعد میرا اور غالب کا ہاتھ پکڑ کے یوں اٹھایا جیسے باکسنگ رنگ میں ریفری جیتنے والے کا ہاتھ اٹھا کے اس کی فتح کا اعلان کرتا ہے۔ لوگوں کی صورت پر دوستانہ جذبات سے معمور مسکراہٹ نے ہمیں یقین دلا دیا کہ یہ نوبل کے الفاظ کا اثر ہے۔ آہستہ آہستہ بیشتر لوگ اپنی جھونپڑیوں میں گھس گئے۔ نوبل نے چار جوان عورتوں کو روک لیا اور انہیں مزید ہدایات جاری کرتا رہا۔ وہ سب سر جھکائے اور ہاتھ باندھے کھڑی رہیں۔

نوبل نے ان کے رخصت ہوتے ہی کہا "میں نے سب سمجھا دیا ہے۔ یہ عورتیں سارا انتظام کر لیں گی۔ اب میں چلتا ہوں۔"

غالب نے کہا "تم کہاں جا رہے ہو ابھی سے؟"

نوبل نے کہا "میں اپنے گھر جاؤں گا۔ لیکن تمہیں کوئی کام ہے مجھ سے تو میں رک جاتا ہوں۔"

غالب نے کہا "تمہارے گھر تک میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔"

نوبل کا رنگ ذرا سی دیر کے لئے بدلا "وہ بھی ..... ایسا ہی

ہے"

میں نے کہا "پھر تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم یہاں رہیں یا تمہارے ساتھ۔"

گل اور نازو نے میری بات کا مطلب سمجھ لیا "بالکل ٹھیک۔ ہم الگ کیوں رہیں۔ جب ہم مسٹر نوبل کے مہمان ہیں۔"

نوبل پریشان نظر آنے لگا مگر انکار کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ بادل ناخواستہ ہمیں اپنے ساتھ لے گیا۔ بستی کے درمیان سے گزرتے ہوئے بہت سے لوگوں نے دروازوں سے سر نکال کے ہمیں دیکھا مگر کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بستی مشکل سے سو بچے گھروں پر مشتمل تھی جو سب بانس' خشک گھاس' پھوس کی بنی ہوئی رسیوں اور چٹائیوں کی مدد سے بنائے گئے تھے۔ یہ گھر اپنے مکینوں کو موسم کے سرد و گرم سے بچاتے تھے اور انہیں جنگلی جانوروں سے تحفظ فراہم کرتے تھے۔ ان کو بنانے میں صرف محنت صرف ہوتی تھی چناں چہ سیلاب انہیں بہا لے جائے' آگ لگ جائے یا زلزلہ آجائے تو انہیں دوبارہ تعمیر کرنا مشکل نہیں ہوتا تھا۔ نوبل کی "معاشی اصلاحات" سے حاصل ہونے والے پیسے کی برکت سے ان گھروں کے اندر کیا تبدیلی آئی تھی اور زندگی کی کیا آسائش لی تھی' یہ ہم نہ دیکھ سکے۔ گھروں میں رہنے والے سو چکے تھے۔

سردار کا گھر تین کمروں پر مشتمل تھا اور اس کے آس پاس بانس جوڑ کے باڑھ اسی طرح تعمیر کردی گئی تھی جیسے ایوان صدر کے گرد فصیل ہوتی ہے۔ صدر کے باڈی گارڈز کی طرح یہاں بھی ایک شخص ہاتھ میں بانس کا نیزہ لئے کھڑا ہوا تھا۔ راستے میں ہر جگہ ہم نے مچھلیوں کے تالاب دیکھے جو گھروں کے درمیان بڑی صفائی سے بنائے گئے تھے۔ بلاشبہ نوبل ایک ہوشیار آدمی تھا جس نے افلاس زدہ انسانوں کی ایک بستی کو اپنی کالونی بنالیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے انگریزوں نے تجارت کے بہانے انڈیا کو ایک قوم نوآبادی میں تبدیل کر دیا تھا۔ نوبل نے بھی تاجر کی حیثیت سے چار پانچ سو افراد کی آبادی پر تسلط حاصل کر لیا۔ [illegible] اب ان کی حیثیت [illegible] جیسی ہو گئی تھی جسے آج برطانیہ کی نمائندگی کے لئے برسر اقتدار رکھا جاتا تھا تاکہ رعایا پر کنٹرول کا ذریعہ بنے۔

نوبل کا گھر بھی گورنر ہاؤس سے کم نہ تھا۔ اس کے بھی تین حصے تھے اور ہر حصہ ایک وسیع کوٹھری تھا۔ اس کے چاروں طرف بھی باڑھ تھی اور باغ تھا۔ اندر جانے والے راستے کی پہرے داری پر مامور شخص نے نوبل کو گارڈ آف آنر کے انداز میں سلیوٹ کیا۔

میں نے کہا "یہ شخص تو مسلح ہے"

نوبل نے سر ہلایا "ہاں۔ یہ رائفل رکھتا ہے اپنے پاس۔ نمائش کے لئے۔"

"کیا مطلب؟ رائفل چلا نہیں سکتا۔ یا رائفل خالی ہے؟"

میں نے کہا "ذرا میں بھی دیکھوں۔"

محافظ نے بوکھلا کے نوبل کی طرف دیکھا اور پھر پیچھے ہٹنے کی کوشش کی مگر میرا ہاتھ رائفل پر جم چکا تھا۔ نوبل کے اشارے پر اس نے رائفل چھوڑ دی۔

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "جاؤ۔ آج تمہاری چھٹی۔"

نوبل نے احتجاج کیا "اسے یہاں رہنے دو۔"

میں نے کہا "خطرے کی کوئی بات نہیں ہوگی تو ہم نمٹ لیں گے۔ بلاوجہ اس کو تکلیف دینے سے فائدہ۔ تم جاؤ نوجوان۔" میں نے کہا اور رائفل ہاتھ میں ڈنڈے کی طرح پکڑ کے چل پڑا۔

"ایسے تو تم میرا سارا نظام خراب کر دو گے" نوبل نے غصے میں ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "اسے گھر چلا جانے دو ورنہ معاملہ خراب ہو جائے گا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ یہ بھی تماشا دیکھے تمہارا تو پھر رہنے دو۔ کھڑا رہے ہمیں کیا۔"

نوبل نے ایک گہری سانس لے کر کہا "دفع ہو جاؤ۔ جاؤ یہاں سے۔ مگر صبح آجانا۔"

"صبح نہیں۔ جب طلب کیا جائے" میں نے کہا "اس کی رخصت اتفاقیہ تا حکم ثانی جاری رہے گی۔"

"تم اس کمرے میں رہو گے" نوبل نے محافظ کے رخصت ہوتے ہی ایک دروازہ کھول دیا۔

"تم کہاں رہتے ہو؟" غالب نے کہا "مجھے تو یہ کمرا بالکل پسند نہیں آیا۔ دوسرا دیکھتا ہوں۔"

نازو نے کہا "ہم دونوں تیسرے کمرے میں رہیں گی' بالکل الگ۔"

نوبل کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ چلانے لگا "آخر یہ سب کیا ہے؟ میرے گھر پر قبضہ کر رہے ہو تم"

میں نے کہا "نہیں یار۔ گھر تمہارا ہی رہے گا ہمارے جانے کے بعد۔ ہم تو مہمان ہیں۔ مہمان جاتے وقت گھر کیسے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا "البتہ میزبان کو ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ زندہ یا مردہ۔"

نوبل کی ہمارے سامنے ایک نہ چلی۔ وہ چالاک آدمی ہم سے معافی مانگ کر' ہمارے سامنے ہاتھ جوڑ کے اور منت سماجت کر کے ہمیں بے وقوف بنانا چاہتا تھا۔ اگر ہم مطمئن ہو جاتے تو رات کو کسی وقت وہ اسلحے کے ساتھ ہم پر شبخون مارتا اور ہم سوتے رہ جاتے۔ اٹھنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ اس کے محافظ کی رائفل بھی بہترین حالت میں اور لوڈڈ تھی۔ اس کے قصر شاہی کو گھوم پھر کے دیکھنے سے ہم پر مزید انکشافات ہوئے۔ اس عشرت کدے میں وہ سب اسباب عیش تھے جو دولت کی قوت خرید میں ہو سکتے تھے۔ وہ

www.paksociety.com

سب کچھ کلکتہ سے لایا تھا۔ سوائے ان کنیزانِ خوبرو کے جو وہاں اس کی خدمت کے لئے موجود تھیں۔ انہیں وہ اپنی بیویاں بھی کہہ سکتا تھا مگر میں جان چکا تھا کہ یہ اس کا مالِ تجارت ہے جو اس مال خانے سے کلکتہ کے بازار میں جاتا ہے اور درمیانی مدت میں نورل کے کام آتا ہے۔

صدر مملکت کے سب اختیارات ہم نے سنبھال لئے تھے چنانچہ نورل اپنی بدبختی اور شامت اعمال پر خون کے آنسو رونے اور ذہن کے گھوڑے دوڑا کر صبر کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہم نے وہیں غسل کیا اور لباس بدلا۔ وہیں کھانا پکوایا اور کھایا اور اس کی کنیزوں نے ہماری خدمت نورل کے حکم پر کی۔ نورل نے جو کچھ کیا ہمارے حکم پر کیا۔

رات کے بارہ بجے تک ہم نورل کے گھر کی تلاشی بھی لے چکے تھے تاہم کسی خفیہ مقام پر چھپایا ہوا یا مدفون اسلحہ نکالنا ناممکن تھا۔ نورل سخت مشتعل تھا کہ ہم نے اسے اسی کے گھر میں قیدی بنا رکھا ہے اور مہمان ہو کے ہم گھر کے مالک بن بیٹھے ہیں مگر وہ اپنے غصے کا اظہار کر کے اپنی رعایا کے سامنے اپنی عزت گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ ہماری خواہش پر اس نے کنیزوں کو بھی رخصت کیا اور ہدایت کی کہ وہ اس گیسٹ ہاؤس میں چلی جائیں جہاں ہم ... کا انتظام کیا گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون لڑکیاں تھیں۔ ہمارے پاس ان کی کہانی سننے کا وقت نہیں تھا اور نہ ذریعہ۔ وہ ہماری زبان نہیں سمجھتی تھیں۔ ہمارے کہنے سے اپنی زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے سے قاصر تھیں اور عزت آبرو کا مفہوم جان کے انہیں کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس نظام اور اس انداز زندگی کو نوشتہ تقدیر سمجھتی تھیں اور اس کے خلاف ان کے دل میں وہ جذبات نہیں تھے جو ہمارے دل میں تھے۔ بقول علامہ مرحوم کے۔ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی۔ نہ ہو احساس جس کو اپنی حالت کے بدلنے کا۔

ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ شاید یہاں سے نکل کے یہ لڑکیاں بھاگ جائیں۔ آزادی کے اس لمحے سے جو اچانک ان پر نئی زندگی کے راستے کھولنے آ گیا تھا، فائدہ اٹھائیں اور اپنی تقدیر بدلنے نکل جائیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ خوف زدہ اور سہمی ہوئی خاموشی سے باہر نکل گئیں اور صبح مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے مالک و آقا کے حکم کی حرف بحرف تعمیل کی تھی۔

"بانگ درا" میں علامہ اقبال کی ایک نظم ہے "غلام قادر روہیلہ" نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوک خنجر سے۔ اور پھر اس کی شاہزادیوں کو رقص کا حکم دیا۔ وہ ناچنے لگیں۔ روہیلہ نے اپنا خنجر ایک طرف رکھا اور سو گیا۔ اور جب کسی شہزادی نے خنجر اٹھا کے اس کا کام تمام کرنے کی کوشش تک نہیں کی تو اسے یقین آیا کہ حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے۔

ایسا ہی یہاں بھی ہو رہا تھا۔ ہم نے تو زنجیریں کاٹ دی تھیں مگر جن میں طاقت پرواز کا حوصلہ ہی نہ ہو ان کے لئے پر ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نورل جیسا بے غیرت اور بزدل آدمی ان کے جسم و جاں کا مالک بنا ہوا تھا مگر ہمارے سامنے وہ پالتو کتے کی طرح دم ہلا رہا تھا۔ ہم نے واقعی اسے اپنے ہی گھر میں اسیر کر لیا تھا۔

ایک کمرے میں قتل اور نازو کے سونے کے بعد میں نے پہلے غالب کو موقع دیا کہ وہ دوسرے کمرے میں سو جائے۔ خود میں تیسرے کمرے میں نورل کے ساتھ موجود رہا۔ وہ بتاتا رہا کہ یہ سب سامان وہ کلکتہ سے لاتا رہا ہے جسے ہم بے دریغ استعمال کر رہے تھے۔ ریشمی ساڑیاں۔ پتلونیں۔ جوتے اور قمیصیں۔ کھانے پینے کی اشیاء کے بند ڈبے۔ ولایتی شراب اور پرفیوم۔ چائے، سگریٹ اور کافی۔

"یہاں رہنے والوں کے لئے ان سب چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں" اس نے کہا "میں بھی جب کلکتہ جاتا ہوں تو قمیص پتلون پہنتا ہوں۔ کبھی سگریٹ اور چائے ان میں بھی تقسیم کر دیتا ہوں۔"

"اور یہ ریشمی ساڑیاں؟" میں نے کہا۔

"ایک ریشمی ساڑی سے ایک عورت مل جاتی ہے" وہ بولا "یہ لوگ بس دس نوٹ کے گاؤں سے خبردار ہیں کہ کہاں نقد رقم کی ضرورت پڑے گی۔ کہاں ریشمی ساڑی کی۔"

"کون قبول کرتا ہے یہ ریشمی ساڑی؟" میں نے بڑے دکھ کے ساتھ پوچھا۔

"کبھی کسی جوان لڑکی کی ماں۔ کبھی بڑی بہن۔ کبھی کوئی خالہ پھوپھی" وہ بولا "یہ ساڑی ایسی رشوت ہے جس کے مقابلے میں کاغذ کے نوٹ بے کار ثابت ہوتے ہیں۔ پانچ سو نقد کے بجائے دو سو کی ساڑی....."

میں نے کہا "چھوڑو یہ ذکر۔ مت کرو یہ باتیں۔ مجھے شرم آتی ہے کہ تم اس عورت کی عزت کے بے وقعت ہونے کا حال سنا رہے ہو جس کے لئے بڑی شاعرانہ خیال آرائی کی گئی ہے کہ اے ماؤ بہنو بیٹیو۔ دنیا کی عزت تم سے ہے۔ جب ماں ہوتی ہے تو اس کے قدموں میں بیٹوں کی جنت ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں مشتعل ہو کے تمہیں جان سے مار دوں۔ ورنہ نہیں چاہتا تم کو یوں کہ تم سے مجھے ایک کام لینا ہے۔"

"کیسا کام؟" وہ بولا۔

"صبح بتاؤں گا۔ ابھی تم سو جاؤ" میں نے کہا۔

"اور تم..... جاگتے رہو گے؟" وہ بولا۔

"ہاں۔ میں جاگتا رہوں گا" میں نے کہا "اپنی اور اپنے دوستوں کی حفاظت کے لئے۔"

"تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔"

میں نے کہا "خطرہ جب نازل ہوتا ہے تو بتا کے نہیں نازل ہوتا۔ چنانچہ ہم سب ایسا موقع نہیں آنے دیتے کہ خواب غفلت

کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

"خطرہ تمہیں مجھ سے نہیں۔ کسی اور سے ہے۔" نورل نے کہا۔

"بلاوجہ اپنے دماغ کو زحمت مت دو۔ یہ مت سوچو کہ ہمیں کس سے خطرہ محسوس ہوتا ہے اور کیوں۔ یہ سوچنا ہمارا کام ہے۔ تم صرف اپنی فکر کرو۔" میں نے جتا کے کہا۔

نیند سے لڑنے کے لئے میں ٹھنڈی بلیک کافی پیتا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر مجھے نوٹ کیس کا خیال آیا جو میں نے غلطی سے اپنے سامان کے ساتھ نیچے پھینک دیا تھا۔ ہیلی کاپٹر اگروال اور سانولی کے ساتھ واپس چلا گیا تھا اور چند منٹ بعد تباہ ہو گیا تھا چنانچہ اب ہم ہی اس کے مالک تھے۔

میں نے بریف کیس سے ذرا بڑے نوٹ کیس کو اٹھا کے چاروں طرف سے دیکھا۔ سونگھا۔ ہلایا۔ کان سے لگایا اور کوئی آواز سننے کی کوشش کی جو ٹائم بم کی ٹک ٹک سے مشابہ ہو مگر اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ سوائے اس کے وزن کے۔ یہ وزن کپڑوں کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس میں سونا ہوتا تو وزن اتنا زیادہ ہوتا کہ ہم اسے اٹھا بھی نہ پاتے۔

تھوڑی دیر تجسس میں مبتلا رہنے کے بعد میں نے پھر اس کے لاک کا معائنہ کیا۔ یہ نمبروں سے کھلنے والا تالا تھا۔ میں نے اسے کان کے قریب کیا اور ایک ایک نمبر گھماتے ہوئے کلک کی اس خفیف سی آواز کو سننے کی کوشش کرتا رہا جو صحیح نمبر کے فٹ ہونے پر آتی ہے۔ آدھے گھنٹے میں متعدد ناکام کوششوں کے بعد آخر کار میں نے ایک لیور کو دبایا تو لاک کھل گیا۔ دوسری طرف کے لیور کو دبا کے میں نے ڈھکنا اٹھا دیا اور پھر دم بخود بیٹھا رہا۔

نوٹ کیس نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں سب بڑے نوٹ تھے جن کو ربڑ کے چھلے چڑھا کے گڈی کی شکل دے دی گئی تھی۔ یہ کسی بینک سے نہیں حاصل کئے گئے تھے کہ ہر گڈی میں سو نوٹ ہوتے۔ نوٹ سیریل نمبر میں بھی نہیں تھے اور مالیت کے لحاظ سے گڈی میں نہیں رکھے گئے تھے۔ کسی گڈی میں ہزار کے نوٹ تھے تو کسی میں سو سو کے۔ سو پچاس اور دس کے نوٹ ایک ربڑ بینڈ میں باندھ دیئے گئے تھے۔ ظاہر ہے اس طرح نوٹ کیس کی مجموعی رقم کا اندازہ کرنا بھی ناممکن تھا۔

یہ ڈاکوؤں کا مال تھا۔ انہوں نے لوٹا تھا یا تاوان کے بطور جمع کیا تھا۔ قیاس کی بنیاد پر میں کہہ سکتا تھا کہ اگروال کی روانگی کے بعد اسے ہیلی کاپٹر میں نیپال لے جانے کا سارا انتظام سانولی نے کیا تھا تو اسے ان مسائل سے بچائے رکھنے اور دولت کی طاقت دینے کا بندوبست بھی اسی نے کیا ہوگا۔ کیا عجیب پاگل عورت تھی وہ بھی۔ محبت کرنے والی عورت عجیب اور پاگل ضرور ہوتی ہے۔

میں نے نوٹ کیس پھر بند کر دیا لیکن اس بار نمبر نوٹ کر لئے تاکہ یاد رہیں۔ یہ پیسہ ہمارے کام آ سکتا تھا۔ اب تک ہمارے سارے مسائل اس پیسے نے حل کئے تھے جو میں نے ایک بنک سے چھینا تھا۔ وہ پیسہ بھی ایک طرح سے ناجائز تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے پاس پیسے والے بے وقوف خود چل کے آتے تھے اور عقیدت کے ساتھ لٹتے تھے۔ اگروال دہشت سے لوٹتا تھا اور اس کا شکار بے وقوف نہیں وہ عقلمند ہوتے تھے جو پیسے سے پیسہ کھینچنے کا فن جانتے تھے۔

صبح چار بجے تک میں اپنے مستقبل کے لائحہ عمل پر غور کرتا رہا۔ ناسازگار حالات کے بطن سے اچانک موافق نتائج پیدا ہو گئے تھے اور حادثات کی مدد سے مشکلات کا حل نکلنے لگا تھا۔ نورل ہمیں کلکتہ پہنچا سکتا تھا اور کروڑوں کی آبادی کے اس شہر میں گم ہو جانے کے بعد ہم ڈھاکا تک اپنا راستہ بنا سکتے تھے۔ اس کام میں تاخیر لاحاصل تھی۔

صبح چار بجے تک نورل خراٹے لیتا رہا۔ پہلے مجھے شک تھا کہ اس طرح وہ مجھے دھوکا دے کر چاہتا ہے کہ میں اس کی طرف سے غافل ہو جاؤں لیکن وہ واقعی بے خبری کی نیند میں تھا۔ اس سے میرا شک دور ہو گیا۔ اگر اس کے ذہن میں کسی سازش کے جراثیم کلبلا رہے ہوتے تو اسے نیند آنا مشکل تھی۔ غالب کو اپنی جگہ بٹھا کے میں سو گیا اور ایک منٹ میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔

میری آنکھ شور سے کھلی۔ یہ غالب اور نورل تھے جن کے درمیان اختلاف رائے کشت و خون کی انتہا تک پہنچ گیا تھا۔

"کیا میں قیدی ہوں؟" نورل نے چلا کے کہا۔

"تم ایک سزا یافتہ قیدی ہو۔ خود کو موت کی کال کوٹھڑی میں سمجھو۔ اتنے سنگین جرائم ہیں تمہارے کہ تم کو ایک بار نہیں ہزار بار پھانسی ہونی چاہئے" غالب نے کہا۔

"میں جا رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں تم کیسے روکتے ہو مجھے"

"اگر تم نے اگلا قدم اٹھایا تو میں گولی مار دوں گا تمہیں۔"

اس کے ساتھ ہی فائر کی آواز سنائی دی اور پھر نورل کی چیخ۔ میں گھبرا کے اٹھا اور دوسرے کمرے کی جانب لپکا جہاں نورل اپنی ٹانگ پکڑے بیٹھا تھا۔ گولی اس کی ٹانگ پر خراش ڈالتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ غالب کے نشانے کی مہارت کو ہم سب مانتے تھے۔ اس کا مقصد بھی یہی ہوگا کہ نورل معذور نہ ہو ورنہ وہ گولی کو اس کے ٹخنے کے اوپر پنڈلی کی ہڈی سے بھی گزار سکتا تھا۔ نورل اس کے برعکس یہ سمجھ رہا تھا کہ غالب کا نشانہ خطا ہو جانے سے اس کی ٹانگ بچ گئی۔

"یہ کیسا شور ہے نورل؟" میں نے کہا۔

"اس نے..... اس نے گولی ماری مجھے" وہ خراش کی جلن سے بے چین ہو کے چلایا۔ اس کی پنڈلی پر ایک لال لکیر نمودار ہو گئی تھی۔

"میں نے کہا تھا تم سے کہ تمہیں باہر جانے کی اجازت نہیں

www.paksociety.com

ہے۔" غالب نے کہا۔

"تم سچ کہہ رہے ہیں۔ میں نظر نہ آیا تو لوگ کیا کہیں گے۔ بہت سے کام ہوتے ہیں مجھے" وہ احتجاج کرنے لگا۔

"لوگ فرض کر لیں گے کہ تم دنیا سے کوچ کر گئے یا پھر بستر مرگ پر ہو" غالب نے کہا۔

"سب سمجھیں گے تم نے مجھے قتل کر دیا ہے" وہ بولا۔

"لوگ کیا سمجھتے ہیں، ہم اس کی فکر کیوں کریں" غالب نے کہا، "ہم انہیں بھی سمجھا سکتے ہیں کہ وہ غلط سمجھے تھے۔"

فائر کی آواز پر کچھ لوگ فوراً آ گئے تھے۔ میں نے نورل سے کہا "انہیں کہہ دو کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ غلطی سے گولی چل گئی تھی۔ تم کہاں جانا چاہتے تھے؟"

"صبح سے یہ وقت ہو گیا۔ گھر میں کوئی ملازمہ نہیں ہے۔ میں انہیں بلانے جا رہا تھا تاکہ کچھ کھانے پینے کا انتظام ہو سکے" نورل نے کہا۔

"اچھا تم جاؤ اس کے ساتھ" میں نے غالب کی طرف اشارہ کیا اور پھر غالب سے پوچھا "وہ دونوں کہاں ہیں؟"

غالب نے کہا "وہ صبح کی سیر کے لئے نکلی تھیں۔ میں بھی چاہتا تھا کہ وہ لوٹ آئیں تو میں اس کے ساتھ جاؤں۔"

نورل اور غالب کے جاتے ہی گل اور نازو بھی نمودار ہو گئیں۔ "یہ گولی کس نے چلائی تھی؟"

"میں نے نہیں چلائی" میں نے کہا۔

"غالب کہاں ہے؟" نازو تشویش میں مبتلا ہو گئی "اور نورل؟"

"کیا مارو غالب کو" میں نے کہا "تم کہاں بجلیاں گرا کے آ رہی ہو؟ ساری بستی میں ہر قدم پر کشتوں کے پشتے لگ گئے ہوں گے۔ ایک نے مار دیا ہو گا، دوسری نے خاک کر دیا ہو گا۔"

گل ہنسی "سچ بڑا مزہ آیا۔ اتنی حیرانی سے دیکھ رہی تھیں غریب عورتیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے۔ جیسے ہم اس دنیا کی مخلوق نہیں، کوہ قاف کی پریاں ہیں۔"

"مردوں کی تو سانس رک گئی تھی۔ دل دھڑکنا بند ہو گئے تھے۔ ایسے کھڑے تھے جیسے قبر سے نکل کے مردے کھڑے ہوں" نازو نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔ نہا دھو کے رات بھر آرام کرنے کے بعد انہوں نے رنگین ریشمی ساریاں باندھی تھیں تو ان کے حسن کی آب و تاب پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ مقامی عورتیں سوتی ساریاں بھی دھوتی کے انداز میں باندھتی تھیں۔ گل اور نازو کا اسٹائل وہ تھا جسے فلمی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے مقابلے پر اس غربت زدہ بستی میں نیم مردہ، سوکھے جسموں والی کالی عورتیں تھیں جن کے تن کو میلے کپڑے بھی پوری طرح میسر نہ تھے۔ گل اور نازو نے میک اپ کیا تھا اور پرفیوم لگائی تھی۔ ان عورتوں کے وجود سے میل اور پسینے کی اور بدحالی کی بو اٹھتی تھی۔

میں نے کہا "تمہیں ایسے گھومنے پھرنے سے گریز کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ کوہ قاف سے اترنے والی پریوں کا چرچا عام ہو جائے تو پولیس والے بھی شوق دید میں چلے آئیں۔"

"ہر وقت ڈراتے مت رہا کرو۔ جو ہونا تھا ہو چکا، اب اور کیا ہو گا؟" نازو نے کہا "آنے دو غالب کو۔ ابھی قینچی لے کر خود اس کی حجامت کرتی ہوں۔"

گل ہنسنے لگی "بھائی سکندر! اب آپ بھی یہ جھاڑ جھنکار صاف کروا لیں۔ بہت دن ہو گئے آپ کا اصلی چہرہ دیکھے۔"

میں نے داڑھی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے کہا "اپنا اصلی چہرہ تو اب خود میں بھی نہیں پہچان سکتا۔ پولیس البتہ پہچان لے گی۔"

"میرا خیال ہے ہم اس خطرے کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ اور آگے صورت حال ایسی ہے کہ...... کچھ بھی نہیں ہو گا۔"

"ہاں۔ اس افراتفری میں کون پہچاننے والا ہو گا سکندر اور غالب کو۔ سوائے ایک محسن کے" میں نے کہا۔

گل کے چہرے پر بادل کا سایہ سا آ کے گزر گیا "بھائی سکندر! یہ شخص کلکتہ آتا جاتا ہے۔ اسے کہیں کہ آج ہی ہمیں کلکتہ پہنچا دے۔"

نازو نے اس کی تائید میں سر ہلایا "وہاں سے اتنا کٹا جانا آسان ہی ہو گا جیسے کراچی سے حیدر آباد جانا۔ یا لاہور سے راولپنڈی۔"

میں نے کہا "وہ لالچی آدمی ہے۔ پیسہ مانگے گا۔"

"پیسہ!" گل نے سوچ کے کہا "ہمارے پاس ہیرا اتنا سونے کا زیور ہے۔ جس کا بوجھ اٹھائے پھر رہے ہیں ہم۔ وہ کس دن کام آئے گا؟"

"وہ بین الاقوامی کرنسی ہم ایسے ضائع نہیں کر سکتے گل۔" میں نے کہا "ابھی تو مجھے یہاں سے روانگی کے امکانات نظر نہیں آتے۔"

گل کی صورت اتر گئی "کیا مطلب؟ ہم یہاں بیٹھے رہیں گے آخر کب تک؟"

میں نے کہا "جب تک خطرہ باقی ہے۔ یہاں ہم محفوظ تو ہیں۔ اور جب تک کوئی ہماری رہنمائی کرنے والا نہ ہو، ہم ایسے منہ اٹھا کے کیسے نکل کھڑے ہوں۔ اس علاقے کا جغرافیہ بالکل مختلف ہے اور پھر سرحد کے دونوں جانب جنگ چل رہی ہے۔"

"جنگ تو ختم ہو چکی ہے" گل مردہ لہجے میں بولی۔

"مگر فوجیں وہیں ہیں۔ کیسے گزر کے جا سکتے ہیں ہم میدان جنگ میں سے؟" میں نے کہا۔

میرا مقصد صرف اسے چھیڑنا تھا اور اس کے رد عمل سے لطف اندوز ہونا۔ وہ متفکر نظر آ رہی تھی اور اداسی کی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ نازو بھی مایوسی میں مبتلا ہو گئی تھی۔

"آپ بات تو کر کے دیکھیں نورل سے" گل نے کہا۔

میں نے مغموم سے لہجے میں کہا "بات کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ناممکن ہے ابھی۔ کم سے کم مہینے تک راستہ صاف ہو گے۔"

"ایک مہینہ!" گل کی آنکھیں پھیل گئیں "میں اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتی۔"

"میں کا کیا مطلب؟ تم ہمارے ساتھ ہو۔ اکیلی تو جا نہیں سکتی ہو" میں نے کہا۔

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "میں اکیلی جا سکتی ہوں بھائی سکندر" اور خاموشی سے اندر چلی گئی۔

"یہ تو پاگل ہے" میں نے کہا "میں مذاق کر رہا تھا۔"

"پھر آپ خود پاگل ہیں جو پاگلوں سے مذاق کرتے ہیں" نازو نے خفگی سے کہا۔

اسی وقت غالب اور نورل نمودار ہوئے۔ ان کے پیچھے ایک جلوس تھا جس میں رات والی کنیزیں یا اب تھیں اور ان کے ہاتھوں میں طباق، تھالیاں اور ڈول تھے۔ یہ سب کھانے پینے کا سامان تھا جو بقول نورل کے بستی کے لوگوں نے مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے بطور خاص ہمارے لئے ارسال کیا تھا۔ چاول، ناریل، مچھلی، ابلی، سبزی اور دودھ سے بنی ہوئی ان اشیا میں سے ہم ناشتے میں کچھ بھی استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اس سے نورل کو مایوسی ہوئی اور اس نے ہماری خواہش کے احترام میں چائے انڈے پراٹھے کا ناشتا فراہم کیا۔

نازو کے سمجھانے سے گل کی اداسی کا دورہ ختم ہو گیا تھا۔ جب ناشتے کے بعد میں نے انکشاف کیا کہ اگروال کے بریف کیس میں سے کیا برآمد ہوا ہے تو سب سے زیادہ خوشی بھی وہی ہوئی۔

"اب تو کوئی مسئلہ نہیں رہا بھائی سکندر؟"

میں نے کہا "پہلا مسئلہ پہلے کب تھا۔ اور ہم مسئلہ حل نہیں کر سکتے کیا؟ تمہیں بھروسہ نہیں ہم پر؟"

"بھروسہ کیوں نہیں۔ مگر......"

"مگر یہ کہ دیوانگی کا کوئی علاج نہیں" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ ہوتا تو تم ٹھیک ہو جاتیں" غالب نے کہا۔

"شکر تمہارا علاج میرے پاس ہے" نازو نے کہا۔

ان کی لڑائی کو میں نے شروع ہونے سے پہلے ہی روک دیا۔ نورل اپنے حرم میں مفصل ناشتا کر رہا تھا۔ وہ سب کچھ جو ہمارے لئے لایا گیا تھا اس نے کمال فراخدلی سے اپنی کنیزوں کے ساتھ بیٹھ کر کھایا تھا۔ جب میں نے اسے طلب کیا تو وہ منہ چلاتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔

میں نے کہا "ناشتے میں بھی پیتے ہو تم؟"

"روز نہیں بیٹا۔ آج ذرا دل بھاری تھا" وہ بولا "تمہاری وجہ سے میری بہت بے عزتی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "تم عزت کا مطلب سمجھتے ہو؟ تم تو خود عزتوں کے سوداگر ہو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ ضرورت نے ہمیں مجبور کر دیا اور ہم نے سب کے سامنے تمہاری عزت نہیں اتاری۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا "میرے لئے کیا حکم ہے؟"

میں نے کہا "تم ہمیں کلکتہ پہنچا سکتے ہو؟ آج ہی۔"

"کیوں نہیں۔ میری اپنی کشتی ہے اور لانچ ہے" وہ بولا "مگر تم ایسے نہیں جا سکتے۔"

"کتنا پیسہ چاہئے تمہیں لالچی آدمی؟" گل بول پڑی۔

اس نے حیرانی سے گل کو دیکھا "مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ میں تو آتا جاتا رہتا ہوں۔ لیکن راستے کھلے رکھنے کے لئے میں ہاتھ کھلا رکھتا ہوں۔ میرا کاروبار ہی ایسا ہے۔ میں تمہاری بات کر رہا تھا۔"

"ہم تمہاری جیب پر بوجھ نہیں بنیں گے۔ جس راستے سے چاہو ہمیں لے جاؤ لیکن راستہ محفوظ ہونا چاہئے" میں نے کہا "ہم راستے کے سب اخراجات ادا کریں گے۔"

"تمہیں اپنے حلیے بدلنے ہوں گے" وہ بولا "یہ کپڑے نہیں چلیں گے۔ تم کو ویسا ہی نظر آنا چاہئے جیسے یہاں کے لوگ ہیں۔ اجنبی نظر آؤ گے تو مشکل ہو جائے گی میرے لئے بھی۔"

"تم جو چاہو کرو۔ ہمارا حلیہ بدلو، لباس یا چہرے۔ تمہیں اختیار ہے۔ اگر تم نے ہمیں بحفاظت کلکتہ پہنچا دیا تو تمہیں اس کام کا منہ مانگا معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ اور کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم سے پہلے تم مارے جاؤ گے۔"

اس نے سوچ کے کہا "ہم رات کو چلیں گے۔ اس وقت تک میں سارا بندوبست کر لوں گا۔ مجھے بڑی کشتی کا بھی انتظام کرنا ہے جس میں گیارہ بارہ آدمی آرام سے جا سکیں۔"

"گیارہ بارہ...... اور کون ہے؟"

اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا "یہ چھ لڑکیاں...... انہیں بھی تو لے جانا ہے۔"

میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا "صرف تم جاؤ گے ہمارے ساتھ۔ اور کوئی نہیں۔"

اس نے گال سہلا کے کہا "تم سمجھتے کیوں نہیں۔ اس وقت سرحد پار آنے جانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ یہ دونوں بھی ان میں شامل ہو جائیں۔ اور تم میرے کاروباری شریک بن جاؤ۔"

میرے جسم کا سارا خون کھنچ کر چہرے پر آ گیا۔ گل اور نازو ان لڑکیوں میں جو کلکتہ کے بازار میں بکنے جا رہی ہیں...... اور ان کے ساتھ ہم بطور بردہ فروش۔ اس کا تصور ہی رسوائی کی انتہا تھی۔ نورل کی بات کا مجھ پر وہی اثر ہوا تھا جو غلیظ ترین گالی کا ہو سکتا تھا۔ مگر غالب کا ردعمل زیادہ شدید تھا۔ نورل نے بارود میں چنگاری پھینک دی تھی۔ غالب نے ایک دم ریوالور نکالا اور اسے شوٹ کر دیا۔ گولی نے اس کے سر کو پاش پاش کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی چیختی چلاتی لڑکیاں ایک دم باہر نکل آئیں۔

www.paksociety.com

کچھ دیر کے لئے ہم سب سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھے رہے اور نوبل کی خاک و خون میں غلطاں لاش کو دیکھتے رہے۔ جس کی کھلی آنکھوں میں اب بھی ہمارے لئے قتل کی دھمکی تھی کہ تم نے مجھے مار تو دیا مگر اب خود اس وحشی قبیلے کے غیظ و غضب اور انتقام کا نشانہ بننے سے کیسے بچو گے۔

میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "غالب! یہ تم نے کیا کر دیا؟"

غالب نے سپاٹ لہجے میں کہا "وہی جو تم نہ کر سکے۔ میری قوت برداشت اتنی نہیں ہے جتنی تمہاری۔"

میں نے بے بسی سے کہا "یار! تم عقل سے کام نہیں لے سکتے تھے؟"

غالب نے اسی سرد لہجے میں کہا "اس کمینے کے تمہارے لئے عقل سے کام لینا ممکن تھا۔ میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔ میری عقل نے بھی یہی کہا تھا۔ اب نہ مجھے اس پر ندامت ہے اور نہ خوف کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

"تم واقعی بہادر ہو" نازو نے کہا مگر اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا فخر کے جذبات تھے۔

غالب نے ممنون ہو کے اسے دیکھا "میں نے غلطی تو نہیں کی نازو؟"

نازو نے اس کا ہاتھ تھام لیا "مجھے فخر ہے تم پر۔"

میں نے کہا "اب تیار ہو جاؤ مقابلے کے لئے۔ خواہ ہمیں اس قبیلے کے ایک ایک فرد کو جان سے مار کے اپنا راستہ بنانا پڑے مگر اب ہمیں نکل جانا چاہئے۔"

باہر ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ نوبل کے قتل ہوتے ہی اس کی زر خرید کنیزیں چیختی چلاتی فرار ہو گئی تھیں اور ہم باہر سے ان کا واویلا سن سکتے تھے۔ ان کی زبان سے ناواقفیت کے باوجود یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ سارے قبیلے کو ہمارے ہاتھوں نوبل کے مارے جانے کی اطلاع دے چکی ہیں۔ ان کی فریاد و فغاں میں دوسری برہم آوازوں کا شور شامل ہو گیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے نوبل کے غلام، عقیدت مند اور پیروکار اپنے مالک، نجات دہندہ اور لیڈر کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے ہر طرف اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اپنی قوت کو مجتمع کر رہے ہیں تاکہ ہمارے جسموں سے کھال اور گوشت نوچ لیں اور ہماری ہڈیوں کو بھی چور چور کر دیں۔

میرے اشارے پر غالب، گل اور نازو نے اٹھ کے ریوالور نکال لئے تھے اور اب وہ میرے اگلے حکم کے منتظر تھے۔ مشتعل لوگوں کا ہجوم بھی باہر رکا ہوا شاید اپنے سردار کے اشارے کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے کہا "اس سے پہلے کہ یہ سب وحشی ہم پر ٹوٹ پڑیں، میں ان سے بات کر کے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

غالب نے کہا "کیسے سمجھاؤ گے انہیں؟ یہ تمہاری زبان کہاں سمجھیں گے۔"

نازو نے کہا "زبان سمجھتے تب بھی ان کے جذبات کی شدت پر قابو پانا مشکل ہوتا۔"

گل نے کہا "باہر مت جائیں بھائی سکندر۔ یہ لوگ مار ڈالیں گے آپ کو۔"

"بے وقوف! مارے تو ہم اندر بھی جائیں گے۔ یہ کوئی قلعہ نہیں ہے جس میں ہم مورچہ بند ہو کے بیٹھ جائیں۔ گھاس پھونس کی دیواریں کب تک پناہ دیں گی آخر۔ میری کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ غالب! تم میرے ساتھ آؤ۔ میرے پیچھے۔ نازو! تم کسی سوراخ سے ہجوم پر نظر رکھو۔ جو بھی حملے میں پہل کرے اسے بے دریغ گولی مار دینا۔ گل! تم پیچھے رہ کر ہم سب کا کور کرو۔ اچھا چھوڑو۔ تم دوسری طرف آ جاؤ۔ کسی سوراخ میں سے تم بھی دیکھتی رہو۔"

میں نے دروازے سے سر نکالا ہی تھا کہ ایک سنسناتا ہوا تیر آیا اور میرے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا گھاس پھونس کی دیوار میں پیوست ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے میرے وجود میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی لیکن میں نے اس خوف کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ریوالور ہاتھ میں لے کر میں ساٹھ ستر افراد کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ان سب کی آنکھوں سے نفرت کا لاوا ابل رہا تھا اور ان پر ...... سردار تھا۔ ان کے نیم برہنہ جسم کی ساری ہڈیاں ناطاقتی کی مظہر تھیں مگر ان کے جارحانہ عزائم کی طاقت کم نہ تھی۔ ان کے پیٹ خالی تھے مگر دل عداوت کی آگ سے پر تھے اور وہ جانتے تھے کہ خشک ٹہنی کمزور ہوتی ہے مگر وہ مل کے ایک گٹھا بن جائیں تو درخت کے تنے کی مضبوطی حاصل ہو جاتی ہے۔

میں نے تیر کو کھینچ کر نکالا اور چلا کے کہا "یہ کس کی حرکت تھی؟"

میرا سوال میرے لہجے اور میری صورت سے عیاں تھا چنانچہ الفاظ کے نہ سمجھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ سب ایک دم چیخ چیخ کر اندر کی جانب اشارہ کرنے لگے اور ہوا میں مکے لہرانے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے، لاٹھیاں، بلّے اور لوہے کے سریے تھے۔ جس کو کچھ نہیں ملا تھا اس نے کوئی پتھر اٹھا لیا تھا۔

میرے سوال کا عملی جواب ایک شخص نے یوں دیا کہ اپنا ہاتھ اٹھا کے اس نے پتھر کھینچ مارا۔ میں اس کے لئے تیار تھا۔ اپنا سر جھکا کے میں نے خود کو بچایا۔ پتھر دیوار پر لگا لیکن اس کے ساتھ ہی فائر کی آواز آئی۔ وہ شخص اچھل کر زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔

ایک لمحے کے لئے مجمع ساکت ہوا۔ پھر ایک نوجوان تیز رو کے نیزہ میرے سینے میں اتارنے کے لئے لپکا۔ اس نے کچھ فاصلے سے ہی نیزہ پھینک دیا تھا۔ نیزا میرے دائیں ہاتھ کو چھوتا ہوا گزرا۔ پھر دوسرا فائر ہوا اور وہ بھی پلٹ کے زمین پر ایڑیاں رگڑنے لگا۔

اب مجمع کا جوش و خروش سرد پڑ گیا تھا۔ دو افراد کے خون نے جذبات کی آگ کو بجھا دیا تھا اور مرنے والوں کا کرب دیکھ کر جینے والوں کو ہوش آ گیا تھا۔

میری نگاہیں سردار کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ سب سے پیچھے متانت و صباحت کھڑی ہوئی عورتوں کے مجمع کو چیرتا ہوا نمودار ہوا اور چیختا چلاتا میرے سامنے آ گیا۔ وہ بار بار ہاتھ اٹھا کے دو لاشوں کی طرف اور اندر کی جانب اشارہ کر رہا تھا اور مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

میں نے کہا "نوبل نے ہمیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں وہ خود مارا گیا۔"

سردار نے پھر تیز تیز کچھ کہا۔

میں نے کہا "یہ دونوں بھی اپنی موت کے خود ذمے دار ہیں۔ ہم کسی کو مارنا نہیں چاہتے تھے لیکن کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس نوبل بابا کی سے ڈر جائیں گے تو......"

سردار نے میری بات کاٹ دی اور ہاتھ ہلا ہلا کے اپنے لوگوں سے کچھ کہنے لگا۔ ان سب نے نیزے، لاٹھیاں اور سریے اٹھا کے ایک ساتھ نعرہ لگایا۔ غالباً سردار نے سوال کیا تھا کہ کیا میرے حکم پر تم ان قاتلوں پر ٹوٹ پڑو گے۔ ان سب نے ایک آواز میں اسے اپنی جاں نثاری کا یقین دلایا تھا۔

صورت حال خطرناک ہو گئی تھی۔ اس کا واحد علاج یہ تھا کہ سردار کو یرغمال بنا لیا جائے۔ میں نے ایک دم اسے دبوچ کے اپنے سامنے کر لیا اور ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔

"ان سے کہو واپس چلے جائیں" میں نے حکم دیا اور ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔

میرے بائیں بازو کے حلقے میں سردار کی گردن پھنسی ہوئی تھی اور وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ گالیاں بک رہا تھا اور سانس لینے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ کا اشارہ بہت واضح تھا۔ سردار نے بڑی مشکل سے کچھ کہا۔ اوپر اٹھے ہوئے تیر، نیزے اور لاٹھیاں نیچے ہو گئے۔ پیچھے سے اٹھارہ بیس سال کا لڑکا آگے بڑھا۔

"اپنا بات کرے گا" اس نے قریب آنے کی اجازت طلب کی۔

میں نے کہا "آگے آ جاؤ۔"

اس نے نزدیک آ کے کہا "سردار کو چھوڑ دو۔"

میں نے کہا "سردار سے کہو اپنے قبیلے کو واپس جانے کا حکم دے۔"

"سردار اپنا باپ ہوتی ہے......" اس نے عاجزی سے کہا۔

"اچھا۔ تو تم سردار کے بیٹے ہو" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "تم حکم دو سب لوگ واپس لوٹ جائیں ورنہ ہم سردار کو مار ڈالیں گے۔ کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

لڑکے نے بے بسی سے مجمع کی طرف دیکھا اور ہمارے کلمات کی ترجمانی کر دی۔ لوگ اسی طرح کھڑے رہے۔ ان کے پیچھے عورتوں کا اور بچوں کا ہجوم مسلسل رونے پیٹنے میں مصروف تھا۔ میری نظر کو ان چھ عورتوں کی تلاش تھی جن کو نوبل نے بطور خاص ہماری میزبانی کے لئے منتخب کیا تھا اور جو اس کے قتل کی عینی شاہد بن چکی تھیں مگر وہ مجھے اس حلقۂ ماتم گساراں میں دکھائی نہ دیں۔

"یہ باپ کا بات مانتی" لڑکے نے اپنی مجبوری بتائی۔

"پھر اپنے باپ صاحب سے کہو کہ ہم بات کرنے کے لئے تیار ہیں اور جرمانہ بھی دیں گے مگر پہلے ان سب سے کہو کہ اپنے گھر جائیں ورنہ ہم فائر کھول دیں گے اور بہت خون خرابہ ہوگا۔"

لڑکا کچھ دیر میری صورت تکتا رہا۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے اپنے والد محترم سے کچھ کہا۔ والد نے جانکنی کے عالم میں کچھ فرمایا۔ لڑکے نے اپنی رعایا سے پھر خطاب کیا اور ایک نعرہ لگایا جس کے جواب میں سردار نے سر ہلا کے کہا کہ معاملہ ختم کر دیا جائے۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے مزاحمت اختیار کی اور اپنے ساتھ وہ دونوں لاشیں بھی اٹھا کے لے گئے۔

اب میں نے سردار کو باعزت طور پر اندر تشریف لانے اور مذاکرات کے ذریعے معاملات طے کرنے کی پیشکش کی۔ اس کا بیٹا بطور مترجم شریک ہوا اور ہمارے درمیان کسی دشواری کے بغیر سمجھوتہ ہو گیا۔ انہیں نوبل صرف اس لئے عزیز تھا کہ وہ ان کے معاشی مفادات کا تحفظ کرتا تھا۔ نوبل کے بغیر انہیں اقتصادی بحران کا خطرہ درپیش تھا اور وہ خود کو اتنا ہی غیر محفوظ سمجھتے تھے جتنا کوئی اندھا خود کو لاٹھی کے بغیر محسوس کرتا ہے۔

نازو نے بڑی ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سونے کے تمام زیورات کی پوٹلی آگے بڑھا دی "نوبل یہ سب چھین لینا چاہتا تھا۔ اس نے کل رات بھی چوری کرنی چاہی تھی۔"

سردار کی آنکھیں خالص سونے کے ڈھیر کو دیکھ کر چمک رہی تھیں۔ اس نے اپنے ولی عہد کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ولی عہد نے اسے نازو کی بات کا مطلب سمجھایا۔

"باپ صاحب بولتی نوبل چور نہیں ہوتی۔" سردار کے بیٹے نے کہا۔

"وہ چور بھی تھا اور ڈاکو بھی" میں نے برہمی سے کہا "اس زیور کے لئے وہ ہماری جان لینا چاہتا تھا۔"

سردار نے اپنے سپوت کی معرفت کہا "آخر تم لوگوں کے پاس اتنا سونا کہاں سے آیا؟"

میں نے جواب دیا "تمہیں یہ سوال پوچھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ یہ ہماری جائز ملکیت ہے۔"

اس نے کہا "تم اتنے امیر آدمی نہیں ہو۔ تم نے بھی یہ کسی سے چھینا ہوگا۔"

میں نے غصے کو پی کر کہا "اس بحث سے کیا حاصل ہوگا آخر؟ نوبل کی موت سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن تم لوگ سمجھتے ہو کہ تمہارا نقصان ہوا ہے تو ہم یہ زیور تمہیں دے سکتے ہیں۔"

www.paksociety.com

ولی عہد نے ہماری فراخدلانہ پیشکش سے سردار کو آگاہ کیا تو اس کی جذباتی کیفیت ایک دم بدل گئی۔ وہ نوبل کی موت پر جتنا مغموم اور مشتعل نظر آتا تھا اب اتنا ہی مطمئن اور مسرور نظر آنے لگا۔

"والد صاحب پوچھتے ہیں کہ یہ سب تم کس کو دو گے۔ سارے قبیلے کو؟"

میں نے کہا "والد صاحب کی خدمت میں عرض کرو کہ ہم یہ سب ان پر چھوڑتے ہیں۔ اس کی تقسیم وہ خود کریں۔ چاہیں تو سب اپنے پاس رکھیں۔ قبیلے کو کفن عطر دیں کہ نوبل کی مغفرت کے لئے دعا کی جائے کیوں کہ وہ گناہ گار اور دوزخی تھا۔ آدھا اپنے پاس رکھ کے باقی آدھا صاحب میں بانٹ دیں یا انصاف اور مساوات کے اصولوں کی پاسبانی مطلوب ہو تو سب کو برابر حصہ دیں۔"

ولی عہد نے جو صورت سے بھی اور ناتراشیدہ عقل لگتا تھا میری بات پر کافی دیر غور کیا اور مطلب سمجھ لینے کے بعد والد صاحب کو متن کا خلاصہ پیش کیا۔ والد صاحب کی بتیسی نظر آنے لگی اور انہوں نے سونے کے ڈھیر کو اپنے قبضے میں کر لیا۔

مہمانوں سے کہو کہ وہ بالکل فکر مند نہ ہوں۔ قبیلہ ہمارے

میں نے کہا "مجھے قبیلے کے نوجوانوں کا رویہ خاصا باغیانہ لگتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری حمایت کے جرم میں سردار کا تختہ الٹ جائے۔"

یہ بات سمجھنا ولی عہد کے لئے دشوار ثابت ہوا کہ تختہ کیسے الٹا جاتا ہے مگر اس کے والد صاحب کی ناقص عقل میں تو یہ بات ہی نہیں آئی کہ بغاوت کا علم کیوں اور کیسے بلند کیا جاتا ہے اور سرداری کے منصب پر ان کی وفات حسرت آیات کے بعد ولی عہد کے سوا کوئی دوسرا شخص کیسے فائز ہو سکتا ہے۔

غالب نے کہا۔ "یار ان کو سب سمجھانے کی کیا ضرورت ہے؟"

نازو نے کہا "سردار کی ضمانت کافی ہے۔"

میں نے کہا "میں ایک اندیشے کا اظہار کر رہا ہوں۔ ممکن ہے نوجوان' سرکش خون میں اطاعت کا موروثی جذبہ کمزور پڑ گیا ہو۔ جیسا کہ ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ غلام بھی اب سر اٹھا کے سوال کرتے ہیں اور اختلاف کا حق مانگتے ہیں۔ ساری دنیا میں....."

غالب نے کہا "دنیا کو گولی مارو۔ سردار سے صاف بات کر لو کہ یہ جرمانہ ہی نہیں' معاوضہ بھی ہے۔ وہ ہمیں بہ حفاظت یہاں سے نکالنے کا پابند ہو گا اور اگر کسی قسم کی بدعہدی ہوئی تو ہمیں ممکن ہے کہ قبیلے پر اس کے خاندان کی حکومت کا دور ختم ہو جائے اور رعایا جمہوری روایات کے مطابق اپنا سردار خود منتخب کرے۔"

"جہاں بھی بادشاہت اور آمریت ہو وہاں حکمراں موت سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا عوام کے جمہوری شعور سے ڈرتے ہیں۔" نازو نے ایک عظیم فلسفیانہ حقیقت بیان کی۔

میں دنگ رہ گیا "نازو! یہ اچانک تمہارے وجود میں کس کی روح حلول کر گئی ہے! ابراہم لنکن کی۔ یہ تم بول رہی تھیں؟"

غالب نے کہا "پتا نہیں کب کالج کی کسی تقریب میں کوئی تقریر کی ہو گی۔ اس کا ایک جملہ یاد رہ گیا۔"

خلاف توقع نازو نے برا ماننے کے بجائے مسکرا کے کہا "ایک رات بھر جاگ کے تقریر یاد کی تھی۔ بڑی مشکل سے۔ اور پھر یہ عین وقت پر گڑبڑا گئی تھی۔"

"کیا؟ مخالفت میں بولنا تھا اور موافقت میں دلائل دے رہی تھیں۔"

نازو نے جھینپ کر کہا "کچھ ویسا ہی ہوا تھا۔"

میں اور غالب ہنسنے لگے۔ سردار اور ان کا ہونہار بیٹا بے وقوفوں کی طرح دیکھتے رہے۔ ان کے لئے اس صورت حالات میں لطیفے جیسی کوئی بات نہ تھی کہ ہم نے پہلے بعد دیگرے تین قتل کر ڈالے تھے اور پھر ہنسی خوشی سونے کا ایک ڈھیر جرمانے کے طور پر پیش کر دیا تھا۔ جب کہ ہمارے لئے کشتوں کے پشتے لگا کے لاشوں سے اپنا راستہ بنانا بھی مشکل نہ تھا۔ ہم اپنے مجرم ثابت ہونے پر کہ ہم نے جرم کی سزا بھی رضاکارانہ طور پر قبول کی تھی۔ وہ بھی اپنی عدالت کے فیصلے پر۔

آخر کار تمام تصفیہ طلب امور پر اتفاق رائے ہو گیا اور سردار نے ہم سے معاہدہ کر لیا کہ وہ ہمیں اس لانچ تک پہنچا دے گا جو نوبل کی ملکیت تھی۔

"اب بولتی کہ ہم رات کو جاتی۔ کسی کو معلوم نہ ہوتی۔" ولی عہد نے کہا۔

"یعنی ہم خاموشی سے وہ لانچ لے کر فرار ہو جائیں۔ لیکن کچھ پتا نہ چلے؟" میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی "ہم آپ کو لے جاتی اور لانچ دکھاتی۔ لانچ چلاتی۔ واپس آتی۔"

میں نے سر ہلا کے کہا "اللہ آپ کو جزا دے گا مگر یہ بھی بتا دو کہ تم نے اور والد صاحب نے اس دولت کی تقسیم کے لئے کیا اصول وضع کیا ہے؟ مقتولین کے ورثاء کو بھی کچھ ملے گا یا نہیں؟"

غالب نے کہا "آخر آپ کیوں متفکر ہیں کہ ہمارے جانے کے بعد کیا ہو گا؟ حق اور انصاف کے معاملات پر غور مت فرمائیں۔ صرف اپنے بارے میں بات کریں۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "تم مجھے خود غرضی اور کمینگی سکھا رہے ہو دوست۔ مجھے اپنے جیسا بنانا چاہتے ہو۔"

"اس وقت یہ بقا کی جدوجہد ہے" غالب نے کہا "یہاں اصولی اخلاقیات پر کوئی مذاکرہ یا سیمینار نہیں ہو سکتا۔"

سردار سے مذاکرات ختم ہوئے تو صورت حال میں کچھ زرا سی تبدیلی رونما ہوئی۔ سردار نے پہلے تو ولی عہد کو زبانی ہدایات دے کر کہیں بھیجا۔ غالباً سونے کے زیورات کی پوٹلی کو چھپانے

لئے اور عوامی جذبات کا رخ بدلنے کے لئے سردار ایک کامیاب سیاست داں تھا اور اپنے ولی عہد کی تربیت اس طرح کر رہا تھا کہ بعد میں وہ عنان حکومت سنبھالے تو اتنا ہی بااختیار ہو جتنا صدر امریکا ہوتا ہے۔ فرق صرف برسر اقتدار آنے کے طریقے کا تھا لیکن سیاست کی بساط کے اصول وہی تھے۔ پیادے یہاں بھی آگے رہ کر مرتے تھے۔ وزیر سے قلعے تک سب شاہ کی حفاظت کرتے تھے اور شاہ کے لئے صرف مات تھی۔ موت نہیں۔

سردار نے بڑی عیاری سے اپنی رعایا کو یقین دلایا کہ نوبل درحقیقت ایک شیطان تھا جس نے فرشتے کا روپ دھار لیا تھا۔ سردار پہلے بھی جانتا تھا کہ نوبل کس طرح ان جاہل اور غریب انسانوں کی محنت' جان و مال اور عزت کی سوداگری سے اپنے ہوس کے خزانے بھرتا ہے مگر وہ خود اس کا شریک کار تھا چنانچہ نوبل کا کوئی جرم نہیں تھا مگر وہ نہیں رہا تو سردار نے اس کی لاش پر سیاست کی۔ اسے بدترین اخلاقی مجرم ثابت کر دیا اور اس کو قتل کرنے پر ہمیں نجات دہندہ کی حیثیت عطا کر دی۔

اس نے قبیلے کے لوگوں پر اپنی فصاحت سے جادو کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب جو کچھ دیر پہلے ہماری جان کے درپے تھے' ہماری عقیدت میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ ہمارے ہاتھ چومنے لگے اور پیر چھونے لگے۔ گل اور نازو نے بھی یہ تماشا بڑی حیرت بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ میں اور غالب' سردار کی ساحری اور قبیلے والوں کی سادگی پر حیرانی اور افسوس کے جذبات کا شکار رہے۔ حالانکہ جو تماشا اس چھوٹے سے دور افتادہ نیم وحشی قبیلے میں ہوا تھا' وہی ترقی یافتہ' مہذب اور بڑے ممالک کی سیاست میں بھی ہوتا تھا۔

نوبل کے اخلاقی جرائم کی نوعیت ایسی تھی کہ اس کے لئے بنیادی قوانین کے تحت دی جانے والی سخت ترین سزائیں بھی ناکافی تھیں۔ مگر ان دو نوجوانوں کا قصور اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ فرط جذبات میں وفاداری پر زندگی قربان کر بیٹھے تھے۔ اس کے باوجود انہیں کچھ نہ ملا۔ نہ کوئی شجاعت کا تمغہ' نہ وفاداری کا انعام' نہ ستائش اور نہ کوئی اعزاز۔ الٹا وہ مجرم کی حمایت کرنے والے ملعون اور بدبخت قرار دئیے گئے۔ قبیلے کی روایات کے مطابق انہیں آخری رسوم سے محروم کر کے ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا اور زمین برابر کر کے اس جگہ ایک کانٹے دار پودا لگا دیا گیا جس کے پھل کو چھونے سے بھی خارش ہو جاتی تھی۔ یہ گویا ان کی روح کے لئے بعد از مرگ آزار کا اہتمام تھا۔

نوبل کے بغیر اس کا ایوان صدارت خالی خالی اور سونا محسوس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی بدروح اچانک کسی گوشے سے سوار ہو جائے گی اور دیکھتے ہی دیکھتے حالات پھر پلٹا کھائیں گے تو قبیلہ ہمارے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔ قبیلے کے مظلوم و مجبور لوگ انسان سے زیادہ کٹھ پتلیاں تھے جو نوبل کے' سردار کے' ہمارے' مافوق الفطرت طاقتوں کے اور سفلی قوتوں کے اشاروں پر چلتے تھے

اور ان کی اطاعت کے جذبات کا رخ ایک سمت سے دوسری سمت اور پھر پہلی سمت میں ہو سکتا تھا۔

شام تک ہم نے عجیب سی اعصابی بے کلی میں وقت گزارا۔ گل اور نازو سونے کی کوشش کرتی رہیں یا خاموش بیٹھی خلا میں گھورتی رہیں' میں اور غالب باری باری پہرا دیتے رہے اور کسی نامعلوم خطرے سے مقابلے کے لئے مستعد رہے۔ میرا دل سکون سے محروم تھا اور تحفظ کا وقتی احساس میرے اطمینان کو خود فریبی کی طرح لگتا تھا۔

شام کے سائے ڈھلنے لگے۔ کھانے کی خواہش کا اظہار کسی نے بھی نہیں کیا تھا ورنہ وہاں سب کچھ میسر تھا۔
میں نے کہا "گل بانو! اتنی اداسی کس لئے؟"

وہ زبردستی مسکرائی "خوش ہونے کی بھی تو کوئی بات نہیں سکندر بھائی۔"

"خوشی کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ خوشی خیالوں کے سمندر کا موتی ہے" میں نے کہا "جیسے ہر سمندر میں ہر جگہ موتی نہیں ملتے ایسے ہی سب خیال خوشی نہیں دیتے مگر تم چاہو تو اداس کرنے والے خیالوں اور مایوسی کے سمندروں سے دور رہ سکتی ہو۔"

www.paksociety.com

"صرف میں....؟"
"نہیں۔ ہم سب.... مگر بات وہی ہے کہ گزرے ہوئے کل کو مت یاد کرو۔ آنے والے کل کے سنہرے سپنے دیکھو۔ خوش آئند مستقبل کی توقعات کا دامن امید سے اور امید کا یقین سے باندھو۔ خوب صورت خواب آنکھوں میں بسالو۔"
"اور کل جب آنکھ کھلے۔ اور تلخ حقیقت کا سامنا ہو؟" نازو نے کہا۔
غالب نے ہنس کے کہا "بابا! کل اگر نصیب میں رونا ہے تو پھر کل رو لیں گے۔ آج ہی سے رونی صورت بنا کے کیا لے گا۔ آج کی بھولی ہنسی بھی بہتر ہے۔"
میں نے کہا "نازو بی بی! چلو تم کچھ ثواب کماؤ۔ بزرگوں کی خدمت کرو۔ کافی بنا کے لاؤ۔"
گل مسکرائی "یہ بزرگی کا دعویٰ کیوں۔ کافی تو ویسے بھی مل جاتی۔"
غالب نے کہا۔ "بڑے تو ہم ہیں تم دونوں سے۔ پس تمہارے بزرگ ہوئے۔"
"ایسے بزرگوں کی تو خدمت نہیں، ابھی خاطر تواضع کرنی چاہئے" نازو نے اٹھے بغیر کہا "کبھی مربی بن کے حکم چلاتے ہیں کبھی بزرگ بن کے خدمت کراتے ہیں۔ چلو جاؤ خود کرو اپنا کام۔"
"کر لیں گے۔ تم کیا سمجھتی ہو، ہم محتاج ہیں تمہارے" غالب نے اٹھتے ہوئے کہا "تمہیں کیا پکیں ہے۔"
"پکیں پکیں تمہیں کیا ہے۔"
"ہم تو کل بھی کسی کے سرتاج 'مجازی خدا' وغیرہ ہوں گے۔ تم ہی رہو گی پاؤں کی جوتی۔ کنیز اور خادمہ۔ ہمارا کیا ہے بابا۔ چار رکھ سکتے ہیں" غالب نے دوسرے کمرے سے کہا
"ہاں۔ ہاں۔ رکھ لینا۔ مجھے کیا سناتے ہو۔ چاروں کی غلامی کرنا۔ سب کے جوتے کھانا۔" نازو نے چلا کے کہا۔ "ہر ایک کے ہوں بارہ بچے تو اڑتالیس کو سنبھالنا۔"
"اڑتالیس کیوں؟ باقی بچوں کی ہوگی۔ تم کر سکتی ہو؟ آتی ہیں ہمارا مقابلہ کرنے" غالب نے بھی چلا کے جواب دیا۔
گل کو بے اختیار ہنسی آئی۔ اس سے پہلے کہ نازو مزید گل افشانی کرتی، غالب نے ایک چیخ ماری۔ میرا خیال تھا کہ اس کا ہاتھ جل گیا ہو گا یا کوئی ایسی ہی بات ہوگی۔ میرے ساتھ نازو نے بھی دوڑ لگائی۔ لیکن غالب مزے سے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔
"یہ کیا حرکت فرمائی تھی؟" نازو نے کہا۔
"ایک کاکروچ آ گیا تھا" غالب نے کہا
"کاکروچ دیکھ کے ایسے چیخ مارتے ہیں؟"
"پھر کیسے چیخ مارتے ہیں؟" غالب بولا "ہم نے تو کبھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ آپ نے چھپکلی دیکھ کے ایسی چیخ کیوں ماری یا ویسی چیخ کیوں ماری۔ اور مجھے کاکروچ دیکھے بغیر بھی چیخ مارنے کا حق حاصل ہے۔ یوں۔" اس نے ایک اور چیخ ماری۔
باہر سے کسی نے بدحواسی میں چلا کے کہا "کیا ہوا؟ تم کاہے کو چلائی؟"
میں نے وہیں جا کے دیکھا تو سردار کا بیٹا ہونق صورت بنا کھڑا تھا "فکر کی کوئی بات نہیں۔"
اس نے اطمینان کا سانس لیا "ہم سمجھی سانپ کاٹ لیا ہمارا باپ صاحب ادھر آئی۔"
میں نے کہا "تمہارا باپ.... سانپ۔ کیا کہہ رہے ہو؟"
وہ جھینپ کر بولا "ہم پوچھتی آپ سردار کو دیکھی؟"
میں نے کہا "نہیں۔ وہ تمہارے پیچھے ہی گیا تھا۔ اس کے بعد سے نظر نہیں آیا۔"
"ہم بہت دیکھتی۔ کہیں نظر نہیں آئی" وہ پریشانی سے سر ہلا کے بولا۔
نہ جانے کیوں مجھے شک ہوا کہ اس کی پریشانی مصنوعی اور سبب ہے۔ سردار کا دو تین گھنٹے نظر نہ آنا کوئی ایسی بات نہیں کہ وہ تشویش کا شکار ہو جائے۔ وہ ادھر ادھر کہیں بھی جا سکتا تھا۔ جنگل دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور ابھی رات نہیں ہوئی تھی کہ اس کے بارے میں فکر کی جائے۔
میں نے کہا "ہو سکتا ہے وہ کسی کام سے چلا گیا ہو۔"
"کام سے جائی؟" وہ چونکا۔
"ہاں۔ کیا سردار کبھی کسی کام سے نہیں جاتا؟"
غالب نے کہا "ممکن ہے وہ ہمارے ہی کام سے گیا ہو۔ دیکھنے کے لئے کہ نول کی کشتی اپنی جگہ پر ہے یا نہیں۔"
وہ مسکرانے لگا "آپ ٹھیک بولتی۔ وہ آپ کا کام کے جائی۔"
اس کے جانے کے بعد غالب نے مجھے کافی کا مگ تھما کے کہا "یہ نوجوان آخر کیا ہے! احمق سے زیادہ احمق یا عیار؟"
"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔"
"اس کی بدحواسی دیکھی تم نے؟"
"وہ بہت خوف زدہ سا لگتا تھا۔ مگر خوف کو چھپانے کی کوشش بھی کر رہا تھا" نازو نے کہا۔
"بہت عجیب لگا مجھے اس کا رویہ" میں نے کہا "وہ فرضی تھا۔"
رات کو وہ پھر ذرا سی دیر کے لئے نمودار ہوا تو پہلے سے زیادہ گھبرایا ہوا اور پریشان حال تھا۔
میں نے کہا "آپ کے والد ماجد کا کچھ پتا نشان ملا؟"
اس نے کہا "نہیں..... ہاں..... وہ جنگل میں جائی۔ اس کو سانپ کاٹی۔"
غالب بولا "کیا.... سردار کو سانپ نے کاٹ لیا؟"
میں نے کہا "سانپ زہریلا تھا؟ سردار کی حالت تو ٹھیک تھا؟"
اس نے پھر کہا "نہیں.... ہاں۔ ابھی ہم تم کو لے جاتی تھوڑی دیر رہو لی۔ ہم ابھی آئی۔"
اس کا رویہ اتنا پُراسرار اور مشکوک ہو گیا تھا کہ میں متفکر ہو گیا۔ وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی دبے پاؤں غائب ہو گیا۔ وہ ہمیں یہ بتانے آیا تھا کہ ہم تیار رہیں مگر خود ان سوالوں کا جواب دینے کے لئے تیار نہیں تھا جو میں نے اخلاقاً پوچھ لئے تھے۔ میرا مقصود نہ تفتیش تھا اور نہ مجھے سردار کی گمشدگی پر تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت تھی مگر سردار کے بیٹے نے بلا ارادہ انکار اور پھر اقرار سے میرے شکوک کو تقویت پہنچائی۔
"ہم جو یہ چکر کیا ہے؟" غالب کے ذہن میں بھی شاید وہی بات تھی جو میں سوچ رہا تھا "کیا ہوا ہے سردار کو؟"
"کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے" نازو نے کہا "سردار خیریت سے نہیں ہے۔"
"اس کا بیٹا ہم سے کیوں چھپا رہا ہے؟ کیونکہ مملکت کے سربراہ، ہم سیاسی یا کاروباری شخصیت کی علالت کو بعض اوقات مصلحتاً چھپایا جاتا ہے" میں نے کہا "ملک کے اندر اور باہر کی صورت حال کو دیکھا جاتا ہے۔ موت کے اعلان سے پیشتر بھی انتقالی امور اور سیاسی لائحہ عمل طے کر لئے جاتے ہیں۔ مگر ایک چھوٹے سے قبیلے کے سردار کی بیماری یا موت کو کیسے چھپایا جا سکتا ہے۔"
"اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ یہ تو ولی عہد کے لئے خوشی کی ہے کہ عزرائیل کی مدد سے وہ سرداری کے منصب پر فائز ہونے والا ہے۔ یا ہو چکا ہے" غالب نے کہا۔
"اتنی کم عمری میں قسمت نے اسے مرتبہ اور اختیار بخش دیا ورنہ باپ صاحب کا کیا تھا۔ سو سال زندہ رہتی تو ولی عہد صاحب اسی سال میں تخت نشین ہوتی۔"
"یا باپ صاحب سے پہلے ہی سردار بننے کی حسرت دل میں لئے دنیا سے جاتی" نازو نے کہا۔
"خیر ہمیں کیا" ہمارے جانے کے بعد کچھ بھی ہو۔ کوئی بھی سردار بنے" غالب بولا۔
"کہیں اس نے باپ صاحب کو قتل تو نہیں کر دیا؟" نازو نے اچانک کہا۔
میں نے کہا "یہ خیال کیسے آیا تمہیں مس نازو۔ اور کیوں؟"
"خیال پر کوئی قدغن نہیں۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میرا خیال بے سروپا اور بے بنیاد ہے۔"
میں نے اس سے اتفاق کیا "ولی عہد کے رویے کو دیکھتے ہوئے میں تمہارے خیال کو منطقی سوچ کا نتیجہ قرار دے سکتا ہوں۔"
گل نے نازو سے کہا۔ "آخر بیٹا کیوں قتل کرے گا؟"
غالب ہنسے "تم بہت بھولی ہو گل بانو۔ تخت و تاج اور زمین کے سبب ہر دور اور ہر زمانے میں موجود رہے ہیں اور ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے خود ایک سبب فراہم کر دیا تھا۔ وہ اتنا موٹا تھا کہ اس کے لئے مہذب اور دولت مند بیٹے بھی خون کے رشتوں کا خون کر سکتے ہیں۔"
گل نے سر ہلایا "شاید ایسا ہی ہو۔"
"لالچ کا یہ ہتھیار خود ہم نے اسے دیا تھا" نازو بولی۔
"ہتھیار خود کسی کو قتل نہیں کرتا" غالب نے برہمی سے کہا۔ "کوئی انسان کی جان نہیں لیتی، انسان لیتا ہے۔ ارادہ اس کے ذہن میں جنم لیتا ہے پھر اس کا ہاتھ ریوالور اٹھاتا ہے۔"
میں نے کہا "کیا قبیلے والے اتنے بے وقوف ہیں سب کہ سردار کے قتل پر خاموش رہیں گے؟ اس کی موت کو طبعی سمجھ کے قبول کر لیں گے؟ ولی عہد پر کوئی شک نہیں کرے گا؟"
"چھپانا تو ممکن ہے۔" نازو بولی۔
غالب نے جھنجلا کے کہا "یہ کس الجھن اور بحث میں پڑ گئے ہیں ہم۔ نہ ہم اس قبیلے میں ہیں اور نہ ہمارا کوئی تعلق ان معاملات سے ہے۔ کچھ دیر میں ہم چلے جائیں گے اور سب بھول جائیں گے۔ پھر کیا فائدہ یہ سب سوچنے سے۔ ہمارے لئے اتنا کافی ہونا چاہئے کہ بخیر و عافیت یہاں سے نکل جائیں اور کلکتہ پہنچ جائیں۔"
"اور پھر ڈھاکا" گل نے کہا۔
میں نے کہا "اور پھر لاہور۔"
"ہم سب کو اپنی منزل مراد کو نظر میں رکھنا چاہئے" غالب نے کہا۔
"شاد باد منزل مراد۔ ہاں۔ میرا وطن" میں نے سوچا "میرا گھر۔ میری محبت۔ ان سب کے سوا مجھے اب کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہئے۔ دنیا کے بکھیڑے بہت لمبے ہیں" کاروبار حیات میں الجھاؤ بہت ہیں اور فرصت زندگی بہت کم ہے۔ میری زندگی کا ہر لمحہ گریزاں تقاضا کرتا ہے کہ میں اپنی سوچ اور اپنی محبت کو اپنی استطاعت کی حد تک سمیٹ لوں۔ سارے جہاں کے درد کے لئے میرا جگر ہی کیوں۔ اور غم جہاں سے آگے فکر دو جہاں ہے۔ کائنات کی لامحدود وسعت ہے۔ ستاروں پہ کمند ڈالنے کے لئے تو عمر خضر بھی کم ہے مگر وہ تو میری تقدیر کا ستارہ ہے۔ وہ مجھے بلاتا ہے۔ کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے۔ کہیں تو قافلۂ صبح و شام رک جائے
میرے منتشر، بے سمت خیالوں کا سفر یکلخت ختم ہو گیا۔ سردار کے بیٹے نے اندر آ کے کہا "ابھی سب چلتی۔"
میں نے گل اور نازو کی طرف دیکھا "کیا خیال ہے چلیں؟"
"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" گل نے کہا۔
"پوچھا اس لئے کہ شاید تمہیں تیاری کرنی ہو۔"
"کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں۔" غالب نے اٹھ کے اپنی بیلٹ ٹائٹ کی۔
"کیا ہم اسی لباس میں جائیں گے؟" میں نے سردار کے بیٹے سے سوال کیا۔

www.paksociety.com

اس نے کچھ دیر سوچ کے نفی میں سر ہلایا "آپ امیر نظر آتی' راستے میں خطرہ ہوتی۔ کوئی لوٹ لیتی۔"

"ہم غریب کیسے نظر آتی؟" غالب نے کہا۔

ولی عہد نے ہمیں مفید مشوروں سے نوازا اور کہا کہ اگر ہم تلاش کریں تو ہمیں اسی گھر میں ایسے کپڑے مل جائیں گے جن میں ہم اجنبی نہیں لگیں گے۔

"چیف کے تو" غالب نے کہا "کیا یہ ہمیں مشورہ دے رہا ہے کہ ہم بھی صرف جنبی لنگی کا فیشن اختیار کر لیں؟"

"جنبی لنگی" گل ہنسنے لگی۔

"ہاں۔ لنگی کمر سے کم ٹخنوں تک پہنچتی ہے۔ یہاں کمر سے شروع ہو کے گھٹنوں سے پہلے ختم ہو جاتی ہے۔" غالب نے کہا۔

"سنگل پیس سوٹ۔"

"کیا خرابی ہے اس میں؟ نارزن بھی تو ایسے ہی سوٹ پہنتا ہے اور بہت اسمارٹ نظر آتا ہے۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "مگر غالب اور نارزن میں بہت فرق ہے۔"

"چلو میں نہیں لوں گا جنبی لنگی۔ یہ بھی پہن سکتی ہیں یہاں کے فیشن کی جنبی ساری۔ جس میں بلاؤز نہیں ہوتا" غالب نے کہا۔

نازو نے جھینپ کے کہا "فضول باتیں مت کرو۔"

گل نے مسکرا کے اپنی ریشمی ساری کو دیکھا "اس کی جگہ سوتی ساری البتہ باندھی جا سکتی ہے۔"

"ہمیں چاند نکلنے سے پہلے نکل جانا چاہئے" میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا "ابھی اندھیرا ہوتی۔"

"ہمیں چوروں کی طرح تاریکی میں چھپ کر فرار ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" غالب نے کہا۔

"کیا ہر بات پر اختلاف بحث اور جرح کرنا لازمی ہے؟" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ آدمی کو معلوم ہونا چاہئے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے کیوں کر رہا ہے" غالب نے متانت سے کہا۔

میں نے کہا "اصولی طور پر یہ ٹھیک ہے مگر عملاً ہمارے پاس ہر مسئلے پر غور کرنے کے لئے وقت نہیں ہے' اس لئے فوراً تیار ہو جاؤ۔ یہ فیصلہ خود کرو کہ ہمیں کیسا نظر آنا چاہئے۔ یہ میرا حکم ہے۔"

دس منٹ بعد سب اس حکم کی تعمیل کر چکے تھے اور ہمارے حلئے اس حد تک اطمینان بخش ہو گئے تھے کہ سردار کے بیٹے نے سر ہلا کے اطمینان کا اظہار کیا۔ ہمارا اسباب مختصر دو میلی چادروں کی گٹھری پر مشتمل رہ گیا تھا۔ یہ گٹھریاں میں نے اور غالب نے اٹھا رکھی تھیں اور یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ ان گٹھریوں میں لاکھوں روپے نقد اور خطرناک اسلحہ ہو گا۔ ہم نے وہ کپڑے اوپر رکھ لئے تھے جو ابھی اتارے تھے۔ کلکتہ پہنچ کر ہم پھر معزز اور شریفانہ حلیہ اختیار کر سکتے تھے۔ گل اور نازو کے پاس بھی چھوٹی چھوٹی گٹھریاں تھیں مگر ان میں باسکٹ تھے اور کچھ زیورا[illegible] ہم نواب کے ویران گھر کے عقبی حصے کو عبور کر کے باہر سے گزرے۔ سردار کا بیٹا آگے آگے تھا اور بہت تیز[illegible] رہا تھا۔ گل اور نازو کے لئے اس تیز رفتاری کا ساتھ دینا[illegible] تھا۔ چنانچہ ہم بھی بار بار رکنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ایک[illegible] یہ بھی تھی کہ ہم سب نے چپل پہن رکھے تھے اور ہمارے سالار کا اصرار تھا کہ آواز نہ پیدا ہو۔ ایک بار تو اس نے مطالبہ کیا کہ ہم چپل اتار کے ہاتھوں میں پکڑ لیں اور اس[illegible] ننگے پیر چلیں مگر گل اور نازو نے پہلے ہی میں نے اور غالب[illegible] مطالبے کو مسترد کر دیا۔ سردار کا بیٹا اسی جنگل میں پلا بڑھا[illegible] اس کی عمر گزری تھی اسی دشت کی سیاحی میں۔ اس کے پاؤ[illegible] کی سختی' کنکر پتھر' گھاس پھونس اور کانٹوں کی چبھن سے نا[illegible] اور اتنے سخت ہو چکے تھے کہ پیروں کے تلوے بالکل جو[illegible] سول بن گئے تھے۔ ہمارے پاؤں اس راستے پر چالیس قدم[illegible] لہولہان ہو جاتے۔ ان کیڑوں کوڑوں یا سانپ بچھو کے[illegible] خوف الگ تھا جو رات کے وقت جنگل میں آزادانہ پھر رہے[illegible] قافلے کے لیڈر کو کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ اس[illegible] پاؤں زمین پر مارا اور جھٹکا اور کچھ نہ معلوم' نظر نہ آ[illegible] کیڑے مکوڑے کو گالی دی جس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا[illegible] کسی چیز نے کاٹا ہو گا۔

جنگل بہت گھنا تھا اور اسی میں راستہ تلاش کرنے میں[illegible] کا تجربہ اور اس کی حیوانی جبلت کام آ رہی تھی۔ میرے[illegible] سامنے چھوٹے بڑے درختوں کی تاریک دیوار کے سوا کچھ[illegible] اندھیرے میں زمین پر کسی پگڈنڈی کے آثار بھی نظر نہ آتے[illegible] ایک جگہ میں نے اس کو روکا۔ "ذرا آہستہ چلو۔ [illegible] رہ گئی ہیں۔"

اس نے رک کے اپنا توازن ایک پاؤں پر قائم[illegible] دوسرے پیر کی ایڑی سے کوئی کانٹا نوچ لیا۔ نہ جانے کتنی[illegible] اس کانٹے کی اذیت کو برداشت کرتے ہوئے چل رہا تھا۔ میں نے کہا "تم کو ڈر نہیں لگتا کہ کوئی زہریلا جانور[illegible] گا؟"

اس نے دانت نکالے "سانپ کاٹتی۔ بچھو کاٹتی۔"

"سانپ بچھو کاٹتے رہتے ہیں؟" میں نے حیران ہو[illegible]

وہ پھر ہنس پڑا "بوہت کاٹتی۔ اب زہر اثر نہیں کرتی۔"

میں نے کہا "یہاں زہریلے سانپ ہوتے ہیں؟"

اس نے سر ہلایا "بوہت۔ ابھی ہم دیکھتی۔ تم کو دکھا[illegible]"

میں نے جلدی سے کہا "نہیں۔ بڑی مہربانی۔ تم تو[illegible] ہمیں مت دکھاؤ۔"

"سانپ آدمی سے ڈرتی۔ اس پر پاؤں رکھتی تو کا[illegible]" بولا۔ "تم بچ کر چلتی۔"

میں نے کہا "مجھے سانپ نظر آئے گا تو بچ کے چلوں گا نا۔ ان سانپ بغیر ہیڈلائٹ کے پھرتے ہوں گے۔ اندھیرے میں کالا سانپ کون دیکھ سکتا ہے۔"

اس نے ایک دم جھک کے ایک سانپ کی دُم پکڑ لی اور اسے نیچے سے اوپر اٹھا لیا "ہم دیکھتی۔"

گل اور نازو نے ایک چیخ ماری۔ وہ ہم سے چند قدم ہی پیچھے تھیں۔ سانپ کو سردار کے بہادر بیٹے کے ہاتھ میں لہراتا ہوا دیکھ کے میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ ان کا دہشت زدہ ہونا جائز تھا۔

غالب نے کہا "یہ کیا حرکت ہے؟"

"یہ سانپ ہے" اس نے گویا غالب کی لاعلمی پر افسوس کا اظہار کیا اور پھر سانپ کو گھما کے پھینک دیا۔

ظاہر ہے اس کے بعد گل اور نازو کی رفتار میں مزید کمی واقع ہوئی۔ وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہی تھیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے نیچے دیکھنے کی ناکام کوشش میں بار بار رک جاتی تھیں۔ اب اور میں بھی کم خوف زدہ نہ تھے مگر مجبور تھے کہ بے خوفی کا اظہار کریں اور ان کا حوصلہ بڑھائیں۔ گھاس کا پتا بھی سرسراتا تو کبھی گل چیخ مارتی تھی' کبھی نازو۔ پیر کے نیچے کنکر بھی آتا تو وہ اچھل پڑتی تھی۔

غالب نے ان کے ذہن سے خوف دور کرنے کے لئے دوسری بحث شروع کر دی "ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ اس ڈر کا۔"

"کیا مطلب۔ کیسا ناجائز فائدہ؟" نازو نے کہا۔

"اس بہانے تم بار بار میرے زیادہ قریب آنے کی کوشش رہی ہو۔ ایسی حرکت میں کرتا تو تم فوراً الزام لگاتیں۔"

"بے ہودہ کہیں کے۔ تم الزام نہیں لگا رہے ہو؟"

"میں حقیقت بیان کر رہا ہوں" غالب نے کہا "اندھیرے کا مطلب یہ نہیں کہ سب اندھے ہو گئے ہیں۔"

"غالب! کچھ شرم کرو۔" نازو بگڑ کے چلائی۔

"شرم میں کروں۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ جو کچھ تم کر رہی اس پر میں پانی پانی ہو رہا ہوں۔"

اس کے بعد یہ ہوا کہ نازو اپنا ڈر' خوف بھول گئی اور مشتعل ہو کے اس نے ایک دم غالب کو اٹھا لیا۔ دوسرے ہی لمحے غالب ہوا میں اڑتا ہوا ہمارے قافلہ سالار پر گرا۔ پھر وہ دونوں نیچے رہے۔ غالب تو خیر کپڑے جھاڑ کے کھڑا ہو گیا مگر سردار کے بیٹے پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ نازو کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اچانک اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔

"تمہارا۔۔۔ عورت تم کو مارتی؟" وہ اپنی حیرت پر قابو پا کے بولا۔

"کیا تمہاری عورت تمہیں نہیں مارتی؟ کمال ہے!" غالب نے بھی حیران ہو کے کہا "اس کا مطلب ہے وہ تم سے محبت نہیں کرتی۔"

اس کی حیرت مزید بڑھ گئی "جو عورت محبت کرتی وہ مارتی؟"

غالب نے آہ بھر کے کہا "جان لے لیتی ہے میاں یہ محبت تو۔ اور عشق میں کیا نہیں ہوتا۔ اب چلو۔ میں تمہیں قیس اور کوہ کن کے بارے میں بتاتا ہوں کہ وہ کیسے مارے گئے۔ غالب کا ایک شعر ہے۔۔۔۔۔"

ظاہر ہے ہمارا لیڈر دم بخود وہ سب سننے پر مجبور تھا جو اس کی سات پشتوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ غالب کی باتوں پر مجھے بھی ہنسی آ رہی تھی۔ نازو اور گل کا تو ہنس ہنس کر برا حال تھا۔ غالب کی زبان بے لگام ہو گئی تھی اور وہ جو منہ میں آ رہا تھا کہتا جا رہا تھا۔ درمیان میں وہ کبھی اچانک اپنے مخاطب سے کوئی سوال کر بیٹھتا تھا یا کوئی فرمائش کہ تمہیں معلوم ہے شیکسپیئر میٹرک پاس بھی نہیں تھا۔ اچھا نہیں معلوم۔ تو شیخ سعدی کا کوئی شعر سناؤ۔ اس نے اپنا ایک خواب بیان کیا (ظاہر ہے اس میں نازو کا بہت اہم کردار تھا) اور ایک خاندانی شجاعت کا واقعہ جس میں اس کے پردادا کی ایک آدم خور شیر سے پنجہ آزمائی کا ذکر تھا۔ جب شیر ہار گیا تو غائب ہو گیا۔

"غائب ہو گئی؟ کیوں؟"

"شرم کے مارے۔ دراصل وہ ایک بھوت تھا" غالب بولا۔

"بھوت کون ہوتی؟"

"بھوت۔ ایک تو میرا سسر ہے۔ نادر ان لا بلکہ آؤٹ لا" غالب نے کہا۔

غالب اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ جنگل کا باقی راستہ ہنسی کھیل میں کٹ گیا تھا اور خوف جو سب کے اعصاب پر سوار تھا' ایسے ختم ہو گیا جیسے کسی عامل کے عمل سے جن اتر جاتا ہے۔ دریائے برگردون رادی۔ یہ تماشا میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

دریا یوں ہمارے سامنے آیا کہ ایک لمحے کے لئے ہم سب حیران رہ گئے۔ گھنے درختوں کا پردہ ہٹتے ہی ہم نے گدلے پانی کی دھندلی چمک دیکھی اور لہروں میں چاندنی کو جھلمل کرتا دیکھا۔ دریا کی روانی میں بڑا سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دریا خوابیدہ ہے اور نیند سے بوجھل دھارا آنکھیں موندے بہہ رہا ہے۔

دریا کے کنارے' پانی کے اوپر قوس کی شکل میں جھکے ہوئے درخت کے ساتھ ایک کشتی بندھی ہوئی تھی۔ دیکھنے میں یہ بہت چھوٹی کشتی لگتی تھی مگر ہم قریب پہنچے تو اس کے ایک کنارے پر لگا ہوا چھوٹا سا انجن بھی نظر آ گیا۔ یہ موٹر بوٹ تھی جس میں چھ سے آٹھ افراد بہ آسانی سفر کر سکتے تھے۔

میں نے پہلے کشتی میں چھلانگ لگائی اور اپنا توازن قائم کر کے کھڑا ہو گیا۔ غالب نے باری باری گل کو اور نازو کو ایک ہاتھ سے سہارا دے کر آگے بڑھایا۔ انہوں نے ڈرتے اور جھجکتے جھجکتے دوسرا ہاتھ میری طرف بڑھایا تو میں نے انہیں کھینچ لیا۔

www.paksociety.com

نازو کی حالت دیکھ کے مجھے ہنسی آ گئی "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کانپ کیوں رہی ہو؟"

"مجھے بہت ڈر لگتا ہے پانی سے۔"

"پہلے بھی تم ایک بحری جہاز پر رہی ہو۔"

"وہ بحری جہاز نہیں ہے۔ ڈوبنے والی کشتی ہے۔ دیکھو کیسے ڈول رہی ہے" نازو نے کہا۔

گل نے گھبرا کے کہا "یہ کشتی ڈوب جائے گی؟"

غالب نے جب لگائی تو کشتی کا توازن پھر بگڑا۔ نازو نے اور گل نے ایک ساتھ شور مچایا "دماغ خراب ہے کیا۔ ڈبو دو گے سب کو۔"

"ڈوبیں گے تمہیں تمہارے اعمال۔" غالب ہنس کے بولا۔ "اور جناب یہ تو ہے پانی۔ ہمیں تو آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔ تمہارے ساتھ۔"

"تم ڈوبو شوق سے۔ چلو بھر پانی کافی نہیں تو یہاں موقع ہے۔" نازو نے کہا۔

"اس پر بھی غور کیا ہے کہ ہم جو ڈوبیں گے صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے سوچیے تمہارے ساتھ ڈوبنے سے زیادہ تیرنے میں مزا ہے۔ اپنے گھر میں ایک سوئمنگ پول بنوائیں گے اور جب ایسی ہی چاندنی رات ہوگی نا......"

"غالب ابھی پھینک دوں گی پانی میں۔"

"ذرا پھینک کے دکھاؤ۔ ساتھ لے کر نہ جاؤں تو غالب نام نہیں۔" غالب نے ڈھٹائی سے کہا۔

اسی وقت ہمیں یہاں تک لانے والے جوان لڑکے نے ساحل سے ایک سوٹ کیس اٹھا کے کشتی میں رکھا۔ پھر ایک پوٹلی اٹھا کے لایا۔ پوٹلی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری تو میں نے اسے بری طرح بدحواس ہو کے چونکتے ہوئے دیکھا۔ وہ یوں میری طرف پلٹ کے دیکھ رہا تھا جیسے رنگے ہاتھوں چوری کرتے ہوئے پکڑا جانے والا دیکھتا ہے۔ بظاہر ایسی کوئی بات نہ تھی مگر میرے ذہن میں نئے شکوک پیدا ہونے لگے۔ اس کا پراسرار رویہ کسی مجرمانہ خوف کا غماز تھا۔

"ابھی...... ہم چلتی۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے کہا۔ "چابی...... چابی......"

"کیسی چابی؟ یہ انجن اسٹارٹ کرنے کیلئے کسی چابی کی ضرورت پڑتی ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور بدحواسی سے اپنی واسکٹ کی ہر جیب دیکھنے لگا۔ میں نے غور کیا تو مجھے موٹر بوٹ کے ساتھ خشک زنجیر نظر آئی جو پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور زنگ لگنے کے باعث گدلے پانی میں دکھائی بھی نہ دیتی تھی۔ اس زنجیر کا ایک حصہ کشتی کے ساتھ ویلڈ کر دیا گیا تھا اور دوسرا حصہ درخت کے قریب شاید کسی کھونٹے میں لگا ہوا تھا یا اس کے تنے پر لپیٹ دیا گیا تھا۔ چابی اس تالے کی تھی

جو کنارے پر زنجیر کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ نوبل نے کشتی کا تحفظ کے لئے صحیح انتظام کیا تھا۔

"چابی گر گئی۔ اب کیا ہو گی۔" وہ سخت پریشان ہو کے بولا۔

"تالا توڑ دو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"اتنا بڑا تالا ہوتی۔" اس نے اپنے ہاتھ کی مٹھی دکھا کر کہا۔ "اف...... ہم اب مر جاتی۔"

میں نے کہا۔ "ابھی چابی گر گئی ہے تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ زنجیر توڑ دو۔ اکھاڑ لو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ دیکھتی۔ کتنا موٹا زنجیر ہم اس کو......"

اچانک وہ خاموش ہو گیا اور ایک ہاتھ کان پر رکھ کے کچھ سننے لگا۔ اس کی صورت پر وحشت اور دیوانگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔

"آپ کچھ کرتی۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "وہ سب آ جاتی۔ ہم کو مارتی۔ آپ کو مارتی۔"

"کون؟" میں نے کہا۔

"آپ سنتی؟ ادھر سے آواز آتی۔ یہ ظالم لوگ ہوتی۔"

میں نے رات کی خاموشی میں آوازوں کا ایک شور سنا جو آہستہ آہستہ واضح ہونے لگا تھا۔ "یہ...... تمہارے قبیلے کے ہیں۔"

"ہاں۔ یہ ہم کو مارتی۔ تم کو مارتی؟" وہ رونے پر آ گیا اور ہاتھ جوڑنے لگا۔ "ادھر سے نہیں جاتی تو مرتی۔"

گل اور نازو کے علاوہ غالب کو بھی اس شور نے متوجہ کیا تھا۔ یہ کسی غول بیابانی کے چیخنے چلانے کی آوازیں تھیں جو قریب آ رہی تھیں اور ان کی پراشتعال صداؤں میں غصہ تھا۔

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تمہارا قبیلہ کیسے تمہارے پیچھے آ گیا؟" غالب نے کہا۔

"کیسے کی بات نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیوں؟ کیا اعتراض ہے ان کو ہمارے جانے پر؟ ہم ان کے قیدی تو نہیں تھے۔ اور اس نے ہماری مدد کی ہے تو کوئی جرم نہیں کیا۔ تمہارے باپ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں کلکتہ پہنچا دے گا۔ اس سے پہلے نوبل نے بھی وعدہ کیا تھا۔ اب کون سی ایسی بات ہو گئی ہے؟"

"آپ جلدی کرتی۔ خدا کا واسطے۔ زنجیر توڑتی۔ ورنہ آپ سب مرتی۔" وہ میرے قدموں میں گر گیا اور زار و قطار رونے لگا۔

"کیا حول ولا قوۃ۔ یہ کیا کر رہے ہو تم؟" میں نے کہا۔

غالب نے کہا۔ "یہ اس سے بعد میں پوچھیں گے۔ سوال یہ ہے۔ تم زنجیر توڑو۔"

"کیسے توڑوں یار؟ اتنی موٹی رسی ہوتی تو بھی مشکل تھا" غالب نے کہا۔ "گولی مار کے توڑو۔ میں کب کہہ رہا

لیا ہاتھوں سے توڑو۔ جلدی کرو۔ وہ وحشی قریب آ گئے ہیں۔"

میں نے ریوالور نکالا۔ "فائر کی آواز پر وہ سیدھے ادھر آ جائیں گے۔"

"وہ ویسے بھی سیدھے ادھر ہی آ رہے ہیں۔" نازو نے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ ہم بیچ میں مارے جائیں۔"

گل نے تو چیختے ہوئے کہا۔ "بھنا یہ تو فرقہ ہے" اس سے تو بے چارہ ہو جاتا ہے۔"

میں نے نشانہ لے کر فائر کیا اور زنجیر اس جگہ سے الگ ہو گئی جہاں اسے کشتی کے ساتھ ویلڈ کیا گیا تھا۔ شور اب بہت قریب سنائی دے رہا تھا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی درختوں کے آشیانوں میں خوابیدہ پرندے سہم کر اٹھے اور چیختے چلاتے فضا میں پرواز کرنے لگے۔

"اب کیا ہے بے وقوف؟ انجن اسٹارٹ کرو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "ورنہ ان کے زہریلے تیروں کا نشانہ بن جائیں گے سب۔"

"انجن...... ہم نہیں چلاتی۔" وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔

میں دوڑ کر انجن کی طرف گیا اور اس کی ڈوری پکڑ کر کھینچی۔ انجن خاموش رہا۔ میں نے پھر کوشش کی۔ بار بار کوشش کرنے سے سانس پھولنے لگا۔ ادھر ہماری جان کے دشمن لوگوں کا ہجوم سر پر پہنچا تھا۔ ادھر انجن اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

اچانک سردار کا بیٹا میری طرف بڑھا۔ "یہ لیتی۔" میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کی ہتھیلی پر اسپارک پلگ کی کیپ رکھی ہوئی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اس کے اسپارک پلگ کا پھاوڑہ چیز مٹھی میں دبائے کھڑا تھا جس کے بغیر انجن اسٹارٹ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات وہ خود بھی جانتا تھا ورنہ وہ کیپ ساتھ لے کر کیوں آتا۔ اب اتنا بھی وقت نہیں تھا کہ میں کیپ کو تار میں لگاؤں اور انجن کے اسپارک پلگ پر فٹ کروں۔ میں نے تار کو براہ راست پلگ سے جوڑا اور انجن اسٹارٹ ہو گیا۔

موٹر بوٹ مشکل سے بیس گز دور گئی ہوگی کہ قبیلے والے کنارے پر پہنچ گئے۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ پتھر پھینک رہے تھے اور تیر چلا رہے تھے۔ ہمارے آس پاس پانی میں کئی پتھر گرے اور ایک تیر کشتی کی سائیڈ میں لگا۔ میں نے کشتی کے انجن کو رفتار دی اور اسے سیدھا رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

"سب اپنا سر جھکا کے لیٹ جاؤ۔" میں نے چلا کے کہا۔

"تم کشتی کو سنبھالو۔" غالب نے جواب دیا۔

یکلخت سردار کے بیٹے نے ایک بھیانک چیخ ماری "کیا ہوا؟" میں نے پلٹ کے دیکھا۔

"اس کے شانے میں تیر لگ گیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "رفتار بڑھاؤ۔ سوچ پانی میں اتر آئے ہیں۔"

نازو نے کہا۔ "وہ تیر کر ہم تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں"

میں نے کہا۔ "اتنا بدحواس کیوں ہو تم سب؟ ریوالور نکالو اور فائر کرو۔"

میرے ساتھ غالب نے اندھیرے میں نشانہ لے کر فائر کئے۔ کسی گولی کا تعاقب کرنے والوں کے لگنا محض اتفاق ہو سکتا تھا مگر ہم نے فائر جاری رکھے۔ پھر ہمارے ریوالور خالی ہو گئے اور ہم نے محسوس کیا کہ وہ شور بھی ختم ہو گیا ہے جو خون کے پیاسے لوگوں کی دیوانگی کا مظہر تھا۔ یہ عقدہ ابھی وا نہیں ہوا تھا کہ آخر ہم اچانک ان کی نظر میں پھر مجرم کیسے بن گئے تھے۔ سردار نے تو انہیں قائل کر لیا تھا کہ ہم نے نوبل کو مار کے ان پر احسان کیا تھا اور وہ اپنی احسان مندی کے جذبات کا اظہار بھی کر چکے تھے۔

جواب بھی ایک دم مجھ پر وحی کی طرح نازل ہوا۔ قبیلے والے ہمارے نہیں اس شخص کے دشمن ہو رہے تھے جو ان کے سردار کو قتل کر کے فرار ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہم تھے تو انہوں نے ہمیں بھی صف مجرماں میں شامل کر لیا تھا۔ ولی عہد بہادر اپنی سلطنت سے بلا وجہ تو فرار نہیں ہو رہے تھے۔ وہ ہمیں چھوڑنے نہیں آیا تھا" اپنا قبیلہ ہی ہمیشہ کے لئے چھوڑ آیا تھا۔ اسی لئے وہ خوف زدہ تھا کہ پکڑے جانے کی صورت میں اسے اپنے قبیلے کی سرداری نہیں سزائے موت ملتی۔

کشتی اب ساحل سے بہت دور آ چکی تھی۔ تعاقب کرنے والے بھی بہت پیچھے رہ گئے تھے اور ہم دریا کی روانی کے ساتھ ساتھ خاصی رفتار سے اپنی مسافت طے کر رہے تھے۔

سردار کا بیٹا بھی اب مطمئن اور پُراعتماد نظر آنے کی پوری کوشش کر رہا تھا مگر ہم سب کی نظروں کا مقابلہ کرنا اس کے لئے مشکل تھا۔

آخر کار میں نے کہا "تمہارا قبیلہ بہت پیچھے رہ گیا ہے" اب تم بتا سکتے ہو کہ وہ تمہاری جان کے دشمن کیوں ہو رہے تھے۔ یقیناً اس کی وجہ ہم نہیں تھے۔ ہم انہیں مل کے اور خدا حافظ کہہ کے آئے تو انہیں قطعی اعتراض نہ ہوتا۔ شاید وہ جلوس کی صورت میں ہمیں ساحل تک چھوڑنے آتے اور ان کے جذبات بالکل مختلف ہوتے۔"

سردار کے بیٹے نے فقط سر کو اثبات میں جنبش دی مگر زبان سے کچھ کہنے کے لئے اس کے پاس نہ الفاظ تھے اور نہ ہمت۔

غالب نے کہا "تم اس قبیلے کی سرداری کو لات مار کے نکل آئے ہو۔ اس قبیلے سے آئندہ بھی تمہارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔"

"یا ہو گا تو وہی جو مفرور قاتل کا مقتول کے لواحقین سے ہوتا ہے" میں نے کہا "تم کبھی لوٹ کر گئے تو وہ تمہیں اسی طرح جان سے مار ڈالیں گے۔ جیسے تم نے ان کے سردار کو مارا تھا۔"

اس کا رنگ فق ہو گیا "سردار کو...... سانپ کاٹا۔"

میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا بھرپور طمانچہ رسید کیا۔ "پھر قبیلے والے سانپ کے دشمن کیوں نہیں ہوئے؟ تمہارے

www.paksociety.com

تعاقب میں کیوں آئے؟ تم کو ڈسنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اسے سانپ نے کاٹا تھا تو کیا انہیں چھوڑنے کے بعد تم سردار کی جگہ لینے واپس جاؤ گے؟" غالب نے اسے پھر کھڑا کر دیا۔

میں نے اس کے دوسرا چانٹا مارا "کیا قبیلے والے اتنے بے وقوف ہیں کہ تم میں اور سانپ میں فرق ہی محسوس نہیں کر سکتے؟ تمہیں وہ سانپ سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہی سمجھتے ہیں۔ تم آستین کے سانپ ہو۔ انہیں اپنے سردار کی موت کا صدمہ ہے مگر تمہیں اپنے باپ کو مار کے پچھتاوا محسوس نہیں ہوتا۔"

وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی گرامر کے لحاظ سے مونث اردو میں اس نے اعتراف جرم کر لیا۔ اس نے کہا۔ "میں وہاں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنے باپ سے بھی نفرت تھی۔ جیسے وہ دوسروں کی عورتوں کو بیچ رہا تھا ایسے ہی وہ میری ماں کو بھی بیچ چکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم اسے کتنی دولت ملی تھی مگر مجھے اس دولت کا اندازہ ہے جو مجھ سے چھن گئی تھی۔ اس کو عورتوں کی کمی نہ تھی۔ ہر عورت اس کے لئے صرف عورت تھی مگر میری ماں کا بدل تو مجھے نہیں مل سکتا تھا۔ جس عورت نے مجھے جنم دیا تھا وہ کہیں کلکتہ میں اپنا جسم فروخت کر رہی تھی۔ شاید اب اس قابل بھی نہ رہی ہو کہ جسم بیچ کے پیٹ کی آگ بجھا سکے۔ جسم کی خوب صورتی کا خزانہ اگر مال غنیمت کی طرح خرچ کیا جائے اور اسے لوٹنے والے سیکڑوں ہزاروں ہوں تو وہ زیادہ دن ساتھ نہیں دیتا۔ میں دس سال کا تھا جب وہ چلی گئی تھی۔ آٹھ سال بعد میں تصور نہیں کر سکتا کہ وہ کس حال میں ہوگی۔ کوئی تن بیچا روح اور جسم کے ناسوروں سے گلتی سڑتی عورت۔ جو عورت کے نام پر کلنک کا ٹیکہ بھی سمجھی جاتی ہوگی، جس سے سب نفرت کرتے ہوں گے، دور دور رہتے ہوں گے۔ وہ بھی جو پانچ دس روپے میں اس کے جسم پر حق ملکیت حاصل کرنے آتے ہوں گے۔ پھر جب مال پرانا ہو گیا ہوگا تو بھاؤ گر گیا ہوگا۔ پرانی عورت۔ رعایتی ریٹ پر۔ کٹ پرائس سیل۔ تین روپے۔ دو روپے۔ اچھا ایک۔ اللہ کے نام پر آٹھ آنے۔ مگر ایسی ہی عورتیں ہوتی ہیں جن کے جسم غیروں سے ملنے والی شرمناک بیماریوں کو سمیٹتے ہیں اور یہی عورتیں اچھوت ہو جاتی ہیں۔ ان کے قریب جاتے ہوئے بھی لوگ منہ پر رومال رکھ لیتے ہیں۔ وہ سڑک کے کنارے کسی فٹ پاتھ پر پڑی رہتی ہیں۔ کسی کوڑے دان جیسی ریڑھی میں اپنے آتشک زدہ جسم کو داستان عبرت بنائے آنے جانے والوں سے رحم نہیں موت مانگتی رہتی ہیں مگر زندہ 'صحت مند' پاک صاف انسان انہیں سکے دے کر اللہ سے اور بھگوان سے ثواب اور نیکی 'رحم اور دیا' مانگتے ہیں کہ ان کا ایسا حال نہ ہو۔ جب میں یہ سب سوچتا ہوں تو میرا جسم اور میری روح انگاروں میں جلنے لگتے ہیں۔ میں نے بہت پہلے سوچ لیا تھا کہ پہلے میں اپنی ماں کو تلاش کروں گا اور جب وہ مل جائے گی تو اسے واپس اپنے باپ کے سامنے لاؤں گا پھر میں اپنی ماں کا انتقام لوں گا۔ اس کی نظروں کے سامنے۔ تاکہ کچھ قرار اسے بھی ملے۔ کلکتہ بہت بڑا شہر ہے۔ کہتے ہیں دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں سب سے زیادہ انسان رہتے ہیں۔ کئی بار میں نے یہ سوچا کہ اب آٹھ سال بعد میں اسے کیسے تلاش کروں گا اور کیسے پہچانوں گا مگر اس کا جواب پھر ایک ہی آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ خود مجھے نہ پہچانے اور میں اسے دیکھوں تو میرا دل خود پکار کے نہ کہے کہ یہی ہے وہ عورت جس کے وجود کا تو ایک حصہ ہے۔ جیسے چاند اس زمین کا حصہ ہے۔ وہ مجھے چاند ہی کہتی تھی۔ اگر میں چاند تھا تو وہ میری دھرتی ماں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں اسے تلاش بھی کر لوں گا اور پہچان بھی لوں گا۔ مجھے کسی مناسب وقت کا انتظار تھا۔ کلکتہ جیسے شہر میں مجھے مزدوری نہیں کرنی تھی۔ کوئی بھی کام نہیں کرنا تھا سوائے اپنی ماں کو تلاش کرنے کے۔ اگر میں صبح کسی مل یا کارخانے میں کام کرتا اور شام تک مزدوری کرتا تو میرے پاس سونے کے لئے رات کے آٹھ نو گھنٹے نکال کے کتنا وقت بچتا جس میں یہ کام ہوتا۔ نہیں۔ میں نے طے کیا تھا کہ صبح سے شام تک صرف ایک ہی کام کروں گا۔ رات کے اندھیرے میں صورتیں نظر نہیں آتیں۔ رات کو میں اس کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا تو پہچانتا کیسے۔ یہ صرف دن کے اجالے میں ہو جانے والا کام تھا۔ لیکن کلکتہ میں کام کئے بغیر کھائے بغیر کون رہ سکتا ہے۔ اس کام میں کئی مہینے بھی لگ سکتے تھے اور کئی سال بھی۔ اتنا عرصہ زندہ رہنے کے لئے میرے پاس بہت پیسہ ہونا ضروری تھا۔ یہ پیسہ مجھے اسی شخص سے وصول کرنا تھا جس نے میری ماں کے بدلے میں پیسہ لے کر اپنے خزانے میں جمع کیا تھا۔ نوبل شیطان اس کے ساتھ تھا اس لئے میں ڈرتا تھا۔ پیسہ چرانے کی جرأت دسترس میں تھا مگر میں سمجھتا تھا کہ نوبل سے چھپ کر میں کلکتہ کہیں بھی نہیں جا سکتا۔ وہ کسی نہ کسی ذریعے سے مجھے تلاش کر لے گا۔

"جب تم نے نوبل کو مار دیا اور اس کے ساتھ ہی میرے کو سونے کا ایک ڈھیر بھی دے دیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جس وقت کا انتظار کر رہا تھا وہ آگیا ہے اور خدا میرے ساتھ ہے۔ مددگار ہے۔ اس نے تمہیں میری مدد کے لئے بھیج دیا ہے۔ جب میرے باپ نے کہا کہ اس سونے کو میرے کمرے میں رکھ دو میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے وہ سونا دوسری جگہ چھپا دیا۔ باپ کے کمرے میں زمین کے نیچے ایک لوہے کا صندوق دفن ہے۔ اس میں بہت دولت ہے۔ لیکن اس کی چابی نوبل کے پاس تھی۔ خود نوبل بھی اپنا پیسہ اسی میں رکھتا تھا۔ کئی بار میں نے دیکھا کہ وہ اس صندوق کو بغیر چابی کے کھول رہا ہے۔ وہ اس پر کچھ پڑھتا تھا یا جادو کرتا تھا۔ وہ جھک کر اپنے ہاتھوں سے چھوتا تھا اور تالا کھل جاتا تھا (ظاہر ہے وہ نمبروں والے تالے کی بات کر رہا تھا جس کے کمبی نیشن کو سمجھنا اس کے لئے مشکل تھا)

"میں نے نوبل کی لاش کی تلاشی لی تھی مگر اس کے پاس مجھے کوئی چابی نہیں ملی ورنہ میں ان کا خزانہ خالی کر آتا۔ اب تو صرف وہی سونا اپنے ساتھ لایا ہوں جو تم نے اسے دیا تھا۔ یہ کم نہیں ہے۔ اس لئے میں مطمئن ہوں۔ میں اسے تھوڑا تھوڑا کر کے بیچوں گا تو شاید کئی سال چلے گا۔"

جب وہ خاموش ہوا تو خاموشی کا بڑا افسوس ناک وقفہ آیا۔ گل اور غالب کا دل اس کی داستان حیات سن کے پانی ہو گیا تھا اور یہ پانی ان کی آنکھوں میں اشک بن کے اتر آیا تھا۔ یہ مجھے بھی ہوا تھا اور سب کو بھی۔ وہ ایک بدبخت آدمی تھا جس کی ماں بک گئی تھی۔ وہ ان ہزاروں سے زیادہ بدبخت تھا جن کی مائیں مر جاتی ہیں۔ کئی لاکھ بدبخت تھا کہ اس کی زندگی کی تصویر عبرت اپنے تصور میں دیکھنا اور جینے پر مجبور تھا۔ اس تصور کو زندہ رکھنے پر مجبور تھا۔

آخر کار میں نے کہا "تم نے اپنے باپ کو کیسے مارا؟"

"اس کو مارنا کیا مشکل تھا" وہ بولا "جب وہ کمرے میں آیا اور اس نے صندوق کھول کے دیکھا تو اسے وہ سونا نظر نہیں آیا جو تم نے دیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا اور میں نے کہا کہ ہاں وہ سونا میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ میں نے اسے صندوق بند کرنے کی مہلت دے دی۔ وہ بہت بھاری اور مضبوط ہے۔ اس کا ڈھکن ہے جس پر وہ سانپ کی طرح کنڈلی مار کے سوتا تھا۔ اس نے صندوق بند کیا اور مجھے گالیاں دینے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی اور اس سے پوچھا کہ تو نے میری ماں کو کتنے میں بیچا تھا؟ اگر تو بتا دے گا تو میں تجھے چھوڑ دوں گا ورنہ تیرا آخری وقت ہوگا۔ جب اس نے میرے ارادے کو میری آنکھوں میں دیکھ لیا تو وہ ڈر گیا اور اس نے مجھے میری ماں کی قیمت بتا دی۔ معلوم ہے قیمت کیا تھی؟ صرف سوا سو روپے۔ سوا سو روپے میں کون بک سکتا ہے اپنی ماں کو۔ سوا سو نہیں 'سوا لاکھ' 'سوا کروڑ' میں بھی کوئی میری ماں لا کر دے سکتا ہے؟ ویسے تو ہر عورت ایک ماں ہوتی ہے مگر اپنی ماں ایک ہی ہوتی ہے۔ یہ سن کے میں نے اسے مار ڈالا۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں نے اسے تسلی دی "چلو اب جو ہونا تھا ہو چکا۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔"

میں نے کہا "لیکن ..... یہ بات دوسرے لوگوں کو کس نے بتائی کہ تم نے سردار کو مارا ہے؟"

اس نے اپنے آنسو پونچھے اور شانے پر ہاتھ رکھ کے کراہتے ہوئے کہا "وہ..... ایک لڑکی دیکھتی تھی۔ اس وقت جب ہم باہر نکلی۔ ہم اس کو بولی۔ ہم تمہارا ساتھ شادی کرے گی۔ تو وہ بھی خاموش رہتی۔"

"تم نے اس لڑکی سے شادی کرنے کا جھوٹا وعدہ کر لیا تھا جو عینی گواہ تھی۔" میں نے کہا "پھر جب تم وہاں سے بھاگ آئے تو اس نے تمہارا راز فاش کر دیا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"اب قبیلے کا سردار کون ہوگا؟" غالب بولا۔

"اپنا چاچا ہوتی۔ سردار کا چھوٹا بھائی۔"

گل نے کہا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"ہاں۔ یہ تو بہت پہلے پوچھنا چاہئے تھا انہیں" میں نے غالب کی طرف دیکھ کے کہا۔

"ماں چاند بولتی۔ چندو بولتی" وہ نقاہت سے ہانپنے لگا۔

اس کے شانے سے تیر تو کھینچ کر نکال دیا گیا تھا مگر زخم سے بہنے والا خون ابھی تک بند نہیں ہوا تھا حالانکہ بانو نے اس پر ایک ساری پھاڑ کے مضبوطی سے پٹی باندھ دی تھی۔ اب اس پر کمزوری غالب آ رہی تھی۔ شاید یہ بہت دیر بولنے کا نتیجہ بھی تھا۔ میں نے اسے کشتی میں آرام سے لٹا دیا۔

"ہم راستے میں مر جاتی۔ ماں سے کبھی نہیں ملتی" اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔

میں نے کہا "ایسی باتیں مت کرو چندو۔ یہ معمولی زخم ہے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"نہیں۔ ہم مر جاتی۔ تیر میں زہر ہوتی۔"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا کہ تیر کی نوک زہر میں بجھی ہوئی ہوگی۔ معلوم نہیں کیسا زہر تھا اور اس کے اثرات کتنی دیر میں ہلاکت کا سبب بنتے تھے۔ ابھی ہمارے پاس ان چند دواؤں کے سوا کچھ نہیں تھا جو گل نے چلتے ہوئے احتیاطاً رکھ لی تھیں۔ ان میں اینٹی بائیوٹک گولیاں بھی تھیں۔ زخم کو بگڑنے سے

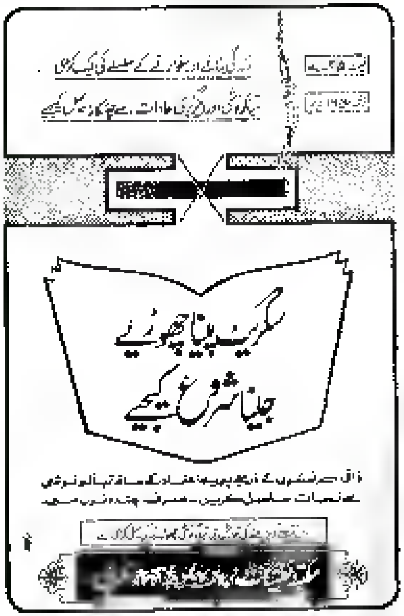

www.paksociety.com

بچانے کے لئے میں نے اسے ذہنی ڈرز دے دی مگر اس کے باوجود میری تشویش کم نہ ہوئی۔

"چندو! ہم کلکتہ کب تک پہنچ جائیں گے؟"

"صبح۔ اگر کشتی اسی طرح چلتی رہی" نازو نے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"چندو نے بتایا تھا مجھے۔ لیکن موٹربوٹ میں تیل کم ہے۔ فالتو تیل کے ڈبے بھر کے ساتھ رکھتا تھا" نازو نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے... ہم آدھے راستے میں کہیں بھی پھنس جائیں گے اور کشتی صرف بہاؤ کے آسرے پر چلے گی۔"

"اس میں چپو بھی تو نہیں ہیں" غالب نے کہا۔

آہستہ آہستہ رات کے ساتھ ستاروں کا قافلہ بھی چلتا گیا۔ چاند ڈھلنے لگا۔ ہم سب جاگتے رہے اور خاموش بیٹھے انتظار کرتے رہے اس لمحے کا جب تیل ختم ہوگا اور کشتی کا انجن دم توڑ دے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ ہم صبح ہونے تک لہروں پر ہی بہتے رہیں گے؟ صبح شاید کوئی اور موٹربوٹ یا لانچ ادھر سے گزرے تو ہماری مدد کرے۔

چندو پر غشی طاری ہونے لگی تھی۔ اس کا جسم بخار میں تپ رہا تھا اور ہم اسے خاموشی سے مرتا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ کسی ہسپتال میں اس کی جان بچ سکتی تھی مگر ہسپتال کلکتہ میں تھے۔ کسی ڈاکٹر کے اعجاز مسیحائی یا قدرت کی معجزہ نمائی سے وہ پھر زندگی کی راہ پر گامزن ہو سکتا تھا اور اپنی حسرتوں کی تکمیل اور اپنے مقصد کے حصول کی جدوجہد جاری رکھ سکتا تھا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا اور اس کے پاس قوت ارادی کا سرمایہ بھی تھا مگر شانے کے زخم سے جسم میں اتر جانے والا زہر اس کے عزائم کی ناکامی کا سبب بن رہا تھا۔ اس زخم سے اس کی مدافعت اور مزاحمت یوں ختم ہو رہی تھی جیسے کسی ٹیوب کے پنکچر سے ٹائر کی ہوا ختم ہوتی جاتی ہے۔ پھر وہ ٹائر باقی ٹائروں کی جادہ پیمائی کا ساتھ نہیں دے سکتا اور گاڑی رک جاتی ہے۔

موٹربوٹ رات ایک بج کر بیس منٹ پر رک گئی۔ اس کے انجن نے چند جھٹکے لئے اور آخری ہچکی کے بعد خاموش ہو گیا۔ ہم سب آدھی رات کے سناٹے میں بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے رہے۔ سبک رفتار ہوا کی لہروں پر کشتی یوں بہنے لگی جیسے کوئی لاش سطح آب پر تیر رہی ہے۔

غالب نے کہا "یہ بڑی بے وقوفی ہے۔ کشتی میں کم سے کم ایک چپو ہونا چاہئے۔ ایک انجن کا کیا ہے۔ کہیں خراب بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ہونا تو بہت کچھ چاہئے، مثلاً تیل کا فاضل ذخیرہ۔ مگر ہمیں ان مسائل کا اندازہ کہاں تھا۔"

"اس الو کے پٹھے کو تو ہوگا۔ یہ جانتا تھا کہ جتنا تیل موٹربوٹ کے ٹینک میں ہے وہ ناکافی ہوگا۔"

"اس کی عقل مفلوج تھی۔ اس کے ذہن پر خوف اور لالچ سوار تھے" میں نے کہا۔

"اب اس بحث سے کیا فائدہ۔ یہ سوچو کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہئے" نازو نے کہا۔

"ان حالات میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے اپنی بے چارگی پر کڑھنے کے سوا اور مجبوری کو صبر کا نام دینے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔"

گل نے سادگی سے کہا "ہم دعا کر سکتے ہیں اور خدا سے امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہم سب کو خیر و عافیت کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچائے گا۔"

اس نے سب کو خاموش کر دیا اور شرمندہ کر دیا۔ بحث کرنے اور اندیشوں کا شکار ہونے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ ہم پرامید رہیں اور اپنے معاملات خدا کو سونپ دیں۔ اس نے تاریک گھڑی میں ہمیں حوصلہ دیا تھا اور ہماری مشکلات کو آسان بنا دیا۔

"اس کا بخار بڑھتا جا رہا ہے" نازو نے چندو کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"اور اسپرین دے دو" میں نے کہا "بخار کا ہمارے پاس یہی علاج ہے۔"

نازو کے چہرے پر مایوسی تھی۔ اسے بھی معلوم تھا کہ زہر سے اترنے والا بخار نہیں ہے مگر اپنے محدود وسائل کے ساتھ موت سے نبرد آزما رہ سکتے تھے۔ اس نے چندو کا منہ کھول کر سہارا دے کر اوپر اٹھایا۔ پھر دریا کے پانی کے ساتھ اسپرین کی گولیاں چندو کے حلق سے اتار دیں۔

کشتی بہت سست رفتاری سے بڑھ رہی تھی۔ صبح ہونے میں کم سے کم بھی چار گھنٹے باقی تھے۔ خشک بسکٹ کھاتے ہوئے اور پانی پیتے ہوئے میں نے اور غالب نے رات کے تاریک سناٹے میں روشنی کے سراب کی جستجو جاری رکھی۔ کہیں کوئی چراغ یا کسی لالٹین یا ٹارچ کا اجالا نظر آئے۔ آگے یا پیچھے سے کوئی لانچ گزرے۔ ساحل پر کہیں آبادی کا نشان ملے تو مدد کی کوشش کی جائے۔

اب سردی بھی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ کسی گھر کی چار دیواری میں بڑی نعمت تھا۔ آسودگی بخش نرم بستروں اور گرم لحافوں میں صرف راحت ہوتی۔ آسمان کے نیچے دریا کی سرد ہواؤں میں سردی کی شدت ...

گل اور نازو نے سب فاضل کپڑے چندو پر ڈال دئے۔ خود سردی میں ٹھٹھر رہی تھیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ گھٹنے سمیٹے اور ہاتھوں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹے سردی گزار رہی تھیں۔ ایک بے سروسامانی میں سفر کی صعوبت کا تجربہ تھا۔ پھر بھی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم موجود ہیں اور کسی سمندر کی بے کراں وسعت میں نہیں

ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ صبح کوئی ہماری مدد کرنے ضرور آئے گا اور ہمیں دریا کے اس پار پہنچا دے گا۔ اس کے بعد کلکتہ کی باقی مسافت بھی طے ہو جائے گی۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس وقت میرے ذہن میں اور کوئی خیال نہیں تھا۔ نہ اس حکومت کا جو سیاسی سازشی گروہوں نے ہماری کوتاہیوں اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کے رکھی تھی۔ ہماری قومی شناخت کے تصور پر کاری ضرب لگی تھی اور وقتی طور پر ہم اس یقین سے بھی محروم ہو گئے تھے جو اس ملک کے وجود کی بنیاد رہا تھا۔ مجھے ملا اور جیسے غداروں کے خون سے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کا خیال نہ تھا۔ دادو نے مالی نقصانات کے صدمے برداشت کئے تھے اور پہلی بار کو اپنی نادانی کی سزا سمجھ کے قبول کر لیا تھا۔ وہ واپس جا چکا تھا اور شاید اپنے نقصان کی تلافی کے لئے دولت کمانے کے نئے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا یا نئے پروگرام پر عمل پیرا ہو چکا تھا۔ اس کے نزدیک غیر اہم تھا کہ دولت کے حصول کا کوئی ذریعہ غیر قانونی یا غیر اخلاقی ہے۔ مگر ہم اس وحشت کی ویرانی میں سرگرداں تھے اور ناامیدی سے بچنے کے لئے دست غیب کی امداد کے انتظار میں تھے۔ مجھے راجہ کا خیال بھی نہ تھا جو اپنے اکیلے پن کی سزا کاٹ رہی تھی۔ میرے سامنے صرف کالی رات تھی۔ گل اور نازو کے افسردہ چہرے تھے۔ غالب تھا جو اپنی مایوسی کو چھپانے میں ناکام تھا۔ دریا پر بہنے والی کشتی لہروں کے رحم و کرم پر تھی اور چندو کی زندگی کے چراغ کی لو تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ میں صرف اجالا چاہتا تھا اور مدد چاہتا تھا۔ ساحل پر اترنے اور چندو کے مرنے سے پہلے کلکتہ پہنچ جانے کی آرزو کے سوا میرے دل میں کوئی آرزو نہ تھی۔ مجھے محسن کا خیال تک نہ تھا جو ڈھاکا میں ہمارے لئے چشم براہ تھا۔

اچانک غالب نے کہا "سکندر! وہ کیا ہے؟"

میں نے چونک کر دیکھا "روشنی؟ دریا کی سطح پر!"

"ہاں۔ اس کا عکس پانی میں پڑ رہا ہے۔"

"کہیں یہ سراب نہ ہو" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "کوئی لانچ آ رہی ہے۔"

گل نے بھی خوش ہو کے کہا "ہاں۔ ہماری طرف ہی آ رہی ہے۔"

غالب نے کہا "میں اس کے انجن کی آواز سن رہا ہوں۔"

"آواز مجھے بھی سنائی دے رہی ہے" نازو بولی۔

لانچ بڑی تیزی سے آ رہی تھی۔ اب میں بھی اس کی آواز سن رہا تھا اور دور سے جھلملانے والی روشنی بھی واضح ہوتی جا رہی تھی۔

"کہیں یہ فوجی نہ ہوں" نازو نے کہا۔

"کون سے فوجی؟" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "اس سرحد پر ہمارے فوجی نہیں ہو سکتے۔"

"تم نے رات بھر میں نہ کوئی فائر کی آواز سنی، نہ کوئی جنگی ہوائی جہاز اوپر سے گزرا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہم محاذ جنگ سے دور ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "یہ پولیس بھی ہو سکتی ہے۔ اسمگلر بھی ہو سکتے ہیں۔"

"اب جو بھی ہو۔ ہم ان سے مدد کی درخواست کریں گے اور خدانخواستہ مشکل میں پڑ گئے تو پھر مقابلہ کریں گے۔ ضروری نہیں کہ ان کا رویہ دوستانہ ہو ہمارے ساتھ۔ ہمیں مقابلے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔"

لانچ ہمارے بہت قریب آ گئی۔ ہماری لانچ کے مقابلے میں یہ کسی بحری جہاز سے کم نہ تھی۔ اس کے عرشے پر کھڑے ہوئے کسی شخص نے ہم پر تیز ٹارچ لائٹ ڈالی۔ میں نے اور غالب نے ہاتھ ہلا کے انہیں اپنی طرف بلایا۔ ٹارچ کی روشنی کا دائرہ گل اور نازو پر گیا لیکن لانچ کی رفتار میں کمی نہیں آئی۔

میں نے چلا کے کہا "رکو۔ ہمیں مدد کی ضرورت ہے۔"

غالب نے بھی چیخ کر یہی بات انگریزی میں دہرائی۔

"ہمارے ساتھ ایک بیمار ہے" میں نے چلا کے کہا "اسے طبی امداد نہ ملی تو وہ مر جائے گا۔"

"ہمارے پاس تیل ختم ہو گیا ہے" غالب چلایا۔

لیکن لانچ ہماری چیخ و پکار سے بے نیاز گزر گئی۔ ٹارچ لائٹ سے موٹربوٹ کا جائزہ لینے والا مطمئن ہو گیا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ لائٹ بجھا کے وہیں کھڑا ہمیں دیکھ رہا تھا لیکن ہماری آواز جیسے اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔

"کیا انہوں نے سنا نہیں؟" غالب بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

"پھر کیا وہ سمجھے نہیں؟"

"اس میں سمجھنے کی کون سی بات تھی۔ ہم انہیں بلا رہے تھے۔ وہ اشارہ دیکھ سکتے تھے" میں نے کہا "رک کر یہ تو پوچھ سکتے تھے کہ کیا بات ہے۔"

لانچ والوں کی بے نیازی اور بے حسی نے مجھے غصے سے پاگل کر دیا۔ میں نے چیخ چیخ کر انہیں گالیاں دیں۔ غالب نے مجھ سے زیادہ شور مچایا مگر جواب میں ان کی طرف سے کسی رد عمل کا اظہار نہیں ہوا۔

یہ طیش کی انتہا تھی کہ میں نے نازو سے ریوالور چھین کر ان پر گولی چلا دی۔

غالب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "سکندر!"

میں نے کہا "میں انہیں مار دوں گا۔ یہ انسان نہیں ہیں۔"

غالب نے کہا "اور جواب میں انہوں نے بھی فائر کھول دیا تو کیا ہوگا؟ ہم سب مارے جائیں گے۔ ہمیں غرق ہو جائیں گے۔"

لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس کے برعکس تھا۔ لانچ کی رفتار میں کمی آئی۔ کسی نے چلا کے کچھ کہا اور لانچ رک گئی۔ آہستہ آہستہ ہماری کشتی لانچ کے قریب پہنچ گئی۔

www.paksociety.com

لانچ پر سے کسی نے ایک رسی پھینکی جو میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دوسری جانب سے کوئی رسی کو کھینچنے لگا۔ کشتی عین لانچ کے نیچے پہنچ گئی۔

اوپر سے کسی نے ٹارچ کی روشنی ڈال کے پھر ہمارا جائزہ لیا اور انگریزی میں کہا "کیا تم پاگل ہو؟ گولی کیوں چلائی تھی؟"

میں نے چلا کے کہا "اور ہم کیا کرتے؟ تمہارے کان ہماری آواز جو نہیں سن رہے تھے۔"

"بے وقوف! تم سب مارے جاتے..."

"ہم سب ویسے بھی مر رہے تھے۔ تم سے مدد مانگی تھی ہم نے لیکن تم نے ایسی بے رحمی کا مظاہرہ کیا۔"

"او کے۔ کیا چاہئے تمہیں؟"

میں نے کہا "یا تو نیچے آ کے بات کرو۔ یا مجھے اوپر آنے دو۔"

اس نے اپنے دو ساتھیوں سے مشورہ کیا "رسی پکڑ کے اوپر آ سکتے ہو؟"

دو منٹ بعد میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ صورت سے کوئی دولت مند عیاش، مغرور اور بد دماغ آدمی لگتا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں کے ہاتھوں میں خود کار اسلحہ تھا۔ وہ اس کے باڈی گارڈ تھے جو مجھے خون آشام کتوں کی طرح گھور رہے تھے۔ مجھے شدت سے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اپنی سٹین گن سے ایک برسٹ مار کے وہ ہمیں بوٹ سمیت دریا کی تہہ میں پہنچا سکتے تھے۔ لیکن تقدیر مہربان ہو تو آدمی کی حماقت بھی اس کے لئے فائدہ مند بن جاتی ہے۔

"کون ہو تم لوگ؟" اس نے بڑی رعونت سے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا ایک عورت کی نیند یا نشے میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی "ڈارلنگ... کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوا۔ تم نیچے جاؤ" اس نے عورت کو سخت لہجے میں حکم دیا "تم ہوش میں نہیں ہو۔"

عورت کو واقعی اپنا ہوش نہ تھا ورنہ وہ اوپر آنے سے پہلے اپنے جسم کی بے لباسی کو ضرور دیکھتی۔ وہ برائے نام شفاف نائٹ گاؤن میں تھی جو ہر طرف سے کھلا ہوا تھا۔

"اسے نیچے لے جاؤ" اس نے اپنے ایک محافظ سے کہا کیوں کہ عورت اس کے حکم کی پروا کئے بغیر آگے چلتی آ رہی تھی۔

اب میں سمجھ چکا تھا کہ ہماری فریاد و فغاں کو انہوں نے کیوں در خور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ یہ ایک دولت مند کا سطح آب پر تیرتا ہوا عشرت کدہ تھا۔ ان کی جگہ پولیس کی لانچ ہوتی یا ماہی گیروں کی، وہ ہماری چیخ و پکار کو ایسے نظر انداز نہ کرتے مگر ایک عیش پرست آدمی کو کسی بھی مصیبت زدہ کے چکر میں پڑ کے اپنے لطف کی ساعتوں کو مکدر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب میں نے اس پر گولی چلائی تو اس کی بے حس انا کے شیشے پر ضرب پڑی۔ وہ کوئی عام قسم کا بدمعاش یا کم ظرف ہوتا تو فوراً حکم دیتا کہ جوابی کارروائی کی جائے اور جس نے بھی یہ گستاخی کی ہے اسے عبرت ناک سزا دی جائے مگر وہ ہماری فریاد و فغاں بھی دیکھ چکا تھا۔ جذباتی طور پر وہ ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ میرے فائر کرنے سے اس نے اندازہ کیا کہ ہم نے یہ قدم انتہائی مایوسی کے باعث اٹھایا اور اسے صورت حال کی سنگینی کے خیال نے رکنے پر مجبور کر دیا۔

جب محافظ عورت کو زبردستی نیچے لے گئے تو اس نے اپنا سوال دہرایا۔

میں نے اتنی دیر میں ایک گول مول جواب سوچ لیا تھا "ہم بڑی مشکل میں ہیں جناب۔ پٹرول ختم ہو گیا ہے۔"

"اتنے لمبے سفر پر کیوں نکلے تھے؟" اس نے اپنی عقابی نظر مجھ پر جما کے کہا۔

"مجبوری میں سر۔ جان بچانے کے لئے۔"

اس نے سوچ کے کہا "ہوں۔ کہاں جا رہے ہو اب؟"

میں نے کہا "کلکتہ سر۔ عورتوں کا ساتھ ہے۔ چھوٹا بھائی مر رہا ہے۔ پانی میں اترا تھا، شاید کسی سانپ نے کاٹ لیا۔ کلکتہ نہ پہنچے تو وہ دوا دارو سے پہلے ہی مر جائے گا۔"

"لیکن میں تمہیں کیسے کلکتہ پہنچا سکتا ہوں؟" اس کے لہجے میں کچھ نرمی اور تاسف کے جذبات آ گئے "ابھی واپسی بھی نہیں۔"

"آپ ہمیں ساحل پر چھوڑ دیں سر۔"

"ساحل پر! یہاں؟ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ کون سی جگہ ہے؟" اس نے کہا "یہاں ہر طرف جنگل ہی جنگل ہے۔"

"کسی سڑک تک پہنچ جائیں گے۔"

"بے وقوف آدمی! دس میل تک کچھ نہیں ہے۔ جاؤ گے؟ عورتیں جنگل سے پیدل گزر سکتی ہیں؟ اور وہ جو بھائی تمہارا، اسے لاد کے چل سکتے ہو تم؟ راستے میں ہی مر جائے گا، تم بھی مارے جاؤ گے۔ ہاں ایک صورت ہے" اس نے کہا "میں تمہیں پٹرول دے سکتا ہوں۔ اتنا کہ تم صبح تک کلکتہ جاؤ گے۔"

میں نے کہا "حضور کو خدا اس نیکی کا اجر دے۔"

وہ چونکا "تم مسلمان ہو؟"

اب انکار سے کچھ حاصل نہ ہوتا "جی سر۔"

"بنگال سے فرار ہوئے ہو؟" وہ بولا۔

"جی سر... جنگ میں سب تباہ ہو گیا۔"

اس نے کہا "تم کلکتہ کیوں جا رہے ہو؟ پاکستان جاؤ۔"

میں نے اس کے لہجے میں طنز کو محسوس کیا اور کہا "جلد ہی... کلکتہ میں اپنے عزیز ہیں جناب۔ ابھی ان کے پاس جائیں گے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد واپس گھر لوٹیں گے۔"

"جنگ تو ختم ہو گئی۔ بنگلہ دیش بن گیا اور تمہاری فوج کو شکست ہو گئی" اس نے مسکرا کے کہا۔

میں نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا "ہمیں کیا لینا سیاست سے حضور۔ آپ ہمیں پٹرول دے دیں۔"

"اور انگریزی بہت صاف بولتے ہو تم۔ کیا کرتے تھے ڈھاکا میں؟" وہ بولا۔

"پڑھاتے تھے کالج میں" میں نے کہا۔

"جو کچھ تم پڑھاتے رہے، اب نہیں پڑھا سکو گے۔ خیر۔ مجھے کیا" اس نے ایک محافظ کی طرف رخ کر کے کہا "رضوان ان کو دے دو بیس لیٹر۔"

"بیس لیٹر... ہمیں کم نہ پڑ جائے سر۔"

"جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو" اس نے بگڑ کے کہا "دفع ہو جاؤ۔"

محافظ فوراً دفع ہو گیا اور کچھ دیر بعد بیس لیٹر پٹرول کا جری کین تھامے نمودار ہوا۔

"بیس روپے نکال بھک منگے" اس نے آہستہ سے کہا۔

میں نے چلا کے کہا "بیس روپے کس بات کے؟ سیٹھ صاحب نے پٹرول بیچنے کی بات تو نہیں کی تھی۔"

سیٹھ نیچے جاتے جاتے رک گیا "کیا بات ہے؟"

محافظ نے فوراً کہا "کچھ نہیں سر۔ میں نے کہا کہ جری کین خالی کر دو تو شور کر رہا ہے۔"

"سارا پٹرول کیسے ڈال دوں۔ اتنا بڑا ٹینک نہیں ہے کشتی کا" میں نے کہا۔

سیٹھ نے ہاتھ ہلایا "دے دو جری کین بھی" اور نیچے غائب ہو گیا۔

محافظ نے دانت پیس کے کہا "لے، دفع ہو۔"

میں اس کی گالی کو پی گیا اور اس سے جری کین لے لیا "ایک سگریٹ تو پلا دے یار۔"

"اب جاتا ہے یا..."

میں نے جیب سے سو کا نوٹ نکالا "سو۔ پٹرول کے بیس کاٹ کے باقی واپس کر دو۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "ابے تو پاگل ہے کیا؟"

میں نے کہا "پاگل نہیں ہے تو باقی کے سگریٹ دے دو۔ اور کیا ہے تمہاری دکان میں؟ چائے ملے گی؟"

اس نے سو کا نوٹ اچک لیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس نکال کے مجھے تھمائے اور بولا "اب زیادہ سر مت چڑھ۔ شکر کر جان بچ گئی۔ سیٹھ اچھا آدمی ہے ورنہ میں تو مچھلی کو کھلا دیتا سب کو۔"

میں نے جری کین سمیت رسی پر پھسلتے ہوئے کہا "مچھلی کے بچے! اتنا ہمت والا ہے تو یہ جا کے بتا سیٹھ کو... کہ مجھ سے سو کا نوٹ لیا ہے تم نے بھک منگے۔ مجھے سیٹھ کا لحاظ نہ ہوتا تو میں تیری ماں کی ایسی تیسی کر دیتا۔"

ظاہر ہے وہ تلملانے اور جواب میں گالیاں بکنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ گالیاں بکتے ہوئے اپنی آواز بھی کم رکھنے پر مجبور تھا۔ کشتی میں آ کر میں نے مزید اشتعال انگیزی کی اور اس کی بے بسی پر ہنسا۔ اچانک ہم سب کا موڈ اچھا ہو گیا تھا۔ پلک جھپکتے میں ناامیدی کا گھپ اندھیرا دور ہو گیا تھا اور امید کے سورج کی روشنی بڑی آب و تاب سے سب کے دلوں میں اتر آئی تھی۔

"سب ہندو شیطان نہیں ہوتے" غالب نے انجن کے فیول ٹینک میں پٹرول ڈالتے ہوئے کہا۔

"جیسے سب مسلمان فرشتے نہیں ہوتے" میں نے دور جاتی ہوئی لانچ کو دیکھ کے کہا "ان میں دلاور جیسے بھی ہوتے ہیں اور حاجی عبداللہ جیسے پاپی بھی۔"

"اچھائی اور برائی آدمی کی ذات سے منسوب ہے کسی مذہب سے نہیں" نازو نے کہا "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔"

میں ہنس پڑا "یہ بھی کسی تقریر کا حصہ تھا؟"

وہ بھی ہنس پڑی "اسی تقریر کا۔"

موٹر بوٹ کا انجن پھر اسٹارٹ ہوا اور دو بج کر چالیس منٹ پر سو فیصد تائید ایزدی سے ہم نے دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کیا۔ چندو کی حالت بدستور تشویش ناک تھی اور یقین کے ساتھ کچھ نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کلکتہ پہنچنے تک زندہ رہے گا یا مر جائے گا۔ سیٹھ نے بھی کہا تھا کہ ہم صبح تک کلکتہ پہنچ جائیں گے۔ میں تھوڑا سا پُرامید اس لئے بھی تھا کہ چندو زہر کے خلاف ایک فطری قوتِ مدافعت رکھتا تھا۔ اس نے خود ہی راستے میں بتایا تھا کہ سانپ بچھو کے کاٹے سے اس کو کچھ نہیں ہوتا۔ بچپن سے اب تک اسے زہریلے جانوروں نے اتنی بار کاٹا تھا کہ اس کے خون میں زہر شامل ہو گیا تھا۔

چندو کی جگہ یہ تیر ہم میں سے کسی کو لگ جاتا تو شاید وہ بہت پہلے مر چکا ہوتا مگر چندو میں جو قوتِ مدافعت پیدا ہو چکی تھی وہی اس کو زہر کے مہلک اثرات سے بچا رہی تھی۔ اس کے شانے سے اب خون نہیں بہہ رہا تھا مگر جتنا خون بہا تھا اس کے ساتھ ہی کافی زہر بھی فوراً خارج ہو گیا تھا۔

غالب نے چندو کی نبض دیکھتے ہوئے سر ہلایا "بیچارا!"

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوا ابھی تک تو۔ مگر..."

"بری بات مت نکالو منہ سے" نازو نے بگڑ کے کہا۔

گل نے اس کی تائید کی "اللہ اچھا کرے گا۔ یہی کہنا چاہئے۔"

غالب مسئلۂ قضا و قدر کے حوالے سے کوئی جواب دیتا تو بلا وجہ بحث چھڑ جاتی۔ میں نے کہا "مرزا جی! یہ قبیلے والے تیروں اور نیزوں کی انی پر کس قسم کا زہر لگاتے ہوں گے؟"

"ایسے قبیلوں کو جڑی بوٹیوں کے خواص کا علم ہوتا ہے۔ کسی پودے کا عرق استعمال کرتے ہوں گے یا ممکن ہے سانپ کے حلق سے زہر برآمد کر لیتے ہوں" غالب نے کہا۔

www.paksociety.com

"سانپ اس علاقے میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ سانپ کا زہر ہوا تو شاید چندو بچ جائے۔"

"مگر ہم سردی سے اکڑ کے مر جائیں گے صبح تک" نازو نے کہا "سردی بڑھتی جا رہی ہے۔"

"صبح تک اور بڑھے گی" گل نے کہا۔

"افسوس کہ ہم اپنی کھال اتار کے آپ کو نہیں پہنا سکتے۔ صرف مفید مشورے دے سکتے ہیں سردی سے بچنے کے لئے۔ وہ بھی بالکل مفت" غالب نے کہا "پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ سردی کو بھول جاؤ۔"

"یہ فرض کر لیں کہ جون کا مہینہ ہے اور دوپہر کا سورج سر پہ ہے؟" نازو نے طنز سے کہا۔

"نہیں۔ ساری بات احساس کی ہے۔ احساس نہ ہو تو گرمی سردی دکھ درد کسی چیز کا پتا نہیں چلتا۔ جیسے بے ہوش آدمی کو بالکل پتا نہیں چلتا کہ اس کے جسم کو کہاں سے کاٹا جا رہا ہے۔ میرا دوسرا مفید مشورہ یہ ہے کہ بے ہوش ہو جاؤ" غالب نے کہا "تم عورتوں کے لئے تو یہ معمولی کام ہے۔ اچھی خبر سنی تو بے ہوش۔ بری خبر سنی تو بے ہوش۔"

"میں کر دوں تمہیں بے ہوش؟" نازو نے جارحانہ لہجے میں کہا۔

"لڑکی۔ ابھی بہت سے مشورے باقی ہیں۔ اتنے بے صبرے پن کا مظاہرہ مت کرو۔" غالب نے کہا "تیسرا مشورہ تو بہت ہی آسان ہے۔ جسم کو گرم رکھنے کے لئے ورزش کرو۔ چھلانگیں لگاؤ۔ رسی کودو۔ باکسنگ کرو تکیں میں۔ کشتی کے اندر ہی دوڑ لگاؤ۔ قسم خدا کی سردی میں پسینہ نہ آ جائے تو کہنا۔"

خوشی کا ایک اور وقفہ صبح ساڑھے چار بجے آیا جب میں کشتی کے انجن کی ٹنکی میں پھر پٹرول ڈال رہا تھا۔ اینٹی بائیوٹک گولیوں کی دوسری خوراک چندو کو کچھ دیر پہلے ہی دی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اسپرین بھی۔ شفا کی کوشش اور توقع ہم انہی دو دواؤں سے وابستہ کر سکتے تھے۔ شفا دینے والا بہرحال وہ مالک ارض و سما تھا جس کے قبضے میں چندو کی اور ہماری جان تھی۔

اچانک میں نے چندو کے کراہنے کی آواز سنی۔ پھر نازو اور گل نے ایک ساتھ خوشی سے چلا کے کہا "اسے ہوش آ گیا۔"

میرے ہاتھ سے پٹرول کا جری کین گرتے گرتے بچا۔ پٹرول ٹینک کا ڈھکن بند کر کے اور جری کین میں بچا ہوا پٹرول سنبھال کر رکھنے کے بعد میں چندو کے قریب پہنچ گیا۔

"اس کا بخار بھی کچھ کم ہوا ہے" گل نے کہا۔

نازو اس کے حلق میں پانی ٹپکا رہی تھی اور چندو پھر بھی پانی مانگ رہا تھا۔ غالب نے اس کے سر کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور نازو نے وہ سٹور کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا جس میں دریا کا گدلا پانی تھا۔ چندو کی آنکھیں بند تھیں اور نقاہت کے باعث وہ ٹھیک بھی نہیں سکتا تھا مگر اس نے ہاتھوں سے گلاس پکڑا ۔۔۔ ہی سانس میں اور وہ سارا پانی غٹاغٹ پی گیا۔

پانی پینے کے ساتھ ہی اسے الٹی آ گئی۔ وہ پھر پانی مانگنے لگا اور یوں ہاتھ پیر چلانے لگا جیسے شدید اذیت میں ہو۔

گل ڈر گئی "بھائی سکندر.... یہ کیا ہو رہا ہے اسے؟"

میں نے اس کا برف جیسا سرد ہاتھ تھام کے کہا "یہ اچھا ہے۔ بخار کی وجہ سے پیاس لگ رہی ہے۔ یا شاید یہ بھی زہر کا اثر ہو گا۔ ممکن ہے اس کے ہاتھ پاؤں جل رہے ہوں اور اندر بھی آگ سی لگی ہوئی محسوس ہوتی ہو۔"

اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں اس نے کئی بار پانی پیا اور الٹی کی۔ اس کے بخار میں نمایاں کمی واقع ہو گئی تھی مگر اس کا جسم پسینے میں نہا گیا اور ہم اسے نہ روکتے تو وہ کھرچ کھرچ کے اپنی کھال زخمی کر لیتا۔ واضح طور پر زہر کے اثرات تھے۔

آہستہ آہستہ افق کی سیاہ لکیر مٹنے لگی اور صبح کاذب کے ہراول دستے نے صبح صادق کی نوید دی۔ آسمان پر اجالا پھیلنے لگا اور اس کے ساتھ ہی سردی میں اضافہ ہوا۔ گل اور نازو سردی سے کانپ رہی تھیں مگر ہم انہیں برداشت کی تلقین کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ چندو کو سردی سے بچانا زیادہ ضروری تھا۔ اگر بیمار نہ ہوتا تو ہم سب کے اضافی کپڑے خواتین کو سردی سے تحفظ فراہم کرتے۔

نازو نے کہا "یہ کیسے معلوم ہو گا کہ ہم کلکتہ پہنچ گئے ہیں؟"

غالب ہنسنے لگا "یہ کیسے معلوم ہو گا کہ سورج نکل آیا ہے۔"

نازو نے خفا ہو کے کہا "یہ کیا بات ہوئی؟"

"احمقانہ بات خود کرتی ہو۔ پھر مجھ سے پوچھتی ہو یہ کیا بات ہوئی۔ بابا کلکتہ کوئی رسالہ تھوڑی ہے کہ گزر جائے گا اور پتا نہیں چلے گا۔ دنیا کا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہے۔"

نازو نے کہا "مگر ہم رات بھر ایک ہی سمت میں چلتے رہے ہیں۔"

"سب دریا ایک ہی سمت میں بہتے ہیں۔ ایسا دریا میں نے آج تک نہیں دیکھا جو کبھی الٹا بہتا ہو کبھی سیدھا۔"

"الٹی کھوپڑی ہے تمہاری" نازو جھلا کے بولی۔

"چلو الٹی ہے تو الٹی ہی سہی۔ یہ تو نہیں ہے تمہاری طرح کبھی الٹی کبھی سیدھی" غالب نے کہا "کھوپڑی میں تولہ تو ماشہ۔ جب جی چاہا۔ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد۔"

اب میں نے نازو کا دفاع کیا "نازو کیوں پریشان کر رہے ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ کہیں ہم غلط سمت میں تو سفر نہیں کر رہے۔ اندھیرے میں کیا پتا چلتا ہے۔"

نازو نے ممنونیت سے مجھے دیکھا۔ لیکن غالب نے قہقہہ لگایا اور بولا "یہ لو۔ یک نہ شد دو شد۔ فرماتے ہیں اندھیرے میں کیا پتا چلتا ہے۔"

"کون سی ایسی بات ہے اس میں ہنسنے کی؟"

"میرے بھائی۔ آدمی سمت بھول سکتا ہے، دریا نہیں۔ ہمارے سب دریا ایک ہی سمت میں بہتے ہیں۔ شمال سے جنوب کی سمت۔ بھارت کے بھی اور پاکستان کے بھی۔ کچھ مجھے آپ یا نقشے کی مدد سے سمجھاؤں کہ دریا ہمالیہ سے نکلتے ہیں جو شمال میں ہے اور سمندر میں گرتے ہیں جو نیچے جنوب میں ہے" غالب نے کہا۔

میں نے سر کھجا کے کہا "اچھا؟ یہ ہمالیہ پہاڑ کو شمال میں کس نے کر دیا۔ جب ہم جغرافیہ پڑھتے تھے تو شاید جنوب میں تھا۔"

"آپ نقشہ الٹا دیکھتے ہوں گے۔ ممکن ہے کتاب بھی الٹی پکڑ کے دیکھتے ہوں جغرافیہ کے پیریڈ میں" غالب نے کہا۔

"مرزا جی! تم واقعی ماہر جغرافیہ داں ہو۔ کولمبس ہو بلکہ واسکوڈی گاما ہو۔ اب یہ بتاؤ کہ آخر یہ دریا کون سا ہے؟"

غالب نے سوچ کے کہا "یہ ہگلی ہو سکتا ہے یا اس کی ذیلی شاخ۔ کوئی چھوٹا دریا ہو آخر کار ہگلی سے جا ملتا ہو۔ معلوم ہو جائے گا۔"

روشنی پھیلی تو ہمارا اشتیاق بڑھ گیا۔ غالب کا خیال بالکل ٹھیک ثابت ہو رہا تھا۔ دریا پھیل رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ گھوم کے سمندر میں شامل ہو جائے گا مگر وہ سمندر نہیں دوسرا بہت بڑا دریا تھا اور ہم دونوں دریاؤں کے سنگم پر تھے۔ بہت دور بائیں طرف آبادی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے اور آسمان پر اٹھنے والا دھواں کسی صنعتی شہر کی نشاندہی کرتا تھا۔

غالب کے مشورے پر میں نے موٹر بوٹ کو موڑا اور ساحل کے رخ کر دیا۔ یہ چھوٹی سی موٹر بوٹ بے حد وفادار ثابت ہو رہی تھی اور کسی حادثے کا شکار ہوئے بغیر ہمیں منزل تک لے آئی تھی۔

گل اور نازو بہت خوش تھیں اور بار بار بچوں کی طرح پوچھ رہی تھیں "یہ کلکتہ ہے نا؟"

تنگ آ کے غالب نے کہا "آٹھ بار تو یقین دلا دیا میں نے۔ اب تم خود پوچھ لینا کلکتے سے۔ حد ہو گئی یار۔ بھلا اس راستے پر کانا کاچھا یا چھانگا مانگا آ سکتا ہے۔"

"اب ہم زمانہ ابھی پہنچ جائیں گے نا؟" گل نے کہا۔

"دیکھو نیک بیبیو۔ سارے احمقانہ سوالات مجھ سے مت کرو۔ اپنے سکندر صاحب بھی تو ہیں اور مشن کا نعرہ وہی ہیں۔ کچھ ان سے بھی پوچھو" غالب نے جھلا کے کہا۔

ساحل تک پہنچتے پہنچتے دھوپ پھیل گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی سردی کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے رات بھر کشتی چلائی تھی اور اس کا رخ سیدھا رکھا تھا۔ یہ مشکل کام نہیں تھا مگر میں تھک گیا تھا۔ آخری لمحات میں کسی مناسب جگہ کی تلاش کرنا مجھے زیادہ دشوار محسوس ہو رہا تھا۔

آخر کار میں نے ایک ہموار کنارا دیکھا اور موٹر بوٹ کی رفتار بڑھا کے اسے سیدھا لے گیا۔ جہاں تک پانی تھا کشتی چلتی گئی۔ پھر کیچڑ سے گزری اور کنارے پر پھنس گئی۔ انجن نے آخری سا زور لگایا اور ناکام ہو کے رک گیا۔

میں نے اطمینان کی گہری سانس لی "خدا کا شکر ہے کہ یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔"

غالب نے کہا "اصل مرحلہ تو اب درپیش ہو گا۔"

میں نے کہا "اس کی ابھی سے فکر مت کرو۔ پہلے نیچے اترو۔ چندو کو اتارو۔"

گل اور نازو پہلے ہی کنارے تک پہنچ کے گھاس پر دھوپ میں سیدھی لیٹ گئی تھیں اور آنکھیں بند کئے سورج کی حرارت سے توانائی حاصل کر رہی تھیں۔ میں نے اور غالب نے چندو کو سہارا دے کر اٹھایا اور ان کے قریب لٹا دیا۔ وہ اب پوری طرح ہوش میں تھا مگر اس کا بخار کم ہو کے پھر بڑھ گیا تھا۔ ہم نے دوسرا پھیرا لگایا اور اپنا اسباب کشتی سے اتار لائے۔

ادھر چاروں طرف وہی گھنا جنگل تھا اور ویرانی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ آبادی اس جگہ سے زیادہ دور نہیں ہو سکتی۔ میں نے چند بسکٹ کھائے اور ایک سگریٹ جلا کے خالی ڈبیا پھینک دی۔

"اب میں جاتا ہوں سروے کرنے" غالب نے کہا "یہ دیکھتا ہوں کہ قریب ترین آبادی کہاں ہے۔"

میں نے کہا "نہیں، ہم سب ساتھ چلیں گے۔ ہم یہ رسک نہیں لے سکتے کہ کوئی اکیلا جائے تو راستہ بھولنے کی صورت میں باقی سب سے بچھڑ جائے یا خدانخواستہ کسی حادثے کا شکار ہو جائے تو دوسرے انتظار ہی کرتے رہ جائیں۔"

"بالکل ٹھیک۔ اکیلا کوئی نہیں نہیں جائے گا۔" نازو نے میری تائید کی۔

"چندو کا کیا ہو گا؟" غالب نے کہا۔

"اسے ہم اٹھائیں گے باری باری" میں نے کہا "آخر کتنی دور جانا پڑے گا ہمیں۔ دو میل۔ چار میل۔ اس کے بعد کوئی سواری ضرور مل جائے گی۔ اب یہ مضحکہ خیز لباس بدلو۔ لیڈیز آپ اگر چاہیں تو منہ دھو لیں۔ اس کے بعد وہی ساڑیاں باندھ لیں جو تو ملی کے گھر میں باندھ رکھی تھیں۔ ہم بھی قمیص پتلون اور جوتے پہن کے چلتے ہیں۔ کلکتے میں ہم دیہاتی نہیں، معزز شہری بن کے داخل ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں اتنے بڑے شہر میں ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ ہم خطرے کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ یہاں ہمیں پہچاننے والا کوئی نہیں ہو گا اور ہم پوری کوشش کریں گے کہ گمنام رہیں۔ بستی کی طرح ہمارے کلکتہ پہنچتے ہی کوئی ایڈ مخبر نہ ہو۔"

"اب کیا ایڈ مخبر ہو گا" غالب نے آہ بھر کے کہا۔

یہاں میں مختصراً وہ سب کچھ دہرانا نہیں چاہتا جو آپ بھی جانتے ہیں۔ ہماری قومی تاریخ کا وہ المیہ اب ماضی کا حصہ ہے اور اس کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور لکھا گیا ہے۔ سیاست دانوں سے جرنیلوں تک اور اخباری تجزیہ نگاروں سے مورخین

www.paksociety.com

کیچنن تک مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی کے اسباب اور واقعات پر ہر رخ سے روشنی ڈالی گئی ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ابھی تک ہم سب پورا سچ نہیں جانتے یا جان ہی نہیں سکتے۔ سچ ایک آئینے کی طرح تھا جس کو سنگسار کر دیا گیا اور اس سچ کے ریزے ریزے چھوٹے بڑے ٹکڑے انھوں نے چن لیے جو سچ کو عزیز رکھتے تھے مگر ان لوگوں کے پاس صرف ٹکڑے ہیں مکمل سچ نہیں ہے۔ ان ٹکڑوں کو جوڑ کے پھر وہ آئینہ کون بنا سکتا ہے جس میں پورا سچ نظر آئے۔ میں فقط داستان گو ہوں۔ آپ بیتی کہتا ہوں۔ جگ بیتی میں میری آپ بیتی شامل ہے مگر میری آپ بیتی کسی طرح بھی جگ بیتی نہیں۔ نہ میں نے سب دیکھا' نہ سنا' نہ پرکھا اور نہ سمجھا۔ پھر مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ کسی پر حرف زنی کروں۔ کوئی رائے دوں اور اسے صائب جانوں۔ بہت سے حقائق کے چہرے میں نے تب دیکھے جب وہ مسخ ہو چکے تھے۔ ان گنت تاریخ کے ٹکڑے میری نگاہ سے اوجھل رہے۔ پھر میں کوئی فیصلہ کس حوالے سے صادر کروں۔ یہ بہت متنازعہ' بڑا دل آزار اور تلخ موضوع ہے۔ پس میں صرف کہانی کہتا ہوں۔ سیاست میں ہر طرف کیا تھا۔ کیا ہو رہا تھا اور کیا نہیں ہو رہا تھا۔ کیا ہونا چاہیے تھا اور کیا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ سب میں حذف کرتا ہوں اور یہ بتاتا ہوں کہ سکندر بخت نے کیا کیا۔ کیوں کہ یہ بہرحال اسی کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں اب سکندر بخت کے سیاسی رد عمل' نظریات اور عقائد کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ آج بھی نجومی اور دیاتوں کے بین السطور اصل تاریخ کا مظلوم چہرہ کون نہیں دیکھ سکتا۔ بظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی۔ تو اس کہانی میں جو سکندر بخت کی آپ بیتی ہے وہ سب نظر آجائے گا جو کہانی نہیں ہے۔

دریا کے کنارے سے پہلی انسانی آبادی تک ہمارا سفر قوت ارادی کی آزمائش کا سخت ترین مرحلہ ثابت ہوا۔ کوئی ہمیں راستہ بتانے والا نہ تھا چنانچہ ہم اندازے کو بنیاد بنا کے چلتے گئے۔ چندو کو اٹھا کے ان دشوار گزار راستوں پر سفر کرنا مشکل سے مشکل ہوتا گیا۔

گل اور نازو نے بھی پوری رات جاگ کے کاٹی تھی اور اس کے ساتھ شدید اعصابی دباؤ برداشت کیا تھا۔ دن نکلنے کے ساتھ ہی ایک سفر کے اختتام نے انہیں حوصلہ عطا کر دیا تھا مگر رفتہ رفتہ جسمانی تھکن غالب آرہی تھی۔ وہ ہمت بھی ختم ہو چکے تھے جو گل ساتھ لے آئی تھی۔ دھوپ چڑھتے ہی جنگل میں حبس بڑھ گیا اور ہمارے جسموں کی توانائی پسینہ بن کے خارج ہونے لگی تھی۔

میں نے اور غالب نے گل اور نازو کو تھک کر بیٹھنے نہیں دیا اور انہیں اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے چلتے گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ قدم ایک بار رک گئے تو دوبارہ اٹھنا مشکل ہوگا۔ عین اس وقت جب خود میرا حوصلہ ختم ہو رہا تھا اور میرے قدم لڑکھڑانے لگے تھے' جنگل ختم ہو گیا اور ہم نے خود کو ایک دیوار کے مقابل دیکھا۔

یہ کسی قلعے کی فصیل جیسی بارہ چودہ فٹ بلند دیوار تھی کے اوپر کانٹے دار تاروں کی باڑھ تھی۔ دیوار کے اوپر ہر دس دس فٹ کے فاصلے پر ایک فولادی کھمبا تھا جو اوپر سے باہر کی طرف مڑا ہوا تھا۔ اس میں چھ چھ انچ کی دوری سے کانٹے دار تاروں کی پانچ متوازی تانتیں تھیں۔ دیوار سے پہلے ہی تقریباً دس فٹ چوڑی خندق تھی جس میں خاردار تاروں کے ڈھیر گول لچھوں کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔

کچھ دیر اس ممنوعہ علاقے کا جائزہ لینے کے بعد میں نے کہا "یہ کیا جگہ ہو سکتی ہے؟ کوئی ملٹری کیمپ؟"

غالب نے کہا "خاموشی سے تو لگتا ہے کہ یہاں کوئی بھی نہیں رہتا۔"

میں نے دونوں جانب نظر دوڑائی "اس خندق کو عبور کرنے کا بھی کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"راستہ ہو تا تب بھی ہم دیوار کے دوسری طرف کیسے جاتے؟" غالب نے کہا۔

"ان تاروں میں کرنٹ بھی ہو سکتا ہے" میں نے خندق میں جھانک کر اور اوپر دیکھ کے کہا۔

نازو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "اس خیال کو دل سے نکال دو۔"

"کس خیال کو؟" میں نے کہا۔

"کہ تم یہاں سے دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا "اگر میں اس قابل ہوتا تو ایسا ضرور سوچتا۔ لیکن اس وقت تو یہ کام میرے لیے کوہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی کو سر کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔"

غالب نے کہا "ہم چکر لگا کے دیکھ سکتے ہیں۔ اندر جانے کا کوئی راستہ ضرور ہوگا۔"

"اندر جانے کا راستہ تو مل جائے گا۔ باہر آنے کا راستہ ملے گا یا نہیں" نازو نے کہا۔

"میں غیب کا علم نہیں رکھتا" غالب نے چڑ کے کہا۔

ہم نے پھر چلنا شروع کیا۔ دیوار کی لمبائی دو سو گز کے قریب ہوگی۔ اس وقت یہ فاصلہ ہمیں دو سو میل محسوس ہوا۔ پہلا موڑ کاٹتے ہی میں نے خندق پر بنے ہوئے پل اور فصیل کے دروازے کو دیکھا۔ لکڑی کے بنے ہوئے پل پر فولادی جنگلا تھا اور اس کے دونوں طرف دو فوجی جدید خودکار بندوقیں لیے کھڑے تھے۔

ہم پر نظر پڑتے ہی انھوں نے بندوقوں کا رخ ہماری طرف کر دیا اور چلا کے کچھ کہا۔

میں نے غالب سے کہا "ایسے ہی چلتے رہو۔"

"اگر انہوں نے گولی چلا دی؟"

"میں نے چندو کو اٹھا رکھا ہے۔ تم ہاتھ اوپر اٹھا دو' تاکہ انہیں شک نہ ہو کہ ہم جارحانہ عزائم رکھتے ہیں" میں نے کہا۔

لکڑی کے پل تک پہنچنے والی پگی سی سڑک پر ایک ٹرک نمودار ہوا۔ دونوں فوجی مستعد ہو گئے۔ ان میں سے ایک دوڑ کر ہماری طرف آیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے ہمیں وہیں بیٹھ جانے کا حکم دیا۔

میں نے چندو کو زمین پر ڈال دیا اور سب کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔ فوجی بنگالی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ ہماری سمجھ میں ایک لفظ نہیں آرہا تھا۔ پھر ہم کسی سوال کا انکار یا اقرار میں کیسے جواب دیتے۔

اس وقت چندو نے ہماری مدد کی۔ وہ ہمت کر کے اٹھ بیٹھا اور اس نے بنگالی میں بات کی۔ فوجی کے لہجے اور چہرے کی کرختگی قدرے کم ہوئی اور وہ چندو سے سوالات کرنے لگا۔ میں نے لکڑی کے پل پر سے گزرنے والے ٹرک کو دیکھا۔ یہ ہر طرف سے بند ویسا ہی ٹرک تھا جیسا زیر سماعت مجرموں کو جیل سے عدالت لے جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ٹرک جب گیٹ میں داخل ہو گیا تو فوجی نے ہمیں اٹھنے کی اجازت دی۔

چندو شاید اسے مطمئن کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ فوجی نے پیچھے رہتے ہوئے ہمیں آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ میں نے پھر چندو کو اٹھا لیا اور ہم دونوں فوجیوں کی نگرانی میں گیٹ تک پہنچے۔ گیٹ پر متعین فوجیوں نے باہر والوں سے نہ جانے کیا پوچھا اور معلوم نہیں انہوں نے کیا جواب دیا۔ چند منٹ بعد بھاری بھرکم فولادی گیٹ میں ایک کھڑکی سی کھل گئی اور ہم سر جھکا کے باری باری اندر داخل ہوئے۔

غالب نے آہستہ سے کہا "یار کہیں ہم جنگی قیدی تو نہیں بن گئے ہیں؟"

"یہ مجھے فوجی نہیں لگتے" میں نے کہا۔

"پھر کیا لگتے ہیں؟"

"ان کی وردی پر مت جاؤ۔ چال ڈھال دیکھو۔ فوجی ایسے نہیں چلتے' ان کے قدم..."

ایک فوجی نے بندوق کا کندا مار کے غالب کو خاموش کر دیا۔ "بات نہیں کرے گا۔ شٹ اپ کرے گا۔"

غالب لڑکھڑا کے گرا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ اندر وسیع میدان کے وسط میں ایک مربع عمارت نظر آرہی تھی۔ ایک منزلہ عمارت کی تعمیر بیرک کے انداز میں ہوئی تھی۔ سپاٹ دیواروں میں اوپر صرف ایک روشن دان تھا جس میں مضبوط سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اندر جانے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہاں بھی خطرناک ہتھیاروں والے فوجی پہرا دے رہے تھے۔

مجھے اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ ہم آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک چکے ہیں اور کسی وجہ کے بغیر جیل میں ٹھونسے جا رہے ہیں۔ اس جیل سے کب نکلنا ہوگا اور کیسے' یہ سوچنے کا اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ کسی جیل کی فصیل ہے تو ہم ادھر کا رخ ہی کیوں کرتے۔ جیل کے قریب سے گزرنا کوئی جرم نہیں تھا۔ ہمارا جرم یہ تھا کہ ہم بنگالی نہیں بول سکتے تھے۔

اندر کا منظر دیکھ کے مجھے یقین آگیا کہ نہ یہ جیل خانہ ہے اور نہ کوئی فوجی علاقہ۔ یہ کوئی دہشت گردوں کا عقوبت خانہ تھا جہاں سیاسی مجرم لائے جا رہے تھے۔ جو ٹرک میرے سامنے سے گزر کے اندر آیا تھا اس میں سے چیختے چلاتے مرد عورتیں برآمد کیے جا رہے تھے۔ انہیں ٹرک میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونسا گیا تھا اور اب زبردستی کھینچ کر باہر نکالا جا رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں کوئی بچہ نہ تھا۔ وہ سب جوان لوگ تھے۔

ہمیں برآمدے کی طرف موڑ دیا گیا اور پھر ایک کمرے میں دھکیل کر دروازے کو باہر سے بند کر دیا گیا۔

گل اور نازو دہشت سے بے ہوش ہونے کو تھیں۔ وہ فرش پر ڈھیر ہو گئیں اور سسکیاں لے کر رونے لگیں۔

"یہ ہم کہاں پھنس گئے؟" غالب بولا۔

میں نے چندو سے پوچھا "یہ کون لوگ ہیں اور یہ کیا جگہ ہے؟ تم سے کیا بات ہوئی تھی ان کی؟"

چندو نے ٹرک ٹرک کر ہانپتے ہوئے کہا "ہم بولتی۔ ہم راستہ بھول جاتی۔ کشتی میں جاتی شکار کا واسطے۔ کشتی خراب ہوتی۔ ادھر سے ہم پیدل آتی۔ سب کلکتہ میں رہتی۔"

"ہمارے بارے میں تم نے کیا بتایا؟"

"ہم بولتی۔ صاب لوگ بہت امیر ہوتی ہے۔ ادھر بہت بڑا کاروبار ہوتی" چندو نے کہا "یہ ان کا لی بی ہوتی۔ ہم نوکر ہوتی۔"

"اور انہوں نے یقین کر لیا؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا۔ "یہ نہیں پوچھا کہ ہم ہندو ہیں یا مسلمان؟"

"ہم آپ کو ہندو بولتی۔"

"مگر یہ کون لوگ ہیں؟" میں نے پھر کہا۔

"ہم نہیں جانتی۔ وہ نہیں بتاتی۔ کہتی سب کو بڑا افسر کا سامنے پیش کرتی۔"

میں نے کہا "بڑا افسر... خیر ہو۔"

اسی وقت دروازہ کھلا اور سٹین گن والے دو فوجی ٹائپ شخص اندر آگئے۔ انہوں نے ہم سب کو گردن سے دبوچ کر سجدے میں گرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر وہ ہمارے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ میں نے تیسرے شخص کے بھاری' متوازن قدموں کی آواز سنی اور اس کے جوتوں کو اپنے چہرے سے ایک فٹ دور دیکھا۔

"تم بنگال سے بھاگ کر آئے ہو؟" اس نے انگریزی میں کہا۔

"یہ غلط ہے" میں نے انگریزی میں جواب دیا "ہم کلکتہ میں رہتے ہیں۔ یہاں ہمارا پرانا بزنس ہے۔"

بوٹ کی ٹھوکر میرے شانے پر لگی "جھوٹ بکتے ہو تم۔ کلکتہ میں پرانا بزنس ہے مگر تم بنگالی نہیں جانتے۔"

میں نے درد کی ٹیس کو دبا کے کہا "سر! میں کمپنی کا ملازم ہوں۔ پہلے میری پوسٹنگ دہلی میں تھی۔ اس سے پہلے میں سنگاپور میں۔ یہ ایک انٹرنیشنل فرم ہے۔"

www.paksociety.com

"کیا نام ہے فرم کا؟"
"گریوز کاٹن ۔۔۔" میں نے ذہن میں آنے والا پہلا نام کسی تذبذب کے بغیر بتا دیا۔
"کیا کرتی ہے یہ فرم؟"
"یارن، جنرل پیس، انڈسٹریل اور ٹیکسٹائل۔۔۔"
"تم کیا کرتے ہو؟"
"میں ڈائریکٹر مارکیٹ ریسرچ ہوں۔ سوبھاش چندر۔ یہ میرے ساتھ چیف اکاؤنٹ آفیسر ہے اپّی سوڈا ۔۔۔ اگر تم اجازت دو تو میں باقی سوالات کا جواب کھڑے ہو کر دوں؟"
"او کے، کھڑے ہو جاؤ۔ تم سب" اس نے کہا۔
میں نے اٹھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔۔۔؟"
میری بات پوری ہونے سے پہلے میرے منہ پر اس کا بھرپور مکا پڑا "تم نے جواب دینے کے لئے کھڑے ہونے کی اجازت مانگی تھی' سوال تم نہیں کر سکتے۔"
وہ چالیس سال کا ہٹا کٹا' پستہ قد' بھاری بدن والا سیاہ فام شخص تھا۔ صورت سے وہ خطرناک ذہنی مریض نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جنون اور وحشت کے آثار تھے اور اس کے اطوار میں کسی خونی درندے کی ذہانت کارفرما محسوس ہوتی تھی۔
مکا لگنے سے میں ایک قدم پیچھے ہو گیا تھا۔ پیچھے کھڑے ہوئے محافظ نے مجھے آگے دھکا دے کر پھر قطار میں شامل کرنے کی کوشش کی تھی مگر میں بلا ارادہ اس سے ٹکرا گیا جو افسر اعلیٰ کی حیثیت سے تفتیش کرنے آیا تھا۔
وہ بیک آپ ایسا تھا جب میں نے جان کی بازی لگا دی۔ نہ جانے کیسے میرے جسم میں اتنی قوت آ گئی کہ میں نے ایک سیکنڈ میں اس کی گردن کے گرد اپنے ایک ہاتھ کو شکنجے کی طرح کس لیا اور اس کے دوسرے ہاتھ کو موڑ کے کمر کے پیچھے کر دیا۔ خود گھوم کر اس کے پیچھے ہو گیا اور اسے ڈھال بنا کے دیوار سے لگ گیا۔ میرا ایک گھٹنا اس کی کمر پر تھا اور دوسرا پاؤں زمین پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔
وہ سخت اذیت میں چیخ رہا تھا اور محافظوں کو حکم دے رہا تھا کہ مجھے شوٹ کر دیں مگر محافظ پتھر کا بت بنے کھڑے تھے۔ اگر وہ گولی چلاتے تو اپنے افسر کے جسم کو چھلنی کرتے۔ اس کے جسم سے گزرے بغیر کوئی گولی مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔
"ان سے کہو ہتھیار ڈال دیں" میں نے اسے حکم دیا "جلدی کرو۔ میں صرف تین تک گنوں گا۔ پھر تمہاری گردن توڑ دوں گا۔"
میری گرفت سے اس نے اتنا اندازہ ضرور کر لیا تھا کہ یہ کسی اناڑی کی گرفت نہیں ہے اور میں اپنی دھمکی پر عمل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں تین تک گنتا ایک اور نوجوان بڑی افسرانہ شان سے کمرے میں داخل ہوا۔ اندر قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رکا اور کسی سے کچھ پوچھے بغیر اس نے صورت حال کو سمجھ لیا۔
اس نے ریوالور نکالنے میں دیر نہیں کی لیکن ایک ایسی غلطی کر بیٹھا جو آج سے پہلے بھی اکثر لوگوں نے کی تھی۔ اس نے نازو کو کھینچ لیا تھا اور اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھ دیا "کرنل کو چھوڑ دو۔"
اس سے زیادہ کہنے کی اسے مہلت ہی نہ ملی۔ نازو نے اس کے ساتھ وہی کیا جو میں نے کرنل کے ساتھ کیا تھا۔ نازو ایک ہزار مردوں کو جسمانی طاقت کے بل پر قابو میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس نے زیادہ آسان نسخہ استعمال کیا اور نوجوان افسر سے ایک سیکنڈ میں ریوالور چھین لیا۔ دوسرے سیکنڈ میں وہ اس افسر کے پیچھے تھی اور وہی ریوالور اس کی گدی سے لگا دیا۔
میں نے چلا کے کہا "ایک ۔۔۔ دو ۔۔۔"
کرنل صاحب کے حلق سے ایک چیخ سی برآمد ہوئی۔ دونوں مسلح محافظ پہلے ہی بے بسی کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ اشارہ ملتے ہی انہوں نے اپنی خودکار رائفلیں زمین پر ڈال دیں۔
"کیا ایسے تم ۔۔۔ یہاں سے نکل سکتے ہو؟" کرنل نے کراہتے کہا۔
میں نے اس کی کمر پر گھٹنا مارا "تمہارا سوالات کرنے کا اختیار باقی نہیں رہا۔"
کرنل درد سے بلبلایا اور میں نے اسے جھٹکا دے کر آگے جھکا دیا۔ نوجوان افسر جتنا بددماغ ثابت ہوا تھا اتنا ہی بزدل بھی ثابت ہوا۔ یہ اس کی عمر کا تقاضا اور گرم خون کی تاثیر تھی۔ ایک کمزور اور دھان پان سی عورت کے ہاتھوں مار کھا کے اس کی حالت زخم خوردہ سانپ کی طرح ہو رہی تھی۔ وہ خود کو بے عزت اور بے غیرت محسوس کر رہا تھا۔
جب نازو نے اسے بھی سجدے میں گرنے کا حکم دیا تو اس کا قوت برداشت کا فیوز اڑ گیا۔ اس نے پلٹ کے نازو کو گرانا چاہا اور اس کے ریوالور کی زد سے بچتے ہوئے جھک کر نازو کو ٹکر ماری۔ نازو کو دیوار سے ٹکرا کے گرانا چاہتا تھا مگر اس وقت نازو بھی بجلی بن گئی تھی۔ وہ ایسے درمیان سے ہٹ گئی جیسے وہاں تھی ہی نہیں اور اس نے پیچھے سے نوجوان افسر کو ایسی لات ماری کہ اس کی رفتار بڑھ گئی۔ اس کا سر بڑی آواز کے ساتھ دیوار پر لگا۔ ابھی گرا بھی نہ تھا کہ نازو کی دوسری لات حرکت میں آئی اور اس کی گردن پر پڑی۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر مر گیا۔ آخری آواز جو ہم سب نے سنی اس کی گردن کی ہڈی کے ٹوٹنے کی تھی۔ اس کا جسم بھی کچھ دیر پھڑکتا رہا اور پھر ساکت ہو گیا۔
اب کرنل کی سب خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دونوں محافظ بھی سجدہ ریز ہو گئے۔ میں نے اور غالب نے فوراً ہتھیار اٹھا لئے۔
"تم تن کرنل۔ اب تمہاری باری ہے۔ تمہیں بہت سے سوالوں کے جواب دینے ہوں گے" میں نے کہا "مگر ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا آفس کہاں ہے؟"
"اسی برآمدے کے آخری حصے میں" وہ بولا۔
میں نے غالب سے کہا "اس کی جامہ تلاشی لو۔ دیکھو اس کے پاس بھی کوئی ریوالور ضرور ہوگا۔"
غالب نے اس کی وردی کی ایک جیب سے ریوالور برآمد کر کے اور گل کی طرف بڑھا دیا۔
میں نے کہا "تمہارے علاوہ یہاں کتنے افسر ہیں؟"
"دو باقی ہیں اب۔ تین تھے" وہ بولا۔
"ان کو تم اپنے آفس میں طلب کرو گے۔ ہم یہاں سے تمہارے آفس جائیں گے۔ میں اور تم۔ وہاں تم زندہ پہنچو گے یا مردہ اس کا انحصار تمہارے رویئے پر ہے۔ اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ سب کو بھون کے رکھ دیں۔ جو بھی مزاحمت کرے۔۔۔۔"
"مزاحمت کوئی نہیں کرے گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم جہاں چاہو گے وہاں پہنچا دیئے جاؤ گے" کرنل بولا "کیا اب میں اٹھ سکتا ہوں؟"
"نہیں" میں نے اس کے شانے پر جوابی ٹھوکر مار کے کہا اور نازو کو اشارہ کیا "تم میرے ساتھ چلو۔ ان دونوں کے لئے ہمارے دو آدمی کافی ہیں۔"
"تم چاہو تو اسے بھی لے جاؤ" غالب نے گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"تم انہیں لے کر پانچ منٹ بعد نکلو گے" میں نے کہا "اور ہمارے پیچھے پیچھے آؤ گے۔ کوئی معمولی غلطی کرے تو تمہیں احکامات کی ضرورت نہیں۔ کِل دیم لائک ڈاگس۔ تم آفس کے باہر ٹھہرو گے۔"
کرنل کے ساتھ برآمدے میں چلتے ہوئے میں نے بہت سی خالی کوٹھریاں دیکھیں۔ پہلے یہ یقیناً کوئی جیل خانہ تھا جو اب ان لوگوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔
کرنل کا آفس بہت وسیع اور شاندار تھا۔ میں نے باہر بھی ایک محافظ کو مسلح کھڑا دیکھا۔ اس کی مشکوک نظریں مجھ پر جمنے سے پہلے جھک گئیں۔
میں نے اسے حکم دیا "دروازہ کھولو اور اندر چلو۔"
"کیا ۔۔۔ تم ۔۔۔"
کرنل نے اسے ہاتھ اٹھا کے خاموش کر دیا "دروازہ کھولو اور اندر چلو۔ خاموشی سے۔ کوئی احمقانہ حرکت مت کرنا۔"
اندر داخل ہوتے ہی میں نے کرنل کو مزید احکامات جاری کئے۔ "اپنی جگہ پر بیٹھو۔ بہتر کیا ہے۔ انٹرکام؟ اپنے باقی دو افسروں کو طلب کرو۔ اس محافظ سے کہو کہ ہتھیار یہاں رکھ کے خود باہر بیٹھے۔ جب افسران تشریف لائیں تو انہیں کچھ نہ بتا سکے نہ زبان سے نہ اشارے سے نہ ملا سکے۔ ورنہ باہر بھی ہمارے آدمی موجود ہوں گے۔"
کرنل نے تعمیل کی اور دونوں افسروں کو اپنے آفس پہنچنے کی ہدایت کی۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ خودکار رائفل کا رخ کرنل کی جانب رہا۔
"یہاں کوئی ڈاکٹر ہے؟" میں نے کہا۔
"ان افسروں میں سے ۔۔۔ ایک ڈاکٹر ہے" کرنل نے کہا۔
"ہمارے ایک ساتھی کو فوراً طبی امداد کی ضرورت ہے اور ہمیں بھی کھانے پینے کو کچھ چاہئے" میں نے کہا "جو بھی مل جائے۔"
"سب کچھ ملے گا" کرنل نے کہا "جو تم چاہو گے۔ کیا اس کے بعد تم چلے جاؤ گے؟"
میں نے کہا "یو ایڈیٹ! کیمپ اب ہمارے قبضے میں ہے اور تم خود بھی ایک قیدی ہو۔ صرف اپنی زندگی کی دعا مانگو۔ سوال مت کرو ہم سے۔"
چند منٹ بعد دونوں افسران آئے اور اندر آتے ہی منجمد ہو گئے۔ کسی مزاحمت کے بغیر انہوں نے اپنے ہتھیار نازو کے حوالے کر دیئے۔ میں نے غالب اور گل کو بھی اندر بلا لیا۔ سارے قیدی دیوار کے ساتھ کھڑے کر دیئے گئے۔ تین ماتحت اور تینوں افسر۔ ان سب کی حالت غیر تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ کیمپ پر کسی نے قبضہ کر لیا ہے مگر یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ہمارا تعلق کس گروہ سے ہے اور ہم اچانک کہاں سے نازل ہو گئے۔
آدھے گھنٹے بعد جب ہم چائے کافی' سینڈوچ اور بسکٹ وغیرہ کھا پی کے تازہ دم ہو گئے اور چندو کو ڈاکٹر نے انجکشن لگانے کے بعد شانے کے زخم پر مرہم پٹی سے فارغ کر دیا تو میں نے کہا۔
"کرنل۔ اب مقدمے کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔"
"مقدمہ! ۔۔۔ کیسا مقدمہ؟" کرنل کا رنگ فق ہو گیا۔
"تمہیں ایم آر ایس کی عدالت کے سامنے پیش ہو کے استغاثہ کے سوالات کے جواب دینے ہوں گے۔ اپنی صفائی میں تم جو کہو گے وہ بھی سنا جائے گا۔"
"واٹ از ایم آر ایس؟" کرنل نے کہا۔
میں نے اسے کرسی سے گھسیٹ لیا اور خود اس کی جگہ بیٹھ گیا۔
"یہ ہماری عدالتِ انصاف ہے۔ جہاں ہم اپنے قوانین کے مطابق اپنی سزا دیتے ہیں۔ ہم مدعی' منصف اور سزا پر عمل درآمد کرنے والے سب خود ہیں۔ ایم آر ایس کا مطلب ہے مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔ یہ تم بھی جانتے ہو گے کہ اس وقت ساری دنیا میں اسی نظریے پر سیاست بھی ہو رہی ہے اور انصاف کا بھی یہی اصول ہے۔"
"میں نہیں مانتا ایسی کسی عدالت کو" کرنل چلایا۔
"عدالت سے تعاون کر کے تم رعایت حاصل کر سکتے ہو۔"

www.paksociety.com

صورت ہو گی۔ تم سے تعاون حاصل کرنے کا پُراذیت مرحلہ پہلے آئے گا۔ سزا اس کے بعد زیادہ طے گی۔ تم سے جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔ یہاں تمہاری نہیں ہماری مرضی چلے گی" میں نے کہا۔ "ہمارے لئے کوئی سوال کئے بغیر تمہیں گولی مار دینا کیا مشکل تھا مگر ہم تمہیں ایک موقع دینا چاہتے ہیں۔"

"او کے... پوچھو، کیا پوچھنا ہے" کرنل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"یہ کیا جگہ ہے۔ کوئی جیل خانہ؟"

"یہ پہلے پاگل خانہ تھا۔"

"پاگل کہاں گئے؟"

کرنل نے کہا "مر گئے۔"

"کیسے مر گئے؟" میں نے کہا "تم نے مار دیا سب کو۔"

کرنل نے مجبوراً اقرار میں سر ہلایا "وہ سب خطرناک پاگل تھے۔"

"خطرناک پاگلوں کو دنیا میں کہیں قتل نہیں کیا جاتا۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"نہیں... ان کے خون کی ضرورت تھی" کرنل نے کہا۔

میں نے چیخ کر کہا "خون کی؟" ان کے جسم سے خون کشید کر لیا [illegible] کس کے لئے؟"

"زخمیوں کے لئے" کرنل نے کہا۔

"کون سے زخمی؟" میں نے کہا "جو بنگال میں لڑ رہے تھے۔ پاکستان کی فوج کے؟ بھارت کے فوجی؟"

اس نے کہا "ان کے علاوہ بنگالی جو اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔"

میرے وجود میں غصے کی آگ ایک دم بھڑک اٹھی تھی مگر میں نے ضبط اور برداشت سے کام لیا۔ میں ان قاتلوں کی فوج کے ناپاک جسم کا آخری قطرہ خون بھی نچوڑ لینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے میں ان کی زبانی اس انسانیت سوز ظلم کی پوری تفصیل جاننا چاہتا تھا۔

"کتنے پاگل قتل کئے تم نے اس طرح؟"

"تقریباً دو سو" کرنل نے کہا۔

"اور ان کی لاشیں کہاں گئیں؟"

"ہم نے یہاں دفنا دیں۔ اسی احاطے میں" کرنل نے کہا۔

"کیا یہ سب حکومت کے علم میں نہیں ہے؟ تم کون ہو؟"

"ہم شیو سینا کے رضاکار ہیں۔ ہم نے دو ہفتے پہلے اس جگہ پر قبضہ کیا تھا۔ ابھی تک یہ بات عام نہیں ہوئی۔ صرف ہم جانتے ہیں اور ہمارے کچھ ساتھی۔"

"اس عرصے میں کسی پاگل کا کوئی عزیز ملنے نہیں آیا؟"

"خطرناک پاگلوں کا کوئی دوست یا عزیز نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "اور یہاں کی انتظامیہ؟"

"اسے بھی ہم نے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ ان کا خون بھی کام آ گیا تھا" کرنل نے کہا۔

"تم کو اندازہ ہے کچھ اپنے جرم کی سنگینی کا؟ اگر یہ بات حکومت کو معلوم ہو جائے، دنیا کو پتا چل جائے تو کیا ہو گا؟"

کرنل نے کہا "اس سے پہلے ہی ہم بھاگ جاتے۔ فوری طور پر اس کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہمیں سپلائی مل رہی تھی، راشن فراہم ہو رہا تھا۔"

"اگر ہم تمہیں مغلوب نہ کرتے تو تم ہمارا خون بھی نکال لیتے؟" میں نے کہا۔

کمرے میں ایک بھیانک خاموشی تھی۔ گل اور نازو پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان جنونی قاتلوں کو دیکھ رہی تھیں اور خون ریزی کی ایسی لرزہ خیز کہانی سن رہی تھیں جو اس سے پہلے صرف جرمن نازی کیمپوں کے بارے میں مشہور ہوئی تھیں۔ اگر یہ بات مہذب دنیا تک پہنچ جاتی تو ساری انسانیت چیخ اٹھتی مگر اب اس کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔ قدرت نے ہمیں ان بے گناہوں کے خون کا بدلہ لینے بھیج دیا تھا جو شیو سینا کے ان درندہ صفت قاتلوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ میں اب پُرسکون تھا اور فیصلہ سنانے سے پہلے مزید تحقیق کے خیال سے رُکا ہوا تھا ورنہ انہیں سزائے موت دینے کے لئے ان کا اعترافِ جرم کافی تھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ایک ٹرک میں جو نوجوان مرد اور عورتیں یہاں لائے گئے تھے وہ کون تھے؟" میں نے کہا۔

"وہ سب مجرم تھے۔ قیدی بنا کے لائے گئے تھے بنگال سے۔"

کرنل نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ تم معاف کرنے والے نہیں ہو۔ تم بہت پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہو کہ ہمیں قتل کر دو گے مگر ہم اب موت سے نہیں ڈرتے۔ ہم نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ اپنا فرض سمجھ کے کیا۔ دشمن کے ساتھ جنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جرمنوں اور جاپانیوں نے جنگِ عظیم میں جو کچھ کیا تھا ساری دنیا جانتی ہے۔ کوریا اور ویت نام میں مہذب جمہوریت پسند امریکی افواج نے کیا سلوک کیا تھا۔ اب میں نے تمہیں پہچان بھی لیا ہے۔ مجھے تمہارا نام یاد نہیں آ رہا ہے مگر مجھے سب معلوم ہے کہ تم نے کیا کارنامے سر انجام دئیے ہیں۔ یہ میرے لئے واقعی حیرانی کی بات ہے کہ تم یہاں کیسے آ پہنچے۔ یوں سمجھ لو کہ ادھر ہم بھی وہی ہیں جو سرحد پار پاکستان میں تم تھے۔"

میں نے کرنل کو گولی ماری۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے جھکا تو میں نے کہا "یہ گولی اس الزام کے جواب میں ہے جو تم نے ہم پر لگایا۔ ہم نے کبھی کسی بے گناہ کا خون نہیں بہایا۔ صرف اسی کو مارا جو ہمارا دشمن تھا یا ہمارے وطن کا دشمن تھا۔"

کرنل نیچے گرا تو میں نے اسے ایک اور گولی ماری جو اس کے سینے میں دوسری طرف لگی "اور یہ گولی اس سزا کے طور پر جو تمہیں دو سو قابلِ رحم انسانوں کو بے رحمی سے ہلاک کرنے کے جرم میں دی

گئی۔ اور یہ آخری گولی اس ظلم کی سزا جو تم نے مشرقی پاکستان کے لوگوں پر کیا۔ وہ سب ہمارے ساتھی تھے۔"

تیسری گولی اس کے سر پر لگی تو وہ آخری بار تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ اس کا خون فرش پر پھیل گیا تھا اور اس خون کے چھینٹے دیواروں تک پہنچے تھے۔ میری آخری گولی کے ساتھ ہی نازو نے نیم دیوانگی کے عالم میں چیختے ہوئے باقی لوگوں پر فائر کھول دیا۔ وہ سب وہیں دیوار کے ساتھ گر کے ایڑیاں رگڑنے لگے۔ نازو ان پر فائر کرتی رہی۔

غالب نے اس کے ہاتھ سے رائفل چھین لی مگر اس پر جنون کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے غالب کو اٹھا کے پھینک دیا اور دوبارہ رائفل حاصل کر لی۔ گل نے ایک دہشت ناک چیخ ماری۔

"بھائی سکندر! اسے روک لیں۔"

نازو دروازے سے باہر جانے کے لئے لپکی تو میں نے دوڑ کر اسے قابو کیا۔ اس نے میری گرفت سے نکلنے کی دیوانہ وار کوشش کی مگر ناکام رہی۔ میں نے ایک ہاتھ مار کے اسے ناک آؤٹ کر دیا اور وہیں میز پر لٹا دیا۔

فائرنگ کی آواز پر کیمپ میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ میں اور غالب باہر نکلے تو ایک ساتھ چار محافظ دوڑتے نظر آئے۔ ایک ستون کی اوٹ سے غالب نے ان چاروں کو نشانہ بنا لیا۔

"ابھی باہر والے باقی ہیں" میں نے کہا۔

"انہیں میں باہر جا کے ٹھکانے لگاتا ہوں" غالب نے کہا اور میرے منع کرنے کے باوجود برآمدے میں دوڑتا چلا گیا۔ خود اس پر جنون کی کیفیت طاری تھی اور میرے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ اسے تحفظ فراہم کروں۔ میں اس کے پیچھے بھاگا۔

گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی میں نے غالب کو پکڑ لیا اور اسی کمرے میں گھسیٹ لیا جس میں ہم اندر آنے کے بعد کچھ دیر قید رہے تھے "ہوش میں آؤ مرزا۔ ایسے سامنے جا کے کیوں خودکشی کرنا چاہتے ہو۔ ہماری ساری جدوجہد زندگی کے لئے ہے موت کے لئے نہیں۔"

غالب نے ایک گہری سانس لی "آئی ایم سوری۔ میرے جذبات قابو میں نہیں رہے تھے۔ اس حرام زادے کی بات سن کر۔"

"آخر میں نے بھی تو وہ سب سنا تھا۔"

"اسی لئے تم مشن کمانڈر ہو۔ چیف کے ڈو" وہ مسکرایا "یہ بات ہم مذاق میں ضرور کہتے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ تمہاری قائدانہ خوبیوں میں سب سے اہم کیا ہے۔ ہنگامی صورت حال میں جذبات پر کنٹرول رکھنا اور دوسروں کو بچانا۔"

اسی وقت باہر کے محافظ دوڑتے ہوئے ہمارے سامنے سے گزرے۔ میں نے غالب کو آہستہ آہستہ دبے پاؤں آگے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہم سے چند قدم دور ہی گئے تھے کہ پیچھے سے ہم دونوں نے فائر کئے اور وہ برآمدے میں ہی لیٹ گئے۔

"اب کون بچا ہے؟" میں نے ایک کی مشین گن اٹھا کے کہا جو لوڈڈ تھی۔

"شاید کوئی نہیں" غالب نے بھی اپنی رائفل پھینک دی اور ایک مشین گن اٹھا لی "ہو گا تو اس سے بھی نمٹ لیں گے۔"

لیکن وہ اس خونی کیمپ میں شیو سینا کے آخری محافظ تھے۔ میں اور غالب لاشوں کے اوپر سے چھلانگ لگاتے ہوئے اس آفس تک پہنچے جہاں اس خود ساختہ کرنل کی اور اس کے باقی ساتھیوں کی لاشیں خون کے بنے ہوئے ایک تالاب میں پڑی ہوئی تھیں۔ کمرا تازہ خون اور بارود کی بُو سے بھرا ہوا تھا۔

گل بڑی بہادری سے میز پر لیٹی ہوئی نازو کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی اور کسی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو چکی تھی۔

"نازو! اٹھو۔ آنکھیں کھولو" گل نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے کہا۔ پھر غالب نے اس کے گالوں پر آہستہ آہستہ تھپڑ مارے اور نازو نے ایک دو بار اوں آں کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور پھر اٹھ بیٹھی۔ اسے کچھ دیر صورت حال کا اندازہ کرنے میں لگی اور وہ سوچتی رہی کہ آخر وہ میز پر کیوں بیٹھی ہے۔ پھر اسے سب یاد آ گیا۔

اس نے انگلیوں سے بال سنوارے۔ ساڑی کو درست کیا اور میز سے اتر آئی۔ گل نے کہا "طبیعت کیسی ہے اب؟"

نازو شرمندگی سے مسکرائی "ٹھیک ہوں۔ پتا نہیں ایک دم کیا ہو گیا تھا مجھے۔"

"تمہیں کچھ بھی نہیں ہوا تھا" غالب نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا "آؤ اب چلیں۔"

باہر سے اب بھی شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر یہ شور مخالف سمت کے کمروں سے اٹھ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم دونوں گیٹ پر رکو" میں نے گل اور نازو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں اور غالب ابھی آتے ہیں قیدیوں کو رہا کر کے۔"

غالب نے کہا "راستے میں بھی چار لاشیں پڑی ہیں۔ دو کی مشین گنیں ہم نے لے لی تھیں۔ تم چاہو تو باقی دو اٹھا لینا۔"

وہ سیدھی برآمدے میں بڑھ گئیں۔ میں اور غالب درمیانی صحن کو عبور کر کے قیدیوں کی طرف گئے۔ وہ ٹرک ابھی صحن میں کھڑا ہوا تھا جس میں جوان صحت مند انسانوں کا تازہ ریوڑ لایا گیا تھا کہ ان کے بدن سے قطرہ قطرہ خون نچوڑ کے بے مصرف جسم کو کہیں گاڑ دیا جائے۔

میں نے کہا "غالب! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جنہیں یہ لوگ دشمن قرار دیتے تھے انہی کا لہو دے کر اپنوں کی زندگی بچاتے تھے۔ لوگ خون کا عطیہ دیتے ہیں انسانی ہمدردی کی بنا پر۔ نیکی کرنے کے لئے اور ثواب کمانے کے لئے۔ عداوت اور نفرت کے جذبات سے مغلوب ہو کے نہیں۔ جب کسی کی رگوں میں آپ کا لہو دوڑ رہا ہو

www.paksociety.com

ور اسے آپ کے خون سے زندگی ملی ہو، پھر وہ دشمن کہاں رہا۔ ں سے تو خون کا رشتہ استوار ہو گیا۔"

"یہ سب کچھ انسان سوچتے ہیں۔" غالب نے کہا "شیطان نہیں۔ ان کی ذہنی کیفیت تو یہ تھی کہ اگر بس چلتا تو یہ خون سے محروم کرنے کے بعد جسموں کو مٹی میں نہ گاڑتے۔ اپنے کتوں کو کھلا دیتے۔"

دو طویل برآمدوں کی قطار میں تیس کوٹھریاں تھیں اور ہر کوٹھری میں دو دو آدمی جانوروں کی طرح بند تھے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں ان کے جسم سے خون کشید کیا جائے گا۔ مگر وہ دیوانوں کی طرح چلا چلا کے رو رہے تھے۔ سلاخوں سے سر ٹکرا رہے تھے۔ اپنے کپڑے پھاڑ رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔

"یہ سب دروازے تو مقفل ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "چابیاں کسی کی جیب میں ہوں گی۔ میں لاتا ہوں۔"

غالب کے آنے تک میں نے ان لوگوں کو تسلی دی۔ اور انھیں سمجھایا کہ ہم انھیں رہا کر رہے ہیں۔ وہ میری بات تو نہیں سمجھے مگر میرے دوستانہ رویے اور محبت بھرے انداز نے انھیں کچھ حوصلہ دیا۔ پھر ایک کوٹھری میں مجھے ایک اردو بولنے والا مل گیا۔ اس نے روتے روتے مجھے بتایا کہ وہ سرحدی علاقے کے رہنے والے لوگ ہیں۔ جنگ میں ان کے گھربار تو تباہ ہوئے ہی تھے انھیں ریلیف کیمپ میں پہنچانے کے بہانے یہاں پہنچا دیا گیا۔

میں نے کہا "آپ سب ایک ہی علاقے کے لوگ ہیں؟"

"ایک ہی گاؤں کے" وہ بولا "پورے پورے خاندان....."

میں نے کہا "بوڑھے اور بچے کہاں ہیں؟"

اس نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ جب چلے تھے تو سب ساتھ تھے۔ دو ٹرک تھے۔ ایک میں بوڑھے اور بچے تھے۔"

میں سمجھ گیا کہ دوسرے ٹرک والوں پر کیا بیتی ہوگی۔ بوڑھوں کو یقینی طور پر ہلاک کر دیا گیا ہوگا۔ وہ کسی کام کے نہیں تھے۔ نہ خون دے سکتے تھے اور نہ غلاموں کی منڈی میں بیچے جا سکتے تھے۔ بچوں کو غلاموں کے تاجر لے گئے ہوں گے۔ لاوارث بچوں کی ترکاروں اور گداگری کے ٹھیکے داروں اور غلام فروشوں کو ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ یہ سب کچھ اکیسویں صدی کے مہذب ترقی یافتہ کہلانے والے معزز معاشرے میں ہو رہا تھا جس میں ہم زندہ تھے۔ غالب چابیاں لے کر آیا تو میں نے باری باری قفل کھول کے انھیں آزاد کیا۔ انھیں قید کرنے والوں نے کسی درجہ بندی کے بغیر الگ الگ کوٹھریوں میں رکھا تھا۔ ایک کی بیوی کسی کے ساتھ تھی تو بہن کسی اور کے ساتھ۔ وہ سب درمیان میں اکٹھے ہو کے اور آپس میں گلے مل کے رونے لگے۔

میں نے تین افراد کو منتخب کیا جو اردو سمجھ سکتے تھے "انھیں سمجھاؤ کہ حوصلے اور صبر سے کام لیں۔ ہم انھیں یہاں سے نکال کے آزاد کریں گے۔ آگے یہ جہاں چاہیں جائیں۔ خود فیصلہ کریں۔ ہم اس سے زیادہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

"یہ لوگ خالی ہاتھ کہاں جائیں گے؟" ان میں سے ایک بولا۔

میں نے کہا "اچھا ہم تھوڑی بہت مالی مدد بھی کریں گے۔ بس تم انھیں خاموش کرا دو۔ اور ان کو ٹرک میں سوار کرلو۔"

"میں ٹرک کی چابیاں بھی لے آیا ہوں" غالب نے کہا۔

"ہم ان سب کو اسی ٹرک میں بھریں گے" میں نے کہا "اور خود بھی اسی میں جائیں گے۔"

میرے سوال کا جواب اس شخص نے دیا جو لوگوں کو یہ سمجھانے گیا تھا کہ ہم انھیں باہر لے جا کے چھوڑ دیں گے۔

"جناب۔ کچھ لوگ میری نہیں مان رہے ہیں۔ کسی کی سننے کو تیار نہیں" وہ واپس آ کے بولا۔

"کیا مطلب۔ کیا وہ آزادی نہیں چاہتے؟"

"نہیں۔ وہ ٹرک میں سوار ہونے پر راضی نہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ انھیں دھوکے سے کسی دوسری جگہ لے جایا جا رہا ہے۔"

"اچھا" میں نے سوچ کے کہا "پھر یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ صرف آزادی؟ ٹھیک ہے۔ جانے دو انھیں جو جانا چاہیں۔"

اس شخص نے واپس جا کے اعلان کیا تو لوگ ایک دم خاموش ہو گئے۔ اب ان کی نظریں بند گیٹ پر تھیں جہاں گل اور نازو کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں مشین گن دیکھ کر کوئی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔

مجھے ان مظلوم گزیدہ لوگوں پر ترس بھی آیا اور ان کی اس ذہنی کیفیت پر دکھ بھی ہوا "اب شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ انھیں گیٹ سے گزرتے ہوئے گولیوں کا نشانہ بنایا جائے گا۔ چلو۔ ہم ان کا خوف دور کر دیں۔"

غالب کے ساتھ میں پہلے کمرے میں گیا جہاں ابھی تک ان کا سامان ویسا ہی رکھا ہوا تھا۔ کسی نے ان پوٹلیوں کو کھول کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ان میں بھی کپڑوں، جوتوں یا باسی کھانے کے سوا کیا ہوگا۔ اگر ہمارے ہاتھ میں جدید وضع کے سوٹ کیس اور قیمتی بریف کیس ہوتے تو وہ دولت محفوظ نہ رہتی جو ان گٹھریوں میں بندھی پڑی تھی۔

میں نے ایک گٹھری کھولی جس میں ڈالر [illegible] میں نے غلطی سے اس کا نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس بجلی [illegible] سے گرا دیا تھا۔ یہ غلطی بھی شاید غیب کا اشارہ تھی کیوں کہ منٹ کے بعد وہ بجلی کا تار گرا دیا گیا تھا۔ سوٹ کیس اگر اس کے پاس رہ جاتا تو یہ دولت اس کے کام بھی نہ آتی۔

جب گیٹ کھلوا دیا اور لوگوں نے ایک ایک دو دو کر کے [illegible] شروع کیا تو میں نے شمار کیے بغیر ان کے ہاتھوں میں نوٹوں کی [illegible] تھما دیے۔ یہ ملے جلے نوٹ تھے چناں چہ نہ مجھے اندازہ تھا کہ کس کو کتنی رقم دے رہا ہوں اور نہ لینے والوں کو۔ وہ میرے

طمانیت، تعجب کا اور احساس مسرت کا انوکھا تجربہ تھا۔ آزادی پا کے بھی جو لوگ شکوک اور اندیشوں کا شکار تھے اور اسے بھی تقدیر کا دھوکا سمجھ رہے تھے، اچانک اپنے ہاتھوں میں نوٹ دیکھتے تھے تو ان کا چہرہ ناقابل یقین خوشی، احسان مندی کے جذبات اور امید سے دمکنے لگتا تھا۔ وہ ہاتھ اٹھا کے ہمارے حق میں دعائیں کرتے تھے۔ ہمارے پاؤں چھونے کی کوشش کرتے تھے اور پھر چیخیں مارتے ہوئے گیٹ سے باہر بھاگ جاتے تھے۔ انھیں اندازہ نہ تھا کہ ہم کو خدا یہاں نہ بھیجتا تو ان کے ساتھ کیا ہوتا مگر وہ اتنا ضرور سمجھتے تھے کہ ہم نے ان کو نئی زندگی بخشی ہے۔

بہت سے لوگ پیسے وصول کرنے کے بعد واپس ٹرک کی طرف چلے گئے۔ ہم نے ان کا اعتماد حاصل کر لیا تھا اور وہ ہمارے ساتھ ہی جانے پر تیار ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود نصف سے زائد یوں فرار ہوئے جیسے اچانک زنجیریں کٹ جائیں، دیواریں گر جائیں اور زنداں کے دروازے کھل جائیں تو سزائے موت کے منتظر قیدی دیوانہ وار نکل جائیں۔ کوئی سمت دیکھے بغیر اور راستے کی پروا کیے بغیر جلد از جلد اس جگہ سے دور جانے کے لیے دوڑتے جائیں جہاں وہ دست اجل کے اسیر تھے۔

غالب نے کہا "اب ہمیں بھی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کوئی آ جائے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ اب یہاں وہی آئے گا جس کی قضا لائے گی۔ اور کوئی دو بجے تک نہیں آیا تو اب کیوں آئے گا۔ میں ذرا وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"کون سی جگہ؟" غالب نے کہا۔

"جہاں یہ زندہ انسانوں کے جسموں سے خون کشید کرتے تھے" میں نے کہا۔

غالب نے مجھے روک لیا "مت جاؤ ادھر۔ ورنہ تمھاری آنکھیں وہ منظر نہ دیکھ لیں جو تمھارے خیالوں کا آسیب بن جائے۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے مرزا۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ وہاں کچھ لوگ بند رہ جائیں۔ وہ جن کی باری آ گئی تھی یا آنے والی تھی۔ بعد میں انھیں کون بچانے آئے گا۔" میں نے کہا۔

غالب نے کچھ دیر سوچا اور پھر میرے ساتھ چل دیا۔ ہم نے سارے احاطے کا چکر لگا کے ہر کوٹھری میں جھانکا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ گیٹ کے قریب آخری کمرے کا دروازہ کھولتے ہی میرے دماغ کو شدید جھٹکا لگا۔ یوں جیسے میرے سر سے چار سو چالیس وولٹ کرنٹ کا تار چھو گیا ہو۔ اندر سے اٹھنے والی بو ویسی ہی تھی جیسے کسی کمیلے کی متعفن فضا میں محسوس ہوتی ہے۔ یہ خون کی بو تھی جو فرش پر جما ہوا تھا۔ سیاہ دھبوں کی صورت میں اور دیوار پر سرخ پینٹ کی طرح۔

میں نے دل کڑا کر کے کمرے میں قدم رکھا اور بائیں طرف والے دروازے کی طرف بڑھا جو بند تھا۔ یہ پاگلوں کے علاج کا کمرا تھا جہاں شاید انھیں الیکٹرک شاک بھی دیے جاتے ہوں گے مگر اب یہ ایک مذبح خانہ تھا۔

دوسرے کمرے میں آٹھ نو فٹ کی بلندی پر لوہے کا ایک پائپ چوڑائی کے رخ لگا ہوا تھا اور اس کے دونوں کنارے مخالف دیواروں میں پیوست تھے۔ اس پائپ کے ساتھ لوہے کے دو ہک لٹکے ہوئے تھے اور نائلون کی خون آلود رسیاں پڑی تھیں۔ فرش پر دو ڈرم رکھے ہوئے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر میری روح تک لرز اٹھی۔ چشم تصور سے میں نے دیکھ لیا کہ دو زندہ انسانوں کے پاؤں رسی سے باندھ کے انھیں ہک سے لٹکا دیا گیا ہے۔ ذبح کیے جانے والے بکروں کی طرح۔ پھر ان کی گردن کی ایک رگ کاٹ دی گئی ہے اور اس میں سے بہنے والا تازہ خون تھیلیوں میں بھرا جا رہا ہے۔ ڈرم صرف اس لیے تھا کہ ایک تھیلی بھرنے کے بعد دوسری لگانے تک جتنا خون گرے اس میں گرے۔

مجھے سخت متلی محسوس ہوئی اور میں ابکائیاں لیتا ہوا باہر بھاگا۔ غالب مجھ سے پہلے واپس چلا گیا تھا مگر مجھے پتا نہیں چلا تھا۔ اسے میں نے برآمدے کے فرش پر چت پڑا دیکھا۔ میں وہاں بیٹھ کے الٹیاں کرنے لگا۔ مجھے سخت کمزوری محسوس ہوئی اور ذرا سی دیر کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا۔

گل اور نازو ہماری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں اور گیٹ کی پہرے داری بھول کے ہمیں سنبھال رہی تھیں۔ میں نے اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے محسوس کیے تب مجھے پتا چلا کہ میں بھی بے ہوش ہو گیا تھا۔ غالب میرے قریب ہی لیٹا ہوا تھا۔

چند منٹ بعد میں اٹھ بیٹھا "غالب!"

غالب نے آہستہ سے کہا "میں نے منع کیا تھا۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "مجھے کیا معلوم تھا۔ خیر۔ اٹھو ہم اس منحوس جگہ سے نکل جائیں۔"

"میں یہ منظر کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔" غالب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ نازو کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اس نے ایک گھونٹ لیا اور گلاس مجھے تھما دیا۔ پانی پی کر میں نے اپنی حالت بہت بہتر محسوس کی۔

"یہ کیا ہو گیا تھا تم دونوں کو ایک ساتھ؟" نازو نے تشویش سے پوچھا۔

"یہ نہ پوچھو تو اچھا ہے" میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ادا کرو کہ جو ہم نے دیکھ لیا، وہ تم نے نہیں دیکھا۔ ورنہ تم پاگل ہو جاتیں" غالب نے کہا۔

ہم سے کچھ فاصلے پر وہ سب قیدی خاموش کھڑے تھے جن کو ہم نے قید سے رہائی دلا کے اپنا بنا لیا تھا۔ وہ ہمارے دکھ پر اتنے دکھی تھے کہ اپنا دکھ بھول گئے تھے۔

"چلو۔ سب ٹرک میں" میں نے کہا "راستے میں جس کو جہاں اترنا ہو بتا دے۔ ایک آدمی جو راستے سے واقف ہو آگے ہمارے

urdupaksociety.com

ساتھ بیٹھ جائے۔"

دس منٹ بعد ٹرک اس پاگل خانے سے نکلا تو میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میرے ساتھ ایک میاں بیوی بیٹھے تھے۔ بیوی نرس تھی اور اس کا شوہر ٹیچر تھا۔ وہ کلکتہ کے راستوں سے واقف تھے اور میری رہنمائی کر رہے تھے۔

یہ کلکتہ کے مضافات تھے۔ پاگل خانہ ضرورت کے تحت شہر سے بہت فاصلے پر بنایا گیا تھا۔ مگر صنعتی شہر کا کینسر وہاں تک پھیل گیا تھا۔ آس پاس نئے کارخانوں کی بنیادیں کھودی جا رہی تھیں یا تعمیرات جاری تھیں۔ بہت سے لوگ پاگل خانے کی گاڑی دیکھ کر چونکتے نظر آئے۔ انہیں کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ دیوانے وہ خود ہیں جو حقیقت سے بے خبر ہیں اور اپنی بے خبری پر خوش رہتے ہیں۔ اس گاڑی میں ان سے زیادہ ذی عقل' باہمت اور ہوشیار لوگ تھے۔

کلکتہ تک ایک طویل مسافت تھی۔ مضافات' کارخانے' نئی آبادیاں' کچی بستیاں' جھونپڑیاں اور محلات گزرتے جا رہے تھے۔ انسانوں کا ایک سمندر تھا جس کی وسعت کا اندازہ کرنا ممکن نہیں تھا تاہم ایک فرق جو میں نے بمبئی اور کلکتہ میں محسوس کیا افلاس زدہ انسانوں کے تناسب کا تھا۔ بمبئی میں کچھ خوشحالی نظر آتی تھی اور ایک طبقہ تھا۔ یہاں غربت کی انتہا نے آبادی کی اکثریت کے چہروں پر پریشانی اور دکھ' تنگی اور خرابی کی چھاپ لگا رکھی تھی۔ یہ فرق یوں بھی زیادہ نظر آتا تھا کہ جنوبی ہند کے رہنے والے دوسری نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے جسم گٹھے ہوئے' مضبوط اور جفاکش لگتے تھے۔ بنگالی نسلاً غریب کمزور تھے اور لباس بھی کم پہنتے تھے چنانچہ ان کے استخوانی بدن اور کوتاہ قد فاقہ کشی کے تاثر کو ابھارتے تھے۔

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ٹیچر نے مجھے بہت سی خون رُلانے والی کہانیاں سنائی تھیں جو حقیقت پر مبنی تھیں مگر سچ کا خوگر ہو انسان تو مست جاتا ہے سچ۔ میں سب کچھ سن رہا تھا اور کسی رد عمل کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ میں نے جنگ کے نتائج کی ہولناکی اور تباہی کو منطقی انداز میں قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری یہ بے حسی بالکل فطری تھی۔ آپریشن ٹیبل پر مریض مر جائے تو ڈاکٹر ہاتھ دھو کے باہر نکل جاتا ہے اور سگریٹ جلا کے اپنے کسی ساتھی سے شام کی پارٹی یا فلم کے بارے میں بات کرنے لگتا ہے۔ گورکن قبر کھودنے اور مردے کو دفنانے کے بعد اپنی کمائی پر خوش ہو کے سکون سے سو جاتا ہے۔ انجبی سڑکوں اور پُر ہجوم شاہراہوں پر ہر قسم کی ٹریفک کے درمیان کوئی اس گاڑی کو دیکھ کر ہنس بھی نہیں رہا تھا جس پر مینٹل ہاسپٹل کا نام لکھا ہوا تھا۔ کسی کو اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ کسی اور کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔

میں گاڑی چلاتے چلاتے تھک گیا تھا۔ رات بھر کے سفر اور اس کے بعد ایک پُر اذیت تجربے نے میرے جسم اور اعصاب کی ساری توانائی ختم کر دی تھی۔ یہ صرف قوت ارادی کی آخری رمق تھی جو مجھے رواں دواں رکھنے میں کام آ رہی تھی۔ اس کے ختم ہونے سے پہلے میں رک جانا چاہتا تھا۔ ورنہ مجھے یقین تھا کہ ٹرک میرے قابو میں نہیں رہے گا اور میں کسی بس یا ٹرام سے ٹکرا جاؤں گا۔

ایک معروف چوک سے گزرتے ہی میرا سر اسٹیئرنگ پر لگا اور ٹرک تھوڑا سا لہرایا۔ مجھے نرس کی چیخ نے بیدار کر دیا۔ میں نے عین وقت پر آنکھیں کھول کے بریک لگائے مگر اس کے باوجود ٹرک فٹ پاتھ پر چڑھ گیا اور پھر اتر کے سڑک کے کنارے رک گیا۔

"اب تم لوگ جاؤ" میں نے کہا "ان سب سے کہہ دو کہ یہ بھی جائیں۔ جہاں ان کا دل چاہے۔"

پیچھے سے غالب اتر کے آگے آیا "یہ کیا ہوا تھا؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ سب کو یہاں اتار دو۔"

"پیچھے تو اب کوئی نہیں ہے۔"

"کہاں ہیں وہ سب لوگ....." میں نے نیچے اتر کے کہا۔

"وہ راستے میں اتر گئے۔ باری باری۔ جہاں بھی ٹرک کی رفتار کم ہوتی تھی۔ کسی موڑ پر یا چوراہے پر۔ میں دو چار افراد کو اتار دیتا تھا۔" غالب نے کہا۔

"گڈ۔ یہ تم نے عقل مندی کی۔ انہیں سمجھا دیا تھا اچھی طرح کہ وہ آج کے دن کو اپنی زندگی سے خارج کر دیں۔ یہ سمجھ لیں کہ صبح اب ہوئی ہے۔"

"ہاں۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ وہ آج کے واقعات کو بالکل بھول جائیں۔ نہ کبھی خود یاد کریں نہ کسی کو بتائیں۔ اسی میں ان کی بہتری ہے" غالب نے کہا

"اچھا تم آگے آ جاؤ۔ ٹرک چلاؤ" میں نے کہا۔

نرس اور ٹیچر نیچے اتر گئے تھے۔ انہوں نے کہا "آپ کی بہت مہربانی۔ آپ کا بہت احسان۔"

میں نے ان سے ہاتھ ملایا اور ٹرک میں ان کی جگہ بیٹھ گیا۔ غالب نے ٹرک کو آگے بڑھا دیا۔

"اب کہاں چلیں؟"

میں نے کہا "پہلے اس ٹرک سے نجات حاصل کرنی ضروری ہے۔ اس کے بعد کسی ہوٹل میں چلو۔"

دو بجے ہم نے ٹرک کو ایک ریلوے اسٹیشن کے سامنے روک دیا۔ وہ کلکتہ کے بہت سے لوکل اسٹیشنوں میں سے ایک تھا۔ کسی نے ہمیں شک کی نظروں سے یا غور سے نہیں دیکھا۔ ہم میں ایسی کوئی بات ہی نہ تھی۔ ہم جیسے ہزاروں تھے۔ ہم سے بھی زیادہ عجیب حلیوں میں اور زیادہ مضحکہ خیز نظر آنے والے۔

چندو کی حالت پھر خراب ہو رہی تھی۔ مسلسل بیماری اور مناسب علاج نہ ملنے سے وہ قریب المرگ ہو رہا تھا۔ میں نے اور غالب نے اسے سہارا دے کر اتارا اور ہم کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے جہاں بہت سے قلی مزدور چادر تانے سو رہے تھے۔ ہمارے سامنے اور ہمارے پیچھے لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو دکانوں اور ریستورانوں میں بیٹھے تھے۔ خریداری کر رہے تھے۔ آپس میں لین دین کر رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے اور لڑ رہے تھے۔ زندگی اپنی پوری گہما گہمی کے ساتھ وقت اور پیسے کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ وقت دولت ہے' دولت وقت ہے۔ انسان کی تمام مصروفیت کا محور اور کچھ نہیں۔ ایک روٹی کا مسئلہ بھی اتنا ہی اہم ہو جاتا ہے جتنا ایک نایاب ہیرے کے حصول کا مسئلہ۔

غالب نے کہا "چندو.... تم کلکتہ پہنچ گئے۔"

"ہاں ابھی تم جاتی۔ ہم کو ادھر بھی موت دیتی۔" وہ غالب کی بات سمجھ کے بولا۔

نازو نے احتجاج کیا "ابھی تمہاری حالت ایسی نہیں ہے چندو۔ ٹھیک ہو جاؤ تو چلے جانا۔"

میں نے کہا "ہم چندو کے ٹھیک ہونے تک یہاں نہیں رک سکتے۔ اس کی امانت اسے لوٹا دو۔"

گل نے سونے کے زیورات کی پوٹلی چندو کی طرف کھسکا دی۔

"اس کی حفاظت کر سکو گے تم؟"

"کسی کو پتا چل گیا تو وہ تمہارا سر بھی کاٹ کے ساتھ ہی لے جائے گا" غالب نے کہا۔

وہ کچھ متفکر نظر آنے لگا "ابھی یہ آپ رکھتی۔"

"نہیں۔ ہم یہ ذمے داری قبول نہیں کر سکتے۔ ہمارا کچھ پتا نہیں کل کہاں ہوں" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "کل تک تو چندو ہمارے ساتھ رہ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ہمارے ساتھ؟ نہیں۔ مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اسے کسی ہسپتال میں داخل کرا دیں۔ اس کے علاج معالجے کے اخراجات ادا کریں اور جب تک یہاں ہیں اسے دیکھنے جاتے رہیں۔ اسے ہم اپنے ساتھ ہوٹل میں نہیں رکھ سکتے۔"

میری تجویز سے سب نے اتفاق کیا۔ پھر غالب نے وہیں کھڑی ہوئی ایک ٹیکسی کے ڈرائیور سے بات کی۔ بیشتر ٹیکسی ڈرائیور فرفر انگریزی بولتے تھے۔ ایک ہوشیار نوجوان نے کہا۔

"آپ لوگ اجنبی ہیں۔ بمبئی سے آئے ہیں؟"

غالب نے فوراً تردید کی "ہم دہلی سے آئے ہیں۔ گھومنے پھرنے۔"

"اچھا تو پھر میں آپ کو کلکتہ کی سیر کراؤں گا۔ میں خود اس ٹیکسی کا مالک ہوں۔ دوسرے ڈرائیوروں کے پاس اپنی ٹیکسی نہیں ہے۔ وہ آٹھ گھنٹے کی شفٹ لیتے ہیں۔ ان کے ساتھ آپ کو پرابلم ہوگی۔ میں چوبیس گھنٹے آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں۔ میرا کوئی گھر بار نہیں۔ بیوی بچے نہیں ـــــ میں گریجویٹ ہوں۔ پروفیشنل گائیڈ رہا ہوں۔ آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کا ہر کام کر سکتا ہوں" اس نے ایک سانس میں کہا۔

میں نے کہا "اگر تم پھر اتنی لمبی تقریر نہ کرنے کا وعدہ کرو تو ہم تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔"

وہ مسکرایا "اب کیا رہ گیا ہے بتانے کو۔ میں وہ سب پہلے ہی بتا رہا ہوں جو لوگ مجھ سے بعد میں پوچھتے ہیں۔ اگر آپ کہیں گے تو میں ہونٹ سی لوں گا۔"

نازو اور گل اسے دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے سامان ڈکی میں رکھا اور چندو کو پیچھے بٹھا دیا۔

"پانچ آدمی۔ دس روپے زیادہ ہوں گے۔"

"تم نے ابھی سے گڑبڑ شروع کر دی" میں نے کہا۔

"یہ میری جیب میں نہیں جائیں گے۔ راستے میں پولیس لے گی" وہ بولا "میرے تو گنے بندھے سو روپے روز کے ہیں۔"

"اچھا پہلے ہمیں کسی درمیانے درجے کے اچھے ہسپتال میں لے چلو" میں نے کہا "ہمارا یہ دوست بیمار ہے اور زخمی ہے۔"

اس نے کہا "گولی کا زخم ہے یا خنجر کا؟"

میں نے کہا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"پڑتا ہے۔ خیر۔ میں آپ کو وہاں لے جاؤں گا جہاں آپ سے کوئی کچھ نہیں پوچھے گا۔ بھروسے کے لوگ ہیں اور ایک لیڈی ڈاکٹر ہے جو ایسے کیس کے دو سو روپے زیادہ لیتی ہے۔ سو پولیس کے اس کے اپنے۔"

"تم جانتے ہو اسے؟"

"وہ میری چھوٹی بہن ہے۔ اسے میں نے ہی ڈاکٹر بنایا تھا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"بہت بدمعاش ہو تم؟"

"بہن کو ڈاکٹر بنانے میں کیا بدمعاشی ہے؟"

میں نے کہا "تم خود اس کے لئے کیس لے جاتے ہو۔"

"پھر کون لے جائے گا؟ اور لے جانے والے تو بہن کے لئے گاہک بھی لے جاتے ہیں۔ شاید دہلی میں ایسا نہ ہو مگر کلکتہ میں ہوتا ہے۔ تم کو تجربہ ہو جائے گا۔ یہاں صرف پیسہ چلتا ہے۔ کوئی اصول قانون نہیں۔"

"تم کمال کے آدمی ہو۔ ٹیکسی کیوں چلاتے ہو آخر؟ اپنی بہن کے ساتھ مل کے ہسپتال کیوں نہیں چلاتے؟"

"چھوٹی بہن کی کمائی کیوں کھاؤں میں۔ اسے میں نے اس لئے تو ڈاکٹر نہیں بنایا تھا کہ وہ کمانے لگے تو میں وہ سب وصول کر لوں جو اس پر انویسٹ کیا تھا۔ میں خود کما سکتا ہوں۔ اس کے برابر نہ سہی اس سے آدھا ضرور کما لیتا ہوں اور ٹیکسی چلانا کیا جوئے کے اڈے شراب خانے یا چکلے چلانے سے بہتر نہیں ہے؟"

مجھے اس کی دو ٹوک بے باک باتیں پسند آئیں۔ وہ حد سے زیادہ صاف گو اور خوددار آدمی تھا۔ ایسے لوگ ایمان دار' دل کے کھرے اور بااصول ہوتے ہیں۔

غالب نے کہا "تمہارے یہ جذبات واقعی قابل تعریف ہیں۔ مگر دوست "اس دنیا میں تم کیسے گزارا کرتے ہو' جہاں لوٹ کھسوٹ' بے ایمانی' منافقت اور دھوکے بازی ہے....."

"میری دنیا سب سے الگ ہے۔ اور میں اس دنیا میں بہت خوش اور مطمئن ہوں" اس نے غالب کی بات کاٹ دی۔

"ہم کسی ہوٹل میں قیام کریں گے" میں نے کہا "ہوٹل بھی

www.paksociety.com

اوسط درجے کا اور شریفانہ ہو۔ اگر ہسپتال کے قریب ہو تو سب سے بہتر۔"

"قریب اور دور سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بڑے شہر کے فاصلے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ دلوں کے فاصلے اور گھروں کے فاصلے۔ آبادیوں کے فاصلے، انسانوں کے فاصلے۔"

"تم تو فلاسفر ہو یار" غالب نے کہا۔

اس نے ٹیکسی کو ایک دم موڑ دیا "یہ ہسپتال ہے، دس روپے روز والا کمرا لے لو۔ ایک ہزار ایڈوانس جمع کرا دو۔ اور پیسہ کم ہے تو دو روپے روز کا بیڈ لے لو جنرل وارڈ میں۔ رکنی نام ہے میری بہن کا۔ اسے بولنا کمار نے بھیجا ہے۔"

"تم ساتھ نہیں چلو گے؟"

"نہیں۔ میری اس سے لڑائی ہے۔ بات چیت بند ہے۔"

"کس بات پر؟" نازو نے حیرانی سے کہا۔

"ہوتی رہتی ہے۔ میرے پیچھے پڑی رہتی ہے کہ میرے ساتھ رہو اور شادی کرو۔ میں دونوں کام نہیں کر سکتا۔"

"آخر کیوں؟"

"میری مرضی دیدی جی، آپ یہ مت پوچھیں۔"

چندو کا داخلہ کسی دشواری کے بغیر ہو گیا۔ رکنی بڑی نازک اور بیچاری سی لڑکی تھی۔ بھائی کا نام سنتے ہی وہ چونکی۔

"کمار کہاں ملا تھا تمہیں؟ وہ خود لایا ہو گا تم کو۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ ہمیں چھوڑ کے واپس چلا گیا۔"

غالب نے کہا "ہمارا دوست ٹھیک ہو جائے گا نا؟"

"ٹھیک کیوں نہیں ہو گا۔ لاؤ پانچ سو روپے نکالو" اس نے کہا "اور نام پتا بولو۔"

میں نے کہا "ہم کسی ہوٹل میں ٹھہریں گے۔"

اس نے چین دانتوں میں دبا کے کہا "اچھا جاؤ، میں لکھ لوں گی جو بھی لکھنا ہو گا۔ یہ خنجر کا زخم ہے۔ کم سے کم بارہ گھنٹے پر انا۔ مگر تم فکر مت کرو۔ پولیس کو کچھ نہیں معلوم ہو گا تمہارے بارے میں۔"

میں اور غالب واپس آئے تو کمار نے کہا "اس نے میرے بارے میں پوچھا تو ہو گا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ تمہارا نام لینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔"

اس کا چہرہ اتر گیا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں ہنس پڑا "عجیب چیز ہو تم بھائی بہن۔ اسے تو یہ بھی یقین تھا کہ ہمیں تم ہی لائے ہو۔ میں نے جھوٹ بول دیا کہ تم ہمیں چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ اس کا چہرہ بھی ایسے ہی اتر گیا تھا۔"

نازو نے کہا "کب تک چلے گی یہ لڑائی؟"

اس نے ٹیکسی چلاتے ہوئے کہا "جب بھی چلے گی۔ ورنہ وہ بھی یقین نہ کرتی تم پر۔ باہر آ کے مجھے پکڑ لیتی۔"

"اس کی شادی ہو گئی ہے؟"

"نہیں۔ ضد پر اڑی ہوئی ہے کہ پہلے میں شادی کر لوں۔ اس کا جو یہ بھی ہے، ڈاکٹر ہے وہ بھی۔ بیچارا مجھے اور اسے مناتا رہتا ہے اور صبر کئے بیٹھا ہے۔ کہتا ہے پچاس سال تو انتظار کروں گا۔ اس کے بعد نہیں۔ ابھی چھتیس سال کا ہے، پچاسی کا ہو جائے گا۔"

"اس کے بعد شادی کرے گا" نازو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ اس کے بعد خودکشی کرے گا۔"

"مجھے تو تم سب پاگل لگتے ہو" نازو کا ہنس ہنس کے برا حال ہو گیا۔

غالب نے کہا "ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ایک ہی دن دونوں شادی کر لو۔"

اس نے ہنسی میں سر ہلا دیا "رکنی کا تو گھر ہو گا۔ میرے پاس ابھی رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ پہلے گھر بناؤں گا پھر بساؤں گا۔ شادی کے بعد بہن کے گھر میں رہوں، یہ ناممکن ہے۔ رکنی کو عقل سے کام لینا چاہئے۔"

"یہ مسئلہ ہی جذبات کا ہے۔ عقل کیا کرے گی" میں نے کہا۔

اس نے ٹیکسی روک لی "ایک تو یہ ہوٹل ہے۔"

میں نے پانچ منزلہ وسیع و عریض عمارت کو دیکھا جس کے باہر والے گیٹ پر "ہوٹل وائسرائے" لکھا ہوا تھا اور اندر پارکنگ ایریا میں سیکڑوں کاریں کھڑی تھیں۔ یہ فائیو اسٹار تو نہیں مگر فور یا تھری اسٹار ہوٹل یقیناً تھا۔

"ہم وائسرائے تو نہیں ہیں یار" غالب نے کہا۔

نازو نے بھی کہا "اس کا کرایہ بہت ہو گا۔"

لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ ہم ایسے ہی ہوٹل میں زیادہ محفوظ ہوں گے۔ اگرچہ ہمارا سامان اور حلیہ انتہائی مضحکہ خیز تھا مگر اصل چیز پیسہ تھی جو ہمارے پاس کم نہ تھا۔

"ٹھیک ہے مسٹر کمار۔ ہم یہاں قیام کریں گے۔ تم یہ سو روپے رکھو۔ ایڈوانس۔"

اس نے کہا "تھینکس۔ میں اسی جگہ موجود رہوں گا۔"

"کل صبح تک شاید تمہاری ضرورت نہ پڑے۔"

"پھر بھی میں کہیں جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو آپ کسی ویٹر کے ذریعے مجھے طلب کر سکتے ہیں" کمار نے کہا۔

ہوٹل کے دربان اور پورٹر نے ہمارا استقبال کرتے ہوئے ناک بھوں چڑھائی۔ یہاں آنے والے کاروں سے اترتے تھے اور ان کے پاس غیر ملکی سوٹ کیس ہوتے تھے۔

میں نے کاؤنٹر پر جا کے کہا "ہمیں دو ڈبل روم چاہئیں۔"

کلرک نے مجھے غور سے دیکھا اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا "تم کو معلوم ہے کرایہ..."

میں نے اتنے زور سے کاؤنٹر پر مکا مارا کہ وہ اچھل پڑا "تم کو جرأت کیسے ہوئی یہ پوچھنے کی؟ کیا میں حقیر نظر آتا ہوں تمہیں؟ کوئی جاہل۔ میں دنیا کے ہر بڑے شہر کے بڑے ہوٹل میں ٹھہرا ہوں مگر ایسی بدتمیزی سے کسی نے بات نہیں کی۔ آخر تم سمجھتے کیا ہو خود کو۔ اپنے منیجر کو بلاؤ۔"

شور نے دوسرے مسافروں کو متوجہ کر لیا تھا جو وہاں بکنگ لے چکے تھے یا اس انتظار میں تھے کہ پورٹر ان کا سامان اٹھائے۔ ان میں سے کچھ مسکرائے۔ ایک غیر ملکی نے فرنچ میں ساتھی عورت سے کہا "یہ پُراسرار لوگ ہیں۔"

میں اس پر برس پڑا "کیا پُراسراریت ہے مجھ میں؟" میں نے فرانسیسی کی ساری مہارت بروئے کار لاتے ہوئے کہا "میرے سر پر سینگ ہیں۔ جب میں پیرس کے کسی ہوٹل میں جاتا تھا تو وہاں کسی کی مجال نہ تھی کہ مجھ پر ایک تمسخر کی نگاہ بھی ڈال سکے۔"

فرانسیسی بری طرح بوکھلا گیا "موسیو۔ میں..... میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

"مطلب میں خوب سمجھتا ہوں۔ پُراسرار تو مجھے تم لگتے ہو۔ ضرور یہاں جاسوسی کرنے آئے ہو گے" میں نے کہا۔

"تم حد سے بڑھ رہے ہو" وہ گرم ہو گیا۔

اتنے شور کے بعد منیجر کا باہر آنا یقینی تھا۔ جب اسے ساری بات معلوم ہوئی تو ظاہر ہے کہ شامت غریب کلرک کی آئی۔ نزلہ بر عضو ضعیف۔ منیجر نے بہت معذرت کے بعد خود ہمیں کمروں کی چابیاں دیں اور رجسٹر میرے سامنے رکھ دیا کہ اس میں ناموں کا اندراج کر دوں۔ میں بھی چاہتا تھا کہ بلاوجہ کی پوچھ گچھ اور تصدیق کا مسئلہ درپیش نہ ہو۔ میں نے ایک نام "مسٹر اور مسز آفندی" اور پتا "بائیس راج بلڈنگ اجمل خان روڈ قرول باغ دہلی" لکھا۔ دوسرا نام میں نے "مسٹر اینڈ مسز ڈی سوزا" لکھا۔ پانچ ہزار روپے ایڈوانس دینے کے بعد ہم معتبر ہو گئے۔

اس وقت تک دوپہر کے کھانے کا وقت گزر چکا تھا لیکن کھانا ضروری تھا۔ روم سروس سے کافی چائے اور سینڈوچ منگوا کے کھاتے ہی ہم نے باہر "ڈونوٹ ڈسٹرب" کا بورڈ سیدھا لٹکایا اور کمرے اندر سے بند کر کے سو گئے۔ ایک کمرے میں گل اور نازو تھیں اور ساتھ والے میں، میں اور غالب۔ یہ بے ہوشی کی ایسی نیند تھی کہ زلزلہ بھی آ جاتا تو مجھے خبر نہ ہوتی۔

جب میری آنکھ کھلی تو گھڑی میں آٹھ بج رہے تھے۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ میں صرف چار گھنٹے سویا۔ لیکن پردوں کے پیچھے کھڑکی کے شیشے تاریک نہیں تھے۔ رات ہوتی تو کمرا بھی اتنا روشن نہ ہوتا۔

میں اٹھ کر کھڑکی تک گیا اور پردے ہٹا کے باہر دیکھا تو مجھے یقین آیا کہ اس وقت صبح کے آٹھ بجے ہیں اور میں سولہ گھنٹے بعد جاگا ہوں۔ غالب ابھی تک سو رہا تھا اور ساتھ والے کمرے کی خاموشی بھی بتاتی تھی کہ گل اور نازو کی آنکھ بھی نہیں کھلی ہے۔

میری ساری تھکن دور ہو گئی تھی لیکن جسم کا عضو عضو درد کر رہا تھا۔ مجھے گرم پانی سے غسل کرنے کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے میں نے سگریٹ جلا کے ایک کش لیا تو دھواں خالی پیٹ میں گھونسے کی طرح لگا۔ میں نے سگریٹ بجھا کے روم سروس سے کافی منگوانے کا سوچا، ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کھینچ لیا۔ کیوں نہ پہلے میں اپنا حلیہ درست کر لوں۔ یہ جھاڑ جھنکاڑ صاف کرا دوں۔ داڑھی اور سر کے بال آپس میں یوں مل گئے تھے کہ میں حلئے سے پہاڑوں کی گپھا میں رہنے والا جوگی نظر آتا تھا۔ یہی حال مرزا غالب کا بھی تھا۔ اس ہیئت کذائی کے ساتھ ہوٹل وائسرائے میں ہمارا جو استقبال ہوا تھا وہ غلط بھی نہ تھا۔ ایسے حلئے کے لوگ یہاں آئے بھی ہوں گے تو باہر سے ہی دھتکار دیئے جاتے ہوں گے۔ ہمارے ساتھ گل اور نازو نہ ہوتیں تو شاید دربان ہمیں بھی "معاف کرو بابا" کہہ کے روک دیتا۔ ہوٹل والے غلط قسم کے افراد کو روکنے کے لئے "حقوق داخلہ محفوظ ہیں" کا بورڈ تو یہاں رکھتے ہیں۔ اگر میں انگریزی اور پھر فرانسیسی نہ بولتا تو ممکن تھا کہ منیجر بھی مجھے کمرا دینے سے انکار کر دیتا۔

حلیہ بدلنا مشکل اور لمبا کام تھا۔ میں نے فون اٹھا کے روم سروس سے بات کی "کیا یہاں ہیئر ڈریسر ہے۔"

"یس سر۔ میز منٹ میں سیلون ہے۔"

"میں اسے یہاں مانگتا ہوں" میں نے کہا۔

"سوری سر۔ ہیئر ڈریسنگ کے لئے روم سروس نہیں ہے، آپ کو زحمت کرنی پڑے گی۔"

"او کے۔ ہم زحمت کریں گے بعد میں۔ ابھی ہمارے لئے دو بلیک کافی بھیجو" میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔

دوسری کافی میں نے غالب کے لئے منگوائی تھی جو میری آواز سن کے جاگ گیا تھا۔

"میں بہت دیر سے سوچ رہا تھا کہ پہلے کیا کروں۔ نہاؤں، کافی پیوں یا انسانوں کی شکل میں آنے کے لئے بالوں کا یہ جنگل صاف کراؤں" میں نے کہا۔

غالب نے گھڑی دیکھی اور انگڑائی لے کر بولا "وہ ابھی سو رہی ہیں۔ خیر سونے دو۔"

میں نے کہا "آج میں سکندر بخت کا چہرہ دیکھوں گا۔ بہت عرصے بعد..."

غالب نے کہا "میں تو بھول گیا ہوں کہ میں کیسا تھا اور کیا تھا۔ اب تو یقین نہیں آتا کہ میں ایک صحافی تھا۔"

"ہم ایسا کرتے ہیں کہ کافی پی کے باہر چلتے ہیں" میں نے کہا "کمار کو ساتھ لیتے ہیں۔ پہلے اسی حلئے میں تصویریں بنوائیں گے یادگار رکھنے کے لئے۔ پھر کہیں سے بال کٹوائیں گے اور ریڈی میڈ کپڑے خریدیں گے۔"

"گل اور نازو پریشان ہوں گی کہ ہم بغیر بتائے کہاں نکل گئے" غالب نے کہا۔

"ان کے لئے دروازے کے نیچے سے پیغام چھوڑ جائیں گے کہ بازار جا رہے ہیں۔ وہ نہا دھو کے ناشتا کر لیں۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا اور کافی ختم کرتے ہی ہم ہوٹل سے نکل گئے۔ ہمارا کمرا تیسرے فلور پر تھا چنانچہ جب ہم زینے سے

www.paksociety.com

اتر رہے تھے تو بہت سے اوپر آنے والوں نے ہمیں حیرانی اور دلچسپی سے دیکھا۔ ہم ہال سے گزرے تب بھی لوگوں نے ہمارے بارے میں مختلف تبصرے کیے۔ ہمیں خبطی 'ہپی' جوگی وغیرہ قرار دیا گیا۔ ایک خاتون نے تو یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ہمارے بال اصلی نہیں ہیں اور ہم نے بھیس بدل رکھا ہے۔

کمار اپنی ٹیکسی کو صاف کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ تیر کی طرح آیا "گڈ مارننگ سر۔"

میں نے کہا "تم رات کو کہاں تھے؟"

"وہ... دراصل... رکنی لے گئی تھی مجھے کان سے پکڑ کے' کیا آپ نے تلاش کیا تھا مجھے؟" وہ خفت سے بولا۔

"نہیں۔ مگر رکنی یہاں کیسے آ گئی تھی؟"

"وہ بہت چالاک ہے۔ اس نے یقین کب کیا تھا آپ کی بات کا۔ گاڑی لے کر پیچھے چل پڑی تھی" کمار نے کہا "آپ کے دوست کی حالت بہت اچھی ہے اب۔"

میں نے کہا "یہ اچھی خبر سنائی تم نے۔ اب فوری طور پر اسپتال جانا ضروری نہیں رہا۔"

"پھر کہاں جانا ہے پہلے؟"

میں نے اسے اپنا پروگرام بتا دیا۔ ٹیکسی روانہ ہو گئی۔

اس نے کہا "ایک مشورہ دوں۔ برا تو نہیں مانیں گے؟"

میں نے کہا "مفت کچھ بھی ملے' ہم لے کر خوش ہوتے ہیں۔"

اس نے کہا "آپ بال ضرور کٹوائیں۔ مگر فرنچ کٹ داڑھی رہنے دیں۔ آپ پر اچھی لگے گی۔"

میں نے حیرانی سے غالب کی طرف دیکھا "یہ لڑکا تو بہت تمیز دار ہے۔ ہم سے بھی زیادہ۔"

"تم سے زیادہ' مجھ سے کم" غالب نے کہا۔

ایک گھنٹے بعد ہم پھر ہوٹل میں داخل ہوئے تو بہترین سوٹ' ٹائی' سلیقے سے بنے ہوئے بالوں اور نفاست سے تراشی ہوئی فرنچ کٹ داڑھی کے ساتھ ہماری شخصیت بالکل بدل چکی تھی۔ دربان نے ہمیں سلیوٹ کیا اور ہمارے گزر جانے کے بعد ہمیں پہچانا۔ کاؤنٹر کلرک نے استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "یس سر۔" پھر جیسے اسے الیکٹرک شاک لگا۔ وہ دم بخود کھڑا ہمیں اوپر جاتا دیکھتا رہا۔

لیکن جتنی حیرت گل اور نازو کو ہوئی اس سے کہیں زیادہ ان کی خوشی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو وہ جاگ رہی تھیں۔ ان کے باتیں کرنے کی آواز باہر سنائی دے رہی تھی۔ گل نے دروازے کے قریب آ کے کہا "کون...؟"

میں نے کہا "مسٹر آفریدی اور مسٹر ژی سوزا۔"

گل نے دروازہ کھولا اور بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے بار بار ہمیں دیکھا اور خوشی سے ایک چیخ ماری۔

"بھائی سکندر... آپ... غالب... یہ... اف کتنے اچھے لگ رہے ہیں آپ دونوں" اس نے معصومیت سے دیکتے چہرے اور بھرپور ہنسی کے ساتھ کہا۔

میں نے ان کے کپڑوں کے پیکٹ بیڈ پر ڈال دیے۔ نازو بالکل سحر زدہ سی کھڑی تھی اور رونے کے قریب ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا' تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" غالب نے کہا۔

نازو کے آنسو چھلک پڑے "خوشی... مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری کھوئی ہوئی خوشیاں مجھے واپس مل گئی ہیں۔ کہیں یہ خواب نہ ہو۔"

میں نے کہا "ابھی یہ خواب ہی ہے نازو۔ حقیقی خوشی کے لیے ابھی کچھ دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔ ابھی تو صرف ہمارے چہرے واپس ملے ہیں۔ وہ زندگی نہیں ملی جس سے ہم بچھڑ گئے تھے۔"

"وہ بھی مل جائے گی اب" غالب نے کہا۔

"جب محسن ملے گا" گل نے کہا اور پھر ایک دم رو پڑی۔

میں نے اسے گلے لگا کر تسلی دی "پاگل۔ رونی کیوں ہے۔ محسن بھی مل جائے گا۔ چند دن کی بات ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم آج ہی ڈھاکا روانہ ہو جائیں گے کسی وقت۔ آج نہ جا سکے تو کل بہرحال چلیں گے۔ ڈھاکا کون سا بہت دور ہے۔ بس وہاں پہنچ تھوڑا سا مشکل مسئلہ ہے۔ حالات کی وجہ سے۔ وہ ہمارا منتظر ہوگا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ ہر روز شاہ باغ ہوٹل کے سامنے خود موجود رہے گا یا اپنا پیغام چھوڑ جائے گا۔ اس کا پتا ہے ہمارے پاس۔ اسے تلاش کرنا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بس اس کے ملتے ہی ہم واپس آ جائیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا' چلو اب یہ رونا دھونا چھوڑو۔"

"ہاں۔ تمہارے لیے بھی کپڑے لائے ہیں ہم۔ کپڑے بدل لو' بات کرتے ہیں" غالب نے کہا "ہم بھی تیار ہو لیں۔"

"تم نے ناشتا کیا؟" میں نے کہا۔

گل نے نفی میں سر ہلایا "ابھی نہیں۔ آپ کا انتظار تھا۔"

"اچھا۔ ہم ابھی اکٹھے ناشتا کرتے ہیں" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔

کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھتا' دروازہ کھلا اور پولیس اندر آ گئی۔ ایک انسپکٹر کے ساتھ مسلح پولیس والوں نے ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ ان کے ساتھ ہوٹل کا منیجر بھی تھا۔

"کہاں ہیں وہ انسپکٹر۔ انہوں نے حلیے بدل لیے ہیں آتے ہوتے ہی" منیجر نے کہا۔

انسپکٹر نے کہا "یہ لوگ حلیے بدلتے رہتے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں انہیں۔ اچھا اب آپ جائیں۔"

منیجر نے کہا "میرے ہوٹل کی نیک نامی کا خیال رکھیے گا۔ میں نے آپ سے پورا تعاون کیا ہے۔"

وہ دروازہ بند کر کے نکل گیا۔ انسپکٹر نے حکم دیا کہ ہم ہاتھ اٹھا لیں اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جائیں۔

مقابلے کی صورت میں ہماری کامیابی کے امکانات بہت کم تھے۔ وہ کامیاب شکاری تھے جو اپنے شکار کو ہر طرف سے گھیر چکے تھے اور گولی چلانے کے لیے انہیں صرف بہانے کی ضرورت تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے یہ بھی سوچا کہ کیا وہ ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں فائرنگ کریں گے؟ عام طور پر ہوشیار منیجر اپنے ہوٹل سے متعلق کوئی ایسی خبر بننے ہی نہیں دیتے جو شائع ہو کے منفی پبلسٹی کا باعث بن جائے۔ لیکن پولیس اپنے فرائض کی راہ میں رشوت کے سوا کسی بھی طاقت کی مداخلت برداشت نہیں کرتی۔

ابھی معاملہ اس کمرے کی چار دیواری تک محدود تھا۔ کیا اسے رشوت کی طاقت سے محدود رکھا جا سکتا ہے؟ میں نے سوچا۔ کوشش کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ اگر رشوت بھی کام نہ آئی تو پھر مہلت مل جائے گی کہ ہم طاقت کو سوچ سمجھ کے استعمال کریں۔

میں نے کہا "انسپکٹر صاحب! یہ معاملہ کیا ہے آخر؟"

انسپکٹر نے کہا "معاملے کے بچے! تم قانون کو اندھا سمجھتے ہو۔"

"قانون تو واقعی اندھا ہوتا ہے جناب۔ بلکہ اب تو بہرا اور لنگڑا لولا بھی ہو گیا ہے۔" میں نے کہا "میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ سننے میں کوئی حرج کی بات تو نہیں ہے۔ ممکن ہے آپ کے فائدے کی بات نکل آئے۔"

انسپکٹر نے مجھے ایک گالی دی "میں تیری باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ ان سب کی تلاشی لو۔ اور ان کے سامان کی بھی۔"

دو افراد نے ہماری جامہ تلاشی لی مگر سوائے اس رقم کے جو خریداری کے بعد بچ گئی تھی' ہمارے نئے سوٹوں میں سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا۔ ہمارا سب اسلحہ بھی دوسرے کمرے میں تھا۔ مشین گن وغیرہ کو ہم نے ٹرک میں چھوڑ دیا تھا۔ صرف ریوالور ہمارے پاس تھے' جو ہم نے بیڈ کے نیچے چھپا دیے تھے۔ تلاشی میں وہ برآمد ہو جاتے تو ہم قطعی لاعلمی کا اظہار کر سکتے تھے۔ یہ ہوٹل والے جانیں کہ ہم سے پہلے یہاں کون ٹھہرا ہوا تھا۔ نقد رقم کتنی بھی ہو' اس وقت تک مسروقہ نہیں کہی جا سکتی جب تک مسروقہ ثابت نہ ہو۔ سونے کے زیورات پہلے ہی چندو کے سپرد کیے جا چکے تھے ورنہ انہیں بھی گل اور نازو کی ملکیت قرار دیا جا سکتا تھا۔

"یہاں سے تو کچھ نہیں ملا جناب!" ایک ماتحت نے مایوسی سے کہا۔

"ان سوٹ کیسوں میں کیا ہے؟" انسپکٹر نے کہا "کھول کے دیکھو۔"

دوسرے ماتحت نے تعمیل کی اور بولا "اس میں زنانہ کپڑے ہیں سر۔ استعمال شدہ۔"

"اسلحہ نہیں ہے؟"

"نہیں سر۔ ہم نے باتھ روم کا ٹائلٹ بھی دیکھ لیا۔ فلش ٹینک میں بھی..."

اچانک میرے دل میں امید کی ایک کرن پیدا ہوئی۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ دوسرا کمرا بھی ہمارے پاس ہے۔ غالباً منیجر نے کمروں کے نمبر بتانے کے بجائے پولیس کو سیدھا ہم تک پہنچا دینا بہتر سمجھا تھا۔

میں نے کہا "انسپکٹر صاحب! آپ کو غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟"

اس نے کہا "غلط فہمی کیسی؟ ہمیں خود منیجر نے مطلع کیا تھا کہ ڈاکوؤں کا گروہ یہاں موجود ہے۔ وہ کل آئے تھے تب بھی ان کے حلیے بدلے ہوئے تھے اور آج انہوں نے پھر..."

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر ہنس کے کہا "آپ خود اتنے معقول اور تجربہ کار آدمی ہیں۔ کبھی ہم جیسے ڈاکو بھی دیکھے ہیں؟ کیا ڈاکو صورت سے اتنے معزز اور شریف نظر آتے ہیں اور ان کے ساتھ ایسی مہذب خواتین ہوتی ہیں۔"

انسپکٹر کی خاموشی ظاہر کرتی تھی کہ وہ عدم اعتماد کا شکار ہو گیا ہے۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی "ہم قانون سے تعاون کرنے والے لوگ ہیں۔ مقابلہ کرنے والے نہیں۔ ہوٹل کے منیجر سے تو بعد میں نمٹ لیں گے ہمارے وکیل۔ لیکن آپ کوئی غلط قدم اٹھا کے اپنی نوکری کو خطرے میں کیوں ڈالتے ہیں۔"

انسپکٹر نے کہا "اچھا۔ ہاتھ نیچے کر لو اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ منہ میری طرف کر لو۔"

میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں؟ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ مگر یہ سب ٹھنڈے دماغ سے کام لینے کا نتیجہ تھا۔ اگر میں مقابلے پر اتر آتا اور نازو کو بھی اشارہ کر دیتا تو یقیناً ممکن تھا کہ ہم پانچ افراد سے نمٹ لیتے اور انہیں قابو بھی کر لیتے مگر اس کوشش میں ایک دو کا مارا جانا بھی بعید از قیاس نہیں تھا۔ فائرنگ کی آواز اسی کمرے تک محدود نہ رہتی۔ ممکن تھا ہم لیں اتر کے فرار ہونے سے پہلے ہی منیجر' پولیس سے ہنگامی امداد طلب کر لیتا اور ہوٹل کو چاروں طرف سے گھیر لیا جاتا۔

میں نے انسپکٹر کی طرف رخ کر کے کہا "اب بتاؤ یہ سب کارروائی کیا تھی؟ کیوں چھاپا مارا گیا تھا؟"

انسپکٹر نے ایک ماتحت کو حکم دیا "اس حرامی کی یہ داڑھی نوچ کے اس کے ہاتھ میں پکڑا دو۔"

ایک سپاہی نے میری داڑھی کو نقلی سمجھتے ہوئے جھٹکا دے کر چہرے سے الگ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے بلبلا کے اسے دور دھکیل دیا اور گالیاں بکنے لگا "میں ایسی کی تیسی کر دوں گا سب کی۔ تم نے کیا میری داڑھی کو نقلی سمجھ رکھا ہے؟"

غالب الگ چلا رہا تھا "سور کے بچے! ابھی اپنے باپ کی داڑھی کھینچ کر دیکھنا۔ وہ تو نقلی نہیں ہے۔ تم نے بے عزتی کی ہے میری' میں تمہارا خانہ خراب کر دوں گا۔"

"داڑھی تو اصلی ہے جناب!" ایک سپاہی نے مردہ لہجے میں رپورٹ دی۔

www.paksociety.com

"داڑھی اصلی ہے؟ کیا کہہ رہے ہو!" انسپکٹر بولا۔

"داڑھی بالکل اصلی ہے سر۔ آپ خود دیکھ لیں" نازو نے پریشان لہجے میں کہا۔

انسپکٹر کی صورت پر رونما ہونے والے تغیرات نے مجھے ایک قدم آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کر دیا "تم ایک معمولی انسپکٹر۔ تم اپنے اختیارات سے اس حد تک تجاوز کر سکتے ہو۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہندوستان کی وزارت داخلہ نے پولیس کو فرعون کی فوج بنا دیا ہے۔ کوئی شریف آدمی اگر اس ہوٹل میں محفوظ نہیں تو پھر اس کے لئے تحفظ کہاں ہے؟......" میں نے رواں انگریزی میں کہا۔

انسپکٹر نے کہا "منیجر کو بلاؤ۔"

میں نے فون اٹھا لیا "کہاں ہے تمہارا منیجر؟ اسے اوپر بھیجو۔ مجھے اپنا حساب برابر کرانا ہے۔ اس سے کہو حساب ساتھ لے کر آئے۔ ایڈوانس میں سے رقم کاٹ لے باقی ایک ایک پیسہ یہاں لے آئے۔ ہم اب اس ہوٹل میں ایک منٹ بھی نہیں رک سکتے۔"

میں نے ریسیور کو زور سے مارا۔

"آپ خفا نہ ہوں" انسپکٹر ایک دم عاجزی پر اتر آیا "لیڈیز! توئی ایم سوری۔ آپ تشریف رکھیں۔"

اب محاذ نازو نے سنبھال لیا "تشریف تو میں ضرور رکھوں گی۔ مگر انسپکٹر! اگر اتنی بے عزتی کے بعد میں نے تمہیں گلے سے پکڑ کر جیل نہ بھجوا دیا تو میں وزارت خارجہ کے سیکریٹری کی بیٹی نہیں۔ میرا یہ شوہر تو کاٹھ کا الو ہے۔ زبان ہی نہیں ہے اس کے منہ میں ورنہ یہ بھی بتا سکتا تھا کہ یہ خود کیا ہے۔"

انسپکٹر کو پسینہ آ گیا "دیوی جی! شما کر دیں مجھے۔ مجھے تو منیجر نے اطلاع دی تھی کہ یہاں دو ڈاکو ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ نقلی داڑھی لگا کے آئے تھے۔ فر فر انگریزی بولتے تھے۔ صبح انہوں نے دوسری داڑھی لگا لی۔ رنگ بھی بدل لیا۔"

میں نے گرج کے کہا "وگ! یعنی ہمارے سر پر جو بال ہیں وہ بھی نقلی ہیں۔ اوہ مائی گاڈ۔"

منیجر بوکھلایا ہوا اندر آیا۔ اندر کا نقشہ دیکھتے ہی اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

"منیجر صاحب! آگے تشریف لائیے" انسپکٹر نے طنز سے کہا "بڑی دور کی کوڑی لائے تھے آپ۔ کمال کی نظر پائی ہے آپ نے۔ نقلی وگ۔ نقلی داڑھی۔ خوب پہچانتے ہیں آپ۔"

"جی... کیا... میں سمجھا نہیں۔"

میں نے چلا کے کہا "سمجھ جاؤ گے تم بھی۔ میں ابھی بلاتا ہوں دہلی سے اپنے وکیلوں کو۔ وہ خود تمہارے خلاف کیس کریں گے۔ ہتک عزت کا کیس تو بعد میں ہو گا۔ پہلے غیر قانونی کارروائی کا مقدمہ درج ہو گا۔ تم نے زبانی پاس کیا۔ غلط بیانی کی۔ سرچ کے لئے کوئی وارنٹ نہیں تھا مگر تم ہمارے کمرے میں گھسے۔ سامان کی تلاشی لی۔ ہمیں مارا پیٹا۔ خواتین پر دست درازی کی۔"

انسپکٹر کی حالت غیر ہو گئی۔ "سر پلیز۔ میرا کوئی قصور نہیں اس میں۔ غلط اطلاع دینے والا یہ تھا۔"

"غلط کارروائی تم نے کی۔ کس نے اختیار دیا ہے تمہیں ہاتھ پکڑنے مارنے کا؟ کسی مجسٹریٹ کی عدم موجودگی میں تم نے جو کچھ کیا تم اختیارات کا غلط استعمال تھا جو تمہیں اس وردی کی وجہ سے ملے ہیں۔ یہ وردی نہ ہوتی تمہارے جسم پر تو میں تمہارے دانت توڑ کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ میں بلیک بیلٹ رکھتا ہوں جوڈو میں۔ آ کے دیکھ لو۔ تمہارے یہ ہتھیار سب بے کار تھے۔ تم نے اس کا غلط مطلب لیا۔ شرافت کو آج کل آدمی کی کمزوری سمجھ لیا جاتا ہے۔"

غالب نے ڈرامے کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ اس نے چلا کے آپے سے کہا "کیا بات ہے تم بہری ہو یا انگریزی سمجھتے ہو تم سمجھو کون سی لاطینی بول رہا ہوں میں۔ چرن لال ریندھاوا اینڈ کو ایڈووکیٹس قرول باغ دہلی۔ نمبر..."

منیجر نے بدحواسی میں لائن کاٹ دی "پلیز سر۔ مجھے موقع دیں۔ ایک بار۔ میری عرض تو سن لیں۔ میں وضاحت کرتا ہوں۔"

اس کے بعد صورت حال بالکل پلٹ گئی۔ منیجر کی دونوں طرف سے شامت آ گئی تھی۔ پولیس اس "غلط فہمی" کا اسے ذمہ دار قرار دے رہی تھی اور ہم بھی اپنی بے عزتی کا سارا الزام اس پر عائد کرتے تھے۔ بہت سی معافی تلافی کے بعد آخر کار ہم نے بھی فراخ دلی سے کام لیا اور سب کو معاف کر دیا۔ مگر اس ہوٹل میں ایک منٹ نہ رکنے کا اعلان کرتے ہوئے سامان اٹھا لیا۔

پولیس جس راستے سے آئی تھی اسی راستے سے واپس گئی۔ منیجر انہیں پچھلی طرف سے لایا تھا۔ ہر ہوٹل کی طرح یہاں بھی بہت سے غیر قانونی دھندے ہوتے تھے مگر انتظامیہ اور پولیس کے درمیان ایک پرامن بقائے باہمی کا معاہدہ تھا کہ وہ "شرفا" پر ہاتھ نہیں ڈالیں گے اور پولیس کو اس کی فرض شناسی کا "انعام" ملتا رہے گا۔ تاہم کبھی کبھی خود ہوٹل کی انتظامیہ انہیں کارکردگی دکھانے کا موقع فراہم کرتی تھی۔

ہماری آمد کو منیجر نے ایک ایسا ہی موقع سمجھنے کی غلطی کی۔ اس غلطی کا سبب چند دن قبل کی ایک واردات تھی۔ ایک بینک اور ایک جوہری کی دکان کو دو ڈاکوؤں نے لوٹا تھا اور ہر جگہ چشم دید گواہوں کے مطابق وہ بھیس بدل کر گئے تھے۔ جوان آدمی تھے مگر انہوں نے نقلی بالوں کی نقلی وگ لگا رکھی تھی۔ ان کی داڑھی بھی نقلی تھی۔ ظاہر ہے وہ میک اپ کے معاملے میں بہت اناڑی ہوں گے کہ عام لوگ بھی دھوکا نہ کھا سکے۔ پولیس انہیں تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی لیکن شہر کے مخبروں کی اطلاع کے مطابق ڈاکو فرار نہیں ہوئے تھے بلکہ شہر میں ہی مزید وارداتوں کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

ہوٹل کے منیجر کی طرف سے ملنے والی یہ اطلاع کہ ڈاکو ملزم وہاں یقیناً بہت بڑی اطلاع تھی اور اگر پولیس کے ہوٹل میں ان ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیتا تو یہ اس کے کیریئر کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی جس پر اس کے لئے ترقی کے سارے راستے کھل جاتے۔ ادھر ہوٹل کے لئے اس خبر میں بدنامی کی کوئی بات نہیں تھی۔ پولیس نے عام مسافروں کو پریشان کئے بغیر ڈاکوؤں کے گروہ کو عین اس وقت پکڑ لیا تھا جب وہ بڑی بے خوفی سے مزید وارداتوں کے منصوبے بنا رہے تھے۔ خبر یہ بھی بنائی جا سکتی تھی کہ وہ چھپنے کے لئے آئے تھے اور رات کو ہر مسافر سے نقد رقم، سونے چاندی کے زیورات اور ہیرے جواہرات سب رکھوا لیتے اور دو چار کر کے فرار ہو کے نکل جاتے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ڈاکو تو ملے نہیں منیجر کے حصے میں پریشانی اور پولیس کے حصے میں پشیمانی آئی۔ پولیس والے ہمیں کیا دیتے۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ کچھ لئے بغیر چلے گئے جب کہ میں انہیں رشوت طاقت سے زیر کرنے کی سوچ رہا تھا۔ منیجر نے بڑی کوشش کی کہ ہم رک جائیں مگر اب ہم خود اسے خلاف مصلحت سمجھتے تھے۔ پھر اس نے بل کی ساری رقم خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے چھوڑنی چاہی مگر ہم نے ساڑھے چھ سو روپے اس کے منہ پر مارے پھر واک آؤٹ کر گئے۔

نازو کو کچھ اندازہ ہو سکا کہ ہمارے ساتھ ہوٹل میں کیا ہوا۔ اسے کچھ بتانا قطعی غیر ضروری تھا۔ ہم نے اپنا سامان اس کی ٹیکسی میں رکھا اور اسے کسی دوسرے ہوٹل میں چلنے کو کہا۔

"کیا ہوا؟ یہ ہوٹل پسند نہیں آیا۔"

"ہاں۔ یہاں تو ویٹرس۔ خوفناک شکل اور لمبی مونچھوں والے" غالب نے کہا "ہمارا خیال تھا کہ ویٹرس ہوں گی۔ نرم و نازک۔"

"تو وہاں لے چلوں......"

"ان دونوں کو لے جاؤ" نازو نے کہا "ہمیں تو ایسی جگہ لے کر چلو جہاں ان سے بھی زیادہ شاندار مونچھوں والے ہینڈسم ویٹرز ہوں۔ میرا ٹائپ۔ مردانہ وجاہت کے نمونے۔"

میں نے کہا "تجھ پر خواہ مخواہ بگڑ رہی ہو۔ بگڑا ہے یہ محض سنوری کی وجہ سے۔"

"میری وجہ سے؟" نازو چمک کر بولی۔

"ہاں۔ تم نے اتنی ڈھیل کیوں دے رکھی ہے" میں نے کہا۔

"مجھے تو یہ تمہاری صحبت کا نتیجہ لگتا ہے" نازو بولی۔

"بالکل ٹھیک کہا ہے تم نے۔ ورنہ میں تو اتنا سیدھا بھولا بھالا اور شریف تھا پہلے" غالب نے معصوم صورت بنا کے کہا "اگر تم جیسی لڑکی نے بھی اتنی آسانی سے الو بنا لیا مجھے۔"

نازو ہنسنے لگی "الو تمہیں کون بنا سکتا ہے۔"

دوسرا ہوٹل بھی پہلے والے ہوٹل کے معیار کا ہی تھا مگر اس کے بیک سے پندرہ کلو میٹر دور تھا۔ اس مرتبہ ہم نے یہ کیا کہ راستے میں رک کے دو سوٹ کیس خرید لئے جو ہم جیسے معززین کے شایان شان ہوں۔ ظاہر ہے اس مرتبہ ہمیں وی آئی پی سمجھا گیا اور ہوٹل کا سارا عملہ بہترین کاروباری اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے بچھ بچھ جانے فرش راہ بنتے رہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ پہنچ گئے" غالب نے کمرے میں پہنچتے ہی کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب ہمارے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے" غالب نے کہا "کلکتہ میں ہزاروں لوگ باہر سے آتے ہوں گے۔ ہم نے قدم رنجہ فرمایا تو کہاں۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والا محاورہ سچ ہو گیا۔"

میں نے کہا "ہاں یار۔ ہم کچھ کرنا نہیں چاہتے پھر بھی کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ اس پاگل خانے کے بارے میں سوچتا ہوں تو اب بھی میرے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ کیسے سفاک اور شیطان صفت لوگ تھے وہ سب۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ انہیں بہت کم سزا ملی۔ اور یہ شاید کبھی کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ وہاں کیا خونی کھیل کھیلا گیا تھا۔"

"چھوڑو اس ذکر کو۔ مجھے بھی وحشت ہوتی ہے" غالب نے کہا "یہ بتاؤ اب ہم ڈھاکا کیسے جائیں گے اور کب؟"

میں نے کہا "بہت سے مسائل ہیں جن کے بارے میں ہماری معلومات صفر ہیں۔ لیکن ہمارے وسائل کافی ہیں۔ ایک تو سرحد پار کی صورت حال معلوم ہونی چاہئے۔ پھر راستے کا انتخاب ہے۔ ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہاں پہنچنے کے لئے ہوائی یا ٹرین سروس دستیاب ہے یا نہیں۔"

غالب نے کہا "فی الحال سرحدیں بند ہوں گی۔ ٹرین سروس بھی معطل ہو گی۔ سڑکوں پر فوجی نقل و حمل جاری ہو گی۔"

"رائٹ۔ دوسرا فضائی راستہ ہے۔ کلکتہ ائیرپورٹ تو کھلا ہو گا مگر ڈھاکا کا ائیرپورٹ بند ہے۔ ہمارے پاسپورٹ بھی نہیں ہیں۔" میں نے کہا "چنانچہ تیسرا راستہ وہ ہے جو اسمگلر استعمال کرتے ہوں گے۔ خفیہ راستے۔ یہاں سڑکیں کم ہیں آبی راستے زیادہ ہیں۔ نہریں، دریا اور جھیلیں۔ ان راستوں سے ہمیں کون گزار کے لے جا سکتا ہے۔"

"مکار" نازو نے اچانک کہا۔

"مکار" میں نے کہا "رائٹ وہ ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

"اس نے کہا تھا کہ وہ ہر کام کر سکتا ہے" غالب بولا "اگر وہ خود ساتھ نہ گیا تو کوئی بندوبست ضرور کر دے گا۔ کسی سے ملوا دے گا جو ہمیں بحفاظت سرحد پار پہنچا دے۔"

"پیسے لے کر؟" نازو نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ کوئی خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہو کے یہ کام نہیں کرے گا ہمارے لئے" غالب نے کہا "ابھی غلطی سے ہوٹل کی بات کہہ دیتی ہو تو فوراً حساب برابر کر دیتی ہو اگلی بات سے"

www.paksociety.com

جو انتہائی احمقانہ ہوتی ہے۔"
"تم بلاوجہ مت بولا کرو" نازو نے بگڑ کے کہا "احمق تم خود ہو جو غلط مطلب نکال لیتے ہو۔"
"صحیح بات کا غلط مطلب نکالا ہی نہیں جا سکتا۔"
"ذہن کی کھوپڑی الٹی ہو وہ نکال لیتا ہے۔"
میں نے کہا "بس۔ سیز فائر۔ یہ بتاؤ ہمارے پاس اس وقت نقد رقم کتنی ہے۔"
"زیادہ نہیں ہوگی۔ تم نے حاتم طائی بن کے بانٹ جو دی تھی۔" نازو نے کہا۔
"وہ بھی ضروری تھا۔ مال حرام تھا مگر حرام تو نہیں گیا تھا۔ شاید وہی نیکی کام آگئی ورنہ پولیس کو رشوت دینے ہی والا تھا میں۔"
"مال حرام تو اب بھی ہے" غالب نے کہا۔
"جیسے بلیک منی وائٹ ہو جاتی ہے ایسے ہی اب ہم اسے اپنی ضرورت پر خرچ کر سکتے ہیں" میں نے کہا۔
نازو نے گل کی مدد سے نوٹ الگ الگ کئے اور حساب کر کے بتایا "ایک لاکھ ستاون ہزار پانچ سو ہوں گے۔"
"اور تم کہہ رہی تھیں زیادہ نہیں ہوگی" غالب نے کہا۔
"ہماری ضروریات کے لئے کافی ہے" میں نے کہا۔
غالب باہر گیا اور کمار کو اپنے ساتھ لے آیا۔
"کیا پرابلم ہے؟" اس نے کہا۔
میں نے کہا "بیٹھو۔ پرابلم ایک نہیں ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ تم حل کر سکتے ہو۔"
وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
"تم ہماری مدد کر سکتے ہو" غالب نے کہا۔
"پہلے مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ مسئلہ کیا ہے۔"
"تم نے کہا تھا کہ ہر کام کر سکتے ہو" غالب نے اسے یاد دلایا۔
"ہر کام کا مطلب غیر قانونی کام نہیں" وہ بولا "تم یہ چاہو کہ میں کسی کو قتل کر دوں..... تو یہ ناممکن ہے۔"
میں نے کہا "کام تو غیر قانونی ہے مگر چوری، قتل، ڈاکے جیسا نہیں۔ ہم سرحد پار کر کے ڈھاکا جانا چاہتے ہیں۔"
"ڈھاکا؟" اس نے نفی میں سر ہلایا "ابھی تو بہت مشکل ہے۔ بس، ٹرین، ہوائی جہاز سب بند ہیں۔"
میں نے کہا "یہ تو ہم بھی جانتے ہیں مگر مشرقی اور مغربی بنگال کے درمیان سرحد پار کرنے کے کئی راستے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے لوگ ادھر سے ادھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ڈھاکا سے کلکتہ کے درمیان باقاعدہ تجارت ہوتی ہے اور آمدورفت کی پابندیاں برائے نام ہیں۔"
"پہلے ایسا ہی تھا لیکن اس وقت سرحدیں بند ہیں۔ دونوں جانب فوجوں کے مورچے ہیں۔"
"سرحد بہت لمبی ہے۔ کیا راستہ ضرور ہوگا جہاں حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہوگی۔ وہ علاقے جنگ سے محفوظ ہوں" میں نے کہا۔
اس نے سوچ کے کہا "آج کل بڑی تعداد میں لوگ وہاں سے نکل رہے ہیں۔ لیکن وہ نیپال کے راستے فرار ہو رہے ہیں۔"
"فرار ہو رہے ہیں!" میں نے حیران ہو کے کہا "کون لوگ؟"
"وہی جو بنگلا دیش کے مخالف تھے اور جنہوں نے شیخ مجیب کی مخالفت کی تھی، ان کے خلاف مسلح جدوجہد میں جو پاکستانی افواج کا ساتھ دیا تھا۔"
مجھے دکھ سے زیادہ اشتعال کے جذبات نے مغلوب کر لیا "انہیں مار کے نکالا جا رہا ہے؟ آخر کس جرم میں؟"
"وہ اب وہاں کیسے رہ سکتے ہیں؟"
"کیوں؟ کیا وہ پاکستانی نہیں ہیں؟"
"جو پاکستان تھا وہ اب بنگلہ دیش ہے۔ ان کا ٹھکانا پاکستان ہے اور پاکستان جانے کا یہی ایک راستہ کھلا ہوا ہے۔ جو والے ہیں وہ ایجنٹوں کے ذریعے سرحد پار کرتے ہیں۔ بہت مشکل سے۔"
غالب نے کہا "تم کسی ایجنٹ سے واقف ہو؟"
کمار نے نفی میں سر ہلایا "مگر پاسپورٹ وغیرہ بنوانے والوں ان لوگوں سے ملوا سکتا ہوں جو یہ کام کرتے ہیں۔"
"اصلی پاسپورٹ ہوں گے؟"
"ویسے تو جعلی بھی بنا دیتے ہیں دھوکے باز لیکن [illegible] بنوا کے دوں گا۔"
"کسی تصدیق، تفتیش کے بغیر؟"
"میں سمجھا نہیں! آپ لوگ دہلی میں رہتے ہو۔ شریف معزز آدمی ہو۔ کاروبار بھی اچھا ہی ہوگا ورنہ ایسے مہنگے عالی شان ہوٹلوں میں قیام نہ کرتے۔ تصدیق سے کیوں ڈرتے ہو؟"
میں نے کہا "ایسے تو کوئی بھی پاسپورٹ بنوا سکتا ہے۔"
اس نے کہا "پھر آپ بنوائیں۔ میں تو جلدی کی بات کر رہا تھا۔ ایجنٹ چار گھنٹے میں پاسپورٹ لا دے گا۔ آپ خود چکر لگاؤ گے۔"
میں نے کہا "کمار! یہ مسئلہ کچھ اور ہے۔ پاسپورٹ تو پاس ہیں۔ ہم فرضی ناموں سے دوسرے پاسپورٹ بنوانا چاہتے ہیں۔"
"صرف ڈھاکا جانے کے لئے؟"
"ہاں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے اصلی ناموں کا کہیں اندراج ہو۔ کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ ہم ڈھاکا گئے تھے۔"
وہ مجھے نظر جما کے دیکھتا رہا۔ "آپ لوگ مجھ پر بھروسا کرتے؟"
میں نے کہا "بھروسا نہ کرتے تو تم سے یہ سب کیوں کہتے۔"
"اصل بات مجھے نہیں بتانا چاہتے کہ آپ کو ڈھاکا

ہے اور اس طرح چھپ کے ایسے خطرناک حالات میں۔"
میں نے کہا "ہم کوئی تخریب کار یا دہشت پسند نہیں ہیں کمار۔ کیا ہم صورت سے ایسے لگتے ہیں؟"
"صورت سے تخریب کار پہچانے جاتے تو آسانی سے پکڑے جاتے" کمار نے منطقی بات کی۔
میں نے ہنس کے کہا "تجزیہ تو ٹھیک ہی کیا ہے تم نے مگر ہمارا مسئلہ کچھ اور ہے۔ ہم تخریب کار ہوتے تو سرحد پار کرنے کے لئے مدد مانگتے؟ ہم بہت پہلے اندر پہنچ چکے ہوتے۔"
وہ ایک دم قائل ہو گیا "پھر کیا بات ہے؟ آپ مجھے بتا کیوں نہیں دیتے۔ میں قسم نہیں کھاتا، صرف وعدہ کر سکتا ہوں کہ جو کچھ مجھے معلوم ہوگا وہ میری ذات تک محدود رہے گا۔ اگر میں نے وعدہ خلافی کی اور آپ کی کوئی مدد نہ کی تب بھی میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اور مدد کر سکا تو ضرور کروں گا۔"
میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پھر غالب کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا اور سر ہلا کے کہا "ہوں۔ دیکھو مسٹر کمار۔ ہمارا ایک دوست ڈھاکا میں پھنس گیا ہے۔ بالکل اکیلا رہ گیا ہے۔ اس کے سب ساتھی مارے جا چکے ہیں یا پکڑے گئے ہیں۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں اور وہ ڈھاکا میں ہی چھپا ہوا ہے۔ ہم نے بہت پہلے اس سے رابطہ کیا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ حالات بہت خراب ہیں۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مستقبل کی صورت حال کیا ہوگی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے ہمیں مطلع کر دیا تھا کہ حالات زیادہ خراب ہو گئے تو وہ روپوش ہو جائے گا اور اس نے دو تین مقامات کی نشان دہی کی تھی جہاں وہ ہو سکتا ہے۔ ہم اسے تلاش کریں گے۔"
کمار نے کہا "کیسے تلاش کرو گے اور کہاں؟"
"یہ ہم ڈھاکا جا کے دیکھیں گے۔ وہاں کیا لائحہ عمل ہوگا، یہ ابھی یہاں کیسے بتا سکتے ہیں۔"
"تمہیں کیسے یقین ہے کہ وہ مارا نہیں گیا؟ اس کے تمام ساتھی پکڑے گئے یا مارے گئے۔ وہ اکیلا محفوظ رہا۔"
میں نے کہا "یار! اس میں بحث کی گنجائش کہاں ہے۔ ہم تو ایک امید پر جا رہے ہیں۔ امید پر دنیا قائم ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ کمال کے لوگ ہو! یہ کام تو ایک آدمی بھی کر سکتا تھا۔ دو عورتوں کو ساتھ لے جانا....."
میں نے کہا "چھوڑو یار! تم بے کار آدمی ہو۔ فضول سوالات سے لگتا ظاہر ہوتا ہے کہ تم کچھ نہیں کر سکتے ورنہ دو ٹوک بات کرتے۔ ہاں یا نہ۔ کام ہو سکتا ہے یا نہیں۔"
"دنیا کا ہر کام ہو سکتا ہے....."
میں نے کہا "ہم پیسہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں۔"
"اگر ایک پاسپورٹ پر پانچ ہزار مانگے کسی ایجنٹ نے تو دو گے؟" کمار نے کہا۔
"پانچ ہزار......"
"وقت وقت کی بات ہے۔ کبھی کام پہلے دو ہزار میں ہو جاتا اور اگر تمہیں جلدی نہ ہوتی تو دہلی یا بمبئی سے آج بھی پاسپورٹ بنوانے میں ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں۔ ایک روپیا چاہے جتنے چاہو لے لو۔ یہ ملک تو تمہارا اپنا ہے۔ کلکتہ میں ریٹ ایک دم بڑھ گئے ہیں" کمار نے کہا "یہاں سے جاری ہونے والا پاسپورٹ بھی کئی بار بکتا ہے۔"
"وہ کیسے؟" میں نے کہا۔
"یہاں سے ایک فیملی کا پاسپورٹ جاری ہوتا ہے۔ ڈھاکا میں دوسرا گروہ ان پر تصویریں بدلتا ہے اور ایک فیملی کو جہاز سے سیدھا کراچی روانہ ہونے کے لئے ٹکٹ مل جاتا ہے۔ ائر انڈیا سے دہلی، وہاں سے دبئی پھر کراچی۔ یہ پیچھے والوں کا کھیل ہے۔ وہ پہلے ہی نکل گئے تھے اور جو باقی رہ گئے ہیں وہ حالات کے معمول پر آتے ہی نیپال یا سیلون کے راستے پرواز کر جائیں گے۔"
"تمہاری معلومات حیرت انگیز ہیں" میں نے کہا "ایسا لگتا ہے جیسے خود تم بھی یہی کرتے ہو۔"
"میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا۔ صرف ٹیکسی چلاتا ہوں۔ مگر سارے شہر میں پھرتا ہوں۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھتا ہوں اور دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی خبر مل جاتی ہے مجھے۔ اب یہ بتاؤ کہ پاسپورٹ بنوانے کے لئے بیس ہزار خرچ کر سکتے ہو یا نہیں۔"
میں نے کہا "بغیر پاسپورٹ کے سرحد پار نہیں کر سکتے؟"
"میرا مشورہ ہے کہ یہ خطرہ مول مت لو۔ اگر پکڑے گئے تو جیل میں پڑے رہو گے۔ انڈین پاسپورٹ کی آج کل خاصی اہمیت ہے۔ تمہیں کوئی نہیں پوچھے گا۔ ہوٹل شاہ باغ میں ٹھہر جانا۔"
"شاہ باغ میں؟"
"ہاں۔ غیر ملکی عموماً وہیں جاتے ہیں۔ تم لوگوں کے معیار کا ہے اور تمہارے لئے محفوظ ترین جگہ" کمار نے کہا۔
میں نے کہا "اگر تم نے یہ کام کرا دیا تو....."
"کرا دیا؟" وہ ہنسا "میں خود کروں گا یہ کام۔"
میں حیران رہ گیا "پھر پہلے کیوں نہیں بتایا؟"
"کیا میں نے بتایا نہیں تھا کہ میں ہر کام کر سکتا ہوں۔ تمہیں پاسپورٹ کب چاہئیں؟"
میں نے کہا "آج۔ بلکہ ابھی۔"
"ابھی۔" وہ ہنسنے لگا "کل تک ہوگا یہ کام۔ نکالو بیس ہزار روپے۔"
میں نے غالب کی طرف دیکھا، غالب نے نازو کی طرف۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم نے ایک دوسرے سے سوال کیا کہ کیا اتنی بڑی رقم کسی ضمانت کے بغیر اس کے حوالے کر دینی چاہئے؟ اگر وہ بھاگ گیا تو ہم کیا کریں گے؟ ہم تو اس کی رپورٹ بھی نہیں لکھوا سکتے۔

www.paksociety.com

کمار نے کہا "تم لوگ ڈر رہے ہو نا کہ میں تین ہزار لے کر غائب ہو جاؤں گا؟"

نازو نے تین ہزار اس کے سامنے ڈال دیے "مجھے پورا اعتبار ہے تم پر۔ جو بھائی اپنی چھوٹی بہنوں سے اتنی محبت کرتے ہوں وہ دھوکے باز نہیں ہو سکتے۔"

نازو کا تجزیہ بالکل درست تھا۔ کمار کو پیسے کا لالچ ہوتا تو وہ رکمنی کے پیسے کو اپنا حق سمجھ کے قبول کر لیتا۔ اس کا سرپرست بن کے رہتا۔ جتنی محنت اس نے رکمنی کو ڈاکٹر بنانے میں کی ہوگی اسے اپنی انویسٹمنٹ سمجھتا تو اس کی آمدنی سے اپنا قرض وصول کرتا۔ مگر وہ اس حد تک اصول پرست تھا کہ اپنی ٹیکسی چلاتا تھا اور بہن کے گھر میں رہنے پر تیار نہ تھا۔ بے غرضی اور بے نیازی کے اس انداز میں ایک قلندرانہ شان تھی۔ اتنا خوددار آدمی پیسے کے لالچ میں کسی کے اعتبار کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔

"تمہارے نام پتے کیا ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"جب پاسپورٹ ملیں تو دیکھ لینا" وہ رقم جیب میں ڈالتے ہوئے بولا "ایک بات میں ابھی واضح کر دیتا ہوں۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ پیسہ کم خرچ ہو لیکن تین ہزار سے جتنے بچ جائیں گے وہ میری کوشش اور محنت سے بچیں گے۔ وہ میں واپس نہیں کروں گا۔"

میں نے ہنس کے کہا "حق محنت اپنی جگہ......"

اس نے کہا "کلکتہ میں پیسہ کمانا آسان ہے۔ جمع کرنا مشکل کام ہے۔ مجھے پیسہ جمع کرنا ہے اپنا گھر بنانے کے لئے۔ جب تک میرا کوئی چھوٹا موٹا گھر نہیں ہے گا شادی کا مسئلہ اٹکا رہے گا۔ فکر مجھے اپنی بہن رکمنی کی ہے۔ میری وجہ سے وہ بھی بیٹھی ہوئی ہے۔"

نازو نے کہا "اتنا کرنے والے تم جیسے بھائی کے لئے رکمنی کی یہ قربانی بہت معمولی ہے۔"

"مجھے تصویریں چاہئیں۔ آپ سب کی۔"

"تصویریں تو نہیں ہیں" میں نے کہا "کھنچوا لیتے ہیں تمہارے ساتھ چل کے۔"

"چندو کو بھی دیکھ لیں گے" گل نے کہا۔

دوپہر کے کھانے کا وقت قریب تھا۔ ہم نے کمار کو بھی لنچ پر مدعو کیا۔ وہ ماڈرن قسم کا ہندو تھا جو ماس کھاتا تھا اور بہت سے فرسودہ ہندو عقائد پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ذہین آدمی تھا مگر اس کی ذہانت ضائع ہو رہی تھی۔ ان ہزاروں نوجوانوں کی طرح جو سفارش نہ ہونے یا موقع نہ ملنے کے باعث ہر جگہ خوار و زبوں پھرتے ہیں اور ان سے کہیں کم تر صلاحیت رکھنے والے عیش کرتے ہیں۔

ہسپتال جاتے ہوئے کمار نے پھر کہا "رکمنی کو مت بتانا......"

نازو نے اس کی بات کاٹ دی "آج تو میں ضرور بتاؤں گی بلکہ تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔ رات پھر لڑائی ہو گئی تھی۔"

نازو نے کہا "میں دیکھوں گی کیسے نہیں جاؤ گے۔"

وہ حیران ہو گیا "مجھے زبردستی لے جا سکتی ہو تم؟"

"ہاں۔ یہ بھی دیکھ لینا۔"

میں نے کہا "نازو! یہ کیا فضول بات ہے۔ یہ بہن بھائی کا معاملہ ہے۔ اور یہ روٹھنا بھی تو پیار کی ایک ادا ہے۔ تمہارا ان کا۔ تم کیوں ٹانگ اڑاتی ہو؟"

"میری مرضی۔"

غالب نے کمار سے کہا "بیٹا! مارے گئے تم۔ اب شرافت سے چلے چلو ورنہ بڑی بے عزتی کروا لوگے۔ تم نہیں جانتا کہ ہم تو بھگت رہے ہیں۔"

کمار ہنسنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مذاق ہے اور میں بھی سمجھ رہا تھا کہ نازو خواہ مخواہ اڑ گئی ہے۔ ہسپتال کے سامنے ہی تو ہو جائے نازو کا کیا ہے "کمار کو اٹھا کے اندر پھینک دے" معاملہ سیریس ہو جائے گا۔

جب ٹیکسی ہسپتال کے سامنے رکی اور نازو نے کمار سے چلنے کو نہیں کہا تو میں نے سکون کا سانس لیا کہ وہ مذاق میں نہیں بڑھی۔ اس سے زیادہ خوشی مجھے کمار کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر ہوئی۔

غالب نے کہا "بس۔ اکڑفوں تمام۔ ڈر گئے نا؟"

کمار مسکرایا "ہاں۔ میں ڈر گیا۔ رکمنی سے۔ وہ ابھی مجھے پکڑ کے اندر لے جاتی۔"

رکمنی اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کے کتاب نیچے رکھ دی۔ مجھے وہ پریشان اور بدحواس سی لگی۔ ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ہم چندو کو دیکھنے آئے ہیں۔ کیا حال ہے اس کا؟" گل نے کہا۔

"چندو....." وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولی۔

میرا ماتھا ٹھنکا "کیا بات ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

رکمنی نے چشمہ اتار کے آنکھیں ملیں اور ایک گہرا سانس لے کر پھر چشمہ لگا لیا۔ "آئی ایم سوری۔ وہ مر گیا۔"

"مر گیا؟" ہم سب تقریباً ایک آواز میں چلائے۔

"ہاں۔ وہ صبح دس بجے مر گیا" رکمنی نے کہا "اس کو پولیس لے گئی ہے۔ پوسٹ مارٹم کے لئے۔"

"مگر وہ تو ٹھیک ہو رہا تھا" میں نے کہا۔

"ہاں۔ بہت بہتر ہو گئی تھی اس کی حالت۔ آج صبح تھوڑا سا دلیہ کھایا تھا اور دودھ پیا تھا۔ پھر اچانک اس کو خون کی۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسی کیا بات ہوئی۔ ابھی میں یہ کتاب دیکھ رہی تھی۔ میں نے پولیس سرجن سے بات کی۔ وہ اتفاق سے راجن کا دوست ہے۔"

"کون راجن؟" میں نے کہا۔

کمار نے کہا "اس کا ہونے والا شوہر۔"

"پولیس سرجن حیران ہونے لگا مجھ پر کہ تم نے یہ کیس کیوں لیا۔ کا زخم کسی عام خنجر کا زخم نہیں تھا۔ زخم کے آس پاس کا گوشت گل گیا تھا اور اس میں سے عجیب سی بدبو اٹھ رہی تھی۔ میں نے کہا کہ یہاں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ چاقو لگ گیا ہے اور میں نے مان لیا۔ مرہم پٹی کر دی۔ لیکن پولیس سرجن غلط نہیں کہتا۔ اس کا زخم کسی ایسے خنجر کا تھا جس پر زہر تھا۔ اور یہ زہر بھی عام زہر نہیں تھا۔ اس کا اثر دو مرحلوں میں ہوتا ہے۔ بہت خطرناک زہر ہوتا ہے۔ پہلے مرحلے سے آدمی ٹھیک ہو جاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ بچ گیا۔ بارہ گھنٹے بعد دوسرے مرحلے کے مہلک اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ چندو کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔"

"لیکن اسے تم لوگ ہی لائے تھے۔"

میں نے کہا "وہ راستے میں ملا تھا۔ اس نے ہاتھ کا اشارہ دیا تو ہم نے گاڑی روک لی۔"

"کون سی گاڑی؟" کمار بولا۔

"ایک دوست کی گاڑی تھی۔ وہ ہمیں یہاں چھوڑ کے واپس لے گیا تھا" میں نے فوراً ایک جھوٹ بولا "چندو بیمار تھا اور اس کی حالت خراب تھی۔ پہلے اس نے کہا کہ اسے سانپ نے کاٹا ہے۔ پھر تسلیم کیا کہ جھگڑا ہوا تھا کسی سے اور اس کے چاقو سے یہ زخم آیا ہے۔"

"اس نے تم سے بھی جھوٹ بولا تھا۔" رکمنی نے کہا "وہ چاقو کا زخم نہیں لگتا۔ یہ بات بھی پولیس سرجن نے بتائی ہے مجھے۔ وہ خنجر یا تیر کے گھپ جانے کا زخم تھا۔ میں تو بڑی مشکل میں پڑ گئی ہوں۔"

"اب کیا مسئلہ ہے؟" میں نے کہا "پولیس سرجن سے کہو کہ لکھ دے۔ اس کو لاوارث سمجھ کر جو کرنا ہے کرے۔ ہم خود اس کی ذمے داری قبول نہیں کر سکتے۔"

رکمنی نے مجھے غور سے دیکھا "تم نے کہا تھا کہ وہ تمہارا بھائی ہے۔"

"اور کیا کہتا میں۔ پوری بات اب بتا دی ہے تمہیں۔"

"نہیں۔ پوری بات تم نے ابھی تک نہیں بتائی ہے" اس نے میز کے نیچے سے وہ پوٹلی اٹھا کے اوپر رکھ دی جس میں سونے کے زیورات تھے "یہ کیا ہے؟"

میں نے پوری کوشش کی کہ میری صورت پر حیرت کے سوا کسی جذبات کا عکس نظر نہ آئے "کیا ہے؟"

رکمنی نے پوٹلی کھول دی "یہ کم سے کم ایک کلو سونے کے زیورات ہیں۔ یہ چندو کے پاس کہاں سے آئے؟"

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ہم سب مکمل انجان بن کے چندو کے معاملات سے قطعی لاعلمی کا اظہار کریں۔

میں نے حیرانی سے کہا "سونا! یہ سونا ہے؟"

"کیا تم سونے اور پیتل میں فرق محسوس نہیں کر سکتے؟" رکمنی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میں نے نازو کی طرف دیکھا "ذرا تم دیکھو۔"

نازو نے انتہائی حیرت کے ساتھ ایک ایک زیور کو اٹھایا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا اور گل کی طرف بڑھا دیا۔ یہ سب زیور دھت سے ہمارے پاس تھا اور ان کا ہزار بار کا دیکھا ہوا تھا مگر اب انہوں نے اپنی اداکاری سے یہ ثابت کیا کہ اس زیور کو وہ پہلی بار دیکھ رہی ہیں۔

"لگتا تو اصلی ہے" گل نے کہا۔

رکمنی نے برہمی سے کہا "میں جو بتا رہی ہوں کہ سونا ہے۔"

میں نے کہا "بی بی آپ ڈاکٹر ہیں کوئی سنار نہیں ہیں کہ ہم آپ کی بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیں۔"

غالب نے بھی کہا "سونے کی جانچ پرکھ آپ کو ہوگی اتنی ہی ہمیں بھی ہے۔"

گل اور نازو نے اتفاق رائے سے سونے کو اصلی قرار دے دیا تو میں نے کہا "وہ آدمی تو غریب لگتا تھا۔ اتنا زیور کہاں سے مار لایا وہ؟"

غالب نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ اسی چکر میں مارا بھی گیا۔ زر، زمین اور زن کی ساری خرابی ہے۔"

میں نے ایک آہ بھری "لالچ بڑی بلا ہے۔"

رکمنی نے کہا "وہ تو سب ٹھیک ہے مگر اب میں کیا کروں؟ کیا بتاؤں پولیس کو؟"

"پولیس کو؟ پولیس کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں ہے تو آ جائے گی" غالب نے کہا "ڈاکٹر صاحبہ ابھی خود بلائیں گی پولیس کو۔"

میں نے کہا "خود کیوں بلائیں گی؟ یعنی عقل سے کہیں گی کہ آ جائیں مجھے مارے۔ اتنی بے وقوف نہیں ہیں ڈاکٹر صاحبہ۔"

"یہ بے وقوفی کی بات نہیں، قانونی تقاضا ہے بے وقوف۔" غالب نے کہا "اور قانون کا بہت احترام کرتی ہیں ڈاکٹر صاحبہ۔"

رکمنی نے چلا کے کہا "شٹ اپ۔ پلیز شٹ اپ! یہ کیا تم آپس میں بک بک کئے چلے جا رہے ہو۔ جو میں پوچھ رہی ہوں اس کا جواب دو۔ اگر تمہارے کہنے پر میں نے اسے علاج کے لئے داخل کر لیا تھا تو کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ جھوٹ اس نے بولا تھا یا تم نے بولا تھا۔ میں اگر اندازہ نہیں کر سکی کہ زخم مہلک ہے تو یہ میری نااہلی ہے یا غلطی۔ اسے کوئی میرا جرم نہیں بتا سکتا۔ سمجھے؟"

میں نے سر ہلایا "بالکل سمجھ گیا۔"

غالب نے کہا "تم سے پہلے تو میں سمجھ گیا تھا۔"

www.paksociety.com

"خاک سمجھ گئے تھے۔ تم کیا زیادہ عقل مند ہو مجھ سے۔"

"ہاں۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں۔"

میں نے کہا "خود کو عقل مند سمجھنے والا سب سے بڑا بے وقوف ہوتا ہے۔"

رکشی کا حوصلہ جواب دے گیا "یہ کیا مصیبت ہے۔ تم نے کیا تماشا شروع کر رکھا ہے۔ بند کرو اپنی بکواس اور مجھے سچ سچ بتاؤ کہ یہ کیا معاملہ ہے ورنہ میں پولیس کو بلاتی ہوں۔ تم کو اندازہ نہیں ہے کہ یہ کتنی سنگین صورت حال ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گے تو پولیس خود پوچھ لے گی تم سے۔"

"پولیس اور کیا پوچھے گی؟ جو ہمیں معلوم تھا وہ ہم نے آپ کو بھی بتا دیا اور پولیس کو بھی بتا دیں گے۔" میں نے نرم ہو کے کہا۔ "آپ کیا دھمکی دیتی ہیں ہمیں۔ ہم نے کون سا جرم کیا ہے۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ شہر سے باہر کسی ویران مقام پر کوئی بھی زخمی آدمی مدد کی درخواست کرے تو کیا گاڑی روک کے اسے ساتھ بٹھا لینا جرم ہے؟ اسے علاج کے لئے ہسپتال لے جانا جرم ہے؟"

میں نے کہا "ہسپتال میں وہ مر جائے تو کیا یہ ہمارا جرم سمجھا جائے گا؟ اور اگر اس کے پاس سیر بھر سونے کے زیورات تھے تو اس کو بھی ہمارا جرم شمار کیا جائے گا؟"

کمار خاموشی سے سب کچھ سن رہا تھا لیکن کم پریشان نہ تھا۔ اب اس نے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا۔

"دیکھو میں کل سے سب کچھ دیکھ رہا ہوں اور بہت سی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ تم نے اپنا حلیہ کیوں بدلا۔ ایک ہوٹل سے دوسرے ہوٹل میں شفٹ ہونے کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ وہ ہوٹل پسند نہیں آیا تھا ہمیں۔" میں نے کہا۔

کمار نے نفی میں سر ہلایا "جب تم ملے تھے تو تمہارے حلئے ایسے نہیں تھے جیسے اس وقت نظر آ رہے ہیں۔ تم جنگلوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے اور تمہیں بال کٹوائے اور شیو بنوائے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ تم جنگلی نظر آتے تھے۔ آخر کیوں؟ کیا مجبوری تھی؟ کس کا خوف تھا کہ تم اتنا عرصہ انسانوں کی دنیا سے دور رہے؟ میرا خیال ہے کہ تم مفرور تھے۔"

غالب بولا "تمہارا خیال غلط ہے۔ ہم مفرور نہیں مجبور تھے۔"

"اس کے بعد تم نے کہا کہ فرضی نام سے پاسپورٹ بنوا کے تمہیں ڈھاکا جانا ہے اور میں اس کام میں تمہاری مدد کروں۔"

رکشی چلائی "راجو! ایسی بے وقوفی مت کرنا۔"

میں نے کہا "راجو ہم سے معاہدہ کر چکا ہے۔"

غالب بولا "اور ہم سے ایڈوانس بھی لے چکا ہے۔"

"ہم معاہدے کی خلاف ورزی برداشت نہیں کرتے۔" ... سر ہلایا "کوئی اور ہوتا تو ہم پتا نہیں کیا کرتے۔ لیکن تمہارا راج کمار عرف راجو اچھا آدمی ہے اس لئے چھوڑ دیتے ہیں۔"

"شکر ہماری رقم واپس لاؤ۔" غالب نے کہا "یہ کام آدھی قیمت میں کوئی بھی کر دے گا۔ خود پولیس ہماری مدد کرے گی۔"

رکشی نے فون اٹھایا "ٹھیک ہے۔ میں پولیس کو بلاتی ہوں۔ تم ان کے پیچھے منہ پر مارو راجو۔"

میں نے فون پر ہاتھ رکھ دیا "ڈاکٹر صاحبہ کا غصہ معلوم ہوتا ہے۔ میرا تو مشورہ ہے کہ آپ کسی چکر میں نہ پڑیں۔"

"اسی لئے تو پولیس کو بلا رہی ہوں۔ میں انہیں سب بتا دوں گی۔"

"کیا وہ آپ کے سچ کو مان لیں گے؟" غالب نے کہا۔ "ان کے آنے سے پہلے ہم تو بھاگ جائیں گے۔ پکڑی جائیں گی آپ؟ کون ہو گا آپ کے بیان کا گواہ؟ میری مانیں تو یہ سب اپنے پاس رکھیں۔ یہ زیور۔"

غالب نے کہا "کسی کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ آپ بھی خاموش رہیں۔ ہم بھی چندو کو بھول جائیں۔"

رکشی کا غصہ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا "یہ...... میں رکھ لوں؟"

"ہاں۔ کیا حرج ہے اس میں۔ سونے کا زیور ہے۔ فروخت کریں۔ اپنی بھابی کو دیں۔ بڑی شادی میں دکھائی دیں۔"

"آپ نے ایمانداری کیا تو یہ سونا پولیس کے پاس چلا جائے گا۔ وہ آپس میں تقسیم کر لیں گے۔" میں نے کہا "جس کا ہے اسے بہرحال نہیں ملے گا۔ آپ نے یہ کسی سے چھینا نہیں ہے۔ یہ تو خدا کی دین ہے۔"

لالچ آدمی کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور سونا تو وہ جس میں ہر عورت بے پناہ رغبت خود محسوس کرتی ہے۔ رکشی کی ساری مزاحمت یکلخت خوشی آمیز دلچسپی میں بدل گئی۔ اس نے زیورات کو اٹھا کے دیکھا اور پھر رکھ دیا۔

"مجھے یہ بتاؤ وہ کیا وہ تمہارا ساتھی نہیں تھا؟ اور تم کون ہو؟"

میں نے کہا "مس رکشی! کیا ڈاکو اتنے احمق ہوتے کہ غنیمت کو بھی بھول جائیں؟ ہم ڈاکو ہوتے اور وہ ہمارا ساتھی تو کیا ہم یہ سونا آپ کو پیش کرتے؟ اس سے کہیں زیادہ آسان ہوتا کہ ہم آپ دونوں پر دو گولیاں خرچ کرتے اور چلے جاتے۔"

غالب نے کہا "راج کمار! تم ہی سمجھاؤ۔ انہوں نے کبھی ڈاکو نہیں دیکھے؟ ان کے بارے میں سنا اور پڑھا تو ہوگا۔ اتنے مہذب اور شریف لوگ ہوتے ہیں؟ کل سے تم دیکھ رہے ہو۔"

راج کمار نے تذبذب کے ساتھ کہا "وہ تو ٹھیک ہے"

"ڈاکو کیا؟ تم بھی شک کرتے ہو ہم پر تو لاؤ ہمیں ہزار واپس دو ... پولیس کو۔ کل سے آج تک تم نے ہمارا ساتھ دیا ہے اور ... بلالو پولیس ... ابھی تمہارے تعاون کو پولیس اپنی نظر سے دیکھے ... ساری بکتا ... ہمارے ساتھ تمہیں بھی لپیٹ لے گی۔"

غالب نے راج کمار کی قوتِ مدافعت ختم ہوتی دیکھی تو کہا "... جب اخبار میں خبر آئے گی کہ ڈاکوؤں کی مدد کے الزام میں ... ڈاکٹر اور اس کا بھائی گرفتار۔ مال مسروقہ برآمد..."

"میں کہتا ہوں چھوڑو ساری باتیں۔ ہمارے سوا کسی کو بھی معلوم نہیں کہ چندو یہاں آیا تھا۔ کہاں سے آیا تھا اور کیسے آیا۔ وہ مر گیا تو اسے بھول جاؤ۔ ہم بھی سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ... اب سب کا فائدہ ہے۔ کوئی بھی تم پر شک نہیں کر سکتا اور ... تم تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ یہ عقل مندی تو نہیں ہوگی کہ سیر بھر ... پولیس کو جلد معاوضہ دیا جائے اور پھر وہ ہم سب کی کھال میں ... بھر دیں۔ مال ہضم کر جائیں اور ہمیں رسوا کر کے پھر چھوڑ دیں۔ ... تو پھر یہاں سے چلے ہی جائیں گے۔ تمہارا مستقبل برباد ہو جائے ..."

راج کمار نے سوچ کے کہا "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔"

رکشی نے ایک گہری سانس لے کر کہا "میں انکل کو فون کرتی ہوں۔ وہ لاوارث لاش کسی کے حوالے کر دیں۔ مردہ خانے سے ... کروا دیں۔"

میں نے کہا "انکل کو نہیں اپنے ساجن کو فون کرو۔"

"ساجن نہیں۔ راجن۔" کمار بولا۔

"وہ ایک ہی بات ہے۔" میں نے کہا "ہم تمہیں کمار کہتے رہے ... کہ تم راج کمار تھے۔"

"راج پاٹ نہیں تھا اس کے باوجود..." غالب بولا۔

"بس تمہیں راجو کہتی ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟ ... ہو یا ساجن۔ کیا کہا تھا کسی نے کہ گلاب کے پھول کو جس ... سے چاہو پکارو وہ گلاب ہی رہے گا۔"

غالب بولا "جیسے کدو کو کچھ بھی کہو کدو ہی رہے گا۔"

رکشی ہنسنے لگی "تم ایسی ہی باتیں کرتے ہو ہمیشہ؟"

"ہمیشہ؟ ساجن کی باتیں...."

"میرا مطلب تھا.... خیر۔ میں راجن کو کیا کہوں؟"

"اس سے کہو۔ بلکہ اسے حکم دو کہ اپنے ماما سے بات کرے ... اسی وقت۔"

"ماما نہیں وہ چاچا جی ہیں راجن کے۔"

میں نے کہا "ہاں ہاں وہی۔ راجن کا ماما یا ساجن کا چاچا۔ جو ... کرے گا وہی سول سرجن کرے گا۔"

"سول سرجن نہیں پولیس سرجن ہے۔"

میں نے سر پر ہاتھ پھیرا "بی بی! تمہیں بھی عادت ہے بیچ میں ... پولیس سرجن چاچا ہے جب ان کا بھتیجا کہے گا تو وہ اور بات ہوئی اور چاچا کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ لاش کو انسانیت کی فلاح کے لئے وقف کرا دیں۔"

"انسانیت کی فلاح کے لئے؟" کمار چکرا گیا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ چندے میں اسے دے دیں۔ پردھان منتری کے امدادی فنڈ میں۔ میڈیکل کے طلبا کو سبق اور تجربات کے لئے لاش دینا بھی انسانیت کی خدمت ہے۔ وہ زہر اور اس کی نوعیت کے بارے میں تو کچھ معلوم کریں گے..."

نازو نے کہا "آپ تحقیقات نہیں کر سکتے؟"

میں نے کہا "جہاں خط لکھنا ضروری ہو وہاں میں تار نہیں دیتا۔ الفاظ بچا کے کیا ملے گا؟"

"تھوڑا سا وقت۔ دوسرے کاموں کے لئے" نازو نے طنز سے کہا "اب ڈاکٹر رکشی ان کی ہیں تو باقی سب ان پر چھوڑ دو۔"

"یہ زیور سنبھال کے رکھیں۔ معلوم نہیں کون سی تنگی تھی جو آپ کے کام آئی۔ چندو کے مقدر میں نہیں تھا یہ سب۔ اور اگر نصیب کھوٹے ہوں تو کوشش سے کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "کبھی کبھی کھوٹا ہو جاتا ہے۔ ورنہ کھوٹے سکے بھی چل جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارا یہ نکھٹو بھائی اب شادی کر سکتا ہے۔ اپنا گھر بنا سکتا ہے۔"

"یہ سونا میرا نہیں ہے۔" کمار نے احتجاج کیا۔

"اور کس کا ہے" رکشی نے جھنجھلا کے کہا "تم ہی لائے تھے اسے۔ میں لینے نہیں گئی تھی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"کیوں فرق نہیں پڑتا؟ تم لائے تھے۔ تم ہی لے جاؤ اور جو چاہو کرو۔" رکشی کو بولنے کا موقع مل گیا۔

"شکریہ تمہیں دے گئے ہیں انہوں نے...."

"یہ کون ہوتے ہیں پرایا مال کسی کو دینے والے؟" رکشی نے کہا "ان کی چیز ہوتی تو اور بات تھی۔"

میں نے کہا "ہم تو ایسے ہی کرتے ہیں۔"

"کیا کرتے ہو؟" کمار بولا۔

میں نے کہا "حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ اور کیا۔"

کمار ہنس پڑا "تم عجیب لوگ ہو۔ میں تمہیں سمجھ نہیں سکا۔"

"آدمی اگر آدمی کو سمجھ لے تو دنیا کیا عاقبت بھی سنور جائے اس کی۔" غالب بولا۔

میں نے کہا "خود اپنے آپ کو سمجھ لے تو...."

نازو نے بگڑ کے کہا "کیا مصیبت ہے! آپ تک بولتے رہو گے یہ فلسفہ؟ اب چلو بھی یہاں سے۔"

رکشی نے کہا "ایسے نہیں۔ آج کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔"

میں نے کہا "نہیں۔ آپ ہمارے ساتھ کھائیں۔ ہمیں راجن عرف ساجن سے ملوائیں۔"

"کیوں نہ ہم انہیں بھی ساتھ لے چلیں؟" غالب نے کہا۔

www.paksociety.com

وہ رکمنی جو کچھ دیر پہلے تشویش میں مبتلا تھی اور سخت فکرمند تھی' اب بے حد مسرور نظر آرہی تھی اور ہمارے' اس کے درمیان محبت کا رشتہ' شکوک کی فضا اور بدخواہی کے جذبات سب اپنا وجود کھو چکے تھے۔ اس نے چہک کر کہا "ٹھیک ہے۔ مگر ایک مہمان اور ہوگا۔"

میں نے کہا "کون؟ علاقے کا تھانیدار۔"

"تھانیدار ہی سمجھ لو" رکمنی مسکرائی "اس علاقے میں ایک ایسا عادی مجرم بھی ہے جسے اور کوئی قابو نہیں کر سکتا۔"

"اچھا۔ اتنا زبردست ہے کوئی؟" نازو بولی۔

غالب نے کہا "تم کیا سمجھتی ہو' بس تم ہی ایک چیز ہو۔ بڑی بڑی بلائیں پڑی ہیں دنیا میں۔ جو کسی کے پیچھے پڑ جائیں۔"

"میں بلا ہوں؟" نازو نے چراغ پا ہو کے کہا۔

غالب نے ایک دم لہجہ نیازمندانہ کر لیا "تم ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو۔ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے۔"

غالب کے ہر الگ اشعار سے غالب نے جو مفہوم پیدا کیا وہ لاجواب تھا' جس نے نازو کو بھی لاجواب کر دیا۔ ہم سب بڑے خوش گوار موڈ میں ایک ساتھ نکلے۔ اب کمار کی ٹیکسی کے پیچھے ڈاکٹر رکمنی کی گاڑی تھی جو ریل کا زنانہ ڈبا بن گئی تھی۔ ہم نے ایک جگہ سے راجن کو اٹھایا۔ پھر دوسری جگہ سے اس لڑکی کو ساتھ لیا جو کمار کے وعدہ فردا پر بڑی استقامت کے ساتھ زندگی سے پرامید سمجھوتا کئے بیٹھی تھی۔ اس کا نام پاروتی تھا اور وہ تھی بھی بہت پیاری سی۔ جب ہم نے کمار کی طرف سے اسے یہ مژدہ سنایا کہ اس کا انتظار ختم ہوا تو اس کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں کو نہ روک سکیں۔ یہ اطلاع خود راجن کے لئے بھی اتنی ہی خوشی کا باعث بنی۔ آخرکار کمار نے ایک گھر خریدنے کا ارادہ کر لیا تھا اور یوں دو طرفہ ہجر کا عذاب تمام ہوا۔

وہ ایک خوب صورت دن تھا جب ہم نے جانتے بوجھتے اپنے آج اور کل کے سارے دکھوں کو بھلا دیا اور اپنے ان نئے دوستوں کے ساتھ ان کی خوشیوں میں بھرپور شرکت کی۔ ایک مدت کے بعد ہم خوب ہنسے' انہیں بھی ہنسایا اور ہنستے کھیلتے کلکتہ دیکھتے رہے۔ یہ ایک دن کی مستعار خوشی تھی۔ ہمارے اندیشہ ہائے دور دراز کے بیاباں میں راحت کا ایک نخلستان جہاں ہم نے وقتی رشتوں کے خلوص کا سہارا لیا جو سفر کے اگلے مرحلے کی ضرورت تھا۔ جیسے طویل مسافتوں کے درمیان سیاح اپنی گاڑی کو سروس کراتے ہیں۔

ہم میں سے کسی نے چندو کو یاد نہیں کیا اور اس خیال سے دل افسردہ نہیں کیا کہ وہ اپنی منزل کا نشان پا کے کیوں مرا؟ اس کو مرنا تھا تو بہت پہلے مر جاتا۔ اپنی ماں کے خریداروں کو قتل کرکے یا اس مقدس رشتے کو بیچنے والے کی جان لے کر پھانسی چڑھ جاتا۔ یا خودکشی کر لیتا۔ زندگی میں مرنے کے لئے مواقع کی کمی نہ تھی لیکن وہ اس موقعے کی تلاش میں تھا جب وہ کلکتہ جا کے اپنی ماں کی تلاش کے مشن کو کامیاب بنا سکے۔ احمق! جب یہ موقع ملا تو گیا۔ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور۔

چندو سے پہلے رامن مر گیا تھا۔ وہ بھی اپنی ماں کی خواہش پوری کرنے کے لئے تقدیر کے مہرباں ہونے کی دعا کر رہا تھا مگر یہ دعا قبول ہونے کا وقت آیا تو خود قضا سے جا ملا۔ رامن اور چندو۔ وقت کی مسافت پر بہت پیچھے رہ جانے والے استاد ٹیپی اور میرے والد وزیر خان۔ اور سفر آرزو کی راہ ہو جانے والی شملا اور اس کا بچہ۔ ان کے مقدر میں ایسی موت کیوں تھی؟

میں نے یہ سب نہیں سوچا۔ میں نے مشرقی پاکستان کے اور اپنے مسائل کے بارے میں نہیں سوچا۔ ہاں مگر میں نے کو اس رات بہت یاد کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے خاموشی سے محسن کو بہت یاد کیا۔ اس دن ہم دونوں ہی تنہا تھے اور اندر کی ویرانی کو اور خلا کو خوش گوار باتوں اور مجبوری کی نہیں بھر سکتے تھے۔ پھر بھی ہم نے سب کا ساتھ دیا۔

رات گئے ہم لوٹ آئے۔ راجن اور رکمنی ہم سے کہیں اور چلے گئے۔ کمار اپنی پارو کو چھوڑنے کے بہانے چھوڑ گیا اور ہم دوسری ٹیکسی میں بیٹھ کے ہوٹل پہنچے۔ ہماری تصویریں اتروائی تھیں اور وعدہ کیا تھا کہ اگلے دن پاسپورٹ مل جائیں گے۔ اس نے راجن کو اور پارو کو متعلق صرف یہ بتایا تھا کہ ہم دوست ہیں اور ہمیں ڈھاکا مگر ہمارے پاسپورٹ گم ہو گئے تھے۔ کلکتہ ائرپورٹ پر سامان میں سے ایک بریف کیس غائب ہو گیا تھا۔ انہوں جھوٹ سمجھا یا سچ' اس کی ہم نے پروا نہیں کی۔

ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کے ہم نے روم سروس طلب کی۔ سب کی نیند اچانک روٹھ گئی تھی۔ مستعار خوشی ختم ہوتے ہی سب پھر اداسی اور ڈپریشن کا شکار ہو رہے نہیں چاہتا تھا کہ کوئی افسردہ کرنے والی بات کرے اور افسردہ کرے۔

میں نے کہا "آج کا دن اچھا گزر گیا۔ ہنستے کھیلتے۔"

غالب نے سر ہلایا "اس لئے کہ ہم بے حس' خود فراموش پسند ہو گئے ہیں۔ حالات نے ہمیں ایسا بنا دیا۔ اپنے آپ کو خوشی کا فریب دیتے ہیں۔ ورنہ آج ہمیں تھا۔ اس بدنصیب شہزادے چندو کو جس کی لاش لاوارث نہیں۔ غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا۔"

نازو نے ٹھنڈی سانس لی "کس کس کو روئیں گے ہم۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اتنے تو آنسو بھی نہیں ہوں گے ہمارے پاس۔"

"بیچارا کتنے ارمان لے کر آیا تھا۔" گل نے سادگی سے کہا۔

"جذباتی ہو گیا تھا" میں نے کہا "غیر جذباتی لوگ بھی لے کر آتے ہیں۔ ہر کوئی نہیں۔ اب تو کیا وہ کسی کو ماں نہیں بنا سکتا تھی اس عورت کے لئے راج پاٹ کو لات مارنے کی کیا ضرورت جس کو بیچ دیا گیا ہو۔ ہوتے ہوئے بھی زمانہ ہو گیا۔"

غالب نے کہا "یہ رشتہ ہی ایسا تھا کہ عقل سے کام لینا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔ محبت کی انتہا نفرت کے جذبات کو جنم دیتی ہے۔ رقابت پیدا کرتی ہے۔ انتقام کی آگ کو ہوا دیتی ہے۔ اس کے چھوٹے بڑے کو بڑھنے نہیں دیا۔ ان پڑھ کی تخصیص نہیں۔ دیکھ لو اس نے اپنے باپ کو مار دیا۔ نفرت کی یہ انتہا اس کی ماں سے شدید محبت کا شاخسانہ تھی۔"

نازو نے شرمندگی سے کہا "اور کتنے اطمینان سے ہم نے کہہ کر اس کی لاش کو لاوارث قرار دے کر ٹھکانے لگوا دو۔ کیا وہ لاوارث ہوتا ہے جس کے ہم جیسے دوست ہوں؟"

"وہ ہمارا دوست نہیں تھا" غالب نے کہا۔

"اس نے ہماری مدد کی تھی۔"

"ہم نے اس کو معاوضہ دیا تھا۔ دوستی کا معاوضہ نہیں ہوتا" غالب نے کہا۔

گل نے اداس ہو کے کہا "کتنا ظلم ہے کہ ماں اس شہر میں بے دردی ہے اور اسے نہیں معلوم کہ اس کا کوئی بیٹا بھی ہے۔ اسے بھول نہیں سکا تھا اور اس کی تلاش میں کلکتہ تک آ گیا تھا۔"

"مگر اب اس کی لاوارث لاش مردہ خانے میں پڑی ہے۔ کاش کوئی ایسا طریقہ ہو تاکہ ہم انہیں ملوا سکتے۔ کوئی ایسی طاقت ہمارے پاس" نازو نے بے بسی سے کہا۔

"یا کم سے کم اتنے بااختیار ہوتے ہم کہ اس کی آخری رسوم ادا کر سکتے۔ اسے عزت کے ساتھ رخصت کرتے۔ مگر ہم نے اپنی جان بچالی" میں نے کہا۔

"جان چھڑائی" غالب نے کہا۔

"بھائی سکندر! یہ سوچنا بڑا منحوس ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس ملکیت میں کتنی نحوست ہے" گل بولی۔

"ہاں۔ اگرچہ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں اور میں سمجھتا ہوں یہ سب کچھ منجانب اللہ ہے" میں نے کہا "مگر جب میں اس جعلی کی موت کا منظر یاد کرتا ہوں۔ رامن کا تصور کرتا ہوں۔ اور چندو کے مر جانے کا سوچتا ہوں تو تمہاری بات بھی غلط نہیں لگتی۔"

"چلو اچھا ہوا اس سونے سے ہماری جان چھوٹی" گل نے اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"اللہ نے چاہا تو کل پاسپورٹ مل جائیں گے۔ پرسوں ہم یہاں سے ضرور نکل جائیں گے" میں نے کہا "اور پرسوں ہی ڈھاکا پہنچ جائیں گے۔"

"اگر کمار نہ آیا؟" گل نے سوال کیا۔

"کمار نہ آیا؟ کیا وہ بیس ہزار لے کر بھاگ جائے گا؟" غالب نے کہا۔

"آدمی کی نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔"

"پریشانی میں تمہیں ایسی باتیں سوجھ رہی ہیں گل۔ کمار ایسا آدمی نہیں ہے" میں نے کہا "پھر وہ بھاگ کے جا بھی کہاں سکتا ہے۔ اس کی بہن ہے یہاں اور پارو ہے۔ رشتوں کی یہ زنجیریں توڑنا اس کے بس کی بات نہیں۔"

"جاگتی رہو گی تو فضول خیالات دماغ میں آتے رہیں گے" غالب بولا "کہیں پاسپورٹ جعلی نہ ہوں۔ ہم پکڑے نہ جائیں۔ ڈھاکا پہنچنے سے پہلے ہی مارے نہ جائیں۔ کیا پتا محسن نہ ملے۔ واپس وطن جانے کے بجائے إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ نہ ہو جائیں۔ بابا جو ہونا ہے سو ہونا ہے۔ اسے اپنی کوشش سے کون روک سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ تم اچھی باتیں سوچتے ہوئے سو جاؤ تاکہ اچھے خواب آئیں۔ اور تم صبح مسکراتی ہوئی اٹھو" غالب نے کہا۔

میں نے اس سے اتفاق کیا "ہم سب کو انتشار پیدا کرنے والے خیالات سے دور رہنے کی شعوری کوشش کرنی چاہئے۔ اگر یہ خود فریبی ہے تو یوں ہی سہی۔"

"ہاں۔ حقیقت پسندی سے کیا ملا ہے اور کیا ملے گا۔ سوائے قنوطیت' مایوسی اور بددلی کے۔ بس خوش رہو کہ جو ہوگا سب اچھا ہی ہوگا" غالب نے کہا۔

"اور اچھا نہ ہوا پھر؟"

"پھر روئیں گے۔ ابھی تو سو سکتے ہیں۔ جاؤ' چلو اٹھو۔ نکلو یہاں سے۔ اپنے کمرے میں جا کے سو جاؤ۔ خبردار جو آپس میں کوئی رونے دھونے والی بات کی" غالب نے بڑبڑی سے کہا۔

"اور ہم نہ جائیں تو دھکے دے کر نکالو گے؟"

"نہیں۔ ہم خود چلے جائیں گے" غالب اٹھ کھڑا ہوا "اٹھو یار سکندر۔ اپنا دماغ خراب کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔"

لیکن دوسرے کمرے میں آ جانے کے بعد غالب نے سیدھا بستر کا رخ نہیں کیا اور لائٹ آف کرکے سونے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کھلی کھڑکی سے کلکتہ کی رات کے اندھیرے میں نہ جانے کیا دیکھتا رہا۔ میں نے بیڈ پر لیٹ کر ایک سگریٹ جلائی اور دھوئیں کے مرغولوں میں وہی دیکھتا رہا جو غالب تاریکی میں دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر مجھے گل اور نازو کی آواز سنائی دی۔ پھر شاید وہ سو گئیں۔ میں نے دروازے سے باہر جا کے دیکھا' ان کے کمرے کی لائٹ دروازے کے نیچے نظر نہیں آرہی تھی۔

"کیا وہ سو گئی ہیں؟" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ تم کیا دیکھ رہے ہو باہر؟"

غالب نے کہا "یار' وہ ہسپتال کہاں ہوگا' کس طرف ہوگا؟"

"کون سا ہسپتال' رکمنی کا؟"

"نہیں۔ جہاں چندو کی لاش پڑی ہے۔"

میں نے کہا "مجھے کیا معلوم۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

www.paksociety.com

غالب نے کہا "یار تم معلوم کر سکتے ہو۔ رکنی سے پوچھ لو۔"

"بات کیا ہے؟"

"مجھے اپنی خود غرضی کی سوچ پر شرم آرہی ہے۔ آدمی کو اتنا بھی کمینہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے چندو کے لئے کچھ نہیں کیا۔ بالکل بے تعلق ہوگئے اس سے" غالب بولا۔

میں نے کہا "یہ خلش تو میرے دل میں بھی ہے کہ ہم نے اچھا نہیں کیا۔ اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"ہم اس کے کریا کرم کا بندوبست کر سکتے تھے۔"

"کریا کرم۔ وہ مسلمان تھا" میں نے کہا "کفن دفن کہو۔"

غالب بولا "یہ قرض ہم چکا سکتے ہیں سکندر۔ ابھی وقت ہے۔ چلو۔"

"اس وقت! کہاں چلیں؟"

"ہسپتال اور کہاں۔"

"ہوش کی دوا کرو مرزا۔ رات کے وقت ہم لاش لے کر کہاں جائیں گے۔ کیسے بندوبست کریں گے کفن دفن کا۔ ہمیں تو اس شہر کے مرے پیر کا علم نہیں۔ خواہ مخواہ پھنس جائیں گے اگر لاش لے کر پھرتے رہے۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "ہم لاش نہیں لیں گے۔ کسی سے کہہ دیں گے کہ وہ ہماری طرف سے تجہیز و تکفین کرا دے۔ ویسے تو بہت سے ادارے بھی یہ کام کرتے ہوں گے لیکن ہمیں ان کا پتا نہیں۔ کوئی مسلمان اسے نیکی کا کام سمجھ کے کرے گا۔"

"نیکی کا کام!" میں نے تلخی سے کہا "یہاں کیا چندو اور کیا مسلمان، سب کا دھرم پیسہ ہے۔ سب پیسہ کماتے ہیں، ثواب کمانے کی کسی کو فرصت نہیں۔"

"تو ہم پیسہ دے سکتے ہیں۔ پیسے کے لئے کوئی بھی یہ کام کرے۔"

"وہ پیسہ رکھ لے گا اور کفن دفن کا خرچ بچا کے لاش کو سمندر میں ڈال دے گا۔ میں تو ایک کروڑ انسانوں کو پیسے کی خاطر عزت، ایمان سب بیچ کر توت تتے دیکھ رہا ہوں۔ یہاں بھوک اور مفلسی نے رشتوں کو اور جذبات کو دو کوڑی کا کر دیا ہے۔"

"مگر یار سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔"

"ہمیں اچھا آدمی کیسے ملے گا؟ کہاں ملے گا؟ پہچان کیا ہوگی اس کی؟" میں نے کہا۔

"تو بہت تلخ ہو رہا ہے بھائی۔ چل اٹھ۔ نیک نیتی کے ساتھ نکلیں گے تو نیک آدمی بھی مل جائے گا" غالب نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "یہ وقت نکل گیا تو..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "مثل اور تازو کو جا رہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ انہیں سونے دو۔ دو تین گھنٹے کی تو بات ہے" غالب نے کہا "انہیں پتا بھی نہیں چلے گا اور ہم واپس آجائیں گے۔"

"اور پتا چل گیا تو؟"

"تو کیا قیامت آجائے گی۔ ہم بتا دیں گے کہاں گئے تھے۔"

میں نے آہستہ سے دروازہ مقفل کیا اور ہم دبے پاؤں کمرے سے گزر کے زینہ اتر گئے۔ میں نے چابی کاؤنٹر پر دیتے ہوئے فون کی اجازت مانگی۔ اس نے ہال کے آخری حصے کی طرف اشارہ کیا جہاں شیشے کے پانچ کیبن نظر آ رہے تھے۔ یہ سب کال آفس تھے۔

نمبر ملتے ہی رکنی نے فون اٹھا لیا "کیا بات ہے راجن؟"

میں نے ہنس کے کہا "نہ میں راجن ہوں نہ ساجن۔"

اس نے کہا "اوہ۔ دراصل ابھی تو میں واپس آئی ہوں۔ اور آتے ہی اس کے فون کا انتظار کرنے بیٹھ گئی۔"

وہ ہنسی "نہیں۔ میں بھی شاید.... خیر تم بتاؤ"

میں نے کہا "وہ.... مجھے پتا بتاؤ اس ہسپتال کا۔"

"کیوں؟" وہ چونکی "اس کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

میں نے کہا "کیا تم نے اپنے انکل سے کہہ دیا تھا لاش کو لاوارث قرار دے کر ٹھکانے لگا دیں؟"

"ہاں۔ تم نے ہی کہا تھا۔ ابھی چند منٹ پہلے میری انکل سے بات ہوئی ہے" وہ بولی۔

"پھر تو ہم پہنچ جائیں گے" میں نے کہا "جلدی سے ذرا سمجھا دو ہسپتال کے اندر کا۔"

"آخر تم کیا کر رہے ہو؟ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

میں نے کہا "ہم اپنے دوست کی آخری رسوم میں خود شامل نہیں ہو سکتے مگر یہ انتظام تو کر سکتے ہیں کہ کوئی ادارہ یہ کام کرے، معاوضہ جتنا مانگے گا ہم دیں گے۔"

"تمہاری مرضی" وہ کچھ دیر بعد بولی "بس مجھے کسی بات میں مت ڈالنا۔ تم کس وقت جاؤ گے؟"

"ہم ابھی اور اسی وقت جا رہے ہیں۔"

"اس وقت! اس وقت کون سا ادارہ کھلا ہوگا، کون آدمی اس وقت یہ کام کون کرے گا؟"

میں نے کہا "اس کی فکر تم مت کرو۔ مردہ خانے کا بتاؤ۔ اور یہ بتاؤ کہ وہاں کون ملے گا؟"

"وہی ہوگا۔ پاگل۔ ایک بڈھا ہے۔ وہیں مردوں کے ساتھ سوتا ہے" وہ بولی "چوبیس گھنٹے مردہ خانے میں رہتا ہے۔"

"گھر بار نہیں ہے اس کا؟"

"اسی کو اپنا گھر کہتا ہے۔ مردوں کو اپنا مہمان۔ کئی سال ہوگئے ہیں اس بات کو۔ مگر اس کے دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ وہ مردہ خانے سے نکلتا ہی نہیں۔ وہ بڑا بدمعاش تھا۔ دو تین بار جیل گیا۔ باہر نکلا تو پھر وہی چوری چکاری مار پیٹ۔ ایک بار کسی نے پیٹ میں خنجر گھونپ کے آنتیں نکال دیں اور مرا سمجھ کر مردہ خانے میں پھینک دیا گیا۔ یہ وہاں مردوں کے ساتھ رہا۔ ہوش آیا تو اس کا دماغ الٹ گیا۔ شاک سے۔

لڑوں نے کوشش کی اور اسے بچا لیا۔ حالاں کہ ڈاکٹر بھی اسے مردہ قرار دے چکے تھے۔"

"پھر تو یہ کہو کہ خدا نے بچا لیا۔"

"اسے یہ معجزہ ہی تھا کہ مردہ زندہ ہوگیا۔ مگر اس دن کے بعد اپنی دنیا میں لوٹ کر نہیں گیا۔ رات کو مردوں سے باتیں کرتا ہے۔ تم جا کے دیکھنا کیا تماشا ہے۔"

"تماشائے عبرت" میں نے کہا "کیا نام ہے اس کا؟"

"اصل نام تو خود اسے بھی یاد نہیں ہوگا۔ سب بدرو کہتے ہیں۔ لے پالک کہتے تھے، بعد میں بدرو ہوگیا۔ بابا بدرو۔"

یہ سمجھ کے میں نے ریسیور رکھا اور ہم باہر نکل آئے۔ باہر کی دنیا ابھی تک آباد تھی اور رات کے سارے کاروبار جاری تھے۔ ایک ٹیکسی نے ہمیں ہسپتال پہنچا دیا جو کسی چھوٹے موٹے شہر سے کم نہ تھا۔ ہم پیدل پھرتے تو تلاش میں دو گھنٹے لگ جاتے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں مردہ خانے کے گیٹ پر اتار دیا جو شعبۂ حادثات کے قریب تھا۔

بابا بدرو کو ہم نے مردہ خانے کے باہر ہی دیکھ لیا۔ وہ ساٹھ ستر سال کا تندرست و توانا بوڑھا تھا جس کے لیے چھتاور بال سفید تھے۔ اس کی داڑھی بھی سفید تھی اور بھویں تک سفید ہو گئی تھیں۔ اس کا لباس سیاہ تھا۔ سر سے پیر تک ایک کالا چغہ۔

"آگیا۔ آگیا۔ ایک اور مہمان آگیا۔ خوش آمدید" اس نے بڑھ کے ایک لاش کو اٹھا لیا۔ لاش لانے والے اس کی بات پر نہیں مسکرائے۔ وہ اس پاگل بدروح کی باتوں کے عادی تھے۔

"اس بھئی کیا نام ہے میاں تمہارا" وہ ہماری طرف متوجہ ہوئے بغیر مُردے سے مخاطب رہا "جان تو اچھی پائی ہے لیکن کیا رہ پہلوان۔ یہاں کون سی کشتی لڑو گے تم۔ میرے مہمان ہو تم، کچھ نہیں۔ نہ پہلوان نہ دادا۔ نہ راجہ نہ بھکاری۔ کب تک رہو گے یہاں۔ گھڑی دو گھڑی۔ پھر ایسے جاؤ گے کہ لوٹ کے ادھر واپس نہیں آؤ گے۔ لو یہاں لیٹو مزے سے۔ کیسی ہے یہ جگہ۔ نہ افسار نہ دوڑ بھاگ لین دین کی۔ نہ چکر دنیاداری کے، نہ رشتے داری کے۔ یہ جو تمہارے ساتھ سو رہا ہے نا، یہ ابھی دیر پہلے ہی تو آیا ہے۔ بھائی نے اس کی جھونپڑی پر قبضہ کر لیا۔ جورو پر۔ لیکن بچوں کو باہر نکال دیا۔ اس بیچارے کو کیسے معلوم تھا۔ یہ تو جیل میں۔ اور ہاں، مزے کی بات یہ کہ جیل اسی بھائی کی خاطر گیا تھا، اسے بچانے کے لئے۔ جب باہر آیا تو پتا چلا نہیں رہی جورو نہ بچے، نہ گھر بار۔ بھائی سے جھگڑا ہوا۔ وہ تھا ذرا پلا ہوا تمہاری طرح۔ اس نے میرے پاس بھیج دیا اسے۔ یہ دوسری طرف جو لیٹا ہے نا۔ اس کو پولیس نے بھیجا ہے۔ بڑا مشکل ہے بھئی۔ پولیس نے ایک ہفتہ اتنی کوشش کی کہ یہ مان لے۔ بار بار یہی کہتا تھا کہ جب چوری کی نہیں تو کیسے مان لوں۔ پاگل۔ مان جاتا۔ اپنے گھر میں رہتا۔ اب مجھ سے کوئی کہے

بدرو، مان لے کہ تو کالا ہے۔ تو میں مان لوں گا بھئی۔ کالا تو نہیں ہوں نا میں۔ دیکھ لو۔ دونوں آنکھیں ٹھیک ہیں۔"

میں اور غالب مردہ خانے کے وسیع ہال میں کھڑے تھے اندر لمبی لمبی بینچوں پر، سٹریچر پر اور زمین پر درجنوں لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ کچھ تازہ، کچھ پرانی۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی اور کچلی ہوئی۔ کچھ صحیح سالم۔ تازہ ترین لاش جس سے بدرو باتیں کر رہا تھا، کسی ہٹے کٹے شخص کی تھی جس کے سینے پر خون کا داغ کسی گولی کے زخم کی نشاندہی کرتا تھا۔ بدرو واقعی ان سب کے درمیان بیٹھا ہوا ان سے یوں ہمکلام تھا جیسے وہ سب زندہ انسان ہوں۔ ابھی تک اس نے مجھے اور غالب کو در خور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔

دروازہ کھلا اور ایک عورت روتی چیختی اندر آئی۔ اس کے پیچھے ایک مرد تھا جو اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا اور زیر لب بڑی رعونت سے مسکرا رہا تھا۔ یہ اسی شخص کی بیوی تھی جس کی عدم موجودگی میں اس نے بھائی سے شادی کر لی تھی اور یہ شخص وہی احسان فراموش تھا جس نے اپنے محسن بھائی کو مار کر اس کو گھر بار سے بھی محروم کر دیا تھا۔ غالباً انہوں نے اس قتل کے الزام سے خود کو بچا لیا تھا اور پولیس سے مل کے اس قتل کو نامعلوم قاتلوں سے منسوب کرانے میں کامیاب رہے تھے۔ ان کا رونا پیٹنا اور اس کی جھوٹی اداکاری خود ان کا پول کھول رہی تھی۔ قانون کا سر شرم سے جھکا ہوا تھا۔ انصاف کی ترازو ٹوٹ گئی تھی۔ مگر دنیا میں وہ سب ہو رہا تھا جو پہلے نہیں ہوتا تھا۔ وہ بڑے بوڑھے پاگل تھے جو ہر ناقابل یقین برائی پر آسمان کی طرف منہ اٹھا کے کہتے تھے کہ یہ کلجگ ہے۔ قرب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر۔

جب خود کو بیوہ کرنے والی اور بھائی کا قاتل لاش کو لے گئے تو بدرو کو ہمارا خیال آیا کہ ہم بہت دیر سے خاموش تماشائی بنے کھڑے ہیں۔

"ہاں بھئی، تم کون ہو؟ کس کو لینے آئے ہو؟"

میں نے کہا "بدرو چاچا...."

وہ چلانے لگا "ایسی کی تیسی تمہارے چاچا کی۔ مت رشتہ جوڑو مجھ سے۔ لعنت بھیجتا ہوں میں تمہارے سارے جھوٹے رشتوں پر۔ میں بدروح ہوں۔ بدکار نہیں۔"

میں نے کہا "بدرو! ہم بھی کسی کو لینے آئے تھے۔"

"کس کو؟ کسے بھیجا تھا تم نے میرے پاس؟" وہ بولا۔

"ہم نے تو نہیں بھیجا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ تم لوگ بڑے بھولے ہو، بڑے معصوم ہو۔ تم نے خود نہیں بھیجا ہوگا، کسی کے ہاتھ بھجوایا ہوگا" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا "بولو کیا نام ہے اس کا؟"

"چندو" میں نے کہا "اس کے کندھے پر زہریلے تیر کا زخم ہے۔"

www.paksociety.com

"اچھا اچھا۔ ادھر آؤ۔ کس نے مارا تھا اسے؟ تم نے یا تم نے؟" وہ میری اور غالب کی طرف دیکھ کے بولا اور پھر ہمیں جواب کا موقع دیے بغیر چل پڑا۔

"ہم نے نہیں مارا تھا وہ تو...."

"ارے چھوڑو۔ بدرو سب جانتا ہے۔ تیر کس کا ہے' ہاتھ کس کا اور نشانہ کس کا؟" اس نے میری بات کاٹ دی "یہ رہا تمہارا چندو۔ مگر.... اس کی پرچی پر نام تو ہے ہی نہیں۔ خیر اپن کو کیا۔ بہت سے مہمان آتے ہیں ایسے جن کا نام پتا نہیں ہوتا۔"

میں نے لاش کے انگوٹھے سے بندھا ہوا کارڈ دیکھا جس پر چندو کے نام کا خانہ خالی تھا۔ صرف ایک نمبر کا اندراج تھا۔

"کہاں ہے چندو؟" میں نے کہا۔

"اور تم کون ہو؟ میرے مہمان کو کیوں لے جانا چاہتے ہو؟ بولو۔ شرماؤ نہیں۔ رشتہ کیا تھا اس سے تمہارا؟"

میں نے کہا "رشتہ تو کوئی نہیں تھا۔ اور اگر تھا تو بس انسانیت کا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی بڑی عجیب تھی۔ پُرآسیب اور ڈراونی۔ "انسانیت! یہ کیا چیز ہوتی ہے؟ کہاں ملتی ہے؟ اس گھر کے باہر؟ چندو کے مہمان خانے میں تو چلتا ہے یہ رشتہ۔ دیکھو' یہاں سب انسان ہیں۔ صرف انسان۔ باہر کوئی ہندو تھا کوئی مسلمان' کوئی برہمن کوئی اچھوت۔ کوئی مال دار کوئی غریب۔ کوئی چاچا ماما اور کوئی باپ بیٹا۔ یہاں سب ایک ہیں۔"

DEATH THE LEVELLER۔ تیری سرکار میں پہنچے تو سب ہی ایک ہوئے۔ بندہ صاحب و محتاج و غنی۔

بدرو نے کہا "ابھی اپنا رشتہ بتاؤ۔ کیا ہو تم اس کے؟ بھائی؟ دوست؟ چوری؟ نام بتاؤ۔ رشتے کا لیبل لگاؤ۔ اجازت نامہ بنواؤ اور لے جاؤ۔ سمجھے کیا" بدرو نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "جاؤ ادھر ہے دفتر۔ باہر۔"

وہ چندو سے مخاطب ہو گیا۔ "او تم۔ آجاتے ہیں پتا نہیں کہاں سے۔ انسانیت کا رشتہ ہے۔ بدرو کو بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔ یار تُو میرا مہمان ہے۔ بالکل فکر مت کر۔ کس کی مجال ہے کہ تجھے زبردستی لے جائے۔ زبردستی یہاں بھیج تو سکتا ہے ہر کوئی لیکن ایسے لے جا نہیں سکتا کوئی سالا۔ تجھے بیچنے کے لئے۔ مجھے پتا ہے ان سب کا۔ یہ چور ہیں۔ میرے گھر میں بھی چوری کرتے ہیں۔"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "بدرو! نہ ہم اس کو بیچنا چاہتے ہیں' نہ ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تم بات تو سن لو ہماری۔"

"بولو' کیا کہتا ہے۔" اس نے ایک لاش کے بکھرے ہوئے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "چندو کا کوئی وارث نہیں ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ پھر ہنسنے لگا "صاف کیوں نہیں کہتا کہ کوئی وارث بننا نہیں چاہتا۔ سب نے رشتہ توڑ لیا ہے اس سے۔"

میں نے کہا "اچھا یہی سمجھ لو۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کی تدفین کا انتظام ہو جائے۔ اس کی لاش کو لاوارث سمجھ کر ٹھیکیدار کے حوالے نہ کیا جائے۔ فروخت نہ کیا جائے۔"

وہ پھر چلانے لگا۔ "تم تو پاگل ہو۔ یہاں کس کی اجازت سے آئے ہو؟ نکل جاؤ۔ میرے مہمانوں کو میرے گھر میں پریشان کرتے ہو۔"

غالب نے مجھے پیچھے سے کھینچا "اس سے بات کرنا بے کار ہے۔"

میں نے کہا "کیوں؟"

"یہ نہیں سمجھے گا ہماری بات۔ اور سمجھ گیا تو کیا کر لے گا؟" غالب بولا "اس کے لئے ڈاکٹر آن ڈیوٹی سے بات کرنا ہو گی۔ اس کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں ہو گا۔"

میں نے کہا "وہ پہلے شناخت مانگے گا۔"

غالب نے کہا "باہر چل کے کسی اور سے بات کرتے ہیں۔"

میں اور غالب شکست خوردہ اور دل گرفتہ خود اپنی نظر میں باہر آ گئے۔ ایک لاش اور آ گئی۔ بدرو نے ایک اور مہمان کا استقبال کر لیا۔ وہ ہماری طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ رات کا وقت تھا اور اس کے مہمان خانے میں اس وقت بھی کئی لوگ آ رہے جا رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ مسئلہ کیسے حل ہو گا۔

اچانک ایک کبڑا سا شخص لاٹھی کے سہارے ٹیک لگاتا ہوا اندر چلا گیا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرا تو میں نے آواز سنی "ایسا ظلم نہ کرنا مجھ پر میرے مولا۔ بازی ہنسی میری ہے۔" اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کی داڑھی تر کر رہے تھے "تو بڑا رحیم و کریم ہے۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔"

غالب نے کہا "یہ مسلمان ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ پتا نہیں اس پر کیا افتاد آن پڑی ہے۔ کیا کر رہا تھا یہ۔ میری سمجھ میں تو آتی نہیں اس کی بات۔"

"بازی مت بھولنا کہ میری ہے" غالب نے کہا "ہو سکتا ہے اس کا بیٹا پہلے یہ خود مرنا چاہتا تھا۔ کسی اور کی جگہ۔"

"اپنی آرزو کر رہا تھا بیچارا۔ ورنہ موت باری باری ہے۔ کون ہو دنیا میں پہلے آیا ہے وہ پہلے جائے گا۔"

غالب نے کہا "ممکن ہے' اپنے بیٹے کے لئے ایسا باپ چاہتا ہے کہ پہلے اسے موت آ جائے۔"

کبڑا بڈھا باہر آیا تو اس کے چہرے پر خوشی اور شکر گزاری کے جذبات سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔ "پروردگار' ہزار بار شکر ہے تیرا۔ کوئی اور تھا وہ۔ تو نے میرے بیٹے کو بخش دیا۔ شکر ہے تیرا میرے مولا۔"

میں نے آگے بڑھ کے پوچھا "چچا میاں! اچھی خبر ملی؟"

وہ چونکے "ہاں.... اللہ کا ہزار شکر ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ نہیں تھا میرا اکبر۔ اللہ اکبر.... اللہ اکبر۔"

میں نے کہا "کیا اکبر کے بارے میں.... خدانخواستہ۔"

"ہاں بیٹا.... پتا نہیں کس نے ایسی منحوس بات کی۔ کون تھا وہ؟ خواہ میرا اور میرے بیٹے اکبر کا بھلا کون دشمن ہو سکتا ہے؟ کوئی بھی تو نہیں۔ پھر کسی نے مذاق کیا ہو گا۔ مگر نہیں۔ ایسا بے ہودہ مذاق بھلا میرے ساتھ کون کرے گا۔ میرا بیٹا قتل ہو گیا ہے اکبر؟"

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بعد خود سے ہم کلام ہو گیا تھا' گویا بے دھیانی تھی۔ وہ بہت خوش تھا کہ مرنے والا اس کا بیٹا نہیں کوئی اور تھا۔

اچانک اس نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا سا بنا کے کہا "تم.... کون ہو؟ اکبر کے دوست۔ میں اس کے سب دوستوں کو جانتا ہوں۔ ضرور کسی کو غلط فہمی ہوئی۔ وہ لڑکا جو اندر لیٹا ہوا ہے' اکبر ہے مگر بتاتے ہیں مگر اکبر نہیں ہے۔ تم بھی دیکھ لو جا کے۔"

میں نے کہا "اچھا میاں! اللہ آپ کے بیٹے کو سلامت رکھے۔ ہمارا آپ سے کوئی تعلق ہے نہ اکبر سے۔ ہم اجنبی ہیں یہاں۔"

"مسلمان ہو۔ الحمد للہ" وہ بولا۔

میں نے سر ہلایا "الحمد للہ۔ اور مسلمان ہونے کے ناتے آپ سے ایک درخواست ہے۔"

"کیا ہے لو۔"

"اللہ نے آپ کے اکبر کو بچا لیا' آپ کی دعا سن لی۔ اس کے صدقے میں آپ ایک مسلمان کی لاش کو کفن دے سکتے ہیں؟"

"کیا؟ کس کی لاش....؟" وہ چونک کر بولا۔

میں نے کہا "ایک لاوارث لاش پڑی ہے اندر۔ اس کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ پرچی پر صرف نمبر ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ اس کا نام چاند خاں تھا۔"

"چندو کہتے تھے سب" غالب نے میری تائید کی۔

"آپ اس کی تجہیز و تکفین کرا دیں۔ اپنی نگرانی میں۔ وہ بھی کسی کا اکبر تھا۔ اب اس کا کوئی وارث نہیں۔ یہاں جو گدھ بیٹھے ہیں اس کی لاش کو لاوارث قرار دے کر بیچنا چاہتے ہیں۔"

"لاش کو بیچنا چاہتے ہیں؟" وہ خوف زدہ ہو کے بے یقینی سے بولا "کفن چور تو سنے تھے۔ یہ لاشوں کے سوداگر کہاں سے آ گئے؟ کون خریدتا ہے ان سے لاشیں؟"

میں نے کہا "جو ضرورت مند ہوتے ہیں۔ چیر پھاڑ کرنے والے میڈیکل کے طالب علم۔ آپ اسے بچا سکتے ہیں۔ اس کو کفن دے کر مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرا دیں۔ اپنے اکبر کی زندگی کا صدقہ سمجھ کے یہ نیکی کما لیں۔ اخراجات ہمارے۔ یہ رہا ایک ہزار۔"

اس نے ایک دم ہاتھ پیچھے کر لیا "لاحول ولا قوۃ۔ رکھو یہ ہزار بیٹے اپنے پاس۔ اکبر کا واسطہ بھی دیتے ہو' نیکی اور صدقے کی بات کرتے ہو اور کفن کے پیسے دیتے ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟ تم خود کیوں نہیں کرتے یہ کام؟"

میں نے کہا "ہم ضرور کرتے لیکن بدقسمتی ہے ہماری کہ ہم اسی وقت جا رہے ہیں واپس دہلی۔ ہم سامنے نہیں آ سکتے۔"

"لاش کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے" غالب بولا۔

وہ سوچ میں پڑ گئے "اب میں کس منہ سے انکار کروں بس میاں' میرے بڑھاپے پر رحم کرو۔ مجھے سچ بتا دو کہ کہیں یہ معاملہ میرے گلے تو نہیں پڑ جائے گا۔ یہ نیکی مہنگی تو نہیں پڑے گی مجھے۔"

میں نے کہا "ہم حلف اٹھا کے کہہ سکتے ہیں کہ آپ پر آنچ نہیں آئے گی۔"

"اللہ مالک ہے" وہ بولے "میں کروں گا یہ کام۔"

"پھر ہم جائیں؟" میں نے کہا "مطمئن ہو کے۔"

"جاؤ میاں جاؤ۔ تم دونوں بھی ہو' جھوٹ بول رہے ہو یا سچ اور چندو یا چاند خاں سے تمہارا کوئی رشتہ تعلق ہے یا نہیں۔ اب وہ میری ذمے داری ہے۔ کسی لاش کو کفن اور دو گز زمین دینا کوئی جرم نہیں ہو سکتا۔ یہ اکبر کی زندگی کا صدقہ ہے تو میں اس نیکی سے ہاتھ نہیں کھینچ سکتا۔" انہوں نے کہا اور واپس ہو گئے۔

"آؤ مرزا' ہم بھی چلیں" میں نے مڑ کے کہا "ہمارا کام ہو گیا۔ اللہ نے ایک فرشتے کو بھیج دیا۔"

"دنیا میں نہیں جن کا کوئی ان کا خدا ہے۔ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔" غالب نے کہا "چندو کیسے جان سکتا تھا کہ اسے مٹی دینے والے ہاتھ کس کے ہوں گے۔ اکبر کے باپ کو غلط اطلاع دینے والا کیسے جان سکتا تھا کہ اس طرح وہ دست قدرت کے حسن انتظام میں شریک ہو رہا ہے۔ اکبر کا باپ کیسے جان سکتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی لاش کو نہیں' کسی اور کے بیٹے کو دفنائے گا۔ اللہ نے اس کی دعا شاید اسی لئے قبول کی تھی۔"

میں نے اس کبڑے بڈھے کو ہال میں داخل ہوتے اور پھر ایک بیزار صورت ڈاکٹر کے ساتھ باہر آتے دیکھا۔ وہ مردہ خانے میں گئے اور دس منٹ بعد چندو کی لاش اسٹریچر پر باہر آئی۔ بدرو اس کے پیچھے تھا۔

"جاؤ بھئی' اپنے مہمان خانے میں تمہارا اتنا ہی قیام تھا۔" بدرو نے چندو کو مخاطب کر کے کہا "لو۔ تمہاری جگہ لینے والا آ گیا۔"

بدرو نے ایک اور مہمان کو وصول کیا اور اسے اندر لے گیا۔ چندو کی لاش ایک ایمبولینس میں رکھی گئی اور ایمبولینس روانہ ہو گئی۔ غالباً بڑے میاں پر کسی نے شک نہیں کیا تھا کہ وہ دھوکے سے کوئی لاش لے جا سکتے ہیں۔ ان سے شناخت مانگے بغیر چندو کی لاش ان کے حوالے کر دی گئی تھی جس کا کوئی دلی وارث ابھی تک نہیں آیا تھا۔ بڑے میاں صورت سے نہ لاشوں کے سوداگر لگتے تھے اور نہ دھوکے باز۔ کوئی شریف آدمی بھلا پرائی لاش کیوں لے جائے گا۔ اسی بھروسے میں ڈاکٹر نے ان کے کہنے کو تسلیم کر لیا تھا۔

www.paksociety.com

انہوں نے چندو کو کیا بتایا تھا؟ اپنا بیٹا، بھانجا، بھتیجا یا کچھ اور۔ اگر انہوں نے جھوٹ بھی بولا تھا تو یہ سچ سے زیادہ ثواب رکھتا تھا۔

میں اور غالب چھپ کے سب کچھ دیکھتے رہے تھے۔ جب ایمبولینس چلی گئی تو ہم آہستہ آہستہ واپسی کے راستے پر چلنے لگے۔ مُردہ خانے کا نظارہ ویسے بھی انتہائی عبرت ناک ہوتا ہے۔ بدروح عرف بدروؤں کی باتوں نے اور اکبر کے باپ کے رویے نے ہمیں زیادہ دکھی اور شرمسار کر دیا تھا۔ آدمی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب۔ موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشان ہونا۔ ہم زندگی کے عناصر میں ترتیب کے باعث اپنے قدموں پہ چل رہے تھے۔ چندو کسی نامعلوم مدفن کی جانب جا رہا تھا۔ مٹی صرف مٹی ہے۔ آدمی کا جسم کس مٹی میں ملتا ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چندو کی روح کا بھی کیا پتا وہ کس مٹی میں ملی۔

میں اپنے ذہن کے پراگندہ خیالوں میں اس درجہ محو تھا کہ جب غالب نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور میں نے کسی گاڑی کے زبردست بریک لگانے کی آواز سنی تو مجھے احساس ہوا کہ میں اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سڑک پار کر رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں حادثے کا شکار ہونے والا تھا۔

کسی نے گالی دے کر کہا "اندھا سالا۔"

غالب نے کہا "بھائی صاحب! آپ بدروؤں کے مسان بننے کا ارادہ رکھتے ہیں کیا؟"

مجھے جھرجھری آ گئی۔ زندگی کیسے ہر قدم پہ سبق دیتی ہے۔ وہ ایک لمحے کی بات تھی جب میں نے موت کو چشم تصور سے دیکھا۔ میں بدروؤں کا مسان تھا۔ میرا جسم اسی طرح پڑا ہوا تھا جیسے چندو کا۔ غالب رو رہا تھا۔ گل اور نازو کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم رات کو انہیں کچھ بتائے بغیر کیوں نکلے تھے اور یہ حادثہ کیسے پیش آیا تھا۔ ایم آر اینس کا خاتمہ۔ اب کوئی اور کرے پرورش گلشن غم۔ محسن کو خبیہ اور بتاؤ رابعہ کو۔ دیوانہ مر گیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزری۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے ایک لمبی سانس لی اور تین بار آیت الکرسی پڑھی۔ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے میرے ذہن میں اس گیت کی آواز گونجتی رہی۔ تیرا شکر ہے ہزار بار شکر ہے میرے معبود۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ میں زندہ ہوں اور زندہ ہونا کتنی بڑی نعمت ہے۔

رات کے تین بجے ہم واپس ہوٹل پہنچے۔ گل اور نازو کے کمرے کی لائٹ آف تھی۔ وہ سو رہی تھیں۔ انہیں کچھ پتا نہیں چلا تھا کہ ہم سونے کے بجائے بدروؤں کے مسان خانے چلے گئے تھے اور تین گھنٹے میں زندگی اور موت کے اس کھیل کے منظر دیکھ آئے تھے جو ہر جگہ ہر لمحہ جاری رہتا ہے مگر ہماری نظر اسے دیکھ نہیں پاتی۔

واپس آ کے میں بہت اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ میرے دل سے خلش آزار ِ سست گئی تھی اور شاید کچھ ایسی ہی کیفیت غالب کی تھی۔ ہم دونوں بے خبر سوئے تو صبح نو بجے دروازے پر دستک کے جاگے۔

میں نے اٹھ کے دروازہ کھولا تو گل اور نازو کو اپنے مقابل دیکھا کہ بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ نہا دھو کے کپڑے بدل چکی تھیں۔ تھوڑے سے میک اپ نے ان کے انداز حسن میں ایک نو حسن آفرینی اور عشوہ گری کا جادو جگا دیا تھا۔ کچھ رنگ پیراہن جلوہ سامانی تھی لیکن ان کے مدوب میں یہ نکھار سکون اور آرام وقت کا نتیجہ بھی تھا۔ دو دن وہ ہر قسم کے ذہنی، جسمانی اور اعصابی دباؤ سے آزاد رہی تھیں اور انہیں گھومنے پھرنے، ہنسنے بولنے کا موقع ملا تھا۔

نازو نے اندر آ کے کہا "ایسی بھی کیا نیند۔"

میں نے کہا "تمہیں کیا معلوم رات ہم کتنی دیر سے سوئے تھے۔"

"ہم سے تو پہلے ہی سو گئے تھے" نازو بولی۔

غالب نے کمبل سے سر نکال کے کہا "تمہیں کیا معلوم"

"معلوم کیوں نہیں۔ ساڑھے بارہ بجے بھی دروازہ بجایا مجال ہے جو کسی کے کان پر جوں بھی رینگی ہو" نازو نے کمبل کھینچ کر دور پھینک دیا۔

"ساڑھے بارہ بجے؟" غالب نے میری طرف دیکھا اور بیٹھا "آخر پریشانی کیا تھی؟"

گل ہنسنے لگی۔ پھر نازو بھی ہنسنے لگی۔ ہم احمقوں کی طرح صورتیں دیکھتے رہے اور منتظر رہے کہ وہ ہمیں کچھ بتائیں۔

"کچھ پتا بھی چلے کہ بات کیا ہے" غالب نے کہا "تاکہ فیصلہ کریں کہ ہنسنا چاہیے یا رونا چاہیے تمہاری عقل پہ۔"

"رات ایک بھوت آیا تھا" گل نے کہا۔

غالب نے قہقہہ مارا "بھوت۔ ارے یار! وہ میرا سر کرے بول گئے تھے تمہارے۔ وہ ادھر پہنچ گیا۔"

نازو نے بگڑ کے کہا "کوئی بھوت وغیرہ نہیں تھا۔"

"تمہیں معلوم ہے بھوت کیسا ہوتا ہے جو مجھ سے کہ رہی ہو؟"

"کیسا ہوتا ہے؟" نازو تنک کر بولی۔

"میں ایک خاتون کو جانتا ہوں لیکن نام نہیں لے سکتا۔ ان کے والد کی شبیہ" غالب نے کہا "وہی ناک نقشہ...."

نازو آگے بڑھی "ابھی بتاتی ہوں ناک نقشہ بگاڑ کے بھوت نظر آؤ گے۔"

میں نے اسے روک لیا "یہ کیا صبح صبح نہ سلام دعا نہ آداب۔ لڑائی سے دن کا آغاز ہوگا تو سارا دن لڑائی میں گا۔ یہ بتاؤ ساڑھے بارہ بجے رات کو کیا ہوا تھا آخر؟"

گل نے کہا "کچھ بھی نہیں سکندر بھائی۔ وہ.... نازو کا کوئی رنگ دیتا تھا۔ جھانک کے دیکھتا تھا اور پھر چھپ جاتا تھا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے وہ ہم تھے؟" غالب نے کہا۔

"نہ.... کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم نے واپس آ کے دیکھا اور نازو نے بہت سے کام لے کر اسے ڈانٹا۔ کہ کون بدتمیز ہے۔ شامت آئی ہے کیا۔ کیا دیکھ رہے ہو چھپ چھپ کے۔ خواتین کے بیڈ روم میں جھانکتے ہو۔ پولیس کے حوالے کروا دوں گی۔ گولی ماروں گی۔ اٹھا کے کھڑکی کے نیچے پھینک دوں گی۔"

ایک بار پھر ان پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ ہنستے ہنستے دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"پھر اس بدمعاش نے کوئی جواب دیا؟" غالب بولا "کون تھا نخرہ؟ اور اتنی لمبی تقریر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایسے لوگوں کو گولی مار دینی چاہیے۔ فوراً۔"

"کوئی ہوتا تو گولی مارتی نا" نازو نے ہنستے ہوئے کہا "وہ تو شاخ تھی کسی درخت کی جو کھڑکی پر جھک آئی تھی اور ہوا سے جھول رہی تھی۔ روشنی اس کے پیچھے تھی جس پہ بار بار اس کا سایہ پڑتا تھا۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان پر ہوٹل سے ہمارے تین گھنٹے غائب رہنے کا راز افشا نہیں ہوا۔

"ہم تو صبح تین بجے تک جاگتے رہے" غالب بولا۔

"کیوں۔ پیٹ میں درد تھا، مروڑ اٹھ رہے تھے؟" نازو نے کہا۔

"آہ یہ مت پوچھو" غالب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کباب سیخ تھے اور کروٹیں ہر سو بدلتے تھے۔ جو جل اٹھتا تھا یہ پہلو وہ پہلو بدلتے تھے۔ کیا شعر ہے؟"

"اچھا ہے۔ جب واپس جا کے کباب کی ریڑھی لگاؤ تو اس پر لکھوا لینا" نازو نے کہا۔

"نادان لڑکی! ہم صحافی ہیں۔ واپس جا کے پھر میدانِ صحافت میں ہم چوکڑیاں بھریں گے۔ ذرا ہم پٹری سے اتر گئے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ صحافت چھوڑ دی۔ وہ تو اپنے خون میں ہے۔ یہ محبت اپنے دل میں ہے" غالب نے یوں کہا کہ نازو کا رنگ لال ہو گیا۔ اس کے لب مسکرانے لگے اور آنکھیں اعتراف سے جھک گئیں۔ غالب نے اس کا نام نہیں لیا تھا مگر نازو نے یہ سنا کہ نازو۔ محبت تم ہو اور تم ہی میرے دل میں ہو۔ دل کی ہر دھڑکن میں ہو۔

ہم غسل سے فارغ ہوئے تو دس بجے تھے۔ میں نے روم سروس سے ناشتا طلب کیا۔ باتوں باتوں میں چندو کا ذکر بھی آیا۔ گل اور نازو اس کے لیے بہت جذباتی ہو رہی تھیں۔ میں اور غالب اس موضوع پر اظہار خیال سے گریز کرتے رہے۔ ہمیں کوئی کام نہیں تھا سوائے کمار کا انتظار کرنے کے۔ کمار نے کہا تھا کہ وہ خود سب کے پاسپورٹ لے کر آئے گا۔ کمار نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کس وقت آئے گا چنانچہ ہم ہوٹل میں اس کا انتظار کرنے پر مجبور تھے۔

دوپہر گزر گئی۔ لنچ کا وقفہ ختم ہو گیا۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ گزرے ہوئے وقت کی اور آنے والے وقت کی۔ حالات بڑی تیزی سے اچانک بدل گئے تھے اور ہماری توقعات کی شکست کا سبب بنے تھے۔ سب کا خیال یہی تھا کہ کمار آیا تو دوپہر کے بعد آئے گا۔ ہوٹل کی طرف سے انگریزی کا ایک اخبار فراہم کیا گیا تھا۔ اس کی تمام خبریں مشرقی پاکستان کے سیاسی انقلاب کے تذکروں سے بھری پڑی تھیں۔ ہمارے لیے ان خبروں میں صرف فرسٹریشن تھی۔

غالب نے غصے میں اخبار ایک طرف پھینک دیا "کل سے میں اخبار کی شکل نہیں دیکھوں گا۔"

میں نے کہا "اس سے کیا ہوگا؟ اخبار بند ہو جائے گا؟"

"میں بے خبر رہنا چاہتا ہوں۔ ریڈیو ٹی وی سے بھی کوئی خبر نہیں سنوں گا" غالب نے کمرے میں چکر لگاتے ہوئے کہا۔

"ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن ہی بند کرا دو" نازو نے کہا۔

"بھاڑ میں جائیں سب۔ نہیں چاہیے مجھے کوئی خبر۔ سکون چاہیے مجھے۔ ذہنی پریشانی کے سوا کیا ملتا ہے خبروں سے۔ خون جلتا ہے میرا اور بلڈ پریشر بڑھتا ہے۔ وہ ان پڑھ مزدور فائدے میں ہے جو سارا دن بوجھ ڈھوتا ہے اور شام کو چار روٹیاں کھا کے بے خبر سو جاتا ہے۔ وہ کسان اچھا ہے جو صرف ہل چلاتا ہے۔ خبر رکھتا ہے تو صرف اپنے بیلوں کی، فصل کی اور موسم کی۔ روس، امریکا، ہندوستان، پاکستان۔ سیاست، معیشت کچھ نہیں جانتا۔ ہمیں بھی کیا ضرورت ہے جاننے کی۔ کیا کر لیں گے ہم اگر حقیقت جان لی تب بھی۔ ہوا کا رخ بدل سکتے ہیں ہم۔"

"میں بدل سکتی ہوں" نازو بولی "یہ دیکھو۔"

اس نے کھڑکی کے ایک پٹ کو تھوڑا سا کھولا۔ ساحل کی طرف سے آنے والی ہوا میرے چہرے سے ٹکرائی۔ اس نے پٹ کو اور کھولا۔ ہوا سے اخبار اڑنے لگا۔

"تم سب کچھ کر سکتی ہو۔ بھوت کی بچی" غالب ہنس پڑا۔

گل نے کہا "کمار کیوں نہیں آیا ابھی تک؟"

میں نے کہا "آ جائے گا۔ چار پاسپورٹ بنوانے تھے۔ آفس شاید چار بجے تک کھلے رہتے ہیں۔"

غالب نے کہا "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کام میں دیر لگ جائے۔ غیر قانونی کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"اتنا پیسہ کس لیے خرچ کر رہے ہیں ہم۔"

"بعض اوقات پیسہ بھی دغا دے جاتا ہے۔ پیسے سے اتنی زیادہ توقعات وابستہ مت کرو" غالب رٹنے کے موڈ میں تھا۔ "ہر آدمی خریدا نہیں جا سکتا۔ کیا پتا کمار کا واسطہ پڑ جائے کسی ایماندار آدمی سے۔ وہ کمار کو اندر کرا دے۔"

گل کا چہرہ اتر گیا "اس کا مطلب ہے...."

www.paksociety.com

میں نے کہا "اس کا کوئی مطلب نہیں۔ کمار شام تک آجائے گا۔ وہ تجربہ رکھتا ہے اور جانتا ہے یہ کام کیسے ہوتے ہیں۔ مرزا! تم اپنی قنوطیت کے جراثیم مت پھیلاؤ۔"

غالب نے کہا "میں قنوطی نہیں، حقیقت پسند ہوں۔ تم سب خواب پرست ہو۔ یہ سمجھتے ہو کہ جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہوگا۔ جب نہیں ہوتا تو روتے ہو۔ ناامیدی میں بڑی برکت ہے۔ ناکامی کا رنج نہیں ہوتا۔ کامیابی کی غیر متوقع خوشی ملتی ہے۔"

"بہتر ہے تم سو جاؤ" نازو نے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔ چینی کہتے ہیں کہ جب تم بیٹھ سکتا ہو تو اسے کھڑا نہیں رہنا چاہئے۔ جب لیٹ سکتا ہو تو بیٹھنا نہیں چاہئے اور سو سکتا ہو تو جاگنا نہیں چاہئے۔"

"پھر بھی چینی فالو نہیں کرتے" میں نے کہا۔

"مگر میں کرتا ہوں۔ کیوں کہ میں چینی نہیں ہوں" غالب نے کہا اور منہ پر کمبل لپیٹ کر لیٹ گیا۔

میرے دل کو عجیب سی بے قراری تھی۔ جی چاہتا تھا کہ ابھی اور اسی وقت ہوٹل سے نکلوں اور اڑ کے ڈھاکا پہنچ جاؤں۔ وہاں سے محسن کو ساتھ لوں اور لاہور۔ مگر بات وہی تھی کہ وصال یار فقط آرزو کی بات نہیں۔ ابھی نہ جانے کتنے مرحلے اور طے کرنے تھے۔ سفر کی اگلی منزل کا فاصلہ بہت کم بھی لگتا تھا اور اس کے باوجود نشان منزل بے یقینی کی دھند میں گم تھا۔

شام تک نہ کمار آیا نہ اس کا کوئی پیغام ملا تو مجھے وحشت ہونے لگی۔ ہم نے بوجوہ جٹواد پر کمار کی تسلی حاصل کی تھی اور وہ ایسا شخص بہرحال نہیں تھا کہ پاسپورٹ کے حصول کو بہانہ بنا کے دن بھر کے لئے غائب ہو جائے۔

مغرب سے کچھ دیر قبل ہم نے چائے پی۔ انتظار کی کوفت نے سب کو چڑچڑا کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم اس ہوٹل میں قید کر دیئے گئے ہیں۔

غالب نے نازو سے کئی بار لڑائی مول لینے کی کوشش کی مگر اس پر اثر نہ ہوا۔ پھر گل رونے لگی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" غالب نے کہا۔

"کچھ نہیں۔"

"تو پھر یہ رونا کس لئے؟ دل چاہ رہا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑکیوں کو رونے کا اتنا شوق کیوں ہوتا ہے۔ بس بہانہ چاہئے۔ ہاں تم ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہو" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "گل! اپنے آنسو پونچھ لو۔ جہاں اتنا صبر کیا ہے وہاں ایک دو دن اور گزر جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ہر روز کوئی نئی بات ہو جاتی ہے" گل نے روتے ہوئے کہا۔ "ایک ایک دو دو کر کے کتنے دن گزر گئے ہیں۔ کسی نہ کسی بہانے... دیر ہوتی جا رہی ہے۔ آخر محسن کب تک انتظار کرے گا؟ آخر کار وہ مایوس ہو جائے گا کہ اس کا پیغام کسی کو نہیں ملا۔ اب کوئی ڈھاکا نہیں آئے گا۔"

میں نے کہا "ایسی مایوسی کی باتوں سے کیا فائدہ ہے گل؟ جانتی ہو کہ ہم سب پوری کوشش کر رہے ہیں۔"

"کوئی کچھ نہیں کر رہا ہے۔ سب [illegible] رہے ہیں۔ محسن اکیلا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ بچے بھی اس کے مارے گئے ہیں۔ اور کسی کا کیا گیا۔ راجہ صاحب [illegible] میں جیتی ہے مزے سے۔ ہم سب ساتھ ہیں اور ہوٹل کے کمرے میں آرام سے بیٹھے ہیں۔ اس پر پتا نہیں کیا بیت رہی ہوگی۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگا۔ کہاں رہتا ہوگا۔ کیا کھاتا ہوگا۔ کیا [illegible] ہوگا۔ کہیں اسے بھارتی فوجیوں نے پکڑ کے جیل میں نہ ڈال دیا ہو۔"

وہ روتی گئی اور بولتی گئی۔ یہ اس کے دل میں جمع ہو جانے والے اندیشوں کا غبار تھا جو اس کے آنسوؤں میں ڈھل گیا تھا۔ اس ذہن پر چھائے ہوئے آزار دینے والے خیالوں کے بادل تھے جو برس پڑے تھے اور اس کی قوت برداشت سے زیادہ لبریز ہونے والا صبر کا پیالہ تھا جو اچانک چھلک گیا تھا۔ میں نے اور غالب نے اسے کسی دلیل سے قائل کرنے کی اور کسی جواب سے مطمئن کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ سب کچھ کہہ دے جو اس نے خود پر جبر کر کے آج تک نہیں کہا تھا اور سارے رکے ہوئے آنسوؤں کو بہہ جانے دے۔ اس کی بہت سی باتیں غلط اور الزام کی طرح تھیں۔ لیکن میں نے اسے ایک جذباتی طور پر لڑکی سمجھتے ہوئے درگزر کیا۔ وہ محسن کو دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی۔ اس وقت بھی جب اسے حاصل کرنے کی تمنا کرنا گویا آسمان سے اس کی چاندنی مانگنے کے مترادف تھا۔ اور آج بھی جب اس کا تصور باقی تھا۔ اسے اپنے دکھوں کا نہیں، محسن کے دکھ کا خیال رلا رہا تھا۔

غالب کے اشارے پر نازو اسے خاموش کرانے لگی اور ہم اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

"جیسے گل کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے، ایسے ہی تمہارا بھی ہو جائے گا" غالب نے کہا۔

"شٹ اپ۔ ایسا کب ہوگا؟" میں نے کہا "مجھے پتا چل جائے تو اپنے بارے میں کچھ بتاؤں۔"

"یہ مذاق نہیں ہے۔"

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ یہ مذاق ہے۔ یہ مسئلہ ہے جس کا علاج کچھ نہیں۔ رونے دو۔ غبار نکل جاتا ہے تو وقتی طور پر سکون ملتا ہے" میں نے کہا۔

"یار تم رکمنی کو فون کرو" غالب نے کہا "اس سے پوچھو راج کمار صاحب کہاں تشریف لے گئے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ رکمنی کو معلوم ہوگا؟ تم کیا سمجھتے ہو وہ فارغ بیٹھا ہوگا وہاں" میں نے کہا "وہ وقت ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ ہو گئی کوئی ایسی مصروفیت...."

"مثلاً یار...." غالب نے میری بات کاٹ دی۔ "یعنی وہ کام چھوڑ کے اس کے ساتھ گھوم رہا ہوگا؟ ناممکن۔"

"پوچھ لینے میں کیا حرج ہے یار" غالب نے فون اٹھا کے میرے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کام تم بھی کر سکتے ہو" میں نے فون واپس کیا۔

"مجھے تو نمبر نہیں معلوم" غالب نے پھر فون مجھے تھما دیا۔

"نمبر میں بتا رہا ہوں" میں نے دوسری بار فون اس کو پکڑایا "مگر تم جو پوچھنا ہے پوچھو۔"

غالب نے میرے بتائے ہوئے نمبر پر ڈائل گھمایا اور کچھ دیر ریسیور کان سے لگائے بیٹھا رہا "کیا مصیبت ہے!" اس نے بڑبڑا کے کہا اور پھر نمبر ملایا۔

"گھنٹی بج رہی ہے۔ ریسیور کوئی نہیں اٹھاتا" غالب نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

"ممکن ہے فون خراب ہو" میں نے کہا۔

"کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں ہے؟ یہ سب یہاں بیٹھ کے سوچتے رہیں گے ہم؟"

"اور ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"ہم خود جا کے معلوم کر سکتے ہیں۔"

"اور ہمارے جانے کے بعد کمار آ گیا تو؟" میں نے کہا۔

"تو گل اور نازو ہیں۔ وہ پاسپورٹ لے لیں گی۔ اسے بٹھا کے چائے پلائیں گی۔ ہمارے آنے تک اس کا دماغ کھائیں گی۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "چلو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں بھی تو تنگ آ گیا ہوں اس قید سے۔"

"ایک بات اور یار چیف۔"

"کیا؟" میں نے کہا۔

"اگر کسی وجہ سے کمار ہمارے لئے پاسپورٹ حاصل کرنے میں ناکام رہا تو ہم کیا کریں گے؟"

"کچھ نہیں۔ ہم ساری عمر کلکتہ کے اسی ہوٹل میں گزار دیں گے" میں نے جھنجھلا کے کہا "یہ نہایت احمقانہ اور فضول سوال کیا ہے آپ نے مرزا جی۔ جواب آپ جانتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا جانا پہنچنا کسی چیز سے مشروط نہیں۔ پاسپورٹ تو سہولت اور تحفظ کے لئے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے ہم جہاں گئے ہیں کیا ویزا لے کر گئے ہیں؟"

غالب نے کہا "یار آئی ایم سوری۔ دراصل گل نے مجھے بھی کچھ نروس کر دیا تھا۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔

"آپ کے لئے ایک پیکٹ ہے سر" کسی نے ہوٹل آفس سے کہا۔

"کیسا پیکٹ؟"

"ہوٹل کوریئر سروس سے ملا ہے۔ کیا میں کمرے میں پہنچا دوں؟"

"ایک منٹ" میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے کہا اور غالب سے مشورہ کیا "ہمارے نام کون پارسل بھیج سکتا ہے؟ کس کو معلوم ہے ہمارا فرضی نام اور پتا۔"

"صرف ایک شخص کو۔ کمار کو" غالب بولا۔

"رائٹ۔ اور وہ پارسل میں بم نہیں بھیج سکتا" میں نے مطمئن ہو کے کہا اور دوبارہ آفس سے بات کی "پیکٹ اوپر پہنچا دیں پلیز۔"

چند منٹ کے بعد ویٹر نے دروازے پر ناک کیا اور پیکٹ مجھے تھما دیا۔ میں نے اسے پانچ روپے ٹپ دی اور دروازہ بند کر کے پیکٹ سب کے بیچ میں رکھ دیا۔

"یہ کمار نے نہیں بھیجا" غالب نے کہا "کوئی چوپٹ لال پوپٹ ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیا نام ہوا۔"

میں نے کہا "کمار اپنا اصلی نام نہیں لکھنا چاہتا تھا۔ اس میں ہمارے پاسپورٹ ہوں گے۔ ان پر بھی فرضی نام ہوں گے۔"

غالب نے کہا "جلدی میں کھول لو اسے۔ کلمۂ شہادت پڑھ کے۔ نازو! میرا کہا سنا معاف کرنا۔ بلکہ وہ بھی معاف کر دو جو میں نے نہ کہا نہ سنا۔"

نازو نے اس سے پیکٹ چھین کر کھول لیا۔ میرا خیال بالکل ٹھیک ثابت ہوا۔ اس کے اندر سے آج کی تاریخ میں جاری ہونے والے چار پاسپورٹ برآمد ہوئے۔ ہم سب نے اپنی اپنی تصویریں دیکھیں اور اپنے نام دیکھے۔ کمار نے سارا کام بڑی ہوشیاری سے کیا تھا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ خود نہیں آیا تھا۔ اس نے کوئی وجہ بھی بیان نہیں کی تھی کہ اسے کوریئر سروس استعمال کرنے کی کیا مجبوری لاحق تھی۔ اگر وہ چاہتا تو ایک پرچے پر مختصراً یہ مجبوری بیان کر سکتا تھا۔

غالب نے نازو کی طرف دیکھ کے کہا "بیگم مبارک ہو۔"

"شکریہ" نازو نے جھینپ کے کہا۔

"اب یہ ایک دستاویزی ثبوت ہے۔ اسے کون جھٹلا سکتا ہے۔ میں اور تم مسٹر اور مسز راجن۔ گویا تم رکمنی۔"

میں نے مسکرا کے کہا "اور ہم ہو گئے مسٹر اور مسز راج کمار۔ پتا وہی جو ڈاکٹر رکمنی کے ہسپتال کا ہے۔"

"آخر کمار نے ایسا کیوں کیا؟ نام بہت تھے۔ پتا کچھ بھی ہو سکتا تھا" غالب بولا۔

"میرا خیال ہے اس نے عقلمندی کی۔ اگر کبھی کہیں بھی تصدیق کی ضرورت پڑی تو تصدیق ہو جائے گی۔ اور خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو ان پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ نہ راجن اور رکمنی

www.paksociety.com

پڑنہ کمار اور پاہار ہے۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی نے ان کا نام چرا استعمال کر کے کسی ایجنٹ سے پاسپورٹ بنوائے تو اس میں ان کا کیا قصور؟ تصویریں تو ان کی نہیں ہیں" میں نے کہا۔

"مجھے کمار کے نہ آنے سے تشویش لاحق ہو رہی ہے۔ کیا وجہ ہو سکتی ہے اس کے نہ آنے کی؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "ہم چل کے معلوم کر آتے ہیں۔ ہم دونوں"

نازو نے احتجاج کیا "پھر چھوڑ کے جا رہے ہو ہمیں۔"

"پھر؟ پھر کا کیا مطلب؟" غالب بولا۔

"رات بھی نکل گئے تھے کہیں۔"

میرا اور غالب کا ردعمل یکساں تھا "رات کو۔"

وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائی "اب تم نے انکار کرنا بھی چھوڑ دیا ہے ہم پہ۔ میں تو دیکھ رہی تھی کہ اب تک نہیں بتاتے تم۔"

غالب نے سر کھجا کے کہا "عزیزہ! کیا خیال ہے تم کچھ غلط فہمی کا شکار نہیں ہو؟"

"میرے عزیز! غلط فہمی تمہیں ہے کچھ میرے بارے میں کہ میں بے وقوف ہوں۔"

"واللہ۔ اس میں کیسی غلط فہمی۔ آپ جدی پشتی خاندانی بے وقوف" غالب نے ہاتھ ہلا کے کہا۔

گل نے حیرانی سے کہا "رات کی کیا بات ہے؟"

نازو نے کہا "یہ دونوں چپکے سے نکل لئے تھے کہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم تو سو گئے۔ ہمیں کیا معلوم ہو گا۔ صبح سے پہلے واپس لوٹ آئیں گے۔ پوچھو ذرا ان سے۔"

"اچھا۔ ابھی سے یہ حرکتیں۔" گل ہنسنے لگی۔

غالب نے سر ہلایا "اس میں کوئی شک نہیں کہ عام طور پر شادی کے دو چار سال بعد شوہر ایسا کرتے ہیں۔ اور بیویاں اسی طرح ان کی چوری پکڑ لیتی ہیں تو ایسے ہی احمق بھی ہیں مگر ہم کیوں ڈریں۔ گئے تھے تو گئے تھے ڈنکے کی چوٹ پر گئے تھے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"جب ہم نے دروازہ بجایا اور تم لوگ اٹھے نہیں تو مجھے شک ہو گیا تھا" نازو بولی "تمہاری نیند ایسی نہیں ہو سکتی۔ غالب سو سکتا ہے گدھے بیچ کے۔"

"اتنا بے عزت تو مت کرو سب کے سامنے۔ محاورے کی مار تو مت مارو" غالب نے کہا۔

"مجھے بھی نہیں بتایا تھا آپ نے۔"

"تم کو بتانے سے کیا ہوتا۔ اس وقت تم ویسے ہی ڈری ہوئی تھیں" نازو بولی "تمہاری آنکھ لگی تو میں نیچے گئی اور کاؤنٹر سے معلوم کیا تو پتا چل گیا۔ چابیاں وہاں موجود تھیں۔ یہ لوگ کمرا لاک کر کے گئے تھے۔ اندر سے بند کر کے نہیں سو رہے تھے۔"

"اب تو بتا دیں کہاں گئے تھے؟" گل نے کہا۔

غالب ڈھیٹ بن گیا "بتا دیں گے جلدی کیا ہے۔ ذرا سوچ لیں کوئی اچھا سا بہانہ۔ اسٹوری ایسی ہو تو ہو کہ چل جائے۔"

میں نے بھی کہا "ہاں واپس آ کے بتائیں گے۔"

"میری واپسی تک میرے سوا کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔ اور مجھے اپنے چھوڑ کے مت جانا جیسے میں چلا گیا تھا۔ اس ہوٹل سے نہ اس جہان سے۔ بس میرے نام کی مالا جپتی رہنا۔"

میں نے اسے کھینچ لیا ورنہ اس کی بکواس جاری رہتی۔ باہر اندھیرا پھیل گیا تھا اور اسٹریٹ لائٹس روشن ہو گئی تھیں۔ مین گیٹ سے باہر رکشا ٹیکسی والے اور اونچے ہوٹلوں میں دھندا کرنے والی طوائفوں کے ایجنٹ کسی گاہک کے منتظر تھے۔ ان سب نے ہم پر یلغار کی۔ "سر! ایک نمبر ٹیکسی۔ ایک دم ٹیم کا مال۔ جوان چھوکری صاحب۔ گولڈن ٹیپل ایئرکنڈیشنڈ۔ جسٹ فائیو ہنڈرڈ روپے۔ آپ کا دل خوش ہو جائے گا صاحب۔ فور ہنڈرڈ۔ نیپالی، پنجابی....."

"نہیں چاہئے" میں نے مشتعل ہو کے کہا "بھاگ جاؤ۔ دفع ہو جاؤ سب۔"

مگر وہ بے غیرت اور بے شرم لوگ تھے۔ انہوں نے ہمارا تعاقب جاری رکھا اور مختلف رنگ روپ، عمر اور قومیت کی الگ الگ قیمت بڑی فحش تفصیلات کے ساتھ بتاتے رہے اور کوشش کرتے رہے کہ ہماری قوت خرید کا اندازہ کرتے ہوئے ہمیں کسی طرح شکار کر لیں۔

ایک ٹیکسی میں بیٹھ کے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"یہ بڑی مصیبت ہے یہاں۔ معلوم ہوتا ہے سب سے بڑا بزنس یہی ہے" غالب بولا۔

"مجھے بھی تعجب ہوتا ہے۔ لگتا ہے اس شہر میں کوئی شریف عورت نہیں رہتی۔ کتنی بے غیرتی کے ساتھ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں کہ میری بیوی ہے۔ میری بہن ہے۔ اس بچے کو دیکھا"

ٹیکسی ڈرائیور نے سر گھما کے مجھے دیکھا اور ہنسا "تو سر سب جھوٹ نہیں بولتے۔"

میں دم بخود رہ گیا "کیا مطلب؟ وہ واقعی ان کی بیویاں ہوتی ہیں؟"

"ہیں سر..... یہ لوگ شریف ہی سمجھے جاتے ہیں، جہاں رہتے ہیں۔ سفید پوش بھی ہیں مگر کیا کریں؟ حالات سے تنگ ہیں۔ مہنگائی اتنی ہے کہ گزارا نہیں ہوتا۔ بے روزگاری اتنی ہے کہ مرد کو مزدوری تک نہیں ملتی۔ کبھی ملتی ہے دو چار دن۔ ہفتہ بھر ایسے گزر جاتا ہے۔ پکی نوکری والے بھی مجبور ہیں۔ کرایہ بہت ہے تنخواہ کم ہے۔ بچے زیادہ ہیں۔ ماں باپ یا بہن بھائی کا بوجھ ہے۔"

"ماں باپ بوجھ ہوتے ہیں؟"

"ہیں سر۔ پیسہ بوجھ اٹھاتا ہے، آدمی نہیں۔ اگر کمانے بہت ہو تو رشتے چلتے ہیں۔ ایک روٹی کی طرف چار یا آٹھ ہاتھ بڑھتے ہیں تو کوئی رشتوں کو یاد نہیں رکھتا۔ بھوک بڑی ظالم چیز ہے۔ میں نے سنا ہے کہ بنگال میں قحط پڑا تھا تو ایک مٹھی چاول میں عورت ملتی تھی۔ ماں اپنا بچہ تک بیچ دیتی تھی۔ ابھی ویسے حالات تو نہیں مگر زندہ رہنے کی مجبوریاں بڑھ گئی ہیں۔"

میں نے کہا "تم پڑھے لکھے آدمی ہو؟"

"میں اسکول ٹیچر ہوں۔ دن میں پڑھاتا ہوں، رات کو یہ ٹیکسی کرائے پر چلاتا ہوں اس لئے میری بیوی گھر میں رہتی ہے۔ ہفتے کے سات دن، بچے عزت اور غیرت کے ساتھ سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ بیوی کو گھر سے لے جاتے ہیں۔ سب نہیں، کچھ۔ بہت تھوڑے۔ مگر ایسے لوگ ہیں۔ بعد میں دو چار بار بھی وہ لے آئیں تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ صبح چار پیسے لائے گی۔ کلرک کی ایک مہینے کی تنخواہ بیوی کی ایک رات کی کمائی کے برابر ہو تو پھر بھی ہو گا سر۔ امارت اور غربت ساتھ ساتھ ہوں گے تو شرافت کیسے نہیں بکے گی۔"

"تمہاری باتوں نے تو مجھے دہلا دیا ہے۔"

وہ مسکرایا "معلوم ہوتا ہے آپ بڑے شہروں میں نہیں رہے۔"

"میں لندن، پیرس اور بہت سے شہروں میں رہا ہوں۔"

"ادھر نہیں سر! ادھر۔ سنگاپور، ہانگ کانگ، بنکاک، کلکتہ گیا۔ سب جگہ ایک دنیا یہ بھی ہے۔ وہ جو بچہ تھا، اس کو میں جانتا ہوں۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔"

"کیا؟ یعنی خود ماں نے بھیجا تھا اسے؟"

"جی سر۔ ماں اچھی ہے ابھی۔ خوب صورت بھی ہے۔ شوہر کارخانے میں تھا۔ لائن پار کر کے فیکٹری جاتا تھا۔ ایک دن تاروں میں پاؤں الجھ گیا۔ کانٹا بدلنے والے لوہے کے تار جو پٹری کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں نا ان میں۔ ادھر سے انجن آ رہا تھا۔ شنٹنگ کرتا ہوا۔ دونوں پاؤں کٹ گئے۔ بچ گیا مگر معذور ہو گیا۔ ابھی وہ ہوٹل کے سامنے بھیک مانگتا ہے۔ وہ بیٹا ہے اس کا جو باپ کو ریڑھی میں ڈال کے ادھر لاتا ہے۔ دن بھر اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اخبار بیچتا ہے اور پڑھتا بھی ہے۔ رات کو ادھر....."

میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا تھا۔ مجھے واقعی معلوم نہ تھا کہ ان شہروں میں غربت نے انسانوں کو اس حد تک غریب کر دیا ہے کہ وہ اپنی عزت خود بیچتے ہوئے نہیں شرماتے۔ اسٹریٹ گرل اور کال گرل سے لندن بھی بھرا پڑا ہے۔ دنیا کا کوئی شہر اس لعنت سے محروم نہیں مگر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ لاہور یا کراچی میں شرافت اور انسانیت کی یہ تذلیل ناقابل تصور ہے۔ وہاں لوگ بہت خوش حال سمجھے جا سکتے ہیں کہ انہیں اپنی غیرت پر جان دینا بھی آتا ہے اور جان لینا بھی۔ اور وہاں عورت اتنی رسوا نہیں ہے کہ رشتوں کی آبرو نہ رہے۔ وہاں ہر ماں، ہر بیٹی اور ہر بیوی عزت کے اثاثے پر فخر کرتی ہے اور خواہ نوبت فاقہ کشی کی آ جائے مگر یہ اثاثہ محفوظ رہتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں طوائف کا لفظ ایک گالی ہے۔ خون ریزی اور قتل کے تین بنیادی اسباب زر، زمین اور زن شمار کئے جاتے ہیں مگر زر اور زمین بنیادی طور پر ایک ہی سبب بنتے ہیں اور اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ سب سے زیادہ قتل کے اسباب ہمارے عزت و عصمت کے تصورات اور غیرت و حمیت کے جذبات فراہم کرتے ہیں۔ ایک مادر پدر آزاد معاشرے میں عورت وجہ نزاع نہیں بنتی کیوں کہ وہ کسی رشتے کے حوالے سے محترم و معتبر نہیں۔ بلکہ صرف جنس بازار ہے۔

ہسپتال آ گیا تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دے کر رخصت کیا۔ بیرونی احاطے کا گیٹ کھلا ہوا تھا لیکن اندر کی لائٹس بھی آف نظر آ رہی تھیں۔ میں قریب جا کے کال بیل تلاش کر رہا تھا کہ غالب نے مجھے ایک نوٹس کی طرف متوجہ کیا جو کاغذ پر موٹے مارکر سے لکھ کر دروازے پر چپکا دیا گیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "ہندی میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ یا شاید بنگالی میں ہے۔"

اسی وقت کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں چونک کر پلٹا تو مجھے ایک وردی والا پولیس مین نظر آیا۔

"کیا کر رہے ہو تم لوگ؟" اس نے مجھے اور غالب کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ ہم ڈاکٹر رکمنی سے ملنے آئے تھے۔"

"اچھا!" اس کے لبوں پر طنز آمیز معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "ڈاکٹر رکمنی سے ملنے آئے تھے۔"

"ہاں۔ ہم ان کے مریض ہیں۔ انہی سے علاج کراتے ہیں۔"

غالب نے کہا "اپنی بیویوں کا۔"

پولیس مین کی نظر ہم پر جم گئی "نظر تو پڑھے لکھے آتے ہو شکل سے۔"

"ہم واقعی پڑھے لکھے ہیں" میں نے کہا۔

"کیا کرتے ہو، کہاں رہتے ہو؟ نام پتا بتاؤ اپنا" اس نے خالص پولیس والوں کے تفتیشی لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "معاملہ کیا ہے؟ یہ سب کیوں پوچھا جا رہا ہے ہم سے؟"

"یہاں بتاؤ گے یا تھانے جا کے؟" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں یہاں اسی لئے بیٹھا ہوں کہ جو مشکوک نظر آئے اس سے پوچھ گچھ کروں۔ اور ضروری ہو تو تھانے لے جاؤں۔"

میں غصے کو پی گیا "ہم کیوں اور کیسے مشکوک نظر آتے ہیں؟ کون سی غلط حرکت کی ہے ہم نے؟"

"تم اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔"

"یہ غلط ہے۔ ہم ڈاکٹر رکمنی سے ملنا چاہتے تھے۔ دروازہ بند تھا اس لئے میں کال بیل تلاش کر رہا تھا۔ تم یہ الزام....."

www.paksociety.com

پولیس مین نے میرے منہ پر اچانک تھپڑ مار دیا۔ میرا ایک گال دہک اٹھا لیکن میں نے اس ذلت کو صرف اس لئے برداشت کیا کہ میں معاملے کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

"الزام کے بچے۔ تو اس کے بجا آ ہے....." پولیس مین نے مجھے گالی دے کر کہا "ہر چوک میں جانے سے کا تو رکنی سے۔ مجھے بے وقوف بناتا ہے..... کوئی مانے گا تیری بات کہ یہ تو نے نہیں دیکھا تھا۔"

"یہ۔" میں نے نوٹس کی طرف دیکھا "یہ کیا ہے؟ مجھے بنگالی نہیں آتی۔"

اس نے میرے دوسرا تھپڑ رسید کرنے کی کوشش کی "یہ ہندی ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "مجھے ہندی بھی نہیں آتی لیکن ایک اور بھاشا آتی ہے جو تم آسانی سے سمجھ سکو گے۔ میں نے رمدی کی وجہ سے تمہیں کچھ نہیں کہا تھا لیکن اب میں تمہاری زبان میں بات کروں گا۔"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی بے سود کوشش کی۔ میرے تیور اور میری گرفت دیکھ کے اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ طاقت کی زبان میں وہ میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

"ہاتھ چھوڑو میرا ورنہ....."

"ورنہ کیا؟" میں نے اسے ایک جھٹکا دیا "تھانے لے جائے گا؟ چل تھانے تیری تو....." وہ جھٹکے سے آگے آیا تو میں نے گھٹنا اوپر اٹھایا اور راستے اوپر سے گزار کے پھر قدموں میں کھڑا کر دیا۔ زمین کو قدموں کے نیچے سے نکلتے اور آسمان کو اوپر سے گزرتا دیکھنے کے بعد وہ کچھ دیر ہکا بکا کھڑا رہا۔

میں نے کہا "پولیس والے ہر جگہ دو زبانیں بولتے ہیں۔ ابھی تم نے مجھ سے اپنی مادری زبان میں بات کی تھی۔ اب میں تمہاری ہی فادری زبان میں بات کرتا ہوں۔ یہ لو" میں نے اس کے ہاتھ میں سو کا ایک نوٹ تھما دیا۔

"اگر تم نے پیسے کی زبان نہ سمجھی تو پھر ہم طاقت کی زبان میں بات کریں گے" غالب نے کہا۔

پولیس مین نے بے یقینی سے سو کے نوٹ کو دیکھا۔ کچھ دیر تذبذب کا شکار رہا۔ غصے سے ہونٹ کاٹتا رہا اور شاید یہ سوچتا رہا کہ اسے دھمکی سے ڈرے بغیر ایک فرض شناس پولیس مین کا رول ادا کرنا چاہئے یا مصلحت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے سو کے نوٹ کو پرامن سمجھوتے کی دستاویز کے طور پر قبول کر لینا چاہئے۔ جذبات پر عقل نے فتح پائی اور اس نے نوٹ جیب میں ڈال کے ایک گہری سانس لی۔

"کیا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ بس یہ پڑھ کے سنا دو۔ اس میں کیا لکھا ہے؟"

وہ حیران ہوا۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ جو اس کی مادری اور فادری زبان پر اتنا عبور رکھتے ہیں وہ اتنا معمولی مطالبہ پیش کریں گے۔

اس نے کہا "ڈاکٹر رکنی کے سورگباش ہونے سے کل سے ہسپتال بند رہے گا۔"

"کیا ہوا ہے ڈاکٹر رکنی کو؟ کل تک وہ ٹھیک تھیں۔"

پولیس مین نے کہا "ان کی ہتیا ہو گئی ہے۔ مرڈر۔"

"مرڈر!" غالب نے یوں کہا کہ پولیس مین بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "کیسے..... کب..... کس نے کیا ہے ان کا مرڈر؟"

"اگر تمہیں معلوم ہو جائے تو پولیس کو بتا دینا۔ بڑی مہربانی ہوگی" وہ بولا "قتل کرنے والے کا نام پتا سب لکھوا دو اور [illegible] کر کارن کیا تھا۔"

میں نے کہا "اگر تم نے ساری بات نہ بتائی تو مجھے پھر تمہاری مادری یا فادری زبان استعمال کرنی پڑے گی۔"

"مجھے فادری زبان پسند ہے" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

میں نے اسے دوسرا نوٹ دیا "اس سے زیادہ نہیں بول کر میں فادری زبان۔ تم مجبور کرو گے تو مادری زبان میں بات کروں گا۔"

وہ نوجوان جوشیلا اور احمق نظر آتا تھا مگر خاصا ذہین اور معاملہ فہم ثابت ہوا "آج صبح یہاں کچھ لوگ آئے تھے۔ ہسپتال میں کام کرنے والی ایک نرس، ایک مڈوائف اور ایک جمعدارن نے بتایا کہ صبح نو بجے ہسپتال کھلا تو وہ پہلے سے باہر موجود تھے۔ عجیب قسم کے لوگ تھے اور مضافات کے دیہات کی زبان بولتے تھے جو کہ قبیلے کی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ نرس اندر مصروف تھی۔ جمعدارن جھاڑ پونچھ کر رہی تھی اور مڈوائف ڈاکٹر رکنی کے پاس تھی۔ انہوں نے کسی مریض کے بارے میں پوچھا۔"

"کس مریض کے بارے میں؟"

"انہوں نے نام نہیں بتایا۔ صرف یہ کہا کہ کیا یہاں کوئی شخص زخمی حالت میں لایا گیا تھا جس کے جسم پر کوئی زہریلے تیر کا زخم ہو؟"

"زہریلے تیر کا؟" میں چونکا۔

"اس میں چونکنے کی کیا بات ہے؟" وہ بولا۔

"چونکنے کی بات تو ہے۔ یہاں لوگ خنجر یا گولی کے زخم کھایا کرتے ہیں۔ تیر کون چلاتا ہے؟" میں نے کہا۔

"پھر انہوں نے براہ راست یہی سوال کیا تھا۔ ڈاکٹر رکنی نے کہا کہ ہاں۔ ایک زخمی آیا تو تھا۔ تمہارا کیا تعلق ہے اس سے اور تم یہ بات کیسے جانتے ہو کہ زخم کسی زہریلے تیر کا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر رکنی کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور کہا کہ اب وہ کہاں ہے اور وہ لوگ کہاں ہیں جو اسے لائے تھے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ زخمی تو مر گیا اور جو اسے لائے تھے وہ معلوم نہیں کہ

گئے۔ انہوں نے زخمی کے بارے میں مزید سوالات کئے۔ ڈاکٹر رکنی نے پولیس کو بلانے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ تمہارے سوالوں کا جواب پولیس دے گی اچھی طرح۔ بس اس کے بعد انہوں نے رکنی کو مارا۔ نرس کو بھی مارا اور سب کو باتھ روم میں بند کر دیا۔ کپڑے اتار کر۔"

"کپڑے اتار کر!"

"ہاں۔ تاکہ وہ شور نہ کریں اور بعد میں سیدھی باہر جا کے دنیا کو نہ بتائیں" پولیس مین بولا "فون انہوں نے زمین پر مار کے توڑ دیا تھا۔ باتھ روم میں باہر کنڈی نہیں تھی ورنہ وہ کنڈی لگا جاتے۔ ان کے کپڑے اتار گئے تھے۔ ظاہر ہے بعد میں انہیں کچھ [illegible]"

"عجیب بے وقوف لوگ تھے۔ ہسپتال کو باہر سے کیوں نہیں لاک کر گئے" میں نے کہا۔

"باہر جانے کے دو دروازے ہیں۔ وہ کسی کھڑکی سے بھی نکل سکتی تھیں" پولیس مین بولا۔

"کیا اتنی دیر میں کوئی مریض یا ملاقاتی نہیں آیا؟"

"آیا ہوگا۔ مگر انہوں نے باہر یہ نوٹس لگا دیا تھا۔ یہ انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے" اس نے دروازے پر چسپاں کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"یوں کہ اور کسی نے یہ نوٹس نہیں لکھا۔ نہ ہسپتال کے عملے نے اور نہ رکنی دیوی کے کسی جاننے والے نے۔ پولیس نے سب سے پوچھ لیا ہے۔ اگر کسی نے لکھا ہوتا تو مان لیتا۔ اس میں جرم کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کسی کی ہینڈ رائٹنگ نہیں۔ مارکر ہسپتال کا ہے اور کاغذ بھی۔ انہوں نے یہ نوٹس یہاں آنے کے بعد لکھا اور ہرا لگایا۔"

میں نے کہا "گویا وہ پہلے سے طے کر کے آئے تھے۔ انہیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا مطلوبہ آدمی اس ہسپتال میں ہے؟"

"ہاں۔ مگر زخمی سے زیادہ وہ ان لوگوں کے متعلق جاننا چاہتے تھے جو اسے لائے تھے" پولیس مین بولا۔

"تم تو تفتیش کے سارے نتائج سے باخبر ہو۔ ہر بات معلوم ہے تمہیں" میں نے کہا۔

"ساری تفتیش میں خود کر رہا ہوں" وہ دانت نکال کے بولا۔ "اور اس وقت بھی تفتیش ہی کر رہا ہوں۔ گپ شپ نہیں کر رہا تمہارے ساتھ۔ میں ڈیوٹی پر ہوں۔"

"یعنی تم ہمارے بارے میں بھی رپورٹ دو گے؟"

"ہاں۔ تفصیل سے" وہ بولا "تمہارا حلیہ اور تم سے ہونے والی گفتگو میری رپورٹ میں شامل ہوگی۔"

"اپنی رپورٹ میں وہ سو روپے بھی نتھی کرو گے؟"

"کیوں نہیں۔ ان پر تمہارے فنگر پرنٹ ہیں۔ ویسے بھی وہ رشوت تھی۔ ظاہر ہے رشوت کوئی بلاوجہ نہیں دیتا۔ صبح سے اب تک نہ جانے کتنے لوگ آ چکے ہیں اور مجھ سے پوچھ چکے ہیں کہ ڈاکٹر رکنی کو کس نے قتل کر دیا اور کیوں۔ کسی نے مجھ سے مادری یا فادری زبان میں بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

میں نے کہا "گویا تمہاری نظر میں ہماری حیثیت مشکوک ہے؟"

"سخت مشکوک ہے" وہ بولا۔

"اچھا یہ بات ہے تو پھر باقی اسٹوری بھی سنا دو تاکہ ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"اور کیا رہ گیا ہے بتانے کو۔ تمہیں سب معلوم ہے" وہ بولا۔ "وہ تمہارے بارے میں ہی پوچھ رہے تھے۔"

میں اور غالب اس انکشاف پر شدید ردعمل کا اظہار نہ کرتے یہ کیسے ممکن تھا۔ مگر اس نے اچانک ریوالور نکال لیا۔

میں نے کہا "کیوں۔ تمہارا دماغ خراب ہے؟"

"نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس زخمی کو تم لوگ لائے تھے اور تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔ تمہارا حلیہ بالکل وہی ہے جو قاتلوں نے ڈاکٹر رکنی کو بتایا تھا۔ نرس اور مڈوائف دونوں نے سنا تھا اور ان کے بیان میں شامل ہے۔ تمہارے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں" پولیس مین بولا "آہ ڈاکٹر رکنی نے اس کا اعتراف نہیں کیا مرتے دم تک۔ انہوں نے اسے بہت اذیت دی۔ باتھ روم میں بند عورتوں نے اس کی چیخوں کو سنا تھا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی کہ مجھے نہیں معلوم۔ میں کسی کو نہیں جانتی۔ وہ زخمی کو چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ جھوٹ تھا۔ وہ تمہیں بچانے کی کوشش میں ماری گئی۔ پہلے میں نے تمہیں عام آدمی سمجھا تھا۔ تم تو خاص آدمی ہو۔"

ہم بری طرح پھنس گئے تھے۔ وہ بے وقوف نظر آنے والا پولیس مین جس نے مزاحمت کے بغیر رشوت بھی قبول کر لی تھی اور یہ ظاہر کرتا رہا تھا کہ وہ ہم سے تعاون کر رہا ہے۔ بے حد چالاک اور نڈر ثابت ہوا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں تفتیش مکمل کر لی تھی اور ہمیں سب بتا کے ہم سے سب پوچھ لیا تھا۔

"اب تم ہمیں گرفتار کرو گے؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا "صرف تم ہی وہ سب کچھ بتا سکتے ہو جو ڈاکٹر رکنی نے نہیں بتایا تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ زخمی کون تھا اور اب کہاں ہے۔"

"ڈاکٹر رکنی نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ مر چکا ہے اور اس کی لاش بھی کوئی لے گیا ہے۔ تم کرزن ہسپتال سے معلوم کر لو۔"

"وہ میں معلوم کر لوں گا" وہ بولا "ایک بات اور بتا دو۔ وہ لوگ سونے کا ذکر کر رہے تھے۔ نرس نے بھی سنا۔ وہ بار بار پوچھتے تھے کہ سونا کہاں ہے؟"

"کچھ۔ ڈاکٹر رکنی نے کیا بتایا؟"

www.paksociety.com

"دیکھو نہیں۔ وہ کھتی رہی کیسا سونا۔"
"سونے کے بارے میں تو میں بھی نہیں معلوم۔"
"یعنی باقی باتوں کا علم ہے تمہیں؟" وہ خوش ہوتے ہوئے بولا "کیا تم ایک اور بات جانتے ہو؟"
"وہ کیا بات ہے؟"
"یہ کہ میں عام پولیس مین کی وردی میں اے ایس پی ہوں۔ اور مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم لوگ آؤ گے" وہ بولا "میں دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جن کی خاطر ڈاکٹر رکنی نے جان دے دی مگر ان کا پتا ٹھکانا نہیں بتایا۔"
"تم واقعی بہت ہوشیار شکاری ہو" میں نے کہا "تم نے خود کو ایک عام، بے وقوف، بزدل اور لالچی پولیس مین ظاہر کیا حالاں کہ تم ایک ذہین اور فطین افسر ہو۔"
"یہ معاملہ ہی اتنا پُراسرار اور عجیب تھا۔"
"بالکل ٹھیک۔ اور غالباً تم معاملے کی تہ تک پہنچ گئے ہو؟"
"ہاں" اس نے کہا "کسی حد تک۔ اس واردات کے پیچھے سونا ہے۔"
"زر، زمین، زن" میں نے سر ہلایا "رکنی جیسی حسین عورت سونے کے چکر میں ماری گئی۔ یہی بات ہے نا؟"
"یہ سونا کس کا تھا؟ وہ بولا "اور کتنا تھا، کہاں سے آیا تھا؟"
میں نے غالب کی طرف دیکھا "سونا کہاں سے آتا ہے؟"
غالب نے کہا "سونا کان سے نکلتا ہے۔ میرے کانوں کی طرف مت دیکھو۔ میں اس کان کی بات کر رہا ہوں......"
"مجھے معلوم ہے۔ تمہارے کان سے صرف میل نکلتا ہے مگر جیسے ہاتھ کا میل ہوتا ہے تو کیا سونا کان کا میل نہیں سمجھا جا سکتا؟" میں نے کہا۔
"شٹ اپ۔ بہت سن لی تمہاری بکواس میں نے" وہ ریوالور ہلا کے بولا "اب پولیس اسٹیشن چل کے بولنا۔"
میں نے کہا "تمہارا ایک اندازہ غلط ہو گیا اے ایس پی صاحب۔"
"وہ کیا؟"
"تم نے یہ کیسے فرض کر لیا تھا کہ ہم تمہارے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہنسی خوشی تھانے چلے جائیں گے؟"
"تمہارا تو باپ بھی جائے گا" وہ بولا۔ "میں تمہیں تک گنوں گا۔"
"کیوں۔ دس تک کیوں نہیں؟" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا اور ایک قدم آگے بڑھا۔
وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ "خبردار! اب تم نے ایک قدم بھی بڑھایا تو میں گولی مار دوں گا۔"
صورت حال یکلخت سنگین ہو گئی تھی۔ اے ایس پی پہلے ہی اندازہ کر چکا تھا کہ میں جوڈو کراٹے کے داؤ پیچ جانتا ہوں اور وہ مجھے قریب آنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ ہسپتال کے احاطے میں مجھے پولیس کی کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں وہ اکیلا ہے مگر وہ مسلح تھا اور اس کے تیور بتاتے تھے کہ وہ گولی چلا دے گا۔ جیسے وہ پہلے ہمیں عام آدمی سمجھا تھا ویسے ہی ہم اسے عام پولیس مین سمجھے تھے۔ پھر وہ سنبھل گیا تھا مگر میں نے اپنی کمزوری کو غلط وقت پر استعمال کر کے اپنی کمزوری بنا لیا تھا۔
اس نے ریوالور اٹھا کے کہا "اوکے۔۔۔۔۔۔"
میں نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے "اوکے۔ ہم چلتے ہیں۔"
"اسی طرح گھوم جاؤ اور چلنا شروع کر دو۔ میں بالکل تمہارے پیچھے ہوں۔ اگر کوئی غلط حرکت کی تم نے تو کھوپڑی اڑا دی جائے گی" وہ بولا "میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔"
"اس طرح کہاں تک لے جاؤ گے تم ہمیں؟"
"تھانے تک" وہ بولا "باہر پولیس کی نفری موجود ہے۔"
میں نے اور غالب نے پلٹ کے گیٹ کی طرف چلنا شروع کیا۔ میں اب بھی پُرامید تھا کہ مجھے اے ایس پی کوئی موقع ضرور فراہم کرے گا جب میں تھوڑا سا خطرہ مول لے کر اس کی کامیابی کو ناکامی میں بدل دوں گا لیکن اندر ہی اندر یہ خیال بھی زور پکڑ رہا تھا کہ ایسا نہ ہوا تو کیا ہو گا۔ تھانے پہنچ جانے کے بعد ہمارے رہائی کے امکانات معدوم ہو جاتے تھے اور ہمارے اعمال کے سارے دفتر کھل جانے کے امکانات بہت روشن ہو جاتے تھے۔
مجھے یوں غیر متوقع طور پر پکڑے جانے کا جتنا افسوس تھا اس سے کہیں زیادہ رنج رکنی کی دردناک موت کا تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ سیدھی سادی لڑکی جو کل رات تک ہمارے ساتھ اور ہم سے اپنے مستقبل کے خوابوں کی باتیں کرتی رہی تھی۔ بہت خوش تھی کہ اب سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ پارو اور کالا گھر بن جائے گا تو وہ راجن کے ساتھ شادی کر سکے گی۔ وہ لڑکی اب زندہ نہیں ہے۔ اس کا مظلوم تشدد کی تاب نہ لا کے بے جان ہو جانے والا زخموں سے چُور اور شکستہ بدن کسی مردہ خانے میں پوسٹ مارٹم کے عمل سے گزر رہا ہے یا کسی چتا کے شعلوں میں راکھ ہو رہا ہے۔
بہت سے سوالات کا جواب حالات نے فراہم کر دیا تھا۔ رکنی کی جان لینے والے اسی قبیلے کے لوگ تھے جن کے سردار کا کالا اسی کا بیٹا تھا مگر وہ ہمارے ساتھ فرار ہو کے کلکتہ پہنچ گیا تھا۔ انہوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ تورلی کی لالچ میں ہم اور کالا کہیں نہیں سکتے۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ ہم میں سے کوئی ان کے نشانہ ضرور بنا ہو گا۔ انہوں نے حیرت انگیز مستعدی اور عقل کا ثبوت دیا اور ہمارے پیچھے پیچھے کلکتہ پہنچ گئے۔ شاید وہ ورا رات بھر ہسپتال میں گئے۔ یا انہیں اگلا پورا دن ملا اور آخر ایک ایسے زخمی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئے جس کے پر زہر میں بجھے تیر کا زخم تھا۔

مجھے رکنی پر تعجب تھا کہ اس نے ہماری خاطر اتنی اذیت کیوں جھیلی؟ اسے کیا ضرورت تھی یوں مرنے کی؟ وہ قبیلے والوں کو بتا سکتی تھی کہ فلاں ہوٹل میں جاؤ۔ تمہیں وہ لوگ مل جائیں گے جو چندو کو لے کر آئے تھے۔ وہ بتا سکتی تھی کہ چندو کی لاش فلاں ہسپتال میں پڑی ہے۔ یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی کہ اس نے ہمارے لیے یہ سوا سیر سونے کی خاطر زندگی قربان کر دی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ قبیلے والے اسے مارنا نہ چاہتے ہوں اور وہ خود بھی تھوڑی بہت مزاحمت پر تیار ہو مگر حادثاتی طور پر اور بالارادہ پڑنے والی کسی چوٹ نے اس کی جان لے لی ہو یا زیادہ مشتعل ہو جانے والے کسی شخص نے اس کو ہلاک ہی کر دیا ہو۔ ایک امکان اس بات کا بھی تھا کہ وہ اپنے بھائی کمار کو بچانا چاہتی ہو۔ اسے معلوم ہو گا کہ سونا تو کمار کے پاس ہے اور اس نے قاتلوں کو ہمارا پتا بتایا تو کمار انہیں خود ہی مل جائے گا۔ اور یہی بات زیادہ قرین قیاس لگتی تھی۔ اس کے باوجود کمار کا ہم سے ملنے کے لیے نہ آنا اور کوریئر سروس سے پاسپورٹ ارسال کرنا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کیا کمار کو معلوم ہو گیا تھا کہ رکنی کا قتل ہو گیا ہے؟ اس کو قتل کرنے والے کون تھے اور انہوں نے اسے کیوں مارا؟ ممکن ہے یہ سب اسے دیر سے معلوم ہوا ہو۔ وہ ہمارے پاسپورٹ بنوانے کے چکر میں تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کے وہ رکنی کی طرف گیا تو اس نے پولیس کو دیکھا اور اسے بہن کے قتل ہونے کی خبر ملی تو وہ خود اپنی جان بچا کے بھاگ گیا۔ اس نے پاسپورٹ ہمیں کوریئر سروس سے بھجوا دیے۔ شاید اسے ڈر ہو کہ وہ خود ہم سے ملنے گیا تو ہمارے ساتھ ہی پکڑا جائے گا۔ رکنی کے قاتل وہاں موجود ہوں گے۔ یہ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ رکنی نے قاتلوں کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ویسے بھی سونا اس کے پاس تھا اور قاتل وہی سونا مانگ رہے تھے۔ کیا کمار کو سونا اتنا عزیز تھا؟ اس سونے کی وجہ سے رکنی کی جان گئی تھی۔ اس کی موت کے ذمے دار ہم تھے۔ وہ سونا قبیلے والوں کے حوالے کر کے انہیں بتا سکتا تھا کہ یہ رہیں تمہارے مطلوبہ آدمی۔ یا وہ سونا پولیس کو دے کر ہماری نشان دہی کر سکتا تھا۔
مگر اس سے کمار کو کیا فائدہ ہوتا؟ رکنی مر چکی تھی اور واپس نہیں آ سکتی تھی۔ وہ انہیں پکڑوا دیتا، سونا واپس کرتا تو ہمارے ساتھ وہ خود بھی خون کے پیاسے قبیلے والوں کی نظر میں آتا یا پولیس والوں کے ہتھے چڑھ جاتا۔ اس نے عقلمندی سے کام لیا اور خود روپوش ہو گیا۔ اپنی جان بچانے کے لیے وہ یہی کر سکتا تھا۔ ہم سے انتقام لینے کی نوبت تک نہیں آئی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ ہم سے مل کے قبیلے والوں سے اپنی بے گناہ بہن کے خون کا بدلہ لے۔ اس کی مدد ہم کر سکتے تھے جب کہ اس کی نظر میں رکنی کے قاتل ہم نہیں ہو سکتے تھے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل میں امید کی ایک کرن پیدا ہوئی۔ شاید کمار ہم سے رابطہ کرے گا۔ ممکن ہے وہ چھپ کے سب دیکھ رہا ہو۔ آخر اس نے ہوٹل فون کیوں نہیں کیا؟ اس ڈر سے کہ کال ٹریس ہو جائے گی؟ مگر کال کیسے ٹریس ہو سکتی ہے؟ وہ کسی پبلک کال آفس سے فون کر سکتا تھا۔ ہمیں خبردار کر سکتا تھا کہ ہوٹل سے نکل جائیں۔ اب ہوٹل میں قتل اور تازہ کیا کریں گی؟ جب انہیں معلوم ہو گا کہ ہم گرفتار ہو گئے مگر انہیں معلوم کیسے ہو گا؟ کون بتائے گا انہیں؟ گیٹ تک آتے آتے میرا ذہن سوالوں میں الجھا رہا۔ پولیس کی کوئی گاڑی مجھے پہلے نظر نہیں آئی تھی مگر اب سڑک کے پار میں نے ایک جیپ دیکھ لی۔ اے ایس پی اتنا چوکس تھا کہ میں نے جب بھی پلٹ کے دیکھنے کا ارادہ کیا اس نے مجھے خبردار کر دیا اور میں مجبور ہو گیا کہ اپنے سر کو پاش پاش ہونے سے بچانے کے لیے چپ چاپ اس کی اطاعت کرتا رہوں۔ یہ سر ہی آخر کار مجھے بچا سکتا تھا۔ اسی سر کا سلامت رہنا جسم کی سلامتی کا ضامن ہو سکتا تھا۔
اے ایس پی نے یقیناً کوئی اشارہ کیا ہو گا کہ جیپ چلی اور سڑک عبور کر کے عین ہمارے سامنے آ رکی۔ میں نے مجرمانہ صورت کے ساتھ غالب کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں وہی پیغام تھا جو حسب حال تھا کہ میاں سکندر بخت۔ گیدڑ کے بارے میں کسی فلسفی نے ایسے ہی تو نہیں فرمایا کہ شامت اعمال اسے شہر کی جانب کھینچ لاتی ہے۔ ہم بھی خود ادھر آئے۔ ٹیلی فون پر ہی تصدیق کر لیتے یا کمار کے آنے کا انتظار کرتے تو ایسے نہ پکڑے جاتے۔ صبح اخبار دیکھنے سے معلوم ہو جاتا کہ ڈاکٹر رکنی پر کیا بیتی اور ظاہر ہے اس کے بعد یہاں سے بھاگ لیتے۔
اگر ہم تھوڑا سا رک کے صورت حال کا جائزہ لیتے تو یوں منہ اٹھائے اندر نہ جاتے۔ سوال میں کچھ کانٹا تو ہم نے محسوس کر لیا تھا مگر ہماری چھٹی حس دغا دے گئی تھی جس نے ہمیں خطرے سے آگاہ نہیں کیا۔ دراصل ڈاکٹر رکنی کا اس قبیلے والوں کے ہاتھوں قتل ہونا اتنا بعید از قیاس تھا کہ ہماری چھٹی حس بھی غافل رہی۔ نتیجہ یہ کہ ہم سیدھے چوہے دان میں چلے گئے تھے اور چوہوں کی طرح پکڑے گئے تھے۔ اگر ہم رکنی کے قتل پر غیر معمولی ردعمل کا اظہار نہ کرتے اور اس کائیاں پولیس افسر سے نہ الجھتے تو وہ عام لوگوں کی طرح ہمیں ایک جھانپڑ مار کے رخصت کر دیتا۔ خود کو

www.paksociety.com

خاص آدمی ثابت کرنا اسی برا ہوا۔ ہمارے اس انجام سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آدمی ترکی میں ہو اور زبان یار بھی سمجھتا ہو تو ترکی تمام شد والا معاملہ ضرور ہوتا ہے۔ ہم ہندی سے واقف ہوتے تو اس نرلس کو پڑھتے ہی بھاگ لیتے مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

جیپ قریب آ کے رک گئی تو اے ایس پی نے مجھے اشارہ کیا "تم چلو پہلے اندر۔ ہاتھ اٹھا کے بیٹھ جاؤ۔ ہلنا مت ورا بھی ورنہ مجھے گولی مارنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

میں نے کہا "تمہیں تو کوئی پیدا ہونے سے نہیں روک سکا اور پولیس میں بھرتی ہونے سے نہیں روک سکا۔ مگر میرا فرض بنتا ہے کہ تم کو ظلم سے روکوں۔"

"بکومت" اس نے دہاڑ کے کہا اور مجھے دھکا دیا۔

میں جیپ میں سوار ہو گیا اور آگے جا کے بیٹھ گیا۔ جب غالب جیپ میں چڑھ رہا تھا تو مجھے صورت حال کو اپنے حق میں کرنے کا ایک موقع ملا تھا۔ میں غالب کو واپس دھکیل کر اے ایس پی پر پھینک سکتا تھا اور اسے آف بیلنس کر کے آسانی سے قابو کر سکتا تھا مگر اس میں مرزا غالب کا شہید ہو جانا لازمی تھا چنانچہ میں نے صبر سے کام لیا اور خود کو قائل کیا کہ ابھی اور بھی مواقع ملیں گے۔ اگر قدرت کو ہمیں بچانا منظور ہو گا تو وہ خود بہانہ فراہم کرے گی ورنہ ہم اپنی جان پر کھیل جائیں گے لیکن اتنی بے بسی کے ساتھ حوالات میں بند نہیں ہوں گے۔

جیپ کو چلا کے لانے والے کی صورت ابھی تک میں نے نہیں دیکھی تھی۔ اے ایس پی نے پولیس کی نفری کا ذکر کیا تھا مگر یہاں ایک ڈرائیور کے علاوہ وہ خود تھا۔ تیسرا کوئی نہیں تھا ورنہ اتر کے ضرور آتا۔ یہ ایک امید افزا خیال تھا کہ اب اے ایس پی بھی ہمارے ساتھ بیٹھے گا۔ اگر اس نے ڈرائیو کرنے کو ترجیح دی تو یہ مزید بہتر ہو گا کیوں کہ ایک پولیس جیپ کا ڈرائیور کسی اے ایس پی سے زیادہ خطرناک نہیں ہو سکتا۔ وہ ہو گا کوئی سال خوردہ کانسٹیبل یا ہیڈ کانسٹیبل۔ ایک نوجوان اور ذہین، براہ راست افسر بن کر آنے والے اے ایس پی کے مقابلے میں اس سے مقابلہ کرنا یقیناً آسان ہوتا۔ راستے میں کہیں جھٹکا لگے گا یا موڑ آئے گا۔ ممکن ہے کوئی چھوٹا موٹا حادثہ ہو جائے۔

اے ایس پی نے بگڑ کے کہا "وشوا ناتھ! کیا اب میں آ کے تم سے درخواست کروں کہ پیچھے آؤ اور میرے ساتھ بیٹھو۔ وشوا ناتھ!"

کسی وشوا ناتھ نے افسر کو "یس سر" نہیں کہا تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ وشوا ناتھ خود ڈرائیور تھا یا ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

"ڈرائیور! کیا ہوا ہے اس وشوا ناتھ کو؟ سو تو نہیں گیا ہے؟ اسے لات مار کے نیچے گرا دو باسٹرڈ کو۔"

میں اور غالب جیپ کی درمیانی پارٹیشن سے دوسری طرف نہیں دیکھ سکتے تھے ورنہ ہمیں پتا چل جاتا کہ ڈرائیور کے علاوہ بھی آگے کوئی بیٹھا ہے تو وہ افسر کے حکم کی تعمیل کیوں نہیں کرتا اور خود ڈرائیور کیوں خاموش ہے؟

غالباً خود اے ایس پی کو بھی یہی بات حیران کر رہی تھی تاہم پریشان نہیں تھا۔ اسے پریشان ہونے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ ابھی آخری الفاظ اس کے لبوں سے ادا ہی ہوئے تھے کہ ایک ہاتھ آگے بڑھا اور بھرپور انداز میں اس کی گردن پر پڑا۔

میں نے اس ہاتھ کو پہچان لیا اور چلا کے کہا "ناز و!"

اے ایس پی کے گرتے ہی ناز و سامنے آ گئی "جلدی کرو۔"

غالب نے ہکلا کے کہا "مگر..... تم.... یہاں؟"

"اسے اٹھا کے اندر ڈالو مسٹر ہکلا اینڈ مسٹر ہکا۔ آگے میرے ساتھ وشوا ناتھ تو نہیں۔ گل ہے۔"

میں نے بے حس پڑے ہوئے اے ایس پی کو اٹھا کے جیپ میں ڈال دیا "شاباش۔ تم نے آج اپنا سہاگ اجڑنے سے بچا لیا۔"

"ناز و!" غالب نے کہا "تم واقعی موت کی پڑیا ہو۔"

ناز و نے کوئی جواب نہیں دیا اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔ میں نے درمیان میں پڑے ہوئے اے ایس پی کو دیکھا، دور نظر سے اوجھل ہوتے ہسپتال کو دیکھا اور ایک لمبی گہری سانس لی۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا مرزا۔ یہ تمہارے مستقبل کی شریکِ حیات موت کی پڑیا ہے۔ بلکہ خود موت ہے۔ جن ہے۔"

غالب نے فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ اس خراج تحسین کو قبول کیا "پتا نہیں یہ کیسے پہنچ گئی۔"

میں نے کہا "پتا کیوں نہیں۔ اس نے پوچھا کیا ہو گا ہمارا۔ کل رات کی بات سے معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے تمہارا۔"

"صرف میرا..... وہ کیسے؟"

"بھائی! ابھی سے اعتبار اٹھ گیا تیرا۔ بعد میں کیا ہو گا؟" میں نے کہا "شوہر پر بھروسہ نہ ہو بیوی کو تو زندگی ایسے گزرتی ہے کہ بن خدا اور شمن کی نہ گزرے۔"

"آپ نے مروایا تھا مجھے۔"

"قسم خدا کی میں بھی جھوٹ نہ بولتا رابعہ سے، سب بتا دیتا کہ کہاں گیا تھا" میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"خیر، اس وقت وہی بے اعتباری کام آ گئی۔ اس کی وجہ سے رابعہ کا سہاگ بھی اجڑنے سے بچ گیا۔" غالب بولا۔

"سوال یہ ہے کہ اپنے وشوا ناتھ جی کہاں گئے؟"

"ناز و نے انہی کی وردی پہن رکھی ہے" غالب نے کہا۔

"اس وردی میں وہ تو سما نہیں سکتے" میں نے کہا "جیسے ایک نیام میں دو تلواریں۔"

"میرے پاس ایک تلوار بھی ہوتی تو اس بات پر آپ کا بھٹے کی طرح اڑا دیتا" غالب نے کہا۔

"سوال یہ ہے کہ اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟ پہلے تو خیر تم جا رہے تھے۔"

"اب کہاں کے جا رہے ہیں۔ ڈرا" غالب بولا۔

اسی وقت جیپ رک گئی اور ایک ساتھ گل اور ناز و مشکل خیز جھٹکوں میں نمودار ہوئیں۔ انہوں نے جو پولیس والوں کی وردی پہنی تھی وہ ان کے سائز سے بہت بڑی تھی۔

"تم نے پوچھا کیا تھا ہمارا؟" غالب نے اسے ڈانٹا۔

"شکر کرو وقت پر پہنچ گئے" ناز و بولی۔

میں نے کہا "قدرت کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اب یہی دیکھ لو کہ رات ہم چوری چھپے نہ نکلتے تو تمہارے دل میں شک پیدا نہ ہوتا اور شک نہ ہوتا تو تمہیں تعاقب کرنے کا خیال نہ آتا۔ مگر تم نے کیسے اندازہ کر لیا کہ دال میں کالا ہے؟"

ناز و نے کہا "دماغ سے کام لے کر۔ اور عقل سے کام لے کر۔"

غالب قہقہہ مار کے ہنسا اور چپ ہو گیا۔

"اب ہنستے ہو۔ کیسی ہنکی لی ہے تھانے جا رہے تھے ذرا بھی عقل ہوتی تو دیکھ لیتے کہ باہر پولیس کھڑی ہے اور اندر اندھیرا ہے۔ بھلا ہسپتال بھی بند ہوتا ہے کبھی۔"

میں نے شرمندگی سے کہا "تم اندر بھی آئی تھیں؟"

"ہاں۔ دروازے تک گئے تھے۔ تم ہینڈز اپ کیے کھڑے تھے۔ رشوا ناتھ جی سے پوچھا کہ کیا بات ہے تو انہوں نے سمجھایا کہ ہم دو لڑکی کی مریض ہیں۔ اور بھی دو عورتیں پوچھ کے جا چکی تھیں کچھ دیر پہلے۔ اس نے ہمیں بتا دیا کہ ان کو قتل کر دیا گیا ہے۔"

"اس نے بتایا کہ قتل کرنے والے کون تھے؟"

"نہیں۔ خود میں نے اندازہ کر لیا کہ وہی ہوں گے جن کے مرار کا قتل ہو گیا تھا۔ وہ چندو کو تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔"

"تمہاری ذہانت نے تو مجھے دنگ کر دیا ہے بی بی" میں نے کہا "تم شرلاک ہومز کا زنانہ ایڈیشن ہو۔"

"وشوا ناتھ اور جیپ چلانے والا، دونوں مارے گئے جانا تک میں مارنا نہیں چاہتی تھی انہیں" ناز و نے افسوس سے سر ہلایا۔ "وہ وشوا ناتھ تو میری توقع سے زیادہ نازک ثابت ہوا۔ ڈرائیور نے مقابلہ کرنے اور شور مچانے کی کوشش کی تھی۔"

"انہیں کہاں چھوڑا ہے؟" میں نے کہا۔

"وہیں۔ ایک کنارے پر ڈال دیا تھا" ناز و بولی "فکر کی کوئی بات نہیں۔ انہیں کسی نے دیکھا بھی تو صبح ہونے سے پہلے نہیں دیکھے گا۔"

"اور اس سے پہلے بھی دیکھ لیا تو کیا ہو گا؟ کچھ بھی نہیں۔ وہ کسی کو کیا بتائیں گے" گل نے کہا۔

"مگر یہ ہمارے ساتھ ہے" میں نے کہا "یہ ہوش میں آتے ہی ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔"

"اب ہمیں فوراً اس ہوٹل سے اپنا سامان اٹھا لینا چاہیے" غالب نے کہا "اس واردات کے بعد مجھے یوں لگتا ہے جیسے چھپنے والے ہماری تلاش میں ہوں گے۔ وہ جاہل اور بے وقوف نظر آنے والے لوگ میری توقع سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کمار کو ڈھونڈ نکالیں اور کمار کے ذریعے ہم تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

میں نے کہا "یار، اب اتنا ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ کلکتہ بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں کسی کو پتے کے بغیر تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سوئی کو تلاش کرنا۔"

"مگر اس کے باوجود انہوں نے چندو کا پتا چلا لیا۔"

"وہ..... اتفاق، بدقسمتی کچھ بھی کہہ لو" میں نے کہا۔

"ایسا ہی اتفاق ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ہسپتالوں کی طرح وہ ہوٹلوں میں دیکھنے لگے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ انہیں مرار کے قاتل کی تلاش تھی۔ وہ اس کو سزا دینا چاہتے تھے۔ ہم سے ان کی کیا دشمنی۔ ہمارا کوئی جرم ہے تو بس اتنا کہ ہم نے ان کے مجرم کی مدد کی اور خود بھی اس کے ساتھ فرار ہو گئے۔ چندو مر گیا۔ یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد وہ واپس لوٹ گئے ہوں گے۔"

"پھر وہ سونا کیوں غائب رہے تھے؟"

"ظاہر ہے ان کی چیز تھی۔ انہیں حق حاصل تھا مانگنے کا مگر اس کی خاطر وہ کلکتہ کی خاک چھانتے پھریں، یہ مشکل لگتا ہے مجھے۔ پھر بھی میں اس تجویز سے متفق ہوں۔ ہمیں بلا تاخیر اس ہوٹل سے نکل جانا چاہیے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "ہوٹل سے کیوں، شہر سے کیوں نہیں؟"

"ہاں۔ اب کیا مشکل ہے؟" ناز و بولی "پہلے ہمارے پاس کوئی شناخت نہیں تھی مگر اب ہم انڈین شکل میں ہیں۔ پاسپورٹ کی رو سے۔"

"پیسہ بھی ہے ہمارے پاس" گل نے کہا "ہم ہوائی جہاز میں بیٹھ کے کہیں بھی جا سکتے ہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "کیا بچوں جیسی باتیں کرتی ہو۔ صرف پاسپورٹ ملنے سے ہر بھارتی کو دنیا کے کسی بھی ملک میں جانے کا حق حاصل نہیں ہو جاتا۔ اس کے لیے متعلقہ ملک کے سفارت خانے سے ویزا حاصل کرنا پڑتا ہے۔ بنگلہ دیش کو ابھی تک بین الاقوامی سطح پر سفارتی مراعات حاصل نہیں ہوئیں۔ اسے تسلیم کرنا الگ بات ہے مگر ابھی تک ان کی کرنسی پاکستانی ہے۔ پاسپورٹ بھی وہی ہوں گے۔ ہوائی جہاز سے وہاں جانے کے لیے ہمیں پاکستانی سفارت خانے یا کونسلیٹ سے رجوع کرنا ہو گا۔"

"ابھی یہ مسئلہ تو حل کرو" ناز و نے جیپ کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ جیپ کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اور تم بھی یہ

www.paksociety.com

مضحکہ خیز وردیاں اتار دو۔ دن کا وقت ہوتا تو نہ جانے کتنے لوگ دیکھ کر ہنستے اور شکوک میں مبتلا ہوتے" غالب نے کہا "تمہارے اپنے کپڑے کہاں ہیں؟"

"اس وردی کے نیچے" نازو نے کہا۔

"اور وہ دونوں تو کیا ایسے ہی پڑے ہوئے ہیں؟"

"ظاہر ہے۔ اتنا وقت کہاں تھا ہمارے پاس کہ انہیں اپنے کپڑے پہناتے" نازو نے کہا "اور یہ تھا بھی بہت مشکل کام۔"

گل اور نازو نے وردیاں اتار کے جیپ میں ڈال دیں۔ ساری پہ چلون پہننا کوئی آسان کام نہ تھا چنانچہ جیپ کی اوٹ میں رہتے ہوئے انہوں نے پھر ساری کو ٹھیک کیا۔ کلکتہ میں بھی بڑے شہروں کی طرح لوگوں کو نظر اٹھا کے کسی کی طرف دیکھنے کی نہ فرصت تھی اور نہ ضرورت۔ کوئی کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ کوئی پروا نہیں کرتا تھا۔ کسی کا حلیہ بھی لوگوں کو متوجہ نہیں کرتا تھا۔ لوگ ہر قسم کے حلیے میں نظر آتے تھے۔ لنگوٹی سے تھری پیس سوٹ تک اور ترکی ٹوپی سے ہیٹ تک۔ وہاں ہر قومیت کے لوگ آباد تھے اور جسے جو میسر آتا تھا وہ بلا تکلف پہن لیتا تھا۔

سڑک کے ایک کنارے کھڑی ہوئی جیپ کو بہت سے لوگوں نے دیکھا تھا اور گزر گئے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ راستے کے ہر اسٹریٹ لیمپ کو یا ہر گزرنے والی کار کو دیکھتے تھے مگر دیکھنے کے اس عمل کا تعلق آنکھوں سے تھا دماغ سے نہیں۔ اگر گل اور نازو سب کے سامنے ساری پر سے وردی اتار دیتیں تب بھی شاید کوئی رک کر نہ پوچھتا کہ یہ کیا چکر ہے۔

ابھی تک میں طے نہیں کر پایا تھا کہ اس اے ایس پی کا کیا کروں۔ اسے مارنا بے مقصد تھا اور بلا ضرورت اس کی جان لینا کوئی بھی منظور نہ کرتا۔ اسے مسلسل بے ہوش رکھنا بھی مشکل تھا اور ایسی کوئی جگہ بھی نہ تھی جہاں اسے قید رکھا جاتا۔

اس موقع پر غالب نے ایک تجویز دی "کیوں نہ ہم اسی کے ساتھ نکل جائیں۔ اسی جیپ میں۔"

میں نے کہا "اسے یرغمال بنا کے؟"

"ہاں۔ جیپ اسے ڈرائیو کرنے دیں۔ یہ ہمارے تحفظ کا ضامن بن جائے تو ہم اس کو یہ ضمانت فراہم کر دیں گے کہ اسے خیروعافیت کے ساتھ واپس آنے دیا جائے گا۔ ایک پولیس آفیسر ہمیں بارڈر کراس کرا سکتا ہے۔"

"اور اگر یہ نہ مانا؟" میں نے سوچ کے کہا۔

"یہ پھر دیکھیں گے" غالب نے کہا "ابھی تو ہم چل کے ہوٹل سے سامان اٹھاتے ہیں اور نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ رات بھر میں ہم کافی دور جا سکتے ہیں۔ کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو تو ڈھاکا پہنچ سکتے ہیں۔"

اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا اور ایک بار پھر ہم جیپ میں سوار ہو گئے۔ اب جیپ میں چلا رہا تھا۔ رات کے وقت پولیس کی جیپ اس وقت پہچانی جاتی تھی جب گزر جاتی تھی۔ میرے جسم پر وردی نہیں تھی مگر افسران عموماً سرکاری جیپوں کو ذاتی استعمال میں رکھتے ہیں اور ڈیوٹی کے اوقات میں بھی وردی کے بغیر نظر آتے ہیں۔

میں نے اے ایس پی کو نازو کی نگرانی میں چھوڑا اور نازو کی حفاظت کے لئے غالب کو جیپ میں بیٹھے رہنے کی تاکید کی۔

"ہم ابھی آتے ہیں۔ بل ادا کر کے" میں نے کہا۔

"زیادہ دیر مت کرنا" نازو بولی۔

"اگر اس عرصے میں یہ ہوش میں آنے لگے......"

"تو میں اس سے نمٹ لوں گی" نازو نے میری بات کاٹ دی "بلکہ اس سے بھی نمٹ لوں گی جو میرے محافظ کی طرف بری نیت سے دیکھے گا۔"

غالب نے کہا "تم سے زیادہ بدنیت کون ہوگا۔"

میں نے کہا "مصروفیت کے لئے شوق سے لڑو مگر خود کو تنہا مت سمجھنا۔ یہ نہ ہو کہ ہم واپس آئیں تو اودھم مچا ہو۔"

مجھے ہوٹل سے اسباب اٹھانے اور بل ادا کر کے باہر آنے میں تقریباً آدھا گھنٹا لگ گیا۔ ہمارا سامان ہی کیا تھا۔ صرف ایک سوٹ کیس جو ہم نے معتبر نظر آنے کے لئے خریدا تھا۔ چند کپڑے اور ایک بریف کیس جو دیکھنے میں بھی بہت قیمتی لگتا تھا۔ اس میں ہمارا سارا اثاثہ محفوظ تھا۔ نقد رقم، پاسپورٹ اور ریوالور۔ میں نے احتیاطاً یہ کی کہ نوٹ اور اسلحہ سوٹ کیس میں کپڑوں کے نیچے چھپا دیے اور بریف کیس میں تھوڑی سی رقم کے ساتھ پرچے اور اخبارات وغیرہ ڈال لئے۔

ہوٹل کا پورٹر سوٹ کیس گیٹ پر چھوڑ کر اور ٹپ لے کر رخصت ہو گیا تو میں نے بریف کیس گل کو تھمایا اور ... خود سوٹ کیس اٹھا کے اس طرف چل پڑا جہاں پولیس کی جیپ میں غالب اور نازو ہماری واپسی کے انتظار میں تھے۔ ابھی میں چند قدم دور گیا تھا کہ کسی نے پیچھے سے مجھے آواز دی۔ اس نے میرا نام لئے بغیر کہا تھا "سر!" چنانچہ پہلے میں نے یہی سمجھا کہ پکارنے والا کسی اور کو پکار رہا ہے۔ پھر مجھے آواز جانی پہچانی لگی اور میں نے رک کر پیچھے دیکھا۔ اس وقت تک کمار تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آ گیا تھا۔ وہ بہت پریشان تھا اور بار بار پلٹ کر دیکھتا تھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ میں وقت پر پہنچ گیا۔"

میں اپنی حیرانی پر قابو پا چکا تھا۔ "کمار! تم کہاں تھے؟"

کمار نے کہا "لمبی بات ہے۔ پھر بتاؤں گا۔ آپ ہوٹل چھوڑ کے جا رہے تھے؟"

"ہاں، ہم نے بہت انتظار کیا تمہارا۔"

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "ابھی کچھ پتا نہیں۔ شاید کسی دوسرے ہوٹل میں۔ یا کہیں اور۔"

"میری مانیں سر تو کسی ہوٹل میں مت جائیں۔" وہ میرے ساتھ چلنے لگا "باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"وہ ادھر جیپ میں بیٹھے ہیں۔ تمہاری ٹیکسی کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"ٹیکسی ...... وہ میں نے آج بیچ دی۔ ٹکڑے ٹکڑے سودا کر دیا" وہ بولا۔

"مگر کیوں؟"

"بہت خطرہ تھا ٹیکسی چلانے میں۔ سب جانتے ہیں مجھے کوئی بھی بتا دیتا کہ راج کمار کی ٹیکسی کون سی ہے اور کہاں ہے۔ میری جان کے قاتل میری تلاش میں پھر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یقین کرو، ہمیں بہت دکھ ہوا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ وہاں پہنچ جائیں گے ورنہ ہم چندو کو کہیں اور لے جاتے۔"

اس نے آنکھوں میں آ جانے والے آنسو آستین سے صاف کئے "چھوڑیں سر، ہونے والی بات تھی۔ آپ کا کیا قصور ہے اس میں۔ وہاں آپ ہوتے تو آپ بھی مارے جاتے۔ میں بال بال بچ گیا۔"

ہم جیپ تک پہنچے تو نازو نے کہا "کمار۔"

میں نے کہا "یہ وقت پر پہنچ گیا۔ ورنہ ہم تو نکل جاتے۔"

"میں بہت دیر سے کھڑا تھا وہاں۔ میں نے آپ کو اندر جاتے بھی دیکھا تھا" وہ بولا "میں اندر نہیں جا سکتا تھا۔"

"اندر کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"میں ڈرتا تھا... آپ بھی خدا کا شکر ادا کریں کہ ابھی تک وہ یہاں نہیں پہنچے۔ وہ ضرور ہوٹلوں میں دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ ذرا اونچا ہوٹل ہے اس لئے ان کا دھیان ادھر نہیں گیا ہے۔ وہ ابھی عام مسافر خانوں اور ہوٹلوں میں تلاش کر رہے ہوں گے۔"

"تم بلاوجہ ڈرے ہوئے ہو۔ اتنے یقین کے ساتھ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"مجھے معلوم ہے سر۔ معلوم ہے۔ وہ ایسے ہی لوگ ہیں۔ ضدی اور کینہ پرور۔ کبھی ہار نہ ماننے والے" وہ بولا۔

"تم سے کیا دشمنی ہے ان کی؟"

"رکمنی سے کیا دشمنی تھی انہیں؟" وہ بولا۔

"رکمنی نے ...... انہیں بتایا ہوتا ......" میں نے کہا "ہمارے بارے میں ...... اور اس سونے کے بارے میں۔"

"کیسے بتاتی وہ۔ اسے کچھ معلوم ہوتا تو بتاتی۔ میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ آپ لوگ کس ہوٹل میں ہو۔ ہاں میرے بارے میں وہ جانتی تھی۔ یہ اس نے غلطی کی۔ وہ میرا پتا بتا دیتی۔ میں سونا ان کے حوالے کر دیتا۔ پھر وہ چلے جاتے۔ مگر رکمنی نے مجھے بچایا۔ اور اس سونے کو جس سے میں نے ......" وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں نے اسے تسلی دی "حوصلے سے کام لو۔ ہم تو خیر اب جا رہے ہیں۔ بعد میں اپنا خیال رکھنا۔ اور پارو کا۔"

"ہم آپ کے ساتھ جائیں گے سر۔ میں اور پارو۔ اسے میں نکال لایا ہوں۔ ورنہ وہ اس کو پکڑ لیتے اور پھر مجھے۔"

میں حیران رہ گیا "تم اسے بھی لے آئے ہو! کہاں ہے وہ؟"

"ادھر ایک گاڑی میں بیٹھی ہے۔ ٹیکسی بیچ کے جو رقم ملی تھی مجھے، اس کی گاڑی لی ہے میں نے۔ یہ جیپ تو پولیس کی ہے۔ اور یہ اندر کون لیٹا ہے؟" اس نے جھانک کے کہا۔

میں نے کہا "کمار، میرا خیال ہے کہ تم جاؤ۔ ہمارا اور تمہارا ساتھ نہیں بنتا۔ میرا مشورہ ہے کہ اپنی اور پارو کی جان بچاؤ۔ اپنی زندگی سے زیادہ کسی چیز کی اہمیت نہیں ہوتی۔"

"ایک چیز اہم ہو گئی ہے سر۔"

"وہ کیا؟"

"انتقام۔ رکمنی کے قاتلوں سے" وہ بولا۔

"فضول باتیں مت کرو۔ پارو کے ساتھ جاؤ اور انہیں وہ سونا واپس کر دو جس کی خاطر وہ تمہارے پیچھے پھر رہے ہیں۔ ان کی چیز انہیں دے دو۔ جان مت دو" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "اب یہ نہیں ہو سکتا۔ پہلے ہو سکتا تھا۔ اگر وہ رکمنی کو نہ مارتے تو میں سب کچھ انہیں دے سکتا تھا۔ اپنی جان بھی۔ مگر اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں رکمنی کے خون کو بھول جاؤں۔ کتنے ارمانوں سے پالا تھا میں نے اسے۔ اتنا بڑا کیا تھا۔ ڈاکٹر بنایا تھا۔ اب اس کی شادی ہونے والی تھی۔ راجن پاگل ہو گیا ہے۔ تم کہتے ہو میں یہ سب بھول جاؤں" وہ چلانے لگا۔

"اچھا دوست" میں نے کہا "کیا کرو گے آخر تم؟ کیسے بدلہ لو گے ان سے؟ تمہیں کیا معلوم کہ تیلپے کے کتنے افراد تھے اور کون تھے۔"

"میں معلوم کر لوں گا۔" وہ بولا۔

"تم خود بھی مارے جاؤ گے۔ پارو کا ہی کچھ خیال کرو۔"

"وہ پاگل تو خود میری جان نہیں چھوڑتی۔ میں اسے چھوڑ کے بھاگ جاتا۔ مگر وہ دھمکی دیتی ہے کہ اپنی جان لے لے گی۔ اور مجھے معلوم ہے وہ ایسا ہی کرے گی۔ ایسا کر سکتی ہے وہ۔"

میں نے کہا "اچھا۔ ہم کہیں اور جا کے بات کریں گے۔ تم جاؤ اپنی گاڑی یہاں لے آؤ۔"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا "نہیں۔ آپ یہ جیپ لے کر میرے ساتھ چلو۔ مجھے معلوم ہے آپ بھاگ جاؤ گے مجھے چھوڑ کر۔"

"کمار! خدا کے لئے سوچو کہ تم کیسے جا سکتے ہو ہمارے ساتھ۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں کہ ہم کون ہیں" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کون ہو تم۔ سب جان چکا ہوں میں۔ پہلے ہی مجھے شک ہوا تھا کہ تم مفرور مجرم ہو۔ تمہارا رویہ پراسرار تھا۔ پھر میں نے معلوم کر لیا۔"

www.paksociety.com

میں نے اس پر نظر جما کے کہا "کیسے معلوم کرلیا؟"

غالب نے کہا "کیا معلوم کرلیا؟"

"میں نے اخبار دیکھے۔ پرانے اخبار۔ ان میں تمہاری تصویریں تھیں۔" وہ بولا "اکثر لوگ بھول چکے ہیں مگر پھر بھی تمہیں غور سے دیکھنے والا پہچان لے گا۔ اگر اس کا حافظہ کمزور نہ ہو۔"

ہم سب کو اس انکشاف نے سُن کردیا تھا۔ یہ حیرت سے زیادہ خوف کا ردِعمل تھا اور اپنی کوتاہی کا احساس تھا۔ ہم مطمئن تھے کہ [illegible] خطرہ [illegible] ہمارے ہم رکاب تھا۔

میں نے کہا "سب کچھ جان لینے کے بعد بھی تم نے کچھ نہیں کیا۔"

"میں نے اس راز کی حفاظت کی۔"

میں نے کہا "آخر کیوں؟ تم کو انعام وصول کرنے کا خیال نہیں آیا؟"

"میرے دل میں عزت نہ ہوتی آپ سب کی۔ اس مقصد کی جس کی خاطر آپ لوگ مصیبت اٹھا رہے ہو تو میں ایسا ہی کرتا مگر میں خود قوم پرست ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں بھارتی ہوں اور تم پاکستانی ہو۔ اگر یہ سب بھارت میں ہوتا جس کے خلاف تم میدانِ عمل میں کودے تو شاید میں بھی یہی کرتا۔ خود کچھ نہ کرتا تو بھارت کے غداروں سے لڑنے والوں کا ساتھ ضرور دیتا۔ ساتھ بھی نہ دے پاتا تو ان کی مدد ضرور کرتا اور مدد بھی نہ کرسکتا تو حمایت ضرور کرتا۔ ایک اچھے کام کی اور نیک مقصد کی حمایت تو کوئی بھی کرسکتا ہے۔ میرے نزدیک تم اچھے آدمی ہو جو اپنے ضمیر کی آواز سن کے خاموش نہیں رہتا۔ عملاً کچھ کرتا ہے۔ قربانی دیتا ہے اور مخالفت مول لیتا ہے۔ دشمنوں کا سامنا کرتا ہے اور جان خطرے میں ڈال کے بھی اپنے ارادے پر قائم رہتا ہے۔"

"تم بھارتی ہو اور ہم پاکستانی۔ کیا یہ فرق بھول سکتے ہو تم؟ ہمارے درمیان سیاسی فاصلہ ہے جو ہمیں دور کرتا ہے۔"

"مگر یہ کام جو تم کررہے ہو، یہ سیاسی مسئلہ نہیں ہے۔ اخلاقی مسئلہ ہے۔ تم غداروں سے لڑ رہے ہو۔ بھارت سے یا بنگلہ دیش بنانے والوں سے نہیں لڑ رہے ہو۔ مجھے حمایت کرنی چاہئے تمہاری۔ بالکل اسی طرح جیسے مجھے دنیا کے کسی بھی حصے میں ہونے والی لڑائی میں اس فریق کا ساتھ دینا چاہئے جو انسانی اور اخلاقی مسئلے سے لڑ رہا ہو۔ مثلاً بھوک سے یا بیماری سے۔ یہ تو میں نہیں کرسکتا کہ کسی انعام کی خاطر ایک نیک مقصد کو ختم کردوں۔"

میں نے مسکرا کے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "اوکے۔ میں قائل ہوگیا۔ اب زیادہ لمبی تقریر کی ضرورت نہیں۔ باقی باتیں پھر کریں گے۔ ابھی چلو تمہاری گاڑی کہاں ہے؟ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

وہ میرے ساتھ چل پڑا "آپ نے بہت غلطیاں کی ہیں سر۔ کئی بار آپ نے نام لیا میرے سامنے۔"

"اس میں ارادے کو دخل نہیں تھا۔"

"مگر ایسی غلطی آپ کو غیر ارادی طور پر بھی نہیں کرنی چاہئے۔ اب یہ پولیس کی جیپ کہاں سے لے آئے ہیں آپ؟"

میں نے اسے مختصراً ساری بات بتادی لیکن اسے اپنا ارادہ ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ہم ایک پرانی سی گاڑی تک پہنچ گئے تھے۔ یہ دس سال پرانی اوپل ریکارڈ تھی۔ ایک مضبوط اور بھروسے کے قابل گاڑی جس پر ابھی تک زرد رنگ کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

میں نے کہا "یہ ہے تمہاری گاڑی۔ یہ تو......"

"مجھے معلوم ہے" وہ بولا "یہ چوری کی ہے۔ ڈھاکا سے لایا تھا ایک شخص۔ مجھے پانچ ہزار میں دے دی۔"

"مگر یہ ڈپلومیٹک نمبر پلیٹ سفارتی عملے کے زیر استعمال گاڑیوں کے لئے ہوتی ہے" میں دروازہ کھول کے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"ابھی کون پوچھنے والا ہے" وہ بولا "افراتفری ہے۔ لوگ بھاگ رہے ہیں۔ جس کے ہاتھ جو لگتا ہے وہ لے آتا ہے۔ اس گاڑی کو روکتا کوئی نہیں۔"

"اور جس ملک کے سفارت خانے کی یہ نمبر پلیٹ ہے؟"

"اگر کوئی دیکھ بھی لے گا تو یہی سمجھے گا کہ شاید ڈھاکا سے ہماری گاڑی آئی ہے۔ آج کل سفارت کار بھی ادھر اُدھر ہو رہے ہیں۔ زیادہ تر کلکتہ میں ہیں" وہ بولا۔

"بعد میں کیا کرو گے؟"

"چھوڑ دوں گا اسے کہیں بھی۔ پانچ ہزار میں پانچ ہزار میل کی سواری کیا بری ہے۔ اور جس مقصد کے لئے میں نے لی ہے وہ ایسی گاڑی میں آسانی سے پورا ہوگا۔ کوئی اور گاڑی مجھے اتنی سستی کہاں ملتی۔ جو پیسہ بچا اس سے میں نے اسلحہ خریدا۔ وہ بھی آج کل بہت سستا ہے۔ اسمگل ہوکے آرہا ہے" اس نے گاڑی چلاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "ایک چائنیز آٹومیٹک رائفل مل گئی۔"

پچھلی سیٹ پر سے یاور نے کہا "سر! آپ اسے سمجھاؤ۔ یہ تو پاگل ہوگیا ہے بالکل" وہ رو رہی تھی اور ٹوٹی پھوٹی اردو بول رہی تھی۔

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا "یاور! معاف کرنا میں نے تمہیں دیکھا ہی نہیں تھا۔ باتوں میں الجھ گیا تھا۔"

"بکواس بند کر لڑکی چپ۔ مجھے پاگل کہتی ہے" کمار نے بگڑ کے کہا "کوئی تجھے ایسے مار جاتا تو میں دیکھتا تیرا بھائی کیا کرتا۔ میرا ساتھ نہیں دے سکتی تو اتر جا۔"

میں نے بہتر سمجھا کہ فی الحال اس مسئلے کو نہ چھیڑوں۔ کمار کے جذبات کا آتش فشاں اتنا بلند تھا کہ اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے الفاظ کا سمندر بھی ناکافی ہوتا۔ اس کا غم ابھی تازہ تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ زخم کو مندمل ہونے کی مہلت ملے۔ وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے جو ہر غم کی شدت کو ایسے کم کردیتا ہے کہ پتا بھی

نہیں چلتا۔ جیسے بہار کا سورج پہاڑوں کی برف کو پگھلاتا ہے۔ آہستہ آہستہ بے برگ زمین نمودار ہوتی ہے۔ پھر پودے اور خزاں رسیدہ شاخوں پر شگوفے نمودار ہوتے ہیں اور جب بہار آتی ہے تو پھر وہ برف یاد بھی نہیں آتی جس نے زمین کو سفید کفن پہنا رکھا تھا۔ پھولوں کے رنگ، سبزہ اور نیلا آسمان نظر میں رہتا ہے۔

اتفاق رائے سے ہم نے جیپ کو وہاں سے دو میل دور ایک سڑک کے کنارے چھوڑ دیا۔ اے ایس پی کو لیاقت ہوٹل میں آنے کے [illegible] چھوڑ دیا تھا۔ تاہم نازو نے اسے اپنے طور پر سب سمجھا دیا تھا اور وہ سمجھدار آدمی تھا کہ سمجھ گیا تھا۔

میں اور غالب اگلی سیٹ پر کمار کے ساتھ تھے۔ یہ سیٹ اتنی بڑی تھی کہ اس پر تین افراد کے لئے گنجائش تھی۔ پچھلی سیٹ پر یاور، گل اور نازو کے درمیان اے ایس پی کو مجبوراً فٹ ہونا پڑا تھا۔ وہ ہر طرف سے زنانہ فورس میں محصور تھا۔ عام حالات میں ایسی محفل میں خود کو راجہ اندر سمجھتا مگر اب وہ خود کو اس کوے کی طرح محسوس کررہا تھا جو بلبلوں کی قید میں ہو۔

جیپ چھوڑنے کے بعد میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

میں نے کمار کا اصلی نام لینے سے احتراز کیا۔ "تمہاری نظر میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم آج کی رات گزار لیں؟ اپنے مہمان کے ساتھ۔"

غالب نے کہا "ہوٹل کی بات مت کرنا۔"

کمار نے سوچ کے کہا "جگہ تو ہے مگر......"

میں نے کہا "اے ایس پی صاحب کچھ نہیں کہیں گے۔ انہیں معلوم بھی نہیں ہوگا۔ ہم ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں۔"

جب نازو نے اے ایس پی کی آنکھوں پر پٹی باندھی تو اس نے لفظی احتجاج نہیں کیا۔ کمار نامعلوم سڑکوں اور گلیوں سے گاڑی گزار کے لے گیا اور نہ جانے کہاں ایک دروازے کے سامنے رک گیا۔ دروازہ مقفل تھا مگر وہ گاڑی سے اتر کے عقبی حصے میں گیا اور کچھ دیر بعد اندر کی طرف سے پھاٹک کھلا۔

"آؤ اِدھر سے سب لوگ۔" اس نے کہا۔

میں نے کہا "یہ کیا ہے؟ کس کا گھر ہے؟"

اس نے کہا "جلدی کرو۔ اندر آکے پوچھ لینا جو بھی پوچھنا ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے باری باری گل، نازو اور یاور کو اندر پہنچا کے اے ایس پی کو لے کے گیا اور اس کے پیچھے میں اور غالب بھی اندر اتر گئے۔ کمار نے گاڑی اندر کی، پردے برابر کئے اور لائٹ جلادی۔

"یہ ایک سیٹھ کی کوٹھی ہے۔ میں اس کا ڈرائیور تھا۔ وہ فیملی کے ساتھ لندن میں رہتا ہے" کمار بولا "کبھی آتا ہے تو یہاں ٹھہر جاتا ہے۔"

"آج رات تو نہیں آئے گا نا؟" میں نے کہا۔

"ہماری قسمت خراب ہوئی تو ضرور آئے گا" نازو بولی۔

"ہماری نہیں۔ خود اس کی" غالب بولا "اب تو ہم بن بلائے مہمان، بلائے جان بن چکے۔ اسے نہیں آنا چاہئے یہاں۔"

"یہاں کھانے پینے کو کچھ ملے گا؟" میں نے کہا۔

"سب ملے گا" کمار بولا "ڈیپ فریزر بھرے پڑے ہوں گے۔ سیٹھ کی کوٹھی ہے۔ کسی کنگلے کی جھونپڑی نہیں۔"

[illegible] موجود تھے۔ دو گھنٹے بعد ہم سب کھانے سے فارغ ہوچکے تھے اور چائے پی رہے تھے۔ اے ایس پی نے حالات سے مفاہمت کرلی تھی اور ہم سے مکمل تعاون پر آمادہ تھا۔ ہم اسے یقین دلا چکے تھے کہ ہم دہشت گرد ہیں اور تخریب کاری کے لئے بنگلہ دیش آتے جاتے رہتے ہیں۔ بہتر ہے وہ ہمارے بارے میں تجسس سے گریز کرے اور کوئی ایسی بات نہ پوچھے جس کا جواب جھانپڑ کے سوا کچھ نہ ہو۔ وہ غلط سوال کرنے پر دو دو جھانپڑ پہلے ہی کھا چکا تھا۔

اس نے سوچ سمجھ کے ایک سوال کیا "میں اپنے گھر والوں کو مطلع کرنا چاہتا ہوں۔"

"کون گھر والے؟" غالب نے کہا۔

"ماں ہے۔ بیوی بچے ہیں اور کون۔"

"ان سے کیا کہو گے؟" غالب نے جرح کی۔

"یہی کہ وہ فکر نہ کریں۔"

"انہیں فکر کرنے دو۔ بلکہ خوب فکر کرنے دو۔ دنیا میں کون ہے جسے فکر نہیں۔"

"یہ بہت ضروری ہے۔ پلیز! ورنہ وہ میرے آفس والوں سے پوچھیں گے اور آفس والے ایکٹو ہوگئے تو ہر جگہ میرے لاپتا ہونے کی خبر پہنچ جائے گی۔ یہ نہ ہو کہ ہم بارڈر پر پکڑے جائیں" وہ بولا۔

"اوکے۔ ان سے بات کرلو لیکن......"

"دھمکی مت دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم مجھے گولی مار دو گے ایک غلط لفظ منہ سے نکالنے پر۔ میں پوری کوشش کررہا ہوں اپنی جان بچانے کی۔ میں ایسی حماقت نہیں کرسکتا۔ میری ماں کا بھی میرے سوا کوئی نہیں ہے اور بیوی بچے تو خیر ہوتے ہی اپنے ہیں۔ آفس والوں کو بتانا بھی ضروری ہے۔"

نازو نے کہا "غالب! انہیں بات کرنے دو۔"

اے ایس پی نے ممنونیت کے ساتھ اسے مسکرا کے دیکھا "تھینک یو فار دی سفارش۔ میں تمہارا وار ابھی بھولا نہیں ہوں ظالم حسینہ۔"

اس نے اپنے گھر والوں سے مختصر بات کی اور انہیں صرف یہ کہا کہ وہ ایمرجنسی ڈیوٹی پر دو تین دن کے لئے باہر جارہا ہے۔ پھر اس نے اپنے کسی افسر سے بات کی۔ بہت ہوشیاری سے اس نے کہا کہ وہ اچانک بیمار ہوگیا تھا اس لئے گھر چلا گیا اور ممکن ہے دو تین دن

www.paksociety.com

ڈیوٹی پر ٹھیک حاضر ہو۔

"اب بتاؤ تمہارا پلان کیا ہے؟"

"یہ سوال ایک جہانگیر کے قابل ہے۔ وحشت گردوں سے ان کا پلان پوچھ رہے ہو۔ کیا یہ تقاضہ ہے اور ہم قید کر کے یہاں لائے گئے ہیں؟" غالب نے ہم پر زور دے کر کہا۔

"تم نے کہا تھا کہ میں تمہیں بارڈر کراس کرا دوں۔ مجھے اتنا تو معلوم ہونا چاہئے کہ تم کون ہو۔ تمہیں کہاں جانا ہے اور کب؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "پہنچنا تو ہمیں ڈھاکا ہے۔"

"تم جانتے ہو ڈھاکا کا فال ہو چکا ہے۔ اس کے بعد سے وہاں صورت حال کتنی خراب ہے۔ تمام سرحدیں بند ہیں۔ کوئی غیر ملکی آ جا نہیں سکتا۔"

"نہ تم غیر ملکی ہو، نہ ہم" میں نے کہا "وہاں انڈین ملٹری کا کنٹرول ہے اور تم ایک پولیس افسر ہو۔"

"مگر تمہارے متعلق میں کیا بتاؤں گا کہ تم کون ہو؟"

"تم کہہ سکتے ہو کہ یہ ہمارے ہندو لوگ ہیں جن کو میں محفوظ مقام پر منتقل کر رہا ہوں۔ وہاں دو قسم کے لوگ غیر محفوظ ہوں گے۔ ایک وہ جو پاکستان کے حامی تھے اور بنگلہ دیش یا مکتی باہنی کے نزدیک غدار۔ دوسرے وہ جو مکتی باہنی میں شامل تھے جنہوں نے چھپ کے انڈین آرمی کی مدد کی۔ تم ہمیں اس دوسرے گروہ کے ارکان قرار دے سکتے ہو۔ اس وقت جو بھی انتظامیہ ہے وہ انہی کی حفاظت کر رہی ہوگی۔ دوسری قسم کے لوگ تو عوام، حکومت اور بھارتی فوج تینوں کے ہاتھوں عذاب میں ہوں گے۔"

"میں سمجھ گیا۔ اب یہ بتا دو کہ تم کب جانا چاہو گے؟"

"ہم تو ابھی جانا چاہتے ہیں" میں نے کہا۔

"تو پھر انتظار کس کا ہے؟" وہ بولا "چلو۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ رات کا سفر محفوظ رہے گا یا دن کا؟" میں نے کہا۔

"میرا مشورہ اگر کوئی اہمیت رکھتا ہے تو صبح روانہ ہونا بہتر رہے گا۔ رات کو ایک تو راستے سے بھٹک جانے کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے بارڈر پر خطرہ زیادہ ہوگا۔ فوج کی طرف سے بھی اور چھاپہ ماروں کی طرف سے بھی۔ ہم غلط فہمی رفع کرنے سے پہلے ہی نہ مارے جائیں۔ ہم تین آدمی بنگالی بول سکتے ہیں۔ باقی کو شاید لوگ اپنا دشمن سمجھ لیں۔ اس وقت انتقامی جذبات عروج پر ہیں۔ اور سیاسی لڑائی کے علاوہ غنڈہ عناصر کو کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "تم انگریزی بہت اچھی بولتے ہو۔ اور قائل بھی کر سکتے ہو۔ تمہارا مشورہ بالکل ٹھیک ہے۔ اب اگر تم سونا چاہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ درمیان والا دروازہ کھلا چھوڑ دینا۔ ہم سامنے ہی بیٹھے ہیں۔ دوسرے بیڈ کا دروازہ بند کر دینا۔"

اس نے پھر شکریہ ادا کیا اور اٹھ کے ساتھ والے دروازے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں دو بیڈ لگے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بیڈ روم تھا جس میں ہمارے اصرار پر گل، نازو اور پارو سو گئی تھیں۔

اب میں، غالب اور کمار ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے اور ہمیں موقع مل گیا تھا کہ جس موضوع سے اب تک گریز کر آئے ہیں اس پر بات کر سکیں۔

میں نے کہا "کمار، تمہارا فیصلہ غلط ہے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "ہاں۔ مجھے اور پارو کو تم راستے میں اتار دینا جہاں وہ بستی آئے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اس کا تو ہمیں پتا نہیں۔ چندو تو کس طرف سے آیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے" اس نے کہا "تمہارا راستہ پھر اُدھر سے گزرے گا۔ دریا کے اس پار سے مجھے کشتی مل جائے گی۔"

"اور تمہاری یہ گاڑی؟"

"یہ تم لے جاؤ" اس نے کہا "تمہارے زیادہ کام آئے گی۔"

میں نے کہا "تم پاگل ہو گئے ہو۔ اپنے منہ اٹھا کے جاؤ گے اس قبیلے میں۔"

اس نے کہا "تم کو میں نے ابھی تک اپنا پلان نہیں بتایا۔ تو وہاں ان لوگوں سے معافی مانگنے جاؤں گا۔ اور یہ ظاہر کروں گا میں خود ان کی امانت لوٹانا چاہتا تھا مگر مجھے موقع نہیں ملا۔ میری بہن رکنی بے وقوف تھی۔ اس نے واقعی غلطی کی تھی ان لوگوں کی مدد کر کے اور ان کا پتا نہ بتا کے۔ اس کی طرف سے اب معافی مانگتا ہوں اور اگر کچھ لوگ میرے ساتھ کر دئیے جائیں تو ان کو سیدھا وہاں لے جا سکتا ہوں، جہاں چندو کے مددگار تمہارے سردار کے قاتل موجود ہیں۔ ظاہر ہے پھر وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ البتہ میری خاطر تواضع ہوگی اور مجھے ہمدرد باخبر آدمی سمجھ کے وہ مجھ پر اعتبار کریں گے۔ میں کہوں گا کہ ایک تو وہی لوگ میری بہن کی موت کے ذمہ دار ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ رکنی کو مارنے والے واپس پہنچ چکے ہوں۔ ناکام ہو جانے کے بعد۔ انہیں دوبارہ میرے ساتھ کر دیا جائے گا۔ اگر وہ نہ ملے تو ان کا انتظار کروں گا۔ آخر کب تک تلاش جاری رکھ سکتے ہیں۔ ان کی واپسی تک میں قبیلے کا مہمان رہوں گا۔ اور پھر ان سے کہوں گا کہ اب میرے ساتھ چلو۔"

میں دکھ، حیرانی اور پریشانی کے ساتھ سب کچھ سنتا رہا اور اس کی صورت دیکھتا رہا "تمہارا پلان واقعی مکمل ہے۔ مگر ایک بات بتاؤ۔ اگر انہوں نے تمہاری بات پر اعتبار نہ کیا؟"

"اعتبار کیوں نہیں کریں گے۔ میں خود سوا سیر سونا ان کو پیش کروں گا تو پھر کیا بات رہ جائے گی۔ کون دستبردار ہوتا ہے مفت میں ملنے والے خزانے سے۔ اس سے ثابت ہوگا کہ میں معتبر ہوں۔"

"اچھا۔ اگر انہوں نے تمہاری تلاشی لی اور تمہارے پاس سے وہ خنجر، پستول یا رائفل برآمد ہو گئی۔ تو کیسے یقین دلاؤ گے انہیں کہ تم یہ بھی خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے لائے تھے؟" غالب نے کہا۔

"میں ان کی بستی میں پہنچنے سے پہلے ہی سارا اسلحہ کہیں چھپا دوں گا۔" کمار بولا "بالکل خالی ہاتھ جاؤں گا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ وہ میری نگرانی کریں گے مگر میرا رویہ خود انہیں قائل کرے گا کہ میرے عزائم غلط نہیں۔ رات کو کسی وقت میں اسلحہ نکال لاؤں گا۔ اگر موقع ملا تو سوتے میں ہی سب کو خود چن کے مار ڈالوں گا۔ ورنہ صبح ایسی جگہ رکھ دوں گا کہ چلتے وقت آسانی سے اٹھایا جا سکے۔ میرا سامان وہی ہوگا جس کی وہ تلاشی لے چکے ہوں گے۔ ایک بیگ میرے ہاتھ میں ہوگا، ایک پارو کے پاس۔ مجھے رخصت کرتے وقت وہ کیسے شک کر سکتے ہیں کہ راتوں رات میرے پاس ان کی موت کا سامان آ گیا ہے۔ ہم کشتی سے یا لانچ سے کلکتہ روانہ ہوں گے اور راستے میں سب کا حساب برابر۔ سب کی لاشیں دریا اپنے ساتھ لے جائے گا اور سمندر میں پھینک دے گا۔" وہ کسی جنونی کی طرح بول رہا تھا۔

"اور اس کے بعد باقی عمر تم چھپتے پھرو گے۔ ظاہر ہے پھر ان کی باری ہوگی۔ آخری بازی یہ لوگ کھیلیں گے۔ تمہیں، تمہاری بیوی کو اور شاید بچے کو مار کے" میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں انہیں ایسا موقع فراہم نہیں کروں گا۔" کمار نے کہا "یہ لوگ اپنے آدمیوں کی واپسی کا انتظار کریں گے۔ جو کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ ان کی لاشیں دریا میں گرانے کے بعد میں لانچ کا رخ بدل لوں گا۔ میں واپس کلکتہ نہیں جاؤں گا۔"

"پھر کہاں جاؤ گے؟"

"میں ڈھاکا پہنچ جاؤں گا۔ میں اور پارو کہیں بھی رہ سکتے ہیں۔ ابھی بڑے پیمانے پر آبادی کا انخلا ہو رہا ہے اور ہم تو ویسے بھی ہندو ہیں۔ اگر مسلمان ہوتے تو شاید مشکل میں پڑتے۔ ہم سے پوچھا جاتا کہ ہم کہاں کے رہنے والے ہیں اور کس کے ساتھی ہیں۔ لیکن کسی ہندو سے یہ کوئی سوال نہیں کرتا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے علاقے سے جان بچا کے بھاگے ہیں۔ ہمارے لئے بنگلہ دیش کے دروازے کھلے ہیں۔"

"اور یہ دروازے کھولنے والے بھی ہندو ہی ہیں۔ تمہارا ففتھ کالم جو ہمیشہ بنگال کے مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپتا آیا ہے" غالب نے تلخی سے کہا۔

"دیکھو۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ میں بتا چکا ہوں کہ میرے دل میں تمہارے لئے اچھے جذبات ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں سیاہ فاموں کے حقوق کی جدوجہد کرنے والے مارٹن لوتھر کنگ یا تنظیم آزادی فلسطین کے یاسر عرفات کے لئے رکھتا ہوں۔"

"تم مجھے بانس پر چڑھا کے ان لوگوں سے مار رہے ہو جو قطب مینار سے بھی زیادہ بلند ہیں" میں نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں تمہارا دل میری طرف سے صاف رہے۔"

میں نے کہا "مسٹر راج کمار! یہ بات تو مانی جا سکتی ہے مگر مجھے یہ بتاؤ کہ ہمارے ساتھ جانے پر کیوں اصرار تھا تمہیں؟ تم نے یہ گاڑی ایسے ہی خریدی تھی۔ اب تم کہتے ہو ہمارے لئے لی تھی۔"

"دراصل۔ مجھے اکیلے جانے میں ڈر تھا کہ راستے میں ہی نہ پکڑا جاؤں۔ قبیلے کے لوگوں نے دیکھ لیا تو میری بات سنے بغیر مجھے مار ڈالیں گے۔ میں نے سوچا کہ بھیس بدل کے اس گاڑی میں نکل جاؤں گا۔ اس گاڑی کو پولیس بھی نہیں روکے گی۔ میں اس بستی کے بالکل قریب پہنچ کے گاڑی کو جنگل میں چھپا دوں گا اور اپنا کام ختم کر کے اسی میں لوٹ آؤں گا۔ پھر مجھے تمہارا خیال آیا کہ اس گاڑی سے تمہارا کام آسان ہو جائے گا چنانچہ میں نے تمہارے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اور پارو ڈکی میں چھپ کے بھی جا سکتے تھے لیکن بعد میں مجھے یہ پلان سوجھ گیا کہ میں دشمن کو اس کے گھر میں جا کے اور اپنا بنا کے ماروں۔ بھیس بدل کے انہیں مارنے سے بات نہیں بنتی تھی۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے تھا کہ بدلہ لینے والا کون تھا۔ تمہارے ساتھ ایک پولیس افسر بھی ہے اس لئے اب راستے میں تو کوئی خطرہ نہیں۔ گاڑی کی مجھ سے زیادہ تمہیں ضرورت ہے۔ تم چاہو تو اس کی قیمت دے دو۔ مجھے پیسے کی زیادہ ضرورت ہوگی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ پانچ ہزار تمہیں مل جائیں گے مگر کمار......"

"دیکھو مجھے لیکچر مت دینا کہ معاف کر دینے میں بڑائی ہے اور مجھے قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے ورنہ میں مجرم بن جاؤں گا، میرا ضمیر مجھے تمام عمر ملامت کرے گا اور میرا بیٹا ایک قاتل کا بیٹا کہلائے گا۔ یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ قانون میری مدد نہیں کرے گا۔ میں یہ بات سمجھتا ہوں۔ مجرم کو معاف کرنا جرم کی حوصلہ افزائی کے مترادف ہوتا ہے۔ میرا ضمیر اس وقت مجھے ملامت کرے گا جب میں نے اپنی بزدلی پر مفاہمت کا پردہ ڈال کے بدلہ نہ لیا۔ میرا خون سفید نہیں ہوا ابھی ورنہ سوا سیر سونا لے کر ڈھاکا چلا جاتا اور عیش کرتا۔ آرام سے زندگی گزارتا۔ خود کو سمجھا لیتا کہ بہن مر گئی تو کیا اس کی خاطر مجھے مرنا چاہئے۔ یہ میرے لئے ناممکن ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "اچھا۔ خدا تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے اور سکون دے۔ محفوظ رکھے۔ معلوم نہیں یہ تم اچھا کر رہے ہو یا برا۔ میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

غالب نے کہا "پارو کو اپنا گھر چھوڑنے کا دکھ نہیں؟"

"گھر! اس کا گھر تو ایک قید خانہ تھا جہاں اسے میں نے روک

www.paksociety.com

رکھا تھا ورنہ وہ کب کی آزاد ہو کے بھاگ جاتی" کمار بولا "اس کا باپ سوتیلا ہے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ پارو مان جائے تو کسی مال دار کے ہاتھ بیچ دے۔ اس کی شادی تو یہاں کے رواج کے مطابق بہت کم عمری میں ہو گئی تھی۔"

"پارو شادی شدہ ہے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

کمار ہنسنے لگا "یہاں لڑکی کی شادی تیرہ چودہ سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی کر دی جاتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ بات تو مجھے معلوم ہے مگر....."

"پارو کے باپ نے بھی اس کی شادی گیارہ سال کی عمر میں طے کر دی تھی۔ وہ نوجوان تو ہی تھا۔ اگر پارو اس کے ساتھ چلی جاتی تو خوش رہتی۔ جیسے کہ سب لڑکیاں رہتی ہیں۔ آج تو پانچ چھ بچوں کی ماں ہوتی اور وہ چار سال بعد اپنی لڑکی یا بچے کی فکر کرتی۔"

"پھر پارو گئی کیوں نہیں اس کے ساتھ؟"

"اس تقدیر نے اسے میرے نام لکھ دیا تھا" وہ بولا "رخصتی کا دن مقرر ہو چکا تھا۔ وہ اپنے کچھ رشتے داروں اور دوستوں کے ساتھ پارو کو لینے آیا تھا کہ راستے میں ناؤ الٹ گئی۔ پوری بارات غرق ہو گئی۔ برسات میں یہاں ایسے حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ پارو منحوس قرار دے دی گئی اور دو سال بیٹھی رہی۔ پھر اس کے سوتیلے باپ نے ایک ساٹھ سال کے بڈھے سے ہزار روپے لے لئے اور پارو کا نکاح پڑھوا دیا۔ ذرا سوچو کہ پارو کی عمر اس کی عمر کا ایک چوتھائی تھی۔ خود اس کی پوتیاں اور نواسیاں پارو سے بڑی تھیں۔"

"یعنی پارو کی دوسری شادی بھی ہو چکی ہے؟" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ دوسری بار اس کی رخصتی ہوئی اور اس نے شوہر کے گھر میں دو مہینے گزارے۔ پھر بیوہ ہو گئی۔ بڈھا دمے کا مریض تھا۔ اسے بیوی کی نہیں کسی دیکھ بھال کرنے والی نوکرانی کی ضرورت تھی۔ اس کی دو بیویاں مر چکی تھیں اور تیسری بھاگ گئی تھی۔ صرف چار مہینے پہلے۔ اس کے بیٹے اپنی بیویوں کے غلام تھے اور بیویاں انہیں لے کر الگ ہو گئی تھیں۔ پارو نے بھی دن رات اس کی کھانسی سنی اسے دوا دینے اور اس کے غلیظ کپڑے دھونے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ جب یہ بیوہ ہو گئی تو بڈھے کے وارثوں نے اسے گھر سے نکال دیا اور یہ پھر ماں باپ کے گھر آ بیٹھی۔ پھر یہ چار سال نحوست کا لیبل لگائے کسی رشتے کا انتظار کرتی رہی۔"

"اور اس کے بعد ہیرو آ گیا۔"

"ابھی نہیں" کمار ہنسنے لگا "ابھی ایک شادی باقی ہے۔"

"کیا تین شادیاں..... اف..... عشق کی ایسی فضول کہانی میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی جس میں ہیرو کا انتظار میں چوتھا نمبر ہو۔"

میں نے کہا "تیسرا شوہر کہاں گیا؟"

"اسے میں نے قتل کر دیا تھا" کمار بولا۔

کچھ دیر میں اور غالب اس اعتراف اور انکشاف پر ہکا بکا بیٹھے رہے۔ اس امید میں کہ کمار کچھ اور کہے لیکن وہ نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ شاید وہ چشم تصور سے قتل کا منظر دیکھ رہا تھا۔

"اس کی تیسری شادی طے ہونے سے پہلے ہی میں پارو کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی پارو کے باپ سے بات کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جب مجھے پارو نے یہ بتایا کہ اس کا رشتہ تیسری بار پکا ہو گیا ہے اور وہ کوئی دھنا ہے جو مردہ جانوروں کی ہڈیاں جمع کرتا پھرتا ہے لیکن اچھے خاصے پیسے کما لیتا ہے۔ پارو نے مجھ سے کہا کہ وہ اس بار خود پر تیل چھڑک کے آگ لگا لے گی مگر اس شخص کے ساتھ نہیں جائے گی۔ تو اسے بھی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر ہڈیاں پھینکنے کے لئے لگا دے گا۔ میں نے کہا کہ فکر نہ کرو تمہارا بیاہ اس سے نہیں ہو گا۔ اور پھر یہی ہوا۔ اس کی لاش کوڑے کے ایک ڈھیر پر پڑی ہوئی ملی۔"

میں نے کہا "کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ تم پارو کے باپ سے مل کر رشتہ مانگ لیتے، تم ہر لحاظ سے بہتر تھے، زیادہ پیسہ بھی دے سکتے تھے۔"

"ہاں، میں نے سوچا تھا۔ مگر پارو نے کہا کہ اس کا باپ انکار کر دے گا۔ وہ پارو کو زیادہ سے زیادہ قیمت میں دیکھ کر خوش ہے، وہ اسے سکھی نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ابھی کسی کو میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ پارو کے باپ نے انکار کر دیا اور پھر میں نے کچھ کیا تو الزام مجھ پر آئے گا۔ آسان طریقہ تھا کہ پارو پر نحوست کی ایک اور چھاپ لگا دی جائے تاکہ پھر کوئی اس کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے اپنے کریا کرم کی سوچے اور ایسا ہی ہوا۔ اب یہ پانچ سال سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ باپ اسے دھکے دے کر نکال دیتا مگر میں اسے ہر ماہ گزارے کے لئے دے رہا تھا۔ یہ گویا طے تھا کہ پارو اب میری بیوی ہے جو میکے میں رہتی ہے کہ ابھی میں اس کو اپنے گھر نہیں لے جا سکتا۔ بڈھے کو اب پارو کے جانے کا نہیں اس آمدنی کے ختم ہو جانے کا صدمہ ہو گا جو اسے پارو کے خرچ کے نام پر کئی سال سے ہو رہی تھی۔"

میں نے کہا "یہ دنیا کی مشہور عشق کی داستانوں سے بالکل مختلف کہانی ہے لیکن یہ زندگی کی حقیقت ہے۔"

غالب نے کہا "اس لئے فلم اپنی تو فلاپ ہو جائے گی۔"

رات کا باقی حصہ بھی باتیں کرتے ہی گزرا۔ کمار دو بار چائے بنا کے لایا۔ وہ ہم سے ہمارے بارے میں پوچھتا رہا اور ہم اس کے تجسس کو دور کرنے کے لئے بہت کچھ بتایا مگر کوئی ایسی نہیں بتائی جو ہمارے لئے پُرخطر ہوتی۔

صبح چھ بجے گل اور نازو سے پہلے پارو جاگ اٹھی۔ وہ جلد اٹھنے کی عادی تھی۔

اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا کہ کیا ہم لوگ رات بھر سوئے نہیں؟

غالب نے کہا "ہم تمہاری باتیں کرتے رہے، تمہاری شادیوں کی۔"

پارو کا چہرہ ذرا سی دیر کے لئے بدلا "اس نے بتایا۔"

میں نے کہا "ہاں، کمار بہت اچھا آدمی ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ بالآخر تم کو اپنی منزل مل گئی۔"

وہ کچھ بھی نہیں "ہم ایک دم ستوش ہے۔ اپنی منحوس قسمت سے تنگ ہوا۔"

میں نے کہا "نہیں، یہ سب غلط ہے۔ تم کو منحوس کہنے والے جاہل تھے۔ ہر خرابی میں کوئی خیر کی صورت مضمر ہوتی ہے، میرا مطلب ہے۔ اللہ اچھا کرتا ہے۔ یہ تمہارے لئے اچھا ہوا۔"

"تب اس کو بولا....." وہ کمار کی طرف دیکھ کے رک گئی۔

"ایسا بولا؟ تو سمجھتی ہے ان کے منع کرنے سے میں مان جاؤں گا" کمار ایک دم بگڑ گیا۔

پارو ڈر کے خاموش ہو گئی۔ وہ اٹھارہ انیس سال کی لڑکی تھی مگر اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آتی تھی۔ بنگالی عورت جسمانی صحت کے اعتبار سے بہت کم اچھی نظر آتی ہے۔ کچھ تو اس میں نسلی صفات کا دخل ہوتا ہے مگر بیشتر صورتوں میں غربت اور تلخ حالات اس کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ ناقص اور ناکافی خوراک، غلط ماحول اور خوشی سے محرومی ان کے چہروں پر شباب کی رعنائی اور شگفتگی کے وجود کو ختم کر دیتی ہے اور انہیں یہ ان ہی ہوتی ہیں کہ بوڑھی نظر آنے لگتی ہیں۔ جو پچیس سال کی عورت چھ آٹھ بچے پیدا کر چکی ہو وہ جوان کیسے رہ سکتی ہے۔ پارو بھی انہی حالات کی پیداوار تھی۔ وہ خوب صورت تو کیا قبول صورت بھی نہ تھی مگر کمار اس پر اتنا ہی فریفتہ تھا جتنا میں رابعہ پر یا غالب نازو پر۔ ہم خوش نصیب تھے کہ رابعہ اور نازو کو خدا نے دولت حسن سے مالا مال کیا، یا شاید یہ نظر کی بات تھی۔ پارو بھی کمار کو اتنی ہی حسین لگتی تھی۔

گل اور نازو کے اٹھتے ہی گویا کورچ کا بگل بج گیا۔ اے ایس پی رات بھر خراٹے لیتا رہا تھا۔ شروع میں مجھے شک ہوا تھا کہ کہیں وہ ہمیں دھوکا دینا تو نہیں چاہتا اور یہ خراٹے مصنوعی تو نہیں۔ اس کا خیال ہو کہ اسے گہری نیند میں دیکھ کر ہم بھی سو جائیں گے کہ فکر کی کوئی بات نہیں لیکن ہمیں نیند ہی نہیں آئی اور بعد میں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خراٹے اصلی ہیں۔

میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا چنانچہ اسے باتھ روم میں بھیجنے سے پہلے میں نے خود باتھ روم کا معائنہ کیا۔ اس میں خاصی بلندی پر ایک روشندان تھا مگر وہ بہت چھوٹا تھا اور اس میں انگزاسٹ فین بھی لگا ہوا تھا۔

کمار کو شہر کی کے ہر حصے سے واقف تھا اور جب پانی ختم ہو گیا تو اس نے باہر جا کے موٹر چلائی۔ میں اور غالب اس کے ساتھ تھے۔

ہم کمار نے چار سال یہاں بہت عیش کی" وہ بولا "سیٹھ مجھ پر بہت بھروسہ کرتا تھا۔ جب وہ یہاں نہیں ہوتا تھا تو گاڑی بھی میرے پاس رہتی تھی۔"

میں نے کہا "کمار، یہ اے ایس پی تمہیں جانتا ہے؟"

وہ چونکا "جانتا ہے؟"

"ہاں۔ کیا اسے معلوم ہے کہ تم رکمنی کے بھائی ہو؟"

"ضرور معلوم ہو گا" وہ بولا۔

"مگر اس نے تم سے کوئی بات نہیں کی۔"

"بات کرتا تو کیا فائدہ ہوتا" غالب بولا "کیا ہم اسے یہاں تحقیق اور تفتیش جاری رکھنے دیتے۔"

میں نے کہا "وہ بعد میں کمار کے لئے مسئلہ بن سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"اسے کمار کے بارے میں معلومات حاصل ہو گئی۔ اس کا نام کیا ہے۔ حلیہ کیا ہے۔ یہ پتہ چل جائے گا کہ وہ ٹیکسی چلاتا تھا، ٹیکسی اس نے کس کو بیچی تھی۔ کہاں بیچی تھی۔ اور اس نے معلوم کر لیا کہ کمار نے بہن کے قتل کا انتقام لینے کے لئے اس رقم سے اسلحہ خریدا تھا اور پانچ ہزار میں یہ چوری کی گاڑی لی تھی تو کمار کے جرائم کی فہرست لمبی ہو جائے گی۔ وہ قبیلے تک جا پہنچے گا اور وہاں اسے قبیلے والے بتا دیں گے کہ کمار کتنے افراد کا قاتل ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد کمار اشتہاری مجرم ہو گا۔"

کمار نے کہا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

میں نے کہا "تمہاری تصویر اخبار میں چھپ جائے گی۔"

"یہاں کے اخباروں میں چھپنے دو۔"

میں نے کہا "تم احمق ہو۔ حکومتوں کے درمیان مجرموں کے

www.paksociety.com

تبادلے کا معاہدہ ہو تو ایک مجرم کو دوسرے ملک سے بھی لایا جاسکتا ہے۔ تم بنگلہ دیش میں بھی اشتہاری مجرم بن جاؤ گے اور پہچان لئے گئے تو گرفتار کرکے بھارت بھیج دیے جاؤ گے۔ پارو اکیلی رہ جائے گی۔"

وہ کچھ متفکر نظر آنے لگا "پھر کیا کرنا چاہیے مجھے؟"

میں نے کہا "آسان کام تو یہ ہے کہ تم اپنے ارادے سے باز رہو۔"

"نہیں۔ میں مشکل کام کروں گا" اس نے ضدی اور فیصلہ کن لہجے میں کہا "اے ایس پی بھی ایک آدمی ہے۔ جہاں اتنے خون بدلہ لینے کے لئے کروں گا وہاں ایک خون اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی....."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم اس اے ایس پی کو زبان دے چکے ہیں کہ اسے بحفاظت واپس جانے کا موقع دیا گیا۔"

"زبان تم نے دی ہے۔ میں نے نہیں۔"

"ہم اپنی زبان کا پاس رکھنا جانتے ہیں کمار۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اس کا رنگ متغیر ہو گیا "سوری سر۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

"اور کیا مطلب نکالا جاسکتا ہے تمہاری بات کا؟" میں نے کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو ' ہمارا ساتھ دینا یا ہمارے خلاف جانا؟" غالب نے کہا "ابھی وقت ہے فیصلہ کرلو۔"

"میں۔ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا" اس نے پریشان ہوکے کہا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ پھر ایسی بات نہیں کہوں گا۔ ایسا خیال بھی دل میں نہیں لاؤں گا۔ اگر پولیس بعد میں میرے پیچھے پڑتی ہے تو پھر میں خود کو بچاؤں گا۔ جیسے بھی ممکن ہوا میں نام بدل لوں گا۔ بھیس بدل لوں گا ' جگہ بدلتا رہوں گا۔ جب تک میں محفوظ نہیں ہو جاتا۔"

مجھے یوں لگا جیسے صرف مجھے مطمئن کرنے کے لئے وہ جھوٹ کا سہارا لے رہا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ جو بات غلطی سے اس کے منہ سے نکل گئی تھی وہ ختم ہو جائے۔ وہ شرمساری کی اداکاری بھی ٹھیک ہی کر رہا تھا اور میں مجبور تھا کہ اس کے وعدے پر اعتبار کروں مگر میں محتاط رہنے کا فیصلہ بھی کر چکا تھا۔

اس نے کہا "آپ اس سے بات کیوں نہیں کرتے؟"

میں نے کہا "کس سے۔ اے ایس پی سے؟"

"ہاں۔ اس کو بھی سمجھائیں کہ وہ میرے پیچھے نہ پڑے۔"

میں نے کہا "ابھی وہ میری ہر بات مانے گا لیکن بعد میں اس کو ادائے فرض سے کون روکے گا۔"

"آپ لوگ اسے دھمکی سے روک سکتے ہیں۔ یہ بھی بتا دیں کہ بعد میں کمار کو کچھ ہوا تو اچھا نہیں ہوگا۔ وہ آپ لوگوں کو جانتا ہے۔"

"جانتا ہے؟ تمہیں کیسے معلوم؟"

"آپ کو خود اندازہ کرلینا چاہیے۔ جب میں نے سمجھ لیا تو وہ کیسے نہیں سمجھے گا۔ وہ تو پولیس کا آدمی ہے۔ آپ خود بتا چکے ہیں کہ دہشت گرد ہیں۔ ڈھاکا میں کسی اور ملک نے دہشت گردانہ تخریب کاری تو جانے سے رہے۔ بھارتی ایجنٹ خود اپنی شناخت کرادیتے۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ آپ پاکستانی ہیں۔ اگر ابھی اسے نہیں آیا ہوگا تو واپس کلکتہ آکے وہ معلوم کرلے گا بڑی آسانی سے۔"

میں نے کہا "یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ مگر ہم اس کی فکر نہیں کرتے۔ اور وہ تو ہے بھی نہیں کہ بعد میں کیا ہوگا۔"

"مگر اسے ڈرا تو سکتے ہیں۔ مجھے بچانے کے لئے۔ وہ جانتا ہوگا کہ آپ لوگوں کی دھمکی محض دھمکی نہیں ہوتی۔ اسے اپنی بیوی بچوں کی سلامتی عزیز ہوگی تو وہ خاموشی کو ترجیح دے گا" اس نے کہا۔

ابھی میں کمار کی تجویز کے مثبت اور منفی پہلو کا جائزہ لے رہا تھا کہ گل اور نازو نے شور مچایا۔ وہ ہمیں ناشتے کے لئے بلا رہی تھیں اور سارے گھر میں تلاش کرتی پھر رہی تھیں۔

"آپ لوگ یہاں ہیں" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "بے وقوف۔ تم کو ہمارے پیچھے آنے کی ضرورت تھی ' وہ اے ایس پی کہاں ہے؟"

غالب نے کہا "اس کے ساتھ تو صرف پارو ہوگی یا گل۔"

اسی وقت میں نے پارو کی چیخ سنی۔ پھر کسی نے زور زور سے دروازہ بجانا شروع کیا۔

"کون ہے اندر ' باہر تو....."

میں اور غالب اندر پہنچ چکے تھے۔ اس کے اور میرے ذہن میں ایک ساتھ خوف زدہ کرنے والے خیالات نے یلغار کی۔ کمار کو تلاش کرتے ہوئے رکنی کے قاتل ہمارا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ کمار کی گاڑی باہر موجود تھی اور یہ بات بھی معلوم کرسکتا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور کمار نے اپنی نئی گاڑی خریدی تھی۔

لیکن اس سے بھی زیادہ پُرخطر بات یہ تھی کہ کہیں باہر شد ہو۔ اے ایس پی کو موقع مل چکا تھا کہ وہ کھڑکی کھول کر فرار ہو جائے۔ گل یا پارو میں سے کوئی بھی جسمانی طور پر ایسا روکنے کی اہل نہیں تھی۔ یہ کام صرف نازو کرسکتی تھی لیکن اس سے ناراضگی میں ایک بھول ہو گئی تھی۔

وہ پارو کو اے ایس پی کے رحم و کرم پر چھوڑ گئی تھی اور اگر وہ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا تو خود کو وہ احمق ثابت کرتا جن کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔ اس نے بائیں بازو کے حلقے میں پارو کی گردن دبا رکھی تھی اور دائیں ہاتھ سے ڈبل روٹی کاٹنے والی چھری اس کے حلق پر یوں رکھ دی تھی کہ پارو خود کو چھڑانے کی کوشش کرتی تو چھری کی تیز دھار اس کے نرخرے تک پہنچ جاتی۔ جیسے شکاری باز کے پنجوں میں پھڑپھڑا کے نیم جاں ہو جانے والی چڑیا کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے گل کو دیکھ رہی تھی اور دستِ قاتل کے مقابل اپنی بے چارگی و بے بسی کا اعتراف کر چکی تھی۔

پارو کی چیخ اس نے بلا ارادہ ماری تھی۔ اب خوف اور دہشت نے اس کے جسم کو سن اور زبان کو گنگ کر دیا تھا۔ وہ کانپ رہی تھی اور اس کا چہرہ کسی لاش کی طرح سفید پڑ چکا تھا۔ گل ان کے سامنے ریوالور لئے کھڑی تھی یہاں جو کچھ پوچھے بغیر میں نے ساری بات سمجھ لی۔

باہر سے کسی نے پھر دروازہ بجا کے کہا "ابھی اندر کون گھسا ہوا ہے؟"

میں نے اے ایس پی سے کہا "اس لڑکی کو چھوڑ دو۔"

"نہیں۔ میں بتا رہا ہوں کہ..... میں اس کی گردن کاٹ دوں گا اگر کسی نے میری طرف ایک قدم بھی بڑھایا" اے ایس پی نے پارو کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا۔

میں نے کہا "غالب ' جا کے دیکھو باہر کون ہے۔ انہیں باہر ہی روکو۔"

"تم کچھ نہیں کرسکتے۔" اے ایس پی بولا "اس کی جان بچانا چاہتے ہو سب تو مجھے جانے دو۔"

گل نے ریوالور اوپر اٹھایا "اگر تم نے خودکشی کا سوچ ہی لیا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں گل۔ یہ قصائی پارو کو مار دے گا۔"

اچانک کمار نے کہا "سوچو مت۔ گولی مار دو اسے۔"

اے ایس پی کا چہرہ تاریک ہو گیا "فائر کی آواز سب سن لیں گے ' ان سے کیا کہو گے تم؟"

باہر ایک ساتھ کئی افراد دروازے پر گھونسے مارتے ہوئے ہنگامہ آرائی میں مصروف تھے۔ وہ گالیاں بک رہے تھے اور دھمکیاں دے رہے تھے۔

غالب نے چلا کے کہا "ارے کیا مصیبت ہے۔ کون ہے؟"

"پولیس" باہر سے کوئی غرا کے بولا۔

"پولیس ہے تو کیا کپڑے پہنے بغیر دروازہ کھول دوں؟ نہانا شروع کر دیا۔ ایک منٹ صبر نہیں کرسکتے" غالب نے اس طرح چیخ کے کہا جیسے وہ باتھ روم میں سے جواب دے رہا ہے۔

میں نے کہا "مسٹر اے ایس پی! اس لڑکی کو مار کے بھی تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ہمارے ساتھ بعد میں کیا ہوگا ' یہ دیکھنے کے لئے تم زندہ نہیں رہو گے۔ عقل سے کام لو۔ ہمارا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ دس بیس آدمی بھی خواہ مخواہ مارے جائیں گے۔"

اے ایس پی کا جارحانہ رویہ کھوکھلے اعتماد کا آئینہ دار تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی صورت پر ناکامی کے دکھ اور احساسِ جرم کے ڈر خوف سائے پھیلنے لگے۔ اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور پارو تڑپ کے اس کی قید سے نکلی تو کمار کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے حصار میں سمٹ گئی۔ کمار اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

اے ایس پی کا وہ ہاتھ بھی نیچے آگیا جس میں چھری تھی۔ اب گل کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس سے پہلے وہ خود اتنی نروس تھی کہ ریوالور اس کے ہاتھ کی گرفت میں کانپ رہا تھا اور مجھے یہ اندیشہ لاحق تھا کہ کہیں اسی کیفیت میں وہ بلا ارادہ گولی نہ چلا دے۔

"نازو!" میں نے کہا "اس حرام زادے کو اندر لے جاؤ اپنے ساتھ۔ اگر ذرا بھی شک ہو کہ اس کے حلق سے آواز نکلنے والی ہے تو ہاتھ مار کے اس کی گردن توڑ دینا۔ تم بھی جاؤ گل ' پارو کو سنبھالو اور کمار کو بھیج دو۔ جلدی کرو۔"

باہر شور کرنے والے غالب کے جواب پر چند منٹ کے لئے دروازہ توڑنے کا پروگرام ملتوی کر چکے تھے مگر بہ آواز بلند اپنے شکوک کا اظہار اور اپنے خطرناک عزائم کا اعلان کرنے میں مصروف تھے۔ تاخیر ان کے آتشِ اشتعال کو بھڑکا رہی تھی۔ آوازوں سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ جہاں پہلے چند افراد تھے وہاں اب ایک ہجوم ہے۔

میری اجازت پا کے کمار نے دروازہ کھولا تو ایک ساتھ آٹھ دس افراد کا ریلا اندر آگیا۔ اس جلوس کی قیادت پولیس کا ایک حوالدار کر رہا تھا۔ وہ دبلا پتلا ' سیاہ رو اور پستہ قد شخص تھا مگر اس کی آواز دبنگ تھی۔

"کیا بات ہے ' ایسے منہ اٹھا کے سب کیوں اندر آگئے ہو تم سب؟" کمار نے انگریزی میں کہا اور حوالدار کے مقابل دیوار بن گیا۔

حوالدار کے پیچھے اندر آجانے والے رک گئے "اتنی دیر کیوں لگی دروازہ کھولنے میں؟"

کمار نے کہا "تم مجھے اپنی آمد کی پہلے سے اطلاع دیتے تو میں دروازہ کھولنے تمہارا استقبال کرنے کے لئے موجود رہتا۔ میں بتا چکا ہوں کہ میں باتھ روم میں تھا۔"

"اور یہ ' کیا یہ بھی تمہارے ساتھ تھا؟" حوالدار نے ایک چھڑی سے میری طرف اشارہ کیا "یہ بہرا ہے کیا؟"

دو افراد قہقہہ مار کے ہنسے ' باقی مسکرا دیے۔

میں نے ابھی تک طے نہیں کیا تھا کہ مجھے کس حد تک دخل در معقولات کرنا چاہیے۔ اس بحران سے نمٹنے کے لئے کمار کی

www.paksociety.com

ہمت ہو، بات پر انحصار کیا جا سکتا تھا اور جب تک اس کی ناکامی کے واضح امکانات پیدا نہ ہوں، میرا ان مذاکرات سے الگ رہنا ہی بہتر تھا۔ حوالدار کی بات نے فوراً مجھے ایک راہ سجھا دی۔

میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کے اشارے سے کہا کہ میں نے کچھ نہیں سنا اور پیچ بسرا ہی کیا۔

"میں ان سوالات کا مقصد سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا چاہتے ہو آخر تم اور یہ جلوس یہاں کیوں آیا ہے؟" کمار نے برہمی سے کہا "ان سب سے کہو کہ فوراً نکل جائیں۔"

ایک نوجوان نے اپنا دھوتی بند نکال کے اور عینک کو ناک پر جما کے کہا "کیسا اکڑتا ہے سالا، جیسے اس کے باپ کا گھر ہو۔"

کمار نے اس کو غور سے دیکھ کے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا باپ کون ہے؟ اپنی ماں سے پوچھا ہے کبھی؟"

اب کچھ دیر افراد قہقہہ مار کے ہنسے۔ نوجوان کو کمار سے اتنے سخت و زہریلے جواب کی توقع نہ تھی۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"حوالدار صاحب! آپ سنا... یہ گالی دیا میرے کو۔"

"میں کہتا ہوں گیٹ آؤٹ۔ تم آف یو" کمار نے چیخ کے کہا "حوالدار! اتنے بدمعاشوں کے ساتھ تم نے حملہ کیا ہے گھر پر۔ ساری ذمے داری تمہاری ہے۔ رپورٹ کروں گا میں۔"

"ہم کو بدمعاش بولا۔ سالا" ایک دھوتی پوش بنگالی بابو نے اچھل کر کمار کو چھتری سے چھونے کی کوشش کی۔

کمار نے اسے نظرانداز کر دیا "کوئی بات تھی تو تم معلوم کرنے کے لیے آ سکتے تھے۔ تم نے سرکاری وردی پہن رکھی ہے۔ تمہیں یقیناً اختیار حاصل ہے مگر یہ کون لوگ ہیں؟ نکالو انہیں باہر۔"

حوالدار کو کمار کے اعتماد نے کچھ پریشان کر دیا تھا۔ اس نے فوراً کارروائی کی اور تین افراد کے سوا باقی کو ریوڑ کی طرح ہانک دیا۔ ان تین میں سے ایک وہی بنگالی بابو تھا جو چھتری کو ایک دفاعی ہتھیار سمجھتا تھا۔ بارش، دھوپ اور بدمعاش کے خلاف۔ اس کا آدھا سر تیل سے چمک رہا تھا۔ اس نے باقی رہ جانے والے گنتی کے چند بالوں کو خضاب سے یوں سیاہ کیا تھا کہ سر کی چمڑی بھی کالی ہو گئی تھی۔ دوسرا شائستہ، خاموش طبع اور مہذب صورت شخص تھا جس نے علی گڑھ پاجامے پر سیاہ اچکن پہن رکھی تھی۔ اس کی خشخشی داڑھی کے بالوں پر سفیدی غالب تھی۔ وہ مسلسل پان چبا رہا تھا اور پیک اپنے کلوں میں جمع کرتا جا رہا تھا۔ تیسرا وہی نوجوان تھا جس کی جوانی دیکھ کر ایک عبرت ناک بڑھاپے کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ مگر وہ فرط جذبات سے "تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز" کی عملی تفسیر بنا ہوا تھا۔

حوالدار پر کمار کی دھمکی اثر کر گئی تھی یا اپنی سرکاری وردی کے اختیارات کے تسلیم ہوتے ہی اس نے تمام کارروائی قانون کے مطابق کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس نے کہا "جھگڑے کی کوئی بات نہیں۔ ہم آرام سے بیٹھ کے گفتگو کر سکتے ہیں۔"

"کس سلسلے پر؟" کمار نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا۔

حوالدار نے ایک صوفے پر تشریف رکھنے کے بعد باقی لوگوں کو ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ وہ بیٹھ جائیں "ایک معمولی سی شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ سب یہاں کے رہنے والے ہیں۔"

"این بنرجی۔ ڈی سی آفس میں کلرک ہے" چھتری والے نے بڑے ادب کے ساتھ اعلان کیا۔

اچکن والے بزرگوار نے منہ آسمان کی طرف اٹھا کے اور پیک سے غرارے کرتے ہوئے کہا "ہم غوغیاں بخش دیے گئے" جس کا مطلب تھا کہ ہم تو میاں بخش لے چکے۔ انہوں نے اپنا نام عاشق علی خان کے ہر جزو کو بھی پیک سے ادا کیا۔

باقی نوجوان نے آتش فشاں لہجے میں کہا "میں کریمین روڈ محلوں کی ایسوسی ایشن کا اعزازی سیکرٹری ہوں۔ امن کمیٹی کا رکن بھی ہوں۔"

"چنانچہ تمہیں لائسنس مل گیا ہے امن عامہ میں خلل ڈالنے کا؟ امن والا نہ ہو گا تو تمہیں کون گھاس ڈالے گا؟ تم امن کے نام پر امن میں سب کو پکڑوا سکتے ہو مگر خود آزاد ہو۔ آخر کیا ہوا ہے یہاں؟ لڑائی جھگڑے، مار پیٹ کی آواز سنی تھی کسی نے؟ مدد کے لیے پکار رہا تھا کوئی؟ قتل ہونے والا تھا کسی کا؟" کمار نے کسی کو بولنے کا موقع دیے بغیر اپنا جارحانہ خطاب جاری رکھا۔

کمار کے اشارے نے نوجوان کو اپنا ہونٹ کاٹنے پر مجبور کر دیا۔ جواب میں اس نے پولیس مین سے بنگالی میں کچھ کہا۔ چھتا بابو نے بھی چھتری کو شمشیر بے نیام کی طرح لہراتے ہوئے قانون سے مطالبہ کیا کہ کمار کے خلاف فوری کارروائی کا آغاز کیا جائے۔ قانون کے لمبے ہاتھ بھی کمار تک پہنچنے سے گریزاں تھے۔ کمار نے زیادہ روانی سے بنگالی میں بات کی۔ پھر ایک مختصر وقفہ ایسا آیا جس میں سننے والا کوئی نہیں رہا کیوں کہ وہ سب بول رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اب کسی کی بھی سمجھ میں بات ہاتھا پائی تک پہنچ جائے گی۔ میں کچھ بھی نہیں رہا تھا لیکن جذبات کی شدت سے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کر سکتا تھا اور گونگا بہرا بن کے بیٹھنے پر مجبور تھا۔

خلاف توقع سب سے زیادہ صلح جو اور امن پسند خود پولیس والا ثابت ہوا۔ عام طور پر پولیس معمولی اختلافات کو لڑائی تک پہنچا کے صورت حال کو اس مقام تک لے آتی ہے جہاں فریقین کے خلاف نقض امن، مار پیٹ، بلوہ یا اقدام قتل جیسی فوجداری دفعات کا فراخدلانہ استعمال کیا جا سکے۔ مدعی اور مدعا علیہ کو ایاز سب کو ایک صف میں کھڑا کر کے زیر دفعہ ایک سو اٹھائیس کر دیا جائے اور پھر چھترکاری کے ذریعے ان سے حسب استطاعت معافی لے کر نذرانہ وصول کر کے چھوڑ دیا جائے۔

حوالدار نے ایک دم دہاڑ کے سب کو خاموش کر دیا "کیا جواب کوئی ہوا؟ بس جو میں پوچھوں اس کا جواب دو۔" اس نے

"... داخل ہوئے؟"

"پچھلی طرف سے دیوار پھاند کے اور کھڑکی کے راستے۔" کمار نے خوش دلی سے کہا "کوئی اعتراض؟"

"یہ جرم ہے..."

"جرم میرے لیے نہیں ہے" کمار نے اس کی بات کاٹ دی "مجھے اس گھر کا مالک سمجھا جا سکتا ہے۔"

"سمجھا جا سکتا ہے کا کیا مطلب؟"

"گھر کے مالکوں نے مجھے یہ اختیار دے رکھا ہے کہ میں جب چاہوں آ جا سکتا ہوں۔ انہیں اعتماد ہے مجھ پر۔ وہ باہر رہتے ہیں" کمار نے کہا "میری حیثیت خاندان کے ایک فرد سے کم نہیں۔ سب کچھ مجھے سونپ کر جاتے تھے۔ یہ بات تم کسی سے بھی معلوم کر سکتے ہو۔ کسی بھی پرانے آدمی کو لے آؤ۔ اگر وہ کہہ دے کہ یہ غلط ہے تو چوری کی سزا وہ میری سزا۔"

کمار نے ایک سانس میں دس نام گنوا دیے۔ ایک نام پر امن کمیٹی کا ممبر چونکا "یہ تو میرے ڈیڈی ہیں۔"

"بابا انہیں بلاؤ۔ وہ پہچان لیں گے مجھے۔"

پولیس مین نے کہا "اگر تم اتنے ہی معتبر ہو تو ایسے چوروں کی طرح گھر میں کیوں داخل ہوئے تھے؟ باہر تالا لگا ہوا ہے اور تم اندر پہنچ گئے۔"

کمار نے گالی دے کر کہا "چھپنے والے کی..... ہم رات کو پہنچے۔ اور افراتفری میں ڈھاکا سے روانہ ہوئے تھے اور بہت سی چیزوں کے ساتھ چابی وہیں رہ گئی۔"

"اور کون ہے تمہارے ساتھ؟ اس بہرے کے علاوہ کیا یہ تنہا ہی ہے؟" پولیس مین نے مجھے غور سے دیکھا۔

میں نے چہرہ سپاٹ رکھا اور مختلف دانتوں کی نمائش کی۔

"اس کا آلۂ سماعت بھی ساتھ نہیں لا سکے۔ ویسے یہ گونگا نہیں ہے۔ تم اس سے لکھ کے کچھ پوچھ سکتے ہو۔ فرنچ میں" کمار نے کہا۔

"فرنچ میں!" پولیس مین مایوسی سے بولا "یہ غیر ملکی تو نہیں ہے؟"

"ہاں۔ تم سمجھتے ہو غیر ملکی" کمار نے حوالدار کے خالص بنگالی رنگ اور حلیے پر طنزیہ نگاہ کی۔

حوالدار نے تحقیق سے ادھر ادھر دیکھا "باقی لوگوں کو بھی بلاؤ۔ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

بنگالی نے چھتری لہرا کے کہا "ان کے ساتھ عورتیں بھی ہیں۔ سامنے آوازیں بہت سی تھیں۔"

امن کمیٹی کے ممبر نے پوچھا "کون ہے یہ غیر ملکی؟"

"یہ ڈھاکا میں اٹلی کے پریس اینڈ کلچرل اتاشی تھے۔ ذرا بہرا ہو گیا" کمار نے کہا۔

کمار کی بات نے مجھے حیران کیا۔ وہ اطالوی ادب کی اس قدر اور شخصیت سے واقف تھا اور اسے یقین تھا کہ باقی لوگ اس عالمی شہرت یافتہ اطالوی ادیب کو نہیں جانتے جو نوبل پرائز حاصل کر چکا تھا اور ایک باکمال کہانی نگار تھا۔ یہاں تو پڑھے لکھے شیکسپیئر کو اس لیے جانتے ہیں کہ وہ نصاب میں شامل ہوتا ہے کم بخت۔

بے روزگار گریجویٹ ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری نے سر کھجا کے کہا "البرٹو مراویا.... چندر گپت موریا...."

"ان کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں۔ جیسے اندرا گاندھی کا راجیو اندرا سے یا اندو سے کوئی تعلق نہیں" کمار نے کہا "یہ جہالت کی باتیں ہیں۔ تمہاری بے روزگاری غلط نہیں تھی۔"

اچکن والے بزرگوار جو صرف پیک بنانے میں مصروف تھے منہ اٹھا کے ہنسے تو وہ بند ٹوٹ گیا جس نے پیک کے بہاؤ کو روک رکھا تھا۔ ایک دم سرخ چھینٹوں کی پھوار ہر طرف گری۔ بنرجی کی سفید دھوتی داغدار ہو گئی۔ حوالدار کی آستین پر، قالین پر اور امن کمیٹی کے رکن کے چشمے پر سرخ چھینٹے نظر آنے لگے۔

بنرجی نے چھتری کو لہرا کے کہا "ستیاناس۔ ایک دم ستیاناس۔ ابھی دھونا پڑے گا اسے" وہ اٹھ کے باہر لپکا۔

نوجوان نے چشمے کا شیشہ صاف کرتے ہوئے غصے سے کہا "اگر یہ خون ہوتا تمہارا تو مجھے خوشی ہوتی" اور احتجاجاً واک آؤٹ کر گیا۔

مگر عاشق علی خان نے سکون کا سانس لے کر ہونٹ اپنی آستین سے صاف کیے اور بولے "میاں! ہم نے پہچان لیا تم کو۔ ہم سوچ رہے تھے کہاں دیکھا ہے یہ چہرہ۔ سو بھئی حوالدار صاحب! ہم تو چلے۔ شک کی کوئی بات ہی نہیں رہی اب۔ آداب۔" انہوں نے اٹھ کے سب کو جھک کر آداب کیا اور باہر نکل گئے۔

میدان صاف ہو گیا تو حوالدار نے اپنی حکمت عملی پر نئے سرے سے غور کیا "باقی سب لوگوں کو بلاؤ۔"

"کیوں؟ اب کیا ہے؟" کمار بولا۔

"میں ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں سب کو۔ کل کوئی ایسی ویسی بات ہو تو الزام مجھ پر نہ آئے۔" حوالدار نے عیاری سے کہا "علاقے میں مشتبہ افراد کی آمد و رفت پر نگاہ رکھی جا رہی ہے۔"

"ان میں کوئی مشتبہ آدمی نہیں۔"

"یہ فیصلہ کرنا میرا کام ہے۔ میں تصدیق کروں گا۔ ان لوگوں کے پاس اپنی شناخت کا ثبوت ہونا چاہیے۔"

"لوگ مجھے جانتے ہیں اور یہ میرے مہمان ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں؟" کمار اڑ گیا۔

"یہ غیر ملکی ہیں۔ ان کے پاسپورٹ...."

اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک جست لگا کے اے ایس پی باہر آ گیا "انہیں تھانے لے جاؤ۔ پکڑ لو انہیں۔ یہ سب وحشت گرد ہیں" اس نے چیخ کے کہا اور حوالدار نے پلٹ کے ایک دم پلٹ کیا "میں ایک اے ایس پی ہوں۔ یہ ہم سے ہیں۔"

www.paksociety.com

حوالدار ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

میں نے سکون سے کہا "آرام سے اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔"

حوالدار کو ایک اور جھٹکا لگا "تم......"

دروازے کے پیچھے سے نازو نمودار ہوئی۔ ہماری طرف دیکھے بغیر اس نے ریوالور کا رخ اے ایس پی کے سر کی جانب کر دیا جو ایک صوفے کے نیچے گھس کے دیوار سے جا لگا تھا۔

میں نے چلا کے کہا "یہ کیا کر رہی ہو؟ گولی مت چلانا۔"

لیکن نازو نے سائلنسر والے ریوالور سے فائر کر دیا۔ گولی صوفے سے گزر کے کہیں دیوار میں پیوست ہو گئی تھی۔ اے ایس پی دہشت زدہ ہو کے بلبلایا اور صوفے کے نیچے سے نکل آیا۔

"مجھے معاف کر دو۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ غلطی ہو گئی تھی مجھ سے... مجھے مت مارو۔" وہ نازو کے پیروں میں لوٹنے لگا۔

نازو نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری "اٹھ کے مرغا بن جاؤ۔"

اے ایس پی نے بڑی مستعدی سے تعمیل کی اور اسکول کے بچوں کی طرح کان پکڑ لئے۔ نازو اس پر یوں بیٹھ گئی جیسے وہ اسٹول ہو۔

میں نے حوالدار سے دوبارہ کہا "میں نے تم سے کہا تھا کہ بیٹھ جاؤ۔ تم ابھی تک کھڑے کیوں ہو؟"

"یہ..... کیا چکر ہے" حوالدار نے بیٹھتے ہوئے کہا "کیا یہ... واقعی اے ایس پی صاحب ہیں؟ اور تم.... تم تو......"

میں نے اس کے سامنے بیٹھ کے کہا "سب سوالات بھول جاؤ۔ یہ بتاؤ خاموشی کے بدلے کیا قبول کرو گے؟ معاوضہ یا موت۔"

"کیا مطلب..... ہے اس فضول.... بات کا؟" وہ ہکلا کے بولا۔

"فیصلہ کرو جلدی۔ ہمیں جانا ہے" میں نے کہا۔

غالب ڈرامائی طور پر ریوالور کے ساتھ قریب آیا اور میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے تختہ دار پر کھڑا ہوا جلاد لیور کھینچنے کے لئے جیلر کے اشارے کو دیکھتا ہے۔

حوالدار کے ماتھے پر پسینہ آ گیا "میں..... کچھ نہیں جانتا..... بس مجھے جانے دو۔"

اے ایس پی کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ فرش پر لڑھک گیا۔ نازو بڑی پھرتی سے اٹھ کھڑی ہوئی "کیا تکلیف ہے آخر تمہیں؟ آرام سے بیٹھنے بھی نہیں دیتے۔"

اے ایس پی پھر مرغا بن گیا۔ نازو پھر اس کی کمر پر ٹک گئی۔ نازک اندام نازو بہت ہلکی پھلکی تھی مگر اے ایس پی کو مرغا بننے کی پریکٹس نہیں تھی۔ ذرا سی دیر میں اس کی ٹانگیں کپکپانے لگی تھیں۔ یہ سب ذلت وہ ایک جذباتی غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لئے برداشت کر رہا تھا' جب اسے اپنے اعصاب پر قابو نہیں رہا تھا۔ کامیابی کے امکانات شمار کئے بغیر اس نے رہائی حاصل کرنے کی ایک احمقانہ کوشش کی تھی۔ نازو نے جان بوجھ کے نشانہ نہیں بنایا تھا۔ گولی اس کے شانے کو چھوتی ہوئی گزری تھی اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اتفاق یا خوش قسمتی کے باعث اس کی جان بچ گئی ورنہ وہ موت کی دہشت کا شکار تھا۔

حوالدار شاید دل ہی دل میں اس لمحے کو کوس رہا تھا جب وہ بے وقوفوں کے ایک دستے کی کمان کرتا ہوا قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے لئے اس گھر میں داخل ہوا۔ سارے بے وقوف دیدہ گواہ ہو سکتے تھے' اسے تنہا چھوڑ کر رخصت ہو گئے اور عقل مندی کا نمونہ عبرت بنا بیٹھا ہے اور عقل بھی کسی طرح رینٹ تو کے گھاس چرنے کے لئے جانے پر آمادہ ہے۔

غالب بولا "حوالدار صاحب فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں۔"

نازو نے کہا "چلو فیصلہ تم کرو۔ وقت ضائع ہو رہا ہے۔"

غالب نے سر ہلایا "ان کو پیک کر کے ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ کتنے ٹکڑے ہوں گے؟"

میں نے کہا "دیکھ لو۔ ڈبے چھوٹے ہیں۔ آٹھ دس تو لو۔"

حوالدار کی حالت غیر ہو گئی "میں..... ہاتھ جوڑتا ہوں۔ توبہ۔ میرے باپ کی' چچا کی' تایا کی توبہ۔ مجھے جانے دو۔"

میں نے اسے ایک جھٹکے سے سیدھا کھڑا کر دیا "جو کچھ جیب میں ہے' خود ہی نکال کے میز پر ڈال دو۔ مجھے رحم آ گیا ہے۔"

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہر جیب خالی کر دی "... اور کچھ نہیں ہے۔"

میں نے غالب سے کہا "یہ کاغذات اٹھا کے چیک کرو۔ کام کا کچھ ہے یا نہیں۔"

غالب نے شناختی کارڈ دیکھ کے سر ہلایا "تمہارا رہائشی پتا بدل گیا ہے؟"

"یہ پرانا پتا ہے.... میں اب سسرال میں رہتا ہوں۔" اتنا خوفزدہ تھا کہ رضاکارانہ طور پر سب بتا رہا تھا۔

"اچھا' خیر سے گھر داماد ہو۔ اس کاغذ پر پتا لکھو۔ اپنے نام لکھو۔ سالوں اور بہن بھائیوں کے نام پتے سب لکھو۔ چیک کرتے ہیں" غالب نے اسے قلم پکڑا دیا۔

میں نے غالب سے کہا "تم فون کرو اور تصدیق کر کے آؤ۔"

حوالدار کا ہاتھ لرز رہا تھا "یہ سب.... کیوں لکھوا رہے ہو؟"

"صرف اسی شرط پر چھوڑا جا سکتا ہے تمہیں کہ تم غلط نہ لکھو۔ ایک بھی جھوٹ بولا تم نے تو پھر تمہیں

بخشا نہیں جا سکے گا۔ ہم تمہارے ٹکڑے الگ الگ ڈبوں میں ڈال کے تمہارے عزیز رشتے داروں کو بھجوا دیں گے۔ وہ تمہیں دوبارہ مکمل کر کے تمہارا کریا کرم کریں یا تمہارے اجزائے ترکیبی کو گٹر میں ڈال کے اپنی جان چھڑائیں۔ یہ ان کی مرضی۔"

حوالدار بھوں بھوں کر کے رونے لگا "بھگوان کے لئے مجھ پر دیا کرو۔ میں کچھ نہیں کہوں گا کسی سے۔ کبھی نہیں کہوں گا۔"

میں نے نرمی سے کہا "یہ نام پتے ہم صرف ضمانت کے لئے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ کہیں بعد میں تم پر بہادری کا بھوت سوار نہ ہو جائے یا تمہیں غلط فہمی ہو جائے کہ قانون کی طاقت کے ساتھ تم ہم سے بچ کے نکل سکتے ہو تو تمہارے سارے خاندان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ جو بھی لکھو' انگریزی میں صاف صاف لکھنا۔"

"ہم کسی کو بھی اٹھا لیں گے اور اس کے آٹھ پیس ارجنٹ میل سے روانہ کر دیں گے" غالب نے کہا۔

اے ایس پی پھر گرا۔ نازو نے اسے بالوں سے پکڑ کے کھینچا اور اس کے چیخنے کی پروا کئے بغیر مقابل کی دیوار پر دے مارا۔ وہ گر کے واپس آیا تو نازو نے اسے پاؤں سے ایسے اچھالا جیسے کھلاڑی فٹ بال کو اچھالتے ہیں۔ اس کا ہاتھ پکڑ کے گھمایا اور دیوار پر پھینک دیا۔ حوالدار نے حقیقی زندگی میں ایسا تماشا پہلے کب دیکھا ہوگا۔ اس کے لئے اپنی آنکھوں پر یقین کرنا مشکل تھا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے' کسی ڈراؤنے خواب کا حصہ نہیں ہے' اب جو کچھ اس کے کان سن رہے ہیں' قریب قیامت کا پتا نہیں ہے۔

غالب قطعی بے نیازی کے ساتھ ریوالور سے کھیلتا رہا اور ظاہر کرتا رہا جیسے اس کے لئے نہ کوئی بات غیر معمولی ہے نہ دلچسپ بلکہ وہ ایسی باتوں کا عادی ہے۔

اب میں نے اے ایس پی کو نازو کی طرف پھینک دیا' کسی مردہ کتے کی لاش کی طرح۔ وہ نیم جاں ہو چکا تھا اور اس کی شکستہ حالی کا منظر حوالدار کو قائل کرتا تھا کہ ہم کتنے سفاک اور خونی لوگ ہیں۔

"اسے لے جاؤ اور پیک کرو" میں نے سکون سے کہا۔

نازو نے کہا "یس باس۔ کتنے پیس کروں؟"

"یہ بات مجھ سے مت پوچھو' کچھ اپنی عقل بھی استعمال کیا کرو" میں نے غرا کے کہا "کام صفائی سے ہونا چاہئے۔ کہیں کوئی بال باقی نہ رہے۔"

اے ایس پی چلایا "پرماتما کے لئے...."

نازو اسے گھسیٹ کر لے گئی۔ حوالدار نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک اے ایس پی کو پیکنگ کے لئے جاتا دیکھا۔ اس کا سارا بدن لرزنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی پتلون تک گیلی ہو چکی ہے۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ ہمارا ڈرامہ ضرورت سے زیادہ ظالمانہ ہو گیا تھا مگر یہ سب خود حفاظتی کے انتظام کا حصہ تھا۔ اس کے لئے قلم پکڑنا بھی مشکل ہو رہا تھا مگر وہ مجبور تھا اور لکھتا جا رہا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

غالب نے گھڑی دیکھ کر برا سا منہ بنایا "کیا مصیبت ہے! تم ہاتھ نہیں چلا سکتے؟ مجھے ان سب سے مل کے بھی آنا ہے۔"

حوالدار نے پرچہ آگے بڑھا دیا "یہ..... یہ لو۔"

غالب نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر حوالدار کی طرف دیکھا تو وہ تذبذب اور "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کی عملی تصویر بن گیا تھا۔

"خبیث! ایک نام نہیں لکھا ہے نا تم نے۔"

خوف نے حوالدار کی عقل کو مفلوج نہ کیا ہوتا تو وہ سوچتا کہ یہ بات غالب کو کیسے معلوم ہو سکتی ہے اور اپنی بات پر قائم رہتا کہ فہرست مکمل ہے مگر چور کے پاؤں نہیں ہوتے "میں... میں نے بس..... اپنی بہن کا نام پتا نہیں لکھا ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ وہ پہلے ہی بہت دکھی ہے۔"

غالب نے کچھ سوچ کے سر ہلایا "اچھا۔ لیکن باقی سب کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا ہے سو فیصد درست ہونا چاہئے۔"

حوالدار نے ہاتھ جوڑ دیے "آپ معلوم کر لو۔"

میں نے کہا "اچھا۔ تم اندر چلو۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے اسے آخری بیڈ روم سے متصل غسل خانے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگائی لیکن اس طرح کہ وہ دو چار مرتبہ دروازے کو ہلاتا تو سوراخ کے کنارے پر اٹکی ہوئی کنڈی کا سرا الگ ہو جاتا۔

میں نے وہیں سے چلا کے کہا "تم گئے نہیں ابھی تک۔"

غالب نے چلا کے جواب دیا "بس جا رہا ہوں۔ ذرا اپنے اے ایس پی صاحب کی پیکنگ میں مدد کر رہا تھا۔"

"پیکٹ بھی ساتھ لے جانا۔"

"اچھا۔ تم وردی والے کا خیال رکھنا۔ وہ بھاگ نہ جائے۔"

"فکر مت کرو۔ میں یہیں بیٹھا ہوں" میں نے کہا۔

میں کچھ دیر کمرے میں گنگناتا رہا اور گانے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ باتھ روم میں قید حوالدار نے میری اور غالب کی گفتگو کا ہر لفظ سنا ہوگا اور اب تک اسے یقین آ گیا ہوگا کہ غالب کی واپسی تک میں ساتھ والے کمرے میں موجود رہوں گا چنانچہ اس کے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ وہ سکون سے بیٹھ کے بھگوان سے جیون کی پرارتھنا کرے۔

غالب اور کمار نے روانگی کی تیاری شروع کر دی تھی اور میں ان کی آوازیں سن سکتا تھا۔ کسی بات پر کمار نے نازو کو ڈانٹا "اتنا ڈر لگتا ہے تو آئی کیوں تھی میرے ساتھ؟ جب دیکھو رونا بیٹھنا' آنسو بہانا۔ کانپنے لگتی ہے' بے ہوش ہونے لگتی ہے موقع محل دیکھے بغیر۔ آخر یہ بھی تو لڑکیاں ہیں۔"

پھر نازو نے کمار کو ڈانٹا "مت پریشان کرو اسے۔ معلوم ہے تم

www.paksociety.com

کھٹے پڑے سو رہا ہو۔"

گل نے بھی کہا "پہلے میں بھی بزدل تھی۔ پھر سب کے ساتھ رہی تو دل سے ڈر نکل گیا۔"

میں نے کمرے میں بجلی سے چلنے والا ایک ریڈیو گرام دیکھا جو پہلے بہت مقبول تھا اور امیروں کے ڈرائنگ روم میں ہی نظر آتا تھا۔ یہ گرونڈگ آف جرمنی کا بہترین پالش کی ہوئی لکڑی کے کیبنٹ والا ریڈیو گرام تھا جو دیوار کے ساتھ چار ٹانگوں پر بڑی شان و شوکت کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس میں چار بینڈز کے ریڈیو اور ریکارڈ پلیئر کے لئے چھ اسپیکر تھے چنانچہ اس کی آواز واقعی شاندار تھی۔ میں نے وہاں ریکارڈوں کے البم میں سہگل، خورشید اور لتا کے ایل پی ریکارڈ دیکھے اور ایک ریکارڈ بجانے کی کوشش کی۔ لتا کی مدھر الم کے بھرپور تاثر میں ڈوبی ہوئی فریاد جیسے رابعہ کی آواز بن گئی۔ "تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے۔ ہم بھری دنیا میں تنہا ہو گئے......"

میں نے ریکارڈ پر سے سوئی ہٹائی اور ریڈیو کو آن کر دیا۔ غالب نے دروازے سے سر نکال کے سیٹی بجائی اور مجھے انگلی سے اشارہ کر کے بلایا۔ میں دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔

"چلو۔ سب گاڑی میں بیٹھ چکے ہیں" غالب نے سرگوشی میں کہا۔

"باہر کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے؟"

"نہیں۔ میں کھڑکی سے باہر نکلا تھا۔ پھر نازو نے کھڑکی اندر سے بند کر دی" غالب نے کہا۔

"پھر تم اندر کیسے آئے؟"

"پیچھے گل آئے تھے۔ گاڑی پیچھے کھڑی ہے۔ کمار گھما کے لے آیا ہے" غالب نے کہا "حوالدار کا کیا بنے گا؟"

"کچھ نہیں۔ وہ خود ہی نکل آئے گا باہر، جب اسے یقین آجائے گا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے سوائے ریڈیو کے۔ کسی کی آواز سنائی نہیں دے گی تو سمجھ جائے گا کہ ہم اسے بے وقوف بنا کے نکل گئے۔ ابھی کچھ دیر تو وہ ریڈیو سنتا رہے گا۔"

غالب ہنسا "اس وقت تک ہم بہت دور پہنچ جائیں گے" میں نے کہا "ویسے بھی حوالدار اتنا ڈر گیا ہے کہ یہاں سے فرار ہو گا تو خدا کا شکر ادا کرے گا۔"

"ہاں۔ خوش قسمتی سمجھے گا کہ سالم ایک پیس میں واپس جا رہا ہے اور اپنے پیروں پر چل کے۔ آٹھ پیس میں ڈاک سے نہیں۔"

میں اور غالب باری باری عقبی حصے کی دیوار کے اوپر سے گلی میں اتر گئے۔ کار کے اگلے حصے میں کمار کے ساتھ پارو اور کھڑکی سے لگی ہوئی نازو بیٹھی تھی۔ ان کے پیچھے گل تھی اور اے ایس پی تھا جو پشت سے سر لگائے سو رہا تھا یا آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ میں ایک دروازے سے اور غالب دوسرے دروازے سے اندر بیٹھ گئے۔ تو کار آگے بڑھی۔ اے ایس پی کو میں نے اپنے اور غالب کے بیچ میں رکھا۔

"اللہ تیرا شکر ہے" نازو نے کہا "اس مصیبت سے تو بچے۔"

گل مسکرائی "دعا کرو اب ڈھاکا پہنچنے تک کچھ نہ ہو۔"

"یہ دعا تمہیں مانگنی چاہئے پھر قبول ہو گی۔ دل سے نا" غالب بولا۔

گل نے کہا "کیا تم دل سے ایسا نہیں چاہتے؟"

"ہمارے اور تمہارے چاہنے میں فرق ہے" غالب نے کہا "جو دعا مانگو گی اس میں فراق کا درد ہو گا اور دل مجبور ہو گی۔"

"فضول باتیں مت کرو" گل نے جھینپ کے کہا۔

"بالکل صحیح عرض کر رہا ہوں میں۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ لاہور پہنچنے کی دعا میں اتنی تاثیر ہے کہ [illegible] ہو سکتے ہیں۔ ڈھاکا پہنچنے کی درخواست برائے خصوصی توجہ میرٹ پر قبول ہو گی۔ میں یا نازو کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ ایسے پاگل ہیں۔"

"تمہیں خوش فہمی ہے کہ میں ہر جگہ تمہارے ساتھ ہوں" نازو نے کہا "مثلاً پاگل خانے نہیں جا سکتی میں۔"

"بالکل ٹھیک۔ دوبارہ کون جاتا ہے لوٹ کر اسی طرف" غالب نے کہا "اور تمہیں وہاں سے نکالا ہی گیا۔ واپس کیسے لے جا سکتا ہوں۔"

"جہنم میں بھی اکیلے جاؤ گے تم" نازو نے ہنس کے کہا۔

"یہ بھی کسی حد تک ٹھیک ہے۔ جب میں جاؤں گا تو پہلے سے بیٹھی ہوئی کچھ نکالے 'لال' ہو رہا ہے۔"

گل اور پارو نے کھی کھی کر کے ہنسنا شروع کیا تو غصے سے نازو کا چہرہ لال پڑ گیا "فائدہ مت اٹھاؤ پیچھے بیٹھ کے۔"

"فائدہ ایمان سے میں تو بڑے نقصان میں رہا" غالب صورت بنا کے بولا "آگے آ جاؤں پارو کی جگہ؟"

نازو نے ہاتھ پیچھے کی طرف گھمایا مگر غالب نے اپنے آپ کو بچا لیا۔ کسی قصور کے بغیر تھپڑ اے ایس پی کو پڑ گیا۔ وہ چونک کے ہم سب کی طرف مظلومیت سے دیکھنے لگا۔ سب ہنس رہے تھے۔

"یہ بھی ہوگا میرے ساتھ۔ کسی وجہ کے بغیر ذلیل کیا مجھے" اس نے مجروح لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "سوری۔ اس کا نشانہ غلط ہو گیا۔"

"جب برے دن آتے ہیں تو یہی ہوتا ہے" اس نے دیکھتے ہوئے کہا "کسی کی گالی یا گولی راستہ بدل لیتی ہے مجھ سے بھی ہو محفوظ رہتا ہے۔"

نازو نے کہا "اب بلاوجہ فلسفہ مت بولو۔ غلطی ہوئی میں معافی چاہتی ہوں۔"

اے ایس پی ایک خوش گوار حیرانی میں مبتلا ہو گیا۔

"مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ آخر یہ سب کیوں؟ جب تم لوگ [illegible] کیا حاصل ہوا ہے اب تک تمہیں؟"

"اب تک؟" میں نے کہا "حاصل کچھ نہیں ہوا مگر گنوایا بہت کچھ۔ تم بتاؤ تم جان کے کیا کرو گے؟"

"ٹھیک ہے کہ تم نے جبر کیا اور جان بچانے کے لئے میں نے تمہارا ساتھ دیا" وہ بولا "لیکن آہستہ آہستہ میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ تم کیا ہو۔ تم جنونی (FANATIC) ہو۔ کسی بھی مقصد کے سوال کو ایک مقدس فریضہ بنا لینے والے لوگ۔"

"ہم قانون کی نظر میں مجرم ہیں" غالب نے طنز سے کہا۔

"قانون کو تم مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ میں تمہیں مجرم نہیں سمجھتا" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں؟"

"تم کیا کر رہے ہو۔ صرف ڈاکے ڈال رہے ہوتے، قتل کرتے پھر رہے ہوتے گناہوں کو دولت کے لئے۔ حالاں کہ تمہارے لئے یہ بہت آسان ہے" وہ بولا "مجھے اختلاف ہو سکتا ہے تمہارے نظریات سے کیوں کہ ہمارے درمیان سیاسی اور ذہنی منافرت کے فاصلے ہیں لیکن اپنی اپنی جگہ تم بھی ٹھیک ہو اور میں بھی ٹھیک ہوں۔"

"سچ کے دو رخ [illegible] ہو سکتے۔"

"ہوتے ہیں۔ ساری دنیا میں ہوتے ہیں" اس نے اصرار کے ساتھ کہا "حریت پسند دہشت گرد، گوریلوں، ہلاک کر رہے ہیں، انھیں دہشت گرد اور تخریب کار کہتے ہیں۔ جو گوریلوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں ان کے لئے کہا جاتا ہے کہ بہادری سے ادائے فرض پر جان دے گئے۔ خود تمہاری خبروں میں کہا جاتا ہے کہ اتنے بھارتی ہلاک ہوئے اور اتنے مجاہدین شہید۔ آکاش وانی اس کے برعکس کہتا ہے۔ یہ بات تو محض جذبات کی ہے۔ میں تمہارا نقطہ نظر سمجھتا ہوں۔"

"اس سے تمہارے خیالات نہیں بدلیں گے۔"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ مگر ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے سے بھی بڑا فرق پڑتا ہے" وہ بولا "میں تمہاری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے تمہیں بے وقوف بنانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے واقعی تمہارے بارے میں زیادہ نہیں معلوم۔ تجسس ضرور ہے۔ اشتیاق رہنے سے راستہ کٹ جائے گا اور اعتبار ہو گا تو تشویش کم ہو گی۔"

گل نے اسے غور سے دیکھا "آخر تمہیں کیا ضرورت ہے تم ہم پر اعتبار کرنے کی؟ تم ہمارے دشمن ہو۔"

اس کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور سر پیچھے ٹکائے خاموش ہو گیا۔ کمار کلکتہ کے راستوں سے آشنا تھا۔ گاڑی انسانوں کے ہجوم، بازاروں اور سڑکوں کے اژدہام، ٹریفک کے ہنگاموں اور شور کے درمیان اپنا راستہ بناتی تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ مضافات کے ایک پمپ سے کمار نے پٹرول لیا اور ٹینک فل کرا لیا۔

کلکتہ کے مضافات کی کوئی حد نہیں۔ ایک کروڑ سے زائد انسانوں کو اپنی بے کراں وسعت میں سمیٹ لینے والے اس شہر نے بھی اپنی کم مائیگی اور کوتاہ دستی کا اعتراف کر لیا تھا۔ کارخانوں، ملوں اور فیکٹریوں، ورکشاپوں اور کاروباری اداروں، دفتروں اور دکانوں، کھوکھوں، ریڑھیوں اور غیر قانونی اور غیر اخلاقی دھندوں کے باوجود اس کی آدھی آبادی بھوک اور فاقہ کشی کے چنگل میں تھی۔ ان کے لئے روزگار نہیں تھا اور ان کے پاس بھی کوئی کام نہیں تھا جہاں آدمی اپنی عزت نفس، ڈگری اور انسانیت کو بھول کے بھی کچھ کما سکے۔ محنت کا کوئی مول نہیں تھا لیکن زندگی کی قیمت تھی۔ پورے پورے خاندان کھلے آسمان کے نیچے فٹ پاتھ پر پڑے رہنے کا حق حاصل کرنے کے لئے جمعدار کو بھاڑا اور پولیس کو بھتہ دیتے تھے مگر دوسری طرف فائیو اسٹار ہوٹل سے عالی شان محلوں تک ہر رنگ [illegible] عشرت کدوں میں رات جاگتی تھی، جگمگاتے فانوس بے حسی سے عصمتوں کے چراغوں کو بجھتا دیکھتے رہتے تھے۔ سچ گلی میں ایک نوٹ دیا کے لوٹنے والی عورت اپنے پیٹ کی اور اپنے پیٹ سے جنم لینے والے بچوں کی بھوک کا سامان مہیا کرتی تھی یا کسی معذور شوہر، بیمار باپ اور نشہ کرنے والے بھائی کے لئے اپنے جسم کو زندہ رکھتی تھی تاکہ وہ رات کو پھر قتل ہو سکے۔ سوکھی روٹی کھا کے نل کا پانی پینے والے مزدور سارا دن رکشا کھینچتے تھے، بھٹی جھونکتے تھے اور پتھر کوٹتے تھے تو خون تھوکتے تھے لیکن ان کے لئے کسی سرکاری ہسپتال میں رنگین پانی تک نہیں تھا۔ معصوم بچے ہر راہ گیر کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے اور کوڑے کچرے میں کچھ کھانے کے لئے تلاش کرتے تھے۔

یہ منظر دیکھ دیکھ کر پہلے میری روح کانپ اٹھتی تھی اور مجھے اپنے انسان ہونے پر شرمندگی کا احساس ہوتا تھا مگر رفتہ رفتہ میں بھی بے حسی کا شکار ہو گیا تھا۔ بمبئی سے کلکتہ تک کروڑوں انسانوں کی زندگی کا ایک ہی انداز تھا۔ میں نے اپنے لئے اس خیال میں پناہ تلاش کر لی تھی کہ انسان خود ہی انسانیت کی تذلیل کے ذمے دار ہیں، جو محلوں کے خواب دیکھتے ہیں اور فٹ پاتھوں پر بچے پیدا کرتے ہیں۔ کیوں غلام کرتے ہیں وہ اپنی مجبوریوں کا اور کیوں استحصال کی بنیادیں مضبوط کرتے ہیں۔ ایک روٹی کو عزت پر ترجیح کیوں دیتے ہیں؟ وہ خودی کو بلند کیوں نہیں رکھتے!

جہاں یہ عبرت کا مقام تھا وہیں شکر کا بھی کہ میرے وطن میں ہزار خرابیاں دیکھنے والوں نے بھی کراچی یا لاہور کی فٹ پاتھ پر زندگی کی یہ رسوائی نہیں دیکھی ہوگی۔ غربت اور افلاس کی اس انتہا کا یہ تصور ابھی وہاں ناپید ہے۔ خاندانوں کو ایک چھت کا سایہ ضرور میسر ہے، خواہ وہ کسی جھگی کی چھت ہو یا کچے گھروندے کی، اور کھانے کو ایک وقت روکھی سوکھی ضرور ملتی ہے مگر عزت کے

www.paksociety.com

ساتھ۔

کار سڑک پر دوڑتی جا رہی تھی اور میں خیالات کے صحرا کی بادِ سموم میں کسی تنکے کی طرح اُڑ رہا تھا۔ سڑک پر آگے پیچھے سینکڑوں گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ کناروں پر سائیکلوں اور رکشاؤں کی قطار چل رہی تھی اور آدھے ادھورے لباس میں سوکھے کالے جسموں والے مرد اور عورتیں ننگے پاؤں چل رہے تھے۔ وقفے وقفے سے فوجی گاڑیاں گزرتی تھیں تو وہ سہم کر اور دور ہو جاتے تھے۔ ایک جگہ سامنے سے آنے والے ملٹری کانوائے کے دیو ہیکل ٹرک نے سائیکل رکشا میں سوار ایک مسافر کو کچل دیا تھا۔ رکشا والا زخمی ہونے کے باوجود اپنے ختم ہو جانے والے ذریعہ معاش کو رو رہا تھا اور مُردہ مسافر کی طرف بالکل متوجہ نہ تھا۔ کانوائے رکے بغیر گزر گیا تھا۔ میں نے بھی یہ دیکھنے اور جاننے سے عملاً اجتناب کیا تھا کہ اس کے پچھلے حصے میں جنگی قیدی کون تھے۔

سڑک بہت کشادہ اور تیز رفتاری کے لئے موزوں تھی مگر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ملٹری پولیس ٹریفک کو کنٹرول کر رہی تھی۔ سڑک کا ایک حصہ فوجی گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے وقف کر دیا گیا تھا چنانچہ آمنے سامنے سے آنے والی دوسری گاڑیاں نصف حصے کو استعمال کر رہی تھیں۔ کوئی ملٹری والوں سے یہ نہیں پوچھ رہا تھا کہ انہوں نے آدھی سڑک پر کیوں قبضہ کر رکھا ہے۔ کوئی اپنے شہری حقوق اور قانون کی بات نہیں کر رہا تھا۔ سب جانتے تھے کہ جنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو یہ جانتے تھے کہ جنگ کہاں اور کیوں ہو رہی ہے وہ اپنی سینا کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ انگلیوں سے وی کا نشان بناتے تھے اور ہاتھ ہلاتے تھے۔ ظاہر ہے اس سے "فاتح" فوج کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں اور انداز میں غرور آ جاتا تھا۔ ہم سب جو کار میں خاموش بیٹھے تھے ایک سے کرب و عذاب خیالوں میں مبتلا تھے اور وہ سب دیکھنے پر مجبور تھے جو ہم کبھی تصور میں بھی دیکھتے تو ناممکن سمجھتے اور شرمسار ہوتے کہ آخر ہمارے ذہن میں ایسا گھٹیا کیوں خیال کیوں آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان الگ ہو کے بنگلہ دیش بن جائے اور ہماری فوج محصور ہو کے ہتھیار ڈال دے۔ وہ بھی بھارتی فوج کے سامنے۔ اس نظارے سے خوشی حاصل کرنے والا صرف اے ایس پی تھا جو اب سکتے سے زیادہ چاق و چوبند بیٹھا تھا۔ اسے ہماری صورتوں پر اذیت دیکھ کر وہی مسرت مل رہی ہو گی جو اس کی ذلت پر ہم نے محسوس کی تھی۔ تاہم وہ خوف کی وجہ سے نہ سیاسی صورت حال پر بات کر رہا تھا اور نہ اپنی خوشی کا اظہار۔ کمار بھی بھارتی تھا مگر وہ جذباتی طور پر کسی کے ساتھ نہیں تھا۔ اس کا سارا مسئلہ ذاتی تھا۔

ایک گھنٹے بعد ہم نے صرف تیس کلومیٹر طے کئے۔ اس سے اگلے گھنٹے میں چالیس۔ مضافات سے گزرنے کے بعد تیسرے گھنٹے میں پچاس کلومیٹر کے بعد کمار نے گاڑی کو بائیں جانب موڑ لیا۔ اب دو بج چکے تھے۔ سائڈ روڈ پر ٹریفک نسبتاً کم تھی اور ملٹری کی مداخلت بھی نہ تھی چنانچہ کمار نے خطرناک حد تک تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا اور بیس منٹ بعد کار کو ایک قصبے کا بازار ختم ہونے پر روک لیا۔ اس وقت تک ہم مین روڈ سے چالیس کلومیٹر دور آ چکے تھے۔

"ہم یہاں کھانا کھائیں گے۔" کمار بولا "اس کے بعد تم راستے پر واپس چلے جاؤ گے۔"

"اور تم؟" نازو نے کہا۔

"میں آگے جاؤں گا۔ پارو کے ساتھ۔ یہاں سے دریا دور نہیں ہے۔ شام تک میں پار اتر جاؤں گا۔" وہ گاڑی سے اترتے ہوئے بولا۔

"یعنی تم نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا؟" میں نے کہا۔

وہ ہنسا "کچھ فیصلے ہی ایسے ہوتے ہیں۔ ناقابلِ تنسیخ۔"

غالب نے کہا "کیا پارو کی محبت بھی ایسا ہی فیصلہ ہے؟"

کمار نے سر ہلایا "ابھی تک تو ہے۔"

"گویا تمہیں آئندہ کا یقین نہیں؟" میں نے کہا۔

اس کے جواب دینے سے پہلے پارو نے کہا "کمار! ارادہ بدل دو۔"

کمار چونکا "کون سا فیصلہ؟"

"انتقام کا۔"

کمار نے تلخی سے سر ہلایا "مجھے دھمکی مت دینا پارو۔"

پارو نے اداسی سے کہا "تم تو خود ہی کہتے تھے..... تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔"

"ہاں۔ مگر مر تو سکتا ہوں۔ سب کو مارنے کے بعد، معلوم بھی نہیں ہو گا....."

"ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر مت۔ ان کے ساتھ چلی جا۔ میں زندہ رہا تو آ جاؤں گا ورنہ صبر کر لینا۔ یہاں رونے دھونے کا ڈراما مت کرنا۔ ہوں' سب اپنی زندگی سے بڑھ کر کسی کو نہیں چاہتے۔ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ماں باپ بھی جوان اولاد کا صدمہ سہہ جاتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں۔ میاں بیوی کا ساتھ چھوٹ جائے تو ساری عمر کوئی اکیلا نہیں رہتا۔ دوسرا ساتھی مل جاتا ہے۔"

گل نے کہا "اتنے بے رحم مت بنو۔"

میں نے کہا "اور ایسا ہی ہے تو تم وقت کو موقع دو، تم بھی رکمنی کے قتل کو بھول جاؤ گے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اس وقت سے پہلے ہی مجھے بدلہ لینا ہے ورنہ بعد میں میرا خون سفید ہو جائے گا۔ میری مثل یا کرنے لگے گی۔ خدا کے لئے میری راہ میں دیواریں نہ کھڑی کرو۔ جاؤ اپنی اپنی زندگی کے راستوں پر۔" وہ ایک دم کھڑا ہوا۔

ہم سب سڑک کے کنارے اس ریسٹورنٹ کے اندر پہنچے اور انتظار کر رہے تھے کہ بیرا ہماری طرف متوجہ ہو۔ میں نے کمار کا ذکر کیا تو آواز اچانک بلند ہو گئی تھی۔ کچھ لوگوں نے سر گھما کر اسے دیکھا پھر پارو اس کے پیچھے لپکی۔

"یہ تو پاگل ہو گیا ہے۔" غالب نے اردو میں کہا اور ایک بار پھر بیٹھے والوں نے ہماری طرف دیکھا۔

"جاؤ اسے پکڑ کے لاؤ" میں نے کہا "اچھا ٹھہرو، میں خود جاتا ہوں۔" پارو اسے روکنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ کمار اس سے ہاتھ چھڑا کے باہر نکل گیا تھا۔ نازو اور گل دکھی نظر آنے لگی تھیں۔

میں نے ریسٹورنٹ سے باہر آ کے ادھر اُدھر دیکھا مگر کمار تو چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ بنگال میں پردے کا رواج نہیں ہے چنانچہ ہر جگہ مرد اور عورتیں ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ بسیں، بازاروں میں اور دکانوں میں۔ کسی نے کسی عام عورت کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ گل اور نازو کو سب نے دیکھا تھا مگر پارو کا کسی نے بھی نوٹس نہیں لیا تھا۔ میں نے بہت سے افراد سے پوچھا جو وہاں موجود تھے۔ صرف ایک نے بتایا کہ ایک مرد کے پیچھے جو عورت روتی ہوئی دوڑی تھی وہ اس کے ساتھ گھاٹ کی طرف جانے والی ٹیکسی میں بیٹھ گئی تھی۔ ٹیکسی وہاں اس رکشا کو کہتے تھے جس کے تین پہیے ہوتے تھے اور اس میں ڈرائیور کے علاوہ چھ افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی تھی مگر آٹھ دس آسانی سے سفر کرتے تھے۔

میری اُردو اور میرا لب و لہجہ ایک منفی اور ناپسندیدہ تاثر کو جنم دیتا تھا۔ لوگ بے رُخی اور کسی حد تک جارحانہ بے اعتنائی کے ساتھ جواب میں "جانا نہیں" کہتے تھے یا منہ پھیر لیتے تھے۔

مجھے کمار کے متعلق بتانے والا بنگالی نہیں تھا مگر "ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد" کے مصداق وہ بھی مجھے معاندانہ نظروں سے گھور رہا تھا۔

میں نے کہا "گھاٹ کتنی دور ہے؟"

"پانچ میل" اس نے پنجہ پھیلا کے کہا۔

"یہاں تو مجھے کوئی ٹیکسی نظر نہیں آ رہی ہے۔"

"آئے گی۔ اُدھر سے آئے گی۔" اس نے بڑی سڑک کی طرف اشارہ کیا اور پلٹ کے نہ جانے کدھر روانہ ہو گیا۔

میں مایوس ہو کے اندر لوٹ آیا۔ میز پر دال چاول اور مچھلی کا شوربے والا سالن رکھے ہوئے تھے لیکن کسی نے بھی ابھی تک کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ سب بے چینی سے میری واپسی کے منتظر تھے۔ مجھے اکیلا واپس آتا دیکھ کر ان کی صورتوں پر مایوسی اور فکر کا تاریک سایہ پھیل گیا۔

"کیا ہوا؟ وہ آئے نہیں؟" نازو نے کہا۔

"نازو میں تھک کر بیٹھ گیا" "وہ ملے ہی نہیں۔ مل جاتے تو میں لے آتا۔"

غالب نے کہا "اتنی جلدی کہاں نکل گئے۔ اور کیسے؟"

"اتفاق یا بدقسمتی۔ مین روڈ کی طرف سے کوئی ٹیکسی رکشا آ کے رُکا ہی تھا کہ کمار سیدھا اس میں بیٹھ گیا۔ ظاہر ہے پارو کچھ نہیں کر سکتی تھی اس کے ساتھ روانہ ہو جانے کے سوا۔"

گل نے کہا "معلوم تو کرتے وہ کہاں گئے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ گھاٹ کی طرف گئے ہیں۔ گھاٹ پانچ میل دور ہے۔ سڑک کی طرف سے دوسرا کوئی رکشا نہیں آ رہا تھا۔"

"تم گاڑی لے جاؤ" غالب نے کہا۔

میں نے چڑ کے کہا "کیوں؟ کیا فائدہ اس کے پیچھے جانے سے؟ کیا وہ آ جائے گا واپس؟ چھوڑو اس کا خیال۔ اس پر دیوانگی طاری ہے۔ اسے کوئی نہیں سمجھا سکتا۔ کھانا کھاؤ اور چلو۔"

نازو نے کہا "مجھے بھوک نہیں ہے۔"

اے ایس پی بولا "آگے شاید کچھ نہ ملے کھانے کو۔ شام تک یا رات تک۔"

گل نے کہا "تم کھا لو۔ ہم کھانا ساتھ لے لیں گے۔"

غالب نے افسوس سے سر ہلایا "سب کچھ چھوڑ گیا ہمارے پاس۔ خالی ہاتھ نکل گیا۔"

"کم سے کم اسلحہ تو ساتھ لے جاتا" میں نے کہا "اور یہ سونا....."

"یہ منحوس سونا پھر ہمارے پاس رہ گیا؟" نازو نے بگڑ کے کہا۔

میں نے کہا "آہستہ بولو۔ لوگ سن رہے ہیں۔"

اے ایس پی ہماری باتوں پر حیران ہو رہا تھا۔ انتقام۔ اسلحہ۔ سونا۔ یہ سب باتیں اس کی سمجھ میں کچھ آ رہی تھیں کچھ نہیں مگر وہ خاموشی سے کھانے میں لگ گیا تھا۔ اس کا رویہ کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ جب میری سنتے نہیں' مانتے نہیں اور مجھے کچھ بتاتے نہیں تو بھاڑ میں جاؤ۔ اس نے ایک دفاعی رویہ اپنا لیا تھا کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ نہ خود مرنے کی ضرورت ہے نہ مرنے سے ڈرنے کی۔

ہم نے لوگوں کی پروا کئے بغیر کھانا ساتھ لیا اور پیسے ادا کر کے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ مجموعی صورت حال ہمارے خلاف نہیں تھی تو ہمارے حق میں بھی نہیں تھی۔ کسی بھی وقت کوئی بات ہماری سلامتی کو خطرے میں ڈال سکتی تھی۔ ابھی تک اے ایس پی کی موجودگی نے سب کو دور رکھا تھا مگر وہ خود موقعے سے فائدہ اٹھا کے لوگوں کے ساتھ مل جاتا تو ہمارے لئے قتلِ عام کرنا ناگزیر ہو جاتا۔ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں چاہتا تھا۔

اب ڈرائیونگ غالب نے سنبھال لی تھی۔ اس کے ساتھ گل بیٹھ گئی تھی اور پچھلی سیٹ پر میں نے اور نازو نے دونوں طرف سے اے ایس پی کے فرار کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔

"جیسے بھی ہو کمار تک پہنچنے کی کوشش کرو" نازو نے حکم دیتے ہوئے کہا "گھاٹ اگر پانچ میل دور ہے تو ہم اسے پکڑ لیں گے۔ دریا پار جانے سے پہلے۔"

www.paksociety.com

کوئی فائدہ نہیں" غالب نے کہا۔

"کوشش کیے بغیر ایسا مت کہو۔ وہ مل گیا تو......"

"تو کیا ہوگا؟ کیا وہ واپس آجائے گا یا سر تسلیم خم کردے گا تمہارے سامنے؟" غالب نے بگڑ کے کہا "اپنی بہن کے قاتلوں کو ٹھکانے لگائے بغیر اس کا دماغ ٹھکانے نہیں آئے گا۔ اس کے پاگل پن کا یہی علاج ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس پاگل پن پر وہ اپنا سب کچھ قربان کرسکتا ہے۔ پارو کو بھی۔"

"خدا کرے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو" گل بولی۔

"یہ دعا ہے یا بددعا؟" غالب نے کہا۔

"بددعا کیوں؟"

"یعنی تم کہہ رہی ہو کہ خدا کرے وہ سب کو قتل کردے۔"

میں نے کہا "دشمنوں کو مارنا بہادری ہے۔"

نازو نے کہا "معاف کرنا اس سے بھی بڑی بہادری کی بات ہے۔"

"ہاں۔ مگر ہر شخص اتنا بہادر کیسے ہوسکتا ہے۔ ہم سب اپنی فطرت کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ ہماری مجبوریاں اور کمزوریاں، خوبیاں اور خامیاں الگ ہیں۔ کمار بھی عام آدمی ہے جو ولی نہیں ہوتا کہ نفرت اور عداوت، بغض اور کینہ جیسے سفلی جذبات سے یکسر بیگانہ رہے۔ جب تک انتقام کی آگ اسے جلاتی رہے گی وہ اپنے مستقبل کی آسودگی، کامیابی اور خوش حالی کے بارے میں کیسے سوچے گا؟ اس کی نظر تو جتنی کے عذاب ناک خواب دیکھتی رہے گی۔"

غالب نے کہا "کیا انتقام لینے کے بعد اسے سکون مل جائے گا؟ کہیں وہ پشیمانی کے عذاب میں نہ مبتلا ہوجائے۔"

"کچھ بھی نہیں ہوگا" نازو نے دکھ اور غصے کی تلخی کے ساتھ کہا "تم لوگ بلاوجہ بحث کررہے ہو۔ قسمت نے ساتھ دیا تو وہ بچ کے نکل جائے گا اور پھر ساری عمر بھاگتا رہے گا۔ کبھی آباد نہیں ہوگا۔ ورنہ مارا جائے گا۔ ہمیں معلوم بھی نہیں ہوگا۔"

ہم سب خاموش ہوگئے۔ نازو نے غلط نہیں کہا تھا۔ کمار کی زندگی کا راستہ بدل گیا تھا۔ وہ کچھ تھوڑے سے وقت کے لیے ہمارا شریک سفر رہا مگر اس گزرے ہوئے وقت کے خیال کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ اس کے بارے میں سوچنا بے کار تھا۔

اگلے تین گھنٹے کے سفر میں راستہ زیادہ دشوار ہوگیا۔ اچانک کوئی دریا ہماری راہ میں حائل ہوجاتا تھا۔ ہمیں سڑک چھوڑ کے دریا کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا تھا اور کسی پل کی تلاش میں میلوں تک دائیں بائیں جانا پڑتا تھا۔ ہم کئی بار راستے سے بھٹکے اور لوگوں نے ہمیں آگے جانے کا نیا راستہ بتا دیا۔ اس علاقے میں سڑکوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ جتنے جنگل اور ندی نالوں کی اس سرزمین پر کار کے ذریعے سفر کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ بسوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے تھے۔ کوئی ندی آتی تھی وہاں سے مسافر کشتی یا لانچ سے ندی عبور کرتے تھے اور اسی طرح کہیں خشکی پر اور کہیں پانی پر کشتیوں میں مسافت طے کرنا عام معمول تھا [illegible] تھے۔

رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو ہم قریب ہونے کے باوجود منزل سے بہت دور تھے۔ مشرقی اور مغربی بنگال کی سرحد اور اس کے بعد کھلنا، باریسال اور نارائن گنج تک رسائی ہماری توقعات سے کہیں زیادہ مشکل کام ثابت ہو رہا تھا۔ [illegible] سب کا برا حال تھا۔ یہ خوف اس کے علاوہ تھا کہ سرحدی محافظوں کی نظر میں نہ آجائیں کہاں کب [illegible] میں ہمارے سوا کوئی نہ تھا۔ گاؤں تو بہت تھے مگر ابھی راستے پر کوئی ایسا قصبہ نہیں آیا تھا جہاں ہم آرام کرسکتے۔ بنگال کے گاؤں بھی مختلف تھے۔ بانس، ناریل اور پھوس کے جھونپڑوں کی کسی بھی آبادی میں ہمیں ایک زبان نہیں ملا۔ ظاہر ہے وہاں ہمارے رکنے کا کوئی سوال نہ تھا۔

نازو اور گل پر گھبراہٹ سوار تھی۔ خود میں بے یقینی کا شکار تھا۔ ہمیں راستہ بتانے والا ایک ہی شخص ہمارا قیدی اے ایس پی تھا۔ ہم اس کی راہنمائی پر بھروسا تو کیا کرتے۔ اگر وہ ہمیں غلط راستوں پر لے جاتا تو ہم زیادہ سے زیادہ اس کی جان لے سکتے تھے مگر اس سے منزل تک پہنچنا مشکل ہوجاتا۔ وہ خود بھی موت سے نہ ڈرتا تو یہ اس کی بہادری تھی اور یوں مفاد ہی کے رشتوں نے ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت بنا دیا تھا۔

آخرکار ایک ندی کے کنارے غالب کا حوصلہ جواب دے گیا۔

"مجھ میں اب ہمت نہیں ہے جنگل میں بھٹکنے کی" وہ اتر کے قدرتی گھاس کے ایک قطعے پر دراز ہوگیا "بہتر ہے اسی جگہ فوت ہوجاؤں۔"

میں نے کہا "آپ چاہیں تو باعزت طور پر ابھی جان دے سکتے ہیں۔ ندی میں چلو بھر پانی کافی ہے۔"

"ہم سب کو واقعی ڈوب مرنا چاہیے شرم سے" گل نے گھاس کا ایک تنکا چباتے ہوئے کہا "جس نے [illegible] کر لیڈرشپ کیا ہوتی ہے، نہ راستوں کا پتا [illegible]"

گل نے قریب بیٹھ کے کہا "آخر اب کتنی دور ہے؟"

میں نے کہا "صوبہ سرحد مغربی پاکستان میں ہے۔ کلکتہ یہاں سے۔"

نازو اپنے ساتھ اے ایس پی کو لے آئی تھی "تم بتاؤ یہ چکر کیا ہے؟ تم کہاں لے آئے ہو ہمیں؟"

اے ایس پی مسکرایا "میں؟ میں لایا ہوں آپ کو۔ نہیں بالکل آپ سب مجھے لائے ہیں یہاں۔ زبردستی۔"

میں نے کہا "ہم ڈھاکا سے اب کتنی دور ہیں؟"

غالب نے سر ہلایا "تم نے جو فاصلہ بتایا تھا اگر ہم نے طے کرلیا ہے لیکن ابھی تو کھلنا یا باریسال بھی نہیں پہنچے ہیں ہم۔"

اے ایس پی آرام سے ہمارے قریب بیٹھ گیا "ہم ہائی وے پر نہیں جا رہے ہیں۔ جس راستے سے میں تمہیں لے جا رہا ہوں وہ لمبا ضرور ہے لیکن محفوظ ہے۔ میں اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ سرحدی اور حفاظتی چوکیاں کہاں کہاں ہیں۔ کہاں بھارتی فوج سے مڈبھیڑ کا امکان ہے اور کہاں پاکستانی فوج ہوسکتی ہے۔ اس راستے پر نہ کھلنا آئے گا نہ باریسال۔ یہ اسمگلروں کا راستہ ہے۔ چور راستہ۔ صبح تک میں تمہیں ڈھاکا پہنچا دوں گا۔ اگر خلاف توقع کسی نے ہمارا راستہ نہ روکا تو۔ لیکن۔"

"جنگل کیا؟" میں نے کہا۔

"اب اس کار کو چھوڑ دو۔ اسی جگہ۔" وہ بولا۔

"کار کو چھوڑ دیں؟" نازو نے کہا۔

"یہاں سے پیدل چلیں؟" گل نے سہم کے کہا "جنگل میں رات کے وقت!"

اے ایس پی نے کہا "رات کو سفر کرنے میں خطرہ کم ہے لیکن آپ لوگ تھک گئے ہیں تو ٹھیک ہے صبح تک رک جاتے ہیں۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا "یہاں رکنے میں کوئی خطرہ ہے؟"

اے ایس پی نے کہا "ہاں۔ رات کو گشت کرنے والے فوجی کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔ وہ دریا کے کناروں پر نظر رکھتے ہیں۔"

"کیا تم انہیں مطمئن نہیں کرسکتے؟" نازو بولی۔

"میں کوشش ضرور کروں گا لیکن وہ مطمئن نہ ہوئے تو سب کو پکڑ کے لے جائیں گے" اے ایس پی بولا "ہماری پوزیشن...... میرا مطلب ہے تمہاری پوزیشن پہلے ہی مشکوک ہے۔ میں تو اپنی شناخت کرادوں گا اور بچ جاؤں گا۔ تم کیا کروگے؟"

"تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے ہمیں؟" میں نے کہا۔

"کار میں سفر کرنا ایک بنیادی غلطی تھی" وہ بولا۔

"یہ بات تم نے روانگی سے پہلے کیوں نہیں کی؟" غالب نے بگڑ کے کہا۔

"اگر میں تمہیں منع کرتا تو کیا تم مان جاتے؟" اے ایس پی نے کہا "تم سمجھتے میں چکر دے رہا ہوں۔ ابھی تک اعتماد حاصل نہیں کرسکا ہوں میں حالانکہ......"

میں نے کہا "چھوڑو یہ بات۔ ہم کار میں نہ آتے تو کیا ہوائی جہاز سے سفر کرتے؟"

"اس خطے میں سڑکیں بہت کم ہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دریا ہیں اور ندی نالے ہیں۔ اگر تم عام لوگوں کی طرح بس سے سفر کرتے، جہاں ندی آتی کشتی میں سوار ہوجاتے، پھر بس پکڑ لیتے۔ تو آٹھ دس گھنٹے میں ڈھاکا پہنچ جاتے۔ عام حالات میں۔ آج کل سرحد کے اس طرف سے دوسری طرف جانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ایک طرف پاکستانی فوج ہے، دوسری طرف بھارتی فوج۔ سرحد پار کرانے والے ایجنٹ مخصوص مقامات سے دریا پار کراتے ہیں یا سندربن کی طرف سے لے جاتے ہیں۔ یہ ایک دن کا نہیں کئی دن کا سفر ہے۔ لیکن میں تمہیں محفوظ اور مختصر ترین راستوں سے یہاں تک لے آیا ہوں۔ ایک زمانے میں میری پوسٹنگ اسی علاقے میں تھی۔ مجھے دن رات اسمگلروں کا تعاقب کرنا پڑتا تھا، اس لیے مجھے سارے راستوں کا علم ہے۔ اس سے آگے کار جا ہی نہیں سکتی۔ جنگ نہ ہوتی تو میں کار سمیت تم کو فیری میں سوار کرا دیتا اور کنارے پر اترتے ہی تم پھر سڑک پر رواں ہوجاتے مگر ان راستوں پر آج کل کوئی بھی نہیں جا سکتا۔ لانچ اور فیری سروس بند ہے۔ کشتیاں بند ہیں اور کشتی بان تک دور دراز مقامات سے چوری چھپے مسافر اٹھاتے ہیں۔ ایجنٹ یہی کام جیسے لے کر رہے ہیں جو تم مجھ سے زبردستی کروا رہے ہو۔ وہ ایک آدمی کو سرحد پار کرانے کے دس ہزار تک لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا تم معاوضہ طلب کررہے ہو؟"

نازو نے اچانک سونے کی وہ پوٹلی اس کے سامنے رکھ دی جو کمار چھوڑ گیا تھا "یہ لو۔ معاوضہ۔ ہم نقد تو نہیں دے سکتے مگر یہ کافی ہونا چاہیے تمہیں......"

اے ایس پی نے حیرانی سے پوٹلی کو دیکھا "اس میں کیا ہے؟"

"خالص سونا" نازو بولی "یہ سب تم کو مبارک ہو۔"

"یہ وہی سونا ہے نا جس کو تم نے منحوس قرار دیا تھا؟" اے ایس پی بولا "پھر میرے حق میں یہ مبارک کیسے ثابت ہوسکتا ہے؟ اسے اپنے پاس رکھو۔ تمہارے کام آئے گا۔"

"تم ڈرتے ہو اس سے؟" غالب نے کہا۔

اے ایس پی بولا "میں بتا چکا ہوں کہ میرا کام اسمگلروں کو پکڑنا تھا۔ ایسا کئی بار ہوا کہ بارڈر سیکیورٹی فورس والوں نے سونے کی اسمگلنگ کرنے والوں کا راستہ روکا۔ انہوں نے سیروں کے حساب سے سونا ضبط کیا......"

"جو تم نے نہیں لیا" نازو نے طنز کیا "کیوں کہ تم ایک بہادر، فرض شناس اور ایمان دار افسر تھے۔"

اے ایس پی ہنسنے لگا "نہیں۔ میں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ میں نے رشوت میں سونا لیا اور اسمگلروں کے راستے سے ہٹ گیا۔ آٹھ دس سیر سونا ضرور ہوگا میرے پاس مگر کیا وہ سونا میری جان بچا سکتا ہے اس وقت؟" اس نے نفی میں سر ہلایا "تم نے سونے کا انڈا دینے والی مرغی کی کہانی سنی ہوگی۔ کیا سونے کا انڈا اس مرغی کی جان بچا سکا تھا؟ نہیں۔ مرغی اپنی جان سے گئی تھی

www.paksociety.com

لیکن اس کا بے وقوف مالک یقیناً کافی امیر ہو گیا تھا۔ وہ مرغی پہلے تو اسے ہر روز سونے کا ایک انڈا دیتی رہی تھی......"

میں نے کہا "فضول باتوں کے لئے وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔"

غالب نے سونا اٹھا کے پھر نازو کو تھما دیا "اسے سنبھال کے رکھو۔"

نازو نے اسے نیچے پھینک دیا "مجھے نہیں چاہئے یہ منحوس سونا"

غالب نے ہنس کے کہا "کیا چیز منحوس ہے اور کیا مبارک' یہ فیصلہ تم کیسے کر سکتی ہو؟ اپنی ناقص عقل کے ساتھ قدرت کی کسی مصلحت کو سمجھنے کی کوشش بھی مت کرو۔ کیا پتا اس میں ہمارے لئے بھلائی ہو۔"

اے ایس پی نے کہا "اب اس سے پہلے کہ گشتی دستے یہاں پہنچ جائیں' اس کار کو غائب کر دو۔"

"ہم میں سے کوئی جادوگر نہیں ہے" غالب نے کہا۔

"اسے دریا میں اتار دو۔ یا واپس لے جا کے جنگل میں چھپا دو" اے ایس پی بولا "اگر رات کو قیام کا ارادہ ہے تو پھر اسی میں لوٹ جانا بہتر ہو گا۔ کنارے سے میل ڈیڑھ میل دور ہم جنگل میں رات گزار کے صبح بھی روانہ ہو سکتے ہیں۔"

"مگر تم نے کہا تھا کہ رات کا سفر ہی محفوظ ہے"

"ہاں۔ لیکن دن میں سفر آسان ہو گا۔ اس وقت دریا پار کرنے کے لئے کشتیاں نہیں ملیں گی۔ اور دریا پار کر لیا تو بس سروس نہیں ملے گی" اے ایس پی نے کہا "صبح ہم کسی ایجنٹ کو پکڑیں گے اور عام لوگوں کی طرح سفر کریں گے۔"

"مگر ہم عام لوگ نہیں ہیں۔ ہم تو یہاں کی زبان تک نہیں جانتے" میں نے کہا "آخر تمہاری یہ وردی کب کام آئے گی؟"

"جب اس کی ضرورت پڑے گی" وہ بولا۔

گل اور نازو میں پیدل سفر کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ انہوں نے صبح تک قیام کے فیصلے کی تائید کی۔

"خواتین!" غالب نے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ سندربن کا علاقہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے؟"

اے ایس پی نے سر ہلایا "ہم اس علاقے کو چھوتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ چند میل کا فرق ہے۔"

نازو نے کہا "جنگل تو یہ بھی ہے۔"

غالب بولا "مگر سندربن میں شیر ہوتے ہیں۔ اصلی' آدم خور شیر۔ ان کے بارے میں جم کاربٹ نے کتنی کہانیاں لکھی ہیں۔"

"کہانیوں کے شیر تو پتا نہیں گھر کے شیر سے بھی کم خطرناک ہوتے ہیں۔" نازو نے کہا

"چلو ٹھیک ہے۔ ہمارا کام تو خبردار کرنا تھا۔ جب کوئی شیر اٹھا کے لے جائے گا تو پتا چلے گا۔"

"شیر مجھے کیوں اٹھائے گا؟ گوشت تم پر زیادہ ہے۔"

"اگر حسن پرست شیر ہوا تو......"

میں نے کہا "چلو اٹھو۔ آج رات اسی جنگل میں بسیرا ہو گا۔ واپس چلتے ہیں۔"

غالب نے اٹھتے ہوئے کہا "مجھے تو بھوک بھی لگ رہی ہے۔"

نازو نے کہا "یہاں جو ملے وہ کھا لو۔ جنگل کے پھل پھول' پتے' گھاس' ٹھنڈی ہوا' حشرات الارض یا جو بھی جانور ہاتھ لگے۔ اور کچھ نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" غالب نے فریاد کی "رات بھر بھوکے پیاسے رہیں گے ہم؟"

"پیاسے بہرحال نہیں رہو گے" نازو بولی "بہتا دریا ہے۔ جا ہو پانی پیو۔ براہ راست منہ ڈال کے۔"

"تم بھی میرے ساتھ پیو تاکہ شیر بکری کے ایک گھاٹ پانی کا محاورہ سچ ہو جائے" غالب نے کہا۔

ابھی ہم نے کار کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ ایک طرف سے ہم پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ درختوں کے پیچھے سے ساتھ چھ فوجی نمودار ہوئے اور انہوں نے ہر طرف سے محصور کر لیا۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جن کا رخ ہماری طرف تھا۔

کسی نے انتہائی کرخت لہجے میں کہا "ہالٹ۔"

میں نے غالب کو اشارہ کیا اور ہم سب نے اپنے ہاتھ اٹھا لئے۔ وہ سب اتنی خاموشی سے آئے تھے کہ ہمیں پتا نہیں چلا تھا یا ہم اپنی باتوں میں ایسے محو تھے کہ ان کے قدموں کی آہٹ نہیں سن پائے تھے۔ ہم نے باتوں میں وقت نہ ضائع کیا ہوتا تو شاید ان کے آنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل جاتے۔ مگر فوراً اے ایس پی کے ساتھ پوزیشن لے لی تھی اور میرا ہاتھ بھی تھا۔ ساتواں آدمی چند سیکنڈ کے وقفے سے نمودار ہوا۔ وہ نوجوان لیفٹیننٹ تھا اور اس کی عمر پچیس چھبیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ نئی افسری کے زعم میں وہ خاصا اکڑ کے چل رہا تھا' گویا گارڈ آف آنر کا معائنہ کرنے کے انداز میں قدم اٹھا رہا تھا۔

قریب آ کے اس نے باری باری ہم سب کی صورتوں کا معائنہ کیا۔ پھر اس کی نگاہ کار پر گئی۔ ڈپلومیٹک نمبر پلیٹ پڑتے ہی اس کی صورت کے تاثرات بدل گئے۔

اس نے انگریزی میں کہا "یہ کیا سلسلہ ہے؟ کون ہو تم آخر؟"

میں نے موقعے سے فائدہ اٹھا کے ہاتھ نیچے کر لئے اور فرانسیسی بولنی شروع کر دی۔ لیفٹیننٹ کی آنکھوں میں الجھن نمودار ہوئی۔

"یہ کیا مصیبت ہے! مجھے فرنچ نہیں آتی۔ کیا تم انگریزی میں بات نہیں کر سکتے؟" اس نے غالب کی طرف دیکھا اور اے ایس پی کی وردی کو "تم...... تم انڈین پولیس آفیسر ہو؟"

"ہاں۔ اور میرا رینک وہی ہے جو تمہارا" اے ایس پی نے کہا "اپنے ہاتھوں سے کہو کہ خود کو بلاوجہ نہ تھکائیں۔ ان توپوں کا رخ آسمان کی طرف کر لیں۔ غیر ملکیوں کے کچھ حقوق ہوتے ہیں"

لیفٹیننٹ کا چہرہ سرخ پڑ گیا لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور جوانوں سے کہا کہ وہ رائفلیں نیچی کر لیں "تم ان کے ساتھ کیا کر رہے ہو یہاں؟"

"یہ لوگ راستے سے بھٹک گئے تھے۔ میں ان کو واپس ڈھاکا پہنچانا چاہتا ہوں۔"

"یہ لوگ ڈھاکا سے آئے ہیں؟" لیفٹیننٹ کی حیرانی بڑھ گئی "مجھے یہ لڑکیاں تو غیر ملکی نہیں لگتیں۔"

"یہ مولیعد انڈین ہیں مگر سفارتی عملے میں شامل ہیں۔" اے ایس پی بولا۔

لیفٹیننٹ نے پھر نازو اور گل کو دیکھا "تم کیا کرتی ہو؟ نام کیا ہے تمہارا......؟"

"میرا نام اوشا ہے" نازو نے انگریزی میں جواب دیا "میں فرسٹ سیکریٹری کی اسٹینو ہوں اور یہ آشا ہے میری بہن۔ یہ سیکنڈ سیکریٹری کے ساتھ ہے۔"

"گویا یہ دونوں تمہارے باس ہیں جن کے ساتھ تم جنگل میں منگل منا رہی ہو؟" لیفٹیننٹ اب اردو بولنے لگا۔

"یہ ہمارے باس نہیں ہیں" نازو نے درشت لہجے میں کہا "خواہ مخواہ وہ باتیں فرض مت کرو جن سے یہ ظاہر ہو کہ تم کسی عورت کو قابل عزت نہیں سمجھتے۔ جو پوچھنا ہے وہ پوچھو۔"

لیفٹیننٹ کی طنزیہ مسکراہٹ غائب ہو گئی "مجھے یہ دونوں بھی غیر ملکی نہیں لگتے۔"

"پھر میں کیا کر سکتی ہوں؟" نازو نے کندھے ہلا کے۔

لیفٹیننٹ نے غالب کو مخاطب کیا "تم بھی صرف فرنچ بولتے ہو؟"

غالب نے سادگی سے کہا "آپ مجھ سے اردو' فارسی' ہندی یا بنگالی میں بات کر سکتے ہو۔"

"کس ملک کے سفارت خانے سے تعلق ہے تمہارا؟"

"ارجنٹائن" غالب نے نمبر پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"تم کیا کرتے ہو؟"

"میں سفارت خانے میں خانساماں ہوں۔ بلکہ تھا۔"

"خانساماں...... یعنی باورچی" لیفٹیننٹ مسکرایا۔

"کچھ بھی کہہ لیں۔ کک۔ رسویا۔ شیف۔ داروغۂ مطبخ اب ایکس ہے" غالب نے کہا۔

لیفٹیننٹ نے ایک احمقانہ سوال کیا "مسور کی دال' بینگن کا بھرتا یا حلوہ کھلانے ہو تم؟" "مگر ارجنٹائن والوں کو دیسی خانساماں کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"جی۔ اکثر' بلکہ ہر روز پکاتا تھا کیونکہ وہاں عام لوگوں سے لے کر پردھان منتری تک سب آتے ہیں۔ لنچ اور ڈنر کے لئے۔"

"توکیا یہ تم ان کی زبان کیسے سمجھتے ہو؟"

"مطلب کی بات تو گونگے بہرے بھی سمجھا دیتے ہیں۔ عملے کے بیشتر لوگ فرنچ کے ساتھ انگلش جانتے ہیں اور ہم انگلش بول بھی سکتے ہیں۔ ہمارے ساتھ مترجم بھی ہوتا ہے" غالب نے کہا۔

"تم میں سے کون ہے مترجم؟" لیفٹیننٹ نے باری باری سب کو دیکھا۔

"اس وقت نہیں ہے" غالب نے کہا "وہ ہمارے ساتھ ہی دوسری گاڑی میں فرار ہوا تھا مگر راستے میں ہم بچھڑ گئے۔ وہ تو شاید کلکتہ پہنچ بھی چکے ہوں گے۔ ہم یہاں بھٹک رہے ہیں۔"

"تم لوگ فرار کیوں ہوئے تھے؟"

"جان بچانے کے لئے" غالب نے مختصراً کہا۔

"تمہیں تو معلوم ہو گا کہ انڈین آرمی کیا کر رہی ہے ڈھاکا میں؟" نازو نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اور جو پاکستانی فوج کر رہی ہے......" لیفٹیننٹ نے چراغ پا ہو کے کہا۔

"ہماری بلا سے۔ تم آپس میں لڑو یا پبلک کو مارو۔ لیکن ان حالات میں وہاں کون محفوظ ہے؟ ہم کیا' سب سفارت کار پریشانی میں مبتلا ہیں کہ ان کا کیا بنے گا۔ جو سمجھدار تھے وہ پہلے ہی نکل گئے تھے۔ ہم پھنس گئے تھے اپنے محترم سفیر صاحب کی وجہ سے۔ ان کا خیال تھا کہ کچھ نہیں ہو گا۔ دو چار دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آخری وقت میں خیال آیا کہ عملے کو محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جائے اور اہم دستاویزات تلف کر دی جائیں۔ ہم دو گاڑیوں میں روانہ ہوئے تھے لیکن یہاں کے راستے ایسے ہیں کہ توبہ! سیدھی سڑک تو ہے ہی نہیں کہ آدمی گاڑی لے کر نکلے تو کلکتہ پہنچ جائے" نازو نے بڑی ذہانت اور خوب صورتی سے لیفٹیننٹ کو باتوں میں الجھا لیا اور وہ نازو کے انداز دلبری' شوخیٔ گفتار اور ادائے حسن کی معصومیت کا شکار ہو گیا۔

لگتا یوں تھا جیسے نازو کو لیفٹیننٹ کی وردی اور مردانہ وجاہت نے متاثر کیا ہے۔ یہ خوش فہمی کسی بھی مرد کو ذاتی طور پر جھوٹے احساس تفاخر کے جال میں گرفتار کر سکتی تھی کہ نازو جیسی طرح دار حسینہ اس کی جانب ملتفت ہے۔ لیفٹیننٹ بھی ساری اکڑفوں بھول گیا۔ اس کے جارحانہ' متکبرانہ اور افسرانہ رویے میں پہلے جیسی تندی نہ رہی۔ وہ ہمارے بارے میں شکوک و شبہات کی تصدیق و تفتیش بھول گیا۔ ایک اے ایس پی کی موجودگی نے پہلے ہی بے اعتباری کی فضا کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور صورت حال کی تمام نامعقولیت کے باوجود ہم مجرم یا قانون شکن تو کیا مشتبہ افراد بھی نہیں رہے تھے لیکن لیفٹیننٹ اتنی آسانی سے جان چھوڑتا نظر نہیں آتا تھا۔

www.paksociety.com

"آپ کی بہن اوشا......"

"اوشا میں ہوں' یہ آشا ہے؟" نازو مسکرا کے بولی "اتنی جلدی بھول گئے۔"

"سوری مس اوشا" لیفٹیننٹ نے خفت سے کہا "میں......"

"لیفٹیننٹ۔ میں مس نہیں مسز اوشا ورما ہوں۔ یہ میرے پتی ہیں مسٹر ورما" نازو نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔

غالب ابھی تک نازو کی عشوہ طرازی اور لیفٹیننٹ کی بڑھتی ہوئی دلچسپی پر اندر ہی اندر کسی آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا مگر ایک دم اس کا سارا غصہ صابن کے جھاگ کی طرح ختم ہو گیا اور اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ نازو کی شرارت میں اس کے لئے دل بستگی کے ہزار انداز تھے۔ غرور عشق کے لئے سند افتخار تھی اور عہد وفا کا اعلان عام تھا۔

اس کے برعکس لیفٹیننٹ کے جذبات پر اوس پڑ گئی اور اس کی صورت پر جذبات کا تغیر دیکھ کے مجھے بھی اپنی مسکراہٹ چھپانی پڑی۔

"آپ... ان کی... مسٹر ورما... یعنی یہ خانساماں..... خیر..... "لیفٹیننٹ نے اپنی حیرت اور بوکھلاہٹ پر فوراً قابو پا لیا۔ وہ کہنا چاہتا ہو گا کہ آپ جیسی پری جمال کے حسن و شباب اور ناز آفرینی کے جملہ حقوق ایک خانساماں کے نام کیسے منتقل ہو گئے۔ کہاں یہ حسن شعلہ ساماں کہاں ایک خانساماں جس کی قسمت پر رشک کرنا بھی گویا خود شرمندہ ہوتا ہے۔

اے ایس پی نے کہا "لیفٹیننٹ تم کچھ رہنمائی کر سکتے ہو ہماری؟"

لیفٹیننٹ نے طنز سے کہا "یہ دعویٰ غالباً تم نے کیا تھا کہ تم ان کی رہنمائی کے لئے ساتھ ہو۔"

"ہاں۔ مگر اب میں خود کنفیوز ہو گیا ہوں۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہاری ان لوگوں سے ملاقات کہاں اور کیسے ہوئی؟ یہ تو کہتے ہیں کہ راستہ بھول گئے اور بھٹک کر ادھر آ گئے۔ تم کیا کہتے ہو؟ تم یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے ہم مرتبہ پولیس افسر سے تفتیش کرنا زیب نہیں دیتا" اے ایس پی بولا "تم یہ پوچھنے کے مجاز نہیں کہ میں یہاں کیوں موجود ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں تم سے یہ احمقانہ سوال نہیں کروں گا کہ تم یہاں کیوں گھومتے پھر رہے ہو۔ ظاہر ہے کہ تم بھی ڈیوٹی پر ہو۔"

لیفٹیننٹ ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ وہ پھر اس بے عزتی کو پی گیا "تم اکیلے ڈیوٹی پر ہو؟"

اے ایس پی نے اپنا شناختی کارڈ نکالا "یہ تم کو مطمئن کرنے کے لئے ہے۔ میں کوئی جعلی پولیس افسر نہیں ہوں۔"

اس کا شناختی کارڈ نکالنا ایک غلطی بن گیا۔ لیفٹیننٹ نے اس پر صرف ایک نگاہ ڈالی اور غالب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "تم لوگوں کے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم سفارتی عملے کے ارکان ہو؟"

غالب نے کہا "کوئی ثبوت نہیں۔"

نازو نے کہا "ہمارے پاسپورٹ' سفری دستاویزات اور شناخت کے سب کاغذات ایک جگہ تھے۔"

"اس گاڑی میں جو الگ ہو کے کلکتہ چلی گئی۔" لیفٹیننٹ پھر شک بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ اس میں خود فرسٹ سیکریٹری تھے اور انہی کے بریف کیس میں......"

"گویا تمہارے پاس کچھ نہیں' اس کار کے سوا جس کی نمبر پلیٹ ڈپلومیٹک ہے" لیفٹیننٹ نے کہا "مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم نے یہ کار چرائی نہیں ہے اور تم اسمگلر نہیں ہو؟ اسمگلروں کا پولیس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔"

"تم کو سوچ سمجھ کے بات کرنی چاہئے" اے ایس پی نے کہا

"میں کبھی سوچے سمجھے بغیر نہیں بولتا" لیفٹیننٹ نے کہا "یہ فوجی حکمرانی کا علاقہ ہے جہاں تم کھڑے ہو مسٹر اے ایس پی۔ میں تم کو گرفتار کر رہا ہوں اور ان سب کو بھی جو تمہاری قیادت میں رہے تھے۔ اب میں ان کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔ اچھے بچے کا۔"

لیفٹیننٹ کے اشارے پر فوجیوں نے پھر بندوقیں تان لیں۔

"یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو" اے ایس پی نے کہا۔

"شٹ اپ۔ مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ سیدھی طرح چلو۔ سب ایک لائن میں۔ تم کو میں کرنل صاحب سامنے پیش کروں گا۔ اس کے بعد میری ذمے داری ختم۔ وہ مطمئن ہو جائیں گے تو تمہیں چھوڑ دیں گے۔ ممکن ہے حفاظت سے کلکتہ پہنچا دیں۔ سفارتی عملے کو تحفظ فراہم کرنا ذمے داری ہے۔"

لیفٹیننٹ بہت کائیاں تھا اور اسے بے وقوف بنانا بھی نہ تھا مگر اب مجھے اے ایس پی کی طرف سے بھی خطرہ بلا کا تھا۔ ابھی تک وہ ہمارے رحم و کرم پر تھا اور اسے یقین انشائے راز کی صورت میں ہم کچھ بھی کر گزریں گے یہ ضرور جان سے مار دیں گے۔ ملٹری کی حفاظت میں پہنچ جانے وہ ہمارا سارا حساب بے باق کر سکتا تھا۔ وہ خود ہی غالب کا افسر تھا جس کی فوج کا افسر وہ لیفٹیننٹ تھا۔ اسے اگر معلوم تھا کہ میرا ہاتھ جیب میں کیوں ہے۔ ریوالور میری گرفت میں تھا لیکن میں اسے صرف ایک بار استعمال کر سکتا تھا۔ ایک گولی سے میں اے ایس پی کی زبان کھلنے سے پہلے بند کر دیتا۔ اس کے بعد دوسری گولی کوئی فوجی پیچھے سے میرے سینے کے پار کر دیتا۔ جنگ میں کسی فوجی کے ہاتھوں ایک مسلح مجرم کا مارا جانا نہیں کہلاتا اور وہاں تو سب لاقانونیت تھی۔ سیکڑوں ہزاروں گمنام ہر روز مارے جا رہے تھے اور کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔

میرا خیال ہے کہ خود اے ایس پی نے بھی یہی منطقی نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ اس نے منہ سے کوئی غلط لفظ نکالا تو نتائج کی پروا کئے بغیر میں اسے شوٹ کر دوں گا۔ بعد میں کوئی مجھے جان سے مار دیتا ہے یا نہیں اس سے اے ایس پی کو فرق نہیں پڑتا تھا۔ میری موت سے اسے زندگی نہیں مل سکتی تھی۔ یہی سوچ کے وہ خاموش رہا اور اس نے اپنے ہم وطنوں کے بجائے دشمنوں کا ساتھ دینے کو ترجیح دی۔

لیفٹیننٹ کی ہدایات کے مطابق فوجی عملاً ہمیں سنگینوں کی نوک پر لے کر چل رہے تھے۔ ان میں سے دو ہمارے دائیں بائیں جانب تھے اور دو پیچھے۔ ظاہر ہے اس حالت میں شرافت سے سیدھا چلتے رہنے کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم میں مایوس نہیں ہوا تھا۔ میرے لئے اطمینان کی ایک بات یہ تھی کہ فوجیوں نے ہماری تلاشی نہیں لی تھی ورنہ ہم اسلحے سے محروم ہو جاتے اور اس کے بعد اے ایس پی ہمارے خلاف پوری فرد جرم پڑھ دیتا۔

امید کا دوسرا سلسلہ نازو سے وابستہ تھا۔ پہلے ہم سب کسی ترتیب کے بغیر ایک ساتھ چل رہے تھے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد میں اور غالب خود ہی پیچھے ہو گئے۔ میں اور اے ایس پی ان کے آگے رہے۔ نازو نے بڑی ہوشیاری سے لیفٹیننٹ کے ساتھ چلنا شروع کیا اور ہم سے چند قدم آگے ہو گئی۔ کسی نے اسے آگے بڑھنے سے نہیں روکا۔ نازو نے کہا "لیفٹیننٹ! کتنی دور پیدل لے جاؤ گے تم ہمیں؟"

لیفٹیننٹ کو ایک دھان پان' کمزور اور نازک لڑکی سے کیا خطرہ محسوس ہو سکتا تھا چنانچہ اس نے نازو کی جرأت کا برا نہیں مانا۔ "زیادہ دور نہیں۔ آگے جیپ کھڑی ہے۔"

"اور کیمپ کتنی دور ہے تمہارا؟"

"یہ سیکرٹ انفارمیشن ہے" لیفٹیننٹ بولا۔

"کمیشن کب لیا تم نے؟" نازو اس سے بے تکلف ہو گئی۔

"گزشتہ سال" لیفٹیننٹ نے مختصراً کہا "دو سال بعد میں کیپٹن ہو جاؤں گا۔"

"ہاں۔ بشرط زندگی۔"

"کیا مطلب! تم سمجھتی ہو میں مارا جاؤں گا یہاں؟"

"ہر فوجی کی زندگی ہر وقت داؤ پر لگی رہتی ہے' جب وہ میدان جنگ میں ہو" نازو نے کہا۔

وہ کچھ دیر خاموشی سے چلتے رہے' پھر لیفٹیننٹ نے کہا "تم نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔"

"کیا؟" نازو نے معصومیت سے کہا۔

"یہی کہ تم.... اس خانساماں کی بیوی ہو.... مجھے تو وہ ذرا بھی خانساماں نہیں لگتا۔"

نازو نے ایک آہ بھری "زندگی اسی کا نام ہے۔ بھگوان نہ کرے کہ کبھی تمہارے ساتھ یہ ظلم ہو۔ ہو گا بھی نہیں کیوں کہ تم مرد ہو۔ تم کو انتخاب کا حق دیا جاتا ہے۔ میں لڑکی ہوں...."

لیفٹیننٹ کی دلچسپی پھر بیدار ہو گئی "زبردستی تمہاری شادی کی گئی تھی اس سے؟"

"زبردستی نہیں' ماں باپ کی مرضی تھی" نازو تلخی سے بولی۔

"مگر تمہاری مرضی نہیں تھی" لیفٹیننٹ بولا۔

لیفٹیننٹ کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ اس سے یوں باتیں کرنے والی لڑکی کے ذہن میں کیا ہے۔ وہ بے خبری میں مارا گیا۔ نازو بھی شاید انتظار میں تھی کہ پہلے جیپ نظر آ جائے۔ میں حیران تھا کہ آخر ہم نے کسی جیپ کے انجن کی آواز نہیں سنی تھی۔ جیپ کو دیکھ کر مجھے ایک خیال اور بھی آیا کہ اس میں لیفٹیننٹ سمیت سات افراد کیسے بیٹھتے ہوں گے؟ ان میں سے ایک ڈرائیور کی سیٹ پر ہو گا جو خود لیفٹیننٹ بھی ہو سکتا تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر دوسرا بیٹھا ہو گا تو پیچھے باقی پانچ افراد میں سے دو ایک سیٹ پر ہوں گے۔ تین دوسری سیٹ پر بڑی مشکل سے پھنس کر سمائے ہوں گے۔ ہم پانچ افراد کے لئے اس میں کوئی جگہ نہ تھی۔

بظاہر اس بات کا امکان نظر نہیں آتا تھا کہ وہ سب جیپ میں سفر کریں گے اور ہمیں پیدل لے جائیں گے مگر ایک تو لیفٹیننٹ بچ گیا تھا' اس کے علاوہ ہم مشتبہ علاقے میں پکڑے گئے تھے اور اگر ہمارے ساتھ جنگی قیدیوں والا سلوک کیا جاتا تو لیفٹیننٹ کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ جو نیئر افسر تھا اور سفارتی عملے کے ساتھ زیادتی کے الزام سے بچنا چاہتا تھا چنانچہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ خواتین کے ساتھ رعایت برتے' انہیں جیپ میں اپنے ساتھ لے جائے اور ماتحت فوجیوں کو حکم دے جائے کہ ہمیں کیمپ تک مارچ کرا کے لائیں۔ اے ایس پی بھی خود کو افسر ثابت کر چکا تھا۔ صرف میں اور غالب ہی تھے جو رعایت کے معاملے میں غیر مستحق سمجھے جا سکتے تھے۔

میرے اندیشوں کی فوراً تصدیق ہو گئی۔

جیپ کے قریب پہنچ کر لیفٹیننٹ نے بغل میں دبی ہوئی چھڑی سے اشارہ کیا "میرے ساتھ جیپ میں یہ ڈرائیور جائے گا اور یہ لیڈیز۔"

"باقی لوگ کیسے جائیں گے؟" اے ایس پی بولا۔

"ان کے لئے دوسری گاڑی آئے گی" غالب نے سمجھانے کے انداز میں کہا "یا دوسرے پھیرے میں......"

لیفٹیننٹ نے اس کی بات کاٹ دی "شٹ اپ۔ تم مرد ہو اور صحت مند ہو۔ چار پانچ میل پیدل چلنے سے مر نہیں جاؤ گے۔"

غالب نے مشکوک لہجے میں کہا "کیا تم مرد نہیں ہو؟"

میں نے بڑی مشکل سے ہنسی کو ضبط کیا مگر لیفٹیننٹ کا ایک گستاخ ماتحت ہنس پڑا۔

"یو ایڈیٹ" لیفٹیننٹ کا پارہ چڑھ گیا "بہت بے قابو ہو رہے ہو تم سب' ہنسی بھول جاؤ گے جب تمہیں ایڈجوٹنٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔"

www.paksociety.com

"معاف کریں سر۔ غلطی ہو گئی۔" سپاہی نے سیلوٹ مار کے کہا "آپ بولیں تو میں اس کا دماغ درست کروں؟"

لیفٹیننٹ نے غالب کی طرف دیکھا "تم ایک معمولی خانساماں! تمہاری یہ جرأت کہ میرا مذاق اڑاؤ۔ میں سمجھ لوں گا تم کو۔"

اے ایس پی نے آگے بڑھ کر کہا "تم بھی میرے ساتھ یہ رویہ اختیار نہیں کر سکتے۔ تم افسر ہو تو میں بھی افسر ہوں۔"

لیفٹیننٹ نے اُسے نظر جما کے دیکھا اور عیاری سے بولا "میں تسلیم کرتا ہوں تمہاری افسری کو مگر تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

"آخر کیوں؟ جیپ میں جگہ ہے...."

"جگہ یقیناً ہے لیکن میں تم کو اضافی ذمے داری سونپ رہا ہوں۔ ان سب کو کیمپ تک اپنی نگرانی میں لانے کی۔" لیفٹیننٹ مسکرایا "میرے ماتحت اب تمہارے ماتحت ہیں۔ تم انہیں کمان کرو گے۔ یہ تمہارے احکامات کے تابع ہوں گے۔"

لعنت کمان کرنے والے پر...." اے ایس پی مشتعل ہو گیا "تم خود سنبھالو اپنی ذمے داری۔"

غالب نے پھر شرارت کی "چلو لیفٹیننٹ صاحب! غصہ چھوڑو۔ میں سنبھال لیتا ہوں یہ ذمے داری۔"

"دیکھو! مجھے اتنا غصہ مت دلاؤ کہ میں تمہیں شوٹ کر دوں۔ کوئی نہیں پوچھے گا مجھ سے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔"

"آخری ہچکی لینے سے پہلے میں ضرور پوچھوں گا" غالب بولا "کہ آخر میرا کیا دوش تھا.... جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔"

نازو نے نظر بچا کے مجھے اور غالب کو آنکھ ماری "گاڑی میں بیٹھنے کا بڑا شوق ہے۔ ساری عمر جوتیاں چٹخاتے رہے۔"

لیفٹیننٹ نے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور جیپ روانہ ہو گئی۔ اے ایس پی کو سخت مایوسی ہوئی۔ شاید اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لیفٹیننٹ کے ساتھ نکلنا چاہا تھا۔ لیفٹیننٹ کے اور اے ایس پی کے درمیان افسری حائل نہ ہوتی تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتا۔ جب اس نے زبردستی خود کو افسر تسلیم کرانے کی غلطی کی تو لیفٹیننٹ نے ضد میں اسے بھی عام لوگوں میں شامل کر دیا۔ اگر لیفٹیننٹ مان جاتا تو میں اے ایس پی کو نہ روک پاتا اور دونوں افسران جیپ میں آگے بیٹھ جاتے تو اے ایس پی ہمارے بارے میں لیفٹیننٹ کو تفصیلی معلومات فراہم کرتا اور ہم سے اپنی ذلت و رسوائی کا بدلہ لینے میں کوئی کسر نہ چھوڑتا۔ تاہم ایسی صورت حال کے لیے میں ذہنی طور پر تیار تھا اور مجھے یقین تھا کہ غالب اور نازو کا بھی یہی فیصلہ ہوگا۔ ہم دیکھتے کہ معاملات ہمارے قابو سے باہر ہو رہے ہیں تو آخری دفاع کے طور پر اے ایس پی کے ساتھ لیفٹیننٹ کو بھی یرغمال بنا لیتے یا اے ایس پی کو گولی مار کے لیفٹیننٹ کو اور اس کے ماتحت فوجیوں کو اچانک اپنی مار قوت استعمال کرتے ہوئے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتے۔ اس اشارے پر میں اور نازو ایکشن میں آ جاتے تو چار افراد کو تو آؤٹ کر دیتے اور وہ کو غالب اور گل جنڈ آپ کرا لیتے۔ اے ایس پی جانتا تھا کہ لیفٹیننٹ کی سپاہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کی تو بات نہیں چلے گا اور بازی الٹ جائے گی۔

جب ہم فوجیوں کے نرغے میں روانہ ہوئے تو غالب کے اور میرے درمیان اے ایس پی تھا۔ ایک فوجی ہم سے چند قدم آگے تھا۔ تربیت کے اصول و قواعد کے مطابق دو پیچھے چلتے رہے اور ہمارے دائیں بائیں۔

غالب نے بڑی بے تکلفی سے اے ایس پی کے کندھے پر ہاتھ مارا "یار! بڑی کوشش کی تم نے مگر تمہاری چلی نہیں۔ جان چھڑا کے بھاگنا چاہتے تھے استاد۔"

اے ایس پی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"خیر.... جو ہوا اچھا ہوا۔ ہم کیا تمہیں جانے دیتے۔ رخصت کرنا ہی پڑتا تو دنیا سے رخصت کرتے" غالب آہستہ آہستہ بولا "یہ سالے بڑے غلط وقت پر آئے۔ مجھے تو نیند بھی آنے لگی تھی کچھ نہ ملتا تو گھاس چر کے سو جاتا۔ اب پیدل چلنا ہی پڑے گا دور تک۔"

"یہ بھی بتا دو اس کے بعد کیا ہوگا؟" اے ایس پی نے سے کہا۔

"کچھ نہیں۔ نازو ابھی لوٹ آئے گی جیپ لے کر۔ لیفٹیننٹ کو شامتِ اعمال لے آئی تھی ہماری طرف" غالب بولا۔

"اب ہم قیام نہیں کر سکتے" میں نے آہستہ سے کہا "رات جتنی دور نکل جائیں اچھا ہے۔"

غالب نے کہا "اس لشکر کا کیا ہوگا جو ہمارے ساتھ چل رہا ہے۔"

"نمٹ لیں گے ان سے بھی۔ یہ دشمن ہیں، انہیں مار دینا عقل مندی ہے ورنہ ہم خود مارے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

ایک فوجی نے کہا "چوپ۔ شالا لوگ۔"

اسی وقت جیپ کی آواز سنائی دی۔ اندھیرے میں ہیڈ لائٹ کی روشنی پھیلنے لگی پھر جیپ نمودار ہوئی۔ فوجیوں نے انہیں رک جانے کا حکم دیا اور جیپ کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔ بے وہ اپنے افسر کی واپسی کو کسی ناگہانی آفت، شکست یا موت کے خیال سے منسوب نہیں کر سکتے تھے مگر میں اور غالب مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔

جیپ کی ہیڈ لائٹس کی چکا چوند کر دینے والی روشنی میں ونڈ اسکرین کے پیچھے کسی کی صورت نظر نہیں آتی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ جیپ کو نازو ڈرائیو کر رہی ہے۔ جیپ سامنے آ کے رکنے کے بجائے ایک جست لگا کے آگے بڑھی۔ اس سے پہلے کہ فوجی کچھ سمجھتے، نازو نے دو کو کچل دیا۔ تیسرا جو پیچھے تھا، بے سمت دوڑ کے بھاگا۔ نازو نے کسی تذبذب اور توقف کے بغیر جیپ کو یکدم موڑا اور تیسرے کے اوپر سے گزار دیا۔

نازو کی نیت تو میں نے جیپ کا رخ دیکھتے ہی سمجھ لی تھی۔ چنانچہ میں نے ہکا بکا کھڑے ہوئے دونوں فوجیوں کو کسی دشواری کے بغیر ناک آؤٹ کر دیا۔ ایک تو گردن ٹوٹتے ہی گر گیا تھا۔ دوسرے نے رائفل اٹھائی تھی مگر میری لات پڑی تو وہ سنبھل نہ سکا۔ رائفل کے ساتھ ہی نیچے گرا پھر نازو نے چیخ کر کہا "ہٹ جاؤ سکندر۔"

میں ایک دم جست لگا کے پیچھے ہو گیا ورنہ میرا ارادہ آگے بڑھ کر دشمن کے آخری سپاہی کو خود فنا کرنے کا تھا۔ نازو نے بڑی پھرتی اور مہارت کے ساتھ دس گز قطر کے نصف دائرے میں جیپ کو دوبارہ انتہائی خطرناک رفتار پر گھمایا تھا۔ تین فوجیوں کے اوپر سے جیپ گزارنے کے بعد بھی وہ رکی نہیں۔ اس نے دیکھ لیا ہوگا کہ میں دو سے لڑ رہا ہوں چنانچہ وہ میری مدد کے لیے پلٹ کر آئی۔ چوتھے آدمی کی بھیانک چیخ کے ساتھ ہی جیپ کا انجن بند ہو گیا۔ نازو کے ساتھ گل نے جیپ سے چھلانگ لگائی۔

میں نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے "ویل ڈن لیڈیز۔ دشمن کے ساتھ تم نے مجھے بھی مار ہی دیا تھا۔"

"سوری.... تم ٹھیک ہو نا؟" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا "وہ کہاں ہیں جن کے ساتھ تم فرار ہوئی تھیں؟"

نازو نے کہا "وہ تو ہمیں اغوا کر کے لے گئے تھے اور تم دیکھتے رہے۔"

"غلط" غالب نے کہا "تم بہ رضا و رغبت جیپ میں سوار ہوئی تھیں۔ اس لیے کہ میں ایک معمولی خانساماں ہوں اور وہ ایک فوجی افسر تھا۔"

گل چٹخنے لگی "بیچارا۔ آیا تھا محاذِ جنگ پر۔ مارا گیا دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے۔ نوجوان تھا نا! جذبات پر قابو نہیں تھا۔"

غالب نے کہا "کیا مطلب.... کیا اس نے کوئی بدتمیزی کی تھی؟"

"وہ بدتمیزی کی کوشش تو کر سکتا تھا" نازو نے کہا "جیپ میں اسی لیے وہ اپنے ساتھ کسی کو بھی نہیں لے گیا تھا۔ تھوڑی دور جا کے جیپ روک دی اور خود اتر کے پیچھے آ گیا۔"

"تم نے جال ہی ایسا پھیلایا تھا۔ اور اسے کیا معلوم تھا کہ تم شکاری ہو۔" گل نے کہا "وہ تو خیر جلد باز تھا، تم نے بھی بہت جلدی کی۔ کم سے کم اسے اتنی مہلت تو دی ہوتی کہ تم سے حالِ دل کہہ لیتا۔"

"وقت کم تھا گل بانو۔ ورنہ میں اسے اظہارِ عشق کے لیے چند منٹ ضرور دیتی۔ اس کی آخری خواہش پوری ہو جاتی" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "اب یہ بتاؤ کہ اپنے اس کشتۂ تیغِ ستم کو چھوڑا کہاں ہے؟"

نازو نے ہاتھ سے اشارہ کیا "دونوں پیچھے پڑے ہیں۔"

غالب نے کہا "نہیں ایسے پڑا چھوڑ کے نہیں جا سکتے ہم۔"

"پھر کیا رات ان کی آخری رسوم ادا کرتے ہوئے گزار دیں گے؟" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "غالب ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ایک ساتھ چھ فوجی، افسر اور جیپ کے ساتھ غائب ہو گئے تو ان کے والی وارث خاموش نہیں بیٹھے رہیں گے۔ وہ ایک حد تک انتظار کریں گے پھر ان کی تلاش شروع ہوگی اور لاشیں ملیں گی تو اپنا سراغ خود دیں گی۔"

"مگر سکندر! سوچو ذرا، سات لاشیں دفنائیں گے ہم یا جلائیں گے؟" نازو نے کہا۔

"ہم انہیں سپردِ خاک بھی نہیں کریں گے اور راکھ بھی نہیں کریں گے۔ دریا برد کریں گے" میں نے کہا "رات بھر میں دریا کا بہاؤ انہیں جہاں بھی لے جائے۔ بس ان کی وردیاں اتار لو تاکہ فوری شناخت ممکن نہ رہے۔"

اے ایس پی سب کچھ سن رہا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار اس کا واسطہ حقیقی دہشت گردوں سے پڑا تھا اور وہ ہم سب کے روپ میں فلمی کردار دیکھ رہا تھا، جو ناقابلِ یقین حد تک افسانوی تھے۔ ہالی ووڈ نے ایسی بہت فلمیں بنائی ہیں جو پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران کمانڈوز کے کارناموں پر بنی ہیں۔ اے ایس پی کا ہماری رفاقت کے دور کا تجربہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ چوروں، بدمعاشوں سے نمٹنے والا شخص ایسے کسی گروہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جو چٹکی بجاتے سات مسلح فوجیوں کو ٹھکانے لگا دیں اور ان کی لاشیں سپردِ آب کر کے ہاتھ جھاڑتے ہوئے آگے روانہ ہو جائیں۔ وہ بے حد خائف اور مرعوب تھا۔

میں اور غالب جیپ لے کر پیچھے گئے اور دونوں لاشیں جیپ میں ڈال کر لے آئے۔ لیفٹیننٹ کا جسم ابھی تک گرم تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ مرا نہیں بے ہوش ہے۔ جو آدمی کچھ دیر پہلے افسری اور وردی کی اکڑفوں کے ساتھ کسی کو خاطر میں لانے پر آمادہ نہ تھا وہ محض ایک لاش رہ گیا تھا۔ ہم نے اس لاش پر کپڑوں کا کفن بھی نہیں چھوڑا اور اسے ایک نسبتاً بلند مقام سے یوں دریا میں پھینکا کہ بہاؤ اسے کنارے سے دور رکھے۔

جو چار افراد جیپ سے کچلے گئے تھے ان کے جسم ٹوٹ پھوٹ گئے تھے اور ان کی وردیاں خون آلودہ چیتھڑے ہو گئی تھیں۔ ان وردیوں کو بد وضع گوشت کے لوتھڑوں سے الگ کرنا ول گردے کا کام تھا اور ایک بھیانک تجربہ لیکن اس کے بنا چارہ نہ تھا۔ لاشوں کو وردی کے ساتھ بہانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ہم نے گل اور نازو کو دور رکھا اور اے ایس پی سے مدد کے لیے کہا مگر وہ انتہائی

www.paksociety.com

ہوا ثابت ہوا۔ خون کی مہک اور پھٹے ہوئے جسم سے کپڑے کو الگ کرتے ہوئے اسے متلی ہونے لگی۔

میں نے غالب کے ساتھ مل کر چاروں مسخ شدہ لاشوں کے کپڑے ایک گٹھڑی کی صورت میں باندھے۔

"اسے کہیں دفن کر دیتے ہیں" غالب نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "خون کی بو جنگلی جانوروں کو کھینچ لے گی۔ وہ اسے کھود نکالیں گے۔ زیادہ گہرا گڑھا کھودنے میں صبح ہو جائے گی۔"

غالب نے دوسری تجویز پیش کی "پھر اسے آگ لگا دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "خون کے جلنے کی بو دور تک جائے گی۔ اس بنڈل کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ جہاں موقع ملا وہاں پھینک دیں گے۔ کسی کنویں یا جھیل میں۔"

"اسے ساتھ لے جانا بھی تو مشکل ہو گا" غالب نے لڑکیوں کی طرف دیکھا جو بڑے صبر اور استقلال کے ساتھ انتظار کر رہی تھیں۔

"دیکھو جیپ میں کوئی بیگ ہو یا تھیلی" میں نے کہا۔

غالب نے سیٹوں کے نیچے سے ایک پلاسٹک کا واٹر پروف بیگ نکال لیا۔ وردیاں اس میں ٹھونس کے پیچھے رکھ دی گئیں۔ خالی بیگ میں فوجی راشن بھی ڈالنے کے بعد میں نے وقت دیکھا تو رات کے دس بجے تھے۔ ہم نے دوپہر سے اب تک کچھ بھی نہیں کھایا تھا اور صبح ہونے سے پہلے کچھ ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔ حالات اچانک ایسے ہو گئے تھے کہ بھوک پیاس کا خیال بھی کسی کے دل میں نہیں آیا تھا۔ پہلا مسئلہ اس پُرخطر علاقے سے خود کو بحفاظت دور لے جانے کا تھا۔

"ہمارے پاس تین فوجی وردیاں ہیں" میں نے کہا "یہ دیکھو کس کے سائز پر کون سی فٹ آتی ہے۔"

"مجھے کسی وردی کی ضرورت نہیں" اے ایس پی بولا۔ "رات کے وقت دو فوجیوں کے ساتھ ایک پولیس مین۔ اور وہ بھی فوجی جیپ میں۔ کہیں دوسری چیکنگ پارٹی مل گئی تو انہیں شک ہو جائے گا۔"

میں نے بھی کہا "ہاں۔ ویسے ہم خود ایک فوجی پٹرول پارٹی نظر آئیں گے۔"

"دو لڑکیوں کے ساتھ!" اے ایس پی طنز سے بولا۔

"لڑکیوں کو ہم چھپا کے رکھیں گے یا ان کے لئے کوئی اسٹوری بنا لیں گے کہ انہیں غنڈوں، حملہ آوروں سے بچا کے لائے ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "ہم بھی اپنے کپڑے سنبھال کر رکھیں گے۔ صبح تم بھی پھر پولیس افسر بن جانا۔ جیپ صرف رات کے سفر کے لئے ہے۔"

آخر کار اے ایس پی مان گیا۔ ہم نے وردیاں پہن لیں۔ بالکل فٹ تو نہ تھیں مگر جیپ میں بیٹھے ہوئے ان کی ناموزونیت کا زیادہ احساس نہیں ہوتا تھا۔ جیپ کے پچھلے حصے میں خون آلود وردیوں کے بنڈل پر اپنے کپڑوں کی گٹھڑی ڈال کے ہم نے گل اور نازو کو سوار کیا۔ وہ پیچھے کی دو آڑی سیٹوں پر سمٹ کر لیٹ گئیں اور ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا۔

چند منٹ میں ہم پھر وہیں پہنچ گئے جہاں چیکنگ ٹیم والوں کی لاوارث گاڑی کھڑی تھی۔

"اب اس کا کیا کریں؟" غالب نے کہا۔

میں نے سوچ کر کہا "ہم اس کو لے کر آگے چلتے ہیں۔ راستے میں جہاں کوئی مناسب جگہ ملی اسے چھوڑ دیں گے۔"

مناسب جگہ بیس پچیس میل کے بعد ملی۔ یہ ایک سڑک تھی جو دریا تک پہنچ کے اچانک ختم ہو گئی تھی۔ دریا پر شاید پہلے کوئی پل ہو گا جس کے اب آثار تک باقی نہ تھے۔ پل کی بلندی تک سڑک انتہائی خستہ حالت میں تھی۔

میں نے غالب سے مشورہ کیا اور کار کو دریا کی طرف موڑ کے کھڑا کر دیا۔ ہم نے جیپ میں سے خون آلود وردیوں کا بنڈل نکال کے کار کی سیٹ پر بچھا دیا۔ سیٹوں کے درمیان فرش پر راشن کا ڈھیر کیا اور وہ سب اسلحہ بھی جو اس فوجی جیپ میں تھا۔

جیپ کے پیچھے دس لیٹر والا جیری کین بندھا ہوا تھا۔ میں نے اس کا ڈھکن کھول کر جیری کین کو الگ کیا۔ اس میں سے نصف پٹرول جیپ میں ڈالا تو ٹینک فل ہو گیا۔ باقی دس لیٹر پٹرول میں نے کار میں سیٹوں کے اوپر ڈال دیا۔ خون آلود وردیاں پٹرول میں تر ہو گئیں اور پٹرول بہہ کر فرش پر اکٹھا ہو گیا جہاں اسلحہ پڑا تھا۔ اسلحے میں رائفلیں ہی نہیں میگزین بھی تھے اور گولیوں کے ڈبے بھی۔ ان کارتوسوں میں بارود بھرا ہوا تھا چنانچہ یہ سب آتش گیر تھا جسے صرف ایک تیلی دکھانا کافی تھا۔

غالب نے کار کا انجن اسٹارٹ کیا تو نازو کی حالت غیر ہو گئی۔ ابھی تک وہ گل کے ساتھ ساری کارروائی کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

"مسٹر غالب! کیا پروگرام ہے آخر آپ کا؟"

غالب نے کہا "تم ایک عظیم اسٹنٹ شو دیکھو گی جو ماضی کا ایک عظیم صحافی ایک سنسنی خیز کمال کا مظاہرہ پیش کرنے والا ہے۔ جلتی ہوئی کار میں ......"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے کیا؟" نازو نے چلّا کے کہا "پاگل ہو گئے ہو دونوں۔"

"مجھ پر کیوں خفا ہوتی ہو۔ میں آرام سے کھڑا ہوں" میں نے کہا "میں صرف انجن کی تیلی جلاؤں گا۔"

نازو نے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا "جہنم نذر دو منٹ کے اور دوست سے کہو کہ کود جائے اس میں؟"

"یہ میرا نہیں غالب کا آئیڈیا ہے۔ تم چاہو تو اس کے ساتھ بیٹھ جاؤ" میں نے کہا "ڈارلنگ ....."

غالب نے ایکسیلیٹر پر ایک پتھر رکھا۔ انجن کی رفتار بہت زیادہ ہو گئی۔ اس نے دوسرا پتھر رکھا تو دباؤ بہت کم رہا۔ تیسرے پتھر کو اس نے اوپر کر دیا۔ اب فیصلہ کلچ کا تھا۔ اس کے لئے خاصا وزن درکار تھا۔ میں نے تقریباً پانچ کلو کا لمبوترا سا پتھر تلاش کیا۔ اس پتھر سے کلچ اتنا دب جاتا تھا کہ گیئر نیوٹرل نہ ہو تب بھی گاڑی کھڑی رہتی تھی اور انجن شور کرنے لگتا تھا۔

جیپ میں سے مجھے کوئی رسّی نہیں ملی لیکن گاڑی کی ڈگی میں سے آٹھ دس فٹ لمبی زنجیر مل گئی۔ معلوم نہیں اس کی وہاں موجودگی کا مقصد کیا تھا۔ زنجیر کو پتھر سے باندھنے کے لئے مجھے کپڑے کی کئی پٹیاں استعمال کرنا پڑیں۔ زنجیر اتنی چھوٹی تھی کہ پتھر پر نہیں لپیٹی جا سکتی تھی۔

اب نازو نے بھی سمجھ لیا تھا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں چنانچہ وہ کچھ خفیف اور برہم سی کھڑی تھی۔

غالب نے کہا "اچھا مس نازو! مجھے اللہ کے سپرد کرو۔ موت کا کھیل شروع ہونے والا ہے۔"

میں نے کہا "اب بھی وقت ہے۔ غالب کا اس دنیا میں ساتھ دیا ہے تو پھر آگے بڑھو۔ آگے بھی ساتھ دو۔"

"آپ دونوں اکٹھے جائیں جہنم میں" نازو نے کہا۔

غالب ہنسنے لگا "ابھی تو رو رو کے التجا کر رہی تھیں ....."

"التجا کرتی ہے میری جوتی" نازو نے بگڑ کے کہا۔

"گویا وہ سب ڈراما تھا۔ تمہارے حقیقی جذبات نہیں تھے؟" غالب نے افسوس سے سر ہلایا "تمہاری ایسی اداکاری ....."

میں نے کہا "یار بس کرو۔ بولو سب ٹھیک ہے۔"

"ایک دم ٹھیک ہے استاد۔ ابھی ہم الٹ مارو" غالب بولا۔

میں نے احتیاطاً ذرا ڈرائیونگ سائیڈ کا ایک دروازہ بند کیا۔ انجن ایکسیلیٹر کے دباؤ سے غرّا رہا۔ غالب نے دوسری طرف سے کلچ پر پتھر رکھا اور گاڑی کو گیئر میں ڈال دیا۔ آہستہ آہستہ احتیاط سے اس نے زنجیر کا سرا اپنے ہاتھ میں لیا اور گاڑی سے پانچ چھ فٹ دور کھڑا ہو گیا۔

میں نے ماچس نکال کے تیلی جلائی اور اندر پھینک دی۔ پٹرول کے بخارات کار میں جمع ہو گئے تھے۔ ایک شعلہ لپکا اور غالب نے زنجیر کو ایک جھٹکا دیا۔ کلچ پر رکھا ہوا پتھر ہٹ گیا۔ گاڑی پہلے گیئر میں تھی اور انجن کی خاصی رفتار تھی۔ ایک بھڑکتا ہوا الاؤ بن جانے والی کار جست لگا کے آگے بڑھی۔

یہ بڑا دلکش منظر تھا۔ متحرک شعلہ فضا میں بلند ہوا تو گولیاں چلنے لگیں۔ کار سڑک کے اختتام تک دوڑتی ہوئی گئی تو اس کی رفتار چالیس میل فی گھنٹہ سے زیادہ تھی۔ وہ خلا میں کچھ اوپر اٹھی اور پھر نیچے جانے لگی۔ اسی وقت پٹرول ٹینک دھماکے سے پھٹا اور کار کے جلتے ہوئے ٹکڑے منتشر ہو گئے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے شعلے ندی میں شہاب ثاقب کی طرح گرے اور غائب ہو گئے۔

یہ سب ایک منٹ کا تماشا بھی نہیں تھا۔ جلتی ہوئی کار نے گرد و نواح کے جنگل کو روشن کر دیا تھا۔ ایک منٹ بعد کچھ نہ رہا۔ نہ روشنی، نہ کار، نہ بھارتی فوجیوں کی خون آلود وردیاں، نہ ان کا اسلحہ۔ فضا پھر سکوت اور تاریکی میں ڈوب گئی۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہم پھر جیپ میں بیٹھے اور اے ایس پی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگے۔ راستے میں متعدد گاؤں بھی آئے جہاں لوگ سکون سے سو رہے تھے۔ اگر ہم چاہتے تو گاؤں والوں کو جگا کے ان سے زبردستی سب کچھ حاصل کر سکتے تھے۔ بھارتی فوجی یہی کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم تمہارے نجات دہندہ ہیں۔ تمہیں پاکستانی فوج کے مظالم سے نجات دلانے آئے ہیں۔ پھر وہ خود ان سادہ دل لوگوں سے سب کچھ چھین لیتے تھے۔ مال و زر، عزت و آبرو، متاعِ حیات، یہ سب کچھ ہم نہیں کر سکتے تھے۔ ہم اخلاقی پستی کی اس انتہا تک گرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ہم اپنے پیچھے بدنامی یا نیک نامی کی کوئی داستان چھوڑنا نہیں چاہتے تھے جو ہمارے راستوں کا سراغ دے۔ خاموشی کے ساتھ گمنام رہتے ہوئے اپنی منزل کی جانب بڑھتے رہنا تحفظ کی ضمانت تھا۔

سنسان رات کی پُرآسیب ہولناکی سب کے اعصاب کو متاثر کر رہی تھی۔ ہر لمحہ خوف اور بے یقینی کا لمحہ تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس شب کی سحر ہونے تک کیا ہو گا۔ امید کی روشنی منزل کا نشان دے گی یا ہم اندیشوں کے سراب میں بھٹکتے رہ جائیں گے۔

میں اور غالب باری باری ڈرائیونگ کر رہے تھے۔ غرّاتا ہوا طاقتور انجن سامنے کی دشواریوں کو نظر انداز کرتا ہوا جیپ کو آگے بڑھا رہا تھا۔ اس کے سب فولادی اعضا بھرپور قوت کے ساتھ مصروفِ عمل تھے اور چاروں مضبوط ٹائر مسلسل دوڑ رہے تھے۔ انسان مشین بناتا ہے اور اسے قوت فراہم کرتا ہے، پھر مشین کارکردگی میں اپنے خالق سے مقابلے میں ہزار گنا بہتر ثابت ہوتی ہے مگر آدمی کی غلام رہتی ہے۔

جیپ کوئی آرام دہ سواری نہیں ہوتی۔ ناہموار، پُرپیچ اور دشوار گزار راستوں پر جھٹکے بہت زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔ ایک پورا دن سفر میں کٹ گیا۔ پھر رات آئی تو آرام کی مہلت ملی اور نہ جسم کو توانائی۔ کچھ کھائے پیئے بغیر ہم سفر کو جاری رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ ذہنی و اعصابی تھکن الگ تھی۔ دل چاہتا تھا کہ جیپ روک دی جائے اور ہم آسمان کی چادر کے نیچے زمین کے بستر پر لیٹتے ہی سو جائیں لیکن عقل اس خواہش کے خلاف برسرِپیکار تھی اور مسلسل خبردار کر رہی تھی کہ جاگتے رہو، چلتے رہو۔ رکنے کی غلطی کی تو راستے بند ہو جائیں گے۔ منزل دور ہو جائے گی۔

گل اور نازو پچھلی سیٹ پر پاؤں سمیٹ کر سونے کی ناکام

uuupaksociety.com

کوشش میں مصروف تھیں۔ ہم سب خاموش تھے اور اپنے اپنے خیالات کے گرداب میں غوطہ زن۔ ہنسی مذاق تو دور کی بات تھی' آپس میں بات کرنا بھی غیر ضروری محسوس ہوتا تھا۔ خاموشی میں عافیت تلاش کرنا زیادہ مشکل کام تھا۔

جیپ کی لائٹ دور دور تک سڑک کو روشن کر رہی تھی مگر تاحدِ نظر ہمارے سوا کوئی بھی حرکت میں نہ تھا۔ ہوا رکی ہوئی تھی' درخت ساکت تھے' آسمان پر ستارے ٹھہرے ہوئے تھے۔ وقت بھی جیسے منجمد ہو کے تھم گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم کبھی ڈھاکا نہیں پہنچ پائیں گے اور مایوسی کے خلا میں سفر کبھی ختم نہیں ہوگا۔

اس جمود کو پہلے ایک ندی نے توڑا جو خاموشی سے ہماری راہ میں حائل ہو گئی۔ کنارے پر دو کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ سارا دن لوگوں کو دریا پار لانے لے جانے والے تھکے ہوئے آڑے ترچھے پڑے تھے مگر ایک بوڑھا جاگ رہا تھا' بیڑی پی رہا تھا اور کھانس رہا تھا۔ اس نے ہمیں خوف سے کانپتے ہوئے بتایا کہ ندی کا پل تو بہت دور ہے مگر مشرق کی جانب ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر گھاٹ سے فیری چلتی ہے۔ وہ ہمیں جیپ سمیت دوسرے کنارے پہنچا دے گی۔

گھاٹ تک پہنچنے میں ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی مگر آدھی رات کے وقت دریا پار جانے والا کوئی نہیں تھا۔ فیری کا مالک ہمیں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ صرف ایک گاڑی لے کر جانا اور خالی واپس آنا اس کے کاروباری نقطۂ نظر سے گھاٹے کا سودا تھا مگر وہ خاکی وردی والوں کو انکار کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا "صبح تک انتظار کر لیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

میں نے دہاڑ کے کہا "مہربانی کے بچے! ہم کیا سیر کرنے آئے ہیں۔ یہ سرکاری ڈیوٹی ہے۔"

غالب نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "چلو' تمہارا نقصان نہیں ہوگا۔"

"ہم غریب آدمی ہیں جناب۔"

"فیری کے مالک ہو اور غریب کہتے ہو خود کو" میں نے اسی جلالی لہجے میں کہا "شرافت سے نہیں چلو گے تو....."

"چلیں گے' چلیں گے کیوں نہیں" وہ بولا اور احکامات جاری کرنے چلا گیا۔ اس نے لات مار مار کے اپنی گھر والی کو اور عملے کے دیگر افراد کو بیدار کیا۔ انہوں نے پہلے احتجاج کیا اور ان کے درمیان کچھ تو تکار بھی ہوئی لیکن فیری کے مالک نے ہماری طرف اشارہ کیا تو جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ ایک دم مستعد ہو کے کام میں لگ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم پندرہ منٹ بعد جیپ سمیت دریا عبور کر رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے میں فیری نے ہمیں دوسری طرف اتار دیا۔ غالب نے مجھ سے مشورے کے بعد نازو کو سمجھایا تھا کہ فیری والے کو مناسب معاوضہ ادا کر دے' جو اتنا زیادہ بھی نہ ہو کہ صبح ہر شخص کو ان دریا دل فوجیوں کے بارے میں معلوم ہو جائے جو آدھی رات کے وقت حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے فیری کے مالک کو قارون کا خزانہ بخش گئے تھے اور نہ اتنا کم ہو کہ فیری کا مالک ظلم ظلم چلاتا پھرے۔

نازو نے اسے سو روپے دیے جو اس نے چپ کر کے رکھ لیے۔

جیپ خشکی پر اترتے ہی پھر دوڑنے لگی۔ ابھی ہم نے مشکل سے دس پندرہ میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ سامنے ایک لائٹ نظر آنے لگی۔ پھر وہ روشنی کی لکیر سی بن گئی جو آہستہ آہستہ لمبی ہوتی گئی۔ یہ ایک ملٹری کانوائے تھا جس میں چالیس پچاس چھوٹی بڑی' ہلکی بھاری گاڑیاں شامل تھیں۔ کانوائے کی قیادت ایک جیپ کر رہی تھی جو بالکل ہماری جیپ جیسی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ بھارتی فوجی تھے مگر درمیان میں چند ٹرک مجھے پاکستانی فوج کے لگے۔

کانوائے کو کراس کر کے میں نے اطمینان کا سانس لیا "خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے ہمیں روکا نہیں۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ ہم اُن کے ایک بھی سوال کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ انجام یہ ہوتا کہ اسی کانوائے میں شامل ہو کے اور دو واپس....."

اچانک رات کے سکوت میں فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔

"یہ..... کیا ہو رہا ہے؟" نازو نے ڈر کے کہا۔

"میرا خیال ہے بچے پٹاخے چھوڑ رہے ہیں۔ شب برات پر ایسا ہی ہوتا ہے" غالب نے جواب دیا۔

"یہ تو گولیاں ہیں" گل سادگی سے بولی۔

غالب ہنس پڑا "کون سی گولیاں؟ کھٹی میٹھی یا ہاضمے کی۔"

میں فائر کی آوازوں سے فاصلے کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا "کیا ہم عین اسی سمت میں جا رہے ہیں جہاں فائرنگ ہو رہی ہے؟"

غالب نے اقرار میں سر ہلایا "اور جا بھی کہاں سکتے ہیں۔ ایک ہی سڑک ہے۔ آگے جائیں یا پیچھے۔"

نازو نے کہا "واپس چلو۔"

گل نے کہا "غور سے سنو۔ یہ کیسی چیخ پکار ہے۔"

ہم سب خاموش ہو گئے۔ مردوں اور عورتوں کے چلانے کا شور بہت واضح ہو گیا تھا۔ فائرنگ اب بند ہو گئی تھی۔

"کیا یہ بھارت اور پاکستان کی جنگ ہو رہی ہے؟" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا "چل کے دیکھ لیتے ہیں۔ بلکہ پوچھ لیتے ہیں لڑنے والوں سے۔"

"ڈھنگ کی بات مت کرنا....." نازو بگڑ کے بولی۔

"تم بھی کوئی ڈھنگ کا سوال کرو" غالب نے کہا "جنگ ایسی ہوتی ہے؟ چند فائر ہوئے اور ختم۔ نہ توپ خانہ کام آیا نہ ٹینک۔"

میں نے کہا "یہ معاملہ واقعی کچھ اور ہے۔"

گل نے کہا "آخر ہم لوگ رک کیوں نہیں جاتے؟ ایسا نہ ہو کسی مشکل میں پڑ جائیں۔"

"اگر یہ کارروائی بھارتی فوج کی ہے تو ہمیں اس سے دور رہنا چاہیے' کوئی آپس کا جھگڑا ہے تو ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔"

غالب نے کہا "یہاں لوگ آپس کے جھگڑوں کو آدھی رات کے وقت گولیاں چلا کے طے نہیں کرتے۔"

"جو سیاسی طور پر ایک دوسرے کے حریف اور دشمن ہیں وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا "اور کسی بھی وقت کر سکتے ہیں۔"

اس وقت میں جیپ چلا رہا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ ان حالات میں مجھے چلتے رہنا چاہیے یا کہیں سائڈ میں رک کر سب کی حفاظت کی فکر کرنی چاہیے کہ سڑک اچانک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ فائرنگ اور چیخ پکار دائیں طرف سے سنی گئی تھی۔ دوسری سڑک بائیں جانب یعنی مخالف سمت جا رہی تھی۔ اے ایس پی نے کچھ پوچھے بغیر ہی بائیں طرف مڑ گیا۔

"اگر یہ راستہ غلط ہے تو ہم واپس آ جائیں گے" میں نے کہا۔

اے ایس پی نے کہا "نہیں' اِدھر ہی جانا تھا۔ آگے دریا آئے گا۔"

"ایک اور دریا۔ رات کے دو بجے" میں نے کہا۔

اے ایس پی ہنسنے لگا "ابھی سے گھبرا گئے۔ ابھی تو بہت سے ندی نالے اور دریا آئیں گے اور ان پر پل بھی نہیں ہوں گے۔"

میں نے کہا "کوئی ایسا راستہ بھی تو ہوگا جس پر سڑک رکے بغیر چلی جائے۔ اور یہ آخر تُک کیا ہے دریا پر پل نہ بنانے کی؟"

اے ایس پی بولا "دراصل تمہارے ذہن میں اپنا ملک ہے جہاں گنتی کے چند دریا ہیں۔ پنجاب کے تین دریا اور ایک سندھ کا۔"

غالب نے کہا "پنجاب کا چوتھا دریا بھی تھوڑا سا ہمارے پاس ہے۔"

"یہاں برساتی ندی نالوں کو شامل کیا جائے تو سیکڑوں دریا ہیں اور آبادی اتنی گنجان ہے کہ ہر قدم پر ایک پل چاہیے۔ پل بڑی بڑی سڑکوں اور شاہراہوں کو ملاتے ہیں مگر وہ بہت کم ہیں۔ ہم اس طرف سے نہیں جا سکتے تھے۔" اے ایس پی نے کہا "یہ عام راستہ نہیں ہے' چور راستہ ہے۔"

دریا ایک برساتی ندی ثابت ہوا۔ اس میں پانی نہ ہونے کے برابر تھا۔ درمیان میں پانی کا دھارا بیس پچیس فٹ کی چوڑائی میں بہہ رہا تھا اور بظاہر اس کی گہرائی بھی زیادہ نہیں لگتی تھی۔ کچی مٹی اور کنکروں پر دو میل ڈرائیو کر کے جیپ کسی دشواری کے بغیر گزر گئی۔

عام گاڑی ہوتی تو اس کے پہیے ایک ہی جگہ دھنس کر رہ جاتے۔ میں نے جیپ کو ندی سے گزارنے کا ارادہ کیا تو نازو اور گل نے شور مچا دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" نازو بولی "اپنے ساتھ ہمیں بھی ڈبو دو گے۔"

"نہیں۔ ہم پار اتر جائیں گے تم ڈوب جاؤ گی انشاء اللہ۔"

غالب نے کہا "مطلب یہ کہ اگر خدا نے چاہا۔ کیوں کہ تمہارے اعمال ہی ایسے ہیں۔"

گل نے کہا "خدا نے تو منع کیا ہے خودکشی سے۔"

میں نے کہا "ہمارے آباؤ اجداد نے بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑائے تھے۔ یہ تو ایک ناچیز دریا ہے اور گھوڑے کے مقابلے میں ایک جیپ ہے کئی ہارس پاور کی۔"

غالب نے کہا "چلو یار' ان بزدل لڑکیوں کی خاطر پہلے گہرائی دیکھ لیتے ہیں۔"

"گہرائی کیسے دیکھیں گے؟" میں نے کہا۔

"تم اللہ کا نام لے کر پانی میں اتر جاؤ۔" غالب نے کہا "میں تمہارے پیچھے پیچھے جیپ لاتا ہوں۔ جہاں گہرائی زیادہ ہو اور تم ڈوبنے لگو تو مجھے روک دینا۔"

"مجھے تیرنا آتا ہے" میں نے کہا "مگر اس وردی کا کیا' یہ بھیگ جائے گی۔"

"وردی اتار کے ہمارے پاس امانت رکھوا دو۔ پار اتر کے پھر پہن لینا۔"

میں نے کہا "یار! مجھے شرم آتی ہے۔"

غالب نے حیران ہو کے کہا "اچھا؟ یہ تو کمال کا انکشاف کیا ہے آپ نے۔ ہم تو آپ کو بالکل بے شرم سمجھتے تھے۔ خیر ہم ایسا کرتے ہیں کہ آنکھیں بند کر لیتے ہیں کیوں کہ پردہ آنکھ کا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "میں اِدھر اُدھر دیکھ کے آتا ہوں کہ کون سی جگہ بہتر ہے۔"

ہیڈ لائٹس آف کر کے میں پہلے دائیں طرف گیا۔ تقریباً بیس پچیس گز کے بعد پانی کا دھارا تین حصوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ درمیان میں خشکی کے چھوٹے جزیرے سے ابھر آئے تھے۔ یہ جگہ ہر اعتبار سے موزوں نظر آتی تھی۔ میں نے جسم پر صرف انڈرویئر رہنے دیا اور وردی اتار کے بنڈل سا بنا لیا۔ آہستہ آہستہ قدم جما کے میں پانی کے ایک دھارے سے گزرا۔ پھر درمیانی ٹیلا پار کر کے دوسرے دھارے میں اترا۔ کہیں بھی پانی کی گہرائی میرے گھٹنوں سے اوپر نہیں تھی۔

میں نے وردی اور جوتے پہنتے ہوئے غالب کو چلا کے آواز دی۔ اس نے جیپ کو اسٹارٹ کیا اور میری طرف لے آیا۔ آہستہ آہستہ جیپ بہتے پانی میں ہچکولے کھاتی اور چھینٹے اڑاتی آگے آئی۔

www.paksociety.com

میں اب پیچھے بیٹھ گیا۔

غالب نے کہا "اسے دریا کہنا سخت مبالغہ آرائی ہے۔"

اے ایس پی بولا "اکثر برسات میں اس کا پاٹ کئی فرلانگ تک پھیل جاتا ہے۔ کنارے کی آبادیاں سیلاب کی زد میں آجاتی ہیں۔"

"دریا کا پاٹ ہمارے عزائم میں حائل نہیں ہو سکتا" غالب نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا "ہم بحر ظلمات سے گزر جائے۔"

"اور اسلاف میں شامل ہو جاتے" نازو نے کہا۔

اس سے پہلے کہ غالب مزید کچھ بولتا اندھیرے میں کسی گاڑی کی ہیڈلائٹس چمکنے لگیں جو دائیں طرف اور کافی دور تھی مگر اجالے کی دو متوازی لکیریں درختوں کو روشن کر رہی تھیں اور بڑھتی ہوئی روشنی کم ہوتے فاصلے کا پتا دیتی تھی۔

"ہیڈلائٹس بجھا دو۔ اور گاڑی روک لو ایک طرف" نازو نے کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں۔ جیسے ہم نے روشنی دیکھی ہے ایسے ہی ہماری جیپ کی ہیڈلائٹس کا اجالا نظر آگیا ہوگا" غالب نے کہا۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟" گل نے گھبرا کے کہا۔

"اب جو بھی ہوگا۔ دوست ہوگا یا دشمن' سامنے آجائے گا۔" میں نے کہا "بلاوجہ اور قبل از وقت پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ ایک فوجی جیپ تھی' بالکل ایسی ہی جیسی ہمارے پاس تھی۔ اس نے سامنے آکے لائٹ دوبارہ جلائی بجھائی۔ میں نے جوابی سگنل دیا۔ جیپ چند قدم کے فاصلے پر آکے رک گئی۔ میں پہلے نیچے اترا۔ سامنے والی جیپ میں سے بھی کوئی ٹارچ لے کر نکلا۔ اس کے پیچھے چار فوجی تھے۔

"کون ہو تم؟" اس نے روشنی میرے چہرے پر ڈالی "وہیں رک جاؤ۔"

میں نے انگریزی میں کہا "میں دشمن نہیں دوست ہوں۔"

اس نے ٹارچ بجھا دی "دور سے نام بتاؤ اپنا۔"

میں نے کہا "لیفٹیننٹ پرشوتم داس۔ تم؟"

"کیپٹن یو گیش" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "تم ادھر کیا کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "نوکری۔ حکم کی تعمیل' بلا چون و چرا۔"

غالب اور اے ایس پی میرے بعد جیپ سے اترے تھے۔ انہوں نے کیپٹن کو سیلیوٹ مارا۔

"اور کون ہے تمہارے ساتھ؟" کیپٹن نے جیپ میں جھانکا پھر سیٹی بجائی "واہ لڑکیاں؟"

میں نے کہا "ادھر گاؤں میں بلوہ ہو گیا تھا۔"

کیپٹن نے پھر ٹارچ روشن کی اور غور سے گل اور نازو کو دیکھا۔ "ہاں مجھے بھی معلوم ہوا تھا۔ یہ مال غنیمت ہاتھ لگا ہے تمہارے۔"

میں نے پرسکون رہتے ہوئے کہا "ان لڑکیوں کا سارا خاندان قتل ہو گیا تھا۔"

کیپٹن اوباشوں کی طرح ہنسا "پھر تو تم کو کسی کا ڈر نہیں۔ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔"

میں نے متانت سے کہا "یہ اپنے رشتے داروں کے پاس جانا چاہتی ہیں۔ قریب ہی کسی گاؤں میں ان کے چاچے ماسے رہتے ہیں۔"

"گولی مار دو چاچے ماسے کو۔"

"کرنل صاحب نے مجھے حکم دیا ہے کہ انہیں بحفاظت پہنچا کے آؤں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

کیپٹن ہنسا "ٹو ہیل ود یور کرنل۔ سمجھو تم نے انہیں بحفاظت پہنچا دیا۔"

وہ آگے بڑھا تو میں اس کے سامنے آگیا "میں اس وقت تک ایسا نہیں سمجھ سکتا جب تک یہ لڑکیاں واقعی اپنے گھر نہیں پہنچ جاتیں۔ میں کرنل کے احکامات پر سو فیصد عمل کروں گا' ایک مجنے کے ساتھ اور ایک پروفیشنل سولجر کی طرح۔ تم انہیں ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔"

"شٹ اپ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں تم جیسے ایماندار' فرض شناس حکم کے غلاموں کو" وہ مشتعل ہو کے بولا "میں ناجائز مطالبہ نہیں کروں گا۔ ان میں سے ایک میرے حوالے کر دو۔"

"یہ لڑکیاں میری تحویل میں ہیں' ان کی حفاظت میں کروں گا۔" میں نے کہا "اگر تمہیں اپنی عزت کا خیال ہے تو جاؤ اپنا راستہ لو۔"

"ورنہ۔ کیا کرو گے تم؟" وہ غرا کے بولا۔

"میں تمہاری رپورٹ بعد میں کروں گا' اس سے پہلے میں خود تمہیں ایسا سبق دوں گا جو دوسروں کے لئے بھی درس عبرت ہوگا۔" میں نے کہا "تم پھر کبھی دوسروں کو بری نظر سے دیکھنے کے قابل نہیں رہو گے۔"

"کیا؟" کیپٹن نے بے یقینی سے کہا "تم خود......"

"ہاں میں خود" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "اگر تم اپنی بے عزتی کرانا چاہتے ہو اپنے ماتحتوں کے سامنے تو ان لڑکیوں کی طرف ایک قدم بڑھا کے دیکھو۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تم انہیں رشتے داروں کے پاس چھوڑنے جا رہے ہو۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم انہیں اغوا ہو" کیپٹن بولا "میں پوچھوں گا ان سے۔"

"میرا کہا وہ سچ ہے جو کسی ثبوت کا محتاج نہیں۔ میں تمہیں تصدیق کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

اس نے مجھے دھکا دیا "ہٹ جاؤ میرے راستے سے ورنہ......"

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نشے میں ہے۔ میں نے کچھ سوچا اور پھر ایک طرف ہو گیا "او کے کیپٹن یو گیش۔ ٹیک یور گرل۔"

میں نے نازو کی طرف اشارہ کیا۔ نازو خاموشی سے اتر آئی۔

کیپٹن قہقہہ مار کے ہنسا "ناؤ یو ہیو ٹاکڈ لائک اے گڈ بوائے۔ یہی طریقہ ہے۔ سمجھ کے آدمی مل بانٹ کے کھائے۔ کیا نام ہے تمہارا سوئٹی؟"

"گیدڑ کی موت" نازو نے اطمینان سے کہا۔

"واٹ؟ گیدڑ..... کون گیدڑ؟" کیپٹن ہنسنے لگا "تم مجھے گیدڑ کہہ رہی ہو؟ کیپٹن یو گیش کو۔ تم خود کیا ہو؟ شیر کی خالہ؟"

"میں تمہاری بہن ہوں" نازو نے کہا "تم تو عادی ہو گے اپنی کسی بھی بہن کو داشتہ رکھنے کے۔ اپنی یا کسی اور کی۔"

کیپٹن اتنی بڑی گالی کے لئے تیار نہ تھا۔ خود میں نازو کی زبان سے یہ بات سن کے حیران ہوا مگر وہ شعلہ بن کے بھڑک اٹھی تھی اور برق تپاں کی طرح بے قرار تھی۔

کیپٹن یو گیش نے اسے چیخ کر گالی دی "زبان دراز کتیا۔"

اس نے نازو کی کلائی پکڑ کے اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا غیر متوقع نہ تھا۔ ہم سب اس کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ نازو نے پے در پے وار کئے اور اس سے پہلے کہ کیپٹن کے ساتھی کچھ سمجھ پاتے' ان کا افسر چیختا چلاتا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ نازو نے اسے لاتوں اور ٹھوکروں سے مارا۔

"دیکھ کیا رہے ہو؟ شوٹ کر دو انہیں" کیپٹن چلایا۔

اپنے افسر کی آواز پر ان سب نے ایک ساتھ رائفل اٹھائی مگر انہیں گولی چلانے کی مہلت نہ ملی۔ میں نے اور غالب نے کسی تذبذب کے بغیر ریوالور نکالے اور ان کے سروں میں سوراخ کر دیئے۔ فائرنگ کی آوازوں نے آشیانوں میں خوابیدہ پرندوں کو بیدار کر دیا۔ وہ خوف زدہ ہو کے اڑے اور فضا میں شور مچاتے چکر لگانے لگے۔

کیپٹن بڑی مشکل سے اٹھا۔ ایک سکتے کی کیفیت میں وہ اپنے ماتحتوں کو دم توڑتا دیکھتا رہا "تم...... تم نے قتل کر دیا سب کو!"

"ہاں۔ اور اب تمہاری باری ہے" میں نے کہا۔

"مجھے مت مارو" وہ دہشت زدہ ہو کے چلایا۔

"میں نے کہا تھا کہ میں تمہیں ایسا سبق سکھاؤں گا جو دوسروں کے لئے باعث عبرت ہوگا۔ پھر تم کبھی کسی کو بری نظر سے دیکھنے کے قابل نہیں رہو گے" میں نے کہا اور نازو کی طرف دیکھا۔ "یہ تمہارا مجرم ہے' تم اسے جو سزا چاہو دو۔"

نازو نے اسے سر کے بال پکڑ کے جھٹکے سے اٹھایا اور ایک ہاتھ اس کی گردن پر مار کے چھوڑ دیا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح گرا اور اس کا جسم کرب میں ادھر سے ادھر دوہرا ہونے لگا۔

"اب چلو۔ کچھ دیر میں صبح ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

"کیا ان کو یہاں ایسے ہی چھوڑ دیں؟" غالب نے کہا۔

"ہمارے پاس انہیں ٹھکانے لگانے کے لئے وقت نہیں ہے۔" نازو نے کہا۔

غالب بولا "ٹھیک ہے۔ مگر ان کو ایک طرف ڈال دیتے ہیں۔ کتنی دیر لگے گی۔ یہاں سڑک کے بیچ میں تو نہ پڑے رہیں۔"

میں نے اس کی مدد کی اور ہم نے لاشوں کو گھسیٹ کر درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپا دیا۔ پھر غالب جیپ کو چلا کے لے گیا اور جنگل میں چھوڑ آیا جہاں سڑک پر سے گزرنے والے کی نگاہ نہیں جا سکتی تھی۔

اگلے دو گھنٹوں میں ہم نے کسی مداخلت کے بغیر سفر کیا اور اسی کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے میں کامیاب رہے۔ راستے میں دو برساتی نالے' تین چھوٹی نہریں اور ایک نسبتاً بڑا دریا آیا۔ نالوں سے ہم جیپ میں گزر گئے۔ ندی پر ایک شکستہ حال کشتیوں کا پل تلاش کرنے میں کچھ وقت لگا مگر دریا پار کرنے میں دیر نہیں لگی۔ اس پر نیا پختہ پل تھا۔

صبح صادق کے آثار ہویدا ہو رہے تھے کہ اے ایس پی نے اچانک اعلان کر دیا "ہم ڈھاکا کے نواح میں پہنچنے والے ہیں۔"

"سچ؟" گل نے جذبۂ بے اختیار شوق کے ساتھ کہا "کتنی دیر میں؟"

"تیس چالیس کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا" وہ بولا۔

میں نے کہا "پھر تو ہمیں یہ وردی اور جیپ چھوڑ دینی چاہئے۔ ڈھاکا کے آس پاس اور ڈھاکا کے اندر فوج ہی فوج ہے۔"

غالب نے کہا "جب ہر طرف فوج ہوگی تو ہمیں کون شک کی نظر سے دیکھے گا۔ کیا ہم فوجی نظر نہیں آتے۔"

نازو نے اس کی تائید کی "فوجی بھی عام لوگ ہوتے ہیں مگر وردیوں میں۔ ان کے سر پر سینگ تو نہیں ہوتے۔"

غالب نے کہا "ٹھیک ہے میڈم۔ کسی موقعے پر میں آپ کی حمایت کروں گا' خواہ بات کتنی ہی احمقانہ کیوں نہ ہو۔"

"کیا میں احمقانہ باتیں کرتی ہوں؟" نازو نے خفگی سے کہا۔

"جی اکثر۔ انجانے میں عقل مندی کی بات منہ سے نکل جائے وہ الگ مسئلہ ہے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "دیکھو' یہ لڑائی شروع کرنے کا وقت نہیں ہے۔"

"ہاں' صبح ہو رہی ہے۔ ہم منزل تک پہنچ رہے ہیں" گل نے خوشی سے کہا۔

"یہاں حالات بہت خراب ہیں۔ خانہ جنگی اور انتشار' لاقانونیت اور کسمپرسی کا عالم ہے" اے ایس پی نے نصیحت کے انداز میں کہا "تم کو بہت محتاط رہنا ہوگا۔"

میں نے کہا "تم نے ہماری رہنمائی کا فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔"

"ہم سب بہت ممنون ہیں" غالب بولا "تمہاری مدد کے بغیر ہم اتنے کم وقت میں یہ مسافت طے نہیں کر سکتے تھے۔ یا تو ہم بھٹکتے

www.paksociety.com

رہتے یا کسی مشکل میں پڑ جاتے۔"

میں نے کہا "ایک بات بتاؤ۔ آخر تم نے یہ کام نیک نیتی سے کیوں کیا؟"

"نیک نیتی سے؟" وہ بولا "میں مجبور تھا۔"

"ہاں۔ ابتدا میں تم واقعی جبر کے تحت تعاون کر رہے تھے لیکن بعد میں تم کو بہت سے موقعے ملے۔ جب تم...... کچھ کر سکتے تھے ہمارے خلاف۔ حالات سے فائدہ اٹھانا چاہتے تو اٹھا سکتے تھے۔ مگر تم نے کچھ نہیں کیا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا "سچ بتا دوں؟ میں کچھ قائل ہو گیا تھا کہ تم جس مقصد کی خاطر یہ سب دکھ جھیل رہے ہو' وہ غلط نہیں ہے۔ تمہارا مشن تخریب کاری نہیں تھا۔ میں تمہاری ٹیم اسپرٹ سے متاثر ہو گیا۔ تمہارے درمیان ایک ایسی اعتماد کی فضا ہے' ایسی مفاہمت ہے اور ایسی جذبات کے رشتوں کی ہم آہنگی ہے کہ مجھے اس خاندان میں شامل ہونا اچھا لگنے لگا۔ تم سب کے ساتھ تعلق میں کوئی ایسی کشش تھی کہ میں نے دامن چھڑانے کی کوشش ہی نہیں کی۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "تم کو اس خیال نے شرمندہ نہیں کیا کہ تم دشمنوں کا ساتھ دے رہے ہو؟"

"یہ احساس ہوتا تھا مجھے۔ مگر بعض اوقات آدمی دشمن کی تعریف کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے" وہ بولا "مثلاً ابھی جو کچھ اس کیپٹن کے ساتھ ہوا' غلط نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ مستحق تھا اس سزا کا۔ مگر اس کے علاوہ یہ بھی سچ ہے کہ میں بہت دہشت زدہ تھا۔ تم سب بہت خطرناک بھی ہو۔ اور مجھے اپنی زندگی عزیز تھی۔ میں اپنے خاندان میں واپس لوٹ جانے کے لئے بے چین تھا اور اسے تم میری خود غرضی سمجھ لو کہ میں اپنے قول و فعل سے تم کو ناراض کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ مجھے امید ہے تم مجھے وعدے کے مطابق جانے دو گے۔ میرا کام ختم ہو گیا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں۔"

ہم چپ' ٹوٹی پھوٹی سڑک اچانک ایک بڑی سڑک سے مل گئی جس پر دونوں جانب سے ٹریفک آ رہی تھی۔

"دائیں جانب ڈھاکا ہے" اے ایس پی نے کہا "تم مجھے یہاں چھوڑ سکتے ہو۔"

"یہاں!" میں نے کہا "تم کیسے واپس جاؤ گے؟"

اس نے مسکرا کے کہا "میں چلا جاؤں گا۔ چور راستوں سے آنا مشکل تھا' سیدھے راستے سے واپسی بہت آسان ہو گی۔"

"او کے۔ تم جہاں کہو گے وہاں جیپ روک لوں گا میں۔"

"بس اسی جگہ روک لو" اس نے کہا۔

میں نے بریک لگائے "اچھا خدا حافظ۔ تمہارے ساتھ جو ظلم زیادتی ہوئی' وہ ہماری ضرورت تھی۔ پھر بھی سوری۔"

اس نے ہم سب سے ہاتھ ملایا "میں یہ سب بھول جاؤں گا۔"

نازو نے کہا "تمہارے پاس واپسی کے لئے پیسے ہیں؟"

"پیسے میں پیدا کر لیتا ہوں" وہ مسکرایا "مجھے یہ وردی بدلنی پڑے گی۔ پھر اے ایس پی بن جاؤں گا تو کون کرایہ مانگے گا مجھ سے۔"

ہم نے اسے سڑک کے کنارے چھوڑا اور جیپ آگے روانہ ہو گئی۔ سامنے سے میں نے کئی فوجی گاڑیاں اور کانوائے گزرتے دیکھے۔ شہری گاڑیاں بہت کم تھیں اور مجموعی طور پر ماحول میں خوف کا احساس ہوتا تھا۔

دس منٹ بعد افق کے کنارے روشن ہونے لگے اور ایک زرد' بجھے بجھے سورج نے مشرق کے افق سے سر نکالا۔ سڑکوں پر سائیکل رکشا نظر آنے لگے۔ بسوں میں مسافر چھت کے اوپر بھی لدے ہوئے تھے۔ وہ ہماری طرف دیکھتے تھے تو ان کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں۔

اچانک غالب نے کہا "سکندر! میرا خیال ہے کہ ہم یہ وردیاں اتار کے عام آدمی بن جائیں۔ کہیں ان کی وجہ سے ہم کسی بڑی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔"

میں نے کہا "ایسی بہت سی فوجی گاڑیاں گزر رہی ہیں۔۔۔"

"مگر ان میں کوئی عورت نہیں ہے" غالب نے کہا "اور نہ جانے کیوں مجھے اے ایس پی کی طرف سے اطمینان نہیں ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ جھوٹ بول رہا ہو' ہمیں بے وقوف بنانے کے لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہمارے حلیے بتا دے اور ہم کسی اس وقت پکڑ لئے جائیں جب منزل سامنے ہو۔"

میں نے سوچ کے کہا "تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔"

"اس کے علاوہ ہمیں کہیں رک کے آرام کرنا چاہئے۔ سب کا برا حال ہے" غالب نے کہا "ان وردیوں کے ساتھ ہم کسی ہوٹل یا سائڈ کیفے میں بیٹھ کے چائے بھی نہیں پی سکتے۔"

میں نے اس کی بات پر جتنا غور کیا اتنا ہی اس کی معقولیت کا قائل ہوتا گیا۔ سڑک کے کنارے اکا دکا مکانات نظر آ رہے تھے مگر ان میں مکین نظر نہ آتے تھے۔ وہ ابھی سو رہے تھے یا شاید گھر چھوڑ کے کہیں چلے گئے تھے۔

ایک فرلانگ دور آنے کے بعد میری نگاہ چند درجن افراد کے ہجوم پر گئی۔ ان سب کے ہاتھوں میں بانس' ڈنڈے' سریے اور لوہے کے پائپ تھے۔ وہ ننگے پاؤں اور ننگے بدن تھے۔ جسم کے زیریں حصوں پر انہوں نے دھوتی باندھ رکھی تھی اور وہ صورت سے ہی وحشی نظر آتے تھے۔ چیختے چلاتے انہوں نے سڑک عبور کی اور دوڑتے ہوئے پچاس ساٹھ گھروں کی ایک بستی میں گھس گئے۔ بستی میں چیخ پکار مچ گئی۔

میں نے جیپ روک لی "یہ کیا ہو رہا ہے آخر؟"

غالب نے کہا "وہی جو ایسے حالات میں ہوتا ہے۔ لوٹ مار۔"

نازو نے کہا "تم چلو آگے۔ جو ہوتا ہے ہونے دو۔"

میں نے کہا "مگر دیکھو ذرا' یہ لوگ کس طرح تالے توڑ رہے ہیں اور کس طرح زبردستی گھروں میں گھس رہے ہیں۔ کوئی روکنے والا نہیں۔"

"جب قانون کو حکومت کی اور حکومت کو قانون کی پشت پناہی حاصل نہ رہے تو یہی ہوتا ہے" غالب نے کہا "ابھی یہاں کسی کے پاس نہ اقتدار ہے نہ اختیار۔ اندھیر نگری چوپٹ راج۔"

میں نے کہا "یار یہ لیکچر چھوڑو۔ ہم انہیں روک سکتے ہیں۔"

"کیا ہم یہاں نظم و نسق سنبھالنے اور امن و امان قائم کرنے آئے ہیں؟" غالب نے طنز سے کہا۔

میں نے جیپ موڑتے ہوئے کہا "یہ ضرور مسلمانوں کی آبادی ہو گی۔"

"مسلمان تو سب ہی ہیں۔ مارنے والے بھی اور مرنے والے بھی۔"

"میرا مطلب تھا' پاکستان کے حامی مسلمان ہوں گے۔ اس وقت حملہ آور موقعے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں" میں نے کہا "اس پاس نہ پولیس ہے نہ فوج۔"

گل نے کہا "بھائی سکندر! خواہ مخواہ......"

میں نے اسے ڈانٹ دیا "میں کوئی کام خواہ مخواہ نہیں کرتا۔" بلوائی لوگوں کو گھروں میں گھس کر مار رہے تھے۔ عورتوں کی چیخوں کے ساتھ بچوں کے چلانے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور یوں لگتا تھا کہ صرف وہی ظلم کا نشانہ بن رہے ہیں۔ مقابلے پر مرد ہیں ہی نہیں یا ہیں تو جان بچانے کے لئے چھپ گئے ہیں۔ مگر یہ بات ناقابل فہم تھی۔ ایسے بے غیرت اور بزدل مرد کہاں ہوتے ہیں جو اپنے گھر کی حفاظت نہ کریں۔

ایک گھر کے دروازے پر لگے ہوئے تالے کو توڑ کر دو افراد میرے سامنے اندر گئے تھے۔ جیپ روک کے میں نے ریوالور نکال لیا۔

"کون ہے اندر؟" میں نے گرج کے کہا "باہر آ جاؤ۔"

غالب نے ایک شخص کو پکڑ لیا جو زبردستی ایک عورت کو اپنے ساتھ کھینچ کر لے جا رہا تھا۔ ایک فوجی کو دیکھتے ہی وہ حواس باختہ ہو گیا اور عورت کو چھوڑ کر بھاگا۔

عورت چلانے لگی "ہمارا گہنا لے گیا۔ چور۔"

غالب نے فرار ہونے والے شخص کو پیچھے سے گولی ماردی اور عورت سے کہا "جاؤ۔ اپنا گہنا واپس لے لو۔"

تالا توڑ کے اندر گھسنے والے ایک گٹھڑی میں مال غنیمت باندھ کے نکلے تو انہوں نے مجھے مقابل دیکھا۔ وہ گٹھڑی پھینک کر بھاگنے لگے۔ میں نے ان دونوں کو نشانہ بنا لیا۔ فائرنگ کی آواز نے لوٹ مار کرنے والوں کو بدحواس کر دیا تھا۔ وہ شور مچا رہے تھے "فوج آگیا' فوج آگیا" اور مختلف گھروں سے نکل نکل کے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

تین کو غالب نے مار گرایا' چار میرے ہاتھوں جہنم رسید ہوئے اور دو کا نازو نے جھٹکا کیا۔ باقی مختلف سمتوں میں فرار ہو گئے۔ چند منٹ میں ہمارے گرد روتی چلاتی عورتوں کا مجمع لگ گیا۔ وہ سب بنگالی میں اپنی اپنی کہہ رہی تھیں لیکن ہم کچھ نہیں سمجھ رہے تھے۔

پھر ایک جوان لڑکی آگے آئی۔ اس نے انگریزی میں کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نہ آتے تو یہ غنڈے سب کچھ لے جاتے۔"

میں نے کہا "کون تھے یہ لوگ؟"

وہ میرے سوال پر کچھ حیران ہوئی "وہی مکتی باہنی کے غنڈے۔ کتنا ظلم کیا ہے انہوں نے' دیکھو۔"

میں نے اس کے ہاتھ دیکھے تو کانپ گیا۔ اس کے ہاتھ کی ایک انگلی نہیں تھی۔ ایک انگوٹھی اتارنے کے لئے کسی نے وہ انگلی کاٹ دی تھی اور اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ رو نہیں رہی تھی۔

نازو نے کہا۔ "بے وقوف لڑکی! اپنی باندھو اس پر۔"

میں نے کہا "آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ اس بستی کے مرد کہاں ہیں؟ انہوں نے غنڈوں کو مارا کیوں نہیں مقابلہ کیوں نہیں کیا؟"

اس لڑکی نے کہا "وہ اسی لئے آئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ گھروں میں صرف عورتیں اور بچے ہیں۔ وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ ایک دن پہلے پولیس جوان لڑکوں اور مردوں کو پکڑ کے لے جاتی ہے' دوسرے دن غنڈے گھروں میں گھس جاتے ہیں۔ لوٹ مار کرتے ہیں اور عورتوں کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ گلے میں سونے کا زیور ہو تو گلا کاٹ دیتے ہیں۔"

ان سب کو یقین تھا کہ ہم بھارتی فوجی ہیں جن کے بروقت آ جانے سے ان کی عزت' آبرو اور جان و مال محفوظ رہے۔ دہشت زدہ عورتیں خود رو رہی تھیں اور روتے ہوئے بچوں کو دلاسا دے رہی تھیں۔ میں نے ان سب کو تسلی دے کر اپنے اپنے گھروں میں جانے کو کہا۔ جس لڑکی نے ترجمانی کے فرائض سرانجام دیے تھے وہ بھی اپنی ادھوری انگلی پر پٹی باندھنے چلی گئی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک بہادر لڑکی تھی جو اتنی تکلیف کو سکون سے برداشت کر رہی تھی۔

اس نے جاتے جاتے کہا "ابھی آپ نہ جائیں' بڑی مہربانی ہو گی۔ ورنہ وہ غنڈے پھر آ جائیں گے۔"

میں نے کہا "تم جا کے گھر میں بیٹھو اور سب سے کہو کہ باہر کوئی نہ نکلے۔ دروازے بند رکھو اور جب تک آواز نہ پہچانو کسی کے لئے دروازہ مت کھولو۔ اگر ان میں سے کسی نے پھر حملہ کرنے کی غلطی کی تو اس کا بھی یہی حشر ہو گا" میں نے ادھر ادھر پڑی ہوئی لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

سب عورتیں غائب ہو گئیں تو میں نے غالب سے کہا "تم جیپ کو پیچھے لے جاؤ' سڑک پر سے نظر نہ آئے۔"

"اب کیا انتظار فرمائیں گے ہم کہ کوئی آئے اور اس بہادری کے کارنامے کی تفصیلات پوچھے' ہم سے شناخت مانگے؟" غالب

www.paksociety.com

نے گڑ کے کہا "خواہ مخواہ مصیبت میں پڑ جائیں گے سب۔"

میں نے کہا "بس چند منٹ کی بات ہے یار۔ یہاں سے پیدل کے نکلیں گے۔ جیپ کو چھوڑ جائیں گے۔ جیپ کھڑی رہے گی تو عورتوں بچوں کو اطمینان رہے گا کہ فوج موجود ہے۔ غنڈے بھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔"

غالب نے میری بات سمجھ لی۔ گل اور نازو کا رویہ بھی ایکدم مصالحانہ ہوگیا۔ ان کو پرائے معاملات میں میری دخل اندازی کی پالیسی سے قطعی اتفاق نہ تھا۔ عام حالات میں وہ اختلاف نہ کرتیں مگر اس وقت انہیں جلد از جلد ڈھاکا پہنچنے کی بے چینی تھی۔

ہم بے خوف و خطر اس گھر میں داخل ہوگئے جس کا تالا توڑنے والے مال غنیمت پھینک کر بھاگ گئے تھے۔ اندر ابتری کی حالت تھی۔ اس کوٹھری میں بھی ایسی کوئی چیز نہ تھی جسے وہ اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ اس میں چند کپڑے تھے، کچھ برتن اور چاندی کے زیور۔ وہ کسی غریب کا گھر تھا جسے کوئی غریب چور لوٹنے آیا تھا۔

غالب نے اندر آ کے دروازہ بند کر دیا "اب دیر مت کرو، کپڑے بدلو اور چلو۔" اس نے گل اور نازو سے کہا۔

میں نے کہا "بس وردیاں اتار کے اپنے کپڑے پہنتے ہیں اور چلتے ہیں۔"

غالب نے کہا "میرا مشورہ ہے کہ وہ کپڑے بھی چھوڑ دو۔"

"پھر کیا کریں؟"

غالب نے ادھر ادھر دیکھا "یہ جو کپڑے دیواروں پر لٹکے ہوئے ہیں، یہ ٹھیک ہیں۔"

"اتنے میلے اور پھٹے ہوئے!"

"یار، ہمارے حلیے بالکل ویسے ہی ہونے چاہئیں جیسے عام لوگوں کے۔ اس اے ایس پی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اگر اس نے کسی کو ہمارا حلیہ بتایا تو یہ بھی بتا دے گا کہ ہم نے کیسے کپڑے پہن رکھے ہوں گے۔" غالب نے کہا۔

"تمہیں اس اے ایس پی کا فوبیا ہوگیا ہے۔ وہ اتنا برا آدمی نہیں تھا۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔ وہ ادھر نہیں آئے گا۔ لوٹ کے گھر جائے گا۔ میری چھٹی حس کہتی ہے کہ وہ بدھو تھا۔"

"مگر میری ساتویں حس کہتی ہے کہ وہ بہت عیار اور مکار شخص تھا۔ اس نے بڑے ٹھنڈے دماغ سے کام لیا اور ہم سے تعاون کرکے اپنی جان بخشی کرالی مگر اس کے دل میں کچھ اور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم ڈھاکا پہنچنے کے بعد غائب نہیں ہوسکتے۔ پولیس، فوج اور انٹیلی جنس کے ادارے ہمیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ پھر رسک لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے اس کی بات مان لی "چلو تم بھی دیکھو اور پسند کرو اپنے لئے کوئی لباس فاخرہ۔"

نازو نے کہا "کتنی غلط بات ہے کہ ہم پہلے تو مالک مکان کی اجازت کے بغیر گھر میں گھسے۔ پھر اس کے کپڑے بھی پہن لیں۔"

"اور یہ فوجی وردیاں چھوڑ جائیں جو ان کے کسی کام کی نہیں" گل نے کہا "الٹا انہیں مصیبت میں ڈال سکتی ہیں۔"

"ہاں، وہ بیچارے کیا بتائیں گے تفتیش کرنے والوں کو کہ فوجی وردی میں وہ کون لوگ تھے اور ان کے ساتھ دو عورتیں کون تھیں" غالب نے تائید میں سر ہلایا "اچھی نیکی کی ان کے ساتھ۔ چوروں سے بچایا اور پولیس کی تحویل میں دے دیا۔"

"آسمان سے اتارا اور کھجور میں لٹکا دیا" نازو بولی۔

میں نے کہا "تم لوگ بلاوجہ جذباتی ہو رہے ہو۔ پتا نہیں یہ کون تھے، کہاں گئے۔ لوٹ کر آئیں گے یا نہیں مگر پھر بھی میں تم سے متفق ہوں۔ ہماری وجہ سے ان کو پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ اپنے کپڑے اور وردیاں ساتھ لے جاتے ہیں۔"

"ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جیپ میں چھوڑ دیتے ہیں" غالب نے کہا۔

"جیپ کہاں کھڑی کی ہے؟"

"اس گھر کے نزدیک نہیں ہے" غالب نے کہا۔

نازو نے کہا "یہ بہت غریب لوگ ہیں۔ ان کے لئے پرانے کپڑوں کا چوری ہونا بھی نقصان ہے۔ اس کی تلافی ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ کچھ رقم یہیں چھوڑ دینا۔ جو ملے تو صرف ہم کو ملے" میں نے کہا۔

دس منٹ بعد ہم اس گھر کی دیواریں پھاند کے پچھلی طرف سے پیدل سڑک کی جانب روانہ ہوگئے۔ اب ہم جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق بالکل مقامی حلیے میں تھے اور کسی نے ہمیں باہر نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ میلے کپڑے کی ایک پوٹلی نازو نے اٹھا رکھی تھی اور دوسری گل نے۔ ایک میں ہمارے ریوالور تھے اور دوسرے میں باقی بچی ہوئی نقد رقم کے ساتھ وہ سونا تھا جو ابھی تک کسی کے بھی کام نہ آیا تھا اور ہمارا ساتھ نہیں چھوڑ رہا تھا۔

ڈھاکا کی سمت جانے والی ہر بس کھچا کھچ بھری ہوئی آرہی تھی۔ ان میں مرد اور عورتوں کو جس طرح ٹھونسا گیا تھا اسے دیکھ کر گل اور نازو کو سفر تو خرت زیادہ آسان محسوس ہوتا تھا۔

"میں تو دم گھٹنے سے مر جاؤں گی" نازو نے کہا۔

"زیادہ نخرے مت دکھاؤ۔ تمہارے لئے ائر کنڈیشنڈ کوچ نہیں آئے گی یہاں" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "اوپر ائر کلاس میں جگہ مل سکتی ہے۔"

"کیا مطلب؟ چھت پر" گل نے گھبرا کے کہا۔

"ہاں۔ کھلی فضا اور اس خوب صورت ماحول سے لطف اندوز ہوتے جائیں گے" میں نے کہا۔

"یہ الگ بات ہے کہ راستے میں کہیں گولیاں چل رہی ہوں تو نشانہ ہم بن جائیں۔ یا بس الٹ جائے تو۔۔۔"

"فضول باتیں مت کرو" نازو نے کہا۔

وہیں کھڑے کھڑے ایک گھنٹا گزر گیا لیکن کوئی ایسی بس نہ

تھی جس میں ہمارے لئے کھڑے ہونے کی جگہ بھی ہوتی۔ وہاں مرد و زن کے لئے الگ الگ خانوں کا رواج نہیں تھا چنانچہ حضرات اور خواتین سفر کے دوران ایک دوسرے کے ساتھ قابل اعتراض حد تک شیر و شکر ہو جاتے تھے مگر انہیں نہ اس کا احساس تھا اور نہ کوئی پروا تھی۔ تاہم گل اور نازو کے لئے یہ بعید از قیاس تھا کہ وہ کسی طرف سے سینڈوچ ہو جائیں اور وہ بھی صرف دھوتی پہن کے ننگے بدن سفر کرنے والے مردوں میں جن کے جسم سے پسینہ بہہ رہا ہو اور پسینے میں مچھلیوں کی بو ہو۔

آخر کار قدرت کو ہم پر رحم آیا۔ اچانک ایک ٹیکسی نمودار ہوئی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ٹیکسی خالی تھی۔ اسے روکنے کے لئے میں نے تقریباً سڑک کے وسط میں جست لگائی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ایک دم بریک لگائے اور پھر کھڑکی سے سر نکال کے مجھے نہ جانے کیا کچھ کہا۔

گالیاں کھا کے بے مزہ ہوئے بغیر میں نے کہا "ڈھاکا۔"

اس نے مزید کچھ ارشاد کیا اور باری باری ہم سب پر غور کیا۔ ہم حلیے اور صورت سے ہرگز اتنے معزز نہ لگتے تھے کہ ٹیکسی میں سفر کریں۔ تاہم اس نے یہ اندازہ کرلیا کہ ہم اس کی زبان نہیں سمجھتے۔

اس نے کہا "سو ٹکا۔"

میں نے کہا "ون ہنڈرڈ۔ اوکے۔ یو اسپیک انگلش۔"

وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس نے سر ہلایا اور بولا "یو ناٹ بنگالی؟"

میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "نو ریسٹ۔ سری لنکن۔"

اس نے دوبارہ گل اور نازو کے سراپا پر نظر ڈالی۔ ان کے لباس مشرقی پاکستان کی عورتوں جیسے تھے اور رنگ روپ سے وہ ذرا بھی سری لنکا کی نظر نہ آتی تھیں۔ تاہم اس نے مزید تجسس کا اظہار غیر ضروری سمجھا اور ہم نے ٹیکسی میں بیٹھ کے خدا کا شکر ادا کیا۔

راستے میں ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ غالب اگلی سیٹ پر تھا۔ میں گل اور نازو کے ساتھ پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔

میں بہت زیادہ تھک چکا تھا۔ رات بھر جیپ کا سفر انتہائی سخت جسمانی قوت برداشت کا امتحان تھا۔ جیپ کسی کار کی طرح آرام دہ نہیں ہوتی۔ پھر وہ سڑک بھی شہر کی ہموار شاہراہ نہیں تھی۔ رہی سہی کسر ندی نالوں سے گزرنے اور دریا پار کرنے میں پوری ہوگئی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس رات کے سفر میں نہ ہم آرام کے لئے قیام کرسکے تھے اور نہ ہمیں کھانے پینے کے لئے کچھ میسر آیا تھا۔

جب میری یہ حالت ہے تو گل اور نازو کا کیا حال ہوگا، یہ سوچ کے مجھے دکھ بھی ہوا کیوں کہ انہیں مصائب اور مشکلات کی اس انتہا تک لانے کا ذمے دار میں ہی تھا۔ مجھے ان پر فخر بھی محسوس ہوا۔ ان میں صعوبات جھیلنے، دکھ اٹھانے، بھوک پیاس اور

www.paksociety.com

مسافرت کی تکالیف برداشت کرنے اور ذہنی و جسمانی اذیت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی غیر معمولی تھی۔ رفاقت کا حق ادا کرنے، عہد وفا نبھانے اور صبر و شکر کے ساتھ ہر حال میں خوش رہنے کا سلیقہ بھی ان کو قدرت نے بڑی فیاضی سے ودیعت کیا تھا۔

اب جب کہ کٹھن راستوں پر آزمائش کے جان لیوا سفر کا مرحلہ ختم ہو رہا تھا، میں انہیں یاد کرنے پر مجبور تھا جو آغاز سفر میں بچھڑ گئے تھے، راستوں میں کھو گئے تھے، بہت پیچھے رہ گئے تھے یا اتنا آگے نکل گئے تھے جہاں سے لوٹ کر آنا ان کے بس میں نہ تھا، کسی کے بھی اختیار میں نہیں ہوتا۔ لیکن ان سب کے مقابلے میں اس وقت میرے خیالوں میں محسن کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ سب عکس مدھم پڑ گئے تھے اور میرے بچپن کے اس دوست کا تصور کسی زندہ تصویر کی طرح روشن ہوگیا تھا۔

کیا وہ اب بھی امید لگائے چشم براہ ہوگا؟ کہیں سر راہ گزار بیٹھا ستم کش انتظار ہوگا؟ یقین اور ناقابل شکست رشتوں پر ایمان کے ساتھ منتظر ہوگا کہ ایم آر ایس کے جاں نثار حلیف، اس کے دوست، سکندر اور غالب، رابعہ، گل اور نازو، یہ سب پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ نہ آئیں۔ اسے بھول جائیں اور واپس چلے جائیں۔

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے؟ سب نے ویسے تو عمر کا ایک حصہ نذر کیا۔ زندگی کی راحتوں اور نعمتوں سے منہ موڑا۔ عیش و آرام کو قربان کیا اور اس کے بدلے میں ذلت و خواری، دربدری اور بے سروسامانی کی اذیت قبول کی۔ عداوتوں کا سامنا کیا اور موت کے پرخطر راستوں پر چلے۔ شکست و فتح مقدر سے ہے، ولے اے میر، مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا۔ ایم آر ایس جس جذبے کا نام تھا، اسے دوام ہے۔ کوئی نمرود، کوئی یزید یا ہلاکو خان آدمی کی انسانیت کو نہیں مار سکا۔ اس کے حق، سچائی اور راستی پر ایمان کو نہیں ختم کرسکا۔ ہم سب کے لئے ہمارا یہی غرور سب سے بڑا انعام تھا کہ ہم برحق تھے چنانچہ شرمسار اور پشیمان نہیں تھے۔ پاکستان کو بگاڑنے والے یا توڑنے والے، بنگلہ دیش کے وجود کے اسباب اور اسے معرض وجود میں لانے کے ذمے دار سیاست داں، دانشور، فوجی اور بین الاقوامی سازشوں کے پروردگار شاید کبھی احساس جرم کی خلش اپنے ضمیر میں محسوس کرتے ہوں مگر ہم نہیں۔ ہم مطمئن تھے کیوں کہ شکست نہ ہمارے مقصد کو ہوئی تھی نہ جذبے کو۔

غالب بھی کسی گرداب خیال میں غوطہ زن تھا اور میرے ساتھ بیٹھی ہوئی نازو اور گل سیٹ پر آنکھیں بند کئے نڈھال پڑی تھیں۔ انہیں بالکل احساس نہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے بہتے ہوئے سیل اشک نے ضبط کی دیواروں کو عبور کرلیا ہے۔ یہ آنسو ان کے خیالوں کی تصویر درد تھے جو حد سے گزر گیا تھا تو دوا بن گیا تھا۔

میں بے خیالی میں سامنے سے آنے والی ٹریفک کو دیکھ رہا تھا جو شہر کے نواح میں اچانک بڑھ گئی تھی۔ اچانک میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ میں نے بے اختیار پلٹ کے دیکھا۔ ایک جیپ تیزی سے گزر گئی تھی۔ اس میں سب اجنبی چہرے تھے۔ بھارتی فوجی جوانوں کی صورت پر فاتحانہ خوں آشامی کا غرور تھا۔ اس شکاری کی طرح جو بندوق کی طاقت سے جنگل کے بادشاہ کو مار ڈالے اور پھر اس کی لاش پر پاؤں رکھ کے تصویر بنواتا ہے۔ ان خونی چہروں کے درمیان مجھے ایک آشنا صورت دیکھ کر جھٹکا لگا تھا۔

یہ صورت اے ایس پی کی تھی۔ وہ آگے ایک فوجی افسر کے ساتھ اپنی وردی پہنے بیٹھا تھا اور اس کی پُرکینہ نگاہیں بڑے انتقامی تجسس کے ساتھ آتے جاتے لوگوں پر پڑ رہی تھیں۔ یہ محض میرے خیال کا واہمہ یا نظر کا فریب نہیں تھا۔ غالب نے بھی اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ پھر میرے ساتھ وہ بھی پلٹ کر جاتی ہوئی جیپ کو دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا مگر جیپ کے پچھلے حصے میں دوسرے فوجی تھے۔

غالب نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے اشارے سے روک دیا۔ اس کی نگاہوں میں وہی سوال تھا جو میرے دل میں تھا اور شاید غالب نے بھی میری آنکھوں میں پڑھ لیا ہو گا۔ دوسرے لمحے سوال کی جگہ جواب کا عکس نمایاں ہو گیا اور ہم نے زبانِ خاموشی میں کہا "ہاں۔ یہ وہی تھا۔"

غالب کی خفیف سی مسکراہٹ نے کہا "دیکھا، میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ حرامزادہ ہمیں الو بنا رہا تھا اپنی باتوں سے۔"

میری جھکی ہوئی نظر نے کہا "واقعی تم نے اسے صحیح سمجھا تھا۔"

خاموشی کی زبان میں غالب نے کہا "ہم بال بال بچ گئے۔"

میں نے اسی زبان میں جواب دیا "مگر محض میری وجہ سے۔ اگر ہم اسی جیپ میں سڑک پر چلتے جاتے تو اب تک گرفتار ہو جاتے۔" ہماری باتوں کو نہ ڈرائیور نے سنا نہ گل اور نازو نے مگر پھر بھی ہم نے ایک دوسرے سے سب کچھ کہہ دیا۔ غالب بولا "ہم کو شکر گزار ہونا چاہئے میری چھٹی حس کا جس نے تمہیں خبردار کر دیا تھا۔"

"ہم سے الگ ہوتے ہی اس خبیث نے ایک لمحہ ضائع نہیں کیا ہو گا اور جو پہلی فوجی گاڑی نظر آئی ہو گی اسے سب کچھ بتا دیا ہو گا۔"

"ہاں۔ مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔"

"سالا حیران پریشان تو ہو گا کہ اتنی جلدی ہم کدھر نکل گئے کہیں جیپ نظر آئی نہ ہماری شکلیں۔"

"وہ جیپ کو تلاش کر لیں گے۔"

"کر لیں۔ اس وقت تک ہم ڈھاکا کی بھیڑ میں گم ہو جائیں گے۔"

ے درمیان یہ خاموش مکالمے جاری رہے اگر ٹیکسی والا ہم سے سوال نہ کرتا کہ ڈھاکا میں ہم کہاں جائیں گے۔ ڈھاکا شہر کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ سوائے چند مقامات کے جن کا ذکر اکثر اخبارات میں آتا تھا میں کسی جگہ کا نام نہیں لے سکتا تھا۔ پلٹن میدان۔ شہید مینار۔ مسجد بیت المکرم۔ میں نے پہلا ہی نام لے دیا۔

شہر سنگینوں پر دشمنوں کا راج تھا۔ قابض فوجی ہر طرف دندناتے پھر رہے تھے۔ ان کا ساتھ دینے والے خوشیاں منا رہے تھے۔ پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگانے والے اپنے خوابوں کی شکست پر نوحہ خواں تھے اور ایک بار پھر بے وطن ہو جانے کے خیال سے پریشان تھے۔ ہر قدم پر مجیب کی تصویر تھی' جگہ جگہ دیش کے حق میں نعرے تھے اور پاکستان کے خلاف۔ سڑکوں اور بازاروں میں بہت بھیڑ تھی مگر لوگوں کے چہرے سپاٹ اور بجھے بجھے تھے۔ وہ اپنے اندیشوں اور خوف کے جذبات کو دبانے کی فکر میں مبتلا نظر آتے تھے۔ بڑی بڑی دکانیں بند تھیں۔ بہت سی دکانیں لوٹی جا چکی تھیں۔ بہت سے گھر جلائے جا چکے تھے۔ فضا میں وہ سکوت تھا جو کسی میدانِ جنگ میں توپوں' ٹینکوں کی گولہ باری' جہازوں کی بمباری اور مشین گنوں کی فائرنگ بند ہو جانے کے بعد ایک آسیب کی طرح مسلط ہو جاتا ہے۔

عام ضروریاتِ زندگی کے لئے دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور لوگ خریداری بھی کر رہے تھے۔ ایک جابر آمرانہ حکومت ختم ہو گئی تھی۔ بیرونی مداخلت کاروں نے اپنی مرضی سے دوسری حکومت کے قیام کو جواز فراہم کر دیا تھا مگر ابھی تک اس حکومت کا اقتدار قائم نہیں ہوا تھا اور لوگ گومگو... کی کیفیت کا شکار نظر آتے تھے کہ کس کی مانیں اور کس کی نہ مانیں' کسے غلط قرار دیں اور کسے صحیح۔ یہ تبدیلی وقتی اور عارضی ہے یا بھارتی فوج کی واپسی کے بعد بھی فاصلے ختم نہ ہوں گے جو دلوں کے درمیان پیدا ہو گئے ہیں۔ جغرافیائی فاصلوں سے کبھی فرق نہیں پڑا تھا اور ملک کے دونوں حصے جسم کے دو بازوؤں کی طرح تھے کہ ایک بھی جدا ہو تو ادھورا جسم معذور ہو جاتا ہے' نظر آتا ہے اور سمجھا جاتا ہے۔

ٹیکسی رک گئی "دس پلٹن میدان" ہم خواندہ ٹیکسی ڈرائیور نے بدولی سے کہا "یو ٹورسٹ بٹ ناٹ فرام سری لنکا" (تم سیاح ہو مگر سری لنکا کے نہیں ہو)

میں نے اسے سو کا نوٹ دیا "ہاؤ یو نو؟"

اس نے سوچ کے کہا "یو ناٹ سیف۔ یو لک پاکستانی" (تم محفوظ نہیں ہو کیوں کہ تم پاکستانی نظر آتے ہو)

میں نے کہا "پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا "خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ میں جاہل ہوں' متعصب اور دشمن نہیں ہوں۔ یہ لباس بدلوا کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل یا شاہ باغ ہوٹل میں کمرا لے لو اگر لے سکتے ہو۔ ورنہ کسی مسجد میں چلے جاؤ۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا "ہم شاہ باغ ہوٹل جا سکتے ہیں مگر یہ لباس کیسے تبدیل کریں؟ اس لباس میں ہمیں وہاں کون داخل ہونے دے گا؟"

اس نے کہا "میں یہ کر سکتا ہوں کہ تمہیں شاہ باغ ہوٹل لے جاؤں۔ تم پہلے ہی بتا دیتے تو اچھا تھا۔ چلو بیٹھو۔"

ہم پھر ٹیکسی میں بیٹھ گئے تو میں نے کہا "ایک ذاتی سا سوال ہے۔ تم کیا ہو' ہندو یا مسلمان؟"

اس نے پلٹ کے دیکھے بغیر کہا "میں بدھ مذہب کو مانتا ہوں' اس لئے خون خرابے سے نفرت کرتا ہوں۔ مہاتما بدھ کا پیغام ہے شانتی اور محبت۔"

میں نے کہا "ویسے تو سب مذاہب کا یہی پیغام ہے......"

اس نے میری بات کاٹ دی "مگر تم اس پر عمل نہیں کرتے ورنہ یہ سب کیوں ہوتا؟ تم کو مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ پڑتی اور تم ایسے بھیس بدل کے نہ پھرتے۔ یہ سب سیاست ہے نفرت کی' جس نے خوف پیدا کیا ہے۔"

اس نے مجھے شرمندہ اور لاجواب کر دیا تھا۔ اس بحث سے کچھ حاصل بھی نہ تھا۔ عداوتوں کے زہر سے مسموم شہر میں ملنے والا پہلا آدمی انسانیت پرست ثابت ہوا تھا۔ پُرامید رہنے کے لئے یہ نیک شگون ایک اچھا سہارا تھا۔

میں نے کہا "دیکھو' ہم تمہیں اپنی دکھ بھری کہانی سنا کے متاثر کرنا نہیں چاہتے۔ تم سمجھو گے یہ بھی جھوٹ ہے۔"

"یہاں ہر قدم پر کوئی اپنی دکھ کی داستان لئے بیٹھا ہے۔"

میں نے کہا "تم اگر ہماری تھوڑی سی مدد کر دو گے تو ہم اس نیکی کو یاد رکھیں گے اور اگر مانگو گے تو اس کا معاوضہ بھی دیں گے۔"

اس نے تنقی سے کہا "کیا نیکی معاوضہ لینے کے بعد نیکی رہتی ہے؟"

میں نے کہا "سوری۔ دراصل ہم بڑی مصیبت میں ہیں اور خود کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم اس شہر میں اجنبی ہیں۔ نہ ہم راستوں سے واقف ہیں اور نہ لوگوں سے۔ اگر تم کسی طرح ہمارے لئے مناسب کپڑوں کا بندوبست کر دو۔"

"کیا... میں کہاں سے کر دوں؟"

"بازار سے' قیمت ہم دیں گے۔ تم خرید کر لا دو" میں نے کہا "ہم کو تو شاید دکاندار بھی انکار کر دے گا۔"

"سب لوگ بُرے نہیں ہیں۔ اکثریت میں اچھے لوگ ہیں مگر وہ بُرے لوگوں سے ڈرتے ہیں۔ شریف لوگ ہر جگہ غنڈے بدمعاشوں کے آگے بے بس ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے سب کے سب بُرے لگنے لگتے ہیں۔ کچھ دن بعد سب ٹھیک ہو جائے گا جب یہ نفرت کے جذبات کی چڑھی ہوئی آندھی اتر جائے گی۔ تم لوگ ٹیکسی میں بیٹھے رہو' میں کپڑے لاتا ہوں" اس نے ایک جدید قسم کے شاپنگ سینٹر میں پہنچنے کے بعد کہا۔

میں نے اسے پانچ سو روپے دئے۔ وہ فٹ پاتھ پر چلتا ہوا ایک دکان تک گیا اور آگے پیچھے دیکھ کر اندر داخل ہو گیا۔

غالب نے کہا "یہ شخص تو فرشتۂ رحمت بن کے آ گیا۔"

میں نے کہا "جب میں نے ٹیکسی روکی تھی تو کتنا مشتعل ہو رہا تھا۔ اب بالکل بدل گیا ہے۔ انگریزی بھی فرفر بول رہا ہے۔"

"احتیاط یہ ہی حالات کا تقاضا ہے۔" غالب نے کہا۔

نازو نے کہا "پتا نہیں ایسی باتیں کیوں سوجھ رہی ہیں تمہیں۔ پیٹ خالی ہو تو دماغ بھی خالی ہو جاتا ہے۔"

گل نے بھی کہا "واقعی اب تو میں بے ہوش ہونے والی ہوں۔"

غالب نے گھڑی دیکھ کے پوچھا "کتنی دیر ہو گئی؟"

"مذاق کی بات نہیں' میری قوتِ برداشت جواب دے چکی ہے۔" گل نے بگڑ کے کہا "سب کی جان پر بنی ہوئی ہے۔"

میں نے اسے تسلی دی "بس تھوڑا سا حوصلہ گل۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم نے بڑی ہمت سے کام لیا ہے۔"

موٹر سائیکل پر ایک پولیس مین گزرتے گزرتے رک گیا۔ اس نے بنگالی میں کچھ کہا جو میری خاک سمجھ میں نہیں آیا۔

میں نے کہا "جو کچھ کہا ہے اس کا انگریزی میں بامحاورہ ترجمہ کرو۔"

وہ جھلا کے بولا "یہ ٹیکسی یہاں کیوں کھڑی ہے؟"

میں نے احمقوں کی طرح اسے دیکھا "اس لئے کہ انجن بند ہے۔"

اس نے اتر کے موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کر دیا "آخر کون ہو تم لوگ جو مجھ سے اس لہجے میں بات کر رہے ہو؟"

"ہم نے تم سے کوئی بات نہیں کی' تم خود رکے تھے۔ تم نے سوال کیا ہم نے جواب دیا" میں نے کہا "اور بھی جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔"

"کہاں رہتے ہو تم؟" اس نے مجھے گھور کے کہا اور پھر سب پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی۔ مجھے اس کا لہجہ خالص پنجاب کا لگا تھا۔

"کہیں نہیں۔ جب رہیں گے تب بتا دیں گے" میں نے کہا۔

"کیا مطلب ہے اس بات کا؟" وہ چڑچڑا ہو کے بولا۔

میں نے کہا "ابھی ہم نے طے نہیں کیا کہ ہوٹل شاہ باغ میں قیام کریں گے یا انٹرکان میں۔ اور طے کرنے سے کیا ہوتا ہے' جہاں جگہ ملے گی وہاں کا کمرا نمبر بتا دیں گے۔ تم اپنا فون نمبر دے جاؤ۔"

"باہر نکلو تم سب" وہ غصے میں آتش فشاں بن گیا۔

میں نے کہا "میں اس غیر قانونی حکم کو ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ ٹیکسی کے اندر وارنٹ کے بغیر داخل ہونے کی کوشش مت کرنا اور دست درازی بھی مت کرنا ورنہ چھٹی اتر جائے گی۔ ہمیں سفارتی تحفظ حاصل ہے۔"

"سفارتی تحفظ... تم مجھے غیر ملکی نظر نہیں آتے" اس کا جوش و خروش کچھ سرد پڑ گیا۔

www.paksociety.com

"پھر کیا نظر آتے ہیں' سرکس کے جوکر؟" وہ نظر آنے کی کیا بات کرتے ہو۔ تم نے بھی غور کیا کہ تم کیا نظر آتے ہو؟" غالب نے کہا "بالکل پولیس والے...."

"نظر آنے کا کیا مطلب!" وہ تیز ہو کے بولا "میں پولیس مین ہوں۔ کسی فلم کی شوٹنگ کے لئے پولیس کی وردی اور میک اپ میں نہیں ہوں۔"

"اچھا؟" نازو نے بے حد حیران ہو کے گل سے کہا "یعنی یہ اصلی پولیس مین ہے بالکل......"

میں نے اسے بولنے کا موقع دیے بغیر کہا "خیر۔ تمہارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے ہم۔ تم ڈیوٹی پر جا رہے ہو۔ یہ بتاؤ تم سے پھر ملنا ہو تو کہاں ملیں؟ ہم ہنٹر کان میں ہیں۔"

ہماری باتوں نے اسے پہلے ہی بوکھلا دیا تھا۔ وہ چونکا "کیوں ملنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟"

میں نے کہا "تم پولیس میں ہو' شہر کے اندر کے حالات جانتے ہو۔ ہم غیر ملکی صحافی ہیں' خبریں تلاش کرنے نکلے تھے۔"

"اور اسی لئے یہ حلیہ بنایا تھا" غالب نے کہا۔

اس کا رویہ بالکل بدل گیا۔ اس نے جیب میں سے ایک کارڈ نکال کے مجھے دیا "یہ میرا پتا ہے۔"

میں نے کارڈ لے لیا "اے ایس آئی۔ بی اے دتہ۔ یہ بی اے سے کیا بنتا ہے؟"

"چوہدری اللہ دتا" وہ بولا۔

"تم لاہور کے رہنے والے ہو؟" میں نے اردو میں کہا۔

وہ حیران ہو کے بولا "خاص لاہور کا۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے کہا "ادھر ایک ایس ایس پی تھے ضامن رضوی۔"

"بالکل تھے جناب۔ اللہ مغفرت کرے۔ ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں پولیس میں۔ انسان نہیں فرشتہ تھے۔ میں نے تین سال گزارے ان کے ساتھ۔ پھر ادھر پوسٹنگ ہو گئی۔ اب پتا نہیں واپسی کا کیا بنے گا۔ مگر آپ ضامن صاحب کو کیسے جانتے ہو؟"

میں نے کہا "ایک ایس ایس پی سراج تھا۔"

"کیسی عجیب بات ہے۔ پہلے آپ نے فرشتے کا حوالہ دیا پھر شیطان کا" وہ بولا۔

میں نے کہا "اللہ دتا چوہدری! تم سے پھر ملیں گے اسی شہر میں۔ ہم بھی لاہور سے ہی آئے ہیں' غیر ملکی وغیرہ خاک نہیں ہیں۔"

"وہ تو میں سمجھ گیا تھا" وہ مسکرایا۔

"ٹیکسی والا آ رہا ہے' اسے کچھ مت بتانا" میں نے کہا۔

غالب نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا "تمہاری واپسی کا بندوبست کر دیں گے ہم۔"

"بڑی مہربانی ہو گی جناب۔ ادھر تو ہر وقت خطرہ ہے۔ جتنے بھی ادھر سے آئے تھے سب مشکل میں ہیں۔ نوکری کی خیر ہے' جان بچ جائے اور واپس گھر پہنچ جائیں" وہ بولا "آپ سفارت خانے میں ہیں' سب کچھ کر سکتے ہیں۔ میرے لئے کوئی خدمت ہو تو ضرور بتانا۔"

ٹیکسی ڈرائیور کپڑوں کے بنڈل اٹھائے آ گیا تھا اور ہمیں ایک ٹریفک سارجنٹ سے گفتگو کرتا دیکھ کے حیران تھا۔ اس نے ٹیکسی واقعی غلط جگہ کھڑی کی تھی۔ وہاں کرب پارکنگ تھی یعنی فٹ پاتھ کے متوازی۔ جب سارجنٹ اس سے کوئی سوال کئے بغیر چلا گیا تو وہ مزید حیران ہوا۔

"یہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ ٹیکسی کا چالان کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے سمجھا کر رخصت کر دیا" میں نے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور شکر گزار نظر آنے لگا۔ "کتنے پیسے لے گیا؟"

میں نے کہا "اس کا ذکر چھوڑو۔ تم نے ہمارا کام کیا' ہم نے تمہارا ایک چھوٹا سا کام کیا کہ تمہارا چالان نہیں ہونے دیا۔ یہ بتاؤ کپڑے مل گئے؟"

"مل گئے" اس نے باقی رقم میرے حوالے کی "یہ دو سو اٹھائیس روپے اور یہ رسید۔"

"صرف دو سو بہتر خرچ ہوئے" میں نے حیرانی سے کہا "یہ راستے میں کہیں سے ایک سوٹ کیس بھی لیں گے تاکہ شاہ باغ ہوٹل میں معزز مسافروں کی طرح داخل ہوں۔ وہاں جگہ مل جائے گی؟"

اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی "آپ کے لئے ضرور ہو گی۔ نہیں ہو گی تو وہ نکال لیں گے۔ وہاں اسسٹنٹ منیجر میرا بھائی ہے۔ میں اس سے کہہ دوں گا۔"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "اب یہ بھی بتا دو کہ ہم اپنا لباس کہاں تبدیل کریں؟"

"میرے کوارٹر میں کر لیں" وہ بولا "قریب ہی ہے مگر میری بیوی..... خیر۔"

میں نے کہا "تمہاری بیوی شک کرے گی؟"

"ہاں۔ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ وہ بنگالن ہے اور مسلمان ہے اس لئے تم سے تعصب بھی قدرتی بات ہے" وہ بولا۔

"یہ عجیب بات ہے۔ تم بدھ اور وہ مسلمان۔ تمہیں کیسے قبول کر لیا تھا اس نے؟"

"وہ اور بات تھی" وہ مسکرایا "اس بات کا تعلق عقل سے نہیں جذبات سے تھا اور وہ پرانی بات ہو گئی۔ اب تو سات بچے ہیں۔"

اس کا کوارٹر دیکھ کے مجھے تعجب ہوا۔ کثرت آبادی کے باعث بنگال میں عموماً اور ڈھاکا شہر میں خصوصاً جگہ نایاب ہے اور یہ بڑے گنجان آباد شہر کا المیہ ہے کہ وہاں اکثر لوگ ڈربے جیسے گھروں میں رہتے ہیں جن کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ان میں چلنا پھرنا تو کیا سانس لینا بھی مشکل ہو گا۔ مگر یہ کوارٹر خاصا کشادہ اور خوب صورت تھا۔

اندر جانے سے پہلے میں نے کہا "یار' یہ تو بتا دو کہ ہمیں تمہاری بیوی کے سامنے کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے۔ ابھی تک تم نے اپنا نام تک نہیں بتایا۔"

"تم نے کب بتایا ہے" وہ بولا "میں جے دیو ہوں اور میری بیوی ہے کستوری بیگم۔ یہ گھر اسی کا ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ اس کا باپ بڑا آدمی تھا۔ بڑے سے میری مراد ہے پیسے والا۔ اس نے سب بیٹیوں اور بیٹوں کے نام ایک ایک مکان خرید کے ڈال دیا تھا۔ اپنا کالا دھن چھپانے کے لئے چنانچہ یہ مکان نہیں چھینا جا سکا۔"

ہم نے اپنے نام بتائے تو اس نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اگر وہ ہمارے پس منظر سے واقف ہوتا تو چونکتا۔

اس کی بیوی کستوری ایک خوب صورت عورت تھی۔ اس نے ہمیں خوش آمدید نہیں کہا تو ہماری موجودگی پر ناگواری کے جذبات کا اظہار بھی نہیں کیا۔ ہم نے بہتر یہی سمجھا کہ لباس بدلتے ہی وہاں سے نکل جائیں۔ جے دیو بعد میں اپنی بیوی کے سامنے کیا وضاحت پیش کرتا ہے' یہ اس کا کام تھا۔

دوپہر سے کچھ پہلے ہم ہوٹل شاہ باغ پہنچے۔ حسب توقع ڈیسک پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے ہمیں ہری جھنڈی دکھا دی۔ عام حالات میں اس کا رویہ معزز مسافروں کے ساتھ شائستگی آمیز ہوتا ہو گا اور وہ ان کا خیر مقدم بڑی میٹھی مسکراہٹ سے کرتی ہو گی مگر ایک انار کے طلب گار سو بیمار ہوں تو انار بیچنے والا کیسے سب کو خوش آمدید کہے۔ اور کیا ضرورت ہے اسے خود کو اچھا سیلزمین ثابت کرنے کی۔ اس نے خاصے روکھے اور حوصلہ شکن لہجے میں بتا دیا کہ کمرا تو وی آئی پی کے لئے بھی نہیں ہے کیونکہ جتنے وی آئی پی ہیں وہ سب پہلے سے وہاں پناہ گزین ہیں۔

میں نے باہر آ کے جے دیو سے یہ صورت حال بیان کی۔

اس نے کہا "مجھے تو معلوم تھا مگر میں نے سوچا شاید سیدھے طریقے سے مقصد پورا ہو جائے۔ اب میں پچھلا دروازہ کھولتا ہوں۔ تم یہیں میرا انتظار کرنا۔ میں اپنے بھائی کو لے کر آتا ہوں۔ اور ہاں ایک ضروری بات....."

"کہو۔ رک کیوں گئے؟"

"میرا بھائی میری طرح نہیں ہے" وہ بولا۔

"کیا مطلب؟ وہ بدھ مذہب کا پیروکار نہیں ہے؟"

"مانتا بدھ کی تعلیمات کو تو ہے مگر ان پر عمل نہیں کرتا" وہ بولا "خصوصاً کاروبار کے معاملات میں۔"

میں نے کہا "یہ تو دنیا کا چلن ہے۔ ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں جو دین و دنیا کو الگ رکھتے ہیں اور اسے جائز قرار دے سکتے ہیں۔"

غالب نے کہا "ہم اس سے سودا کر لیں گے۔ تمہیں اپنے بھائی کے لئے یا کسی اور کے لئے شرمسار ہونے کی ضرورت نہیں۔"

جے دیو چلا گیا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ گل موجود نہیں ہے۔ ٹیکسی میں صرف نازو بیٹھی ہوئی تھی۔

"یہ گل بانو کہاں چلی گئی؟" میں نے کہا۔

نازو نے انگلی سے اشارہ کیا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔

میں نے ادھر دیکھا تو گل ہوٹل کے سامنے والے کھمبے کا طواف کر رہی تھی۔ اس کی نظر نیچے سے اوپر تک لگے ہوئے پوسٹروں اور اشتہاروں کے درمیان اس پیغام کو تلاش کر رہی تھی جس کی آس میں ہم اس شہر بے وفا تک عذاب کے ہزار مرحلوں کا سفر طے کر کے پہنچے تھے۔

گیٹ کے سامنے تین کھمبے تھے مگر ان سب پر سیاسی اور اشتہاری پوسٹر ایک کے اوپر ایک چپکائے گئے تھے۔ ان سب کے نیچے یا بیچ میں کہیں محسن نے ہمارے لئے کوئی پیغام چھوڑا تھا تو ابھی تک گل کی نظر نے نہیں دیکھا تھا اور یہ خاصی مایوس کرنے والی بات تھی۔ گل کی بے قرار نگاہیں اس تحریر کو سب سے پہلے دیکھ سکتی تھیں مگر شاید وہاں اس کے دل مضطر کی تسکین کا سامان تھا ہی نہیں۔ میں اسے گرد و پیش سے بے خبری کی کیفیت میں ہر کھمبے کے گرد چکر لگاتے اور پوسٹر کھینچ کر اکھاڑتے دیکھتا رہا۔ وہ دیوانہ وار تہہ در تہہ چپکے ہوئے پوسٹر اتار رہی تھی۔

میں نے غالب سے کہا "یار' یہ کیا خود کو تماشا بنانا چاہتی ہے؟ ابھی لوگ جمع ہو جائیں گے۔"

نازو نے پریشانی سے کہا "تم جا کے اسے واپس لاؤ۔"

"اسے جانے ہی کیوں دیا تھا تم نے؟" میں نے کہا۔

"نہ اس نے اجازت لی تھی ہم سے' نہ کچھ کہا تھا۔ اتر کے چل پڑی۔ نازو نے پوچھا تو کہنے لگی کہ میں دیکھ آؤں...."

میں تیز تیز قدموں سے سڑک عبور کر گیا۔ اس وقت تک تین چار آدمی دلچسپی اور حیرانی سے ایک خوب صورت' تعلیم یافتہ اور مہذب نظر آنے والی لڑکی کا شغل دیوانگی دیکھ رہے تھے اور اس کے جنون اور وحشت پر خندہ زن تھے۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا تو ایک شخص سامنے آ گیا۔ "کیا کرتا ہے؟" اس نے بدمعاشوں کی طرح سینہ تان کے کہا۔

ادھر گل نے مزاحمت کی اور اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی رہی "چھوڑ دو مجھے' چھوڑ دو' میں نہیں جاؤں گی۔"

وہ ہسٹریا میں مبتلا ہو گئی تھی۔ یہ مایوسی کا خفیف سا جھٹکا تھا جس نے یکلخت اسے جذباتی عدم توازن کے تاریک خلا میں گرا دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے برسوں ایک کنکری کی نوک پر قائم رہنے والی چٹان طوفان باد و باراں یا زلزلے سہہ جاتی ہے مگر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ پھر اسے تو ہوا کا جھونکا گرا دیتا ہے۔

بدمعاش نے میرا کالر پکڑ لیا "اے بابو! چھوکری کو زبردستی لے جاتا ہے۔ یہ تیرا کیا لگتا ہے؟"

میں نے بڑی مشکل سے گل کو قابو کیا تھا۔ بدمعاش یہ سمجھ رہا تھا کہ میں گل کو زبردستی اور اس کی مرضی کے خلاف لے جا رہا ہوں۔ شاید وہ خود کچھ غلط عزائم رکھتا تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ

www.paksociety.com

اس پاگل عورت کو اپنے ساتھ لے جانا کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔ میں نے مداخلت کی تو وہ مشتعل ہو گیا۔

میں نے کہا ”میرا کالر چھوڑو، ورنہ.....“

”ورنہ کیا.....“ اس نے مجھے گالی دی ”اپن تیرا تھوبڑا بگاڑ دے گا سالا۔“

وہ اپنی زبان، لہجے اور داداگیری کے انداز سے بمبئی کا لگتا تھا۔ اس کی بکواس پر کچھ لوگ اور اکٹھے ہو گئے تھے۔ گل میری گرفت سے نکلنے کے لیے مچل رہی تھی اور یہ تماشا زیادہ جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے غصہ غالب اور نازو پر بھی آرہا تھا جو دور ٹیکسی میں مزے سے بیٹھے تھے۔ وہ میری مدد کے لیے آجاتے تو میں گل کو ان کے حوالے کرتا اور بدمعاش خود رفع نہ ہوتا تو میں اس کی آنکھوں نکال کے خود بھی نکل جاتا۔ مگر وہ تو جیسے ادھر دیکھ ہی نہیں رہے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ ان کے اور میرے درمیان تماشا دیکھنے والے حائل ہو گئے تھے۔

جب اور کوئی چارہ نہ رہا تو میں نے گل کے پاؤں پر اپنا پاؤں مارا۔ وہ درد سے بلبلائی مگر ایک جھٹکے سے اس کا ذہن سنبھل گیا۔ میں نے اسے چھوڑا تو وہ لڑکھڑائی اور پیچھے گر گئی۔

”اب بتاؤ، تم کو کیا اعتراض ہے اگر میں اپنی بہن کو واپس لے جانا چاہتا ہوں؟“ میں نے بدمعاش کے ہاتھ سے اپنا کالر چھڑا کے اس کی گردن دبوچ لی۔

”ارے سالا... گردن چھوڑ۔ تیرا تو..... ابھی پہلے کاہے کو نہیں بولا کہ یہ تیرا بہن ہے؟“ وہ خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتے ہوئے بولا۔

میں جھگڑا نہیں چاہتا تھا ”جاؤ۔ آئندہ ہر معاملے میں ٹانگ مت اڑانا اور یہ مت سمجھنا کہ ہر شریف نظر آنے والا کمزور بھی ہوتا ہے۔“

بدمعاش نے بھی اپنے جارحانہ عزائم سے دستبرداری میں ہی عافیت جانی۔ کچھ فاصلے پر فوجی موجود تھے اور جھگڑے کی صورت میں وہ کسی سے بھی کچھ نہ پوچھتے، سب کو پکڑ کر لے جاتے اور برا حشر کرتے۔ آمرانہ اختیارات نے بھارتی فوج کو دہلی میں قتل عام کرنے والی نادر شاہ کی فوج بنا دیا تھا۔

اسی وقت ایک نئی صورت حال نے جنم لیا۔ مجمع میں سے کسی نے کہا ”شاید پاکستانی۔“

اس کے لہجے میں نفرت اور حقارت تھی۔ پاکستان کا لفظ اس نے کسی گالی کی طرح ادا کیا تھا۔ ایک اور شخص نے بنگالی میں چیخ کر کچھ کہا۔ تیسرے نے کہا ”پان جابی کو ڈنڈا شالا!“ جس نے مجھے پٹھان کہا اور اس کے ساتھ ہی دلال۔ میں نے مشتعل ہونے سے گریز کیا اور گل بانو کو اٹھا لیا مگر مجمع اتنی دیر میں عداوت کے جذبات کی رو میں بہنے لگا تھا۔

اس وقت ایک عجیب بات ہوئی۔ اس بدمعاش نے کمانی دار چاقو نکال لیا۔ میں نے بغل کے ہولسٹر سے برآمد ہونے کی مخصوص آواز سنی۔

”سالا، محمد بھائی کا سامنے گالی دیتا ہے۔ پاکستانی ہے تو کیا ہوا، بہ چھوڑی کاٹ گا۔ کون سالا اس کو دلال بولا؟ سامنے آؤ۔ اپن اس کا پیٹ پھاڑ دے گا۔ بولو کون حرامی اس کو گالی دیا؟ ابھی اپن سارا انبور کا مال باہر کرے گا۔“

اسی وقت غالب بھی نمودار ہوا ”کیا بات ہے؟“

میں نے کہا ”کچھ نہیں۔ بات ختم ہو گئی۔ گل کو لے کر یہاں سے چلو۔“

مجمع کا جوش و خروش محمد بھائی کے خنجر کی آب دیکھتے ہی ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ پلک جھپکتے میں شرپسند کھسک گئے لیکن فوجی نمودار ہو گئے۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں؟“ ایک کیپٹن نے گرج کے کہا ”کیوں جمع ہیں اتنے سارے لوگ؟“

محمد بھائی نے بڑی صفائی سے چاقو غائب کر دیا اور اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے بڑے میٹھے، خوشامدانہ لہجے میں بولا ”کچھ نہیں کرنل صاحب! ابھی یہ شریف آدمی اپنی بہن کو لے جاتا ہے سالا.....“

کیپٹن نے مجھے دیکھا اور پھر گل کو ”کیا پرابلم ہے؟“

میں نے پرسکون لہجے میں کہا ”کوئی بھی پرابلم نہیں سر، یہ میری بہن ہے۔ ہم یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ شاہ باغ میں۔ یہ باہر آگئی تھی اور میں اسے زبردستی واپس لے جا رہا تھا۔ کچھ لوگ سمجھے.....“

”کیا ثبوت ہے کہ یہ تمہاری بہن ہے؟“ کیپٹن میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔

”اس سے پوچھ لیں۔“

ایک شخص نے موقعے سے فائدہ اٹھایا ”سر، یہ [illegible] تھی۔“

ایک مسخرے ٹائپ شخص نے کہا ”کھسیانی بلی.....“

کیپٹن نے اسے گھورا تو وہ خاموش ہو گیا ”زبردستی کیوں کی تم نے؟“

میں نے کہا ”سر، آپ تو جانتے ہیں باہر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بے شک آپ لوگ موجود ہیں ہماری حفاظت کے لیے مگر.....“

ایک اور شخص نے میری بات کاٹ دی ”اس سے پوچھو کہ یہ کھمبوں پر سے پوسٹر کیوں پھاڑ رہی تھی؟“

میں نے خود ہی اسے جواب دے دیا ”اس لڑکی کو کسی کا انتظار تھا۔ اس نے کہا تھا وہ اس کھمبے پر پیغام چھوڑ جائے گا۔ ان کا چل رہا تھا لیکن وہ اچھا آدمی نہیں ہے اور شادی شدہ بھی ہے۔ اب واپس مغربی پاکستان جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں تو اس پر پاگل پن سوار ہے۔ اس کا پیغام نظر نہیں آیا تو وہ دورہ پڑ گیا۔“

کیپٹن مسکرایا۔ گل بانو کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا تھا۔ وہ کیپٹن کی نظروں میں مجرم بن گئی تھی اور اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ

[illegible] اس کی وجہ سے خراب ہو رہی ہے۔ اس نے ندامت سے سر جھکا کے گویا میری بات پر مہر صداقت ثبت کی۔

محمد بھائی نے کہا ”ابھی جاؤ۔ لڑکی لوگ کو سمجھاؤ، عزت کا معاملہ ہے۔ کچھ خیال کرے، کیا؟“

میں نے کہا ”ٹھیک ہے کیپٹن۔ تم نے بروقت مدد کی۔“

کیپٹن واپس لوٹ گیا مگر جاتے جاتے محمد بھائی کو مشورہ دے گیا کہ اتنی بڑی مونچھیں نہ رکھے جو اس کی بدمعاشی کا سائن بورڈ نظر آئیں۔

”سالا حرامی۔“ محمد بھائی نے اس کے جاتے ہی کہا ”ابھی اس کے پاس بندوق نہ ہوتا تو اپن اس کو مونچھوں سے لٹکا کے پھانسی دے دیتا، کیا؟“

میں نے کہا ”محمد بھائی! تم بھی جاؤ۔ جو کچھ ہوا اس کے لیے سوری۔“

محمد بھائی نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا ”اپن غلط سمجھا۔ تم اپن کو معاف کر دیا۔ ابھی کوئی کام بولو۔ تم پاکستانی ہے تو اپن کو بولو؟“

”تم پاکستانی ہو؟“ میں نے چلتے ہوئے کہا۔

وہ میرے ساتھ چلنے لگا ”یہ سب پاکستانی ہے۔ کل تک تھا۔ آج کیا ہو گیا سالا لوگ کو؟ سب کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اپن تو ادھر کراچی میں پیدا ہوا۔ ادھر لیاری میں بڑا ہوا۔ شادی بنایا۔ اپنا فیملی ادھر ہوتا۔ اپن آج بھی پاکستانی، کل بھی۔“

میں نے مصافحہ کر کے اس سے جان چھڑانے کی کوشش کی مگر وہ ٹلنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ ٹیکسی کے پاس غالب نے گل کو نازو کے سپرد کر دیا تھا اور خود کسی اجنبی سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ بجے دیو کا بھائی ہی ہو سکتا تھا۔ بجے دیو کے مقابلے میں وہ بہت لمبا چوڑا اور وجیہہ لگتا تھا۔ یہ غالباً ہر روز مرغن غذائیں اور مالِ مفت سے حاصل ہونے والی خوشحالی کا نتیجہ تھا۔

میرے پہنچنے تک کاروباری معاملات طے پا چکے تھے۔ بجے دیو کا دیودار بھائی واپس چل پڑا تھا اور بجے دیو ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔ غالب نے میرے ساتھ آنے والے چھ فٹ سے بھی زیادہ لمبی گھنی اور اکڑی ہوئی مونچھوں والے محمد بھائی کو غور سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے۔

میں نے اسے اشارہ کیا کہ ٹیکسی میں بیٹھ جائے اور خود پھر محمد بھائی سے ہاتھ ملایا ”اچھا محمد بھائی.....“

”تم ادھر سے جانے کا ہے؟“ اس نے کہا۔

”ہاں۔ بس کچھ بندوبست ہو گیا ہے۔“ میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

”اچھا۔ اپن کا ایک کام کرو۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھ کے نیفے سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی ”تم کراچی جاتا پڑا ہے۔ یہ ادھر اپنا فیملی کو دے گا۔ ابھی ایڈریس لکھو۔“

میں بھونچکا رہ گیا ”محمد بھائی..... اتنی بڑی رقم.....“

”دس ہزار ہے۔ بہت بڑا رقم نہیں ہے۔ ابھی تم پتا لکھو۔ ادھر اپنا ماں ہے اور بیوی بال لوگ ہے۔ ان کو بولنے کا..... کیا.....“

میں نے کہا ”محمد بھائی! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ تمہیں ہمارا نام پتا کچھ معلوم نہیں۔ ہم یہ رقم لے کر بھاگ گئے تو.....“

اس نے قہقہے کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ مارا ”ابھی محمد بھائی ایسا پاگل نہیں ہے۔ آدمی کا تھوبڑا دیکھتا ہے اور اندر تک سب جان لیتا ہے، کیا؟ کون اندر سے بے ایمان ہے، کون شریف ہے۔ اتنا ٹائم پاس کیا کراچی، بمبئی، کلکتہ، سب جگہ رہا۔ اپن کو مالوم ہے تم جھوٹ نہیں بولتا۔ محمد بھائی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔“

مجھے سخت شرمندگی ہوئی ”دیکھو محمد بھائی! وہ میں نے اس کیپٹن کے سامنے تھوڑا سا جھوٹ بولا تھا۔ ہم یہاں نہیں رہتے ہیں۔ ابھی آئے ہیں۔ شاہ باغ ہوٹل میں جگہ نہیں تھی۔“

اس کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے رقم واپس نیفے میں رکھ لی ”اچھا۔ ابھی کدھر جانے کا؟ انٹرکان؟“

میں نے کہا ”وہاں بھی جگہ نہیں ملے گی.....“

”ابھی محمد بھائی بولے گا تو ایک دم جگہ ملے گا۔ ادھر اپن کو انکار کون سالا کرے گا، کیا؟ تم بولو.....“

میں نے کہا ”بہت بہت شکریہ محمد بھائی۔ لیکن یہاں بندوبست ہو گیا ہے۔ اس ٹیکسی ڈرائیور نے مدد کی تو جگہ مل گئی ہے۔“

غالب نے کہا ”ہاں۔ ہم پہنچ کے جائیں گے۔“

غالب اور بجے دیو کے علاوہ گل اور نازو بھی خوف اور دلچسپی کے ساتھ محمد بھائی کو دیکھ رہی تھیں جو چہرے مہرے سے کسی طرح بھی شریف آدمی نظر نہیں آتا تھا اور اس کیپٹن نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اتنی بڑی مونچھیں اس کی بدمعاشی کا سائن بورڈ تھیں۔

محمد بھائی نے کہا ”اچھا۔ اپن کا واسطے کوئی کام ہو تو بولو، کیا؟ اپن ادھر نہیں ملے گا تو کسی سے پوچھو۔ بیرا لوگ سے، ٹیکسی والوں سے کہ محمد بھائی کو بولنے کا ہے۔ اپن کو مالوم ہو جائے گا۔“

پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ ٹیکسی پر جھکا اور ہاتھ جوڑ کے گل سے مخاطب ہوا ”اپن غلطی کیا بہن۔ ابھی میرے کو معاف کرنے کا ہے۔ پر دیکھو، تم بھی تھوڑا خیال کرو اپنی عزت کا۔ کیا؟“

گل پانی پانی ہو گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے سر ہلایا۔ پھر میں ٹیکسی میں بیٹھا اور محمد بھائی پلٹ کے روانہ ہو گیا۔ وہ چھ فٹ سے نکلتے قد کا بھاری بھرکم آدمی تھا۔

”یہ کیا عجیب کیریکٹر تھا؟“ غالب نے کہا ”اتنی بلندی، اتنی پستی، اتنی بدمعاشی اور یہ عاجزی۔“

میں نے کہا ”بڑے اور اصلی بدمعاش ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شہدے لفنگے اور خاندانی بدمعاش کے رویے میں وہی فرق ہوتا ہے جو خاندانی رئیسوں کے اور نودولتیوں کے طرزِ انداز میں نظر آتا ہے۔ خیر گولی مارو اسے۔ تم یہ بتاؤ رہائش کے مسئلے کا کیا بنا؟“

”پانچ سو روپے نذرانہ وصول کیا بجے دیو کے بھائی نے۔“

www.paksociety.com

جے دیو شرمندگی سے بولا "میں نے کہا تھا نا کہ وہ بہت مختلف ہے۔"

"تم کیوں شرمندہ ہوتے ہو" غالب نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا "ہوٹل میں تو جگہ تھی نہیں۔ سرونٹ کوارٹر میں اس کا جو کرایہ ہماری خوش قسمتی کے باعث دستیاب تھا۔ آج ہی خالی ہوا تھا۔ وہ سو روپے روز پر ہمارا ہو گیا۔"

"کیا مصیبت ہے اسو روپے روز میں سرونٹ کوارٹر۔"

"اس کا کہنا ہے کہ آرام اور آسائش میں کمی نہیں ہوگی۔ ہوٹل کی سروس دستیاب ہوگی اور ہمیں گھر کا آرام ملے گا" غالب نے کہا۔

"کتنے کمرے ہیں؟"

"دو۔ باتھ روم ایک ہے۔ ٹیلی فون کی لائن رات کو جوڑ دی جائے گی" غالب نے کہا "کوئی سوال جواب نہیں کرے گا۔"

نازو نے کہا "میرا تو خیال ہے کہ یہ بہتر انتظام ہو گیا۔ ہوٹل میں اپنا نام لکھواتے۔ آتے جاتے لوگوں سے دور رہتا۔ انٹیلی جنس والے بھی نظر رکھتے ہوں گے۔"

ٹیکسی رک گئی اور جے دیو نے کپاؤنڈ وال کے چور دروازے سے ہمارا اسباب اندر پہنچا دیا۔

"میرا بھائی اچھی ہے مگر دل کا اچھا ہے۔ ہر آدمی کی کوئی نہ کوئی کمزوری تو ہوتی ہے" جے دیو بولا "اگر پھر میری ضرورت پڑے تو اس سے کہہ دینا مجھے پیغام مل جائے گا۔"

اس کے جانے کے بعد غالب نے کہا "کیسا کھیل ہے قسمت کا۔ کہاں تو منزل تک سب راستے بند محسوس ہوتے تھے اور یہاں آ کے لگتا ہے کہ سارے بند دروازے کھلتے جا رہے ہیں۔ ایک پولیس میں "ایک بدمعاش اور ایک ٹیکسی ڈرائیور رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر چکے ہیں۔"

"یہ باتیں کیا بعد میں نہیں کر سکتے؟" نازو نے کہا "پہلے بندوبست کرو کچھ کھانے کا۔"

"میں کیا بندوبست کروں۔ بازار سے کھانا لاؤں۔"

میں نے کہا "دیکھو، شاید جے دیو کا بھائی خود ہی پوچھنے آ جائے۔ نام لیا شیطان کا اور وہ حاضر۔"

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو جے دیو کا بھائی موجود تھا "سر! کیا کھائیں گے آپ؟"

"پورا ہوٹل" غالب نے کہا "کھانے پینے کی جتنی بھی چیزیں اس وقت دستیاب ہیں سب لا کے یہاں ڈھیر کر دو۔"

"لنچ کا مینیو" اس نے ایک فولڈر بڑھایا۔

غالب نے اس کو کھول کے دیکھا "نمبر ایک سے نمبر ایک سو ایک تک سب لے آؤ۔ کولڈ ڈرنک بھی، کافی بھی، آئس کریم بھی۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"اشوک" اس نے کہا "کیا واقعی یہ سب لانا ہے؟"

میں نے کہا "اشوک! ہم پہلے لنچ کریں گے چار افراد کے لئے

لنچ لاؤ اور جو اچھی چیز ہو وہ مناسب مقدار میں لے آؤ۔ زیادہ تم جانتے ہو کہ یہاں کیا کھانے کے قابل ہے اور کیا کے۔ اس کے بعد کافی۔ اور ہاں، جب واپس آؤ تو سگریٹ کا کارٹن لیتے آنا۔ اسٹیٹ ایکسپریس۔"

وہ میری بات ختم ہونے کے بعد بھی کھڑا رہا تو میں سمجھ گیا۔ نازو سے کہا کہ اسے کچھ ایڈوانس ادا کر دے تاکہ اسے اطمینان حاصل ہو جائے کہ یہ کہیں بل ادا کئے بغیر بھاگ جانے والے مہمان نہیں ہیں۔ نازو نے اسے ایک ہزار روپے تو اس نے نکال کے فرشی سلام کیا اور الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔

"سب پیسے کے غلام ہیں۔" نازو نے کہا۔

"سوائے میرے۔ میں تمہارا غلام ہوں" غالب نے کہا "دو تو اس کھڑکی سے کود جاؤں۔"

نازو ہنسنے لگی کیونکہ کھڑکی گراؤنڈ فلور پر زمین سے تین فٹ تھی۔ میں نے تولیہ اٹھایا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ مگر نیند اور تھکن اتارنے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میں ایک نیا ہوں۔ آتے وقت جو امید، حوصلہ اور مقصد پرانا ہو کر رہ گیا تھا وہ میری لوٹ آئی اور زندگی پر میرا اعتماد بحال ہوتے ہی دنیا مجھے بدلی نظر آنے لگی۔ یہی باقی سب کے ساتھ ہوا، سوائے گل۔ وہ مرجھائی اور بجھی بجھی تھی۔ شرمندگی کے باعث وہ یہ کہہ نہیں سکتی تھی ورنہ مطالبہ کرتی کہ ابھی چلو اور محسن کو تلاش کرو۔ کسی اور نے اسے کچھ بھی نہیں کہا تھا پھر بھی وہ احساس جرم کا شکار تھی۔

کھانے کے بعد کافی پینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس وقت سب پر نیند نے حملہ کیا اور جو جہاں تھا وہیں سو گیا۔ مجھے فکر تھی۔ میں اسے سلانے کے بعد سویا۔ یہ بے ہوشی کی نیند تھی جس میں زلزلہ بھی آ جاتا تو کسی کو پتا نہ چلتا۔

حسب توقع میری آنکھ کھلی تو باہر اجالا تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ نازو مجھ سے پہلے بیدار ہو گئی تھی اور گل شاید اس سے بھی پہلے جاگ اٹھی ہوگی۔ وہ دونوں کھلی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ میں نے گھڑی دیکھی تو آٹھ بجے تھے۔ میں تقریباً ستر ہ گھنٹے سوتا رہا تھا۔

میں نے غالب کو جگانے کی کوشش کی مگر اس پر اثر نہیں ہوا۔ نازو کچھ متفکر نظر آتی تھی مگر گل کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے گل؟ تم کھلی جا رہی ہو۔"

اس نے نازو کی طرف دیکھا اور ہنسی "آپ سن کے بھی بہت خوش ہوں گے۔ محسن کا پتا چل گیا ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "کیا.... محسن....؟"

"جی۔ یہ دیکھئے" گل نے مسرت سے بے قابو ہو کے کاغذ کا ایک پرزہ میری طرف بڑھا دیا "محسن کا پیغام ہم تک پہنچا ہے۔"

میں نے وہ پرزہ لے لیا۔ میری نظر اس کی عبارت پر جم

میں نے کاغذ کے اس بوسیدہ پھٹے ہوئے پرزے کو غور سے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ "یہ کہاں سے آیا؟"

گل نے بڑی امید سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "یہ محسن نے لکھا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مگر تمہارے پاس کہاں سے آ گیا یہ پیغام۔ کیا وہ خود دے گیا تمہیں؟"

گل ہنسی۔ "آپ مذاق کر رہے ہیں۔ میں لے کر آئی ہوں۔"

"تم باہر گئی تھیں؟" میں نے کہا "اکیلی؟"

"آپ سب سو رہے تھے۔ میں نے سوچا ایک نظر دیکھ آؤں۔ در اصل میں نے ...."

"خاک اچھا کیا تم نے۔" میں نے دہاڑ کے کہا "کل اچھا خاصا تماشا ہو گیا تھا ہم سب۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی تم نے خود کو پکڑ وانے اور ہمیں جیل خانے پہنچانے میں۔ بچا لیا اس بدمعاش نے جو ہمارا نیا دوست بنا ورنہ وہ کیپٹن بھی برا آدمی نہیں تھا ورنہ....."

گل رونے لگی "آپ تو بلا وجہ خفا ہو رہے ہیں مجھ پر۔ کیا غلطی کی ہے آج میں نے؟"

نازو نے مجھے گھور کے دیکھا اور گل کو تسلی دینے لگی "تم نے بالکل ٹھیک کیا تھا گل۔ سکندر کی بات کا برا مت مانو۔"

میں نے بے بسی سے نازو کو دیکھا "نازو! کل جو تماشا دیکھنے والے تھے وہی آج بھی دیکھ رہے ہوں گے۔ کیا سوچتے ہوں گے وہ کہ اس لڑکی میں ایسی کیا بات ہے۔ کیوں دیوانی ہے یہ لڑکی اس کے پیچھے۔"

"مجھے کسی کی پروا نہیں۔" گل نے روتے روتے کہا "مجھے معلوم تھا کہ محسن کا پیغام ضرور ملے گا۔"

"گل! یہ محسن کا پیغام نہیں ہے۔ نہ اس کی ہینڈ رائٹنگ ہے نہ کہیں نام ہے اس کا۔" میں نے کہا "یہ کسی چھپے ہوئے پوسٹر کا حصہ ہے۔"

"مگر اس میں صاف تو لکھا ہے۔ آج رات آٹھ بجے، چلتن میدان۔ کیا مطلب ہے آخر اس کا؟ محسن نے جگہ بتا دی ہے اور وقت لکھ دیا ہے۔"

مجھے افسوس سے زیادہ گل کی ذہنی کیفیت پر دکھ محسوس ہوا۔ وہ جذبات سے اس درجہ مغلوب تھی کہ عقل سے محروم ہو گئی تھی۔ وہ کسی پھٹے ہوئے پوسٹر کا ٹکڑا اتار لائی تھی جس پر اتنی ہی عبارت تھی۔ یہ کسی سیاسی جلسے کے وقت اور مقام کا اعلان ہوگا مگر گل نے اس ایک سطر کو محسن کا پیغام سمجھ لیا تھا۔ جب بھوک حد سے بڑھ جاتی ہے تو بقول شاعر، انسان کو چاند میں نظر آتی ہیں روٹیاں۔ ایسے میں جب عشق کا جادو سر چڑھ کے بولنے لگے تو جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے والی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ہر صدا میں محبوب کی پکار سنائی دینے لگتی ہے۔ ہر تحریر اس کا پیغام بن جاتی ہے۔ تو راہ ہموار ہو جاتی ہے عقل سے گزر کر کرتی جاتی ہے.... پھر کوئی بیچ کے

کہاں جا سکتا ہے!

گل کی اور میری آواز سن کر غالب بھی اٹھ بیٹھا "کیا ہو گیا صبح صبح۔ فساد کیوں ہو رہا ہے؟"

میں نے کاغذ کا وہ پرزہ غالب کو تھما دیا "گل کو یقین ہے کہ یہ محسن کا پیغام ہے۔"

غالب ہنس پڑا "پیغام یا اعلان۔"

میں نے کہا "ہنسنے کی بات نہیں۔ خاتون اکیلی نکل گئی تھیں اور یہ اسی کھمبے پر سے اتار لائی ہیں۔"

غالب نے کہا "باقی پوسٹر کیوں نہیں اتارا؟"

گل نے کہا "یہ پوسٹر نہیں تھا۔ بس اتنا ہی تھا۔"

"باقی تم نے کل پھاڑ دیا ہوگا" غالب بولا "اچھا ہوا شیخ مجیب یا بھاشانی کے کسی حامی نے نہیں دیکھا ورنہ ہنگامہ ہو جاتا۔"

میں نے کہا "یہ پرانا پوسٹر تھا۔ آج کل پلٹن میدان میں جلسے جلوس کہاں ہو رہے ہیں۔ ہم سو رہے تھے اور یہ پاگل لڑکی باہر نکل گئی تھی۔ اسے سمجھاؤ کہ عقل سے کام لے۔ یہ لاہور یا کراچی نہیں ہے۔"

نازو نے کہا "اب اس کا پیچھا چھوڑو خدا کے لئے۔ میں اسے سمجھا لوں گی۔"

"تم کیسے سمجھاؤ گی؟" غالب نے کہا "تم اس سے زیادہ نا سمجھ ہو۔"

نازو کے جواب دینے سے پہلے دروازے پر دستک ہوئی اور کوارٹر کے مالک کا متفکر اور طویل چہرہ نظر آیا۔

میں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا "کیا بات ہے بھئی۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو ہمیں؟"

اس نے کہا "سر! آپ سے بات کرے گا۔"

میں نے کہا "بات کرنے سے کس نے روکا ہے تمہیں۔"

"ایک دم پرائیویٹ بات کرے گا۔" وہ بولا "آپ باہر آئے گا۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا اور سر ہلایا "ٹھیک ہے۔ باہر چلو۔"

میں اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ وہ کوارٹر کی سائیڈ میں کھڑا ہو گیا "سر! ہم بہت غریب آدمی ہوتا۔"

میں نے کہا "ہم بھی کسی ریاست کے نواب یا کوئی صنعت کار بیکار وغیرہ نہیں ہیں۔ غریب ہی ہیں۔"

اس نے کہا "ہم بہت ڈرتا ہے خدا سے۔ قانون سے بیوی سے۔"

میں نے مسکرا کر کہا "ہر شریف آدمی ڈرتا ہے۔"

"رات کو پولیس آتا۔ رجسٹر چیک کرتا۔ منیجر سے بک بک کرتا پھر ملٹری آتا۔ سب دیکھتا۔ سارا کمرا میں جاتا۔"

میں نے کہا "ہوٹل کی تلاشی لی ملٹری نے؟"

www.paksociety.com

"پولیس کا ساتھ ملٹری آتا۔ آپ کو پوچھتا۔" وہ بولا۔

میں نے چونک کر کہا "ہمیں..... کیا مطلب؟ انھیں کیسے معلوم ہوا ہمارے بارے میں؟"

"یہ ہم نہیں جانتا۔ ہمارا بھی ڈیوٹی ہوتا۔" وہ بولا "سب دھڑ شیٹ ڈش واشر ہیلپر لوگ کو بلاتا۔ انڈین پولیس کا ایک اے ایس پی بہت شور کرتا۔ گالی بکتا سالا۔"

میں نے سوچ کر کہا "اے ایس پی..... کیا حلیہ تھا اس کا؟"

اس نے حلیہ بتا دیا۔ یہ اسی اے ایس پی کا حلیہ تھا جس کو ہم زبردستی اپنا راہنما بنا کے ڈھاکا تک لائے تھے۔ غالب کے اندیشے درست ثابت ہوئے تھے۔ وہ ہمیں اپنی باتوں سے اور اپنی اداکاری سے یقین دلانے میں کامیاب رہا تھا کہ اس کا دل ہماری طرف سے بالکل صاف ہے۔ اب ہم دشمن نہیں دوست ہیں جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اس نے موقع پاتے ہی ہمارا تعاقب شروع کر دیا تھا اور ہمارے بارے میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ضروری معلومات فراہم کر چکا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہر ہوٹل میں چھاپے مارتے پھر رہے تھے۔ عام حالات میں اعلیٰ درجے کے ہوٹل جہاں معززین اور وی آئی پی قسم کے لوگ قیام کرتے ہیں قانون کے لمبے ہاتھوں کی دسترس سے محفوظ رہتے ہیں اور وہاں پس پردہ عیش و عشرت کے جملہ لوازمات جو عوام کے لئے گناہ اور جرم کا درجہ رکھتے ہیں بطور استحقاق فراہم کئے جاتے ہیں۔ ساغر شراب سے مینائے شباب تک۔

مگر یہ عام حالات نہیں تھے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں غیر ملکی سفارت خانوں کے اہلکار، سابقہ حکومت پاکستان کے نمائندے، وزرا اور بیورو کریٹ، صنعت کار اور سیاست داں پناہ گزیں تھے ان میں سے بہت سے نئی حکومت کو مطلوب تھے یا انتقامی کارروائی کمان کے نقطۂ نظر سے مجرم تھے چناں چہ تمام مراعات اور تحفظات کے باوجود "ملک دشمن عناصر" کے لئے کہیں بھی جائے امان نہ تھی اور ہم اپنا شمار ایسے ہی لوگوں میں کر سکتے تھے۔ یہ ستم ظریفی حالات کی تھی جس نے ہماری حب الوطنی کی سند کو فرد جرم بنا دیا تھا۔ یہاں ہم اس لئے بھی مجرم تھے کہ پاکستانی تھے اور اس لئے بھی کہ ہم نے بنگلہ دیش کے دوستوں سے دشمنی کی تھی۔ ان دوستوں میں چوہدری دلاور جیسے لوگ شامل تھے۔ ریوتی تھا اور کرنل تھا۔

"سر! آپ ناراض مت ہونا۔"

میں نے کہا "ناراض..... کس بات پر..... تم نے جو کچھ کہا....."

"ہم غلط کرتا۔ ہم پکڑا جاتا تو مارا جاتا۔ گاڈ ہم کو ایک بار بچا لیا۔ بار بار نہیں بچاتا۔ آپ ادھر سے جاتا۔ بجھ بہت صوبائی ہوتا۔ ہم کسی کو نہیں بولتا۔"

میں نے کہا "تم بلاوجہ ڈر رہے ہو۔ ہمیں کون تلاش کرنے آئے گا۔ کیا کسی نے نام لیا تھا ہمارا؟"

"وہ آپ کا نام لیتا۔ سکندر بابو، محسن بابو اور ایک اور لوگ کا نام بولتا۔ رابعہ بی بی بات نازو بی بی۔"

میں نے اپنی جذباتی کمزوری اور خوف کا اظہار نہیں کیا بلکہ اور مسکرا کے بولا "مگر یہ ہمارے نام نہیں ہیں۔"

"وہ حلیہ بتاتا۔ ایک دم آپ کا۔"

میں نے ہنس کے کہا "کیا خاص بات ہے ہمارے حلیے میں ایسے تو نہ جانے کتنے لوگ اس ہوٹل میں مقیم ہوں گے۔"

میرے اعتماد نے اسے چکرا دیا "پھر آپ..... کون ہوتا؟"

"یہ تم نے اس وقت کیوں نہیں پوچھا تھا جب ہم نئے تھے؟" میں نے کہا۔

"ہمارا بھائی۔ بے دیو آپ کو لاتا۔"

"دیکھو، تم چاہو تو ہم اپنے پاسپورٹ دکھا دیں۔ آؤ اندر آؤ۔ یہ بات تم سب کے سامنے بھی کر سکتے تھے۔"

میں نے اندر آ کے کہا۔ "ابھی رکنی، یہ اس کو ذرا سب کے پاسپورٹ دکھا دو۔ ویسے میں بتاتا ہوں۔ یہ رکنی ہے اور یہ والا مسٹر اور مسز راجن۔ یہ پانڈے ہے اور میں ہوں کمار۔ ہم سب کو بتاتے اچھی طرح دیکھ لو۔"

نازو نے سمجھ لیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ غالب نے، گل نے بھی کسی حیرانی یا پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ ہم سے ہم سب کے انڈین پاسپورٹ نکال کے پیش کر دئیے گئے۔ تذبذب اور احساس ندامت میں مبتلا تھا۔ معزز مسافروں پر شک کر کے اس نے تو آپ میزبانی کی سخت خلاف ورزی کی تھی۔ انعام و اکرام حاصل کرنے کے مواقع گنوا دئیے تھے۔

"سوری۔ سوری سر..... اپن غلط سمجھا۔"

میں نے کہا "اب تسلی کر لو اپنی۔" میں نے اسے زبردستی پاسپورٹ تھما دئیے "تاکہ تمہارے دل سے ڈر نکل جائے بعد میں۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ ایسا نہ ہو کل پھر کوئی تمہیں بہکا دے۔" اس نے پاسپورٹ کھول کر دیکھے۔ ہماری تصویریں اصلی تھیں اور کسی دوسرے شخص کے پاسپورٹ پر فوٹو سٹیٹ یونٹ کی مدد سے نہیں لگائی گئی تھیں۔ پاسپورٹ بھی اصلی تھا اس پر لگی ہوئی مہر بھی۔ اشوک نے ان کا معائنہ کسی ماہر کی طرح کیا۔ تمام اندراجات کا مطالعہ فرمانے کے بعد اس نے جھوٹ کے ایک انگلی سے ناک کھجائی۔

"اس پر ویزا کا ٹھپہ اور تاریخ نہیں ہوتا۔"

وہ ایک ایسے ہوٹل کا ویٹر تھا جہاں ہر ملک کے شہری قیام کرتے تھے۔ قاضی جی کے گھر کے چوہے بھی سیانے مشہور تھے۔ اشوک کو اتنی آسانی سے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پاسپورٹ میں کیا ہیرا پھیری ہوتی ہے۔

میں نے کہا "ہاں۔ وہ ہم لگوا لیں گے۔"

"جی..... ادھر کیسے ہوتا؟"

میں نے کہا "تم فکر مت کرو۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔"

"دنیا میں تو بہت گڑبڑ ہوتا ہے....."

میں نے اس سے اتفاق کیا اور پاسپورٹ واپس لے لیا "پیسے ہوں تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی۔ سارے کام ٹھیک ہو جاتے ہیں۔"

اس وضاحت نے اشوک کو مطمئن نہیں کیا "ہم جانتا..... کیسے۔"

غالب نے کہا "دیکھو مسٹر اشوک کمار! جب ہم کلکتہ سے روانہ ہوئے تو بہت جلدی میں تھے ہمیں فوراً یہاں پہنچنا تھا۔ دیر ہو جاتی تو بہت بڑا نقصان ہو جاتا۔ ہم نے ویزا لگوانے کی کوشش کی مگر ادھر کوئی نہیں تھا۔ نہ پاکستان کا کونسلیٹ نہ بنگلہ دیش کا۔ ابھی تک بنگلہ دیش کے سفارت خانوں میں پوری طرح کام شروع نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "اس کے علاوہ اتنی بڑی فوج کون سا ویزا لگوا کے آئی ہے؟"

اشوک کمار نے برا سا منہ بنایا "وہ اور بات ہے۔"

میں نے کہا "یہ بھی اور بات ہے۔ ہم انڈین ہیں۔ تمہاری مدد کرنے آئے ہیں۔ تمہیں مصیبت سے بچانے آئے ہیں اور تم شکر گزار ہونے کے بجائے ہم سے ویزا طلب کرتے ہو؟ ویری بیڈ۔"

غالب نے کہا "سیکڑوں انڈین آفیشل ہر روز جہاز میں ادھر سے ادھر آتے جاتے رہتے ہیں..... کسی پاسپورٹ کے بغیر۔"

میں نے غصے میں کہا "اسے سمجھانا بے کار ہے۔ اس سے کہو کہ منیجر کو بلائے۔ ہم اس سے بات کریں گے۔"

جو بات منطقی دلائل سے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی وہ ایک دھمکی نے سمجھا دی۔ آہستہ آہستہ دنیا میں بدمعاشی کو بالادستی حاصل ہونے لگی ہے۔ مالک ڈاکہ قانونی اور اخلاقی حوالے دے کر جبلت کو اپنا ثابت کرنے تا شمی دلائل اسے ہانک کرتے جاتا ہے اور اسے عین انصاف بھی قرار دیتا ہے۔ ہماری "مائٹ از رائٹ سوسائٹی" یا ایم آر ایس بھی انہی حالات کے رد عمل کی پیداوار تھی۔

منیجر کو بلا کے لانا اشوک کے لئے شامت اعمال کو بلانے سے کم نہ تھا۔ وہ اپنے سرونٹ کوارٹر میں مسافروں کو ٹھہرانے اور ان سے کرایہ وصول کرنے کے جرم میں خود بے گھر اور بے آسرا ہو جاتا۔ ہوٹل کے اندر دوسرا غیر قانونی مسافر خانہ چلانا ایک ریاست کی حدود میں اپنی حکومت قائم کرنے کے مترادف تھا۔ اشوک اس لئے بھی ڈر گیا تھا کہ بات منیجر تک پہنچ گئی تو ہم مزید سنسنی خیز انکشافات کریں گے مثلاً یہ کہ ہمیں ہوٹل کے طعام خانے سے کھانا فراہم کیا جا رہا ہے اور وہ مال مسروقہ کی پوری قیمت وصول کر رہا ہے۔

غالب نے کہا "اب کھڑے کیوں ہو۔ جا کے ناشتا اور ہر چیز ڈش۔ سوائے قیمت کے۔ چلو ڈش اسپیشل کرو۔"

"یس سر!" اشوک نے مردہ لہجے میں کہا اور پلٹ کے جانے لگا۔

میں نے کہا "ڈش کراس مت کرنا ہمیں ورنہ....."

"تم اپنا ڈبل نقصان کرو گے۔" غالب نے کہا۔

اس کے جانے کے بعد غالب تو نہانے کے لئے باتھ روم میں گھس گیا۔ میں نے کھڑکی میں بیٹھ کر باہر کی دنیا کو دیکھا۔ ہر نئے شہر کی فضا میں اجنبیت کا احساس ایک فطری بات ہے مگر ڈھاکا میں ہوائے بغض و عداوت نے مجھے اپنے ہی وطن میں جلاوطن بنا دیا تھا۔ عدم تحفظ، خوف اور بے یقینی کے ماحول میں دوست اور دشمن میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ کل کا دوست آج کا دشمن تھا اور آنے والے دن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ کسے دوستی کا تاوان ادا کرنا ہو گا اور کسے دشمنی کا خراج دینا پڑے گا کس کا سایہ پیٹھ میں خنجر گھونپے گا اور کون بے چہرہ قاتل کسی کو جرم بے گناہی کی سزا دے گا۔

بظاہر جنگ ختم ہو گئی تھی لیکن ایک سطحی مصنوعی اور عارضی محسوس ہونے والے امن کی راکھ ابھی گرم تھی اور اس کے پیچھے نفرتوں کی آگ بجھی نہیں تھی۔ ان چنگاریوں کو ہوا دینے والے عفریت اپنی مکروہ صورتوں پر معصومیت کی نقاب ڈالے شریف انسانوں کے لہو سے ہولی کھیلتے پھر رہے تھے۔ رات بھر ادھر ادھر سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ اس وقت بھی کئی جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا اور فضا میں جلے ہوئے بارود کی بو کا آسیب باقی تھا۔ وقفے وقفے سے گزرنے والی فوجی گاڑیوں کو دیکھ کر لوگ سہم جاتے تھے اور دور کے راستے چھوڑ دیتے تھے۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں مگر خریدار مفقود تھے۔ بازاروں میں پھرنے والے وہ تھے جو گھر سے نکلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ چہروں سے خوشی اور لبوں سے مسکراہٹ ناپید تھی۔ چشم بنگال، زلف بنگال اور سحر بنگال۔ نذر السلام اور ٹیگور کی سرزمین۔ رقص اور موسیقی کا گہوارہ۔ سو نا رو دیش سب لوگ سوگ میں تھے۔

خود میں نے بے حسی کی قبا پہن لی تھی اور دل کو خوگر صدمات کر لیا تھا۔ میرے اطراف میں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے، ظلم کیا ہے ظالم کون اور مظلوم کون، یہ سب بے معنی ہو گیا تھا۔ مجھے اب صرف محسن کی تلاش سے سروکار تھا۔ کرتی ہوم ہے اک رقص خرد ہونے تک۔ تلاش ختم ہوئی تو رشتے بھی ختم ہو جائیں گے۔ رشتے جو اخوت، ہم وطنی اور یگانگت کی بنیادوں پر استوار رہے۔ ہم پہ مشترکہ تھے احسان غم الفت کے۔ مگر اب ہم سارے رشتوں سے منکر ہیں۔

ایک اخبار والا سائیکل کو تیز تیز پیڈل مارتا اور کسی سنسنی خیز سرخی کو اعلان کی طرح نشر کرتا گزرا۔ میں نے اسے روکنے کے لئے ہاتھ اٹھایا اور کھینچ لیا "یہ تو بنگالی کے اخبار تھے۔"

www.paksociety.com

غالب نے کہا "انگریزی اخبار بھی ہوگا اس کے پاس۔"

میں نے سر ہلایا "خبریں تو ایک ہی ہوں گی محض دل دکھانے والی۔"

"خبر صرف خبر ہوتی ہے۔ ایک فریق کے لئے شکست کی خبر ہی دوسرے کے لئے فتح کی خبر ہوگی۔"

"میرے لئے اچھی خبر صرف یہ ہو سکتی ہے کہ محسن شیروانی کا سراغ مل گیا۔ وہ خیریت سے ہیں اور ایک بیان میں انہوں نے اس یقین کا اعادہ کیا ہے کہ وہ بہت جلد اپنے دوستوں سے ملاقات کریں گے۔ محسن شیروانی کی تلاش میں مغربی پاکستان سے آنے والے ایم آر الیس کے سربراہ نے ہوٹل شاہ باغ میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ...... ناشتا آگیا ہے۔ نوش فرمایئے۔"

میں نے کھڑکی سے اترتے ہوئے کہا۔ نازو ہنسنے لگی۔ اشوک کمار نے ایک ٹرے درمیان میں میز پر رکھی اور حیران ہو کے نازو کو دیکھنے لگا۔

"مسٹر اشوک کمار!" غالب نے کہا "تم اور کیا کرتے ہو؟"

"اور..... کیا..... ہم اور کیا کرے گا سر! بس ویٹر ہے۔"

"ہاں۔ مگر میں نے تمہاری فلمیں بھی سب دیکھی ہیں۔ وہ جو فلم تھی نا تمہاری قسمت" غالب ناشتے پر ٹوٹ پڑا۔

"تمہاری قسمت؟ ایسی تو کوئی فلم نہیں بنی۔" میں نے غالب کے سامنے بیٹھ کے کہا۔

"پھوٹ گئی قسمت۔" غالب نے سر پر ہاتھ مارا۔ "بابا صرف قسمت۔"

"پھوٹ گئی قسمت؟ بابا صرف قسمت؟" میں نے کہا "اس نام کی کوئی فلم اگر کسی نے بنائی ہے تو مجھے نام بتاؤ اس کا۔"

غالب پھر اشوک کمار کی طرف متوجہ ہو گیا "فلم قسمت میں تم نے ایک گانا بھی گایا تھا۔ میرا بلبل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا۔ یہ بلبل مؤنث ہے یا مذکر؟"

"بلبل مؤنث ہے۔ اس کا مذکر ہے بلبلا۔ تو یہ بلبلا ہے صاحب کا" میں نے کہا۔

"سر! ہم ایکٹر نہیں ہے۔" اشوک کمار گھبرا کے بولا۔

"یار کیوں انکسار سے کام لیتے ہو۔" غالب نے ہاتھ اور منہ ایک ساتھ چلاتے ہوئے کہا "فلم دیدار میں کیا غضب کی اداکاری کی تھی تم نے۔ دلیپ کمار کو مات کر دیا تھا۔"

ویٹر بوکھلا گیا "وہ۔ وہ دوسرا اشوک کمار ہے۔ ہم نہیں ہے سر!"

"اچھا؟..... معاف کرنا میں دھوکا کھا گیا۔" غالب نے کہا۔

میں نے اسے ڈانٹا "ہر چیز مت کھایا کرو۔ ناشتے میں دھوکا کھا لیا۔ اس کے بعد دھکے کھانے نکل جاؤ گے۔ شام تک ہوسکتے کھا کے لوٹو گے۔"

"بھوک میں سب حلال ہے" غالب نے نازو کی طرف دیکھ کر سر ہلایا "مثلاً چھپکلی کا سوپ۔ مینڈک فرائی۔ کالے بچھو روسٹ۔"

نازو نے منہ پر ہاتھ رکھ کے ابکائی لی "مجھے الٹی آجائے گی۔"

"الٹی تم خود ہو۔ تمہیں سیدھی آئے گی" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "اس کا ناشتا حرام مت کرو۔"

غالب نے کہا "یہ سب چیزیں دنیا میں کھائی جاتی ہیں نازو۔"

"مگر تمہیں شوق ہو رہا ہے مار کھانے کا۔" نازو نے کہا۔

"دیکھو مجھے دھمکی مت دو۔ میرا سسر بھوت ہے۔ میں اس سے شکایت کردوں گا تو وہ آج ہی رات کو آجائے گا اور دماغ درست کردے گا۔ بند دروازے اور کھڑکیاں اس کو نہیں روک سکتے۔ بڑا خوف ناک بھوت ہے۔"

"تم باز نہیں آؤ گے؟....."

"لاحول ولا قوة۔ کیا میں نے تمہارے ابا کو کچھ کہا ہے؟" بولا۔

"اور کسے بھوت کہا ہے۔" نازو نے چلا کے کہا۔

"اپنے سسر کو۔ تم کیوں میرے گلے پڑ رہی ہو۔ ہزار بار کہا ہے کہ میں اپنی بیوی کے باپ کو بھوت کہتا ہوں تو تم کیوں ہو۔" غالب نے بھی چلا کے کہا۔

اشوک ہنسنے لگا "سر! کیا یہ آپ کا پتی لوگ نہیں ہے؟"

غالب کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا "وہ..... ہاں ہاں۔"

نازو نے موقعے سے فائدہ اٹھایا "وہ ہاں کیا۔ جس بھوت خاندان سے تمہارا تعلق ہوگا سب لاتوں کے بھوت ہوں گے تمہاری طرح۔"

میں نے فوراً مداخلت کی "شانتی شانتی۔ ہم یہاں لڑنے آئے۔ بھارتی سینا کی طرح۔"

"آپ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں سر؟" اشوک کمار نے سوال کیا۔

میں نے کسی تذبذب کے بغیر کہا "حالات کا جائزہ لینے۔ آر الیس کے نمائندے ہیں۔"

"ایم آر الیس۔ یہ کیا ہوتا ہے؟" اشوک کمار سوچ میں پڑ گیا۔

غالب نے مجھے گھور کے دیکھا "مسلم ریشنلسٹ سوسائٹی۔ تم نے انڈین ہسٹری پڑھی ہے تو یہ نام ضرور دیکھا ہوگا۔ جسٹس امیر علی یا سرسید میں سے کسی نے قائم کی (RATIONALIST) کا مطلب ہوتا ہے منطقی سوچ والا۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس تھا۔ غالب نے بات سنبھالی ورنہ عین ممکن تھا کہ یہ نام اشوک کو کھٹکتا تو وہ کسی اور کے سامنے ذکر کر دیتا۔ کیا پتا کون اصل میں

ویٹر ناشتے کی ٹرے اٹھا کے چلا گیا تو غالب میرے پیچھے پڑ گیا "تم نے کیا گل کو سرحد پار چھوڑ آئے ہیں۔"

میں نے کہا "سوری یار۔ بس زبان پر نام آگیا۔ تم بھی تو بھول گئے کہ یہ نازو نہیں مسز راجن ہے اور تم راجن ہو۔"

ہم سب کو بہت محتاط رہنا چاہئے۔ بھول جاؤ ایم آر الیس کو اقبال۔ میں محسن کو تلاش کرنا اور خیر و عافیت کے ساتھ واپس لے جانا ہمارا مشن ہے۔" غالب نے کہا۔

"وہ کہاں ملے گا؟ کب ملے گا؟" گل نے اچانک کہا۔

"وہاں جہاں میرے انکل ہیں۔ آج رات آٹھ بجے" غالب بولا۔

گل دکھی نظر آنے لگی۔ مجھے غالب کا مذاق بہت سفاک محسوس ہوا "مل جائے گا۔ ملے گا کیوں نہیں۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "آخر ہم سب مل کے تلاش کریں گے اسے تو وہ کب نہیں ملے گا۔"

غالب نے کچھ شرمسار ہو کے کہا۔ "وہ بھی تو ہمیں ڈھونڈ رہا ہے۔ دیکھ لینا وہ خود ہم سے رابطہ قائم کرے گا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کے عرصے بعد ہماری نظریں اسے نہ دیکھ پائیں۔"

نازو نے بھی کہا "ہاں۔ اس کی صورت اور حلیہ بدلا ہوا ہو۔"

گل کی مسکراہٹ جاگ اٹھی "مگر میں پہچان لوں گی اسے۔"

میں نے کہا "کیوں نہیں۔ تم اسے دیکھ لو گی تو ہم بھی پہچان لیں گے وہ خود دیکھ لے گا ہمیں۔"

"پھر ہم اس کے ساتھ واپس چلے جائیں گے۔" گل کی آنکھیں خواب دیکھنے لگیں۔ "یہ سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ زندگی میں سکھ ہی سکھ ہوگا۔ بے شک اس کا دل زخمی ہے۔ وہ والد کی موت کے بعد سے اکیلا ہے۔ اس کا بیٹا بھی مر گیا ہے جس کو اس نے باپ کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ لیکن میں اس کے ہر زخم دل پر مرہم رکھوں گی۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ آہستہ آہستہ میں اس کو واپس زندگی کی طرف لے آؤں گی۔ وہ پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسا تھا۔ وہ ہم سب سے زیادہ اکیلا ہو گیا تھا۔ میں اسے اکیلا نہیں رہنے دوں گی۔ اس کا اکیلا پن دور ہو جائے گا میرے ساتھ....."

میں غالب اور نازو حیرت آمیز مسرت اور مجرمانہ احترام کے جذبات کے ساتھ گل کے اعتراف محبت کو سن رہے تھے۔ یہ سب سے زیادہ یہ اعلان تھا۔ بے باک، بے خوف اور بے تاب محبت کا بے لوث منشور۔ اس کے یقین کا آئینہ دار اور عزائم کا مظہر۔ لیکن ہم سب کے خواب تھے مگر گل کی بات مختلف تھی۔ اس کی امید کا راستہ تھا۔ بغیر محسن کو چاہا تھا۔ اس کا عشق بے لوث تھا۔ وہ جانتی تھی کہ محسن بھی اس کا نہیں ہوگا۔ وہ شملا کا ہو رہے گا۔ آج بھی وہ صرف اس کے دکھ پڑھ سکی تھی۔ وہ شملا کی روح بستی پر خوش نہیں تھی۔ اس احساس سے رنجیدہ تھی کہ محسن تنہا رہ گیا اور اس کی تنہائی کے درد کا درماں ضروری ہے۔

مسئلہ یہ تھا کہ محسن کی تلاش کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟ اس نے بہت عرصہ قبل ایک سراغ چھوڑا تھا کہ وہ ہوٹل شاہ باغ کے سامنے ہر صبح ہمارا انتظار کرے گا اور اگر ہم نہ پہنچے تو صدر دروازے کے مقابل کھمبے پر ہمارے لئے پیغام چھوڑ جائے گا۔ یہ بات بہت پرانی ہو گئی تھی۔ اب اس خیال سے اس امید باندھنا لاحاصل محسوس ہوتا تھا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود محسن ہر روز آتا ہوگا۔ اپنے مایوسی کے خیالوں سے ہار نہیں مانی ہوگی اور ناقابل شکست یقین کے ساتھ وہ ہمارے لئے پیغام چھوڑنے کے معمول پر کاربند ہوگا۔

اس کھمبے پر محسن کا کوئی پیغام نہیں تھا۔ ہوتا تو سب سے پہلے گل کی نظر اسے دیکھتی۔ اس کے باوجود یہ ضروری تھا کہ ہم یاد ماضی کے سراغ کو نئی امید مستقبل کا نشان راہ تسلیم کرتے ہوئے جستجو کے سفر کا آغاز اسی مقام سے کریں جہاں محسن نے ہمارا انتظار کیا ہوگا۔ اس خیال نے مجھے بڑی اذیت دی کہ مایوسی کی انتہا تک پہنچنے سے پہلے اور امید کی آخری کرن کو مایوسی کے اندھیرے میں گم کرنے سے پہلے محسن کتنے صبر آزما مراحل سے گزرا ہوگا۔ اس نے ہر آتی جاتی صورت کو دیکھا ہوگا۔ ہر دعا کو پھر آنے والے دن اور اس کے بعد طلوع ہونے والے سورج کی پہلی کرن سے منسوب کر دیا ہوگا۔ وفا اور دوستی پر ایمان کی بنیادوں کو استوار رکھنے کے لئے اس نے خود فریبی کے ہزار اسباب تلاش کرلئے ہوں گے۔ وہ آج نہیں آسکے۔ کوئی بات نہیں۔ کل ضرور آئیں گے۔ ان کا سفر دشوار ہے۔ قدم قدم پر آزمائش کے مراحل ہیں۔ دشمن گھات میں ہیں۔ شکاری جال پھیلائے بیٹھے ہیں۔ حادثات اور خطرات... ہم رکاب ہیں۔ مگر جو ہم سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں۔ حالات گردش لیل و نہار رکھتے ہیں۔

"لوٹ آیئے حقائق کی دنیا میں۔" غالب نے میری ناک کے سامنے چٹکی بجائی "مانا کہ تو شاہین بے پرواز ہے مگر کام تیرا اے گرا اس وقت فلائٹ کینسل کر دیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "ترگس کا جھنڈا اور بے ننا ہیں کا جھار اور۔ چلو میں آگیا واپس زمین پر۔"

"میرے قابل رشک ذہن میں ایک لاجواب خیال آیا ہے۔" غالب نے کہا "توجہ چاہتا ہوں مس نازو اور مس گل۔"

"کچھ کو بھی۔" نازو نے کہا۔

غالب بولا "ہم تلاش کا آغاز کرتے ہیں منفی سوچ سے یعنی پہلے تاریک پہلو کو دیکھتے ہیں۔ ناممکنات سے ممکنات کی جانب چلتے ہیں۔ یہ بڑا باریک نکتہ ہے۔ ناامیدی کے ساتھ امید کی طرف جانے میں کبھی خوش فہمی کے جال میں گرفتار ہونے کا امکان نہیں اور نہ دل شکنی کا۔"

"مرزا جی! آسان اردو میں عرض کیجئے جو بھی کہنا ہے۔"

غالب نے سر کھجایا "مرزا غالب کو بھی ابتدا میں یہی مسئلہ

www.paksociety.com

درپیش تھا۔ وہ مشکل کہتے تھے اور کوئی سمجھتا نہیں تھا۔ میں اپنے زمانے کے جاہلوں میں پھنس گیا ہوں۔"

"پاگل خانے میں ہر شخص کہتا ہے کہ میں کہاں پاگلوں میں پھنس گیا ہوں۔" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا "یہ اپنے چوہدری اللہ دتہ نے تمہیں ایک کارڈ دیا تھا جس پر اس کا فون نمبر تھا۔"

"ہاں۔ کارڈ محفوظ ہے میرے پاس۔"

"کیا خیال ہے؟ وہ بندہ قابل اعتماد ہے یا نہیں؟ ہے تو اپنے شہر لاہور کا۔" غالب نے کہا "اور وہ بھی مصیبت میں گرفتار ہے۔"

"پھر؟" نازو نے کہا "ہم کیا کریں؟ یہاں تو سب ہی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ہم اللہ دتا کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

"ممکن ہے وہ ہماری مدد کر سکتا ہے۔" غالب نے سکون سے کہا "کیا ہے وہ فارسی میں۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ کبوتر با کبوتر باز با باز۔ یعنی ایک مصیبت زدہ دوسرے کا ساتھ دے سکتا ہے تم اسے بلاؤ۔"

"اور بلا کے کیا کہوں؟" میں نے کہا۔

"اب آپ لوگ اپنے جذبات پر قابو رکھیں۔ حقیقت پسندی کا یہ تقاضا ہے کہ ہم تمام امکانات کا جائزہ لیں۔ فرض کرو۔ میرے منہ میں خاک۔ محسن پکڑا گیا ہو۔"

گل کا رنگ اڑ گیا "اللہ نہ کرے..... یہ تم....."

"سنو۔ سنو۔" غالب نے کہا "عقل سے کام لو۔ گمشدہ افراد کی تلاش ایسے ہی کی جاتی ہے۔ یہاں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب جانتے ہیں۔ ان حالات میں یہ ناممکن یا بعید از قیاس نہیں ہے کہ محسن کو پولیس یا ملٹری نے گرفتار کر لیا ہو۔"

"آخر کیوں؟ ایسی منحوس بات....." گل چلائی۔

میں نے اسے ڈانٹ دیا "گل! ایسے کام نہیں چلے گا۔ غالب ٹھیک کہتا ہے۔ یہاں سب کچھ ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہئے مگر ہمارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تم خود جانتی ہو کہ ہمارے راستوں پر کہیں گلاب نہیں بچھے ہوئے تھے۔ کانٹے تھے اور پتھر تھے۔ اس سفر میں ہم نے کیا صعوبت برداشت نہیں کی۔ ہر قدم پر موت کا سامنا کیا مگر خطرات سے نہیں ڈرے۔ ہم خوش قسمت تھے کہ اکٹھے اور صحیح سالم یہاں تک آ گئے مگر ہمارے کتنے ساتھی ہمیشہ کے لئے ساتھ چھوڑ گئے۔ محسن تو آج بھی ہمارے ساتھ ہے۔ سفر میں یہ تو ہوتا ہے کہ کوئی آگے نکل گیا کوئی پیچھے رہ گیا۔ جدا ہونے والے کل پھر ملیں گے۔ یہ امید نہ ہوتی تو ہم صرف محسن کی تلاش کا مقصد لے کر اتنی طویل مسافت کیوں طے کرتے جو ہمارا مقصد ہرگز مشرقی پاکستان کو فتح کرنا اور بھارتی فوج کو شکست دے کر ملک سے نکالنا نہیں تھا۔"

گل شرمندہ نظر آنے لگی "آپ ٹھیک کہتے ہیں بھائی سکندر۔"

میں نے کہا "دنیا میں زندہ رہنے کا یہی اصول ہے کہ بھلائی کی امید رکھو مگر برائی کے لئے تیار رہو۔ خوشی کے شادیانے بجاتے ہوئے یہ نہ بھولو کہ زندگی میں رنج و الم اور دکھ درد بھی ہیں۔ یہ تو انسانوں کا مقدر ہے وہی ہمارا بھی ہے۔ ہمیں تقدیر نے کسی خصوصی رعایت کے تحت دائمی مسرت اور غموں سے تحفظ کی کوئی گارنٹی نہیں دی ہے۔ میں یا تم، غالب یا نازو آج اکٹھے ہیں۔ خوش رہتے ہیں اور ایک ساتھ ہیں۔ کل کیا پتا ہم میں سے کون کہاں ہو۔ اس خیال پر آج کے دن کی رفاقت کے لطف کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔"

غالب نے ہاتھ مل کے کہا "رہ... میرا خیال ہے کہ آج اتنا ہی کافی ہے۔ فلسفہ حیات کے لیکچر کا حصہ دوم کل کی نشریات میں۔"

میں نے مسکرا کے کہا "تم جیسے کند ذہن شاگرد صرف بحث سے غرض رکھتے ہیں۔"

"پروفیسر صاحب! عمل سے زندگی بنتی ہے۔ باتوں سے نہیں۔" غالب بولا "چلیں میدان عمل میں کود جائیں۔ چلیں، لیں کہ محسن اپنے وعدے کے مطابق کھمبے کے ساتھ کھڑا ہو۔"

"صبح تو نہیں تھا" گل بولی۔

"کیا پتا اب آ گیا ہو۔ فراغت کے دن ہیں۔ صبح دس بجے سے پہلے ڈیوٹی رہتا ہو اور بارہ بجے لنچ کے لئے چلا جاتا ہو۔ اگر وہ ملا تو پھر ہم جاسوسی اور سراغ رسانی کی خداداد صلاحیت کو کام لاتے ہیں۔ جو خدا نے یہاں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔" غالب اور انگلی سے اپنا سر بجایا۔

"یہاں تو بھوسا بھرا ہوا ہے۔" نازو نے کہا۔

"جیسے بلی کو خواب میں چھیچھڑے نظر آتے ہیں اسی طرح جینئس کو ہر جگہ بھوسا دکھائی دیتا ہے۔" غالب نے کہا "عظیم کھوپڑی میں جتنی عقل ہے اتنی تمہارے سارے خاندان کی سات پشتوں کے پاس نہیں ہو گی۔"

نازو نے بگڑ کے کہا "خاندان اور سات پشتوں تک مت جاؤ"

"ورنہ تم کیا کرو گی؟"

"تمہارا سر توڑ دوں گی۔ بہہ جائے گا عقل کا دریا۔ عقل کا۔"

"پہلے ذرا اپنے سر کو دیکھو۔" غالب نے ایک انگلی مار کے "دیکھا کیسی ٹن سے آواز آئی۔ جیسے ٹین کا خالی ڈبا۔ بھوسا نہیں ہے۔"

"اف۔ یہ تم لوگ وقت بے وقت سب کچھ بھول کے میں کیوں الجھ جاتے ہو" میں نے کہا "کیا بات ہو رہی تھی اور کیا شروع کر دیا۔"

گل نے کہا "میں..... چکر لگا کے آتی ہوں۔"

میں نے کہا "بیٹھی رہو آرام سے۔ تم ضرورت سے

جذباتی ہو رہی ہو۔ ہم بھی چلتے ہیں۔ پہلے یہ طے کر لیں کہ ہمیں کرنا کیا ہے۔"

غالب نے کہا "تم بلاؤ مسٹر اے ڈی سی کو۔ دیکھو وہ بھروسے کے قابل ہے یا نہیں۔ پھر اس کے سپرد یہ کام کر دو کہ محسن کو تھانوں کی حوالات سے جیل تک تلاش کرے۔"

"یہ ایک دن میں ہونے والا کام نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"یہاں ہر روز سینکڑوں پکڑے جاتے ہیں۔ کچھ چھوٹ جاتے ہیں اور دوسروں کے جرم کی سزا کاٹتے ہیں۔ یہاں محسن کا والی وارث کون تھا۔ خدا نخواستہ وہ پکڑا گیا ہو گا کہ ابھی ہم بچ جاتے۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" گل نے سادگی سے کہا۔

غالب ہنس پڑا "بھئی ایک لومڑی بھاگی جا رہی تھی۔ کسی نے پوچھا کیا ہوا کیا ہے۔ کہنے لگی کہ پولیس والے اونٹوں کو پکڑ رہے ہیں۔ پوچھنے والے نے کہا کہ پھر تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لومڑی نے کہا کہ بابا ان پولیس والوں کا کوئی بھروسہ نہیں کہ اگر یہی کہہ دیں کہ یہ بھی اونٹ کا بچہ ہے اور مجھے پکڑ لیں پھر؟ تو خدا نخواستہ ایسے ہی محسن پکڑا گیا ہو کہ یہ بھی تخریب پسند ہے یا پاکستانی فوج کا ایجنٹ ہے۔ لیبل لگانے والے اسی کام کے ماہر ہوتے ہیں۔ مکتی باہنی کا آدمی، بہاری یا کسی محب وطن تنظیم کا۔ ادھر والے نہ پکڑیں ادھر والے پکڑ لیں۔ کون تصدیق، تفتیش کرتا ہے۔ یوں پکڑے جانے والوں کی تو کسی عدالت میں پیشی تک نہیں ہوتی۔ نہ فرد جرم لگتی ہے نہ ضمانت۔ بس پڑے رہتے ہیں جیل خانوں میں وقت کے رحم و کرم پر۔ اگر ایسی کوئی بات ہو گی تو اے ڈی سی پتا لگا لے گا۔"

"اے ڈی سی ایک معمولی سب انسپکٹر ہے" میں نے کہا۔

"مگر اس کے مراسم ہوں گے۔"

"جن سے مراسم تھے وہ سب یار اغیار ہو گئے ہیں۔"

"سب نہیں۔ یہاں اس کے ہم زبان زیادہ بہت ہوں گے۔ مغربی پاکستان سے ہزاروں لاکھوں لوگ بھیجے گئے تھے انتظامی امور سنبھالنے کے لئے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اے ڈی سی کو بلاتا ہوں اور اس سے بات کرتا ہوں۔ تم جا کے محسن کو دیکھو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سامنے نہ ہو۔ کہیں چھپ کے کھڑا ہو اور تمہیں دیکھ لے۔ اکیلے نہ جانا....."

"میں ساتھ جاؤں گی" گل نے کہا۔

"نہیں۔ تم میرے ساتھ رہو گی۔" میں نے کہا۔

کہنے لگی "نازو کیوں نہیں رہ سکتی تمہارے ساتھ؟"

"اس لئے کہ وہ غالب کی حفاظت بھی کر سکتی ہے۔ کوئی خطرہ ہو تو مقابلہ کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"تم آمادہ نہ تھی" "ریوالور سب کے پاس ہیں۔"

میں نے کہا "بے وقوف لڑکی! یہاں اسلحہ استعمال کیا تو سمجھو پکڑے گئے یا مارے گئے۔ ایک گولی چلائی کسی نے تو بلوہ ہو جائے گا یا آرمی شوٹ کر دے گی۔ یہاں تو اسلحہ لے کر پھرنا بھی خطرناک کام ہے۔ جہاں تک ممکن ہو جھگڑے فساد سے دور رہو۔ کوئی گلے پڑے زبردستی تو جان چھڑانے کے لئے ہاتھ پیر چلانے میں کوئی حرج نہیں۔ تم غالب کے ساتھ جاؤ گی تو نہ غالب تمہاری مدد کر سکے گا نہ تم غالب کو بچا سکو گی۔ اس لئے میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔"

نازو اٹھ کھڑی ہوئی "چلو میرے ساتھ۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں تمہاری محافظ ہوں۔"

غالب نے تو بگڑ کے کہا "یہ شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے میرے لئے۔"

"ایسے مقام تو پہلے بھی اکثر آئے ہیں۔"

"اچھا آج ڈوب مروں گا تمہارے ساتھ۔ کوئی مناسب جگہ نظر آئے تو بتانا مثلاً کوئی سوئمنگ پول۔" غالب بولا۔

میں نے کہا "زیادہ دور مت جانا۔ آس پاس ہی نظر رکھو۔ ایک دوسرے سے الگ رہو اور کچھ فاصلے پر۔"

"یہ دوری کی شرط آخر کیوں؟" غالب بولا۔

میں نے کہا "ایک تو اس لئے کہ اکٹھے رہو گے تو کام بھول کے آپس میں لڑتے رہو گے۔ دوسرے اس لئے کہ محسن کو ایک نظر نہ آئے تو دوسرا نظر آ جائے۔ دو مختلف مقامات سے ہر طرف جائزہ لینے میں آسانی رہے گی۔"

ان کے جاتے ہی میں نے فون اٹھایا تو ریسیور سے کوئی ٹون سنائی نہ دی۔ مجھے یاد آیا کہ اشوک نے صرف رات کے وقت ٹیلی فون لائن دینے کی پیشکش کی تھی۔ دن میں ایکسچینج پر بہت لوڈ ہوتا ہو گا۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں ہوٹل کے لاؤنج سے فون کروں یا کہیں باہر جاؤں۔ باہر جانے کی صورت میں میرا غیر بنگالی ہونا مجھے مسائل سے دوچار کرتا۔ تعصب کے جذبات کی شدت انتہا پر تھی۔ کسی کے پاس فون ہوتا تو محض اردو بولنے کے جرم میں وہ مجھے دھتکار بھی سکتا تھا۔

لاؤنج میں بھی صورت حال مختلف نہیں تھی۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی بد مزاج مگر خوب صورت آنکھوں والی سانولی سی لڑکی نے کہا "ٹیلی فون صرف ان کے لئے ہے جو یہاں مقیم ہیں۔"

میں نے ایک ڈرامہ کیا اور کاؤنٹر پر زور سے مکا مارا۔ "کون کہتا ہے؟ کس قانون اور قاعدے کے تحت کہتا ہے؟ بلاؤ منیجر کو۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔ جیب سے اپنا پاسپورٹ نکالا اور اسے ایک جھلک دکھا کے واپس رکھ لیا۔

لڑکی کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے پاسپورٹ کے اندر میری تصویر دیکھ لی تھی یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ پاسپورٹ نیا اور بھارتی ہے۔ میرے لہجے اور بڑا اعتماد جارحانہ انداز تخاطب نے اسے خوف زدہ کر دیا کہ شاید غلطی سے اس نے کسی وی آئی پی کو انکار کر دیا ہے۔

www.paksociety.com

لاؤنج میں موجود ہر شخص کی نظر گھوم گئی تھی اور کاؤنٹر پر موجود دوسرے لوگ بھی گھبرا گئے تھے۔ ایک نوجوان فوراً صورت حال کو سنبھالنے کے لئے آگے آیا۔

"پلیز ڈونٹ مائنڈ سر۔ آپ ادھر سے فون کریں۔ یہ فون ویسے بھی خراب ہے۔" اس نے مجھے اپنی طرف بلالیا۔

میں نے خوب صورت آنکھوں والی لڑکی پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی اور دوسرے فون کا ریسیور اٹھالیا۔ نمبر ملانے کے بعد میں نے چند سیکنڈ انتظار کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی۔

آخر کار کسی نے ریسیور اٹھا کر کہا "پولیس اسٹیشن......"

میں نے بیچ میں کہا "کون بول رہا ہے۔ نام بتاؤ۔"

بات کرنے والا گھبرا گیا "جی...... انسپکٹر جلیل۔ ایس ایچ او۔"

میں نے کہا "سب انسپکٹر بی اے وڑائچ کہاں ہے؟"

"کون بول رہا ہے؟" وہ ذرا محتاط ہو کے بولا۔

"تمہارے خیال میں کون ہو سکتا ہے۔ میں کمار بول رہا ہوں۔"

"اوہ۔ ڈی ایس پی صاحب۔ سوری سر...... میں نے آپ کی آواز نہیں پہچانی۔"

اس دلچسپ اتفاق پر میں محظوظ ہوا "تمہارا کیا ہے کسی دن اپنے باپ کو پہچاننے سے انکار کر دو گے۔ اللہ دتا کہاں ہے۔"

"جی...... ابھی بلاتا ہوں سر۔"

کچھ دیر میری گفتگو میں رسمی سی دلچسپی لینے کے بعد کاؤنٹر پر بیٹھنے والے پھر مصروف ہو گئے تھے اور کسی حد تک مطمئن بھی کہ بات زیادہ نہیں بگڑی۔ خوب صورت آنکھوں والی سانولی لڑکی اب گل کو خاصے رشک اور حسد کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

اللہ دتا کی آواز سن کے میں نے کہا "کیا ہو رہا ہے مسٹر اے ڈی۔ فارغ ہو؟"

اس نے کنفیوز ہو کے کہا "جی۔ میں نے پہچانا نہیں آپ کو۔"

"کل تم نے مجھے کارڈ دیا تھا۔ واپس جانا چاہتے ہو تم۔ دیکھو شور مت کرنا۔ یہ تمہارا احمق ایس ایچ او مجھے ڈی ایس پی سمجھ رہا ہے۔ کمار نام کا کوئی ڈی ایس پی ہے یہاں؟"

"ہمارے علاقے کا تو نہیں ہے۔ مگر ہے۔ خیر حکم کریں۔"

"حکم یہ ہے کہ تم فوراً مجھ سے ملو۔ بہت ضروری کام ہے۔"

"مگر کہاں؟ آپ کہاں سے بول رہے ہیں اس وقت؟"

"تم بتاؤ کوئی جگہ جہاں ہم اطمینان سے بات کر سکیں۔ مجھے تو کچھ پتا نہیں ہے ابھی۔ یا تم ایسا کرو ٹیکسی یا کار لے کر ہوٹل شاہ باغ کے سامنے آجاؤ۔ میں وہیں ملوں گا۔"

"رائٹ سر۔ میں حاضر ہوتا ہوں۔" اس نے کہا۔

میں نے ریسیور رکھا اور جیب سے پرس نکالا "کتنے پیسے؟"

کاؤنٹر کلرک نے خفت سے کہا "کچھ نہیں سر۔ آپ [illegible] کریں۔"

میں نے کہا "اچھا دیکھو۔ تم ایک پیغام لے سکتے ہو؟ نام کیا ہے تمہارا؟"

"علی شاہ۔" وہ بولا۔

"علی شاہ! میں آنند کمار ورما ہوں۔ زینی ٹیکنیکل انڈسٹریز۔ دہلی۔" میں نے کہا "یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی [illegible] کوئی آئے اور مجھے پوچھے۔ دراصل میرا خیال تھا کہ مجھے یہ مل جائے گا چنانچہ میں نے کچھ اہم لوگوں کو اپنا [illegible] دے دیا تھا جو میری غلطی تھی۔ میری کوئی [illegible] یہاں۔ میں اب انٹر کان میں ہوں۔ اگر کوئی [illegible] وقت بھی کوئی آتا تھا۔" میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔

"بعد میں کوئی آئے گا تو میں بتا دوں گا اور پیغام بھی دے دوں گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔"

"شکریہ مسٹر علی شاہ! بھروسہ بہت ضروری ہے۔ پیغام اور...... راز داری کا تقاضا بھی ہے۔"

"سر! آپ اگر چاہیں تو......"

"یس" میں جاتے جاتے پلٹ گیا۔

"میں ایک کمرا نکال سکتا ہوں آپ کے لئے۔ ادھر سے کینیڈا کے ٹریڈ کونسلیٹ خالی کریں گے۔"

میں نے بے حد مسرت اور تھوڑی سی حیرت سے کہا "واقعی؟ یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔ شکریہ مسٹر شاہ۔"

"میں مسٹر اور مسز کمار ورما کے لئے بکنگ شو کر دوں؟"

"بالکل۔ اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے۔" میں گل کا ہاتھ تھام کے باہر چلا گیا۔ اصولاً مجھے شکریہ ادا کرنا چاہئے تھا مگر میرے پاس صرف پاکستانی کرنسی تھی جو میرے دعوؤں کی قلعی کھول دیتی۔ کلرک مجھ سے اتنا مرعوب تھا کہ اس نے مجھے روک کر کچھ مانگنے کی ہمت ہی نہیں کی۔

باہر آکے میں نے ادھر ادھر دیکھا اور گل سے کہا "یہ حد سے زیادہ حیران یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں برا ماننے کی۔ خود کو بچانے اور چھپائے رکھنے کے لئے ہم [illegible] جھوٹ بولیں گے۔ جھوٹ جنگ کی حکمت عملی میں [illegible] رکھتا ہے خواہ وہ پروپیگنڈا ہو یا اسٹریٹجی۔"

"میں یہ سب نہیں سمجھی۔"

"اسی لئے سمجھا رہا ہوں تمہیں۔ اس کلرک [illegible] دوسرے لوگ بھی تمہیں اور مجھے مسٹر اور مسز کمار سمجھیں گے۔ انہیں ایسا سمجھنے دو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نام تو [illegible] سوچ ایسی ہی ہوتی ہے۔"

گل نے کہا "غالب اور ناز و نظر نہیں آرہے ہیں۔"

میں نے کہا "ظاہر ہے مسٹر اور مسز ورما بن کے

وہ گروہ ہیں کہاں؟"

"اب کیا ہم ان پر نظر رکھیں گے؟ انہیں اپنا کام کرنے دو۔"

میں نے نرمی سے کہا "آؤ ہم ادھر بس اسٹاپ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی اس طرف سے گزرا تو ہمیں دیکھ لے گا ورنہ ہم دیکھ لیں گے۔"

بس اسٹاپ پر بہت سی عورتیں اور مرد کھڑے تھے۔ عورتوں نے موٹی ساڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ وہ سب تیس سے تیس سال کی [illegible] نوجوان ہی نہیں جا سکتی تھیں مگر ان کی جوانی رنگ روپ اور [illegible] کے اسباب سے محرومی کا نوحہ تھی۔ سوکھے جسموں پر سیاہ [illegible] بے رونق چہرے اور روکھے بال۔ ویران آنکھیں اور مرجھایا رخسار۔ بھرپور شادابی جو عورت کے جسم کو نشیب و فراز کے انداز [illegible] حسن عطا کرتی ہے تنگی حالات کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ [illegible] اور کام سے زیادہ یہ کم سنی کی شادیوں کا نتیجہ تھا۔ ایک [illegible] افسر کی بات جو وہاں عام مشاہدے میں آئی یہ تھی کہ [illegible] متوسط اور پڑھے لکھے لوگ بھی بارہ تیرہ سال کی لڑکی کو [illegible] کر کے رخصت کر دیتے تھے۔ بیس بائیس سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ بچے جن لیتی تھی۔ اس کا شوہر اور اس کے بچے کسی PARASITE کی طرح چوٹ کر اس کے جسم کا سارا حسن، صحت [illegible] یہاں تک کہ خون تک نچوڑ لیتے تھے اور وہ پچیس سال [illegible] بوڑھی ہو جاتی تھی۔ تیس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے [illegible] جاتی تھی اور شاید چالیس سال سے پہلے ہی زندگی کا وہ سفر [illegible] ہو جاتا تھا جو ستر سال بھی جاری رہ سکتا تھا۔

مرد بھی زیادہ صحت مند نہیں تھے۔ ان پر بھی خاندان کی گاڑی کھینچنے کی ذمہ داری تعلیم اور وقت ڈال دی جاتی تھی۔ وہ خود بھی [illegible] گزار بچے تھے ویسی ہی زندگی ان کے وارث پاتے تھے جس [illegible] ایک وقت پیٹ بھر کھانا خوش نصیبی سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم [illegible] عیاشی تھی جو بھوک کا تدارک نہیں کر سکتی تھی اور ایسی [illegible] اور علاج معالجہ بھی عیاشی کے زمرے میں آتے تھے جو [illegible] مقدور نہیں ہو سکتی چنانچہ بیماری سے کسی کا مر جانا بھی بالکل [illegible] تھا۔ تاہم شہری آبادی کے حالات قدرے بہتر تھے۔

اچانک دو افراد نے ہنگامہ شروع کیا۔ وہ زمین پر دو لتی پالتی مار کے بیٹھے ایک ہی اخبار پڑھ رہے تھے کہ کسی خبر پر نظریاتی اختلاف پیدا ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بات بڑھ گئی اور وہ اچھل اچھل کر مرغوں کی طرح لڑنے لگے۔ وہ مرغوں کی طرح لڑ بھی رہے [illegible] لوگوں نے انہیں الگ کیا مگر وہ پھر الجھ گئے۔ اخبار تو ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے بال بھی نوچے [illegible] کپڑے پھاڑے اور گھونسے بھی مارے۔ ایک کی ناک سے خون [illegible] دوسرے کی آنکھ نیلی پڑ گئی۔ متعدد بسیں آئیں اور چلی گئیں۔ لڑنے والے اور چھڑانے والے بدل گئے۔ میں پریشانی سے ادھر ادھر نظریں دوڑاتا رہا کہ اسے وہی نظر آجائے تو ہماری جان چھوٹے۔ اپنے رنگ روپ سے ہم الگ نظر آتے تھے اور سب سے الگ بھی کھڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہر سوالیہ نگاہ اٹھتی تھی تو شکوک بڑھ جاتے تھے۔ پھر اچانک ایک لڑاکا مرغے کو ہوش آیا اور وہ دوڑ کر بس پر چڑھ گیا۔ دوسرے کو بھی شاید اسی بس سے جانا تھا مگر وہ دیر سے بھاگا۔ اگر وہ بس پر سوار ہو جاتا تو ان کی نظریاتی جنگ جاری رہتی مگر دوسرے شخص کی چلتی ہوئی دھوتی دغا دے گئی۔ وہ الجھ کے گرا اور بس اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔

مجھے ہنسی آئی مگر میں نے چیخنے سے گریز کیا۔ پھر کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر بھاری بھرکم ہاتھ رکھا تو میں چونک پڑا۔

محمد بھائی کا چہرہ دیکھ کر مجھے مسکرانا پڑا "تم یہاں کیسے؟"

"ابھی اپن ادھر نکلا۔ دیکھا" اس نے گل پر نظر جما کے کہا "پھر تم کو اپن سمجھا یہ سالا لوگ تم کو تنگ کرتا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ہمیں کسی نے پریشان نہیں کیا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اپنا ماتھا نہیں چلے گا۔ تم بس میں جائیں گا تو لفڑا ہوئیں گا۔ یہ سب سالا پاکستان کا دشمن ہے۔ ابھی۔ کیا؟"

میں نے جان چھڑانے کے لئے کہا "ابھی ہم بس سے نہیں جا رہے ہیں۔"

اس نے کہا "اپن ادھر بھی پوچھا رات کو۔ سالا لوگ بولا۔ ادھر کوئی نہیں۔" عادت کے مطابق اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"تم نے ہوٹل والوں سے پوچھا تھا۔ کیوں؟"

"اپن چیک کیا تمہارے واسطے ایک روم فرسٹ کلاس۔ ایک پاکستانی فیملی کا گھر ہے۔ وہ ادھر سے چلا گیا۔ پتا نہیں کدھر گیا۔ اپن ادھر سب کو بول دیا کہ کوئی حرامی اندر جائیں گا تو اس کا لاش باہر آئیں گی۔ کیا؟" وہ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

میں نے کہا "محمد بھائی! ہماری رہائش کا معقول انتظام ہو گیا ہے۔ کمرا بھی مل گیا ہے شاہ باغ میں......"

"ادھر کا ہے کو جیسا دیں گا۔ ادھر ایک روم اپنا گھر ہے۔ سالا بھارتی فوج گھس جانے کا خطرہ نہیں۔ کیا؟"

میں نے کہا "اچھا محمد بھائی۔ پھر بات کریں گے۔"

وہ مسلسل گل کو گھور رہا تھا اور مجھے اس کی آنکھوں میں ہوس کار فرما نظر آئی تھی۔ خود گل اس سے بہت نروس تھی اور میرے پیچھے چھپنے کی بے سود کوشش کر رہی تھی۔ بظاہر محمد بھائی کی پیشکش خلوص پر مبنی تھی مگر مجھے اس میں چھپی ہوئی غرض صاف محسوس ہو رہی تھی۔ میں اسے جھڑک کر دفع ہونے کو کہتا تو شاید وہ مشتعل ہو جاتا اور میں کسی قیمت پر جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔ خدا نے بروقت مدد کی اور چودھری اللہ دتا عرف اے ڈی کی کار سامنے آکے رک گئی۔

www.paksociety.com

میں نے فوراً کار کا پیچھے والا دروازہ کھول کر گل کو اشارہ کیا "تم بیٹھو" اور پھر محمد بھائی کی طرف ہاتھ بڑھایا "بہت شکریہ تمہاری چیکنگ کا۔ ضرورت پڑی تو تم سے رابطہ کریں گے۔"

اے ذی حیرانی سے مجھے اور محمد بھائی کو دیکھ رہا تھا "تم ..... ایک دوسرے کو جانتے ہو!"

میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کے کہا "ہاں۔ آگے چلو پھر بتاؤں گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ محمد بھائی کو میرا حوصلہ شکن انداز بے رُخی کچھ پسند نہیں آیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ ناگواری کا اظہار کرتا اے ذی نمودار ہو گیا اور اسے دیکھتے ہی محمد بھائی کے چہرے پر پسپائی کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ کچھ عجلت میں ہاتھ ملا کے کھسک گیا۔

"تم بڑے وقت پر آئے ہو اے ذی" میں نے کہا۔

"سوری۔ چوہدری اللہ دتا ہے میرا نام" وہ بولا "آپ نے اے ذی کر دیا۔"

"اے ذی زیادہ اچھا لگتا ہے" میں نے کہا "یہ محمد بھائی خواہ مخواہ ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"وہ تھے ہی بتا رہا تھا ذی۔" وہ کار کو بریک لگا کے بولا "میں تو خود حیران تھا کہ آپ لوگوں کا اس ہسٹری شیٹر سے کیا تعلق۔"

میں نے اسے تعلق کی وجہ بتائی۔ وہ سنتا رہا اور کار ذی ابھی راستوں سے گزرتی ہوئی ایک نسبتاً خاموش علاقے میں پہنچ گئی جسے کراچی کی ڈیفنس سوسائٹی یا لاہور کے گلبرگ کی طرح خواص کا مسکن سمجھا جا سکتا تھا۔ عالی شان کوٹھیاں اور وسیع بنگلے اپنے مکینوں کی دولت مندی اور شان و شوکت کی زندگی کے آئینہ دار تھے۔ ایسے تمام علاقے آفات ارضی و سماوی سے تحفظ کی خصوصی ضمانت بھی رکھتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال۔ بجلی گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر۔ ایسی عالی مرتبت ہاؤسنگ سوسائٹی میں پانی کے نلکوں پر ہنگامہ نہیں ہوتا۔ چاہے عوام پینے کے لئے ڈول بھر پانی کے لئے بھٹکتے پھریں۔ یہاں کاروں اور کتوں کو دھونے اور گھاس کے لان کو سیراب کرنے کے لئے پانی ملتا ہے۔ یہاں بجلی اور گیس کا بریک ڈاؤن نہیں ہوتا۔ ٹیلی فون خراب نہیں ہوتا۔ مین ہول کھلے نہیں ملتے۔ کرفیو نہیں لگتا۔ سیاسی جلسے نہیں ہوتے اور جلوس نہیں آتے۔ یہاں تک کہ احترام رمضان آرڈیننس کا بھی ادھر سے گزر نہیں ہوتا۔

یہ سب خیال مجھے اس لئے آئے کہ شہر کی سہمی ہوئی فضا کا یہاں وجود نہیں تھا۔ خوش حال، غم دو جہاں سے آزاد اور تفکرات سے بے نیاز لوگ اپنی دنیا میں شاد و آباد تھے۔ کیا پاکستان اور کیا بنگلہ دیش۔ تو ٹیل ورلڈ لیکن اپنا دھندا چلے گا۔ جنگ اور تجوریوں میں مال رہے گا اور اپنی زندگی ایسے ہی عیش سے گزرے گی۔ ڈھاکا مشرقی پاکستان کا کیپٹل ہو یا بنگلہ دیش کا۔ وزیراعظم آتے جاتے۔

فوج اگر فوج سے لڑتی ہے تو لڑے، ہمیں کیا۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" اے ذی نے دروازہ کھول کے کہا۔

گل مجھ سے پہلے ہی اتر چکی تھی۔ میں نے تفنن سے کہا "سوچ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے جہاں خانہ جنگی خونریزی یہاں کیوں نہیں؟"

"سوری" اے ذی مسکرایا "آپ نے آکھیا تھا کسی جگہ پہ بیٹھ کے گل بات کرنی ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔ کرایہ ڈھائی ہزار روپے ماہانہ۔"

میں دم بخود رہ گیا "یہ کار بھی تمہاری ہے؟"

"آہو جی" اس نے ڈھٹائی سے سر ہلایا "سو فیصد میری اب یہ مت پوچھنا کہ سب انسپکٹر کی تنخواہ میں یہ سب کیسے ہے۔ خدا کا فضل ہے جی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے مسٹر اے ذی۔ جب تم نے اعتراف ہی کر لیا ہے تو پھر اہمیں کیا۔ تم جانو اور تمہارا ایمان۔ یہاں تم رہتے ہو؟"

"آج کل چھڑا چھانٹ ہوں۔ بیوی بچے پہلے ہی بھجوا دیے میں نے۔" اس نے اندر ہماری راہنمائی کرتے ہوئے کہا۔

اندر کوٹھی کی آرائش کے انداز میں بھی شان ریاست تھی۔ فرنیچر، پردے اور قالین سے لے کر سجاوٹ کی اشیاء تک بیش قیمت اور رشوت کی کمائی سے خریدی ہوئی تھی۔ بیشتر چھوٹے چھوٹے افسران کے پاکستان میں بھی یہی ٹھاٹھ تھے۔ پھر وہ خاندان کے ہر فرد کے نام پر جائیدادوں اور کاروں کے مالک تھے اور بے خوف تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں۔ جو پوچھے گا وہ لحاظاً عہدہ میں ان سے بڑا ہو گا، ان سے بڑا مجرم سرمایہ دار بھی ہو گا اور انہی کی طرح ہر طرح سے کالے دھن کا مالک بنا ہو گا۔

"تم نے بنگالیوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے اے ذی" میں نے کہا "یہاں سے جانا پڑا تو کیا کرو گے؟"

وہ ہنسنے لگا "سوری۔ اللہ تو شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ میں ہوں یا لاہور میں۔ کھلے ڈُلے ہو کے جھوٹے کو کھل کر پھر جائی بڑی چیز ہے۔"

"پھر جائی تو ہے کہ اس کا گھر والا میں نہیں ہوں۔" کہا۔

"اچھا، معاف کرنا۔ تمہاری کیا ہے ....."

"پھر جائی سمجھ لو۔ بس سمجھ لو۔" میں نے کہا۔ "یہاں ڈھاکے میں گم ہو گیا ہے۔"

وہ متفکر ہو کے بولا "گم ہو گیا ہے .... کب .... اور کل کر جاؤ لیکن ایک منٹ، خدا کرے گھر کیا چلے گا؟"

میں نے کہا "گرم آگر کمائی ہو تو وا دوا ..... جائے ہو"

"بیٹھنے لگا اور دروازے کی طرف منہ کر کے چلانے لگا "او نوری، حوری کہاں مر گئیں۔"

ایک لڑکی دوڑتی ہوئی اندر آئی، پھر دوسری۔ ان دونوں کی عمر تھی۔ دونوں کے رنگ صاف تھے اور نقوش تیکھے۔ دونوں ایک سے کپڑے پہن رکھے تھے اور ایک ہی طرح کے پھول بنا رکھے تھے۔ دونوں کے بے حساب لمبے گھنے بال کمر سے نیچے تک پہنچے تھے۔ دونوں کے جسم ایک سے گدرائے ہوئے تھے۔ بات یہ تھی کہ ان کی شکلیں بھی ایک تھیں۔

"یہ نوری یہ نور النساء ہے۔ یہ حور النساء۔ دونوں جڑواں بہنیں ہیں" اے ذی بولا "یہ میرے پاس ملازم ہیں۔"

"صرف ملازم؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"صرف ملازم۔ ان کے ماں باپ میرے پاس ملازم تھے۔ انہیں انہوں نے مار دیا۔ یہ مسجد میں جھپ گئی تھیں۔ اسی مسجد کے پیش امام میرے بچوں کو پڑھانے آتے تھے۔ انہوں نے مجھ گنہگار کو اس قابل سمجھا۔ ان کو میرے کول چھڈ گئے کہ میں پتر یہ نیکی کما لے۔ چوہدری تیرے بگڑے کام بنائے گا۔ ان کی حفاظت کرنا۔ میں نے سوچا کہ ایسا ہی ہو گا۔ میری بیوی بھی یہاں تھی۔ اس نے امام صاحب کو روکا کہ آدھی رات کا ویلا ہے۔ صبح چلے جانا مگر ان کا تیم پورا ہو جائے تو اسے کون روک سکتا ہے۔ صبح ان کی لاش کسی نے مسجد میں ان کی کمر میں خنجر گھونپ دیا تھا۔"

نوری اور حوری چپ کھڑی تھیں۔ ان کی صورت پر دکھ کا رنگ سایہ اتر آیا تھا۔

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"چھ مہینے ہو گئے" وہ بولا "اب تم جانو سمجھو نہیں۔ میں ان ایسے ہی رکھتا ہوں جیسے اپنی بہنوں کو رکھتا۔ سمجھے بندیاں۔"

"کیا ہوا نہیں؟"

"چوہدری پرانی گلاں ہیں، دل دکھانے والی۔" اس نے کہا اور بات کا طالب ہو گیا "جا حور چائے بنا کے لا اور حور وٹی اج کیا ہے کھانے میں بھی۔"

ان دونوں نے اقرار میں سر ہلایا اور زبردستی مسکرائیں، "ابھی لاتے ہیں۔"

"ابھی اسے گا ایک دم فراغی کر کے۔ جا اللہ تجھے حور بنائے۔" ہنستے ہوئے بولا "جا میری اکھیاں کے نور۔ قافت چائے۔"

دونوں چلی گئیں۔ وہ جیسے آئی تھیں ویسے ہی فلاتیں بھرتی غائب ہو گئیں۔ ان کی نظریں مسلسل گل پر رہی تھیں اور صاف ظاہر تھا کہ جیسے وہ اس کا قبول رنگ ہو، جو وہ سمجھ رہی تھیں۔

اے ذی نے الماری سے بوتل نکالی۔ "معاف کرنا ....." اس نے بوتل سے دو گھونٹ لے کر بوتل کو پھر الماری میں رکھ دیا۔ "ابھی گھر والی نہیں ہے نا۔ وہ حرام اسی کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ چھپا چھپا کر رکھتا ہوں۔ وہ نکال لیتی ہے ہر تھاں سے۔ لڑتی رہتی ہے بڑی بکواس کرتی ہے۔ میں اس کان سے سنتا ہوں، اس سے اڑا دیتا ہوں۔ چنگی پالیسی ہے نا۔ خوش رہتا ہے بندہ۔"

میں نے کہا "تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"او چوہدری، کیا کیا چھوڑیں۔ سب ہی حرام ہے یہاں تو۔ اس سے تو اچھا ہے بندہ دنیا چھوڑ دے۔" وہ ہنسا "بس دو ہی گل اے۔"

اے ذی مجموعہ تضادات ہے۔ چوہدری اللہ دتا دنیا کی سب برائیوں میں ملوث تھا۔ جانتا تھا کہ رشوت بھی حرام ہے، شراب بھی مگر اس کے باوجود وہ اپنے نفس پر قابو پانے میں ناکام تھا۔ اپنی فطرت کی خامیوں اور کوتاہیوں سے پوری طرح آشنا تھا۔ خود کو گنہگار اور جہنمی مانتا تھا۔ دوسری طرف ایک پیش امام نے اسے ایک بہت بڑی ذمے داری سونپتے وقت اس کی نیت پر شک نہیں کیا تھا اور وہ صدق دل سے کوشش کر رہا تھا کہ اس امانت میں خیانت نہ ہونے پائے۔ بے شک اس کے پس منظر میں بھی کوئی ایسی تھا جس کا شکار اے ذی کی بہنیں ہوئی تھیں لیکن اے ذی نے انتقامی رویہ اختیار نہیں کیا تھا جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ کسی نے اس کی بہنوں کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ وہ کسی اور کی بہنوں سے اس کا بدلہ لے سکتا تھا مگر وہ ثابت قدمی سے نوری اور حوری کو اپنے گھر میں ملازم ظاہر کر کے بہنوں کی طرح پال رہا تھا۔ چوہدری اللہ دتا مجھے اس حاجی عبداللہ کے مقابلے میں ہزار درجہ بہتر انسان لگا جو اپنے ظاہر سے تقویٰ اور پرہیزگاری کا دھوکا دیتا تھا۔ اس کا باطن خباثت سے پُر تھا اور وہ نام کی رعایت کے برعکس اللہ کا بندہ نہیں شیطان کا چیلہ تھا۔

"تو چھ مہینے سے بندا غائب ہے؟" اے ذی نے غور کرتے ہوئے خود سے کہا۔ "نام کی اے بندے دا؟"

میں نے کہا "نام ..... اصل نام تو محسن شیروانی ہے مگر ہو سکتا ہے اس نے نام اور چہرہ بدل لیا ہو۔"

وہ احمقوں کی طرح میری صورت دیکھنے لگا۔ "سوری، سب کچھ بدل لیا ہو گا تو پھر کیا ہو گا؟ کیسے پہچانا جائے گا۔ چلو پہلے اسے دسو کہ بندا غائب کیسے ہوا۔"

میں نے کہا "وہ ڈھاکا آیا تھا۔ ایک خفیہ مشن پر۔"

"خفیہ مشن، جناب بات خفیہ ہے تو پھر مجھے کیوں بتاتے ہو؟ بھروسہ نہیں ہے تو چھوڑو پراں۔" وہ بولا۔

"تم خواہ مخواہ برا مان گئے۔ میں تم سے کچھ خفیہ نہیں رکھوں گا۔ اس کا مشن تھا مجیب کے چھ نکات کی تحریک کو ناکام بنانے کا۔ بنگلہ دیش کی علیحدگی کے آثار تو پہلے ہی عیاں تھے۔ بہت سے لوگ پاکستان کو متحد رکھنا چاہتے تھے۔"

www.paksociety.com

"میں بھی جانتا ہوں" وہ تلخی سے بولا "تم بھی جانتے ہو کہ مگر ہونا وہی ہے جو منظورِ خدا ہو۔"

"اب تو یہی کہا جا سکتا ہے۔ کوئی چلتی گاڑی کے آگے لیٹ جائے، بادشاہی مسجد کے مینار سے کود جائے یا تیزاب پی کر مر جائے۔ تو یہ کہنا کہ خدا کو ایسا ہی منظور تھا، یہ بالکل غلط بات ہے۔ خدا نے عقل دی ہے اور فیصلوں کا اختیار دیا ہے۔ کیکر بونے والا آم نہیں کھا سکتا۔ اگر وہ کہے کہ یہ خدا کو ہی منظور نہ تھا ورنہ آم لگتے۔ تو یہ پاگل پن ہے ایسا سوچنے والے کا۔ ہم نے اسباب بہت پہلے پیدا کر دیے تھے اور یہ محض نتیجہ ہے۔ خیر۔ اس بحث سے اب کیا حاصل۔ میں اور میرا دوست عملاً مزاحمت کرنے والوں میں شامل تھے جیسے یہاں البدر اور الشمس جیسی تنظیمیں ہیں۔ ایسی ہی مغربی پاکستان میں ایک تنظیم تھی۔ تھی کیا ہے۔ وہ یہاں علیحدگی پسندوں سے لڑنے والوں کی مدد کرتے تھے۔ میرا دوست بھی ایسے ہی ایک کام سے یہاں آیا تھا۔"

"تو کیا تمہیں یہ معلوم ہو گا کہ اس کا رابطہ کس سے تھا؟"

"جن سے رابطہ تھا وہ روپوش ہو گئے ہیں، مارے گئے ہیں یا پکڑے جا چکے ہیں۔ اب کسی کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ کون کہاں گیا۔"

"تمہارا دوست اکیلا ہی تھا؟"

"ہاں۔ یہ کوئی بہت بڑی تنظیم نہیں تھی۔ اس کے گنے چنے ارکان تھے جو صرف نقد امداد فراہم کرتے تھے۔ پیسے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ اسلحہ۔ ضروریاتِ زندگی۔ پوشیدہ ٹھکانے۔ تحفظ اور سلامتی۔"

"کیا نام تھا تمہاری اس تنظیم کا؟" اے ڈی نے کہا۔

"اپنا" میں نے کہا "ایک پاکستان نظریاتی اتحاد۔"

اس نے سر ہلایا "اچھا نام تھا۔ کام بھی اچھا تھا مگر ضائع گیا۔"

میں نے کہا "اس سے فرق نہیں پڑتا۔ نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ جدوجہد میں اصل کامیابی خود اپنا اطمینان ہے۔"

نوری اور حوری چائے کے ساتھ تلی ہوئی مچھلی رکھ کے خاموشی سے لوٹ گئیں۔ گل نے چائے بنائی۔

"خیر دوستی کیا کرنا ہے؟" اے ڈی بولا۔

"محسن کو تلاش کرنا ہے ورنہ یہ مر جائے گی" میں نے کہا "اسی کی خاطر ہم ایسے خطرناک حالات میں نکل کھڑے ہوئے۔"

"دوست کی خاطر نہیں؟" اے ڈی نے سوال کیا۔

میں نے کہا "ظاہر ہے دوست کی خاطر۔ وہ دوست نہ ہوتا تو ہماری بلا سے کچھ بھی ہوتا۔ اب تم ذرا یہ معلوم کرو کہ پولیس نے گزشتہ چھ مہینوں میں کتنے بندے پکڑے ہیں۔"

"ہیں! چھ مہینوں میں۔ او بھائی کیسی گلاں کرتے ہو۔ پولیس نے سیکڑوں نہیں ہزاروں بندے پکڑے ہوں گے۔ سیکڑوں تو روز تھانوں میں ایسے ہی ڈک دیے جاتے ہیں" وہ بولا۔

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ مگر ان میں سے اکثر صبح چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ سودا ہو جاتا ہے کچھ دے دلا کر۔ کچھ سفارش سے چھوٹ جاتے ہیں۔ کچھ بدقسمت جن کا آگے پیچھے کوئی نہ ہو اور جن کی جیب میں بھی کچھ نہ ہو، کسی نہ کسی الزام کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ ضابطہ فوجداری کی کوئی نہ کوئی دفعہ ان پر لگ جاتی ہے اور کسی اور کا جرم ان کے سر منڈھ دیا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔"

"پھر بھی یہ بہت اوکھا کام ہے۔"

"مشکل کام نہ ہوتا تو ہم تمہیں کہتے؟ تم اپنے لیڈر ہو اتنا بھی نہیں کر سکتے اپنی بھرجائی کے لیے۔"

نہایت مناسب وقت پر گل نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے آنسو بالکل اصلی تھے اور جذبات بھی مگر اس نے عقل مندی سے انہیں روکے رکھا اور ٹھیک وقت پر ریلیز کر دیا۔ اس کا اور خاطر خواہ اثر ہوا۔

اے ڈی نے پریشان ہو کے کہا "او پاگل، جھلی۔ رونے کی بات ہے۔ او مل جائے گا تیرا گھر والا۔ بندہ ہے کوئی سوئی نہیں۔ کچھ بھی ہو، بھوت تو ہے نہیں کہ غائب ہو جائے۔ میں پتا کروں گا۔"

میں نے کہا "کیسے پتا کرو گے؟"

اس نے کان میں انگلی ڈال کے ہلائی "اوجی، یہ اوکھا ہے۔ کوئی فوٹو شوٹو ہوتی اس کی تو پھر کام آسان ہو جاتا۔ کتنے تھانے ہیں ڈھاکا شہر اور چھاؤنی میں۔ سب جگہ کی واقفیت نکالنی پڑے گی اور آج کل تو واقف بھی ناواقف ہیں۔ لیکن اپنے بندے ہیں ابھی تھانوں میں۔"

میں نے جیب سے محسن کی ایک تصویر نکالی جو اخبار میں تصویر کے ساتھ شائع ہوئی تھی اور میں اسی مقصد کے لیے لایا تھا۔ "یہ ایک تصویر ہے۔ کوئی سال بھر پرانی۔ ہم نے پہلے گمشدگی کا اشتہار شائع کرایا تھا۔"

"کس اخبار میں؟"

"بمبئی اور دہلی کے اخباروں میں۔"

"بندہ ڈھاکے میں ہے اشتہار دلی بمبئی میں۔"

میں نے کہا "دراصل وہ مختلف وسیلوں، رابطوں اور ذریعوں سے ڈھاکا پہنچا تھا۔ ہم خود بہت چھپتے چھپاتے آئے ہیں۔ بھارت کی پولیس بھی ہماری تلاش میں ہے۔ بلکہ یہاں بھی ہمارے دشمن ہیں سوائے ان کے جو محبِ وطن ہیں مگر وہ بھی دبکے ہوئے ہیں۔"

اے ڈی نے تصویر پر غور کیا "اوجی بندہ دیکھا ہوا ہو سکتا ہے فوٹو دیکھی ہو کہیں۔"

میں نے کہا "اس کے ساتھ یہی تصویر بھی ہو گی اشتہار بمبئی کی پولیس نے دیا تھا۔"

"اچھا! اشتہاری مجرم ہو خیر سے۔"

"ہاں۔ اور ہمارا جرم ہے پاکستان سے محبت۔ پاکستان کے دشمنوں سے نفرت۔ یہاں وہ طاقت ور ہیں اور اقتدار بھی لے چکے ہیں۔"

"پھر تو میاں تم خطرے میں ہو مجھ سے زیادہ۔ ایسے کیوں گھومتے پھرتے ہو؟ کسی نے پہچان لیا تو ٹھنڈا ٹھار کر دے گا۔ آج کل کسی کو مارنا سب سے آسان کام ہے۔" وہ بولا "میں یہ فوٹو رکھ لیتا ہوں....."

"ہوں تو ضرور رکھو مگر اس بات کا بھی خیال رکھنا کہ کسی دشمن کے سامنے مت نکالنا ورنہ خود بھی پھنس جاؤ گے۔"

"اوجی اب تم پولیس والوں کو ہدایت دے رہے ہو" اس نے ہنسنا شروع کیا۔

میں نے کہا "ممکن ہے اس کی شکل صورت بدل گئی ہو۔ داڑھی بڑھالی ہو اس نے۔ یا خود ہی بڑھ گئی ہو۔"

اے ڈی نے کہا "وہ میں نے سوچ لیا ہے۔ میں اس تصویر سے تین چار تصویریں بنواؤں گا۔ کسی آرٹسٹ سے۔ یہ جو سینما کے سائن بورڈ وغیرہ بناتے ہیں واہ واہ آرٹسٹ ہوتے ہیں۔ نیلو کی صورت بناتے ہیں تو نشہ نہیں لگتی۔ ایک اسی داڑھی کے ساتھ۔ ایک دوسرا مونچھوں کے ساتھ۔ تیسرا داڑھی مونچھوں والا۔ لمبے بالوں والا۔ گنجے سر کے ساتھ۔ پھر چہرا ایک ہو۔ تو کام آسان ہو جائے گا۔"

میں نے اس کی ترکیب کو پسند کیا "یہ تم نے ذہانت کی بات کی۔"

وہ ہنسنے لگا "اوجی اپنا کیا کمال ہے اس میں۔ ہمارے پاس ہوتا ہے شناختی تصویر بنانے کا سامان۔ مختلف ٹوٹے ہوتے ہیں۔ کبھی سر، بال، آنکھیں، ناک، ہونٹ، ٹھوڑی۔ باری باری انہیں جوڑ کے بندے کی شکل بدلتے ہیں۔ کوئی موقعے کا گواہ ہو تو پوچھتے رہتے ہیں کہ اب کیا خیال ہے۔ شکل ایسی تھی۔ فرق ہے تو کہاں۔ اور گواہ نے بندے کو ٹھیک طرح دیکھا ہو تو وہ بتاتا جاتا ہے کہ بال کچھ چھوٹے تھے یا بھورے تھے۔ ناک چپٹی تھی۔ آنکھیں ذرا بادامی۔ آخر کار ایک شکل بن جاتی ہے جو گواہ کے نزدیک مجرم کی صورت سے نوے فیصد ملتی ہے۔ اس تصویر کو ہم مشتہر کر دیتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اسے (IDENTITY KIT) کہتے ہیں جی" میں نے کہا۔

اے ڈی نے کہا "یار معلوم تھا تو پہلے بولتے۔ میں اتنا نہ بولتا۔ ترکیب میں اس تصویر سے بندہ تلاش کروں گا۔ بھرجائی یہ سچ ہے بندہ حوالات یا تھانے سے گزرا ہے اور جیل میں بھی ہے تو مل جائے گا۔ مطلب یہ کہ سراغ مل جائے گا۔ یہ وعدہ نہیں کہ تمہیں مل جائے گا۔ عین ممکن ہے کٹ مرا ہو گا یا کال کوٹھڑی میں....."

گل نے ایک چیخ ماری "ایسا مت کہو" اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"او یار، او بابا میٹوں معاف کر دے۔ میری توبہ۔ میرا یہ مطلب تو نہیں تھا" اے ڈی حواس باختہ ہو گیا "او جھلی کچھ نہیں ہوگا اسے۔ میں لا کے دوں گا تجھے تیرا گھر والا۔ چل چپ کر۔"

لیکن گل اتنی آسانی سے چپ ہونے والی نہیں تھی۔ اس کی سسکیاں ہچکیوں میں ڈھل گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ہسٹریا کی طرف بڑھ رہی تھی جو ایک خطرناک بات تھی۔ دورے کی کیفیت میں وہ میرے جھوٹ کا بھانڈا پھوڑ سکتی تھی اور یہ تو ایک ایسا آتش فشاں تھا جو پھٹ جاتا تو اس کا لاوا کسی سیلاب کی طرح ہم سب کی حفاظتی اور بقا کی کوششوں کو خاک کر دیتا۔ ہماری مصلحت کوشی اور دور اندیشی پر مبنی خود حفاظتی انتظامات کو تہس نہس کر دیتا اور غیروں کے جور و جفا سے عافیت کے ساتھ بچ نکلنے والے اہم ترین کے پسماندگان اپنوں کے اسیرِ ستم ہوتے۔

گل کو ہوش میں لانے کے لیے میں نے اس کی کلائی اٹھا پیار سے پکڑی مگر اس پر اپنی گرفت اتنی سخت کر دی کہ گل درد سے تڑپ اٹھی "دیکھو رونے سے کیا فائدہ" میں نے نرمی سے کہا۔

گل نے کراہ کے کہا "سکندر بھائی! میرا ہاتھ......"

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا "جاؤ اندر جا کے منہ دھو لو، یار اے ڈی کوئی بابا تو نہیں۔ خدا پر توکل کرو۔"

میرا خیال ہے کہ اے ڈی تاڑ گیا تھا مگر اس نے چشم پوشی اختیار کی اور دونوں لڑکیوں کو بلا لیا۔ وہ گل کو اپنے ساتھ لے گئیں۔

اے ڈی پھر اٹھا الماری میں سے بوتل نکال کے اس نے دو گھونٹ لیے اور بوتل واپس رکھتے ہوئے بولا "شراب سمجھ کے نہیں پیتا میں۔ یہ تو دوائی ہے میری۔ دو گھونٹ کی خوراک ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ نشہ نہیں ہوتا مجھے بالکل بھی۔ چنگا بھلا ہوں میں۔"

میں نے کہا "یہ صفائی کیوں پیش کر رہے ہو؟ اس لیے کہ تم خود اپنے احساسِ جرم و گناہ میں مبتلا ہو۔ تم جانتے ہو یہ دوا نہیں مرض ہے۔"

وہ میرے پاس آ کے بیٹھ گیا۔ ایک لمبی گہری سانس لے کر اس نے کہا "ہاں یار۔ بندہ کیا کرے جب بیماری لگ جائے اور جان نہ چھوڑے۔ جیسے ٹی بی۔ یا کینسر۔ کیا علاج کرے کوئی۔ بس انتظار کرتا ہے کہ رب کی طرف سے کچھ ہو جائے۔ کوئی معجزہ....."

"تم خود کچھ نہیں کر سکتے؟ اتنی عقل اور توانائی دی ہے خدا نے تمہیں" میں نے کہا۔

"او چھوڑو جی۔ جب بندہ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارے تو پھر پیروں پر کھڑا کیسے ہو۔ کیا تم کو ایسی کوئی بیماری نہیں ہے جس کا علاج تم خود کر سکتے ہو مگر نہیں کرتے۔ فرشتے ہو تم؟ نہیں۔ تم بھی انسان ہو میری طرح۔ تم میں بھی کمزوریاں اور خامیاں ہیں، خرابیاں ہیں لیکن تم چھپاتے ہو۔ کچھ چھپاتے ہو، کچھ کا تمہیں پتا

www.paksociety.com

ہی نہیں ہوگا۔"

"خدا سے کسی کا حال پوشیدہ نہیں۔" میں نے کہا۔

"لو جی۔ خدا کی کیا بات کرتے ہو۔ تم میرے جیسے گناہ گار، عقل کے اندھے کی دھوکا کھانے والی آنکھوں سے کچھ نہیں چھپا سکے" وہ ہنسنے لگا "تم کو جھوٹ کی بیماری ہے۔ ہے نا؟ جھوٹ بھی حرام ہے شراب بھی حرام ہے۔ ایک حرام کام میں نے کیا دوسرا تم نے۔ پوچھو کیا؟ تم نے ایک جھوٹی اسٹوری سنائی۔ اب میں بتاؤں؟ تمہارا نام ہے سکندر بخت ہے نا؟"

مجھ پر شرم سے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس نے مجھے لاجواب ہی نہیں کیا تھا میرے ہاتھ کا طمانچہ میرے ہی منہ کی جانب لوٹا دیا تھا۔ یہ عذرِ امتحان جذبِ دل کیسا نکل آیا۔ میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا!

"اس کاکی نے جب تمہارا نام لیا نا" تو بس ایک دم گھنٹی بج گئی اور جیسے سینما ہال میں گھنٹی بجتی ہے تو اندھیرا ہو جاتا ہے مگر اسکرین روشن نظر آنے لگتا ہے" ایسے ہی میرے دماغ میں سب واضح ہو گیا۔ میں نے سب تصویریں دیکھی تھیں۔ تمہاری۔ محسن کی۔ اور ایک بندا تھا غالب جو کل تمہارے ساتھ تھا۔ اس کاکی سے تو واقف نہیں ہیں۔ گل نام ہے نا اس کا؟ مگر وہ جو غالب کے ساتھ تھی۔ ہاؤ.... " وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

میں نے کہا "جب تم جانتے ہو..... تو پھر میں کیا کہوں؟"

اس نے ایک دم ریوالور نکال لیا "کچھ نہیں۔ اب جو کہنا ہے نا پولیس اسٹیشن جا کے کہنا۔ ملٹری انٹیلی جنس کو بتانا۔ سچ کے جھوٹ بولنا ان کے سامنے۔ سچ وہ خود اگلوا لیں گے۔ ہاتھ اٹھاؤ اوپر۔ کھڑے ہو۔"

"اف وہ! تم تو بڑے کمینے اور دغا باز ہو" میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا "ہم وطن اور ہم زباں ہو کے بھی تم نے ہمارے اعتماد کا بھرم نہیں رکھا۔ تم سمجھتے ہو کہ تمہیں نشہ نہیں ہوتا..... تمہارا ہاتھ کانپ رہا ہے۔"

وہ پھر ہنسا "اچھا؟..... مجھے تو تم بھی کانپتے ہوئے نظر آ رہے ہو۔ بندے کی موت اسے کہاں لاتی ہے گھیر کے۔"

میں نے کہا "میں موت سے نہیں ڈرتا۔"

"پھر کس سے ڈرتے ہو؟" وہ تمسخر آمیز لہجے میں بولا "بیوی سے؟ میں بھی ڈرتا ہوں۔ میری بیوی جو ہے وہ ڈرتی ہے مگر..... مجھ سے نہیں ڈرتی۔ کاکروچ تک سے ڈرتی ہے۔ میں چوہے اور کاکروچ سے بھی گیا گزرا ہوں۔ تمہاری بیوی کیا کرے گی جب اسے معلوم ہوگا تم غیر سے شہید ہو گئے ہو۔"

میں نے کہا "ابھی کوئی بیوی نہیں ہے میری جو بیوہ ہو۔ ایک لڑکی ہے، وہ فخر کرے گی میری شہادت پر اور لعنت بھیجے گی تم جیسے دوست بن کے دشمنی کرنے والے پر۔ اگر میں رشتوں کے ہاتھوں مارا جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا چوہدری الطاف!"

"اے ڈی" وہ بولا "مجھے بھی اے ڈی اچھا لگا تھا۔ سنا ہے تم بڑے جوڈو ماسٹر ہو۔ گولی پر کوئی داؤ چلتا ہے؟ خبردار! اپنی حماقت مت لگانا۔ میں بالکل نشے میں نہیں ہوں۔ تمہارا دل صاف نظر آ رہا ہے مجھے سینے کے اندر دھڑکتا ہوا۔ ایکسرے کر سکتا ہوں میں یہ پوسٹ مارٹم بھی کر سکتا ہوں۔ بتا سکتا ہوں کہ بندا کیسے فوت ہوا تھا۔"

وہ حقیقتاً نشے میں ہونے کے باوجود بے حد مستعد اور ہوشیار تھا۔ اس کی نظر ایک لمحے کے لئے مجھ پر سے نہیں ہٹی تھی اور اس نے اپنے ریوالور کا رخ ایک سوت نہیں بدلا تھا۔ اس نے میری نفسیاتی چال کو بھی رد کر دیا تھا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ اگر وہ ہاتھ کی طرف توجہ دیتا تو میں ایک کوشش ضرور کرتا کہ ریوالور چھین لوں۔

"تم مجھے کیش کرا سکتے ہو۔" میں نے کہا "میرے دشمن میرے سر کی بولی لگائیں گے۔ مکتی باہنی والے سب سے زیادہ قیمت ادا کر سکتے ہیں۔ میں انہی کا مجرم ہوں۔ تمہارا کیا بگاڑا ہے میں نے؟"

اس نے قہقہہ مارا اور ریوالور جیب میں رکھ لیا "بلو تم چھوڑو یار۔ ہم بھی گولی نہیں مارتے تمہیں۔"

میں بھونچکا رہ گیا اور کچھ دیر بے وقوفوں کی طرح اسے گھورتا رہا "یہ کیا مذاق تھا اے ڈی؟ اس میں تمہاری یا میری کسی کی جان بھی جا سکتی تھی۔"

"لو جی میری کیسے؟" وہ ہنسا "تم کیا جیب سے توپ نکال لیتے؟"

میں نے کہا "اس سے پہلے بہت لوگ اسی خوش فہمی میں مارے گئے ہیں کہ انہوں نے اسلحے کی طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے مجھے کمزور سمجھ لیا تھا۔ اگر موقع ملتا مجھے تو اس سے پہلے کہ تمہیں پتا چلتا میں تمہاری گردن توڑ دیتا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مگر میں جو ابھی کھیلا ہوں۔ سارے شرابی عیب ہیں میری ذات میں" وہ بولا "مگر سبق چنگا سی۔ یاد رہے گا تمہیں۔"

"میرے لئے کیا سبق تھا اس میں۔"

"سبق یہ تھا بھائی جی کہ بندے کو آنکھاں بند کر کے ہر ایک پر اعتبار نہیں کر لینا چاہئے۔ بندہ لیڈر ہو وے تے بھاویں جھنگ دا، اگر کھوٹے دا پتر ہے تو انسان نہیں بن سکتا۔ میری گل سمجھ آ گئی ہے! یہ سارے رشتے بس ایسے ہی ہیں۔ اب ان بنگالیوں کو دیکھو کتنا مضبوط تے سچا رشتہ تھا ہمارا۔ پاکستان انہوں نے بھی بنایا تھا۔ مسلمان یہ بھی ہیں مگر پاکستان کے دشمن ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ ہیں رہے میں نے بھی کر لیا تھا تمہارا اے ڈی۔ اندر تک دیکھ لیا تھا میں نے تمہیں۔ کبھی فرصت ملی تو بتاؤں گا کہ ہزار میل کے اس سفر میں انسانوں کے ہزار روپ دیکھے ہیں میں نے۔ زندگی کے اور موت کے، جھوٹ اور سچ کے ہزار چہرے جیسے

نظر سے گزرے ہیں۔ آدمی کے ظاہر سے باطن کا اندازہ کرنا آ گیا ہے مجھے۔ حادثات اور تجربات نے سکھا دیا ہے۔ خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔"

وہ بات بات پر ہنسنے کا عادی تھا "کاکا جی! ایک لفافہ اور ہے محمد بھائی۔ اس کا مضمون پڑھ کے بتاؤ تو مجھے۔ کیا لکھا ہے اس میں؟"

"محمد بھائی! جو تم نے بتایا ہے وہ ہسٹری شیٹر ہے۔ ظاہر ہے کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ جرائم پیشہ رہا ہوگا مگر کل اس نے ایک وطن پر جان دینے کے سامنے خود کو پاکستانی ثابت کیا۔ مجھے بھی بچا لیا۔ وہ دل سے پاکستان کا حامی ہے شاید جان دے بھی سکتا ہے اور لے بھی سکتا ہے پاکستان کی خاطر۔"

"ٹھیک۔ اور کچھ....."

میں نے سر کھجا کے کہا "اور..... اور یہ کہ اس کی نیت کچھ ٹھیک نہیں لگی مجھے۔ کل اس نے گل کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ رات کو وہ ہوٹل پہنچا مگر اتفاق سے ہم سرونٹ کوارٹر میں تھے۔ ہوٹل میں کمرا نہیں ملا تھا۔ آج ملے گا۔ پتا نہیں وہ جانے کہاں آگ میں بیٹھا تھا کہ بس اسٹاپ پر آ گیا اور جن نظروں سے وہ گل کو دیکھ رہا تھا اس سے مجھے خطرہ محسوس ہوا تھا گل کے لئے۔ اچھا ہوا تم آ گئے ورنہ میرے لئے ضبط سے کام لینا مشکل ہو جاتا۔ وہ کوئی گھٹیا بازاری حرکت کرتا اور میں اسے مار دیتا۔"

"گل تمہاری حقیقی بہن تو نہیں ہے۔"

"تو دوسری اور حوری بھی تمہاری سگی بہنیں نہیں ہیں۔ کیا تم محمد بھائی جیسے کسی غنڈے کو اجازت دو گے....."

اس نے میری بات کاٹ دی "محمد بھائی نے چھ بندے گنج کرائے تھے۔ وہ ایک گرلز اسکول کی استانی کو اٹھانے گئے تھے۔ اس کے گھر والوں کو وہ پہلے ہی ختم کر آئے تھے۔ وہاں بہت لوگ تھے کوئی اسے بچانے نہیں آیا۔ سب بھاگ گئے۔ جو وہاں تماشا دیکھ رہے تھے وہ بس شور کر رہے تھے۔ محمد بھائی کو بھی چاقو لگے پر بندہ جی دار۔ مقابلے پر غنڈے تھے۔ غنڈے اور بدمعاش میں فرق ہوتا ہے۔ محمد بھائی نے کہا کہ اکیلی لڑکی پر ہاتھ ڈالتے ہو بزدلو۔ خنجر کے استعمال میں محمد بھائی فنکار ہے اور خنجر بھی اس کا بجلی ہے۔ بلیڈ کی دھار سے اس کی۔ ادھر سے ادھر تک پیٹ ایسے کاٹ دیتا ہے جیسے مکھن کو گرم چھری۔ بندے کو پتا ہی اس وقت چلتا ہے جب کڑوے شوربے آنتوں کے ساتھ باہر آ جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "چھ قتل کر دیے اس نے اور پکڑا نہیں گیا۔"

"پکڑا جاندا۔ پھانسی بھی لگ جاتا" اے ڈی بولا "پر ایک بہت بڑے آدمی نے اسے بچا لیا۔ اس بہت بڑے آدمی کا پتر اسی استانی کے چکر میں تھا اور استانی بھی اس بہت وڈے بندے کی بہو بننے والی تھی۔ سارا جھگڑا خاندانی دشمنی کا تھا۔ اس بہت وڈے بندے نے کہہ دیا کہ محمد بھائی تو اس کے ساتھ تھا سارا دن اور وہ

خود فلاں سے ملا اور فلاں سے ملا تب بھی محمد بھائی ساتھ تھا۔ پوچھ لو فلاں فلاں سے۔ یہ جو فلاں فلاں تھے یہ بھی وڈے بندے تھے مگر بہت وڈے بندے کو سلام کرنے والے۔ وہ کیسے کہتے کہ یہ جھوٹ ہے۔ بہت وڈا بندا جو بولتا ہے وہی سچ ہوتا ہے۔ ادھر جو چھوٹے موٹے چشم دید گواہ بن گئے تھے ان کو بھی چھترے تو وہ مان گئے کہ انہوں نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ محمد بھائی نے اس بہت وڈے بندے کے چھ دشمن گنج کر دیے تھے۔ اس کا بدلہ تو وڈے بندے نے ادا کرنا ہی تھا۔ وہ آج بھی بہت بڑا آدمی ہے۔ پہلے سے بھی بڑا ہو گیا ہے۔ پہلے مینار تھا تو اب قطب مینار ہو گیا ہے اس لئے محمد بھائی اپنی بغلی مونچھوں کو تاؤ دیتا پھرتا ہے مگر اسے کوئی بدمعاش نہیں کہہ سکتا۔"

میں نے کہا "یہ تو اور مصیبت ہو گئی۔ کڑوا کریلا نیم چڑھا ہو گیا ہے اگر وہ گل کے پیچھے پڑ گیا تو میں کیا کروں گا؟"

اے ڈی ہنسنے لگا "لو جی! یہ میں بتاؤں کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے؟ بھرجائی میری ہے کہ تمہاری؟ جیسے میری گردن توڑ رہے تھے ویسے ہی اس کی گردن توڑ دو۔ ذرا پیار محبت سے۔"

"پیار محبت سے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ لڑائی جھگڑا کر کے نہیں اور کسی کے سامنے نہیں۔ اگر وہ تمہاری بھرجائی کے پیچھے لگ گیا ہے تو بھرجائی سے کہو اسے بلائے۔ ایسے مت گھورو مجھے۔ شکار تگڑا ہو تو شکاری کو چالاک ہونا چاہئے۔ شیر کو سامنے بلا کے تو ارزن بھی نہیں کہتا کہ آ شیر مجھے مار۔ تیری تو....."

مجھے ہنسی آ گئی "تمہارا..... مطلب ہے دھوکے سے کہیں اکیلے میں بلا کے اس سے نمٹ لوں۔ یہ تو بڑی غلط بات ہوگی۔"

"فیر صحیح بات دسو مینوں" وہ جھلا کے بولا۔

"پہلے میں بات کر لوں اس سے۔ سمجھانے کی کوشش کروں شرافت سے۔" میں نے کہا۔

اے ڈی ہنس پڑا "شرافت سے۔ معاف کرنا یار تم بالکل وہ ہو۔ چوکے اچھے۔ تم اسے سمجھاؤ گے کہ رب کے راستے پر چلے شرع کے مطابق داڑھی رکھے اور نماز پنج وقتہ پڑھے۔ تسبیح گھمائے۔"

میں نے کہا "تم مذاق مت سمجھو اسے۔ میں اسے جان سے مارے بغیر بھی اس کا دماغ درست کر سکتا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔ کرو جو دل چاہے کرو۔"

میں نے کہا "تم یہ کام کب تک کرو گے جو میں نے کہا ہے؟"

"لو جی بس ابھی جاتا ہوں" اس نے دوبارہ الماری کا رخ کیا "شام تک دیکھتا ہوں کس کس سے بات کی جا سکتی ہے۔ دو چار دن تو لگیں گے۔"

"ہم بھی کوشش کریں گے۔"

"گرفتار ہونے کی؟" وہ منہ صاف کر کے بولا "ایسے پھرتے

www.paksociety.com

رہو گے تو انشاءاللہ جلد کامیابی ہوگی۔ تمہیں پہچاننے والے بہت ہیں۔ انڈین پولیس اور فوج میں سارے ان پڑھ اور بے خبر لوگ نہیں ہیں۔ سب نے نہ سہی تو کچھ نے تو مجھے نہیں تو ایک چوتھائی اخباروں میں تمہاری شکل مبارک دیکھ چکے ہوں گے۔ انٹیلی جنس کے بندے بھی بہت ہیں۔ وہ ذہن کے لئے جاتے ہیں اور تمہاری طرح کھا گل پوتے نہیں ہوتے۔"

"کھا گل پوتے" میں نے غور کر کے کہا "تمہارا مطلب ہے پاگل کھوتے اس سے پہلے تم نے مجھے الو کا پٹھا کہا تھا ..."

"میں نے تمہیں الو کا الو کہا تھا" اسے ذرا بے نیازی سے کہا۔

"اچھا گل کو بلاؤ" میں نے کہا "بہت دیر ہو گئی"

"ہاں۔ کھانے میں کچھ دیر ہو گئی۔" وہ سر ہلا کے بولا اور اندر کی جانب منہ کر کے پکارا "او نور النور!"

نور اور نور نے کورس میں کہا "کیا ہے؟ ہم کام کر رہے ہیں۔"

"تمہارا سر۔ یہ بائی کو واپس کرو۔ کیا اسے بھی کام پر لگا دیا ہے۔" اسے ذرا سے اندر جھانک کر کہا "بڑی بری بات ہے۔ پر اس کی چھب ہے۔ نے تو ذرا شغل کو دی تھی۔ تم نے استعمال شروع کر دیا۔"

میں بیٹھ گیا۔ گل ان لڑکیوں کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹانے لگی ہوگی۔ کسی بھی عورت کے لئے کچن میں جا کے وقت گزارنا اتفاقی مشغلہ ہے جتنا ہم ایجنسی کے دوا لیے چلنے پر بجی پاور کا شوق کرتا ہے۔ گل کے لئے اچھا تھا۔ کچن کی فضا اس کے اعصاب کے لئے سکون آور ثابت ہوگی۔ وہ کچھ دیر کے لئے محسن اور اس کی ذات سے منسوب اندیشوں کو بھول جائے گی۔

ہم کھانے کے بعد واپس پہنچے تو غالب اور نازو کا کہیں پتا نہ تھا مگر سامان حیرت کی صورت میں محمد بھائی کمرے میں براجمان تھا۔ گل کو دیکھتے ہی اس کے چہرے سے ایک ایسی مسرت آمیز دلچسپی کے جذبات جھلکنے لگے کہ میرے خون میں حدت پیدا ہو گئی مگر اے ڈی کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے میں نے اپنے اشتعال کے جذبات کو دبا دیا۔

"محمد بھائی! تم یہاں کیسے آ گئے؟" میں نے کہا۔

"اپن اور کیا کرتا۔ تم ایک دم گاڑی میں بیٹھ کے پولیس کا ساتھ چل دیا۔" محمد بھائی بولا "وہ سالا ہم کو کیا ہاتھ ڈالتا پڑا تھا۔ جانتا نہیں اپن کون ہے۔ کیا؟"

میں نے کہا "اچھی طرح جانتا ہے وہ تمہیں اور اب میں بھی جان گیا ہوں۔ مگر یہ بتاؤ کہ تم اندر کیسے آئے؟ بگل بجاؤ تم دوسرے کمرے میں۔"

"کہیں" اپن کا راستہ کون روکے گا؟ اپن پیٹ کا چچ سے چھری پھیرتا ہے تو یہ چھری کو پتا چلتا ہے نہ پیٹ کو۔"

میں نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا "میں باتیں کر سکتے ہو تو تم جاؤ اور اپنا خنجر بھی ساتھ لے جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج تم سے تمہاری یہ طاقت چھن جائے جس پر تم اکڑتے پھرتے ہو۔ کیا؟"

محمد بھائی کا رنگ بدل گیا "ابھی تم اپن کو ترکی دیتا ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ نکالو خنجر اور وار کرو مجھ پر۔ میں نہتا بیٹھا ہوں۔ آؤ تمہیں اپنی ماں کے دودھ کی قسم۔ بھائی۔ آ مرے۔"

میرا مقصد اسے مشتعل کرنا تھا۔ اس حد تک کہ وہ مجھ پر حملہ کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ قسم اتنی جلدی کام کر گئی کہ وہ آتش فشاں کی طرح پھنکار اٹھا۔

"اپن تیرے ساتھ بات کرنے کو آیا تھا۔ یہ تو گالی دیا ہے اپن کو۔ ابھی دیکھ ... محمد بھائی ....."

"کل تو چھوڑ دیا تھا میں نے تمہیں۔ تم نے میری بہن کا بازو پکڑا تھا۔ آج میرا ہاتھ پکڑ کے دکھاؤ اگر مرد کے بچے ہو۔" میں نے اسے للکارا۔

وہ جنگلی چیتے کی طرح غرغر کرتا مجھ پر حملہ آور ہوا اس کے خنجر کی آب لمحہ بھر کے لئے میری آنکھوں میں لہرائی۔ ایک جست لگا کر اس نے خنجر کو دائیں سے بائیں اور اوپر سے نیچے تک لہرایا۔ پھرتی اور مہارت کا یہ ایسا کارنامہ تھا کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کے چار ٹکڑے ہو جاتے مگر میں نے غوطہ مارا اور پھر لات محمد بھائی کے شانے پر ماری۔ اس کا ہاتھ اوپر اٹھا اور وہ دوسرے لڑکھڑایا۔ میں نے ایڑی پر گھوم کے دوسری لات اس کے پیٹ پر رسید کی۔ اس کا اوپر اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آیا اور وہ درد سے بلبلاتا ہوا ہو کے فرش پر گر گیا۔ کسی اضطراری کے عالم میں میں نے خنجر اس سے چھین لیا اور آرام سے اس کے ایک گھٹنے سے اسے دبا دیا۔

"اب بول" میں نے خنجر کو اس کی گردن پر شہ رگ کے قریب رکھ کے کہا "میری بہن کی طرف پھر بری نظر سے دیکھو گے تو قسم اس خنجر سے تمہاری آنکھیں نکال کے ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔"

اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں "تو پاک کی قسم ..... تم اپن کو غلط سمجھا۔ تو میرے کو ماں کا دودھ کا قسم پلا۔ اپن دودھ کا قسم کھا کے بولتا ہے۔ تیرا بہن اپنا بہن ہے۔ اپن سالا حرامی نہیں ہے کہ جس کو بہن بولے اس پر بری نظر رکھے۔"

وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور خنجر کو رگ جان کے قریب پا کے جتنا خوف زدہ تھا اتنا ہی مشتعل بھی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا لیکن گل کچن کے دروازے میں کھڑی مسلسل چلا رہی تھی "بھائی سکندر... بھائی سکندر۔"

میں نے گرج کے کہا "تم سے کس نے کہا تھا یہاں آنے کو؟ جاؤ اندر چپ کر کے بیٹھو۔"

میں نے اس سے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ وہ ڈر کر چپ ہو گئی اور دروازے سے غائب ہو گئی۔ محمد بھائی اب بیٹھا تھا اور ایک ہاتھ سے اپنا شانہ دبا رہا تھا۔

"چلو اٹھو۔ چلتے پھرتے نظر آؤ۔ دوبارہ دکھا میں نے تو پھر خنجر ہوگا اور تمہارا گلا لیکن دوسری بار میرا ہاتھ نہیں رکے گا"

نے خنجر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

اس نے خنجر کو وہیں پڑا رہنے دیا اور صوفے پر بیٹھ گیا "دیکھو ابھی میرا بات سن لو۔ اپن کا اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کل اپن جو کہا تھا ابھی ایک راز کا بات ہے۔"

"کیسی راز کی بات؟" میں نے محتاط ہو کے کہا۔

"ہم بہا نیت سے پوچھ نہیں کیا سکندر بادشاہ" اس نے کہا۔

میں اس کے منہ سے یہ نام سن کے اچھل پڑا۔ ایک تو مجھے بالکل امید نہ تھی کہ محمد بھائی جیسا بستری شیر تک مجھے پہچان جائے گا اور اسے میرا نام بھی معلوم ہوگا۔ دوسرے اس طرح مجھے سکندر بادشاہ کہنے والا ایک ہی شخص تھا جو اب اس دنیا میں نہیں تھا۔ اس ایمان و استقامت کی آزمائش کے سفر میں سب سے پہلے شہادت کی منزل تک پہنچنے والا استاد جیدی تھا جو پہلے محمد بھائی کی طرح ایک بدمعاش تھا۔ پھر قسمت نے اسے ہمارا ہم سفر کر دیا اور وہ بھٹکا ہوا مسافر جب صراط مستقیم پر آیا تو اس شان سے کہ اس کی شرافت اور انسانیت پر حاجی عبداللہ جیسے دین متقی اور پرہیزگار قربان کیے جاتے تھے۔ محمد بھائی نے مجھے سکندر بادشاہ کہا تو میرے دل میں سوئی ہوئی کسک یوں جاگی جیسے کوئی مندمل ہوتے زخم پر سوئی کی گرم نوک رکھ دے۔ مجھے یوں لگا جیسے استاد جیدی ایک نئے روپ میں میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے اور پوچھ رہا ہے۔ کیوں حیران ہوا ہے سکندر بادشاہ۔ ارے ہم جدا کب ہوئے تھے تم سے۔ قسم مولا علی کی ہم تو بس نظر سے اوجھل ہو گئے تھے مگر تمہارے دل میں تو تھے نا۔ ہاں۔ ایک یاد کا پرتو تھا۔ ایک خیال تھا جو مجسم ہو گیا تھا۔ استاد جیدی اب محمد بھائی بن کے آ گیا تھا۔

میں بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر آب دار دیکھ کر میں اتنا نروس نہیں ہوا تھا جتنا میں اس کے لبوں سے سکندر بادشاہ کے دو لفظ سن کر ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "استاد .... محمد بھائی! تم مجھے کیسے جانتے ہو؟"

محمد بھائی نے کہا "اپن کو تمہارے یار نے سب بتایا تھا۔"

"کس یار نے؟" میں نے کہا۔

"تمہارا جگری یار بولتا تھا اپنے کو۔ محسن شیروانی....."

مجھے یوں محسوس ہوا کہ محمد بھائی نے اچانک جیب سے دستی بم نکال کر مجھے تھما دیا ہے جس کی پن وہ پہلے ہی نکال چکا تھا۔ دھماکے نے میرے اعصاب شل کر دیئے اور میرے ہوش و حواس کو معطل کر دیا۔ ایک لمحے کے لئے میرا جسم مفلوج ہو گیا۔ پھر اس میں بے پناہ توانائی بھر گئی اور میں اچھل کے محمد بھائی پر جا گرا۔

"تم .... تم جھوٹے ہو۔ جھوٹ بولتے ہو" میں نے اس کی گردن دبا کے کہا "اس کا نام کسی شکاری نے بتایا ہے تمہیں تاکہ تم مجھے بھی اس کی طرح شکار کر سکو۔ میں اس نام کو چارے کی طرح نگل لوں تو تم مجھے مجبوری کی ڈور سے کھینچ کر لے جا سکو۔"

محمد بھائی تڑپا "ارے ..... سکندر بادشاہ۔ اس قسم اپن سچ بولا ہے۔ کیسا پاگل مافک آدمی ہے تم۔"

مجھے ایک دم ہوش آ گیا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا "محمد بھائی! میں واقعی پاگل ہو گیا تھا یہ نام سن کر۔ دوبارہ بتاؤ۔ کیا نام لیا تھا تم نے؟"

"محسن شیروانی۔ شیروانی جانتا۔ اچکن۔ وہ ہم کو بولا اچھی یاد رکھو" محمد بھائی ہانپتے ہوئے بولا "تم سالا اپن کو نہیں چھوڑے گا۔ ابھی بازو توڑا۔ ابھی گردن موڑا۔ ابھی سر پھوڑا تو اپن ایک دم مر جائیں گا۔ بات کرنے سے پہلے ہی جہنم میں داخل ہو جائیں گا۔"

میں نے لجاجت سے کہا "مجھے معاف کر دو محمد بھائی۔ تم واقعی محسن سے مل چکے ہو؟ کہاں ملے تھے؟ کیسے؟ مجھے بتاؤ۔ کیا کہا تھا اس نے..... وہ کیسا تھا..... ٹھیک تھا نا؟"

محمد بھائی مسکرانے لگا "ایسا مافک سوال کریں گا تو جواب کیسے دیں گا اپن سکندر بادشاہ۔ تھوڑا ٹیم دو۔"

"ایک منٹ" میں نے اندر جھانک کے دیکھا۔ گل کونے میں چپ بیٹھی تھی اور دیوار کو گھور رہی تھی۔

"گل! خفا ہو گئی ہو؟" میں نے مسکرا کر کہا "چلو سوری۔ غلطی ہو گئی مجھ سے کہ میں نے تم سے ایسے بات کی۔ معاف کر دو مجھے۔"

"بھائی سکندر!" وہ چلائی "ایسی باتیں مت کریں۔ کبھی چھوٹی بہن سے معافی مانگتے ہیں بڑے بھائی۔"

میں نے کہا "وہ..... دراصل میری کوئی چھوٹی بہن نہیں تھی نا....."

"میرا تو بڑا بھائی تھا۔ بہت مارتا تھا مجھے بچپن میں لیکن جب میں بڑی ہوئی تو صرف ایک بار تھپڑ مارا تھا اس نے۔ وہ میری ماں کی جگہ بھی تھا اور باپ کی جگہ بھی اور وہ شیشی ناگ ڈاکو تھا۔ میں ناگ منی تھی۔ اس کے باوجود معافی نہیں مانگی تھی اس نے۔ وہ رات بھر روتا رہا تھا اکیلا۔ صبح اس نے کہا تھا کہ ناگ منی میں نے ہو گیا ٹھیک کیا۔ میں معافی نہیں مانگوں گا تجھ سے اور میں نے کہا تھا کہ بھیا اگر غلط بھی کیا تھا تو معافی آپ نہیں مانگیں گے۔ ایسے نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ تو معافی نہیں مانگے گا بھیا۔ اپنی عزت کا کچھ خیال کر۔" گل میرے سینے سے لگ کر رونے لگی "اب میں گل بانو ہوں تو کیا ہوا! آپ کی عزت تو وہی ہے جو شیشی ناگ کی تھی۔ اس سے زیادہ ہے۔ آپ تھپڑ بھی مار سکتے ہیں مجھے۔"

میں نے بڑی مشکل سے آنسو روکے اور زبردستی مسکرا کے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا "اچھا چل آنسو مت بہا۔ بھوک لگی ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "غالب اور نازو آ جائیں۔ پھر کھانا کھائیں گے۔"

میں نے کہا "اچھا دیکھو! میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ چونکی "کہاں جا رہے ہیں آپ؟ محمد بھائی کے ساتھ؟"

www.paksociety.com

میں نے اقرار میں سر ہلایا "ابھی آتا ہوں....."

"نہیں۔ میں نہیں جانے دوں گی آپ کو اس بدمعاش کے ساتھ اکیلا۔ میں بھی ساتھ چلوں گی۔ میں اکیلی نہیں رہوں گی یہاں۔"

میں نے کہا "اب تو واقعی تھپڑ کھائے گی۔ پاگل! ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ محمد بھائی دوست ہے ہمارا۔ میں غلط سمجھا تھا۔ وہ بات کرنا چاہتا تھا مجھ سے....."

"تو کیا بات یہاں نہیں ہو سکتی۔"

"ہو سکتی ہے۔ مگر وہ کہتا ہے باہر چلو" میں نے کہا۔

"ضرور کوئی چال ہوگی اس کی۔ کسی نے بھیجا ہوگا اسے۔ کہاں لے جانا چاہتا ہے آخر وہ تمہیں؟"

میں نے کہا "دیکھو پھر وہی دیوانگی کا دورہ پڑ رہا ہے تمہیں۔ میں بتا رہا ہوں کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ تم دروازے بند کر کے بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

"نہیں۔ میں ساتھ چلوں گی۔ تم مار دو یا جو چاہو کرو، میں اکیلا نہیں جانے دوں گی تمہیں بھائی سکندر۔ ایسی کون سی بات ہے جو میری موجودگی میں یہاں نہیں ہو سکتی۔ میرے سوا کون ہے سننے والا۔"

"یہ بات نہیں ہے گل....." میں نے کہا۔

"بھائی سکندر! کیا محسن کا کچھ پتا چلا ہے؟" وہ مجھے غور سے دیکھ کر بولی۔

میں اس کی ذہانت اور منطقی سوچ کا قائل ہو گیا۔ اس نے بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا تھا اور ایسی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی جو گل کے سامنے نہ کی جا سکتی ہو۔ شاید میری صورت پر اس نے میرے خیالات کا عکس پڑھ لیا تھا۔

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں" گل نے میری خاموشی پر کہا "میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گی۔ اپنے جذبات پر قابو رکھوں گی۔ بالکل خاموش بیٹھوں گی۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر ہتھیار ڈال دیے "اچھا۔ آجاؤ تم بھی۔"

محمد بھائی شاید سب کچھ سن رہا ہوگا۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ ہی تو تھا اور وہ بھی کھلا ہوا تھا۔ گل سر جھکائے آئی اور صوفے پر ایسے بیٹھ گئی جیسے بدتمیز بچے امی سے مار کھا کے آئے تو مہمانوں کے سامنے شرافت کا نمونہ بن جائے۔

میں نے کہا "محمد بھائی! اب بتاؤ تمہاری محسن سے کہاں ملاقات ہوئی تھی؟"

"اپن اس کے ساتھ تھا سکندر بادشاہ" محمد بھائی نے کہا۔

"محمد بھائی!" گل نے جھٹکے سے سر اٹھایا "میرے بھائی کا نام سکندر بخت ہے۔ سکندر بادشاہ کیوں کہتے ہو؟"

میں نے مسکرا کر کہا "گل! یہ وعدے کی خلاف ورزی ہے۔"

"یہ سکندر بادشاہ تمہیں کیسے لگا تمہیں" گل اُڑ گئی "اسے بتادو۔"

محمد بھائی ہکا بکا بیٹھا تھا "اچھا بابا! تمہیں بولے گا۔ ایسا ماٹی نا راضی کا کون سا بات ہے۔ اپن بادشاہ بولا فقیر تو نہیں بولا۔"

میں نے کہا "یہ بات میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا کہ مجھے سکندر بادشاہ کہنے سے اس پاگل لڑکی کو دورہ کیوں پڑتا ہے۔ تم محسن کی بات کرو۔"

"اپن محسن کے ساتھ حوالات میں تھا" محمد بھائی نے کہا۔

گل کو پھر شاک لگا۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا اور پھر منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

میں نے کہا "حوالات میں۔ کب..... کیوں پکڑے گئے تھے وہ اور تم؟"

"ابھی کتنا ٹیم ہو گیا" وہ سوچتے ہوئے بولا "دو مہینہ..... سو دن..... اپن چھ آدمی تلاش میں گیا۔ سالا لوگ ایک عورت کو اٹھا تھا۔ استانی کو۔ اپن بہت خراب آدمی ہے۔ بدمعاش اور بھتہ خور ہے مگر عورت کے سامنے کیا بدمعاشی۔ ایک عورت کا سامنے چھ مرد کیسا مرد۔ اور پھر وہ استانی۔ اپن استاد کو باپ کے برابر جانتا۔ اپن سب کو کاٹ دیا۔"

چوں کہ یہ کہانی میں سن چکا تھا اس لئے میں نے بے چینی سے کہا "اس کے بعد تمہیں پولیس نے پکڑ لیا اور ایک بہت بڑے آدمی نے چھڑا لیا..... محسن کہاں ملا تھا تمہیں؟"

وہ میری معلومات پر کچھ حیران ہوا "وہ..... ادھر بیٹھا تھا پہلے سے۔ حوالات کا اندر۔ تین دن رات اپن ادھر رہا۔"

"کیسا تھا وہ؟" گل نے بے اختیار کہا پھر میری طرف دیکھ کر گھبرا گئی۔

میں نے اسے گھور کے دیکھا "محمد بھائی بتا تو رہا ہے۔"

"وہ کیسا تھا؟ ابھی کیا بولے۔ ایک دم جوگی بابا کا مافک اس اتنا بڑا داڑھی تھا۔" محمد بھائی نے ٹھوڑی کے نیچے بالشت بھر ہاتھ پھیلایا "لمبا لمبا بال تھا۔ لال لال آنکھیں جیسے چرس پیتے..."

"چرس! محسن چرس پینے لگا تھا!" میں نے کہا "یہ غلط ہے۔"

محمد بھائی نے اقرار میں سر ہلایا "اپن اس کو چرس پلایا کہ اپنا تھانے میں چلتا ہے۔ ہر تھانے میں مہمان رہتا تھا اپن۔ تھانیدار آج اس تھانے میں کل دوسرے تھانے میں۔ سب کو اپن ہی پہنچاتا تھا۔ حوالات میں اپن جو مانگتا تھا وہ ملتا تھا۔ ایک گھر کا مافک۔ سالا گھر میں کیا ہے؟ ایک چارپائی اور دو برتن۔"

میں نے کہا "محسن پر کیا الزام تھا؟"

"وہ ادھر ہوٹل کے سامنے پھرتا تھا۔ روز صبح آتا تھا اور سڑک کا مافک کھڑا ہو جاتا تھا۔ ادھر ٹیکسی والا، رکشا والا، گاڑی صاف کرنے والا چھوکرا لوگ بولتا سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ ہوٹل کا کسی نے دیکھا تو منیجر کو بولا اور منیجر خفیہ پولیس کا افسر سے بات کر"

ابھی ایسا کیا لگتا ہے کہ اپن کا دروازے پر آدمی کھڑا کیا ہے۔ وہ پولیس کا آدمی ہو گا۔ پولیس بولتا ملٹری انٹیلی جنس کا ہو گا۔ پولیس والا کھمبا پر کچھ لکھتا اور چلا جاتا۔ منیجر پولیس کو بتاتا۔ ایک دن وہ پولیس خفیہ پولیس کو بولا۔ اس کھمبے پر نام ہوتا اور ایک جگہ اودھر جاتا تم کچھ نہیں۔ سب سمجھتا کوئی کھیلا ہو رہا ہے۔ جاسوسی کا چکر ہو رہا ہوئیں گا۔ دھماکا ہوئیں گا۔ دوسرا دن محسن پھر آتا۔ دوسرا نام اور دوسرا جگہ لکھتا اور جاتا۔ پولیس پھر ادھر جاتا اور کچھ نہیں ہوتا۔ تیسرا دن محسن کو پکڑتا۔ اس سے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ کاہے کو ہر روز آکے تم کھمبا پر ایسا مافک نام لکھتا اور جگہ لکھتا۔"

دم لینے کے لئے رکا تو میں نے کہا "محسن نے کیا بتایا؟"

"کچھ نہیں۔ پولیس بہت مارا اس کو۔ اپن تین دن دیکھا۔ رات بھر اس کو الٹا لٹکاتا۔ کپڑا اتار کے مارتا۔ وہ بس چلاتا..... بکرے کا مافک۔"

میں نے گل کی طرف دیکھا۔ وہ کانپ رہی تھی اور چپکے چپکے رو رہی تھی۔ محمد بھائی کو کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اس کی باتوں سے گل کے دل پر اور خود میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ محسن نے وعدے کے مطابق ہمارا انتظار کیا تھا۔ وہ ہوٹل شاہ باغ کے سامنے آ کے کھڑا ہوتا رہا۔ تمہارے لئے پیغام لکھتا رہا اور اس بات سے بے خبر رہا کہ وہ دیکھنے والوں کی نظر میں مشتبہ ہو گیا ہے۔ وہ کیا بتاتا کہ اسے کس کا انتظار تھا اور وہ کس کے لئے پیغام چھوڑتا تھا۔ پولیس کو خدا اپنی درندگی اور سفاکی کے مظاہرے کا موقع دے۔ وہ تو فوراً ہی تخریب کاری کا الزام عائد کر دیتے اور اس کی ایک نہ سنتے کہ وہ بڑی کے لئے ہوئے شیر نکال رہا تھا۔ پہاڑ کچا کے نہیں لے جا رہا تھا۔

"وہ اپن سے بھی نہیں بولتا تھا۔ مار کھا کے سارا دن روتا رہتا تھا" محمد بھائی نے پھر بات شروع کی۔ "تیسرا دن اپن اس کو بولا کہ تیرا کیا خراب ہے کیا۔ کاہے کو پھوکٹ میں مار کھاتا پڑا ہے۔ سالا بتا کیا بات ہے۔ اپن بہت قسم دیا کہ محمد بھائی کا چمڑی بہت سخت ہے مگر دل بہت نرم ہے۔ اپنا اسٹوری بتا۔ اپن چھڑائے گا۔ تب کو پھر اس نے سب بتا دیا۔"

"سب کیا؟" میں نے کہا۔

"یہ کہ وہ اپنا یار دوست کا انتظار کرتا ہے ادھر۔ فقیر کا مافک چھپ کے پھرتا ہے۔ تاکہ شک نہ ہووے کسی کو۔ اس نے سب کا اپنا اور میرے کو بولا کہ میں باہر جا کے دیکھوں۔ ادھر ہوٹل شاہ باغ کا گیٹ ہے۔ گیٹ کا سامنے کھمبا ہے۔ ادھر کوئی ضرور آئے گا۔ سکندر بادشاہ، مرزا غالب، تاڑو یا گل بانو۔ اپن بہت پوچھا کہ وہ کیوں آئے گا اور کب آئے گا تو وہ بولا کہ اپنا یار ہے۔ اپنا جان ہے اور زندگی ہے۔ پر اپن یہ نہیں جانتا کہ کب آئے گا....."

"پھر..... آگے بولو" گل چلا اٹھی۔

میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی "ہاں محمد بھائی! پھر کیا ہوا؟"

"پھر..... اپن کا ضمانت ہو گیا۔ ایک بہت بڑا آدمی ادھر آ کے اپن کو چھڑایا۔"

"محسن کو نہیں رہا کرایا تم نے؟ وعدہ کرنے کے باوجود۔"

محمد بھائی نے سر ہلایا "سالا تھانیدار اڑی کر گیا۔ اپن کو بولا کہ ابھی ہم اس کو کچھ نہیں کہے گا۔ مارے گا بھی نہیں۔ آرام سے رکھے گا مگر اس کو چھوڑے گا نہیں۔"

"کیوں؟ تم تو جانتے تھے کہ وہ بے قصور ہے۔ کیا تم اس بہت بڑے آدمی سے نہیں کہہ سکتے تھے؟" میں نے بے بسی سے کہا۔

"اپن بولا۔ پر وہ کیس خراب ہو گیا تھا۔ وہ بڑا آدمی ہم کو بولا کہ محمد بھائی تم اپن پر احسان کیا۔ اپن تم کو بچائے گا۔ اس کو چھوڑ دو۔ اس کا ضمانت نہیں ہو گا۔ ابھی ملٹری والا لوگ اس سے بات کرے گا۔"

"ملٹری۔ ملٹری انٹیلی جنس" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"ہاں..... یہی بولا وہ۔ تھانیدار مجبور ہوتا لیکن وہ محسن کا خیال کرتا۔ ہم بھی جاتا۔ تین دن حوالات میں اس کو جا کے سگریٹ، چرس، کھانا پہنچاتا۔ تو پہلے دن وہ نہیں ملا۔ تھانیدار بولا اس کو چھوڑ دیا۔ وہ چلا گیا" محمد بھائی نے کہا۔

"وہ تمہیں نہیں ملا؟" میں نے کہا۔

"نہیں" محمد بھائی نے مختصراً کہا۔

"تم نے معلوم بھی نہیں کیا؟"

"اپن کس سے معلوم کرتا۔ تھانیدار بولا کون سالا کدھر جاتا ہے ادھر سے نکل کے۔ اپن کیا ان کا رجسٹر میں لکھتا ہے۔ وہ بھی ٹھیک بولا سکندر بادشاہ لیکن....." وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"لیکن کیا؟"

"اپن کو ایسا مافک لگا کہ تھانیدار جھوٹ بولتا پڑا تھا۔"

"کیا مطلب؟ اسے معلوم تھا کہ محسن کہاں ہے مگر اس نے تمہیں نہیں بتایا؟"

"اپن کو شک ہے ابھی لیکن....."

"لیکن کو چھوڑو۔ کون تھا وہ تھانیدار؟" میں نے کہا۔

"بدلی ہو گیا ہے ابھی۔"

"بدلی ہو کے بھی ڈھاکہ میں ہی ہو گا نا۔ کسی دوسرے تھانے میں" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ بھاگ گیا جان بچا کے۔ ادھر پبلک اس کا تکا بوٹی کرتا۔ چھاترو لیگ کا ایک لیڈر حوالات میں مر جاتا۔ ادھر اسٹوڈنٹ لوگ بہت لفڑا کرتا۔ تھانہ کا گھیراؤ کرتا۔ آگ لگاتا۔ وہ جان بچا کے نکلا اور افسر لوگ اس کو معطل کرتا۔ اس کا جان بچانے کا واسطے واپس پاکستان بھیجتا۔"

www.paksociety.com

"وہ پاکستان سے آیا تھا؟ کہاں سے؟"
"اپن کو نہیں معلوم" محمد بھائی نے کہا۔
"معلوم تو ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔
"معلوم کرنے کا مگر کیا فائدہ ہوئیں گا۔ وہ پھر بولے گا اپن کو نہیں بتایا۔"
"تمہارا کیا خیال ہے؟"
"اپن لوگ کا خیال کچھ نہیں۔ اپن تو بس ادھر گھوم رہا تھا کہ اس چھوکری کو دیکھا۔ یہ کھمبا پر سے پوسٹر پھاڑ رہا تھا اور پھر تم آگیا۔ تم بولا کہ یہ کھمبا پر کسی کا پیغام چپکا پڑا ہے۔ اپن کو پہلے شک تھا، پھر اپن سمجھ گیا کہ تم محسن کا دوست ہے..... اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اپنا جان بچانے کا واسطے تم جھوٹ بولا تھا۔ پھر اپن تم کو آزمایا۔ دس ہزار دیا کہ کراچی میں اپنا گھر والا کو دو مگر تم کراچی جاتا نہیں تھا۔ تم کراچی سے آیا تھا۔ اس کا بعد ہم کوشش کیا تم سے بات کرنے کا۔"
میں نے کہا "تمہارا اندازہ بالکل درست تھا محمد بھائی۔ اب یہ اندازہ بھی کیجیے کہ محسن تھانے سے نکل کے کہیں ملٹری انٹیلی جنس والوں کے ہتھے تو نہیں پڑ گیا" میں نے کہا۔
محمد بھائی ٹھوڑی جیسا سہلانے لگا "یہ بھی ہو تا۔"
میں نے متفکر ہو کے کہا "ملٹری انٹیلی جنس سے نمٹنا تو بہت مشکل ہو جائے گا۔ نہ وہ رشوت لیتے ہیں نہ سفارش مانتے ہیں۔ اگر انہوں نے محسن کو کہیں اور بھیج دیا ہو گا تو؟"
"تو ہم بھی چلے جائیں گے وہاں" گل نے جذباتی لہجے میں کہا۔
"ہم کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ کیوں بھائی سکندر؟"
میں نے نرمی سے کہا "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ اگر ہمیں معلوم ہو گیا کہ وہ کہیں اور ہے تو ہم ڈھاکا میں رک کے کیا کریں گے۔ پہلے ذرا پتا تو چلے، کوئی سراغ تو ملے اس کا۔"
"یہ بہت مشکل کام ہے۔ سن" محمد بھائی بولا۔
میں نے کہا "محمد بھائی! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ایک استانی کو اغوا ہونے سے بچایا تھا اور جس کی وہ ہونے والی بہو تھی، وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ اس نے اپنی گواہی سے تمہیں صاف بچا لیا۔ وہ بہت اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ اس کے کہنے سے دو معتبر گواہ اور مل گئے جو خود بھی بڑے آدمی تھے۔ یہ بہت بڑا آدمی کون ہے؟"
محمد بھائی کے چہرے پر تذبذب اور حیرانی کے آثار نظر آنے لگے "اپن اس کا نام نہیں بتانے کا۔"
میں نے کہا "وہ استانی کون تھی؟"
اس نے پھر نفی میں سر ہلایا "نہیں بولنے کا۔"
میں نے کہا "محمد بھائی! تم ہماری مدد کر سکتے ہو۔ ایک آدمی ہے تمہارے پاس جو کام آ سکتا ہے۔ تم اس سے کچھ نہیں کہہ سکتے تو استانی سے درخواست کرو۔ وہ تمہاری سفارش کر سکتی ہے۔ آخر تم نے اتنی بڑی نیکی کی تھی اس کے ساتھ....."

"بابا نیکی کیا تھا اپنا واسطے، کسی پر احسان نہیں کیا تھا۔ اپن کا صبر پھر گیا تھا سالا۔ ایسا مانگ کسی بھی لڑکی پر ظلم کرتا کوئی تو محمد بھائی کا صبر پھر جاتا۔ اپن کو نہیں معلوم تھا وہ کون ہے۔ استانی ہے کہ کوئی اور۔ جب معلوم پڑا استانی ہے تو اپن سب حرامی لوگ کو کاٹ دیا۔ ایک دم خلاص کر دیا۔ ہاں قسم سے ہم کو کسی نے نہیں بتایا تھا کہ وہ کس فیملی کا ہے۔ اپن تو ریڈی تھا پھانسی کا واسطے۔ اخبار میں دیکھا تھا کہ محمد بھائی چھوٹ گیا۔ اپن بولا ہاں کیا۔ پھر وہ آگیا۔ استانی کا سسر۔ ابھی اس کا شادی ہو گیا ہے۔ اس وقت نہیں ہوا تھا۔ وہ بولا محمد بھائی! تم اپن پر احسان کیا۔ اپن بولا جاؤ بابا! اپن تم کو نہیں جانتا پھر تم پر کیسا احسان۔ پھر وہ ہم کو ادھر سے نکالا۔ احسان کا بدلہ برابر ہو گیا۔ ابھی ہم اس سے کچھ نہیں مانگے گا۔ ورنہ بولے گا محمد بھائی بے ایمان ہو گیا ہے۔ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ روز آئے گا۔ آج یہ کرا دو۔ آج وہ کرو دو۔ احسان کا قیمت مانگے گا۔"
میں نے لاجواب ہو کے کہا "یہ بات نہیں محمد بھائی۔ تم نے جو کچھ کیا تھا نیک نیتی سے کیا۔ انعام کے لالچ یا معاوضے کی امید پر نہیں کیا تھا۔ نہ تم کسی پر احسان کرنا چاہتے تھے اور نہ تمہیں کوئی ثواب کمانے کا خیال آیا تھا۔ تم نے تو ایک غلط کام ہوتا دیکھا اور انجام کی پروا کیے بغیر میدان میں کود پڑے۔ لیکن اب ہم ایک فرض لے کر آئے ہیں تمہارے پاس۔ یہ بھی ایک زندگی کا سوال ہے۔ تم اپنے لیے تو کچھ نہیں مانگ رہے ہو۔ ہماری خاطر اس سے بات کر کے دیکھو، شاید نیکی کا جذبہ اس کے دل میں بھی اتنا ہی طاقت ور ہو جتنا تمہارے دل میں ہے۔ اگر تم اس سے پیسہ مانگو، نیا ٹھکانا مانگو، نوکری مانگو تو غلط ہو گا۔ تم اپنے لیے کچھ مت مانگو۔ ہماری سفارش کرو۔"
محمد بھائی کچھ نرم پڑ گیا۔ "اپن سالا کیا سفارش کرے گا۔"
میں نے کہا "وہ تمہاری بات نہیں ٹالے گا۔ جب وہ دیکھے گا کہ اس کام سے تمہارا کوئی مفاد وابستہ نہیں اور یہ بھی ایک نیکی ہے جو تم دوسروں کے ساتھ کر رہے ہو تو شاید، شاید کیا یقیناً تمہاری مدد کرے گا۔"
محمد بھائی خاموش ہو کے سوچنے لگا "ابھی اگر کیا بولے گا اپن کو۔ وہ پوچھے گا محسن کون ہے تیرا۔"
"تم کہہ دینا کہ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں مگر مغربی پاکستان سے یہ لوگ بڑی مشکلوں سے اس کو تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں۔ انہوں نے بہت مصیبت اٹھائی ہے اور ان کا یہاں کوئی بھی مددگار نہیں۔ وہ صرف اتنا کرے کہ محسن شیروانی کے بارے معلومات حاصل کر کے انہیں بتا دے۔ اسے صرف فون کرنے ہوں گے۔ اگر اس کے سیاسی تعلقات ہیں تو وہ فوج کی ہائی کمان سے بھی رابطہ کر سکتا ہے۔ انڈین آرمی کا دعویٰ تو یہی ہے کہ وہ بنگلہ دیش کے عوام کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ وہ بنگلہ دیش کے لیے

کی بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔"
خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد محمد بھائی نے گل کے سر پر ہاتھ رکھا "ابھی مت رو میرا بہن۔ اپن کچھ کرے گا۔ اپن سالا جانے کا سیٹھ کے پاس۔ اس کا سامنے ہاتھ جوڑے گا، پاؤں پکڑے گا اس کا اور کہے گا کہ تیرا محسن کو لائے۔"
گل کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔
"محمد بھائی! مجھے لے چلو اپنے سیٹھ کے پاس....."
"نہیں۔ تم ادھر بیٹھو آرام سے۔ اپن جائے گا" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"پھر کب آؤ گے؟" میں نے کہا "آؤ گے نا؟"
"آئے گا۔ اپن بھاگنے والا نہیں ہے۔"
میں نے شرمندہ ہو کے کہا "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تم اگر مناسب سمجھو تو مجھے اس کے سامنے پیش کر دو تاکہ جو وہ پوچھنا ہو مجھ سے پوچھ لے۔"
محمد بھائی نے سر ہلایا! "اپن بات کرے گا" پھر جانے لگا۔
محمد بھائی چلا گیا تو میں نے گل سے کہا "اب تو رونا بند کرو۔ محسن کے ملنے کی امید ہو گئی ہے۔"
گل نے آنسو پونچھے "وہ..... چھوڑ دیں گے اسے؟ فوجی....."
"وہ اگر ان کی تحویل میں ہوا..... تو پھر کوشش کی جا سکتی ہے۔ پہلے یہ تصدیق تو ہو جائے کہ تھانے سے اس کو واقعی ملٹری انٹیلی جنس والے ہی لے گئے تھے" میں نے کہا "ابھی تک تو وہ لاپتا ہے۔ اس کا پتا مل جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہے تو پھر ہم سب کچھ کر سکتے ہیں اسے واپس لانے کے لیے۔ سفارش نہ چلی تو رشوت چلائیں گے۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ سب دے دیں گے۔ وہ کم پڑے گا تو چوری کریں گے، ڈاکا ڈالیں گے، کچھ بھی کریں گے اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو ہم سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ ہم جان پر کھیل کے اسے نکالیں گے۔ ہم اسے ساتھ لے کر ہی واپس جائیں گے ورنہ ہمیں ماریں گے اور مر جائیں گے" میں نے کہا۔
گل کا چہرہ روشن ہونے لگا "محمد بھائی کا احسان....."
میں نے کہا "وہ احسان کو سمجھتا ہی نہیں۔ بس یہ جانتا ہے کہ مظلوم کی مدد کرنی چاہیے خواہ اس میں جان بھی چلی جائے۔ اگر اس کی کھوپڑی میں یہ بات بیٹھ گئی کہ محسن مظلوم ہے تو پھر وہ کود پڑے گا میدان عمل میں، نتائج کا خیال کیے بغیر۔"
"محسن سے زیادہ کون مظلوم ہو گا" گل نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

سہ پہر کے وقت میں نے ہوٹل کا رخ کیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے ٹاشا وے نے مسکرا کے میرا استقبال کیا اور ایک چابی دراز میں سے نکال کر تھما دی۔
"آپ کا روم خالی ہے سر!" وہ بولا۔
میں نے کہا "تم انڈین کرنسی قبول کرو گے؟"
"کیوں نہیں سر!" وہ بولا۔
صورت حالات بدل جانے سے انڈین کرنسی کا بھاؤ کچھ چڑھ گیا تھا اور اسے پاکستانی کرنسی کی طرح سکہ رائج الوقت تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ابھی بنگلہ دیش صرف ایک نام تھا۔ حکومت اگر تھی تو سرکاری بیانات اور امور خارجہ پر ساری توجہ دے رہی تھی۔ داخلی امور کا نظم و نسق درہم برہم تھا یا بھارتی فوج کے کنٹرول میں تھا۔ ڈاک کے ٹکٹ لفافے، پاسپورٹ اور کرنسی کے علاوہ سکوں پر ابھی حکومت پاکستان کا نام تھا لیکن بنگلہ دیش چھاپنے اور پاکستان کے لفظ کو حرف غلط کی طرح مٹانے کی دیوانگی عوام سے خواص اور سرکاری و نجی دفاتر میں نیچے سے اوپر تک کسی وبا کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ کل تک دشمن سمجھے جانے والے بھارتی اچانک دوست اور نجات دہندہ کہلانے لگے تھے۔ چنانچہ ان کی کرنسی بھی پاکستان کی کرنسی سے زیادہ مقدس ہو گئی تھی۔
میں نے چار ہزار روپے ایڈوانس جمع کرا دیے اور کہا "مسٹر علی شاہ! تھینک یو۔ فار یور فیور....."
اس نے کہا "یو ڈونٹ مینشن اٹ سر۔"
"کیا مستقبل قریب میں یہ ممکن ہو گا کہ ایک کمرا اور مل جائے؟"
"میں کوشش کروں گا سر....."
"اگر مجھ سے بھی کوئی کام ہو تو بلا تکلف بتانا۔"
اس نے جھجکتے ہوئے کہا "اگر آپ برا نہ مانیں تو..... ایک درخواست ہے۔"
"کہو کہو۔" میں نے مربیانہ شان سے کہا۔
"وہ۔ مجھے یہ نوکری بالکل پسند نہیں۔ میں باہر جانا چاہتا ہوں۔ پاسپورٹ بھی ہے میرے پاس۔ آپ فارن افیئرز میں ہیں۔ اگر کبھی کوئی موقع ملے....."
میں بات کر کے پھنس گیا تھا مگر میں نے اسے متانت سے کہا "کہاں جانا پسند کرو گے تم؟ ملک بتاؤ۔ امریکا، کینیڈا، برطانیہ یا مڈل ایسٹ۔"
اس کا چہرہ کھل اٹھا "اگر آپ میری پسند پوچھتے ہیں تو کینیڈا، پھر امریکا، پھر برطانیہ یا مڈل ایسٹ لیکن یہ شرط نہیں ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ میں خیال رکھوں گا واپس جانے کے بعد" میں نے کہا اور چابی لے کر اوپر چلا گیا۔ یہ فرسٹ فلور پر وی آئی پی روم تھا اور ہر اعتبار سے بہترین تھا مگر اس میں ہم سب رہ نہیں سکتے تھے۔ حفاظت کے نقطۂ نظر سے دو افراد کا یہاں منتقل ہو جانا فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا۔ خدا نخواستہ چھاپا پڑتا تو ایک ہی جگہ سے نہ پکڑے جاتے۔ گزشتہ رات کو پولیس نے ملٹری کے ساتھ مل کے ہماری تلاش میں ہوٹل کو کھنگال ڈالا تھا۔ انہوں نے مکینوں کو کمروں سے نکال کر اپنا اطمینان کیا تھا اور ہم محض دست قدرت

www.paksociety.com

کے حسن انتظام سے بچ گئے تھے جس نے ہمیں ایک سرونٹ کوارٹر میں محفوظ کر دیا تھا۔ اب ہوٹل پر دوبارہ چھاپا پڑنے کا احتمال نہ تھا۔ اگر مخبری ہو جاتی تو سرونٹ کوارٹرز اور دوسرے مقامات کا محاصرہ ممکن تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ غالب اور نازو کے واپس آتے ہی ہم اس کمرے میں شفٹ ہو جائیں گے۔ میں اور گل تو بے خوف و خطر اس وی آئی پی روم میں ٹھہر سکتے تھے۔ غالب اور نازو کو ہم چھپا کے رکھ سکتے تھے اس طرح کہ انتظامیہ کو پتا نہ چلے۔

میں لوٹ کر سرونٹ کوارٹر میں گیا تو میرا بھوک کے مارے برا حال تھا۔ مجھے غالب اور نازو پر تاؤ آ رہا تھا جو کچھ بتائے بغیر غائب ہو گئے تھے اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ یقین کے ساتھ کچھ بھی کہنا مشکل تھا کہ وہ محسن کی تلاش میں کسی سراغ کے پیچھے نکل کھڑے ہوئے ہیں یا اپنے رومانس کی تلاش کے بجائے سیر و تفریح کر رہے ہیں۔

انہیں کمرے میں موجود پا کر میرا غصہ فرو ہو گیا۔ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی غالب نے سوال کر دیا "ڈائننگ ہال سے آ رہے ہو؟ مجھے تمہارے وجود سے قورمے پلاؤ کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ دیوانگی کی اولین علامات ہیں۔ دوسرے مرحلے میں تم کو ہر طرف پلاؤ قورمہ نظر بھی آنے لگے گا۔"

نازو نے کہا "آخری مرحلے میں تم ہر چیز کو پلاؤ قورمہ سمجھ کے منہ مارو گے۔"

"مثلاً تمہیں" غالب بولا "حالانکہ تم گھر کی مرغی ہو۔"

"یہ بتاؤ تم کہاں منہ اٹھا کے چلے گئے تھے؟" میں نے کہا۔

غالب نے نازو کی طرف دیکھا "میں سچ نہیں بول سکتا۔"

"کیوں نہیں بول سکتے، بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔"

"میری جان کو خطرہ لاحق ہے۔" غالب نے آہ بھری "میں مجبور ہوں دوست۔"

نازو نے چڑ کے کہا "میں نے روکا ہے تمہیں؟ بتاؤ ورنہ بتاتا ہے میں خود بتا دیتی ہوں۔ وہ... دراصل ہم محسن کے پیچھے لگ گئے تھے۔"

غالب نے کھی کھی کر کے ہنسنا شروع کیا "یہ تو عنوان ہے خاتون کے حماقت نامے کا۔ ہم ادھر ادھر کے لوگوں سے پوچھ رہے تھے کہ ان میں سے کسی نے محسن کو یہاں منڈلاتے تو نہیں دیکھا تھا؟"

میں نے کہا "کیا! تم براہ راست نام لے کر پوچھتے پھر رہے تھے؟"

غالب نے کہا "یار اب ایسا بھی نہیں بلکہ ہم نے دل کے ساتھ عقل کو بھی گروی رکھ دیا ہے۔ میں بہت ہوشیاری سے چلا کہ 'معاملہ تھی' عشق، منڈی، راز داری وغیرہ کے ساتھ بالکل سیکرٹ ایجنٹ اعتمادیہ زیرو زیرو سیون کی طرح تفتیش کر رہا تھا۔ میں نے ایک

فقیر کے پاس بیٹھ کے سوا روپیہ نذر کیا۔ اس سے پوچھا کہ میری شادی کب ہوگی اور بچے کتنے ہوں گے۔"

"اچھا۔ کیا بتایا اس نے؟"

"اس نے بڑا حوصلہ شکن اور مایوس کن جواب دیا" غالب منہ لٹکا کے بولا۔

نازو کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا تھا لیکن وہ بولی نہیں بلکہ ظاہری بے نیازی سے کھانا کھانے میں مصروف رہی۔

"فقیر نے واضح ہو کر وہ بہت پہنچا ہوا درویش تھا۔ اس نے کہا کہ بچہ بھاگ جا۔ ابھی وقت ہے۔ تو جو بے وقت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مارا جائے گا۔ قید بامشقت کاٹے گا ساری عمر۔ ایک بلا تیرے پیچھے پڑ گئی ہے۔"

"تعویذ کیوں نہیں لے لیا اس بلا سے جان چھڑانے کا؟" نازو نے بگڑ کے کہا۔

"افسوس! اس بلا پر کوئی تعویذ جادو ٹونا، سفلی عمل وغیرہ کارگر نہیں ہوتا" غالب آہ بھر کے بولا۔

گل مسکرانے لگی "اور دوسرے سوال کا جواب کیا ملا؟"

"دوسرا سوال؟ اچھا۔ انہوں نے کہا تیرے بچے نہیں ہوں گے۔ ہو ہی نہیں سکتے خواہ تو ایک نہیں چار شادیاں کر لے" غالب نے روتی شکل بنا کے کہا "کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔"

"یار ایسی کیا بات ہے؟" میں نے کہا "وہ فقیر بکتا ہے۔"

"نہیں اس نے ٹھیک کہا تھا۔ بچے میری بیوی کے ہوں گے" غالب بولا۔

اس نے اتنی مظلومیت کے ساتھ یہ بات کی تھی کہ میرے ساتھ گل کو ہی نہیں نازو کو بھی ہنسی آ گئی "بڑے بے شرم ہو۔"

میں نے کہا "کھانا جاری رکھو اور باقی بات بھی بتا دو۔"

غالب نے کہا "فقیر سے میں نے سوا روپے فی سوال کام کر لیا۔ پہلے دس سوالات تو اپنے ہی تھے۔ بے شری کے بجائے کاٹا بدلا اور اسے دوسری پٹڑی پر لے آیا۔ اس سے پوچھا یہاں کوئی مجنوں دیوانہ یا مجذوب قسم کا مشکوک بندہ تو نہیں، اس نے جو ہر وقت اس قصبے کے آس پاس نظر آتا ہو۔ اس نے سر ہلایا اور بڑے یقین سے کہا کہ وہ آج کل پارٹ ٹائم مخبر ہے پولیس کا۔ اسے مشتبہ افراد پر نظر رکھنے کی خدمت کے بدلے چرس بھری سگریٹ بیچنے کا اجازت نامہ حاصل ہے۔"

میں نے چونک کر کہا "چرس والی سگریٹ؟"

غالب نے قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا "یہ لو۔ شوق فرمائیے، دم مٹے غم۔ یہ تحفۂ درویش ہے۔ ایک روپے کے رعایتی نرخ پر..."

نازو نے سگریٹ چھینے کی کوشش کی "یہ کیا حرکت ہے۔"

میں نے کہا "ٹھہرو۔ اسے سنبھال کے رکھو۔ عین ممکن ہے اس سے کوئی سراغ ملے۔ پہلے تم اپنی بات ختم کرو، پھر میں

بولی۔"

"بس اور تو کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ ایک جوتشی نجومی قسم کا خبطی شخص بھی بیٹھا تھا۔ اس سے بھی میں نے وہی سوالات پوچھے تھے۔ وہ پتا نہیں کیوں جلا بھنا بیٹھا تھا۔ کہنے لگا چار شادیاں ہوں گی تیری۔ ہر ایک سے تیرہ بچے ہوں گے۔ تیرہ کا عدد منحوس ہے۔ شادی کے تیرہ سال بعد تیرہ تاریخ کو تجھے تیرہ نمبر کے چھترے مار پڑے گی۔ میں نے کہا انشاءاللہ یعنی اگر اللہ نے چاہا ورنہ تو دیکھا بڑا جاہ ہوتا کیا ہوتا ہے۔ پھر اس سے میں نے تیرہ روپے فی سوال کا سودا کیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ میں نے تیرہ سوال پوچھے۔ وہی کہ اس نے آس پاس کسی کو دیکھا تو نہیں۔ اس حلیے میں اور ایسی حالت میں۔ اب کرنا خدا کا دیکھو کہ وہ بھی پولیس کا مخبر نکلا۔ یوں لگتا ہے کہ آس پاس جتنے بھی لوگ نظر آتے ہیں ان کی خدمات مستعار لے لی گئی ہیں آتے جاتے لوگوں پر نظر رکھنے کے لئے۔"

میں نے کہا "اسے بھی چرس والی سگریٹ بیچنے کا اجازت نامہ ملا ہوا تھا؟"

"نہیں۔ اس کا ذرا اونچا دھندا تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگا آنکھ مار کے حالانکہ ایک آنکھ پہلے ہی ماری جا چکی تھی اس کی کہ مال چاہئے۔ میں نے کہا کیوں نہیں اور اس کا مال لے کر بھاگ گیا۔ ایک پیسہ نہیں دیا۔ وہ شور مچاتا رہ گیا لیکن عین اسی وقت خاتون نے بدحواسی کے عالم میں مجھے بتایا کہ وہ جا رہا ہے محسن۔ اور بس میری بھی مت ماری گئی۔ جادو یا نظر بندی اسی کو کہتے ہیں۔ مجھے بھی لگا کہ وہ محسن ہی ہے۔ وہ رکشا میں بیٹھ رہا تھا۔ ہم بھی رکشا لے کر اس کے پیچھے لپکے۔ رکشا والے سے کہا کہ بس آگے والے رکشا کو اوجھل مت ہونے دینا۔ سو روپے ملیں گے۔ وہ تو فرشتۂ اجل کی طرح پیچھے لگ گیا۔ ایک سائیکل والے کو سائیڈ ماری۔ وہ سائیکل سمیت روڑ سائیڈ پر ڈریسنگ سیلون میں گھس گیا جہاں ایک شخص کو سر عام مونڈا جا رہا تھا۔ دوسری جگہ اس نے ایک رکشا سے ٹکر لگائی۔ نازو کی جان ہتھیلی پر رکھ کے۔ اور سارا راستہ جانے کتنے لوگ بال بال بچے اور گالیاں بکتے رہ گئے۔ آخر کار محسن ایک بلڈنگ میں گھس گیا۔ ہم بھی سو کا نوٹ پھینک کر دوڑے۔ وہ پانچویں منزل پر ایک دروازے کے پیچھے غائب ہو رہا تھا کہ ہم بھی سیڑھیاں چڑھتے اور ہانپتے ہوئے پہنچ گئے۔"

بتاتے بتاتے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے "اور پھر پتا چلا کہ وہ محسن نہیں تھا۔"

"نہیں۔ یہی تو گلا ہے۔ وہ محسن تھا" غالب بولا۔

میری بھی ایک دم رک گئی "محسن تھا؟ تم مذاق کر رہے ہو۔"

"قسم خدا کی وہ محسن تھا۔"

"پھر اب کہاں ہے وہ؟ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا..." گل نے بے قراری سے کہا۔

"وہ محسن شیروانی نہیں تھا، محسن میاں تھے" غالب بولا "حد

ہو گئی۔ میں نے دروازہ بجایا تو اس نے کہا کہ کیا بات ہے۔ میں نے پریشان ہو کے کہا کہ ہم محسن سے ملنے آئے تھے۔ اس نے کہا "ہم محسن میاں ہیں۔ بیٹا لایا ہے تم تو اندر آ جاؤ" اب اسے پتا نہیں کس کا انتظار تھا۔ میں نے تو کہا کہ بیٹا لانا تو ہم بھول گئے اور اس نے گالی دے کر دروازہ بند کر دیا کہ پھر دفع ہو جاؤ۔ ہم الٹے قدموں لوٹ آئے۔ خیر ایک محسن تو ملا ہمیں۔ تم نے کیا تیر مارا؟"

میں نے کہا "ہم نے تقریباً نشانے پر تیر مارا۔"

میں نے اسے ڈی اور پھر محمد بھائی سے ملاقات کا تفصیل حال بتایا۔ غالب اور نازو دم بخود بیٹھے رہے۔ اس دوران میں اشوک آیا اور کھانے کے برتن سمیٹ کر لے گیا۔ میں نے اسے کافی لانے کا کہا۔

غالب بولا "تم نے محمد بھائی سے پوچھا کہ وہ رہتا کہاں ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ ایسے لوگوں کا کیا پتا ٹھکانا۔"

"اگر ہم کو ملنا ہو تو ہم کہاں جائیں گے؟"

"وہ خود آئے گا" میں نے کہا "اس نے کہا تھا۔"

"یار وہ آیا پھر؟" غالب ہنسا کے بولا۔

میں نے کہا "وہ ہسٹری شیٹر ہے۔ اسے ڈی سے معلوم ہو جائے گا۔ بہت ہوں گے اس کے جاننے والے۔ اب میں اور گل شفٹ ہوتے ہیں اپنے کمرے میں۔ تم فی الحال یہیں ٹھہرو۔ رات کو ملاقات بن کے آ جانا۔"

"ہوٹل والوں کو معلوم ہو جائے گا۔"

"کیسے معلوم ہو جائے گا۔ ہم کسی کو اندر داخل ہونے نہیں دیں گے۔ اگر روم سروس سے کچھ منگوائیں گے تو دروازے پر ہی لے لیں گے۔ ازوقت ڈسٹرب کا بورڈ لٹکا دیں گے۔"

"پھر بھی صفائی کرنے والے تو آتے ہیں اور ایسے کب تک چھپ کر رہیں گے ہم، کیا باہر نہیں نکلیں گے؟"

میں نے کہا "باہر جانا منع نہیں ہے۔ ہم الگ الگ جائیں یا ایک ساتھ۔ میں نے دوسرے کمرے کی بات کی ہے۔ امید ہے ہو جائے گا۔"

ابھی ہم کافی پی رہے تھے کہ محمد بھائی پھر نمودار ہو گیا۔ وہ خاصا مضطرب نظر آ رہا تھا اور بیٹھنے پر آمادہ نہ تھا۔

"اپن یہ بتانے کو آیا ہے کہ رات کو وہ ملے گا۔"

"کون ملے گا؟" میں نے کہا۔

"عبدالستار چوہدری..... اپن بات کیا تھا استانی سے" محمد بھائی نے کہا۔

"اچھا۔ میں سمجھ گیا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے" میں نے کہا۔

"اپنا ایک بات بولنے کا۔ تم مجبور کیا تو اپن مجبور ہو گیا۔" محمد بھائی ایک دم زبان کا پکا ہے پر دوسرے کا دل میں کیا ہے، یہ اوپر والا جانتا ہے۔ ایسا ویسا کوئی بات ہو گئی گا تو اپن کو مت بولنا کہ محمد بھائی دغا کیا۔ کیا؟"

www.paksociety.com

میں نے کہا "کیا مطلب؟ تم سمجھتے ہو اس میں دھوکا بھی ہو سکتا ہے؟"

"بابا یہ بڑا لوگ بابا تھس کھیلتا ہے۔ ایک دم اوپر والا پالی ٹکس اپنا نہیں جانتا۔ صاف بات بولتا ہے تم کو "اس میں رسک تمہارا ہے۔ اپن کو چودھری بولا کہ محمد بھائی' تمہارا فرینڈ ہمارا فرینڈ۔ اس کو لاؤ۔ ہم اس سے بات کرے گا اور اس کا مدد کرے گا۔"

"تم سمجھتے ہو اس سے ملنے میں خطرہ ہے؟" میں نے کہا "کیا وہ بہت بڑا آدمی ... جو تمہارا احسان مند ہے تم سے بھی دھوکا کر سکتا ہے۔"

"اپن کو امید تو نہیں پر سالا پالی ٹکس میں سب چلتا ہے..."

"کیا چودھری بھی پاکستان دشمن عناصر کا ساتھی ہے؟" غالب نے پوچھا۔

"ساتھی؟ وہ لیڈر ہے یار۔ عجیب کا خاص آدمی تو نہیں لیکن اوپر والا لیڈر ہے۔ سب جانتا ہے وہ ضرور وزیر بنے گا۔ اس کا سیٹ پر اور کوئی نہیں آ سکتا۔" محمد بھائی بولا۔

"کیوں نہیں آ سکتا۔ اگر عوامی لیگ کسی کو نامزد کرے گی۔"

محمد بھائی مسکرایا "بابا یہ لیگ وہ لیگ ان کو کیا فرق پڑتا ہے۔ ابھی کل یہ مسلم لیگ میں تھا آج عوامی لیگ میں ہو گیا۔ پھر کل کہیں اور ہو گیا۔ جو بھی طاقت میں ہو گا یہ اس کا ساتھی اور یہ اس کا طاقت۔ چیک تو اپنا مانگ تماشا لگتا ہے۔ کیا؟"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا لیکن ایسا آدمی تو ذاتی نا قابل اعتبار ہے۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ ہم بنگلہ دیش کی مخالفت کرنے والوں کے ساتھی ہیں تو وہ ابن الوقت کہیں ہمیں پکڑوا نہ دے۔"

"اپن بولا نا' چودھری ہم سے وعدہ کیا لیکن اس کا نیت اندر سے خراب ہووے تو کیا پتا۔ خیر۔ وہ بھی جانتا ہے کہ محمد بھائی کو دھوکا دے کر کوئی سالا بہت دن زندہ نہیں رہا۔ وہ اپنا لا کف کم کرے گا اور سارا وائف کو بیوہ کرے گا۔ کیا؟"

نازو نے کہا "کتنی بیویاں پال رکھی ہیں چودھری نے؟"

غالب بولا "تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے بھیڑ بکریاں پالنے کی بات ہے۔"

"یہ لوگ اور کیا سمجھتے ہیں پرائی بہو بیٹیوں کو؟ بھیڑ بکریاں۔ جب چاہا خرید لائے' ہانک لائے۔ ایک کمرے کے باڑے میں بند کر دیا۔ چارہ ڈال دیا اور دل سے اتر گئی تو قصابوں کو بیچ دیا۔"

"ابھی تم ٹھیک بولا۔ یہ چودھری حرامی ایسا مانگ کرتا ہے۔ ایک کو نکال دیتا ہے' ایک لے آتا ہے۔ اسٹاک میں چار ہی رکھتا ہے۔ اس کا چمچے لوگ جن کے چھوکری لا تا ہے اور وہ شادی بنا کے گھر میں رکھتا ہے سال دو سال۔ پرانا والا مال نکال دیتا ہے۔ اپن جانتا ہے اس کا عورت کدھر جاتا ہے۔" محمد بھائی نے غصے سے کہا۔

"... کدھر جاتی ہے وہ بدنصیب"

"ایک ہی جگہ ہوتا ہے اس کا۔ قحبہ بازار۔ خریدار اسے ایکسپورٹ کر دیتا ہے۔ شور کرے تو اس کا پتا بھی نہیں چلتا۔ وہ بولتا ہے کہ طلاق دیا۔ اسے گھر بھیج دیا۔"

"اور گھر والے کچھ نہیں کہتے؟ وہ شور نہیں کرتے؟"

"غریب لوگ شور کرتا ہے تو اپنا خانہ خراب کرتا ہے۔ پولیس اس کو پکڑتا ہے کہ سالا حرامی تو بردہ فروش ہے۔ اپنا چھوکری کو تو بیچا۔ خیر چھوڑو یہ بات۔ اپن رات کو آئے گا۔"

میں نے کہا "رات کو کس وقت؟"

"وہ بارہ بجے بولا۔"

"بارہ بجے' آدھی رات کو!" میں نے تشویش سے کہا "اس سے پہلے ملنے میں کیا ہے؟"

"معلوم نہیں ہے اس کا پاس۔ اس کا سیکریٹری بولا۔ کہ محمد بھائی کل آنا۔ اپن شور کیا کہ تم سالا اپنا ٹانگ اڑاتا ہے۔ چودھری صاحب خود باہر آیا۔ سیکریٹری کو بولا محمد بھائی کو بھی مت روکو۔ پھر ہم کو بولا رات کو آؤ۔ بارہ بجے کا بعد۔ کیا؟"

"تمہاری بات سنے بغیر کہہ دیا؟"

"نہیں۔ اپنا بات سن کے بولا" محمد بھائی نے کہا۔

"وہ رہتا کہاں ہے؟" غالب نے کہا۔

"ابھی نیا بنگلہ بنایا شہر سے باہر۔ نیا آبادی ہے۔ ہم لے جائے گا تم کو" محمد بھائی نے کہا۔

میں نے کہا "رات کو تم آؤ تو ہوٹل میں آنا۔ کاؤنٹر سے پوچھ لینا کہ آنند کمار ورما' ڈپٹی سیکریٹری فارن افیئرز گورنمنٹ آف انڈیا کہاں ہیں۔"

محمد بھائی گڑبڑا گیا "کیا بولا۔ یہ سالا کون ہے؟"

میں نے کہا "میں۔ فرسٹ فلور پر روم نمبر ..."

محمد بھائی نے شرمندہ ہو کے کہا "وہی..... نام پھر بولو۔"

میں نے کہا "آنند کمار ورما۔ تم صرف مسٹر ورما پوچھ لینا۔"

اس نے سر ہلایا اور زیر لب کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ وہ ایک امید افزا خبر لایا تھا مگر ہمیں اندیشوں میں بھی مبتلا کر گیا تھا۔

غالب نے کہا "کیا عبدالستار چودھری جیسے بے کردار اور بے ضمیر آدمی پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟"

"محمد بھائی اس کا محسن ہے" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "جو ضمیر فروش ہوں وہ احسان فراموش تو ہوتے ہی ہیں۔"

نازو بولی "مگر محمد بھائی جیسے بدمعاش کی دشمنی بھی اسے مہنگی پڑے گی۔"

غالب نے کہا "بی بی! سیاست جیسے مشکل موضوع کو اپنا زنانہ جذباتیت کی عینک سے مت پڑھو۔ یہ سیاست داں تو غنڈے بدمعاشوں کو پالتے ہیں۔ غنڈے بدمعاش کسی سیاست داں کے سرپرستی نہیں ہوتے۔ اگر چودھری نہ چھڑاتا تو محمد بھائی کی ساری بدمعاشی دھری رہ جاتی۔ اس کی ہسٹری شیٹ میں آخری اندراج یہ ہوتا کہ اس نے حوالات میں خودکشی کر لی یا وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ ورنہ پھانسی کی تاریخ پر اس کی تاریخ کا آخری باب ختم ہو جاتا۔ چودھری تو سمجھتا ہو گا کہ احسان اس نے کیا محمد بھائی پر۔"

نازو نے مایوسی سے کہا "پھر کیا تم لوگ نہیں جاؤ گے؟"

"اب اتنے بھی بزدل نہیں ہیں ہم۔ اور نہ بے مروت" میں نے کہا "اتنی دور چل کے کیا اسی لئے آئے ہیں کہ عبدالستار چودھری جیسے بزدل آدمی کا مقابلہ کئے بغیر واپس چلے جائیں۔"

"دشمن کو بزدل سمجھنا نادانی ہے" نازو نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی وہ دشمن ہوا نہیں ہے۔ محض اندیشے یا قیاس کی بنیاد پر حتمی فیصلہ صادر کرنا زیادہ بڑی نادانی ہے" غالب بولا "دوسری بات یہ ہے کہ بے ضمیر آدمی' منافق' دھوکے باز اور دروغ گو' یہ سب بزدل ہوتے ہیں۔ بزدل نہ ہوں تو اپنے ضمیر کی آواز سے کیوں ڈریں۔ منافقت کیوں کریں۔ حق کے سامنے کیوں نہ آئیں۔ سچ کیوں نہ بولیں۔"

میں نے غالب کی تائید کی "وہ بزدل نہ ہوتا تو سیاسی وفاداریوں کا نیلام نہ کرتا۔ اصولی موقف پر قائم رہتا مگر وہ برسر اقتدار رہنے والوں کا پٹھو ہو جاتا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ ڈرتا ہے۔ ہم اس کی فطرت سے واقف ہو گئے ہیں تو محتاط بھی رہیں گے اور جوابی کارروائی کے لئے تیار بھی رہیں گے۔"

"اگر اس نے تمہیں پہچان لیا یا معلوم کر لیا تمہارے بارے میں تو وہ تمہارے گرد بہت مضبوط جال پھیلائے گا۔"

"پھیلانے دو۔ ہم نے بہت شکاری دیکھے ہیں۔ چودھری والا اور سے عبدالستار چودھری تک کوئی ہماری راہ میں حائل نہیں ہو سکا اور ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکا کیوں کہ ان خود ساختہ فرعون صفت خداؤں کے مقابلے میں سارے جہانوں کا خدا ہمارا حامی و ناصر نگہبان و پاسبان ہے۔ تم نے اس چیونٹی کی مثال سنی ہے جو آتش فشاں پہاڑ پر چڑھ رہی تھی کہ آتش فشاں میں گڑگڑاہٹ ہوئی۔ چیونٹی نے خود سے کہا' میری بھی کیا بات ہے۔ پہاڑ میرے قدموں تلے کانپ رہا ہے اور گڑگڑا رہا ہے۔ آتش فشاں پھٹا تو راکھ کے کروڑوں اربوں ذرات میں چیونٹی یوں غائب ہو گئی تھی جیسے سمندر میں ایک قطرہ اقلب گم ہو جائے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "اللہ کرے زور بیاں اور زیادہ۔ یہ بتاؤ اس فرعونی سے ملنے کون جائے گا؟ ہمارا آئندہ عمل کیا ہو گا؟"

"ملاقات کے لئے میں جاؤں گا" میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں جاؤں گی" گل نے کہا "میں سب سے زیادہ گمنام ہوں۔ میرا مطلب ہے جتنی شہرت بھائی سکندر' غالب اور محسن کو ملی یا رابعہ باجی اور نازو کو ملی' اس سے میں بچی رہی۔ اس لئے کہ میں پہلے نائک سی تھی اور بہت بعد میں گل بانو بن کے شامل ہوئی۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا" غالب بولا۔

"فرق کیسے نہیں پڑتا۔ خود تم نے میرے اور محسن کے درمیان جس رشتے کو مشتہر کر دیا ہے' اس کے بعد یہ میرا حق بنتا ہے کہ میں محسن کی تلاش میں آگے آگے رہوں۔ یہ بالکل فطری بات نظر آئے گی۔ میں ایک عورت ہونے کا فائدہ بھی حاصل کر سکتی ہوں" گل نے کہا۔

میں مخمصے میں گرفتار ہو گیا۔ گل کی دلیل کو مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور اسے یوں خطرات کی دلدل میں کودنے کی اجازت بھی نہیں دی جا سکتی تھی۔ وہ ہم سب کے مقابلے میں ایک کمزور فریق تھی اور اپنی حفاظت خود کرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔

"تمہارا اکیلے وہاں جانا کسی صورت مناسب نہیں" غالب بولا۔

"میں چلی جاتی ہوں گل کے ساتھ" نازو نے کہا۔

"اور ہم کیا کریں؟ پاؤں میں مہندی رچا کے اور ہاتھوں میں چوڑیاں پہن کے بیٹھ جائیں گھر میں" غالب نے کہا "بڑے شرم کی بات ہو گی۔"

"ایسی تو بہت سی باتیں ہیں جن پر تم کو شرم آنی چاہئے مگر نہیں آتی" نازو نے کہا۔

"تمہیں کیا معلوم مجھے کتنی شرم آتی ہے۔ اس بات پر کہ میرا شوہر ایک بھوت ہے اور وہ بھی خاصا احمق قسم کا۔ شرم مجھے آتی ہے تمہاری عقل پر۔ اور جب تم بدمعاشوں کی طرح غیر مردوں سے مار پیٹ کرتی ہو۔ اور اس وقت جب تم غالب کے شعر کو بازار کے بھاڑ کی طرح پڑھتی ہو۔"

میں نے فوراً مداخلت کی "فیصلہ ہم رات کو کریں گے کہ کون محمد بھائی کے ساتھ جائے گا اور کون ان کے پیچھے حفاظتی دستے کے طور پر چلے گا۔ خطرہ ہے یا نہیں ہے۔ ہے تو اس سے کیسے نمٹا جا سکتا ہے۔ ایسے سب سوالوں کا جواب حالات پر منحصر ہو گا" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "ہمارے پاس نقد رقم بہت کم باقی رہ گئی ہے۔"

"کل جیب کاٹیں گے کسی کی یا ڈاکا ڈالیں گے کسی بینک میں" غالب بولا۔

"حوا سیر ہو گا آخر کب کام آئے گا؟" نازو نے کہا۔

"میری شادی پر" غالب بولا۔

"وہ منحوس سونا ہے" میں نے ہنس کے کہا۔

"شادی کون سی مبارک ہوگی" غالب نے کن انکھیوں سے نازو کو دیکھتے ہوئے کہا "بلا پڑ جائے گی اپنے گلے۔"

نازو نے جل کے کہا "تو کیا ضرورت ہے شادی کرنے کی۔ کچھ اور کر لو۔ خودکشی کر لو۔ لیٹ جاؤ گاڑی کے آگے۔"

www.paksociety.com

"پہلے تم گاڑی تو خریدو" غالب نے آہ بھر کے کہا "پھر یہ بھی کر دکھائیں گے تمہیں۔"

"یہ تم لوگ سنجیدہ باتیں کرتے کرتے پٹڑی سے کیوں اُتر جاتے ہو؟" میں نے جھنجھلا کے کہا "بالکل بچوں کی طرح لڑنے لگتے ہو موقع محل دیکھے بغیر۔ بات ہو رہی تھی سونے کی۔"

"میں سمجھتا ہوں جلدی سونے اور جلدی اٹھنے کی عادت کے بارے میں جو کچھ بزرگوں نے فرمایا ہے وہ ٹھیک ہی ہوگا" غالب سر کھجا کے بولا۔

مجھے ہنسی آگئی "محمد بھائی سے بات کرتے ہیں اگر وہ سونا فروخت کرا دے۔"

غالب نے کہا "یہ کام اے ڈی بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ غیر قانونی کام کو قانون کے رکھوالے سے بہتر کون سمجھتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ بھی ٹھیک ہے۔ چلو میں اسی کو بلوا لیتا ہوں۔ اب میں اور گل جاتے ہیں ہوٹل۔ میں وہیں سے فون کروں گا۔ تم اپنی باقی لڑائی جاری رکھو جو ان اہم معاملات کی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی۔"

"میری کیا مجال کہ نازو سے لڑوں۔ یہ آپ یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے" غالب بولا "یہ خود ہی لڑنے لگتی ہے۔"

نازو نے کہا "میں لڑتی ہوں؟ بات تم کرتے ہو ایسی۔"

"کبھی سچی بات بھی نکل ہی جاتی ہے منہ سے" غالب بولا "اور سچ کڑوا ہی لگتا ہے۔ تم میں حوصلہ ہونا چاہئے سچ کو برداشت کرنے کا۔"

"مجھ میں حوصلہ ہے۔ ایسی کون سی سچی بات ہے جو مجھے بری لگتی ہے؟ لیکن غلط بات نہیں سن سکتی میں۔"

"اس میں کیا غلط بات ہے کہ میرا شوہر بھوت ہے۔ نہایت شریفانہ قسم کا۔ مجھے پٹی پڑھاتا رہتا ہے کہ بیوی کو پاؤں کی جوتی بنا کے رکھو بیٹا ورنہ میری طرح پچھتاؤ گے۔"

جب میں اور گل نکلے تو ان کی باقاعدہ لڑائی کا ایک اور راؤنڈ شروع ہو چکا تھا مگر ابھی ہم مشکل سے چند قدم ہی دور گئے تھے کہ ان کے کھلکھلا کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں قہقہے لگا رہے تھے۔ میرے ساتھ گل بھی مسکرانے لگی۔ ہم سامان کے ساتھ گھوم کے صدر دروازے کی طرف چلنے لگے۔

"بڑا اچھا لگتا ہے.... جب یہ لڑتے ہیں اور پھر ذرا سی دیر میں سب بھول کے ہنسنے لگتے ہیں۔" گل نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "محبت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے سورج کی روشنی کا رنگ جس میں سات رنگ ہوتے ہیں۔ شوخ بھی اور ہلکے بھی۔ وہ بھی جو آنکھ دیکھ سکتی ہے اور وہ بھی جو کسی کو نظر نہیں آتے۔"

"بڑا فرق ہے دونوں کی فطرت اور عادت میں۔ پھر بھی....."

میں نے کہا "گل! غور کرو تو تمہیں فرق نہیں جھلک محسوس ہوگی ان کے درمیان۔ ابھی ایک شعلہ ہے تو دوسرا شبنم۔ پھر کسی لیے یہ پانی ہے تو وہ آگ۔ اسی پر مفاہمت اور تعلق کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ دیکھنے میں نٹ اور بولٹ بالکل الگ لگتے ہیں مگر جب ملے ہیں تو کیا انہیں کوئی طاقت جدا کر سکتی ہے۔ میں ان سے اتفاق نہیں کرتا جو سمجھتے ہیں کہ مزاج اور طبیعت ایک ہوں تو زندگی اچھی گزرتی ہے۔"

گل نے حیرانی سے کہا "کیوں؟ یہ تو ضروری ہے۔"

میں نے کہا "سب کتابی باتیں ہیں۔ اگر دونوں کا غصہ تیز ہو، دونوں ضدی ہوں تو ہار کون مانے گا؟ کون کسے منائے گا؟ دونوں شاعر ہوں گے تو شعر کون سنے گا؟ ایک زیادتی کرے تو دوسرا برداشت کرے۔ ایک فضول خرچ ہو تو دوسرا کفایت شعار۔ ایک عالم مست ہو تو دوسرا دور اندیش۔ پھر زندگی کی گاڑی یکساں رفتار سے اور کسی رکاوٹ کے بغیر رواں دواں رہتی ہے۔"

گل نے کہا "آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ حالانکہ ایسی بات میں نے پہلے کبھی سنی نہیں۔"

"اب ذرا مسکراؤ۔ علی شاہ سمجھے گا ہم لڑ کے آرہے ہیں" میں نے کہا۔

علی شاہ نے مسکرا کے ہمیں خوش آمدید کہا "آپ کا پیغام تو کوئی نہیں آیا سر۔"

"علی شاہ! ایک آدمی کا پتا چلانا ہے" میں نے کہا "اگر وہ مل جائے تو کمرے میں میری بات کرا دو۔"

"نام بتائیں سر۔"

میں نے کہا "وہ سب انسپکٹر ہے۔ چوہدری اللہ دتا۔ یہ معلوم نہیں کہ گھر پہ فون ہے یا نہیں۔ تم تھانے کا نمبر لکھ لو۔ وہاں سے شاید گھر کا نمبر مل جائے۔"

"میں کوشش کرتا ہوں سر۔"

ابھی میں نے کمرا کھول کے سامان رکھا ہی تھا کہ کمرے میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ میں سمجھا کہ علی شاہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہے مگر ریسیور اٹھا کے مجھے مایوسی ہوئی۔ کسی نے فرنچ میں چلانا شروع کیا "آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے کیوں نظر بند کیا گیا ہے اپنے ہی گھر میں۔ کوئی بھی میری سفارتی مراعات تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔"

"میں زیڈی کو تسلیٹ نہیں ہوں تمہارا۔" میں نے فرنچ میں کہا "پھر بھی تمہیں مشورہ دے سکتا ہوں کہ موجودہ حالات میں اپنی مراعات کو بطور حق طلب مت کرو۔ منت سماجت خوشامد سے خیرات میں لے لو۔ یہی ڈپلومیسی ہے۔"

وہ حیران ہو کے بولا "تم..... کون ہو؟"

میں نے کہا "ایک مخلص مشیر۔ دوبارہ اس نمبر پر فون مت کرنا۔ یہ کمرا خالی ہے اب۔"

اے ڈی کا فون اس وقت آیا جب میں غسل کر رہا تھا۔ گھنٹی بجی تو میں نے دروازے سے کان لگا کے سنا۔

گل کہہ رہی تھی "جی آپ دس منٹ بعد فون کر لیں۔"

میں نے دروازہ کھول کے کہا "اس کا فون نمبر لے لو۔ میں خود بات کر لوں گا۔"

گل نے کہا "آپ اپنا نمبر دے دیں جی۔"

دس منٹ سے بھی پہلے میں نے اے ڈی کے گھر کا نمبر ملایا۔ وہ شاید فون سے چپکا بیٹھا تھا کہ پہلی گھنٹی پر ہی ریسیور اٹھایا۔

"خیر ہے نا جناب؟" وہ بولا "اچھی خبر ہے کہ بری؟"

میں نے کہا "خبر کوئی نہیں ہے۔ تم کسی سونے کے تاجر کو جانتے ہو۔ دکاندار نہیں۔ تاجر۔"

"لوجی چوہدری اللہ دتا کو سب سنار جانتے ہیں۔ اپنی ڈیوٹی ادھر تھی تو چھاپے شاپے مارتے تھے۔"

میں نے کہا "یار کسی سے دوستی بھی ہے یا سب دشمن ہیں۔"

"پولیس والوں کا دوست کون ہوتا ہے" وہ بولا "لیکن گل کی اے۔"

"گل اے ہے سر جی کہ ہمارے پاس کوئی سوا سیر سونا ہے جو ہم بیچنا چاہتے ہیں" میں نے کہا "خود تو یہ کام کر نہیں سکتے۔ پکڑے جائیں گے یا سونا خریدنے والا مٹی کا مول لگائے گا۔"

"چھن جی ہم سے لے لو جتنا بیچنا چاہئے۔"

میں نے کہا "میں ادھار کی بات نہیں کر رہا تھا۔"

"چلو سونا ہم خرید لیتے ہیں" وہ نشے میں بولا "ہم تو مٹی بھی سونے کے مول لے سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ کسی سنار کو ساتھ لا سکتے ہو تو ہوٹل میں آجاؤ۔ نام یاد ہے نا میرا؟"

وہ ہنسنے لگا "بادشاہو، کیسی گلاں کرتے ہو۔ تمہارا نام بھی بھول سکتے ہیں ہم آنند کمار ورما۔ تم تو میرے چاچے کے پتر ہو۔ چاچے ہو۔ ماسے ہو..... وہ قوالی ہے نا۔ میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا....."

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ باقاعدہ گا رہا تھا۔ غالباً ہوش میں آجانے کے بعد اس نے احتیاط کی حدود کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پی تھی۔

اس کے باوجود وہ ایک گھنٹے بعد اپنے ساتھ ایک کارٹون لے کر آگیا۔ کارٹون سطح زمین سے پانچ فٹ بلند تھا اور درمیان میں اس کی گولائی بھی اتنی ہی تھی۔ معلوم نہیں توند کے اس گنبد پر دھوتی کیسے ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کا غلاف سر گردن کے بغیر ہی کندھوں پر رکھا ہوا تھا اور نہرو کیپ اس کی پیشانی تک آرہی تھی۔

اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "بندگی سرکار۔"

خوشامدانہ لہجہ۔ غریبانہ مسکینی۔ پُرعیار عاجزی۔ منافقانہ انکساری۔ یہ ہندو بنیے کے وہ ہتھیار تھے جن سے اس نے کاروبار کی دنیا میں مسلمانوں کے قدم نہیں جمنے دیے تھے جو سلطنت گنوا دینے کے بعد بھی اکڑفوں میں رہتے تھے کہ "پدرم سلطان بود" اور آج بھی اپنے ماضی کے کارناموں پر جتنا فخر کرتے تھے اتنا سبق اپنے ماضی کی غلطیوں سے لینا گوارا نہیں کرتے۔

میں نے کہا "لالہ جی تشریف رکھئے۔"

اے ڈی نے کہا "یہ لالہ لاجپت لعل لائی ہیں۔ دہلی، بمبئی اور کلکتہ میں ان کا وسیع کاروبار ہے۔"

لالہ جی پھر مسکرائے "تابعدار ہیں آپ کے جی۔"

میں نے اے ڈی سے کہا "کیا تم نے انہیں ساری بات بتا دی ہے؟"

لالہ جی نے کرتے کے اندر سے ایک پوٹلی سی برآمد کی "حضور، یہ سچے بائیس ہزار ہیں۔ بازار کا بھاؤ دیکھ لیں....."

میں نے کہا "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

میرے اشارے پر گل نے سونے کی پوٹلی اس کے حوالے کر دی "آپ بھی تول لیں.... پرکھ لیں کسوٹی پر۔"

لالہ جی نے ہاتھ جوڑے "اجت دار لوگ ہیں آپ۔ کھوٹ ہوتا ہے غریب کی نیت میں جب وہ ضرورت مند ہوتا ہے۔ سوچتا ہے چار پیسے زیادہ مل جائیں۔ آپ کی جبان کسوٹی ہے۔"

اے ڈی نے کہا "تم اپنی زبان کا خیال رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ مجھے بیچ کاٹنی پڑے؟"

"آپ اپنی جبان سے کچھ نکلے تو جبان نہیں گلا کاٹ دینا۔"

"وہ تو کاٹنا ہی پڑے گا زبان باہر نکلنے کے لئے" اے ڈی نے تھانیدارانہ لہجے میں کہا "اب تم جا سکتے ہو۔ بلکہ دفع ہو سکتے ہو۔"

میں نے کہا "کچھ چائے شربت....."

اے ڈی نے کہا "یہ صرف غریبوں کا خون پیتے ہیں جو یہاں نہیں ملتا۔"

لالہ جی نے ہاتھ جوڑ کے نمسکار کیا اور لڑھکتے ہوئے دروازے سے نکل گئے۔ مجھے اے ڈی کی بداخلاقی پسند نہیں آئی تھی۔

"اس شریف آدمی کے ساتھ یہ سلوک مناسب نہیں تھا۔"

"وہ شریف اسی لئے تھا کہ میں نے اس کے ساتھ صحیح سلوک کیا۔ اس کی شرافت دیکھنی ہے تو اس وقت دیکھو جب یہ کسی حاجت مند بیوہ کا زیور گروی رکھتا ہے" اے ڈی بولا۔

"بہرحال اس نے وقت پر ہماری مدد کی۔"

"خاک مدد کی۔ اس نے بزنس کیا اپنا۔ اسے معلوم ہے کہ بازار کا بھاؤ اس وقت گرا ہوا ہے۔ حالات ٹھیک ہونے پر چڑھے گا تو اس نے اونے پونے ہر ضرورت مند سے جتنا زیور خریدا ہے سب مہنگا بکے گا۔"

گل نے کہا "مسلمان تو تھا ہمارا۔"

"مسلمان بن کے آتا تو مسلمان ہوتا۔ سودا کرنے آیا تھا سودا کر کے گیا۔ اللہ اللہ خیر صلا" اے ڈی نے کہا۔

"ایسا آدمی خطرناک بھی ہو سکتا ہے اے ڈی....."

www.paksociety.com

"خطرناک ہر بندہ نظر آ رہا ہے جب بندہ آپ خطرے میں ہو۔ بندہ اگر کھوہ وچ گر گیا ہے تے اس کو پانی ہی نظر آئے گا باہر طرف" وہ ہنسنے لگا۔

"پھر کیا کریں؟"

"میری مانو تو کھوہ میں سے نکل جاؤ۔ اصل ہوٹل بالکل ٹھیک نہیں۔ خطرہ ہی خطرہ بھرا ہوا ہے اس میں" اے ڈی بولا "پولیس کے مخبر اور سادہ کپڑوں وچ بندے ہر ویلے پھرتے رہتے ہیں۔ کوئی رپورٹ غلط بھی مل جائے تے چھاپا مار دیتے ہیں۔"

"یہاں سے نکل کے کہاں جائیں؟"

ابھی اس نے جواب نہیں دیا تھا کہ باہر شور مچ گیا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا تو مجمع لگا ہوا تھا اور کسی کو کچھ معلوم نہ تھا یا شاید ہر شخص چلا رہا تھا۔ چند سیکنڈ میں چند نوجوان بڑے اشتعال کے عالم میں مجمع سے نکلے اور انہوں نے ادھر ادھر دوڑتے ہوئے لوگوں کو چھرے گھونپنے شروع کئے۔ میری نظروں کے سامنے تین آدمی سڑک پر گر کے تڑپنے لگے۔ ایک چیخ پکار اور بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ لوگ دیوانہ وار چیخ رہے تھے "پولیس پولیس" کچھ محض تماشائی بنے کھڑے تھے۔ چاقو سے راہ گیروں اور تماشائیوں پر حملے کرنے والے غائب ہو چکے تھے مگر نئے لوگ میدان میں اتر آئے تھے اور لڑنے والوں کے دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک گروہ "مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی" کے اصول پر عمل پیرا تھا۔ دونوں فریق مومن تھے مگر سپاہی تھے نہ ان کے پاس تیغ و تبر تھے چنانچہ وہ لاتوں گھونسوں سے ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ نیچے گرا کے کپڑے پھاڑ رہے تھے اور منہ نوچ رہے تھے۔ دوسرے بہت کم فریق ایسے تھے جو مقابلے پر چاقو چلا رہے تھے۔ ابھی تک نہ پولیس آئی تھی اور نہ ملٹری۔ بازار میں افراتفری کا عالم تھا اور کسی معمولی بات پر شروع ہونے والے ہنگامے نے فساد کی صورت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ تماشائی بھی جان بچا کے بھاگنے لگے تھے اور دکانیں بند ہو رہی تھیں۔

پھر میں نے وہ معمولی بات دیکھ لی۔ مجمع منتشر ہوا تو مجھے عین سڑک کے وسط میں لالہ لاجپت علوانی نظر آیا۔ کسی نے اس کا پیٹ پھاڑ دیا تھا اور اس کا خون سڑک پر پھیلتا جا رہا تھا۔ حملہ کرنے والے نے کئی وار کئے تھے چنانچہ لالہ جی کی انتڑیاں تک باہر آ گئی تھیں۔

یہ بڑا کراہیت پیدا کرنے والا منظر تھا مگر میری نظریں لالہ جی کی کھلی آنکھوں والی لاش پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ ناقابل یقین لگتا تھا کہ ابھی مشکل سے پانچ منٹ پہلے یہ شخص زندہ سلامت ہمارے سامنے عجز و انکساری کا پیکر بنا کھڑا تھا۔ اس نے ہمیں بائیس ہزار روپے نقد دئے تھے اور وہ پوٹلی نہ کھول کر بھی ہم نے گنی نہ تولی کہ جس میں سونے کا زیور تھا۔ اسے اپنے ہاتھوں کے لمس پر بھروسہ تھا کہ اس نے سونا ہی اٹھا رکھا ہے "لوہا یا پیتل نہیں اور سونا کسی

صورت سوا سیر سے کم نہیں۔

میں نے کہا "اے ڈی! یہ کیا ہوا؟"

اے ڈی متفکر نظر آنے لگا تھا "وہ تو جو ہونا تھا ہو گیا۔ سوچ آگے کیا ہو گا۔"

"مگر اے ڈی...... کس نے مروایا اسے؟"

"لو جی بندہ ہی مارتا ہے بندے کو۔ چاقو یا پستول خود تو نہیں مارتے نا۔ اب یہ مت پوچھنا کہ بندہ کون تھا۔ جیسے تم نے نہیں دیکھا ایسے ہی میں نے نہیں دیکھا۔"

"کسی کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ لالہ جی کے پاس سوا سیر رہا ہو گا؟" میں نے سوچتے ہوئے افسوس سے سر ہلایا۔

اے ڈی نے کہا "چھوڑو یار۔ اپنی فکر کرو۔ تم نکلو یہاں سے۔"

گل نے کہا "یہ سونا واقعی منحوس تھا۔ ابھی پتا نہیں اور کس کس کی جان لے گا۔"

میں نے کہا "شکر کرو ہمارے پاس سے گیا۔ اب منحوس تھا یا مبارک تھا، ضرورت میں ہمارے کام آ گیا۔"

اے ڈی نے کہا "لو وہ پولیس بھی آ گئی۔"

میرے کانوں نے ایک سائرن سنا "کوئی پولیس کو ضرور بتائے گا کہ لالہ جی اس ہوٹل سے برآمد ہوئے تھے۔ پھر وہ علی شاہ سے پوچھیں گے اور علی شاہ انہیں سیدھا یہاں بھیج دے گا۔"

"تم اپنا سامان چیک کرو۔ ثنا فٹ۔ وہ تیرے بندے کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "نیچے سرونٹ کوارٹر میں۔"

"ان کو بھی ساتھ لو اور پہنچ جاؤ میرے گھر۔ میں جاتا ہوں ورنہ سب سے پہلے میں ہی پکڑا جاؤں گا۔" اے ڈی نے کہا "اگر دیکھ لیا ہے نا تم نے۔ میں نہ ملوں تو تم خود دروازہ کھول لینا۔"

"کیوں؟ تم یہاں سے کہیں اور جاؤ گے؟"

"میری ڈیوٹی کا ٹائم ہو گیا ہے یار۔ شام کی ڈیوٹی ہے آج۔ کوئی بندوبست کروں نا اپنا۔ کوئی گواہی ہو کہ میں تو چار بجے تھانے میں ہوں۔ ابھی بجے ہیں پانچ۔ تم پانچ منٹ میں نکل جاؤ" بولا اور دروازہ بند کر کے نکل گیا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو گل کانپ رہی تھی "بھائی صاحب اللہ وتا ٹھیک کہتا ہے۔ علی شاہ نے بھی دیکھا ہو گا لالہ جی کو۔ اور پتا نہیں کس کس نے دیکھا ہو گا۔"

میں نے کہا "تم سامان کے ساتھ چلو۔ نیچے سے کسی بوائے کو بلا لو۔"

"میں...... اکیلی؟"

"ہاں۔ سامان ٹیکسی میں رکھو اور گھوم کر پیچھے آ جاؤ۔ میں ادھر سے جمپ کر کے پہنچتا ہوں۔"

گل نے فون اٹھایا "ہیلو۔ دیکھیں کسی بیل بوائے کو بھیج دیں" میں نے کہا "گھبراؤ نہیں۔ میں جا کے صورت حال کو

غالب اور ناز کے ساتھ سامان اٹھا کے پیچھے پہنچتا ہوں۔"

گل زرد تھی مگر اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک بیل بوائے نظر آیا "آپ نے بلایا صاحب؟"

میں نے کہا "بیگم صاحب کو جانا ہے۔ ان کا سامان لے جاؤ۔"

بیل بوائے نے کہا "یس سر" اور اندر چلا گیا۔

میں اطمینان سے نیچے اترا۔ حسب توقع علی شاہ نیچے موجود تھا اور اس نے بڑی خوش اخلاقی سے مجھے گڈ ایوننگ کہا۔

میں نے کہا "علی شاہ! یہ باہر کیا ہنگامہ ہے؟"

"ہوتا رہتا ہے سر۔ ابھی پولیس یا ملٹری آ جائے گی تو سب کو پکڑ لے گی۔ بدمعاش بچ کے نہیں۔"

میں نے کہا "میں ذرا مارکیٹ تک جا رہا ہوں۔"

علی شاہ نے کہا "ابھی...... میرا مشورہ مانیں تو کچھ دیر بعد جائیے یہ ہنگامہ ختم ہو جائے۔"

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی "مجھے بہت ضروری کام تھا۔"

اسی وقت گل نیچے اتری اور میں نے اسے ہاتھ ہلا کے خدا حافظ کہا۔

"آپ کی مسز کہیں جا رہی ہیں؟" علی شاہ بولا۔

"ہاں۔ ان کی فلائٹ ہے دہلی کے لئے۔ میرا تو کچھ پتا نہیں اب تک رکنا پڑے۔ عورتوں کو گھر کی فکر ہو جاتی ہے۔ میں تو اسے ایئر پورٹ پر سی آف کرنے بھی نہیں جا سکتا۔"

"ایئر پورٹ تو بند ہے سر۔"

"میرا مطلب تھا ملٹری ایئر بیس۔ اسے میں نے ایک ہیلی کاپٹر میں لفٹ کرا دیا ہے۔ میرا ایک کنٹیکٹ تھا میجر جگجیت کے ساتھ۔ کیا کہا؟" میں نے کہا "ادھر تو بہت گڑبڑ ہے۔"

"آپ ایسا کریں پیچھے سے نکل جائیں۔ نالی سے ہو کے سرونٹ کوارٹرز کی سائیڈ سے" علی شاہ نے مشورہ دیا۔

"یہ ٹھیک ہے" میں نے کہا "تھینک یو۔"

سرونٹ کوارٹر میں پہنچنے تک مجھے دھڑکا لگا رہا کہ اچانک علی شاہ کی بلوائی تجارت میں یا اشوک کے ساتھ پولیس نہ آ گئی تو بلوائی آیا میں فرار ہونے سے پہلے ہی میں پکڑا جاؤں گا۔ جب معلوم ہو گا کہ میں کوئی سیکریٹری ہوں نہ آنند کمار ورما بلکہ سکندر بخت ہوں تو پھر لالہ جی کے قتل کے مشتبہ افراد کی فہرست میں میرا نام سب سے اوپر ہو گا۔

غالب اور ناز پتا نہیں کس بات پر ہنس رہے تھے۔ میری صورت دیکھ کے ان کی شکل پر بھی بارہ بج گئے۔

"خیریت تو ہے؟ اکیلے آئے ہو؟ گل کہاں ہے؟"

میں نے کہا "گل نکل گئی۔ اب ہمیں نکلنا ہے فوراً۔ بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ذرا بھی دیر کی تو مارے جائیں گے سب" میں نے کہا "سامان اٹھاؤ اور بھاگو۔"

سامان ایک سوٹ کیس کے سوا کیا تھا۔ وہ غالب نے اٹھایا اور چند منٹ میں ہم دیوار پھاند گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت اشوک نمودار نہیں ہوا ورنہ شور مچا دیتا۔ اس کے چنگل میں گیسٹ معاوضہ ادا کئے بغیر فرار ہو رہے تھے۔

باہر آ کے میں نے غالب سے کہا "تم ادھر جاؤ۔ میں دوسری طرف جاتا ہوں۔"

غالب نے کہا "اچھا خدا حافظ۔ دنیا واقعی گول ہے اور ہم ناک کی سیدھ میں چلتے رہے تو دوسری طرف ملیں گے۔ جہاں ہم کھڑے ہیں اس کے بالکل نیچے کسی جگہ۔"

میں نے کہا "گل آئے گی ٹیکسی میں۔ ادھر سے یا ادھر سے۔ اس کو روک لینا۔ ناز کو اپنے ساتھ رکھو۔"

گل کے نمودار ہونے تک میں نے انتظار کے چند منٹ پُر اضطراب خوف آمیز انتظار میں ہر سمت سے وسوسوں اندیشوں کا حصار تنگ ہوتا محسوس کیا۔ میرے دل میں ایک ایسی بے کلی تھی جس میں اپنی چھٹی حس کی شرارت بھی سمجھ سکتا تھا۔ نہ جانے کیوں یقین نہیں آتا تھا کہ لالہ کا قتل کسی بے رحم اتفاق کا نتیجہ تھا اور کسی نے اس کی تحویل میں سوا سیر سونے کا راز فاش ہو جانے کی وجہ سے اس کی جان لے لی تھی۔ لالہ بے وقوف نہیں تھا کہ ایسے حالات میں سونے کو اچھالتا ہوا جاتا۔ اگر یہ ذاتی دشمنی کا نتیجہ تھا جو پہلے سے چلی آ رہی تھی تو اس دشمن نے دیدہ و دانستہ پرانے قرض کا حساب چکانے کے لئے وقت اور جگہ کا تعین کیا۔ خون کا حساب تھا تو بے باق ہوا اور لین دین کا جھگڑا تھا تو وہ بھی ختم ہوا۔ لالہ جیسے لوگوں کے دشمن ضرور ہوتے ہیں مگر اس سے زیادہ دشمن ہمارے تھے۔ کہیں انہوں نے ہمیں زیر دام لانے کے لئے تو یہ انتظام نہیں کیا تھا کہ ایک تیر سے دو شکار کرلئے جائیں۔ لالہ جی کے قتل کے الزام میں قانون کے ہاتھ ہم کو دھکیل کر تختہ دار کی جانب لے جائیں۔ لیکن دست قاتل پر لہو کی سرخی کوئی نہ دیکھے۔ وہ سوا سیر سونے کو خدمات کا معاوضہ قبول کرتے ہوئے اپنی کامیابی کے جشن منانے کے لئے آزاد ہوں۔ وہ سونا واقعی منحوس تھا۔ میں نے سوچا مگر پھر اس خیال کو اپنے پریشان ذہن کی پیداوار سمجھ کر خدا سے توبہ کی۔ اچھا برا نیکی بدی یا زندگی اور موت اگر اس کے حکم اور اس کی قدرت کاملہ سے ہے تو بندہ اپنے افعال و کردار کو ظاہر سے کیوں منسوب کرے۔ کیا پتا اس میں بھی کاتب تقدیر نے کوئی مصلحت پوشیدہ رکھی ہو۔

گل دوسری سمت سے نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر غالب اور ناز بھی بیٹھے تھے۔ ٹیکسی میرے قریب آ کے رکی اور میرے بیٹھتے ہی چل پڑی۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے پیچھے دیکھا تو ان سب کے اترے ہوئے پُرخوف چہرے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ نگاہوں کی زبان میں انہوں نے مجھے محتاط رہنے اور سوال یا تبصرہ کرنے سے منع کر دیا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور سے بھی میں نے کوئی بات نہیں کی۔ اسے کہاں

www.paksociety.com

جاتا ہے یہ پہلے ہی اس کے علم میں تھا ورنہ وہ از خود دائیں بائیں موڑ کاٹنے سے پہلے پوچھتا کہ اب کدھر جانا ہے۔ ٹیکسی انٹرکان ہوٹل کے سامنے رکی اور غالب نے اسے سو کا نوٹ دے کر رخصت کیا۔ اس میں ٹپ کا عنصر غالب تھا۔ کرایہ بہت کم بنتا تھا مگر بیان کی کشیدگی کو بڑھانے کے لئے ڈرائیور نے ہمیں نہ سلام کیا اور نہ ہمارا شکریہ ادا کیا۔ اس نے گل اور نازو پر آخری نظر کی اور بے زار صورت پر نفرت کے جذبات نمایاں کرکے چلا گیا۔

میں نے کہا "اس الو کے پٹھے کو کرایہ دے کر باقی ایک ایک پیسہ وصول کرنا تھا۔"

غالب نے کہا "وہ میں نے وصول کرلیا ہے" اور مجھے ایش ٹرے دکھائی جو اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے نکال لی تھی "کیا یاد رکھے گا۔"

گل نے کہا "آپ کو پتا ہے......"

غالب نے کہا "ہم یہاں کھڑے رہ کے باتیں نہیں کرسکتے۔ اندر چلو۔"

ہم رسماً اندر گئے اور دو ٹوک انکار سن کے واپس باہر آگئے۔ حسب توقع نہ وہاں کوئی کمرا خالی تھا اور نہ ہونے کی امید تھی۔ ملنے کا رویہ بھی ایسا تھا جیسے ہم نے یہ سوال کرکے بھی ناقابل معافی جرم کیا ہو۔ ہم خود فوراً باہر نہ آتے تو شاید دھکے دے کر نکالے جاتے۔ میرا غصہ اور بڑھ گیا۔ عام آدمی کا رد عمل شدید جذباتی تھا اور اس کے پس منظر میں حالات کا اور کچھ اس پروپیگنڈے کا اثر تھا کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والا ہر شخص استحصالی، جابر اور ظلم کی فرد جرم رکھتا ہے اور ایک جارح کی حیثیت سے جارحانہ طرز عمل کا مستحق ہے۔

"ہماری یہاں ایڈوانس بکنگ تو نہیں تھی کہ ایسے سامان اٹھا کے آگئے" میں نے کہا۔

"یہ اپنے دفاع کو مضبوط بنانے کی سیاسی حکمت عملی کا اظہار تھا" غالب نے کہا "اب چلو جہاں سینگ سمائیں۔"

"سینگ کس کے سر پر ہیں" نازو نے کہا۔

"سب کے سر پر۔ اسی لئے تو ہم ہر جگہ نمایاں ہیں" غالب بولا۔

سامان فٹ پاتھ پر رکھ کے غالب ٹیکسی والوں سے مذاکرات کرنے گیا اور مسکراتا ہوا لوٹا۔ ٹیکسی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد کی لگتی تھی اور اسے مہاراجہ بہ نفس نفیس چلا بھی رہے تھے۔ ڈرائیور کی صورت مہاراجہ رنجیت سنگھ کی اس تصویر سے بہت ملتی تھی جو میں نے تاریخ کی غیر مستند کتابوں میں دیکھی تھی۔ اس کی ایک آنکھ بھی نہیں تھی۔ مہاراجہ سے ان گنت لطیفے منسوب تھے اور ٹیکسی ڈرائیور بھی کسی لطیفے سے کم نہ تھا۔

اس نے ہمیں دیکھ کر ایسی خوشی کا اظہار کیا جیسے ہم اس کے برسوں سے بچھڑے ہوئے سسرالی عزیز ہوں۔ گفتگو ست سری اکال سے آغاز ہوئی اور ٹھیٹھ پنجابی میں ہوئی۔ سردار جی ہر کس و ناکس کی والدہ و ہمشیرہ کی ذات کو کسی دشنام میں لپیٹ لیتے تھے اور انہیں قطعی احساس نہ ہوتا تھا کہ پیچھے "زنانیاں" بھی ہیں۔

غالب نے کہا "سردار جی! کوئی ایسی جگہ جا کے جہاں ایسا نہ لگے کہ ہمارے چاروں طرف پاگل کتے غرا رہے ہیں۔"

"آپ فکر ہی نہ کرو جی" وہ بولے "میں سب سمجھتا ہوں...... جی۔ لیکن ہمارے آپ کے درمیان پیار ہے۔ دو بار میں ننکانہ صاحب گیا ہوں۔ حسن ابدال میں پنجہ صاحب میں جہاں گیا آپ کے لوگوں نے مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا، عزت دی اور بڑی خاطر مدارات کی۔ آپ کی حکومت نے ہم سے وہ سلوک نہیں کیا جو خود ہماری حکومت یہاں کرتی ہے۔ آپ میرے مہمان ہو۔ کسی...... کی مجال ہے جو آپ کی طرف نظر بھر کے دیکھے۔ سوں واہگورو کی۔ کرپان سے...... پھاڑ دوں گا۔"

میں نے کہا "کچھ پتا بھی چلے تم کہاں لے جا رہے ہو۔"

"ہے ایک جگہ۔ میری بوہٹی رہتی ہے وہاں۔ جو پنجابی ہو مجھے اپنا باپ کہتے ہیں۔ پتا نہیں...... میں بھی کہ نہیں۔ اپنا ہی سمجھ کے پال رہے ہیں۔ بوہٹی تو اچھی ہی ہے...... کہ یہ مدھوبالا تو اس کی نقل ہے۔"

"وہ خفا تو نہیں ہوگی کہ یہ جلوس کہاں سے لے آئے؟"

"خفا ہوگی! زبان سے چوں بھی کرے تو...... کی زبان کاٹ کے ہتھیلی پر رکھ دوں۔ پاگل کتے کی زبان لگا دوں اس کی جگہ۔ بولتی نہیں گالی ہے۔ پھر بھونکتی رہے گی......"

سردار جی کی باتوں پر سب ہنس رہے تھے اور شاید کیفیت پہلے جیسی نہ رہی تھی جو لالہ جی کے قتل کے بعد فرار ہوتے وقت تھی۔ سردار جی رہتے بھی ڈھاکا کی آبادی میں تھے مگر دیکھ تو ان کا گھر کشادہ تھا۔ ان کی بے حد موٹی بیوی کا دل اس سے زیادہ کشادہ تھا۔ ننکانہ صاحب اور پنجہ صاحب کی زیارت کے سفر میں وہ بھی سردار جی کے ساتھ گئی تھیں اور پاکستانیوں کے جذبۂ مہمان نوازی سے بے حد متاثر تھیں۔ انہوں نے اپنی بہلہ پیداوار کو ہانک کر ایک کمرے میں منتقل کیا اور ہمارے حوالے کردیا کہ جب تک دل چاہے رہو۔ ڈھاکا کی تنگی نے کشادگی کا مفہوم بھی بدل دیا ہے۔ یہ کوئی ہزار گز پر محیط جگہ نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ سو مربع گز پر...... والے تین کمرے تھے۔ صحن میں اتنے سوراخ تھے کہ ہر سوراخ سے کوئی ستارہ نظر آتا رہا اور میں یہ محسوس کرتا کہ کھلے آسمان کے نیچے سو رہے ہیں۔ جب اچانک بادل...... ہم سب نے شاور کا لطف لیا۔ اس کے باوجود...... فضا نے سب کو آسودگی فراہم کی تھی اور کھانا کھا کے......

بجے تھے۔

کھانا دال چاول پر مشتمل تھا جس کے بعد سویٹ ڈش کے طور پر زردہ پیش کیا گیا تھا۔ سردار جی نے بے تکلف پاؤ بھر زردہ کھانے کے بعد کہا "نیک بخت! گل کے لئے کچھ مت بچا۔ مہمانوں کے سامنے رلا کے رکھ۔"

نیک بخت نے کہا "مہمانوں کو مت بدنام کرو۔ سب نے مل کے اتنا...... بھی نہیں کھایا ہوگا۔ آدھا سیر تم کھا گئے۔"

"کیسی جھوٹی عورت ہے......" سردار جی نے ڈھٹائی سے کہا۔ "ایک پھانک کی ڈلی سامنے رکھی تھی۔ زیادہ سے زیادہ آدھی کھائی ہے......"

"کچھ خیال کرو اپنا۔ شکر کی بیماری ہے تمہیں۔"

"شکر کہاں کھائی ہے۔ گڑ کی بیماری ہوتی تو گڑ سے پرہیز کرتا۔ میرا کھانا اچھا نہیں لگتا تجھے" سردار جی بولے۔

"اتنا زہر ہے تمہارے لئے۔"

"اتنا زہر تو خود بھی ہے تو۔ جا چلی جا" نہیں تو تجھے بھی اباؤں گا......" سردار جی نے کہا۔

رات گیارہ بجے کے قریب میں نے کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کرکے آنکھیں کھولیں تو نازو نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اندھیرے میں وہ کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں باہر آیا تو اس کا ڈھیلا ڈھالا لباس اور بدلا ہوا حلیہ دیکھ کے حیران رہ گیا۔

اس نے چارپائی پر پڑی ہوئی گھیردار شلوار کرتے کی طرف اشارہ کیا "یہ پہن لو۔ میں سردار جی کی پگڑی چرا کے لاتی ہوں۔"

میں نے سر پکڑ لیا "پگڑی چراؤ گی۔ ان کی خواب گاہ میں جا......"

میری بات کو اہمیت دیئے بغیر وہ اندر گھس گئی۔ میں نے غسل خانہ کہلانے والے دڑبے میں گھس کے کپڑے بدلے۔ تنگی میں میرا سر دو بار چھت سے لگا اور میری کہنی کئی بار دیوار سے ٹکرائی۔ سر پر پگڑی سجا کے میں بالکل سکھ بن گیا۔

"تم سو فیصد سکھ نظر آرہے ہو۔ دماغ کو بچا کے رکھنا کہیں بارہ نہ بج جائیں" نازو ہنسی۔

"سرداروں کے تینوں دن کے بارہ بجے ہوتے ہیں" میں نے کہا "لیکن ابھی تو کسی کی موت نہیں لگ رہی ہو مس نازلی۔"

"پھر کیا لگ رہی ہوں؟" وہ متفکر ہوگئی۔

"کسی بھوت کی بچی" میں نے کہا اور اسے خفا ہونے کا موقع دیئے بغیر باہر لے گیا۔ ابھی تک نہ اس نے مجھے بتایا تھا نہ میں نے اسے پوچھا تھا کہ ہمیں یہ بھیس بدل کے کہاں جانا ہے۔ ہمیں محمد سے ملنے کے لئے واپس ہوٹل شاہ باغ جانا تھا۔ اس نے بارہ بجے کے بعد ہمیں عبدالستار چودھری سے ملوانے کا وعدہ کیا تھا چناں چہ اس وقت سے پہلے وہاں موجود ہونا ضروری تھا۔ ہم خاموشی سے باہر آگئے۔

"کچھ دیر ہوگئی ہے" نازو بولی "محمد بھائی واپس نہ لوٹ جائیں۔"

میں نے کہا "اب ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ گھڑی دیکھ کے ٹھیک بارہ بجے چلا جائے۔"

نازو بولی "وہ اس سے پہلے ہی مایوس ہو کے واپس جا سکتا ہے، جب اسے بتایا جائے گا کہ وہ کان اپنی جھاڑ گئے۔"

"پھر محمد بھائی کو ہم تلاش کریں گے اور وہ ایسی چیز نہیں ہے جو کھو جائے تو پھر نہ ملے" میں نے کہا "یہ تو بتاؤ ہم جائیں گے کیسے۔"

نازو ہنسی اور اس نے مٹھی میرے سامنے کھول دی "تم گاڑی چلانا بھولے تو نہیں ہوگے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "تم ٹیکسی کی چابی بھی چرا لائی ہو؟"

"ہاں۔ پگڑی میں تھی" وہ بولی "زیادہ تلاش نہیں کرنی پڑی۔"

"میزبان کے گھر میں چوری! واللہ۔ اللہ تمہیں معاف کرے" میں نے ہنس کے کہا "اور مجھے تمہارا ساتھ دینے پر......"

ٹیکسی تنگ گلی کے آخر میں کھڑی تھی۔ میں نے اسے اسٹارٹ کیا تو اس نے بیک فائر کیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں کوئی اسے فائر کی آواز سمجھ لیتا تو ساری بستی جاگ اٹھتی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ دہائی دیتے کہ مہمان ہی اسے لوٹ کر لے گئے تاہم تفتیش پر مشتبہ مہمانوں کا ایک جوڑا حوالۂ پولیس کرنے کے لئے دستیاب ہے۔

دوسری بار میں انجن شرافت سے رواں ہوگیا تو میں نے کہا "اب دعا کرو کہ ہم صراط مستقیم پر چلیں اور وہیں پہنچ جائیں جہاں ہم کو پہنچنا ہے۔ اے بلدیاتی راہنمو۔ بھٹک گئے تو......"

نازو نے کہا "کیا تمہیں راستہ یاد نہیں رہا؟"

"اگر تمہیں یاد ہے تو رہنمائی کرتی جاؤ۔"

"مجھے یاد ہے۔ بس سیدھے ہوٹل شاہ باغ چلو۔" نازو بولی۔

"سیدھا تو راکٹ بھی نہیں گزر سکتا۔ راستے میں سیکڑوں دیواریں حائل ہوں گی۔ کہو تو اڑا کے لے جاؤں؟" میں نے کہا۔

گیارہ بجے بھی سڑکوں پر ویرانی تھی۔ جنگ و جدال اور فساد و خونریزی سے ڈرے ہوئے لوگ جلد گھروں میں بند ہو جاتے تھے۔ تفریح گاہیں اور بازار جو آدھی رات کے بعد بھی آباد نظر آتے ہوں گے اجاڑ پڑے تھے اور سڑکوں پر پولیس یا ملٹری کی گاڑیوں کے علاوہ بہت کم گاڑیاں تھیں۔ ہمیں بھی دو جگہ چیک کیا گیا مگر نازو کے جواب نے انہیں مطمئن کردیا۔ ایک جگہ تو وہ گرم ہوگئی کہ کیا شہر میں کرفیو نافذ کردیا گیا ہے۔ نہیں تو پھر ہوٹل شاہ باغ جانے والوں سے یہ سوال کرنا چہ معنی دارد کہ وہاں کیوں جا رہے ہو۔ جو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہوں وہ ہوٹل نہیں جائیں گے تو کیا تھانے

www.paksociety.com

جائیں گے۔

کئی جگہ ہم ہوٹل کا راستہ پوچھنے پر مجبور ہوئے اور اس سے پہلے کہ کوتوال سامنے آ کے چور سے پوچھتا کہ جاتے ہو کس طرف کو کدھر کا خیال ہے۔ چور نے خود کوتوال سے پوچھ لیا کہ جاؤں کدھر کو میں؟ پولیس والوں نے ہی ہمیں راستہ سمجھایا۔

ٹیکسی کو ہم نے گیٹ کے سامنے کھڑی ہوئی ٹیکسیوں سے کچھ فاصلے پر روک لیا جہاں سے ہم دونوں جانب نظر رکھ سکتے تھے۔ محمد بھائی ایسی چیز نہیں تھا کہ نظر سے اوجھل رہ سکتا۔ میرا خیال تھا کہ اس کا چھ فٹ سے زیادہ قد اوسطاً پانچ فٹ کے بنگالیوں میں نمایاں نظر آئے گا مگر نازو نے کہا کہ اس کی بڑی بڑی مونچھیں پہلے نظر آئیں گی لیکن ہم دونوں کے اندازے غلط ہو گئے۔ محمد بھائی نے ساڑھے گیارہ بجے ٹیکسی میں منہ ڈال کے کہا "السلام علیکم" تو میں اور نازو اچھل پڑے۔ وہ پیچھے سے آ گیا تھا۔

میں نے کہا "تم... تم نے دیکھ لیا ہمیں؟"

نازو نے کہا "تم کیسے...؟"

پیچھے بیٹھتے ہوئے وہ مسکرایا "اپن فون کیا تھا۔ کوئی سالا حرامی بولا کہ وہ آنند کا روما ایک دم فرانس مرڈر کر کے بھاگ گیا۔ اپن بولا کہ دارو پی کے کاہے کو بکتا ہے ادھر۔" وہ بولا "..... خیر چھوڑو۔ یہ کیا لفڑا ہے؟"

میں نے ٹیکسی چلاتے ہوئے کہا "پہلے تم بتاؤ کہ تم سیدھے نازی طرف آ گئے تھے؟"

"بابا اپن ایک دم الو بھی نہیں ہے۔ جب ہم کو معلوم ہوا کہ تم بھاگ گیا ہے تو ہم سوچا اب تم کدھر جاوے۔ پھر عقل ہم کو بولا کہ سالا تم ایک دم بدھو۔ تم کاہے کو ادھر ادھر بھٹکے گا۔ وہ خود آ جائے گا تم پر لیکن چھپ کر آئے گا۔ اپن ابھی کی دیکھتا پڑا تھا۔ پیچھے سے گزرا تو ایک ٹیکسی میں کھیلا تھا۔ اف کرتا اپن سمجھ لیا۔ ایک چھوکرا اور ایک چھوکری نوک ادھر کیا کرتا پڑا ہے۔ یہ دیکھنے کا واسطے آیا تو تمہارا شکل دیکھا۔ تم ابھی ایک دم سردار لگتا ہے کیا؟"

"اور یہ؟" میں نے نازو کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ سردارنی۔ سکھ کا بی بی" وہ بولا "ابھی ناراض نہیں ہونے کا۔ تمہارا بی بی لوگ کا ہونا ایک دم خطرناک ہے کیا؟"

نازو کچھ شرمائی۔ میں نے کہا "خطرناک کیسے؟"

"بابا جو ایک بار دیکھے گا دیکھتا رہ جائے گا۔ بھول نہیں سکتا۔ یہ خطرناک بات ہے کہ نہیں؟ اگر تم ہمارا بات مانے تو تم ہونے کا کہ اپنا بی بی کو اس سالا حرامی ستار چودھری کا سامنے مت لے جاؤ۔"

میں نے کہا "یہ میرا بی بی لوگ نہیں ہے۔"

"اچھا! پھر کون ہے؟" محمد بھائی کان کھجا کے بولا۔

"بتا دو کہ کالی ہے" میں نے بتایا "اپن اکیلا ہے۔"

"تمہارا ایک بھی نہیں ہے۔ آدھا بھی نہیں ہے کیا؟"

میں نے ہنس کے کہا "ایک ہے تو سہی مگر وہ بہت دور لاہور میں ہے۔"

"ابھی یہ مرڈر کا کیا لفڑا ہے؟ تم کسی ہندو کو مارا؟"

میں نے اسے ساری بات بتائی۔ وہ بڑے غور سے سنتا رہا۔ "ابھی یہ ایک دم گھپلا ہے۔"

"کیسا گھپلا؟" میں نے کہا۔

"سازش۔ کوئی تم کو پھنسایا۔ پھانسنے کا کوشش کیا۔"

میں نے کہا "محمد بھائی! تم تو بڑے ذہین ہو۔ یہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا مگر سوال یہ ہے کہ وہ کون ہو سکتا ہے؟"

"وہی سالا حرامی اے ڈی۔ اور کون۔ اپن شرط لگاتا ہے، اپن مونچھیں صاف کروا دے گا ایک دم....."

میں نے کہا "شک کی بنیاد پر اتنی بڑی شرط مت لگاؤ۔"

"اپن جانے گا" وہ بولا "ابھی گاڑی ادھر روکو۔ ہمارا ساتھ صرف تم جائے گا۔ کیا؟"

میں نے گاڑی روک دی اور نازو سے کہا "تم میرا انتظار کرو۔"

"کتنی دیر تک؟"

"جب تک میں واپس نہ آؤں" میں نے کہا "یہ تم... میرا۔"

نازو نے کہا "ایک گھنٹہ۔ اس کے بعد ایسی کی تیسی تمہارے حکم کی۔"

"کیا کرو گی؟ آخر تم ٹینک لے کر اندر گھس جاؤ گی۔ عقل کی کوئی چیز اگر ہے تمہارے پاس تو وہ ٹینک سے زیادہ کارآمد ہو سکتی ہے۔ میں واپس کیوں نہیں آؤں گا آخر؟ محمد بھائی ساتھ جا رہا ہے۔ یہ تو واپس آئے گا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو تمہیں بتا دے گا۔"

"ایسا ویسا کوئی بات نہیں ہوگا" محمد بھائی نے اپنی مونچھ پر بل دے کر کہا۔

"بہ فرض محال میں نہ آیا تو تم واپس چلی جاؤ گی خاموشی سے ورنہ گل اور غالب کو کیسے پتا چلے گا کہ ہم پر کیا بیتی۔ اور ہو سکے تو انہیں بند کرا دیں گے ٹیکسی کی چوری کے الزام میں۔"

نازو نے سر ہلایا اور کہا "اچھا۔ جاؤ۔ خدا حافظ۔"

میں اور محمد بھائی کچھ دور پیدل گئے۔ پھر ایک گیٹ کے سامنے محمد بھائی رک گیا۔ اس علاقے میں سب عالی شان کوٹھیاں تھیں جن کے آہنی بھاری بھرکم مضبوط اور بارعب گیٹ تھے، پر لائٹس نصب تھیں اور چوکیدار اندر موجود بیٹھے تھے۔

محمد بھائی کی دستک پر چوکیدار نے گیٹ میں چھوٹی سی کھڑکی سے سر نکال کے باہر دیکھا اور پھر بند کر دیا۔ چند منٹ انتظار کے بعد محمد بھائی نے گیٹ پر لات ماری۔ کھڑکی کے چوکھٹے میں

نظر آیا مگر اس بار بندوق کی نال کے پیچھے۔

"کیا بات ہے؟ تمہارا نظر اتنا کمزور ہے کہ تم کو محمد بھائی نظر نہیں آتا؟ چھوڑو یہ نوکری چھوڑ دو۔ بیٹھو سڑک پر اور بھیک مانگو۔ اللہ کا بندہ عالی شان کو چار آنہ" محمد بھائی نے بندوق کی نال کو حقارت سے پیچھے کر دیا۔

چوکیدار نے کہا "اندھا تم سالا۔ ہم کسی محمد بھائی کو نہیں جانتا۔"

"پھر جا کے اپنا باپ کو بولو۔ وہ جانتا ہے۔ اسی نے بلایا ہے ہم کو اس وقت۔" "نہیں جائے گا تو ہم تمہارا بندوق کا نال میں گھس کے گولی کا مالک۔ اور تمہارا...... میں گھس جائے گا۔"

چوکیدار اپنی بندوق سمیت غائب ہو گیا۔ غالباً اس نے اپنے مالک چوہدری سے رابطہ قائم کیا اور اجازت ملنے پر دروازہ کھول دیا۔

اس سے پہلے کہ محمد بھائی اسے قتل کرتا چوکیدار نے اس سے ہاتھ جوڑ کے کہا "معاف کرنا محمد بھائی! ادھر جو آتا ہے اپنا مالک ہے۔"

"اور تم بعد میں اپنا مالک سے معافی مانگ کے جان بچاتا ہے۔ ہم بھی معاف کیا" محمد بھائی نے کہا "لیکن اپن ایک بات بولتا ہے۔ جس دن کوئی الٹا کھوپڑی والا آئے گا اور وہ تم کو معاف نہیں کرے گا۔"

چوکیدار نے دانت نکال کے کہا "ایک آیا تھا۔ چھ مہینے پہلے۔ قیامت کے انتظار میں لیٹا ہے کہیں۔ دنیا سے ایک دم غائب ہے۔ ابھی جاؤ۔"

میں نے محمد بھائی کو کھینچ لیا۔ محمد بھائی بہت بڑا بدمعاش تھا۔ اسے طاقت پر ناز تھا مگر اس کے مقابل جو شخص تھا وہ جانتا تھا کہ اس کی کھال کے سامنے کوئی الٹی کھوپڑی والا بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ اسے ناز تھا عبدالستار چوہدری کی طاقت پر اور اس اختیار پر جو عبدالستار چوہدری نے بندوق کے ساتھ ہی دیا تھا۔ دبلا پتلا ہونے کے باوجود چوکیدار ہی زیادہ طاقت ور تھا کیوں کہ وہ اپنے ہاتھ میں ان کی لگام رکھنے والے مالک کا غلام تھا۔

غربت، بے روزگاری، خانہ جنگی اور انتشار کی سیاست سے مارے ہوئے بھوکے عوام کا لیڈر جتنا بڑا تھا اتنی ہی بڑی کوٹھی میں رہتا تھا۔ اتنی ہی بڑی کار میں گھومتا تھا اور اتنی ہی بڑی دولت کا خزانہ رکھتا تھا۔ عبدالستار چوہدری کی وسیع و عالی شان کوٹھی کے احاطے میں اس وقت بھی درجن بھر کاریں کھڑی تھیں۔ کئی منتظر تھے اور ملاقات کے خواہاں ضرورت مند اس کی نگاہ التفات کے انتظار میں صبر کے ساتھ ذلت برداشت کر رہے تھے۔

میرا خیال تھا کہ اس ہجوم میں میری باری شاید صبح ہوتے ہی آئے گی۔ ہمیں ایک ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا جہاں دیوار کے ساتھ لگے صوفوں پر بہت سے اکڑی ہوئی گردنوں والے پہلے

سے موجود تھے۔ انہوں نے مجھے بے نیازی اور ناپسندیدگی سے دیکھا مگر محمد بھائی کی مونچھوں کی دہشت کے باعث خاموش رہے۔ یہ خواص کی انتظار گاہ تھی۔ میں عوام جیسا لگتا تھا چنانچہ مجھے باہر برآمدے میں یا فرش خاک پر اپنی باری کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔

بچو جیسا ایک شخص سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ وہ قمیص پتلون میں تھا اور حد سے زیادہ مستعد نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس نے محمد بھائی سے مسکرا کے ہاتھ ملایا۔ بنگالی میں آہستہ آہستہ بات کی۔ مجھے غور سے دیکھا اور سرعتاً کے اندر چلا گیا۔ میں اور محمد بھائی اس کے واپس نکل آنے کے بعد بھی خاموش بیٹھے رہے۔ حیرت انگیز طور پر تمام خاص ملاقاتوں کو آدھے گھنٹے میں فارغ کر دیا گیا۔ کوئی دو منٹ اندر ٹھہرا تو کوئی دس منٹ۔ میں اس دروازے کو کھلتا اور بند ہوتا دیکھتا رہا جس کے پیچھے شاندار قالین، آفس فرنیچر اور پردوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

آخر کار بچو سیکرٹری نے محمد بھائی کو اشارہ کیا اور ہم ایک ساتھ آگے بڑھے۔ ریوالور ابھی تک میری جیب میں تھا اور کسی نے چیک نہیں کیا تھا۔ میں دروازے سے گزرنے لگا تو اچانک ایک آلہ بیپ دینے لگا اور بچو سیکرٹری نے دوڑ کر میرا راستہ روک لیا۔

"کیا ہے تمہارے پاس؟" اس نے اوپر اُدھر ہاتھ مار کے کہا۔

میں نے کہا "تم کیا تلاش کر رہے ہو؟ کوئی توپ یا ٹینک؟"

"یہ میٹل ڈیٹیکٹر (METAL DETECTOR) پاگل نہیں ہے۔" اس نے برا سا منہ بنا کے کہا۔

میں اس وقت جب وہ کپڑوں کی بغل میں پوشیدہ ریوالور تک پہنچنے والا تھا محمد بھائی نے جیب سے خنجر نکالا "اے یہ لے۔"

بچو نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور میں اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تھوڑا سا آگے بڑھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس قسم کے الارم نظر نہ آنے والی شعاعوں کی مدد سے کام کرتے ہیں۔ یہ شعاعیں جسم سے تو گزر جاتی ہیں مگر درمیان میں دھات کی بنی ہوئی چیز آ جائے تو روشنی کی یہ شعاعیں رک جاتی ہیں اور سرکٹ بریک ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ٹی وی کے ریموٹ کنٹرول کسی چیز کے درمیان میں حائل ہونے سے کام نہیں کرتے۔

میں ان نادیدہ شعاعوں کی زد سے نکل گیا تھا اور بچو سیکرٹری ایک مسلک خنجر برآمد کرنے کے بعد مطمئن ہو گیا تھا کہ اس نے حفاظتی نظام کی اطلاع پر فرض شناسی کا بہترین مظاہرہ کیا۔

محمد بھائی اور بچو کے درمیان کچھ تلخ کلامی بھی ہوئی مگر پھر اندر سے عبدالستار چوہدری نے انٹرکام پر کچھ کہا اور ہمیں فوراً شرف باریابی حاصل ہو گیا۔

عبدالستار چوہدری ادھیڑ عمر، انتہائی خرانٹ نظر آنے والا پُرفریب ظاہر و باطن کا مالک شخص تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی مگر آنکھیں دل کے کینہ کی چغلی کھاتی تھیں۔ ابن الوقت سیاست دانوں کی طرح اس نے بھی عجیب کی وضع قطع بنائی

www.paksociety.com

تھی۔ اس کے پیچھے سنہرے فریم میں مجیب کی قدِ آدم تصویر آویزاں تھی اور میز پر عوامی لیگ کا جھنڈا تھا۔

مجھ سے ہاتھ ملانے کا احسان کرتے ہی وہ بولا "تمہارا دوست گم ہوا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے وہ ملٹری انٹیلی جنس کی تحویل میں ہے؟"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔"

اس نے ہاتھ باندھ کر ٹہلنا شروع کیا "پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس کو کس الزام میں پکڑا گیا ہے؟"

میں نے کہا "معلوم ہے۔ اس کا جرم یہ ہے کہ وہ پاکستانی ہے۔"

عبدالستار چوہدری ایک جھٹکے سے مڑا اور غصے سے بولا۔ "پاکستانی تم بھی ہو۔ پھر تو تم بھی مجرم ہوئے۔ کیا میں تمہیں بھی ملٹری کے حوالے کر دوں؟"

"اگر تم سمجھتے ہو کہ....."

اب محمد بھائی نے فوراً مداخلت کی "ابھی کام کا بات کرتا چوہدری صاحب سے۔ کاہے کو فالتو بک بک کرتا ہے۔"

میں نے کہا "چوہدری صاحب! کل تک آپ بھی پاکستانی تھے۔ آج اگر آپ نے اپنی قومیت بدل لی ہے تو کیا ہوا، آپ کا تشخص تو نہیں بدلا۔ آپ کل بھی مسلمان تھے، آج بھی ہیں الحمدللہ۔ اور مرتے دم تک رہیں گے میری طرح۔ بالکل اسی طرح جیسے ہندوستان کی آزادی کے وقت میں ہندوستانی تھا۔ چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستانی ہو گیا مگر میرے اور آپ کے درمیان کی رشتہ وہی ہے....."

چوہدری چلتے چلتے رک گیا "اچھا۔ بس کرو یہ بھاشن۔ میرے پاس فضول باتیں سننے کے لئے وقت نہیں ہے۔"

میں نے کہا "وقت نہیں ہے یا حوصلہ نہیں ہے سچ سننے کا؟ آپ بیشتر کہتے ہیں بلکہ فرماتے ہیں، لوگ سنتے ہیں اور پھر تعریف کرتے ہیں۔ ایک بڑے سیاست داں میں یہ خوبی سونے پہ سہاگا ہوتی ہے کہ وہ خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے۔"

خلافِ توقع چوہدری مشتعل نہیں ہوا۔ اس نے کہا "بیٹھ جاؤ۔"

میں بیٹھ گیا "میرا تو خیال تھا کہ اب آپ مجھے مرغا بننے کو کہیں گے۔"

"تم نے ابھی ایک شعر پڑھا تھا۔ اقبال کا تھا نا؟"

میں نے کہا "مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ ہمارے قومی شاعر کو جانتے ہیں۔"

"وہ تمہارا قومی شاعر ہے" چوہدری پھر اپنی وسیع گھومنے والی کرسی پر میز کے دوسری طرف بیٹھ گیا "ہمارا قومی شاعر ٹیگور ہے۔"

"ویسے شاعر کسی قوم کی ملکیت نہیں ہوتا۔ انسانیت کا ورثہ ہوتا ہے۔"

"تم نے ٹیگور کو پڑھا ہے؟"

میں نے شرمندہ ہو کے کہا "میری بدقسمتی اور جہالت [illegible] میں نے 'گیتانجلی' تک نہیں پڑھی جس پر ادب کا نوبل پرائز [illegible]"

"تمہارے قومی شاعر کو صرف انگریزوں سے سر کا خطاب [illegible] تھا" چوہدری نے طنز سے کہا "تمہارے سب قومی لیڈر انگریز [illegible] تھے۔ اسی لئے سر کا خطاب دیا گیا تھا انہیں۔"

میں نے بے بسی سے کہا "وہ خطاب انہوں نے [illegible] کھینچ مارا تھا انہی انگریزوں کے منہ پر۔ اس وقت وہ تمہارے بھی لیڈر تھے۔ تم نے بھی قائد اعظم زندہ باد۔ بن کے رہے گا پاکستان کے نعرے لگائے ہوں گے اور پاکستان کے حصول کی جدوجہد میں اسی طرح بڑھ چڑھ کے حصہ لیا ہوگا جیسے آج پاکستان کو توڑ کر بنگلہ دیش بنانے میں لیا ہے۔"

"بکواس بند کرو" چوہدری نے میز پر مکا مارا "تم جانتے ہو میرے ایک اشارے پر....."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں اندر ہو سکتا ہوں، گولی مار کے ہزاروں لاکھوں شہیدوں کی طرح گمنام قبر میں [illegible] جا سکتا ہے مگر کیا سچ کو دبایا جا سکتا ہے چوہدری صاحب؟"

اب محمد بھائی کی قوت برداشت بھی جواب دے گئی "سالا بک بک کرتا پڑا ہے۔ اپن کو معلوم ہوتا تم ایک [illegible] چوہدری صاحب کا سامنے ہاتھ باندھ کے تیرا جان بخشی [illegible] اپن آج تک اپنا واسطے ہاتھ نہیں جوڑا۔ یہ تیرا واسطے [illegible] تو اپنا خیال کر۔"

میں نے محمد بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ سخت غصے میں [illegible] اچانک میں اس کے بارِ احسان سے دب گیا۔ اگر واقعی اس نے میری خاطر اپنی خودداری اور انا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے [illegible] کے سامنے میری جان بخشی کی خاطر دست بستہ درخواست کی تھی تو یہ احسان مجھ پر کیا تھا۔ چوہدری کمینہ آدمی تھا مگر وہ ایک کمینے کے سامنے بھی جھک گیا تھا۔ شاید میں ایسا نہ کرتا کہ کسی کے سامنے سر جھکا دوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ احسان نہیں [illegible] ہے۔ جب جھکا تو ضمیر کے آگے [illegible] مگر اس نے [illegible] سر قربان کیا تھا اور میں اس کی قربانی کو ضائع کر کے اسے [illegible] کے احساس میں مبتلا کر رہا تھا۔

میں نے کہا "میں معافی چاہتا ہوں چوہدری صاحب۔"

چوہدری مسکرایا "معاف تو پہلے ہی کر چکا تھا میں محمد بھائی کے کہنے پر۔ ورنہ تم اس کمرے میں قدم نہ رکھ پاتے۔ گیٹ پر تمہارا استقبال کرنے والے موجود ہوتے جو تمہیں [illegible] ملوا دیتے۔"

میں خاموش رہا کیوں کہ محمد بھائی میری طرف التجائی نظروں سے دیکھتے ہوئے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

چوہدری نے کہا "تم صرف اپنے دوست کی سلامتی کے

لئے آئے تھے؟"

"جی ہاں۔"

"سمجھتا میں سب ہوں، وہ بھی جو تم سمجھتے ہو کہ مجھے معلوم نہیں۔ میرے پاس ایک ایک رپورٹ ہے" چوہدری نے ایک دراز کھولی اور اس میں سے ایک فائل نکال کے میری طرف بڑھا دی "یہ دیکھو۔"

میں نے فائل لے کر سرسری طور پر ورق گردانی کی۔ اس میں ہماری ہر فردِ جرم کی نقل تھی۔ ہم نے کب کیا کیا تھا۔ ہمارے خلاف کیا الزامات تھے۔ کتنے مقدمات زیرِ سماعت تھے۔ پاکستان سے بھارت کے راستے میں ہم نے کتنے معرکے سر کئے تھے۔ ان کی تفصیلات جن اخبارات میں شائع ہوئی تھیں اور جن میں ہماری تصاویر شائع ہوئی تھیں۔ وہ سب ایک جگہ موجود تھی۔

میں نے فائل لوٹاتے ہوئے کہا "آپ نے یقیناً کافی محنت کی ہوگی۔"

"میں نے؟" وہ فخر سے بولا "اصل محنت تو تمہاری ہے کہ تم نے اس فائل کے لئے مواد فراہم کیا۔ رپورٹیں مجھے پولیس اور دیگر خفیہ اداروں نے فراہم کی ہیں۔"

"میں سمجھا تھا آپ ایم اے ایس پر کوئی تھیسس لکھ رہے ہیں اور آپ نے شوقیہ یہ سب جمع کیا ہے" میں نے بھی طنز کیا۔

چوہدری بولا "یہ فائل چند گھنٹوں میں تیار کر کے بھجوائی گئی ہے مجھے مسٹر سکندر بخت عرف کبیر خان۔ تم سمجھتے ہو کہ تمہاری پوزیشن کتنی نازک ہے، تم کتنے مجبور ہو......"

"میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آپ کیوں مجبور ہیں۔ آپ میں انسانیت کی تھوڑی سی رمق باقی ہے جس کی وجہ سے آپ نے محمد بھائی جیسے بہاری جیسے کی بات مانی۔ آپ نیکی، عدل و احسان کا مطلب ضرور سمجھتے ہیں۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ آپ اس فائل کو اپنے مہمان کے خلاف استعمال نہیں کریں گے۔ لیکن میری توقعات کے برعکس آپ نے محمد بھائی سے جھوٹ بول کے مجھے یہاں بلایا ہے اور آپ کا وعدہ محض ایک جال تھا تو آپ ایک کامیاب شکاری ہیں چوہدری صاحب۔ اپنے چوہدری ولادور کی طرح۔"

چوہدری کا چہرہ غصے میں سرخ پڑ گیا تھا مگر نہ جانے کیوں اس نے ضبط سے کام لیا۔ میز کی دراز سے ایک گولی نکال کے پانی کے ساتھ نگل کر وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا مجھے گھورتا رہا۔ غالباً وہ ہائی بلڈ پریشر یا انجائنا کا مریض تھا۔ بالواسطہ طور پر میں نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ میں بھی بہت کچھ جانتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ محمد بھائی نے اس کے ساتھ کیا نیکی کی تھی۔

اس نے فائل واپس میز کی دراز میں ڈال دی "تم نے ٹھیک کہا ہے کہ میں اس فائل کو تمہارے خلاف استعمال نہیں کروں گا۔ بلکہ تم خود کو میرے حوالے کر دو۔"

میں ذرا سی دیر کے لئے گڑبڑا گیا "آپ کے حوالے..... میں سمجھا نہیں، میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔"

اس نے گھنٹی بجائی۔ بیجو نامی سیکریٹری ایسے اندر آیا جیسے کسی نے اسے لات مار کے اندر کیا ہو "سر؟"

"ٹو وان اے ڈرنک اور ان کے لئے بھی۔"

میں نے کہا "مجھے معاف رکھیں۔"

"ان کے لئے چائے لاؤ" وہ فوراً سمجھ گیا "تم کو پتا ہے میں نے آج کچھ نہیں کھایا۔"

"یس سر۔"

"یس سر کے بچے، یہ خیال رکھنا تمہارا کام ہے۔ گھر میں جو کام بیوی کا ہے وہی یہاں تمہارے فرائض میں شامل ہے سوائے بچے پیدا کرنے کے۔ اب جاؤ۔ میری بیوی جیسی شکل مت بناؤ۔"

بیجو سر جھکا کے باہر نکل گیا۔ چوہدری ہنسا۔

محمد بھائی خوشامدانہ انداز میں مسکرایا "بہت کام کرتا ہے آپ چوہدری صاحب۔ سیاست میں بڑا لفڑا ہے۔"

چوہدری نے ایک آہ بھری "ہاں محمد بھائی۔ خدمتِ خلق ہے بلکہ بیگار ہے۔ خدمتِ خلق میں آدمی اپنی مرضی سے کھانے سونے کے لئے وقت تو نکال سکتا ہے یہاں تو دن رات وہی ایک چکر ہے۔ لوگوں کے مسائل حل کرتے رہو جس کا جب دل چاہے گا آ جائے گا اور جس کا بھی کام نہ ہو وہی گالیاں دے گا۔"

میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا مگر مصلحت آڑے آئی اور میں نے خاموشی اختیار کی۔ میں کہہ سکتا تھا کہ چوہدری صاحب، یہ خدمتِ خلق نہیں، پیشہ ہے آپ کا اور اس پیشے کو برصغیر میں سب سے زیادہ منافع بخش کاروبار سمجھا جاتا ہے۔ یہ کوٹھی کار، اختیار سب اسی کے طفیل ہیں۔ ذرا یہ حساب بھی تو لگائیے کہ روٹ پرمٹ، امپورٹ ایکسپورٹ لائسنس، الاٹمنٹ آرڈرز، سفارش، تقرر ناموں اور غیر قانونی کام کرانے کا آپ نے عوام سے کیا معاوضہ لیا۔ کتنے مخالفین کا جینا عذاب کیا۔ کتنوں کو جیلوں میں ڈلوانے کے لئے ان پر جھوٹے مقدمات بنائے۔ کتنوں کو مروا دیا۔ کس کس کی بہو بیٹی کو اٹھوایا۔

بیجو سیکریٹری ایک ٹرے میں وہسکی سوڈا اور شغلِ مے نوشی کے دیگر لوازمات لے کر اندر آیا اور میز پر رکھ کے لوٹ گیا۔

چوہدری صاحب نے ایک جام اپنے لئے بنایا اور دوسرا محمد بھائی کے لئے۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "ابھی چوہدری صاحب، اپن کو معاف کرو۔"

چوہدری ہنسا "اچھا! تم بھی پارسا ہو۔ بہت خوب۔ دنیا کی ہسٹری شیٹ میں خواہ کچھ بھی لکھا جائے نامۂ اعمال تو آخرت کے لئے صاف رہے۔"

"اپنا بہت گنہگار آدمی ہے سر۔ سارا گناہ کیا۔ بس ایک گناہ سے بچ گیا۔ پتا نہیں کیسے بچ گیا۔ ابھی بچا رہے تو اچھا ہے" محمد بھائی نے کچھ خود ملامتی کے انداز میں کہا۔

www.paksociety.com

"تو میں کہہ رہا تھا کہ سب کچھ ایسا ہی ہوگا جیسا تم چاہتے ہو۔ تم کو محسن مل جائے گا۔ تمہارے سب ساتھی خیر و عافیت کے ساتھ یوں واپس پہنچ جائیں گے" اس نے چٹکی بجائی "رابعہ سمیت۔"

میں اچھل پڑا "رابعہ.... وہ۔"

"وہ بھی ادھر ہی ہے۔ تم کو نہیں معلوم" چوہدری نے دوسرا جام بھرا "اور میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ تم سے بات سچ میں کہہ رہا ہوں۔"

میں اب ابتدائی شاک سے سنبھل گیا تھا "آپ بتائیں ہوش و حواس مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں چوہدری صاحب اور وہ بھی جھوٹ بول کر...."

"تمہارا کیا خیال ہے رابعہ کہاں ہے؟"

"جہاں اسے ہونا چاہئے" میں نے کہا۔

"نہیں۔ رابعہ وہاں ہے، جہاں اسے نہیں ہونا چاہئے۔"

میرا غصہ برداشت کی آخری حد کو چھونے لگا "چوہدری! ایسا نہ ہو کہ تمہارے مرتبے اور اپنی عاقبت کا خیال کئے بغیر میں کچھ کر بیٹھوں۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنس پڑا "تم کیا کرو گے۔ تم اور تمہاری ایم آر ایس سب ایک خود فریبی کے خیال کا شکار ہو۔ کہ تم آزاد ہو اور کہیں بھی آ جا سکتے ہو۔ اور میں نے تمہیں بات کرنے کے لئے بلایا ہے۔ لڑنے کے لئے نہیں۔ اس لئے تم غصے میں کچھ بھی کہو، میں برا نہیں مانوں گا۔"

بیرو دوبارہ آیا اور میرے سامنے چائے رکھ کے لوٹ گیا۔

محمد بھائی نے کہا "چائے پیو اپنا سکندر بادشاہ۔ تم اپنی کا ساتھ آیا ہے۔ پھر فکر کا کیا بات ہے۔"

چوہدری نے ترنگ میں کہا "سکندر اعظم ثانی! اسے ذی ہمت اچھا آدمی ہے۔ تمہارا ہم وطن ہے۔"

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ چوہدری کے لہجے اور اس کی معنی خیز مسکراہٹ نے مجھے سب سمجھا دیا "وہ.. اس حرام زادے نے سب اطلاعات فراہم کی ہیں تمہیں۔ وہ مار آستین......"

"وہ پولیس والا ہے، جو کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ ہمارے ملک میں سوائے پیسے کے۔ وہ لڑکیاں بھی ہیں وہاں۔ نور اور حور۔ وہ بہت کام کرتی ہیں۔"

غصے اور صدمے سے میرا برا حال ہو گیا۔ کیسا جھوٹ بولا تھا اس نے مجھ سے ان لڑکیوں کے بارے میں۔ یہ بے غیرتی اور بے ضمیری کی انتہا تھی۔ اس نے مجھے ایسی کہانی سنائی تھی کہ میں جذباتی ہو گیا تھا۔ اب مجھے کوئی شک نہ رہا کہ اللہ دتی کو ہوٹل میں لانے والا اسے ذی تھا تو اس کے پیچھے کسی قاتل کو لگانے والا بھی وہی تھا۔

"اگر تم خود نہ آتے تو اسے ذی تمہیں لے آتا۔" اس نے کہا کہ وہ تو خود ہی آ رہا ہے محمد بھائی کے ساتھ" چوہدری نے کہا۔

محمد بھائی کا چہرہ تاریک ہو گیا "چوہدری! ابھی اپنا منہ بند رکھو۔ ابھی وضاحت کرتا۔ یہ اپنا یار ہے۔ اس کو کچھ نہیں ہوگا۔ جب تک محمد بھائی زندہ ہے۔"

"ارے نہیں محمد بھائی۔ کیسی باتیں کرتے ہو" چوہدری

"تم سے میں نے جو وعدہ کیا تھا وہ اپنی جگہ۔ لیکن تمہارے دوست کا مزاج بہت گرم ہے۔ یہ سچ کو بھی سچ نہیں مانتا۔ میں اسے بتا رہا ہوں کہ رابعہ یہاں ہے تو یہ گڑبڑ کرتا ہے بچے کی طرح۔ خود کو سمجھتا آتش فشاں۔"

میں نے کہا "کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ رابعہ یہاں ہے؟"

"اسا یہ ہوئی نا ڈھنگ کی بات" وہ بولا اور ایک فون کا ریسیور اٹھا کے سیکرٹری سے بات کرنے لگا "ذرا مس رابعہ تارڈیا سے بات کراؤ۔"

ایک لمحے کے لئے مجھے اپنے ذہنی توازن کے بگڑ جانے کا اندیشہ لاحق ہوا۔ پھر میں نے خود کو سنبھال کے لیا۔ یہ جھوٹ، ڈراما ہے۔ ناممکن بات ہے کہ رابعہ یہاں ہو اور مجھے معلوم نہ ہو۔ بے شک عرصہ دراز سے میرا اس کا رابطہ نہیں مگر......

"یہ لو سکندر اعظم ثانی! بات کرو" اس نے اٹھا کر سیل فون کا ریسیور اٹھا کے مجھے تھما دیا۔

میرا ہاتھ کانپنے لگا اور دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی۔ یقین کا مضبوط حصار یوں بکھرنے لگا جیسے ریت کی دیوار۔ میرا وجود سراب کی طرح تحلیل ہونے لگا۔ نہیں۔ چوہدری اپنے اقتدار کے ساتھ مجھے ریسیور نہ تھماتا اگر اس کی بات جھوٹی ہوتی۔

بڑی مشکل سے میں نے کہا "ہیلو۔"

دوسری طرف سے رابعہ نے کہا "ہیلو۔ کون....؟"

میں نے بولنے کی کوشش کی مگر آواز میرے حلق میں پھنس گئی اور میرا دل میرے سینے میں مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ سردی کے باوجود میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا اور میں نے سخت کمزوری محسوس کی۔

رابعہ نے چلا کے کہا "بولتے کیوں نہیں؟ کون ہو تم اگر نہیں ہو؟ تمہاری آواز اتنی ملتی کیوں ہے سکندر سے؟"

میں نے لمبے لمبے سانس لے کر کہا "رابعہ۔ تم رابعہ۔.... کہاں ہو تم....؟"

"میں؟ مجھ سے پوچھتے ہو؟" وہ چلاتی رہی "مجھے بلا کر غائب ہو۔ کتنی مشکل سے پہنچی ہوں میں ڈھاکا۔"

میں نے کہا "رابعہ۔ میری بات سنو۔ خدا کی قسم میں نے تمہیں نہیں بلایا تھا۔ مگر خیر۔ تم آ گئی ہو تو یہ بتاؤ کہ کہاں ہو؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہے.... کسی نے کوئی زیادتی تو نہیں کی تمہارے ساتھ۔"

ایک دم لائن کٹ گئی۔ بالکل صحیح وقت پر لائن کاٹ دی گئی۔ سیکرٹری نے اپنے آقا کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے مناسب لمحے کو میرے اور رابعہ کے درمیان دوری کی دیوار بنا کے کھڑا کیا اور رابعہ جو چند منٹ پہلے میرے تصور میں ہزاروں میل دور تھی، میرے قریب آ کے میرے احساس کی گرفت سے نکل گئی۔

میں نے کریڈل کو زور زور سے ہلایا "ہیلو۔ رابعہ۔ ہیلو۔" اور ریسیور کراس پر دھڑ سے دے مارا۔ کریڈل ٹوٹ گیا اور ریسیور لٹکنے لگا۔

چوہدری نے ایک اور جام کو حلق میں انڈیلا "میں بتا سکتا ہوں کہ رابعہ آرام سے ہے اور اس کے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔"

"سنو چوہدری" میں نے اس کی منت کرتے ہوئے کہا "صرف ایک بار میری بات کرا دو اس سے۔ پانچ منٹ۔"

چوہدری نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا چار منٹ...... تین منٹ...... دو منٹ...."

"او کے۔ دو منٹ" چوہدری بولا "مگر تم اس سے صرف محسن کے بارے میں پوچھو گے۔ اور کچھ نہیں۔ اس شرط پر بات کر سکتے ہو۔"

میں نے لجاجت سے کہا "مجھے منظور ہے۔"

یکلخت میں ایک مختلف آدمی بن گیا تھا۔ میری خودی اور انا۔ احساس عزت نفس۔ غیرت و حمیت۔ آئین جواں مردی۔ سب بالکل ختم ہو گئے تھے۔ یہ عجب کیا کالا جادو تھا کہ کوئی آگ کو برف میں بدل دے۔ چاند کو پھونک مار کے گل کر دے۔ گلشن میں کھلے پھولوں کو کاغذی پھولوں میں بدل دے۔ میری عقل منطق ہی نہیں سب بے وجود ہو گئی تھی۔

دوسرے فون پر لائن پھر ملی۔ رابعہ نے کہا "اب کہاں سے سب ہو؟ فون کرنا ضروری تھا۔ آ نہیں سکتے تھے۔"

میں نے کہا "رابعہ! محسن کہاں ہے؟"

"میرے ساتھ ہے۔ دوسرے کمرے میں۔"

"تمہارے ساتھ؟ رابعہ، میں پاگل ہو جاؤں گا۔ وہ تمہارے پاس ہے اور مجھے خبر نہیں۔ کیسا ہے وہ؟"

"ٹھیک ہے۔ تمہیں یاد کرتا ہے۔ مگر وہ ایک فطری بات ہے۔ سب کی راہ دیکھتا رہتا ہے۔ راتوں کو سوتا نہیں انتظار کرتا ہے۔ نیند کی گولیاں دینا پڑتی ہیں...."

لائن پھر کٹ گئی۔ میں نے آرام سے ریسیور رکھا اور دیوار کو دیکھنے لگا۔ یہ ڈراما نہیں ہو سکتا تھا۔ کوئی عورت مجھے رابعہ کی آواز میں دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ کوئی رابعہ کو مجبور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ محسن کے بارے میں جھوٹ بولے۔

چوہدری نے کہا "تمہارے سب دوست محفوظ ہیں اور محفوظ رہیں گے۔ محسن اور غالب، باہر جو لڑکی ٹیکسی میں بیٹھی تمہاری واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔ غالب کی محبوبہ نازو۔ اور گل بانو۔ یہ سب واپس چلے جائیں گے۔ میں انہیں نیپال کے راستے ہوائی جہاز سے کراچی پہنچا دوں گا۔ سب انتظام میرا۔"

میں نے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھا "اب اپنی شرائط بتاؤ۔"

"وہ میں بتا چکا ہوں۔ خود کو میری تحویل میں دے دو۔ ان سب کی خاطر جو تمہیں اتنے عزیز ہیں۔ تم یہ قربانی دے سکتے ہو...."

میں نے ایک لمبی گہری سانس لی "چوہدری صاحب! کھل کر بات کریں تاکہ مجھے سمجھنے میں آسانی ہو۔"

"میری ایک لڑکی ہے۔ دماغ خراب ہے اس کا۔ کئی ڈاکٹروں، حکیموں، ویدوں کو دکھایا۔ پیروں فقیروں سے تعویذ لئے۔ بہت خوب صورت لڑکی ہے۔ دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ پاگل ہے۔ ایک باپ کی حیثیت سے مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مگر کیا کروں، اکلوتی اولاد ہے۔ وہ تم پر مرتی ہے۔ میرا جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ تم اس سے شادی کر لو۔ اور یہیں رہو میرے پاس۔"

اس وقت جیسا کہ ہونا چاہئے تھا، میرے دماغ کا فیوز بھک سے اڑ گیا۔ میں نے چیخ کر چوہدری کو گالی دی اور جیب سے ریوالور نکال کے کھڑا ہو گیا۔

www.paksociety.com

عبدالستار چوہدری ذرا بھی نروس زدہ نہیں ہوا۔ وہ حیران و پریشان بھی نہیں ہوا۔ ہر کامیاب سیاست داں کی طرح وہ ایک کامیاب اداکار بھی تھا اور مشکل صورت حال میں مناسب راستہ اختیار کرنے کا فن جانتا تھا۔

"یہ ریوالور اصلی ہے؟" اس نے میرا تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا "اصلی ہی ہوگا۔ دراصل مجھے ان ہتھیاروں کی پہچان نہیں ہے۔"

"اب۔ تمہارے ہتھیار دوسرے ہیں۔ جن سے تم قتل بھی کرتے ہو تو پتا نہیں ہوتا۔ تمہارے ہاتھ صاف رہتے ہیں اور تمہارے دامن پر کوئی داغ نہیں آتا" میں نے پُرسکون رہتے ہوئے کہا "تم لوگوں کے جذبات میں آگ لگا کے انہیں لڑاتے ہو اور فتنہ و فساد کے بعد لواحقین کو صبر جمیل کی تلقین کرنے کے لئے ان کے گھر جاتے ہو تو اخباروں میں تصویر کی اشاعت کا پیشگی بندوبست کرتے ہو۔ تم خود بدست قاتل میں خنجر تھماتے ہو اور تم ہی فریادی بھی بن جاتے ہو۔ تم بلیک میلنگ کرتے ہو۔ ووٹ لینے کے لئے خوب صورت وعدوں کے پُرفریب جال بچھاتے ہو اور اس کے بعد...!"

عبدالستار چوہدری نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ تالی بجائی "واہ۔ کیا تقریر ہے۔ کیا فصاحت کا دریا ہے اور بلاغت کا سمندر ہے۔ تم میرے مشیر خاص بن سکتے ہو۔ پی آر اچھا نہیں ہے آج کل میرے پاس....."

"تمہارے پاس تو ایک پاگل بیٹی کے لئے تعلیم تک نہیں ہے۔ ضمیر نہیں ہے اور سکون نہیں ہے کیوں کہ دنیا و عاقبت میں تمہارے لئے صرف روسیاہی ہے....."

"بند کرو اپنی بکواس کتے۔" ستار چوہدری ایک دم کسی بم کی طرح پھٹ گیا اور اس نے خالی جام میرے منہ پر کھینچ مارا "بہت بھونک چکے تم....."

میں نے اطمینان سے اپنے سر کو بچالیا "اپنی رفتہ رفتہ تباہی۔ آخری شادی خانہ آبادی تم کس کتے سے کرو گے عبدالستار چوہدری؟ بھونکنے والے کتے سے یا کاٹنے والے کتے سے؟ کیسی زبردست تصویر آئے گی اخبار میں کہ تم اپنے نو من بل ٹیریر داماد کے پٹے کی زنجیر تھامے اپنی پاگل بیٹی کے ساتھ کھڑے ہو اور اپنے مستقبل کے پوتوں کی تصویر تمہاری آنکھوں میں تیر رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پلّے۔"

میری توقع کے عین مطابق عبدالستار چوہدری چیخنے لگا۔ اس پر نشے میں دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ فحش گالیاں بکتے ہوئے اپنے سیکریٹری کو پکار رہا تھا۔ محمد بھائی کی حالت غیر تھی۔ وہ بھی مجھ سے خاموش ہونے کی التجا کر رہا تھا اور کبھی چوہدری سے مگر اس کی سننے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے ریوالور لینے کی کوشش بھی کی مگر میں نے اسے دوسرے ہاتھ سے دور دھکیل دیا۔

"سکندر! یہ کیا کر رہا ہے تم؟ پاگل ہو گیا ہے سالا...."

میں نے کہا "میں تو ہوں ہی پاگل۔ مجھے سایا سمجھنے والے تنہی میں مارے جانے تھا محمد بھائی۔ میں سایا ہوتا تو آپ کی پیشکش کو قبول نہ کرتا۔ اتنے بڑے آدمی کا داماد اور اس کا وارث بن کے میں کتنے فائدے میں رہتا۔ رابعہ کا کیا ہے؟ کبھی ایک عورت وسکی اور سری۔ جسم تو ایک پاگل عورت کا بھی ویسا ہی ہوتا ہے اور سچ پوچھو تو کیا رابعہ پاگل نہیں ہے؟ ہم سب خطرناک پاگل ہیں محمد بھائی جو نفع چھوڑ کے نقصان قبول کرتے ہیں کسی پچھتاوے کے بغیر....."

بجو ایک دم اندر آیا۔ اس کے ساتھ دو مسلح افراد تھے جن کے ہاتھوں میں اتنے ہی خطرناک ہتھیار تھے جتنے خطرناک ان کے ارادے۔

چوہدری نے بجو کو ایک موٹی گالی دی "کہاں مر گیا تھا..... اتنی دیر میں تو جنازہ اٹھ جاتا میرا..... یہ آخر یہ ریوالور لے کر اندر کیسے آ گیا؟ تو کیا اپنی ماں....."

"میں نے دیکھا تھا سر....." بجو کی آواز میں رقت پیدا ہوگئی "چیک کیا تھا..... مشین کس لئے لگی ہے باہر..... کیا مشین خراب تھی؟"

"مشین تو ٹھیک تھی سر....." بجو نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے مجھے خون آشام نظروں سے گھورا۔

"نکل جا..... اسی وقت..... دفع ہو جا..... کی اولاد..... اتنا ہی کافی ہے کہ تیری الائی....."

بجو دھاڑیں مار مار کے رونے لگا "سر! غلطی معاف کریں۔ ایک موقع دیں مجھے۔ میں کہاں جاؤں گا؟"

چوہدری مسلح افراد کی طرف متوجہ ہو گیا "تم کیا دیکھ رہے ہو؟ کس بات کا انتظار ہے تمہیں؟ حرام کی کھاتے ہو اور کام کا وقت آئے تو حرامی ہونے کا ثبوت دیتے ہو۔ پکڑ لو اس کتے کو۔"

"چوہدری صاحب! اپنی پاگل بیٹی کے لئے آپ کتیا کا اتنا بڑا منگوا لیں۔ اچھی نسل کا کتا تو شاید اسے قبول نہ کرے۔" میں نے کہا۔

"گولی مار دو اسے" چوہدری نے چیخ کر کہا۔

مجھے معلوم تھا کہ ایسی دھماکا خیز صورت حال میں میری شرپسندانی کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اپنی بات مکمل کرتے ہی میں فوراً اور چوہدری کی میز کے نیچے گھس گیا۔ گولیوں کی آواز میرے سر کے اوپر سے گزری اور میں نے شیشے بکھرنے کا چھناکا سنا۔ گولیاں دیوار میں پیوست نہیں ہوئی تھیں وہ کھڑکیوں کے شیشے توڑتی ہوئی نکل گئی تھیں۔

میں ایک لمحے کے دوسرے نصف حصے میں میز کی جانب طلوع ہوا تو نقشہ بدل چکا تھا بلکہ محاورے کے مطابق الٹ چکی تھی۔ میں نے چوہدری کے پاؤں پکڑ کے کھینچ لئے وہ نیچے گرا۔ میری لات لگنے سے میز الٹ گئی۔

چوہدری کی پشت پر بیٹھ کے میں نے ریوالور اس کی گدی پر رکھ دیا اور مسکرانے لگا "سیکریٹری! ہماری تصویر بناؤ۔ ہم نے ایک اور شکار کیا ہے۔ اس نے دھوکے، منافقت، جھوٹ اور ... سے اپنے حلقے میں کامیابی حاصل کی ہوگی اور کسی بہت ... حریف کو ہرایا ہوگا۔ آج یہ خود ہار گیا۔ اپنی زندگی تک ہار گیا۔"

بجو کا منہ کھلا ہوا تھا اور دونوں محافظ ہکا بکا کھڑے تھے۔ چوہدری نیچے دبا تھا مگر اس کی مدد کے لئے آگے بڑھ کے کچھ کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔

چوہدری کو اب بھی یقین تھا کہ اس کے مسلح محافظوں کی گن کے سامنے میری حیثیت اتنی بھی نہیں جتنی شیر کے مقابلے بلی کی ہوتی ہے مگر سمجھنے والے اس کی زندگی اور موت کے درمیان بال برابر فرق دیکھ رہے تھے اور یہ بال بھی صرف چوہدری کی کنپٹی پر تھے۔ باقی سر میں تو پنسل سے نشان لگا کر سوراخ کیا جا سکتا تھا۔

محمد بھائی الگ چلا رہا تھا "سکندر! چھوڑ دے اس کو سالا تو خود بھی مرے گا اپن کو بھی مروائے گا۔"

"تو کیوں جان دینے سے ڈرتے ہو محمد بھائی....."

"سکندر، دیکھ گولی مت مارنا اس کو۔ اپنا کالا تم بھی باہر نہیں جائے گا۔ اپن ادھر سے نہیں نکل سکتا سکندر۔ اس گھر میں اپنا قبر بنے گا۔"

میں نے کہا "محمد بھائی! نکالو اپنا خنجر اور ہلاک کر دو ان سب کو۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ آج تم ہاتھ کی صفائی دکھاؤ گے۔ انہیں پتا بھی نہیں ہوگا کہ کب ان کے سر خود انہی کے قدموں میں ہوں گے۔ تم نے مجھے مایوس کیا محمد بھائی" میں ہنستا رہا۔

محمد بھائی نے ہاتھ جوڑ دیے "دیکھ تیرے کو اللہ رسول کا واسطہ۔"

"محمد بھائی! یہ اللہ رسول کا حکم ہی تو ہے جس کی وجہ سے میں ... اس مجسم مسلمانوں کے دشمن، فتنہ و شر کے ... مفسد اور منافق، شراب پینے والے اور زناکار کو میں کیسے چھوڑ دوں۔ یہ غدار بھی ہے، میرا دشمن بھی ہے اور اپنی بقا کا ... قتل بھی قتل نہیں ہوگا۔"

آخر کار چوہدری کے اعصاب شکست کھا گئے۔ اس نے میری ... بہت دیر مزاحمت کی۔

"سکندر! مجھے چھوڑ دو۔ ہم..... بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ تم جو چاہو گے وہی ہوگا" چوہدری نے تحت احساس ذلت کے ساتھ کہا۔

میں نے کہا "ہم پہلے تو اپنی فوج کو پسپا ہونے کا حکم دو۔"

چوہدری نے پھر بجو کو گالیاں دیں "تیری عقل میں نہیں آتا کہ کیا کرنا چاہئے۔ دیکھتا نہیں ...... کہ میری جان خطرے میں ہے۔"

بجو نے فوراً اپنے آقا کی خواہش کے مطابق احکامات صادر کئے۔ دونوں مسلح محافظ شرمندہ، مجبور اور بے بس تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ادائے فرض میں ناکامی ان کا کتنا بڑا جرم بن چکی ہے اور اس کی سزا کیا ہوگی۔ وہ بادل ناخواستہ واپس گئے۔

میں نے کہا "محمد بھائی! بجو کو بولو۔"

"بجو کون؟ کدھر ہے بجو؟" محمد بھائی کی عقل خبط ہو گئی۔

"یہی جو تمہارے پاس کھڑا ہے" میں نے کہا اور چوہدری کو گردن سے پکڑ کے کھڑا کر دیا۔

میز الٹ جانے سے اسباب شان و شوکت بھی تہس نہس ہو گئے تھے۔ جھنڈا سوگ میں سرنگوں پڑا تھا۔ ٹیلی فون ٹوٹ گئے تھے اور غالباً مر چکے تھے جتنی بوتلیں تھیں ذبح ہو گئی تھیں۔

محمد بھائی نے بجو سے کہا "ابھی تم ادھر جمع ہو یار۔ سالا بہت لفڑا ہو گیا ادھر تو۔"

بجو نے صوفے پر گر کے کہا "ابھی کیا ہوا ہے؟ اس کے بعد جو ہوگا....."

میں نے چوہدری کو گھومنے والی کرسی پر دھکیل کر بٹھا دیا "تمہارا یہ سیکریٹری تو پاگل ہو چکا ہے۔ تم نے سنا یہ کیا کہہ رہا تھا؟ اس کا مطلب تھا کہ ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ تمہارا انتقال؟ سوئم؟ چہلم؟ اچھی بات نہیں نکالتا منہ سے کہ آپ کی بیٹی کا گھر آباد ہوگا۔ وہ صاحب اولاد ہوگی۔ اس کے بچے آپ کے ساتھ کھیلیں گے۔ ایک ساتھ چھ پوتے ہو جائیں گے۔ اس کو حکم دیں کہ حجلۂ عروسی سجائے۔"

چوہدری دھاڑیں مار مار کے رونے لگا "سکندر..... مجھے معاف کر دو خدا کے لئے۔ یہ سوچ کہ میں ایک باپ ہوں۔ کوئی سکھ نہیں دے سکا میں بیٹی کو۔ اس کی خوشی نہیں دیکھ سکا۔ ساری عمر اس کا غم میرے دل کا گھاؤ بنا رہا۔ پاگل وہ نہیں میں ہوں کہ اس نے مجھ سے چاند مانگا اور میں نے کہا کہ میں ستارے بھی ساتھ لاؤں گا۔"

بلکہ مجھے اس پر ترس آیا۔ اب وہ میرا دشمن نہیں رہا۔ ایک بااثر سیاست داں عبدالستار چوہدری نہیں رہا۔ وہ محض ایک مصیبت کا مارا باپ رہ گیا۔ بیٹی تو اللہ کی رحمت ہوتی ہے مگر اس کے حالات نے رحمت کو مصیبت بنا دیا تھا۔

کمرے میں اب صرف محمد بھائی تھا جو شدت سے پچھتا رہا تھا کہ وہ مجھے یہاں کیوں لے کر آیا تھا۔ صورت حال اتنی مشکل ہوگئی تھی کہ اسے اپنی گردن میں پھانسی کا پھندا ہر صورت میں محسوس ہوتا تھا خواہ مارا کوئی بھی جائے۔ چوہدری یا میں۔ ڈیل ڈول میں وہ ہاتھی تھا۔ ہاتھیوں کی لڑائی میں حشرات الارض کچل جاتے ہیں، یہ تو ہونا ہی ہے مگر یہاں ہاتھی کی طاقت کا پیمانہ جسمانی برتری نہیں تھا۔

www.paksociety.com

عبدالستار چوہدری جیسا بڑی طاقت رکھنے والا سیاست دان ایک طرف تھا اور میرے جیسا شہرت یافتہ دہشت گرد دوسری طرف۔ وہ اپنے ضمیر کو آزما کے کیا کرتا۔ نہال اور اللہ رسول کے واسطے دینے سے قیام امن کی کوششوں میں اسے کوئی کامیابی نہیں ہو رہی تھی اور عقل کی بات سننے پر کوئی تیار نہ تھا۔ مایوس ہو کے اس نے سب کچھ تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔

چوہدری کی آہ و زاری سے میرا نہیں محمد بھائی کا دل بھی پسیج گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر مجھ سے ملتجیانہ درخواست کی۔ "اسے بھائی! اسے میرا باپ! ابھی اس گدھے پر سواری چھوڑ۔ اس کا بات سن۔ میرا بات سن۔"

میں پہلے ہی گدھے کی پیٹھ سے اترنے کا اصولی فیصلہ کر چکا تھا چنانچہ میں نے محمد بھائی کی درخواست قبول کرنے کا اخلاقی فائدہ حاصل کیا۔ ابھی میں اخلاقی تھا کہ اس ڈرامے کا دوسرا سین شروع ہو گیا اور پردہ گرنے سے پہلے اس لڑکی نے انٹری دی جس کو سائیڈ ہیروئن سمجھا جا سکتا تھا۔

اسے دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا۔ وہ حیرت انگیز بلکہ ہوش ربا حسن کی مالک جواں سال لڑکی تھی۔ سفید ساڑی میں ملبوس اس کا گدرایا ہوا بدن شراب کی بوتل کی طرح تھا جس میں نشہ ہی نشہ بھرا ہوا ہو۔ اس کے لمبے کالے بال اس کے شانوں پر بوسے لیتے ہوئے پیچھے ہوئے تھے اور اس کی بڑی آنکھوں میں کاجل خود قدرت نے بھرا تھا۔ دیکھنے میں وہ ذرا بھی پاگل نہیں لگتی تھی لیکن اسے دیکھنے والا ضرور پاگل ہو سکتا تھا۔

"اسے نادیدہ! چھوڑ دیں سکندر صاحب۔ میرے غیرت مند باپ کے پاس آپ کو دینے کے لئے ایک میں تھی، دوسری اس کی اپنی زندگی۔" اس نے رواں، شستہ اردو میں کہا "مجھے آپ ٹھکرا دیں!"

میں نے بوکھلا کے کہا "آپ... چوہدری کی..."

"جی۔ میرا نام کاجل ہے۔" وہ بولی۔

میں نے میز سمیٹ دی۔ چوہدری اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے رو رہا تھا۔ میں اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"چوہدری نے کیا بتایا تھا آپ کے بارے میں؟"

"نہیں۔ میرے باپ نے جو بھی کہا تھا ان کے نقطۂ نظر سے ٹھیک ہی تھا۔ میرے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ میں پاگل ہوں۔" وہ محمد بھائی کے قریب بیٹھ گئی۔

"جو تمہیں پاگل بولے وہ سالا خود پاگل۔" محمد بھائی بولا۔ کاجل کے حسن نے اس کی نگاہوں کو خیرہ اور عقل کو منجمد کر دیا تھا۔

میں نے تائید میں سر ہلایا "ایسی غلط بات نہیں کہنی چاہئے کسی کو بھی۔"

وہ مسکرائی۔ بالکل خفیف، معلوم نہ ہونے والی مگر محسوس ہونے والی مسکراہٹ کا اجالا اس کے سانولے چہرے پر پھیلا جیسے رات کے چہرے پر صبح کاذب کی سفیدی۔

"کون پاگل ہے اور کون پاگل نہیں ہے؟ اس کا فیصلہ کیسے ہو آخر؟ ایک وہ پاگل تھا جو کہتا تھا سورج نہیں زمین گھومتی ہے حالانکہ سب اندھے نہیں تھے اور دیکھتے تھے سورج مشرق سے مغرب کی طرف روز جاتا ہے۔ پاگل وہ بھی تھا جس نے کہا تھا کہ زمین گول ہے حالانکہ یہ بات کہنے والا بھی ہموار اور چپٹی زمین پر کھڑا تھا اور اس کے لئے یہ ثابت کرنا مشکل تھا کہ عین اس قطعہ زمین کے نیچے زمین کی دوسری طرف دوسرے نصف کرے میں اگر لوگ اسی طرح قدم جمائے ہیں تو کیا الٹے لٹک رہے ہیں؟"

میں نے سر کھجا کے کہا "آپ تو فلسفی ہیں۔"

"کیا فلسفی پاگل نہیں سمجھے جاتے؟" [illegible] "بات صرف یہ ہے کہ فیصلہ رائے عامہ کرتی ہے۔ آپ کسی [illegible] سے کہیں کہ سانپ کے تو کان ہی نہیں ہوتے [illegible] دماغ خراب ہے۔ کیا تم نے اسے بین کی [illegible] نہیں دیکھا؟ تم نے کہا کہ چکارا [illegible] اندھے گنوار تک سب جانتے ہیں کہ چکارا [illegible] کرتا ہے۔"

"رائے عامہ نے آپ جیسی باشعور لڑکی کو [illegible] دے دیا آخر؟ ایسا کون سا سچ بولا تھا آپ نے؟"

وہ پھر اسی طرح زیر لب مسکرائی [illegible] روشن ہوئی اور غائب ہو گئی "لوگ کہتے ہیں کہ میں [illegible] پیدا ہوئی تھی۔ عبدالستار چوہدری کے گھر میں [illegible] بلکہ بیٹی کا حامی [illegible] پاکستان کی وحدانیت [illegible] نظریے کی حامی۔ میں جو کچھ کہتی اور کرتی ہوں [illegible] حفاظت کرنے کے لئے کافی ہے [illegible] مشہور کر دیا۔ وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی لیڈری [illegible] خطرے میں پڑ جاتی۔"

عبدالستار چوہدری اب [illegible] بیٹھا تھا اور واقعی شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ [illegible] وہ اس ملک اور مرکز [illegible] میں نے کاجل کی گہری [illegible] "مس کاجل! [illegible] آپ کی فہم و فراست اور بصارت و بصیرت [illegible] کرتا ہوں اور اس سے زیادہ آپ کی شخصیت [illegible] حسن سیرت میں کیا آپ کے پاس زیادہ ہے [illegible] سکتا۔ اگر میں مجبور نہ ہوتا تو آپ کے والد کی [illegible] سے بڑا انعام سمجھ کے خوشی سے پاگل ہو جاتا [illegible] دیوانے اور..."

"مجھے معلوم ہے کہ آپ کی مجبوری کا نام کیا ہے؟" [illegible] مظلوم مسکراہٹ سے کہا۔

"پھر خدا کے لئے میری مدد کریں۔ سب کچھ ہے آپ کے [illegible] عبدالستار چوہدری تک ہے جو ایک دن اس ملک کا [illegible] سفیر۔ اس سے کہیں مجھے جانے دے۔ باہر ایک اور [illegible] ٹیکسی میں جیسی میرا انتظار [illegible] اس کی فکر ہے اور وہ خطرناک [illegible] اگر میں واپس نہ گیا تو وہ اکیلی ہی اس قلعے پر حملہ کر دے [illegible] وہ پاگل ہے کہ اکیلی اور خالی ہاتھ بنگلہ دیش فتح کرنے کا [illegible] سکتی ہے۔"

وہ مسکرائی۔ اس مرتبہ مسکراہٹ واضح تھی۔ جیسے صبح کاذب کے بعد صبح صادق کا اجالا واضح اور یقینی ہوتا ہے۔

"[illegible] اپنا پستول مجھے دو۔"

میں نے کنفیوز ہو کے کہا "پستول؟ مگر یہ تو ریوالور ہے۔"

"ممکن ہے یہ توپ ہو۔ میں وہ چیز مانگ رہی ہوں جو تمہارے [illegible] میں ہے۔"

میں نے کہا "مس کاجل! آپ تو خود ایک ایسی دو دھاری [illegible] شمشیر آبدار ہیں..."

اس نے میری بات کاٹ دی "تم فضول باتوں میں اپنا وقت [illegible] کر رہے ہو۔"

میں نے کہا "آخر کیا کریں گی آپ اس کا؟ والد صاحب آپ کو پاگل قرار دے چکے ہیں۔ میں ریوالور تھما دوں آپ کے ہاتھ [illegible]"

"فرصت کرو۔ میں تمہیں گولی [illegible] کسی اور کو۔"

عبدالستار چوہدری چلایا "اس کو مت دینا [illegible] مجھے گولی مار دے گی۔"

میں نے فوراً ریوالور کاجل کو دے دیا "پھر تو کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔"

محمد بھائی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا "ابے مروا دیا! اپن کدھر [illegible] پھنس گیا۔"

[illegible] کاجل نے ریوالور [illegible] ٹیبل پر رکھ دیا "بابا! آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ [illegible] قسم کھاتی ہوں۔"

عبدالستار چوہدری کا چہرہ [illegible] کی طرح سفید پڑ گیا "پاگل کیا [illegible]"

[illegible]

"[illegible] بات سنو۔ میں تیرے بیٹے کی بات کر رہا [illegible]"

اس نے چیخ کے کہا "میری سوت میں بھلائی ہے تمہاری بھی [illegible] اس کے بعد جو دل چاہے کرنا۔ ابھی تو میری بات مانو [illegible]"

عبدالستار چوہدری کا ایک دم نروس بریک ڈاؤن ہو گیا "تم مجھے مار دو گی کاجل۔ میری جان چھٹ جائے اس روز روز کی مصیبت سے۔ تیری خاطر سب کیا میں نے۔ تو بھی کچھ کر میرے لئے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

محمد بھائی نے گھگھیا کے لہجے میں کہا "کاجل بی بی! کوئی کسی کو گولی مت مارو۔ یہ تمہارا باپ ہے، تو اس کا بیٹی ہے۔ سکندر کو بھی کوئی رونے والا ہے۔ اس کا زندگی بھی کسی کو پیارا ہے۔ کوئی پیار کرتا ہے اس سے اور یہ پیار کرتا ہے کسی سے۔ تمہارا باپ تیرے کو بہت پیار کرتا ہے۔ بس اپن سالا کسی کا نہیں ہے۔ کوئی اپن کو پیار نہیں کرتا۔ تو اپن کو گولی مار دے۔ ایک گولی چلانا اتنا ضروری ہے تو ادھر چلا۔ اپن سالا بہت حرامی پن کیا دنیا میں۔ دنیا کا جان اپن سے چھوٹے گا۔ اپنا جان دنیا سے۔"

کاجل نے کہا "تم محمد بھائی ہو نا؟"

"ہاں۔ اسٹوری شیٹر سالا اپنا کھاتا میں سب کچھ ہے۔ ہر جرم کیا اپن نے۔ چوری، ڈاکا، قتل اور بدمعاشی کا بہت نام کمایا اور بھی [illegible] جیل میں رہا ابھی چھ سال۔ اپن کو [illegible] کوئی بڑا آدمی بچا لیا ورنہ اپن کو کب کا پھانسی ہو جاتا۔ ابھی سالا اپنا [illegible] اب اپن بولتا ہے خود تیرے کو..."

"محمد بھائی! تم تو بہت شریف آدمی ہو۔ ان شریفوں سے بھی زیادہ جنہوں نے تم کو بدمعاش بنایا۔ تم واپس جاؤ۔ اس لڑکی کو بھی ساتھ لے جاؤ جو ابھی بنگلہ دیش فتح کرنے کا سوچ رہی ہوگی..."

"اور اپنا یار سکندر بادشاہ؟"

"سکندر بادشاہ میرے پاس رہے گا۔ تمہاری امانت کے طور پر۔" کاجل نے کہا "آپ کے دوستوں کے ساتھ۔ راجہ کے ساتھ۔"

"لیکن کب تک... اور کیوں؟" محمد بھائی نے پریشان ہو کے پوچھا۔

"جب تک خطرہ ٹل نہیں جاتا۔" کاجل نے سوچ کے کہا "یہ میرا مہمان ہوگا۔"

"اور اپنا کیا بنے گا؟"

"تمہیں ابھی کچھ نہیں ہوگا۔" عبدالستار نے اپنا سر اٹھا کے کہا اور بیٹی کے ہجر کو آواز دی۔

[illegible] اندر آیا جیسے اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے آیا ہو۔

"محمد بھائی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کو حفاظت سے واپس پہنچا دو جہاں ہو گے۔ اور اس کے ساتھ آنے والی لڑکی کو بھی۔" عبدالستار چوہدری بولا۔

محمد بھائی اپنی جگہ کھڑا رہا "اپن ساتھ آیا تھا، ساتھ ہی واپس جائے گا۔ تم [illegible] کو چھوڑو۔"

میں نے سر ہلایا "بالکل درست فرماتے ہیں محمد بھائی۔"

کاجل نے کہا "نہیں۔ صرف تم یہاں رہو گے۔ جاؤ بابا نے جو کہا ہے [illegible] ورنہ..."

"ورنہ کیا؟" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"ہم سب کو رہنا پڑے گا یہاں" کاجل نے کہا۔

میں نے کہا "آخر تم کیوں روکنا چاہتی ہو مجھے؟ کیا مقصد حاصل ہوگا اس سے؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم محسن کو اور رابعہ کو میرے ساتھ کر دو۔"

اس نے خوابیدہ لہجے اور پُر اسرار انداز میں کہا "دیکھو' میں تمہارے لئے التجا کر رہی ہوں' تم میری ایک بات نہیں مان سکتے؟"

میں نے اس کی بات پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ انکار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر اس نے نازو کو بھی اندر بلوا لیا تو غالب اور گل کی پریشانی دو چند ہو جائے گی۔ سوار تھی جو پاکستانی قوم کے حق مہمان نوازی کا قرض چکانے کے لئے جذباتی ہو رہے تھے ٹیکسی کی چوری کا علم ہوتے ہی ان کے دشمن ہو جائیں گے اور سارے زمانے میں کہتے پھریں گے کہ کبھی پاکستانی پر اعتبار مت کرنا۔ میں نے انہیں مہمان رکھا عزت دار سمجھ کے مگر وہ تو لڑکی سمیت میری ٹیکسی لے کر بھاگ گیا اگر محمد بھائی اور نازو واپس نہ گئے تو انہیں صورت حال کا علم ہو جائے گا اور پھر وہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔

میں نے کہا "اچھا کاجل! میں نے خود کو تمہارے باپ کے حوالے تو نہیں کیا تھا مگر تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ بشرطیکہ تم محمد بھائی کو واپس جانے دو۔"

کاجل کا چہرہ روشن ہو گیا "انہیں کب روکا ہے میں نے۔"

میں نے کہا "کیا میں دو منٹ بات کر لوں محمد بھائی سے؟"

"جو کہنا ہے میرے سامنے کہو۔"

میں نے کہا "کیا میں قیدی ہوں تمہارا؟"

"نہیں۔ تمہاری قیدی میں ہوں" اس نے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا "میرا مطلب تھا جیسے زنجیر کے ساتھ ہتھکڑی ہو۔ تو قیدی کے ساتھ ہتھکڑی اور ہتھکڑی کے ساتھ زنجیر تو رہتی ہے۔۔۔"

اس بے تکی مثال نے مجھے پہلی بار شک میں مبتلا کیا کہ کاجل واقعی ذہنی عدم توازن میں مبتلا ہے۔ اسے پاگل پن کہنا غلط تھا۔ وہ مخبطی' سنکی' جھکی یا الجھی ہوئی شخصیت تھی۔ یہ الجھاؤ کہیں بھی بے وجہ نمودار ہو جاتا تھا۔ جیسے ہموار میدانوں میں بہنے والی پُرسکون ندی کی راہ میں کہیں کوئی چٹان آ جائے۔ وہ پڑھی لکھی اور خاصی ذہین لڑکی خود اپنے خیالوں کے طلسم میں اسیر تھی اور اپنی ذات کی بھول بھلیوں میں اپنا الگ راستہ تلاش کرنا چاہتی تھی۔ یہی اس کا پاگل پن تھا کیوں کہ بھول بھلیوں سے باہر آنے کا راستہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اپنی مرضی کا راستہ ڈھونڈنے والا ہمیشہ بھٹکتا رہتا ہے۔

میں نے محمد بھائی سے کہا "تم جاؤ محمد بھائی۔ نازو کو بھی لے جاؤ۔ یہاں جو کچھ ہوا' کسی کو مت بتانا۔ بس یہ کہہ دینا کہ میں خیریت سے ہوں اور اپنے ساتھ محسن کو بھی خیر و عافیت کے ساتھ لے کر لوٹوں گا' ایک آدھ روز میں۔ رابعہ کا ذکر مت کرنا۔ انہیں یقین دلا دینا کہ نہ میں قید میں ہوں اور نہ پریشان ہوں۔ جاؤ' ورنہ وہ پاگل لڑکی چل پڑے گی۔"

"اچھا!" محمد بھائی نے ٹھنڈی سانس لی "ابھی تم بولتا ہو تو اپنا جاتا ہے لیکن خدا کا قسم اس میں دھوکا ہوا تو اپنا کسی کو نہیں چھوڑے گا۔"

عبدالستار چوہدری مشتعل ہو گیا "دھمکی دیتا ہے مجھے۔"

"ہاں۔ تیرے ساتھ نیکی بھی کیا میں' اب اپنا کا برائی دیکھنا۔ اپنا تیرا گھر کو آگ لگا دے گا۔ بم پھینک دے گا تیرا گھر میں سالا حرامی۔ تیرا چھوکری کو اٹھا لے گا۔"

چوہدری آگ بگولا ہو کے اٹھا مگر کاجل ایک دم بیچ میں آ گئی "تم جاؤ۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ سکندر کو کچھ ہوگا نہ کسی کو۔"

"تم کیا چیز ہے چھوکری۔ اپنا باپ کو بولو۔ یہ کیوں چپ ہے"

"آپ کیوں خاموش ہیں بابا؟ آپ کو میری قسم' ان کو بتا دیں کہ میرا وعدہ آپ پورا کریں گے۔"

"تم مجھے بلیک میل کرتی ہو بے بی" چوہدری نے پاس ہو کے کہا "ایسے تو کسی دن میں قسم بھی توڑ دوں گا۔"

"آپ قسم کھائیں۔"

"اچھا بابا۔ قسم کھاتا ہوں میں۔ تیرے ہاتھوں سے تو زہر کھا سکتا ہوں میں۔ تجھے معلوم ہے یہ بات" چوہدری نے بے بسی سے کہا۔

محمد بھائی چلا گیا تو کاجل نے کہا "میرے ساتھ چلو۔"

میں نے کہا "کہاں چلوں؟"

"رابعہ اور محسن سے نہیں ملو گے؟"

میں نے کہا "وہ کہاں ہیں؟ انہیں یہاں بلوا لو۔"

"وہ نہیں آ سکتے۔ تم کو جانا ہوگا میرے ساتھ۔ اٹھنا پڑے گا میرا" اس نے التجا کی اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

"بے بی! یہ ریوالور۔۔۔" چوہدری بولا۔

"یہ میرے پاس رہے گا۔ اپنی جان دے کر سکندر کو بچانے کے لئے" وہ ہنسی "اپنے وعدے پر قائم رہنا بابا ورنہ کھو دو گے۔"

میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی نیت مجھے نیک نہیں لگتی تھی مگر محسن کے قلعے میں محصور ہو جانے والے میں جھوٹے سہاروں کی پناہ نہ لیتا تو کیا کرتا۔ اب کچھ نہ تھا۔ کاجل آگے آگے ہوا میں تیرتی چلی رہی تھی۔ اس کا خرامی سے "موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی" والا شعر یاد اس کے بے داغ' سفید بادلوں کے اور چاند کی کرنوں ہوئے شکار لباس میں سے اس کے ساتھ لے ہوں کا ہر ... دیا تھا۔ آتش شوق کو بھڑکاتا تھا اور چیلنج محسوس ہوا میں کسی ممنوعہ' پراسرار ہو جانے والے معمول کی ... کے پیچھے چلا گیا۔ میرے سامنے وہ تھی۔ پھر اچانک اس کا

سراپا سا گیا اور فضا اس کے قرب کی خوشبو سے بھر گئی۔ ... ذہن میں رابعہ کا خیال تھا اور نظر میں کاجل تھی یا جیسا ... شعور بھٹک گیا۔ نہ جانے کیوں میں ایک مقناطیسی کشش کے زیر اثر اس کے نقش پا میں رابعہ کا عکس دیکھتا ہوا اس کے بیڈ روم تک جا پہنچا۔

جب اس نے دروازہ بند کیا تو مجھے ہوش آیا۔

میں نے کہا "کاجل! یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو' رابعہ کہاں ہے؟"

"صرف ایک رات کی مسافت پر" اس نے میرے قریب ہو کر سرگوشی کے انداز میں کہا "آج تم مجھے ملے ہو' صبح وہ تمہیں مل جائے گی۔"

میں نے اسے دور دھکیل دیا "یہ ناممکن ہے۔"

اس نے مجروح لہجے میں کہا "اتنے ظالم مت بنو۔ بہت دنوں سے تم میرے خوابوں پر قابض ہو' میرے خیالوں میں شامل ہو۔"

میں نے کہا "کاجل! تم نے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا' ملاقات کی بات ہے۔ اگر تم خواب میں نظر آنے والی کسی صورت یا خیالوں کے تراشے ہوئے پیکر سے محبت کرتی رہی ہو تو یہ پاگل پن ہے کیوں کہ حقیقی زندگی کسی خواب کی تعبیر یا خیال کا عکس نہیں ہوتی۔ جیسے کہانیاں افسانے اور فلمیں۔"

اس نے بڑے دکھ سے کہا "تم نے بھی مجھے پاگل کہہ دیا نا۔ ... زندہ نہیں مجھ سے۔ میں عورت ہوں' عام عورت۔ ... جاؤ گی۔ میں بتاتی ہوں تمہیں خواب اور حقیقت ..."

میں ایک بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔ بیڈ روم میں عجیب سی ... ہوئی تھی۔ اس کے اسباب آرائش میں دولت کی ... سے زیادہ نفاست ذوق جمال اور اپنائیت کا حسن شامل تھا۔ ... میں نرمی اور محبت تھی اور ایک ایسی کشش تھی جسے ... نام دیا جا سکتا تھا۔

مجھے اپنے احساس پر ندامت ہونے لگی۔ یہ مجھے کیا ہونے لگا ہے ... حواس پر اس ماحول کا طلسم کیوں اثر انداز ہو رہا ہے ... ذہن میں بے وفا خیالات کے چور دروازے کیوں کھل رہے ہیں ... مجھے سنبھل جانا چاہئے ورنہ میں الف لیلوی کہانی کے ... کی طرح پتھر ہو جاؤں گا جو بھٹکتا ہوا کسی پری کے قید ... جا پہنچا ہو۔

... نے ڈریسنگ وارڈ روب میں سے ایک مجلد البم نکالا اور ... مجھ سے لگ کے بیٹھ گئی۔ تب مجھے یقین آیا کہ اس ... خوشبو کا منبع کاجل کا بدن تھا۔

... "کاجل! یہ سب مت کرو۔"

... تو کچھ بھی نہیں کیا میں نے۔ تمہاری مدد کر رہی ... معصومیت سے بولی مگر اس معصومیت کے پیچھے اسی

حوا کی بیٹی کی ترغیب گناہ تھی جسے شیطان نے ورغلایا تھا۔ میں اب واقعی خوفزدہ تھا۔ اقرار کی گنجائش نہ تھی اور انکار سے اپنے حسن کی قوت تسخیر پر غرور کرنے والی عورت کا شیشۂ پندار بکھر جاتا تھا۔ ایسی عورت کچھ بھی کر سکتی تھی۔ جان دینے سے جان لینے تک۔ عشق کے ہر امتحان سے گزر جانا اس کے اختیار میں رہتا ہے کیوں کہ وہ اپنی ناکامی برداشت نہیں کر سکتی اور توہین قبول نہیں کر سکتی۔

کاجل نے کہا "یہ ایک خواب ہے جو آج بھی ادھورا ہے۔ اسے تم بھی دیکھو کیوں کہ تم اس میں شامل ہو۔"

میں نے البم لے لیا "کاجل! خواب کبھی پورے نہیں ہوتے۔ تعبیر مل جانے کے بعد بھی ادھورے رہتے ہیں کیوں کہ ہر خواب خواہشوں کی زنجیر ہے۔ کبھی ختم نہ ہونے والی۔ دم نکلنے تک ایسی خواہشیں ساتھ رہتی ہیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے اور ہزاروں بار زندگی ملے تب بھی یہ حسرت رہ جائے کہ بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی۔۔۔"

"تم کو سمجھنا پڑے گا کاجل۔ دیکھو' ہم زندگی بھر انہی خوابوں کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں جو ہماری خواہشوں کا روپ ہوتے ہیں۔ کسی کو چاہنے اور اسے پانے سے مسافت تمام نہیں ہوتی۔ یہ کسی فلم کا انجام تو ہو سکتا ہے کہ ہیرو یا ہیروئن ظالم سماج اور ولن کی رخنہ اندازی اور بدخواہی پر مبنی سازشوں کے باوجود مل جائیں مگر زندگی میں اس انجام سے خواہشات کے سفر کی ہزار راہیں نکل جاتی ہیں۔ شادی ایک دروازہ ہے۔ اس میں داخل ہونے والے کو ہر سمت میں ہر قدم پر دروازے نظر آتے ہیں جن کو وہ کھولنے پر مجبور ہوتا ہے۔ خوشی اور خوش حالی' صحت اور زندگی' اولاد اور ان کے مستقبل پر اپنے ارمانوں کا مکمل اختیار۔ وہ نیک ہوں' قسمت والے ہوں' قابل فخر ہوں۔ پہلے اپنا گھر بنے۔ اس میں آرائش' آسائش اور عیش کے اسباب ہوں۔ کار ہو یا کاریں ہوں اور اتنی دولت ہو جس کی قوت خرید میں دنیا ہو۔ پھر بچوں کے پاس اور ان کے بچوں کے پاس یہ سب ہو۔ یہ سارا سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ ایک عورت کی محبت یا ایک مرد کی رفاقت کے خواب کی تعبیر مل جانے سے۔ مگر اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ کتنے محبت کرنے والے ازدواجی زندگی کی منزل پا لینے کے بعد اپنے سارے ارمانوں کی تکمیل کی طمانیت پاتے ہیں؟ کون کہتا ہے کہ میں نے جو چاہا پا لیا؟ جسے سب مل جاتا ہے وہ بھی کہتا ہے کہ ایک زندگی اور ہوتی تو میں بہت کچھ کر لیتا جو میں کر نہ سکا۔"

"آخر تم کیا سمجھانا چاہتے ہو مجھے؟ کیا یہ سب میں نہیں سمجھتی؟ میں نے تو اپنے خوابوں کو دیواروں میں قید کر دیا ہے۔ خواہشوں کے گرد محرومی کے حصار کھینچ دیئے ہیں۔ خود اپنے خیالوں کے پر کاٹ دیئے ہیں اور ان کی پرواز چھین لی ہے۔ غلط تم

www.paksociety.com

جیسے ہو میری دیوانگی کو۔ میں تم سے کوئی تعبیر نہیں مانگتی مگر کم سے کم میرے خواب دیکھ تو لو۔ انھیں میں نے لہو لہو محفوظ کر رکھا ہے۔ کھولو اس قبرستان کا بند دروازہ اور دیکھو کہ گڑی ہیں کتنی صلیبیں۔"

میں نے کہا "تم کمال کی اردو بولتی ہو بنگالی ہو کے۔"

اس نے کہا "میں وہ سب کرتی ہوں جو ایک کامیاب بنگالی سیاست داں کی بیٹی کو نہیں کرنا چاہئے۔ جیسے چہ میں پاگل پن کا الزام قبول کر لیتی ہوں۔ میں اپنے باپ کی کامیابی کو ناکامیوں میں بدلنا نہیں چاہتی۔ اس نے بڑی جدوجہد کی ہے اس مقام تک پہنچنے کے لئے اور اس کے مجھ پر بہت احسانات ہیں جن کا بدلہ چکانا ممکن ہی نہیں۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میں نے اسے مایوس کیا اور صرف دکھ دیئے۔ کوئی بیٹی اگر جانتے بوجھتے ماں باپ کے ارمانوں کا گلشن اُجاڑ دے' ان کی خوشیوں کی جھولی میں انگارے ڈال دے' ان کی پرطمانیت مسکراہٹ کو پرعذاب آنسوؤں میں بدل دے تو اسے تم کیا کہو گے؟ وہ میں ہوں۔ کابل۔ میں نے انھیں اپنے گھر اور خاندان کو بچانے کے لئے یہ الزام قبول کر لیا ہے کہ میں پاگل ہوں۔ کاش میں اس سے زیادہ کچھ کر سکتی اور ان میں بھی اتنی ہمت ہوتی کہ مجھے پاگل خانے میں ڈال کے بھول جاتے۔"

"تم نے یہ الزام قبول کر کے یقیناً قربانی دی ہے۔"

"قربانی!" وہ طنزیہ انداز میں ہنسی "قربانی کا بکرا کب جانتا ہے کہ اس کی جان لی جائے گی مگر اس کے اختیار میں کیا ہوتا ہے؟ خیر چھوڑو۔ مجھ سے خوب یہ میں ہوں۔ وہ جو میں تھی۔ یہ ہے میری عمر گزشتہ کی کتاب۔"

البم کے پہلے صفحے پر اس کے بچپن کی تصویریں تھیں' کچھ پیدائش کے بعد کی۔ پہلی سالگرہ سے چودھویں سالگرہ تک اس کی زندگی کے ہر سال کا عکس ایک تسلسل کے ساتھ وقت کی مسافت کا اور عمر کی پیش قدمی کا افسانہ سناتا تھا۔ پھر وہ تصویریں آئیں جو خاندانی تقاریب میں اتاری گئی تھیں۔ ان میں کچھ چہرے جو پہلے موجود تھے' بعد کی تصاویر میں غیر موجود ہو گئے۔ میں کسی سے آشنا نہ تھا چنانچہ مجھے کسی کے وجود سے دلچسپی تھی نہ عدم سے۔ ان تصویروں کو میں نے محض کابل کا دل رکھنے کے لئے دیکھا۔ بس ایک سرسری نگاہ سے۔ مگر پھر جو تصویریں آئیں انھیں دیکھ کر میں چونکا۔

یہ آؤٹ ڈور فوٹو گرافی تھی۔ اسکول' کالج' بازار' تفریح گاہیں' مزارات' باغ اور نہریں۔ یہ سب مقامات میرے اپنے تھے۔ جانے پہچانے۔ یہ لاہور تھا جہاں وہ ہر جگہ نظر آ رہی تھی۔ کبھی جہانگیر میں۔ کبھی زمزمہ کے پس منظر کے ساتھ۔ مقبرہ جہانگیر کے اندر۔ شالیمار باغ میں.....

میں نے کہا "تم لاہور بھی رہی ہو؟"

"میں لاہور میں پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن وہیں پلی بڑھی ہوں۔ میں نے وہیں ہجویرہ کے گلستان اسکول سے میٹرک کیا تھا۔ لاہور [illegible] فاروق کالج کے بعد فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں دو سال پڑھتی رہی [illegible]"

"پھر تم ڈاکٹر کیوں نہیں بنیں؟"

"میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی' نہ مجھ میں اس کی صلاحیت [illegible] میں اور پاکستان ایک ساتھ ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے [illegible] اگست کو جب پاکستان بنا تو میں نے آنکھیں کھولیں۔ [illegible] ہوئی تو میں لاہور میں ہی تھی۔ بابا کے ساتھ قصور سے [illegible] کرلن کے لیجے تک ہو آئی تھی۔ افسوس سوا [illegible] اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کیا۔ پھر جو تین سو تین افسر نکالے گئے [illegible] میرے بابا بھی تھے۔ وہ کہتے ہیں ان کا قصور صرف یہ تھا [illegible] محفلوں میں وہ مشرقی پاکستان کے ساتھ ہونے والی ناانصافی [illegible] کرتے تھے۔ بہت سے متعصب لوگ ان کے دشمن تھے انہی [illegible] نے خبر تو پہلے ہی آگے پہنچا دی تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچی [illegible] سب کچھ چھوڑ کے فرار ہونا پڑا۔ سیاست میں کیا ہوتا ہے تم [illegible] ضرور معلوم ہوگا کہ شیر بنگال فضل حق کو غدار تک قرار دے [illegible] تھا۔ ایسے ہی لوگوں نے پاکستان کی سالمیت کے خلاف سازش [illegible] بالواسطہ شرکت کی۔ انہوں نے نفرت کو پروان چڑھایا۔ [illegible] نتیجہ تو ہوتا ہے۔ یہاں آ کے بابا نے اپنا کاروبار کیا۔ ان کو [illegible] اور شہید کا درجہ تو بنگالی پہلے ہی دے چکے تھے۔ وہ پیدائشی طور [illegible] بنگالی تھے۔ موقع ملا تو وہ اپنے کریڈٹ کے ساتھ سیاست کے [illegible] میں کود پڑے اور کامیاب ہو گئے۔"

میں تحیر کے عالم میں یہ سب سن رہا تھا "کیا صدق دل [illegible] بھی تمہارے بابا یہی چاہتے تھے کہ مشرقی پاکستان الگ ہو جائے؟"

"نہیں۔ یہ میں جانتی ہوں" وہ بولی "مگر بابا اس [illegible] نہیں کر سکے۔ وہ کٹر پاکستانی تھے مگر اب سیاسی مصلحت کا تقاضا [illegible] کہ وہ پاکستان دشمن زبان بولیں۔ نفرت کو ہوا دیں۔ بنگلہ [illegible] حمایت کریں۔ حب الوطنی کا انھیں کیا صلہ ملا تھا؟"

"ہاں!" میں نے افسوس سے کہا "بعد کے حالات نے [illegible] سے مخلص کارکنوں کو دل شکستہ اور مایوس کر دیا تھا۔ [illegible] بندے تھے جو صبر کر کے خاموش ہو گئے۔ کچھ [illegible] ہو گئے اور لوٹ مار میں لگ گئے۔ انہوں نے [illegible] کہا کہ جب سب ہی ہاتھ دھو رہے ہیں تو ہم کیوں پیچھے رہ کے [illegible] کمائیں اور نقصان اٹھائیں۔ خیر چھوڑو۔ یہ بہت لمبا اور [illegible] موضوع ہے۔"

"میرے بابا بھی اندر سے دکھی ہیں کہ یہ سب کیوں ہوا [illegible] کو اپنی سیاست کی دکان چلانی ہے۔ اب انہوں نے بھی [illegible] خلوص پر یقین کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور یہ [illegible] سیاست میں اصول پرستی انھیں کچھ نہیں دے گی۔ وہ [illegible] خیال ہیں مگر مجبور ہیں کہ مجھے سب کے سامنے غلط [illegible] میں پہلے سب کے سامنے بولتی تھی۔ انہوں نے [illegible]

پہلے ایک ماہر نفسیات کے سپرد کیا۔ پھر نفسیاتی علاج کے ایک کلینک میں داخل کرا دیا اور اس بات کو بہت پبلسٹی دی۔ اس طرح سب کو یقین آ گیا کہ میں کریک ہوں۔ بابا کے سیاسی مستقبل کو نقصان نہیں ہوا۔ وہ نفسیاتی کلینک میں میرے پاس آ کے روتے تھے کہ بیٹا میں نے اپنی زندگی اصول پرستی میں گنوا دی۔ میں مر گیا تو تمہارے پاس کیا ہوگا؟ آج کون پوچھتا ہے ناظم الدین' حسرت موہانی اور لیاقت علی خاں کی اولاد کو۔ کہ بعد میں ان پر کیا بیتی۔ کسی نے انھیں وہ عزت تک نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے۔ عزت دار وہ اسمگلر ہیں گیا جو چار ہاتھ لمبی کار میں گھومتا ہے۔ میں بھی ہار گیا ہوں بیٹی۔ میں تم سب کو عزت کے وہ اسباب فراہم کروں گا جو اب بدل چکے ہیں اور اس کے لئے میں اپنے آپ کو بیچوں گا۔"

میں چونکا سا گیا "یہ تم اپنے والد کا اعتراف جرم پڑھ رہی ہو؟"

"میں حقیقت بتا رہی ہوں" وہ بولی "وہاں سب کے سامنے انہوں نے جو کہا اسے بھول جاؤ۔"

"انہوں نے مجھے مروانے میں کوئی کسر تو باقی نہیں چھوڑی تھی۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"لیکن تم مرے تو نہیں۔ انھیں یقین تھا کہ تم ان کے ذرائع ابلاغ حقیقی بنا دو گے کہ کسی کو شک کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ وہ پہلے بھی شک سے بالاتر ہو چکے ہیں۔ ورنہ تمہیں مروانا ہوتا تو انھیں کسی کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود بھی گولی مار دیتے۔ وہ بہت خطرناک انداز میں اپنا گیم کھیل رہے ہیں۔ انہوں نے بہت سے تخریب کار' علیحدگی پسندوں کو خود گرفتار کرائے لیکن الزام دوسروں پر آیا۔ پاکستانی ایجنٹوں پر۔ اسی طرح انہوں نے کئی پاکستانی خاندانوں کی مدد کی چھپ کر....."

"اگر کبھی ان کا راز فاش ہو گیا؟"

"تو وہ مارے جائیں گے' انھیں معلوم ہے۔ مگر اب انھیں فکر نہیں ہے۔ وہ میرے اور بھائیوں کے لئے بہت جائیداد بنا چکے ہیں۔ ان کے اور بیٹوں کے اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے خود کو بیچ کر بڑی اچھی قیمت لی ہے۔"

میں نے کہا "کابل! مجھے افسوس ضرور ہے کہ تمہارے بابا نے اپنے آپ کو بیچا۔ پھر بھی میں ان سے معافی مانگ لوں گا۔ یہ البم رکھو اور مجھے بتاؤ محسن اور رابعہ کہاں ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے ہاتھ پھیلا کے کہا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"چلاؤ مت۔" وہ خود آتے ہی ہوں گے۔ جیسے انہوں نے تم کو بچا لیا ہے' ایسے ہی رابعہ اور محسن بھی ان کی وجہ سے محفوظ ہیں۔ انہیں اتفاق سے معلوم ہو گیا تھا کہ محسن کو پولیس نے پکڑ لیا ہے۔ انہوں نے بڑا لمبا چکر چلایا اور محسن کو ملٹری انٹیلی جنس کی تحویل میں دے دیا۔ وہ بنگلہ دیش کی فوج کی قید میں رہا۔ فوج میں سب غدار نہیں ہیں۔ فوج میں غداری کا تصور بھی نہیں اور اس جرم کی سزا موت ہے۔ پھر بھی جو دل سے پاکستانی ہیں' وہ میرے بابا کی طرح موقعے سے فائدہ اٹھا جاتے ہیں۔"

اچانک دروازہ کھلا اور چوہدری اندر آ گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی اور میری نظریں ملیں۔ پھر وہ شکست خوردہ آدمی کی طرح صوفے پر گر گیا۔ زبان سے میں نے بھی کچھ نہیں کہا تھا' کابل بھی چپ رہی تھی اور چوہدری بھی خاموش تھا لیکن اس کے باوجود ہم اعتراف کر چکے تھے کہ اب ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی نہیں رہی۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب! کابل نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

چوہدری چھت کو گھورتا رہا "پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں نے؟ کس بارے میں؟"

"کابل کے بارے میں" چوہدری بولا۔

میں نے کہا "میں صرف رابعہ اور محسن کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ وہ کہاں ہیں؟"

"وہ جہاں بھی ہیں خیریت سے ہیں۔"

"پھر یہ تاخیر کیوں؟ تم مجھے ان سے ملواتے کیوں نہیں؟"

"یہ بھی ہو جائے گا" وہ بولا "تم سب کو بحفاظت روانہ کر دیا جائے گا۔ تم خیر و عافیت کے ساتھ پاکستان پہنچ جاؤ گے۔ کابل کے ساتھ۔"

"کابل کے ساتھ؟"

"کابل تمہارے ساتھ جائے گی" وہ بولا۔

"اگر یہ شرط ہے تو مجھے نامنظور ہے" میں نے بگڑ کے کہا۔

"یہ شرط نہیں ہے' مجبوری ہے" وہ دکھی لہجے میں بولا۔

"یہ مجبوری تمہاری ہے۔"

"نہیں۔ میں ایک بیٹی کو قربان کر رہا ہوں' باقی سب کی بھلائی

بابر زمان خان کی آپ بیتی جگ بیتی
سب رنگ میں شائع ہونے والا مقبول ترین سلسلہ

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

www.paksociety.com

پر۔ مجھے زیادہ دکھ نہیں جتنا مجھے اس کی چار چھوٹی بہنیں ہیں۔ تمہارا بھائی ہیں اور ماں ہے۔ ان سب کی سلامتی اور بچانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ میں ذلت اور بدنامی کا ٹیکا خود اپنے ماتھے پر سجالوں۔ جب تم سب نکل جاؤ گے تو میں رپورٹ لکھوا دوں گا کہ میری بیٹی کاجل ایک دشمن کے ایجنٹ کو اپنے ساتھ لے کر فرار ہوگئی ہے جسے میں نے بڑی چالاکی سے قید کیا تھا۔ میں یہ اعلان بھی ساتھ ہی کرا دوں گا کہ کاجل اب میری بیٹی نہیں رہی۔ میں اس سے قطع تعلق کرتا ہوں اور اسے عاق کرتا ہوں۔" وہ اچانک رونے لگا۔

میں نے کہا "لیکن ـــ میں یہ ذمے داری قبول نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟ تم اکیلے تو نہیں ہو۔ محسن اور رعائب ہیں تمہارے ساتھ۔ نادو اور کل ہیں، رابعہ ہے۔ اس قافلے میں کاجل کسی پر بوجھ کیسے ہو سکتی ہے؟ میں اس کا خرچ دوں گا۔ سب کے لئے راستے میں آخر کیوں مار رہا ہوں؟ کیوں میں نے سب کو اتنا خطرہ مول لے کر چھپا رکھا ہے؟"

کاجل نے خود چھلک آنے والے آنسو صاف کئے "میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ بعد میں بھی۔ بس تم مجھے لاہور میں چھوڑ دینا۔ وہاں میرے بہت دوست ہیں۔ پرانے ہمسائے ہیں۔ میں اپنا ٹھکانہ بنالوں گی اور کسی نہ کسی طرح گزارا بھی کرلوں گی۔"

میں نے کہا "اچھا۔ میں کاجل کو لے جاؤں گا تمہارے احسان کا بدلہ چکانے کے لئے۔"

"احسان کی بات مت کرو۔ میں کاجل کو بھی بچانا چاہتا ہوں اور خود کو بھی" چوہدری بولا "سب جانتے ہیں کہ یہ پاگل ہے۔ پاگل خانے میں رہ چکی ہے۔ اس کے بھاگ جانے پر نہ کسی کو تعجب ہوگا نہ دکھ۔" پھر اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی "تم بہت خطرناک کھیل میں الجھ گئے ہو۔"

"اور تم؟ تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا اس کھیل میں۔"

میں نے کہا "تم مطمئن تو تھے۔"

"اطمینان باہر سے نہیں" اندر سے ملتا ہے۔ میں مطمئن ہوں کہ مجھے ایسا ہی کرنا چاہئے۔ یہی مسئلے کا حل ہے۔"

"تم اس وقت بھی مطمئن تھے جب پاکستانی تھے؟"

"پاکستانی میں آج بھی ہوں مگر اندر سے۔ باہر کی فکر تم مت کرو۔ اب چلو میں تمہیں رابعہ اور محسن کے پاس لے چلتا ہوں" وہ اٹھ کھڑا ہوا "تم پیچھے سے جاؤ گے۔ تم کاجل کے ساتھ۔ ذرا میں گاڑی لے کر گیٹ سے نکل رہا ہوں تاکہ چوکیدار مجھے دیکھ لے۔ تم تیار ہو کاجل؟"

"میری تیاری مکمل ہے" کاجل نے کہا اور ایک بیگ کندھے پر ڈال لیا۔

میں حیران رہ گیا "بس ـــ یہی تمہاری تیاری ہے؟"

"اور کیا میں اونٹ گھوڑے، بستر اور خیمے ساتھ لے کر چلوں۔ اس میں نقد رقم ہے اور میری چوڑیاں ہیں۔ باقی سب بیکار ہے بابا جانی" اس نے باپ کی باہوں، سر کو اور دل کو انگلی سے چھوا۔

"کیا ـــ تم لوٹ کر نہیں آؤ گی؟"

"شاید اس کا موقع نہ ملے۔"

"اپنی بہنوں سے اور بھائیوں سے بھی نہیں ملو گی؟ ماں سے ـــ؟"

اس نے میری بات کاٹ دی "دشمن کے ساتھ فرار ہونے والی لڑکیاں گھر سے ایسے رخصت نہیں ہوتیں جیسے اور سب ہوتی ہیں۔ تو چلو۔"

میں حیران پریشان شرمندہ اور تذبذب میں مبتلا کھڑا رہا "تم بعد میں بھی تو نکل سکتی ہو!"

"بعد میں کب؟" وہ بولی "کیا پتا ہم صبح ہونے سے پہلے روانہ ہو جائیں۔"

"صبح ہونے سے پہلے۔ چار گھنٹے میں!"

"روانہ ہونے والے چار منٹ میں روانہ ہو جاتے ہیں" وہ مسکرائی۔

"مجھے تو یہ ناممکن سی لگتا ہے۔"

"اگر صبح روانہ ہونے کی نوبت نہ آئی تو کل یا پرسوں۔ موقع ملتے ہی ہم نکل جائیں گے اور اس وقت میں کیسے آؤں گی؟ مجھے موقع نہ ملا پھر کیا ہوگا؟ اچھا اب چلو بھی۔ بابا ہم سے پہلے کار لے کر پیچھے پہنچ جائیں گے۔"

میں کاجل کے ساتھ روانہ ہوا تو مجھے ایسا لگتا تھا جیسے یہ سب خواب ہے۔ میں تو عبدالستار چوہدری سے یہ درخواست کرنے آیا تھا کہ وہ محسن کا سراغ لگانے میں ہماری مدد کرے۔ اس کے بعد صورتحال اتنی تیزی سے بدلی تھی کہ اب چند گھنٹوں میں رابعہ اور محسن کے ساتھ واپس اپنے وطن اور اپنے شہر کی جانب سفر کے آغاز کا تصور بھی بعید از قیاس لگتا تھا۔

کاجل ریے پاس چلتی ہوئی میرا ہاتھ پکڑے کچن کے راستے باہر نکلی۔ ہم نے مختصر سے باغیچے کو طے کیا۔ ایک کتا مجھے دیکھ کر بھونکا۔ کاجل نے اسے ڈانٹ کر کہا "ڈائر! چلو واپس۔"

میں نے کہا "اس کتے کا نام تم نے ڈائر کیوں رکھا ہے؟"

"میرا خیال تھا تم سمجھ لو گے" وہ بولی "ڈائر وہ شخص تھا جس نے جلیانوالہ باغ میں گولی چلانے کا حکم دیا تھا۔ بریگیڈیئر جنرل۔ اس میں میرے دادا کو شہادت نصیب ہوئی تھی۔ تم نے کبھی تصویر دیکھی ہے اس قتل عام کی؟"

"ہاں۔ ایک تصویر دیکھی ہے جس میں بہت سے بے جسم نادار مارنے والوں کی بانہوں پر لٹکے نظر آتے ہیں۔ تمہارے بابا کے دادا بھی کہیں ہوں گے۔"

"بالکل ٹھیک۔ ہمارے پاس وہی ایک تصویر ہے۔ اس میں میرے دادا صاف پہچانے جاتے ہیں۔ وقت ملا تو تمہیں دکھاؤں گی اور بتاؤں گی کہ دادا کون سے ہیں۔"

حویلی احاطے کے چھوٹے سے گیٹ سے باہر آتے ہی مجھے تحیر و صدمے کا سامنا ہوا اور میں نے خود کو شہر میں وارد ہونے والے اس دیہاتی کی طرح محسوس کیا جس نے اعتکاف کرتے ہوئے کسی سے مسجد کا پتا پوچھا ہو مگر پتا بتانے والے نے اسے حوالات پہنچا دیا ہو۔

باہر پولیس کی ایک گاڑی کھڑی تھی اور دیوار کے ساتھ چار پولیس والے اپنی بندوقوں کا رخ میری جانب کئے موجود تھے۔ ڈھول جیسے پیٹ والا سپاہی تھانیدار ثابت ہوا۔ میں نے ایک کاجل کو دبوچ لیا۔ اسے چلانے کی مہلت ہی نہ ملی اور میرے بائیں ہاتھ نے اس کی گردن کو جکڑ لیا۔ میرا دایاں بازو اس کی کمر اور پیٹ کے گرد حائل ہو گیا۔ اس کے وجود کی ساری نرمی اور گرمی بے معنی ہو گئی اور میرے لئے اس کی حیثیت ایک دفاعی سپر سے زیادہ نہ رہی۔ وہ مچلی اور تڑپی مگر خود کو چھڑا نہ سکی۔

ایک پولیس انسپکٹر نے پنجابی میں کہا "اوئے پاگل دے پتر۔ چھڈ اینوں۔"

میں نے کہا "میں اسے جان سے مار دوں گا۔ کہاں ہے اس کا ذلیل نسل کا کتا باپ۔"

عبدالستار چوہدری گاڑی سے کود کے اترا "سکندر! خدا کے لئے عقل سے کام لو۔"

میں نے کہا "اب عقل آئی ہے مجھے۔ پہلے میں جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا۔"

"سکندر! یہ اپنے لوگ ہیں" چوہدری نے کہا "یہ تمہیں گرفتار کرنے نہیں آئے ہیں۔"

کاجل نے بڑی مشکل سے سر کو اوپر نیچے حرکت دی۔

میں نے بے یقینی کی کیفیت میں پولیس والوں کو دیکھا "جھوٹ بکتے ہو تم۔ کیا ثبوت ہے کہ یہ بھی دھوکا نہیں ہے؟"

انسپکٹر نے کہا "او یار! ہم تو لینے آئے ہیں تمہیں۔ تھانے میں لے جا کے رکھیں گے۔ تیری ایسی خاطر تواضع کریں گے کہ تو یاد رکھے گا۔"

میں نے چوہدری سے کہا "سن لیا تم نے۔"

چوہدری نے کہا "یہ مذاق کر رہا ہے۔ یہ تم کو حفاظت سے لے جائیں گے اور جہاں تم کہو گے پہنچا دیں گے۔ رابعہ اور محسن بھی انہی کے مہمان ہیں۔"

میں نے کہا "اور کس حال میں ہیں! یہ بھی بتا دو۔ جو ان کے مہمان ہوتے ہیں ان کی میزبانی فرشتۂ اجل کرتا ہے۔"

انسپکٹر ہنس پڑا "سبحان اللہ۔ تم کو بڑا تجربہ ہے حوالات میں قیام فرمانے کا۔ مگر ہم چھتر نہیں، تو رسے نے حلوائی کھلائیں گے تمہیں۔ کیا کہا کے مشکور ہو جاؤ گے ہماری طرح۔ ہم بھی پاکستانی ہیں یار اور تمہارے بھی ہیں۔"

"پیچھے ـــ؟"

"ہاں۔ پیچھے یعنی FAN۔ تو بڑا ہی ڈاڈا بندا ہے بھئی۔ اچھا لگا ہے دلاور تجھے ـــ کے بارے کو۔ بڑی ریلو راو کرنے تھے ہم کہ ساری قوم اگر متحد ہو جائے تو ہم دنیا فتح کرلیں گی گی ـــ"

"میں مزید اضافہ نہیں کر سکتا ـــ" میں نے کہا۔

"اچھا بھئی۔ تیری مرضی۔" وہ بولا۔

اسی وقت پیچھے سے دو افراد نے مجھے دبوچ لیا۔ وہ اتنی خاموشی سے آئے تھے کہ میں نے قدموں کی آہٹ تک محسوس نہیں کی تھی۔ وہ تھے بھی میاں والی کے لمبے تڑنگے جوان جو مجھ سے جونک کی طرح چمٹ گئے۔ موقع پاتے ہی کاجل تڑپ کر میری گرفت سے نکل گئی اور ڈھول سپاہی جیسی تھانیدار نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کے میرے سر پر ریوالور کا دستہ مارا۔

"خبردار، آنچ" تھانیدار کے آخری الفاظ میں نے کاجل کی چیخ کے ساتھ سنے۔ پھر اس کے باپ نے کچھ کہا جو میری سماعت تک پہنچا مگر سمجھ میں نہ آیا۔ میں بے ہوش نہیں ہوا تھا مگر چوٹ سے میرا دماغ چکرا گیا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں جگنو اڑنے لگے تھے۔ دوسرے لمحے چار ہاتھوں نے اٹھا کے مجھے ٹرک میں ڈال دیا۔

میں نے ٹرک کو حرکت کرتا محسوس کیا اور سر کو جھٹکا۔ میرے حواس بحال ہونے لگے تھے۔ اس وقت میں تھوڑی سی مکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوری طرح ہوش میں آنے تک خاموش لیٹا رہتا تو ڈھول کے پیٹ والے انسپکٹر سمیت دو افراد کو باہر پھینک دیتا اور ٹرک کو اپنی جگہ لے جاتا مگر اس وقت عقل بھی میری دشمن ہو رہی تھی اور میں عقل کا۔ میں نے سر اٹھایا ہی تھا کوئی سخت چیز پھر میرے سر پر لگی اور میں نے تھانیدار کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی سنی "بڑی سخت چیز ہے بھئی" پھر میں اندھے کنویں میں گرتا گیا اور سب آوازیں معدوم ہو گئیں۔

ہوش آنے پر میں نے بلا ارادہ فلمی اداکاری کی۔ آنکھیں کھولتے ہی میں نے چاروں طرف دیکھا اور کہا "میں کہاں ہوں؟"

"آپ جہنم میں ہیں۔ اپنے اعمال کی وجہ سے" کسی فرشتے نے کہا۔

میں فرشتے کی اردو سن کے بہت حیران ہوا۔ کیا وہ دوسری دنیا میں پہنچنے والے ہر شخص سے اس کی مادری یا قومی زبان میں بات کرتے ہیں۔ پھر مجھے اس لغو اور بے سروپا خیال نے حیران کیا جو بالکل پاگل ہو جانے والے کسی شخص کے دماغ میں ہی آ سکتا تھا۔

مگر میں پاگل نہیں ہوا تھا۔ بس ہوش کی باؤنڈری پار کر گیا تھا اس بال کی طرح جسے ظہیر عباس کے بیٹ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہو۔ اب میں کسی فیلڈر کے ہاتھ میں تھا اور واپس ہوش میں آرہا تھا۔

روشنی ہوکے دھندلکے میں غائب ہوتے چہرے آخر کار میری

www.paksociety.com

نظر نے واپس میں آنے لگے۔ اس کے بعد پھر مجھے شک ہوا کہ میں فوت ہو چکا ہوں۔

میں نے کہا "کیا یہ عالم ارواح ہے؟ تم یہاں کیسے پہنچے اور کب پہنچے مسٹر محسن شیروانی۔"

"میں براستہ ڈھاکہ تشریف لایا تھا" اسی فلائٹ سے جو بعد میں آپ نے پکڑی" محسن بولا "دنیا کا کیا حال ہے؟ تمہاری بیوہ اور اس کی جملہ پیداوار یعنی عمر بھر جنہیں وصول کرنے والے لوگ ہی تھے، تمہارے دنیا سے کوچ کرنے پر خوش تو ہوں گے کہ کروڑوں کے وارث بن گئے۔"

میں ایک دم اٹھ بیٹھا "محسن... تو... سے تو ہے؟"

"اسے بھول کبیر خان! چھوڑ مجھے کیا تو بھی مجھے اپنے آباؤ اجداد میں شامل کرے گا؟" محسن نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی "بھیا میری روح کو بدروح مت بنا۔"

میں نے کہا "مجھے یقین نہیں آتا محسن... تو ٹھیک ہے نا؟"

محسن ہنسا "ابھی تک تو ٹھیک تھا۔ آگے تیری مرضی۔ چھوڑ دے مجھے ورنہ میں ڈھول سپاہی کو بلاتا ہوں۔"

میں نے کہا "کون ڈھول سپاہی؟" میں نے اسے چھوڑ دیا۔

"وہی جو تیرا جنازہ یہاں لایا تھا" محسن بولا "میرا تو خیال تھا اتنے دنوں میں تو عاقل و بالغ ہو گیا ہو گا مگر افسوس ابھی تک بچہ ہے۔"

میں نے کہا "محسن! مذاق مت کر، مجھے بتا ہم کہاں ہیں۔ دوسرے لوگ کہاں ہیں؟"

"کیا تو یہ ہے رابعہ کا نام لیتے ہوئے تو واقعی بڑا شرمیلا بچہ ہے" محسن بولا اور جس بستر پر میں لیٹا ہوا تھا اس کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اگر ہم قید میں ہیں تب بھی یہ بڑے سکون اور قرار کی بات ہے کہ ہم کو شامت اعمال نے یکجا کر دیا ہے" میں نے کہا "میں تو سمجھتا تھا کہ اب اس دنیا میں شاید ملاقات ہی نہ ہو... یہ کون سی جگہ ہے؟"

"یہ تیسری دنیا ہے" محسن بولا "ایک دنیا وہ تھی جس میں ہم نے سرزمین پاکستان پر قدم رنجہ فرمانے تک قیام کیا۔ دوسری وہ جس میں ہم چوہدری دلدار اینڈ کمپنی سے لڑتے رہے، مرتے رہے اور مر مر کے جیتے رہے، بچھڑتے رہے اور بھٹکتے رہے۔ یہ تھانے کا گوشہ عافیت ہے۔"

"تھانہ اور گوشہ عافیت؟"

"کیا صحرا میں نخلستان نہیں ہوتے؟" محسن بولا "تو دیکھ سکتا ہے کہ ہم حوالات میں نہیں ہیں۔ مگر یہ تھانے کا ہی ایک کمرا ہے جسے بطور خاص ہماری خاطر گیسٹ ہاؤس میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔ تو بول کیا کھائے گا؟"

"یہاں کا مینیو تو وہی ہوگا۔ قیمہ تیتر کا بھجیا، انڈا اور مرغ

سوپ۔ الیکٹرک شاک۔ لاتیں گھونسے تھپڑوں کی سلاد کے ساتھ۔"

محسن ہنسا "تجھے یقین نہیں آتا؟ اچھا دیکھ تماشا۔"

اس نے چیخ کر کہا "الو کے پٹھے۔"

ایک دبلا پتلا شخص دوڑتا ہوا آیا "آپ نے آواز دیا شر؟"

"شور نہیں، سر بولو۔"

"شر..." بنگالی بڑی مشکل سے بولا۔

"میں نے تم سے کہا تھا چائے لاؤ۔ اس کے ساتھ کچھ سلائس اور انڈے..."

بنگالی کی حالت غیر ہو گئی "کب بولا..."

"جب تم سو رہا تھا۔ ابھی جاگ رہا ہے یا نہیں؟" محسن نے ڈانٹا۔

"ایک دم جاگ رہا ہے شر۔ ایک دم" بنگالی نے کہا اور رفوچکر ہو گیا۔

میں نے کہا "تو اس کا نام لے کر اسے کیوں نہیں بلاتا؟"

محسن ہنسا "میں بلند آواز میں کچھ بھی کہوں۔ … گدھے کا بچہ … یہ حاضر ہو جاتا ہے۔ میں نے اسے سو بار جوتے کھانے اور ہلاک ہونے سے بچا لیا۔ اپنی سفارش پر۔"

"اس کا کوئی نام تو ہو گا۔"

"ہے۔ احتجاب الزمان۔ میرے حلق میں پھنس جاتا ہے پورا نام لیتے ہوئے۔ اس لئے آسان نام سے پکارتا ہوں۔"

"تو نے کب کہا تھا اسے چائے لانے کو؟"

"ابھی تیرے سامنے کہا ہے نا۔ باقی تو اپنے ہی … فضا کا اثر ہو گیا ہے مجھ پر" محسن بولا۔

میں نے کہا "فضول باتیں چھوڑ۔ یہ بتا رابعہ کہاں ہے۔"

"وہ خدا کے فضل سے بالکل خیریت سے اپنے گھر میں شاد و آباد ہے۔ بچے … اس کے صرف دو سال میں ہے۔ اس کا میاں … ہے۔ خوب گھبرائی ہوئی ہے اس کی…"

میں نے کہا "تاریخ میں پہلی بار تھانے والے کے دوست کے ہاتھوں دوست مار کھائے گا۔ اسی کوالٹی کی … تھانے … چوری کے جھوٹے الزام میں پکڑا جانے والا کہتا ہے۔ شرافت سے سنجیدہ ہو کے بات کر ورنہ…"

میں نے جملہ مکمل ہونے سے پہلے محسن کو اٹھایا اور تھوڑا اچھال کے اپنے بیڈ پر گرا لیا۔ وہ ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے رونے لگا۔

"قسم خدا کی میں پھر زندہ ہو گیا ہوں۔ ورنہ میں دنیا سے بچھڑ کے تنہا … کئی بار سوچا کہ خودکشی کر لوں۔ پھر خیال آیا تم سب کا۔ کہ تمہیں دکھ ہوگا اور … کہ محسن کم ہمت تھا۔ بس اسی خیال نے مجھے بزدلی کا عذاب … رہا۔"

"ہم جنگ ہار گئے ہیں محسن" میں نے اپنے آنسو پی کے کہا۔

"ایسی کی تیسی جنگ کی۔ ہم زندہ ہیں اور پھر لڑ سکتے ہیں۔

ہماری زندگی پھر مل گئی ہے ہمیں جو ہم سے روٹھ گئی تھی۔ اور ہار جیت کیا چیز ہے کبیر خان! اصل چیز ہے نظریے اور اصولوں پر یقین۔ ہم اس لئے نہیں ہارے ہیں کہ ہم اس یقین میں غلط نہیں تھے۔ بنا پر ہم پشیمان نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے کئے پر ندامت نہیں، فخر ہے۔ ہم نے اپنی بساط سے بڑھ کر کیا۔ باقی سب سیاست ہے یا کچھ اور۔ ہمیں اس سے کیا…"

میں نے کہا "محسن! کیا رابعہ بھی ہے یہاں؟"

"ہاں۔ وہ سب بھول گئے ہیں" محسن بولا۔

"کون سب؟"

"وہ جو تجھے یہاں لائے تھے ہمارے مہربان۔ رابعہ کو اس لئے ساتھ لے گئے ہیں کہ کہیں نادر ایک تو بندے کی … دعائیں … اپنے مرزا غالب … دعائیں قبول نہ … تیری طرح مزاحمت تو وہ بھی کرتے اگر پولیس انہیں گرفتار کر کے لاتی۔ اب پہلے رابعہ انہیں سمجھائے گی اور چند منٹ بعد چلا جائے گا۔"

"یہ اصلی پولیس والے ہیں؟"

"بالکل اصلی۔ گرفتاری ایک ڈراما ہے پبلک کو خوش اور مطمئن کرنے کے لئے۔ چوہدری اپنی پوزیشن محفوظ رکھتا ہے۔"

"مگر رات کے وقت کون دیکھ رہا تھا؟ جب مجھے لایا گیا تھا۔"

"آپ کا عقل کے ساتھ یک جان دو قالب نہ ہوتے تو سمجھ نہ ہوتا۔ بے شک لڑکی اچھی ہے مگر تو اس کو جذبات پر قابو ہونا چاہئے۔ بنگال کی سوغات ہے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

میں نے کہا "تو کر لے مقدمانی اگر وہ بھی لڑکی ہے۔ مجھے رابعہ لگتی ہے۔"

بات کے زبان سے نکلتے ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا مگر یہ کمان سے نکلا ہوا تیر تھا جو سیدھا محسن کے دل میں پیوست ہو گیا۔

اس کا مسکراتا چہرہ ایک دم غم کے تاریک سائے میں ڈوب گیا۔ وہ خلا میں گھورے جا رہا تھا۔ متحرک یادوں کے آسیب دیکھ رہا تھا جو اس کے ماضی کے قبرستان سے بد روحوں کی طرح نکل آئے تھے۔ … وہ حال میں زندہ تھا کہ میں نے اسے ماضی میں لے جا کر مار دیا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "محسن!"

وہ … بیٹھا رہا۔ اس کی صورت دیکھ کے مجھے خوف آنے لگا۔

"محسن!" میں نے اسے جھنجوڑا "ایسے مت دیکھ مجھے۔ کچھ بول مجھے بتا میں کیا کروں؟ مجھے سزا دے میرے جرم کی۔ یہ سب … سے ہوا تھا میں۔ میں تجھ سے تیری زندگی کی روشنی چھین لینے کا قاتل ہوں شملا کا" پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "ایسا مت کہہ کبیر! تیرے آنسو

دیکھ رہی ہے شملا۔ اور دیکھ کتنی دکھی ہے وہ۔ اسے میں کبھی نہیں رلاؤں گا۔ خدا نے مجھے حوصلہ دیا۔ صبر دیا اور قوت برداشت عطا کی۔ یہ احسان تھا اس کا۔ پھر میں ناشکرا پن کیسے کرتا؟ زندگی اسی کا نام ہے کبیر، اور اس سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ کسی انسان کے نہیں، تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں جن سے فرار ممکن نہیں۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے کیوں ہوتا ہے۔ شملا کو جانا ہی تھا تو وہ میری زندگی میں کیوں آئی تھی اور جاتے وقت وہ مجھے ساتھ کیوں نہیں لے گئی۔ اپنے بیٹے سے اسے زیادہ پیار تھا۔ یہ میں ضرور پوچھوں گا اس سے میدان حشر میں۔ لیکن وہ بیچاری کیا جواب دے گی۔ اس کے اختیار میں کیا تھا؟"

فرط غم سے میرا دل پھٹنے کے قریب تھا مگر میں فولادی اعصاب اور چٹان جیسا حوصلہ رکھنے والے اس انسان کو دیکھ رہا تھا جس نے حالات سے شکست کھانے سے انکار کر دیا تھا اور حقیقت کی بے رحمی کے سامنے اپنے یقین کی استقامت کے ساتھ ڈٹا رہا تھا۔ شاید اس کی جگہ میں ہوتا تو پاگل ہو جاتا مگر یہ بھی میرا خیال تھا۔ قدرت کے حسن انتظام نے بقا کی جدوجہد کرنے والے انسان میں ایسی مافوق الفطرت قوتوں کو مخفی رکھا ہے جن کا ادراک خود اسے نہیں ہوتا۔ جب تک کہ حادثات و صدمات کی یلغار میں اس کے لئے حوصلے کے آخری تنکے کا سہارا لینا بھی ممکن نہ رہے۔ تب اچانک اسے کوئی دست غیب … جو … لڑ جانے کی طاقت آجاتی ہے۔ کمزور پرندہ اپنے آشیانے کو بچانے کے لئے انسان پر حملہ کر دیتا ہے۔ … کو شاہین سے لڑا دے۔ یہ علامہ اقبال نے ایسے ہی نہیں کہا تھا۔ محسن اتنا بڑا صدمہ جھیل کر بھی پاگل نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ پرسکون تھا۔

میں شملا کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ سب باتیں جو صرف محسن کے لئے تھیں۔ اسی طرح محسن کا … اور کوئی بات ہی نہ کرتا لیکن عملاً ہم دونوں نے بزدلی کا ثبوت دیتے ہوئے فرار میں پناہ تلاش کی۔ مجھ سے پہلے خود محسن نے موضوع بدل دیا۔

اس نے کہا "بہت دیر ہو گئی انہیں گئے ہوئے۔"

میں نے کہا "یہ رابعہ کیسے … واپس؟"

"میں نے بلوا لیا۔ ابھی فرشتہ بچے ہی تو آئی ہے۔"

"فرشتہ بچے تو کہاں تھی؟"

"بھابی اب یوں" وہ بولا "گھبرا گیا تھا میں نے سوچا کیوں نہ رابعہ کو بلا لوں کہ آ کر … کریں آہ و زاریاں۔ تو نے گل … وہ گل کی بات پر یاد آیا گل بانو عرف ناگ منی اب کیسی ہے؟"

"اب کا کیا مطلب؟ وہ گل بانو ہی ہے۔ مجھے رابعہ کے بارے میں بتا۔ اس نے تیری کیسے مان لی؟"

www.paksociety.com

"زمانہ خراب ہے دوست۔ سچ کوئی نہیں سنتا۔ جھوٹ کا سکہ چلتا ہے۔ میں نے بھی جھوٹ کا سہارا لیا کہ سکندر اعظم ہندوستان فتح کرتا ہوا بنگال پہنچا ہی چاہتا ہے۔ آؤ اس کا استقبال کریں۔ وہ بھی جیسے بہانہ ہی ڈھونڈ رہی تھی۔ بھاگی چلی آئی۔"

"اور اگر میں نہ آتا۔ پھر؟"

"پھر کیا' ہم انتظار کا آدھا آدھا دکھ بانٹ لیتے مگر تو دیکھ کہ جھوٹ بھی نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ بولا جائے تو سچ کی طرح اثر کرتا ہے۔"

"کیا مطلب؟ تو رابعہ کو نہ بلواتا تو میں نہ آتا۔"

"ہاں۔ تو گرفتار ہو جاتا۔ پولیس کے ہاتھوں یا کاجل کی زلف گرہ گیر میں۔ یہ جادوگروں کا دیس ہے۔ کوئی کاجل ہے کوئی سرسے والی۔"

"کل میرے لئے سب سے زیادہ پریشان تھی۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ پریشان اور فکرمند ہم سب تھے مگر اس کی حالت......"

"وہ پاگل ہے۔" محسن نے نظر چراتے ہوئے آہستہ سے کہا' جیسے وہ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے ڈر رہا ہو۔

"سنا ہے تجھے پولیس نے پکڑ لیا تھا۔ پھر ملٹری والے لے گئے تھے۔ جان کیسے چھوٹی ان سے؟" میں نے کہا۔

"چیف کے نزدیک یہاں کے سیاسی و معاشرتی حالات کا تو نے بھی مشاہدہ کیا ہو گا" محسن بولا "بے شک مجیب کے حامی غالب اور بااختیار ہیں اور سکہ بھی انہی کے نام کا چلتا ہے مگر اس کی وجہ عوامی لیگ یا ان کے منشور کی مقبولیت نہیں۔ یہ اثر مجیب کی شخصیت کا ہے۔ بالکل اسی طرح ہٹلر کی شخصیت نے جرمن جیسی ذہین قوم کی عقل کو مفلوج کر دیا تھا۔ باقی ان کی دہشت ہے۔ وہ انتہا پسند جنونی اور خونی انتقام کے جذبات سے مغلوب ہیں۔ نہ مخالفت برداشت کرتے ہیں اور نہ پاکستان کی حمایت' خواہ وہ جائز ہو۔ اکثریت کو معلوم ہے' احساس محرومی' ناانصافی اور استحصال کی شکایت ضرور ہے مگر اس کا علاج وہ پاکستان سے علیحدہ کسی ریاست کے قیام کی صورت میں نہیں چاہتے۔ اکثریت میں ابھی وہ لوگ ہیں جو پاکستان بنانے کے سارے عمل میں شریک تھے اور یہ نہیں سمجھتے کہ ان سے کوئی سیاسی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ وہ مجیب کے بنگلہ دیش کو ایک سیاسی المیہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جسم کے کسی بیمار عضو کا واحد اور پہلا علاج یہ نہیں کہ اسے کاٹ کے الگ کر دیا جائے۔ سیاسی مسائل بات چیت' مذاکرات' احتجاج اور مظاہروں کے دباؤ سے بھی حل کئے جاتے ہیں۔ حالات اتنے برے بھی نہیں کہ پھر آزادی کا مطالبہ کر دیا جائے۔ ابھی ابھی تو آزادی حاصل کی ہے انگریز سے۔ چوتھائی صدی بھی نہیں گزری۔"

"چوتھائی صدی بیت چکی ہے۔" میں نے کہا۔

"آج واقعی پچیس سال سے زیادہ ہو گئے ہیں مگر علیحدگی کا نعرہ تو بہت پہلے لگا دیا گیا تھا۔" محسن بولا "میں اپنی زندگی کا منحوس ترین دن سولہ دسمبر کو شمار کرتا ہوں جب بنگلہ دیش نے اعلان آزادی کیا تھا۔ اپنوں سے کیسی آزادی یار۔"

"تو چھوڑ یہ دل دکھانے والی باتیں۔ مجھے یہ بتا کہ ڈھاکا آ کے کیا ہوا تھا۔"

"کچھ نہیں۔ میں چند دن ہوٹل شاہ باغ کے سامنے والے کھمبے پر اپنے پیغام کو خود پڑھتا تھا۔ سارا دن انتظار کرتا تھا اور رات کو ایک پاکستان کے حامی مجاہد کے گھر لوٹ آتا تھا۔ اس مجاہد کی کہانی الگ ہے جو پھر کبھی فرصت میں سناؤں گا۔ میں نے اس کے ساتھ بڑے معرکے سر کئے۔ کئی بار شرپسندوں کو ٹھکانے لگایا اور ان کے عزائم کو خاک میں ملایا۔ بہت سے محصور ہو جانے والوں کو بچایا۔ کچھ کو نہ بچانے کا صدمہ مجھے ہمیشہ رہے گا۔ پھر وہ مجاہد مارا گیا۔ شہر میں بے گھر نہیں ہوا تھا کہ وہاں کر رہا تھا میں!" محسن ہنسا "یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں۔ وہ سب گھر میرے ہو گئے تھے جن کو بچانے کی خدا نے مجھے توفیق دی تھی۔ وہ خود کو شکر گزار' احسان مند اور مقروض سمجھتے تھے۔ میں جب گھر دیتا تھا تو ان کا [illegible] لکھ آتا تھا۔ اس طرح کہ کوئی سمجھ بھی لے تو براہ راست وہاں تک نہ پہنچ پائے۔ اول تو مطلب ہی نہ سمجھے اور سمجھے تو صرف مجذوب کی بڑ سمجھے۔ کوڈ ورڈز میں ہوتا تھا پیغام۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس پر کوئی اشتہار یا پوسٹر لگ گیا۔ اعلان۔ اطلاع عام۔ خوش خبری۔ اعلان کسی سیاسی جلسے کا۔ اطلاع عام کسی اشتہاری مجرم کے لئے۔ خوش خبری ان جوانوں کے لئے جو ستاروں پر کمند ڈالنے کے بجائے دیگر لغویات میں جوانی لٹا چکے ہوں اور شب عروسی میڈیکل [illegible] ہو گئے ہوں۔"

میں ہنس پڑا "یہ وضاحت ضروری نہیں تھی۔"

"میں کیدڑ تو نہیں ہوں پھر بھی شامت مجھے شہر لے آئی۔ مجھے کوئی اندازہ نہ ہوا کہ میں بھی کسی کی نظر میں ہوں۔"

"کون تھی وہ؟" میں نے کہا۔

"تھی نہیں' شکاری تھے۔" محسن بولا "وہ تاڑ چکے تھے کہ یہ بندہ کوئی پراسرار گیم کھیل رہا ہے۔ انہوں نے مجھے بار بار کچھ لکھ کے کھمبے پر چپکاتے دیکھ لیا ہو گا۔"

"ماشاء اللہ سے آپ بھی اتنے عقل مند ہیں کہ سمجھتے رہے کہ مجھے تو کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا" میں نے کہا۔

"کسی نے کہیں سے ایک فرانسیسی کو پکڑا اور اس سے ترجمہ کرا لیا۔ بس اس کے بعد میری نگرانی ہونے لگی۔ ایک دن' دو دن' ایک ہفتہ' دو ہفتہ' مہینہ پورا ایسے ہی نگرانی میں گزر گیا تو پولیس کا حوصلہ بھی جواب دے گیا کہ آخر یہ آدمی کچھ کرتا کیوں نہیں! قابل دست اندازی پولیس ہو۔ تنگ آ کے انہوں نے مجھے پکڑا اور بڑی محبت سے پوچھا کہ میاں یہ ماجرا کیا ہے۔"

"کتنی محبت سے؟" میں نے کہا۔

"بس یار' تو جانتا ہے ان کی محبت کو" محسن نے آہ بھری "وہ تو رات مجھے بجاتے رہے مگر اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ اچانک کاجل وارد ہوئی۔ اس وقت تاریخ مرتبہ ہوا تھا اور نامعقول تھانے دار [illegible] کو میں انڈا دوں۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے ان کی عقل کو۔ [illegible] سے اذان دینے کا مطالبہ تو کیا جا سکتا ہے۔ انڈا دینے پر [illegible] کو مجبور کرتے تو جواز بھی ہوتا۔ کیا شعر ہے وہ۔ پہلے تو مرغ چمن کے انڈے سے نکال۔"

"تو کاجل کی بات کر رہا تھا۔"

"ہاں۔ کاجل بڑی من موہنی لڑکی ہے۔ اس پر کوئی بھی عاشق ہو سکتا ہے۔ افلاطون سے مجنوں تک۔ مگر وہ ایک مرغے پر فریفتہ تھی جب اسے معلوم ہوا کہ مرغا لاہور کا ہے اور مشکوک ہے یا [illegible]......"

"وہ کیا لینے آئی تھی وہاں؟"

"کسی کو پوچھتی ہوئی آئی تھی" محسن بولا "اب یہ تو تجھے معلوم ہو گا کہ کاجل غلطی سے ڈھاکا میں پیدا کر دی گئی۔ ورنہ وہ [illegible] کی جہاں کے ہم بھی ہیں۔ اس کا باپ دوغلا ہے۔ ڈبل ایجنٹ۔ [illegible] پاکستانی دماغ سے بنگلہ دیشی۔ ایسے یہاں بہت ہیں۔"

"[illegible] کام کے لوگ۔"

"ان سب کے درمیان ایک خفیہ رابطہ ہے۔ یہ ایک [illegible] کی مدد کرتے ہیں اور پاکستان کے حامی عناصر کو بچانے کے [illegible] نیچے سے اوپر تک قابل اعتبار ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ یہ [illegible] خطرناک کام ہے۔ پکڑے جاتے ہیں تو پھر ایک نہیں سب [illegible] جاتے ہیں مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک زنجیر ٹوٹتی [illegible] دوسری کا سرا ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ کاجل نے باپ سے کہا۔ [illegible] نہ جانے کس کس سے۔ ایک چوہدری اللہ دتا ہے اپنے لور [illegible]"

"[illegible] چوہدری" "وہ سالا حرامی۔ اس نے تو مروا دیا تھا مجھے۔"

محسن ہنسا "اب وہ بڑا فنکار ہے۔ ایکٹنگ ایسی کرتا ہے کہ کوئی [illegible] کو کیا جانے۔"

"یار ہم نے اس کی معرفت سوا سیر کے قریب سونا بیچا تھا۔ وہ [illegible] کو لے آیا۔ لالا لا چپت لگوائی۔ وہ بائیس ہزار دے [illegible] سے مروا دیا۔ ہم فرار نہ ہوتے تو پکڑے جاتے۔"

"[illegible] نہیں سمجھتا اسے۔ وہ سونا بھی واپس لا دے گا تمہیں۔"

"کیا؟ سونا واپس لا دے گا؟" میں نے کہا "نہیں محسن۔ وہ بڑا [illegible] ہے۔ لعنت ایسے سونے پر۔ گل اور نانو ٹھیک ہی کہتی [illegible] پہلے ان کا مذاق اڑاتا تھا مگر......"

"[illegible] کیا؟ اب تو قائل ہو گیا ہے اس نظریے کا کہ سونا منحوس [illegible] حالاں کہ ہر مبارک موقع پر پہنا جاتا ہے۔ سونا صرف [illegible] کی وجاہت ہے اور عورت کی کمزوری ہے۔"

"[illegible] پھر کیا ہوا؟ کاجل نے کیا [illegible]۔"

"اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔ تو جانتا ہے کہ میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے مگر اثر وقتی سا ہوتا ہے۔ تیرا سی کے باپ نے مارا۔ اس نے مجھے ملٹری والوں کے پاس پہنچایا۔ چولہے سے نکال کے بھاڑ میں جھونک دیا گویا۔ کم سے کم میں یہی سمجھا تھا پہلے۔ مگر وہ بڑا شاطر ہے۔ اس نے بہت دیکھ بھال کے انتخاب کیا تھا۔ اس یونٹ کا کرنل اور تقریباً ساری نفری پاکستانی تھی۔ دو بنگالی تھے مگر پاکستان کے حامی۔ کاجل تو ہمیں یوں جانتی ہے جیسے ہمارے ساتھ رہی ہو۔ اس نے باپ کے ذریعے ہمارے تحفظ کو یقینی بنایا۔ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے ہی پولیس نے خاکسار کی کھال میں بھس بھرا تھا۔ تھانے دار بعد میں معافی مانگ رہا تھا اور اپنی مجبوری بتا رہا تھا۔ حرام زادہ۔ میرے ساتھ جتنے جیب کترے' چور پکڑے جاتے تھے' انہیں بھی میرے برابر روشن ملتا تھا جو ہوا کاری کا۔ کاجل کی معرفت مجھے اطلاع مل گئی تھی کہ مجھے تھوڑی سی ہمت اور قوت برداشت سے کام لینا ہو گا۔ مجھ سے جرح تفتیش ضرور کی جائے گی مگر یہ رسمی کارروائی کرنے والے بھی کیا کریں۔ وہ مجبور ہیں۔ ان کے اوپر نگرانی کرنے والے بیٹھے ہیں جو نتائج مانگتے ہیں' اعلیٰ کارکردگی کی توقع رکھتے ہیں۔ ملٹری فیلڈ انٹیلی جنس یونٹ میں ایک لیفٹیننٹ سخت متعصب قسم کا قوم پرست تھا۔ ایک دن اس نے تفتیش کی۔ بس یار اس دن تو واقعی کلمہ پڑھ لیا تھا میں نے۔ دراصل اس دن کرنل کہیں ہائی کمان کی میٹنگ میں تھا اور سیکنڈ ان کمانڈ کے ہاتھ میں سارے معاملات تھے ورنہ ایسا نہ ہوتا۔ عام طور پر جو لوگ تفتیش کرتے تھے وہ مجھے الگ کمرے میں لے جا کے بالکل بدل جاتے تھے۔ وہ تفتیش کا سارا شور و غل ریکارڈ کرتے تھے جو تم [illegible] اور گالی گلوچ کی آوازیں۔ میری فریاد و فغاں۔ ایک ریڈیو ڈرامہ ہوتا تھا جس میں صوتی اثرات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ بعد میں یہ رپورٹ کرنل کو پیش کی جاتی تھی۔ میں جب کرنل کے سامنے جاتا تھا تو ظاہر یہ کرتا تھا کہ دم واپسیں پر سر راہ ہے۔

پھر ایک دن مجھے رات کے وقت بلایا گیا۔ مجھے معلوم ہے وہ بھی ڈرامہ تھا۔ میری پیشی کرنل صاحب کی خدمت میں کی گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ میرا سمری کورٹ مارشل ہو گا۔ اس میں سیکنڈ ان کمانڈر اور ایڈجوٹنٹ بطور معاون شریک ہوئے۔ میری فرد جرم پڑھ کے سنائی گئی۔ مجھ پر الزام تھا کہ میں جاسوسی اور تخریب کاری کی غرض سے بنگلہ دیش آیا تھا اور میرا جرم ثابت ہو چکا ہے چناں چہ مجھے سزائے موت دی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ایک گھنٹے میں ہو گیا۔ استغاثہ کا بیان' فرد جرم' میرا صفائی کا بیان اور فیصلہ۔ اپیل کی گنجائش ہی نہ تھی۔ مجھے صبح پانچ بجے گولی مار دینے کا حکم صادر کرنے کے بعد سمری کورٹ مارشل ختم ہو گیا اور مجھے ایک طرح سے ڈیتھ سیل میں پہنچا دیا گیا۔ اس رات میری عجیب ذہنی کیفیت تھی۔ کاجل کی طرف سے یقین دہانی پر میرا اعتقاد متزلزل ہو رہا تھا۔

www.paksociety.com

مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ ڈراما نہیں حقیقت ہے اور مجھے واقعی صبح پانچ بجے گولی ماری دی جائے گی۔

چار بجے کے قریب دو فوجی آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ ایک کیپٹن نے میرے ہاتھ میں ریوالور دیا "لو۔ اب بھاگ جاؤ۔"

میں نے حیرانی سے کہا "بھاگ جاؤں یعنی فرار ہو جاؤں؟"

"ہاں۔ تمہارے فرار کے سب انتظامات مکمل ہیں" کیپٹن نے کہا "ہم نے بائیں طرف سے خاردار تاروں میں راستہ بنا دیا ہے۔ یہ جوان تمہیں راستہ دکھائیں گے۔"

میں نے کہا "فرار ہو کے میں کہاں جاؤں گا؟"

کیپٹن نے مجھے ایک نقشہ پکڑا دیا جو سادہ کاغذ پر پینسل سے بنایا گیا تھا "یہاں تم کو ایک کار ملے گی۔ ڈارک براؤن مرسیڈیز۔" اس نے مجھے نمبر بھی بتا دیا تھا جو اب مجھے یاد نہیں مگر وہ عبدالستار چوہدری نے بھجوائی تھی اور اسے کاجل چلا رہی تھی۔ کیپٹن نے مزید کہا کہ جیسے ہی مجھے فرار کا سگنل ملے گا' گارڈ فائرنگ شروع کر دیں گے اور تم مارے جاؤ گے۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا "مارا جاؤں گا!"

کیپٹن مسکرایا "حوصلے سے کام لو جوان۔ فائرنگ تم پر نہیں ہوگی۔ عین اسی وقت ایک اور ملزم کو فرار کا موقع فراہم کیا جا رہا ہے۔ وہ ایک ہسٹری شیٹر قسم کا بدمعاش ہے جس پر قتل و خونریزی کے متعدد الزامات تھے مگر پولیس نے اسے کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ اسے قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اس طرف جائے' ادھر سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ وہ عین باڑھ کے قریب گولیوں کا نشانہ بن جائے گا۔ اپنے کپڑے اتار دو۔ یہ کپڑے قربانی کا بکرا پہنے گا۔"

میں نے کہا "ننگا میں اور شہیدوں کی طرح بھاگوں؟"

کیپٹن سمجھا نہیں چنانچہ مجھے بتانا پڑا کہ لباس کے بغیر میں نہیں بھاگ سکتا۔ میں تو شرم سے زمین میں گڑ جاؤں گا۔ اس نے کہا کہ اندھیرے میں کون دیکھنے والا ہے اور جان بچانے کے لئے اتنا تو کرنا ہی پڑے گا۔ بس بھائی کبیر خان! اس رات بے شرمی کی انتہا ہو گئی۔ میں ایسے ہی بھاگا اور ابھی میں خاردار تاروں کی باڑھ سے نکلا بھی نہ تھا کہ تڑتڑ گولیاں چلنے لگیں اور محافظوں کی سیٹیاں گونجنے لگیں۔ سرچ لائٹس روشن ہو گئیں مگر کسی کا رخ میری طرف نہیں ہوا۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے براؤن کار تلاش کر رہا تھا۔ براؤن رنگ کا تو خاک پتا چلتا مجھے مگر کار میں نے دیکھ لی۔ اس کا انجن اسٹارٹ تھا۔ اس وقت تک مجھے یہ علم نہیں تھا کہ اسے چلانے والی کاجل ہوگی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور دروازہ کھول کے کار میں گھس گیا۔ جب کاجل ہنسی تو مجھے صورت حال کے انتہائی قابل اعتراض ہونے کا احساس ہوا اور میں کیا بتاؤں۔ زندگی میں اتنی شرمندگی میں نے کبھی نہیں اٹھائی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ ستر پوشی کے لئے کچھ ہو مگر کار میں کیا ملتا۔ کار اندھیرے میں دوڑتی جا رہی تھی اور کاجل مجھے تسلی دے رہی تھی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے سخت طیش آیا اور میں نے کہا کہ اچھا پھر تم بھی میری طرح ہو جاؤ۔"

ہنستے ہنستے میرا برا حال ہو گیا "اگر وہ ہو جاتی پھر؟"

"میں چلتی کار سے کود جاتا" محسن نے کہا "اور دوڑتا ہوا رضاکارانہ طور پر پاگل خانے پہنچ جاتا۔ بڑی عجیب و غریب صورت حال تھی۔ مگر کچھ دیر بعد میری عقل ٹھکانے آئی تو میں نے کار کا سیٹ کور اتار کے پہن لیا۔"

"وہ کیسے؟"

"بس پہن لیا۔ ضروری حصے پر اسے لپیٹ لیا' غیر ضروری حصے بہرحال بیان سے باہر ہے۔ تو نے دیکھا ہے کبھی کسی کو سیٹ کور میں ملبوس؟ ایسا لگ رہا تھا میں جیسے کسی افریقی قبیلے کا پہلوان اکھاڑے میں اترنے والا ہو۔ کوئی زولو ڈانس کرنے کے لئے۔ اس خلعت فاخرہ کے ساتھ میں عبدالستار چوہدری کے در دولت پر پہنچا اور ان کی خدمت میں پیش ہوا۔ کاجل نے راستے میں تو وہ بھی نوٹس نہیں لیا۔ وہاں بھی کہنے لگی کہ بالکل ٹارزن لگ رہے ہو جو ایسے ہی سوٹ میں شاخ سے لٹک کر جھولتا ہوا اس درخت تک جاتا ہے۔ میں نے بڑی متانت سے فرمایا کہ سیٹ کور کا دوسرا حصہ اتار کے والد صاحب قبلہ کے لئے بھی ایسا ہی سوٹ بنوا لو۔ والد صاحب نے خاصا برا مانا مگر پھر مجھے زیر زمین کرا دیا۔ وہاں ایک انڈر گراؤنڈ طور سے پورا۔ وہ بتانے لگے: وہاں روپوش! سرکاری طور پر میں وفات پا چکا تھا۔ میں نے سزائے موت عدالتی فیصلے پر عمل درآمد سے پہلے ہی مرنے کا فیصلہ کیا اور محافظ کو دھوکا دے کر بھاگا مگر باڑھ عبور کرنے سے پہلے ہی مجھے مار دی گئی۔ میری شناخت کے بعد میری لاش وہیں دفنا دی گئی۔ معلومات کاجل کے ذریعے مجھے ملیں مگر اسے شاید چوہدری نے ... ہوگا۔ مجھے کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کون بدنصیب قربانی کا بکرا تھا جس نے میرے کپڑے پہن کر زندگی کی امید میں موت قبول کی۔ اسے بھی کہا گیا ہوگا کہ بھیس بدل کے تم آسانی سے ... ہو جاؤ گے۔ اس کھیل میں زندگی صرف ایک کے لئے تھی اور فال میرے نام نکل چکا تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ بھی تمہاری تلاش میں رہی اور اس نے اے ڈی کو بھی اس خدمت پر مامور کیا۔ واضح ہو کہ اے ڈی کاجل کے عشاق میں سرفہرست اور اس حد تک دیوانہ ہے کہ کاجل کے قدموں پر کسی کو بھی طلاق دے ڈالے۔ اس کی بیوی اسی وجہ سے ماں باپ کے گھر چلی گئی ہے۔"

"حبیب مجھ سے کہہ رہا تھا کہ حالات کے پیش نظر تم نے تیلی کو واپس بھیج دیا ہے۔ ویسے یار کیا یہ واقعی پولیس ... ہے؟"

"نہیں۔ پہلے تھا۔ پھر کسی نے اس کی عمارت پر بم پھینک دیا کیونکہ یہاں ایک طلبہ تنظیم کے صاحب صدر تفتیش کی تاب نہ لاتے ہوئے راہی ملک عدم ہو گئے تھے۔ تھانے کا کچھ حصہ تباہ ہو گیا۔ تھانہ دوسری عمارت میں شفٹ کر دیا گیا۔ اس کے دو کمرے باقی بچے تھے۔ وہ ہمارا گیسٹ ہاؤس بنا دیئے گئے۔ اس کھنڈر کی طرف کون آتا ہے اور یہ جگہ ہے بھی الگ تھلگ۔ رات کو یہاں نشئی اور چرسی سونے کے لئے آتے ہیں۔ انہیں پہلی رات ہی پکڑ لیا گیا اور اصلی تھانے پہنچا دیا گیا۔ وہ ایسے خبیث کہ تین دن بعد پھر موجود۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اتفاق سے پکڑے گئے تھے ورنہ ٹھکانہ اچھا ہے۔ یہ اتفاق دوبارہ ہوا تو انہیں یقین آیا کہ وہ بے گھر ہو چکے ہیں۔ پھر ایک رات علی بابا چالیس چور والا کیس ہو گیا۔ لوٹ مار تو ہر طرف ہو رہی تھی۔ جو پہلے بے روزگار تھے مگر ہمت والے تھے' وہ خاصے فارغ البال ہو گئے۔ اٹھائی گیرے چور اور چور ڈاکو بن گئے۔ چار نو آموز نہ جانے کہاں سے لمبا ہاتھ مار کے آئے تھے۔ مجھے تو پتا بھی نہ چلتا' رابعہ نے جگا کے کہا کہ دوسرے کمرے میں کوئی ہے۔ میں نے چھپ کے دیکھا تو وہ موم بتی جلائے مال غنیمت تقسیم کر رہے تھے۔ ریوالور میرے پاس تھا۔ میں نے گرج کے کہا' قصور تمہارا تو ... اور دعائیں سے پستول داغ دیا۔ وہ ایسے بدحواس ہو کے بھاگے کہ دروازے سے گزرتے ہوئے آپس میں ٹکرا گئے۔ میں نے پھر گولی چلائی۔ میرا خیال ہے ان میں سے ایک تو حوائج ضروریہ سے بھی فارغ ہو گیا تھا۔ دوسرے کی دھوتی کھل گئی تھی۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی والا محاورہ درست ثابت ہوا۔ رابعہ اور میں جب مال گن رہے تھے تو ان کی حالت کا تصور کر کے ہمیں بار بار ہنسی آ رہی تھی۔ تقریباً ستر ہزار روپے تھے۔ رابعہ کا خیال تھا کہ پولیس کو ساری بات بتا دی جائے اور رقم بھی ان کے حوالے کر دی جائے۔ پولیس کے کچھ اہلکار بھی ہماری خدمت پر مامور تھے اور صبح شام حاضری دیتے تھے' ناشتا کھانا لاتے تھے اور ہمارے ہر حکم کی تعمیل کو ان پر فرض کر دیا گیا تھا۔ ایک پٹھان تھا' دوسرا سندھی۔ اپنے اپنے گھروں کو یاد کر کے چار چار آنسو بہاتے تھے اور ہم سے پوچھتے تھے کہ واپس جانا بھی نصیب ہوگا یا نہیں۔ میں ہر روز ایک ہی جواب دیتا تھا۔ بے شک ہم سب کو لوٹ کر جانا ہے۔"

"پھر وہ رقم واپس کر دی تم نے؟"

"مال غنیمت حلال ہوتا ہے۔ اسے حرام خوروں کے حوالے کرتا؟ وہ کون سا سرکاری خزانے میں جمع کراتے۔ پھر بھی غیر سرکاری ایف آئی آر لکھوانے کے لئے میں نے دس فیصد اٹھائے ظاہر کر دیئے اور وہ خاصے مایوس ہوئے اور میرے بیان پر شک میں بھی مبتلا رہے لیکن زبان سے کیسے کہتے کہ میں اصل رقم گول کر گیا ہوں۔ انہوں نے سات ہزار آپس میں بانٹ لئے صبر شکر کے ساتھ۔ مگر وہ تھے پولیس میں' بات کو آگئے کہ چور پھر آئیں گے تو ان سے تفتیش کے ذریعے اصل رقم معلوم ہو جائے گی۔ صبح تک جماہیاں لیتے رہے اور پہرا دیتے رہے اور بہت مایوس واپس گئے۔"

میں نے ہنس کے کہا "اگر وہ آ جاتے اور بتا دیتے کہ رقم سات نہیں ستر ہزار تھی۔ پھر؟"

"پھر کیا۔ ہم کہتے کہ صفر اس نے خود لگایا ہے۔ کیا یہ سچا ہے اور ہم جھوٹے؟" محسن بولا "وہ ہم سے ڈرتے بہت تھے۔ معلوم نہیں ان پر کس کا دباؤ تھا۔ یار' یہ رابعہ نہیں آئی باقی لوگوں کے ساتھ۔ مجھے تو اب تشویش لاحق ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا "کاجل ان کے ساتھ ہے اور انتظام پکا ہے تو ڈر کیسا۔ یہ بتا کبھی اپنے منظر ایڈووکیٹ سے بات کرنے کا موقع ملا؟"

"ہاں۔ ایک دن عبدالستار چوہدری کے گھر سے فون کیا تھا۔ اطلاع دے دی تھی کہ خیر سے بد خو گھر کو آنے والے ہیں۔ ان کے سواگت کا خاطر خواہ انتظام رکھنا۔ تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ یار مجھے کیا معلوم کہاں ہیں اور کب آئیں گے تو شور کرنے لگا کہ پھر رابعہ کو کیوں بلایا ہے۔ تیری نیت خراب معلوم ہوتی ہے۔ قانونی طور پر سات سال آدمی لاپتا رہے تب اس کی بیوی مال پر اور کوئی چاہے تو بیوی پر قبضہ کر سکتا ہے۔ اندر ہو جائے گا تو۔ میں نے کہا کہ میں باہر کب ہوں۔ اندر گیا' پیچھے مدفون ہوں اور باقاعدہ ہلاک ہو چکا ہوں۔ اس کے اب چودہ بچے ہیں۔ کہتا تھا تیرہ کا عدد منحوس ہوتا ہے۔"

میں نے ہنستے ہنستے پوچھا "اکرام شیخ کی خبر بھی ملی اس سے یا کسی اور ذریعے سے؟"

"وہ وہیں کراچی میں ٹیکسی چلا رہا ہے۔ ایسا وعدے کا پکا ہے کہ ہماری واپسی سے پہلے اسے وزارت کی پیشکش ہو تو ٹھکرا دے گا اور ٹیکسی چلاتا رہے گا۔ البتہ نیلم بھی شوہر کے منصب پر فائز کرنے کے لئے طلب کرے تو اس اعزاز سے محرومی قبول کرے گا۔ بس اپنے چوہدری دلاور صاحب کا کچھ پتا نہیں۔ سنا ہے خیر سے واپس پہنچ گئے ہیں۔"

"اچھا ہوا۔ جا کے ہی خبر لیں گے اُن کی" میں نے کہا۔

اسی وقت محسن کی نظر نے رابعہ کا راز فاش کر دیا۔ وہ ایسے نہ مسکراتا تو مجھے معلوم بھی نہ ہوتا کہ رابعہ دبے پاؤں میرے پیچھے آ کے کھڑی ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دم پلٹ کے دیکھا اور کھڑا ہوا تو بت بن گیا۔ جیسا کہ ہر بار بچھڑ کر ملنے کے بعد ہوتا تھا۔ الفاظ کام نہ آئے اور جذبوں نے الفاظ کا کام کیا۔

وہ بہت بدل گئی تھی۔ مصیبتوں کے سفر میں تلخی حالات نے اس کے حسن کو گہنا دیا تھا۔ اب وہ پھر حسن کے ماہ کامل کی تابانی کے ساتھ وہی رابعہ بن گئی تھی جس کے جمال سے محفل نہیں ساری کائنات روشن ہو جائے۔ میں بھول گیا کہ مجھے اس سے شکوہ کرنا تھا کہ وہ اچانک کیوں چلی گئی تھی۔ پوچھنا اسے بھی بہت کچھ ہوگا مگر وہ بھی صرف دیکھتی رہی۔ پھر اس کی آنکھ سے ایک موتی ٹپکا اور اس کے عارض کے گلابوں پر ٹھہر گیا۔ میرے ضبط کا حوصلہ

www.paksociety.com

جواب دے گیا اور میں نے اسے ایک دم اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

اسی وقت نازو نے کہا "ابھی ہم اندر آ سکتے ہیں؟" اور اس کی شوخ ہنسی نے سارا راز فاش کر دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے غالب آ گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اس نے ڈانٹ کر کہا "کیا سمجھایا تھا تمہیں کہ رونے دھونے کا سین آیا تو شاٹ کٹ۔"

"اور درمیانی فاصلہ تین فٹ سے کم ہو تب بھی سین کٹ۔" نازو نے بھی دوبارہ شروع کیا "آتی رومانٹک فلم نہیں چل سکتی۔"

"اور تم یہ جو کچھ کے آنسو بہا رہے ہو اس کی حقیقت خوب جانتا ہوں میں" غالب بولا "میں نے سب تاڑ لیا ہے کہ ابھی میں جناب کی جذباتی کیفیت کیا تھی۔ میں لگام اپنے ہاتھ میں نہ رکھتا تو......"

میں جھینپ کر رابعہ سے الگ ہو گیا تھا۔ رابعہ کا رنگ بھی لال پڑ گیا تھا اور وہ آنسوؤں کے ساتھ مسکرانے لگی تھی۔

"بڑے بدمعاش ہو تم دونوں" میں نے کہا۔

"تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ کتنی شرافت سے کھڑے ہیں ہم، ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے ہیں چوری چوری" غالب بولا۔

"یہ کیا نامعقولیت تھی" میں نے کہا "چھپ کر دیکھ رہے تھے اور پرائیویٹ باتیں سن رہے تھے ہماری۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔"

"افسوس! شرافت کا زمانہ نہیں رہا" محسن بولا "ہم نے تو خصوصی اجازت دی تھی مشروط طور پر کہ بچھڑے ہوئے مل لیں۔"

میں نے کہا "کاجل کہاں ہے؟"

محسن بولا "جواب دو رابعہ! تم سے پوچھا ہے نینوں کا کجرا کہاں گیا......"

میں نے کہا "اب تو مار کھائے گا۔"

"بھئی یہ اسے پوچھ رہے ہیں، جس کے ساتھ تھے، جب رابعہ یہاں نہیں تھی" نازو نے معنی خیز انداز میں کھنکار کے کہا۔

میں نے کہا "بھاڑ چولہے سو بولے، چھلنی کیا بولے جس میں نو سو چھید۔ اس سے پوچھو کہ جب یہ کاجل کے ساتھ فرار ہوا تھا تو کس حال میں نکلا تھا۔"

محسن نے ہاتھ بڑھا کے کہا "آپ تو بلیک میلنگ پر اتر آئے۔ بھئی ہم مذاق کر رہے تھے۔ آپ سے تو کوئی اختلاف رائے ہی نہیں۔"

غالب باہر گیا اور گل کے ساتھ ایک سوٹ کیس گھسیٹتا نمودار ہوا مگر کاجل کا ابھی تک کچھ پتا نہیں تھا۔

میں نے کہا "کاجل کہاں ہے؟"

محسن ہنسا "یار! نہیں کہیں سے کاجل لا دو۔ بہت تڑپ رہے

ہیں اس کے بغیر۔"

نازو نے رابعہ کی طرف دیکھ کے کہا "اس سرے سے کام نہیں چلتا۔"

گل نے کہا "وہ ہمیں چھوڑ کے چلی گئی۔ ہمارے لئے کسی دوسری جگہ کا بندوبست کرے گی۔ کہتی تھی کہ سب یہاں کیسے رہ سکیں گے۔"

میں نے کہا "ایک تم ہی ہو عزیزہ جس نے ڈھنگ سے بات کی ہے۔ باقی سب پر تو بھوت سوار ہے بہت خبیث قسم کا۔"

غالب نے شور مچایا "دیکھو خبردار جو میرے سسر کا نام لیا اور تم نے اسے خبیث کیسے کہہ دیا میرے سامنے۔ میں تو خودکشی کر لوں گا۔ میرا ذاتی سسر ایک شریف بھوت ہے۔ کیوں نازو؟"

نازو نے کہا "مگر تم لاتوں کے بھوت ہو۔ باتوں سے نہیں مانتے" اس نے غالب کو اٹھایا اور پلٹ کے پھینک دیا۔

غالب چلایا "چیف کے نوا تم دیکھ رہے ہو یہ ظلم و تشدد؟ کیا میں نے اس کے باپ کو کچھ کہا تھا؟ آہ اب میں خود ایک بھوت بننے والا ہوں" وہ بستر پر گرا تھا اور اٹھ کے بیٹھ گیا تھا مگر خوامخواہ یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے اس کی سب ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں "میں اپنا خون معاف کرتا ہوں نازو مگر میرا بھوت سسر تم کو نہیں چھوڑے گا۔"

گل ہنس رہی تھی، رابعہ ہنس رہی تھی میں اور محسن ہنس رہے تھے۔ ایک بار پھر قدرت کے حسن انتظام اور اعجاز مسیحائی نے فرقت کے درد کا درماں کیا تھا اور ہم سب آزمائش کے ہزار حوصلہ شکن اور صبر آزما مرحلوں سے کامیاب گزرنے والے پھر ایک جگہ ایک ساتھ تھے۔ کل تک یاس اور ناامیدی کے احساس سے دل زدہ، مسافرت کے عذابوں کی انتہا سے نیم جاں۔ نفرتوں اور عداوتوں کے جنگل میں راہ گم کردہ ہم سب کسی معجزے کے انتظار میں تھے جو ہمیں ملا دے اور آج وہ معجزہ رونما ہو گیا تھا۔ چوہدری اللہ دتا، محمد بھائی، عبدالستار چوہدری اور کاجل۔ سب وسیلے تھے جو ہمارے تحفظ کے ضامن دست غیب نے پہلے سے فراہم کر رکھے تھے اور ہماری مدد پر مامور تھے۔ وقت مقررہ پر وہ سامنے آتے گئے۔ ہم نے انہیں تلاش نہیں کیا، وہ خود ایک مقصد کی تکمیل میں معاون ہو گئے۔ یہ جانے بغیر کہ ان سے پہلے کون تھا اور ان کے بعد کون ہو گا جو ہمیں سلامتی کی راہ پر لے جائے گا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ جو کچھ میں سوچ رہا تھا وہ صرف میرے خیالات کی صدا نہیں تھی۔ وہ سب کے خیالوں کی بازگشت تھی جس کی گونج میرے ساتھ دوسروں نے بھی سنی ہو گی۔ وہ خاموش بیٹھے تھے، اس لئے کہ انہیں ایک دوسرے کی سوچ آواز غیب کی طرح سنائی دے۔

غالب اور محسن دیوار سے ٹیک لگائے اور بیچارے کھڑکی سے باہر خلا میں دیکھ رہے تھے۔ گل بت بنی محسن کو دیکھ رہی تھی۔ رابعہ کو معلوم بھی نہ تھا کہ اس کی آنکھیں رو رہی ہیں۔ نازو پوری

کوشش کر رہی تھی کہ اس جذباتی فضا کو اپنے اعصاب پر مسلط نہ ہونے دے۔ اس کی نظر مجھ سے ملی تو میں مسکرانے لگا۔ کسی وجہ کے بغیر مگر سخت کوشش کے بعد۔ پھر نازو نے ایسا ہی کیا۔ یہ اشارہ صاف اور واضح تھا کہ خاموشی ٹوٹنی چاہئے۔ برف پگھلنے کا موسم آ گیا۔ خیر بہار کی لایا ہے کوئی گل یا رب۔ احساس پر جمنے والی دکھ اور الم کی، احساس زیاں کی ملامتوں اور حسرتوں کی، غم رفتگاں کی اور ملال کے ہر زخم پر خاموشی سے اترنے والی برف کو جھاڑ دو۔ مسکراہٹوں کی دھوپ کو جگہ دو۔ روشنی کے لئے راستے بناؤ۔

پہلے میں نے کہا "رابعہ، تم بولو گی نہیں؟"

رابعہ نے چشم نم اور بوجھل پلکیں اٹھا کے کہا "کیا بولوں؟ تم ہی کچھ کہو۔"

میں نے کہا "تم اتنی حسین کبھی نہ تھیں۔ بہت بدل گئی ہو تم۔"

میرا خیال ہے کہ یہ بات خلوت کی تھی جو میں نے جلوت میں کہہ دی۔ رابعہ کے رخسار شہابی ہو گئے مگر میری بات نے مجمع پر ہلکی مسکراہٹ بکھیر دی۔

محسن بولا "اس کا مطلب سمجھ رہی ہو نا؟ یہ تم سے بھی جواب میں ایسی ہی بات سننا چاہتا ہے حالانکہ اس کی صورت ہی نہیں سیرت بھی بدل گئی ہے۔ پہلے یہ انسان کا بچہ لگتا تھا۔"

"اور اب کیا لگتا ہے؟" غالب نے سوال کیا۔

"اب الو کا پٹھا لگتا ہے" محسن بولا۔

"مجھ سے پوچھو کہ تم مجھے کیا لگتے ہو" غالب نے کہا۔

محسن نے آستین چڑھائی "بول لو ذرا۔ کیا لگتا ہوں میں۔"

"بالکل محسن شیروانی" غالب نے کہا "جان بچانے کے لئے یہ جھوٹ بولنا پڑا۔"

اچانک گل نے کہا "میں کیسی لگتی ہوں تمہیں؟"

میں حیران رہ گیا کیونکہ اس کا روئے سخن واضح طور پر محسن کی طرف تھا۔ وہ لڑکی جذبات کی رو میں اتنی بے اختیار ہو گئی تھی کہ مجھے اس پر ترس آیا۔

محسن نے اسے نظر بھر کے دیکھا "سب کے سامنے بتا دوں؟ مجھے سکندر نے بتا دیا تھا۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ میری طرح سب نے اس جواب کے انتظار میں سانس روک لی تھی۔ محسن نے بڑی خوبصورتی سے بات کو نبھایا۔ گل کا چہرہ دمک اٹھا۔ وہ ایسا ہی جواب چاہتی تھی۔ اگر محسن ایسا نہ کہتا تو اچھا نہ ہوتا۔ میں نے نظروں ہی نظروں میں محسن سے اظہار تشکر کیا۔

باہر صبح کا اجالا افق کو روشن کرنے لگا تھا۔ مجھے رابعہ سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ ہم سب کو ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا تھا اور پھر یہ طے کرنا تھا کہ اب واپسی کی کیا صورت ہو گی مگر سب کاجل کی واپسی کے انتظار میں تھے۔ وہ خستہ حال کرے محسن اور

رابعہ کو پناہ دینے کے لئے کافی تھے مگر ہم سب ملا کے چھ افراد یہاں نہیں رہ سکتے تھے۔ ڈیوٹی پر موجود پولیس مین وفاداری کے عالم میں مستعد کھڑے ہوئے تھے لیکن ہم سے اتنی دور تھے کہ ہماری باتیں نہیں سن سکتے تھے۔ ابھی تک ہم نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس کا راز میں رہنا ضروری ہو کہ

"یہاں جانے کا بندوبست تک نہیں ہے" میں نے کہا۔

محسن بولا "یہ ہوٹل نہیں ہے۔"

"پھر ہوٹل سے کیوں بلایا تھا ہمیں؟" نازو بولی۔

"واپس چلی جاؤ۔ روکا کس نے ہے" غالب نے کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے نخرے بڑھتے جا رہے ہیں۔"

"میں ابھی دماغ درست کر دوں گی غالب......"

"اس کے لئے بھی دماغ چاہئے۔ وہ کہاں سے لاؤ گی؟" غالب بولا۔

کھڑکی کے شیشے پر روشنی ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گئی۔ پھر میں نے کار کے انجن کی سرسراہٹ سنی "کاجل" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "رابعہ! نوٹ کر لو یہ عالم شوق کا۔ اور یہ بھی سن لو کہ کاجل ہمارے ساتھ جا رہی ہے۔ ان سے نام ہمارا ہے......"

رابعہ مسکرائی "پھر کیا ہوا؟"

"ارے بابا، تم کو ایک عورت کی طرح سوچنا چاہئے۔ کسی دن سوکن نہ بن جائے تمہاری۔ مجھے آثار ٹھیک نہیں لگتے۔ یہ بنگالی کا جادو ہے۔"

رابعہ نے کہا "تم اگر نازو سے کہتے تو ٹھیک ہوتا۔"

غالب نے کہا "کیا ہوتا؟ میں بزدل نہیں ہوں۔ چاہوں تو ابھی وقت کاجل کے عشق میں مبتلا ہو سکتا ہوں۔"

"کچھ کر کے دکھاؤ" نازو نے کہا "زبانی دعوے تو سب کرتے ہیں شہزادہ گلفام۔"

"تم چیلنج کر رہی ہو مجھے؟"

"ہاں چیلنج کر رہی ہوں" نازو نے کہا۔

"مجھے منظور ہے" غالب نے کہا "شرط کیا ہو گی؟"

کاجل کے اندر آنے سے بات ختم ہو گئی۔ سب کو معلوم تھا کہ غالب اور نازو مذاق میں لڑتے ہیں اور لڑائی میں مذاق کرتے ہیں لیکن بعد میں غالب نے جو کچھ کیا وہ سب کی توقعات کے خلاف تھا۔

کاجل کے اندر آتے ہی غالب نے کہا "لو سورج نکل آیا۔"

کاجل نے پریشان بال سنوار کے حیرانی سے کہا "ابھی سے؟"

غالب بولا "تمہیں دیکھ کر مجھے ایسا ہی لگا۔ سچ روشنی کی تابانی صبح کی دھوپ سے کم تو نہیں۔"

نازو نے غالب کو گھور کے دیکھا مگر وہ ایسی والہانہ فریفتگی سے کاجل کو تک رہا تھا کہ کاجل متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ کوئی عورت جو حسین بھی ہو، خراج تحسین کو اپنا حق سمجھ کے وصول کرتی ہے

www.paksociety.com

ایک حیا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کاجل نے کہا "کیوں بناتے ہو؟" جس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ تم نے ٹھیک کہا۔

وہ اب بھی سفید لباس میں تھی مگر لباس مختلف تھا۔ اس نے میکسی پہن رکھی تھی جو سرسراتے نرم اور چمکیلے ساٹن کی تھی اور اس کے پیکر میں یوں ڈھالی گئی تھی کہ لگتا تھا اس کا جسم ایک بہتا دھارا ہے جو راہ کے ہر نشیب و فراز میں سماتا چلا گیا ہے۔

کاجل وہیں بیٹھ گئی "مجھے کچھ دیر ہو گئی۔"

میں نے کہا "کوئی بندوبست ہوا؟"

"ہاں۔ ایک بہت بڑی کوٹھی مل گئی۔ اس کے مالک پاکستان جا چکے ہیں۔ یہاں صرف بنگالی چوکیدار تھا۔"

"وہ کیسا آدمی ہے؟"

"وہ صرف چوکیدار ہے۔" کاجل نے کہا "عام آدمی جسے نہ سیاست سے سروکار ہے نہ ان حالات سے۔ کل جب بنگلہ دیش بن جائے گا تب بھی وہ چوکیدار ہی رہے گا 'ڈپٹی کمشنر' نہیں ہو جائے گا۔"

غالب نے کہا "ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گی؟"

"برا کیوں مانوں گی" کاجل مسکرائی۔

"حسن اور ذہانت کا ایسا متوازن امتزاج میں نے آج تک کسی عورت میں نہیں دیکھا۔ خدا کسی کو حسن دیتا ہے تو اوپر کی منزل خالی چھوڑ دیتا ہے اور دماغ دیتا ہے تو صورت ایسی دیتا ہے کہ آدمی صبح دیکھ لے تو سارا دن خراب گزرے" اس نے نازو کی طرف دیکھ کے کہا۔

کاجل شرما کے اٹھلائی "چھوڑو بھی۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ آؤ چلیں۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ غالب کی لفاظی کا جادو اثر کر رہا ہے۔ کاجل بڑی تیزی سے اس کے بچھائے ہوئے جال میں گرفتار ہونے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی اور کسی ماہر شکاری کی طرح غالب حلقۂ دام کو تنگ سے تنگ تر کرتا جا رہا تھا۔ نازو جو پہلے مشتعل نظر آتی تھی اب کچھ شکست خوردہ اور اداس تھی۔ کل اور وہ ایسا برہم نہیں مگر غالب بڑی ڈھٹائی سے نظر چرا رہا تھا اور کاجل پر فریفتہ نظر آنے کی کوشش میں کامیاب تھا۔ وہ عورت ہی کیا جو کسی مرد کے انداز پرستش کو اور اس کے جذبات کی گہرائی کو ایک نظر میں نہ بھانپ لے۔ غالباً اب تک کسی نے یوں کھل کے اس بے باک لہجے میں سب کے سامنے اس سے نہیں کہا تھا کہ وہ خالق حسن کی صناعی کا انوکھا شاہکار ہے۔ ایک مدت سے وہ پاگل مشہور تھی۔ اس کے باپ کی سیاسی مصلحت کے تقاضے یہی تھے مگر اب کوئی اس کے لئے پاگل ہو رہا تھا تو کیسے ہانت نہ ہوتی۔

غالب کی یہ حرکت مجھے ہی نہیں محسن کو بھی پسند نہیں آئی تھی مگر وہ نازو کو جلانے کے لئے سنجیدگی سے کاجل پر ڈورے ڈال رہا تھا اور چیلنج کو مذاق کی بات سمجھنے پر آمادہ نہ تھا۔

"اب اور کتنے دن رہیں گے ہم یہاں؟" میں نے کہا۔

"بابا کوشش کر رہے ہیں" وہ بولی "سیدھا راستہ تو کوئی نہیں ہے۔ نیپال کے راستے کسی فلائٹ سے بندوبست ہو گیا تو ٹھیک ورنہ بحری راستہ۔"

میں نے کہا "سڑک کے راستے سے تو بڑا لمبا سفر ہو گا؟"

صرف غالب نے خوشی کا اظہار کیا "ذرا اپنا ہاتھ دکھانا۔"

کاجل نے بڑی نزاکت سے اپنا ہاتھ آگے کر دیا "نجومی ہو تم؟"

"میں سب کچھ ہوں۔ دیوانہ بھی" وہ بولا "تمہارے اور میرے ہاتھ کی ریکھائیں کتنی ملتی ہیں۔ کمال ہے! مجھے یقین ہے ستارے بھی ملتے ہوں گے مگر اس کے لئے حساب لگانا پڑے گا۔"

"بات سفر کے انتظام کی ہو رہی تھی" میں نے کہا۔

غالب نے سر ہلایا "ذاتی طور پر میں ہوائی جہاز سے اڑ کر پہنچنے پر بس کے طویل سفر کو ترجیح دوں گا۔ کیوں کاجل؟"

کاجل مسکرائی "ہاں۔ راستہ اتنا خوب صورت ہے۔۔۔"

"کوئی راستہ خوب صورت نہیں ہوتا۔ کسی کو سزائے موت دینے کے لئے اسی راستے سے لے جاؤ۔ اور کوئی تمہارے ساتھ ہم سفر ہو۔ سارا فرق تو اس سے پڑتا ہے۔"

کاجل کا ہاتھ ابھی تک غالب کے ہاتھ میں تھا "چلو پھر ہم بائی روڈ چلیں گے۔"

"صرف میں اور تم۔ ان کو جانے دو جہاز میں۔" غالب بولا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ لڑکی محبت کی اتنی بھوکی ہو گی' یوں جھوٹے لفظوں کے جال میں پھنس کے رہ جائے گی' اتنی جلدی پکے ہوئے پھل کی طرح غالب کی جھولی میں آگرے گی' یہ شاید خود غالب کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا۔ اس نے تو مذاق میں پیش قدمی کی تھی اور نازو سے شرط جیتنے کی خاطر اپنی وارفتگی کا ڈراما رچایا تھا مگر کاجل نے اس کا مطلب کچھ اور لیا تھا۔ وہ سمجھی تھی' غالب واقعی دیوانہ ہو گیا ہے۔ اس پر مرتا ہے اور اسے واقعی اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا۔ میری طرح دوسرے بھی کاجل کی پیش رفت پر حیران اور پریشان تھے۔ سوچے سمجھے بغیر اس نے خود سپردگی کا وہ انداز اپنا لیا تھا جو ہماری نظر میں ناپسندیدہ اور غیر شریفانہ تھا۔ صرف فلرٹ کرنے والی لڑکیاں ہی ایسا RESPONSR دیتی ہیں۔

کار میں بیٹھتے وقت بھی غالب نے بڑی چالاکی سے کام لیا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ سب بیٹھ چکے تھے اور وہ اکیلا باہر رہ گیا تھا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ اسے میرے ساتھ بیٹھنا پڑے تو میں راستے میں ہی اس کے عشق کے غبارے کی ہوا نکال دوں۔ مجھے نازو کی صورت دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا۔ عین وقت پر غالب نے مجھے آنکھ ماری اور آگے چلا گیا۔

"کاجل! گاڑی میں چلاؤں گا تم آگے کھسک جاؤ۔"

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ چالاکی میں یا محسن بھی کر

www.paksociety.com

کاجل بلا وجہ ہنسی "اچھا اگر تم چاہتے ہو تو..."

"چاہنے کی تو ساری بات ہے" غالب بولا "میں بس تمہارا ساتھ چاہتا ہوں۔ پھر کار ہو یا ٹرک میں ماؤنٹ ایورسٹ تک چلا جاؤں گا"

کاجل اٹھلائی "خالی باتیں ہی کرتے ہو۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ انہیں اتار کے دنیا کے سفر پر چلتے ہیں۔ جب تک زندگی کی گاڑی چلے گی ہم بھی چلتے رہیں گے اس گاڑی میں۔"

میں نے ہنس کے کہا "آپ گاڑی چلاتے ہیں آپ ہاں میں سیلف مار کے آپ کو اسٹارٹ کروں!"

غالب نے کہا "آگے چار آدمی نہیں بیٹھ سکتے۔ چلو نازو تم پیچھے جاؤ۔"

نازو نے اڑ کے دروازہ زور سے مارا۔ اس نے سخت بے عزتی محسوس کی تھی اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں مذاق اس کی قوت برداشت سے بڑھ گیا تو وہ غالب کے ساتھ کاجل کا بھی آملیٹ بنا دے گی۔ آگے اب دروازے کے ساتھ گل تھی۔ بیچ میں کاجل جو غالب سے چپکی بیٹھی تھی۔ پیچھے میں اور محسن تھے۔ پھر رابعہ کے ساتھ نازو آئی۔

اب میں بھی غالب کی احمقانہ سوچ پر برہم تھا۔ اس مذاق کا نقصان نہ ہوا تھا۔ نازو تو خیر ابھی تھا ہے اسے منایا بھی جا سکتا ہے مگر کاجل کا کیا ہوگا جب اسے معلوم ہوگا کہ یہ نازو اور غالب کی شرط تھی محبت نہیں تھی۔

ہم سب دل گرفتہ اور خاموش تھے اور اس مذاق کے انجام سے خائف بھی۔ غالب بڑی مستی میں کار چلا رہا تھا اور بار بار جھک کر نہ جانے کاجل کے کان میں کیا کہہ رہا تھا۔ کاجل بار بار ہنستی تھی اور اس کے لمبے گھنے بال غالب کے شانوں تک پہنچ جاتے تھے۔ بنگال میں عورت مرد کے درمیان وہ حجاب نہیں جو مغربی پاکستان کے معاشرے میں نظر آتا ہے اور لڑکے لڑکیاں عشق کے معاملات میں یورپ کی تقلید کرتے نظر آتے ہیں۔ بوس و کنار کی نوبت تو نہیں آئی مگر جوان جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سر عام نظر آتے تھے اور کوئی نظر اٹھا کے نہیں دیکھتا تھا کہ کون کس کے ساتھ ہے۔ کاجل بھی اسی معاشرے کی پیداوار تھی لیکن اس کی ساری زندگی لاہور میں گزری تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ ایسی بے شرمی کا مظاہرہ کیوں کر رہی ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ نازو اور غالب ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں اور انہیں جدا کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا آگ سے حدت کو جدا کرنا۔ کوئی ان کے درمیان حائل نہیں ہو سکتا۔ جیسے زمین اور کشش ثقل کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کرنے والا منہ کے بل گرتا ہے۔

جب گاڑی رکی تو میں نے اس کوٹھی کو دیکھا اور پھر نازو کو۔ اس کی صورت رونے والی ہو رہی تھی۔ کاجل کے ساتھ غالب اندر چلا گیا۔ میں نے آہستہ سے کہا "کیا ہوگیا ہے تمہیں نازو! یہ مذاق ہے۔"

نازو نے دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا "میں جان سے ماردوں گی اسے۔"

رابعہ نے کہا "پاگل مت بنو۔ اتنی سمجھ دار ہو کے ایسی باتیں کرتی ہو۔"

"نہیں۔ وہ ذہین بھی ہے اور حسین بھی" نازو نے کہا "مگر اسے معلوم نہیں کہ میں نازو ہوں۔"

گل اور رابعہ بھی اندر جا چکی تھیں۔ محسن میرے ساتھ تھا۔ اس نے نازو کا ہاتھ پکڑ کے اندر کھینچ لیا "وہ بھی غالب ہے کہاں کسی اور کا ہو سکتا ہے تم خود سوچو۔ اتنی بے اعتباری۔۔۔"

ہم اندر پہنچے تو ایک ساتھ سب ہنسنے لگے۔ کاجل نے آگے بڑھ کے نازو کو سینے سے لگا لیا "لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں۔ پاگل تو تم ہو۔ بے وقوف! کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ غالب صرف تمہارا ہے۔ وہ شرارت پر آمادہ تھا۔ میں نے بھی کہا کہ چلو تھوڑی ہی تفریح سہی۔ میں نے تو سنا تھا تم بہت ہمت والی ہو۔"

"یہ آلو کی دُم شرط ہار گئی ہے" ہنستے ہنستے غالب کا برا حال ہو گیا "ذرا شکل دیکھو اس کی۔ میں غلط نہیں کہتا تھا کہ اس کے دماغ میں بھوسہ بھی نہیں۔"

نازو کچھ نہیں بولی بس اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہی اور دانتوں سے اپنے ناخن کاٹتی رہی۔

اندر جا کے میں نے کہا "کاجل! تم نے مجھے بھی ڈرا دیا تھا۔ غالب کا نہ جانے کیا تھا۔"

"کیا سچ تھا؟" کاجل نے کہا۔

"کہ نازو اسے واقعی جان سے مار دے گی اور پھر خود بھی مر جائے گی جس دن ایسا ہوا" میں نے کہا "اور یہ خود بھی کیا کم ہے۔ یہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا نازو کے بغیر۔ مجھے تمہاری فکر تھی۔"

"آپ اپنے بارے میں جو چاہیں کہیں" غالب بولا "میں کیا مرتا ہوں کسی پر اور نہ کسی کے لئے مر سکتا ہوں۔"

نازو ہنس پڑی "جھوٹے کمینے۔ بہت خوش ہو شرط جیت کے۔ یہ تو کاجل نے سازش کی تھی۔"

"سازش نہیں" کاجل بولی "شرارت۔ ایمان سے مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارا دل دکھا رہی ہوں میں۔"

محسن نے کہا "یہ لڑائی مار کٹائی میں جتنی بہادر ہے اندر سے اتنی ہی کمزور اور بزدل ہے۔ آج ثابت ہو گیا۔"

رابعہ نے بھی کہا "حیرانی ہے نازو کہ تمہیں اپنے آپ پر بھی اعتبار نہیں۔"

"رابعہ!" نازو نے نظر اٹھا کے کہا "کبھی سکندر نے اتنا ستایا۔ مذاق کیا ہے تمہارے ساتھ؟"

"نہیں۔ مگر۔۔۔"

"اس دن دیکھوں گی تمہارے اعتبار اور اعتماد کو جس دن سکندر نے سب کے سامنے تمہارے جذبات کی یوں توہین کی" نازو نے اس کی بات کاٹ دی "ہم سب کی موجودگی میں سکندر تمہارے منہ پر تھپڑ مار دے اور پھر کہے کہ یہ مذاق تھا تو تم پر کیا گزرے گی؟" وہ ایک دم اٹھی اور دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

غالب اس کے پیچھے لپکا "ارے نازو! خدا کی قسم یہ تو جھوٹ کی بچی۔ ہاں ہاں میں معافی مانگتا ہوں۔"

کاجل بھی اب شرمندہ نظر آ رہی تھی "مجھے شرارت میں بھی غالب کو لفٹ نہیں دینی چاہئے تھی۔ یہ بڑے نازک جذبات کا معاملہ تھا۔"

"غلطی تو غالب کی ہے جس نے یہ بات نہیں سمجھی" محسن خفا ہو کے بولا "خبیث۔۔۔ وہ بہت زہریلی چیز ہے۔ اسے منا لے گا۔ اب ہمارے لئے کیا حکم ہے؟"

"حکم کچھ نہیں۔ جب تک روانگی کا انتظام نہیں ہو جاتا تم لوگ یہاں رہو۔ یہاں سب کچھ ہے۔ کھانے پکانے کی چیزیں البتہ بازار سے لانی ہوں گی اور وہ سب میں لا دوں گی۔ بہتر یہی ہے کہ تم باہر نہ نکلو۔ نانے کا سامان میں ساتھ لے آئی تھی۔ گاڑی میں پڑا ہے۔ اب میں رات کو آؤں گی۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے دوسرے کمرے میں جا کے دیکھا۔ نازو کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی صورت بتاتی تھی کہ وہ روئی رہی ہے۔ غالب دیوار کی طرف منہ کئے کھڑا تھا اور اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔

میں نے حیرانی سے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"نازو میری جان بخشی کرا" غالب نے روتی آواز بنا کے کہا۔ میرے پیچھے رابعہ آ گئی تھی۔ اس نے کہا "سزا تو ملنی چاہئے تمہیں۔"

نازو نے غالب کو ڈانٹا "چلو۔ صاف بولو اور اونچا بولو۔ ابھی صرف ایک سو کتنا بار کہا ہے تم نے ایک ہزار بار کو لکھ کر لاؤ۔"

غالب نے اڑ جانے والے ریکارڈ کی طرح بولنا شروع کیا۔ "میں الو کا پٹھا ہوں۔ میں نے مذاق میں نازو کا دل دکھایا۔ آئندہ کے لئے میرے باپ کی توبہ۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "نازو! یہ تو ظلم ہے۔"

رابعہ نے بھی سفارش کی "نازو! اتنا کافی ہے۔"

غالب نے پلٹ کے کہا "کاغذ لاؤ۔ میں لکھ کر دوں گا۔"

گل ناشتا تیار کر رہی تھی اور محسن اس کی مدد کر رہا تھا۔ میں نے کاغذ پنسل تلاش کئے۔ خالی کوٹھی میں صرف کچن نہیں تھا گھرانے کا سب اسباب موجود تھا۔ ایک کمرا غالباً بچوں کا تھا۔ اس میں اسکول کی کتابوں کے ساتھ کاپی اور پنسل ہر کتنے میں موجود تھے۔ لیتے بھی یوں تیار رکھے تھے جیسے ابھی کچھ دیر میں اسکول کی بس ہارن دے گی تو وہ ناشتا ادھورا چھوڑ کے دوڑتے ہوئے آئیں گے اور بستے اٹھا کے باہر دوڑ جائیں گے۔ ممی ٹاٹا۔ بائی بائی ڈیڈی۔ ماں برتن سمیٹتے ہوئے مسکرائے گی اور ڈیڈی اخبار پڑھتے پڑھتے کہیں گے بائی بائی بیٹا۔ یہ عام زندگی کا منظر تھا جو ہر خوش حال اور آباد گھر میں ہر صبح دہرایا جاتا تھا مگر اس کی یکسانیت میں تعمیر اور تکمیل کے عمل پیہم کی تسکین ہوتی ہے۔ مقاصد حیات کے حصول میں کامیابی کے احساس پر طمانیت کا اور اپنی ذات کے دشمنوں اعتماد کا غرور شامل رہتا ہے۔ چنانچہ ہر صبح یہ منظر نئی خوشی دیتا ہے۔ نہ جانے وہ کون تھے جو کسی ارادے اور اختیار کے بغیر اس زندگی کی ساری خوب صورتی سے دست بردار ہونے پر مجبور ہوئے تھے۔ عسرت میں ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت کے سائے میں پرورش پانے والے وہ بچے اب کہاں ہیں؟ کسی کیمپ میں فاقہ کشی اور ذلت کی وہ زندگی گزار رہے ہیں جس کا ان کے معصوم ذہن میں کوئی تصور نہ تھا؟ میں نے ایک بستہ کھولتے ہوئے سوچا۔ زندگی اور مستقبل پر اعتماد بھی بعض اوقات کتنا دھوکا اور دکھ دیتا ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ سب کچھ یوں ہی رہے گا۔ خوب صورت پر بہار موسم کے نظاروں میں گھرے بچے صبح کا آغاز دعا سے کرتے رہیں گے لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری۔ زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری۔ ڈیڈی ہر صبح بریف کیس لے کر کار میں آفس جاتے رہیں گے۔ ممی مسکراتی رہیں گی اور ان سب کے لئے میز پر مزے مزے کے کھانے سجاتی رہیں گی۔ یہ خوشی یہ مسکراہٹ اور یہ نعمتوں سے مالا مال زندگی اسی طرح رواں دواں رہے گی مگر اچانک حادثہ ہو جاتا ہے۔ جنگ کا عفریت اپنی بد صورتی کے ساتھ سب کچھ تہس نہس کر دیتا ہے۔ سیلاب، زلزلہ، بیماری اور آفات ساری خواب چکنا چور کر دیتے ہیں اور اچانک زندگی کا دوسرا ان دیکھا بد صورت اور بھیانک روپ سامنے آتا ہے۔

میں کاپی واپس لے کر لوٹا تو میرا دل اداسی سے بوجھل تھا۔

"تمہیں کیا ہو گیا؟ مجھے تو خیر اعمال کی سزا ملی ہے" غالب بولا۔

میں نے کہا "وہ جو یہاں رہتے تھے انہیں کیا ہوا؟ کہاں گئے وہ سب لوگ؟ کیا وہ کبھی لوٹ کر آئیں گے؟"

غالب نے کہا "ان سب سوالات کا جواب میں فرصت ملنے پر دوں گا۔"

دوپہر تک یہ ہوا کہ کبھی غالب کاپی پنسل لے کر بیٹھ جاتا تھا۔ ہماری سفارش سے اس کو چھٹی مل جاتی تھی کہ ناشتا کر لے۔ کچھ دیر بعد وہ کاپی پھینک دیتا تھا کہ میں اور نہیں لکھ سکتا اور دیوار کی طرف منہ کر کے چلانے لگتا تھا "میں الو کا پٹھا ہوں۔۔۔" پھر تھک کر بیٹھ جاتا تھا کہ ایسے تو میں پاگل ہو جاؤں گا اور کاپی اٹھا کے لکھنا شروع کر دیتا تھا۔ ہم سب کا ہنس ہنس کے برا حال تھا۔ نازو کسی قسم کی رعایت دینے پر آمادہ نہ تھی۔ غالب نے

بھی ثابت کر دیا کہ سو پیاز اور سو جوتے والی بات محض محاورہ نہیں۔ اس نے ہزار بار کھا بھی ہوگا اور زبان سے اقرار بھی کیا ہوگا۔

وہ سارا دن ہم نے باتیں کرتے گزارا۔ پہلے محسن اپنی اسیری کی رُوداد سناتا رہا۔ سفر کے آغاز سے دوبارہ ملنے تک اس پر کیا بیتی۔ یہ سب ہی جاننا چاہتے تھے۔ نازو اور غالب ایسے بیٹھے تھے جیسے ان کے درمیان کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ ایک نے غلطی کی اور سزا کاٹ لی تو بات ختم۔ انہیں سمجھنا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا ان کی محبت کو۔

تھکن اور نیند کی کمی کا اثر سب پر تھا مگر سونے پر کوئی تیار نہ تھا۔ محسن اپنی کہہ چکا تو میری باری آئی۔

غالب نے کہا "یہ فلم میری دیکھی ہوئی ہے۔ بلکہ اس کا ہیرو ہی میں تھا۔ میرے لئے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔"

غالب کے ساتھ نازو بھی اٹھ کھڑی ہوئی "میں نے بھی ایک فلم دوبار نہیں دیکھی۔ مجھے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے تمہیں اب کس میں دلچسپی ہے۔"

نازو بولی "آخر ہم کیوں سنیں وہ سب جو ہمیں معلوم ہے۔"

میں نے کہا "اچھا بابا جاؤ۔ ایک دوسرے سے لڑو اور پھر مناؤ ایک دوسرے کو۔"

"میں ادھر سونے جا رہا ہوں" غالب دائیں جانب والے کمرے میں گھس گیا۔

"میں ادھر سو رہی ہوں۔" نازو نے بائیں طرف کے کمرے کا رخ کیا۔

کچھ دیر بعد میں نے اور رابعہ نے جا کے دیکھا تو نہ وہ دائیں کمرے میں تھے اور نہ بائیں کمرے میں۔ سہا ہرا جڑے ہوئے باغ کی ایک بینچ پر نازو بیٹھی تھی۔ غالب سوکھی ہوئی گھاس پر اس کے قریب بیٹھا تھا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ یہ اتنا خوب صورت منظر تھا کہ میرے پاس کیمرہ ہوتا تو اسے محفوظ کر لیتا مگر کیمرہ صرف عکس کو منجمد کرتا ہے۔ وہ حسن جو کسی ایسے ہی منظر میں جذبات سے آتا ہے تصویر میں کیسے آ سکتا ہے۔

ہماری آپ بیتی بہت طویل تھی۔ میں، غالب، نازو اور گل جن حالات سے دوچار ہوئے تھے ان سے محسن بے خبر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ گل بھی بور ہو کے اٹھ جائے گی اور باتیں کرنے کے لئے صرف میں اور محسن رہ جائیں گے۔ رابعہ کے لئے دونوں طرف کے واقعات میں دلچسپی کی نوعیت ایک جیسی تھی۔ مگر گل چپ بیٹھی رہی اور اچانک مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس شدت سے ہوا۔ گل میری وجہ سے چپ تھی۔

میں نے کہا "گل یہ سب تو تم بھی بتا سکتی ہو محسن کو۔"

محسن بولا "کاش یہ بات آپ کی عقل شریف میں پہلے آ جاتی لیکن آپ اب بات پوری کر کے جائیں۔"

"یعنی اٹل ارادے کی......"

"نہیں۔ میں آپ سے سنوں گا" محسن بولا۔ اور پھر ہنس پڑا۔ "یار ہمیں چکر دیتا ہے۔ تیری رگ رگ سے واقف ہوں میں۔"

"چکر کی کون سی بات ہے اس میں" میں نے کہا۔

"میاں کبیر خان! [illegible] کرو۔ رابعہ سے اکیلے میں داستان ہجر و فراق کہنا چاہتے ہو نا۔ ہماری طرف سے اجازت ہے۔"

جس علاقے میں یہ کوٹھی واقع تھی اسے بھی ڈھاکا میں وہی حیثیت حاصل تھی جو لاہور میں گلبرگ کو ہے۔ یہاں خوش حال اور مال دار لوگ رہتے تھے۔ بزنس مین، صنعت کار، بیوروکریٹس اور بیرون ملک جا کے دولت کمانے والوں سے لے کر اسمگلر تک۔ جدی پشتی رئیس اور خاندانی نسب و نام کے ساتھ صاحب ثروت رفتہ رفتہ ختم ہو رہے تھے۔ شرافت و عزت کا پیمانہ جب سے دولت کو سمجھا جانے لگا تھا شجرۂ نسب پر غرور ایک مذاق بن گیا تھا اور کہنے والے کہتے تھے کہ رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔ ذہن صرف ذہن ہے۔ کالا ہو یا سفید۔ کیا حرام اور کیا حلال۔ جائز ناجائز کچھ نہیں۔ معاشیات کا اخلاقیات سے کیا تعلق۔

میں اور رابعہ برآمدے میں بیٹھ گئے۔ کرسیوں پر دھول پڑی ہوئی تھی۔ میں نے گدیوں کو پلٹ کے رکھ دیا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر باغ کے آخری گوشے میں غالب اور نازو بیٹھے تھے مگر ان کی آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ لڑ رہے ہیں یا لڑنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں۔ کوٹھی کے احاطے کا گیٹ کھلا ہوا تھا اور اس وقت وہاں کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ دیوار کے اوپر سے بھی ہمیں ویران سڑکیں نظر آ رہی تھیں۔ کوٹھیاں بھی اتنی خاموش تھیں کہ بے مکین لگتی تھیں۔ فضا ایک عجب سوگوار سناٹے میں ڈوبی محسوس ہوتی تھی۔

جب رابعہ نے کہا "تم خفا ہو مجھ سے؟"

تو میں چونکا "میں خفا ہو سکتا ہوں تم سے؟"

"تمہیں حق ہے خفا ہونے کا" رابعہ نے کہا "میں تم کو چھوڑ کر چلی گئی تھی تمہیں کچھ بتائے بغیر۔"

میں نے کہا "پہلے میں خفا تھا اب نہیں ہوں۔"

"اب کیوں نہیں ہو؟"

"تم خود ہی واپس جو آ گئی ہو۔"

"یہ تو پوچھو کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا" رابعہ نے کہا "اور مجھے ایسے مت دیکھو۔"

"چلو تم ہی بتا دو کیسے دیکھوں؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے شرما کے کہا "آخر کیا دیکھ رہے ہو؟ پہلے دیکھا نہیں کیا؟"

"سچ بتا دوں؟ ویسے تو ہر بار تمہارا روپ نیا لگتا ہے لیکن اس بار کچھ اور بات ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ دوری نے میرے

جذبات کی آتشِ شوق بھڑکا دی ہے۔ تم واقعی اتنی حسین کبھی نہ تھیں۔ لگتا ہے یہ وقت تم نے سارے جہاں کے حسن کا خزانہ لوٹ کر جمع کرنے میں ہی گزارا ہے......"

"میں نے بڑا ظلم کیا خود پر بھی اور تم پر بھی۔ تمہارا خیال رکھنے کے لئے مجھے تمہارے ساتھ رہنا چاہئے تھا۔ دیکھو کیا حال ہو رہا ہے تمہاری صحت کا۔ تم کتنے کمزور ہو گئے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا "مصیبت بھگت کے ہو کے واپس آنے والی بیویوں جیسی بات مت کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اس فرق کو صرف میں محسوس کر سکتی ہوں کیوں کہ میں نے تم کو بہت پہلے دیکھا تھا۔ اس وقت تمہاری یہ حالت نہیں تھی۔ یہ میری خود غرضی تھی یا مجبوری کہ میں واپس لوٹ گئی لیکن سکندر! یہ بہت مشکل فیصلہ میں نے خود اپنے خلاف کیا تھا۔"

"آخر کیا ضرورت تھی اس فیصلے کی؟"

"میں محسوس کر لیا تھی سکندر کہ میں تم پر بار ہوں۔ صرف ساتھ نبھانا ہی تو کافی نہیں تھا۔ میں کسی اور کے لئے کیا، خود اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔"

"تمہاری یہ سوچ محض جذباتی کمزوری تھی ورنہ......"

"نہیں سکندر میں خود بھی کمزور تھی" رابعہ نے میری بات کاٹ دی "نہ میں نازو تھی اور نہ ناگ منی۔ گل بانو بن جانے کے باوجود وہ کتنی دلیر اور نڈر ہے۔ نازو کی تو بات ہی الگ ہے۔ میں تو گل کی برابری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی۔ میں نے سوچا جب میں کچھ کر ہی نہیں سکتی تو پھر واپس کیوں نہ چلی جاؤں۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "تم میرا حوصلہ تھیں، میرا سہارا تھیں۔"

"غلط۔ میں تمہاری کمزوری بن چکی تھی" رابعہ نے کہا "جیسے کچھ لوگ ہوتے ہیں نا کہ صبح اٹھتے ہی انہیں چائے کا کپ نہ ملے یا سگریٹ نہ ملے تو ذہنی طور پر وہ مفلوج محسوس کرنے لگتے ہیں خود کو۔ ذہنی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی۔ تم نے اس مشہور مقرر کی بات تو سنی ہوگی جو فصاحت و بلاغت اور جوش خطابت سے مجمع پر جادو کر دیتا تھا مگر اسے عادت تھی اپنے کوٹ کا بٹن گھمانے کی۔ ایک روز کسی بدخواہ نے وہ بٹن غائب کر دیا اور مقرر جب تالیوں کے شور میں اسٹیج پر آیا تو بٹن کو غائب پا کے بولنا تک بھول گیا۔ عادت یا جذباتی کمزوری بھی بیساکھی بن جاتی ہے جس کے بغیر آدمی محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک قدم نہیں چل سکتا۔ حالانکہ بعد میں اس کی خود اعتمادی لوٹ آتی ہے......"

"اس مقرر کا کیا ہوا؟ اس نے کوٹ میں دوسرا بٹن لگوایا؟ بٹن کے بغیر تقریر کرنے لگا یا اس شوق سے تائب ہو گیا؟" میں نے کہا۔

"میں جانتی ہوں تم نے میری بات سمجھ لی ہے" رابعہ مسکرائی۔ "شروع میں تم کو بہت غصہ آیا ہوگا۔ پتا نہیں کیا کچھ کہا ہوگا تم نے اور کیا سمجھا ہوگا۔ مگر پھر تم نے میرے بغیر اپنی خود اعتمادی کے سہارے آگے بڑھنا سیکھ لیا ہوگا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم کامیاب ہوئے اور آج پھر میرے سامنے ہو۔"

میں نے مظلوم لہجے میں کہا "مگر میری صحت کتنی خراب ہو گئی ہے۔"

رابعہ ہنسی "میں سب ٹھیک کر لوں گی۔ میں تمہیں لینے آئی تھی اور اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔ واپس اپنے گھر۔"

"اپنے گھر" میں نے دل میں ٹھنڈک اور سکون کی راحت محسوس کی "وزیر خان کے گھر؟"

"وہ اب تمہارا گھر ہے اور میرا گھر ہے۔"

میری آنکھیں خواب میں کھو گئیں۔ میرے تصور میں وہ گھر آ گیا جو ماڈل ٹاؤن میں تھا۔ سرسبز و شاداب درختوں میں گھرا ہوا۔ اس گھر میں میرے بچپن کی بربادی زندہ تھی۔ اس گھر سے کچھ جگر خراش اور دل فگار یادیں بھی وابستہ تھیں۔ وہ گھر وزیر خان کے جرم کا آئینہ دار تھا۔ اس نے ماضی کے کھنڈر پر مستقبل کی امیدوں کے ساتھ یہ محل تعمیر کیا تھا۔ میرے لئے اور مجھے بتائے بغیر وہ اس گھر سے بے آبرو ہو کے نکلا۔ ذلت کو صبر اور خاموشی سے برداشت کرتا رہا اور قتل ہو گیا۔ اس کے قاتل آج بھی آزاد گھوم رہے تھے۔ اسی شہر میں جہاں سے اس کی قبر کا نشان تک مٹا دیا گیا تھا اور اس کی ہڈیاں غائب کر دی گئی تھیں۔ یہ سب یاد کر کے میرے لہو میں انتقام کی وہ آگ پھر روشن ہو گئی جسے میں نے ضرورت اور مصلحت کی مٹی ڈال کے دبا دیا تھا۔

رابعہ نے مجھے جھنجھوڑ کے کہا "سکندر... ہوش میں آؤ۔"

میں چونکا اور مجھے احساس ہوا کہ مجھ پر جنونی کیفیت طاری تھی۔ میرا سانس تیز تیز چل رہا تھا، چہرہ تپ رہا تھا اور میرے ہاتھوں نے اتنی سختی سے کرسی کے بازو کو گرفت میں لے رکھا تھا کہ بازو کی سب رگیں ابھر آئی تھیں۔ میری انگلیاں درد کرنے لگی تھیں اور میرے اعصاب کے تار ٹوٹنے کے قریب تھے۔

آہستہ آہستہ میں نے ایک گہری لمبی سانس لی۔ بدن کو ڈھیلا چھوڑ کے میں نے سر کو کرسی کی پشت سے ٹکا لیا اور آنکھیں بند کر کے ان پھولوں کا تصور کرنے لگا جو میرے گھر کے سبزہ زار میں رنگین حاشیہ بناتے تھے۔

میں نے کہا "رابعہ! مجھے اس گھر کے بارے میں بتاؤ۔ اپنے گھر کے بارے میں۔ اکیلی تم وہاں کیا کرتی رہیں؟"

رابعہ نے کہا "اکیلی کب تھی میں۔ اکیلا تو میں نے کبھی محسوس نہیں کیا خود کو۔ تم کہو گے یہ جھوٹ ہے اور اکیلے پن نے ہی مجھے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ منظر کو یقین تھا کہ میں پاگل ہو چکی ہوں۔"

"اس کا تو دماغ خراب ہے مگر تمہارے بارے میں ایسی رائے کیوں قائم کی اس نے؟"

رابعہ نے کہا "تم ہنسو گے مجھ پر۔"

www.paksociety.com

"کیا یہ تمہاری عقل پر پردہ پڑ گیا ہے" میں نے کہا۔
"ایسا کئی بار ہوا جب رات کو میں نے دستک سنی اور دروازہ کھولا تو تم تھے"
میں ہنسنے لگا "پھر تو منظر نے ٹھیک سمجھا۔"
رابعہ خفا ہو گئی "تم بھی سمجھتے ہو میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ وہ میرا وہم تھا۔ فریب خیال تھا۔ منظر کہتا تھا کہ HELLUCINATION سے باقاعدہ دیوانگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اب یا تو تم واپس چلی جاؤ یا اس کو کسی طرح بلالو۔ اس نے گالی بھی دی تھی جو میں نہیں دہرا سکتی۔ کہتا تھا کہ سکندر کا تو باپ بھی آئے گا۔ میں ابھی تار دیتا ہوں کہ رابعہ بستر مرگ پر تمہیں یاد کر رہی ہے۔ میں نے کہا تار کس پتے پر دو گے تو مجھ پر ہنسنے لگا۔"
مجھے ہنسی آ گئی "مشورہ غلط نہیں تھا اس کا۔"
"مگر اندازہ غلط تھا یہ بات وہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا اور تم بھی نہیں سمجھ رہے ہو" رابعہ نے کہا "بولو میں کس کی قسم کھاؤں؟ اس محبت کی جو مجھے تم سے ہے۔ تم تین بار آئے' وہاں بیٹھے اور تم نے مجھے وہ باتیں بتائیں جو اب سچ ثابت ہو رہی ہیں۔"
"کون سی باتیں؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔
"آج تم نے بہت سے واقعات سنائے تھے محسن کو جو میری واپسی کے بعد پیش آئے تھے۔ کچھ باتیں تم مجھے بتا چکے تھے۔ مجھے معلوم نہیں۔"
میں نے کہا "یعنی میں بھوت بن کے پہنچا تھا۔ تیری دشمنی....."
"مجھے نہیں معلوم یہ کیا تھا مگر یہ غلط نہیں ہے۔"
"تم کو ڈر نہیں لگا تھا؟" میں نے کہا۔
"اس وقت تو نہیں لگا تھا" وہ سوچ کے بولی "بعد میں اس خیال سے ڈر لگا تھا کہ شاید مجھ پر دورے پڑنے لگے ہیں۔ کوئی ذریعہ نہیں تھا تم سے تصدیق کرنے کا۔ فون کر کے پوچھ سکتی تو پوچھ لیتی کہ کیا ایسا ہوا تھا۔ اس کے بعد میں عادی ہو گئی۔ تم اکثر نظر آ جاتے تھے اور غائب ہو جاتے تھے۔"
"گویا باقاعدہ ملاقات صرف تین بار ہوئی۔"
"تم اب بھی مذاق اڑا رہے ہو۔ مت کرو یقین میری بات کا۔ میں کب کہتی ہوں کہ مانو۔ ٹھیک ہے میں پاگل ہو گئی تھی۔ مجھ سے تو تمہارے والد بھی ملنے آتے تھے۔ بڑی ڈھارس بندھا کے گئے تھے۔ تم جھوٹ سمجھتے ہو تو سمجھتے رہو" رابعہ نے غصے سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔
"تم تو ناراض ہو گئیں۔ آئی ایم سوری۔"
"نہیں۔ بات کرنے کا کیا فائدہ جب تمہیں اعتبار نہیں۔"
میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے بٹھالیا "دیکھو یہ بات کوئی اور نہ مانے' میں مانتا ہوں" میں نے کہا "خود مجھے ایسے تجربات ہوئے ہیں جب میں نے خود تمہیں دیکھا اور تم سے باتیں کرتا رہا مگر میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ ہر شخص ایسے تجربات اور مشاہدات کا گواہ خود ہوتا ہے۔ ایک بار میں بھی اپنے والد کو دیکھ چکا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ زندگی میں تھے۔ خیر چھوڑو' یہ بتاؤ اب یہ گھر کیسا ہے؟"
"جیسا پہلے تھا" رابعہ کا منہ پھولا رہا۔
"اتنا عرصہ تم وہاں کیا کرتی رہیں؟"
"جھک مارتی رہی۔ قید تنہائی کاٹتی رہی۔"
میں نے اندھیرے میں تیر چلایا "جھوٹ اب بول رہی ہو تم مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم نے اسے نئے سرے سے ڈیکوریٹ کیا ہے۔"
"ضرور منظر نے بتایا ہوگا" وہ مسکرانے لگی "میں نے منع بھی کیا تھا اسے مگر اس کے پیٹ میں بات کہاں ٹھہرتی ہے۔"
میرا تیر نشانے پر لگا تھا "میں تم سے سننا چاہتا ہوں۔"
اس نے کہا "ظاہری شکل و صورت تو میں بدل نہیں سکتی تھی۔ میں نے نیا پینٹ کرایا ہے' اندر اور باہر۔ اپنی کلر اسکیم کے مطابق۔ معلوم نہیں تم پسند کرو گے یا نہیں۔"
میں نے کہا "جب میں تمہیں اتنا پسند کرتا ہوں تو تمہاری پسند کو کیسے ناپسند کر سکتا ہوں۔"
"وقت گزاری کا یہی ایک مشغلہ رہ گیا تھا میرے پاس جس میں میرے لئے تسکین کا سامان بھی تھا اور خوشی کا بھی۔ میں نے سب پرانا رنگ و روغن اپنی نگرانی میں صاف کرایا۔ کئی جگہ سے پلستر خراب تھا' وہ ٹھیک کرایا۔ کھڑکیوں کے جو شیشے ٹوٹے ہوئے تھے' وہ بدلے۔ دروازوں کا رنگ بھی اڑ گیا تھا۔ باتھ روم کی فٹنگ بہت خراب ہو گئی تھی۔ ان میں ٹائل کا اضافہ کیا ہے میں نے۔ اس کے بعد فرنیچر اور پردوں کی باری آئی تو میں خود بھولی رہی۔ ایک ملازمہ رکھ لی تھی میں نے وہ ہر جگہ ساتھ جاتی تھی۔ بعد میں ایک مالی کی ضرورت پڑی تو اس کا شوہر آ گیا۔ وہ کہیں اور کام کرتا تھا مگر وہاں ان کے پاس رہنے کی جگہ نہیں تھی۔ میں نے سرونٹ کوارٹر بھی دیا اور تنخواہ بھی پہلے سے زیادہ کر دی۔ ظاہر ہے وہ بہت خوش ہیں اور مطمئن۔ مالی نے دن رات ایک کر کے باغ لگایا ہے۔ کوئی ذرا خبطی ہے۔ میری ہدایات پر بالکل عمل نہیں کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ بیگم صاحبہ آدمی کو جس کام کا پتا نہ ہو اس میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ اب میں اگر آپ کو قانونی مشورے دینے لگوں تو آپ کو کیسا لگے گا۔ باغ لگانا میرا کام ہے۔ آپ کو پسند نہ آئے تو دھکے دے کے نکال دیں۔"
میں نے کہا "کوئی خاندانی باغبان ہے؟"
"ہاں۔ کہتا ہے میرے باپ اور دادا نے یہی کام کیا۔ دادا انگریزوں کے ساتھ ولایت چلا گیا تھا اور وہیں مر گیا۔ بچوں کو چھوڑ گیا تھا لیکن وہ اس وقت تک اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے تھے۔ باپ انڈیا میں رہ گیا' یہ اکیلا پاکستان چلا آیا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے کام میں ماہر ہے۔ اس کی محنت کا نتیجہ اب سامنے ہے تو تجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ وہی اجاڑ باغ ہے۔"
میں نے کہا "تم جو یہ سب کرتی رہیں' اس میں تو بہت پیسہ خرچ ہوا ہو گا۔"
"پیسہ اور کس لئے ہوتا ہے"
"مگر وہ پیسہ آیا کہاں سے؟" میں نے کہا۔
"کہیں سے بھی آیا' تمہیں کیا" وہ بولی۔
میں نے کہا "بابا! یہ تو بتا دو کہ چوری کی' ڈاکا ڈالا یا لاٹری کا انعام نکلا؟"
"میری فرم پھر اچھی چل رہی ہے۔ تم جانتے ہو نا' میرا ایک بڑا ہونہار شاگرد تھا۔ ایسا فرماں بردار' وفادار اور وضع دار کہ سب چلے گئے مگر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ آمدنی برائے نام رہ گئی تھی۔ جس وقت منظر نے معاملات کو سنبھالا۔ واجبات ادا کئے۔ جو کیس وہ نہیں لے سکتا تھا وہ مجھے بھیجنے شروع کئے۔ شاہد علی۔ یہ اس کا نام ہے جو میری عدم موجودگی میں بھی استقامت کے ساتھ اچھے دنوں کی آس لگائے بیٹھا رہا۔"
"یہ تو بڑی عجیب بات ہے" میں نے کہا "مجھے اس شاہد علی سے رقابت کا حسد محسوس ہو رہا ہے۔"
رابعہ ہنسی "رقابت کے بغیر محبت کا کیا مزہ۔ جیسے تیز مرچ مسالے نہ ہوں تو چاٹ پھیکی۔"
"لاہور پہنچ جائیں تو یاد دلانا۔ سب سے پہلے رقیب روسیاہ کو قتل کرنا ہے" میں نے کہا۔
"وہ بے چارہ کہاں' گورا چٹا جوان لڑکا ہے۔"
"اچھا گورا چٹا' جوان" میں نے سر پکڑ لیا "تم بیٹھو یہاں' میں آتا ہوں اسے قتل کر کے۔ کم سے کم میرے سامنے اس کی تعریف مت کرو۔ کیا میں اس سے مل چکا ہوں؟"
"ضرور ملے ہو گے میرے آفس میں۔"
"بس وہیں غلطی ہو گئی۔ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری جو اسے چھوڑ دیا...... خیر یہ بتاؤ۔ شادی شدہ ہے۔"
"پہلے تو نہیں تھا اب ایک بچے کا باپ ہے" وہ ہنسنے لگی۔ "کیا ایک غلط کام کیا اس نے میری عدم موجودگی میں۔"
"کیا مطلب؟ اسے انتظار کرنا چاہئے تھا تمہارا؟"
"بے وقوف آدمی۔ ادھر آمدنی نہیں رہی' ادھر بھائی نے گھر بنالیا۔ عشق تو پرانا تھا مگر حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ خانہ آبادی کے مسئلے کو حالات کے عذر پر مزید نہیں ٹالا جا سکتا تھا۔ ایک دن اس لڑکی کا باپ آ گیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے ریوالور نکال لیا اور بولا۔ تم نے یہ کیا کھیل شروع کر رکھا ہے۔ کب ٹھیک ہوں گے تمہارے حالات اور بھاڑ میں جائیں حالات۔ وہ وقت کی روٹی تک کھا سکتے ہیں تو مجھے کیوں کھا رہے ہو اس بیچ میں۔ کوئی اور کام کرو۔ ریڑھی لگاؤ' سبزیاں بیچو لیکن شادی تو اب تمہارا باپ بھی کرے گا۔ میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔ ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرو ورنہ فیصلہ میں کرتا ہوں۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ کیسے کہتا۔ مگر دیکھو سکندر اوہ جو لوگ کہتے ہیں نا کہ بیوی اپنی تقدیر ساتھ لاتی ہے۔ تو اس کے آتے ہی حالات سدھرنے شروع ہو گئے۔ منظر نے سپورٹ کیا اور کیس آنے لگے۔ جب میں واپس پہنچی ہوں تو وہ اپنے ساتھ دو نئے لڑکے رکھ چکا تھا اور اچھا خاصا کما رہا تھا۔ گاڑی بھی لے چکا تھا۔"
"تم نے کچھ نہیں کیا' بس امور خانہ داری میں لگی رہیں۔ وکالت کا پیشہ بھی بھلا دیا؟"
"نہیں۔ میں بھی چکر لگا لیتی تھی' ایک دن چھوڑ کے۔ ہاں ابھی تک کورٹ میں نہیں گئی۔"
"کیوں۔ ڈرتی ہو؟"
"ہاں۔ دل تو چاہتا تھا مگر ڈر لگتا تھا۔ خود منظر نے منع کر دیا تھا کہ ابھی گھر سنبھالو اور خود کو سنبھالو۔ اس یتیم کو تو لاوارث چھوڑ آئی ہو" رابعہ ہنسنے لگی "مگر شام کو بیوی بچوں سمیت آ جاتا تھا یا مجھے لے جاتا تھا۔"
میں نے کہا "بیگم رضوی کا حال کیسا ہے؟"
"وہ لندن چلی گئی ہیں اور وہیں سیٹل ہیں۔ اچھا کیا' یہاں اب کچھ نہیں تھا سوائے پریشانیوں کے۔ وہ سب جو انکل رضوی کے زمانے میں صبح شام سلام کرنا فرض سمجھتے تھے' ہر تقریب میں بلا کے عزت دیتے تھے' کسی موقعے پر پوچھتے نہیں تھے۔ سب نے انہیں بھلا دیا تھا۔ اس لئے کہ اب وہ کسی ایس ایس پی کی بیوی نہیں رہی تھیں۔ کچھ بے مروت تھے تو کچھ بزدل۔ ڈرتے تھے کہیں وہ ان کا دشمن نہ ہو جائے۔ تاہم کچھ نیک دل لوگ تھے جو انکل کے ساتھی اور ماتحت رہے تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا اور پھر انتظام بھی کیا کہ وہ باہر چلی جائیں۔"
میں چوہدری دلاور کا نام لینے سے بھی گریز کر رہا تھا۔ اتنی خوب صورت گفتگو میں اس شیطان کا حوالہ بھی میرے موڈ کو خراب کر دیتا مگر اب رابعہ نے ذکر کیا تو میں پوچھنے پر مجبور ہو گیا "وہ حرام زادہ بمبئی سے بھاگ گیا تھا۔"
"بھاگ کے کہاں گیا؟" رابعہ بولی۔
"کیوں۔ لاہور نہیں پہنچا؟" میں نے کہا۔
"نہیں۔ لاہور میں تو نہیں ہے وہ۔"
"اس نے گھر بدل لیا ہو گا" میں نے کہا۔
"بمبئی اس نے بھی بیوی بچوں کو غائب کر دیا تھا۔ ملک سے باہر ہی بھیجا ہو گا۔ وہ خود لوٹ کر پاکستان نہیں گیا۔ وہیں چلا گیا ہو گا جہاں اس کے بیوی بچے ہوں گے۔ ہاں استاد چیڈو نظر آیا تھا منظر کو اور وہ حاجی عبداللہ ایک دن شاہد علی کے پاس گیا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ مس رابعہ قاری کب آ رہی ہیں واپس۔"
میں چونکا "وہ..... وہ کیوں پوچھ رہا تھا؟"
"مجھے کیا معلوم۔ شاہد تو کچھ جانتا نہیں تھا۔ پتا نہیں تھے

www.paksociety.com

سوکل یہی سوال کرتے ہوں گے۔ اس نے کہا کہ کوئی کام ہو تو مجھے بتائیے۔ کہنے لگا کہ میاں! ویسے تو ماشاء اللہ سے تم بھی ہونہار لگتے ہو مگر ہمارا معاملہ کچھ اور ہے۔ تمہارے بس کا نہیں۔ اس کے بعد وہ لوٹ کے نہیں آیا۔"

"مغیث یار زندہ صحبت باقی۔ ابھی پرانے کھاتے بند نہیں ہوئے ہیں۔ مجھے ان سے حساب لینا ہے" میں نے کہا "اپنا حساب...."

"چھوڑو سکندر۔ پرانی باتوں کو بھول جاؤ" رابعہ نے کہا۔

میں نے برہمی سے کہا "بھول جاؤں؟ یہ بھول جاؤں کہ وزیر خاں کیسی کسمپرسی کے عالم میں مرا تھا!"

"بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ سب، حالات پرانے ہو گئے ہیں اور حالات کی گرد میں دب گئے ہیں" رابعہ نے کہا "اس گرد کو چھیڑو گے تو خود ہمارے خلاف دبے ہوئے تمام قانونی مسائل پھر اٹھ کھڑے ہوں گے۔"

میں نے کہا "تم کیا سمجھتی ہو' میں فریاد لے کر عدالت میں جاؤں گا؟ وہاں تو ملزم میں ہوں' قتل کا الزام مجھ پر ہے لیکن حقیقت کیا ہے' یہ میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی سمجھتی ہو۔ میرے والد کے ساتھ کس نے فراڈ کیا' کیسے کیا اور کس طرح ان کی لاکھوں کی جائیداد ہتھیا کے انہیں پیسے پیسے کا محتاج بنایا گیا وہ ایک صنعت کار تھے مگر وہ مرے تو ایک کمپنی ملازم کی حیثیت سے ان کا جنازہ بھی ان کے گھر سے نہیں اٹھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان سب معاملات کی خبر مجھے لندن میں نہیں ہونے دی گئی۔ یہ سب کچھ ایک ہفتے یا ایک مہینے میں نہیں ہوا ہوگا۔ میں وہاں ٹھاٹ سے پڑھتا رہا اور عیش کرتا رہا۔ یہ فرض کئے بیٹھا رہا کہ وزیر خاں کو میں جس خوشحالی کی منزل پہ چھوڑ کے آیا تھا اب وہ اس سے کہیں آگے دولت مندی کی منزل پہ ہوں گے مگر وہ یہاں بیماری میں اپنے لئے دوا تک نہ خرید سکے اور سرکاری ہسپتالوں کا دھکے کھاتے کھاتے مر گئے۔ کیا مجبوری لاحق تھی انہیں کہ انہوں نے حالات کو مجھ سے چھپایا اور انہیں مجبور کرنے والا کون تھا؟ ان کے نمک خوار' دوست احباب اور شناسا سب کیوں خاموش تماشائی بنے رہے؟ کسی نے بھی ان کی مدد نہیں کی تو کیوں؟"

رابعہ نے کہا "ان کے ساتھ اتنا ظلم ہوا اور قانون کچھ نہیں کر سکا۔ انہوں نے کسی عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا' کسی سے انصاف نہیں مانگا' کسی کو وکیل نہیں کیا۔"

"وہ جانتے ہوں گے رابعہ کہ یہ سب بے کار ہے۔ قانون کتنا بے بس ہے' جھوٹے گواہوں اور جھوٹی شہادت لانے والوں کے سامنے۔ انصاف کرنے والے کیا کر سکتے ہیں جب مظلوم کی حمایت میں کوئی زبان سے سچ بولنے کی ہمت بھی نہ کرے۔ یہ بھی نہ بتائے کہ اس نے کیا دیکھا تھا اور کیا سنا تھا۔ چشم دید گواہ اندھے بہرے بن جائیں۔ اور قسم اٹھانے پر تیار ہو جائیں کہ وہ تو جائے واردات کے آس پاس ہی نہیں تھے۔ نہیں رابعہ! اب میرا معاملہ ایسے نظام انصاف سے طے نہیں ہوگا جو گواہی اور شہادت کی بیساکھی کا محتاج ہو۔ جہاں خدا' رسول اور قرآن کی قسم کھا کے جھوٹی گواہی دینے والے تو میسر آ جاتے ہوں' خریدے جا سکتے ہوں مگر کوئی حقیقی گواہی بولتے ہوئے اپنا فرض' اپنا ضمیر' خوف خدا اور معاشرے کے حقوق' سب کچھ بھول جاتا ہو اور صرف ذاتی مفاد یا اپنی ذات کے تحفظ کی خاطر خاموشی سے کسی بے گناہ کو تختہ دار تک جاتا دیکھنا قبول کر لیتا ہو۔"

"پھر کیا کرو گے تم آخر؟"

"رابعہ! ایم آر اے کی عدالت نے کتنے فیصلے کیے تھے' کتنے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا تھا' یہ تم بھی جانتی ہو۔ کیا وہ فیصلے غلط تھے؟ کسی کے ساتھ ناانصافی ہوئی تھی یا کسی بے گناہ کو سزا دی تھی ہم نے؟" میں نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر....."

"اگر مگر کچھ نہیں۔ یہ میرا معاملہ ہے جسے وقتی طور پر میں نے عظیم تر ملکی و قومی مفادات کی خاطر التوا میں رکھا تھا۔ اب مجھے انصاف حاصل کرنا ہے۔ خود کرنا ہے یہ کام۔ ہر مجرم کو میں خود تلاش کروں گا اور خود سزا دوں گا' ان کا اعتراف جرم حاصل کرنے کے بعد۔ ان کے ہاتھوں میں نے ہی نہیں تم نے بھی بہت نقصان اٹھائے ہیں۔ وہ سب ناقابل تلافی نقصانات تھے۔ ہم سب ظلم کا شکار ہوئے اور شکاری اپنے تمام وسائل کی قوت کے ساتھ ہمارے تعاقب میں رہے۔ ان کی طاقت تھی دولت۔ اس سے انہوں نے پولیس کو خرید لیا' شہادتوں کو خرید لیا یہاں تک کہ انصاف کرنے والوں کو خرید لیا۔ اب شکاری ہم ہیں مگر ہماری طاقت دولت نہیں' ہمارا یقین ہے۔ تم دیکھنا' میں انہیں کیسے شکار کرتا ہوں۔ ابھی مہلت ہے ان کے پاس۔ جہاں چاہے جا کے چھپ جائیں مگر وہ مجھ سے بچ کے کہیں نہیں جا سکتے۔ میں ان کو ڈھونڈ نکالوں گا' خواہ کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے۔"

"کوئی سے کیا مراد ہے تمہاری؟" رابعہ نے برہمی سے کہا۔

"تم ساتھ دو گی میرا؟"

"یہ سوال پوچھ کے تم میری توہین کر رہے ہو۔ کیا تمہیں شک ہے کہ میں انکار کر دوں گی؟"

میں نے خفت سے کہا "دراصل..... تم قانون داں ہو نا....."

"میں تمہارے لئے صرف رابعہ ہوں۔ تمہاری اور ہماری زندگی کے راستے ایک ہیں مگر....."

"مگر کیا؟ کھل کے بات کرو۔"

"کیا غالب اور نازو تمہارے ذاتی انتقام کی اس جنگ میں بھی اسی طرح تمہارا ساتھ دیں گے؟ یہ مقصد اور تھا' اس میں ذاتی پہلو کوئی نہیں تھا لیکن اس کے بعد مقصد کی نوعیت بدل جائے گی۔" رابعہ بولی "کوئی بھی اپنی زندگی کے خواب تمہاری خواہشوں پر قربان نہیں کر سکتا۔ دوستی کے خلوص کو آزمانے کی ایک حد ہوتی ہے۔ دوستی میں وفاداری کا مطلب یک طرفہ اجارہ داری نہیں ہے۔"

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اجارہ داری....."

"دیکھو' ٹھنڈے دماغ سے سوچو' دل سے مت سوچو۔ کیا اب غالب اور نازو کی اپنی کوئی زندگی ہے؟ ان کے ارمان ہیں اور خواب ہیں؟ اگر ہیں تو انہیں کیا اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنی خوشیوں کے رنگ بھر سکیں؟ تم تو چاہتے ہو کہ بس وہ تمہارے مقاصد کی تکمیل کے آلۂ کار بنے رہیں۔"

میں نے بگڑ کے کہا "یہ الزام ہے مجھ پر۔ وہ اپنی مرضی سے اس مشن میں ساتھ دے رہے تھے۔"

"مگر اس کے بعد والا مشن؟ کیا اس میں بھی تم انہیں اپنے ساتھ گھسیٹو گے؟ ممکن ہے محسن تم سے اتفاق کرے مگر تم دیکھ لینا' آخر کار گل اسے جیت لے گی۔ جب وہ گل کا ہو جائے گا تو تمہارا نہیں رہے گا۔"

"تم غلط سوچ رہی ہو۔ وہ ایسا دوست نہیں ہے۔"

"دوستی کے درمیان جب خاندانی رشتے' بیوی بچوں کی محبت' ذمہ داریاں اور مجبوریاں حائل ہو جاتی ہیں تو بہت کچھ پہلے جیسا نہیں رہتا۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ کتنی آسانی سے لوگ گھر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ گھر جس میں ماں باپ بھائی بہن ہی پیدائش سے بیس تیس سال تک آدمی کا سب کچھ ہوتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ماں کے پیروں تلے جنت ہے مگر اس جنت کی خاطر کون بیوی کی ناراضی کو ختم کرتا ہے؟ چند مہینوں یا سال دو سال میں وہ عورت جو بیوی ہوتی ہے' بچوں کی ماں بن جاتی ہے اور سب سے زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔ پھر جب بچے بڑے ہونے لگتے ہیں تو سب کچھ غیر اہم ہو جاتا ہے۔ ان کی پرورش' ان کی خواہشات کی تکمیل' ان کی خوشی کے لئے جدوجہد' ان کی کامیابی کے وسائل کا حصول' یہ سب آدمی کو تمام دوسرے رشتوں سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ اصول' نظریات اور جذباتی فلسفے سب بے مصرف ہو جاتے ہیں۔ آدمی خود غرض' بزدل اور بے بس ہو جاتا ہے۔ میں عام آدمی کی بات کر رہی ہوں۔ لاکھوں میں چند ایک ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی زندگی اور خوشیوں تک کو قربان کر دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔"

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ بڑے منطقی انداز میں دلائل دے رہی تھی۔ اس وقت وہ پھر ہائی کورٹ کی وکیل بن گئی تھی۔ پہلا مقدمہ سرکار بنام غالب بنام سکندر بخت' دوسرا مقدمہ سرکار بنام محسن بنام سکندر بخت۔ رابعہ وکیل استغاثہ بن کے میرے خلاف بول رہی تھی۔ آخر کیا حق پہنچتا تھا ملزم سکندر بخت کو کہ وہ محبت کرنے والوں کا جذباتی استحصال کرے؟ ان سے دوستی کے نام پر ایثار و قربانی طلب کرے؟ انہیں ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرے؟ انہیں ازدواجی زندگی کی مسرتوں سے محروم کرے؟ ملک اور قوم کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینا ایک مقدس فریضہ تھا اور زندگی ایک سچے پاکستانی کی حیثیت سے اس جہاد میں ملزم سکندر بخت کے ساتھ رہے' اس کی حمایت کرتے رہے اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے رہے مگر اپنے والد کے ساتھ ہونے والے ظلم کا انتقام لینا ایک بالکل مختلف اور متنازعہ موضوع ہے.....

"میں وکیل استغاثہ سے اتفاق کرتا ہوں" میں نے کہا۔

رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "کیا؟ تم کہاں تھے سکندر؟ یہ وکیل استغاثہ کہاں سے آ گیا؟ اس کا مطلب ہے تم میری بات سن ہی نہیں رہے تھے۔"

میں نے چونک کر خفت سے مسکراتے ہوئے کہا "سب سن کے ہی تو میں نے اتفاق کیا ہے تم سے۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ یہاں سے واپس جانے کے بعد میں' غالب اور محسن صرف دوست رہ جائیں گے۔ اگر خود انہوں نے میرا ساتھ دینا چاہا تو میں انہیں اجازت نہیں دوں گا۔ وہ اپنے گھر میں خوش اور آباد رہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ مان جائیں گے؟ اور کہیں گے کہ اچھا کبیر خاں جاؤ اپنا انتقام لو۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ نہیں سکندر! وہ اتنے کمینے اور خود غرض نہیں ہیں۔ انہیں آزمائش میں مت ڈالو۔ وہ مجبور ہو جائیں گے کہ تمہارا ساتھ دیں۔"

"آخر تم چاہتی کیا ہو؟" میں نے جھنجھلا کے کہا۔

"جو میں چاہتی ہوں' وہ تم نہیں چاہتے اس لئے میری بات چھوڑو۔ میں ہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں" رابعہ نے کہا' "تمہیں غور و فکر کی نصیحت پہ بگڑنا بے کار ہے۔ تمہیں اپنا انتقام اپنے گھر سے زیادہ عزیز ہے تو یوں ہی سہی۔ مگر ابھی غالب اور نازو سے کچھ مت کہنا۔ محسن اور گل کو بھی مت بتانا کہ تمہارے عزائم کیا ہیں۔ تمہیں جو کرنا ہو لاہور جا کے کرنا۔ بالکل خاموشی سے اور اس وقت جب وہ اپنی ازدواجی زندگی کے سفر پر روانہ ہو جائیں اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں کہ اب تم کیا کر رہے ہو۔ وعدہ کرو مجھ سے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں" میں نے شکست خوردہ اور کھوکھلے لہجے میں کہا۔

رابعہ اٹھی اور اندر چلی گئی۔ اس کے دلائل نے مجھے یقین اور اعتماد سے محروم کر دیا تھا۔ میرے جذبات میں انتشار پھیلا دیا تھا اور میرے خیالوں کو دھندلا دیا تھا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کیا ان حالات میں گھر بسا کے میں رابعہ پر ظلم نہیں کروں گا؟

رابعہ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں مجھے نہیں سمجھا سکتی تھی کہ آج اور کل میں کیا فرق ہوگا۔ کل غالب اور نازو شاید مجبور نہ ہوں۔ ان کے پاس اپنی زندگی پر اپنا اختیار ہوگا جس سے وہ کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہوں گے۔ محسن اور گل کی مجبوریاں بھی مختلف ہوں گی۔ میرا اختیار باقی رہے گا تو صرف رابعہ پر اور اس کی مجبوری ہوگی وہ محبت جس سے میں فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ اس سے

www.paksociety.com

کہہ سکتا ہوں کہ آؤ میرے ساتھ چلو اور وہ کوئی سوال کئے بغیر اس گھر کو خدا حافظ کہہ دے گی جس کو اس نے دن رات جاگتی آنکھوں میں خواب بسا کے ارمانوں کے رنگ سے سجایا تھا۔ نہیں۔ میں یہ ظلم نہیں کر سکتا۔ میں رابعہ کی محبت کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھاؤں گا۔ اس کی زندگی اور جذبات کی کمزوری سے نہیں کھیلوں گا۔ یہ تو سراسر کمینگی ہوگی کہ ان مقاصد کی خاطر جس سے صرف مجھے تسکین حاصل ہو، میں اسے بھی اپنے ساتھ مصائب و آلام، خطرات اور موت کی دلدل میں گھسیٹتا پھروں۔

یہ فیصلہ کر لینے کے بعد مجھے قدرے سکون ملا۔ اس وقت تک شام کے دھندلکے پر رات کا اندھیرا غالب آنے لگا تھا۔ صبح کا ناشتا سب نے اتنی دیر سے کیا تھا کہ دوپہر کے کھانے کی ضرورت کسی نے بھی محسوس نہیں کی تھی۔ ویسے بھی باتوں سے دل نہیں بھرا تھا تو پیٹ بھرنے کا خیال کسے آتا۔

نازو اور غالب میں جنگ عظیم کے بعد صلح نامہ ہو چکا تھا مگر وہ چھوٹی موٹی جھڑپیں حسب سابق جاری تھیں جن کے بغیر شاید انہیں محبت کا مزہ ہی نہیں آتا تھا۔ رابعہ بھی پرسکون تھی مگر مجھ سے نظریں چراتی تھی اور شاید سچ کا کڑوا زہر میرے حلق سے اتارنے کے بعد اپنی زیادتی کے احساس سے پشیمانی میں مبتلا ہونے لگی تھی۔ سب سے نمایاں فرق گل کے رویئے میں آیا تھا۔ وہ اپنی خاموشی اور اداسی کے خول سے نکل آئی تھی اور پہلے کی طرح ہنس بول رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس تبدیلی کا ذمے دار محسن ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ اتنی جلدی شملا کو بھول جائے مگر اس کے لئے بے رخی اور بے اعتنائی سے کسی کا دل توڑنا بھی اتنا ہی ناممکن تھا۔

کاجل آٹھ بجے نمودار ہوئی۔ اس کا حلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ شلوار قمیص اور دوپٹے میں تھی اور اس نے بالوں کی چوٹی گوندھ لی تھی۔ اس کے لمبے کالے بال پشت پر کسی سیاہ ناگ کی طرح لہرا رہے تھے اور کانوں میں بڑی بڑی طلائی بالیاں جھول رہی تھیں۔ وہ ایک دم بنگالن سے پنجاب کی مٹیار بن گئی تھی۔

"معاف کرنا مجھے کچھ دیر ہو گئی" وہ بولی "دن میں تم نے کیا کھایا؟"

غالب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تمہارا غم کھایا۔"

کاجل ہنس پڑی "اچھا؟"

نازو نے غالب کو گھورا تو اس نے فوراً وضاحت کی "میرا مطلب تھا ہم سب کو تمہاری فکر رہی۔"

"مرزا! تم ایک بزدل آدمی ہو۔ بلکہ آدمی ہو ہی نہیں۔ تم نے ناک کٹوا دی ہم سب مردوں کی" محسن نے کہا۔

"تمہاری ناک تو نہیں کٹی نا" غالب بولا۔

"مجھے شرم آتی ہے تمہیں اپنا دوست کہتے ہوئے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا یار، تو ایک بار منہ سے وہ شرمناک الفاظ نہ نکالتا۔ ایک بار لکھ کر دینا جو تو نے ہزار بار لکھ دیا۔"

"پھر کیا کرتے؟" نازو نے کہا۔

"میں...... میں ہاتھ پکڑتا کاجل کا اور نکل جاتا پیچھے پیچھے کسی نکاح خواں کی تلاش میں۔ تم دلڑی آنکھیں پیچھے رگڑتی ہوئی اور میں... ہزار بار کہتا......"

کاجل نے ایک دم اپنا ہاتھ بڑھا دیا "تو پکڑو میرا ہاتھ، جاتی ہوں ایک نکاح خواں کو۔"

محسن نے گڑبڑا کے کہا "وہ...... وہ تو میں غالب کی جگہ ہوتا...... فی الحال میں اپنی جگہ پر ہوں۔"

اب غالب کی باری تھی۔ اس نے کہا "تو یہاں میری آگے ہمت کرو۔ ورنہ ڈوب مرو۔ گل کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

گل کا رنگ گلابی ہو گیا۔ اس نے گھبرا کے کہا "مجھے اس لڑائی میں مت گھسیٹو۔"

کاجل نے کہا "پہلے کھانا کھا لیں آپ لوگ۔ پھر میں ایک خوشخبری سناؤں گی۔"

میں نے کہا "خوش خبری پہلے سناؤ۔ ممکن ہے اس کے بعد کھانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔"

"اسی لئے تو کھانا پہلے ضروری ہے۔ خود میں نے بھی کچھ نہیں کھایا سخت بھوک لگی ہے" وہ بولی "ڈرائیور جا کے گاڑی میں سے کھانا لے آئے۔"

یہ نیک کام محسن نے کیا۔ کاجل کسی ہوٹل سے کھانا پیک کرا کے لائی تھی۔ اس کی خوشبو اتنی اشتہا انگیز تھی کہ کھانا آتے ہی سب ٹوٹ پڑے۔

"ہمارے جانے کا انتظام ہو گیا ہے" کاجل نے کھانے کے بعد اعلان کیا۔

"سچ!" نازو نے خوشی سے بے قابو ہو کے کہا "کب؟"

"کل سے روانگی شروع ہو جائے گی" اس نے کہا۔

"کل سے...... کیا ہم سب ایک ساتھ نہیں جا سکیں گے؟" میں نے کہا۔

"ایک ساتھ تو بہت مشکل ہے" وہ بولی "جہازوں میں بہت رش ہے کہ باقاعدہ سیٹوں کی بلیک ہو رہی ہے۔ تین چار دن تک بھی سیٹ نہیں ملتی۔ پھر ڈائریکٹ فلائٹ تو ہے نہیں۔ ایک کولمبو سے ہے دوسری نیپال کی طرف سے۔ دونوں بہت لمبے ہیں چنانچہ کرائے ویسے ہی ڈبل ہو جاتے ہیں۔"

میں نے مایوسی سے کہا "یہ تو بہت مہنگا بھی پڑے گا۔"

محسن نے کہا "کتنا مہنگا پڑے گا یار۔ ساٹھ ہزار، ستر ہزار؟"

"بائیس ہزار سے زیادہ ہمارے پاس ہیں" نازو نے کہا۔

"یہ تو بہت ہے" کاجل بولی "اور پیسہ میں بھی لا سکتی ہوں مسئلہ جگہ کا ہے۔ ہر فلائٹ میں ایک دو افراد کی سیٹیں مل سکتی ہیں یا انہیں غیر قانونی طور پر کہیں فٹ کیا جا سکتا ہے۔ ہم..."

رہتے ہیں مگر ایک ساتھ چھ سات سیٹوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فی الحال دو کے جانے کا بندوبست ہوا ہے گل کی فلائٹ سے ہی کے راستے۔"

"صرف دو" غالب نے کہا "باقی کب جائیں گے؟"

"جب جگہ ملے گی۔"

"جگہ کب ملے گی؟" غالب بولا۔

"یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں۔ قسمت کی بات ہے، باقی سب ایک دو نکل جائیں یا اگلی فلائٹ میں ایک بھی نہ جا پائے۔ انتظار تو کرنا پڑے گا اور میرے کام کے لئے بتا چارہ نہیں۔"

"بائی روڈ سب ساتھ جا سکتے ہیں نا!" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ مگر وہ بہت لمبا، تکلیف دہ اور غیر محفوظ سفر ہے۔ اس سے یہاں انتظار کرنا آسان ہے" کاجل نے کہا۔

میں نے کہا "اوکے۔ دو کل چلے جائیں گے۔"

رابعہ نے کہا "کون دو؟"

میں نے کہا "کوئی بھی دو۔ نازو اور گل چلی جائیں۔"

نازو نے صاف انکار کر دیا "میں بعد میں جاؤں گی۔"

اس کے انکار کا مطلب بھی صاف تھا کہ میں غالب کے ساتھ ہی جاؤں گی۔ اسے اکیلا چھوڑ کے نہیں جاؤں گی۔

"رابعہ اور گل" میں نے کہا۔

اب رابعہ نے انکار کر دیا "مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ ایسا کرو نا محسن، اور اس کے ساتھ گل کو روانہ کر دو۔"

محسن نے کہا "تم چلی جاؤ نا سکندر کے ساتھ۔"

کاجل نے کہا "یہ کیا مصیبت ہے! آخر کوئی تو جائے گا۔ چلو قرعہ اندازی کر لو۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک ہے۔ اعتراض بالکل نہیں چلے گا کسی کا۔"

"ہاں۔ خواہ غالب کا اور کاجل کا نام نکل آئے" محسن بولا۔

"میں ابھی سے انکار کرتا ہوں۔ مجھے یہیں مرنا قبول ہے" سب نے احتجاج کیا۔ "میں راستے میں کود جاؤں گا جہاز سے اگر یہ ہوگیا۔"

کاجل نے ہنس کے کہا "اب میں اتنی بری بھی نہیں ہوں۔"

غالب نے کہا "فکر میں گرفتار بلا ہوں۔ وہ بلا مجھے نہیں چھوڑے گی۔ مجھے پھر ایک ہزار مرتبہ لکھ کے دینا پڑے گا۔"

نازو ہنسی "جانا تو پڑے گا تمہیں۔ قرعہ اندازی آخر کس لئے ہے۔ ایسے تو فیصلہ کبھی نہیں ہوگا۔"

جب قرعہ اندازی میں محسن کا نام نکلا تو غالب نے سب سے پہلے نعرہ لگایا "حق یا...... شوں قسمت کا دھنی لاکھ بڑا ہے......"

دوسرا نام گل کا نکل آیا تو پھر شور مچا "بے ایمانی ہوئی ہے۔"

"کیا بے ایمانی ہوئی ہے؟" غالب نے کہا۔

"جان بوجھ کے یہ نام نکالا گیا ہے" محسن بولا۔

"نام سب کے سامنے نکالا گیا ہے" میں نے کہا اور کن انکھیوں سے گل کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں فتح مندی کا غرور تھا اور اس کی آنکھیں اپنی خوش نصیبی کا اعلان کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ اگر اس نے دعا مانگی تو وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ اگر یہ جذبۂ دل کی تاثیر تھی تو اس میں کلام نہیں تھا۔ اگر یہ حسن اتفاق تھا تو بڑا حسین اتفاق تھا۔ مجھے ایک بار پھر یوں لگا جیسے محسن کا احتجاج بھی رسمی اور مصنوعی ہے۔ وہ گل کو احساس دلانا چاہتا ہے کہ درحقیقت وہ بھی اس قرعہ اندازی کے نتیجے سے اتنا ہی خوش ہے جتنی گل۔

بات صرف اتنی تھی کہ محسن پہلے سے گل کے جذبات سے آگاہ تھا۔ جب شملا زندہ تھی تب بھی اس میں ہمت نہ تھی کہ وہ گل کی دل شکنی کر سکے۔ کچھ اس لئے کہ ڈاکو شیش ناگ کی بہن ناگ منی سے جب وہ گل بانو بنی تو اس کو جذباتی سہاروں کی ضرورت تھی۔ بھائی کے مرنے کے بعد وہ دنیا میں لاوارث ہو گئی تھی۔ ایسے میں ہم نے اسے اپنایا اور اس نے محسن کو پسند کر لیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ شملا کا ہو چکا ہے اور وہ تمام عمر اس کے پیچھے بھاگتی رہے گی تب بھی اس کو نہ پا سکے گی۔ اب دل کس پر آتا ہے اور کیوں آتا ہے، اس کی کیا توجیح اور کیا دلیل۔ جو نہ مصلحت دیکھے نہ مصالحت کرے "اسے کوئی کیا سمجھائے۔" ہم نے بھی محسن کو مجبور کیا تھا کہ گل کو نئی زندگی کی راہ پر چلتے رہنے کی استقامت صرف ہمارا رویہ دے سکتا ہے۔ اس راہ پر ایک تلخ تجربہ اس کو پھر صراط مستقیم سے بھٹکا سکتا اور وہ جذباتی عدم توازن کا شکار ہو کر محبت اور وفا کے نام سے ہی بدظن ہو جاتی تو تمام عمر زمانے کی ٹھوکروں میں رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ محسن نے اسے کبھی یک طرفہ محبت کے حق سے محروم نہیں کیا کہ اگر وہ یوں خوش ہے تو یوں ہی سہی۔ لیکن اب اچانک شملا نہیں رہی تھی۔ اس کی تمام زندگی قربانی سے عبارت تھی۔ یہ قربانی اس نے پہلے بھائی کے لئے دی تھی، پھر شوہر کے لئے اور آخر میں بیٹے کے لئے اور ہم سب کے لئے۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے گل کو بھی زیر بار احسان کیا۔ وہ گل سے کبھی نہیں ملی اور اس نے گل کو دیکھا تک نہیں۔ جب گل نے اسے دیکھا تو وہ شیشے کے تابوت میں خوابیدہ ایک لاش سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ گل بانو نام کی ایک لڑکی جو پہلے ڈاکو ناگ منی تھی، اب اس کے شوہر سے دل لگا بیٹھی ہے۔ اگر یہ بات اسے کوئی بتا بھی دیتا تو شاید مرتے وقت اس کے دل میں ایک خلش رہ جاتی کہ کہیں اس میں بچا ہی فیصلہ نہ ہو، "دو فیصد" "ایک فیصد" برائے نام ہی سہی "غلط فہمی کی بات سہی" قصور محسن کا تو نہیں تھا؟ لوگ تو کہتے ہیں تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی اور دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔

لیکن خدا نے اسے محبت پر اعتماد، محسن پر اعتبار اور وفا پر یقین کے سکون سے محروم نہیں کیا اور اس نے بے مثال صبر و رضا فرقت

www.paksociety.com

کے عذاب کو شکر کے ساتھ جھیلنے کی بے مثل ہمت اور قربانی کی بے مثل روایت قائم کرنے کا حوصلہ دیا اور اس کے ساتھ ہی وہ گل کو تمام عمر کے لئے زیر بار احسان کر گئی کہ میں مروں تو اسے خوش رکھنا۔ میں تو اسے سنبھال کے نہ رکھ سکی۔ تم اسے سنبھال کے رکھنا۔

محسن نے بھی حیرت انگیز اور ناقابل یقین صبر کے ساتھ اپنی زندگی کے سب سے بڑے جذباتی سانحے کو برداشت کیا تھا۔ شاید اس کی جگہ میں ہوتا تو ہوش کھو بیٹھتا مگر اس نے نوشتۂ تقدیر کو خدا کی رضا سمجھ کر قبول کیا اور ثابت کر دیا کہ وہ ناقابل شکست ہے۔ اپنی وفا میں، اپنی محبت میں، اپنی دوستی میں۔ اس کا خلوص ایک جذبۂ جاوداں ہے۔

بدلے ہوئے حالات میں وہ گل کے ساتھ پہلے کی طرح مہربانی اور التفات کا رویہ اپنائے ہوئے تھا مگر گل کا انداز عشق بدل گیا تھا۔ اب وہ زیادہ پرامید تھی اور محسوس کرنے لگی تھی کہ یہ سب انتظام دست غیب ہے۔ یہ تو سوچنا ہی غلط تھا کہ اس کے دل کے کسی گوشے میں شملا کی موت پر خوشی یا اطمینان کا خیال بھی موجود ہوگا لیکن یہ سمجھنے میں وہ حق بجانب تھی کہ جب اس نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا پھر بھی قدرت نے اس کا راستہ صاف کر دیا تو وہ خود کو مجرم کیوں سمجھے اور کیوں محسن کو نہ اپنائے۔ اسے کیوں نہ چاہے۔ اتنی ہی شدت سے اور خلوص نیت کے ساتھ، جیسے شملا نے چاہا تھا۔ وہ اس کے لئے شملا کیوں نہ بن جائے اور اس خلا کو اپنی کوشش کی انتہا تک پر کرنے کی خواہش کیوں نہ کرے جو محسن کی زندگی میں پیدا ہو گیا ہے۔

کاجل رات دس بجے گئی تو دو پولیس مین ڈیوٹی پر آ چکے تھے مگر وہ نئے آدمی تھے۔ گل اور محسن کی پرواز اگلے دن دوپہر کو روانہ ہونے کا امکان تھا۔ جہاز شیڈول کے مطابق نہ آ رہے تھے اور نہ جا رہے تھے مگر اس نے کہا کہ وہ دس بجے آ کے انہیں اپنے ساتھ لے جائے گی۔

ابھی وہ رخصت ہو کے زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ ہم نے فائرنگ کی آواز سنی۔ یہ مشین گن کے فائر تھے۔ میں نے اور محسن نے خواتین کو اندر رہنے کی تاکید کی اور غالب کو ان کے پاس چھوڑ کے باہر گئے۔ ادھر ادھر کی کوٹھیوں سے بہت سے لوگ نکل آئے تھے اور اپنے اپنے نوکروں کو صورت حال معلوم کرنے کے لئے بھیج رہے تھے۔

بظاہر کہیں کچھ نہیں ہوا تھا مگر اچانک میری نگاہ گیٹ پر گئی۔ دونوں پولیس مین جو رات کی ڈیوٹی دینے آئے تھے، غائب تھے۔

میرا ماتھا ٹھنکا "محسن! مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔"

محسن نے سر ہلایا "فائرنگ بہت قریب ہوئی تھی۔ مجھے تو یوں لگا جیسے اسی دروازے پر۔ کہیں ان کا نشانہ کاجل تو نہیں تھی۔"

"یہ ہو سکتا ہے" میں نے کہا "ویسے تو عبدالستار چوہدری نے اسے پاگل مشہور کر رکھا ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں وہ لگتا ہے پاگل پن ہے۔ وہ کار لے کر پھرتی ہے۔ نت نئے فیشن کرتی ہے۔ اپنی مرضی سے آتی جاتی ہے اور باتوں سے اتنی ہوش مند لگتی ہے کہ اسے پاگل کہنے والا خود پاگل ہے....."

محسن نے کہا "کچھ لوگوں کو ضرور معلوم ہو گا کہ وہ بنگلہ دیش والی سے حامی نہیں اور پاکستانی ہے۔ کہیں کسی نے ان کا ہمارے تعلق کا پتا تو نہیں چلا لیا۔ اللہ خیر کرے۔"

ابھی ہم اندھیرے کی اوٹ میں کھڑے اپنے اندیشوں کے اسباب تلاش کر ہی رہے تھے کہ اصل پولیس مین نمودار ہوئے۔

میں نے کہا "تم لوگ کہاں چلے گئے تھے؟"

ان میں سے ایک نے کہا "سائیں ہم کو پانی دو۔ آپ کو تم دیر ہو گیا۔"

میں نے کہا "ابھی یہاں فائرنگ ہوئی تھی؟"

دوسرا پولیس مین بولا "ہو جی۔ آوازاں تو ہم نے بھی سنیں۔ اک بندے نے بتایا کہ کسی نے گڈی پر گولیاں چلائی ہیں۔"

میں نے کہا "کس کی گاڑی پر؟"

"یہ تو نہیں پوچھا میں نے۔ پر وہ بندہ کہہ رہا تھا کہ کوئی لال گڈی چلا رہی تھی۔ اندھیرے میں گڈی کا رنگ نظر نہیں آیا۔"

میں نے کہا "اندھیرے میں کون سا رنگ نظر نہیں آتا؟ گاڑی صاف نظر آتی۔ بجلی بھی نمایاں ہوتی۔ یہاں لال یا کالا ڈارک براؤن رنگ شناخت کرنا مشکل ہو گا۔"

محسن بولا "اب تم دھیان سے پہرا دو۔ ہمیں شک ہے کہ کسی نے چوہدری صاحب کی گاڑی پر گولیاں چلائی تھیں۔"

میں نے کہا "تم فون کر کے معلوم کر سکتے ہو؟"

ان کو عبدالستار چوہدری کا فون نمبر معلوم نہیں تھا۔ ہمیں تشویش تھی مگر تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میں نے اور محسن نے طے کیا کہ خواتین کو کچھ نہ بتایا جائے اور انہوں نے پوچھا تو ہم نے خاصی لاتعلقی سے ٹال دیا کہ پتا نہیں کیا معاملہ تھا۔ حالات ایسے ہیں کہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ہم یہاں محفوظ ہیں۔ میں نے انہیں مطمئن کر کے سونے پر مجبور کر دیا اور بھی سب کے ساتھ ہی لیٹ گیا مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور مجھے ہر سمت سے خطرے کی آہٹ محسوس ہوتی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے محسن کو اٹھ کر باہر جاتے دیکھا اور خود دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ ہم باغ کے آخری گوشے میں ایک جگہ گئے جہاں دن میں غالب اور نازو بیٹھے رہتے تھے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر ہم نے ریوالور اپنے پاس رکھے اور ان پولیس والوں پر نظر بھی جو پہرے پر مامور تھے۔

محسن نے کہا "یار سکندر! میری جگہ گل تو نہیں جا سکتی؟"

میں نے کہا "نہیں۔ فیصلہ ہو گیا ہے۔"

"بات فیصلے کی نہیں ہے یار، حوصلے کی ہے۔ تو جا سکتا ہے اس گھر میں جو تیرا اپنا ہے۔ تو اسے آباد کر سکتا ہے۔ میں اس گھر میں نہیں جا سکتا جہاں اب شملا نہیں ہے۔ گل کے ساتھ جاتے ہوئے میں خود کو مجرم محسوس کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "یہ ضروری تو نہیں کہ تو اپنے گھر جائے۔ تو ہمارے گھر میں رہ سکتا ہے۔ گل کو مظفر کے پاس چھوڑ سکتا ہے اور اب تو خود بھی وہیں قیام کر سکتا ہے۔ ہم سب کی واپسی تک۔"

وہ کچھ دیر چپ رہا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ شملا کا نام اس کے لب پر بے سبب نہیں آیا تھا۔ یہ آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ ابھی تک اس نے ضبط سے کام لیا تھا۔ وہ کسی اور کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔ اب میں اور وہ تنہا تھے تو اس نے خود اپنے دل کے ناسور میں نشتر اتار دیا۔ وہ شملا کی باتیں کرنے لگا اور جذبات کا آتش فشاں پھٹ گیا۔ وہ سب لاوا جو اس کے وجود میں پیچ و تاب کھا رہا تھا بہہ نکلا۔ وہ رونے لگا اور میرے کندھے پر سر رکھ کے آنسو بہانے لگا۔

میں نے اسے روکا نہیں۔ صبر کی تلقین بھی نہیں کی۔ میں خود اس کے ساتھ روتا رہا اور شملا کو یاد کرتا رہا۔ اسے وہ سب بتاتا رہا جو ابھی تک وہ نہیں جانتا تھا۔ کسی سفاک مسیحا کی طرح میں نے اس کے زخم کا سارا مواد بڑی ہوشیاری سے نکال دیا۔ اس کے درد کا مداوا یہی تھا۔ اس کو شفا صرف ایسے ہی مل سکتی تھی۔

وہ رات بھر روتا رہا اور شملا کے ساتھ گزرنے والی زندگی پر آنسو بہاتا رہا۔ یادوں کے قبرستان میں ہر لمحے کی قبر پر اشکوں کے پھول نچھاور کر کے اسے کچھ سکون ملا۔ صبح ہوتے ہوتے وہ نارمل [illegible] فضا ساکت تھی۔ رات اتنی خاموش تھی کہ پتا بھی گرتا تھا تو آواز سنائی دیتی تھی۔ باہر خاصی سردی تھی اور خزاں کی ہوا تھی مگر ہمیں خنکی کا احساس بھی نہیں ہوا۔ ہم اپنی یادوں میں اور اپنی باتوں میں اتنے منہمک تھے کہ ہم نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔

پھر اچانک مجھے اپنے پیچھے ایک سایہ سا نظر آیا۔ میں ایک دم اٹھا تو اس سائے نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ میں نے ایک جست میں اسے جا لیا۔ یہ گل تھی جو نہ جانے کب پیچھے آ کے کھڑی ہو گئی تھی اور شاید اس نے سب کچھ سنا بھی تھا۔

گل نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی "جانے دو مجھے۔"

وہ ہسٹریا سے مغلوب تھی اور اس میں غیر معمولی طاقت آ گئی تھی۔ اسے قابو کرنے کے لئے مجھے دونوں بازوؤں کے حلقے میں اسیر کرنا پڑا۔

وہ پھر بھی مچلتی رہی "چھوڑ دو مجھے۔ میں شملا نہیں ہوں۔ میں محسن کے لائق نہیں ہوں۔"

میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا "گل! ہوش میں آؤ۔ پاگل مت بنو۔"

"میں پاگل ہوں۔ میں پاگل ہی رہوں گی۔"

میں نے اس کے ایک جھانپڑ مارا۔ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور مزاحمت ترک کر دی۔ پھر میں اسے کھینچ کر محسن کے پاس لے گیا جو احساس ندامت سے مغلوب وہیں بیٹھا تھا۔ "آج سے اس کی ذمے دار تم ہو گل۔ تم وہ سب کچھ کرو گی محسن کے لئے جو شملا کرتی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کر سکتی ہو کیوں کہ تم کرنا چاہتی ہو۔ تم شملا نہیں ہو مگر شملا سے کم بھی نہیں ہو۔"

پھر میں پلٹا اور اسے زاروقطار روتا چھوڑ کے اندر چلا گیا۔ جیسی کہ مجھے امید تھی، محسن نے اسے سنبھال لیا۔

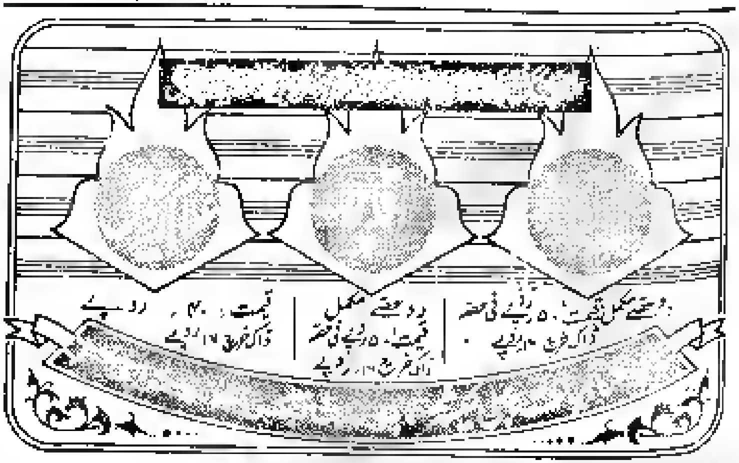

www.paksociety.com

دوسری حیرت کا سامنا مجھے رابعہ اور نازو کو دیکھ کر ہوا۔ وہ دونوں ایک کھڑکی سے لگی کھڑی تھیں اور سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟ کوئی تماشا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"انسانی تماشا" رابعہ نے کہا "میں خود ہی تماشا ہوں اور خود ہی تماشائی۔"

نازو نے کہا "گل کیا کہہ رہی تھی؟"

میں نے کہا "کچھ بھی کہہ رہی تھی......"

رابعہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یعنی اب شملا کا باب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے۔"

"ہاں۔ کتاب زندگی ایسے ہی رقم ہوتی ہے۔ یہ دست تقدیر کے اختیار میں ہے کہ جس باب کو جہاں چاہے ختم کر دے۔ اور ہم پر لازم ہے کہ رضائے الٰہی کے سامنے صبر کا اظہار کریں۔ وقت کے کارواں کے ساتھ چلتے رہیں۔ آج سے کوئی شملا کا ذکر نہیں کرے گا۔"

وہ دونوں گم صم سی بیٹھ گئیں۔ ایک عورت کی حیثیت سے انہیں یہ سب اچھا نہیں لگا تھا۔ ان کے جذبات اس وقت عقل کے تابع نہیں تھے۔

"کتنی جلدی بھلا دیا محسن نے اسے" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "یہ ناممکن ہے کہ محسن اسے بھلا سکے۔ جب کوئی کسی کی زندگی کے ایک حصے میں شامل ہو تو اسے یادوں سے کیسے نکالا جا سکتا ہے مگر اسے یاد رکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ اپنی دنیا و آخرت کو بھلا کے اس کے مزار کا مجاور ہو جائے۔ تمام عمر اسے رونے میں گزار دے۔"

"وفاداری تو اسی کا نام ہے" نازو بولی۔

میں نے کہا "یہ وفاداری نہیں بے وقوفی ہے، پاگل پن ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ کون مرتا ہے؟ ایسا صرف شیریں فرہاد کی داستان میں ہوتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "چھوڑو نازو! کس سے بحث کر رہی ہو۔ یہ بھی تو مرد ہیں۔"

"سب مرد ایک جیسے بے وفا ہوتے ہیں۔ ساتھ چھوٹتے ہی بھول جاتے ہیں" نازو نے فیصلہ صادر کیا۔

"یہ سب روایتی زنانہ جذباتی جملوں کے ڈائیلاگ ہیں۔ گل کو کچھ نہیں کہا تم نے۔ اس نے کیوں جگہ لے لی شملا کی؟ اس نے بھی تو کچھ قربانی دی اور شملا کی محبت کے احترام میں کبھی محسن کا خیال بھی دل میں نہ لائی" میں نے اب مرد کی حیثیت سے دنیا کے سب مردوں پر آنے والے الزام کا دفاع ضروری سمجھا "حقیقت یہ ہے کہ عورت ہی عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔"

"یہ غلط ہے۔"

"کیا غلط ہے؟ کوئی عورت جب جانتے بوجھتے کسی شادی شدہ مرد پر عاشقانہ قبضہ کرتی ہے......"

"مرد ورغلاتا ہے اسے۔ شیطان بن کر۔"

"بالکل ٹھیک۔ مرد خود زور سے مزا لئے ہیں..." نازو بولی۔

میں نے کہا "پھر تم تسلیم کر لو کہ عورت کے پاس عقل نام کی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں ورنہ وہ کیوں کسی کے چکر میں آ جائے۔ اس کے پاس صرف جذبات ہوتے ہیں۔ مجھے کوئی ورغلا کے تو دیکھے۔"

"رہنے دو یہ پارسائی کے دعوے" نازو بولی "ورنہ کبھی آپ بھی جذبات کے دھارے کا رخ بدلتے ہیں۔"

"مگر یہ بات یک طرفہ نہیں ہے۔ ثبوت کے طور پر میں سچ بولا تو تم دونوں ناراض ہو جاؤ گی۔"

نازو نے تنک کر کہا "ہم کیوں برا مانیں گے۔"

"سچ سننے کا حوصلہ ہے ہم میں" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "تو پھر بی نازو! یہ پوچھو اپنی رابعہ باجی سے کہ انہوں نے کس طرح اپنے جذبات کا رخ میری طرف بدلا تھا۔ اور تم بی نازو! ذرا خود سوچو اور یاد کرو کہ تم نے پہلے کسے چاہا تھا۔ پھر غالب کی کیسے ہو گئیں تم؟"

رابعہ کا رنگ ذرا سی دیر کے لئے بدلا "طعنے مت دو۔"

میں نے کہا "دیکھا بری لگی نا میری بات۔"

رابعہ نے کہا "حقیقت یہ ہے کہ اس کے لئے میرے دل میں جذبات تھے ہی نہیں جس کا تم حوالہ دے رہے ہو۔"

میں نے کہا "میں چائے بنا کر لاتا ہوں" اور کچن کی طرف بھاگ گیا۔ میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ یہ بحث بہت تلخ ہو گی مگر گل کے معاملے میں یہ اعتراف ضروری تھا کہ سب ایک سے انسان ہیں۔ ہم سب کی زندگی ضرورتوں اور مجبوریوں سے عبارت ہے اور ہم سب جذباتی مفاہمت کرتے ہیں ورنہ جینا محال ہو جائے۔ رابعہ کی پہلی شادی ایک ایسے شخص سے ہو گئی تھی جو شادی کے قابل ہی نہ تھا اور اس شریف لڑکی نے محرومی کا رابعہ سے کوئی انتقام نہیں لیا تھا۔ وہ ایک کامیاب وقت گزار رہا تھا اور بعد میں بھی اس نے بہت نیکی کی۔ شادی اس نے صرف دنیا کا منہ بند کرنے اور ایک الزام سے بچنے کے لئے کی تھی۔ اس کے بعد وہ محفوظ ہو گیا۔ اس نے عورت کی سرشت سے نفرت کو دوبارہ شادی نہ کرنے کا جواز بنا لیا۔ رابعہ کو باعزت طور پر معافی مانگ کے آزاد کرنے کے بعد۔

آج برسوں بعد اس حوالے نے رابعہ کے احساس کو جھنجھلا دیا تھا۔ اسے یقیناً مجھ سے ایسی بے رحمی کی امید نہ ہوگی۔ جس طرح نازو نے پہلے مجھے ٹوٹ کے چاہا تھا اور دیوانگی کی حد تک۔ میں نے اسے دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا تھا کہ میں رابعہ کو چاہتا ہوں اور اس زندگی میں یہ ناممکن ہے کہ کسی اور کا خیال بھی میرے دل میں رہے تو مایوسی کے طویل اور تکلیف دہ مرحلے سے گزر کے اس نے غالب کو قبول کر لیا۔ وہ باہمت لڑکی تھی اور مایوس ہو کر خودکشی نہیں کی تھی۔ اس نے جینے کا ایک اور بہانہ تلاش کر لیا۔

مختلف حوالوں سے ان دونوں کی زندگی میں دو مرد آئے تھے۔ ان میں سے ایک میں تھا۔ میں رابعہ کی زندگی میں دوسرا تھا اور نازو کے لئے پہلا۔ اس حقیقت کا ادراک گل اور محسن کے تئیں باعزت انداز میں تسلیم کرانے کے لئے ضروری تھا۔ یہ نہ ان کا جرم تھا اور نہ گل کا قصور تھا۔ یہ حالات کا جبر تھا اور ایک بیوی نہ ملنا بھی حادثہ ہوتا ہے۔ بچھڑنا بھی۔ مارنے سے بھلا کون بچ سکا ہے۔

میں چائے بنا کے لایا تو رابعہ اور نازو خاموش بیٹھی تھیں۔ میں نے کہا "صبح بخیر خواتین۔ آج بڑا مبارک دن ہے۔ ہم لوٹ کر زندگی کی طرف جا رہے ہیں۔"

"لوٹ کر؟" رابعہ نے طنز سے کہا۔

"سوری۔ الفاظ بدل لئے جاتے ہیں۔ ہم زندگی کی اس منزل کی طرف رواں ہو رہے ہیں جو ہماری منزل مراد ہے۔ شاید یہ منزل تقسیم کرتا اس موقعے پر۔ فی الحال اس چائے کی پیالیاں لیجئے۔"

"انداز سکندرانی "ہم پہ بے رحم ہو سکندر۔""

میں نے کہا "یعنی میں منافق نہیں ہوں۔ ٹھیک ہے۔ اچھے میں محسن بھی یہی رائے ہے۔ کیا خیال ہے؟ انہیں بھی۔"

غالب ایک دم اٹھ بیٹھا "گولی مارو انہیں۔ چائے مجھے دو۔"

نازو نے خالص زنانہ انداز میں کہا "ہائے۔ تم جاگ رہے تھے؟" اور اپنا کپ غالب کو تھما دیا۔

"اب تو۔ بک بک فرما رہے تھے میں سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا" غالب نے کہا "تم نہیں پیو گی چائے؟"

"میرا موڈ نہیں ہے" وہ بولی۔

"نیند میں تو چائے رہنے دو کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ آپ لے لیجئے یہ بہتر ہے۔"

"کہیں جن جا کے یہ چاہ کن را چاہ درپیش کا حوالہ تو نہیں؟" میں نے کہا "کہ جو دوسروں کے لئے گڑھا کھودتا ہے خود اسی میں۔"

"ماشاء اللہ آپ سمجھدار ہیں" غالب بولا۔

"مگر میں ناسمجھ ہوں۔ میرے لئے کنواں بہتر ہے" نازو نے "کون سا کنواں کھودا ہے میں نے تمہارے لئے؟"

"آپ جیسے چراغ تلے نہیں بلکہ بلب کے اوپر اندھیرا ہے۔ ایسے ہی جو دوسروں کے لئے کنواں کھودتا ہے اس میں جھونکا کرتے ہیں۔ تم خود وہ کنواں ہو جس میں یہ رشتہ دار غرقاب ہوا اس میں خود ڈوب مرا۔" غالب نے کہا۔

"کیا رات صبح ہونے میں؟" رابعہ نے باہر جھانک کر کہا۔

"سرکاری طور پر صبح ہو گئی ہے" میں نے کہا "اجالا پھیلنے میں بس ذرا سی دیر ہے ابھی۔"

"میں تو سو رہی ہوں" رابعہ بولی "وہ دونوں آ رہے ہیں۔"

"پھر تو سمجھو میں اٹھی ہی نہیں" نازو ایک دم لیٹ گئی۔

میں نے اور غالب نے ان کی تقلید کی۔ جب گل اور محسن اندر آئے تو ہم سب گہری نیند میں تھے۔ گل نے سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو مگر چائے کے کپ دیکھ کر محسن ضرور سمجھ گیا ہو گا کہ ہم انہیں خفت سے بچانے کے لئے سوتے بن گئے ہیں۔ گل رب یارن گزر کے دوسرے کمرے میں چلی گئی تو محسن نے کہا "یہاں تو سب مرے پڑے ہیں۔ چلو ہم بھی سو جاتے ہیں" مگر لیٹنے کے بجائے اس نے ایک تنکا بنا کے میری ناک میں گھمایا۔ میں نے چھینک ماری۔ محسن نے وہی تنکا غالب کی ناک میں گھمایا۔

"کیا مصیبت ہے؟" غالب اٹھ بیٹھا "سونے کیوں نہیں دیتا؟"

میں نے اٹھ کے کہا "یہ خوب! الو بھی رات بھر جاگتا ہے۔"

"مجھے انکار ہو رہا ہوں" محسن بولا "شکر کرو تنکا ناک میں گھمایا۔"

"ورنہ..." غالب نے آستین چڑھائی۔

"ورنہ کان میں بھی ڈال سکتا تھا" محسن دانت نکالنے لگا "مجھے نیند نہیں آ رہی ہے" اس نے بیچ کا دروازہ بند کر دیا۔

"نیند کیوں رات بھر نہیں آئی" غالب نے سوال کیا۔

میں نے کہا "انہیں معلوم ہے اور کس کی نیندیں اڑی ہیں۔"

غالب نے کہا "تمہی کی جو خود اڑنے والے ہیں۔"

"اچھا تو لیٹ، میں کہانی سناتا ہوں، پھر نیند آ جائے گی۔ ایک تھی چڑیا، ایک تھا چڑا" میں نے کہا "دونوں نے مل کے......"

غالب نے میری بات کاٹ دی "یہ گل و بلبل کی کہانی ہے۔ یار تو اپنا قصہ بلبل کر لے۔ وہ گانا ایسا فٹ بیٹھے گا نمبر ایک۔ تھا گل اور ایک تھی بلبل" اس نے آہستہ آہستہ گانا شروع کیا۔

"بلبل کے بچے تو بہت چہک رہا ہے" محسن نے غالب کو ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا "باہر چل میرے ساتھ۔ تم بھی سکندر اعظم۔"

"یہ یہ کہانی بالکل سچی، میرے نانا فرماتے تھے" غالب نے باہر کا رخ کرتے ہوئے گانا جاری رکھا۔

"کہتے تھے" میں نے تصحیح کی۔ "گانے کا بیڑا غرق کرو۔"

"یہ گانے کی بات نہیں۔ میرے نانا بچپن فرماتے تھے، کہتے نہیں تھے۔"

باہر آ کے ہم خنک گھاس والے لان میں ٹہلنے لگے۔ حسب توقع محسن نے کہا "یار! میں کیا کروں؟"

میں نے کہا "آپ واپس جائیں اور ایک عقل مند، ہوش مند اور دانش مند آدمی کی طرح زندگی گزارنے کے لئے نئے سرے سے جدوجہد کا آغاز کر دیں" میں نے کہا۔

"تمہارے حق میں بھی فائدہ مند، سودمند اور اقبال مند ہے؟" غالب نے سہلایا۔

www.paksociety.com

میں دُہرے عذاب میں گرفتار ہوں۔ مجھے شملا سے بے وفائی کا احساس جرم الگ پریشان کرتا ہے۔ میں گل کا دل بھی نہیں توڑ سکتا۔ اس کے خلوص کو نہیں ٹھکرا سکتا۔"

میں نے کہا "شملا سے بے وفائی کا کیا سوال۔ جب تک وہ زندہ رہی کیا بے وفائی کا خیال بھی آیا تھا۔ لیکن اب وہ زندہ نہیں تو کیا اس کے لئے مرجانا وفاداری کہلائے گا اور دوکھ بھائی! زندگی کے کچھ حقائق بڑے بے رحم ہوتے ہیں۔ انسان مجبور ہے کہ صبر کرے اور غم کو جلد از جلد فراموش کرنے کی کوشش کرے۔ ماں باپ مرجاتے ہیں۔ ماں باپ کے سامنے جوان اولاد دم توڑ دیتی ہے۔ پچاس سالہ ازدواجی زندگی کے سفر میں ساتھ رہنے والے بچھڑ جاتے ہیں لیکن زندہ رہنے والوں کو اپنی زندگی کے لئے سہارے تلاش کرنے ہی پڑتے ہیں۔ کسی کی زندگی صرف اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں ہوتی۔ ہم دوسروں کے لئے بھی جیتے ہیں۔ اس لئے بھی غم میں جان نہیں دیتے کہ پھر ان سب کا اور دوکھ ملے گا جو زندہ ہیں اور پہلے ہی دکھی ہیں۔ ہم انہیں بچاتے ہیں ورنہ ایک کی خاطر دوسرا مرنے لگے تو چند دن میں دنیا ویران ہو جائے۔"

محسن نے کہا "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں مانتا ہوں گل بہت اچھی لڑکی ہے۔"

غالب نے کہا "صرف یہ نہیں کہ وہ اچھی لڑکی ہے" اصل بات یہ ہے کہ اسے بھی سہارے کی ضرورت ہے۔ ہم سب نے اس کے لئے اپنی بساط سے بڑھ کر کیا مگر جو تو کر سکتا ہے بھائی! وہ ہم نہیں کر سکتے۔ اس کا ہاتھ تھام لے' سہارے کی ضرورت تجھے بھی ہے۔"

میں نے کہا "مرنے والوں کے لئے صبر کرنا گناہ نہیں خدا کی رضا کو قبول کرنا ہے۔ یہ ثواب کا درجہ رکھتا ہے مگر کسی کا دل توڑنا اور کسی کی محبت کو ٹھکرانا یقیناً گناہ کبیرہ ہے۔ دل بدست آور کہ حج اکبر است....."

غالب نے کہا "ذرا سلیس اردو میں سمجھا یئے اس اَن پڑھ کو۔"

"کسی کی دلداری ثواب میں حج اکبر سے کم نہیں۔ اب خیال ال کہ شاعرانہ ہو مگر انسانیت اسی کا نام ہے" میں نے کہا۔

صبح کا اجالا ہونے تک ہم باہر ٹہلتے رہے۔ رفتہ رفتہ ہم محسن کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ اب اسے ماضی کے اندھیرے سے مستقبل کی روشنی کی جانب سفر کرنا ہو گا اور اس کے لئے ایک شعوری جدوجہد کرنی ہو گی۔ مجھے متفق ہونے کا دعویٰ نہیں مگر میرے نزدیک شملا کی موت شہادت کا درجہ رکھتی تھی اور شہید بھی مرتے نہیں۔ وہ زندہ رہے گی مگر ہمارے دل میں' ہماری یادوں میں اور خیالوں میں۔

صبح کا سورج طلوع ہوا تو اس کی دھوپ قدرے میلی تھی۔ ماحول میں ایک نامعلوم اداسی کی نظر نہ آنے والی دھند محسوس ہوتی تھی۔ میں' غالب اور محسن اندر گئے تو خواتین بھی بیدار ہو چکی تھیں۔ شیدان میں سے کس کو آئی ہو گی مگر آنکھیں خمار آلود ایک پردہ سا تھا جس نے تھوڑی سی اجنبیت کی فضا پیدا کر دی یا یہ کہا جائے کہ انسانیت کے اعتماد کو مجروح کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ ہم نے ایک دوسرے سے اپنے خیالات اور دلی جذبات چھپائے ہوں۔ گل کو شک تھا کہ رابعہ اور نازو سب جانتی ہیں اور ان کا سوتے رہنا بھی تجاہل عارفانہ کا ایک انداز تھا لیکن وہ یقین کے ساتھ یہ بات ان کے منہ پر نہیں کہہ سکتی تھی۔

گل کا دل رکھنے کے لئے اور نارمل نظر آنے کے لئے نازو اور رابعہ ہنس بول رہی تھیں مگر وہ اپنی خوش دلی اور خوش مزاجی کا مصنوعی پن چھپانے میں پوری طرح کامیاب نہ تھیں۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ ہم سب کو گل اور محسن سے جدا ہونے کا ملال تھا۔ ایک طرف یہ خوشی تھی کہ وہ لوٹ کے اپنے وطن کی دلدار' دوست دار اور وضع دار دنیا میں جا رہے ہیں اور نئی زندگی کے سفر کا آغاز نیک امیدوں کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں ... دوسری طرف ایک خوف بھی تھا کہ نہ جانے ہم انہیں پھر کب دیکھیں گے۔ اگر جہاز پر جگہ مل گئی پھر تو چند دن' ہفتے دو ہفتے یا مہینے بھر کا انتظار بھی کیا جا سکتا ہے مگر اس وقفے میں سلامتی کی ضمانت بھی درکار ہو گی۔ اور اگر جہاز سے نہ جا سکے تو پھر سڑک کے راستے نیپال اور وہاں سے پاکستان پہنچنا ہجرت کا ایک اور صبر آزما مرحلہ ہو گا۔

گل کچھ خجل تھی اور ہم سے نظر چرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف ایک سوال بن کر اتر آیا تھا۔ سچ بتاؤ تم سب مجھ سے خفا نہیں ہو۔ کہ میں نے شملا کی جگہ لے لی اور اب محسن کے ساتھ رخصت ہو رہی ہوں۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ کچھ کہہ سکے ورنہ وہ اصرار کرتی کہ اس کی جگہ نازو یا رابعہ کو بھیج دیا جائے۔ وہ جانتی تھی کہ ہمارا جواب کیا ہو گا۔

ناشتے کے دوران غالب اور نازو کے درمیان ایک چشمک ہوئی مگر وہ بھی پھیکی رہی۔

پھر محسن نے کہا "یار! میرا دل نہیں مانتا۔"

میں نے کہا "تو دل کی مت مان۔ حساب برابر۔"

"کیوں نہ ہم ایک ساتھ چلیں یا تھوڑے دن انتظار کر لیں" محسن نے کہا۔

اب گل نے بھی لب کھولے "مجھے اچھا نہیں لگ رہا سب کو چھوڑ کے جانا۔ سوسوئے اٹھ رہے ہیں دل میں۔"

"تم دونوں کے دل کا ایک ہی معاملہ ہے" غالب نے نازو لہجے میں کہا "بکری کے دل ہیں۔ بزدل۔"

میں نے کہا "محسن کا دل تو بکرے کا ہو گا یار۔"

مزید باتوں کی نوبت ہی نہیں آئی۔ باہر بڑے طوفانی انداز میں ایک کار آکے رکی۔ اس کا انجن اور پھر دروازہ بند ہوا۔ ہم نے دروازے پر تم گئیں۔ پس منظر کی روشنی میں کاجل نمودار ہوئی مگر اس کا پیکر حسن ایک تصویر خرابی نظر آ رہا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور بال الجھے ہوئے۔ وہ آہوئے صیاد دیدہ سے زیادہ خوف زدہ تھی۔

میں نے کہا "کاجل! رک کیوں گئیں؟ اندر آؤ۔"

رابعہ نے کہا "یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا؟"

وہ اندر آئی اور بیڈ پر گر گئی "تو بچو… وقت کم ہے… بہ۔"

میں نے کہا "پہلے بتاؤ یہ معاملہ کیا ہے۔"

اس نے ایک لمبی سانس لے کر کہا "معاملات خراب ہو گئے ہیں۔ رات کسی نے مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی تھی۔"

"وہ فائرنگ تمہاری کار پر ہوئی تھی؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا "خدا نے بچا لیا۔ ان کا نشانہ اس لئے چوک گیا کہ میں کار بہت تیز چلاتی ہوں۔ اور نہ جانے کیوں' اس وقت پر مجھے لگا کہ کچھ گڑبڑ ہے اور میرا پاؤں ایکسیلریٹر پر جم گیا۔"

"تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں۔ گاڑی میں سوراخ ہو گئے' شیشے ٹوٹ گئے مگر میں نے مارنے والوں کو نہیں دیکھا لیکن مجھے معلوم ہے وہ کون تھے۔ ہیڈ ویو میں مجھے ان کے چہروں کی ایک جھلک نظر آ گئی تھی۔ وہ میاں وڈیرے کے اپنے تھے۔ بڑے آدمی تھے مگر میں نے شک نہیں کیا" وہ بولی۔

"کس نے بھیجا تھا انہیں؟" نازو نے کہا۔

"کون بھیج سکتا ہے انہیں' سوائے ان کے جو دشمن ہیں۔ ان کے سوا کیا نام دیا جا سکتا ہے انہیں۔ رات ہمارے گھر پر بھی گیا۔ کسی نے دستی بم پھینکا تھا مگر وہ باہری گر کے پھٹ گیا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ..... تمہارے بابا کے کردار کا دوسرا ناگی سامنے آ گیا ہے۔ ان کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔"

"ہاں۔ رات کو آدمی آئی تھی" وہ بولی "انہوں نے ہر طرف بے شمار رستے دیکھ۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ کیا وہ گھر میں چھپ کر بیٹھے رہیں؟ باہر تو جانا ہی پڑے گا نہیں' پبلک کے سامنے۔ اس خطرے کا کیا کریں گی؟ انہوں نے رات کو مجھے بہت برا بھلا کہا کہ سب میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ انہوں نے مجھے کمرے میں بند کر دیا۔ میں دوسری منزل پر سوتی ہوں۔ وہ خود رات بھر جاگے دیکھنے کے لئے کہ میں موجود ہوں یا نہیں۔ مجھے صبح موقع ایک نوکر نے مدد کی۔"

"نوکر نے؟" میں اور محسن ایک ساتھ بولے۔

"ہاں۔ میں نے اسے اشارے سے قریب بلایا اور وہ اندر آ گیا۔"

"مگر کیسے بچ نکلیں؟"

"کسی نہ کسی طرح بچ نکلی تھی۔ ممی کے کمرے میں تھی" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ "وہ بھاری سوٹ جو ہماری حفاظت کے لئے آئے تھے۔ جب وہ گیا تو..... سب کچھ لے گیا..... میرا زیور بھی..... اور اس کے بدلے..... مجھے اس نے اجازت دی کہ میں نکل جاؤں۔"

میں' غالب اور محسن اس کے بکھرے بالوں' پھٹے کپڑوں اور چہرے کی خراشوں سے نظر نہیں ملا سکتے تھے۔ گل' رابعہ اور نازو کے چہرے آتش غضب سے دہک رہے تھے۔ یہ ایک مظلوم لڑکی پر ایک فاتح مرد کی عنایت کا شاخسانہ تھا۔ وہ کہانی تھی جو ہر جگہ ایسے ہی دہرائی جا رہی تھی۔ مختلف نام ہونے سے آغاز یا انجام پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب انسان کے اندر کا درندہ بے لگام ہو جاتا ہے تو پھر وہ ماں کو دیکھتا ہے اور نہ بہن کو اور نہ بیٹی کو.....

کاجل نے آنسو صاف کئے اور بولی "چلو' جلدی کرو۔ ابھی کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔"

"کیا معلوم نہیں؟"

"تمہارے اور میرے پروگرام کے بارے میں۔ تم ذرا ٹیلی فون کر سکتے ہو؟" وہ بولی "کون جا رہا ہے؟"

"محسن اور گل" میں نے کہا "محسن کو ذرا دیر لگ رہی ہے۔"

"تم گاڑی لے جاؤ۔ ایئرپورٹ چلے جاؤ۔"

"تم ساتھ نہیں جاؤ گی؟" محسن نے کہا۔

"نہیں۔ جاؤ خطرے کی کوئی بات نہیں" اس نے تلخ تھا

خواب سب دیکھتے ہیں۔

لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں؟ بچے خواب کیا ہوتے ہیں؟ خوابوں کی اقسام کیسے کی جا سکتی ہیں؟ ان کی تعبیر کیا کیا ہیں؟ خواب آدمی کی زندگی میں کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ ان کی ابتدائی سے مستقبل کی تعبیریں کیا بدلی جا سکتی ہے؟ کیا وہ ہماری نفسیات کے عکاس ہوتے ہیں؟ یا وہ ہماری الجھنوں کا حل بھی پیش کرتے ہیں؟ خوابوں کے بارے میں ماہرین کیا کہتے ہیں؟ خوابوں کے بارے میں مذاہب عالم کیا کہتے ہیں؟ یا ایسے لاتعداد سوالوں کے مکمل جواب کے لئے ——— پڑھئے:

خوابوں کے اسرار

قیمت ۲۵ روپے

ڈاک خرچ ۱۲ روپے

اے ایس صدیقی کے قلم سے

اردو میں اپنی نوعیت کی ——— ایک منفرد کتاب

مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس ۹۲۳ کراچی

www.paksociety.com

کے کہا "یہ لو۔ یہ میرا رومال ساتھ لے جاؤ۔ اسے ہاتھ میں رکھنا۔ یہ زرد رومال تمہاری پہچان ہوگا۔ ایک تمری تمہیں جہاز پر سوار کرا دے گا۔ کسی قسم کی روک ٹوک کے بغیر۔ ازابیلا کی ضمانت ہے۔"

"مگر تم خود۔۔۔"

"میں ان لوگوں کو یہاں سے کہیں اور لے جا رہی ہوں۔ یہ جگہ اب محفوظ نہیں رہی" کاجل نے کہا۔

"تو تم ایسا کرو، انہیں بھی ساتھ سنبھالو۔ جہاں ان کو چھوڑنا ہے پہلے وہاں چلتے ہیں" محسن نے کہا "پھر ائرپورٹ چلے جائیں گے۔"

تھوڑی سی بحث کے بعد کاجل مان گئی۔ ایک بار پھر ہم اس دارالامان سے فرار ہوئے۔ کاجل بار بار گھڑی دیکھتی رہی۔

"آج کل سیکیورٹی بہت سخت ہے۔ وقت پر پہنچنا پڑتا ہے" اس نے کہا "کم سے کم ایک گھنٹا پہلے۔"

"تم اپنی نظر سڑک پر رکھو" میں نے کہا "ورنہ ہم وقت سے پہلے عدم آباد پہنچ جائیں گے۔"

یہ مذاق بے محل تھا مگر اس کا مقصد اسے تھوڑا سا سکون پہنچانا تھا تاکہ وہ کچھ ابزی ہو جائے۔

وہ مسکرائی "فکر مت کرو۔ ہوں گے تو ساتھ ہی نا۔"

بیس منٹ بعد اس نے ایک گھر کے دروازے کے سامنے گاڑی روک کے گھنٹی بجائی۔ ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔

"تارا بائی! یہ میرے مہمان ہیں۔ دوست ہیں۔ ان کو اندر لے جاؤ" اس نے کہا "میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔"

میں نے کہا "رابعہ! تم اور نازو جاؤ۔ میں اور غالب انہیں ائرپورٹ پہنچا کے آتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "ہم نہیں ہی آف کرنے ہم کیوں نہیں جا سکتے؟"

"ہاں۔ کاجل بھی تو واپس آئے گی۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا "جاؤ، بحث مت کرو۔ ہم ائرپورٹ کے اندر تک نہیں جائیں گے۔"

کاجل نے بھی کہا "ہاں۔ باہر ہی سے رخصت کر دیں گے۔"

محسن نے ان کا سامان جو ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا اتار کے اندر رکھا اور انہیں خدا حافظ کہہ کے لوٹ آیا۔ عقب ارجو کسی نے روتی شکل دکھائی مجھے "اندر بیٹھو جا کے۔" اس نے پھر کار میں بیٹھ کر کہا۔

کار پھر ڈھاکا کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ بظاہر سب ٹھیک تھا مگر خطرے کا احساس ہمارے اندر بیٹھا جیتا تھا۔ سڑکوں پر سے جب پولیس یا ملٹری کی گاڑی گزرتی تھی، میرے اعصاب خود بخود کھنچ جاتے تھے۔

گاڑی کو میں نے پارکنگ ایریا سے گزار کے روکا۔ یہ بات والی گاڑی نہیں تھی۔ وہ تباہ شدہ گاڑی تو فوراً سب کی نظروں میں آ جاتی۔ کاجل اپنے باپ کی دوسری گاڑی لائی تھی جس پر بنگلہ دیش کا نیا پرچم لہرا رہا تھا۔ ابھی لوگ بنگلہ دیش کی حکومت کے اعلیٰ حکام کو پہچانتے نہیں تھے۔ چنانچہ ہم ہر جگہ سے سیلیوٹ وصول کرتے گزر گئے تھے۔

محسن اور گل کو ہم نے گلے مل کے الوداع کہا۔

"میں فون کروں گا منظر کو" میں نے کہا "آج رات نو بجے ہم وہیں ہوں گے۔ اگر کراچی سے لاہور کی فلائٹ مل گئی ورنہ منظر کو فون پر خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دے دیں گے۔"

"پیسے ہیں تمہارے پاس؟ گل۔۔۔"

محسن بولا "ہیں۔ اب تم جاؤ۔ یہ الوداعی تقریبات کا وقت نہیں ہے۔"

کاجل نے کہا "ہاں۔ تم بھی جاؤ۔ خدا حافظ۔"

اسی وقت ایک شخص نے قریب آ کے کاجل کو سلام کیا "کیا یہ آپ کے دوست۔ آپ میرے ساتھ۔ بہت لیٹ ہو گئے ہیں آپ لوگ۔ میں نکال دوں گا۔"

میں اور غالب انہیں تو بیاریج لاؤنج سے گزرتا دیکھنا چاہتے تھے مگر کاجل نے کہا "چلو۔ کہیں کوئی مجھے پہچان نہ لے۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پرچم لہراتی گاڑی پھر انہی سڑکوں پر روانہ ہو گئی جن سے چند منٹ پہلے گزری تھی۔ سڑکوں پر ہر جگہ بنگلہ دیش کے پرچم کو سیلیوٹ ملا تو مجھے دکھ اور شرمندگی کے احساس نے گھیر لیا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور حالات کی مجبوری کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کر لیا۔ ہم سب کچھ سمجھ سکتے تو کیا کر سکتے ہیں۔

آدھے گھنٹے بعد ہم پھر تارا بائی کے دروازے پر تھے۔ غالب نے گھنٹی بجائی اور کچھ دیر انتظار کیا۔ دوسری بار گھنٹی بجانے کے بعد کاجل نے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"تارا بائی!" کاجل نے چلا کے کہا مگر اندر سے جواب ایک خوف زدہ کرنے والی موت کے سناٹے جیسی خاموشی نے دیا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ہم دیوانہ وار ایک سے دوسرے کمرے میں، غسل خانے اور کچن میں گئے مگر وہاں نہ تارا بائی تھی نہ رابعہ اور نازو۔ گھر کا سب سامان تتر بتر پڑا تھا اور جگہ جگہ فرش اور دیوار پر تازہ خون کے چھینٹے بھی نظر آئے۔

نتیجے کی غلطی کی گنجائش نہ تھی۔ دشمن اتنے بے خبر نہیں تھے کہ ہمیں نکل جانے دیتے۔ انہوں نے ہمارا تعاقب کیا تھا شاید ائرپورٹ تک۔

گل اور نازو کے اغوا ہو جانے کا خیال ہی اتنا روح فرسا تھا کہ مشکلات و مصائب کا دور ختم ہونے اور حصولِ مقصد میں کامیابی کے بعد ایک پُرمسرت، پُرامید اور پُرعزم خوابوں کی جنت سے عبارت اور خواہشات کی تکمیل کی نعمت سے معمور زندگی بے خیالی محسوس ہونے لگی۔ یہ تقدیر کا ایک بے رحم مذاق تھا جس نے ہمیں منزل کے سراب میں سرگرداں رکھا۔ ہر بار ہم خود ہی فریبِ نظر کا شکار ہوتے رہے مگر شوقِ سفر سے دست بردار ہونا بھی اپنی عالی ہمتی اور شوقِ طالع آزمائی نے قبول نہ کیا۔

غالب پر صدمے، اشتعال، بے بسی اور جھنجلاہٹ کے ہذیان طاری تھے "سمجھ رہا تھا انہیں زبردستی اغوا کیا گیا ہے؟"

میں نے آہستہ سے سر ہلایا "ہاں۔ یہ خون مزاحمت کے آثار ہیں۔ بے رحمی سے زخمی۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔"

غالب نے جھک کر خون کے چھینٹوں کو دیکھا "یہ خون کس کا ہے؟"

میں نے اسے افسوس سے دیکھا "خون سے صرف یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کا گروپ کیا ہے۔ خون کسی کا نام نہیں بتاتا۔"

"کتنا اچھا ہوتا اگر ہم ان کی بات مان لیتے۔ انہیں بھی اندر لے جاتے" غالب نے بے بسی سے کہا۔

کاجل نے کہا "مجھے معلوم ہے یہ کس کی حرکت ہے۔"

غالب نے ایک دم اسے پکڑ لیا "پھر خاموش کیوں ہو؟ اتنی دیر سے بتا کیوں نہیں رہیں؟ نام بتاؤ ان کا۔۔۔"

"غالب! چھوڑو مجھے" کاجل چلائی "میں ان کے نام جانتی تو اب تک تمہیں نہ بتا دیتی۔ انہوں نے صرف مجھ پر فائرنگ کی تھی۔ میرے گھر کو بھی دستی بم سے تباہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ میرا باپ کر سکتا تھا۔۔۔"

"تمہارے باپ کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا" غالب نے اس کے شانوں پر سے ہاتھ اٹھائے "جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کے بہت سے دشمن بھی اس سے واقف ہیں۔ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ بھی ناممکن نہیں۔ خنجر چھپا کر وفاداری کا دم بھرنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ یہ اس کی طاقت کا غرور اور اختیارات کا زعم ہے جس نے بچھا رکھا ہے۔"

کاجل نے کہا "غلط خیال ہے تمہارا۔ وہ براہ راست شیخ مجیب سے بات کر سکتا ہے۔"

"بڑی خوش فہمی ہے تمہاری کاجل۔ جو وقت آنے پر خود دھوکا کھائے گا" غالب نے کہا "شیخ مجیب کے حواری بہت پہلے طے کر چکے ہوں گے کہ اس نے تمہیں کیوں روانہ مشہور کر رکھا ہے۔ صرف تمہاری جان بچانے کے لئے۔ اس لئے کہ تم بنگلہ دیش کی مخالفت، پاکستان کی اور دو قومی نظریے کی تبلیغ کرتی رہی ہو۔ انہیں اب تک رپورٹ مل چکی ہوگی کہ در پردہ خود عبدالستار چودھری پاکستان کے حامی عناصر کا مددگار ہے۔ یہ اسی کی سزا ہے۔ شاید وہ تصدیق کر رہے تھے، مسلسل دیکھ رہے تھے کہ عبدالستار چودھری راہِ راست پر آ جائے۔ یا ابھی ان کو تمہارے باپ کی حمایت کی ضرورت تھی۔ جواب نہیں ملا۔"

"کیا پتا؟" کاجل کا چہرہ تاریک ہو گیا "شاید۔۔۔ تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔"

میں نے کہا "غالب! یہ ٹھیک ہے کہ ہم عبدالستار چودھری کی خیر سگالی پر انحصار نہیں کر سکتے مگر ہم خود تو کچھ کر سکتے ہیں۔"

غالب نے تلخی سے کہا "کیا کر سکتے ہیں ہم؟ کون بتائے گا ہمیں کہ نازو اور رابعہ کہاں ہیں؟ ان کو یہاں سے کون لے گیا ہے؟ وہ زندہ ہیں یا۔۔۔"

میں نے مایوسی سے کہا "ہمت رکھو۔ کیا ہوا ہمارے ساتھ۔ ہم خود اپنی حفاظت کے خیال سے غافل ہو گئے تھے۔"

"اس عورت کی وجہ سے" غالب نے انگلی اٹھا کے کاجل کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔۔۔ میرا کوئی قصور نہیں اس میں" وہ چلائی۔

"تو کوئی تھی ہمیں یہاں۔ تجھ پر بھروسہ کیا تھا ہم نے۔ لیکن تو نے دھوکا دیا ہمیں۔ دغا باز شکاری ہے تو" غالب پر جنون سوار ہونے لگا تھا "میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔ تو نے گل اور محسن کو کہاں بھیجا ہے؟ بول! کن قصائیوں کے حوالے کیا ہے؟ اور۔۔۔" وہ آگے بڑھتا گیا۔

کاجل نے ایک چیخ ماری کیوں کہ غالب کے ہاتھ اب اس کی گردن کی طرف بڑھ رہے تھے اور کاجل کا راستہ پیچھے ایک دیوار نے روک لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اشتعال کے اس دورے میں وہ کاجل کو سچ مچ مار ڈالے گا، خواہ بعد میں یہ قتل اس کی غلط فہمی کا نتیجہ ثابت ہو۔

میں نے غالب کو پیچھے کھینچ لیا "پاگل ہو گیا ہے تو؟"

"ہاں میں پاگل ہو گیا ہوں۔ پوچھو اس دوغلی ناگن سے کہ نازو اور رابعہ کو کس نے اغوا کیا ہے؟"

"مجھے۔۔۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔ خدا کی قسم" کاجل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"وہ سب جھوٹ تھا، فریب تھا" غالب کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا "نہ کسی نے فائرنگ کی تھی تجھ پر، نہ تیرے گھر پر دستی بم پھینکا تھا کسی نے۔ تیرے باپ نے تجھے ہمارے پیچھے لگایا تھا۔ وہ غدار ہمارا دشمن ہے۔"

کاجل نے روتے روتے کہا "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کبھی تم کچھ کہتے ہو، کبھی کچھ۔ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ اس نے مکتی باہنی والوں کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ اب اسے اپنا دشمن قرار دے رہے ہو۔"

میں نے کہا "چھوڑو یہ بحث۔ سوال یہ ہے کہ اب کیا کرنا چاہئے ہمیں؟ مجھے بھی شک ہے کہ گل اور محسن غلط ہاتھوں میں پڑ گئے ہوں گے۔ انہیں نیپال جانے والے جہاز پر سوار کرانے

www.paksociety.com

والے کہیں اور لے گئے ہوں گے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم بھی پکڑے جائیں۔ پہلے تو یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

"ہاں۔ مگر اس عورت کے ساتھ سے اس وقت تک ہمارے قبضے میں رہے گی جب تک رابعہ اور نازو کا پتا نہیں چل جاتا۔ یہ معلوم نہیں ہو جاتا کہ گل اور محسن کہاں ہیں۔ ہم اسے یرغمال رکھیں گے" غالب نے کہا "اور اگر ان میں سے کسی کو کچھ ہوا تو خدا کی قسم......"

باہر سے کسی نے سہمے ہوئے لہجے میں پکارا "کاجل' او کاجل!"

کاجل چلائی "تارا بائی!"

دوسرے لمحے تارا بائی کا لاش جیسا سفید' دہشت زدہ چہرہ نمودار ہوا "تم آ گئی ہو۔ خدا کا شکر ہے۔"

کاجل اس کی طرف لپکی "تارا بائی! وہ...... وہ دونوں کہاں ہیں؟"

تارا بائی نے ساری کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا "وہ ٹھیک ہیں' بالکل ٹھیک ہیں۔ بس خدا نے میری عزت رکھ لی۔ میں انہیں بچا کے لے گئی ورنہ وہ ظالم......"

میں نے تارا بائی کو ایک کرسی سیدھی کرکے بٹھا دیا "یہاں بیٹھ کے بتاؤ۔ آرام سے اور سکون سے بات کرو۔"

غالب نے کہا "کاجل! تارا بائی کو پانی پلاؤ۔"

کاجل نے کہا "ابھی لائی۔"

مگر تارا بائی نے کہا "میں ٹھیک ہوں...... بس تم چلو میرے ساتھ۔ کہیں وہ پھر نہ آ جائیں۔ خونی الٹیرے......" وہ سسکی لے کر پھر آنسو صاف کرنے لگی "تو وہ بس...... عین وقت پر مجھے اندازہ ہو گیا اور میں نے ایک دم دروازہ بند کرکے لڑکیوں سے کہا کہ نکل جاؤ پیچھے سے......"

میں نے کہا "یہ سب بعد میں بتانا۔ پہلے ہمیں بتاؤ کہ وہ اس وقت کہاں ہیں؟"

"مولوی شمس الحق کے حجرے میں" وہ بولی "تو چلیں......"

میں نے غالب سے کہا "پہلے کیوں نہ ایک نظر باہر دیکھ لیں۔"

غالب نے سر ہلایا "ہاں۔ دشمن گھات میں نہ ہوں۔"

کاجل کی گاڑی باہر موجود تھی۔ اس کے اور ہمارے دشمن یقیناً عبدالستار چوہدری کی دوسری گاڑی کو پہچانتے ہوں گے۔ باہر کھڑی ہوئی یہ گاڑی کسی گھر کی چھت پر لہرانے والے پاکستانی پرچم سے کم خطرناک نہ تھی جو دشمن کے دل میں انتقامی جذبات کو ہوا دے۔

میں نے احتیاط کے ساتھ کھڑکی کھولی اور باہر جھانک کر دیکھا۔ بظاہر سب ٹھیک تھا۔ آتے جاتے لوگوں کے چہروں سے دوست اور دشمن کی تمیز کرنا محال ہی نہیں' ناممکن تھا۔ غالب نے دوسری کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے کسی شکاری کو تاڑنے کی کوشش کی مگر باہر سب عام لوگ تھے جن کے چہرے سپاٹ اور بے تاثر تھے۔ ان سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس کے دوست اور کس کے دشمن ہیں' اپنے دل میں کتنا بغض و عناد رکھتے ہیں اور سیاست کے موجودہ' منافرت اور تعصب پر مبنی نظریات سے کس حد تک اختلاف یا اتفاق کرتے ہیں۔ راہ چلتے آدمی کا چہرہ کچھ نہیں بتاتا کہ اگلے لمحے وہ کیا کرے گا۔ جھڑا کرنے والوں میں شامل ہو جائے گا' جذبات سے مغلوب ہو کے کسی بھی اجنبی کو دشمن فرض کرتے ہوئے خنجر گھونپ دے گا یا جان بچا کے بھاگ کھڑا ہو گا۔

میں نے کہا "چلو تارا بائی! راستہ صاف ہے۔"

غالب نے میری تائید کی "خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

تارا بائی کھڑی ہو گئی "کیا تمہاری آنکھیں خطرہ دیکھ سکتی ہیں؟"

میں نے غالب کی طرف دیکھ کے خفت سے کہا "نہیں......"

تارا بائی مسکرائی "پیچھے سے چلو' ادھر کوئی نہیں ہو گا۔"

اب میں نے کہا "تارا بائی! کیا تمہاری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں کہ پچھلی طرف خطرہ نہیں ہے؟ کیا پتا وہ اب پیچھے کھڑے ملیں جو کہ سامنے سے آ کے کچھ نہیں ملا تھا۔"

تارا بائی نے سوچ کے کہا "کہتے تم ٹھیک ہو لڑکے ہونے کو! بات تو ہو کے رہتی ہے۔ پھر عقل کے حساب پر بھروسا کرنے سے کیا فائدہ۔ چلو خدا پر بھروسا کرو۔"

ہم سامنے سے نکلے۔ میں نے اور غالب نے ایک ہاتھ جیب میں ڈال لیا اور ریوالور کو اپنی گرفت میں بالکل تیار رکھا۔ اس سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا اور خدانخواستہ کوئی اچانک حملہ کرتا تو ہم جوابی کارروائی میں ایک لمحے کی تاخیر نہ ہوتی۔

تارا بائی کے پیچھے چلتے ہوئے ہم ایک گلی میں داخل ہوئے پھر مختلف گلیوں کے موڑ کاٹتے ہوئے ایک مسجد کے عقب میں نکلے۔ وہاں ایک چھوٹے سے کوارٹر کا دروازہ تھا مگر اس پر زنجیر کنڈی لگی ہوئی تھی اور کنڈی پر بڑا تالا نظر آ رہا تھا۔ غالباً کوارٹر کا دوسرا دروازہ مسجد کے صحن کی جانب کھلتا ہو گا۔ میں نے سوچا۔ تارا بائی نے پریشانی سے تالے کو دیکھا "یہ مولوی صاحب کہاں چلے گئے؟"

میں نے کہا "میں مسجد کی طرف سے جا کے دیکھتا ہوں۔"

تارا بائی نے نفی میں سر ہلایا "ادھر سے کوئی راستہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "پھر وہ مسجد میں کیسے جاتے ہیں؟"

"گھوم کے صدر دروازے کی طرف سے' جہاں سے اندر جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "پانچوں وقت؟"

تارا بائی نے بے خیالی میں سر ہلایا "ہاں۔ اس کے علاوہ بچوں کو پڑھانے۔"

"پھر اب وہ کہاں ہو سکتے ہیں؟" غالب نے جھنجلا کر کہا۔

تارا بائی کی نظریں ہر سمت میں نادیدہ دشمنوں کے اور بے وجود خطرات کے سائے منڈلاتے دیکھ کر دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ "مجھے...... کیا معلوم۔"

"سوچو' ان کا یہاں کون تھا۔ کوئی عزیز' بھائی' بہن' بیٹا یا بیٹی جس کے گھر کو وہ اپنے حجرے سے زیادہ محفوظ سمجھتے ہوں۔"

تارا بائی نے نفی میں گردن ہلائی "وہ تو بالکل اکیلے تھے...... بچے سب مر گئے تھے۔ ایک ہی بیوی تھی اور وہ......"

غالب پھر گرم ہونے لگا "پھر تم نے کوئی عقل مندی نہیں کی تھی تارا بائی کہ انہیں یہاں لے آئی تھیں۔"

"اور کیا کرتی میں؟" وہ رقت آمیز لہجے میں بولی "کہاں لے جاتی ان کو؟ اور کسی پر میں بھروسا نہیں کر سکتی تھی۔"

"اچھا بھروسا کیا تم نے......"

تارا بائی کا دکھ دگنا تھا۔ رابعہ اور نازو کے غائب ہو جانے کی پریشانی الگ تھی' امانت کی حفاظت میں کوتاہی اور غفلت کے جرم کا احساس الگ تھا اور وہ بوڑھی عورت غالب کے تند و تلخ لہجے کی ذلت برداشت کرنے پر مجبور تھی۔

ہم بلاوجہ گلی میں کھڑے تھے اور آتے جاتے لوگوں کی شک بھری نظروں کا نشانہ بن رہے تھے۔ تارا بائی نے پڑوس کے گھروں سے معلوم کیا لیکن مولوی صاحب کسی کو کچھ بتا کے نہیں گئے تھے۔ پریشانی مجھے بھی لاحق ہو رہی تھی۔

غصے میں غالب نے ایک غلط بات کی "چھوڑو تارا بائی! وہ مولوی بھی جان بچا کے بھاگ گیا۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا" تارا بائی نے دکھی لہجے میں کہا۔

"ایسا ہو چکا ہے۔"

"مولانا صاحب بھاگنے والوں میں سے نہیں تھے۔ وہ تو کہتے تھے کہ موت جہاں لکھی گئی وہیں آئے گی۔ پھر میں خدا کے گھر کی دیوار کے سائے میں ہوں۔ اس سے زیادہ محفوظ جگہ کون سی ہو گی......"

ایک آٹھ نو سال کے بچے نے گزرتے گزرتے تارا بائی کی ساری کا پلو کھینچا اور بنگالی میں آہستہ سے کچھ کہا۔ تارا بائی کا غم زدہ چہرہ یکلخت خوشی کی مسکراہٹ سے روشن ہو گیا۔ اس نے آنکھوں سے نکل آنے والے آخری آنسو کو انگلی سے صاف کرکے جھٹک دیا اور ہمیں اشارہ کرکے اس بچے کے ساتھ چل پڑی۔

میں اور غالب اس سے کچھ فاصلے پر چلنے لگے۔

"کوئی پیغام دیا تھا اس لڑکے نے" میں نے کہا "تو کہیں سے دیکھ رہا ہو گا۔"

"لڑکا بھلا اتنی دیر تک کیا دیکھتا رہا؟"

میں نے کہا "بچہ ہے۔ یقین کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہو گا کہ ہم وہی لوگ ہیں جن کے لئے پیغام تھا۔"

"کہیں یہ مروانہ دے۔ دشمنوں کا آلۂ کار نہ ہو۔"

میں نے کہا "دماغ چل گیا ہے آپ کا۔ معصوم بچے کا بھی اعتبار نہیں۔"

غالب نے کہا "معصوم بچے سے ہر کام لیا جا سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دے کر ٹریگر دبانے کو بھی کہا جا سکتا ہے اور اس کی معصومیت پر کوئی حرف بھی نہیں آتا۔ آخر کہاں لے جا رہا ہے یہ ہم سب کو؟"

تارا بائی نے پلٹ کر کہا "اپنے گھر۔ اس کی ماں نے بھیجا تھا۔"

"مولوی صاحب کیا اسی کے گھر میں ہیں؟"

"رابعہ اور نازو اسی کے گھر میں ہیں" تارا بائی نے کہا۔

"اور مولوی صاحب؟" میں نے کہا۔

"ان کے بارے میں بچے کو معلوم نہیں۔"

میں نے کہا "تم جانتی ہو نا اس بچے کو......"

"خدا پر بھروسا رکھو۔ نیت کا حال وہی جانتا ہے۔ ویسے اس کا باپ سرحد کا پٹھان ہے' جو قول پر جان دیتا اور مہمان کی حفاظت کے لئے اپنی زندگی کو قربان کرنا جانتے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہو گا؟"

"یہ سب پرانی باتیں ہیں" غالب سخت قنوطی ہو رہا تھا۔

میں نے کہا "یہ بچہ پٹھان نہیں لگتا۔"

"اس کی ماں بنگالن ہے" تارا بائی نے کہا۔

"یہ بنگالی کیسے بولتا ہے؟"

"جیسے دوسرے بچے بولتے ہیں۔ مادری زبان تو کہنے کی بات ہے۔ بچہ جو زبان سنتا ہے وہی سیکھتا ہے۔ بچوں میں رہتا ہے تو انہی کی زبان بولتا ہے۔"

بچہ ایک دروازے پر رک گیا۔ اس نے کنڈی بجائی تو اندر سے کسی عورت نے کہا "سوک دے؟" (کون ہے؟)

بچے نے ہنس کے کہا "استامزمان راغلے دے" (تمہارے مہمان آئے ہیں۔)

عورت نے دروازہ کھول دیا اور فوراً ایک پردے کے پیچھے غائب ہو گئی جو دروازے پر اندر کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ وہ سخت پردہ دار قسم کا مسلمان گھرانا تھا جس کی تہذیبی روایات نے مشرقی پاکستان کے معاشرتی ماحول کا کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا۔ تارا بائی پردہ ہٹا کر اندر چلی گئی۔ میں اور غالب گلی میں کھڑے رہ گئے۔ اندر سے رابعہ اور نازو کی آواز آئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"چلئے' آگے قدم بڑھائیے" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "پہلے آپ۔"

میں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے قبل کہ اس غیرت مند پٹھان کی گولی کا نشانہ پہلے میں بن جاؤں۔"

غالب بولا "دیکھئے آپ لیڈر ہیں۔ پہلے شہید ہونے کا اعزاز آپ کے لئے ہے۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "یار! ایسے بلا اجازت کیسے موت کے منہ میں چلا جاؤں۔ اندر وہ بیٹھا ہوگا' بندوق دیوار پر ٹنگی ہوگی۔ نامحرموں کو اپنے منہ اٹھا کے اندر آتا دیکھے گا تو سوال بعد میں کرے گا۔"

"ہاں۔ قاعدہ تو یہی ہے ان کا۔۔۔ خیر۔ آپ کو گولی مارنے کے بعد وہ سوال کرے گا تو جواب میں دوں گا۔"

نارا بائی نے پردہ ہٹا کے جھانکا "ارے تم یہاں کھڑے ہو ابھی تک؟ اندر کیوں نہیں آتے؟"

میں نے سر کھجا کے کہا "میں نے تو کہا تھا اس سے۔۔۔"

غالب بولا "مجھے اندر کا راستہ معلوم نہیں تھا کہ دائیں طرف جاتا ہے یا بائیں طرف۔ غلط سمت میں مڑ جاتے تو مارے جاتے۔"

میں نے کہا "گھس جاتے باورچی خانے یا زنان خانے میں تو۔۔۔"

"اچھا اب اندر آجاؤ۔ کوئی مشکل راستہ نہیں ہے" نارا بائی نے زیر لبی مسکرا کے کہا۔

پردہ ہٹاتے ہی پورے گھر کا نقشہ اس کے مکینوں کی زندگی کی تصویر ماضی و حال کے ساتھ سامنے آگیا۔ وہ مختصر زیریں صحن تھا جس میں ہمارے سامنے چارپائی پر ایک شخص نیم دراز تھا۔ اس کے پیروں پر کمبل تھا اور وہ چہرے سے بھی بیمار لگتا تھا مگر جسمانی ساخت کے اعتبار سے اس کا جسم سخت اور توانائی کا مظہر تھا۔ اس کی گھنی سیاہ داڑھی جو پہلے نفاست سے تراشی جاتی ہوگی اب قدرے بے ترتیب تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا تو اس کے مضبوط سفید دانت نظر آئے۔

"آؤ آؤ۔ برادر" اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے آگے بڑھاتے ہوئے کہا "خو باہر کیوں رک گیا تھا؟"

میں نے ہاتھ ملا کے کہا "ذرا پردے کا خیال تھا۔"

وہ ہنسا "ہمارا! اخر اپنا مسلمان بھائی' اپنا پاکستانی برادر اور مجاہد لوگ ہے۔ اپنا بابا خوا کل کا بچہ "ار مرحبا! در خوار اشئے۔"

میں اور محسن اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گئے۔ عملاً ہم نے اس واحد کمرے کی طرف دیکھنے سے گریز کیا جس کے دروازے پر ریشمی چادر پڑی ہوئی تھی۔ رابعہ اور نازو اسی کے پیچھے کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔ صحن کے ایک کونے کو کھانے اور دوسرے کو حوائج ضروریہ سے فراغت کے لئے وقف کر دیا گیا تھا۔ تین فٹ چار فٹ کے ان کونوں کو کپڑے پر کپڑا بچھا کے بہت سوم کیسا ٹکڑا ہوگا۔ وہ پورا گھر مشکل سے ڈیڑھ سو مربع فٹ جگہ تھی۔ سولہ سترہ مربع گز۔ اور اس میں ایک پورا خاندان آباد تھا۔

نازو کے پیچھے رابعہ اور پھر مرجان برآمد ہوئی۔ وہ صحت مند اور گوری چٹی پٹھان عورت کبھی یقیناً بہت خوب صورت رہی ہوگی۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن مفلسی کا گھن لگ جائے تو شباب کی رعنائی کا دور مختصر ہو جاتا ہے۔ آرائش و زیبائش کی

حیثیت تو ثانوی ہے کھانے کو بھی مشکل سے ملے گی سوکھی روٹی۔ تو جسم کیسے تروتازہ رہ سکتا ہے۔ پچیس تیس سال کی مرجان چالیس پینتالیس سال کی لگتی تھی۔ اس نے دوپٹے کو چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ قریب آکے اس نے ہمیں سلام کیا اور پھر سیدھی گزر کے چولہے کے پاس جا بیٹھی۔

پٹھان نے کہا "خوبارا! تم میں کون سکندر ہے؟"

میں نے کہا "میں سکندر ہوں۔ تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"تمہارا بی بی لوگ بولا" اس نے کہا اور غالب کی طرف متوجہ ہو گیا "ابھی ہم سمجھ گیا' تم غالب ہے۔"

غالب نے کہا "بالکل ٹھیک لیکن تمہارا نام تو بی بی لوگ بولا نہ تم۔"

وہ مسکرانے لگا "اپنا تو مقدر میں رکھ ہے" اس نے سر پر ہاتھ مارا "ہمارا نام ہے سیف اللہ۔ اللہ کا تلوار۔ ابھی یہ تلوار تمہیں بے کار رکھتے ہے۔"

میں نے کہا "کیوں کیا ہوا ہے تمہیں؟"

اس نے ایک دم کمبل ہٹا دیا۔ کمبل کے نیچے اس کے دونوں پاؤں گھٹنے تک سفید پلاسٹر آف پیرس میں چھپے ہوئے تھے "یہ دیکھو' ابھی اس کو کیا بولے گا؟ لکڑی کا ٹانگ بھی کام آتا ہے' یہ تو چور ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہم کسی کافر کا سر بھی نہیں توڑ سکتا اس سے۔"

غالب نے کہا "یہ فریکچر کیسے ہوا؟"

"ایک گولی ادھر' ایک اُدھر" اس نے دائیں ٹانگ پر انگلی رکھ کے نشاندہی کی' پھر بائیں ٹانگ پر "ایک ادھر' دوسرا اُدھر۔ ہڈی کا قیمہ ٹکڑا ہو گیا۔ ابھی چھ مہینہ ہم ترحا فری ہے' ترحا پھر اس کا بعد خدا خیر ہم کیسا چلے گا؟ انسان کی طرح کہ بندر کی طرح۔"

رابعہ اور نازو چپ کھڑی تھیں۔ میں اور غالب اپنا غم و غصہ' خوف اور اندیشے سب بھول گئے تھے۔ یہ بھی بھول گئے تھے کہ ان سے اس گھر میں پناہ لینے سے پہلے پیش آنے والے واقعات کے بارے میں ہی کچھ پوچھ لیں۔

میں نے کہا "تم ٹھیک ہو جاؤ گے سیف اللہ۔"

اس نے کہا "انشاء اللہ بولو۔ ایک اللہ کا بندہ ہم کو ڈاکٹر جوشی کا اسپتال لے گیا۔ جو بہت بڑا ہڈی کا ڈاکٹر ہے۔ وہ بھی بولا کہ تم پٹھان ہے' مسلمان ہے۔ انشاء اللہ بولو۔ ڈاکٹر جوشی کا بڑا نام ہے لیکن سب سے بڑا نام کس کا ہے؟ تم اللہ بولو' ہم اسٹور۔"

میں نے متاثر ہو کے کہا "اللہ بھی شفا انہی کے ہاتھ میں دیتا ہے جو اس پر بھروسہ کرتے ہیں' اپنے علم اور اپنی مہارت پر نہیں۔"

غالب نے کہا "مگر یہ ہوا کیسے؟ گولی کس نے ماری تھی؟"

وہ ہنسنے لگا "خوبارا' خدا خیر ہم کو مانو ہو' تاتو ہم اس کا نس کو

چھوڑتا۔"

میں نے کہا "کوئی دشمن تھا تمہارا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "سیف اللہ کا دشمن ادھر اپنا ملک میں بھی نہیں ہے' جو ہم سے بدلہ لے۔ ہم کو لوگ بدنام بہت کیا کہ پٹھان بدلہ ضرور لیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے یارا! ہم معاف بھی کرتا ہے۔ اب ایک جیسا لوگ کدھر ہوتا ہے؟ کون سا قوم کا سارا لوگ اچھا یا برا ہوتا ہے؟ ہم کو گولی دشمن نے مارا مگر وہ ہمارا دشمن نہیں تھا۔"

نازو نے کہا "کیا مطلب؟ غلط فہمی میں تم کو گولی ماردی؟"

سیف اللہ پھر ہنسا "نہیں بی بی' وہ دشمن تھا انسان کا' پاکستان کا' شرافت کا اور اپنا عقل کا دشمن تھا کوئی۔ ہم اس کا نام نہیں جانتا' اس کو پہچانتا بھی نہیں۔ ہم تو ادھر اپنا کام کا واسطے گیا تھا۔"

میں نے کہا "کیا کام کرتے تھے تم؟"

"چوکیدار تھا ہم ایک سیٹھ کا' ایک ہندو سیٹھ کا۔ ادھر ہندو لوگ اپنا حفاظت کا واسطے گورکھا بھی رکھتا مگر اعتبار نہیں کرتا۔ جیٹھو رشوا ناتھ کا باپ ہم کو رکھا۔ دس سال ہوا۔ وہ مر گیا تو اس کا بڑا ہم کو بولا کہ تم چاچا ہے ہمارا۔ اس کا جوٹ مل میں چار سو نوکری کام کرتا ہے۔"

"اور اتنے بڑے سیٹھ نے تم کو یہاں اس حال میں ڈال رکھا ہے؟ تمہارے لئے اس کی کوٹھی میں کوارٹر بھی نہیں تھا؟"

وہ کچھ دیر خلا میں دیکھتا رہا اور ادا سی نے اس کی آنکھوں میں پل بھر کے لئے آنسوؤں کی نمی پیدا کی' پھر وہ مسکرانے لگا۔ وہ بہادر تو بنا تھا۔ اسے اپنے زخموں پر مسکراہٹ کا پردہ ڈالنا آتا تھا۔ وہ اپنے زخموں کی ٹیس کو اپنی ہنسی میں چھپا سکتا تھا۔

"خوبارا! ابھی ایسا رہتا ہے کہ جو ساتھ چل سکتا ہے اس کا ساتھ رہتا ہے' جو رک جاتا ہے اس کو چھوڑ دیتا ہے' پیچھے بھول جاتا ہے۔ سیٹھ کا گھر پر ہم رات بھر جاگتا تھا۔ ہم بولا کہ سیف اللہ جب تک ادھر ہے' اندر کوئی نہیں گھسے گا۔ ایک بار ڈاکو لوگ آیا۔ ہم ایک کو مار دیا' دوسرا زخمی کیا۔ سیٹھ ہم کو دس روپیہ انعام دیا۔"

"دس روپے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"جان بچانے کا معاوضہ صرف دس روپے؟" غالب بولا۔

"وہ جان کے علاوہ مال بھی لے جاتے پھر؟" نازو نے کہا۔

سیف اللہ مسکرایا "دس روپیہ انعام دیا' معاوضہ نہیں یارا۔ کھانا لگ سا ہم کو۔ ابھی ادھر بہت لوٹ مار ہوتا' خون خرابہ ہوتا۔ گندہ لوگ کا کیا ایمان اور مذہب۔ لیکن سیف اللہ کا ہے۔ ایک مسلمان لڑکا دن میں ہم کو بولتا کہ آج رات تمہارا سیٹھ کا خانہ خراب کرے گا۔ تم چھٹی کرو آج یا اپنا بندوق رکھو اور سو جاؤ۔ ہم بولا کہ خنزیر کا بچہ' سیف اللہ کو ایسا بولتا۔ وہ بولا کہ تمہارا سیٹھ کافر ہے۔ ہم بولا کہ ہمارا کام اس کا حفاظت ہے اور وہ ہم کرے گا' اپنا جان دے کر بھی اس کو بچائے گا۔ تمہارا باپ بھی آئے گا تو ہم گولی

مارے گا اس کا مغز میں۔ وہ بولا کہ ہم تم کو بھی حصہ دے گا۔ بس پھر ہم بندوق اٹھایا تو وہ دوڑ کر بھاگ گیا۔ ہم یہ بات سیٹھ کو بولا اور سیٹھ پولیس کو۔ ایک ہفتہ بعد پولیس کا سنتری چلا گیا۔ رات کو غنڈہ لوگ حملہ کیا۔"

"تم نے پہچان لیا تھا انہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ نقاب ڈال کے آیا۔ آٹھ دس ڈاکو تھا۔ ہم دو کو مار دیا۔ مغز میں گولی مارا۔"

"ان میں وہ بدمعاش لڑکا بھی تھا جس نے تم سے بات کی تھی؟" میں نے کہا۔

ایک بار پھر سیف اللہ نے نفی میں سر ہلایا "مرنے والوں میں نہیں تھا۔ پکڑا کوئی بھی نہیں گیا۔ دو دن بعد ہم واپس آتا تھا کہ کوئی فائر کیا۔ ہم کسی کو نہیں دیکھا۔"

"ظاہر ہے یہ انہی کی انتقامی کارروائی تھی۔" غالب نے کہا۔

نازو بولی "آپ کو معلوم تو ہوگا کہ وہ لڑکا کون تھا۔ اس کا نام۔۔۔"

"خو بی بی! ہم دیکھا نہیں کسی کو تو نام کیسے لے گا۔ اس کا نام ہم جانتا بھی نہیں۔ سامنے آئے گا تو پہچانے گا۔ ہم ادھر گر گیا۔ ایک شیطان کا بچہ ہم کو گولی مارا' دوسرا انسان کا بچہ گاڑی میں اسپتال لے گیا۔ ابھی ہم ادھر لیٹا ہے۔"

میں نے کہا "اس بار تمہارے حق سیٹھ نے جان نثاری کا کیا انعام دیا؟"

وہ تلخی سے مسکرایا "ابھی چھوڑو اس کو۔ سیف اللہ نے اپنا فرض پورا کیا۔ یہ بات اللہ نے دیکھا' ابھی وہی کچھ کرے گا۔ سیٹھ جو ہم کو چاچا بولتا تھا' ہم کو بھول گیا ہے۔"

"اس نے تمہارے علاج معالجے کا بندوبست تو کیا ہوگا؟" غالب نے کہا۔

"کچھ نہیں کیا وہ۔ اس سے زیادہ مجبوری نے کہا" سیف اللہ نے دکھ اور تاسف کے ساتھ کہا "وہ ہم کو نوکری سے جواب دیا۔ بولا' سیف اللہ ہم چھ مہینہ انتظار نہیں کر سکتا۔ ہم دوسرا چوکیدار رکھا ہے۔ ابھی تم چھٹی کرو دوراں۔ ہم چھٹی نہیں کرے گا تو کیا زبردستی کرے گا؟"

"یعنی جب تک تم زیر علاج ہو' چھٹی پر رہو گے؟" نازو نے سادگی سے سوال کیا۔

"پکا چھٹی بی بی۔ ایک دم" وہ بولا "ایک مہینے کا تنخواہ دیا اور بس۔ ہم کو دیکھنے ایک دفعہ بھی نہیں آیا۔ اس کا ڈرائیور لوگ آیا۔ بولا سیٹھ ڈرتا ہے۔ تم مسلمان ہے اور پاکستانی ہے۔ تمہارا ساتھ بات کرے گا تو کوئی بھی اس کو غدار بولے گا' کوئی اس کو بھی مارے گا۔ وہ اپنا بیوی بچہ کا ساتھ لندن چلا گیا ہے۔ ادھر بھی کوٹھی ہے اس کا۔ کلکتہ ٹھیک ہوگا تو آئے گا۔"

"اور تم کیا کرو گے؟" رابعہ نے کہا۔

www.paksociety.com

"کیا کرے گا؟ صبر کرے گا۔ دعا کرے گا اللہ ان کو عقل دے۔ ہم کیا کر سکتا ہے بی بی۔"

"تم واپس نہیں جاؤ گے تو یہاں کیسے گزارا ہوگا؟"

"واپس بھی جائے گا ابھی۔" اس نے اپنی زخمی ہو جانے والی ٹانگ کی طرف افسوس سے دیکھا "جو ٹانگ والا بھی نہیں جاتا۔ راستہ بند ہے۔ ایجنٹ لوگ پیسہ مانگتا ہے۔"

"اگر پیسے کا بندوبست ہو جائے۔۔۔"

"پھر بھی نہیں جا سکتا۔ ہم کو اٹھا کے کون لے جائے گا؟ کون بس پر سوار کرے گا؟ کون اتارے گا؟ بس بار بار بدلنا پڑتا ہے، جگہ جگہ پیدل چلنا پڑتا ہے۔ پہاڑی راستہ ہے۔" اس نے بے بسی اور بے چارگی سے کہا "تم ابھی تم جاؤ اور رجھو۔ چائے پیو۔"

مرجان بالکل خاموشی سے کئی بار گزر کے اندر گئی تھی اور ہم دیکھتے رہے تھے کہ وہ چائے کے ساتھ کھانے پینے کے لوازمات کا بندوبست بھی کر رہی ہے۔ نارا بائی اور کاجل کمرے سے نہیں نکلی تھیں اور بنگالی میں نہ جانے کیا باتیں کر رہی تھیں اور رو رہی تھیں۔

سیف اللہ کی باتوں سے میرا دل بہت دکھا تھا۔ اس پورے معاشرے کے غیر منصفانہ، غیر انسانی اور غیر اخلاقی طرز عمل کے ذمے دار صرف دو رو غلے کردار اور منافقانہ سوچ رکھنے والے رہنما تھے جو طاقت اور پیسے کے بل پر قیادت پر قابض تھے۔ سیاست کے خود ساختہ ٹھیکیدار جن کے کوئی سیاسی نظریات نہیں تھے اور اگر تھے تو سو فیصد ذاتی مفادات سے وابستہ رہتے تھے۔ وہ نام نہاد علماء جو مذہب کے نام پر منافرت اور تعصب پھیلاتے تھے اور جن کے دامن فرقہ پرستی کی جنگ میں مرنے والوں کے لہو سے داغدار تھے۔ جو دن رات جلسے جلوس، بیانات اور پریس کانفرنسوں کے ذریعے اپنی عوام دوستی کے جھوٹ کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے مگر عام آدمی کے ساتھ ہونے والے ظلم پر ان کی زبان اور ان کی آنکھیں بند رہتی تھیں۔ آئے دن بے گناہ پولیس کے تشدد سے ہلاک ہوتے تھے۔ بیواؤں کی عصمت دن دہاڑے لٹ جاتی تھی اور یتیموں کا مال کھانے والے انہیں کرائے کے قاتلوں کے حوالے کرتے تھے کہ انہیں صفحہ ہستی سے یوں مٹا دیا جائے جیسے وہ لوح جہاں پر حرف مکرر تھے۔ لیکن آج تک کسی لیڈر نے یا فرقہ پرست ملا نے کسی تھانے کے باہر مظاہرہ کیا؟ کسی بے گناہ کی موت پر احتجاج کے لئے ایک بینر بھی لگایا؟ کسی بیوہ اور یتیم کے حقوق کی پامالی پر مذمت کا ایک بیان بھی جاری کیا؟ کسی مظلوم کی داد رسی کے لئے کوئی مہم چلائی؟ سیاست اگر عوام کی خدمت کا نام ہے تو مذہب انسانیت کی خدمت کا مگر انہیں گمراہ لوگوں نے مکروہ دھندہ بنا ڈالا ہے۔

جب رابعہ نے میرے بازو پر تھپکی دے کر کہا "چلو، سب انتظار کر رہے ہیں تمہارا۔"

تو میں چونکا "معاف کرنا" میں نے سیف اللہ سے کہا "ابھی تک میں نے تمہارا شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ تم نے۔۔۔"

"تم ابھی ایسا بات مت کرو بابا۔ جاؤ کچھ کھا پی لو۔" سیف اللہ خوش دلی سے مسکرایا "بی بی لوگ کو تسلی دو۔ رونے سے کچھ نہیں ہوتا، کوشش سے ہوتا ہے۔"

چھوٹے سے کمرے میں صاف ستھری دری پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ اوپر تلے تین کے چار پرانے صندوق رکھے ہوئے تھے۔ کمرے میں روشنی کم تھی مگر اس کی دیواریں اجلی تھیں۔ کہیں گرد و غبار یا جالے نظر نہیں آتے تھے جس سے مرجان کی صفائی پسندی اور سلیقے کا پتا چلتا تھا۔ دیوار کے ایک طاق میں کلام پاک کو ریشمی گوٹے والے غلاف میں پورے احترام کے ساتھ محفوظ کر دیا گیا تھا۔ فریم کئے ہوئے "یا اللہ" اور "یا محمدؐ" اور خانہ کعبہ کی تصویر ایک مخصوص انداز طبع اور عام مسلمان گھرانے کے روایتی مزاج کی عکاسی کرتی تھی۔ یہ عام طرز عمل ہے کہ قرآن پاک کسی بلند مقام پر اسی طرح خوب صورت غلافوں میں بصد احترام محفوظ رہتا ہے۔ اسے گھر میں لے کر رفت سب سے پہلے پہنچایا جاتا ہے۔ دلہن کو اس کے سائے میں رخصت کیا جاتا ہے یا مصیبت ملے تو مرنے والے کے سرہانے سورۂ یٰسین پڑھنے کے لئے کھولا جاتا ہے۔ جو اسے باقاعدگی سے پڑھتے بھی ہیں تو سمجھتے نہیں اور جو اسے نمک کے برابر سمجھنے والے ہیں وہ اس پر عمل نہیں کرتے۔ وہ قوم جس نے خدا کا کہا نہیں مانا، بھلا قائد اعظم کے فرمودات اور علامہ اقبال کے ارشادات پر کیا عمل کرتی۔ نتیجہ ساری دنیا میں مسلمانوں کی رسوائی، پاکستان سے پاکستانی کی دوری۔

میرے ذہن کو حالات اور حادثات نے تاریکی، مایوسی اور قنوطیت پسندی کی طرف دھکیل دیا تھا۔ حد سے زیادہ حقیقت پسندی سے فرسٹریشن کے سوا کیا ملتا ہے۔ سنگ دشنام اور تیر الزام کے سوا۔ جو سچ بولے وہ مجرم، جو اصل ایمان کی بات کرے وہی کافر، جو حق پرست ہو وہی گردن زدنی۔

سیف اللہ پر ہونے والے ظلم پر کیا کہہ کر خاموش رہا جا سکتا تھا کہ یہ نوشتہ تقدیر تھا، اس کی آزمائش تھی اور خرابی کے پیچھے کیا اسباب مصلحت ہیں یہ خدا جانتا ہے۔ رفتی بہ جملہ سب کا ایک ساتھ۔ کسی حد تک احتجاج کر کے ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے کاری کی۔ بندہ خطا کار اور کم ظرف ہے۔ اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے اور اس سے شکوہ کرنے لگتا ہے جو زندگی دیتا ہے۔ اسے قائم و دائم اور رواں دواں رکھتا ہے۔

میں نے بے دلی سے چائے ختم کی۔ کاجل سب سے زیادہ متفکر نظر آ رہی تھی۔ اس نے چائے بھی نہیں پی۔ گو کہ بن کے سب بے زبان خاموشی میں التجا کرنے والی ہماری میزبان کچھ شرمسار تھی کہ شاید مہمانوں کی خاطر مدارات ان کے شایان شان نہیں تھی۔

نارا بائی نے اچانک کہا "میں جا رہی ہوں۔"

کاجل نے اسے روک لیا "مولوی صاحب کا انتظار نہیں کرو گی؟"

"کب تک انتظار کروں، میرا گھر۔۔۔"

"تمہارے گھر میں اب کیا ہے؟" رابعہ نے کہا "جو ہونا تھا ہماری وجہ سے ہوا تھا۔ اب اس اجڑے گھر کو اجاڑنے کوئی نہیں آئے گا۔"

نازو نے بھی سمجھایا "ایسا نہ ہو تم اکیلی جاؤ تو وہ اپنی ناکامی کا بدلہ تم سے لیں۔"

میں نے کہا "وہ کون تھے؟ تم نے دیکھا تو ہوگا۔ کسی کو پہچانتی ہو؟"

نارا بائی خلا میں دیکھنے لگی "میری آنکھوں میں جالے آ گئے ہیں۔ چہرے مجھے صاف دکھائی نہیں دیتے۔"

میں نے کہا "یہ خوف کے جالے تو نہیں ہیں نارا بائی؟ تم جانتی ہو کہ وہ کون تھے۔ ان کے چہرے اور نام بتانا نہیں لیکن تم ڈرتی ہو۔"

"نارا بائی کو کس کا ڈر۔ جس سے آج تک جو تھا سب کچھ تو دنیا نے لوٹ لیا۔ اب نہ مال ہے نہ دولت، جسم کو ڈھانکا کپڑا ہے۔"

کاجل نے کہا "وہ میرے پیچھے آئے تھے۔ میں رکھشی تو بچا سکتی تھی مگر اس سے کیا ہوتا۔"

نارا بائی نے کہا "تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ وہ یہاں بھی آ جائیں گے۔ میں بوڑھی عورت ہوں، اکیلی اور بے سہارا ہوں۔ سختی نہیں برداشت کر سکتی۔ انجام نہیں ہے میری بوڑھی ہڈیوں میں کہ جوان ہاتھوں کی مار سہہ سکیں۔ میں بتانے پر مجبور ہو جاؤں گی کہ تم سب کہاں ہو۔"

"پھر تمہارا واپس جانا کیوں ضروری ہے؟" میں نے کہا۔

"ضروری ہے" نارا بائی نے بے رخی سے کہا اور کسی کے روکنے سے پہلے ہی باہر نکل گئی۔

کاجل نے کہا "اسے اپنی شاگرد لڑکیوں کی فکر ہے۔"

"نارا بائی۔۔۔ کیا پڑھاتی ہے؟" میں نے کہا۔

"رقص کی تعلیم دیتی ہے۔ یہ خود بھی بڑی زبردست ڈانسر، کتھک فنکار تھی۔ مشہور نہیں ہوئی کیوں کہ اسے صرف فن سے پیار تھا، شہرت یا دولت کی اس نے کبھی پروا نہیں کی۔ اسٹیج یا فلموں میں بھی ڈانس نہیں کیا حالانکہ قدر کرنے والے بہت تھے۔ کبھی کسی دولت مند کے محل میں مجرا کرنے نہیں گئی۔ اس کا شوہر بھی رقاص تھا۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے پاگل تھے اور لوگ انہیں پاگل کہتے تھے۔ کبھی میاں ناچ رہا ہے تو بیوی۔ کبھی دونوں کے درمیان مقابلہ چل رہا ہے۔ کلاسیکل ڈانس میں نارا بائی سے بڑا نام کوئی نہیں ہو سکتا مگر لوگ اس نام کو نہیں جانتے۔ صرف وہی جانتے ہیں جو فن کو سمجھتے ہیں یا خود فنکار ہیں۔ تمام عمر رقص سکھاتے گزر گئی۔ کبھی کسی سے ایک پیسہ نہیں مانگی۔ ان کے شاگرد کہاں سے کہاں نکل گئے۔ بین الاقوامی شہرت حاصل کر کے لکھ پتی ہو گئے۔ فلموں میں چلے گئے۔ وہی ان کی ہر ضرورت پوری کرتے تھے۔ تحفے تحائف اور نذرانے بھی زبردستی دے جاتے تھے۔ شوہر رقص کرتا تھا تو بیوی طبلے پر سنگت کرتی تھی۔ بیوی ناچتی تھی تو شوہر طبلہ لے کر بیٹھ جاتا تھا۔ گھنٹوں ریاض کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ابھی تو کچھ نہیں سیکھا، دنیا ایک ساگر سمان ہے، ہم نے ایک بوند پائی تو اسے سمندر کیسے کہیں۔ عجیب وجدانی سی کیفیت ہوتی تھی ان کے رقص میں، جس میں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ کھانے پینے کا ہوش تک نہیں رہتا تھا۔ ممکن ہے یہ سب تمہیں عجیب اور معیوب لگے مگر یہاں کا یہی کلچر ہے۔ یہ بات ہے روح کے جذبوں کی۔ جیسے ممتا ایک جذبہ ہے جسے صرف عورت سمجھتی ہے۔ جذبہ ہی کہ دن کی محنت کر کے بھی ہریالی اور خوشحالی دیتا ہے۔ بس ہر جذبے کا رنگ جدا ہے، مفہوم الگ ہے، مقصد اور مدعا مختلف ہے۔ اس کا رقاص شوہر ایک دن اسی سرشاری کی الوہی کیفیت میں رقص کرتے کرتے گرا اور مر گیا۔ زندگی ختم ہو گئی تو رقص ختم ہو گیا یا یوں کہہ لو کہ رقص ختم ہوا تو زندگی ختم ہو گئی۔ زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب۔ دل کی دھڑکن کا رقص، ترتیب، توازن اور تسلسل کی کیفیت، نبض اور سانس کی رفتار کے ساتھ حرکت قلب اور دوران خون کی ہم آہنگی۔ یہی زندگی کا رقص ہے، حرکت کا۔ توازن تو ساری کائنات میں ہے۔ سورج، چاند، ستارے، متحرک سیاروں کے بدلتے موسموں کی رت، ساون کی جھڑی اور دریا کی روانی، سب میں ترتیب، توازن اور ہم آہنگی ہے۔"

میں دم بخود بیٹھا تھا "تم تو فلاسفر ہو کاجل۔"

"غلط۔ میں پاگل ہوں۔ اپنی دھن میں بولتی جا رہی ہوں" اس نے ہنس کے کہا "در اصل میں نارا بائی کے لئے بہت دکھی اور فکر مند ہوں۔"

غالب نے کہا "کیا تم بھی شاگرد ہو اسی کی؟"

"ہاں۔ مگر ایک ایسی شاگرد جس نے استاد کا نام روشن نہیں کیا۔" وہ بولی "میری وجہ سے اس کا گھر نہیں بچا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ محلے والے اسے بچانے آ گئے۔ سب نارا بائی کی عزت کرتے ہیں مگر جو نارا بائی کو نہیں جانتے وہ اسے کب معاف کریں گے۔"

میں نے کہا "کیا اس کے بچے نہیں ہیں؟"

"اتنے شاگرد ہیں اس کے تو وہ کسی کے گھر کیوں نہیں رک جاتی؟" غالب نے کہا۔

"اولاد خدا نے نہیں دی" کاجل بولی "مگر میرا خیال ہے کہ اولاد ان کی نہیں ہو سکتی تھی اور یہ اولاد کے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے اچھا ہی ہوا جو نہیں ہوا۔ خود انہیں کبھی اولاد کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اب تو تم اپنے احساسِ محرومی سے خود ہی سمجھوتا کر لے تو الگ بات ہے" رابعہ نے کہا۔

"اچھا؟" میں نے مسکرا کے اس کی طرف دیکھا۔

رابعہ کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ اس نے عام بات کی تھی، میں نے ایک لفظ سے اسے خاص مفہوم دے دیا مگر یہ بات کاجل نہیں سمجھی۔

"نارا بائی خودکشی تھی۔ اگر بھگوان مجھے ماں بنا دیتا تو میں مر جاتی۔ ماں کے مقابلے میں رنگی کی بھلا کیا حیثیت۔ ماں بڑی طاقت ور ہوتی ہے۔ ماتا کا جذبہ کلاکار کی کلا کو مار ڈالتا ہے۔ کسی شاگرد کے گھر جا کے رہنا اس کی خوددار طبیعت کو گوارا نہیں ہوگا۔ ویسے بھی اس نے خود تو اسی دن رقص چھوڑ دیا تھا جس دن اس کا شوہر مرا تھا۔ کہتی تھی اب دل میں کچھ ہے ہی نہیں۔ بس خلا ہے۔ خلا میں پاؤں تھکتے ہی نہیں تو رقص کیسے کروں۔ بعد میں رقص سکھانے لگی۔ شوہر کی موت پر بڑا رشک کرتی ہے۔ کہتی ہے اگر مجھے معلوم ہو جانے پہلے سے کہ میرا وقت پورا ہو گیا ہے تو میں یم دوت سے کہوں گی کہ بس چند منٹ ٹھہر جا۔ تجھے میں گھنگھرو باندھ لوں اور آخری رقص شروع کر دوں۔ آگے اس کی مرضی، جب چاہے رقص کو ختم کر دے۔ بالکل پاگل عورت ہے۔"

میں نے کہا "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی نہ کسی پہلو سے ہم سب پاگل ہوتے ہیں۔ کیا سیف اللہ پاگل نہیں ہے جسے سجدے سے کوئی تشویش ہی نہیں؟ نہ منافقوں کی مخالفت ملے کی پروا۔"

غالب نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک مسجد کے پیش امام نے نارا بائی جیسی عورت کی خاطر جان کو خطرے میں کیوں ڈالا؟"

"اسے ڈی کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس جیسے شرابی، راشی پر ایک دیندار شخص نے اعتبار کیا تھا۔ جور اور نور کو اس کے سپرد کر گیا تھا اور خود مارا گیا تھا۔ دراصل جان دینا اس شخص کے لئے ایک سعادت ہے جو سمجھتا ہو کہ جان دی ہوئی اسی کی تھی اور اگر حق ادا ہو جائے تو ایسی موت برحق ہے۔ اور وہ زندگی بار ناحق جو صرف اپنے لئے ہو۔"

ناذو نے کہا "آخر وہ اپنی نابینا بیوی کے ساتھ کیوں نکلے تھے؟ وہ ہمیں یہاں چھوڑنے کے لئے خود آ جاتے۔"

رابعہ نے کہا "ہاں۔ یہ مجھے بھی عجیب لگا تھا جب انہوں نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ تب تک جنت برقعہ اوڑھ لے اور چل میرے ساتھ۔ اندھی عورت بھلا کیا راستہ دکھا سکتی تھی۔ کمال یہ ہے کہ اس عورت نے بھی کوئی سوال نہیں کیا کہ یہ کہاں جانے کا فیصلہ کر لیا اچانک۔"

"وہ تم جیسی نافرمان اور گستاخ بیوی نہیں ہوگی" غالب بولا "اپنے مجازی خدا کے ساتھ جنت میں جائے گی۔"

"تمہارے بھی ساتھ ہوگی جہنم میں" میں نے کہا۔

"وہ تو جیتے جی جہنم میں جھونکی جائے گی" ناذو نے کہا "زندگی جہنم ہو گی اس کی۔"

"ہو سکتا ہے اپنے بارے میں تمہارے خدشات غلط ثابت ہوں۔"

"میں اپنی بات نہیں کر رہی تھی" ناذو نے بگڑ کے کہا۔

غالب نے کہا "تم جہنمی کہاں ہو۔ تم تو جنت میں رہو گی میرے ساتھ۔"

آخری دو الفاظ اس نے عمداً آہستہ سے کہے تھے جو میں نے سنے مگر ناذو نے نہیں سنے چنانچہ بات وہیں ختم ہو گئی۔

کاجل نے کہا "مولوی صاحب کا پتا کرنا چاہئے۔ وہ ہمیں دروازے تک چھوڑ کے چلے گئے تھے۔"

"ہم نے دیکھا نہیں تھا کہ وہ واپس گئے تھے اسی راستے پر یا۔۔۔؟"

کاجل نے کہا "یہی تو پریشانی ہے۔ وہ آگے نکل گئے تھے۔"

"شاید سیف اللہ کو معلوم ہو" میں نے کہا۔

سیف اللہ کو کچھ معلوم نہیں تھا "ہم کو ابا جی لوگ بولا تھا کہ مولوی صاحب آیا ہے۔ اپنا استاد صاب ہے۔ ہم بدبخت ان کو لینے کا واسطے دروازے تک نہیں گیا۔ وہ دروازے تک آ کے چلا گیا ہم اپنا بابا کو بولا کہ ان کو اندر بلاؤ مگر وہ نہیں تھا۔"

"تم انہیں کب سے جانتے تھے؟" غالب بولا۔

"ہم بہت چھوٹا بچہ تھا۔ والد صاحب ادھر آ کر دکان کھولا، بیٹھتا۔ تم کو معلوم ہے ادھر کتنا بڑا دارالعلوم ہے؟ جیسا تعلیم کا ہے؟"

میں نے کہا "میں نے دیکھا ہے۔"

"بس ہم بدبخت ادھر کا علم نہیں لیا۔ پھر والد صاحب قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا۔ ہمارا چاچا اس کو قتل کیا۔"

"تمہارے سگے چچا نے؟ کیوں؟"

"قبائلی زمین کا واسطے۔ کیا مراد ہے یہ زمین۔ ابھی ہم چاچا کو قتل کرتا؟ پھر وہ ہمارا بیٹا کو۔ پھر ایسا سب دو گز زمین لیتا تو زمین ختم ہو جاتا، دشمنی ختم نہ ہوتی۔ ہم زمین اس کو دیا اور ادھر آ گیا۔ ہمارا استاد صاب بعد میں آیا۔ اس کا پیر و مرشد حکم دیا۔ ابھی خدا خبر کیا حکم ہوا؟ وہ کدھر گیا۔"

میں نے کہا "میں دیکھ کے آتا ہوں۔"

بے اختیار رابعہ نے کہا "کوئی ضرورت نہیں۔"

میں نے اسے دیکھا تو وہ شرمندہ نظر آنے لگی "میرا مطلب تھا کہ یہ۔۔۔ وہ بچہ جو ہمیں یہاں لایا تھا وہ بھی تو معلوم کر سکتا ہے۔"

غالب اور ناذو اس کے ہمنوا ہو گئے "ہاں۔ رابعہ ٹھیک کہتی ہے۔ ہمارا باہر جانا خطرے سے خالی نہیں۔"

"اور اور ہم محفوظ ہیں؟ اس کی کیا گارنٹی ہے؟" میں نے کہا۔

کاجل نے کہا "تم سب بیٹھو، میں جاتی ہوں۔ مجھے ویسے بھی گھر جا کے بابا کی خیریت معلوم کرنی ہے۔ وہ میری وجہ سے پریشان ہوں گے۔"

"تم کیسے جاؤ گی؟ کار تو وہیں چھوڑ دی تھی تم نے۔"

"کار وہیں ہوگی۔ میں لے جاؤں گی" کاجل نے کہا۔

رابعہ نے مضطرب لہجے میں کہا "کاجل! اکیلی مت جاؤ۔"

"حالات ٹھیک نہیں ہیں" ناذو بولی۔

"تم فکر مت کرو، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں واپس آؤں گی۔ جب تک میں نہ آؤں تم یہاں سے مت نکلنا۔"

میں نے کہا "اس کی گارنٹی ہم نہیں دے سکتے۔ تم نہ جانے کب آؤ۔"

"میں بندوبست کر کے آؤں گی۔ کوشش کروں گی کوئی گاڑی مل جائے جس میں ہم سب نکل جائیں۔ بس کا سفر مشکل اور لمبا ہوگا۔ راستے میں جگہ جگہ روکنے والے بھی بدمعاشی کرتے ہیں۔ روپیہ پیسہ اور زیور بھی چھین لیتے ہیں۔"

"اور پولیس کچھ نہیں کرتی؟"

"یہ سب پولیس ہی تو کرتی ہے" کاجل نے کہا "سرحد پار کرانے والے ایجنٹ بھی ان سے ملے ہوتے ہیں۔ وہ پولیس کو بتا دیتے ہیں کہ کس کے پاس کتنا نقد ہے اور کتنا سونا۔ مجبور لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔ ایجنٹ راستے میں اپنا حصہ وصول کر لیتا ہے۔ بس یا ٹرک بھی اسی کا ہوتا ہے۔"

"اور یہ سب جانتے ہوئے بھی لوگ ان پر بھروسا کرتے ہیں؟"

"بھروسا نہ کریں تو کیا کریں؟ کہاں جائیں اور کیسے جائیں؟ آخر جان تو بچانی ہے" کاجل نے کہا "کار والے بچ جاتے ہیں۔ پولیس بھی ڈرتی ہے کہ نہ جانے اس میں کون ہو۔"

میں نے کہا "پھر تم ہر قیمت پر کار یا جیپ حاصل کرو۔ ہم اس پر بوگس نمبر پلیٹ لگا کر نکل جائیں گے۔"

"بوگس نمبر پلیٹ؟"

"تمہارے پاس انڈین پاسپورٹ ہیں" میں نے کہا "مگر انڈیا کے کسی شہر کا رجسٹریشن نمبر مل جائے۔"

غالب نے کہا "یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ آج کل بھارتی گاڑیاں بہت آتی ہیں۔ کوئی بھی نمبر نوٹ کر لو اور نمبر پلیٹ بنوا لو۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ اصل نمبر کی کار تو دہلی میں ہوگی۔ پولیس کے پاس اس کے گم ہونے یا چوری کی رپورٹ نہیں ہوگی کہ ہمیں کوئی بارڈر پر روکے۔"

"بارڈر پر ہمیں لازمی روکا جائے گا" میں نے کہا "بلکہ ریاست کی حدود کے بعد نیپال میں داخل ہونے سے پہلے۔"

"روکنے والے جب پاسپورٹ دیکھ لیں گے تو گاڑی کے کاغذات طلب نہیں کریں گے" غالب نے کہا۔

ناذو نے کہا "گاڑی تو مل جائے گی۔ بوگس نمبر پلیٹ کون بنا کے دے گا؟"

"اور سرحد تک راستہ کون بتائے گا؟" رابعہ نے کہا۔

"راستہ جاننے والا ڈرائیور ہے" کاجل نے کہا "شاید وہ بوگس نمبر پلیٹ بھی بنوا دے۔"

"بھروسے کا آدمی ہے نا؟" غالب نے کہا۔

"بھروسا کون کس پر کر سکتا ہے؟ ویسے تو۔۔۔ میری بات نہیں ٹالے گا" کاجل نے کہا "میں اسے ساتھ لے آؤں گی۔"

ناذو بولی "ہم اسے آنے جانے کا اچھا معاوضہ دے سکتے ہیں۔"

"پہلے رقم تو کاجل کے حوالے کرو" میں نے کہا "گاڑی مفت تو نہیں ملے گی۔"

"ہاں نکالو جو اس منحوس سونے کے بدلے ملا تھا۔ خزانے پر سانپ بنی بیٹھی ہو" غالب نے کہا۔

"لعنت بھیجتی ہوں میں اس خزانے پر" ناذو نے خفگی سے کہا "وہ میرے پاس ہے بھی نہیں۔"

"کیا! ارے ناذو خدا کے غضب سے ڈرو۔ اتنا بڑا غبن کر رہی ہو؟ ویجنتی کی بدروح چمٹ جائے گی تم سے" غالب نے کہا۔

"پیسے میرے پاس ہیں" رابعہ نے کہا۔

غالب نے سر کھجا کے کہا "میں بھی حیران تھا کہ ناذو جیسی ایماندار، نیک، شریف اور خدا ترس لڑکی کر کیا رہی ہے۔"

"تم بڑے کمینے دوست ہو" میں نے کہا۔

کاجل کے رخصت ہو جانے کے بعد ہمارے پاس کرنے کے لئے کچھ نہیں رہا، سوائے انتظار کے۔ سیف اللہ کا اکلوتا بیٹا مولوی صاحب کے گھر تک گیا اور ایک گھنٹے میں لوٹ کر آیا تو یہ خبر لایا کہ ان کے حجرے میں بدستور تالا پڑا ہوا ہے۔ مولوی صاحب نے ظہر کی نماز بھی نہیں پڑھائی تھی۔ مسجد میں کسی نے اذان بھی نہیں دی تھی۔

سیف اللہ نے کہا "اللہ توبہ، اللہ توبہ۔ یہ اچھا شگون نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ایسی باتوں پر کیوں یقین رکھتے ہو سیف اللہ؟ شگون کا اچھا برا ہونا بے معنی بات ہے جب دنیا میں سب کچھ خدا کی مرضی اور اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ یہی عقیدہ ہونا چاہئے ہمارا۔ ہندوؤں کے ساتھ رہ کے ہم تو وہم پرست ہو گئے ہیں۔"

"مگر مسجد میں اذان نہیں ہوا۔"

لڑکے نے کہا "بابا! میرا بات پورا نہیں سنا آپ۔ میں ادھر گیا تو حجرے کو وہ لالہ دکاندار بولا کہ مولوی صاحب پاکستان بھاگ گیا ہے۔ آج تو اذان بھی نہیں ہوا۔ پھر میں اذان دیا۔"

"کیا؟ تو اذان دیا" سیف اللہ نے تڑپ کر اٹھنے کی ناکام کوشش کی اور پھر اپنے ہاتھ پھیلا دیے "خو ادھر آ بچہ، بابا کا جان۔"

www.paksociety.com

اس نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ وہ حد درجہ جذباتی ہو رہا تھا۔
اس نے بیٹے کو چوما اور رونے لگا۔

"روتا کیوں ہے بابا؟" بچہ ڈر گیا۔

"یہ خوشی کا آنسو ہے بچہ۔ تو میرے کو سرخ رو کیا نا تو اللہ کا گھر میں اذان دیا۔ آفرین۔ ہمارا استاد ہوتا تو تیرے کو اپنا خاص شاگرد بناتا۔"

"مولوی صاب پہلے بھی میرے کو اذان کا واسطے بولا" لڑکے نے خوش ہو کے انکشاف اور اعتراف کیا۔

"اور تو آفرین۔ مرجانا! تو خان" تیرا بیٹا کیا بولتا۔ آگے بول" جب تو اذان دیا تو نماز کا واسطے آیا کوئی؟"

"ہاں۔ سب آیا۔ میں بھی نماز پڑھا۔ دس نفری تھا۔"

"امامت کس نے کی؟" سیف اللہ بولا۔

"حاجی بابا تھے۔ وہ ادھر تھا۔ میرے کو بولا بچہ ابھی ہم اذان نہیں دے سکتا۔ اس کا آواز کیا ہوا بابا؟"

"اللہ نے لے لیا" سیف اللہ بولا اور پھر ہم سے مخاطب ہو گیا "کینسر ہو گیا تھا۔ گلے کا آپریشن ہوا۔ ابھی مشین کی مدد سے بولتا ہے۔ گلے پر مشین رکھتا ہے تو مشین سے آواز نکلتا ہے۔ قریب کا لوگ ہی سنتا ہے۔"

مرجان نے دوپہر کا کھانا بنانے میں رابعہ اور نازو کی مدد قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اپنے اصرار سے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ صرف مہمان بن کے آرام سے بیٹھ جائیں۔ وہ مہمان کو سر آنکھوں پر بٹھانے والے پٹھان تھے' جن کی نسلی روایات قید زمان و مکاں سے آزاد تھیں۔ وہ نہ وقت کے ساتھ انہیں چھوڑتے تھے اور نہ دشمنی کے رشتے ختم ہو جانے کے بعد۔ وہ اتنی خاموش طبع اور صابر و شاکر عورت تھی کہ بلا ضرورت کسی سے بات نہیں کرتی تھی لیکن سب کی سنتی تھی اور مسکراتی رہتی تھی۔ نہ تلخئ حالات کا گلہ نہ اپنی پریشانیوں کا ذکر' نہ تقدیر سے شکوہ' نہ زمانے کے سلوک سے' نہ کسی کی غیبت' نہ برائی۔ اس سے کوئی بات پوچھی جاتی تھی تو وہ ہاں یا نا میں جواب دینے کی کوشش کرتی تھی یا پھر کم سے کم الفاظ میں۔

دوپہر کے کھانے سے فراغت پاتے ہی سب نے سو جانا بہتر سمجھا۔ نیند ایک ضرورت بھی تھی اور پناہ بھی۔ تفکرات اور خدشات کی اذیت اور انتظار کے کرب سے نجات پانے میں ذہن اور جسم کے لئے بہتری کے جزا و اسباب تھے۔ آنے والا وقت ناقابل اعتبار تھا۔ واپسی کے سفر سے پہلے اور سفر کے دوران حالات کس حد تک مخالف ہوں گے اور ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے کتنے ذہنی سکون اور کتنی جسمانی توانائی کی ضرورت پڑے گی' یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

میری آنکھ کاجل کی آواز پر کھلی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی اور سیف اللہ اس کو تسلی دے رہا تھا۔

میں گھبرا کے باہر آیا "کاجل! کیا ہوا؟"

اس نے میری طرف دیکھا اور بلا جھجک مجھ سے لپٹ کے رونے لگی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے الگ کیا اور اس کے دونوں شانوں کو تھام کے اسے جھنجوڑا۔

"اب کیا ہو گا سکندر؟" وہ روتے روتے بولی۔

میں نے سخت لہجے میں کہا "پہلے منہ سے تو کچھ بکو کہ آخر کیا بات ہو گئی ہے؟ مجھے معلوم تو ہو۔"

سیف اللہ نے کہا "اس کا بابا گم ہو گیا ہے۔"

"گم ہو گیا ہے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"ہاں۔ ان کا کچھ پتا نہیں" کاجل نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

"پتا چل جائے گا۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔"

"وہ دوپہر سے پہلے گئے تھے اور ابھی تک نہیں لوٹے۔"

میں نے کہا "بھئی وہ سیاست داں ہیں۔ ہزاروں ان سے ملنے گھر پر آتے ہیں تو سینکڑوں سے وہ خود ملنے جاتے ہوں گے۔ آج کل تو زیادہ ہی مصروف رہتے ہوں گے۔"

اس نے کہا "وہ بتا کے جاتے ہیں۔"

"کس کو بتا کے جاتے ہیں؟"

"مجھے' اپنے سیکریٹری کو' گھر کے کسی نوکر کو۔"

میں نے کہا "بعض اوقات اچانک جانا پڑتا ہے۔ موقع نہیں ملتا کسی سے بات کرنے کا بھی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "بابا کہتے تھے' یہ بہت ضروری ہے کہ تم کو میرے بارے میں معلوم ہو کہ میں کہاں ہوں۔ اور خدا نخواستہ میں واپس نہ آؤں تو تم معلوم کر سکو۔ ان کا پروگرام سیکریٹری کے ذہن میں ہوتا تھا مگر انہیں اچانک کہیں جانا پڑتا تھا تب بھی وہ سیکریٹری سے کہتے تھے کہ یہ لکھ لو' مجھے کس نے کہاں بلایا ہے۔ عام طور پہ سیکریٹری ان کے ساتھ جاتا تھا اور کار تو وہ کبھی خود نہیں چلاتے تھے۔"

اب نازو' رابعہ اور غالب بھی اٹھ کے آ گئے تھے اور میرے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے کاجل کو رابعہ کے حوالے کر دیا۔

"اسے آرام سے بٹھاؤ' پانی پلاؤ تاکہ اس کے حواس بحال ہوں" میں نے کہا۔

"تم نے ڈرائیور سے پوچھا؟" غالب بولا۔

"ڈرائیور بھی گاڑی سمیت موجود ہے" وہ بولی۔

"پھر وہ کیسے گئے ہیں؟" نازو نے کہا۔

"یہی تو پتا نہیں چلتا۔ میں نے سب نوکروں سے پوچھ لیا۔ نوکر بھی کتنے ہیں' ایک شوفر' ایک مالی' ایک خانساماں اور اوپر کا کام کرنے والی شوفر کی بیوی۔ سب پرانے ملازم ہیں۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم۔"

"سیکریٹری کیا کہتا ہے؟"

"اس کا کہنا ہے کہ مجھے چوہدری صاحب نے بھاشانی صاحب کے پاس پھول دے کر بھیجا تھا۔ ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ وہ واپس آیا تو بابا اپنے کمرے میں موجود نہیں تھے۔ ان کا آفس اور بیڈ روم ساتھ ساتھ ہیں۔ آفس میں ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی۔ یوں جیسے وہ اٹھ کے باتھ روم گئے ہوں۔ جس بات نے مجھے پریشان کیا وہ ان کے چشمے کی موجودگی تھی۔ چشمہ وہ صرف سوتے وقت اتارتے تھے لیکن آفس میں ان کے سونے کا کیا سوال؟ سونا ہوتا تو وہ بیچ کا دروازہ کھول کے بیڈ روم میں چلے جاتے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ذرا سی دیر کے لئے چشمہ اتار کے رکھا اور میز پر سر رکھ کے یا کرسی کی پشت سے سر لگا کے آنکھیں بند کی ہوں اور بس اتنی دیر میں کچھ ہو گیا ہو۔" وہ پھر رونے لگی۔

"حوصلہ رکھو کاجل۔ سوچو کیا ہو سکتا ہے۔"

"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ پیچھے سے کوئی اندر گھسا اور پھر انہیں اغوا کر لیا گیا۔"

"کیا یہ ممکن ہے — میرا مطلب ہے کیا اتنی بڑی واردات خاموشی سے ہو سکتی ہے؟ ایسے کہ گھر میں کسی کو بھی پتا نہ چلے؟"

میں نے کہا "اگر کوئی چھپ چھپا کے اندر پہنچ بھی گیا تھا تو چوہدری صاحب کا اغوا اکیلے آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔ کم سے کم دو یا تین افراد مل کر ایسا کر سکتے تھے۔ فرض کرو پہلے شخص نے اچانک اندر جا کے انہیں بے ہوش کر دیا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ کسی نے کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال ان کے منہ پر رکھ دیا۔"

"مگر کاجل' اس کے بعد؟" میں نے کہا "وہ انہیں اٹھا کے کیسے لے گئے ہوں گے؟ ایک تو کوئی کھڑکی کے راستے داخل تو ہو سکتا ہے۔ کسی بھاری بھرکم آدمی کا بوجھ اٹھا کے کھڑکی کے راستے واپس جانا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن لیکن ایک لمحے کے لئے فرض کرلو کہ ایسا ہی ہوا' کیوں کہ انہیں دروازے سے باہر لے جایا جاتا تو گھر میں کوئی دیکھ لیتا۔ باہر تو پولیس کا پہرا ہے اور اب تو فوجی موجود ہے۔"

"برا وقت آ جائے تو جن پہ تکیہ ہو وہی پتے ہوا دینے لگتے ہیں" کاجل نے کہا۔

"تم نے ان سے پوچھا؟"

"ہاں۔ انہیں بھی کچھ نہیں معلوم۔"

"وہ سب اپنی اپنی جگہ پر موجود رہے تھے؟"

"کوئی ہلا بھی نہیں۔ مجھے یہی بتایا انہوں نے۔ سب سے الگ الگ بات کی تھی میں نے۔ اگر انہوں نے دشمنی میں انکار کیا ہو تو اور بات ہے مگر سب جھوٹ نہیں بول سکتے۔"

میں نے کہا "یہ تو ماننے والی بات ہی نہیں کہ چوہدری صاحب گھر سے نکلے اور کسی پہرے دار نے بھی نہیں دیکھا۔ وہ ہوا بن کے جاتے تب بھی معلوم ہو جاتا۔ گزرے تو وہ دروازے سے ہی ہوں گے۔ اپنی کار میں نہ سہی' کسی اور کی کار سے۔"

کاجل نے کہا "یہی تو الجھن والی بات ہے۔ سنتری صرف ان کاروں کو روکتا ہے جو اندر آتی ہیں۔ انٹرکام پر سیکریٹری کو بتاتا ہے' وہ بابا کو اطلاع دیتا ہے اور اجازت ملے تو کار اندر آتی ہے ورنہ سنتری وہیں سے واپس کر دیتا ہے کوئی جھوٹ بول کے۔ صاب میٹنگ میں ہیں' سو رہے ہیں' ان کی طبیعت خراب ہے۔ لیکن واپس جانے والی کار کو نہیں روکا جاتا۔"

"اس نے دیکھا تو ہو گا کہ آج کتنی کاریں آئی تھیں اور ان میں کون کون تھا؟" غالب بولا۔

"دیکھا تھا مگر وہ کسی گاڑی کا نمبر اور ملاقاتی کا نام کسی رجسٹر میں نہیں لکھتا" کاجل نے کہا "وہ چار نام اسے یاد ہیں۔ یہ یاد ہے کہ وہ کس رنگ کی گاڑی میں آئے تھے۔"

"سیکریٹری کیا کہتا ہے؟"

"اس کے پاس درجن سے زیادہ افراد کے نام لکھے ہوئے ہیں کہ کون کتنے بجے آیا تھا۔ ان میں سے چند نام تو ایسے ہیں کہ ان پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"

"میرا خیال ہے کہ نتیجے کے بغیر تفتیش شروع ہی نہیں ہوئی۔ اور تفتیش میں اپنے سائے کو بھی بالاتر نہیں سمجھنا چاہئے" غالب نے کہا۔

کاجل بولی "سیکریٹری سب کو فون کر چکا ہے۔ پولیس بھی آ گئی تھی اور ان کے نزدیک چند نام تصدیق طلب ہیں۔ یہاں سیکڑوں ادارے ہیں' ہر شخص نے کوئی انجمن یا تنظیم بنا رکھی ہے۔ بیوہ گداگروں سے لے کر فلاح جیب تراشاں تک۔ سب فراڈ ہیں اور کھانے کے بہانے۔ ایسے بہت سے وفود یا کسی تنظیم کے ارکان بھی بابا سے ملنے آتے تھے جن کا وہ نام بھی نہیں جانتے تھے مگر دل رکھتے تھے۔ ایک کارڈ یا لیٹر ہیڈ چھپوا کر کوئی اعتبار حاصل کر لیتا ہے۔ نام پتے کی تصدیق تو وہ ایسے ہو سکتی ہے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ ایسے ہی کسی آدمی نے —"

"یہ میرا نہیں پولیس کا خیال ہے" کاجل نے میری بات کاٹ دی "کوئی ان سے ملنے آیا اور انہیں گن پوائنٹ پر لے گیا۔ وہ خاموش رہنے پر مجبور تھے۔ اگر سیکریٹری اپنے کمرے میں ہوتا تو اسے بھی خاموش کر دیا جاتا مگر انہیں معلوم تھا کہ اس وقت سیکریٹری موجود نہیں۔ وہ ان کو اپنی کار تک لے گئے اور پھر ہاتھ باندھ کر کے پیچھے ڈال دیا۔ گیٹ سے گزرتے وقت کار میں وہ کسی کو بھی نظر نہیں آئے۔ اب پولیس ان سب سے معلومات حاصل کر رہی ہے جن کا ریکارڈ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ گمنام لوگوں کا بھی پتا چلا لیں گے۔"

"پھر ابھی سے رونا دھونا کیوں؟" غالب نے کہا۔

کاجل بولی "وہ مجھے تسلی دینے کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں۔ سب کا سراغ لگانا ممکن ہی نہیں۔"

www.paksociety.com

"کتنے گھنٹے ہوگئے ہیں انہیں گئے ہوئے؟" ناز نے کہا۔

"چھ' ساڑھے چھ گھنٹے۔"

"پھر تو ایسی پریشانی کی بات نہیں" ناز نے کہا۔

رابعہ نے کہا "تم نے اعلیٰ حکام سے بات کی تھی؟"

"اعلیٰ حکام؟" کاجل نے تلخی سے کہا "سکندر ہی سب کو بتا چکا ہے۔ ان سب کے پاس وہی کھوکھلے الفاظ ہیں' وہ گھسے پٹے سے بھرپور یقین دہانیاں ہیں کہ چوہدری صاحب کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ عوامی راہنما ہیں' اتنے مقبول ہیں۔ ان کا دشمن کوئی نہیں ہو سکتا' ہو تو کچھ نہیں سکتا۔ بکواس' محض بکواس۔"

رابعہ نے کہا "تمہارے اعصاب پر گزشتہ شب کے واقعات کا بھی دباؤ تھا اور آج اس میں مزید اضافہ ہوا اس لئے تم۔۔۔"

"تمہارا مطلب ہے میں پاگل ہوگئی ہوں' سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوگئی ہوں؟" کاجل نے چلا کے کہا اور پھر رونا شروع کر دیا۔

"آئی ایم سوری کاجل! میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا" رابعہ نے کہا۔

"تم سب۔۔۔ نہیں سمجھو گے" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی "میں کسی جھوٹی تسلی! بے بنیاد بہلاوے اور خواہ مخواہ کی دلجوئی سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ خود میری عقل کے دلائل بھی وہی ہیں جو تمہارے۔ کہ مجھے تحقیق' تحقیق اور تصدیق کے نتائج کا انتظار کرنا چاہئے۔ مگر ایک بات جو میرا دل کہتا ہے' میری چھٹی حس بتاتی ہے وہ ساری دلیلوں پر بھاری ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کچھ ہوا ہے! ہونے والا ہے۔"

ہم سب خاموش رہے۔ کسی کے پاس اب کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

کاجل نے پھر آنسو صاف کئے اور بولی "مجھے۔۔۔ اس طرح بات نہیں کرنی چاہئے تم سے۔ تم ہی تو اب میرے لئے سب کچھ ہو۔ میرا سہارا' میرے دوست' میرا خاندان۔ رابعہ باجی! میں پاگل ہوں' سارا زمانہ جانتا ہے۔ نہیں ہوں تو ہو جاؤں گی۔"

رابعہ نے اس کے سر کو کندھے سے لگا کے تھپکا "خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم رات یہیں رہو گی تو پاپا تمہیں گھر پر ملیں گے۔"

میں نے بہتر سمجھا کہ موضوع بدل دیا جائے "کاجل! وہ ذرا نیور ملا تمہیں؟ کوئی بات ہوئی اس سے؟"

"نہیں۔ ابھی تو نہیں ہوئی" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی "اس کے لئے مجھے اس کے گھر جانا ہوگا۔ آج رات۔ صبح وہ سب کچھ کرے گا۔"

میرے دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی۔ وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں تھا' وہ کاجل کی نظروں نے اور اس کے لہجے نے بیان کر دی تھی۔ کیا میرے سوا کسی نے کچھ نہیں سمجھا تھا؟

یہ صرف میرے شکی مزاج میں پھیلی ہوئی بے اعتمادی کی دھند سے نمودار ہونے والا خیالی پیکر تھا۔ وہ رات کو کیوں جائے گی؟ اور اس کے گھر جانے کی ضرورت کیوں؟ کیا وہ خود نہیں آ سکتا؟ صبح وہ سب کچھ کرے گا۔ کیا اس لئے کہ اسے وہ سب مل جائے گا جو وہ چاہتا ہے۔ کاجل جیسی شعلہ ساماں شباب اور سیمابی حسن رکھنے والی لڑکی آخر کتنے دشمنوں کو دوستی کا خراج دے گی؟ نہیں۔ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔ اگر ایک بھارتی سورما نے اس کو رشوت میں حاصل کر لیا تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کاجل اپنی ہر ضرورت کو اپنی ذات کی رشوت سے پورا کرتی ہے۔

"میں اب جاتی ہوں' صبح فون کروں گی" اس نے کہا "ابھی صرف اس لئے آئی تھی کہ میرے نہ آنے سے تم پریشان ہو جاتے اور نہ جانے کیا کیا سوچتے۔ صبح تک کچھ مت کرنا۔ اس گھر سے باہر بھی مت نکلنا۔ خدا نے چاہا تو کل ہم ایک ساتھ نکلیں گے۔"

"شکاری کا۔۔۔"

"وہ بھی ہو جائے گا کل۔۔۔ صبح۔۔۔" اس نے جھنجلا کے کہا "جیسے الہ دین کے چراغ کا جن تھا' ایسے ہی میرے قبضے میں ایک جن ہے۔"

میں نے کہا "الہ دین کا چراغ تم خود ہو؟"

اس کا چہرہ بجھ گیا۔ اس نے بڑی زخمی اور شکایت کرنے والی' فریادی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اس کی کاجل بھری آنکھوں نے تڑپ کے کہا۔ تم بھی ایسا کہتے ہو سکندر؟۔۔۔۔۔ (YOU TOO BRUTUS) اور اس ایک نظر سے وہ راز فاش کر دیا جو شاید ابھی تک محض گمان تھا یا ذرا سا خیال تھا اور پردے کے پیچھے چھپے ہوئے چور کا سایہ تھا۔

کاجل ایک دم اٹھی اور باہر نکل گئی۔ کسی نے اسے کچھ بھی نہیں کہا تھا مگر وہ گھر سے اس عورت کی طرح گئی تھی جو چوری چھپے رات بھر باہر رہنے کے بعد مٹھی میں اپنی کمائی دبائے گھر لوٹتی ہے۔ رابعہ' ناز اور غالب نے محض ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے گریز کیا ورنہ ہم سب مزید شرمندہ ہوتے۔

سیف اللہ نے رات کے کھانے کے بعد مجھے باہر بلایا۔ مرجان کی زبان اب کچھ کھل گئی تھی۔ وہ اندر ناز اور رابعہ سے باتیں کر رہی تھی۔ اپنے بچپن کی' جوانی کی' شادی کی' اپنے گھر کی اور گھر والوں کی۔ اس سادہ دل اور سادہ لوح عورت کو ان باتوں کے علاوہ کوئی بات کرنی نہیں آتی تھی۔ غالب کچھ دیر پہلے سیف اللہ کے بچے کو ساتھ لے کر مولوی صاحب کے بارے میں معلوم کرنے گیا تھا۔

"ہم کو تمہارا یار بولا' تم پٹھان ہے؟ تمہارا باپ رزیر خان تھا۔"

میں نے کہا "اگر سب خان پٹھان ہوتے ہیں تو پھر میں انکار نہیں کر سکتا۔ میرا اپنا نام پہلے کبیر خان تھا مگر اب میں ان چیزوں کا

قائل نہیں۔ میں پہلے مسلمان ہوں' پھر پاکستانی۔ انسان تو ہم سب ہیں۔"

وہ چپ ہو گیا "ہاں۔ تم ٹھیک بولا۔ ہمارا ایک کام کرے گا؟ ہم تمہارا احسان۔۔۔"

"احسان کی بات کرو گے تو میں کوئی کام نہیں کروں گا۔ ویسے تمہارا حق بنتا ہے کہ تم مجھ سے جو کہو وہ میں مانوں" میں نے کہا۔

"پکا وعدہ۔ ابھی ہاتھ ملاؤ" سیف اللہ نے کہا "اپنا بات یاد رکھنا۔" میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا مگر میں الجھن میں پڑ گیا تھا۔ سیف اللہ نے کسی عیار شکاری کی طرح مجھے میرے ہی الفاظ کے شکنجے میں کس لیا تھا۔

"تم بولا کہ میرا ہر بات مانے گا؟"

میں نے کہا "اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم کہو' مجھے گولی مار دو تو میں ریوالور نکال لوں گا۔"

وہ ہنسنے لگا "خوا ابھی ہم معذور ہے' پاگل نہیں ہوا ہے۔ ہم کو تمہارا مدد کا ضرورت ہے۔ بولو مدد کرے گا؟"

"مدد ضرور کروں گا خواہ اس کے لئے مجھے جان بھی دینی پڑے۔"

"جان دینے کی ضرورت نہیں' بہت چھوٹا سا کام ہے" وہ بولا "اور تم کر سکتا ہے۔ صرف تم اور تمہارا دوست لوگ۔"

میں نے کہا "کام بتاؤ سیف اللہ۔"

اس نے کہا "ہمارا بیوی بچہ کو لے جاؤ اپنا ساتھ۔ واپس پاکستان۔"

"ا!" میں نے کہا "اور تم۔۔۔"

"میرا بات چھوڑ دو۔ ابھی جو میں بولا۔۔۔"

میں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے سیف اللہ؟"

"آہستہ بولو۔ تم زبان دیا ہے' مردوں والا وعدہ کیا ہے کہ میرا بات مانے گا' میرا مدد کرے گا" سیف اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اس حالت میں تم کیسے جا سکتے ہو؟"

"میں اپنا نہیں بولا۔ مرجان کا اور اپنا بچہ کا بات کیا۔ ادھر ہم رہ سکتا ہے۔ وہ نہیں رہ سکتا۔"

"تم بھی اکیلے کیسے رہ سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

"اس کا فکر تم مت کرو۔ ہم تم کو مدد کا واسطے بولا ہے۔ یہ کام تمہارا واسطے مشکل نہیں ہے" سیف اللہ نے سرگوشی کی۔

"سیف اللہ! کیا مرجان مان جائے گی؟ کہ اس حالت میں تمہیں یہاں چھوڑ دے اور اپنے بچے کے ساتھ ماں باپ کے گھر پہنچ جائے۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو اسے تو واقعی پاگل ہو گئے ہو۔ وہ تمہارے ساتھ مر جائے گی مگر تمہارا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔ یہ مشرق کی ریت ہے' ہماری روایت ہے۔"

"اس کو ہم راضی کرے گا۔"

"اس کا راضی ہونا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سورج کا مغرب سے نکلنا۔"

"ضرور نکلے گا یار! ہم تھوڑا سا جھوٹ بولے گا۔ ایسا جھوٹ اللہ معاف کرتا ہے جو زندگی بچانے کا واسطے بولا جاتا ہے۔"

"کیا جھوٹ بولو گے تم؟" میں نے پریشان ہو کے کہا۔

"ہم بولے گا کہ تم سکندر خان کا ساتھ جاؤ۔ گاڑی میں ہم تو اس میں نہیں جا سکتا مگر ہمارا بندوبست بھی ہو گیا ہے۔ ہم کو ایک ٹرک والا لے جائے گا۔ چارپائی کا ساتھ اٹھا کے ٹرک میں ڈالے گا۔"

"لیکن اس کے بعد یہ ہوگا کہ تم اکیلے پڑے رہو گے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کے تم ایک قدم بھی چلو تو تمہیں جیسا کسی کا سہارا کافی نہیں ہوتا۔ تمہاری دوسری جیسا کسی مرجان ہے۔ وہ تمہیں سنبھالتی ہے' کھلاتی پلاتی ہے' صاف ستھرا رکھتی ہے۔ اس کے چلے جانے کے بعد تم بھوکے پیاسے پڑے رہو گے۔ تمہیں پوچھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ تم گر گئے تو اٹھانے والا نہیں ہوگا۔ نہیں سیف اللہ میں یہ نہیں کر سکتا۔ مجھے وعدہ شکن اور جھوٹا کہلانا منظور ہے۔ تم مجھے احسان فراموش کہو یا کچھ اور میں برا نہیں مانوں گا۔"

اس نے بے بسی سے کہا "خیر یار! تم وعدہ نبھا سکتا ہے تو کیا فائدہ؟"

"یہ وعدہ نہیں ظلم ہے۔ میں نے ظلم کرنے کا وعدہ نہیں کیا تھا" میں نے الجھتے ہوئے کہا "میں تم کو یہاں کسمپرسی کے عالم میں چھوڑ کر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہاں' میں کوشش کروں گا کہ تم سب کے لئے واقعی کسی ٹرک کا بندوبست ہو جائے مگر یہ وعدہ نہیں ہے۔"

"خوا ایک بات سنو۔ سمجھو" وہ بولا۔

میں پھر بیٹھ گیا "کوئی اور بات ہے تو کہو۔"

"دیکھو یار! مرجان کو چھوڑ دو ادھر۔ کلیم اللہ کو لے جاؤ۔ اس کا لئے جگہ ہو گا تمہارا گاڑی میں۔ اس کو بچا لو ان ظالموں سے۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "کیا مرجان مان جائے گی؟"

"مرجان کو ہم راضی کرے گا۔"

میں نے سہلا کے کہا "یہ بہت بڑی آزمائش ہے میرے لئے سیف اللہ۔ بہت مشکل کام ہے۔ اتنی بڑی ذمہ داری کا بوجھ مت ڈالو مجھ پر۔"

"وہ تو چھوٹا لڑکا ہے سکندر خان۔ تم اٹھا سکتا ہے اس کو۔ اس کا باپ کو بھی اٹھا سکتا ہے تم" سیف اللہ مسکرانے لگا۔

میں نے کہا "مجھے سوچنے دو' اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے دو اور تم بھی مرجان سے بات کر لو۔ وہ بھی کہے گی تو میں کلیم اللہ کو لے جاؤں گا۔"

"ابھی پھر وعدہ کرتا ہے' اپنا کر دیا؟"

میں نے کہا "نہیں' یہ پکا وعدہ ہے۔ صبح پتہ چلے گا کہ مرجان کیا کہتی ہے۔ بلکہ میں خود پوچھوں گا اس سے۔ یہ بھی بتا دوں گا کہ کلیم

اللہ کو کہاں لے جانا ہوگا اور کس کے حوالے کرنا ہوگا۔"

"بڑا مہربانی" اس نے میرا ہاتھ دبایا "ہم تمہارا احسان نہیں بھولے گا۔"

میں نے بگڑ کے کہا "پھر وہی احسان کی بات! کیا میں غیر ہوں؟"

وہ ہنسنے لگا۔ عجیب کھوکھلی' ویران اور نوحہ خواں ہنسی تھی اس کی "اچھا یارا! ابھی تم اس کا چاچا ہے' ہمارا بھائی ہے۔ ٹھیک؟"

"ٹھیک" میں نے کہا "لیکن سیف اللہ! تم بھی ایک وعدہ کرو کہ مرجان سے زبردستی کچھ نہیں منواؤ گے۔"

"زبردستی۔ توبہ ذرا۔ کیا ہم اس کو مارے گا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ زبردستی زبان سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً تم اسے اپنی قسم دے دو تو وہ کیا کرے گی۔"

"وہ بھی جانتی ہے سکندر خان! ہم ادھر محفوظ نہیں ہے اور ابھی تو معذور آدمی ہے۔ اپنا حفاظت نہیں کر سکتا تو بیوی بچہ لوگ کو کیسے بچائے گا۔ اللہ اس کو زندگی دے۔ ہمارا کیا ہے' قسمت میں ہوگا تو پھر ملے گا۔ اپنے گھر' اپنے خاندان سے۔"

میں نے کہا "تم تو سب کو چھوڑ آئے تھے۔"

"ایسے چھوڑنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ خون کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ ابھی ہمارا وہ چاچا بھی نہیں ہے۔ اس کا کوئی اولاد نہیں تھا۔ سارا زمین ہمارا بھی کو ملا۔ وہ بولتا ہے بھائی ادھر آؤ' اپنا حصہ لو۔ خو حصہ ہم کیا کرے گا یارا۔ یہ کافی ہے کہ اپنا لوگ بلاتا ہے۔ اپنا ادھر کون تھا۔" وہ سخت جذباتی ہو رہا تھا۔

غالب کچھ دیر بعد آگیا۔ مولوی صاحب کا ابھی تک کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ اچانک کہاں چلے گئے۔ رات کو کھانے سے فراغت پاتے ہی رابعہ اور شاذو نے مرجان کو اپنے تجربات سنانے شروع کیے تو وہ ان کی آپ بیتی کو ایسے سنتی رہی جیسے یہ جن بھوت چڑیلوں اور پریوں کی الف لیلوی داستان ہے۔

میں نے اور غالب نے صحن میں سیف اللہ کی چارپائی کے ساتھ ہی بستر بچھالیا۔ رات گئے تک وہ اپنے گاؤں' آباؤ اجداد' ان کی رقابتوں اور روایتوں' محبتوں اور نفرتوں کے قصے سناتا رہا۔ اچانک وہ جو اپنوں سے خون کے سب رشتوں کو توڑ کے آیا تھا' اپنی عمر گزشتہ کی کتاب کا ہر ورق پلٹتے ہوئے ماضی کی جانب لوٹ گیا تھا۔ اس کی حالت بالکل اس شخص جیسی تھی جو زندگی کی آخری سرحد پر پلٹ کر دیکھے تو آرزو کے سراب کا شکار ہو جائے اور خواہشات کے طلسم کا اسیر ہو کے گزری ہوئی زندگی کی تمنا کرنے لگے کہ ایک بار اور' صرف ایک بار پھر وہ صبح و شام لوٹ آئیں' وہ لوگ مل جائیں جو بچھڑ گئے تھے۔ پرانی خوشی کے جذبے اور شفقتی خوشی سے بھرپور لمحے پھر اپنے نئے پن کا احساس جگانے آجائیں۔ ایک زندگی اور مل جائے تو تمام حسرتیں پوری ہوں۔ وہ سب نہ ہو جو نارسائیوں کا قرض بنا۔ ایک زندگی کا تجربہ دوسری بار بہتر طور پر

جینے کے کام آتا ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ مقدر کی نارسائی سے ہی زندگی کامیابی کا غرور لٹتا ہے۔ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا۔ میں سیف اللہ کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا تھا اور میرا دل غم کے احساس سے بوجھل تھا کیوں کہ اس کی یادوں میں محرومی کا دکھ تھا' امید کی دولت تہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ واپسی ممکن نہیں رہی۔ کلیم اللہ کو وہ مرنے والے کل کے لیے اپنے سفیر کے طور پر بھیج رہا تھا کہ وہ سب جو اسے بھول چکے تھے' اس کے بیٹے کو باپ کے حوالے سے جانیں اور کہیں کہ وہ ہے سیف اللہ کا بیٹا۔ بالکل اپنے باپ پر گیا ہے تاہم۔ وہ ہو بہو سیف اللہ کی تصویر ہے۔

نہ جانے کب سیف اللہ خاموش ہوا۔ میں اس کی باتیں سنتے سنتے اپنے خیالوں کی دنیا میں پرواز کرنے لگا تھا' گل اور محسن کے ساتھ۔ کیا ان کا جہاز لاہور کے ہوائی اڈے پر اتر گیا ہوگا؟ کراچی سے ان کو لاہور کی فلائٹ مل گئی ہوگی؟ اس وقت وہ کہاں ہوں گے؟ منظر کے گھر میں یا کراچی میں انعام شیخ کے ساتھ اس کی جیپ میں پھر رہے ہوں گے؟ اسے وہ سب بتا رہے ہوں گے جو ہم سب پر بیتی۔

اچانک غالب نے کہا "یار! ہم نے محسن سے وعدہ کیا تھا کہ اسے منظر کے گھر فون کریں گے۔"

"بھولا تو میں بھی نہیں ہوں یار مگر مسئلہ یہ ہے کہ فون کہاں سے کریں اور کیسے کریں؟"

"ہاں اس کے لیے باہر جانا پڑے گا۔"

"بہت دور جانا پڑے گا" میں نے کہا "اور کوئی ایسا فون تلاش کرنا پڑے گا جس کا مالک ہمیں غیر بنگالی سمجھنے کے باوجود فون کرنے کی اجازت دے دے' اور وہ بھی کراچی۔"

"ہم انگریزی میں بات کر سکتے ہیں۔"

"لہجے کو پھر بھی نہیں چھپا سکتے۔ بنگالی اور طرح سے انگریزی بولتے ہیں۔ جیسے مدراسی' پٹھان یا کوئی اور زبان بولنے والے۔"

غالب نے کہا "اس سے یہ تو معلوم ہو جاتا کہ وہ خیر و عافیت کے ساتھ منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"

میں نے کہا "منزل! منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی۔ جب سفر آغاز کیا تھا تو منزل کا مفہوم کچھ اور تھا۔ آج منزل کا مطلب ہے مقام آغاز سفر۔"

"یہی ثابت ہوا کہ مسافر' راستے' منزلیں سب وقت کے ساتھ بدل جانے والی چیزیں ہیں" غالب نے کہا۔

"گردش رنگ چمن ہے ماہ و سال عندلیب۔"

غالب نے کہا "یہ میں نے فرمایا تھا۔ میں کبھی غلط نہیں فرماتا۔"

میں نے کہا "مرزا غالب کی طرح صبح تک تمہارا ابھی بس نام رہ جائے گا۔ سردی کا یہی حال رہا تو پہلے تمہیں ڈبل نمونیہ ہوگا پھر ڈبل

ڈولی۔"

"میں خود کو ایک بہت بڑی تتلی کی طرح جمتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ کچھ دیر میں دانت بجنے لگیں گے' پھر کوچ کا نقارہ بجے گا۔"

"اب تو مجھے نیند نہیں آئے گی' ڈنکی ٹو بیٹ کی نیند ہوگی۔ اس کا کوئی علاج ضروری ہے۔"

جناب نے کہا "سیف اللہ کو دیکھیے اور قوت ارادی کو بطور کمبل استعمال کیجیے۔ ایمان کی حرارت سے کام چلائیے یا فرض کر لیجیے کہ جون کا مہینہ ہے۔"

میں نے مایوسی سے بند کمرے کی طرف دیکھا۔ "کتنی بے مروت ہیں یہ لڑکیاں بھی۔ دروازے بند کر کے سو گئی ہیں مزے سے۔"

غالب نے کہا "ایک تجویز ہے۔"

"پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

غالب نے کہا "کائنات کے اسرار و رموز اور سائنسی نظریات پر غور فرمانے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چارپائی کو دو طرح سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

"پیدا ہونے کے لیے اور مرنے کے لیے۔"

"نہیں۔ ایک آدمی اس کے اوپر سو رہا ہو تو دوسرا نیچے بھی سو سکتا ہے" غالب نے کہا "چاروں طرف چادر لٹک رہی ہے۔ ہوا راست ہوا اور خنکی سے کچھ بچاؤ ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "مرزا! میں شرمندہ ہوں۔ میں تمہاری ذہنی سطح کے بارے میں بہت غلط رائے رکھتا تھا۔"

چارپائی تین فٹ' چھ فٹ کے مدفن کی طرح تھی جس کے نیچے ہم مردوں کی طرح سیدھے لیٹنے پر مجبور تھے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ نسبتاً باہر کے مقابلے میں کم سردی تھی۔

کچھ دیر بعد غالب نے کہا "یار! محسن اور گل نے ہمارے فون کا انتظار کیا ہوگا۔ فکر کر رہے ہوں گے۔"

"کرنے دو۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ ہم فون کرنے جائیں اور فون ہو جائے ہمارا۔ پھر وہ ساری عمر انتظار کرتے رہیں۔" میں نے چادر سے ہاتھ باہر نکال کے جوتا اٹھایا "یہ لو۔"

"کیا کروں اس کا؟" غالب نے بے خیالی میں جوتا پکڑ لیا۔

"کھاؤ۔ تمہارا منہ ایسے ہی بند ہوگا۔ میں سونا چاہتا ہوں۔"

غالب نے آہ بھری "جو نے کہا کہ ہی سونا ہے ہمارے نصیب میں۔ نہ جانے وہ دن کب آئے گا جب خوشبوؤں سے مہکتی خواب گاہ میں۔۔۔"

میں نے کہا "اس کے بعد کا سین شب میں خواب میں دیکھ لینا۔"

علی الصبح سیف اللہ نے شور مچایا "مرجانا! او مرجانا! دیکھ کوئی ہمارا مہمانوں کو اٹھا کر لے گیا۔"

مرجان نے جائے واردات کا معائنہ کیا اور حاوتا کہا "ہاں۔"

میں نے چادر اٹھا کے سر نکالا اور کہا "السلام علیکم۔"

غالب بھول گیا کہ وہ چارپائی کے نیچے ہے۔ اس نے پڑیا کے اٹھنے کی کوشش کی تو اس کا سر پٹی سے لگا۔ سیف اللہ اور ہنسنے لگا۔ پھر اپنی بیوی پر خفا ہونے لگا کہ اس نے سردی کا خیال کرتے ہوئے ہمیں دو کمبل کیوں نہیں دیے تھے۔ جب بیوی نے خاموش نظروں سے اسے یاد دلایا کہ گھر میں یہی ایک کمبل بچا تھا تو وہ چپ ہو گیا۔

سیف اللہ سارا دن لیٹا رہتا تھا اور جلد سو جانے کا عادی تھا۔ وہ منہ اندھیرے اٹھ گیا تھا۔ ہم بہت دیر سے سوئے تھے مگر مرجان نے گرم سبز چائے پلائی تو ہماری آنکھوں سے نیند کا خمار غائب ہو گیا۔ میں نے صبح وطن کا تصور کیا اور ان بے شمار صبحوں کا جو مسافرت کی مختلف منزلوں میں آئیں۔ یہ ایک اور صبح تھی جو اپنا الگ انداز رکھتی تھی۔ شاید یہ نوید سحر والی صبح تھی۔ اپنے ہی وطن میں ہم پر تنگ ہو جانے والی زمین کی آخری صبح تھی۔ زہر کے موسم کی الوداعی صبح تھی۔ اگلی صبح کہاں ملے گی اور اس کے بعد کتنی صبحوں کی مسافت ہوگی' صبح وطن کی دید تک۔

دروازے پر دستک سن کے میں نے خالی گلاس نیچے رکھ دیا۔

"کون آگیا اتنی صبح؟" سیف اللہ نے قدرے پریشانی سے کہا۔

"میں دیکھتا ہوں" غالب بولا۔

اس نے ایک ہاتھ اپنی جیب میں رکھا اور کنڈی کھول کے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے بالکل پیچھے میں آنے والوں کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھا اور آنے والا غلط عزائم کے ساتھ آتا تو اسے صبح کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوتا لیکن وہ ایک مظلوم صورت' ہکا بکا قسم کا نوجوان تھا جو بعد میں مخبوط الحواس بھی ثابت ہوا۔ اس کا جسم بہت بڑا تھا اور دماغ بہت چھوٹا۔

اس نے دانت نکال کے کہا "ہم کو مس کاجل نے بھیجا ہے۔ ہمارا نام تو سیدھ ہے مگر وہ ہمیں سوریا کہتی ہیں۔"

"سوریا یا سرسے؟" غالب نے اس کی آنکھوں میں پائی جانے والی سرے کی کثیر مقدار پر غور کر کے کہا۔

"آپ کی تشریف آوری کا مقصد؟" میں نے کہا۔

"ہم سے مس کاجل نے کہا کہ سوریا! ہمارا ایک کام کرو گے؟ ہم نے کہا کہ ہم تو غلام ہیں آپ کے۔"

"وہ خود کہاں ہیں؟"

"کون؟ مس کاجل؟" وہ دھوتی کا کونا اٹھا کے ناک صاف کرنے لگا "ہم ان کے ساتھ تھے رات بارہ بجے تک۔ ایک عینک والا گنجا اور پالسی کی طرح رنگا نوری تھا' اس سے ملنے گئے تھے۔ پتا نہیں وہ کون تھا۔ اکیلا تھا اتنی بڑی کوٹھی میں۔ ہم نے تو آسانی سے اس کا گلا بھی گھونٹ دیا۔"

میں اچھل پڑا "کیا! گلا گھونٹ دیا؟ مار دیا اسے؟"

"ہم نے بس گلا دبایا تھا' وہ خود ہی مر گیا" سوریا نے یوں کہا

جیسے یہ کسی کو قتل کرنے کی بات نہیں، کسی معمولی واقعے کا تذکرہ ہے۔

"سوہا!" میں نے کہا "یہاں بیٹھو آرام سے۔ تم نشے میں تو نہیں ہو؟"

اس نے سادگی سے کہا "ہم نشہ کرتے ہیں۔ چرس پیتے ہیں۔ چرس ہوگی آپ کے پاس؟"

میں نے اسے ایک سگریٹ دی "تو را پھر بتاؤ، تم کہاں گئے تھے مس کاجل کے ساتھ؟ کس کے گھر؟ پھر کیا ہوا تھا؟"

اس نے وہی سب دہرا دیا "ہم کو مس کاجل لے گئی تھیں۔ ہم یہ نہیں جانتے وہ کون تھا۔ ہم تو پہلے کبھی اس کے گھر بھی نہیں گئے تھے۔"

"پھر تم نے کیوں قتل کر دیا اسے؟" غالب نے جھنجلا کے کہا "یار، تم نے غضب کیا ہے۔ خود تو پاگل ہو، ہمیں بھی کر دو گے۔"

"یار، ایسے بات مت کرو اس سے۔ یہ بیچارہ ذہنی طور پر بچہ ہے۔ اور پسماندہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کاجل نے اس کو کسی خاص مقصد کے لئے استعمال کیا تھا" میں نے غالب کو ایک طرف لے جا کے کہا۔

"اچھا تم ان پوچھو اس سے جو پوچھنا ہے۔"

میں نے کہا "سوہا! تم کیسے جانتے ہو مس کاجل کو؟"

اس نے سوال پر غور کیا "ہم۔۔۔ بس جانتے ہیں۔ ان کے گھر میں ہی رہتے ہیں ہم۔"

"اچھا مس کاجل نے کہا کہ اس آدمی کو مار دو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "جب وہ اندر گیا تو مس کاجل نے ہم سے کہا کہ سوہا، جب یہ دوبارہ آئے تو اس کی گردن پکڑ لینا اور خوب دبانا۔ اتنے بڑے بڑے ہاتھ ہیں تمہارے۔ بد بچھو" اس نے اپنے پنجے پھیلا کے فخر سے کہا۔

"تراتی۔ بہت طاقت ور بھی ہو تم۔"

وہ خوش ہو کے دانت نکالنے لگا "اس کی گردن بہت پتلی تھی۔ ہم نے آسانی سے دبا لی۔ مس کاجل نے کہا شاباش۔ چھوڑنا نہیں ابھی۔ جب تک میں نہ کہوں۔ ہم تو ساری رات نہ چھوڑتے۔ وہ ٹانگیں چلاتا رہا۔ پھر مر گیا تو ہم نے مس کاجل کے حکم پر اسے چھوڑ دیا۔"

"اس کے بعد؟" میں اور غالب دم بخود بیٹھے رہے۔

"اس کے بعد؟" وہ سوچ کے بولا "ہم کو مس کاجل نے باغ میں ایک جگہ دکھائی۔"

"کون سے باغ میں؟"

"اسی گھر کے پیچھے چھوٹا سا باغ تھا۔ اس میں ایک الو بھی تھا۔" وہ ہنسنے لگا "مس کاجل نے ہمیں کدال اور بیلچہ دیا اور کہا سوہا، یہاں گڑھا کھودو اور اس لاش کو دبا کے مٹی برابر کر دو۔ کر لو گے یہ کام؟ ہم نے کہا یہ کون سا مشکل کام ہے۔ پھر وہ چلی گئیں۔"

"چلی گئیں۔ کہاں چلی گئیں؟"

"ہمیں کیا معلوم" وہ بولا "ہم تو اپنا کام کرتے رہے۔ ہم نے گہرا گڑھا کھودا۔ پھر اس عینک والے گنجے کو اٹھا کے لائے اور اس میں ڈال کے مٹی برابر کی۔ پھر ہم وہیں بیٹھے رہے۔"

"کیوں؟ پولیس کا انتظار کرتے رہے؟" غالب بولا۔

میں نے اسے گھور کے دیکھا "تم کو مس کاجل کہہ گئی ہوں گی کہ ہماری واپسی کا انتظار کرنا۔"

"ہاں۔ یہی کہا تھا انہوں نے۔ ہم پولیس کا نہیں مس کاجل کا انتظار کر رہے تھے" وہ بولا۔

"پھر وہ کب آئیں؟"

"وہ نہیں آئیں" سوہا نے اداسی سے کہا "انہوں نے کسی اور کو بھیج دیا۔"

"کسی اور کو؟ کون تھا وہ؟"

"ہم نہیں جانتے۔ بس اس نے آ کے پوچھا سوہا کام ختم ہو گیا؟ ہم نے کہا کہ ہو گیا مگر مس کاجل کیوں نہیں آئیں؟ اس نے کہا کہ انہوں نے بلایا ہے تمہیں۔ فوراً چلو میرے ساتھ۔ ہم اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کے آ گئے۔ مس کاجل کہاں ہیں؟"

"مس کاجل؟" میں نے گڑبڑا کے کہا "کیا اس نے کہا تھا کہ وہ یہاں ملیں گی؟"

"ہاں۔ اس نے بتایا تھا کہ اس گھر میں چلے جاؤ۔"

"وہ خود کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

سوہا نے کہا "ادھر۔ گلی ختم ہوتی ہے وہاں کار میں بیٹھا ہے۔"

"الو کا پٹھا" غالب نے دانت پیس کے کہا "پہلے نہیں بتا سکتا تھا یہ بات۔"

"اس کا کوئی قصور نہیں۔ تم اسے روکو، میں دیکھ کر آتا ہوں" میں نے انگریزی میں کہا۔

"یار، میں اس گوریلے کو کیسے روکوں گا؟"

"اسے کہو کہ مس کاجل ابھی آتی ہیں۔" میں نے کہا اور خود باہر نکل گیا۔ سوہا ذہنی طور پر قابل رحم تھا اور اس کی باتوں نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا بلکہ سچ تو یہی بول رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس بچے کو کاجل نے ایک آدمی کی جان لینے اور اسے زمین میں دفن کرنے کے لئے کیوں استعمال کیا تھا؟ وہ آدمی کون تھا اور جو سوہا کو یہاں لایا ہے وہ کون ہے؟

ان سوالات کا جواب ایک سیاہ ڈاٹسن جیپ سے ملا جس میں ایک چرسی اور لمبی مونچھوں والا کریہہ صورت شخص تھا جو غیر ملکی ساخت کا کالا چشمہ چڑھائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کے اس نے شیشہ اتارا اور منہ باہر نکال کے پان کی پچکاری ماری۔

"ارے بابو! ادھر تو" اس نے بدتمیزی سے کہا "اتنی دیر سے آیا ہے تم۔"

میں نے قریب جا کے کہا "تم نے مجھ سے کہا ہے کچھ؟"

"اور کیا ہوا سے باتیں کر رہا ہوں؟" وہ بولا۔

میں نے دروازہ کھول کے اسے باہر کھینچ لیا "پہلی بات تو یہ کہ مجھے دوبارہ بابو مت کہنا۔ بابو ایک گالی ہے میرے لئے۔ انگریزوں نے جو غلام ابن غلام کلرک پیدا کئے تھے وہ بابو تھے۔ میں ایک عزت دار اور خود دار شہری ہوں۔ دوسری بات یہ کہ میں بدتمیزی پسند نہیں کرتا۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "بڑی گرم چیز ہے تو بابو۔"

میں نے کہا "تم بھی بہت بگڑے ہوئے ہو۔ بہت کچھ سکھانا پڑے گا تمہیں۔ ابھی تو بات کرنی بھی نہیں آتی تمہیں۔"

اس نے کہا "تم کو میرے ساتھ چلنا ہے۔ ابھی۔ میں نے اس پاگل کے بچے کو بھیجا تھا کہ فوراً تم کو بلا لائے۔ وہ بیٹھ گیا ہوگا اپنی کتھا سنانے۔"

"تم کو کاجل نے بھیجا ہے؟"

وہ بے شرمی سے مسکرایا اور آنکھ مار کے بولا "کوئی اعتراض؟"

میں نے غصے کو پی کر کہا "اعتراض نہیں، ثبوت۔ کیا ثبوت ہے کہ تم کو کاجل نے بھیجا ہے؟"

"ثبوت کاجل سے پوچھنا یا اس سوہا سے پوچھو۔ فالتو باتیں مجھے پسند نہیں ہیں۔ چلنا ہے تو چلو میرے ساتھ ورنہ میں واپس جا کے اسے بتا دوں گا کہ تم نے ساتھ آنے سے انکار کر دیا۔"

"خود کاجل کہاں ہے؟"

"کاجل!" وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا "میرے گھر میں۔ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جلدی کرو۔ ورنہ نکلنا مشکل ہو جائے گا۔"

میں نے کار پر اور اس کی نمبر پلیٹ پر ایک نظر ڈالی "یہ گاڑی کس کی لائے ہو؟"

"میں اب کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ تم کیا تھانیدار ہو کر مجھ سے تفتیش کر رہے ہو؟ جو پوچھنا ہے کاجل سے پوچھنا۔ [illegible] کرو۔ بس اس سوہا کو چھوڑ دو۔"

میں چلتے چلتے رک گیا "کیا؟ اس کو یہاں چھوڑ دوں؟"

"میں نے بکواس تو نہیں بولی۔ سوہا نہیں جا سکتا ہمارے ساتھ۔ نہ گاڑی میں جگہ ہے اور نہ کوئی عقلمندی ہے اس کو لے جانے میں" وہ بولا۔

"ہاں۔ اس پاگل کو عقل مندوں نے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر لیا۔ اب وہ بے مصرف ہو گیا ہے۔ چلے ہوئے کارتوس کی طرح۔ میں اسے چھوڑ کے نہیں جا سکتا۔"

"تو پھر تم خود رک جاؤ" وہ بولا "سمجھ میں آ جاتا۔"

میں طے کر چکا تھا کہ اپنے غصے کو قابو میں رکھوں گا چنانچہ میں اس حد درجہ بیہودہ اور بدزبان شخص کی ساری بداخلاقی برداشت کر رہا تھا۔ میں ابھی تک سوہا، کاجل اور اس عجیب شخص کے رشتے کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر تھا اور الجھن سے بچنے کا آسان طریقہ یہی تھا کہ وضاحت کاجل سے مانگی جائے مگر اس سے پہلے مجھے اس خطرناک شخص کے ساتھ جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کرنا تھا۔ میں نے رابعہ اور رضا کو تیار ہونے کا حکم دیا اور ایک طرف لے جا کر غالب کو کم سے کم الفاظ میں ساری صورت حال سمجھانے کی کوشش کی "میرا خیال ہے کہ کاجل نے اپنے آپ کو داؤ پر لگا کے یہ بازی کھیلی ہے۔ اس نے سوہا سے کسی کو قتل کرا کے جرم کا نشان بھی مٹوا دیا۔ سوہا کے بیان کے مطابق وہ کوٹھی میں اکیلا تھا۔ کسی نے یہ جرم سرزد ہوتے نہیں دیکھا اور یوں سوہا بچ گیا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو سوہا ہی پکڑا جاتا۔ کاجل صاف بچ جاتی کیونکہ وہ کہیں اور چلی گئی تھی۔"

"کہیں اور کہاں؟"

"غالباً اس خبیث کے پاس۔ مجھے شبہ ہے کہ اس کے اور کاجل کے درمیان ایک غیر قانونی اور غیر اخلاقی سودا ہوا، جس کی رو سے یہ طے پایا کہ یہ شخص ہمیں سرحد پار کرائے گا اور ہمارے لئے سب کچھ کرے گا۔" میں نے کہا "اس کی خدمات مشروط تھیں اور کاجل کو شرائط کا علم تھا۔"

"چنانچہ اس کی خدمات کے بدلے میں کاجل نے وہ سب کچھ کیا جو اس نے چاہا" غالب نے تلخی سے کہا۔

"ہاں۔ یہ سودا غالباً ایسے ہی ہوا۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔"

"یہ کاجل نے اچھا نہیں کیا۔"

"اچھا کیا ہے اور برا کیا، اس کا فیصلہ کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں" میں نے کہا "یہ کاجل کا ذاتی عمل تھا جس کے لئے ہم نے اسے مجبور نہیں کیا تھا۔ اگر ہمیں معلوم بھی ہو جاتا کہ حصول مقصد کے لئے کاجل یہ طریقہ اختیار کرے گی تو ہم اسے منع کر دیتے۔"

"ایسی تیاری پر ہم اسیری کو ترجیح دیتے۔"

"پڑا تھا لیکن اب بے کار ہیں۔" میں نے کہا "اب ہم انکار بھی نہیں کر سکتے ورنہ کاجل کی قربانی اور اس کی تمام جدوجہد رائیگاں جائے گی۔"

"کاجل نے سوہا سے قتل کرایا۔ ایک معصوم بچے کو جو صرف طاقت ور جسم رکھتا تھا، قاتل بنا دیا" غالب بولا "بڑی بے حسی ہے یہ۔ آخر وہ انسان ہے۔ اسے کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح اپنے اشاروں پر چلانا اور اس کے ہاتھوں کسی دوسرے انسان کا خون کرانا، ایسی بے حسی کے ساتھ۔ یہ جرم ہی نہیں"

www.paksociety.com

گناہ ہے سکندر۔ قاتل مجرم۔ کاجل کے اپنے گناہ سے زیادہ شرم ناک۔ اب یہ حرام زادہ کہتا ہے کہ سوہا کو یہاں چھوڑ دو۔"

"پھر تم ہی بتاؤ کہ ہم کیا کریں؟ سوہا کو کیسے ساتھ لے جائیں۔ وہ تو پاگل ہے۔ کہیں بھی چیخ پکار شروع کر دے گی تو ہمیں بھی مروا دے گی" میں نے کہا "ہم سیف اللہ کے بچے کی ذمے داری بھی قبول کر چکے ہیں۔ یہ ہمارے لئے آخری موقع ہے۔"

"سکندر! کیا یہ آدمی بھروسے کے قابل ہے۔ کہیں یہ جھوٹ ہی نہ بول رہا ہو۔ وہ ہمیں کاجل کے پاس نہ لے جائے، کہیں اور لے جائے۔ کیا پتا اس نے کاجل کو بھی مار دیا ہو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"سب کچھ تو ہو چکا ہے سکندر! اب کیا نہیں ہو سکتا۔ وہ گاڑی کس کی لایا ہے؟"

"غیر ملکی گاڑی ہے۔ شیورلٹ امپالا۔"

"کسی کاروان مشن کی؟" غالب نے کہا۔

"میں کیسے کہوں۔ نمبر پلیٹ مہاراشٹر کی ہے۔ گاڑی امریکن ہے، بہت بڑی۔" میں نے کہا "اور میرا خیال ہے اسی بدنصیب کی ہے جسے ہوش سے بیگانگی اور بدحواسی میں سوہا نے خود مار کے اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیا۔ غالباً کار حاصل کرنے کے لئے کاجل نے ایسا کیا۔"

"اس نے تو کہا تھا کہ گاڑی خریدے گی، نمبر پلیٹ بنوائے گی۔" غالب نے برہمی سے کہا۔

"یہ کاجل ہی بتائے گی کہ اس نے مشکل طریقہ کیوں اختیار کیا۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ پہلے اکیلا جاتا ہوں اس شخص کے ساتھ۔"

"وہ کیوں؟" غالب بولا۔

میں نے کہا "یہ دیکھنے کے لئے کہ اس میں کوئی دھوکا تو نہیں ہے۔"

"اور آپ خود شکار ہو گئے دھوکے سے پھر؟"

"اس کی زندگی میرے پاس گروی رہے گی" میں نے کہا "یہ بات میں اسے اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ وہ مجھے لے کر جائے گا تو واپس بھی لائے گا۔ ورنہ میں اس کی لاش سڑک پر پھینک سکتا ہوں اور خود گاڑی لے کر واپس آ سکتا ہوں۔"

"یہ بہت خطرناک کام ہے۔ میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔"

"عقل سے کام لو یار۔ تم لڑکیوں کو تیار کرو۔" میں نے کہا اور غالب کے کچھ کہنے سے پہلے باہر نکل گیا۔

وہ شخص پھر شیشے چڑھائے بیٹھا تھا۔ ان سیاہ شیشوں کے اندر بیٹھا ہوا آدمی نظر نہیں آتا تھا مگر اندر سے باہر دیکھا جا سکتا تھا۔

"اب کیا ہو گیا؟ باقی لوگ کیوں نہیں آئے؟" اس نے شیشہ اتار کے ناگواری سے کہا۔

میں دروازہ کھول کے اس کے ساتھ بیٹھ گیا "میں چل رہا ہوں تمہارے ساتھ۔ باقی لوگ جائیں بھاڑ میں۔"

"کیا مطلب؟"

"میں کوئی بنگالی تو بول نہیں رہا ہوں" میں نے اسی کی بات دہرائی "وہ نہیں جانا چاہتے تمہارے ساتھ تو پھر کہیں بھی جائیں۔ تم چلو۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا "مگر کاجل نے کہا تھا...."

"جو کاجل نے کہا تھا، وہ کاجل پھر کہہ دے گی" میں نے ریوالور نکال لیا "دیکھنا یہ ہے کہ تم کو کاجل نے ہی بھیجا ہے یا اس کے دشمنوں نے؟"

"اوہ۔ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے گویا" اس نے گاڑی سخت غصے میں اسٹارٹ کی اور اتنی تیزی سے واپس لے گیا کہ ایک موتی والا جو مسواک کرتا آ رہا تھا، خود کو بچانے کی کوشش میں دیوار سے ٹکرا گیا۔ بلاشبہ گاڑی بہت اچھی تھی، ڈرائیور اس سے بھی اچھا تھا مگر اس کی صورت سے زیادہ سیرت مکروہ تھی۔ غصے میں وہ اور بھی بھیانک لگ رہا تھا۔ اس نے میرے ریوالور نکالنے پر کوئی احتجاج نہیں کیا تھا اور نہ تعجب۔ اس نے گاڑی چلاتے ہوئے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا اور یہ نہیں پوچھا کہ میں ریوالور پکڑے کیوں بیٹھا ہوں۔

وہ ساٹھ ستر میل کی رفتار سے شہر میں گاڑی دوڑاتا رہا۔ آدھے گھنٹے میں اس نے جتنے موڑ کاٹے، خطرناک انداز میں کاٹے۔ ہر بار مجھے لگتا تھا کہ گاڑی الٹ جائے گی۔ وہ مجھے وحشت زدہ کر کے مجھ پر ایک نفسیاتی غلبہ حاصل کرنا چاہتا تھا اور میں اسے محتاط ڈرائیونگ کا مشورہ دے کر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں خوف زدہ ہوں۔

جب اس نے گاڑی کو ایک دم بریک لگا کے روکا تو میرا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔

وہ مسکرایا "جاؤ، اس دروازے سے اندر جا کے مل لو کاجل سے۔"

میں نے کہا "تم نہیں چلو گے؟"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "میں اور وہ رات بھر مل چکے ہیں۔"

اگر ممکن ہوتا تو یہ بات سن کے میں اسے گولی مار دیتا مگر میں سب کچھ برداشت کرنے پر اور نظر انداز کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو مجھے کاجل کا چہرہ نظر آیا۔ وہ جیسے دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اس کی ظاہری حالت میں "یہ اڑی اڑی سی رنگت، یہ کھلے کھلے سے گیسو۔ تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ۔" والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ بہت نکھری ہوئی اور دھلی دھلائی، بال سنوارے، میک اپ کئے اور بہترین استری کی ہوئی ساڑی باندھے کھڑی تھی۔

"تم.... اکیلے آئے ہو؟ باقی سب کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "میں اس شخص پر آنکھ بند کر کے بھروسا نہیں کر سکتا تھا جس کے ظاہر و باطن سے خباثت ٹپکتی ہے۔ کون ہے یہ؟"

"یہ جابر ہے۔ میں نے کہا تھا...."

"تم نے جو کہا تھا، وہ نہیں کیا اور جو کیا وہ سب غلط تھا مگر میں بحث کرنے نہیں آیا ہوں" میں نے کہا "ایک تو مجھے تصدیق کرنی تھی کہ اسے تم نے بھیجا ہے۔ دوسرے یہ پوچھنا تھا کہ تم سوہا کو کیا سمجھتی ہو؟ وہ انسان ہے یا قربانی کا بکرا؟ تم نے اس سے ایک قتل کرایا، اس قتل کا سراغ مٹوایا اور اب چاہتی ہو اسے لاوارث چھوڑ دیا جائے۔"

کاجل کا رنگ اڑ گیا "اس کے ساتھ رہ کے تم ثواب کمانا چاہتے ہو تو بے شک ساتھ لے آؤ مگر یہ سمجھ لو کہ اس کی موجودگی ہم سب کی زندگی کے لئے موت کا پیغام بن جائے گی۔ تم سنبھالو گے اسے۔ وہ قربانی کا بکرا ہے یا نہیں، انسان کی شکل کا ایک جاندار ضرور ہے جسے برے بھلے اور اپنے پرائے کی تمیز نہیں۔ وہ حالات کے رحم و کرم پر زندہ ہے۔ اس کی بہتری اسی میں ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔"

"یہ تم نے کل رات کیوں نہیں سوچا تھا؟"

"فضول باتیں مت کرو۔ یہ جنگ ہے فنا اور بقا کی۔ جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ جنگ میں اخلاقیات کے اصول کام نہ آئے تو وہ سب نہ ہوتا جو ہو رہا ہے۔ جو میرے ساتھ ہوا...." ایک دم اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور پھر غصے سے دروازہ بند کر کے بھاگ گئی۔

میں چند سیکنڈ بے وقوفوں کی طرح کھڑا رہا پھر شکست خوردگی کے احساس سے مفاہمت کر کے واپس ہوا اور گاڑی کا دروازہ کھول کے بیٹھ گیا۔

جابر کے ہونٹوں پر فتح مندی کی مسکراہٹ تھی "تسلی ہو گئی؟"

میں نے دھاڑ کے کہا "جابر! مجھے مجبور مت کرو کہ میں انجام کی پروا کئے بغیر تمہیں گولی مار دوں۔ اپنی وجہ سے نہیں، دوسرے بہت سے لوگوں کی وجہ سے میں تمہیں برداشت کر رہا ہوں جن کی سلامتی کا میں ذمے دار بن گیا تھا۔ مجھے مشتعل کر کے جان سے جانے کا رسک مت لو۔"

اس نے گاڑی آگے بڑھا دی "میں جان سے جاؤں گا تو تم کیسے جاؤ گے اس دنیا سے؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

باقی راستہ خاموشی سے کٹا۔ اب وہ پرسکون تھا مگر میں اندر سے کھول رہا تھا اور ان سب حقائق کو تسلیم کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو میرے ضابطہ حیات کے اخلاقی اصولوں سے متصادم تھے۔ یہ کام حرام کھانے سے کم مشکل نہ تھا مگر مجبوری آدمی سے سب کچھ کرا سکتی ہے۔

رابعہ اور نازو تیار تھیں مگر ان کے چہرے دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط کر رہی ہیں۔ خود غالب سخت نروس تھا اور کلیم اللہ کا ہاتھ پکڑے کھڑا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور سیف اللہ کی خالی چارپائی پر سوہا سو رہی تھی۔ جابر نے یہ سب نقلی بے حسی کے ساتھ دیکھا۔

"بہت دیر کی تم نے" غالب نے بگڑ کے اور چلا کے کہا۔

میں نے کہا "کیا ہو گیا ہے تجھے؟"

"کچھ نہیں۔ تم چلو سب کو لے کر۔ رابعہ! نازو! کیا سنا نہیں تم نے؟ چلو۔" غالب نے کہا "کلیم کو اپنے ساتھ رکھو۔ جلدی سکندر! ان کو گاڑی تک لے جاؤ۔"

"اور تم؟"

"میں بھی چل رہا ہوں یار" غالب نے کہا "چلو نکلو۔"

اس نے تقریباً مجھے دھکیل کر کنڈی لگا دی۔ رابعہ اور نازو لڑکھڑاتی ہوئی آگے جا رہی تھیں اور کلیم کو اپنے ساتھ کھینچ رہی تھیں۔ غالب نے باہر سے کنڈی لگائی تو میں نے کہا "یار! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

غالب نے ایک لمبی گہری سانس لی "سب ہو چکا جو ہونا تھا۔ اب تو بس نکل چلو۔ تم کیا دیکھ رہے ہو؟ گاڑی چلاؤ۔"

جابر نے اپنی جیبوں میں اور ڈیش بورڈ پر دیکھا "سگریٹ ماچس تھی میرے پاس۔ شاید اندر رہ گئی" وہ اتر کے واپس گیا۔

موقع پاتے ہی میں نے کہا "سیف اللہ اور مرجان کہاں ہیں؟"

"کمرے میں" غالب نے کہا اور میرے ہاتھ میں کاغذ کا ایک رقعہ تھما دیا۔

رابعہ اور نازو پچھلی سیٹ پر تھیں اور غالب بھی انہی کے ساتھ کھڑکی سے لگا بیٹھا تھا۔ کلیم کو انہوں نے اپنے بیچ میں بٹھا لیا تھا۔

"ہم کدھر جا رہے ہیں چاچا؟" وہ بار بار پوچھ رہا تھا۔

"اپنے گھر۔ تم اپنے چاچا کا گھر نہیں دیکھو گے؟" غالب نے کہا۔

"اور بابا؟ اماں۔ وہ پہلے کیوں چلے گئے؟"

جابر کے آتے ہی گاڑی روانہ ہو گئی۔ میں نے بیک ویو مرر میں رابعہ کو روتے دیکھا۔ وہ منہ کھڑکی کی طرف کئے چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ دس سال کے کلیم کو پتا نہ چلے۔ نازو درمیان میں زیادہ مجبور تھی کہ اس سے باتیں کرے، اس سے مسلسل جھوٹ بولتی رہے۔ اسے تسلیاں دیتی رہے اور بہلاتی رہے کہ ہم اس کے ماں باپ سے ملنے ہی جا رہے ہیں۔

گاڑی کے روانہ ہوتے ہی میں نے مٹھی کھول کے وہ کاغذ کا رقعہ نکال لیا۔ اس پر شکستہ خط میں لکھا تھا۔

میرا بھائی، تم پر اللہ کا فضل ہو۔

ابھی ہم اپنا بچہ خدا کے بعد تم کو سونپتا۔ ہم کاغذ پر اس کا گارنٹی لکھتا ہے۔ ادھر تم کسی سے ہمارا والد صاحب کا حویلی پوچھے گا تو

www.paksociety.com

بتائے گا۔ اس کا نام حکمت اللہ تھا اور ہمارا دادا کا نام برکات کو گڑی حکمت بولتا ہے۔ راستہ اچھی طرح سمجھ لو۔ بہت آسان ہے۔ ادھر کلیم اللہ کا بھولا ہے۔ وہ اس کا ماں بنے گا اور اس کا پرورش کرے گا۔ گڑی حکمت پہنچانے کے بعد تمہارا ذمے داری ختم۔ اس دنیا میں ہم تمہارا احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا کہ تم ہمارا خاندان کو واپس اپنا زمین کا مالک اور وارث بنایا۔ ہم جانتا تھا کہ یہ کام اس کا باپ نہیں کر سکتا۔ اللہ نے فرشتہ لوگ کو کلیم کا چاچا بنا کے بھیجا۔ مرجان بے وقوف عورت اس دنیا میں ہمارا بہت ساتھ دیا۔ ابھی ادھر بھی ہمارا ساتھ جانے کا ضد کرتا ہے۔ بولتا ہے ابھی کیا غم ہے۔ کلیم اللہ اپنوں میں پہنچ جائے گا' اپنا زمین کا مالک ہوگا۔ اس کو جانے دو۔ اچھا ہوتا اگر ہم سب ساتھ جاتے لیکن بارا جو اللہ کا مرضی۔ ہم مرجان کو اپنا ساتھ لے جاتا ہے ہمارا غلطی معاف کرنا۔ اللہ ہمارا غلطی معاف کرے کہ ہم اس کی رحمت سے مایوس ہوا۔ اگر زندہ رہتا تو شاید ہم بھی بچ جاتا مگر ہم نہیں بچے گا۔ ہمارا ٹانگ اندر سے ختم ہو گیا ہے۔ اس میں پیپ پڑ گیا ہے۔ زخم کا زہر پھیل رہا ہے۔ ابھی کون علاج کرے گا ہمارا؟ ہمارا بعد مرجان کیسے رہے گا؟ اس لئے ہم مجبور ہے کہ اپنا جان خدا کے حوالے کرے۔ تمہارا بھائی۔

سیف اللہ (مرحوم)

میں نے اس مختصر تحریر کو بار بار پڑھا' یہاں تک کہ اس کا ہر لفظ مجھے ازبر ہو گیا۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا مگر ذہن ضرور ان دو لاشوں کو دیکھے۔ غربت جن کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا۔ ان کو مٹی دینے والا وارث اپنی بے بسی کے احساس سے بے نیاز ہمارے ساتھ جا رہا تھا اور کچھ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ماضی اور مستقبل کو ملانے والا پل عبور کرنے کی اس کے ماں باپ کو کیا قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ ہر پل پر سے گزرتے ہوئے کچھ تو ٹوٹنا پڑتا ہے۔ کلیم اللہ کے والدین نے پل میں اپنی جان دے دی تھی لیکن اپنی آنے والی نسل کو بچا لیا تھا۔

گاڑی رکی تو مجھے ہوش آیا۔ رابعہ اور نازو کے ساتھ کلیم اللہ بھی اتر کے اندر چلا گیا۔ میں نے عمداً اترنے میں تاخیر کی۔

"یہ سب کیسے ہو گیا غالب؟" میں نے پیچھے پلٹ کے دیکھے بغیر کہا "تم تو تھے وہاں۔"

غالب نے کہا "ہاں میں تھا وہاں۔ سب کچھ میں نے کیا اور سب کچھ دیکھا بھی لیکن مجھے بعد میں پتا چلا کہ میں نے انجانے میں کیا کر دیا ہے۔ مجھ سے تو سیف اللہ نے درخواست کی تھی کہ اسے اندر لے جا کر لٹا دوں کیونکہ باہر دھوپ تیز ہے۔ دھوپ واقعی تیز تھی مگر اتنی تیز نہیں تھی کہ ناقابل برداشت ہوتی۔ اس نے ایک طرف سے بیساکھی کا سہارا لیا اور دوسری طرف سے میرے کندھے کا۔ میں نے اسے اندر لٹا دیا تو اس نے مرجان سے پشتو میں کاغذ مانگا جو اس نے کلیم اللہ کے بستے سے نکال کر دیے۔ وہ آرام سے ریوالور کے ساتھ ٹیک لگائے لکھتا رہا۔ کہنے لگا اپنے گاؤں کا پتا لکھ رہا ہوں۔ درمیان میں ہی اس نے مرجان سے کہا کہ وہ درد کی دوا کہاں رکھی ہے جو میں نے تجھے دی تھی۔ مرجان نے ایک زنگ میں سے وہ ٹکیاں نکال کر اسے دی۔"

"تم پھر بھی نہیں سمجھے؟"

"یار مجھے الزام مت دو۔ تم بھی نہیں اندازہ کر سکتے تھے کہ وہ دنیا سے روانگی کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ بالکل نارمل تھا۔ اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے مجھے شک ہوتا یا میں اندازہ کر سکتا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ بڑے آرام سے لکھتے لکھتے اس نے تھوڑی سی دوا حلق میں انڈیلی اور پانی مانگا جو مرجان نے اسے دے دیا۔ اب مرجان نے پانی میں زہر کب ملایا' یہ میں نے واقعی نہیں دیکھا۔"

"کیا اسے معلوم تھا......؟"

"ممکن ہے اسے معلوم ہو۔ سیف اللہ نے برے وقت میں بچنے کے لئے انتظام پہلے سے کر لیا ہو۔ وہ غیرت مند آدمی تھا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے گھر بار اور غیرت لٹتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ بھیک مانگ کر بھی نہیں جی سکتا تھا۔ جانتا تھا کہ اب اس کا وجود زمین کا بوجھ ہے۔ اس نے مرجان کو قائل کرنے کی کوشش کی ہوگی کہ ہمارے ساتھ چلی جائے مگر وہ مشرقی عورت ہی کیا جو شوہر کو چھوڑ دے اور زندگی سے چمٹی رہے۔ اس نے واضح طور پر بچے اور شوہر میں سے شوہر کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔ اس لئے کہ بیٹا بہرحال محفوظ ہاتھوں میں تھا اور اس کا مستقبل بھی محفوظ تھا۔ شوہر مر رہا تھا......"

"یہ بات بھی جانتی تھی وہ؟"

"ضرور جانتی ہوگی یار۔ میاں بیوی جب رفاقت کا اتنا طویل سفر طے کر لیتے ہیں تو ایک دوسرے کے جذبات تک پڑھ لیتے ہیں۔ رہی بات ہو جاتی ہے کہ سنگ تھوڑا اٹھے اور زخم آئے مجھے۔ سیف اللہ نے لاکھ چھپایا ہو مگر مرجان کے علم میں یہ ہوگا کہ اب اسے زندگی کے آخری سفر پر شوہر کے ساتھ ہی روانہ ہونا ہے۔ اس کے فیصلے سے سیف اللہ واقف تھا یا نہیں؟ اس نے سیف اللہ سے کیا کہا تھا؟ اس کا دل رکھنے کو یہ بات مان لی تھی کہ وہ بھی کلیم کے ساتھ جانے کو تیار ہے؟ سیف اللہ نے اسے زہر پیتے دیکھا تھا یا نہیں۔ کیا ان کے درمیان دنیا سے ایک ساتھ جانے کا کوئی معاہدہ پہلے سے ہی ہو چکا تھا؟ ان سب سوالوں کے جواب کوئی نہیں دے سکتا' سوائے ان دونوں کے جو اب زندگی کے سب دکھوں سے نجات پا کے مٹی ہو گئے ہیں۔ وہ حرام موت قبول کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اللہ ان کے گناہ کو معاف کرے۔ وہ سب کی مجبوریاں کو جانتا ہے اور نیت کا حال بھی۔"

"کلیم نے کچھ نہیں دیکھا تھا؟"

"نہیں۔ اسے سیف اللہ نے باہر کر دیا تھا۔ چاچا کے ساتھ

جاؤ۔ ہم سب جا رہے ہیں" غالب بولا "رابعہ نے اور نازو نے اسے باہر ہی رکھا تاکہ ماں جذباتی نہ ہو۔ بیٹے کی جدائی کے خیال سے۔ انہیں کہاں معلوم تھا کہ وہ ایک انتہائی غیر جذباتی فیصلہ کر چکی ہے۔ سیف اللہ نے خط لکھ کے میرے حوالے کیا ہی تھا کہ مرجان بیٹھے بیٹھے لڑھک گئی۔ میں نے گھبرا کے رابعہ کو بلایا اور نازو سے کہا کہ کلیم کو باہر ہی رکھے۔ میرا بھی خیال تھا کہ مرجان کی یہ حالت بیٹے سے بچھڑنے کی رنج سے ہوئی ہے۔ وہ جذبات کا گلا گھونٹ کر چپ رہنے والی عورت تھی۔ ایسی عورتیں ہسٹریا کا شکار ہو جاتی ہیں۔ رابعہ نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس کے لئے پانی لائی لیکن پانی کا ایک گھونٹ بھی اس کے حلق سے نہیں اترا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب سیف اللہ نے آخری سانس لیا۔ ہم تو مرجان کو سنبھال رہے تھے۔ اس کی موت کا احساس ہوتے ہی میں نے سیف اللہ کو پلٹ کے دیکھا تو وہ کھلی آنکھوں سے چھت کو گھور رہا تھا اور بالکل اسی حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت مجھ پر اچانک انکشاف ہوا' کہ ہم خاموش تماشائی بنے ان کو ہر لمحہ موت کی طرف بڑھتا دیکھتے رہے اور فرشتۂ اجل کے قدموں کی چاپ تک نہ سن سکے۔ ظاہر ہے اس کے بعد کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بہت ضروری اور ناگزیر ہو گیا تھا کہ ہم کلیم کے ساتھ جلد از جلد وہاں سے نکل جائیں۔ میں اسے تھوڑی دیر کے لئے باہر لے گیا اور اتنی دیر میں رابعہ نے دروازہ بند کر دیا۔ ہم نے کلیم کو بتایا کہ تمہارے والدین آگے چلے گئے ہیں دوسری گاڑی میں۔ ایک گاڑی میں سب نہیں جا سکتے تھے۔"

میں دل پر غم کی بوجھل چٹان اٹھائے کڑھتا رہا "ہم کب تک کلیم سے چھپائیں گے؟"

"گڑھی حکمت اللہ پہنچنے تک۔ پھر ہم بھاگ آئیں گے مگر اس کے چچا اور خاندان کے دوسرے لوگوں کو سب بتا سکتے۔ وہ جیسے چاہیں کلیم کو سنبھالیں" غالب نے کہا "بس خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم اس امانت کو صحیح ہاتھوں تک پہنچا دیں۔"

"غالب! کیا سوچا بھی......" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

غالب نے نفی میں سر ہلایا "وہ سو گیا تھا۔ میں نے بہت سوچا۔ میرا ذہن فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ تم ہوتے تو مشورہ کرتا۔ میں نے رابعہ سے پوچھا۔ رابعہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ آخر کار میں نے وہ فیصلہ کیا جو میرے ضمیر کی آواز کے خلاف تھا۔ میں نے جبر کیا' ظلم کیا خود پر' شاید احساس جرم مجھے ہمیشہ رہے گا مگر میں اور کیا کر سکتا تھا۔ میں نے اسے وہیں سونے دیا۔ وہ ہمارے ساتھ نہیں آ سکتا تھا۔ اس سے ہم سب کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔"

"اب اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی ہے۔"

"نہیں۔ شاید وہ بچ جائے گا۔ پولیس اسے گرفتار تو کرے گی مگر جب یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ فاتر العقل ہے اور کیس قتل کا نہیں' خودکشی کا ہے تو وہ چھوٹ جائے گا۔"

"بشرطیکہ اس سے پہلے ہی وہ گزشتہ شب کے جرم کا اعتراف نہ کر بیٹھے" میں نے کہا "اسے جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں۔"

میں اور غالب آپس میں باتیں کرتے رہے۔ جابر کی طرف سے بالکل بے خبر تھے اور ہمارے نزدیک اس کے رکھ جانے سے فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ وہ پہلے ہی بہت کچھ جانتا تھا۔

"کہیں وہ پولیس کو ہمارے بارے میں رپورٹ نہ کر دے" غالب نے کہا۔

جابر نے اچانک کہا "ہم دوست یار۔ جابر نے اس کا بھی بندوبست کر دیا ہے۔ اب کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا وہ۔"

میرا دل صدمے سے ڈوبنے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ ہمیں گاڑی میں چھوڑ کے چند منٹ کے لئے اندر گیا تھا۔ اس وقت ہم نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی مگر اب میں نے بھی اور غالب نے بھی سمجھ لیا کہ ان چند منٹوں میں کیا ہوا ہوگا۔

میں نے ایک دم اس کی گردن دبوچ لی "تم نے اسے مار دیا سور کے بچے۔"

جابر نے اپنے سر سے میرے سر کو ٹکر ماری اور خود کو چھڑا کے باہر نکل گیا۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ مجھے چکر آ گیا۔ میں نے سر کو جھٹکا اور بے اختیار میرا ہاتھ اپنے ریوالور کی طرف گیا مگر جابر بھاگ کے اندر گھس گیا۔

غالب نے کہا "نمٹ لیں گے اس سے بھی یار۔ مگر ابھی نہیں۔"

"کتنا ظلم کیا اس نے یار" میں نے لرزتے ہوئے کہا "کتنی سفاکی سے یہ!"

"تم جذباتی ہو رہے ہو" غالب نے کہا "اگر پاگل ہو جائے تو اسے کوئی مارتا ہے قرار دے مشتاق جیسی کون نہ ہو۔ گھوڑے کی ایک ٹانگ ٹوٹ جائے تو اس کو بھی مار دیتے ہیں اسی کی بھلائی کے لئے اسے دکھوں سے بچانے کے لئے۔"

"مگر وہ انسان تھا۔"

"نہیں۔ وہ انسان کا بچہ ضرور تھا' انسانوں سے مشابہت کی حد تک مگر وہ عقل و شعور سے محروم تھا۔ معلوم نہیں آج تک کیسے زندہ تھا۔ اب تو اس کی نجات موت میں ہی تھی اور شاید اسی میں بہتری بھی۔"

"میں نہیں مانتا۔ ایسے قتل میں کبھی بہتری نہیں ہوتی۔ جو سوچ سمجھ کے کیا جائے کیا دنیا والوں کو جینے کا حق نہیں دیتی؟ پاگل خانے اور ذہنی امراض کے شفاخانے' نفسیاتی کلینک اور روحانی طور پر معذور افراد کی امداد کرنے والے ادارے قائم کرنے کیا ضرورت تھی؟ نہیں سیدھا جیل لے جا کے پھانسی دی جا سکتی تھی۔ یہ ایک وحشیانہ قتل تھا اور میں اسے قتل ہی کہوں گا۔ جو سوچ کے کیا گیا' اسے میں نادانی میں سرزد ہو جانے والی حرکت سمجھ سکتا ہوں۔ اسے احساس نہیں تھا کہ وہ ایک سنگین جرم کا مرتکب ہو رہا ہے مگر جابر جانتا تھا۔"

"شاید یہ احساس جابر کو بھی نہیں ہوگا۔"

www.paksociety.com

"جابر کو چھوڑو' تم کیا سمجھتے ہو؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"مجھے بھی چھوڑو" غالب نے کہا اور اٹھ کے اندر چلا گیا۔

میں اپنے احساس کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ کیا واقعی میں جذباتی ہو رہا ہوں؟ غالب بھی سمجھتا ہے کہ جو ہوا ٹھیک ہوا؟ نہیں' میری اور اس کی سوچ میں اتنا فرق نہیں ہے۔

اندر ایک کمرے میں سب خواتین گلے مل کے رو رہی تھیں۔ کلیم ہکا بکا کھڑا تھا۔ جابر ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور اس جذباتی بحران سے قطعی بے نیاز نظر آتا تھا۔

غالب نے چلانا شروع کیا "آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ کس بات کا ماتم ہے؟ عقل ماری گئی ہے تم سب کی۔ کسی کو خیال نہیں اپنی ذمے داری کا۔ ہم یہاں رونے پیٹنے کے لئے آئے ہیں؟ صبح سے یہ وقت ہو گیا ہے' کسی نے ابھی تک اس بچے سے بھی نہیں پوچھا ناشتے کے لئے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا' خدا کے لئے یہ سوچو کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

جابر نے کہا "چلنا ہے اور کیا کرنا ہے۔ اپنے پاس فالتو ٹائم نہیں ہے بالکل۔"

رابعہ نے سب سے پہلے خود کو سنبھالا اور آنسو پونچھ کے کلیم کو اپنے ساتھ لپٹا لیا "بھوک لگی ہے بیٹا؟"

"نہیں۔ اماں ابا کہاں ہیں میرے؟ پہلے یہ بتاؤ؟"

"بتایا ہے نا کہ ہم سب ایک جہاز میں نہیں جا سکتے تھے ہم نے ان کو ہوائی جہاز سے بھیج دیا ہے۔ تمہارے بابا کو اب کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ ہم تکلیف اٹھا سکتے ہیں۔ ہم کار میں جائیں گے اور تم بھی۔"

نازو نے کہا "تم تو بہادر لڑکے ہو تم کوئی بچے تو نہیں ہو۔"

کاجل نے کہا "تم سب کے لئے ناشتا بنا کے رکھا تھا میں نے ناشتا کر لو پھر چلتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "کلیم کو کچھ دے دو' مجھے بھوک نہیں ہے۔"

میں نے اسے گھورا "سب کو بھوک لگی ہے۔ سب کھائیں گے کلیم کے ساتھ۔"

نازو نے بھی میری بات کا مطلب سمجھ لیا اور خواہش نہ ہونے کے باوجود ہم سب نے چائے پی۔ کاجل نے ڈبل روٹی' مکھن اور جام بیچ میں رکھ دیے تھے مگر ان کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ جابر نے ڈٹ کے کھایا اور ہم سب سے الگ بیٹھا رہا۔ مجھے اس شخص کی صورت سے نفرت ہو گئی تھی اور اس کے لبوں کی شیطانی مسکراہٹ دیکھ کر میرا دل چاہتا تھا کہ اسے شوٹ کر دوں۔ وہ ہم سب کی مجبوری کی پوری قیمت وصول کر رہا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ ہم اس کی مدد کے محتاج ہیں اور اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کاجل اس سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔ ہمارے اور اس کے درمیان صرف اجنبیت ہی حائل نہیں تھی' معاندانہ جذبات کی دیوار تھی جو گرائی نہیں جا سکتی تھی اور یہی بے بسی احساسِ جرم و ندامت کی گھٹن بن گئی تھی۔

اس ایک کمرے کے کوارٹر میں کاجل کو الگ لے جا کے بات کرنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ پھر بھی میں نے اسے باہر مختصر سے آنگن میں بلا لیا۔

"کاجل! میں اس حرام زادے کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں اس کو برداشت کرنا پڑے گا" کاجل نے کہا "آخر مجھے دیکھو' کیا تم میری قربانی کو بھی ضائع کر دو گے؟ میں نے خود اس کو اس کی ہوس کی بھینٹ کیوں چڑھایا تھا آخر؟"

"کیا اس کے سوا چارہ نہیں تھا؟ کوئی باعزت طریقہ نہیں تھا؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"ہوتا تو مجھے کیا شوق تھا خود اپنی نظر سے گرنے کا؟ میں وہی کر سکتی تھی جو میرے اختیار میں تھا" وہ بگڑ کے بولی "میری نظر میں صرف جابر تھا جو ہمارے سب کے مسائل حل کر سکتا تھا لیکن اس کی ایک قیمت تھی جو تم نے نہیں میں نے ادا کی۔"

"میں محسوس کرتا ہوں کہ زندگی کے لئے میں بہت ذلت قبول کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں۔ میں موت کو ترجیح دیتا اگر سب کا خیال نہ ہوتا۔ میں اس کو جان سے مار دیتا لیکن رابعہ ہی نہیں' تم اور نازو' غالب اور کلیم۔ ہم سب گٹر میں گر گئے ہیں اور باہر سب ہی نکلنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں۔ ہم گٹر میں ہیں اور گٹر میں گر جانے والے کو غلاظت کو قبول کرنا چاہئے۔ جو کچھ بھی گٹر میں ہے ناگزیر ہے۔ اس میں اپنے پرائے سب کی نالیوں سے بہہ کر آنے والی گندگی ہے۔ اس سے نفرت کر دو یا کراہیت محسوس کرو۔ یا تم ڈوب سکتے ہو اس میں یا ہاتھ پاؤں چلا کے اس سے باہر نکل سکتے ہو۔ ہاتھ پاؤں چلاؤ گے تو چھینٹے اڑیں گے' غلاظت تمہارے منہ میں' آنکھوں میں اور ناک میں جائے گی۔"

نہ جانے کب غالب میرے ساتھ آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "کاجل ٹھیک کہتی ہے۔ ہمیں اپنا راستہ بنانا ہے تو راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرنا پڑے گا۔ جیسے فوجی میدان جنگ میں راستہ بناتے وقت جذبات کو بھول جاتے ہیں۔ ٹینک پھولوں کے تختوں پر سے بھی ایسے ہی گزر جاتے ہیں جیسے ریت کے ٹیلوں پر سے مگر وہی فوجی جو ٹینک چلاتا ہے' امن کی حالت میں شہر کے پارک میں لگے ہوئے ایک پھول کو توڑنا غلط سمجھتا ہے۔"

"تم ثابت کرنا چاہتے ہو کہ کاجل نے جو کیا ٹھیک تھا۔ اس نے اپنی آبرو کی بھینٹ دے کر اچھا کیا۔ اس بے شعور' بے عقل لڑکے سے خون کرا کے اچھا کیا اور جابر نے اسے مار کے اچھا کیا؟" میں نے چلا کے کہا "نہیں۔ یہ سب اچھا نہیں ہے۔"

"ہم کب اچھا کہتے ہیں۔ یہ بہت برا ہے مگر مجبوری میں سب کچھ برا بھی اچھا ہو جاتا ہے۔"

"نہیں' نہیں ہو سکتا۔ برا کبھی اچھا نہیں ہو سکتا' وہ برا ہی رہے گا۔ بس یہ ہو کہ ہم نے مجبوری میں برائی کو قبول کیا۔"

"یار' یہاں کوئی مباحثہ ہو رہا ہے؟" غالب بگڑ گیا "ہم الگ

الگ دو سڑک پر کھڑے ہیں؟ اپنا اپنا فلسفہ ثابت کرنے کے لئے اور کوئی کپ پینے کے لئے۔ میں لٹتا ہوں چلو۔ بس کرو خدا کے لئے۔ کیا بات نہیں ہوئی اب۔"

میں نے ہتھیار ڈال دیے "اچھا..."

"ہوا یہ کہ۔ تم اب جابر کو کچھ نہیں کہو گے۔ کاجل کو یا کسی کو بھی کچھ نہیں کہو گے۔ پورے سفر کے دوران۔ ہم سب واپس جا رہے ہیں سکندر۔ ایک ایک لمحہ بھاری ہے ہم پر۔ ہمیں ہر قیمت پر گھر پہنچنا ہے۔ اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنے کوئی کراچی سے نیویارک کا ہوائی ٹکٹ لے اور جہاز میں آ کے بیٹھ جائے۔ ہمیں اپنا راستہ بنانا ہے اور اپنی زندگی کی منزل تک پہنچنے کے لئے وہ سب کچھ کرنا ہے جو اپنا حق حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ جائز ناجائز۔"

وہ ایک دم پلٹا اور اندر چلا گیا' پھر کاجل بھی اندر چلی گئی۔ میں برآمدے میں اکیلا کھڑا سگریٹ کے دھوئیں میں خیالات کے انتشار کو تحلیل کرتا رہا' خود کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میری ہی سوچ غلط ہے۔ باقی سب ٹھیک کہتے ہیں' اس لئے کہ وہ اکثریت میں ہیں۔ اکثریت غالب آ جاتی ہے' خواہ وہ غلطی پر ہی کیوں نہ ہو۔"

رابعہ نے آہستہ سے میرا ہاتھ پکڑا "آؤ چلیں سکندر۔ اپنے گھر چلیں۔" میں نے سر ہلایا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ مجھے اندر لے گئی' پھر باہر لے گئی جہاں کمر باندھے ہوئے چلنے کو سب تیار بیٹھے تھے۔ میں کسی دل گرفتہ بچے کی طرح رابعہ کے ساتھ چپکا رہا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

ایک بچے کے علاوہ گاڑی میں سات افراد ہو گئے تھے مگر کار اپنی وسعت میں جہاز جیسی تھی اور اس کی پچھلی والی نشست پر چار افراد بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ ایک کھڑکی کے ساتھ رابعہ کو جگہ ملی' دوسری طرف مجھے اور درمیان میں نازو کے ساتھ کلیم کو۔ آگے جابر کے ساتھ غالب رہا اور کار آہستہ سے آگے بڑھی۔ میں نے چلتے چلتے ایک الوداعی نظر اس گھر پر ڈالی جہاں مجھے کبھی لوٹ کے نہیں آنا تھا مگر اس کی یادوں کے پُرالم نقوش کو وقت نہیں مٹا سکتا تھا۔

واپسی کے سفر کا احساس ایک بالکل نیا' سنسنی خیز تجربہ تھا۔ بیک وقت خوشی اور بے قراری تھی' خوف اور بے بسی کے جذبات تھے اور مایوسی کے ساتھ رنج و الم کے تحت ندامت خیالوں کا آزار تھا۔ خوشی اور جلد واپس اپنے گھر پہنچنے کی بے قراری ایک فطری رد عمل تھا۔ خوف ان مشکلات اور مصائب کا تھا جو راہ میں حائل ہو سکتی تھیں اور بے بسی اس لئے تھی کہ سلامتی کے ساتھ وطن کی منزل تک پہنچنے کا تصور ہزاروں صبر آزما مرحلوں کی مسافت تھا اور بیک وقت ان مراحل سے کامیاب و کامران گزرنے کی نہ ضمانت دی جا سکتی تھی اور نہ پیش گوئی کی جا سکتی تھی۔ رنج و الم کے اسباب بہت تھے۔ ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے' خسارات سود و زیاں کا حساب لاحاصل تھا۔ بہت آگے گئے تھے ان کا تو ذکر ہی کیا۔ اپنے پیچھے ہم ثمین' مجیب' افراز' ارشد اور بے گور و کفن لاشوں کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اگرچہ اطمینان کا پہلو اپنی جگہ تھا کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور ہم نے چوہدری ولاور اینڈ کمپنی کے عزائم کو ناکام کیا مگر مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے اس خیال کو بے وقعت کر دیا تھا۔ پچھتاوا تھا تو اس بات پر کہ اگر یہی سب کچھ ہونا تھا تو پھر ہم نے یا ایم آر ایس نے اپنی جدوجہد سے کیا پایا؟ ہم نے اپنا فرض ادا کیا' ضمیر کی آواز پر لبیک کہا اور راہ حق میں جہاد کیا' اس احساس میں جو اطمینان کا پہلو تھا' اس میں بھی شک کی تھوڑی سی آمیزش تھی کہ انجام کچھ بھی ہو جدوجہد کی بنیاد میری اور ولاور کی ذاتی دشمنی تھی۔ اگرچہ بعد میں اس کے وطن دشمن عزائم کا انکشاف ہونے پر یہ ذاتی دشمنی نہیں رہی تھی اور اس میں انتقام کا عنصر شامل نہیں تھا مگر میں اس حقیقت کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور تھا کہ ولاور میرا دشمن نہ ہوتا تو میں اس جنگ میں ملوث نہ ہوتا۔ میں اس آگ کے دریا میں کود گیا تو محض خاموش تماشائی بن کے نہیں کھڑا رہتا۔ اس کے بعد رابعہ' پھر نازو اور غالب ایک ایک کر کے سب دوست ایک منزل کے لئے حصول نیت کا زاد راہ لے کر شریک سفر ہوتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ ان سب نے میرا ساتھ دیا' میری غیر مشروط اطاعت کی۔ ممدوحہ پر جان و مال کو قربان کر دیا اور سب رشتوں کو بھلا دیا۔ ان کا احسان مجھ پر تھا مگر میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں نے پاکستان پر احسان کیا تھا۔ مجھ سے ہزاروں ہوں گے جو وطن کے لئے زیادہ مخلصانہ قربانی دینے کا حوصلہ اور نیت رکھتے تھے' ہزاروں جان دے کے وطن کی مٹی کو سرخرو کر گئے تھے جن کی راہ طلب میں ہمارے قدم مختصر کر چلے وہ دو کے فاصلے لیکن ان کی کسی چوہدری ولاور اینڈ کمپنی سے جنگ نہیں تھی۔ انہوں نے کوئی ایم آر ایس تشکیل نہیں دی۔ میدان جنگ میں ہزاروں گمنام سپاہی جام شہادت نوش کر گئے اور کسی نے ان کا نام جانا' نہ صورت دیکھی۔

میری طرح سب خاموش تھے اور شاید ایسے ہی خیالات کے گرداب میں غوطہ زن تھے۔ گاڑی ڈھاکا شہر سے گزر رہی تھی جہاں زندگی سہمی سہمی اور خوف زدہ' اپنی تباہی پر نوحہ کناں اور بے بسی پر حیراں' معمول کی جانب لوٹنے کی کوشش کرتی نظر آتی تھی۔ دکانیں اور بازار گاہکوں سے محروم تھے مگر کاروبار حیات کو رواں دواں رکھنے کی مجبوری اور فکر معاش' جنگ سے سہمے ہوئے لوگوں کو پھر اپنے گھروں کی پناہ گاہوں سے نکال لائی تھی۔ میں نے ان کے چہرے دیکھے تو مجھے متضاد جذبات کے عکس نظر آئے۔ وہ اندر سے دل شکستہ تھے مگر ان کے لئے مسکرانا ضروری تھا۔ کچھ اپنی فتح مندی کے جشن طرب پر شاداں تھے اور نہیں جانتے تھے کہ وہ گردش سیاست دوراں کا شکار ہوئے۔ اصل شکاری بہت دور دہلی یا ماسکو میں ان سے زیادہ مطمئن بیٹھے تھے کہ ان کی چال کامیاب رہی۔

رابعہ کے آنسو تھم گئے تھے۔ آخر وہ کب تک روتی۔ رونے

www.paksociety.com

کے ایسے پڑاؤ جانے ہر قدم پر موجود تھے اور یادوں پر رونے کے لئے تو ساری عمر پڑی تھی۔ اس کے آنسو خشک ہو جاتے مگر سکون پھر بھی نہ ملتا۔ صدمات اور حادثات کے تسلسل نے میرے دل کو پتھر تو نہیں کیا تھا مگر کسی حد تک بے حس ہو جانا سکھا دیا تھا۔ رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج۔ غالب نے ... سو وقت نے آنکھوں سے حیرانی چھین لی تھی اور حقائق کا جذباتی جذبات کے بغیر مشاہدہ کرنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

ایک جابر تھا جو احساس کی ذہنی سطح سے بیگانہ تھا اور زندگی کو محض جسمانی ضروریات کی ... سمجھتا تھا جہاں وہ خوش تھا کہ اس نے جو مانگا اسے مل گیا۔ کسی نے کیا کھویا؟ اس سے اسے کیا غرض۔ ظاہر ہے جب ایک کچھ پاتا ہے تو دوسرا کچھ کھوتا ہے۔ زندگی نفع نقصان کی بیلنس شیٹ ہے۔ غالب کی غرض نہیں کہ ... ادا ہو۔

اس نے گاڑی روکی تو سب کے خیالات کی قلم ٹوٹ گئی۔

غالب نے کہا "یہاں کتنا وقت لگے گا؟"

"یہ کیا جگہ ہے؟" میں نے ایک سہ منزلہ پرشکوہ عمارت کو دیکھ کر کہا "کیوں رکے ہیں ہم یہاں؟"

جابر نے کسی کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور بولا "پاسپورٹ نکالو اور پیسے بھی۔"

کاجل نے چاروں پاسپورٹ اس کے حوالے کئے۔ میرا، رابعہ اور غالب کے پاسپورٹ وہی تھے جو ہم نے کلکتہ میں ایک ایجنٹ کے ذریعے بنوائے تھے۔ کاجل کے پاسپورٹ پر اس نے بڑی صفائی سے رابعہ کی تصویر لگوا دی تھی۔

"پیسے کام ہو جانے کے بعد۔" کاجل نے کہا۔

"ہمیں اعتبار نہیں کرنا" وہ بولا۔۔

"اسی ہزار لے چکے ہو۔ اب بھی اعتبار نہیں کرتے؟"

"جابر نے اپنے باپ پر بھی اعتبار کرنا نہیں سیکھا۔ اور تم نے کون سا احسان کیا ہے مجھ پر۔ جان بچانے کی قیمت دی ہے۔"

کاجل نے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی طرف پھینک دی "اچھا زیادہ مت بھونکو۔"

اس نے نوٹ جیب میں ڈالے اور گاڑی سے اتر کے گیٹ تک گیا جہاں ایک مسلح محافظ فولادی گیٹ کے پیچھے مستعد کھڑا تھا۔ اس نے جابر سے کچھ بات کی پھر اس کے لئے بڑے پھاٹک میں ایک چھوٹا سا دروازہ کھول دیا گیا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔

"یہ جابر کون ہے؟" میں نے کہا "کیا کرتا ہے؟"

"کیا سب کچھ کرتا ہے جو تم دیکھ رہے ہو" کاجل نے تلخی سے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ کیا دھندا ہے اس کا؟"

"یہ ملازم تھا ثریا کا۔"

"کون ثریا؟" میں نے کہا۔

کاجل کے بجائے غالب نے کہا "بھارتی سفارت خانے کا ایک اہم اہلکار تھا۔ جابر اس کا شوفر ہے اور یہ اسی کی کار ہے۔ کوئی اس پر شک نہیں کر سکتا اور وہ اندر چلا گیا ہے۔"

میں نے کہا "تو اس کا نام ثریا تھا۔ جابر شاید یہ اطلاع دے گا کہ ثریا صاحب علیل ہیں اور آج حاضر نہیں ہو سکیں گے کہ کل۔۔۔"

"وہ کیا کہے گا یہ سوچنا ہمارا کام نہیں ہے" غالب نے بات کاٹ کے کہا۔

"رائٹ۔ ثریا زیادہ کے لئے تو ... تو کسی کو پتا ہی نہیں چلے گا کہ۔۔۔ ہو سکتا ہے کبھی ... کسی کو کچھ بتائے بغیر کہاں غائب ہو گیا" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "تم کیوں متفکر ہو اس کے لئے؟ تمہارا کیا تھا وہ؟ مر گیا تو مر گیا۔ دفن بھی ہو گیا۔ اب گڑے مردے اکھاڑنے کا فائدہ؟"

میں خاموش ہو گیا۔ میری جرح واقعی لاحاصل تھی۔ اور صرف کاجل کی دل آزاری ہو رہی تھی۔ اس نے جو کچھ ہمارے لئے کیا تھا۔ اس نے ثریا ہی کو نہیں خود کو بھی قتل کیا تھا۔ اور میں تھا کہ احسان مند اور شکر گزار ہونے کے بجائے اس کے زخموں پر نمک پاشی کر رہا تھا۔

میں نے کہا "کاجل! آئی ایم سوری۔"

اس نے بے رخی سے کہا "مجھے کسی کی ہمدردی چاہئے۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے تم مجھ سے خفا ہو لیکن کیا کروں؟ میں خود اپنے آپ سے بہت خفا ہوں کہ میں نے یہ کیوں کیا تھا؟"

"پلیز شٹ اپ" غالب نے کہا "اور کوئی بات نہیں کر سکتے تو خاموش رہو۔"

... نے کہا "تم نے تو کاجل سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس کے والد کا کچھ پتا چلا۔"

میں نے پلٹ کے شرمندگی سے کہا "کیا۔۔۔ ابھی تک۔"

کاجل نے سر ہلایا "ابھی تک وہ لوٹ کر نہیں آئے اور اب آئیں گے بھی نہیں۔"

"پولیس۔۔۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "پولیس بھی نہیں چاہتی کہ سراغ ملے۔ ان کی تفتیش محض ڈراما ہے۔ خانہ پری کی کارروائی ہے۔ وہ سب جانتے ہیں۔ اگر وہ نہیں تو اوپر والے جانتے ہیں۔ اسی لئے کوئی بھی پولیس پر دباؤ نہیں ڈال رہا ہے کہ بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتے اور پولیس کو اشارہ مل چکا ہوگا کہ دکھانے کے لئے دوڑ دھوپ جاری رکھو مگر نتیجہ کچھ نہیں اور مجھے تو جابر نے بتا دیا ہے۔"

"جابر نے۔۔۔ اسے کیسے معلوم ہوا؟"

غالب نے کہا "یار وہ ثریا کا شوفر تھا۔ اس کی گاڑی کا

جانے کتنے لوگوں نے کیسی کیسی راز کی باتیں کی ہوں گی۔ یہ ڈرائیور اور شوفر قسم کے لوگ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ ہم اخبار پڑھتے ہیں۔ جو خبر ہی نہیں بنتی اس بات سے تو اخبار والے بھی بے خبر رہتے ہیں۔"

... میرے ذہن میں ایک خیال آیا "کہیں ایسا تو نہیں ... ۔۔۔"

"... یہ بات آپ کی عقل شریف میں آ گئی ہے تو امید ہے زیادہ سوالات سے گریز فرمائیں گے" غالب نے کہا۔

... اس کے بعد کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں تھی۔ ثریا نے خود سازش کی یا سازش کرنے والوں کے ... تنظیم کو ختم کرتے ہوئے عبدالستار چودھری کو اغوا کرایا۔ ان کو اطلاع ملتی رہی ہوں گی کہ عبدالستار چودھری کی بیٹی ذرا بھی بنگالی نہیں ہے۔ بس مغربی پاکستان میں رہ کے اس کی بنگالی قومیت کا جذبہ ہے اور وہ خطرناک حد تک پاکستانی ہو گئی ہے۔ خود عبدالستار ... سیاسی لیڈری کی دکان چلانے کے لئے بنگلہ دیش کا حامی ... در پردہ وہ پاکستان کے حامی عناصر کے لئے اپنے دل میں گوشہ رکھتا ہے۔ کاجل بچ گئی تھی مگر ستار چودھری کو غداری کی سزا دینے والوں نے خاموشی سے مار دیا ہوگا اور یہ خبر تک جابر کے ذریعے پہنچی ہوگی۔ اس نے کاجل کو بتایا ہوگا کہ تمہارے باپ کا اصل قاتل تو ثریا ہے اور کاجل کو اس سے انتقام تو جابر ہی اس کی مدد کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ جابر کو اپنی زندگی کی ایک رات دے دے۔ اور جب کاجل نے سوچا ہوگا تو اسے مہنگا نہیں لگا ہوگا۔ وہ جابر سے اور بھی بہت سے کام لے سکتی تھی۔ اس کی مدد سے وہ جان بچا کے واپس مغربی پاکستان پہنچ سکتی اور ہمیں اپنے ساتھ بنگال سے لے جا سکتی تھی۔ جابر کسی کا وفادار نہیں تھا۔ وہ ہوس کا پیکر تھا اور اپنی نفسانی خواہش میں کسی حیوان سے کم نہ تھا۔ کاجل نے اسے منہ مانگی ادا کر دی تو اس نے اپنے ہی مالک کو قتل کرانے کی ذمہ داری بھی قبول کر لی اور نقد معاوضے کے بدلے بھارتی سفارت سے ہمارے لئے کلیرنس حاصل کرنے کا وعدہ بھی کر لیا۔

جواب طلب سوال صرف دو تھے۔ ایک یہ کہ کاجل کا جابر سے واسطہ ہوا اور ایک معمولی شوفر کی رسائی عبدالستار چودھری تک کس وسیلے سے ہوئی؟ دوسرا یہ کہ سودا کون تھا اور اس نے کس سے چکایا تھا؟ اس وقت میں کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا۔ محسوس کرتی تھی کہ وہ آزادی اور زندگی کے سودے میں ... کے مقام سے گر کے طوائف کی سطح پر آ گئی اور عزت نفس قربان کر کے اس نے باپ کے قاتل سے انتقام لینے کا فیصلہ بھی ... کیا۔ کسی ثبوت کے بغیر اس نے جابر کی بات کو سچ تسلیم ... جب کہ عبدالستار چودھری کی پراسرار گمشدگی ہنوز پردہ راز میں ہے۔

انہی اسباب کی بنا پر وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ ہماری نظروں میں اس کی عزت و وقعت پہلی جیسی نہیں رہی ہوگی اور ہمارے دلوں میں اس کے لئے عقیدت و احترام کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہوگی۔ درحقیقت ایسا ہرگز نہیں تھا۔ ہم سب کی نظروں میں کاجل کی قربانی وہ احسان تھا جس کا بدلہ ہم کبھی ادا نہیں کر سکتے تھے اور جو کچھ کاجل نے ہمارے لئے کیا تھا اس کے بعد کاجل کے لئے ہمارے دل میں پہلے سے زیادہ عزت اور محبت پیدا ہو گئی تھی۔ اسے دلجوئی اور تسلی کی ضرورت تھی۔ اس یقین دہانی کی ضرورت تھی کہ وہ بے گھر لاوارث اور تنہا نہیں ہے۔ وہ ہمارے خاندان میں شامل ہو چکی ہے اور ہم اسے اپنا چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش میں اس کے لئے جگہ نہ سہی، پاکستان پہلے بھی اس کا تھا، آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نفرت کی کالی آندھی نے اس سے گھر بار اور والدین کو چھین لیا تھا تو ہم سے بھی خود ہمارے اہل وطن نے جینے کے سارے سہارے چھین لئے تھے۔ ہم سب حالات کے مختلف دھاروں میں بہتے ہوئے تنہا لوگ اکٹھے ہو گئے تھے تو یہ حادثات و اتفاقات کا انوکھا کرشمہ تھا۔

ابھی صبح کے دس بجے تھے اور محسوس یوں ہوتا تھا جیسے وقت کی پرواز تھم گئی ہے۔ گزشتہ دو گھنٹوں میں بہت کچھ ہو گیا تھا جو ناقابل تصور تھا اور ناقابل یقین تھا۔ میری نظروں میں سیف اللہ اور مرجان کے چہرے تھے۔ زندگی کی تپش اور توانائی سے بھرپور۔ نہ جانے کیوں میں ان کی بے جان لاشوں کا تصور کرنے سے قاصر تھا جو بہت دور ایک چھوٹے سے کمرے کے فرش پر پہلو بہ پہلو پڑی تھیں۔ ان کی سپرد کی ہوئی امانت ہمارے ساتھ تھی اور وہ وقت مجھے خیال کی حد سے بھی دور نظر آتا تھا جب ہم سیف اللہ کی طرف سے اس کے وارثوں کو بیک وقت دو خبریں دیں گے اور خوشیوں کا یہ تحفہ پیش کریں گے۔ وہ بہت روئیں گے کہ ناراض ہو کے گھر، خاندان، گاؤں اور ملک سے چلا جانے والا سیف اللہ اب اتنا دور چلا گیا ہے کہ وہ اس سے اپنے سابقہ رویے پر معافی بھی نہیں مانگ سکتے۔ انہوں نے سیف اللہ کو اس کے حق سے محروم کیا تھا۔ اس کے باپ سے زمین اور پھر اس کی زندگی چھین لی تھی مگر عالی ظرف اور فراخ دل سیف اللہ نے انہیں معاف کر دیا تھا۔ کسی سے انتقام نہیں لیا تھا مگر ان سے سب رشتے توڑ لئے تھے جن کے نزدیک زر، زمین یا زن کی قیمت لہو کے رشتوں سے زیادہ تھی۔ اب اس کی اگلی نسل اور نام و نسب کا مالک لوٹ آیا تھا تو یہ خوشی کا مقام بھی تھا۔

میں نے بہت دیر سے کلیم کی آواز نہیں سنی تھی۔ پلٹ کے دیکھا تو وہ رابعہ کے کندھے سے لگا سو رہا تھا۔ مجھے اس معصوم پر بہت ترس آیا جس کو ہم جھوٹ سے بہلا رہے تھے کیوں کہ وہ سچ کا بھیانک چہرہ دیکھنے کی ہمت اور طاقت نہیں رکھتا تھا۔ ایک بہت بڑے جھوٹ کا بھرم رکھنے کے لئے ہمیں اور نہ جانے کتنے جھوٹ

www.paksociety.com

ہوگئے تھے۔ جب ہم اسے اپنوں کے حوالے کرکے بھاگ آئیں گے اور اسے معلوم ہوگا کہ ہم بہت جھوٹے لوگ تھے تو اس کا رد عمل کیا ہوگا؟ اس کا معصوم ذہن اس حقیقت کو کیسے تسلیم کرے گا کہ وہ ماں باپ جن کے بارے میں اسے یقین دلایا گیا تھا کہ کار میں اسے منتظر ملیں گے، ان کی لاشیں تو منتظر رہ گئیں کہ ان کا وارث انہیں مٹی دے اور سینکڑوں ہزاروں میل پیچھے لوٹ کر جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا اپنے ماضی میں سفر کرنا۔

غالب باہر نکل کے گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور بے چینی سے بار بار اپنی گھڑی دیکھتا تھا۔ رابعہ اور نازو نے سوتے ہوئے بچے کے سر جوڑ کے آنسو بہانا شروع کردیا تھا۔ ان کی فطرت بھی مجموعہ تضادات تھی۔ وہ بدتر حالات میں آگ اور خون کے دریا سے بچنے کیلئے گزر چکی تھیں۔ انہوں نے رشتوں کے جسم گولیوں سے چھلنی ہوتے اور ان کے دماغ پاش پاش ہوتے دیکھے تھے۔ وہ لاشوں کو ہر حال میں دیکھ چکی تھیں۔ مسخ شدہ، جلی ہوئی، شکستہ نامکمل اعضا کے ساتھ، سوختہ اور لہولہان۔ اور وہ ان لاشوں پر سے ایسے گزر آئی تھیں جیسے وہ راستے کے پتھر ہوں۔ انہوں نے قید بند میں بدترین جسمانی و ذہنی تشدد جھیلا تھا اور ہار نہیں مانی تھی۔ آج وہی ایک مجسم بچے کو ساتھ لے جاتے ہوئے اس پر ہونے والے ظلم کے تصور پر آنسو بہائے جا رہی تھیں۔

میں بھی بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو باہر نکل آیا حالانکہ گاڑی کے سیاہ شیشوں کے پیچھے کوئی بھی ہماری صورت نہیں دیکھ سکتا تھا اور ہم زیادہ محفوظ تھے۔ سوچ میں کھڑی ہوئی گاڑی میں اتنے لوگوں کی موجودگی سے حبس اور گرمی کا احساس ہوتا تھا۔ باہر کی ہوا میں فرحت بخش خنکی تھی۔

غالب نے کہا "آپ کی رونمائی ضروری تھی؟"

میں نے کہا "لوگ اتنی دیر سے تمہاری شکل کو برداشت کر رہے تھے۔"

"یہ جابر کہاں مرگیا؟ آدھا گھنٹہ ہوگیا۔"

"وہ مرگیا تو ہم مارے جائیں گے" میں نے ایک سگریٹ نکال کے جلائی۔

"کسی نے آکے پوچھ لیا کہ آپ مسٹر شہباز کی کار میں کیوں بیٹھے ہیں تو کیا ہوگا؟"

"سوال کرنے والا شرمندہ ہوگا اور بغیر اشتعال دلائے معذرت کرکے چلا جائے گا" میں نے کہا "میرا جواب ہی ایسا مدلل اور مسکت ہوگا۔"

"کیا کہیں گے آپ؟ میں سالا ہوں شہباز کا۔"

"ہاں۔ اور آپ سسر" میں نے کہا "اگر کسی نے سوال کیا کہ داماد سے سسر کی عمر اتنی کم نہیں ہوسکتی تو اس کے لئے میرے پاس ایک لاجواب کردینے والا سوال موجود ہے کہ کیا میں شہباز کے سسر کا سسر نظر آتا ہوں؟ ہمارے پاس سدا بہار جوانی کا نسخہ ہے ورنہ میری عمر ہے اسّی سال اور شہباز جی کے سسر ہیں ساٹھ سال کے

نوجوان۔"

"پہلے کہیں گے کہ میں سالا ہوں۔ پھر بتائیں گے کہ سسر ہوں" غالب نے ہنس کے کہا۔

"کچھ رشتوں کے الٹ پھیر ایسے ہوتے ہیں" میں نے کہا "خواتین تو فوراً بتاتی ہیں کہ سمدھیانے کے ایک رشتے سے فلاں بزرگ اس بچے کے نواسے ہیں اور ددھیال کی طرف سے نانا یا دادا۔ یہ کاجل اور جابر کا کیا چکر ہے؟"

"مقدر کے چکر تو ایسے ہی ہوتے ہیں سکندر بادشاہ۔"

میں نے کہا "یہ کیسے جانتا تھا کاجل کو؟"

"کاجل کا باپ سیاسی لیڈر تھا۔ ہر قسم کے لوگ آتے تھے اس کے پاس" غالب نے کہا "ان میں شہباز بھی تھے۔ جابر ان کو لے کر آتا تھا۔ کاجل ذرا بے باک قسم کی لڑکی ہے۔ اس نے جابر کی دلچسپی کو نوٹ کیا اور اسے بے وقوف بنا کے بہت سے کام لئے۔ سب کام ایسے تھے جن سے اس کے باپ کی سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچ سکتا تھا اور یہ ثابت ہوجاتا تھا کہ کاجل کا دماغ خراب نہیں ہے۔ وہ بہت سے سیانوں سے زیادہ سیانی ہے۔ جابر کے معاملے میں وہ دھوکا کھا گئی۔ وہ اسے چوری چھپے کئی باغی کے ہاتھوں مارے جانے والوں کے لواحقین کے گھر لے گیا۔ کاجل نے ان کی مدد کی اور بعض اوقات انہیں محفوظ مقامات پر پہنچایا۔ اس کے روابط پاکستان کے حامی عناصر سے بھی تھے۔ جابر اس کی توقعات کے برعکس بہت عیار ثابت ہوا۔ اس نے بہت سے ثبوت اکٹھے کرلئے اور پھر کاجل کو بلیک میل کیا۔ کاجل کی ساری ہوشیاری دھری رہ گئی۔ بے وقوف بن کے اسے لوٹنے والا مرد بہت بڑا شکاری تھا۔"

"خوش فہمی یا غلط فہمی میں کیا فرق ہے؟" میں نے کہا "خود کو بہت بڑا شکاری سمجھنے والا بھی تو شکار ہوسکتا ہے۔ کاجل اسے پھر گھیر لائی ہے اور اس بار وہ ہمارے مقابل ہے۔"

غالب نے کہا "یہ سوچنا تو بہت آسان ہے کہ اپنا کام نکل جانے کے بعد جابر کا کام تمام کردیا جائے۔ کاجل کی تو یہی خواہش ہوگی۔ خود رابعہ اور نازو کے ذہن میں بھی یہ خیال آیا ہوگا مگر کیا معلوم جابر نے کیا سوچ رکھا ہے۔ وہ اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہوگا اور اس نے ضرور کوئی ایسا بندوبست کیا ہوگا کہ ہم بعد میں بھی اسے نقصان پہنچانے کی نہ سوچیں۔ جانتا ہے کہ ہم سب اس کے دشمن ہیں اور پھر بھی وہ ہمارے ساتھ جا رہا ہے۔"

"کیا شہباز کو واقعی خود اس نے مروایا تھا؟"

"اس نے کاجل کی خاطر یہ شرط منظور کی تھی۔ سوسا کو بھی وہی لایا تھا۔"

"کہاں سے لایا تھا؟"

"اسے وہ سڑک پر لاوارث پھرتا ہوا ملا تھا۔ غالباً اس کا گھر اور گھر والے سب خانہ جنگی کی نذر ہوگئے تھے۔"

"اس کے ذہن پر صدمے کا اثر ہے؟"

"نہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ ذہنی طور پر پسماندہ ہے۔ ممکن ہے وہ کسی نفسیاتی ہسپتال یا کسی خیراتی ادارے سے نکل بھاگا ہو۔ جابر اسے اپنے گھر لے گیا۔ اس نے کاجل سے کہا کہ یہ وفادار ہر کام کرسکتا ہے۔ اگر تم اسے یقین دلادو کہ تم ہی اس کی بہن ہو۔ یہ سڑک پر لوگوں سے پوچھتا پھر رہا تھا کہ میری بہن کو تو نہیں دیکھا ہے تم نے۔ کاجل نے پہلے انکار کردیا تھا۔ پھر جابر نے اسے یقین دلایا کہ شہباز نے اس کے باپ کو اغوا کرایا اور قتل کرکے اپنی کوٹھی کے باغ میں گاڑ دیا ہے۔ اس نے قسم کھاکے کہا کہ وہ اس قتل کا چشم دید گواہ ہے۔"

"کیا جابر نے سچ بولا تھا؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔ اسے خود شہباز سے اپنا کوئی پرانا حساب برابر کرنا تھا۔ اس نے کاجل کے جذبات میں انتقام کی آگ بھڑکائی اور اسے اس حد تک عقل و ہوش سے بیگانہ کردیا کہ وہ سوسا جیسے نادان کو قربان کرنے پر تل گئی۔ بعد میں اس نے جو کیا تمہیں معلوم ہے۔"

"کیا واقعی عبدالستار چوہدری کو قتل کردیا گیا ہے؟"

"اگر ایسا ہوا ہے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ یہاں دن رات لوگ مارے جا رہے ہیں۔ دوست دشمن کی تمیز اور تخصیص نہیں رہی۔ تاہم یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اسے اغوا کرانے یا مروانے والا شہباز ہوگا۔ اور بھی بہت دشمن تھے اس کے۔"

"کاجل کی ماں بھی تو تھی۔"

غالب نے حیران ہوکے کہا "کیا تمہیں نہیں معلوم؟"

"کیا نہیں معلوم؟" میں نے کہا۔

"جب عبدالستار چوہدری کو اغوا کیا گیا تو اس کی بیوی نے حملہ آوروں کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ کسی نے اس کے سر کے پیچھے گولی ماری۔ وہ بے ہوش ہوکے گر گئی۔ اسے بعد میں ہسپتال لے گئے تھے اور وہ انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں تھی۔ اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ برین ہیمرج ہوگیا تھا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا اور کہا تھا کہ انہیں گھر لے جاؤ لیکن کاجل نے کہا کہ گھر میں کس کے پاس لے جاؤں۔ کون ہے وہاں۔ میرا خیال ہے وہ مرچکی ہوگی۔"

"ماں کے لئے بھی کاجل کے دل میں کوئی جذبات نہیں؟"

"پہلی بات تو یہ کہ وہ سوتیلی ماں ہے۔ جس کی وجہ سے عبدالستار چوہدری نے بہت کم عمر میں ہی کاجل کو گھر سے دور بھیج دیا تھا۔ وہ آٹھ سال کی تھی جب اس کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ سولہ سال وہ لاہور میں رہی۔"

"لاہور؟"

"زیادہ تر ہوسٹل میں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی گھر سے وہ جذباتی وابستگی نہیں رہی جو عام طور پر سب گھر میں رہنے والوں کی ہوتی ہے۔"

"کاجل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ چودہ اگست سن سینتالیس کو پاکستان کے ساتھ پیدا ہوئی تھی" میں نے کہا "اور اس کا باپ ان تین سو تمیں سرکاری افسران میں شامل تھا جو نااہلی کے الزام میں برطرف کئے گئے تھے اور یہ کہ سن پینسٹھ کی جنگ ہوئی تھی تو وہ لاہور میں تھی۔ اس وقت اٹھارہ سال کی ہوگی۔"

"ہاں۔ یہ سب ٹھیک ہے" غالب نے کہا "عبدالستار چوہدری پیدائشی طور پر تو بنگالی تھا مگر ملازمت کے دوران وہ ایک بار کراچی میں بھی رہا تھا۔ اس کا باقی سارا وقت بنگال کے مختلف اضلاع میں گزرا۔ اس کی دوسری بیوی ٹھاکر گھرانے کی ہندو عورت ہے۔"

"اس نے ہندو عورت سے شادی کی تھی؟"

"تم ایسے حیران ہو رہے ہو جیسے یہ دنیا میں پہلی بار ہوا ہو۔ بمبئی کی فلم نگری میں تو ایسی مثالیں عام ہیں مگر یہاں بھی کم نہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا مذہبی اختلاط تھا۔ معاشرت اور معیشت پر ہندو غالب رہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے بھی ان کے اطوار اپنا لئے۔ لیا رشتہ آگیا۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا تو جابر گیٹ سے باہر آتے ہوئے سنتری سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہا تھا۔ غالباً وہ کو سلیٹ کا پرانا ملازم تھا اور اسے سب جانتے تھے۔ ہمارے ساتھ بات کرتے ہوئے اس کا لب و لہجہ بالکل مختلف ہوجاتا تھا۔ کسی حد تک جارحانہ اور گستاخانہ۔

"چلو اندر بیٹھو" اس نے قریب آکے حکم دیا۔

میں نے غرا کے کہا "پہلے یہ بتاؤ کام ہوا ہے کہ نہیں؟"

وہ بولا "جابر جائے اور کام نہ ہو۔"

"جابر جائے جہنم میں۔ ہم نے پیسہ دیا ہے نقد" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

جابر نے پاسپورٹ پیچھے پکڑا دیئے "پیسہ، پیسہ کیا چیز ہے؟ اگر میں اندر جاکے بیٹھ جاتا یا کسی دوسری گاڑی میں نکل جاتا تو تم میرا کیا بگاڑ لیتے؟"

"ہم بہت کچھ کرسکتے تھے" میں نے کہا۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی "تم خاک بھی نہیں کرسکتے تھے۔ میں اندر سے پولیس کو صرف ایک فون کردیتا تو کافی ہوتا۔ تم سب شہباز کی کار میں پکڑے جاتے۔ باقی سب پولیس خود اگلوا لیتی۔"

رابعہ نے میرا ہونٹ دبایا چنانچہ میں نے اس اشتعال انگیزی کو نظرانداز کردیا "چلو تم نے احسان کیا ہم پر۔ کیا کہلوانا چاہتے تھے تم؟"

اس نے کہا "شیشے بند کرلو۔ میں اے سی چلا رہا ہوں۔"

کاجل نے پاسپورٹ غور سے دیکھنے کے بعد مجھے تھمائے۔ میں نے اس پر لگا اسٹیمپ کو غور سے دیکھا۔ یہ ہمارے بنگلہ دیش میں داخل ہونے کا اجازت نامہ تھا جس پر تاریخ بھی پرانی ڈالی گئی تھی۔

www.paksociety.com

غالب نے کہا "اگر ہم نیپال کے راستے جا رہے ہیں تو کیا اس پر نیپال کا ردعمل نہیں ہونا چاہیے؟"

"عام حالات میں سرحد پر روزانہ چیک ہوتا ہے، آج کل نہیں ہو رہا" جابر نے کہا "سکھوں سے ہزاروں لوگ ہر روز جان بچا کے فرار ہو رہے ہیں اور قافلوں کی صورت میں سرحد عبور کر رہے ہیں۔"

"نیپال کی حکومت اعتراض نہیں کرتی؟" غالب نے کہا۔

"حکومت پاکستان اور نیپال کے تعلقات اچھے ہیں۔ ہوائی جہاز بھی نیپال کے راستے آتے تھے، درمیان میں بھارت کے اوپر سے گزرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اب مہاجرین کو بھی نیپال سے ہی پاکستان جانے کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے۔"

"مہاجرین!" میں نے تلخی سے کہا "اپنے وطن کے ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں جانے والے آج مہاجر ہو گئے۔ ایک بار ہندو، سکھوں نے مارا تھا تو بے گھر ہوئے تھے۔ آج انہی کے ہاتھوں بے گھر ہوئے جو مسلمان ہیں اور پاکستان بنانے کی تحریک میں ان کے ساتھی تھے۔"

جابر نے کہا "میں سیاست کو نہیں سمجھتا۔"

میں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا "ہم بھی کہاں سمجھتے ہیں اس سیاست کو۔ اخباری بیان، پریس کانفرنس، اعلانات، احتجاج اور مظاہروں، ہڑتالوں اور پاکستان مخالف جلسوں کی اس سیاست کو ہم سمجھ سکتے تو یہ سب کیوں ہوتا!"

"یہ سیاست کہاں، ایک سیاسی سازش تھی جسے خود سیاست داں بھی نہیں سمجھ پائے" غالب بولا۔

"بڑے اور چیدہ چیدہ سیاست داں سب جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں، کس کے لئے کر رہے ہیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا مگر وہ صرف اقتدار چاہتے تھے۔ ہر قیمت پر۔"

میرا لہجہ اتنا تلخ ہو گیا تھا کہ غالب نے خاموشی اختیار کر لی ورنہ یہ ناگوار بحث مزید تلخی پیدا کر لیتی۔ کار اب خاصی رفتار سے رواں تھی اور ہم ڈھاکا شہر کے مضافات سے گزر رہے تھے۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب ہم کلکتہ سے ڈھاکا پہنچے تھے اور انہی مضافات سے بڑی پریشان حالی و درماندگی کے عالم میں خطرات کے ہمرکاب گزرے تھے۔ ہم اپنے بچھڑ جانے والے دوست محسن کی تلاش میں تھے اور محسن کے مل جانے کے بعد صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ کل کے ساتھ واپس جا چکا تھا اور ہم ایک ائرکنڈیشنڈ کار میں سفر کر رہے تھے جو لمحہ لمحہ خطرات کو پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی اور جس نے تحفظ کے یقین سے ملنے والا اعتماد عطا کر دیا تھا۔

جابر ایک ماہر ڈرائیور تھا اور راستوں سے بھی شناسائی تھی۔ کہیں وہ اچانک مین روڈ چھوڑ کے سائڈ روڈ پکڑ لیتا تھا اور چکر لگا کے پھر بڑی سڑک پر طلوع ہوتے وقت بتاتا تھا کہ درمیانی حصہ خراب تھا۔ بیچ میں کوئی چیک پوسٹ تھی جو ملٹری کیمپ تھا۔ ہم اس کی تمام اطلاعات کو درست اور مصدقہ تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ خود کابل ان راستوں سے ناواقف تھی۔ اس کی موجودگی کا یہ فائدہ ضرور تھا کہ ہمیں ایک بنگالی ترجمان میسر تھا جو وقت ضرورت ہمارا مقصد فریق ثانی تک پہنچا دے اور بات کو ادھر سے ادھر کرتے وقت ہیرا پھیری نہ کرے۔ جابر اس معاملے میں قطعی ناقابل اعتبار تھا۔

تین گھنٹے میں ہم ڈھاکا سے دو سو کلومیٹر دور پہنچ گئے تھے۔ منظر ہر جگہ وہی تھا۔ گھنے درخت، ندی نالے، کچے اور بانس کے بنے ہوئے مکانات، مچھلیوں کے تالاب اور دلدلی زمین۔ حشرات الارض کی طرح زمین پر رینگنے والے انسانوں کی زندگی کا انداز بھی ایک سا نظر آتا تھا۔ ہر انتہا کو پہنچی ہوئی غربت اور بے سروسامانی۔ کم اور ناقص خوراک اور حد سے زیادہ محنت مشقت کے مارے ہوئے لاغر ہڈیوں کے ڈھانچے بدن۔ ننگ دھڑنگ بچے اور برائے نام لباس میں ستر پوشی کے احساس سے بے نیاز عورتیں۔ یہ صدیوں سے ان کا رہن سہن تھا۔ ان کے آباؤ اجداد بھی ایسے ہی جیتے تھے اور ان کی آنے والی نسلوں کے لئے بھی یہی زندگی ہوگی۔ کون بدلے گا ان کی حالت؟ کہاں سے نکلے گی ان کے نام مقدر کی وہ لاٹری جو خوش حالی، صحت، تعلیم اور بیسویں صدی کی آسائشوں سے ان کی زندگی کو بھی جینے کے اور لطف اندوز ہونے کے قابل بنا سکے۔

آرام دہ ہونے کے باوجود اس سفر میں کوئی مزہ نہیں تھا۔ ہم سب ساتھ ہوتے ہوئے بھی اپنے اپنے خیالات کے حصار میں تھے اور ہم سفر ہو کے بھی تنہا تھے۔ اجنبیت کے احساس کی فضا کے ذمہ دار تین افراد تھے، جابر، کابل اور کلیم اللہ۔ کابل کے اپنے دکھ تھے، کچھ جسم کے کچھ روح کے۔ کلیم کی بے خبری اور معصومیت کے مقابل ہم سب خود کو مجرم محسوس کرتے تھے اور جابر کا وجود نفرت انگیز تھا۔ ورنہ واپسی کے سفر میں رابعہ، نازو اور غالب میرے ساتھ ہوتے تو ہم ان راستوں سے پیدل گزرتے ہوئے بھی رفاقت کے ہر لمحے سے لطف اندوز ہوتے۔ مشکلات اور تلخ حالات کو بھی ہنستے کھیلتے ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھاتے۔ ابھی تو ہم سب اپنی فطری خوش مزاجی، بے تکلفی اور زندہ دلی کو بھی بھولے ہوئے تھے۔

دو بجے سے پہلے ہی کلیم جاگ اٹھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ڈرتے ڈرتے کہا "چاچا مجھے بھوک لگی ہے۔"

اس ایک معصوم سوال نے جیسے جمود کی برف توڑ دی۔ رابعہ نے کہا "بھوک تو بیٹی مجھے بھی لگی ہے مگر دیکھو تمہارے چاچا کو ذرا بھی خیال نہیں کہ گاڑی روکنے کو کہیں۔"

"چاچی تم کہو نا" وہ بولا "تمہاری تو مانیں گے نا۔"

غالب اور نازو کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی "بچہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

رابعہ نے کہا "آخر میری کیوں مانیں گے؟"

"پاپا بھی مانتا تھا اماں کی بات" کلیم نے کہا۔

"بیٹی جیسی چاچی ہو تم" غالب نے کہا "تمہاری خاطر سبھی خاطرین کروا کے چاچا ہے۔"

"کیا تم نانا نہیں ہو؟" رابعہ نے جھینپ کے کہا۔

"نہیں۔ میں ماما ہوں" غالب بولا۔

جابر نے کہا "آگے میرا گاؤں ہے۔ ہم کچھ دیر وہاں ٹھہریں گے۔"

میں نے کہا "وہ کس لئے؟ ہم تمہاری میزبانی قبول نہیں کریں گے۔"

"مت کرو۔ میں تھوڑی دیر کے لئے اپنے گھر جاؤں گا۔ تم کو ادھر چھوڑ دوں گا۔ ایک جگہ ہے جہاں تمہیں کھانا مل جائے گا" اس نے کہا۔

چند منٹ بعد ہی اس نے ایک روڈ سائڈ ریسٹورنٹ کے آگے گاڑی روک دی۔ یہ بانس اور گھاس پھوس کی چھت والا سائبان تھا جس میں دو خستہ حال بسیں مخالف سمت میں منہ کئے کھڑی تھیں۔ بسوں کے تمام مسافر دیہاتی تھے اور بے تکلفی سے پالتی مارے اپنے خاندانوں سمیت دال چاول کا مغرب میں مصروف تھے۔ ہر خاندان کے بیچ میں ایک تھال رکھ دیا گیا تھا جس کا سائز خاندان کے سائز کی مناسبت سے تھا اور اسی مناسبت سے اس میں چاولوں کے ڈھیر پر دال ڈالی گئی تھی۔ وہ ہدایت کے مطابق دائیں ہاتھ سے دال اور چاول کا ایک گولا بنا رہے تھے اور اسے بڑی مہارت سے حلق میں ڈال کے نیچے اتار رہے تھے۔ جتنے کم وقت میں وہ دوسرا گولا بنا لیتے تھے، اس نوالے کو چبانے کی مہلت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دو سال کے بچے بھی اسی طرح خوراک کو معدے میں منتقل کرنے کا فن جانتے تھے۔ اس سے کم عمر بچوں کی مدد ان کی مائیں کر رہی تھیں جن کا اب کام دگنا ہو گیا تھا۔

"یہاں بس یہی ملے گا" جابر نے کہا "ادھر ایسے ہی کھانا بھی ملے گا۔"

نازو نے کہا "مجھے تو کراہیت محسوس ہو رہی ہے۔ دیکھو کیسے الوؤں کی طرح ان کے بچے چل رہے ہیں۔ پورے ہاتھ کی پوروں اور ہتھیلی تک استعمال ہو رہی ہے۔"

غالب نے کہا "اگر تمہیں بتایا جائے کہ تمہارے آباؤ اجداد بھیڑیوں کی طرح شکار کو زندہ بھنبھوڑ کے کھا جاتے تھے، کچے گوشت کے لوتھڑے کچھ نہیں چھوڑتے تھے۔"

"وہ تمہارے آباؤ اجداد ہوں گے" نازو نے تڑخ کے کہا۔

"کیوں، تمہارے آباؤ اجداد کیا ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کے چھری کانٹے کی مدد سے اور نیپکن لگا کے کھاتے تھے؟" غالب نے کہا۔

"کم سے کم کھاتے تو نہیں تھے اس طرح۔"

"مت کھاؤ۔ بھوکی بیٹھو گاڑی میں" غالب نے باہر نکل کے کہا اور کچھ دیر ہوا میں ہاتھ پاؤں چلا کے اطمینان سے زمین پر لیٹ گیا۔ پھر میں اترا اور میں نے بھی اکڑے ہوئے ہاتھوں پیروں کو قابل استعمال بنانے کے لئے ورزش کے انداز میں حرکت دی اور غالب کے قریب ہی لیٹ گیا۔ اس علاقے میں زمین کا مطلب مٹی دلدل نہیں ہوتا۔ درختوں اور خودرو پودوں کے درمیان جہاں بھی جگہ ہوتی ہے وہاں گھاس اپنی قدرتی تازگی کے ساتھ سبز فرش بچھا دیتی ہے۔ اوپر آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تیرتے ہوئے ایک سمت میں جمع ہو رہے تھے۔ رابعہ اور نازو کو بھی آخر کار باہر نکلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جابر کھانے کا آرڈر دے کے چلا گیا۔

ہم مجمع عوام سے کچھ فاصلے پر تھے۔ ایک کار اور اس میں سے برآمد ہونے والی کوہ قاف کی پریوں جیسی مخلوق نے ایک دم سب کو دم بخود کر دیا تھا۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے خواص کے لئے خصوصی انتظامات کا آغاز یوں کیا تھا کہ دیگر مہمانوں پر گرجنا برسنا شروع کر دیا تھا جو ہماری تشریف آوری سے قبل ضرور معزز تھے مگر ہماری موجودگی میں کسی اعزاز کے مستحق نہیں رہے تھے۔

میں نے کابل سے کہا "یہ بڈھا کیا شور مچا رہا ہے؟ کیوں ڈانٹ رہا ہے ان بے چاروں کو؟"

غالب نے کہا "انہوں نے کھانا جو چھوڑ دیا ہے۔ غالباً انہیں خوش خوراکی کے فوائد بتا رہا ہے۔"

رابعہ نے کہا "کیسے ہکا بکا بیٹھے ہیں سب۔"

"اور کیسے ٹک ٹک پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہے ہیں بے چارے!" نازو نے کہا۔

کابل نے بتایا کہ بڈھا انتہائی بات پر خفا ہو رہا ہے کہ کیا ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ انہوں نے پہلے امیر لوگ نہیں دیکھے۔ بس جلدی سے کھانا ختم کرو اور بس میں بیٹھ کے روانہ ہو جاؤ ورنہ ایسے ہی اٹھا دوں گا۔"

"کیا مطلب؟ پورا کھانا بھی نہیں کھانے دے گا!" رابعہ بولی۔

نازو نے کہا "پھر پورے پیسے کون دے گا؟"

کابل نے کہا "یہاں ان سے پیسے پہلے وصول کر لئے جاتے ہیں۔"

"یعنی بل پہلے، کھانا بعد میں؟"

"ہاں۔ کسی کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ پورے خاندان کا پیٹ بھر جائے تو وہ گالیاں دیتے کھانے کے لئے تیار ہو کے کہنے لگے کہ کھانا پیا اللہ کے نام پر معاف کرو۔ ہوٹل والا یہ رسک نہیں لے سکتا۔ کسی کسی کو مارنے اور مارنے سے نقصان تو پورا نہیں ہوتا۔ ان کے کپڑے بھی اتروا لے تو کہاں رکھے ضبط شدہ سامان کو۔ اس کے لئے الگ اسٹور بنائے۔ پھر اس سامان کا کیا کرے؟ آسان طریقہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ فی عدد کے حساب سے رقم لے کر کھانا دے دیا جائے" کابل نے کہا۔

"بچہ چاہے سب برابر۔"

www.paksociety.com

"سات سال سے کم کا کچھ نہیں' اس سے اوپر کا پورا۔" کاجل نے کہا۔

"کیا یہ برتھ سرٹیفکیٹ پیش کرتے ہیں کسی بچے کے بل سے بچنے کے لئے؟" غالب نے کہا۔

کاجل مسکرائی "یہ اختیارات ہوٹل کے مالک کو حاصل رہتے ہیں کہ وہ کس کی عمر سات سال سے کم مانتا ہے اور کس کی زیادہ۔ کوئی رحم دل ہو تو آٹھ نو کو بھی سات کا تسلیم کر لیتا ہے۔ زیادہ بھوری ٹائپ پانچ چھ سال والے کے بھی پورے پیسے مانگتا ہے۔ یہ لوگ منت سماجت کے عادی ہوتے ہیں۔"

"بس.. کاجل! اگر کسی کے پاس کھانے کے پیسے نہ ہوں۔ یا پورے پیسے نہ ہوں۔ پھر؟" غالب نے کہا۔

"کم پیسے ہیں تو کم کھائے۔ جتنا ملے سب مل بانٹ کے کھالیں۔ پیسہ نہیں ہے تو بس میں ہی بیٹھے رہیں" کاجل نے کہا۔

میری نظر بے اختیار بس کی طرف چلی گئی۔ ہر بس میں کم سے کم دس بارہ افراد خاموش بیٹھے کھڑکی سے جھانک رہے تھے اور کھانے والوں کو زبان خاموشی سے یہ احساس دلانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے کہ وہ بھی بھوکے ہیں مگر ان کی التجا سے کسی کے دل پر اثر نہیں ہو رہا تھا۔ کھانے والے کامل بے حسی کے ساتھ کھا رہے تھے اور بھوکی نظروں سے دیکھنے والوں کا ان کے نزدیک کوئی وجود نہیں تھا۔ ان میں مجھے چھوٹے چھوٹے بچے بھی نظر آئے۔ معلوم نہیں کیا مجبوری تھی کہ انہوں نے بس کا سفر اختیار کیا۔ شاید وہ کسی کی موت پر جا رہے تھے یا شادی میں اور جتنی رقم تھی وہ کرائے پر خرچ کر چکے تھے اور اب بھوک کو برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

اس منظر نے ہم سب کے دلوں پر ایک سے دکھ کے احساس کی چٹان لڑھکا دی تھی۔ بھوکے لوگوں کی نگاہیں اب چاول کے اس ابلے بھاپ دیتے ڈھیر کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھیں جو ایک بنگالی لڑکا جابر کی قیادت میں ہماری طرف لے کر آ رہا تھا۔ ہوٹل کا مالک بڑے خوشامدانہ انداز میں دال سے بھرا ہوا پیالہ لئے خود پیچھے پیچھے تھا۔

اس پُراذیت منظر نے ہم سب کے جذبات کو ایک ہی انداز میں متاثر کیا تھا۔ یکلخت دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ یہ تقسیم جغرافیائی' لسانی' تہذیبی یا سیاسی بنیاد پر نہیں تھی۔ دنیا دو ٹانگوں پر چلنے والے حیوان ناطق یا سوشل انیمل کا خطاب پانے والے انسانوں کے دو متحارب گروہوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ یہ نادار بھا جنگ لوٹنے والے' حیوانی خواہشات اور جذبات سے مغلوب خود غرض انسانوں کی وہ دنیا تھی جس میں ایک طرف فائیو اسٹار ہوٹل' نائٹ کلب' ائرکنڈیشنڈ کاریں' بنگلوں' ایل پی ریکارڈز' اعلیٰ ترین عورت' شراب' خوشبو اور ہیروں کے خریداروں کی ریل پیل تھی تو دوسری طرف ایک مٹھی چاول کے لئے بکتے بچوں' فاقہ کشی سے دم توڑتے بیمار بوڑھوں اور پانچ روپے کے حقیر کاغذی نوٹ کے لئے جسم کو گروی رکھنے والی عورتوں کی دنیا تھی۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں پہلے طبقے میں شامل تھا جو اس وقت میرے لئے بدقسمتی کے عذاب سے بڑھ کر احساسِ شرمندگی بن گئی۔ اور ایسا صرف میرے ہی ساتھ نہیں ہوا ہم سب نے انسانوں کے درمیان اس فرق کی اذیت کو محسوس کیا۔

"شاب شولام" بنگالی لڑکے نے اور پھر اس کے مالک نے ہاتھ اٹھا کے یہ آواز بلند کہا "میم شاب شولام"

میرے کچھ بولنے سے پہلے رابعہ نے کہا "یہ کھانا ادھر لے جاؤ۔"

نازو نے سمجھایا "ہاں' یہ لوگ جو بس میں بیٹھے ہیں ان کو دے دو۔"

بنگالی کا منہ کھلا رہ گیا "کیا بولا؟"

اب میں نے کہا "کاجل! اس کو تم سمجھاؤ کہ ان سب کو پیٹ بھر کے کھانا کھلائے' قیمت ہم ادا کریں گے۔ جو لوگ کھانا کھا رہے ہیں انہیں بھی پریشان نہ کرے۔"

غالب نے کہا "کہہ دو کہ سب کا بل ہم سے وصول کر لے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ پہلے سب کو کھانا دے' پھر ہمارے لئے لائے۔ ہم انتظار کر سکتے ہیں۔"

کاجل نے یہ بات ریسٹورنٹ کے بنگالی مالک کو سمجھائی تو وہ ہم سب کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اسے شک ہے کہ ہم اگر پاگل نہیں ہیں تو پھر نشے میں ہیں۔ تاہم اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا اور سر ہلا چلا گیا۔ اس کے بعد ہم نے ایک اور تکلیف دہ منظر دیکھا۔ بس میں بیٹھے ہوئے بھوکے انسانوں کا گروہ ایسے باہر نکلا جیسے عمر قید کاٹنے والے قیدیوں پر اچانک کسی نئی حکومت کے حکم پر جیل کے دروازے کھول دیے جائیں۔ وہ باہر نکلتے ہی کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے بچوں کو ہی نہیں' کچھ بڑوں کو بھی دونوں ہاتھوں سے کھاتا ہوا دیکھا۔ چاول کے کئی تھال خالی ہو گئے۔ دوسری طرف ان سب نے ایک ساتھ ریسٹورنٹ کے مالک کو گھیر لیا جو کھانے کی قیمت پیشگی ادا کر چکے تھے۔ بھوک نے انہیں تہذیب اور احساسات سے اتنا عاری کر دیا تھا کہ کسی نے ہمارا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا اور یہ بھی نہیں دیکھا کہ ان کے محسن کون ہیں۔ جو پہلے پیٹ بھر چکے تھے' انہوں نے اس دعوتِ عام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوبارہ کھانا شروع کر دیا اور چلا چلا کے اپنے بیوی بچوں سے کچھ کہنے لگے۔ کاجل نے بتایا کہ وہ ان کو مجبور کر رہے ہیں اور سمجھا رہے ہیں کہ ابھی موقع ہے' شام کا کھانا بھی پیٹ میں ڈال لیں۔ جو لوگ کے پیٹ پہلے ہی پھولے ہوئے تھے ان کے لئے اچھی غذاؤں کے اعمال کی سزا میں ہر سال ایک بچہ جنتا ہوا ان کی تقدیر کا نوشتہ تھا۔ مجھے یقین آنے لگا تھا کہ بسیار خوری کے باعث ان میں سے کچھ ضرور بدہضمی اور اسہال کا شکار ہوں گے۔

جب یہ ہنگامہ فرو ہوا اور ریسٹورنٹ کے بنگالی مالک نے ہم سب کو رقم کی ادائگی کے جنجال سے نجات پائی تو مسافر بسوں کو

بھرنے لگے۔ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ نوجوان جس نے صرف نیکر پہن رکھی تھی اور ایک بوڑھا جو بنگلی چلتی پھرتی لاش تھا' ڈرتے ڈرتے ہماری طرف آئے۔ قریب آ کے بوڑھے نے اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور کانپتی آواز میں کچھ کہتے ہوئے اس نے میرے قدم چھونے کی کوشش کی کیوں کہ سب سے آگے میں ہی تھا۔

"کاجل! اسے منع کرو' سمجھاؤ کہ انسان کو صرف خدا کے آگے جھکنا چاہئے" میں نے پیچھے ہٹ کے کہا۔

کاجل نے پہلے اسے روکا اور پھر میری طرف مڑ کے بولی "تمہارا یہ فلسفہ اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ان کے لئے وہی خدا ہے جو ان داتا ہو۔"

نوجوان نے انگریزی میں کہا "سب کی طرف سے میں انسانی ہمدردی کے اس مظاہرے پر آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے تصویریں کیوں نہیں بنائیں؟"

میں نے حیران ہو کے کہا "تصویریں؟"

"ہاں۔ کیمرے تو ضرور ہوں گے آپ کے پاس۔ پھر آپ نے یہ موقع کیوں ضائع کر دیا؟ بہت اچھی تصویریں بن سکتی تھیں اور کہیں بھی شائع ہو سکتی تھیں۔"

میں نے کہا "میں اس بات کا مطلب نہیں سمجھا!"

"یہ تماشا دیکھنے والے' ہمارے غریب ملک میں آتے رہتے ہیں۔ بھی غیر ملکی اخباری نمائندے' فوٹو گرافر اور سیاح۔ فاقہ کش ننگے بھوکے انسانوں کو کتوں کی طرح چھین جھپٹ کر کھاتا دیکھنے کے لئے وہ اسی فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور پھر یادگار تصویریں بنا کے لے جاتے ہیں' اخبارات اور رسائل میں چھپوانے کے لئے۔ بعض اوقات وہ کلرک کی اسامی کے لئے ضرورت ہے کا اشتہار دیتے ہیں جب ایک بے قابو ہجوم اکٹھا ہو جاتا ہے تو وہ جیب سے اتنے کے نوٹ نکال کے اچھال دیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ جو سلامت نوٹ پیش کرے گا اسے ملازمت مل جائے گی۔ ظاہر ہے نوٹ پرزہ پرزہ ہو جاتا ہے۔ ملازمت کسی کو بھی نہیں ملتی مگر ان کو بہترین شاٹ مل جاتے ہیں' کوئی انعامی تصویر بن جاتی ہے۔"

اس نوجوان کی بات چونکا دینے والی ہی نہیں افسوس ناک بھی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ پڑھا لکھا اور حساس آدمی ہے جس نے بھوک دیکھی ہے اور برداشت کی ہے۔

میں نے کہا "یہ ترقی یافتہ کہلانے والے نام نہاد مہذب ممالک کے لوگ غریب قوم کے ساتھ ایسا مذاق کرتے ہیں۔ ایتھوپیا' افریقی ممالک کے ساتھ تو ان کا رویہ ہمیشہ تذلیل کا ہوتا ہے مگر ہم پاکستانی ہیں' تمہارے ہم وطن اور ہم مذہب ہیں۔ یہ نیک کام ہم نے تمہاری غربت یا بے بسی کا تماشا دیکھنے کے لئے نہیں کیا تھا۔ ہمارے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ ہمارے اتنے قریب بچے تک بھوکے بیٹھے ہوں اور ہم اپنا پیٹ بھر کے ان کی طرف دیکھے بغیر چلے جائیں۔"

"ایک وقت ان کا پیٹ بھر دینے سے کیا ہوگا؟ آپ کے دل کو کچھ تسلی حاصل ہوئی کہ آپ نے نیک کام کیا" وہ اسی تلخی سے بولا "کچھ ثواب بھی ملے گا لیکن یہ کل پھر بھوکے ہوں گے۔"

میں نے کہا "نوجوان! دنیا کو رزق دینے والا خدا ہے۔ ہم نے محض ہمدردی کے جذبے سے مجبور ہو کے ایسا کیا۔ ہم بھلا کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ کل بھی سب کے پیٹ بھریں گے۔ کسی کی غربت' امارت میں بھی ہمارا کیا دخل ہے۔ یہ تو صرف اتنی سی بات ہے کہ اس وقت ہم سب ایک دسترخوان پر اکٹھے ہوئے تھے۔ جو سب نے کھایا' ہم بھی کھائیں گے۔ یہ ناممکن تھا کہ اسی جگہ کچھ لوگ بھوکے بیٹھے رہیں۔ ہم نے سب کے ساتھ کھانا شیئر کیا ہے۔ اسے احسان مت سمجھو اور نہ ہماری نیت پر شک کرو کہ ہم تم پر امیر ہونے کا رعب ڈالنا چاہتے ہیں یا ہم نے ثواب کمانے کی غرض سے ایسا کیا۔"

وہ کچھ شرمندہ نظر آنے لگا "اچھا۔ آئی ایم سوری" اس نے جاتے ہوئے پلٹ کے کہا اور پھر رکا "اور ہاں۔ ان سب کی طرف سے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں نہ احساس ہے اور نہ تمیز تہذیب۔"

"انہیں ضرورت نہیں ہے تمہارے شکریے کی" رابعہ نے اسے ڈانٹا۔

میں نے کہا "ایک بات بتاؤ گے سچ سچ؟"

اس نے کہا "پوچھئے۔"

میں نے کہا "تم نے غیر ملکی سیاحوں اور اخباری نمائندوں کے ذلت آمیز سلوک کی شکایت کی تھی۔ کتنی بار دیکھا ہو گا تم نے ان کا غیر انسانی تماشا؟"

"کئی بار....."

"اور ہر بار تمہاری اپنی پوزیشن کیا تھی؟ تم خود بھی تماشا تھے؟ یا تماشائی رہے؟" میں نے کہا۔

اس نے سوال کو سمجھ لیا اور ندامت سے اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کئی مڑے تڑے' میلے ہو جانے والے نوٹ نکالے۔

"یہ دیکھئے! یہ امریکن ڈالر ہیں" اس نے کہا "ہر ایک پر تاریخ پڑی ہوئی ہے کہ یہ میں نے کب لوٹا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ کون لوگ تھے اور انہوں نے سالم نوٹ پیش کرنے والے کے لئے نوکری کا اعلان کیا تھا۔"

"پھر تمہیں نوکری ملی؟" نازو نے پوچھا۔

"نہیں۔ نوکری ان کے پاس نہیں تھی۔ جب میں نے سالم نوٹ ان کی خدمت میں پیش کیا تو ان سب نے ایک جیسی بے غیرتی اور ڈھیٹ مسکراہٹ کے بعد قہقہے لگاتے ہوئے کہا کہ ویل ڈن نوجوان' تم واقعی نوکری کے اہل ہو۔ جیسے ہی ہمیں کسی نوکری کی ضرورت پڑی ہم تمہیں امریکا بلا لیں گے۔ اپنا نام پتا دو۔ بعد میں انہوں نے تسلیم کیا کہ وہ صرف مذاق تھا اور میں نے ان سے کہا کہ میں اس نوٹ کو ایک تعلیم یافتہ' مہذب اور جمہوریت پسند قوم کے

www.paksociety.com

مذاق کی سند کے طور پر محفوظ رکھوں گا کیوں کہ یہ مذاق نہیں تمہاری تہذیب اور شائستگی کے منہ پر طمانچہ ہے کیوں کہ تم سفاک لوگ انسانیت کی تذلیل کو مذاق اور تماشا کہتے ہو۔"

میں نے کہا "مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے خاموش تماشائی کا کردار ادا نہیں کیا اور اپنی قوم کی طرف سے ان کے منہ پر اچھا طمانچہ مارا۔"

غالب نے کہا "ایک ہمدرد ہم وطن اور ہم مذہب کی حیثیت سے میں تمہیں ایک پیش کش کرتا ہوں۔ اپنا نام پتا مت دو، میرا نام پتا لکھ لو۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو مجھے خط لکھ دینا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں ملازمت مل جائے گی، باعزت طور پر اور کسی احسان کے بغیر۔"

"شکریہ" اس نے رکھائی سے کہا "تم میرے ہمدرد اور ہم مذہب ضرور ہو اور مجھے آدمی بھی ہو مگر میرے ہم وطن نہیں ہو۔ تم بھی غیر ملکی ہو اور میں ملازمت کے لئے اپنا وطن چھوڑ کے تمہارے وطن نہیں آ سکتا۔ میں یہیں بھوکا مرنا پسند کروں گا۔"

وہ ایک دم پلٹا اور چلا گیا کیوں کہ بس میں مسافر بیٹھنے جا چکے تھے اور وہ بار بار ڈرائیور نے ہارن دے کر اس نوجوان کو متوجہ کرانے کی کوشش کی تھی۔ پھر رائے عامہ اور ریسٹورنٹ کے مالک نے اسے مجبور کر دیا کہ صبر سے کام لے۔ جاتے جاتے وہ نوجوان جو تعلیم یافتہ تھا، حساس ذہن رکھتا تھا اور غیرت مند بھی تھا، ہمارے منہ پر بھی طمانچہ مار گیا تھا۔ مجھے اس سے امید نہ تھی کہ وہ بھی بنیادی طور پر نفرت اور تعصب کے جذبات میں اندھا ہو گا، اس حد تک کہ ہم بھی جو کل تک اس کے ہم وطن پاکستانی تھے آج "غیر ملکی" ہو جائیں گے۔

رابعہ نے افسوس سے کہا "یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی ہم سے بے وطن ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ اجتماعی شعور کی مسموم فضا کا نتیجہ ہے۔ جب ایسے ہی ہٹلر نے اپنی پوری قوم کو جنگ کے جنون میں مبتلا کر دیا تھا اور اس جذبات کے ریلے میں پڑھے لکھے، ذہین اور دانشور تک بہہ گئے تھے۔"

غالب نے کہا "شاید ان کے جذبات کی یہ کیفیت ایک وقتی ردعمل ہے۔"

"شاید نہیں، یقیناً" میں نے کہا "یہ ایسا ہی ہے جیسے بڑے بھائی کے غلط رویے پر احتجاج کرتے ہوئے چھوٹا بھائی گھر چھوڑ دے۔ اسے بہت جلد پشیمانی کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کا ردعمل جذباتی حد تک غلط تھا۔ مگر بہرحال گھر گھر ہوتا ہے، گھر کے جھگڑے گھر میں ہی طے کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے گھر کو ختم نہیں کیا جا سکتا اور نہ گھر سے خلق کو۔ بھگانے والے اور لڑانے والے تو موقع ڈھونڈتے ہیں۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ ابھی ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ عالمی سیاست کے سازشی شکاری ان کا گھیراؤ ہی کے ہاتھوں جلد کرا چکے ہیں۔ انہوں نے اسی طرح کوریا کے دو حصے کئے تھے اور ویتنام کے۔ تقسیم کرو اور حکومت کرو۔ ان کا پرانا فارمولا ہے، اسی سے ان کی بالادستی قائم ہے۔ یہ پہلے اپنا اسلحہ بیچتے ہیں اور لڑواتے ہیں، پھر جنگ سے مفلوج اور معذور ہو جانے والوں کے ہمدرد بن کے پہنچ جاتے ہیں۔ تعمیر نو اور آبادکاری کے نام پر اپنا فالتو مال نکالتے ہیں اور فالتو افرادی قوت کو کھپاتے ہیں۔ فوجی طاقت کا توازن بحال کرنے کے لئے متروک سامان دیتے ہیں۔ ان کے پرانے اسلحہ بنانے والے کارخانے بند نہیں ہوتے۔"

ہمیں باتیں کرنے کا موقع اس لئے مل گیا تھا کہ دال چاول ختم ہو گئے تھے اور ہمارے لئے اسپیشل ڈش کے طور پر مچھلی بھی پکائی جا رہی تھی۔ یہ سب جلد تیار ہو جانے والی چیزیں تھیں۔ اسی دوران جابر بھی اپنے گھر چلا گیا تھا۔ چند منٹ کے بعد جب ہمیں کھانا فراہم کیا گیا تو اس کا ڈھنگ ہی اور تھا۔ عام کھانے میں موٹے چاول تھے، اب بہترین خوشبودار باسمتی پکائے گئے تھے۔ دال میں بگھار دیا گیا تھا اور مچھلی اضافی تھی۔ تاہم اسے کھانا مشکل کام تھا۔ ایک تو مچھلی کو تالاب سے پکڑ کے براہ راست پکا لیا گیا تھا۔ ان کی صفائی ضروری نہیں سمجھی گئی تھی چنانچہ شوربے کے ایک تالاب میں مچھلیاں ناک، منہ اور آنکھوں سمیت ڈوبی ہوئی تھیں۔

نادرہ نے برا سا منہ بنا کے کہا "میں تو نہیں کھا سکتی یہ مچھلی۔"

غالب نے کہا "کھاؤ گی کیسے؟ کھانے سے پہلے پکڑنے کے لئے تمہارے پاس بنسی اور ڈور ہے؟"

میں نے کہا "مچھلی کی جان مفت میں گئی۔ پانی کے تالاب سے نکلی تو اس شوربے کے تالاب میں ڈوب گئی۔ کھایا کسی نے بھی نہیں۔"

غالب نے کہا "میں اپنے کمینے میزبان کا دل رکھنے کی کوشش ضرور کرتا مگر مجھے معلوم ہے، اس مچھلی کے کھانے سے کیا ہوگا۔"

"کیا ہو گا؟" میں نے کہا۔

"انتقال پُرملال" غالب نے دال چاول کو مضحکہ خیز انداز میں ہاتھوں سے منہ میں ڈالنا شروع کیا "وہ ایسے کہ اس میں ہوں گے صرف کانٹے۔ یہ بنگالی ایسی ہی مچھلی پسند کرتے ہیں جس میں مچھلی کم سے کم اور کانٹے زیادہ سے زیادہ۔"

نادرہ ہنسنے لگی "ہاں۔ اور ایسے ماہر ہوتے ہیں یہ لوگ کہ منہ میں کانٹے جمع کرتے جاتے ہیں اور پھر پان کی پیک کی طرح تھوک دیتے ہیں۔"

"لیکن میں تو ماہر نہیں ہوں۔ ایک مچھلی کھائی تو دس کانٹے حلق میں پھنس جائیں گے۔"

میں نے کہا "ہم اس کا سوپ تو استعمال کر سکتے ہیں مس رابعہ۔"

"تم کرو" رابعہ نے کہا "تم دیکھتے نہیں مچھلی کے پیٹ سے آنتیں تک تو نکالی نہیں ہیں۔"

"مچھلی پکانے والے کے جذبات کا خون ہو گا، نقصان الگ" میں نے کہا۔

"بالکل غلط" نادرہ بولی "وہ تو بہت خوش ہو گا۔ پوری قیمت وصول کرے گا اور یہ مچھلی اگلی بس کے مسافروں کو خصوصی رعایتی قیمت پر فروخت کرے گا۔"

"یہ تو ہم سے اسپیشل ریٹ چارج کرے گا۔ سمجھ گیا ہے کہ ان سے پیسہ کھینچا جا سکتا ہے" رابعہ نے اس کی تائید کی۔

"خوب کھانا، میں ٹھیک حساب کرتا ہوں اس سے ایک ایک پیسے کا" غالب نے کہا۔

"اب تم کچھ نہیں کر سکتے۔ بسوں کے مسافر گئے۔ کس نے کتنے پیسے دیے تھے، اس کو کتنے واپس ملے، یہ حساب تو اسی وقت ہو سکتا تھا جب وہ لوگ موجود تھے۔ اب وہ جو مانگے خاموشی سے دے دو" نادرہ نے کہا۔

نادرہ کی بات بالکل ٹھیک تھی۔ ہم سب کھانے سے فارغ ہوئے تو ہوٹل کے مالک نے اپنی طرف سے بہت حساب کتاب کرنے کے بعد مجموعی رقم چار سو پچاس روپے پچاس پیسے بتائی۔ پھر بولا "پچاس پیسہ سوری۔"

"جی؟ کیا فرمایا آپ نے" غالب بولا۔

میں نے کہا "تمہیں خصوصی ڈسکاؤنٹ دے رہا ہے کہ پچاس پیسے چھوڑ دو۔ چار سو پچاس روپے دے دو۔"

"چار سو پچاس؟" غالب نے چلا کے کہا "سور کا بچہ لوٹنا چاہتا ہے ہمیں۔ فائیو اسٹار ہوٹل کے ریٹ لگا رہا ہے۔ چار سو پچاس جوتے ماروں گا۔"

"یہ کاروبار ہے مسٹر مرزا غالب۔ اس کی جگہ تم ہوتے تو تم بھی یہی کرتے" نادرہ نے غالب سے کہا "اب شرافت کرو۔"

"تم کہہ رہی ہو کہ میں بھی اتنا ہی کمینہ ہوں" غالب نے کہا۔

"نہیں، وہ کچھ کم ہے تم سے" نادرہ نے کہا۔

"اچھا تو پھر تم یہیں رہ جاؤ۔ اسی کے ساتھ باقی زندگی گزارو۔ دال بھات اور مچھلی کھاؤ، ہوٹل چلاؤ اور خوش رہو" غالب نے کہا "میں اس سے زیادہ کمینہ ہوں۔ میں واپس جا کے شادی کروں گا سیٹھ نذیر سے! نیلا سے اور اپنے مجوزہ سسر سے کہوں گا کہ تم کو فوراً عاق کرے۔"

ہوٹل کا مالک کچھ سمجھا تھا اور کچھ نہیں سمجھا تھا کہ فساد کی وجہ کیا ہے۔ وہ مظلوم صورت بنا کے مجسم فریادی بنا کھڑا تھا۔

"شاباش! ہمارا پیشہ۔ ہم غریب۔"

غالب نے کہا "غریب کے بچے! یہ ساڑھے چار سو کیسے ہو گئے؟ کیا لیتے ہو تم ایک ڈش سے دال بھات کا؟ مجھے اس لوٹ کے سب بتاؤ ہے۔"

غالب کی چال کامیاب رہی "اسٹا شوب۔ فقد آپ کا کھوری۔ ہم سار شوبو نا" اس نے چار انگلیوں سے وضاحت کی۔

"چار سو؟" غالب بضد تھا کہ اس سے پیسے پیسے کا حساب کرے "ہم ایک بات بولے گا۔ دو سو۔"

اس نے واویلا شروع کیا "ہم سو ہونا ئے کا شوب۔ گریب قوی۔"

غالب نے ڈانٹ کے کہا "سیدھی طرح حساب کرو۔ ایک تو یہ کیا پیٹتے ہو تم۔ ایک سوچو۔ دو بسوں میں کتنے مسافر تھے جن کو تم نے ہماری طرف سے کھانا کھلایا؟ اور یہ جو کھانا ہم نے کھایا یہ کیا تھا آخر؟ مچھلی کس نے مانگی تھی؟ اور ہم مچھلی پکڑتے کیسے بغیر بنسی ڈور کے۔ کیا غوطہ مار کے شوربے میں؟"

چوں کہ ابھی تک جابر لوٹا نہیں تھا اس لئے ہم نے محض تفریح کے لئے یہ بحث چلنے دی۔ کاجل ابھی تک کلثوم کے ساتھ الگ بیٹھ کے کھا رہی تھی اور اسے کھلانے میں اتنی مصروف تھی کہ ہماری گفتگو میں شریک نہیں تھی۔ اب اس کو ثالث کا کردار ادا کرنا پڑا۔ میزبان مصر تھا کہ ہر بس میں اندر باہر اوپر نیچے سب ملا کے سو افراد سے کم نہیں تھے۔ غالب اس حساب کو غلط ثابت کرنا چاہتا تھا۔ آخر کار تین سو پر سودا ہو گیا، بشرطیکہ اس میں چائے بھی شامل کی جائے جو ہم پئیں گے۔

غالب نے اسے تین نوٹ پکڑائے تو اس کی ساری خوشی خاک میں مل گئی جو اسے ہم جیسے سخی اور فیاض طبع دولت مند مہمانوں کی آمد پر ہوئی تھی۔ ہم میں سے ایک حساب کتاب میں کسی بنیئے سے کم نہیں تھا۔

جابر کے آتے ہی ہم نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور گاڑی میں جا بیٹھے۔ جابر کے ساتھ ایک اور شخص بھی آیا تھا جو ہم سب کو غور سے دیکھتا رہا اور پھر واپس چلا گیا۔

"یہ کون تھا؟" میں نے کہا "ایسے کیوں گھور رہا تھا ہمیں؟"

"یہ میرا بڑا بھائی تھا" جابر بولا "اسے میں نے بتا دیا ہے کہ میں کس کے ساتھ اور کہاں جا رہا ہوں تاکہ تم مجھے کہیں مار کے میری لاش کسی پہاڑ سے نیچے نہ پھینکو۔ میں نے رقم بھی اس کے پاس رکھوا دی ہے۔"

"ایسی صورت میں کیا اسے خوشی نہیں ہوگی کہ تمہارے ساتھ یہ کچھ کیا جائے" غالب نے برہمی سے کہا "ابھی تک یہ ہمارے دماغ میں نہیں تھا۔"

"دماغ میں کوئی خیال کسی وقت بھی آ سکتا ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "اگر ہم نے ویسا ہی کیا جیسا تمہیں اندیشہ تھا تو تمہارا یہ بڑا بھائی کیا کرے گا؟"

"یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا" وہ بولا "تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ جابر کیا شکاری نہیں ہے۔"

"تم شکاری ہی نہیں ہو جابر۔ ابھی تم نے شکاری دیکھے بھی

www.paksociety.com

نہیں ہوں گے۔" میں نے کہا "خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم دھوکے میں رکھ کے کسی کو نہیں مارتے اور زبان کا پاس رکھنا جانتے ہیں۔ ورنہ تمہارا یہ بھائی کیا کوئی بھی نہ تمہیں بچا سکتا تھا اور نہ ہمارا کچھ بگاڑ سکتا تھا۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا تم بھی۔ کوئی یہ سمجھے کہ ہمیں دھوکا دے سکتا ہے" ہماری مجبوری سے فائدہ اٹھا کے ہمیں بلیک میل کر سکتا ہے تو۔۔۔"

"لعنت دھوکا دینے والے پر" جابر نے کہا "دھوکا دینے کے لئے میں تمہارے ساتھ اتنی دور کیوں آتا؟ وہیں پکڑوا دیتا تمہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جنگ ختم ہو گئی ہے مگر وہ انعام باقی ہے جو تمہاری گرفتاری پر تھا۔"

کاجل نے فوراً مداخلت کی "چلو چھوڑو۔ جب کسی کی نیت میں فتور نہیں تو پھر بحث سے کیا فائدہ۔"

گاڑی پھر پوری رفتار سے پہاڑی راستے پر دوڑنے لگی۔ آہستہ آہستہ پہاڑوں کی بلندی میں اضافہ ہو رہا تھا اور سڑک جو پہلے سیدھی جا رہی تھی۔ اب جگہ جگہ موڑ کاٹ رہی تھی۔ پھر دیکھتے دیکھتے بادل گہرے ہو گئے اور دس منٹ بعد موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ پہاڑوں کے اوپر سے پانی کا ریلا سڑک پر آ رہا تھا اور ڈرائیونگ زیادہ خطرناک ہو گئی تھی لیکن جابر نے گاڑی روکی نہیں تھی۔

اچانک رابعہ نے میرے کان میں کہا "وہ شخص جو جابر کے ساتھ تھا یا خادم جابر کا بھائی نہیں ہو سکتا۔"

"کیا تم نے اس کی ولدیت نوٹ کی تھی؟" میں نے کہا۔

"مذاق کی بات نہیں۔ نازو نے بھی دیکھا تھا؟"

"کیا دیکھا تھا۔"

"ان کے چہرے بالکل مختلف تھے" رابعہ نے کہا "جسمانی ساخت کے اعتبار سے بھی۔۔۔۔"

میں نے کہا "بی بی جی! یہ تھیوری جس کی بنیاد قیاس پر ہے۔۔۔۔۔"

رابعہ نے میری بات کاٹ دی "یہ قیاس آرائی نہیں ہے۔ جب میں نے کاجل سے پوچھا تو اس نے تصدیق کی۔ اس نے دونوں کی گفتگو سنی تھی۔ شاید وہ بھول گئے تھے کہ ہم میں ایک بنگالی سمجھنے والی بھی ہے۔ کاجل انجان بن گئی تھی اور علیم سے باتیں کرنے لگی تھی مگر اس کا دھیان ان کی طرف تھا۔"

"کون تھا وہ؟" میں نے سنجیدہ ہو کے کہا۔

"کوئی پولیس کا آدمی تھا" رابعہ نے کہا "اس نے کہا تھا کہ تم فکر مت کرو۔ میں آگے چوکی پر اطلاع کر دوں گا۔"

"کیا اطلاع کرے گا؟"

"پولیس چوکی والوں کو کیا اطلاع فراہم کی جا سکتی ہے؟" رابعہ نے چڑ کے کہا۔

"ضروری تو نہیں کہ اطلاع ہمارے بارے میں ہو" میں نے کہا۔

"اور کس کے بارے میں ہوگی؟"

میں نے کہا "خاتون! اطلاع سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے بھائی کی مدد کرنے کے لئے اس کے راستے کی رکاوٹیں دور کرنا چاہتا ہو۔"

"وہ اس کا بھائی نہیں تھا" رابعہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "تم چاہو تو پوچھ لو۔"

"یعنی جابر سے پوچھوں؟ کیا کہوں اس سے کہ اسے اپنا بھائی ثابت کرے ورنہ۔۔۔۔"

"کاجل نے ایسی باتیں بھی سنی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھائی نہیں تھے" رابعہ نے کہا۔

"مثلاً؟ میں ذرا دور رہوں ورنہ خود انٹرویو لیتا کاجل کا۔"

"پہلے تو جابر نے اسے بتایا کہ وہ ماں اور بیوی کی وجہ سے پریشان ہے۔ دونوں کو لڑنے کے سوا کوئی کام نہیں۔ اس حد تک ایک دوسرے کی ضد ہیں وہ کہ ساس خودکشی کرنے کا اعلان کرے تو بہو کہے گی کہ بڑھیا تو جان چھڑانا چاہتی ہے مجھ سے۔ طعنے سنے میں سنوں گی۔ بہو زہر کھانے لگے تو ساس چھین لے گی کہ ڈرامہ کیا سب رکھا جائے گی" مجھے ہنسی آئی تو جابر نے پلٹ کے دیکھا۔

"آہستہ بولو" میں نے رابعہ کو ڈانٹا۔

رابعہ نے خفگی سے کہا "خود ٹھٹھا مار کے ہنسے تھے" آپ کو اپنے پر کنٹرول نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میرا کنٹرول تمہارے ہاتھ میں ہے۔ خیالات کا، جذبات کا اور کسی حد تک حرکات و سکنات کا۔ میرے مستقبل کا، گھر بار اور بال بچوں کا۔"

رابعہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ یہ اعلان تھا کہ اس طرح مجھ سے کوئی بھی بات نہیں کی جا سکتی کیوں کہ میں سنجیدہ نہیں ہوں۔

مجبوراً مجھے سنجیدہ ہونا پڑا "بھئی سوری۔ چلو میں تمہاری اطلاع پر تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔"

"نہیں، آپ ہنستے رہیں۔"

"دراصل ابھی مجھے اس خیال پر ہنسی آئی تھی کہ تمہاری بھی ساس زندہ ہوتی تو کیا ہوتا؟ یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے بلکہ بیماری ہے جو تقریباً ہر عورت کو ایک خاص عمر کو پہنچ کے لاحق ہوتی ہے اور اس کا وائرس بہو اپنے جہیز میں ساتھ لاتی ہے۔ تم اے ایس بی انجکشن لگوا لو" یہ آخری بات میں نے زور سے کہی۔

"کیوں مجھے کیا ہوا ہے؟" رابعہ نے منہ پھلا کے کہا۔

"ہوا تو نہیں مگر احتیاط کے طور پر چیچک، پولیو اور ٹائیفائڈ وغیرہ سے بچاؤ کے ٹیکے بھی تو لگوائے جاتے ہیں۔ اے ایس بی" میں نے آواز بلند کہا۔

نازو فوراً متوجہ ہو گئی "اے ایس بی کا انجکشن اب کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "حفظ ماتقدم کے طور پر تمہیں بھی لگوا لینا چاہئے۔"

غالب نے سر گھما کے دیکھا "یہ کون سا حفاظتی ٹیکہ ہے اور کس لئے؟"

میں نے کہا "صرف عورتوں کو لگتا ہے۔ جب وہ ساس بنتی ہیں تو ان پر ایک خطرناک وائرس حملہ کرتا ہے جس سے بہو کے خلاف دل میں فاسد خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ بہو کو بھی لگایا جائے تو دہرے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ زندگی امن و سکون کے ساتھ گزرتی ہے" میں نے کسی محقق کی طرح کہا "اے ایس بی یعنی اینٹی ساس بہو وائرس کا ٹیکہ۔۔۔۔"

غالب ہنسنے لگا "شکر ہے ہم تو محفوظ ہیں اس وائرس سے۔"

میں نے کہا "یہ خوش فہمی ہے، یہ مستقبل کی منصوبہ بندی ہے۔ تیرا کیا خیال ہے تو کبھی ساس نہیں بنے گی؟"

غالب نے عقیدت سے سر ہلایا "بجا ارشاد۔ کہاں سے ملے گا یہ انجکشن؟"

"مجھے کیا معلوم۔ جب ایجاد ہوگا تو ہر جگہ ملے گا اور سب سے زیادہ لگوایا بھی جائے گا۔"

نازو نے جھلا کے کہا "سٹھیا جانے کا وائرس بھی تو ہوتا ہے۔ تم ابھی سے اس کا انجکشن لگوا لو۔"

"اب بے کار ہے نازو" رابعہ نے کہا "ان پر وائرس کا حملہ ہو چکا ہے۔ یہ سٹھیا چکے ہیں۔"

جابر بھی ہمارے ساتھ ہنسنے لگا "سکندر خان نے ٹھیک کہا۔ میری بیوی رابعہ بڑی اچھی عورت ہے۔ فرماں بردار، نفس کُش اور ملنسار۔ ماں بھی سب کے ساتھ بڑی شفقت اور محبت کا سلوک کرتی ہے۔ دنیا میں کسی کو ان سے شکایت نہیں ہوگی" سوائے ایک دوسرے کے۔ یہ واقعی مرض ہوتا ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہے۔"

"علاج تو ہے جابر خان" غالب نے کہا۔

"کیا علاج ہے جی؟"

"تم مزید تین شادیاں کر لو۔ ایک ساس کے مقابلے میں چار بہوئیں ہوں گی تو ظاہر ہے طاقت کا توازن۔۔۔۔"

جابر ہنسا "مگر پھر وہ بہوئیں آپس میں لڑیں گی؟"

غالب نے کہا "اس کا بھی حل ہے۔ خدا نے ہر مسئلے کا حل رکھا ہے جابر خان۔ بہت آسان علاج ہے۔ ان سب کو ایک دائرے میں کھڑا کرو۔ ایک بیوی کو مشرق میں، دوسری کو مغرب میں، تیسری بہو شمال میں تو چوتھی جنوب میں۔ خود درمیان میں کھڑے ہو جاؤ اور چاروں طرف گھوم کے ایک دو تین بار کہو۔ طلاق۔"

رابعہ نے کہا "مگر اپنے کفن دفن کا انتظام پہلے کر لینا۔"

اب نازو بھی بولی "ہاں۔ بہتر ہوگا اگر سر سے کفن باندھ کے یہ عمل قبرستان میں ہی کیا جائے۔"

ہمیں مسلسل ڈرائیونگ کرتے ہوئے پانچ گھنٹے ہو گئے تھے۔ جابر نے راستے میں دو بار ٹینک میں پٹرول بھروایا تھا اور ہمیں بیس لیٹر کے دو جیری کین ابھی تک گاڑی میں محفوظ تھے۔ اس پورے سفر میں بھی ان گنت ندی نالے اور دریا آئے تھے مگر جابر ان راستوں سے اچھی طرح واقف تھا جیسے ہم لاہور پنڈی کے۔ اسے کو جانتے تھے کہ کہاں موڑ آئے گا کہاں پٹرول پمپ ہوگا اور کہاں پل۔ کس شہر سے گزرتے ہوئے کون سی سڑک پر کس طرف ٹریفک ہوگی اور باہر جانے والا راستہ کدھر سے نکلے گا۔ جہاں ضرورت محسوس ہوئی اس نے کشتی یا فیری کے ذریعے کار کو پار اتارا مگر بیشتر مقامات پر اس نے گھوم پھر کے کوئی پل تلاش کر لیا یا ایسی جگہ دیکھی جہاں پانی کم تھا اور کار کو اس میں سے گزارا جا سکتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ کہاں پانی کی گہرائی خطرناک نہیں ہوگی اور پانی کی سطح کے نیچے خطرناک گڑھا یا دلدلی زمین نہیں ہوگی۔

رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو اس نے ہم سے پوچھا کہ کیا ہمارا ارادہ کہیں رک کر رات گزارنے کا ہے۔

میں نے کہا "تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے۔ کیا رات کا سفر غیر محفوظ ہوگا؟"

"نہیں۔ خطرے کی بات تو کوئی نہیں" وہ بولا۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"آپ لوگ مسلسل سفر سے تھک گئے ہوں گے۔"

میں نے کہا "تھکن کا علاج تو یہ ہے کہ کچھ دیر کے لئے رک جائیں۔ رات کا کھانا آخر کہیں تو کھائیں گے۔"

اس نے سوچ کے کہا "ہوٹل تو کوئی ہوگا نہیں۔ ہوا تو بند ملے گا۔ اس گاؤں میں لیکن کھانے کا بندوبست ہو جائے گا۔"

"کیسے ہو جائے گا؟"

"کسی کے گھر سے۔ یہ غریب لوگ ہیں" پیسے لے کر سب کچھ کر دیتے ہیں" وہ بولا "یہاں سب کچھ بک سکتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے ضمیر، ایمان؟"

"میرا مطلب تھا بیوی بچے تک" وہ تلخی سے بولا "ایمان وہ اپنے پاس رکھ لیتے ہیں دوسری دنیا کے لئے۔"

"وہ کھانا پکا کے دیں گے؟" غالب نے کہا۔

"آپ کسی کو سو کا نوٹ دکھائیں" وہ بولا "وہ کھانا پکائے گا اور حکم ہوگا تو ایک ٹانگ پر کھڑا رہ کے کھلائے گا۔ دوسرا نوٹ دکھائیں گے تو اپنی بیوی کو رات بھر آپ کی خدمت پر مامور کر کے خود گھر سے چلا جائے گا۔ غریبی بری چیز ہے سر۔ آپ کا اس سے واسطہ نہیں پڑا ہوگا۔ یہاں نہ نوکریاں ہیں نہ روزگار۔ دفتر، کارخانے، کاروبار سب شہروں میں ہوتے ہیں لیکن بہت تو وہاں بھی اتنا ہی کمانے کو ملتا ہے۔ یہ تو چوری بھی نہیں کر سکتے اور نہ ڈاکے ڈال سکتے ہیں۔ سب ایک سے کنگال ہیں۔ جو محلوں میں کوئی دولت مند ہے تو اس کا گھر رکھا یا پٹھان چوکیدار آدمی کو ایسے گولی مار دیتا ہے معمولی سے جرم پر جیسے وہ انسان نہیں پاگل کتا ہے۔ اور حقیقت

www.paksociety.com

بھی لگی ہے۔ یہ انسان کہاں ہیں' جو کتے سے بدتر زندگی گزارتے ہیں۔ یہ ان کے لئے تو خدا نے نہ پکھری ہے۔ سوری۔۔۔ میں بہت بول گیا۔ میں نے سوچا' آپ کو اس دنیا کا ظاہری حسن تو نظر آ رہا ہے' اس کے پیچھے جتنی بدصورتی ہے' وہ بھی نظر آ جائے۔"

میں نے کہا "جابر خان! ایسا تو ہر جگہ ہے۔ افریقہ بڑا خوب صورت ملک ہے۔ کشمیر کو دیکھو یا مری سے سوات تک پھیلے ہوئے حسن قدرت کو۔ غربت بھی وہیں زیادہ ہے۔"

اس نے کار کو ایک کچے مکان کے عقب میں لے جا کر روک لیا جہاں سے کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ پھر اس نے سامنے سے دروازے پر دستک دی اور ایک بوڑھے آدمی سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے اچھی طرح دیکھنے کے بعد وہ گھر منتخب کیا تھا۔ وہاں مرغیوں کے ڈربے بھی نظر آ رہے تھے۔ اس کا اندازہ بھی درست تھا۔ سو ناشتے میں ہم نے تازہ پکا ہوا کھانا کھایا' جس میں بھنی ہوئی مرغی کے ساتھ گرم روٹی تھی جو بیک وقت دو عورتوں نے الٹے توے پر گیلی لکڑیوں کے دھوئیں کی پروا کیے بغیر پکائی تھیں۔ جابر کی باتیں سننے کے بعد مجھ میں اتنی ہمت نہ رہی تھی کہ میں اندر جھانک بھی سکتا اور دیکھتا کہ ان کوہساروں' آبشاروں اور مرغزاروں کی حسین آغوش میں پرورش پانے والی عورت کے حصے میں کتنا حسن آیا ہے۔

ہمارا میزبان اس لئے خاموش رہا کہ وہ ہم سے مرعوب تھا اور ہم نے اس سے کوئی بات اس لئے نہیں کی کہ ہم اپنی "امارت" سے شرمندہ تھے اور ہماری خوش حالی جو رنگ روپ' لباس اور کار کے علاوہ سو کے نوٹوں سے عیاں تھی' ہمارے احساس کے لئے ایک جرم بن گئی تھی۔

تقریباً دو گھنٹے بعد ہم پھر روانہ ہوئے تو تازہ دم تھے۔ رات کا باقی حصہ خاموشی سے سفر میں کٹا۔ میں اور رابعہ کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے' پھر میں آگے غالب کی جگہ بیٹھ گیا اور غالب پیچھے آ کے سو گیا۔ کلیم بالکل خاموش رہا تھا اور سب سے پہلے سو گیا تھا۔ کاجل بھی اپنی ساری شوخی اور طراری بھول گئی تھی اور شاید گھر سے دوری کا احساس اور ماں باپ کو ایک ساتھ کھو دینے کا غم وقت کے ساتھ ساتھ بڑھنے والا بوجھ ہو گیا تھا کہ وہ بار بار رونے لگتی تھی لیکن کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی کہ وہ رو رہی ہے۔

رات کا آخری پہر تھا جب اچانک سڑک کے بیچ میں ٹارچ لائٹ کی چندھیا دینے والی روشنی دکھائی دی۔

"سرحدی پولیس" جابر نے مجھے ہوشیار کرنے کے لئے کہا۔

کار کے سامنے دو باوردی افراد بندوق کا رخ ہماری طرف کیے کھڑے تھے۔ اشارے سے انہوں نے مجھے اور جابر کو اترنے کا حکم دیا۔ ہمیں لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے سے کیبن میں لے گئے۔ وہاں ایک افسر قسم کی چیز لکڑی کی میز کے پیچھے کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔ وہ صورت سے ہی خبیث' کرخت اور خطرناک لگتا تھا۔ میرے پیچھے پیچھے غالب بھی اندر آ گیا۔

میرا اور غالب کا بغور معائنہ کرنے کے بعد اس نے کہا "تم سب نیپال میں پناہ لینے جا رہے ہو؟"

اس نے انگریزی میں بات کی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں انگریزی میں جواب دیتا' جابر نے اردو میں کہا "یہ بھارتی شرنارتھی نہیں سر۔ آپ کو۔۔۔"

افسر نے غرا کے کہا "بس بلا ضرورت بھونکنے والے کتے کو پہلے خاموش کرو۔"

رائفل کا ایک بٹ جابر کے سر پر پڑا۔ وہ لڑکھڑایا اور گرنے لگا تو دو افراد اسے کھینچ کر لے گئے۔

"اس نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم بھارتی سفارت خانے سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنی اپنی فیملی کے ساتھ سفر کر رہے ہیں" میں نے انگریزی میں کہا "تم کو ہمارے ڈرائیور کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں' یہ بتانا تمہارا کام نہیں۔ پاسپورٹ نکالو سب کے" اس نے دہاڑ کر میز پر ہاتھ مارا۔

میں نے اور غالب نے اپنے' رابعہ اور نازو کے پاسپورٹ اس کے سامنے ڈال دیئے۔

"کار میں جتنے لوگ ہیں سب کو لے آؤ" اس نے ایک ماتحت کو حکم دیا۔

چند منٹ بعد نازو' کاجل اور کلیم کے ساتھ رابعہ کو حاضر کر دیا گیا۔ افسر نے پاسپورٹ کی تصویر سے باری باری سب کا چہرہ ملایا اور سر ہلانے لگا۔

"یہ عورت کون ہے؟" اس نے کاجل کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ عبدالستار چوہدری کی بیٹی ہے۔ کاجل" میں نے کہا "اور یہ اس کا بیٹا ہے۔ وہ بنگلہ دیش کے اہم سیاسی لیڈر اور شیخ مجیب کے دست راست ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "ان کو الگ کر دو۔"

"مگر کیوں؟" میں نے احتجاج کیا۔

وہ کرسی سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا رابعہ کے سامنے رک گیا۔ رابعہ کا پاسپورٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"یہ۔۔۔ جعلسازی ہے" اس نے کہا "اس پر تصویر بدلی گئی ہے۔"

"یہ غلط ہے" میں نے کہا۔

اس نے گھوم کے میرے منہ پر بھرپور تھپڑ مارا "میری آنکھ میں کوئی دھول نہیں جھونک سکتا۔"

پھر اس نے اپنے ایک ماتحت کو حکم دیا کہ کار کو قبضے میں کر لے۔ باہر سے جابر کے چلانے کی آواز آئی۔ پھر ایک فائر ہوا۔

صورت حال کی یہ ڈرامائی تبدیلی اس حد تک غیر متوقع اور ہمارے خلاف تھی کہ میری قوت فیصلہ بھی جواب دے گئی۔ مجھے یقین نہیں ہم میں سے کسی کو بھی یہ امید نہ تھی کہ ایک چھوٹی سی سرحدی چوکی پر ہم اچانک پکڑے جائیں گے۔ ہم سب کو خدا پر بھروسا تھا کہ وہ بڑا کارساز ہے' تو یہ سمجھنے کی بات نہیں تھی بلکہ ایمان تھا۔ سمجھا ہم نے یہ تھا کہ جابر انتہائی معاملہ فہم ہے۔ رشوت بھی جانتا ہے اور اسے بند راستوں کی رکاوٹیں دور کرنے کے سب منتر بھی آتے ہیں۔ اس نے اپنے طور پر کوشش سے ایڈوانس کلیئرنس حاصل کر لی ہوگی ورنہ جہاں ضرورت محسوس ہوگی' ہمارا وہ تعلقات کے حوالے یا رشوت کے فارمولے سے کام چلانے کی پوزیشن میں ہوگا۔

گرفتاری کے ساتھ ہی جابر کے ساتھ ہونے والے سلوک نے اچانک ہم سب کے اعتماد کو متزلزل کر دیا اور جب میں نے فائر کی آواز سنی تو یوں لگا جیسے ہم ایک راہ گم کردہ کارواں ہیں جس کو نشان منزل دکھانے والا کوئی نہیں رہا۔ میں نے اپنے منہ پر پڑنے والے تھپڑ کو بھی صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کر لیا تھا اور کسی ایسے جوابی ردعمل سے گریز کیا تھا جس کا خمیازہ سب کو سفر کے پہلے مرحلے کی کامیابی سے محروم کر دیتا لیکن فائر کے ساتھ جابر کی چیخ بھی سنائی دی تو میں خاموش نہ رہ سکا۔

میں نے چیخ کر کہا "یو باسٹرڈ! اگر تم نے اسے مار دیا ہے تو یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔"

وہ واپس اپنی کرسی پر جا بیٹھا تھا "تم مجھ سے اچھائی کی امید رکھتے ہو؟ کیا میں اچھا آدمی ہوں؟ تم جانتے ہو مجھے؟"

میں نے کہا "وہ ایک بہت اہم بھارتی سفارت کار کا سرکاری ڈرائیور تھا۔ تمہیں اس جرم کی جواب دہی کرنی ہوگی۔"

وہ نازی فوج کے کسی افسر کی طرح ایکٹنگ کر رہا تھا جس نے ذاتی کوشش سے اتحادی جاسوسوں اور تخریب کاروں کو گرفتار کر لیا ہو۔ اپنی برتری اور ہماری بے بسی' اپنی طاقت اور ہماری ناطاقتی' اپنے اختیار اور ہماری بے اختیاری پر فخر و غرور کی نمائش میں وہ اوور ایکٹنگ کر رہا تھا۔

میرا یہ اندازہ غلط ہو گیا تھا کہ وہ کوئی چھوٹی سی سرحدی چوکی ہے۔ لکڑی کے اس کیبن کے پیچھے یقیناً اور بھی بہت سے کیبن تھے یا کوئی بیرک تھی جہاں خاصی تعداد میں مسلح افراد موجود تھے۔ دو افراد جابر کو کھینچ کر باہر لے گئے تھے تو ان کی جگہ چار اندر آ گئے تھے۔ پھر دو کاجل اور کلیم کو دھکیل کر لے گئے تھے تو مزید چار نے ان کی جگہ لے لی تھی۔ مجموعی طور پر اب ہم آٹھ افراد کے حصار میں تھے جن کی بندوقوں کا رخ ہماری طرف تھا اور وہ کوئی عام قسم کی رائفلیں یا بندوقیں نہیں تھیں۔ وہ جدید ساخت کی خودکار رائفلیں تھیں۔

ان کے افسر اعلیٰ نے جو بظاہر صرف کیپٹن تھا' انتہائی سکون اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے' جذبات سے عاری اور سپاٹ لہجے میں آہستہ آہستہ ہر لفظ ادا کرتے ہوئے سارے سوالات کیے تھے اور پھر یوں مسکرانے لگا تھا جیسے وہ جانتا ہے کہ ہم اس کے کسی سوال کا جواب دے ہی نہیں سکتے۔

میز پر پڑے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ کو اپنی طرف کھینچ کر اس نے ایک سگریٹ نکالی' اس کے دونوں سروں کا غور سے معائنہ کیا پھر میز پر ٹھونکا اور انگلیوں میں گھما کے کچھ سوچتے ہوئے ہونٹوں میں دبا لیا۔ اسے سلگانے میں اور پہلے کش کا دھواں چھت کی جانب چھوڑنے میں اس نے پورا ایک منٹ گزار دیا۔ میں اس نفسیاتی دباؤ سے اعصاب کو کشیدہ کرنے والے ذہنی تشدد کے پہلے مرحلے کو سمجھ چکا تھا چنانچہ میں نے سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود بھی زیر لب مسکرانے لگا۔

"میں ایک سفاک اور مکار افسر سمجھا جاتا ہوں" اس نے آخر کار کہا "یہ جو میرے ماتحت ہیں' پیٹھ پیچھے مجھے بہت کچھ کہتے ہیں۔ بھیڑیا مشہور ہوں میں اور میں برا نہیں مانتا۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جس نے مجھے افسرانِ اعلیٰ کی نظر میں بے عزت نہیں کیا' سرخرو کیا ہے۔"

اچانک اس نے میز پر ہاتھ مارا اور گرج کے بولا "اور تم کہتے ہو مجھے جواب دہی کرنی ہوگی! کس کے سامنے؟ تمہارے سامنے؟ تم کیا سمجھتے ہو کہ میرا کورٹ مارشل کروا دو گے؟ اگر میں نے ایک معمولی ڈرائیور کو شوٹ کروا دیا تو کیا میں تم سب کو شوٹ نہیں کر سکتا؟ کیوں زندہ چھوڑوں گا میں کسی ایسے شخص کو جس سے مجھے اندیشہ ہو کہ وہ ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے میرے خلاف اعلیٰ حکام کو بے بنیاد الزامات پر مبنی شکایت نامہ بھیج سکتا ہے؟ کون روک سکتا ہے مجھے اس جرم کا سراغ لگانے سے؟ اگر یہ مان لیا جائے کہ میں نے جرم کیا تھا۔ یہاں ہر روز اسمگلر' سرحد پار کرانے والے ایجنٹ اور سرحد کو ناجائز طور پر پار کرنے والے مارے جاتے ہیں۔ یہی کام سونپا گیا ہے مجھے اور میں اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا' خوشی محسوس کرتا ہوں۔ میں رشوت قبول نہیں کرتا اور کسی کے پاس پردھان منتری کا خط بھی ہو تو پھاڑ کے پھینک دیتا ہوں۔"

اب میں اس کو سمجھ چکا تھا۔ یا تو وہ نفسیاتی مریض تھا جو اپنے احساس کمتری کو مٹانے کے لیے اپنی اہمیت کی تشہیر کرتا تھا۔ وہ اپنے اختیار و اقتدار کے اعلان سے خوشی حاصل کرتا تھا اور لوگوں کو خوف و دہشت میں مبتلا دیکھ کر اس کی خود اعتمادی بڑھ جاتی تھی۔ یا وہ محض ڈراما کر رہا تھا۔

میں نے کہا "یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ کیا میں مجرم اور اسمگلر ہوں؟ ناجائز طور پر سرحد پار کر رہا ہوں؟ میں نے رشوت دینے کی کوشش کی یا پردھان منتری کا خط پیش کیا؟ تمہاری باتوں سے میں خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔"

اس نے پاؤں میز پر پھیلا کر سگریٹ کے کش لیتے ہوئے میری

www.paksociety.com

بات ایسے سنی جیسے نہیں سنی اور چھت کی طرف ایسے دیکھتا رہا جیسے اپنے خیالات میں کھو ہو۔ پھر اس نے محافظوں کو مخاطب کیا۔

"تم نے تلاشی لی ان سب کی؟"

ایک نے دوسرے کی طرف اور دوسرے نے تیسرے کی طرف دیکھا لیکن جواب کسی نے نہیں دیا۔

"اگر ابھی ان میں سے کوئی اچانک ریوالور نکال لے مجھے شوٹ کرنے کے لیے تو تم سب احمق کیا کرو گے؟" اس نے طنزیہ کہا "مجرم کو شوٹ کرو گے؟ اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ البتہ تمہارے خلاف دو الزامات ہو جائیں گے۔ ایک فرائض میں غفلت برتنے کا دوسرا کسی قانونی اختیار کے بغیر قتل کا۔ اصولاً تمہارا کام یہ ہونا چاہیے کہ ملزم کو قانون کے حوالے کرو۔"

سکون سے بات کرتے کرتے وہ ایک دم گرجا "شکل کیا دیکھ رہے ہو ایک دوسرے کی! تلاشی لو ان کی اور کڑی کی۔"

یہ اس کا خاص انداز تھا۔ محافظ ایک دم اچھل پڑے اور انہوں نے سب سے پہلے مجھے تلاشی کے لیے منتخب کیا۔ دو محافظ مجھے دھکیل کر باہر لے گئے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ آخر شب کے گھپ اندھیرے میں بھی کچھ فاصلے پر مجھے ایک اور کیبن اور اس کے ساتھ ہی نسبتاً طویل بیرک نظر آئی۔ درمیانی فاصلہ سو گز کے قریب تھا اور اونچی نیچی چٹانوں اور پتھروں کے درمیان بل کھاتا راستہ ہموار جگہ کو صاف کر کے بنایا گیا تھا اور نشاندہی کے لیے اس کے دونوں جانب قطار میں رکھے گئے پتھروں کو چونے سے سفید کر دیا گیا تھا چنانچہ تاریکی میں بھی یہ راستہ صاف نظر آتا تھا۔ میں کسی مزاحمت کے بغیر دونوں محافظوں کے آگے چلتا گیا۔ اگر میں چاہتا تو پلٹ کر ایک سیکنڈ میں ان کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ میرے لیے بے خبری میں ان کے سر آپس میں ٹکرا دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ ان کے سر ناریل کی طرح کسی چٹان پر مار کے بھی توڑے جا سکتے تھے اور میں آسانی سے ان کی خود کار رائفلیں چھین سکتا تھا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ الٹا نقصان یہ ہوتا کہ میرے باقی ساتھیوں کی رہائی کے امکانات معدوم ہو جاتے۔ میں عجلت میں کوئی غلط قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے پہلے یہ ضروری تھا کہ حریف کی قوت کا صحیح اندازہ کر لیا جائے اور مناسب منصوبہ بندی کے بعد اس موقع کا انتظار کیا جائے جو خوش قسمتی سے کبھی مل جاتا ہے۔

میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ کاجل اور کلیم اللہ کو انہوں نے کہاں رکھا ہے اور انہیں کس لیے الگ کرنا ضروری سمجھا گیا تھا۔ جابر کی چیخ سے اندازہ تو یہی ہوتا تھا کہ گولی اسے ماری گئی ہوگی۔ اس کے قتل پر میرا فوری ردِعمل ایک احتجاجی کیفیت کا حامل تھا ورنہ مجھے اس کی موت کا کوئی جذباتی صدمہ نہیں تھا۔ اب مجھے تجسس تھا کہ جابر سے کیا غلطی سرزد ہوئی تھی؟ اس کے انتظام میں کیا خامی رہ گئی تھی اور اس کے اعتماد کی شکست کے پیچھے کیا عوامل کارفرما تھے؟ کیا کسی نے اس سے دشمنی کرتے ہوئے مخبری کی تھی یا شامتِ اعمال کے باعث اس کے جرائم کا راز فاش ہو گیا تھا۔

محافظ مجھے بیرک کے بجائے علیحدہ بنے ہوئے کمرے میں لے گئے وہاں بھی لالٹین جل رہی تھی۔ اس کی زرد دھندلی روشنی میں لکڑی کی دیواروں والے کیبن کا ماحول زیادہ پُرخوف ہو گیا تھا۔ میں نے کاجل کو ایک کرسی پر اداس اور مضمحل بیٹھا دیکھا۔ کلیم اللہ اس کے قریب ہی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ شاید کاجل نے اسے زبردستی سُلانے کی کوشش کی تھی مگر وہ جاگ رہا تھا اور مجھے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا۔

"چاچا جی! یہ کون بدمعاش تھا جس نے تم کو مارا؟"

میں نے کہا "تم سو جاؤ..."

"نہیں۔ پہلے بتائیں اس نے کیوں مارا تھا تمہیں؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کاجل سے کہا "تم..."

اس نے میری بات سمجھ کے سر ہلایا "میں ٹھیک ہوں۔"

میں نے کہا "تمہارے ساتھ کسی نے بدتمیزی تو نہیں کی؟"

"نہیں۔" وہ بولی "انہوں نے کیوں روک لیا ہے ہمیں سکندر؟"

میں نے کہا "انہیں اس کا اختیار ہے مگر فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"فکر کی بات کیوں نہیں۔ جابر کو مار چکے ہیں یہ لوگ اور ہمارے بارے میں بھی ان کے عزائم ٹھیک نہیں لگتے۔"

"جابر کو اس کے کیے کی سزا ملی۔ یہ بہت ٹھیک ہوا۔"

"مگر ہم آگے کیسے جائیں گے؟" کاجل نے کہا۔

میں نے کہا "ڈرائیونگ مجھے بھی آتی ہے۔ ہم سب کو آتی ہے۔"

اس تمام عرصے میں محافظ میرے کپڑوں کی ہر جیب ٹٹول کر خالی کر چکے تھے۔ انہوں نے میرے جوتے اتروائے اور میرے سارے جسم پر ہاتھ مار کے کسی خفیہ مقام پر موجود اسلحہ برآمد کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ہم اتنے احمق نہیں تھے کہ ایسے خطرناک راستے پر سفر کرتے ہوئے اسلحہ جیب میں رکھتے اور کہیں بھی تلاشی لینے والوں کو اپنے خلاف ایک فردِ جرم بنانے کا موقع فراہم کرتے۔ ناجائز طور پر سرحد عبور کرنا ان دنوں کوئی سنگین جرم نہیں تھا۔ نیپال کے حکام عموماً پاکستانی مہاجرین سے چشم پوشی کر رہے تھے اور انہیں پاکستان پہنچانے کے لیے انتظامات بھی کر رہے تھے لیکن لائسنس کے بغیر اسلحہ رکھنا یقیناً جرم تھا۔ اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ ہم نے آرام کی خاطر کار میں سفر کیوں کیا۔ ہم کسی بھی قافلے کے ساتھ روانہ ہو جاتے تو بلا روک ٹوک نیپال پہنچ جاتے۔ یہ بہت لمبا اور تکلیف دہ سفر تھا مگر ہم دوسرے پورے خاندان عورتوں اور بچوں کے ساتھ یہ سختی جھیل رہے تھے تو ہم بھی برداشت کر سکتے تھے۔

محافظوں کو اطمینان ہو گیا کہ اب میرے پاس کوئی خطرناک چیز نہیں رہی تو انہوں نے مجھے واپسی کا اشارہ کیا۔

اسی وقت کاجل نے کہا "سکندر! بابا کا نام پوچھو کے انہوں نے مجھے کیوں الگ کر دیا تھا؟ کیا یہ بھی دشمن ہیں ان کے؟"

میں نے رک کے کہا "ابھی میں کیا بتا سکتا ہوں۔"

"یہ ضرور مجھے روک لیں گے اور تم کو جانے دیں گے۔" وہ رونے لگی۔

میں نے کہا "بے وقوف لڑکی! کیا ہم تمہیں چھوڑ کر جا سکتے ہیں؟ یہ بھی تو سوچو۔"

وہ اسی طرح آنسو بہاتی رہی "سکندر! ان سے کہنا کہ..."

اب محافظوں نے مجھے دروازے کی جانب دھکا دیا "چلو۔"

کاجل چلائی "تم بات ضرور کرنا کم سے کم اس معصوم اور یتیم بچے کو تو جانے دیں۔"

کلیم اللہ نے کہا "کیا میں یتیم ہوں؟"

میں پھر رک کر کہا "نہیں بیٹا! تمہارے تو ماں باپ زندہ ہیں۔" میں نے کاجل کو غصے سے دیکھ کر کہا۔

محافظوں کے دوسرے دھکے سے میں باہر جا گرا۔ میرے کانوں میں اس وقت بھی کلیم کی آواز آ رہی تھی۔

"بتاؤ نا مجھے کیا میں یتیم ہو گیا ہوں؟ تم نے یتیم کیوں کہا تھا مجھے؟ تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم سب جھوٹے ہو۔" وہ چلانے لگا تھا۔

غالباً اسے پہلے سے شک تھا کہ ہم اس کے ساتھ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ یہ بات اس کی عقل و فہم سے بالاتر تھی کہ آخر والدین نے اس سے بیٹے الگ رہ کے کیسے اختیار کر لی تھی۔ اس کا باپ تو معذور تھا اپنی ٹانگ تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ پھر وہ غریب آدمی تنہا جہاز میں بیٹھ کے کیسے چلا گیا اور اپنے بیٹے کو پیچھے چھوڑنا اس نے کیوں منظور کر لیا؟ وہ ذہین بچہ تھا اور عین ممکن تھا کہ ان سوالات کے جواب خود تلاش کرتا رہا ہو۔ شاید اسے ہم پر کچھ اعتبار بھی تھا چنانچہ اس نے شک کا اظہار نہیں کیا اور اس امید میں خاموش رہا کہ ہم اسے بحفاظت لے جا رہے ہیں تو گھر بھی پہنچا دیں گے۔ کیا پتا ہم سچ ہی کہتے ہوں۔

لیکن کاجل کی زبان سے بے اختیاری میں نکل جانے والے ایک لفظ نے اس کے شک کو یقین میں بدل دیا اور اسے دوہرا صدمہ پہنچا۔ ایک اس خیال سے کہ اب وہ ماں باپ سے محروم ہو چکا ہے۔ دوسرا ہم سب کے ناقابلِ اعتبار ثابت ہونے سے۔ اب وہ بے قابو ہو گیا تھا اور اس کے زور زور سے رونے کی آواز مجھے رات کی خاموشی میں دور تک سنائی دیتی رہی۔ کاجل کی تسلی اور زیادہ بڑے جھوٹ سے اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

واپس کیپٹن کے کمرے میں قدم رکھتے ہی میرے قدم رک گئے۔ کمرے میں اب کوئی نہیں تھا۔ غالب، رابعہ اور مازوی نہیں، لا خود بھی غائب تھا۔

میں نے ایک محافظ سے کہا "یہ سب لوگ کہاں ہیں؟"

ان میں سے ایک ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتا تھا "نہیں مالم۔"

"تمہارا کپتان صاحب بتا سکتا ہے؟"

"نہیں مالم۔"

"کیا انہیں بھی تلاشی کے لیے..."

"نہیں مالم۔" اس نے فوراً میری بات کاٹ دی۔

"ایسی کی تیسی تمہارے نہیں مالم کی۔" میں نے جھنجھلا کے کہا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ نہیں مالم نے مجھے کھینچ کر کھڑا کرنے کی کوشش کی تو ایک دم میرا غصہ بے قابو ہو گیا۔ میں نے ایک ہاتھ مارا۔ کلائی ٹوٹنے کے بعد وہ رائفل پکڑنے کے قابل نہیں رہا۔ وہ درد سے بلبلاتے ہوئے ہاتھ پکڑ کے دہرا ہو گیا۔ میں نے رائفل کا رخ دوسرے محافظ کی طرف کر دیا جو ابھی تک طے نہیں کر پایا تھا کہ بغاوت کے جرم میں وہ خود مجھے شوٹ کرنے کے قانونی اختیارات رکھتا ہے تو کیا ان کا استعمال بھی کر سکتا ہے؟ یہ تذبذب کی کیفیت غالباً کپتان صاحب کے رویے نے پیدا کر دی تھی۔

میں گھوم کر کپتان کی کرسی پر جا بیٹھا لیکن اس دوران میں نے اپنی رائفل کا رخ نہیں بدلا۔ دوسرے محافظ نے شکست قبول کر لینا تذبذب سے بہتر سمجھا اور سر ہلا کے آرام سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے رائفل کو بھی "ایٹ ایز" کے انداز میں فرش پر رکھ دیا۔ میں نے میز پر رکھی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا میں سے ایک سگریٹ نکال کر جلایا تب بھی وہ معترض نہیں ہوا حالانکہ یہ اس کے افسر کی ملکیت تھی اور میں صریحاً چوری یا ڈکیتی کا مرتکب ہو رہا تھا۔ کسی کی چیز کو اس کی مرضی کے بغیر زبردستی حاصل کرنا خالص تھانیدارانہ نقطہ نظر سے اور کچھ نہیں سمجھا جا سکتا تھا گھوڑی بھی چوری سے لکھ دی بھی چوری۔ بات تو صرف ملزم کی حیثیت کی ہے۔ وہ تنکا چرائے اور جیل جائے یا لاکھ اٹھائے اور گھر چلا جائے۔ ضابطہ فوجداری کیا ہے؟ اصل مرضی ہے تھانیدار کی کہ وہ کسے مجرم بناتا ہے۔

جس محافظ کی کلائی ٹوٹی تھی وہ اب کسی ناقابلِ فہم زبان میں اپنے اس ساتھی پر بگڑ رہا تھا جس نے انتہائی بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے تھے اور اس کی کوئی مدد نہیں کی تھی۔ دونوں کی صورتوں کے نقوش نیپال اور اس سے ملحق سکم، بھوٹان کے رہنے والوں کی طرح چینی جاپانی قوم سے مشابہ تھے جو منگول نسل سے تعلق رکھتے ہیں مگر نیپالی قد و قامت میں آریہ قوم کی کچھ صفات کے باعث دراز قد ہیں اور پہاڑوں میں رہنے کی وجہ سے تنومند نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ آپس میں بھی نیپالی زبان ہی بول رہے تھے۔

کیپٹن دس منٹ بعد آیا تو اندر کا نقشہ دیکھتے ہی ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے پُر نفرت اور پُر ملامت نظروں سے اپنے مسلح محافظوں کو دیکھا جن میں سے ایک اپنی کلائی کے ٹوٹ جانے پر مسلسل واویلا کر رہا تھا اور دوسرا مسلح ہونے کے باوجود کچھ کرنے پر آمادہ نظر نہ

آتا تھا۔ اس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف گیا تو میرا ہاتھ خودکار رائفل کی طرف بڑھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟ میں تم کو گولی ماردوں اور اس ناکارہ فوج کی کمان سنبھال لوں؟" میں نے کہا۔

"تم مجھے گولی مارو گے؟" اس نے طنز اور تمسخر آمیز لہجے میں حقارت سے سوال کیا۔

میں نے کہا "جس کے ہاتھ میں بندوق ہو وہ اپنے دشمن کو بڑی آسانی سے گولی ماردیتا ہے۔ گولی نہ مارنا زیادہ مشکل کام ہے۔ تمہارے تھپڑ کا جواب میں گولی سے دینا نہیں چاہتا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے مگر جان لو کہ یہ میرے نزدیک زیادتی ہے۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کردو۔"

"ایک رائفل کی مدد سے کیا تم پوری بٹالین کو ختم کردو گے؟ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اس طرح تم بچ کے نہیں نکل سکتے۔" اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا اور دروازہ بند کردیا۔

میں نے کہا "اس اطلاع کا شکریہ۔ تم ابھی میرے ہاتھ میں ایک رائفل دیکھ رہے ہو۔ ابھی میں تمہارے دوسرے ماتحت کو حکم دوں گا تو وہ بھی اپنی رائفل مجھے پیش کردے گا۔ ایک ریوالور تم بھی نذر کرو گے۔ اس کے بعد جو آتے جائیں گے ایسے ہی نذرانے دیتے رہیں گے۔ یہاں اسلحے کا ڈھیر لگ جائے گا۔"

"اور تم اکیلے وہ سب اسلحہ استعمال کرو گے۔ تمہارے ہر ہاتھ میں دو دو رائفلیں ہوں گی۔ دو دو رائفلیں تم پیروں سے پکڑ کے چلاؤ گے، ایک منہ میں پکڑ کے۔" وہ میرا مذاق اڑانے لگا۔

میں نے اطمینان سے اپنی سگریٹ بجھائی اور اٹھ کھڑا ہوا "میں مذاق کا بالکل برا نہیں مانتا بلکہ مجھے وہ لوگ اچھے لگتے ہیں جن کی حس مزاح ہنگامی حالات سے مجروح نہیں ہوتی۔ اپنے اس ماتحت سے کہو منہ بند رکھے۔ ہاتھ صرف ٹوٹا ہے، جسم سے الگ نہیں ہوا ہے۔ اور اس دوسرے شریف آدمی سے کہو کہ رائفل کو ہاتھ سے چھوڑ دے۔ خود اسی پوز میں کھڑا رہے۔"

میں آگے بڑھا ہی تھا کہ کیپٹن نے بڑی پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالنے کی کوشش کی اور جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ میں ذہنی طور پر مستعد تھا چنانچہ ایک خودکار عمل کے طور پر میں نے کک ماری۔ میرا نشانہ اس کا ہاتھ تھا مگر وہ بیٹھنے لگا تو ٹھوکر اس کی پسلی پر پڑ گئی اور وہ کراہ کے ایک طرف گر گیا۔ اس کی پسلی ٹوٹ گئی تھی مگر وہ باہمت آدمی تھا۔ اس نے گرتے گرتے بھی پلٹ کے فائر کیا۔ اس کا نشانہ خطا ہوا اور گولی کہیں چھت کی طرف نکل گئی۔

میں نے اسے دوسرا فائر کرنے کی مہلت نہ دی اور پے درپے ٹھوکریں مار کے اس کو اٹھنے کے قابل نہ چھوڑا۔ وہ چلاتا رہا اور اپنے ماتحت کو گالیاں دیتا رہا یا شاید حکم دیتا رہا کہ اپنی جان افسر پر قربان کردے کہ تقاضائے تابعداری یہی ہے۔ ایک مرحلے پر اس کی فرض شناسی کی رگ پھڑکی تھی اور اس نے رائفل اٹھانے کی تھوڑی سی ہمت کی تھی مگر وہ میری دسترس میں تھا۔ ایک ہاتھ بھرپور انداز میں پڑا تو وہ بغیر آواز نکالے اپنے افسر کے قدموں میں گر گیا۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔

میں نے ایک ٹھوکر سے اس کی رائفل کو دور کیا اور کیپٹن سے پوچھا۔

"اب بتاؤ میرے باقی ساتھی کہاں ہیں؟" میں نے اس کو دیوار سے لگا کے اس کی گردن دبوچ لی "اور اس بات کا خیال رکھو کہ اندر کوئی نہ آئے۔"

کیپٹن سخت تکلیف میں تھا اور اس کی پھٹی پھٹی نظریں لاشوں پر جمی ہوئی تھیں۔ شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے وہ ماتحت جن پر اس نے ہمیشہ بھروسا کیا تھا، اتنے نازک تھے کہ ایک ہاتھ کی مار برداشت نہ کرسکے۔ ایک کا بازو ٹوٹ گیا اور دوسرے کی گردن۔ خود اس کی پسلی ٹوٹ چکی تھی اور وہ تصور کرسکتا تھا کہ یہ مقابلہ ایسے ہی جاری رہا تو فوراً جو بھی اندر آئے گا اسی قسم کے انجام سے دوچار ہوگا۔ یہاں تک کہ پوری بٹالین لنگڑے لولے، معذور اور ہڈی پسلی ایک کرا کے صف بستہ ہوگی تو یوں محسوس ہوگا جیسے وہ فوجی نہیں کسی آرتھوپیڈک وارڈ کے مریض ہیں۔

مجھے حیرت تھی کہ فائر کی آواز سن کے بھی کوئی ابھی تک ادھر نہیں آیا تھا۔ مگر پھر کسی نے دستک دی اور میں نے ایک ساتھ بہت سے لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز سنی۔

"ان سب سے کہو کہ واپس چلے جائیں۔" میں نے کیپٹن کا ریوالور اس کی گردن پر رکھ دیا "ہم کچھ بھی نہیں کریں گے۔ کوئی دخل اندازی نہ کرے۔"

اس نے سرہلایا اور بلند آواز میں بولا "کیا بات ہے؟"

باہر سے کسی نے پوچھا "ہم نے گولی کی آواز سنی تھی سر۔"

"تو اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟"

"حیرانی تو نہیں سر، پریشانی تھی آپ کی طرف سے۔"

کیپٹن نے کہا "میں خیریت سے ہوں۔ جاؤ اور جب تک میں نہ بلاؤں ادھر کوئی نہ آئے اور تم۔ تم بھی جاکے اپنے ہاتھ کی مرمت کرو۔"

"یس ... یس سر۔" ٹوٹے ہوئے ہاتھ والا فوراً رخصت ہوگیا۔

"گڈ!" میں نے کہا "تم نے اپنے ساتھ ان کی جان بھی بچالی۔ اگر تم اسی طرح تعاون کرو گے تو بات صرف ایک پسلی کی شکست پر ختم ہوجائے گی۔ کچھ عرصہ تم ملٹری اسپتال میں رہو گے تو پسلی پھر جڑ جائے گی لیکن جب تک پلاسٹر رہے گا تم کو احساس رہے گا کہ تم نے مجھے تھپڑ مار کے غلطی کی تھی۔ اس کے جواب میں ....."

اس نے کہا "تم نے جواب دینے میں جلدی کی۔ خیر۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو شاید یہی کرتا یا اس سے بھی زیادہ۔ میں سخت تکلیف

میں ہوں۔ کیا تم مجھے اجازت دو گے کہ میں بیٹھ جاؤں بلکہ لیٹ جاؤں اس میز پر؟ تم جاکے باہر کھڑے ہوجاؤ۔ اندر کوئی نہ آئے۔"

اس نے دوسرے سپاہی کو حکم دیا جو میری ضرب مومن سے بچ گیا تھا۔ اس نے عملاً ثابت کردیا تھا کہ اسے ادائے فرض سے زیادہ اپنی جان بچانے کی فکر ہے۔ اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا۔ صرف محاورے کے مطابق ورنہ اس کے سر پر ایک بھی بال نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے، لیٹ جاؤ۔" میں نے کہا اور پھر اس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تمہارے سب ساتھی خیریت سے ہیں۔" اس نے لیٹ کر ایک ہاتھ سے پسلی کو دبایا اور گہری سانس لے کر بولا "ذرا یہ تکیہ میرے سر کے نیچے رکھ دو۔ یار وہ گدی جس پر تم بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا "تمہاری گدی تم کو مبارک۔ میں اس کے بغیر بھی تشریف رکھ سکتا ہوں۔"

اس نے سر اٹھایا تو میں نے گدی نیچے رکھ دی۔ ہلنے سے اس کی ٹوٹی ہوئی پسلی کی اذیت بڑھ جاتی تھی اور درد کو برداشت کرتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہوجاتا تھا۔

"تھینک یو۔" اس نے ایک گہری سانس لی "میں واقعی احمق ہوں۔ پسلی کے جڑنے تک مجھے یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔"

"تم تھوڑے سے عقلمند بھی ہو کہ اپنی زندگی بچالی۔ اس خیال سے تمہیں کچھ تسکین مل سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"احمق تم مجھ سے زیادہ ہو۔" اس نے ایک لمبی سانس لی "یہ تم نے آخرکار ثابت کردیا۔ جب تمہیں کچھ کرنا چاہیے تھا، اس وقت تم نے کچھ نہیں کیا۔ صبر اور ضبط سے کام لیا اور بعد میں ایک فضول سی بات پر مشتعل ہوگئے، اس حد تک کہ ایک آدمی کو معذور کردیا اور دوسرے کو ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ تاہم ... غلطی میری تھی۔ میں اس معاملے کو حد سے آگے لے گیا۔ سنو، پہلے مجھے اپنی بات ختم کرلینے دو۔ بولنا مشکل کام ہے میرے لیے، سانس لینے سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے، اس کے بعد بات بگڑ جاتی ہے۔ بے شک میں محتاط تھا ..... اور بات میری عدم موجودگی میں بگڑ گئی۔ میں ہوتا تو صورت حال کو کنٹرول میں رکھتا اور تم کو سمجھا دیتا کہ یہ سب کچھ نہیں ....."

میں نے کہا "کیا کچھ نہیں؟"

"وہی۔ جو ہوا ....." اس نے کہا "سب ویسے ہی تھا۔ مجھے موقع نہیں ملا، تم کو اشارے سے سمجھانے کا۔ میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا تھا ..... تم کو تلاشی کے لیے بھیجنے کا مقصد یہی تھا کہ جب تم واپس آؤ تو اور کوئی نہ ہو۔ تمہارے باقی ساتھیوں کو .... میں نے بعد میں سمجھا دیا تھا کہ وہ تھوڑی سی زیادتی برداشت کریں۔ تفتیش کی رسمی کارروائی ضروری تھی۔ میں رعایت کرتا تو گڑبڑ ہوجاتی۔"

"کیا مطلب ہے آخر تمہارا؟ یہ سب ڈراما تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے اپنے آپ کو بھی بچانا تھا۔ ورنہ کیا جو میرے ماتحت ہیں، ان میں سے کوئی اوپر رپورٹ بھیج دیتا کہ میں نے رشوت لی یا مسلمان ہونے کی وجہ سے تم سب کو نکل جانے دیا۔ یہ الزام بہت آسانی سے لگادیا جاتا ہے یہاں۔ ہم مسلمانوں کی وفاداری ہمیشہ مشکوک رہی ہے اور رہے گی۔ آج کل تو خیر حالات ہی ایسے ہیں۔"

میں نے افسوس سے کہا "تم مسلمان ہو؟"

"کیپٹن حمید عباسی۔" وہ مسکرایا اور اس نے اپنا ایک ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا "سکندر بخت کا دوست جو غلط فہمی میں مارا گیا۔"

میں نے ہاتھ ملا کے کہا "آئی ایم سوری! تم نے پہلے بتادیا ہوتا ....."

"مجھے تو ... اشارہ کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ ورنہ تم سمجھ لیتے۔ خیر۔ تم نے لعنت کا جواب پتھر سے دیا۔"

میں نے کہا "کپتان صاحب، اور شرمندہ مت کریں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ میں ہڈی پسلی توڑ سکتا ہوں، جوڑ نہیں سکتا۔"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے اس کام میں تم بہت تیز ہو، بس مجھے تھوڑی سی دیر ہوگئی۔ میں باقی سب لوگوں کو بیرک تک لے گیا تھا۔ پوچھ گچھ کرنے والوں کو یہ سمجھانا بھی ضروری تھا کہ وہ زیادہ سختی نہ کریں۔"

میں نے کہا "گویا تھوڑی سختی کی اجازت تم دے آئے تھے؟"

"وہ ... کچھ تو ضروری تھا ..... آخر ہم نے گرفتار کیا ہے تمہیں، تم کوئی مہمان بن کر نہیں آئے تھے۔" وہ بولا۔

"یہ کم سختی کی کیا تعریف ہے تمہاری لغت تفتیش میں؟" میں نے کہا "اور آلات تفتیش میں تھرڈ نمبر کا چھتر شامل ہے یا۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "وہ پولیس کے طریقے ہیں۔"

"کیپٹن حمید، مجھے معلوم تو ہو کہ اس بیرک میں میرے ساتھیوں کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟ انہیں الٹا لٹکا کے یا بجلی کے جھٹکے دے کر تم کہو گے کہ یہ کم سختی تھی بلکہ عین مہربانی تھی تو میں نہیں مانوں گا کہ تمہارا یہ فعل دوستانہ تھا۔"

"ایسی کوئی غیر شائستہ حرکت نہیں ہوگی۔ بس وہ ذرا ان پر سرچ لائٹ ڈالیں گے، تھوڑی بہت دھونی دیں گے۔"

"مرچوں کی؟" میں نے چبا کے کہا۔

"ایک آدھ تھپڑ ماریں گے ....." اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "دوچار رسید کریں گے۔ تھرڈ ڈگری کے ابتدائی مرحلے تو برداشت کرسکتے ہیں تمہارے ساتھی؟"

میں نے کہا "ہو یا مرزا! تھرڈ ڈگری کی اولاد! ان عورتوں کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی تو میں سب کی ....."

www.paksociety.com

اس نے کہا "سکندر رحمت ! پلیز ! میری بات سنو۔ گالیاں جتنی دینا چاہو مجھے دو مگر میری مجبوری کو سمجھو۔ میں ایسے تمہاری مدد نہیں کر سکتا کہ کسی کو شک ہو جائے۔ کل کو مجھ پر الزام آئے تو میری نوکری جائے گی یا میرے خاندان کے لیے مسائل اور مشکلات پیدا ہو جائیں۔ میں تمہارے فائدے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔"

"اس لیے تم رسک نہیں لے سکتے؟"

"ہاں۔ میں رسک نہیں لے سکتا۔ میں اکیلا ایک پورے خاندان کی کفالت کرتا ہوں۔ ایک ماں ہے بیمار اور معذور۔ ایک بہن ہے شادی کے قابل۔ ایک بھائی ہے بے روزگار آوارہ گرد۔ تم لوگ تو بہت کچھ برداشت کر چکے ہو۔ ہر قسم کے حالات کی سختی جھیل چکے ہو۔ دشمنوں کے ساتھ قید میں جو سلوک ہوتا ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی کے ساتھ نہیں ہوگا۔ میری مجبوری سمجھ کے اسے قبول کر لو۔ یہ آخری آزمائش سمجھ لو۔ میں ہاتھ جوڑ کے تم سے معافی مانگ رہا ہوں لیکن یقین کرو میں نے بہت سوچ سمجھ کے یہ سارا منصوبہ بنایا تھا جس میں تم بھی محفوظ رہو گے اور مجھے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ میں آج رات تمہیں بحفاظت نیپال پہنچانے کا پکا بندوبست کر دوں گا۔ بس آج کے دن یہ زیادتی کی معافی قبول کر لو۔"

"یہ انتہائی ذلت کی بات ہے جس کو تم معافی کہہ رہے ہو۔ تم کو شرم آنی چاہیے کہ تمہارے مہمان دن بھر بھوکے پیاسے رہیں گے۔ صرف جوتے اور گالیاں کھائیں گے؟" میں نے بے بسی سے کہا۔

"کیا وہ اس سے بہتر ہوتا اگر میری جگہ کوئی تمہارا دشمن جان محمد افسر ہوتا اور وہ تمہاری کھال میں بھس بھر کے جسم کو گولیوں سے چھلنی کروا دیتا اور تمہاری لاشوں کو جنگلی بھیڑیوں کی ضیافت کے لیے ان پہاڑوں میں پھینک دیتا اور ہاتھ جھاڑ کے اطمینان سے بیٹھ جاتا کہ خس کم جہاں پاک۔ اپنے سفر کی اس منزل پر پہنچ کے جہاں تم کو یقین تھا کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا، تمہیں احساس ہوتا کہ موت کتنی بے رحم اور عیار شکاری ہے جو تمہیں ڈھیل دیتی رہی اور کہاں سے کہاں لے آئی۔ زندگی پر اعتبار عطا کر کے مارنے کے لیے۔ تم اپنی خوش قسمتی پر خدا کا شکر ادا نہیں کرتے کہ یہاں میں ہوں۔ یہ بچانے والے ہاتھ کا انتظام ہے۔ میری خواہش یا کوشش کو اس میں ایک فیصد بھی دخل نہیں۔ مجھے تو بطور سزا کے گھر سے اتنی دور بھیجا گیا تھا۔ کچھ ناپسندیدہ مقامات ہوتے ہیں جہاں ناپسندیدہ افراد کی پوسٹنگ اس لیے کی جاتی ہے کہ انہیں قواعد و ضوابط کی پاسداری جانے کل کیا؟ ابھی رات تک میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ اس راستے سے تم گزرو گے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں ضرور تمہارے استقبال کے لیے موجود رہتا لیکن یہ تو میری سزا تو تھی جو تمہاری کسی نیکی کی جزا بن گئی۔ بعد میں کیا ہوتا ہے میرے ساتھ، یہ تمہیں کبھی معلوم نہیں ہوگا لیکن مجھے بہرحال ایک

اطمینان حاصل رہے گا کہ میں نے اپنی کم ہمتی اور بزدلی کے باوجود تمہاری مدد کی۔ تم کو میرا شکر گزار ہونے کی ضرورت نہیں مگر خدا سے اور تقدیر سے تو شکوہ مت کرو۔ قدرت نے تو یہ سب انتظام بڑی پلاننگ کے ساتھ بطور خاص تم سب کے لیے ہی کیا ہوگا۔"

وہ بولتے بولتے تھک کر ہانپنے لگا۔ سانس تیز لینے سے اس کی پسلی ہلنے لگی تھی اور وہ سخت تکلیف میں تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا "معاف کرنا دوست ! میں نے بہت زیادتی کی تمہارے ساتھ۔ اگر تقدیر مہربان نہ ہوتی تو ہم واقعی مارے جاتے۔ تم کو خدا نے فرشتۂ رحمت بنا کے بھیجا تھا مگر میری نظر تمہیں نہ پہچان سکی۔ میں گناہ گار تم سے بھی شرمندہ ہوں اور خدا کے سامنے بھی شرمسار ہوں۔"

"یہ باتیں چھوڑو۔" اس نے کہا "میری بات دھیان سے سنو۔ آج دن میں تم سے باقاعدہ تفتیش ہوگی۔"

"ابھی کیا بے قاعدہ تفتیش ہو رہی ہے؟"

وہ مسکرایا "تم بہت زیادہ متکبر ہو اپنے ساتھیوں کے لیے میں نے یہ کام ایک سکھ نائب صوبیدار کے سپرد کیا ہے۔ دوسرا نائب صوبیدار مرہٹہ ہے اور تیسرا بنگالی مسلمان۔ تفتیش میں ان کا رویہ انتقامی ہوتا۔ میں ان سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ زیادہ سختی نہ کی جائے۔ سکھ نائب صوبیدار کو یہ ہدایات دینے میں کوئی رسک نہیں تھا۔ میں نے تم کہا ہے تو وہ بہت کم کرے گا۔ اس کے ماں باپ ہر سال پنجہ صاحب حسن ابدال جاتے ہیں اور ننکانہ صاحب کی یاترا کرتے ہیں۔ اس کے جذبات پاکستان کی حکومت اور عوام کے لیے دوستانہ حد تک موافق ہیں۔"

میں نے کچھ اطمینان محسوس کیا "میری خاصی فکر کم ہو گئی۔"

"مگر آج دن میں جو تفتیش ہوگی اس میں میرے ساتھ تمہارے سب دشمن بھی شامل ہوں گے۔" وہ بولا "تین نائب صوبیداروں میں سے ایک سکھ ہی تمہارے ساتھ کچھ رعایت کرے گا۔ میں غیر جانبدار رہوں گا لیکن اصل مسئلہ ہے کان سنگھ صوبیدار کی۔ وہ میرے بعد سب کا افسر ہے۔ جتنا بھی کمینہ ہے اور کسی قدر بے رحم بھی۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔"

"سب کچھ۔ یعنی گولی بھی مار سکتا ہے؟"

"نہیں نہیں۔ اس کا افسر میں ہوں آخر۔ فیصلہ میں ہی صادر کروں گا لیکن یہ میں پہلے ہی بتانا بہتر سمجھتا ہوں کہ فیصلہ تمہارے حق میں نہیں ہوگا۔" حمید نے کہا۔

"مطلب یہ کہ تمہاری افسری دھری رہ جائے گی۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ وہ کثرت رائے سے فیصلہ دیں گے۔ تین تمہارے دشمن ہیں۔ مرہٹہ نائب صوبیدار، بنگالی مسلمان اور کان سنگھ صوبیدار۔ سردار جی غیر جانبدار رہیں گے اور میں نہ ادھر نہ ادھر۔ اپنی بھی جان بچاؤں گا اور تمہاری بھی لیکن ایسے نہیں کہ تم کو ہر الزام سے بری کر کے باعزت طور پر سرحد پار کرنے کی اجازت دے دوں۔ میں ٹریبونل کے متفقہ فیصلے کو برقرار رکھوں گا

بطور چیف جسٹس۔"

"یہ فیصلہ کیا ہوگا؟ تم اندازہ تو کر سکتے ہو۔"

"ہاں۔ فیصلہ یہ ہو سکتا ہے کہ تم سب کو۔۔"

"گولی ماردی جائے ایک قطار میں کھڑا کر کے۔"

"نہیں۔ یہ اختیار کہاں ہمیں۔ ہم تو بس یہ فیصلہ کریں گے کہ تمہارے خلاف الزامات کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے سفر جاری رکھنے کی اجازت دی جائے یا تمہیں زیر حراست واپس بھیج دیا جائے متعلقہ حکام کے پاس۔"

میں اچھل پڑا "کیا واپس بھیج دیا جائے گا۔ ناممکن۔"

اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "میرا۔۔ میرا خیال ہے کہ پسلی ٹوٹی نہیں تھی۔ شدید چوٹ کا اثر تھا۔ اب میں بہتر محسوس کر رہا ہوں۔"

"لیکن میں یہ محسوس کر رہا ہوں محترم چیف جسٹس کہ تمہارے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔" میں نے کہا "اگر تم ٹریبونل کے اس فیصلے پر عمل درآمد کا ارادہ رکھتے ہو تو مجھ پر بھی لازم آتا ہے کہ تمہاری یہ پسلی بچ بچ توڑ دوں اور دیگر ہڈیاں بھی۔۔۔"

"ابھی نہیں۔۔۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں ابھی نہیں۔ جب تم ہمیں واپس بھیجو گے اس وقت یہی ہوگا۔ ہم ایسے ٹرائل سے عدالت کا حکم ماننے والے نہیں ہیں۔ ہم تو تمہارے اس جرگے کو عدالت ہی تسلیم نہیں کرتے جس میں ایک مرہٹہ ہو، ایک سکھ، ایک مسلمان اور ایک کان سنگھ براہمن۔ چنانچہ ہم اس عدالت کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے مسٹر چیف جسٹس۔" میں نے اعلان کیا۔

"دیکھو کافی دیر سے میں تفتیش کر رہا ہوں۔" کیپٹن حمید نے کہا "میرے ماتحت یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ تم کوئی خاص مجرم ہو یا ان سب کے سرغنہ ہو اس لیے تم کو خود میں نے پوچھ گچھ کے لیے منتخب کیا۔ مگر جیسے کہ کہا جاتا ہے 'انصاف ہونا بھی چاہیے اور انصاف ہوتا نظر بھی آنا چاہیے۔' ایسے ہی تفتیش ہو تو نظر بھی آنی چاہیے کہ تفتیش ہو رہی ہے بلکہ سنائی دینا چاہیے باہر۔"

"کیا مطلب؟"

"کیا تھانے سے باہر معلوم نہیں ہوتا کہ اندر تفتیش ہو رہی ہے؟" وہ بولا "تمہارے اور ہمارے تھانوں کی تہذیب ایک ہے۔ میں اب تمہیں زدوکوب کرنے کے صوتی اثرات دوں گا۔ امید ہے تم مجھ سے تعاون کرو گے۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور میں نے ایک چیخ ماری "ہائے۔ او میں مر گیا۔ اف !"

اس نے بید سے میز پر دو تین مرتبہ وار کیے پھر کئی بار تالی بجائی اور میں نے یہ ظاہر کیا کہ تھپڑ پڑنے کی تھی۔

"میں کھال کھینچ لوں گا تمہاری۔ بڑے بڑے بدمعاش جو جلیبی کی طرح تنے میرے سامنے ایسے سیدھے ہو گئے جیسے تیر کی طرح۔"

میں نے سر پر ہاتھ مار کے آہستہ سے کہا "اور کوئی مثال نہیں

تھی؟ بھلا تیر کی طرح بھی سیدھی ہوتی ہے۔ بارہ سال نلکی میں رکھنے کا تجربہ کیا جا چکا ہے۔"

اس نے کہا "چلو چھوڑو۔ یہ بیچارے کہاں سمجھتے ہیں میرے ماتحت۔"

میں نے اس کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کے کہا "مجھے بھوک پیاس اور جانے سب کچھ لگ رہا ہے۔"

"میں ابھی بندوبست کرتا ہوں۔" وہ بولا "لیکن پہلے تم یہ بات سمجھ لو کہ میرا کیا پروگرام ہے۔"

"تم اپنا پروگرام بنا چکے ہو۔ اب ہم کو اپنا پروگرام طے کرنا ہے۔ ہم بھی تمہیں بتا دیں گے کہ آگر تم بچ جاؤ۔ باقی سب کام ہم وہی حسب کریں گے جو بلدر سنگھ نے دلی کا کیا تھا۔"

وہ بولا "تم جلد باز ہو۔ مجھے بات پوری کرنے نہیں دیتے اور خود بولنے لگتے ہو۔ عدالتی فیصلے کے بعد۔۔۔"

"سوری۔" میں نے کہا "میں پھر مداخلت کر رہا ہوں۔ مجھے یہ تو معلوم ہو کہ ہمارے خلاف الزامات کیا ہیں۔ کیا یہ سب لوگ ہمیں پہچان گئے ہیں؟"

"تمہیں صرف میں نے پہچانا تھا۔" وہ بولا "باقی لوگوں کو تمہارے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔"

"لیکن تم نے کہا تھا کہ کسی نے مخبری کی ہے۔"

"ہاں۔ یہ ڈرائیور صاحب ہیں تمہارے ساتھ۔ مسٹر جابر۔ ان کے کسی بھائی نے اطلاع دی تھی۔" وہ بولا۔

"گویا رابعہ کا شک درست ہی تھا۔" میں نے اپنے آپ سے کہا۔

"کیسا شک؟"

"کچھ نہیں۔ وہ سور کا بچہ بھائی نہیں تھا اس کا۔ یہ بے غیرتے کا بچہ۔ ظاہر ہے ان میں بہت فرق ہے اور ہم نے یہ فرق نوٹ کر لیا تھا۔ خیر۔ فون کرنے والے نے کیا فرمایا تھا؟"

"اس نے کہا تھا کہ جو لوگ بھارتی سفارت خانے کی کار میں سرحد عبور کرنے والے ہیں ان کے پاس جعلی کاغذات ہیں۔ ایک عورت رابعہ کی تصویر بدل کے لگائی گئی ہے۔ باقی سب کے پاسپورٹ تو اصلی ہیں مگر ان کے نام بے تعلق ہیں۔ ان میں کوئی مسٹر یا مسز راجن ہے، نہ مسٹر اور مسز کمار۔ ان کے اصل نام سکندر، رابعہ اور غالب ہیں۔"

"یہ سب جانتا تھا وہ ! اور اسے کچھ معلوم نہیں تھا؟" میں بھونچکا رہ گیا۔

"اور کیا؟"

"کیا اسے ہمارے کرتوتوں کا علم نہیں تھا؟ یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم کتنے مشہور و معروف لوگ ہیں اور ہماری گرفتاری پر کتنا انعام ہے؟"

"میں بتا چکا ہوں کہ خوش قسمتی تمہارا ساتھ دے رہی ہے۔ اس کو صرف نام معلوم تھے۔ نام کے ساتھ منسوب کارناموں کا

www.paksociety.com

اور تم سب کے اشتہاری مجرم ہونے کا اسے ذرا بھی علم ہوتا تو وہ تمہیں وہیں پکڑا دیتا۔"

"پھر اس نے یہ نیک کام کیوں کیا؟ کیا حاصل ہوتا اسے اگر ہم یہاں روک لیے جاتے؟" میں نے کہا۔

"یہ جابر کا حرامی پن ہے۔" کیپٹن حمید نے کہا "اس نے تم سے بھاری معاوضہ وصول کیا ہوگا سرحد پار کرانے کا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اس نے تو لوٹ لیا ہمیں۔ وہ بھارتی سفارت خانے میں ملازم تھا۔ ایک مسٹر شرما تھے جن کی یہ کار ہے۔"

"تھے کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب نہیں ہیں۔ جابر نے ان کو قتل کر کے انہی کے گھر میں گاڑ دیا ہے۔" میں نے کہا۔

کیپٹن حمید حیرانی سے پلکیں جھپکاتا رہا "تم مذاق کر رہے ہو!"

"مذاق میں ایسی فضول بات نہیں کر سکتا میں۔ یہ حقیقت ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ۔۔۔"

میں نے کہا "ہمیں خود جابر نے بتایا۔ دراصل یہ ایک لمبی کہانی ہے جو میں پھر کسی وقت سناؤں گا۔ اس کے دامن پر ایک نہیں دو افراد کے لہو کا داغ ہے۔"

"بہتر ہوگا کہ تم ابھی بتا دو۔ اختصار سے۔"

میں نے اسے کم سے کم الفاظ میں وہ سب بتا دیا جو جابر کے نامہ اعمال میں درج تھا۔ حمید غور سے سنتا رہا۔ اب وہ میز کے دوسری جانب والی کرسی پر آرام سے بیٹھا ہوا تھا لیکن ایک ہاتھ سے پیشانی کی مالش میں مصروف تھا۔

"میں سمجھ گیا۔" اس نے سب سننے کے بعد کہا۔

"کیا سمجھے؟ مجھے بھی سمجھا دو۔" میں نے کہا۔

"فون خود جابر نے کرایا ہوگا۔" وہ بولا "وہ تم کو اسی جگہ چھوڑ کے واپس جانا چاہتا ہوگا۔ اسے تو سفارتی تحفظ حاصل ہے۔ اسے بھروسا ہوگا کہ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن تم کو روک سکتے ہیں۔ اس نے معاوضہ کھٹمنڈو پہنچانے کا لیا ہوگا مگر وہ تم کو نیپال کی سرحد پر چھوڑ کے واپس چلا جاتا۔ آگے تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے' یہ فکر اسے کیوں ہو۔ اسے تو معاوضہ پورا مل گیا ہوگا۔ اگر وہ کھٹمنڈو جاتا تو وہاں بھارتی سفارت خانے والے اس کار کو دیکھ کر پہچان جاتے۔ اسے ڈر ضرور ہوگا کہ کوئی دیکھ نہ لے' دیکھ لے گا تو پوچھے گا کہ تم یہاں کیسے؟ شرما جی کہاں ہیں؟ کس کام سے آئے ہو؟ یہاں تک تو اس کے آنے کا ریکارڈ بھی نہیں۔ وہ ثابت کر سکتا ہے کہ ڈھاکا سے باہر نہیں گیا۔ کھٹمنڈو میں اس کے خلاف گواہ پیدا ہو جاتے چنانچہ اس نے یہیں سے واپسی میں عافیت جانی۔ ایک جعلی فون کال کرے گا وہ اپنے بھائی کو۔"

"یار' وہ بھائی نہیں تھا۔"

"او کے۔ اس سور کے بچے کو ہزار دو ہزار روپے کا وہ واپسی کا اور خیر سے ڈھاکا لوٹ جائے گا۔ یہ خیال ہوگا اس کا۔ مگر اب میرا خیال کچھ اور ہے۔ اسے واپس وہیں بھیج دیا جائے جہاں ہم سب کو لوٹ کے جانا ہے ایک دن۔" کیپٹن حمید بولا۔

"اسے کچھ بھونکنے کی مہلت مت دینا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خود کو مصیبت میں دیکھے تو ہمارے خلاف بولنا شروع کر دے۔ وہ سب جانتا ہے۔ پتا نہیں اس نے بتایا کیوں نہیں۔"

"وہ بتاتا تو خود بھی شریک جرم سمجھا جاتا۔ ابھی تو وہ معصوم بنا ہوا ہے کہ اسے کیا معلوم پاسپورٹ اصلی ہیں یا جعلی۔ کس نے تصویر بدلی ہے اور کس نے غلط اندراج کیا ہے۔ اسے تو شرما جی نے کہا تھا کہ ان مہمانوں کو نیپال کی سرحد کے پار پہنچا دو۔"

"یہ کہا ہے اس حرامزادے نے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"ابھی تک تو یہی بیان ہے اس کا۔" حمید بولا۔

"یعنی وہ ابھی زندہ ہے۔ وہ گولی اور اس کی چیخ کی آواز؟"

"گولی اس کی ٹانگ پر ماری گئی تھی۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔" حمید نے کہا "اب تم اس کی بات چھوڑو' سمجھ لو کہ وہ دنیا میں تھا ہی نہیں۔ اپنے خلاف الزامات کی نوعیت سمجھ لی تم نے؟"

"سمجھ لی" میں نے کہا "لیکن میں ابھی تک فیصلے کی مصلحت کو نہیں سمجھ پایا۔ اگر تم ہماری مدد کر رہے ہو تو ہمیں قانونی کارروائی کے لیے واپس ارسال کرنا چہ معنی دارد؟"

"سب سمجھ جاؤ گے تم۔" اس نے گرج کے کہا اور میز پر بید کی چھڑی ماری۔ میں نے فریاد و فغاں کا غلغلہ بلند کیا اور حلق سے ایسی آوازیں نکالیں جو ہر تھانے میں زیر تفتیش ملزم ہی نکال سکتے ہیں۔

حمید نے کہا "ضروری نہیں کہ ہر بات اسی وقت بتا دی جائے۔ جو کچھ بھی ہوگا تمہارے سامنے آ جائے گا۔ تم خود سمجھ لو گے کہ کیا ہو رہا ہے اور اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ میرے پیش نظر تمہاری بھلائی ہے۔"

میں نے کہا "مگر یہ تو بتا دو کہ بھلائی کہاں ہے' کس طرف کو ہے' کدھر ہے۔ قیدی کی حیثیت سے ہم واپس جائیں گے تو تمہارے یہی ماتحت ساتھ ہوں گے ۔۔۔"

حمید نے کہا "تم کتنی بار جیل سے فرار ہوئے ہو؟"

میں نے کہا "ایک بار بھی نہیں۔ اس لیے کہ میں جیل بھی نہیں گیا۔"

"یہی اطوار رہے تو ایک دن ضرور جاؤ گے۔" وہ بولا "مگر دشمن کی قید سے فرار ہونے کا تجربہ تو ہے نا؟ جان ہتھیلی پر رکھ کے اور سر سے کفن باندھ کے؟"

میں نے کہا "اس کا تجربہ سب رکھتے ہیں۔"

"بس تو اسی تجربے سے فائدہ اٹھانا۔ محافظوں کو ٹھکانے لگا کے نکل جانا۔" حمید نے کہا۔

"کیا یہ اتنا آسان ہوگا؟" میں نے کہا۔

"بہت آسان ہوگا۔" حمید نے مجھے یقین دلایا "میں مزید آسان بنا دوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے کتنے ماتحت حرام خور' بزدل اور کاہل ہیں۔ دراصل انہی اوصاف حمیدہ کے باعث انہیں یہاں بھیجا گیا ہے۔ چنانچہ فرض تو سب ادا کر رہے ہیں مگر مجبوری میں اور مطمئن بالکل نہیں ہیں۔ ایک غیر مطمئن کارکن کبھی مستعد نہیں ہوتا اور اس سے اعلیٰ کارکردگی کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ میں سب سے زیادہ ناخوش اور ناکارہ افراد کو محافظ کی حیثیت سے بھیجوں گا جو ہرگز اپنی جان پر کھیل کر ادائے فرض نہیں کریں گے۔ تم ان کو رشوت دے سکو گے' بے وقوف بنا سکو گے اور بہ آسانی زیر کر لو گے۔ کچھ تمہارے طرف دار بھی ہوں گے اور ممکن ہے خود تمہیں موقع فراہم کریں۔ اس سے زیادہ تمہارے لیے کیا آسانی پیدا کر سکتا ہوں میں۔"

میں نے غور فرمانے کے بعد سر ہلایا "تم میرے پہلے پسندیدہ دشمن اور جیلر ہو۔ تم جیسے جیلر ہر جگہ ہوں تو دنیا میں سب آزاد انسان نظر آئیں' اسیر کوئی بھی نہ ہو۔ جیل خانے خالی ہو جائیں۔"

اس نے دروازہ کھولا اور ۔۔۔۔۔۔۔ چیخ کر کہا "جوان! کھڑے کھڑے سو رہے ہو' ان کو نکال آنے کے بعد بھی؟"

افسر کی آواز پہ وہ اچھل پڑا "نو ۔۔۔ نو سر۔"

"نو سر کا بچہ!" حمید نے کڑک کر کہا "یہ باقی لوگ آج کیا کر رہے ہیں؟"

"حاضری میں ہیں سر۔" اس نے جواب دیا "حوالدار کے ساتھ پریڈ گراؤنڈ میں۔"

"احمد سنتری کی ڈیوٹی والے کہاں ہیں؟ ان کو بتاؤ۔"

"یس سر۔" وہ سیلیوٹ کر کے رخصت ہو گیا تو حمید نے کہا "اب میں تم کو تمہارے ساتھیوں کے پاس پہنچا رہا ہوں۔ جو میں نے تمہیں سمجھایا' تم انہیں سمجھا دینا کہ گڑبڑ کوئی نہ ہو۔"

"تم یہ گڑگڑاہٹ کی آواز سن رہے ہو۔ کچھ سمجھے؟"

"ہاں۔ کوئی ہیلی کاپٹر ہے کہیں۔"

"غلط۔ یہ میرا پیٹ ہے' خالی پیٹ جس میں آنتیں قل ہو اللہ کے بعد سورۂ فاتحہ پڑھ رہی ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ مسکرایا "خاطر تواضع بھی ہوگی۔ بہت اچھی طرح۔" اس نے ذومعنی لہجے میں کہا "دس بجے تک تمہیں فرصت ہے کہ ایک دوسرے سے گلے مل لو۔ نصیحت وصیت جو کرنا ہے کر لو کیوں کہ اس کے بعد عدالتی کارروائی شروع ہوگی۔"

"نصیحت کا تو کسی پر اثر ہوتا نہیں' ہوتا تو ہم اس حال کو کیوں پہنچتے۔ ہمارے ایک انکل تھے۔ ایس ایس پی ضامن رضوی مرحوم۔ پولیس کی سروس میں رہے مگر ایمانداری کا یہ حال تھا کہ مرتے وقت تک اپنا گھر نہ بنا سکے۔ انہیں دیکھ کر ہی یقین آتا تھا کہ واقعی پولیس میں نیک انسان بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں فرشتے۔ انہوں نے بہت سمجھایا تھا' ہر روز بلکہ ہر وقت نصیحت کرتے تھے کہ ان چکروں میں مت پڑو۔ راہ راست پر چلنا بہت مشکل کام ہے' اس لیے اپنے کام سے کام رکھو۔ آج تمہیں دیکھ کر وہ یاد آ رہے ہیں۔ تمہاری صورت میں ان کی مشابہت ہے۔ افسوس ناک حد تک۔"

"افسوس کی کون سی بات ہے اس میں؟"

"خیال آتا ہے' کہیں تمہارا بھی انجام انہی جیسا نہ ہو۔" میں نے کہا۔

دو مسلح افراد اندر آئے اور سیلیوٹ کر کے اٹینشن ہو گئے۔

"اس خطرناک قیدی کو وہیں لے جاؤ جہاں باقی سب ہیں۔" حمید نے ایک دم لہجہ اور رویہ بدل لیا "اور دیکھو' یہ فرار ہو گیا تو تمہیں بھی جانا پڑے گا اس دنیا سے۔"

محافظ میرے آگے پیچھے ہو گئے۔ ان کے ہاتھ بڑے قاتلانہ انداز میں خودکار رائفلوں کے ٹریگر پر تھے۔ میرا ایک قدم بھی ادھر ادھر پڑ جاتا تو شاید اسے وہ فرار کی کوشش سمجھتے ہوئے مجھے فوراً منصب شہادت پر فائز کر دیتے۔ وہ چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا والی بات ہوتی چنانچہ میں صراط مستقیم پر چلتا رہا اور دعا کرتا رہا کہ ان کا پیر اونچی نیچی زمین پر نہ لڑکھڑائے ورنہ ٹریگر پر خفیف سا دباؤ بلا ارادہ پڑ جائے گا۔ رائفل ویسے بھی خودکار تھی۔

طویل بیرک پتھروں کو بڑی صناعی سے تراش کے بنائی گئی تھی۔ یہ زرد اور سلیٹی رنگ کے پتھر مقامی پہاڑوں سے حاصل کیے گئے تھے اور دیواروں میں سیمنٹ سے اس طرح چنے گئے تھے کہ مضبوطی کے ساتھ خوب صورتی کا پہلو بھی اجاگر ہو گیا تھا۔ پس منظر کے پہاڑوں اور سبزہ و گل میں یہ عمارت اپنی ڈھلوان مخروطی چھت کے ساتھ ایک خوب صورت منظر کا حصہ لگتی تھی تاہم یہ میری نظر کا بھی کمال تھا کہ میں نے اس حسن کو محسوس کیا اور یہ کمال اس یقین سے پیدا ہوا تھا کہ ہمارے لیے کسی حقیقی خطرے کا وجود نہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس بیرک میں قید رکھنے کے بعد اس خوب صورت پس منظر میں کھڑا کر کے مجھے گولی ماری جانے والی ہے تو مجھے احساس حسن کہاں ہوتا۔ مجھے یہ کال کوٹھری اور پھانسی گھاٹ سے زیادہ بدصورت' خوفزدہ کرنے والی اور منحوس عمارت لگتی اور قدرت کا سارا حسن آنکھوں میں پھرنے والی موت کی تصویر میں غائب ہو جاتا۔

بیرک کے آخری حصے میں ایک کمرے کے فرش پر دیگر اسیران کرام تشریف فرما تھے۔ مرزا غالب مٹی دھول میں ایسے سکون سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے لیٹے تھے کہ فکر سخن میں غلطاں نظر آتے تھے۔

www.paksociety.com

نازو اور کاجل ایک دیوار کے قریب چھنگا مارے کانا پوسی میں مصروف تھیں اور سو فیصد یقین شاید غیر شریفانہ یا زنانہ تھا کہ نازو نے چیخنے کے لیے منہ سے "ہکی" کی آواز نکالی اور ایکدم خاموش ہوگئی۔ رابعہ اور کلیم اللہ دوسری دیوار کے ساتھ استاد شاگرد والے پوز میں بیٹھے تھے۔ رابعہ فرش پر انگلی سے نہ جانے کیا بنا رہی تھی۔ کلیم اللہ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ رابعہ نے کیسے اتنے کم وقت میں کلیم اللہ کے خیالات کو اپنے حق میں کرلیا۔ وہ جوان لڑکا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس پر بھی حسن کا جادو چل گیا مگر ابھی وہ بچہ تھا۔ حقیقت حال معلوم ہوجانے کے بعد وہ ہم سب سے بدظن ہوگیا تھا مگر اب ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی۔

میں نے غالب کے قریب بیٹھ کے دردناک آواز نکالی "آہ!"

غالب گھبرا کے بیٹھ گیا "کیا بات ہے؟ کوئی تکلیف ہے؟"

میں نے سر ہلایا "بڑا سخت، ظالم اور بے رحم آدمی ہے۔"

رابعہ کا رنگ اڑ گیا "تم پر تشدد کیا اس نے؟"

میں نے اسے پرملامت نظروں سے دیکھا "اور کیا۔۔۔ وہ مجھ سے رشتے کی بات کررہا تھا۔ بیت بازی ہورہی تھی۔ بیت بازی کا ماہر ہے وہ۔"

غالب نے فوراً میرے مکر کو سمجھ لیا۔ اس نے میری کمر پر ایک مکا رسید کیا "بیت بازی کے بعد آدمی ایکٹنگ نہیں کرسکتا مرنے کی۔"

"میں سچ مچ فوت ہورہا ہوں۔" میں نے کراہ کر کہا "کیوں میرے قتل کا الزام لیتے ہو اپنے سر پر۔ بلاوجہ۔ تو رابعہ! تم بھی مسکرا رہی ہو۔ ظالم حسینہ عرف کوئن آف ہارٹ۔ تم سے کسی نے تفتیش نہیں کی؟"

غالب نے کہا "ہوئی تھی مگر تفتیش کرنے والے سردار جی کے بارہ بجے ہوئے تھے صبح صبح۔ ان کی باتیں لطیفے سے کم نہیں تھیں۔ بڑی شرافت سے یقین دلاتے رہے کہ واہگورو کی کرپا سے سب ٹھیک ہوجائے گا کڑیو۔ بیک وقت تینوں پر فریفتہ نظر آتے تھے۔ تاہم فیصلہ کرنا مشکل ہورہا تھا ان کے لیے۔ آخر میں رابعہ کی طرف زیادہ ملتفت تھے اور غالباً بے تکلف بھی ہوگئے تھے۔ پہلے بزرگانہ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔"

رابعہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا "کچھ شرم کرو، ان کی عمر کا لحاظ کرو۔"

غالب ہنسنے لگا "میں نیت کی بات کررہا تھا، جس کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

نازو نے بھی احتجاج کیا "آپ جیسا سمجھتے ہو سب کو؟"

"بالکل ٹھیک۔ میں بچپن سے ہی بدنیت تھا اور بقول شاعر میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ جوانی تو خیر ہوتی ہی دیوانی ہے مگر مرتے دم تک حسن پرستی کا جذبہ قائم و دائم رہے گا۔"

میں نے کہا "کیا بک بک شروع کردی تم نے؟ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی کسی نے؟"

"میرے ساتھ تو نہیں ہوئی۔" غالب نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جھوٹ مت بولو۔" رابعہ نے کہا۔

"بھئی تفتیش میں کچھ تو ہوتا ہی ہے۔" غالب نے کہا "آخر ہم سب زیر حراست ہیں۔ ہمارے ساتھ اس سے بہت کم ہوا جو زیر تفتیش ملزمان کے ساتھ ہوتا ہے اور معمولی واقعات کو بڑھا چڑھا کے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں نہ ہم سب کچھ بھول جائیں مس رابعہ۔"

"چلو بھول جائیں گے۔" میں نے کہا "مگر مجھے کچھ معلوم تو ہو۔"

"ابتدا تم کرو۔ سچ سچ بتاؤ کہ تم سے کس طرح تفتیش کی گئی۔ پہلے جھانپڑ سے شروع کرو۔" غالب نے کہا۔

میں نے جھینپ کر کہا "وہ سب ڈراما تھا۔"

غالب نے قہقہہ مارا "سن رہی ہیں آپ خاتون اول۔ ڈراموں میں آپ بھی شامل تھیں۔ آپ کو کیا لگا تھا روزانہ خصوصاً ہیرو کی بہادری۔"

میں نے کہا "اگر وقت میں بہادری کا مظاہرہ کرتا تو اس وقت تم یوں ہنسنے کے قابل نہ رہتے۔ کیپٹن حمید خود مجرم ہے اور یہاں سزا کاٹ رہا ہے۔"

کاجل نے حیرانی سے کہا "کیا جرم کیا تھا اس نے؟"

"اس کا جرم قومیت کے اعتبار سے وہی ہے جو تمہارا۔ وہ مسلمان ہے، فرض شناس ہے اور پاکستان کا حامی ہے۔" میں نے کہا "چنانچہ اسے گھر سے دور اس ویرانے میں پھینک دیا گیا ہے اور ایک ایسی فوج کی کمان دے دی گئی ہے جس میں سب ہی ناپسندیدہ افراد شامل ہیں۔ جن کو کوئی اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ خود بڑی مشکل میں ہے تاہم اس نے ہماری مشکل کو آسان بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ انشاء اللہ ہم آج شام سے پہلے واپس روانہ ہوجائیں گے۔"

"واپس؟" تقریباً سب نے ایک ساتھ چلا کے کہا۔

"سنو، ذرا صبر سے پوری بات سنو۔" میں نے کہا اور پھر کیپٹن حمید کے ساتھ ہونے والی تمام گفتگو کا خلاصہ پیش کردیا۔ تاہم خلاصہ کوئی نہیں چاہتا تھا۔ درمیان میں مجھ سے اتنے سوالات کیے گئے کہ کوئی بات باقی نہیں رہی۔

غالب بولا "مجھے خوشی ہوئی کہ جابر کو اس کے جرم کی سزا ملی۔"

"ابھی ملی نہیں، ملے گی۔" میں نے کہا۔

"ایسے لوگوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔ بہت غرور ہوگا اسے اپنی چالاکی اور مکاری پر۔ سوچ رہا ہوگا کہ سب کو پھنسا کے سیٹی بجاتا ہوا واپس لوٹ جاؤں گا۔" غالب نے کہا۔

نازو بولی "بڑا شکاری سمجھتا تھا خود کو۔ اپنے ہی پھیلائے ہوئے

جال میں گرفتار ہوگیا۔"

کاجل نے کہا۔ "تم کیپٹن حمید سے بات کرنا۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"اس سے کہنا کہ مجھے موقع دے۔ میں خود گولی ماروں گی اسے۔" کاجل نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ناممکن ہے۔ یہ کوئی کھیل نہیں ہے ہاکی کا۔ کہ ریفری سب کو ایک طرف کھڑا کردے اور تمہیں پنیلٹی اسٹروک لگانے کا موقع دے۔ اتنا کافی ہے کہ اسے اپنے کیے کی سزا مل جائے گی۔" میں نے کاجل کو سمجھایا۔

"اچھا۔ تو اس سے کہو کہ مجھے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنے دے۔" کاجل کے وجود میں سویا ہوا نفرت کا لاوا ابلنے لگا۔ "میرے سامنے۔۔۔"

"میں ایسا کوئی احمقانہ مطالبہ نہیں کرسکتا۔ وہ فلم کی شوٹنگ نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔۔۔ سامنے نہ سہی میں چھپ کر دیکھ لوں۔"

میں نے بگڑ کے کہا "کاجل! کیا ہوگیا ہے تمہاری عقل کو؟"

اس نے چلا کر کہا "یہ مجھ سے پوچھتے ہو کہ میری عقل کو کیا ہوگیا ہے! میں نے بھی تو سب سے بڑی قیمت ادا کی ہے۔ تم سب کی آزادی کی خاطر کیا نہیں کھو دیا میں نے! اپنے ماں باپ کو، گھربار کو، عزت کو۔ کہاں سے لاؤں میں وہ عقل جو میرے احساس کی لاش کو آنسو بہائے بغیر دفن کردے۔ میں جذبات سے عاری ہوجاؤں اور سب کچھ بھول جاؤں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رابعہ نے اسے بڑی مشکل سے چپ کرایا۔ اس دوران میں دو افراد اندر آئے اور ناشتا رکھ کر چلے گئے۔ المونیم کی ایک کیتلی میں ابلی ہوئی چائے تھی۔ چائے میں اس کے تمام اجزا پہلے ہی ملا دیے گئے تھے۔ چائے پینے کے لیے کپ کی جگہ سلور کے مگ تھے اور انہیں ہونٹوں سے لگانے سے ہی ہونٹ جلتے تھے۔ کھانے کے لیے عجیب لیوتری سی تندوری روٹیاں تھیں اور ایک پیالہ مکھن سے بھرا ہوا تھا۔ کاجل خاموش ہوگئی تو ہم نے خاموشی سے ناشتا کیا۔ اس کے ہسٹریا نے سب کو متاثر کیا تھا۔ بلاشبہ اس کا یہ رد عمل فطری تھا۔ صبر و ضبط اور قوت برداشت کی حد وہ پہلے ہی پار کرچکی تھی۔ کوئی عورت یوں اپنے آپ کو قربان کرکے کسی اور کے لیے آزادی کا سودا نہیں کرسکتی تھی۔ ہم سے اس کا اتنا قریبی تعلق بھی نہ تھا کہ ہم اس سے قربانی کی توقع رکھتے۔ ایسی قربانی تو رابعہ اور نازو کے لیے بھی ناممکن تھی۔ جان دینا بہت آسان ہوتا ہے۔ اپنی آن اور انا کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا یہ صرف کاجل ہی کرسکتی تھی۔ اور میں اس سے کہہ رہا تھا کہ عقل سے کام لو۔ عقل تو میری ماری گئی تھی۔

ناشتے سے فراغت پانے کے بعد غالب نے مجھے خاصی سنجیدگی سے بتایا "سردار جی کا خیال تھا کہ ہم پاکستانی جاسوس ہیں۔ اس کے ساتھ ایک نائب صوبیدار بنگالی مسلمان تھا۔ وہ کاجل سے بنگالی میں بات کرتا رہا۔ کاجل نے بعد میں بتایا کہ اسے سب سے پہلے الگ لے جاکر یہی پوچھا گیا تھا کہ وہ بنگلہ دیش سے کیوں فرار ہورہی ہے اور وہ بھی بھارتی سفارت خانے کی گاڑی میں۔ انہوں نے یعنی تفتیش کرنے والوں نے کہا کہ وہ بنگلہ دیش کے ایک ممتاز سیاستدان کی بیٹی ہونے کا دعویٰ بھی رکھتی ہے۔ یہ بھی کہتی ہے کہ اس کا باپ شیخ مجیب کا دست راست ہے۔ انہوں نے کاجل کی اس بات کا یقین نہیں کیا کہ وہ فرار ہونے میں ہماری مدد کررہی تھی۔"

"کیا انہوں نے تھرڈ ڈگری کا استعمال کیا؟"

"تھوڑا بہت۔ کاجل نے بھی یہی کہا تھا کہ زیادہ سختی نہیں ہوئی۔"

"مگر سختی ہوئی؟"

"ہاں۔ سختی تو کی انہوں نے۔ دھمکیاں دے کر خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔ کاجل کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہمارے اصل نام تفتیش کرنے والوں کو معلوم ہوچکے ہیں۔ وہ اس سے اعتراف کرانا چاہتے تھے کہ ہم پاکستانی جاسوس ہیں مگر اس نے نہیں مانا۔ یہ بنگالی نائب صوبیدار جو مسلمان ہے، کیا سب سے زیادہ خطرناک دشمن ثابت ہوا۔ اس نے کاجل کو گندی گالیاں دیں۔ ایسی کہ دہرا بھی نہیں سکتی تھی۔ انتہائی فحش کلامی کے ساتھ اس نے کاجل پر ہر الزام لگایا جس میں غدار کی بیٹی کا خطاب بھی شامل تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ تشدد میں حد سے بڑھ جاتے مگر کیپٹن حمید آگیا اور اس نے بنگالی کو کسی کام سے بھیج دیا۔ اس نے میرے ساتھ بھی ڈراما کیا۔"

میں نے ہنس کے کہا "ویسا ہی جیسا میرے ساتھ ہوا تھا؟"

"اس سے بھی زیادہ۔" غالب جھینپ کر بولا "خبیث نے سردار جی کے سامنے مجھے مارا اور بہت گرجا برسا کہ کھال کھینچ کے بھس بھرنے کا ماہر ہوں میں۔ اس کے ساتھ ہی سردار جی بھی شروع ہوگئے مگر حمید نے مجھے آنکھ ماری جس کا مطلب میں فوراً تو نہیں سمجھا تھا تاہم اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے مار خاموشی سے برداشت کی۔ کیپٹن حمید نے سردار جی کو تفتیش جاری رکھنے کے لیے کہا اور خود چلا گیا تم سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے۔ بعد میں سردار جی نے خاصی محبت سے مجھے پنجابی میں گالیاں دیں کہ کھوتے دے پتر، بے توں جسوس ایں تے میتوں دس دے کن ہو۔" ان کا مطلب تھا کہ شرافت سے مان جاؤں ورنہ۔۔۔ اس ورنہ کے بعد کچھ نہیں تھا، میرے سمجھنے کی بات تھی۔ سردار جی نے باری باری رابعہ، نازو اور کاجل سے بھی تفتیش کی۔ میں مذاق نہیں کررہا تھا۔ وہ سردار جی واقعی ٹھرکی ہیں۔ ان کا رویہ خاصا اشتعال انگیز تھا اور میں ڈر رہا تھا کہ کہیں نازو ان کا حشر نشر نہ کردے۔ میں پیچھے کھڑا اسے اشارے کرتا رہا اور ہاتھ جوڑ کے خاموش رہنے کی اپیل کرتا رہا۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "انھوں نے گاڑی کی تلاشی بھی لی ہوگی؟"
"ہاں۔ اور تلاشی میں سب کچھ نکل آیا۔ اسلحہ بھی' مال بھی۔ ہمارے پاس بس اللہ کا نام ہے۔" غالب بولا۔
"یہ سب جابر کی خباثت کے باعث ہوا۔" میں نے کہا "اس نے ہمارے ساتھ دھوکا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب دیکھو اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔"
غالب نے کہا "وہ خود ہے کہاں؟"
"مجھے تو نہیں معلوم۔"
"زندہ تو ہے نا؟" غالب نے کہا۔
میں نے کہا "ہاں۔ ابھی تک تو زندہ ہے۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ ایک ٹانگ میں گولی ماردی انھوں نے۔"
"جابر ہمارے خلاف بولے گا۔ وہ سب بتائے گا جو کسی کو بھی معلوم نہیں۔" غالب نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔ "بلکہ ممکن ہے اب تک وہ بتا بھی چکا ہو لیکن اسے ڈر بھی ہوگا کہ جتنا وہ ہمارے بارے میں جانتا ہے اس سے زیادہ ہم اس کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔"
"وہ تو میں بتا چکا ہوں کیپٹن حمید کو۔" میں نے کہا۔
"پھر اس سے امید مت رکھو کہ وہ خاموش رہے گا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے خاموش رہ سکتا تھا۔" غالب نے کہا۔
"مگر جو کچھ میں نے بتایا ہے ابھی تک کیپٹن حمید کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "میں اس سے بات کرسکتا ہوں۔"
"اب کیا بات کرو گے؟"
"یہی کہ جابر ہمارا راز فاش نہ کرے تو اس کے جرائم پر بھی پردہ پڑا رہنے دیا جائے۔" میں نے کہا۔
"کیا وہ مان جائے گا؟"
"اگر وہ ہماری مدد کرنا چاہتا ہے تو ضرور مانے گا۔ ابھی تک تو ہم پر کوئی بہت سنگین الزام نہیں' سوائے اس کے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہندو ناموں سے بھارتی پاسپورٹ لے کر سفر کررہے تھے۔ رابعہ کے پاسپورٹ میں بھی ردوبدل کیا گیا تھا مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ ہم ایم آر ایس کے وہ اراکین ہیں جو ہر قیمت پر ہر حکومت کو مطلوب ہیں۔ پہلے پاکستان میں پولیس کو مطلوب تھے' پھر بھارت میں اور اب بنگلہ دیش میں ہمارے خلاف تخریبی سرگرمیوں سے لے کر ڈکیتی اور قتل و غارت گری کے نہ جانے کتنے مقدمات درج ہیں۔"
غالب بولا "یار! کیا اب بھی پاکستان میں پولیس ہمیں پریشان کرے گی؟ وہ پرانے مقدمات پھر زندہ ہوں گے؟ وہ فائلیں دوبارہ نکالی جائیں گی؟"
"یہ تو وہاں جا کے ہی پتا چلے گا۔" میں نے کہا "فکر آج کی کرو مرزا جی۔ ایسا نہ ہو کہ پاکستان پہنچنے سے قبل ہی پہلے بنگلہ دیش میں پھانسی ہو اور پھر بھارت میں۔"
غالب نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم کیپٹن حمید سے بات کرلو اور اس سے پہلے جابر سے۔"
"جابر سے مجھے کون ملنے دے گا؟"
"کیپٹن حمید کے اختیار میں سب کچھ ہے۔" غالب نے کہا "وہ عہدے کے لحاظ سے چھوٹا افسر ہے مگر یہاں وہی حاکم ہے۔ اگر ابھی تک جابر نے ہمارے کارناموں کا ذکر نہیں کیا ہے تو ہم بھی اس کے جرائم کی پردہ پوشی کریں گے۔ اس سے معاہدہ کرلو۔"
میں نے کہا "میں کوشش کرتا ہوں۔"
باہر برآمدے میں دو خیالی سپاہی رائفلیں لٹکائے ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بندوق کا رخ میری طرف کرکے لپکے اور اپنی زبان میں مجھے فوراً واپسی کا حکم دینے لگے۔ الفاظ ناقابلِ فہم تھے مگر اشارے واضح تھے۔
میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا "بلاوجہ شور مت کرو۔ میں فرار نہیں ہورہا ہوں۔ مجھے کیپٹن حمید سے ملنا ہے۔"
کیپٹن حمید کے نام پر وہ رک گئے ورنہ ایک نے تو بٹ مارنے کے لیے رائفل اٹھائی تھی۔ انھوں نے آپس میں تبادلۂ خیال کیا اور مجھے اپنے ہمراہ چلنے کا اشارہ کیا۔ بیرک کے دوسرے حصے میں دو نائب صوبیداروں کا کمرا تھا۔ ان میں سے ایک ہمارا دشمن نمبر ون بنگالی تھا۔
مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ بگڑ گیا اور اس نے کچھ پوچھے بغیر پہلے مجھے چند گالیوں سے نوازا پھر اس کی نفرت اور تعصب پر مبنی قومیت کے جذبات کا لاوا ابلنے لگا اور اس نے مغربی پاکستان میں رہنے والے سب افراد کو ظلم اور استحصال کرنے والی قوم کا خطاب دیا۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم انگریزوں سے زیادہ کمینے تھے ہم نے بنگالیوں کو غلام بنا کے رکھا' ان کے حقوق پامال کیے اور ان کی کمائی کھا گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی چنانچہ میں نے مشتعل ہوکے جواب دینے سے گریز کیا۔
دوسرے نائب صوبیدار نے مداخلت نہ کی ہوتی تو اس کی بکواس جاری رہتی "یہ بھی تو پوچھو اس سے کہ یہاں کیوں آیا ہے؟"
میں نے کہا "نائب صوبیدار کی شاید اور کوئی نہیں سنتا۔ انھیں بولنے دو۔ فضول بول کے یہ اپنی انرجی ضائع کررہے ہیں۔"
"میں فضول بول رہا ہوں؟" وہ مشتعل ہوکے اچھلا۔
"میں نے ذرا شریفانہ الفاظ استعمال کیے ورنہ درحقیقت تم بھونک رہے تھے۔" میں نے کہا۔
دوسرا نائب صوبیدار مرہٹہ تھا۔ اس نے میرے منہ پر تھپڑ مارا "مجھ سے بات کرو اور تمیز سے بات کرو۔ کیا چاہتے ہو؟"
میں نے کہا "میں اپنے تمام سابقہ اور آئندہ جرائم و عزائم کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ کیا کرچکا ہوں آج تک اور کل کیا کروں

گا۔"
"کل تم زندہ رہو گے تو کچھ کرو گے۔" مرہٹے نے کہا۔
"میں مر کے بھی بہت کچھ کرسکتا ہوں۔ بھوت بن کے تمھیں چمٹ سکتا ہوں یا جن بن کے تمھاری بیوی پر عاشق ہوسکتا ہوں۔" میں نے کہا۔
اس نے پھر تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ میں نے اس کی کلائی پکڑلی "ابھی تک مجھ پر کوئی جرم ثابت نہیں ہوا ہے۔ تفتیش کے بعد اگر یہ ثابت ہوجائے کہ میں نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے تب بھی تمھیں سزا دینے کا اختیار حاصل نہیں ہے نائب صوبیدار۔ اپنی حد میں رہو۔ تم سرحد پار کرنے والوں کو روک سکتے ہو اور واپس بھیج سکتے ہو۔ اس سے زیادہ تم کچھ نہیں کرسکتے۔ تفتیش بھی تم محدود اختیارات کے ساتھ کرو گے کیونکہ تم پولیس نہیں ہو۔ تمھارا کام صرف گرفتار کرنا اور ملزموں کو متعلقہ حکام کے حوالے کرنا ہے۔"
"بکواس بند کرو اپنی۔" وہ چلایا "تم نے ایک قتل کیا ہے یہاں۔ ایک آدمی کا ہاتھ توڑ دیا ہے اور کپتان صاحب پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔"
"ہاں' یہ سب کیا ہے میں نے مگر تم نہ عدالت ہو' نہ تفتیشی افسر۔ تم مجھے پھانسی نہیں دے سکتے اور نہ جیل بھجوا سکتے ہو۔ میں جانتا ہوں ملٹری کے قوانین کیا ہیں۔ کورٹ مارشل تمھارا ہوسکتا ہے' میرا نہیں۔ میرے خاندان کے بہت لوگ ملٹری میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ایک نام میجر جنرل ملہوترا کا ہے اور ایک بریگیڈیر نسیم کا۔ وہ بھارتی فوج کے ساتھ ڈھاکا میں ہیں۔"
نائب صوبیدار کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا "تم جھوٹ بولتے ہو۔"
"یہ جھوٹ ہوتا تو تمھارا کیپٹن حمید ہمارے ساتھ سختی نہ کرنے کی ہدایت کیوں دیتا؟ وہ خود ڈرتا ہے۔" میں نے طنز آمیز تمسخر کے ساتھ کہا۔
بنگالی نے کہا "وہ آرہا ہے کیپٹن حمید۔"
میں نے پلٹ کے دیکھا تو کیپٹن حمید برآمدہ طے کرکے ادھر ہی بڑھ رہا تھا۔ غالباً وہ ہم سے ملنے گیا تھا اور وہاں کسی نے بتا دیا تھا کہ میں خود اس سے ملاقات کے لیے نکلا تھا۔
"کیا بات ہے؟" اس نے کمرے میں قدم رنجہ فرماتے ہی گرج کے کہا۔
"تمھارا یہ ماتحت تمھارے خلاف بول رہا تھا۔" میں نے بنگالی کی طرف اشارہ کیا "اس کا خیال ہے کہ تم مسلمان ہو اس لیے غدار ہو۔"
بنگالی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ یہ جھوٹ اس کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ سنبھل ہی نہ سکا۔ اس کا خیال ہوگا کہ اگر میں نے شکایت کی تو مرہٹے کی کروں گا جس نے مجھے تھپڑ مارا تھا۔
"یہ جھوٹ کہتا ہے سر!" بنگالی چلانے لگا۔
"بس اتنا ہی حوصلہ تھا؟" میں نے طنز سے کہا "جو پیٹھ پیچھے بھونک رہے تھے وہ منہ پر کہو۔"
"میں نے کچھ نہیں کہا سر۔"
"کیوں' تم نے نہیں کہا کہ یہ مسلمان اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے والوں اور اسمگلروں کو پکڑتا ہے اور رشوت لے کر چھوڑ دیتا ہے۔ ساری رقم خود ہضم کرجاتا ہے۔ جب میں آیا تو تم کیا باتیں کررہے تھے آپس میں؟"
اب مرہٹہ بھی چونکا "یہ بالکل غلط ہے سر۔"
کیپٹن حمید نے انھیں شعلہ بار نظروں سے دیکھا "اس کا فیصلہ بھی بعد میں ہوجائے گا۔ ابھی یہ بتاؤ کہ تم کیوں ملنا چاہتے تھے مجھ سے؟"
میں نے کہا "میں ان کے سامنے بات نہیں کرسکتا۔ یہ میری جان کے دشمن ہورہے ہیں۔ یہ بنگالی مجھے دہشت زدہ کررہا تھا کہ انڈین آرمی کا کوئی بریگیڈیر نسیم اس کا سسر ہے جو آج کل ڈھاکا میں ہے۔"
بنگالی نے غصے میں پاگل ہوکے کہا "یہ بھونکتا ہے سر!"
میں نے اسے جواب دیے بغیر مرہٹے کی طرف دیکھا "اور یہ کسی میجر جنرل ملہوترہ کا ماموں ہے۔ ابھی کہا ہے اس نے۔"
مرہٹہ بھی چیخنے لگا "بکواس کرتا ہے یہ۔۔۔"
کیپٹن نے ہاتھ اٹھا کے کہا "اچھا بند کرو یہ شور ہنگامہ۔ جب تحقیقات ہوں گی تو سب سامنے آجائے گا۔ اور تم باہر چلو۔"
میں اس کے ساتھ معصوم صورت بنائے باہر آگیا۔ ان الزامات کے پیشِ نظر جو میں نے بنگالی اور مرہٹہ نائب صوبیداروں پر عائد کیے تھے اب تحقیقاتی کمیشن میں ان کی شمولیت مشکوک ہوگئی تھی اور ان کی ساکھ کو سخت نقصان پہنچا تھا۔
میں نے برآمدے میں آکے کہا "میں جابر سے ملنا چاہتا تھا۔"
"پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے جھوٹ بولا تھا۔۔۔"
میں نے کہا "بالکل نہیں۔ مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں تو کسی بریگیڈیر نسیم یا میجر جنرل ملہوترا کو جانتا تک نہیں۔ یہ لوگ آپس میں باتیں کررہے تھے۔ میں نے اتفاق سے سن لیا۔"
"کیا واقعی انھوں نے کہا تھا کہ میں رشوت لیتا ہوں اور سب ہضم کرجاتا ہوں؟" کیپٹن حمید متفکر ہوگیا۔
"جھوٹ سچ کا علم تو تمھیں ہوگا۔ یہ ان کی رائے تھی۔ اور بھی نہ جانے کس کس کا یہ خیال ہوگا۔ یا ممکن ہے یہ دونوں تمھارے خلاف زہرافشانی کرتے ہوں۔"
کیپٹن حمید نے سرہلایا "مجھے پہلے بھی رپورٹ ملی تھی کہ میرے خلاف باتیں ہوتی ہیں لیکن باتیں کون کرتا ہے' یہ آج معلوم ہوا۔ مجھے انھی دونوں پر شک تھا۔ ان کا سابقہ ریکارڈ بھی زیادہ اچھا نہیں

www.paksociety.com

ہے۔ خیر... تم جابر سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

میں نے کہا "مجھے اس سے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس نے ہمارے خلاف تو کچھ نہیں بکا۔ وہ ہماری اصلیت سے واقف ہے ایسا نہ ہو کہ وہ سب کے سامنے بک دے۔"

کیپٹن حمید نے کہا "گویا تم ابھی مفاد کا سودا کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ ابھی تک ہمارے متعلق اگر کسی کو تمام حقائق کا علم ہے تو وہ تم ہو اور جابر کے بارے میں تم کو میں نے ہی بتایا تھا۔"

"تم چاہتے ہو میں اسے چھوڑ دوں؟"

"یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ اگر ہم پر کوئی سنگین جرم ثابت نہیں ہوتا تو تم ہمارے جانے کے بعد اس سے مزید پوچھ گچھ کر سکتے ہو اور اسے بھارتی حکام کے حوالے بھی کر سکتے ہو۔ شک کی بنا پر کہ یہ لوگوں کو جیسے لے کر سرحد پار کراتا ہے۔ اس کے پاس سفارت خانے کی گاڑی تھی جسے یہ ناجائز کام کے لیے استعمال کر رہا تھا اور چاہو تو کسی گمنام ٹیلی فون کا حوالہ دے سکتے ہو کہ غالباً اس نے ثریا جی کو قتل کیا ہے جن کا یہ ڈرائیور رہا تھا۔ باقی کام پولیس والے خود کر لیں گے۔"

"صرف دس منٹ ہیں تمہارے پاس۔"

"دس منٹ کے بعد کیا ہوگا؟"

"گویا کرم یعنی تمہاری آخری رسومات فوجی تفتیشی کیپٹن کے ہاتھوں۔" حمید نے کہا۔

جابر پچھلے حصے میں واقع ایک کاٹیج نما کیبن میں اکیلا بند تھا اور باہر ایک لمبی ناک اور مونچھوں والا جاٹ صفت پہرے دار بندوق کو کسی کھلونے کی طرح پکڑے کھڑا تھا۔ خالی ہاتھ بھی وہ جابر جیسے چار کو کافی تھا۔ اس نے کیپٹن حمید کو سیلوٹ کیا اور حلق سے چند ناقابل فہم تراکیب نکال کے اشاروں میں کچھ سمجھانے لگا۔ وہ گونگا تھا۔

حمید نے اس کی بات سمجھتے ہوئے سر ہلایا "اچھا ٹھیک ہے میں سمجھ گیا، بالکل ٹھیک کیا تم نے۔"

میں نے کہا "یہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"جابر نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔"

"کیسے؟"

"چادر پھاڑ کے رسی بنائی تھی اور چھت کی کڑی سے لٹک کر پھانسی دینا چاہتا تھا خود کو مگر پرانی چادر کی رسی مضبوط ثابت نہ ہوئی۔ جب اس نے لات مار کر کرسی ہٹائی جس پر وہ گلے میں پھندہ ڈال کر کھڑا ہوا تھا تو فرش پر گرا۔ اس کی چیخ سن کر یہ اندر گیا تو وہ ٹانگ پکڑے بیٹھا تھا جس ٹانگ میں گولی لگی تھی۔"

میں نے کہا "چلایا کیوں تھا؟ دوسری کوشش کرتا۔"

"یہ اسی سے پوچھ لینا۔" حمید نے کہا۔

جابر ننگے فرش پر خود بھی ننگا بیٹھا تھا۔ اس کی حفاظت پر مامور شخص نے حفظ ماتقدم کے طور پر نہ صرف یہ کہ کیبن میں سے بستر، چادر وغیرہ ہٹا لیے تھے بلکہ اس کے کپڑے تک اتروا لیے تھے کہ کہیں وہ دوسری کوشش اپنی شلوار کے ازاربند سے نہ کرے۔ سوائے دیوار سے سر ٹکرانے کے اب اس کے پاس مرنے کا کوئی طریقہ نہیں رہا تھا اور یہ مشکل ہی نہیں ناممکن طریقہ تھا کیونکہ دیواریں لکڑی کی تھیں۔

حمید کے لوٹ جانے کے بعد میں نے کہا "جابر کو مجبور دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ لباس فطرت میں تم کو آزادی کا مزہ آرہا ہوگا۔ اتنے آزاد تو ہم بھی نہیں ہیں۔"

اس کی ساری اکڑفوں ختم ہو چکی تھی "سکندر صاحب! آپ پنجھ کرو ورنہ یہ لوگ ہمیں مار ڈالیں گے۔"

"اب میں کیا کروں؟ یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے جو سامنے آرہا ہے۔" میں نے کہا "البتہ میں ایک کام کر سکتا ہوں۔"

اس نے پُرامید نظریں اٹھائیں "وہ کیا؟"

"میں تم کو فرار ہونے کا موقع فراہم کر سکتا ہوں۔ باہر جو موت کا فرشتہ کھڑا ہے اس سے نمٹنا تمہارا کام ہے۔"

وہ مایوس نظر آنے لگا "میں نے ایک کوشش کی تھی۔"

"تم ایک کوشش اور کر سکتے ہو۔ دوسری ٹانگ ابھی باقی ہے۔"

"تم مذاق کر رہے ہو۔" وہ کراہ کے بولا۔

میں نے کہا "مذاق کیسا! کیا تم نے اس مکڑی کی کہانی نہیں سنی جو کنگ رابرٹ بروس کے سامنے چھ بار گری مگر اس نے اوپر چڑھنے کی کوشش جاری رکھی۔ یہاں تک کہ ساتویں بار کامیاب ہو گئی اور بعد میں جب کنگ رابرٹ مکڑی کی مثال سامنے رکھ کے کامیاب ہوا تو ایک شاعر نے نظم لکھ ماری۔ لیکن تم نہ کنگ رابرٹ ہو اور نہ مکڑی۔"

"معلوم ہوتا ہے تم نے ان سے کوئی ساز باز کر لی ہے اس لیے بے فکر ہو۔"

میں نے کہا "ساز باز تم نے کی تھی۔ بعض اوقات وہ بات سچ بھی ہو جاتی ہے کہ گڑھا کھودنے والا خود ہی اس میں گرتا ہے۔ تم ہمیں دھوکا دے کر نکلنا چاہتے تھے۔ دیکھو تقدیر نے کیا پھنسایا ہے تمہیں۔"

"مجھ سے غلطی ہوئی، میں مانتا ہوں۔"

"اب ماننے کا فائدہ؟" میں نے کہا "آخری وقت میں توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ اور تم کس غلطی کی بات کر رہے ہو؟ تمہاری تو پوری زندگی بھی تمہارے باپ کی ایک غلطی تھی۔ جو تم ساری عمر کرتے رہے وہ گناہ تھے یا جرائم تھے۔ اخلاقی اور قانونی جرائم۔ ایسے ہی رشتہ میں آدمی کو وہ سب یاد آتا ہے جو اس نے زندگی کے اختیار، طاقت اور غرور میں کیا تھا۔ جب وہ زمین پر یوں اکڑ کر چلتا تھا جیسے اسے پھاڑ دے گا اور یہ نہیں سوچتا تھا کہ زمین ہی اسے کھائے گی۔ پھانسی کی سزا پانے والے موت پانے والے زندگی کی آخری رات میں خود اپنے اعمال کا حساب کرتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں مگر اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

اس نے سر جھکا لیا "میں مانتا ہوں۔ میں کافی عرصے معافی مانگنے کو تیار ہوں۔"

میں نے تلخی سے کہا "کیا معافی سے اس کو وہ سب مل جائے گا جو تم نے اس سے چھینا تھا؟ ایک عورت کے پاس اس کے غرور کے سوا ہوتا کیا ہے کہ وہ آبرومند ہے۔ اگر یہی سب کچھ کوئی تمہاری بہن کے ساتھ کرتا اور بعد میں کہتا سوری۔ تو کیا تم مطمئن ہو جاتے؟ تمہاری بہن کی عزت اسے واپس مل جاتی؟ وہ عزت جو اس نے اپنی نظر میں رکھی تھی۔"

"پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟" وہ رونے لگا۔

میں نے کہا "ہم سب ایک چانس لے سکتے ہیں۔"

"کیسا چانس؟" وہ سر اٹھا کے بولا۔

"وہ کون شخص تھا جس نے ہمارے بارے میں مخبری کی؟ وہی جسے تم نے اپنا بھائی بتایا تھا؟"

"وہ... بھائی نہیں تھا میرا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ تم نے تفتیش کے دوران اس کا نام پتا اور کھوکھا اس نے جھوٹ بولا تھا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"یہ لوگ اسے پکڑ لائیں گے اور اسے جھوٹ بولنے کی سزا دیں گے۔ یہی ایک صورت ہے ہمارے بچنے کی۔"

جابر نے نفی میں سر ہلایا "اس کا سچ ثابت ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "کیا ثابت ہو گیا ہے؟ ابھی کچھ ثابت نہیں ہوا۔ ان کو نہ ہمارے بارے میں کچھ معلوم ہے نہ تمہارے متعلق۔"

"غلط خیال ہے تمہارا۔ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ تم سکندر ہو۔ باقی سب کے نام بھی۔"

میں نے کہا "نام سے کچھ نہیں ہوتا۔ سکندر اعظم سے لے کر سکندر بخت تک ہزاروں نام کے سکندر گزرے ہیں۔ انہیں ابھی تک یہ نہیں معلوم کہ میں کون سا سکندر بخت ہوں۔ انہیں میرے ساتھیوں کے کارناموں کا علم نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جعلسازی کے سوا کسی جرم میں ملوث نہیں اور جعلی پاسپورٹس پہ غلط ناموں سے سفر کر رہے تھے۔ تم ان کو یقین دلا سکتے ہو کہ پاسپورٹ اصلی ہیں۔"

"وہ میری بات کب مانیں گے؟"

"مانیں گے۔ جب تم بتاؤ گے کہ تم سفارت خانے کے ملازم ہو اور ثریا جی کے ڈرائیور رہے۔ ثریا جی کے بارے میں تو ابھی ہمارے سوا کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ سورگ باشی ہو چکی ہیں۔ تم ذرا رعب سے بات کرنا کہ ثریا جی کوئی معمولی فرد نہیں ہیں چنانچہ ان کے ڈرائیور کا بال بھی بیکا ہوا تو ان سب کی وردی اتر جائے گی۔ مجھے تمہاری اتنی سی ہے۔ تم تصدیق کر سکتے ہو کہ پاسپورٹ اصلی ہیں کیونکہ خود تم نے بنوا کے دیے تھے۔" میں نے کہا "کیا تمہارے پاس ثبوت کافی نہیں ہے؟"

"ہے۔ میں دکھا چکا ہوں۔" وہ بولا۔

"بس تو کام بن گیا۔ ان کا تو باپ بھی مانے گا کہ تم خاص فرد ہو اور وہ مجبور ہو جائیں گے تم کو چھوڑنے پر۔ ان سے کہنا کہ وہ چاہیں تو کسی بھی سفارت خانے سے تصدیق کر لیں۔ بنگلہ دیش کے سفارت خانے سے یا نیپال کے سفارت خانے سے۔ ثریا جی کے ڈرائیور کو سب ہی جانتے ہوں گے۔"

اس کا اعتماد بحال ہونے لگا تھا "بالکل جانتے ہیں۔ میں ثریا جی کے خاص پیغام لے کر بھی جاتا تھا۔"

"ویری گڈ! تم ہمیں بھی بچا سکتے ہو اور خود بھی بچ سکتے ہو۔ ہم اعتراف کر لیں گے کہ پاسپورٹ میں ہمارے نام غلط ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ انڈین شہری کی حیثیت سے ہم زیادہ آسانی سے سرحد عبور کر جائیں گے۔ درحقیقت ہم مسلمان ہیں۔ جان بچا کے فرار ہو رہے تھے اور پاکستان جانا چاہتے تھے۔ اس کے بعد وہ ہمیں رکھ نہیں سکیں گے۔ سیکڑوں ہزاروں مسلمان روز نیپال جاتے ہیں۔"

"اور میرا کیا بنے گا؟"

"وہ مجبور ہوں گے کہ تم کو باعزت طور پر واپس جانے دیں۔ ایک معمولی کیپٹن میں اتنی ہمت نہیں کہ تمہیں نقصان پہنچا سکے۔ وہ بگڑی زیادہ بگھارتا ہے اور چیخ چلا کے اپنی دہشت قائم کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے مگر تم بھی جانتے ہو کہ اس کا کام صرف چیک کرنا ہے، کسی کو سزا دہ کیسے دے سکتا ہے۔ چیکنگ کے دوران کوئی مشتبہ شخص پکڑا جائے تو اس کی صرف اتنی ذمہ داری ہے کہ اسے قانون کے حوالے کر دے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔" جابر بولا۔

"مجھے صرف دس منٹ کے لیے تم سے بات کرنے کی اجازت ملی تھی۔" میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "ہمارا مقدمہ ایک عدالت کے سامنے پیش ہوگا۔"

"عدالت؟ ایسی کی تیسی ان کی..."

میں نے کہا "غصے میں مت آؤ۔ وہ صرف تفتیش کریں گے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہم سچے ہیں یا جھوٹے، مشتبہ ہیں یا نہیں۔ ہمیں پولیس کے حوالے کیا جائے یا چھوڑ دیا جائے۔ اس سے زیادہ نہ ان کے اختیارات ہیں اور نہ وہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لیے میری بات دھیان سے سنو۔ تم کو بیان دیتے وقت صرف یہ کہنا ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور تم نے ہمیں سرحد عبور کرانے کی ذمہ داری لی تھی۔"

"پیسے لے کر؟"

"یہ تمہاری مرضی کہ ہمیں اپنا دوست، رشتے دار کہو یا پیسے لے کر ہماری مدد کرنے کی بات کرو۔" میں نے کہا "تم یہ کہو گے کہ پاسپورٹ بنوانے کا مشورہ تم نے ہی دیا تھا بلکہ پاسپورٹ خود تم نے

www.paksociety.com

ہی ہوا کے سبب سے تھے کیونکہ تم سمجھتے تھے اس طرح ہم سو فیصد محفوظ ہو جائیں گے۔ مزید یہ کہ ہمارے نام سکندر، نازو اور غالب وغیرہ نہیں ہیں۔"

"پھر کیا نام ہیں؟"

"فرض کرو میرا نام ہے محمد علی۔ رابعہ ہو گئی مسز محمد علی۔ مسلمانوں میں یہ بہت عام نام ہے۔ رابعہ کا اپنا نام زبیدہ یا سلطانہ بتا دیتا۔"

"ایک نام پہلے کر لو۔"

"اچھا سلطانہ کر دیتا۔ غالب کا نام عبداللہ اور نازو کا نام رکھ لو پروین۔ کاجل تو کاجل ہی رہے گی۔"

"نازو، تجہ، کلیم؟ کہیں وہ تو نہیں مروا دے گا؟"

"نہیں اسے سمجھا دوں گا۔ ابھی تک کسی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا ہے۔" میں نے کہا۔

میرا خیال ہے کہ حمید دروازے سے لگا سب کچھ سن رہا تھا۔ میری بات ختم ہوتے ہی وہ اندر آ گیا۔

"وہ مست ہو گئے۔" اس نے راز سے کہا۔

باہر آ کے میں نے کہا "ٹھیک ہے۔"

اس نے کہا "ٹھیک کر لیا ہے نا؟"

"ہاں۔ بس تم یہ کرنا کہ سب کو الگ الگ لانا۔ اس کا بیان الگ لینا۔" میں نے کہا۔

"یہی ہو گا۔" حمید نے مجھے یقین دلایا "طریقہ بھی یہی ہے۔"

واپس اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ کے میں نے انہیں جاری ہونے والی گفتگو کے بارے میں مختصراً بتایا اور انہیں بھی سمجھا دیا کہ کس کو کیا کہنا ہے۔

"آخر کتنے نام بدلیں گے ہم؟" نازو نے کہا۔

"خاتون! آپ ایک گلاب ہیں۔ آپ کو کسی بھی نام سے پکارا جائے، آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔" غالب نے کہا۔

"جیسے نام رکھنے سے یہ مرزا غالب نہیں بنا۔" میں نے کہا۔

"الٹا مرزا غالب کے نام کو بدنام کیا۔" نازو بولی۔

غالب نے کہا "بدنام تم نے کیا ہے مجھے۔"

"میں نے؟ میں نے کیا بدنام کیا ہے؟" نازو تیوری پر بل ڈال کے بولی۔

"سب باتیں کرتے ہیں کہ... کیسا کالا کلوٹا الو ہے۔ عقل ماری گئی ہے۔ دماغ ہو تو اس پر مرتا جس کی صورت نہ شکل۔"

نازو کا پارہ چڑھا ہوا تھا "کبھی اپنی شکل دیکھی ہے؟"

"دیکھی ہے میرا بیٹا بالکل میرے جیسا ہو گا اگر اسے کچھ کہا تم نے تو میں..."

"تم کیا کرو گے؟" میں نے اس سے کہا کیونکہ اب نازو کو غصے، شرم اور بے بسی نے لاجواب کر دیا تھا۔

غالب نے سر کھجایا "پھر میں بیٹی کو ترجیح دوں گا۔" اس نے یوں نازو کی طرف دیکھ کر کہا کہ مفہوم سب پر عیاں ہو گیا۔ "حالانکہ قدرت بھی شاہکار ایک بار ہی تخلیق کرتی ہے۔"

رابعہ نے کہا "بہت بدمعاش ہو تم غالب!"

غالب کو وقتی جلال آ گیا اور بولا "ہیں تو نکما ہم جو کچھ ہیں آپ کی وجہ سے ہیں۔"

اب رابعہ کے جھینپنے اور نازو کے ہنسنے کی باری تھی۔

میں نے کہا "جھگڑے وقت کم ہے۔ اپنا اپنا بیان سمجھ لو کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

غالب نے کہا "کلیم اللہ کا کیا ہو گا اگر اس نے سچ بول دیا؟"

رابعہ نے بھی سر ہلایا "کیا ہم اسے بھی جھوٹ بولنا سکھائیں گے؟"

"بات جھوٹ سچ کی نہیں، ہم اسے اعتماد سکھائیں گے مشکل حالات سے نمٹنے کے لیے عقل کی ذہانت سے کام لینا سکھائیں گے۔ یہ بتائیں گے کہ زندگی جو خدا کی دی ہوئی ایک نعمت ہے اور ہم پابند ہیں کہ اس کی حفاظت کریں، اسے بے وقعت نہ جانیں۔ ابھی اس کے سامنے ایک عمر کی مسافت ہے۔ اسے جینے کا ڈھنگ آنا چاہیے ورنہ یہاں تو ہر قدم پر شکاری ملیں گے جو اس کو جان و مال سے محروم کرنا چاہیں گے۔ رابعہ! تم کاجل سے بات کرو۔ وہی کلیم کو سمجھا سکتی ہے۔"

"کلیم اس کے ساتھ منفی ہو گیا ہے۔"

"منفی ہونے پر مجھے اعتراض ہے۔" نازو نے کہا "یہ جذباتی وابستگی ہے۔"

"جیسی تم کو مجھ سے ہے۔" غالب نے معصوم بن کے کہا۔

"غلط فہمی ہے آپ کی۔" نازو نے کہا۔

"پھر تم ہی صاف بتا دو کہ یہ کیا ہے۔ تم کو محبت ہے مجھ سے، عشق ہے، تم مرتی ہو مجھ پر؟ کیا ہے یہ چکر آخر۔"

نازو چلائی "غالب کے بچے..."

غالب فوراً میرے پیچھے آ گیا "الفاظ کا الٹ پھیر ہے سب۔ اصل بات یہی ہے کہ تم منفی ہو گئی ہو میرے ساتھ زبردستی۔"

نازو نے اسے پکڑنے کی کوشش کی "میں تو تھوکوں بھی نہیں تم پر۔"

غالب دوسری طرف آ گیا "ہاں۔ بڑی منتوں مرادوں سے تو ایک الو کا پٹھا ملا ہے۔ اس پر بھی تھوک دیا تو دوسرا کیا شریف سے اچھا ہو گا۔ کوئی کالا بھجنگ حبشی؟"

میں نے بڑی مشکل سے دونوں کو روکا "چلو بعد میں فیصلہ کر لینا۔"

رابعہ نے ہنس کے کہا "تمہارا گھر بھی بڑا گھر ہو گا، بعد والا کا نقشہ ہر وقت یہی ہو گا۔"

غالب نے کہا "اور آپ کا گھر ہو گا جانب گھر۔ مہاتما بدھ کے مجسموں کی طرح آمنے سامنے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے ہوں گے ہر وقت۔ چپ چاپ..."

www.paksociety.com

اب نازو ایک دم غالب کی طرف دار ہو گئی "نہیں۔ کبھی کبھی یہ لوگ ٹھنڈی سانس لے کر کوئی شعر پڑھ دیں کے مرزا غالب کا جو وکیل صاحب کی سمجھ میں خاک نہیں آئے گا مگر یہ شرمائی رہیں گی۔"

رابعہ نے کہا "نازو! بہت بولنے لگی ہو تم بھی۔"

غالب بولا "ہمارے گھر کو چڑیا گھر کیوں کہا تھا؟"

"ہم عجائب گھر بھی نہیں کہہ سکتے۔" نازو بولی۔

"کیا ہم عجوبہ ہیں؟" میں نے کہا۔

"تو کیا ہم بندر ہیں؟" غالب بولا "میں اور نازو..."

نازو نے پھر سانحہ بدل لی "میں تو نہیں۔ ہاں تم کچھ کھٹے ہو۔ اگر ذم ہوتی..."

اس قید خانے میں بھی ہم دل کھول کر ہنسے۔ اپنے آپ پر ہنس کے آدمی کتنا ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ دوسروں پر ہنسنے والے بعض اوقات خود سے شرمسار ہوتے ہیں۔

کیپٹن حمید کے ایک نمائندے نے اندر قدم رنجہ فرما کے اعلان کیا "کھڑے ہو جاؤ سب!"

وہ بہت پستہ قد آدمی تھا۔ غالب نے کہا "پہلے تم تو کھڑے ہو جاؤ دوست۔"

ہم سب کو بیرک کے وسطی حصے میں لے جایا گیا۔ وہاں ایک میز کے پیچھے تین کرسیوں پر تین افسران تشریف فرما تھے۔ بنگالی مسلمان نائب صوبیدار اور مرہٹہ کو کیپٹن حمید نے کورٹ آف انکوائری میں شامل کیا تھا۔ اسی طرح کلیم بھی منصفان میں شامل تھا۔

جابر کا بیان ہم سے پہلے لیا جا چکا تھا اور اسے بیرک میں واپس بھیج دیا گیا تھا۔ اس نے وہی کہا تھا جو میں نے اسے سمجھایا تھا چنانچہ ہماری پوزیشن بہت بہتر ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے میرا نمبر آیا اور میں نے بھی اپنے بارے میں جھوٹ کو سچ بنا کے پیش کیا۔ ایک کہانی سنائی کہ کس طرح ہمارا گھر اور خاندان بنگلہ دیش کی خانہ جنگی میں ختم ہوا اور کس طرح جابر نے ہماری جان بچائی۔ وہ سب خاصے متاثر ہوئے سوائے حمید کے جو زیر لب مسکراتا رہا۔

میرے بعد غالب، رابعہ اور نازو کے بیانات ہوئے۔ بیان کے بعد جرح سے فارغ ہو کے جو بھی واپس آتا تھا وہ بتاتا تھا کہ ابھی تک سب ٹھیک جا رہا ہے لیکن میں کاجل اور کلیم اللہ کی طرف سے متفکر تھا کیونکہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ اور ہوا بھی یہی۔ کاجل کی باری آئی تو اس نے کہا کہ میرا بیان سب کے سامنے ریکارڈ کیا جائے لیکن اس کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔

"یہ ضابطے کے خلاف ہے۔" بنگالی مسلمان نے اعتراض کیا۔

"اگر وہ سب گواہ ہیں۔" کاجل نے احتجاج کیا۔

"وہ سب ملزم ہیں۔" مرہٹہ بولا "جیسے تم ملزم ہو۔"

کیپٹن حمید نے فیصلہ صادر کر دیا۔ "ایک ملزم کا گواہ دوسرا ملزم نہیں ہو سکتا۔"

قانونی طور پر یہ فیصلہ درست تھا یا غلط، اس سے قطع نظر لیکن مجھے کاجل کی بات نے چونکا دیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا کہے گی اور پھر یہی ہوا۔

کاجل نے ایک ایک کر کے وہ سب مظالم گنوا دیے جن کا ہدف اس کی ذات تھی۔ وہ ظلم جو اس کے والدین پر بنگلہ دیش بنانے والوں نے کیا تھا۔ اس کا گھر انہی جیسے بیدار گروں نے لوٹا تھا۔ کس طرح مظلوموں کی مددگار بھارتی سینا کے ایک دیالے سورما نے اس کی آبرو کو اسی گھر کی چھت کے نیچے پامال کیا تھا۔ پھر کیسے جابر نے اس کے جسم سے ہوس کا خراج وصول کیا تھا۔

جہاں یہ نام نہاد عدالتی کارروائی ہو رہی تھی وہ لکڑی کی دیواروں والا ایک کمرا تھا۔ ہم سب دوسرے کمرے میں تھے اور درمیان میں لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی ایک دیوار حائل تھی۔ ایک جھری سے دوسری طرف کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا اور کان لگانے سے آواز بھی سنی جاتی تھی۔ ہم سب نے ایک دوسرے کے بیان کا ہر لفظ سنا تھا چنانچہ اختلاف یا تضاد بیانی کا کوئی مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا کیپٹن حمید کی بے وقوفی کے باعث ہوا تھا اور اسے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اگر وہ چاہتا تو ہم سب کو بیک وقت نہ طلب کیا جاتا۔ بیرک کے ایک کنارے سے صرف ایک ملزم کو لایا جاتا اور اسے بیرک کے دوسرے کنارے پر بیان دینے کے بعد واپس پہنچا دیا جاتا۔ یہ بہت بڑی رعایت تھی جو کیپٹن حمید نے دانستہ دی۔ تاہم اس کے ماتحت اعتراض کرتے تو خود کو اس الزام سے بچانے کے لیے وہ سختی سے تفتیش کے طریقہ کار پر عمل کرتا۔

جیسے بنگالی نے ہم مذہب ہونے کے باوجود ہم سب کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز، جارحانہ اور اشتعال انگیز رویہ اپنایا، ایسے ہی مرہٹہ نائب صوبیدار نے بھی انصاف کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے کینہ پرور انتقامی ردعمل سے ثابت کر دیا کہ تفتیش محض ایک ڈراما ہے تاہم اسی ڈرامے کی وجہ سے ہم محفوظ رہے۔ کیپٹن حمید نے یہ چکر نہ چلایا ہوتا تو وہ اپنے ہاتھوں سے ہمیں گولی مار کے بہت محظوظ ہوتے اور مطمئن بھی کہ انھوں نے جو کیا وہ عین تقاضائے انصاف تھا۔ آخر کار اس عدالت کا فیصلہ کیا ہو گا؟ یہ سب جانتے تھے۔ بظاہر کیپٹن حمید کا رویہ بھی تذلیل آمیز اور پُر عداوت تھا مگر درحقیقت وہی ہمیں تحفظ فراہم کرنے والی دیوار بن کے ہمارے اور ان دشمنوں کے درمیان حائل ہو گیا جو ہمارے خون کے پیاسے تھے۔ اس نے افسر کی حیثیت سے اپنی بالادستی قائم رکھی اور کسی ماتحت کو اس حد تک بے لگام نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنی حیوانی درندگی کا مظاہرہ کر سکے۔

جیسا کہ مجھے توقع تھی، آہستہ آہستہ کاجل کے جذبات کی آتش فشانی میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ ہسٹریا کا شکار ہونے لگی۔ اب وہ جابر کے انسانیت سوز مظالم کا ذکر کر رہی تھی۔

"... مجھے نہیں معلوم کہ اس کا ماضی کیا تھا لیکن جو کچھ اس نے میرے ساتھ کیا، جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، جو کچھ میرے جسم نے برداشت کیا، میرے احساس کا آزار بنا اور میری روح کے ہر زخم کو رستا ہوا ناسور بنا گیا۔ اس کے بعد میں جابر کا ماضی بھی دیکھ سکتی ہوں۔ وہ جرم اور گندگی کی پیداوار، جرم اور گندگی کا پروردہ، جرم اور گندگی کا وہ ڈھیر ہے جو شریف اور پاک نفس انسانوں کی دنیا کے ماتھے پر ایک رسوا کن بدنما داغ ہے، جس کو مٹ جانا چاہیے۔ میں مظلوم اور مجبور تھی اور کمزور تھی۔ جسمانی طور پر نہیں، ضرورت اور حالات کے باعث۔ اگر میں اسے مارنا چاہتی تو اس کے دل میں خنجر بھی اتار سکتی تھی۔ ایک گولی سے اس کا دماغ نکال کے گٹر میں بہا سکتی تھی مگر میں نجات چاہتی تھی۔ اس زنداں سے، اس عقوبت خانے سے، اس خطۂ زمین سے جو کبھی میرا گھر تھا، میرا وطن تھا۔ اور میں اکیلی نہیں تھی، میرے ساتھ کچھ مجھ سے بھی زیادہ ستم رسیدہ تھے۔ ایک جسم بچا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی معزز اراکین عدالت، محترم جج صاحبان۔"

آخری الفاظ اس نے انتہائی تلخ اور طنزیہ لہجے میں ادا کیے تھے۔ کیپٹن حمید کے ماتحتوں نے مجبوراً یہ ذلت برداشت کی۔

رابعہ نے تشویش سے میرے کان میں کہا "کاجل کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا ضرورت ہے یہ سب بتانے کی؟"

نازو نے بھی سر ہلایا "اور کیا۔ کس کا دل پسیجے گا ان الفاظ سے یا اس کی باتوں سے۔ بے وقوف!"

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے کہا "بے وقوفی تم کر رہی ہو۔ ہم اسے بولنے سے تو نہیں روک سکتے مگر ہماری آواز کسی کے کانوں تک پہنچ گئی تو ہمیں ضرور روک دیا جائے گا یہ سب سننے سے۔"

کاجل کا بیان جاری تھا۔ اب وہ رو رہی تھی اور ہچکیاں لے رہی تھی "آپ کے پاس طاقت ہے، اختیار ہے۔ اس شیطان کے وجود سے انسانیت کا نام بدنام ہوتا ہے۔ اسے زمین میں بھی گاڑا گیا تو یہ مٹی ناپاک ہو جائے گی۔ سمندر میں اس کی راکھ ڈالی جائے تو اس بارش کی ہر بوند ناپاک ہو گی جو اس پانی سے اٹھنے والے بادل برسائیں گے۔"

کیپٹن حمید نے اسے ٹوک دیا "فضول، جذباتی باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ یہ رونا دھونا بند کرو اور کوئی الزام ہے جابر کے خلاف تو بتاؤ۔"

کاجل نے خود کو سنبھالا اور آنسو صاف کیے "ایک الزام نہیں، دس الزام ہیں جن کی گواہ میں خود ہوں، مجھے معلوم ہے اس نے کتنے قتل کیے ہیں اور قتل ہونے والے کون تھے۔ اس کے خلاف بڑی لمبی فردِ جرم ہے۔ اس ننگ حرام نے اپنے مالک کا خون کیا اور اسے اپنے ہی گھر میں دفن کرا دیا حالانکہ وہ ایک شریف النفس انسان تھا اور اپنے اس ملازم پر خصوصی اعتماد کرتا تھا۔ وہ اکیلا آدمی تھا جس کی بے گور و کفن لاش اسی گھر کے عقبی حصے میں

انصاف کی منتظر اپنے دفن میں لپٹی ہوئی ہے۔"

بنگالی نے کاجل کو ٹوکا "کیا تم بتا سکتی ہو کہ جابر نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

"کوئی آدمی قتل کیوں کرتا ہے؟" کاجل نے الٹا سوال کر ڈالا۔ "لالچ میں یا انتقام لینے کے لیے۔ جابر کی اس سے کوئی دشمنی نہیں ہو سکتی تھی۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" بنگالی بولا۔

"شربانی کا دشمن کوئی نہیں تھا۔"

"کیا تم شربانی کو ذاتی طور پر جانتی تھیں؟" بنگالی نے کہا۔

"ہاں۔ وہ میرے والد سے ملنے آتے تھے۔ ہمارے سیاسی خیالات، مذہب اور قومیت کا فرق اپنی جگہ مگر میں ان کی ذاتی شرافت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جابر کے ساتھ ان کا سلوک کبھی ایسا نہیں رہا کہ وہ ان کا دشمن ہو کے انھیں قتل کرنے کی سوچتا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ قتل اس نے لالچ میں کیا۔"

"کیا شربانی لالچی آدمی تھے؟" مرہٹہ نے کہا۔

"کیا مطلب؟ میں جابر کو لالچی کہہ رہی ہوں۔" کاجل نے تیز ہو کے کہا۔

"اتنا مال و زر جس کے لیے ایک قابل اعتماد ملازم کے دل میں قتل کا خیال آ جائے، کسی لالچی اور کنجوس آدمی کے پاس ہی ہو سکتا ہے؟" مرہٹہ نے کہا۔

ایک لمحے کے لیے کاجل لاجواب ہو گئی، پھر اس نے کہا "یہ ضروری نہیں کہ ان سے جابر کو کروڑوں یا لاکھوں ملے ہوں۔ آخر وہ ایک سینئر ڈپلومیٹ تھے۔ ان کے پاس اتنی رقم رہتی ہو گی، کسی بھی ہنگامی ضرورت کے لیے۔ اور ہزاروں کا زیور تو ایک عام، متوسط طبقے کے آدمی کے گھر میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن جابر نے ایک اور وجہ سے شربانی کو قتل کرنا ضروری سمجھا۔ وہ شربانی کی گاڑی حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

"لیکن گاڑی تو ہر وقت اس کے پاس رہتی تھی اور جیسا کہ تم نے بتایا، شربانی اس پر بھروسا بھی کرتے تھے۔" بنگالی نے اعتراض کیا۔

"شربانی کے پاس ایک نہیں دو گاڑیاں تھیں مگر وہ سرکاری گاڑی کے استعمال میں بہت محتاط تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان حالات میں جن سے بنگلہ دیش دوچار تھا، بھارتی سفارت کار کی گاڑی کسی بھی واردات میں ملوث ہو یا غلط جگہ پر پائی جائے چنانچہ وہ جابر سے پوچھتے ضرور تھے کہ کون سی گاڑی کہاں کہاں گئی تھی۔ ممکن ہے تصدیق بھی کرتے ہوں۔ جابر اس گاڑی میں ہم سب کو سرحد پار کرانا چاہتا تھا۔ اس نے پاسپورٹ وغیرہ حاصل کرنے اور ویزا لگوانے میں ہماری مدد کی تھی۔ اگر وہ شربانی سے گاڑی مانگتا تو وہ صاف انکار کر دیتے اور بغیر بتائے نکل جاتا تو اس کی رپورٹ ہو جاتی جب کہ جابر یہ کام خاموشی سے کر کے واپس پہنچ جانا چاہتا

www.paksociety.com

تھا تاکہ جلد از جلد ان کے غائب ہونے کی اطلاع متعلقہ حکام کو دے سکے۔ اس نے ہم سے تو بھاری معاوضہ لیا ہی تھا، یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ شرافی کو مار کے اسے کیا ملا۔۔۔"

"کیا پولیس اس پر شک نہیں کرے گی؟" کیپٹن حمید نے کہا۔

"شک کی اب گنجائش کہاں رہی ہے؟ میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ وہ قاتل ہے۔ اس نے لاش کو کہاں دفن کیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس کے ارادے کیا تھے۔ وہ لوٹ کر واپس جانا چاہتا تھا یا نہیں مگر وہ چالاک اور عیار آدمی ہے۔ اس نے اپنے خلاف کوئی ثبوت اور شہادت نہیں چھوڑی ہے۔ اس نے لاش کو بھی غائب کر دیا ہے۔ جہاں ہر روز سیکڑوں افراد نامعلوم لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو رہے ہوں، بے ہوش ہو جاتے ہوں یا لاپتا، وہاں ایک سفارت کار کے اغوا یا قتل کو کسی بھی انتہا پسند تنظیم سے منسوب کرنا کیا مشکل ہوگا۔ اس کے علاوہ جابر نے یہ قتل اپنے ہاتھوں سے نہیں کیا۔"

بنگالی ایک دم چونکا "کیا؟ ابھی تم نے کیا کہا تھا؟"

"آپ میری بات سن لیں۔ اس نے یہ قتل ایک ایسے شخص سے کرایا جو کہنے کو انسان تھا مگر وہ اپنے قول و فعل پر اختیار سے محروم تھا۔ جس کے پاس عقل و شعور نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کا جسم ایک بالغ مرد کا جسم تھا مگر وہ چھ سال کے بچے سے بھی زیادہ ناسمجھ تھا۔ جابر نے جیسا کہا اس نے ویسا ہی کیا۔ جابر نے کہا کہ شرافی کا گلا گھونٹ دو اور اس نے تعمیل کی، سوچے سمجھے بغیر اور کچھ پوچھے بغیر۔ دبلے پتلے، کمزور شرافی اس بے شعور، طاقت ور انسان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ جابر نے اسی کے ہاتھوں شرافی کو دفن کرایا۔۔۔"

"پھر تو جابر کو قاتل نہیں قرار دیا جا سکتا۔" بنگالی نے کہا۔

"کیوں؟ صرف اس لیے کہ قتل کرنے والے ہاتھ کسی اور کے تھے؟ وہ ہاتھ تو ایک وسیلہ تھے جن کو جابر نے اسی طرح استعمال کیا جیسے کوئی شخص ریوالور یا خنجر کو استعمال کرتا ہے۔ ریوالور کسی اور کا ہو، خنجر کا مالک دوسرا آدمی ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس ناسمجھ بچے کے ہاتھوں پر اختیار کس کا تھا؟ کیا وہ خود انہیں قتل کے لیے استعمال کر سکتا تھا؟ نہیں۔ اس کے ہاتھ جابر کے ہاتھوں میں تھے۔ اگر کوئی کسی اندھے کو قتل کرنے کے لیے سڑک پار کرانے کے بہانے لے جائے اور ٹریفک کے درمیان چھوڑ کے ہٹ جائے تو کیا وہ قاتل نہیں ہوگا؟ کیا یہ کہا جائے گا کہ مرنے والا اس لیے مارا گیا کہ وہ دیکھ نہیں سکتا تھا؟ کیا یہ قتل نہیں سمجھا جائے گا؟ جابر نے اس شخص کی طاقت کو بندوق سے نکلنے والی گولی کی طاقت کی طرح استعمال کیا اور پھر جیسے کوئی آلۂ قتل کو غائب کرتا ہے، جابر نے بھی اس معصوم قاتل کو قتل کر دیا، خود اپنے ہاتھوں سے۔ وہ انسان نہیں آلۂ قتل تھا۔ میں بتا سکتی ہوں کہ وہ آلۂ قتل کہاں ہے۔ میں وہ جگہ بتا سکتی ہوں جہاں ایک نہیں تین لاشیں پڑی ہیں۔ ایک اس جواں مرد بچے کی جس کو مرتے وقت بھی معلوم نہ ہوگا کہ اسے کیوں مارا جا رہا ہے۔ اس کے گلے پر جابر کی انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ اگر آپ اسے انسان سمجھتے ہیں تو اس کا خون کرنے والا جابر دوہرے قتل کا مرتکب ہوا ہے۔"

"تم نے تین لاشوں کا ذکر کیا ہے۔" کیپٹن حمید بولا۔

"باقی دو لاشیں اس بچے کے ماں باپ کی ہیں جو ہمارے ساتھ ہے۔"

"تم نے اسے اپنا بیٹا بنایا تھا۔"

"ہاں، وہ میرا بیٹا ہے۔ وہ تمہارا بھی بیٹا ہے۔ وہ ان سب انسانوں کا بیٹا ہے جو انسانیت پر ایمان رکھتے ہیں۔" کاجل نے چیخ کر کہا "وہ انسان کا بیٹا ہے، ایک ایسے انسان کا جو مظلوم بنا تھا، بے مروت انسانوں کے ظلم کی چکی میں پس جانے والا آدمی جس نے اپنی زندگی کو اپنا نہیں سمجھا تھا اور شرم و وفا نبھانے کے لیے ادائے قرض کی خاطر اور نمک کا قرض چکانے کے لیے اپنے آقا، مالک اور ان داتا پر قربان کر دی تھی۔ وہ کوئی اسمگلر، جرائم پیشہ، ہسٹری شیٹر یا بدمعاش ہوتا تو آج کل کے حالات میں یوں بے بسی سے نہ مرتا۔ وہ لوٹ مار کرنے والوں میں شامل ہو جاتا، دولت کے ڈھیر قبول کر لیتا اور ایمان بیچ دیتا مگر اس پٹھان کے لیے اپنا ایمان اپنی جان سے زیادہ گراں بہا تھا اور اس کی بیوی کے لیے شوہر کا ساتھ دینا ہی بنیادی فرائض میں سب سے مقدس فریضہ تھا۔ ایمان آبرو کی سلامتی کی طرح وہ اپنے مجازی خدا کے لیے بھی اپنی جان دیتے ہوئے کسی کمزوری یا تذبذب کا شکار نہیں ہوئی۔ اس نے اپنا بیٹا ہمارے حوالے کر دیا اور خود شوہر کے ساتھ سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئی۔ اب میں اس بچے کی ماں ہوں اور خدا کی قسم مرتے دم تک رہوں گی۔ کوئی اسے مجھ سے نہیں چھین سکتا، کوئی نہیں چھین سکتا۔" وہ ایک دم دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

بنگالی نے بڑی بے رحمی سے کہا "تم اس کو کیسے لے جا سکتی ہو؟"

"کیوں نہیں لے جا سکتی؟" کاجل نے چیخ ماری۔

"اس لیے کہ نہ تم اس کی ماں ہو، نہ قانونی طور پر اس کی گارجین۔ اگر اس کے والدین نے یہ اختیار تمہیں دیا تھا تو اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں۔ تمہارا اس سے کوئی خونی رشتہ ہوتا تو الگ بات تھی۔"

"میں اسے لے جاؤں گی، ضرور لے جاؤں گی۔ دیکھوں گی مجھے کون روکتا ہے؟" کاجل دیوانہ وار چیخنے لگی "تم خود اس سے پوچھ لو۔"

مرچے نے کہا "وہ نابالغ ہے، اس کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں۔ تمہارے پاس گارجین کورٹ کا اجازت نامہ نہیں ہے۔"

"ایسی صورت میں یہ اغوا کی واردات کہلائے گی۔" بنگالی بولا۔

دوسرے کمرے میں میری اور غالب کی ساری توانائی خود کو یہ سمجھانے میں صرف ہو رہی تھی کہ عدالتی فیصلہ ہر صورت میں ہمارے خلاف ہوگا مگر کیپٹن حمید ہمیں اس فیصلے پر عمل درآمد کو روکنے کے لیے موافق حالات فراہم کرے گا۔ خود کو الزام سے بچانے کے لیے اس نے ان ہی دونوں کو اپنے ساتھ رکھا تھا جن کو جھوٹے الزامات لگا کے اپنا دشمن بنا چکا تھا چنانچہ یہ بالکل ناجائز توقع تھی کہ وہ ہمیں کسی قسم کی رعایت دیں۔ ان کی جگہ سرکاری ہوتے تو شاید فیصلہ مختلف ہوتا مگر بعد میں بنگالی اور مرچہ نائب صوبیدار اس کے خلاف الزامات کا طومار باندھ دیتے۔ اب کیپٹن حمید کو اپنی مجبوری کے فیصلے پر مہرِ تصدیق ثبت کرنا تھی اور یہ بعد میں کیا ہوتا ہے، کیا نہیں ہوتا، یہ اس کی ذمے داری نہیں بنتی تھی۔

کاجل نے سب کچھ بتا دیا تھا اور اس کے بعد کسی کے بتانے کو کچھ باقی نہیں رہا تھا مگر کیپٹن حمید نے بنگالی نائب صوبیدار کے مشورے پر حکم دیا کہ کلیم کو لایا جائے۔

"وہ نہیں آئے گا۔" کاجل نے چیخ کے کہا۔

"تم اب جا سکتی ہو۔" حمید نے سرسری لہجے میں کہا۔

"میں کہہ رہی ہوں کہ اس بچے کو بخش دو۔ خدا کے لیے اسے یہاں مت بلاؤ۔ ہم نے بڑی مشکل سے اور بڑی کوشش سے اس کو سنبھالے رکھا ہے، صبر اور حوصلے سے محروم نہیں ہونے دیا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ یتیم ہو چکا ہے۔ وہ پاگل ہو جائے گا صدمے سے۔ وہ ہم سب سے نفرت کرنے لگے گا، ہم پر اعتبار نہیں کرے گا اور ہمیں جھوٹا سمجھے گا۔"

"مگر اس سے پوچھے بغیر سچ کا کیسے پتا چل سکتا ہے؟" بنگالی نائب صوبیدار نے کہا۔

کیپٹن حمید نے اس کی تائید کی "یہ ٹھیک ہے۔ اس کے بیان سے ہی تمہارے بیان کی تصدیق ہوگی۔ اسے بلاؤ۔"

کاجل ہاتھ جوڑ کے التجا کرنے لگی "کپتان صاحب! رحم کریں اس بچے پر۔"

"دوسرے الفاظ میں تم کہہ رہی ہو کہ ہم تمہاری کہی ہوئی ہر بات کو من و عن تسلیم کر لیں اور تمہارے سچ، تمہاری انسانی ہمدردی اور ماتا کے مصنوعی جذبات اور تمہارے آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے دردناک بیان سے متاثر ہو کے تم کو باعزت طور پر بری کر دیں اور خود بھی شریک جرم ہو جائیں، ایک نابالغ کے اغوا کے معاملے میں۔ کلیم اللہ کو پیش کیا جائے۔" کیپٹن حمید نے دہاڑ کے کہا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ کاجل کو واپس دوسرے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔

ہسٹریا کی جنونی کیفیت میں کاجل نے سپاہیوں کے خلاف سخت مزاحمت کی۔ چیختے چلاتے ہوئے اس نے لاتیں چلائیں، اپنے ناخنوں سے ان کو کاٹا اور ان کے کپڑے پھاڑ دیے۔ اس کشمکش میں خود کاجل کے کپڑے بھی تار تار ہو گئے اور اس کو چوٹیں بھی آئیں مگر طاقتور محافظ اسے کسی زخمی شیرنی کی طرح زندہ پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔

انہوں نے کاجل کو کمرے میں دھکیلا اور دروازہ بند کر دیا۔ رابعہ اور نازو پہلے ہی نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو کے آنسو بہا رہی تھیں اور ہمارے سمجھانے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

نازو نے بیچ کا دروازہ کھول کے معزز اراکینِ عدالت کو مخاطب کیا "تم درندے ہو، سب وحشی ہو۔ تم میں انسانیت نام کی کوئی چیز ہوتی تو تم اس عورت کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتے۔"

رابعہ نے بھی نازو کا ساتھ دیا "شرم آنی چاہیے تم سب کو۔ انصاف کی کرسی پر بیٹھ کے ناانصافی کرتے ہوئے۔ اس بچے نے کیا جرم کیا ہے؟"

عدالت کے تینوں ارکان کامل بے حسی کے ساتھ اپنی شرمندگی کو چھپاتے رہے اور خون آشام نظروں سے ان پاگل عورتوں کو گھورتے رہے جو سب اپنے ہسٹریا پر قابو پانے میں ناکام تھیں۔

میں نے رابعہ کو پیچھے کھینچا اور غالب نے نازو کو۔ نازو اتنے غصے میں تھی کہ اس نے غالب کو اٹھا کر دور پھینک دیا "خود کچھ کرتے نہیں، مجھے بھی روکتے ہو۔"

اب مجھے آگے بڑھنا پڑا۔ میں نے کہا "نازو! میں لحاظ نہیں کروں گا۔ کیا تم میرا مقابلہ کرو گی؟"

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے اس نے میرا چیلنج قبول کر لیا ہے مگر دوسرے لمحے اس نے ایک گہری سانس لی اور دروازہ بند کر کے اپنی ہار مان لی۔

میں نے کہا "رابعہ! تم نے قانون پڑھا ہے، تم اچھی طرح جانتی ہو کہ قانون میں جذبات کی نہیں، حقائق کی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر وہ کلیم اللہ کا بیان لینا چاہتے ہیں تو اس میں کون سی غیر قانونی بات ہے؟"

"یہ زیادتی تو ہے۔" رابعہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے یہ ظلم ہو تمہاری نظر میں مگر تم عورت کی نظر سے دیکھ رہی ہو۔ قانون۔۔۔"

"بار بار قانون کا حوالہ مت دو۔" رابعہ نے بگڑ کے کہا "ان کو کس قانون کے تحت عدالتی اختیارات حاصل ہو گئے ہیں؟ میں نہیں مانتی اسے عدالت۔"

"مت مانو، یہ عدالت ہے ہی نہیں۔ یہ لوگ صرف بیان لے رہے ہیں، سزا نہیں سنا رہے ہیں۔ تحقیق ان کا حق ہے اور اس میں کوئی بات غلط نہیں۔ پھر تم جانتی ہو کہ کیپٹن حمید تو یہ سب پہلے ہی بتا چکا تھا کہ کیا ہوگا اور کیسے ہوگا۔"

"اب مجھے اس پر بھی اعتبار نہیں رہا۔ وہ بے بس ہے۔"

میں نے کہا "ہم تو بے بس نہیں ہیں۔ ابھی دیکھو اور انتظار

www.paksociety.com

کرو۔ حوصلے اور صبر کے ساتھ۔ قبل از وقت کوئی جذباتی غلطی سب کو مہنگی پڑے گی۔"

کاجل بے ہوش ہو گئی تھی اور نادرہ اس پر پانی کے چھینٹے ڈال رہی تھی۔ یہ پانی بھی اس نے کیپٹن حمید سے منگوایا تھا۔ اس دوران میں دو محافظ بیرک کے دوسرے کنارے سے کلیم کو لانے کے لیے جا چکے تھے۔ پریشانی مجھے بھی لاحق ہو رہی تھی کہ کلیم کے بیان کو ہمارے خلاف سمجھا گیا تو اس سے دو طرفہ مشکلات پیدا ہوں گی۔ کیپٹن حمید کے لیے الگ اور ہمارے لیے الگ۔ ہم اپنے جھوٹ کو نبھانے میں ناکام رہے تھے۔ کلیم کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے والدین آگے نہیں گئے ہیں' جیسا کہ ہم نے اسے سمجھایا تھا بلکہ پیچھے رہ گئے ہیں اور شاید وہ بھی اسے نہیں ملیں گے۔ اس کی نظر میں ہم جھوٹے اور دغا باز لوگ تھے مگر ہمارا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ وہ خود بھی بتا سکتا تھا کہ ہم کون ہیں۔ کس طرح اس کے گھر پہنچے تھے اور کس کے ذریعے۔ اس سے یہ اگلوایا بھی جا سکتا تھا جس سے ہماری شناخت کے رازہائے سربستہ فاش ہو جاتے اور ان سنسنی خیز انکشافات کے بعد کیپٹن حمید کے لیے ہمیں بچانا عملاً ناممکن ہو جاتا۔

میں نے کلیم کو بڑے سکون سے آتا دیکھا۔ تختوں کی جھری سے میں نے یہ بھی دیکھا کہ کورٹ آف انکوائری کے تینوں ارکان کی نظریں اس پر جمی ہوئی ہیں مگر وہ اعتماد کی تصویر بنا کھڑا ہے۔ پھر کیپٹن حمید نے اسے کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

حسب توقع سوالات میں پہل بنگالی نائب صوبیدار نے کی۔ "کیا نام ہے تمہارا؟ اصلی نام بتاؤ۔"

"کلیم اللہ۔" اس نے کہا "باپ کا نام سیف اللہ۔"

"کس نے کہا تھا تم سے کہ کوئی پوچھے تو یہی نام بتانا۔" بنگالی بولا۔

"ہمارا ایک نام ہے اور ایک باپ۔ تمہارا کتنا ہے؟" کلیم نے سادگی سے کہا۔

حمید مسکرانے لگا۔ مرہٹہ ہنسا اور بنگالی کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا "تم سالا بہت حرامی ہے۔"

کلیم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "حرامی تم ہے۔ تمہارا باپ۔ کافر۔ خنزیر کا بچہ...."

گالیوں کی بوچھاڑ نے بنگالی کو بوکھلا دیا۔ اس نے کیپٹن حمید کی طرف دیکھا اور بولا "آپ سن رہے ہیں اس کی زبان۔"

"تم نے بہت غلط سوال کر کے اسے یہ موقع دیا۔ اب تم کوئی بات نہیں کرو گے۔" حمید نے اسے شرربار نظروں سے دیکھا۔

مرہٹہ نائب صوبیدار نے کہا "کلیم! تمہارا باپ کیا کرتا تھا؟"

کلیم نے جواب میں وہ سب بتایا جو سیف اللہ نے ہمیں بتایا تھا۔

"تم ان کو چھوڑ کے جا رہے ہو۔ کیوں؟" حمید نے کہا۔

"ہم اپنے ملک جاتا ہے واپس۔ اپنا پھوپی کے پاس۔ ادھر ہمارا زمین ہے۔" کلیم نے کہا "ہمارا والد بولا کہ تم جاؤ۔"

"وہ خود تمہارے ساتھ کیوں نہیں آئے؟"

"وہ کیسا آتا۔ گاڑی میں جگہ نہیں تھا۔ وہ ادھر رہ گیا۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے ماں باپ دونوں مر چکے ہیں؟" بنگالی نے پھر زہر افشانی کی۔

"ہم کو معلوم ہے۔" کلیم نے اتنے اطمینان سے کہا کہ میں حیران رہ گیا "اگر وہ زندہ ہوتا تو ضرور ہمارا ساتھ آتا۔ اس نے ہم کو بولا کہ تم جائے گا۔ اپنا چاچا کے ساتھ اور ماما کے ساتھ۔"

"کون چاچا ماما؟"

"تم ان کو پکڑا' ابھی ہم سے پوچھتا ہے!" کلیم بگڑ گیا۔

"بے وقوف! تمہارے ماما چاچا نے انہیں مار دیا ہے" بنگالی چلایا۔

"شٹ اپ۔۔۔ ڈول یو" حمید نے دھڑ سے میز پر ہاتھ مارا۔

"تم بکواس کرتا ہے۔" کلیم نے بے خوفی سے کہا "تمہارا ماما چاچا تمہارا ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔"

مرہٹے نے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ لوگ تمہیں کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔ ہمارا گاؤں۔ اپنا زمین پر۔ پھوپی کے پاس۔"

"تمہارا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے جن کے ساتھ تم جا رہے ہو۔"

"ہم بولا وہ ہمارا ماما اور چاچا ہے۔ رشتہ اور کیا ہوتا ہے؟" کلیم نے کہا "وہ ہمارا باپ کا پکا دوست ہے۔ ادھر آتا تھا۔"

"تم سمجھدار لڑکے ہو' یہ بتاؤ کہ جابر کیسا آدمی ہے؟"

"وہ ڈاکو ہے۔ اس نے ہمارا گھر میں ایک خون کیا۔ اور بھی قتل کیا ہوگا۔ شراجی کو مارا اور دفن کیا۔ اس کا مال اٹھا لیا۔"

"یہ تم کیسے جانتے ہو؟" حمید حیران ہو کے بولا۔

"وہ بات کرتا تھا اور ہم سنتا تھا۔" کلیم نے کہا۔

"اسے سبق پڑھایا گیا ہے۔" بنگالی نائب صوبیدار بولا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔ کلیم اللہ! شروع سے سب بتاؤ۔ تم نے کیا دیکھا اور کیا سنا؟" حمید نے کہا۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ ہماری آمد سے واقعات کا بیان شروع کرے گا۔ یہ بتائے گا کہ ہمیں ایک امام مسجد اپنی حفاظت میں اس کے گھر چھوڑ گئے تھے مگر وہ خود لاپتا ہو گئے۔

"یہ جابر کو ہمارا باپ بولا کہ تم ادھر سے کچھ بندوبست کرے گا۔" کلیم اللہ نے کہا "ہم اپنا بیوی بچہ کو بھیجے گا اور اپنا فیملی کا کچھ لوگ بھی ہے۔ لڑکے کا چاچا ہے اور ماما ہے' ان کا بال بچہ ہے۔ وہ بولا۔ ہم ایک آدمی کا بیس ہزار لیتا ہے۔ تمہارا لڑکا کو چھوڑ دے گا اور ایک لاکھ لے گا۔ ہوائی جہاز میں بیٹھ رہے گا۔"

میں نے اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "یہ کیا

کہہ رہا ہے' اس نے کب سنا؟"

"اور جو کہانی نہیں کیا وہ سنا کیسے؟" غالب نے سرگوشی کی۔

میں نے کہا "اچھا سنو' وہ اور کیا کہہ رہا ہے۔"

کلیم اللہ کا بیان جاری تھا "وہ بولا ہم پاسپورٹ بھی لائے گا۔"

"تمہارے باپ کے پاس ایک لاکھ روپیہ تھا؟" بنگالی نے طنز سے پوچھا۔

"ہوتا تو وہ بھی جہاز پر جاتا۔ وہ محنت کرتا تھا' حرام نہیں کھاتا تھا۔" کلیم اللہ نے کہا۔

"پھر یہ رقم کس نے فراہم کی؟" مرہٹہ نے سوال کیا۔

"اس کا دوست۔ ہمارا چاچا اور ماما سب مل کے دیا۔ کاجل اپنا گھر سے لایا' ہمارا ماں کا زیور بیچا۔" کلیم کا اعتماد ذرا بھی متزلزل نہیں ہوا۔

"کاجل تمہاری کیا لگتی ہے؟" بنگالی نے کہا۔

"وہ ہمارا بہن ہے' ماں ہے۔ سب کچھ ہے۔" کلیم نے کہا۔

"مگر تم پٹھان ہو' وہ بنگالن ہے۔" بنگالی نائب صوبیدار نے کہا۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو کسی کے کہنے پر۔"

"جھوٹا آدمی سب کو جھوٹا سمجھتا ہے۔" کلیم نے یوں کہا کہ میں پھر حیران رہ گیا۔

"کیا تمہارا باپ' عبدالستار چودھری کو جانتا تھا؟ یا اس کے پاس ملازم رہا تھا؟ آخر کاجل کے تمہارے ساتھ تعلقات کیسے ہوئے؟" بنگالی بال کی کھال نکالنے پر آمادہ تھا۔

"یہ ہم نہیں جانتا۔" کلیم نے مختصراً کہا "ہم بہت چھوٹا تھا جب وہ آیا تھا۔"

"تم نے کبھی اپنے باپ سے بھی نہیں پوچھا؟"

حمید نے کہا "چھوڑو یہ بات...."

"سر! بات تو پوری کرنے دیں مجھے۔" بنگالی نائب صوبیدار نے ڈھٹائی سے کہا "کون سا غلط سوال کیا ہے میں نے؟"

مرہٹے نے بھی کہا "یہ لڑکا غلط بیانی کر رہا ہے۔"

"تم ثابت کر سکتے ہو؟" کیپٹن حمید نے کہا۔

"آپ موقع تو دیں۔" بنگالی نے تڑپ کے کہا "ایک غریب پٹھان چوکیدار کے تعلقات اتنے خوش حال اور تعلیم یافتہ لوگوں سے کیسے ہو گئے؟ جابر کو کیسے جانتا تھا وہ آخر؟"

"اور کیا پوچھو گے۔ مگر میں یہ عدالتی کارروائی سارا دن جاری نہیں رکھ سکتا۔" حمید نے کہا۔

اب بنگالی صوبیدار نے زیادہ اختیارات کے ساتھ سوال کیا "ہاں بیٹا! اب بتاؤ کہ یہ جو تمہارا چاچا ہے اس کا نام کیا ہے؟"

"سکندر بخت۔" کلیم نے جواب دیا۔

"اچھا۔ اور تمہاری چاچی کا؟"

"رابعہ قادری۔"

"تمہارا چاچا کیا کرتا ہے؟"

روشنی کے مینار
اسلام کے فراموش سلطان اولیائے کرام کے دلچسپ اور ایمان افروز واقعات ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے
قیمت ۱۵۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

عظمت کے مینار
ضیا تسنیم بلگرامی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ
قیمت ۱۵۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

ایمان کا سفر
محی الدین نواب کی ۱۰ معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ وہ کہانیاں جن کی آپ کو تلاش ہے
قیمت ۱۵۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

کچا گھر
محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے
قیمت ۱۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

آدھا چہرہ
محی الدین نواب کا پہلا طویل معاشرتی ناول ان لوگوں کا جو ایک نازیبا جرم کی وجہ سے اپنا اصل چہرہ چھپا کر رکھتے ہیں
قیمت ۲۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

کالی کہانیاں
جرائم، جادو، شیطان، اوہام و رواج، طنز و مزاح، اسرار و خوف، سسپنس اور تجسس پر مبنی ۴۰ کہانیاں
قیمت ۳۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

ٹک وولٹ کی چوریاں
مشہور ... جلد اول ... جلد دوم
ڈاک خرچ فی جلد ۱۶ روپے

www.paksociety.com

"اچھا بات کرتا ہے، اچھا کام کرتا ہے، کھانا کھاتا ہے، سوتا ہے، چائے پیتا ہے۔"

بنگالی نے خفیف ہو کے کہا "میرا مطلب تھا انہیں نوکری کرتا ہے یا اس کا کوئی بزنس ہے؟ وہ ڈاکٹر ہے، وکیل ہے کیا ہے؟"

"وہ ہمارا چاچا ہے۔" کلیم نے کہا۔

بنگالی نے زچ ہو کے کہا "چاچا کو آمدنی کہاں سے ہوتی ہے؟"

"ہم کو نہیں معلوم، اسی سے پوچھو وہ بتائے گا۔"

"اچھا وہ رہتا کہاں تھا؟"

کلیم نے بڑے یقین کے ساتھ ایک پتا بتایا۔

غالب نے مجھے کہنی ماری "ثبوت کرلو سکندر اعظم ہے۔"

میں نے سر ہلایا اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"تمہارے چاچا کی شادی کب ہوئی تھی؟"

"جمعہ کے دن۔" کلیم نے کہا۔

اب مرشد بھی مسکرانے لگا "تاریخ یاد ہے؟ مہینہ اور سال۔"

"نہیں۔" کلیم نے کہا "ہم چھوٹا تھا۔"

"تمہاری چاچی کس کی بیٹی ہے؟" بنگالی نے کہا۔

"اپنے باپ کی۔" کلیم نے بڑی سادگی سے کہا۔

بنگالی نے سر پکڑ لیا "اُف! یہ جتنا چھوٹا ہے اتنا ہی خبیث ہے۔"

"تم بہت بڑا خبیث ہے۔ بچے کو گالی دیتا ہے۔" کلیم بگڑ گیا۔

مگر بنگالی بہت ڈھیٹ تھا۔ سوالات کا ایک اور ایسا ہی سلسلہ اس نے ماما کے بارے میں شروع کیا اور کسی پیشہ ور گواہ کی طرح کلیم نے اسے بھر وہی جواب دیے جو اس نے چاچا کے بارے میں دیے تھے۔

اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی کہ ان سوالات کے سارے جواب اسے کاجل نے رٹائے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ پوچھنے والے کلیم سے کیا کچھ پوچھ سکتے ہیں۔ وہ اسی کے ساتھ الگ بیٹھی رہی تھی اور اسے یہی سبق یاد کرائی رہی تھی۔ اس کی دور اندیشی اور ذہانت نے ہم سب کا راز فاش نہیں ہونے دیا تھا اور ہمارے بیانات کو اعتبار کی سند دلوا دی تھی۔

کلیم نے ایک گھنٹا سوالوں کے جواب دینے میں صرف کیا اور ذرا نروس نہیں ہوا۔ اس نے ہمارے بیان پر مہر تصدیق لگا دی اور ثابت کر دیا کہ ہم سب نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا۔ آخر کار جب کیپٹن حمید کی مداخلت پر یہ سلسلہ ختم ہوا تو غصے اور جھنجلاہٹ سے بنگالی نائب صوبیدار کی حالت غیر تھی۔ مرشد سب کچھ سمجھنے کے باوجود خاموش بیٹھا مسکرا رہا تھا اور کیپٹن حمید شاید دل ہی دل میں اس ننھے گواہ کے حوصلے اور اعتماد کو سراہ رہا تھا جس نے کورٹ آف انکوائری کے چالاک، ذہین اور تجربہ کار معزز اراکین کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا تھا۔

جب کلیم کو جانے کی اجازت ملی تو ہم سب کے رکے ہوئے سانس بحال ہوئے۔ اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ جھک کر بھری سے آنکھ اور کان لگائے ایک گھنٹا گزرنے کے بعد میں سیدھا بھی نہیں ہو سکتا۔ بوڑھوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کے میں آہستہ آہستہ اس قابل ہوا کہ سر اٹھا کے کاجل کو دیکھ سکوں۔ یہی کیفیت غالب کی تھی۔ رابعہ اور نازو ہمارے مقابلے میں کوتاہ قامت تھیں چنانچہ ان کی صرف گردن ٹیڑھی ہوئی تھی۔ صرف کاجل تھی جو سکون و اطمینان کی تصویر بنی دیوار کے ساتھ کمر لگائے بیٹھی تھی۔ اس ماسٹر کی طرح جس نے سارا سال اپنے شاگرد کو دن رات محنت کرا کے اس یقین کامل کے ساتھ امتحان دینے بھیجا ہو کہ اس کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی اور یہ ناممکن ہے کہ اس کا ہونہار شاگرد فیل ہو کے اسے رسوا کرے۔

جب کلیم اندر آیا تو میں نے اسے گلے سے لگا لیا "تم تو بڑے چھپے رستم نکلے۔"

مگر اس نے بے رخی سے خود کو چھڑا لیا "تم بھی رستم ہے، ہم جانتا ہے۔"

پھر غالب کی ہمت نہ پڑی کہ اسے روکے اور عدالت میں اپنی شاندار پرفارمنس پر شاباشی دے۔ وہ سیدھا کاجل کے پاس گیا۔ کاجل نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ابھی کیوں روتا ہے دیدی؟ کیا ہم غلط بولا؟ غلطی کیا ہم کوئی؟ وہی بولا جو تم بولا۔" وہ کاجل کو منانے لگا۔

کاجل نے اسے بے تحاشا چوما "نہیں بیٹا! تم نے تو وہ کام کیا ہے جو کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ تم نے مجھے اور ہم سب کو بچا لیا۔"

"مگر میں نے جھوٹ بولا دیدی۔"

"نہیں بیٹے یہ جھوٹ میں نے بولا۔ اور ایسا جھوٹ گناہ نہیں ہوتا جو کسی بے گناہ کی جان بچائے۔ یہ تو ثواب ہی ثواب ہے۔ اگر عذاب بھی ہے تو مجھ پر کیونکہ میں نے تم سے کہا تھا۔"

میں غالب، رابعہ اور نازو اس کے پاس چپ چاپ کھڑے تھے۔ سرنگوں اور شرمسار۔ اس کے بار احسان سے دبے ہوئے۔ اس کی قربانیوں کا قرض پہلے ہی کم نہ تھا کہ ہم ادا کرتے۔

میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے کہا "تم نے کمال کر دیا کاجل۔ تم نے ثابت کر دیا کہ تم بہت عظیم ہو۔"

"ایسی باتیں مت کرو مجھ سے۔" وہ چلائی "میں ایک آبرو باختہ عورت ہوں۔ بے گھر اور لاوارث، ماں باپ کو چھوڑ کے فرار ہونے والی، ان کی بربادی کی ذمے دار۔ میں پاگل ہوں، سب جانتے ہیں۔"

وہ بُری طرح رو رہی تھی۔ اس کے ہسٹریا کا جن اس کے اعصاب پر سوار تھا اور اترنے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور اپنی ذات پر اعتماد سے محروم ہو چکی تھی۔ بہانا

بنا کے ایک سپاہی نے اور پھر جابر نے اس کے جسم کو پامال کر کے خود اپنی نظر میں بے آبرو کر دیا تھا۔ عام عورتوں کی طرح اس کا ذہن یہ ماننے پر تیار نہ تھا کہ اس کی قربانی عظیم تھی۔ عورت کے پاس تمام رکاوٹوں کے اندر وہی غرور ہوتا ہے جو وہ اپنی عزت کے بے داغ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر محسوس کرتی ہے۔ اسے اپنی رسوائی اور تذلیل کی وجہ پر ندامت کا احساس مارے ڈالتا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا سرعام نہیں ہوا تھا مگر سرعام کہا اور سنا گیا تھا۔ اسے خود بتانا پڑا تھا اور اپنی تذلیل خود کرنی پڑی تھی۔

رابعہ اور نازو نے اسے سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کسی کے قابو میں نہیں آئی، سوائے کلیم کے۔ جب وہ رونے لگا تو کاجل چپ ہو گئی۔ وہ کاجل کو دیدی کہنے لگا تھا جو بنگالی میں بڑی بہن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

"دیدی! ہم بھی مر جائے گا۔ ہم جھوٹ بولا تمہارے واسطے لیکن تم ہم سے خفا ہے۔ ہم بھاگ جائے گا، واپس چلا جائے گا۔"

اب کاجل اسے منانے لگی اور رونا دھونا سب بھول گئی۔ اسی وقت ہمیں ایک ساتھ طلب کر لیا گیا اور میں سمجھ گیا کہ جیوری نے اپنا فیصلہ مرتب کر لیا ہے۔ اعلان سے پہلے ہی مجھے فیصلے کا اندازہ تھا۔

بنگالی نے ہم پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا "کاجل اور اس کا بیٹا کدھر ہے؟"

میں نے تڑاک سے کہا "ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا جھوٹ بولنے سے ہاضمہ خراب ہو گیا ہے؟" بنگالی بولا۔

میں نے کہا "سور ذات تمہارے پیٹ میں اٹھ رہا ہے۔"

کیپٹن حمید نے گرج کے کہا "خاموش۔ میں اپنا فیصلہ بدل بھی سکتا ہوں۔ مجھے مجبور مت کرو کہ تم سب کو فائرنگ اسکواڈ کے سپرد کر دوں۔"

میں نے کہا "کیپٹن! کورٹ مارشل ہوتا ہے فوجیوں کا اور اگر ہم سب فوجی ہوتے تب بھی تم جیسے معمولی عہدے کے افسر کو یہ اختیار بھی حاصل نہیں کہ ہمیں جیل بھیج سکتا۔"

"اسٹاپ بارکنگ۔" کیپٹن حمید نے میز پر مکا مارا "میں باہر کو انڈر اریسٹ رکھوں گا۔ اسے سفارتی مراعات حاصل ہیں اس لیے وہ بھارتی سفارتخانے والے اس کے جرائم پر مزید کارروائی کریں گے۔ باقی سب کے لیے میرا حکم ہے کہ انہیں ایک ٹرک میں فوجی کانوائے کے ساتھ واپس بھیج دیا جائے اور وہاں پولیس پوسٹ پر قانون کے حوالے کر دیا جائے۔ ان کے تمام معاملات کی مکمل تفتیش قانون کے مطابق ہوگی۔"

"لیکن کیوں؟ ہمارا جرم کیا ہے؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"تمہارے پاسپورٹ جعلی ہیں۔ ان پر تمہارے نام غلط ہیں۔ ایک عورت کی تصویر بدلی گئی ہے۔ یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ تم سب کا آپس میں کوئی رشتہ ہے یا نہیں اور تمہارے دیگر کوائف کس حد

تک درست ہیں۔" کیپٹن حمید نے کہا "تم کو شام چھ بجے واپس جانا ہوگا۔ جابر کو ہم کل اس کی کار میں ڈھاکا بھیج دیں گے۔ کورٹ ڈسمس۔"

"کورٹ!" میں نے تلخ لہجے میں دہاڑ کے کہا "واٹ بلڈی کورٹ؟ کون مانتا ہے تمہاری اس عدالت کو اور اس کے فیصلے کو؟ ہاں تم اپنے جنگل کے قانون سے کام لیتے ہوئے ہم سب کو گولی بھی مار سکتے ہو مگر انصاف کا نام کیوں بدنام کرتے ہو۔ لالچی کتے ہو تم، بکے ہوئے ہو۔"

جب تک وہ اٹھ کر چلے نہیں گئے میں اسی طرح چیختا دہاڑتا رہا۔ جواب میں بنگالی نائب صوبیدار نے بھی بہت کچھ کہا جو میں نے نہیں سنا کیونکہ میں اپنا شور سن رہا تھا۔ اگر یہ کسی عدالت ہوتی تو میں توہین عدالت کا مرتکب قرار دیا جاتا اور میری سزا میں مزید سال چھ مہینے کا اضافہ ہو جاتا مگر اس رسمی قسم کی تحقیقات کرنے والے ایک کیپٹن افسر اور دو جے سی اوز پر مشتمل ٹریبونل کی کوئی قانونی حیثیت تھی ہی نہیں۔

مسلح محافظ ہمیں دھکیل کر واپس لے گئے اور شام تک کے لیے ہم سب کو ایک کمرے میں قید کر دیا گیا جو دس فٹ چوڑا اور بارہ فٹ لمبا تھا۔ اس میں پہلے دو چارپائیاں تھیں۔ ان کو ہٹا کے اب زمین پر دری بچھا دی گئی تھی۔ وہ کمرے سے میز کرسیاں وغیرہ بھی اٹھا کے لے گئے تھے۔ اس کمرے میں ایک کھڑکی پیچھے کی طرف

علم و حکمت پر ایک بے حد کارآمد کتاب
ٹیلی پیتھی اور مستقبل بینی
ایک کتاب جو آپ کو بدل سکتی ہیں
اپنا پیغام دوستوں کے ذہنوں تک پہنچانے اور ان کے دلوں کا حال جاننے کا سائنسی طریقہ
قیمت [illegible] روپے

www.paksociety.com

تھی مگر وہاں بھی دو فوجی پہرے پر متعین کیے گئے تھے۔ دو برآمدے کی طرف کھلنے والے دروازے پر مستعد کھڑے تھے اور دو ذرا آگے سیڑھیوں کے پاس۔

کاجل اور کلیم اب بھی ایک دوسرے کے ساتھ تھے لیکن ان کے جذباتی عدم توازن کا دورہ ختم ہو چکا تھا۔ رابعہ اور نازو حقیقت حال سے باخبر ہونے کے باوجود خوفزدہ اور الجھی الجھی تھیں۔

میں نے کہا "لیڈیز! اس مہلت کو غنیمت جانتے ہوئے ذہن کو تفکرات سے آزاد رکھیے۔ طعام کے بعد قیلولہ فرمائیے اور اٹھ کے رخصتِ سفر باندھیے۔"

"مگر اس سے پہلے تشریف رکھیے۔" غالب نے کہا۔

"تشریف رکھتا ہے تو کوئی صوفے یا قالین پر، کرسی پر یا کم سے کم چارپائی پر۔ اس غلیظ دری پر تو صرف بیٹھ سکتا ہے۔" نازو نے کہا۔

"دری غلیظ ہے تو ہٹا دو۔ فرش صاف ہے۔" غالب نے کہا۔

رابعہ نے کہا "کیا یہ لوگ واقعی ہمیں واپس بھیج رہے ہیں؟"

غالب نے کہا "معاف کرنا آنٹی! آپ کا سوال اتنا احمقانہ ہے کہ اس کا جواب دینا بھی حماقت ہوگا۔"

"تم سے کس نے کہا ہے بک بک کرنے کو۔" رابعہ بگڑ گئی۔

میں نے کہا "وکیل صاحب! ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں۔ آپ جانتے بوجھتے ایسا مایوسی پھیلانے والا اور قنوطیت پسند رویہ کیوں اپنا رہی ہیں؟ کیپٹن حیدر بتا چکا تھا کہ یہ ڈراما ہوگا۔"

"مجھے یہ ڈراما حد سے زیادہ حقیقی نظر آتا ہے۔"

"یہ تو ڈرامے کی کامیابی کا ثبوت ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ تو اس وقت بھی یہی فرمائیں گے جب وہ ہمیں ٹرک میں لوڈ کر کے ٹیک نوڈی پولیس کر دیں گے۔" غالب نے کہا۔ "فرض کرو حیدر کی رائے بدل گئی یا اس کا دماغ چل گیا۔۔۔"

"ابھی تو تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" نازو بولی۔

"دماغ چل گیا ہے، دل چلا گیا ہے۔" غالب ٹھنڈی سانس لے کر بولا "بائی بچائے مرزا غالب کا یہ بڑھاپا۔"

"تو جیتوں جیتوں کرنے والا۔" نازو نے لقمہ دیا۔

"تمہارے پاس پانچ گھنٹے ہیں۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا "کیا ہم یہ وقت رونے دھونے، سونے اور کھانے میں گزار دیں گے؟"

"پہلے دو کام تمہارے اور رابعہ کے لیے۔ باقی دو میں اور نازو کر لیں گے۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "کاجل! کچھ تم بھی بولو۔ نہیں تو تم نے بولنے نہیں دیا۔"

وہ اداسی سے مسکرائی "کیا بولوں، بولنے سے کیا ہوگا؟"

"بولنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ ویسے بھی تم ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہو۔" غالب نے کہا اور پھر نازو کی طرف دیکھ کر بولا "تم تو خیر مجھے ہر حال میں اچھی لگتی ہو۔ اس لیے ڈونٹ مائنڈ۔"

دو فوجی مارچ کرتے اندر آئے اور بڑے بڑے تھال ہمارے درمیان رکھ کر لوٹ گئے۔ ایک تھال میں بھاپ دیتے ہوئے چاول تھے اور دوسرے میں گوشت کے بڑے بڑے اشتہا انگیز خوشبو والے بھنے ہوئے ٹکڑے۔ ان میں سب سے چھوٹا ٹکڑا بھی آدھا سیر کا تھا۔

میں اور غالب فوراً بیٹھ گئے "یہ غالباً یہاں کی اسپیشل ڈش ہے۔ کباب دوست۔"

غالب نے گوشت کا ایک ٹکڑا چکھتے ہوئے اعلان کیا "یہ کباب نہیں ہے۔"

"تو پہاڑی بکرا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"یہ ہرن ہے یا نیل گائے۔" غالب نے کہا۔

"یا ہمالیہ کا برفانی ریچھ یا آسٹریلیا کا کنگارو۔" نازو نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا "تم ایسے کہاں کے ماہر شکاری ہو گئے کہ گوشت کے ذائقے سے جانور کو پہچان لیا۔"

غالب نے سرد آہ بھر کے کہا "ہم نے تو تمہیں بھی ایسے ہی پہچان لیا تھا۔"

میں نے کہا "کیا مطلب؟ بات گوشت کے ذائقے کی ہو رہی تھی۔"

نازو نے جھینپ کے کہا "بات کو ایسا موڑتے ہو تم۔"

"جیسے تم نے میری زندگی کا رخ موڑا۔ یا بقول فلمی شاعر:

ایک ہی انکل تھے میرے ان کو ماما کر دیا
پیٹ تھا سر پر میرے اس کو عمامہ کر دیا
خود ہوئیں جامے سے باہر اور کہا فیشن ہے یہ
میری اک پتلون تھی اس کو پاجامہ کر دیا

ہم سب کی ایک دم ہنسی چھوٹی۔ ہمارے قہقہے سن کے دونوں محافظوں نے اندر جھانکا اور کچھ حیران ہوئے کہ ہم اتنے پُرلطف کھانے کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں جو بطور آخری طعام ہمارے لیے کپتان صاحب کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ انہوں نے فرض کر لیا ہوگا کہ ہم سب پاگل ہو چکے ہیں۔

نازو نے ہنستے ہنستے آنسو پونچھے "یہ کہاں سے یاد آ گیا تمہیں؟"

غالب تعظیم بجا لا کے بولا "فی البدیہہ عرض کیا ہے، ابھی ابھی۔"

میں نے کہا "بکواس مت کرو۔ یہ اکبر الہ آبادی کا قطعہ ہے۔"

"اکبر الہ آبادی کیا، کسی بھی شاعر کا ہو یہ میرے سوا تو نکالو شرط۔ سال دو سال جب تک چاہو تصدیق کرو اور ہار جاؤ تو میرے پاس آ کے بیعت کر لینا میرے ہاتھ پر۔" غالب نے کہا۔

"گویا تم واقعی شاعر ہو؟" نازو نے کہا۔

"بابا گھر کی مرغی ہوں، اڑا لو میرا مذاق۔ میں فطری عاجزی اور طبعی انکساری کے باعث کچھ کہتا نہیں ورنہ کہاں میں کہاں

غالب!"

اس کی بات کے دونوں مطلب نکالے جا سکتے تھے۔ وہ مرزا غالب کو عرش قرار دے رہا تھا اور خود کو فرش یا پھر اس کے برعکس۔ تاہم مجھے پتہ یقین آنے لگا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ ممکن ہے فی البدیہہ اس نے نہ کہا ہو، پہلے کبھی طبع آزمائی کی ہو مگر اس وقت دو اشعار نے وہ کام کیا جو درجن لطیفے بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے ایک دم سب کا موڈ بدل دیا، یہاں تک کہ کاجل بھی مسکرانے لگی اور کلیم جو کچھ نہیں سمجھا تھا، کاجل کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔ نہ جانے کیوں اس نے اپنے آپ کو اس حد تک کاجل سے وابستہ کر لیا تھا کہ اسے روتے دیکھ کر وہ رونے لگتا تھا اور اس کے ہونٹوں کی ہنسی پر خود بھی ہنستا تھا۔ یہی کیفیت کاجل کی تھی۔ عورت کے وجود میں ممتا کی جڑیں بہت گہری ہیں، وہ ایک سائبان کی طرح کلیم پر سایہ فگن تھی اور کاجل اسے اپنی ذات کی پناہ فراہم کر رہی تھی۔ اسے ماں بننے کا کوئی تجربہ نہ تھا مگر شاید اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جب دو اردلی کھانے کے برتن اٹھا کر لے گئے تو میں اور غالب ایک طرف لیٹ گئے۔ رابعہ، نازو اور کاجل کچھ فاصلے پر دراز ہو گئیں اور کچھ دیر بعد سو بھی گئیں۔ میں اور غالب اپنے اپنے خیالات میں گم تھے اور سونے کی کوشش میں کامیاب ہونے والے تھے کہ کھڑکی میں پل بھر کے لیے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ ہم ایک ساتھ اٹھ بیٹھے۔ وہ کسی فوجی کا مونچھوں والا کرخت چہرہ تھا جو پل بھر کے لیے نظر آیا، پھر اس نے کوئی چیز کھڑکی میں رکھی اور غائب ہو گیا۔

میرے ذہن میں آنے والا سب سے پہلا خیال یہ تھا کہ وہ ٹائم بم یا دستی بم ہے اور مونچھوں والا اسے پن نکال کے رکھ گیا ہے۔ دستی بم پن نکالنے کے بعد پانچ سیکنڈ میں پھٹ جاتے ہیں۔ اتنے کم وقت میں سب کو جگانا، خطرے سے خبردار کرنا اور ان کو محفوظ رکھنے کے لیے اس جگہ سے منتقل کرنا ناممکن تھا چنانچہ ایک ہی خیال کے تحت میں اور غالب ایک سیکنڈ میں کھڑکی تک جا پہنچے کہ وہ دستی بم ہو تو اسے پھٹنے سے پہلے باہر اچھال دیں۔ اس وقت مجھے قطعی علم نہ تھا کہ وہ دستی بم ہے تو اس کی پن کو کھلے ہوئے تین سیکنڈ گزر چکے ہیں چار اور وہ میرے ہاتھ لگاتے ہی پھٹ گیا تو کیا ہوگا۔

لیکن وہ دستی بم نہیں تھا۔ عین وقت پر میں نے اسے دیکھ لیا اور اٹھاتے ہوئے اس کے بہت کم وزن نے میرا ہاتھ روک لیا۔ دستی بم ایسے ہلکے نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ شکل سے بھی وہ گیند نہیں بلکہ واکی ٹاکی لگتا تھا۔ میں نے اسے پلٹ کے دیکھا تو مجھے اسپیکر، ڈائل اور آن آف کرنے والا سوئچ نظر آئے۔

غالب باہر دیکھ رہا تھا اور آگے جھک کر اس شخص کو تلاش کر رہا تھا جو یہ تحفہ چھوڑ کے غائب ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "مرزا! یہ تو فرشتہ اجل کا تحفہ نہیں ہے۔"

"لیکن وہ تھا کون؟ کس نے بھیجا تھا اسے؟ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"وہ کوئی بھوت تھا۔" میں نے کہا۔

"یعنی میرا شبہ صحیح، اس کی مونچھیں نہیں تھیں۔" غالب بولا۔

نازو بھی شاید ابھی سوئی نہیں تھی چنانچہ ہماری گفتگو سن کر وہ بھی اٹھ کے آ گئی تھی مگر اس نے غالب کی بات کو سنا ہی نہیں۔

"کہیں یہ خفیہ قسم کا بم نہ ہو۔" نازو بولی۔

"یہ خفیہ بم ہے تو تمہیں کیسے نظر آ رہا ہے؟" غالب نے سوال کیا "اور یہاں کون دے خفیہ بم دھر گیا ہے؟"

"میرا مطلب تھا، واکی ٹاکی جیسا۔ کھلونا بم کے اندر بم فٹ کر دیا گیا ہو۔ آن کرتے ہی پھٹ جائے۔" نازو نے اکڑ کے کہا۔

میں نے اس کا معائنہ کرتے ہوئے کہا "میں اس امکان کو ذہن میں رکھتے ہوئے بھی یہ خطرہ مول لوں گا۔"

"گویا خودکشی جاگتی ہوش و حواس۔" غالب نے کہا "کیا اس کے لیے آپ مجھے اور مسماۃ نازو کو اتنی مہلت دیں گے کہ ہم اس کھڑکی سے کود کے فرار ہو جائیں اور کم سے کم پچاس گز دور چلے جائیں؟ آخر کوئی تو باقی رہنا چاہیے جو لواحقین کا رول کر سکے۔"

میں نے اسے آن کر دیا۔ "یہ اجتماعی خودکشی ہوگی۔ لواحقین سمیت۔"

ٹیلی فون ریسیور جیسے اس آلے میں سے ہلکی سی سرسراہٹ

www.paksociety.com

سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اسے کان سے لگایا مگر اور کوئی آواز نہ سن سکا۔ پھر نازو نے ریسیور لے لیا اور بولی "مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیتا۔"

غالب ہنس پڑا "مجھے وہ مشہور لطیفہ یاد آ رہا ہے۔"

میں نے کہا "ہم نے نہیں سنا ہے۔"

"مگر میں پھر سناؤں گا۔ ایک پاگل آدھے گھنٹے سے دیوار کے ساتھ کان لگائے بیٹھا تھا۔ ایک وارڈن اُدھر سے گزرا تو وہ بھی پاس بیٹھ گیا اور کچھ دیر بعد بولا کہ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیتا۔ پاگل نے افسوس سے سر ہلا کے کہا کہ بے وقوف کے بچے جب آدھے گھنٹے سے مجھے کچھ سنائی نہیں دیا تو پانچ منٹ میں تجھے کیا سنائی دے گا۔ لاؤ یہ چیز مجھے دو۔"

"کیا تم وارڈن ہو؟" نازو نے کہا۔

"بھئی یہ عین ممکن ہے تم دونوں کی سماعت متاثر ہو چکی ہو مگر تمہیں پتا نہ ہو۔" غالب نے ریسیور کان سے لگا لیا "بالکل ٹھیک۔ تم لوگ تو واقعی بہرے ہو۔"

میں نے اسے مذاق سمجھا "کس کی آواز سن رہے ہو؟ کسی بھوت کی؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "میرے سسر محترم ڈائریکٹ بات کر رہے ہیں۔ وائرلیس اور ٹیلی فون غیر محفوظ 'شیطانی آلے' ہیں۔"

بات کرتے کرتے وہ ایک دم سیریس ہو گیا اور پھر ریسیور اس نے مجھے تھما دیا۔ اس میں کوئی بہت آہستہ سرگوشی میں بول رہا تھا۔

"ہیلو ہیلو' زوبی ریڈی؟"

میں نے کہا "آئی ریڈی۔ کون ہو تم؟"

"تمہارا دوست۔ وقت کم ہے اس لیے جو میں کہہ رہا ہوں وہ غور سے سنو۔" اس نے کہا "تمہارا سب اسلحہ ضبط کر لیا گیا ہے۔ وہ بھی جو تم نے کار میں چھپایا تھا۔"

"یہ کوئی نئی اطلاع نہیں۔"

"تمہیں شام چھ بجے ایک ٹرک واپس لے جائے گا۔ اس میں حفاظت کے لیے پانچ آدمی ہوں گے۔ ڈرائیور سمیت چھ۔ ایک آگے بیٹھے گا۔ چار تمہارے ساتھ پیچھے ہوں گے۔ ان کے پاس خودکار ہتھیار ہوں گے۔"

"ہم ان سے نمٹ لیں گے۔ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔"

"تیغ اور آٹومیٹک رائفل میں بہت فرق ہوتا ہے۔" وہ ہنسا اور میں نے فوراً پہچان لیا کہ وہ درپردہ ہماری مدد کرنے والا کیپٹن حمید تھا۔

"پھر ہم شہادت کا درجہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔" میں نے کہا۔

"میں نے کچھ انتظام کیا ہے۔" اس نے کہا "ٹرک کے پیچھے والے ٹائر کے اوپر مڈگارڈ کے نیچے ایک ریوالور موجود ہے۔"

"کون سے ٹائر کے اوپر؟ رائٹ یا لیفٹ؟"

"ڈرائیور سائیڈ۔" وہ بولا "ریوالور ایک پلاسٹک بیگ میں لپٹا ہوا ہے اور اونچی کیرانائٹ کے ساتھ باندھا گیا ہے۔"

میں نے کہا "بڑی مشکل جگہ ہے۔ میں وہاں کیسے پہنچ سکتا ہوں؟ تمہیں کوئی آسان جگہ نظر نہیں آئی تھی؟"

"آسان جگہ پر دوسرے بھی دیکھ لیتے۔"

"مگر اب میں اسے حاصل کرنے کے لیے ٹرک کے نیچے کیسے گھسوں گا؟"

"یہاں سے دس میل کے بعد ایک موڑ آئے گا۔ وہاں ٹرک کا ٹائر فلیٹ ہو جائے گا۔ کم سے کم ایک۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا تم علم غیب بھی رکھتے ہو؟"

وہ پھر ہنسا "میں پکا بندوبست رکھتا ہوں۔ یہ انتظام بھی میں نے کیا ہے کہ موڑ کاٹتے وقت بائیں جانب کا ایک ٹائر پنکچر ہو جائے۔ بائیں طرف پہاڑ ہوگا' دائیں طرف کھائی۔"

میں نے کہا "اگر اگلا ٹائر برسٹ ہو گیا تو ٹرک بے قابو ہو جائے گا اور ہم جائیں گے سیدھے کھائی میں۔"

اس نے کہا "ٹائر نئے ہیں' برسٹ نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ ملٹری کے ٹرک اس علاقے میں حدِ رفتار سے نہیں بڑھ سکتے۔ یہ رفتار پندرہ سے بیس میل ہوتی ہے۔ یعنی زیادہ سے زیادہ بیس میل فی گھنٹا۔ تم روانگی کے آدھے گھنٹے بعد توقع کر سکتے ہو کہ ٹرک دس پندرہ منٹ کے لیے رکنے والا ہے۔ ٹائر بدلنے میں اتنا ہی وقت لگے گا۔ تم اس مہلت سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔"

"وہ کیسے؟ کیا میں محافظوں سے درخواست کروں کہ مجھے ٹرک کے نیچے گھسنے کی اجازت دیں؟ یا خود ریوالور نکال دیں تو بڑی مہربانی۔"

"تم حوائج ضروریہ سے بے نیاز تو نہیں ہو۔ اچانک کسی کو اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تو آنسر دی کال آف نیچر۔"

"بجا ارشاد۔ مگر کیا محافظ اتنے احمق ہیں کہ میرے سر پہ بندوق تانے نہیں کھڑے رہیں گے؟"

وہ بولا "تمہارے ساتھ خواتین بھی ہیں۔ ان میں سے ایک تو مونث ہے۔"

میں نے کہا "وہ سب مونث ہیں....."

"میرا مطلب تھا بے تیغ لڑنے والی۔ دوسری کا اسلحہ ہے اس کی ذہانت۔ اس نے آج استغاثہ کے سب سے اہم گواہ ایک بچے کے ہاتھوں جرح کرنے والوں کی ایسی تیسی کرا دی۔ ایسا سبق پڑھایا تھا اسے....."

"تمہاری مراد کاجل سے ہے؟"

"اس کا نام بھی خوب ہے' آنکھوں کی مناسبت سے۔ فرصت ہوتی یا موقع ملتا تو میں اس پر فریفتہ ہو جاتا۔ بعد میں اسے بتا دینا کہ اس کا ایک غائبانہ عاشق میں بھی تھا۔ نازو اور کاجل بہت کچھ

کر سکتی ہیں۔"

میں نے کہا "محترم عاشق صاحب! آپ تیسری خاتون کو نظر انداز کر کے میرے جذبات کو مجروح کر رہے ہیں۔ کیا وہ بے وقوف ہے؟"

"دراصل..... اس نے کوئی عقلمندی کی بات نہیں کی میرے سامنے..... اور ہے بھی ذرا ایسی ہی۔ معصوم سی' بھولی بھالی سی۔ بلاشبہ وہ سب سے حسین ہے مگر۔"

"تھینک یو۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ بہت قابل اور کامیاب وکیل بھی ہے۔ بیرسٹر ہے۔"

"ہے نہیں' تھی کہو۔ یہاں تو عدالت میں اس کی آواز بھی نہیں نکلی۔"

"وہ عدالت عالیہ کی وکیل ہے اور یہ تو قبائلی جرگہ بھی نہیں تھا۔" میں نے خفگی سے کہا "تم نے مزید مجروح کیا ہے میرے جذبات کو۔"

وہ ہنسنے لگا "کہیں زخموں کی تاب نہ لا کے تمہارے جذبات دم نہ توڑ دیں۔"

"اس سے پہلے میں یہ کیوا سی آلہ توڑ دوں گا..... تمہارا سر توڑ دوں گا۔"

"کیا وہ بھی تمہیں اتنا ہی چاہتی ہے؟"

"میں اس کی طرف سے بیانِ حلفی داخل کر سکتا ہوں۔"

"معاف کرنا' پھر تو مجھے شبہ ہے اس کی ذہانت میں۔ خیر..... میں نے کہا تھا کہ وقت کم ہے اور خود بھول گیا۔"

"وقت کی کمی کے باعث میں نے تمہاری گستاخی کو معاف کیا۔"

"جیسے ہی ٹرک رکے' مس کاجل کی طرف سے درخواست کی جائے کہ وہ اشد ضرورت محسوس کرتی ہے۔"

"تو آنسر دی کال آف نیچر۔"

"رائٹ۔ سپاہی تمہارے سر پر تو بندوق لے کر کھڑے ہو سکتے ہیں مگر عورت کے معاملے میں تم عزت اور غیرت کے مشتعل جذبات کا مظاہرہ کرو گے تو وہ دور کھڑا ہو جائے گا جہاں سے وہ براہِ راست کاجل کو نہ دیکھ سکتا ہو۔ زیادہ بے وقوف ہوا تو پیٹھ پھیر کے کھڑا ہو جائے گا۔ وہاں کوئی درخت یا جھاڑی ہے تو بلندی پر۔ ظاہر ہے کوئی عورت اوپر چڑھ کے نہیں بیٹھ سکتی اور فرار بھی نہیں ہو سکتی۔ آگے پیچھے کھلی سڑک ہے۔ ٹرک کی اوٹ میں رہتے ہوئے اس کا نیچے گھس جانا اور ریوالور نکال لینا عین ممکن ہے۔ وہیں ڈرائیور بھی ٹائر بدل رہا ہوگا لیکن اس کی ساری توجہ ٹرک کو جیک سے اوپر اٹھانے یا نٹ بولٹ کھولنے پر ہوگی۔ ویسے بھی اس وقت تک اندھیرا ہو جائے گا اور ٹرک کے نیچے اسے کوئی نقل و حرکت محسوس نہیں ہوگی' بشرطیکہ اس میں احتیاط کی جائے اور کوئی غیر متوقع حادثہ نہ ہو مثلاً اسے اچانک چھینک نہ آئے' اس کا سر اوپر کسی چیز سے نہ ٹکرائے اور وہ "اوئی" کی آواز نہ نکالے' ہائے اللہ وغیرہ نہ کہے۔"

"نہیں کہے گی۔" میں نے اسے یقین دلایا "البتہ چھینک نہ آنے کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ عشق اور مشک کی طرح اسے بھی چھپایا نہیں جا سکتا۔ خیر فرض کرو اس نے ریوالور حاصل کر لیا۔ اس کے بعد؟"

"پھر کیا۔ سب سے پہلے تو گولی مار دے ڈرائیور کو۔ اس ٹیم میں وہ اکلوتا ڈرائیور ہے۔ پھر اس محافظ کو جس نے اسے نیچے گھسنے کی اجازت دی تھی۔"

میں نے کہا "وار پلان تو ہم بنا لیں گے مگر پہلے ایک اور سوال کی وضاحت ضروری ہے۔"

"جلدی سے پوچھ لو' مجھے جانا ہے۔"

"کیا تم یہ اسلحہ ہم تک اسی طرح نہیں پہنچا سکتے' جیسے یہ آلۂ گفت و شنید پہنچایا تھا؟ وہ مونچھوں والا تو چیلا ہی تھا۔"

"تمہیں ٹرک پر سوار کرانے سے پہلے تلاشی ہوگی۔ دستور کے مطابق اس وقت تمہاری جیب سے پن بھی برآمد کر لی جائے گی۔"

"کیا تم تلاشی نہیں لے سکتے؟ یا کسی ایسے شخص کو اس فرض پر مامور نہیں کر سکتے جو ہماری جیب میں توپ بھی دیکھے تو نظر انداز کر دے؟"

"نہیں۔ جو میں نے کیا ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔" کیپٹن حمید نے کہا "تمہیں اندازہ نہیں کہ میری پوزیشن کتنی نازک ہے۔ تمہارے دشمن پہلے ہی بہت جھلائے ہوئے ہیں کیونکہ میں نے اس کیس میں ساری کارروائی عین قانون کے مطابق کی' جو میں ہمیشہ نہیں کرتا۔ اور اس طرح تم سب کو مارے جانے سے بچا لیا ورنہ وہ بہت مشتعل تھے۔ تم نے ادیب کی تھی اور ایک قتل کر دیا تھا۔ مرنے والا انہی کا ساتھی تھا۔ تمہیں کیفرِ کردار تک پہنچانے کی کارروائی وہ خود کرنا چاہتے تھے مگر اس لیے بھی نہ کر سکتے تھے کہ تم انڈین پاسپورٹس پر سفر کر رہے تھے اور پاسپورٹ جعلی نہیں تھے۔"

"مگر ہمارے نام تو غلط لکھے ہوئے تھے۔"

"وہ ایک گمنام فون کال تھی۔ اسے معتبر نہیں سمجھا جا سکتا اور اسے بنیاد بنا کے قطعی فیصلہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے سب کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ وہ اس اطلاع پر بھروسا نہ کریں۔ عین ممکن ہے کسی نے دشمنی میں بھی فون کر دیا ہو اور پاسپورٹ کے اندراجات درست ہوں۔ اس کے بعد میں نے تمام معاملات تمہارے دشمنوں کے سپرد کر دیے ہیں۔ محافظوں کا انتخاب بھی خود انہوں نے کیا ہے اور وہ بنگالی نائب صوبیدار کی کمان میں ہوں گے۔"

"گویا یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا خفیہ منصوبہ ہمیں راستے میں ہی ٹھکانے لگانے کا ہو؟" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"بالکل ٹھیک سمجھے تم۔ قیدیوں پر فراری کی کوشش کا الزام عائد کر کے انھیں گولی مارنا بہت آسان کام ہے۔"

"اور یہ نیک کام انھوں نے نازفیئٹ ہونے سے پہلے ہی کر لیا پھر؟"

"نہیں۔ وہ جلدی نہیں کریں گے۔ پوری رات کا سفر ہو گا تو وہ اس کے لیے آدھی رات کے بعد کا وقت بہتر سمجھیں گے' جب ٹریفک بالکل نہیں ہوتی۔ بنگالی نائب صوبیدار آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہو گا اور جب نازبدلا جائے گا تب بھی بیٹھا ہی رہے گا مگر کاجل کی درخواست منظوری کے لیے اسی کے سامنے پیش ہو گی۔ اس وقت وہ ضرور اترے گا اور کاجل' ڈرائیور کو گولی مارنے کے بعد اسے بر قبال بنالے تو۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "تمھارا پلان اچھا ہے لیکن ہم موقع محل اور صورت حال کے مطابق رد و بدل کر لیں گے۔ ایک ریوالور بہت ہے' باقی ہماری ہمت اور ہماری قسمت۔ ٹھیک ہے دیری بچے۔ خدا کرے یہ آخری احسان کا قرض ہو۔ اب تک نہ جانے ہم کتنے لوگوں کے مقروض ہو چکے ہیں۔"

"مجھے قرض خواہوں میں مت شامل کرو۔ قرض میں سے ایک نقطہ کم کر کے فرض کر لو۔"

"کیا تمھارا یہ فرض تھا؟"

"اچھا ایک نقطہ اور کم کر لو۔ قرض نہیں یہ مرض تھا۔ جذباتی عارضہ' جیسے تمھیں لاحق ہے۔ اس میں مریض کی عقل کے پرزے معطل ہو جاتے ہیں۔"

اس کی بات اچانک ختم ہو گئی۔ ریسیور میں صرف سرسراہٹ رہ گئی۔ "یہ کیا ہوا؟" میں نے تشویش سے کہا۔

پہلے غالب اور نازو بالکل خاموش کھڑے ریسیور کی وہ آواز سننے کی ناکام کوشش کرتے رہے تھے جو براہ راست میرے کان میں داخل ہو رہی تھی۔ یہ آواز اتنی کم تھی کہ خود میں بڑی مشکل سے سن رہا تھا۔ پھر غالب اور نازو نے میری یکطرفہ باتوں سے ساری گفتگو کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

غالب نے ریسیور لے کر کان سے لگایا اور فرمایا "کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ یہ پہلے کی طرح خاموش ہے۔"

"پھر کیا سکندر کو کچھ ہو گیا ہے؟" نازو نے کہا "یہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔"

غالب نے ٹھنڈی سانس لی "ہاں' سکندر کو بھی وہی ہوا ہے جو مجھے۔ میں بھی اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔ کہو تو اقتباس سناؤں۔"

"رہنے دو' مجھے معلوم ہے۔" نازو نے ناک بھوں چڑھا کے کہا اور ریسیور لے لیا۔

"اچھا تو پھر تم سناؤ۔" غالب بولا "اگر ہمت ہے۔"

"ہمت کی کیا بات ہے؟"

"ہمت کی بات تو ہے۔ خود میں وہ سب نہیں دہرا سکتا کسی کے سامنے تو تم کیا سناؤ گی۔ اتنی بے شرم تو نہیں ہو تم۔"

جھلا کے میں نے کہا "یار کچھ نہیں بعد میں بتاتا۔"

غالب نے مسکرا کے نازو کو دیکھا "کیوں ٹھیک ہے نازو؟ سکندر کی بات کو ٹالا تو نہیں جا سکتا۔ بعد میں کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"تم اپنی چونچ بند کرنے ہو یا نہیں!" نازو اسے پکڑنے کے لیے لپکی مگر وہ بھاگ گیا۔ اس ہنگامے سے پہلے ہی رابعہ اور کاجل اٹھ گئی تھیں۔ وہ رابعہ کے پاس بڑے مؤدبانہ انداز میں جا بیٹھا۔ نازو کی پیش قدمی خود بخود رک گئی۔

اب میں نے آواز آہستہ رکھتے ہوئے کیپٹن حمید سے ہونے والی تمام گفتگو سب کے سامنے دہرائی۔ وائرلیس ریسیور اس وقت آف تھا۔

کاجل نے یہ ذمے داری قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ "مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے تمھارا سارا پلان فیل ہو جائے۔"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"ابھی تک مجھے کیپٹن حمید کے پیش کردہ منصوبے میں کسی خامی کا احساس نہیں ہوا۔ اگر ہر کام اس کے مطابق ٹھیک وقت پر ہوتا رہا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں بہت سی وجوہات گنوا سکتا ہوں۔" غالب نے کہا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا "گنواؤ۔"

"کیا یہ ناممکن ہے کہ حمید کو ریوالور چھپانے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے؟ اس کی بھی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ریوالور جھٹکوں سے راستے ہی میں گر جائے یا خراب ہو جائے' عین وقت پر فائر نہ کرے۔ یا ہم سے پہلے ہی کوئی اس کی موجودگی کا پتا چلا لے یا وہ خبیث بنگالی' رابعہ کو اجازت ہی نہ دے اترنے کی۔ رابعہ کی جگہ نازو کو رکھو۔"

"اس سے یہ وجوہات ختم ہو جائیں گی؟" میں نے کہا۔

"کم ہو جائیں گی۔ وہ موجب ہے بقول کیپٹن حمید۔ ریوالور نہ ملا یا گولی نہ چلی تب بھی اس کے ہاتھ پیر تو چلیں گے۔" غالب نے کہا۔

رابعہ کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے اترا "ہاں یہ تو ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ہم ایک فیصد ناکامی کے اسباب کو ننانوے فیصد کامیابی کے خیال پر ترجیح نہیں دے سکتے۔ رابعہ ہی کرے گی یہ کام۔ کیپٹن حمید نے کہا تھا کہ وہ ایسا بندوبست کرتا ہے ریوالور کے گر جانے' کسی کی نظر میں آنے یا کام نہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"چلو فرض کر لو کہ ہمارا یہ آپریشن کامیاب ہو گیا تب ہم کوئی بھی موزوں نام دے سکتے ہیں۔ آپریشن کال اقتداری تجویز" غالب

www.paksociety.com

نے کہا۔

سب کے ہونٹوں پر ہنسی آ گئی "اچھا نام ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد کیا ہو گا واپسی؟"

"ظاہر ہے" میں نے کہا "اب تم پوچھو گے کیسے؟"

"نہیں۔ یہ احمقانہ سوال ہے۔ نازو کرے گی۔"

نازو نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا "مجھے معلوم ہے ہم اسی ٹرک میں لوٹیں گے ہمارے قبضے میں آٹومیٹک فوجی رائفلیں ہوں گی اور جسم پر فوجی وردیاں۔ اس چوکی پر ہمیں روکنے کی کوشش کوئی نہیں کرے گا۔ جب ہم سیدھے گزرتے چلے جائیں گے تو انہیں ہوش آئے گا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ پھر وہ تعاقب میں دوڑیں گے لیکن ہم سب کو بھون کے رکھ دیں گے۔ اس سے پہلے کہ مزید کمک آئے اور دشمن زیادہ قوت کے ساتھ دوسری کوشش کرے ہم سرحد پار کر چکے ہوں گے۔ سرحد یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

میں نے بے اختیار تالی بجا کے کہا "اس وقت تو تم نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کو ناقص العقل سمجھنے والا خود عقل نہیں رکھتا۔ کیا مکمل منصوبہ بیان کیا ہے۔ بالکل وہی جو میرے ذہن میں تھا۔ جی تو چاہتا ہے کہ ذہانت کے اس مظاہرے پر تمہارا... خیر چھوڑو۔"

نازو کا رنگ لال ہو گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ نامکمل جملے کا باقی حصہ کیا ہو گا "منہ چوم لوں" یہی کہنا باقی رہ گیا تھا جو محاورے کی رو سے غلط نہ ہوتا مگر اس سے بڑی خانہ جنگی پھیل جاتی۔ رابعہ الگ ناراض ہوتی۔ غالب ہنگامہ کرتا اور نازو شور مچاتی۔ اب بات ہنسی میں ٹل گئی۔

رابعہ نے کہا "ابھی ڈر گئے؟"

"آگے بول کے تو دیکھے۔ ابھی ایم آر ایس قیادت سے محروم ہو جائے گی۔ نیا لیڈر آ جائے گا۔" غالب نے آستین چڑھائی۔

"بابا میں نے کچھ کہا ہے؟ میں تو کہنا چاہتا تھا کہ تمہارا نام چاند بی بی اور رضیہ سلطانہ کو ملا کے سی بی آر سلطانہ رکھ دوں۔ بہادری، حسن اور ذہانت کا مرکب اور بالکل الٹرا ماڈرن نام۔" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "رکھ دو، مجھے کیا۔ سینٹرل بورڈ آف ریونیو سلطانہ کہیں گے لوگ۔ سی بی آر اسی کا مخفف ہے۔"

سونے کا وقت نہیں رہا تھا۔ ہنسی مذاق میں کاجل شریک نہیں تھی۔ وہ گم صم بیٹھی تھی اور کبھی مسکرا دیتی تھی لیکن اسے نہ چھیڑنا ہی بہتر تھا۔ کسی خوابیدہ آتش فشاں کی طرح اس کے وجود میں جذبات کا خاکستر کر دینے والا لاوا پک رہا تھا۔ اس کے غم کا مداوا کسی کے پاس نہیں تھا۔ زخم تازہ تھے اور ابھی اس نے ہماری طرح مزاج کا خوگر ہونا نہیں سیکھا تھا۔ اس کا علاج وقت کر سکتا تھا اور یہ سفاک مسیحا ہمارے قبضے میں نہ تھا۔ وہ سوچوں اور یادوں میں گم ہو جاتی تھی تو اس کا چہرہ تاریک نظر آتا تھا۔ اسے اپنے ساتھ ہونے والے جبر کا خیال آتا تھا تو اس کی آنکھوں کی ویرانی بڑھ جاتی تھی اور اسے معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ کب آنسو ٹپک گئے۔ وہ نظر بچا کے آنسو پونچھ لیتی تھی اور ہماری کسی بات پر مسکرانے لگتی تھی۔ اس کی ساری توجہ سوتے ہوئے کلیم اللہ پر تھی۔ وہ بار بار محبت سے اس کے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی تھی اور اسے تھپکنے لگتی تھی۔ ایک بار مجھے یہ خیال بھی آیا کہ پاکستان پہنچنے کے بعد جب آخر کار ہم کلیم کو اس کے آبائی گاؤں لے جائیں گے اور اس کی پھوپی کے حوالے کریں گے تو کاجل اچانک ان جذباتی رشتوں سے کیسے لاتعلق ہو گی جو زیادہ سے زیادہ استوار ہوتے جا رہے تھے۔

شام کو غالباً کیپٹن حمید کی مہربانی سے چائے ارسال کی گئی۔ فوجی میس کی ریڈی میڈ چائے تو ہم کئی بار پی چکے تھے یہ باقاعدہ چائے تھی یعنی پتی الگ اور دودھ الگ۔ اس کے ساتھ دو چھوٹی پلیٹوں میں اخروٹ کی گری تھی جس نے چائے کے ساتھ بڑا مزہ دیا۔ یہ قدرت کا تحفہ اس علاقے میں بہ افراط تھا۔

ٹھیک پونے چھ بجے بنگالی نائب صوبیدار بڑے کروفر کے ساتھ نمودار ہوا اور اس نے ہمیں حکم دیا "ایک لائن میں ہو جاؤ اور اپنے ہاتھ اٹھا لو۔"

غالب نے کہا "کون سا ہاتھ، دایاں یا بایاں؟"

اس نے خونی نظروں سے غالب کو دیکھا "دونوں۔"

میں نے کہا "وہ لائن کہاں ہے جس پر ہمیں چلنا ہے؟ ایک لائن پر کوئی گاڑی چلتی ہے؟"

اس نے چیخ کے مجھے گالی دی "یو بلڈی ڈاگ۔ سن آف اے... جو کہا تم چاہتے ہو کہ..."

مگر اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے ایک جست لگا کے اسے دبوچ لیا "پھر گالی دی تو تمہاری زبان حلق سے کھینچ کے نکال لوں گا اور اسے پکا کے تمہارے اس بلڈ اگ افسر کو کھلا دوں گا۔ سمجھے؟"

میرے چھوڑتے ہی وہ چلانے لگا۔ پلک جھپکتے میں چھ فوجی اندر آ گئے اور انہوں نے سنگین کی نوک پر ہمیں دھکیل کر ایک قطار میں کر دیا۔ ہمیں جنگی قیدیوں کی طرح کیمپ سے باہر لایا گیا۔ نائب صوبیدار اس صدمے سے سنبھل گیا تھا جو اسے چند لمحے میری گرفت میں ذلت کی موت کا تصور کرنے سے ہوا تھا۔ وہ اندر سے زخم خوردہ سانپ ہو گیا تھا مگر ملٹری کے قواعد و ضوابط کے باعث وہ سب کے سامنے مجھے ڈسنے سے قاصر تھا۔ اس کے ذہن میں اگر ہم سب کو "حادثاتی موت" کے نتیجے میں واصل جہنم کرنے کا خیال تھا تو اب یہ خیال مجھے ایک بڑا اذیت اور عذاب ناک موت دینے کا فیصلہ بن گیا ہو گا۔

جب تلاشی شروع ہوئی تو میں نے چلانا شروع کیا "کہاں ہے وہ حرامزادہ؟ تمہارا کمانڈنگ افسر۔ جج کی اولاد۔ کس نے اختیار دیا ہے تمہیں کہ تم ہماری یوں تذلیل کرو؟ ہمارے پاسپورٹ کہاں ہیں؟ تم ان کو ضبط نہیں کر سکتے۔ بہت جلد تم سب کو معلوم ہو جائے گا کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ تم سب کی وردیاں نہ اترواؤں میں نے تو..."

ظاہر ہے ان دھمکیوں کا کسی پر کیا اثر ہوتا۔ ہم چاروں طرف سے بندوقوں کی زد میں تھے اور تلاشی کا عمل جاری تھا۔ پہلے میری جیب میں سے ایک چاقو برآمد ہوا جو نائب صوبیدار کو دکھایا گیا۔ پھر غالب کی جیب میں سے ایک پڑیا برآمد ہوئی جس میں چٹنی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" صوبیدار نے چٹنی کو غور سے دیکھا۔

"پوٹاشیم سائنائیڈ۔ بہترین زہر ہوتا ہے کتے مارنے کے لئے۔ میں تمہیں دینا چاہتا تھا۔" غالب نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ کھا لو۔"

کیپٹن حمید کا کہیں پتا نہ تھا لیکن وہ کہیں سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ جب خواتین کی تلاشی کا مرحلہ آیا تو میں اور غالب بپھر گئے۔

"کوئی ہاتھ تو لگا کے دیکھے میری بیوی کو۔" غالب نے کہا "آج تک میں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔"

وہ سب دانت نکالنے لگے۔ خود نائب صوبیدار مسکرانے لگا۔

"میرا مطلب تھا... ہاتھ نہیں اٹھایا۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "از روئے قانون لیڈی پولیس سرچ ہی یہ کام کر سکتی ہے۔"

"ایسی کی تیسی تمہارے قانون کی۔" نائب صوبیدار دہاڑا۔

میں نے چیخ کر کہا "تم مسلمان ہو؟ بے غیرت! یہ سوچو کل کیا ہندو تمہاری ماں بہن کے ساتھ کیا کریں گے۔"

نائب صوبیدار غصے میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ اچانک، خلاف توقع اس نے عورتوں کی تلاشی لینے کا حکم منسوخ کر دیا "ان کے ہاتھ کمر کے پیچھے مضبوطی سے باندھ دو۔ ایک ہی رسی سے۔"

میں نے پھر احتجاج کیا "یہ کس کے حکم پر ہو رہا ہے؟"

اس نے قریب آ کے میرے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔ "میرے حکم پر۔ اور آگے بہت کچھ میرے حکم پر ہو گا۔"

اسی وقت کیپٹن حمید سامنے آیا "یہ کیا ہو رہا ہے؟ صوبیدار! میں نے قیدی تمہاری تحویل میں اس لئے نہیں دیے ہیں کہ تم ان پر تشدد کرو۔"

صوبیدار نے پلٹ کر دیکھا "پھر کیا یہ قیدی تشدد کریں گے مجھ پر؟ تم نے ان کا رویہ دیکھا ہے؟ اس نے حملہ کیا تھا مجھ پر۔ اس نے عورتوں کی تلاشی پر اعتراض کیا میں نے مان لیا۔ مگر کیا میں ان کے ہاتھ بھی نہ باندھوں؟"

کیپٹن حمید نے کہا "اس کا اختیار ہے تمہیں۔"

میں نے کہا "اختیار کی ناجائز اولاد۔ میں بتاؤں گا تمہیں کہ میرے اختیار میں کیا تھا۔ یہاں اس بندوق کی طاقت ہے تم مجھے ڈرا سکتے ہو۔ بعد میں..."

"آئی ڈیم کیئر کہ بعد میں کیا ہوتا ہے۔ تم مجھے پھانسی نہیں لگوا سکتے' یہ مجھے معلوم ہے۔" کیپٹن حمید نے کہا اور پلٹ کے چلا گیا۔

نائب صوبیدار کے پاس اب مکمل اختیارات تھے کہ وہ ہمارے ساتھ جیسا چاہے سلوک کرے۔ اس نے کاجل، رابعہ اور نازو کے ہاتھ اتنی سختی سے بندھوائے کہ رسی ان کی کلائیوں میں گڑ گئی۔ اس نے کلیم کو بھی نہیں بخشا۔ وہ بہت لمبی اور مضبوط رسی تھی، جس میں سب باری باری باندھے گئے اور یکے بعد دیگرے ٹرک پر سوار کئے گئے تھے اور غالب کو آگے رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد خواتین تھیں اور کلیم تھا۔ آخر میں خودکار ہتھیاروں سے لیس چار سپاہی چڑھے۔ وہ ایک طرف بیٹھ گئے اور دو نے دوسری طرف پوزیشن سنبھال لی۔ وہ اتنے مستعد تھے کہ لگتا تھا گولی چلانے کا اشارہ پانے کے منتظر ہیں۔ یہ بہت خطرناک بات تھی کیونکہ ناہموار پہاڑی راستے پر کسی جھٹکے سے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھ جاتا تو ہم میں سے کوئی بے سبب مارا جاتا۔

نائب صوبیدار کے بیٹھتے ہی ٹرک روانہ ہو گیا۔ ہم سب نے حسب توفیق سب کو گالیاں دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ جابر کو، اس کے حرامی بھائی کو، ہمیں اسیر کرنے والوں کو، تقدیر کو اور زمانے کو۔ ان سب کے نزدیک یہ ان کتوں کے بھونکنے کا شور تھا جو کاٹ نہیں سکتے تھے۔ ہر مجرم احتجاج کرتا ہے مگر اس سے قانون کے لمبے ہاتھ کمزور نہیں ہوتے۔

میں اور غالب ٹرک کے کیبن کی پشت کا سہارا لیے فرش پر بیٹھے تھے۔ زنجیر کی اگلی کڑی نازو تھی، پھر رابعہ، کاجل اور کلیم تھے۔ میں عادت کے مطابق کلائی پر نظر ڈالتا تھا مگر انہوں نے گھڑی تک اتار لی تھی چنانچہ میں وقت کا صرف اندازہ کر سکتا تھا اور وہ بھی گزرتے ہوئے سنگ میل دیکھ کر۔ میرا رخ سڑک کی جانب تھا مگر ہر سنگ میل مجھے اس وقت نظر آتا تھا جب ٹرک سو گز آگے نکل جاتا تھا۔

غالب آہستہ آہستہ میرے کان میں کہہ رہا تھا "یہ دوسرا' یہ تیسرا' یہ چوتھا۔"

میں نے کہا "سنگ میل مجھے بھی نظر آ رہے ہیں۔ اگر ماہ و سال کے حساب سے اپنی اولاد شمار کرتے ہو تو چار کافی ہیں۔"

نازو نے لال پیلی ہو کے کہا "تم اپنی فکر کرو سکندر اعظم۔"

میں نے مسکینی سے کہا "خاتون' غالب کے بچوں کی تعداد سے آپ کا بھی کوئی تعلق ہے؟ سوری۔ اس کا سسر تو بھوت ہے۔"

"خالص بھوت ہے؟" غالب نے سر ہلایا "آپ کہیں تم اپنے ابا کا ذکر مت لے آنا بیچ میں۔"

رابعہ نے کہا "چھوڑو نازو، ان کے منہ مت لگو۔"

"آخر کب تک نہیں لگوگی۔ بکرے کی ماں..."

www.paksociety.com

"مرزا بکرے۔۔۔ تو سیل ہو گئے۔" میں نے کہا "تیار ہو جاؤ بکرے کی ماں۔ سوری۔ وہ غالب نے کہا تھا تو میری زبان پر بھی آگیا۔ میرا مطلب تھا محترمہ نازی بیگم۔"

ٹرک نے موڑ کاٹا اور ایک دم اس کے ٹائر سے ہوا نکلنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے مسکرا کے غالب سے کہا "مبارک ہو۔"

"کیا مبارک ہو؟ بکرے کی ماں؟" غالب نے کہا "وہ کب تک خیر منائے گی۔"

ایک محافظ نے جو ہماری گفتگو کے سمجھنے کی بے سود کوشش میں مصروف تھا، جھک کر پیچھے دیکھنے لگا "رو کو۔ بکرا پنکچر ہو گیا۔ ہوا نکل گئی۔"

میں نے بھی چلا کے کہا "بکرا پنکچر ہو گیا۔ غضب ہو گیا۔"

ایک دم سب کو ہنسی آئی تو خفت سے سپاہی کا برا حال ہو گیا۔ وہ بکرا بکرا سنتے ہوئے ٹائر کو بکرا کہہ گیا تھا۔ ہماری ہنسی ان سب کو مشتعل کر رہی تھی لیکن وہ خون کے گھونٹ پی کر برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

ٹرک رک گیا۔ فلیٹ ہونے والا ٹائر بائیں ہاتھ پر تھا جنبی پہاڑ کی طرف۔ ٹرک اسی طرف جھکا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے نیچے اتر کے ٹائر کا معائنہ کیا اور اس کی رپورٹ نائب صوبیدار کو دی۔

اسی وقت نازو نے پیٹ پکڑ کے چلانا شروع کر دیا۔

ایک فوجی نے کہا "کیا ہوا ہے اسے؟"

میں نے کہا "جو ہر روز ہوتا ہے۔ آج یہ باتھ روم نہیں گئی تھی۔"

غالب نے کہا "اس کو نیچے آنے دو ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟" وہ غرایا۔

"سارا ٹرک گندہ ہو جائے گا۔ تم بھی بیٹھے رہو گے اسی میں رات بھر۔"

یہ دھمکی کام کر گئی۔ فوجی اتر کے نائب صوبیدار کے پاس گیا اور اسے دوسری رپورٹ دی۔ اس وقت میں ڈرائیور نے جیک نکال لیا تھا اور نیچے جھک کر اسے کہیں فٹ کر رہا تھا۔ نائب صوبیدار اتر کے پیچھے آیا۔

"یہ کیا بدمعاشی ہے؟" اس نے کہا۔

"یہ بدمعاشی ہے تو کیا تم نہیں کرتے؟" غالب نے اور میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی "تمہارے گھر میں۔"

"اچھا اچھا۔ بکواس بند کرو۔" نائب صوبیدار بولا۔

اس نے نازو کو ٹرک سے اتارنے کا حکم دیا۔ وہ پہلے بھی متعدد مواقع پر اپنی اداکاری کے جوہر دکھا چکی تھی۔ اس وقت بھی نازو نے نائب صوبیدار کو قائل کر لیا۔ آپریشن کال آف دی نیچر شروع ہو چکا تھا۔ ہم سب ایک ہی رسی سے بندھے ہوئے تھے مگر ایک نازو کو اتارنے کے لیے اس لڑی میں پروئے ہوئے سب دانوں کو نیچے نہیں اتارا جا سکتا تھا چنانچہ انہوں نے پہلے کلیم اور کاجل کو کھولا پھر

رابعہ کو کھول کے انہوں نے نازو کو الگ کیا اور باقی سب کو پھر باندھ کے اسے نیچے اتار دیا۔

نائب صوبیدار نے کہا "ادھر ادھر کہاں جاتی ہے؟"

نازو نے چلا کے کہا "کیا سڑک پر بیٹھ جاؤں؟"

بے بس اور مجبور نائب صوبیدار نے کہا "تو کیا پہاڑ پر جائے گی۔"

نازو نے کہا "اس ٹرک کے پیچھے۔"

"اچھا۔ مگر دیکھو، میں گولی ماروں گا اگر کوئی چالاکی ہوئی۔ بھاگنے کی کوشش مت کرنا، میں دیکھ رہا ہوں۔"

جتنا شور نازو نے کیا اس سے زیادہ ہم نے کیا۔ غالب نے تو خاصی اشتعال انگیزی کی کہ کیا تمہارے اپنے گھر میں یہی دستور ہے؟ خواتین باتھ روم جاتی ہیں تو حضرات رکھتے ہیں؟ نائب صوبیدار پریشان ہو گیا۔

نازو نے کہا "بھاگ کے میں کہاں جاؤں گی؟ ادھر پہاڑ ہے، آگے پیچھے سڑک ہے۔ دونوں طرف تم ہی لگ ہو۔"

نائب صوبیدار نے یہی کیا۔ وہ خود ہٹ گیا مگر اس نے سڑک پر دس قدم دور ایک سپاہی کو کھڑا کر دیا اور اسی طرح پیچھے۔ ان دونوں کو حکم تھا کہ اپنی نگاہ سڑک پر رکھیں۔ ڈرائیور جیک پر ٹرک کو اٹھا چکا تھا اور پہیے کے نٹ بھی کھول چکا تھا۔ اس نے فلیٹ ہو جانے والا ٹائر ایک طرف رکھا ہم سب سانس روکے ایک ایک لمحہ شمار کرتے رہے۔ ہم سب کے اعصاب پر ایک ہی سوال کا دباؤ تھا۔ کیا نازو کامیاب ہو جائے گی؟ یا عین وقت پر کوئی اسے دیکھ لے گا؟ ابھی اندھیرا زیادہ گہرا نہیں ہوا تھا۔ مغرب کی جانب کہیں سورج غروب ہونے والا تھا مگر ٹرک پر پہاڑوں کا تاریک سایہ پھیل چکا تھا۔

ڈرائیور نے دوسرا ٹائر فٹ کیا اور نٹ بولٹ کسنے لگا۔ اب یہ مشکل سے چند سیکنڈ کی بات رہ گئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ایک منٹ۔ نازو کو ٹرک کے پیچھے گئے ہوئے دس منٹ ہونے والے تھے۔

نائب صوبیدار کا اضطراب بھی بڑھ رہا تھا "جلدی کر بھئی ٹرک۔۔۔" ابھی جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ پہلا فائر ہوا اور ٹرک ڈرائیور ایک کربناک چیخ مار کے سڑک پر گر گیا۔ دوسرے لمحے میں نے نازو کی آواز سنی۔

"خبردار! ہاتھ مت ہلانا۔ کوئی ماروں گی سر میں۔ کوئی نہ ہلے اپنی جگہ سے ورنہ تمہارا یہ نائب صوبیدار مارا جائے گا۔ چلو ہاتھ اوپر اٹھالو۔ آہستہ، بہت آہستہ۔ اب گھوم جاؤ۔ آہستہ۔ تیزی مت دکھاؤ۔ اب حکم دو اپنے ماتحتوں کو ہتھیار ڈال دیں۔ جلدی کرو مور کے بچے!"

نائب صوبیدار چلایا۔ غالباً نازو نے اس کے ہاتھ مار دیا تھا۔ اس نے کراہتے ہوئے حکم جاری کیا "تم سب اندھے ہو، پاگل ہو،

کچھ نہیں دیکھا کسی نے۔ ایک لڑکی نے بے وقوف بنا دیا۔ آنکھوں میں دھول جھونک دی۔ تم نے خاک تلاشی لی تھی۔"

"بک بک کرنے کو کس نے کہا تھا میں نے۔" نازو نے اس کے دوسرا ہاتھ مارا۔

وہ پھر بلبلایا "ارے میں مر جاؤں گا تب کچھ کرو گے۔ اڑو۔۔۔" اس نے گالیاں دینی شروع کیں۔

ایک ایک کر کے فوجیوں نے اپنی آٹومیٹک رائفلیں نیچے رکھ دیں اور نازو کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ٹرک کے پیچھے قطار میں الٹے لیٹتے گئے۔ ان میں سے ایک نے حاضر دماغی اور بہادر ہونے کا ثبوت دینا چاہا اور اپنے ہاتھ میں آ جانے والا پتھر اچانک نازو پر کھینچ مارا۔ اس کا نشانہ خطا گیا۔ عجلت اور بدحواسی میں یہی ہو سکتا تھا مگر نازو نے اسے ایک موقع اور دیا۔

"کھڑے ہو جاؤ۔ دوسرا پتھر اٹھاؤ۔ اٹھاؤ۔" اس نے دہاڑ کے کہا اور گولی چلا دی۔ نائب صوبیدار نے عین اسی وقت نازو کی کلائی پکڑی اور ریوالور پر ہاتھ مارا۔ مگر وہ نازو ہی کیا جو دشمن کی طرف سے بے خبر ہو کے مار کھا جاتی۔ یہ سب ہماری نظروں کے سامنے ہو رہا تھا، بالکل کسی فلم کے سین کی طرح۔ ابھی تک ہمیں خیال نہیں آیا تھا کہ ٹرک سے اتر جائیں۔

نازو نے پلک جھپکنے میں جمعدار کے لات رسید کی۔ گردن پکڑ کے اسے آگے کھینچا اور اوپر اٹھا کے پہاڑ پر دے مارا۔ وہ تھوڑا سا اٹھا اور پھر لڑھکتا ہوا اپنے ماتحتوں کی قطار پر گرا۔ یہ میں نے ٹرک کی سائیڈ کی جھری سے جھانک کر دیکھا۔

"اب تم یہ پتھر مجھے مارو۔ اچھی طرح نشانہ لے کر۔ اگر پتھر مجھے لگ گیا کہیں بھی چھو گیا تو میں تم کو چھوڑ دوں گی ورنہ میری گولی تم کو نشانہ بنائے گی۔ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ یہ سب دیکھ لیں گے۔ چلو جلدی کرو۔ دس تک گنوں گی میں۔ ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔"

گنتی چار تک پہنچی تھی کہ پتھر نازو کو چھوئے بغیر گزرا۔ بڑی پھرتی سے نازو نے خود کو بچایا اور اس کے ساتھ ہی فائر کیا۔ فضا ایک اور چیخ سے مرتعش ہو گئی۔ نازو کا پہلا شکار دم توڑ چکا تھا۔ نائب صوبیدار بالکل لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا۔ یہ تیسرا شخص، نائب صوبیدار کے قدموں میں تڑپ رہا تھا۔ اب باقی بچ جانے والے تین فوجی شاید کال آف دی نیچر کا جواب دے چکے تھے۔

نازو کے حکم پر جب ایک اٹھا اور ہماری رسیاں کھول لے آیا تو اس کی پتلون تر تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور وہ زیر لب نہ جانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ اس کے لیے یہ سب کسی بھیانک خواب سے کم نہ تھا۔ زندگی میں اس نے فرشتۂ اجل کا زنانہ روپ پہلے کہاں دیکھا ہو گا۔

آپریشن کال آف دی نیچر کا دوسرا مرحلہ بھی کامیابی سے

ہمکنار ہو چکا تھا۔ میں نے نیچے اترتے ہی ڈرائیور کی لاش کو گھسیٹ کر نیچے نشیب کی جانب لڑھکا دیا کیونکہ سڑک کی طرف سے کسی گاڑی کی آمد و رفت متوقع تھی۔ باقی سب ٹرک کے پیچھے تھے اور انہیں کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

اگلے دس منٹ میں ہم نے دوسری لاش کو بھی کھائی میں پھینکا۔ نائب صوبیدار کی وردی اتاری اور اسے باندھ کے ٹرک میں ڈالا۔ یہ وردی غالب کو بھی ڈھیلی تھی مگر ٹرک میں آگے بیٹھ کر وہ بالکل نائب صوبیدار نظر آنے لگا تھا۔ دو فوجیوں کا ہم نے کریا کرم کر دیا تھا۔ ان کی خون آلود وردیاں ویسے بھی ہمارے کام کی نہیں رہی تھیں۔ ایک فوجی میرے قد و قامت کا تھا۔ اس کی وردی میں نے چڑھا لی۔ باقی دو وردیوں کو رابعہ اور نازو نے پہنا اور کاجل کے بارے میں فیصلہ کیا گیا کہ وہ چھپ کر بیٹھے اور جب ضرورت پیش آئے تو ٹرک میں لیٹ جائے۔

ہم سب نے وردیاں اپنی کپڑوں پر چڑھالی تھیں جو ہم نے پہن رکھے تھے چنانچہ نائب صوبیدار اور باقی تین فوجیوں کے پاس لباسِ قدرت کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔ نائب صوبیدار ابھی تک ہوش سے بیگانہ تھا مگر دوسرے فوجی شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے اور عرقِ انفعال میں ڈوب کے مر جانا چاہتے تھے۔ ان کی عقل کو ایک لڑکی نے مات دے دی تھی۔ پھر ان کی مردانگی دھری رہ گئی تھی اور ان کے لمبے چوڑے ڈیل ڈول کے باوجود ایک دھان پان سی لڑکی نے

دنیا کے حیرت انگیز فنِ تحریر شناسی کی مدد سے
دوسروں کی شخصیت کو کھلی کتاب کی طرح پڑھیں،
تحریر شناسی کے فن پر ایک نادر و بیش بہا کتاب
تحریر اور شخصیت
قیمت ۱۵/ روپے
ڈاک خرچ ۱۴ روپے
○ آپ کو بتائے گی کہ آپ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔
○ آپ کن صلاحیتوں کے مالک ہیں ○ تحریر کے ذریعے اپنی کمزوریاں اور خامیاں کیسے دور کی جا سکتی ہیں؟
ملنے کا پتہ
مکتبہ نفسیات ○ پوسٹ بکس ۹۴۴ کراچی

www.paksociety.com

انھیں دشمن کے رکھ دیا تھا اور اب انتہا یہ تھی کہ دست و پا بستہ قیدیوں نے خود کو آزاد اور انھیں اسیر کر کے ان کے کپڑے تک اتروا لیے تھے اور واقعی بے عزتی کے بعد بھی وہ زندہ تھے۔

باری باری ان سب کو میں نے ٹرک میں سوار کیا اور اسی رسّی سے غالب نے انھیں بنڈل بنایا جس سے ہم بندھے پڑے تھے۔ انھوں نے تعاون کے بے مثل جذبے کا مظاہرہ کیا اور ہمارے ہر حکم کی تعمیل کی۔ غالب نے انھیں لیٹ جانے کو کہا تو وہ لیٹ گئے۔ غالب نے کپڑا ٹھونسنے کے لیے ان کو منہ کھولنے کی ہدایت کی تو انھوں نے فوراً منہ کھول دیے۔ غالب نے ان پر ایک چادر ڈال کے انھیں خاموش پڑے رہنے کی تاکید کی تو انھوں نے فوراً سر ہلا دیا۔

میں نے فلیٹ ہو جانے والے ٹائر کو اس کی جگہ پر فٹ کیا اور ڈرائیونگ کے لیے آگے جا بیٹھا۔ ایک ریوالور نائب صوبیدار کے پاس سے برآمد ہوا تھا، وہ رابعہ نے اپنے پاس رکھا اور میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

میں نے اسے ڈانٹا "آگے افسر لوگ بیٹھیں گے۔ تم سپاہی ہو۔"

رابعہ نے کہا "وہ... دراصل نازو نے کہا تھا مجھ سے۔"

"نازو نہیں، نائب صوبیدار صاحب۔" میں نے کہا۔

"اس کا خیال تھا کہ وہ اور غالب پیچھے قیدیوں سے بہتر طور پر نمٹ لیں گے۔"

"خاک نمٹ لیں گے۔ وہ آپس میں لڑتے رہیں گے اور دشمن اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھائے گا۔" میں نے کہا۔

"ان کا دل نہیں لگتا ایک دوسرے کے بغیر۔"

"یہ دل لگانے کی جگہ ہے نہ موقع ہے۔" میں نے کہا "جو کام نازو کر سکتی ہے وہ تم بھی کر سکتی ہو۔"

"نہیں۔ تم جانتے ہو کہ ایسا نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا "میرا اور اس کا کیا مقابلہ۔"

"تم طنز کر رہی ہو یا احساسِ کمتری کا اظہار؟ دونوں صورتوں میں یہ غلط ہے۔"

"یہ حقیقت ہے۔ میں صرف گولی چلا سکتی ہوں۔"

"گولی ہی چلانی ہے تمھیں، کوئی توپ نہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا پھر میں پیچھے جاتی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے رویے سے کچھ آزردہ ہے۔ اس نے مجھے احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ نازو کے پیچھے رہنے کی ایک اور بھی وجہ ہے مگر اس وجہ کو میں نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔

"ارے لڑکی!" میں نے کہا "ادھر بیٹھو، ہمارے ساتھ۔"

"کیوں؟ اب کیا ہو گیا؟"

"ہمارا موڈ اچانک رومانٹک ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

رابعہ ہنسی اور میرے ساتھ بیٹھنے کے لیے اوپر چڑھ گئی۔ میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ پیچھے غالب نے نائب صوبیدار صاحب کی اسپیشل چیکنگ کی تھی اور انھیں بھی چادر کے نیچے ڈال دیا تھا۔ ٹرک کے آخری کنارے پر وہ نازو کے ساتھ خود کار رائفل لے کر بیٹھ گیا تھا۔ کاجل اور کلیم کے لیے وہ خالی بنچوں پر بہت جگہ تھی اور وہ آرام سے سیدھے لیٹ گئے تھے۔

میں نے سر نکال کے کہا "اوئے کلینروے! پھڑا چلاں کرنا؟"

غالب نے عین کلینر کی طرح جواب دیا "چلو نا استاد جی۔ آل رائٹ، ریڈی، ٹائٹ، سب ٹھیک ہے۔"

آدھے گھنٹے بعد ٹرک پھر روانہ ہوا۔ مجھے واپسی کے لیے یوٹرن لینا تھا اور یہاں اتنی جگہ ہی نہ تھی۔ مزید ایک میل کے بعد مجھے موقع ملا تو میں نے ٹرک کو آگے پیچھے کیا اور تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا رخ بدلنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ خاصی مہارت اور محنت کا کام تھا۔ دو بار ٹرک تھوڑا سا آگے بڑھا تو عین کھائی کے کنارے تک پہنچ گیا اور خوف سے رابعہ کا برا حال ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگلے دو پہیے کھائی میں اتر کے معلق ہو چکے ہیں لیکن مجھے اندازہ تھا کہ ابھی ایک فٹ کا فاصلہ ہے۔ تاہم یہ فاصلہ بہت کم تھا۔ ٹرک کے وزن سے کنارا ٹوٹ جاتا تو ٹرک کو نیچے جانے سے روکنا ناممکن ہو جاتا اور ہزاروں فٹ کے نشیب تک پہنچتے پہنچتے نہ ہم بچتے نہ ٹرک کا کوئی پرزہ سلامت ملتا۔

جب آخر کار ٹرک واپس اسی سڑک پر روانہ ہوا تو میں نے بھی سکون کا سانس لیا "تم اتنا ڈرتی ہو؟ افسوس! فلمی شاعر فرماتا ہے کہ ساتھ جئیں گے ساتھ مریں گے۔"

رابعہ ہنسی "ذرا اپنا حال دیکھو، پسینے پسینے ہو رہے ہو۔"

میں نے کہا "میری جگہ فلمی شاعر ہوتا تو کچھ اور فرماتا۔ شاید بغیر فرمائے ہی خوف سے مر جاتا۔ یہ بتاؤ تم نے کسی فلم میں ایسا سین دیکھا ہے کبھی؟"

"کیسا سین؟"

"یہی کہ ہیرو فوجی وردی میں ہے اور ہیروئن بھی اور وہ جنگل یا پہاڑ سے گزرتے ہوئے دوگانا گا رہے ہوں۔ ساتھی ہے خوب صورت، موسم بہت حسین ہے۔" میں نے گانا شروع کیا۔

رابعہ ہنسنے لگی "خدا کے لیے بس کرو۔ میں ویسے ہی مان لیتی ہوں کہ تم گا سکتے ہو۔ آشیانوں میں لوٹنے والے پرندے کیا کہیں گے!"

"کیا کہیں گے؟" میں نے بہت برا مان کے کہا۔

"یہی کہ جنگل میں یہ نیا جانور کہاں سے آ گیا۔ ایسی ڈراؤنی آواز والا۔"

پیچھے سے غالب نے چلا کے کہا "استاد جی! خیر ہے نا؟ رو کیوں رہے ہو؟ گھر والی مار رہی ہے کیا؟"

میں نے بدلی آواز بنا کے کہا "ہاں چھوٹے کلینر۔ یہ تیری گھر والی نے اس کو بھی غلط راستے پر ڈال دیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں استاد جی، ہماری طرح تم بھی سیدھے ہو جاؤ گے۔" غالب بولا۔

رابعہ نے کہا "مجھے اب بھی یقین نہیں کہ ہم وطن واپس جانے کے لیے آزادی حاصل کر لیں گے۔"

میں نے علامہ اقبال کا ایک مصرعہ پڑھا "یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے" اور اسے دوسرے مصرعے سے جوڑ دیا۔ "قریب ہے شبِ غم کی سحر اداس نہ ہو۔"

رابعہ مسکرائی "ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آخری وقت میں کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

اب میں نے غالب کی زبان میں کہا "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا۔"

"معلوم ہے، میں نے یہاں آنے سے پہلے ایک منت مانی تھی۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "اچھا! کیا منت مانی تھی؟"

"میں نے رانا صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ واپس آ کے سو دیگ چاول غریبوں میں تقسیم کروں گی۔ تمھارے ساتھ جا کے۔"

"بہت اچھا کیا تھا۔" میں نے کہا "چاول کا مطلب ہو گا پلاؤ، تو رائتہ میری طرف سے اور سویٹ ڈش کے طور پر زردہ۔"

"تم مذاق اڑا رہے ہو نا میرا!"

"میری کیا مجال۔ میں تو پتنگ تک نہیں اڑا سکتا، جو ہر بچہ اڑا سکتا ہے۔" میں نے کہا "کیا تم سنگِ میل دیکھ رہی ہو؟"

"ہاں۔ سات گزر چکے ہیں۔"

ٹرک چلاتے ہوئے میں بہت محتاط تھا۔ مجھے پہاڑوں کے پُرپیچ اور تنگ راستوں پر بھاری گاڑی چلانے کا کوئی تجربہ نہ تھا اور اندھیرے میں یہ کام زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ ہیڈ لائٹس بھی کمزور تھیں اور زیادہ سے زیادہ بیس گز تک راستے کو روشن کر لیتی تھیں۔ جہاں موڑ آتا تھا وہاں کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ دوسری طرف سڑک بلندی کی جانب رواں ہو گی یا نشیب کی طرف مائل ہو گی۔ رات کے سناٹے میں جنگلی جانوروں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں اور اندھیرے نے پورے منظر کو اس طرح نگل لیا تھا کہ مجھے اپنے اطراف ایک سیاہ زمین اور آسمان کی چادر پھیلی نظر آتی تھی جس میں درخت، پہاڑ سب روپوش تھے۔ اوپر آسمان پر بھی نہ چاند تھا اور نہ ستارے۔ بادلوں کے پرے جو شام تک سرمئی تھے، اب کالے ہو گئے تھے اور مجھے سب سے زیادہ خوف بارش کا تھا۔ بارش کے بعد پہاڑی راستے زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں۔ سڑک پر ٹائروں کی گرفت بہت کم رہ جاتی ہے اور بریک بھی صحیح طور پر کام نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ ونڈ اسکرین کے دھندلا جانے اور ہیڈ لائٹس کے اجالے میں کمی کے باعث حدِ نگاہ بھی آٹھ دس گز سے زیادہ نہیں ہوتی۔

جب چوکی سے پہلے آنے والا سنگِ میل بھی گزر گیا تو میں نے ذرا سی دیر کے لیے ٹرک کو روکا، اس کے ہینڈ بریک کھینچے اور پیچھے جا کے غالب سے ایکشن پلان پر آخری بار مشورہ کیا۔

"میرا خیال ہے کہ ہیڈ لائٹس آف کر دو۔" غالب نے کہا۔

"تمھارا دماغ خراب ہے۔ اندھیرے میں ٹرک نیچے اتر جائے گا اور ہم سب اوپر چلے جائیں گے۔" میں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"ہیڈ لائٹ انھیں پہلے سے خبردار کر دے گی کہ کوئی گاڑی آ رہی ہے۔"

میں نے کہا "وہ ہیڈ لائٹ کے بغیر بھی فوجی گاڑی کے انجن کی آواز پہچان سکتے ہیں۔ اس خاموشی میں ایک فرلانگ دور سے بھی۔"

"بس تو پھر چلو۔ وہ فوجی گاڑی سمجھ کے شاید ہمارا راستہ نہ روکیں۔" غالب بولا۔

"راستہ تو نہیں روکیں گے مگر ہمارے سیدھا گزرتے ہی انھیں شک ہو جائے گا لیکن تم انھیں پہلے فائر کرنے کا موقع مت دینا۔ تمھیں معلوم ہے کہ چوکی پر گارڈ کہاں کھڑے ہوتے ہیں؟"

"فکر مت کرو میں سب کو اڑا دوں گا۔"

نازو نے کہا "ایک گاڑی بھی ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اسے میں ختم کر دوں گی۔"

"رائٹ۔ اس کے بعد میں ٹرک کو بھگا دوں گا۔ جتنی رفتار سے بھی ممکن ہوا۔" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "دو چار میل کے بعد ہم ٹرک چھوڑ کیوں نہ دیں؟"

غالب نے کہا "اور خود پیدل ہو جائیں تاکہ وہ آسانی سے ہمارا پیچھا کر کے ہمیں پکڑ لیں۔"

"نہیں۔ ٹرک کو نشیب کی جانب روانہ کر دیں تاکہ وہ سمجھیں ہم سب فرار کی کوشش میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

میں نے کہا "بات تمھاری بھی غلط نہیں ہے مگر یہ دیکھو کہ ٹرک سے محروم ہو کے ہم رات بھر میں کتنی دور جا سکیں گے۔ ان راستوں پر پیدل چلنا بہت دشوار کام ہے۔ صبح تک ہم دس بارہ میل دور بھی نہیں جا پائیں گے۔ صبح انھیں معلوم ہو جائے گا کہ ٹرک میں ہماری لاشیں نہیں ہیں تو وہ پھر ہمارے تعاقب میں آ جائیں گے اور یہاں ہمارے لیے پناہ نہیں ہے۔ نہ ہم پہاڑ پر چڑھ کے چھپ سکتے ہیں اور نہ وادی میں اتر کے۔"

غالب نے کہا "ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ سرحد کتنی دور ہے۔"

"سرحد زیادہ دور نہیں ہو سکتی۔" نازو نے یقین سے کہا۔

"بہتر ہے کہ ہم رات بھر میں بنگلہ دیش کی سرحد سے جتنا دور جا سکتے ہیں چلے جائیں۔" میں نے کہا "اگر تعاقب میں کوئی گاڑی آئے گی تو اس سے بھی تمھیں ہی نمٹنا ہو گا۔"

اچانک وادی کی طرف سے ایک زبردست دہاڑ سنائی دی اور نازو نے زنانہ عادت کے مطابق ایک چیخ مارنا ضروری سمجھا "شیر!"

غالب نے بگڑ کے کہا "شیر نے تمھیں کھا تو نہیں لیا ہے جو اتنا چلا رہی ہو۔ اس علاقے میں شیر چیتے سب ملتے ہیں۔"

www.paksociety.com

نازو نے خفت سے کہا "وہ تو معلوم ہے مجھے۔"

میں نے کہا "ڈرو نہیں۔ ببر جنگل میں انتہائی بے ضرر ہوتا ہے جب تک وہ بھوکا نہ ہو یا آدم خور نہ بن گیا ہو۔"

غالب نے کہا "ویسے تو یہ ببر کے ڈنر کا وقت ہے' بھوکا ہی ہوگا۔ وہ آدم خور ہے یا نہیں' اس کا پتا تب ہی چلے گا جب وہ نازو کو کھا کے ڈکار لے گا۔"

"مجھے کیوں' تمہیں پہلے کھائے گا۔ تم پر چڑھا ہوا ہے گوشت مجھ میں ہڈیاں ہی ہڈیاں ہیں۔"

"یہ بھی ببر کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کس کو ترجیح دیتا ہے کہا جاتا وہ سویٹ ڈش کے طور پر تمہیں نوش فرمالے۔ یو آر سو سویٹ!"

میں نے کہا "اب میں اسٹارٹ لیتا ہوں۔ ریڈی؟"

"ایک دم ریڈی باس۔" غالب نے کہا۔

ٹرک پھر روانہ ہوا تو میں نے رفتار معمول کے مطابق رکھی۔ آہستہ آہستہ فوجی چوکی کی لائٹ نظر آنے لگی۔ کسی نے ٹارچ کی روشنی ہلائی مگر ہیڈ لائٹس کے مقابلے میں ٹارچ بے مصرف تھی۔ میں نے بہت قریب پہنچ کے دو افراد کو دیکھا جو بندوقیں اٹھائے بالکل مطمئن کھڑے ہوئے تھے ایک جیپ ان سے کچھ فاصلے پر موجود تھی۔

عین اس وقت جب انہوں نے ٹرک کو راستہ دینے کے لیے بیریئر اٹھایا' میں نے ایکسیلیٹر دبا دیا۔ ٹرک کا انجن گرجا اور رفتار ایک دم بڑھی۔ اس کے ساتھ ہی خودکار رائفلوں کے مسلسل فائر ہوئے۔ میں پیچھے کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ غالب اور نازو نے آسانی سے دونوں محافظوں اور جیپ کو نشانہ بنایا ہوگا۔ انہیں جوابی فائر کرنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔

ایک راؤنڈ کے بعد فائرنگ بند ہوگئی۔ میں نے ٹرک کی رفتار اور بڑھا دی۔ اب میری ساری توجہ سڑک پر تھی۔ بھاری بھرکم' دس ویل ٹرک چالیس کی رفتار پر بھاگ رہا تھا جو ان راستوں پر انتہائی خطرناک رفتار تھی۔ میری نظر نے ایک ایک میل کی مسافت کو ایک گھنٹے میں طے ہوتا محسوس کیا۔

اچانک مجھے عقب ویو مرر میں دور دو روشنی کے نقطے نظر آئے۔ یہ تعاقب کرنے والے ہی ہو سکتے تھے۔ اپنے سامنے مجھے اندھیرے میں ایک مدھم سی روشنی دکھائی دے رہی تھی جو میرے خیال میں اگلی سرحدی چوکی ہو سکتی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں غالب سے کوئی بات نہیں کی تھی مگر مجھے امید تھی کہ وہ ان پر فائر کرنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ دوسرے ملک میں داخل ہوتے ہی اس ملک کے سرحدی محافظوں کو مار دینا نئی دشمنی کے آغاز کے مترادف ہوتا اور اب ہم کسی دشمنی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے ہمارے پیچھے بھی دشمن تھے چنانچہ آگے ہمیں دوستوں کی ضرورت تھی۔

تعاقب کرنے والے تیزی سے قریب آ رہے تھے میں روشنی کے نقطوں کو ہر لمحہ بڑھتا محسوس کر رہا تھا۔ اب غیر ارادی طور پر میرا پاؤں ایکسیلیریٹر کو دباتا جا رہا تھا۔ سامنے والی روشنی قریب آگئی۔ میں نے سڑک کے بیچ میں دو افراد کو دیکھا جو ہمیں رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر وہی کیا جو میں چاہتا تھا کہ غالب نہ کرے۔ ایک لمحے نے میرے خیال کو بدل دیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں رک گیا تو پیچھے آنے والے بھی پہنچ جائیں گے اور وہ سرحدی محافظوں کو یقین دلا دیں گے کہ ہم بھگوڑے ہیں اور ان کا فوجی ٹرک لے کر فرار ہو رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ نائب صوبیدار سمیت چار فوجی قیدی بھی تھے جو ہمارے خلاف گواہ بن جاتے۔

میں نے رابعہ سے کہا "فائر" اور ٹرک کو سیدھا نکال کر لے گیا۔ رابعہ نے ایک گولی چلائی۔ ایک شخص چلایا۔ دوسرے نے بڑی کوشش کی کہ وہ کود کر الگ ہو جائے مگر ٹرک کے بھاری پہیے اس کو پیستے ہوئے گزر گئے۔ پھر پیچھے سے غالب یا نازو نے پورا راؤنڈ چلا دیا۔

"او مائی گاڈ!" میں نے سر پر ہاتھ مارا "یہ کیا کر دیا انہوں نے؟"

رابعہ نے کہا "اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ وہ بچ جاتے تو ہمیں واپس لے جاتے۔"

"کیسے لے جاتے؟ ہمارے پاس ویزا ہے۔ زبردستی ایک ملک سے کسی کو یوں نہیں لے جایا جا سکتا۔ ہم انڈین ہیں' بنگلہ دیش کی پولیس ہمیں تیسرے ملک میں پکڑنے کے لیے داخل نہیں ہو سکتی۔"

"مگر یہاں تو صرف سرحد ہے' قانون کہاں ہے۔" رابعہ نے کہا "یہاں جنگل کا قانون چلتا ہے۔"

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ ہمارے تعاقب میں آنے والی بنگلہ دیشی فوجی گاڑی سرحد کی پروا کیے بغیر تیزی سے آگے آ رہی تھی۔ ویسے بھی ان کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ جو تھے انہیں خود ہم نے مار دیا تھا۔

رات کے سکوت کو تیسری بار مسلسل فائرنگ نے ختم کر دیا مگر اس بار گولیاں دونوں طرف سے چل رہی تھیں۔ اچانک ٹرک لڑکھڑانے لگا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات پندرھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

www.paksociety.com

سنسنی خیز ساعتوں سے بھرپور نہایت آہنگ
احمد اقبال کے سحر نگار و شبنم فشاں قلم سے

معاشرے کے ان ناسوروں کی
زہر آلود جونکوں سے بھی بدتر گھن زدہ سوچ
انسانی ذہنوں میں اتر رہے تھے ایک کمسن پرجوش
نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز عبرت
کی بستی میں گزر رہے تھے جلتے دن
سلگتی راتیں آس و یاس خوف
ہراس تلخ حقیقتیں
سنہرے خواب

میں نے کہا "رابعہ! ٹرک کا ٹائر برسٹ ہو گیا ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟" اس نے عقب نما آئینے میں دیکھا "ایک ٹائر نہ سہی تین پر چلو۔"

"یہ ٹرک ہے ٹرائی سائیکل نہیں" میں نے ٹرک کی رفتار کم کی اور اسے سیدھا سڑک پر چلانے کی جدوجہد کرتا رہا۔ ٹرک ایک جانب سے جھک گیا تھا۔ اس کا سارا بوجھ بھی جھکاؤ کی طرف منتقل ہو گیا تھا اور میں اسٹیئرنگ کو بائیں جانب کاٹ کے نہ پکڑتا تو ٹرک دائیں طرف کی کھائی میں اتر جاتا۔

"بہنا! اب کوئی پیچھے ہے؟" میں نے چلا کے کہا۔

رابعہ نے بیک ویو مرر کو قریب سے دیکھا "نظر تو کوئی نہیں آتا۔"

"جو ٹرک دور سے پیچھا کر رہا تھا اس کی ہیڈ لائٹس تو نظر آ رہی ہوں گی۔"

رابعہ نے نفی میں سر ہلا دیا "یا ہیڈ لائٹس ٹوٹ گئی ہیں یا پھر ٹرک سے جان چھوٹ گئی ہے۔"

میں نے رفتار کو دس میل پر رکھا اور ایک گہری لمبی سانس لے کر پسینہ اپنی آستین سے صاف کرنے کی کوشش کی جو میری آنکھوں میں آ رہا تھا۔

رابعہ نے اپنے دوپٹے سے میری پیشانی کو صاف کر دیا۔

میں نے اسے مسکرا کے دیکھا "تھینک یو۔ مگر تم کو ایسا کرنا نہیں چاہیے۔"

"آخر کیوں؟" اس نے حیرانی سے کہا۔

میں نے کہا "اس سے حادثہ ہو سکتا تھا۔ اس دوپٹے میں تمہاری زلفوں کی مہک بسی ہوئی تھی جو بہت مدہوش کرنے والی تھی۔"

رابعہ مسکرانے لگی "میرا خیال ہے کہ ٹرک روک لو۔"

میں نے سر ہلایا "میں بھی اس ساڑھے تین ٹانگوں والی سواری کو قابو میں رکھنے سے تھک گیا ہوں۔"

ٹرک کو میں نے پہاڑ کے دامن میں انتہائی بائیں جانب کر کے کھڑا کر دیا۔ کسی چٹان کے گرنے سے وہاں ایک ایسا خلا نمودار ہو گیا تھا جس کی پتھریلی دیواروں میں ٹرک کو چھپایا جا سکتا تھا۔ احتیاط برتنے کے باوجود انجن کا اگلا حصہ چٹانوں کے نوکیلے حصوں سے ٹکرا گیا۔ رگڑنے سے دونوں مڈگارڈ ادھڑ گئے۔ دھات کے پتھر پر رگڑنے سے ایک سمع خراش شور پیدا ہوا جو رات کے سناٹے میں زیادہ بھیانک لگا۔ کچھ پتھر ٹوٹ کے بونٹ پر گرے اور سکوت شب میں ان کی آواز بھی بم کے دھماکوں کی طرح گونجی۔

غالب نے ٹرک کے رکنے سے پہلے ہی چھلانگ لگا دی تھی۔ "اگر ہم سڑک پر سیدھے چلتے جاتے تو کیا تھا؟"

"ہم سیدھے نہیں جا سکتے۔"

"ہم اس پہاڑ میں سے بھی تو نہیں گزر سکتے" غالب نے کہا۔

"کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا؟" نازو نے تنگ جگہ میں پھنسے ہوئے ٹرک کو ملاحظہ فرما کے کہا "ذرا رفتار بڑھا کے اور تھوڑا تجیر لگا کے کوشش کرتے تو شاید سرنگ بناتے ہوئے پہاڑ کی دوسری جانب نکل جاتے۔ اچھا شارٹ کٹ تھا۔"
"شارٹ کٹ تو ہو جاتا سیدھا ہی" غالب بولا۔
میں نے کہا "تمہارے پیچھے لگ جانے والے شکاری گئے کہاں گئے؟"
"جہاں بالآخر انہیں جانا تھا" غالب نے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ "سیدھے جہنم میں۔ تم تو جانتے ہو میرا نشانہ خطا نہیں جاتا۔"
نازو نے کہا "تو کیا میرا نشانہ خطا ہوتا ہے؟"
"تمہارے جیسے تیر نظر کا نشانہ خطا نہیں ہوا تھا میں مانتا ہوں۔ مگر اس وقت ہم بات کر رہے ہیں اصلی ریوالور اور بندوق کی گولی کی۔"
میں نے کہا "غضب کا نشانہ لیا تھا۔ وہ جو ٹرک موڑ رہا تھا اس کی دائیں آنکھ کا۔ حالانکہ آنکھ چہرے پر تھی اور چہرہ ونڈ اسکرین کے پیچھے اندھیرے میں تھا۔"
رابعہ ہنسی "ٹرک تو بہت پیچھے تھا۔"
نازو نے کہا "اور ڈرائیور کانا تھا پہلے سے۔ اس کی دائیں آنکھ تھی ہی نہیں۔"
"یہ تم نے کیسے دیکھ لیا؟" غالب خفا ہونے لگا۔
"جیسے تم نے دیکھا تھا۔"
"میں تو اُلّو ہوں" غالب نے جھلا کے کہا۔
"پھر میں چمگادڑ ہوں" نازو ہار ماننے والی نہیں تھی۔
میں نے ہاتھوں پیروں کو ورزش کے انداز میں جھٹکا اور ایک انگڑائی لے کر خوابیدہ پہاڑوں اور جنگلوں کی سرد لطیف ہوا میں لمبا گہرا سانس لیا "میرے تو ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے تھے۔"
"ابھی سارا جسم اکڑ جائے گا۔ اتنا بھیگ رہا تھا اور جناب کچھ پہنے بغیر نکل آئے ہیں اتنی سردی میں" رابعہ نے بالکل کسی محبت کرنے والی بیوی کی طرح میری بے پروائی پر مجھے ڈانٹا۔
"کیا!" میں نے منہ کھول کے کہا "کچھ پہنے بغیر؟ یار غالب! دیکھو ذرا کیا میرے جسم پر کچھ نہیں ہے؟"
غالب نے بدمعاشی سے کہا "نظر انکسار کرنے والی ہو تو پھر بقول شاعر قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا۔ والی بات ہو جاتی ہے۔"
رابعہ نے ٹرک میں سے جرسی نکال کے مجھے دی "نمونیہ ہو گیا تو بھول جاؤ گے سب شوخی۔"
میں نے جرسی پہن لی "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں نہیں بھولوں گا۔"
غالب نے پیچھے کی خالی سڑک کے اندھیرے کو دیکھا "ایسا لگتا ہے کہ ہم دشمنوں کے نرغے سے نکل آئے ہیں۔ ہمارے تعاقب میں کوئی ہوتا تو اب تک نظر میں آجاتا۔"
میں نے کہا "ہاں۔ وہ رکنے پر آمادہ ہی نہ تھے۔ سرحد کی ہوا پیے بغیر ہمارا پیچھا کر رہے تھے میرا خیال ہے ان کا ٹرک کھڈ میں گر گیا ہوگا۔"
نازو بولی "ان کے لیے بھی راستہ تو ہم نے ہی صاف کر دیا تھا۔"
"ورنہ وہ کون سے رک جانے" میں نے کہا "شکر ہے۔ جو ہوا اچھا نہیں ہوا۔ کوئی زندہ نہیں بچا ہوگا ان میں سے۔"
"تمہیں کیوں افسوس ہو رہا ہے؟" غالب بولا۔
"میں سرحدی چوکی کے محافظوں کی بات کر رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ سب مارے گئے۔" میں نے کہا "یہ بات زیادہ سے زیادہ صبح ہونے تک چھپی رہ سکتی ہے۔"
غالب نے نفی میں سر ہلایا "ہمیں کیا معلوم کہ سب مارے گئے یا کوئی بچ گیا۔ عام طور پر ایک شخص چوکی میں وائرلیس سیٹ پر بیٹھا رہتا ہے۔ کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے۔ اس کا رابطہ دوسری سرحدی چوکیوں سے اور مرکزی کمان سے رہتا ہے۔"
"ایسا ہوا تو اب تک آگے اطلاع پہنچ گئی ہوگی ہماری تشریف آوری کی اور اگلی چوکی پر ہمارے استقبال کی تیاری مکمل ہوگی۔"
رابعہ نے پریشانی سے کہا "پھر پکڑے جائیں گے ہم؟"
"انشاء اللہ۔ یعنی اللہ نے چاہا تو" غالب بولا "پکڑے تو ہم اکثر جاتے ہیں۔ اب تک تمہیں بھی عادی ہو جانا چاہیے۔"
"مگر یہاں پہنچ کے؟ آزادی کی منزل کے اتنا قریب آ کے؟"
غالب نے کہا "منزل بڑا دھوکا دینے والا لفظ ہے خاتون۔ چوہا اس روٹی کے ٹکڑے کو منزل سمجھ لیتا ہے جو چوہے دان میں لگایا جاتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کی منزل موت ہے۔ منزل کا سراب..."
میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ کیا یہ فلسفہ جھاڑنے کا وقت ہے مرزا؟ یہ بتاؤ اب کیا کریں۔"
"کیا کریں؟ ٹرک کا جائزہ لیں اور روانہ ہو جائیں" نازو نے کہا۔
"یہ تمہاری ناقص العقلی کی دلیل ہے کہ تم سے رائے نہیں مانگی گئی اور تم دے رہی ہو" غالب نے کہا "اور وہ بھی ہمیشہ کی طرح غلط۔"
نازو نے بگڑ کے کہا "پھر کیا اسی لنگڑے ٹرک کو لے جائیں گے ہم؟ جائزہ لیے بغیر۔"
میں نے کہا "ہم ٹرک کو نہیں لے جائیں گے۔ یہ چوری کا ٹرک ہے۔ ہم اس کا سراغ تک مٹا دیں گے۔"
رابعہ نے کہا "پھر قندھار کیسے جائیں گے؟"
"سواریاں زیادہ ہیں اس لیے ایک پر نہیں دو ٹانگوں پر جائیں گے۔" میں نے کہا "کاجل کہاں ہے؟ وہ اتری نہیں۔"
"وہ بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ وہ سو رہا ہے کاجل کی گود

میں سر رکھ کے" نازو نے کہا۔
"یہ کاجل تو مامتا کے سارے فرائض نبھا رہی ہے گی اس پر اور بعد میں روئے گی" غالب نے افسوس سے کہا "جب اسے چھوڑ کے جانا پڑے گا۔ کلیم تو ماں کو بھول گیا ہے۔"
میں نے کہا "جا کے اسے کہو کہ ٹرک خراب ہو گیا ہے۔ ضروری سامان اٹھاؤ اور چلنے کی تیاری کرو۔"
رابعہ اور نازو کے جاتے ہی میں نے اور غالب نے بڑی مہارت کے ساتھ سائنٹیفک طریقوں پر اس ٹرک کا حشر نشر کیا۔ میں نے اس کی سب تاریں نکال کے نیچے پھینک دیں۔ اسپارک پلگ توڑ دیے اور ڈسٹری بیوٹر کیپ توڑ دی۔ غالب نے چاروں پہیوں کے نٹ بولٹ کھول لیے اور سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں اچھال دیے۔ کار ہوتی یا جیپ تو ہم اسے دھکیل کر نیچے لڑھکا دیتے مگر ٹرک بہت بھاری تھا۔ ہم سب مل کے اسے ایک انچ نہیں ہلا سکتے تھے اس لیے بھی کہ ایک بار ڈھلوان تھا اور اس لیے بھی کہ ٹرک چٹانوں میں پھنسا ہوا تھا۔ ہم اسے آگ لگاتے تو شعلے دور بیٹھے دشمنوں کو متوجہ کرتے اور ہماری نشاندہی کرتے۔ اب ٹرک اپاہج اور ناکارہ ہو گیا تھا۔ تار لگانے کے بعد بھی کوئی پہیوں کی طرف دھیان دیے بغیر اسے چلانے کی کوشش کرتا تو پہیے آزاد ہو کے اپنی راہ لیتے اور ٹرک کی باڈی وہیں دھری رہ جاتی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو مجھے حیرت ہوئی۔ رات کے دس بجنے والے تھے مگر یہاں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے آدھی رات گزر چکی ہے۔ ہم شہر کے رہنے والے رونق اور چہل پہل سے بھی وقت کا حساب لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی ایسی جگہ رہتا ہو جہاں رات کے بارہ بجے تک چہل پہل، روشنی اور گہما گہمی کم نہ ہوتی ہو تو سنسان بازار اور گلیاں دیکھ کر اسے لگتا ہے کہ رات کے دو بجے ہوں گے، خواہ اس وقت نو بجے ہوں۔ گاؤں والے سرِ شام سونے کے عادی ہوتے ہیں اور وہاں نو بجے ہو کا وہی عالم ہوتا ہے جو لاہور کی مال پر رات دو بجے بھی نہیں ہوتا۔ یہاں تو نہ کوئی گاؤں تھا نہ آدم زاد۔ سنسان پہاڑوں میں رات کا اندھیرا اور سکوت جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی خاموشی کو بھیڑیے یا گیدڑ کے چلانے کی آواز مجروح کر دیتی تھی۔ سردیوں میں گیدڑوں کا چلانا ایک عام سی بات ہے مگر اس وقت ہم سب کو خوف نے مفلوج کر دیا جب قریب ہی سے کوئی شیر دہاڑا۔ شیر نیچے وادی میں تھا مگر اس کی دہاڑ سے پیدا ہونے والی گونج کی بازگشت چاروں طرف پھیلے ہوئے پہاڑوں کی پتھریلی دیواروں سے ٹکرائی تو کچھ اور بھیانک ہو گئی۔
کاجل ابھی کلیم کے ساتھ ٹرک سے اتری ہی تھی۔ اس نے سب سے پہلے چیخ ماری اور کلیم کو بھینچنے لگی "اوہ یہ جنگل ہے۔"
نازو نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "شیر" اور رابعہ سے لپٹ گئی۔
رابعہ خود کون سی بہادر تھی۔ اس نے بدحواسی میں کہا "شیر۔ یہ اصلی شیر کی آواز ہے۔"
میں نے متانت سے کہا "آواز سے کچھ پتا نہیں چلتا کہ شیر اصلی ہے یا نقلی۔"
غالب نے میری تائید کی "کیا پتا کوئی لومڑی خواہ مخواہ دہشت پھیلا رہی ہو شیر کی آواز بنا کے۔ بہت مکار چیز ہے لومڑی۔ عورت سے بھی زیادہ۔"
رابعہ نے اپنے ساتھ نازو کو بھی کھینچ لیا "یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں۔ ٹرک پر چڑھ جاتے ہیں۔"
"ہاں۔ کیا پتا شیر آدم خور ہو" نازو نے کہا اور رابعہ کے ساتھ پھر ٹرک میں گھس کے بیٹھ گئی۔
"اب آپ زیادہ بہادر نہ بنیں" رابعہ نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا "شیر کے آنے سے پہلے اندر آ جائیں۔"
غالب نے کہا "پہلے یہ تو دیکھ لیں کہ شیر آدم خور ہے یا نہیں۔"
"یہ کیسے دیکھو گے تم؟" نازو بولی۔
میں نے کہا "اگر اس نے مجھے کھا لیا تو غالب دیکھ لے گا اور تمہیں بتا دے گا ورنہ میں آپ کو مطلع کروں گا۔"
"اور ہم دونوں کو کھا لیا تو ظاہر ہے آپ کو کل کا اخبار دیکھ کے پتا چل جائے گا کہ شیر واقعی آدم خور تھا" غالب بولا۔
"ہمالیہ کی ترائی میں آدم خور شیر ہوتے ہیں۔ جم کاربٹ نے لکھا ہے" کاجل نے کہا۔
"پھر تو یہ ہمالیہ کی ترائی ہے۔ کڑا!" میں نے سگریٹ کا کش لے کر چاروں طرف کا جائزہ لیا "واپس جا کے میں بھی کوئی کتاب لکھوں گا کہ کس طرح میرا گزر آدم خور شیروں کی بستی سے ہوا۔"
"ایک سفرنامہ۔ میں بھی رقم فرماؤں گا کہ کیسے میرا گزر کوہ قاف پر سے ہوا جہاں مجھے پریوں نے روکنے اور ورغلانے کی بہت کوشش کی مگر میں کہاں ان کے قابو میں آنے والا تھا" غالب نے کہا۔
میں نے ہنس کے کہا "ہاں۔ جیسے یورپی ممالک کے سفرنامے لکھنے والے حضرات بھی لکھتے ہیں کہ انہوں نے ایمان کی سلامتی کو عزیز جانتے ہوئے نہ کسی میم کو منہ لگایا نہ دخترِ انگور کو۔ جیسے پارسا گئے تھے ویسے ہی..."
میری بات ادھوری رہ گئی۔ رابعہ اور نازو نے یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم سمجھنے والے نہیں ہیں، خود کو ٹرک کے کیبن میں بند کر لیا تھا۔ انہیں کچھ خفت بھی تھی کہ صرف آواز سن کے وہ شیر کی دہشت میں مبتلا ہو گئیں۔ میں اور غالب بظاہر پُرسکون اور مطمئن تھے کیونکہ سامنے کچھ نہیں تھا۔ شیر کی آواز بہت دور سے سنائی دی تھی اور ہمارا خیال تھا کہ وہ نیچے کہیں وادی میں گھوم رہا ہوگا۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ آواز کسی اور شیر کی تھی اور ہمارے سامنے

www.paksociety.com

خاموشی سے دوسرا شیر آگیا۔ یا ہم نے آواز سن کے جو اندازہ قائم کیا تھا' وہ غلط تھا۔ پہلے تو اچانک سڑک پر اندھیرے میں دو چراغ سے روشن نظر آئے۔ جہاں پہلے رات کی سیاہ چادر میں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا وہاں دو قدم پر سی چنگاریاں دیکھتے ہی جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا اور نامکمل جملہ میرے حلق میں پھنس گیا۔ ہم سے چند سو گز کے فاصلے پر عین سڑک کے بیچ میں کوئی شیر موجود تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شیر' چیتے اور بھیڑیے کی آنکھیں اندھیرے میں روشن نظر آتی ہیں۔ شیر کا پیٹ خالی نہ ہو تو وہ کسی بھی جانور پر حملہ نہیں کرتا اور آدم خور تو شاذ و نادر بحالتِ مجبوری بنتا ہے مگر اس کے نام کی دہشت اچھے اچھے سورماؤں کے ہوش اڑا دیتی ہے۔

غالب نے میرے اچانک خاموش ہونے یا میری صورت کے تاثرات سے کچھ اندازہ کیا اور پلٹ کے دیکھا۔ پھر ہم دونوں بھاگے اور ٹرک کے عقبی حصے سے اندر کود گئے۔ وہاں کاجل بھی کلیم کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی سوالیہ نظروں کا جواب میں نے سہلا کے دیا اور اپنا ریوالور نکال لیا۔

"شیر... تو سچ مچ آگیا" غالب نے کہا "اگر یہ سچ مچ آدم خور ہوا اور سچ مچ ہمیں کھا گیا..."

میں نے بہادری سے کہا "دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام۔"

"یعنی ہم میں سے کسی پر اس شیر کا نام لکھا ہوا ہے؟" غالب بولا "تم ذرا پوچھ لو شیر سے کہ وہ نام کس کا ہے۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"ہم دیکھ لیں گے کہ کس دانے کو رخصت کرنا ہے۔ کم سے کم گلے مل کے تو رخصت کریں گے اسے۔ بائی دا وے' یہ شیر کتنا پڑھا ہوا ہے؟ یہ کیسے پڑھے گا کسی دانے پر اپنا نام...؟" اس نے ریوالور کا رخ سڑک کی طرف رکھا۔

"یہ سب کچھ تم براہ راست شیر سے بھی پوچھ سکتے ہو۔"

"وہ... سکندر بادشاہ! تم تو جانتے ہی ہو' میں کتنا بزدل آدمی ہوں۔" غالب نے کہا۔

شیر بڑے وقار سے چلتا نمودار ہوا اور عین ہمارے سامنے آ پہنچ کے رک گیا۔ کاجل کی تو گھگھی بندھ گئی تھی اور وہ کلیم سمیت فرش پر یوں اوندھی پڑی تھی جیسے لوگ بمباری کے وقت لیٹتے ہیں۔ میں اور غالب شیر کو دم سادھے دیکھتے رہے۔ جنگل کے بادشاہ سے منسوب ہلاکت آفرینی اور خون آشامی کی سب روایات' قصے اور واقعات جو ہم نے سنے اور پڑھے تھے یا فلموں میں دیکھے تھے' ذہن میں تازہ ہوگئے تھے اور جیسا کہ مشہور ہے' ہم سرانڈر ہوگئے تھے۔ سرکس یا چڑیا گھر کے پالتو اور بے بس' غلام شیر کو دیکھنے کی عادت میں اب تفریح کا بھی کوئی پہلو باقی نہیں رہا تھا لیکن یہ ایک پُرخطر' پُرخوف اور سنسنی خیز تجربہ تھا جہاں ہم بے بس تھے۔ انسان کی فطری ذہانت پر ایک جانور کی حیوانی جبلت کو برتری حاصل تھی۔

ہم سے ہزار گنا جسمانی طاقت رکھنے والا شیر ایک جست لگاتا تو ہماری فائرنگ بھی اسے روک نہیں سکتی تھی۔ ریوالور کی گولی اس کی بے پناہ قوت کے مقابلے میں بہت حقیر چیز تھی۔

شیر کچھ دیر ٹرک کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی روشن' انگارہ آنکھیں مجھے خود پر مرکوز محسوس ہو رہی تھیں۔

"خبردار! کوئی مت چلانا" غالب نے سرگوشی کی۔

میں نے سہلایا "کوئی حرکت بھی مت کرنا جو اسے مشتعل کردے۔"

خوف کی سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر چکی تھی مگر میرے حواس باقی تھے۔ رابعہ اور نازو کی آوازیں بند ہوگئی تھیں۔ غالبا انہیں بھی احساس تھا کہ اس وقت چیخ پکار سن کے مدد کرنے والا تو کوئی نہیں آئے گا مگر شیر کو شاید یہ ہنگامہ آرائی پسند نہ آئے۔

شیر کا بھاری بھرکم' سیاہ پیکر جاہ و جلال کی تصویر بنا سڑک کے وسط میں موجود تھا اور ابھی تک اس کے رویے سے ٹرک کی موجودگی پر برہمی کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ وہ اس مشتعل جانور کو اپنی مملکت میں دخل اندازی کی سزا دینے کے موڈ میں ہوتا تو پہلے غراکے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار ضرور کرتا مگر وہ پُرسکون تھا۔

وہ چند منٹ ہم پر چند گھنٹوں سے زیادہ بھاری تھے۔ جب ہم شیر کو دیکھتے رہے اور وہ اپنے غرور آمیز انداز بے نیازی سے ہماری حالتِ زار پر غور فرماتا رہا۔ غالبا وہ ڈنر سے فارغ ہو چکا تھا اور شکم سیری کے بعد کی غنودگی کا شکار تھا یا محض ایک امن پسند اور رحم دل شیر تھا۔ بالآخر اس نے حرکت کی اور چند قدم چل کے پھر رک گیا۔

"تھینک یو سر" غالب نے گہری سانس لے کر کہا "کہ آپ نے ہمیں معاف کیا۔"

"حالانکہ ہمارے ہم جنسوں نے آپ کی نسل کا خاتمہ کرنے میں بڑی سفاکی سے کام لیا" میں نے ریوالور پر اپنی گرفت ڈھیلی کردی۔

"یہ ایک شریف النفس' نیک دل اور جمہوری مزاج رکھنے والا بادشاہ تھا جو شاید اپنی رعایا کا حال معلوم کرنے کے لیے سلطنت کا دورہ کرنے نکلا ہے" غالب نے کہا "میں بھی معلوم کروں کہ دوسری طرف کیا حال ہے۔"

"دوسری طرف؟"

"ہاں۔ زنانہ ڈبے میں" غالب بولا "دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ بھی آج سچ ثابت ہوگیا۔"

میں نے کہا "کون سا جھوٹ؟"

"جس پر جھوٹ بولنے کے عالمی مقابلے میں پہلا انعام ملا تھا کہ ایک جگہ دو بے تکلف سہیلیاں خاموش بیٹھی تھیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہ خاموشی نہیں بے ہوشی ہے غالبا۔"

"میں نیچے اتر کے دیکھتا ہوں۔"

"ابھی کوئی ضرورت نہیں۔ بادشاہ سلامت سامنے کھڑے ہیں۔ اسے گستاخی نہ سمجھ لیں۔"

اسی وقت شیر نے یوں سر گھما کے دیکھا جیسے اس نے ہمارے ریمارکس نوٹ کرلیے ہوں' پھر وہ آگے بڑھ گیا۔

آگے سے نازو کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی "غالب' تم کہاں ہو؟"

"میں یہاں ہوں" غالب نے اس کی نقل اتاری "اور خوف سے بے ہوش پڑا ہوں۔ آکے مجھے نمک سنگھاؤ۔"

شیر کے اور ہمارے درمیان اب بیس پچیس گز کا فاصلہ تھا اور وہ ایک موڑ پر کھڑا ہوا تھا۔

نازو نے کہا "شیر تو چلا گیا۔"

غالب نیچے اتر گیا "تم کہو تو پھر بلا لاؤں۔ کان سے پکڑ کے تمہاری خدمت میں حاضر کردوں۔"

"اس نے ہمیں کچھ بھی نہیں کہا" نازو بولی۔

"تمہاری وحشت ہی ایسی ہے" غالب نے کہا "میری آواز نہیں نکلی تو اس بلی کے بھتیجے کی کیا مجال..."

"بھانجے کی" نازو نے تصحیح کی "شیر کی خالہ ہوتی ہے بلی۔"

میں نے کاجل کو تسلی دے کے اٹھایا "حد ہوگئی۔ تم اتنی ڈرپوک ہو۔ شیر انسانوں سے تو زیادہ ظالم نہیں ہوتے۔"

کاجل نے سہلایا "مجھے کلیم کی فکر تھی۔"

"مگر میں تو نہیں ڈرا تھا" کلیم نے کہا۔

"تم بہادر باپ کے بہادر بیٹے ہو نا" کاجل نے کہا۔

میں نیچے اتر کے کیبن کے دوسری جانب گیا اور دروازہ بجا کے رابعہ سے کہا "ہیلو۔"

وہ غالب کی طرف متوجہ تھی۔ میری آواز پر اچھل پڑی۔

میں نے کہا "بابا میں شیر نہیں ہوں۔"

غالب نے کہا "آدم خور تو ہو۔"

اسی وقت آسمان پر روشنی کا کوندا سا لپکا۔ پھر یہ روشنی اندھیرے میں لہرانے لگی۔

غالب نے کہا "یہ کیا ہے؟"

"کوئی گاڑی آرہی ہے۔ راستے کے نشیب و فراز سے لائٹ اوپر نیچے ہو رہی ہے" میں نے کہا۔

"اس وقت ادھر کون آسکتا ہے؟"

"شکاری ہمارے تعاقب میں تھے۔ ان کے سوا کون ہوگا۔ اب تو ٹرک سے نکل کے کہیں دور جا کے چھپنے کا وقت بھی نہیں رہا" میں نے کہا۔

غالب بولا "کوئی بات نہیں۔ یہ مورچہ بھی مقابلے کے لیے برا نہیں ہے۔"

رابعہ نے کہا "ہم سے پہلے تو ان کا مقابلہ جنگل کے بادشاہ سے ہوگا۔"

"کاش اگر بادشاہ سلامت' ہم دعا کے قرار نہ ہوئے" غالب نے کہا۔

"اس شیر کو اتنا ذلیل بھی مت کرو" نازو بولی "وہ کوئی چوہا نہیں ہے تمہاری طرح۔"

"تم نے سنا سکندر؟ اس نے مجھے سرعام چوہا کہا ہے اور وہ بھی آدھی رات کے وقت۔ ساری دنیا نے سنا ہوگا..."

غالب کا احتجاج جاری تھا کہ شیر دہاڑا۔ وہ موڑ کاٹ کے ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا مگر پھر بھی اس کی آواز نے سب کے اوسان خطا کردیے۔ شیر کے دہاڑنے کا یہ انداز بھی مختلف تھا۔ اب وہ غصے میں گرج رہا تھا۔

میں اور غالب دوڑ کے واپس ٹرک کے پچھلے حصے میں پہنچ گئے۔ روشنی بہت قریب سے جھلک دکھا کے غائب ہو چکی تھی اور شاید اسی چندھیا دینے والی لائٹ نے شیر کو مشتعل کردیا تھا۔ میرے کان اب کسی ٹرک کے انجن کی آواز بھی سن رہے تھے۔ شیر پھر گرجا۔

"آخر ہے نا جانور۔ عقل ہوتی تو خاموشی سے گھر چلا جاتا۔" غالب نے کہا "مارا جائے گا اس اکڑفوں میں۔ ہم نے تو معاف کردیا تھا مگر موت میں ورنہ..."

غالب کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی شیر کی زبردست دہاڑ کے ساتھ فائر ہوا اور پھر جیسے قیامت آگئی۔ ایک ساتھ بہت سے انسانوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں' شیر کی مسلسل گرج اور فائرنگ کے شور سے جنگل اور پہاڑ گونجنے لگے۔ کسی گاڑی کا ہارن شارٹ ہوکے ایک بھیانک چیخ بن گیا۔ فولادی ڈھانچے اور چٹانوں کے ٹکرانے کی سمع خراش آوازوں کے ساتھ ہی ہیڈ لائٹس کا رخ کئی بار بدلا۔ روشنی کی تھوڑی لکیروں نے تاریک آسمان کا نشانہ لیا پھر گھوم کر وادی کے نشیب کی طرف گئیں اور غائب ہوگئیں۔

شیر اب بھی دہاڑ رہا تھا مگر اس کی گھن گرج میں پہلے جو غیظ و غضب تھا' وہ اب اذیت بھری فریاد میں ڈھل گیا تھا۔ میں نے چشمِ تصور سے وہ پورا منظر دیکھا جو میری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ زخمی شیر سڑک پر دم توڑ رہا تھا اور ہمارے تعاقب میں آنے والی دوسری فوجی گاڑی اس کے حملے سے بے قابو ہوکے ہزاروں فٹ کی گہرائی میں گرتی جارہی تھی۔ اس گاڑی میں بیٹھے ہوئے افراد کے جسم بھی ٹوٹ پھوٹ گئے تھے اور گاڑی کے اجزا کی طرح بکھرتے جارہے تھے۔ وہ سب جو چند منٹ پہلے زندگی کی بھرپور توانائی کے ساتھ حوصلے اور عزم سے امید کا رشتہ قائم کیے اپنی طاقت کی برتری ثابت کرنے کے لیے بڑھتے چلے آرہے تھے اور موت کے تصور سے بھی دور تھے' اچانک زندگی سے محروم ہوگئے تھے۔ کوئی شکاری نہیں جانتا کہ سب سے زیادہ پُرفریب اور سفاک شکاری وہ اجل ہے جو لمحہ لمحہ زندگی کے ساتھ ہم قدم چلتی ہے اور کہیں' کسی بھی لمحے اگلے قدم سے پہلے راستہ کاٹ دیتی ہے۔

جب غالب نے کہا "ہوائی گاڑ! تو میں ہی نہیں' ہم سب

www.paksociety.com

چونکے۔ ہم سب کی آنکھوں کے سامنے ایک ہی بھیانک تصویر تھی جسے ہم وم سادھے' پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہے تھے۔

وادی کی گہرائی میں ایک شعلہ سا روشن ہوا اور پھر ایک دھماکا سنائی دیا۔ میں اور غالب ٹرک سے کود کر موڑ کی جانب لپکے۔ رابعہ اور نازو نے چلا کے ہمیں روکنے کی بے سود کوشش کی۔ پھر وہ بھی ہمارے پیچھے دوڑنے لگیں۔

"غالب! سنو۔ دیکھو شیر کے قریب مت جانا۔" نازو نے چیخ کر کہا۔

رابعہ نے فوراً مجھے ٹوکا "سکندر! کیا پتا ان میں سے کوئی سڑک پر کود گیا ہو' ٹرک کے گرنے سے پہلے۔ آگے مت جاؤ۔"

لیکن میں اور غالب ان کی سنے بغیر موڑ تک جا پہنچے۔ میرا سانس پھول گیا تھا حالانکہ درمیانی فاصلہ سو گز سے بھی کم تھا لیکن یہ پہاڑی راستہ تھا جس میں ہمارے سامنے پندرہ سے بیس درجے کی چڑھائی تھی۔

موڑ کے قریب میں نے غالب کو روک لیا۔ ہم اپنے اپنے ریوالور ہاتھ میں پکڑے دوسری طرف کی آوازوں پر کان لگائے کھڑے رہے۔ رابعہ اور نازو بھی ہانپتی ہوئی ہمارے ساتھ شامل ہو گئیں۔

نازو نے بدحواسی میں ایک احمقانہ سوال کیا "کیا شیر مر گیا؟"

غالب نے اسے گھور کے دیکھا "ہاں۔ یہ اس کی روح کے کراہنے کی آواز ہے۔"

"میرا مطلب تھا۔ کیا وہ مر جائے گا؟" نازو بوکھلا گئی۔

"ابھی اس کا طبی معائنہ کر کے بتاتا ہوں۔ مر گیا تو شہید کہلائے گا" غالب بولا "اب تیسرا احمقانہ سوال کیا تو اٹھا کے زخمی شیر کے سامنے ڈال دوں گا۔"

میں نے چند قدم آگے جا کے چٹان کی اوٹ سے دیکھا۔ شیر سڑک پر پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا اور اس کے حلق سے نکلنے والی دھاڑ اب ایک پُرعذاب خرخراہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ نیچے وادی میں ایک بڑا شعلہ کسی الاؤ کی طرح بھڑک رہا تھا۔ آس پاس چند دیے بھی روشن تھے۔ یہ گاڑی کا جلتا ہوا ڈھانچہ تھا جس کے کچھ شکستہ سے ابھی جل رہے تھے۔

آہستہ آہستہ شیر خاموش ہو گیا۔ ہم سب دور سے اس کو مرتا ہوا دیکھتے رہے جو ہماری جان لینے نہیں ہماری جان بچانے کے لیے اپنی جان قربان کرنے آیا تھا۔ اسے بھی انتظامِ دستِ غیب کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہم اس سے ڈر رہے تھے جب کہ وہ فرشتۂ غیب کی طرح ہمیں دشمنوں سے نجات دلانے کے لیے آیا تھا۔ اس نے گاڑی پر حملہ کیا ہو گا۔ اس سے ڈرائیور کا بدحواس ہونا لازمی تھا۔ دوسرے لوگوں نے اسے دیر سے دیکھا ہو گا اور فائرنگ کر کے شیر کو ہلاک کرنے کی کوشش میں دیر کی ہو گی۔ شاید جست لگا کے شیر گاڑی کے بونٹ پر گرا ہو گا۔ اس کے بعد

ڈرائیور کو سامنے کچھ نظر نہ آیا ہو گا۔ اس کے لیے گاڑی کے اسٹیئرنگ پر کنٹرول رکھنا بھی ناممکن ہو گیا ہو گا۔ ایک تو خوف اور دہشت کے باعث اور دوسرے شیر کے وزن کی وجہ سے جو مشتعل ہونے کے باعث مسلسل حرکت کر رہا ہو گا۔ اور ممکن ہے اس کے حملوں نے ونڈ اسکرین کو بھی توڑ دیا ہو۔ میں نے یہ سب نہیں دیکھا تھا مگر میں جانتا تھا کہ یہی ہوا ہو گا۔ میں اس حادثے کا پورا منظر اپنے تصور میں دیکھ رہا تھا۔

میں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا تو غالب نے مجھے روک لیا' "بس۔ اور آگے مت جاؤ۔"

میں نے کہا "کیوں' اب کیا ہے؟ شیر کی لاش سے کیا ڈرنا۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "دور سے ایسا ہی لگتا ہے مگر شیر ابھی مرا نہیں ہو گا۔ مرنے سے پہلے وہ آخری سانسیں لینے کے لیے اٹھے گا۔"

نازو نے اسے پیچھے کھینچا "تم اتنے قریب کیوں کھڑے ہو؟"

غالب نے خفگی سے کہا "میں قریب کھڑا ہوں' تم خود میرے قریب آ کے کھڑی ہوئی ہو۔ تم نے خود میرا بازو پکڑا اور اب خود اپنی طرف کھینچ رہی ہو' شرم تم کو مگر نہیں آتی۔۔۔"

نازو نے اسے دھکا دیا "اچھا جاؤ' مرو۔ آگے جا کے شیر کی مونچھیں اکھاڑ لو۔"

غالب نے ایک پتھر اٹھایا اور شیر کی طرف پھینکا۔ پتھر بلند آواز کے ساتھ سڑک پر گرا مگر شیر کو نہیں لگا۔

"کیا پاگل ہوئے ہو؟" نازو نے کہا۔

"شیر زندہ ہوتا تو پتھر کی آواز پر چونکتا۔" رابعہ نے فیصلہ دیا۔

"ابھی پتا چل جاتا ہے" غالب بولا اور اس نے دوسرا پتھر اٹھا کے شیر کو مارا' جو شیر کے سر پر لگا۔

ایک آخری زبردست دہاڑ کے ساتھ شیر نے تڑپ کر سر اٹھایا اور پھر جسم کی باقی ماندہ توانائی کے ساتھ اٹھنے کی کوشش کی۔ سب پلٹ کے بھاگے۔ بھاگنے والوں کی قیادت غالب کر رہا تھا۔ اپنے ساتھ وہ نازو کو بھی ایسے کھینچ کر لے جا رہا تھا جیسے ٹرین کا انجن صرف ایک بوگی کو لے کر بھاگا جا رہا ہو۔ دوسرا انجن یعنی میں ان ٹریک پر رابعہ کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔

چند قدم دوڑ کے مجھے خاموشی کا اور اس سے زیادہ اپنی بزدلی کا احساس ہوا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو شیر وہیں پڑا ہوا تھا۔

"مبارک ہو مرزا جی! شیر مر گیا" میں نے کہا۔

غالب نے رک کر پیچھے دیکھا اور زبردستی دانت نکال کے بولا "دیکھا کیسا ناک کے نشانہ لیا تھا۔"

نازو نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "بڑی بہادری کی۔ مرے کو مارے شاہ مدار۔"

رابعہ نے بھی نازو کی حمایت کی "ہاں۔ پتھر مارنے کی ضرورت تھی آخر؟ وہ ویسے ہی مر جاتا۔"

"خاتون! وہ میرا پتھر لگنے سے ہلاک ہوا ہے۔ زنانہ تعصب اور حسد کی عادت کے باعث تم مجھے کریڈٹ نہ دینا چاہو تو میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔" غالب بولا "کیا تم نے دیکھا نہیں' اپنی آنکھوں سے کہ آتی' دیکھا ہی ہو گی تمہیں مگر وہ زندہ تھا۔ میں نے بس ایک پتھر مارا اور وہ مر گیا۔"

میں نے غالب کی تائید کی "اب تم ایک مستند یافتہ شکاری ہو۔ ہم سب گواہ ہیں کہ تم نے ہمالیہ کی ترائی میں ایک ببر شیر کو خالی ہاتھوں سے پتھر مار کے شکار کر لیا تھا۔ ایسا تو جم کاربٹ بھی نہیں کر پایا تھا۔ وہ بڑی توپ قسم کی رائفلیں استعمال کرتا تھا۔"

غالب انکساری سے بولا "مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔"

میں نے اس کی کمر پر ہاتھ مار کے کہا "چلو سپاہی' اب اگلے مورچے کی طرف مارچ کرو۔"

"دسمبر کے مہینے میں مارچ کیسے ہو سکتا ہے؟" غالب بولا مگر نازو کے ساتھ چل پڑا "تم دیکھنا' میں کیسی تہلکہ خیز کتاب لکھتا ہوں واپس جا کے۔ شیر کا شکار تو ہمارے آباؤ اجداد نے خواب میں بھی نہیں کیا ہو گا حالانکہ وہ بھی شکاری تھے۔ خاندانی شکاری۔"

نازو نے جلا کے کہا "اپنی عقل کے پیچھے لٹھ لے کر پھرتے ہوں گے۔ اسی کا شکار کرتے ہوں گے۔"

"نہیں۔ میں نے بچشمِ خود انہیں متعدد جانور ہلاک کرتے دیکھا تھا۔ مجال ہے جو ان کی نظر سے کوئی چھپکلی' چوہا یا کاکروچ اور مچھر بچ کے نکل جائے۔ اس سے بڑا جانور صرف بلی تھی جسے وہ شادی کی پہلی رات ہی مار چکے تھے۔ وہ جو محاورہ ہے نا گربہ کشتن روزِ اول۔ وہ انہی سے منسوب ہے۔"

"غالب! خدا کے لیے بند کرو یہ بک بک" نازو بولی۔

غالب نے افسوس سے سر ہلایا "تم دیکھنا' وہ کتاب کیسے دھڑا دھڑ بکے گی۔ ایسے شیر کو پتھر مار کے ہلاک کرنے والا واقعہ آج تک کوئی ہوا ہے؟ میں تھوڑی بہت رنگ آمیزی ضرور کروں گا' زیبِ داستاں کے لیے۔ مثلاً یہ کہ چاندنی رات تھی اور تم میرے ساتھ تھیں۔ زبردست منظر کشی ہوگی کہ کیسے تم نے شیر کی دہاڑ سنی اور ڈر کے چیخ ماری۔۔۔"

اس کے ساتھ ہی غالب نے چیخ ماری کیونکہ نازو نے اسے خاموش کرنے کے لیے آخری حربے کے طور پر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا کے آگے اچھال دیا تھا۔ وہ میرے قریب آ کے گرا۔ میں اور رابعہ ٹرک کے پاس کھڑے غالب کی باتوں پر ہنس رہے تھے۔ اس نے ہمیں ہنسا کر ہمارے اعصاب کو خوف سے نجات دلا دی تھی اور اس حادثے کے ذہنی دباؤ کو ختم کر دیا تھا۔

غالب کپڑے جھاڑ کے اٹھا "یہ لڑکی نفسیاتی مریض ہے' کچھ قاتلانہ رجحانات رکھتی ہے' احساسِ کمتری کا شکار ہے اور کسی سے سچ بھی نہیں سن سکتی۔۔۔ تم تو مانتے ہو نا مجھے عظیم شکاری؟"

میں نے کہا "بالکل مانتا ہوں۔ تمہاری کتاب کا دیباچہ میں ہی لکھوں گا مگر ابھی چلنے کی فکر کرو۔"

رابعہ نے کہا "ہاں۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

غالب نے کہا "کیا آپ کو کسی پارٹی میں وقت پر پہنچنا تھا خاتون؟ فکر نہ کریں' ایک دو گھنٹے کی تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

رابعہ جھینپ کر مسکرانے لگی "میرا مطلب تھا کہ صبح ہو گئی تو ہمارا چھپے رہنا مشکل ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ شیر کی لاش ملتے ہی خبر دور دور تک پھیل جائے گی۔ پھر حادثے کا سراغ مل جائے گا اور ہمارا یہ ٹرک۔۔۔"

غالب بولا "جسے آپ نے پہاڑ سے گزارنے کی کوشش کی تھی۔"

"کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ سوئی کے ناکے سے لوگ اونٹ گزار لیتے ہیں" رابعہ بولی۔

میں نے تالی بجا کے کہا "کم آن۔ گپ شپ کے لیے وقت نہیں ہے۔ سامان اٹھاؤ اور چلو۔ یہ وردیاں اسی ٹرک میں چھوڑ دو' صرف اپنے کپڑے کافی ہیں۔"

رابعہ نے کہا "مگر یہاں تو بہت سردی ہے۔"

"میرا تو خون بھی جمنے لگا ہے" نازو نے کہا۔

"خون سفید ہو تو جلد جم جاتا ہے" غالب بولا "مگر میں خواتین کے مؤقف کی حمایت کرتا ہوں۔ اس سردی سے بچانے والی یہی گرم فوجی وردیاں تھیں۔"

میں نے کہا "یار' یہ ہمارے لیے مصیبت بن جائیں گی۔ کوئی بھی دیکھے گا تو شک میں پڑ جائے گا کہ آخر فوجی قافلہ پیدل کیوں جا رہا ہے۔ اور اس قافلے میں ایک بچہ کیوں شامل ہے۔ یہ وردیاں کسی کو بھی فٹ نہیں تھیں۔ ٹرک میں بیٹھے ہوئے تھے تو پتا نہیں چلتا تھا مگر اب ذرا ملاحظہ کرو' مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ کو کتنی بڑی ہے ان کی وردی۔"

غالب نے کہا "کیوں نہ یہ دونوں مل کے ایک ہی وردی پہن لیں۔ ایک تہائی نازو کو کافی ہو گی' دو تہائی میں رابعہ آ جائے گی۔"

میں نے کہا "سردی کا علاج یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کمبل کو بکل مار کے استعمال کریں۔ چلنے سے بھی جسم میں گرمی پیدا ہو گی۔"

"پیدل چلنا بھی تو مشکل ہے" رابعہ نے رونی صورت بنا کے کہا۔

"اللہ حساب لے گا تم سے اس ظلم کا جو اس وقت ہم پر ہو رہا ہے" نازو نے کہا۔

پیدل چلنا واقعی بہت مشکل کام تھا۔ فروری کا مہینہ تھا' جب ان پہاڑوں پر درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے رہتا ہے۔ آدھی رات کے بعد سردی انتہا پر تھی۔ اندھیرے راستے پر ایک ایک قدم اٹھانا ہم سب کی قوتِ برداشت کا امتحان بن گیا۔ اس پیشہ

قدری کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کمبل تھا۔ رابعہ اور نازو نے تو اسے شال کی طرح اوڑھ لیا تھا اور انہیں شال کو دوپٹے کی طرح استعمال کرنا بھی آتا تھا مگر میں اور غالب بکل مار کے چلنا نہیں جانتے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں ضروری سامان بھی تھا۔ خاکی زین کا ایک بیگ میرے ہاتھ میں تھا۔ اس میں سارا اسلحہ اور نقدرقم تھی اور ہمارے پاسپورٹ تھے۔ دوسرا تھیلا غالب نے اٹھا رکھا تھا جس میں کھانے پینے کا سامان بھرلیا گیا تھا۔ کمبل باربار میرے کندھوں پر سے پھسل جاتا تھا اور میں اسے ٹھیک کرتا تھا تو باہر کی یخ بستہ ہوا کا جھونکا جسم کی ساری گرمی کو کھا جاتا تھا۔ یہی حال غالب کا بھی تھا۔ کمبل کو ساتھ رکھنا مشکل تھا مگر اسے چھوڑنا زیادہ مشکل تھا۔

کاجل نے بڑی صفائی سے کلیم کو بھی اپنے ہی کمبل میں لپیٹ لیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی عمر کے اعتبار سے کلیم نے ہم سب سے بڑھ کر ہمت اور قوت برداشت کا ثبوت دیا۔ نہ اس نے نیند کی شکایت کی نہ بھوک کی' نہ وہ سردی سے گھبرایا اور نہ تھکن سے۔ الٹا وہ کاجل کا حوصلہ بڑھاتا رہا اور اسے بتاتا رہا کہ سرحد کے پہاڑی علاقوں میں اس سے بھی زیادہ سردی پڑتی ہے۔

کاجل نے کہا "تمہیں کیسے معلوم؟"

"ہمارا باپ نے بتایا۔ ادھر ہمارا سب لوگ رہتا ہے۔ ہم پٹھان لوگ کا زندگی بہت سخت ہے۔ ادھر بجلی نہیں' پانی کچھ نہیں ہوتا۔ سڑک بھی نہیں ہوتا۔ اسکول تھانہ کچھ نہیں۔"

"گاڑیاں پھر کیسے چلتی ہیں؟"

کلیم ہنسنے لگا "جب سڑک نہیں ہے تو گاڑی کہاں سے آئے گا؟ سب پیدل چلتا ہے یا گھوڑے پر۔ غریب لوگ کئی میل دور سے پانی لاتا ہے۔ ادھر اسپتال بھی نہیں ہے' علاج کا واسطے شہر جانا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"پھر وہاں لوگ زندہ کیسے رہتے ہیں؟" کاجل نے حیرانی سے کہا۔

"بس زندہ رہتا ہے۔ تھوڑا فصل ہوتا ہے' تھوڑا مویشی۔ اپنا مکان پتھر سے خود بناتا ہے۔"

"اور تم ایسی جگہ رہو گے؟ شہر سے جا کے..."

"ہاں دیدی۔ اپنا لوگ ہے ادھر' وہ بھی تو رہتا ہے" کلیم نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

میں اور غالب ان کے آگے چلتے ہوئے ساری گفتگو سن رہے تھے۔ سب سے پیچھے نازو اور رابعہ تھیں اور ان کی خاموشی بتاتی تھی کہ کلیم کی باتیں انہیں بھی متاثر کررہی ہیں۔

غالب نے کہا "کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا "سوچ رہا ہوں کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔ اچانک ایک گھر ملے' اس گھر کا میزبان دروازے پر ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے موجود ہو' اندر آتش دان روشن ہو اور حرارت ہو۔ میز پر چائے کی کیتلی اور پیالیاں رکھی ہوں' فضا میں چائے کی مہک ہو۔"

"کون سی چائے؟"

"کوئی سی بھی' سبز چائے یا گلابی' کشمیری یا قہوہ..."

"یار' خواب تو ڈھنگ سے دیکھو۔ چائے کی جگہ کافی ہو۔ اس کے ساتھ کلب سینڈوچ۔ فضا نغمۂ ساز سے معمور ہو۔ میزبان ہول صاحب خانہ کی دختران بے مثال۔ منی اسکرٹ میں اور..."

میں نے کہا "بس۔ اب تم چیزی سے اتر گئے ہو۔ نازو کو بتاؤں کہ تمہاری آخری خواہش کیا تھی۔ ابھی خواب اور حقیقت کا پتا چل جائے گا۔ مرزا جی' ہم لندن میں نہیں ہیں' ان پہاڑوں کی ویرانی میں سرگرداں ہیں۔"

غالب نے ایک سرد آہ بھری "ایک تو تم مجھے اپنی مرضی سے خواب تک نہیں دیکھنے دیتے۔ جو بھاری تھیلا تھا وہ مجھے پکڑا دیا ہے کیونکہ ہماری بدقسمتی ہے یا بے وقوفی کہ تم کو مشن کمانڈر بنا لیا۔"

"مشن پورا ہو چکا۔ یہ عہدہ خالی ہے۔ تم چاہو تو میری جگہ لے لو" میں نے کہا "باقی رہی تھیلے کی بات' تو یہ لو۔"

غالب نے اپنا تھیلا مجھے پکڑا دیا "جب دلی اجڑ گئی تو کہتے ہو تخت سنبھالو۔ پہلے بنا دیتے مشن کمانڈر تو میں دیکھتا۔"

"تم کیا دیکھتے؟ وہی جو ہم نے دیکھا۔"

"میں ایک گھر دیکھ رہا ہوں" غالب نے اچانک رک کے کہا "غالباً یہ سراب ہے۔ تم بتاؤ کیا واقعی کچھ ہے گھر جیسا؟"

میں نے کہا "یہ تو میرے خواب کی تعبیر لگتی ہے۔ مرزا! یہ سراب نہیں حقیقت ہے۔ آؤ ادھر چلتے ہیں۔"

دائیں جانب درختوں کے درمیان اور چٹانوں کے بیچ میں ایک کمرے کا مکان نظر آرہا تھا جو پتھروں کو چن کے بنایا گیا تھا۔ مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور تاریکی کا حصہ نظر آتا تھا۔

غالب نے کہا "اب آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ کیا پتا میزبان واقعی دروازے پر ہمیں خوش آمدید کہے اور بڑے تپاک سے اندر لے جائے۔ یا پھر کوئی اور ہی صورت دیکھتے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ کیوں؟"

"مجھے کیا معلوم۔ جب وہ گولی مار دے گا تو پوچھ لیں گے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟" غالب بولا "ممکن ہے وہ کوئی خطرناک پاگل ہو یا مفرور مجرم۔ پھر وہ دوسری گولی سوال پوچھنے والے کو مار دے۔ خواب کی تعبیر بعض اوقات الٹی بھی ہو جاتی ہے۔"

لیکن اس وقت مجھے کوئی شک نہ رہا کہ ہر دعا کے لیے قبولیت کی ایک گھڑی ہوتی ہے اور جب میں نے ایک معجزہ رونما ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو وہ ایسی ہی گھڑی تھی کہ میں تاج و تخت بھی مانگتا تو مل جاتا۔ ابھی ہم پتھر کے بنے ہوئے ناہموار زینوں پر چڑھ ہی رہے تھے کہ دروازہ کھٹاک سے کھلا اور ایک شخص ہاتھ میں لالٹین اٹھائے نمودار ہوا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی کے جذبات رفتہ رفتہ تجسس اور پھر خوف میں ڈھل گئے۔ غالباً اس نے انسانی آوازیں سن کے دروازہ کھولا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس وقت اور اس موسم میں کون ہے جو اس سے ملنے آیا ہے مگر اپنے سامنے وہ مردوں' تین حسین اور جوان عورتوں کے ساتھ ایک بچے کو دیکھ کر وہ وہم میں مبتلا ہو گیا کہ ہم انسان نہیں۔ نہ ہمارے حلیے اس علاقے کے لوگوں جیسے تھے' نہ چہرے عام لوگوں کی طرح۔ اس کا بدامزاج پر عقیدہ رہا ہوگا جو ایسے ہی انسانی روپ میں نمودار ہوتی ہیں' چڑیلیں خوب صورت عورتیں بن جاتی ہیں اور آدھی رات کو بھٹکتی پھرتی ہیں۔ صرف ایک بچے کی موجودگی کے باعث یہ خیال غلط ہو رہا تھا۔

میں نے اس کے تذبذب کو دیکھ کر کہا "السلام علیکم ہم مسافر ہیں اور راستہ بھٹک گئے ہیں۔"

غالب نے مجھے کہنی ماری "آداب عرض۔ دراصل ہماری گاڑی کے ساتھ ایک حادثہ پیش آگیا تھا۔"

ہم نے ایک جیسی دوستانہ بلکہ خوشامدانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ جواب میں بوڑھا مسکرایا اور اس نے ہم دونوں سے ہاتھ ملا کے دروازہ کھول دیا۔ پھر اس نے ناقابل فہم زبان میں کچھ کہا جو بنگالی نہیں تھی مگر اس سے کچھ ملتی جلتی زبان تھی۔ اس وقت مسئلہ زبان کا نہیں' پناہ کا تھا۔

کمرے کی چاروں دیواریں پتھروں سے اٹھائی گئی تھیں جو ناہموار اور بے ہنگم تھے۔ اس کی چھت میں درختوں کی شاخیں اور تنے بطور شہتیر استعمال ہوئے تھے اور چھت پر سوکھے پتوں اور گھاس پھوس کی موٹی تہ تھی۔ اس کے اوپر مٹی اور گارے کی تہ میں نے صبح دیکھی۔ فرش پر خشک لمبی لمبی گھاس کو چٹائی کی طرح بُن کے ڈال دیا گیا تھا۔ اس چٹائی کے اوپر میلے کچیلے لحاف اور بستر نظر آرہے تھے۔ ایک لحاف میں چھپی ہوئی بوڑھی عورت کچھ خوف زدہ ہو کے بیٹھ گئی تھی۔ دوسرے لحاف میں سے ایک نوجوان سر نکال کے ہمیں گھور رہا تھا۔ وہ چہرے کے نقوش میں بوڑھے سے مشابہ تھا۔ تیسرے لحاف میں کوئی ابھی تک روپوش تھا۔

کمرے کی فضا میں جلی ہوئی لکڑی کے دھوئیں کی بو تھی اور کوئلے کی گیس کا حبس تھا جس کا مکینوں کو قطعی احساس نہیں تھا مگر ہم باہر کی تازہ ہوا کے بعد اندر کی محبوس فضا میں اس فرق کو محسوس کرسکتے تھے۔ تاہم وہ حرارت جس کی ہمارے جسموں کو اشد ضرورت تھی' اس کمرے میں گھٹن' بو اور مفلسی کی ناگزیر ناپاکی کے ساتھ دستیاب تھی۔

میں نے تھیلا نیچے رکھ کے کمبل اتارا اور اس بستر پر بیٹھ گیا جس کو چھوڑ کے بوڑھا دروازہ کھولنے گیا تھا۔ پھر غالب نے بھی ایسا ہی کیا اور باری باری ہم سب بیٹھ گئے۔ بوڑھے نے اپنی زبان میں چند سوال کیے تھے مگر اس کا لہجہ ہمدردانہ تھا اور وہ باری باری ہم سب کی صورتوں کو دیکھ کر افسوس سے سرہلاتے ہوئے کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا۔

میں نے کاجل سے کہا "یہ کون سی زبان ہے؟"

کاجل نے کہا "نیپالی۔ اس میں بہت سے الفاظ بنگالی کے ہیں۔"

"بہت سے کتنے؟ پچاس فیصد" غالب بولا "پھر تو تم کو مفہوم اخذ کرلینا چاہیے۔"

اچانک نوجوان بیٹھ گیا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے چشمہ نکالا اور ہماری صورتوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ چشمے کے شیشے بہت موٹے تھے چنانچہ میں نے اندازہ لگایا کہ اب تک وہ صرف آوازیں سنتا رہا ہوگا۔ ہمارے چہرے اسے چشمہ لگانے کے بعد ہی نظر آئے ہوں گے۔

"ٹیورسٹ؟" اس نے انگریزی کا حلیہ بگاڑ کے کہا۔

میں نے فوراً کہا "نہیں۔ انڈین ٹورسٹ۔"

اس نے مزید انگریزی کا خون کیا "یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا "تقدیر لے آئی ہے لیکن یہ سوال جواب تم بعد میں بھی کرسکتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ہم سردی اور بھوک سے فوت ہو جائیں۔ ہم تمہارے مہمان ہیں۔"

اس نے نیپالی لہجے میں انگریزی کے الفاظ کو گرامر کے بغیر جوڑتے ہوئے کہا "ہم مہمان نہیں رکھ سکتے۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ تم امیر ہو' قیمت ادا کرسکتے ہو۔"

میں نے کہا "تمہاری صاف گوئی نے مجھے متاثر کیا۔ ہم منہ مانگی قیمت دیں گے' چائے اور کھانے کی۔"

"اپنے منہ سے بتاؤ کیا دو گے؟" وہ لڑکا انتہائی بے مروت اور کاروباری ذہن کا مالک تھا اور موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ جیسے اس گھر کا ملنا ہم اپنی خوش نصیبی سمجھ رہے تھے' ایسے ہی وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ آدھی رات کو خوش قسمتی نے اس کے دروازے پر دستک دی ہے تو وہ مروت چھوڑ کے کاروبار کی بات کیوں نہ کرے۔ ضرورت ہمارے درمیان قدر مشترک تھی اور ضرورت مند صرف ہم ہی نہیں' وہ بھی تھے۔ ان ضروریات کی نوعیت مختلف تھی مگر مقصد وہی ایک تھا یعنی بچانے جسم و جان کا۔

میں نے کہا "جب ایک بار کہہ دیا کہ جو مانگو گے وہ مل جائے گا تو پھر قیمت کے مسئلے پر کسی اختلاف یا اندیشے کی گنجائش نہیں رہی۔"

اس نے مسکرا کے کہا "کیا تم ایک روٹی کے ایک لاکھ بھی دے سکتے ہو؟ قیمت ہمیشہ ضرورت کی ہوتی ہے۔ یہاں تمہارے لیے پیسہ اتنا ہی بے مصرف ہے جتنا صحرا کے پیاسے مسافر کے لیے لعل و جواہر جو اس کی ہمت سے لدا ہے اور پیالہ سونا کہلاتا ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "تم تو فلسفی بھی ہو' تاجر بھی اور سیاست داں بھی۔ اتنی خوبیاں تم میں کیسے یکجا ہو گئیں؟ بظاہر تو ایک ان پڑھ اور جاہل آدمی لگتے ہو۔"

اس نے کہا "میں کھٹمنڈو میں رہتا ہوں۔ پرائمری اسکول ٹیچر

www.paksociety.com

ہوں۔ میں نے بی اے تک پڑھا تھا لیکن یہاں تعلیم سے کچھ نہیں ملتا۔ سوائے ایسی ہی فضول سی نوکری کے جس سے حالات نہیں بدلتے۔"

"اور تم چاہتے ہو کہ آج راتوں رات تمہارے حالات بدل جائیں؟" میں نے کہا "تبدیلی دو طرح آتی ہے۔ جمہوری طریقے سے یا خلافت کے ذریعے۔"

"جمہوریت!" وہ ہنسنے لگا "دنیا میں کہیں ہے یہ جانور؟ اس کی نسل تو پیدا ہونے سے قبل ہی معدوم ہو گئی اور اس کے تحفظ کے لیے دنیا میں کہیں کوئی ادارہ کام نہیں کر رہا ہے۔"

"رائٹ۔ اب دوسرا طریقہ ہے جو دنیا میں رفتہ رفتہ مقبول ہونے لگا ہے۔" میں نے اسے اپنے بیگ میں سے ریوالور نکال کے دکھایا "اگر ہمارے درمیان مذاکرات ناکام رہے تو یہ ہے آخری حل۔"

بڑھا جو اب تک خاموشی سے ہماری گفتگو سن رہا تھا اور سر گھمائے کبھی مجھے دیکھتا تھا تو کبھی اپنے 'لائق فائق' عالم فاضل سپوت کو، اب چلانے لگا۔ اس کی ماں نے بھی واویلا کی چیخ ماری اور اسی وقت چوتھی رضائی میں سے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ جیسے گھنے کالے بادلوں سے اچانک چودھویں کا چاند طلوع ہو جائے۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کی انتہائی حسین اور دلکش لڑکی تھی جس کے حسن و شباب کی رعنائی کو میلے کچیلے کپڑے، غربت زدہ ماحول اور افلاس کی سختی بھی دبا نہیں سکی تھی۔

اب باپ بیٹے میں کوئی بحث چل رہی تھی۔ باپ کے لہجے میں برہمی غالب تھی اور بیٹے کے لہجے میں سرکشی۔ صاف ظاہر تھا کہ موضوع سخن ہم تھے، ہماری تشریف آوری اور وہ اسباب جن کی بنا پر میں نے ریوالور کی نمائش کی تھی۔ ایسا میں ہرگز نہ کرتا اگر وہ لڑکا ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کرتا۔ میں بحث کے موڈ میں نہیں تھا۔ ہم سب تھکے ہوئے تھے، بھوک سے بے حال تھے اور سردی میں ہماری عقل تک منجمد ہو رہی تھی۔ یہ فلسفہ بولنے یا سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔

بالآخر لڑکے نے مایوسی اور شکست تسلیم کرنے والے لہجے میں کہا "میرا بے وقوف باپ کہتا ہے کہ مہمانوں سے پیسے کی بات مت کرو۔"

"تم ایک وضع دار اور شریف آدمی کو جو تمہارا باپ بھی ہے، بے وقوف کہہ کے خود کو کیا ثابت کر رہے ہو؟" میں نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اسی وضع داری اور شرافت کے باعث یہ یہاں پڑا ہوا ہے ورنہ یہ شاہ نیپال کا بہنوئی بھی بن سکتا تھا۔ اسے موقع ملا تھا جو اس نے اپنی حماقت سے گنوا دیا" وہ بولا "خیر۔ اب تم عیش کرو۔ یہ میرا نہیں، میرے باپ کا گھر ہے۔ میں سو رہا ہوں۔"

وہ لحاف میں غائب ہو گیا۔ اس کے باپ نے اپنی بیوی اور بیٹی کو بتا دیا تھا کہ ہم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ماں چولہے میں لکڑیاں سلگا رہی تھی اور بیٹی ایک کمرے میں سے آٹا نکال چکی تھی۔ ان کے درمیان آپس میں ہونے والی گفتگو غالباً اس شخص کے بارے میں تھی جو ایک کا بیٹا اور دوسری کا بھائی تھا۔ وہ بار بار افسوس سے اس کی طرف دیکھتی تھیں۔ وہ سیدھے سادے پہاڑی لوگ تھے جو طبعاً اور نسلاً مہمان نواز ہوتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ مہمان باعث خیر و برکت ہوتا ہے۔

رابعہ اور نازو جوتے اتار کے اپنے پاؤں دیکھ رہی تھیں جن پر سرخ دھبے سے نمودار ہو گئے تھے۔

"پیدل چلنے سے چھالے پڑ گئے ہیں" نازو نے کہا۔

"یہ چھالے نہیں ہیں، اسے فراسٹ بائٹ کہتے ہیں" غالب نے کہا "یعنی تمہیں سردی اور برف نے کاٹ لیا ہے۔"

میں نے کہا "انتہائی سرد علاقوں میں ایسا ہوتا ہے مگر وہ چار میل چلنے سے نہیں۔ مستقل رہنے سے برفانی علاقوں میں فراسٹ بائٹ کی شکایت ہو جاتی ہے۔"

نازو نے گھبرا کے کہا "پھر اب کیا ہو گا؟"

غالب نے بڑی مسرت سے کہا "اب ہو گا یہ کہ تمہارے چھالے رفتہ رفتہ زخم بن جائیں گے، پھر پاؤں گل سڑ جائیں گے اور بالآخر تم کو ٹخنے سے کاٹ کے چھوٹا کر دیا جائے گا۔ تقریباً ساڑھے چار فٹ کی لمبائی باقی بچے گی اور تم ایسے نظر آؤ گی جیسے تمہاری ٹانگوں کی جگہ کرسی کی ٹانگیں لگا دی گئی ہیں۔ بھول جاؤ گی یہ ناز نخرے جو تم اونچی ایڑی کی سینڈل پہن کے دکھاتی پھرتی ہو۔ [illegible] کے بغیر۔"

رابعہ سمجھ گئی کہ غالب انہیں خوف زدہ کرنا چاہتا ہے "بولتے رہو۔ تمہارے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"پنجابی میں کہتے ہیں نا کہ کوؤں کی بددعا سے مویشی نہیں مرتے" نازو بولی۔

"یہ تم نے مجھے کوا کہا ہے یا خود کو مویشی تسلیم کیا ہے؟" غالب بولا۔

"بلاوجہ کائیں کائیں کرنے والے کو اور کیا کہوں؟" نازو نے کہا۔

"تم خود کو اللہ میاں کی گائے سمجھتی ہو، لیکن کیا گائے کا شمار مویشیوں میں نہیں ہوتا؟ رنگ روپ کے علاوہ گائے کی ایک اور صفت بھی پائی جاتی ہے تم میں۔ تم بھی بلاوجہ سینگ مارتی ہو۔"

میں نے کہا "یار، تم لوگ بھی کیا فضول باتوں میں الجھ گئے؟"

غالب نے کہا "مسٹر افلاطون، ہم اس وقت فضول باتیں ہی کرنا چاہتے ہیں۔ فرصت ملتے ہی کام کی بات شروع کر دیں، یہ نہیں ہو سکتا۔"

"غالب ٹھیک ہی کہتا ہے" میں نے سوچا۔ "ریلیکس کرنے کے

لیے یہ DIVERSION ضروری ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم کوشش کر کے ذہن کو ان تمام واقعات اور حادثات کی یادوں سے دور لے جائیں جن کے آسیب نے ہمارے اعصاب کو تفکرات اور اندیشوں کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ سکون کے لیے ضروری ہے کہ ہم فکر فردا اور غم دوراں کو بھول جائیں۔ ان مسائل کے بارے میں سوچیں بھی نہیں جو آنے والے دن کا حصہ ہوں گے۔"

میں آرام سے اس غلیظ گدے پر لیٹ گیا اور جب بوڑھے نے اپنے لیے ایک گھٹیا سی سگریٹ جلائی تو میں نے اس کی سگریٹ لے لی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ ہم باری باری کش لگاتے رہے اور اس طرح میں اپنے دوستانہ جذبات سے مدارات قائم کرنے میں کچھ کامیاب ہوا۔ پھٹا ہوا کمبل بغل سے جھکتا ہو رہا تھا اور اس میں سے میل کی بو آ رہی تھی لیکن اس وقت میرے لیے اس کمرے کی ہر چیز میں راحت تھی، تحفظ کی ضمانت تھی اور خوش نصیبی کا اشارہ تھا۔

غالب اور نازو کے لیے فرصت کا بہترین مشغلہ لڑائی تھا اور وہ لڑائی کے لیے کسی سبب کے محتاج نہ تھے۔ لڑائی ایسی بات پر بھی شروع ہو جاتی تھی جس میں اختلاف کی گنجائش ہی نہ ہو۔ رابعہ اور کاجل نیند میں جھکتے جھکتے کچھ باتیں کر رہی تھیں اور بار بار اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھیں جن پر سرخ نشان زیادہ نمایاں ہو گئے تھے۔ ظلم کچھ کھائے پیئے بغیر ہی سو گیا تھا۔ اچانک بوڑھا اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک کونے میں دیوار پر لٹکی ہوئی تھیلی میں سے کچھ نکالنے لگا۔ بہت سی شیشیوں اور ڈبیوں میں سے اس نے بالآخر ایک ڈبیا نکالی، اسے لالٹین کے قریب لا کر غور سے دیکھا اور مطمئن ہو کے مسکرایا۔ اس نے وہ ڈبیا کھول کے رابعہ کو دی اور اپنی زبان میں کچھ کہا مگر اشارے سے یہ بھی بتا دیا کہ اس دوا کو وہ اپنے پاؤں پر چھالوں کی جگہ لگا لیں۔ رابعہ نے قدرے تذبذب کا اظہار کیا اور میری طرف دیکھا۔ انکار سے بوڑھے کی دل شکنی ہوتی جو ہمدردی میں اپنی طرف سے اچھائی کر رہا تھا مگر شہر کی پروردہ اور اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کے مشورے پر پیٹنٹ دوائیں استعمال کرنے والی رابعہ اس دیسی علاج کو اپنی جلد پر آزماتے ہوئے ڈرتی تھی تاہم میرے اشارے پر اس نے ڈبیا لے لی۔

میں نے اور غالب نے بڑی دلچسپی سے ان کے تاثرات کا مشاہدہ کیا۔ وہ دوا کو غور سے دیکھ رہی تھیں اور سونگھ رہی تھیں۔ خدا نہ کرے الرجی ہو جائے، ان کی جلد متاثر نہ ہو۔ معلوم نہیں اس میں کیا ہے اور کس مرض کی دوا ہے؟ کتنی پرانی ہے اور کب سے رکھی تھی؟ ایک مقررہ مدت کے بعد تو تریاق بھی زہر ہو جاتا ہے۔

ایسے ہی اندیشے ان کی صورت سے عیاں تھے۔ دوسری طرف وہ شہر کی تہذیب اور میڈیکل سائنس کے اسرار و رموز سے ناواقف پہاڑوں میں بسنے والا بوڑھا تھا جس کے آباؤ اجداد نے بھی یہی زندگی بالکل اسی انداز میں گزاری ہوگی۔ اس کے لیے زندگی کا تجربہ اور نسلوں پرانا علم اتنا ہی معتبر تھا جتنا کسی ڈاکٹر کے لیے ایم بی بی ایس کی سند ہوتی ہے۔ جو یقین اسے حاصل تھا، نیا نہیں تھا مگر رابعہ اور نازو کا یہ تجربہ نیا تھا۔ ڈرتے ڈرتے انہوں نے تھوڑا سا مرہم انگلی پر لگا کے ایک زخم پر ملا اور پھر ایک دوسرے کی طرف تسلی ہو جانے کے انداز میں دیکھا کہ مجبوری میں وہ بھی کرنا پڑتا ہے جو دل نہیں مانتا۔ خیر اللہ مالک ہے۔

میں نے بوڑھے کی صورت پر طمانیت دیکھی۔ وہ میرے پاس بیٹھ کے کچھ کہنے لگا جو میری سمجھ میں خاک بھی نہیں آیا۔

غالب نے کہا "جواب تو دو کسی بات کا، کچھ بولو۔"

"کیا بولوں؟ زبان یار من ترکی...!"

"تم جواب میں فرنچ بھی بول سکتے ہو۔ بے شک اسے ژاں پال سارتر کے اقتباس سنا دو۔ نہ تمہیں کوئی فرق پڑے گا نہ اسے اور نہ سارتر کو" غالب نے کہا۔

میں نے بوڑھے کے بیٹے کی رضائی کھینچی "سنو۔ مجھے معلوم ہے تم سو نہیں رہے ہو۔"

"کیا کروں گا اٹھ کے؟" اس نے رضائی کے اندر سے جواب دیا۔ اس عقلمند کے پرائمری اسکول ٹیچر کی انگریزی اتنی ہی با محاورہ تھی جتنی کسی انگریز لارڈ کی اردو ہو سکتی ہے "جہاں میری کوئی نہیں سنتا۔ مجھے احمق سمجھا جاتا ہے۔"

میں نے اس کے الفاظ کو جوڑ کے مطلب اخذ کرنا سیکھ لیا تھا "اگر تم خود کو ایسا نہیں سمجھتے تو پھر برا ماننے کی کون سی بات ہے؟ اب کوئی مجھے گنجا کہے تو میں کیوں برا مانوں گا۔ مجھے معلوم ہے میرے سر پر کتنے بال ہیں؟"

وہ اٹھ بیٹھا "اچھا۔ یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔ گویا تم تسلیم کرتے ہو کہ احمق میں نہیں ہوں، میرا باپ ہے۔"

"میں نے ایسا نہیں کہا۔ اگر میں گنجا نہیں ہوں تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تم گنجے ہو۔"

اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا "یہ بھی ٹھیک ہے۔ خیر، تم کیا کہنا چاہتے تھے؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم مترجم کے فرائض انجام دو" میں نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کے اسے دیا "یہ اس کا معاوضہ ہے۔ جو بات تمہارا باپ کہے وہ مجھے سمجھاؤ اور میری بات اپنے باپ تک پہنچاؤ۔ ایمانداری سے۔"

اس نے سو کا نوٹ اچک لیا "یہ تو بھارتی کرنسی ہے۔ خیر، میں اسے تبدیل کرا لوں گا۔ ڈالر نہیں ہیں تمہارے پاس؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا "میں کوئی چلتا پھرتا فارن ایکسچینج بینک نہیں ہوں۔"

اب ہمارے درمیان معلومات کا تبادلہ ہوا۔ بوڑھے نے بتایا کہ وہ سو سال کا ہو گیا ہے اور ابھی مزید بیس سال نہیں مرے گا کیونکہ اس کے باپ دادا سب سنچری بنانے کے بعد بھی بیس پچیس سال گزارے بغیر نہیں گزرے تھے۔ یہ سب غلط تھا۔ ان پہاڑوں

www.paksociety.com

میں رہنے والوں کی طویل عمری کے نظریے کو تسلیم کیا جا سکتا تھا مگر کسی کا سوا سو سال زندہ رہنا بعید از قیاس تھا۔ اسے اپنی تاریخ پیدائش کسی بھی حوالے سے یاد نہیں تھی۔ اسے نہ جارج پنجم کی تخت نشینی کا علم تھا' نہ انیسویں کے بعد بیسویں صدی کے شروع ہونے کا۔ اتنی طویل زندگی گزار کے اس نے اپنے حساب سے عمر کو سو سال سمجھ لیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ستر سال کا تھا یا شاید اسی کا لیکن اس سے زیادہ کا نہیں۔ اس نے مترجم کو اپنا سولھواں بیٹا اور اس کی بہن کو گیارھویں لڑکی قرار دیا تو میں بھونچکا رہ گیا۔ پھر اس نے وضاحت کی کہ یہ سب تین بیویوں کی پیداوار تھے۔ چوتھی سامنے ہے۔ بقیہ اولاد کا حساب کچھ یوں تھا کہ آدھے تو وہ غنچے تھے جو بن کھلے مرجھا گئے۔ جو بڑے ہوئے انہیں دنیا لے گئی یعنی وہ گھر چھوڑ کے دنیا میں کہیں گم ہو گئے۔ لڑکیاں بھی شادی کر کے گئی تھیں۔ اب معلوم نہیں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں' کتنے بچوں کی ماں ہیں اور زندہ ہیں یا مر گئیں۔ یہ ایسی ہی دنیا تھی اور ایسی ہی زندگی تھی۔ یہاں بقا کی جدوجہد کے مقابلے میں جذباتی رشتوں کو شکست ہو جاتی تھی۔ خاندان کی مرکزی حیثیت باقی رکھنا ناممکن تھا۔ جو بڑا ہو جائے اور اپنا پیٹ خود بھر سکے وہ جائے اور دنیا میں اپنا رزق خود تلاش کرے۔ ان پرندوں کی طرح جو اڑنا سیکھتے ہی آشیانوں سے پرواز کر جاتے ہیں اور پھر کبھی لوٹ کے نہیں آتے۔

کھانے اور چائے کے دوران ہم نے اپنے اپنے سوالات سے یہ سب معلومات حاصل کی تھیں۔ اس کے بعد ہماری باری آئی۔ ہم نے بتایا کہ ایک حادثے میں ہماری کار ختم ہو گئی' ہم اس لیے بچ گئے کہ کار میں نہیں تھے۔ کار ایک سائڈ پر کھڑی تھی کہ ایک ٹرک نے ٹکر مار کے اسے نیچے گرا دیا۔ ہم ٹرک کو روک کے پکڑنے میں ناکام رہے۔

مترجم نے کہا "تم کار سے اترے ہی کیوں تھے؟"

میں نے کہا "گاڑی گرم ہو گئی تھی۔ ویسے بھی کوئی چوبیس گھنٹے کار میں نہیں رہتا۔ کیا تم باہر نہیں جاتے؟ باہر کوئی تم کو اسی طرح ٹکر مار کے گرا دے تو یہ سوال احمقانہ ہوگا کہ تم گھر سے نکلے ہی کیوں تھے۔"

اس نے سوچ کے کہا "یہ تو ٹھیک ہے۔ تم نے اتنی عقلمندی کی باتیں کس سے سیکھیں۔"

میں نے اسے ایک پرانا جواب دیا "بے وقوفوں سے۔"

"ان عورتوں میں سے تمہاری بیوی کون ہے؟" وہ بولا۔

"کوئی بھی نہیں" میں نے کہا۔

پھر اس نے یہی سوال غالب سے کیا اور یہی جواب سن کے شک میں پڑ گیا۔ دو مرد' تین عورتیں۔ نہ کوئی کسی کی بیوی نہ کوئی شوہر۔ بچہ پھر کہاں سے آ گیا؟ یہ گتھی سلجھانا اس کے لیے بڑا مشکل ہو گیا۔ ایک ایک کر کے رابعہ' نادر' کاجل اور تیم سب سو گئے۔ پھر غالب کی باری آئی۔ بوڑھے کی چوتھی بیوی اور گیارھویں بیٹی ایک کونے میں بیٹھی رہیں۔ ان کے سونے کے لیے اب کوئی جگہ ہی نہیں بچی تھی۔ بوڑھا بے خوابی کا مریض تھا' وہ مجھ سے سر کھپاتا رہا۔ اس کا بیٹا مترجم بننے پر مجبور تھا کیونکہ وہ سو کا نوٹ جیب میں اڑس چکا تھا۔ اس نے کئی بار مجھے بھی سونے کا مشورہ دیا مگر میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک لالچی آدمی تھا اور ہمیں لوٹ کے فرار ہو سکتا تھا۔ معلوم نہیں اپنے باقی بھائیوں کی طرح وہ ابھی تک گیا کیوں نہیں تھا۔ شاید اسی لیے وہ خود کو احمق تسلیم کرتا تھا۔ خود اس نے کہا کہ پڑھ لکھ کے میں بزدل اور ناکارہ ہو گیا۔ میں وہ سارے کام نہیں کر سکتا جو میرے بھائیوں نے کسی احساسِ پشیمانی' کمتری کے بغیر کر لیے۔ ان کے نزدیک رشتے بھی اہم نہیں رہے' خواہ وہ زمین کے ہوں یا خون کے۔ چنانچہ وہ جہاں بھی ہوں گے جو کچھ بھی کر رہے ہوں گے' عدمِ اطمینان کا شکار نہیں ہوں گے۔ جب کہ میں پرائمری بچہ بن کے انسان بن گیا ہوں۔ انسان بہت مجبور ہوتا ہے اور غلام ہو جاتا ہے۔ بندشوں کا' خواہشوں کا اور اپنی کمزوریوں کا۔ جانور آزاد رہتا ہے۔

اگرچہ وہ اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں خاصی دشواری محسوس کرتا تھا مگر میں اس کی سوچ کو سمجھ رہا تھا۔

اچانک اس نے کہا "تم میری بہن سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

میں بھونچکا رہ گیا "یہ تم... کیا فضول بات کر رہے ہو؟"

"کیوں؟ اتنی اچھی اور خوب صورت لڑکی ہے وہ اور تم نے ابھی تک کسی کو بیوی نہیں بنایا ہے۔ یہ لڑکیاں جو تمہارے ساتھ ہیں' میری بہن کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ نہ یہ اتنی حسین ہیں اور نہ اتنی خدمت کر سکتی ہیں تمہاری۔ پھر یہ کہ خرچ بھی زیادہ نہیں' پانچ ہزار دے دو...."

"بکواس بند کرو" میں نے گرم ہو کے کہا۔

"اچھا چار ہزار...."

میں نے کہا "بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں کسی لڑکی کو خرید کے شادی نہیں کروں گا۔"

"پھر کیا ایسے ہی کسی کو بھگا کے لے جاؤ گے' مفت میں۔ یہ تو بڑی غلط بات ہوگی۔"

"غلط بات کے بچے! ہم شادی کے لیے عورت خریدتے نہیں' " میں نے بگڑ کے کہا "لڑکی راضی ہو' اس کے والدین راضی ہوں اور خود وہ لڑکی آدمی کو پسند ہو' تب بات بنتی ہے۔"

"پھر تو بات بن گئی سمجھو۔ لڑکی ضرور راضی ہو جائے گی۔ وہ شہر جانا چاہتی ہے۔ تم جوان اور خوبصورت آدمی ہو۔ وہ تمہیں پسند بھی کرنے لگی۔ ماں باپ بن پیسے راضی نہ ہوں گے۔ چلو تم تین ہزار دے دینا۔"

میں نے کہا "اب تم نے شادی کی بات کی تو میں ایک طمانچہ ماروں گا۔ ان لڑکیوں میں سے ایک میری بیوی بنے گی' یہ فیصلہ ہ

کر چکا ہوں۔"

"پھر کیا ہوا' آدمی جتنی شادیاں چاہے کر سکتا ہے۔ یہ لڑکی تم نے کتنے میں لی اور کہاں سے لی جسے تم بیوی بناؤ گے؟"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اسے شادی کے پورے معاشرتی پس منظر سے آگاہ کرنا' خاندان کی اہمیت سمجھانا اور اس رشتے کی جذباتی اہمیت پر لیکچر دینا بے سود تھا۔ وہ میری بات نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ میرے اور اس کے درمیان دو دنیاؤں کا فاصلہ تھا۔ ہم ایک ہی سیارے پر رہتے تھے مگر ایک دوسرے کے لیے مریخ کی مخلوق سے زیادہ اجنبی تھے۔ ہم ایک دوسرے کی زبان' خیالات' نظریات' عقائد اور رسوم سے بیگانہ تھے۔ جسمانی ساخت اور ضروریات کے اعتبار سے ہم بلاشبہ ایک تھے مگر ذہنی سطح پر ہمارے درمیان دنیاوی معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت مشترک تھی۔ ایک انگریزی جو اظہار کا ذریعہ تھی۔ دوسری سکہ رائج الوقت کی زبان۔

میں نے کہا "تم سب باتیں چھوڑو' مجھے یہ بتاؤ کہ ہم کھٹمنڈو کیسے پہنچ سکتے ہیں؟"

اس نے کہا "یہ سڑک سیدھی کھٹمنڈو جاتی ہے۔"

میں نے کہا "اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں؟ تم تو یہاں کے رہنے والے ہو' خفیہ راستے بھی جانتے ہو گے۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "تم خفیہ راستے سے کیوں جانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "یہ بتانا ضروری نہیں۔ میری بات کا جواب دو۔"

اس نے سوچ کے کہا "خفیہ راستے بہت ہیں مگر ان پر سفر کرنا آسان کام نہیں ہے۔ ہر راستہ محفوظ بھی نہیں ہے۔ کہیں پہاڑ ٹوٹ کر گر جاتے ہیں یا اوپر سے برف پھسل کے آ جاتی ہے۔ خطرناک شیر' چیتے اور بھیڑیے مل جاتے ہیں۔ سڑک محفوظ ہے؟"

"سڑک کے بعد کون سا راستہ محفوظ ہے۔"

"اس راستے پر تم جاؤ گے کیسے؟ وہ بہت لمبا راستہ ہے۔ لوگ جو تبت کی طرف جاتے ہیں' وہ خچروں پر سفر کرتے ہیں' قافلوں کی صورت میں" اس نے کہا۔

"یہ قافلے کہاں سے گزرتے ہیں؟"

"ادھر سے" اس نے ہاتھ ہلا کے کہا "پرسوں ایک قافلہ گیا تھا' اب پھر پرسوں جائے گا۔"

"تمہیں پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے؟"

"سب کو معلوم ہو جاتا ہے۔ جسے جانا ہو ان کے ساتھ چلا جاتا ہے' کچھ خریدنا ہو تو ان سے خرید لیتا ہے۔ وہ جگہ جگہ رکتے جاتے ہیں اور مال بھی جمع کرتے رہتے ہیں۔ میرے باپ نے سب لڑکیاں قافلے والوں کو دیں۔ انہیں اچھے شوہر مل گئے۔"

"اور تمہارے باپ کو اچھے پیسے!" میں نے غصے سے کہا۔

"شرم نہیں آئی تم لوگوں کو؟ اپنی عورتوں کو بیچتے ہوئے...."

وہ میرے غصے پر حیران ہوا "شرم کی کیا بات ہے؟ خود میرے باپ نے تین بیویاں بیچ دیں۔"

"بیویاں بیچ دیں! کیوں؟"

"اسے پیسوں کی ضرورت تھی" وہ بولا "خود میں نے قافلے سے ایک بیوی خریدی تھی' سال بھر بعد واپس کر دی۔ جس سے لی تھی وہ خود آیا تھا کہ ایک ہزار زیادہ لے لو۔ میں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ دو ہزار زیادہ لے کر دی۔"

صدمے سے میرا برا حال ہو گیا۔ ان لوگوں کے نزدیک عورت کی وہ حیثیت تھی جو شہروں میں کار کی ہوتی ہے۔ خریدی' استعمال کی' اچھے پیسے ملے تو بیچ دی۔ سیکنڈ ہینڈ لے لی' بدل لی۔

اپنے بلڈ پریشر کو کنٹرول کر کے میں نے کہا "دیکھو' میں اس قافلے کے ساتھ جانا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟ کتنے دن میں ہم پہنچ جائیں گے کھٹمنڈو؟"

اس نے سوچ کے کہا "تم نہیں پہنچو گے۔"

"کیوں؟ کیا وہ ہمیں ساتھ لے جانے سے انکار کر دیں گے؟ ہم انہیں اچھا معاوضہ دے سکتے ہیں۔"

"بات معاوضے کی نہیں۔ راستے میں تم غائب ہو جاؤ گے' تمہارے ساتھ جو عورتیں ہیں ان کو شوہر لے جائیں گے' خرید کے۔"

میں نے کہا "بکواس بند کرو۔ ان معاملات سے نمٹنا ہم جانتے ہیں۔ ایک ایک کو گولی مار دیں گے۔ جو بچ گیا وہ ہمیں کھٹمنڈو پہنچا دے گا۔"

"اگر معاوضہ دو تو یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں" وہ بولا۔

"حد ہو گئی۔ یہ بات تم پہلے نہیں بک سکتے تھے۔ بولو کتنا ہوگا تمہارا معاوضہ؟"

"پانچ آدمی۔ پانچ ہزار" وہ اپنی پانچوں انگلیاں پھیلا کے بولا۔

"چلو یہ بات طے ہو گئی" میں نے کہا "تمہارے پانچ ہزار پکے۔"

"بچے کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

میں نے جھنجھلا کے کہا "پانچ سو اس کے اور لو۔"

"تم پیدل نہیں جا سکتے۔ خچروں کا کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "تم بتاؤ۔ خچر کرائے پر ملتے ہیں یا انہیں خریدنے پڑیں گے؟"

"تم خچر واپس کر دو گے؟"

"اور کیا اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤں گا" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

وہ مسکرانے لگا "تم کو پاکستان جانا ہے۔ ایسے بولو نا۔ آج کل کھٹمنڈو میں ہزاروں لوگ پڑے ہیں۔ ان کے پاس رہنے کے لیے جگہ نہیں اور کرایہ بھی نہیں۔ کرائے پر بس یا ٹرک میں لوگوں کو لے جانے والے بھی خوب مال کما رہے ہیں۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ پیسہ لیتے ہیں اور لوگوں کو آدھے راستے میں اتار دیتے ہیں۔

www.paksociety.com

زبردستی۔ اچھی لڑکیاں اور عورتیں غائب ہوجاتی ہیں۔ گھنٹنڈو جاؤ گے تو خود دیکھ لو گے۔"

میں نے اپنے دکھ کے احساس کو دبا کے کہا "مقدر سے کوئی نہیں لڑسکتا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ تم ہمیں گھنٹنڈو پہنچادو" اس کے بعد تمہاری ذمے داری ختم۔ تم نے کہا تھا کہ وہاں کسی پرائمری اسکول میں پڑھاتے ہو۔"

"ہاں۔ گورنمنٹ اسکول ہے۔ میں وہاں تمہاری رہائش کا انتظام بھی کرسکتا ہوں۔ دن میں کلاسیں ہوتی ہیں مگر رات کو تم وہاں سوسکتے ہو۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ برآمدے میں۔"

"جگہ کا کرایہ دے کر؟" میں نے کہا۔

"اب۔ مفت میں آج کل وہاں کچھ نہیں ملتا۔ بیٹھنے یا کھڑے ہونے کی جگہ کے پیسے لینے بھی کوئی آجائے گا" وہ بولا۔

"چلو جو سب پر بیت رہی ہے ہم پر بھی گزر جائے گی۔ تم ہماری گھنٹنڈو جانے کے لیے خچر کہاں سے آئیں گے؟"

"میں لاؤں گا" وہ بولا "ایک خچر کا سو روپیہ روز۔ تمہارے پاس پستول ہے؟ تمہیں راستے میں کوئی خطرہ نہیں۔ کیا تم واقعی گولی ماردیتے ہو؟"

میں نے کہا "یقین نہیں آتا تو تمہیں مار کے دکھاؤں؟"

"نہیں نہیں" وہ گھبرا کے بولا "میرا مطلب تھا' راستے میں کہیں اچانک شیر چیتا آجائے۔ ویسے تو وہ کچھ نہیں کہتے کسی کو۔"

"خطرے کی بات ہوئی تو ہم انہیں ماردیں گے" میں نے کہا۔

"تم کب جانا چاہتے ہو؟ سفر لمبا ہے۔"

"کیا ہم رات کو بھی سفر کرسکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اگر صبح سورج نکلتے ہی روانہ ہوجائیں تو رات سے بہت پہلے ہی گھنٹنڈو پہنچ سکتے ہیں" وہ بولا۔

"پھر کل صبح کا پروگرام پکا سمجھو" میں نے کہا "آج ہم آرام کریں گے۔"

"ابھی تو کافی وقت ہے" وہ بولا "تم بھی سوجاؤ۔"

نہ جانے کیوں مجھے شک ہوا کہ وہ میرے سوجانے کے بعد کچھ کرے گا۔ اس نے کم سے کم چھ بار یہی بات کی تھی۔ وہ لالچی آدمی تھا اور اس کے ساتھ ہی شدید احساسِ محرومی میں مبتلا تھا۔ اسے قسمت سے' زمانے سے' اپنے گھر اور والدین سے' سب سے گلہ تھا کہ کسی نے اسے خوشحالی کے مواقع فراہم نہیں کیے اور وہ آزادی وابدی بدنصیبی سے چھٹکارا پانے کی خواہش میں ہمیشہ ناکام رہا۔ دولت مندی اس کے لیے ایک شجرِ ممنوعہ رہی کیونکہ وہ پڑھ لکھ کے کم ہمت اور جذباتی احمق بن گیا تھا۔

اس نے باتوں باتوں میں اندازہ کرلیا ہو گا کہ ہماری حقیقت کچھ بھی ہو۔ ہم ہندوستانی ہوں یا پاکستانی۔ مفرور مجرم ہوں یا تو سیاحوں کا ٹولہ۔ ہمارے پاس اتنی دولت ہے کہ ہم سب کچھ خرید سکتے ہیں چنانچہ اس نے ہر معاملے میں سودے بازی کی تھی۔ اپنی طرف سے جو قیمت اس نے طلب کی وہ حد سے زیادہ تھی۔ شاید اس امید میں کہ وہ اس سے آدھی بھی وصول کرنے میں کامیاب ہوا تو وارے نیارے ہوجائیں گے مگر میں نے منہ مانگے معاوضے کی بات کی تھی۔ ممکن ہے اسے صدمہ ہوا ہو کہ وہ اپنی کم ہمتی کے باعث نقصان میں رہا ورنہ اس سے دگنا یا دس گنا بھی لے سکتا تھا۔ نانگ تو سکتا تھا۔ ملنا نہ ملنا بعد کی بات تھی لیکن ایک بار پھر اس نے موقع گنوادیا۔

اس کی نظر بار بار ہمارے بیگ کی طرف جاتی تھی۔ ایک میں سے میں نے ریوالور برآمد کیا تھا مگر دوسرا کسی نے کھولا ہی نہیں تھا۔ اس کی تمام توجہ اسی بیگ کی طرف رہی تھی۔ محض اسے آزمانے کے لیے میں نے سونے کا فیصلہ کیا۔

میرے لیٹتے ہی وہ بھی دوسری طرف جاکے سوگیا' جہاں اس کی ماں اور بہن نے اپنے لیے ایک گوشے میں جگہ بنالی تھی۔ وہ ایک ہی کمبل میں گٹھری بنی سورہی تھیں۔ کمرے میں لالٹین کی روشنی کم کردینے کے بعد وہ کچھ دیر ساکت پڑا رہا اور میں نیند سے لڑتے ہوئے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ اس نے ایک بار سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ میں نے خود کو گہری نیند میں ظاہر کرنے کے لیے خراٹے شروع کیے تو اس نے مجھے پھر دیکھا اور اٹھ بیٹھا۔ اس کی نظر بیگ کا طواف کررہی تھی۔ اس بیگ میں جتنا کھانے پینے کا سامان تھا' وہ ہم راستے میں ہی ختم کرآئے تھے اور اب اس بیگ میں فالتو کپڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کپڑوں کا ایک ایک جوڑا ہم نے وقتِ ضرورت اپنا حلیہ بدلنے کے لیے رکھا تھا۔

میں اسے ایک آنکھ کو تھوڑا سا کھول کے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ دیر بیٹھا رہا اور پھر لیٹ گیا۔ دوبارہ اٹھا اور اپنا سر کھجاتا رہا۔ اس کی ہمت اور قوتِ فیصلہ میں کشمکش جاری تھی۔ یہ نیکی بدی کی متحارب قوتوں کی خانہ جنگی تھی جس میں اس کا ضمیر پس رہا تھا۔ بالآخر ہوس کا پلہ بھاری رہا۔ وہ چور نظروں سے ہم سب کو اور اپنے گھر والوں کو دیکھتا ہوا اٹھا اور دبے پاؤں بیگ کی طرف بڑھا۔ آخری وقت میں پھر اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ واپس گیا اور پھر لوٹ کے آیا۔ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ چوری کرتے وقت اس کے دل کی کیا حالت ہوگی۔ اسے یقین ہوگا کہ میں جاگ اٹھا تو کوئی سوال کیے بغیر اسے گولی ماردوں گا۔ معلوم نہیں کامیابی کی صورت میں وہ کیا کرتا۔ اگر اس کے ہاتھ چند سو میں ہزار یا پچاس ہزار لگ جاتے تو کیا وہ راتوں رات فرار ہوجاتا؟ اس نے یقیناً طے کرلیا ہوگا کہ خوش قسمتی کی "لاٹری" نکل آئی تو وہ کہاں جائے گا اور کیا کرے گا۔

اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ بیگ کی زپ کھولی اور اندر ہاتھ مارا۔ اس کے چہرے پر اضطراب و اشتیاق' امید اور تجسس' خوف اور احساسِ جرم کے سارے جذبات کا رنگ الگ اور بہت واضح تھا۔ اس کا سانس تیز چل رہا تھا اور بیگ میں کپڑوں کے سوا کچھ نہ پاکے اس نے شدید مایوسی میں احتیاط کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ وہ اب ایک ایک کپڑے کو نکال کے بیگ کی تلاشی لے رہا تھا۔

اس وقت میں نے سوچا کہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑلوں مگر پھر میں رک گیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا وہ دوسرے بیگ میں بھی قسمت آزمائی کرے گا جو غالب کے سر کے نیچے تھا۔ اس نے حفاظت کے خیال سے بیگ کا تکیہ بنالیا تھا مگر نیند میں غالب نے کروٹ لی تھی تو اس کا سر بیگ پر سے ہٹ گیا تھا۔ اب یہ بیگ میرے اور غالب کے بیچ میں تھا اور گویا انتہائی خطرناک علاقے میں تھا۔

اس نے سخت مایوسی کے ساتھ کپڑے واپس بیگ میں ڈالے اور زپ بند کردی۔ کچھ دیر وہ دوسرے بیگ کو دیکھتا رہا اور اپنی ہمت کے طیارے کو خوابوں کی تعبیر کے آسمان تک اڑانے کے لیے جدوجہد کرتا رہا مگر اتنی طاقتِ پرواز وہ کہاں سے لاتا۔ چیونٹی کے پر نکل آئیں تب بھی وہ اس بلندی کو کہاں چھوسکتی ہے جہاں سے شاہین کی اڑان شروع ہوتی ہے۔

اسے کشمکش کے عذاب سے نجات دلانے اور یہ احساس دلانے کے لیے کہ ہم سوتے بھی غافل ہوں' خطرے کے وقت ہماری چھٹی حس ہمیں بیدار کردیتی ہے' میں اٹھ بیٹھا۔

"کون۔ کون ہے؟" میں نے کہا اور ریوالور نکال لیا۔

وہ کھڑا ہوا ہی تھا کہ میری آواز پر اچھل پڑا۔ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ اس کے دل کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اس کا رنگ پیلا پڑگیا تھا اور وہ کانپنے لگا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ دھڑام سے گر کے بے ہوش ہوجائے گا۔

"تم۔ یہ تم ہو" میں نے اطمینان اور خوش دلی کے ساتھ کہا "میں نے قدموں کی آہٹ سنی تو آنکھ کھل گئی۔ میں سمجھا کوئی چور آگیا اندر۔"

"چور۔ چور۔ کہاں سے آئے گا۔ میں۔۔۔ میں اٹھا تھا" اس نے بڑی مشکل سے ہکلاتے ہوئے کہا اور اپنے خشک حلق کو تھوک نگل کے تر کیا "یہ دیکھیے۔۔۔ دروازہ بند ہے۔"

"دروازہ بند ہے نا" میں نے کہا اور پھر لیٹ گیا۔

اس نے اقرار میں سرہلایا اور اپنی جگہ جاکے لیٹ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کے مجھے افسوس بھی ہورہا تھا اور ہنسی بھی آرہی تھی۔ پیسہ بھی کیا چیز ہے۔ آدمی سے اس کا سب کچھ چھین سکتا ہے۔ اس کا انحصار طلب کی نوعیت اور شدت پر ہے۔ ضمیر اور ایمان' اپنی عزتِ نفس' غیرت اور حمیت' عصمت و عفت سب کو حالات کی مجبوری شکست دیتی ہے تو انسان کے غرور کا آبگینہ یوں ٹوٹ جاتا ہے جیسے مٹی کا کوزہ۔

اس کے بعد میں اطمینان سے سوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ ذرا سی دیر کے لیے ہوس زر پر جان دینے کے مرحلے سے گزرنے والا خود کو خوش قسمت سمجھ رہا ہوگا کہ وہ بال بال بچ گیا اور خدا کا شکر ادا کررہا ہوگا کہ وہ زندہ سلامت لیٹا ہے۔ اس کی لسو میں عرق' زخم خوردہ لاش اس بیگ کے قریب نہیں پڑی ہے جس میں اس کے لیے بدقسمتی کی آخری سند کے طور پر دستِ اجل کی تحریر کے سوا کچھ نہ تھا۔

صبح میں سب کے بعد اٹھا۔ رابعہ' نازو اور غالب میں سے کوئی بھی کمرے میں موجود نہ تھا۔ کاجل گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی اور کلیم سو رہا تھا۔ بے اختیار میری نظر بیگ پر گئی۔ اس کی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ عورتیں چولھے پر کچھ پکارہی تھیں اور ہمارے میزبان باپ اور بیٹے کے درمیان جنگ چل رہی تھی۔ وہ دبے دبے لہجے میں بات کررہے تھے مگر ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ ان میں اختلافِ رائے کی نوعیت معمولی نہیں۔

میں نے کاجل سے کہا "کاجل! تمہیں کیا ہوا؟"

اس نے سر اٹھا کے مسکرانے کی کوشش کی لیکن میں نے دیکھ لیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو رکے ہوئے ہیں "کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "تم کیوں ضرورت محسوس کرتی ہو جھوٹ بولنے کی؟ آخر اتنی بے اعتباری کیوں؟"

"کون سا جھوٹ بولا ہے میں نے؟" وہ نظر چرا کے بولی۔

"تم اپنا دکھ چھپا رہی ہو' ہم سب سے۔ ہمارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی تم ہمارے ساتھ نہیں ہو۔ تم تنہا ہو' تم اپنی دنیا میں' اپنے احساس کی چتا میں جل رہی ہو اور یہ سمجھتی ہو کہ ہم سب اندھے' بہرے اور بے حس لوگ ہیں جو کچھ دیکھ نہیں سکتے یا دیکھتے ہیں تو پرائی آگ سے دور دور رہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کاجل۔"

وہ رونے لگی "تم بتاؤ میں کیا کروں؟ کیسے خود کو تم جیسا سمجھوں؟ رابعہ اور نازو کے سامنے میرا دل چاہتا ہے کہ میں ڈوب کے مرجاؤں کسی گڑھے میں۔ میرا تو سایہ بھی اتنا ناپاک اور گنہگار ہے۔ میں اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتی آئینے میں۔ اس پر مجھے خون ہی خون نظر آتا ہے۔ اپنے والدین کی قاتل ہوں میں۔ ایک آبرو باختہ لڑکی۔ میں کاجل کی قاتل ہوں جو ایسی ہی تھی' نازو جیسی اور رابعہ جیسی۔ مگر اب میرا وجود غلاظت سے بھرا ہوا ہے اور میں اس کو باہر نہیں نکال سکتی۔ کوئی مجھے پھر پاکیزگی کا غرور نہیں دے سکتا۔ اگر کل کو میں نے محسوس کیا کہ میرے وجود میں گناہ کا ثمر پرورش پارہا ہے' میں بن بیاہی ماں بننے والی ہوں تو میں کیا کروں گی؟ مجھے تو ابھی مرجانا چاہیے۔ لیکن میں کیا کروں؟ آج اس نے میرے لیے مرنا مشکل کردیا ہے۔ کلیم نے مجھے ماں بنالیا ہے حالانکہ یہ میرا بچہ نہیں ہے' کل اپنے بچے کو مار سکوں گی میں۔۔۔ اور خود مرسکوں گی۔۔۔"

میں نہیں جانتا تھا کہ میرا ایک سوال اتنے بڑے بارود کے ڈھیر میں چنگاری بن جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں کاجل کے ذہن کی اس سوچ کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا ورنہ میں یہ سوال بھی نہ کرتا۔ جب اس نے سچ بولا تو اس کی تلخی نے مجھے مفلوج کردیا۔ یہ زہر تھا جس کا مزہ میں نے پہلے نہیں چکھا تھا۔ میں احمقوں کی طرح اس کی صورت دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس سے کیا کہوں؟

www.paksociety.com

ہمارے میزبان باپ بیٹا اپنی لڑائی بھول کے ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور ہکا بکا بیٹھے تھے۔ میں نے تو بتایا تھا کہ ان عورتوں میں سے کوئی بھی میری بیوی نہیں مگر انہوں نے شاید میری بات کا یقین نہیں کیا ہو گا اور کچھ نہ سمجھنے کے باعث وہ سمجھے ہوں گے کہ ایک شوہر کی حیثیت سے میں نے کاجل پر کوئی ظلم کیا ہے جبھی وہ رو رو کے فریاد کر رہی ہے۔

ان کی نظروں کے سوال کو دیکھے بغیر میں نے کاجل سے کہا "تم پاگل ہو کاجل۔ اتنا عرصہ ہو گیا تم کو ہمارے ساتھ اور ابھی تک تم نے اعتماد کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔ کسی پر بھی بھروسہ نہیں کیا۔ مجھے یا غالب کو نہ سہی، رابعہ اور نازو کو تم عورت سمجھ کے اپنا دکھ بتا سکتی تھیں۔۔۔"

"میں عورت نہیں ہوں، عورت کے نام پر گالی ہوں۔ جس عورت کی آبرو لٹ جائے اور جس کی وجہ سے گھر برباد ہو جائے، گھر والے مر جائیں، وہ عورت نہیں زہریلی ناگن ہے۔ طوائف بھی اپنا گھر تو نہیں اجاڑتی۔" وہ روتے روتے بولی۔

میں نے برہمی سے کہا "مت کرو ایسی باتیں۔ تم ہم سب کے نزدیک اتنی ہی معصوم اور قابل احترام ہو جتنی ہر عورت ہوتی ہے، جتنی رابعہ اور نازو ہیں، میری ماں تھی اور بہن تھی۔ قابل نفرت وہ ہیں جو ظالم تھے، وہ شیطان تھے جنہوں نے تمہیں رسوا کرنے کی کوشش کی۔ رسوا وہ خود ہوئے۔ تم نے کچھ بھی نہیں کھویا، انہوں نے اپنی انسانیت کا بھرم کھو دیا۔"

"یہ سب باتیں ہیں، کھوکھلی باتیں، جو تم مجھے تسلی دینے کے لیے کرتے ہو۔"

"نہیں کاجل! یہ حقیقت ہے۔ تم مجھے اتنی ہی عزیز ہو جتنی رابعہ یا نازو ہیں۔ ہم سب میں سے کسی کی نظر میں تمہاری عزت کم نہیں ہوئی کیونکہ ظلم ہم سب نے سہا ہے۔ ہم سب مظلوم ہیں۔ ظلم کی نوعیت کچھ بھی ہو مگر ظلم سہنے والے ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہوتے ہیں کیونکہ وہ ہمدرد ہوتے ہیں۔ اور یہ تم قبل از وقت کیسے اندیشوں میں مبتلا ہو گئی ہو؟ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ تم عزت آبرو کے ساتھ زندہ رہو گی، ہم سب کے درمیان۔ ویسے تو ہر گھر تمہارا گھر ہو گا لیکن سکندر بخت کا گھر تمہارے لیے ویسا ہی گھر ہو گا جیسا ماں باپ کا گھر تھا۔ اگر تم اپنے بھائی کے گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ اس گھر میں تمہاری اتنی ہی عزت ہو گی جتنی میری سگی بہن کی ہونی چاہیے۔ میں قسم کھانے کا عادی نہیں، جو میں کہتا ہوں وہ کر کے دکھاتا ہوں۔ تم دیکھو گی کہ میں نے آج تم سے جس رشتے کا عہد کیا ہے وہ کس حد تک حقیقی ہے۔"

کاجل نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کے مجھے بے یقینی سے دیکھا "آج کی بات تم کل بھول گئے تو۔۔۔"

"میں نے کہا نا، وقت خود اس رشتے کی سچائی کا ضامن ہو گا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ کمل کیا تھی؟ ایک بدنام زمانہ ڈاکو شیش ناگ کی بہن ناگ تھی۔ مرتے وقت اس ڈاکو نے اپنی بہن کو کسی تعلق یا تعارف کے بغیر ہمارے حوالے کر دیا تھا۔ آج وہ کمل بانو ہے اور جیسے اس نے ہمارا ساتھ دیا ایسے ہی ہم نے بھی اسے اعتماد کا سہارا دیا۔ اب وہ ہم میں سے ایک ہے۔ وہ اپنے ماضی کو بھول چکی ہے اور اسے کبھی احساس نہیں ہوا کہ اس کی حیثیت رابعہ یا نازو سے کم تر ہے۔ مجھے یقین ہے بالآخر وہ محسن کو بھی اپنی محبت سے جیت لے گی اور اس خلا کو بھی پر کر دے گی جو شملا کی موت نے محسن کے دل میں پیدا کر دیا ہے۔ اب میں تمہارے ساتھ ظلم کرنے والوں سے اس ظلم کا حساب برابر کرنے کا وعدہ تو نہیں کر سکتا مگر یہ وعدہ ضرور کر سکتا ہوں کہ جب تک موت اس رشتے کی راہ میں حائل نہیں ہو گی تم میرے گھر میں میری بہن کی طرح رہو گی۔ اس وقت تک جب تک میں خود تمہیں رخصت نہ کروں، اپنا گھر آباد کرنے کے لیے۔"

"لیکن۔۔۔۔" اس نے فرط جذبات سے گلوگیر لہجے میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"لیکن کیا۔ میں ہر ذمے داری قبول کرتا ہوں۔ نتائج کی پروا کیے بغیر۔ میں دنیا سے ڈرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ خدا کے بعد میں کسی سے ڈرتا ہوں تو خود اپنے آپ سے، اپنے ضمیر سے۔ اگر میں تمہیں کسی بازار کے کوٹھے سے بھی اٹھا کے اپنے گھر لاتا اور بہن کہتا تو پھر بہن کی عزت بھی دیتا۔ تمہارے دامن کے ہر داغ رسوائی کو تمہاری طرف اٹھنے والے ہر سنگ ملامت کو اور ہر تیر دشنام کو میں قبول کرتا۔ تم تو مظلوم اور معصوم ہو۔"

وہ پھر رونے لگی "لیکن سکندر۔۔۔۔ میں۔۔۔ میں عورت ہوں جو مرد کے ظلم کا خمیازہ تمام عمر بھگتنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اگر۔۔ خدانخواستہ۔۔۔۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا "اول تو کچھ ہو گا نہیں۔ اس وہم کو دل سے نکال دو۔ اور۔۔۔ ہوا تو میں سمجھوں گا کہ میرے بھانجے کا بے غیرت اور بے ضمیر باپ اسے لاوارث چھوڑ کے چلا گیا، مر گیا۔ اس کی پرورش میں کروں گا۔ وہ ہم سب کے خاندان کا ایک فرد ہو گا۔ اسے کبھی احساس نہیں ہو گا کہ اس کا کسی سے خون کا رشتہ نہیں۔ ڈرنا چھوڑ دو کاجل۔ ظلم کا مقابلہ کرنا سیکھو، اعتماد کرنا سیکھو اور ہمارے ساتھ رہو۔ ہم سب مظلوم ہیں اور ہمارے درمیان یہ رشتہ خون کے رشتے سے زیادہ مضبوط ہے۔"

کاجل نے آنسو پونچھ لیے تھے "میں کوشش کروں گی۔"

"وعدہ کرو مجھ سے" میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا "تم آئندہ مرنے کا فضول خیال دل میں نہیں لاؤ گی۔ تمہیں کس کی قسم دوں؟"

"میں وعدہ کرتی ہوں" وہ مسکرائی "قسم دینے کی ضرورت نہیں۔"

"نہیں۔ اس معصوم کی زندگی کی قسم کھاؤ" میں نے سوتے

ہوئے کلیم کی طرف دیکھا "اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے کہو کہ تم مجھے بڑا بھائی سمجھو گی۔ اپنے دکھ کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھو گی۔ اپنے ماضی کو بھول کر مستقبل میں یہ رشتہ نبھاؤ گی۔ بہنوں کی طرح۔"

اس نے کلیم کے سر پر ہاتھ رکھا "میں۔۔۔۔ قسم کھاتی ہوں۔"

دور بیٹھے ہوئے میزبانوں نے یہ منظر بڑی حیرانی سے دیکھا۔ ان میں سے کسی نے دخل اندازی نہیں کی تھی۔

میں نے کاجل سے کہا "یہ بات آج ختم ہو گئی، اسی وقت۔ اب دوبارہ نہیں ہو گی۔ کوئی مسئلہ ہو یا پریشانی ہو تو تم کسی سے بھی بات کر سکتی ہو۔ ہم سب ایک ہیں۔ ہر معاملے میں۔"

مرزا غالب نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا "اٹھ گئے آپ۔ میں تو رابعہ کو تسلی دے چکا تھا کہ صبر کرے۔ اللہ نعم البدل دے گا۔"

میں نے کہا "بہت دیر سے سویا تھا میں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ لوگ گھوڑے بیچ کے سوتے ہیں، تم خچر خرید کے سوئے تھے" غالب نے کہا۔

"اچھا تو تم جاگ رہے تھے، سونے کا ڈراما تھا۔"

"پہلے تو واقعی نیند آ گئی تھی، بعد میں تمہاری باتوں سے آنکھ کھلی تھی۔"

میں نے کہا "وقت کیا ہوا ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ دوپہر ہو گئی۔"

"میں بھی اٹھا تھا تو یہی سمجھا تھا۔ یہاں پہاڑوں پر سورج طلوع ہونے سے قبل ہی دوپہر ہو جاتی ہے۔ ابھی نو بجے ہیں۔ دو گھنٹے سے تو میں باہر بیٹھا تھا، اس وقت بھی اتنا ہی اجالا تھا۔"

"سردی بھی تو ہو گی؟"

"ہاں۔ مگر منظر اتنا حسین ہے باہر کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔ پھر رابعہ اور نازو آ گئیں۔ ہم سب دم بخود بیٹھے رہے۔"

"کیا وہ ابھی تک دم بخود بیٹھی ہیں؟"

"تم دیکھو تو سہی باہر نکل کے" غالب نے کہا۔

باہر واقعی قدرت کا سارا حسن ایک سحر آفریں منظر بن کے پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف بادل تھے جو وادی کی گہرائی میں اترتے ہوئے خزاں رسیدہ درختوں کی شاخوں پر اٹکے نظر آتے تھے۔ دوسری جانب برف پوش چوٹیوں پر دھوپ جگمگا رہی تھی اور اس کی خیرہ کن چمک انسان کے عزم تسخیر پر خندہ زن محسوس ہوتی تھی۔ پھر ہمالیہ کی سربفلک چوٹیاں تھیں۔ اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں۔ چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں۔ اس پرہیبت خاموشی اور سکوت میں مجھے اسی نظم کا آخری شعر بھی یاد آیا۔ ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو۔ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو۔ یہ ہم سب کی آرزو تھی، دعا تھی۔ اور ہماری ساری جدوجہد پھر اپنے تصور کی صبح و شام تک رسائی کے لیے تھی۔ تھا اور ہم سب اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ رہے تھے۔ وطن کی کشش ہمیں کھینچ رہی تھی اور اپنے شہروں کی دلدار فضا کی یاد ہمیں پکار رہی تھی۔ اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم راستے کی سب رکاوٹوں کو اڑ کے عبور کر لیتے۔ یہاں میں نے خود کو قدرت کے بہت قریب محسوس کیا اور میں نے دعا مانگی۔ وہ ایک خواہش تھی جس نے خود ہی دعا کا پیکر اختیار کیا۔ اس دعا کے لیے الفاظ کا وجود بے معنی ہو گیا لیکن میں اس یقین سے سرفراز ہوا جو بے اثر نہیں ہوتا۔

رابعہ اور نازو ایک چٹان کے ہموار حصے پر بیٹھی ہوئی تھیں جو دست قدرت کے تراشے ہوئے چبوترے کی طرح تھا اور کسی بے ستون چھت کی طرح آگے تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں سے سڑک مجھے سو گز دور نظر آئی۔ اس کا ایک حصہ دائیں جانب بلندی پر نظر آ رہا تھا اور تھوڑا سا ٹکڑا بائیں طرف نشیب میں دکھائی دے رہا تھا۔ باقی سڑک پہاڑوں کے نشیب و فراز میں گم تھی۔

میں نے کہا "مرزا جی! یہ سڑک تو خاصی دور ہے اس گھر سے۔"

غالب نے کہا "میں بہت پہلے حیران ہو چکا ہوں اس بات پر۔"

"رات تو ایسا لگا تھا کہ گھر بالکل سڑک کے ساتھ ہے۔ اتنی دور ہوتا تو ہم کیسے دیکھتے؟ جب یہاں سے سڑک دکھائی نہیں دیتی تو سڑک پر سے یہ گھر کیسے نظر آیا تھا؟ وہ بھی رات کے اندھیرے میں۔"

"رابعہ اور نازو کا خیال ہے کہ ہم سے اندازے کی غلطی ہوئی تھی کیونکہ ہم تھکن، نیند اور سردی کے باعث اپنے حواس میں نہیں تھے۔ مگر میں یہ بات نہیں مان سکتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم سڑک پر چلتے جا رہے تھے اور ہم نے اچانک یہ گھر دیکھا تھا۔ پھر وہ بوڑھا نکلا تھا لالٹین اٹھائے۔ جب ہم اس سے باتیں کر رہے تھے تو ہم کہاں کھڑے تھے؟ سڑک کے ساتھ ہی تو تھے۔"

"بالکل ٹھیک۔ مکان سڑک کے قریب تھا۔ زیادہ سے زیادہ دس گز کے فاصلے پر" میں نے کہا "یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

غالب نے کہا "میں سمجھا سکتا ہوں۔ آپ نے ایک معجزہ رونما ہونے کی دعا مانگی تھی۔ قدرت نے معجزہ دکھا دیا۔ رات کو یہ مکان آگے آ گیا تھا۔ جب ہم اندر داخل ہو گئے تو یہ پھر پیچھے اپنی اصل جگہ پر لوٹ آیا۔"

میں نے کہا "یار! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"جب انہونی کسی ناقابل فہم، ناقابل وضاحت اور ناقابل یقین وجہ سے ہونی بن جائے تو اسے معجزے کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا اور ایسے معجزے جب قدرت دکھاتی ہے تو انسان اپنی عقل کے منطقی استدلال سے ان کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ ہمارے میزبان کا آخری وارث صبح کہیں گیا تھا۔ میں نے دیکھا تو وہ اسی سمت سے آیا تھا۔"

"جدھر ہم شیر کی لاش اور ٹرک چھوڑ کر آئے تھے؟"

www.paksociety.com

"ہاں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ مارننگ واک کے لیے گیا تھا تو اس نے تڑ کر کہا کہ اپنی تو عمر گزر گئی جوتیاں چٹخاتے اب اسے کوئی مارننگ واک کہے یا ایوننگ واک۔ واک واک تل وی تائم۔ ناہم اس سے میری صحت خراب ہو رہی ہے۔"

"اس کی مراد ذہنی صحت سے ہوگی۔"

"وہ خچروں کا بندوبست کرنے گیا تھا" غالب بولا "میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ پانچ چھ میل پیچھے خچروں، گدھوں، گھوڑوں کا ایک شوروم ہے جہاں ایک ہارس پاور کے گھوڑے، دو ہارس پاور کے خچر اور نو سے ہارس پاور کے گدھے ملتے ہیں۔ کرائے پر بھی اور سیکنڈ ہینڈ بھی۔"

"سیکنڈ ہینڈ؟"

"ہاں۔ ان کے اصل مالک یا تو ان راستوں پر سفر کے لیے خچر لیتے ہیں اور پھر قضائے الٰہی سے ملک عدم کے سفر پر چلے جاتے ہیں۔ ایسے گھوڑے اور خچر واپس آ جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ضرورت مند بھی ہوتے ہیں جو دور دراز سے یہ جانور رکرا کے لاتے ہیں اور سو پچاس روپے میں بیچ جاتے ہیں۔ وہ ہر خچر یا گھوڑے کا زر ضمانت سو روپے رکھتا ہے۔ دس روپے روز کرایہ لیتا ہے۔ واپس آ جائے تو ٹھیک ہے نہ آئے تب بھی فائدہ۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کرایہ صرف دس روپے؟"

"اس نیچر نے پانچ ہزار میں سودا کیا ہے تم سے؟" غالب بولا۔

"وہ بڑا استاد ہے۔ پانچ سو کے پانچ ہزار دینا لیے۔"

"سارنگ صحیح ہے۔ اس نے تو بچے کے بھی پانچ سو لگائے ہیں۔"

میں نے کہا "میں کیا کرتا۔ مجھے ریٹ معلوم نہیں تھا اور میں منہ مانگی قیمت ادا کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا "اس کی مدد کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ مردہ بدست زندہ۔ وہی واقف ہے یہاں کے راستوں سے بھی۔"

"کیا تمہاری اس سے بات ہوئی؟"

"ہاں۔ اس نے خود ہی سب بتا دیا جو تم نے جو پروگرام بنایا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم کہاں گئے تھے تو اس نے کہا کہ وہ پانچ چھ میل پیچھے گیا تھا۔ اسی سڑک پر لیکن کمال کی بات ہے کہ نہ اس نے کہیں کوئی شیر دیکھا جو سڑک پر مرا پڑا ہو نہ اس نے کسی سے ایسی کوئی بات سنی۔ حالانکہ ایسا روز نہیں ہوتا۔ سڑک پر تو آج تک کبھی مردہ شیر کسی کو نظر نہیں آیا۔ زندہ شیر بھی مل جاتے ہیں۔"

میں نے سوچ کے کہا "کمال ہے! کیا اس نے تم سے سوال کیا کہ تم شیر کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اس نے پوچھا تھا" غالب بولا "میں نے کہا کہ جب ہم ادھر آ رہے تھے تو ہم نے دیکھا تھا۔"

"ممکن ہے کوئی اٹھا کے لے گیا ہو۔ شیر کی کھال اور چربی بہت قیمتی ہوتی ہے۔"

"اس نے ٹرک کا ذکر بھی نہیں کیا" غالب نے حیرانی سے سر ہلایا "پہاڑوں میں پھنسا ہوا ٹرک دیکھا تو ہوگا اس نے۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے میزبان نے ہانک لگائی اور اس کے کچھ بچے نے انگریزی میں چلانا شروع کیا "بریک فاسٹ۔ بریک فاسٹ" تو رابعہ اور نازو بھی اس تخت شاہی سے اتر آئیں جس پر وہ یوگا کے انداز میں آلتی پالتی مارے خاموش بیٹھی تھیں۔

رابعہ نے کہا "کیسی خواب ناک جگہ ہے۔ جنت کی طرح لگتی ہے۔"

نازو نے کہا "واقعی یہی جی چاہتا ہے کہ کوئی یہیں رہ جائے۔"

غالب نے کہا "میری طرف سے اجازت ہے۔ یہ زندگی دنیاوی جنت میں گزار لو ورنہ مر کے تو جہنم رسید ہی ہونا ہے تم جیسے گنہگاروں کو۔"

"میں تو جہاں جاؤں گی تمہارے پیچھے جاؤں گی۔ ڈھونڈوں گی نہیں۔"

"آخر ہے نا بھوت کی بچی" غالب نے آہستہ سے کہا۔

"کیا! تم نے پھر میرے ابا کو بھوت کہا" نازو نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

"ہاں ہاں۔ میرا سسر بھوت ہے۔ اب وہ تمہارا باپ ہو یا کسی اور کا۔ میں نہیں ڈرتا کسی بھوت چڑیل سے" غالب نے چلا کے کہا۔

ہمارے میزبان بہت غریب لوگ تھے۔ پھر بھی ہماری مدارات کے لیے انہوں نے کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیا تھا۔ غالباً صبح ہوتے ہی خچر کو اس کے باپ نے "شاپنگ" کے لیے بھیجا تھا۔ پتا نہیں کہاں سے وہ انڈے اور مرغیاں لایا تھا۔ ان غیر آباد نظر آنے والے پہاڑوں میں گدھوں، گھوڑوں کا شوروم اور "ریسٹ اے ہاؤس" میرون وسنباپ بھی تو کہیں کسی کا مرغی خانہ بھی ہوگا۔ انڈا وال بھی وہ کہیں سے تو لاتے ہی ہوں گے۔ مارکیٹ کا تصور تو یہاں محال تھا مگر ممکن ہے کوئی اپنے گھر میں سپر اسٹور کھولے بیٹھا ہو۔ مہینے میں ایک بار گلگت سے سپلائی لاتا ہو اور پورا مہینہ مقامی لوگوں کو فروخت کرکے دس گنا منافع کما لیتا ہو۔ خچر نے شاپنگ ٹور سے دہرا فائدہ حاصل کیا تھا۔ وہ خچروں کے شوروم سے بھی معاملات طے کر آیا تھا۔

یہاں ناشتے کا تصور کھانے کی طرح تھا۔ انہوں نے موٹی موٹی روٹیاں تھوپ کے ہمارے سامنے رکھیں اور نرم کچی پکی مرغی کے ساتھ ہی ابلے ہوئے انڈے بھی رکھ دیے۔ رات کو میزبان نے گوشت کے شوربے میں ملا کے ہمارے سامنے جیپ کی گئی تھی۔ اس وقت بہت زیادہ دودھ اور سیاہ پتی والی چائے سفید پتیلی کے ساتھ ابال کے رکھی گئی۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے پیٹ بھرا اور دن کا باقی حصہ خوب صورت کہساروں اور وادیوں کی دھوپ میں گھومتے گزرا۔ کابل اب پہلے سے بہت زیادہ مطمئن تھی اور خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ کلیم کے ساتھ تتلیاں پکڑنے کے لیے بھاگتی رہی۔ رکھو رہی نازو نے بھی اس کھیل میں شرکت کی، پھر نہ جانے کب وہ اور غالب غائب ہو گئے۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا اور کہا "رابعہ یہ لیلیٰ مجنوں کے لڑنے کی آواز نہیں آ رہی ہے۔"

"وہ ہر وقت تو نہیں لڑتے" رابعہ مسکرائی۔

"جب سو رہے ہوتے ہوں تو واقعی نہیں لڑتے" میں نے کہا "کہیں واپسی کا راستہ نہ بھول جائیں۔ سارے پہاڑ ایک سے لگتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "وہ۔۔۔ وہ دیکھو نازو کیا کر رہی ہے۔"

میں نے دیکھا تو نازو ایک سایہ دینے والے سیدھے درخت پر چڑھ رہی تھی اور غالب بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھائے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہے یہ پاگل پن!" میں نے برہمی سے کہا "ایسے پرخطر کھیل میں خوار مخواہ چوٹ آ گئی تو؟ اور جا کے کیا یہ سب کو بتانا چاہتی ہے کہ ہم یہاں ہیں۔"

ابھی وہ دس فٹ اوپر ہی گئی ہوگی کہ اس کا ہاتھ پھسلا۔ میرا سانس رک گیا۔ لیکن دوسرے لمحے غالب نے ہیرو بن کے دکھا دیا۔ اس نے نازو کو کیچ کر لیا۔ بلندی کم تھی اور نازو سب سے ہلکی تھی پھر بھی غالب اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ دونوں ایک ساتھ گرے اور پھر کپڑے جھاڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب ان کی لڑائی شروع ہوئی تو میری جان میں جان آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ سب خیریت ہے۔

رابعہ نے کہا "کیا ہم خچروں پر گلگت جائیں گے؟"

"تمہیں کس نے بتایا؟" میں نے کہا اور اس کے ساتھ خودرو قسم کے سہانی پھولوں کی طرف چل پڑا جو ایک چٹان پر پھیلے ہوئے تھے۔

"مجھے غالب نے بتایا ہے۔ میں نے تو آج تک خچر پر سواری نہیں کی۔ اور ان پہاڑی راستوں پر۔۔۔۔۔"

"بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو آدمی زندگی میں پہلی بار کرتا ہے تو سمجھتا ہے "بہت مشکل ہوں گے لیکن وہ کر لیتا ہے۔ یہ سب کام جو ہم نے کیے کیا یہ آسان تھے؟ پہلے کسی نے کیے تھے؟"

"اب بہت نہیں رہی سکندر۔ اور کچھ کرنے کی" وہ بولی۔

میں نے کہا "کیا غضب کرتی ہو۔ ابھی تو بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اصل جہاد زندگانی تو واپسی کے بعد شروع ہوگا۔ ہیڈ باجے کے ساتھ۔"

وہ مسکرائی "یہ خواب تو پرانا ہو گیا۔"

"تعبیر تو نئی ہوگی" میں نے کہا۔

"پتا نہیں کیوں۔۔۔ میرا یقین متزلزل ہو گیا ہے۔ حالانکہ ہم واپس گھر جا رہے ہیں مگر لگتا ہے یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوگا۔"

"اب تو بقول شاعر۔ چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز۔"

"چند روز نا کتنے چند روز؟" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "محسن اور کابل پر رشک آتا ہے کیسے بچھڑے ان کے۔"

"در آید درست آید والی مثال پر غور کرو۔ ہم بھی بس پہنچنے ہی والے ہیں۔ ایک بار گلگت پہنچ جائیں، پھر پاکستان پہنچنا کیا مشکل ہوگا۔ عین ممکن ہے ہمیں کسی فلائٹ میں جگہ مل جائے۔"

"ورنہ ہم قافلے کے ساتھ پیدل جائیں گے۔"

"یہ ضروری نہیں۔ وہاں سے گاڑیاں بھی مل جاتی ہیں" میں نے کہا۔

"سنا ہے وہ خوب گوشتے ہیں۔ دھوکے باز بھی ہیں جو سب کچھ چھین کے راستے میں مار ڈالتے ہیں۔"

میں نے کہا "بابا، تم کیوں بلاوجہ کے اندیشوں میں مبتلا ہو۔ ولاور اچنڈ کتنی جیسے دھوکے بازوں کے ہم نے چھکے چھڑا دیے تو ان چوروں اچکوں کی کیا حیثیت ہے ہمارے سامنے۔ محاذ جنگ پر دشمن سے لڑ کر واپس آنے والے کا راستہ کتے روک سکتے ہیں؟ بھونکنے والے ہوں یا کاٹنے والے۔ بس تم کابل کا خیال رکھو۔"

"کابل کو کیا ہوا ہے؟" رابعہ نے کہا "وہ بہت اداس رہتی ہے۔"

میں نے کہا "وہ مرنا چاہتی ہے۔ کلیم ساتھ نہ ہو تو وہ کب کی خودکشی کر چکی ہوتی۔"

رابعہ دم بخود رہ گئی "خودکشی! وہ کیوں؟"

"میں رابعہ فاروقی! تم بہت اچھی ایڈووکیٹ ہو لیکن افسوس کہ تم نے اور نازو نے عورت ہوکے بھی عورت کے دکھ کو نہیں سمجھا۔ یہ احساس جرم و ندامت کی انتہا کو پہنچ کے یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کا وجود ایک قابل نفرت چیز ہے۔ اس کی زندگی کے دامن پر صرف خون کے داغ ہیں اور اس رسوائی کے جو کابل نے برداشت کی مگر ابھی ختم نہیں ہوئی۔"

رابعہ نے کہا "تم سے رکھو کہا ہے اس نے؟"

میں نے رابعہ کو اپنی اور کابل کی ساری گفتگو بتا دی۔ وہ بے یقینی اور خوف کے ساتھ سنتی رہی اور میرے ساتھ چلتی رہی۔

"کب ہوئی یہ بات؟"

"آج صبح۔ اور اب ہم سب کے لیے یہ ایک چیلنج ہے کہ کابل کی عزت نفس بحال ہو۔ خود اپنی نظر میں۔"

"جب تم نے ایک ذمے داری قبول کر لی ہے تو ہم سب کی طرف سے بات ہو گئی" رابعہ نے کہا۔

"رابعہ! فرض کرو یہ فرض محال۔۔۔" میں نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

رابعہ سمجھ گئی "کیا تم سمجھتے ہو۔۔۔ کہ ایسے ماموں جتنا مشکل ہوگا؟"

میں مسکرانے لگا "ماموں کے لیے کوئی مشکل نہیں۔"

www.paksociety.com

"تو ہمالیہ کے لیے کیوں ہوگا" وہ ہنسی اور شرمائی۔

شام کے سائے ڈھلنے لگے تو ہم واپس لوٹے۔ ہم سے پہلے غالب اور نازو واپس پہنچ چکے تھے۔

"یہ آوارہ گردی کی جگہ ہے؟" غالب نے مجھے ڈانٹا "کہاں پھر رہے تھے؟"

"نہیں۔ ہم تو درخت پر چڑھ کے کرنے کی پریکٹس کر رہے تھے" میں نے کہا "میں اندازہ کر رہا تھا کہ کتنی بلندی سے رابطہ کر سکتا ہوں۔"

"پھر کوئی بات نہیں۔ یہ تو آؤٹ ڈور اسپورٹس ایکٹیوٹی ہوتی ہے" غالب نے دانت نکال کے کہا۔

"اور اگر کچھ ڈراپ ہو جائے تو کیا ہوتا ہے؟"

"وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے" نازو بولی "اب اس کے بعد تو کسی اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔"

میزبان نے ہماری فرمائش پر مٹی کے کونڈوں میں سبز چائے پیش کی جو ہم نے باہر بیٹھ کے پی اور غروب ہوتے سورج کی زرنگار کرنوں کو ہمالہ کی برف میں گم ہوتا دیکھتے رہے۔

غالب نے کہا "وہ کیا ماؤنٹ ایورسٹ ہے؟"

نازو نے فوراً اعتراض وارد کر دیا "یہ کے ٹو ہے۔ نقشہ دیکھا ہے کبھی؟"

"تمہیں معلوم ہے جغرافیہ کسی مرد کا نام ہے یا عورت کا؟" غالب نے کہا "یہ ماؤنٹ ایورسٹ ہے۔ یقین نہیں تو میرے ساتھ چلو۔"

"میں ہو آئی ہوں، یہ کے ٹو ہے" نازو بولی۔

میں نے کہا "اس بوڑھے کو زیادہ پتا ہو گا جس کی عمر انہی پہاڑوں میں گزری ہے۔ اس سے پوچھ لیتے ہیں۔"

بوڑھے نے باہر آ کے دیکھا اور بولا "یہ نانگا پربت ہے۔"

غالب نے سر کھجا کے کہا "اچھا وہ یہاں آ گیا۔ پہلے کہاں تھا؟"

نازو نے کہا "پہلے تمہارے سر پر تھا۔ مانتے کیوں نہیں اپنی غلطی کہ یہ ماؤنٹ ایورسٹ نہیں ہے۔"

"غلطی تمہاری بھی تھی جو اسے کے ٹو بتا رہی تھیں" غالب بولا۔

رات کو سردی بڑھنے لگی تو نیچے وادی میں گیدڑ اور بھیڑیے چیخنے لگے۔ میں نے سب کو گزشتہ رات کی ہر بات بتا دی تھی چنانچہ میں نے اور غالب نے باری باری جاگنے اور سونے کا پروگرام بنا لیا۔ ہمارے میزبان رات ہوتے ہی سو جانے کے عادی تھے۔ وقت گزارنے کے لیے یہاں سونا ہی سب سے اچھی اور واحد تفریح تھی۔ شہر میں تو خیر زندگی کے سب ہنگامے آدھی رات کے بعد بھی جاری رہتے ہیں مگر گاؤں بھی اب ٹی وی کی رونق سے محروم نہیں رہے۔ وہاں بھی سرِ شام سونے کا تصور پہلے جیسا نہیں رہا۔ مگر اس ویرانے میں تو کوئی بات کرنے والا بھی نہ تھا۔

پہلے ہم اپنے میزبان سے اس کی تمام شادیوں کا احوال سنتے رہے۔ وہ مزے لے لے کر سب بتاتا رہا۔ اس کی تازہ ترین بیوی خاموشی سے سب سنتی رہی۔ اچانک اس نے ایک سوال کر دیا۔

"میرے بیٹے نے تم سے شادی کی بات کی تھی۔ تین ہزار اگر بہت زیادہ ہیں تو دو ہزار دے دو۔ بہت اچھی لڑکی ہے میری بچی۔"

میں نے برہمی سے کہا "آخر تم اپنی بچی کو یوں کوڑیوں کے مول کیوں دینا چاہتے ہو؟ میں بتا چکا ہوں کہ یہ ناممکن ہے۔ تم مفت دو تب بھی۔"

وہ مایوسی سے بولا "میرا بیٹا واپس نہیں آئے گا۔ مجھے معلوم ہے تم اس کو اتنا پیسہ جو دے رہے ہو۔ تم کو میرا خیال نہیں۔ وہ اس میں سے مجھے ایک پیسہ دینے کو تیار نہیں۔"

یہ سب گفتگو اسی ناخلف بیٹے کی معرفت ہو رہی تھی جو سمجھتا تھا کہ یہ اس کی خوش نصیبی ہے ورنہ آج تک وہ بد قسمت رہا۔ اس کے باپ کو بس ایک موقع ملا تھا جو اس نے اپنی بے وقوفی سے گنوا دیا۔ وہ کہیں سڑک کے کنارے ایک پودا لگا رہا تھا کہ اُدھر سے شاہ نیپال کی سواری گزری۔ نوشیرواں بادشاہ نے بھی ایک بوڑھے کو پھل دار پودا لگاتے دیکھا تھا تو پوچھا تھا کہ بڑے میاں تمہاری اتنی زندگی تو رہی نہیں کہ اس درخت کا پھل کھاؤ۔ پھر یہ محنت چہ معنی دارد؟ اور پودا لگانے والے نے جو عاقلانہ جواب دیا تھا وہ آج تک کتابوں میں ملتا ہے کہ حضور والا، اس کا پھل میرے بعد آنے والے کھائیں گے۔ جیسے کہ میں نے گزر جانے والوں کی محنت کا پھل کھایا۔ شاہ نیپال نے بھی اس کے قریب سواری روکی اور پوچھا کہ بڈھے، اس جنگل میں ایک پودا لگانے کا فائدہ؟ بڈھے نے سادگی سے جواب دیا کہ حضور، ایسے ہی کسی نے پہلا پودا لگایا ہوگا جہاں اب یہ جنگل ہے۔ بادشاہ کو یہ جواب اتنا پسند آیا کہ اس نے بوڑھے سے کہا کہ وہ چاہے تو شاہی محل میں مالی بن جائے۔ اس نے کہا کہ جناب مجھے تو مالی کا کام آتا ہی نہیں۔ شاہی سواری روانہ ہو گئی اور وہ بڈھا جو محل میں پہنچ جاتا تو شاید ہیڈ مالی بن جاتا اور اس کے بعد آنے والی نسلوں کے لیے خوش حالی کے سب دروازے کھل جاتے، اپنی راہ میں آ جانے والی خوش نصیبی کے اس پہلے اور آخری موقعے کو ٹھوکر مار کے لوٹ آیا۔ اب اسے تقدیر سے گلہ کرنے کا حق حاصل نہیں رہا۔

رات کو سونے سے پہلے ہم نے اپنے وسائل کا جائزہ لیا۔ ہم سب کے پاس اپنے اپنے استعمال کے لیے اسلحہ تھا۔ صبح سے شام تک کے سفر میں کسی سے مقابلے کا امکان کم تھا مگر کسی بھی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے پانچ بھرے ہوئے ریوالور کافی تھے۔ اضافی راؤنڈ بیگ میں تھے۔ فوجی وردیوں کی جیب میں سے نکلنے والی سب رقم ملا کے ہمارے پاس بیس ہزار نقد اور ایک لاکھ سے اوپر کی مالیت کے زیورات تھے جو کاجل اپنے ساتھ لائی تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ صبح روانگی سے پہلے بڈھے کو خاموشی سے پانچ ہزار روپے

جائیں گے تاکہ اسے یہ گلہ تو نہ رہے کہ خوش نصیبی نے دستک اس کے دروازے پر دی تھی مگر جوان بیٹے نے اس سے یہ موقع بھی چھین لیا تھا۔ ہم کسی کی تقدیر نہیں بدل سکتے تھے۔ یہ صرف اپنے دل کے اطمینان کا سودا تھا۔ نہ یہ ممکن تھا کہ پانچ ہزار کو وہ کسی منافع بخش کاروبار میں لگائے اور باقی عمر آرام سے دال روٹی کھاتے گزار دے۔ یہاں کاروبار تھا ہی نہیں۔ اس سے یہ امید رکھنا بھی عبث تھا کہ وہ اس بچت کو آڑے وقت کے لیے سنبھال کر رکھ لے گا۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اگلے روز قافلے سے ایک اور اچھی سی بیوی خرید لائے۔

رات کو باپ بیٹوں کے درمیان اچھی خاصی جھڑپ ہوئی۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ جھگڑے کا سبب وہی دولت ہوگی جو بیٹے نے چھپالی تھی۔ باپ اس میں سے اپنا حصہ طلب کر رہا ہوگا۔ جب معاملہ اس حد تک بڑھ گیا کہ بیٹے نے باپ کی داڑھی پکڑلی اور باپ نے بیٹے کو دھکا دیا تو میں نے مداخلت کی۔

"یہ کہتا ہے مجھے میرا حق دو۔ حق کی کیا بات ہے؟ میں نے سودا کیا اور ساری محنت میں کروں گا" بیٹے نے گویا باپ کے خلاف فردِ جرم عائد کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "دیکھو، آخر وہ تمہارا باپ ہے۔ تم بیٹے ہو۔"

"میں اکیلا ہی تو اس کا بیٹا نہیں ہوں" وہ بولا "اور کس بیٹے سے حق مانگا اس نے اور کس نے یہ حق تسلیم کیا؟ اتنی بیٹیوں کی شادی کی اس میں سے میرا حق بھی دیا؟"

"کیا حوالہ دو گے" میں نے کہا "اس میں بھی حق تھا تمہارا۔ یہ نہیں تم لوگوں کی اخلاقیات میں حقوق کیا ہیں اور فرائض کیا۔ تم کو لالچ نہیں کرنا چاہیے۔"

"لالچ میں کر رہا ہوں یا یہ بڈھا کر رہا ہے۔ اسے ایک پیسہ نہیں دوں گا میں۔" وہ بولا "اس دولت سے میں اپنی زندگی بناؤں گا۔ بڈھے کی زندگی تو گزر گئی۔"

میں نے کہا "کیا کرو گے تم اس دولت کا؟"

اس نے کہا "میں کھٹمنڈو میں مکان خریدوں گا۔ ایک کمرا مجھے کافی ہوگا۔ اور میں شادی کروں گا۔ میری مستقل ماہانہ آمدنی ہے۔"

"یعنی تم اب لوٹ کر نہیں آؤ گے؟"

"نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نیپال سے باہر چلا جاؤں۔ دہلی یا بمبئی" وہ بولا "میں تمہارے ساتھ کراچی چلا جاؤں اور پھر دبئی۔"

"کیا بڑے اونچے ارادے ہیں" میں نے کہا "ایک بات بتاؤ۔ تم شہر میں رہتے ہو، پڑھے لکھے ہو۔ تم کو دہلی، کراچی اور دبئی کا علم ہے۔ پھر کیا تم جانتے نہیں کہ عورتوں کی خرید و فروخت اخلاقی ہی نہیں قانونی جرم بھی ہے۔ مہذب لوگ اپنی بیویوں اور بیٹیوں کا سودا یا تبادلہ نہیں کرتے۔ یہ جہالت کی بیہودہ رسم ہے جو یہ ثابت کرتی ہے کہ ابھی تک قوی شخص حیوان ہے اور کمزور فریق یعنی عورت اس کی غلام ہے جسے وہ بیچ بھی سکتا ہے۔ ماں، بہن یا بیٹی کی حیثیت سے اس کی عزت کوئی نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو" وہ میری بات سن کے بولا "مگر ہمارا تعلق تبت کے ایک قبیلے سے ہے۔ ان علاقوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اچھی عورتیں باہر چلی جاتی ہیں۔ ذرائع معاش نہ ہونے کے برابر ہیں۔ خود شوہر بھی مجبور ہو کے بیچ دیتے ہیں۔ گھر میں بیچنے کو اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔"

"چنانچہ بیوی کو بیچ دیتے ہیں؟"

"آہستہ آہستہ اس علاقے میں عورتوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ لوگ بچپن میں ہی ان کے سودے کرنے لگے ہیں۔ جوان ہونے کا انتظار کون کرے۔ اس میں پرورش کا خرچ بھی بچ جاتا ہے۔"

میں نے افسوس سے کہا "اور ان بچیوں کو کون لے جاتا ہے؟ وہی بردہ فروش جو انہیں دنیا کے بازاروں میں پہنچا دیتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے انجام کیا ہوتا ہے ان کا؟"

www.paksociety.com

"نہیں۔ مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟" وہ بولا "یہاں کے لوگ باہر نہیں جاتے۔ ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے ہیں چنانچہ یہاں جنسی بیماریاں عام ہیں۔ سوزاک اور آتشک۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ مہینوں نہیں نہاتے۔ پانی نہیں ہے اور سردی بہت پڑتی ہے۔"

میں حیرانی سے ان انکشافات پر غور کرتا رہا۔ دنیا کے ہر خطے میں لوگ الگ ہیں۔ ان کا طرزِ زندگی اور فلسفۂ اخلاق سب الگ ہے اور شاید معاشی حالات کے تابع ہے۔ اس نظام کو بھلا کون بدل سکتا ہے۔

میں نے کہا "خیر اب تم اپنے بوڑھے باپ کو ایک خوش خبری سناؤ۔ ہم جانے سے پہلے اس کو پانچ ہزار روپے دے جائیں گے۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو "پانچ ہزار روپے! کس بات کے؟"

"بس مجھے رحم آ رہا ہے اس پر۔"

"تم مجھے رحم کھا کے کچھ نہیں دو گے؟" وہ بولا "اس بوڑھے نے آخر تمہارے لیے کیا کیا ہے؟"

"کیا تو تم نے بھی کچھ نہیں ہے ابھی تک" میں نے غصے میں کہا "ہم جس گھر میں ٹھہرے ہیں وہ تمہارا نہیں، تمہارے باپ کا ہے۔ اور تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ اس نے ہی تمہیں پیدا کیا تھا۔"

"مگر میں نے تو نہیں کہا تھا" وہ مظلوم لہجے میں بولا۔

میں نے اس کے تھپڑ مارنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا "تم ایک بیہودہ شخص ہو۔ مجھے زیادہ غصہ مت دلاؤ ایسا نہ ہو کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں اور تمہاری جگہ اسے ساتھ لے جاؤں۔"

وہ سہم گیا "وہ ... تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔"

"کیوں نہیں کر سکتا؟ راستوں کا علم اسے تم سے زیادہ ہوگا۔ تم بھی ہمیں کندھوں پر بٹھا کے تو نہیں لے جاؤ گے" میں نے کہا "ایک خچر پر وہ ہماری راہنمائی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ میں تم کو زبردستی بھی لے جا سکتا ہوں ایک پیسہ دیے بغیر۔ ایک گولی صرف ایک روپے کی ہوتی ہے۔ تم کیا پسند کرو گے، طے شدہ معاوضہ یا ایک گولی؟"

اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ ایک دم میرے قدموں میں گر گیا اور میرے پاؤں پکڑ کے معافی مانگنے لگا۔ اس کا باپ بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر میرے پاس آیا۔ میں نے بیٹے سے کہا کہ وہ مجھ سے نہیں، اپنے باپ سے معافی مانگے لیکن اسے ابھی نہ بتائے کہ ہم نے اسے بھی پانچ ہزار روپے دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

"مگر میں اپنا معاوضہ جانے سے پہلے لوں گا" وہ بولا "مجھے خچروں والے کو دینے ہوں گے۔ اس کے علاوہ میں تم پر اعتبار کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ تمہارا کیا ہے، منزل کے پاس پہنچ کے مجھے گولی مار دو۔"

میں نے کہا "ہم کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔ جو وعدہ کرتے ہیں اس پر قائم رہتے ہیں مگر تمہارا ڈرنا بھی بجا ہے۔ معاوضہ تم کو روانگی سے پہلے ادا کر دیا جائے گا۔ یہ بتاؤ کہ اسے تم ساتھ رکھو گے یا کہیں دبا کے جاؤ گے؟"

وہ بولا "میں کچھ بھی کروں۔ تمہیں کیا؟"

میں نے ہنس کے کہا "ساتھ مت رکھنا ورنہ کوئی چھین لے گا۔ ہم خود ہی نکال لیں تمہاری جیب سے" تمہیں مارنے کے بعد۔"

"تم نے وعدہ کیا ہے ...."

"ہاں۔ وعدہ تو کیا ہے لیکن فرض کرو کوئی ایسی بات ہو گئی کہ ہم نے کسی بات پر مشتعل ہو کے تمہیں گولی مار دی یا کوئی اور تمہارے پیچھے لگ گیا تو تمہاری جان بھی جائے گی اور یہ رقم بھی۔ خواہ تم اسے یہاں گاڑ کے جاؤ۔ وہ تمہارے کام تو نہیں آ سکتی۔"

"مجھ ... پھر میں کیا کروں؟" اس کی حالت غیر ہو گئی۔

"ہم پر اعتبار کرو۔ منزل پر پہنچ کے اپنا معاوضہ لینا" میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" وہ بولا "مجھے تم پر اعتبار کرنا ہی چاہیے۔"

صبح جب میری آنکھ کھلی تو غالب جاگ رہا تھا۔ اس نے مجھے مطلع کیا کہ ٹرین آ گئی ہے۔

"کون سی ٹرین؟" میں نے جمائی لے کر کہا۔

"ڈی میول ٹرین" اس نے کہا "باہر کھڑی ہے۔ اس میں سات بوگیاں ہیں۔"

میں ہنس پڑا "سات خچر آ گئے ہیں۔"

"ہاں۔ آٹھواں ایک گدھا ہے جو انہیں لایا ہے" غالب نے کہا۔

"وہ گدھا اس ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک ہوگا" میں نے کہا "بہت بڑا بزنس ہے اس کا۔ کیا اس کے سر پر سینگ ہیں؟"

"سینگ جیسی مونچھیں ہیں اس کی۔ وہ مجھے کوئی شریف تو نہیں لگا" غالب بولا۔

"ظاہر ہے اس کا شرافت سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ وہ چوری کے گدھے گھوڑے اور خچر خریدتا ہے۔"

"یہ بات نہیں۔ وہ ہمارے قافلہ سالار سے کوئی بات کر رہا تھا۔ ان کی باتیں سن کے مجھے دال میں کالا محسوس ہوا۔"

میں نے کہا "تم باتیں سن کے سمجھ گئے؟"

"نہیں۔ سمجھا تو نہیں مگر دال میں کالا تو کسی کو بھی نظر آ جاتا ہے" غالب نے عجیب منطق بگھاری "اس کے لیے کسی خاص زبان میں مہارت یا ڈگری کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"پھر تو میں بھی دیکھ لیتا۔ تم نے کیوں بتایا؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

یہاں پانی کا باب تھا۔ عورتیں نہ جانے کہاں سے اور کتنی دور سے سر پر چھاگلیں اور کاندھوں پر گاگریں رکھ کے پانی لاتی تھیں جو اتنا ہی ہوتا تھا کہ کھانا پکانے اور پینے کو کافی ہو۔ ہاتھ منہ دھونے کا رواج یہ تھا کہ ایک کپڑے کو گیلا کر کے بنام ضرورت منہ پر لگاتے تھے پھر اسے خشک کپڑے سے رگڑ کر چمکا لیتے تھے یا چلو بھر پانی جو کٹورے میں ڈوب مرنے کے لیے تو استعمال ہو سکتا تھا منہ پر اور ہاتھوں پر لوشن کی طرح مل کے اور صاف کر کے فرض کر لیا جاتا کہ میل بھی صاف ہو گیا۔ نہانا تو امراء کی عیاشی تھی یا سنت کی صورت مگر یہ بات بھی میں اندازے کی بنا پر کہہ رہا ہوں نہ میں نے کسی امیر کو نہاتے دیکھا تھا نہ کوئی سنت بھی تھی۔

وہ ہماری منہ دھونے کی فضول خرچی سے ضرور پریشان ہوں گے حالانکہ میں نے صرف ایک مگ پانی سے منہ اور آنکھوں پر چھینٹے مارے تھے تاہم ان کے لیے یہ مقدار اتنی تھی کہ پورے خاندان کو کافی ہوتی۔ میں باہر آیا تو ٹرین واقعی پلیٹ فارم پر موجود تھی۔ خچر ٹرین کے سامنے خچر ایک قطار میں استادہ تھے اور منتظر لگتے تھے کہ ہم انہیں شرفِ باربرداری بخشیں۔ سمور کی ٹوپی اوڑھے منہ کے گرد مفلر لپیٹے لنڈے کی گرم پتلون اور کوٹ پہنے ایک شخص خچر ٹرین کے قریب کھڑا تھا اور ہمارے قافلہ سالار سے کسی اختلافی موضوع پر بحث کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر دونوں چپ ہو گئے۔ دنیا فساد کے بنیادی اسباب میں زر، زمین اور زن کو شمار کیا جاتا ہے۔ زمین یہاں صرف خدا کی تھی اور وہ بھی برف پوش پہاڑوں کی شکل میں۔ زن یہاں کی جوتی یا ان کے کپڑوں سے بھی گئی گزری چیز تھی۔ اچھے جوتے کپڑے نہ کوئی کسی کو بیچتا تھا نہ کسی سے بدلتا تھا۔ اس کے برعکس زن یہاں سکہ رائج الوقت کے عوض قابلِ فروخت اور قابلِ تبادلہ چیز تھی۔ قطع نظر اس سے کہ وہ خریدار یا فروخت کرنے والے کی کیا رشتہ دار تھی چنانچہ اختلاف کا واحد سبب زر تھا۔

ہمارے میزبان کا بیٹا اپنے قول و فعل سے ثابت کر چکا تھا کہ پیسہ اس کے نزدیک تمام رشتوں سے افضل اور اہم تر ہے اور خود اپنے باپ کے ساتھ وجہ نزاع بھی پیسہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا خچر ٹرین چلانے والے سے کسی اور مسئلے پر اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ان کی اچانک خاموشی نے غالب کے خیال کی تصدیق کی اور مجھے بھی دال میں کالا نظر آنے لگا۔ خچر لانے والے نے آگے بڑھ کے اور مفلر سے منہ برآمد کر کے مسکراہٹ کا نمونہ دکھایا اور مجھ سے ہاتھ ملا کے بولا "پلیز ٹو میٹ یو سر۔"

قافلہ سالار فوراً وہاں سے کھسک گیا "مجھے روانگی کا انتظام کرنا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارا کیا نام ہے؟"

"ہوشنگ سر" وہ بولا "میں ایک بزنس مین ہوں اور یہاں آنے والے سیاحوں کی خدمت کرتا ہوں۔ آپ میرے گیسٹ ہاؤس میں بھی ٹھہر سکتے تھے میں نے ایک کمرا مہمانوں کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوتی۔"

"تمہیں ہمارے نہ ٹھہرنے سے ضرور تکلیف ہوگی۔ ہم تو یہاں بہت آرام سے رہے" میں نے اس کے تبتی منگولی قسم کے چہرے کو غور سے دیکھ کر کہا جس پر خوشامدانہ مکاری یوں نظر آتی تھی جیسے روئے آب پر کائی۔ "کیا بزنس ہے تمہارا؟ چوری کے خچر اور گھوڑے خریدنے کے علاوہ۔"

وہ پہلے جھینپا پھر بے شرمی سے ہنسنے لگا "میں سب کچھ بیچتا ہوں۔"

"مثلاً اپنی پرائی بیوی بیٹی؟" میں نے کہا "سگریٹ ہوں گی تمہارے پاس؟"

"یس سر" اس نے اوور کوٹ کی تھیلا نما جیب میں ہاتھ ڈال کے کیپسٹن کے دو پیکٹ برآمد کیے "دس روپے ایک پیکٹ کے صرف۔"

"صرف؟" میں نے کہا "چور بازاری کرتے ہو۔"

وہ منمنانے لگا "غریب تو اتنی محنت اور بہت دور سے کوئی چیز لائے اور چار پیسے کمائے تو یہ چور بازاری ہے۔ اور فائیو اسٹار ہوٹل میں اس سے زیادہ کوئی وصول کرے تو جائز ہے۔ آپ تو جانتے ہیں سر! قیمت ہمیشہ ضرورت کی ہوتی ہے۔ یہاں پچاس میل کے علاقے میں آپ کو یہ سگریٹ نہیں ملے گی۔"

میں نے سگریٹ کے پیکٹ لے لیے "پھر ٹھیک ہے۔ اور کیا مال لائے ہو؟"

اس نے دوسری تھیلا نما جیب میں ہاتھ ڈالا اور کافی کا ایک چھوٹا ٹن نکالا "نیس کافی ہے سر، آ گئی۔"

پہلے میں نے سوچا کہ انکار کر دوں۔ وہ شخص واقعی بزنس کرنا جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ادھر آنے والے سیاح کیا مانگ سکتے ہیں۔ کافی اس سرد علاقے میں سب سے زیادہ کارآمد چیز تھی۔

"اور یہ بیئر سر" اس نے جیب سے دوسرا ڈبا برآمد کیا "فارمان ہنڈرڈ آئی ہے۔"

میں نے کافی لے کر اسے سو کا نوٹ دیا "ستر روپے کاٹو باقی مجھے واپس کر دو اور اپنی دکان سمیٹ کر دفع ہو جاؤ۔"

"چاکلیٹ؟ بسکٹ؟ دس روپے ..."

میں نے کہا "نہیں۔ روپے واپس کرو۔"

اس نے مایوسی سے سر ہلایا جس کا مطلب یہ تھا کہ تیس روپے وہ کیسے واپس کرے اس کے پاس چینج نہیں ہے۔ یہ بھی اس کی عیاری تھی۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا

www.paksociety.com

کہ باقی نہیں سو پے کی خریداری کروں یا پھر خریدا ہوا مال واپس کروں اور نوٹ لے لوں۔

"فاریو۔ آئی تھنگ" اس نے پنیر کے ڈبے کی قیمت ایک رقم ترمیم کر دی۔

میں نے ڈبا لے کر کہا "چلو حساب برابر۔ آپ جاؤ۔"

اس نے فرفر کی "تھونتی مور سر۔"

میں نے اس کی ایک نہیں سنی اور اندر چلا گیا۔ وہ میرے پیچھے شور مچا کے یہ ظاہر کرتا رہا کہ وہ لٹ گیا ہے اور میں نے اس کو معاشی طور پر تباہ کر دیا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان تینوں چیزوں کی مجموعی قیمت تیس سو پے بھی نہیں۔ تاہم اس کا احتجاج کرنا بھی جائز تھا۔ جن چیزوں پر وہ سات آٹھ سو فیصد منافع لینے کا عادی تھا ان پر اسے تین سو فیصد کا منافع بھی نہیں ملا تھا۔

ناشتے کے بعد ہم نے کافی پی تو مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ قدرت کی مہمان نوازی کا سلسلہ ابھی تمام نہیں ہوا تھا۔ جہاں چائے کی خواہش کرنا بھی پاگل پن سمجھا جاتا، وہاں کافی مل گئی تھی۔ سگریٹ، پنیر، چاکلیٹ اور بسکٹ بالکل ایسے ہی تھے جیسے بنی اسرائیل کے لیے من و سلویٰ۔ آسمان سے اترنے والی نعمتوں کی طرح۔ خدا کی دین ہے کہ موسیٰ آگ لینے گئے تھے تو پیغمبری مل گئی تھی۔ ہمارے میزبان کافی سے نا واقف تھے۔ کافی بنانے کا طریقہ انہیں نادر نے سمجھایا۔ وہ خاصے حیران ہوئے کہ ہم نے اپنے پانی میں کافی اور چینی گھول کے وہ تلخ مشروب پی لیا جو انہیں بہت بدذائقہ اور کڑوا لگا تھا۔ کلیم نے اور کاجل نے چائے کو ترجیح دی۔ پنیر نے ناشتے کی رونق بڑھا دی تھی۔ اچھی طرح پیٹ بھرنے کے بعد اور دو دو کپ کافی کے پی کر ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ رات بھر آرام کرنے کے بعد ہماری جسمانی توانائی اس حد تک بحال ہو چکی تھی کہ ہم پیدل بھی سفر کر سکتے تھے تاہم خچر زین تیار تھی اور رابعہ وصل رہی تھی۔

باقی لوگ باہر نکل گئے تو میں نے بوڑھے سے ہاتھ ملایا اور اسے پانچ ہزار روپے پیش کیے۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے شکر گزاری کے ساتھ اصرار کیا تو اس نے بڑی عجلت میں رقم چھپائی اور باہر کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہنے لگا۔

میں سمجھ گیا "تمہارا مطلب ہے اس کو نہ بتاؤں؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور اشاروں کی زبان سمجھا دی۔ اس کی بیوی اور بیٹی کو بالکل خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو خود بھی بوڑھے کی کر نسی تھیں۔ شاید بیوی کو اتنا افسوس ہوا ہو کہ اب وہ زیادہ اچھی اور مہنگی بیوی لائے گا اور اسے اونے پونے بیچ ڈالے گا۔ بیٹی کو ایک دن جانا ہی تھا۔ جو بیٹی کپڑا اسے وہی شوہر نہیں آتا۔

باہر عجیب افراتفری تھی۔ بالکل ٹرین پر سوار ہونے والے مسافروں کی طرح۔ میں نے پوچھا تو پتا چلا کہ مسئلہ کلیم نے اور کچھ رابعہ نے پیدا کیا تھا۔ رابعہ خچر پر بیٹھنے سے ڈر رہی تھی۔ غالب نے مجبور پیش کی کہ وہ میرے ساتھ بیٹھ جائے تو خچر کا مالک نہیں مانا۔ ان پہاڑی راستوں پر ڈبل سواری کے لیے نہیں بنائے گئے تھے۔ ان کے نزدیک پسنجر بیٹھ جائیں گے ڈبل ہو گئے تو اب دے جائیں گے۔ کلیم کو مزید سواری کے طور پر کاجل کے ساتھ فٹ کر دینے سے ایک خچر بچ گیا تھا۔ اگر رابعہ میرے ساتھ بیٹھ جاتی تو مالک کا مزید نقصان ہوتا۔ سب در دو جاتے تو تین خچر فالتو ہو جاتے اور واپس کر دیے جاتے۔ اس کے سوا پریشانی کی بات کوئی نہیں تھی۔ یہ مجبوری پر وہ افراد آسانی سے سفر کرتے ہیں اور خچر تو اسپیلڈ نگ اور ساز و سامان ڈھونے کے لیے ہوا تھا۔ جیسے میدانوں میں کار چلتی ہے تو پہاڑی پر فور وہیل ڈرائیو جیپ کام آتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ خچر بھی فور وہیل ڈرائیو کی طرح کارآمد ثابت ہو گا۔ عبار تری کو عیاری سے ہی شکست دی جا سکتی ہے۔

میں نے کہا "تمہارے خچر واقعی بہت کمزور ہیں۔"

"نہیں سر۔ اگر ان پہ دو آدمی بیٹھ گئے تو ان کی کمر ٹوٹ جائے گی۔" اس نے میری منصف مزاجی سے متاثر ہو کے کہا۔

"اور خچری کی کمر ٹوٹی تو سواروں کا کیا ہو گا؟ ممکن ہے ان کی بھی کمر ٹوٹ جائے یا ٹانگ ٹوٹ جائے۔" میں نے کہا "نہیں، ہم یہ رسک نہیں لے سکتے۔ ایک خچر پر ایک ہی سوار ہو گا۔"

"تینوں خچر اسپیشل ہوں گے؟" غالب نے کہا۔

"اچھا ہے نا۔ جو خچر فالتو ہوا اسے یہیں چھوڑ دیں گے" نادر بولا۔

رابعہ نے مجبوری میں میرے فیصلے کو قبول کر لیا تھا۔ وہ غالب کی مدد سے سوار ہوئی۔ اس قیمتی رہائی کے بعد کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔

"اول تو یہ سب سے شریف اور وضع دار خچر ہے۔ تم دیکھو اس کی آنکھوں میں مروت ہے" غالب نے کہا "اور اس کی صورت پر غور کرو۔ بالکل میری طرح معصوم اور مظلوم نظر آتا ہے کہ نہیں۔ اسے کسی کیریکٹر سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں۔ یہ شوہر سے زیادہ تمہارے اشارے پر چلے گا۔ میڈیکل چیک اپ میں ہر چیز دیکھ لی ہے میں نے۔ چاروں پہیئے میرا مطلب ہے چاروں ٹانگیں بالکل ٹھیک لگی ہوئی ہیں۔ کوئی امکان نہیں کہ راستے میں ایک نکل جائے۔ یہ مکمل فور وہیل خچر ہے۔ یعنی اپنی مرضی سے چلتا ہے۔ اپنی مرضی سے دوڑتا ہے اور اپنی مرضی سے رکتا ہے۔ تم کو بالکل فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں گرانا ہو گا یہ خود ہی گرا دے گا۔"

گھبرائی ہوئی رابعہ بھی اس کی باتوں پر ہنس پڑی۔ نادر اور کاجل تو پہلے ہی اپنے اپنے خچر پر بیٹھی مزے لے رہی تھیں۔

میں نے خچر ٹرین کے مالک سے کہا "اب تم کو کس کا انتظار ہے؟ ہم اور کچھ نہیں خریدیں گے۔ تم جانے کیوں نہیں؟"

اس نے گھبرا کے کہا "چلا جاؤں گا سر۔ تھوڑی دیر بعد۔"

میں نے کہا "تم ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟ یہ خچر تم نے

مانوس ہوں گے۔ واپسی میں ایک آدمی سب کو کیسے لائے گا؟"

اس نے کہا "لے آئے گا۔ میں ساتھ نہیں جا سکتا۔"

میں نے کہا "میں ایک ہزار دوں گا۔ کل تک تم واپس آ جاتے ہو۔ تم دو دن میں یہاں بیٹھ کے تم ایک ہزار کما لو گے؟"

اس نے بوڑھے کے بیٹے یعنی ہمارے قافلہ سالار کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور اس نے نظر بچا کے اشارہ کیا کہ انکار کر دو۔ مگر میں نے دیکھ لیا۔ وہ چوری پکڑے جانے پر بوکھلا گیا۔

"تم کو کیا اعتراض ہے؟" میں نے کہا۔

"مجھے۔ نہیں... اس کی اپنی مرضی ہے" وہ بولا۔

"میری مرضی نہیں ہے" ہوشنگ بولا۔

میرا شک پختہ ہو گیا کہ وہ ہماری روانگی کے بعد کچھ کرے گا۔ "اگر میں تم کو دو ہزار دوں؟"

اس نے پھر اجازت طلب نظروں سے دوسری طرف دیکھا۔ اس کی مزاحمت کمزور پڑتی جا رہی تھی اور وہ مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ہمارے قافلہ سالار نے دوبارہ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں انکار کرنے کا اشارہ کیا اور مجھ سے مخاطب ہو گیا "آپ کو چھوڑ دیر ہے کار آ رہی ہے۔ ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔"

میں نے سر ہلایا اور اپنے خچر پر سوار ہو گیا جو دوسرے نمبر پر تھا۔ میرے پیچھے ترتیب وار نادر، پھر رابعہ، کاجل، کلیم اور آخر میں غالب تھا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے غالب سے کہا کہ وہ آگے آ جائے۔ میں سب سے پیچھے ہو گیا۔

"تم لوگ آہستہ آہستہ چلو۔ میں آتا ہوں۔"

قافلہ سالار نے گھبرا کے کہا "کیا بات ہے؟ تم واپس کیوں جا رہے ہو؟"

"ایک چیز بھول آیا ہوں میں" میں نے کہا اور خچر کو موڑ لیا۔

"تم ٹھہرو میں لے آتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کیا چیز ہے؟" وہ میرے پیچھے لپکا۔

غالب نے اس کا راستہ روک لیا "فکر مت کرو۔ وہ راستہ بھول نہیں سکتا۔ ابھی تو ہم چند قدم دور ہی آئے ہیں۔"

میں ابھی بوڑھے کے گھر سے دور ہی تھا کہ مجھے اس کے چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ میں نے خچر کو روک کے چھلانگ لگائی اور دوڑ کر اندر گیا تو ایک دم خاموشی ہو گئی۔ ہوشنگ جو بوڑھے کے سینے پر سوار تھا اور اس سے پانچ ہزار چھین چکا تھا، مجرم کی طرح کھڑا ہو گیا۔

میں نے کہا "یہ رقم واپس کر دو ہوشنگ۔"

اس نے بدحواسی میں کہا "یہ... بڈھا... میرے پاس امانت رکھوانا چاہتا تھا تاکہ محفوظ رہے۔"

"بڈھے کو چھوڑو۔ اپنی حفاظت وہ جیسے چاہے کرے۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔"

"کیا... میں نے پہلے بھی بتایا تھا" اس نے رقم واپس کر کے بڑھی سے کہا "میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔"

"تم کو ساتھ جانا پڑے گا۔ میں تم سے درخواست نہیں کر رہا ہوں، تمہیں حکم دے رہا ہوں۔"

"اور اگر میں۔ حکم نہ مانوں؟ میں پابند نہیں ہوں۔"

میں نے اسے گردن سے دبوچ لیا اور دروازے کی طرف دھکیلا "میں تم کو پابند کروں گا۔ چلو، تمہارے بغیر خچر بھی نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہیں اور تمہیں بہت یاد کر رہے ہیں۔"

میں نے دوبارہ بوڑھے کو خدا حافظ کہا جو اپنی رقم مل جانے کے بعد بھی پریشان کھڑا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی کو نہ اس کے دولت مند ہونے کی خوشی تھی نہ اس کے لٹنے کا غم۔ وہ خاموش تماشائی کی طرح ایک طرف سہمی بیٹھی تھیں۔

ہوشنگ سمجھ گیا تھا کہ وہ مزاحمت نہیں کر سکتا۔ باہر آتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگنا اور منت سماجت کا ڈرامہ شروع کیا "آپ سمجھے میں اس کو لوٹ رہا تھا سر! ہرگز نہیں۔ اس علاقے کے سب لوگ میرے پاس رقم رکھواتے ہیں۔ میں سب کو ضرورت پڑنے پر ادھار بھی دیتا ہوں۔ مجھے معاف کرو اور جانے دو۔"

اب میں نے اسے اٹھا کے خچر کی طرف پھینکا۔ وہ نیچے گرا ہی تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے ایک جھٹکا دیا تو وہ اڑتا ہوا خچر پر جا گرا "چلو سیدھے بیٹھو ورنہ میں یہ رسی تمہارے گلے میں ڈال دوں گا اور تمہیں خچر کے ساتھ دوڑاتا ہوا لے جاؤں گا۔"

خوف سے اس کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ سنبھل کے سیدھا بیٹھ گیا "سر میں نے بڑی غلطی کی...."

"ہاں۔ تم نے پیدا ہو کے بہت غلطی کی" میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا "پھر تم نے زندہ رہ کے غلطی کی۔ تم نے ہم سے جو معمول کے غلطی کی کہ یہ خچر دو افراد کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ دیکھو ہم اس پر سوار ہیں اور خچر کوئی احتجاج نہیں کر رہا ہے۔ تمہاری آخری غلطی میں نے رعایت پر بخش دی ورنہ تم اس بڈھے سے سب رقم چھین لینے لگے تھے۔ اب اگر تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تو یہ غلطی تمہیں مہنگی پڑے گی۔ میرے ہر سوال کا جواب تمہیں سچ دینا ہو گا۔ سمجھے!"

اس نے بڑی مجبوری میں سر ہلایا "ہم سچا آدمی ہے سر۔"

"سچے آدمی! یہ بتاؤ کہ تم کو اس حرکت پر کس نے اکسایا تھا؟ کیا اس کے بیٹے نے کہا تھا کہ میرے جانے ہی باپ کو لوٹ لینا؟"

"ہاں۔ اس نے مجبور کیا تھا ورنہ میں لالچی نہیں ہوں۔"

"تو تم یہ کام دوستی میں کر رہے تھے یا ثواب کی خاطر؟ تم کو اس کار خیر کا کوئی اجر نہیں لینا تھا۔" میں نے کہا "جھوٹ! تم جھوٹ بول رہے ہو نا؟"

میں نے پیچھے سے ہاتھ ڈال کے اس کی گردن کو بازو کے شکنجے میں کس لیا۔ اس کا سانس رک گیا اور وہ تڑپنے لگا۔ میں نے ایک ہاتھ سے خچر کو قابو میں رکھا اور اس کا سر پیچھے موڑنے لگا "ابھی تمہاری گردن ٹوٹ جائے گی۔ تمہاری لاش کو میں نیچے پھینک دوں

www.paksociety.com

گا اور چلا جاؤں گا۔ مجھے کون پکڑے گا؟ تمہاری لاش کو آج رات ہی بھیڑیے اور جنگلی درندے کھا جائیں گے، بول سیٹھ۔"

میں نے اسے اچھی طرح دہشت زدہ کرنے کے بعد تھوڑی سی مہلت دی۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا اور ہاتھوں سے گردن کو ملنے لگا۔ اسے یقین آچکا تھا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ کر کے بھی دکھا سکتا ہوں۔

اب ہم اپنے باقی ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے تھے۔ وہ ابھی تک وہیں موجود تھے جہاں میں نے انہیں چھوڑا تھا۔ ہوشنگ کو میرے ساتھ دیکھ کر قافلہ سالار کی حالت غیر ہوگئی۔

"اب بتاؤ، تم کو کس نے مجبور کیا تھا؟" میں نے ہوشنگ کو نیچے گرا دیا "تم نے جس کا نام لیا تھا وہ سامنے بیٹھا ہے۔"

ہوشنگ نے دو جھانپڑ کھا کے سب اُگل دیا "اس نے مجھے کہا تھا، میرے باپ کے پاس پانچ ہزار ہیں۔ وہ چھین لینا۔ آدھے تمہارے، آدھے میرے۔"

"کیا اسے ڈر نہیں تھا کہ تم ساری رقم مار جاؤ گے؟"

"اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ واپس نہیں آئے گا۔ اس نے مجھے کرایہ نہیں دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے حصے کی رقم سارے خچر بیچ کر پوری کر لے گا۔ اور... باقی کے دو ہزار... اس نے کہا تھا کہ تم میری بہن کو لے جانا اور اس سے شادی کر لینا۔ حساب برابر ہو جائے گا۔"

"یہ جھوٹ بولتا ہے" قافلہ سالار چلایا۔ "میں نے اسے کچھ نہیں کہا تھا۔"

"پھر اسے کیسے معلوم ہوگیا تھا کہ تمہارے باپ کے پاس پانچ ہزار ہیں؟" میں نے کہا "یہ وہاں کیوں آیا تھا؟"

"ہم سگریٹ کافی لایا تھا سر......"

میں نے اس کے سر پر مُکا مارا۔ وہ چکرا کے گرا اور پھر کھڑا ہو کے رونے لگا "آپ مجھے کیوں مارتے ہیں سر؟ اس نے مجھے منع کیا تھا کہ آپ کے ساتھ نہ جاؤں۔ میں تو راضی تھا۔ آپ مجھے دو ہزار دے رہے تھے۔ اس کے باپ سے مجھے ڈھائی ہزار ملتے۔"

میں نے کہا "اگر نہ ملتے تو تم کیا کرتے؟ اسے مار ڈالتے؟"

ہوشنگ نے اعترافِ جرم کے طور پر سر جھکا لیا۔ ہماری توجہ اس کی طرف پا کے دوسرے ملزم نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہوشنگ کے بیان کے بعد بارِ جرم اس پر آگیا ہے۔ اس نے اچانک اس خچر کے ساتھ ایک انتہائی معیوب حرکت کی جس پر غالب سوار تھا۔ اس کے بالکل پیچھے میں کھڑا تھا۔ خچر نے مشتعل ہو کے احتجاج کیا اور دولتی جھاڑ دی۔ غالب کا توازن بگڑ گیا اور خچر کی ایک لات میری پنڈلی پر لگی۔ وہ ایک دم بھاگا۔ فوری طور پر میں اس کا تعاقب کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور غالب کو بھی گر کے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا۔ اس نے اپنی راہ میں حائل ہوشنگ کو بھی دھکا دیا۔ وہ نشیب کی جانب لڑھک گیا۔ ناقابلِ یقین

پھرتی کے ساتھ وہ خود بھی نیچے جانے لگا۔ اس کو معلوم تھا کہ سڑک پر سیدھا دوڑنے میں وہ پکڑا جائے گا اور چڑھنا بھی مشکل کام تھا۔ نیچے اترنے میں وہ تجربہ اور مہارت اس کے کام آ رہی تھی جو بچپن سے آج تک ان پہاڑوں میں زندگی گزار کے اسے حاصل ہوئی تھی۔ وہ بندر کی طرح چھلانگیں مارتا، ایک پتھر سے دوسرے پر قدم رکھتا، ایک چٹان سے دوسری چٹان پر جست لگاتا اور درختوں کی شاخوں کو پکڑ کے اپنا توازن قائم رکھتا وادی میں غائب ہو رہا تھا۔

پہلے غالب نے اور پھر میں نے اسے خبردار کیا کہ وہ رک جائے مگر اس نے ہماری وارننگ کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد غالب نے نشانہ لے کر گولی چلائی۔ غالب کا نشانہ ہم سب سے بہتر تھا۔ اپنے کمال کا مظاہرہ وہ پہلے بھی کر چکا تھا۔ گولی نے فرار ہونے والے شخص کو اس وقت جا لیا جب اسے یقین ہو گا کہ وہ اپنی چالاکی اور پھرتی سے جان بچا کے نکل جانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

وہ ایک دم اچھلا اور اس کی چیخ نے سربفلک پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی کو بھر دیا۔ یہ آواز لاکھوں کروڑوں سال پرانے پتھروں کی بے حس دیواروں سے ٹکرا کے لوٹی، خزاں رسیدہ ننگے درختوں کی بے برگ شاخوں میں الجھی اور چوٹیوں کی دھوپ سے روشن برف میں جذب ہونے کے لیے روانہ ہو گئی۔ صرف اس کا ساکت جسم قدرت کے حسن کی لازوال تصویر پر ایک بدنما داغ کی طرح رہ گیا۔ اس کے پاؤں اوپر ایک چٹان پر تھے اور پاش پاش ہو جانے والا سر نیچے ایک درخت کے تنے سے ٹکرا کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ غالباً گرنے کے ساتھ ہی اس کی گردن بھی ٹوٹ گئی تھی ورنہ اس کا سر تنے سے ٹکرا کے یوں نہ ٹھہرتا کہ نظریں اوپر ہماری طرف جمی محسوس ہوتیں۔ اس کے دونوں بازو نیچے لٹک گئے تھے اور سر سے نکلنے والا خون ہاتھوں پر بہنے لگا تھا۔

فائر کی بازگشت اور سزائے موت پانے والے مجرم کی آخری چیخ کی گونج ختم ہو جانے کے بعد بھی ہمارے کانوں میں زندہ تھی۔ سب کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑے اس شخص کو دیکھتے رہے جو خود کو احمق اور بدنصیب سمجھتا تھا تو غلط نہیں سمجھتا تھا۔ وہ زندہ رہ سکتا تھا مگر اس کی موت نے ہوس کا جال پھیلا کے اسے شکار کیا۔

ہوشنگ پر جیسے فالج گر گیا تھا۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی پتلون تک بھیگ چکی ہے۔ میں اپنی پنڈلی کی چوٹ کو سہلا رہا تھا۔

رابعہ نے پُرتشویش لہجے میں کہا "کیا زیادہ چوٹ آئی ہے؟"

میں نے کراہ کے کہا "اس سے زیادہ نہیں جو دل پر لگی ہے۔"

سفر کے آغاز میں پیش آنے والے اس حادثے نے سب کو متاثر کیا تھا چنانچہ میری بات کا بھی خوشگوار اثر نہیں ہوا۔ غالب نے ہوشنگ کو حکم دیا۔

"جاؤ، اس کی جیب سے سب کچھ نکال لو۔"

ہوشنگ رونے لگا "مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے مت مارو۔"

"پانچ ہزار کے لیے تم ایک بوڑھے کی جان لینے کا سودا کر چکے تھے۔ اس لاش سے کس لیے ڈرتے ہو؟" غالب نے تلخی سے کہا "وہ تو مزاحمت بھی نہیں کرے گا۔ جو معاوضہ اسے ملا تھا وہ اس کا نہیں رہا۔ اب ہمارے ساتھ تم جاؤ گے۔"

ہوشنگ نے انکار میں سر ہلایا "جاؤں گا، ضرور جاؤں گا سر۔ لیکن آپ مجھ کو ماریں گے نہیں، وعدہ کریں۔ آپ کو گاڈ کا قسم، اپنی ماں کا قسم" اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے "اپنے باپ کا قسم۔"

میں نے اسے لات مار کے دور کیا "کمینے آدمی! تم بہت چالاک ہی ہو۔ تمہاری سزا بھی موت ہوتی مگر تم نے ہم سے بے اعتبار چھین لیا ہے۔ تم نے قسم دے کر ہمارے لیے ناممکن بنا دیا ہے کہ تمہیں قتل کر سکیں مگر تم کو نیچے جا کے وہ رقم لانی پڑے گی جو لاش کے پاس ہے۔"

"نہیں... مجھے اس کی ضرورت نہیں" وہ ہکلایا۔

"مگر ہمیں ہے۔ سفرِ آخرت میں اعمال کام آتے ہیں، نوٹ نہیں۔ یہ زندہ انسانوں کے استعمال کی چیز ہیں" غالب بولا۔

"اچھا... میں جاتا ہوں لیکن....."

"لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ بھاگنے کا خیال بھی دل میں مت لانا" غالب نے کہا۔

وہ ڈرتے لرزتے نیچے گیا۔ ہر قدم پر پیچھے سے آنے والی گولی کی دہشت نے اسے لرزہ براندام رکھا۔ وہ کئی بار گرتے گرتے بچا مگر بالآخر اس جگہ تک پہنچ گیا جہاں وہ لاش تصویرِ عبرت بنی پڑی تھی۔ ایک مُردے کو لوٹتے ہوئے اس کے ہاتھ کئی بار آگے بڑھے اور رک گئے۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا تو غالب نے ریوالور لہرا کے اسے جلدی کا اشارہ کیا۔ اس نے رقم برآمد کرنے کے لیے لاش کو کھینچا اور سیدھا کر دیا۔

اوپر کے سب نوٹ خون میں بھر گئے تھے لیکن نیچے والے صاف تھے۔ میں نے خون سے خراب ہو جانے والے پانچ نوٹ ہوشنگ کے حوالے کیے "ان کو دھو کے استعمال کر لینا اگر داغ صاف ہو جائیں یا..."

ہوشنگ نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیے "نہیں صاحب۔ یہ میں نہیں لوں گا۔"

"اچھا تو انہیں پھاڑ کے پھینک دو۔ پرزہ پرزہ کر دو اور اپنے دوست کی لاش پر نچھاور کر دو۔"

اس نے بادلِ ناخواستہ تعمیل کی۔ نوٹوں کے ننھے ننھے پرزے ہوا میں اڑتے گئے اور ان میں سے چند لاش پر جا کے ٹھہر گئے۔ کاغذ کے بے قیمت پھول جو خود اس کے لہو کا رنگ رکھتے تھے اس آدمی پر نچھاور تھے جو انہیں زندگی کے رشتوں سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔

قافلہ سالار وہیں پڑا رہا، قافلہ آگے چل پڑا۔

وہ سارا راستہ ایک سا تھا۔ تنگ، کچی اور ناہموار سڑک پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ یہ قدرتی راستہ انسان نے خود تلاش کیا تھا۔ پھر کتنی ہی ہزاروں صدیاں بیت گئیں اور انسان کے قدم اسے کھودتے اور پھر اس کو روندتے رہے، یہاں تک کہ پتھروں اور جنگلوں کی وادی میں راستے کے نقوش واضح ہو گئے۔ دشوار گزار اور ناہموار نشیب و فراز سے گزرتا یہ راستہ اصل فاصلے سے کئی گنا زیادہ تھا۔ جو مسافت ہم نے طے کی وہ بہت زیادہ تھی۔ اگر ہم ہیلی کاپٹر میں افقی پرواز کرتے تو فاصلے کے ساتھ وقت بھی سمٹ جاتا۔ ہم نے جو سفر دس گھنٹے میں طے کیا وہ ایک گھنٹے سے کم وقت میں ختم ہو جاتا۔

راستے میں دو جگہ ہم نے کھانے کے لیے قیام کیا۔ ہمارے پاس باقی بچی ہوئی کافی تھی لیکن چولہا نہیں تھا اور ہم لکڑیاں جلا کے پانی ابالنے میں وقت ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ ہوشنگ نے خشک لکڑیاں چن کے آگ جلانے اور کافی بنانے کی پیش کش کی تھی۔

راہ میں کئی جگہ ہمیں جنگلی جانور نظر آئے۔ سانبھر اور نیل گائے، ہرن اور بارہ سنگھے وادیوں میں گھومتے پھر رہے تھے اور ہم پر نظر پڑتے ہی چھلانگیں مارتے غائب ہو جاتے تھے۔ دن کے وقت ہمیں کوئی گیدڑ یا بھیڑیا نہیں ملا۔ قدرتی پانی کے دھارے ہر جگہ بہتے دکھائی دیتے تھے اور یہ پگھلی ہوئی برف کا سرد شفاف پانی ذائقے میں منفرد تھا۔ یہ منرل واٹر تھا جو بڑے شہروں میں بڑے لوگ استعمال کرتے تھے اور مہر بند بوتلوں میں ملتا تھا۔ تاہم جہاں خالص دودھ تک ناپید ہو وہاں سادہ پانی کو "منرل واٹر" کا لیبل لگا کے بیچنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ملاوٹ والی ہر چیز کھانے والے خالص قدرتی پانی محض دل کے اطمینان کی خاطر خریدتے تھے اور ایک نفسیاتی تسکین ضرور حاصل کر لیتے تھے کہ وہ عوام کو نلکوں سے سپلائی کیا جانے والا گندہ پانی نہیں پی رہے ہیں۔ یہاں قدرت کی اس نعمت کی بہتات تھی اور بے دام تھی۔

شام کا سورج مغرب کی جانب اترنے لگا تھا کہ ہوشنگ نے نوید دی "کھنڈو۔"

میں نے رک کے کہا "کہاں؟"

"ادھر، اس پہاڑی کے پیچھے سڑک ہے" وہ بولا "قافلے اسی سڑک پر سفر کر کے کھنڈو پہنچتے ہیں۔"

"کھنڈو تک کتنا فاصلہ ہوگا؟" غالب نے پوچھا۔

"شہر تو چار پانچ میل پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "اچھا۔ پھر تم جاؤ، اپنے خچر بھی لے جاؤ۔ ہم باقی راستہ پیدل طے کر لیں گے۔"

اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا "آپ کا مہربانی ہے سر۔"

میں نے کہا "خدا کا شکر ادا کرو کہ زندہ واپس جا رہے ہو مگر یہ خیال رکھنا ہوشنگ کہ ہم پھر آئیں تو ہمیں وہ بڈھا زندہ ملے۔ ہم پھر تمہیں تلاش کر سکتے ہیں، تم شیطان کی طرح مشہور ہو۔"

اس نے مظلوم صورت بنائی "مگر وہ بڈھا تو مریض ہے، کب تک

www.paksociety.com

زندہ رہے گا۔ میں کیسے ضمانت دوں کہ وہ بیماری سے بھی نہیں مرے گا؟"

میں نے کہا "تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ بیمار ہو کے مرا، اچانک مر گیا یا غائب ہو گیا۔"

ایک ایک کر کے سب خچروں سے اتر گئے۔ یہ انتہائی سخت سفر تھا جس نے سب کے جسموں کی چولیں تک ہلا دی تھیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ روانگی کے بعد ہر خچر پر دو ہو جائیں گے۔ ایک خچر کی ڈرائیونگ میں کروں گا اور دوسرے کی غالب مگر اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ خچر بہت فرمانبردار قسم کے تھے اور خود رابعہ کا خوف دور ہو گیا تھا۔ پیدل سواری کی صورت میں خچر سست پڑ جاتے اور شاید ہم رات ہونے سے پہلے کھٹمنڈو نہ پہنچ پاتے۔ خچر سواری کا تجربہ کسی کو نہیں تھا۔ جو شہسواری جانتے تھے انہیں بھی گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے زمانہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد سب خچروں سے اتر کے کچھ فاصلہ پیدل طے کرتے تھے یا پانچ دس منٹ کے لیے کمیں لیٹ کر کمر سیدھی کرتے تھے۔ پھر میں کوچ کا حکم دیتا تھا تو سب پر گراں گزرتا تھا مگر وقت کی کمی اور جلد از جلد منزل تک پہنچنے کی آرزو سب کو مستعد کر دیتی تھی۔

جب ہوشنگ اپنی خچر ٹرین کو واپس لے کر چلا گیا تو سب سے پہلے غالب نے کہا "اس بے ہودہ سواری پر لعنت!"

نازو نے کہا "اسی قسم کے جذبات خچر کے بھی ہوں گے مگر وہ بول کچھ نہیں سکتا تھا بے چارہ۔"

"تم کو ایک خچر کے جذبات کا زیادہ خیال ہے؟"

"تم کو شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ وہ تم کو تمہارے بارِ گناہ سمیت یہاں تک ڈھو کے لایا۔" نازو نے کہا "عین ممکن ہے میدانِ حشر میں وہ تم پر سوار ہو۔"

"ابھی تو میرے اعصاب پر تم سوار ہو۔ بلائے بے درماں بن کے" غالب نے کہا۔

"کیا۔۔۔ میں بلا ہوں! پھر پیچھا کیوں نہیں چھڑا لیتے مجھ سے؟"

"تم جیسی بلائیں تو جان لے کر ٹلتی ہیں" غالب بولا۔

ہم اب تارکول کی پکی سڑک پر چل رہے تھے۔ آگے پیچھے زندگی کے آثار کہیں نہ تھے پھر اچانک میں نے انسانی آوازیں سنیں۔ میرے ساتھ سب کے قدم رک گئے۔ کوئی شخص بری طرح چیخ رہا تھا۔ ایک اور آدمی اونچی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا اور غصے میں معلوم ہوتا تھا۔ ہم سب کی نظریں سڑک سے ہٹ کے بائیں طرف اندھیرے میں کسی آبادی کے نشان تلاش کر رہی تھیں مگر وہاں نہ روشنی تھی اور نہ کسی بستی کا کوئی سراغ۔

میں نے کہا "ان درختوں کے جھنڈ کے پیچھے ہے کوئی۔"

غالب نے سرہلایا "شاید کوئی قافلہ۔"

"یہ کیسے اندازہ کیا تم نے؟"

"شور سے سنو۔ جو شخص شور مچا رہا ہے وہ گالیاں بک رہا ہے اُردو میں" غالب نے کہا۔

"میرے کان اتنے تیز نہیں ہیں" میں نے کہا "چلو چل کے دیکھتے ہیں۔"

"ایسے مت جاؤ" رابعہ نے کہا "پتا نہیں کون لوگ ہیں۔"

میں نے کہا "ہم جانتے ہیں سب سے نمٹنا۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ ہم بُروں کے ساتھ بُرے ہیں، اچھوں کے ساتھ اچھے۔ یہ تو اپنے ہی ہم زبان لگتے ہیں۔ ان سے کیا ڈرنا۔"

غالب کا خیال درست تھا۔ درختوں کی گھنی پناہ میں تقریباً چالیس افراد پر مشتمل ایک قافلہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ ہم بے آواز آگے بڑھے تھے مگر بالکل نزدیک پہنچنے تک ہمیں کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ سب بالکل خاموش اور دم سادھے بیٹھے تھے۔ پانچ سے دس افراد کا ایک خاندان جس میں عورتیں اور بچے بھی تھے، ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر گروہ کی صورت میں کھلے آسمان کے نیچے بیٹھا تھا۔ غالباً انہیں سختی سے تاکید تھی کہ خاموش رہیں۔ ہم نے جو چیخنے چلانے کی آواز سنی تھی وہ بھی اب بند ہو گئی تھی۔

میں اور غالب ایک دم سامنے آ گئے۔ لوگوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ عورتوں نے دبی دبی چیخ ماری۔ مرد ہڑبڑا کے اٹھے۔ بچے سہم کے ماؤں سے چمٹ گئے۔ ان کی آوازوں کا شور ایسے بلند ہوا جیسے کسی نے شہد کی مکھیوں کے چھتے پر پتھر مار دیا ہو۔ مرد، عورتیں سب دبے لہجے میں پوچھ رہے تھے "یہ کون ہیں؟ کون لوگ ہیں؟"

میں نے کہا "ہم آپ ہی جیسے انسان ہیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

ایک لمبا تڑنگا شخص فوراً سامنے آ گیا۔ اس کا جثہ پہلوانوں کا اور انداز بدمعاشوں کا تھا۔ وہ کرتے پاجامے اور گول فراکی ٹوپی میں تھا اور اس کی مونچھیں سخت نوکوں والی بھاری چہرے کی خوفناکی میں اضافہ کر رہی تھیں۔

"یہ کس نے کہا ہے کہ ہم ڈر گئے؟ بول" اس نے مجھے دھکا دیا۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹ کے بولا "پہلوان! تم بلاوجہ ناراض ہو رہے ہو۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہم انسان ہیں۔۔۔۔"

"اے انسان تو میں ماروں گا تجھے وحشت میں۔۔۔۔" وہ دہاڑ کر بولا "کیسے آ گیا تو ادھر آخر؟ بول۔ یہ سب مرد عورتیں نہتے ہیں یہاں۔ تجھے خیال نہیں آیا۔"

میں نے کہا "دیکھو میں بھی مسلمان ہوں۔ میرے ساتھ بھی عورتیں ہیں اور میں عزت کرنے والے کی عزت کرتا ہوں۔ ایک غلطی کو معاف بھی کرتا ہوں۔ دوبارہ مجھے گالی مت دینا۔"

وہ کچھ محتاط ہو گیا "ورنہ۔۔۔ کیا کرے گا تو؟ میرا نام معلوم ہے؟ بول۔ مجھے سرکار کہتے ہیں۔"

میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "میرا نام سکندر ہے۔ یہ میرا

بھائی ہے غالب۔ ہم پاکستانی ہیں۔"

"اچھا۔ پھر پہلے کیوں نہیں بتایا؟" اس نے مجبوراً اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "میں اس قافلے کو پاکستان لے جا رہا ہوں۔"

"ہم سے مل کے کوئی خوشی نہیں ہوئی مسٹر خرکار" غالب نے زبردستی اس کا ہاتھ تھام لیا "مگر مجبوری ہے۔ ہم بھی اس قافلے میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اپنے خاندان سمیت۔"

سرکار نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا "خرکار نہیں سرکار۔ آئندہ غلط نام مت لینا بے۔"

"ہمیں سمجھ گیا۔ سرار۔۔۔۔ کار" غالب نے دہرایا "سرکار اچھا نام ہے۔ حکومت بھی کہہ سکتے ہیں تمہیں۔ گورنمنٹ بھی۔"

"مر کھپ بے تو مارا جائے گا میرے ہاتھوں۔ مجھ سے مذاق کرتا ہے!" سرکار نے غرا کے کہا۔

میں نے کہا "جانے دو پہلوان۔ اس کی عادت ہے موقع محل دیکھے بغیر مذاق کرنے کی۔ کیا ہم بیٹھ جائیں یہاں؟"

"یہاں نہیں۔ ادھر جاؤ آخر میں۔ خالی ہاتھ نکل پڑے تھے گھر سے۔ سامان کوئی نہیں لائے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "بڑی مشکل سے جان بچا کے بھاگے۔ ساتھ کیا لاتے؟"

"تو پھر پاکستان کیسے جاؤ گے؟ مال دال تو لائے ہو نا؟"

"بس جو تھوڑا بہت تھا وہ لے آئے" میں نے کہا "ابھی بات کرتے ہیں تم سے۔"

ہم سب کو آخری حصے میں جگہ الاٹ کی گئی تھی۔ کسی نے ہمارے لیے ایک دری بچھا دی۔ ہم سب اس پر بیٹھ گئے۔

"سرار اور کار۔ دونوں کو مرمت کی ضرورت ہے" غالب نے کہا "میں نے خرکار کہا تھا تو غلط نہیں کہا تھا۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ تم نے ہی فساد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے کہا "پہلے دیکھو، صورتِ حال کو سمجھو۔ اگر جھگڑے کے بغیر ہم ان کے ساتھ کھٹمنڈو پہنچ جائیں بلکہ پاکستان تو کیا حرج ہے۔"

غالب نے نفی میں سرہلایا "تم دیکھ لینا، یہ شخص دھوکے باز ہے۔ ان سب کو چکر دے کر لایا ہے۔ ان سے پیسے وصول کر چکا ہو گا۔ آج رات کو غائب ہو جائے گا۔"

رابعہ نے کہا "اتنے یقین سے کہہ رہے ہو یہ بات جیسے تم خود بھی اس کے ساتھ شریکِ جرم ہو۔"

"تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں" غالب بولا "تم خود سوچو۔ کھٹمنڈو چار پانچ میل دور ہے۔ ابھی آدھی رات بھی نہیں ہوئی ہے۔ ایک گھنٹے میں یہ شہر پہنچ جاتے مگر اس نے یہاں روک لیا ہے سب کو۔ آخر کیوں؟ رات کے اندھیرے میں تو ان کا کھٹمنڈو پہنچنا آسان ہو گا۔"

میں قائل ہو گیا "تمہاری بات میں وزن ہے برخوردار۔"

رابعہ نے کہا "کیا یہ بہتر نہ ہوتا اگر ہم سیدھے گزر جاتے۔ اس قافلے میں شامل ہونا ضروری تھا؟"

"ہاں۔ اس قافلے میں ہم ایسے شامل ہو گئے ہیں جیسے دریا میں لہر۔"

غالب نے کہا "موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں۔"

"یہ بالکل بے موقع شعر ہے" میں نے کہا۔

"بے محل کیا ہے؟" غالب بولا "سب غلط ہے۔ مثلاً ہم سب کی یہاں موجودگی اور یہ حالات۔ وہ سب ہو رہا جو نہیں ہوا۔ کل جب ہم سوچیں گے تو اسی نتیجے پر پہنچنا ناگزیر ہو گا۔"

"یہ مجذوب کی بڑ ہے" نازو بولی۔

"یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب" غالب نے آہ بھر کے کہا "تجھے سب ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا۔"

میں نے کہا "اسکول ٹیچر کی موت آئی تھی۔ وہ ساتھ ہوتا تو ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جاتے۔ اس کی واقفیت تھی یہاں۔ وہ ہمارے قیام کا بندوبست کر سکتا تھا۔ اب ہم پانچ آدمی فوراً تاڑ لیے جائیں گے۔"

"گواچی گاں کی طرح بھٹکتے ہوئے" غالب بولا۔

"گواچی گاں کیا؟" کاجل نے کہا۔

نازو ہنسنے لگی "وہ گائے جو ریوڑ سے بچھڑ کے بھٹک رہی ہو۔ جسے گوالے کا بھی پتا نہ ہو۔"

میں نے کہا "گورنمنٹ سے بات کرتے ہیں، شاید بندوبست ہو جائے۔"

رابعہ حیرانی سے بولی "نیپال کی گورنمنٹ سے!" پھر خود ہی شرمندہ ہو کے بولی "تمہارا مطلب ہے مسٹر سرکار سے؟"

"گورنمنٹ خود مذاکرات کے لیے آ رہی ہے" غالب بولا۔

"بھئی تم نے کچھ کھایا پیا ہے؟" وہ سرپرستانہ لہجے میں بولا۔

"کیا ملے گا کھانے کو؟" غالب نے کہا "آج کا مینو کیا ہے؟"

"بے اڑا ہوا ہے مینو کے بچے" پہلوان بگڑ گیا۔

"کچھ مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ ایک رات بھوکے بھی رہ سکتے ہیں" میں نے کہا۔

"بھئی میرا لنگر تو ہے نہیں۔ دال بھات کا وعدہ تھا۔ سو روپے نکالو تو پانچ کا کھانا بھجوا دوں۔ مفت کا کچھ نہیں۔"

میں نے اسے سو روپے دے دیے۔ ایک طرف چند عورتیں کچھ پکانے میں مصروف تھیں۔ میں نے کاجل سے کہا کہ وہ ان میں شامل ہو کے مدد کے بہانے معلومات حاصل کرے۔ وہ کچھ دیر بعد دال چاول لے کر آئی تو اس نے بتایا کہ سرکار نے ہر خاندان سے ایک ایک ہزار روپیہ لیا تھا۔ کہا تھا بیل گاڑیوں میں لے جائے گا مگر سب کو پیدل لایا ہے۔ مردوں نے احتجاج کیا تو اس نے دو چار کو مارا اور پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی تو سب خاموش

www.paksociety.com

ہو گئے۔ کھانے کے پیسے الگ لیتا ہے اور انھی عورتوں سے پکواتا ہے جو قافلے میں شامل ہیں۔ بے چاروں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے اور کوئی بولے تو غنڈہ گردی کرتا ہے۔ اس کی پولیس سے سلام دعا ہے۔ یہ خود اس نے بتایا تھا مگر سارے راستے میں اس قافلے کو کسی نے روکا ہی نہیں ورنہ شاید اس کے دعوے کی قلعی کھل جاتی۔ یہ کہتا ہے کہ سب میری وجہ سے ہوا۔"

میں نے کہا "شاباش! بہت کم وقت میں تم نے بہت کچھ معلوم کر لیا۔"

کاجل نے کہا "اور غالب کا خیال بھی ٹھیک ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ابھی کھٹمنڈو ایک دن کی مسافت پر ہے۔ صبح چلیں گے تو شام کو پہنچ جائیں گے۔ انھیں چلتے ہوئے تیسرا دن ہے۔ دو راتیں گزاری ہیں انھوں نے سفر میں۔ ہر خاندان پانچ پانچ سو روپے تک کھانے کے دے چکا ہے۔"

ہم کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سرکار آگیا۔

"دیکھ بے! تو چپ کر کے بیٹھ" اس نے غالب سے کہا "اس سے بات کرلوں میں۔ تم سب کو پاکستان جانا ہے نا؟"

"مجھے تو لندن جانا ہے" غالب بولا "بائی ائر۔"

"بے باؤلا ہوا ہے!" پہلوان غصے میں دہاڑ کے بولا۔

میں نے کہا "چھوڑو پہلوان۔ تم پاکستان پہنچا سکتے ہو؟"

"اور کیا بول رہا ہوں میں" سرکار نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے کہا "اب ہم کہیں بھی پہنچا سکتے ہیں تمہیں۔ پاکستان کہو تو پاکستان، جہنم کہو تو جہنم۔"

"تم تو جا چکے ہو گے، راستہ جانتے ہو گے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "پہلوان! یہ کچھ کھسکا ہوا ہے، اسے معاف کرو۔ مجھے بتاؤ پاکستان کیسے پہنچاؤ گے؟ میرا مطلب تھا کس راستے سے؟"

"اب راستے بہت ہیں۔ مشکل بھی اور آسان بھی۔" وہ معاملات طے کرنے آیا تھا اس لیے بگاڑ نہیں چاہتا تھا "پیدل چلو تو دو ہفتے میں نیپال کی سرحد پار کرلو گے۔ آگے میرا کام نہیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے مہینہ بھر لگ جاتا ہے قافلوں کو۔ موسم بڑا خراب ہے۔"

میں نے کہا "اس کے علاوہ کوئی آسان طریقہ ہے؟"

"ہاں۔ بس اور ٹرک جاتے ہیں۔ ویزا لینا پڑے گا سفارت خانے سے۔ ویزا کیا بس اجازت نامہ ہے۔ سب کے نام لکھوانے پڑیں گے۔ ہزار اس میں لگ جائیں گے۔"

"سب کے؟" میں نے کہا۔

"اب ایک آدمی کے۔ پھر بس کا کرایہ دو ہزار روپے۔"

"سب کا؟" میں نے جانتے بوجھتے احمقانہ سوال کیا۔

"بے باؤلا ہوا ہے! ایک آدمی کا۔ سب کے ہوں گے گیارہ ہزار۔ شاید دس میں کام چل جائے۔ چودہ ہزار کا خرچا ہے۔"

میں نے کہا "پہلوان جی! اس میں خطرہ تو کوئی نہیں؟"

"اب خطرہ ہی خطرہ ہے ہر جگہ۔ یہ کام ہی ایسا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ تم بھاگ کر جا رہے ہو۔ پاسپورٹ ویزا کچھ ہے نہیں۔ یہ تو نیپال کے بادشاہ کی مہربانی ہے کہ کوئی روکتا نہیں۔"

"کیا ہوائی جہاز نہیں جاتا یہاں سے؟"

"ہوائی جہاز! اب باؤلا ہوا ہے؟" یہ اس کا تکیۂ کلام تھا۔ "پتہ ہے کتنے لگتے ہیں جہاز سے جانے میں؟ ایک آدمی کے دس ہزار۔ بلیک میں ٹکٹ ملتے ہیں۔ رشوت کا ریٹ اونچا ہے۔ ساٹھ ستر ہزار کہاں سے لاؤ گے؟"

میں نے متانت سے کہا "یہ تو زیادہ نہیں۔"

"زیادہ نہیں!" اس نے مشتبہ نظروں سے مجھے گھورا۔

"کوئی پرائیویٹ جہاز کرائے پر نہیں ملتا۔ چار مسافروں والا، چھ آٹھ سیٹوں والا سیسنا" میں نے کہا "جو صرف ہمیں لے جائے۔"

اس نے پھر کہنا چاہا "اب باؤلا ہوا ہے" مگر میرے لہجے اور میرے سوال نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا "سیسنا۔ چھوٹا جہاز۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اگر ایک لاکھ تک مل جائے۔"

"ایک لاکھ! تیرے پاس ہیں؟ بول؟" وہ مجھے گھورنے لگا۔

"کچھ میرے پاس ہیں۔ پندرہ بیس ہزار....."

وہ ہنس پڑا "اور باقی تیرا باپ پورے کرے گا۔"

میں نے کہا "تمہارے پاس کتنے ہیں؟ ساٹھ ستر ہزار تو ہوں گے جو تم نے ان لوگوں کو بے وقوف بنا کے وصول کیے ہیں۔"

"اب باؤلا ہوا ہے۔ سیدھی بات کر مجھ سے۔"

میں نے کہا "یہ سیدھی بات تو ہے۔ الو کے پٹھے! اور کون سی زبان سمجھتا ہے تو" میں نے ایک دم لہجہ بدل لیا۔

وہ ایک دم بھڑک اٹھا "تیری تو....."

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا، وہ منہ کے بل گرا تو میں نے اس کی پسلیوں پر ہاتھ مارا۔ وہ ایک دم کراہ کے دوہرا ہو گیا۔ میں نے بال پکڑ کے اس کا سر اٹھایا اور دوبارہ زمین پر مارا۔

غالب نے کہا "اب کیوں بھول گیا پہلوان اپنی بات۔ یہ کہ اب کیا باؤلا ہوا ہے۔"

"اب سیدھے بیٹھو شرافت سے" میں نے اسے بٹھا کے "ابھی تک کسی نے تم کو شرافت نہیں سکھائی تھی کیونکہ ان کوئی بدمعاش نہیں تھا۔"

"میں..... میں تم کو پاکستان پہنچا دوں گا" وہ ہانپتے ہوئے اپنے منہ کو کرتے سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"پاکستان ہم خود پہنچ سکتے ہیں" میں نے کہا "تم نے ان لوگوں کو کھٹمنڈو پہنچانے کی ذمے داری لی تھی یا پاکستان پہنچانے کی؟"

"کھٹمنڈو پہنچانے کی" وہ بولا۔

"جھوٹ" میں نے اس کے ایک مکا رسید کیا "تم نے پاکستان پہنچانے کی فیس لی تھی۔"

وہ پیچھے گر گیا۔ دوسرے لوگ اس منظر کو حیرانی اور پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ انھیں یقین نہیں آرہا تھا کہ سرکار سے بھی بڑی سرکار ہو سکتی ہے۔ ابھی تک وہ ہمارے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔

"تم نے ہر خاندان سے ایک ہزار روپے فی کس لئے تھے پھر تم نے راستے میں پانچ پانچ سو کھانا فراہم کرنے کے لئے۔ اس دال بھات کے جو تم نے انہی سے پکوایا جس روپے روز کے بھی نہیں تھے۔ ہم ابھی کھا کے دیکھ چکے ہیں۔ تم ان کو پیدل لائے اور تم نے کیا حرکت کی، یہ معلوم ہو جائے گا۔"

"تم.. کون ہو تم؟" وہ خوف زدہ ہو گیا "کس نے بتائی ہیں تم کو یہ ساری باتیں، یہ سب جھوٹ ہے۔"

میں نے کہا "ابھی یہ لوگ تمہارے سامنے آ کے بتائیں گے، پھر مانو گے؟"

غالب اور بازو نے ایک ایک شخص کو بلانا شروع کیا۔ ہر خاندان کا ایک فرد ڈرتے ڈرتے آیا۔ سب کا خیال تھا کہ ہم پولیس کے لوگ ہیں اور انھیں غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے پر گرفتار کرلیں گے۔ غالب نے انھیں تسلی دی مگر اس کے باوجود کوئی بھی سرکار کے خلاف بیان دینے پر تیار نہیں ہوا۔

میں نے ان سب کو اکٹھا کر لیا۔ "تم سب کھٹمنڈو جا رہے ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کھٹمنڈو کتنی دور ہے؟"

ایک عینک والے شخص نے کہا "کل شام تک ہم کھٹمنڈو پہنچ جائیں گے۔ ایک دن کا سفر باقی ہے۔"

"یہ جھوٹ بولا ہے اس نے۔ کھٹمنڈو تم ایک گھنٹے میں پہنچ سکتے ہو۔ یہاں سے چار پانچ میل دور ہے۔ یہ شخص آج رات تم کو یہاں چھوڑ کے فرار ہونے والا تھا۔ ہم نے اسے پکڑ لیا ہے۔ اب تم کو اپنا پیسہ واپس چاہیے یا میں اسے چھوڑ دوں؟"

ایک دم شور سا مچ گیا۔ تین چار زیادہ جوشیلے مرد آگے بڑھ کے سرکار کو مارنے پر تل گئے۔

"اتنا بڑا جھوٹ ہم سے؟ نکال ہمارے سب کے پیسے واپس۔" ایک نوجوان نے اس کی گردن دبوچ لی۔

دوسرے نے اس کا گریبان پھاڑ دیا "چور بدمعاش! ہم کو بیچ میں چھوڑ کے فرار ہونا چاہتا تھا۔ حرام کے پیسے تھے ہمارے؟"

میں نے کہا "ٹھہرو! ایسے نہیں۔ باری باری آؤ، اپنے اپنے پیسے لے جاؤ۔ کھٹمنڈو تک تمہیں ہم لے جائیں گے ابھی۔ آگے تم خود جا سکتے ہو۔"

"میں کسی کے پیسے واپس نہیں کروں گا۔"

"اب باؤلا ہوا ہے" غالب نے اس کے ایک لات رسید کی "مال برآمد کرنا جانتے ہیں ہم۔ تیری تو لاش بھی بیچ دیں گے نقد چور۔ نکال کیا ہے تیرے پاس؟ یا ہم تیرے کپڑے اتاریں۔"

"تم ایسا نہیں کرسکتے" وہ چیخ کے بولا۔

"اگر تم مان لیتے تو اچھا تھا۔" میں نے کہا "ہم میں سے ہر ایک سب کچھ کرچکا ہے اور پھر کرسکتا ہے۔"

"سوائے شادی کے" غالب نے کہا۔

سرکار ایک دم کھڑا ہو گیا اور پلک جھپکتے میں اس نے جیب میں سے ایک ریوالور برآمد کر لیا "میں جا رہا ہوں۔ میرا یہی پروگرام تھا۔ میں ان کو یہاں تک لے آیا۔ آگے کا راستہ یہ خود معلوم کرلیتے۔"

میں نے کہا "پہلوان! تم نے تو پاکستان پہنچانے کا وعدہ کیا تھا ان سب سے۔ ابھی سے واپس جا رہے ہو۔ پاکستان تو بہت دور ہے۔"

"اب باؤلا ہوا ہے۔ جہنم میں جائیں یہ سب۔ تم سنبھالو انھیں" وہ تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹتا گیا۔

قافلے کے بہت سے مرد چلانے لگے "کوئی روکو اسے۔ یہ لٹیرا

www.paksociety.com

ہے۔"

"تمہارے پاس کچھ بھی نہیں چھوڑا اس نے۔"

"ہم نے سب تو اسے دے دیا۔"

"اب ہم افغانستان کیسے جائیں گے؟"

"شیچوارا! کسی نے میرا راستہ روکا تو میں لحاظ نہیں کروں گا۔ گولی مار دوں گا۔" سرکار نے اگلے قدم چلتے ہوئے کہا "میں بلا وجہ خون خراب نہیں چاہتا۔"

اس کے پیچھے مظلوم صورت، پریشان حال غریب عورتوں کا ایک غول کھڑا اسے گالیاں اور کوسنے دینے میں مصروف تھا مگران کے مردوں میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ کچھ کر سکتے تو عورتیں زبان چلانے کے سوا کیا کر سکتی تھیں۔ تاہم انہی کے درمیان کہیں نازو تھی۔

"اچھا پہلوان جاؤ۔ مگر جاتے جاتے ایک بات تو بتاتے جاؤ" میں نے کہا "اگر تم کھٹمنڈو پہنچا دیتے انہیں اور پھر واپس چلے جاتے؟"

"پہلوان!" غالب نے کہا "میں سمجھ گیا تم ڈرتے ہو۔"

میں نے کہا "یار گورنمنٹ کسی سے نہیں ڈرتی۔"

"اس گورنمنٹ کو ڈر ہے کہ کھٹمنڈو میں پرانے دشمن نہ مل جائیں۔ سرکار نے پہلی بار ایسا نہیں کیا ہے۔ پہلے بھی کئی قافلے یہاں تک لا کے چھوڑ دیے ہوں گے۔ شاید وہ ابھی تک کھٹمنڈو کی سڑکوں پر پڑے ہوں گے بھیک مانگ رہے ہوں گے۔ بے چارے کہ کوئی انہیں ترس کھا کے پاکستان پہنچا دے۔ یا وہ محنت مزدوری کی کمائی سے کچھ پس انداز کر لیں تو کرایہ ادا کر کے وطن پہنچ جائیں مگر دونوں کام ناممکن ہیں۔ وہاں نہ کوئی ترس کھانے والا ملتا ہو گا نہ بھیک دینے والا اور مزدوری ملتی ہو گی تو مشکل سے پیٹ بھرتا ہو گا۔"

پہلوان رک گیا تھا "تم نے بالکل ٹھیک سمجھا۔ میرے دشمن بہت ہیں کھٹمنڈو میں ورنہ چار پانچ میل آگے جانے میں کیا تھا۔"

"شاید پولیس کو بھی تمہاری تلاش ہو گی" غالب بولا "کچھ اپنے قتلے کی فریاد لے کر پولیس کے پاس بھی گئے ہوں گے اور انہوں نے تمہارا نام اور حلیہ بتایا ہو گا۔"

وہ ہنسا "مجھے پروا ہے... میں اکیلا تو نہیں ہوں اس کاروبار میں۔ میرے جیسے بہت ہیں۔ پولیس کس کس کو پکڑے گی؟"

"مگر اس بار تم پکڑے گئے پہلوان۔" میں نے کہا "سو دن چور کے تو ایک دن کوتوال کا۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "کوتوال کے بچے! میرے پیچھے مت آنا۔"

"پہلے تم اپنے پیچھے تو دیکھو" میں نے کہا "تمہاری موت کھڑی ہے۔"

سرکار نے پلٹ کے دیکھا تو اسے نازو نظر آئی جو زور زور کرتی عورتوں کے بیچ میں سے آگے نکل آئی تھی "یہ چھوکری...."

"ہاں میں ہوں تیری موت" نازو نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہا ہے۔ اٹھا میرے پیسے واپس کر۔"

سرکار نے نازو کا آگے پھیلا ہوا ہاتھ پکڑ کے اپنی طرف کھینچا "ہا ہا! ارے یہ سب تیرے۔ اگر تو...."

دوسرے لمحے جیسے طاقت اور کشش ثقل کے سارے کے سارے قانون غلط ہو گئے۔ نازو نے سرکار کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا اسے ایک ٹانگ اوپر اٹھا کے پلٹ دیا۔ اسے حیران ہونے کا موقع بھی نہ ملا۔ نازو نے اسے کمر کے بل زمین پر دے مارا مگر اس کی کلائی نہیں چھوڑی۔ اس کا ہاتھ مڑ گیا۔ وہ کراہ کے پھر اٹھنے پر مجبور ہوا اور نازو نے اسے قلابازی دے کر رکوع کی حالت میں کر دیا۔ ریوالور اس کی گرفت سے پہلے ہی چھوٹ گیا تھا۔ نازو نے اسے گھما کے لات ماری تو وہ منہ کے بل گیا۔

"اٹھو پہلوان۔" میں نے کہا "بڑے شرم کی بات ہے۔ ایک عورت سے مار کھا گئے۔"

غالب نے کہا "دیکھو کہیں تمہیں پہلے راؤنڈ میں ہی شکست نہ ہو جائے۔"

وہ گالیاں بک رہا تھا اور چلا رہا تھا۔ اسے اپنی ذلت کا اندازہ تھا اور وہ سمجھ گیا تھا کہ اس نے بازی ہار دی تو وہ زندگی بار جائے گا۔ وہ پھر اٹھ کے نازو پر حملہ آور ہوا۔ حیرت سے گنگ ہو جانے والے مرد اور ہکا بکا عورتیں نازو جیسی دبلی پتلی اور نازک اندام لڑکی کے ہاتھوں سرکار جیسے سانڈ کی یہ درگت بنتے دیکھ رہے تھے اور ان کے لئے یہ ایک فلمی منظر تھا جس میں کیمرا ٹرک سے ناممکن کو ممکن بنا کے دکھا دیا جاتا ہے۔

نازو نے دوسری بار اسے قریب بھی نہیں آنے دیا۔ وہ نازو کے ہاتھوں اور اس کی لاتوں کی زد میں رہا اور خود کو بچانے کی کوشش میں اس نے زیادہ مار کھائی۔ ایک لات اس کے منہ پر گئی دوسری پیٹ پر۔ ہاتھوں کے وار اس کے بازوؤں پر ہوئے جو ضرب کی شدت سے شل ہو کے وقتی طور پر ناکارہ ہو گئے۔ وہ درد سے چیخنے لگا اور پھر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

غالب نے باکسنگ کے ریفری کی طرح گننا شروع کیا "ون، ٹو، تھری، فور...."

میں نے چلا کے کہا "پہلوان! آخری راؤنڈ لڑ کے دیکھو۔ تخت یا تختہ۔ عزت کی موت بہتر ہے اس ذلت سے۔"

مگر سرکار سمجھ گیا تھا کہ دھوکا اس کی عقل یا نظر نے نہیں، تقدیر نے دیا ورنہ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ایسی دھان پان لڑکی اس کو چیلنج کرے اور یہ ناداں ایک بھیانک حقیقت بن جائے۔ سنا اس نے بھی ہو گا مگر تجربہ اسے آج عملی طور پر ہوا کہ چیونٹی بھی ہاتھی کی موت بن جاتی ہے۔

وہ بڑی مشکل سے اٹھا "ٹھہرو.... سب لے لو مجھ سے اور مجھے

جانے دو۔"

اب میں نے آگے بڑھ کے اسے اٹھایا "یہ بات تم اچھی سے کرو جن کو تم پاکستان پہنچانے کے وعدے پر لائے تھے۔ اگر یہ اپنی رقم واپس لے کر تمہیں جانے دیتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ تم کھٹمنڈو سے لوٹ جانا۔"

"میں کھٹمنڈو نہیں جاؤں گا" وہ بولا۔

میں نے کچھ سوچ کے کہا "اچھا۔ پہلے ایک معاملہ تو طے ہو جائے۔"

اب کوئی بھی اس پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھا۔ لوگوں نے یہ موقع غنیمت جانا اور اپنا ایک ایک پیسہ وصول کر لیا۔ سفر تو انہوں نے پیدل ہی کیا تھا مگر کھانے پینے کے اخراجات سرکار کے کھاتے میں گئے۔ میں نے انہیں ہدایت کی کہ وہ اسی وقت روانہ ہو کے کھٹمنڈو پہنچ جائیں اور پاکستانی سفارت خانے سے رابطہ کریں۔ انہیں کوئی نہیں پکڑے گا اور ان کے وطن پہنچنے کا کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔

وہ سب ہم سے ہاتھ ملا کے ہمیں دعائیں دیتے رخصت ہو گئے تو جہاں ایک قافلے کا پڑاؤ تھا وہاں صرف ہم رہ گئے۔

"کیا اب تم کچھ بتاؤ گے اپنے بارے میں سرکار عالی؟" میں نے کہا۔

"تم نے جو چاہا وہ میں نے کر دیا۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟" اس نے کہا۔

غالب نے کہا "ہم تفتیش کے ان سب طریقوں سے بھی واقف ہیں جن سے سچ اگلوایا جاتا ہے۔"

اس نے بے بسی سے غالب کی طرف دیکھا جو ایک درخت کی کانٹے والی شاخ کو صاف کر رہا تھا۔

"تم کوئی مفرور مجرم ہو؟" میں نے پوچھا۔

"مفرور... نہیں۔ میں نے ایک جرم کیا تھا۔ اس کی سزا کاٹ کے چھ ماہ جیل رہا ہوا تھا۔ پھر نوکری نہیں ملی تو یہ کام پکڑ لیا۔"

"جرم کیا تھا تمہارا؟"

"میں پاسپورٹ آفس میں تھا۔" وہ بولا "جعلی پاسپورٹ بھی جاری کر رہا تھا۔"

"زبردست گڈ" میں نے کہا "پھر تو تم ہمارے لئے کام کے آدمی ہو۔ تمہارا تعلق سب سے ہو گا۔ ٹریول ایجنسی سے، غیر قانونی طور پر باہر بھجوانے والوں سے" لازماً تعلق ہے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "لیکن میں کھٹمنڈو نہیں جا سکتا۔ میں لوگوں کو یہاں تک لا کے چھوڑ دیتا ہوں۔ آگے دوسرے لوگ ہیں۔"

"سب کچھ تم رکھ لیتے ہو۔ آگے دینے کے لئے ان کے پاس کیا رہ جاتا ہے؟"

"یہ سب اتنے قلاش نہیں ہوتے جتنا ظاہر کرتے ہیں۔ کئی

جانے کے ڈر سے کچھ نہیں بتاتے۔ وہ پاگل ہی ہو گا جو خالی ہاتھ اتنے لمبے سفر کے لئے نکل کھڑا ہو۔ انہیں سب اندازہ ہوتا ہے کہ راستے میں کہاں کتنا خرچ ہو گا۔"

میں نے کہا "چلو پھر ان کی بات چھوڑو۔ ہمارا مسئلہ حل کرو۔ ہم بھی پاکستان جانا چاہتے ہیں۔"

"تو جاؤ، میں نے روکا ہے" وہ تلخی سے بولا۔

"ایسے نہیں پہلوان! ہمارے ساتھ چلو۔ ہماری راہنمائی کرو۔ ہم سے ان لوگوں کو ملواؤ جو ہمیں مدد فراہم کر سکتے ہیں۔"

"تم تو ہر کام کرا سکتے ہو زبردستی...."

میں نے کہا "ہم معاوضہ دیں گے تمہاری خدمات کا بھی۔"

"میں جو ابھی دیا تھا، مجھے معاف کرو بھائی۔"

میں نے کہا "دیکھو، تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ تم ہم سے تعاون کرو اور ہم تمہیں چھوڑ دیں۔ ہم بھی غیر قانونی طریقے سے واپس افغانستان پہنچنا چاہتے ہیں مگر ہمیں راستوں کا علم نہیں۔ قانونی طریقے سے پہنچ سکتے تو ظاہر ہے مسئلہ کوئی نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ ہم جلد از جلد جانا چاہتے ہیں۔ تم اپنے دوستوں سے بات کرو۔"

"نہیں۔ میں کھٹمنڈو نہیں جا سکتا۔"

"رات کے وقت تو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں" میں نے کہا "راتوں رات کوئی بندوبست ہو جائے تو صبح تم واپس جاؤ اور اپنا دھندا جاری رکھو۔"

"اس کاروبار میں درست کوئی نہیں ہوتا۔ سب پیسے کے یار ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہم پیسہ دیں گے۔"

"کہاں ہے پیسہ؟" اس نے بے یقینی سے کہا۔

میں نے کہا "ہمارے پاس کچھ نقد ہے۔ باقی زیور ہے تقریباً ایک لاکھ کی مالیت کا۔"

اس نے کچھ دیر سوچا "اچھا۔ میں تم کو ایک جگہ لے کر جاتا ہوں۔ میرے لئے بہت خطرہ ہے لیکن اگر تم نے میرے ساتھ دغا کی تو مجھ سے زیادہ خطرے میں تم گھر جاؤ گے۔ پاکستان کے بجائے تمہیں جیل جانا پڑے گا میرے ساتھ۔"

"ہم خطرات سے کھیلنے کے عادی ہیں" میں نے کہا۔

ہم رات نو بجے کے قریب اپنی کمین گاہ سے نکلے اور سڑک پر چلنے لگے۔ جب آگے یا پیچھے سے کوئی گاڑی نمودار ہوتی تھی تو ہم سڑک کے کناروں پر پھیلے ہوئے گھنے جنگل کے درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپ جاتے تھے۔ سخت سردی کے باعث گاڑیوں کی آمد و رفت بھی خال خال ہی تھی۔ ایسے موسم میں چار پانچ میل چلنا بھی مشکل کام تھا۔ سرکار نے جو راستہ اختیار کیا وہ زیادہ طویل ثابت ہوا اور رات گیارہ بجے ہم رنگ روڈ کی ایک ویران کوٹھی میں داخل ہوئے تو تھکن سے بے حال تھے۔ میں اپنی حالت

www.paksociety.com

سے اندازہ کر سکتا تھا کہ خواتین کس درجہ ہمت اور قوت برداشت کا مظاہرہ کر چکی ہیں۔

پرانی کوٹھی زیادہ بڑی نہیں تھی اور اس کا مختصر سا باغیچہ ویران پڑا تھا۔ کسی نے ہمیں گیٹ پر نہیں روکا۔ سرکار نے اندر جا کے برآمدے میں لگی ہوئی گھنٹی بجائی تو اندر ایک کھڑکی کے پیچھے روشنی نمودار ہوئی۔ پھر کسی نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک دبلا پتلا زرد رو بوڑھا تھا جس نے سردی سے بچنے کے لئے سر پر ٹوپی اوڑھ رکھی تھی۔

سرکار کو دیکھ کے اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس نے نیپالی میں کچھ کہا جس کا جواب سرکار نے بھی نیپالی میں دیا۔ اس نے ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دی اور ہمیں اس کمرے میں لے گیا جس میں وہ ہمارے آنے سے پہلے سو رہا تھا۔ اس وسیع بیڈ روم میں وہ اکیلا تھا۔ بیڈ، قالین اور بھاری پردے سب بیش قیمت تھے مگر کمرے میں بے ترتیبی کا احساس ہوتا تھا۔ ایک کونے میں فین ہیٹر چل رہا تھا چنانچہ کمرے کی فضا میں انتہائی راحت بخش حرارت تھی۔

"یہ میرا دوست ہے۔ رام ناتھ" سرکار نے کہا "اور یہ۔۔۔ ان کو تم میرا دشمن سمجھ لو۔ مجھے نہیں معلوم یہ کون لوگ ہیں۔ یہ پاکستان جانا چاہتے ہیں۔"

رام ناتھ نے ہم سب کی صورت پر باری باری غور کیا اور مسکرایا "تم اپنے دشمنوں کو میرے پاس کیوں لائے ہو؟"

"اس لئے کہ تم بھی میرے دشمن ہو۔ تم تبھی میں دوست بن سکتے ہو" وہ بولا۔

"میں تمہارا دشمن نہیں ہوں سرکار۔ مجھے یقین تھا کہ تم نے ہی میری بیوی کو قتل کیا تھا۔ میں نے تمہارے خلاف جھوٹی گواہی نہیں دی تھی۔ یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی تھی جب تمہاری سزا کی میعاد پوری ہونے والی تھی کہ اصل قاتل کوئی اور تھا۔ میں تم سے معافی مانگتا۔۔۔"

"معافی سے مجھے میری وہ زندگی واپس نہیں مل سکتی جو میں نے کسی جرم کے بغیر جیل میں گزار دی۔"

"مگر جیل سے بھاگ کے تم نے اچھا نہیں کیا۔ اب تم واقعی مجرم ہو گئے ہو" وہ بولا۔

"میں فرار نہ ہوتا تو کیا کرتا۔ عمر قید کاٹتا؟" وہ بگڑ کے بولا "اور وہ آزاد پھرتا رہتا جو اصل قاتل تھا۔ باہر نکلنے کا موقع پاتے ہی میں نے پہلا کام یہی کیا کہ اسے بھی ٹھکانے لگا دیا۔"

"یہ بات سب کو معلوم ہے۔ پولیس کو بھی۔ اس کے باوجود تم یہاں آ گئے۔ ایسی کیا مجبوری تھی؟"

اس نے ہماری طرف اشارہ کیا "یہ ہیں میری مجبوریاں۔ میں بھاگ کے بنگال چلا گیا تھا۔ پھر کچھ پرانے ساتھیوں سے رابطہ ہو گیا جو پاسپورٹ آفس میں میرے ساتھ تھے۔ میں لڑکوں کو پاکستان بھجوانے لگا۔ مجھے معلوم ہے تم بھی یہ کام کرتے ہو۔"

"لیکن میں ایسے کام نہیں کرتا جیسے سب کرتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ یہ بھی ہوائی جہاز سے جانا چاہتے ہیں۔ اور یہ پیسہ بھی خرچ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے۔"

"ساٹھ ستر ہزار سے کم خرچہ نہیں ہو گا" وہ بولا۔

اب میں نے کہا "سیٹھ! ہمارے پاس نقد رقم کے علاوہ ایک لاکھ سے اوپر کی مالیت کے زیورات ہیں۔"

"زیورات۔ میں کیا کروں گا زیورات کا۔۔۔"

"تم زیورات خرید سکتے ہو" سرکار نے کہا "اس میں بھی فائدہ ہو گا تمہیں۔ ایک لاکھ کے زیور تم کو پچاس ہزار میں مل جائیں گے۔"

میں نے احتجاج کیا "پچاس تو بہت کم ہیں۔"

"پھر کیا کرو گے تم؟ خود بازار جا کے بیچو گے؟ کیسے بیچو گے اور کون لے گا یہ زیورات؟" سرکار نے کہا "چوری کا مال۔۔۔"

"یہ چوری کا مال نہیں ہے" کاجل نے برہمی سے کہا۔

"سمجھا تو جائے گا" سرکار بولا "مجبوری میں یہی ہوتا ہے۔"

"قیمت بعد میں طے ہو جائے گی" میں نے کہا "پہلے تو ہمیں کچھ کھانے پینے کو چاہئے۔ ہم سردی میں بہت دور سے پیدل چل کے آئے ہیں۔"

"میں اکیلا رہتا ہوں یہاں" وہ بولا "مگر میں تم کو کچن دکھا سکتا ہوں۔ میرا رسوئیا اس وقت نہیں ہے لیکن کچن میں سب کچھ ہے۔"

رابعہ نے کہا "ہم اپنا کام خود کر سکتے ہیں۔"

ان کے اندر جانے کے بعد میں نے سرکار سے کہا "تم نے اصل بات کیوں چھپائی تھی مجھ سے؟"

"تم یقین نہ کرتے اس لیے میں تمہیں سیدھا یہاں لے آیا۔ تم نے سب کچھ سن لیا۔"

غالب نے کہا "کتنا وقت گزارا تم نے جیل میں؟"

"سات سال" وہ بولا "صرف اس شخص کی وجہ سے۔ اب یہ معافی کی بات کرتا ہے۔ اب میں یہاں تک آ گیا ہوں تو ان سات سالوں کی قیمت وصول کر کے جاؤں گا۔"

"اس نے اپنی غلطی تسلیم کر لی ہے" غالب بولا۔

"مگر غلطی کا کفارہ تو ادا نہیں کیا ہے۔ میری کیا غلطی تھی آخر؟"

میں نے کہا "جب قتل کسی اور نے کیا تھا تو الزام تم پر کیسے آیا؟"

"اس لئے۔۔۔ کہ میرے اس سے مراسم تھے شادی سے پہلے سے۔ جو شادی کے بعد بھی رہے" وہ بولا "یہ خود بھی جانتا تھا سب لوگ جانتے تھے۔ شک مجھ پر ہی کیا گیا اور گواہ اس شخص نے آگے بڑھائے جو اصل قاتل تھا۔"

کھانے اور چائے کے بعد، رابعہ، نازو اور کاجل لحافوں میں گھس کے سو گئیں۔ میں اور غالب دوسرے کمرے میں بیٹھے رہے جہاں موٹے اونی قالینوں پر روئی کی گدیاں رکھی ہوئی تھیں اور ہیٹر بھی چل رہا تھا۔ سیٹھ ان زیورات کا معائنہ کر رہا تھا جو ہم نے فروخت کے لیے پیش کیے تھے۔ سرکار بھی خاموش بیٹھا تھا اور ہم سب اس کشیدگی کی فضا کو محسوس کر رہے تھے جو اس ماحول میں موجود تھی۔

اچانک سیٹھ رام ناتھ نے زیورات کی پوٹلی سرکار کی طرف کھسکا دی "ٹھیک ہے۔ ان کی مالیت کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں۔ ایک لاکھ سے زیادہ ہی کے ہوں گے۔ یہ سب تم لے لو۔"

"میں لے لوں!" سرکار نے کہا۔

"ہاں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس وقت میرے پاس نقد رقم نہیں ہے۔ میں نے آج تک زیورات خریدے بھی نہیں۔ اگر صبح میں نے کسی کو بلایا تو وہ ان کی آدھی قیمت ہی لگائے گا اور سو طرح کے سوال الگ کرے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے، میں انہیں بیچنے جاؤں؟" سرکار گرم ہو گیا۔

"نہیں سرکار، یہ سب میں تم کو دے رہا ہوں۔ اپنے ساتھ لے جاؤ۔ مجھے معلوم ہے تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ تمہارا جرم اتنا سنگین نہیں تھا جتنا بنا دیا گیا۔ میں خود تمہیں قتل کر دیتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ میں نے آج بھی تمہیں معاف نہیں کیا ہے۔ میرے گھر کو برباد کرنے والے تم ہی تھے مگر تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی۔ یوں سمجھ لو کہ آج ہمارا ایک حساب برابر ہوا۔ تم نے اس قاتل کو مار کے میرا قرض بھی چکا دیا تھا۔ یہ اس کی قیمت بھی ہے اور تمہارے سات سالوں کی بھی جو تم نے جیل میں کاٹے۔ ان لڑکوں کو میں اپنی ذمے داری پر پاکستان پہنچا دوں گا مگر تم مجھے دوبارہ نظر آئے تو پھر ہم اصلی دشمن ہوں گے۔ یہ حساب درمیان میں نہ ہوتا تو میں تم کو دیکھتے ہی گولی مار دیتا۔" اس نے کمبل کے نیچے اپنی واسکٹ میں سے ریوالور نکال کے دکھایا۔

سرکار خاموش بیٹھا اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔

"یہ اس وقت بھی میرے پاس تھا جب تم نے گھنٹی بجائی تھی۔ میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے ہی تمہیں دیکھ لیا تھا۔ اگر میں تم کو مار دیتا تو قانون مجھے کچھ نہ کہتا۔ تم پہلے ہی مفرور ہو اور پولیس کو مطلوب ہو۔ میں آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ تم مجھے قتل کرنے آئے تھے اور میں نے اپنے دفاع میں تم کو مار دیا۔"

"یہ میری زندگی کے سات سالوں کی قیمت ہے؟" سرکار نے زیورات کو دیکھتے ہوئے کہا "اگر یہ سات سال تمہارے ہوتے تو تم کیا لیتے؟"

"مانگنے سے کچھ نہیں ملتا سرکار۔ کون خریدتا ہے کسی سے اس کی زندگی کے سات سال۔ اور کون بیچتا ہے! میری اور تمہاری زندگی میں جو فرق ہے وہی فرق قیمت میں بھی ہو گا۔ بس بھگوان کا شکر کرو کہ تم زندہ واپس جا رہے ہو۔ اپنی جان دینے کے بجائے کچھ لے کر ہی جا رہے ہو۔ قیمت کم ہے یا زیادہ، اسے اٹھاؤ اور نکل جاؤ۔"

"میں چلا جاؤں گا صبح ہونے سے پہلے۔"

"نہیں۔ اب میں تمہیں اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے کہ میرا ارادہ بدلے اور تم نقصان میں رہو، بھاگ جاؤ۔"

میں نے سرکار کو اشارہ کیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا "اچھا ہے، میں راتوں رات نکل جاؤں۔ میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا تھا۔ رام ناتھ وعدہ کر کے مکر جائے تو مجھے الزام مت دینا۔"

میں نے کہا "رام ناتھ ایسا نہیں کر سکتا۔ تم جاؤ۔"

اس نے دروازہ کھولا اور سرد رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ باہر ہوا اتنی تیز تھی کہ خزاں رسیدہ درختوں کی شاخوں سے سیٹی بجاتی گزر رہی تھی۔

"جہاز پر جگہ بڑی مشکل سے ملتی ہے۔" وہ کچھ دیر بعد بولا "تمہارے پاس نقد رقم کتنی ہے؟"

میں نے کہا "دس چند ہزار۔ شاید زیادہ ہو۔ کاجل کے پاس کتنی ہے، یہ مجھے معلوم نہیں۔"

"کاجل کون ہے؟"

میں نے کہا "میری بہن۔ جس کے ساتھ وہ لڑکا ہے۔"

"بہنوئی کہاں ہے تمہارا؟"

میں نے کہا "وہ۔۔۔ مارا گیا۔"

"پاسپورٹ ہیں تم لوگوں کے پاس؟"

میں نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "چار پاسپورٹ ہیں مگر وہ انڈین گورنمنٹ کے جاری کردہ ہیں۔"

"انڈین پاسپورٹ ہیں۔ پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ تم یہاں سے انڈین ایئرلائن کے ذریعے دہلی یا بمبئی جا سکتے ہو۔"

میں نے کہا "کاجل کا پاسپورٹ نہیں ہے۔ اور اس لڑکے کا بھی۔۔۔"

"ان کو میں نیپال کا پاسپورٹ بنوا دوں گا۔ وہ بعد میں آ جائیں گے" رام ناتھ بولا۔

"نہیں سیٹھ رام ناتھ۔ ہم سب ایک ساتھ جائیں گے اور ہم دہلی یا بمبئی نہیں، براہ راست کراچی جائیں گے۔"

"ایک ساتھ۔ اس میں بہت دن لگ جائیں گے۔"

"ہم انتظار کر سکتے ہیں" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"آج کے کسی فلائٹ پر چھ سیٹیں ایک ساتھ ملیں گی یہ کہنا بہت مشکل ہے" وہ فکر مند ہو گیا۔

"یہاں سے چھوٹے جہاز بھی تو جا رہے ہیں۔ کوئی چھ یا آٹھ سیٹوں والا سستا نہیں مل سکتا؟"

وہ چونکا "چارٹر فلائٹ کوئی نہیں ہے۔ ایک شخص ہے جو غیر قانونی طور پر جہاز اڑا کے لے جاتا ہے۔ جہاز اس کا اپنا نہیں ہے۔ وہ پائلٹ ہے مگر بہت اثر و رسوخ والا آدمی ہے۔ شاہی محل میں اس کا آنا جانا ہے اس لئے کوئی کچھ نہیں کہتا۔"

"تم اس سے بات کر سکتے ہو۔"

"بات تو کر سکتا ہوں مگر بات سوچنے کی ہے۔ اسے جب موقع ملتا ہے تو وہ ایک دو دن کے لئے جہاز لے جاتا ہے۔ وہ تمہیں کراچی یا لاہور نہیں پہنچا سکتا۔ کسی دوسرے ملک کی سرحد وہ کیسے عبور کر سکتا ہے؟"

"پھر کیا وہ نیپال سے پرواز کر کے نیپال ہی میں اتار دے گا ہمیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ وہ تمہیں عین سرحد پر کسی جگہ اتار دے گا اور واپس بھاگ آئے گا۔ پاکستان کی سرحد پر کسی ایسی جگہ جہاں روک ٹوک نہ ہو۔ اسے ایسی ہر جگہ معلوم ہے جہاں ایک چھوٹا طیارہ اتارا جا سکتا ہے" رام ناتھ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم اس سے بات کرو۔"

"ابھی؟" رام ناتھ نے نفی میں سر ہلایا "صبح بات ہوگی۔"

میں نے کہا "اگر اس نے انکار کر دیا۔"

"انکار تو وہ نہیں کرتا۔ لالچی آدمی ہے اور یہ کوئی برائی بھی نہیں۔ سب لالچی ہوتے ہیں" رام ناتھ نے کہا "مگر کیا پتا اسے کب موقع ملے۔ تمہارے لئے آسان ہوتا اگر تم دہلی کے راستے جاتے۔"

"اس کا کوئی سوال نہیں۔"

"یہ تو ہو سکتا ہے.... کہ کچھ لوگ پہلے چلے جائیں۔ فرض کرو دو یا تین سیٹوں کا بندوبست ہوتا ہے۔"

میں نے سوچ کے کہا "ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں بعد میں جا سکتے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے پرائیویٹ جہاز میں کتنا خرچ ہوگا؟"

"ہم اپنا سب کچھ وہ ہے چھوڑے چلے جائیں گے۔ اور اگر یہ کم ہو تو تار" ہم پاکستان سے تمہیں رقم ارسال کر دیں گے ایک لاکھ کے بدلے دو لاکھ۔"

اس نے کہا "پھر تم اپنے سفارت خانے کے ذریعے بات کیوں نہیں کرتے؟"

میں نے غالب کی طرف اور غالب نے میری طرف دیکھا۔ پھر ہم ایک ساتھ ہنس پڑے۔

"زائفی۔ یہ خیال تو ہمیں آیا ہی نہیں" غالب بولا۔

"حالانکہ سب سے آسان طریقہ یہی تھا۔" میں نے کہا "بے شک سفارت خانے والوں کے رویے کی شکایت عام ہے مگر ہمارے لئے وہ اتنا تو کر ہی سکتے تھے کہ لاہور میں منظر سے بات کرا دیں۔"

"یہ منظر کون ہے؟" رام ناتھ بولا۔

"ہمارا دوست ہے۔ بہت بڑا وکیل ہے" میں نے کہا "وہ اکیلا ہمارے لئے سب کچھ کر سکتا ہے۔"

"اور بہت کچھ کرا سکتا ہے" غالب بولا۔

"تمہیں اس کا نمبر معلوم ہے؟" رام ناتھ نے کہا۔

"ہاں۔ زبانی یاد ہے۔"

"پھر سفارت خانے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں سے فون کر لو۔ اس وقت آسانی سے کال مل جائے گی۔ لائنیں خالی ہیں۔"

"اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے" میں نے کہا۔

رام ناتھ نے آپریٹر سے بات کی اور اسے لاہور کے عبدالوہاب منظر ایڈووکیٹ کا نمبر دیا۔ "یہ ارجنٹ کال ہے۔"

کال خلاف توقع فوراً مل گئی۔ چند منٹ بعد گھنٹی بجی تو آپریٹر نے کہا "لاہور بات کریں۔"

میں نے بہت ہلکی سی آواز سنی۔ کسی نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "ہیلو۔"

میں نے کہا "منظر!"

"کون منظر؟"

میں نے کہا "مجھے عبدالوہاب منظر ایڈووکیٹ سے بات کرنی ہے۔"

اس نے کہا "سوری۔ وہ یہاں نہیں رہتے۔ یہ گھر میں نے خرید لیا ہے اور میں بہت تنگ آ چکا ہوں اس کی کالوں سے۔ اسے کم سے کم اپنا نیا نمبر مجھے بتا کے جانا چاہئے تھا۔ تمہیں بھی سوچنا چاہئے کہ یہ کوئی وقت نہیں ہے کسی کو پریشان کرنے کا۔ خواہ وہ منظر ہو اور تم نے قتل کر دیا ہو کسی کو۔"

وہ سخت بدتمیز آدمی تھا کہ اپنی کہہ گیا اور مجھے کچھ کہنے کا موقع دئے بغیر فون بند کر دیا۔

"الو کا پٹھا!" میں نے جھنجھلا کے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اسی وقت باہر سے ایک ساتھ کئی گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں آئیں۔ رام ناتھ نے بڑھ کے دیکھا تو دھندلائے ہوئے شیشوں کے پیچھے ہیڈلائٹس کی روشنی بھی گل ہو گئی۔ اس نے ایک پٹ کھول کے جھانکا۔ میں نے جھری سے دیکھا تو اس کی کوٹھی کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ تین گاڑیوں سے مسلح پولیس والے کود کے اتر رہے تھے۔ خوف سے سیٹھ رام ناتھ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

میں نے کہا "رام ناتھ! اب یہ سب کیا ہے؟"

"میں... میں کیا بتاؤں" رام ناتھ کی حالت غیر تھی۔ "یہ مصیبت تم لوگ ہی اپنے ساتھ لائے ہو۔"

میں نے برہمی سے کہا "اگر یہ حرکت اس کمینے سرکار نے کی ہوئی تو اسے مہنگی پڑے گی۔"

پولیس اب گھر کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

میں نے کہا "رام ناتھ! ہم کہاں جائیں؟"

"تم کو کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم یہاں ٹھہرو، میں بات کرتا ہوں۔ یہ غلط فہمی معلوم ہوتی ہے۔"

پال نے نادر اور رابعہ کو بھی جگا دیا تھا اور وہ سب اپنے اپنے طور پر گھر کے مختلف حصوں میں مورچہ بند ہو چکے تھے۔ غالب ساتھ والے کمرے کی دیوار سے لگا دروازے کے پیچھے تھا۔ رابعہ ایک باتھ روم میں تھی اور نادر دوسرے میں۔

"رام ناتھ! دروازہ کیوں نہیں کھولتے؟" باہر سے کسی نے انگریزی میں گرج کے کہا۔

رام ناتھ نے اندر سے کہا "کیا مصیبت ہے۔ تم انتظار نہیں کر سکتے دو منٹ۔"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "آخر تم لوگوں کو کیا ہوا ہے؟ تم کیوں پریشان ہو۔ ایسے ریوالور ہاتھ میں لے کر چھپنے کا کیا مقصد ہے اور اس سے فائدہ؟ کیا تم پولیس والوں پر گولیاں چلاؤ گے؟"

میں نے کہا "حفظ ماتقدم...."

اس نے میری بات کاٹ دی "خاک دھول۔ تم میرے مہمان ہو کوئی ڈاکو نہیں۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ لڑکیوں سے کہو سو جائیں۔ بستر میں سے انہیں کون کھینچ کے نکالنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ ایسے تم خواہ مخواہ پولیس کو موقع دو گے کہ وہ تمہیں گرفتار کریں اور پوچھ گچھ کے لئے لے جائیں۔ اور کچھ نہیں تو وہ تم سے اسلحے کا لائسنس ہی مانگ لیں گے۔"

میں نے اس کی بات پر غور کر کے کہا "کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو۔"

"رام ناتھ! ہم دروازہ توڑ دیں گے" باہر سے کسی نے دروازے پر لات ماری۔

"توڑ کے دیکھو" رام ناتھ نے دہاڑ کے کہا "جو سب سے پہلے داخل ہوگا وہی میری گولی کا پہلا نشانہ بنے گا۔"

میں نے کہا "تم جا کے دروازہ کھولو۔ میں سب ٹھیک کر لیتا ہوں۔"

جب رام ناتھ نے دروازہ کھولا تو پولیس والوں نے اسے دھکا دے کر راستے سے ہٹایا اور سیدھے اندر آ گئے۔

"یہ کیا بدمعاشی ہے؟ یہ میرا گھر ہے کوئی تھانہ نہیں کہ تم منہ اٹھائے اندر گھسے چلے آ رہے ہو" رام ناتھ نے مشتعل ہو کے کہا "اور تم کس رات کو میرے گھر پر چھاپا مار کے تم کیا برآمد کرنا چاہتے ہو؟"

"سرکار کو" ایک سب انسپکٹر نے کہا "سرکار کہاں ہے؟ ہم اسے گرفتار کرنے آئے ہیں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ میں پولیس کمشنر۔"

"ہاں کر دینا رپورٹ۔ پولیس کمشنر کو ذرا بیدار کو اٹھنے چاہو تا دینا۔ مفرور مجرم کو پکڑنے کے لئے ہم کہیں بھی داخل ہونے کا پورا اختیار رکھتے ہیں" دوسرے انسپکٹر نے غرا کے کہا۔

"مگر سرکار کا یہاں کیا کام؟"

"کام.... کام تو ایک ہی ہو سکتا ہے اسے تم سے۔ تمہیں قتل کرنا" پولیس انسپکٹر نے ادھر ادھر جھانکتے ہوئے کہا اور پھر اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ وہ سارے گھر میں پھیل جائیں اور کونا کونا چھان ماریں۔

"کسی وارنٹ کے بغیر خانہ تلاشی غیر قانونی ہے" رام ناتھ نے احتجاج کیا۔

انسپکٹر نے کہا "مجھے معلوم ہے" اور بے پروائی سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا "جب ہم چلے جائیں گے تو کیا ثبوت ہوگا تمہارے پاس کہ ہم یہاں آئے بھی تھے؟ ہم سب تو تھانے میں موجود ہیں اور اس بات کے گواہ بھی بہت ہیں۔ تم گواہ کہاں سے لاؤ گے؟"

میں اور غالب صوفوں پر یوں بیٹھے تھے جیسے ہم نیند سے جاگے ہوں۔ ہم اس ساری کارروائی کو ناگوار لاتعلقی سے دیکھ رہے تھے۔ رابعہ اور نادر کے لئے بھی گھوڑے بیچ کر سوتے رہنا محال تھا۔ اس ہڑبونگ میں وہ بھی آنکھیں کھولے بستر پر بڑی خوف زدہ نظروں سے پولیس والوں کو ہر کمرے، باتھ روم، الماری اور کونوں کھدروں میں جھانکتا دیکھنے پر مجبور تھیں۔

میں نے کہا "کیا تمہارے خیال میں میری گواہی قابل قبول نہیں ہوگی؟ میں نہ بچہ ہوں اور نہ ذہنی طور پر معذور۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ تم جھوٹے گواہوں پر اتنا انحصار کرتے ہو تو رام ناتھ کو احمق کیوں سمجھتے ہو؟ پھر خاصے معتبر چشم دید گواہ ہوں گے تمہاری لاقانونیت کے مظاہرے کے...."

"تم کون ہو؟" انسپکٹر نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں سوال کیا۔

میں نے غالب سے کہا "کیمرہ نکالو اور ان سب کی تصویریں بنا لو تاکہ سند رہیں اور کام آئیں۔"

انسپکٹر نے غالب کو روک لیا "ایک منٹ شریمان۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیمرہ توڑنا پڑے اور کیمرہ بچانے کی کوشش کرو تو تمہارا سر ٹوٹ جائے۔"

"اپنی فکر کرو انسپکٹر۔ ہمارا کیمرہ یا سر ٹوٹنے کے بعد کہیں تمہارا کندھا نہ ٹوٹ جائے" میں نے کہا "ہم غیر ملکی ہیں۔ میں اور میری بیوی رپورٹرز ہیں مگر ہم دہلی گزٹ سے بھی منسلک ہیں۔"

انسپکٹر کا سارا مصنوعی کروفر غائب ہو گیا اور وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا "سیٹھ رام ناتھ! تم نے اپنے مہمانوں کا تعارف نہیں

www.paksociety.com

کرایا۔"

میں نے اپنے پاسپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا "میں ڈاکٹر راجن ہوں اور یہ میری بیوی ڈاکٹر رتنی ہے۔ یہ میرا سالا ہے کمار اور وہ اس کی پتنی سنتر کمار۔ اچھی طرح دیکھ لو۔ پاسپورٹ جعلی نہیں ہیں اور ان پر نیپال کی حکومت کا جاری کردہ ویزا ہے۔"

انسپکٹر کو میرے اعتماد نے ہی نروس کردیا تھا۔ اس نے پاسپورٹ کے اندراجات پر سرسری نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا "آئی ایم سوری کہ آپ کو بھی اس وقت زحمت ہوئی۔ دراصل یہ معاملہ ہی ایسا تھا۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ ایک قاتل جو جیل سے فرار ہو گیا تھا اسے یہاں داخل ہوتے دیکھا گیا ہے۔"

اب رام ناتھ بھی گرم ہوگیا "کس الو کے پٹھے نے دی تھی یہ اطلاع؟ اسے میرے سامنے لاؤ۔ میں کوئی ایرا غیرا نہیں، سیٹھ رام ناتھ ہوں۔ سرکار کو جس نے دیکھا تھا میں اس کی آنکھوں کا ٹیسٹ پہلے کراؤں گا 'دماغ' کا بعد میں۔"

انسپکٹر نے چیخ کر اپنی فوج کو واپسی کا حکم دیا "برا مت مانیں سیٹھ صاحب۔ سرکار آپ کی جان کا دشمن ہے 'یہ سارا زمانہ جانتا ہے۔ ہم کیا جواب دیتے اگر خدانا خواستہ آپ کو کچھ ہو جاتا؟"

"میں اپنی حفاظت کرسکتا ہوں" رام ناتھ نے اپنے ریوالور کی نمائش کی "بھگوان کے بعد اپنی رکھشا کے لئے میں اس پر بھروسا کرتا ہوں 'تم پر نہیں۔"

وہ بڑی عجلت میں گاڑیوں پر سوار ہو کے روانہ ہوگئے۔

"آخر کس نے مخبری کی تھی 'یہ تو بتا جاؤ" رام ناتھ بولا۔

"ہے ایک..." انسپکٹر نے اس کو گالی دے کر کہا "آج تک اس نے کبھی غلط اطلاع نہیں دی تھی۔"

"اچھا مت بتاؤ اس کا نام مگر اس سے خود ہی پوچھ لینا کہ اب وہ نشہ تو نہیں کرنے لگا ہے" رام ناتھ نے کہا اور دھڑ سے دروازہ بند کردیا۔

ایک ایک کرکے پولیس کے سارے ٹرک چلے گئے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

رام ناتھ نے سرکار کو گالی دی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کو کیا کہوں۔ اس نے مجھے تباہ کردیا لیکن میں اس کا مقروض بھی ہو گیا تھا۔ اس کا قرض تو ادا کردیا میں نے لیکن ایسا لگتا ہے کہ مجھے یہ نیکی بھی مہنگی پڑے گی۔ اس کی دشمنی بھی جان کا روگ بنے گی۔"

میں نے کہا "رام ناتھ "آخر بات کیا ہے؟"

اس نے دروازہ بند کردیا اور سرکھڑے کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا "ضرور کسی نے اسے دیکھا ہوگا۔ رکھشا کا خاندان بہت بڑا ہے۔ دس تو بھائی تھے اس کے۔"

غالب نے کہا "یہ رکھشا کیا چیز ہے؟"

رام ناتھ نے دکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا "وہ میری دھرم پتنی تھی۔ میرے بڑھاپے کی وہ غلطی جس کا کفارہ میں آج تک ادا کررہا ہوں۔ دولت نے میری آنکھوں پر پٹی نہ باندھی ہوتی تو میں اپنی اور اس کی عمر کا فرق دیکھ لیتا۔ میں اندھا ہو گیا تھا کہ میں نے اس کی جوانی نہیں دیکھی۔ نہیں 'صرف اس کی جوانی دیکھ کر دیوانہ ہو گیا۔ اس کی مجبوری نہیں دیکھی۔ نہیں 'یہ بھی غلط ہے۔ مجبوری کو بھی دیکھا میں نے مگر سمجھا نہیں۔ میں نے سمجھا کہ مجبوری کی قیمت ادا کرکے میں رکھشا کو خرید سکوں گا۔ حالانکہ رکھشا صرف شریر نہیں تھی 'آتما بھی تھی۔ کسی بھی خوب صورت عورت کا جسم خریدا جاسکتا ہے۔ ایک لاکھ روپے میں یا ایک کروڑ ڈالر میں۔ مگر اس کی آتما۔ وہ بن مول کسی کو اپنی آتما دان کردیتی ہے۔ کسی مفلس اور بے حیثیت آدمی کو۔"

میں نے کہا "رکھشا تمہاری دوسری بیوی تھی؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "پہلی نے جیون بھر ساتھ دیا۔ بڑا لمبا عرصہ تھا وہ اور بہت مشکل وقت بھی تھا۔ میرے پاس رہنے کا گھر تک نہیں تھا جب وہ آئی تھی۔ بس ایک جھونپڑی سی تھی اسی کو آباد کرنے آگئی تھی وہ۔ بہت پرانی ہے یہ بات۔ دوسری جنگ عظیم سے بھی پہلے کی۔ اس جھونپڑی کو آباد ہی نہیں کیا اس نے آہستہ آہستہ ایک کمرے میں پھر ایک مکان میں اور کوٹھی میں بدل دیا۔ میری تقدیر تھی وہ۔ میں اس کے آنے سے پہلے کیا تھا۔ ایک مزدور۔ خود اپنا پیٹ بھرنا مشکل ہوتا تھا مجھے مگر ہم نے آدھا آدھا کھایا جو بھی ملا۔ پھر وقت بدلا۔ وہ عورت نہیں لکشمی تھی۔ میں نے جو مانگا اس نے مجھے دیا اور جب مانگنے کو کچھ نہ رہا تو وہ چلی گئی۔ جیسے وہ مجھے صرف دینے ہی آئی تھی۔ روپیہ پیسہ 'عزت 'اولاد 'خوشی۔ خود اس نے کبھی کچھ نہیں مانگا تھا۔ کوئی سکھ بھی تو نہ دے سکا میں اسے۔ بس ایک رات جیسے وہ چپ چاپ سرخ کپڑوں میں لپٹی گٹھری سی بنی آئی تھی ویسے ہی خاموشی سے چلی گئی۔ وہ بولتی بھی کم تھی۔ کوئی شکوہ نہیں 'شکایت نہیں۔ میں اسے بہت کچھ کہہ جاتا تھا مگر وہ سن لیتی تھی اور خاموش رہتی تھی۔ اس کے دس بھائی تھے۔ چار چھوٹے 'چھ بڑے۔ وہ سب بدمعاش ٹائپ تھے لیکن اس نے کبھی کسی کو بیچ میں نہیں بولنے دیا۔ وہ سب ناراض ہو کے الگ ہو گئے۔ اس سے ملنا تک چھوڑ دیا حالانکہ وہ ایک ہی بہن تھی۔ مجھے قتل کردیتے 'میری بوٹیاں تو نوچ لیتے مگر اس نے ایک دیوار کی طرح میری حفاظت کی۔ اس نے کہا کہ یہ میرے لئے بھگوان سمان ہیں۔ ان کی عزت میری زندگی ہے۔ بڑی عجیب عورت تھی وہ خالص ہندوستانی عورت۔"

"ایک مشرقی عورت" میں نے کہا۔

"ہاں۔ بالکل مشرقی روایات پر پورا اترنے والی مثالی شوہر پرست بیوی۔ مگر میں نے اس کی قدر نہیں جانی۔ میں بہت جلد اسے بھلا بیٹھا۔ اس کے بنا جیون کا سونا پن مجھے کاٹتا تھا مگر میں نے نہیں سمجھا کہ اس خلا کو دنیا کی کوئی دوسری عورت کیسے پُر کرسکتی

ہے اور میں بھٹکنے لگا۔ تین سال اس نے مجھے نہیں بھٹکنے دیا۔ دولت بہت ہونے کے باوجود مجھے بھٹکنے کا خیال نہیں آیا۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ اس کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی ہے جو زیادہ حسین اور قابل توجہ ہے۔ ہے نا حیرانی کی بات؟ یہی کمال تھا اس کا۔ جب وہ راستے سے ہٹ گئی تو میں اس راستے پر چل پڑا جس پر سب ہی دولت مند بوڑھے ہوس کی لاٹھی تھام کے چلتے ہیں اور ان کی دولت کی طلب گار شکاری عورتیں اس راستے کے دونوں جانب اپنے حسن کا جال پھیلائے کھڑی رہتی ہیں۔ اپنی اداؤں کی 'حسن' وشباب کی اور جسم کی نمائش لگائے 'پُرفریب' محبت بھری مسکراہٹ چہروں پر سجائے۔ گھریلو عورت یہ سب کچھ نہیں جانتی۔ وہ تو محبت کرنا جانتی ہے 'خدمت کرسکتی ہے اور دکھ سہہ سکتی ہے۔ اچانک میری نظریں اس نمائش کی ہوشربا چمک دمک سے خیرہ ہو گئیں۔ میرے دن رات عیش و عشرت میں ڈوب گئے۔ یہ ایک نیا 'انوکھا اور بڑا سنسنی خیز تجربہ تھا مگر ایک دن اچانک میری آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ ہٹ گیا۔ وہ ایک عام سا تجربہ تھا جو میرے جیسے سب ہوس پرستوں کے لئے ایک سبق ہوتا ہے۔ ایک عورت کو میں نے اپنے کاروباری حریف کے ساتھ دیکھ لیا۔ بیک وقت وہ ہم دونوں سے محبت کررہی تھی 'ہم دونوں کو لوٹ رہی تھی۔ اس حقیقت کا انکشاف ہوا تو ہم جو کاروباری حریف تھے 'ایک دوسرے کے رقیب بن گئے۔ ہمیں احساس ہوا کہ ہماری اصل حریف تو وہ عورت تھی جو ایک ساتھ ہم دونوں کو بے وقوف بنا کے تباہ کررہی تھی۔ ہم دونوں مل کے بیٹھے اور سوچنے لگے کہ اسے کیا سزا دی جائے۔ اچانک یہ بھی ایک کاروباری معاملہ بن گیا اور ہم یوں متحد ہو گئے جیسے ہمیں کسی مشترکہ دشمنی کا سامنا ہے۔ حکومت کی غلط پالیسی یا کسی نئے ٹیکس کے خلاف بھی ہم سب کاروباری حریف اکٹھے ہوجاتے تھے جس سے ہمارے کاروبار پر زد پڑتی ہو۔ اتفاق رائے سے ہم نے اس عورت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا جو ہم دونوں کو بہت نقصان پہنچا چکی تھی۔ کسی مشکل کے بغیر ہم نے اسے پرلوک بھیج دیا لیکن اس واقعے کے بعد میں سنبھل گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں کتنا بے وفا اور بے وقوف ہوں۔ اگر مجھے عورت کی ضرورت ہی تھی تو مجھے دوسرا بیاہ کرلینا چاہئے تھا۔ اس کی صلاح مجھے سب دیتے تھے۔ یہ بات میری عقل میں آئی بھی تو ٹھوکر کھانے کے بعد۔ پھر میں نے سوچا کہ چلو صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا۔ میں نے تلاش شروع کی اور اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش میں پھر دھوکا کھا گیا۔"

وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس کی داستان حیات کا یہ باب رابعہ اور نازو کے لئے باعث دلچسپی ہو گیا تھا۔ وہ لحاف میں سے منہ نکالے بڑی توجہ سے ساری بات سن رہی تھیں۔

میں نے یاد دلانے کے لئے کہا "پھر تمہیں رکھشا مل گئی۔"

وہ چونکا "ہاں۔ ایک شخص نے مجھے رکھشا کے بارے میں بتایا۔ میری شرط یہ تھی کہ وہ غریب گھر کی لڑکی ہو جو میرا گھر سنبھالے اور مجھے سنبھالے۔ مجھے کوئی حسین و جمیل 'بڑے گھر کی لڑکی مل بھی نہیں سکتی تھی۔ میں تیس چالیس سال کی کسی عورت کو قبول کرنے کے لئے تیار تھا جس کی شادی کی راہ میں غربت رکاوٹ بنی رہی ہو۔ ایسی بہت ناریاں ہیں ہمارے دیش میں جو بن بیاہی رہ جاتی ہیں کیونکہ ان کے ماں باپ جہیز کی شرط پوری نہیں کرسکتے۔ میرا خیال تھا کہ رکھشا بھی ایسی ہی ہوگی۔ میں نے اسے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ اس وقت پچیس سال کی تھی۔ ایک بار بیوہ ہو چکی تھی۔ شادی کے چند دن بعد حادثے میں اس کا شوہر مر گیا تھا اور سسرال والوں نے اسے منحوس 'ڈائن' قرار دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کے لئے دوسرے رشتے ایسے آئے جو کسی کو بھی قبول نہ تھے۔ نہ رکھشا کو نہ اس کے ماتا پتا کو۔ وہ بڑی سندر 'کومل اور عجیب سی لڑکی تھی۔ اداس اداس کھوئی کھوئی۔ اس کی آنکھوں میں بڑے گہرے دکھ کا ساگر ہلکورے لیتا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ بات کرتے کرتے رو پڑے گی۔ اس کی آنکھوں سے کوئی آنسو چھلک پڑے گا۔ وہ جتنی دلکش اور خوب صورت تھی اس کی تقدیر اتنی ہی بدصورت اور بے رحم ثابت ہوئی تھی۔ دنیا نے اسے منحوس قرار دے کر بھلا دیا تھا حالانکہ خوبصورتی کو تو نحوست سے منسوب کرنا ہی غلط ہے۔ بس مجھے اس پر ترس آگیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسے دیکھتے ہی میرا دل اپنے تمام دکھ بھول گیا۔ وہ دکھ جو ایک وفا شعار بیوی کی جدائی نے دیئے تھے اور وہ دکھ جو ایک خود فروش عورت کی بے وفائی نے دیئے تھے۔ میں نے سوچا کہ وہ ان دکھوں کا مداوا بن کے آئی ہے۔ بھگوان نے مجھے بھٹکنے کی سزا دی اور پھر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا موقع فراہم کردیا۔ میں نے اس کے لئے پیغام دیا تو اس کے ماں باپ نے فوراً قبول کرلیا کیونکہ میں نے کوئی جہیز نہیں مانگا تھا۔ رکھشا کی نحوست کی بات کرنے والوں کی جہالت کو نظرانداز کردیا تھا اور... اور رکھشا کے باپ کے سارے دلدر بھی دور کردئے تھے۔ وہ دلدر جو غربت کے ساتھ رہتے ہیں۔ میں نے اس کی یوں مدد کی کہ اس کی زندگی کو مفلسی کی دلدل سے نکال دیا۔ رکھشا کا سارا خاندان میرا شکرگزار تھا اور میرا خیال تھا کہ رکھشا بھی بہت خوش ہوگی۔ بہت احسان مند ہوگی۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "افسوس کہ یہ سب کچھ ایسا نہیں تھا۔ میں نے رکھشا کے باپ کی مجبوریوں کے بدلے رکھشا کا جسم خرید لیا تھا 'اس کی روح بھی میری نہ تھی۔ روح تو وہ پہلے ہی اپنے پریمی کو دان کرچکی تھی اور جس سے وہ پریم کرتی تھی وہ ایک جوان آدمی تھا۔ ایک معمولی سے خاندان کا لڑکا جو کبھی بڑا آدمی نہیں بن سکتا تھا اور جو کبھی رکھشا کو حاصل بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس دنیا میں ان کا ملنا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا زمین آسمان کا ملنا کیونکہ وہ مسلمان بھی تھا۔ اگر وہ رکھشا کی خاطر اپنا دھرم چھوڑتا تو اس کا سارا خاندان برباد ہو جاتا۔ اس کی بہنوں کے گھر اجڑ جاتے۔ خود

www.paksociety.com

وکھشتا کے لئے بھی مسلمان ہونا اتنا ہی ناممکن تھا۔ اس کے بھائی اسے زندہ جلا دیتے۔ یہ بات مجھے وکھشتا کی موت کے بہت عرصے بعد معلوم ہوئی کہ وہ کسی سے پیار کرنے لگی تھی۔ یہ ایسی خاموش محبت تھی کہ نہ مجھے کبھی اس کا اندازہ ہوا، نہ کسی اور کو۔ وہ ڈرتی تھی کہ اس کے ظالم بھائیوں کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو وہ اس کے پریمی کو بڑی بھیانک موت ماریں گے۔ اگر وہ مجھے بتا دیتی۔۔ تو شاید میں اس کو آزاد کر دیتا۔ آزاد نہیں، میں اس کی مدد بھی کرتا۔ یہ میں آج کہہ رہا ہوں۔ اس وقت کیا پتا میں مشتعل ہو کے اسے مار ڈالتا۔"

میں نے کچھ دیر بعد کہا "یہ سرکار بیچ میں کہاں سے آگیا تھا؟"

"سرکار۔۔ وہ بس میرے پڑوس میں رہتا تھا" وہ بولا "اس نے وکھشتا کو دیکھا تو اس پر لٹو ہو گیا۔ بوڑھے آدمی کی جوان بیوی خوبصورت بھی ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ مجھے سوچنا چاہئے تھا کہ وکھشتا جیسی لڑکی مجھ سے کیسے پیار کر سکتی ہے۔ میری عمر اس کے باپ کے برابر تھی۔ سرکار بہت بدمعاش تھا۔ اس نے ہر طرح سے وکھشتا کو ورغلایا۔ اسے میرے خلاف بھڑکاتا رہا کہ لعنت بھیجو اس بڈھے پر، میرے ساتھ بھاگ چلو۔ وہ پاسپورٹ آفس میں تھا۔ وکھشتا نے اسے بے وقوف بنایا۔ اس سے کہا کہ میرا ایک کام کر دو پہلے۔ اس نے دو جعلی پاسپورٹ بنوائے اپنے لئے اور اپنے پریمی کے لئے۔ سرکار اس کے چکر میں آگیا۔ وہ پاسپورٹ آفس میں کام کرتا تھا۔ اس نے جعلی پاسپورٹ بنا دیئے۔ ان پر نام غلط تھے، باقی سب ٹھیک تھا۔ ایسا ہی ایک پاسپورٹ وہ اپنے لئے بنا چکا تھا۔ اس کا تو یہ دھندا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا مگر بہت پہلے سے خفیہ پولیس والوں نے اس کی نگرانی شروع کر دی تھی۔ اس نے وکھشتا کے ساتھ فرار ہونے کے چکر میں ایک لمبا ہاتھ مارا اور چھ جعلی پاسپورٹ بنا دیئے۔ اسے کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ یہ خفیہ پولیس والوں کا پھیلایا ہوا جال تھا۔ وہ گرفتار ہو گیا۔ اپنی ساری کمائی رشوت میں دے کر وہ بچ تو گیا مگر اسے شک ہو گیا کہ اسے وکھشتا نے دھوکا دے کر پکڑوایا تھا۔ اس کے علاوہ۔۔۔ شاید اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وکھشتا میری پتنی ہے اور نہ اس کی محبوبہ۔۔۔ وہ جسے چاہتی ہے وہ تو کوئی اور ہی ہے۔ وہ چالاک آدمی تھا۔ یہ بات مجھے نہ معلوم ہو سکی۔ غالباً اس لئے کہ میں اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں۔ شکی مزاج نہیں ہوں اور دھوکے باز نہیں ہوں چنانچہ کسی بھی تعلق کی ابتدا عدم اعتماد سے نہیں کرتا۔ اسے علم ہو گیا کہ وہ وکھشتا کے ہاتھوں برباد ہوا۔ اس کی نوکری بھی گئی، عزت بھی گئی اور دولت بھی۔ میں اس کا جانی دشمن ہو گیا اور میں نے ہی اسے زیادہ سے زیادہ سزا دلوانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اس کی وجہ سے میری بہت رسوائی ہو رہی تھی۔ وہ میری عدم موجودگی میں آتا جاتا تھا لیکن میں ایک بار بھی اسے رنگے ہاتھوں نہ پکڑ سکا۔ وکھشتا اس سے کسی قسم کے تعلق کا کیسے اقرار کر سکتی تھی مگر میں زبان خلق کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ جب تک مقدمہ چلتا رہا وہ ضمانت پر باہر رہا اور اس نے اپنے سازشی ہتھکنڈوں سے میری کوششوں کو ناکام کر دیا۔ اس کے خلاف مقدمہ ختم ہو گیا مگر اس چکر میں وہ کہیں کا نہ رہا۔ اس کی ساری حرام کی کمائی نکل گئی، وہ ملازمت سے برطرف ہو گیا اور اس نے مار بھی بہت کھائی۔ پولیس سے بھی اور کرائے کے غنڈوں سے بھی، جو میں نے اس کے پیچھے لگائے تھے۔ پھر اچانک ایک دن کسی نے وکھشتا کو قتل کر دیا اور پولیس نے اسے پھر گرفتار کر لیا۔ حالات کی گواہی اس کے خلاف تھی۔ اس کے اور وکھشتا کے تعلقات کے بھی شاہد بہت تھے جو سامنے آئے بغیر مجھے حالات کی خرابی سے آگاہ رکھتے تھے۔ اب پھر انہی لوگوں نے مجھے گمنام فون کئے اور کہا کہ تمہاری بیوی کا قاتل سرکار کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ میرے ہمدرد ہیں تو سامنے آئیں اور عدالت کو یہ بات بتائیں، کوئی ثبوت ہے تو پیش کریں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میرے بہت سے پڑوسی چشم دید گواہ بن گئے۔ میں نے دو ملازموں کو گواہ کے طور پیش کیا اور انہی مخبروں سے کام لے کر جن کی مدد سے سرکار جعلسازی کے کیس میں سزا پانے سے بچ گیا تھا، میں نے اس کے گھر سے آلۂ قتل بھی برآمد کرا دیا اور ماہرین کی رپورٹیں بھی حاصل کر لیں کہ قتل اسی آلے سے ہوا ہے۔ اب وہ قلاش تھا چنانچہ اپنی بے گناہی نہ ثابت کر سکا۔ اسے سزائے موت ہو گئی مگر پھر ملک میں ایک سرکاری جشن پر سزائے موت پانے والے سب مجرموں کو رعایت دی گئی تو موت کی سزا کو عمر قید میں بدل دیا گیا۔ مقدمے کے دوران ہی سرکار نے وکھشتا پر الزام لگایا تھا کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی مگر دولت مند رام ناتھ نے اسے خرید لیا۔ وکھشتا نے اپنے محبوب کے ساتھ فرار ہونے کا منصوبہ بنایا تھا کیونکہ وہ مسلمان ہے اور وہ یہاں شادی نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم وہ وکھشتا کے محبوب کا نام نہیں بتا سکا اور نہ ہی یہ ثابت کر سکا کہ جن کے لئے اس نے جعلی پاسپورٹ بنوائے تھے وہ کون تھا۔ اس نے بارہا مجھے بھی گالیاں دیں اور کہا کہ میں اندھا، جاہل اور احمق ہوں کہ اپنی بیوی پر اعتماد کرتا ہوں اور یہ نہیں جانتا کہ وہ کسی اور سے پیار کرتی ہے۔ اور یہ کہ میں بلاوجہ اس کا دشمن ہو رہا ہوں حالانکہ وہ خود بھی وکھشتا کے تریا چلتر کا شکار ہوا ہے۔ وکھشتا پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ پہلے کی طرح خاموش اور گم صم رہتی تھی۔ اتنا تو میں اندازہ کر چکا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے اور میں نے اس سے شادی کر کے غلطی کی تھی۔ الزامات کی تردید وہ خود کر چکی تھی کہ یہ سب بکواس ہے اور مجھے فضول باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہئے۔ پھر مجھے جیل سے اس کا پیغام ملا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی مگر تجسس مجھے کھینچ کر لے گیا۔ آخر میرا دشمن، میری بیوی کا آشنا اور قاتل مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے۔ یہی جاننے کے لئے میں جیل پہنچ گیا۔ تھوڑا سا پیسہ خرچ کر کے میں نے اس سے علیحدگی میں ملاقات کی رعایت حاصل کر لی

مگر اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہوا۔ وہ جوان آدمی تھا اور بہت صحت مند بھی۔ اکیلے میں وہ میرا گلا گھونٹ سکتا تھا۔ اسے تختہ دار تک پہنچانے میں سب سے زیادہ تو میری ہی کوششوں کو دخل تھا۔ اس وقت تک خود اس کے پاسبانوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ قاتل نہیں ہے۔ اس شخص کی ذہنی کیفیت کیا ہو سکتی ہے جس کو یقین ہو کہ اسے ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں زندگی سے محروم کیا جا رہا ہے اور یہ ظلم بھی انصاف کے نام پر ہو گا۔ موت سے بچ جانے کے بعد بھی اسے شدت سے احساس تھا کہ عمر قید وہ کسی اور کے جرم میں کاٹ رہا ہے۔ جب میں اس سے ملا تو وہ پاگل ہو رہا تھا۔ اگر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہ ہوتیں تو وہ مجھے گلا گھونٹ کے ہلاک کر دیتا۔ بہت ضبط سے کام لیتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ میری پتنی وکھشتا کا قاتل اس سے ملنے آیا تھا۔ میں اس انکشاف پر اچھل پڑا۔ اس نے روتے روتے مجھے بتایا کہ گزشتہ روز اس سے ایک شخص ملنے آیا تھا۔ اس نے اپنا نام غلط لکھوایا تھا۔ وہ تقریباً تیس سال کا جوان اور خوب صورت آدمی تھا۔ میرے سامنے اس نے اعتراف کیا کہ وہ وکھشتا کا محبوب ہے اور اسی نے وکھشتا کا خون کیا تھا۔ اس کو معلوم ہے کہ میں بے گناہ ہوں اور مجھے دی جانے والی سزائے موت بھی اتنی ہی غلط تھی جتنی عمر قید کی سزا۔ وہ بہت پریشان تھا اور اس کا ضمیر اسے مسلسل ملامت کر رہا تھا کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ خاموش ہے اور قانون لاعلمی کے باعث ایک بے گناہ کو پھانسی پر چڑھانے والا ہے۔ اگر اسے پھانسی ہو جاتی تو شاید وہ پاگل ہو کے خودکشی کر لیتا۔ موت کی سزا کے عمر قید میں تبدیل ہو جانے کے بعد اسے کچھ سکون ملا تو وہ اپنے جرم کا اعتراف کرنے آ گیا ہے مگر اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ وہ مجبور ہے اور بزدل ہے۔ میں نے پہلے اس کی بات بے یقینی سے سنی، پھر اسے بہت گالیاں دیں اور اس پر بہت چیخا چلایا کہ مجبور اور بزدل ہی نہیں، وہ ایک بے ضمیر شیطان ہے۔ کوئی انسان کسی بے گناہ کو سزا پاتے نہیں دیکھ سکتا اور خاموش نہیں رہ سکتا۔ اس نے کہا کہ میں نے بہت سے لوگوں کو گمنام فون کئے تھے اور خط بھی لکھے تھے۔ وکیل سرکار سے لے کر چیف جسٹس تک سب کو بتایا تھا کہ سرکار قاتل نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہے گمنام خطوط کو عدالت یا وکیل اہمیت نہیں دے سکتے تھے۔ سمجھا یہی گیا ہو گا کہ میرے ہمدرد یہ کام کر رہے ہیں یا میں خود یہ چکر چلا رہا ہوں۔ اس نے اخباروں کے مدیروں کو بھی قائل کرنا چاہا تھا مگر وہ کہتے تھے کہ سامنے آ کے بات کرو اور ثابت کرو۔ اس شخص کو اپنے سامنے پا کے جو مجھے تختہ دار تک پہنچانے کا ذمے دار تھا اور جس کی وجہ سے میں عمر قید کاٹ رہا تھا، میں پاگل ہو گیا۔ اس کی دیدہ دلیری نے مجھے بہت مشتعل کیا کہ وہ اپنے جرم کا اعتراف کرنے آ گیا تھا۔ میں مجبور تھا ورنہ وہیں اسے مار ڈالتا۔ میرے شور ہنگامے پر جیل کے حکام مجھے لے گئے۔ انہوں نے میری ایک نہیں سنی حالانکہ جو کچھ اصل مجرم نے کہا تھا وہ سب میں نے انہیں بتا دیا تھا۔ لیکن وہ حرام زادہ جا چکا تھا اور جانے سے پہلے اس نے میرے شور کرنے پر کہا تھا کہ مجھے پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہے۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "سرکار نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کون ہے، کیا کرتا ہے اور کہاں رہتا ہے؟"

رام ناتھ بولا "اگر وہ عقل سے کام لیتا تو شاید معلوم کر لیتا مگر اس کی بات سن کے وہ واقعی پاگل ہو گیا تھا۔"

میں نے کہا "اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو پاگل ہو جاتا۔"

طالب نے کہا "اس نے جیل کے حکام سے یہ بھی نہیں کہا کہ اس شخص کو جانے مت دو۔"

رام ناتھ نے سر ہلایا "کہا تھا مگر جیل والے مجرم کی بات کب سنتے ہیں۔ اصل مجرم باہر تھا اور آزاد تھا۔ وہ اپنی کہہ کے چلا گیا۔ میں تو سمجھتا ہوں، وہ بھی پاگل تھا۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی سرکار سے مل کر اعتراف جرم کرنے کی؟ کیا ملا اسے آخر؟ ضمیر کی خلش اس اعتراف سے ختم تو نہیں ہوئی ہو گی۔ خیر، جب سرکار نے یہ سب مجھے بتایا اور رونے لگا تو مجھے اس پر یقین آ گیا۔ اور مجھے اس سے ہمدردی بھی محسوس ہوئی۔ مجھے اپنے آپ سے شرم بھی آئی کہ میں نے ایک بے گناہ کو محض شک اور دھوکے میں مبتلا ہو کے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی تھی اور اب وہ میری وجہ سے زندگی کے دن جیل میں کاٹ رہا ہے۔ زندگی بار بار تو نہیں ملتی۔ وہ عمر قید کاٹ کے نکلے گا تو اس کے پاس کیا رہ جائے گا۔ کیا کرے گا وہ دنیا میں لوٹ کے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اس کی مدد کروں گا اور اصل مجرم کا پتا چلاؤں گا۔ تاہم چھ مہینے تک جھک مارنے کے باوجود مجھے کچھ معلوم نہیں ہوا۔ سرکار نے اس کا حلیہ ضرور بتایا تھا مگر اس حلیے کے ہزاروں ہوں گے اور محض حلیہ ملنے سے تو کسی راہ چلتے کو پکڑا بھی نہیں جا سکتا۔ سرکار نے مجھے کئی بار بلوایا مگر میں اس سے ملنے کے لئے جیل نہیں گیا۔ میں جا کے کیا کرتا؟ اس کی عمر قید کا ایک دن بھی میں کم نہیں کرا سکتا تھا اور یہ احساس میرے لئے عذاب بنتا جا رہا تھا۔ پھر میں نے دوسرا طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر کسی کو دولت اور طاقت کی مدد سے جیل میں دھکیلا جا سکتا ہے تو کیا اسے طاقت سے رہا نہیں کرایا جا سکتا؟ قانونی طور پر یہ ناممکن تھا۔ وہ اب اپیل بھی کہیں نہیں کر سکتا تھا ورنہ اس کی طرف سے میں بہترین وکیل کرتا اور پولیس کے موقف کو بھی کمزور کر دیتا مگر وہ مجرم ثابت ہو چکا تھا اور سزا کاٹ رہا تھا۔ اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنے اور پشیمانی کے عذاب سے نجات پانے کے لئے میں نے سرکار کو جیل سے فرار کا موقع دلوانے کا منصوبہ بنایا۔ ادھر ادھر کے بہت سے لوگوں کی مدد سے میں بالآخر اسے نکلوانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میں میرا کتنا پیسہ خرچ ہوا، مجھے نہیں معلوم۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ سرکار اصل مجرم کا پتا خود چلائے۔ اس نے مجرم کو دیکھا تھا اور اس کے لئے یہ کام مشکل ضرور تھا مگر ناممکن

www.paksociety.com

نہیں۔ جب وہ جیل سے فرار ہوا تو مجھے معلوم ہو گیا اور میں نے اپنی حفاظت کا پورا بندوبست کر لیا۔ یہ بات سرکار کو معلوم نہیں تھی کہ میں مدد نہ کرتا تو وہ کبھی جیل سے فرار نہ ہو پاتا۔ وہ بدستور میرا دشمن تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اسے جیل پہنچانے والا میں ہی ہوں۔ وہ مجھ سے بدلہ لینے کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا جس میں میرا قتل بھی شامل تھا۔ ایک قیدی جس پر قتل کا الزام ہو جیل سے فرار ہونے کے بعد دوسرا یا تیسرا قتل کر کے ملک سے بھی فرار ہو سکتا ہے۔"

میں نے اس کی بات کاٹی "رام ناتھ! ایسا حرج تھا اگر تم اسے بتا دیتے کہ اس کے فرار کے منصوبے کی کامیابی کے ذمہ دار تم ہو؟"

"حرج یہ تھا کہ اگر وہ پکڑا جاتا تو تفتیش میں میرا نام آتا۔ جیل سے فرار ہونے والے بیشتر مجرم پکڑے جاتے ہیں اور یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ ایک ملزم صرف اپنی کوششوں سے جیل کی سلاخیں بار بار نہیں توڑ سکتا۔ ہمیشہ اندر یا باہر سے کوئی اس کی مدد کرتا ہے۔ پولیس اور جیل میں حفاظت کرنے والوں کو ساتھ ملا کے بااثر مجرم نکل جاتے ہیں اور انہیں یہ موقع فراہم کرنے والوں کو اتنا دے جاتے ہیں کہ بعد میں وہ معطلی کے دوران مالی مشکلات کا شکار نہ ہوں۔"

میں نے کہا "معطلی کا حکم تو رائے عامہ کو خاموش کرنے اور اخباروں کی آواز کو دبانے کے لئے جاری کیا جاتا ہے۔"

غالب نے سہلایا "بعد میں وہ کب بحال ہوتے ہیں یہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہوتا۔ کاغذی کارروائی سے فائل کی خانہ پری بھی کر دی جاتی ہے کہ اس معاملے میں کوئی بھی قصوروار نہیں پایا گیا۔ مالی مشکل کا شکار تو وہ بھی ہوتے ہی نہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ کچھ بڑے مشکل کشا اور بابرکت ادارے ہیں جہاں پیسہ بن بلائے آتا ہے۔ مانگنے کی ضرورت نہیں۔ بیشتر سرکاری ادارے ایسے ہی ہیں جہاں ملازمت درحقیقت بادشاہت ہے۔ معلوم رعایا اپنے کام نکلوانے کے لئے دست بستہ حاضر ہوتی ہے اور بڑی احسان مندی کے ساتھ ان کی بدخالی نظر آنے والی جھولی بھر جاتی ہے۔ جب تک وہ خود قبر کو نہیں بھرتے نہ ان کی نیت بھرتی ہے اور نہ جھولی۔ ایسے اداروں میں دو چار سال گزارنے والا پبلک کو اور حکومت کی نوکری کو لات بھی مار سکتا ہے۔ خیر، میں تو اپنی کہنے لگا، تمہاری بات رہ گئی۔"

رام ناتھ بولا "اور کیا رہ گیا۔ باقی سب تم جانتے ہو۔"

میں نے کہا "تم نے بتایا نہیں کہ سرکار نے اصل مجرم کو کیسے تلاش کیا؟"

"یہ کام اس نے خود کیا۔ وہ بھیس بدل کے پھرتا رہا حالانکہ یہ بڑی خطرے کی بات تھی اس کے لئے۔ وہ سرکاری دفتروں میں گیا، اسکولوں کالجوں میں گیا کیونکہ یہ اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ "باضمیر" شخص کام کہاں کرتا ہے۔ اس نے دن رات ہوٹلوں میں، چائے خانوں میں اور بازاروں میں ایک چہرے کی جستجو جاری رکھی اور ایک مہینہ بھی نہیں لگا اسے۔ وہ اصل مشتبہ دوبارہ بڑا شہر ہے۔ دلی، بمبئی یا کلکتہ کی طرح۔ اس کے علاوہ اصل قاتل کو عرصہ گزر جانے کے بعد بے خوف بھی ہو گیا تھا کہ اب تو معاملہ ختم ہو گیا۔ اسے کون پکڑے گا۔"

"کیا سرکار کے فرار کی خبر اس کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی؟"

"پتا نہیں۔ یہ ایک معمولی سی خبر تھی۔ جیل سے ایک عام مجرم کے فرار کی خبر شہ سرخی تو بن نہیں سکتی۔ ممکن ہے وہ اخبار پڑھتا ہی نہ ہو یا اتنی تفصیل سے نہ دیکھتا ہو۔ سرکار نے اسے تلاش کیا اور پھر اس کا پیچھا کرتا ہوا اس کے گھر تک پہنچ گیا۔ اپنا انتقام لینے کے بعد اس نے کہیں سے اخبار والوں کو فون کیا اور ساری بات بتا کے فرار ہو گیا۔ میں نے اگلے دن کے اخبار میں پوری خبر پڑھی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ یہ جیسے بھی ہوا مگر انصاف کے تقاضے پورے ہوئے۔"

میں نے کہا "دو باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ وہ شخص تمہاری بیوی رکھشا کے ساتھ جانے پر رضامند نہیں تھا تو رکھشا اس کے لئے اور اپنے لئے غلط ناموں سے پاسپورٹ کیوں حاصل کئے بیٹھی تھی؟"

"کیا پتا وہ ایسا سمجھتی ہو" رام ناتھ بولا "کہ اس کا پریمی اس کا ساتھ دے گا۔ اس نے رکھشا سے جھوٹا وعدہ کیا ہو۔ وہ بزدل تو تھا، مرد ہو کے بھی ڈرتا تھا۔ اس سے زیادہ بہادری کا ثبوت تو رکھشا نے دیا کہ سارا انتظام کر لیا جس کی اسے توقع نہ ہو گی۔"

غالب نے کہا "رام ناتھ! میں تمہارے جذبات کو مجروح نہیں کرنا چاہتا مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ سارا معاملہ یک طرفہ محبت، صرف تمہاری بیوی کے جذبات کی انتہا ہو۔ اس کا پریمی کسی حد تک تو اس کے ساتھ ہو مگر ایک شادی شدہ اور [illegible] عورت کی خاطر زندگی داؤ پر لگانے کو بیوقوفی سمجھتا ہو۔"

رام ناتھ نے اقرار میں سر ہلایا "ہاں۔ ہو سکتا ہے۔ ایسے شکاری بھی ہوتے ہیں جو کسی مقصد کے بغیر شکار کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "دوسری بات یہ کہ اس نے رکھشا کو کیوں قتل کیا؟ وہ بزدل قری تھا...."

رام ناتھ نے کہا "جب جان بچانے کے لئے فرار کے سب راستے بند نظر آتے ہیں تو چوہا بھی بلی کے سامنے ڈٹ جاتا ہے۔ ایک عام سی بات ہے۔ خطرے سے سب بچتے ہیں مگر جان بچانے کی صورت ہی کوئی نہ رہے تو ہر کمزور اپنے سے سو گنا یا ہزار گنا طاقتور دشمن کے مقابلے پر اتر آتا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ میرا خیال ہے رکھشا نے سارا انتظام خود ہی کر لیا ہو گا۔ نقد پیسہ، زر اور زیور سب اس کے حوالے کر دیا ہو گا تاکہ اسے کسی دوسرے شہر میں چھپ کر رہنا پڑے تو وہ کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہو۔ اس کا محبوب کچھ عرصے بعد کوئی چھوٹا موٹا مکان خرید لے یا کاروبار کر لے اور معاملہ دب جانے کے بعد وہ باقی زندگی محبت کے گیت گاتے گزار دیں۔"

میں نے کہا "کیا تمہیں یقین ہے کہ رکھشا نے اسے سب کچھ دے دیا تھا؟"

"ہاں۔ بعد میں مجھے اس کا ایک بھی زیور نہیں ملا حالانکہ میں اس کی خاطر کچھ بھی لاتا رہتا تھا اور اس کی ہر فرمائش بھی پوری کرتا تھا۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ اس نے کبھی جوتے، کپڑے یا سامان آرائش کی فرمائش نہیں کی تھی اور کہیں تفریح کے لئے جانے کو نہیں کہا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ اسے صرف زیور پہننے کا شوق ہے۔ وہ تو مال جمع کر رہی تھی۔ اور یہ مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ مال کہاں جا رہا ہے۔ نہ میں کبھی چیک کرتا تھا۔"

میں نے کہا "کوئی بھی معقول فرد ایسا نہیں کرتا۔"

"معقول! میں تو اندھا تھا۔ آنکھوں کا بھی اور عقل کا بھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ عشق اور مشک بھی کہیں چھپتے ہیں۔ مگر اس کے بس سب مجبور ہیں۔ عشق آخری وقت تک کسی پر ظاہر نہیں ہوا۔ ورنہ لڑکا تھا ضمیر کی اولاد، خود نہ جاتا سرکار کے پاس تو کچھ نہ ہوتا۔ سرکار اپنی سزا کاٹتا رہتا۔ کبھی رہا ہوتا تو باہر آتے ہی پہلا کام یہ کرتا کہ مجھے قتل کرتا۔ خود میں اس کے رہا ہونے سے پہلے روپوش ہو جاتا یا اسے جیل میں مروا دیتا۔ لیکن بھگوان کو انصاف کرنا تھا خود۔ اس نے اسباب اور حالات پیدا کر دئیے۔ مجرم کو خود منصف کے پاس پہنچا دیا، ورنہ خود اپنا جیون رکھا تا تو اسے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔"

میں نے کہا "اس نے رکھشا کو کس مجبوری میں قتل کیا تھا؟"

"مجبوری ایک ہی ہو گی۔ مجبوری سے نجات حاصل کرنے کی۔" رام ناتھ نے کہا "وہ کمبل کو چھوڑنا چاہتا تھا مگر کمبل اسے نہیں چھوڑتا تھا۔ پہلے اس نے سب کچھ ایک عورت کی مجبوری کا خراج سمجھ کے وصول کیا۔ شاید اس نے رکھشا کو سمجھایا بھی ہو کہ ان کا ملاپ ممکن نہیں مگر رکھشا نہ مانی ہو۔ عشق کا بھوت سر پر سوار ہو تو کسی عقل کی بات کہاں سمجھ میں آتی ہے۔ اس نے کہا ہو گا کہ یہاں نہ سہی، ہم کہیں اور جا کے رہ سکتے ہیں۔ سارا بندوبست میں کر لوں گی، تم فکر نہ کرو۔ اور اس کے بعد وہ مجبوری کے جال میں الجھتا چلا گیا ہو گا۔ اس نے دوسرے پہلو سے سوچا تو رکھشا اسے سونے کے انڈے دینے والی مرغی نظر آئی ہو گی۔ وہ ایک غریب آدمی تھا۔ اس کا باپ بھی غریب آدمی تھا اور وہ زندہ رہتا تو اس کی اولاد بھی غریب رہتی۔ جب تک مقدر کی لاٹری نہ نکلے یا آدمی حلال کی کمائی کے چکر سے نہ نکلے، مفلسی اور تنگ دستی کی زندگی ایک کے بعد دوسری نسل کو وراثت میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اس نے بھی سوچا ہو گا کہ یہ لاٹری تو مقدر سے نکلی ہے۔ اسے ایمانداری، شرافت اور ضمیر کے چکر میں پڑ کے کیا ملے گا۔ وہ بدنامی سے بچا ہوا تھا۔ رکھشا خود اس کی رکھشا کر رہی تھی اور اس کے لئے کوئی رسک نہیں تھا۔ اس نے رکھشا سے محبت کا خراج تو وصول کر ہی لیا تھا۔ اب اسے کچھ دن جھوٹے وعدوں اور خوابوں میں الجھا کے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ اپنی خاندانی مفلسی کے عذاب سے نجات پانے کے لئے اگر اسے ضمیر کو بھی ہمیشہ کے لئے خاموش کرانا پڑے تو کیا حرج ہے۔ کسی عورت کو محبت کی قید میں گرفتار کرنا مشکل ضرور ہوتا ہے مگر اس زنجیر کو توڑنا کیا مشکل ہے۔ یہی سب سوچ کے اس نے رکھشا کے دل کو قبول کرنا شروع کیا۔ بدلے میں ایک جھوٹا وعدہ ہی تو کرنا تھا کہ موقع ملتے ہی وہ نکل جائیں گے۔ رکھشا نے سارا انتظام کر لیا۔ اس کا پریمی آخری وقت تک ٹالتا رہا۔ آج کل کرتا رہا، بہانے بناتا رہا اور عذر پیش کرتا رہا۔ ممکن ہے وہ کہتا رہا ہو کہ یہ سب تو بہت کم ہے جو تم نے میرے پاس رکھوایا۔ بڑے شہر کے بڑے خرچے ہوتے ہیں اور ہم کسی بڑے شہر میں ہی گم ہو سکتے ہیں، کسی قصبے یا گاؤں میں نہیں۔ شاید کسی اسٹیج پر رکھشا کو شک ہو گیا کہ اس کا پریمی اپنے پریم کی کند چھری سے اس کو ذبح کر رہا ہے۔ اس نے آخری فیصلہ کن اور دو ٹوک جواب مانگا ہو گا پھر دھمکی دی ہو گی کہ وہ اس کو پکڑوا دے گی۔ سارا چوری کا مال برآمد کرا دے گی اور بس۔ پریمی نے اسی وقت یہ کھیل ختم کر دیا۔ سونے کے انڈے دینے والی مرغی کڑک ہو گئی تھی۔ اسے پالنا خطرے کو پالنے کے برابر تھا۔ اندازہ اسے پہلے سے تھا کہ ایک دن ایسا ہو گا اور وہ دن بالآخر آ گیا۔ اس نے بزدل ہونے کے باوجود بڑی بہادری سے کام لیا اور محبت کی اس کہانی کو ختم کر کے خاموشی سے نکل گیا۔ ایسے بھی محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ ایسی بھی محبت ہوتی ہے۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں مجھے رکھشا کی صورت کا تصور کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کیونکہ اس کی تصویر میں دیکھ چکا تھا مگر اس کی موت کا تصور میں نہ کر سکا۔ موت سے پہلے کے ان چند شرمسار، پشیمان اور ملامتی لمحات کا تصور نہ کر سکا جب رکھشا نے پہلی بار محبت جیسے لطیف، دلدار اور ستاروں کی طرح روشن، مہکتے رنگوں کی خوشی اور خوشبوؤں کی دھنک والے خواب آفریں جذبے کو ایک سفاک، خونی، عفریت کے بھیانک روپ میں دیکھا ہو گا۔ اور اس نے کتنی اذیت جھیلی ہو گی اس جاں کنی کے لمحے میں اپنی دہری موت پر۔ ایک اپنے جسم کی موت، دوسری اس محبت کی موت جسے وہ زندگی سمجھی تھی۔

رام ناتھ نے خود ہی پھر بات شروع کی "سرکار نے اسے مار دیا، اپنا اور میرا انتقام لے لیا اور کھلے بھاگ گیا۔ وہاں سے زمانہ آ پہنچا۔ اور اس کے بعد آج میں نے پھر اسے اپنے دروازے پر دیکھا تو میں ڈر گیا تھا۔ حالانکہ ڈرنا مجرم کو چاہئے۔ میں نے کیا جرم کیا تھا۔ رکھشا سے شادی کو میرا جرم تو نہیں سمجھا جا سکتا۔ زیادہ سے

www.paksociety.com

زیادہ میری بے رخی کہا جا سکتا ہے' یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں سٹھیا گیا تھا' ہوس کے جذبات نے میری عقل کو مفلوج کر دیا تھا۔ مگر یہ بے رخی میری گمراہی سے زیادہ تھی۔ کیا شادی کرنا اس بے راہ روی سے اچھا نہیں ہوتا جس میں تم ہر عورت کو مال غنیمت سمجھنے لگتے ہو؟ قصور تھا تو رکھشا کا۔ اس کی محبت غلطی تھی۔ وہ خود بھی بزدل تھی اور اس کا پریمی بھی بزدل تھا۔ محبت ہوتی تو وہ ساری دیواریں پھلانگ جاتے۔ سماجی' مذہبی اور قانونی دیواریں گرا کے نکل جاتے۔ مگر وہ صرف اخلاقی حدود سے نکل سکے۔ پھر رکھشا نے دوسری غلطی کی کہ شادی پر راضی ہو گئی؟ میری بیوی بن کے میرے گھر آ گئی۔ یہ جھوٹ' فریب' ہوس اور بزدلی کی فوج جرم بھلا محبت ہو سکتی ہے؟"

میں نے کہا "رام ناتھ! تم تو فلاسفر ہو۔ اتنی اچھی اردو کیسے بول لیتے ہو؟"

وہ ہنسی سے مسکرایا۔ "اردو پر کیا تمہاری اجارہ داری ہے؟ کوئی اور غالب یا کرشن چندر کو نہیں پڑھ سکتا؟ کسی سیٹھ' ساہوکار کہلانے والے' ناجائز دھندے کرنے والے' اسمگلر یا بدمعاش کے بارے میں کوئی قانون ہے کہ اس کا ذوق اچھا نہیں ہو سکتا؟ جب سائنس داں' موسیقار اور مصور ہو سکتے ہیں تو اس میں حیرانی کی کیا بات ہے کہ میرے جیسا نری ادب سمجھتا ہے یا ادب بولتا ہے؟ میں ادیب یا فلسفی بن سکتا تھا مگر میں نے سیٹھ بننے کو ترجیح دی۔ یہ اپنی اپنی زندگی ہے اور اپنا اپنا راستہ۔ تم خالی خولی شہرت اور ناموری کے پیچھے بھوکے بھاگتے رہو یا مایا جال لے کر گھومو' دولت کے شکاری بن جاؤ۔ کوئی فنکار اور کوئی عشرت تن کی دنیا ہے۔ میرے من کی دنیا الگ ہے اور اس میں میرے ساتھ دوسرے لوگ ہیں۔"

"غالب اور کرشن چندر" میں نے طنز سے کہا "ان سے زندگی کا کبھی چلن سیکھا تم نے تو...."

"تو کیا؟ میں نے پڑھا اس پر مجھے کوئی ندامت نہیں۔ میری ذاتی لائبریری دیکھو گے تم؟" اس نے بڑھی سے کہا "اردو' فارسی ادب کا سارا سرمایہ وہاں جمع ہے مگر وہ صرف میری ذات کے لئے دوسری قسم کی تسکین فراہم کرتا ہے۔ میرا باپ پنڈت دیا ناتھ بہت بڑا عالم تھا اور مہاراجہ کشمیر کے ساتھ تھا۔ اردو' فارسی اور عربی زبان میں اس کی مہارت مستند تھی۔ وہ تاریخ اور فلسفہ جانتا تھا۔ لیکن یہی علم اس کی ذلت اور موت کا سبب بن گیا۔ اس نے کشمیر کے سیاسی مسئلے کو اپنی علمیت کی نظر سے دیکھا' اس کو ایک مورخ کی حیثیت سے سمجھا اور پھر وہی کہا جو صحیح تھا۔ وہ جھوٹ بول ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی زندگی کے آخری ایام بڑی عسرت میں گزرے۔ اسے کہیں نوکری نہیں مل سکتی تھی۔ اور وہ نوکری کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علم نے ساری خرابی پیدا کی اور میں نے اس کے انجام سے عبرت پکڑی۔ میں نے علم کو اپنی ذات تک محدود رکھا اور عمل کے معاملے میں دنیا کو ایک مقابلہ گاہ جانا۔ تو آج میرے پاس سب کچھ ہے۔ میرے باپ کے پاس صرف علم کا عذاب تھا۔ میرے پاس زندگی ہے مگر اس کا عذاب نہیں ہے۔"

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا "اچھا۔ اب تم لوگ سو جاؤ' رہنا کیا ہے' میں ساری رات بولتا رہوں گا۔"

میں نے بھی اس اشتیاق کو دبا دیا جو اس کی لائبریری کا سن کر میرے دل میں جاگ اٹھا تھا۔ کتابیں میرے بچھڑ جانے والے رفیقوں کی طرح تھیں لیکن یہ ان سے ملنے کا وقت اور موقع تھا۔ بار زندہ صحبت باقی۔ کتابوں سے دوستی کا رشتہ تو زندگی کی آخری سانس تک باقی رہے گا اور یہ علم کی دولت پھر عطا ہو جائے گی۔ شرط اول ہے زندگی اور فارغ البالی مجھے اسی کی تو چاہئے۔ خواتین پہلے ہی سو چکی تھیں' غالب بھی دکھو دیر بعد سو گیا۔ میں بستر پر تنگ رکھشا کے تصور میں گم رہا۔

صبح میں سب کے بعد اٹھا۔ غالب نے میری ناک پکڑ کر دبا کو بل دے کے نہ گھمایا ہوتا تو میں نہ جانے کب تک سوتا رہتا۔ میں ایک چھینک مار کے اٹھا تو سب ہنسی کرنے لگے۔

میں نے کہا "کیا پریشانی ہے تم کو؟"

"خواب غفلت میں رہنے والے ذرا بیدار ہو" غالب نے کہا "خبر کل صبح نکلے کس طرف سے آفتاب۔"

میں نے کہا "اگر آفتاب کسی قوی کا نام ہے تو اس کا کہ دروازے سے نکلا یا کھڑکی کے راستے اور مراد سورج ہے تو یہ نہایت مہمل شعر ہے۔ سورج کبھی شمال یا جنوب سے نکلا۔ اور کل کے سورج کی فرح کیا فکر کرنی۔"

"فرح کا سورج تو سر پر آ گیا" ناز نے کہا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا "کس کے سر پر؟"

"شری رام ناتھ کے سر پر" غالب بولا "یقین نہیں تو جا کے دیکھ لو۔ وہ دھوپ میں اپنے سر کے بال سفید کر رہا ہے۔"

رابعہ بولی "اب بیٹھ کر لگا کے کرے گا بھی کیا۔"

ناز نے کہا "یہ مت کہو۔ پھر تلاش کرے گا کوئی رکھشا کے سفید بالوں کو جس ریٹنگ چانس کو دیکھے گی۔"

غالب نے مجرمانہ ملامت لہجے میں کہا "یہ تم کہہ رہی ہو؟ ناز کے بارے میں....."

رابعہ نے فوراً کہا "ہر عورت کی بات نہیں ہے۔ ایسی عورت کیا نہیں ہو گی؟"

غالب نے دلچسپی سے کہا "اچھا! کہاں ہوتی ہیں؟"

ناز نے کہا "جب تم سٹھیا جاؤ گے رام ناتھ کی طرح تو خود نظر آ جائیں گی۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ یعنی میں اتنا ہی دولت مند ہو جاؤں گا" غالب بولا۔

میں نے کہا "کیا باہر بہت سردی ہے؟"

لحاف کے باہر واقعی بہت سردی ہے" غالب بولا اور اس نے میرا لحاف کھینچ کے پھینک دیا "ہم سب بھوکے بیٹھے ہیں تمہاری خاطر اور تم موسم کا حال پوچھ رہے ہو۔"

"جناب ہم نے ناشتا نہیں کیا ابھی تک" رابعہ بولی "ہم کر لو۔ میں بھی کر لوں گا تمہارے ساتھ۔"

"ابے نہیں۔ اٹھو' ہم سب نہا دھو چکے" غالب نے مجھے اٹھانا شروع کیا "تم بھی نہا لو۔ پانی گرم ہے۔"

"مجھے تمہارے بیان کی صداقت پر شبہ ہے کیونکہ تمہارا چہرہ مجھے بالکل ویسا ہی لگ رہا ہے۔ غالب جیسا۔ یہ تمہارے من کا میل ہے جو تمہاری صورت پر نظر آ رہا ہے۔ قریں کا چہرہ اس کے دل کا آئینہ ہوتا ہے اور اگر تم آئینے میں دیکھو...."

"تب ایسے نہیں اٹھنے والے۔ میں بالٹی بھر کے لاتا ہوں ٹھنڈے پانی کی" غالب نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آخری غسل اٹھنے سے پہلے ہی ہو جائے گا" میں چھلانگ مار کے اترا اور دوڑ کر غالب سے پہلے باتھ روم میں گھس گیا۔

پانی واقعی بہت گرم تھا۔ میں اتنی دیر تک نہاتا رہا کہ باہر سے غالب نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا "اتنی حضرت کیا غضب کرتے ہو۔ صابن کی طرح گھل گھل کے بہہ جاؤ گے۔ بس اب نکل آؤ۔ پانی بے پانی کے ملیے۔"

میں نے چلا کے کہا "نہیں آتا۔ مزہ آ رہا ہے نہانے میں۔ تم دل شام تک مرو گے نہیں۔ تھوڑا سا انتظار نہیں کر سکتے۔"

"نہیں کر سکتے" غالب نے دروازے کو لات ماری "مگر یہ کر سکتے ہیں کہ ناشتے سمیت اندر آ جائیں۔"

ناشتا خود ناز نے رابعہ کے ساتھ مل کے بنایا تھا کیونکہ رام ناتھ کے ہندو رسوئی نے ملیچھ مسلوں کی خدمت سے صاف انکار کر دیا تھا۔ نوکری جاتی ہے پر دھرم نہ جائے۔ اس نے اعلان کیا تھا۔ وہ بڑا متعصب ہندو تھا مگر پرانا نمک خوار تھا چنانچہ رام ناتھ نے اسے اجازت دے رکھی تھی کہ وہ ایک دن چھٹی کر لے۔ نیپال میں ہندو اور بدھ مذہب کے پیروکار اکثریت میں تھے۔ بدھ تو خیر ہوتے ہی اعتدال کے بچاری ہیں اور مذہب کے نام پر کیا کسی بھی مسئلے پر اختلاف رائے میں تشدد کو حرام سمجھتے ہیں مگر وہاں کے ہندوؤں پر بھی مہاتما بدھ کی تعلیمات کا اثر نمایاں نظر آتا تھا۔ رام ناتھ کا رسوئیا بھی پرامن طور پر رخصت ہو گیا۔

دن نا بجے بھی سردی کم نہیں ہوئی تھی اور ہمارے پاس گرم کپڑے نہ ہونے کے برابر تھے۔ رام ناتھ سے ہم نے بازاروں کے بارے میں راجہ ہی معلومات حاصل کر کے اجازت لی۔

"ہم پاکستانی سفارت خانے جا کے دیکھتے ہیں' شاید وہ کوئی انتظام کر دیں" میں نے کہا۔

"ضرور کرنا تو چاہئے مگر آج کل حالات مختلف ہیں۔ جانے والے ہزاروں ہیں۔ جو ہزاروں خرچ کر سکتا ہے وہ چلا جاتا ہے۔ باقی ہزار دو سو تک انتظار کریں یا جائیں۔ پیدل جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اگر سانس چلتی رہے اور ٹانگوں میں دم رہے تو تمہاری ساری دنیا میں کہیں بھی پہنچ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "تم تو بڑی دلچسپ ہو۔"

"عام خیال ایسا نہیں ہے" وہ بولا "میرے بارے میں تمہیں اچھی رائے دینے والا مشکل سے ہی ملے گا۔"

"بھولی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں" غالب نے کہا "چلو۔"

کاجل نے کہا "میں کہیں نہیں جا رہی۔"

"کیوں؟" رابعہ نے کہا "گھر پر کیا کرو گی؟"

"کلیم کو بخار ہے۔ غالباً سردی لگ گئی ہے" وہ بولی۔

رام ناتھ مسکرایا "میں ڈاکٹر کو فون کر کے بلا لیتا ہوں۔ اتنا اداس اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جانا چاہو تو تم بھی چلی جاؤ۔ میں اس لڑکے کو دکھا دوں گا۔"

"نہیں۔ میرا جانا ضروری نہیں۔ یہ لوگ کر لیں گے سارے کام" کاجل نے کہا "آپ ذرا ڈاکٹر کو بتا لیں۔ اور اسے کہیں جلدی نہ ہے۔ وہ اچھا ڈاکٹر ہے نا؟"

"کوئی ڈاکٹر برا نہیں ہوتا" رام ناتھ بولا "تو میرے ساتھ۔"

اب ہم کاجل کو زبردستی ساتھ جانے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ ہم سڑک کے کنارے بنے ہوئے فٹ پاتھ پر پیدل چلنے لگے۔ میں اور رابعہ آگے تھے اور ہم سے چند قدم پیچھے غالب کے ساتھ ناز تھی۔ ربڑ اور ہمارے کپڑوں کی اندرونی جیبوں میں محفوظ تھے۔

نیپال کے لوگ اپنی مخصوص وضع کی ٹوپیاں پہنے ہر جگہ روز مرہ کے کاروبار میں مصروف نظر آتے تھے۔ اس علاقے کے لوگوں کا لباس وہی تھا جو سارے ہندوستان کا۔ عورتیں ساڑی میں تھیں اور ماتھے پر ایک ہی بندیا لگائی تھیں۔ فرق عمارتوں کے طرز تعمیر میں نظر آتا تھا۔ ایک کے اوپر ایک مخروطی چھتوں والے پگوڈا ہر قدم پر موجود تھے جن کی تعمیر میں لکڑی کا استعمال بڑی خوب صورتی سے کیا گیا تھا۔ ان کی دیواریں اور چھت سب کے نقش رنگار ہنرمندوں کی مہارت اور مہارت کاروں سے جذباتی عقیدت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ بدھ بھکشو سردی کے باوجود کیسری رنگ کی دھوتی سے ایک شانے کو چھپا کے مطمئن پھر رہے تھے۔ ان کے اوپر والے جسم کا آدھا حصہ لباس نہ ہونے پر بھی موسمی حالات کی سختی کا عادی تھا۔ ان میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے جو سر منڈائے تکلے لگائے خود کو مہاتما بدھ کی تعلیمات کے لئے وقف کر چکے تھے۔

مقامی لوگوں کے درمیان ہر جگہ وہ بے خانماں لوگ بھی نظر آ جاتے تھے جن پر بنگلہ دیش کی زمین تنگ کر دی گئی تھی۔ وہ کسی پگوڈا کی دیوار کے سائے میں' کسی عمارت کے برآمدے میں اور خیموں میں اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ کسمپرسی کی تصویر

www.paksociety.com

عبرت بنے پڑے تھے۔ ان کے چہرے مسافرت کی تھکن، خوف اور بے یقینی کے عکاس تھے۔ زندگی میں وہ دوسری بار دربدر ہوئے تھے اور جیسے انہیں موت جیسا بس میں اپنی منزل فراری کی جانب گامزن ہوئے تھے ایسے ہی آج پھر لٹ پٹ کے اپنے پاکستان جا رہے تھے۔ پاکستان وہ پہلے بھی گئے تھے مگر اس وقت ان کے جذبات مختلف تھے۔ وہ امیدوں اور خوابوں کے ساتھ دلوں میں خوشی، امنگ اور حوصلے لئے، مستقبل پر یقین کے ساتھ روانہ ہوئے تھے مگر آج وہ مایوس، دل گرفتہ اور بدبختی پر نوحہ خواں تھے اور اپنے ماضی پر پشیمانی کے دکھ میں جلا تھے۔

میں ان کے درمیان سے اجنبی بن کے گزرا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ میں سکندر بخت ہوں جس نے ایم آر ایس کی بنیاد صرف اس لئے رکھی تھی کہ وہ ملک کو دولخت کرنے والے سازشی عناصر کے خلاف وطن پرست قوتوں کا ساتھ دینا چاہتا تھا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اب میں بھی انہی جیسا تھا اور میرے پاس بھی وہی پچھتاوے تھے۔ اپنے ایم آر ایس کے کسی کارنامے پر غرور سے سر اٹھا کے چلنا میرے لئے باعث عار تھا۔

حلیے سے بھی ہم انہی کی طرح تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہم نسبتاً بے فکر اور خوشحال نظر آتے تھے۔ کئی جگہ میرے اپنے ہم وطن مجھے ہاتھ پھیلائے نظر آئے۔ وہ بھکاری نہیں تھے، مسافر تھے لیکن ان کے پاس زادِ راہ نہیں تھا۔ انہیں طویل سفر درپیش تھا لیکن ان کے وسائل ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

ایک بوڑھا اچانک میرے سامنے آ گیا "سیٹھ! میری بات سن لو بھگوان کے لئے۔"

میں رک گیا "تم مسلمان ہو یا ہندو؟"

وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس نے مجھے ہندوستانی سمجھ کے بھگوان کا حوالہ دیا تھا "میں... بنگلہ دیش سے آیا ہوں۔"

"اور تم کو پاکستان جانا ہے۔ تم یقیناً مسلمان ہو" میں نے کہا۔

"ٹھیک بولا آپ نے سیٹھ۔"

"میں سیٹھ نہیں ہوں۔ مسلمان اور پاکستانی ہوں تمہاری طرح" میں نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے کہ تم نے مجھے ہندو سمجھ کے بھگوان کا واسطہ دیا۔ کیا تمہیں افسوس نہیں ہے؟"

"چھوڑو جی۔ صرف لیکچر دیتا ہے تو کسی اور کو دو" وہ بگڑ گیا "میرے کام نہ کوئی مسلمان آئے گا نہ کوئی پاکستانی۔ صرف پیسہ کام آئے گا۔ سب کچھ پیسہ ہی ہے میاں۔ دین ایمان، خدا بھگوان......"

میں نے کہا "تم بہت جلد حوصلہ ہار گئے۔ یہ تو بہت چھوٹی سی آزمائش تھی تمہارے ایمان کی۔"

"جس کا سب کچھ لٹ گیا ہو وہ اور کیا کرے؟ ایک گھر تھا وہ نہیں رہا۔ بیوی ساتھ چھوڑ گئی، بیٹے مارے گئے۔ دو لڑکیاں ساتھ ہیں۔ ان کی جوانی کو کس کس سے بچاؤں۔ جب ہر طرف بھیڑیے مار رہے ہوں۔ تم کہتے ہو میں حوصلہ ہار گیا! اور کیا امتحان لے گا خدا میرے صبر کا۔ میں تو حرام موت بھی قبول کر لیتا مگر ان لڑکیوں کو مارنے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔ میں انہیں قتل کر سکتا تو..." وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا اور پھر ایک دم واپس چل پڑا۔

مجھے دکھ بھی ہوا اور ندامت کے احساس نے میرے دل میں کانٹے بکھیرے۔ میں نے ایک مجبور اور بے بس آدمی کے زخم پر نمک پاشی کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ مدد تو میں کسی کی نہیں کر سکتا مگر اتنا تو کر سکتا تھا کہ کوئی مانگے تو ہمدردی کے دو بول دے دوں۔

رابعہ نے کہا "اسے کچھ دے دو سکندر۔"

غالب نے کہا "خیرات کے طور پر کیونکہ اس نے ہاتھ پھیلایا تھا۔"

"نہیں۔ کسی کی مدد کرنے میں کیا حرج ہے۔"

غالب نے تلخی سے کہا "ہم خود مدد کے محتاج ہیں۔ ہم کریں گے کسی کی۔ اپنوں اور غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے والے آخر خدا کے سامنے ہاتھ کیوں نہیں پھیلاتے؟"

رابعہ نے کہا "یہ عادی بھکاری نہیں ہیں۔"

"تم جانتی ہو کہ ہو جاتے ہیں؟" میں نے کہا "آج اس نے ہندو سیٹھ سمجھ کے بھیک مانگی تھی۔ اسے بھیک مل جاتی تو کل بھی کسی ہندو سے بھیک مانگتا۔"

نازو نے کہا "بھیک مانگنے والے کے لئے ہندو کیا اور مسلمان کیا۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں" میں نے کہا "اپنے مدد کرنے پر خیرات رہتے ہیں۔ ساری بات احساس کی ہے۔ اس کا احساس مر گیا تو یہ غیروں سے بھی کہے گا کہ ہاتھ پھیلاؤ۔ ایسے آدمی کو مارنا چاہئے۔"

"تم بڑے ظالم ہو سکندر" رابعہ نے کہا۔

غالب نے کہا "کسی کو بھکاری بنانا کوئی ہمدردی نہیں اس کے ساتھ دشمنی ہوتی ہے۔"

نازو نے کہا "آخر یہ لوگ کیا کریں؟ یہاں تو محنت مزدوری نہیں کر سکتے۔"

"خدا پر بھروسہ کریں، انتظار کریں، حوصلہ کریں۔ بے غیرتی کے ساتھ ہاتھ پھیلانے یا عزت کو نیلام کرنے سے بہتر ہے کہ تکلیف اٹھائیں، فاقے کاٹیں، سردی میں اکڑ کے مر جائیں" میں نے کہا "یہ ایک آدمی یا ایک خاندان کا المیہ تو نہیں ہے قوم کا مسئلہ ہے اور اسی قوم کے نام سے ہماری شناخت ہے۔ کسی پاکستانی کو یوں ہاتھ پھیلا کے رحم کی بھیک مانگتے دیکھنا چاہتا۔ اس ملک میں پاکستان کا نام تو بدنام نہیں ہونا چاہئے۔"

سب خاموشی سے چلنے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ خواتین سے اتفاق نہیں ہو گا۔ کسی کے رنج و غم پر ان کا ردعمل منطقی جذباتی ہی ہو گا۔ میرا ہم خیال صرف غالب تھا جس نے

www.paksociety.com

پاکستانی کو بھیک مانگتا دیکھ کر اپنے آپ کو اتنا ہی بے توقیر محسوس کیا تھا جتنا کوئی بھی پاکستان کے نام سے جذباتی عقیدت اور محبت رکھنے والا محسوس کر سکتا ہے۔

بازاروں میں لوگوں کا اژدحام تھا۔ یہ کراچی یا لاہور جیسے بازار نہیں تھے اور نہ یہاں وہ چمک دمک' رونق اور شان و شوکت نظر آئی تھی جس کو انگریزی میں گلیمر کہا جاتا ہے۔ بیشتر لوگ روز مرہ کی اشیائے ضرورت خرید رہے تھے اور غربت زدہ نظر آتے تھے۔ ان میں نیپال کے راستے ہجرت کر کے پاکستان جانے والے بھی تھے جو بے سروسامانی کے عالم میں جان بچا کے بھاگے تھے تو صرف نقد اور زیورہی اٹھا کے لا سکے تھے۔ گھر اور گھر کا سامان پیچھے رہ گیا تھا۔ یہاں بارش تو سارا سال ہوتی تھی مگر گرمی سردی کی شدت بھی قابل برداشت تھی۔ گرمی کا علاج وہ کم سے کم کپڑے پہن کے' تہا کے یا پنکھا جھل کے کر لیتے تھے مگر نیپال کی سردی میں جسم کی حفاظت کے لئے گرم کپڑے ضروری تھے جو ان کے پاس نہیں تھے۔ وہ پرانے کوٹ پتلون اور کمبل خرید رہے تھے اور اپنی حیثیت اور ضرورت کے مطابق کپڑے چھانٹ رہے تھے۔

اب وہ سہ پہر ہونے والی تھی چنانچہ دھوپ میں تمازت پیدا ہو گئی تھی اور موسم بہت خوشگوار محسوس ہوتا تھا۔ آسمان کا رنگ گہرا سرخ نیلا تھا اور درخت جو خزاں کی چیرہ دستی سے محفوظ تھے' اس پس منظر میں زیادہ سرسبز دکھائی دیتے تھے۔

میں نے غالب کے مشورے سے خریداری کو واپسی تک موقوف کیا اور ہم لوگوں سے راستہ پوچھتے پاکستان کے سفارت خانے کی طرف چل پڑے۔ رام ناتھ نے بھی ہمیں راستہ سمجھایا تھا مگر ہم ایک اجنبی شہر کے راستوں پر چلتے ہوئے عدم اعتماد کا شکار تھے۔ غنیمت بات یہ تھی کہ انگریزی یہاں بھی تعلیم یافتہ طبقے کی زبان تھی اور لوگ عام طور پر خوش اخلاق تھے۔ ستم ظریفی حالات نے ان ہجرت کرنے والوں پر "بہاری" کا لیبل لگا دیا تھا جو پاکستان کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں پہنچنا چاہتے تھے۔ جب تک وہ مشرقی حصے میں تھے' غیر بنگالی کہلائے اور جب مغربی حصے میں پہنچے تو انہیں بلا تفریق بہاری کہا گیا حالانکہ صوبہ بہار سے تعلق رکھنے والے ان میں اتنے ہی تھے جتنے کسی اور صوبے کے لوگ۔ گورکھپور' لکھنؤ تک کے لوگ بہاری ہو گئے۔

جیسے جیسے ہم سفارت خانے کے قریب پہنچے' ہجرت کر کے نیپال پہنچنے والے پاکستانیوں کا ہجوم بڑھتا گیا اور سفارت خانے کے آس پاس تو ان کی پوری بستی آباد نظر آئی۔ حکومت نے اپنے تمام وسائل اور تعلقات کو بروئے کار لاتے ہوئے نیپال سے ان کی واپسی کا انتظام کیا تھا۔ خود نیپال کی حکومت کا رویہ انتہائی دوستانہ اور ہمدردانہ تھا لیکن ہجرت کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی چنانچہ تمام انتظامات غیر موثر ہو کے رہ گئے تھے۔ عام آدمی کی سفارتی عملے تک رسائی مشکل ہو گئی تھی اور بیوپاری ایجنٹوں کی حکومت تھی۔ وہ کسی کو اندر پہنچانے سے پاکستان پہنچانے تک تمام مسائل کی ذمہ داری قبول کرتے تھے اور ہر ذمہ داری کا الگ معاوضہ وصول کر رہے تھے۔

یہ صورت حال بہت پریشان کن اور تکلیف دہ تھی۔ ہم دور سے ہی اس ہجوم کو دیکھا جو سفارت خانے کے اندر دھکے کھا رہا تھا اور کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا۔

"یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی مرزا غالب" میں نے کہا۔

غالب نے زہر خند کیا "جس کے پاس دال ہو گی' گل جائے گی' ہمارے پاس تو دال بھی نہیں ہے۔"

"یہاں محمود و ایاز سب ایک ہیں" رابعہ نے کہا۔

"غلط۔ ہم محمود ہوتے تو دربان خود ہمیں عزت کے ساتھ لے جاتا۔ یہ سب ایاز ہیں" میں نے کہا "ان کے ایک ہی صف میں کھڑے ہونے کا زمانہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ محمود کسی صف میں شامل نہیں ہوتے' سیدھے اندر جاتے ہیں' ایاز باہر صف بستہ رہتے ہیں اور قطار بنا کے باانتظار فرما ہدایت پر عمل کرتے ہوئے جھک مارتے ہیں۔"

کھانے کے لئے ہم ایک نسبتاً بہتر ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ ہم میں اور عام لوگوں میں نمایاں فرق صورت شکل اور رنگ روپ کا تھا۔ رابعہ اور نازو کا حسن و جمال یہاں بھی لوگوں کو متوجہ کر رہا تھا۔ پھر وہ ہمیں دیکھتے تھے اور ہماری گفتگو سے سمجھ لیتے تھے کہ ہم "بہاری" نہیں ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی تک ہم پر کسی کی نظر کرم نہیں ہوئی تھی۔

ایک ویٹر نے ہماری صورت اور لب و لہجے پر غور فرماتے ہوئے ہمیں خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا۔ اس نے بڑے اہتمام سے میز صاف کی اور پھر ایک مینو دیا جس کا بہت کم حصہ ہماری سمجھ میں آیا۔ آرڈر رابعہ نے دیا۔

میں نے کہا "غالب! کیا ہم کسی طرح بھی اس اُلو کے پٹھے سے رابطہ نہیں کر سکتے؟"

نازو نے کہا "عجیب آدمی ہے اچانک مکان بدل لیا۔"

غالب بولا "سے وہ مکان چھوڑنا پڑا ہو گا۔ جلوہ کثرت اس کا باعث۔"

میں نے کہا "وجہ کچھ بھی ہو۔ اسے یہ بھی سوچنا چاہئے تھا کہ ہم اس کے سوا کسی کو فون نہیں کر سکتے۔"

"اور کیا۔ کم سے کم اپنا فون نمبر ہی بتا جاتا نے مالک کو۔ وہ بھی بدتہذیب آدمی تھا۔ ممکن ہے منظر نے نمبر دیا اس کو کال کرنے والوں سے تنگ آیا ہوا تھا۔"

"ہم نے فون بھی غلط وقت پر کیا تھا" نازو بولی "اگر ابھی میں کوئی ہمیں بھی جگا کے کسی کے بارے میں پوچھے تو ہم کہیں گے جہنم میں گیا۔"

"اس کی جگہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے شادی کر لی۔ لب بولا "اللہ کو پیارا ہوا یا بیوی کو پیارا ہوا۔"

"رخصت تو لڑکیاں ہوتی ہیں جب اپنے گھر سے اور وہ جہنم میں جاتی ہیں" نازو نے کہا۔

"عورت تو اپنے گھر کو اپنی جنت سمجھتی ہے" رابعہ نے کہا۔

"ہاں۔ فلموں میں ایسا ہی دکھایا جاتا ہے کہ سسرال کو میدان جنگ بنا کے اور سب کی ناک میں دم کر دیا ہے۔۔۔۔"

میں نے کہا "یار غالب! ابھی تو موقع دیکھ کر بات کیا کرو۔"

غالب نے کہا "سوری۔ موضوع تھا منظر کی گمشدگی۔ میرا خیال ہے کہ اس کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "میرے آفس فون کرو۔"

میں نے کہا "تم خود بات کر لو گی؟ کون ہو گا وہاں؟"

"تم بھول رہے ہو" رابعہ بولی "منظر نے بتایا تھا کہ میرے آفس کے معاملات کو بھی وہی سنبھال رہا ہے۔"

"ارے ہاں" میں نے چٹکی بجا کے کہا "اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ رابعہ کی ساکھ اور رفتہ رفتہ بحال ہو رہی ہے' تمہارے کلائنٹ پھر آنے لگے ہیں۔ اور کوئی لڑکا تھا وہاں جو بڑی وفاداری کے ساتھ اکیلا ہی کام چلا رہا تھا اور برے وقت میں فرم کو چھوڑ کے نہیں گیا تھا۔ کیا نام تھا اس کا۔"

"تم یوسف" رابعہ نے کہا "جس نے بعد میں شادی کر لی تھی اس سے۔"

"کیا اس نے بھی شادی کر لی؟" غالب نے یوں کہا جیسے اس خبر سے اسے سخت حیرت ہوئی ہے یا صدمہ پہنچا ہے۔

میں نے ہنس کے کہا "تم ہی تو کہتے تھے' عقد سے کس کو رستگاری ہے۔"

"ہاں۔ آج تم کل ہماری باری ہے" وہ مصنوعی رقت آمیز لہجے میں بولا "میری آنکھوں میں آنسو آ رہے ہیں۔ نازو! ذرا رومال دینا۔"

"نہیں ہے رومال میرے پاس" نازو نے کہا۔

"تم تو اتنی رومانٹک بھی نہیں ہو جتنا یہ سمجھا۔ اچھی خاصی پوزیشن پیدا کی تھی میں نے۔ تم اپنے آنچل سے میرے آنسو صاف کر سکتی تھیں۔"

"آپ اس کے لئے ٹشو پیپر استعمال کیجئے۔"

رابعہ پھر مجھ سے مخاطب ہو گئی "میرے آفس والوں کو ضرور منظر کا نیا فون نمبر معلوم ہو گا۔"

"اگر وہاں فون ہوا۔"

"فون کے بغیر منظر کا تو کام ہی ٹھپ ہو جاتا ہے۔ اس نے جہاں بھی گھر لیا ہو گا وہاں پہلے سے فون ہو گا یا اس نے لگوا لیا ہو گا۔"

ویٹر نے ہمارے سامنے دال چاول اور سبزی رکھ دی۔

غالب نے کہا "بس رابعہ! تم نے کھانے کے لئے کچھ نہیں منگوایا۔"

رابعہ مسکرائی "اور یہ کیا ہے؟"

"یہ کھائیں گے ہم!" غالب بے یقینی سے بولا۔

"یہاں گوشت نہیں ہوتا۔ بدھ اور ہندو ماس نہیں کھاتے' ویجیٹیرین ہوتے ہیں۔"

"بجا فرمایا۔ مگر ہم تو مسلمان ہیں" غالب فریادی لہجے میں بولا "یا میرے مولا۔ امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے۔"

نازو نے کہا "سبزی کھانے والے لمبی عمر پاتے ہیں۔"

غالب نے کہا "دال سبزی کی سو سالہ عمر سے قورمے پلاؤ کی ایک سال کی زندگی بہتر ہے۔ ٹیپو سلطان سے معذرت کے ساتھ۔"

نازو نے اسے ڈانٹا "صبر شکر کے ساتھ کھا لو جو سامنے ہے۔"

"بابا یہی تو کر رہا ہوں۔ شکایت کہاں ہوئی ہو" غالب نے مسکینی سے کہا۔

کھانا کھاتے ہوئے میں نے ساتھ والی میز پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ بڑی توجہ سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی وہ شخص دوسری طرف متوجہ ہو گیا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے باتیں کرنے لگا۔

میں نے جان بوجھ کے بلند آواز میں کہا "اگر ہمارا منظر سے رابطہ نہ ہوا تو ہم پاکستان کیسے جائیں گے؟ سفارت خانے میں تو داخل ہونا بھی مشکل ہے۔"

غالب نے کہا "رام ناتھ کرے گا کچھ۔"

میں نے کہا "وہ بھی کسی ایجنٹ کے ذریعے ہی کرے گا۔ کوئی ایسا شخص مل جاتا جس سے ہم براہ راست معاملہ طے کر لیتے۔"

اب وہ شخص ایک دم اٹھ کے ہمارے قریب آ گیا جو ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ کوئی ایسا ہی ایجنٹ تھا جس شخص سے وہ بات کر رہا تھا وہ جا چکا تھا۔

"معاف کیجئے۔۔۔۔" اس نے انگریزی میں کہا۔

غالب نے کہا "جاؤ معاف کیا۔ اب تم بھی ہمیں معاف کرو' ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

"لیکن میں آپ لوگوں کی مدد کرنا چاہتا ہوں" وہ بولا۔

غالب بولا "دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا کہ ابھی دنیا میں کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ کوئی فرشتہ غیب سے ضرور نمودار ہو گا۔ خضر راہ بن کے۔"

میں نے کہا "یہ خدمت خلق نہیں کرتے۔ منزل تک پہنچانا ان کا پیشہ ہے جس کا یہ معاوضہ لیتے ہیں۔"

اس شخص نے کہا "میرا نام بہرام ہے۔ کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟"

غالب نے کہا "پہلے کرسی کھینچ لو ورنہ نیچے بیٹھ جاؤ۔"

اس نے کرسی کھینچ لی "اگر میرا اندازہ درست ہے۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "چونکہ تم ہماری باتیں سن رہے تھے اس لئے اندازے کی بات نہیں۔ تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔"

وہ تھوڑا سا جھینپا "آپ سفارت خانے کی مدد کے چکر میں نہ پڑیں وہ کسی کی نہیں سنتے۔"

غالب بولا "کمال ہے۔ حکومت نے سب بہرے ایک ہی ملک کے سفارت خانے میں جمع کردئے۔ آلۂ سماعت سے بھی نہیں سنتے؟"

ایجنٹ مسکرایا "اس آلۂ سماعت کا نام ہے روپیہ پیسہ۔ دربان سے چپراسی اور پی اے تک رسائی حاصل کئے بغیر آپ کسی بھی ذمے دار افسر تک نہیں پہنچ سکتے۔ ایک ہزار میں آپ نے یہ مرحلہ طے کرلیا تو ذمے دار افسر سے یہ جواب ملے گا کہ نام لکھوا دیں ویٹنگ لسٹ میں اور اپنی باری کا انتظار کریں۔ آپ لوگ ذرا معزز نظر آتے ہیں۔"

"ذرا کا کیا مطلب! اچھے خاصے معزز ہیں۔"

"جی نہیں۔ تھے" نازو نے کہا۔

"ایسی صورت میں وہ خوش اخلاقی سے آپ کو ایک کپ چائے بھی پیش کرے گا" بہرام بولا۔

"ایک ہزار روپے میں ایک کپ چائے تو مہنگی ہے" میں نے کہا۔

"آپ لوگوں کا تعلق مغربی پاکستان سے ہے۔ رائٹ؟" اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"رائٹ۔ اور کیا جانتے ہو تم ہمارے بارے میں؟" غالب بولا۔

"آپ لوگ غالباً سرکاری افسران ہیں یا کاروباری لوگ ہیں جو مغربی پاکستان سے غلط وقت پر مشرقی پاکستان گئے اور پھر وہاں پھنس گئے" بہرام بولا۔

"تم نے تو کمال کردیا" غالب نے کہا "کب سے ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے تم؟ کہیں تم شرلاک ہومز تو نہیں ہو؟"

نازو نے اسے گھورا "شرلاک ہومز کالا نہیں تھا۔ خالص انگریز تھا۔"

بہرام نے برا نہیں مانا اور مجھ سے مخاطب رہا "میرے پاس دو ٹکٹ ہیں ہوائی جہاز کے۔ ابھی جو شخص اس ٹیبل پر بیٹھا تھا وہ مجھ سے سودا کرگیا ہے۔ کل کی فلائٹ ہے۔"

"اور تم اب ہم سے سودا کرنا چاہتے ہو" میں نے کہا "کتنے میں؟"

رابعہ نے کہا "دو ٹکٹ ہمارے لئے بے کار ہیں۔ ہم چھ آدمی ہیں۔"

"اور بھی انتظام ہوجائے گا۔ چند دن میں۔ یہ دو ٹکٹ تو آپ لے ہی لیں" وہ بولا "بیس ہزار......"

"بیس ہزار!" غالب نے چلا کے کہا "بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

اس نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا "اوکے۔ چند دن میں سات کی بات کی ہے اور تین ہزار میرا حق بنتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ کوئی اور بولتا، میں نے کہا "ٹکٹ کہاں ہیں؟"

اس نے جیب سے ٹکٹ نکالے "مشتاز کریم اور عبدالکریم کے نام سے کنفرم سیٹیں ہیں کراچی تک۔"

میں نے کہا "لاؤ مجھے دو۔"

اس نے ٹکٹ مجھے دے دیے "آپ میں سے کوئی دو جائیں۔"

غالب نے کہا "مثلاً ہم دونوں۔ یا یہ خواتین۔"

اس نے کہا "آپ بہت مذاق کرتے ہیں۔ میری مراد جوڑے سے تھی۔"

"جوڑے خدا آسمان پر بناتا ہے۔ ہم یا تم کیسے بناسکتے؟" غالب نے کہا "کیا میں نے غلط کہا نازو؟"

"ہاں۔ جوتوں کے جوڑے بازار والے بناتے ہیں" نازو بولی۔

میں نے کہا "رابعہ! اسے ادائیگی کردو۔ بارہ ہزار۔"

رابعہ نے احتجاج کیا "ہم نے طے کیا تھا کہ سب ساتھ جائیں گے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ہم ساتھ ہی جائیں گے۔"

رابعہ سمجھ گئی کہ میں نے دو ٹکٹ کا جیل اور کلیم کے خریدے ہیں۔ اس نے اپنے بیگ سے رقم نکال کے میرے حوالے کردی اور میں نے ایجنٹ کو دے دی۔

"یہ تو انڈین کرنسی ہے" وہ خوش ہوکے بولا۔

میں نے کہا "اسی لئے بارہ ہزار ہیں۔ تم تبدیل کروگے تو ہو جائیں گے۔"

ایجنٹ کی خوشی کافور ہوگئی "میں نے پاکستانی کرنسی کی نہیں کی تھی۔"

میں نے کہا "ہم بنگلہ دیش سے آئے ہیں۔ وہاں کون سی چلتی ہے؟ خواہ مخواہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔ تم بھی یہ سب خیر قانونی کام ہے۔ ان ٹکٹوں پر خریدنے والے کوئی سفر نہیں کرسکتا۔ ہم بھی رسک لے رہے ہیں۔"

اس نے سر دو بھر کے کہا "اوکے سر۔ میں چار سیٹوں کا بندوبست کروں گا۔ اسی ہفتے میں۔"

"ایک ساتھ۔ ایک ہی فلائٹ پر" رابعہ نے کہا۔

"یہ تو مشکل ہوگا بلکہ ناممکن۔"

"پھر رہنے دو۔" رابعہ نے کہا۔

"اچھا میں کوشش کروں گا۔ لیکن سر۔ پیسے کچھ زیادہ لگے میڈم۔ یوں ہی لوگ ضرورت کی قیمت لیتے ہیں۔ ایک سستی مل جاتی ہے جہاں پورے پورے خاندان ساتھ جاتے ہیں۔ ان کے لئے کنفرم سیٹیں خریدنی پڑیں تو بھاؤ اونچا

سب مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں" نازو نے کہا۔

غالب نے اس کی طرف دیکھ کے ٹھنڈی سانس لی "یہ کمین ہو گئی مگر میں تم سے کیا کہوں۔"

رابعہ مسکرائی۔ غالب معصوم صورت بنا کے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"اب آپ سے رابطہ کہاں قائم کیا جاسکتا ہے سر؟" بہرام

میں نے کہا "تم اپنا پتا ٹھکانا یا نام پتا بتاؤ۔ فون نمبر دے دو۔"

وہ جلدی سے بولا "میں یہیں ملوں گا۔"

میں نے کہا "اس ریسٹورنٹ کا مالک تمہیں جانتا ہوگا۔ میں اسے پوچھتا ہوں۔"

وہ گھبرا گیا "اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اور کیا تمہیں بارہ ہزار کے ساتھ جانے دیں؟ یہ ٹکٹ کیا ہیں صرف کاغذ۔"

"میں ذمے دار ہوں سر۔ جہاز پر سوار کرانا میرا کام ہے۔"

میں نے کہا "کل تم نظر ہی نہ آئے تو ہم کیا کریں گے؟"

غالب نے کہا "ہم ائرپورٹ سے جہاز کو پرواز کرتا دیکھتے رہیں اور پھر سب واپس آجائیں گے جیسے گئے تھے۔ پھر چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی کوئی بہرام نہیں ملے گا۔"

"بعد میں پتا چلے گا کہ تم تو بہرام ڈاکو تھے۔ وہ بھی بھیس بدل کر پھرتا تھا" نازو نے کہا۔

بہرام کچھ گھبرا گیا تھا "نہیں سر۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "ہم کیسے آدمی ہو؟ ہم یہی جاننا چاہتے ہیں۔"

وہ اٹھنے لگا تھا کہ میں نے اس کی کلائی پکڑلی "ہم نے نقد رقم دی ہے۔ اس بات کی ضمانت لئے بغیر تم نہیں جاسکتے کہ ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہوا ہے۔"

بہرام کی حالت پھر پکڑے جانے والے مفرور مجرم جیسی تھی۔ اس نے زور لگا کے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی "چھوڑو سر۔"

میں نے کہا "تم چھڑا سکتے ہو تو چھڑالو۔"

غالب نے سب کی نظر بچا کے اپنا ریوالور نکالا "اور بھاگ نہ ہو تو بھاگ کے دکھاؤ۔"

اس کی ساری مزاحمت ختم ہوگئی "اچھا آپ ٹکٹ واپس دیں۔ میں پیسے دیتا ہوں۔"

میں نے کہا "بالکل نہیں۔"

"کیوں۔ سودا جب یہاں ہوا تھا۔۔۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"ہم یہاں ہنگامہ نہیں چاہتے مگر تم ہمیں مجبور مت کرنا" میں نے کہا اور اپنی جیب سے پاسپورٹ نکال کے اسے دکھایا۔

"ڈاکٹر۔۔۔ ڈاکٹر راجن" اس نے بمشکل نام کہا "تم نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔۔۔"

اب غالب نے اپنا پاسپورٹ اس کے سامنے لہرایا "میرا نام ہے کمار۔ ہم سب انڈین فارن آفس کے لوگ ہیں۔ امیگریشن اور پاسپورٹ ڈویژن۔ تم جیسے لوگوں کی تلاش ہمارا کام نہیں ہے مگر ہم تمہیں متعلقہ حکام کے حوالے ضرور کرسکتے ہیں۔"

بہرام کی حالت غیر ہوگئی "سر۔۔۔ مجھے معاف کردیں۔ آئی ایم سوری۔ میں نے مجبوری میں یہ کام کیا۔ یہ میرا پیشہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ہم باہر جاکے بات کریں گے۔ ایسی باتوں کے لئے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔"

بہرام بری طرح پھنس گیا تھا۔ اس کے لئے تعمیل کے سوا چارہ نہ تھا۔ باہر نکلتے تک میں نے اور غالب نے اسے دونوں طرف سے محصور رکھا۔ اس کا ایک ہاتھ بڑے دوستانہ انداز میں میرے ہاتھ میں تھا اور غالب جو اس سے لگ کے چل رہا تھا "یہ بتاچکا تھا کہ اس نے اپنی جیب میں ریوالور پکڑ رکھا ہے۔ ریوالور کی نوک بہرام کی ریڑھ کی ہڈی کو چھو رہی تھی۔

"تم لوگ مجھے کہاں لے جارہے ہو؟" وہ باہر آکے مچل گیا۔

"تم اپنے پیروں پر چل کے بھی جاسکتے ہو اور بے ہوشی کی حالت میں بھی۔ کون سا طریقہ پسند کروگے تم؟" میں نے کہا "ہم تمہیں رام ناتھ کے گھر لے جائیں گے۔ سیٹھ رام ناتھ کا نام ضرور سنا ہوگا تم نے۔"

ہمارے ٹیکسی میں بیٹھنے تک اسے یقین تھا کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں اور در حقیقت اسے سفارت خانے کی معرفت نیپال کی پولیس کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں مگر میں نے ٹیکسی والے کو پتا بتایا تو وہ کچھ مطمئن ہوگیا اور آرام سے بیٹھ گیا۔

ہم واپس رام ناتھ کی حویلی پہنچ کے ٹیکسی سے اترے تو ہمارے ساتھ ایک نئے قیدی کو دیکھ کر رام ناتھ نے کہا "یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "یہ بہرام ڈاکو ہے۔ تم نے اس کے بارے میں بہت ناول پڑھے ہوں گے۔ اس نے ہمیں بھی لوٹنے کی کوشش کی تھی۔"

"نہیں۔۔۔ میں وہ سب واپس کرنے پر تیار تھا۔ یہ لوگ مجھے زبردستی یہاں لے آئے" اس نے رام ناتھ سے کہا "یہ تو بڑا ظلم ہے۔"

میں نے کہا "رام ناتھ جی! آپ اندر جائیں۔ لیڈیز! آپ بھی چلیں۔ ہم کچھ تفتیش کریں گے۔"

بہرام کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑگیا تھا "تم مجھے نہیں جانتے۔"

میں نے اسے دھکا دے کر بٹھادیا "ہم تمہیں جاننا چاہتے ہیں، اسی لئے تو یہاں لائے ہیں۔ لیکن تمہارے بارے میں پھر بات کریں گے پہلے یہ بتاؤ کہ مشتاز کریم اور عبدالکریم کون ہیں؟"

www.paksociety.com

"تم کون تھے؟" غالب نے کہا۔

اس نے کہا "یہ سب میں نہیں جانتا۔ میں نے تمہارے سامنے ہی ٹکٹ لئے تھے۔"

"کس سے لئے تھے؟" میں نے کہا "ہم اسے بھی اٹھوا لیتے ہیں۔"

"وہ اجنبی تھا میرے لئے۔"

میں نے پے در پے اس کے چہرے اور پیٹ میں گھونسے مارے۔ وہ چلانے لگا اور تڑپنے لگا۔

میں نے کہا "تم اتنے بے وقوف نہیں ہو کہ ایک اجنبی سے اتنا بڑا سودا کر لو۔ وہ تمہارے گروہ کا آدمی تھا۔۔۔ یہ ٹکٹ کس کے ہیں؟"

اس نے ہانپتے کانپتے ہوئے کہا "مجھے نہیں معلوم۔"

میں نے کہا "مطلب یہ کہ آسانی سے تم نہیں بتاؤ گے۔"

"تم مجھے۔۔۔ پولیس کے حوالے کر دو" وہ چیخ کر بولا۔

میں نے اسے دوسری بار زیادہ بے رحمی سے مارا "پولیس کے ساتھ مل کے تم یہ ریکٹ چلاتے ہو نا؟ ہم جانتے ہیں۔"

غالب نے ریوالور کو اور اچھال کے پکڑنے کی کوشش کی مگر یہ مظاہرہ ناکام ہو گیا۔ ریوالور نیچے گرا تو ایک دم اس پر جھپٹا۔

میں نے اس کے ایک لگ رسید کی۔ وہ دور جا کے گرا اور اپنی پسلیوں پر ہاتھ رکھ کے دہرا ہو گیا۔ "مجھے معلوم ہے پولیس تمہیں چھوڑ دے گی۔"

"ترائی" "ترائی اگین" غالب بولا۔ "دیکھتے ہیں کون کامیاب ہوتا ہے۔" اس نے دوسری بار ریوالور اچھالا اور کیچ کر لیا۔

میں نے بہرام کو گھسیٹ کر۔۔۔ ایک کرسی پر ڈال دیا "اگر تم نے سچ نہ بولا تو میں دوسرے طریقے استعمال کروں گا۔ میں بجلی کے جھٹکے دے دے کر تمہیں مار ڈالوں گا۔ تمہیں ننگا کر کے فریزر میں ڈال دوں گا۔ چھری سے تمہاری کھال اتار لوں گا۔ بتاؤ شہناز کریم اور عبدالکریم کے ٹکٹ تمہارے پاس کہاں سے آئے؟"

ڈرامے کے بعد اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ اس نے ایک پاکستانی فیملی کے دو افراد کو قتل کر کے ان سے یہ ٹکٹ حاصل کیے تھے۔ اپنے ایک ساتھی کی مدد سے اس نے لاشوں کے سر کاٹ کر الگ گاڑ دیے اور دھڑ یہاں سے دور ایک ایسی گھاٹی میں پھینک دئیے جہاں وحشی درندے ان کی ہڈیاں تک کھا جائیں۔

اس لرزہ خیز قتل کی واردات نے میرے اور غالب کے دماغ کو شدید صدمے سے دوچار کیا۔ میں اس معاملے میں کسی دھوکے یا فراڈ کے امکانات دیکھ رہا تھا اور صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ دھوکا کس کے ساتھ ہوا ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ صرف بارہ ہزار کی خاطر وہ شخص دوہرے قتل کا مرتکب ہو چکا ہے۔

اس نے اپنے جرم کا اعتراف اس امید میں کیا تھا کہ ہم اپنے وعدے پر قائم رہتے ہوئے اس کو چھوڑ دیں گے مگر اس سے پہلے وہ بہت مار کھا چکا تھا اور نیم جاں ہو رہا تھا۔ ہم نے اسے غسل خانے میں بند کر دیا۔ اس بات کا قطعی کوئی امکان نہ تھا کہ وہ فرار ہو جائے۔ اس میں اٹھنے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ بھیانک انکشاف رابعہ اور نازو کی عدم موجودگی میں ہوا ورنہ ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا۔

"اب اس کا کیا کریں؟" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "وہی جو اس نے کیا۔ یہ شخص رحم کا مستحق نہیں۔"

"بالکل ٹھیک۔ اسے ہم ٹھکانے لگا دیں گے۔ یہ ایک جلاد ہے جس نے ہمارے دو ہم وطنوں کی جان لی تھی۔ اگر یہ معاملہ پولیس کے سپرد کیا گیا تو یہ صاف بچ جائے گا۔"

"پھر قصہ تمام کرو۔"

"میں کچھ اور سوچ رہا تھا" میں نے کہا "ابھی عبدالکریم اور شہناز کریم کے بارے میں کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اس نے پورے اعتماد کے ساتھ ٹکٹ بیچے تھے۔ یہ جانتا تھا کہ جہاز کی پرواز کے وقت کوئی عبدالکریم یا شہناز کریم اعتراض نہیں کر سکے گا اور نہ پولیس اتنی جلدی ان کا سراغ لگا سکتی ہے۔ مجھے تو شک ہے کہ شہناز اور کریم کو بھی ٹکٹ اسی نے لا کر دیے ہوں گے۔ ورنہ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ ان کے پاس فلاں فلائٹ کے ٹکٹ ہیں۔"

"اگر اسے ڈر نہیں تھا تو وہ گھبرا کیوں گیا تھا؟"

میں نے کہا "وہ تصدیق اور ضمانت طلب کرنے پر گھبرایا تھا۔ اسے ہم سے یہ امید نہیں تھی۔ اس نے تو سوچا ہو گا کہ ہم ٹھیک یہ دوری بچ کر کے ٹکٹ جیب میں ڈالیں گے اور اپنی راہ لیں گے۔"

تفتیش کے دوسرے راؤنڈ میں اس نے مزید انکشافات کیے۔ عبدالکریم اور شہناز کریم اسے ایک پب میں ملے تھے جہاں وہ دوسرے بہت سے ایجنٹس کی طرح شکار کی تلاش میں گھومتا تھا۔ شہناز ایک بنگالی لڑکی تھی اور کریم ایک سال سے مشرقی پاکستان میں تھا۔ فوجی اصطلاح میں وہ ایک بھگوڑا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچنے کے لیے روپوش ہو گیا تھا۔ اسے شہناز کے گھر میں پناہ ملی تھی جسے وہ پہلے سے جانتا تھا اور یقین دلا چکا تھا کہ اس سے شادی کرے گا۔ جب حالات خراب ہونے لگے یہ محبت کرنے والے بچھڑ گئے اور سارے وعدے خواب و خیال ہو گئے۔ شہناز اسے بھول گئی تھی کہ وہ اچانک آ پہنچا اور شہناز کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انہوں نے ڈھاکا پہنچ کے خفیہ طور پر نکاح پڑھوا لیا۔ شہناز کے والدین جو پہلے تیار تھے اب اس شادی پر ہرگز رضامند نہ ہوتے۔ ڈھاکا سے وہ چھپتے چھپاتے نیپال پہنچے تھے اور کریم کا خیال تھا کہ واپس پہنچ کے وہ اپنی رجمنٹ کے سامنے

رپورٹ کرے گا۔ پاکستان میں وہ محفوظ ہوں گے اور ہنسی خوشی زندگی گزاریں گے۔ شہناز نے اپنے زیورات اور کریم نے تمام نقد رقم دے کر بہرام کی معرفت وہ ٹکٹ حاصل کیے۔ اس کے لیے انہیں دو ہفتے انتظار کرنا پڑا۔ یہ دو ہفتے انہوں نے اپنے کیمپ میں ہی گزارے۔ پکڑے جانے کے ڈر سے وہ باہر نہیں نکلتے تھے اور کسی سے بات تک نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے تو اپنے نام بھی غلط بتائے تھے مگر بہرام کو انہوں نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ یہ ان کی بے وقوفی تھی یا شامت اعمال۔ وہ بہرام جب کو لب بام لے گیا تو فرشتہ اجل کے روپ میں بہرام نے ان کے مستقبل کا راستہ روک لیا۔ وہ لاوارث اور گمنام لوگ تھے۔ بہرام کے لیے انہیں مار کے غائب کر دینا بہت آسان کام ثابت ہوا۔ ان کا تو کوئی پوچھنے والا بھی نہ تھا جو ان کی اچانک گمشدگی پر تشویش کا اظہار کرتا۔ انہیں ٹکٹ دکھا کے وہ اپنے ساتھ لے گیا اور کہا کہ اب ان کا کام ختم ہوا۔ جہاز پر انہیں دوسرا شخص سوار کرائے گا۔ کریم اور شہناز اس سے ملنے گئے اور واپس نہیں آئے۔ ہم نے اسے پھر بند کر دیا۔

یہ سب سن کے رام ناتھ جیسا شخص بھی مشتعل ہو گیا "بند یہاں کر رکھا ہے اسے؟ ختم کرو۔ آج رات کو اس کی لاش سڑک پر پھنکوا دیں گے۔"

میں نے کہا "رام ناتھ! بہت سے لوگوں نے اسے ہمارے ساتھ دیکھا ہو گا۔ اس کی لاش بھی نہیں ملنی چاہیے۔"

"نہیں ملے گی۔ وہ خود ہمیں اس جگہ لے جائے گا جہاں۔۔۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک سوچا تم نے مگر میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔"

غالب نے کہا "تم ٹکٹ استعمال کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔ شہناز اور کریم نے اس کی قیمت ایک بار ادا کی پھر اپنی جان دے کر۔ تیسری بار ہم نے یہ ٹکٹ بارہ ہزار میں لیے ہیں۔ انہیں ضائع کرنا کون سی عقلمندی ہے۔"

"کیا کاجل مان جائے گی؟"

میں نے کہا "کاجل کو کچھ معلوم نہیں۔ رابعہ یا نازو کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ کل ہم کاجل کے ساتھ کلیم کو روانہ کر دیں گے۔ خود انہیں سی آف کرنے جائیں گے۔ پھر کل رات بہرام کو بھی آف کر دیں گے جہاز کے ٹیک آف کرنے کے بعد۔"

"کل تک بہرام کو کہاں رکھیں گے ہم؟"

رام ناتھ نے کہا "اسی گھر میں۔ ایک تہ خانے میں۔"

"رابعہ اور نازو کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"سو رہی ہیں سب۔" رام ناتھ نے کہا "یہی بہترین وقت ہے اسے نیچے لے جانے کا۔"

بہرام کو اپنی موت کا یقین آ چکا تھا۔ جب اس نے چیخنا چلانا شروع کیا تھا تو ہم نے کپڑا ٹھونس کے اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ اب اسے اٹھا کے تہ خانے تک لے جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہیں تھا چنانچہ اسے میں نے اٹھایا۔ رام ناتھ نے ہماری رہنمائی کی اور ہم کچن کے پیچھے سے زیر زمین چلے گئے۔

تہ خانہ اچھا خاصا بڑا بیڈ روم تھا جو پہاڑی کو کاٹ کے بنایا گیا تھا۔ یہ کمرا نہ بنایا جاتا تو بالائی عمارت کو سہارا دینے کے لیے بہت بھرائی کرنی پڑتی اور ستون اٹھانے پڑتے۔ رام ناتھ سے پوچھے بغیر ہی میں سمجھ گیا کہ یہ ایک خفیہ عشرت کدہ تھا۔ پہلی بیوی کی موت کے بعد رام ناتھ نے بڑی رنگین زندگی گزاری تھی مگر اس سے پہلے بھی وہ کون سا پارسا ہو گا۔

ہم اس خواب گاہ سے ملحق باتھ روم میں بہرام کو ڈال کر اوپر آ گئے۔ اس قید خانے سے صرف اس کی روح باہر نکل سکتی تھی اور ہم نے اسے خودکشی کے امکانات سے محروم نہیں کیا تھا۔ اگر وہ خود اپنی جان لے لیتا تو ہم قتل کے الزام سے بچ جاتے۔ رام ناتھ کے نزدیک بھی یہ قتل نہیں انصاف تھا اور ضروری تھا۔

اٹھنے کے بعد رابعہ نے پہلا سوال یہ کیا "بہرام کہاں ہے؟"

میں نے کہا "وہ تو چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد۔"

نازو بولی "مگر میں نے اس کے چلانے کی آواز سنی تھی۔"

"کیسے چلا رہا تھا وہ؟" غالب بولا "چلا کے بتاؤ۔"

میں نے کہا "اب پوچھ گچھ شرافت سے تو ہوتی نہیں۔"

"پھر کیا معلوم ہوا؟" رابعہ بولی۔

"کوئی خاص بات نہیں۔ ٹکٹ ٹھیک ہیں۔ وہ اپنا نام غلط بتا رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"بے وقوف آدمی تھا" غالب بولا "معلوم نہیں اس کے ذہن میں کیا تھا۔ جھوٹ بول کے وہ کیا چاہتا تھا۔"

میں نے کہا "اسے ڈر تھا کہ ہم اسے پکڑوا دیں گے۔ ہمارے پاس فضول کاموں کے لیے وقت نہیں ہے۔ نام پتا معلوم ہو گیا تو ہم نے چھوڑ دیا۔"

رابعہ نے کہا "اب وہ تمہارا کام نہیں کرے گا۔"

"نہ کرے۔ اور بہت ہیں اس جیسے" میں نے کہا۔

نازو بولی "اور اگر اس نے ہمارے بارے میں پولیس کو بتا دیا تو پھر؟"

غالب نے کہا "کیا بتائے گا؟ ہمارے پاسپورٹ دیکھ چکا ہے وہ۔ یہ جانتا ہے کہ ہم رام ناتھ کے مہمان ہیں۔ غلط کام کر رہا ہے تو وہ خود۔"

"ہم کل انشاءاللہ کاجل اور کلیم کو کراچی بھیج دیں گے تمہارے بھائی کے پاس" غالب نے کہا "ڈبل ایس آئی جی کے پاس۔"

نازو اداس ہو گئی "بھیا تو مایوس ہو چکے ہوں گے۔ انتظار کتنا مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور پر ان کا جن کے زندہ واپس آنے

www.paksociety.com

کا یقین ہی ادھورا ہو۔ کتنی پرانی بات لگتی ہے یہ جب ہم ان کو چھوڑ کر آئے تھے۔"

غالب نے کہا "مری رشتی" مری ہم سفر! اب تو بہت جلد تم بھی ان سے جا ملوگی ہم سب کا انتظار ختم ہونے والا ہے۔"

شام ہوتے ہی سردی پھر بڑھنے لگی۔ ہم نے ابھی تک گرم کپڑے نہیں خریدے تھے۔ رام ناتھ نے بڑی فراخدلانہ پیشکش کی کہ ہم اس کی گاڑی میں چلے جائیں لیکن ہم نیپال کے دلکش نظاروں والے دارالحکومت کی سیر بھی کرنا چاہتے تھے۔ کلیم کو ابھی تک بخار تھا اور کاجل اس کے لیے بہت فکر مند تھی۔ اس نے ہمارے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔

"تم کہو تو ہم بھی نہ جائیں" رابعہ نے کہا۔

جواب رام ناتھ نے دیا "بھئی ایسی کوئی بات نہیں۔ اس موسم میں ٹھنڈ لگ ہی جاتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا تھا کہ شام کو پھر دیکھ جائے۔"

کاجل نے کہا "ہاں سر، آتا ہی ہوگا۔ تم لوگ جاؤ۔"

جب ہم باہر آرہے تھے تو دھواں چھوڑتی، شور مچاتی اور خطرناک انداز میں لہراتی چلتی ہوئی ایک گاڑی اندر داخل ہوئی۔ میں نے چھلانگ مار کے خود کو ایک طرف کیا ورنہ میرا خیال ہے کہ حادثے کی صورت میں اس قدیم و ضعیف کار کا کوئی حصہ ٹوٹ کے گر جاتا۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر سرکس کے جوکر جیسا ایک شخص یوں اکڑا بیٹھا تھا جیسے منجمد ہوگیا ہو۔ اسے شاید امید نہ تھی کہ اندر سے بھی کوئی نکل سکتا ہے۔ کوشش کے باوجود وہ اسٹیرنگ پر کنٹرول نہ رکھ سکا اور گاڑی لان پر اتر گئی۔ سبزے پر سے گزری اور چار گملوں کے درمیان سے راستہ بنا کے رک گئی۔

نازو کو سب سے زیادہ ہنسی آئی "یہ کیا چیز تھی؟"

رابعہ بولی "ایک سوار تھا دوسری سواری تھی۔ تم کس کو پوچھ رہی ہو؟"

میں نے کہا "غالباً یہی ڈاکٹر تھا۔"

وہ کار سے باہر آنے کے بعد ڈاکٹر ہی ثابت ہوا۔ کچھ دیر حیرت سے گھورنے کے بعد اس نے افسوس سے سہلاتے ہوئے کار کے مضروب حصوں کو اسی طرح دیکھا جیسے وہ جاں بہ لب مریضوں کو دیکھتا ہوگا اور پھر اپنا سال خوردہ میڈیکل بیگ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ لان پر ہل چلانے یا گملے توڑ کے پودوں کو بے گھر کرنے کا اسے کوئی ملال نہ تھا۔

"کمال ہے! ہمالیہ کی ترائی میں ایسی چیزیں بھی پائی جاتی ہیں۔" غالب بولا۔

میں نے کہا "تمہارے ملک میں ضیاء جی بابا بھی تو ہیں جو ہمالیہ کے غاروں میں سو سال گزارنے کے دعوے رکھتے ہیں۔"

"جس کا دل چاہے تو شنتر دبوا دیکھ لے کہ وہ تو سب جوان تھے۔ گھر لوٹ کر گئے تو زیادہ جوان تھے۔" غالب بولا۔

نازو نے کہا "کیا تم ملے ہو کبھی ایسے جوان بابا سے؟"

غالب نے کہا "نادان لڑکی! لوگ آتے ہیں مجھ سے ملنے۔"

میں نے کہا "یہی تو ہیں بابا نذر کو دیکھتے میں اٹھا نہیں سکتے ہیں تو ایک سو اٹھائیس سال عمر ہے۔"

رابعہ ہنسی "پھر تو تمہیں ضیاء جی بابا غالب کہنا چاہیے۔"

نازو بولی "میرے پردادا ہوگئے تم تو۔"

غالب نے کہا "دیکھا سکندر! یہ ان عورتوں میں کبھی بیٹھ نہ جاؤ جو اپنی عمر میں دو منٹ اسٹے کی۔ اس نے تو دو ہزار مار دیا۔ مجھ سے تو ہی کم ہوگی اس کی عمر۔"

"سکندر صاحب!" پیچھے سے کسی نے مجھے نام لے کر پکارا۔

میں ایک دم گھوم گیا۔ میرے ساتھ ہی وہ میرے سب لوگ کے قدم رک گئے۔ مجھے آواز دے کر ہوئے والا دو منزلہ ایک شخص تھا۔ جس نے ڈفل کوٹ پہن رکھا تھا۔ نہایت سرد علاقوں میں جہاں برف باری بھی ہوتی ہے، یہ کوٹ بہت کام آتے ہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقوں اور اسلام آباد میں بھی لوگ یہ اوور کوٹ استعمال کرتے ہیں جس میں کالر کے ساتھ ہی سر کو ہر طرف سے ڈھانپ لینے والا حصہ بھی ہوتا ہے۔ ڈفل کوٹ والے نے بہت قریب آکے آواز دی تھی اور وہ ابھی رکے رہے تھے۔ میرے اچانک رک جانے سے اس کو بھی بریک لگانے پڑے۔ وہ جانے کہاں سے ہمارے تعاقب میں تھا۔

کوٹ کی جیب سے ہاتھ نکال کے اس نے مجھ سے مصافحہ کیا "آپ سکندر بخت ہوناں؟ مجھے شک تھا۔"

"آپ کا شک غلط نہیں تھا" میں نے ہاتھ ملا کے حیرت کے سارے تاثرات کو چہرے پر جمع کرلیا۔

"جی... آپ سکندر نہیں ہو!" اس نے سنبھل کے کہا اور عینک کے شیشے صاف کرکے پھر میری صورت کا جائزہ لیا۔

"معلوم نہیں آپ کس سکندر کی بات کررہے ہیں۔ جس کا مقابلہ پورس سے ہوا تھا وہ تو ساڑھے تین سو سال قبل مسیح ادھر آیا تھا۔"

غالب بولا "ادھر کا مطلب ہے ہندوستان۔ کٹھمنڈو وہ کبھی نہیں آیا تھا۔"

"آپ مذاق کرتے ہو جی" وہ خفت سے مسکرایا "ابھی آپ نے بھی ان کا نام لیا تھا۔"

"میں نے!" غالب حیران ہوکے بولا اور پھر قہقہہ مار کے ہنس پڑا "چشمہ تو صاف کرلیا تم نے اب کان بھی صاف کراؤ۔ اب بھائی میں اس کو مذاق میں چقندر کہتا ہوں۔ یہ مجھے قلم کہتا ہے۔"

میں نے بھی سرہلایا "ورنہ تمہیں ہم کیا چرسولی کہتے ہیں۔"

وہ بخت تھے میں پڑ گیا "چقندر.... قلم...."

غالب نے بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیا تھا۔ مجھے سکندر کہنے والے شخص کو پورا یقین تھا کہ میں سکندر بخت ہوں یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور غیر ملکی ہوں چنانچہ وہ تصدیق کے لیے ہمارے پیچھے چلا آیا تھا اور جب غالب نے میرا نام لیا تو اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار آگیا مگر غالب نے بڑی چالاکی سے نظر کے دھوکے کو فریب سماعت کا نام دے دیا۔

میں نے دوستانہ انداز میں اپنا پاسپورٹ نکالا "میں ڈاکٹر راجن ہوں اور یہ میری دھرم پتنی ڈاکٹر کرتی۔ یہ مسٹر اور مسز کمار ہیں۔"

اس نے بے یقینی سے میرا پاسپورٹ لیا۔ اس پر میری تصویر اور نام کو دیکھا اور بولا "معاف کرنا۔"

غالب نے کہا "ہمارے پاسپورٹ بھی دیکھ لو۔ تمہارا یہ شک بھی رفع ہوجائے گا کہ میں راجہ پورس تھا۔"

اس نے مجھے پاسپورٹ واپس کرتے ہوئے کہا "میں غلط سمجھا تھا۔ تم وہ نہیں ہو۔"

میں نے پاسپورٹ پھر جیب میں رکھ کے کہا "تم کس سکندر کو تلاش کرتے پھر رہے ہو؟"

غالب نے ہمدردی سے کہا "تمہارا بیٹا یا کوئی بھائی تھا جو گم ہوگیا ہے؟"

اس نے خفت کے ساتھ سرہلایا "نہیں.... ایک دوست تھا۔ بمبئی میں ملا تھا۔ صرف ایک بار تھوڑی دیر کے لیے۔ وہ ملاقات بھی کہاں تھی۔ دور سے ہی دیکھا تھا اسے۔ میں ریلوے کوارٹر میں اپنے ایک دوست کے ساتھ رہتا تھا اور وہ سامنے والے کوارٹر میں ٹھہرا تھا۔"

میں نے کہا "آخر وہ تھا کون؟"

"وہ... تھا ایک مجاہد، ایک عظیم انسان" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا کہ میں نے اس کے لیے کچھ نہ کیا حالانکہ میری بڑی تمنا تھی۔ خیر۔"

وہ واپس جانے کے لیے پلٹا تو میں نے کہا "عجیب فرد ہو تم بھی۔ اگر وہ سکندر یہاں مل جاتا تو تم کیا کرتے؟ جب وہاں کچھ نہیں کرسکے تھے۔"

وہ پھر رک گیا "یہاں میں بھارتی سفارت خانے میں ہوں۔ ایسے تو چپڑاسی کچھ نہیں ہوتا مگر میں سفیر صاحب کا ذاتی چپڑاسی ہوں۔ میں اسے خبردار کردیتا کہ وہ خطرے میں ہے۔ فوراً نیپال سے نکل جائے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ کوئی کام ہو تو آجانا میرے پاس۔"

غالب نے کہا "کام پڑسکتا ہے مگر نام تو معلوم ہو تمہارا۔"

"بھولے علی" وہ جلدی سے بولا "معاف کرنا میں نے آپ کا وقت خراب کیا۔"

میں نے کہا "بھولے علی! ایک کام تو ہے مگر باتیں یہاں سڑک پر کھڑے ہوکر نہیں کی جاسکتیں۔ کیوں نہ ہم کہیں بیٹھ جائیں۔"

"تمہارے ساتھ ایک کپ چائے بھی پی لیں" غالب نے کہا "تمہیں کوئی ضروری کام تو نہیں ہے؟"

وہ مسکرایا "نہیں جی۔ ایسے ہی نکلا تھا بازار سے کچھ لانے کے لیے۔ یہاں آپ مہمان ہو، چائے میں پلاؤں گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ ہمیں تو معلوم نہیں یہاں چائے کہاں اچھی ملتی ہے۔"

وہ بولا "بہت اونچی جگہ تو میں آپ کو نہیں لے جاسکتا۔ ایک خالص نیپالی ریسٹورنٹ ہے۔ چائے بھی خاص ہے اس کی۔"

غالب نے کہا "پھر تو ہم وہیں جائیں گے۔"

اس خالص نیپالی ریسٹورنٹ کا ماحول خاصا پراسرار تھا۔ باہر سے صرف ایک دروازہ نظر آتا تھا مگر اس کے پیچھے طویل سرنگ جیسا غار تھا۔ دروازہ پہاڑی کے اس حصے میں تھا جہاں عمارات کے سامنے نے پہاڑی کو چھپالیا تھا۔ یہ مصنوعی نہیں حقیقی غار تھا جسے ضرورت کے مطابق کچھ گہرا اور چوڑا کرلیا گیا تھا۔ اوپر سے مٹی اور پتھروں کو گرنے سے بچانے کے لیے جگہ جگہ سیمنٹ بھی بھرا گیا تھا مگر سیمنٹ کو بھی خاکی رنگ سے قدرتی چٹانوں کا حصہ بنادیا گیا تھا۔

نیچے چٹا فرش تھا جس پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ جنان کی

www.paksociety.com

دیواروں پر ایسی وال لائٹس نصب تھیں کہ دیکھنے سے قدیم طرز کی مشعل کا گمان ہوتا تھا۔ میزوں پر خوب صورت پھول سجے ہوئے تھے اور کہیں فانوسوں میں چھپے ہوئے اسپیکروں سے موسیقی کے سُر پھوٹ رہے تھے۔ یہ مغربی موسیقی نہیں تھی۔ خالص ہندوستانی کلاسیکل موسیقی تھی۔ اور جب ہم ایک میز پر بیٹھے تو وہی ٹھمری اور استاد علی اکبر خاں کے سروں کا ریکارڈ ختم ہوا پھر چند لمحے بعد... بسم اللہ خان کی شہنائی کا جادو جاگا۔

مجھے اس ماحول کے طلسم نے اسیر کرلیا تھا۔ اگر بندے علی نہ ملتا تو ہم اس خوب صورت جگہ سے اجنبی بن کے گزر جاتے اور بعد میں کبھی کوئی ذکر کرتا تو ہمیں ملال ہوتا کہ ہم کھٹمنڈو میں تھے تو کسی نے اس جگہ کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا۔

ایک معصوم صورت نیپالی لڑکی نے قریب آکے سر خم کیا اور مسکرا کے کہا "ویلکم ٹو نیپال سر" اور مینو ہمارے سامنے رکھ دیا۔

اس کا خالص مشرقی لباس بھی متاثر کن تھا۔ اس نے ساڑی کے اوپر بڑی خوب صورت شال اوڑھ رکھی تھی اور بالوں کا جوڑا بنا کے ان میں پھول گوندھ رکھے تھے۔

مینو میں کھانوں کی اور مشروبات کی فہرست بہت طویل تھی اور بہت سے عام کھانوں کے ساتھ نیپال کی ہر خصوصی ڈش شامل تھی۔ بندے علی نے بہت اصرار کیا کہ ہم ڈنر کی دعوت قبول کرلیں

مگر ہم میں سے کوئی بھی سرِشام کھانے والا نہیں تھا اور ہم اس کو شرفِ میزبانی بخشنے نہیں آئے تھے بلکہ میں اس سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا تھا۔

میں نے کہا "بندے علی! تم نے چائے کا ذکر کیا تھا۔ بس وہی اسپیشل چائے چلے گی اور کچھ نہیں۔"

بندے علی نے مایوسی سے کہا "اچھا جی۔ آپ کی مرضی۔"

اس سے زیادہ مایوسی ویٹرس کو ہوئی مگر اس نے اپنی دلربا مسکراہٹ سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور سر جھکا کے چلی گئی۔

پھر میں نے کہا "بندے علی! تم نے کہا تھا کہ سکندر بخت خطرے میں ہے اور اسے فوراً نیپال سے نکل جانا چاہیے۔"

"میں نے تو سکندر کہا تھا، سکندر بخت نہیں۔ اور وہ خطرے میں ہے تو آپ کو کیا؟ آپ تو ڈاکٹر راجن ہو" وہ عیاری سے بولا۔

اب اعتراف کے سوا چارہ نہ تھا "فرض کرلو کہ میں اس کا دوست ہوں اور جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔"

"آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہے ہے کہ نہیں؟" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا "مگر آپ ڈرتے ہو کہ کسی کو معلوم ہوگیا تو وہ پکڑا جائے گا۔ اچھا جی مت بتاؤ مگر ہم تیار بیٹھے ہیں۔"

اس نے جیب میں سے خاکی رنگ کا سرکاری لفافہ برآمد کیا جس پر گول، سرخ رنگ کی "ٹاپ سیکریٹ" کی مہر تھی۔ اس پر بھارتی سفیر کا نام لکھا ہوا تھا اور یہ ہدایت درج تھی کہ اسے کوئی فوراً کھولے۔ اندر دوسرا لفافہ تھا جس پر کچھ تحریر نہیں تھا۔ اسے لاکھ پگھلا کے بند کیا گیا تھا۔ لفافے کے جوڑ پر اور درمیان میں لاکھ کو گرم کرکے پیتل کے ابھرے ہوئے حروف والی مہر لگائی گئی تھی کہ سیل توڑے بغیر کوئی بھی لفافے میں سے کچھ نہیں نکال سکتا تھا۔ انتہائی خفیہ اور اہم نوعیت کی سرکاری ڈاک کو بھیجنے کا طریقہ ہر جگہ مروج تھا۔

"اسے مت کھولنا" بندے علی نے ہاتھ بڑھایا۔

میں نے لفافہ اسے واپس کردیا "پھر دیا کیوں تھا مجھے؟"

غالب بولا "اس میں کیا ہے آخر؟"

بندے علی نے لفافے کو احتیاط سے ڈفل کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اور دوسری جیب سے ٹائپ کیا ہوا کاغذ نکال کے پکڑا دیا "یہ تھا اس میں۔ یہ اصل کی نقل ہے۔"

یہ بنگلہ دیش میں بھارتی ہائی کمان کی طرف سے نیپال کے سفیر کو جاری ہونے والا ایک مراسلہ تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ بدنام زمانہ دہشت گرد سکندر بخت اور اس کے ساتھی فوجی لباس میں ایک بھارتی فوجی ٹرک لے کر سرحد عبور کرگئے ہیں اور نیپال پہنچے ہیں۔ مراسلے میں ہمارے کارناموں کی تفصیل تو نہیں تھی مگر ان سب کے حلیے بیان کیے گئے تھے جو اہم اداروں کے پاس ریکارڈ تھے۔ نیپال کی حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ ان پر کڑی نظر رکھے اور انہیں فرار ہوکے پاکستان جانے سے روکے۔ اگر گرفتار ہوجائیں تو ان کو خصوصی حفاظتی انتظامات کے ساتھ واپس بھیج دیا جائے۔ مراسلے میں ہم سب کے نام تھے، وہ نام بھی جو ہم نے اختیار کر رکھے تھے۔ ہمارے پاسپورٹس کے نمبر تھے اور اس ٹرک کا نمبر تھا جس میں ہم ایک سرحدی چوکی پر گرفتاری کے بعد فرار ہوئے تھے۔ اس کے نیچے "ملٹری اپریشنل کمانڈر ناردرن سیکٹر تھری" لکھا ہوا تھا مگر اوپر کیپٹن جیدو کے دستخط تھے۔ ظاہر ہے کمانڈر وہ خود نہیں تھا۔ اس نے اپریشنل ہیڈکوارٹرز کو مطلع کیا اور ان کی ہدایات کے مطابق یہ مراسلہ بھیجا تھا۔ وہ ذہین اور حوصلہ مند افسر تھا جس نے بڑی ہوشیاری سے ہمیں بھی بچالیا اور اپنے آپ کو بھی۔

میں نے خط کے مضمون کو دوبارہ پڑھا اور پھر غالب کے حوالے کردیا۔ ویٹرس چائے کے برتن سجا گئی تھی اور تازہ چائے بنا رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب بندے علی سے کیا کہوں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا اور وہ جانتا تھا کہ میں کیوں جھوٹ بولنے پر مجبور ہوں چنانچہ اس نے میری مجبوری کو قبول کرتے ہوئے اسے مان لیا تھا۔

بندے علی نے کہا "اب آپ بتاؤ گے کہ سکندر بخت کون ہے؟"

میں نے کہا "بندے علی! میں ہی سکندر بخت ہوں۔ قصور نہ تمہاری نظر کا تھا نہ تمہارے کانوں نے غلط سنا تھا۔"

"آپ اچھی طرح سوچ لو جی۔ ہر ایک پر بھروسا کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ ہم تو مان لیں گے کہ آپ ڈاکٹر راجن ہو۔"

میں نے کہا "اب اور شرمندہ مت کرو۔ تم جانتے ہو یہ احتیاط ناگزیر تھی۔ ہماری جگہ تم ہوتے تو یہی کرتے۔ حالات ایسے ہیں کہ ہم دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کرسکتے اور کئی بار بھروسا کرکے مصیبت میں پڑ چکے ہیں۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "جاوید جی! مت اعتبار کرو بندے علی پر۔ ہم قسم کھائیں گے تب بھی کیا ہوگا۔ تم کہو گے کیا ثبوت ہے کہ یہ نقل مطابق اصل ہے۔"

غالب نے کہا "اصل کہاں ہے؟"

اس نے کوٹ پر ہاتھ رکھا "اس لفافے میں لیکن میں دوبارہ یہاں آپ کو لفافہ کھول کے نہیں دکھا سکتا۔"

"پہلی بار لفافہ کیسے کھولا تھا تم نے؟ اس پر تو ہر مہر سلامت ہے" غالب نے کہا۔

"ہیں جی اس کے بھی طریقے۔ لوگ تو جعلی نوٹ چھاپ لیتے ہیں اور کسی کو پتا نہیں چلتا۔"

میں نے کہا "گویا تم نے بھی ایک جعلی مہر بنوا رکھی ہے۔ آخر کیوں؟ تم ٹاپ سیکریٹ سرکاری ڈاک کیوں کھولتے ہو؟"

غالب نے کہا "ظاہر ہے یہ کوئی پہلی بار نہیں کیا تھا تم نے۔ لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لینا تو شاعرانہ بات ہے۔ عملاً یہ ناممکن ہے۔"

میں نے کہا "ہر سفارت خانے میں آنے والی سب ڈاک انتہائی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس میں حساس نوعیت کے راز ہوتے ہیں۔ یہ بہت سنگین نوعیت کی چوری ہے اور اس جرم کو غداری کی بدترین مثال سمجھا جاسکتا ہے۔"

اس نے اپنی صفائی میں کچھ بھی نہیں کہا اور سر جھکائے خاموشی سے چائے پیتا رہا۔

میں نے کہا "بندے علی! تم ایک معمولی چپراسی نہیں ہو۔ تم کسی کے ایجنٹ ہو۔ تم اپنے ملک کے خلاف جاسوسی کررہے ہو اور اس کا بھاری معاوضہ وصول کرتے ہو۔"

غالب نے کہا "کیا تمہیں احساس ہے کہ یہ کتنا خطرناک کام ہے؟ جاسوس کا دوست کوئی نہیں ہوتا۔ وہ پکڑا جائے تو نہ اسے اپنے معاف کرتے ہیں اور نہ وہ جن کے لیے وہ جاسوسی کرتا ہے۔"

اس نے چپاٹ لہجے میں کہا "چائے کیسی لگی آپ کو؟"

میں نے ایک گہری سانس لی اور چائے کا کپ خالی کردیا۔ بندے علی نے ہماری سب باتوں کو ایک کان سے سنا تھا اور دوسرے سے اڑا دیا تھا۔ اس کے نزدیک یہ سب بکواس تھی۔ وہ سب اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس کام کے تمام مضمرات سے واقف تھا۔ اسے کچھ سمجھانا یا لیکچر دینا بے سود تھا۔

غالب نے کہا "تمہیں یقین ہے کہ پہلے سے تمہاری نگرانی کوئی نہیں کررہا ہے اور کسی نے تم کو ہمارے ساتھ آتے نہیں دیکھا ہوگا....."

غالب کی بات نے مجھے چونکا دیا "ہاں بندے علی۔ عام طور پر یہ معاملات زیادہ دن پوشیدہ نہیں رہتے۔ تمہیں کیا معلوم کہ...."

"مجھے سب معلوم ہے" وہ میری بات کاٹ کے بولا "مجھے اتنا بے وقوف مت سمجھو کہ میں نے مدد کرکے تمہارے لیے مصیبت پیدا کردی ہوگی اور یہ نیکی تمہارے حق میں برائی بن جائے گی۔ تمہیں سکندر بخت، کم از کم تمہارے ساتھ یہ نہیں ہوگا۔ یہ تو مجھ سے تفتیش کرنے والے سرکاری ادارے بھی معلوم نہیں کرسکتے کہ میں کس ملک کے لیے کام کرتا ہوں اور کیوں۔ کیوں کا جواب تو جانتے ہیں سب۔"

میں نے افسوس سے کہا "کیا تم جانتے ہو کہ آج کل تفتیش کیسے کی جاتی ہے؟"

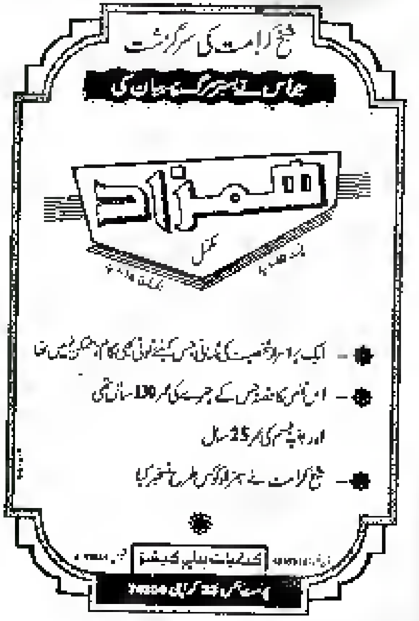

www.paksociety.com

اس نے انکار میں سرہلایا! "جانتا ہوں۔ مگر میری لاش سے بھی کچھ نہیں اگلوا سکتے وہ۔"

غالب نے نظر بچا کے مجھے آنکھ ماری "فرض کرو بندے علی! یہ بوگس اطلاع ہو۔ اصل اطلاع کسی اور ذریعے سے سفیر کو فراہم کر دی گئی ہو؟"

بندے علی نے کہا "اس میں کیا نقطہ ہے؟ مجھے بتاؤ۔"

میں نے جلدی سے کہا "کچھ نہیں۔ میں بہت شکر گزار ہوں تمہارا کہ تم نے اتنا بڑا خطرہ مول لے کر انہیں تلاش کیا اور یہ اطلاع بر وقت فراہم کر دی۔ اب بتاؤ اس کے بدلے میں ہم تمہارے لیے کیا کریں۔"

اس کا جو جواب تھا شکوک اور مایوسی کا مظہر تھا "ایک دم بھول اٹھا "بس سکندر میاں! تم سلامت رہو اور خیریت سے واپس پہنچ جاؤ تو ہمارے لیے بھی دعا کرنا۔ ہم بھارت میں ہیں تو کیا، دل تو پاکستان کے ساتھ ہے ہمارا۔"

"تمہارے جذبات واقعی قابل قدر ہیں" میں نے کہا۔

"تم نہیں جانتے آج دوسری بار تم سے مل کے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے اور میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں" وہ بولا "پہلی بار میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا حالانکہ اس وقت بھی میں سمجھتا تھا کہ جو کچھ تم پاکستان کی خاطر کر رہے ہو اس پر ہر مسلمان کو فخر ہونا چاہیے۔ تم نے جو کارنامے سرانجام دیے تھے اور جس طرح پاکستان کے دشمنوں کے دانت کھٹے کیے تھے وہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ہم تو۔۔۔"

میں نے کہا "چلو اب باقی باتیں رات کو کھانے کے بعد کریں گے۔"

"چائے تو ہم نے پی لی، تمہاری ڈنر کی دعوت بھی ہم قبول کرتے ہیں بندے علی۔ تم بھی کیا یاد رکھو گے کہ ہم قدر دانوں کے کیسے قدردان ہیں۔"

"اچھا۔ تو پھر میں یوں گیا گھر اور یوں آیا" اس نے چٹکی بجا کے مسرت کا اظہار کیا "اس فانی زندگی میں پھر نہ جانے کب ملیں۔ شاید کبھی نہ ملیں۔"

میں نے کہا "ہم اسی بازار میں ملیں گے۔ تھوڑی سی شاپنگ کرنی تھی۔"

"میں تلاش کر لوں گا تمہیں" وہ بولا۔

میں نے کہا "دیکھو اپنی بیوی کو کچھ مت بتانا۔ عورت کے کان میں بات گئی تو سمجھو کہ مائیکرو فون میں گئی اور لاؤڈ اسپیکر سے نشر ہوئی۔"

اس نے سرہلایا! "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ خود اپنے بارے میں بیوی کو راز دار بنایا ہوتا تو کب کا سولی چڑھ چکا ہوتا۔"

جب وہ بل ادا کر کے چلا گیا تو رابعہ نے خفگی کے اظہار میں پہل کی "گویا ہم بھی ناقابل اعتبار ہو گئے سب کے ساتھ۔"

"تمہارے کان مائیکرو فون ہیں" نازو نے کہا۔

"آخر کون سی بات نشر کی ہم نے؟"

"لیڈیز۔۔۔ لیڈیز۔۔۔" غالب نے سمجھانے کے انداز میں کہا "آپ کا احتجاج بے جا ہے۔ سکندر نے بیویوں کی بات کی تھی۔ یہ مقام شکر ہے کہ آپ لوگ ابھی تک اس منصب پر فائز نہیں ہوئیں۔"

میں نے کہا "سبحان اللہ۔ مرزا جی! کیا لاجواب کرنے والا جواب پیدا کیا ہے آپ نے۔ اب اٹھیے ورنہ بندے علی آ جائے گا اور اسی جگہ بحث میں الجھے رہیں گے۔"

غالب نے ریسٹورنٹ سے باہر آ کے کہا "بندے علی خطرناک ہو سکتا ہے۔ تم نے اسے جانے کیوں دیا؟"

"میں چاہتا تھا کہ وہ ہماری طرف سے مطمئن ہو جائے۔"

"اگر وہ لوٹ کر نہ آیا پھر؟"

"وہ ضرور آئے گا۔ چاہو تو شرط لگا لو۔"

ابھی ہم کپڑے خرید رہے تھے کہ بندے علی آ گیا اور اس نے رضاکارانہ طور پر کپڑوں کے انتخاب سے قیمت کے تعین تک تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ پھر کھانے کے لیے اس نے ہمیں ایک اور اچھے ریسٹورنٹ لے جانے کی پیشکش کی جو دور نہیں تھا۔ اتفاق سے وہی ہماری واپسی کا راستہ بھی تھا، پیدل روانہ ہوئے اس طرح کہ چند قدم آگے ہم تینوں مرد، بندے علی کو ہم نے بیچ میں رکھا تھا۔ ہم سے چند قدم پیچھے رابعہ، نازو تھیں۔ وہ بھی ہماری نیت کا اندازہ کر چکی تھیں۔

ایک جگہ بندے علی نے کہا "بس یہاں سے دائیں طرف۔۔۔"

میں نے کہا "دائیں طرف نہیں بندے علی۔ بائیں جانب"

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا "تمہیں نہیں معلوم۔۔۔"

میں نے سنجیدگی سے کہا "تمہیں بھی نہیں معلوم بندے علی! ہم تمہارے ساتھ نہیں جا رہے ہیں، تم کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ صورت حال کچھ بدل گئی ہے۔ اب تم مہمان ہو اور ہم میزبان ہیں۔"

وہ چوکنا تھا چنانچہ میرے لہجے سے کھٹک گیا "کیا بات ہے؟ کہاں لے جا رہے ہو تم مجھے؟"

میں نے کہا "آہستہ بات کرو اور خاموشی سے چلتے رہو۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔"

"اور اس چیز کو بھی" غالب نے جیب سے ریوالور نکال کر اسے دکھایا اور پھر جیب میں رکھ لیا۔

"یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟" اس نے چلانا شروع کیا۔

میں نے ایک دم اس کا منہ دبایا اور پھر اس کی کنپٹی پر ضرب ماری۔ وہ ایک جھٹکا لے کر تڑپا اور پھر کٹے ہوئے درخت کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

اس نٹ پاتھ پر آگے پیچھے جانے والے رک گئے۔ انہوں نے بندے علی کے چلانے کی آواز سنی تھی مگر کچھ سمجھ نہیں پائے تھے۔ درمیانی فاصلہ اتنا تھا کہ کسی نے چند سیکنڈ میں عمل ہو جانے والی واردات کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ بندے علی کو فٹ پاتھ پر پڑا دیکھ کر وہ ایک ساتھ بولنے لگے "کیا ہوا؟ کیسے گر گیا؟"

"یہ زندہ ہے کہ مر گیا؟"

ایک خاتون نے اپنے متجسس شوہر کو کھینچ لیا "چلو جی، کیوں بلا وجہ مصیبت میں پڑتے ہو۔"

میں نے جھک کر بیٹھتے ہوئے کہا "کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ بیچارے کو دل کا دورہ ہے۔"

"اور یہ پریشانی کی بات نہیں ہے!" ایک بزرگ نے مجھے ڈانٹا۔

"پلیز! آپ میں سے کوئی کچھ کر سکتا ہے تو کرے" میں نے کہا "ہم اسے گھر لے جانا چاہتے ہیں۔"

"گھر کیوں؟ اسپتال لے جانا مناسب تھا۔"

غالب نے کہا "کیسے لے جائیں، کندھے پر ڈال کے۔ ارے بھائی! تم کسی گاڑی کو روکو۔"

ایک گاڑی فوراً رک گئی۔ کار والا رائے عامہ کے سامنے بے بس ہو گیا۔ میں نے اور غالب نے بندے علی کو گاڑی میں ڈالا اور اس سے پہلے کہ پبلک میں سے کوئی ہمارے ساتھ چلتا، ہم سب گاڑی میں گھس گئے۔

گاڑی والے نے شور مچایا "ارے بھائی! یہ کار ہے، بس نہیں کہ سب لد گئے۔ کیا میں اتر جاؤں؟"

غالب نے کہا "نہیں، ہم اتر جاتے ہیں۔ خفا کیوں ہوتے ہو؟"

رابعہ اور غالب نے رضاکارانہ طور پر پیدل مارچ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب گاڑی کی اگلی سیٹ پر نازو تھی اور پیچھے میں اپنے بیمار کے ساتھ۔ جب گاڑی روانہ ہوئی تو غالب لوگوں کو مطمئن کر رہا تھا کہ معمولی سا دورہ تھا اور ایسے دورے تو انہیں پڑتے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بعد میں اس نے بندے علی کو اپنا سالا بھی ثابت کر دیا ہو گا۔ خود میں نے کار ڈرائیور سے یہی کہا تھا۔ میرے ساتھ نازو تھی اور غالب کے ساتھ رابعہ چنانچہ بات بن گئی۔ کار والے نے ہمیں رام ناتھ کے گھر میں اتارا اور ایسے فرار ہوا جیسے وہ گھر نہیں تھانہ تھا۔

گاڑی کی آواز پر رام ناتھ باہر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا میں نے اسے انگلی کے اشارے سے خاموش کر دیا۔

"ایک اور شکار کر لائے" وہ گاڑی کے جاتے ہی بولا "یہ کیا چکر ہے؟"

میں نے کہا "یہ بندے علی ہے۔ اسے بھی وہیں بند کریں گے۔"

"وہ تو مر گیا جسے پہلے بند کر کے گئے تھے" رام ناتھ نے بدمزگی سے کہا۔

میں بندے علی کو گھسیٹ کر اندر لے گیا اور قالین پر ڈال دیا۔ "کیا اس نے خودکشی کر لی؟ اچھا کیا۔ ہمارا کام آسان کر دیا۔"

نازو نے کہا "خودکشی کیسے کر لی؟"

"اس نے باتھ روم کے بجلی کے تار اکھاڑ لیے۔ چھت سے سوئچ بورڈ تک چھ سات گز تار تھا۔"

"اور اس تار سے خود کو پھانسی دے دی؟"

"نہیں۔ اس نے تو عجیب مشکل کام کیا۔ میں تو دیکھ کے حیران رہ گیا۔ اس نے تار بڑی صفائی سے اکھاڑے۔ ایک تار اپنی ٹانگ پر مضبوطی سے باندھا، دوسرا گلے میں۔ اس نے تار کو ایک ایک فٹ تک ننگا کر لیا تھا۔ باتھ روم میں لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ کے اس نے دانتوں سے تاروں کو چھیلا ہو گا۔ ٹانگ کے تار کو اس نے ٹخنے کے اوپر اچھی طرح لپیٹ لیا تھا اور گردن کے گرد بھی۔ پھر اس نے ہاتھ سے سوئچ آن کر دیا۔"

میں نے کہا "واقعی کمال! اس نے خود کو کرنٹ سے ہلاک کیا؟"

"ہاں۔ اس کی بھیانک چیخ سن کے میں تو اچھل پڑا اور ایک دم باتھ روم کی طرف لپکا۔"

"تم اس وقت نیچے تھے؟" نازو بولی۔

"ہاں۔ میں ایک کام سے گیا تھا" وہ بولا "میں نے دروازہ کھول کے دیکھا تو وہ کانپ رہا تھا اور اینٹھ رہا تھا۔ یہ چند سیکنڈ کی بات ہے۔ پھر وہ مر گیا۔ ہاتھوں پیروں کے جھٹکوں سے تار ٹوٹ گئے مگر کھلے نہیں۔ بجلی کا تو ایک ہی جھٹکا کافی ہوتا ہے۔ اس کے جسم کو آزاد ہونے میں دس پندرہ سیکنڈ تو لگے ہوں گے۔ شاید زیادہ وقت لگا ہو۔"

میں نے نازو کے ہاتھ پر تھپکی دی جو خوف زدہ ہو کے مجھ سے لگی کھڑی تھی "میں دیکھ کے آتا ہوں۔"

"اب دیکھ کے کیا کرو گے؟" نازو نے مجھے روک لیا "پہلے اس کا کچھ کرو۔ یہ ہوش میں آ رہا ہے۔"

رابعہ اور غالب کے آنے تک بندے علی اٹھ بیٹھا اور عجیب پُر وحشت نظروں سے ہم سب کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن ایک سوال بن گئی تھی کہ آخر یہ کیا ہے؟ یہ کیسی دوستی ہے اور کیسی احسان مندی ہے؟ میں نے تو بھلائی کی تھی تمہارے ساتھ۔ پھر میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں؟

میں نے کہا "بندے علی! اصل خط نکالو۔"

بندے علی کا چہرہ زرد پڑ گیا "وہ۔۔۔ بالکل وہی ہے۔ نقل خود میں نے تیار کی تھی۔ ذرا بھی فرق نہیں دونوں میں۔"

میں نے کہا "ہم تصدیق کریں گے۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "ایسا مت کرو۔ میری نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "بندے علی! تم نوکری کی کیا بات کرتے ہو۔ تم نے تو اپنی زندگی کو خطرات کے جہنم میں جھونک دیا تھا۔ جو کچھ تم کرتے رہے تھے وہ کوئی اچھا کام نہیں تھا۔ اس کا انجام ایک دن یہی ہونا تھا۔"

وہ چلایا "سکندر! میں نے تو تمہیں بچایا! تمہاری مدد کی۔"

میں نے کہا "تم نے غداری کی اپنے وطن سے، اپنے مذہب سے اور اپنے ضمیر سے۔"

وہ پھر چلایا "مگر میں بھی مسلمان ہوں تمہاری طرح۔ دل سے پاکستانی ہوں۔"

میں نے انکار میں سر ہلایا "یہی تو غلطی ہے تمہاری۔ مسلمان دنیا کے ہر ملک میں ہیں مگر وہ جہاں بھی ہیں اس ملک کے شہری ہیں اور ان پر لازم ہے کہ وہ اسی ملک کے قانون کے پابند رہیں۔ عہد شکنی اور اعتماد کو دھوکا دینا کسی مذہب کی تعلیم نہیں۔ ظاہر کو باطن سے الگ رکھنا منافقت ہے اور تمہارا مسئلہ صرف اخلاقی یا مذہبی نہیں۔ قانونی طور پر یہ ایک سنگین جرم تھا۔ نہ ہم اس جرم کی پردہ پوشی کر سکتے ہیں اور نہ تمہارے جرم میں شریک ہو سکتے ہیں۔"

غالب نے کہا "اگر تم جاسوسی کے الزام میں پکڑے جاتے تو کیا سزا ہوتی تمہارے جرم کی؟"

وہ چیخنے لگا "مجھے مت ڈراؤ۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

میں نے کہا "تم تسلیم کرتے ہو کہ دل سے تم پاکستان کے ساتھ ہو؟"

"ہاں۔ ہاں۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"تو پھر سمجھ لو کہ تم نے پاکستان کی خاطر جان دی۔ ابھی تک تمہارے جرم کا راز فاش نہیں ہوا۔ تم عزت آبرو کے ساتھ جان دے سکتے ہو۔ بعد میں پکڑے جاتے تو کتنی رسوائی ہوتی تمہاری؟ بھارت کے دوسرے مسلمانوں کی وفاداری پر بھی حرف آتا۔ اس کے علاوہ تمہاری جائیداد ضبط ہو جاتی۔ جو پیسہ تم نے جاسوسی کر کے کمایا وہ بھی جاتا۔ اب کم سے کم بیوی بچوں کا مستقبل تو محفوظ ہے۔ تم نے ادائے فرض میں جان دی۔ ان کو فیملی پنشن بھی ملے گی۔"

خوف اور صدمے نے اسے مفلوج کر دیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی نیکی ہی اس کا جرم بن جائے گی۔ پھر اچانک جیسے اس نے حقیقت کو جان لیا اور پہچان لیا اور تسلیم کر لیا۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ مطمئن اور پرسکون تھا۔

اس نے جیب میں سے لفافہ نکال کے مجھے تھمایا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں غیروں کے ہاتھوں ذلت کی موت کیوں قبول کروں۔ جب کہ میں آج کفارہ ادا کر سکتا ہوں اور اس اطمینان کے ساتھ مر سکتا ہوں کہ میں نے سکندر بخت کی جان بچانے کے لیے اپنی جان دی۔"

میں نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا "مجھے بہت افسوس ہوگا۔ میں تمہارا شکر گزار ضرور ہوں لیکن تم نے خود رابطہ کر کے ہم سب کی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔"

رابعہ چلائی "سکندر۔۔۔ چھوڑ دو۔ جانے دو اسے۔"

غالب نے کہا "بے وقوفی کی بات مت کرو۔ اس کے ساتھ نہ جانے کس کس نے ہمیں دیکھا ہوگا۔ اور یہ مت بھولو کہ بندے علی بھارتی سفیر کا چپراسی ہے۔"

بندے علی کی ذہنی رو ایک دم پلٹ گئی۔ شاید اس کی اداکاری کا بھرم کھل گیا۔ وہ ایک دم بھاگا۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ جب وہ انور کے پاس سے گزرا تو ایک دم اس کا ہاتھ اوپر اٹھا اور پھر بڑے بھرپور انداز میں بندے علی کی گردن پر لگا۔ بندے علی بند دروازے سے ٹکرا کے گرا۔ کچھ دیر وہیں موت کے کرب میں الٹ پلٹ کے بالآخر وہ ساکت ہو گیا۔

یہ ایک ناخوشگوار مگر ناگزیر تجربہ تھا جس نے وقتی طور پر ہم سب کو ذہنی صدمے سے دوچار کیا۔ پھر میں نے اصل لفافے کو پھاڑ کے وہ خط نکالا جس کی نقل بندے علی نے فراہم کی تھی۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ نقل اور اصل میں ایک لفظ کا بھی فرق نہیں تھا۔ میں نے جیب سے لائٹر نکالا اور دونوں خطوط کو جلا کے راکھ ایش ٹرے میں مسل دی۔

رام ناتھ نے کہا "ٹھیک نہ ہوا شدھ۔ تم نے تو مجھے مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ اب کیا کرو گے ان لاشوں کا؟"

میں نے کہا "جیسے ایک کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں دوسرے کو بھی لگا دیں گے۔ افسوس دونوں کی موت کا رہے گا۔ پہلا آدمی بغیر جگہ بتائے مر گیا جہاں اس نے میرے دو ہم وطنوں کی بے سر لاشوں کو جنگل کے درندوں کی ضیافت کے لیے پھینکا تھا۔ میں اسے بھی وہیں پھینکنا چاہتا تھا۔ دوسرا بہرحال ہمارا محسن تھا۔ ہم محسن کش نہیں ہیں مگر ہم اسے معاف کر دیتے تو ہمارا یہ فعل خودکشی کے مترادف ہوتا۔ خودکشی ہمارے نزدیک حرام موت ہے جو ہم قبول نہیں کر سکتے تھے۔"

رام ناتھ نے ہاتھ جوڑ کے کہا "میری سمجھ میں تمہاری باتیں نہ آئی ہیں نہ آئیں گی۔ تم تو بس اتنی کرپا کرو کہ ان مُردوں سے میری جان چھڑا دو۔ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔ بھگوان نے بھی میرا ہی گھر دیکھ لیا ہے۔"

میں نے کہا "رام ناتھ! ہم بس آج کل کے مہمان ہیں۔"

"مجھے تو لگتا ہے ایک رات کا مہمان بھی نہیں ہوں میں۔ میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔" رام ناتھ بولا اور ماتھے سے پسینہ صاف کرتا ہوا اندر چلا گیا۔

"اتنی سردی میں پسینہ۔ اسے تو سچ مچ ہارٹ اٹیک ہو رہا ہے۔" غالب نے کہا۔

"اس کی جگہ لاہور میں خود کو فرض کرو۔ کوئی مفرور قاتل اور

مجرم تمہارے گھر میں بن بلائے مہمان چھوڑ جاتے اور وہ مہمان بلائے جان بن جائیں۔ وہ بندے تمہارے گھر میں مار کے ڈال دیں تو کیا تم کو ہارٹ اٹیک نہیں ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ہمیں اب جلدی سے انہیں ٹھکانے لگا دو۔" انور نے گھبراہٹ میں کہا "زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔"

"رام ناتھ کے کمرے کا فرش کھود کے گاڑ دیں؟" غالب بولا۔

"وہ اتنا پریشان ہے، کہیں پولیس کو نہ بلا لے۔" رابعہ نے کہا۔

"اچھا تو تم دونوں کیوں فضول مشوروں سے نواز کے ہمیں پریشان کر رہی ہو۔ جا کے رام ناتھ کو سنبھالو، اس کا دل بہلاؤ۔"

"سنبھالنے کا مطلب ہے اس پر نظر رکھو۔" غالب بولا۔

"تم بھی نظر رکھو کہ بری نظر؟" نازو نے کہا۔

رابعہ بولی "اور دل کس حد تک بہلائیں، یہ بھی بتا دو۔"

"جتنا ہے شوقین مزاج۔" انور ہنسی۔

غالب نے چٹکی بجائی "سنو! اس نے ہمیں گاڑی پیش کی تھی بازار جانے کے لیے۔ لاشیں ڈھونے کے لیے نہیں دے گا۔ تم دونوں چشم بددور اس سے سب کچھ منوا سکتی ہو۔"

نازو نے کہا "وہ گرگ باراں دیدہ ہے۔ اسے الو نہیں بنایا جا سکتا۔"

"ارے ہمیں کیسے بنا لیا تھا۔ وہ بھی مرد ہے آخر اور مرد کا دل سدا جوان رہتا ہے۔ حسین عورت کی مسکراہٹ اور آنسو دونوں سے پگھل جاتا ہے۔" غالب نے کسی فلسفی کی طرح ارشاد فرمایا۔

اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ انور کچھ دیر بعد نمودار ہوئی جب ہم پچھواڑے نہ خانے کے باتھ روم سے ایک اکڑی ہوئی بھیانک لاش کو اٹھا کے بندے علی کے ساتھ ڈال چکے تھے۔

غالب نے کہا "ذرا ادھر آؤ۔ یہ نشان کیسا ہے تمہارے گال پر؟"

انور نے سادگی سے کہا "شاید مچھر نے کاٹا تھا۔"

غالب نے کہا "یہاں اتنی سردی میں مچھر! جھوٹ مت بولو۔"

"تو پھر ہوگا کوئی جانور۔"

"کیسا جانور؟ جوان کہ بوڑھا؟ چوپایہ کہ دو ٹانگوں والا؟"

"میں بتاتی ہوں تمہیں۔" نازو نے دانت پیس کے کہا مگر میں نے بیچ میں آ کے معاملہ وہیں ختم کر دیا۔

"اس موضوع پر بعد میں لڑ لینا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ کل شام چار بجے کے بعد ملتے ہیں۔ کیوں انور؟"

"ٹھیک چار بجے، بھولنا مت۔" انور جاتے جاتے بولی۔

میں اور غالب لاشوں کو ڈکی میں ٹھونس کر نکلے۔ راستوں کا نہ مجھے علم تھا نہ غالب کو۔ اس وقت کسی سے یہ پوچھنا بھی غلط ہوتا کہ کسی ویرانے کا پتا بتاؤ جہاں ہم دو لاشوں کو پھینک آئیں اور کوئی نہ دیکھے۔ میں اندازے سے ایک ہی سمت میں چلتا رہا۔

غالب نے ایک بار کہا "خیال رکھنا کوئی سرحد نہ عبور کر جائیں۔"

میں نے کہا "ادھر کون سی سرحد ہوگی؟"

"مجھے کیا معلوم ہم مشرق کی طرف جا رہے ہیں یا مغرب کی طرف۔ چین، تبت، بھارت یا بنگلہ دیش نہ پہنچ جائیں اچانک۔" غالب بولا "اور یہ آپ جا کس طرف رہے ہیں آخر؟ واپسی کا راستہ یاد رکھیے گا۔"

میں نے کہا "دلی روڈ کسی سے پوچھ لیں گے۔"

پندرہ بیس منٹ بعد ہم ایک پہاڑ کے گرد گھوم کے جانے والی سڑک پر تھے جب میرے کانوں نے کوئی آواز سنی۔

میں نے کہا "یہ کیا تھا؟"

غالب نے کہا "کوئی بھوت دیکھا ہے کیا؟ میرے سسر ہوں گے۔"

"ارے اس کی قسمیں تمہارے سسر کی۔ یہ آواز کیسی تھی؟"

غالب نے کہا "میرے سسر نے کچھ فرمایا ہوگا۔"

میں نے گاڑی روک کے پیچھے دیکھا "مرزا جی! ڈکی کھل گئی ہے۔"

غالب نیچے اتر کے پیچھے گیا اور بوکھلایا ہوا واپس آیا "یار سکندر! غضب ہو گیا۔ ایک مردہ بھاگ گیا۔"

میں نے کہا "کیا بکتے ہو!"

"خدا کی قسم۔ تم خود دیکھ لو۔ ڈکی میں صرف بندے علی ہے۔"

میں نے غالب کی سنجیدگی پر غور کرتے ہوئے پیچھے جا کے دیکھا۔ اس میں واقعی صرف بندے علی پڑا ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے لاش پیچھے گر گئی۔" میں نے کہا۔

"کیسے گر گئی؟ خود بخود؟"

"ڈکی کا لاک ٹھیک سے بند نہیں ہوا تھا یا ڈھیلا ہوگا۔ ہم نے دو لاشوں کو زبردستی ٹھونسا تھا۔ جب موڑ کاٹا تو لاک کھلنے سے ایک لاش ابھر کے باہر جا پڑی۔"

"واپسی میں وہ ہمیں بیچ سڑک پر راستہ روکے نظر آئے گا۔" غالب نے کہا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا "بھاگ چلو مرزا جی۔ اگر پیچھے سے کوئی گاڑی آ گئی تو ہم ہی پکڑے جائیں گے کہ لاش ہم نے نہیں پھینکی تھی تو سڑک پر لاش دیکھ کے رکے کیوں نہیں اور لاش کے اوپر سے کیا کار نے اپنی جمپ لگائی تھی۔"

وہاں سے دو کلومیٹر آگے آنے کے بعد غالب نے کہا "بس استاد جی، بریک لگاؤ۔ یہ جگہ ٹھیک ہے اپنے بندے علی کے لیے۔"

یہاں چاروں طرف بلند پہاڑ تھے جن کی برف پوش سفیدی بھی رات کے اندھیرے کا حصہ بن گئی تھی۔ سائیں سائیں کرتے درختوں کا شور وادی میں ایک ہولناک گونج پیدا کر رہا تھا۔ رات کے ساڑھے دس بجے اس ویران سڑک پر ہمارے سوا کوئی نہ تھا۔ دو زندہ انسان اور ایک وہ شخص جو صراط مستقیم سے بھٹکا اور

www.paksociety.com

کرتے ہوئے مارا گیا۔ معلوم نہیں آگے یہ سڑک کہاں تک جاتی تھی؟ ابھی تک تو ہمیں نہ کوئی آنے والی گاڑی ملی تھی اور نہ جانے والی۔ اس علاقے میں گاڑیاں ہوں بھی تو کم تھیں اور خطرناک پہاڑی راستوں پر کوئی رات کو مجبوراً ہی نکلتا ہو گا۔

اچانک برف پڑنے لگی۔ برف کے ہلکے ہلکے گالے ہر طرف اترنے لگے۔ اس صورت حال نے ہمیں اور زیادہ پریشان کر دیا۔ برف باری میں دیکھتے دیکھتے شدت آ گئی۔ میں نے اور غالب نے بندے علی کی لاش سڑک کے ایک کنارے پر رکھی اور گاڑی میں بیٹھ کے انجن اسٹارٹ کر دیا۔

واپسی کا مرحلہ زیادہ کٹھن ثابت ہوا۔ سڑک پر برف نے پھسلن پیدا کر دی تھی۔ ونڈ اسکرین کے سامنے برف کے گالے دھند پیدا کرتے تھے اور اس دھند میں ہیڈلائٹس کا اجالا بھی ناکافی محسوس ہوتا تھا۔ میں انتہائی محتاط انداز میں اسٹیئرنگ کو کنٹرول کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری معمولی سی کوتاہی کے نتیجے میں گاڑی پھسل کے سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں پہنچ جائے گی۔ صبح نہ ہماری لاشوں کا سراغ ملے گا اور نہ بندے علی کی لاش کا۔ جب دھوپ سے برف کا کفن اترے گا تو بندے علی کی لاش نظر آ جائے گی مگر ہم تو یوم حشر سے پہلے رابعہ اور نازو کو نہیں بتا سکیں گے کہ اس رات کیا ہوا تھا۔

برف کی چادر کے نیچے سڑک غائب ہو گئی تھی اور کنارا نظر نہ آتا تھا۔ میں انتہائی بائیں جانب پہاڑ سے لگ کے چلتا رہا۔ کہیں گاڑی اچانک کسی پتھر پر چڑھ جاتی تھی یا باہر نکلی ہوئی چٹان کو چھو لیتی تھی تو اسے سنبھالنا مزید مشکل ہو جاتا تھا۔ باہر ہوا رک گئی تھی اور سردی کا اثر بھی کم ہو گیا تھا مگر بند شیشوں سے برف کے گالوں کو دیکھ کر جسم پر کپکپی طاری ہوتی تھی۔ یہ خوف مجھے ماحول کا عطا کردہ تھا اور یہ ہمارے احساس کی پیداوار تھا۔ غالب کی نظر بھی سڑک پر تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اس کی نگاہیں کیا تلاش کر رہی ہیں۔

جب ہم پھر شہر کے قریب پہنچے تو غالب نے کہا "یار وہ لاش تو کہیں نظر نہیں آئی۔ کیا کسی نے اٹھا لی؟"

"وہ بڑا تعاون کرنے والا فرد تھا" میں نے کہا "خود ہی فوت بھی ہو گیا تھا، ہمیں تکلیف نہیں دی۔ خود ہی باہر گر گیا۔"

"ڈر کے کہاں گیا؟ کیا بھوت بن کے جنگل میں غائب ہو گیا؟"

"میرا خیال ہے کہ لاش جب باہر گری تو گاڑی حرکت میں تھی اور نیوٹن کے قوانین حرکت کے مطابق لاش گر کے بھی حرکت میں رہی۔ نتیجہ۔ کہ کنارے سے نیچے لڑھک گئی۔"

"ثابت کرو کہ ایسا ہی ہوا تھا۔"

"تم ثابت کرو کہ ایسا نہیں ہوا تھا" میں نے کہا۔

"پھر تو ایک مفروضہ میں بھی پیش کر سکتا ہوں۔ ہوا یہ ہو گا برادر بزرگ۔ کہ اس ویرانے میں کہیں کوئی بھوتوں کا ڈیرا تھا جہاں سے ہم بے خوف و خطر گزر آئے۔ وہاں کسی بھوت نے مردوں کو ورغلایا کہ وہ ان کی قوم میں شامل ہو جائیں۔ ایک مردہ تو کم ہو گیا ایک نہیں ہوا۔ جسے یہ تجویز پسند آئی تھی وہ فی الفور بھوت بن کے غائب ہو گیا۔"

"بھوت؟" میں نے ہنس کے کہا۔

"یار تو مسلم ہوتا ہے کہ نہیں۔ تو ذرا شبہ بھی ہوتا ہے۔ پھر تو بھوت کیوں نہیں ہو سکتا۔ جو نیا نیا بھوت بنا ہو" غالب نے کہا۔

"یہ تو کمال ہو گیا" میں نے کہا "میں راستہ یاد رکھنے میں کامیاب رہا۔ جواب نہیں میری قوت مشاہدہ کا اور یادداشت کا۔"

"دراصل میری چھٹی حس تمہاری راہنمائی کر رہی تھی" غالب بولا۔

"افسوس اور شرم کی بات ہے کہ اس نے خود تمہیں بھی گمراہ کیا" میں نے کہا۔

برف باری اس وقت عروج پر تھی جب ہم نے گاڑی کو ویران کوٹھی میں کھڑا کیا۔ اس کے بند دروازوں اور کھڑکیوں کے پیچھے اندھیرا محسوس ہوتا تھا مگر گاڑی کا دروازہ بند ہوا تو ایک کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا ہٹ گیا اور مجھے دھندلے شیشوں کے پیچھے انسانی سایہ نظر آیا۔ غالباً رابعہ اور نازو میں سے کوئی تھا۔

رام ناتھ نے اپنی پریشانی میں ان کو زیادہ پریشان کیا تھا۔ اسے اپنی عقل اور جذباتی طبیعت پر غصہ آ رہا تھا کہ نتائج کی پروا کئے بغیر اس نے لڑکیوں کی بات مان لی اور گاڑی ہمارے حوالے کر دی۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ ہمارے خیر و عافیت کے ساتھ لوٹ آنے کی امید رکھنا بھی یہ خیال است و محال است و جنوں۔ اس نے برف باری میں انتقال پر ملال کے سارے مناظر بڑی تفصیل سے بیان کیے تھے اور اپنی یاس آمیز بے بسی میں رابعہ اور نازو کو بھی مشورہ دے چکا تھا کہ ہماری مغفرت کے لیے کوئی دعا پڑھ کے رکھیں۔ ہماری سلامتی کے ساتھ واپسی کے امکانات تو معدوم ہو چکے۔

ایسے میں ہماری تشریف آوری نے سب کو خوشی اور طمانیت عطا کی۔ رابعہ اور نازو کے اترے ہوئے چہرے کھل اٹھے۔

رام ناتھ نے کہا "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ کوئی بچے تو نہیں ہیں۔"

نازو نے اسے خون آشام نظروں سے گھورا "رام ناتھ جی! میرا منہ مت کھلوایئے۔ آپ نے تو انہیں پہنچا دیا تھا دوسرے جہان میں۔"

"خواہ مخواہ ہمیں دہشت زدہ کر رہے تھے کہ اب وہ لوٹ کر نہیں آنے والے، ان پر فاتحہ پڑھ لیں" رابعہ نے بھی کہا۔

"وہ... دراصل پریشانی میں فضول خیالات پریشان تو کرتے ہی ہیں۔ خیر تم بتاؤ سب ٹھیک ہو گیا نا؟"

میں نے رونی شکل بنا کے کہا "سب چوپٹ ہو گیا رام ناتھ۔" غالب بھی دھڑام سے کرسی پر گر گیا "جلدی میں کام خراب

کر دیا۔"

رام ناتھ نے سینے پر ہاتھ رکھا "میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ جلدی سے بتاؤ کیا گڑبڑ کر دی ہے؟"

"ہم نے کچھ نہیں کیا۔ بس قسمت ہی خراب تھی" میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا "ہمیں رستہ نہ جانے کہاں سے پولیس نمودار ہو گئی۔"

"پولیس!" رام ناتھ کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔

"ہم اصلی پولیس۔ ایک جیپ میں آ گئی" غالب نے تقریباً روتے کہا "ہمیں ایک لاش پھینکنا تھا سڑک پر۔"

"سڑک پر؟" وہ اچھلا "تم سڑک پر لاش پھینک رہے تھے؟ تمہارا دماغ خراب ہے!"

"جی ہم نے سوچا دور کیوں جائیں۔ سڑک خالی پڑی تھی۔ وہ ٹیڑھے پولیس والے تو جیسے آسمان سے ٹپک پڑے۔ میں جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا اور ہم بھاگے لیکن وہ بھوت کی طرح پیچھے لگ گئے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "مگر ہم بھی چھلاوہ ثابت ہوئے۔ ایسا چکر دیا انہیں کہ وہ نہ جانے کہاں رہ گئے۔ خوب ریس ہوئی۔"

رام ناتھ کی آنکھیں حلقوں سے باہر آنے لگیں "نمبر تو دیکھ ہی لیا ہو گا انہوں نے میری گاڑی کا۔"

میں نے مجرم نظروں سے غالب کی طرف دیکھ کے سر ہلایا "شاید دیکھ لیا ہو۔ کئی بار وہ قریب آ گئے تو ہم ایک دم مڑ گئے یا ان کو سائیڈ دے کر نکل گئے۔"

غالب نے احمقوں کی طرح کہا "خوب ہڑبونگ ہوئی۔"

رام ناتھ جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا "ہے رام۔ تم نے گولیاں چلائیں پولیس پر؟"

"اور کیا کرتے ہم؟ وہ بھی کوئی پھول نہیں پھینک رہے تھے ہماری طرف" میں نے کہا "بلکہ سچ تو یہ ہے کہ پہلا فائر ان کی طرف سے ہوا تھا۔ ہم کیا جواب نہ دیتے؟"

رام ناتھ کی آواز بند ہو گئی۔ رابعہ اور نازو سمجھ چکی تھیں کہ ہم اداکاری کر رہے ہیں اور یہ سب جھوٹ ہے مگر وہ ہمارا ساتھ دے رہی تھیں۔ رام ناتھ نے بھی ان کو کم دہشت زدہ نہیں کیا تھا۔

"ارے... کوئی... قتل تو نہیں کر دیا؟" رام ناتھ نے بڑی مشکل سے حلق میں پھنس جانے والی آواز نکالی۔

"ایک... بچ تو نہیں گئی... اب پتا نہیں..."

"دراصل ہم کو فکر تھی دوسری لاش کی۔ اسے ٹھکانے لگانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا" غالب بولا۔

رابعہ نے کہا "کیا... تم اسے واپس لے آئے؟"

"اور کیا پولیس کو دے آتے تحفے میں؟"

"اب کہاں ہے لاش؟" نازو نے تشویش سے پوچھا۔

"وہیں رکھی ہے ڈکی میں" غالب بولا۔

رام ناتھ ایک دم باہر دوڑا "لاش میری گاڑی میں، پاگل ہو۔ مجھے پھانسی لگواؤ گے۔ میں ابھی بلاتا ہوں پولیس کو۔"

اس کے جاتے ہی میں نے اور غالب نے ہنسنا شروع کیا تو رام ناتھ کے واپس آنے تک ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ اس کی حالت واپسی پر زیادہ غیر ہو چکی تھی کیونکہ ڈکی میں اسے کوئی لاش نہیں ملی تھی۔ اس نے ہمیں ہنستا دیکھا تو بگڑ گیا۔

"یہ مذاق کر رہے تھے تم۔ میرے ساتھ... تمہیں اندازہ ہے کہ میں دل کا مریض ہوں۔ میرا ہارٹ فیل ہو جاتا تو؟"

نازو نے کہا "حساب برابر ہو گیا رام ناتھ جی۔ تم نے بھی بہت ڈرایا تھا ہمیں۔"

رام ناتھ کرسی پر بیٹھ کے پسینہ صاف کرنے لگا "ایسا نہیں کرنا چاہیے کسی بوڑھے بیمار شخص کے ساتھ۔ یہ بہت جان لیوا مذاق تھا۔"

میں نے اور غالب نے معافی مانگ کے اسے بڑی مشکل سے منایا۔ کلیم اب ٹھیک تھا اور کھانا کھا کے سو گیا تھا۔ ہماری عدم موجودگی میں کاجل نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ ہم تو صرف گرم کپڑے لینے گئے تھے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ باہر تقدیر کیا گل کھلانے والی ہے۔

رام ناتھ بھی کھانا کھا کے سو گیا تو ایک کمرے میں ہم سب نے قالین پر بستر بچھائے۔ رابعہ اور نازو چائے بنانے چلی گئیں تو کاجل نے کہا "میں اوپر سونے جا رہی ہوں۔ کلیم کے ساتھ۔"

میں نے کہا "چلی جانا، ابھی بیٹھو۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

وہ بیٹھ گئی۔ کمرے میں گیس ہیٹر چل رہا تھا اور باہر برف گر رہی تھی۔ کھڑکیوں کے بھاری پردوں اور شیشوں کے پیچھے ہمالہ کی سرد ترین رات میں درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے کافی نیچے تھا مگر کمرے میں بڑی راحت بخش اور آسودگی دینے والی حرارت تھی۔

میں نے کہا "کاجل! تم اور کلیم ہوائی جہاز سے نکل جاؤ۔ دو ٹکٹ ہیں ہمارے پاس۔"

کاجل نے انکار کر دیا۔ "مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم نے جھوٹ بولا تھا اس کے بارے میں کہ وہ چلا گیا۔ وہ نیچے نہ تھا۔"

"اب اس سے کیا ڈرنا۔ وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہمارا۔ تم کراچی پہنچ کے ہماری واپسی کا انتظار کرو" میں نے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ تم میں سے کوئی جائے۔ رابعہ اور نازو کو بھیج دو۔"

"کاجل! وہ نہیں جائیں گی" میں نے کہا۔

"پھر میں کیوں جاؤں؟"

"اس لیے کہ تمہارے ساتھ کلیم ہے۔ وہ ایک امانت ہے

www.paksociety.com

جس کا خمیازہ کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچنا ضروری ہے اور یہ ذمے داری ہم سب کی ہے لیکن وہ تمہارے علاوہ کسی کے ساتھ نہیں جائے گا، یہ تمہیں بھی معلوم ہے۔"

رابعہ ایک ہاتھ میں ٹرے اٹھائے اندر آئی۔ اس کے پیچھے نازو نے ٹرے میں کپ اٹھا رکھے تھے۔ میں رنا مل سے کاجل کو قائل کر رہا تھا کہ اس کا ہوائی جہاز سے جانا سب کے مفاد میں ہے۔

"ہم بھی موقع ملتے ہی نکل آئیں گے۔ ابھی دو ٹکٹ ہیں، انہیں ضائع نہیں ہونا چاہیے۔"

"مگر... کراچی میں تو مجھے کوئی نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "کراچی میں نازو کا بھائی ہے" اکرام شیخ۔ وہ ہم سب کی روانگی کی راہ دیکھ رہا ہے۔ ہمارے پاس اس کو اطلاع دینے کا ذریعہ کوئی نہیں ورنہ وہ تم کو ائیرپورٹ سے اپنی ٹیکسی میں لے جاتا۔"

"وہ ٹیکسی چلاتے ہیں؟" کاجل نے کہا۔

"ہاں۔ میری طرح میرا بھائی بھی پاگل ہے" نازو بولی "اس کی اچھی بھلی پولیس کی نوکری تھی۔ نوکری کیا تھی بادشاہت تھی۔ اب تک تو انسپکٹر ہو کے کسی تھانے کا انچارج ہوتا مگر لات ماردی نوکری کو۔"

کاجل مزید حیران ہوئی "وہ کیوں؟"

"یہ بھی تو بغیر وجہ کے دولتی جھاڑتی ہے" غالب بولا۔

"تم نزد کرو جے" نازو نے برا مانے بغیر کہا۔ "وہ اس وقت اپنے بھائی کی بات کر رہی تھی اور جذباتی ہو رہی تھی "بہت بڑا فوجی ہے میرا بھائی کاجل۔ جو کچھ پولیس والے کرتے ہیں، وہ نہیں کر سکتا تھا۔ اور دوسرے اس کی ایمانداری اور فرض شناسی سے پریشان تھے۔ اس نے بہت مقابلہ کیا مگر اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔"

غالب نے کہا "چنانچہ شیخ صاحب اب بھاڑ جھونک رہے ہیں کراچی میں۔"

میں نے کہا "تمہیں اس کو تلاش کرنا پڑے گا لیکن یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کی ٹیکسی کا نمبر یاد رکھنا۔ دوسرے ٹیکسی والے خود ہی بتادیں گے کہ وہ کس وقت کہاں مل سکتا ہے۔ ممکن ہے کوئی اس کا پتا ٹھکانا بھی بتادے۔ پھر وہاں گل اور محسن بھی ہوں گے۔"

"اور اگر وہ نہ ملے؟" کاجل نے کہا۔

"تو کوئی بات نہیں۔ کراچی شہر ہے جنگل نہیں، کسی ہوٹل میں ٹھہر جانا یا ٹکٹ لے کر ٹرین میں بیٹھ جانا۔ لاہور میں منظر تمہیں ریسیو کرلے گا۔"

تھوڑی سی رد و کد کے بعد وہ مان گئی۔ ہم نے اسے زیادہ تفصیل سے ایس آئی شیخ اور عبدالودود منظر کے بارے میں بتایا۔ ماضی کے جھروکوں سے جھانکنا اور گم رفتہ کو آواز دینا ایک ایسا دلچسپ تجربہ تھا کہ ہم سب پرانی یادوں میں اور یادوں میں کھو گئے۔ بہت سی باتیں کاجل کو معلوم نہ تھیں۔ اس کے ساتھ ہم بھی بہہ رہے۔ کچھ باتیں رلانے والی تھیں جنہوں نے ہمیں اداس کر دیا۔ میں نے اپنے والد مرحوم وزیر خاں کو یاد کیا جن کے لہو کا قرض باقی تھا۔ وہ رخصت یاد کر کے میرا دل پھر دکھی ہوا جب میں نے لندن میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور دیار فرنگ کی رنگینیوں میں دسمبر میں ایسا کھو گیا تھا کہ مجھے وطن میں اپنے والد کے ساتھ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے ظلم و ستم اور دغابازی کی خبر تک نہ ہوئی۔ لاکھوں کا مالک صنعت کار اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا مگر اس نے مجھے کچھ پتا نہ چلنے دیا۔ وہ جیسے جیسے کا محتاج ہو کے سرکاری اسپتال کی بے اثر دوائیں لاتا رہا۔ اپنے ہی ایک تنگ حرام ملازم کے گھر میں کام کرنے پر مجبور ہوا اور کسمپرسی کے عالم میں مرگیا۔ اس کے قاتل چوہدری دلاور اور استاد پیلا تھے۔ ایک نے انہیں راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا تھا اور دوسرے نے اس فیصلے پر عمل درآمد کیا تھا۔ وزیر خاں کی ہڈیاں تک پوسٹ مارٹم سے پہلے قبر سے نکال لی گئی تھیں اور اب مجھے فرصت ملی تھی کہ میں ظالموں سے ہر ظلم کا حساب لے سکوں۔ انہوں نے تو بہت چاہا تھا کہ مجھے ختم کر دیں اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے قانون کو خرید لیا تھا۔ قانون کے محافظ بھی میرے دشمن ہوگئے تھے۔ مجھے رابعہ جیسی وکیل اور رفیق سفر نہ ملتی تو میرا انجام تختہ دار پر ہوتا۔ خود رابعہ کو میرا ساتھ دینے کی بڑی سخت سزا ملی تھی۔ اس کی ماں کو اس کے گھر میں مار دیا گیا تھا اور اس کے گھر کو خاکستر کر دیا گیا تھا۔ بہت سے مہربان چہرے تھے جو ماضی کی گرد میں گم ہو گئے تھے۔ محسن کی موت کے بعد اس کے والد شیرازی صاحب بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مجھے ایس ایس پی عباس رضوی۔ وہ باضمیر اور ایماندار، نیک سیرت اور صاحب بصیرت انسان جس نے قانون کی بالادستی کو حق پرستی کے اصولوں کو ایمانداری سے رزق حلال کمانے کی جدوجہد کو ناسازگار حالات کی انتہا تک جاری رکھا اور ہمیں اس وقت میں تحفظ اور شفقت کا سایہ فراہم کیا جب ہر طرف سفاک شکاری ہمیں محصور کر چکے تھے۔ ان سب کے ساتھ استاد نیٹو بھی یاد آیا اور شمشاد بار بار آئی۔ ان سب کے قاتل کون تھے؟ یہ بھی میں جانتا تھا لیکن گردش حالات نے مجھے اسیر کر لیا تھا، دوسرے زیادہ اہم مسائل میں الجھا دیا تھا۔ میں مجبور ہو گیا تھا اپنے ذاتی انتقام کے معاملات کو التوا میں ڈال دوں۔ آج پھر مجھے پرانی یاد کرید کے لے آئی تھی تو پرانے درد بھی جاگ اٹھے تھے۔

رات کے آخری پہر سب سے بعد میں بھی خود کو نیند کی پرسکون وادی میں دھکیلنے میں کامیاب ہو گیا مگر یہ نیند بے سکون تھی اور لاشعور کے مدفن سے وہ سب یادیں نکل کے خواب میں آ گئیں جن سے کہیں مفر نہ تھا۔ اس شہر بے نشاں میں ہر لمحہ مصلوب لمحے کی تاریخ وفات درج تھی اور میری کتاب زندگی

ویران گلیوں میں بند دروازوں کے پیچھے یادیں ویران پریشاں تھیں کہ فرار ہمیں اس قید تنہائی سے نکالے۔

صبح میں نے رابعہ کو دیکھا، وہ دبے پاؤں باہر جارہی تھی۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ کچن کی طرف جارہی تھی۔ قدموں کی آہٹ پر اس نے پلٹ کے دیکھا اور مسکرائی "رات بھر سو نہیں سکے نا؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "ہم اپنے ماضی کے اتنے قریب تھے کہ مستقبل بھی کل کی بات لگتا ہے۔"

اس نے کچن میں بجلی کی کیتلی کا پلگ لگایا "چائے پیو گے یا کافی؟"

میں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا "کل جب ہمارا گھر آباد ہو گا تو کیا ہر روز تم مجھ سے پوچھا کرو گی؟ آج کیا پکاؤں جی؟ چائے میں کتنی شکر ڈالوں؟ کرتے سوٹ کے ساتھ کون سی ٹائی میچ کرے گی۔ یہ سب تمہیں معلوم ہونے چاہئیں پہلے سے۔ میرا موڈ، میری پسند اور عادات۔"

وہ منہ دوسری طرف کیے ہنستی رہی اور کچھ شرمائی بھی رہی۔ "تمہارا موڈ اور تمہاری عادتیں ایک سی رہنے والی چیزیں ہیں؟"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر یہ موڈ بھی خراب ہو جاتا ہے اور عادتیں بھی بگڑ جاتی ہیں مگر یہ آرٹ تو سب اچھی بیویاں جانتی ہیں کہ انہیں ٹھیک کیسے کیا جائے۔"

غالب نے دروازے کے پیچھے سے سر نکال کے کہا "جیسے سب اچھے شوہر جانتے ہیں کہ بیویوں کا دماغ کیسے درست کیا جائے۔"

"آگیا شیطان جنت میں خلل اندازی کے لیے" میں نے کہا۔

"یار مجھے کافی کی خوشبو نے بتایا کہ کہیں معاملہ گڑبڑ ہے۔"

"گڑبڑ تو تمہارے واہیات دماغ میں ہے" میں نے کہا۔

"اچھا۔ چوری اور سینہ زوری" غالب نے مجھے ڈانٹا "دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کے کچن میں بیٹھے ہوئے تھے دونوں۔ اور یہ باتیں کس قسم کی ہو رہی تھیں؟ میں ظالم سماج بن کے بیچ میں آگیا ورنہ تو سب دھرا رہ جائے گا۔"

میں نے کہا "ظالم سماج کا تو ہم حشر نشر کر دیں گے۔"

غالب نے کہا "بی بی رابعہ! تمہارے بھلے کی ایک بات کہنے آیا ہوں۔ ابھی سے اتنا سر مت چڑھاؤ اسے۔ کیسا موڈ اور کیسی پسند۔ بس ٹھنڈے پکاؤ اور دھر دو اس کے سامنے۔ کھانے ہوں تو کھائے ورنہ بھاڑ میں جائے۔"

میں نے کہا "قانون میں ایسی کوئی دفعہ نہیں جس کے تحت کسی بھی شوہر یا تم جیسے جورو کے غلام کو ٹھنڈے کھانے پر مجبور کیا جا سکے" میں نے کہا۔

غالب نے سوچ کے کہا "وکیل صاحبہ! کیا واقعی قانون میں ایک دفعہ نہیں ہے؟"

رابعہ ہنسی "ہوگی تو میں نازو کو بتا دوں گی، تمہیں کیوں بتاؤں۔ لو کافی پی لو۔ ابھی سے متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"متفکر میں کسی اور وجہ سے ہوں" غالب نے کافی کا مگ پکڑ کے کہا "اللہ شاد آباد رکھے۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔"

میں نے کہا "یہ وجہ ہے آپ کے متفکر ہونے کی؟"

رابعہ نے کہا "یہ ہر صبح کا آغاز اپنے لیے ایسی ہی دعا سے کرتے ہیں نا۔"

غالب بولا "یار، بندے علی نے تو ساری اسکیم فیل کر دی۔ اب ہم نہ پاکستانی سفارت خانے جا سکتے ہیں اور نہ بھارتی۔ جیسے اس نے پہچان لیا تھا ایسے ہی کوئی اور بھی پہچان سکتا ہے۔"

"اسی بات سے دوسرا نکتہ پیدا ہوتا ہے۔ بندے علی نے ایک پیغام تو تحریر کر دیا تھا مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ بعد میں کوئی اور مراسلہ نہیں بھیجا گیا ہوگا۔"

غالب نے کہا "کیپٹن حمید نے کاغذی کارروائی کی تھی خود کو محفوظ رکھنے کے لیے مگر اسے ہمارا خیال بھی ہوگا۔ وہ اس سے زیادہ مستعدی کا مظاہرہ نہیں کرے گا لیکن تمہاری بات میں خاصا وزن ہے، ہم کو محتاط رہنا چاہیے۔"

رابعہ نے کہا "اور سفارت خانے کے چکر میں بھی نہیں پڑنا چاہیے۔"

میں نے کہا "اور رام ناتھ کی پیشکش کو قبول کر لینا چاہیے۔"

"وہ ایک لاکھ کی بات کر رہا تھا۔ وہ پائلٹ جو ہمیں ہیلی کاپٹر میں اسمگل کر کے پاکستان پہنچا سکتا ہے، ایک لاکھ مانگتا ہے۔"

میں نے کہا "رام ناتھ ایک لاکھ کے زیورات لینے کے بعد اخلاقی طور پر اس کو معاوضہ ادا کرنے کا پابند ہے۔"

"اس نے کب انکار کیا ہے۔ اس سے آج کہہ دیں گے کہ وہ جلد از جلد ہماری روانگی کا انتظام کرے۔ اس پائلٹ سے بات کرے، وہ بھی موقع تلاش کرے گا۔"

اندر ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ رام ناتھ نے باہر آ کے کہا "ارے کوئی ہے؟ کیا کر رہے ہو سب کے سب کچن میں؟"

میں نے کہا "آؤ کافی پیو۔"

اس نے برا سا منہ بنایا "صبح صبح کافی اور تم کو کس کا فون ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "فون! ہمارے لیے؟"

"ہاں، ہاں۔ تمہیں ہی پوچھ رہا ہے۔ عجیب الٹی کھوپڑی کا نوجوان ہے۔ میں نے کہا کہ نام بتاؤ، کس سے بات کرنا چاہتے ہو تو بولا کہ کسی سے بھی کرادو۔ یہ جو تمہارے گھر میں مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں نا، ان میں سے کسی کو بھی بلادو۔ میں نے کہا کہ تم کون ہو تو کہنے لگا کہ میں ان سب کا کزن ہوں۔ پتا نہیں مذاق ہے یا مصیبت؟ آخر میرا نمبر کیوں، یا تم نے کسی کو؟ ایسا کون ہے جو......"

میں نے کہا "خفا کیوں ہوتے ہو۔ ہم کسی کو تمہارا فون نمبر کیسے دے سکتے ہیں۔ نہ ہمیں یہ معلوم تھا کہ تقدیر کہاں پہنچائے گی۔ اور

www.paksociety.com

فون نمبر تو اب بھی کسی کو پتا نہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا۔ جاؤ پہلے اس سے بات کرو" رام ناتھ بولا "اور لڑکی! ہوا دینا کالی۔ دیکھوں تم کیسی بناتی ہو۔ یہ جو میرا رسوٹا ہے یا یہ تو باپ ہے میرا۔ اپنی مرضی سے مجھے کچھ نہیں کرنے دیتا۔ کہتا ہے صبح صبح کافی پیتا باپ ہے۔ باپ کی اولاد۔"

میں نے کمرے میں جا کے ایک طرف رکھا ہوا ریسیور اٹھایا اور آواز بدل کے کہا "ہیلو!"

"وعلیکم ہیلو۔ تم کون ہو؟" آواز غالباً اس نے بھی بدلی تھی لیکن مجھے شک ہوا کہ وہ کیپٹن حمید ہے۔

"یہ پہلے تم کو بتانا چاہیے۔ فون تم نے کیا ہے۔"

"فون پر پاس ورڈ نہیں ہو سکتا۔ اب کیا کریں۔ فیصلہ کیسے ہو گا کہ کے نام پہلے بتانا چاہیے؟"

"جس کے نام کا پہلا حرف پہلے آتا ہو" حروف تہجی کی ترتیب میں۔ وہی پہل کرے۔"

"اچھا سکندر رخصت۔"

"گڈ مارننگ کیپٹن حمید" میں نے کہا۔ پھر ہم دونوں ہنسنے لگے۔

"ثابت ہوا کہ ہم ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دے سکتے" وہ بولا۔

میں نے کہا "تم نے ہمارا سراغ کیسے لگایا؟"

"میرا تعلق خلاف انٹیلی جنس یونٹ سے ہے۔ ذہن میں پیدائشی طور پر ہوں" حمید بولا "بندے علی ملا تم سے؟"

"بندے علی! میری آزادی مشکل سے نکلی" ہاں۔ مگر۔۔۔"

"شکر ہے" حمید بولا "پیغام مل گیا تمہیں؟"

"وہ۔۔۔ تم نے۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ تم یہ بات جانتے تھے پہلے سے۔۔۔ کہ حبیب۔۔۔"

"ہاں۔ میں نے ڈی ار کو ہدایت کی تھی کہ پیغام اسی کے حوالے کرے اور باقی بات زبانی کہلواری تھی۔"

"یہ ڈی ار کیا ہوتا ہے؟"

"ڈسپیچ رائڈر۔ عام زبان میں شہسوار قاصد۔ موٹر سائیکل پر ڈاک لے جاتا ہے" وہ بولا "بندے علی نے وصیت پر سرکاری سرگاڑی۔ رسید مجھ تک پہنچ گئی۔ میری پوزیشن محفوظ ہو گئی۔"

"اس کو معلوم تھا کہ ہم کہاں ہیں؟"

"نہیں۔ اس نے معلوم کیا اور پھر مجھے اطلاع دی۔ تم ابھی تک نیپال میں کیوں بیٹھے ہو؟ تمہیں تو فوراً نکل جانا چاہیے ورنہ حمید اس پیغام کو کب تک روکے گا۔ آج سفیر کو مل جائے گا۔"

میں نے بے خیالی میں کہا "مشکل ہے۔"

"کیا مشکل ہے؟ بندے علی نے نقل تمہیں ماری مگر اصل کو وہ کیسے غائب کر سکتا ہے۔ میں بھی بات نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "اوکے۔ ٹھیک ہے حمید۔ ہم آج ضرور نکل جائیں گے۔ تم نے جو کچھ ہمارے لیے کیا۔۔۔"

لائن اچانک کٹ گئی۔ میں نے بوجھل دل کے ساتھ ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ خدا نے میری مشکل آسان کی ورنہ میں کیا حمید کو کیسے بتاتا کہ ہم نے اپنے اس محسن کو شکوک اور خوف کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ ہم نے اپنے اندیشوں سے نجات پانے کے لیے اس پر غداری کا الزام عائد کیا اور اسے قلعہ اغلان پر ہم نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کی لاش بہت دور سڑک کے کنارے برف کا سفید کفن اوڑھے چپ چاپ پڑی ہے۔

میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا اور خوف زدہ نظروں سے ٹیلی فون کے آلے کو دیکھتا رہا کہ شاید حمید پھر لائن ملائے گا گھنٹی پھر بجے گی اور حمید مجھ سے پوچھے گا کہ تم نے بندے علی کو انعام بھی دیا یا نہیں۔ جو انعام اسے ملا تھا وہ اب میرے احساس کی خلش اور ضمیر پر بار گناہ بن گیا تھا۔

لائن دوبارہ نہیں ملی یا حمید نے مطمئن ہو جانے کے بعد بھی گفتگو کا سلسلہ بحال کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اب پچھتانے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ بندے علی اگر مجرم تھا تو ہمیں اس کا معاملہ خدا یا قانون کے سپرد کرنا چاہیے تھا۔ اس کے قول و فعل کے لیے سزا و جزا کے فیصلے دار ہم تو نہیں تھے۔ ہم نے تو محض انکشاف کے ڈر کے خوف سے اس کے وجود کو ختم کر دیا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اس پشیمانی کے عذاب میں کسی اور کو شریک نہ کروں۔ جو ہونا تھا ہو گیا تھا۔ اب اپنے ساتھ سب کو احساس جرم میں مبتلا کرنے سے کچھ حاصل نہ تھا۔

مجھے دیکھتے ہی غالب نے کہا "حمید کا فون تھا؟ اسے کیسے معلوم ہو گیا۔"

میں نے کہا "اس کے اپنے وسائل ہیں۔ تم باہر سب سن رہے تھے؟"

"ہاں۔ کیا کہہ رہا تھا؟" رابعہ بولی۔

"پوچھ رہا تھا کہ گئے کیوں نہیں ابھی تک؟"

"رام ناتھ نے کہا ہے کہ وہ آج اس پائلٹ سے بات کرے گا اور اس سے کہے گا کہ آج رات ہی ہمیں نکال لے جائے مگر ظاہر ہے یہ سب اس کے اختیار کی بات نہیں" غالب بولا۔

رام ناتھ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ وہ بستر میں لیٹا کھانستا رہا اور ہم بے چینی سے اس شخص کا انتظار کرتے رہے جو ہمیں نجات دہندہ بن کے پہنچنے والا تھا۔ رام ناتھ نے بڑا امید افزا بیان دیا تھا کہ پائلٹ صورت حال کا جائزہ لے کر جائے گا مگر ایک لاکھ کی رقم اتنی بڑی ہے کہ وہ یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔ کوئی نہ کوئی طریقہ خود ایجاد کرے گا۔ جو وارادہ کرے تو چوری کے راستے تلاش کر لیتا ہے۔

میں نے کہا "آخر یہ پائلٹ ہے کون؟"

"بھی نشے کا تو کچھ لیتا۔ کوئی کہتا ہے تمہارے سالے کا سالا ہے یا دوست ہے۔ کوئی تعلق ضرور ہے اس کا شاہ سے۔ پہلے انٹرلائن میں تھا۔ وہاں سے بھی اسی لیے نکالا گیا تھا کہ تنگ کرتا تھا۔ اکیلا آدمی ہے اس لیے ڈرتا نہیں۔"

"اکیلا آدمی یہ سب کیوں کرتا ہے؟ اس کی ضروریات تو محدود ہوں گی۔"

رام ناتھ طنز سے مسکرایا "ضروریات محدود ہوتی ہیں شریف لوگوں کی۔ اور شادی کے بعد تو وہ ہو جاتا ہے ذمہ داریوں کا بوجھ بلا کر مار جاتے کوئی کھاں نہیں۔ ڈالنگ سوائے اس کی کمر کے۔ جو وہ چکا کے سامنے رکھ دے' سر جھکا کے کہا لیتا ہے' جیسا پہن لیتا ہے اور اپنے بچے کو بھگوان کی مرضی سمجھ کے قبول کرتا ہے۔"

مجھے اور غالب کو بے اختیار ہنسی آ گئی "سچ کہا تم نے۔"

رابعہ نے کہا "کہاں ہوتے ہیں ایسے شوہر؟"

"ہر جگہ ہوتے ہیں۔ زیادہ تر تو ایسے ہی ہوتے ہیں لیکن بعض جیسے بھی حرامی ہوتے ہیں' پیدائشی بدمعاش۔"

"جوزف اس پائلٹ کا نام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ جوزف پریرا۔ پرتگالی ہے مگر زیادہ عمر گوا میں گزاری ہے۔ شادی بھی کئی بار کی مگر سب کو چھوڑ کے بھاگ گیا۔ یا وہ خود ہی چھوڑ کر بھاگ گئیں۔ اب اکیلا مست سانڈ کی طرح پھرتا ہے۔ شراب اور عورت سے جو بچتا ہے وہ جوئے میں ہار جاتا ہے۔ آ گیا۔ بے اشیطان کا نام لیا اور در آیا۔"

باہر کوئی مسلسل گاڑی کا ہارن بجا رہا تھا۔ رام ناتھ نے کھڑکی کے کالے بجتے ہوئے کہا "اربار سن لیا۔" سن لیا۔ معلوم ہو گیا آ گیا ہے۔ بند کر یہ ہارن۔"

مگر ہارن بند نہیں ہوا۔ جوزف نے جواب میں کچھ کہا تھا جو میں سمجھ میں نہیں آیا۔ غالباً ہارن شارٹ ہو گیا تھا۔ اس کے شور سے ہمارے کان بھی خراب ہو رہے تھے۔ جوزف نے اسے بند کیا یکدم سکون ہو گیا۔ پھر وہ دروازے میں نمودار ہوا۔ چھ فٹ ساڑھے قد کا ایک دیو تھا جس کا جسم بے ہنگم طریقے پر پھیل گیا تھا اس نے ترمی آستین کی چیک والی قمیص پہن رکھی تھی اور پتلون کی پتلون کو توند کے رستے کے لیے الاسٹک استعمال کیے تھے جو اس کے کندھوں پر سے کر کے پہنچے تھے۔ بڑے جسم پر اس کا چہرہ بالکل کسی بچے جیسا تھا۔ معصوم اور نظر انسانیت اس کے کردار کے عین برعکس۔

"ہیلو بابا رام ناتھ" اس نے اپنا فلیٹ ہیٹ اتار کے سر جھکایا "ابھی تم نے انڈر کیا اور یہ جوزف از ہیئر۔"

"بکو مت یار جوزف۔ تم پیسے کی خاطر سر کے بل آئے ہو" رام ناتھ بولا "ورنہ مجھے معلوم ہے۔"

"اوکے اوکے۔ ابھی کام ہے کو ہمارا اسپیچ خراب کرنا ہے۔ ہم انگریزی بولے گا۔" اس نے کہا اور پھر فلیٹ کو سینے سے لگائے ہم سب کی طرف جھکا "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ہم جوزف پریرا۔ ونگ کمانڈر۔۔۔"

"جوزف! تم کسی ایئر فورس میں نہیں رہے۔"

"دیکھو بابا! تم نہیں جانتا۔ ہم حساب لگایا' اگر ہم انڈین ایئر لائن میں نہیں جاتا' ایئر فورس میں جاتا تو ونگ کمانڈر ہوتا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "میرا نام سکندر ہے۔ یہ میرا بھائی ہے غالب۔ یہ میری وائف' یہ غالب کی۔"

"ایک فالتو وائف کس کا ہے؟" وہ کاجل کی طرف دیکھ کے بولا۔

"جس کی وائف فالتو ہو وہ تمہیں مل جائے۔ خبیث!" رام ناتھ نے کہا "اب بھی وقت ہے اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔"

جوزف نے ایک ایسا قہقہہ مارا کہ اس کا سارا جسم زلزلے کی زد میں آ گیا۔ اس نے پتلون کی جیب سے ایک چپٹی سی بوتل نکال کے دو گھونٹ لیے اور بوتل بند کرتے ہوئے بولا "سوری۔ یہ سالا اپنے واسطے پینا ہے پانی۔ ٹھنڈی اندر گرم ہو جاتا ہے تو باقی ڈرائنگ ہے بابا۔ یہ بابا رام ناتھ کیسا بات بولتا ہے۔ اس کا مغز گندم ہو گیا ہے اور لڈ ایج میں۔ جوزف جب تک زندہ ہے ایسے ہی زندہ رہے گا۔ مر جانے گا تو گاڈ کو بولے گا کہ اپن سالا بہت حرامی تھا۔ ابھی تمہارا مرضی جدھر بھیجو۔ ٹکٹ ار جیون۔ اپن خوش رہنا جانتا ہے۔ تم کو پاکستان جانے کا ہے؟"

میں نے کہا "ہم بیٹھ جاؤ تو بات کریں۔"

وہ کرسی پر بیٹھا تو کرسی ٹوٹ گئی۔ وہ نیچے گرا اور ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا "ڈیڈی اوور ویٹ کا اولڈ ہے۔ ابھی جوزف گاڈ کا تھن پر بیٹھے گا۔ ایک لاکھ میں سے کرسی کا قیمت کاٹ لو۔"

میں نے کہا "ایک لاکھ بہت زیادہ ہیں جوزف۔"

"تمہارے لیے بہت زیادہ ہے" جوزف کا راستے بہت کم ہے۔ مگر ہم بابا رام ناتھ کو اسپیشل ڈسکاؤنٹ دے گا۔ چلو ننانوے ہزار ننانوے روپیہ کم دو" اس نے پھر ایک فلک شگاف نعرہ مارا۔ اس کے ساتھ ہی بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا' پھر رابعہ کو آنکھ ماری۔

میں نے کہا "ہم کب جا سکتے ہیں؟ جلدی سے جلدی۔"

"آج فرنائٹ" اس نے پھر شراب کا ایک گھونٹ لیا اور سر اوپر اٹھایا "اگر گاڈ کا مرضی ہو گا۔"

"تمہاری اپنی مرضی کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"جوزف کا مرضی کیا؟ گاڈ کا مرضی سے کام بنتا ہے جگ میں۔ ہم تو ایک مشین کو کنٹرول کرتا ہے۔ گاڈ ہم کو ہمارا لائف اور ہم کو کنٹرول کرتا ہے۔ موسم کو کنٹرول کرتا ہے۔"

میں نے کہا "اگر موسم ٹھیک رہا اور حالات سازگار ہوئے تو کیا آج رات ہم فلائی کر جائیں گے؟"

"ایک بہت بڑا بات بھولتا ہے تم۔"

"وہ کیا؟"

www.paksociety.com

"روکو ذرا" اس نے ایک انگوٹھے اور انگلی سے نوٹ گننے کا اشارہ کیا "جوزف ایڈوانس مانگتا۔ ادھار نہیں چلے گا۔ گاڑی میں پہلے پٹرول ڈالتا ہے پھر انجن اسٹارٹ ہوتا ہے۔"

"لاکھی ذری" رام ناتھ نے اٹھ کے ایک دیوار میں نصب تجوری کھولی جو ابتک ہماری نظر سے اوجھل تھی کیونکہ سامنے رام ناتھ کے پتاجی کی قد آدم تصویر استادہ تھی "یہ لو۔ پورے ایک لاکھ۔"

"تھینک یو پاپا جی" جوزف نے ہر گڈی کو چیک کر لیا۔

رام ناتھ نے تجوری کو پھر مقفل کر دیا۔ اس کا تالا نمبروں والا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق تجوری میں اس وقت بھی دس لاکھ نقد ضرور موجود تھے۔

جوزف نے کھڑے ہو کر رام ناتھ کو سیلوٹ مارا "ابھی ہم جانے کو مانگتا۔ بہت کام کرنا ہے۔"

"شراب پینے اور بدمعاشی کرنے کے علاوہ تم کیا کرتے ہو؟"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "وہ بھی کام ہے۔ اس کا اپنا ٹائم ہے مگر ابھی ہم شاپنگ کرے گا۔ بہت لوگ ہے۔ کسی کا ایمان خریدے گا' کسی کا ضمیر خریدے گا' کسی کا مجبوری خریدے گا۔ ادھار تم تو خرچ ہو جائے گا۔ پھر کہیں راستہ کلیئر ہوگا۔ اپنے کون جانے رہتا ہے جہاز تک۔ لیکن فکر کا بات نہیں۔ جوزف رائٹ ٹائم پر ادھر ہوگا' رائٹ ٹائم پر سب کو لے جائے گا اور بالکل رائٹ ٹائم پر فلائی کر جائے گا۔ گاڈ بلیس یو آل" اس نے منہ اوپر اٹھا کے سینے پر انگلی سے صلیب بنائی اور ریچھ کی طرح چلتا باہر نکل گیا۔

"کیا عجیب کیریکٹر ہے" رابعہ نے کہا۔

میں نے رام ناتھ سے پوچھا "اگر یہ نہ آیا پھر؟ تمہارے ایک لاکھ تو گئے۔"

رام ناتھ نے نفی میں سر ہلایا "جوزف جیسے لوگ کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔ یہ جیسے اندر سے ہوں ویسے ہی باہر سے نظر آتے ہیں۔ اپنی ذات کے ہر عیب کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس پر منافقت آمیز نیکی کا پردہ نہیں ڈالتے۔"

شام کو ہم کاجل کے ساتھ ائیرپورٹ تک گئے۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ ہم نے غیر قانونی طور پر ٹکٹ خریدے تھے۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ اصل مسافر قتل کیے جا چکے ہیں تو شاید ہماری ہر دلیل' ہر تسلی اسے سفر پر آمادہ کرنے میں ناکام رہتی۔ اندر سے تھوڑا سا خوف مجھے بھی تھا کہ عین وقت پر کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ مقتول عبدالکریم اور اس کی بیوی ممتاز لاوارث اور گمنام لوگ تھے۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ کوئی انہیں ہی تلاش کرنے آ جاتے۔ تاہم یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی ہمیں پہچان جائے۔

ائیرپورٹ پر سخت افراتفری تھی اور جتنے مسافر تھے' ان سے زیادہ وہ لوگ تھے جن کو دھوکے بازوں نے جھوٹی امید کے آسرے پر یہاں بلا لیا تھا۔ ان کا نام ویٹنگ لسٹ میں ظاہر کر کے کہا جہاز کی روانگی سے قبل انہیں سیٹ مل جائے گی۔ کنفرم سیٹوں کے مسافر بعض اوقات آتے ہی نہیں اور بکنگ منسوخ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو سیٹ کینسل کروا دیتے ہیں۔ ان سیٹوں کے حصول کی خاطر خریداروں کے درمیان مقابلہ تھا۔ ضرورت مند ایجنٹوں کے پیچھے بھاگ کے بولی لگا رہے تھے۔

ہم اس ہجوم سے الگ کھڑے اندر جانے والے راستے کے قریب کھڑے سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ میری نظریں مسافروں کی صورتوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ غالب کوشش کر رہا تھا کہ کراچی کا سارا جغرافیہ بھول کر پار رہے۔

"ائیرپورٹ پر بھی بہت ٹیکسیاں ہوں گی۔ پہلے ان سے ٹیکسی کا نمبر یاد ہے نا؟ اکرام شیخ کی جگہ فضل الٰہی آتی شیخ سے پہلے بھی اسے کافی لوگ جانتے تھے' اب تو ممکن ہے وہ ڈرائیوروں کی ایسوسی ایشن کا صدر منتخب ہو گیا ہو۔ بغرض محال ٹیکسی کے نمبر سے کچھ پتا نہ چلے تو نام سے واقف کسی بھی ٹیکسی میں بیٹھ جانا۔ میرا خیال ہے کہ تم شریف اور اعتبار قرینی کا انتخاب کر سکتی ہو۔ اس سے کہنا کہ جیسے بھی ہو ٹیکسی ڈرائیور کو تلاش کرنا ہے۔ جتنا کرایہ بنے گا دوں گی۔ صدر' ٹاور' لی مارکیٹ اور ریلوے اسٹیشن لے چلو جہاں یہ اسٹینڈ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری تلاش کامیاب ہو گی۔ یہ کھیل تماشے ہیں اور یہ اتفاقات کی دنیا ہے۔ کیا پتا کسی ڈرائیور سے پوچھو اور وہ کہے چشم ما روشن دل ماشاد۔ اکرام شیخ کہتے ہیں اور یہی ہے آپ کی منزل مراد۔ ٹیکسی رکی ہو۔ تم نے دیکھا ہوگا سب وفا شعاری بابو کو صحافت کی دنیا میں کیسے تلاش کر لیا ہے۔"

نازو نے کہا "اب بس بھی کرو۔ دماغ چاٹ گئے اس کا۔"

"دماغ؟" غالب بولا "اتنا تو کہ بھوسے جیسا تھا۔"

اچانک میری نظر ایک آشنا صورت پر گئی اور بے اختیار ردعمل کے طور پر میں نے غالب کا بازو تھام کے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اب ہم دونوں کی پشت اندر جانے والے راستے کی طرف تھی اور ہم نے رابعہ کے ساتھ نازو کو بھی کور کر لیا تھا۔

"غالب! اپنی پشت درست رکھنا" میں نے کہا "رابعہ! ہماری آڑ میں رہو۔ خبیث تمہارا چہرہ نہ دیکھ لے۔"

غالب نے کہا "کون خبیث؟ کس کو دیکھ لیا ہے آپ نے؟"

میں نے کہا "حاجی عبداللہ کو۔ وہ اسی فلائٹ سے جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک شخص اور بھی ہے۔"

"وہ پاجی عبداللہ... یہاں!" غالب چونکا رہ گیا۔

رابعہ نے میری اوٹ سے اور نازو نے غالب کی آڑ سے جھانک کر دیکھا اور ان کے تاثرات نے میرے خدشات کی تصدیق کر دی۔

"واقعی یہ تو عبداللہ ہے۔ اندر جا رہا ہے ایک مونچھوں والے کے ساتھ۔ مونچھیں نقلی لگتی ہیں۔ ساڑھے تین انچ دائیں اور ساڑھے تین انچ بائیں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ شخص غالباً ایک لڑکی سے ٹکرانا چاہتا تھا۔ ٹکرایا ہے ایک سکھ سے۔" نازو نے رننگ کمنٹری جاری رکھی "نقلی مونچھوں والا اور داڑھی والا عبداللہ اب اندر جا چکے ہیں۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

غالب اور میں نے اطمینان کا سانس لے کر پیچھے دیکھا۔ لاؤنج کے اسپیکر سے اعلان نشر ہو رہا تھا کہ مسافر جہاز پر سوار ہو جائیں۔ انگریزی' پنجابی اور بنگالی میں کیا جا رہا تھا۔ پھر شاید پاکستان والوں کے لئے یہ اعلان اردو میں بھی ہوا۔

"جاؤ بابا' فی امان اللہ" غالب بولا "مجھ پر سخت رقت طاری ہے' یہ ٹھیرنے کے لئے ٹائم نہیں ہے۔ بعد میں نازو سے گلے لگ کے رو لوں گا۔"

نازو بھی رو رہی تھی اور اس کا ساتھ رابعہ دے رہی تھی۔ کاجل کا نہ رونا سخت خلاف تہذیب نسواں ہوتا۔ اس نے سسک سسک کر آنسو بہاتے ہوئے رابعہ اور نازو سے کہا "کوئی غلطی ہو تو معاف کر دینا۔"

"ان کی طرف سے میں معاف کرتا ہوں۔ یہ خود اتنی غلطیاں کر چکی ہیں۔ کیا معاف کریں گی تمہیں" غالب بولا۔

میں نے کہا "بہرحال یہ الوداع آخر کس لئے؟ کیا یہ آخری وقت ہے؟ الہام ہوا ہے کہ یہ جہاز کریش کر جائے گا۔"

رابعہ نے کہا "کیسی باتیں کرتے ہو! اللہ نہ کرے۔"

میں نے کہا "تمہاری رونی بسورتی صورتوں سے تو یہی لگتا ہے۔ چلو بند کرو یہ ڈراما۔ جاؤ کاجل! تم جہاز میں بیٹھو۔ ایک دن کی بات ہے۔ کل ہم بھی پہنچ جائیں گے۔ اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ چاچا" کلیم نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"دیکھو یہ کتنا بہادر لڑکا ہے" میں نے کہا "کلیم! اپنی امی کا دھیان رکھنا۔ ان کو رونے مت دینا۔"

غالب نے کاجل کے سر پر بزرگانہ شفقت سے ہاتھ پھیرا "بیٹی تو پرایا دھن ہوتی ہے' اسے ایک دن جانا ہی ہوتا ہے۔ روز بابل کا گھر۔"

کاجل مسکرائی اور آہستہ آہستہ لاؤنج کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نے کلیم کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ شیشوں والے دروازے کے پیچھے غائب ہونے سے پہلے اس نے پلٹ کر ہاتھ ہلایا۔

کچھ دیر بعد میں نے ان کے جہاز کو آسمان کی بلندی میں پرواز کے لئے اٹھتے دیکھا۔ خوف کا کانٹا میرے دل سے نکل چکا تھا۔ مرنے والے دو مسافروں کے ٹکٹ پر کاجل اور کلیم سفر کر رہے تھے۔ جیسے لوگ کہتے ہیں کہ دانے دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے' ایسے ہی شاید قدرت ہر راستے اور ہر منزل کے لئے مسافر کا نام لکھ دیتی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہی نام ٹکٹ پر بھی ہو۔

"اللہ جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے" غالب نے واپسی پر کہا "اب سوچو ذرا کہ اس فلائٹ پر کاجل اور کلیم اللہ کی جگہ ہم میں سے کوئی ہوتا تو کیا ہوتا۔ وہ پاجی عبداللہ تو گلے پڑ جاتا کہ بھئی ماشاء اللہ سے کیا خوب ملاقات ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "وہ حرام زادہ یہاں کیا کر رہا تھا؟"

"ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟" غالب نے کہا "جیسے مقدر ہمیں لے آئی ایسے ہی اس کو بھی لے آئی۔"

میں نے کہا "نہیں مرزا جی۔ وہ ہم جیسے لوگوں کی طرح خوار ہونے والوں میں نہیں ہے۔ وہ گھربار لٹا کے ہجرت کرنے والوں میں بھی شامل نہیں ہو سکتا۔"

"صاف کہو نا کہ وہ ہماری تلاش میں تھا" غالب نے جھنجلا کے کہا۔

"میں اس امکان کو مسترد نہیں کر سکتا۔"

"میں آپ کو بھی خبطی اور نفسیاتی خوف کا مریض قرار دیتا ہوں" غالب نے کہا "تمہیں وہ فوبیا ہو گیا ہے جس میں آدمی کو سب اپنے دشمن نظر آتے ہیں۔"

"کیا حاجی ہمارا مخلص دوست ہے؟" میں نے کہا۔

"مگر یہ بھی نہیں کہ وہ اور کچھ نہیں کرتا۔ ہم سے دشمنی اس کا واحد مقصد حیات نہیں ہے۔ یار' وہ کاروباری دورے کرتا رہتا ہے اور ساری دنیا میں آنا جانا ہوگا۔ نیپال میں نظر آ گیا تو کیا ہوا۔ فارگیٹ دی باسٹرڈ۔"

میں خاموش ہو گیا۔ رابعہ اور نازو پہلے ہی خاموش تھیں۔ رام ناتھ کے گھر تک کا راستہ خاموشی میں کٹا مگر میں اپنے ذہن سے حاجی عبداللہ کے خیال کو جھٹک نہ سکا۔ غالب کی توضیح یقیناً منطقی تھی مگر سانپ کے ڈسے کو رسی سے ڈر لگتا ہے تو اسے وہمی یا خبطی نہیں سمجھا جا سکتا۔

فلائٹ کچھ تاخیر سے روانہ ہوئی تھی۔ رام ناتھ کے گھر پہنچنے تک نو بج گئے۔ اب ہم نے اپنے سفر کی تیاری شروع کی۔ ہمارے پاس اسباب سفر کچھ نہیں تھا مگر ذہنی طور پر اس لمبے رسک میں درپیش تمام خطرات کو سمجھنا ضروری تھا۔ یہ ایک غیر قانونی پرواز تھی۔ پہلے تو اس کا طے شدہ پروگرام کے مطابق روانہ ہونا ہی غیر یقینی تھا۔ دیگر خدشات کا سلسلہ پرواز کے بعد شروع ہوتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ بیچ میں جہاز کو روک لیا جائے' اسے اترنے پر مجبور کر دیا جائے یا نشانہ بنا لیا جائے۔ سو دن چور کے ہوتے ہیں تو ایک دن کوتوال کا بھی ہوتا ہے۔ جوزف بڑا جن لوگوں پر انحصار کرتا ہے کہ وہ حاسد نہیں ہوں گے' وہ کوئی مخلص دوست نہیں ہوتے۔ غرض کے بندے ہوتے ہیں۔ خود کو اعانت مجرمانہ کے الزام سے بچانے کے لئے وہ کسی تذبذب کے بغیر جوزف بڑا کو مروا سکتے ہیں۔

www.paksociety.com

ہے سب نہ ہوا اور بیلی کاپٹر نکل جانے تو مشکلات اور خطرات کے اگلے مرحلے میں اس علاقے کے باسیاسے جغرافیائی اور موسمی حالات کا سامنا ہوگا۔ ان پہاڑوں کی عام بلندی دس سے بیس ہزار فٹ کے درمیان تھی۔ جہاں آکسیجن کی کمی کے باعث ائیر پاکٹس (AIR POCKETS) ہوں گی جن کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تجربے کار پائلٹ ہی جانتے ہیں کہ کس روٹ پر کتنی بلندی پر اور کہاں اچانک فضا میں خلا نمودار ہو جائے گا۔ ایسے خلا میں جہاز ایک دم نیچے جاتا ہے۔ سیکڑوں فٹ تک یا ہزاروں فٹ تک نیچے ہمالہ کی برف پوش چوٹیاں ہیں جو رات کو گہری دھند، برف باری یا بارانوں میں دکھائی بھی نہیں دیتیں۔ ایک اچھی کاپٹر کی طاقت پرواز ہی کیا۔ وہ ہی کسی چوٹی پر کریش کر سکتا ہے۔

ہم میں نے اپنے اندیشوں کا کسی پر اظہار نہیں کیا۔ رابعہ اور نازو کا حوصلہ پہلے ہی ڈاؤن تھا۔ میں انہیں یقین دلاتا رہا کہ جوزف بہت تجربے کار پائلٹ ہے اور یہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز ہوگی پھر ہم پاکستان کی سرحد میں اتر جائیں گے۔

"خدا معلوم وہ کس ویرانے میں اتارے گا" رابعہ بولی۔

"میرا خیال ہے گلگت یا اسکردو کا علاقہ ہوگا۔ بالکل یہی حالات ہوں گے لیکن ہم اپنے پاکستان میں ہوں گے" غالب نے کہا۔

"کسی برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑ کی چوٹی پر یا برف باری میں اتار دیا تو مارے جائیں گے" نازو نے کہا "معلوم نہیں آبادی تک پہنچنے کے لئے کتنا پیدل چلنا پڑے۔"

"پیدل چلیں تمہارے دشمن" غالب بولا "تم نوجوان قدم رنجہ فرماؤ وہیں قیام کرنا۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں۔ میں جا کے لاہور یا راولپنڈی کی کار لے کر آؤں گا تمہارے پاس۔"

نازو نے برا سا منہ بنایا مگر کچھ بولی نہیں۔ رام ناتھ کے ویران گھر کے باہر دور خاموشی اور تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ عجیب پُراسرار آدمی تھا۔ اس کے ذرائع معاش کیا تھے؟ یہ نہ ہم نے پوچھا تھا نہ اس نے بتایا تھا۔ وہ کوئی شریفانہ کام نہیں کرتا تھا مگر ہم نے دو دنوں میں اسے کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ نہ اس سے کوئی ملنے آیا تھا اور نہ ہم نے اسے کسی سے فون پر باتیں کرتے سنا تھا۔ بظاہر اس کی راہبانہ زندگی کا مقصد کوئی نہ تھا مگر اس کی دولت درختوں پر نہیں اگی تھی۔ اس کے لئے رام ناتھ نے جدوجہد ضرور کی تھی خواہ وہ ناجائز تھی یا جائز۔ وہ کنجوس قری بھی نہیں تھا ورنہ اپنی ایک غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لئے یوں ایک لاکھ کے نوٹ جوزف پر یا کے سامنے نہ پھینک دیتا۔ اس کی جگہ دلا در ہوتا تو بس ایک کوڑی خرچ کرتا اور سرکار کو جہنم رسید کر دیتا۔ نہ ضمیر نہ اس کی غلطی۔ سرکار کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی تو کیا؟ وہ کون سا رام ناتھ کا خیر خواہ تھا۔ رام ناتھ بزدل بھی نہیں تھا۔ اس نے سرکار کو اپنے گھر میں بلانے کے بعد دیکھا اور اس وقت نکالا تھا جب خطرے کا

احساس بھی غیر اہم ہو گیا تھا۔ رام ناتھ نے جوزف پر اپنا ہماری موجودگی میں تجوری کھولی تھی اور ہم سب نے دیکھا اس میں کتنی دولت موجود ہے مگر جتنا اعتماد اسے ہم پر تھا اس سے زیادہ اپنے آپ پر تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوگا۔ بجلی کے باعث لائٹ باہر نظر نہیں آتی تھی۔ دوسرے سب لائٹس آف تھیں۔ ہم اپنے کمرے میں بیٹھے تو میں نے اٹھ کر اور پھر فین ہیٹر کو آن کیا۔ گرم کپڑوں کے باوجود سب سردی سے شل ہو رہے تھے۔ رابعہ اور نازو نے کچھ دیر اپنی ناخواستہ کافی بنانے کی ذمے داری قبول کی اور کچن کی طرف گئیں۔ میں اور غالب سفر کی ضروریات تیار کرتے رہے۔ کپڑے ایک کے اوپر ایک جتنے پہنے جاسکتے ہوں پہن لئے۔ کھانے پینے کا جتنا بھی سامان دستیاب ہو اور سب اٹھا سکیں تھرماس کافی سے بھر لئے جائیں۔

رابعہ اور نازو کافی بنا کے لوٹ آئیں مگر رام ناتھ نہیں۔ میں نے کہا "تم نے رام ناتھ کو دیکھا؟"

رابعہ نے انکار میں سر ہلایا "وہ سو رہا ہے۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا۔"

"اس کی طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہے؟" غالب بولا۔

"میں جا کے دیکھتا ہوں" میں نے کہا "ابھی وقت ہے، بلایا جاسکتا ہے۔"

لیکن اس کے کمرے میں پہنچ کے مجھے احساس ہوا، اسے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں رہی۔ رام ناتھ سوتے میں ہی تھا۔ ایک کروٹ پر وہ سوتا ہوا ہی لگتا تھا مگر میرے قریب جانے پر جب اس نے حرکت نہیں کی تو میں نے لحاف ہٹا کے اس کو ہلایا اور اس کی کھلی ہوئی ساکت آنکھوں کو دیکھا۔ اس کا جسم لحاف میں ہونے کی وجہ سے ابھی تک گرم تھا۔ نتیجہ یہ اندازہ نہ تھا کہ اسے مرے ہوئے کتنی دیر ہو چکی ہے؟

میں نے اسے سیدھا لٹایا اور اس کی آنکھیں بند کر کے اوپر تک پھیلا دیا۔ موت کے سبب بتانے میں چند سیکنڈ سے گزار کے میں واپس آگیا۔

میری صورت دیکھتے ہی غالب پریشان ہو گیا "کیا ہوا؟"

میں نے کہا "بہت برا ہوا یار۔ رام ناتھ مر گیا۔"

رابعہ کے ہاتھ سے کافی کا مگ چھوٹ گیا۔ "کیا!"

میرے ابتدائی الفاظ نے بم کا دھماکا کیا تھا جس نے سب حواس معطل کر دیے تھے۔ آہستہ آہستہ میری بات کا مفہوم واضح ہونے لگا اور انہیں یقین آگیا کہ اتنی سنجیدگی کے ساتھ بیان کرنے میں اداکاری نہیں کر رہا ہوں۔ ان سب کی نگاہیں مرتکز ہوگئی تھیں۔

"میرا خیال ہے سوتے میں اس پر دل کا دورہ پڑا۔"

کہا۔ "دل کا دورہ" غالب نے یوں کہا جیسے یہ کوئی انہونی بات تھی۔

میں نے سر ہلایا "اور کیا وجہ ہو سکتی ہے اچانک موت کی۔ ہم ائیرپورٹ گئے تھے ضرور گھنٹے پہلے تو وہ زندہ تھا۔ اسے معمولی سا زکام تھا اور زکام سے فوری موت نہیں ہو سکتی۔"

"کیا پتا اسے نمونیا ہو گیا ہو۔ ڈبل نمونیا۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ ڈبل نمونیا بھی ایک دم نہیں ہوتا اور ایک دم جان نہیں لیتا۔ رام ناتھ تو لحاف اوڑھے سو رہا تھا" میں نے کہا۔

غالب بولا "پھر اب کیا کریں؟ ڈاکٹر کو بلائیں یا پولیس کو؟"

"کسی کو نہیں" میں نے کہا "رام ناتھ کو سونے دو۔ جوزف نہیں آئے گا۔ ہم اسے بھی کچھ نہیں بتائیں گے سوائے اس کے کہ رام ناتھ کو بخار ہے وہ سو رہا ہے۔ صبح یہ خبر دنیا کو کیسے ملتی ہے اور کس سے ملتی ہے یہ فکر ہم کیوں کریں۔"

"کتنی بری بات ہے، ہم ایسے ہی بھاگ جائیں!" رابعہ نے کہا۔

"اس سے زیادہ بری بات ہوگی اگر ہم پکڑے گئے۔ یہ مت بھولو کہ ہم بھاگ رہے ہیں، فرار کی حالت میں ہیں۔ پولیس یا ڈاکٹر کو اطلاع دے کر ہم نے ذرا سے سلئے فرار کے راستے بند کر دیے تو ہمارا ٹھکانا کہاں ہوگا؟"

غالب نے کہا "بالکل ٹھیک۔ ہم ایسی غلطی کا رسک نہیں لے سکتے جو ہمیں مہنگی پڑے۔ وہ بھی اس مرحلے میں جب کہ ہم اپنی منزل کے بہت قریب ہیں۔"

میں نے کہا "جلدی سے کھانے پینے کا سامان باندھ لو۔ دیکھو گھر میں کتنے تھرماس ہیں۔ سب میں کافی بنا کے بھر لو۔ وقت بہت کم ہے۔"

رابعہ اور نازو نے گھر میں سے دو تھرماس فلاسک تلاش کئے۔ ان میں سے ایک بڑا تھا، دو لیٹر والا اور دوسرا چھوٹا ایک لیٹر کا۔ کچن میں کافی بنانے ہوئے بھی ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

میں نے کہا "دیکھو فریج میں جتنا مکھن اور پنیر ہے سب پیک کر لو۔ اس موسم میں خراب کچھ نہیں ہوتا۔"

"ہم ذرا بازار جا کے آتے ہیں دس منٹ میں۔"

"کیا؟ ہمیں اکیلا چھوڑ کے جا رہے ہو دونوں؟" نازو بولی۔

"غالب بولا "اکیلی اور دو دو نوں۔ واہ کیا انداز بیان ہے۔"

میں نے کہا "ایک لاش بھی تو ہے تمہارے ساتھ۔"

نازو نے کہا "مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ایک مردے سے؟ کیا وہ بھوت بن کے چمٹ جائے گا تمہیں بھوت کی بچی" غالب بولا۔

میں نے کہا "ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ جب تک کریا کرم نہ ہو جائے، مرنے والے کی روح یہیں موجود رہتی ہے۔ جسم بوڑھا تھا اس کا مگر رام ناتھ کی روح جوان تھی اور حسن پرست بھی۔"

رابعہ نے کہا "سکندر یا تم پہلے جاؤ یا غالب کو بھیج دو۔ ایسا کون سا بوجھ ڈھو کے لانا ہے۔ یہاں جوزف آگیا تو اس سے کون بات کرے گا؟"

"وہ چلا جائے گا سیدھا اندر یا رام ناتھ کے پاس اور اسے اٹھانے کی کوشش کرے گا" نازو بولی۔

غالب نے ہار مانتے ہوئے کہا "اچھا بابا! میں جاتا ہوں۔ سکندر اعظم ہیں یہاں زندوں اور مردوں سے نمٹنے کے لئے۔"

میں نے کہا "کچھ بھولنا نہیں اور دیر مت لگانا۔"

غالب نے سر ہلایا "بسکٹ کے ڈبے، اسپرین، اینٹی بائیوٹک کیپسول، مرہم پٹی کا سامان، خشک میوہ اور چاکلیٹ، لپ اسٹک، نیل پالش، فیس پاؤڈر، بیوٹی لوشن....."

نازو نے کہا "یہ کس نے کہا ہے؟ میک اپ کا سامان....."

"کہا کسی نے نہیں، نازو مجھے خیال ہے کہ تم واپس اپنے وطن جا رہی ہو۔ جب دلہن میکے لوٹتی ہے تو اس کا بناؤ سنگھار....."

نازو نے اسے کپ کھینچ کے مارا مگر وہ بھاگ گیا۔ کپ دیوار سے ٹکرا کے ایک چھناکے سے بکھر گیا۔ رام ناتھ زندہ ہوتا تو پوچھتا۔ کیا توڑ دیا؟ کی سیٹ غارت کر دیا۔ اب اس دنیا میں ہر کچھ تھا اس کے لئے بے مصرف ہو گیا تھا۔ پہلے ہم اس کی گاڑی لے کر ائیرپورٹ گئے تھے تو اس سے اجازت لی تھی۔ اب غالب کے لئے کسی سے کچھ پوچھنا ضروری نہیں رہا تھا۔ کمرے میں رام ناتھ کی تجوری نوٹوں سے بھری پڑی تھی۔ اگر ہم کوشش کرتے تو نمبروں والا تالا بھی کھول سکتے تھے۔ یہ دولت ہمارے کام آسکتی تھی۔

میں کچھ دیر تذبذب کا شکار رہا۔ کیا یہ چوری کہلائے گی؟ بے شک مالک کی اجازت کے بغیر جو چیز لی جائے وہ چوری کے زمرے میں آتی ہے مگر یہ صورت حال قدرے مختلف تھی۔ کل صبح جب اس کی موت کی خبر عام ہوگی تو پولیس آجائے گی۔ سب پولیس والے فرشتے نہیں ہوتے۔ پاس پڑوس کے لوگ جمع ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بھی لواحقین کے آنے تک سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے گا۔ لاوارث لاش پر گدھ فوراً آجاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی تجوری پر بھی ہاتھ صاف کر دے گا۔ جسے موقع ملا وہ رکھ نہ رکھ لے جائے گا۔ انہیں روکنے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ رام ناتھ کے پاس تو بینک میں بھی بہت رکھا ہوگا۔ یہ بلیک منی تھی جو اس نے چھپا کے رکھی تھی۔ پولیس والوں سے یا چوروں سے زیادہ تو اس کی ضرورت ہمیں تھی۔

بند کمرے کا دروازہ کھول کے میں دبے پاؤں اس کمرے میں داخل ہوا جہاں رام ناتھ دنیا کے جھمیلوں سے بے نیاز سکون سے سو رہا تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے نمبر والے قفل کو گھمانا شروع کیا اور کان اس کی گراری پر لگا دیے۔ پہلا نمبر ملتے ہی خفیف

www.paksociety.com

ہی کلک کی آواز سنائی دی۔ میں نے اسے دائیں بائیں گھمانے کا عمل جاری رکھا۔ باری باری میں نے ہر ہندسے کو آزمایا پھر دوسری بار ہیچ عدد ملنے کی آواز آئی۔ اب شاید ایک نمبر باقی تھا۔ آہستہ آہستہ کان آہٹ پر لگائے میں نمبروں کے الٹ پھیر میں مصروف رہا۔ تیسری بار کھٹکا بہت ہلکا ہوا مگر مکمل سکوت میں میرے کانوں نے یہ آواز سن لی۔

ہینڈل گھماتے ہی تجوری کھل گئی۔ میرے سامنے اوپر نیچے رکھے ہوئے نوٹوں کے بنڈل آ گئے۔ یہ سو سو کے نوٹ تھے جن پر ربر بینڈ چڑھا کے دس دس ہزار کی گڈی بنادی گئی تھی۔ وہاں تھیلی کوئی نہیں تھی چنانچہ میں نے رام ناتھ کی روح سے معذرت کی اور لاش کے سرہانے کے نیچے سے تکیہ نکال کے غلاف اتار لیا۔ تجوری کی رقم میرے اندازے سے بہت زیادہ تھی۔ ایک تکیے کے غلاف میں پچون گڈیاں ہی بھری گئیں۔ پانچ لاکھ چالیس ہزار روپے۔ تجوری میں اتنی ہی رقم اور تھی۔ میں نے دوسرے تکیے کا غلاف بھی اتار لیا۔

رابعہ نے کمرے میں جھانک کے کہا "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"چوری" میں نے کہا اور دوسرے غلاف کو بھرنے میں مصروف ہو گیا۔

"کیا کریں گے ہم اس دولت کا؟" رابعہ بولی "کون اٹھائے گا اتنا بوجھ؟ اور یہ پاکستانی کرنسی تو ہے نہیں۔"

میں نے کہا "ہم اسے تبدیل کرا لیں گے۔"

"اس وقت؟ ہم تو کسی کو جانتے بھی نہیں۔"

"جوزف پیرا کو معلوم ہوگا۔" میں نے کہا "یہ ایک احمقانہ سوال ہے کہ ہم دولت کا کیا کریں گے۔ ہم نہ لے گئے تو صبح یہ سب دوسرے لوگ لے جائیں گے۔ ہم پاکستان میں اتریں گے اور خالی ہاتھ ہوں گے تو مارے جائیں گے۔ اس بوجھ کو ڈھونا ہی پڑے گا۔ ابھی یہ دو تھیلے ہیں مگر تبدیل ہونے کے بعد ایک رہ جائے گا۔ پاکستانی کرنسی کی قیمت بہت کم چل رہی ہے اور چور بازار کے ریٹ تو نصف ہوں گے۔"

اسی وقت باہر سے جوزف کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ میں دونوں تھیلے اٹھا کے باہر نکلا۔ ان کے منہ باندھنے کا کام میں نے رابعہ کے سپرد کر دیا۔

"ہیلو ایوری باڈی" جوزف نے اندر آ کے خوش دلی سے کہا "اپن آگیا ہے سارا بندوبست کر کے۔ یو ریڈی؟"

میں نے کہا "سب تیار ہیں۔ بس ہمارا دوست آجائے۔ وہ بازار سے کچھ دوائیں لینے گیا ہے اور کچھ کھانے پینے کا سامان۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی ہم بابا جی سے ملتا ہے۔"

میں نے کہا "رام ناتھ کو بخار ہے۔ ڈاکٹر نے دوا دی تھی، اس کے بعد وہ سو گیا۔ تم دیکھ لو۔"

وہ میرے ساتھ دروازے تک گیا۔ میں نے ایک پٹ کو تھوڑا سا کھولا اور جوزف کو کمرے کے اندر کا منظر دکھا دیا۔ رام ناتھ کا چہرہ کھلا ہوا تھا اور وہ واقعی گہری نیند میں نظر آتا تھا۔

جوزف نے دروازہ بند کر دیا "او لارڈ میں کا تو خیال ہوگیا ہے۔ کسی دن سوئے گا تو اٹھے گا نہیں۔"

میں نے جلدی سے کہا "جوزف! تم کسی کرنسی ڈیلر سے واقف ہو جو نیپالی کرنسی کو پاکستانی کرنسی میں بدل دے۔"

"او یس۔ مگر ریٹ کم ہوگا۔ ففٹی پرسنٹ۔ کتنا کرنسی ہے؟"

میں نے کہا "تقریباً دس لاکھ۔"

"دس لاکھ!" جوزف کا سانس رک گیا اور آنکھیں پھیل گئیں۔

میں نے کہا "دس پرسنٹ تمہارا ہے۔"

"میں نیپالی کرنسی کو ترجیح دوں گا۔" اس نے کہا۔

"مجھے منظور ہے۔ کیا یہ کام راستے میں ہو جائے گا؟"

"ایک دم ہو جائے گا" وہ بولا "لیکن تم اتنا کرنسی کدھر سے لایا؟"

میں نے کہا "کیفے بزنس کا زیور بیچا تھا۔ میرا خیال ہے ہم سامان رکھ دیں۔ غالب کے آتے ہی نکل جائیں۔"

اس نے سہلا کے تائید کی۔ ابھی ہم نے سامان اٹھایا ہی تھا کہ غالب بھی لوٹ آیا۔ کرنسی سے بھرے ہوئے دونوں بیگ میں نے اٹھا رکھے تھے۔ رابعہ اور ناز و نے غالب کے ساتھ مل کے کھانے پینے کا سامان اٹھا لیا۔ ہم سب جوزف کی جیپ میں بیٹھ گئے۔

"میں یہ چابی رام ناتھ کو دے آؤں" میں نے گاڑی کی چابی دکھا کے کہا "اور اس سے کہہ دوں کہ دروازہ اندر سے بند کر لے۔ ویسے تو دروازہ باہر سے بھی لاک ہو جاتا ہے۔"

میں اندر گیا اور ایک منٹ بعد لوٹ آیا۔ جوزف کو ذرا بھی شک نہ ہوا کہ ہم سب نے مل کے کتنے بڑے سچ کا راز اپنی اداکاری سے فاش نہیں ہونے دیا۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی۔ سرد ہوا ہمارے جسموں کو کاٹنے لگی۔ رام ناتھ کی موت نے سب کے اعصاب کو متاثر کیا تھا مگر جوزف نے اسے ایک غیر قانونی سفر کا خوف سمجھا۔

"ابھی کاہے کو ڈرتا ہے؟ جوزف کئی بار فلائی کیا، کبھی کچھ نہیں ہوا۔" اس نے ڈیش بورڈ کے خانے سے بوتل اٹھا کے شراب کا ایک گھونٹ لیا "ٹھیک دو گھنٹے بعد تم اپنا کنٹری میں ہوگا۔"

میں نے کہا "فارگاڈ سیک، اس وقت تو مت پیو۔"

اس نے قہقہہ مارا "یہ فائن ہے نا مسٹر۔ دیکھو اپن ایک شرٹ میں ہے۔"

میں نے کہا "اچھا وہ کام مت بھول جانا۔ اس میں کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے نا؟ اگر اس نے بدمعاشی کی تو ہم اسے شوٹ کر دیں گے۔"

جوزف ہنسنے لگا "بابا وہ بہت بڑا ڈیلر ہے۔ ایک گودام بھرا ہوا ہے اس کا۔ ہر کنٹری کا کرنسی ہے۔"

جوزف نے غلط نہیں کہا تھا۔ بلیک میں کرنسی خریدنے اور بیچنے والا صبح سے شام تک یہی کام کرتا تھا۔ اس نے سرسری لہجے میں پوچھا کہ کرنسی کتنی ہے اور مجھ سے دونوں بیگ لے کر ایک طرف پھینک دیے۔

وہاں ہر دیوار کے ساتھ ڈھیر کی صورت میں ایسے ہی بہت سے بیگ پڑے تھے۔ بوریاں تھیں اور اوپر نیچے رکھے ہوئے قیمتی بریف کیس سے لے کر ٹین کے صندوق تک تھے۔ یہ سب کرنسی تھی۔ سکہ رائج الوقت "زر" دنیا کی سب سے بڑی طاقت اور انسانوں کے درمیان مناقشت اور مطابقت کا سب سے موثر ذریعہ۔ رشتوں کو تقسیم اور تبدیل کرنے، وفاداری، اصول اور ایمان، ہیرے موتی سے پتھر کے محلوں اور سنگ مرمر کے مقبروں تک سب کچھ اپنی قوت خرید میں لانے والی طاقت۔ جو یہاں کاغذ کے ٹکڑوں کے ڈھیر کی شکل میں اسی طرح پڑی تھی جیسے کچرا گھر میں شہر بھر کی بے مصرف چیزوں کا انبار۔

"کتنا ہے یہ سب؟" اس نے سرسری لہجے میں کہا۔

جوزف نے میری طرف دیکھا اور میں نے سر جھکا کے کہا "پتا نہیں، ہو گا اندازاً..."

"اچھا اچھا" اس نے بیگ کو دیکھ کر کہا "کتنا چاہیے؟"

میں حیران ہو گیا۔ نہ اس نے یہ پوچھا کہ نوٹ چھوٹے ہیں یا بڑے۔ نہ یہ سوال کیا تھا کہ کرنسی کون سی ہے اور اس کے بدلے میں مجھے کس ملک کی کرنسی درکار ہے۔ وہ نوٹوں کو تول کر مالیت کا اندازہ لگانے والا شخص تھا جو دو چار لاکھ کم یا زیادہ ہونے کی پروا نہیں کرتا تھا۔

میں نے کہا "یہ دس لاکھ انڈین کرنسی ہے۔ ہم کو پاکستانی کرنسی چاہیے جتنی بھی مل جائے۔"

"وہ پانچ لاکھ اٹھا لو" اس نے انگلی کے اشارے سے مجھے حکم دیا۔

میں نے اشارے کی سمت میں دیکھا "یہ... بریف کیس؟"

"ہاں۔ اس میں پانچ لاکھ ہیں۔"

میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور بریف کیس اٹھا کے واپس آ گیا۔ میں بھی مجبور تھا کہ اس شخص پر اعتبار کروں جس نے میرے کہنے پر مان لیا تھا کہ اس بیگ میں دس لاکھ ہیں "ٹھیک ہے" میں نے کہا۔

دروازہ بند ہو گیا اور جوزف نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا "ارے چلو بابا، کیسا ٹھیک ہے۔ سال سے بدل مال لیا، بات ختم۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور واپس آ کے جیپ میں بیٹھ گیا۔ جیپ پھر چل پڑی اور شہر سے باہر ایک سنسان، تاریک مقام پر رک گئی جہاں کسی دیوہیکل فولادی پرندے کی طرح ہیلی کاپٹر کا سیاہ ہیولا زیادہ ہیبت ناک محسوس ہوتا تھا۔

رابعہ نے کہا "اس بریف کیس میں کیا ہے؟"

میں نے کہا "پانچ لاکھ، تھوڑا کم یا زیادہ۔ یا پھر کاغذ۔ ہم نے دیکھا نہیں ہے۔"

جوزف نے جیپ سے چھلانگ مار کے کہا "ابھی اندر۔ باتوں کا کام نہیں ہے۔"

ایک ایک کر کے ہم سب ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گئے۔ اس کے انجن نے اسٹارٹ لیا تو میرا سانس رک گیا۔ سسپنس اور اعصابی کشیدگی نے سب کو اپنی گرفت میں یوں جکڑ رکھا تھا کہ ہمارے جسم اور ذہن مفلوج ہو رہے تھے۔ بالآخر ہم پاکستان جا رہے تھے لیکن بے یقینی کی دھند ابھی تک باقی تھی۔ نامعلوم آوازوں کی سرگوشی ہر سمت سے صدا دیتی تھی۔ بھاگو! بھاگو! موت تعاقب میں ہے۔ اجل وہ شکاری ہے جو نظر نہیں آتا۔ اندھیرے میں پرواز کر کے تم کہاں تک جا سکتے ہو؟ وہ تو ہر جگہ ہے۔ ہر سانس کے پیچھے اور دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ ہے....

ہیلی کاپٹر نے پرواز کی۔ میں نے رابعہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد ہو رہا تھا اور وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ ہم سب ہیلی کاپٹر کے فرش پر ایک دوسرے کے ساتھ ملے بیٹھے تھے اور بار بار ایک دوسرے پر گر جاتے تھے۔

بالآخر جوزف نے ایک قہقہہ مارا۔ ہم سب اچھل پڑے۔

"ابھی کیا ہو گیا سالا تم کو؟ اتنا کاہے کو ڈرتا ہے" اس نے منہ

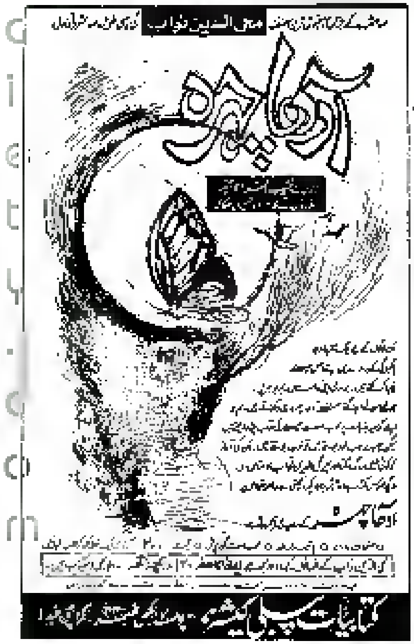

www.paksociety.com

ے شراب کی بوتل لگائی "سمجھو تم پاکستان میں پہنچ گیا۔"

میں نے کہا "واقعی؟" تو میرے حلق سے عجیب مضحکہ خیز سی آواز نکلی جو میری اپنی آواز نہیں لگتی تھی۔

"ایک گھنٹہ، ساٹھ منٹ، چھتیس سو سیکنڈ۔" جوزف بولا "ہر سیکنڈ کو کاؤنٹ کرو مگر اس سے پہلے ہمارا حصہ کاؤنٹ کرو۔ ہم کو [illegible] دے دو۔"

میں نے کہا "کیوں نہیں۔ رابعہ، بریف کیس میں سے پچاس ہزار نکال کے مسٹر جوزف کے لئے رکھ دو۔"

رابعہ نے بریف کیس کھولا۔ اس میں پاکستانی کرنسی تھی۔ یہ سو سو کے نئے نوٹ تھے۔ اس نے پانچ گڈیاں نکال لیں۔ جوزف نے ان کو کاک پٹ کی ایک پاکٹ میں ڈال دیا۔

اچانک غالب نے ایک انتہائی جذباتی مگر غلط حرکت کی۔ اس نے چیخ کر کہا "نازو! ہم گھر پہنچ گئے" اور ایک دم نازو کو اپنی طرف کھینچ کے چوم لیا "میری جان! ہم اپنے پاکستان....."

نازو نے سہم کر چیخ ماری اور غالب کو دور دھکیلا "تم.... تم پاگل ہو رہے ہو کیا؟" اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔

"ہاں.... ہاں میں پاگل ہو گیا ہوں" غالب نے زور زور سے ہنسنا شروع کیا اور مجھ سے لپٹ گیا "سکندر.... سکندر اعظم، چیف کے ٹوکی دم، تیری ایسی کی تیسی۔"

میں نے اسے مکا مارا "الو کے پٹھے۔ مرزا غالب کی اولاد۔"

پھر ہم سب چیخ چیخ کے ہنسنے لگے اور ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ ہم واقعی پاکستان پہنچ گئے تھے۔ اپنے وطن، اپنے شہر، اپنے شہر کی گلیوں اور اپنے گھروں کا خواب ایک حقیقت بن کر سامنے آ رہا تھا۔

جب جوزف نے کہا "او بابا! کیا شور کرتا ہے تم سب لوگ۔ ناہین کو بھی پنگل کرے گا کیا۔ تیاری کرو۔ ہم ابھی پاکستان کا بارڈر کراس کیا ہے۔"

میں نے اور غالب نے پھر چلا کے کہا "پاکستان۔" اور ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ہم دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ رابعہ بھی رو رہی تھی، نازو بھی رو رہی تھی۔ بے خودی اور دیوانگی کے عالم میں رابعہ کے ساتھ میں نے بھی وہی جذباتی حرکت کی جو غالب نے کی تھی اور کمال یہ ہے کہ رابعہ نے مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس وقت ہم میں سے کسی کو بھی اپنا ہوش نہ تھا۔

"چلو اب تیاری پکڑو۔ ہم پچاس کلومیٹر اندر ہے۔ ادھر ہم ڈراپ کرے گا تم کو۔"

"ڈراپ کرے گا! کیسے؟" میں نے کہا "پیرا شوٹ سے؟"

جوزف نے قہقہہ مارا "پیرا شوٹ.... دیکھو ادھر ایک رسی ہے، اس کو پکڑو اور لٹک جاؤ۔ ہم ہیلی کاپٹر کو نیچے لے جائے گا۔"

"کیا مطلب، تم جہاز کو اتارو گے نہیں؟" میں نے چلا کے کہا۔

"نہیں۔ ہم بہت نیچے جائے گا۔ کچھ فٹ رہ جاتی ہے۔ تم تھوڑا چھلانگ مارے گا....." وہ بولا "کم ان، ڈرنے کا بات نہیں ہے۔"

میں نے باہر جھانک کے دیکھا مگر اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ غالب نے ہیلی کاپٹر سے رسی نیچے لٹکا دی۔

"جلدی.... جلدی....." جوزف چلایا "ہمت کرو تھوڑا۔"

غالب رسی پر پھسلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں نے سرد، تاریک رات کی ہوا کو جسم پر آرے کی طرح محسوس کیا اور جب رسی کا تناؤ ختم ہوا تو سمجھ گیا کہ غالب لینڈ کر چکا ہے۔ کہاں اور کس حال میں، یہ ہم جان ہی نہیں سکتے تھے۔

"پہلے میں جاؤں یا تم جاؤ گی؟" میں نے کہا۔

نازو کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا تھا مگر اس نے کہا "میں جاؤں گی، خدا حافظ۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔"

اب میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ نیچے پہاڑ تھے اور درخت تھے یا ہموار میدان تھا۔ برف تھی یا چٹانیں، ہمیں کچھ نہیں دکھ سکتا تھا اور مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ جہاں رسی ختم ہو گی وہاں سے زمین تک کتنا فاصلہ ہو گا۔

"تم.... میں جاؤں؟" رابعہ نے بمشکل تمام کہا اور پھر مجھ سے لپٹ گئی "سکندر! مجھے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے اسے تسلی دی "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ چلو ہم ایک ساتھ اترتے ہیں۔ تھوڑا سا آگے پیچھے۔ رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا اور نیچے مت دیکھنا۔ آنکھیں بند رکھنا۔ چلو شاباش۔"

رابعہ نے رسی کو پکڑا "تم.... آ رہے ہو نا۔"

اسی وقت ہیلی کاپٹر کو ایک جھٹکا لگا۔ جوزف نے چیخ کر کہا "سالا کباڑا ہیلی کاپٹر کا ناٹک ڈرامہ بولتا پڑا ہے۔"

انجن نے دوسری ہچکی لی اور بند ہو گیا۔ جیسے کوئی کار چلتے چلتے ایک دم رک جائے۔ جوزف نے گالی دے کر اسے پھر اسٹارٹ کیا اور تھوڑا سا آگے لے گیا۔ ہیلی کاپٹر اوپر اٹھا اور پھر نیچے آیا۔ جوزف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے نیچے دیکھ رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔

"ابھی لٹکو، ابھی ہم بولے گا تو تم کودے گا۔"

رسی اندھیرے میں کسی لمبے کالے سانپ کی طرح لہرا رہی تھی۔ میں نے رابعہ کو ایک ہاتھ سے سمیٹ کر اپنے ساتھ لگا رکھا تھا مگر وہ خزاں کی ہوا کا مقابلہ کرنے والے کمزور درخت کی طرح کانپ رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر نہ جانے کدھر جا رہا تھا۔ غالب اور نازو بہت پیچھے رہ گئے تھے مگر مجھے یقین تھا کہ ہم انہیں تلاش کر لیں گے۔

ہم جوزف کے اشارے کے منتظر تھے۔ ہیلی کاپٹر نیچے ہو گیا اور جوزف نے سر گھما کے ہمیں دیکھا۔ اسی وقت ایک زوردار دھماکا ہوا۔

پائلٹ نے چیخ کر گالی دی۔ ہیلی کاپٹر ایک دم کٹی پتنگ کی طرح فضا میں ڈولنے لگا۔

"نوٹنڈ۔ سیپ زنٹ۔" جوزف دیوانوں کی طرح چلا کے "رانی بورانٹ نوڈائی ورہی؟" (تم میرے ساتھ کیوں مرنا چاہتے ہو؟)

میں نے رابعہ کو کھلے دروازے کی طرف دھکیلا۔

"جمپ.... جمپ....." اس نے رابعہ کو ایک گندی گالی دی۔

ہیلی کاپٹر ایک دم اوپر اٹھا، پھر نیچے آیا اور پھر یوں گھوما جیسے کسی گھومتے رائی کو ہاتھ مار کے گھما دے۔ یہ دست اجل تھا جس نے اچانک ہیلی کاپٹر کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ ابھی تک میں نے وہ شعلہ نہیں دیکھا تھا جو ہیلی کاپٹر کی دم پر بھڑک اٹھا تھا۔ اب مجھے صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ ہیلی کاپٹر کسی لمحے گر کے تباہ ہو سکتا تھا۔ اس کے پچھلے حصے میں لگی ہوئی آگ بجھائی نہیں جا سکتی تھی۔ رابعہ رسی کو تھام کے اتر چکی تھی۔

میں نے دروازے میں سے کہا "جوزف! یہ کیا ہو گیا اچانک؟"

اس نے ایک قہقہہ مارا جو بے جان، کھوکھلا اور موت کے قریب سے آتا ہوا محسوس ہوتا تھا جیسے پھانسی کے کنویں سے سنائی دینے والی کسی کی آخری چیخ۔

"تمہارا اپنے ہی پکڑا ہے بابا۔" اس نے ہیلی کاپٹر کو قابو میں رکھنے کی دیوانہ وار جدوجہد کو جاری رکھا "آئی ہیو بین ہٹ" (مجھے مار گرایا گیا ہے۔)

"کس نے ہٹ کیا ہے؟" میں نے نیچے جھانک کر رابعہ کو رسی پکڑے دیکھا۔

"یہ تمہارا پاکستانی گن تھا۔" وہ پھر ہنسا "بوبی، جوزف انڈین سالا۔ پاکستان میں آ کے مرا۔ اینڈ یو نو؟ آئی ایم ناٹ اے شہید مین" (میں شہید بھی نہیں کہلاؤں گا۔)

میں نے کودنے سے پہلے آخری بار کہا "تم کود کیوں نہیں لیتے؟"

"کیا تم چاہتے ہو میں آخری وقت میں بزدل بن جاؤں، اپنے اس خوب صورت پرندے کو اکیلا جل جانے دوں؟ وی ڈائی ٹوگیدر (ہم ایک ساتھ جان دیں گے) ہری۔ جمپ۔ گیٹ سٹ۔"

میرے ہاتھوں نے رسی کو تھاما اور دوسرے لمحے میں فضا کی گہرائی میں جھولنے لگا۔ رسی کسی سانپ کی طرح بل کھا رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر کی حرکت کے ساتھ ساتھ اس کا رخ بدل جاتا تھا۔ رسی کے آخری سرے پر رابعہ ابھی تک لٹک رہی تھی اور آگ نے ہیلی کاپٹر کی دم کو نگل لیا تھا۔ سرد، منجمد کر دینے والی رات میں درختوں کے جھنڈ اور خزاں کی پاگل ہوا کا رقص جاری تھا۔ یہ ہوا شعلوں کو ذرے ذرے بکھیر رہی تھی، ہیلی کاپٹر کے اس حصے کی طرف جہاں ایک زنگی شرابی، اپنی جان اور پچاس ہزار نقد کی پروا کیے بغیر موت کو ہنستے ہنستے گلے لگانے پر تیار بیٹھا تھا۔

عین رابعہ کے سر پر پہنچ کے میں نے زمین کو اچانک اوپر اٹھتے دیکھا اور سمجھ گیا کہ ہیلی کاپٹر تیزی سے نیچے آ رہا ہے۔

"رابعہ، رسی کو چھوڑ دو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

رابعہ نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا مگر رسی کو نہیں چھوڑا۔

اس روز پہلی بار میں نے رابعہ کو وہ گالیاں دیں جن کو یاد کر کے میں بعد میں اکثر شرمندہ اور حیران ہوا کہ ذرا ایسے فحش الفاظ میری زبان سے اس عورت کے لیے کیسے ادا ہوئے؟ کیا یہ موت کا خوف تھا یا زندگی کی محبت تھی؟ رابعہ کے ساتھ مرنے جینے کی قسم کھانا آسان تھا مگر وقت آیا تو مجھے پتا چلا کہ میں اس کے ساتھ صرف جینا چاہتا تھا۔

رابعہ نے رسی کو چھوڑ دیا۔ تاریکی میں اس کا سفید سایہ کسی پاکیزہ آسمانی روح، کسی بادل کے بادبان یا کسی امن کی فاختہ کے پچھلے پروں کی طرح دکھائی دیا۔

نیچے زمین، میرے وطن کی زمین برف کی دبیز چادر اوڑھے لیٹی تھی۔ ماں کی مہربان آغوش مجھے بلا رہی تھی۔ تو میرے بچے، میری عزت کے رکھوالو۔ آؤ اور سو جاؤ۔ دیکھو میں نے تمہارے آرام کے لیے کیسا بے داغ، سفید بستر بچھا دیا ہے۔ میرے سکندر اعظم، تم اور تمہاری رابعہ کتنے حسین لگ رہے ہو، ہنس کے جوڑے کی طرح پرواز کرتے ہوئے۔

میں نے رابعہ کو برف میں غائب ہوتے دیکھا۔ دوسرے لمحے میں خود اسی برف میں اتر گیا جو دھنکی ہوئی روئی کی طرح تا حد نگاہ پھیلی ہوئی تھی۔ درد کی ایک لہر نے میری ٹانگ کو کاٹ دیا۔ تاریکی نے مجھ پر یلغار کی مگر اندھیرے کے سمندر میں ڈوبنے سے پہلے میری آنکھوں نے ایک شعلے کو رقصاں دیکھا۔ جیسے برق فروزاں ہو سر وادی سینا۔ آخری آواز کیا تھی؟ کوئی دھماکا ہوا تھا۔ شاید زمین پھٹ گئی تھی یا آسمان گر گیا تھا۔ یہ کون ہنسا تھا؟ بوبی، جوزف بڑا لالچی اور کمینہ تھا، شرابی اور عیاش تھا۔ مگر وہ بزدل نہیں تھا۔ اس نے موت کو شکست دی۔ اگر وہ چاہتا تو ایک بٹن دبا کے خود کو اجیکٹ (EJECT) کر سکتا تھا مگر اس نے رسوا ہو کے جینے سے انکار کر دیا۔ دوسرے شہیدوں میں نام نہیں لکھوا سکتا تھا مگر وہ زندہ پکڑا جاتا تو اس پر ایک ملک میں جاسوسی کا اور پھر دوسرے ملک میں غداری کا الزام ضرور آتا۔ وہ بے گھر اور بے وطن ہوتا اور آخر کار اسے سزائے موت سنائی جاتی۔ چنانچہ اس نے باعزت موت کو ہنستے ہنستے گلے لگا لیا۔ رام ناتھ اپنے لاکھوں کے ساتھ بستر میں لیٹ کے مر گیا تو کیا اور جوزف اپنے پچاس ہزار کے ساتھ جل کر مر گیا تو کیا۔ جینے کی طرح مرنے کے بھی تو اپنے اپنے انداز ہوتے ہیں۔

نہ جانے کتنی صدیاں برف میں مدفون رہنے کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں کہ دنیا کو دیکھا تو نیلے آسمان کی شوخ چمک نے میری نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ میرے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور میرا جسم

www.paksociety.com

ٹھوس برف کے اعصاب سے بنا ہوا لگتا تھا۔ میں برف کی ایک سل تھا یا مجسمہ تھا جو اب دھوپ کی تمازت سے پگھل رہا تھا۔

میں نے سر کو گھما کے دائیں اور بائیں جانب دیکھنے کی کوشش کی اور اس چھوٹی سی کامیابی نے وہی کام کیا جو ایک چھوٹا سا سوئچ کرتا ہے، جس سے کسی فانوس کے سارے چراغ روشن ہو جائیں۔ یا وہ لیور کرتا ہے جس کو دبانے سے دھماکا ہوتا ہے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کے بکھر جاتے ہیں، دیو ہیکل مشینوں کے سارے پرزے متحرک ہو جاتے ہیں اور خلائی سفر پر روانہ ہونے والا راکٹ چاند اور مریخ کے راستے پر چل پڑتا ہے۔

میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ میری ٹانگ میں پھر درد نے انگڑائی لی لیکن اب یہ درد میرے احساس کو شکست دینے سے قاصر تھا۔ زندگی کا یقین قوی تر تھا اور ہر خوف کے خلاف عزم کی ڈھال بن گیا تھا۔

پہلے برف سے منعکس ہونے والی دھوپ کی اجلی روشنی نے مجھے چند لمحوں کے لیے اندھا کر دیا پھر آہستہ آہستہ اردگرد کا منظر میری آنکھوں پر عیاں ہونے لگا۔

مجھ سے پچاس قدم کے فاصلے پر رابعہ اوندھی پڑی تھی۔ اس کے اوپر کی برف بھی پگھل کر بہہ گئی تھی مگر اس کے چاروں طرف پرانی ٹھوس برف پر دھوپ کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

اپنے ہاتھوں کو برف پر ٹکا کے اور ایک پاؤں پر سارا زور ڈال کے میں کھڑا ہو گیا۔ میری دوسری ٹانگ میں درد کی ٹیس اٹھی۔ میں نے اس کو دبا کے اور ہلا کے دیکھا۔ پنڈلی سے ٹخنے تک کا حصہ نیلا ہو رہا تھا اور سوج گیا تھا لیکن خوشی کی بات یہ تھی کہ ٹانگ کی کوئی ہڈی ٹوٹی نہیں تھی۔ درد کو برداشت کرتے ہوئے میں چل سکتا تھا۔

لنگڑاتے ہوئے میں نے وہ پچاس قدم کا فاصلہ دس منٹ میں طے کیا۔ میرے قدموں کے نیچے سب سے بڑا سہارا میرے وطن کی زمین تھی جو حوصلہ دیتی تھی اور اعتماد عطا کرتی تھی کہ یہاں میں محفوظ ہوں، میرے دشمن تعاقب میں نہیں ہیں اور اگر میں چاہوں تو زندہ بھی رہ سکتا ہوں اور وہی زندگی ایک تعبیر بن سکتی ہے جو آج تک میرا خواب تھی۔

میری نگاہیں دور دور تک برف دیکھ رہی تھیں۔ درخت اگر جاندار ہوتے ہیں تو بلاشبہ وہاں زندگی تھی مگر انسان کا وجود صرف میری ذات تک محدود تھا یا رابعہ اگر زندہ تھی تو ہم عرش کی بلندی سے فرش کی پستی میں پہنچنے والے آدم و حوا کی طرح اس کائنات کی ویرانی میں نسلِ انسانی کی علامت تھے۔ ہمارے سوا تاحدِ نظر کسی ذی روح کا وجود نہ تھا۔

تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر اس برف کی چادر پر دوسرا داغ ایک ہیلی کاپٹر کا جلا ہوا سیاہ ڈھانچہ تھا جس کا نصف حصہ ٹھوس برف کو توڑتا ہوا زمین بوس ہو گیا تھا۔ جو حصہ برف سے اوپر تھا اس کی آگ بھی سرد پڑ چکی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہیلی کاپٹر کو گرے ہوئے کافی وقت گزر چکا ہے ورنہ اس کے ملبے سے تھوڑا بہت دھواں بھی اٹھتا نظر آتا۔ فولادی ڈھانچے کے اندر ایک انسانی ڈھانچہ بھی بکھرا پڑا تھا۔ کچھ ہڈیاں، کچھ گوشت کے ریشے اور کچھ خون کے داغ جن تک آگ نہ پہنچ سکی تھی۔ زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب۔ موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا۔

میں نے بڑی مشکل سے جھک کر رابعہ کو سیدھا کیا۔ اس کا جسم برف سے زیادہ ٹھنڈا تھا مگر وہ زندہ تھی۔ جب میں نے اس کا ایک ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں دبا کر رگڑا تو حرارت کے آثار نمودار ہوئے۔ چلنے سے میرا اپنا جسم کچھ گرمی اور توانائی حاصل کر چکا تھا۔ دھوپ کی تمازت نے اور اس سے زیادہ زندہ رہنے کی خواہش نے مجھے اتنا حوصلہ عطا کر دیا تھا کہ آخری سانس تک جاری رہنے والے سفر میں رابعہ کو اپنے ساتھ لے کر چل سکوں۔

میں نے اسے تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور اس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ وہ بے ہوشی میں بیٹھی رہی لیکن برف کی سطح سے دور ہو کے اس کا جسم میرے جسم کی حرارت تو جذب کر سکتا تھا۔ سامنے سے وہ دھوپ لے رہی تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا چہرہ جو پہلے لاش کی طرح سفید تھا، رفتہ رفتہ حرارت سے زندگی پانے لگا تھا۔

ایک مشینی انداز میں رابعہ کے ہاتھوں اور پیروں کو رگڑتے ہوئے اور حرکت دیتے ہوئے میں نے یہ بھی دیکھا کہ چند چوٹوں کے سوا اس کے اعضا سلامت ہیں۔ یہاں کسی قسم کی امداد کا تصور بھی محال تھا اور کسی دوا کی آرزو کرنا اس فرمائش سے کم نہ تھا جو کھیلنے کے لیے چاند کی مٹی کا کھلونا مانگے۔

یہ عجیب بات تھی کہ اس وقت مجھے رابعہ کے سوا کسی کا خیال آیا بھی تو بس خیالِ خوابِ فردا کی طرح۔ مجھے یاد تھا کہ حادثہ ہوا تھا اور حادثے سے پہلے کیا ہوا تھا۔ نازو کے بعد محسن اور وہ بھی برف کے اس صحرا کی ویرانی میں کہیں موجود تھے، امید کے ساتھ زندہ کہ ہم آخرکار انہیں تلاش کر لیں گے اور انہیں بچانے آ جائیں گے۔ لیکن ہے ہماری طرح وہ بھی سمت کا تعین کر رہے ہوں، کوئی سراغ تلاش کر رہے ہوں اور امید کے آسرے پر محوِ سفر ہوں یا کچھ بھی نہ ہو۔ نازو اور غالب وقت کے کتبے پر لکھے ہوئے دو نام رہ گئے ہوں۔ یادوں کے مدفن میں بس دو نشانیاں۔ ان کے جسم بھی ایک دوسرے سے اتنے دور ہوں جتنی دور وہ زندگی سے تھے۔

لیکن یہ خیال مجھے رابعہ کو پھر زندگی کی طرف لاتے ہوئے خواہشوں، دعاؤں اور کوششوں کے ساتھ نہیں آیا۔ یہ سب میں نے بہت بعد میں سوچا۔ اس وقت تو میں رابعہ کو پکارتا رہا اور آہستہ آہستہ اس کے رخساروں پر نمودار ہونے والی سرخی کو یوں دیکھتا رہا جیسے صبح کا انتظار کرنے والا افق کے کناروں پر شفق کو پھیلتا۔

مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ میری کوشش کب بار آور ہوگی اور میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ رابعہ کے ہوش میں آنے کے بعد میں کیا کروں گا۔ پوری یکسوئی کے ساتھ میں اس کے وجود میں اتنی حرارت اور توانائی بھرتا رہا جتنی اسے ایک بار آنکھیں کھول کر میرا نام پکارنے کے لیے درکار تھی۔

مجھے کسی حرفِ دعا کی ضرورت نہیں تھی۔ زبان کا ذریعۂ اظہار انسانوں کے لیے ہے۔ خدا تو دل کی آواز سنتا ہے اور میرے دل کی ہر دھڑکن ایک دعا تھی جو مسلسل عرش کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ اس کے انصاف کو پکار رہی تھی جو رحمان ہے اور رحیم ہے کہ مجھے رابعہ بھی چاہیے ورنہ یہ زندگی بھی نہیں چاہیے۔ کیونکہ میں نے اس سے وہ پیار کیا ہے جس کے دامن پر کوئی داغ نہیں، جس پر مجھے کوئی ندامت نہیں کیونکہ اس پر کسی لمحے بھی ہوس کا الزام نہیں آیا۔

دوپہر کا سورج سر پر آیا تو رابعہ نے آنکھیں کھول کے اور کراہ کے کہا "سکندر! تم میرے پاس ہو نا۔"

اور میں نے اسے چوم کے کہا "میں کب تم سے دور تھا میری جان۔" رابعہ نے ایک گہری سکون کی سانس لی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے کہا "رابعہ اٹھو، آؤ اپنے گھر چلیں۔"

رابعہ نے پھر آنکھیں کھول لیں "یہ... یہ اپنا گھر نہیں ہے کیا؟"

میں نے کہا "یہ اپنا پاکستان ہے۔ پاکستان میں ایک شہر ہے، وہ کہتے ہیں نا جنے لہور نئیں ویکھیا او جمیا ای نئیں۔"

"لاہور" اس نے زیرِ لب کہا "ہاں۔ اور لاہور میں ماڈل ٹاؤن ہے نا؟ وزیر خان نے وہیں بتایا تھا ایک گھر ہمارے لیے۔ میں وہاں۔ وہاں مرنا چاہتی تھی۔ مجھے وہاں لے چلو سکندر۔"

میں نے اس کے آنسوؤں کو پی لیا "میں تم کو وہیں لے جاؤں گا رابعہ گھر مرنے کے لیے نہیں، جینے کے لیے۔ میرے ساتھ جیو گی نا۔ تم نے وعدہ کیا تھا۔ اٹھو ہمت سے کام لو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ تم اٹھ کے چل سکتی ہو نا۔ میں سہارا دوں گا تمہیں۔ شاباش، چلو اٹھو۔"

میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش میں اپنے جسم کی ساری توانائی صرف کر دی۔ آخرکار وہ کھڑی ہو گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

میرا سانس پھول گیا تھا۔ یہ گلگت یا چترال کا علاقہ تھا اور ہم سطح بلندی پر تھے جہاں آکسیجن کم ہو جاتی ہے۔

میں نے کہا "دیکھو رابعہ! ہم کو اس برف کے صحرا کو عبور کر کے کسی آبادی تک پہنچنا ہے رات ہونے سے پہلے۔"

رابعہ نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا "ہمیں پہلے ان کو تلاش کرنا ہے سکندر، نازو اور غالب کو۔"

"مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ وہ کہاں کو رہے تھے لیکن ہم انہیں ضرور تلاش کریں گے۔ تم چل سکتی ہو نا؟ کوئی ہڈی تو نہیں ٹوٹی ہے؟"

رابعہ نے باری باری دونوں ہاتھ ہلائے پھر دونوں پیروں کو حرکت دی "نہیں، مگر چوٹیں آئی ہیں۔ میں نہ جانے کتنی بلندی سے گری تھی۔ بس برف نے بچا لیا۔ نرم روئی کی طرح برف کا ڈھیر تھا۔ اب تو پگھل کے بہہ گیا۔"

میں نے کہا "تمہارے کپڑے گیلے ہیں، سوکھ جائیں گے کچھ دیر میں۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ تمہیں نمونیہ نہ ہو جائے۔"

وہ آہستہ سے مسکرائی "تمہارے ساتھ مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن...... وہ کیا ہے؟ ہیلی کاپٹر؟"

"ہاں۔ پہلے ادھر ہی چلتے ہیں۔" میں نے کہا اور رابعہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگے۔

"یہ حادثہ کب ہوا تھا سکندر۔ کل رات یا پرسوں رات؟"

"میرا خیال ہے کل رات۔ پرسوں رات کی بات ہوتی تو ہم زندہ کیسے رہتے۔" میں نے کہا۔

"اس وقت کیا بجا ہوگا؟"

"بارہ، ساڑھے بارہ۔"

"گھڑی نہیں ہے کیا؟" رابعہ بولی۔

"ہے مگر دو بج کے دس منٹ پر رک گئی ہے۔" میں نے کہا "حادثے کا یہی وقت ہوگا۔"

"یعنی دس گھنٹے ہو گئے۔ کیا یہ معجزہ نہیں ہے کہ ہم زندہ ہیں۔ اتنی دیر برف میں دفن رہ کے کون زندہ رہتا ہے۔"

"ہاں۔ ہم بہت خوش قسمت لوگ ہیں۔ جوزف اتنا خوش قسمت نہیں تھا۔"

"کیا وہ مر گیا؟"

میں نے ہیلی کاپٹر کے شکستہ اور سوختہ ڈھانچے کی طرف دیکھ کر آہ بھری "ہاں رابعہ! پاگل آدمی تھا وہ، بالکل پاگل۔ جیسے جیا ویسے ہی مر گیا اپنی مرضی سے۔ میرے کہنے سے وہ نہیں مانا۔"

"تم نے کیا کہا تھا؟"

"وہ ہیلی کاپٹر سے نکل سکتا تھا۔ بس ایک بٹن دباتا اور سیٹ خود اسے فضا میں اچھال دیتی۔ پیراشوٹ خود بخود کھل جاتا اور وہ آرام سے اتر جاتا۔"

"پھر اس نے کیوں نہیں مانی تمہاری بات؟"

"میرا خیال ہے وہ ڈرتا تھا کہ پکڑا جائے گا تو دھوبی کا کتا ہو جائے گا۔ یہاں اس پر مقدمہ چلے گا کہ وہ غیر قانونی طور پر پاکستان کی فضائی حدود میں داخل ہوا، جاسوسی کرنے کے لیے۔ اسے نیچے سے کسی نے نشانہ بنایا تھا۔"

رابعہ نے حیرانی سے کہا "کس نے؟"

"غالباً سرحد کی حفاظت کرنے والوں نے۔ وہ بھی غافل نہیں ہوتے۔ پہلے اتفاق رہا یا خوش قسمتی کہ وہ آتا تھا اور نکل جاتا تھا۔"

www.paksociety.com

ہمارا خوش قسمتی ساتھ نہیں دے رہی۔"

"ہاں۔ اس بار شامتِ اعمال جن کے دم جو ساتھ ہو گئے تھے۔ بڑے سبز قدم ہیں ہم لوگ۔" رابعہ نے احساسِ جرم کے ساتھ کہا "جس نے ہمارا ساتھ دیا، ہماری مدد کی، وہی مارا گیا۔"

"ایسا مت سوچو۔"

"مجھ سے اب چلا نہیں جاتا۔" رابعہ نے کہا "میرے بازو میں اور اس طرف پسلیوں میں۔ اور اس ٹانگ میں گھٹنے سے اوپر درد ہے۔"

میں نے کہا "گرنے سے چوٹ تو آتی ہے۔ یہ دیکھو کہ کوئی فریکچر ہوتا تو ہم ہل بھی نہ پاتے۔ وہیں پڑے پڑے سردی اور بھوک سے اکڑ کے مر جاتے۔"

"اب بھی کیا ہو گا۔" وہ مایوسی سے بولی۔

میں نے اسے کمر میں ہاتھ ڈال کے سہارا دے رکھا تھا اور خود بھی اس کے سہارے پر لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ ہمارے آس پاس لمبے تنوں والے پہاڑی درخت تھے جن کی خزاں رسیدہ بے برگ شاخیں ویرانی کے تاثر کو مزید گہرا کرتی تھیں۔ بہت بلندی پر چیل یا عقاب جیسے پرندے سیاہ دھبوں کی طرح نمودار ہو گئے تھے۔ اچانک برف کی چٹان کے پیچھے سے ایک لومڑی نمودار ہوئی۔ اس نے غور سے ہمیں دیکھا اور بے پروائی سے لوٹ گئی۔ پھر ایک برفانی گلہری نے برف کے بل سے سر نکالا۔

رابعہ نے سہم کے کہا "یہاں جنگلی جانور بھی ہوں گے۔"

میں نے کہا "ڈرو نہیں۔ یہ کسی کو کچھ نہیں کہتے جب تک بھوکے نہ ہوں۔"

"یہاں ان کو کھانے کے لیے کیا ملتا ہو گا؟"

"جس کا رزق جہاں ہو اسے مل جاتا ہے۔" میں نے کوئی اطمینان بخش جواب نہ پا کے ایک فلسفیانہ خیال پیش کیا۔

"ہمیں کیا ملے گا یہاں؟"

"دیکھو، ہیلی کاپٹر ایسے ہی حادثے کا شکار نہیں ہوا تھا۔ اسے زمین پر سے نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی کہ اس علاقے میں بھی ہماری سرحدوں کے محافظ موجود ہیں۔ وہ ضرور گرنے والے ہیلی کاپٹر کا ملبہ تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ اگر ہم اس جگہ سے دور نہ گئے تو جلد وہ یہاں آ جائیں گے۔"

"کب آئیں گے؟ جب ہم بھوک اور سردی سے اکڑ کے مر چکے ہوں گے۔" رابعہ پر سخت قنوطیت طاری تھی۔

"نہیں، وہ بہت جلد آئیں گے۔" میں نے کہا۔

ہیلی کاپٹر کے قریب پہنچ کر میں نے رابعہ کو ایک خشک چٹان کے ہموار حصے پر بٹھا دیا۔ برف پگھل چکی تھی اور اب چٹان سے ایک توانائی بخش حرارت پھوٹ رہی تھی۔

میں نے کہا "تم یہاں آرام کرو، میں ہیلی کاپٹر کے اندر دیکھتا ہوں۔"

"اندر کیا دیکھو گے؟ جوزف کی جلی ہوئی لاش۔ سب اسے۔" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "ممکن ہے کچھ کھانے کو مل جائے۔"

"بیچنے کو اس کے پاس ایک ہی چیز تھی۔" رابعہ مسکرائی "گئے؟"

میں نے کہا "وہ میں تمہاری آنکھوں سے پی لیتا ہوں۔"

ہیلی کاپٹر کا ڈھانچہ ہر طرف سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے دور دور تک بکھرے پڑے تھے اور برف جانے کے بعد دھوپ میں چمک رہے تھے۔ دروازہ برف کی رضنا ہوا تھا مگر مجھے اندر داخل ہونے کے لیے کسی دروازے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ حادثے کے بعد ہیلی کاپٹر کا درمیانی حصہ یوں کھل گیا تھا جیسے کسی نے چھری سے اس کو چیر دیا ہو۔

میں دھوئیں سے سیاہ ڈھانچے کے اوپر چڑھا۔ یہ بہت اور خطرناک کام تھا۔ دھات کے نوکیلے اور تیز کنارے ہر طرف مڑ چکے تھے۔ میرا پیر کہیں بھی پھسل جاتا تو وہ نوکیلے کنارے میرے جسم کے چیتھڑے اڑا دیتے۔

جوزف اندر کہیں نہ تھا۔ اس کے اعضا جسم سے الگ اندر ہی جل گئے تھے۔ اس کا دھڑ پائلٹ کی سیٹ پر رکھا تھا کیونکہ وہ بیلٹ سے بندھا ہوا تھا۔ دھڑ بھی جلی ہوئی شکستہ ایک پنجر تھا جس کے نہ ہاتھ تھے نہ پاؤں۔ سر کی جگہ ایک بدہیئت گولا سا نظر آ رہا تھا۔

براہِ راست اندر آنے والی دھوپ نے اس بھیانک تمام تفصیلات کو روشن اور عیاں کر دیا تھا۔ میں نے تھوڑی کے بعد اس کا ایک ہاتھ دریافت کیا جو کہنی سے ایک نیچے سلامت ہو گیا تھا مگر سالم تھا۔ اس کے کپڑے اور کاغذ سب جل گئے تھے۔ پھر وہ کاغذی نوٹ کیسے سلامت رہ سکتے کی خاطر اس نے زندگی کو داؤ پر لگایا تھا۔

میں نے ملبے کو کھنگالا تو مجھے وہ ادھ جلا ہوا بیگ مل گیا میں ہم نے کھانے پینے کا سامان بھرا تھا۔ بسکٹ جل کر کوئلہ تھے۔ مکھن اور پنیر پگھل کر بہہ گئے تھے مگر چند ابلے انڈے بیگ کے نیچے سے صحیح حالت میں نکل آئے۔ میں نے جیب میں ڈال لیا اور چند بسکٹ بھی تلاش کر لیے جو دھوئیں کالے ہو رہے تھے مگر صاف کر کے کھائے جا سکتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ کسی بیگ میں کافی کے تھرماس ایسے خوف ناک تصادم میں کسی تھرمس فلاسک کے اندر نازک بوتل کا سلامت رہ جانا بعید از قیاس تھا مگر مجھے امید دھات کا بنا ہوا بیرونی خول نہ ٹوٹا تو آگ کی حرارت سے ہوا ہو گا۔ کافی اس کے اندر ہو گی اور شیشے کی بوتل کی ساری بھی کافی میں شامل ہوں گی مگر اسے کپڑے سے چھان کے کیا جا سکتا تھا۔

دس منٹ تک کونوں کھدروں میں جھانکنے کے بعد میں مایوس ہو چکا تھا۔ میری نظر اب باہر دھوپ اور برف میں پڑے ہوئے اسباب کا جائزہ لے رہی تھی۔ شیشے اور دھات کے چھوٹے بڑے ٹکڑے تقریباً سو میٹر کے دائرے میں بکھر گئے تھے۔

میں بڑی مشکل سے باہر آیا اور پاؤں کی ٹھوکر سے برف ہٹاتا ہٹاتا دبی ہوئی چیزوں کو باہر نکالنے لگا۔ ایسی ہی ایک ٹھوکر نے تھرمس کو دور پھینک دیا۔ میں نے اسے دوڑ کے اٹھایا۔ اندر شیشے کی کرچیاں کھنک رہی تھیں مگر تھرمس کے وزن سے میں نے اس کے اندر بھری ہوئی کافی کا اندازہ کر لیا۔

میں نے تھرمس کا ڈھکن بڑی مشکل سے کھولا۔ سردی سے میری انگلیاں سن ہو رہی تھیں اور تھرمس کا گیلا ڈھکن ٹیڑھا بھی ہو چکا تھا۔ میں نے ہاتھوں کو کپڑوں پر رگڑ کے خشک کیا اور کسی جیسے ڈھکن کو گھمانے میں کامیاب ہو گیا۔

ڈھکنے کے نیچے کارک کا اسٹاپر موجود تھا جس نے کافی کو بہنے نہیں دیا تھا۔ ظاہر ہے شیشے کی بوتل کے ٹوٹ جانے کے بعد کافی گرم نہیں رہ سکتی تھی۔ شیشے کے ہزاروں باریک اور تیز دھار والے ٹکڑے کافی میں شامل تھے اور کافی کا درجۂ حرارت وہی تھا جو برف میں دبے ہوئے ٹین کے ڈبے کا۔

میں نے کارک ہٹا کے کافی کی مہک کو محسوس کیا۔ یہ ٹھنڈی یخ بستہ کافی بھی ایک نعمت ثابت ہو سکتی تھی بشرطیکہ اس کو شیشے کے ذرات اور کرچیوں سے الگ کر کے پیا جاتا۔ یہ مشکل کام تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔ میں نے تھرمس کو سیدھا رکھ دیا۔ شیشے کا کوئی ذرہ مائع کافی میں حل نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد تمام شیشوں کا تہہ میں بیٹھ جانا یقینی تھا۔

میں نے آج تک ایسی بہت سی کہانیاں پڑھی تھیں اور فلمیں دیکھی تھیں جن میں بحری یا ہوائی جہازوں کے حادثات میں بچ جانے والا کوئی ایک شخص یا ایک جوڑا ہیرو اور ہیروئن کسی غیر آباد جزیرے پر جا اترتے ہیں۔ وہ کس طرح بقا کی جنگ لڑتے ہیں، ہمت نہیں ہارتے اور کیسے آخر کار اپنے گھر لوٹتے ہیں۔ یہ سب افسانوی باتیں آج میرے لیے زندگی کی حقیقت بن گئی تھیں۔

میں کسی غیر آباد جزیرے پر نہیں، اپنے وطن میں تھا اور مجھے کسی جنگلی قبیلے یا آدم خوروں کا سامنا نہیں تھا۔ میرا مسئلہ صرف یہ تھا کہ زندہ رہوں۔ رابعہ کو اپنے ساتھ رکھوں اور عزمِ سفر کے ساتھ تلاش جاری رکھوں۔ نازو اور غالب کی، کسی آبادی یا سڑک کی جہاں سے مجھے امداد مل جائے۔ خوراک، کپڑے، دوائیں اور ٹرانسپورٹ سب مجھ سے بہت زیادہ دور نہیں تھے۔ شرط صرف صحیح سمت میں سفر کی تھی۔

ایک بات میں جانتا تھا کہ یہ انتہائی شمال مغرب کا علاقہ ہے چنانچہ مجھے شمال اور مغرب کی طرف نہیں جانا چاہیے۔ گلگت یا چترال سے کاغان تک تقریباً دو سو کلو میٹر کا فاصلہ جنوب کی طرف تھا۔ وہاں سے بالاکوٹ اور مانسہرہ کے راستے ہم ایبٹ آباد پہنچ سکتے تھے۔ یا دوسری طرف سے ہم پہلے سوات اور پھر مردان جا سکتے تھے اور وہاں سے پشاور یا لاہور۔ سورج کی مدد سے میں نے جنوب مشرق کی سمت کا تعین کر لیا تھا۔

ایک تھرمس مل جانے کے بعد میں نے خود کو ایک عظیم مہم جو اور سراغ رساں تسلیم کیا۔ میرا دماغ ذہانت کے ساتھ صحیح خطوط پر سوچنے لگا۔ اگر تھرمس یہاں دفن تھا تو کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ گرد و نواح میں کہیں دوسری چیزیں بھی ہوں گی جو اسی تھیلے میں تھیں جس میں تھرمس تھا۔ تھرمس ایک نہیں تھا، دو تھے۔ اسی میں اسپرین اور اینٹی بائیوٹک ادویات تھیں، مرہم پٹی کا سامان تھا، خشک دودھ کے ڈبے تھے اور چاکلیٹ تھی۔

بحیثیت سراغ رساں مجھے سخت ناکامی کا سامنا ہوا مگر میں اکیلا تھا چنانچہ صرف اپنے آپ سے شرمندہ ہوا۔ مجھے ان میں سے کوئی چیز نہیں ملی۔ میں نے تھرمس اٹھایا اور واپس چل پڑا۔ پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے تھرمس کو نیچے رکھا اور دوبارہ ہیلی کاپٹر کے اندر گیا۔ اندر آگ پکڑنے والی بہت سی چیزیں تھیں مگر میں ان سب کو ایک ساتھ اٹھا کے نہیں لے جا سکتا تھا۔

میں اس چٹان تک گیا جہاں رابعہ تنہا بیٹھی تھی۔

"میں آ گیا" میں نے چلا کے کہا "اور یہ دیکھو میں کیا لایا ہوں۔" میں نے تھرمس کو کسی میڈل یا ٹرافی کی طرح بلند کیا۔ پھر میں نے ایک جیب سے ابلے ہوئے انڈے نکالے اور دوسری سے جلے ہوئے بسکٹ۔

"ٹھنڈی لذیذ بریک فاسٹ از ریڈی۔" میں نے کسی بٹلر کی طرح سینے پر ہاتھ رکھ کے اور سر جھکا کے کہا۔

رابعہ نہیں مسکرائی۔ ان حالات میں میرا مذاق کرنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔

"میں نے یہاں سے چاروں طرف دیکھا۔ نازو اور غالب کہیں دور دور تک نظر نہیں آئے۔" رابعہ بولی۔

"دیکھو ڈیئر، جیسے ہم بچ گئے، ایسے ہی وہ بھی زندہ سلامت ہوں گے۔" میں نے کہا "وہ ہم سے پہلے اترے تھے جب ہیلی کاپٹر کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ انہیں لینڈنگ کے لیے بہت سازگار حالات ملے تھے۔ ہیلی کاپٹر اپنی جگہ پر ساکت تھا اور بہت کم بلندی پر۔ رسی بھی سیدھی لٹکی ہوئی تھی۔ وہ زیادہ آرام سے اور بہت سنبھل کے برف پر اترے ہوں گے۔ ہم تو ہنگامی حالات میں اترے تھے۔"

رابعہ کا چہرہ امید سے روشن ہو گیا "یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔"

"میں غلط کب کہتا ہوں۔" میں نے کہا "مایوسی آدمی کے حوصلے کو توڑ دیتی ہے، اس لیے قنوطیت سے بچو اور زندگی کے روشن پہلو پر نظر رکھو۔ یہ سوچو کہ بچھڑ جانے کے باوجود ہم ساتھ ہیں، وہ ہمیں اور ہم انہیں تلاش کر رہے ہیں اور یہ تلاش صحیح سمت میں اور صحیح خطوط پر جاری ہے چنانچہ ہم ہر لمحہ ایک دوسرے

www.paksociety.com

کے قریب ہوتے جا رہے ہیں اور خدا نے چاہا تو کسی ایک مقام پر مل جائیں گے۔ اور خدا ایسا کیوں نہیں چاہے گا۔ آخر اسی نے ہمیں خیر و عافیت واپس پہنچایا اور سخت ترین حالات میں زندہ رکھا۔ اچھا باقی تقریر میں کچھ دیر بعد کروں گا۔"

"اب کہاں چل پڑے؟"

"کافی ٹھنڈی ہے۔" میں نے کہا "اسے گرم تو کرنا ہے کسی طرح۔"

ہیلی کاپٹر کے ڈھانچے میں ایک جگہ قطرہ قطرہ تیل ٹپک رہا تھا اور بالشت بھر چوڑے گڑھے میں جمع ہو رہا تھا۔ یہ گڑھا ہیلی کاپٹر کی باڈی میں بن گیا تھا۔ مڑ کر پیالے کی شکل اختیار کرنے والے ایک دھاتی ٹکڑے کی مدد سے میں نے تھوڑا سا تیل نکال لیا اور ایک ہموار جگہ پر رکھ دیا۔ پھر میں نے سیٹوں کی ریگزین کو پھاڑا، استر کا کپڑا پھاڑا، کشن کا ربر نکالا اور لکڑی کے چند ٹکڑے دریافت کیے۔ یہ سب میں نے چمڑے کی بیلٹ سے باندھ کر ایک بنڈل سا بنا لیا۔ باہر مجھے ایک سوٹ کیس کا آدھا حصہ ملا۔ سوٹ کیس کا باقی حصہ کہاں پڑا تھا اور اس میں بھرا ہوا سامان کدھر گیا، یہ سوچنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے آئل سے بھرا ہوا پیالہ اٹھایا اور واپس چل پڑا۔

رابعہ حیرانی سے مجھے سب سامان اکٹھا کرتا دیکھتی رہی۔ میں نے چٹان کی اوٹ میں رکھے ہوئے پلاسٹک اور ریگزین کے ڈھیر پر تیل ڈالا اور جیب میں سے لائٹر نکالا۔ انگوٹھے سے دباتے ہی لائٹر کا ننھا سا نیلا شعلہ مسکرانے لگا۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ ہوا ساکت تھی ورنہ دھوپ کی تمازت میں بھی ہم ٹھٹھر جاتے۔

میں نے ہیلی کاپٹر تک ایک اور پھیرا لگایا۔ اس بار میں اپنے ساتھ ایک "تار" تیل کا دوسرا پیالہ اور جلانے کے لیے مزید سامان لے کر لوٹا۔ اس وقت تک آگ روشن ہو چکی تھی اور فضا میں گہرا بدبودار دھواں بلند ہو رہا تھا۔

رابعہ کپکپانے لگی تو میں نے کہا "یہاں آجاؤ، کیمپ فائر کے پاس۔"

میں نے تار سے تھرماس کو باندھا اور اس تار کا دوسرا حصہ چٹان پر ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اب تھرماس آگ کے اوپر تھا۔ ٹین کے گول ڈبے میں شیشے کے ذرات کافی کی تہہ میں بیٹھ گئے تھے اور پیندے کو آگ کے شعلے چھو رہے تھے۔ کافی گرم ہو رہی تھی۔

"تم واقعی عجیب ہو، بہت عجیب۔" رابعہ نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"عجیب و غریب کہنے میں کیا ہے۔" میں نے آگ پر تھوڑا سا تیل ڈالا۔

"تم ہارنا نہیں جانتے، مایوس ہونا نہیں جانتے۔ خواہ حالات کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں۔" رابعہ نے کہا "بالکل جن ہو تم۔"

"اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے سے نہ گزرے خود کو سب سے اونچا سمجھتا رہتا ہے۔ تم مجھے ایسا ہی اونٹ سمجھتی ہو مگر اونٹ کے بارے میں یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔"

وہ مسکرانے لگی "تمہیں یقین ہے کہ نازو اور غالب مل جائیں گے؟"

"مجھے تو یہ بھی یقین تھا کہ تم مل جاؤ گی حالانکہ اس وقت میرا تمہارا وہ نہیں ہوا تھا۔ کیا کہتے ہیں اسے ٹاکرا، یعنی آمنا سامنا، جب نینوں سے نین ملتے ہیں اور بس۔ محبت ہو جاتی ہے پہلی نظر میں۔ پھر فلم شروع۔"

رابعہ ہنسنے لگی "تمہارے خیال میں یہ فلم ہے؟"

"اور کیا یہ زندگی ہے؟" میں نے کہا "خالص فلمی چیز ہے۔ کیمرا ہوتا تو واہ واہ ہو جاتی۔ میرے جیسا ہیرو اور تم ہیروئن۔"

رابعہ نے کہا "ہیرو صاحب، کافی ابل رہی ہے۔"

میں نے کہا "اسے کہتے ہیں ایک ٹکٹ میں تین مزے۔ کافی گرم ہو گئی۔ ہم نے اسموک سگنل دے دیا۔ ایس او ایس یہاں ہیں۔ آگ بھی تاپ لی۔ اب آتا ہے مرحلہ نمبر دو۔ تھرماس کو اتارنے کا اور کافی کو چھان کر شیشے سے الگ کرنے کا۔ شیشے کا مسیحا کوئی نہیں ہے، جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا۔ یہ غالباً تھرماس کے بارے میں کہا ہو گا فیض صاحب نے۔ جو نہیں ہے بے وقوف مگ کو منہ سے پکڑو، میں کافی انڈیلتا ہوں۔"

"مگ ٹین کا ہے بے وقوف۔ میرا ہاتھ جل جائے گا۔"

"او کے۔ تم سے نہیں ہو گا کوئی کام۔ نیچے رکھو مگ کو اور اپنی قمیص کا دامن پھیلاؤ۔"

"وہ کیوں؟"

"بابا کافی چھان کر پینی ہے۔ ورنہ جیسے پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کٹ جاتا ہے، ایسے ہی کافی کے ساتھ شیشہ پی لیا تو دل کٹ جائے گا۔" میں نے کہا "شہزادی نہیں، میں کافی کی [illegible] دیکھ رہا ہوں۔"

رابعہ نے قمیص کا دامن مگ پر پھیلا دیا۔ میں نے اس پر انڈیلی۔ گرم، سنہری کافی چھن کر مگ میں جمع ہونے لگی۔ سب کچھ رابعہ کی قمیص کے دامن پر داغ آ گیا لیکن اس میں کوئی شیشہ گرفتار نہیں ہوا۔ احتیاطاً اس نے دامن جھاڑ دیا۔

ہم نے ایک ایک ابلا ہوا انڈا کھایا اور بغیر دودھ چینی کی تلخ کافی کو ایک ہی مگ سے پیا۔ مگ کا کنارہ بھی گرم ہو گیا۔ میرے ہونٹ جل گئے مگر مجھے کافی کو ٹھنڈا کر کے پینا منظور نہ تھا۔ رابعہ نے کہا "تم لنگڑا کر چلتے ہوئے بالکل [illegible] تھے۔"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ میں لنگڑا ہوا۔ کانا ہو جاتا تو ایک دیکھا ہوا نہ جانے کہاں نکل جاتا۔ شاید واپسی میں تم پر نظر پڑتی۔"

رابعہ ہنسنے لگی اور پھر ایک دم رک گئی "یہ۔۔۔ یہ آواز۔"

میں نے مگ نیچے رکھ کے اوپر دیکھا "ہوائی جہاز۔ کوئی آ گیا ہماری مدد کو۔ دھواں دیکھ لیں گے۔" میں نے خوشی سے چلا کے رابعہ سے کہا۔

"یہ جہاز تو یہاں نہیں اتر سکتا۔" رابعہ نے کہا۔

ہم آسمان پر نظر جمائے بیٹھے رہے۔ دور افق پر نقطہ بن کے ابھرنے والا پی آئی اے کا فوکر جہاز کچھ دیر بعد ہماری نظروں کے سامنے سے پرواز کرتا سیدھا گزر گیا۔

"انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا۔" رابعہ نے مایوسی سے کہا۔

"ضرور دیکھا ہو گا۔ اتنا کثیف دھواں ہے۔ برف کی سفیدی پر زیادہ نمایاں ہو گیا ہو گا۔"

"پھر وہ رکے کیوں نہیں؟" رابعہ نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"کیا ہوا میں رک جاتے؟ جیسے سڑک پر کار بریک لگانے سے رک جاتی ہے۔" میں نے کہا "کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو۔ وہ ایک چکر لگا کے جا سکتے تھے۔ اس سے ہمیں معلوم ہو جاتا کہ انہوں نے ہمیں دیکھ لیا اور ایس او ایس کا پیغام سمجھ لیا ہے۔"

"جہاز گلگت جا رہا ہے۔" میں نے کہا "گلگت پہنچ کر وہ کسی نہ کسی کو بتائیں گے۔"

"پی آئی اے والے؟ اونہہ" رابعہ نے منہ بنا کے کہا۔

"میرا مطلب تھا مدد کرنے والے۔ پی آئی اے والے کسی کو ضرور بتائیں گے کہ فلاں جگہ دو افراد پھنسے ہوئے ہیں اور ایک ہیلی کاپٹر کا ملبہ پڑا ہوا ہے۔ اس اطلاع پر فوجی ہیلی کاپٹر روانہ ہوں گے۔ تم کافی پیو گی گرم گرم؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا "تم پی لو۔"

میں نے پھر اس کے دامن کو چھلنی کے طور پر استعمال کیا "یہ ختم کر کے میں جاؤں گا نازو اور غالب کو تلاش کرنے۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"یہ بڑی مصیبت ہے عورتوں کے ساتھ۔ ہر جگہ جانے کے لیے ضد کرنے لگتی ہیں۔ میں نے سمجھایا تھا کہ تم اسی جگہ رک کر انتظار کرو گی۔ میں ابھی لوٹ کر دو گھڑی میں آؤں گا۔ ہیلی کاپٹر کو تلاش کرنے والے یا ہماری مدد کرنے والے بھی اسی جگہ پہنچ سکتے ہیں۔ یہاں کوئی تو ہونا چاہیے جو انہیں کچھ بتا سکے۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کس سے؟ جو خوف ہے کہ وہ اپنی جلی ہوئی ہڈیاں اور راکھ ہو جانے والے جسم کو جمع کر کے اٹھ کھڑا ہو گا؟" میں نے کہا "یا بھوت بن کے آ جائے گا تمہیں کھانے کے لیے۔ تم اچھی چیز ہو مگر تمہارا ذائقہ نہیں ہے۔ ذوق اور ذائقے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"مذاق مت کرو۔" وہ بگڑ گئی۔

"یہ مذاق نہیں ہے۔ بھوت ویسے بھی تو موجود نہیں ہوتے۔ جن البتہ کچھ عاشق مزاج ہوتے ہیں لیکن تم پر تو پہلے ہی ایک جن عاشق ہے۔ ابھی خود تم نے مجھے جن قرار دیا تھا۔ جن بھوت کے علاوہ تو یہاں کوئی تمہیں ڈرانے یا پریشان کرنے نہیں آ سکتا۔"

"کیوں؟ جنگلی جانور بھی تو آ سکتے ہیں۔ اور اس علاقے کا کیا پتا، یہاں کیسے لوگ رہتے ہیں۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی "تم جیسی پڑھی لکھی لڑکیاں جب ایسی حماقت کی بات کریں تو پہلے ہنسی آتی ہے پھر رونا آتا ہے۔ جنگلی جانور اس موسم میں یا تو ہجرت کر جاتے ہیں یا زیر زمین چلے جاتے ہیں۔ مثلاً ریچھ سردی کے موسم میں سوتے رہتے ہیں۔ بہ فرض محال کوئی لومڑی آ نکلے تو اسے اپنا نام بتانا۔ وکیل کا نام سنتے ہی وہ بھاگ جائے گی۔ ورنہ اسے شوٹ کر دینا۔ ریوالور تمہارے پاس ہے۔ دیگر یہ محترمہ کہ ہم افریقہ کے اس خطے میں نہیں جہاں جنگلی وحشی اور آدم خور قبائل رہتے ہیں۔ ہم چترال یا گلگت کے علاقے میں ہیں۔ یہاں جو بھی آئے گا تمہاری مدد کرے گا۔ یہاں کے لوگ انتہائی مہمان نواز ہوتے ہیں اور جسے پناہ دیتے ہیں اس کے لیے اپنی جان بھی دے سکتے ہیں۔ کچھ آیا عقل شریف میں؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے کافی ختم کی۔ جیب سے ریوالور نکال کے چیک کیا اور ایک فائر کر دیا۔

رابعہ اچھل پڑی "یہ کیا حرکت ہے؟"

میں نے کہا "برفانی علاقوں میں آواز بہت دور تک سفر کرتی ہے۔ ہم جو باتیں کر رہے ہیں یہ آواز بھی ایک میل دور سنی جا سکتی ہے۔ فائر کی آواز چار پانچ میل قطر کے دائرے میں ہر طرف سنی جائے گی۔ کوئی بھی اس پر متوجہ ہو سکتا ہے۔ ایک فائر تم بھی کرو۔"

رابعہ نے ریوالور نکال کے اس کا رخ اوپر کی طرف کیا "یہاں متوجہ ہونے والا کون ہو گا؟"

مجھے فائر کی آواز مکمل سکوت میں بم کے دھماکے سے زیادہ محسوس ہوئی "اس علاقے میں فائرنگ بلاوجہ نہیں ہوتی۔ مقامی آبادی کے لوگ بھی یہ آواز سن کر ادھر آ سکتے ہیں، یہ سمجھتے ہوئے کہ کہیں دو قبیلے تو آپس کی جنگ میں نہیں الجھ گئے۔ فائرنگ ان کو بھی متوجہ کر سکتی ہے جو ہماری سرحدوں کی حفاظت کے لیے یہاں موجود ہیں اور جنہوں نے ہیلی کاپٹر گرا دیا تھا۔"

"تم کتنی دیر میں واپس آؤ گے؟"

"گھڑی ہوتی تو میں بتا دیتا کہ میں دو بج کے انتیس منٹ پر واپس آؤں گا۔ ڈھائی بجے تک کھانا میز پر لگا رہنا۔ کھانے میں چکن روسٹ ضرور ہو اور فروٹ کسٹرڈ..."

رابعہ بگڑ گئی "سیدھی طرح بات کا جواب نہیں دے سکتے؟"

"اس بات کا کیا سیدھا جواب دوں، بابا۔ تم کہتی ہو تو میں ساڑھے تین گز کے دائرے میں گھوم کے ساڑھے تین منٹ میں لوٹ آتا ہوں۔ ورنہ ساڑھے تین کلو میٹر تک گیا تو ساڑھے تین گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں۔ پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ مزے سے دھوپ میں لیٹ کر آرام کرو۔ قدرت کا حسن دیکھو۔ سمجھو تم ابھی

www.paksociety.com

سے جہاں تفریح اور آرام کے لیے زندگی ہو۔ میں تمہیں چھوڑ کر تو بھاگنے سے رہا۔ پاؤں میں تمہارے عشق کی زنجیر ہے۔ لوٹ کر میں آؤں گا۔ تم خود کھینچ لوگی۔"

"اُف سکندر! بہت بولتے ہو تم اور بے مقصد۔ میرا مطلب تھا کہ انتظار بہت مشکل ہوگا۔"

"یہ میں مانتا ہوں۔" میں نے کہا "لیکن تم چاہو تو فارغ وقت میں بہت کچھ کر سکتی ہو۔ خلا میں گھورنے اور جمائیاں لینے سے بہتر یہ ہے کہ تم تفتیش اور سراغرسانی کرو۔"

"۔۔۔یا میں نہیں جاتی اس مردہ خانے میں۔"

میں نے کہا "دور جانے کو کس نے کہا ہے۔ باہر ہیلی کاپٹر کے آس پاس گھوم پھر کر دیکھو۔ بہت سی چیزیں برف میں دفن ہیں جن کی ہمیں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ مثلاً تم دوسرا تھرمس تلاش کرو۔ دوائیں کا بیگ ڈھونڈو۔ کچھ بھی مل جائے بڑا دلچسپ کام ہے۔"

"سکندر! تمہیں یقین ہے وہ مل جائیں گے؟"

مجھے غصہ تو آیا مگر میں پی گیا "یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم۔ کیا شمشیریں لے کر میں جہاد پر جا رہا ہوں۔ میری کامیابی کے لیے دعا کرنا۔ میں ضرور آؤں گا۔ ایسا نہ ہو کہ میں آؤں تو معلوم ہو تم جا چکی ہو۔ میرا انتظار کرو گی نا؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو! میں کہاں جا سکتی ہوں۔"

میں نے آواز میں رقت پیدا کی "یہ ممکن ہے کہ دن بیتتے بیتتے اور سال بیت جائیں۔ پچاس سال بعد ایک سفید بالوں والا بوڑھا لاٹھی ٹیکتا کمر جھکا کر چلتا رابعہ رابعہ پکارتا آئے۔ اسے نظر کچھ نہ آتا ہو اور ہر قدم اٹھانا اس کے لیے ایک امتحان ہو۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔"

رابعہ ہنسنے لگی "میں پہچان لوں گی تمہیں اب جاؤ۔"

میں پہلے سے طے کر چکا تھا کہ اس تلاش اور جستجو کے مختلف مراحل میں میری پلاننگ کیا ہو گی جس سے کامیابی کے امکانات زیادہ اور ناکامی کے کم سے کم ہوں۔

اس وقت دن کا اجالا تھا اور میری حدِ نگاہ ایک ڈیڑھ میل تک تھی۔ میں نے ہیلی کاپٹر کے ملبے کو نظر میں رکھا۔ اس کی اوپر اٹھی ہوئی دھوئیں سے کالی ہو جانے والی دُم مجھے جہاں تک نظر آتی رہی میں سیدھا چلتا رہا اور اس راستے پر دونوں طرف دیکھتا گیا۔ کہیں کوئی معمولی سی حرکت بھی ہوتی تو میری نظر سے اوجھل نہ رہتی۔ بلند تنوں والے ویران درختوں کے بیچ میں برف کی بے داغ سفیدی پر ایک دھبا بھی نظر آتا تو میں قریب جا کے دیکھتا۔

تقریباً دو کلو میٹر کے بعد میں نے دائرے میں سفر شروع کیا۔ اس دائرے کا مرکز ہیلی کاپٹر کا ملبہ تھا۔ دو کلو میٹر نصف قطر یا چار میل قطر کے دائرے کا محیط بڑی لمبی مسافت تھی جسے میں نے لنگڑاتے ہوئے طے کیا۔ ایک طرف میں دو کلو میٹر دور ہیلی کاپٹر کو دیکھ سکتا تھا اور درمیانی فاصلے کا بغور جائزہ لے سکتا تھا تو دوسری طرف بھی اتنی ہی دور دیکھ سکتا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ نازو اور غالب ہیلی کاپٹر سے چار کلو میٹر کے اندر اترے ہوں گے۔ اس یقین کی کوئی منطقی یا سائنسی بنیاد نہیں تھی۔ یہ میرا اندازہ تھا اور میرا ذہن اسے قبول کرتا تھا۔ نازو اور غالب کے ہیلی کاپٹر سے کود جانے کے بعد ہم بہت زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ چار کلو میٹر کے دائرے میں ان کا مل جانا مجھے قرینِ قیاس لگتا تھا۔

میرے دل کو یہ اطمینان بھی حاصل تھا کہ غالب اور نازو بخیر و عافیت اترے تھے۔ ان کے شدید زخمی ہو کے مر جانے کا سوال نہ تھا اور یہ بھی بعید از قیاس تھا کہ وہ سردی یا بھوک سے ہلاک ہو گئے ہوں۔ انہوں نے بھی گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ ایک رات وہ اپنے اپنے جسموں کی حرارت کو یکجا کر کے گزار چکے تھے۔ دس بارہ گھنٹے میں بھوک پیاس سے حوصلہ ہارنے کا بھی امکان نہ تھا۔ اس سردی میں پیاس محسوس بھی نہ ہوتی تھی۔

پریشانی کا واحد سبب یہ خیال تھا کہ وہ ہمیں تلاش کرتے ہوئے غلط سمت میں بہت دور نہ چلے گئے ہوں۔ مجھے غالب کی عقل اور ہمت پر پورا بھروسا تھا۔ وہ ایک بے حد ذہین صحافی تھا۔ اسے یقیناً معلوم ہوگا کہ یہ پاکستان کا کون سا علاقہ ہے۔ ہم نے تو اس برف کے صحرا میں بھٹکنا نہیں پھرے گا۔ وہ چند دن یہاں گزارنے کی کوشش کرے گا۔ اس یقین کے ساتھ کہ آخر کار ہم کو بھی پہنچنا ہے اور جب ہم پاکستان پہنچ گئے تو پھر ہر جگہ ہماری منزل ہے۔

میں نے اپنا دائرہ آدھا مکمل کیا تھا کہ میری نگاہ نے برف کی سفیدی میں ایک دھبا سا دیکھا۔ سیاہ نقطہ ایک ابھار سا تھا جو قریب سے دیکھنے پر اس کا رنگ براؤن ہو گیا۔ میں نے برف میں خشک ٹہنی گاڑ کے اس پر اپنا سرخ مفلر باندھ دیا تاکہ واپس آ کے باقی نصف دائرے کا سفر شروع کر سکوں۔

میں نے ناک کی سیدھ میں سفر کیا اور اس براؤن رنگ ابھار پر غور کرتا رہا۔ جب میں سو گز کے فاصلے پر تھا تو میں نے بریف کیس کو پہچان لیا جو نیپال کے آرمی جنرل نے دیا تھا اور میں جوزف کے پچاس ہزار نکالنے کے بعد اب ساڑھے چار روپے پاکستانی رہ گئے تھے۔

بریف کیس کو جہاز سے پھینک دیا گیا تھا اور وہ برف میں گر کر ایک کونے پر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا ایک کونا نرم برف میں دھنس گیا تھا اور رات بھر اس پر برف گرتی رہی تھی۔ صبح تک برف پگھل کے بہہ گئی تھی۔ بریف کیس اسی توازن کے ساتھ رہ گیا تھا۔

بریف کیس بہت مضبوط تھا۔ اسے اگر کسی بلندی سے پھینکا جاتا تو نہ ٹوٹتا۔ جب میں نے اسے اٹھایا تو مجھے ساڑھے

لاکھ روپے مل جانے کی کم خوشی ہوئی۔ زیادہ خوشی اپنی تلاش کے رائیگاں نہ جانے کی ہوئی۔

غالب اور نازو مل جاتے تو میری کامیابی ہی میری زندگی کا سب سے بڑا انعام بن جاتی مگر یہ بریف کیس بھی نہ ملتا تو خالی ہاتھ لوٹنے سے اپنی ناکامی کا خیال زیادہ حوصلہ شکن اور رنج آزار ہوتا۔ بلاشبہ یہ دولت یہاں بے مصرف تھی مگر اس کی طاقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ریوالور پر گرفت سے تحفظ کا احساس حاصل ہوتا تھا ایسے ہی ساڑھے چار لاکھ روپے کی ملکیت کا احساس باعثِ تقویت تھا۔ سفرِ حیات کے اگلے مراحل میں یہ طاقت ہمارے راستوں کی مشکلات کو دور کر سکتی تھی اور آسانیوں کو خرید سکتی تھی۔

واپس رابعہ کے پاس پہنچ کے میں نے بریف کیس کو چٹان پر پھینک دیا اور خود بھی اس کے پاس ہی گر پڑا۔ میں بہت تھک گیا تھا۔ میری ٹانگ میں درد بھی بڑھ گیا تھا۔ ایک درد چوٹ کا تھا اب اس میں تھکن کا درد شامل ہو گیا تھا۔ میں گھور رہا آسمان کی وسعت و گہرائی میں گم رہا۔

پھر رابعہ نے کہا "اب کیا ہو گا سکندر؟"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ میں خود اس سوال سے گریز کر رہا تھا۔

میں نے کہا "مجھے ایک کپ کافی کا دو۔"

"کافی تو ٹھنڈی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ٹھنڈی ہی دے دو۔"

رابعہ نے کہا "مجھے دو چیزیں ملی ہیں۔ ایک ڈبا ہے خشک دودھ کا ایک پیکٹ دواؤں والا۔ دوسرا تھرمس بھی وہیں تھا مگر وہ اس طرح ٹوٹا کہ کافی سب بہہ گئی۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا "ویری گڈ۔ تم نے اس وقت خود کو نصف بہتر ثابت کر دیا۔"

وہ تھوڑا سا شرمائی اور مسکرائی "بس میں وقت گزاری کے لیے ادھر ادھر بکھری ہوئی چیزیں نکال رہی تھی اس سلاخ سے۔"

"تم نے پوچھا نہیں کہ میں نصف بہتر کیسے ہوا۔"

رابعہ نے مگ میں کافی چھانی مگر اب اپنے دامن کے بجائے ایک صاف کپڑا استعمال کیا "تم نے بھی کم محنت تو نہیں کی۔"

میں نے مگ لے لیا "مگر حاصل کیا ہوا؟ یہ کاغذ کے نوٹوں کا ڈھیر جو ہمارے کسی کام کا نہیں۔ تم نے اس مسخرے کی کہانی تو پڑھی ہوگی جس کے پاس صحرا کے سفر میں سونے کا انبار تھا مگر پانی کا ایک گھونٹ نہیں بچا تھا۔ اس نے سارا سونا پھینک دیا مگر پھر بھی پیاسا مر گیا۔ ایسی ہی صورتِ حال ہماری ہے۔ ہم اس ساڑھے چار لاکھ سے یہاں کیا خرید سکتے ہیں؟ برف۔"

"وہ تو مفت ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"ہاں۔ ہماری جان بچا سکتی ہیں یہ دوائیں اور دودھ کا یہ ڈبا ہمارے کام آ سکتا ہے۔" میں نے کہا "فوری طور پر تم مجھے درد کا احساس مٹانے والی دو گولیاں دے دو۔ اسپرین یا پیراسیٹامول۔"

اس نے مجھے پیراسیٹامول دی جو میں نے تلخ ٹھنڈی کافی کے ساتھ نگل لی۔ "تم نے بھی کچھ کھایا؟"

"یہی دو گولیاں۔" رابعہ بولی "پانی کے ساتھ۔"

"پانی کہاں سے آیا؟"

رابعہ نے کہا "سائنس پڑھی ہوتی تو ایسا سوال نہ کرتے۔ یہ جو برف ہے باہر ہر طرف یہ پانی سے بنی ہے۔ درجۂ حرارت جب نقطۂ انجماد سے گر جاتا ہے۔۔۔"

"اچھا۔ کون کہاں سے گر جاتا ہے؟" میں نے گھبرا کے کہا۔

وہ ہنسی "میں نے برف کو مگ میں ڈال کے دھوپ میں رکھ دیا تھا۔ وہ پھر پانی بن گیا۔ بالکل صاف۔ اسی طرح ہم دودھ کے پاؤڈر کو پانی میں حل کر سکتے ہیں اور ایک ڈبا راشن بندی کے ساتھ کم سے کم تین دن تک ہم دونوں کو کافی ہو سکتا ہے۔"

"میں تم کو چیف کنٹرولر آف راشننگ مقرر کرتا ہوں۔ چار ابلے ہوئے انڈے، آدھا بسکٹ اور ایک چمچ پاؤڈر کا۔ لیکن تم اگر ایک مہینہ چلانا چاہو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"ایک مہینہ چل سکو گے؟" وہ ہنسی۔

"آزما کے دیکھو۔ تمام عمر ساتھ چل سکتا ہوں۔ ویسے عقلمندوں نے کہا ہے کہ آزمودہ را آزمودن جہل است۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "تمہیں کچھ اندازہ ہے ہمیں کس سمت میں جانا ہو گا اور کتنی دور؟"

میں نے کہا "آپ کے پاس ایک سگریٹ ہو گی خاتون؟"

"صرف سگریٹ؟" وہ بولی "آپ اس سے بھی بڑھ کے ایک چیز ہے اگر آپ پینا چاہیں۔" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

"یہ شراب کی بوتل!" میں حیران رہ گیا "یہ تو جوزف اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ کیا تم نے لاش کی جامہ تلاشی لی تھی؟"

"اگر یہ ہیلی کاپٹر میں ہوتی تو سلامت رہ سکتی تھی؟"

میں نے شرمندگی سے سر کھجایا "یہ بھی باہر ملی؟ مگر کیسے؟ میرا مطلب ہے شیشے کی بوتل ٹوٹی نہیں؟"

"ایسے حیرت انگیز واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ جہاز گرتا ہے تو سب مسافر مر جاتے ہیں۔ یا بلڈنگ میں آگ لگتی ہے تو سب ہلاک ہو جاتے ہیں مگر کوئی شیر خوار بچہ بچ جاتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ یہ ابلے ہوئے انڈے نہیں ٹوٹے تھے۔ یہ بوتل بھی برف میں جا گری تھی۔ خیر اب تو زیادتی ہوں میں اسے۔"

میں نے کہا "ارے! یہ کیا غضب کر رہی ہو۔ یہ برانڈی ہے۔"

اس نے آنکھیں نکال کے کہا "کیا کافی میں ڈال کے پیو گے؟"

www.paksociety.com

میں نے کہا "دیکھو' یہ دوا ہے۔ جان بچانے کے لیے حرام کو بھی حلال کردیا گیا ہے۔ برانڈی تھوڑی سی میں فائدہ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ شراب کا بنیادی جزو ہے الکحل۔ یہ ڈیٹول یا اسپرٹ کی طرح زخم پر لگا سکتے ہیں۔ خدانخواستہ زخم آجائے تو۔ اور آخری بات یہ کہ تیل نہ ہو تو ہم برانڈی ڈال کے لکڑیاں جلا سکتے ہیں' یہ آگ پکڑ لیتی ہے۔ اور بھی ایک فائدہ ہے۔"

"وہ بھی بتادو۔"

"دیکھو' میں نے یہ نسخہ آزمایا تو نہیں لیکن فلموں میں اکثر دیکھا ہے۔ یہ غم غلط کرتی ہے۔"

"تمہیں کیا غم ہے جی؟" رابعہ نے مجھے گھورا۔

میں نے آہ بھر کے کہا "ہائے ہم بھی رکھتے ہیں ذرا ہو بہو ہم اپنا غم تیرا غم جہاں کا غم۔ کیا تم چلنے کے لیے تیار ہو؟"

رابعہ نے کہا "مجھے کیا تیاری کرنی ہے۔"

میں نے کہا "عورتوں کو مقررہ وقت سے دو گھنٹے پہلے تیاری کا نوٹس دینا پڑتا ہے تو وہ دو گھنٹے کی تاخیر سے تقریبات میں شریک ہو سکتی ہیں۔"

"ہم عورتوں نے بدنام کر رکھا ہے" وہ کھڑی ہو گئی "اب بولو کون پہلے تیار ہوا۔"

میں نے کہا "تم تو برا مان گئیں سچ کا" اب اتنی جلدی بھی نہیں کرنی کہ ہم سامان سفر بھی چھوڑ جائیں۔"

"میں نے سب باندھ لیا ہے" رابعہ نے ایک پوٹلی کی طرف اشارہ کیا۔

"ایک بات اور سمجھ لو۔ ممکن ہے کہ آنے والی رات بھی اسی برف زار میں بسر ہو۔" میں نے کہا "جگہ بھی ایسی ہی ہو' کھلے آسمان کا سائبان ہو اور برف کا بستر۔"

"جو گرم کپڑے ہم نے پہن رکھے ہیں' کافی ہیں۔ انہی سے ہماری جان بچ گئی تھی۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے' تمہاری جان میں نے کیسے بچائی تھی؟" میں نے معصوم شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

اس کا رنگ گلابی ہو گیا "اب اٹھتے ہو یا......"

"یا کیا؟" میں نے اس کے رخساروں پر شفق کو پھوٹتا دیکھ کے اس وقت کو یاد کیا جب رابعہ کو ہوش میں لانے کے لیے میں نے اپنے جسم کی اور اپنے جذب دل کی ساری تپش اس کے لیے وقف کردی تھی۔

"یا میں بھی بیٹھ جاؤں؟" رابعہ نے ہنس کے کہا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا "رابعہ! اس جگہ کو آخری بار دیکھو۔ اس منظر کی تصویر اپنے دل میں اتار لو۔ بعد میں کبھی ہم اپنے گھر کے اندر' ڈرائنگ روم میں مسٹر اور مسز غالب' مسٹر اور مسز محسن' مسٹر اور مسز اکرام سب اکٹھے ہوتے اور ایسا ہی موسم ہوا تو ہیٹر سے گرم کمرے میں صوفوں پر بیٹھ کے گرم کافی پیتے ہوئے اور خشک میوے کھاتے ہوئے اس وقت اور اس جگہ کو یاد کریں گے۔ اور ہمارا کتنا دل چاہے گا کہ صرف ایک بار ہم پھر اس جگہ سے اور اس وقت کے ٹکڑے سے گزریں۔ مگر یہ ناممکن ہوگا۔ کون اپنے ماضی کی یاد کو حال کے زندہ لمحے میں لا سکتا ہے۔ دیکھو یہاں کتنا سکون' کتنی پاکیزگی اور کیسی خاموشی ہے۔ ایک میں ہوں' ایک تم اور ہم قدرت کے کتنے قریب ہیں۔"

رابعہ اداسی آمیز حسرت سے ماحول کو دیکھتی رہی۔ پھر ہم ایک دم چل پڑے۔ میرے بائیں ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ دائیں ہاتھ سے میں نے رابعہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ رابعہ نے کھانے پینے کے مختصر اسباب کی پوٹلی اپنی کمر پر ایسے باندھ لی تھی جیسے چائے کے باغات میں کام کرنے والی عورتیں اپنے شیر خوار بچوں کو ایک جھولی میں ڈال کر اٹھا لیتی ہیں تاکہ وہ دونوں ہاتھوں سے کام کر سکیں۔

"ہم جنوب مشرق کی طرف جا رہے ہیں۔" میں نے دوری رابعہ کو بتانا شروع کیا "میرے پاس قطب نما تو نہیں مگر میرے ذہن میں پاکستان کا نقشہ ہے۔ ہم انتہائی شمال مغرب میں ہو سکتے ہیں۔ آبادی مخالف سمت میں آئے گی۔"

"کتنی دور چلنے کے بعد؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ میں نہیں بتا سکتا کیونکہ مجھے اپنی صحیح پوزیشن کا علم نہیں۔ ہو ڈھائی سو کلومیٹر سے پہلے ہی ہم کسی آبادی میں پہنچ جائیں گے۔"

رابعہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا "دو ڈھائی سو کلومیٹر!"

"اور کیا میٹر" میں نے کہا "پیچھے مڑ کے مت دیکھنا۔ جب کوئی پہاڑ پر یا بلندی کی جانب سفر کرے تو کبھی پیچھے نہ دیکھے ورنہ حوصلہ جواب دینے لگتا ہے۔"

"لیکن سکندر! ایک دن میں ہم کتنا چل سکتے ہیں آخر؟ دو ڈھائی سو کلومیٹر......"

میں نے ہنس کے کہا "بس ڈر گئیں۔ بابا وہ تو میں نے زیادہ سے زیادہ فاصلہ بتایا تھا۔ کوئی چھوٹی موٹی آبادی دس پندرہ کلومیٹر کے اندر بھی مل سکتی ہے۔ چالیس پچاس کلومیٹر کے اندر تو یقینی ہے بشرطیکہ ہم انہیں نظرانداز کرتے ہوئے نہ گزر جائیں۔"

"ہم کیوں نظرانداز کریں گے؟"

"دانستہ نہیں کریں گے مگر کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم دو بستیوں کے درمیان سے گزر جائیں؟ ایک سیدھے ہاتھ پر دو چار کلومیٹر دور ہو اور دوسری الٹے ہاتھ پر۔ ہم کسی سڑک پر تو چل نہیں رہے ہیں کہ سیدھے کسی گاؤں یا قصبے جالگیں۔"

رابعہ متفکر ہو گئی "ایسے تو ہم بھٹکتے رہیں گے' نہ جانے کہاں تک۔ ممکن ہے غالب اور نادرہ بھی بھٹک رہے ہوں۔"

"اصل امکانات کی بات مت کرو۔ فلمی امکانات یا اتفاقات پر نظر رکھو۔ کیا پتا 'ادھر سے تم چلے اور ہم ادھر سے' والی بات ہو۔ ہم اچانک ایک ہی جگہ مل جائیں۔ یا جیسا کہ فلمی فارمولا ہے 'بالآ

یا بچھڑے ہوئے بہن بھائی اچانک گانے کی آواز سن لیں جو اُن کے سوا کوئی نہ گاتا ہو اور وہ بچپن سے ایک ہی دھن میں مسلسل گاتے رہے ہوں۔"

رابعہ ہنسی "ایسا کوئی گانا ہے جو سوائے تمہارے اور غالب کے کوئی نہ گاتا ہو؟"

"نہیں' افسوس کی تو یہی بات ہے۔ ورنہ اب تک ہم مل نہ گئے ہوتے۔ ہم میں سے کسی نے گانے کی ہمت کی ہے تو صرف باتھ روم میں۔"

"باہر گاتے تو ایک سو سات دفعہ میں پکڑے جاتے۔"

"یہ کیا کون سی دفعہ لگادی وکیل صاحب؟ اپنے پلے کچھ نہیں پڑا۔" میں نے کہا۔

"اندیشہ نقص امن۔ اشتعال انگیزی۔"

"خیر اب اتنا برا بھی نہیں گاتا میں۔ اس بیان کے بعد تم پر بھی ہتک عزت کا کیس ہو سکتا ہے۔" میں نے برا ماننے کی اداکاری کی۔

"تم کہہ رہے تھے کہ یہاں آواز میلوں سنائی دیتی ہے۔"

میں نے کہا "ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے گولیاں نہیں ہیں۔"

رابعہ بولی "فرض کرو' تم غالب کو آواز دو اور وہ کہیں دو تین کلومیٹر دور ہوں تو کیا وہ سن لیں گے؟"

میں نے کہا "آئیڈیا اچھا ہے۔ اگر میں ڈرل سارجنٹ ہوتا تو میری آواز دس کلومیٹر تک سنی جاتی۔ ویسے میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔" میں نے سینے کو پھلا کر اور پورا زور لگا کے آواز دی "غالب!" میری آواز برف کی بیکراں وسعت میں نہ جانے کہاں تک گئی اور گم ہو گئی۔ میں نے پوچھا "کتنی آؤٹ پٹ تھی۔ پچاس واٹ کہ سو واٹ؟"

"کیا مطلب؟"

"اسپیکر ہوتے ہیں چھوٹے بڑے۔ آؤٹ پٹ زیادہ ہو تو آواز زیادہ ہوتی ہے۔ فرض کرو میرے گلے کے اسپیکر کی آواز تھی پچاس واٹ۔"

"تو اب دو سو واٹ کی آواز نکالو۔ یا پانچ سو واٹ کی۔"

"بے وقوف لڑکی! تم چاہتی ہو اسپیکر پھٹ جائے۔ میرا اسپیکر فالتو پڑا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"میں وکیل ہوں' کوئی ریڈیو مکینک نہیں۔"

میں نے دوسری بار زیادہ طاقت کے ساتھ غالب کو آواز دی مگر اس بار بھی میری آواز خاموشی کی سرحدوں کو عبور کرتی۔ اس کی کوئی بازگشت تک لوٹ کر نہ آئی۔ میرے گلے میں خراش سی ہونے لگی۔ غالب کو مسلسل پکارتے رہنا مخبوط دیوانگی تھا اور کوئی مجھے دیکھتا تو دیوانہ مجنوں سمجھتا۔ لیلیٰ لیلیٰ پکارتا ہوا بن بن میں۔ ایسے بن میں غالب غالب چلاتا پھر رہا تھا۔ ہر سو قدم کے فاصلے سے میں اسے آواز دیتا تھا۔ غالب کی اس علاقے میں موجودگی بعید از امکان نہ تھی۔ ہم دو چار کلومیٹر کے فرق سے ایک محدود فاصلے پر اترے تھے اور یہ ناممکن تھا کہ وہ ہم سے سینکڑوں میل دور چلا گیا ہو۔ مجھے غالب کی جغرافیائی معلومات پر اعتماد تھا چنانچہ میں جانتا تھا کہ اس نے بھی جنوب مشرق کی سمت اختیار کی ہوگی۔ اگر ہم ایک ہی سمت میں رواں تھے تو اس بات کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کسی جگہ ہمارے درمیان فاصلہ دو چار کلومیٹر کا ہو اور ہم متوازی خطوط پر رواں ہوں۔ ایسی صورت میں وہ میری آواز سن سکتا تھا۔

دوپہر ڈھل گئی' شام کا سورج مغرب کی طرف ڈھلنے لگا۔ ہم اپنے اندازے کے مطابق آٹھ نو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکے تھے لیکن سوائے موسم سرما میں نقل مکانی کرنے والے پرندوں اور کچھ برفانی آب و ہوا میں رہنے والے پرندوں کے ہمیں کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔

شام پانچ بجے کے قریب میں نے کہا "مس رابعہ! یو نو اٹز ٹی ٹائم؟" (کیا تمہیں معلوم ہے چائے کا وقت ہو گیا ہے۔)

اس نے کہا "سوری سر' چائے نہیں ہے۔"

"او کے۔ کولڈ کافی لاؤ۔" میں نے ویٹر کو آرڈر دینے کے انداز میں کہا اور ایک پتھر پر بیٹھ گیا جس کی سطح اوپر سے ہموار تھی۔

اب گردوپیش میں ایک خوشگوار تبدیلی یہ آئی تھی کہ برف بہت کم رہ گئی تھی۔ جگہ جگہ سے پتھریلی بنجر زمین جھانکنے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے سفید چادر میں خاکی پیوند لگا دیے ہوں۔ میرا خیال تھا کہ کچھ آگے جا کے صورت حال مزید بہتر ہوگی تو زمین کی خاکی چادر میں برف کے سفید پیوند رہ جائیں گے۔

کافی دیتے ہوئے رابعہ نے کہا "اس پتھر پر تم بالکل مہاتما بدھ کا مجسمہ لگ رہے ہو۔"

"شکر ہے بدھو کو جا رہے ہیں۔ تم نے غور کیا' یہاں سردی کی شدت کچھ کم ہے' برف بھی اتنی زیادہ نہیں رہی۔ شاید آگے بالکل ختم ہو جائے گی۔" میں نے سرد کافی کا ایک گھونٹ لیا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ سردی رات کو کم نہیں ہوگی۔ ہم تو ابھی کہیں بھی نہیں پہنچے" رابعہ نے میرے ساتھ بیٹھ کے کہا۔

"ہم کہیں پہنچے ضرور ہیں۔ اتنی دیر سے ناک کی سیدھ میں چل رہے تھے' کسی دائرے میں نہیں گھوم رہے تھے۔ البتہ اس جگہ کا نام و نشان ہمیں نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔

"اگر رات تک ہم کسی آبادی تک نہ پہنچے تو کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "رات آٹھ بجے ڈنر ہوگا۔ ایک ایک اُبلا ہوا انڈا اور دودھ۔ خالص قدرتی غذا۔ پروٹین سے بھرپور۔"

"خواہ مخواہ مذاق سے بات کیوں نہیں کرتے۔ رات کیسے گزرے گی' کہاں سوئیں گے صبح تک؟"

"باتیں کریں گے۔" میں نے کہا "سونا کیا ضروری ہے۔ یہ کچھ لوگ سو گئے تو پھر حشر کے دن ہی اٹھیں گے۔ معلوم نہیں یہاں سے میدان حشر کتنی دور ہوگا۔ خیر اٹھ کے جانا تو پڑے گا پیدل۔"

www.paksociety.com

تم سے بات کرنا فضول ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "یار! تم تو سیریس ہو گئیں۔ بھئی [illegible] ایڈونچر سمجھو کہ ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔ یہ ایک ایڈونچر ہے، اسے انجوائے کرو۔ ایسا سفر زندگی میں پھر کب ہوگا۔ رات کو ہر طرف خاموشی ہوگی اور سکون ہوگا۔ شاید چاندنی بھی ہوگی۔ آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے ہوں گے۔ ہم کو دنیا میں کہیں ایسی خلوت مل سکتی ہے؟ اتنی مکمل، بے خلل تنہائی کہیں نصیب نہ ہوگی۔ اپنا گھر ہوگا تو وہاں بھی آدھی رات کو فون چلانے لگے گا۔ ریسیور اٹھانے پر کوئی کہے گا "غضب ہو گیا سکندر بھائی، سالا منی دھوبے کا سودا ایک دم کر گیا۔ سوچو کہ گھبرا کے اٹھنے والے کا غصے سے کیا حال ہوتا ہے؟ صبح تک وہ خوں خوں کرتا رہتا ہے..... یا علی الصبح کوئی کال بیل بجاتا ہے۔ چھٹی کے دن جب آدمی دس بجے تک سونا چاہتا ہے اور دروازہ کھولو تو کوئی رنگی داڑھی اور لنگی والا فراڈ مولوی [illegible] کی مسند دھکی بجا کے کہتا ہے۔ بکرا چوڑی میں مسجد کے لیے چندہ۔۔۔۔"

رابعہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی "بس تو ہو گیا۔"

میں نے کہا "ہاں زندگی کے ساتھ زندگی کے سارے تفکرات اور ہنگامے ہوں گے۔ نہ جانا "کاروباری مصروفیات، مہمان داری، اپنے بل جمع کرانے ہیں، گاڑی کا سائلنسر پھٹ گیا ہے، نلکا لیک کر رہا ہے، جلدی سو جاؤ صبح بچوں کو اسکول چھوڑنے جانا ہے۔ وین خراب ہے۔"

"ابھی سے یہ بچے، اسکول اور وین کہاں سے آگئے۔" رابعہ زیرلب مسکرائی۔

میں نے کہا "کیوں؟ بچے ہوں گے تو یہ سب بھی ہوگا۔ اس لیے مس رابعہ، مسز سکندر بننے سے پہلے فرصت اور محبت کے ہر لمحے کو غنیمت جانو اور اس کی بھرپور خوشیوں سے مسکراہٹ کشید کر لو تاکہ ہمارے یادگار لمحوں میں آج کی رات کا ہر لمحہ شامل ہو۔ چاندنی اور برف، ستاروں کی تنک تابی، یہ قرب اور بے خوابی، آج رات بھر کی باتیں اور صبح کا انتظار اور پھر نمود صبح کا منظر، یہ سب یاد رکھنے کے لیے دیکھو اور سوچو، ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ یہ لازوال محبت چھوڑنے والی رات ہمیں ملی۔ تم کو غالب اور [illegible] کے سوا کوئی نہ ملے گا جو تمہارے تجربات کی پُرمسرت کسک اور سنسنی خیزی کو سمجھ سکے۔"

رابعہ نے اپنا سر میرے کندھے پر ٹکا دیا۔ خاموشی زبان بن گئی اور ہم اپنے ماضی سے کٹ کے مستقبل کا ایک خواب دیکھنے لگے۔

پھر اچانک رابعہ نے کہا "چلو سکندر۔"

میں نے کہا "چلو۔"

ہم پھر چلنے لگے۔ ہر قدم اٹھاتے ہوئے مجھے لگتا تھا کہ فاصلہ ایک قدم اور کم ہوا۔ گھر کچھ اور قریب آگیا۔ شاید اگلے قدم پر کوئی مل جائے۔ کوئی بستی نظر آجائے، اندھیرے میں جھلملاتے کسی چراغ کی لو ہمیں پکارے "ادھر آؤ مسافرانِ راہ، [illegible] تمہارے لیے نشانِ منزل ہے۔ یہاں بے سمت راستوں کا سفر تمام ہوا۔"

آہستہ آہستہ سورج غروب ہونے لگا۔ شفق کا سارا آتشیں رنگ آسمان سے زمین تک پھیل گیا۔ برف کے دھبوں میں شامل ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ آسمان تاریک ہونے لگا۔ رات نے ہر سمت سے یلغار کر دی۔ سردی بڑھ گئی۔

میری نظریں اب کسی جائے پناہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ ناہموار زمین پر ہر طرف بے برگ و بار درخت تھے اور برف پوش چٹانیں تھیں۔ اگر کسی چٹان کا سائبان مل جاتا تو ہم رات بھر کے لیے ٹھہر سکتے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ رات کو سرد ہوا کے ساتھ برف باری ہوگی۔ گزشتہ رات ہوا نہیں تھی اور نہ سارا دن چلی تھی مگر اب یخ بستہ ہوا کا پہلا جھونکا ہمیں خبردار کرنے آیا تھا۔

اس سے پہلے کہ ہوا تیز ہو کے طوفانی جھکڑ بن جاتی، میری نظروں نے ایک جگہ تلاش کر لی۔ اس چٹان کی بلندی زیادہ نہیں تھی مگر اس کا مغربی حصہ تھوڑا سا آگے جھکا ہوا تھا۔ ہوا کے رخ پر اس کا پھیلاؤ دو طرف یوں تھا کہ سامنے سے ٹکرانے والی ہوا رخ بدل کے دائیں بائیں ہو جاتی تھی اور پچھلے حصے میں تحفظ و عافیت کا بھرپور احساس ملتا تھا۔

رابعہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ برفانی علاقوں میں درجۂ حرارت صفر سے نیچے ہو تب بھی سردی قابل برداشت رہتی ہے مگر جب ہوا چلتی ہے تو گرم کپڑوں سے گزر کر براہ راست جسم کو کاٹتی ہے اور ہڈیوں تک اترنے والی سردی سے گویا [illegible] منجمد ہونے لگتا ہے۔ کوئٹہ میں یہ قندھاری ہوا کہلاتی ہے۔ وہاں جو اس قاتل ہوا کا مقابلہ کرتے ہوئے رات کو باہر نکلتے ہیں، وہ خون کے منجمد ہونے سے بھی مر جاتے ہیں۔

میں نے رابعہ کو چٹان کے سہارے پر زمین صاف کر کے بٹھا دیا اور خود خشک لکڑیاں اور گھاس پھوس جمع کرنے نکل گیا۔ [illegible] کی ہوا کے مقابلے کی تاب نہ لا کے زمین پر گرنے والا ایک درخت اس وقت عطیۂ خداوندی ثابت ہوا۔ میرے ہاتھ سن ہو رہے تھے مگر میں نے اس کی باریک ٹہنیاں اور شاخوں کو توڑا۔ موٹی شاخوں کو پاؤں سے دبا کے الگ کیا اور لکڑیوں کا پورا گٹھا اٹھا کے لوٹ آیا۔

رابعہ نے گھاس اور خشک پتوں پر پتلی ٹہنیاں توڑ کے رکھیں اور میں نے اس پر شراب کی آدھی بوتل انڈیل دی۔ اسے ختم کرنے سے پہلے جوزف کی زندگی ختم ہو گئی تھی مگر یہ قدرت کا انتظام ہے۔ وہی شراب ہمارے لیے زندگی کی ضامن بن گئی، جس کا ایک قطرہ بھی مسلمان کے لیے اتنا ہی حرام ہے جتنا ایک [illegible]۔

لائٹر جلاتے ہی شراب میں شامل الکحل نے آگ پکڑ لی۔ خشک گھاس اور پتوں کے ساتھ لکڑیاں جلنے لگیں۔ رابعہ [illegible] حرارت سے ان پر زیادہ بڑی شاخیں رکھتی گئی۔ چٹان کے نیچے

روشنی پھیل گئی اور شعلوں کی حرارت نے ہمارے جسموں میں راحت کا احساس بھر دیا۔

ایک بار پھر میں نے ٹین کے ڈبے جیسے غرماس کو آگ پر لٹکایا اور کافی کو ابالا۔ یہ بڑا غرماس تھا اور ابھی آدھا بھی خالی نہیں ہوا تھا۔ رابعہ نے اپنی قمیص کے دامن سے کافی چھانی اور مجھے ایک مگ [illegible] کے ساتھ پیش کی۔

میں نے کہا "ذرا کم سے کم اسبابِ زندگی کے ساتھ کیسے رہا جاتا ہے؟ اس کا تجربہ بھی ہو گیا ورنہ کیا کیا تکلفات کے جھمیلے ہیں۔ بیڈ روم، ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، ٹی سیٹ، ڈنر سیٹ، صوفہ سیٹ، ہر چیز جیسے ضروری اور ناگزیر ہو جاتی ہے، جیسے اس کے بغیر تو زندگی ہی نہیں گزرے گی۔"

"پھر زندگی کے لیے کیا ضروری اور ناگزیر ہے؟"

میں نے سوچ کے کہا "ایک تو محبت، دوسرے قناعت اور طمانیتِ قلب، اچھی صحت اور عزت۔"

"تم نے تو سب کچھ ہی مانگ لیا۔" رابعہ ہنسی۔

"سب کچھ خدا سے مانگ لیا تم کو مانگ کے۔ اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد۔ مگر تم نے یہ چھاؤں میں لے جا دیا۔"

جیسے جیسے رات گزرتی گئی، سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ ہوا جو شام سے ٹھہر ٹھہر کے رہ رہی تھی، طوفان کی رفتار سے درختوں کو جھنجھوڑنے اور چٹانوں سے سر ٹکرانے لگی۔ خشک شاخوں کی سیٹیاں تیز ہو گئیں اور دور سے چلانے والے بھوکے بھیڑیوں اور سردی سے ٹھٹھرتے گیدڑوں کی چیخوں کا شور قریب آگیا۔ رابعہ مجھ سے چمٹ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا "سوچ لو، ڈر زیادہ لگ رہا ہے یا سردی زیادہ لگ رہی ہے۔"

رابعہ ہنس پڑی "دونوں، سکندر! سنا ہے بھیڑیا زیادہ سفاک ہوتا ہے شیر اور چیتے سے بھی۔"

"میرے گناہ گار کانوں نے بھی کچھ ایسا ہی سنا ہے۔"

"اگر بھیڑیے قریب آگئے تو؟"

"تو کیا ہمیں کھا جائیں گے۔" میں نے اطمینان سے کہا "اس سے زیادہ ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو۔"

"ہم انہیں شوٹ کر دیں گے۔" رابعہ بولی۔

"فکر نہ کیا۔ ان سے کہیں گے کہ وہ قطار بنا کے حملہ کریں۔ یہ نہیں کہ سب ایک ساتھ ٹوٹ پڑیں۔ اس کے بعد ہم باری باری نشانہ لیتے جائیں گے، ایک کے بعد ایک کو گراتے جائیں گے۔ دس کارتوس ہیں ہمارے پاس۔ دس سے زیادہ ہوئے تو ہم کہہ دیں گے کہ بھئی مقابلہ ختم، اب کسی نے حملہ کیا تو فاؤل۔"

رابعہ بولی "تم بالکل خوفزدہ نہیں ہو؟"

"یہ تم سے کس نے کہا اور کیوں کہا؟"

"نہیں، مذاق جو سوجھ رہا ہے۔ ان حالات میں تو آدمی کا حوصلہ ہی نہیں، عقل بھی جواب دے جاتی ہے۔ دیکھو نہیں، خوفناک رات ہے اور اس ویرانے میں ہم تنہا ہیں۔ مر جائیں تو کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ میرے بدن میں تو ہوا کی آواز سے کپکپی طاری ہو رہی ہے۔ بھیڑیے الگ ڈرانے پر آمادہ ہیں۔"

میں نے اسے پیار سے تھپکی دی "دیکھو، آگ روشن ہے اور ہم اسے رات بھر روشن رکھیں گے۔ یہ جنگلی جانور آگ کے قریب نہیں آتے۔ اس چٹان کے نیچے تو سردی بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تم سو جاؤ۔"

"میں سو جاؤں؟ تم جاگتے رہو گے؟"

"ہاں، اس طرح تمہارا دماغ پریشانی سے بچا رہے گا ورنہ اپنے ساتھ تم مجھے بھی [illegible] کر دو گی۔ چلو شاباش! آرام سے پاؤں پھیلا دو، سر میرے کندھے پر رکھو، لیٹو۔ اب آنکھیں بند کرو۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور آنکھیں بند کر کے سو گئی۔ میرا خیال تھا کہ خوف اور ذہنی پریشانی میں اس کے لیے سونا مشکل ہوگا لیکن اسے مجھ پر اتنا اعتماد تھا کہ میری آغوش میں اس نے خود کو تمام خطرات سے محفوظ تسلیم کر لیا۔

وہ شاید آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ اس سے پہلے جب قریب آکے ایک بھیڑیے نے غرانا شروع کیا۔ رابعہ ایک دم چیخ مار کے اٹھ بیٹھی۔ میں نے ایک جلتی ہوئی لکڑی اس کی طرف پھینکی تو بھیڑیا بھاگ گیا لیکن کچھ دیر بعد پھر لوٹ آیا۔ اس کے ساتھی کہیں قریب ہی شور مچا رہے تھے۔

"اسے۔۔۔ شوٹ کرو۔" رابعہ نے لرزتی آواز میں کہا۔

"نہیں۔ ایک کو مارا تو باقی مشتعل ہو جائیں گے۔ بھیڑیے اپنے غول کے ساتھ پھرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

چند منٹ کے بعد دوسرا بھیڑیا آگیا پھر تیسرا۔ وہ چٹان سے کچھ فاصلے پر ایک حلقہ بنا کے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ حوصلے کے ساتھ آگ کو روشن رکھے۔ اس نے چند لکڑیاں اور جلنے کے لیے ڈال دیں۔ میں نے ایک جلتی لکڑی اٹھائی اور آگے بڑھا۔ بھیڑیے کچھ پیچھے ہو گئے لیکن ان کے عزائم جارحانہ محسوس ہوتے تھے۔

رابعہ نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا "آگے مت جاؤ سکندر۔"

میں نے کہا "فکر نہیں، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس غول میں کتنے بھیڑیے ہیں۔"

جب مجھے یقین آگیا کہ بھیڑیے صرف چھ ہی ہیں تو میں نے ایک خطرناک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ شکاریات پر میری معلومات محدود تھیں اور مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ ایک بھیڑیے کو شوٹ کرنے سے باقی بھاگ جائیں گے یا اپنے ساتھی کی موت کا انتقام لیں گے۔ میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ بھی ریوالور نکال کے ایک

www.paksociety.com

بھیڑیے کو نشانہ بنائے۔

"ہم ایک ساتھ فائر کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کسے نشانہ بناؤں؟"

"میں دائیں طرف والے کو گراتا ہوں، تم بالکل بائیں جانب والے کو گولی مارو۔ مگر دیکھو، پہلے پرسکون ہو جاؤ۔ تمہارا ہاتھ نہیں کانپنا چاہیے۔ اگر نشانہ خطا ہوا تو....."

"نشانہ خطا نہیں ہو گا۔" رابعہ کا لہجہ پرسکون اور پراعتماد ہو گیا۔

"گولی سر میں لگنی چاہیے۔"

"میں کوشش کروں گی۔" رابعہ بولی۔

"او کے۔ تین پر گولی چلا دینا۔ ون۔ ٹو۔ تھری۔"

دو فائر ایک ساتھ ہوئے۔ دو بھیڑیے ایک بھیانک چیخ مار کے اچھلے اور زمین پر گر کے تڑپنے لگے۔ باقی چار میں سے تین بڑی سرعت کے ساتھ پلٹ کر فرار ہوئے۔ چوتھا شاید بدحواسی میں ڈگمگا گیا۔ میں نے اسے ایک دم اپنے سامنے پایا۔ رابعہ کی چیخ کے ساتھ ہی میں نے دوسری گولی چلائی اور بھیڑیا پیچھے جا گرا۔

"کم آن گرل، اٹس آل اوور۔" میں نے رابعہ کو جھنجوڑا جو مجھے بازوؤں کے حلقے میں لے کر بھینچ رہی تھی اور مسلسل "پیچھے آجاؤ، پیچھے آجاؤ" کی گردان کر رہی تھی۔

"دو چلے گئے۔ تین کو ہم نے مار دیا، تین بھاگ گئے۔ اب کوئی خطرے کی بات نہیں رہی۔" میں نے رابعہ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ رابعہ کا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کے ارتعاش کو کنٹرول کیا۔ کچھ دیر بعد وہ دھیرے دھیرے پرسکون ہو گئی اور مردہ بھیڑیوں کو دیکھنے لگی جو ٹارچ کی روشنی میں اپنی کھلی آنکھوں اور خونی دانتوں کے ساتھ زیادہ بھیانک لگ رہے تھے۔

"صبح ہونے میں کتنی دیر ہے سکندر؟" آخرکار رابعہ نے ایک لمبی گہری سانس لے کر کہا۔

"معلوم نہیں۔ تین چار گھنٹے تو ضرور ہوں گے۔ چلو تم پھر سو جاؤ۔"

"نہیں مجھے نیند نہیں آئے گی۔ تم سو جاؤ۔" وہ بولی۔

"میں سو جاؤں! تمہیں ڈر نہیں لگے گا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ڈر تو اس وقت بھی لگ رہا ہے۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "بھیڑیے دم دبا کے بھاگ گئے ہیں۔ ممکن ہے اپنے ساتھ ہاتھی، شیر اور چیتے لے آئیں۔ ہاتھی کو تم سمجھو جنگل کا ٹینک، شیر کو ایک توپ۔ اس کی گرج بالکل توپ جیسی ہوتی ہے۔"

رابعہ آہستہ سے مسکرائی "میں ایسے ڈرنے والی نہیں ہوں۔ شیر کہاں سے آ گیا پاکستان میں اور ہاتھی کا یہاں کیا کام۔ تم سو جاؤ۔"

"اچھا۔ زیادہ ڈر لگے تو بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے جگا لینا۔

یہاں وحشی درندوں کے علاوہ بدروحیں بھی تو ہوں گی، بھوت....."

اس نے مجھے زبردستی لٹا دیا "بک بک مت کرو۔"

میں نے اس کی گود میں سر رکھا اور سونے کی اداکاری میں مشغول ہو گیا۔ نیند آنے کا سوال ہی نہ تھا۔ میرا خیال تھا کافی آرام کر کے اٹھنا چاہیے مگر میں اس کی آغوش میں سر رکھ کر لیٹا تو مجھ پر ایک سحر سا طاری ہو گیا۔ میں نے اس کے بدن کی خوشبو کو اپنے حواس پر طاری ہوتے محسوس کیا اور مدہوشی کے عالم میں اس کی آنکھوں میں جھانکا تو میری آنکھیں جیسے نشے سے بوجھل ہو گئیں۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا مگر سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو رات کا سفر تمام نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی سکون سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور جاگ رہی تھی مگر اس کا ایک ہاتھ میرے بالوں میں ہولے ہولے حرکت کر رہا تھا۔ میں نیم باز آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا اور اپنے نصیب پر رشک کرتا رہا جس نے مجھے اس کے قرب کی یہ حسین دولت دی۔ جب میرے اور اس کے درمیان محبت کے مقدس جذبات کی بے تابی، جدائی کے طویل عرصے اور فراق کے برزخ میں زندہ رہنے والی اس محبت کے لیے یہ عشق کا لمحہ گھڑی تھی۔ میں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کے سر کو جھکایا۔ اس کا چہرہ میرے قریب آ گیا۔ اتنا قریب کہ میں نے زندگی میں پہلی بار اس کے لب لعلیں کی حلاوت کو اپنے ہونٹوں پر محسوس کیا۔ اس نے کامل خود سپردگی کے ساتھ مجھے اس گستاخی کی اجازت دے دی تھی مگر میں نے جذبات کی آگ کو ہوا دینے سے گریز کیا۔

میں نے جذباتی سرگوشی میں کہا "رابعہ! کاش یہ رات کبھی ختم نہ ہو۔"

"کیوں؟" اس نے میرے گالوں پر اپنے گال رکھ دیے "ہماری ہر صبح ایسی نہیں ہو گی؟ اور اس کے بعد آنے والی ہر رات زیادہ خوبصورت نہیں ہو گی؟ چلو خدا سے زیادہ مہربانی مانگیں، اپنی زندگی مانگیں۔ صبح ہونے کو ہے۔ کیا پتا یہ دعاؤں کے قبول ہونے کی گھڑی ہو۔"

میں نے اٹھ کے کہا "کیا واقعی صبح ہو رہی ہے؟ تم نے اندازہ کیا؟"

رابعہ نے کہا "صبح کاذب کا اُجالا ختم ہونے کو ہے۔"

میں نے شرمندگی سے کہا "میرا ارادہ سونے کا نہیں تھا مجھے ایک نشہ سا ہو گیا تھا۔ مجھے افسوس ہے۔"

"کس بات کا؟"

"میرا فرض تھا کہ خود جاگتا اور تمہیں سونے دیتا اور حفاظت کرتا۔ تم کو اکیلا نہ چھوڑتا۔"

"پگلی" "کیسی باتیں کرتے ہو۔ تم میرے ساتھ تھے تو میں محفوظ تھی۔ اور میں تم سے زیادہ سو چکی تھی۔ تم کو آرام کی ضرورت تھی۔"

سردی اب اپنی انتہا پر تھی۔ لکڑیاں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ مجھے بہت دکھ ہوا کہ میں اس راستے درخت تک گیا جس سے لکڑیاں توڑ لایا۔ چٹان سے دور جا کے مجھے سردی کی شدت کا صحیح اندازہ ہوا۔ رات بھر روشن رہنے والی آگ نے چٹان کے سردی کے اثر کو کافی زائل کیا تھا ورنہ ہم واقعی ٹھٹھر جاتے۔

آہستہ آہستہ صبح صادق کا اُجالا پھیلنے لگا۔ جب افق کا رنگ بدلا تو مجھے معلوم ہوا کہ مشرق ہمارے دائیں ہاتھ پر ہے۔ رات ہم نے پرندوں کو گھونسلوں میں لوٹتے نہیں دیکھا تھا مگر اس وقت نہ جانے کہاں سے ڈھیروں پرندے نکل آئے۔ ان کی آوازوں نے خاموشی کے جمود کو توڑا اور ہماری تنہائی کے احساس کو ختم کر دیا۔ ابھی تک ہم خود کو غضب تنہائی پر محسوس کرتے تھے لیکن اب ہمیں یوں لگا کہ یہ اپنے پاکستان کی وہی پُررونق دنیا برقرار رہتا ہے۔

سورج کا زرد گولا نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک نئے دن کی اجلی دھوپ نے آسمان اور زمین کو جگمگا دیا۔ ابھی دھوپ میں حرارت ناپید تھی۔ میں نے اس وقت تک سفر آغاز کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا جب تک فضا میں کچھ حرارت شامل نہ ہو۔

"دودھ کہاں ہے؟" رابعہ نے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ دودھ جمنے کی چیز ہوتی ہے۔"

رابعہ نے خشک دودھ کا ڈبا میرے سامنے رکھ دیا "ذرا اسے پکا کر لائیے۔"

میں نے کہا "خشک دودھ نکال لو۔ کسی کپڑے پر ڈھیر کر لو۔ میں پانی لے کر آتا ہوں۔"

"پانی؟ پانی کہاں ملے گا؟" رابعہ بولی "اچھا" تمہارا مطلب برف سے تھا۔"

"جی برف غالباً پانی کی منجمد شکل ہوتی ہے۔"

رابعہ نے خفت سے مسکراتے ہوئے ڈبے کو ایک کپڑے پر الٹ دیا۔ میں خالی ڈبا لے کر نکلا۔ تقریباً سو گز کے فاصلے پر مجھے برف کی سفیدی نظر آئی جو ایک پہاڑ کے ساتھ ساتھ پگھلی ہوئی تھی۔ قریب پہنچ کے میں نے پگھلی ہوئی برف کا شفاف پانی دیکھا جو ایک دو جگہ سے گزر کے بیچ پتھروں کے درمیان گڑھے میں جمع ہو گیا تھا۔ میں نے اس پانی میں انگلی ڈالی تو میری انگلی سن ہو گئی اور میں نے اس پانی سے منہ دھونے کا ارادہ فوراً بدل دیا۔

اس پگھلی ہوئی برف کے پانی سے بھرے ہوئے ڈبے کو اٹھا کے لانا بھی قوت برداشت کی آزمائش تھی۔ ڈبے کو میں نے انگاروں کے بیچ میں رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا درجہ حرارت بہتر ہو گیا اور چند منٹ میں پانی ابلنے لگا۔ رابعہ نے اس میں دودھ کا پاؤڈر ملانا شروع کیا اور ایک لکڑی سے ہلاتی گئی۔ پھر نمک ملا کے یہ گرم دودھ میں نے رابعہ کے ساتھ پیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس بے سروسامانی کے سفر میں بھی اس نے ہمارے لیے رزق کی فراہمی کو یقینی بنایا۔

"دیکھو، کیسی رہی یہ تکنیک؟" میں نے کہا۔

"بہت شاندار۔" رابعہ بولی "مگر اب چلنا چاہیے۔"

"او کے۔ کیمپ فائر کو بجھا دو۔"

"یہ خود ہی بجھ جائے گی۔ تم ایسا کرو، تھوڑا سا پانی لا دو، ڈبے کو دھو کے گرم کر کے ہاتھ منہ دھو لیں گے۔" رابعہ بولی۔

"میں نے سوچا تو تھا کہ وہیں منہ دھو لوں لیکن دھو لیتا تو معلوم ہے کیا ہوتا؟" میں نے کہا۔

"کیا ہوتا؟ زکام ہو جاتا۔"

"میرا چہرہ غائب ہو جاتا۔ پانی میں انگلی ڈالی تھی تو انگلی غائب ہو گئی تھی۔" میں نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

منہ دھوتے ہی ہم بالکل فریش ہو گئے۔ رات بھر کے آرام سے بھی بہت فرق پڑا تھا۔ میری ٹانگ کا درد بھی کم تھا اور رابعہ نے بھی کہا کہ اس کی چوٹوں میں اب پہلے جیسی تکلیف نہیں ہے۔ روانگی سے پہلے دھونے نے تیسری بار دودھ کافی گرم کی جو تقریباً ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اگر چائے ہوتی تو اس کا ذائقہ زیادہ خراب ہوتا۔ کافی کے ذائقے میں بھی فرق آیا تھا مگر تلخی میں محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے ایک ایک ابلا ہوا انڈا کھا لیا، کافی کے ساتھ درد کا احساس مٹانے والی دو گولیاں لیں اور سفر کے لیے تیار ہو گئے۔

رابعہ نے خشک دودھ کو پھر ڈبے میں بھر لیا۔ کھانے کے لیے اب ہمارے پاس چند بسکٹ اور اس دودھ کے سوا کچھ نہیں بچا تھا مگر فوری طور پر ہم اتنے تازہ دم تھے کہ دوپہر تک کچھ کھائے پیے بغیر سفر کر سکتے تھے۔ ٹارچ اب بھی روشن تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر تین خونی بھیڑیوں کی اکڑی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ اگر میرے پاس کیمرا ہوتا تو میں اس منظر کی تصویر ضرور اتارتا۔

ہم نے رات بھر پناہ دینے والی چٹان کے سائبان کو خدا حافظ کہا اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چل دیے۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت صبح کے نو بجے ہوں گے۔ سردی کے اثر کو زائل کرنے کے لیے میں نے تیز تیز چلنا شروع کیا۔ رابعہ نے میرا ساتھ دینے کی کوشش کی مگر کچھ دیر بعد اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔

"بھئی یہ کیا ہے، کیوں بھاگے جا رہے ہو؟" اس نے چلا کے کہا۔

"خاتون اگر یہ بھاگنا ہے تو پھر چلنا کیا ہوتا ہے؟"

"مجھے تو دوڑنا ہی پڑ رہا ہے۔ اپنی تیز رفتاری سے یہ ثابت مت کرو کہ دو گھنٹے میں تم لاہور پہنچ جاؤ گے۔"

"میں تو پہنچ جاتا مگر خیر..... تمہاری خاطر حد رفتار دو گھنٹا فی میل۔ میرا مطلب ہے دو میل فی گھنٹا کر لیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

دھیرے دھیرے سفر کے حالات موافق ہونے لگے۔ برف غائب

www.paksociety.com

ہو گئی۔ زمین پر کہیں کہیں خشک گھاس دکھائی دینے لگی۔ پھر کچھ ایسے خودرو پودے نمودار ہوئے جو موسمی حالات کے تغیر کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے تھے۔ تاہم ابھی تک میں اپنے دائیں بائیں کسی آبادی کے آثار تلاش کرنے میں ناکام تھا۔ کسی ماہر کھوجی کی طرح میں زمین کو بھی غور سے دیکھتا جا رہا تھا کہ کہیں کسی کا نقش قدم، کسی سائیکل، تانگے یا بیل گاڑی کے پہیوں کا نشان نظر آئے تو ہم اس کو حل کا سراغ بنا لیں اور نشانات کے ساتھ چلتے جائیں۔

دوپہر ہو گئی۔ چلتے چلتے میری ٹانگیں اکڑ گئیں۔ رابعہ نے میرا ساتھ دیا مگر وہ صنف نازک تھی۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کی قوت برداشت بھی بہت جلد ساتھ چھوڑ جائے گی۔ مایوسی کے آثار اس کی صورت پر عیاں تھے۔ مایوسی میرے اعصاب کو بھی شکست دینے لگی تھی مگر رابعہ کی خاطر میں نے اپنی شگفتہ مزاجی میں فرق نہیں آنے دیا۔ میں اس سے باتیں کرتا رہا اور اسے ہنسانے کی کوشش کرتا رہا۔

اچانک ایک جگہ رابعہ بیٹھ گئی "اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔"

میں نے منہ میں انگلی ڈال کے سیٹی بجائی "ٹیکسی۔ بدمعاش گزر گیا رکے بغیر۔ خیر ابھی دوسری آجائے گی۔"

رابعہ نے کہا "ٹیکسی نہیں ایمبولینس منگواؤ فون کر کے۔"

میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن ہر سمت وہی ویرانی تھی۔ یہاں برف بھی نہیں تھی جسے ہم پگھلا کے پانی بنا لیتے اور اس میں دودھ حل کر کے پی لیتے۔ خشک ٹہنیاں اور پتے بہت تھے مگر انہیں سلگانا مشکل تھا۔ پہلے تو شراب نے فیول کا کام کیا تھا۔ کاغذ کے ٹکڑے بھی ہوتے تو کام چل جاتا مگر لائٹر کا ننھا سا شعلہ تو کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے کہا "چلو کولڈ کافی پی لو اسپرین کے ساتھ اور بسکٹ کھاؤ۔"

رابعہ نے سر ہلایا "یہ ہمارا آخری طعام ہوگا۔ اس کے بعد......"

میں نے تھرمس کے ڈھکن میں کافی بہائی "اس کے بعد ہم صبر سے کام چلائیں گے۔ سنا ہے صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

کافی ختم ہو گئی تو میں نے تھرمس کو پھینک دیا۔ رابعہ کی قمیص پر سامنے کافی کے رنگ کا داغ نمایاں ہو گیا تھا۔ اس کے کپڑے میلے ہو رہے تھے اور بال پریشان تھے۔ خود میری شیو اتنی بڑھ گئی تھی کہ خشخشی داڑھی قرار دی جا سکتی تھی۔

رابعہ اپنی پوٹلی کو سر کے نیچے رکھ کے لیٹ گئی۔ میں نے بریف کیس کو سر کے نیچے رکھا اور دھوپ سے روشن آسمان کو گھورنے لگا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ ابھی تک نہ ہمیں آبادی کے آثار ملے تھے اور نہ کوئی راہ گیر جو ہماری راہنمائی کر سکتا۔ بھولے بھٹکوں کو راستہ بتانے والے خواجہ خضر بھی نہ جانے ہمیں کیوں بھول گئے تھے۔ جغرافیائی حالات خاصے بدل چکے تھے اور یہ جگہ کسی بھی انسانی بستی کے لیے موافق ماحول فراہم کر سکتی تھی مگر آبادی کہیں نہ تھی۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ دائیں بائیں کسی گاؤں کو دیکھ نہ سکے اور بستی کے پاس سے کئی کلومیٹر دور سے گزر گئے۔

فضا کی سکون بخش حرارت اور تھکن کے باعث مجھ پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ رابعہ پہلے ہی آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ اب ہمارے پاس کرنے کو بات بھی کوئی نہ رہی تھی۔ تھے تو وہ سوالات جن کا جواب نہ تھا۔

اچانک میں نے مکمل سکوت میں ہلکا سا ارتعاش محسوس کیا۔ یہ ہلکی سی سرسراہٹ تھی جیسے شہد کی مکھیاں بے شمار تعداد میں پرواز کرتی میرے سر پر سے گزر رہی ہوں۔ اب بھنبھناہٹ زیادہ واضح ہو گئی اور میرے ساتھ ہی رابعہ اٹھ بیٹھی۔

"یہ آواز سن رہے ہو تم سکندر؟"

"ہاں۔ یہ تمہاری آواز ہے جو میرے کانوں میں رس گھول رہی ہے۔"

"میرا خیال ہے کوئی گاڑی آرہی ہے؟" رابعہ کھڑی ہو گئی۔

"کون سی گاڑی؟ گدھا گاڑی، بیل گاڑی۔" میں اس وقت تک اندازہ کر لیا تھا کہ یہ جیپ کی آواز ہے۔

رابعہ اسی سمت میں دیکھ رہی تھی جدھر سے ہم پیدل چل کر آئے تھے "سکندر یہ کار کے انجن کی آواز ہے نا؟"

"کون سی کار؟ فورڈ، شیورلیٹ یا..."

"کم بخت یہ مرسڈیز کار کے انجن کی آواز ہے اور قریب آرہی ہے۔" رابعہ نے خوشی سے کہا۔

"بالکل غلط۔ یہ کار کے انجن کی آواز نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟" رابعہ بولی۔

"یہ جیپ کے انجن کی آواز ہے مگر جیپ کہاں ہے؟ کیا نظر نہ آنے والی جیپ ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"دیکھو آواز کتنی واضح ہے۔"

"شاید جنات کی سواری گزر رہی ہے جنگل سے تو آواز ہی سنائی دیتی ہے۔" میں نے ادھر ادھر نظریں گھماتے ہوئے کہا۔

"تم سیریس نہیں ہو سکتے؟" رابعہ بگڑ گئی۔

"لاحول ولا قوۃ کیا میں تمہیں لگ رہا ہوں۔ اتنا سیریس ہوں۔"

"سکندر پلیز! جب ہم جیپ کی آواز سن سکتے ہیں تو وہ ہماری آواز ضرور سن لیں گے۔ جیپ زیادہ دور ہے۔"

میں نے سر ہلایا "دو کلومیٹر شمال مغرب، چالیس سے پچاس ڈگری۔ غالباً ان درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے۔ فاصلہ زیادہ ہو سکتا ہے۔"

رابعہ نے میرا بازو پکڑ کے مجھے جھنجھوڑ ڈالا "آواز دو۔

ورنہ وہ نکل جائیں گے۔"

میں نے منہ پر دونوں ہاتھ رکھے اور گلا پھاڑ کے کہا "مسٹر جیپ والے... اے... آپ... ہیلو..."

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"آوازیں نکال رہا ہوں۔ نام تو مجھے کسی کا معلوم ہے نہیں۔" میں نے کہا "مقصد تو شور مچا کے انہیں متوجہ کرنا ہے۔"

رابعہ نے سر ہلایا۔ اشتیاق اور امید کے جذبات نے اس کے اضطراب کے رنگ بکھیر دیئے تھے۔

"جیپ کے پیچھے کوئی ہے؟ آؤ... ہو ہو... او جیپ والے ارے ہم ادھر ہیں بھائی" میں نے گلا پھاڑنا جاری رکھا۔

میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ جب اچانک میرے کانوں تک پہنچنے والی جیپ کے انجن کی آواز نے رخ بدلا تو میں نے اس تبدیلی کو فوراً محسوس کر لیا۔ آواز لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتی گئی۔

"رابعہ! انہوں نے ہماری آواز سن لی۔ وہ آرہے ہیں۔" میں نے فرط مسرت میں رابعہ کو سمیٹ کر اٹھایا اور گول گول گھوم کر اسے اپنے ساتھ گھمانے لگا "خدا نے ہماری سن لی۔"

"ارے چھوڑو مجھے۔ پاگل ہو گئے ہو کیا؟" رابعہ نے ہنستے ہنستے کہا "اف دیکھو کوئی آجائے گا تو کیا کہے گا۔"

میں نے اسے نیچے اتار دیا "وہی کہے گا جو تم نے کہا۔ میں خود بتاؤں گا انہیں کہ میں پاگل ہوں، دیوانہ ہوں۔ دیوانہ ہوں اس لڑکی کا۔ اور یہ لڑکی رابعہ ہے۔ میں سکندر اعظم ہوں۔ پہلے میں نے اس کو فتح کیا پھر دنیا کو فتح کیا۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ ڈر کا یہاں کیا کام یہاں تو سب اپنے ہیں۔ سب پاکستانی ہیں۔"

رابعہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے اگرچہ ہم نے ابھی تک آنے والوں کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ جو بھی تھے ہمیں اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے اور صحیح راستہ دکھا سکتے تھے۔ اس کے بعد چند ہی گھنٹوں میں لاہور، کراچی سب ہماری پہنچ میں تھے۔

جیپ درختوں کے بیچ میں سے نمودار ہوئی تو ہم اس کی طرف لپکے۔ میں دوڑ کر آگے نکل گیا۔ جیپ رک گئی۔ اس میں آگے ڈرائیور کے ساتھ سویلین کپڑوں میں ایک سنجیدہ افسر نما شخص بیٹھا تھا۔ اس کی عمر چالیس سے اوپر تھی مگر صحت قابل رشک تھی۔ وہ ٹویڈ کے کوٹ اور گرے ورسٹیڈ کی پینٹ میں تھا۔ کوٹ کے نیچے اونی سویٹر تھا جس کے وی شیپ گلے سے ٹائی بھی نظر آرہی تھی۔ اپنے پہناوے سے وہ فوجی یا پولیس والا لگتا تھا۔

"آپ آوازیں دے رہے تھے ہمیں؟" اس نے ہاتھ ہلا کے پوچھا۔

"ہم نے جیپ کی آواز سن لی تھی۔" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا "ہم کل سے مسلسل سفر میں تھے۔ نہ ہمیں کوئی آبادی ملی نہ راستہ بتانے والا ملا۔ اب تو ہمارا حوصلہ ہی جواب دینے لگا تھا۔ آپ لوگ نہ آتے تو نہ جانے ہم..."

اس نے کہا "ٹھیک ہے انکل۔ پہلے جیپ میں بیٹھو، باقی باتیں بھی ہو جائیں گی۔ یہ بیوی ہے آپ کی؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور رابعہ سے کہا "تم بیٹھو پہلے آپ۔ میں نے کہا تھا کہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، کوئی ضرور ملے گا۔"

رابعہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تو میں بھی جیپ میں چڑھ گیا۔

"ہم بھی آپ ہی کو تلاش کر رہے تھے۔" افسر نما شخص نے جیپ میں بیٹھنے کے بعد کہا اور جیب سے سگریٹ نکالی۔

"ایک سگریٹ مجھے بھی۔ پلیز!" میں نے بے اختیار کہا۔

"سوری۔ یہ آخری سگریٹ تھی۔ تم بھی چاہو تو شیئر کر لو۔" وہ بولا "آپ لوگوں نے واقعی کمال کیا۔ اتنی دور پیدل آگئے۔ تمہاری بیوی کی ہمت کی میں داد دیتا ہوں۔"

میں نے سگریٹ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور کھینچ لیا۔ رابعہ مجھے گھور رہی تھی۔

"ہم کہاں سے آرہے ہیں یہ جانتے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔

"ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم آپ ہی کو تلاش کر رہے تھے۔"

اس نے کہا "ہم کل رات بھی نکلے تھے پر امید تھے مگر اندھیرے میں یہ کام مشکل تھا۔ اور آپ لوگ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔"

میں نے انگریزی میں کہا "آخر آپ کون ہیں اور ہمیں کیوں تلاش کر رہے تھے؟"

اس نے کہا "میرا نام میجر شفیق ہے۔"

"اوہ! میں سمجھ گیا۔ آپ لوگوں نے ہی وہ ہیلی کاپٹر گرایا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"رائٹ۔ وہ ہیلی کاپٹر پاکستان کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بہت اندر آگیا تھا۔" میجر شفیق نے کہا۔

"کیا اسے گرانے سے پہلے ضروری نہیں تھا کہ آپ اسے وارن کرتے؟" میں نے کہا۔

"ہم نے اسے وارننگ دی تھی۔" وہ بولا "ایک بار نہیں دو بار اور اگر ممکن ہوتا تو ہم اسے انٹرسیپٹ (INTERCEPT) بھی کرتے۔ جب اس نے ہمارے کہنے کے باوجود لینڈ کرنے سے انکار کر دیا......"

"آر یو شیور کہ اس نے انکار کیا تھا؟"

"وات ڈو یو مین بائی دیٹ۔ یہ موجودہ طریق کار ہے۔ ہر جگہ، ہر ملک میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی غلطی سے کسی ملک کی سرحد عبور کر جائے۔ نیوی گیشن کے آلات کی خرابی سے ایسا ہو جاتا ہے تو اسے بغیر وارننگ کے کوئی شوٹ نہیں کرتا۔ وٹ بلڈی باسٹرڈ۔ آئی ایم سوری! مجھے ایک خاتون کی موجودگی میں ایسی زبان استعمال

www.paksociety.com

کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ وہ جو ہیلی کاپٹر اڑا رہا تھا' اس نے ہمارا مذاق اڑایا' ہمیں مشتعل کیا اور چیلنج کیا کہ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

میں ہکا بکا بیٹھا تھا "میں نے تو نہیں سنا۔"

"تم اس کے ساتھ تھے نا؟" وہ میرے رضاکارانہ اور غیرارادی اعتراف جرم پر خوش ہو کے بولا "میں بتاتا ہوں اس نے کیا کہا۔ اس نے کہا تو ہیلی دو یہ۔ اور پھر وہ گاتا گاتا رہا۔ "کیچ می اف یو کین" تم جانتے ہو کہ یہ گانا محمد علی کلے سے منسوب ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے افسوس سے کہا "مگر یہ چیلنج نہیں تھا میجر شفیق۔"

"اور کیا تھا؟" وہ بگڑ کے بولا "وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے پکڑ سکو تو پکڑو۔"

"وہ نشے میں تھا۔" میں نے کہا "سارا راستہ پیتا رہا تھا۔"

"پھر تو ٹھیک ہی ہوا اس کے ساتھ۔ ایسے لوگوں کو شوٹ ہی کر دینا چاہیے جو جہاز اڑاتے وقت پیتے ہوں اور غیرقانونی طور پر سرحد عبور کر کے کسی ملک میں دشمن کے جاسوس اتارتے ہوں۔"

"دشمن کے جاسوس! کون ہے دشمن کا جاسوس؟" میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرہ اس گالی پر گرم ہو گیا ہے۔

"اور کون ہو تم؟" اس نے طنز سے کہا۔

"مائنڈ یو میجر شفیق۔ مجھے مشتعل مت کرو۔ میں اتنا ہی پاکستانی اور محب وطن ہوں جتنے تم۔ یہ بات دوبارہ مت کہنا۔ میرا نسلی میں تم نے مجھے بہت بڑی گالی دے دی تھی۔ اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میرا نام سکندر بخت ہے اور ابھی یہ میری بیوی نہیں ہے لیکن یہ مس رابعہ قادری بار ایٹ لاء' ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور ہے۔ میری شادی اسی سے ہو گی۔"

اس کی صورت کے تاثرات ایکدم بدل گئے "ایک بار پھر بتاؤ۔"

میں نے کہا "پہلے تم بتاؤ کہ ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟"

"اپنی یونٹ میں' تفتیش کے لیے۔"

"ارے! پھر باقی باتیں ہم تفتیش کے وقت بتائیں گے۔ سب کچھ تمہیں راستے میں نہیں بتایا جا سکتا۔ تم کو سوچنا چاہیے کہ ہم ذہنی اور جسمانی طور پر کتنے خستہ حال ہیں۔ ہمیں پہلے فوراً آرام اور طبی امداد چاہیے۔ میں یہ بھی بتا دوں میجر شفیق کہ میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں۔ میں ایک صنعتکار کا بیٹا ہوں اور خود بھی......"

میجر شفیق مسکرایا "او کے او کے۔ آئی ایم سوری۔ اگر یہ سب سچ ہے اور اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے تو پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ریلیکس۔ میں آپ سے بھی معذرت خواہ ہوں مس رابعہ۔"

رابعہ نے خوش دلی سے انگریزی میں کہا "میرا بھی آپ کے خلاف ہتک عزت کا کوئی دعویٰ کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ یہ غلطی بھی اب دور ہو چکی ہے۔"

میں نے کہا "میجر شفیق! کیا ہمارے علاوہ بھی آپ لوگوں کو علاقے میں کوئی نظر آیا تھا؟ کل یا آج؟"

"آپ کے علاوہ کون تھا؟ آپ کا کوئی ساتھی؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "ایک جرنلسٹ مرزا غالب۔"

"جرنلسٹ! مرزا غالب تو شاعر تھے۔"

"وہ تھے' یہ ہیں۔" میں نے کہا "اور اس کے ساتھ بھی ایک خاتون ہیں۔ مس ہاٹلی۔"

"وہ کیا کرتی ہیں؟ میرا مطلب ہے ان کا پیشہ۔"

"مار دھاڑ" میں نے کہا "خونریزی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔ آخر یہ کس قسم کا ٹولہ تھا جس میں ایک صنعتکار' ایک بیرسٹر خاتون' ایک جرنلسٹ' ایک مار دھاڑ کرنے والی خاتون شامل تھیں۔ اس ہیلی کاپٹر کے بارے میں ہم تصدیق کر چکے ہیں۔ وہ نیپال سے آیا تھا۔" میجر نے کہا۔

"ہم بھی نیپال سے آئے تھے۔" میں نے کہا "اور اگر اس ہیلی کاپٹر کو شوٹ کر کے نہ گراتے تو وہ ہمیں اتار کے واپس جاتا جیسے کہ وہ پہلے متعدد بار جا چکا تھا۔"

"متعدد بار؟"

"جی۔ اس نے ہم سے پچاس ہزار لیے تھے۔ نیپال پاکستان کی سرحد کے اندر پہنچانے کے۔ ہم مشرقی پاکستان میں جب وہ بنگلہ دیش بنا تو لاکھوں پاکستانیوں کی طرح ہم بھی وہاں سے نکلنے پر مجبور ہوئے مگر ہمارے پاس پیسہ تھا۔ ہم نے یہ ہیلی کاپٹر فرار کے لیے چارٹر کر لیا تھا ورنہ ہم بھی قافلوں کے ساتھ آنے پر پاکستان پہنچتے۔"

رابعہ نے کہا "آپ کو ہمارے ساتھی نہیں ملے میجر شفیق؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "مجھے تو نہیں ملے اور میرا خیال ہے کسی کو بھی نہیں ملے۔ عام خیال یہ تھا کہ اس جگہ سے آگے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ رات کوئی کہاں گزارے گا؟ مر جائے گا سردی میں۔ صبح مجھے خیال آیا کہ نوری بہت جان ہوتا ہے اور ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ مجھے نکلنا چاہیے۔"

"اگر میں تم کو فرار نہ دیتا تو تم سرحد سے آگے نکل جاتے!"

"پتا نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ واپس لوٹ جاؤں۔ شاید جنگل سے گھوم کے آتا تو تم سے ملاقات ہو جاتی۔ اب یہ تو دیکھیں گے۔ کسی کی ملاقات تمہارے ساتھیوں سے ہوئی یا نہیں۔ چانس کم ہے۔"

"وہیں میجر شفیق! وہ کہاں جا سکتے ہیں۔ وہ بھی پیدل ہوں گے۔ انہیں تلاش کرنا' اتنی جلدی فیصلہ مت کرو۔"

"ہم پوری کوشش کریں گے' ایک بار پھر۔ اور اس مرتبہ تمہیں بھی ساتھ رکھیں گے۔ رائٹ۔"

مجھے کچھ یہ لگ رہا تھا کہ جیپ اسی راستے پر واپس جا رہی ہے جس پر میں اور رابعہ آئے تھے۔ ہم اس چٹان کے پاس سے گزرے جہاں ہم نے زندگی کی ایک یادگار مگر ہولناک رات گزاری تھی۔ وہاں شاید ابھی تک تین بھیڑیوں کی لاشیں پڑی ہوں گی۔ آگ جو رات بھر سردی کے خلاف ایک ڈھال بنی رہی' روشن رہی تھی' بجھ چکی ہوگی۔ آدھ جلی لکڑیوں اور کوئلوں پر راکھ کی تہہ ہوگی اور چٹان کے نیچے ان انڈوں کے چھلکے پڑے ہوں گے جو ہم نے کھائے تھے۔

جو راستہ ہم نے دن رات اپنے قدموں سے برف میں تھک کر' ناہموار زمین پر جسمانی تکالیف کو برداشت کرتے اور موسم کی سختی کو جھیلتے طے کیا تھا' وہ جیپ کے مشینی پہیوں نے انتہائی تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے آدھے گھنٹے میں طے کر لیا۔

جب ہم وہاں برف میں دھنسے ہوئے ہیلی کاپٹر کے پاس سے گزرے تو وہاں ایک چھوٹا سا خیمہ نصب تھا اور چار پانچ افراد بڑی محنت سے اس کو کھود کر نکالنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ایک فوجی ٹرک کے قریب ہی جیپ کھڑی ہوئی تھی اور تین افراد آپس میں مصروف گفتگو تھے۔

میجر شفیق نے اپنی جیپ کو ان سے کچھ فاصلے پر روکا اور ایک شخص کو سیلوٹ کیا "وی گاٹ دیم سر۔"

جسے سیلوٹ کیا گیا تھا' وہ زیادہ عمر رسیدہ' متین اور بارعب چہرے والا شخص تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے آیا۔

میں نے نیچے اتر کے اس سے ہاتھ ملایا "سکندر بخت میرا نام ہے۔ یہ خاتون رابعہ قادری بار ایٹ لاء' ایڈووکیٹ لاہور ہائی کورٹ ہیں۔"

مجھے اس شخص کی آنکھوں میں تحیر کے جذبات نظر آئے۔ اس نے ہاتھ ملا کے کہا "کرنل جعفری" اور سوالیہ نظروں سے میجر شفیق کی طرف دیکھا۔ سوال بہت واضح تھا۔ تم نے تو کہا تھا میجر کہ ہم نے انہیں پکڑ لیا مگر یہ تو انڈین جاسوس نہیں ہیں؟

میجر شفیق نے قریب آ کر وضاحت کی۔ کرنل نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور سوچتا رہا۔

"ان دیٹ کیس" اس نے میرے کندھے پر بزرگانہ شفقت سے ہاتھ رکھا "کسی بات کا برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ جا کے آرام کرو' شام کو بات کریں گے۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی تفتیش مکمل کیے بغیر اور مطمئن ہوئے بغیر ہمیں جانے کی اجازت ہی نہیں دیں گے۔ ہمیں کہیں پہنچانے کا انتظام تو بعد کی بات تھی' ان سے بحث کرنا اور انہیں قائل کرنا کہ وہ فوراً ہمیں جیپ یا ٹرک سے کسی سڑک تک پہنچا دیں یا فوری طور پر ہماری کسی سے بات کرا دیں' فضول سی بات ہوتی۔

میں نے کرنل سے ہاتھ ملایا اور جیپ ہمیں لے کر آگے روانہ ہو گئی۔ مزید ایک گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد ہم ایک احاطے میں داخل ہوئے جس کے تین طرف بیرکس بنی ہوئی تھیں۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے سنتری نے میجر شفیق کو سیلوٹ کیا اور جیپ سیدھی گزرتی بائیں جانب کی بیرک کے سامنے جا ٹھہری۔ اس راستے کے دونوں طرف سفید اور لال رنگ کی اینٹوں سے حاشیہ بندی کی گئی تھی اور ہر طرف وہ صفائی نظر آتی تھی جو ملٹری ڈسپلن کا خاصا ہوتی ہے۔

چند منٹ بعد ہم ایک کمرے میں تھے۔ میجر شفیق نے اپنے بیٹ مین کو تفصیلی ہدایات جاری کر دی تھیں اور بتا دیا تھا کہ ہم کرنل صاحب کے خاص مہمان ہیں چنانچہ ہمارے قیام و طعام کا خاص خیال رکھا جائے۔ اس کمرے میں دو بیڈ تھے۔ دو کرسیاں اور ایک میز یوں لگائی گئی تھیں کہ انہیں کھانے کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا اور پڑھنے کے لئے بھی۔ دونوں بیڈز کے درمیان ایک چھوٹی سی ریک نما سائیڈ ٹیبل تھی۔

بیٹ مین حیران تھا کہ ہم کیسے خاص مہمان ہیں جن کا حلیہ بگڑا ہوا ہے اور جن کے پاس ایک بریف کیس کے سوا کچھ بھی سامان سفر نہیں۔ اس علاقے میں کسی سویلین اور خاص طور پر ایک جوان اور حسین عورت کا پہنچنا ہی سب کے لئے عجیب تر تھا۔

میں نے کہا "ہم پہلے نہائیں گے۔ میں شیو بھی کروں گا۔ پھر چائے یا کافی کے ساتھ کچھ کھائیں گے۔"

"یس سر" بیٹ مین بولا۔

"پھر کرنل صاحب کے آنے تک ہم آرام کریں گے" میں نے کہا "سب سے پہلے مجھے سگریٹ کا ایک پیکٹ لا کے دو۔ کوئی سی سگریٹ ہو۔"

"سگریٹ تو نہیں ہے سر" بیٹ مین نے کہا اور رخصت ہو گیا۔

"کل سے سگریٹ نہیں پی تھی تو مرے نہیں تھے" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"قریب المرگ ضرور ہو گیا تھا۔"

"جھوٹ مت بولو۔ کچھ نہیں ہوا تھا تمہیں۔ پہلے جیپ میں بیٹھتے ہی میجر شفیق کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ اب اس بیٹ مین کو حکم دے دیا۔"

میں نے کہا "چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ یہ نشہ ہے۔"

"اسے نشہ سمجھتے ہو تو بابا چھوڑ دو" رابعہ نے کہا "مگر صرف

www.paksociety.com

فیصلہ اداری کی بات ہے تو اس کی تمہیں کوئی کمی نہیں۔ بس ارادہ کرلو۔"

"کیا بات ہے۔ آج اچانک ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ آج ہی چھڑا کے دم لوگی۔"

"بالکل۔ بڑا اچھا موقع ہے۔ جب تک ملتی رہی 'پیتے رہے' اب نہیں ہے تو مجبوری مت سمجھو۔ طے کرلو کہ جیسے دوران گزر گئے ایسے ہی تم اگلے روز دن' پھر دو ہفتے' دو مہینے اور دو سال بھی گزار لوگے۔ سگریٹ کے بغیر۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا "کہتی تو تم ٹھیک ہو عزیزہ مگر..."

"اگر مگر مت کرو۔ ایک بری عادت چھٹ جانے کی توبہ بھی اس یادگار سفر کا یادگار تحفہ ہوگا۔ ہم یاد رکھیں گے اس بات کو بھی کہ کب اور کہاں تم نے سگریٹ نوشی ترک کرنے کا عہد کیا تھا۔ بولو' مانو گے میری بات؟ آج تک میں نے پہلے کبھی تم سے کچھ کہا' کوئی بات کی اس موضوع پر؟"

وہ بہت سیریس ہو رہی تھی۔ میں تعجب کو کورٹ میں رہا کے اس کی صورت کو دیکھتا رہا۔ "کیا چاہتی ہو تم آخر۔ میں جھوٹا وعدہ کرلوں؟"

"تم... مجھ سے جھوٹا وعدہ کرو گے؟" اس کا چھوٹوں اٹھا جیسے میں نے اس کی تذلیل کردی ہو۔ وہ رونے کے قریب ہوگئی۔

میں ہنس پڑا "پاگل۔ میں چھیڑ رہا تھا تمہیں۔"

"اچھا تو پھر وعدہ کرو" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے سر پر رکھ لیا "میری قسم کھا کے وعدہ کرو۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "کیا کرتی ہو۔ یہ ملٹری یونٹ ہے' ہمارا بیڈ روم نہیں ہے۔ تماشا بن جائے گا۔"

"بننے دو" اس نے پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا "میں تمہیں زندگی کی ہے۔ تم کو ماننی پڑے گی میری بات ورنہ؟"

"ورنہ کیا...؟"

"ورنہ میں کچھ کروں گی" اس نے عزم مصمم کے ساتھ کہا۔ "قسم پھر میں کھاؤں گی کہ جب تک تم سگریٹ نہیں چھوڑو گے میں کھانا چھوڑے رکھوں گی۔"

میں نے کہا "تم سچ مچ پاگل ہوگئی ہو۔"

"یہی سمجھ لو۔ مگر تمہاری قسم ایسا ہی ہوگا۔"

رابعہ نے انگریزی محاورے کے مطابق لوہے پر اس وقت چوٹ لگائی تھی جب لوہا گرم تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میری سگریٹ نوشی کی عادت کبھی اس کے اور میرے درمیان وجہ نزاع نہیں بنی تھی اور اس نے کبھی مجھے چھڑانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی مگر اب اچانک وہ دھمکی دینے پر اتر آئی تھی اور اس پر عمل کرنے کو پختہ تھی۔ اس نے موقع غنیمت جانا تھا اور بالکل صحیح وقت پر اپنی بات منوانے پر تل گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دو دن سگریٹ کے بغیر گزار کے میں نے اس عادت کے خلاف تو گویا

جنگ تو جیت ہی لی ہے۔ اگر میں دو دن اور گزار لیتا تو اس مجبوری کے جال سے نکل سکتا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا "جانم' تمہارے کہنے سے سگریٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا' میرا تم سے وعدہ ہے۔"

اس نے ایک دم میرا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں کے جلتے پانی کی نمی مجھے اپنے ہاتھ کی پشت پر محسوس ہوئی۔ "بس' اب قسم مت کھانا۔ مجھے معلوم ہے تم مجھ سے جھوٹا وعدہ کر ہی نہیں سکتے۔"

جبھی میں ایک دم دروازہ کھول کے اندر آگیا۔ وہ ہاتھ میں گرم پانی کی بالٹی رکھے آیا تھا۔ یہ جذباتی 'رومانی' منظر کچھ اتنا بدنما ہوا کہ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کے قدم دروازے پر ہی رکے رہے پھر وہ لڑکھڑا کے ہاتھ روم میں گھس گیا۔

جب وہ واپس جا رہا تھا تو میں نے کہا "سنو جوان!"

"یس... یس سر" وہ سر جھکا کے کھڑا ہوگیا۔

"تم جب کسی کے کمرے میں جاتے ہو تو کیا ناک نہیں کرتے؟ دستک دے کر اجازت کا انتظار نہیں کرتے؟"

"معاف کردیں' غلطی ہوگئی سر" وہ بڑی مشکل سے بولا "میجر صاحب سے میری شکایت مت کریں۔"

"نہیں کروں گا۔ جاؤ" میں نے کہا اور وہ دروازہ کھول کے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی حالانکہ آنسوؤں کی نمی اب بھی اس کی آنکھوں میں تھی۔

"مجھے باتھ روم میں سے شیونگ کا سامان دے دو اور تم تیار ہو جاؤ۔ آٹھ بج رہے ہیں" میں نے کہا۔

"سکندر" وہ اٹھی اور دروازے کی طرف ایک قدم اٹھا کر بولی "تم... خفا تو نہیں ہو مجھ سے؟"

"خفا۔ کس بات پر؟" میں نے کہا۔

"میں نے تمہیں بلیک میل کیا۔"

میں ہنس پڑا "یہ رائٹ میل تھا۔ بلیک میل کیا جاتا ہے بڑے مقصد کے لئے۔ تم نے تو بقول شاعر وہ کام کیا جو کم سے کم نہ ہوگا۔ اور یہ نیکی تھی جو تمہارے نامۂ اعمال میں لکھی گئی۔ مبارک باد دیتا ہوں تمہیں کہ تم نے اپنی محبت سے میری ایک کمزوری کو میری طاقت بنادیا۔ یہ کام تم ہی کرسکتی تھیں۔"

رابعہ کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا اور اس نے ایک ایسی حرکت کی کہ اگر بیٹ مین اندر آکے دیکھتا تو چھت سے گر کے بے ہوش ہو جاتا۔ خود میں بھونچکا رہ گیا اور رابعہ باتھ روم میں غائب ہوگئی۔ میں نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ میرے عکس نے مجھ سے کہا۔ اے مجنوں! اب منہ اور مسور کی دال۔

اور میں نے قہقہہ مار کے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرا "مسور کی دال؟ کہاں ہے مسور کی دال؟" میں نے کہا۔

گیا ہے۔"

بیٹ مین پھر دستک دینا بھول گیا اور اندر آگیا۔ اب اس نے مجھے آئینے میں اپنے آپ سے باتیں کرتے دیکھا تو گڑبڑا کے واپس ہوا۔ باہر جاکے اس نے دستک دی اور میرے "یس" کہنے پر دوبارہ اندر آیا۔ وہ سخت شرمندہ تھا۔ "یہ سگریٹ سر... میجر شفیق نے بھیجی ہے۔"

"ان کو میرا سلام اور تھینکس بولنا۔ سنو۔ کہاں بھاگے جارہے ہو؟ یہ سگریٹ واپس لے جاؤ۔ میجر صاحب سے کہنا کہ ابھی تین گھنٹے پہلے میں نے سگریٹ پینا چھوڑ دی ہے۔ کیا کہو گے؟"

اس نے میری بات دہرائی اور سگریٹ کا آدھا پیکٹ اٹھا کے بھاگ گیا۔ بے شک ہم کرنل صاحب کے مہمان تھے مگر ہم نے اپنی مشتبہ حرکات و سکنات سے ثابت کردیا تھا کہ معزز مہمان بھی ذہنی عدم توازن کا شکار ہوسکتے ہیں۔

اس یونٹ تک سپلائی ایک مشکل کام تھی۔ وہاں بجلی بھی نہیں تھی۔ رات کے وقت ایک جنریٹر چلایا جاتا تھا جس سے ضروری اور اہم نوعیت کے فرائض کی ادائیگی ممکن ہو جاتی تھی۔ کھانے پینے کی ہر چیز کا راشن تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

چائے کے ساتھ ہمارے کھانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ بسکٹ' مٹھائی' خشک میوے اور ڈبے ہوئے مربے جہاں ہر چیز ٹن پیک رکھی جاتی تھی اور اس موسم میں فریج کے بغیر محفوظ رہتی تھی۔ زنانہ کپڑوں کا وہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا چنانچہ رابعہ نے بھی مردانہ شلوار قمیص پہن کے اوپر چادر اوڑھی ہوئی تھی۔

ہم چائے پی کے فارغ ہی ہوئے تھے کہ کرنل جعفری دستک دے کر اندر آگیا۔

"گڈ لک' چیئرز' ایند بون ایپٹیٹ" اس نے رابعہ کی طرف دیکھ کے کہا (تم بہت مسز لگ رہی ہو۔ اور تم زیادہ حسین)

میں نے کہا۔ "میں اس مہمان نوازی اور حسن انتظام..."

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "ڈونٹ بی فارمل۔ مجھے کچھ بتایا ہے میجر شفیق نے' لیکن میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور سگار کاٹنے لگا۔ وہ عادتاً انگریزی بولتا تھا۔ "خاتون! آپ اجازت دیں تو..." اس نے سگار سلگانے سے پہلے کہا۔

"یہ اجازت نہیں دیں گی۔ ابھی ابھی انہوں نے مجھ پر مکمل پابندی عائد کی ہے۔ دس سال پرانی سگریٹ پینے کی عادت میں نے ان کے اصرار پر تین گھنٹے پہلے ترک کردی۔"

کرنل نے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ "میں نے سنا تھا میجر شفیق سے لیکن میں نے مذاق سمجھا تھا۔"

"یہ مذاق نہیں' حقیقت ہے کرنل۔"

"اوہ مائی گڈنس۔ یہ بیویاں سب کچھ کرسکتی ہیں۔" کرنل نے سگار اپنی جیب میں رکھ لیا۔

رابعہ نے شرم سے سرخ ہوکے کہا۔ "آپ سگار پئیں سر' آپ مہمان ہیں۔"

"میں مہمان ہوں؟" کرنل نے حیرانی سے کہا۔ "میرا خیال تھا میں میزبان ہوں۔"

"اس یونٹ میں ہم آپ کے مہمان ہیں لیکن اس کمرے میں آپ ہمارے مہمان ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"یہ تو ہے قانونی پوزیشن۔" کرنل بولا۔ "اچھا آپ کی اجازت ہے تو پھر..." اس نے دوبارہ سگار نکالا اور جلا لیا۔

اگلے ایک گھنٹے تک اس نے ہماری سرگزشت سننے کے بہانے تفتیش کی مگر انسانی شائستگی اور اخلاق کے ساتھ۔

"میرا وہاں زرعی مشینری کے آلات اور پرزے بنانے کا چھوٹا سا کارخانہ تھا۔" میں نے اپنے بیک گراؤنڈ کے حوالے سے بات کی۔ "ڈھاکا کے صنعتی علاقے میں جب تباہی مچی تو وہ کارخانہ بھی تباہ ہوگیا۔ اس کے بعد میرے گھر کی باری آئی۔ میں اکیلا تھا اس لیے جان بچا کے فرار ہوگیا۔ گھر کا سارا اسباب بلوائیوں نے لوٹ لیا پھر گھر کو آگ لگا دی۔ وہاں واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں ہوٹل شاہ باغ میں فرضی نام سے رہا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے بینک سے اپنا سرمایہ نکلوانے کا موقع مل گیا۔ وہ غیر ملکی بینک تھا اس لیے محفوظ رہا ورنہ لوگ تو ایک پیسہ نہیں نکلوا سکے۔"

"آپ کا تو بہت نقصان ہوا ہوگا۔" کرنل بولا۔ "کارخانہ چھوٹا ہو پھر بھی لاکھوں سے کم کا نہیں ہوتا۔"

"جی۔ کارخانے کی بلڈنگ' مشینیں اور سب اثاثے تقریباً بیس پچیس لاکھ مالیت کے تھے۔ مکان بھی دو لاکھ کا تھا علاوہ سامان کے۔"

"اور آپ کتنا بچا کے ساتھ لاسکے مسٹر سکندر؟" اس نے بے پروا سے لہجے میں کہا۔

"تقریباً ساڑھے چار لاکھ۔ نقد۔ جو اس بریف کیس میں موجود ہے۔ آپ چیک کرسکتے ہیں۔ یہ سب پاکستانی کرنسی ہے۔"

"مجھے آپ پر اعتبار ہے مسٹر سکندر بخت۔" وہ بولا۔ "تاہم ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ نے کہا تھا کہ یہ خاتون جو آپ کی مسز ہیں لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتی ہیں۔"

"پہلے تو میں وضاحت کردوں سر کہ ابھی تک یہ مسز سکندر بخت ہونے کا اعزاز حاصل نہیں کرسکیں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "یہ میری منگیتر ہیں اور یوں سمجھ لیں کہ مجھے لینے آئی تھیں مگر خود بھی ڈھاکا میں پھنس گئیں۔"

"آئی سی۔" کرنل نے کہا۔ "یہ آپ کے ساتھ ہی مقیم تھیں؟"

www.paksociety.com

"اوہ لوگ یہ اپنے ایک عزیز کے گھر ٹھہری تھیں۔ انہوں نے میری بہت مدد کی۔ وہ عوامی لیگ کے مقامی عہدیدار تھے اس لئے ان کی چلتی تھی۔ انہی کے دم سے ہم نیپال پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔"

"یہ اب بھی رکن ہیں لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی؟"

"آف کورس۔ ان کی اپنی لیگل فرم ہے جس کا دفتر لاہور کی مال روڈ پر ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ ٹیلی فون نمبر لکھ لیں۔ ان کے اور میرے ایک مشترک دوست عبدالودود مینجر ان کے معاملات کی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ بھی لاہور ہائی کورٹ کے وکیل ہیں۔"

کرنل نے غالباً نمبر یادداشت میں محفوظ کر لیا۔ "آپ ڈھاکا میں اکیلے تھے۔ آپ کی فیملی کے باقی افراد ــــ"

میں نے کہا۔ "میرے والدین کا تو انتقال ہو چکا۔ والد تقسیم کے وقت پاکستان آ گئے تھے۔ والدہ اور باقی سارے بھائی بہن فسادات کی نذر ہو گئے تھے۔ صرف میں بچا تھا۔ میرے والد نے لاہور میں مکان بنایا تھا جو آج میری ملکیت ہے۔ وہ ماڈل ٹاؤن میں ہے۔ نمبر لکھ لیں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔" کرنل نے کہا مگر وہ مزید معلومات کے انتظار میں مجھے متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"میرے ایک چچا تھے اکرم شیروانی۔ وزارت خارجہ میں ڈپٹی سیکریٹری تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ تاہم ان کی بیٹی فوزیہ ہے اور میں یہ اعتراف کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتا کہ پہلے میں فوزیہ سے منسوب تھا۔ یہ ہمارے والدین کا فیصلہ تھا۔ مس رابعہ سے ملنے کے بعد میں نے اپنی مرضی سے اس فیصلے کو منسوخ کر دیا۔ وجہ وہی تھی۔ میری اور فوزیہ کی افتاد طبع میں مطابقت نہیں تھی۔ اس سے ہمارے خاندانی تعلقات بھی متاثر نہیں ہوئے اور بزرگ بھی خفا نہیں ہوئے۔ فوزیہ کا شوہر اب لیورپول میں لیکچرار ہے۔ رابعہ کے ایک چچا ایس ایس پی حاسن رضوی صاحب تھے۔ وہ بھی انتقال کر چکے ہیں۔ پورا پولیس کا محکمہ انہیں جانتا تھا کیونکہ وہ غالباً ایمانداری، فرض شناسی اور اصول پرستی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ رابعہ کا اپنا گھر گڑھی شاہو میں کراؤن سینما کے سامنے تھا مگر والدہ کے انتقال کے بعد یہ چچا کے گھر میں رہیں جو بانسوں والی سڑک پر رہتے تھے۔ آپ نے لاہور دیکھا ہے؟"

"میں لاہور میں ہی پلا بڑھا ہوں۔" کرنل جعفری نے سادگی سے کہا

"تو آپ جانتے ہوں گے کہ بانسوں والی سڑک دھرم پورہ ریلوے کراسنگ سے شروع ہوتی ہے۔ مسز حاسن رضوی نے شوہر کے انتقال کے بعد کرائے کا ایک مکان لیا اور اس میں اسکول چلایا۔"

"کرائے کا مکان! ان کا اپنا کوئی مکان نہیں تھا؟"

"صرف تنخواہ میں سے بچت کر کے مکان بنانا اتنا آسان تو نہیں کرنل جعفری۔ آپ کا ذاتی مکان ہے؟"

وہ چونکا۔ "نو۔ ابھی تک تو نہیں ہے۔ مگر ایک ایس ایچ او کا مکان نہ ہو۔ ان بلیو ایبل۔"

"میں نے اور میرے چچا زاد بھائی نے گریجویشن لاہور سے کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلے گئے۔ وہاں ہم نے چار سال گزارے۔"

"تمہارا آبائی مکان لاہور میں ہے، بزنس ڈھاکا میں تھا۔" کرنل نے پھر سگار جلاتے ہوئے کہا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں زیادہ مراعات حاصل تھیں مغربی پاکستان کے صنعتکاروں کو۔ بڑے منافع بخش (INCENTIVES) تھے۔ میرے والد نے اسے لاہور میں شروع کیا تھا مگر بعد میں ڈھاکا منتقل کر دیا۔"

کرنل کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ "یہ ٹیلی کاپٹر آپ نے کیسے حاصل کیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "میرے والد وزیر خان کا ایک پرانا دوست تھا رام ناتھ۔ اس کا بنگلا دلی روڈ پر ہے۔ ہم اسی کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس نے سارا بندوبست کیا تھا۔"

"اور اس غیر قانونی پرواز کے لئے جوزف پریرا کو پچاس ہزار روپے دیے گئے تھے؟" کرنل ایک دم سے بولا۔

"آپ اس کا نام جانتے ہیں؟"

"ہم نے معلوم کر لیا ہے۔ نیپال کے پاکستانی سفارت خانے سے جہاز کا نمبر وغیرہ مل گیا تھا۔ ہم مزید تفتیش کر رہے ہیں تاہم ثابت ہو گیا ہے کہ ہیلی کاپٹر میں سراغرسانی اور جاسوسی کے آلات نہیں تھے۔"

سفارت خانے کے حوالے پر میرا دل ڈوبنے لگا تھا کہ شاید کرنل نے ہمارے بارے میں ہمارے کچھ بتانے سے پہلے ہی سب کچھ معلوم کر لیا ہو گا۔ میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بولا تھا اور کرنل نے بھی بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ سچ جانتا ہے کہ میرے جھوٹ کو اخلاقاً تسلیم کر رہا ہے یا بعد میں میرے خلاف استعمال کرنے کے لیے۔ وہ بہت ذہین اور جہاندیدہ آدمی تھا۔ اس کے سامنے میری حیثیت طفل مکتب جیسی تھی۔ اس کی آخری بات سے مجھے کچھ سکون ہوا۔

"آپ نے یہ بھی معلوم کر لیا ہو گا کہ جوزف پریرا پہلے ہم اس قسم کی فلائٹ پر آ رہا ہے؟" میں نے کہا۔

کرنل نے سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے وہ نفسیاتی مریض تھا۔ ایسے لوگ تم نے بھی دیکھے ہوں گے جو بالکل نارمل نظر آتے ہیں مگر ان میں خودکشی کے رجحانات غالب ہوتے ہیں۔ خودکشی زہر یا خواب آور گولیاں کھا کے، خنجر سے شہ رگ کاٹ کے یا پنکھے سے لٹک کر پھانسی چڑھ جانے سے ہی نہیں ہوتی۔ اس کے لاشعوری طریقے کو جنتی تیزی کو تکرار کرتے ہوئے حد سے زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ خطرے کے ساتھ گاڑی چلانا اور اسے ایڈونچر سمجھنا، لاقانونیت رفتاری کو دلیرانہ کرنے کے نام پر شراب اور سگریٹ نوشی میں حد سے بڑھ جانا، خطرناک رسک لینا اور خود کو نڈر ثابت کرنا۔ یہ سب در حقیقت ایسے ہی لوگوں کے کام ہیں جنہیں (SUICIDAL TENDENCY) کہتے ہیں۔ جوزف ولی بھی ایسا ہی تھا۔ آپ کو قتل کر رہا تھا اور مارنا چاہتا تھا۔ اس کے پرائیویٹ لاشعور میں ایک احساس جرم تھا۔ دنیا کے سامنے وہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ عیاش اور خوش باش آدمی ہے جس کا غم سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اس نے اپنے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ اس کے مکان پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے۔ اس رات جوزف کا ہیولا گھر میں تھا۔ وہ قتل کے الزام میں پکڑا گیا اور اسے موت کی سزا ہو گئی۔ جوزف کی ماں یہ بات جانتی تھی لیکن وہ منہ کھولتی تو بیٹا بھی ہاتھ سے جاتا۔ اسے یہ بات بھی دیر سے معلوم ہوئی تھی۔ بس کہیں چلی گئی تھی۔ اس کے بارے میں پھر کبھی کسی نے کچھ نہیں سنا۔ وہ مر گئی تھی۔ تاہم جوزف جانتا تھا کہ اپنی ماں اور بہن دونوں کو خود اس نے تباہ کیا تھا۔ یہی احساس جرم تھا جو اس کے لیے سوہان روح بنا۔ وہ دن رات شراب پیتا تھا۔ اس نے شادی بھی نہیں کی تھی۔ دو سال تک وہ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتا رہا اور دو بار حادثے کا شکار بھی ہوا لیکن بچ گیا۔ ایک بار سو کلومیٹر کی رفتار پر گاڑی چلاتے ہوئے اس کی کار کے بریک فیل ہو گئے اور وہ سامنے سے آنے والے ٹرک میں گھس گیا مگر آدمی خوش قسمت تھا! سمجھ لو کہ اس کی موت کا مقررہ وقت دور تھا۔ وہ پھر بچ گیا۔ ہمیں معلوم ہے وہ چار مرتبہ ہماری فضائی حدود میں داخل ہوا۔ ایک بار اس نے ہمیں جھوٹ بول کے ڈاج کیا، ایک بار وہ عین سرحد پر مسافروں کو اتار کر بھاگ گیا، دو بار وہ نشانہ چوک جانے کے باعث نکل گیا۔ بٹ بی کاز ہم سیلف فائٹنگ۔ (لیکن آخر کار وہ اپنی جان لینے میں کامیاب رہا)"

میں دم بخود بیٹھا تھا۔ رابعہ کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ کرنل جعفری نے جوزف پریرا کی پوری زندگی کو ہمارے سامنے کھلی کتاب کی طرح رکھ کے ثابت کر دیا تھا کہ اس کی معلومات کس حد تک مکمل ہو سکتی ہیں اور وہ کتنے کم وقت میں اپنے وسائل کو بروئے کار لا کے جھوٹ اور سچ کا تفصیلی پوسٹ مارٹم کر سکتا ہے۔ وہ لاہور کا رہنے والا بھی تھا یا وہ مجھے اشارہ دے رہا تھا کہ میں اس سے جھوٹ نہ بولوں۔

میں نے کہا "کرنل جعفری! یہ سب آپ نے اتنے کم وقت میں کیسے معلوم کر لیا؟"

"ہمارے وسائل ہیں بینک مین۔ ہم اپنا کام پیشہ ورانہ مہارت اور پرفیکشن (PERFECTION) کے ساتھ کرتے ہیں۔"

"اگر آپ لاہور کے رہنے والے ہیں تو آپ ایس ایس پی حاسن رضوی سے بھی واقف ہوں گے۔"

"او ویل۔ ہی واز اے فائن مین۔" کرنل جعفری نے کہا۔

"آپ نے سول اینڈ ملٹری گزٹ بلڈنگ میں واقع رابعہ قادری اینڈ کمپنی کا دفتر بھی دیکھا ہو گا۔"

"وہ بلڈنگ تو ظاہر ہے مال پر ہے مگر مجھے کبھی کسی لیگل فرم کی خدمات کی ضرورت نہیں پڑی۔" وہ مسکرایا۔ "تاہم مجھے معلوم ہے ایک خاتون بیرسٹر تھیں۔ ان کی رہائش گڑھی شاہو میں تھی، کراؤن سینما کے سامنے۔ اور ان کا مکان غالباً ہنگامے سے تباہ کر دیا گیا تھا۔ عین اسی دن جس دن ان کی والدہ کی تدفین تھی۔"

"وہ ــــ وہ میں ہی تھی کرنل جعفری۔" رابعہ نے بڑی مشکل سے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ "سکندر! انہیں سب معلوم ہو گا۔"

میں نے اپنے ماتھے پر خفت کا پسینہ محسوس کیا۔ "کرنل جعفری! آپ جانتے ہیں کہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔"

"لیں۔ تم نے جھوٹ کو سچ کے ساتھ ملا کے پیش کیا تھا۔" اس نے شاید دسویں بار سگار جلایا۔ "ڈھاکا میں تمہاری فیکٹری کی کہانی غلط تھی۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ تم کس طرح ڈھاکا پہنچے تھے اور کیوں۔ میرا خیال ہے کہ بہت سے لوگوں کو معلوم ہو گا۔ اخبارات میں بھی بہت کچھ آیا تھا پہلے تو بعد میں کچھ انڈین پریس نے رپورٹ کیا۔ تم سب کی تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں اور کچھ ایم آر ایس کا نام بھی آیا تھا۔"

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سب خوف اور اندیشوں کے آسیب نمودار ہو گئے جو میرے ماضی کی گرد میں گم ہو گئے تھے۔ خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے کہا۔ "اب مجھے کیا سمجھنا چاہیے کرنل جعفری! کیا میں زیر حراست ہوں؟"

"زیر حراست؟" آف کورس ناٹ۔ کیا جرم کیا ہے تم نے؟" کرنل جعفری بولا۔ "میرے نزدیک تم نے اس جنگ میں حصہ لیا تو کوئی غلطی نہیں کی۔ یوسی! ہم سب حالات اور واقعات کو اپنی اپنی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنا اپنا نقطہ نظر رکھتے ہیں، زندگی کے ہر شعبے میں۔ خواہ وہ معاشرتی ہو یا سیاسی۔ چنانچہ یہ جو کچھ میں اپنی دانست میں اپنی سوچ کے مطابق کرتا ہوں اور اسے صحیح سمجھتا ہوں۔ صحیح اس لیے کہ میرا ضمیر مطمئن ہوتا ہے۔ وہی دوسرے شخص کے نزدیک غلط ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مشرقی پاکستان کے المیے کو لو۔ یہ کس کی غلطی تھی؟ فوج کی، سیاست دانوں کی یا بیوروکریسی کی جس نے ابتدا سے حالات کو اس حد تک بگاڑا۔ مستقبل کا مورخ خود فیصلہ کرے گا۔ آج تو ہم سب اس جرم میں برابر کے شریک ہیں اور ایک سے شرمندہ ہیں کہ ہماری جدوجہد رائیگاں گئی۔ جدوجہد ہر سطح پر کی گئی تھی۔ مشرقی پاکستان کے محب وطن عوام نے اپنے طور پر مزاحمت کی تھی۔ اینڈ ٹوکٹ دی لانگ اسٹوری شارٹ (قصہ مختصر) اٹ از آل اوور ناؤ۔ سب ہمارے ماضی کا حصہ بن گیا۔ ہم

www.paksociety.com

ایک جذباتی قوم ہیں۔ حقیقت جب خود اپنا وجود تسلیم کراتی ہے تو ہم مانتے ہیں' اس سے پہلے ہم خواب کی باتیں کرتے ہیں یا اپنے شاندار ماضی کے حوالوں سے دل بہلاتے ہیں۔ اب ضروری ہے کہ ہم اس باب کو بند کردیں۔ ایک دوسرے پر الزام تراشی سے کیا حاصل ہوگا۔ مزید انتشار اور عدم اعتماد کی فضا۔ اس سے کہیں بہتر ہوگا' اگر اپنے اپنے طور پر ہم اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لیں۔ صرف جائزہ لینے کے لیے نہیں۔ اس لیے کہ ہم سے کبھی غلطیاں پھر سرزد نہ ہوں۔ بے شک انسان خطا کا پتلا ہے۔ ہم دوسری غلطیاں کریں گے۔"

وہ یکلخت خاموش ہوگیا۔ اس کا چہرہ اندرونی کرب اور ذہنی اذیت کے جذبات سے تاریک ہو رہا تھا۔ ہر سچے پاکستانی کی طرح وہ دکھی تھا اور اس کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ حقیقت کے آتش فشاں کا لاوا تھا۔

اب رات ہوگئی تھی۔ رابعہ نے اٹھ کے لائٹ جلانے کی کوشش کی مگر کمرا تاریک رہا۔

"سوری! ہم یہاں جنریٹر استعمال کرتے ہیں' روشنی کے لیے نہیں' کام کے لیے۔" کرنل جعفری نے کہا "یہاں بجلی پہنچی ہی نہیں۔ میں چائے بھی منگواتا ہوں اور موم بتی بھی۔"

اس نے بیٹ مین کو آواز دی جو شاید دروازے کے قریب ہی اٹین شن کھڑا ہوا تھا۔ وہ آرڈر پر سیلوٹ مار کے اور ایڑی پر گھوم کے چلا گیا۔

"یہاں سپلائی بڑا مشکل کام ہے اور بہت مہنگا۔ پھر بھی ہمیں کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ سوائے بیوی بچوں کے۔ تو وہ ایک سپاہی کے لیے کوئی خاص بات نہیں۔ ہم یہاں ایک فیملی کی طرح رہتے ہیں۔ یہاں کسی پرتکلف ضیافت کا اہتمام تو نہیں کیا جاسکتا پھر بھی رات کو ڈنر پر تم ہمارے مہمان خصوصی ہو۔"

میں نے کہا "کرنل جعفری! میں پہلے ہی بہت شرمندہ تھا' آپ نے میری عزت نفس کو بحال کیا اور مجھے اس درجہ اعتبار عطا کیا' اپنائیت دی اور یقین دیا۔ میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔"

"ضرورت شکریے کی نہیں ہے بلکہ میں۔ احتیاط کی ہے۔ تم کیوں خود کو اتنا محفوظ سمجھنے لگے ہو؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ جو پہلے تمہارے دشمن تھے' وہ اب دوست ہوگئے ہیں اور تمہارے شایان شان استقبال کے لیے چشم براہ ہیں؟" کرنل جعفری نے کہا۔ "بے شک وہ میری طرح سوچتے ہیں اور تمہارے جذبۂ حب الوطنی کے معترف ہیں' ان سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ مگر جو پہلے بدخواہ تھے' کیا وہ تمہیں معاف کردیں گے' تمہیں الزامات سے بری کردیں گے؟ میرا اشارہ کس کی طرف ہے' تم سمجھ رہے ہو نا؟"

"میں بالکل سمجھ رہا ہوں۔ اور آپ کی بات نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ جو مجھے پہلے نظر نہیں آرہا تھا' اب صاف نظر آرہا ہے" میں نے کہا "یہ بھی آپ کا احسان ہے کہ آپ نے مجھے خبردار کردیا۔"

"پرانے شکاری نیا جال بھی بچھا سکتے ہیں اور تم کو راستے میں بھی گرفتار کرسکتے ہیں" کرنل جعفری نے کہا "جس کو تم بھولے ہوئے تھے۔"

"یو آر ویری رائٹ۔ مجھے بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے ورنہ میں پھر مشکل میں پڑ سکتا ہوں" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"پہلے حالات کا جائزہ لے لو' دیکھو خطرہ ہے یا نہیں اور تم کس حد تک محفوظ ہو" کرنل نے کہا "اس کے بعد کچھ کرو۔"

میں نے کہا "آپ کے اس مشورے نے مجھے بچالیا ورنہ میں تو لاہور پہنچ کے اپنی آمد کا اعلان ڈھول بجا کے کرتا۔ اب میں خاموشی سے اور رازداری کے ساتھ دوستوں اور دشمنوں کی نیت اور ارادے کو دیکھوں گا۔"

بیٹ مین ناک کرکے آیا اور چائے رکھ کے چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے کارنس پر دو موم بتیاں جلا کے رکھ دیں۔ رابعہ نے کمرے کی کھڑکیاں بند کردیں کیونکہ رات کے ساتھ ہی سردی پھر بڑھ گئی تھی۔

میں اور کرنل کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے خاصے اختصار کے ساتھ اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات بتائے۔ وہ دلچسپی سے سنتا رہا۔ اب ہمارے درمیان دوستانہ اعتماد کا رشتہ قائم ہوگیا تھا اور کوئی حجاب نہیں رہا تھا چنانچہ میں نے کوئی بات نہیں چھپائی۔

آٹھ بجے وہ جانے کے لیے اٹھا۔ "کھانا ہم نو بجے کھائیں گے۔"

رابعہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "کرنل صاحب! میرا لباس....."

اس نے ایک قہقہہ مارا۔ "اٹس آل رائٹ۔ وہاں میرے علاوہ صرف تین افسر ہوں گے میرے کمرے میں۔ میجر شفیق سے تم مل چکے ہو' باقی دو جونیئر افسر ہیں۔ ایک کیپٹن اور ایک لیفٹیننٹ۔ وہ سب شریف اور مہذب لوگ ہیں۔ انہیں معلوم ہے تمہاری مجبوری۔"

میں نے کہا۔ "کیا انہیں یہ سب بھی معلوم ہے جو آپ کو معلوم ہے؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔" اس نے جاتے جاتے کہا اور پھر دروازے میں ذرا سی دیر کے لیے رکا۔ "تمہاری وہی اسٹوری بالکل ٹھیک ہے جو تم نے مجھے سب سے پہلے سنائی تھی۔"

اس نے دروازہ بند کردیا۔ میں اور رابعہ دم بخود بیٹھے رہے۔ پھر رابعہ نے کہا۔ "کیا کمال کا آدمی ہے یہ بھی۔"

"اب پھر مجھے یقین آیا کہ خدا کیسے ہماری حفاظت کر رہا ہے۔ ہم ظاہر کی آنکھ سے تماشا کرنے والے اس کی مصلحت کو کہاں سمجھتے ہیں۔ سوچو رابعہ کہ یہ حادثہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ ہم چھپاتے لاہور یا پنڈی پہنچ جاتے۔ جو بات مجھے کرنل جعفری نے بتائی' وہ تو میرے ذہن میں دور دور تک نہ تھی۔"

رابعہ نے کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہو رہا تھا کہ ہم نے بلاوجہ اتنی تکلیف اٹھائی اور اتنا سفر کیا۔ ہم وہیں بیٹھے رہتے تو کچھ دیر بعد فوج کے لوگ بھی پہنچ جاتے اور ہم اتنی دور سے واپس آنے کے بجائے بیٹھے بیٹھے یہاں پہنچ جاتے۔"

"بات وہی ہے کہ ہر کام کا ایک وقت ہے اور ہر وقت کے لیے ایک کام ہے۔" میں نے کہا۔ "کرنل جعفری از گریٹ۔ وہ میرے حق میں بالکل فرشتۂ رحمت ثابت ہوا۔ میں جتنا ماتم کروں اپنی عقل پر کم ہے۔ آخر میں کیوں بھول گیا تھا کہ مجھ پر پولیس کیس ہے۔ بات صرف چوہدری والا اور اینڈ کمپنی کی نہیں۔ نہ قانون کی نظر میں میرے کارنامے میری بے گناہی کا جواز بنتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا۔ "قانونی مسائل کا مجھے خیال تھا۔"

"ہاں۔ اب تو تم کہو گی کہ تم بھی۔ خیال تھا تو مجھے کیوں نہیں بتایا کہ اپنے منہ اٹھا کے لاہور گئے تو پکڑے جاؤ گے۔"

"منہ اٹھا کے جاؤ یا سر اٹھا کے' قانونی مسائل تو قانونی طریقے ہی حل ہوں گے۔" رابعہ نے کہا۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ تم پر میرے والد کے پارٹنر میر شرافت علی کے قتل کا الزام تھا۔ تم ضمانت پر رہا ہوئے تھے اور بھاگ گئے تھے۔ پھر نئے سے نئے مقدمات کو جوڑو۔"

میں نے کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ جب تک میرے والد کا اصل قاتل نہیں پکڑا جاتا اور میں میر شرافت علی کے قتل کے الزام سے بری نہیں ہوتا' میں نہ سکندر اعظم ہوں' نہ ایم آر ایس چیف کے ٹو۔ میں ایک عام مفرور مجرم ہوں۔ تختۂ دار آج بھی میرے انتظار میں ہے۔"

"اب اتنا پریشان ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں اور منظر مل کے سب ٹھیک کرلیں گے۔" رابعہ نے کہا۔

"اور سب ٹھیک ہونے تک میں کیا کروں؟ جیل میں قوالی گاؤں۔"

"بابا' ضمانت پھر ہو جائے گی تمہاری۔"

"مجھے بابا کہہ رہی ہو' داڑھی صاف کرنے کے بعد بھی۔ کیا میں تم سے عمر میں اتنا زیادہ ہوں' بڈھا ہوگیا ہوں کہ تم مجھے بابا کہہ کر مخاطب کرو؟" میں نے میز پر مکا مار کے کہا۔

"میز ٹوٹ گئی تو سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے کا کیس بھی بن جائے گا۔" رابعہ بولی۔

میں نے کہا۔ "ایک بات بتاؤں۔ اس مردانہ لباس میں تم بہت قیامت لگ رہی ہو۔ بیچارے فوجی بعد میں بھی تمہیں تصور میں دیکھتے رہیں گے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے رہیں گے کہ ایک رات کوہ قاف سے کوئی پری آئی تھی۔"

"چلو اب فضول ڈائیلاگ بازی مت کرو۔" رابعہ نے تھوڑا سا شرما کے کہا۔

ٹھیک نو بجے ہم کرنل کے کمرے میں تھے۔ میجر شفیق نے اپنے باقی ساتھیوں کا تعارف کرایا۔ وہ سب جونیئر افسران کی موجودگی میں کچھ کم بول رہے تھے مگر ان کا رویہ انتہائی دوستانہ تھا۔ کرنل ہم سے مذاق کرتا رہا۔

"بھئی یہ جو کالج گرل نما چپ لڑکی ہے نا' یہ بار ایٹ لاء ہے۔ اس کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات مت کرنا۔ قانونی مسئلہ بن جائے گا' لاہور ہائیکورٹ سے نوٹس آجائے گا۔ اور ایک راز کی بات بتاؤں؟ جو میں جانتا ہوں' پہلے چھپائی تھی مجھ سے انہوں نے۔"

سب اچھل پڑے۔ میرا دل بیٹھ سا گیا۔ کیا وہ سب کے سامنے میرا راز فاش کرے گا؟

"یہ ابھی مسٹر اور مسز نہیں ہیں۔" کرنل نے رازداری سے کہا۔ "لیکن بہت جلد ہو جائیں گے۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ ہمیں مدعو کیا جائے گا۔ ہم سب دعا کرتے ہیں کہ وہ مبارک دن جلد آئے۔"

جعفری نے کہا تھا کہ ان کی سپلائی محدود ہے مگر اس دعوت کے انتظام سے ایسا نہیں لگتا تھا۔ ٹیبل پر جانے کیا کیا سجے تھے۔ فرائیڈ رائس وہ چکن' فرائیڈ فش' چکن کارن سوپ' فرائیڈ پرانز' چکن ریشمی تکے وہ بھی۔ ظاہر ہے یہاں مچھلی' جھینگے اور مرغی کا گوشت بازار میں دستیاب نہیں تھا۔ یہ کسی شہر سے سپلائی ہوتا تھا اور اسٹور کیا جاتا تھا۔ انہیں پکانے والا باورچی بھی ماہر تھا۔ ان کے ساتھ پاکستانی کھانوں میں شامی کباب تھے' بھنی ہوئی مرغی اور کھیر تھی۔ کھانے کے بعد بالکل تازہ اور بہت اعلیٰ قسم کے مالٹے پیش کیے گئے اور آخر میں کافی۔ اس کے باوجود کرنل جعفری معذرت کرتا رہا کہ وہ دعوت کا خاطر خواہ انتظام نہ کرسکے اور فوجی زندگی میں یہاں بس اتنی ہی عیاشی کی گنجائش تھی۔ جتنا اس نے انکسار کا مظاہرہ کیا اتنی ہی ہمیں شرمندگی ہوئی۔ صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے اپنے راشن کا سارا ذخیرہ جو شاید وہ ایک ہفتہ استعمال کرتے' ہماری تواضع پر ایک دن میں ختم کردیا تھا۔

رات کے گیارہ بجے میجر شفیق ہمیں رخصت کرنے ہمارے کمرے تک آیا۔ "کوئی ضرورت ہو تو بتا دو۔"

میں نے کہا۔ "اتنا آرام اور اتنی خاطر تواضع تو گھر میں بھی نہیں ہوتی جو آپ لوگوں نے یہاں کی۔"

"یہ سب کچھ نہیں۔ ہم اتنا ہی کرسکتے تھے۔ سردی یہاں زیادہ ہوگی۔ میں نے تین تین کمبل رکھوا دیے ہیں۔ کھڑکی دروازے بند رکھنا ورنہ جنگلی جانور بھی آجاتے ہیں۔"

"کمروں میں گھس جاتے ہیں؟" رابعہ نے پوچھا۔

"ہاں۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا ہے۔ شب بخیر۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ہماری عدم موجودگی میں کمرے کی تلاشی لی گئی تھی۔ شاید یہ دعوت کا اہتمام

www.paksociety.com

بھی اسی لیے تھا کہ وہ ہمیں بتائے بغیر اپنا اطمینان کر لینا چاہتے تھے۔ معلوم نہیں یہ کام کس نے کیا تھا۔ بظاہر کسی بھی چیز کو نہیں چھیڑا گیا تھا۔ بریف کیس میں پوری رقم موجود تھی۔ کپڑے جو ہم نے اتارے تھے' ایک ڈھیری کی صورت میں وہیں پڑے ہوئے تھے جہاں انھیں چھوڑا گیا تھا مگر اس ڈھیری میں پہلے رابعہ کے کپڑے نیچے تھے کیوں کہ وہ پہلے غسل کر کے نکلی تھی۔ میں بعد میں نہایا تھا اور میں نے اپنے کپڑے ان کے اوپر ڈال دیے تھے مگر اب کسی نے تلاشی لی تھی تو پہلے میرے کپڑے اس کے ہاتھ میں آئے تھے پھر رابعہ کے۔ چنانچہ ترتیب الٹ گئی تھی۔

میں نے یہ بات رابعہ کو بتائی تو وہ پریشان ہو گئی۔ "کیا انھیں ہم پر شک ہے؟"

میں نے کہا۔ "شک ہوتا تو وہ ہماری تلاشی بھی لیتے۔ یہ قاعدہ ضابطے کی کارروائی ہے۔ وہ مطمئن ہونا چاہتے تھے۔"

"اچھا ہوا ریوالور ہم نے اپنے ساتھ رکھے تھے۔" رابعہ بولی۔ "مجھے تو ڈر سا لگ رہا ہے۔ اس مہمان نوازی کے پیچھے بھی کوئی بات نہ ہو۔"

"بات کیا ہو سکتی ہے۔ انشاءاللہ ہم صبح روانہ ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ شام تک لاہور میں ہوں گے ورنہ جلدی تو پہنچ ہی جائیں گے۔

"مجھے نازو اور غالب کی طرف سے تشویش ہے۔"

"تشویش تو مجھے بھی ہے مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہمارا براہ راست لاہور پہنچنا ٹھیک نہیں۔ محسن اور گل تو کراچی میں ہوں گے۔ نازو بھی پہلے بھائی کے پاس پہنچے گی۔"

"ہم بھی پہلے اکرام شیخ سے مل کے یہاں کے حالات کی رپورٹ لیں گے۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو سو جاؤ' کل کی کل دیکھی جائے گی۔"

میں نے پھونک مار کے موم بتی بجھا دی۔ پھر اندھیرے میں لیٹ کر میں باہر کی اور اندر کی آوازیں سنتا رہا۔ یہاں بھی ہر طرف گہرا سناٹا چھا رہا تھا۔ یونٹ میں کہیں جنریٹر چل رہا تھا اور اس کی آواز دور سے گزرنے والے جہاز کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ مجھے گزشتہ رات یاد آگئی جب ہم ایک برفانی وحشت کی ویرانی میں سرگرداں تھے اور ہم نے پوری رات ایک چٹان کے نیچے دبک کر سوتے جاگتے کاٹی تھی۔

مجھے مستقبل کا خیال بھی پریشان کر رہا تھا۔ کرنل جعفری نے مجھے بروقت خبردار کر دیا تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کیا اپنے وطن پہنچ کر بھی میں اجنبی بن کر رہوں گا؟ کیا مجھے اپنا نام اور اپنی شناخت بدل کے اور چھپ کر زندگی گزارنی ہوگی؟ رابعہ اور مظہر میرے قانونی مسائل سے نمٹنے کے لیے پہلے بھی موجود تھے مگر ولاور "اسٹار پیڈرو" حاجی عبداللہ اور ان کے حواری قانون کو کہاں خاطر میں لاتے تھے۔ ان کے سب دھندے غیر قانونی تھے اور وہ فوج بھی ہوں گے۔ کیا وہ مجھے چین سے بیٹھنے دیں گے؟

نہ جانے کب مجھے نیند نے آلیا۔ تھکن سارے خیالات پر غالب آگئی اور میں سویا تو میری آنکھ صبح اس وقت کھلی جب رابعہ نے مجھے جھنجھوڑ کے بیدار کیا۔

میں نے کمبلوں سے سر نکال کے دیکھا تو ہکا بکا رہ گیا۔ آنکھیں پوری کھل گئیں۔ رابعہ زنانہ کپڑوں میں تھی اور یہ کپڑے زیادہ قیمتی نہیں تھے مگر اس کے جسم پر سج رہے تھے۔ اس کا روپ میرے لیے بے حد مسحور کن تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟ آنکھیں تو نکل رہی ہیں۔"

"یہ کپڑے کہاں سے آئے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے میزبانوں نے بھجوائے تھے۔ میں نے پہلے کیوں نہیں پوچھا" رابعہ بولی۔ "کہیں سے منگوائے ہوں گے۔ یہاں کسی کی کمی ہے نہیں۔"

میں نے بستر سے نکلتے ہوئے ضروریات فوجی جرسی پہن لی اور منہ دھونے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔ وہاں گرم پانی سے بھری ہوئی بالٹی رکھی تھی۔ یہاں نہ ٹھنڈے پانی کی لائن تھی نہ گرم کی۔ گرم پانی کچن سے فراہم کیا جاتا تھا۔ ٹھنڈے پانی کے ممکن ہے کوئی عیب رہا ہو۔

میرے جاگنے سے پہلے رابعہ چائے پی چکی تھی۔ برتن ابھی تک میز پر رکھے تھے۔ جب میں باتھ روم سے نکلا تو وہ بیٹھی ناشتے کا آرڈر دے رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "کرنل کی طرف سے کوئی پیغام؟"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس وقت وہ آفس میں ہو شاید..."

اس کی بات نامکمل رہ گئی۔ کرنل اپنی وردی میں مسکراتا اندر آگیا۔

"[illegible]؟" اس نے کہا۔ "رات نیند کیسی آئی؟"

"مجھے تو رات کا پتا ہی نہیں چلا۔" میں نے کہا۔ "ناشتا کریں گے۔ کیا اس کے بعد ہماری روانگی کے لیے کوئی انتظام ہو جائے گا؟"

"انتظام تو میں نے کر دیا ہے۔" وہ بولا۔ "ایک جیپ تم لوگوں کو کالام پہنچا دے گی۔ وہاں سے تم سیدو شریف اور مردان جا سکتے ہو۔ ہم اپنی ٹرانسپورٹ اس سے آگے نہیں بھیج سکتے۔"

میں نے کہا۔ "یہ بہت کافی ہے۔"

رابعہ نے کہا۔ "یہ کپڑے آپ نے کہاں سے منگوا لیے؟"

"یہ میجر شفیق کا بندوبست تھا۔ اس نے رات کو کسی سے کہا تھا۔ اٹھارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔ [illegible] ہے۔ وہیں سے منگوائے ہوں گے۔ خیر' تم ناشتا کرو۔ میں آفس میں ہوں۔"

ناشتے کے بعد ہم باہر نکلے تو جیپ میں موجود تھا۔ وہ ہمیں کرنل کے آفس میں لے گیا۔ جیپ بالکل تیار تھی۔ کرنل نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہمیں خدا حافظ کہا۔ رات کے مقابلے میں وہ کچھ زیادہ تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یونٹ کے سب جوان اور افسر ہمیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ باری باری ہونے کے باوجود میجر شفیق اور دوسرے افسران نے مجھ سے مصافحہ کیا پھر جیپ آگے بڑھی۔ گیٹ سے گزری تو سنتری نے ہمیں باقاعدہ سلامی دی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو وہ سب اپنے آفس کے باہر کھڑے تھے۔ میں نے انھیں ہاتھ ہلا کے الوداع کہا۔

اگلی سیٹ پر صرف ڈرائیور تھا۔ میں اور رابعہ پیچھے تھے۔ ہر طرف اجلی دھوپ بکھری ہوئی تھی اور تیزی سے دوڑتی ہوئی جیپ ہمیں اس یونٹ سے دور لے جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میرے دل میں چھپا ہوا خوف' میرے شکوک اور اندیشے پیچھے رہ گئے۔ میں نے رابعہ کی طرف دیکھا' وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔

"اب تو کوئی شک نہیں رہا تمھیں کہ یہ صرف مہمان نوازی کا جذبہ تھا اور کوئی بات نہیں تھی؟"

رابعہ بولی۔ "مجھے اپنے آپ سے شرم آ رہی ہے کہ میں نے ایسا سوچا۔"

جیپ ڈرائیور ان راستوں سے واقف تھا جہاں راستوں کا کوئی نشان نظر نہ آتا تھا۔ دو گھنٹے بعد ایک کچی سڑک نمودار ہوئی۔ اس سڑک پر ہم نے مخالف سمت میں جانے والی ایک فوجی گاڑی بھی دیکھی۔ وہ بھی گزر گئی اور ایک بار پھر ہم برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں سے گزرے۔ اس سڑک پر کئی جگہ ہم نے بلڈوزر دیکھے جو سڑک سے برف ہٹانے میں مصروف تھے۔

تیسرے پہر ہم کالام پہنچے تو سیدو شریف جانے والی آخری بس تیار تھی مگر ہماری وجہ سے روانگی مؤخر کر دی گئی۔ فوجی ڈرائیور ہمیں اتارنے کے بعد سیلوٹ کر کے رخصت ہوا تو ڈرائیور بھی کچھ مرعوب ہو گیا۔ اس نے ہمیں اجازت دی کہ ہم چائے پی لیں اور کچھ کھا پی کے آجائیں۔ چند مسافروں نے واجبی سا احتجاج کیا مگر وہ سب مقامی لوگ تھے سوائے ایک غیر ملکی جوڑے کے جو اس موسم میں سوات پہنچا ہوا تھا۔ وہ ہپی تھے اور ویرانے غالباً ان کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی تھی۔

ہم ایسی فرنٹ سیٹ دیکھ کر حیران ہوئے کہ خصوصی مراعات کے خود ساختہ قانون کے تحت ڈرائیور نے دونوں اگلی سیٹوں کو خالی کرا لیا تھا جن پر وہ غیر ملکی جوڑا براجمان تھا۔ کوئی پاکستانی وی آئی پی ہوتا تو اسے اپنی توہین سمجھتا مگر انھیں عزت و وقت کی خاک پروا نہ تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ پاکستان میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ وی آئی پی کے لیے بس' ٹرین یا جہاز روکے جا سکتے ہیں یا ان کی روانگی مؤخر کی جا سکتی ہے۔ وقت کی پابندی رہے بھی اس قوم کا شعار نہ تھا اور یہ [illegible] سوسائٹی تھی۔

بس کے پچھلے حصے میں مسافر ٹھونس کر بھرے گئے تھے اور جن کے لیے اور جگہ نہ تھی انھیں اس سردی کے موسم میں چھت پر بٹھا دیا گیا تھا جہاں وہ براہ راست مخالف ہوا کی زد میں تھے۔ مگر یہ ایک ایسا معمول تھا جس کے مقامی لوگ عادی تھے۔ ہم آگے والی سیٹ پر ہونے کے باوجود آرام سے نہ تھے کیوں کہ بس قدامت کا نمونہ تھی مگر اس خوشی نے جو اپنے وطن میں' اپنے لوگوں کے درمیان پہنچ کے حاصل ہو رہی تھی' ہر تکلیف کے احساس کو بے معنی کر دیا تھا۔

بس سیدو شریف پہنچی تو رات ہو گئی۔ بس ڈرائیور نے ہمیں مطلع کیا کہ اب اگلی بس صبح ہی مردان جائے گی۔ ٹورسٹ سیزن میں یہاں چھوٹے بڑے بہت سے ہوٹل کھلے نظر آتے تھے۔ عام لوگ بھی گھروں کے ایک دو کمرے تھوڑی بہت تبدیلی کے لیے وقف کر دیتے تھے مگر موسم سرما میں ادھر کا رخ کوئی نہیں کرتا تھا۔

بس اسٹاپ پر کوئی سواری بھی نہ تھی۔ یہ چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں کوئی کہیں بھی پیدل جا سکتا تھا۔ غیر ملکی جوڑا تو شاید اپنی رہائش گاہ کندھوں پر ڈالے پھرتا تھا۔ ان کے سامان میں کیمپ' سلیپنگ بیگ وغیرہ ہوں گے کہ جہاں اچھا لگا وہیں خیمہ کھڑا کیا اور بیگ میں ہوا بھر کے سو گئے۔ صبح پھر سب پیک کر کے کندھے پر اٹھایا اور چل پڑے۔

ہمارے لیے قصبے کا واحد ہوٹل جنم براہ تھا۔ اسے مقامی حالات کے پس منظر میں تھری اسٹار ہوٹل کی حیثیت حاصل تھی اور سیزن میں ان کے ریٹ فور اسٹار ہوٹل سے کم نہ ہوتے تھے مگر وہاں الّو بول رہے تھے۔ گول شیشوں کی عینک والے ایک الّو نے کاؤنٹر کے پیچھے سے بولنا شروع کیا تو کچھ دیر بعد میں سمجھ گیا کہ وہ انگریزی میں مخاطب ہے اور ہمیں خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ وہ ہوٹل کا منیجر اور مالک تھا۔

"کمرے تو بہت ہیں سر' آپ کا سامان کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "کیسا سامان؟ کھانے پکانے کا یا سونے کا؟ ہم جہاں جاتے ہیں خالی ہاتھ جاتے ہیں۔"

"ایسی صورت میں آپ کو ایڈوانس دینا ہوگا۔" منیجر نے کہا۔

میں نے اس کی نظر بچا کے بریف کیس میں سے ایک ہزار روپے نکالے۔ "میرا خیال ہے کہ ایک رات کے قیام کے لیے یہ ضمانت کافی ہوگی۔"

"تھینک یو سر۔ اتفاق سے ہمارے ہوٹل کا واحد وی آئی پی سویٹ خالی ہے۔"

"یہ اتفاق موسم سرما میں روز کا معمول ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہم اگرچہ عام لوگ ہیں مگر ایک رات کے لیے وی آئی پی بننا پسند کریں گے۔"

وی آئی پی سویٹ بے حد آرام دہ اور دو کمروں پر مشتمل تھا۔

www.paksociety.com

ان میں سے ایک بیڈ روم تھا اور دوسرا مہمانوں کو ریسیو کرنے کا کمرا۔ ...اسی حصے میں کھانے کی میز بھی تھی۔ ہر چیز پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی۔ ہمارے اندر قدم رکھتے ہی ایک بے حد مستعد ملازم نے اس دھول کو جھاڑنا شروع کیا تو دھول کمرے کی فضا میں اڑنے لگی اور کچھ دیر بعد وہیں بیٹھ گئی۔

میں نے ملازم سے کہا۔ "بس کرو، باقی گرد سانس کے ساتھ اندر چلی جائے گی۔ یہ بتاؤ کھانے کے لیے کیا ملے گا؟"

"آٹھ بجے تک بازار میں سب کچھ ملے گا صاحب۔ نان روٹی، دال، سبزی، گوشت اور چپلی کباب۔ ہوٹل کا کچن تو بند ہے۔ سیزن نہیں ہے۔"

آٹھ بجنے ہی والے تھے۔ میں نے اسے بازار دوڑایا کہ نان اور چپلی کباب لے آئے۔ "ہوٹل میں چائے تو ملے گی۔"

"چائے ملے گا۔" اس نے کہا۔ "ہم بھی پیئے گا۔"

جب وہ چلا گیا تو رابعہ نے مجھے مطلع کیا۔ "اگر تم غسل کرنا چاہو تو باتھ روم میں مائع برف موجود ہے۔ تم ایک مگ بھر کے سر پر ڈالو گے تو ایسی حالت میں جم جاؤ گے کہ کسی ڈائنو سار کا مجسمہ نظر آؤ گے۔"

"اور مجھے اصلی حالت میں لانے کے لیے اسٹوو پر گرم کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ مجھے یہ آخری غسل منظور نہیں۔"

"یہ چپلی کباب کیا کھانے کی چیز ہوتے ہیں؟" رابعہ پوچھ بیٹھ گئی۔

"ہاں۔ انہیں چپل سے نہیں بنایا جاتا، بس ان کی شکل چپل کے سول جیسی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے انگریز انہیں مجرموں سے اعتراف جرم کرانے کے لیے بھی استعمال کرتے ہوں۔ توے کے کباب، تو کی مرچیں ہمراہ پشاوری چپل تیرہ نمبر کی مار کھا کے تو مجرم کا باپ بھی اعتراف جرم کر لے۔"

میں صرف رابعہ کو ڈرا رہا تھا۔ چپلی کباب میں مرچیں برائے نام ہوتی ہیں یا بالکل نہیں ہوتیں۔ جو کباب وہ تیار لایا وہ "اسپیشل" تھے یعنی اس میں مغز اور دل کا گودا بھی ڈالا گیا تھا۔ کباب کی طرح نان بھی کچھ لمبوترے تھے، بالکل نقشے میں نظر آنے والے سری لنکا کی طرح۔ مگر ذائقے میں لاجواب تھے۔ چپلی کباب صوبہ سرحد کی تہذیب کا اتنا ہی لازمی جزو تھے جتنی پنجاب کی لسی یا کراچی کی نہاری۔ اس کے بعد عام طور پر یہاں سبز چائے پی جاتی تھی اور ہوٹل کی طرف سے بھی پیش کی گئی۔

رات نو بجے ہر سو سناٹا چھا گیا۔ سردی کے باعث لوگ سرِ شام سونے کے عادی تھے۔ ویسے بھی باہر یا گھر میں ان کے پاس تفریح کے ذرائع مفقود تھے۔ ٹیلی وژن صرف امراء کے گھرانوں تک محدود تھا۔ عام آدمی کے لیے تو معاش کے ذرائع بھی محدود تھے۔ یہاں نہ کوئی صنعت تھی اور نہ سرکاری ملازمت۔ چھ مہینے اتنی سخت سردی پڑتی تھی کہ زراعت ناممکن ہو جاتی تھی۔ چنانچہ غربت بڑھ جاتی تھی تو فاقہ کشی کی نوبت آجاتی تھی مگر گداگری کی ممانعت اور سزا میں بہت سخت تھیں۔ بچے، بوڑھے تصویر حسرت بنے بس کے اڈے پر آتے جاتے خوشحال سیاحوں کو امید بھری نظروں سے تکتے رہتے تھے مگر دست سوال دراز نہیں کرتے تھے۔ یہ تجربہ مجھے صبح ہوٹل سے رخصت ہونے کے بعد ہوا۔

سرِ راہ میں نے بہت سے بوڑھوں کو دیکھا جو بھکاری نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک نے ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر دیکھ کر مجھ سے ایک روپیہ مانگا۔ میں نے اسے دس کا نوٹ دیا ہی تھا کہ نہ جانے کہاں سے ایک پولیس مین نمودار ہو گیا۔ اس نے بڑی بے دردی سے بڈھے کو مارا اور اس سے دس کا نوٹ چھین کر مجھے واپس کر دیا۔ "بھیک مانگنا جرم ہے صاحب" اس نے مجھے مطلع کیا اور بوڑھے کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے جاتے ہی بچوں کے ایک غول نے موقع غنیمت جانا اور ہمارے پیچھے لگ گئے۔ بوڑھے کے ساتھ پیش آنے والے واقعے پر مجھے شدید صدمہ ہوا تھا۔ رابعہ بھی سخت خائف تھی مگر میں نے ان بچوں میں سب کھلے پیسے تقسیم کر دیے۔ میرے پاس صرف وہی چینج تھا جو ہوٹل والوں نے بل کاٹ کے دیا تھا۔ یہ نوٹ ختم ہو گئے مگر میری فیاضی دیکھ کر زیادہ عمر کے لوگ بھی آگئے۔ یہ ناممکن تھا کہ میں سو سو کے نوٹ بانٹنا شروع کر دیتا۔

میری پریشانی کو ایک جوان آدمی نے دور کیا جو صاف ستھری قمیص اور اونی جرسی پر چمڑے کی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے پشتو میں ڈانٹ ڈپٹ کے اور ذرا دھکا کے خیرات مانگنے والوں کو رخصت کیا اور پھر ہم سے انگریزی میں مخاطب ہوا۔ اس کی انگریزی ٹوٹی پھوٹی اور اس حد تک کارآمد تھی کہ غیر ملکی سیاح اس کی بات سمجھنے اور دوسروں کی بات سمجھانے کے لیے اس کی خدمات شکریے کے ساتھ قبول کرتے ہوں گے۔

اس کی بات کا مطلب کچھ یوں تھا کہ "سر! گداگری ایک لعنت ہے اور یہاں کے قانون میں اس کی سخت ممانعت ہے۔ گداگر دوسرے ملکوں سے آنے والے سیاحوں کے سامنے ہماری رسوائی کا سبب بنتے ہیں۔ ویسے تو گداگری کی حوصلہ افزائی بھی جرم ہے مگر نرم دل یا عقل سے ضعیف لوگ فریب میں آ جاتے ہیں۔ اب آپ نے جس دریا دلی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ انہیں مہنگی پڑے گی جن کے ہاتھ میں ایک نوٹ آگیا کیونکہ جو خالی ہاتھ لوٹے وہ ان کے جرم سے پولیس کو آگاہ کر دیں گے۔"

رابعہ نے کہا۔ "یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا تو ہم اس بوڑھے کو بھی کچھ نہ دیتے۔"

میں نے کہا۔ "تم کون ہو...... میرا مطلب ہے کیا کرتے ہو؟"

اس نے کہا۔ "میرا نام عبدل ہے اور میں ٹورسٹ لوگوں کی خدمت کرتا ہوں۔ میرے پاس ایک گاڑی بھی ہے۔"

"گاڑی یعنی کار؟"

"یس سر، کار۔ ایک دم فرسٹ کلاس۔ میں آپ کو مردان لے جا سکتا ہوں۔ میرے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی ہے۔ صرف پانچ سو روپے۔"

میں نے کہا۔ "کون سی گاڑی ہے؟"

"اوپل ریکارڈ۔ میری اپنی ہے۔ میں پنڈی سے مری تک ٹیکسی چلاتا تھا۔ گھر کے حالات کی وجہ سے واپس آنا پڑا۔"

میں نے کہا۔ "راولپنڈی تک جا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں سر" اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ "پنڈی، لاہور، پشاور، جہاں آپ کہیں۔"

میں نے کہا۔ "راولپنڈی تک کیا لو گے؟"

"ایک ہزار سر" اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا۔

"ٹھیک ہے۔ گاڑی کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"میں ابھی لے کر آتا ہوں سر۔ بس پانچ منٹ میں۔ آپ یہاں ٹھہریے۔"

گاڑی کے آنے تک ہم مرکز نگاہ بنے رہے۔ دو افراد نے ہمیں سوات کا خالص شہد مکھیوں کے چھتے سے نکال کر بیچنے کی کوشش کی۔ چھتے انہوں نے چند بیگ کی طرح اٹھا رکھے تھے اور ان پر مکھیاں بھی بیٹھی ہوئی تھیں لیکن میں ان سادہ لوح نظر آنے والے لوگوں کی چالاکی کے قصے سن چکا تھا۔ وہ ایسے ہی چھتے اٹھائے بسوں کے اڈوں پر منڈلاتے پھرتے تھے۔ جو ان پر اعتبار کر لیتے تھے ان کو یہ شہد نچوڑ دیتے تھے اور ایک بس کی روانگی کے بعد اسے دوبارہ شیرے میں ڈبو کے بھر لیتے تھے۔ یہ شہد کے رنگ اور خوشبو والا شیرا ہر بار اصلی سوات کے شہد کے نام پر بکتا تھا۔ اسے خرید کر لے جانے والا بعد میں سوائے صبر کرنے کے اور کیا کر سکتا تھا۔

عبدل واقعی پانچ منٹ میں گاڑی لے آیا۔ یہ سرخ رنگ کی چمکتی ہوئی گاڑی خاصی آرام دہ تھی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کے میں نے پہلی بار خود کو پرسکون اور مطمئن محسوس کیا۔ اب میں واقعی پاکستان میں تھا اور ہر خطرے سے، ہر آفت سے محفوظ تھا۔ سارے شہر اور سب لوگ مجھ سے بہت کم فاصلے پر تھے اور یہ مسافت رفت کی تھی۔ اگر ہم بس سے جاتے تو شام تک راولپنڈی پہنچتے مگر کرائے کی گاڑی مل جانے سے یہ فاصلہ آدھا رہ گیا تھا۔ راولپنڈی سے ہم ٹرین پکڑتے تو شاید یہ فاصلہ چھتیس گھنٹے کا ہوتا مگر ہم پی آئی اے کی پرواز پر ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو ڈھائی گھنٹے بعد کراچی میں ہوتے۔

عبدل ایک ماہر ڈرائیور تھا۔ وہ مری کے پرپیچ راستوں پر ڈرائیونگ کرتا تھا۔ اس کے لیے ان راستوں پر گاڑی دوڑانا بہت آسان کام تھا۔ اس کا انیس سو سی سی کا طاقتور انجن بھی عبدل کی خواہشات کا ساتھ دے رہا تھا اور گاڑی ستر اسی میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ گاڑی کے شیشے بند تھے اور میدانی علاقے کا موسم بھی خوشگوار تھا۔ مردان پہنچنے سے پہلے ہی بھاری بھرکم جرسی میں گرمی محسوس ہونے لگی۔ مردان میں ہم نے دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے تقریباً چالیس منٹ کا قیام کیا اور پھر روانہ ہو گئے۔

ایک بار پھر میرے سامنے اپنے وطن کے نظارے تھے۔ یہ زمین، آسمان، یہ فضا سب میرے لیے اپنائیت کا احساس رکھتے تھے۔ راولپنڈی لے جانے والی سڑک، اس کے دونوں جانب پھیلے ہوئے کھیت، گاؤں اور گاؤں کے کچے مکان، ان میں رہنے والے، قصبوں کی گلیاں اور بازار، ہل چلاتے کسانوں سے لے کر کارخانوں کی دھواں اگلتی چمنی تک ہر منظر میرا دیکھا بھالا تھا اور میری یادداشت میں ایسے محفوظ تھا جیسے البم میں تصویریں لگی ہوتی ہیں۔ میں اس ماحول کا پروردہ اور اس میں شامل تھا۔ اجنبیت کی وہ نامانوس اور نامہربان فضا جو بھارت اور بنگلہ دیش میں اعصاب کو ایک نامعلوم قوت کے دباؤ میں رکھتی تھی، یہاں محسوس تک نہ ہوتی تھی۔

شام ہوتے ہوتے عبدل نے ہمیں راولپنڈی پہنچا دیا۔ کار پشاور روڈ سے مال پر آگئی۔ میں پہلے سے طے کر چکا تھا کہ مجھے صدر میں اترنا ہے۔ پلازا کے سامنے میں نے گاڑی موڑنے کے لیے کہا اور اگلا چوراہا پار کرتے ہی عبدل نے میرے اشارے پر گاڑی روک لی۔ وہ ایک ہزار لے کر اور ایک ہزار دعائیں دے کر رخصت ہو گیا۔ اس نے اپنی دانست میں دگنی رقم مانگی تھی۔ اس امید میں کہ پانچ سو میں سودا ہو جائے گا۔ ممکن ہے واپس جاتے وقت خوشی کے ساتھ اسے افسوس بھی ہو کہ اس نے ایک کے بجائے دو کیوں نہیں مانگے۔

میں نے صدر کے روشن بازاروں اور جگمگاتی دکانوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے عجیب سی سنسنی خیز مسرت کو اپنے رگ و پے میں دوڑتا محسوس کیا۔ مجھے گزرے ہوئے وقت کے بہت سے صبر آزما لمحے یاد آئے جب زندگی کے مقابلے میں ہم موت سے قریب تر تھے۔ سختی حالات کے وہ دن یاد آئے جب ہماری قوت برداشت جواب دینے لگی تھی اور وہ وقت یاد آیا جب ہم دشمنوں میں محصور تھے۔

میں نے رابعہ سے کہا۔ "تم نے دیکھا رابعہ! ہم لوٹ آئے ہیں۔ تم محسوس کرتی ہو اس خوشی کو جو اپنی زمین پر چلنے سے حاصل ہو رہی ہے۔ دیکھو یہ سب اپنے لوگ ہیں، سب دوست ہیں۔ ان میں ایک بھی دشمن نہیں۔ اور یہاں کتنا سکون ہے، کتنی زندگی ہے۔"

رابعہ نے کہا۔ "مجھے تو یہ سب خواب لگتا ہے۔ ایسے خواب بہت دیکھے تھے میں نے کہ تم میرے ساتھ ہو اور ہم اپنی زندگی کی طرف ایک ساتھ بڑھ رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کل ہم کراچی میں ہوں گے۔ اکرام شیخ، محسن

www.paksociety.com

اور گل کے ساتھ۔ مجھے یقین ہے کہ نازو اور غالب بھی وہیں پہنچ جائیں گے یا ہم سے پہلے پہنچ گئے ہوں گے۔"

"ہم آج رات کہاں ٹھہریں گے؟"

میں نے کسی رئیس ابن رئیس کی شان سے کہا۔ "جہاں بڑے لوگ ٹھہرتے ہیں۔ فلیش مین میں۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے ہم تھوڑی سی شاپنگ کریں گے۔ سلور گرل میں جائے پئیں گے۔ ان کی کنفکشنری کا جواب نہیں۔"

"شاپنگ کیا کرنی ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ دیکھو! سامنے ووگ ہاؤس ہے۔ تم یہاں سے اپنے لیے کچھ کپڑے خرید لو۔ میں بھی سوٹ دیکھ لیتا ہوں۔"

رابعہ مسکرائی۔ "رام ناتھ کی روح کو بڑی تکلیف ہوگی۔"

میں ہنس پڑا۔ "ہونی تو نہیں چاہیے۔ اس کی دولت ضرورت مندوں کے کام آرہی ہے۔"

وہ ایک انتہائی حسین رات تھی۔ ہم نے دل کھول کے خریداری کی لیکن پچاس ہزار بھی خرچ نہ کرسکے۔ رابعہ نے اپنے لئے جدید ترین فیشن کا فرکوٹ لیا، جرسیاں اور ساڑیاں خریدیں۔ میں نے دو سوٹ لیے اور شرٹس کے ساتھ میچ کرتی ہوئی ٹائیاں۔ جب ہم ووگ ہاؤس سے برآمد ہوئے تو بالکل بدلے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں نے بلیو بلیک سوٹ پہن لیا تھا اور بے داغ سفید قمیص پر نیلی دھاریوں والی ٹائی باندھ لی تھی۔ رابعہ نے بھی لیڈیز روم میں جاکے ساڑی باندھ لی تھی اور اپنے دیہاتی وضع کے کپڑے بیگ میں ڈال لیے تھے۔ اس کی ساڑی بھی نیلی تھی مگر اس پر وہ زرد پھول نہیں تھے جن کی مجھے تلاش تھی۔ میں احساس کی ایک پرانی، دلنواز اور سحر آفریں مسرت کا طلبگار تھا لیکن ایسی ساڑی تلاش کیے بغیر ملنا محال تھی۔ رابعہ کے حسن کا وہ نقش پر تو میرے تصور میں آج تک محفوظ تھا جب وہ آسمان کے رنگ کی ساڑی پہن کے مجھ سے جہلم میں ملنے آئی تھی۔ اس کے زرد پھول ستاروں کی طرح روشن تھے اور پہلی ملاقات کا یہ نقش جاوداں تھا۔

رابعہ نے فرکوٹ بھی پہن لیا تھا۔ اب ہم وہاں گھومنے پھرنے والے بہت سے خوشحال، خوش پوش اور خوش و خرم جوڑوں کی طرح تھے جو غم دوراں اور غم جاناں سے بے نیاز نظر آتے تھے۔ ابھی تک ہمارے پاؤں میں وہی بدوضع جوتے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم نے ان سے بھی نجات حاصل کرلی۔ ہم نے کاموس شوز سے بہترین جوتے خریدے اور پہن کے دکان سے نکل آئے۔

رابعہ بہت خوش تھی۔ "مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے سکندر! کہیں یہ خواب ٹوٹ نہ جائے۔"

"یہ خواب نہیں، خواب کی تعبیر ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑالیا۔ "لوگ ویسے بھی ہمیں میاں بیوی ہی سمجھ رہے ہوں گے۔ شرط لگالو۔"

"لوگوں کو سمجھنے دو۔ اس کی نمائش مت کرو۔"

ہم ایک گھنٹا سلور گرل میں بیٹھے رہے۔ مجھ پر اس ماحول کا ایک نشہ سا طاری ہو رہا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ سب کچھ رک جائیں اور وقت کے اس لمحے کو اسی جگہ اسیر کرکے زندگی بھر کے ساتھ یہیں ٹھہر جاؤں۔ نہ پیچھے دیکھوں، نہ آگے جانے کا سوچوں۔ میری حالت صحرا میں پیاسے سفر کرنے والے مسافر جیسی تھی جو کسی ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں پہنچ گیا ہو جہاں سکون، راحت اور لطف ہو اور وہ اس سے باہر نہ نکلنا چاہے۔

رات کے ساڑھے نو بجے جب بازار بند ہونے لگے میں سوٹ کیس اٹھائے ہوئے فلیش مین ہوٹل پہنچا تو رابعہ کا بیگ میرے ہاتھ میں تھا اور ایک ٹاپ کلاس ہوٹل کی حدود میں کسی نے میری اس جسارت کو قابل اعتراض بھی نہیں سمجھا تھا۔ متوسط اور نچلے طبقے کی اخلاقیات کے معیار ان کے ماحول اور سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک متعصب اور تنگ نظر معاشرہ عورت کا برقع پہنے بغیر گھر سے نکلنا یا لڑکیوں کا کالج جانا غلط سمجھتا ہے۔ متوسط طبقہ بے پردگی اور عورت کے بازار جانے یا اسکول میں ملازمت کو قبول کرتا ہے مگر اس کا کلب میں جانا اور مردوں کے ساتھ آزادانہ اختلاط غیر اخلاقی سمجھتا ہے اور یوں پاکستان میں ایک شہر سے لے کر بڑے شہروں میں خواص کی انتہا ماڈرن ہاؤسنگ سوسائٹی تک تعلیم و تہذیب کے اعتبار سے دونوں معاشرے ہیں جو سترہویں صدی سے لے کر اکیسویں صدی تک کی اخلاقی اقدار رائج ہیں۔

فلیش مین ہوٹل ایک پاکستانی شہر میں یورپ کے معیار کا ہوٹل تھا جہاں غیر ملکی اور پاکستان کے بڑے لوگ قیام کرتے تھے جو طرز زندگی اور ذہنیت کے اعتبار سے یورپ کو قبلہ سمجھتے تھے۔ یہاں وہ سب آزادیاں حاصل ہوتی تھیں جو یورپ کے کسی ہوٹل میں ہیں۔ ایسے ہوٹل پاکستان کے ہر بڑے شہر میں تھے جو ملکی یا اخلاقی قوانین کے دائرہ اختیار سے خود کو ماورا اور باہر سمجھتے تھے جیسے سفارت خانے۔

میں نے فلیش مین کا انتخاب محض اس لیے کیا تھا کہ وہ محفوظ ترین تھی۔ وہاں سے میں کراچی کی فلائٹ کے لیے ریزرویشن بھی حاصل کرسکتا تھا اور ائیرپورٹ تک کار بھی۔ رات کے اندھیرے میں مجھے کسی نے نہیں پہچانا تھا مگر میں دن میں یوں پھرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا کہ کوئی مجھے پہچان لے اور مجھے پتا بھی نہ چلے۔

میں نے پورے اعتماد کے ساتھ "مسٹر اور مسز ایاز" کے نام سے کمرا بک کرایا اور اپنا پتا "اسسٹنٹ کمشنر نوشہرہ" لکھوایا۔ کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ مجھ سے میرا شناختی کارڈ طلب کرکے جس سے ثابت ہو کہ میں واقعی اسسٹنٹ کمشنر ہوں۔ پورے پاکستان میں سیکڑوں ایسے عہدے ہیں جن کے ساتھ کمشنر کا لفظ آتا ہے جیسے انکم ٹیکس کمشنر سے ہائی کمشنر تک سب شامل ہیں۔

کسی دشواری کے بغیر مجھے صبح کی پہلی فلائٹ سے کراچی کے لیے فرسٹ کلاس کی ریزرویشن مل گئی اور ہماری سیٹیں بھی کنفرم ہوگئیں۔ ڈنر ہم نے کمرے میں منگوایا لیکن بہت تھوڑا کھایا۔ جلد از جلد کراچی پہنچ کے اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملنے کی خواہش نے ہمارے دلوں کو اضطراب میں مبتلا کردیا تھا اور ہمارے لیے رات کاٹنا مشکل ہوگیا۔ آدھی رات تک ہم انہی کی باتیں کرتے رہے جو ہمارے ساتھ تھے پھر بچھڑ گئے۔ عارضی طور پر ہی سہی۔ رابعہ پر تو لاہور سوار ہوگیا تھا۔ وہ اپنی پرانی زندگی کے پیچھے کے سوا کچھ نہیں مانگتی تھی اور اس کے لیے سب کچھ صبح و شام کے لیے چھوڑنے پر تیار تھی۔ اسے معلوم تھا کہ لاہور صرف ایک سوختہ محل کے واسطے رہ گیا ہے مگر کیا وہاں اسے اپنی پرانی زندگی مل جائے گی؟ اس سوال کا جواب سات پردوں کے پیچھے ایک راز سربستہ تھا۔

صبح جہاز کی پرواز سے دو گھنٹے پہلے ہماری ہدایات کے مطابق ناشتا کمرے میں سرو کیا گیا۔ کمرے کے کرائے میں ناشتے کے اخراجات شامل تھے چنانچہ ہمارے بل میں اضافی رقم صرف ڈنر کی شامل کی گئی۔ کرائے کی گاڑی نے ہمیں ایک گھنٹا قبل ائیرپورٹ پہنچایا۔ میں اور رابعہ اب خاموش تھے۔ ہمارے خیالات کی جذباتی کیفیت ایک سی تھی۔ ہم چشم تصور سے اپنے سب دوستوں کو دیکھ رہے تھے جو ہمارے لیے اتنے ہی مضطرب اور بے قرار تھے جتنے ہم۔

جہاز نے پرواز کی تو وقت کا ایک ایک لمحہ ہم پر بھاری ہونے لگا۔ گل اور محسن نے کراچی پہنچنے کے بعد ہم سے رابطہ نہیں کیا تھا مگر ان کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ خیر و عافیت سے کراچی میں اکرام شیخ کے ساتھ ہوں گے اور شاید اب تک کابل بھی ان سے مل کے ہمارے بارے میں بتا چکی ہوگی کہ بہت جلد ہم بھی وارد ہوں گے۔ ان سب کو ہر لمحہ ہماری آمد کا انتظار ہوگا۔

جہاز نے کراچی میں لینڈ کیا تو موسم بالکل بدلا ہوا تھا۔ راولپنڈی کی سردی کے مقابلے میں یہاں گرمی تھی۔ مجھے اپنا کوٹ اتار کے ہاتھ پر ڈالنا پڑا اور اس کے ساتھ ہی رابعہ کا فرکوٹ بھی اٹھانا پڑا۔ گلگت سے سوات تک سردی کی شدت انتہا پر تھی اور ہم نے ایک طویل برفانی راستے پر پیدل سفر کیا تھا۔ راولپنڈی پہنچ کے حالات بدل گئے تھے اور ہم نے ضرورت کے مطابق گرم کپڑے خرید لیے تھے مگر کراچی کا موسم ہمیشہ کی طرح مہربان اور غریب نواز تھا۔ یہاں گرم کپڑوں کی ضرورت دسمبر، جنوری کے چند دنوں تک محدود تھی جب کوئٹہ کی سرد لہر کراچی کو پنڈی یا لاہور بنا دیتی تھی۔

باہر آتے آتے مجھے پسینہ آگیا۔ روز روشن میں پہلی بار میں نے لوگوں کا سامنا کیا تھا۔ کسی دوست کے ملنے کا امکان تو نہ ہونے کے برابر تھا مگر میرے دل کے کسی گوشے میں اس خوف نے جگہ بنالی تھی کہ مجھے میرے نام اور ایم آر ایم کے رشتے سے جاننے والے بہت ہیں۔ وہاں غیر میں بھی بالکل غیر متوقع طور پر ایسے لوگ مل جاتے تھے مگر پاکستان پہنچتے ہی کرنل جعفری نے مجھے پہچان لیا تھا اور خبردار کیا تھا کہ میں محتاط رہوں۔

ائیرپورٹ کی عمارت سے باہر ٹیکسیاں ایک قطار میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے ڈرائیور اپنی باری کے انتظار میں باہر کھڑے ہوئے تھے۔ رابعہ نے کہا "ان میں تو اکرام شیخ نظر نہیں آتا۔"

میں نے کہا "اگر تم نے اسے اطلاع کی ہوتی تو وہ تمہارے استقبال کے لیے ضرور موجود ہوتا۔"

"ان سے پوچھو تو سہی۔"

میں نے آخری ٹیکسی کے ڈرائیور سے بات کی "ہم ایک ٹیکسی ڈرائیور اکرام شیخ کے مہمان ہیں۔"

"کہاں رہتا ہے وہ؟" ٹیکسی ڈرائیور نے حیرانی سے کہا۔

میں نے کہا "یہ تو نہیں معلوم مگر ٹیکسی کا نمبر معلوم ہے۔"

اس نے ذہن پر زور دے کر نمبر یاد کرنے کی کوشش کی اور پھر نفی میں سر ہلایا "میں دوسرے ڈرائیوروں سے معلوم کرتا ہوں، آپ ادھر ٹھہریں۔"

رابعہ اور میں وہیں کھڑے اس کو ہر ٹیکسی ڈرائیور کے پاس جاتا دیکھتے رہے اور ان کی لاعلمی کے اظہار سے مایوس ہوتے رہے۔ وہ سب نفی میں سر ہلاتے تھے اور پھر ہمیں دیکھ کے حیران ہوتے تھے کہ ایسے معزز مہمانوں کا ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کیا رشتہ ہوسکتا ہے۔ ہمارے سامنے بہت سی ٹیکسیاں جو قطار میں آگے تھیں، مسافروں کو لے کر نکل گئیں اور ان کی جگہ پیچھے والی ٹیکسیاں

www.paksociety.com

آتیں۔
"آخر کار ٹیکسی ڈرائیور ناکام لوٹ آیا "سرجی! ان میں سے تو کوئی نہیں جانتا۔ ویسے ابھی جو دو چار گاڑیاں نکل گئی ہیں ان میں ایک اکرام کی تھی۔"

میں نے کہا "ان میں کوئی اکرام شیخ نہیں تھا۔ اچھا تم ہماری کچھ مدد کرو، یہ بتاؤ۔"

اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا "میں تو جناب سواریوں کے لیے کھڑا ہوں۔"

میں نے کہا "میں پوچھ رہا ہوں کہ دن بھر کا کرایہ کیا ہوگا؟ ہمیں اکرام شیخ کو تلاش کرنا ہے، جہاں بھی ٹیکسیاں کھڑی ہوتی ہیں وہاں جائے۔"

اس کا رویہ ایک دم بدل گیا "ویسے تو سرجی! تین سو ہوتے ہیں مگر آپ اپنے ہی بندے کے مہمان ہو، آپ دو سو دے دینا۔"

مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی "دیکھو بادشاہ! مجھ پر احسان مت کرو۔ مجھے معلوم ہے، ایک پورے دن کا کرایہ کیا ہوتا ہے۔ میں کوئی ولایت سے نہیں آیا ہوں۔"

"اچھا جی! جو آپ کی خوشی ہو دے دینا۔ بے شک کچھ مت دینا۔" وہ بولا "ناراض ہونے کی تو بات ہی نہیں ہے۔"

ہم نے دو گھنٹے میں صدر سے اورنگی تک کے ٹیکسی اسٹینڈ دیکھ لیے۔ نمبر کے حوالے سے دو ڈرائیوروں نے کہا کہ یہ ٹیکسی تو ہے مگر ڈرائیور کا نام بادشاہ گل ہے۔ کھارادر کے ٹیکسی اسٹینڈ پر بادشاہ گل مل گیا۔ اس کی ٹیکسی کا وہی نمبر تھا جو پہلے اکرام شیخ کی ٹیکسی کا تھا۔

"خان! یہ کسی اکرام شیخ کا مہمان ہے۔" ہمارے ٹیکسی ڈرائیور نے اسے بتایا۔ "صبح سے اس کو تلاش کرتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ ٹیکسی پہلے اکرام شیخ چلاتا تھا۔"

"سرجی! ٹیکسی ہوتی ہے سیٹھ لوگوں کی۔ ڈرائیور بدلتے رہتے ہیں۔" یہ ٹیکسی ڈرائیور بولا جو ہمیں یہاں تک لایا تھا۔

"مجھے معلوم ہے مگر اکرام شیخ مالک تھا۔"

بادشاہ گل نے اقرار میں سر ہلایا "تو تم ٹھیک بولتا ہے۔ ابھی دو دن ہوا ایک عورت اور بچہ بھی ہم سے پوچھا۔"

رابعہ نے کہا "ہاں، وہ کاجل تھی۔"

اس نے کہا "وہ بھی ایسا ہی پوچھتا تھا صاحب۔ ہم کو ادھر لایا، ناظم آباد میں۔ غریب بہت رویا۔"

میں نے کہا "پھر تم اسے کہاں لے گئے؟ تمہیں معلوم ہے اکرام شیخ کہاں ہے؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ ایک نامعلوم سی اداسی نے اس کے چہرے کو تاریک کردیا۔

"ہمیں اس کے پاس لے چلو بھائی۔" رابعہ نے بے تابی سے کہا۔

"لے جائے گا بہن، کیوں نہیں لے جائے گا۔ ابھی بیٹھو گاڑی میں۔"

میں نے پہلی ٹیکسی کو دو سو روپے دے کر رخصت کیا اور دوسری ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ بادشاہ گل عمر رسیدہ پٹھان تھا۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا اور داڑھی کے بھی آدھے سے زیادہ بال سفید تھے۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا "اکرام شیخ خیریت سے تو ہے، تم نے اسے آخری بار کب دیکھا تھا؟"

"تو ابھی تم کو کیا بتائے گا۔ تم کدھر سے آیا ہے؟"

"ہم تو بہت دور سے آئے ہیں۔ ڈھاکا سے۔" میں نے کہا۔

"بہت عرصے سے اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی۔" رابعہ

"تم نے بتایا نہیں کہ اس سے کب ملے تھے۔"

بادشاہ گل نے ایک آہ بھری "بہن! ابھی کتنا دن ہوگیا، ہم کو نہیں۔ ایک مہینے سے اوپر ہوگیا، یہ فروری کا مہینہ ہے۔"

میں نے کہا "ہاں! آج مارچ ہے۔"

بادشاہ گل نے کہا "تو ایک مہینہ اور اوپر ہوگیا۔ جنوری کو ہم دیکھا تھا اس کو۔ ہم اس کا جنازہ میں گیا تھا۔"

ایک لمحے کے لیے میرے حواس یوں معطل ہوگئے جیسے گیارہ ہزار وولٹ کرنٹ کا جھٹکا لگا ہو۔ رابعہ نے ایک خوفزدہ چیخ کے ساتھ میرا بازو تھام کے اور چلا کے کہا "سکندر! وہ کیا کہہ رہا ہے، ہم تو اکرام شیخ سے ملنے آئے تھے، یہ پتا نہیں کیا کہہ رہا ہے۔"

بادشاہ گل نے کہا "ہم ٹھیک بولتا ہے بی بی۔ ہم اکرام شیخ سے خریدا تھا یہ ٹیکسی۔ اس نے نیا ٹیکسی لیا تھا۔ اس کا ٹیکسی تباہ ہوگیا، غلطی اس کا نہیں تھا۔"

میں نے کہا "تم غلط کہتے ہو، وہ کوئی اور ہوگا۔"

بادشاہ گل نے سر گھما کے مجھے دیکھا اور افسوس سے کہا "ہم ایسا جھوٹ کیوں بولے گا۔ ابھی تم خود ادھر دیکھ لو۔"

اس نے ٹیکسی سڑک کے کنارے روک دی۔ اس کے سامنے ایک دیوار دکھائی دیتی تھی۔ سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ دیوار کے پیچھے سامنے اور دائیں بائیں انسانوں کی آبادی کا گمان کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ اس بستی کے بیچ میں یہ دیوار قبرستان کی فصیل ہے۔

رابعہ نے رونا شروع کردیا تھا "سکندر! یہ جھوٹ کہتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ مجھے بھی معلوم ہے مگر اس میں رونے کی کیا بات ہے۔"

"میں ۔۔۔ میں اندر نہیں جاؤں گی۔ چلو ہم واپس چلیں

سے معلوم کرتے ہیں۔" رابعہ میرا بازو پکڑ کے کھینچنے لگی۔

میں نے کہا "پاگل مت بنو، لوگ دیکھ رہے ہیں۔ تصدیق کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ ابھی معلوم ہوجائے گا کہ وہ کوئی اور تھا۔"

"مگر یہ ٹیکسی ـــ یہ تو اسی کی ہے۔"

میں نے کہا "اس نے دوسری ٹیکسی خرید لی تھی۔ بادشاہ گل! اس کی ٹیکسی کا نمبر کیا تھا؟"

"خیر، یہ ہم کو نہیں معلوم۔" وہ دیوار کے ایک شکستہ حصے سے قبرستان میں داخل ہوگیا۔ میرا دل ڈوب رہا تھا۔ اندر کی ایک آواز کہتی تھی کہ اس سچ کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ بادشاہ گل اتنے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ وہ اکرام شیخ کے جنازے میں شریک ہوا تھا۔ اسے اکرام شیخ کی آخری آرام گاہ کا بھی علم ہے۔ وہ جانتا ہے اکرام شیخ حادثے میں ہلاک ہوا تھا۔

میں نے کہا "بادشاہ گل! ایک عورت اپنے بچے کے ساتھ اکرام شیخ کو پوچھتی ہوئی آئی تھی؟"

"ہاں۔ ہم اس کو بھی ادھر لایا تھا۔"

"پھر وہ عورت اور اس کا بچہ کہاں گئے تھے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تو بابا، ہم اس کو صدر میں چھوڑا تھا۔"

رابعہ نے کہا "اس سے پہلے بھی تو ایک مرد اور عورت آئے ہوں گے، محسن اور گل۔"

"کون گل؟" بادشاہ گل نے کہا۔

"گل بانو ہے اس کا نام۔" میں نے کہا "یہ تقریباً ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ ہمارا پاس نہیں آیا۔ کوئی اور اس کو لایا ہوگا۔ جنازہ میں بہت ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ جس کو معلوم ہوا وہ آیا تھا۔"

رابعہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔

"تم صبر کرو بہن، اللہ کا مرضی۔ اسپتال میں ڈاکٹر لوگ اس کو بچانے کا بہت کوشش کیا۔ ہم بھی اس کا واسطے خون دیا لیکن۔۔"

وہ چلتے چلتے رک گیا "یہ ہے ہمارا اکرام شیخ کا قبر۔" اس نے مٹی کے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

رابعہ نے ایک چیخ ماری اور گرنے لگی۔ میں نے اسے سنبھال لیا۔

*

قبر کے سرہانے کوئی کتبہ نہیں تھا۔ صرف ایک پتھر لگا دیا گیا تھا۔ میں بہت دیر تک اس سنگِ مزار کو گھورتا رہا اور دل شکستگی کے گھپ اندھیرے میں سہارے کے لیے امید کی کوئی کرن تلاش کرتا رہا۔

یہ روشنی رابعہ نے فراہم کی۔ اس نے روتے روتے اچانک سر اٹھایا اور بادشاہ گل سے کہا "تمہیں یقین ہے، یہ وہی قبر ہے؟"

بادشاہ گل نے کہا "تو ہم کیسے بھول سکتا ہے بیگم صاحب۔ ہم خود جنازہ کے ساتھ آیا تھا۔"

رابعہ بولی "یہاں کوئی کتبہ کیوں نہیں لگایا گیا؟"

بادشاہ گل نے خالی ہاتھ پھیلا کے کہا "کون لگانے گا کتبہ؟ اس کا ادھر کوئی ہوتا تو لگاتا۔"

"اس کے دوست نہیں تھے؟" میں نے کہا "تم جیسے۔۔۔"

"دوست۔۔۔ ہم واقف تھا جناب۔" وہ بُری طرح سے پشیمان ہونے لگا تھا "دوست اور واقف میں بہت فرق ہوتا ہے اور کتبہ لگانے سے کیا ہوتا ہے؟ ادھر دیکھو کتنا کتبہ ہے۔ کون پڑھتا ہے کہ مرنے والا کب پیدا ہوا، کب مرا۔ اس کے اوپر شعر شاعری لکھتا ہے۔ سب بے کار بات ہے۔"

میں نے کہا "اپنا فلسفہ چھوڑو۔ یہ کیسے ثابت ہوگا کہ یہ قبر اکرام شیخ کی ہے؟"

"خو بابا! کیا بات کرتا ہے۔ ہم کدھر سے ثبوت لا دے۔ تم بولا جس کا یہ گاڑی ہے وہ کدھر ہے۔ ہم تم کو ادھر لایا ہے۔"

"تم نے ہی کہا تھا کہ یہ اکرام شیخ کی قبر ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کا نام تم بولا۔۔۔"

"کیا مطلب؟ تم خود نہیں جانتے تھے اس کا نام؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم بولا اس کا نام اکرام شیخ ہے۔ ہم نے مانا۔"

میں نے چلا کے کہا "پاگل کے بچے! تم نے گاڑی کس سے لی تھی؟ کس کے بارے میں کہہ رہے تھے کہ اس کا حادثہ ہوا؟ کس کے جنازے میں شریک ہوئے تھے؟"

"جس کا گاڑی تھا۔" بادشاہ گل رو دیا۔

میں نے اس کی گردن دبوچ لی "اس کا کوئی نام تو ہوگا۔ اس نے تمہیں رسید دی ہوگی، ٹرانسفر لیٹر دیا ہوگا۔ کاغذات کہاں ہیں گاڑی کے؟" میں اسے کھینچتا ہوا باہر لے گیا جہاں اس کی ٹیکسی کھڑی تھی۔

رابعہ بھی رونا بھول گئی تھی۔ اچانک امید پیدا ہوگئی تھی کہ کہیں یہ صرف غلط فہمی نہ ہو۔ گاڑی بلاشبہ وہی تھی مگر کیا فروخت کرنے والا اکرام شیخ ہی تھا؟

بادشاہ گل چلانے لگا "تو ہمارا کیا غلطی ہے؟"

میں نے کہا "غلطی کی اولاد، تم کو نام معلوم نہیں تھا اور تم نے کہہ دیا کہ اکرام شیخ مر گیا۔ تم نے دیکھا تو ہوگا اسے، حلیہ بتاؤ اس

www.paksociety.com

کا۔"
صاحب' گاڑی ہم نہیں لیا' سیٹھ لوگ لیا۔ ہم تو اس کا گاڑی چلاتا ہے۔" بادشاہ گل نے منت سماجت کرتے ہوئے اپنی گلو خلاصی کی کوشش کی "وہ بڈھا آدمی تھا۔ ہمارے جیسا......"

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اب کاغذات دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ ایک طرف اچانک میرا دل سکون' اطمینان اور شکرگزاری کے جذبات سے معمور ہو گیا تھا کہ اکرام شیخ زندہ ہے' وہیں دوسری طرف مجھے اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ بادشاہ گل کو اسی قبر میں گاڑ دوں جس کو اس نے اکرام شیخ کی قبر بتایا تھا۔ مگر یہ غلط فہمی ہم نے پیدا کی تھی۔ ہم نے کہا کہ اس گاڑی کا مالک اکرام شیخ ہے تو اس نے مان لیا کہ اکرام شیخ ہی ہو گا مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ وہ مر گیا۔

رابعہ نے مسرت سے کہا "مگر وہ کوئی اور تھا۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور کہا "کاغذات نکالو۔"

بادشاہ گل نے ٹیکسی کے کاغذات نکالے۔ یہ سارے فوٹو اسٹیٹ کاغذات تھے اور ان میں ابھی تک مالک کی جگہ اکرام شیخ کا نام ہی لکھا ہوا تھا۔ نام کے ساتھ پتا بھی تھا جو شاید پرانا ہو چکا تھا۔ اس نے یہ گاڑی کسی کو اوپن لیٹر پر بیچ دی تھی۔ نیچے دستخط اکرام شیخ نے ہی کیے تھے مگر ٹرانسفر لیٹر میں خریدار کے نام کی جگہ خالی چھوڑ دی تھی۔

"تم نے تو اچھے بھلے آدمی کو مار دیا تھا' یہ سوچے بغیر کہ کہیں اس صدمے سے ہم نہ مر جائیں۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "اب یہ بتاؤ کہ تمہارا سیٹھ کہاں ہے؟"

"کون سیٹھ؟"

"جس کی یہ گاڑی ہے۔ اور کون سیٹھ۔"

"وہ باہر رہتا ہے۔" بادشاہ گل بولا "ابھی اس کا بیٹا ہے۔"

میں نے ٹیکسی میں بیٹھ کے کہا "ٹھیک ہے' اسی کے پاس چلو۔"

رابعہ نے کہا "گاڑی کے کاغذات میں اکرام شیخ کا جو پرانا پتا دیا ہوا ہے وہ نوٹ کر لو۔"

میں نے کہا "میرے پاس تو قلم نہیں ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے ایک بال پوائنٹ پین دیا۔ میں نے وہ پتا ایک کاغذ پر اتار لیا "یہاں سے شاید معلوم ہو جائے......"

رابعہ نے میری بات کاٹ دی "معلوم تو قبرستان کے ریکارڈ سے بھی ہو سکتا ہے۔ گورکن کے پاس رجسٹر اموات ہوتا ہے۔"

میں پھر ٹیکسی سے اتر گیا "بالکل ہوتا ہے۔ تم یہیں بیٹھو میں دیکھ کے آتا ہوں۔"

گورکن کو میں نے قبرستان کے ایک دور افتادہ حصے میں دریافت کیا۔ وہ ایک قبر کھود رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ پھر میری نگاہ نے اڑتی ہوئی مٹی کو دیکھا جو ایک ڈھیر پر گرتی جا رہی تھی۔ یہ مٹی وہ اپنے بیلچے سے اوپر پھینک رہا تھا مگر خود گہرائی میں روپوش تھا۔

میں نے مٹی کے ڈھیر پر بیٹھ کے اسے آواز دی تو اس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا "قبر چاہیے؟"

میں نے کہا "ابھی نہیں۔ مجھے تم سے ایک اور کام ہے۔ باہر آؤ۔"

وہ باہر آ کے مجھے شک آمیز نظروں سے گھورنے لگا۔ "کوئی مردہ چاہیے؟ ایک ہزار کا ہو گا۔ تم بڑا ٹائم پر آیا ہے۔ ادھر میت آنے کو ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "کس کی میت ہے؟"

"اپن کو کیا معلوم۔ تم کو ضرورت ہے تو بولو۔"

میں نے کہا "تدفین کے بعد تم لاش نکال لو گے؟"

"رات کو۔" وہ بولا۔

"وارثوں کو پتا نہیں چلے گا؟ وہ دو چار دن تو فاتحہ پڑھنے آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"آئیں' شوق سے آئیں۔ اوپر سے قبر اصلی مافق ہو گی۔ بے شک پکی کرا لیں۔ دس سال آتے رہیں۔" وہ اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

"وہ ایک خالی قبر پر فاتحہ پڑھ کے جاتے رہیں گے [illegible] بھی کرتے ہو۔ ضمیر فروش' شیطان۔"

"تم کون ہے بابا؟" اس نے بے نیازی سے کہا۔

میں نے کہا "میں جو بھی ہوں' تم بتاؤ کہ تم یہ کیا دھندا کرتے ہو؟ کیا تمہیں مر کے قبر میں نہیں جانا ہے؟ اگر کوئی تمہاری [illegible] دے پھر؟"

"بیچے بابا' بھلے بیچے۔ لاش کو کیا فرق پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "کب سے کر رہے ہو یہ دھندا؟"

"یہ سوال چھوڑو' اپنا کام بتاؤ۔" وہ ایک لنگوٹ باندھے ہوئے تھا۔ اس کا کالا بدن دھوپ میں پسینے سے [illegible] پر مٹی جم گئی تھی۔

میں نے کہا "اگر مجھے سچ سچ بتا دو گے تو کچھ نہیں ہو گا ورنہ تم کو چھوڑوں گا نہیں۔"

"کیا نہیں چھوڑے گا۔ ہم کو تڑی دیتا ہے۔ ارے او ڈاکٹر لوگ آؤ۔ آج بہت بڑا نام ہے اس کا۔ وہ ہم کو بچاتا ہے۔ پولیس کو بھتہ دیتا ہے۔ تم جاؤ رپورٹ کرو۔" وہ اکڑ گیا۔

میں چوری اور سینہ زوری کے اس مظاہرے پر حیران تھا "اس کام میں پولیس بھی شریک ہے؟"

"پولیس کی مرضی کے بغیر کون سا غلط کام ہوتا ہے بابو؟"

میں نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا پیسہ کما کے کرو گے کیا۔ کس بات کا لالچ ہے تمہیں؟"

"پیسہ سب کماتا ہے۔ ہم مردہ بیچتا ہے' لوگ تو زندہ اپنی بیوٹی کو بیچتا ہے۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے مگر تم اپنے آپ کو دیکھو' کیا حالت ہے تمہاری؟ تم کسی جھگی یا چھوٹے سے مکان میں رہتے ہو۔ [illegible] قبرستان میں یہ زمین کارپوریشن کی ہے جس کی تم کے وصول کرتے ہو۔ کس بات کا لالچ ہے تمہیں آخر؟"

"بابا لالچ سب کو ہے۔ کروڑپتی سیٹھ بھی کالا دھندا کرتا ہے۔ اس کو کس چیز کا کمی ہوتا ہے اس کو؟ اپن پیسہ جمع کرتا ہے اس دن؟ کس کام کو چھوڑنے کا واسطے جو اپنا باپ کیا' دادا کیا۔ وہ قبر کھودتے کھودتے خود بھی قبر میں چلا گیا۔ اپنا بیٹا یہ کام نہیں کرے گا۔ اپن ادھر سے چلا جائے گا' جب اتنا پیسہ ہو گا کہ کوئی کاروبار کرے۔ کوئی مکان خریدے گا اور عزت سے رہے گا۔ اپنا بچہ سکول میں جائے گا۔ کوئی اس کو نہیں بولے گا کہ تیرا باپ گورکن ہے۔ یہ کام نہیں چھوڑے گا تو باپ دادا کی طرح سارا عمر قبر کھودے گا۔"

میں دکھ افسوس اور حیرانی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ ہر شخص اپنے گناہ کا جواز رکھتا ہے جو گناہ سے بدتر ہوتا ہے۔ جیب کترے سے لے کر کوٹھے پر بیٹھی ہوئی عورت تک سب حالات کو الزام دیتے ہیں۔

مجھے احساس ہوا کہ گورکن سے باتیں کرتے ہوئے میں نے اپنا وقت ضائع کر دیا ہے۔ باہر رابعہ میری واپسی کا انتظار کر رہی تھی لیکن گورکن کی بات ہی ایسی تھی کہ میں اس کے مذموم کاروبار کے بارے میں پوچھنے پر مجبور ہو گیا اور اپنا کام بھول گیا۔ ابھی زندگی میں مجھے بہت کچھ دیکھنا تھا اور سننا تھا۔ میری عمر اور میرا تجربہ محدود تھا۔ دنیا میں کہاں کیا کچھ ہو رہا ہے' یہ سب میں نہ جانتا تھا' نہ جان سکتا تھا۔

گورکن کے انکشاف نے مجھے صدمے سے ہمکنار کر دیا تھا اور میں وقتی طور پر مشتعل ہو گیا تھا مگر جب مجھے احساس ہوا کہ یہ بھی معاشرے کا ایک ناسور ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ برائی کا ایک لمبا چکر ہے جس میں ایک معمولی گورکن سے پولیس تک' سب ملوث ہیں تو میرا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ خرابی اس معاشرے کے رگ و پے میں یوں سرایت کرتی جا رہی تھی کہ اچھائی کے پیروکار بھی شکست خوردگی اور مایوسی کا شکار تھے اور پسپائی میں عافیت جانتے تھے۔

گورکن نے کہا "بابا' تم کیا کس کام کا واسطے آیا تھا؟ ہمارا ٹائم بھی خراب کیا۔ ابھی میت آ جائیں گا۔"

میں نے کہا "ایک منٹ میں وہ رجسٹر دیکھنا چاہتا ہوں جس میں تم مرنے والوں کا ریکارڈ رکھتے ہو۔"

"کتنا پیسہ دے گا؟"

"دوں گا میرے بھائی' کیوں نہیں دوں گا۔ ضرورت مند ہوں آخر۔" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

وہ میرے ساتھ قبرستان کے کنارے پر بنی ہوئی جھگی تک گیا اور اندر سے ایک رجسٹر نکال لایا۔ یہ رجسٹر ایک لمبی سی کاپی تھا جو تہری کر کے رکھی گئی تھی۔ اس میں ہر مرنے والے کے کوائف درج تھے جو تدفین کے وقت ورثا لکھواتے تھے۔ میں صفحے پیچھے کی طرف پلٹتا گیا اور تاریخ دیکھتا گیا۔

اس رجسٹر کے پہلے صفحے پر پندرہ جنوری کا اندراج تھا۔ میں نے رجسٹر اسے واپس کرتے ہوئے کہا "اس سے پہلے کا رجسٹر لاؤ۔"

"وہ نہیں ہے۔" گورکن نے بے رخی سے کہا۔

"کیوں نہیں ہے؟"

"بابا' کری کا ہے کو رکھتا ہے۔ پرانا رجسٹر کارپوریشن جاتا ہے' ادھر جا کے دیکھو۔" وہ اپنی جھگی میں گھس گیا۔

میں مایوس ہو کے لوٹا اور یہ بات رابعہ کو بتائی "ہمیں کارپوریشن جانا پڑے گا۔ شعبۂ اموات میں۔ وہاں کوئی اور کلرک بادشاہ بیٹھا ہو گا۔ وہ پرانا ریکارڈ نکالنے کا معاوضہ طلب کرے گا۔"

رابعہ نے کہا "یہ تو ہوتا ہے۔ جتنا پرانا ریکارڈ ہوتا ہے وہ اتنے ہی زیادہ پیسے مانگتے ہیں۔ بعض اوقات لوگ کئی سال بعد کسی کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنوانے پہنچ جاتے ہیں۔ عدالت میں وراثت کے مقدمات دائر کرنے کے لئے ڈیتھ سرٹیفکیٹ پیش کرنا پڑتا ہے۔"

آدھے گھنٹے بعد ہم کارپوریشن کے دفتر پہنچے تو دوپہر گزر چکی تھی۔ کلرک بادشاہ لنچ سے آدھا گھنٹا قبل ہی لنچ کے لیے تشریف لے جا چکے تھے۔ ایک چپراسی نے مجھے بتایا کہ وہ کہاں دستیاب ہوں گے۔ میں نے انہیں ایک ریڑھی پر مرغ چھولے اور نان تناول کرتے ہوئے جا پکڑا۔ میں ان سے پوچھتا کہ وہ لنچ کا وقفہ شروع ہونے سے قبل ہی کیوں اٹھ گئے اور انہیں ادائے فرض یا وقت کی پابندی پر لیکچر دیتا تو وہ خفا ہو جاتے اور میرا کام خراب ہو جاتا۔

میں نے عرض مدعا کی تو انہوں نے ایک شانِ استغنا کے ساتھ کہا "کیا کھانا چھوڑ کے تمہارے ساتھ چل پڑوں؟ دفتر میں انتظار نہیں کر سکتے تھے۔"

میں نے کہا "غلطی ہوئی سر' آپ اطمینان سے کھانا کھائیے۔"

وہ میری عاجزی سے متاثر ہوا "کس کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنوانا ہے؟ بندہ کب فوت ہوا تھا؟"

میں نے اسے تاریخ بتائی "مجھے ڈیتھ سرٹیفکیٹ نہیں چاہیے' بس نام کی تصدیق کرنی ہے۔"

"مجھے تو رجسٹر اولڈ ریکارڈ سے نکالنا ہی پڑے گا۔" وہ بولا "سو روپے ہوں گے۔"

رزق اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اتنی بے فکری کے ساتھ حرام مانگ رہا تھا کہ مجھے اس کی مردہ ضمیری پر ترس آیا مگر میں نے کہا "ٹھیک ہے سر۔"

اس نے مرغ چھولے کی ڈکار لی' چائے نوش فرمائی پھر ایک

www.paksociety.com

دکان سے میٹھا پان بامہ مسالے والا کھایا اور سگریٹ کا ایک پیکٹ لے کر مجھے تھما دیا "اسے سو کا نوٹ دے دو۔"

اس کا طریقۂ واردات بہت محفوظ تھا۔ اگر سو کے نوٹ پر اینٹی کرپشن والوں کے دستخط ہوتے تو اس کا کچھ نہ بگڑتا۔ سو کا نوٹ تو پان والے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ باقی رقم کلرک بادشاہ نے وصول کی اور جیب میں ڈال لی۔

اپنے نحوست زدہ گرد آلود فائلوں اور بدرنگ پرانے فرنیچر والے آفس میں پہنچ کے اس نے رجسٹر تلاش کرنے میں آدھا منٹ بھی نہیں لگایا۔ اس کا ہاتھ سیدھا ایک شیلف کی طرف گیا اور اس نے سب سے اوپر والا رجسٹر میرے سامنے پھینک دیا۔

میں نے صفحے پلٹے اور مطلوبہ تاریخ کے اندراجات دیکھنے لگا۔ پھر ایک جگہ میری نظر رک گئی۔ اس دن سات افراد کی تدفین ہوئی تھی اور ایک کا نام اکرم شاہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اکرام شیخ اور اکرم شاہ کے ملتے جلتے ناموں کے باعث ہی بادشاہ گل کو غلط فہمی ہوئی تھی۔ ایک مہینہ انیس دن بعد اس نے اکرام شیخ سنا تو اکرم شاہ سمجھا اور مجھے اس کی قبر پر لے گیا۔

میرا کام ہو گیا تھا۔ اب میں نے رجسٹر کلرک بادشاہ کے سامنے پھینکا "یہ لو سنبھال کے رکھو۔ تم کو اچھی مُردوں کے نام کی کمائی خود بھی کھاتی ہے اور اپنی اولاد کو بھی کھلاتی ہے۔"

وہ میرے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

میں نے جاتے جاتے کہا "تم میں اور کفن چور میں کوئی فرق نہیں۔ یہ سب مُردے اور ان کے وارث قیامت کے دن تمہارا دامن پکڑیں گے۔"

"پکڑنے دو۔ تم بھی تو آؤ گے۔" وہ بولا۔

باہر آ کے میں اس قوم کی بدترین زوال اخلاقی حالت پر افسوس کرتا رہا جس کی ہدایت کے لیے قرآن جیسا ابدی و ازلی صحیفہ نازل کیا گیا۔ خدا سے ڈرنا تو لوگوں نے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا، اب قانون کی سزا سے بے خوفی بھی حرام خوروں کے مزاج میں شامل ہو گئی تھی۔

رابعہ نے کہا "بہت دیر لگا دی۔ یہ خیر تو ہے؟"

میں نے کہا "گڑے مُردے اکھاڑنے گیا تھا۔ جنتی بن کے واپس آیا ہوں۔ یہ تازہ خبر؟"

"اتنے متقی کیوں ہو رہے ہو؟"

"رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہوتے ہیں نا۔ میں صبح سے دوسری بار رشوت دے چکا ہوں۔ مگر خیر خوش خبری یہ ہے کہ وہ نام اکرم شاہ تھا، اکرام شیخ نہیں۔"

بادشاہ گل نے کہا "خو اللہ تمہارا بھلا کرے۔ تم اکرام شیخ بولا، ہم اکرم شاہ سمجھا۔"

میں نے کہا "تمہاری اس ناسمجھی نے کتنے مسائل پیدا کر دیے شاید یہ تم نہیں جانتے۔ ہم نے تو جگ ہنسائی اور تحقیق کر کے اصل حقیقت کا پتا چلا لیا مگر دو دن پہلے جو اکیلی عورت ایک ساتھ آئی تھی، اسے ہم کہاں تلاش کریں۔ معلوم نہیں اس بات پر یقین کر کے اس نے کتنی پریشانی اٹھائی ہوگی۔"

"اس کا بھی پتا چل جائے گا۔ ابھی بولو کدھر جانا ہے؟"

میں نے کہا "اپنے سیٹھ کے گھر چلو پہلے۔"

ٹیکسی کا موجودہ مالک کاروں کا دلال تھا۔ صدر میں ہوٹل کے پاس کھڑی ہوئی گاڑیوں کا براہ راست سودا کرنے اور دلال جمع تھے۔ بادشاہ گل نے اسے ایک گلی میں ڈھونڈ کر ہمارے پاس لے آیا۔

وہ دبلا پتلا نوجوان آدمی تھا "جی کیا حکم ہے سرکار؟"

میں نے کہا "یہ گاڑی تم نے اکرام شیخ سے لی تھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میرے والد صاحب نے لی تھی۔"

"والد صاحب کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"وہ حج کو گئے ہیں۔ ایک ہفتے بعد آ جائیں گے سرکار۔"

میں نے کہا "تم کچھ جانتے ہو اس شخص کے بارے میں، اب کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے؟"

اس نے مجھے اور رابعہ کو غور سے دیکھا "معاملہ کیا ہے سرکار؟"

میں نے کہا "معاملہ یہ ہے کہ ہم ڈھاکا سے آئے تو ہم گئے تھے تو اس کے پاس یہ ٹیکسی تھی۔ اس ٹیکسی کے ذریعے اس کا پتا ٹھکانہ معلوم ہو جاتا تھا۔"

"اب دوسری ٹیکسی ہے اس کے پاس۔ ہم نے خرید لی تھی۔ انہیں چیچ کی تھی اس نے۔"

"اس کی نئی ٹیکسی کا نمبر معلوم ہے؟"

اس نے ذہن پر زور دے کر کہا "بڑا اچھا نمبر تھا۔ انشاء۔"

"یعنی نو سات سو چھیاسی؟" میں نے کہا۔

"بالکل صحیح سمجھے آپ سرکار۔" وہ مسکرا کے بولا۔

"یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ملے گا؟ پتا کیا ہے اس کا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ٹیکسی والوں سے پتا کرو۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو ورنہ کل موٹر آفس چلے جانا۔ ادھر ادارہ کاغذ کے پاس ہے۔ آج تو آفس بند ہو گیا۔"

یہ اطلاع اتنی امید افزا تھی کہ ہم نے بادشاہ گل کے نئے سرے سے اکرام شیخ کی تلاش شروع کی۔ وہ کہیں نہیں رکنا چاہتا تھا مگر ہماری تو بھوک ہی اڑ گئی تھی۔ یہ خیال کہ اکرام اس دنیا میں نہیں رہا اور اب اس کا سراغ مل گیا، مجبوراً ہمیں بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ ایک ریسٹورنٹ میں بادشاہ گل نے ڈٹ کے کھایا اور اپنا فلسفۂ حیات بھی بیان کیا۔ آدمی کی ساری تگ و دو پیٹ کے لیے ہوتی ہے۔ آدمی کھائے تو پھر محنت سے فائدہ۔ ہم نے اس سے اتفاق کیا۔

تو اکرام شیخ کا اشتیاق اتنا غالب تھا کہ میں نے کابل اور کلیم اللہ سے ملنے کا ... کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ میں نے اور رابعہ نے کھانے کی طرف کو اکتفا کی اور بادشاہ گل کو مسلسل جلدی ... ایک کپ چائے پر ... کے لیے کہتے رہے۔

... کا دوسرا مرحلہ سہ پہر کے وقت شروع ہوا۔ ہم نے تلاش ... ٹیکسی اسٹینڈ پر پوچھنا شروع کیا۔ نائن سیون ایٹ سکس کا نمبر ... جانے تھے۔ پھر کہتے تھے "اچھا تو بسم اللہ دیکھا ... سوچ ... کہاں ... کدھر ہے یہ معلوم نہیں۔"

... ہمیں بتایا گیا "ابھی ابھی نکلا ہے سواری لے کر نئی ... ملے گا۔" ... ہم بھاگے۔ ہم نئی حسن پہنچے تو وہ راستے میں نظر ... گیا ہے۔ ... تلاش کرنے سے ملا۔ نئی حسن کا علاقہ بہت وسیع تھا اور ... قبرستان کے آس پاس کا سارا علاقہ ہی نئی حسن کہلاتا تھا جس ... نام کے کچھ بلاک اور بفرزون وغیرہ شامل تھے۔ تاہم ... تک ہم نے ہمت نہ ہاری اور جہاں بھی کسی ٹیکسی کو کھڑا دیکھا ... کہ وہ کہ اکرام شیخ تک ہمارا پیغام پہنچا دے اور اسے بتا دے ... رابعہ اور سکندر اسے تلاش کر رہے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شام کو ایک ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں ... پرچی تھما دی۔ اس پر لکھا ہوا تھا "میں گھر پر تمہارا انتظار کر رہا ... نیچے پتا اور راستے کا نقشہ بنا ہوا ہے۔"

میں نے ایک پُرمسرت نعرہ لگایا "بادشاہ گل! چلو تمہارا کام ہو گیا ... یہ پتا سمجھو لو اور چلو۔"

بادشاہ گل نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کے کہا "خو اللہ کا شکر ... ورنہ تم ہمارا جان نہیں چھوڑتا۔"

بادشاہ گل کو نقشہ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کراچی کے ... سے آشنا تھا۔ وہ جس راستے سے گزرا ہمیں بتاتا گیا "خو ... ہے۔ ابھی پل آئے گا۔ اس کے بعد گولیمار۔"

میں نے کہا "گولی مار! یہ کیا نام ہوا۔ کسی کو گولی ماری گئی تھی ... کہ اس جگہ کا نام گولی مار ہو گیا۔"

بادشاہ گل نے کہا "یہ تو ہم کو نہیں معلوم۔"

"ایسے ہی تین ہٹی۔" میں نے کہا "اس کا مطلب ہے تین ... تو آخر وہ کون سی تین دکانیں تھیں؟"

رابعہ نے کہا "کیا فضول سوالات کر رہے ہو۔ ایسے نام تو ... ہوتے ہیں۔ پنڈی میں تیلی محلہ ہے مگر وہاں تیلی نہیں رہتے ... کے بارہ دری باغ میں کون سا بادشاہوں کا باغ تھا۔"

میں نے کہا "بس ایسے ہی گپ شپ کر رہا ہوں وقت گزاری ... سوچو تو دیر بعد ہم اکرام شیخ کے سامنے ہوں گے۔"

"باقی سب کو بھول گئے؟"

"وہ تو ہمارے ساتھ ہی تھے مگر اکرام شیخ تو بس ایک نام رہ گیا ... یاد باقی تھی ہمارے دل میں۔"

ٹیکسی ایک گلی میں مڑتے ہی رک گئی۔ میں اکرام کی ٹیکسی کے سامنے۔ ہماری وجہ سے وہ دھندا چھوڑ کر گھر لوٹ آیا تھا۔ گھر کا نمبر کہیں نظر نہ آتا تھا مگر اکرام نے ہماری سہولت کی خاطر دروازے پر چاک سے اپنا نام "ڈبل ایس آئی شیخ" لکھ دیا تھا۔ جب وہ پولیس میں سب انسپکٹر تھا تو ہم اسے ایس آئی شیخ کہتے تھے۔ اس کا پورا نام سید اکرام شیخ تھا۔ ظاہر ہے یہ اس نے ابھی ابھی لکھا تھا۔

میں ٹیکسی سے چھلانگ مار کے اترا اور دروازہ بجانے لگا مگر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میری نظر سب سے پہلے کابل اور کلیم اللہ پر پڑی۔ کابل فرش پر دری بچھائے بیٹھی تھی اور چائے پی رہی تھی۔ کلیم اللہ اس سے کچھ دور بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

کابل ایک دم اٹھی "سکندر... تم آ گئے۔"

کلیم اللہ نے بھی چلا کے کہا "سکندر چاچا۔"

اس کے ساتھ ہی کمرے میں سے اکرام شیخ بگولے کی طرح نمودار ہوا اور مجھ سے چمٹ گیا۔

"سکندر! تم سکندر ہو؟ مجھے یقین نہیں آتا۔ خدا کی قسم تم نے مجھے بہت ستایا، کتنا انتظار کرایا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں نے اپنے آنسو پونچھ کے کہا "رابعہ بھی ہے میرے ساتھ۔"

رابعہ میرے پیچھے کھڑی تھی اور اسے قطعی احساس نہ تھا کہ

www.paksociety.com

آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے چھلک گئے تھے "اکرام ۔۔۔ تم ٹھیک ہو نا؟" رابعہ نے بڑی مشکل سے کہا۔ پھر وہ اکرام کے گلے لگ کر رونے لگی۔

میں نے کہا "کیا ہو گیا ہے سب کو۔ اتنی خوشی کے موقعے پر رو رہے ہیں ہم سب۔"

اکرام نے کہا "یہ آنسو بھی کب سے رکے ہوئے تھے آج کے دن کے انتظار میں۔ اس خوشی کے لیے میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔"

میں نے کہا "وہ اکرم کا بچہ کہاں ہے؟"

"کون، محسن؟" اکرام بولا "میں تو خود تم سے پوچھنے والا تھا۔ وہ گل کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ مجھے کاجل نے بتایا۔"

میں نے کہا "تو کیا وہ یہاں نہیں پہنچا؟"

اکرام نے نفی میں سر ہلایا "یہاں پہنچتا تو میرے ہی پاس آتا نا۔"

میری خوشی اتنی عارضی ہوگی' یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک دم میرا دل بیٹھ گیا۔ رابعہ کی صورت پر اداسی برسنے لگی۔

"اکرام! وہ کہاں جا سکتے ہیں آخر؟ ہم نے انہیں جہاز میں بٹھا کے خود رخصت کیا تھا۔"

"یہ بھی مجھے بتایا تھا کاجل نے۔ اور میں نے انہیں بہت تلاش کیا۔" اکرام شیخ بولا "لیکن وہ نہیں ملے۔ میں نے ہر ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا کہ کوئی مجھے پوچھتا ہوا تو نہیں آیا تھا' میں' ٹیکسی کا نمبر تو معلوم نہیں کر سکا تھا۔ اس کو تو پرانا نمبر یاد ہوگا لیکن کچھ نہیں۔۔۔"

میں نے کہا "یار' وہ لاہور چلا گیا ہوگا۔"

"میں نے معلوم کر لیا ہے۔"

"کس سے؟ منظر نے تو گھر بدل لیا۔ میں خود اسے فون کرتا رہا۔" میں نے کہا۔

"اچھا تم بیٹھو۔ بیٹھ کے آرام سے بات کرو۔" اکرام بولا "چلو اندر آجاؤ۔"

رابعہ نے کہا "میں یہاں کاجل کے پاس بیٹھی ہوں۔"

"تم نے یہ گھر کب لیا؟" میں نے کمرے میں پلنگ کے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"دو مہینے ہو گئے۔" اکرام شیخ دوسرے بستر پر ٹانگیں لٹکا کے بیٹھ گیا "اور یہ میں نے صرف اس لیے لیا تھا کہ یہاں فون تھا۔"

میں نے کہا "فون۔۔۔ فون ہے یہاں؟ لاحول ولا قوۃ ہم وہاں سوچتے رہے تھے کہ تم سے کیسے رابطہ کریں۔"

"منظر نے نہیں بتایا تھا؟ اسے تو معلوم تھا۔" اکرام بولا۔

"اس سے بھی رابطہ کم ہی ہوتا تھا۔" میں نے کہا "مگر اس نے ذکر نہیں کیا' بھول گیا ہوگا۔ کرائے کا مکان ہے؟"

"اور کیا خرید کر رہوں گا میں۔ صرف فون کی وجہ سے کرایہ دو سو روپے ہے۔" وہ بولا "ایسی فضول سی آبادی میں دو کمرے کے مکان کا کرایہ سو' سوا سو سے زیادہ نہیں ہوتا۔ مگر ٹیلی فون نعمت ہے جو خوش نصیبوں کو میسر ہے۔ اس امید میں لیا تھا کہ تم سے یا نازو سے بات ہو جائے گی۔ وہ کہاں ہے اور غالب؟"

میں نے کہا "وہ بھی پہنچ جائیں گے ایک دو دن میں۔"

"مجھے وہ سب تو کاجل سے معلوم ہو گیا تھا جو مشرق وسطیٰ میں تمہارے ساتھ ہوا تھا۔" اکرام بولا۔

"خاک وصول ہوا تھا۔ جھک ماری تھی ہم نے۔" میں نے کہا "مجھے تو اب افسوس ہوتا ہے کہ ساری جدوجہد رائیگاں گئی۔"

"یار ایسا تو ہوتا ہے۔ جدوجہد کے دو ہی نتیجے نکلتے ہیں' کامیابی اور ناکامی کی صورت میں۔ تمہاری نیت نیک تھی اور ارادے نیک تھے۔ اب حالات ہی ناموافق ہوں۔ تقدیر ساتھ نہ دے اور اپنے پرائے ہو جائیں تو آدمی کیا کرے۔"

"نہیں یار' دکھ تو ہوتا ہے نا پھر بھی کہ ہم نے کیا سوچا اور کیا ہو گیا۔" میں نے کہا۔

"تو کبھی ہم سب بھی ہیں۔ یہاں ہر پاکستانی کا دل روتا ہے' یار ہم عالمی طاقتوں کی سازش کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے۔"

"چھوڑو اس ذکر کو۔ اس بات سے بھی زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔" میں نے کہا "یہ بتاؤ کاجل یہاں کیسے پہنچ گئی؟ اسے تو معلوم ہوا تھا کہ تم فوت ہو گئے ہو۔"

اکرام ہنسا "کیا تمہیں بھی کسی نے میرا مزار دکھایا تھا؟"

"ہاں یار' ہم نے تو بڑی مشکل سے تمہیں اس دنیا میں تلاش کیا۔ ایک خبیث ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ اس کے پاس تمہارا پتا تھا' ٹیکسی تھی۔ کہنے لگا کہ جس کی ٹیکسی تھی وہ تو فوت ہو گیا اور ہمیں لے گیا ایک قبر پر۔ وہاں نہ کوئی کتبہ تھا نہ کوئی نشانی۔ کارپوریشن جا کے رجسٹر اموات نکلوایا تو پتا چلا کہ وہ اکرم شاہ تھا۔"

"ہاں' میری گاڑی اکرم شاہ نے لی تھی۔ اس نے دفتر میں ایک شخص کو دے دی۔" اکرام بولا "وہ بیوپار کرتا ہے اور باہر سے سامان لاتا رہتا ہے۔ اکرم شاہ ایک ہفتے بعد حادثے میں مر گیا۔"

"اس کی ٹیکسی کو کچھ نہیں ہوا؟"

"حادثہ اس وقت ہوا جب وہ پیدل جا رہا تھا۔" اکرام شیخ نے کہا "میری ٹیکسی اس بیوپار کے پاس تھی مگر ٹیکسی والے جانتے تھے کہ میں نے نئی گاڑی لی ہے "اسی بیوپار کرتے" اور پرانی گاڑی اکرم شاہ کو دے دی ہے۔ بس اسی سے گڑبڑ پھیلی۔ تمہیں کون لایا تھا؟"

"بادشاہ گل نام تھا اس کا۔ بڑے وثوق سے کہہ رہا تھا کہ وہ خود جنازے میں شریک ہوا تھا۔ بعد میں حلیہ بتایا تو میری جان میں جان آئی اور میں نے تمہیں ڈھونڈنا شروع کیا۔ اسی بیوپار کرنے والے سے تمہاری نئی ٹیکسی کا نمبر لیا۔"

"کاجل نے بادشاہ گل کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ وہ بڑی بہت والی لڑکی ہے اور بہت ذہین۔ اس نے بھی حلیہ پوچھا تھا۔ بادشاہ گل نے کیا کرو' گڑبڑائی تھا۔ کاجل کو شاید معلوم تھا کہ گڑبڑ ہے۔ بہرحال نہیں بولے۔"

"بہر حال یہ تو طے تھا کہ وہ ایک جوان رعنا ہے' خوبصورت۔" "ہم نے ثابت کیا کہ جس نتیجے پر تم آئی جھک مار افسوس کی بات ہے' ایک عورت کے ذہن نے فوراً اخذ کر لیا۔"

"پھر کیا نتیجہ؟"

"یہی کہ اکرام شیخ نے ٹیکسی بدل لی ہوگی۔ اس نے صدر جا کے ایک ہوٹل میں کمرہ لیا اور ٹیکسی والوں کی یونین کے بارے میں معلوم کیا۔ کسی ٹیکسی ڈرائیور نے یونین کے دفتر کا ٹیلی فون نمبر بتایا۔ اس نے وہاں فون کیا اور پوچھا کہ اکرام شیخ ایک ٹیکسی چلاتا تھا جس کے پاس پہلے اس نمبر کی گاڑی تھی۔ اب اس کے پاس کون سی گاڑی ہے؟ اس کا نمبر کیا ہے اور وہ کہاں رہتا ہے۔"

میں نے سر ہلا کے کہا "یار' یہ تو بڑا آسان طریقہ تھا مگر یہ بھی ہمارے کھوپڑی میں نہیں آئی۔ اور آتی بھی کیسے' تمہارے انتقال پر ملال کی خبر اور تمہاری قبر دیکھ کے عقل کا تو فیوز اڑ گیا تھا' دماغ بالکل معطل ہو رہا تھا۔"

اکرام نے کہا "کاجل کو میری نئی ٹیکسی کا نمبر معلوم ہو گیا اور پتا اس کے بعد وہ دو گھنٹے میں یہاں آ گئی۔"

"جہاں ہم سارا دن گنوا کے پہنچے۔" میں نے کہا "مگر یار' تم تو عقل مند نہیں ہو۔ کاجل کے آنے کے بعد کیا تم سب ٹیکسی والوں سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ اب کوئی مجھے پوچھتا ہوا آئے تو میرے گھر لے آنا۔"

"سارے شہر کے ٹیکسی والوں سے کیسے کہتا دو دن میں۔ کافی لوگوں کو بتا دیا تھا' کچھ رہ گئے تھے۔ بس بدقسمتی تمہاری کہ وہ تمہیں بادشاہ گل ملا جسے کچھ معلوم نہیں تھا۔"

"یہی تو رونا ہے۔ اسے کچھ معلوم نہ ہوتا تو وہ کہہ دیتا کہ کسی اور سے پوچھو۔ اسے جو معلوم تھا وہ غلط تھا' مزید یہ کہ اپنی غلط معلومات پر اسے صحیح ہونے کا یقین تھا۔ سالے نے مروا دیا تھا ہمیں لے جا کے قبر دکھا دی۔ ہارٹ فیل ہو جاتا میرا یا رابعہ کا پھر؟"

"یار اتنے کمزور دل تو نہیں ہونے چاہئیں تمہارے۔ تم سے کاجل اچھی رہی جو نہ گھبرائی نہ پریشان ہوئی حالانکہ اس شہر میں وہ اجنبی تھی۔ دو گھنٹے میں آ گئی یہاں۔ ہوٹل میں کمرہ تو اس نے لیا تھا کہ خدانخواستہ میں نہ ملوں تو اس کے پاس ایک ٹھکانا تو ہو۔ میں تو دنوں میں اس لڑکی سے بے حد امپریس ہوا ہوں۔ اس کی کمانی تمہیں تم نے تو مکمل رنگ دے دیا۔ اتنی جرأت مند اور نڈر لڑکی۔ اور جن حالات میں وہ اپنا گھربار' خاندان اور وطن سب کچھ قربان کر کے یہاں آئی ہے' جتنی لگن کے ساتھ وہ کلیم اللہ کی ذمے داری کو پورا کر رہی ہے اور جتنا اعتماد اس نے مجھ پر کیا۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "بھائی صاحب' آپ کچھ ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو رہے ہیں۔"

"کیوں' کون سی بات غلط کی ہے میں نے؟"

"اچھا اس کی سیرت کے ساتھ صورت کا بھی کچھ آپ کے دل پر خوشگوار اثر ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اب اگر میں نے کہا کہ لاجواب ہے تو تم میرے پیچھے ٹین باندھ دو گے' اس لیے میں جھوٹ بول کے جان بچانا بہتر سمجھتا ہوں۔ وہ انتہائی بدصورت ہے کہ مجھے بالکل اچھی نہیں لگی۔"

اسی وقت کاجل اندر آئی اور اس نے چائے کا ایک مگ مجھے تھمایا' دوسرا اکرام کو دیا' بیچ میں بسکٹ رکھے اور واپس جانے لگی۔

میں نے کہا "کیا بات ہے۔ ہم سے پردہ ہے کیا؟"

وہ ہنسنے لگی "یہ خیال آپ کو کیوں آیا؟"

"تم نے اپنا زنانہ سیکشن الگ جو کر لیا ہے۔"

"آپ یہاں اکرام کو وہی بتا رہے ہوں گے جو رابعہ مجھے بتا رہی ہے۔ دو کی عقل ہو تو آپس میں باتیں ہوتی ہیں' چار ہوں تو جلسہ ہو جاتا ہے۔" کاجل بولی۔

"پانچ ہوں تو دفعہ ایک سو چوالیس کی خلاف ورزی ہو جاتی ہے۔" رابعہ نے برآمدے سے جھانک کے کہا۔

کاجل نکل گئی تو اکرام نے کہا "غالب اور نازو کیوں پیچھے رہ گئے؟"

میں نے کہا "ہم بھی تو پیچھے رہ گئے تھے۔ ہمیں کی زیادہ فکر

ہے۔"

اکرام بولا "ہاں یار! سچ تو یہی ہے کہ سب سے زیادہ مجھ پر نازو کی جدائی شاق گزری۔ میں یہ کہوں کہ تم سب برابر ہو میرے لیے تو یہ غلط ہوگا۔ نازو تو روزِ اول سے میرے ساتھ ہے۔ بے شک میں اس سے بہت زیادہ بڑا نہیں ہوں، مجھ میں اور اس میں صرف پانچ سال کا فرق ہے مگر چھوٹی بہن تو چھوٹی بہن ہوتی ہے، خواہ وہ ایک سال چھوٹی ہو۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "بالکل سچ کہتے ہو تم۔ لیکن افسوس کہ میں نہ کسی کا بڑا بھائی ہوں اور نہ چھوٹا۔ میں ان جذبات کی نعمت سے ہمیشہ محروم رہا جو بڑے یا چھوٹے بھائی کی حیثیت سے محبت کا الگ روپ رکھتے ہیں۔"

"تمہارے بہن بھائی تو تھے۔"

"تھے مگر مجھے تو کسی کی صورت یاد نہیں۔ بس اتنا معلوم ہے کہ وہ سب پاکستان پر قربان ہوگئے تھے۔" میں نے کہا "تمہیں نازو بہت یاد آتی تھی؟"

"بہت۔ اسے یاد کر کے کئی بار تو میں اتنا اُداس ہوا کہ رو دیا۔ اکیلے میں۔" اکرام بولا "عجیب جذباتی ڈیپریشن ہو جاتا تھا۔ اور یہ محبت ہی ہوتی ہے جو آدمی کو خوف زدہ کرتی ہے، بُرے بُرے خیالات سے ڈراتی ہے۔ کبھی کبھار رونا پڑتا تھا اور میں جتنا اس کی یاد سے دامن چھڑانے کی کوشش کرتا تھا اتنا ہی اس کا خیال میرے اعصاب پر سوار ہوتا تھا۔ پھر میں باہر نکل جاتا تھا۔ محبت کرنے والے آدمی کے لیے تنہائی اس کی دشمن ہو جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ تم لوگ مجھے بالکل یاد نہیں آتے تھے۔ ایک زمانہ ہوا ہم سب آپس میں اتنے قریب ہیں جیسے ایک خاندان کے لوگ۔"

میں نے کہا "تمہیں استاد نیڈی کی موت کا پتا چلا تھا اور شملا کی موت کا؟ وہ کس شان سے شہید ہوئے۔"

"ہاں یار! اور اس روز میں جان بوجھ کے اکیلا رہا۔ میں گھر سے نکلا ہی نہیں۔" اکرام شیخ بولا "ورنہ غم کا علاج میرے نزدیک محفل تھی۔ میں انہیں دوست تو نہیں کہہ سکتا لیکن گپ شپ کرنے والے کچھ لوگ ہیں جن کے ساتھ میرا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ سب ٹیکسی ڈرائیور تھے، پڑھے لکھے عالم فاضل لوگ نہیں تھے۔ میرے ہم ذوق بھی نہیں تھے مگر مخلص اور اچھے لوگ تھے۔ تمہاری عدم موجودگی میں وہی میرا سہارا تھے۔ ان کا خیال ہے کہ میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ درمیان میں عید، بقر عید آئی تو وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ وہ نے مجھے اپنے بیوی بچوں سے بھی ملوایا۔ ایک گھر میں تو مجھے باقاعدہ فیملی ممبر کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن اس دن میں اپنے کمرے میں لیٹا رہا اور کئی بار رویا۔ بہت سی باتیں مجھے یاد آئیں۔ وہ کیا تھا اور کیا ہو گیا تھا۔"

"حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا۔ اگر کہیں اس کا مزار بنتا تو میں اس پر یہ ضرور لکھواتا۔" میں نے کہا "جب تک وہ ہم سے نہیں ملا تھا، بدمعاشوں کا ساتھی تھا اور خود کو بدمعاش محسوس کرتا تھا۔"

"حالانکہ اندر سے وہ ایک شریف اور معصوم آدمی تھا۔ وہ بدمعاش بن ہی نہیں سکتا تھا۔ جیسے ہیرا اگر کوئلوں میں گر جائے تو کوئلہ نہیں بن جاتا۔ ہماری محبت نے اس کا رنگ روپ نکھار دیا اور وہ ویسا ہی آدمی بن گیا جیسا وہ تھا۔ مگر دنیا نے نہ جینے دیا۔ اور دیکھو کیا قسمت پائی تھی اس نے؟ ہم سب میں سے ایک وہی شہادت کے منصب اعلیٰ پر فائز ہوا۔ درجۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔"

"استاد نیڈی کی موت نے مجھے زبردست دھچکا دیا تھا۔ مجھ پر سخت مایوسی کا دورہ پڑا تھا۔" اکرام شیخ بولا "میں نے باری باری سب کے متعلق سوچا کہ ایک ایک کر کے تم سب مجھے چھوڑ جاؤ گے۔ یہ خیال کیے بغیر کہ یہاں میں تمہاری واپسی کے انتظار میں ایک ایک دن کا عذاب اکیلا جھیل رہا ہوں۔ مجھے پشیمانی تھی اور دکھ تھا کہ میں تمہاری بات مان کے پیچھے کیوں رہ گیا۔ مجھے تمہارے ساتھ ہی رہنا چاہیے تھا مگر تم سب نے مجھے مجبور کر دیا کہ یہاں بھی کسی کو ہونا چاہیے جو رابطے کا کام کرے، یہاں کی ذمے داری سنبھالے۔ بعد میں کیا ہوا۔ نہ کوئی ایسی ضرورت پڑی اور نہ مجھے کوئی ذمے داری سونپی گئی۔"

میں نے کہا "بس ضرورت نہیں پیش آئی۔ ضرورت پیش آ سکتی تھی۔"

"نہیں یار، میرے ساتھ زیادتی ہوئی۔" اکرام شیخ بولا "تم سب ایک ساتھ ہی تھے اور سارا ثواب بھی تمہارے ہی حصے میں آیا۔ میں ایک مردہ کے پیچھے رہا، کچھ نہیں کیا میں نے؟"

"اکرام! انگریزی کا ایک شاعر ہے ملٹن۔ وہ اندھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جو انتظار کرتے ہیں وہ بھی بہت کچھ کرتے ہیں۔ ایسی بات تھی کہ
THEY ALSO SERVE WHO STAND AND WAIT"

"وہ تم مجھے مطمئن نہیں کر سکتے۔ میرے احساس کو نہیں سمجھ سکتے۔ تم میدانِ جنگ میں لڑتے رہے۔ نازو بھی گئی اور اس کا بھائی جو بڑا بہادر اور فرض شناس پولیس افسر تھا، ٹیکسی چلاتا رہا۔ لعنت ہے مجھ پر۔"

"ایسا مت سوچو یار۔ ہمیں بھی احساس تھا کہ تم انتظار کا عذاب اکیلے کاٹ رہے ہو۔" میں نے کہا "محسن ساتھ رہتے ہوئے اکیلا ہو گیا تھا۔ کیا تم نے اس سے زیادہ اٹھایا؟ وہ تو پاگل ہو گیا تھا اور اس کی جگہ کوئی بھی ہو جاتا۔"

"شملا کی شہادت سب سے بڑا سانحہ تھی مگر ہم بے خبر رہتے ہیں کہ زندہ رہ جانے والوں پر کیا گزرتی ہے۔ لڑکی تھی وہ بھی۔ اس نے اپنے ساتھ اپنی ماں کو بھی ملفوف کر لیا، شہادت نہیں ملی۔ محبت بھی تھی محسن سے اسے اور کتنی بڑی قربانی دی اس نے محسن کے لیے۔ خود محسن کے ساتھ کتنا ظلم ہوا کہ شادی کر کے وہ خانہ آبادی کی ساری خوشیوں سے محروم رہا۔ اس نے اپنے جیتے جی بھی قربان کر دیا اور اس بیوی کو بھی جسے وہ دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا۔ بہت عرصہ وہ ہم سے بھی چھپاتا رہا کہ اسے سب معلوم ہو جاتا تھا کہ شملا کو اور اس کے بیٹے کو یرغمال بنا لیا گیا ہے۔ یہ وہ جانتا تھا کہ وہ دشمنوں کی نہیں، خدا معلوم کس کی قید میں ہیں لیکن ہم اس سے اور وہ ہم سے چھپاتا رہا۔ یہ بڑی عجیب اور افسوس ناک صورتِ حال تھی۔ ہم شملا کا نام لیتے ہوئے ڈرتے تھے اور شاید اسی سے محسن نے اندازہ کیا ہوگا کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ ہم سے بس یہی غلطی ہو گئی مگر یہ بالکل غیر ارادی تھی۔ ہم جانِ جاناں کی باتیں کرتے تھے۔ سب کا ذکر آتا تھا مگر شملا کا نہیں۔ اگر ہم جھوٹ بول کے اس کی باتیں بھی سناتے رہتے تو محسن کو شک نہ ہوتا۔ اس نے تاڑ لیا ہوگا کہ ہم عمداً شملا کے ذکر سے گریز کرتے ہیں۔ پھر ہمارے درمیان ایک ایسا موضوع بن گیا جس پر اظہارِ خیال نہ کر کے ہم سب اعترافِ جرم کرتے جاتے تھے۔ محسن جانتا تھا کہ ہم کیا چھپا رہے ہیں اور کیوں مگر وہ ہمارا بھرم رکھتا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ اس کے جذبات کا آتش فشاں اندر ہی اندر پک رہا ہے۔ اسے چھیڑنا خطرناک تھا۔ بس یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ کتنا اچھا ہوتا اگر ہم کھل کے بات کرتے۔ لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا اور آخر کار ایک دن پھٹ گیا۔"

"مگر وہ اللہ بڑا مہربان ہے۔ وہ امتحان لیتا ہے تو انعام بھی دیتا ہے۔ وہ جبار و قہار ہے تو رحیم و کریم بھی ہے۔" اکرام بولا "مجھے معلوم ہوا تھا کہ گل بانو نے محسن کو سنبھال لیا ہے۔"

"کیا انوکھا انتظام ہے قدرت کا۔ گل بانو کیا تھی پہلے؟ نائک تھا ایک ڈاکو کی بہن۔ وہ ڈاکو ہماری وجہ سے مارا گیا مگر مرتے مرتے بالک سی کو ہمارے سپرد کر گیا اور وہ گل بانو بن گئی۔ ہم انسان جو غیب کا علم نہیں رکھتے، کیسے جان سکتے تھے کہ قدرت کا سارا بندوبست آنے والے وقت کے لیے ہے۔ آج وہ گل بانو ہی شملا ہے۔ کتنی خوبی سے اور کتنی بہادری کے ساتھ، حسد اور رقابت کے جذبات سے خود کو دور رکھتے ہوئے اپنی محبت پر کامل اعتماد کے سہارے آہستہ آہستہ اس نے محسن کو جیت لیا۔ اسے یہ احساس دلائے بغیر کہ وہ شملا کی جگہ لے رہی ہے۔ اس نے وہ خلا پُر کر دیا جو محسن کے دل میں شملا کی شہادت نے پیدا کر دیا تھا۔ بے شک پیار کے زخم مندمل ہو جانے کے بعد بھی نشان چھوڑ جاتے ہیں اور یہ نشان وقت کی چارہ گری سے بھی نہیں مٹتے۔ یہ ناممکن ہے کہ محسن کے دل سے یاد کا نقش بھی مٹ جائے مگر اس نے اپنی زندگی گل بانو کے حوالے کر دی ہے۔ یہ گل بھی کمال کی لڑکی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ محسن کبھی اس سے محبت نہیں کرے گا۔ جب تک شملا زندہ تھی یہ ناممکن تھا۔ اس کی موت کے بعد بھی ناممکن تھا۔ ہم بھی اسے سمجھاتے تھے مگر وہ بالکل یکطرفہ جذبات کے ساتھ محبت کرتی رہی، محسن سے چھپاتی رہی اور پوری کوشش کرتی رہی کہ اسے معلوم نہ ہو۔"

"حالانکہ یہ بھی ناممکن تھا۔"

"بالکل۔ محبت تو وہ روشنی ہے جس پر کوئی لاکھ پردے ڈالے، اس کی کوئی کرن کہیں نہ کہیں سے راستہ بنا لیتی ہے۔ اسے دل کی گہرائی میں جتنا گہرا چاہو دفن کر دو، اس کا وجود رہے گا۔ یہ وہ کونپل ہے جو پتھر کی چٹان کے نیچے دبے ہوئے بیج کی طرح خود روشنی اور ہوا تلاش کر لیتی ہے اور خود پھوٹ نکلتی ہے۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی محسن پر اپنی ملکیت نہیں مانگی۔ اس نے کہا کہ وہ شملا کا ہے تو رہے۔ مگر میں اس کو چاہتی ہوں تو یہ میری غلطی ہے، جرم ہے یا گناہ ہے۔ کچھ بھی ہے، میں اس سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ یہ میرے اختیار کی بات نہیں۔ اس نے کبھی شملا کو اپنا رقیب نہیں سمجھا، کبھی نہیں چاہا کہ وہ اس کے راستے سے ہٹ جائے۔ جب شملا مر گئی تو وہ شدید احساسِ جرم میں مبتلا ہو گئی۔ اس کے لیے محسن کی چاہت زیادہ مشکل امتحان بن گئی۔ مگر یار! یہ قدرت کا قانونِ تلافی ہے۔ LAW OF COMPENSATION کہ آدمی سے سب کچھ چھین لیا جاتا ہے مگر اس کے باوجود وہ زندہ رہتا ہے۔ ان کے بغیر بھی جیتا ہے جن کے بغیر وہ سمجھتا تھا کہ جینا ناممکن ہوگا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ نوشتۂ تقدیر کو قبول کرنے کا حوصلہ پا لیتا ہے، صبر کرنا سیکھ جاتا ہے اور ایک دکھ کے احساس کو مٹانے کے لیے وہی متبادل حل تلاش کر لیتا ہے۔ آج حیرت ہوتی ہے محسن کو دیکھ کر۔ وہ بالکل پاگل ہو گیا تھا۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ اب ٹھیک ہی نہیں ہوگا مگر گل کی محبت کے اعجازِ مسیحائی نے اسے پھر زندگی کی طرف کھینچ لیا۔"

"سوال یہ ہے یار کہ وہ دونوں گئے کہاں؟"

میں نے کہا "عبدالودود منظر کا فون نمبر اب کیا ہے؟"

اکرام نے کہا "نیا نمبر ہے، زبانی یاد نہیں۔ میں ڈائری لاتا ہوں۔"

ڈائری میں نمبر دیکھ کے میں نے کال بک کرا دی اور ہم پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ درمیان میں گزرے ہوئے وقت کی باتیں اتنی تھیں کہ ایک رات میں بھی ختم نہ ہوتیں۔

"یار! یہ اتفاقات کے سلسلے بعض اوقات ناقابلِ یقین حد تک دراز ہو جاتے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا "کاجل کے ماں باپ بھی نہیں ہیں، ہم سب کی طرح۔"

"ہاں، ان کی موت کے حالات انتہائی افسوس ناک ہیں۔" میں نے کہا "والدین کسی کے بھی نہیں رہتے مگر ہم اس معاملے میں بدقسمت تھے۔ میری ماں تقسیم سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئی۔ باپ کی موت کا مجھے پتا نہ چلا۔ تمہارے اور محسن کے والدین نے

www.paksociety.com

اگرچہ طبعی موت پائی مگر وہ بھی ساتھ ساتھ ہی گئے۔ ایک نہ رہا تو دوسرے نے زیادہ دن دُنیا میں نہیں گزارے۔ رابعہ کو اپنے والد کی موت یاد نہیں مگر اس کی ماں کو انہی لوگوں نے قتل کروایا تھا جو میرے والد کے قاتل تھے۔ گل کو اپنے ماں باپ یاد ہی نہیں ہیں۔"

"لوگوں کے والدین لمبی عمر پاتے ہیں اور اولاد کی سب خوشیاں دیکھتے ہیں۔" اکرام شیخ بولا "پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں کھلاتے ہیں۔ یہ سب ہمارے والدین کے نصیب میں نہ تھا اور اسی کو میں اتفاقات کا سلسلہ کہتا ہوں کہ ہم سب والدین کی نعمت سے محروم ہیں۔ ہمارے گھر میں تو خاندان نہیں ہے۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی اور آپریٹر نے کہا "لاہور کی کال آپ نے بُک کرائی تھی؟"

میں نے کہا "جی۔ عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کے نام۔"

اکرام نے کہا "یہ تو کمال ہوگیا۔"

"کیا کمال ہوگیا؟"

"آدھے گھنٹے میں کال مل گئی۔ دوبارہ کہے بغیر۔"

"ابھی تو بس ہولڈ کرنے کا حکم ملا ہے۔" میں نے کہا "ممکن ہے دو گھنٹے ایسے ہی خاموش ریسیور سے کان لگائے بیٹھا رہوں۔"

مگر ایسا نہیں ہوا۔ چند سیکنڈ کے بعد منظر کی مخصوص "ہیلو" سنائی دی۔

میں نے زنانہ آواز بنا کے کہا "جی آپ منظر صاحب ہیں نا؟"

منظر نے کہا "ہاں۔ آپ کون ہیں؟"

میں نے کہا "آپ کی ایک غائبانہ پرستار، محبت میں گرفتار۔"

میرا خیال تھا کہ منظر بوکھلا جائے گا مگر وہ ایک کائیاں تھا۔ پہچان گیا کہ بات کرنے والی کوئی عورت نہیں، مرد ہے۔

اس نے کہا "اے تو میرا نہیں، میری بیوی کا کوئی پرستار لگتا ہے میرا رقیب ہے کوئی۔ سالے وہ چودہ بچوں کی ماں ہے۔"

میں نے مردانہ آواز بنا کے کہا "پھر کیا ہوا۔ یہ عشق عشق ہے۔"

منظر بولا "واقعی! یار، تو پھر بڑی سہانی ہوگی تیری۔ تو غائبانہ عشق چھوڑ اور فوراً حاضر ہوکے اسے لے جا۔ چند مہینوں کی ولادت باسعادت تیرے گھر میں ہو۔ میں تو انعام دیتا ہوں تجھے کہ اس کا والد بھی بن جا۔ آنے جانے کا کرایہ بھی دوں گا۔"

اب میں نے اصلی آواز میں کہا "الّو کے پٹھے، طوطا چشم، بے وفا، کمینے، میں آکے بتاتا ہوں بھائی کو۔ کراچی تو پہنچ گیا ہوں میں۔"

منظر خوشی سے بے قابو ہوکے چلایا "ابے سکندر! بندر کی اولاد، کھوتے دے پتر۔"

جذبات سے بے قابو ہوکے اس نے مجھے کچھ ناقابلِ اشاعت خطابات بھی دے ڈالے۔ میں خواتین کی موجودگی کے باعث مجبور تھا ورنہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا۔ رابعہ اندر آگئی تھی۔

آخر کار اس نے کہا "یار! تو واقعی کراچی میں ہے؟"

"اور کیا عالمِ ارواح سے فون کر رہا ہوں۔ سب میرے ساتھ بھی ہیں۔"

"چھوڑ یار اسے۔ میں نے ابھی جو بکواس کی تھی میرا … قائم ہوں۔" وہ قہقہہ مار کے بولا "مجھے چپ … ایسے ہی آپ شادی کر لی تھی۔ بہت فائدے میں … "

"یار، تجھے تو شرم آئی نہیں۔ میرے ساتھ … اس لیے اب سیریس ہوجا۔" میں نے کہا۔

وہ پھر ہنسا "سالے سکندرِ اعظم، ابھی سے ڈر … گیا۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "اکبر ورے نہیں کسی سلطان … نے لیکن شہید ہوگئے جہلم کی فوج سے۔"

"اور کون ہے تیرے ساتھ؟ سب بخیر و خیریت گھر والے؟ کوئی ہیرو ہیروئن رہ گئے بمبئی میں؟"

میں نے کہا "غالب اور نازو تو ہمارے ساتھ ہی تھے، آج کل میں کراچی آجائیں گے۔"

"اور وہ تیرا لنگوٹیا، لنگوٹی چور شہزادہ کی اولاد…"

میں نے کہا "اس کے بارے میں تو میں پوچھنے والا تھا، لاہور نہیں پہنچے؟"

"پہنچے! ابھی جمع کا مہینہ؟ ابے محسن تو ایک ہی تھا۔"

"اس کے ساتھ گل تھی۔ مذاق چھوڑ، وہ ہم سے پہلے ہوئے تھے۔" میں نے کہا "سب کو کراچی پہنچ کے اکرام نے … تھا۔"

"تو یار، پہلے اکرام شیخ سے پوچھو کراچی میں……"

میں نے کہا "اسی کے گھر سے بول رہا ہوں میں۔"

"گھر سے؟ کیا فون لگوالیا ہے اس نے؟"

"ہاں۔ نمبر لکھ لے۔" میں نے کہا "اکرام کے گھر … ہوکے ہم لاہور جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کریں گے۔ کال …"

"ابے وہاں سے بھی کچھ اٹھا لائے۔ جہنم بنگال سے … لائے۔" منظر نے کہا "نام تو بڑا پیارا ہے۔"

"خود بھی کم نہیں ہے منظر صاحب! مجھے محسن کی کیا میں سخت تشویش ہے۔" میں نے کہا۔

"تشویش کی بات تو ہے۔ آخر وہ رہ گئے کہاں؟"

"ہم نے خود انہیں جہاز پر سوار کراکے رخصت کیا تھا۔"

"کہاں سے، ڈھاکا سے؟"

"نہیں، کھٹمنڈو سے۔" میں نے کہا "اسپیشل فلائٹ … ہم نے بلیک میں ٹکٹ خریدے تھے۔ وہی ٹکٹ تھے جنانچہ … بھیج دیا تھا۔"

"ان دنوں میں کوئی جہاز لاپتا بھی نہیں ہوا۔ کسی کریش کی خبر بھی نہیں آئی۔" منظر بولا "ارے یہ تو ثابت ہوگیا کہ وہ … سے اُترے بھی ہوں گے۔ … اُترنے کے بعد کہاں گئے؟"

… اس کے جواب سے … ممکن ہے وہ نکاح رجسٹرار کے دفتر چلے گئے ہوں … تم دونوں بھی وہیں چلے جاؤ تو وہ مل جائیں …

"یار! مجھے ڈر ہے وہ کسی مشکل میں نہ پڑ گئے ہوں۔"

"یہ کون سی انوکھی بات ہوگی۔ اگر تم لوگ آسانی سے … کی زندگی بسر کرنے لگو، یہ خانہ بدوشی اور آوارہ گردی ترک … کے گھر بساؤ اور اپنی عاشقی کو قیدِ شریعت میں لاکے میرے نقش پر چلتے ہوئے ملک کی پیداوار بڑھانے لگو تو پھر واقعی فکر کی بات … یار! تم لوگوں کا مشکل میں نہ پڑنا ہی مشکل ہے۔ …" وہ اب خفا ہونے لگا تھا۔

میں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لاہور نہیں پہنچے؟"

"یہ میں کیا جانوں۔ ممکن ہے لاہور پہنچے ہوں اور سیدھے چلے … ہوں نجل کے سامنے کہ نجل مجھے مار… وہ نجل بھی کم حرامی نہیں ہے، سالا ہے اور وہ بھی پاگل سالا۔ وہ میرے پاس بہرحال نہیں آئے۔"

"تم نے اپنا گھر بھی تو بدل لیا تھا۔"

"ہاں گھر نہ بدلتا تو کیا بیوی بدلتا۔ سالی باز ہی نہیں آتی۔ … ہر سال نیا مال لے آتی ہے۔"

"کہاں سے لے آتی ہے؟" میں نے کہا "بچے سے؟ اور اس کا گھر بدلنے سے کیا تعلق؟"

"تعلق کیوں نہیں۔ پہلے چار کمروں کا مکان لیا تھا۔ پھر چھ بھی … پڑنے لگے تو یہ آٹھ کمروں کا لیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کسی دن … بنگلہ بھی لینا پڑے گا۔ سنتا ہے اس میں چھ سو کمرے ہیں۔ مگر تم جل بھنتے ہو۔ اب شادی کی ہے تم کرکے دیکھو تو پتا چلے بیٹا کہ … زبانی عشق کر رہے ہوتا اس لیے آٹے دال کا بھاؤ … معلوم ہے۔"

میں نے کہا "… کراچی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ … تمہارے پرانے پتے پر نہ پہنچے ہوں۔"

"… اور میں اتنا گمنام ہوں۔ کیا محسن کو … معلوم کہ میرے ٹھکانے کہاں کہاں ہیں؟ آج میں بار روم میں … کسی بھی کالے کوٹ والے سے میرا نام پوچھو، وہ بتا دے … شام کو میں اپنے چیمبر میں ملتا ہوں۔ چیمبر وہی ہے۔ اس کے … میں رابعہ کی فرم کے معاملات میں پنگا لے بیٹھا ہوں۔ ایک … چھوڑ کے وہاں بیٹھتا ہوں۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا تو نے، وہ تجھے تلاش کرسکتے تھے۔"

"اگر کوشش کرتے۔" وہ بولا "مگر میری مان، وہ ادھر آئے ہی نہیں۔ محسن کے ساتھ وہی نازک سی تھی نازو کی بچی؟"

"نازو کی بہن۔ اب وہ گل بانو ہے۔"

"ہوگی یار۔ تمہارے ساتھ تو واردات کر گئی۔ اپنے ساتھ اغوا کرکے لے گئی۔" منظر بولا "ہے تو یہ دلچسپ مگر میں کہتا ہوں، بالکل ٹھیک کیا اس نے۔ تمہارے ساتھ رہتی تو اس کا انجام بھی وہی ہوتا جو شہلا کا ہوا۔"

میں نے کہا "تو بہت تلخ ہو رہا ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم اب زندگی سے سمجھوتہ کرلو، باز آجاؤ اس سالی سکندری سے۔ رابعہ سے کہو گھر سنبھالے، بچے پالے جنے بھی ہیں۔"

میں نے کہا "کیا بکواس کر رہا ہے!"

"میرا مطلب تھا جنے بھی ہوں۔ یہ بزنس گئی بھاڑ میں۔ شام کو گھنٹا بھر دفتر جاکے دیکھ لے۔ وہ جو اس کا ماتحت وکیل تھا، وہ تمام معاملات بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہا ہے۔ تم سنبھالو اپنا اسپتال اور یہ خیراتی اسپتال کا چکر ختم کرکے اسے ایک شاندار منافع بخش کاروباری ادارہ …"

"سوری یار۔ پروگرام کا پہلا حصہ تو ٹھیک ہے مگر دوسرے سے میں اتفاق نہیں کرتا۔"

"مت کرو۔ عقل کی کوئی بات تم نے پہلے کب مانی ہے۔ یہ بتاؤ کہ لاہور کب آرہے ہو؟"

میں نے کہا "کراچی سے لاہور آنا کیا مشکل ہے۔ کچھ مسئلے ایسے اٹک گئے ہیں کہ ہم یہاں رکنے پر مجبور ہیں۔ سب سے پہلے تو غالب اور نازو کا انتظار ہے، پھر دیکھنا پڑے گا کہ لاہور کی صورتِ حال کیا ہے۔"

"تمہارے جانے سے لاہور اُجڑا نہیں تھا۔"

"دیکھ، میں لمبی بات نہیں کرسکتا۔ فون کا بل تو اکرام ہی کو دینا ہے نا۔" میں نے کہا "ایک تو یہ بتا کہ ہمارے مقدمات کی کیا پوزیشن ہے؟"

"مقدمات میں بڑی برکت ہوئی ہے۔ قتل کے مقدمات میں ضمانت منسوخ ہوگئی تھی۔ پھر آپ کو مفرور مجرم قرار دے دیا گیا تھا۔ بعد میں کچھ گواہ اللہ کو پیارے ہوئے، کچھ حاضر نہیں ہوئے چنانچہ ان کے بھی وارنٹ نکلے۔ استغاثہ ایک بھی گواہ نہ لاسکا۔ اس سے کیس خاصا کمزور ہوگیا مگر ختم نہیں ہوا۔ تاہم غیر حاضری میں تیرے خلاف یک طرفہ فیصلہ سنانے کی نوبت نہیں آئی۔ چھوٹے موٹے دوسرے مقدمات بھی گھسٹ رہے ہیں۔"

"پھر اب میں کیا کروں؟ لاہور آؤں یا نہیں؟"

"نہیں لاہور تو نہ آؤ۔ مقدمے کا کچھ کرتے ہیں تاکہ پھانسی ہو تمہیں تو ہماری جان بھی چھوٹے۔"

"جب تیرے جیسے وکیل ہوں گے تو اور کیا ہوگا۔ موت کے منظر۔"

"میرے جیسے! ابے منظر تو اس منظر میں بڑی دیر سے داخل ہوا تھا۔ پہلے تو وکیل تھی وہ جس نے پہلی پیشی میں ہی عشق کی عمر قید بامشقت کرادی۔ وہ ہے کہاں، ریسیور دے اسے۔"

"دیتا ہوں، پہلے مجھ سے نمٹ لے۔" میں نے کہا "چل

www.paksociety.com

مقدمات میں تو جو بھی ہوگا' قانون کے مطابق ہوگا اور ہم اپنا دفاع بھی کریں گے مگر وہ جو اپنے چوہدری صاحب ہیں' ان کے غیر قانونی معاملات کے لیے ہمارا وجود سر پر لٹکنے والی خطرے کی تلوار ہے۔"

"ابے تلوار کے بچے' چھوڑ دے یہ سب چکر۔ بھول جا پرانی باتیں۔" منظر بولا "سیاست سیکھ لے۔"

"میں یہ کیسے بھول سکتا ہوں یار کہ دلاور نے میرے باپ کو کتنے عذاب کے ساتھ مارا تھا؟ کیسے بھول سکتا ہوں کہ استاد بیڈو نے ان کی لاش تک قبر سے کھود کے نکال لی تھی۔ اس نے پھانسی کا پھندا میرے گلے میں ڈالا تھا اور رابعہ کی ماں کو قتل کروایا تھا۔"

"اچھا اچھا۔ مت بھول مگر ایسے مت چلاؤ ورنہ پولیس والے سن لیں گے تو راستے میں ہی دھر لیں گے۔" منظر بولا "میں تو چاہتا تھا کہ... خیر' تفصیل فون پر نہیں بتائی جا سکتی۔"

"دلاور آج کل ہے کہاں؟"

"یہیں ہے لاہور میں۔"

میں نے کہا "کیا کر رہا ہے؟"

"وہی جو پہلے کرتا تھا۔ دھندے بچھو اور ہوں گے' ٹھاٹ باٹ ہیں۔ الیکشن میں کھڑا ہونا چاہتا ہے۔"

"کبھی استاد بیڈو کو دیکھا؟"

"میں نے دلاور کو استاد بیڈو کے بغیر کبھی نہیں دیکھا۔ وہ کچھ مطمئن ہیں کہ تم سے جان چھوٹ گئی۔ ضامن رضوی صاحب اور چوہدری سراج دونوں ہی نہیں رہے۔ مجھ سے بھی اس نے پنگا لینا چھوڑ دیا ہے۔ نیک نامی کمانے کے چکر میں ہے۔ ہو سکتا ہے تم سے بھی صلح کرنا چاہے۔"

"اس کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں محسن اور گل اس کے مہمان نہ ہوں۔"

"کیا اسے الہام ہوا ہوگا کہ وہ آنے والے ہیں؟"

میں نے کہا "ہم نے حاجی عبداللہ کو دیکھا تھا قندوز میں۔"

"قندوز میں؟ تیری نظر۔"

"نظر ٹھیک ہے میری۔ اور یہ نظر کا دھوکا صرف مجھے ہی نہیں ہوا تھا۔ رابعہ' نازو اور غالب' سب نے دیکھا تھا اسے۔"

"مگر وہاں وہ کیا کر رہا تھا؟"

"جب وہ ملے گا تو اس سے پوچھیں گے۔ ایک فلائٹ پر وہ گیا' دوسری سے گل اور محسن روانہ ہوئے۔"

"اس نے دیکھ لیا تھا تمہیں؟"

"اگر دیکھا تھا تو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اسی سے مجھے شبہ ہوا ہے کہ محسن اور گل کو وہ لاہور میں اترتے ہی اپنے ساتھ نہ لے گئے ہوں۔ شکاری جنگل میں ایسے ہی نہیں گھومتے پھرتے۔"

"اگر یہ بات ہے۔" منظر متفکر ہو گیا "تو پھر میری بات غور سے سنو۔ تم لاہور ضرور آؤ مگر جہاز سے نہ آنا۔"

"پھر کیا ٹانگے پر آئیں یا دو ٹانگوں پر؟"

"تم بائی روڈ آؤ اور نام بدل کے آؤ۔ تمہارے بدھو ہونے میں تو کسی کو شک نہیں لیکن لوٹ کے گھر مت جاؤ۔ لاہور پہنچ کے مجھے فون کرو۔ تمہارے پہنچنے سے پہلے ہی میں تمہاری رہائش کا بندوبست کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اس کے بعد ہم مستقبل کا لائحہ عمل طے کریں گے۔"

"اگر تمہارا کوئی مستقبل ہوا۔ ہم مسلمانوں کا سارا... بس اپنا ماضی ہے۔"

"تیری گھر والی کہاں ہے؟ اس سے بھی دعا سلام کر لوں۔"

"وہ گئی ہے اپنے میکے۔ اللہ نے اسے ایک اور بہن دی ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "بہن! تیری بیوی کی بہن؟ یعنی تیرے سسر کے بیٹی پیدا ہوئی ہے؟ تیرے بچوں کی خالہ۔"

"ہاں یار' بڑا زرخیز خاندان ہے۔ مگر یہ خالی نمبر تین ہے۔ تم ریسیور مس رابعہ کو دو۔ میں ان کی خبر لوں۔"

منظر کی زبان بگڑی ہوئی اولاد کی طرح اس کے قابو میں نہ تھی۔ رابعہ ہنستی رہی اور اس کی باتوں پر خفا ہو کے لال بھی ہوتی رہی۔

اکرام ہاتھ جوڑنے لگا "باقی باتیں لاہور جا کے مفت کر لینا۔ کرایہ بھی میں دے دوں گا۔ مگر اس کال کا بل مجھے دے جانا۔"

رابعہ نے چند منٹ بعد ریسیور رکھ دیا "تم اتنے کنجوس ہو گئے ہو اکرام شیخ؟"

"کنجوس اور کمینے۔ فون لگ گیا ہے گھر میں تو دوستوں کو ہی کرنے دو۔"

"کرو' رات بھر بات کرو۔ میں بھی بھاگ جاؤں گا بل ادا کیے بغیر۔ بعد میں فون کٹتا ہے تو کٹ جائے' مالک مکان لگوائے گا۔"

"رقم تمہارے ایڈوانس میں سے کاٹ لے گا۔"

"کیسے کاٹے گا۔ یہ بل تو آئے گا دو مہینے بعد۔" اکرام دانت نکال کے بولا۔

رات کے کھانے کے لیے ہم نے باہر جانے سے گریز کیا کہ ہمیں غالب اور نازو کا انتظار تھا اور ہمارے کان منتظر تھے کہ کوئی بند دروازے پر دستک دے۔ میرے تصور میں وہ برف زار تھا جس کو میں نے رابعہ کے ساتھ دو مرتبہ عبور کیا تھا۔ ہماری کوشش کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ اس میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے تھے اور آبادی سے کتنی دور تھے! قدرت نے ہماری مدد کے لیے وطن کے محافظوں کو بھیج دیا تھا۔ نازو اور غالب بھی اتنے ہی خوش قسمت تھے؟ یہ خیال مجھے پریشان کرتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ کہیں اس برف کے صحرا کی سمت ویرانی میں بھٹکتے ہوئے ان کے عزم کا زادِ سفر تمام نہ

ہمیں تو ایک چٹان کی پناہ مل گئی تھی جہاں ہم آگ روشن کرنے میں بھی کامیاب رہے تھے اور ہم نے رات کافی پی کے گزار دی تھی۔ ان کے پاس تو یہ بھی نہیں تھا۔ وہ رات انہوں نے کہاں گزاری ہوگی اور کیسے؟

اکرام شیخ کا دل پتھر نہیں تھا مگر حوصلہ چٹان تھا۔ اس نے چند گھنٹے پہلے ہی ہمارے ساتھ ہمارے سفر کی روداد سنی۔

میں نے کہا "اکرام! تم پریشان نہیں ہوئے؟"

"کس بات سے؟" وہ بولا۔

"اس امکان سے کہ یہ کہیں وہ راستے سے بھٹک گئے تو کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوگا' یہ میرا یقین ہے۔" اکرام نے کہا "جب تم سب یہاں نہیں تھے اور میں رات کو اکیلا ہوتا تھا تو میرے ذہن میں برا خیال آتا تھا مگر رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ میرے ذہن کو شیطان گمراہ کرتا تھا۔ وہ سب خیالات غلط ہوتے تھے۔ تمہاری خیریت کی اطلاع کسی نہ کسی ذریعے سے کبھی نہ کبھی مل ہی جاتی تھی۔ دیکھو تم رابعہ کے ساتھ واپس بھی پہنچ گئے۔ تم نے بتایا کہ محسن اور گل تم سے پہلے پہنچ چکے ہیں اور غالب کے ساتھ نازو پہنچنے والی ہے تو میرے لیے شک یا خوف کی قطعی گنجائش نہیں بچی۔ خدا نے تمہیں اتنے لمبے سفر میں ساتھ رکھا' سلامت رکھا۔ افغانستان میں' پھر بھارت اور بنگلہ دیش میں' جس نے تمہاری حفاظت کی اور تمہارے لیے مشکلات کو آسان کیا' تمہارے راستوں کا رخ منزل کی جانب رکھا۔ کیا وہ خدا اب تمہاری طرف سے غافل ہو جائے گا؟ نہیں۔ یہ تو میرے اور تمہارے ایمان کے خلاف ہے۔ وہ میری بہن کو مجھ سے ضرور ملوائے گا۔ وہ غالب کو بھی لائے گا۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ یہ بات ہے یقین کی۔"

میں نے کہا "یقین کے بھی درجے ہیں۔ تمہارے یقین پر مجھے رشک آتا ہے جس کی بنیادیں اتنی مستحکم ہیں۔"

"اسی یقین کی دولت کے سہارے تو میں نے انتظار کے صبر آزما دن گزارے تھے۔ اب میرے لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ اچھا اب تم بیٹھو یا نہانا دھونا چاہو تو اپنا گھر ہے۔ میں جا کے کچھ کھانے کے لیے لاتا ہوں۔ ہم سب چلتے ٹیکسی میں مگر ایسا نہ ہو کہ بعد میں وہ آ جائیں۔"

میں نے اس کی تائید کی "تالا نہیں ہونا چاہیے دروازے پر۔"

رابعہ نے کہا "تم کاجل کو ساتھ لے جاؤ۔"

"کیوں؟ میرا مطلب ہے کیا یہ جانا چاہتی ہیں؟" اکرام بولا۔

"آپ کلیم کو لے جائیں' ذرا دل بہل جائے گا اس کا۔" کاجل نے کہا۔

"نہ دی! ہم اکیلا نہیں جائے گا۔" اس نے کاجل کی ساری کا پلو پکڑ لیا۔

رابعہ نے کہا "چلی جاؤ کاجل۔ تم بھی ذرا دیکھ آؤ کراچی کی رونق۔"

کاجل کا موڈ نہیں تھا مگر وہ کلیم کی وجہ سے مجبور ہو گئی "کلیم! اب ہر روز تو سیر نہیں ہوگی نا۔"

رابعہ نے کہا "اچھا' روز سیر ہو رہی تھی۔"

"روز کہاں' کل گئے تھے اور پرسوں شام کو۔" اکرام نے کہا۔

اس وقت پہلی بار میں نے نوٹ کیا کہ اکرام اور کاجل کے انداز تغافل میں غالب کے اس شعر کی تفسیر ہے۔ کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے۔ کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے۔ بظاہر کاجل خاموش اور لاتعلق تھی اور اکرام بھی اس کے وجود کو نظر انداز کرتا رہا تھا مگر اب میں نے دیکھا کہ اکرام کی آنکھوں میں ایک خاموش سی التجا ہے اور کاجل کے انکار میں بھی خواہش اقرار کے سوا کچھ نہیں۔ دو دن انہوں نے ساتھ گزارے تھے لہٰذا یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ خاموش' دور دور بیٹھے رہے ہوں۔ کاجل نے اپنی کہانی بھی کہی ہوگی تو اکرام نے اپنی کتاب زندگی کا ہر ورق اس کے سامنے کھول کے رکھ دیا ہوگا۔ کاجل کے لیے اکرام کے دل میں ہمدردی کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری بات تھی مگر کاجل کو بھی معلوم ہوا ہوگا کہ وہ کوئی عام ٹیکسی ڈرائیور نہیں بلکہ اچھے خاندان کا اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ہے جس نے پولیس کی افسری کو فرض شناسی اور ایمانداری پر قربان کر دیا تھا۔ وہ نازو کا بھائی ہے اور اتنا ہی ذہین بھی ہے تو کاجل بھی متاثر ہوئی ہوگی۔ اکرام شیخ کی صورت بھی نازو سے ملتی تھی چنانچہ وہ جتنی حسین تھی' اکرام میں اتنی ہی مردانہ وجاہت تھی۔

جب وہ ٹیکسی میں گھومنے چلے گئے تو رابعہ نے کہا "تم نے کچھ محسوس کیا؟ کچھ دیکھا؟"

میں ہنس پڑا "ہاں۔ دونوں اپنے اپنے دل کے چور کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے حالانکہ چور وہ تھا جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ... چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔"

"یہ بات اردو میں نہیں کہہ سکتے تھے؟"

"اصل کا مزہ کچھ اور ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ کیا بہادر چور ہے جو اندھیرے میں چھپ کر نہیں بلکہ ہاتھ میں چراغ لے کر آتا ہے۔ کاجل نے تمہیں کچھ بتایا تھا؟"

"باتوں سے اندازہ کر لیا تھا میں نے۔ وہ اکرام کے کیریکٹر سے سخت متاثر ہوئی تھی۔" رابعہ بولی "رہی سہی کسر اکرام کی دلجوئی نے پوری کر دی۔ وہ اس کو کراچی کی سیر کراتا رہا۔"

"گویا اڑتالیس گھنٹوں میں انہوں نے ایک دوسرے ہی کو دیکھا اور سمجھا۔" میں نے کہا "کراچی کی سیر تو بہانہ بن گئی۔"

"اگر ایسا ہوا تو کیا برا ہوا؟"

"کون کہتا ہے برا ہوا۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ جو میں نے چاہا

www.paksociety.com

وہی ہوا۔" میں نے کہا۔
"تم نے؟ نہیں۔ جو میں نے چاہا تھا وہ ہوا۔"
ہم دونوں ہنس پڑے۔ شاید ایسا ہی نازو اور غالب نے بھی سوچا ہو۔ گل اور محسن کا خیال بھی یہی ہو۔ وہ تنہا انسانوں کی زندگی کے احساسِ تنہائی کو دور کرنے کی سب ہی سوچتے ہیں۔ پھر قدرت کی طرف سے کوئی اشارہ مل جاتا ہے' کوئی بہانہ بن جاتا ہے۔

جب وہ واپس آئے تو میں نے ہنسی کی آواز نہیں سنی۔ میرے کانوں نے کاجل کی مترنم ہنسی پہلے سنی۔ میں حیران ہوا۔ ایسے تو کاجل کو میں نے کبھی ہنستے نہ دیکھا تھا۔ اس کی زندگی ایک عذابِ مسلسل تھی' الم نصیبی کی داستان تھی اور حادثات کے منحوس سایوں کا آسیب تھی۔ وہ اپنوں کے درمیان غیر تھی اور غیروں کے لیے محض مالِ غنیمت۔ اس نے اپنے نظریات اور عقائد پر اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا اور اب اس گھر کی طرح تھی جس کی کھڑکیاں اور دروازے تک چور نکال کر لے گئے ہوں اور جو اپنی ویرانی پر خود ہی اپنا نوحہ بن گیا ہو۔

جب وہ اندر آئی تو مجھے یوں لگا جیسے اکرام نے اس سونے' ویران' اندھیرے گھر کو آباد اور روشن کرنے کا کام اسی طرح شروع کر دیا ہے جیسے فرہاد نے ایک تیشہ اٹھا کے پہاڑ کاٹنے اور جوئے شیر لانے کا کام شروع کیا ہوگا۔ اصل تیشہ تو وہ جذبہ تھا جس نے فرہاد کو کامران کیا۔ میری آنکھوں نے ایک منظر دیکھا کہ اس گھر میں اکرام کھڑکیاں اور دروازے لگا رہا ہے جس کی دیواروں کے خلا سے تاریکی جھانکتی تھی۔ وہ ان میں شیشے لگا رہا ہے۔ دیواروں پر رنگ و روغن پھیر رہا ہے۔ اس نے فرش پر پھول دار قالین بچھا دیا ہے اور کھڑکیوں کے آگے رنگین پردے آویزاں کر دیئے ہیں۔ چھت سے فانوس لٹکا دیے ہیں اور دیواروں کے خالی پن کو زندگی کے رنگوں سے اور جذبوں کی رونق سے بھر دیا ہے۔

یہ سب چند سیکنڈ کی فلم تھی جس میں اکیلے دیکھتے ایک کھنڈر سے ایک گھر بنا۔ ویسا ہی جیسا میرا گھر تھا یا ہم سب کے خوابوں کا گھر تھا۔ جہاں پہلے آدمی کی آنکھیں خواب دیکھتی ہیں پھر ارادے جاگتے ہیں اور حوصلے انگڑائی لے کر اٹھتے ہیں تو صحرا میں پھول کھلتے ہیں اور ستارے آسمانوں سے اتر کے مانگ میں افشاں بھرتے ہیں۔

رابعہ نے کہا "بھئی ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ یہ کاجل ہے کیا اس سے پہلے نہیں ملے؟"

میں چونکا اور میں نے کہا "نہیں۔ اس کاجل سے میں آج ہی ملا ہوں۔"

کاجل سمجھ گئی۔ اس کے عارض کی شاداب سرخی نے مجھے بتا دیا کہ وہ سمجھ گئی ہے۔ اس نے اعتراف کر لیا تھا کہ بقول فلمی شاعر محبت جرم ہے تو جرم کا اقرار کرتے ہیں۔

اکرام بولا "ہم ذرا آگے چلے گئے تھے۔"

رابعہ نے کہا "تم تو کافی آگے چلے گئے ہو ہمیں معلوم ہے۔"

اکرام نے جھینپ کر بات گول کر دی "بھئی آپ لوگوں کی تو خاطر مدارات اسی طرح ہو سکتی تھی۔ میں بریس روڈ سے نکلا تو [illegible] آیا۔ پھر واپسی پر آئس کریم لینے کا خیال آ گیا۔"

رابعہ مسلسل شرارت پر آمادہ تھی "بڑے اچھے خیالات ہیں آپ کے اتنا خیال تھا ہمارا۔"

اکرام نے کہا "سب بازار سے ہی لانا پڑتا ہے۔ گھر میں تو کچھ نہیں تھا۔"

اب میں نے کہا "گھر میں کیا تھا کہ ترا غم جسے غارت کرتا۔"

رابعہ نے دوسرا مصرعہ پڑھ دیا "وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے۔"

"میں جانتا ہوں سب کی حسرتوں کو۔" اکرام بولا "میرا منہ نہ کھلوائیں مس رابعہ قاری۔ اور آپ بھی سکندر اعظم صاحب! آپ کی فتوحات۔۔۔"

میں نے ہاتھ ہلا کے کہا "او کے' او کے' برا ماننے کی کوئی بات نہیں۔"

ہنستے ہنستے ہم سب نے کھانا کھایا۔ کاجل کے لیے نہاری عجیب چیز تھی۔ وہ اتنی مرچیں کھانے کی عادی نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ خود مجھے بھی بعد میں آئس کریم کھانے کے باوجود ایسا لگتا تھا جیسے ایک آگ سی ہے معدے کے اندر لگی ہوئی۔

صبح دم مجھے اکرام نے جھنجوڑ کے جگایا "یار وہ فون آیا ہے منظر کا۔ رابعہ بات کر رہی ہے۔"

میں نے آنکھیں مل کے کہا "منظر اتنی صبح جاگنے والا تو نہیں' خیریت تو ہے نا؟"

"ہاں۔ خبر اچھی بھی ہے اور بری بھی۔"

"پہلے بری خبر سنائے۔"

اکرام نے کہا "ایک ہی خبر کے دو رخ ہیں۔ گل اور محسن سیدھے لاہور پہنچ گئے تھے۔"

"تھے کا کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پھر غائب ہو گئے' کہیں چلے گئے۔"

میں نے بستر سے اٹھ کے رابعہ سے ریسیور لے لیا "منظر! یار! سچ ہے؟"

"جھوٹ میں عدالت جا کے نو بجے بولنا شروع کرتا ہوں۔ اس کے وقت صرف سچ بولتا ہوں۔" منظر نے کہا۔

"اکرام نے بتایا ہے کہ محسن اور گل۔۔۔"

"ہاں۔ عجیب پُراسرار معاملہ ہے۔" منظر بولا "ہم کہتے ہیں محسن اور گل کو ہم نے کراچی کی فلائٹ پر خود سوار کیا تھا۔"

میں نے سوچ کے کہا "خود سوار کرانے والی بات سو فیصد ٹھیک نہیں۔ ہم نے انہیں ائرپورٹ پر چھوڑا تھا۔ ہمارے سامنے وہ ڈیپارچر لاؤنج میں چلے گئے تھے۔ ان کی سیٹیں کنفرم ہو چکی تھیں اور جہاز پرواز کے لیے تیار کھڑا تھا۔ ہم نے انہیں جہاز پر سوار

www.paksociety.com

ہوتے نہیں دیکھا تھا اس سے پہلے ہی ہم لوٹ آئے تھے۔"

"خیر، وہ کراچی پہنچے اور اکرام شیخ سے ملے بغیر لاہور چلے آئے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے بے اختیار کہا۔

"جب محسن سے ملو تو یہ سوال اسی سے پوچھنا۔ جو میں جانتا ہوں وہ بتا رہا ہوں۔" منظر چڑ کے بولا "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کراچی نہ گئے ہوں۔"

میں نے کہا "یار، عقل کی بات کر۔ جہاز کوئی گھوڑا تھا جس کی لگام محسن کے ہاتھ میں تھی کہ راستے میں رُخ بدل کے لاہور کی طرف کر لیا۔"

"ابے افلاطون، بعض اوقات موسم کی خرابی یا کسی اور وجہ سے بھی پرواز کا رُخ بدلنا پڑتا ہے۔ موسمی حالات خراب ہوں یا رن وے اور کنٹرول ٹاور کے آلات میں خرابی ہو جائے یا جہاز میں۔ تو کراچی کی پرواز کو راستے میں پنڈی یا لاہور میں اتارا بھی جا سکتا ہے۔ یہ کوئی ناممکن بات نہیں۔ میں معلوم کرلوں گا کہ کیا ہوا تھا مگر یہ ٹھیک ہے کہ وہ لاہور پہنچے اور پھر کہیں چلے گئے۔"

"رات تک تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"مجھے بھی میری عبادت گزار بیوی نے ابھی بتایا ہے۔ وہ فجر کی نماز کے لیے اٹھی ہے نا۔" منظر بولا "ادھر وہ نماز سے فارغ ہوتی ہے، ادھر ایک بڑا خبیث قسم کا لڑکی توڑ دودھ والا آجاتا ہے۔ پہلے دو دن تو اس نے ہمارے بیڈ روم کی کھڑکی پر ایسی باکسنگ کی کہ میں سمجھا، پھر جنگ چھڑ گئی۔ پڑوسیوں نے اسے سمجھایا کہ وکیل صاحب غصے کے بڑے سور ہیں۔ ایذا رسانی اور املاک کو نقصان پہنچانے کے اندیشۂ نقص امن اور بلوے کا کیس کر دیا تو جیتش سمیت اندر ہو جاؤ گے۔ وہ ڈول باہر رکھ دیتی تھی اور دودھ والا رب یا رس آکے اس میں دودھ ڈال جاتا تھا۔ دو دن بعد کسی کو ڈول پسند آگیا۔ ہوگا کوئی تیرے جیسا نمازی۔ مسجد سے ہوتے حجرے کے لوٹ رہا ہوگا ڈول بھی لے گیا۔ پھر میری بیوی نے ڈول کو دروازے کے کنڈے میں زنجیر سے باندھ کے اور زنجیر میں تالا ڈال کے لٹکانا شروع کیا۔ ایک ہفتے بعد کوئی جان بنانے والا دودھ کا ڈول خالی کر گیا۔ دوسرے دن پھر یہی ہوا۔ پورا دو سیر دودھ ڈول سے منہ لگا کر پی جاتا تھا اور خالی ڈول کو زنجیر سمیت وہیں چھوڑ جاتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں، کوئی پہلوان ہی ایسا کر سکتا ہے۔ تیسرے دن میں نے پہلوان کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ بچنے بھر میں پولیس نے سارا کھایا پیا نکال دیا۔"

میں نے جھنجلا کے کہا "ابے اس کہانی کا محسن اور نگی سے کیا تعلق؟"

"تعلق ہے، اسی لیے تو بتا رہا ہوں۔" منظر بولا "پہلوان کا دودھ چھڑانے کے بعد تو کچھ نہیں ہوا لیکن آج دودھ میں سے ایک رقعہ برآمد ہوا۔ جو محسن نے لکھا تھا۔"

"دودھ میں سے؟" میں بھونچکا رہ گیا "کیا لکھا ہے اس نے؟"

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ اس کا یہ مطلب مت نکالنا کہ محسن نے تیری دوستی اور ایم آر ایس پر لعنت بھیج کے گھر بسانا شروع کر دیا ہے۔ یا تو وہ خود نماز سے آئے اور ڈول کو لیٹر بکس سمجھ کے اس میں خط ڈال گئے۔ بعد میں دودھ والا اپنا کام کر گیا۔"

"محسن پاگل نہیں ہے کہ ڈول کو لیٹر بکس سمجھ لے۔"

"یار، کیا دیر لگتی ہے اچھے بھلے آدمی کو پاگل ہونے میں، عشق کرتے کرتے شادی کر بیٹھا ہے۔" منظر بولا "خیر، دوسرا امکان یہ ہے کہ محسن اور نگی نے خط کسی کو دیا کہ فلاں جگہ دے دو۔ اشارے سے میرا گھر بتا دیا۔ اور وہ واقعی پاگل تھا کہ خط ڈول میں ڈال گیا۔ ورنہ دروازے کے نیچے سے اندر بھی کھسکا سکتا تھا۔ ڈرتا ہوگا کہ کاغذ کی معمولی سرسراہٹ کسی نے سن لی تو دروازہ کھول کے باہر آجائے گا۔ مفت کا دودھ پی کے جان بنانے والے پہلوان کا واقعہ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ سب کو معلوم ہے اور وہ پہلوان جو کسی اکھاڑے میں جاتا تھا ہو گیا ہے۔ اس سے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خط کو ڈول میں ڈالنے والا آس پاس کا کوئی آدمی تھا۔"

"اچھا اب یہ فرمایئے کہ خط میں کیا لکھا ہوا ہے۔"

"بس ایک سطر تھی۔ ہم ایک کام سے جا رہے ہیں، بہت جلد آئیں گے۔" منظر نے کہا۔

"اور یہ کیسے ثابت ہوا کہ خط نگی یا محسن کا تھا؟"

"محسن نے دستخط کیے تھے اپنے۔ میں اس کے دستخط بھی پہچانتا ہوں اور اس کا خط بھی۔ وہ ایم ایسے بناتا ہے۔ اب فوٹو بتاؤں؟"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔"

"اور خود کو ایم ایچ کے شیروانی لکھتا ہے۔ شیروانی اس نے باپ نے بھی نہیں پہنی۔"

میں نے کہا "کیا محسن کے ساتھ نگی کا نام بھی تھا؟"

"ہم کا اور کیا مطلب نکالا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے تو دال میں کالا نظر آرہا ہے۔"

"بیٹا ساری عمر دال کھاؤ گے تم اور ہمیشہ اس میں کالا ہی نظر آتا رہے گا تمہیں۔ میری بیوی کو دودھ میں کالا نظر آیا تھا تو اس نے نکال لیا۔ سیاہی پھیل گئی تھی مگر مٹی نہیں تھی۔ خالص میں ڈھلی تحریر کو میں نے پڑھ لیا۔ وہ تمہارا بچھڑا ہوا جوڑا نہیں؟"

"نہیں، ابھی ان کی فکر ختم نہیں ہوئی تھی کہ نگی نے نیا گل کھلا دیا۔ پتا نہیں اسے کہاں لے گئی۔"

"کیوں؟ کیا محسن اس قابل نہیں کہ نگی کو لے جائے؟"

"یار اسے تو محسن لے گیا تھا اپنے ساتھ۔ اب کے یہ کیسے ممکن تھا کہ محسن نہ مجھ سے ملتا نہ ہمارا انتظار کرتا

پتا کر معلوم کرنے میں بھی ایک دن لگا ہوگا۔ بار روم سے یا کسی وکیل سے پتا پوچھا ہوگا۔ میرا دل کہتا ہے کہ اسے نگی لے گئی۔"

"کہاں اور کیوں؟ یہ بھی پوچھ لے اپنے دل سے۔"

"ابھی اور کچھ نہیں بتا سکتا میں۔"

"کیا یہ ناممکن ہے کہ انہیں کوئی اور لے گیا ہو؟"

"اور کون؟ تیرا مطلب ہے وانا ورائیڈ کمپنی کا کوئی شکاری؟"

منظر نے کہا "ہاں۔ ایک شکاری تو انہی کے ساتھ پہنچا تھا۔ پی آئی اے کی فلائٹ سے؟"

میں نے کہا "میرا تو دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔ تو ایسا کر کسی طرح یہ معلوم کر کہ کل تیرا پتا پوچھتا ہوا کون آیا تھا۔ رابعہ کے آفس سے معلوم کر شاید کوئی بتا دے۔"

"اس لیے نہیں یار۔ اب تو کراچی میں بیٹھ کے فون پر مجھے ہراساں کرنے کے احکامات دے گا تو میری وکالت کا کیا بنے گا۔ اکرام شیخ کو وہیں چھوڑ کر غالب اور نازو کی واپسی کا انتظار کرنے۔ تم آجاؤ لاہور لیکن دیکھو، جذباتی ہو کے اپنے بنگلے مت جانا۔ میرا مطلب تھا ابا کے گھر۔ پہلے مجھے فون کرنا اور بتا دینا کہ تم کہاں ہو۔ میں خود لینے آجاؤں گا اور تمہیں بحفاظت ایک ایسی جگہ پہنچا دوں گا جہاں فوری طور پر کوئی خطرے کی بات نہیں ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم آج ہی روانہ ہو جائیں گے۔ آج کوئی اچھی سی کار خرید لیں گے اور باقی روز رات بھر سفر کر کے کل صبح صبح لاہور پہنچ جائیں گے۔"

میں نے فون بند کر دیا۔ رابعہ اور اکرام میری گفتگو سے بھی بہت کچھ سمجھ گئے تھے اور میرے اٹھنے سے پہلے رابعہ خود بھی منظر سے بات کر چکی تھی۔ کاجل نے کچھ نہیں سنا تھا، وہ کلیم کے ساتھ فرش پر گہری نیند میں تھی۔

رابعہ نے کہا "یہ تم نے کیا کہا تھا کہ محسن کو نگی لے گئی؟ وہ کہاں لے کر جائے گی اسے؟"

میں نے کہا "پتا نہیں۔ کیوں یہ خیال آیا تھا۔ واقعی نگی کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بعض اوقات آدمی کی چھٹی حس جو بتاتی ہے وہ عقل نہیں سمجھتی۔ خیر اب ہمیں نکل جانا چاہیے، جتنی جلد ممکن ہو۔"

"دس ساڑھے دس بجے سے پہلے کوئی شو روم نہیں کھلتا۔"

اکرام نے کہا "اور گاڑی خریدنے کے بعد رجسٹریشن وغیرہ....."

میں نے کہا "ہم اسے اوپن لیٹر پر لے جائیں گے۔"

"تم میں سے کسی کے پاس بھی ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کیا ہوا کافرث ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہوتا؟"

ناشتے کے بعد بھی ہم اس مسئلے میں جتنا سر کھپاتے رہے اتنا ہی کنفیوز ہوتے رہے۔ اب لاہور پہنچ کے انتظار کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ محسن نے جلد واپس آنے کا کہا تھا۔ اب جلد سے اس کی کیا مراد تھی۔ چند گھنٹے یا چند دن۔ اور جہاں وہ گیا تھا وہاں سے واپس آنا اس کے اختیار کی بات تھی یا نہیں؟ اسے کیا جلدی تھی اور کیا ایمرجنسی تھی کہ وہ منظر سے بھی نہیں ملا؟ اس نے ہمارا انتظار بھی نہیں کیا اور ایک سطر چھوڑ کے چلا گیا۔ مجھے محسن پر طیش آنے لگا۔ اگر وہ منظر کو مختصر الفاظ میں کچھ بتا جاتا تو کون سی قیامت آجاتی۔ کیا پانچ دس منٹ کی تاخیر سے آسمان گر جاتا۔

اکرام اور میں ساڑھے نو بجے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ میرے ہاتھ میں صرف اپنا بریف کیس تھا اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ آج یہ پیسہ ساتھ نہ ہوتا تو میں خود کو کتنا بے بس و لاچار محسوس کرتا۔ رام ناتھ کے ساتھ تو یہ پیسہ سورگ یا نرک میں نہ جاتا۔ اسے وہی چور لے جاتے جو اس کے ذرا بھی حقدار نہ تھے۔ ہمارا پروگرام طے تھا۔ مجھے اکرام کے نام سے اور اسی کے پتے پر اپنے لیے ایک گاڑی خریدنی تھی۔ اکرام اس عرصے میں شہر کے راستوں سے ہی نہیں، کاروباری علاقوں سے بھی واقف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے سیدھا گلزار ہوٹل لے گیا۔ صدر میں یہ جگہ بہت مشہور تھی۔ یہاں سڑک کے دونوں جانب صبح سے کاریں قطار میں لگنی شروع ہو جاتی تھیں۔ پھر گاہک اور دلال آنے لگتے تھے اور جو سودا شو روم میں ہوتا تھا وہی یہاں سڑک کے کنارے طے پا جاتا تھا۔

بیشتر کاروں کے مالکان موجود تھے مگر وہ بھی براہ راست کسی گاہک سے معاملہ طے کرنے کے مجاز نہ تھے۔ یہ جگہ دلالوں کی تھی جو بدمعاشی کے زور پر اپنا کاروبار چلاتے تھے اور ان کی اصل طاقت تھی وہ بھتہ جو ماہانہ بنیادوں پر پولیس کو ادا کیا جاتا تھا اور جس کی وجہ سے اس نو پارکنگ زون میں بھی گاڑیوں کی قطار لگی ہوتی تھی۔ ہاں کوئی شریف آدمی اس قطار میں شامل ہو کے دلالی کو کمیشن دیے بغیر سودا کرنے کی کوشش کرے تو قانون فوراً حرکت میں آجاتا تھا اور گاڑی والے کا چالان ہو جاتا تھا کہ اس نے وہاں گاڑی کھڑی کی جہاں پارکنگ کی اجازت نہیں۔ اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں ہوتا تھا کہ آخر یہ سیکڑوں گاڑیاں بھی تو کھڑی ہیں۔

میں نے آدھے گھنٹے میں یہ سب دیکھ لیا اور پھر اپنے لیے ایک کرولا منتخب کر لی جو دو سال پرانی تھی مگر مالک نے سنبھال کے رکھی تھی اس لیے نئی لگتی تھی۔ رقم ادا کر کے رسید لینے اور کاغذات کی جانچ پڑتال میں کوئی دیر نہ لگی۔ دس بج کر چالیس منٹ پر ایک بار پھر میں نے پاکستان کی سڑکوں پر کار چلانے کی مسرت کا تجربہ کیا۔

رابعہ بالکل تیار تھی اور فرصت سے تیار ہوئی تھی اس لیے اس کے حسن کی تابانی پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ گزشتہ رات ہم نے جو خریداری کی تھی اس میں رابعہ نے ایک سیاہ ساڑی بھی منتخب کی تھی جس میں چاندی جیسے چمکیلے پھول تھے۔ اس کے ساتھ ہی آتشیں گلابی ساڑی میں کاجل ایک شعلہ جوالہ بنی کھڑی تھی اور سادگی و پرکاری کے مظہر سے اس نے اپنے لمبے کالے بالوں کو ویسے کھلا چھوڑ دیا تھا اور آنکھوں میں کاجل کی لکیر کو تھوڑا سا پلکوں کے

کناروں تک یوں کھینچ دیا تھا کہ جیسے بنگال اور زلف بنگال کے ساتھ سحر بنگال نے اکرام کے حواس کو بھی مسحور کر لیا۔

اگر کلیم اللہ مداخلت نہ کرتا تو شاید میں رابعہ کو دیکھتا رہتا اور اکرام کی نظر کاجل پر جم کے رہ جاتی۔ اس نے ہم دونوں کے دل پر گزرنے والی قیامت کی پروا کیے بغیر اپنی معصومیت کے ساتھ کہا۔

"چاچا! ہم بھی جا رہا ہے تمہارا ساتھ؟ اپنا گھر۔"

میں چونکا "تم...... نہیں کلیم۔ تم اپنی کاجل دیدی کے ساتھ رہو۔"

"کاجل دیدی بھی جا رہا ہے۔" اس نے مسرت سے کہا۔

اکرام نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ وہ کچھ مایوس اور دل گرفتہ نظر آنے لگا۔

"وہ...... اس نے مجبور کر دیا۔" کاجل بولی "یہ بالکل رکنے پر تیار نہیں۔"

اکرام نے کہا "ہم اسے منا لیں گے۔ ہم ابھی گھومنے چلتے ہیں۔ دیکھو تمہاری کاجل دیدی کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔ ہم تو انہیں نہیں جانے دیں گے۔"

کلیم نے صاف انکار کر دیا "ابھی ہم گھر جائے گا۔ تم دیدی کو رکھو۔"

کاجل کا رنگ گلابی ہوا اور پھیکا پڑ گیا "میں نے کہا تھا نا۔"

اکرام نے کہا "بلوا لے جانے دو۔"

ایک ساتھ میں نے، رابعہ نے اور کاجل نے اسے دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ فرط جذبات میں اس نے کوئی اچھی بات نہیں کی۔

وہ زبردستی ہنسا "نہیں...... مذاق کر رہا تھا۔ ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ۔ میں بھی جو نا گر جاتا ہوں......"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "دو چار دن کی بات ہے جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں تھوڑا اور سہی۔"

"بے شک یہ انتظار زیادہ صبر آزما ہو گا۔" رابعہ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "غم فرقت کے ساتھ۔ میرا مطلب ہے دل کے نکھر جانے سے تمہارے جذبات......"

کاجل نے گھبرا کے کہا "چلو کلیم...... سکندر...... دیر ہو رہی ہے چلو۔" پھر اس نے ایک نظر اکرام کو دیکھا "خدا حافظ۔"

اکرام نے مسکرا کے کہا "خدا حافظ۔ دیکھو لاہور سے اکیلی مت روانہ ہو جانا۔ قبائلی علاقے میں اکیلی عورت نہیں جا سکتی۔ یہ تو شاید بہت مصروف ہو جائیں گے وہاں۔ تم میرا انتظار کرنا۔ اگر سکندر نہ جا سکے......"

میں نے کہا "یہ لاہور جا کے دیکھیں گے۔ ممکن ہے کوئی اور صورت پیدا ہو جائے کلیم کو اس کے گھر پہنچانے کی۔ یہ تم نے ٹھیک کہا ہے نہ اکیلی عورت وہاں جا سکتی ہے اور نہ اس علاقے میں۔ وہاں جانے کے لیے تو شناختی کارڈ لازمی ہے۔ جو ساتھ جائے گا وہ بھی پتلون میں نہیں ہو گا بلکہ شلوار قمیص میں جائے گا۔ تم فکر مت کرو میں کسی پشتو بولنے والے کا بندوبست کر لوں گا جو تمہارے ساتھ چلا جائے۔"

"پشتو مجھے آتی ہے۔" اکرام نے کہا۔

رابعہ ہنس پڑی "ابھی ٹیسٹ ہو جائے گا۔ کلیم! پہلے ذرا ان سے کوئی آسان سوال کرو۔"

جب کلیم اور اکرام میں پشتو بولنے کا مقابلہ شروع ہوا تو میں واقعی حیران رہ گیا۔ رابعہ شرمندہ ہو گئی۔ کلیم بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

رابعہ بولی "تم تو چھپے رستم نکلے۔ آج تک بتایا نہیں۔"

"تم نے پوچھا کب۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ مجھے اور کتنی زبانیں آتی ہیں۔" اکرام نے فخر سے سینہ پھلا کے کہا۔

رابعہ نے کہا "میں دیکھ رہی ہوں گونگوں کی زبان تو میں بھی سمجھتی ہوں۔"

"آخر کیوں نہیں سمجھو گی۔ تم نے تو کانوں کی زبان چھوڑ کے اسی زبان میں ریسرچ کی ہے۔" اکرام کو جوابی وار کرنے کا موقع مل گیا۔

ہم ساڑھے گیارہ بجے روانہ ہوئے تو فوکر میرے ساتھ رابعہ تھی۔ پیچھے والی سیٹ پر کاجل اور کلیم اللہ بیٹھ گئے تھے۔ اپنا مختصر سا اسباب ہم نے ڈگی میں رکھ دیا تھا۔ سپرہائی وے تک اکرام نے ہماری رہنمائی کی۔ وہ اپنے دروازے پر ایک کاغذ چپکا کے آیا تھا جس پر غالب اور نازو کے لیے پیغام لکھا ہوا تھا کہ وہ انتظار کریں۔ میں حیران تھا کہ دو دن میں اکرام کو ایسا شدید عشق کیسے ہو گیا کہ اس کے لیے کاجل سے جدائی اتنا مشکل مرحلہ بن گئی ہے۔ بلاشبہ کاجل ایسی لڑکی تھی کہ اس سے کسی کو بھی محبت ہو سکتی تھی۔ ان دونوں کی بدقسمتی تھی کہ آج تک وہ دونوں محبت سے محروم تھے یا خوش قسمتی تھی کہ قدرت آخرکار انہیں زندگی کے ایک موڑ پر کڑی آزمائشوں کے بعد ملانے کا فیصلہ کر چکی تھی اور جب وقت آیا تو وہ جان گئے کہ انہیں ایک دوسرے کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔

سہراب گوٹھ پر اکرام نے ہمیں خدا حافظ کہا اور میں نے حیدرآباد جانے والی سیدھی سڑک پر گاڑی کی حد رفتار بڑھائی۔ نئی سڑک کسی حد تک عالمی معیار کی تھی اور نئی گاڑی نے ایک سو بیس کلومیٹر کی رفتار آسانی سے حاصل کر لی۔ حیدرآباد شہر سے نکلنے کے لیے مجھے راستہ پوچھنا پڑا مگر اس کے بعد سکھر تک کوئی پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ نواب شاہ میں ہم نے کھانا کھایا۔ شام پانچ بجے ہم سکھر سے گزرے۔

سات گھنٹے کی مسلسل ڈرائیونگ سے میں تھک گیا تھا۔ ہم چائے پینے کے لیے رکے اور آدھے گھنٹے بعد پھر روانہ ہوئے تو ڈرائیونگ رابعہ نے سنبھال لی۔ رات گیارہ بجے تک جو گھنٹے سفر میں کاجل نے بھی تین گھنٹے گاڑی چلائی۔ پھر ہم نے ایک سڑک

سائیڈ ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا جہاں سب ٹرک ڈرائیور چارپائیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے یا سو رہے تھے۔

رات کے باقی حصے میں ڈرائیونگ دوبارہ میں نے سنبھالی۔ کلیم تھک کے سو گیا تھا اور کاجل بھی سر سیٹ کے پیچھے ٹکا کے سونے کی کوشش میں مصروف تھی مگر سڑک اتنی خراب تھی کہ اسے مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔

موسم سرما کے ابتدائی دور کی ایک گرد آلود سرد صبح کے ساتھ ہی میں نے پھر لاہور کو دیکھا اور اس کی خوشبو کو احساس کی پوری شدت کے ساتھ پہچانا۔ گردش ایام نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ گلیاں جن میں میں پلا بڑھا، وہ سڑکیں جن پر آوارہ گردی کرتے ہوئے میں نے آغاز شباب کی مستی تیزی کو جانا، وہ دن جو میری عمر رفتہ کی یادوں کا لامتناہی سلسلہ تھے اور وہ لمحے جو نقش ہیں کے میرے لاشعور کے میوزیم میں ایک نادر تاریخی ورثے کی طرح محفوظ ہو گئے تھے۔ وہ راتیں جو حسین خوابوں اور ولولہ انگیز تصورات کا خزینہ تھیں۔ جہاں وہ اسکول تھا جس کی دیواریں آج بھی مجھے دیکھ کر مسکرانے لگتی تھیں اور گورنمنٹ کالج تھا جس سے تعلق پر میرا غرور کبھی کم نہ ہوا تھا۔ جہاں میرے دوست بھی تھے اور دشمن بھی، دولت اور افلاس بھی تھی۔ شالیمار اور جہانگیر کا مقبرہ تھے۔ میرا گھر تھا جو مجھ سے پہلے میرے والد وزیر خان مرحوم کا گھر تھا۔ پھر ان سے چھن گیا تھا اور دوبارہ اسے رابعہ نے خرید کر سجایا سنوارا تھا۔ جہاں وہ بنگلہ تھی جہاں رابعہ نے برسوں بعد میرے دل کے دروازے پر دستک دے کر کہا تھا۔ میں تمہاری وکیل بھی ہوں اور موکل بھی۔ تمہاری گواہ بھی ہوں اور [illegible] بھی۔ جہاں چودھری دلاور کا گھر بھی تھا اور مرحوم ایس ایس پی ضامن رضوی کا بھی۔ لاہور...... اے تصور پھر وہی صبح و شام تو۔ لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو۔ یہ میری دعا تھی میرے دل کی پکار تھی۔ اور گردش ایام مجھے صدیوں کی مسافت میں زندگی اور موت کے تلخ و شیریں تجربات کا مزہ چکھا کے پھر وہیں لے آئی تھی جہاں سے یہ سفر آغاز ہوا تھا۔ نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا مگر گھر نے اسے نواز دیا۔

اور میں نے رابعہ کو آواز دے کر کہا "دیکھو رابعہ! لاہور آ گیا۔" اور آنسوؤں کی جھلملاہٹ میں مسکراہٹ کا اجالا شامل کر کے رابعہ نے روتے ہنستے کہا "ہاں ہاں مجھے معلوم ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ میری دعائیں بے اثر نہ تھیں۔ ہم لوٹ آئے سکندر۔ اپنی دنیا میں، اپنے پاکستان اور اپنے شہر میں۔ میں بہت خوش ہوں سکندر۔ چلو اپنے گھر چلیں۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا "بس ہو گئیں نا جذباتی۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟ میں پتھر ہو جاؤں۔ جذبات سے عاری ہو کے کون زندہ رہ سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا "تم رہ سکتے ہو؟"

"نہیں...... لیکن جذباتی ہو کے میں خودکشی بھی نہیں کر سکتا۔"

اب ذرا کیا "اب تو ہم زندگی کی طرف لوٹ آئے ہیں اور زندگی نے ہمیں اپنا لیا ہے۔ یہ ناممکن تو نہیں تھا کہ صرف تم واپس آتیں یا میں اکیلا لوٹتا۔"

"یہ ناممکن تھا۔ بالکل ناممکن۔"

"کیوں؟ آخر سلسلہ بھی تو نہیں ٹوٹا تھا۔" میں نے کہا۔

رابعہ کا چہرہ اتر گیا "اس کی جگہ گل ٹوٹی۔ ہاں۔ تمہارے ساتھ بھی کوئی گل آ جاتی مگر میرے ساتھ صرف میری لاش آتی۔"

میں ہنس پڑا "اب ایسی باتیں کیوں سوچتی ہو۔ دیکھو ایسی کتنی صبحوں کا تصور ہمارے سامنے ایک حقیقت کے روپ میں آ گیا ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم کہیں گئے ہی نہیں تھے۔ اسی طرح ہم رات بھر پھرتے رہے ہیں اور اب گھر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے کہ انکل ضامن رضوی جاگ رہے ہوں گے۔ ابھی تو کچھ نہیں کہیں گے مگر ناشتے کی میز پر خوب ڈانٹ پڑے گی۔"

رابعہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا "کوئی نہیں رہا۔ کوئی ہمارا استقبال کرنے والا نہیں رہا۔ ہماری واپسی پر خوش ہونے والے وہی لوگ تو تھے۔ انکل رضوی اور ان کی بیگم، محسن کے والدین، میری ماں، استاد شیدی اور گھسلا۔"

میں نے گاڑی کو سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ کے سامنے روک دیا جہاں کمبل لپیٹے چند مزدور ٹائپ لوگ چائے پی رہے تھے اور چولہے پر بھاپ دیتی کیتلی سے ایک شخص چائے کی سنہری دھار کو ایک کپ میں گرا رہا تھا۔ وہیں دوسرا شخص مدھانی سے لسی ورک رہا تھا اور حلوہ پوری کھا کے مونچھوں پر روغن ملنے والے پہلوان ٹائپ شخص کی بے چین نظریں لسی کے گلاس کی منتظر تھیں۔

"آؤ جی باؤ جی! بسم اللہ۔ تشریف رکھو سرکار۔" ریسٹورنٹ کے مالک نے خالص لاہوری لہجے میں حسن اخلاق کا مظاہرہ کیا۔

میں نے کہا "پہلوان جی! چائے ملے گی؟"

"سویرے سویرے؟ او باؤ جی! ایہہ نامراد چائے جگر نوں ساڑ دیندی اے۔" لسی بنانے والے نے تھوڑی سی ملائی مونچھوں پر ملتے ہوئے کہا "بے بندا ہووے خالی پیٹ تے ٹھنڈا کر کے گلدی اے اندر۔"

میں نے ہنس کے کہا "ٹھیک کہا ہے۔ چلیے ہم حلوہ پوری کھائیں گے بہت عرصے بعد......"

بہت سی سوالیہ نظریں ایک ساتھ میری طرف اٹھیں۔

"ہم باہر گئے ہوئے تھے ملک سے۔" میں نے وضاحت کی "کل کراچی آئے، آج رات بھر سفر کر کے لاہور پہنچے ہیں۔"

ہم پنجابی میں بات کر رہے تھے۔ میں سوٹ میں تھا، کار سے آ رہا تھا مگر یہ میرے ہم وطن تھے، ہم زبان تھے اور ہم مذہب تھے۔ ایک دم رنگ محفل بدل گیا۔ ان سب نے پیار غیر سے لوٹنے

www.paksociety.com

رالوں کے اولین میزباں ہونے کا شرف حاصل کرلیا۔ پہلے پہلوان نے پیسہ بچانے کی کوشش کی پھر ریسٹورنٹ کا مالک بن گیا۔

"او جی خیر ال اپنے گھر آئے ہو۔ اج مہمان ہو' فیر کدی نہ گے تے جیسے رتی لوال تے بادشاہو۔ سوہنا رب ہووے پیسے وچ ہووے برکت نے تھوڑا ری بہت..."

ان کی اپنائیت کے اظہار نے مجھے پھر یقین دلایا کہ میں اپنوں میں ہوں اور یہاں سب کچھ اپنا ہے۔ اب کا جل بھی جاگ اٹھی تھی اور کلیجہ کو جگا رہی تھی۔ ہم نے گرم گرم حلوہ پوری کھا کے چائے پی اور اپنے میزبانوں کا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوئے۔ ہم کہاں کہاں انسانوں کے کیسے کیسے روپ دیکھ آئے تھے مگر خلوص اور پیار کا یہ رنگ کہیں نہ دیکھا تھا جس میں غرض کی ملاوٹ تک نہ ہو۔ دہر دولت کی طاقت' بدمعاش کے غرور' سیاست کی چالبازی اور کاروبار کی ہیر پھیر کی ہوس بھری دنیا تھی جس میں ہم نے نفرت اور تعصب' آگ اور خون' بارود کی بو اور لاشوں کے فریادی جسم دیکھے تھے۔ میرے وطن کی یہ دنیا کتنی مختلف تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم جہنم کے عذاب کی ایک عمر کاٹ کے جنت کی زندگی کی جھلک دیکھ رہے ہیں۔

صبح ہو چکی تھی اور یہ وہی صبح تھی جس کا کوئی روپ میرے لیے نیا نہ تھا۔ دودھ والوں کے ریوڑھے۔ سائیکل پر تیزی سے پیڈل مارتے اخبار فروش لڑکے' کارخانوں کی سمت رواں محنت کش۔ گلوں میں بستے لٹکائے اسکول بس کا انتظار کرتے بچے' صبح کے سورج کی ٹھنڈی دھوپ میں پرواز کرتے پرندے۔ میں اب ان نظاروں میں گم مزے سے نہر کے کنارے کنارے گاڑی چلا رہا تھا۔ رابعہ کی نظریں بھی باہر کے منظر میں کھوئی ہوئی تھیں۔ گزرے ہوئے وقت اور آج کے دن کے درمیان جو بھی ہوا تھا وہ سب احساس کا سرمایہ تھا اور خیال کا اثاثہ تھا جسے ذہن نے سمیٹ کر یادوں میں محفوظ کرلیا تھا۔ ہم انہی یادوں کے درمیان سرگرداں و حیراں تھے جب وہ موڑ آیا جہاں سے ایک سڑک بائیں جانب جاتی تھی اور جو یا نسرولہ والی سڑک کہلاتی تھی تو میرے پاؤں بریک پر جم گئے۔ اسی سڑک پر ذرا آگے ہماری پہلی پناہ گاہ تھی جہاں انہیں پاپا حسن رضوی رہتے تھے اور جہاں ہم نے اپنی محبت کے تحفظ کی تمنا کو تمام حادثات و خطرات کے باوجود پہلے ایک کونپل اور پھر ایک ننھے اور شجر سایہ دار بنتے دیکھا تھا۔

میں نے اس سڑک کی ویرانی کو دیکھا۔ "رابعہ! ادھر چلیں؟"

خود رابعہ بھی ادھر ہی دیکھ رہی تھی مگر اس نے نفی میں سر ہلایا "نہیں آگے چلو۔ مجھے ڈر لگتا ہے قبرستانوں سے۔"

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ویرانے آباد کیے جا سکتے ہیں' قبرستان نہیں۔ ہم اس جگہ دوسرا گھر بنا سکتے تھے جہاں پہلے رابعہ رہتی تھی۔ اس منہدم ہو جانے والے گھر کا ملبہ صاف ہو جانے کے بعد ایک قطعہ زمین رہ گیا تھا جو رابعہ کی ملکیت تھا۔ میرے والد کے گھر کو بھی رابعہ نے دوبارہ حاصل کرلیا تھا اور اب وہ گھر ہمارے استقبال کے لیے چشم براہ تھا مگر حسن رضوی کی سرکاری کوٹھی میں اب نہ جانے کون رہتا تھا۔ خود انکل حسن رضوی [illegible] اور ان کے بیوی بچے بھی ملک چھوڑ گئے تھے۔

میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔ ریلوے ٹریک سے بائیں ہاتھ پر مڑتے ہی گڑھی شاہو کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ [illegible] کے چوک سے میں نے گاڑی کو پھر موڑلیا۔

جہاں رابعہ کے گھر کی زمین تھی وہاں ایک نیا تعمیر شدہ عالی شان گھر دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ پہلے مجھے شک ہوا تھا کہ میں بھول گیا مگر وہاں دوسرا کوئی پلاٹ خالی ہی نہ تھا۔ بھولنے کا سوال اس لیے بھی پیدا نہ ہوتا تھا کہ اس گھر کے دونوں جانب پرانی نشانیاں حسب سابق موجود تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ ہم نے ملبہ ہٹوانے کے بعد اس کے گرد ایک چار دیواری بنا کے گیٹ لگوایا تھا۔ اب نہ چار دیواری تھی اور نہ وہ گیٹ۔

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا "یہ کیا چکر ہے؟"

رابعہ نے پریشانی سے کہا "لگتا ہے کسی نے اس پر ناجائز قبضہ کرلیا ہے۔"

"مگر کس نے؟ اور اتنی جلدی۔ ہم کوئی برسوں تو باہر نہیں رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"قبضہ کرنے والے راتوں رات قابض ہو جاتے ہیں۔"

"بشرطیکہ وہ پہلے سے نیت کیے بیٹھے ہوں اور انہیں کسی کی طرف سے فوری دخل اندازی کا ڈر نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"تم تو جانتے ہو انہیں۔"

"ہاں۔ مگر یہاں منظر بھی تو تھا۔ اس نے نہیں دیکھا۔ جب تعمیر شروع ہوئی تھی' وہ اسی وقت حکم امتناعی بھی حاصل کرسکتا تھا اور بے دخلی کے احکامات بھی۔"

"ذرا اکیلا کیا کیا کرتا۔ اسے تو شاید خبر بھی نہیں ہوئی۔ کبھی وہ ادھر سے گزرا بھی ہوگا تو بے خیالی میں کچھ دیکھے بغیر نکل گیا ہوگا۔ وہ ہر محاذ پر تو لڑ رہا تھا۔ ہمارے مقدمات تھے' اپنی پرنس کمپنی پھر میرے آفس کے معاملات' وزٹ اور اسپتال کا انتظام۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ خیر ہم نمٹ لیں گے ان سے بھی۔"

"نمٹ تو لیں گے مگر اپنی جنگ لڑنے کے بعد۔" رابعہ بولی۔ "پہلے یہ تو پتا چلے کہ اتنی ہمت والا ہے کون؟"

میں سرہلا کے گاڑی سے اترا اور کوٹھی کے سامنے والے کیبن تک گیا۔ وہ پان سگریٹ کا کیبن تھا۔ اس کے مالک کو میں نے صورت دیکھتے ہی پہچان لیا۔ جب رابعہ یہاں رہتی تھی تو میں نے اس سے سگریٹ کے پیکٹ خریدے تھے۔

میں نے سلام کے بعد کہا "استاد جی! تم تو بڑے پرانے بندے لگتے ہو۔ کب سے ہو یہاں؟"

وہ چونکا "آہو جی۔ دس سال سے اوپر ہو گئے۔ پر آپ کیوں پوچھتے ہو؟"

"تو وہ نہیں' میں تمہارا کھوکھا ہٹوانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "میں تو کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا' یہاں ایک وکیل صاحبہ رہتی تھیں۔ لال رنگ کی گاڑی تھی ان کی' تا کسی ہو بجن۔"

"میں سمجھ گیا جی۔ ان کا تو انتقال ہو گیا۔" وہ تعلق لہجے میں بولا۔

"انتقال ہو گیا! کب؟" میں نے محظوظ ہو کے کہا۔

"بڑے دن ہو گئے۔ پہلے ان کی ماں فوت ہوئی۔ فیر کسے حرامی نے اینے بم رکھا۔" اس نے اردو پنجابی ملا کے کہا "وکیل تھی نا جی' لڑائی' دشمن بھی ہوتے ہیں اناں کے۔ کسے دا کیس ہارنا ہوتا ہے۔"

"تو کیا وہ بم کے دھماکے میں ہلاک ہوئی تھی؟"

"نہیں جی۔ اس دھماکے تے بچ گئی تھی۔ بعد وچ کدھرے چلی گئی۔ اوری بہن نے دسیا کہ..."

"بہن نے! اس کی کوئی بہن تھی؟"

"ہاں جی۔ دوسری تو رہتی ہے اب یہاں۔" پان والے نے باتوں کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی جاری رکھا "چنگا بھلا نام ہے۔ ہاں چاندنی بیگم۔ ہیرا منڈی میں کوٹھا تھا۔ بس اک دن آئے تو یہیں گھر بیٹھ گئی ہے۔"

میں نے کہا "ایک بہن وکیل تھی' دوسری ہیرا منڈی میں کوٹھے پر بیٹھی تھی۔ تم یقین کرتے ہو اس بات پر؟"

وہ مجھے حیرانی سے دیکھنے لگا "سو جی' دنیا وچ کیا نہیں ہوندا۔ نصیب ہور کس کو نکھتے ہیں؟"

میں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا "اچھا وہ بڑا آدمی کون ہے؟"

وہ پان لگانا چھوڑ کے میری صورت دیکھنے لگا "آپ نے تو پکی انکوائری شروع کردی ہے۔ کون ہو جی آپ؟ سی آئی ڈی کے بندے؟"

میں نے کہا "نہیں یار۔ میں بھی ایک وکیل ہوں۔ رابعہ میرے ساتھ وکالت کرتی تھی۔ میں بھی لاہور میں رہتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کی کوئی بہن نہیں تھی اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ زندہ ہے۔ یہ سب تمہیں چاندنی بیگم نے بتایا ہے؟"

"سبھوں نہیں صاحب' لوکاں کو۔ میں نے بھی سنا ہے جو سب نے سنا ہے کہ وہ کدھرے اینڈ آگئی تھی' ادھر پارلوں بر ماری گئی۔ کی پتا اسے کی جھوٹ رب جانے۔ ہاں جس بندے نے گھر میں ڈیرا ڈالا ہے' وہ بڑا زور آور بندہ ہے۔ آپ میرا ناں لے کے مت بتانا کسی کو۔ ادھر موہنی روڈ والے اکھاڑے وچ دنگل کرتا تھا۔ گولا تھڑ والا پہلوان مشہور تھا۔ غلام محمد نام تھا۔ سر اور منڈا آتا تھا' راڑ گی سوچ کے ساتھ۔ اس لیے گولا تھڑ والا بن گیا۔ آٹھ سے نے "اک دن اکھاڑے وچ زور کراری کہ اک شیشے نے غلط جگہ ہتھ پایا۔ اجوں آگیا غصہ اور اس نے گردن توڑدی۔ آپس وچ لڑدی تھی اناں دی۔ فیر جی اسے جیل گیا تین سال واسطے اور او تھوں بدمعاش بن کے آیا۔ چودھری غلام محمد ہو گیا ہے اب تو۔"

"تو کیا ہے۔ کہاں سے آیا اس کے پاس؟"

وہ ہنسنے لگا "سو جی' پیسہ کیا شریفاں کول ہوتا ہے۔ میرے بھتیجے شریف نے ساری عمر پان پہ کتھا چونا ملتے رہے ہیں۔ پیسہ بدمعاشی وچ ای آتا ہے بھولے بادشاہو۔ اسے تے میرے بھتیجے بھی لگ گیا تھا۔"

"تمہارے بھتیجے کیوں لگ گیا تھا؟"

"ہیں جی! کوئی اس دا بندا تھا جو میرا کیبن لینا چاہتا تھا۔ جگہ پسند آگئی تھی اونوں۔ پر جی سارا دی رب اے اور کوئی للا ارشد نہیں میں بھی۔ اپنے سنیما کے مالک چنگے بندے ہیں۔ انہوں نے غلام محمد سے آکھیا کہ خیوا ستم حکم دین کے نال پنگا لیا۔"

"حکم دین کون؟"

"میں جی' ہور کون" وہ بولا "یہ جو اوکڑی رابعہ زندہ اے اور یہ سب جھوٹ ہے تو فیر جی آپ جگہ خالی کرا لینا۔ آپ کو معلوم ہو گا وہ کدھر ہے۔ انوں آکھو کہ کیس کرے۔"

"بالکل کریں گے اور جگہ بھی خالی ہوگی انشاءاللہ۔" میں نے کہا "تم سے بھی پھر ملاقات ہوگی حکم دین۔"

حکم دین کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ غلام محمد کے خلاف اپنے دل میں کینہ اور عناد رکھتا ہے۔ غلام محمد نے اس کا کیبن چھین کر اس کے پیٹ پر لات مارنے کی کوشش کی تھی اور کراؤن سنیما کے مالکان اس کی پشت پناہی نہ کرتے تو وہ یقیناً معاش کے اس ذریعے سے محروم ہو جاتا۔ شاید حکم دین کو بقا کی سخت جنگ میں بہت ذلت اٹھانی پڑی تھی۔ ممکن ہے اس نے ہڈیاں بھی تڑوائی ہوں۔ آخر کار وہ جیت گیا تھا مگر دلوں میں بغض باقی رہ گیا تھا۔ ایک پان والے کا اتنے بڑے بدمعاش سے کیا مقابلہ جو ہیرا منڈی کی چاندنی بیگم کو داشتہ رکھے اور اسے شہر کے بیچ کسی کی زمین پر قبضہ کرکے ایک محل بنا دے۔ اصل طاقت کا توازن پیچھے والوں کی وجہ سے قائم تھا۔ ایک طرف غلام محمد تھا تو دوسری طرف حکم دین کے پیچھے کراؤن سنیما والوں کا ہاتھ تھا۔ تاہم اس وجہ عناد سے ہم بعد میں فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

میں نے ساری بات رابعہ کو بتائی تو وہ حیران بھی ہوئی اور مشتعل بھی۔ "کیا خیال ہے' میں اپنی بہن سے مل لوں ابھی؟ اسے بتادوں..."

میں نے کہا "شانتی شانتی۔ جلد بازی میں بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے۔ چاندنی بیگم اور گولا تھڑ والا کچھ بھی ہوں' اس جگہ کے مالک نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے ہمارا نہیں' اپنا نقصان کیا ہے۔ اس محل کو اٹھا کے وہ کہاں لے جائیں گے آخر۔ بے دخلی تو ہوگی۔ آج نہ

www.paksociety.com

سبی گل۔ سال دو سال بعد۔ دس سال تو لگیں گے نہیں۔ اور ہمیں اس جگہ کی فوری ضرورت بھی نہیں ہے۔ جب فرصت ہوگی کیس کریں گے مگر کیس کرنے سے پہلے ان کے ساتھ وہ کھیل کھیلیں گے جو بلی چوہے کے ساتھ کھیلتی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"سمجھ جاؤ گی۔ کل تو وہ بعد میں چھوڑیں گے اس سے پہلے ان کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔ چاندنی ٹھہر سکتی ہے دھوپ میں۔ اسے معلوم ہوگا تمہارا نام تو وہ اپنا نام تک بھول جائے گی۔ اچھا اب پہلے منظر کو فون کرلیں ورنہ وہ کورٹ چلا جائے گا۔" میں نے کہا اور گاڑی کو واپس موڑ کے علامہ اقبال روڈ پر لے آیا۔

چوک میں ایک لڑکا فٹ پاتھ پر اخبار پھیلائے بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے ایک انگریزی کا اخبار لیا اور ایک اردو کا۔ پھر اس سے معلوم کیا کہ میں فون کہاں سے کرسکتا ہوں۔ اس نے مجھے انگلی کے اشارے سے ایک میڈیکل اسٹور دکھایا۔ میں نے اخبار گاڑی میں رابعہ کو پکڑایا اور خود فون کرنے چلا گیا۔

حسب عادت منظر نے میری آواز سنتے ہی گالی دی "نازل ہو گیا تو صبح صبح۔ کہاں سے بول رہا ہے؟"

"جہاں سے تو بولتا ہے۔ ویسے میں چاندنی بیگم کے گھر کے قریب ہی ہوں۔" میں نے کہا۔

"چاندنی بیگم! اب کیا سیدھا ہیرا منڈی چلا گیا لاہور آتے ہی۔"

میں نے کہا "منہ سنبھال کے بات کر۔ وہ رابعہ کی بہن ہے۔ جہاں رابعہ رہتی تھی نا اسی جگہ بڑا شاندار گھر بنایا ہے۔ رابعہ کی موت کے بعد وہی وارث تھی۔"

"سکندر! کیا تو پینے لگا ہے یا کسی نے دھوکے سے چرس والی سگریٹ پلادی ہے۔" منظر سنجیدہ اور متفکر ہو گیا۔

"سگریٹ میں نے کب کی چھوڑ دی بیٹے۔ یہ بھی میں نشے میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں آسمانی رنگ کی کرولا میں ہوں۔ ماڈل ۶۹۔ تیرے پاس کیا ہے؟"

"وہی تو اسٹیشن ویگن ہے لیکن ٹرک لینا پڑے گا یا بس ہوگی اگر بس نہ کیا۔" وہ قہقہہ مار کے بولا اور ریسیور رکھ دیا۔

میں واپس آیا تو رابعہ اخبار پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔

"سکندر! یہ دیکھو۔ غالب اور نازو کے بارے میں خبر ہے۔" اس نے میرے کچھ کہنے سے پہلے یوں چلا کے کہا کہ قریب سے گزرنے والے لوگوں نے سر گھما کے دیکھا۔

میں نے سیٹ پر بیٹھ کے اخبار لے لیا "کیا خبر ہے؟ کہاں؟"

رابعہ نے انگلی رکھ دی "یہ پڑھو۔ وہ مل گئے ہیں۔"

میں نے خبر پڑھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ گلگت کے برفانی علاقے میں پاکستانی فوج کے ہیلی کاپٹر نے دو افراد کی جان بچائی ہے جو طوفان میں بھٹک گئے تھے اور اگر بروقت امداد نہ ملتی تو وہ سردی اور بھوک سے ہلاک ہو جاتے۔ انہیں اتفاقاً دیکھ لیا گیا اور وہ ریسکیو کے کیا بعد ملٹری اسپتال میں پہنچا دیا گیا جہاں ڈاکٹر ان کی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے ایک مشہور صحافی مرزا غالب ہیں جو کچھ عرصہ قبل لاپتا ہو گئے تھے اور دوسری ان کی بیوی۔ ملاقات پر پابندی کے باعث ہمارا نمائندہ ان سے تفصیلی گفتگو نہ کرسکا اور یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ایسے موسم میں راستہ بھول کے گلگت کیسے جا پہنچے تھے اور اتنا عرصہ کہاں تھے۔

میں نے خبر کو دوبارہ پڑھا۔ پھر انگریزی اخبار میں دیکھا۔ انگریزی میں خبر نسبتاً مختصر تھی کہ سابق صحافی اور ان کی بیوی کو ملٹری ریسکیو ہیلی کاپٹر نے ہلاک ہونے سے بچالیا۔

"چلو خدا کا شکر ہے! ان کا پتا بھی چل گیا۔" رابعہ بولی۔

کاجل نے بھی کہا "ہاں اب کوئی فکر کی بات نہیں رہی۔"

میں نے اخبار رکھ دیا "یہ تو ٹھیک کہتی ہو تم لیکن بات اب بھی فکر کی ہے۔"

"اس میں لکھا ہے جان بچالی گئی۔"

"جان تو بچالی ملٹری کے ڈاکٹروں نے۔ اخبار والوں نے ڈھول پیٹ کر اطلاع دے دی سب کو۔" میں نے کہا "ہم اپنی آمد خفیہ رکھنا چاہتے تھے مگر اب ہمارے دشمنوں کو بھی خبر مل گئی کہ وہ لوٹ آئے ہیں۔ ہم سے پہلے وہ نوشہرو پہنچ کے غالب کی خبر لے سکتے ہیں۔"

رابعہ نے پریشان ہو کے کہا "پھر اب کیا ہوگا؟ ہم چلیں نوشہرو۔"

میں نے کہا "ہم فوراً کیسے جا سکتے ہیں۔ نوشہرو کوئی ڈائریکٹ فلائٹ تو ہے نہیں۔ پشاور سے جائیں تو اتنا ہی سفر واپس چترال کی طرف آنا پڑتا ہے۔ ہم پہلے منظر کو بتائیں گے پھر اکرام کو اطلاع دیں گے کہ وہ وہاں مزید انتظار نہ کرے۔"

"خبر کراچی کے اخبارات میں بھی تو شائع ہوئی ہوگی۔"

"مشکل ہے۔ یہ کوئی بین الاقوامی خبر تو ہے نہیں۔ وہ لاہور کا صحافی تھا اس لیے لاہور کے اخباروں نے خبر چھاپ دی۔"

"اکرام کے گھر فون کردو۔"

"منظر کے گھر سے کریں گے۔ اس میں بھی وقت لگے گا۔ کال بک کرانے کے بعد کال ملنے تک ہم انتظار کے سوا کیا کرسکتے ہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا "آخر غالب کو کیا ضرورت تھی کو بتانے کی کہ میں صحافی ہوں۔"

رابعہ بولی "ممکن ہے لوگ خود ہی پہچان گئے ہوں۔"

"کون لوگ؟ ملٹری کے ڈاکٹر؟" میں نے کہا "مشکل ہے۔ میں تو شرط لگا سکتا ہوں کہ اسے یہاں اس چوک میں لا کے کھڑا کردو تو اخبار والا اسے نہ پہچانے۔ اس ملک میں تو کوئی فیض احمد فیض کو نہ پہچانے، غالب کیا چیز ہے۔ اس نے خود ہی بتایا ہوگا۔"

"وہ اتنا بے وقوف بھی نہیں ہے۔" رابعہ نے اس کا دفاع

کیا۔

"بے وقوف ہم سب ہیں۔" میں نے کہا "محسن کو دیکھو، انہوں نے کیا حرکت فرمائی ہے۔ یار جانا تھا تو کچھ بتا کے جاتے، وضاحت کرجاتے چند سطروں میں۔ معاملے کو اتنا پُراسرار بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم سے بے وقوفی یہ ہوئی کہ پلاٹ کو ایسے ہی چھوڑ دیا۔ کوئی چوکیدار چھوڑ جاتے۔"

"اس بات کو چھوڑو۔ یہ سوچو پہلے کہ غالب اور نازو کو کیسے نکالا جائے۔" رابعہ بولی۔

"تم بھی عجیب باتیں کرتی ہو۔ نکالنا کیا معنی۔ وہ حوالات میں ہیں کہ ہم ضمانت دے کر نکال لائیں۔" میں نے بے بسی سے کہا "بابا وہ ملٹری ہاسپٹل میں ہیں۔ ایسے کون گھس سکتا ہے وہاں۔ ملنا بھی ہو گا تو پہلے بتانا پڑے گا کہ ہم کون ہیں۔ اور جب تک ہم جائیں گے غالب کا بھائی اسے لے جائے گا۔ ابراہیم ذوق یا مومن خاں مومن۔"

"غالب کا بھائی! ابراہیم ذوق۔"

"جب تمہاری بہن چاندنی بیگم ہو سکتی ہے اور تمہارے پلاٹ پر محل بنا کے قابض ہو سکتی ہے تو ڈراور ایڈ منی کا کوئی آدمی غالب کا بھائی بن کے کیوں نہیں پہنچ سکتا۔" میں نے کہا "غالب، ذوق اور مومن ہم عصر تھے، یہ کون جانتا ہے۔ وہ چودھری دلاور سالا خود ایسا ایکٹر ہے کہ اپنے آپ کو غالب کا باپ ثابت کردے۔"

میری جھنجلاہٹ اور میرا احساس بے بسی میرا غصہ بن گئے تھے چنانچہ ایک اچھی خبر بھی میرے لیے خوشی سے زیادہ تفکرات کا سبب بن گئی تھی۔ اچانک مجھے ایک کار میں منظر کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے پوری بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے بہت غلط قسم کا اشارہ کیا مگر اس وقت رابعہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ منظر نے گاڑی روکی نہیں اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ کاجل تو اسے پہچانتی نہیں تھی اور اس کے اشارے کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ میں نے زیر لب کہا "سور کا بچہ" اور گاڑی اسٹارٹ کی تو رابعہ نے سامنے دیکھا۔

"یہ تو منظر ہے۔" اس نے مسرت سے کہا "اسی کی گاڑی ہے نا؟"

"ہاں۔ تم نے اب دیکھا ہے۔ میں نے اس کی منحوس شکل پہلے ہی دیکھ لی تھی۔"

رابعہ نے خفگی سے کہا "کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ سب پر غصہ آرہا ہے۔ مجھ سے کیوں لڑ رہے ہو؟"

میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا "سوری۔ میں کچھ ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ تھکا ہوا بھی ہوں۔"

رابعہ نے کہا "گاڑی میں چلاؤں؟"

"اب تو تھوڑی دیر کی بات ہے۔" میں نے کہا "مگر یہ جا کدھر رہا ہے؟ اپنے پرانے گھر کی طرف؟"

"کیا پتا نیا گھر بھی کہیں قریب ہی ہو۔" رابعہ بولی اور پھر کاجل کو منظر کے بارے میں بتانے لگی۔ کلیم لاہور کے نظارے دیکھنے میں منہمک رہا۔ اسے نہر کے کنارے سفر میں بہت مزہ آیا تھا۔

صدر پہنچ کے منظر نے گاڑی اپنے پرانے گھر کے دروازے پر روکی، خود اتر کے گیٹ کھولا اور گاڑی کو اندر لے گیا۔ اس کے پیچھے میں گیا اور کار کو بیچ میں روک کے اترا تو وہ گیٹ بند کر رہا تھا۔ جب ہم نے گلے مل کے ایک دوسرے کو اٹھا اٹھا کے گھمانا شروع کیا اور مکے مار مار کے گالیاں دیں تو کلیم ڈر گیا۔

"ڈیڈی! چاچا کا لڑائی ہو گیا ہے۔"

رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا "نہیں کلیم! یہ دوست ہیں نا۔ بہت عرصے بعد ملے ہیں۔"

آخرکار منظر نے مجھے چھوڑا اور رابعہ کی طرف متوجہ ہوا "ارے وکیل صاحب! خدا کی قسم دل تو چاہتا ہے ایسے ہی تم سے بھی ملوں۔ مگر کیا کروں یہ سالا مار ڈالے گا مجھے۔ اور میں بھی کچھ شرمیلا ہوں۔ ورنہ تم تو بھئی قیامت ہوتی ہو قیامت اور یہ بیٹا ہے تمہارا۔ ماشاء اللہ خاصا بڑا ہو گیا تھوڑے سے دن میں۔"

رابعہ نے خفت سے کہا "کچھ شرم کرو۔ یہ میرا بیٹا ہو سکتا ہے۔"

"کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔" "وہ گلا پھاڑ کے چیخنے لگا "خیر سے یہ کاجل ہوں گی۔ بھئی واہ! ان کی تو آنکھیں دیکھ کر ہی ان کا نام معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا ان کا نام۔ یہ کلیم ہے نا۔ آجا بیٹا! ابھی تجھے ملواتے ہیں تیرے چند مہ زادوں سے۔ اے میں بھی تو چچا ہوں تیرا۔" اس نے کلیم کو لپٹا کے پیار کیا۔

شور سن کر اندر سے منظر کی بیوی نکلی۔ وہ سیدھی سادی اور گھریلو عورت تھی۔ کسی تکلف کے بغیر وہ رابعہ اور کاجل سے گلے ملی اور پھر مجھ سے۔

"سکندر بھیا! لاہور تو سونا ہو گیا تھا تمہارے بغیر۔" وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

منظر نے قہقہہ مارا "ارے نیک بخت! اللہ نے چھپر پھاڑ کے پندرہ عدد لخت جگر دیے ہیں تجھے پھر بھی لاہور سونا لگتا تھا۔"

منظر کی بیوی انہیں اندر لے گئی "یہ تو ایسے ہی بولتے رہیں گے۔"

میں نے کہا "منظر! یہ تو وہی گھر ہے۔ تیرا نیا گھر کہاں ہے؟"

"میں نے تیرے لیے استقبالیہ کیمپ لگا رکھا ہے کل رات سے۔ نیا گھر ذرا دور ہے۔" وہ بولا "بعد میں دیکھ لینا۔"

"جب میں نے فون کیا تو یہاں کوئی اور تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تو نے یہ گھر بیچ دیا ہے۔"

"سالا نشے میں بول رہا تھا۔ ایک رات کے لیے گھر لیا تھا اس

www.paksociety.com

لیے۔" مظہر مجھے آنکھ مار کے بولا "میں نے تو سب انتظام تمہارے لیے ہی کیا تھا۔ یہاں کوئی نہیں جانتا کہ میں نے گھر بدل لیا ہے۔ میری گاڑی صبح و شام آتی جاتی رہتی ہے۔ ہفتے میں ایک بار اپنی پٹھان کو بھی لے آتا ہوں۔"

"مگر مقصد کیا ہے اس کا؟"

"مقصد یہ ہے کہ جب تم رہو تو لوگ سمجھیں میں رہتا ہوں۔ کوئی تمہارے پیچھے لگ جائے تب بھی اندر نہیں گھسے گا۔ آخر مظہر ایڈووکیٹ کا گھر ہے۔ وارنٹ کے بغیر ڈی ایس پی کے قدم بھی رک جائیں گے۔ لیڈی سرچ چاہیے اندر جانے کے لیے۔" مظہر نے مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کے کہا۔

میں صوفے پر جوتوں سمیت دراز ہو گیا "یہ تو کچھ عقل مندی کی بات لگتی ہے مجھے۔"

"اب اپنی گاڑی میرے حوالے کرو۔ جہاں جانا ہو میری گاڑی میں جاؤ۔ خیر یہ باتیں پھر کریں گے۔ مجھے کورٹ جانا ہے۔ تم نہا دھو کے ناشتا کرو۔ آرام کرو اور جو چاہو کرو۔"

میں نے کہا "ایک منٹ۔ یہ خبر کیسی تھی؟"

"غالب کے بارے میں نا۔ سالا صحافی کی دُم۔ اسے کہہ دیتا کہ میں ایرا غیرا ہوں، لکڑہارا ہوں، گھسیارا ہوں۔ کون سی شان گھٹ جاتی۔ نام بھی بتا دیا اور پیسے بھی اور خبر لگوا کے اطلاع عام کر دی۔"

"یار وہ اتنا احمق نہیں ہو سکتا۔" اب میں نے رابعہ کی عدم موجودگی میں اسی کی بولی بول دی۔

"اتنا کیا، احمق تو احمق ہی ہوتا ہے۔ جیسے گدھا بس گدھا ہوتا ہے۔ چھوٹا بڑا کیا۔" مظہر نے کہا "جنیئر سے تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ محسن نے کیا کم گدھے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ رہے تم خود تو تم سے تو گدھے بھی شرمندہ ہیں کہ تم نے ان کا نام بدنام کیا۔"

مظہر رخصت ہو گیا تو اس کی بیوی نے بڑے گھریلو اور اپنائیت کے انداز میں مہمان نوازی پر کمر باندھ لی۔ ہم نے اسے قائل کرنے کی بے شعور کوشش کی کہ لاہور پہنچتے ہی ہم نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ ناشتا کر لیا تھا۔

"پھر کیا ہوا۔ اتنی دور سے آ رہے ہو۔ تھوڑا سا حلوہ پوری کھانے سے بھی کوئی پیٹ بھرتا ہے۔" اس نے کہا "چلیں آپ لوگ نہا دھو لیں۔ ابھی تو میں نے بھی ناشتا نہیں کیا۔"

اس نے رابعہ بہن کو ایک باتھ روم میں دھکیلا اور کاجل بہن کو دوسرے میں۔ پھر مجھ سے علیم کے بارے میں پوچھنے لگی۔ میں نے اسے مختصراً بتایا کہ اسے علاقہ غیر میں اس کی پھوپھی کے پاس رکھا ہے۔

"وہ بھابی۔ بڑا عجیب سا لگ رہا ہے۔ اتنی خاموشی ہے گھر میں۔ بچے کہاں ہیں؟"

"بچے اتو۔ میری۔ ان کو ساتھ لاتی تو وہ تمہیں سے چلتے رہتے؟ اب تک چھت گھیرے ہوتے بھوت کی طرح۔"

"ہیں بھی تو بھوت کے بچے۔" میں نے کہا۔

"میرا تو دماغ خالی ہو جاتا ہے بھیا۔" اس نے بچوں کی اذیتوں اور ان کی پرورش، کنٹرول اور امور خانہ داری کے دکھڑے رونے شروع کیے جو ایک عام عورت کا مقدر ہوتے ہیں۔ بچے یہ کرتے ہیں۔ وہ کرتے ہیں۔ یہ نہیں کرتے، وہ نہیں کرتے۔ باپ کو ذرا فکر نہیں۔ بس عدالت ہے اور اپنا دفتر ہے۔ دنیا بھر کے بکھیڑے ہیں۔

اچانک اس نے کہا "بھیا! اب تم بھی ٹک کے بیٹھ جاؤ۔"

میں نے چونک کے کہا "بیٹھا تو ہوں بھابی۔ بڑے آرام سے۔"

"ارے میرا مطلب تھا گھر بسا لو۔ چھوڑو یہ سارے جہان کے جھمیلے۔ اپنی جان کا روگ بنا رکھے ہیں۔ بھاگے پھرتے ہو ادھر سے ادھر۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو۔ میں پوچھتی ہوں کیا تم نے مل کے ہندوستان پاکستان کی جنگ رکوا دی؟ بنگالیوں نے مانی تمہاری بات؟ اپنا بنگلہ دیش الگ کر لیا نا۔"

وہ خالص زنانہ نقطۂ نظر سے اپنا لیکچر دیتی رہی اور اپنی معلومات کی حد تک مجھے سمجھاتی رہی کہ زمانہ بڑا خراب ہے۔

"تمہیں کیا پتا لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہوں گے۔ ایسا ہوتا ہے دنیا میں کہیں کہ جوان جہان لڑکیاں ساتھ ساتھ پھر رہی ہیں۔ اپنے منگیتر کے سامنے بھی کوئی نہیں نکلتا۔ پردہ ہوتا ہے آنکھ کا۔"

میں نے کہا "بھابی نظر کا پردہ تو باقی ہے۔ رہی دنیا کی بات تو اس نے پیغمبروں کو نہیں بخشا پھر ہم کیا، ہماری اوقات کیا۔"

لیکن وہ قائل ہونے والی نہیں تھی۔ اس کا فلسفۂ حیات بہت سادہ تھا اور اس میں الجھنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ مرد پڑھے لکھے، کمائے اور ترقی کرے۔ شادی کرے، بچوں کی پرورش میں ہاتھ بٹائے۔ "اللہ کو یاد کرے"، آخر عمر میں توفیق ہو تو حج کرے اور جب موت آئے تو مر جائے۔ میں سننے پر مجبور تھا۔ اس کی زبان رکے بنا قینچی کی طرح چلتی تھی۔

بڑی مشکل سے موقع ملا تو میں نے کہا "بھابی ایک بات پوچھوں۔ چند برس بچے مل کے آپ کے برابر بول لیتے ہیں یا آپ کے مقابلے میں بول ہی نہیں پاتے؟"

وہ برا ماننے والی عورت ہی نہیں تھی۔ اس نے پھر بچوں کا موضوع پکڑ لیا۔ جب رابعہ باتھ روم سے نکلی تو میں بھاگ گیا۔ اب رابعہ پھنس گئی۔ نہاتے ہوئے میں اس کی حالت کا سوچ کے خوش ہوتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی زیادہ شامت آئی ہوگی کہ وہ لڑکی تھی۔

ناشتے کے دوران اور اس کے بعد اگر ہم نے ایک سوال کیا تو جواب میں ایک لیکچر تھا۔ میں نے پوچھ لیا "بھابی! یہ سارا سامان تو یہیں ہے۔ نئے گھر میں کیا ہے؟"

"بھیا اپنا سارا اپنا تھا۔ تمہارے وکیل صاحب کو شوق

تھا گھر کا پہلے والی بات کہاں۔ چار دن میں سب چیزوں کا وہ حال ہو گیا ہے کہ چار سال پرانی لگتی ہیں۔"

اب اس نے روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی، بے ایمانی، اخلاقی گراوٹ اور ٹوٹتے رشتوں اور لوگوں کے موضوع پر بولنا شروع کیا، زمانے کی خبر لے ڈالی۔ میں سوچتا رہا کہ دن بھر عدالت میں بولنے والے اور بے وقت مذاق کرنے والے مظہر کی اور اس کی بیوی کی اپنے گھر میں کیسے گزرتی ہوگی۔ دونوں بولنے والے تھے۔ سنتا کون ہوگا۔ بیوی ہر بات میں شکایت کا کوئی پہلو تلاش کرنے والی، تقدیر سے، زمانے سے اور حالات سے شاکی، ہر چیز سے نالاں۔ شوہر اس کے بالکل برعکس، بے وقت ہنسنے والا، ہر سنجیدہ بات میں کوئی غیر سنجیدہ پہلو نکالنے والا، بے فکر اور خوش باش۔ مگر کمال یہ تھا کہ ہم نے کبھی انہیں لڑتے نہیں دیکھا تھا۔ نہ بیوی نے شوہر کو برا کہا تھا نہ ہم نے مظہر کے منہ سے بیوی کے خلاف کچھ سنا تھا۔ عادات اور مزاج کے اعتبار سے تو ان میں کوئی بھی بات مشترک نہ تھی مگر زندگی کی گاڑی چل رہی تھی اور ہر سال ایک اسٹیشن آتا تو پیچھے ایک جنکشن۔ نہ ابھی تک کسی نے کانٹا بدلا تھا نہ گاڑی رکی تھی۔

دس بجے کے بعد اس نے ہمیں سونے کی اجازت دی مگر الگ الگ کمروں میں۔ "رابعہ! تم اس بیڈ روم میں چلی جاؤ۔ سکندر! تم ادھر۔ میں اب جا رہی ہوں گھر۔ بچوں نے میدان جنگ بنا رکھا ہوگا۔ نوکروں کے قابو میں کہاں آتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا۔"

میں نے کہا "ہم نہیں کھائیں گے۔ شام تک سونے کا ارادہ ہے۔"

"اچھا تو پھر شام کو انہی کے ساتھ آ جانا۔ وہ کہہ گئے تھے کورٹ سے آج سیدھے ادھر آئیں گے۔ آفس کی چھٹی کریں گے۔"

"آپ کیسے جائیں گی۔ میں چھوڑ آؤں؟" میں نے کہا۔

"ارے نہیں بھیا۔ میں ٹیکسی پکڑوں گی۔ عادت ہے مجھے اکیلے ہر جگہ آنے جانے کی۔ انہیں کہاں فرصت ملتی ہے۔ صبح سے رات تک۔ آفس سے بھی آتے ہیں تو کیس کی فائلیں ساتھ ہوتی ہیں۔ موکل گھر پر بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ سب مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔"

اس نے ایک طویل تقریر میں بتایا کہ سودا سلف لانے سے نمٹانے تک، ٹکٹ تک سب وہ اکیلی کیسے کرتی ہے۔ جب وہ رخصت ہو گئی تو میں نے دروازہ بند کر کے سکون کا سانس لیا۔

"کتنی اچھی لگ رہی ہے یہ خاموشی۔" میں نے آنکھیں بند کر کے کہا "کسی عورت کا شوہر یا تو بہرا ہونا چاہیے یا مظہر جیسا، کمال والا، چکنا گھڑا جس پر کسی بات کا اثر ہی نہ ہو۔ بولتی ہے تو بولتی رہے۔"

رابعہ نے کہا "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ مظہر کے سامنے اسے بولنے کا موقع بھی نہیں ملتا ہوگا۔ ہر بات کو وہ مذاق میں اڑا دیتا ہوگا۔ وہ خاموش بیٹھنے والا کہاں ہے۔"

"رابعہ! تم سو جاؤ۔ کاجل تو آنے سے پہلے ہی سو گئی تھی۔"

"اور تم کیا کرو گے؟" وہ بولی "تم بھی سو جاؤ۔ رات بھر کے تھکے ہوئے ہو۔"

میں نے کہا "تھکن سے زیادہ مجھے غالب کی فکر ہے۔ میں سوچ رہا ہوں اخبار کے دفتر فون کر کے اس کے کسی پرانے ساتھی سے بات کی جائے۔"

"تم جانتے ہو کسی کا نام؟" رابعہ بولی۔

فون اسی کمرے میں تھا۔ میں نے انکوائری سے اخبار کا نمبر مانگا۔ نمبر آسانی سے مل گیا۔

"مجھے نیوز روم میں......"

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی آپریٹر نے کہا "نیوز روم میں اس وقت کوئی نہیں ہے۔ شام کو آتے ہیں سب۔" اور فون بند کر دیا۔

میں نے پھر نمبر ملایا "یار! اتنی جلدی میں کیوں ہو۔ میگزین میں تو ہوگا کوئی۔ ریڈیو انچارج..."

"صوفی صاحب سے ملا دوں؟"

میں نے کہا "صوفی، ملا کسی سے بھی بات کرا دو۔"

چند سیکنڈ کے بعد کسی نے کہا "صوفی۔"

میں نے کہا "صوفی صاحب! آپ کے اخبار میں ایک صاحب تھے مرزا غالب جن کے بارے میں آج خبر چھپی ہے۔"

"اچھا پھر میں کیا کروں؟ کیا خبر غلط ہے؟ غلط ہے تب بھی نیوز ڈیسک سے پوچھو۔ میرا کام نہیں ہے۔" اس نے بھی فون بند کر دیا۔

میں نے جھنجلا کے کہا "اس حوالدار... ہر شخص آدم بیزار لگتا ہے۔ کسی کو شرافت سے پوری بات سننے کی عادت نہیں یا فرصت نہیں۔"

میں نے ریسیور رکھ کر سوچا اور تیسری بار نمبر ملا کے کتابت کا شعبہ مانگا۔ ریسیور جس کاتب نے اٹھایا، وہ خاصا معقول اور مہذب آدمی ثابت ہوا۔

میرے سوال پر اس نے فوراً کہا "جی بالکل ہوتے تھے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ یاروں کا یار تھا۔"

میں نے کہا "اس کے بارے میں تو آج آپ نے ایک خبر لگائی ہے۔"

"اچھا! کیا خبر ہے؟ کون سے صفحے پر ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔"

میں نے کہا "ضرور دیکھیے۔ اس سے پتا نہیں چلتا کہ یہ خبر کس نے دی تھی۔ آپ کے نمائندے نے یا کسی خبر رساں ایجنسی نے۔ میں ان کا بڑا بھائی بول رہا ہوں۔"

"میں ابھی معلوم کر کے بتاتا ہوں۔ کل رات کی ردی نکالنی

www.paksociety.com

پڑے گی۔ اے پی پی یا پی پی آئی کی خبر ہوگی تو ٹیلی پرنٹر سے آئی ہوگی۔ ہمارے نمائندے نے دی ہوگی تو فون پر کسی سب ایڈیٹر کو لکھوائی ہوگی۔"

اس نے خبر دیکھنے کے بعد کہا "آپ ایسا کریں، دس منٹ بعد پھر زحمت کریں۔"

"زحمت تو میں آپ کو دے رہا ہوں۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

دس منٹ بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ خبر نوشہرہ کے نمائندۂ خصوصی نے دی تھی۔

میں نے کہا "نوشہرہ کے نمائندۂ خصوصی کا نام اور فون نمبر کہیں سے مل سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔ آپریٹر بتا دے گا۔"

"ایک بات اور۔ آپ کے ادارے میں اس کا قریبی دوست کون تھا؟"

"ویسے تو وہ سب کا دوست تھا مگر آج کل جو میگزین انچارج ہیں، صوفی صاحب۔ وہ اس کے خاص دوست تھے۔"

"صوفی صاحب۔ وہ تو عجیب آدمی ہیں۔ بات کیا کرتے ہیں کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔"

وہ ہنسا "بظاہر ایسا ہی لگتا ہے مگر دل کے بہت اچھے ہیں۔"

میں نے ہیڈ کاتب کا شکریہ ادا کر کے پھر صوفی صاحب سے بات کی "دیکھیے جناب! میں مرزا غالب کا ایک بہت عزیز دوست بول رہا ہوں۔ سکندر بخت۔"

"کون؟ تم مجھ سے مذاق کرتے ہو۔" وہ بگڑ گیا۔

"صوفی صاحب! میں حلفیہ عرض کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا غالب سے کہ آپ اس کے خاص دوست تھے؟"

اس کا لہجہ بدل گیا "وہ تو ٹھیک ہے لیکن سکندر یہاں کہاں۔"

میں نے کہا "صوفی صاحب! میں واپس پہنچ گیا ہوں۔ محسن مجھ سے پہلے آ گیا تھا اور غالب پیچھے رہ گیا تھا۔"

"اچھا دیکھو ایسی باتیں فون پر کرنے کی نہیں ہوتیں۔" صوفی بولا "تم کیا کر رہے ہو؟ اخبار کے دفتر کیوں نہیں آ جاتے۔"

"میں دن دہاڑے باہر نکلنا مناسب نہیں سمجھتا فی الحال۔ تفصیل بعد میں عرض کروں گا۔"

"اچھا کہاں سے عرض کر رہے ہو۔ میں آ جاتا ہوں۔"

میں نے اسے منظر کا نمبر دیا "آپ ضرور آئیں مگر ابھی نہیں۔ میں ایک کام آپ کے سپرد کر رہا ہوں جس کا تعلق غالب کی ذات سے اور اس کے تحفظ سے ہے۔ یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں صوفی صاحب۔"

"صاحب نہیں، میں صرف صوفی ہوں۔" وہ بولا۔

"صوفی! وہ خبر نوشہرہ کے نمائندۂ خصوصی نے دی ہے۔ تم اس سے رابطہ کر سکتے ہو، اسی وقت؟"

"ہاں۔ وہ شوقیہ فنکار ہے۔ ہر اخبار کا نمائندہ بننے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دفتر میں تین چار فون لگوا رکھے ہیں۔ اس کی حیثیت وہاں ڈپٹی کمشنر سے کم نہیں۔" صوفی بولا "مگر اپنا غلام ہے ہم اس کی خبریں نہ لگائیں تو اس کی اکڑفوں کیسے قائم رہے گی۔"

میں نے کہا "پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ فون پر اسے کہیں کہ وہ اسی وقت سی ایم ایچ جائے۔ ظاہر ہے اسے کوئی نہیں روک سکتا اور ملٹری اسپتال کے ڈاکٹر بھی اسے جانتے ہوں گے۔ وہ کوئی ایسا بندوبست کرے کہ غالب اور نازو سے ملاقات پر مکمل پابندی عائد ہو جائے، یہ بہت ضروری ہے۔ خبر کی اشاعت سے ان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔"

"کیسا خطرہ.... کس سے؟"

میں نے کہا "یہ فون پر نہیں بتایا جا سکتا۔ آپ وہ کریں جو میں نے کہا ہے۔ غالب یا نازو کا بھائی بن کے آئے کوئی یا باپ بن کے، ڈاکٹر صاف انکار کر دیں۔ انہیں آئی سی یو میں منتقل کر دیں یا کہیں اور۔ ان کے لیے یہ مشکل نہیں ہوگا۔"

"میں ابھی بات کرتا ہوں۔ اپنے نمائندے سے بھی اور سی ایم ایچ کے کمانڈنٹ سے بھی۔"

میں نے کہا "صوفی! تم جانتے ہو نا اس کے دشمن کون تھے؟"

"ہاں، بہت اچھی طرح۔" صوفی طنز سے بولا۔

"وہ ایسے مکار لوگ ہیں کہ میرا نام لے کر بھی اندر پہنچنے کی کوشش کریں گے یا محسن کا نام لے کر۔ ڈاکٹر عام طور پر اتنا غور نہیں کرتے اور پیرا میڈیکل اسٹاف بھی وہاں سخت ڈسپلن کا پابند ہوتا ہے۔ مگر رابعہ کی ماں کو انہی کے ایک آدمی نے سول اسپتال کے وارڈ میں گھس کے مار ڈالا تھا۔ سول اسپتال میں سفید گاؤن اور اسٹیتھوسکوپ کے ساتھ کوئی بھی جا سکتا ہے۔ سی ایم ایچ میں ایسا نہیں ہوگا۔ مگر صوفی، یہ دنیا ہے۔ وہ سو فرشتوں میں ایک شیطان تلاش کر لیتے ہیں اور اسے آلۂ کار بنا سکتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا، سب سمجھ گیا۔ میں پکا بندوبست کرتا ہوں، بالکل فول پروف۔" صوفی بولا "ان کے لیے الگ کمرا ہو جائے گا، گارڈ ہوگی۔ مخصوص ڈاکٹر اور وارڈ بوائے، ان کے سوا طرم خان کا سالا بھی اندر نہیں جائے گا۔ میں انہیں خبردار کر دوں گا کہ ایسی ویسی بات ہوئی تو میں انہیں بخشوں گا نہیں۔ ساری ذمے داری ان پر ڈال دیتا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں رحمان صاحب آ جاتے ہیں۔"

"کون رحمان صاحب؟"

"عجیب جاہل آدمی ہو یار۔ اخبار کے مالک اور کون۔ ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ سروسز سے بات کر لیں گے۔ ارے ہم تو انہیں اٹک فورٹ کے اندر رکھوا سکتے ہیں۔ شکاری بندوق کیا، توپ لاد ٹینک لے کر بھی آ جائیں تو نزدیک نہیں پھٹک سکتے۔"

"ہیں صوفی! میں سمجھ گیا تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ اب دیر مت کرو۔ میں پھر بات کروں گا تم سے۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

رابعہ نے ساری بات سنی تھی "یہ بہت اچھا کیا تم نے۔ اب ان کا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"ہیں، دعا کرو شکاری پہلے وار نہ کر جائیں۔" میں نے کہا "مجھے اطمینان تب حاصل ہوگا جب صوفی بتائے گا کہ غالب اور نازو کے لیے خطرہ نہیں ہے۔"

"اب اکرام کو بھی اطلاع کر دو۔ وہ گھر پر ہی ہوگا۔"

"رائٹ۔" میں نے پھر ریسیور اٹھایا اور کافی دیر کوشش کرنے کے بعد اکرام شیخ کا نمبر ملانے میں کامیاب ہو گیا۔

"اکرام، مبارک ہو۔ تمہاری بہن دریافت ہو گئی ہے۔"

"کہاں؟ کوئی اطلاع ملی ہے یا...؟" وہ مضطرب ہو کے بولا۔

"خبر آئی ہے اخبار میں۔ سنو۔" میں نے کہا اور اسے پوری خبر پڑھ کے سنا دی۔ پھر یہ بھی بتا دیا کہ ہم نے صوفی کے ذریعے ان کی حفاظت کے لیے کیا بندوبست کیا ہے۔

"ویری گڈ! بہت اچھا سوچا تم نے۔ اب مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟ نوشہرہ چلا جاؤں، خود مل لوں۔"

میں نے کہا "کوشش کر کے دیکھو۔ گرفتار ہو جاؤ گے۔"

"اچھا میں لاہور آ جاتا ہوں۔ اب میرا یہاں کیا کام ہے۔ میں آج ۲ بجے کی نائٹ کوچ سے پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے کہا "تھوڑا سا انتظار کرو۔ مجھے صوفی سے معلوم ہو جائے کہ اس نے بات کر لی ہے۔ پھر میں تم سے بات کروں گا۔"

"سکندر! یہاں انتظار کرنے کا کیا فائدہ؟ خبر تو مل گئی۔"

میں نے کہا "یار، فرض کرو وہ نوشہرہ سے کراچی کے لیے چل پڑے ہوں۔ اسپتال سے فرار ہونا آسان نہیں ہوتا مگر ان کے لیے ناممکن نہیں۔ غالب تو نازو کو کہتا ہی بھوت کی بچی ہے۔ مگر وہ خود بھوت سے کم ہے کیا۔ تم نہ ملے کراچی میں تو وہ کہاں جائیں گے۔ ان تک ہمارا پیغام پہنچ جائے پھر تم آ جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہیں جیسے ہی کوئی بات معلوم ہو مجھے بتا دینا۔ میں ٹیلی فون کے پاس بیٹھا رہوں گا اور ہاں... محسن اور گل کی بھی کچھ خبر ہے؟"

میں نے کہا "نہیں، ابھی تک منظر سے تفصیلی بات نہیں ہوئی۔ ہم یہاں پہنچے تو وہ کورٹ جا رہا تھا۔ اب شام کو ملاقات ہوگی۔"

میں کچھ دیر صوفی کے فون کا انتظار کرتا رہا اور لیٹ کر جاگنے کی کوشش کرتا رہا مگر تھکن اور نیند نے میری کوشش کو شکست دی۔ نہ جانے کب میں سو گیا۔ رابعہ بھی حقیقتاً سو گئی تھی ورنہ وہ کوئی بات کرتی تو شاید میں جاگتا رہتا۔

میری آنکھ شام کو منظر کے غل غپاڑے سے کھلی "اے بھائی! زندہ ہے تو اٹھ جا، مر گیا ہے تو بتا دے کیسے مرا۔"

میں نے اٹھتے ہی دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھا "چار.... چار بج گئے۔"

"چار تو روز بجتے ہیں۔ تیری صورت پر بارہ کیوں بج گئے۔"

میں نے کہا "اف، صوفی نے فون کیا ہوگا شاید۔ فون تو مجھے کرنا تھا۔"

"کون صوفی؟ کیا گل اور محسن کا سراغ لگانے کے لیے صوفی، درویش، قلندر اور فقیر کوئی عمل کریں گے؟"

میں نے اسے صوفی کے متعلق بتایا اور جب ٹیلی فون اٹھانے لگا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا ریسیور غلط رکھا ہوا تھا۔ میں نے بے خیالی میں ریسیور ایسے رکھ دیا تھا کہ لائن ڈس کنکٹ نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس عرصے میں کسی نے فون ملانے کی کوشش کی ہوگی تو اسے یہ نمبر انگیج ملا ہوگا۔ اکرام کے پاس یہی نمبر تھا۔ گل اور محسن کو بھی پرانا نمبر ہی معلوم تھا۔ ایسے ہی غالب اور نازو کو منظر کے نئے گھر اور نئے فون نمبر کا علم نہیں تھا۔ ان میں سے کوئی کسی بھی وقت رابطے کی کوشش کرتا تو نمبر مصروف تھا۔

میں نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے صوفی کا نمبر ملایا "ہیلو، صوفی صاحب سے بات کراؤ۔"

"صوفی صاحب چلے گئے۔"

"چلے گئے! کہاں چلے گئے؟" میں نے چلا کے کہا۔

"دیکھیے جناب، میں ٹیلی فون آپریٹر ہوں، ان کا سیکرٹری نہیں کہ وہ جہاں جائیں مجھے بتا کے جائیں۔"

"او یار، میگزین سیکشن پانچ بجے تک تو کھلا رہتا ہوگا۔ کسی دوسرے سب ایڈیٹر سے بات کرا دو۔ شاید وہ کسی کو بتا کے گئے ہوں۔"

لیکن وہاں کوئی نہیں جانتا تھا کہ صوفی صاحب کہاں گئے۔ کسی نے کہا کہ ایک انٹرویو کے لیے گئے ہیں۔ دوسرے نے بتایا کہ رحمان صاحب نے کوئی اسپیشل اسائنمنٹ دی ہے۔ وہ آ بھی سکتے ہیں، نہیں بھی آئیں گے۔ "اخبار کے دفتر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کلرکی نہیں ہے کہ بندہ سیٹ پر ضرور ملے۔" ایک بدتمیز شخص نے کہا۔

میں نے مایوس ہو کے فون رکھ دیا۔ اب امید کا آخری سہارا یہی تھا کہ صوفی خود کہیں سے فون کرے یا مجھ سے ملنے آ جائے۔ اب رابعہ بھی اٹھ گئی تھی مگر ساتھ والے کمرے میں کامل اور کلیم اللہ گہری نیند میں تھے۔

"کھانا آ گیا تھا دن میں؟" منظر نے پوچھا

میں نے کہا "کھانا ہم خاک کھاتے۔ تیری بیوی دماغ کھا گئی۔ بڑی مشکل سے جان چھڑائی اس سے۔ یار! وہ اتنا بولتی کیوں ہے؟"

"دیکھ یار! اب میں اس کو بولنے بھی نہ دوں تو یہ بڑا ظلم ہوگا اس پر۔ وہ پہلے ہی مظلوم ہے۔ اس طرح دل کا غبار نکالتی رہتی

www.paksociety.com

ہے۔"

"تم سنتا رہتا ہے یا بہرا بن جاتا ہے؟"

اس نے کہا "میرے کان میں دیکھو، میل نہیں دکھے اس سوراخ میں سے جھانکو۔ دوسری طرف نظر آتا ہے نا۔ میں ایک کان سے سنتا ہوں تو دوسرے سے خود بخود نکل جاتا ہے۔ بیچ میں دماغ میں نہیں ٹھہرتا۔"

رابعہ نے کہا "محسن کا وہ خط کہاں ہے؟"

منظر نے بریف کیس کھولا اور ریویدر کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کے رابعہ کو پیش کیا۔ "دیکھو تو، خالص اردو میں لکھا ہوا ہے۔"

رابعہ نے وہ کاغذ مجھے پکڑا دیا مگر اس میں وہی کچھ تھا جو منظر بتا چکا تھا۔ یہ کسی کاپی سے پھاڑا ہوا صفحہ تھا اور تحریر کے نقوش باقی رہ گئے تھے مگر اس میں شک کی کوئی بات نہ تھی کہ وہ محسن کے دستخط تھے اور اسی کی تحریر۔

"محمد کردی محسن نے" میں نے پھر غصے سے کہا "بلا وجہ کا سسپنس پیدا کیا ہے۔ چند سطریں اور لکھ دیتا کہ کہاں جا رہے ہیں اور کیوں۔ اس سے تو بہتر تھا کچھ بھی نہ لکھتا۔ ہم تلاش کرتے رہتے۔"

اچانک فون کی گھنٹی پھر بجی۔ میں نے لپک کے ریسیور اٹھایا "کون بول رہا ہے؟"

میں نے صوفی کی آواز پہچان لی "صوفی یار، سوری۔ میں سو گیا تھا۔"

"ریسیور نیچے رکھو گے؟" صوفی نے کہا "محاورے کو اب بدل دینا چاہیے۔ گدھے گھوڑے بیچ کر نہیں، ٹیلی فون اور کال بیل بیچ کے سونا زیادہ مناسب ہے۔ میں کب سے کوشش کر رہا تھا۔"

میں نے کہا "کچھ پتا چلا؟"

"ہاں بھئی۔ بات تو ہو گئی مگر بات بنی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میری اپنے نمائندے سے بات ہوئی۔ اس نے کہا کہ میں خود جا کے دیکھتا ہوں، آپ فکر نہ کریں۔ میں نے کہا کہ مجھے گھر پہ بتانا اس وقت بھی گھر سے بول رہا ہوں میں۔ تم نے رات فون کیا تھا؟"

"ہاں۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا تمہارا۔"

"میں جان بوجھ کے کسی کو بتائے بغیر بھٹک آیا تھا۔ اس نمائندۂ خصوصی نے دو بجے فون کیا اور بتایا کہ وہ نوشہرہ کے سی ایم ایچ میں تو نہیں ہیں۔"

"مگر خبر دینے والا تو وہ خود تھا۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"ہاں۔ خبر غلط نہیں تھی۔" صوفی بولا "تمہارے دوستوں کو وہاں سے ڈسچارج کر دیا گیا ہے۔"

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صحت یاب ہو گئے تھے؟ اتنی جلدی۔"

"حالت زیادہ خراب نہیں ہو گی ان کی۔ ریکوری کے لیے دن کافی ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ انہیں خود ان کے اصرار پر ڈسچارج کیا گیا ورنہ ڈاکٹر چاہتے تھے کہ وہ دو دن اور آرام کریں۔ انہوں نے بڑا اچھا بندوبست کیا تھا۔ آفیسرز وارڈ میں رکھا تھا۔"

"کب ڈسچارج کیا گیا تھا انہیں؟"

"آج صبح دس بجے۔ یعنی اس وقت جب تم مجھے فون کر رہے تھے۔" صوفی بولا "مگر ایک بات اور ہے۔ اسپتال سے وہ اکیلے نہیں گئے، کوئی آیا تھا انہیں لینے کے لیے۔ بظاہر تمہارے دوست بے خبر نہیں تھے۔ اس نے یہی کہا تھا کہ وہ غالب کا بھائی ہے جسے ذرا سی دیر ہو گئی۔"

"دوسرا کوئی انہیں لے جانے والا کون تھا؟ اس کا نام پتا؟ حلیہ۔ کسی نے کچھ پوچھا، دیکھا؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔ جب غالب اور نازو نے اعتراض نہیں کیا اور ہنسی خوشی اس کے ساتھ گاڑی میں چلے گئے۔"

"کون سی گاڑی تھی؟ گاڑی کا نمبر کیا تھا؟"

"یار، یہ کون یاد رکھتا ہے جب ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔"

میں نے کہا "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ہنسی خوشی گئے تھے؟"

"بابا، وہ ملٹری اسپتال تھا۔ دروازے پر بھی پہرا ہوتا ہے۔ ہر آنے جانے والے کو نام پتا لکھوانا پڑتا ہے۔ بتانا پڑتا ہے کہ وہ کون ہے۔ وہاں سے کسی کو اغوا نہیں کیا جا سکتا گن پوائنٹ پر۔"

"یہی تو میں پوچھ رہا تھا کہ اس نے کیا نام پتا لکھوایا تھا۔ تمہارے اس خصوصی احمق نمائندے نے کیا معلوم کیا آخر؟ یہ سنا کہ غالب کو بھائی لے گیا اور فرض کر لیا کہ غالب ہنسی خوشی گیا تھا چنانچہ اس نے باقی انکوائری کی ہی نہیں۔"

"یار، وہ نمائندۂ خصوصی ہے کوئی شرلاک ہومز نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ وہ احمق ہے مگر اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی مطمئن ہو جاتا۔ مجھے کیسے شک ہو سکتا تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ہے۔ اسپتال میں غالب کا بھائی بن کے پہنچنے والے نے اپنا نام کبیر خان بتایا تھا۔"

میں اچھل پڑا "کیا کبیر خان؟ کوئی عورت بھی تھی اس کے ساتھ؟"

"ہاں۔ اس کی بیوی۔ مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے جلا کے کہا "صوفی لعنت ہو تم پر اور تمہارے نمائندۂ خصوصی پر۔ جو بات کام کی تھی وہ تم نے آخر میں بتائی۔"

پھر میں نے ریسیور رکھ کے کہا "رابعہ! غالب اور نازو کو وہ لے گئے۔ محسن شیروانی اور گل۔"

"پھر وہی شیروانی۔ سالا لنگوٹی چور۔" منظر بولا "اور اس کی زوجہ گل۔ اللہ محفوظ رکھے اس کی نزاکت سے۔ کیا الٹے نام رکھ لیے ہیں دونوں نے۔"

"کبھی اپنے نام اور اپنی شکل پر غور کیا ہے؟" میں نے کہا، "منظر کی اولاد کون سا منظر ہے تیرے چہرے پر۔ کریہہ المنظر۔"

"وہ نوشہرہ کیسے پہنچ گئے؟" رابعہ کچھ سوچ رہی تھی۔

"[illegible]" میں نے کہا۔

"مگر اتنی جلدی اور دس بجے صبح۔" رابعہ بولی "اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ وہ نوشہرہ میں ہی تھے یا آس پاس کہ اخبار دیکھتے ہی پہنچ گئے۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "رابعہ! خدا نے تمہیں عقل بھی بڑی بے صورت کے ساتھ دی۔ جو ایک محیر العقول واقعہ ہے۔"

"محیر العقول واقعہ تو یہ بھی ہے کہ خدا نے رابعہ کے مقدر میں مجھے لکھ دیا حالانکہ زمانے میں میرے جیسے مردانہ وجاہت اور عقل و دانش کے پیکر موجود تھے۔" منظر نے دانت نکال کے کہا۔

میں نے کہا "غالباً وہ پشاور میں تھے۔ وہاں سے نوشہرہ تک ایک گھنٹے کا راستہ ہے۔ کسی اور پاننگ جگہ پر ہوتے تو صبح صبح اخبار کہاں ملتا۔ سوال یہ ہے کہ پشاور وہ کیا لینے گئے تھے؟"

"میرا خیال ہے وہ علاقہ غیر کی جانب فرار ہو رہے تھے۔ زعم اقبال پر عمل کرنے کے لیے کہ 'تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر'۔" منظر بولا۔

رابعہ نے کہا "کیا یہ طے ہے کہ وہ محسن اور گل تھے؟"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ آہستہ آہستہ میری خوشی جھاگ کی طرح بیٹھنے لگی "ایک منٹ میں تم نے دو عقل مندی کی باتیں کر دیں۔ یہ غالباً عالمی ریکارڈ ہو گا۔ میرا یہ نام تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ کوئی بھی استعمال کر سکتا ہے۔"

سب دوستوں کے مل جانے کی خوشی کی جگہ مایوسی نے لے لی۔ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ غالب اور نازو کو لے جانے والے محسن اور گل بھی ہو سکتے تھے اور ہمارے پرانے دشمن بھی جو حالات سے فائدہ اٹھانا اور ہماری کمزوری کو اپنی منہ زوری بنانا جانتے تھے

منظر نے کہا "یار! ایسے رونی شکل بنانے سے کیا بگڑے کام بن جائیں گے۔ چلو اٹھو، اپنا اپنا آستانہ دکھاؤں تمہیں۔ میں آگے چلتا ہوں، تم میری گاڑی میں پیچھے آؤ۔"

رابعہ نے کہا "ابھی تو کاجل سو رہی ہے۔ اسے جگاؤں۔"

"ہاں! اس نئی مہمان کو میں بالکل بھول گیا تھا۔ اس سے میرا تعارف بھی کراؤ اور اتنی دیر میں۔"

جتنی دیر میں رابعہ اور کاجل نے تیاری کی، میں نے منظر کو کاجل کے بارے میں تھوڑا بہت بتا دیا۔ سوائے اس کے کہ سابق سب انسپکٹر پولیس سید اکرام شیخ نے ہمارے آنے سے پہلے ہی محبت کا [illegible] کاجل کو اسیر کر لیا ہے۔

وہ ہر بات تفصیل سے سننا چاہتا تھا مگر اس کے لیے لمبی فرصت درکار تھی اور ذہنی طور پر میں پرسکون نہیں تھا۔ کبھی مجھے خیال آتا کہ صوفی کو فون کروں اور اس سے پوچھوں کہ کیا گل اور محسن کو اس نے زبردستی مہمان بنایا ہے لیکن وہ تحریر مجھے روک لیتی تھی۔ اگر وہ محسن سے زبردستی کچھ لکھواتا تو محسن کی تحریر بگڑی دکھائی دیتی۔ وہ اپنے دستخط یوں بدل دیتا کہ ہمیں شک ہو جاتا۔ تاہم یہ بھی حقیقت تھی کہ ان سے پہلے ہی حاجی عبداللہ کراچی پہنچا تھا اور یہ ابھی تک کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا کھنڈر میں نظر آنا محض ایک اتفاق تھا یا ایک سازش کا انکشاف۔ کاروبار کے سلسلے میں وہ کہیں بھی جا سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس نے سائے کی طرح ہمارا پیچھا کیا ہو مگر ہمیں علم نہ ہوا ہو۔ میں جانتا تھا کہ [illegible] جیسے عیار اور مکار دشمن کو دھوکا دینا کتنا مشکل کام ہے۔ الٹا یہ ہو سکتا تھا کہ میرے سوال پر وہ جھوٹ کا جال پھیلا دے اور کہے کہ ہاں تمہارے دوست میرے پاس ہیں۔ تم آ کر لے جاؤ۔ یہی چکر مجھے حاجی عبداللہ بھی دے سکتا تھا۔

جب ہم روانہ ہوئے تو غلطی سے کاجل اس گاڑی میں بیٹھ گئی جس میں ہم کراچی سے لاہور پہنچے تھے۔ کلیم اس کے ساتھ رہا۔ بعد میں اس کی ڈرائیونگ منظر نے سنبھال لی تو میرے ساتھ رابعہ رہ گئی۔ صدر سے دھرم پورے تک ہم آگے پیچھے چلتے گئے۔ منظر کی گاڑی شاید پچاس گز آگے تھی اور میری رش میں تھی۔ ریلوے کراسنگ سے اس کی گاڑی گزری تو اچانک پھاٹک بند ہو گیا۔ رات کا وقت تھا۔ منظر نے کاجل سے باتیں شروع کر دی تھیں کہ اسے پیچھے دیکھنے کا خیال نہیں آیا اور وہ اس یقین کے ساتھ چلتا گیا کہ ہم پیچھے آ رہے ہوں گے۔

جب ریلوے پھاٹک پھر کھلا تو ہم وہاں دونوں طرف جمع ہو جانے والی ٹریفک کے ریلے میں آگے بڑھے (مجھے منظر نے بعد میں بتایا کہ کچھ دور جا کے وہ لوٹا تو پھاٹک بند ملا تھا اور جب ٹریفک ایک ساتھ رواں ہوئی تو ہیڈ لائٹس کی چکا چوند میں وہ ہمیں نہ دیکھ سکا تھا اور ہم اسے نہ دیکھ پائے تھے۔ نتیجہ یہ کہ وہ صدر کی طرف نکل گیا تھا اور ہم گڑھی شاہو پہنچ گئے تھے)

"یہ منظر کہاں نکل گیا؟" میں نے پریشانی سے کہا "بے وقوف آرٹی منہ اٹھا کے چلتا گیا، پلٹ کے ہماری طرف دیکھا تک نہیں۔"

"اب ہم کہاں جائیں؟" رابعہ بولی۔

"سالے کو تھوڑا پریشان ہونے دو۔ اس کا نیا فون نمبر تو ہے ہمارے پاس، تھوڑی دیر بعد گھر سے بلائیں گے۔" میں نے کہا اور گاڑی کو بائیں جانب موڑ لیا۔

"چلو ٹھیک ہے مگر یہ ہم کدھر چل پڑے؟" رابعہ بولی۔

"تمہارے گھر چلتے ہیں۔ ذرا تمہاری بہن سے مل لیں۔ دیکھیں کون چندے آفتاب ہے کون چندے ماہتاب۔"

غالباً خود رابعہ کے دل میں بھی یہ خواہش موجود تھی۔ وہ اپنے پرانے گھر پر غاصبانہ قبضہ کرنے والوں کو دیکھنا چاہتی تھی کہ آخر وہ کون ہیں اور زمین کی اصلی مالک کو ڈھونڈ پا کے ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس منظر کی گاڑی تھی اور چاندنی بیگم یا غلام محمد

www.paksociety.com

معروف گولا بُنڈو والا پہلوان میں سے کوئی بھی ہمیں نہیں پہچانتا تھا۔

میں نے گاڑی کو باہر روک لیا "ابھی اس کو اپنا نام مت بتانا۔ میں اور تم مسٹر اور مسز منظر ہیں۔"

"تم بتاؤ گے کہ تم عبدالودود منظر ایڈووکیٹ ہو؟ اور کیا کہو گے کہ کیوں ملنے آئے ہو؟" رابعہ بولی۔

"بس تماشا دیکھو" میں نے کہا اور کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ ایک چوکیدار ٹائپ شخص نے چھوٹا گیٹ کھول کے جھانکا اور کار کو دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ میرا نام سن کر وہ اندر گیا اور تھوڑی دیر میں لوٹ آیا۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے ہم ایک شاہانہ قسم کے ڈرائنگ روم میں پہنچے تو مجھے رابعہ کا پرانا گھر یاد آیا۔ اس نئے قصر عالی شان کی پُرتکلف فضا میں اپنائیت کی وہ خوشبو دم توڑ چکی تھی جو اس پرانے گھر کے درودیوار سے نکل کے خوش آمدید کہتی تھی۔ وہ زمین اس محل کے بوجھ تلے اس طرح کراہ رہی تھی جیسے کسی طاقت کے نشے میں بدمست وڈیرے کے ہاتھوں بے آبرو ہو جانے والی غریب مزارع کی لڑکی۔ صرف میں اس کی خاموش کراہ کو سن سکتا تھا یا رابعہ اس کے مجبور آنسو دیکھ سکتی تھی۔ وہ ظلم کے خلاف فریاد کناں تھی اور انصاف مانگتی تھی۔ رابعہ افسردہ تھی۔ اس جگہ یادوں کے مدفون خزانے تھے جن سے اچانک اس کا جذباتی ناتا ٹوٹ گیا تھا اور وہ اپنی زندگی کے ادھورے پن کا شکار ہو گئی تھی۔

میں نے غور سے آرائش کے اسباب کو دیکھا۔ ان سے دولت مندی کا غرور اور اپنی قوت خرید کا مظاہرہ کرنے والا 'ذوق جمال' سے یکسر عاری تھا۔ آرائش کا حسن دنیا بھر کی قیمتی چیزوں کو ایک ہال میں ڈھیر کر دینے سے نہیں پیدا ہوتا۔ اور ایسا عام طور پر وہی کرتے ہیں جن کے پاس دولت اچانک آجاتی ہے مگر اس کو خرچ کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔

میں حیران ہو رہا تھا کہ آخر کس بل بوتے پر کسی نے پرائی زمین پر اتنے کروفر کے ساتھ ایسی عالی شان عمارت کھڑی کر دی۔ اس نے کیسے فرض کر لیا کہ اس کا قبضہ برقرار رہے گا اور قانون کی طاقت کو اس کی زبردستی شکست دے سکے گی۔ مال و اسباب تو خیر ہٹایا جا سکتا ہے مگر تعمیر پر اس نے جتنی دولت لٹا دی' اس کا زیاں تو ہوا۔ شاید کسی نے اسے دھوکا دیا اور اس زمین کو اپنا بتا کے جعلسازی سے بیچ دیا۔ حرام کی دولت کمانے والے احمق بہرحال نہیں ہوتے۔ وہ عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ہی ہوشیار اور ذہین ہوتے ہیں۔ وہ اپنی دولت کو بھی چھپا کے رکھتے ہیں اور قانون کو دھوکا دیتے ہیں۔ قانون کو چیلنج نہیں کرتے۔ یہاں تو یہ محل سرعام قانون کا منہ چڑا رہا تھا کہ کس میں ہمت ہے جو میرے وجود کو غلط ثابت کر سکے؟

رابعہ نے گھڑی دیکھ کے کہا "کیا صاحب خانہ تشریف نہیں رکھتے؟ دس منٹ ہو گئے۔"

"ہم صاحب خانہ کی اجازت کے بغیر اندر قدم رنجہ نہیں فرما سکتے تھے" میں نے کہا۔

"پھر ہمیں انتظار کیوں کرایا جا رہا ہے؟"

"یہ بھی بڑے مگر کم ظرف لوگوں کی ایک ادا ہوتی ہے۔ وہ یوں بھاگ کے چلے نہیں آتے جیسے بالکل فارغ بیٹھے تھے۔ تزک و احتشام کے ساتھ تشریف لاتے ہیں تو ظاہر یہ کرتے ہیں کہ بے حد مصروف تھے۔"

"ممکن ہے کوئی چھپ کے دیکھ رہا ہو۔"

"اندر بلانے کے بعد؟" میں نے نفی میں سر ہلایا مگر بات سے مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ استقبال ایک چال نہ ہو جو ہمیں گرفتار کر کے پولیس کے حوالے کرنے کے لیے ہو؟"

رابعہ نے گھبرا کے کہا "پھر بیٹھے کیوں ہو' نکل چلو۔"

میں نے کہا "تم نے سنا نہیں' آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے' جانا دوسرے کی مرضی سے۔ اب پنگا لے لیا تو لے لیا۔"

"منظر کو پریشان کرنے کے لیے خود کو مصیبت میں ڈالنا' جواب نہیں اس عقلمندی کا۔"

اچانک پردہ ہلا اور ایک شخص اندر آ گیا۔ میں نے کسی تردد کے بغیر اسے پہچان لیا۔ وہ اب پہلوان نہیں تھا مگر گولا ضرور تھا۔ اس کا سر چمک رہا تھا اور اس کے کلین شیو چہرے کے مقابلے میں کچھ چھوٹا تھا۔ "سر بڑا سردار کا" یہ تو میں نے سنا تھا مگر اکثر دیکھا تھا کہ چھوٹے سر والے عقل و ذہانت میں کم تر تھے۔ غلام محمد کا جسم ثقل تقل کرتے گوشت کا بے ہنگم ڈھیر تھا۔ اکھاڑا چھوڑ دے مگر خوراک پرانی رکھے تو اس کا حشر ایسا ہی ہوتا ہے۔

غلام محمد کے پیچھے رابعہ کی منہ بولی بہن چاندنی بیگم تھی۔ بلاشبہ اسم بامسمیٰ تھی۔ اس کے آتے ہی گھر یا چراغوں میں [illegible] رہی۔ وہ حسن و نفاست اور نزاکت کا ایک دلفریب امتزاج تھی۔ اسے ہیرا منڈی کی کراہیت انگیز فضا سے منسوب کرنا غلط تھا۔

ایسے ڈیل ڈول کے ساتھ گولا بنڈو والا نے جب حلق سے آواز نکالی تو وہ ایسی ہی تھی جیسے توپ کے دہانے سے گولی نکلے۔ انتہائی مضحکہ خیز باریک آواز میں کہا "السلام علیکم' میں غلام محمد ہوں۔ اس گھر کا مالک۔"

وہ ناک میں بھی بولتا تھا چنانچہ پورے محلے میں [illegible] رہتا تھا۔

"یہ تنہا چاندنی بیگم ہیں۔" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا۔ غلام محمد کے چہرے پر سایہ سا آ کے گزر گیا "آپ جانتے ہیں؟"

میں نے کہا "ہاں' دیکھا تو یقیناً ہے۔ کسی محفل میں۔" عام آدمی کے لیے "محفل" بے ضرر سا لفظ ہے۔ مطلب پارٹی کے سوا کچھ نہیں ہوتا مگر ایک طوائف کے لیے محفل "رقص و طرب" کا حوالہ بن جاتا ہے۔

"اب یہ میری بیوی ہیں۔" غلام محمد نے درشتی سے کہا "آپ کو چودھری صاحب نے بھیجا ہوگا؟"

اسے یقیناً غلط فہمی ہوئی تھی مگر میں نے بڑی مشکل سے اپنی حیرت کے اظہار پر قابو پایا "جی۔ اور کون بھیج سکتا ہے۔"

"چودھری دلاور تو میں کہاں تھا...." وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا "مگر آپ اکیلے آتے تو اچھا تھا۔"

چودھری سے اس کی مراد چودھری دلاور ہوگی' یہ میرے خواب و خیال میں نہ تھا۔ پہلی بار تو میں نے اپنے ردعمل کو چھپا لیا تھا مگر دلاور کے نام پر میں تقریباً اچھل پڑا۔ تاہم مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میں نے حیرت کے جذبات کو ناپسندیدگی اور غصے میں بدل لیا۔

"یہ میری بیوی بھی ہے اور سیکریٹری بھی۔ اس کے بغیر میں کہیں نہیں جاتا غلام محمد صاحب۔" میں نے کہا۔

"اچھا' اچھا۔ خفا ہونے کی کیا بات ہے جی۔ آپ کو چودھری صاحب نے بتا ہی دیا ہوگا کہ معاملہ کیا ہے؟"

"زیادہ تفصیل سے نہیں۔" میں نے کہا "کچھ اس زمین پر قبضے کی بات تھی۔"

"کیاں؟" وہ حیران ہو کے بولا "زمین پر قبضاں؟"

میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا اور وہ خطا ہو گیا تھا "آپ مالک ہیں اس محل کے۔ تو یہ زمین......"

"زمین کو کیا ہوا ہے جی؟" چاندنی نے لب کھولے۔

"کچھ نہیں۔ زمین آپ کی ہے۔ آپ بہن ہیں نا رابعہ قاری کی۔" میں نے بات نبھانے کی جدوجہد جاری رکھی "وہ وکیل تھی۔ اس کی واحد وارث آپ تھیں۔ غلام محمد صاحب نے اس پر یہ مکان بنایا آپ کو۔"

"اس میں اچانک شک کی بات کیسے پیدا ہو گئی جی؟" چاندنی نے بڑی ادا سے بالوں کو پیچھے جھٹکا جو پھسل کر چہرے پر آنے کے لیے بیتاب ہو گئے تھے۔

"ہاں۔ یہ کیسی بات شروع کر دی آپ نے۔ مسئلہ تو کچھ اور تھا۔" غلام محمد نے بدتمیزی سے کہا "اور یہ مکان ٹھیک کر کے بنایا۔"

"غلام محمد صاحب! یہ نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔" میں نے کہا "جو چودھری صاحب نے کہا تھا کہ اس پر پہلے بات کر لینا۔ اب یہ مکان سے کون بالکل قانون کے مطابق اس کی تعمیر غلط ہوئی۔"

"تعمیر تو نقشے کے مطابق ہوئی تھی سرکار۔ اور نقشہ قانون کے مطابق ہی پاس ہوا تھا۔" چاندنی نے مسکرا کے کہا۔

"رابعہ کی موت کے بعد" میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ کیا قانون نے آپ کو وارث تسلیم کر لیا تھا؟ وراثت کا سرٹیفکیٹ ہے آپ کے پاس؟ اور یا۔ نہ سرٹیفکیٹ؟"

"بالکل ہے۔ لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں ہم سے؟" چاندنی پریشان نظر آنے لگی۔

میں نے کہا "بات ہی پریشانی کی ہے۔ چودھری صاحب کو کس نے بتایا کہ رابعہ زندہ ہے تو وہ مانتے نہیں تھے۔ میں نے بھی اس اطلاع کو غلط سمجھا تھا مگر...."

"مگر کیاں؟" غلام محمد کا منہ کھل گیا "رابعاں زنداں ہیں؟ کون سالا بولتا ہیں ایساں۔ رات تو زدوں گاں میں اس کیں۔"

میں نے کہا "غلام محمد صاحب! غصے ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ ذرا مجھے کاغذات دکھا دیجیے۔ میری اطلاعات غلط بھی ہو سکتی ہیں مگر کل کو خدانخواستہ رابعہ نمودار ہو جائے تو ہمارے پاس اپنے دفاع کا بندوبست پکا ہونا چاہیے۔"

غلام محمد کی محدود عقل جواب دے چکی تھی اور وہ احمقوں کی طرح مجھے گھور رہا تھا یا چاندنی کی طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے چوری کا مال بیچنے کی کوشش میں پکڑا جانے والا خریدار کو دیکھتا ہے۔

"قسم خداں کی یہ غلط ہوں گا چاندنی۔ تم کاغذات لے آؤیں۔"

چاندنی نے شاخ گل کی طرح لچک کے اٹھنے کی کوشش کی اور پھر ارادہ ترک کر دیا "اف! ہمارا تو سر چکرانے لگا ہے یہ سن کے۔ ذرا تم ہی وہ فائل اٹھا لاؤ ڈارلنگ ہماری خاطر۔"

گولا بنڈو والا واقعی احمق تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ چاندنی اپنے حسن و شباب کی جادوگری سے اس کے حواس پر قابض ہے اور اس سے اپنی بہت زیادہ قیمت وصول کر رہی ہے۔ گولا ریشہ خطمی ہو کے اٹھا اور اندر غائب ہو گیا۔

"وکیل صاحب! اگر یہ سچ ہوا تو؟" چاندنی نے غلام محمد کے جاتے ہی کہا "ہمارا کیا بنے گا؟"

میں نے کہا "دیکھیے چاندنی بیگم! آپ کو فکرمند ہونے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ آپ برا وقت آنے سے پہلے ہی جتنا سمیٹ لیں اچھا ہے۔ اور پھر اپنی دنیا میں لوٹ جائیں۔ ایک دن کرنا تو یہی تھا آپ کو۔ سمجھ لیں وہ دن آ گیا۔ آپ کو قدردانوں کی کمی تو نہیں ہو سکتی۔"

وہ تھوڑا سا مسکرائی "آپ کی دعا ہے۔ ہم تو پہلے ہی مخالف تھے اس معاملے کے مگر چودھری صاحب نے بھی کہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ رابعہ مر کھپ چکی' اس کا والی وارث کوئی نہیں رہا۔"

میں نے کہا "آپ ابھی سے پریشان نہ ہوں۔ آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ رابعہ سچ مچ زندہ ہو کے سامنے آ جائے تب بھی ہم اسے جھوٹا' جعلساز اور پاگل تک قرار دے سکتے ہیں۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ دشمنوں نے شوشہ چھوڑا ہے۔ آپ کے محل پر اصل رابعہ بھی آسانی سے قبضہ نہیں کر سکتی۔ سالوں لگتے ہیں دیوانی مقدمات میں۔ اپیلوں میں عمر گزر جاتی ہے۔"

139

www.paksociety.com

گولا بنڈر والا فائل بغل میں دبائے کسی چپڑاسی کی طرح لگ رہا تھا۔ اس نے فائل میرے سامنے رکھ دی "کھولیں۔ دیکھ لیں اچھی طرح۔"

میں نے فائل کھولتے ہوئے کہا "چوہدری صاحب! ایک کپ چائے ملے گی۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے نہ جانے کیوں۔"

اس نے بُرا سا منہ بنایا مگر میں چاندنی کو واضح اشارہ کر چکا تھا اور وہ ذہین عورت تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ میں اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔

"ہائے جان! ہم تو اٹھ بھی نہیں سکتے۔ جکڑے ہوئے ہیں۔ تم ہی ذرا تکلیف کرو ہمارے لیے۔" چاندنی نے بڑے پیار سے کہا۔

گولا پھر زر خرید غلام کی طرح اندر دوڑ گیا۔

میں نے کہا "چاندنی بیگم! کیا کل آپ اکیلی میرے پاس آفس میں آسکتی ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ آفس کہاں ہے آپ کا؟ ہم آجائیں گے۔"

"بندر روڈ پر امرتسری حلوائی کے سامنے اوپر۔" میں نے کہا "شام کو آجائیے۔"

"شام کو کس وقت؟" اس نے اندر دیکھتے ہوئے کہا۔

"چھ بجے کے بعد۔ رات کے نو بجے تک۔" میں نے کہا۔ "نیچے میرے نام کا بورڈ آپ کو نظر آجائے گا۔ عبدالودود منظر۔"

"جی ... عبدل ... کیا۔ خیر...... ہم تو منظر کہیں گے جی۔" وہ کھلکھلا کے بولی "اتنا مشکل نام کیوں رکھ لیا آخر آپ نے؟"

"بس مشکل پسندی مزاج میں شامل ہے۔ یہ فائل میں لے اڑوں اگر آپ اجازت دیں۔"

"ہم اجازت دیں! اجی وکیل صاحب۔" اس نے ایسے تجربے اور شیریں لہجے میں کہا کہ رابعہ نے خاصا بُرا مانا۔ اس کے انداز بالکل وہی تھے جو کسی بازاری عورت کے ہوسکتے ہیں مگر اس کے انداز میں ایک لطافت اور نفاست بھی تھی جس سے وہ نچلے درجے کی طوائف نہیں رہی تھی اور اشراف و اُمراء کے طبقے میں قدم جما چکی تھی۔ گولا بنڈر والا سے پہلے بھی اس کے پرستار اور اس کے حسن و شباب کے خریدار ایسے ہی لوگ رہے ہوں گے جو خاندانی حسب نسب چاہے نہ رکھتے ہوں مال و دولت سے شرافت اور عزت کی سند حاصل کرکے معاشرے میں معزز و معتبر ہوگئے تھے۔ اس کی نظر میں ہر وقت ایسے حسن پرست اور ہوس کے شکاری رہتے ہوں گے جن کو ضرورت پڑنے پر اپنے حقوق علیحدہ کھلی بنے جاسکتے ہوں۔ غالباً اس فہرست کے آخر میں اس نے میرا نام لکھ لیا تھا۔

گولا بنڈر والا ٹرے اندر آکے بیٹھ گیا۔ وہ کچھ مضطرب اور بے چین نظر آتا تھا "میں نے چائے کہیں بیٹھک کمرہ وہاں ہیں۔" وہ تلملایا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا "لیکن اب میرے سر کا درد ٹھیک ہوگیا ہے اور میرا موڈ چائے پینے کا نہیں رہا۔"

چاندنی ہنسی "تو کچھ اور پی لیں۔"

میں نے مسکرا کے کہا "درد دل کی دوا ہوگی؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "وکیلوں کے پاس بھی دل ہوتا ہے یہ تو آج ہی جانا۔ کبھی دوا بھی کردیں گے۔" اس نے اٹھ کر ہاتھ بڑھایا۔

گولا بنڈر والا اب برداشت نہ کرسکا "چاندنی! اب چکر نہیں آرہے تمہیں؟"

میں نے چاندنی کے ہاتھ کو نزاکت سے تھام لیا "ہم دیکھیں گے آپ کا اعجاز مسیحائی جب دل پر رکھائیں گے۔"

رابعہ نے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا "ہارٹ اسپیشلسٹ خود عشق کے روگ کا ای سی جی سے اندازہ کر لیتے ہیں۔"

گولا بنڈر والا کچھ نہیں سمجھا تھا مگر چاندنی کی اور میری نظر پہچان گیا تھا چنانچہ وہ بہت جزبز تھا "یہ فائل کہاں لیے جا رہے ہو؟"

چاندنی نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا "فائل ہم سے پوچھ کے لے جارہے ہیں لیکن ہم سے پوچھے بنا کیا لے جارہے ہیں ہم جانتے ہیں۔"

رابعہ نے بے رُخی سے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "چلیے بہت ہو گئیں ان کے کام کی۔ اور بھی کام ہیں۔"

چاندنی نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ جیسے پوچھنا چاہتی ہو تم کیا مجھے چیلنج کر رہی ہو؟ میرے مقابلے پر آ کے دیکھو۔ تم بچی ہو ابھی میری قوت تسخیر کا ذرا اندازہ کرلو تو اچھا ہے۔

"چاندنی! ایسے ہر ایک کو فائل نہیں دی جاتی۔ ہم آنکھیں بند کرکے کیسے اعتبار کرلیں۔"

"وہ تو ہم نے تم پر بھی کیا تھا۔" اس نے تکلیف زدہ آنکھیں اٹھا کے کہا۔

گولا بنڈر والا نہیں چاہتا تھا کہ ہم وہ فائل لے جائیں مگر چاندنی کی مرضی کے خلاف وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی خود اپنی عقل اور قوت مزاحمت چاندنی کے مشورے یا حکم کے آگے راہ میں غلام ہو جاتی تھی۔ مجھے اس سے تھوڑی کسی خطرے کا رہنے تھے اور اب میں جلد از جلد وہاں سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا مگر ایسے نہیں کہ فرار کا شبہ ہو۔

"میں نے چوہدری صاحب کو فون کیا تھا۔ وہ بھی آ رہے ہیں۔" غلام محمد بولا۔

اس وقت تک میں دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ ایک بار پلٹ کے میں نے کہا "کل چودھویں کی رات ہوگی۔ چاندنی تو ہوگی نا؟"

"چاندنی کو کون روک سکتا ہے جی۔" وہ سرور میں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ پر اپنی اداؤں کا جادو چلانے میں کامیاب ہو چکی ہے اور عورت کو فتح کے غرور کا نشہ بہت عزیز ہوتا ہے۔

اپنی گاڑی میں بیٹھنے تک میں پرسکون رہا حالانکہ اندر سے میرا برا حال تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ ابھی کسی طرف سے کوئی گاڑی میرا راستہ روک لے گی اور اس میں سے اتر کے چوہدری رلاور میرا راستہ روک لے گا۔ تو جب آپ کی مستعجب ہونے کی عادت گئی نہیں اپنے محمود صاحب۔ خیر سے اب آپ وہ ہو گئے عبدالودود منظر، راہ بھی ہوا۔

گاڑی موڑتے ہی میں نے ایکسیلریٹر دبا دیا "اُف کیسے بال بال بچے۔"

"بال بال بچے یا بال بال میں جکڑے گئے اس کی ناگن جیسی زلفوں کے۔" رابعہ نے بگڑ کے کہا "درد دل تو بہت بڑھ گیا ہوگا۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی "کمال ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم عام جاہل عورتوں جیسی باتیں کرنا جانتی ہی نہیں۔"

"اس قدر مرعوب ہونے کی کیا ضرورت تھی؟" رابعہ نے تلخی سے کہا "ایسی گھٹیا بازاری ادائیں تھیں اس کی۔"

میں نے کہا "تم حسد سے کباب ہو رہی ہو۔ بے شک وہ عورت کسی کی داشتہ تھی مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ حسین تھی اور اپنے حسن کی طاقت سے کام لینا جانتی تھی۔"

"تمہارا کام تو تمام کر دیتی اگر میں ساتھ نہ ہوتی۔"

"غلام محمد عرف گولا بنڈر والا بھی خدا نے کیا چیز بنائی ہے۔" میں نے کہا "صحت رکھ دی۔ خدا نے بس تھوڑی سی عقل نہیں دی۔"

"اب میں کہوں کہ تم حسد سے کباب ہو رہے ہو پھر؟ ذرا دیکھو اس کے پاس کیا نہیں ہے۔ یہ محل اسی نے کھڑا کیا ہے اور چاندنی اسی کے آنگن میں اُتری ہے۔"

"مگر یہ بھی تو دیکھو کہ چاندنی اسے کس طرح لوٹ رہی ہے۔ پیسہ کمانے کے لیے عقل کا ہونا اب ضروری نہیں رہا۔ ایسے دھندے بہت ہیں جن میں آدمی راتوں رات بھی لکھ پتی بن جاتا ہے۔ ان کی قسمت ساتھ نہ دے تو وہ سلاخوں کے پیچھے نظر آتے ہیں ورنہ چاندنی کے ساتھ۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اسے رلاور نے بھی اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ تمہاری ذہنی اپج تو یقین دلا رہی ہے کہ اُلّو بنا کر کچھ نہیں ہوگا۔ یہ اس کا گھر، پریشانی ہمارے لیے پیدا ہوگی۔ چاندنی کا کیا ہے وہ کل کسی اور کو شکار کرلے گی۔ جیسے غلام گرا ڈالے گا۔ وہ ہے ہم راز کرنے پھریں گے اور رلاور تماشا دیکھے گا۔ ہماری پریشانیوں میں اضافہ کرنے کے لیے غلام محمد کو عارضی طور پر فرار بھی کرا رہے گا اور تسلی بھی دیتا رہے گا کہ جیسے دو چار دن میں رہائی کرائی جاسکے۔"

"اگر اس میں چوہدری رلاور بھی ملوث ہے تو شاید یہ اتنا سیدھا سادہ مسئلہ نہ ہو جتنا تم سمجھ رہے ہو۔" رابعہ بولی۔

"منظر نے ٹھیک سوچا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے ذہن میں کوئی اور خطرناک اسکیم ہو جس کا ابھی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ منظر سے مشورہ کرلیں گے۔"

"پہلے اسے فون تو کرو۔ وہ پریشان ہوگا۔"

میں نے کہا "وہ پریشان ہونے والا آدمی نہیں ہے۔"

"یہ مت کہو۔ کیا وہ ہمارے لیے بھی پریشان نہیں ہوگا؟ بس وہ اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔"

میں نے ایک جنرل اسٹور سے اسے فون کیا تو وہ گھر پر نہیں تھا۔ وہ کابل کو گھر چھوڑ کے پھر ہماری تلاش میں نکلا تھا۔ اس کی بیوی نے اپنی زبان کی قینچی چلانی شروع کی اور دس منٹ بعد آخرکار میں اس سے پتا حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ پتا سمجھاتے ہوئے اس نے ہر سڑک ہر موڑ اس کی ہر نشانی اور ہر نشانی کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرنا ضروری سمجھا تھا۔

آخری نشانی ایک ٹیلر کی دکان تھی جس کے بارے میں اس نے کہا۔ "بڑی منحوس شکل والا لڑکا مالک ہے اس کا لیکن خود کو سمجھتا ہے دلیپ کمار۔ یہ بھی بڑا آرام حرام۔ ایسے ہی لوگ لیڈیز ٹیلر بنے ہیں یا پھر درزیوں کی دکان کھول کے بیٹھ جاتے ہیں۔ بے غیرت کہیں کے! اور کپڑے سینا تو اسے خاک نہیں آتا۔ بورڈ پر لگا رکھا ہے "ہالی ووڈ اسپیشل لیڈیز ٹیلر"۔ کیا سی کروتا ہوگا یہ ان انگریز فلم والیوں کو۔ ان کے پاس پہنچے کو ہوتا ہی کیا ہے۔ بے حیا کہیں کی۔ بالشت بھر کپڑے میں تو سوٹ بنالیں۔ مگر صبا مجبوری ہے کہ قریب میں اور کوئی درزی نہیں۔ اسی لائن میں ساتواں مکان ہے۔ باہر سے رنگ...."

میں نے فوراً کہا "بس میں سمجھ گیا" اور ریسیور رکھ دیا ورنہ وہ مکان کے رنگ، نقشے، ساخت اور حسن و قبح کے بارے میں بات کرنے لگتی۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے مکان تلاش کرلیا۔ ہمارے استقبال کے لیے منظر پہلے سے موجود تھا۔

"آگئے لیلیٰ مجنوں دشت نوردی کرکے؟" اس نے شور مچانا شروع کیا "اب کہو گے راستہ بھول گئے تھے۔ اب میرے پیچھے چلتے چلتے کیسے بھٹک گئے راستے سے؟ بس تم بھٹکنا چاہتے تھے۔ تمہارا تو باپ بھی بھٹک گیا تھا ورنہ میرے جیسے لائق فائق اور قابل شخص کا باپ ہوتا۔ بھٹکنا تمہارا خاندانی کام ہے۔ سالے اتنا بھٹک کے آئے ہو، ابھی دل نہیں بھرا، مجھے کھانے سے۔"

میں نے کہا "تو خود چپ ہوگا یا میں کروں؟"

منظر نے فریادی نظروں سے بیوی کو دیکھا "بیوی! میں نے کچھ کہا ہے ان کو؟ تم اپنے ایمان سے کہو ان کی جگہ میں ہوتا..."

"تم ہوتے تو لوٹ کے گھر ہی نہ آتے۔" اس کی بیوی نے ہماری حمایت پر کمر کس لی "میں کہتی ہوں تم نے فون کیوں نہیں رکھا ان کا۔ تم کدھر مجھے رہے تھے آخر؟ کیسے بچھو رہے تھے؟"

رابعہ اور میں ہنسنے لگے۔ دوسرے کمرے میں ان کے سارے بچے چیخ پکار میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ سب سے کم عمر صرف گلا پھاڑ کے رو سکتا تھا۔ کسی کمرے میں پوری آواز سے ٹی وی چل رہا تھا۔ ادھر میاں بیوی کے

www.paksociety.com

درمیان جنگ چھڑ گئی تھی۔ گھر میں ایک شور محشر بپا تھا۔

میں نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گھر کو ملاحظہ کیا۔ یہ اس کے پُرانے گھر سے واقعی بہت بڑا گھر تھا۔ کاجل اس پُررونق گھر میں آ کر خوش ہو گئی تھی۔ وہ اور کلیم، بچوں کے ساتھ ایک ہال نما کمرے میں بیٹھے تھے۔ ہال کے فرش پر قالین تھا اور اس میں سارے بچے سوتے تھے، پڑھتے تھے، لڑتے تھے اور وہ سب کچھ کرتے تھے جو بچے کرتے ہیں۔ وہ کاجل کو اپنی اپنی چیزیں دکھا رہے تھے۔ کھلونے، کتابیں اور کاپیاں۔ کاجل ان کے درمیان ابھی سے متعارف ہو رہی تھی اور غالباً اپنی باتوں کی وجہ سے خاصی مقبول ہو چکی تھی۔ بچے بار بار اس کی کسی بات پر زور سے ہنستے تھے۔

جب میں لوٹ کر اسی کمرے میں آیا تو رابعہ کی فائل منظر کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

"ان کی تو ایسی تیسی۔ اس گولے جیسے بنڈل والے کو میں نے زور میں رکھ کے توپ کے گولے کی طرح نہ چلا دیا تو منظر نام نہیں۔ اتنی دھاندلی! ایسا حرامی پن۔ محل بنایا۔ جاہلوں کی اولاد۔"

میں نے کہا "اندھے! تجھے پہلے کچھ نظر نہیں آیا۔ اب بول رہا ہے۔"

"خدا کی قسم، میں ادھر سے نہیں گزرا ورنہ ضرور دیکھتا۔ میں تو جب اس جگہ سے گزرتا تھا تو فاتحہ پڑھ لیتا تھا۔" منظر بولا "کسی مزار کی طرح ہو گئی تھی وہ جگہ میرے لیے۔"

رابعہ ہنسی "میرا مزار بنا دیا ابھی سے۔ ابھی تو میں زندہ ہوں۔"

"زندہ؟ ارے کہو! ابھی تو میں جوان ہوں۔ بھئی خدا تمہیں ایسے ہی سدا بہار رکھے۔ آخر یادوں کے مزار بھی تو ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "منظر صاحب! یہ دلاور نے کوئی نیا کھیل کھیلا ہے ہمارے ساتھ۔"

"تھوڑی دیر اور وہاں رک جاتے تو اسی سے پوچھ لیتے۔ رابعہ نے بتایا ہے کہ اس کمینے نے فون کر دیا تھا۔ چہ خوب! ایک جوڑے نے اپنی آمد کا اعلان اخبارات کے ذریعے کر دیا۔ دوسرا خود جا پہنچا بتانے کہ ہم آ گئے اب کر لو جو کرنا ہے۔ آخر اتنی جلدی کیا تھی؟"

میں نے کہا "یار! اتنا بڑا کام کر دکھایا ہم نے۔"

"کام تو سولہ آنے پکا کیا ہے۔ اس میں سب کچھ ہے۔" منظر بولا "رابعہ کی موت کا سرٹیفکیٹ......"

اس کی بیوی جو کھانا لگا رہی تھی، ایک دم چلائی "اوئی کیا واہی تباہی بک رہے ہو۔ ہیں رابعہ کے دشمن۔"

"دیکھ سکندر! مجھے بددعائیں دے رہی ہے۔ تو خود سن اس سے۔" منظر بولا۔

اس کی بیوی نے آتے جاتے مزید کچھ ارشاد کیا مگر منظر اس فائل کے مطالعے میں غرق رہا۔ اس میں ڈیتھ سرٹیفکیٹ کو بنیاد بنا کے وراثت نامہ حاصل کیا گیا تھا۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ جعلی تھا یا رابعہ نام کی کسی عورت کی موت کے بعد حاصل کیا گیا تھا۔ ممکن ہے دلاور نے کسی سے مل ملا کے یہ کام کرایا ہو۔ ورنہ کوئی عورت مری ہو کہ وہ رابعہ کی ولدیت بدل کے اصل رابعہ کے مطابق کر دی ہو۔ اس کے کسی آدمی نے قبرستان میں خود اندراج کیا۔ ایک یہ امکان اس کا بھی تھا کہ کسی رابعہ کے باپ کا نام بھی محمد علی ہو جو اصل رابعہ کے والد کا نام بھی تھا۔ اس سرٹیفکیٹ کو داخل کر کے جاہلوں نے حق وراثت حاصل کیا اور زمین کی منتقلی وغیرہ قانونی کام ہماری عدم موجودگی میں کرا لیا گیا۔ "اطلاع عام" کے عنوان سے شائع ہونے والے اشتہارات عام آدمی تو نہیں پڑھتا، وکیل پڑھتے ہیں۔ ویسے بھی زمین کی کاغذات کی حد تک یہ خفیہ رکھا جا سکتا تھا۔ ہمارے ہوتے اس پر تعمیر ناممکن تھی۔

"اصل فائل کو میں رکھوا دیتا ہوں بینک لاکر میں۔ یہ فوٹو شدہ نقول اپنے پاس رکھیں گے۔"

میں نے کہا "یار منظر! میرا تو خیال ہے کہ نقل ابھی بنا لی جائے اور فائل کو یہاں نہ رکھا جائے۔"

منظر ہنسا "تو سمجھتا ہے ان میں اتنی ہمت ہے کہ میرے گھر گھس کے فائل لے جائیں۔ وہ اتنے احمق نہیں ہیں۔ احمق! اس فائل میں ایسی کون سی دستاویز ہے جو سرکاری ریکارڈ میں نہ ہوگی؟ صرف اس فائل کی بنیاد پر تو ان کا قبضہ برقرار نہیں رہ سکتا۔"

میں نے کہا "یہ بھی ٹھیک ہے۔"

رابعہ نے کہا "میں وقار یوسف کو بلا لیتی ہوں۔ اس سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور فائل آفس میں پہنچ جائے گی۔"

رابعہ نے اپنے آفس کا نمبر ملایا "کون وقار! میں رابعہ بول رہی ہوں۔ ارے رابعہ قادری اور کون۔" وہ ہنسنے لگی "کیا ہو گیا تمہیں۔ اتنے بوکھلا کیوں گئے ہو۔ بھئی میں ہمیشہ کے لیے تو نہیں گئی تھی۔ لوٹ کر تو آنا ہی تھا ایک دن۔ یا نہیں آنا چاہیے تھا؟ ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہوں، بالکل خیریت سے ہوں۔ سنا ہے تم نے گھر بسا لیا ہے۔ بھئی اتنی جلدی کیا تھی۔ ہمارے آنے کا انتظار نہیں کر سکتے تھے؟ نہیں۔ چلو پھر مبارک ہو۔ منظر بہت تعریف کر رہا تھا تمہاری۔ تم نے میری عدم موجودگی میں سارا کام سنبھالا اور بہت اچھا سنبھالا۔ میں واقعی تمہاری احسان مند ہوں۔ بہت وفادار دوست تھے اس زمانے میں جنہوں نے واقعی ساتھ دیا، ان میں ایک تم ہو۔ اچھا کیا کر رہے ہو اس وقت؟ آفس بند ہونے کا وقت تو ہو گیا۔ تم ایسا کرو، آفس بند کر کے منظر صاحب کے گھر آ جاؤ۔ ہاں میں وہیں ملوں گی۔ تم سے ایک بہت ضروری کام ہے۔"

وہ کچھ دیر سنتی رہی اور مسکراتی رہی "اچھا اچھا! تو پھر پہلے گھر جاؤ، اپنی دلہن کو ساتھ لو اور منہ دکھائی کے لیے ساتھ یہاں لے آؤ۔ بھئی باہر کھانے کا وعدہ کیا تھا۔ کوئی وعدہ خلافی کہاں ہوگی، اگر منظر کے گھر میں کھا لو گے۔ آخر تم ایک قانونی نکتے پہ بیوی کو بھی قائل نہیں کر سکتے؟ ٹھیک ہے ہم انتظار کریں گے کھانے پر۔"

کھانا لگ گیا تھا مگر اب وقار یوسف کا انتظار لازمی تھا۔ وہ اپنی دلہن کے ساتھ آ رہا تھا۔

"بلا رہا تھا، بیوی بہت ہارے کی باتیں۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ آج ضرور باہر کھانا کھانے چلیں گے۔ اس کے سر کی قسم کھائی تھی۔ دیر ہو جاتی تھی واپسی میں۔" رابعہ ہنسنے لگی۔

"بیچارا!" منظر آہ بھر کے بولا "آدمی سے شوہر بن گیا۔ میرا تو خیال ہے نکاح کے وقت دلہا کے سر پر اتنا بڑا سہرا باندھتے ہیں، اس پر ایک لوح بھی لگا دینی چاہیے کہ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ بہت لوگ عبرت پکڑیں گے۔"

میں نے کہا "عبرت پکڑنے والے پہلی فرصت میں شادی بھی کر لیں گے۔"

منظر کی بیوی اب بچوں کو کھانا کھلانے میں لگ گئی تھی تاکہ ہم بعد میں سکون سے کھانا کھائیں۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ منظر کی بیوی نے کہا "اوئی! پتا نہیں کون ہے۔ سکندر کو پوچھ رہا ہے۔"

یہ اعلان بم کے دھماکے سے کم چونکانے والا نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے ہم سب ساکت بیٹھے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے رہے۔

پھر منظر بولا "یار یہ انہی میں سے کوئی ہوگا۔ محسن لنگوٹیا یا مرزا غالب۔ کہیں سے معلوم کر لیا ہوگا میرا نیا نمبر۔"

میں نے ریسیور لے لیا "ہیلو کون بول رہا ہے؟" میں نے آواز بدل کے کہا۔

ایک اجنبی آواز نے کہا "ہم ہیں جی۔ آپ کے غلام۔"

میں نے کہا "میں سارے غلام آزاد کر چکا ہوں۔ اب صرف کنیزیں رکھتا ہوں۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "اب یقین آ گیا کہ تم سکندر ہی ہو۔ آواز بدل سکتے ہو، مسخرے پن کی عادت تو نہیں چھوڑ سکتے۔"

مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ میں نے منظر کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس نے سمجھتے ہوئے دوسرے کمرے میں جا کے ایکس ٹینشن کا ریسیور اٹھا لیا۔ اب وہ بھی ہماری گفتگو سن سکتا تھا۔ مجھے شک تھا کہ یہ دلاور ہی ہے جو آواز بدل کے بول رہا ہے مگر ابھی تک اس کا ثبوت نہیں ملا تھا۔ دلاور کے بولنے کا اپنا مخصوص انداز تھا۔ وہ مخصوص الفاظ اور جملے استعمال کرتا تھا مگر اس چالاک آدمی نے آواز بدلتے وقت یہ خیال بھی رکھا تھا کہ وہ طرز تخاطب سے نہ پہچانا جائے۔

میں نے کہا "کیا تم اپنی پہچان چھپاتے ہوئے ڈرتے ہو یا تمہیں اس کی اجازت نہیں ہے؟"

وہ بولا "سکندر! میں محسن بول رہا ہوں۔"

"بکواس کرتے ہو تم۔" میں نے کہا "میں جانتا ہوں تم کون ہو۔"

"تو پھر بتاؤ میں کون ہوں اور ایک بہت بڑی شرط جیت لو۔"

میں نے کہا "کیسی شرط؟ میں نے کون سی شرط لگائی ہے تم سے۔"

"میں لگا رہا ہوں۔ اگر تم نے بوجھ لیا کہ میں کون ہوں تو تمہاری ایک چیز تمہیں واپس کر دی جائے گی جو اس وقت ہمارے قبضے میں ہے۔"

"تم اس زمین کی بات کر رہے ہو جس پر ایک احمق نے ایک طوائف کا محل کھڑا کر دیا ہے تو یہ سمجھ لو کہ شرط میری طرف سے ہے۔"

"میں تو زمین کی بات نہیں کر رہا تھا۔ زمین کا کیا ہے، آج تیری کل میری۔ زمین بھی تو طوائف ہی ہے۔"

میں نے کہا "تمہارے لیے ہوگی۔ ورنہ زمین آدمی کی عزت ہوتی ہے۔ زمین ہی سب کا پیٹ بھرتی ہے، زمین ہی آدمی کی شناخت بنتی ہے اور آخر کار زمین ہی آدمی کو پناہ دیتی ہے۔ ممکن ہے تمہارا پیٹ کوئی طوائف بھرتی ہو، تمہاری شناخت کوئی طوائف ہو اور تمہاری پناہ بھی....."

"ویری گڈ! اچھی تقریر کی تم نے مگر کام کی بات پھر بھی نہیں کی۔ سنو سکندر اعظم کی اولاد۔ ہم سے پنگا مت لو۔ ہم تمہیں ایک موقع اور دینا چاہتے ہیں۔ جیو اور جینے دو۔ ورنہ....." اس نے ایک اشتعال انگیز بات کی۔

"میں تمہیں جینے نہیں دوں گا سور کے بچے۔ اگر میں نے تمہیں کتے کی موت نہ مارا تو....."

اس نے ایک قہقہہ لگایا "رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔ ہار کے تو لوٹے ہو پھر کیوں ہارنا چاہتے ہو؟"

"ہار جیت کا فیصلہ کرنا ہے تو سامنے آ کے کرو۔"

"یہ بھی ہو جائے گا۔ مگر تم اکیلے کب تک لڑو گے؟ کس کس سے لڑو گے؟ تم مجھے نہیں جانتے۔"

"تم دلاور ہو، میں جانتا ہوں۔" میں نے آخر کار وہ بات کہہ دی جو میں کہنا نہیں چاہتا تھا۔

"نہیں سکندر۔ میں تمہارا دشمن ہوں۔ دشمن کا کوئی نام نہیں ہوتا، کوئی چہرہ نہیں ہوتا۔ وہ صرف دشمن ہوتا ہے۔"

اب مجھے اس کی آواز کچھ جانی پہچانی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دلاور نہیں تھا۔

"تمہاری فوج بھی میری قید میں ہے۔"

پہلے میں سمجھا کہ وہ پاکستانی فوج کی بات کر رہا ہے مگر وہ مجھ پر طنز نہیں کر رہا تھا۔ وہ شاید محسن یا غالب کی بات کر رہا تھا۔

"میری فوج؟"

"میں چیف کے تو تمہاری فوج۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ اس کے ساتھ ہی لائن کٹ گئی۔ میں فون کا ریسیور ہاتھ میں تھامے بیٹھا رہ گیا۔

www.paksociety.com

منظر نے میری صورت کو غور سے دیکھا "کیا بھوک سے تمہارا دم نکلنے والا ہے؟ میں کہتا ہوں بیوی سے کہ فوراً کھانا لگوائے ورنہ ایک مہمان تو گیا۔"

میں نے کہا "نہیں یار! یہ بات نہیں۔"

رابعہ نے کہا "کس کا فون تھا؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" میں نے پریشانی سے کہا "پتا نہیں کون تھا۔ کہتا تھا کہ تمہاری فوج میرے قبضے میں ہے۔"

"اس سے کہنا تھا کہ بھائی ابھی تو شادی بھی نہیں ہوئی۔ فوج ہوگی دس بیس سال بعد۔ اگر اللہ نے اور اس کے بعد گھر والی نے چاہا تو۔ ابھی تو سپہ سالار ہے اور سپہ سالاری ہے۔"

میں نے جھلا کے کہا "کس سے کہتا بے۔ اس نے تو بات ختم کرتے ہی لائن کاٹ دی تھی۔ اکیلا ہی بولتا رہتا۔"

منظر نے سنجیدہ ہو کے کہا "یار! ایسی بات تم سے بجز چوہدری ولاور کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ اس سے بڑا حرامی کوئی ہے اس وقت کرۂ ارض پر۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "نہیں یار۔ وہ ولاور نہیں ہو سکتا۔ میں تو آواز پہچانتا ہوں اس کی۔"

"حضور چشم! اس کی آواز آخری بار کب سنی تھی تم نے۔ کچھ یاد ہے؟" منظر بولا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"فرق پڑتا ہے جب۔ اس تمام عرصے میں جو تم نے پاکستان سے بھارت اور بنگلہ دیش پر لشکر کشی میں گزارا تمہارے کانوں نے صرف بھیانک آوازیں سنی ہوں گی۔ گولیاں چلنے کی آوازیں، مشین گن کی تڑتڑ، بموں کے دھماکے۔ سماعت ضرور متاثر ہوئی ہوگی تمہاری۔"

میں نے کہا "میری سماعت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔"

"فرق پڑا ہوگا بیٹے مگر تمہیں احساس نہیں۔ ابھی کوئی دن ایسا بھی ہوگا کہ کسی نے زور سے دروازہ بند کر دیا تو چیخ مار کے اچھل پڑو گے کہ بم کا دھماکا ہوا تھا اور وہ جو شاعرانہ زبان میں کہتے ہیں نا۔ ہنسی کی جلترنگ، تو وہ تمہیں مشین گن کی آواز لگے گی۔"

"یار! کیا فضول بک بک لگا رکھی ہے۔ میں تو کہہ رہا ہوں کہ وہ ولاور نہیں تھا۔ وہ آواز بدل سکتا ہے مگر اپنا بات کرنے کا انداز تو نہیں بدل سکتا۔"

منظر نے ایک آہ بھری "انداز بھی بدل جاتے ہیں پیارے، آپریشن سے شکل بھی بدل جاتی ہے اور ولاور کو کیا سمجھتے ہو، وہ اتنا بڑا اداکار اور صداکار ہے۔"

دروازے کی گھنٹی بجی تو منظر کی بات نامکمل رہ گئی۔ وہ دروازے تک گیا اور واپس آیا تو اس کے ساتھ رابعہ کا پرانا وفادار ماتحت اور ساتھی وکیل وقار یوسف اپنی نئی نویلی "شرمیلی دلہن" کے ساتھ تھا۔

"لو بھئی! آج کے مہمان خصوصی آ گئے۔" منظر نے اعلان کیا۔

وقار یوسف کا چہرہ رابعہ کو دیکھتے ہی مسرت سے کھل اٹھا۔ "رابعہ باجی! مجھے بالکل یقین نہیں آ رہا ہے اپنی آنکھوں پر، آپ ہیں۔"

"میرا چشمہ لگا کے دیکھو۔ اس سے تو بھوت بھی نظر آ جاتا ہے۔" منظر بولا۔

رابعہ نے کہا "وقار! پہلے اپنی دلہن سے تو ملواؤ۔"

"ملوانا کیا باجی! انجم سب کو جانتی ہے۔ اتنا ذکر ہوتا تھا آپ کا" وقار نے جوش سے کہا "آپ سے مراد آپ سب کا، بخت صاحب کا، محسن اور غالب کا۔"

"ذکر تو ہمارا نہ جانے کہاں کہاں ہوتا تھا۔ اخباروں سے لے کر ان اشتہاروں تک جن میں ہمیں مفرور مجرم قرار دیا گیا تھا" نے کہا۔

"مجھے بڑا شوق تھا آپ سب سے ملنے کا۔ یہ تو ہر وقت آپ کو یاد کرتے رہتے تھے۔ پرانی باتیں سناتے رہتے تھے۔" وقار کی نے کہا۔

منظر نے کہا "جیل کے بارے میں ہوئی ہے تو وہ نہیں سنا دو۔"

انجم مسکرائی "یہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسا میں سمجھتی تھی۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"وہ تو بھول گئیں! تمہارے انتظار میں ہم سب فاقے سے تھے۔ پہلے کھانا، پھر باقی باتیں۔" منظر بولا "ایسا نہ ہو کہ باتوں باتوں میں ایک دو بندے لڑھک جائیں۔ صورت دیکھو ان کی، بالکل بھوک ہڑتالی لگتے ہیں نا؟"

کھانے کے دوران رابعہ نے کہا "وقار! تمہارے انتخاب کی داد دینا زیادتی ہوگی۔"

انجم شرمانے لگی۔

وقار یوسف نے آہ بھری "ہر جگہ یہی کہا جاتا ہے۔ میرے انتخاب کی تعریف کرتے ہیں۔ میں تو بیچ میں تعریف کے قابل ہی نہیں رہا۔"

منظر نے اسے تسلی دی "یہ دنیا کی ریت ہے عزیزم! شادی سے پہلے ہم بھی ہیرو تھے۔ ساری خوبیاں تھیں ہم میں۔ پہلا نمبر تھا، ایک شمار ہوتے تھے۔ جو مرتے تھے انھوں نے ہاتھ لے جانے تھے۔ عقد نے ہم کو نکما کر دیا ... ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔ اب کھونٹے سے بندھے ہوئے نکل رہے ہیں۔"

"ابھی چھوڑو، میرا منہ مت کھلواؤ۔" منظر کی بیوی نے چونک کر کہا "ورنہ میں سب بتا دوں گی۔ ہاں۔ سب معلوم ہے مجھے۔ شادی سے پہلے کہاں کہاں دھکے کھاتے پھرتے تھے۔ گھر گھر جہاں رشتہ لے کر جاتی تھیں اماں، صاف جواب ملتا تھا۔ ہمیں لڑکی کو کنوئیں میں دھکا نہیں دینا۔ بس ہماری اماں کی

ہمت تھی۔"

"ہاں۔ جیسے تم سیدھی ہو جلیبی کی طرح۔" منظر نے فقرہ چست کرنے کے لیے جوابی حملہ کیا "تم نے ہی ہاتھ جوڑے تھے کہ اکیلی رہ گئی تھی، سامنے کہ انکار مت کرنا ورنہ میں زہر کھا لوں گی۔ جو آتا تھا رشتے لے کر وہ زن بچے کے بھاگ رہا تھا۔"

منظر کی بیوی کا منہ لال ہو گیا "اتنی موٹی بھی نہیں تھی میں۔ بس صحت اچھی تھی۔ یہ تو تم نے اور تمہارے بچوں نے زندگی اجیرن کر دی ہے میری۔ سوکھ کے کانٹا ہو گئی ہوں۔"

"ہوں، کانٹا بن کے میرے دل میں اتر گئی ہو۔"

سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ چھوٹے بچوں کے ماں باپ خود بچوں کی طرح لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کے وہ راز فاش کر رہے تھے جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے کزن تھے یا نجانے کب سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

کھانے سے فراغت ہوئی تو میں نے خواتین سے کہا "اب آپ لوگ اپنی زنانہ محفل الگ جمائیں۔ ہم اپنی باتیں کریں گے۔"

"یعنی فضول باتیں نہیں کریں گے۔" منظر بولا۔

انجم اب خاصی بے تکلف ہو گئی تھی "ہم تو رابعہ باجی سے سب سنیں گے۔ خواہ رات بھر جاگنا پڑے۔"

ہم ڈرائنگ روم میں جا کے بیٹھ گئے۔ وقار یوسف کو بھی ہمارے سفر اور مہم جوئی کے آغاز سے انجام تک تمام واقعات میں دلچسپی تھی مگر میں پہلے اپنی عدم موجودگی کے حالات کی مکمل واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ اس سے موجودہ صورت حال کو سمجھنے اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے میں مدد ملے۔

فائل دیکھ کے وقار دم بخود رہ گیا "رابعہ باجی کے پلاٹ پر کسی نے قبضہ کر لیا ہے۔"

"اب اور یہ ہم دونوں کے لیے شرم کی بات ہے۔ اس جگہ ایک محل تعمیر ہو گیا اور تمہیں خبر نہیں ہوئی۔" میں نے کہا "ایک بدمعاش نے وہاں ہیرا منڈی کی چاندنی کو رابعہ کی بہن بنا کے رکھا ہوا ہے اور تمہیں معلوم نہیں۔"

وقار واقعی شرمندہ تھا مگر منظر نے کہا "یار! ایک بار مان لیا کہ غلطی ہو گئی۔ وہ بھی اس لیے کہ ادھر ہمارا جانا نہیں ہوا۔ وہ جگہ ہمارے آنے جانے والے راستے میں نہیں تھی کہ ہم آتے جاتے دیکھتے۔"

وقار نے سر ہلایا "یہی بات ہے۔"

میں نے کہا "یہ افسوس ہے کہ تم نے پروا نہیں کی۔"

منظر بھڑک اٹھا "بے پروا کے بچے۔ ہم کیا فارغ تھے کہ روزانہ تمہاری جائیداد کی دیکھ بھال کرتے۔ روز جا کے دیکھتے۔ اپنے کام کم تھے؟ تمہارے روگ زیادہ پال رکھے تھے۔ اتنی مشکل سے کچھ نہیں واخل دفتر کرا کے۔ حالانکہ ہم لوگ ضمانت پر رہا ہوئے تھے اور کہیں جا نہیں سکتے تھے مگر ہم نے جائز ناجائز طور پر

چھوٹے موٹے مقدمات کو ختم کیا۔ قتل کے مقدمات ختم نہیں ہوئے۔ وہ تو جب بھی تم پکڑے گئے اندر ہو جاؤ گے اور مقدمے کا فیصلہ ہونے تک اندر ہی رہو گے۔ اب ضمانت بھی نہیں ہوگی۔ مجھے دن میں اپنے مقدمات سے نمٹنا ہوتا تھا۔ بہت کم کیس لے رہا تھا میں کیونکہ شام کو رابعہ کے آفس بھی جانا تھا۔ اکیلا وقار یوسف بے چارہ کیا کرتا۔ شور یہ بھی کچھ نہ کرتا تو رابعہ بی بی کی کمپنی ہی بند ہو جاتی۔ واپس آ کے نئے سرے سے وکالت شروع کرنی پڑی۔ ہم کو دعائیں دو کہ تمہارے دشمنوں کے عزائم کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ تمہارا ماڈل ٹاؤن والا آبائی گھر محفوظ ہے۔ رابعہ کی لیگل فرم کا بزنس چل رہا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم نے وہ جگہ خالی کرائی جس پر چوہدری ولاور نے اپنی اسلحہ سازی کی فیکٹری لگا رکھی تھی۔ میسرز وزیر اینڈ کمپنی جس میں پہلے زرعی مشینری کے پرزے بنتے تھے تمہارے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ کس میں ہمت تھی کہ وہ جگہ ولاور اینڈ کمپنی سے چھین سکتا۔ تم جو اصل وارث تھے، قتل کے مقدمات میں مطلوب تھے اور فرار ہو چکے تھے۔ ولاور کی پشت پناہی کر رہے تھے ایس ایس پی سراج جیسے وطن فروش لوگ۔ اب جو وہاں اسپتال بن چکا ہے اور وہ بھی وزیر خان کے نام پر۔ وزیر خان ٹرسٹ۔"

"وزیر خان کا صرف نام ہے۔ مالک کون ہے اس کا؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"مالک کوئی نہیں۔ اس کا انتظام ایک بورڈ چلاتا ہے۔"

"اس بورڈ کا چیئرمین کون ہے؟"

"چیئرمین ولاور ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کا ایک ممبر میں ہوں۔ اس کے ممبروں میں تم بھی ہو اور رابعہ بھی ہے۔"

"ہم کیا غائبانہ ممبر ہیں؟"

"ایک سال بعد شاید تم ممبر نہ رہتے۔ ابھی تو رابعہ کی نمائندگی کر رہا تھا وقار یوسف۔ تمہارا نمائندہ تھا ایک صحافی۔ غالب کا دوست سونی۔"

"ولاور کو بورڈ آف ٹرسٹی کا چیئرمین کس نے بنایا؟"

"اس معاملے میں ہم نے مصلحت سے کام لیا۔ دو ووٹ اس کے بھی تھے۔ ایک اسٹیل میٹ ہوگا۔"

"وہ بھی اسپتال کے انتظامی امور میں شریک ہے جو وزیر خان کا قاتل ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"ابھی تک اس پر قتل کا الزام بھی نہیں لگا ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ وہ قاتل ہے مگر اس کے خلاف کسی نے کبھی رپورٹ درج نہیں کرائی ہے اور وہ قتل کے کسی مقدمے میں مطلوب نہیں ہے۔"

"میں اسے چھوڑوں گا نہیں منظر۔ وہ حرامزادہ ہے کہاں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" منظر نے کہا "اسے بھی انتظار ہوگا کہ تم

www.paksociety.com

واپس آ جاؤ تو تمہارا قصہ بھی ختم کر دے۔ تم اس کے لیے مسلسل خطرہ ہو۔ سر پر لٹکنے والی تلوار کی طرح۔ وہ جانتا ہے کہ تم اسے قتل کیے بنا چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔"

"نہیں منظر۔ میں نے اسے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ اسے میں خود نہیں ماروں گا۔ میں اسے انصاف کے راستے سے تختۂ دار تک پہنچاؤں گا۔ ساری دنیا کے سامنے وزیر خاں کا قاتل ثابت ہونے کے بعد وہ پھانسی کے تختے تک خود اپنے قدموں سے چل کے جائے گا۔ میں اپنے عہد پر قائم ہوں۔ دلاور اس کے تمام جرائم میں برابر کا شریک تھا۔ اس نے میرے والد کے کاروباری شریک کو قتل کروا کے الزام میرے سر تھوپ دیا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ انصاف ہو' اس طرح کہ دنیا دیکھے۔"

"وہ پہلے صرف دولت مند تھا' اب معزز بھی ہو گیا ہے سکندر۔ وہ کارپوریشن کا ممبر ہے اور آئندہ انتخابات میں صوبائی اسمبلی کا آزاد امیدوار ہو گا" منظر بولا۔

"اسے صرف سزائے موت کا امیدوار ہونا چاہیے۔"

"لوگوں کے سامنے اس کا امیج بہت مختلف ہے۔ وہ ایک بہت غریب پرور اور فیاض آدمی سمجھا جاتا ہے۔ اپنے حلقے میں وہ سب کا ہمدرد اور مددگار مشہور ہے۔ اس کے لیے روپیہ لٹاتا ہے' اس کی تصویریں اخباروں میں آتی ہیں۔ کسی غریب بیوہ کی بیٹی کو جہیز دیتے ہوئے' کسی غریب بستی میں سلائی کی مشینیں اور کمبل تقسیم کرتے ہوئے۔ کوئی حادثے کا شکار ہو کے مرے یا پولیس کے ظلم کا' وہ اس کے گھر ضرور جاتا ہے تعزیت کے لئے اور دن میں ایک چکر اسپتال کا دورہ ضرور کرتا ہے۔"

میں نے کہا "میں نہیں سننا چاہتا یہ سب کچھ۔ میرے لیے وہ صرف میرے باپ کا قاتل ہے۔ اس نے مجھے میرے حق سے محروم کیا' مجھے دنیا کی نظر میں مجرم بنا دیا۔ میں اس کی عزت اور اس کا اثر ورسوخ سب خاک میں ملا دوں گا۔" غصے سے میرا چہرہ گرم ہو گیا۔

"ٹھیک ہے' جو تجھے کرنا ہے ضرور کر۔ ہم تیرے ساتھ مرنے کے لیے بھی تیار ہیں مگر تجھے خودکشی کا مشورہ نہیں دے سکتے اور تیرے ساتھ خودکشی نہیں کر سکتے۔ سارے مسائل ٹھنڈے دماغ سے اور عقل سے کام لے کر حل ہوں گے۔ اب تم واپس آ گئے ہو تو جلدی کیا ہے۔ تم کو ایک ہوشیار شکاری کی طرح جال پھیلانا ہو گا اور خود بھی پھونک پھونک کے قدم اٹھانا ہو گا ورنہ خود شکار ہو جاؤ گے۔ یہ سب بعد کے مسائل ہیں جن سے ہم سب مل کے نمٹ لیں گے۔"

وقار یوسف نے کہا "منظر صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پہلے آپ سب کو محسن اور غالب کے بارے معلوم کرنا چاہیے کہ وہ کہاں ہیں؟"

"یعنی گل اور نازو کے بارے میں نہیں؟" منظر بولا "تمہاری انجم تمہیں مل گئی' باقی سب پھریں لنڈورے۔"

وقار مسکرایا "میرا مطلب یہ تھا کہ... گل اور نازو تو ان کے ساتھ ہی ملیں گی۔ غالب اور محسن مل جائیں۔"

"اس کے لیے ضروری ہو گا کہ ہم نوشہرہ جائیں" میں بولا۔

"پہلے یہ پتا چل جائے کہ غالب کو اس کا بھائی بن کے کون اپنے ساتھ لے گیا اور غالب اس کے ساتھ کیسے چلا گیا۔ ممکن ہے انہیں محسن لے گیا ہو۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محسن لوگ آخر نوشہرہ کیسے پہنچ گئے؟ ہم نے تو انہیں کراچی آنے والے جہاز پر سوار کیا تھا۔ وہ کراچی پہنچ کے اکرام سے کیوں نہیں ملے' پشاور کی طرف کیوں نکل گئے؟"

"پشاور یا نوشہرہ؟" وقار بولا۔

"اتنی جلدی کوئی بھی لاہور یا پنڈی سے نوشہرہ نہیں پہنچ سکتا۔ پشاور سے نوشہرہ کا فاصلہ اتنا نہیں مکمل ہے۔ وہ مردان یا خیبر بھی پشاور پہنچ سکتے ہیں مگر سوال پھر وہی ہے کہ پشاور' مردان یا خیبر میں ان کا کیا کام؟ یا وہ نوشہرہ میں ہی تھے تو کیوں تھے؟ یہ تو سوچا نہیں جا سکتا کہ انہیں پہلے سے معلوم ہو گیا تھا۔"

"کیا معلوم ہو گیا تھا؟"

"یہی کہ غالب اور نازو نوشہرہ پہنچنے والے ہیں۔ خود اکرام پریشان تھا کہ وہ کراچی پہنچ کے اس سے ملے بغیر غائب ہو گئے۔ آخر کیوں؟ خود میری عقل ماؤف ہو جاتی ہے یہ سوچتے سوچتے اور اس پُراسرار مسئلے کا کوئی حل مل سکتا ہے تو نوشہرہ کے کینٹونمنٹ اسپتال سے۔ وہاں ڈاکٹر بتا سکتے ہیں کہ غالب اور نازو انہیں کیا ملے تھے' کیسے لے گئے تھے اور انہیں کون اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ خوشی ساتھ گئے تھے یا مجبوراً۔"

منظر بولا "زبردستی کون لے جا سکتا تھا انہیں؟"

"بعض اوقات جبر بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ دھوکے یا بلیک میلنگ کے سامنے آدمی مجبور ہو جاتا ہے یا جان کا خوف ہو۔ کیا پتا کسی نے نازو کو یرغمال بنا لیا اور غالب کچھ نہ کر سکا۔ اس کے برعکس غالب کو کسی نے گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ اس طرح کہ کسی کو نظر کچھ نہ آیا مگر نازو کو معلوم ہو گیا اور اس نے...۔"

"چلو یہ تو نوشہرہ جا کے بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ خدا کرے کہ ان کو ساتھ لے جانے والے گل اور محسن ہوں' اپنے چودھری صاحب نہ ہوں۔ وہ مل گئے تو ان سے اچھی طرح پوچھیں گے کہ اس طرح کسی کو بتائے بغیر غائب ہو جانا کیا ضروری تھا۔ حد ہوتی ہے عشق کے جراثیم کی کوئی۔ کراچی کا جہاز سے اترے اور جا پہنچے صوبہ سرحد۔ ایسے تو [illegible] مجنوں بھی نہ تھے۔"

میں نے کہا "یہی تو بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں جانتا ہوں محسن کو۔ بالکل اسی طرح جیسے میں خود کو جانتا ہوں۔ وہ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہیں کر سکتا تھا' کسی سبب اور مجبوری کے بغیر۔"

"یار! اب کیا ہو گا۔ وہی چکر ہے پرانا۔ دل اکتا گیا ہو گا تمہارے ساتھ جھک مار کے۔ وہ لونڈیا لے گئی اپنے ساتھ۔ آخر بے وفا! لڑکی بس۔ چور بھی چوری سے جاتا ہے' ہیرا پھیری سے نہیں جاتا" منظر بولا۔

"میں نہیں مان سکتا کہ گل اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئی۔ ان کا ایسا ارادہ ہوتا تو وہ اکرام کو بتا کے بھی جا سکتے تھے۔ اکرام ان کا راستہ روک سکتا تھا؟ اور میں پھر یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ محسن کا دماغ خراب ہو سکتا ہے مگر اس حد تک نہیں۔"

"پھر تو شک کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ مرزا غالب اور ان کی شریک وفات جہاں بھی ہیں خیریت سے نہیں ہیں۔"

"شریک حیات تو سنا تھا' یہ شریک وفات..." وقار بولا۔

"زندگی اور موت کے ساتھی کو اور کیا کہو گے تم؟ شریک حیات تو بیوی اور شوہر ہوتے ہیں۔ شریک وفات ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جیسے لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد وغیرہ۔ نازو کو دیکھو۔ سفر میں ساتھ رہی' اسپتال میں بھی ساتھ لیٹی رہی۔ غالب کا جنازہ اٹھتا خدانخواستہ تو اس کا بھی اٹھتا۔ غالب اغوا ہوا تو اس نے بھی رضاکارانہ طور پر خود کو اغوا کے لیے پیش کر دیا ہو گا کہ تمہارے سنگ میں بھی چلوں گی پیا' جیسے پتنگ پیچھے ڈور۔ خیر سے یہ سب شریک وفات ہی ہیں ابھی تک۔ رابعہ اور سکندر' گل اور محسن۔"

میں نے کہا "منظر! یہ بہت سیریس معاملہ ہے۔"

"میں کب نان سیریس ہوں۔ بس یہ ہے کہ میں تمہاری طرح منحوس شکل بنا کے اور آواز میں رقت پیدا کر کے بات نہیں کرتا۔ میدان جنگ سے آ گئے ہو تو کیا یہاں کے معاملات میں خواہ مخواہ الجھنا ضروری تھا؟ اور وہ بھی فوراً۔ ارے بھائی کچھ دن سکون آرام سے گزار لیتے۔ سارے بدمعاش گھر آ گئے تھے' سیدھے گھر جاتے مگر نہیں' ایک جوڑا تو جیسے قسم کھا کے آیا تھا کہ پاکستان پہنچ کے [illegible] پھیلانا بے حد ضروری ہے۔ ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ دوسرے گدھے وہ صحافی اور صحافت کی جان۔"

"یار منظر! جان بوجھ کے کسی نے کچھ نہیں کیا۔ جو تقدیر میں لکھا ہوا ہے کون بدل سکتا ہے" میں نے کہا۔

"تم کوشش ضرور کرتے ہو تقدیر کے ساتھ پنجا لینے کی۔ اب آپ فرمائیں کہ اس وقت کس نے مشورہ دیا تھا کہ چاندنی بیگم اور گولا گنڈے والا کو بچا دیدار کرائیں؟ وہ تمہارا ماموں دلاور پہنچ جاتا تو مل جاتا اپنے ساتھ۔ یہ جو مزے مزے کے کھانے کھاتے ہیں ابھی ان کی جگہ آپ کھاتے جوتے۔ قسمت اچھی تھی کہ بچ کے نکل آئے۔"

میں ہنس کے کہا "قسمت اچھی ہونے کا یقین نہ ہوتا تو ہم کچھ بھی نہ کر پاتے۔"

"مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اینفل ٹاور سے کود جاؤ اور کہو کہ قسمت اچھی ہے' کچھ نہیں ہو گا" منظر نے کہا۔

"یار! کوئی مشورہ بھی دے۔ چل ہم بے وقوف ہیں' پاگل اور عاقبت نااندیش ہیں" میں نے بگڑ کے کہا "مگر اب کچھ تو کرنا ہے نا۔"

"یہ رابعہ باجی کے گھر پر قبضے والا معاملہ تو میرے سپرد کر دیں" وقار بولا "فائل میں لے جاتا ہوں اور کیس فائل کر دیتا ہوں۔"

"رابعہ کا وکالت نامہ ہے تمہارے پاس؟" میں نے کہا۔

وقار مسکرایا "میں بنا لوں گا۔ رابعہ باجی کے دستخط کر سکتا ہوں میں۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا تم یہ بھی کرتے رہے ہو؟ اس کی غیر موجودگی میں اس کے دستخط۔"

"میں کم عمر ضرور ہوں' کم عقل نہیں ہوں اتنا۔ عدالتی معاملات میں ایسی جعلسازی کرتا تو ان کا سارا کام کیسے سنبھالتا۔ خود اندر ہو جاتا۔ دستخط دیکھے ہیں میں نے فائلوں میں۔ کاپی کر لوں گا۔ جب تک کوئی چیلنج نہ کرے' اصل اور نقل کا فرق کوئی نہیں دیکھتا۔"

"لیکن برخوردار! رابعہ بقلم خود یہاں موجود ہے' تم کون سا اسی وقت کیس فائل کرنے جا رہے ہو۔ آدھی رات کے وقت عدالت میں کون ملے گا۔ صبح آرام سے وکالت نامہ سائن کرا لینا" منظر نے کہا۔

"آپ سمجھے نہیں۔ میں بیک ڈیٹ میں وکالت نامے پر دستخط کروں گا" وقار یوسف بولا "دو سال پرانی کسی فائل سے دیکھ کر۔ تاریخ بھی پرانی ڈالوں گا۔ اس وقت تو وکالت نامے کا فارم بھی نہیں ہے میرے پاس۔ اس کے علاوہ میں نہیں چاہتا کہ رابعہ باجی کی یہاں موجودگی کا راز فاش ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے بہت پہلے مجھے وکالت نامہ دیا تھا۔ ان کا ارادہ کیس جانے کا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کے گھر کی زمین پر کسی نے ناجائز قبضہ کر کے مکان بنا لیا ہے۔"

"اگر تم سے پوچھا گیا کہ یہ فائل کہاں سے آئی تمہارے پاس جس میں ساری اصل دستاویزات ہیں؟" میں نے کہا۔

وقار یوسف مسکرایا "سکندر صاحب! عدالت میں بعض اوقات جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے۔ نظریۂ ضرورت کے تحت۔ میں کوئی جھوٹ گھڑ لوں گا کہ گولا گنڈے والا خود آیا تھا مجھ سے مشورہ کرنے اور جاتے وقت فائل بھول گیا۔ یا چاندنی آئی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ گولا گنڈے والا نے اسے جو نقل بنا کے دی ہے' اس کیس میں وہ پھنس جائے گی۔ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اصل فائل کی چوری کا الزام تو مجھ پر کوئی نہیں لگا سکتا۔"

"شاباش برخوردار! ایسے ہی چلتے رہے تو بڑی ترقی کرو گے۔ یا پھر کسی دن تمہارا موکل باعزت طور پر بری ہو گا مگر وکیل بے عزت ہو کے اندر ہو جائے گا" منظر نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

www.paksociety.com

"یہ کون سے شریف اور بااصول لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ شرافت برتی جائے" رفاقت یوسف کندھا سہلا کے بولا۔

"میرا خیال ہے کہ میں صبح نکل جاؤں نوشہرو کی طرف اور اجمل کو بھی ساتھ لے جاؤں" میں نے کہا۔

"صرف اجمل کو!" منظر نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

"صرف اجمل کو" میں نے مسکرا کے کہا "کلیم بھی ہوگا ساتھ۔"

"وہ تو بچہ ہے" منظر بولا "رابعہ ہرگز اجازت نہیں دے گی۔"

"اسے اعتماد ہے مجھ پر" میں نے کہا۔

"میں سمجھاؤں گا اسے کہ عورت کا گھر عورت ہی اجاڑتی ہے اور مرد کی ذات تو ہے ہی ناقابل اعتبار۔"

میں نے کہا "یار! میری شادی کو ہو جاتے پندرہ سال اور میرے ہوتے چودہ بچے تو شاید میں بھی سوچتا کہ بھاگ جاؤں۔ ابھی تو میں آؤں گا رابعہ کی خاطر۔"

منظر نے آہ بھری "سچ کہتا ہے تو بھائی۔ شادی سے پہلے تو ری کے جذبات کچھ اور ہوتے ہیں۔ اب ہم جیسے سوچتے ہیں فرار ہونے کی جن کے ساتھ کوئی تیاری ہی نہیں ہوتی بھاگنے کے لیے۔ نہ کاجل شہ سے رہائی۔"

"کاجل کو ساتھ لے جانے کا مقصد یہ بھی ہے کہ نوشہرو سے آگے پشاور ہے" میں نے کہا "علاقہ غیر کے پولیٹیکل ایجنٹ سے پاس لے کر ہم کلیم کو اس کے عزیزوں کے حوالے کرنے چلے جائیں گے۔ رابعہ کا ساتھ جانا قطعی غیر ضروری ہے۔ وہ یہاں میری نمائندگی کر سکتی ہے۔"

منظر قہقہہ مار کے ہنسا "جھوٹی کے "آخر وہ ہے کیا چیز؟ پہلے تیری وکیل تھی پھر محبوبہ ہو گئی۔ ابھی فنشل منیجر بن گئی۔ شریک سفر اور شریک رفاقت رہی اور ہو گی بالآخر شریک حیات۔ لیکن تیری نمائندگی کیا کرے گی وہ؟ بھی چوہدری صاحب آ گئے تو خود پیش ہو جائے گی کہ میرے دو نو گئے ہوئے ہیں کام سے منیجری کو شالی فرمائیے یا پولیس آ گئی تجھے پکڑنے تو اپنی گردن پیش کرے گی کہ فی الحال اس میں پھندہ فٹ کر دیں۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "یار! میرا مطلب تھا یہاں کے معاملات بھی تو ہیں۔ وہ اپنا آفس دیکھے۔ موقع ہے تو گھر جائے اس کے خلاف کوئی کیس نہیں ہے۔ اسے کس کا ڈر۔ وہ روز بر خاں ہوسپٹل جا سکتی ہے۔"

"کس حیثیت میں؟ ایسے ہوتی آپ کی قانونی طور پر تب بھی یہ مشکل ہوتا کہ وہ اسپتال کے معاملات میں دخل اندازی کرے یا اپنا حکم چلائے۔ نہ وہ ایلنو سیکرٹری ہے نہ ڈونر...."

میں نے کہا "وہ اکرام شیخ سے رابطہ رکھے گی۔ انتظار کرے گی گل اور محسن کا۔ ممکن ہے کسی کا پیغام آ جائے میرے نام..."

باہر ایک گاڑی آ کے رکی تو منظر کے کان کھڑے ہوئے "کون آگیا آدھی رات کو؟ خدا خیر کرے۔"

میں نے کہا "تیرا کوئی ملاقاتی ہوگا۔"

"سب جانتے ہیں کہ میں دس بجے کے بعد نہیں ملتا کوئی ملاقاتی ہوگا۔"

"میرا... کون ملنے آ سکتا ہے مجھ سے؟"

"ابے جب فون آ سکتا ہے تو ملک الموت خود کیوں نہیں آ سکتا۔ کیا پتا" آج کل وہ بھی گاڑی لے کر پھرتا ہو۔ فاصلے زیادہ ہو گئے ہیں۔" منظر بولا۔

اچانک رفاقت یوسف بولا "سکندر صاحب! آپ کسی وقت نہ ہو شکر ڈالا۔ قاتل لینے آیا ہو کسی کے ساتھ۔"

میں ایک دم اٹھا "بالکل ٹھیک سوچا ہے تم نے۔ اب تو یہ باہر جا کے۔ اور بہتر ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ نکل جاؤ۔ باہر ہوئے قاتل بھی چھپا کے لے جائے۔"

منظر نے کہا "یار ڈرنے کی کون سی بات ہے۔ کون مائی کا لال سیدھا اندر آ سکتا ہے۔ ایمان سے گولی مار دوں خود اپنے ہاتھ سے اور تھانے فون کروں کہ لاش لے جائیں۔ یہ کسی اور کا گھر نہیں ہے پیارے۔ چوکیدار کسی کو نہیں آنے دے گا۔"

"نہیں۔ میرا نکل جانا ہی بہتر ہے۔ ویسے ہی رات آدھی ہے۔" رفاقت اٹھا اور اپنی بیوی کو آواز دینے لگا "انجم! آؤ چلیں۔"

"ابھی ایسی کیا آفت آ گئی اچانک؟" انجم نے اندر سے کہا۔

"بے وقوف! جلدی کرو۔ آ جاؤ۔ نہیں تو میں اٹھا لے جاتا ہوں۔ باقی باتیں پھر بھی کر لینا۔" رفاقت نے پچھلے دروازے میں جا کے کہا۔

رابعہ اور منظر کی بیوی نے بھی رابعہ سا احتجاج کیا مگر رفاقت یوسف نے انہیں اشارے سے کچھ سمجھا دیا یا خود انہوں نے یوسف کے لہجے سے کچھ اندازہ کر لیا کہ انجم فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور رفاقت اسے تقریباً گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے گیا۔

باہر منظر سے آدھی رات کے وقت ملاقات کے لیے آنے والے اور چوکیدار کے درمیان بحث چل رہی تھی مگر آواز سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ منظر کے سارے بچے سو چکے تھے اور گھر میں خاموشی طاری تھی لیکن سارے دروازے اور کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے باہر کی بات اندر صاف سنائی نہ دیتی تھی۔

"کون الو کا پٹھا ہے آخر؟ کیوں لڑ رہا ہے چوکیدار سے" منظر نے اپنی پریشانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی "وہ سب ڈرتے فوراً گولی مار دے گا اگر کسی نے زبردستی کی۔"

میں نے کہا "تو خود کیوں نہیں دیکھتا باہر جا کے۔"

"خوب! چوکیدار نے کہا ہو گا کہ میں سو رہا ہوں۔ اور میں اٹھ کے چلا جاؤں۔ خیر میں کھڑکی کھول کے دیکھتا ہوں۔"

کھڑکی کا ایک پٹ کھولتے ہی چوکیدار کی آواز کے ساتھ

یوسف کی آواز آئی۔

"دیکھیے آپ اس غریب چوکیدار کو ناوارث سمجھ کے ڈرانے دھمکانے کی کوشش مت کریں۔" رفاقت یوسف نے برہمی سے کہا "آپ جو بھی ہیں سمجھ لیں کہ اس وقت ہائی کورٹ کے ایک سینئر وکیل کے گھر میں کھڑے ہیں۔ آپ فوراً تشریف لے جائیں یہاں سے جناب۔"

"آپ جناب کے بچے تو کون ہے؟" کسی نے غرا کے کہا۔

"میں بھی وکیل ہوں۔ زبان سنبھال کے بات کرو مجھ سے۔ میرا ایک فون کافی ہو گا پولیس کو بلانے کے لیے۔ جیل میں سڑ جاؤ گے نکل جائے گی ساری بدمعاشی۔" رفاقت بپھر گیا۔

انجم نے خوفزدہ ہو کے اسے کھینچا "ابھی چھوڑیں۔ آپ مت جھگڑیں۔ چوکیدار خود نمٹ لے گا ان سے۔"

رفاقت یوسف جوان آدمی تھا اور اس چیلنج آمیز بدمعاشی کے دوسرے رہنے پر مشتعل ہو گیا تھا۔ انجم نے بڑی عقلمندی سے کام لیا اور بروقت مداخلت کر کے اس کی آتش اشتعال کو عقل اور مصلحت کے تقاضوں سے دبا کے فرو کیا۔ بات صرف ایک لمحے کی ہوتی ہے جب غیرت کسی کو مار دیتا ہے یا خود مر جاتا ہے۔ انجم اس لمحے کی راہ میں حائل ہو گئی تھی اور شاید اس کے سامنے آنے سے رفاقت کو احساس ہو گیا تھا کہ جذبات کی رو میں بہہ کے وہ اپنے مقصد کو بھول رہا تھا۔ اس کا قاتل کے ساتھ یہاں سے نکلنا ضروری تھا لیکن اس قاتل سے کہیں زیادہ اہم اس عورت کا ساتھ تھا جس کے ساتھ اس نے تمام عمر کا پیمان رفاقت کیا تھا اور اسے یہ حق بہرحال حاصل نہیں تھا کہ وہ آغاز سفر میں ہی انجام کی پروا کیے بغیر اکیلا کسی راہ پر خطر کی جانب قدم بڑھائے۔ وہ اپنی کار میں بیٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

"پتہ معلوم نہیں کون ہے۔" منظر نے آگ بگولا ہو کے ایک بھاری بھرکم گالی دی۔ "میں دیکھتا ہوں۔"

میں نے باہر جھانک کے دیکھا "ایک منشی ٹائپ۔ گاڑی تو وہی ہے چاندنی کی۔ مگر آواز کو ثناءاللہ صاحب کی نہیں ہے۔"

"پھر خود دیکھ کہیں وہ پیچھے تو نہیں بیٹھا ہے۔"

"پیچھے ہاں کوئی ہے تو سہی۔ چاندنی ہے یار۔ بالکل وہی ہے لمبا لمبا بال کے کٹی ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا کہ وہ یہاں آئے گی۔ تو نے میرا نام جو استعمال کیا تھا۔" منظر نے سر پہ ہاتھ مارا "یہ اس کا ڈرائیور کم باڈی گارڈ کم سیکرٹری کم خصم ثانی ہو گا۔ آنے دے اسے اندر۔"

رابعہ کا اور اپنی بیوی کا خیال کیے بغیر اس نے ایک اور فحش بات کی۔ وہ دونوں سہمی سی پیچھے کھڑی ہوئی تھیں۔ رابعہ کو منظر کی بیوی کے ساتھ پریشان دیکھ کے مجھے حیرانی ہوئی۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں دیکھتی ہوں اسے۔" منظر کی بیوی نے آستین چڑھا کے کہا "طبیعت صاف کر دوں گی۔ بھول جائے گا ساری بدمعاشی۔"

"تم کچھ مت کرو خدا کے لیے۔ پاگل ہو ہی ہو تو پولیس کو فون کر کے ان سے باتیں کرو۔ جتنی چاہے منانا ہمیں ہے۔" منظر بولا "رابعہ! تم بھی اندر جاؤ۔ اور انہیں بھی لے جاؤ اپنے سکندر اعظم کو ورنہ میرے گھر میں ماردھاڑ شروع ہو گئی تو سارا اللہ جانے اٹھے گا۔ چودہ بچوں کی چیخ دیکھا دے سے۔ میں انہیں ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

منظر باہر گیا اور چند منٹ کے بعد چاندنی کے ساتھ لوٹا تو اس کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا۔ اسے غالباً چوکیدار نے باہر ہی روک لیا تھا۔ جسے منظر نے چاندنی کے ڈرائیور، سیکرٹری، باڈی گارڈ اور خصم ثانی کے خطاب سے نوازا تھا۔ میں نے چاندنی کے بڑی نزاکت، سبک خرامی، سکون اور اعتماد کے ساتھ اندر آنے کا منظر ساتھ والے کمرے کے دروازے کی اوٹ سے دیکھا۔

منظر کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا "دیکھیے خاتون! اس وقت یہ نامعقول شخص مارا جاتا میرے چوکیدار کی بندوق کی گولی سے مگر خوش قسمتی سے اس کے آپ ساتھ تھیں۔ میرا ایک فون کافی ہے اس کو اندر کروانے کے لیے۔ صبح اس کی کھال کے جوتے پولیس خود مجھے پیش کرتی۔"

چاندنی صوفے پر بیٹھ گئی "آخر ہم کتنی بار معافی مانگیں۔"

منظر بھی صوفے پر بیٹھ گیا "چلیے پھر معاف کیا۔ مگر آپ جیسی خاتون کو ایسے بدمعاشوں کے ساتھ تو نہیں پھرنا چاہیے۔ اور اگر آپ نے اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہے کسی بدمعاش کو تو اسے یہ سمجھا دیں کہ جب وہ شرفاء کے گھر جائے تو شرافت کی وردی پہن لے۔"

"جی ہم سمجھا دیں گے۔ ابھی تو ہم خود کچھ سمجھنے کے لیے آئے ہیں۔" چاندنی نے بالوں کو پیچھے جھٹکا اور ایک گہری سانس لے کر منظر کو نشیلی نظروں سے دیکھا "آپ نے کہا کہ آپ عبدالودود منظر ایڈووکیٹ ہیں؟"

"جی۔ اور بھی سب لوگ یہی کہتے ہیں۔ میری بیوی نہیں کہتی ہے اور بچے ابا کہتے ہیں۔ باقی ساری دنیا مجھے اسی نام سے جانتی ہے۔ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن سے لے کر چیف جسٹس تک۔"

"ہمارا تو دماغ خراب ہو جائے گا۔" چاندنی نے بڑی نزاکت سے اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھا "آپ منظر صاحب ہیں تو پھر وہ کون تھا؟"

"وہ کون؟"

"جس نے آپ کا نام استعمال کیا اور ہمارے گھر آ کے بڑی دیدہ دلیری سے بیٹھا رہا اپنی سیکرٹری کے ساتھ۔ اب تو ہمیں شبہ ہے کہ وہ حرافہ بھی اس کی سیکرٹری نہیں ہو گی۔"

دروازے کے قریب میرے ساتھ کھڑی ہوئی رابعہ مسکرائی مگر

www.paksociety.com

مظہر کی بیوی نے چاندنی کو ایک سو ایک گالیوں اور کوسنوں سے نوازا پر صرف میں سنے تھے کیونکہ اس کے ہونٹ میرے بائیں کان سے صرف دو انچ کے فاصلے پر تھے اور وہ آہستہ بولنے پر مجبور تھی۔ بولے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔

"میں سمجھا نہیں آپ کس کی بات کر رہی ہیں۔ اور کیا ایسی بات نہ تھی جو صبح نہیں کی جا سکتی تھی؟" مظہر نے کہا "فرض کیجیے کوئی الو کا پٹھا آپ کے پاس گیا اور آپ سے کہا کہ میں عبداللہ ورد مظہر ہوں اور یہ میری سیکریٹری ہے۔ تو اس سے کون سی قیامت آ گئی؟ کیا نقصان ہو گیا ایسا کہ آپ ایک بدمعاش کے ساتھ دوڑی چلی آئیں؟ رفتہ کیسے بغیر۔"

"نقصان تو ہوا ہے ہمارا اور معلوم نہیں اور کتنا ہوگا لیکن ہم اس لیے چلے آئے کہ شاید آپ کچھ بتا سکیں کہ وہ کون تھا اور ایسا کیوں کیا تھا اس نے۔ وہ ہم سے ایک فائل بھی لے گیا جس میں ہمارے جائداد کے اصلی کاغذات تھے اور کچھ خاص اہمیت کی دستاویزات تھیں۔ ان کا غلط استعمال کر کے وہ ہمیں بلیک میل کر سکتا ہے۔"

"دیکھیے، میری صورت پر غور فرمائیے۔ وہ چار سو بیس میں تو نہیں تھا نا؟" مظہر بولا۔

"جی غلطی تسلیم۔ آپ ہرگز نہیں تھے۔"

"بس تو پھر آپ اپنی اسٹوری جا کے پولیس کو سنائیے۔ انہیں تفصیل سے بتائیے کہ آپ کے ساتھ کیا واردات ہو گئی ہے۔ میں اب سونا چاہتا ہوں۔" مظہر نے خاصی حوصلہ شکن بداخلاقی سے کہا۔

چاندنی کو مایوسی ہوئی کہ اس کے جالی دار رنگا لے لباس سے جھلکتے بدن کی چاندنی اور اس کے عشوہ و غمزہ و ادا کی حسن و شباب کا انداز بے حجابی بار بار ڈھلک کر جسم کے قاتل خطوط کی دعوت دید دینے والے آنچل کی شوخی اور کافر بدن کے متلاطم نشیب و فراز کی جادوگری نے کچھ کام نہ کیا اور مظہر کے جذبات کی سرد مہری کم نہ ہوئی۔

"ہم ایک بات پوچھیں وکیل صاحب؟"

"جلدی سے پوچھ لیں۔" مظہر نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

"اب ایسی بھی کیا جلدی۔ آپ اٹھ ہی گئے ہیں تو تھوڑے سے اخلاق اور ذرا سی مہمان نوازی کا خیال رکھنے میں کیا حرج ہے۔ آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں اپنے گھر آنے والوں کے ساتھ ایسے پیش نہیں آتے ہوں گے۔"

"مس چاندنی! میرے گھر آنے والے اپنے ساتھ کسی بدمعاش کو نہیں لاتے۔" مظہر بگڑ گیا "آدھی رات کو بھی آتے ہیں تو یوں زبردستی گھر میں نہیں گھستے۔ آپ عورت ہیں، اس لیے میں نے اندر بٹھا لیا مگر آپ میری مہمان ہرگز نہیں ہیں۔ میں کیوں خیال رکھوں ذرا سی مہمان نوازی کا۔ آپ خیال رکھیں کہ مجھے صبح کورٹ بھی جانا ہے۔"

اپنی ناکامی کے احساس سے چاندنی کا چہرہ زرد پڑ گیا اپنے حسن کی قوت تسخیر پر اتنا غرور تھا کہ وہ کسی بھی حسن و شباب کا سارا اسلحہ آزما کے ہار جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"آپ ہماری توہین کر رہے ہیں مظہر صاحب! ہمارے شوفر کو بدمعاش کہہ کے۔ ہم آپ سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں آخر کسی نے آپ کا نام ہی کیوں استعمال کیا ہمیں دھوکا دینے کے لیے؟ ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ سازش تھی۔ کہیں آپ بھی اس میں شریک تو نہیں تھے۔ ذرا اپنی ساکھ کا بھی خیال کیجیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دروازہ کوئی نہیں تھا آپ خود تھے۔"

"شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔" مظہر نے دہاڑ کے کہا "بھونکنا ہے باہر جا کے بھونکو۔ میرے گھر کی حدود سے نکل سڑک پر چلاؤ۔ پولیس کو مت بلانا۔ پولیس آتی ہی ہوگی۔ تمہیں اندر بلانے سے پہلے میں نے فون کر دیا تھا۔"

"اچھا جی" چاندنی تلخی سے مسکرائی "پھر تو ہم پولیس کے ساتھ ہی جائیں گے۔ ابھی نہیں۔ جو کرنا ہے کر لو۔"

اب میرے کان میں بول بول کے چاندنی کی سماعت خراب کرنے والی مظہر کی بیوی کو فون کرنے کا خیال آیا۔ اسے کہا تھا کہ سب پولیس کو بتا دینا۔ وہ فون کرنے دوڑی اور سیکنڈ بعد بدحواس واپس آ گئی۔

"وہ... فون تو ڈیڈ ہے۔ اب کیا کروں؟ ہائے میرے اللہ کیسی آفت نازل ہو گئی ہے آدھی رات کے وقت۔ یہ منحوس شکل والی ڈائن تو مر مارے کے بیٹھ گئی ہے۔ کے کھڑکی سے باہر پھینک دیں۔ سکندر! تم ہی کچھ کرو۔ کو گھر سے۔"

میں نے کہا "بھائی کسی جوان اور خوب صورت عورت کو ہاتھ لگا کر۔ توبہ توبہ۔ اٹھا کے باہر پھینکنے کا تو سوال ہی میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔"

رابعہ نے مجھے گھور کے دیکھا "فون ڈیڈ ہے! ڈیڈ کیا ہے؟"

"ڈیڈ کر دیا گیا ہے؟ فون کا مرڈر" میں نے کہا "اچھا ہے۔ میری سمجھ میں بھی آ گئی ہے بات۔ انہوں نے اندر پہلے لائن کاٹ دی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے مس چاندنی اور ان کے جسم کا رکھوالا نعم علی ابھی تک نہیں آئے تھے۔"

مشتعل مگر بے بس مظہر کے لیے چاندنی ایک چیلنج ہنگامہ میں بھی نہیں چاہتا تھا لیکن چاندنی کے تیور بتاتے تھے آسانی سے واپس جانے کے لیے نہیں آئی ہے۔

"آپ زبردستی ہمیں نہیں نکال سکتے حضور۔ ہم

www.paksociety.com

مہمان ہیں۔" چاندنی بولی "بلکہ اب تو آپ ہمیں بھی میزبان مان لیں۔"

"کیا مطلب ہے اس فضول بات کا؟"

"مطلب یہ کہ خاطر تواضع ہم کریں گے آپ کی۔ ایسی کہ آپ یاد رکھیں گے۔" چاندنی نے اسے بڑی بے شرمی سے آنکھ ماری۔

منظر کی پشت میری طرف تھی مگر میرا خیال ہے اس بے حیائی پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ہوگا۔ ابھی جواب میں اس نے کچھ کہا نہیں تھا کہ صورت حال میں ایک غیر متوقع تبدیلی آئی۔

باہر سے چوکیدار چلانے لگا "سالا، رستم کا بچہ کدھر جاتا ہے۔"

"ارے ہٹ میرے راستے سے مصیبت۔" کسی نے گالی دے کر کہا۔

اس کے ساتھ ہی چوکیدار بلبلایا۔

منظر نے بپھر کے کہا "یہ کیا۔۔۔ کیا ہو رہا ہے؟ میرے چوکیدار کو کچھ ہوا تو۔۔۔ کوئی بچ کے نہیں جائے گا۔ ذرا پولیس آ جائے۔۔۔"

چاندنی مسکرائی "ابھی کیا بات کرتے ہیں آپ وکیل صاحب بھلا یہ پولیس والے بھی کسی کے ہوتے ہیں! یہ تو پیسے کی طرف دوڑتے ہیں۔ اتنا بھروسہ تو کسی پر بھی نہیں کرنا چاہیے۔ بڑا وفادار مشہور ہے کتا ہے تو جانور رہتا۔ بڑی مثال دو تو چپ۔ پولیس کا انتظار چھوڑ دیں۔"

"ان کا تو باپ بھی آئے گا۔"

"باپ آ کے کیا کرے گا بھلا" چاندنی نے معصوم بن کے کہا "آپ کی جگہ یہاں آپ کے والد صاحب ملتے تو ہم کیا کہتے ان سے۔"

"ساری شوخی بھول جاؤ گی تم چاندنی بیگم۔ تم نے کتنی بڑی حماقت کی ہے یہاں آ کے سب بتا رہے گی پولیس۔"

"ہم ریسے ہی سب سمجھتے ہیں جی۔ پولیس کی دھمکی مت دیں رہا۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کون تھا جس نے ہمارے گھر لی آپ کے نام کا سکہ چلایا، سکندر بخت تھا نا۔ اسے کہاں چھپا رکھا ہے آپ نے؟"

"وہ یہاں نہیں ہے۔ تم سے کس نے کہہ دیا؟"

"بس مشکل سے ایک منٹ کا فرق پڑ گیا وکیل صاحب ورنہ اس کی بھی ملاقات ہو جاتی چوہدری صاحب سے۔ اس کے ساتھ جو زاہد سکینہ بھی ان کے ذمے تھی اسے بھی معلوم ہو جاتا۔۔۔"

"تم شرافت سے جاؤ گی یا جوتے کھا کے؟" منظر چیخ کے بولا۔

"ہم شکل کر کے رکھیں۔ ہم بھی یوں جانے کے لیے نہیں آئے ہیں منظر صاحب" وہ منظر کے مقابل کھڑی ہو گئی "ہم جائیں گے تو فائل اپنے ساتھ لے کر۔ آپ رہے رہیں تو مہربانی ورنہ وہ

سکندر اعظم سامنے آ جائیں جو بزدلوں کی طرح اندر چھپے بیٹھے ہیں۔ ہم نے تو سنا تھا بڑے طرم خاں ہیں وہ۔"

اب میرے لیے خاموش کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ میں ان کے سے نکل کر چاندنی کے سامنے جا کھڑا ہوا "آپ نے غلط کیا چاندنی۔ میں بہت شریف اور بزدل آدمی ہوں۔ آپ نے دھوکے سے لایا تھا مگر آپ کی نظروں کے سامنے وہ دونوں بیوی اس فائل کو اپنے ساتھ لے گئے جو آپ کو باہر ملے تھے۔"

"یہ۔۔۔ یہ جھوٹ ہے۔"

"یہ سچ ہے خاتون۔ لیکن جھوٹ بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا جانتی ہو اس فائل کی اہمیت کیا ہے؟ اس میں چند کاغذ تھے اور وہ بھی جعلی۔ اس سے تمہیں کسی قسم کا حق ملکیت نہیں ہو سکتا۔ تمہاری اصل جگہ ہے ہیرا منڈی۔ سو وہیں لوٹ جاؤ ہونے سے پہلے۔"

چاندنی نے چیخ کے آواز دی "رستم!"

مشین گن کے ساتھ رستم اندر آ گیا۔ وہ چھ فٹ قد کا تنومند شخص تھا جس نے اپنے کسرتی بدن کو نمایاں کرنے کے لیے آستین والی چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس پر شکل سے چنانچہ وہ زندہ بکتر میں ملبوس لگتا تھا۔ اس کی جست پتلون لانگ بوٹ گھٹنوں تک آ گئے تھے اور اس کی کمر پر چوڑی فولادی بکل والی بیلٹ تھی جس پر ایک کھوپڑی بنی ہوئی تھی۔ منظر نے آج تک ہماری جنگ عدالت میں لڑی تھی لیکن اب یہ بار ہوا تھا کہ ہم اس کے گھر میں تھے اور گھر میدان جنگ بن گیا۔

منظر نے چیخ کے کہا "کون ہے یہ۔ رستم کی اولاد؟"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "اس سے مجھے منظر۔ یہ رستم ہے تو میں اس کا باپ ہوں۔ ابھی معلوم ہو جائے اسے کہ بدمعاشی ہم بھی جانتے ہیں۔"

منظر نے غصے سے کہا "یہ حرکت تمہیں بہت مہنگی پڑے گی چاندنی۔ قانون کے سامنے کسی رستم کی بدمعاشی نہیں چلتی۔ حرام زادے کو یہ بات سمجھاؤ کہ میرے چوکیدار کو کچھ ہوا تو اسے خود پھانسی پر لٹکا دوں گا۔"

"تمہارے چوکیدار کو نیند آ گئی ہے۔" رستم مطمئن انداز میں بولا "بڑا حرام خور ہے۔ اس کی جگہ تم بھی لو۔"

منظر نے چلا کے اپنی بیوی سے کہا "پولیس کو فون کیا تم نے؟ دروازے کی اوٹ سے نکل آئی تھیں۔۔۔ میں نے منع کیا

"کیا میں نے لگا رکھی ہے! ابھی تک باتیں بنتے ہیں کچھ بھی نہیں کی گڑیا۔" منظر بگڑ گیا "میں خود بات کرتا ہوں ان سے۔"

"نے کوئی توپ ہی ہنہ کی تھی۔" رستم ہنسا۔

"انہوں نے غالباً ٹیلی فون کے تار کاٹ دیے تھے یہاں آنے سے پہلے۔" میں نے منظر کو سمجھایا "فون ڈیڈ تھا۔"

"ساتھ ہی ادھر ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں۔ ساتھ والی کوٹھی میں۔ وہاں نہیں جا سکتی تھی یہ!" منظر بیوی پر چلانے لگا۔

"میں اکیلی جاتی؟" منظر کی بیوی نے ٹھنک کے کہا۔

"ہائے ہائے زمانہ اتنا خراب ہے۔ جوان جہان لڑکی اکیلی کیسے جاتی۔ زمی بات کرو۔ مردزات کی نیت کا کیا بھروسہ۔" رستم بڑی اچکنے کے ساتھ بولا اور قہقہہ مار کے ہنسا۔

منظر کو میں نے کبھی مشتعل نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایسا آدمی تھا جو کسی کی بات کا برا نہیں مانتا تھا اور زندگی کے سنگین ترین بحران سے ہنس کے گزر جاتا تھا۔ ہنسی علاج غم ہے۔ وہ اس کی عملی تفسیر تھا۔ وہ دونوں کو ہنسا سکتا تھا مگر یہ صورت حال مختلف تھی۔ وہ پاگل ہو کے رستم کی طرف لپکا مگر میں نے اسے زبردستی روک لیا۔

اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا فوارہ سا ابلا۔ پھر منظر میں اس کی بیوی کی زنانہ گالی گلوچ اور طعنوں کوسنوں کا شور اٹھا۔

"بے حیا" فاحشہ "کالا منہ ہو تیرا۔ چاندنی نام رکھ لیا اپنا منحوس شکل والی حرافہ۔ خراب۔ خصم کتنا بڑا رستم ہے۔ ذرا اس سے کہہ کہ بندوق رکھ کے بات کرے۔ ہڑیوں کا سرمہ نہ کر دے سکندر تو۔"

میں نے کہا "بھابی آپ جائیں اندر۔ یہ لاتوں کے بھوت ہیں باتوں کا اثر نہیں ہوتا ان پر۔"

"ارے میں ابھی بندوبست کرتی ہوں ان کے کفن دفن کا۔ فون نہیں ہے تو کیا۔ مجھے معلوم ہے آئی جی کا پتا۔ اسے نور جا کے لاتی ہوں۔ کان سے پکڑ کے نہ لائی تو۔"

رستم پھر ہنسا "یہ تو بتا دو نکلیں کہ جاؤ گی کیسے؟ ہوائی جہاز سے کہ بحری جہاز سے۔ یہیں سے اڑا دے کر پیٹا لو۔ راستے تو سب بند ہیں۔"

تو یہ بات ہے! میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ہم محصور ہو گئے ہیں۔

"ہٹ میرے سامنے سے حرامی۔۔۔" منظر کی بیوی نے چلا کے کہا۔

میں نے کہا "منظر اپنی بیوی کو سمجھا۔ غالباً ان کے زمی ہر طرف موجود ہیں۔ شور مچانے سے سارا محلہ اکٹھا نہیں ہوگا۔ کوئی نکلے گا تو مرنے والا۔ مگر بچے جاگ گئے تو پریشان ہوں گے۔"

منظر نے صورت حال کو سمجھ لیا تھا "ٹھیک ہے۔ میں اسے اندر لے جاتا ہوں۔"

میں نے رستم سے کہا "انہیں جانے دو۔ اور ورنہ انہیں ابھی کوئی بات نہیں کہہ دی۔"

"ہو بھی کیسے سکتی ہے۔" وہ مونچھ تاؤ کے بولا۔

چاندنی مسکرائی "کولا لنڈرا الا شکل یا عقل سے مار کھا سکتا ہے مگر طاقت میں مار نہیں کھاتا۔ اس نے ہمیں ایسے ہی نہیں بھیج دیا ایک رستم کے ساتھ۔ دس رستم باہر ہماری حفاظت کے لیے موجود ہیں۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا "سن چاندنی! پہلے میری بات سن لو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس سے پہلے کہ زیادہ خرابی ہو اور تم قانونی مسائل کی دلدل میں پھنس جاؤ۔ تم کو ایک موقع دیا جا سکتا ہے کیونکہ خود تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ تمہیں دھوکے فریب کی ایک بہت بڑی اور احمقانہ سازش کا آلۂ کار بنا لیا گیا ہے۔ تم ایک خوب صورت عورت ہو مگر عقل سے پیدل ہو۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ رابعہ زندہ ہے۔"

"رابعہ زندہ ہے۔۔۔ تم کہتے ہو؟"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "ذرا سوچو، دنیا میں ایسا کیسے ہوا ہے یا ہو سکتا ہے۔ رابعہ کی بات چھوڑو، اپنی بات کرو۔ کیا صرف موت کے ایک جھوٹے سرٹیفکیٹ سے کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ تم مر چکی ہو۔ تم زندہ ہو تو یہ بات رہنا جانتی ہے۔ تم بھی گمنام بہرحال نہیں ہو۔ رابعہ تو بہت مشہور وکیل ہے۔ نیچے سے اوپر تک ہزاروں لوگ جانتے ہیں اسے۔ اس کی کوئی بہن نہیں تھی۔ اس کی گواہی پولیس کے اعلیٰ افسر تک دے سکتے ہیں۔ ہائی کورٹ کے جج اسے شناخت کر سکتے ہیں۔ تم کیسے اس کی جائیداد پر قبضہ جاری رکھ سکتی ہو۔ مجھے بتاؤ۔ فرض کرو تمہاری جائیداد پر ایسے ہی کوئی قابض ہو جاتا۔"

"مگر۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ رابعہ۔۔۔ زندہ نہیں" چاندنی کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ "اور خود چوہدری رلادر نے کہا تھا کہ وہ واپس نہیں آ سکتی۔"

میں نے کہا "لڑکی عابدہ سے؟"

اس کے ساتھ ہی عابدہ سامنے آ گئی "میں رابعہ کی روح نہیں خود رابعہ ہوں۔"

"کیا۔۔۔ کیا ثبوت ہے آخر تمہارے پاس؟" چاندنی نے رابعہ پر نظر جما کے کہا۔

میری نظر چاندنی پر تھی اور میں اس کی ذہنی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کولا لنڈرا الا شاید رلادر کا ایک حقیر سا کارکن تھا جس کو اس نے مروانے کے لیے اسی طرح آگے بڑھا دیا تھا جیسے شطرنج کی بساط پر پیادے کو قربان کیا جاتا ہے۔ اس نے بدمعاشی کے زعم میں ہیرا منڈی کی ایک طوائف کو رابعہ کے گھر کی مالکن بنا دیا تھا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اب اس سے یہ زمین کوئی نہیں چھین سکتا اور اتنی بڑی قیمت ادا کر دینے کے بعد وہ چاندنی کا بھی مالک بن چکا ہے۔ چاندنی کو شاید کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

www.paksociety.com

"ثبوت بھی مل جائے گا۔ ذرا صبح ہونے دو۔" رابعہ صوفے پر میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی "اس وقت بھی فراہم ہو سکتا تھا مگر تمہارے رستم راہ میں حائل ہیں۔"

آہستہ آہستہ چاندنی کا ذہن حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو رہا تھا "نہیں... ہمیں تو تحفے میں ملی تھی یہ کوٹھی۔"

منظر نے اندر آ کے کہا "ہر کوٹھے والی کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے کوئی کوٹھی والا عزت دار عورت بنا دے۔"

میں نے کہا "کس نے تحفے کی تھی تمہیں یہ کوٹھی؟"

"گولا... غلام محمد نے" چاندنی کی صورت پر اب بدحالی کے آثار واضح تھے "ہم سے شادی کے لیے۔"

"مگر خود کو رابعہ کی بہن تم نے مشہور کیا تھا یا اس کا مشورہ بھی گولا ننھڑ والا نے دیا تھا؟" میں نے کہا۔

"اسی نے کہا تھا۔" وہ نظر جھکا کے بولی "کہ یہاں پہلے ایک وکیل رہتی تھی۔ تم خود کو اس کی بہن کہہ سکتی ہو۔ وہ تو مر چکی اور رابعہ بھی اسے بھول گئی۔ اس طرح تم..."

"رک کیوں گئیں؟" رابعہ نے طنز سے کہا "تم اپنے بدنام ماضی کو اپنی زندگی سے خارج کر دو گی، عزت دار ہو جاؤ گی۔"

اقرار جرم چاندنی کی صورت پر لکھا ہوا تھا۔ "ہمارے ساتھ دھوکا ہوا۔ ہم نہیں جانتے غلام محمد نے ایسا کیوں کیا۔"

"وہ خود کتنا بڑا رئیس تھا؟ اتنی بڑی قیمت ادا کر سکتا تھا تمہاری؟" میں نے کہا "تمہیں تو اندازہ ہوگا۔ تمہارا پرانا پرستار ہوگا۔"

"شادی سے پہلے کتنا آتا جاتا تھا تم پر؟" منظر بولا۔

"بہت... اب ہم کیا بتائیں۔ لیکن یہ کوٹھی ہمارے نام کر کے تو اس نے ہمیں حیران کر دیا تھا۔"

"تم نے اس سے کبھی پوچھا کہ وہ کیا کرتا ہے؟ اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے اس کے پاس؟ وہ زمیندار ہے، صنعت کار یا کچھ اور۔" رابعہ نے کہا۔

"انہیں اس سے کیا۔ وہ اسمگلر ہو، ڈاکو ہو۔ انہیں اپنی منہ مانگی قیمت دے کر کوئی بھی اپنا سکتا ہے۔" منظر بولا۔

"اس نے کہا تھا کہ وہ ٹھیکیدار ہے۔ ہم کیوں شک کرتے۔" چاندنی نے کہا "ہم تو سمجھے تھے کہ شاید ہماری تقدیر بدل گئی ہے۔ ہمیں اپنا گھر مل گیا ہے۔" "اس نے ایک مرد فریبی" پھر طوائف عورت بننا چاہتی ہے۔"

"غلط فہمی ہو تم۔ وہ صرف امیر عورت بننا چاہتی ہے۔ دولت اور عیش و آرام کی زندگی کون چھوڑتا ہے۔" منظر بولا "جو طوائف اس ماحول سے نکلنا چاہے وہ کسی کلرک سے شادی کیوں نہیں کر لیتی؟ کسی غریب دکاندار یا مزدور کے گھر میں پناہ کیوں نہیں لیتی؟ جیتے جاگیرداروں اور رئیسوں کی کوٹھی میں جا کر... آباد ہونا کیوں قبول کرتی ہے؟"

"وہ بہت مجبور، بے بس ہوتی ہیں۔" چاندنی نے اپنا کمزور سا دفاع کیا۔

"ہوں گی کچھ مجبور مگر سب بے چاری نہیں ہوتیں۔ اصل مجبوری ہے عیش و عشرت کی زندگی، آزادی۔ ایسے فراڈ کر کے شرافت کی سند حاصل کرنے کی خواہش تم نے بھی ضرور کی ہوگی۔"

میں نے کہا "چھوڑو یہ بحث۔ رات بہت ہو گئی ہے چاندنی۔ ساری بات اب تمہاری سمجھ میں آ گئی ہے اور تمہیں احساس ہو گیا ہے کہ غلطی سے تم اس چکر میں پھنس گئی تھیں تو ابھی وقت ہے گھر جاؤ اور صبح یہاں آ جاؤ۔"

چاندنی نے سوالیہ نظریں اٹھائیں "کس لیے؟"

"میرے ساتھ چل کے بیان دو عدالت میں۔" منظر نے کہا "یا تھانے چل کے رپورٹ لکھواؤ۔ رپورٹ میں بھی لکھوا سکتا ہوں، رابعہ بھی لکھوا سکتی ہے۔ تم اپنے بیان سے تصدیق کر سکتی ہو کہ تمہارے ساتھ غلام محمد عرف گولا ننھڑ والا نے دھوکا کیا تھا۔"

"یہ... یہ بہت مشکل ہے... ناممکن" چاندنی نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔

"تمہارے بچنے کا بس یہی ایک راستہ ہے ورنہ سب کے ساتھ تم بھی جیل کی ہوا کھاتی نظر آؤ گی۔" منظر نے کہا "اگر تم سلطانی گواہ بن جاؤ تو میں یہ سب کچھ بھول جاؤں گا جو اس وقت تم نے بیان کیا ہے۔ غلط فہمی کو معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ تم عدالت میں سب سچ بتا دو تو..."

وہ اٹھ کھڑی ہوئی "نہیں جی، ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ وہ گھر خالی کر دیں اور صبح اپنی دنیا میں لوٹ جائیں۔ آپ کا جو دل چاہے کریں۔ ہم کسی تھانے کچہری اور مقدمے بازی کے چکر میں نہیں پڑ سکتے۔"

میں نے کہا "اس چکر سے بچنا اب تمہارے اختیار کی بات نہیں رہی۔ تم برابر کی شریک جرم ہو۔ وعدہ معاف گواہ بن کے اور ہمارے کہنے کے مطابق بیان دینے سے تم کو قانونی تحفظ مل جاتا، ورنہ یہ سارے رستم جو تمہارے محافظ بن کے ساتھ آ گئے ہیں، گولا ننھڑ والا اور چوہدری دلاور سب مل کے بھی تمہیں بچا نہیں سکتے۔"

رستم خاموش کھڑا سب کچھ سن رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں ناپسندیدگی کے جذبات دیکھے جا سکتے تھے۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ صورت حال پر ہونے والی گفتگو کو نہ سمجھتا مگر اپنی غلطی یا شکست کو تسلیم کرتے ہوئے "سوری" کہہ کے پسپا ہو جانا اس کی شان کے خلاف تھا۔

منظر کی اور میری خواہش ایک تھی۔ ہم چاندنی کو دلاور کے خلاف گواہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے لیکن اس میں اتنی ہمت ہی نہ تھی کہ وہ اپنے شوہر کی زر خرید بیوی ہونے کے خیال سے بغاوت کر سکے۔ وہ گولے ننھڑ والے سے بھی اتنی ہی ڈرتی تھی جتنا چوہدری دلاور سے۔

ترپ کا آخری پتا چلتے ہوئے میں نے کہا "چاندنی! ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے یار رستم کے خلاف ایک بہت سنگین ایڈووکیٹ کے گھر میں زبردستی گھسنے، مارپیٹ کرنے، خوف و ہراس پھیلانے اور اقدام قتل جیسے سنگین مقدمات درج نہیں کرائیں گے۔ تم بھی مظلوم اور مجبور ہو اور رستم بھی اس لیے قابل معافی ہے کہ یہ ظلم کا غلام ہے۔"

رستم نے بگڑ کے کہا "چلو بیگم صاحبہ! بہت ہو گئی۔"

چاندنی کا رنگ فق ہو گیا تھا "ہاں... ہم ایسی باتوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ ہم ان پڑھ نہیں ہیں اور ہم اپنا دفاع کر سکتے ہیں۔ بڑے سے بڑا وکیل ہماری طرف سے عدالت میں پیش ہونے پر تیار ہوگا۔"

وہ باہر چلی گئی تو منظر ایک دم اٹھا "میں دیکھوں تو سہی کتنے رستم کھڑے تھے باہر۔"

میں نے کہا "بُرا خیال ہے۔ کہیں انہیں شک نہ ہو کہ تم ان کا پیچھا کر رہے ہو۔"

رابعہ نے بھی کہا "وہ فائرنگ نہ کر دیں۔"

منظر نے کہا "اچھا۔ گھر میں چوکیدار کو تو دیکھ لوں۔ پتا نہیں وہ کس حال میں پڑا ہے۔ زندہ بھی ہے یا نہیں۔"

میں نے کہا "وہ بے ہوش ہوگا۔ یہ لوگ قتل کے ارادے سے نہیں آئے تھے۔ اتنی ہمت تو چوہدری دلاور میں بھی نہیں کہ میرے گھر میں یوں گھس کے کسی کو مار دے۔ ابھی جو کچھ انہوں نے کہا اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے نہ کوئی گواہ۔"

"ہم سب گواہ ہیں۔"

"ہم سب ایک پارٹی ہیں۔ مدعی بن سکتے ہیں، گواہ نہیں۔" رابعہ نے کہا۔

باہر سے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ یہ غالباً جیپ تھی۔ اس کے انجن کی مخصوص آواز رات کے سکوت میں واضح ہوتی تھی۔ میں منتظر رہا کہ کسی اور گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز بھی سننے کو ملے مگر اس ایک گاڑی کی آواز بھی آہستہ آہستہ دور ہو کے معدوم ہو گئی۔

"وہ بلف کر رہے تھے۔" منظر بولا۔

"ہاں۔ چاندنی کے ساتھ ایک ہی رستم تھا، دس رستم نہیں۔ شک تو مجھے بھی تھا مگر اس کی تصدیق کیسے ہوتی۔" میں نے کہا "تمہارا ہیرو کہاں ہے؟"

"اسے میں نے ایک جھاڑ جھنکار کے بچوں کے ساتھ کمرے میں بند کر دیا تھا کہ یہاں بیٹھ کے روتا رہ، مگر آواز مت نکالنا حلق سے ورنہ پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑی زیادتی کی تم نے۔ جاؤ رابعہ! تم جا کے اسے دیکھو اور بہتر ہے اب سو جاؤ۔ ہم اس وقت کچھ نہیں کر سکتے۔"

"ہم صبح بھی کچھ نہیں کر سکتے۔" منظر بولا "سالے فون بھی کاٹ گئے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں لائن کہاں سے ٹوٹی ہے۔"

منظر باہر چلا گیا تو میں نے عقبی حصے کا چکر لگایا مگر مجھے کہیں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے۔ اس وقت ہمارے رات میں کہیں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور مجھے کاجل کی فکر ہو رہی تھی۔ وہ بچوں کے کمرے میں تھی اور شاید وہیں سو گئی تھی۔ کیا اس نے بھی یہ سب کچھ سنا ہوگا؟ کہیں منظر کی بیوی نے ساری باتیں اسے بتا دیں تو اس کا ذاتی احساس عدم تحفظ پھر بیدار ہو جائے گا۔ وہ خود کو یہاں محفوظ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی اور ہمارے "خاندان" میں کسی حد تک ایڈجسٹ بھی ہو گئی تھی۔ میری خواہش تھی کہ وہ ان سب جھمیلوں سے دور رہے جن کا تعلق اب میرے اور دلاور کے تصفیہ طلب ذاتی معاملات سے تھا۔

میں واپس اندر گیا تو منظر نے چوکیدار کو صوفے پر بٹھا رکھا تھا اور خود ہاتھ باندھے سامنے کھڑا اس کی روداد سن رہا تھا۔ اسے اندھیرے میں کسی نے پیچھے سے دبوچ کر بے بس کر دیا تھا اور باندھ کے ڈال دیا تھا۔ وہ خاصی عمر کا آدمی تھا اور زیادہ تنومند بھی نہیں تھا۔

"بابا! تم نے حملہ آور کو دیکھا تھا؟" منظر نے پوچھا۔

"کہاں دیکھا جی۔ دیکھتے تو چھوڑتے نہ زندہ جی۔ مجال تھی کسی کی جو اندر آ جاتا ایسے منہ اٹھا کے۔ بندوق کیا شے ہے، توپ سے بھی ہم ڈرنے والے نہیں ہیں۔" اس نے لمبے لمبے کراہتے ہوئے بیان دینا شروع کیا۔

اس کی باتوں پر میں نے رابعہ کو مسکرا کے دیکھا۔ وہ منظر کی بیوی کے ساتھ چوکیدار کی تیمارداری کر رہی تھی۔ وہ کافی دیر سردی میں بندھا پڑا رہا تھا اور کچھ خوف سے بھی کانپ رہا تھا۔

"چلو اب رفع کرو اسے۔" منظر بولا "خبیث لوگ تھے، چلے گئے کوئی نقصان کیے بغیر۔ اب کسی سے ذکر مت کرنا اس بات کا۔"

"کوئی ذکر بھی نہ کریں۔ وکیل صاحب! ان کو تو آپ بند کرا دو ہمیشہ کے لیے۔ صبح شام چھتر کھائیں، مٹکے کا پانی پلایا جائے حرامیوں کو اور دھونی دی جائے دیسی مرچوں کی..."

"بابا جی! کیا فضول باتیں کرتے ہو۔ کس کو پکڑے گی پولیس؟ سب سے پہلے تو تم سے پوچھا جائے گا کہ حلیہ بتاؤ۔ تم نے تو دیکھا ہوگا کتنے بندے تھے۔" منظر بگڑ کے بولا "کیسے کپڑے پہن رکھے تھے؟"

اس نے ایک آہ بھری "ہاں جی، پولیس بھی چوروں کو کہاں پکڑتی ہے۔ الٹا زمانہ آ گیا ہے۔ چوکیدار پکڑے جاتے ہیں۔ پہلے چور مارتے ہیں پھر الگ تھانے والے۔ کچھ نہ بولو تو پولیس کہتی ہے بولو۔ بولو تو چور پوچھنے آ جاتے ہیں کہ ہمارا نام لیا تھا..."

جب وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا تو رابعہ کو سب سے پہلے ہنسی آئی پھر منظر کی بیوی بھی ہنسنے لگی حالانکہ اس کا موڈ خراب تھا۔

میں نے کہا "یار منظر! یہ کیا نمونہ رکھ لیا ہے تو نے بطور

www.paksociety.com

چوکیدار۔ اس کا فائدہ؟ یہ روک سکتا ہے کسی کو اندر آنے سے؟"

"تو مجھے بتا، تالے لگانے کا فائدہ۔ کیا ان سے چور ڈاکو رک جاتے ہیں؟" مظہر بولا "جیسے تالے ہوتے ہیں شریفوں کو یہ بتانے کے لیے کہ صاحب خانہ گھر میں نہیں ہیں۔ ایسے ہی یہ بھی بجاتا رہتا ہے۔ آنے جانے لوگوں کو بتاتا ہے کہ میں ہوں یا نہیں۔ بڑھا آدمی دنیا میں اکیلا ہے۔ میں نے جگہ دے دی ہے رہنے کے لیے۔"

میں نے کہا "اسے دیکھ کر تو پرانے رئیسوں کے دور کے چوکیدار یاد آتے ہیں جو گلیوں میں لالٹین اٹھائے لاٹھی مارتے پھرتے تھے اور چلاتے رہتے تھے رات بھر کہ "جاگتے رہو"۔"

رابعہ بولی "جو کہ نہایت مضحکہ خیز بات ہے۔ اگر لوگ رات بھر جاگتے رہیں تو پھر چوکیدار کی ضرورت کیوں پڑے۔"

"پرانے چور بھی تو صلح دار ہوتے تھے۔ ان کی آواز پر رک جاتے تھے یا فرار ہو جاتے تھے۔" مظہر نے کہا "اب تو میں دروازے پر ٹینک کھڑا کر دوں تو حملہ کرنے والے ٹینک شکن توپ لے کر آ جائیں گے۔"

میں نے کہا "تاجل کہاں ہے؟"

"وہ سو رہی تھی۔ اسے پتہ ہی نہیں۔" مظہر کی بیوی نے کہا۔

"چلو اب تم بھی سو جاؤ رابعہ بی بی۔ دو بج رہے ہیں رات کے۔ مجھے صبح پھر مغز کھپانے کے لیے جانا ہے۔" مظہر نے کہا۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ عام حالات میں کوئی بھی ٹیلی فون کی گھنٹی سن کے نہیں چونکتا مگر اس وقت ایک ساتھ ہم سب تقریباً اچھل پڑے۔

"یہ مردہ زندہ ہو گیا۔" میں نے کہا۔

مظہر نے سوالیہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا "فون تو ڈیڈ تھا؟"

"رابعہ سے پوچھو تو مجھے کیا گھور رہے ہو۔" وہ بولی۔

"اچھا دیکھو تو سہی اس وقت کس نے یاد کیا ہے۔ کیا پتا کوئی اطلاع دینا چاہتے ہوں کہ ہم خیریت سے گھر پہنچ گئے۔ فکر نہ کرنا۔" میں نے کہا۔

مظہر نے فون اٹھا کے کہا "ہیلو" اور ریسیور پر ہاتھ رکھ کے میری طرف دیکھا "ٹھیک کہا تھا تو نے۔ تیری کال ہے۔"

"میری کال ہے۔ کون ہے؟" میں نے تذبذب کے ساتھ کہا۔

"تیرے ماموں۔ چوہدری رلادر۔" مظہر بولا "بول کیا کہوں؟"

وہ فون نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ریسیور لے لیا لیکن لائن کٹ چکی تھی۔ "کوئی بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

مظہر بولا "میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ چوہدری رلادر تھا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا "تجھے چکر دے دیا اس نے۔ اگر میں یہاں نہ ہوتا تو تیرا جواب فوری اور واضح ہوتا۔ تو پوچھتا کہ چوہدری صاحب آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ تیرے توقف نے تصدیق کر دی کہ میں موجود ہوں اور یہی مقصد ہو گا اس کی کال کا۔ اسے

معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں۔"

مظہر نے سر ہلایا "یہ سالا بہت ہی ذرا سے باز ہے۔ خواہ مخواہ رہبے ہی ہو جاتی مس چاندنی سے اور اس سالے رستم خان سے۔"

"وہ تیرا سالا کب سے ہو گیا؟" میں نے کہا۔

مظہر نے ایک آہ بھری "کاش ہم اتنے خوش نصیب ہوتے سکندر صاحب۔ اس نے تو بڑی واضح پیشکش کر دی تھی۔ چاند سا مستی کی تھی۔"

"پھر کیا بیوی سے ڈر گیا؟" میں نے کہا۔

"نہیں یار بچوں سے ڈر گیا۔"

"کیا سب مل کے تجھے مارتے؟" مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"یہ ان سے جو چاندنی کی اولاد کہلاتے۔ چودہ کیا کم ہیں۔ مزید چودہ کا سوچ کے ہی چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ اس کے پھیلنے سے ڈر لگتا ہے ورنہ چار تو حاضر اسٹاک میں دستیاب ہو گئی۔"

میں نے کہا "تاریکی میں ایک چکر باہر کا لگا کے دیکھنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے تار کہاں سے کاٹا تھا اور کاٹا تھا تو جاتے وقت انہیں جوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"رکھ اپنے جاسوسی اشتیاق۔ اس کے بغیر تو شاید نیند بھی نہیں آئے گی تجھے۔" مظہر میرے ساتھ چل پڑا۔

ٹیلی فون کی لائن پول سے چھت تک آئی تھی اور وہاں سے سیدھا ایک روشن دان سے گھر کے اندر آ گیا تھا۔ یہ تار کوئی چھت پر چڑھ کے کاٹ سکتا تھا یا ٹیلی فون کے کھمبے پر۔ چھت پر کسی کا چڑھنا زیادہ مشکل تھا چنانچہ زیادہ امکان یہی تھا کہ کسی نے کھمبے پر چڑھ کے تار کو اس ڈبے سے الگ کر دیا جو اوپر لگا نظر آتا ہے لیکن پھر جوڑ کے اس کارروائی کا کوئی ثبوت باقی نہیں چھوڑا۔

واپس اندر آتے ہوئے میں نے کہا "مجھے اس کارروائی کے پیچھے رلادر کا ہاتھ نظر آتا ہے۔"

مظہر نے قہقہہ مارا "بھونکے گا! یہ تو وہی سکہ بند بات ہو گئی جس نے چوری کی واردات میں لمبی چوڑی تفتیش کے بعد اعلان کیا تھا کہ یہ کام کسی چور کا معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے خفت سے کہا "میرا مطلب تھا اس کا ذہن یہاں بھی کام کرتا ہے۔ اس نے کہا ہو گا کہ خیال رکھنا وہ کسی عام آدمی کا گھر نہیں ہے۔ بہت بڑا وکیل ہے۔ سب کو اندر کروا دے گا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے چوکیدار کو مارا نہیں۔ اس کے جسم پر ضرب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔ اسے دوا سے بے ہوش نہیں کیا کہ کہیں میڈیکل رپورٹ میں آ جائے۔ بس ایسے ہی باندھ کے ڈال دیا تھا۔ ٹیلی فون کا تار بھی انہوں نے پول پر سے الگ کیا تو پھر ایسے جوڑ دیا کہ خود ٹیلی فون کے محکمے والوں کو پتا نہ چلے۔ گھر کے اندر بھی انہوں نے باتوں کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اور یہ جو فون ابھی آیا تھا۔ اس کا ایک مقصد تو میں نے بتایا۔ دوسرا مقصد اپنی

رہا ہو گا کہ فون کی لائن پھر جوڑی جا چکی ہے اور مس چاندنی واپس جا چکی ہے۔"

مظہر نے کمرے میں پہنچ کے گھڑی دیکھی "یار! اصولاً تو مجھے سو جانا چاہیے مگر سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں پھر حشر اٹھانے والی آنکھ نہ کھلے۔"

"فکر نہ کر۔ تیرا ہارٹ فیل نہیں ہو سکتا۔"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ اصل خطرہ تو تیرے دشمنوں سے ہے۔ وہ نہ چھری پھیر جائیں سوتے میں میرے حلق پر۔" مظہر بولا۔

"چل تو سو جا۔ میں جاگ رہا ہوں۔ مجھے نیند کم آتی ہے اور کچھ رات رات بھر جاگنے کی عادت ہو گئی ہے۔" میں نے کہا "آج ہماری وجہ سے تیرے گھر میں بھی پریشانی کے اسباب پیدا ہوئے۔"

مظہر اپنے بیڈ پر لیٹ گیا "ابا تو اب اکثر ہو گا۔ گھر دیکھ لیا ہے انہوں نے اور یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ مسٹر اور مسز سکندر اعظم یہیں پائے جاتے ہیں۔ جب تو یہاں نہیں تھا تب بھی ہم تو زد پر تھے یار۔ اب تیرے آ جانے سے گھر بھی محفوظ نہیں رہا۔ کل سے سب بچوں کی فوجی تربیت شروع کرتا ہوں۔ سالے غلیل تو چلا ہی سکتے ہیں۔ دو چار کو کانا ہی کر دیں۔"

میں نے کہا "تیری نصف بہتر زبان بہت چلاتی ہے۔ اسے ہاتھ چلانا آتا تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"یہ نیک کام تو کر۔ رابعہ کو سکھا دے ہاتھ پاؤں چلانا تاکہ تیرا حشر بھی وہی ہو جو اس مرزا غالب ثانی کا نادرہ کے ہاتھوں ہوا ہے۔" مظہر بولا اور کروٹ بدل کے سو گیا۔

مجھے دو منٹ بعد اس کے خراٹے سن کر حیرانی ہوئی۔ میرے لیے نیند کو بلانا روٹھے محبوب کو منانے سے زیادہ مشکل ہوتا تھا۔ آنکھیں بند کرنے کے بعد بھی خیالات کی رَو ماضی سے حال اور مستقبل کے حالات و واقعات، خدشات اور امکانات میں سرگرداں رہتی تھی۔ اچھی کتاب ایسے پریشان کن خیالات سے نجات دلانے اور ذہن کو پُرسکون کرنے میں معاون ثابت ہوتی تھی مگر یہاں پڑھنے کو کچھ بھی نہیں تھا چنانچہ میں بہت دیر تک جاگتا رہا اور چوہدری رلادر کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس میں کچھ ہماری غلطی کو بھی دخل تھا کچھ ستم ظریفی حالات اور سلسلۂ اتفاقات کہ ادھر ہم پاکستان پہنچے اُدھر رلادر کو خبر ہو گئی۔ غالب نے اپنی آمد کو اخبار سے مشتہر کروایا اور پھر جذباتی ہو کے رابعہ کے پرانے گھر کی جگہ چاندنی کے گھر میں پہنچ گیا۔ کسی کی عدم موجودگی میں اس کی زمین پر قبضہ کر لینے کے واقعات اتنے عام نہیں۔ اگر میں غور کرتا تو اس کا صاف مطلب سمجھ سکتا۔ اس کے پیچھے رلادر کے سازشی ذہن کی کارستانی دیکھ سکتا تھا مگر مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا۔ چالاکی سے کام لے کر میں نے جو فائل حاصل کی تھی وہ اہم ضرور تھی مگر اس کے بغیر بھی رابعہ اپنے حق ملکیت کا موثر دعویٰ کر سکتی تھی اور یہ کہیں بہتر ہوتا اگر رکارڈ یوسف یہ مقدمہ فائل کرتا اور رابعہ کا وکالت نامہ پیش کر کے گواہ ثبوت لاتا

اور چاندنی کو عدالت میں طلب کر لیتا۔ جب چاندنی کو رابعہ آنجہانی کی بہن کے طور پر پیش کیا جاتا تو رابعہ کا زندہ اس جہاں میں خود نمودار ہونا وہ انجام کار رہا کا ہوتا جو سب کو چپ کرا دیتا۔

معلوم نہیں کب مجھے نیند آئی۔ مجھے تو ایسا لگا کہ آنکھ لگتے ہی مظہر نے مجھے جھنجوڑ کے جگا دیا۔

"لاحول ولا قوۃ کیا آفت آ گئی صبح صبح۔" میں نے آنکھیں مل کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میاں سکندر! دو چار زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔ بھاگو۔" اس نے میرے سامنے ایک اخبار رکھ دیا۔

وہ عدالت جانے کے لیے تیار تھا اور کالا کوٹ پہنے بریف کیس اٹھائے کھڑا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا کہ ناشتا کرتے ہوئے اخبار پر نظر ڈالتا تھا۔ جس خبر نے آج اسے بدحواس کر دیا تھا اسے تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ خبر چھوٹی تھی لیکن صفحۂ اول پر تصویر کے ساتھ لگائی گئی تھی۔

چاندنی کی تصویر پر نظر پڑتے ہی میری نیند رفوچکر ہو گئی اور ایک جھٹکے سے میرا خوابیدہ ذہن پوری طرح بیدار ہو گیا۔

"یہ۔ یہ کیا۔ چاندنی کو قتل کر دیا گیا!" میں نے بے یقینی سے کہا۔

مظہر کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں "اصل بات یہ ہے کہ جب اسے قتل کیا گیا اس وقت وہ زندہ تھی اور اس وقت آپ رابعہ کے ساتھ اس کے گھر میں تشریف رکھتے تھے۔"

میں نے خبر کو غور سے پڑھنا شروع کیا۔

گزشتہ شب شاہ ٹاؤن میں قتل کی لرزہ خیز واردات میں حسین عورت کا سفاکانہ قتل۔ بازارِ حسن سے تعلق رکھنے والی ایک عورت چاندنی بیگم کو نامعلوم قاتل نے خنجر کے پے درپے وار کر کے ہلاک کر دیا۔ چاندنی بیگم نے کچھ عرصہ قبل ٹھیکیدار غلام محمد سے شادی کی تھی۔ واردات کے وقت وہ گھر پر تنہا تھی۔ اس کے شوہر مشہور سیاسی و سماجی کارکن چوہدری رلادر کے عشائیے میں شریک تھے۔ انہوں نے واپسی پر رات دس بجے اپنی خواب گاہ میں چاندنی بیگم کی خون میں لت پت لاش دریافت کی اور پولیس کو اطلاع دی۔ ابتدائی تفتیش کے نتیجے میں سامنے آنے والی باتوں سے پتا چلا ہے کہ یہ واردات رات نو اور دس بجے کے درمیان ہوئی تھی۔ چوکیدار نے تقریباً اسی وقت دو مہمانوں کے آنے اور کچھ دیر بعد خاموشی سے چلے جانے کی تصدیق کی جن میں سے ایک مرد تھا اور دوسری کوئی خوب صورت عورت۔ کار کا نمبر نوٹ کرنا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا مگر اپنے بیان میں چوکیدار نے گاڑی کا رنگ اور ماڈل بتایا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ ملاقاتی مرد نے خود کو وکیل ظاہر کیا تھا جس کی وجہ سے چاندنی بیگم نے انہیں اندر بلوا لیا تھا۔ تفتیش کرنے والے ایک افسر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قتل کی واردات ایک سے زیادہ افراد کا کام تھا۔ اگر قاتل وہی ملاقاتی تھے

www.paksociety.com

تو یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ مرد نے چاندنی بیگم کو قابو میں رکھا اور اس کا منہ دبایا جب کہ عورت نے خنجر سے چاندنی کا کام تمام کیا۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ چوکیدار نے چاندنی بیگم کی چیخ یا مدد کی آواز بھی نہیں سنی اور قاتل ملاقاتی خاموشی سے فرار ہونے میں کامیاب رہے اور چوکیدار نے اندر جاکے چاندنی کی خیریت معلوم کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ غلام محمد کے بیان کے مطابق چاندنی کا قتل کسی رقابت کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ چاندنی بیگم گزشتہ کئی ماہ سے گھریلو زندگی بسر کر رہی تھی۔ اسے بطور ماڈل پیش کرنے کی بات چیت چل رہی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کچھ فلمساز اسے پنجابی فلموں میں ڈانسر کا رول قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمارے نمائندے کے مطابق گھر میں کافی نقدی اور زیور موجود تھا مگر غلام محمد نے کسی چیز کی گمشدگی کے شبے کا اظہار نہیں کیا۔ چوکیدار غلام محمد اکھاڑے کے سابق بے تاج بادشاہ گولا تنڈ والا ہیں جو پہلوانی چھوڑ کے صنعتکار چوہدری دلاور کے ساتھ سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے ہیں۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

اس خبر کو پڑھنے کے بعد میرے لیے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کرنا دشوار نہ رہا۔ ہم ایک بہت بڑی سازش کا شکار ہو چکے تھے اور ان حالات میں ہمارا فوراً یہاں سے فرار ہو جانا منظر کو مشکلات سے بچانے کے لیے ازحد ضروری تھا۔

میں نے کہا "منظر! کوئی ہمیں تلاش کرتا ہوا یہاں تو نہیں پہنچا؟"

"ابھی تک تو نہیں پہنچا مگر پولیس کسی بھی وقت آسکتی ہے۔ تم لوگ نکل جاؤ۔" منظر نے کہا "میں نے رابعہ اور کاجل کو اٹھا دیا ہے۔"

"اگر ہمارے نکلنے سے پہلے ہی پولیس آگئی تو؟"

"تو ایسے منہ اٹھا کے اندر نہیں آئے گی۔ میں روک سکتا ہوں ان کو دروازے پر۔ خانہ تلاشی کے وارنٹ مانگ سکتا ہوں۔"

"وہ سب اپنے ساتھ لائیں گے۔" میں نے کہا "یہ سب انتظام دلاور نے پہلے سے کرلیا ہوگا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ بھاگ جاؤ۔ خالی ہاتھ سیدھے وقار یوسف کے گھر چلے جاؤ۔ اس کی گاڑی لو اور لاہور سے نکل کے سیدھے غیر علاقے کا رخ کرو۔ تو شہر بالکل نہیں جانا ورنہ پولیس پہلے سے بیٹھی ہوگی وہاں تمہارے انتظار میں۔ الزام تو رہا ہے رابعہ پر اور تم پر۔ تم کو ثابت کرنا ہے کہ جب قتل کی یہ واردات ہوئی تو تم یہاں سے سیکڑوں میل دور تھے۔ سمجھے کہ نہیں؟"

"سمجھ گیا۔ دلاور نے میڈیکل رپورٹ میں غلط ٹائم لکھوایا ہے۔ خبر خود اخبارات کو اپنی مرضی کے مطابق فراہم کی ہے۔"

"ہاں بھائی۔ آج کل وہ سیاست میں ہے اس کی پہنچ دور تک ہے۔" منظر نے بے چینی سے گھڑی دیکھی۔

"تم وقار یوسف کو فون کر دیتے۔"

"فون کرنے میں خطرہ ہے۔" وہ بولا "کوئی سن نہ رہا ہو۔ تم لوگ ناشتا بھی وہیں کرلینا۔ وقار یوسف کے گھر میں۔ اور اگر ممکن ہو تو حلیہ بدل کے نکلنا۔ کاجل کو یہاں کوئی نہیں جانتا۔ رابعہ برقعے میں چھپ سکتی ہے۔ تم کچھ کرلینا۔"

"میں مروں گا۔ معاف کرنا یار! تو بڑی مشکل میں پڑ گیا ہماری وجہ سے۔" میں نے کہا۔

"اب جاتا ہے یا دھکے دے کر نکالوں بھوتنی کے۔ یہ مت سمجھنا کہ منظر بزدل تھا۔ اب ہم تیرے ساتھ لٹک سکتے ہیں مگر پہلے ان کو لٹکانا ہے سالوں کو جو باز نہیں آرہے ہیں حرامی پن سے۔ پچھلی طرف سے نکل جاؤ تم لوگ۔ کوئی ٹیکسی پکڑ لینا۔"

"منظر یار! میری گاڑی چاندنی کے چوکیدار نے دیکھی تھی۔" میں نے کہا۔

"اسے میں ایک میل دور چھوڑ آیا ہوں۔ سارے کاغذات جلا دیے ہیں اور کپڑے سے کچھ صفائی بھی کردی ہے جہاں بھی فنگر پرنٹ ملنے کے امکانات تھے۔" منظر بولا۔

"صبح صبح یہ سب کرلیا تو نے! رابعہ کو بتایا؟"

"ہاں۔ اپنی گردن تو بچانی ہے نا یار۔" منظر بولا "اب ایسی کی تیسی چوہدری دلاور کی اور پولیس کی۔ ثابت کرکے دکھائیں کہ تم لوگ کہاں تھے پہلے تو یہ ثابت کریں کہ لاہور میں تھے۔"

"وہ کیبن والا۔ جس سے میں نے بات کی تھی۔ جو رابعہ کے گھر کے سامنے پان سگریٹ بیچتا ہے۔"

"وہ خود کچھ نہیں بولے گا۔ قتل کے کیس میں رضاکارانہ طور پر بیان دے کر کوئی اپنی گردن نہیں پھنساتا۔ ویسے بھی وہ گولا تنڈ والا سے ناخوش تھا۔"

"تو نے اپنی بیوی کو سمجھا دیا؟"

"سب سمجھا دیا ہے۔ رابعہ اور کاجل کو راستے میں بتانا اگر ضروری ہو۔" منظر نے کہا "اور وقار یوسف سے کہنا کہ ابھی انتظار کرے۔ رابعہ کی طرف سے فوراً کیس فائل نہ کرے۔ یہ کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی تو یہ ایک سبب بن جائے گا قتل کا کہ رابعہ اپنے گھر کی زمین پر ایک طوائف کا محل دیکھ کر مشتعل ہوئی اور اس نے تمہاری مدد سے چاندنی کو مار ڈالا۔"

منظر سے باتیں کرتے ہوئے میں نے ہاتھ منہ دھویا اور کپڑے بدلے۔ میرے کان باہر کی آوازوں پر بھی تھے اور اندر سے کاجل اور رابعہ کی باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔

"یہ ایک لاکھ کا چیک ہے۔" منظر نے مجھے کاغذ کا ایک پرزہ تھما کے کہا "وقار یوسف سے کہنا بعد میں کیش کرالے۔ تم اس سے ایک لاکھ لے لینا۔"

صبح آٹھ بجے میں نے رابعہ اور کاجل کے ساتھ کوٹھی کے پچھلے حصے کا چھوٹا سا باغیچہ عبور کیا اور ایک گیٹ سے بیک اسٹریٹ میں آگئے۔ رابعہ خاموش تھی اور کاجل نروس۔ کلیم حیران تھا کہ ہم بغیر ناشتا کیے بغیر کہاں روانہ ہو رہے ہیں لیکن کاجل نے اسے سمجھایا کہ ہم تمہارے ساتھ گاؤں جارہے ہیں تو وہ کچھ افسردہ ہو گیا۔

"کیا تم خوش نہیں ہو؟ تم واپس جارہے ہو اپنے گھر۔" کاجل نے کہا۔

"باجی! تم ہم کو چھوڑ کر آجائے گا؟" وہ بولا۔

"ہاں کلیم۔ یہ تو مجبوری ہے۔" کاجل نے کہا۔

"کیوں؟ تم ادھر رہو، ہمارے ساتھ۔" کلیم نے کہا "ہمارا گھر تھا۔"

"جیسے تم یہاں نہیں رہ سکتے کلیم! ایسے ہی میں وہاں نہیں رہ سکتی۔" کاجل نے اسے سمجھایا۔

"تمہارا تو ادھر کوئی گھر نہیں ہے۔" کلیم بولا۔

"کیوں نہیں ہے۔ یہ دیکھو کتنے لوگ ہیں یہاں۔ رابعہ باجی اور سکندر بھائی۔ بعد میں سب آجائیں گے۔ چچا غالب اور نازو حسن چچا اور گل۔ یہ لوگ مجھے کہاں جانے دیں گے۔ اگر میں تمہیں وہیں لانا چاہوں تو کیا تمہارے گھر والے مانیں گے؟ نہیں مانیں گے نا۔"

رابعہ میرے ساتھ تھی اور کاجل ایک قدم پیچھے۔ ہم کاجل کی باتیں سن رہے تھے اور اس کے لہجے سے اندازہ کر رہے تھے کہ وہ خود پر کتنا جبر کرکے اپنے دکھ کو ظاہر نہیں ہونے دے رہی ہے۔ ان دنوں میں کلیم کے ساتھ کاجل کو اتنی زیادہ جذباتی وابستگی ہو گئی تھی کہ کلیم سے زیادہ وہ خود جدائی کے خیال سے اداس تھی۔

"تم نے اخبار دیکھا؟" میں نے رابعہ سے کہا۔

"ہاں۔ منظر نے پہلے مجھے ہی بتایا تھا۔" رابعہ بولی "بہت بڑی حماقت سرزد ہوئی ہم سے کہ چاندنی سے ملنے چلے گئے۔"

"دلاور نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔" میں نے کہا۔

وقار یوسف بھی عدالت جانے کے لیے نکل ہی رہا تھا کہ ہمیں اپنے دروازے پر ٹیکسی سے اترتے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اس نے اخبار نہیں دیکھا تھا۔ اندر جانے کے بعد میں نے اسے خبر دکھائی۔

"ہم فوراً نکل آئے وہاں سے۔ ناشتا کیے بغیر۔" میں نے کہا۔

"ناشتا ابھی تیار ہو جاتا ہے۔" وقار یوسف نے کہا اور خبر کی تفصیل پڑھنے لگا۔ اس کی بیوی، رابعہ اور کاجل کو اندر لے گئی۔

"یہ تو سب ایک طے شدہ پروگرام کے تحت ہوا۔" وقار بولا۔

"ہاں۔ اور ہم نے دلاور کو اس پروگرام پر عمل درآمد کا موقع فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔" میں نے کہا "ہم چاندنی کے گھر سے نکل آئے تھے کہ وہ پہنچا اور اسے معلوم ہوا کہ ہم قاتل سے ملنے صرف تصدیق کے لیے کہ ہم لاہور میں اور منظر کے گھر ٹھہرے تھے۔ اس نے چاندنی کو رستم کے ساتھ بھیجا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ اپنی موجودگی کا کوئی ثبوت نہ چھوڑ کر آئیں۔ وہ جاتے جاتے فون تک بحال کر گئے۔ اس کے بعد دلاور نے خود فون کرکے وہاں ہماری موجودگی کی تصدیق کی اور اس کے بعد چاندنی کو قتل کرا کے اپنی مرضی کی میڈیکل رپورٹ لے لی۔ اپنی خواہش کے مطابق خبر لگوادی۔ مخبر گواہ بعد میں آجائیں گے۔ ٹائمنگ دیکھو کتنی درست رکھی گئی ہے۔ ٹھیک نو بجے ہم چاندنی کے گھر سے نکلے تھے۔ چوکیدار کا بیان ان حالات میں سو فیصد درست ہے اور پولیس کی قیاس آرائی بھی۔ میں تو حیران ہوں کہ وہ صبح ہونے سے پہلے ہی ہماری گرفتاری کے لیے منظر کے گھر چھاپا مارنے کیوں نہیں پہنچ گئے۔"

"خوش قسمتی ہے آپ کی جو بروقت نکل آئے۔"

"اب اگر تمہیں عدالت میں پیش ہونا ہو تو ہونے دو۔" وہ بولا "تمہیں میرا خیال تاریخ لے لے گا۔ ویسے بھی پہلی پیشی وہیں بیٹھے تھی۔"

"تمہیں چند اہم اور ضروری کام کرنے ہوں گے۔" میں نے کہا "ورنہ یوں سمجھو کہ رابعہ اور میں اس قتل کے الزام میں پکڑے گئے تو ہمیں چھڑانا بھی مشکل ہوگا۔ ہم تو ایسے غائب ہوں گے جیسے لاہور آئے ہی نہیں تھے۔ ہم اپنی کسی اور جگہ موجودگی کے ثبوت اور گواہ پیدا کیے بغیر دلاور کے جال سے نہیں نکل سکتے۔ ہمیں گاڑی چاہیے تمہاری۔"

"میری گاڑی....."

"ہاں۔ ہم اپنی گاڑی میں جاتے تو لاہور سے نکلنے سے پہلے ہی دھر لیے جاتے۔" میں نے کہا "منظر نے ہماری گاڑی کو اپنے گھر سے دور لاوارث چھوڑ دیا ہے۔ ہم دوسری گاڑی خرید لیتے مگر وقت نہیں ہے۔"

"مگر آپ سب لوگ کہاں جائیں گے؟"

"ہم سیدھے پشاور سے آگے علاقہ غیر کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" میں نے کہا "کم سے کم بھی ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ ممکن ہے ہم دو ہفتے بعد پکا بندوبست کرکے واپس آئیں۔"

"کیا پکا بندوبست؟"

"واردات کے وقت اپنی علاقہ غیر یا پشاور میں موجودگی کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے کچھ تو کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"گاڑی آپ لے جائیں لیکن راستے میں کسی نے چیک کی تو....."

"کیا چیک کرے گا۔ تم اس کی چوری کی رپورٹ تو نہیں لکھواؤ گے۔ پولیس یا تو ہماری "کورولا" کا نمبر تلاش کرے گی یا منظر کی گاڑی کا نمبر دیکھے گی مگر منظر کی گاڑی تو اسی کے پاس ہوگی۔ تم اپنے لیے دوسری گاڑی کا بندوبست کرسکتے ہو نا؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں۔ یہ کار بھی انجمن کی ہے اور اسی کے نام پر ہے۔" وہ خفت سے مسکرایا "وہ گھر سے دوسری منگوالے گی۔ یہ بے

www.paksociety.com

باپ کی بیٹی ہے۔ "میرے جیسا معمولی وکیل ایسی گاڑی کہاں خرید سکتا تھا۔"

"وہ...... برا تو نہیں مانے گی؟"

"کون انجم؟" وہ ہنسا "تم اسے انتہائی قابلِ اعتماد سمجھ سکتے ہو جتنا تم رابعہ یا نازو کو سمجھتے ہو۔"

میں نے کہا "منظر نے یہ چیک دیا ہے۔ اسے بعد میں کیش کرا لینا۔ ابھی تو مجھے ایک لاکھ لا کے دو۔"

"تو پرابلم۔ یہ کام بھی انجم کرے گی۔ ابھی بینک تو کھلے نہیں ہیں۔ سو وہ گھر سے منگوائے گی۔"

میں نے حیرانی سے کہا "ایک لاکھ کیش؟"

"بہت اونچا ہاتھ مارا ہے میں نے سکندر صاحب۔ اس کا باپ کروڑ پتی ہے۔ پہلے تو روایتی باپ بن کے ہمارے درمیان حائل ہو گیا تھا۔ جب انجم اڑ گئی تو اس کی اکڑ فوں تمام ہو گئی۔ اسے معلوم تھا کہ ہم کورٹ میں بھی شادی کر لیں گے۔ اکلوتی بیٹی ہے۔ مجبور ہو گیا۔ اب بہت خوش ہے مجھ سے بھی۔ کہتا ہے انجم کا انتخاب غلط نہیں تھا۔"

میں نے کہا "یہاں بھی ہم سو فیصد محفوظ نہیں ہیں۔ پولیس کو تمہارا خیال آئے نہ آئے رلاور کو آ سکتا ہے۔ منظر کے گھر میں داخل ہونے کے لیے وارنٹ رات کو نکلوائے گئے ہوں گے یا صبح مجسٹریٹ کے گھر سے سائن ہو جائیں گے مگر تمہارے گھر میں داخل ہونے کے لیے انہیں نئے سرے سے کوشش کرنی ہو گی۔ منظر کے گھر میں ہمیں نہ پا کے وہ آرام سے نہیں بیٹھ جائیں گے۔ اپنے چوہدری رلاور صاحب کے شیطانی ذہن کا جھنڈ پھر چلنے لگے گا اور وہ سوچے گا کہ ہم اور کہاں جا سکتے ہیں۔ بس علاقہ غیر کی طرف اس کے فرشتوں کا دھیان نہیں جا سکتا۔"

انجم نے اندر سے آواز لگائی "چلیں جی! ناشتا کر لیں پہلے۔ باتیں ہوتی رہیں گی۔"

انجم واقعی بہت اچھی لڑکی تھی۔ جب وقار نے اس سے کہا کہ تم اپنے گھر سے دوسری گاڑی منگوا لو تو وہ فون کرنے اٹھی۔

"کون سی گاڑی منگواؤں؟" اس نے سادگی سے کہا۔

"بھئی انہیں جانا ہے پشاور۔"

"پھر جیپ منگوا لیتی ہوں۔" وہ بولی۔

"یہ ہماری گاڑی لے جا رہے ہیں۔" وقار نے اسے سمجھایا "وہ وہاں ہمارے پاس ان کا چیک ہے۔ نو بجے کیش ہو جائے گا۔ تم پوچھو ایک لاکھ فوراً مل سکتے ہیں قارون کے خزانے سے۔ تھیلیوں کو اللہ کے نام پہ۔"

وہ فون پر بات کرنے لگی اور ہم ناشتے میں مصروف ہو گئے۔

"نام تو ہارون ہے اس کے ابا کا۔ مگر میں قارون کہتا ہوں۔ سب دولت مند دل کے برے نہیں ہوتے۔" وقار بولا "تم لوگ کے تو مانو گے۔"

رابعہ نے کہا "ہم پیسے ہی مانگ لیتے ہیں ہم۔ تمہارا سسر ہے اور وہ بھی کروڑ پتی۔"

میں نے کہا "ہمیں احتیاط سے کام لینا ہو گا۔ رابعہ تو چھپ جائے گی برقعے میں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے حلیہ بدلنے کے لیے؟"

"میک اپ کا سامان اس وقت کہاں ملے گا؟ راز کی سوجھ میری ہوتی تو میں اتار کے رکھ دیتا۔" وقار بولا "برقع؟ برقع کہاں سے ملے گا؟ اے انجم! فون بند مت کرنا۔ وہ جو تمہارے مالی کی بیوی ہے نا! اس کا برقع بھی چاہیے۔"

"کیا؟ مالی کی بیوی کا برقع؟" انجم نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"ہیں برقع چاہیے۔ کسی کا بھی ہو۔ دو ہوں تو بہتر۔ ایک ان باجی کے لیے۔ دوسرا سکندر بھائی کے لیے۔ انہوں نے پردہ شروع کر دیا ہے۔ ایک دوسرے سے بھی۔" وقار بولا "یار! میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔"

انجم نے گھر سے تو برقع نہیں منگوایا مگر بعد میں نہ جانے کس کو فون کیا اور بولی "ایک برقع تو ابھی آ جاتا ہے مگر بھائی سکندر آپ کو بھی....؟"

میں نے کہا "تم بھی کس کی باتوں میں آ رہی ہو۔ میں نے حلیہ بدلنے کی خواہش ظاہر کی تھی، جنس بدلنے کی نہیں۔"

"آدھے گھنٹے کے بعد کسی نے کال بیل بجائی تو وقار خود ہی دروازے تک گیا۔ انجم کے گھر سے کوئی ڈرائیور آیا تھا۔ اس نے ایک لفافہ انجم کے حوالے کیا۔ ظاہر ہے اس میں ایک لاکھ روپے تھے۔ وہ گاڑی کی چابیاں چھوڑ کے واپس جانے لگا تو مجھے ایک خیال آیا۔

میں نے کہا "انجم! حلیہ بدلنے میں کپڑے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تمہارے شوفر کی وردی مجھے اچھی لگے گی۔"

وقار یوسف نے بھی سراہا "ہاں! آئیڈیا برا نہیں۔ ڈرائیور کی خاکی وردی اور ٹوپی پہن کے دھوپ کا چشمہ لگا لو تو تمہیں آسانی سے کوئی شناخت نہیں کر پائے گا۔"

انجم دروازے کی طرف لپکی۔ ڈرائیور ابھی رہائش کے احاطے سے باہر بھی نہیں گیا تھا کہ اسے انجم نے آواز دے کر بلا لیا۔ وہ ادھیڑ عمر سیدھا سادہ خاموش طبع اور مظلوم صورت آدمی تھا۔

"تم واپس کیسے جاؤ گے؟" انجم بولی۔

"بس سے چلا جاؤں گا بی بی جی۔" اس نے کہا۔

انجم نے اسے سو کا نوٹ دیا "یہ لو ٹیکسی پکڑ لینا۔"

ڈرائیور نے اس رشوت کو بی بی جی کی فراخدلی سمجھ کے رکھ لیا اور سلام کر کے پھر جانے کے لیے مڑا۔

"سنو! یہ وردی تم نے کہاں سے سلوائی تھی؟" انجم نے چالاکی سے کہا۔

"انارکلی میں انگلش ٹیلرز سے بنتی ہیں سب کی وردیاں۔ میری بھی وہیں سے بنی ہو گی۔"

"وہ دراصل میں نے ایک شخص کو بلوایا ہے شوفر رکھنے کے لیے۔ گاڑی ایک ہے نا! اس لیے تکلیف ہوتی ہے۔ صاحب وہاں چلے جاتے ہیں تو مجھے گھر سے گاڑی منگوانی پڑتی ہے کہیں آنے جانے کے لیے۔ شوفر ہو گا تو صاحب کو عدالت چھوڑ کے گاڑی واپس لے آئے گا اور جب آنے کا وقت ہو گا تو پھر چلا جائے گا۔"

ڈرائیور بہت خاموش کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے جذبات نہیں تھے۔ بات سننا اور اب ملازمت میں شامل تھا۔ مالکوں کے فیصلوں پر تبصرہ کرنا اس کے فرائض میں شامل نہیں تھا۔

"تم ایسا کرو یہ وردی چھوڑ جاؤ۔ دوسری وردی تو ہو گی نا تمہارے پاس۔"

وہ کچھ حیران ہوا "جی! بی بی جی!"

"تم ڈریسنگ روم میں جا کے صاحب کی کوئی قمیص پتلون پہن لو۔ باتھ روم کے ساتھ ہی ہے ڈریسنگ روم۔"

اس نے پھر جی بی بی جی کہا اور اندر چلا گیا۔

"بیچارا فرمانبردار اور اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہے۔" رابعہ نے کہا "کسی حیرانی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔"

انجم بولی "بہت دکھی اور مصیبت زدہ شخص ہے۔ ڈیڈی اس پر بہت اعتبار کرتے ہیں۔ برا ہو گیا ہے نا۔ دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ ایک بیٹی تھی۔ اسے شوہر نے بے وفائی کے الزام میں قتل کر دیا اور فرار ہو گیا۔ سنا ہے لندن میں ہے اور وہاں کسی کالی کلوٹی حبشن سے شادی کر لی ہے۔"

"تمہارے ڈیڈی کا تو بہت اثر رسوخ ہو گا۔ انہوں نے کوشش نہیں کی اسے پکڑوانے کی؟" رابعہ بولی۔

"اتنا آسان کام نہیں تھا۔ وہ برطانوی شہری ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ اسے خود کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کہتا تھا اب اسے پھانسی بھی ہو گئی تو کیا بیٹی مل جائے گی مجھے۔" انجم نے کہا "ہمارے گھر میں اس کی حیثیت ایک فیملی ممبر سے کم نہیں۔ باہر کے سارے کام کرتا ہے۔ لاکھوں لاتا ہے لے جاتا ہے۔ ایک ایک پیسے کا حساب رکھتا ہے۔ بس ایک عادت عجیب ہے اس کی۔ فطرت سمجھ لو۔ خود کو ڈرائیور ہی سمجھتا ہے۔ وردی ضرور پہنتا ہے حالانکہ ڈیڈی کی طرف سے کوئی پابندی نہیں۔ ساتھ بیٹھ کے کھانا نہیں کھاتا۔ ڈیڈی کو سرکار ہی کہتا ہے۔ میں نے کئی بار منع کیا کہ مجھے بی بی جی مت کہا کرو۔ میں بیٹی ہوں تمہاری۔ مگر بیٹی کے نام پر اس کی آنکھوں میں اداسی اتر آتی ہے۔ زبان سے تو نہیں کہتا کہ بیٹی تو وہی تھی جو خدا نے لے لی۔ اس کی جگہ آپ کیسے لے سکتی ہیں۔ بس مجھے بی بی جی کہنا نہیں چھوڑتا۔"

ڈرائیور [illegible] کے لباس میں تھوڑا رہا "قمیص پتلون مجھے تنگ تھے بی بی جی۔ وردی کہاں رکھوں؟"

"یہاں رکھ دو۔ اور دیکھو تھوڑا انتظار کرو۔ صاحب خود تمہیں چھوڑ دیں گے۔ اس لباس میں باہر کیسے جاؤ گے؟"

"چلا جاؤں گا بی بی جی۔" اس نے سر جھکا کے کہا اور سلام کر کے چلا گیا۔

میں نے اندر جا کے لباس بدلا اور آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو خاصی تبدیلی محسوس ہوئی۔ پی کیپ اور وقار یوسف کے سن گلاسز نے آدھے چہرے کو چھپا لیا۔ اگر میں چہرے میں صرف مونچھوں کا اضافہ کر سکتا تو مجھے کوئی غور سے دیکھ کے بھی نہ پہچانتا۔ گردن کے گرد مفلر لپیٹ کے میں باہر آیا تو ایک برقع پوش خاتون کو دیکھ کر ٹھٹکا لیکن وہ رابعہ تھی۔ انجم کی کوئی سہیلی یہ برقع دے گئی تھی جو خاصا جدید فیشن کا اور بہت خوب صورت تھا۔ پھر رابعہ کے سراپا نے اس سیاہ ریشمی چیتھڑوں میں وہ انداز دلکشی پیدا کی تھی کہ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے نقاب سے آدھے چہرے کو چھپا لیا تھا۔ صرف اس کے مرمریں ہاتھ اور ستاروں کی طرح روشن غزالی آنکھیں شوخی سے مسکراتی نظر آتی تھیں۔ میرے مقابلے میں اس نے اپنی شخصیت کو زیادہ آسانی سے اور زیادہ خوب صورتی سے چھپا لیا تھا۔

کاجل مجھے ڈرائیور کی وردی میں دیکھ کر بھی اتنی ہی محظوظ ہوئی جتنی رابعہ کو برقعے میں دیکھ کر ہوئی تھی۔

وقار یوسف نے کہا "میرا خیال ہے اب تم دیر مت کرو۔ نو بجنے والے ہیں۔ یہ لو ایک لاکھ روپے پورے۔"

میں نے کہا "چیک ضرور کیش کرا لینا۔"

"یہ تم مت سوچو۔" وہ بولا۔ "منظر صاحب کا، آپ کا اور میرا حساب ایک ہی ہے۔"

انجم نے بڑی مستعدی دکھاتے ہوئے گاڑی کی ڈگی میں کھانے رکھ دیے تھے اور ایک سوٹ کیس میں کپڑے۔ وقار یوسف کے کپڑے مجھے بھی تنگ ہوتے۔ خصوصاً پتلون قمیص۔ مگر اس نے مجھے بتایا کہ میں ان شلوار قمیص کے دو جوڑے میں ضرورت پڑنے پر استعمال کر سکتا ہوں۔ رابعہ اور کاجل کا سامان وہی تھا جو انجم کا۔ ان کے انکار کرنے پر بھی انجم نے اپنے اچھے جوڑے سوٹ کیس میں بھر دیے۔

"کاغذات گاڑی میں ہی ہیں۔" وہ بولی "راستے میں کہیں چیکنگ ہو تو کہہ دینا میں انجم ہوں، میری گاڑی ہے۔"

وقار یوسف نے کہا "ٹیلی فون پر رابطہ رکھنا۔ جہاں سے بھی موقع ملے اپنی خیریت کی اطلاع دیتے رہنا۔"

میں نے کہا "مجھے ایک بات یاد آئی۔ منظر نے کہا تھا کہ ابھی رابعہ کے مکان پر ناجائز قبضے کے خلاف کوئی کیس درج کرانے یا عدالت میں دعویٰ دائر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بعد میں جب حالات کا رخ کسی کروٹ بیٹھے گا تو دیکھیں گے۔"

اس نے سر ہلایا "ہاں۔ ابھی تو یہ ایک جواز بنتا ہے قتل کا۔

www.paksociety.com

سب سے اچھی پالیسی ہے روپوشی اور خاموشی۔ کون سکندر بخت، کیسی رابعہ۔ یہاں نہ کوئی آیا نہ گیا۔ ہمیں کیا معلوم وہ کہاں ہیں، زندہ ہیں یا مر گئے۔ چوہدری دلاور نے جال تو اچھا پھیلایا تھا مگر شکار کوئی نہیں ہوگا تو وہ بہت تلملائے گا۔ مگر کر کیا سکتا ہے وہ۔"

"مجھے تو افسوس ہو رہا ہے کہ خدا خدا کر کے لاہور پہنچے تھے اور اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ پھر بھاگنا پڑا۔"

"یہ عارضی ضرورت اور مجبوری ہے۔ چند دن کی بات ہے۔" وقار یوسف بولا۔

ڈرائیونگ میں نے سنبھالی۔ رابعہ میرے ساتھ بیٹھی تھی اور پچھلی سیٹ پر کلیم اللہ کے ساتھ کاجل۔ عین وقت پر خانساماں نے اندر سے آ کے اطلاع دی کہ منظر صاحب کا فون ہے۔

"ایک منٹ ٹھہرنا شاید کوئی بات ہو۔" وقار یوسف اندر لپکتے ہوئے بولا۔

میں نے انجن اسٹارٹ رکھا اور وقار یوسف کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ دو منٹ میں لوٹ آیا۔

"وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پولیس پہنچ گئی منظر صاحب کے گھر۔" وقار یوسف نے اطلاع دی "خانہ تلاشی کے وارنٹ کے ساتھ۔"

"کسے تلاش کر رہے تھے وہ؟"

"سکندر بخت اور اس کی ساتھی رابعہ کو۔ ایف آئی آر میں چوکیدار کے بیان کو بنیاد بنا کر تم دونوں کے نام مشتبہ افراد میں شامل کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے چوکیدار نے تمہارا ہی حلیہ لکھوایا ہوگا۔"

"کیا پتا تصویر دیکھ کے شناخت بھی کر لیا ہو کہ یہی وہ پُراسرار ملاقاتی ہیں جن کے جانے کے بعد چاندنی مقتول پائی گئی۔" میں نے تلخی سے کہا "پہلے ایس ایس پی سراج تھا چوہدری دلاور کا مشیر و معاون۔ اب کوئی اور ہوگا اس کا آلۂ کار۔ ان کے پاس ہماری تصویروں کی کمی نہیں۔"

رابعہ بولی "اس سے تو صاف اعلانِ جنگ کا پتا چلتا ہے۔ دلاور صلح صفائی اور مفاہمت کے موڈ میں ہی نہیں۔ وہ نئے کیس بنا رہا ہے تو پرانے کیس بھی ضرور نکلوائے گا۔ ہر فائل پھر کھل جائے گی۔"

میں نے کہا "شاید یہ دباؤ اس لیے بڑھا رہا ہے وہ کہ ہم خود مصالحت کے لیے ہاتھ بڑھائیں۔ اس نے پہلے ہر طرح کوشش کی تھی کہ خاموشی سے سودا ہو جائے اور ہم اپنے ضمیر کی منہ مانگی قیمت لے کر لندن لوٹ جائیں۔ آج وہ پہلے سے زیادہ طاقتور ہے۔ اس نے اپنے جرائم کا پردہ چاک نہیں ہونے دیا۔ مالی نقصان ضرور اٹھایا مگر خود محفوظ رہا اور قانون کے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچنے کے لیے چھوٹے پڑ گئے۔ اب وہ سیاست داں بھی ہے۔ پہلے صرف شکاری تھا۔"

"کیا سیاست داں شکاری نہیں ہوتے؟" وقار یوسف بولا۔

"کچھ ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثر ہوتے ہیں۔ مگر شکاری عموماً سیاست داں نہیں ہوتے۔" میں نے کہا "خیر ہم بھی کیا زمانہ ڈھنگ اور زمانے کی چال دیکھ کے چلنے والے لوگ ہیں۔ یہ شکار گاہ میں تھا تو ہم نے ثابت کیا کہ ہم شکار نہیں ہو سکتے۔ سیاست کا میدان ہوگا تو ہم سیاست بھی سیکھ لیں گے۔ وقت خود سکھا دے گا۔"

رابعہ نے کہا "اب چلو بھی۔ کیا ان کے یہاں پہنچنے کا انتظار ہے۔"

"واقعی۔ وہ منہ کی کھا کے ادھر آ سکتے ہیں۔" وقار یوسف بولا۔

"راستہ دکھانے والا تو دلاور ہے۔" رابعہ بولی۔

"تم ذرا اپنے ابا سے بات کرو۔ کوئی ڈوری ہلائیں۔"

میں نے کہا "کس کس کی ڈوری ہے ان کے ہاتھ میں؟"

"ان کے ہاتھ میں ہے پیسہ اور پیسے کی ڈور سے سب بندھے ہوتے ہیں۔ ایک فون کریں گے اوپر ہوم سیکریٹری کو یا ایڈیشنل چیف سیکریٹری کو تو ادھر کا رخ کرنے والے وردیاں سنبھالے آ جائیں گے معافی مانگنے کہ جی ہم تو حکم کے غلام ہیں۔"

میں نے گاڑی چھوڑی "او کے، خدا حافظ۔ پھر ملیں گے۔"

شاہی قلعے کی بوسیدہ تاریخی دیواروں کے اور اقبال پارک کے درمیان سڑک سے گزرتے ہوئے کاجل نے بتایا پاکستان بنگ اور کلیم اللہ کو اس کے بارے میں بتاتی رہی۔ پھر شاہدرہ کا پل اور جب عبور کرتے ہی مقبرہ جہانگیر کے مینارے نظر آنے لگے۔ اس کے بارے میں رابعہ نے کاجل کو بتایا تو وہ ہنسنے لگی۔

"میری تو زندگی یہیں گزری تھی۔" وہ بولی "میری اصل دنیا یہی تھی۔"

رابعہ نے جھینپ کے کہا "میں بھول گئی تھی۔ خیر۔ تم لوٹ آئیں اس دنیا میں۔"

"لٹ لٹا کے لوٹ آنا کون سی خوشی کی بات ہے!" وہ تلخی سے بولی۔

کار نے جی ٹی روڈ پر دوڑنا شروع کیا۔ ایک بار پھر ہم واپس راولپنڈی کی طرف رواں تھے جہاں صرف دو دن پہلے ہی ہم نے وطن لوٹ آنے کی ساری خوشی کا تجربہ احساس کی بھرپور شدت کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ رابعہ بظاہر باہر کے نظاروں میں گم تھی مگر میرا خیال ہے کہ وہ بھی اپنے خواب آرزو کی شکست کے آزار سے دوچار تھی۔ اس نے ایک طویل صبر آزما اور اعصاب شکن جنگ میں میرا ساتھ دیا تھا جس نے ہم سب کو پشیمانی اور احساسِ زیاں کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ وہ جنگ ہم نہیں ہارے تھے مگر ہماری امیدوں کو ضرور شکست کا صدمہ اٹھانا پڑا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا اور کیسے ہوا تھا، یہ سب سوچنے سے بھی کیا حاصل تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ ہم نے ایک بے مقصد جدوجہد میں اپنے خواب تک گنوا دیے تھے۔ جان و مال کے نقصان کا کیا رونا۔ ہم یقین اور اعتماد سے

محروم ہو گئے تھے۔ ان گنت دوستی کے رشتے اس سودائے خام کی بھینٹ چڑھ گئے۔ یگانگت اور بھائی چارے کے سب دعوے بے نقاب ہوئے تو جانا کہ خواب تھا جو بھی ہم نے دیکھا جو بھی سنا افسانہ تھا۔ اخوت اور اتحاد کے رشتوں پر استوار قومیت کے نظریات خود غرضی اور خوش فہمی کی بھینٹ ہو گئے۔

اور بے سکونی کا پُرعذاب زندگی میں ہر قدم پر موت کے دام ہر جگہ نئی سے بچتے بچاتے دستِ اجل کے بہانے میں ہر لمحہ ملاقتی کے لیے پناہیں تلاش کرتے اور قدم قدم پر ناامیدی کا بھاری کرتے ہم آخر کار وہیں پہنچ گئے تھے جہاں سے ہم نے آغاز سفر کیا تھا۔ واپسی کتنی مشکل اور واپسی کی خواہش سراب سے زیادہ دغاباز نکلی تھی۔

ان حالات میں جذباتی مایوسی کا ردعمل ایک فطری بات تھی۔ ابھی سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا اور مستقبل پر اعتبار کی روشنی دیکھی بھی نہ تھی کہ پھر بے یقینی کی تاریک راہوں نے کھینچ لیا۔

میں نے رابعہ سے کہا "کیا سوچ رہی ہو؟"

اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے تم کیا سوچ رہی ہو۔"

"پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔"

"صرف یہ جاننے کے لیے کہ میرا اندازہ غلط تو نہیں۔"

اس نے ایک بار میری طرف دیکھا اور بولی "آپ کے اندازے کبھی غلط ہوتے ہیں!"

اس بات میں طنز کا جو نشتر چھپا ہوا تھا اور تلخ حقائق کا جتنا زہر بھرا ہوا تھا اس کی اذیت کو محسوس نہ کرنا میرے بس کی بات نہ تھی مگر میں نے اسے برداشت کر لیا۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ میدانِ جنگ میں لڑنے والی فوج ظفریاب ہو تو فتح مندی کا غرور اور کامیابی کی خوشی سب کے حصے میں آتی ہے۔ ہر سپاہی اپنی قوم کے ہر فرد کو قابلِ فخر بناتا ہے۔ اس اعزاز میں سب برابر کے شریک رہتے ہیں اور دشمن کو تباہ کرنے کی خوشی آپس میں بانٹ لیتے ہیں مگر شکست کی ساری ذلت و رسوائی کا عذاب وہ ایک آدمی جھیلتا ہے جو فوج کی کمان کرتا ہے اور خواہ قصور تقدیر کا ہو، حالات کا یا سیاست کے بازیگروں کا، جب وہ ہتھیار ڈالنے کی رسم میں شریک ہوتا ہے اور تاریخ کا حصہ بننے والی کسی شرمناک دستاویز پر دستخط کرتا ہے تو وہ غیروں سے زیادہ اپنوں کی نفرت اور ملامت کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اس کا دکھ، اس کی ذلت اور اس کا عذاب بانٹنے کوئی نہیں آتا اور کوئی خود کو اس کے جرم میں شریک سمجھنا نہیں چاہتا۔

میں نے اپنے آپ سے کہا۔ رابعہ اپنی تمام پیشہ ورانہ قابلیت اور ذہانت کے باوجود جذباتی طور پر وہی کمزور عورت ہے جو تمام خواہشات و مصائب کا مقابلہ مرد کے ساتھ اس امید میں کرتی ہے کہ آخر کار اسے محبت کے سائبان اور اپنے گھر کی چار دیواری کا تحفظ حاصل ہوگا۔ اگر وہ گھبرا گئی ہے تو اسے صرف دل کے بہلانے کے لیے ایک اچھے خیال اور تھوڑے سے یقین کو بحال کرنے والے حرفِ تسلی کی ضرورت ہے۔

میں نے کہا "دلاور کے معاملے میں میرا اندازہ غلط بلکہ اکثر غلط ہی ثابت ہوا۔"

"اور یہ احساس تمہیں کب ہوا؟" وہ لڑنے پر آمادہ تھی۔

"ابھی جب تم نے کہا کہ میں کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ اس وقت تم دلاور کے بارے میں ہی سوچ رہی تھیں۔"

"یہ غلط بات ہے۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "دلاور سے مراد اس کی ذات نہیں۔ ان معاملات سے ہے جو اس کے بارے میں میرے اندازے کی غلطی سے الجھتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر یہی چاندنی والا معاملہ لو۔"

"میں نے تو تم سے کچھ نہیں کہا۔"

"بعض اوقات کچھ کہے بغیر سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔ شاید خاموشی کی زبان الفاظ سے زیادہ موثر ذریعۂ اظہار بن جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں گلہ کرنا نہیں آتا مگر میں تمہاری ذہنی کیفیت کو سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ تمہارے جذبات کا عکس میرے دل کے آئینے میں اسی طرح اتر آتا ہے جیسے کیمرے کے بند خول میں فلم پر ہر منظر ساری تفصیلات کے ساتھ اپنا نقش مرتب کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

رابعہ کا چہرہ اور اس کے لب و رخسار پردے میں تھے مگر حیا کا رنگ اس کی آنکھوں میں یوں آیا جیسے تاریک کمرے میں کسی درز سے سورج کی ایک کرن اترتی ہے۔ "مجھے ملال اور مایوسی کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہیے۔ کیا میں تم سے جھوٹ بولوں کہ اس طرح بے مراد واپس جانا مجھے بہت اچھا لگا؟ لاہور پہنچنے سے پہلے کچھ اور بات تھی۔ اب تو میں نے اپنے پیچھے لگے ہوئے اندیشوں کے ہر آسیب سے نجات پا لی تھی۔ وسوسوں کو دور بھگا دیا تھا اور خوف زدہ کرنے والے ہر خیال سے دامن چھڑا لیا تھا۔ تم سے کم میں نے یہی سمجھا تھا مگر یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے۔"

"تمہیں بہت عرصہ اندھیرے میں گزارنے والے کی طرح ایک دم روشنی کی چکاچوند میں آنے سے گریز کرنا چاہیے۔ سب ایک دم ٹھیک نہیں ہوگا میری جان۔ ویرانوں میں پیچھے سے بہار آ جانے کا خیال ایک شاعرانہ فتور ہے۔ خزاں کے بعد بہت آہستہ آہستہ سوکھے پیڑوں پر کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ کیاریوں کی ہریالی دھیرے دھیرے اپنا رنگ جماتی ہے اور شاخوں کی ویرانی سمٹتی جاتی ہے۔ پھر شگوفے کھلتے ہیں اور پھولوں کے مسکرانے تک خزاں کے تصور کو فراموش ہونے میں دن یا ہفتے نہیں مہینے لگتے ہیں۔ جیسے گہرے زخم مندمل ہونے میں مسیحائی کے مرہم کو بھی وقت کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"زیادہ فلسفہ مت جھاڑو۔" رابعہ نے مسکراتے لہجے میں کہا۔

www.paksociety.com

"ابا یہ حقیقت ہے جسے تم تسلیم نہیں کرتی ہو۔" میں نے کہا "یہ تو مجبوری کہلائے گا کہ شاعر سو کے اٹھے اور کھڑکی کھول کے دیکھے تو پتا چلے کہ دیرانے میں چپکے سے باہر آ گئی ہے' دانوں رات۔ ہمارے حالات کو ابا ہی کوئی معجزہ بالکل ٹھیک کر سکتا ہے۔ ہماری کوشش بہرحال وقت کی محتاج ہے اور ناشکرا ایرانی کی۔ معجزوں کی امید رکھنا مایوسی کو جنم دیتا ہے۔"

"کیا تم خوش ہو؟" رابعہ نے اچانک سوال کر دیا "اور مطمئن ہو کہ جو ہوا ٹھیک ہے۔ یہی چاہتے تھے تم؟"

میں نے سٹپٹا کے کہا "نہیں۔ ابا تو نہیں کہا میں نے۔"

"میں نے بھی کچھ نہیں کہا مگر تم میری خاموشی کو معافی رہے ہو۔ سب جو ہے کہ رکی ہوا ذمی میں تھا۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "نہ میری دانستگی ہے اور نہ میں چور رہوں۔ میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہوں کہ محتاط نہ رہنے کی وجہ سے ہم نے اپنے لیے تھوڑے سے مسائل کھڑے کر لیے۔ نہ ہم جامعی کے گھر جاتے' نہ یہ سارا چکر چلتا۔ اپنے حقوقِ ملکیت قانونی طور پر تمہاری سے بعد میں بھی حاصل کیے جاسکتے تھے۔ ہمیں کون سی فوری ضرورت تھی اس جگہ کی۔ بس ایک جذباتی حماقت سرزد ہو گئی مجھ سے لیکن اس سے آسمان نہیں گرا۔ میں امید پرست ہوں اور ہر خرابی میں پوشیدہ قدرت کی کسی مصلحت پر یقین رکھتا ہوں۔ چلو اس طرح ہم نے پہلے وہ کام کر لیا جو بعد میں کرنا تھا۔ ہماری عارضی مدہوشی سے ایک طرف ملاور کو اپنی ناکامی کا احساس ہوگا...."

"کہیں تم پھر اندازے کی غلطی کا شکار تو نہیں ہو رہے ہو؟"

میں نے جھلا کے کہا "بی بی! میں اپنی عقل کے مطابق اندازے قائم کرتا ہوں اور سوچ سمجھ کے ہی قدم اٹھاتا ہوں مگر نہ میں فرشتہ ہوں کہ مجھ سے غلطی ہی نہ ہو اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں کہ مجھے پہلے سے آگے کے حالات کی تصویر نظر آ جائے۔ اب میں نے سوچا ہے کہ ہم لاہور سے اپنی غیر موجودگی کے ثبوت فراہم کریں اور کلیم کو بھی اس کے گھر چھوڑ آئیں۔ تم بتاؤ' ہمیں ایسا کرنا چاہیے کہ نہیں۔ جب تک تم نہیں کہو گی میں یہیں کھڑا رہوں گا۔"

میں نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر دی اور انجن بند کر دیا۔

"یہ کیا بچوں کی طرح لڑائی شروع کر دی۔"

"تم مجھے بچوں کی طرح سوچ کے بتاؤ کہ آگے جانے میں فائدہ ہے یا نقصان۔ نقصان ہے تو ہمیں واپس لاہور چلے جانا چاہیے یا کہیں اور۔"

کاجل نے پریشان ہو کے کہا "سکندر بھائی! آپ چلیں۔"

"نہیں۔ اب فیصلہ تمہاری باجی کریں گی۔" میں نے منہ پھلا کے کہا اور باہر دیکھنے لگا۔

ہم اس وقت وزیر آباد سے گزر چکے تھے۔ جی ٹی روڈ پر دونوں طرف سے ٹریفک رواں دواں تھی اور آتی جاتی بسوں اور گاڑیوں کے مسافر ہم کو واجبی سی دلچسپی سے دیکھتے تھے۔ اس سڑک پر کسی گاڑی کا رک جانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ بظاہر ہم پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لاہور سے فرار ہونے میں کامیاب رہے تھے۔ نہ کسی چیک پوسٹ پر کسی نے ہمیں روکا تھا اور نہ ہم نے کہیں مفرور مجرموں کو تلاش کرنے والوں کی سخت ناکہ بندی کا منظر دیکھا تھا۔

"زینی! اب بولیں نا انکل کو۔ چلیں۔" کلیم اللہ نے کہا۔

"تمہارے انکل اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ میں نہیں کہوں گی کچھ۔"

"ہمت کرو میں بھی بیٹھا ہوں مزے سے۔"

"بیٹھے رہو۔"

کاجل نے اچانک کہا "یہ گاڑی آپ نے دیکھی؟"

میں نے کہا "بہت سی گاڑیاں ہیں سڑک پر۔"

"ایک سفید ایلبی سی گاڑی ابھی گزری ہے۔ وہ سامنے جا رہی ہے۔" کاجل نے کہا۔

"جا رہی ہے پھر؟"

"اس گاڑی کو میں نے دوبار دیکھا ہے۔" وہ بولی "یہ ہمارے پیچھے تھی پھر آگے نکل گئی۔"

میں نے سر گھما کے دیکھا "ایسی سفید گاڑیاں بہت ہیں۔ جو حرام لال کی ذاتی دا دیتے ہیں۔"

"مجھے حرام لال کا نہیں پتا۔"

"پھر کیا نمبر دیکھا تھا؟" رابعہ نے کہا۔

"نہیں۔ نمبر اب دیکھا ہے۔" وہ بولی "پہلے تو اس کو دیکھا تھا جو گاڑی چلا رہا تھا۔ ایک کالا سا حبشی۔ جیسے افریقی ہوتے ہیں۔ سوٹی ناک' موٹے ہونٹ' سخت گھنگریالے بال۔"

میں بھول گیا کہ میرے اور رابعہ کے درمیان لڑائی جاری تھی "کانوں میں جنگلی کی مندریاں۔"

کاجل نے کہا "مندریاں کیا ہوتی ہیں؟ رنگ تھے ایر رنگ۔"

"ہاں بابا۔ بالیاں' مندریاں' ایر رنگ ایک ہی چیز کے نام ہیں سب۔ وہ استر پیڈرو تھا۔" میں نے چلا کے کہا۔

میرے چلانے سے کاجل کو حیرانی ہوئی "استر پیڈرو۔"

میں نے ایک دم انجن اسٹارٹ کیا "اس حلیے کا دنیا میں ایک حرام زادہ ہے اور اس سے بڑا حرام زادہ بھی کوئی نہیں۔"

رابعہ نے تشویش کا اظہار کیا "کیا وہ ہمارے تعاقب میں ہیں؟"

میں نے اعلان کیا "اب ہم ان کے تعاقب میں ہیں۔"

سفید ڈاج کار زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ بیس منٹ بعد میں نے اسے جالیا۔ اس کے اور میرے درمیان فاصلہ کم ہوتے ہوتے اتنا رہ گیا کہ میں نے اس کا نمبر صاف پڑھا۔

"یاد رکھو اور نمبر ہے۔" رابعہ بولی۔

"نمبر آڑی وہی ہے۔" کاجل نے اصرار کیا۔

"جی! نمبر بالکل مختلف ہے۔" رابعہ نے کہا "ایک دو کا بھی فرق ہوتا تو میں مانتی۔"

"رابعہ باجی! میں نے گاڑی کو پیچھے سے بھی دیکھا تھا۔ اس کی پچھلی دائیں والی لائٹ نہیں ہے۔" کاجل بولی "وہ ٹیفٹ حبشی اتنی خفا اور ذرا نیچر کی سائیڈ پر رگڑ کا لمبا سا نشان ہے۔"

"یہ تمہیں نظر آ گیا تمہیں؟ میں تو نہیں دیکھ سکا۔" میں نے کہا۔

"جب اس نے اوور ٹیک کیا تھا تو دیکھا تھا میں نے۔ وہ جو گاڑی چلا رہا تھا استر پیڈرو' وہ اب ساتھ والی سیٹ پر تھا اور اس نے اس نے.... مجھے ——" کاجل کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا کیا تھا اس نے؟" میں نے پلٹ کے دیکھا۔

کاجل نے کلیم اللہ کی طرف دیکھا اور پھر میرے کان کے پاس منہ لا کے کہا "اس بدمعاش نے آنکھ ماری تھی مجھے۔"

میں نے سر ہلایا اور اپنی کار کو ڈاج سے آگے نکال کر لے گیا۔ ڈرائیونگ کا توازن برقرار رکھتے ہوئے میں نے ڈاج کے اندر غور سے ہر شخص کی صورت پر غور کیا۔ اس کے شیشے کچھ گہرے رنگ کے تھے اور اب بند کر دیے گئے تھے مگر استر پیڈرو کا سایہ بھی ہوتا تو میں رات کے اندھیرے میں شناخت کر سکتا تھا۔ اس گاڑی میں استر پیڈرو کے حلیے کا کوئی بھی فرد نہیں تھا۔

بہت آگے نکل جانے کے بعد میں نے کاجل سے کہا "تم نے غلط دیکھا ہوگا۔ استر پیڈرو جیسی کوئی مکروہ چیز نہیں تھی اس میں۔"

"یہ سب ہو سکتا ہے۔" کاجل نے بے بسی سے کہا۔

میں اسے پھر موقع دیتا ہوں کہ ہمیں اوور ٹیک کرے۔" میں نے ڈاج کو آنے دیا۔ ایک منٹ بعد وہ ہمارے پاس سے گزرنے کے بعد کہا "تم نے ٹھیک دیکھا ہے۔ سائیڈ میں رگڑ کا نشان بھی ہے۔"

میں نے کار کو سائیڈ میں روکا اور اس کا بونٹ کھول کے اندر یوں جھکنے لگا جیسے کوئی خرابی تلاش کر رہا ہوں۔ پانچ منٹ میں مجھے معلوم ہو گیا کہ ڈاج میرے پاس سے گزر گئی ہے۔ میں نے بونٹ بند کیا اور اندر آ بیٹھا۔

"سکندر! اس کا نمبر وہی تھا جو کاجل نے بتایا تھا۔" سب سے پہلے رابعہ نے کہا "گاڑی وہی تھی' بالکل وہی۔ سائیڈ میں اسکریچ تھا یہ۔"

"تو استر پیڈرو بھی کیا وہی تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں" وہ دونوں ایک ساتھ بولیں۔ جیسے انہیں میرا انداز اتنا شدید لگا' لہجہ اچھا نہ لگا ہو۔ ان کے اصرار میں احتجاج بھی شامل تھا۔

رابعہ نے کہا "وہ گاڑی چلا رہا تھا۔"

کاجل بولی "باجی نے بالکل ٹھیک دیکھا۔"

میں چکر میں پڑ گیا۔ "کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ کبھی آدمی بدل جاتا ہے کبھی نمبر' گاڑی وہی رہتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ اور کون تھا اس کار میں؟"

"صرف ایک ڈرائیور ہے۔"

"اس کا حلیہ؟ رابعہ تم نے بھی تو دیکھا ہوگا۔ کہیں وہ استادوں کے استاد اپنے چوہدری ملاور تو نہیں تھے؟ پیڈرو کے پاس۔"

"نہیں وہ چوہدری ملاور نہیں تھا۔ اس کا چہرہ مجھے صاف نظر آیا تھا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔"

"بدمعاش۔ کہیں اس نے تمہیں آنکھ تو نہیں ماری؟"

"تم مذاق سمجھ رہے ہو۔ مجھے گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے سکندر۔ ہم تو بالکل خالی ہاتھ ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے انجن اسٹارٹ کیا "مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔"

"میں بالکل لڑائی کے موڈ میں نہیں ہوں۔ واپس چلو۔"

"اگر وہ استر پیڈرو ہے تو ایک دم میرا موڈ بن گیا ہے لڑائی کا۔" میں نے کہا "پسپائی اختیار کرنے میں تنگی ہے میرے اسلاف کی۔ ہماری خاندانی تاریخ بزدلی اور میدانِ جنگ سے فرار کے واقعات سے یکسر خالی ہے۔ مجھے آباو اجداد کی ارواح کو شرمندہ کرنے پر مجبور مت کرو۔"

"ماننا پڑتا ہے کہ بہت سوچتے ہو تم جب تمہارے پاس بھی وہی عقل ہے جو سو دو سو سال پہلے تمہارے آباو اجداد کو تھی۔ ان کی روح واقعی شرمندہ ہوگی کہ آنے والی نسلوں نے کوئی ترقی نہیں کی۔" رابعہ نے جل بھن کے کہا "نظریہ ارتقا کو غلط ثابت کر دیا۔"

میں ہنس پڑا "ارے مس رابعہ۔ ایک بار مجھے تصدیق کر لینے دو کہ جو کچھ آپ دونوں نے دیکھا وہ نظر کا خلل کا فتور نہیں تھا۔"

کاجل نے کہا "وہ دیکھیں۔"

میں نے ادھر دیکھا جدھر کاجل نے اشارہ کیا تھا۔ سفید ڈاج کار ایک روڈ سائڈ ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑی تھی اور اس میں کوئی بھی بیٹھا ہوا نہیں تھا۔ میں نے پہلے اسی ریسٹورنٹ میں رک کر چائے پینے کا سوچا اور پھر اس خیال کو دوسرے بہتر خیال سے مسترد کر دیا۔ میں اپنی گاڑی کو سیدھا گزار کے دو میل آگے گیا۔ پھر میری نظر نے ایک ایسی جگہ تلاش کر لی جہاں ہم چھپ سکتے تھے۔ اس طرح کہ کسی کو شک بھی نہ ہو۔ اگر کسی کی نظر پڑ جاتی تو یہی سمجھتے کہ ہم نے لمبے سفر میں آرام کے لیے وقفہ لیا ہے اور سڑک سے ہٹ کے کچھ کھا پی رہے ہیں۔ ہمیں مخالف سمت سے آنے والے دیکھ سکتے تھے۔ راولپنڈی کی طرف جانے والی گاڑیوں میں صرف ان بسوں کے مسافروں کی نظر ہم پر پڑ سکتی تھی جو بائیں

www.paksociety.com

طرف کھڑکی کے ساتھ بیٹھے ہوں۔

رابعہ اور کاجل نے نظارہ رچے ہوئے گھنے درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے تھوڑی سی چہل قدمی کی۔ میں کچھ آگے سڑک کے جتنا قریب جا سکتا تھا گیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کے بے نیازی سے آسمان کی طرف دیکھتا رہا مگر میری توجہ جانے والی ٹریفک پر رہی۔ میں قدرے نشیب میں تھا چنانچہ مجھے یقین تھا کہ کار میں آگے بیٹھا ہوا کوئی شخص مجھے نہیں دیکھ سکتا۔

جب سفید ڈاج گزری تو مجھے یوں لگا جیسے اچانک میں نے سورج کی طرف دیکھ لیا ہو۔ پلک جھپکتے میں استاد پیڈرو کا چہرہ فوکس میں آیا اور غائب ہو گیا۔ میں چونکنا بھی بھول گیا تھا اور ہکا بکا کھڑا ہوا تھا۔"

میں ایک دم رابعہ کی طرف دوڑا "رابعہ...!"

رابعہ اچھل پڑی۔ اس نے پلٹ کے کہا "میں تو سمجھی کچھ ہو گیا تمہیں۔"

"ہو گیا' ہو گیا۔" میں نے کہا "استاد پیڈرو کا دیدار مجھے بھی نصیب ہو گیا۔ میں ایمان لایا تمہاری بصارت و بصیرت پر۔ چلو بیٹھو گاڑی میں۔"

رابعہ نے صاف انکار کر دیا "ہم ابھی ٹہل رہے ہیں اور ٹانگیں سیدھی کر رہے ہیں جو بیٹھے بیٹھے اکڑ گئی تھیں۔"

"ٹانگوں کے ساتھ اکڑ رہی ہو تم۔ تم سمجھتی ہو کہ ایسے میں رک جاؤں گا اور پیڈرو کے پیچھے نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا "اور تم نہیں بتاؤ گی تو۔"

"مگر ہم نے ایسا نہیں کہا۔ کیوں کاجل؟"

کاجل نے کہا "ہم چلیں گے ابھی ذرا یہ منظر دیکھو کتنا خوب صورت ہے اور اس اجلی دھوپ میں......"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ تم دھوپ میں حسن فطرت دیکھو' مزے کرو۔ میں جا رہا ہوں۔ شام تک لوٹ آیا تو ٹھیک ورنہ فی امان اللہ۔"

کار میں بیٹھنے کے بعد میں نے ادھر ادھر ہاتھ مارا مگر کار کو اسٹارٹ کرنے والی چابیاں غائب تھیں۔ چابیاں میری جیب میں بھی نہیں تھیں۔ ادھر کاجل اور رابعہ قطعی بے نیازی سے دوسری طرف دیکھ رہی تھیں اور ٹہلتے ہوئے آپس میں باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں۔ ان کا یہ انداز تجاہل خود چغلی کھاتا تھا کہ چابیاں انہی کے قبضے میں ہے۔

میں نے چلا کے کہا "چابی کس کے پاس ہے؟ شرافت سے بتا دو ورنہ......"

"ورنہ کیا جی؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے لات مار کے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا "مجھے چابی کے بغیر بھی گاڑی کو اسٹارٹ کرنا آتا ہے۔"

"تو کر لو۔ چابی میرے پاس نہیں ہے۔" رابعہ بولی۔

"میرے پاس بھی نہیں ہے۔" کاجل نے سر ہلایا۔

"مجھے چابی برآمد کرنا بھی آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اور کیا کچھ آتا ہے آپ کو؟" رابعہ بولی "اللہ نظر بد سے بچائے۔ اتنی کم عمر میں سب کچھ سیکھ لیا۔"

میں نے عاجز آ کے کہا "رابعہ! خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کرو۔ استاد پیڈرو کا تعاقب بے حد ضروری ہے۔"

"کیوں؟ آج کے بعد استاد پیڈرو اڑن چھو ہو جائے گا؟ تمہیں الہام ہوا ہے کہ وہ گاڑی میں بائی روڈ یورپ کے راستے امریکا کی طرف نکل جائے گا۔" رابعہ ایک دم سیریس ہو گئی "ہو کر کیا تعاقب نہ کیا تو کوئی گناہ ہو گا؟ تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہم کس مقصد سے نکلے تھے۔ راستے میں چیکنگ سے بچنے کے لیے تم نے وردی پہنی اور میں نے خود کو برقعے میں چھپا لیا۔ اب استاد سے بھڑنا چاہتے ہو تاکہ سب کو معلوم ہو جائے۔ کلیم اللہ کو پہنچانے کا معاملہ بیچ میں ہی رہ جائے۔ کتوں کے ساتھ بھیڑیے بھی پیچھے لگ جائیں گے اور جان بچانی زیادہ مشکل ہو جائے۔"

کاجل نے کہا "رابعہ باجی کا خیال ہے کہ وہ واسے نار میں ہیں تو فی الحال ان کو چکر میں ڈال دیا جائے۔ وہ سمجھ نہ پائیں ہم کہاں غائب ہو گئے۔ اس راستے پر وہ زیادہ آگے نہیں جائیں گے۔ آخر کار وہ سمجھ جائیں گے کہ ہم نے انہیں دیکھ لیا اور"

"جان بچا کے بھاگ گئے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اس سے ناک نہیں کٹتی ہماری۔" رابعہ بولی "خودکشی کرنے کے لیے کوئی مسلح دشمن کے سامنے خالی ہاتھ چلا جائے تو اسے بہادری نہیں سمجھا جا سکتا۔ شکاری وہ بھی ہیں اور ہم بھی اور اتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ اب تو ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی میں کہ نہ خوش فہمی ہے نہ غلط فہمی۔ وہ جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ وہ کون ہیں۔"

میں نے کہا "تمہاری باتیں کچھ دل کو لگتی ہیں تو اس کا [illegible] غالباً دل کی خرابی ہے بلکہ خاندانی خرابی۔ مزے دار تم ہو بہرحال۔"

رابعہ نے کہا "پہلے ہم کلیم کو چھوڑ آئیں' اس کے بعد تو لاہور ہی آئیں گے نا۔ وہیں ہم ہوں گے وہی چوہدری [illegible] کبھی' خوب لڑنا۔"

میں نے کہا "ملکی سطح پر تو معاملات ختم ہوئے مگر ذاتی [illegible] باقی ہے نا۔ میں کیسے معاف کر سکتا ہوں انہیں۔"

"تم معاف کر بھی دو تو وہ کب بخشنے والے ہیں۔ [illegible] امریکا میں تو سرد جنگ چلتی ہے۔ تمہارے درمیان [illegible] جنگ اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک ایک فریق ہار نہ لے اور اس معاملے میں دونوں تم نہیں۔"

"اگر وہ چاہے تو جنگ ختم ہو سکتی ہے۔ وہ میرے [illegible] قاتل کو میرے حوالے کر دے۔ ان کے ساتھ [illegible] سارے مظالم کی تلافی کرے اور میرے غصب [illegible]

[illegible] مقصد یہ کہ اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر کے خود بیراگی بن جائے۔" رابعہ بولی "کچھ شرائط کے ساتھ اس نے بھی صلح کی پیشکش کی تھی۔"

"وہ تو چاہتا تھا' میں اس کے ہاتھ اپنی عزت بیچ دوں۔ اپنا ضمیر بیچ دوں۔" میں نے برہمی سے کہا "وہ مجھے میرے باپ کے خون کی قیمت دے کر چاہتا تھا کہ میں اس کے ناجائز دھندوں میں شریک ہو جاؤں۔ بھول جاؤں کہ اس نے شرافت' اصول اور ایمانداری کے ساتھ کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے والے اپنے دوست اور محسن میرے والد کے ساتھ کیسی دغابازی کی تھی اور انہیں کتنی بے کسی کی موت مارا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اگر تمہارے جذبات بدل گئے ہیں تو مجھے مفاہمت کا مشورہ مت دو' میرے جذبات آج بھی وہی ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "لیکن حالات خود بدل گئے ہیں۔ تم کو اب پہلے سے زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔ صورت حال کو سمجھنے کے بعد طے کرنا چاہیے کہ تمہاری حکمت عمل کیا ہوگی۔ چوہدری دلاور سیاست داں بن گیا ہے۔ کیا تم سیاست سے کام نہیں لے سکتے؟ تم اسے سیاسی شکست دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے؟ کیسے حساب لگاؤ گے کہ اس جنگ میں ہم نے کیا ہارا اور اس نے کیا کھویا یا فائدے میں کون رہا اور نقصان کس نے اٹھایا۔ یہ جذبات کی ترازو میں تولنے والی چیز نہیں۔ تم اور ہم سب مل کے بیٹھیں گے تو جمع تفریق کر کے دیکھیں گے اور پھر سوچیں گے کہ دوسری بازی کے لیے بساط کیسے بچھائی جائے اور چلنے سے پہلے ہر چال پر غور کریں گے۔ ہم دوسری بازی نہیں ہار سکتے [illegible] یہ تم بھی جانتے ہو کہ اس کے بعد سب ختم ہو جائے گا۔ تم کو انتقام کی خواہش میں اتنا اندھا نہیں ہونا چاہیے کہ تم دیکھے بغیر [illegible] اور اس کنویں میں گر جاؤ جو دشمنوں نے تمہارے لیے کھودا ہے [illegible] اس میں تو خود نہیں گرنا چاہیے۔"

میں نے محسوس کیا کہ استاد پیڈرو کو دیکھ کر میں واقعی جذباتی ہو گیا تھا۔ میری عقل سے کام لینے کی صلاحیت مفلوج ہو [illegible] رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے لمس میں نہ جانے کیا بات تھی کہ میری سوچ کا دھارا بدل گیا۔ میں قائل ہو گیا کہ بدلے ہوئے حالات میں مجھے دوسری بازی کے لیے طاقت سے زیادہ سیاست کے داؤ پیچ آزمانے کا ہنر سیکھنا ہو گا۔ ایک بازی ختم ہوئی [illegible] کر سکتا تھا کہ اس میں ہمارے عزائم کو شکست کا سامنا [illegible] نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا اس کی وجہ سے ہوا۔ [illegible] اسباب عالمی سیاست کے ان بڑے شاطروں.... نے پیدا [illegible] بساط عالم پر ہم جیسے تیسری دنیا کے چھوٹے ممالک کو [illegible] استعمال کرتے تھے۔ لیکن ہم دعوے کر سکتے تھے کہ ہم نے [illegible] پورے نہیں ہونے دیے اور اس وطن

دشمن قبیلے سے تعلق رکھنے والے سب ہی افراد کے کاروبار کو تباہ کر دیا۔ کروڑوں کمانے کی امید رکھنے والوں کو کروڑوں کا گھاٹا اٹھانا پڑا۔ عسکری' سیاسی یا نظریاتی محاذ پر کامیابی اور ناکامی کے اسباب اس سے بالکل الگ تھے۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے مقابلے میں کامیابی ایم آر ایس کی ہوئی تھی۔

اب ایم آر ایس کی کمانڈو تنظیم کو فعال رکھنے کا عمل جاری نہیں رہا تھا۔ رابعہ نے ٹھیک کہا تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں ایک موثر سیاسی حکمت عملی کے لیے غیر جذباتی سوچ اور شاطر ذہن ہی ہمارا اسلحہ ہونا چاہیے۔ جیسے آتشیں اسلحے کی جنگ میں ہم نے ریوالور سے مشین گن تک اور دستی بم سے ڈائنامائٹ تک سب کچھ استعمال کیا تھا ایسے ہی اب شروع ہونے والی جنگ میں دلاور کا مقابلہ اس کی عیار فطرت' مکر و فریب کی ذہانت' باطن کو ظاہر سے مخفی رکھنے کی قدرت' پاکانی اداکارانہ صلاحیت اور جوش کے لمحے میں ہوش سے کام لینے کی مہارت سے کیا جا سکتا تھا۔

مجھے گم صم دیکھ کے رابعہ ہنسی "کیا ہوا' جا نہیں رہے ہو بغیر چابی کے گاڑی اسٹارٹ کر کے؟"

میں نے کہا "رابعہ! میری عقل پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اس کی چابی تمہارے ہاتھ میں تھی۔ اپنا ہاتھ مجھ سے کبھی مت چھڑانا۔"

اس نے ایک دم اپنا ہاتھ چھڑا لیا "سڑک پر سے لوگ دیکھ رہے ہوں گے۔ تمہیں تو خیال نہیں...."

کاجل ہنس پڑی "آپ کو بھی اتنی دیر بعد خیال آیا ہے۔ اب تک تو نہ جانے کتنے لوگ اس رومانٹک پوز سے محظوظ ہو کے گزر گئے۔"

"گزر گئے؟" میں نے افسوس سے کہا "کیسے گزر گئے؟ رشک اور حسد کے صدمے سے یا انا للہ وانا الیہ راجعون...."

"میرا مطلب تھا' بسوں اور کاروں میں سے سب نے ہی یہ سین دیکھا ہو گا تو سمجھے ہوں گے شوٹنگ ہو رہی ہے۔" کاجل بولی "آدھے گھنٹے سے آپ رابعہ کا ہاتھ پکڑے کھڑے تھے۔"

"غلط۔ رابعہ نے پکڑ رکھا تھا میرا ہاتھ۔ میں ایسی جسارت کر سکتا ہوں۔ ملکہ میں تو اتنا شرمیلا ہوں.... یہی ہیں بے شرم۔"

"اچھا اب چلو۔ وہ کافی آگے نکل گئے ہوں گے۔" رابعہ نے شرم سے لال ہو کے کہا۔

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہمیں کچھ دیر رکنا چاہیے۔"

"وہ کیوں؟"

"دیکھو نا' کیسی دھوپ کھلی ہوئی ہے اور کیسے روح پرور مناظر ہیں۔" میں نے انہی کی بات دہرائی "کیا ضرورت ہے کہیں جانے کی۔ ابھی شام ہوگی' پھر رات کو چاند نکل آئے گا' پھر گیدڑ آ جائیں گے۔ صبح تک ہم بھوک' پیاس اور سردی سے اکڑ کو بیچارے ہو جائیں گے۔ اپنے پیچھے ہم ایک اور محبت کی المناک داستان چھوڑ جائیں گے۔ شیریں فرہاد سے رومیو جولیٹ تک تھی

www.paksociety.com

کہانیاں ہیں۔ رابعہ سکندر کی کہانی پر بھی سپرہٹ فلم بنے گی۔"

"ابھی تم اکیلے ہو تو یہ حال ہے" رابعہ نے کہا "پٹری سے اتر جاتے ہو سیدھا چلتے چلتے اور بولنے لگتے ہو تو گویا فل اسٹاپ سب بھول جاتے ہو۔ غالب اور محسن ساتھ ہوتے تو نہ جانے کیا ہوتا؟"

میں نے کہا "مذاق کی بات اور تھی۔ میرے ذہن میں یہاں کچھ دیر رکنے کا خیال اس لیے آیا تھا کہ استاد پیڈرو کی گاڑی بالآخر واپس آئے گی۔ انہیں معلوم ہے کہ ہم انسان ہیں، بھوت نہیں کہ ہوا میں تحلیل ہو جائیں۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ انہیں ڈاج دیے کے لیے۔"

"ان کی ڈاج کار کو ڈاج کرنے کے لیے" رابعہ بولی۔

"چلو یوں ہی سہی۔ وہ ہمیں تلاش کرتے ہوئے آئیں گے۔ اگر ہم واقعی کہیں چھپ جائیں تو ان کے گزرتے ہی سڑک پر آگے جانب حفظِ ما تقدم اختیار کر سکتے ہیں۔ پھر ہم جا رہے ہوں گے شمال کی طرف اور ان کا رخ ہوگا جنوب کی جانب۔ ہم جائیں گے گولی کی طرح اور ان کے لیے دوبارہ ہمیں پکڑنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا۔"

"بات تو عقل کی ہے۔ مگر چھپنے کی یہاں کون سی جگہ ہے؟" رابعہ بولی۔

"یہاں نہیں ہے تو آگے پیچھے کہیں ہوگی" میں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "لاؤ چابی، چل کے دیکھتے ہیں۔"

"میں نے بتایا تھا کہ چابی میرے پاس نہیں ہے۔"

میں نے کاجل کی طرف دیکھا "تم تو ابھی بچی ہو۔"

"مگر بھائی سکندر، خدا کی قسم چابی میرے پاس ہوتی تو میں آپ کو پہلے ہی دے دیتی۔"

"پھر کس کے پاس ہے آخر چابی؟" میں نے جھنجھلا کے کہا۔

"کلیم کے پاس" رابعہ نے معصومیت سے کہا۔ "تم نے اس سے پوچھ لیا ہوتا تو اس وقت ہم یہاں سے بہت دور جا چکے ہوتے۔ اتنا وقت تو برباد نہ ہوتا۔ ہم تو کب سے کہہ رہے تھے چلو۔"

میں نے دل ہی دل میں اسے الو کی پٹھی کہا اور کلیم سے چابی لے کر مسکراتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا "بجا فرماتی ہیں آپ۔ میں ہی گدھا ہوں۔"

گرد و پیش کا بغور جائزہ لینے پر مجھے بائیں جانب ریلوے کی پٹری نظر آئی۔ تھوڑا سا کچا ناہموار فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے کار کو پٹری کے ساتھ بنے ہوئے راستے پر چلانا شروع کیا۔ اس راستے پر بیل گاڑیاں، گھوڑے اور گدھے چلتے ہوں گے۔ مجھے ایک دیہاتی برات بھی ملی جس میں مشکل سے پچیس تیس آدمی تھے۔ آگے ایک شخص خاصا بڑا ڈھول بجاتا جا رہا تھا جو اس کے موٹے پیٹ پر ٹکا ہوا تھا۔ پیچھے دو افراد ریشمی لنگی اور پگڑی پہنے لڈی اسٹائل میں ڈانس کرتے چل رہے تھے۔ جہاں گھوڑے پر بے زار صورت دلہا سر نگوں بیٹھا اپنی آزاد زندگی کی اختتامی تقریب

میں مجبوراً شرکت کرتا محسوس ہوتا تھا۔ خواتین البتہ قرمزی اور زرق برق لال نیلے پیلے کپڑوں میں پیدل رواں تھیں جنہوں نے ہمیں راستہ دیتے ہوئے بالکل بُرا نہیں مانا۔

تقریباً دو میل بعد ریلوے کراسنگ آ گئی جہاں سڑک اور ریل کی پٹری مل کے جدا ہو جاتے تھے، وہیں کچھ فاصلے پر مجھے ایک متروک اور تباہ شدہ کیبن نظر آیا۔ ممکن ہے پہلے اس میں کوئی لائن مین رہتا ہو۔ اب اس کی صرف تین دیواریں کھڑی تھیں اور ان پر قائم چھت کسی بھی وقت نیچے آ سکتی تھی۔ ایک سمت سے کھڑکیاں اور دروازے ہٹا لیے گئے تھے تو دیوار بھی غائب ہو گئی تھی۔

میں نے گاڑی کو اس "گیراج" کے اندر کھڑا کر دیا یہ بڑی مہارت کے ساتھ عمل تھا۔ کئی اینٹوں پر سے اچھلتی کودتی وہ بڑی دھوم دھام سے اس کھنڈر میں داخل ہوئی۔ رابعہ اور کاجل نے خاصی احتجاجی آوازیں نکالیں اور خوف زدہ چیخوں سے مجھے متاثر کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"یہ کیا بد تمیزی ہے۔ کہاں لا کے کھڑا کر دیا ہے گاڑی کو۔" رابعہ نے کہا۔

"مجھے یہ جگہ بہت محفوظ نظر آتی ہے۔ آپ لوگ بیٹھی رہیں۔"

"خدا کا شکر ہے کہ چھت ہم پر نہیں گری۔" کاجل نے ٹھنڈا سانس لیا۔ "یہ دیواریں دیکھیں، پتا نہیں کیسے کھڑی ہیں۔"

میں نے باہر نکلتے ہوئے کہا "مجھے امید ہے کہ میرے واپس آنے تک یہ کھڑی رہیں گی۔"

"اور اگر گر گئیں تو کیا ہوگا؟" رابعہ نے برہمی سے کہا۔

"گاڑی کو میں کھود کے نکال لوں گا۔ ڈینٹ پینٹ بھی کرا لوں گا۔ ورنہ وقار یوسف کی بیوی کہے گی، اچھے دوستوں کو دی گاڑی۔ تباہ کر کے لے آئے۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے جل بھن کے کہا "دیکھا گاڑی کی فکر ہے، ہماری نہیں۔"

"اب ایسا بھی نہیں۔ آپ کی مرمت بھی ہو جائے گی اگر زندگی رہی ورنہ فاتحہ، جہلم تو ضرور ہوگا۔ ہم ایسے بھی نہیں کہ آپ کو بھول جائیں۔"

میں واپس آتے ہوئے کراسنگ کے قریب ایک عارضی دیوار کے پیچھے جا کے بیٹھ گیا جو شارٹ کٹ سے انسانوں اور جانوروں کو ریلوے ٹریک پر آنے سے روکنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ شاید ادھر سے آنے والے اندازے کی غلطی کے باعث پوری رفتار سے گزرنے والی ٹرینوں کے سامنے آ جاتے ہوں گے۔ اب انہیں سڑک کی طرف سے آنا پڑتا تھا۔

اس دیوار کے پیچھے سے میں سڑک کی ٹریفک پر نظر رکھ سکتا تھا مگر مجھے صرف وہی دیکھ سکتے تھے جو لاہور کی جانب سے آ رہے

میں نے آخری دیکھی تو وہ سپر ہو چکی تھی۔ پھر دل ہی دل میں دعا مانگی کہ استاد پیڈرو کی گاڑی واپسی میں ہمیں تلاش کرتی ہوئی اس دھوکے میں نہ گزر جائے جب ہم کچے راستے پر رواں تھے۔

بعض دعائیں فوراً ہی قبول ہو جاتی ہیں اور اس وقت آدمی سوچتا ہے کاش میں نے زیادہ اچھی اور منافع بخش دعا مانگی ہوتی۔ سفید رنگ کی ڈاج زوم سے ریلوے کراسنگ پار کر گئی۔ میں نے اس کی نمبر پلیٹ کی ایک جھلک دیکھی۔ یہ دوسرا نمبر تھا۔ تھوڑا سا غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک ہی کار پر آگے پیچھے دو نمبر پلیٹیں لگائی گئی ہیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ آگے کی پلیٹ پیچھے کرتے ہیں اور پیچھے کی آگے اور جب نمبر پلیٹ بدلتی ہے تو ڈرائیور بھی بدل جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب پہلی بار کاجل نے نوٹ کیا تو نمبر کچھ اور تھا اور گاڑی پیڈرو چلا رہا تھا۔ دوسری بار آگے والا نمبر پیچھے کر دیا گیا تھا اور پیڈرو جگہ بدل کے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ تیسری بار اس نے اپنی قوت مشاہدہ سے صحیح کام لیا تھا اور اس کی نظر نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ اب گاڑی پھر میرے سامنے سے گزری تو میں نے اسے پیچھے سے دیکھا لیکن نمبر بدل جانے کے باوجود اسے شناخت کر لیا۔

میں ایک دم اپنی گاڑی کی طرف گیا۔ رابعہ اور کاجل کے لیے گاڑی میں بیٹھے رہنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں تو ڈرائیور کی خاکی وردی میں کہیں بھی بیٹھ جاتا کسی کو شک نہ ہوتا۔ ریلوے کراسنگ سے گزرنے والوں کے لیے بھی میرا وجود اتنا ہی غیر اہم تھا جتنا کسی پھاٹک کھولنے یا بند کرنے والے کا ہو سکتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس جگہ کوئی اس کام پر مامور نہ تھا۔ گزرنے والوں کو ریلوے کی طرف سے ایک بورڈ لگا کے خبردار کر دیا گیا تھا کہ وہ دیکھ بھال کے اپنی ذمے داری پر لائن کو عبور کریں۔ اس کے باوجود کوئی قضا سے ملنا چاہے تو اس کی مرضی۔

"خدا کا شکر ہے تم جلدی آ گئے" رابعہ نے کہا "یہ جگہ تو بھوتوں کا ڈیرا ہے۔"

"بھوتنیوں کا ڈیرہ ہے۔ ہمارے جانے کے بعد کھنڈر خالی رہ جائے گا۔" میں نے کار میں بیٹھ کے انجن کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔

کاجل نے کہا "کیا وہ واپس چلے گئے؟"

"ہاں اب ہم دوڑ لگاتے ہیں پنڈی کی طرف" میں نے دوبارہ چابی گھمائی۔ بیٹھا گھوما مگر انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔

"اسے کیا ہو گیا؟" رابعہ گھبرا کے بولی "ابھی تو ٹھیک تھی۔"

میں نے کہا "آسیب کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ کسی عامل کو بلانا چاہیے شاید۔ مادرن جن اگر خوب صورت کاروں پر بھی عاشق ہو جانے لگیں تو کیا پتا۔"

تین چار بار کوششیں کرنے کے بعد میں نے بونٹ کھولا اور تار چیک کیے۔ کوائل کے تار جھٹکوں سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔ البتہ

گاڑی کے کاربوریٹر میں پیٹرول زیادہ ہو گیا تھا۔ اب یا تو ہم اس کے خشک ہونے کے انتظار میں وقت گزارتے یا گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کے لیے دھکا لگایا جاتا۔ اچانک میری نظر نے کنڈ نسر کے نکلے ہوئے تار کو دیکھ لیا لیکن اسے لگانے سے بھی فائدہ نہیں ہوا۔ دو تین بار سیلف گھمانے سے گاڑی مزید "اوور" ہو گئی اور بیٹری کے بیٹھ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تو میں نے خواتین سے نیچے تشریف لانے کو کہا۔

"گاڑی کو دھکا لگانا پڑے گا۔" میں نے حسرت سے کہا "میں گاڑی میں بیٹھتا ہوں۔ آپ لوگ ہمت کریں۔"

"گاڑی میں بھی اسٹارٹ کر سکتی ہوں۔" رابعہ نے کہا "اور کاجل بھی کر سکتی ہے یہ کام۔"

کاجل نے کہا "بھائی آپ اندر بیٹھ جائیں۔ برقعے کے ساتھ دھکا لگانا مشکل ہوگا۔ اور اچھا بھی نہیں لگے گا۔"

رابعہ بولی "تم ابھی لکوڈی ساڑی کے ساتھ دھکا لگا لو گی......"

میں نے کہا "تو جاؤ جتنا انتظار کریں تو شاید گاڑی خود اسٹارٹ ہو جائے۔ کار میں کوئی نقص نہیں۔ بیٹری ذرا کمزور ہو گئی ہے۔"

اسی وقت کلیم اللہ نے کہا "رابعہ آنٹی۔ آپ بیٹھو ہم اور سکندر انکل دھکا لگائیں گے۔ کاجل دیدی آپ ہٹ جاؤ۔"

"دو زن تم؟" میں نے کہا "ذرا اپنی شکل کو دیکھو۔"

"ہم پہلے اینٹ پتھر ہٹائے گا۔" کلیم اللہ بولا "اور ضرورت پڑے گا تو ادھر سڑک سے کسی کو بلا کے لائے گا۔"

رابعہ اور کاجل نے خوش ہو کے اسے دیکھا "جاؤ شاباش کسی بھی گاڑی والے کو روک لینا۔"

میں نے مایوسی سے کہا "یار یہ تو میں بھی کر سکتا تھا۔ خواہ مخواہ جذباتی ہو گئے ذرا لطف رہتا۔"

ایک کار کے چار مسافروں نے ہماری مدد کی اور گاڑی اس کھنڈر سے نکل کر اسٹارٹ ہو گئی۔ حیران وہ سب تھے کہ ہم نے گاڑی کو اس "گیراج" میں کیسے داخل کیا تھا۔ مگر پوچھا صرف ایک نے کہ بھائی صاحب یہ آخر آپ کا مقصد کیا تھا۔ دوسرے نے اسے ڈانٹ کر خاموش کرا دیا کہ فضول سوالات مت کرو۔ دھکا لگاؤ۔"

گاڑی اسٹارٹ ہو گئی تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور چند منٹ کے بعد ہم پھر جی ٹی روڈ پر آ گئے۔ ہماری مدد کرنے والے کار میں بیٹھ رہے تھے کہ ایک شخص کو کچھ خیال آیا۔

اس نے میرے پاس آ کے کہا "بھائی صاحب پتا نہیں آپ کے ہی ساتھی تھے وہ۔ آپ کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔"

میں نے چونک کے کہا "ہمارے ساتھی؟"

"ہاں ایک ڈاج ڈارٹ تھی سفید رنگ کی۔ انہوں نے ہم سے بھی پوچھا تھا آپ کے بارے میں۔"

"کیا پوچھا تھا؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ اس نمبر کی گاڑی کہیں دیکھی۔ ایک برقعہ پوش خاتون

www.paksociety.com

ہیں اور ایک برقعے کے بغیر ایک بچہ ہے اور شوفر۔"

"اور بھی کچھ کہا تھا؟"

"ہاں یہ کہا تھا کہ وہ شوفر ذرا مختلف قسم کا ہے۔ شکل سے لگتا ہے مگر صورت سے شوفر نہیں لگتا۔ ٹھیک ہی کہا تھا اس نے۔ آپ تو خاصے تعلیم یافتہ اور مہذب آدمی لگتے ہیں۔ انگریزی اچھی بولتے ہیں۔"

میں نے کہا "دیکھئے اگر وہ پھر ملیں آپ کو۔ تو ان کو کچھ مت بتایئے گا ہمارے بارے میں۔ لمبی کہانی ہے اور آپ سن کے بھی کیا کریں گے۔ وہ دشمن ہیں ہمارے اور ہم ان سے چھپ کے جہاں [illegible] تھے۔"

اس نے میری بات پر غور کیا اور پھر کچھ کہنے کے انداز میں سر ہلایا "ٹھیک ہے نہیں کہا!" وہ مجھ سے ہاتھ ملا کے [illegible] گئے۔"

ان انجانے ہمدردوں کے [illegible] نے [illegible] اس شک کی تصدیق کر دی تھی کہ استاد پیڑو دیا قاعدہ ہمارے تعاقب [illegible] مجھے اپنی ایک غلطی کا شدت سے احساس [illegible] ہو رہا تھا [illegible] انجانے میں ہو گئی تھی۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ [illegible] وردی میں ہوں اور [illegible] میرا [illegible] میں نے سارا [illegible] انگریزی میں بات [illegible] تھی۔

رابعہ نے کہا "آپ [illegible]"

میں دوسری بار [illegible] اور بھی بہت سے [illegible] شہری ہوں۔ [illegible] آپ کا [illegible]"

کابل نے [illegible]

ہم نے تو بہت احتیاط کی تھی۔"

"کیا میں بھی [illegible] کسی نے ہمیں [illegible] دیکھا تھا۔ ہم [illegible] وقار یوسف کے [illegible] پہنچے تھے تب بھی [illegible] تھا۔"

"تم نے دیکھا تب تھا۔" رابعہ بولی "[illegible] یہ بات نہیں کہہ سکتے۔"

میں نے [illegible] ٹھیک کہا تم نے [illegible] یوسف کے گھر پہنچ کے دیکھ لیا تھا [illegible] لیے منظر کے گھر سے [illegible] پڑا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔ وقار یوسف نے [illegible] ضروری نہیں تھا جب تک [illegible] ہوں گے۔"

"اس کا مطلب تو یہ [illegible] وقار [illegible]

اس کی گاڑی میں چلے تب بھی کوئی دیکھ رہا تھا۔" رابعہ بولی۔

"کوئی سائے کی طرح ہمارے تعاقب میں تھا اور ہمیں معلوم نہیں ہوا۔ انہیں کار کا نمبر تک یاد تھا۔"

"انہوں نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ منظر نے ہماری کار کو اپنے گھر سے دور لے جا کے کھڑا کیا ہے۔" رابعہ بولی۔

"شاید نگرانی وہ ضروری کر رہے تھے۔ نگرانی کرنے والے دو ہوں گے تو ممکن ہے ایک منظر کے پیچھے چلا گیا ہو۔ ایک دو گاڑی میں صرف منظر کو دیکھ کے رپورٹ آگے دے رہی ہوگی اور خود وہیں موجود رہا ہوگا لیکن ہم پر نظر رکھنے کا فائدہ کیا ہوا اگر وہ چاہتے تھے کہ ہمیں چاندنی کے قتل میں ملوث کر لیا جائے اور حراست میں لے لیا جائے تو [illegible] مقصد بہرحال پورا نہیں ہوا۔"

"ممکن ہے انہیں قانونی مراحل [illegible] کے خانہ تلاشی اور [illegible] گرفتاری سے [illegible] امکانات [illegible] ہو گئی ہو۔ عام حالات میں پولیس بھی اتنا [illegible] جب چاہے کہیں سے [illegible]"

"[illegible] کار [illegible] بھی ہے۔"

"[illegible] نے کہا۔

"[illegible] کے صدر یا [illegible] رہتا ہے۔ اس کی اپنی بہت [illegible]" رابعہ نے کہا۔

"[illegible] شناخت [illegible]"

"[illegible] آگے پیچھے [illegible]" رابعہ بولی۔

"[illegible] ہو گیا ہو گا [illegible] مجھے [illegible] نہیں سمجھ [illegible] اس طرح کیا [illegible] تعاقب؟"

"[illegible] تجربہ کار آدمی جو خود بھی [illegible] کے ساتھ ساتھ حفاظت بھی [illegible] کی طرح ہو گیا ہے۔ تیزی سے [illegible] فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو۔"

"[illegible] تیزی سے تعاقب کر رہا تھا۔ محض اس لیے [illegible]" رابعہ [illegible]

"[illegible] وہ صرف احساس دلانا چاہتا تھا کہ تمہارے جال سے نکل [illegible] جہاں جاؤ گے ہم پہلے سے موجود ہوں گے۔" میں نے کہا۔

کلیم نے کہا "امی مجھے بھوک لگی ہے۔"

"اف بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔ میں تو بالکل بھول گیا تھا کہ میں فاقے سے ہلاک ہونے والا ہوں۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے کلیم کو تسلی دی "بس پنڈی پہنچ کے کھانا کھائیں گے تھوڑی سی دیر کی بات ہے۔"

"شام تک پشاور پہنچ جانا چاہیے ہمیں۔" میں نے کہا "خدا نے چاہا تو کل ہم کلیم اللہ کے گھر ہوں گے۔"

"آج رات کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ علاقہ غیر میں جانے سے پہلے پولیٹیکل ایجنٹ سے پاس حاصل کرنا پڑتا ہے۔" میں نے کہا "اسے مطمئن کرنا پڑتا ہے کہ آپ بلاوجہ وہاں نہیں جا رہے ہیں۔ علاقہ غیر نورست حضرات کے لیے نہیں ہے۔ پہلے تو باہر کا کوئی ادھر جا ہی نہیں سکتا تھا مگر پاکستان بننے کے بعد حالات کچھ بدل گئے ہیں۔"

ہم چار بجے راولپنڈی سے روانہ ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ سردیوں کے چھوٹے دن تھے۔ پنڈی میں پانچ بجے کے قریب سورج غروب ہوتا تھا۔ سردی ایک دم بڑھ گئی تھی اور جی ٹی روڈ پر شیشے چڑھانے کے بعد مجھے گاڑی کا ہیٹر آن کرنا پڑا۔ راستہ بالکل صاف تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب استاد پیڑو ہم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ انہیں ہماری منزل کی خبر کیسے ہو سکتی تھی۔ ہمیں راولپنڈی اور اسلام آباد سے آگے تلاش کرنے کا خیال بھی شاید انہیں نہ آئے۔"

رات آٹھ بجے ہم پشاور پہنچے تو سردی کے باعث سڑکوں پر ویرانی کا سماں تھا۔ یوں بھی لاہور کے مقابلے میں پنڈی کم آباد تھا اور پشاور میں رونق والے علاقے محدود تھے۔ صدر کا علاقہ جہاں کنٹونمنٹ تھا [illegible] اسٹیشن تھا اور وہاں دوسرے علاقوں کی خواتین بے پردہ گھومتی نظر آ جاتی تھیں۔ مقامی شرفا اور خواتین کے گھروں میں سخت پردہ رائج تھا اور ان کے گھروں کی عورتیں جن گاڑیوں میں آتی جاتی تھیں ان کے شیشوں پر خصوصی اہتمام کے تحت پردے ڈالے جاتے تھے اور اندر بھی وہ برقعہ پوش رہتی تھیں۔ شہر میں ڈگری یا قصہ خوانی کے علاقے میں عورت خال خال نظر آتی تھیں اور وہ بھی پرانی طرز کے ٹوپی والے برقعے میں۔ تقریبات یا اشد ضرورت کے بغیر تعلیم یافتہ اور غریب یا متوسط طبقے کی خواتین گھروں سے نکلتی نہیں تھیں اور اگر نکلنا پڑتا تھا تو تانگے میں آگے پیچھے چادر باندھ دی جاتی تھی۔

کینٹ ایریا بہت وسیع تھا اور ایڈورڈز کالج سے شروع ہوکے باڑہ ان تک جانے والی مال روڈ کے دونوں جانب صدر تک پھیلا ہوا تھا۔ صدر میں جہاں اشرف کی تنگ گلیاں کراچی کے بوہری بازار یا لاہور کے انارکلی بازار کی طرح تھیں۔ اعلیٰ ترین ہوٹل ایک تھا جسے آج کل کے لحاظ سے ایک ستارہ ہوٹل سمجھا جا سکتا ہے۔

میں نے رابعہ اور کابل کے ساتھ [illegible] ہوٹل ہی کا انتخاب کیا تھا مگر وہاں کسی کے لیے ایک جگہ نہیں تھی۔ وہاں صرف ایک مرد اکیلا تھا اب ہم چار افراد تھے۔ ہوٹل کے قوانین دو سے زیادہ افراد کو ایک کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ کلیم اللہ کو بچہ سمجھ کے نظر انداز کیا جا تا تب بھی تین کی جگہ نہ تھی۔ منیجر نے صاف معذرت کرلی اور خصوصی رعایت دینے پر تیار نہ ہوا تو میں نے ایک کمرے میں رابعہ اور کابل کو چھوڑا۔ کلیم کو تین کے ساتھ رہا۔ میں تھوڑی دور واقع گرین ہوٹل میں گیا جہاں شب بسری کے لیے مجھے خاصا آرام دہ کمرا مل گیا۔

وہاں میرے اکیلے قیام کرنے کا ایک اور فائدہ بھی ہوا۔ میں رات کے کھانے کے لیے واپس ڈین ہوٹل گیا تھا اور دس بجے کے قریب واپس آیا تو کاؤنٹر پر ایک باریش پٹھان اور منیجر کے درمیان تکرار چل رہی تھی۔ پٹھان سرخ و سفید رنگ کا جوان آدمی تھا اور حلیے سے معزز لگتا تھا۔ وہ اس بات پر مشتعل تھا کہ اس نے فون پر ریزرویشن کرا دی تھی تو پھر اس کا کمرا مجھے کیوں دیا گیا۔

منیجر نے کہا "آپ نے کل فون کیا تھا۔ بلکہ پرسوں شام۔"

"پھر کیا ہوا۔ ہم دو دن کا کرایہ دے گا۔"

"آفریدی صاحب ایسے ہم کمرے خالی نہیں رکھ سکتے۔ کسی کا کیا پتا وہ فون کرنے کے بعد ارادہ بدل دے۔ آپ نے کوئی ادائیگی تو نہیں کی تھی نا۔" منیجر نے کہا "اب یہ مسافر ہوٹل میں آکے ادائیگی کر رہا ہے اسے ہم کیسے انکار کریں۔"

"تم لوگ پیسے کو اہم سمجھتا ہے۔ شریف آدمی کا زبان کا کوئی اہمیت نہیں ہے۔" پٹھان گرم ہو گیا۔

"خان صاحب میں نے آپ کی صرف آواز سنی تھی۔ ذاتی طور پر تو میں آپ کو نہیں جانتا تھا۔ لوگ تو شرارت میں بھی فون کر دیتے ہیں۔" منیجر نے شائستگی سے وضاحت کی۔

اب میں نے مداخلت مناسب سمجھتے ہوئے کہا "کیا بات ہے۔ ان کا کمرا مجھے دے دیا گیا ہے۔"

آفریدی نے مجھے دیکھا "آپ کا کوئی غلطی نہیں اس میں۔"

میں نے کہا "غلطی کسی کی بھی نہیں۔ چلیں چھوڑیں۔"

"یارا ابھی ہم کدھر جائے گا۔"

میں نے کہا "آپ میرے ساتھ آ جائیں۔ میرا ڈبل بیڈ میرے لیے کس کام کا۔ ایک رات ہم ساتھ گزار سکتے ہیں۔ میں صبح ہی چلا جاؤں گا۔"

اس کے چہرے پر سکون اور اطمینان کے ساتھ شکر گزاری کے جذبات نظر آنے لگے "آپ نے بڑا خواری سے بچا لیا ہم کو۔ بہت مہربانی۔"

میں نے کہا "آئیے میرے ساتھ۔ ہوٹلوں میں رہائش کی کمی کا بڑا مسئلہ ہے۔ مجھے بھی [illegible] چھوڑ کے خود یہاں آنا پڑا۔"

اس کے ہاتھ میں صرف ایک بریف کیس تھا جو چھوٹا سا سوٹ کیس بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ کمرے میں پہنچ کے اس نے قمیص کے نیچے سے ریوالور اور [illegible] اتار کے میز پر ڈال دیے اور دوسرے [illegible] کے [illegible] لگا۔ میں نے [illegible] میں نائٹ سوٹ

www.paksociety.com

پہن لیا۔

"آپ کا نام میں نے رجسٹر میں دیکھا تھا۔" وہ بولا "شرافت علی نقوی۔ کراچی سے آئے ہو ادھر کہاں رہتے ہو۔"

میں نے فوراً اکرام شیخ کا پتا بتادیا "میرا بزنس ہے وہاں۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "کیسا بزنس؟"

"میں نے کہا "کنسٹرکشن کا۔"

اس نے کہا "کراچی میں رائج مزدور سے پوچھو۔ وہ بھی ایسا ہی بولتا ہے۔ ہم ٹھیکیدار ہے ادھر مستری اور الیکٹرک کا ٹھیکہ لیتا ہے کوٹھی بنگلوں میں۔ تم مکان بناتا ہے یا کارپوریشن کا ٹھیکہ لیتا ہے۔"

خوش اخلاقی کا مظاہرہ مجھے مہنگا پڑ رہا تھا اور میں مجبور تھا کہ اس کے ہر سوال کا جواب دوں۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں نے خود کو اسی کاروبار سے وابستہ کرلیا تھا جو آفریدی کی لائن تھی۔ وہ کراچی کے تمام بلڈرز اور بڑے بڑے ٹھیکیداروں کو جانتا تھا اور مجھ سے ان کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ فلاں سے ملے ہو۔ فلاں کے ساتھ بھی کام کیا ہے۔ فلاں بڑا بے ایمان ہے۔ ریت کی دیواریں کھڑی کرتا جارہا ہے ادھر میرا یہ حال تھا کہ مجھے کراچی کے گلی محلوں اور سڑکوں بازاروں کے نام تک یاد نہیں آرہے تھے۔

بہت جلد میرا پول کھل گیا۔ آفریدی نے تاڑ لیا کہ میں نے اس سے غلط بیانی کی تھی "تم نے یہ ڈرائیور کا وردی کیوں پہنا ہے۔"

میں نے مزید جھوٹ بولا "سفر میں کپڑے تو بس ایسے ہی ہونے چاہئیں۔"

"دیکھو یارا! تم کچھ پریشان ہے۔" اس نے کہا "تمہارا مرضی ہے ہم کو کچھ نہ بتاؤ لیکن تم ہمارا پریشانی دور کیا۔ ہم کو اپنے ساتھ جگہ دیا۔ ابھی یہ قرض ہم پر ہے ہم پٹھان ہے۔ احسان کرنے والا جان مانگے تو دیتا ہے۔ زبان دیتا ہے تو پھر جان دے کر نبھاتا ہے۔"

میں نے کہا "میں جانتا ہوں آفریدی صاحب۔"

"صاحب۔ صاحب تو فرنگی ہوتا تھا۔ ہم پاکستانی سب مسلمان بھائی ہے۔" اس نے کہا۔

"معاف کرنا" میں نے کہا "میں نے خواہ مخواہ تم سے جھوٹ بولا۔ تم تو واقعی میری مدد کرسکتے ہو۔ تم یہاں کے رہنے والے ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "صبح ہمرو جائے گا ادھر اپنا گھر ہے۔ گاؤں ہے اور قبیلہ ہے سارا۔"

میں نے سوچ کے کہا "مجھے خیبر ایجنسی جانا ہے قبائلی علاقے میں جہاں میں آج تک نہیں گیا۔"

"کام کیا ہے؟" اس نے کہا "ہم کو بولو۔"

میں نے کہا "ایک دوست تھا میرا۔ ادھر مشرقی پاکستان میں وہ بھی پٹھان تھا۔ اس نے مرتے وقت اپنے بیٹے کو میرے حوالے کردیا تھا۔ اور کہا تھا اس کو میرے گھر والوں کے پاس پہنچا دینا۔ کلیم اللہ کی پھوپی زندہ ہے۔"

"اور اس کی ماں کدھر ہے۔"

"وہ بھی مرگئی۔ وہیں ڈھاکا میں۔ اس لڑکے کا باپ کسی ہندو سیٹھ کا چوکیدار تھا۔ اسے بچانے کی کوشش میں خود زخمی ہوگیا تھا۔ ڈاکوؤں کے ہاتھوں۔ سیٹھ نے وفاداری کا کوئی انعام نہیں دیا۔ نوکری سے بھی نکال دیا کہ مجھے معذور آدمی کی ضرورت نہیں۔ فاقہ کشی کی نوبت آگئی تھی۔ میاں بیوی ایک ساتھ مارے گئے۔" میں نے ان کی خودکشی کے ذکر کو عمداً گول کردیا۔

"کیسے لڑائی میں؟"

"ہاں وہاں تو بہت مسلمان مارے گئے تھے۔ کلیم اللہ خوش قسمت تھا کہ ہمارے ساتھ آگیا۔" میں نے کہا۔

اس نے مزید تفصیلات کے لیے بہت سے سوالات کیے۔ کب ڈھاکا گیا تھا۔ کیوں گیا تھا۔ ہندو کے پاس ملازمت کیوں اختیار کی تھی۔ خود واپس آنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی۔

ساری بات سن کر وہ کچھ سوچنے لگا اور پھر بولا "یارا شرافت علی۔ ابھی میں ایک بات بولتا ہوں۔ یا تو پھر غلط بولتا ہے یا تیرا یار نے غلط بولا۔ قبائلی علاقے میں جانے سے پہلے سوچو۔"

میں نے کہا "سوچنے کی کون سی بات ہے۔"

"ہے یارا ہے" وہ اصرار کرتے ہوئے بولا "تم کچھ نہیں جانتا ابھی ادھر سے ایک پٹھان محنت مزدوری کے واسطے پنڈی لاہور جاتا ہے کراچی جاتا ہے۔ ڈھاکا نہیں جاتا۔ ایسا کام ادھر بہت ہے۔"

"تمہارے خیال میں اس کے وہاں جانے کا سبب کیا تھا؟"

اس نے کہا "اللہ جانتا ہے لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ وہ جان بچاکے گیا۔ کسی دشمن سے۔ ادھر اس نے کسی کو قتل کیا ہوگا اور ڈرتا ہوگا کہ مقتول کا وارث اس کو تلاش کرے گا۔ اگر باپ کو قتل کیا ہوگا تو بیٹا نہیں چھوڑے گا۔ بھائی ہوگا تو وہ بھی بدلہ لے گا۔ ادھر کوئی کب تک چھپ سکتا ہے۔ وہ مہینہ دو سال دس سال۔"

میں نے پریشانی سے کہا "اتنا عرصہ انتظار کرسکتا ہے کوئی۔"

"یارا تم بھول سکتے ہو اپنے بھائی کے قاتل کو یا اپنے باپ کے قاتل کو معاف کرسکتے ہو۔"

اس نے اچانک میری دکھتی رگ پکڑلی تھی۔ مجھ سے وہ سوال پوچھ لیا تھا جس کا میرے پاس ایک ہی جواب تھا۔ ناممکن۔ میں اپنے والد وزیر خاں کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے زندگی کی آخری سانس تک اس کا پیچھا کروں گا۔ دس سال کیا میری باقی عمر اسی انتقام کی پیاس بجھانے کی جدوجہد میں کام آئے تو میں سمجھوں گا کہ میری زندگی بے مقصد بیتنے کا نام نہیں تھی۔ میری سوچ نے خود مجھے حیران کیا۔ کیا ایسا اس لیے تھا کہ میری رگوں میں بھی پٹھان خون تھا۔ میرا اصل نام کبیر خاں تھا۔ میرے والد وزیر خاں بتاتے تھے کہ ہم یوسف زئی پٹھان ہیں۔

میں نے دیوار کو گھورتے ہوئے کہا "آفریدی میرا نام شرافت

نہیں ہے۔ کبیر خاں ہے کبیر خاں ولد وزیر خاں اور میری بدنصیبی کا انتہا اب ان سب کو جہنم رسید کرنا ہے جو میرے والد کے قاتل ہیں۔ وہ بہت طاقتور۔ بااثر اور کینہ پرور لوگ ہیں۔ وہ میرے ارادوں کو سمجھتے ہیں چنانچہ وہ چاہتے ہیں کہ میرے انتقام کا نشانہ بننے سے پہلے مجھے ہی ختم کردیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوگا۔"

میں نے اسے اپنے ذاتی انتقام سے تعلق رکھنے والے تمام واقعات بتادیے۔ اس کہانی میں ایم آر ایس اور مشرقی پاکستان میں پیش آنے والے حالات کا ذکر نہیں آیا۔ رابعہ اور محسن ثعلب یا نازو کا حوالہ بھی نہیں آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح چوہدری والوں نے میرے والد سے سب کچھ چھین لیا تھا اور وہ کس بے کسی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ ایک لکھ پتی کا جنازہ وہ بے چارے ایک تنگ و تاریک ملازم کے گھر سے اٹھا تھا کیونکہ حالات نے اسے ایک کرایہ دار ملازم کی حیثیت سے زندگی کے دن پورے کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ خیراتی اسپتال سے دوائیں لاتا رہا حالانکہ وہ ایک شاندار کوٹھی کا مالک تھا۔ یہ سب کیسے ہوا۔ میں نہیں جانتا۔ میں انگلستان میں تعلیم حاصل کررہا تھا کہ اچانک مجھے ان کی حالت زار کی خبر ایک گمنام شخص کے ذریعے ملی مگر میرے پاکستان پہنچنے سے پہلے ہی وہ اس راز کو سینے میں چھپائے دنیا سے جاچکے تھے۔ ان کا ایک شریک کار شرافت علی مجھے کچھ بتا سکتا تھا مگر وہ بھی قتل کردیا گیا اور اس قتل کا الزام مجھ پر عائد کرکے مجھے تختہ دار تک پہنچانے کا پورا بندوبست کیا گیا مگر خدا نے مجھے بچالیا اب میں روپوشی کی زندگی گزار رہا ہوں اور موقعے کی تلاش میں ہوں جب میں اپنے والد کے قاتلوں کو اعتراف جرم پر مجبور کرسکوں اور انہیں تختہ دار تک پہنچاؤں۔ وہ میری جان کے درپے ہیں اور یہ کھیل ابھی جاری ہے۔"

اس نے بڑی دلچسپی اور ہمدردی کی ساتھ میری کہانی سنی تھی۔ خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد اس نے کہا "یارا کبیر خاں کیا تو ان سے ڈرتا ہے؟"

میں نے کہا "مسلمان موت سے نہیں ڈرتا۔"

"تو پھر لے ریوالور اور جاکے انہیں چھلنی کردے۔ بزدل مت بنو۔ انہوں نے تیرے باپ کی لاش اور ہڈیاں تک قبر سے نکال دیا اور تو نے ابھی تک کچھ نہیں کیا۔ کیسا بیٹا ہے تو۔ ایک ایک کو مار دے اور سب کو بتادے۔ سب کے سامنے مار انہیں اور عزت کے ساتھ پھانسی چڑھ جا۔" آفریدی نے کہا۔

میں نے کہا "تمہارے جذبات غلط نہیں ہیں۔ ایسا ہی کرنا چاہیے تھا مجھے۔ لیکن میرے کچھ اور مسائل بھی ہیں۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔"

"یہ تو اور اچھی بات ہے۔"

"میرا مطلب تھا کہ کسی کو میری ضرورت ہے۔ اکیلا ہوتا تو میں کب کا یہ حساب چکا دیتا لیکن مجھے اپنا حق بھی حاصل کرنا تھا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ تعلیم نے اور دنیا کے جھمیلوں نے مجھے بزدل بنادیا ہے۔ مصلحت کو سمجھنا اور مصالحت کرنا سکھادیا ہے۔ میرے جذبات بھی عقل کے تابع ہیں۔ کاش میں تمہاری طرح سوچ سکتا۔ انجام اور نتائج کی پروا کیے بغیر سب کرگزرتا مگر میں ایسا نہیں کرسکتا۔ شاید کر بھی نہیں سکتا۔ میں اپنے دشمنوں سے بچتا پھر رہا ہوں۔ ڈرائیور کی وردی میں نے اسی لیے پہن رکھی تھی کہ میرا تعاقب کرنے والے مجھے نہ پہچان پائیں۔ وہ لاہور سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان کو ڈاج دیا۔ میں نے اس بچے کو اس کے وارثوں تک پہنچانے کی ذمے داری بھی قبول کرلی تھی۔"

"وارثوں تک یا قاتلوں تک۔ ابھی تم کو کیا معلوم ہے کبیر خاں کہ وہ اس کو قبول کریں گے یا...."

میں نے کہا "نہیں آفریدی۔ ایسا کوئی نہیں کرسکتا۔ ایک بچے سے کون انتقام لے گا۔"

"آج وہ بچہ ہے کل بڑا ہوجائے گا۔ اگر اس کا باپ جرم کرکے بھاگا ہوگا تو سزا اس کے بیٹے کو ضرور ملے گا۔ ادھر کا ایسا ہی قانون ہے۔"

میں نے پریشان ہوکے کہا "مگر جن کا اس سے خون کا رشتہ ہے...."

اس نے میری بات کاٹ دی "اس کے تربور کب خون کے رشتے سے منکر ہوں گے۔ مگر ان سے خون کے رشتے کا نوعیت بدل جاتا ہے۔ پھر یہ محبت کا نہیں نفرت کا رشتہ بن جاتا ہے۔ اس روایت کو تم نہیں سمجھے گا۔ ترپوروں کی روایت۔"

میں نے کہا "میں واقعی یہ سب نہیں جانتا۔ تم نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ کیا واقعی اس کے اپنے اسے مار ڈالیں گے؟"

"ہاں اگر اس کا باپ نے زمین جائیداد یا رشتے کے معاملے میں کسی سگے بھائی کا خون بھی کیا ہوگا تو اب اگلی نسل میں اس کا کوئی چچازاد یا ماموں زاد بھی اس کا جانی دشمن سمجھا جائے گا۔"

"پھر میں کیا کروں۔ میں اسے یہاں اس لیے تو نہیں لایا تھا کہ قاتلوں کے حوالے کردوں۔" میں نے کہا "میں اسے واپس بھی نہیں لے جاسکتا۔ کلیم اللہ اپنے گاؤں جانا چاہتا ہے۔ اپنوں میں رہنا چاہتا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ ایک نسل پہلے کیا ہوا تھا۔"

"میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔ اس حد تک کہ تم ہمرو میں میرے مہمان بن جاؤ۔" آفریدی بولا "اس وقت تک میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا جب تک میرے قبیلے کا ایک ایک فرد تمہاری حفاظت کرتے ہوئے مارا نہ جائے۔ اتنی ہمت کسی میں نہیں ہے۔"

"میں کب تک مہمان رہ سکتا ہوں۔ اور مسئلہ تو کلیم اللہ کا ہے۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"ہم اپنا آدمی بھیج کر معلوم کرنے کا معاملہ کیا ہے۔" آفریدی بہت صاف اور صحیح اردو بولتا تھا مگر کبھی کبھی اس کی گرامر غلط ہو جاتی تھی۔

میں نے کہا "وہاں جانے کے لیے تو پولیٹیکل ایجنٹ سے پاس بھی لینا پڑے گا۔"

"میرے ساتھ ضروری نہیں۔ میں وہاں کا رہنے والا ہے۔" اس نے کہا "تمہارے ساتھ زنانہ کون ہے۔"

میں نے جھوٹ بولا "میری بیوی اور بہن۔"

"ان کو کیوں لیا تم۔ ہمارا علاقہ میں جائے گا تو ایسا نہیں جائے گا جیسا کراچی میں پالا ہوا ہے۔ پردہ کرے گا۔"

"وہ پردہ کریں گی میری بیوی تو برقعہ اوڑھتی ہے۔ بہن کے لیے لے لوں گا۔"

"اچھا ابھی سو جاؤ۔ فی امان اللہ شب بخیر۔"

"شب بخیر" میں نے کہا اور لائٹ بجھا کے لیٹ گیا مگر آفریدی کی باتوں نے میرے ذہن میں نئی پریشانیاں پیدا کر دی تھیں۔ میرا دل نہیں مانتا تھا کہ کلیم کا باپ سرحدی علاقے میں کوئی جرم کر کے سزا سے بچنے کے لیے فرار ہوا ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنے بیٹے کو اپنے جرم کی سزا کاٹنے کے لیے کیوں بھیجتا۔ دوسری طرف آفریدی کی دلیل بھی بے وزن نہ تھی کہ صرف محنت مزدوری کی خاطر کوئی اتنی دور نہیں جاتا۔ سرکاری ملازم کا ٹرانسفر ہو جائے تو اسے جانا پڑتا ہے لیکن کلیم کا باپ معمولی چوکیدار تھا۔ ایسی نوکری تو اسے کہیں بھی مل جاتی۔ ہاں اس کی جان کے دشمن اسے ڈھاکا میں تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ ... کراچی تک تو سب ہی کا خیال جاتا ہے مگر مشرقی پاکستان تو دوسرے ملک کی طرح تھا۔ شاید اتنے عرصے بعد کلیم کے باپ نے یہ سمجھا ہو کہ وہ پرانی بات تھی۔ اب کلیم کو معاف کر دیا جائے گا۔ اس نے مجھے بالکل مختلف کہانی سنائی تھی جو اب آفریدی کے ریمارکس کی روشنی میں غلط لگتی تھی۔

رابعہ اور کاشی دوسرے ہوٹل میں تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ میں ابھی جا کے ان کو یہ سب بتاؤں اور ان سے مشورہ کروں کہ کیا ان حالات میں ہمارا کلیم کے ساتھ واپس لوٹ جانا مناسب نہ ہوگا؟ مگر اب رات بہت بیت چکی تھی اور یہاں یہ مشکل کام تھا کہ اتنی سردی میں ہوٹل جا کے میں انہیں جگاؤں۔ وہ پریشان ہونے کے سوا کیا کر سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ آفریدی نے ایک اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ یہ کوئی یقینی بات نہیں تھی۔

میں سارے معاملات کو خدا کے سپرد کر کے سونے کی کوشش میں مصروف ہو گیا اور رات کے کسی پہر میں آخر کار نیند آ گئی۔ میرے ساتھ ہی دوسرے بیڈ پر آفریدی کروٹ بدلتے ہی سو گیا تھا اور بہت پرسکون تھا۔ اس کے دماغ پر کوئی بوجھ تھا نہ ضمیر پر۔

صبح میری آنکھ قدرے دیر سے کھلی۔ آفریدی اس وقت تک نماز سے بھی فارغ ہو چکا تھا اور غسل سے بھی۔ میں نے قدرے خفت کے ساتھ روم سروس کا بٹن دبا کے اپنے لیے چائے ... اور منہ دھونے چلا گیا۔ پانی گرم تھا مگر مجھے نہانے کا حوصلہ ...

آفریدی نے کہا "خالی چائے کیوں پیتے ہو۔ ناشتا ..."

میں نے معذرت کی "ناشتا میں رابعہ... اپنی بیوی کے ساتھ ہی کروں گا۔ وہ ہوٹل میں انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"کتنی دیر میں واپس آؤ گے۔" وہ بولا "میں تو جلدی ... ہو جاتا۔ تمہاری وجہ سے رکا ہوا ہوں۔"

میں نے کہا "ایک گھنٹے میں۔ اس وقت تک بازار کھل گئے ہوں گے مجھے برقعے لینے ہیں۔ میرا لباس تو ٹھیک ہے نا۔"

"اپنے لیے کوئی ٹوپی لے لو۔ قراقلی اچھی لگے گی۔"

میں نے اسے چائے کا کپ دیا اور خود پشاور کی صبح کا نظارہ کرنے کے لیے ٹیرس میں چلا گیا۔ سڑک ابھی سنسان پڑی تھی بیشتر دکانیں بند تھیں اور سڑک پر سے اکا دکا تانگے گزر رہے تھے یا اسکول جانے والے بچوں کی سواریاں۔ آسمان کچھ ابر آلود تھا فضا میں نیلگوں دھند ٹھہری ہوئی تھی۔ سڑک کے کنارے بہت گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میری نظر گھوم پھر کے ہوٹل کے مقابل ہوٹل کی کاروں پر ٹھہر گئی۔ وہاں دوسری بہت سی کاروں کے درمیان سفید رنگ کی ایک لمبی ڈاٹسن بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ کار ... کی کار کے ساتھ جس نے انہیں لاہور سے پشاور پہنچایا تھا۔

دوسری منزل کی بلندی سے دھند کے باعث میں کار کا نمبر نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کی شکل لائسنس بھی میری نظر سے اوجھل تھا۔ ایک سائڈ پر رگڑ کا نشان بھی۔ کاشی نے صرف نمبر ہی دیکھا تھا ہم کنفیوژن کا شکار رہے مگر اس نے وہ ایسی نشانیاں نوٹ کی تھیں جو ہر سفید ڈاٹسن پر نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس کی ایک ٹیل لائٹ ٹوٹی تھی اور دوسری یہ کہ اس کی ایک سائڈ پر رگڑ کا لمبا نشان تھا۔

میں نیچے جا کے تصدیق کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ تعاقب کرنے والوں کا ہم تک پہنچ جانا مشکل ضرور تھا ناممکن نہ تھا۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ راہ چلتے لوگوں سے بھی ہمارے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ ایک کار کے چار شریف مسافروں نے ہماری مدد کرنے کے بعد یہ انکشاف کیا تھا کہ ہمارے ساتھی ... تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ غالباً ایسے ہی لوگوں سے پوچھتے ... پشاور آ پہنچے تھے۔ گڑبڑ یہ تھی کہ ... یوسف کی کار نمایاں تھی۔ بیش قیمت ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اسپورٹس ماڈل اپنے منفرد کلر کے باعث زیادہ نمایاں ہو جاتی تھی۔ اس کے ... حصے پر سبز رنگ تھا اور بالائی حصے پر شوخ سرخ۔ ایسی ... تلاش کرتے ہوئے دیکھنے والوں کی مدد حاصل کرنے سے ... مشکل کام بھی آسان ہو گیا ہوگا۔ کسی نے اشارہ دے دیا ہوگا کہ ... کار پشاور روڈ کی طرف سو کلومیٹر سے زیادہ کی رفتار پر جا رہی ... پشاور پہنچ جانے کے بعد انہیں یہ کار ... ہوٹل کے باہر کھڑی ... آتی ہوگی تو وہ گرین ہوٹل پہنچ گئے تھے۔ انہیں یقیناً معلوم ... بیگ کے ساتھ ہم اسی دو ہوٹلوں میں قیام کر سکتے ہیں۔

واپس اندر آ کے میں نے آفریدی سے کہا "یار خان صاحب"

"پھر صاحب بولا تم۔ خان کافی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "خان میرے دشمن بھی اسی ہوٹل میں ہیں۔"

اس نے اخبار دیکھتے ہوئے حیرانی سے نظریں اٹھائیں "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے کہا "ان کی گاڑی دیکھ کر۔ جو میری گاڑی کے ساتھ ہی کھڑی ہے۔ میں اپنی گاڑی کیسے نکالوں گا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ گاڑی انہی کا ہے؟"

"اگر تم نیچے جا کے دیکھ آؤ تو مہربانی۔ دو میں سے ایک نمبر نظر آ جائے گا۔" میں نے کہا۔

"دو نمبر کیا مطلب۔"

"دوسرا نمبر پیچھے کی پلیٹ پر ہو تو وہ بھی ایک نمبر آگے ... بھی دوسرا۔"

"میں دیکھتا ہوں۔ ان کی شکل صورت بتاؤ۔ نام...."

میں نے کہا "میری طرح انہوں نے بھی غلط نام لکھوایا ہوگا۔"

آفریدی نیچے جا کے پانچ منٹ میں لوٹ آیا اور اس نے تصدیق کی "نمبر ٹھیک ہے مگر آگے پیچھے ایک ہی نمبر ہے۔"

میں نے کہا "... تو دوسرا نمبر ان کے پاس ہوگا ... گاڑی پر آگے پیچھے مختلف نمبر ہوتے تو وہ پکڑے جاتے۔ یہ کام انہوں نے راستے میں دھوکا دینے کے لیے کیا تھا۔"

"اب کیا کرو گے؟"

میں نے سوچا ... "تم میری مدد کرو۔ نیچے جا کر منیجر یا کلرک سے پوچھو کہ ... فرار ہو سکتا ہوں۔ ایڈوانس میں نے ... دیا تھا۔ ... تم ان کی طرف ہٹ گئی۔"

"فکر نہ کرو ..."

"... نکل خطرے ہیں باہر۔ اگر وہ چھپ کے ... تمہارے ... خون ہوگا۔ لاشیں گریں گی۔ پھر پولیس ... کی شہرت کے لیے کوئی اچھی بات نہیں۔"

... "... ہے وہ مصیبت سے بچنے کا یہ آسان راستہ ... اختیار کریں ..."

"... بات کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "اور ہاں تم اپنا یہ ریوالور دے سکتے ہو مجھے؟ ... قیمت ... لیکن یہ تو شاید تمہارے نام پر ہوگا۔ لائسنس ..."

اس نے مسکرا کے کہا "ادھر کون لائسنس لیتا ہے یار۔ ہم تو اسلحہ بناتا ہے ... غیر ملکی اسلحہ کیا چیز ہے اس کے سامنے۔ ... بازار ... ہے تو ادھر اس سے اچھا دوسو میں ملتا ہے۔ تم لے لو قیمت کا کوئی بات نہیں۔"

"ایسے میں نہیں لوں گا۔"

"یار! مجھے بھی مفت ملا تھا۔ اور بہت ... گھر چل کے دیکھنا کیسا کیسا شاندار چیز ہے ... ہے۔" اس نے ریوالور میری طرف بڑھایا "جان کی حفاظت ... کرتا ہے یار۔"

آفریدی ایک بار پھر نیچے گیا اور دس منٹ بعد مسکراتا ہوا لوٹ آیا "بادشاہ ہم نے بات کر لیا۔ باہر ایک ویگن ... وہ تم کو پیچھے سے نکال دے گا۔"

"ٹھیک ہے خان۔" میں نے اس سے پرجوش مصافحہ کیا "تم اب کہاں ملو گے؟"

"تم بولو" وہ مسکرایا "ہم تو ... ہے۔"

"ہم ... ہوٹل سے بھی فوراً نکل جائیں گے۔ یہ گاڑی میں اسی جگہ چھوڑ جاؤں گا۔ جب تک گاڑی نظر آتی رہے گی وہ سمجھتے رہیں گے کہ میں ہوٹل میں ہوں۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے ہم جمرود کی طرف نکل جائیں تو ان سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔"

"پھر تم جمرود کا چیک پوسٹ پر آ جاؤ۔"

"کیسے آ جائیں گاڑی کے بغیر۔"

"تم ... ہوٹل سے کرائے پر گاڑی لے ... کو بولو کہ بات جاتا ہے۔ پھر پہلا اس کو جمرود لے جاؤ اور بولو کہ ادھر انتظار کرے۔ آگے میں سنبھال لوں گا۔"

میں نے ریوالور کے میگزین کو اپنی ... کے نیچے ... اور ریوالور کو جیب میں ڈال کے باہر نکل آیا۔ ... سردی میں ... تھا اس نے سردی سے بچنے کے لیے ایک کمبل لپیٹ رکھا تھا۔ یہ کمبل اس نے مجھے دے دیا اور کہا کہ میں منہ سر لپیٹ کے اس کے پیچھے چلوں۔

مختصر کاریڈور سے گزرتے ہوئے میں نے اچانک ایک دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور میرا دل دھڑکا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میرے ... ہر آہٹ پر کان لگائے بیٹھے ہوں۔ وہ گرین ہوٹل پہنچ کے اطمینان سے سو نہیں رہے ہوں گے۔ ان کے کان اور نظریں میری آمد اور میرے سامنے کے ... تعاقب میں ہوں گے۔

میرے اندیشے کی اس وقت تصدیق ہوئی جب پیچھے سے ... پٹھان ویٹر کو آواز دی "اوئے تم نے کب بولا تھا چائے کے لیے۔ کیا بات ہے یہ ہوٹل ہے کہ ڈنڈو خانہ ... تمہارا ... کرنا پڑے گا۔"

"ابھی لاتا ہے سر" ویٹر نے ... عاجزی سے کہا۔

میں سیدھا چلتا گیا۔ نیچے اتر جانے کے بعد بھی مجھے ڈر تھا کہ کہیں چور دروازہ سے مجھے نہ پہچان جائے اس کا اور میرا بہت پرانی دشمنی کا رشتہ تھا۔ اب ہم ایک دوسرے کی موجودگی کو محسوس کر سکتے تھے۔ خواہ سامنے کوئی نہ ہو۔

www.paksociety.com

ویٹر نے عقبی حصے میں کھلنے والے ایک دروازے سے باہر نکال دیا تو مجھے کچھ سکون حاصل ہوا۔ وہاں سے ڈسٹرکٹ ہوٹل کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ میں سڑک کے کنارے پیدل چلتا گیا اور چند منٹ بعد ڈملز کے گیٹ سے داخل ہوا تو چوکیدار نے مجھے روکا۔

"کیا بات ہے کس سے ملنا ہے۔"

میں نے کمبل ہٹا کے کہا "کیا تم ظالم سماج کے نمائندے ہو۔ جو میاں بیوی کے درمیان آنا چاہتے ہو۔ ہوٹل کی روم نمبر سیون اے میں میری بیوی ہے اور بہن ہے۔"

اس نے "سوری" تو کہا مگر میری خاکی وردی کے باعث کچھ شک میں مبتلا رہا کہ میرے جیسے شخص کی بیوی اتنے اچھے درجے کے ہوٹل میں کیسے مقیم تھی اور اگر تھی تو میں ان کے ساتھ کیوں نہیں تھا۔

رابعہ اور کاجل بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں نے رات کہاں بسر کی۔

"تم فون کر کے بتا سکتے تھے۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"سوری دراصل میں تارے گن رہا تھا۔ تمہارے فراق میں اور آہیں بھر رہا تھا اس لیے یاد نہیں رہا۔" میں نے کہا "ناشتا کر لیا؟"

"ہم نے ضرور کر لیا ہوگا۔" رابعہ بولی۔

میں نے افسوس سے سر ہلایا "تم میرے جذبات کا مرڈر کر رہی ہو۔ جلدی سے ناشتا منگوالو۔ ہمیں فرار ہونے کا موقع مل گیا ہے۔ دیر لگائی تو استاد پیڑرو یہاں آکر ناشتے میں شریک ہو جائے گا۔"

"استاد پیڑرو۔ وہ کہاں ہے۔"

"اسی ہوٹل میں جہاں میں ٹھہرا تھا۔ بالکل میرے ساتھ اسی فلور پر انہیں کمرا ملا حالانکہ منیجر نے بتایا تھا کہ ایک ہی کمرا خالی ہے۔ میں اپنی گاڑی وہیں چھوڑ کے آیا ہوں۔ قسمت اچھی تھی کہ ان کی گاڑی پر نظر پڑ گئی۔"

ناشتا کرنے سے پہلے ہی میں نے انہیں آفریدی سے ملاقات کے بارے میں بتادیا اور اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو کا خلاصہ بھی سنادیا۔ کاجل تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ کلیم کھڑکی سے باہر ہوٹل کے لان میں کھلے ہوئے پھول دیکھ رہا تھا چنانچہ اس نے کچھ نہیں سنا۔

ناشتا ختم ہوا تو میں نے فون اٹھا کے روم سروس سے بات کی "کوئی کار کرائے پر مل سکتی ہے۔"

"رینٹ اے سروس والوں کو بلایا جا سکتا ہے سر۔ کہاں جائیں گے آپ؟"

"میں نے کہا "پورے دن کے لیے طے کرلیں۔"

کاجل نے میرے قریب آ کے کہا "مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔ باہر چلو۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "رابعہ تم پیک اپ کرو۔ میں کاجل کے ساتھ آفس تک جا کے چیک آؤٹ کرتا ہوں۔"

رابعہ نے نہایت احمق ہونے کا ثبوت دیا "اس کے لیے ہم دونوں کا جانا ضروری ہے۔"

"ہاں مجھے ڈر لگتا ہے اکیلے جاتے ہوئے۔" میں نے کہا۔

"تو میں کیا پیک اپ کروں۔ کیا ہے ہمارے پاس۔"

"اچھا تو کلیم کے ساتھ جا کے باغ کی سیر کرو۔ اب یہ نہ پوچھنا کہ کیوں۔ صبح کی سیر صحت کے لیے اچھی ہوتی ہے اس کے علاوہ مجھے کچھ غیبت کرنی ہے۔" میں نے دانت پیس کے کہا "[illegible] کے سامنے تمہاری برائیاں کرنی ہیں۔"

اب رابعہ سمجھ گئی اور کلیم کا ہاتھ پکڑ کے بولی "چلو ہم بھی جا کے ان دونوں کی برائیاں کریں گے۔"

کلیم کچھ نہیں سمجھا "آنٹی یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ یہ دونوں بہت اچھے ہیں۔"

"ہم دونوں سے اچھے تو نہیں ہیں نا۔" رابعہ نے اسے ٹالا۔ وہ خاموشی سے رابعہ کے ساتھ چلا گیا۔

کاجل نے کہا "بھائی سکندر۔ مجھے خوف آرہا ہے کلیم کو اس کے رشتے داروں کے پاس لے جاتے ہوئے۔"

میں نے کہا "ڈرنے سے کیا ہوگا۔ وہ ہمارے ساتھ ہرگز واپس نہیں جائے گا۔ مزید یہ کہ آفریدی نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ یہ خیال یہ ہے کہ اگر کلیم اللہ کی جان کو خطرہ لاحق ہوتا تو اس کا باپ کیوں اصرار کرتا کہ وہ واپس جائے۔"

"اگر ایسا ہوا تو۔"

"آفریدی نے کہا ہے کہ ہم اس کے مہمان ہیں۔ وہ ذمے دار ہے ہماری سلامتی کا۔ ہم کلیم کو واپس لے آئیں گے۔" میں نے کہا "خیر اب ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔"

فون کی گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اٹھالیا "یس!"

"کار آگئی ہے سر۔ دو سو روپے شام چھ بجے تک چارج کرے گے۔ اس کے بعد پچاس روپے گھنٹہ۔"

"ٹھیک ہے ہمارا بل بنادیں۔ ہم آرہے ہیں۔"

میں اور کاجل باہر نکلے تو کلیم اور رابعہ لان کی بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ رابعہ نے خدا حافظ کہنے کے انداز میں ہاتھ ہلایا جیسے خود اس کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کلیم اسے [illegible] لگا۔

بل ادا کر کے میں دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ منیجر نے کہا "مسٹر رمو آپ کے ایک مہمان بیٹھے ہیں۔ میرا خیال تھا آپ نے دیکھ لیا ہوگا۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا "میرے مہمان۔"

اسی وقت کاجل نے میرا بازو تھام کے کہا "وہ کار سے باہر [illegible]" لیکن میں اپنے مہمان کو دیکھ رہا تھا۔

● ●

آفریدی نے سگریٹ کو مسل کے ایش ٹرے میں بجھایا "کیا کیا ہو سکتا ہے یار۔ کیا مجھے پتا نہیں؟"

میں نے کہا "آفریدی! تم نے تو کہا تھا..."

"ہاں۔ مگر مجھے بعد میں خیال آیا کہ کہیں تم خوار نہ ہو جاؤ۔ یہی بچہ ہے" آفریدی نے ایک بیگ اٹھا کے کندھے پر لٹکالیا جو اس کے پاس ہی صوفے پر رکھا ہوا تھا۔ "اس لیے میں اپنا جیپ لے کر آیا۔"

میں نے کہا "کرائے کی گاڑی آگئی تھی۔"

"خیر یار اوکے کرو۔ ہمارا ساتھ چلو" آفریدی بولا۔

میں نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "آفریدی! اوکی پروگرام تک تو ہم سیدھے جمرود چیک پوسٹ پر پہنچ جاتے۔"

"کیسے پہنچ جاتے۔ ابھی تم کو پولیٹیکل ایجنٹ پاس دے گا تو تم سے ہزار سوال کرے گا۔ ہر شخص غیر علاقے میں نہیں جا سکتا۔ پھر تمہارا ساتھ تو زنانہ بھی ہے۔ میں تم سب کے لیے کپڑے بھی لایا ہوں۔"

"مگر ہم گھومنے پھرنے کے لیے تو نہیں جا رہے ہیں۔ ہم بھی کہہ سکتے ہیں۔ کلیم اللہ بھی بتا سکتا ہے کہ ہمارا مقصد کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے یار" ہم مانتا ہے لیکن وہ مطمئن نہ ہوا تو تم کو انکار کرے گا یا بولے گا کہ تم جاؤ۔ زنانہ کو ادھر چھوڑ دو پھر تم کیا کرے گا۔ جاؤ یہ وردی بدلو۔ شریف آدمی کی طرح چلو میرے ساتھ۔"

"میں اسے قائل کرلوں گا کہ میری بیوی کا اور بہن کا ساتھ جانا بھی ضروری ہے۔ میں انہیں یہاں کسی کے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔ معلوم نہیں واپسی میں دو دن لگ جائیں یا زیادہ۔ اکیلی عورتیں جن کے ساتھ کوئی مرد نہ ہو کیسے ہوٹل میں رہ سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ کلیم اللہ ہرگز میرے ساتھ نہیں جائے گا اگر ساتھ کاجل نہ گئی۔ پوچھ لو اس سے" میں نے کہا اور کلیم اللہ کو اشارے سے بلایا۔

اب کلیم اور آفریدی کے درمیان پشتو میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں اور کاجل ایک صوفے پر بیٹھے رہے۔ دوسرے صوفے پر کلیم اللہ اور آفریدی کے درمیان قربت کے باوجود اجنبیت کا فاصلہ حائل رہا۔ آفریدی کا رویہ دوستانہ اور مشفقانہ تھا مگر کلیم کے چہرے پر کشیدگی اور ناپسندیدگی کے جذبات میں کمی نہ آئی۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے آفریدی کی باتوں سے شدید اختلاف ہے اور وہ اس کی ہر تجویز کو مسترد کر رہا ہے۔ رابعہ تیسری طرف کے صوفے پر خاموش بیٹھی ان مذاکرات کے نتائج کا انتظار کرتی رہی۔

بالآخر آفریدی نے کہا "یہ بھی پٹھان کا بچہ ہے یار! تم ٹھیک بولتا تھا۔ یہ میرے ساتھ جانے پر تیار نہیں حالانکہ میں نے اسے بتایا ہے کہ میں اس کے علاقے سے واقف ہوں اور اس کے سب رشتے داروں کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"میں نے تم سے کہا تھا..."

"ایک بات اور بتاؤں میں تم کو۔ اگر تم اکیلے پولیٹیکل ایجنٹ سے ملنے گئے تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کلیم اللہ کے رشتے داروں کو پشاور بلوالے اور تمہیں ان کے پاس جانے کی اجازت دینے کا مسئلہ ہی ختم کردے۔ وہ کل تک انہیں طلب کر سکتا ہے اور تم سے کہہ سکتا ہے کہ ہوٹل میں انتظار کرو۔"

میں نے کاجل کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا "اچھا ہوتا اگر ہم خود ہی اسے چھوڑ کر آتے۔ ہم نے اس کے باپ سے وعدہ کیا تھا۔"

"تم پولیٹیکل ایجنٹ کے اختیار کو چیلنج تو نہیں کرسکتے۔ اس نے ایک بار انکار کردیا تو پھر بحث سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ کہے گا کہ کان کو ہاتھ گھما کر پکڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ کلیم اللہ کے عزیز آئیں اور اسے لے جائیں۔ تم پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر میں اس کے سامنے کلیم اللہ کو ان کے حوالے کرو اور واپس جاؤ۔" آفریدی نے کہا۔

کاجل کا چہرہ اتر گیا تھا۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ رابعہ کی مایوسی اس کے چہرے پر پڑھی جا سکتی تھی اور خود میں اپنی بے بسی اور جھنجلاہٹ کو چھپانے میں ناکام تھا۔ آفریدی کی بات کو غلط کہہ کے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ ایسا ہو سکتا تھا بلکہ اب مجھے زیادہ امکانات اسی بات کے لگتے تھے کہ پولیٹیکل ایجنٹ وہی کرے گا جو آفریدی بتا رہا تھا۔ ہمارے بلاوجہ علاقہ غیر میں جا کے خطرہ مول لینے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اگر مقصد کلیم اللہ کو اس کے خاندان والوں کے سپرد کرنا تھا تو پولیٹیکل ایجنٹ اس کا بہتر اور محفوظ بندوبست کر سکتا تھا جس میں کسی بھی پہلو سے نہ کوئی بات غلط تھی اور نہ قابل اعتراض۔

آفریدی نے ہمیں سوچ میں گم دیکھ کے کہا "ایک بات اور بتاؤں۔ وہ خود بھی کلیم اللہ کو اپنی تحویل میں لے سکتا ہے۔"

"تحویل میں کیسے لے سکتا ہے؟" میں نے احتجاج کیا۔

"یار! وہ اسی علاقے کے قبیلے کا لڑکا ہے۔ تمہارا کیا رشتہ ہے اس سے کہ تم انکار کرو۔ تم تو اس کو یہاں تک لانے کے ذمے دار ہو۔ آگے خود پولیٹیکل ایجنٹ بھی پہنچا سکتا ہے۔ سرکاری انتظام کرکے یا کسی ذمے دار آدمی کے سپرد کرکے۔"

میں نے کہا "آفریدی! تم کچھ نہیں کرسکتے؟"

"میں کیا کروں؟"

"کوئی ایسا چکر چلاؤ کہ ہم بھی غیر علاقے میں کلیم اللہ کے ساتھ جا کے اس کے خاندان والوں سے مل لیں..."

"یار! اس لیے تو میں یہاں آگیا۔ میں خود تمہارے ساتھ جاؤں گا پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر میں" آفریدی بولا۔

کاجل کا چہرہ پرامید ہو گیا "کیا وہ آپ کو انکار نہیں کرسکتا خان صاحب؟"

"دیکھو بہن! ابھی یہ ہم کو صاحب بولا تو ہم اس کو منع کیا کہ

www.paksociety.com

صاحب بہادر ادھر سے چلا گیا۔ ابھی ہم سب مسلمان اور پاکستانی بھائی ہے۔ تم میرے کو خان بھائی بولو۔ تم کابل سے ہو؟"

میں نے کہا "آفریدی! میں تو باتوں میں بھول ہی گیا تھا۔ تم نے ٹھیک اندازہ کیا۔ یہ کابل سے ہے میری بہن۔"

"اور یہ تمہارا لالی ہے؟ رابعہ۔ بہت خوب صورت ہے۔"

رابعہ کا رنگ لال ہو گیا "خان بھائی....."

آفریدی ہنسا "میرا چھوٹا بہن بالکل ایسا ہے۔ گورو تو ایک دم اَن پڑھ ہے۔ تم بہت ہوشیار لگتی ہے۔ تم کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا۔"

میں نے سرہلایا "بالکل صحیح کہا تم نے۔ شکل سے یہ جاہل بلکہ احمق نظر آتی ہے۔"

رابعہ نے مجھے گھور کے کہا "اور تم...؟"

میں نے انکساری سے کہا "برا ماننے کی تو اس میں کوئی بات نہیں ہے بیگم۔ مانا کہ مجھے خدا نے تمہارے جیسی صورت نہیں دی مگر میں کسی کو جاہل یا بے وقوف تو نہیں لگتا۔"

"ہاں۔ تم بڑے افلاطون لگتے ہو۔ ایم اے، پی ایچ ڈی۔ سب تمہارے چہرے پر لکھا ہوا ہے۔"

آفریدی ہنسنے لگا "خو ہمارا یہ مطلب نہیں تھا یارا۔ تم آپس میں کیوں لڑتا ہے۔ ہم عدالت میں وکیل دیکھا 'کالا کوٹ اور سونا چشمہ والا' یہ تمہارا بابی بی تو کالج کا لڑکی لگتا ہے۔ جو جاہل بولتا ہے اس کو وہ خود جاہل۔"

رابعہ کو مسکراتے دیکھ کر میں نے سر کھجایا "وہ... آپ تو کچھ اور فرما رہے تھے۔ ہمارے ساتھ جانے کی بات کر رہے تھے۔ اس سے کیا فائدہ ہو گا؟"

"فائدہ یہ ہو گا کہ پولیٹکل ایجنٹ تم سے نہیں ہم سے بات کرے گا" آفریدی نے کہا "وہ جانتا ہے ہم کو۔ ہم لے جائے گا تم کو اپنا ذمے داری پہ۔ اپنا مہمان بنا کے۔"

"پھر وہ انکار نہیں کرے گا؟" کاجل نے خوشی سے کہا۔

"وہ ہمارا مہمان کو کیسے روک سکتا ہے۔ ہم دس آدمی لے جائے یا سو آدمی کا برات لے جائے۔"

"یہ بھی نہیں پوچھے گا کہ یہ کون ہیں؟" میں نے کہا۔

آفریدی نے نفی میں سرہلایا "اس کا کیا مجال۔ ہم اپنا ساتھ جس کو مرضی لے جائے۔ ہمارا مہمان بس مہمان ہے۔ وہ کون ہے' کیا کرتا ہے' شریف آدمی ہے کہ [illegible] ہے' عورت ہے کہ مرد۔ یہ سب پوچھنے کا تو ہمارا [illegible] کرے گا۔ آفریدی کا بے عزتی کرنے والا ابھی پیدا [illegible]۔"

"بس تو پھر چلو" میں نے [illegible] تمہارے ساتھ ہی جیپ میں چلتے ہیں۔"

"اور وہ [illegible]" [illegible] بولی۔

"اسے رخصت [illegible] زیادہ [illegible] آج کا [illegible] ہم [illegible] فکر کرنے [illegible]

بات کرلو کہ ہمیں آفریدی صاحب خود لینے آگئے ہیں اس لیے اب بے کار ہے ہمارے لیے۔"

رابعہ نے سرہلایا اور کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔ ہوٹل کا فون کچھ فاصلے پر تھا کہ نہ کلرک ہماری باتیں سن سکتا تھا نہ کوئی اور۔ کپڑے بدل کر آنے کے بعد میں نے کہا "خان صاحب... معاف کیجیے خان بھائی! تم ہوٹل سے اپنی ہی جیپ میں آئے ہو؟"

"اور کیا۔ یہ کسی دوسرے کا جیپ ہے۔"

"خود چلا کے لائے ہو؟"

"یارا! کیسی باتیں کرتا ہے۔ ہم کوئی ڈرائیور نہیں رکھتا۔ ہم خود بہت اچھا گاڑی چلاتا ہے۔"

"وہ... میرا مطلب کچھ اور تھا" میں نے کہا "جب تم ہوٹل سے روانہ ہوئے تھے تو تمہیں یقین ہے کہ کسی نے نہیں دیکھا تھا؟ کوئی تمہارے تعاقب میں تو نہیں آیا تھا؟"

آفریدی نے ایک لمحہ غور کیا "تمہارا وہ دوست؟"

میں نے مسکرا کے کہا "ہاں وہی دوست۔ تم نے ان کی گاڑی دیکھی تھی۔ میری گاڑی کے ساتھ۔"

"وہ گو مری کھڑا تھا" آفریدی نے میرے اطمینان کے لیے پورے یقین کے ساتھ کہا "ہم دیکھا تھا۔ تم کیوں فکر کرتا ہے یارا۔"

"مجھے اپنی نہیں تمہاری فکر ہے۔ اس سے پہلے بار بار ایسا ہوا ہے کہ جس نے ہماری مدد کی' ہمیں مصیبت سے بچایا یا محض انسانی ہمدردی کے نام پر ہمارا ساتھ دیا' ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم اپنے بہت سے مہربان دوستوں کی نیکی کے قرض کا بار اٹھائے پھر رہے ہیں جنہوں نے ہماری سمت آنے والے اجل کے تیر کو ہم تک نہیں پہنچنے دیا اور اس کا نشانہ خود بن گئے۔ اپنی موت کو انہوں نے گلے لگا لیا۔"

آفریدی ہنسنے لگا "یارا! تم بہت زیادہ پڑھا لکھا ہے نا اس لیے یہ بات بولتا ہے۔ تمہارا یقین اٹھ گیا ہے تقدیر سے۔ تم سمجھتا ہے کہ آدمی موت سے بچ سکتا ہے یا کوئی اسے بچا سکتا ہے۔"

"میں ایسا ہرگز نہیں سمجھتا۔"

"پھر یہ کیا مشکل اردو بولتا ہے۔ اجل کا تیر تمہاری طرف آیا تھا مگر کسی نے بیچ میں آ کے تم کو بچا لیا۔" آفریدی نے میرا تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا "یارا! سیدھا سچا بات ہے کہ تمہارا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ جس کا وقت پورا ہو گیا تھا وہ خود سامنے آگیا۔ موت بڑا ظالم شکاری ہے۔ اس کا شکار خود آگے آ جاتا ہے جان دے کر مرتا ہے۔ ابھی تم سمجھو کہ اللہ نے خاص مہربانی کیا تو کوئی کسی کی مدد کرتے ہوئے جان دیتا ہے۔ یہ اپنا خوشی سمجھی ہے ورنہ بدبخت لوگ چور یا ڈاکو بن کے مارا جاتا ہے۔ شراب پی پی کے مرتا ہے یا لالچ میں زر زمین کی خاطر مارا جاتا ہے۔"

زندگی اور موت کے بارے میں یہ سیدھا سادا اور سچا نظریہ پہلے کبھی کسی نے مجھے یوں سمجھایا تھا نہ خود میں نے اس پر غور کیا تھا۔ فوری تحقیق [illegible] سمجھ چکا ہوں۔ خداوندا مجھے صاحب [illegible] زندگی کے ساتھ موت کے فرق کو بھی دیکھ سکوں اور [illegible] کر سکوں۔ ایک آدمی کے تمام عمر کے اعمال اسے اچھا یا برا [illegible] فیصلہ بہت آسان ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں جنت پانے کا [illegible] اور بدبخت طرح موت کے بارے میں آفریدی کے نقطہ نظر نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے استاد شیدی یاد آیا [illegible] تھا مگر ایک عمر کی تیرہ بختی کے بعد وہ ہمارے کاروان میں شامل ہوا تو راہِ حق پر پہلا شہید ہونے کا اعزاز اسی کے حصے میں آیا۔ گل کا بھائی ڈاکو شیش ناگ تھا جو مرتے دم تک ڈاکو [illegible] لیکن زندگی کے آخری لمحے میں وہ ایک نیکی کما گیا' وہ ناگ مٹی کو [illegible] ہو گیا اور ہم سب نے دیکھا کہ ناگ مٹی جب [illegible] تو اس کی زندگی کیسے بدل گئی مگر کیا یہ اس کے ڈاکو بھائی شیش ناگ کی موت سے ملنے والی زندگی نہ تھی؟ یہ تو ہم فانی انسان نہیں جانتے کہ وہ آخر کے لیے ہمارا نوشتہ تقدیر کیا ہے۔ اچھے آدمی کی موت بری ہو گی یا برے آدمی کا مقدر اچھی موت ہو گی۔

رابعہ لوٹ آئی تھی اور آفریدی اٹھ کھڑا ہوا تھا "ابھی زیادہ فکر مت کرو یارا! چلو۔"

میں نے کہا "میں تمہاری بات پر غور کر رہا تھا۔"

"اللہ پر بھروسہ رکھو۔ جب تک زندگی ہے وہ خود تمہاری حفاظت کے اسباب پیدا کرے گا۔ کبھی یہ مت سوچو کہ ہم کو آفریدی نے بچایا یا وہ ہماری خاطر مارا گیا۔ بچانے والا بھی خدا ہے اور مارنے والا بھی وہی ہے۔ اب یہ اس کا مرضی کہ کس کو بچائے اور کس کو اٹھائے۔ کب کہاں اور کیسے۔ یہ ہم کو کیا معلوم۔"

رابعہ نے کہا "آپ کا عقیدہ بہت پختہ اور قابلِ رشک ہے خان بھائی۔ ہم سب تو عقل کے اندیشوں اور وسوسوں کا شکار ہیں۔"

"ابھی تم ادھر ٹھہرو" آفریدی نے اپنا بیگ اٹھا کے کہا "میں جیپ کو اندر لے آتا ہوں۔ پردے کے لیے۔"

میں نے اس کا مطلب سمجھ لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پشاور میں کوئی بھی اس کو جیپ میں دو بے پردہ اور فیشن ایبل خواتین کے ساتھ دیکھے تو شک میں پڑ جائے اور ایک بے غرض کا بوجھ [illegible] تلاش کرنے والوں کو افسانہ طرازی کا موقع مل جائے۔

میرا خیال ہے کہ ہماری روانگی کے وقت تین منٹ سے زیادہ کا فرق نہ ہو گا۔ آفریدی کے جاتے ہی ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے کاؤنٹر پر جا کے بل لیا تھا اور ادائیگی کی تھی۔ رابعہ اور کاجل برآمدے میں جا کھڑی ہوئی تھیں جس کی سیڑھیوں کے سامنے آفریدی کو اپنی گاڑی لا کے کھڑی کرنی تھی۔

میں نے باقی رقم پرس میں ڈال کے دروازے کی جانب قدم بڑھایا ہی تھا کہ باہر ایک زبردست دھماکا ہوا۔ اس کی شدت سے ہال میں بیٹھے میرا [illegible] محض ارتعاش کے باعث کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ کر بکھر گئے اور چند لمحوں کے لیے ہوٹل کے بام و در لرز گئے۔ استقبالیہ کے سامنے انتظار گاہ میں جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے وہاں سینٹر ٹیبل کے گلاس ٹاپ پر رکھا ہوا گلدان نیچے گر گیا مگر قالین کی وجہ سے ٹوٹا نہیں۔ چھت سے آویزاں فانوس جھولنے لگا اور دوال لائٹس آف ہو گئیں۔ اس سے ہال میں تاریکی پھیل گئی۔

کاؤنٹر کے پیچھے سے دو افراد ایک ساتھ نکل آئے۔ ان میں سے ایک دوڑتا ہوا میرے قریب سے گزرا تو میں نے کہا "یہ کیا ہوا ہے؟" مگر اس نے میرے سوال کو نظر انداز کر دیا اور جواب دینے کے لیے رکنا مناسب نہ سمجھا۔

اتنا تو میں بھی سمجھ گیا تھا کہ یہ دستی بم یا خاص طاقت والے کسی ساخت کے بم کا دھماکا تھا مگر فوری طور پر میں نے اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کا سبب یہ ذہنی تاثر تھا کہ صوبہ سرحد میں اسلحہ عام ہے اور صدیوں سے ہے۔ یہاں اسلحہ بنتا بھی ہے اور اسمگل ہو کے بھی پہنچتا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ کوئی نہیں تھا چنانچہ میں یہ سمجھتا تھا کہ قبائلی روایات کے مطابق نسل در نسل چلنے والی دشمنی اور انتقام کی تاریخ کا عکس شہروں کی معاشرتی زندگی میں بھی عام نظر آتا ہو گا لیکن ظاہر ہے کہ یہ تاثر غلط تھا۔

جب ہوٹل کے اندر سے بھی لوگ نکلے اور منیجر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میرے پاس سے گزرا تو مجھے اس کی صورت پر دہشت اور پریشانی کے آثار نظر آئے۔ لائٹس آف ہونے سے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ دھماکا ہوٹل ہی میں ہوا تھا۔

باہر ایک ہنگامہ برپا ہو چکا تھا۔ میں نے منیجر سے کہا "آخر بات کیا ہے؟ یہ دھماکا کیسا تھا؟"

اس نے ذرا سی پریشانی کو فراموش کرتے ہوئے بد تمیزی اور بے رخی سے کہا "یہاں کھڑے رہ کر تو آپ اندازے ہی کر سکتے ہیں۔ میں باہر دیکھنے جا رہا ہوں' آپ بھی چلیں۔"

میں اس کے ساتھ چلنے لگا "کیا سب اسٹیشن کو نقصان پہنچا ہے؟ لائٹس آف ہو گئی ہیں۔"

اس نے مجھے شرمندہ کرنے والی نظروں سے دیکھا "ہوٹل کا کوئی سب اسٹیشن نہیں ہے لیکن ادھر لائن ایم ٹی ہے۔ لائٹس تار ٹوٹنے پر بھی بجھ سکتی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ عین اسی وقت پر بریک ڈاؤن ہو گیا ہو۔ ایسے اتفاق کو ناممکن تو نہیں سمجھا جا سکتا۔"

ایک دروازے سے وہ باہر گیا' دوسرے سے رابعہ اور کاجل اندر آ گئیں۔ کاجل نے مضبوطی سے کلیم اللہ کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اس کا اور رابعہ کا چہرہ خوف اور بد حواسی کے جذبات کی عکاسی کر رہا تھا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے تم اندر کیوں آ گئی ہو؟"

رابعہ نے کہا "باہر... کچھ ہوا ہے۔"

www.paksociety.com

"تمہیں کیا مطلب؟ کسی کا نکاح ہوا ہے یا عقیقہ؟ کیا خوشی میں یہ گولے داغے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا "بابا یہ بم کا دھماکا ہوا ہے کہیں۔ مگر ہمارے لیے ڈرنے یا پریشان ہونے کی کون سی بات ہے۔ ہم تو عادی ہیں۔"

"مسعود یا ہوٹل کے گیٹ پر ہوا ہے۔ بہت لوگ جمع ہو رہے ہیں" رابعہ بولی۔

"ہونے دو۔ ہم نکل جاتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ تفتیش شروع ہو اور خواہ مخواہ ہم بھی بیان یا گواہی کے چکر میں آ جائیں۔" میں نے کہا۔

"نکل کے کہاں جاؤ گے" رابعہ نے جھنجلا کے کہا "دھماکا گیٹ پر ہوا ہے۔"

"دوسرا گیٹ بھی تو ہے" میں نے کہا۔

کابل نے ہونٹوں پر زبان پھیری "مگر.... آفریدی صاحب بھی تو نہیں آئے۔"

میں نے کہا "اچھا ہوا وہ سامنے نہیں ہے ورنہ صاحب کہنے پر تمہیں جھاڑ پڑتی۔ جب گیٹ بلاک ہے تو وہ کیسے آئے گا اندر۔"

رابعہ اور کابل میرے ساتھ چلنے لگیں "مجھے ڈر لگ رہا ہے" کابل نے کلیم اللہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"کابل یہ ہوتا رہتا ہے یہاں۔ اسلحہ یہاں کی ثقافت میں شامل ہے اور اسے مردوں کا زیور سمجھا جاتا ہے۔ قبیلے اپنی دشمنی میں اسلحے کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں اور کسی قبیلے کا ایک فرد مارا جائے تو پھر انتقام کی جنگ چلتی رہتی ہے۔ ایک نسل سے دوسری نسل اور گاؤں سے شہر منتقل ہو جاتی ہے۔ بدلہ لینے والے یورپ امریکا تک پیچھا کرتے ہیں۔ کوئی بندوق کی لڑائی میں اب مزہ نہیں رہا۔ جدید ہتھیار آ گئے ہیں۔ زمانہ اور ترقی کرے گا تو شاید یہ لوگ راکٹ لانچر اور بمبار طیارے استعمال کریں گے مگر میں کیا۔"

رابعہ کی تشویش کم نہیں ہوئی "کہیں آفریدی..."

میں نے خود اپنے اندیشوں کو جھٹلاتے ہوئے اسے تسلی دی "لاحول ولا قوۃ۔ آفریدی کو ہو سکتا ہے۔ اس نے کسی سے اپنی دشمنی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ ایسا خطرہ محسوس کرتا تو یوں بے فکری سے اکیلا نہ پھرتا۔"

"مگر جو ہمارے دشمن ہیں..."

میں نے کہا "تم خواہ مخواہ فرض کر رہی ہو کہ ہمارے دشمن اس کی جان کے بھی دشمن ہو چکے ہیں۔ اول تو انہیں آفریدی کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ ہمارا پہلے کبھی آفریدی سے تعلق نہیں رہا اور شاید آئندہ بھی نہیں ہوگا۔ بس یہ ایک وقتی ضرورت ہے جس میں وہ احسان مند ہو کے ہماری مدد کر رہا ہے اور اس معاملے کا چوہدری ولادر کی ذات سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ میں نے اس سے پوچھ لیا تھا۔ جب وہ آیا تھا تو کسی نے بھی اس کا پیچھا نہیں کیا تھا۔"

میں نے محسوس کیا کہ یہ سب دلائل خود مجھے قائل نہیں کر رہے تھے، رابعہ کو کیسے کریں گے۔ جو اندیشے میرے دل میں موجود تھے، اپنا وجود تسلیم کرا چکے تھے اور میرا انکار ایک خواہش تھی، بارہا کہ اس عارضی تعلق کی بنا پر آفریدی کی ذات کو گزند نہ پہنچے۔

لیکن دوسرے گیٹ سے باہر آتے ہی عقل کی خود فریبی کو کھلے رہنے کی ہر دیوار سے زیادہ بے ثبات ہو گئے۔ نظروں نے اس آگ اور دھوئیں کے الاؤ کو دیکھ لیا جس کے گرد لوگ دم بخود اور متجسس تماشائی حلقہ بنائے ہوئے کھڑے تھے۔ یہ سوال زبان سے کر رہے تھے نہ باقی سب کی آنکھوں میں پڑھے جا سکتے تھے۔ کیا ہوا؟ یہ کیوں ہوا؟ یہ کیسے ہوا؟ زبان صرف جب تھی ہائی کا دھیان تھیں۔

خاموش اور حیران تماش بینوں کا یہ حلقہ بہت وسیع تھا۔ سڑک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلے ہوئے اور میں تقریباً سو میٹر دور دکانوں کے سامنے فٹ پاتھ پہ لوگ دکانوں کے اندر اوپر بالکونیوں اور مکانوں کی کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے۔ چھت کی منڈیر سے ان گنت انسانوں کے سر دیکھ سکتا تھا جو نظریں بم کے دھماکے سے خوف زدہ ہو کے آ رہی جانے والی اسٹیشن ویگن کے دھواں بنتے ڈھانچے پر جمی ہوئی تھیں یا جیسے ساری نظریں گھوم کے مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔

میں دہشت زدہ ہو کے رک گیا "رابعہ۔ یہ تو... آفریدی۔"

رابعہ اور کابل نے کچھ نہیں کہا۔ شاید رابعہ بھی پہلے جانتی تھی کہ میں کیوں جھوٹ بول رہا ہوں۔ مجھے مزید تصدیق کر بھی کچھ حاصل نہ ہوتا۔ آفریدی دو چار منٹ پہلے ایک جیتا انسان تھا۔ شرافت اور مروت، وضع داری اور خیر خواہی کو لیا تھا جو زندگی کے راستوں پر مختصر ترین رفاقت رکھنے والوں کے بھی دوستی کے جذبات کے سوا دل میں کچھ نہ رکھتا تھا، اسے ناگہانی موت کھینچ کر وہاں لے آئی تھی جہاں اجل کے فرشتے نے اس کی کتاب حیات میں آخری اندراج کے بعد لکھا، بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں، اس کتاب کو یوم حشر تک کے لیے بند اور محفوظ کر دیا۔

تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا منیجر میرے سامنے آ گیا "ہم نے پولیس کو بلایا ہے سر۔ بڑے دکھ اور افسوس کی بات ہے۔ نہیں کس نے ایسا کیا۔ آپ سے صاحب ملنے آئے تھے۔"

"آفریدی صاحب! معاف کرنا میں نے غلطی سے انہیں صاحب کہہ دیا" میں نے کہا "وہ بہت بڑا آدمی تھا صاحب کہنے پر..."

منیجر نے مجھے حیرانی سے دیکھا "وہ کیوں سر؟"

"اس لیے کہ وہ صاحب نہیں تھا۔ وہ مسلمان تھا، ایک انسان تھا، پٹھان تھا، دوستوں کا دوست تھا اور دشمن کے لیے... مگر وہ صاحب نہیں تھا" میں نے بے بسی سے کہا "آپ خواتین سے کہیں کہ فی الحال اندر ہی تشریف رکھیں۔"

منیجر بولا "جب تک پولیس نہ آ جائے۔"

"کیوں؟ ہم جانا چاہتے ہیں" کابل نے کہا۔

رابعہ بولی "ہم چیک آؤٹ کر چکے ہیں۔"

"مگر ضابطے کی کارروائی تو ہوگی۔ پولیس کو میں کیا بتا سکتا ہوں" منیجر بولا۔

"میں بھی کیا بتا سکتا ہوں۔ اس کے سوا کہ اس کا نام آفریدی تھا" میں نے کہا "کل سے پہلے میں نے نہ اس کی صورت دیکھی تھی اور نہ وہ مجھے جانتا تھا۔"

"پھر بھی سر وہ آپ سے ملنے آئے تھے۔ انہوں نے آپ کا نام لیا تھا" منیجر ہاتھ مل کے بولا "آپ جو کچھ جانتے ہیں وہ بتا دیں اور پھر چلے جائیں سر۔ دیکھیے نا یہ تو ایک قانونی مسئلہ ہے۔"

"مگر میرا کوئی تعلق نہیں ہے اس قانونی مسئلے سے۔"

"تعلق میرا کیا ہے سر۔ دیکھیے نا دھماکا تو باہر ہوا مگر کچھ دیر پہلے یہ شخص اندر ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ آپ کے پاس۔ یہ خواتین بھی تو موجود تھیں۔ آپ چلے گئے تو میں کیا وضاحت کروں گا۔ میں بڑی مشکل میں پھنس جاؤں گا۔"

"آپ سے کس نے کہا ہے مشکل میں پڑنے کو۔ دھماکا ہوٹل کے اندر تو نہیں ہوا۔ سڑک پر جو کچھ ہوتا ہے اس کی ذمے داری تب پر کون عائد کر سکتا ہے۔" میں نے کہا "ایسے تو بہت سے لوگ اندر، باہر، اپنے گھروں میں بیٹھے تھے، دکانوں میں موجود تھے۔ ان سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ پولیس کو کچھ بتائیں۔"

منیجر نے مجھے بے بسی سے دیکھا "لیکن سر! میں نے تو دیکھا تھا اس کو اندر ہال میں۔"

"کون جانتا ہے یہ بات؟ ماسٹے بہت سے لوگوں میں سے تمہارے سوا کون ہے؟" میں نے کہا۔

"چوکیدار نے دیکھا تھا" منیجر سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا دیکھا تھا؟"

"اس کو اندر جاتے ہوئے اور باہر آ کے جیپ میں بیٹھتے ہوئے۔ اس نے دروازہ بند کیا اور جیسے ہی چابی گھما کے انجن اسٹارٹ کرنا چاہا، دھماکا ہو گیا۔"

"کیا چوکیدار نے اسے ہمارے ساتھ دیکھا تھا؟ اسے معلوم تھا کہ اندر وہ کس سے ملنے آیا تھا؟ کیا اس نے تم سے ہمارے بارے میں پوچھا تھا؟"

"نہیں سر۔ اسے تو شاید نہیں معلوم ہے" منیجر سوچ میں پڑ گیا۔

"پھر اس سے کہہ دو کہ اپنے بیان کو اتنا ہی محدود رکھے جتنا اس کے علم اور مشاہدے میں ہے۔ وہی بتائے جو اس نے دیکھا تھا۔ تم نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔"

"کیا میں جھوٹ بولوں؟ آخر کیوں؟"

"اچھا سچ بول کے دیکھو۔ تم خود بھی مصیبت میں پڑ جاؤ گے لیکن ہے پولیس کیا تمہیں تفتیش کے لیے تھانے لے جائے۔"

"تھانے... کیوں..." میں نے اگر اس کو اندر دیکھا "آپ سے باتیں کرتے دیکھا... وہ بھی اس لیے کہ میں ڈیوٹی پر تھا اور کاؤنٹر پر موجود تھا۔ تو یہ بتانے میں میرے لیے پریشانی کی کون سی بات ہے؟ مجھ سے تفتیش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "جو کچھ تم نے دیکھا یا سنا اس کا گواہ ہے کوئی؟"

"گواہ... لیکن یہ سچ ہے..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ثبوت اور شہادت کے بغیر کوئی سچ بھی سچ نہیں رہتا۔"

"کیا مطلب؟ آپ انکار کر دیں گے کہ آپ اسے نہیں جانتے تھے؟"

"نہیں۔ ہم کسی چکر میں پڑنا نہیں چاہتے۔ سچ تو یہ بھی ہے کہ کل رات ہم بجلی یا ڈسکو میں ملے تھے بالکل اتفاق سے۔ معلوم نہیں آج صبح یہ مجھ سے ملنے کیوں آ گیا۔ اور پھر یہ سب جو اس کے ساتھ ہوا، بے شک بہت افسوس ناک اور قابل مذمت ہے لیکن اس کے بارے میں جتنا ہم بتا سکتے ہیں اتنا ہی تم بھی بتا سکتے ہو۔ اگر تم نے کہا کہ وہ ہم سے باتیں کر رہا تھا تو ہم کہیں گے کہ یہ غلط ہے۔ اس کا تم سے جھگڑا ہو رہا تھا کسی بات پر۔ ہم چیک آؤٹ کرنے کے لیے کاؤنٹر پر کھڑے تھے تو یہ وہاں موجود تھا۔ ہم نے بل لیا اور ادائیگی کی اور پھر یہ شخص چلا گیا۔"

خوف اور حیرت سے منیجر کا منہ کھلا رہ گیا "آپ... اتنا بڑا جھوٹ بولیں گے؟"

"جب تم ہمارے سچ کو نہیں مانتے اور مصر ہو کہ ہم پولیس کی تحقیق و تفتیش کے چکر میں پڑیں تو پھر ٹھیک ہے، ہمارے ساتھ تم بھی شامل تفتیش ہو جاؤ۔ تم اپنا بیان دو، ہم اپنا بیان دیں گے۔ دیکھتے ہیں پولیس کس پر اعتبار کرتی ہے۔ میرے پاس بہرحال دو بالغ گواہ ہیں۔ ایک نابالغ..."

منیجر کی شکل رونے والی ہو گئی "دیکھیے سر! میں غریب آدمی ہوں۔ میری ملازمت چلی جائے گی، جیل ہو جائے گی مجھے۔ پولیس بہت مارے گی مجھے۔"

میں نے کہا "اسی لیے تو تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ اندر جا کے آرام سے کاؤنٹر پر بیٹھو۔ ہم بھی چلے جاتے ہیں۔ جب پولیس آ جائے تو چوکیدار کو اپنا بیان لکھوانے دو۔ تم اس کی تائید کر دو کہ ہاں وہ اندر نہیں آیا تھا۔ ہال میں کسی کا انتظار کرتا رہا، کچھ دیر اور پھر چلا گیا۔ یہ سب لوگ دکانوں میں کھڑے ہیں، یہ بھی دھماکا سن کر نکلے اور تم بھی اٹھ کے آ گئے۔ تمہیں نہیں معلوم یہ جیپ کس کی تھی۔ چوکیدار البتہ جانتا ہے کہ آفریدی اس میں سے اتر کے اندر گیا تھا اور پھر کچھ دیر بعد واپس آ گیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں" منیجر نے کہا "آپ لوگ بھی نکل جائیں جلدی سے۔ پولیس آتی ہی ہوگی۔"

"جلدی کس بات کی۔ یہاں اتنے لوگ کھڑے ہیں تو ہم بھی کھڑے ہیں۔ جیسے دوسرے کچھ نہیں جانتے ایسے ہی ہم بھی کچھ

www.paksociety.com

نہیں جانتے۔ پولیس کو دیکھتے ہی سب کھسک جائیں گے۔ ہم بھی مسٹر خیبر" میں نے کہا۔

میری بات خیبر کی عقل میں آنے لگی تھی۔ اس نے سر ہلایا اور جس گیٹ سے ہم نکلے تھے اسی سے اندر چلا گیا۔ مستعدی اور فرض شناسی کی دیرینہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے پولیس ابھی تک جائے واردات پر نہیں پہنچی تھی۔

جیپ کا ڈھانچا کسی حادثے میں مسخ ہو جانے والی لاش کی طرح رہ گیا تھا۔ اس کے آگے والا نصف حصہ غائب ہو کے ادھر اُدھر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں پھیلا پڑا تھا۔ دھماکے کے یہ جلتے ہوئے ٹکڑے بہت دور تک دیواروں میں پیوست ہو گئے تھے اور دکانوں کے شیشے توڑ کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ جیپ ایک الگ جگہ کھڑی نہ ہوتی تو آس پاس کھڑی ہوئی دوسری کاروں کو بھی نقصان پہنچتا۔ یہ جگہ بالکل ویران نہ تھی مگر یہاں بازار کا رش بھی نہیں تھا کہ دھماکے سے راہ گیر مارے جاتے اور زخمی ہوتے۔ جتنی دیر خیبر مجھ سے باتیں کرتا رہا میں نے ہر طرف نگاہ رکھی لیکن مجھے کہیں کوئی مجروح نظر نہ آیا اور نہ میں نے کسی کے اسپتال لے جائے جانے کا منظر دیکھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ محدود طاقت کے آتش گیر مادے کا دھماکا تھا جس کا مقصد صرف جیپ میں بیٹھے ہوئے افراد کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹانا تھا۔

لوگ اس وقت بھی قانون کے محافظوں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے جب میں نے کابل اور رابعہ کے ساتھ مخالف سمت میں یوں چلنا شروع کیا کہ ہماری روانگی پر کسی کو فرار کا گمان تک نہ ہو اور یوں لگے جیسے ہم بھی اس سنسنی خیز ڈرامے کے اینٹی کلائمکس سے اکتا کے جا رہے ہیں۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب کیا ہوگا۔ وردی والے آئیں گے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اور ڈنڈے ہلاتے ہوئے' چند عینی گواہوں کو پکڑ کے لے جائیں گے جو عزت کی قیمت ادا کر دیں گے' شام تک 'تھانے میں ہونے والی بے عزتی کو بھلا کے خاموشی سے گھر پہنچ جائیں گے اور دل میں عہد کریں گے کہ آئندہ ایسی جگہ سے گزریں گے بھی نہیں جہاں کوئی واردات ہو چکی ہو۔ لاوارث اور بے حیثیت لوگ رات کو بھی مہمان سرکار رہیں گے اور ان کی خاطر تواضع بھی خوب ہوگی۔ پھر ناکردہ گناہوں کے مجرم کروانے جائیں گے۔ ممکن ہے کوئی اعتراف جرم بھی کر لے اور اخبار والوں کے سامنے تصویر کھنچوانے اور اپنے کارنامے کی تفصیل سنانے پر بھی تیار ہو جائے۔ ایسے بہادر لوگ ہمیشہ پولیس کے کام آتے ہیں اور پولیس کا اعتبار قائم کرتے ہیں کہ اس نے ملزموں کو پکڑنے میں دیر نہیں لگائی۔ عموماً یہ خدمت پولیس کے مخبر سر انجام دیتے ہیں اور اس کے عوض انہیں پولیس سے بہت کچھ ملتا ہے۔ بھتا وصول کرنے کا اجازت نامہ' داداگیری کا لائسنس' شرفا کی پگڑی اچھالنے کا اختیار۔ وغیرہ۔

"بھئی آخر ہم کدھر جا رہے ہیں؟" رابعہ نے بالآخر خاموشی کے اس بوجھل پن کو ختم کیا جو احساسِ جرم و ندامت کی پیداوار تھا۔

"ہم ابھی تو خطرے سے دور جا رہے ہیں" میں نے کہا۔

"خطرے سے دور جا سکتے ہیں ہم؟" رابعہ نے تلخ طنزیہ لہجے میں کہا "آتی گاڑیاں بدل کے' حلیے بدل کے اور احتیاط کے سب تقاضے پورے کر کے بھی کیا ہوا؟"

"کیا اس سے یہ منطقی نتیجہ اخذ کرنا جائز ہوگا کہ اب ہمیں احتیاط جیسی فضول چیز سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں' صرف نقصان ہی نقصان ہے؟" میں نے بھی طنزیہ لہجے میں کہا۔

کابل نے کہا "سکندر اور وہ مسلسل ہمارے تعاقب میں تھے۔ ہر جگہ انہوں نے اپنی موجودگی کا احساس بھی دلایا تھا۔"

"آخر کیوں؟" میں نے کہا "کیا ضرورت تھی پیڈ ہولڈ کو اپنا دیدار کرانے کی؟ ہمارے آگے پیچھے رہ کے وہ خاموشی سے بھی تو تعاقب جاری رکھ سکتا تھا مگر اس نے اپنی بدمعاشی کا خم ٹھونک کے اظہار کیا۔ اس نے تمہیں چھیڑا اور پھر رابعہ کو۔"

کابل نے کہا "شاید وہ چاہتا تھا کہ تم اس سے جھگڑا کرو اور اسے روک کے پوچھو کہ وہ کیا چاہتا ہے۔"

"نہیں۔ وہ ہمیں احساس دلانا چاہتا تھا کہ ہم ہر وقت اور ہر جگہ ان کی نظر میں ہیں۔ ہم فرار ہو کے کہیں جا ہی نہیں سکتے۔ وہ ہم پر ایک نفسیاتی غلبہ حاصل کرنا چاہتا تھا کہ ہم خود کو بے بس اور کمزور محسوس کرنے لگیں۔ چوہے کا شکار کرنے سے پہلے بلی اس کے ساتھ کھیلتی ہے" میرے خون میں اب آتشِ اشتعال بھڑکنے لگی تھی۔

"کیا اب وہ ہمارا پیچھا چھوڑ دے گا؟" رابعہ نے کہا۔

"میں یہی دیکھنا چاہتا ہوں" میں نے کہا "ان میں سے کوئی بھی اگر جائے واردات پر موجود ہوتا تو ہمیں دیکھ لیتا۔ میں نے ان کو پورا موقع فراہم کیا تھا اس کے لیے۔ ہم سب زندہ سلامت دس منٹ تو ضرور وہاں کھڑے رہے تھے۔ وہ اپنا کام کر کے اور مطمئن ہو کے جا چکے ہوں گے ورنہ اب تک وہ اپنی ناکامی کو کامیابی میں بدلنے کے لیے دوسری کوشش کر چکے ہوتے۔"

کابل کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا "گویا تم انہیں یہ موقع دے رہے تھے۔ جانتے بوجھتے ہماری جان سے کھیل رہے ہو؟"

"تم بہت دیر سے شامل ہوئی ہو اس کھیل میں کابل" میں نے کہا "یہ بازی جان کی بازی ہے۔ اول تا آخر۔ اس میں ابھی تک طاقت کا توازن برقرار ہے چنانچہ ہم زندہ ہیں۔ ان کے پاس دولت اور طاقت ہے تو ہمارے پاس عقل و ذہانت اور ایک مقصد پر یقین کی قوت جسے ایمان بھی کہا جا سکتا ہے۔ کارزارِ حیات ہو یا میدانِ جنگ' دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ اسلحہ کبھی یقین پر غالب نہیں آیا۔

بالآخر یقین کی جیت ہوتی ہے۔ تم اسلام کے آغاز کی تاریخ سے ویت نام اور بنگلہ دیش تک دیکھ لو۔"

"ابھی تو مجھے پیچھے دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے" کابل نے کہا "حالانکہ تم نے آزما لیا ناکہ اب کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا ہے۔ اب روک لو کسی گاڑی کو' کسی رکشا کو۔"

رابعہ نے کہا "یہ تو کینٹ اسٹیشن آ گیا۔ یہاں سے مل جائے گی سواری۔"

"مشکل سے ایک میل پیدل چل کے یہ حال ہو گیا ہے" میں نے افسوس سے سر ہلایا "کلیم اللہ کو دیکھو۔"

"ڈیڈی تھک گیا ہے" کلیم اللہ نے کابل کی حمایت کی۔

"دیکھو بیٹا! یہاں ڈیڈی کوئی نہیں کہتا۔ آپا کہو یا باجی۔ چاہو تو آنٹی چالو" میں نے کہا۔

"باجی ٹھیک ہے کلیم انکل کے ساتھ ہوتی ہے آنٹی تو تم انہیں رابعہ آنٹی کہتے ہو اور انہیں انکل سکندر" کابل نے کہا۔

رابعہ نے اسے گھورا "پھر تم مجھے کیوں باجی کہتی ہو؟"

"ہاں۔ تم بھی آنٹی کہا کرو۔ بلکہ ماسی بہتر ہے" میں نے کہا "ماسی میں زیادہ اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے جیسے خالہ یا چاچی میں۔"

رابعہ نے کہا "کیا یہاں ٹیکسی نہیں ہوتی؟"

ٹیکسی میں نے بھی نہیں دیکھی تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے باہر مجھے کچھ پرائیویٹ کاریں نظر آئیں جن کو ڈرائیور محبت سے چمکا رہے تھے مگر ان کی متوقع نظریں ہم پر تھیں۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ یہ کرائے کی گاڑیاں تھیں۔ زیادہ بول کے اپنی اپنی خدمت پیش کرنے والے اور خود کو ہمارے حق میں فرشتۂ رحمت ثابت کرنے والے ڈرائیوروں پر میں نے ایک سفید ریش' قناعت پسند بزرگ کو ترجیح دی جو رزق کے لیے اللہ پر توکل کیے خاموش بیٹھے تھے۔

میں نے کہا "ہمیں دن بھر کے لیے گاڑی چاہیے۔"

"بسم اللہ۔ بسم اللہ" انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہم حاضر ہے۔ ہمارا گاڑی حاضر ہے۔"

مایوس ہو جانے والے ایک ڈرائیور نے کہا "گاڑی نہیں چھکڑا بولو چاچا۔"

"ہاں ہاں۔ چھکڑا حاضر ہے۔ اللہ نے چھکڑا دیا ہے' اس کا شکر ہے" چاچا نے بُرا مانے بغیر کہا۔

"یہ مسافر بھی چھکڑے کے ہیں" میں نے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پیچھے والی سیٹ پر رابعہ اور کابل پہلے ہی فٹ ہو چکی تھیں۔

"ہم ایک سو روپیہ لے گا" چاچا نے قدرے تذبذب کے ساتھ [illegible]

"ٹھیک ہے جناب" میں نے کہا "کہیں تو پہلے دے دوں؟"

"نہیں۔ ابھی تم کہاں جائے گا پہلے"

[illegible] ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ سے ملنا ہے۔"

"وہ ادھر قدیم اسٹیڈیم کے پاس ہے" چاچا نے اپنی گاڑی کو اللہ کا نام لے کر اسٹارٹ کیا۔

گاڑی دیکھنے میں جتنی قدیم اور خستہ حال لگتی تھی' چلنے میں اتنی بُری نہیں تھی۔ جب ڈرائیور نے واپس اسی طرف کا راستہ پکڑا جدھر سے ہم پیدل چل کے آئے تھے تو میں نے کہا "وہاں جانے کے لیے دوسرا راستہ کوئی نہیں ہے؟"

"ہے لیکن یہ راستہ سیدھا ہے۔ بالکل سیدھا جائے گا تو۔"

میں نے کہا "آگے راستہ بند ہوگا پھر تم کو واپس آنا پڑے گا۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ "ایسی کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "آگے بم کا دھماکا ہوا ہے۔ پولیس نے ناکا بندی کر رکھی ہے۔ اسی لیے تو ہم اُدھر سے پیدل آئے تھے۔"

وہ اُچھل پڑا "بم کا دھماکا۔۔۔۔ تم دیکھا؟"

میں نے کہا "میں نے دیکھا تو نہیں' سُنا تھا۔ تم دھیان سے گاڑی چلاؤ۔ ابھی تم اس معصوم گدھے سے ٹکرا جاتے۔"

اس نے میرے مشورے کو نظرانداز کر دیا "کتنا بڑا بم تھا؟"

"میں نے نہیں دیکھا۔"

"تم دھماکا سُنا تھا" اس نے کہا "بہت بڑا تھا۔"

"دھماکا تو اتنا ہی بڑا تھا جتنا ایٹم بم کا دھماکا" میں نے کہا۔

"او ہو ہو۔۔۔۔ کتنا لوگ مر گیا؟ یہ ایٹم بم کس نے بنایا تھا۔ خدا خوار کرے" اس نے گاڑی کو ایک سرسبز و شاداب سڑک پر دوڑانا شروع کر دیا جو بعد میں مال روڈ ثابت ہوئی "قیامت والا دن سارا لوگ اس کو پکڑے گا۔"

"تم ذرا اسٹیرنگ کو مضبوطی سے پکڑو۔ ابھی فٹ پاتھ پر چڑھ جاتے تو چالان ہو جاتا۔ فٹ پاتھ تو پیدل چلنے والوں کے لیے بنائی گئی ہے۔"

اس نے کہا "کون چلتا ہے فٹ پاتھ پر۔ ابھی دیکھو' سب سڑک پر جاتا ہے۔ او خانہ خراب' واڑی فٹ پاتھ پر ہو۔"

آخری الفاظ اس نے ایک راہ گیر کو مخاطب کرتے ہوئے گاڑی سے سر نکال کے بہ آوازِ بلند کہے تھے۔ جواب میں سڑک کے تقریباً درمیان میں کاہلی سے بادلِ ناخواستہ اپنے وجود کو گھسیٹنے والے شخص نے اسے ٹھینگا دکھایا جو اشاروں کی زبان میں "لعنت تم پر" کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ ڈرائیور کی دلیل میں مجھے وزن نظر آیا کہ جب راہ گیر سڑک پر چلتے ہوں تو ٹیکسی کو فٹ پاتھ پر چلانا کیسے غلط ہوا۔

میں نے اسے لعنت دکھانے والے کو دندان شکن جواب دینے سے نہ روکا ہوتا تو شاید نوبت مار پیٹ پر آ جاتی۔ مجھ سے انتخاب میں غلطی ہو گئی تھی۔ بظاہر خاموش طبع اور قناعت پسند نظر آنے والے چاچا اب خاموش ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے اور بے حد جارحانہ موڈ میں تھے۔

www.paksociety.com

موضوع بدلنے کے لیے میں نے کہا "یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟"

"ہر سڑک۔ سڑک تو اُدھر ہی رہتا ہے" اس نے یوں کہا جیسے میں نے ایک جاہلانہ سوال کیا تھا "اس پر گاڑی آتا جاتا ہے' آدمی اور جانور چلتا ہے۔ ابھی تم یہ بلڈنگ دیکھا' یہ ایڈورڈ کالج ہے۔ انگریز لوگ بنایا۔ سردار شہزادہ ادھر پڑھا اور یہ قصوری راج۔ تم جانتا ہے اس کو؟ راج کپور کا باپ۔ آگے الٹا ہاتھ کو جائے گا ارباب روڈ پر' اُدھر پھر وہی صدر والا سڑک آجائے گا۔ اُدھر سیدھے ہاتھ پر قیوم اسٹیڈیم ہے' قیوم خان بنایا۔"

گاڑی کے ساتھ اس کی زبان چل رہی تھی اور وہ بیک وقت بہت سے کام کر رہا تھا۔ اس نے گائیڈ کے فرائض سنبھال رکھے تھے۔ وہ پشاور کے تاریخی' سیاسی اور ثقافتی پس منظر پر بھی تبصرہ کر رہا تھا۔ اسے زمانے کی زوال پذیر اخلاقی اقدار اور قرب قیامت کی نشانیوں کے نمودار ہونے پر بھی خاصی تشویش تھی چنانچہ اس کی توجہ ڈرائیونگ پر بہت کم تھی۔ کم سے کم چار افراد اپنی خوش نصیبی کے باعث اس کی چاند گاڑی کے نیچے آنے سے بچے۔ دو بار میں نے اسے فٹ پاتھ پر چڑھنے سے روک لیا۔ ایک ریڑھی والا عین وقت پر بزدل ثابت ہوا اور ایک طرف ہو گیا ورنہ گرما گرم حلیم کی دیگ ونڈ اسکرین کے راستے ہم پر الٹ کے گرتی۔

صدر سے گزرتے ہوئے اس نے اچانک سوال کیا "تم غیر علاقہ میں جائے گا؟"

میں نے کہا "اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔"

"اعتراض کا پتا چل جائے گا۔" اس نے طنز سے کہا "اُدھر غیرت والا لوگ رہتا ہے۔ ان کا بی بی پردہ کرتا ہے۔ ایسا عورت کو بھی وہ گولی مارے گا اور تم جیسا مرد کو بھی۔۔۔"

میں نے کہا "مرد کو بھی؟ مرد بھی پردہ کرتے ہیں' برقعے پہن کے پھرتے ہیں؟"

اب رابعہ نے مداخلت کی "چاچا! تم بہت بولتے ہو اور فضول بولتے ہو۔"

"ہم کیا غلط بولا۔ ابھی تم جا کے دیکھو' اُدھر سے تمہارا لاش واپس آئے گا۔" اس نے کہا "یہ کس کا غلطی ہے؟ مرد کا۔ مرد میں غیرت ہو تو عورت کا کیا مجال۔۔۔"

شاید اس کی حق گوئی اور بے باکی پر میں مشتعل ہو کے کوئی غلط قدم اٹھاتا' اچھا تھا ٹیکسی سے اُتر جاتا یا چلا کے اسے کہتا "شٹ اپ" اور دھمکی دیتا کہ اس نے اپنی بکواس بند نہ کی تو میں اسے بند کرا دوں گا۔ مگر ٹیکسی اچانک رک گئی۔

پولیٹیکل ایجنٹ کے آفس پر ہجوم دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ مرد عورت' بوڑھے بچے لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے تھے یا فٹ پاتھ پر دھرنا دیے بیٹھے تھے۔ سب مرد باریش تھے اور ان کے کندھوں پر رائفلیں تھیں۔

رابعہ نے پریشان ہو کے سفید اور سیاہ خیمہ نما برقعوں میں روپوش عورتوں کو دیکھا "کیا یہ سب ملاقاتی ہیں؟"

"اور کیا یہاں سینما کا ٹکٹ لینے کے لیے لائن لگی ہے؟" میں نے کہا۔

کابل نے کہا "ہمیں بھی لائن میں بیٹھنا پڑے گا۔"

"قطار بندی مہذب اقوام کا شعار ہے" میں نے کہا "آپ اچھی لگیں گی لائن کے آگے جاتی ہوئی۔"

"لیکن سکندر! اب اس طرح۔۔۔ میرا مطلب ہے پردے کے بغیر تو بڑا مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے" رابعہ نے کہا "تم ہو نا؟"

صورت حال میرے لیے بھی باعث تشویش تھی۔ یہ رش میرے لیے خلاف توقع تھا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی عام آفس ہوگا اور میں آسانی سے پولیٹیکل ایجنٹ کے سیکریٹری سے مل کے اور اس سے انگریزی میں کوئی متاثر کن جھوٹ بول کے براہ راست "صاحب" تک رسائی حاصل کرلوں گا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پولیٹیکل ایجنٹ سے ملنے والوں کی اتنی لمبی قطاریں ہوں گی جتنی امریکا یا بھارت کا ویزا حاصل کرنے کے خواہش مندوں کی سفارت خانوں کے باہر نظر آتی ہیں۔ بلند فصیل نما چار دیواری کا بھاری فولادی گیٹ بند تھا اور اس کے باہر چوکی پر دو مسلح محافظ ملیشیا کی وردی پہنے کھڑے تھے۔ ان کے پاس انتہائی خطرناک قسم کا خود کار اسلحہ تھا۔

میں نے سوچتے ہوئے کہا "مس رابعہ! تم اپنی بات کرتی ہو یہاں تو مجھے بھی ملاقات کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ یہ لوگ شاید صبح منہ اندھیرے آ بیٹھے ہوں گے۔"

"رات تک باری آجائے گی" رابعہ بولی۔

"کیا پولیٹیکل ایجنٹ میرے لیے رات تک بیٹھے گا؟" میں نے کہا۔

"پھر تو یہی ہو سکتا ہے کہ واپس چلیں۔ کل صبح فجر کی نماز سے بھی پہلے تم یہاں آ کے بیٹھ جانا۔" رابعہ مسکرائی۔

"میں ترکیب نمبر چار سو بیس آزمانے کی سوچ رہا ہوں۔"

"یعنی رشوت دے کر کام نکالنے کی۔ ان لوگوں کو دیکھ رہے ہو؟" رابعہ بولی "سب کے پاس اسلحہ ہے اور صورت سے بھی یہ کتنے خونخوار نظر آتے ہیں۔ یہ تمہاری خاطر جہنم میں جانے والے لوگ نہیں ہیں سکندر صاحب۔"

"لاحول ولا قوة۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔"

"رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ اس میں غلط سمجھنے والی کون سی بات ہے؟"

"پلیز رابعہ! پریشان مت کرو" میں نے کہا "مجھے اب شدت سے آفریدی کے نہ ہونے کا احساس ہو رہا ہے۔ وہ ہوتا تو ہمارے سارے کام ہو جاتے۔"

"کتنی خود غرضی کی بات ہے۔ جب مشکل پڑی تو اس کی یاد آئی ورنہ اس کی موت پر کسی کی آنکھ سے ایک آنسو تک نہیں ٹپکا تھا۔" رابعہ اُداس ہو کے بولی "ہم اپنی جان بچا کے فرار ہو گئے تھے بالکل ناآشنا بن گئے تھے کون آفریدی' کیسا آفریدی۔"

میں نے برہمی سے کہا "کیسی باتیں کرتی ہو۔ وہاں رک کے اور آنسو بہا کے ہمیں کیا حاصل ہوتا۔ آفریدی کی نیکی اور اس کی بلا جواز دلداری کو ہم کیسے بھلا سکتے ہیں۔ وہ اچھا آدمی تھا مگر اس کی موت کے ہم ذمے دار نہیں ہیں۔ خواہ مخواہ احساس جرم میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"مگر کیا وہ ہماری وجہ سے نہیں مارا گیا؟"

"نہیں۔ وہ خود یقین رکھتا تھا کہ نہ کوئی کسی کی وجہ سے مارا جاتا ہے اور نہ کسی کی وجہ سے زندہ رہتا ہے۔" میں نے کہا "بات قسمت کی ہے۔ جس کا جہاں وقت پورا ہو جاتا ہے' وہ خود وہاں پہنچ جاتا ہے اور تمہیں نہیں معلوم' وہ ایسی ہی موت کو پسند کرتا تھا جو اچانک کام کرتے ہوئے آجائے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں چوری ڈاکے کی واردات میں پولیس کی گولی کا نشانہ بن کے مرنا نہیں چاہتا' نشے کی حالت میں حادثے کا شکار ہو کے مرنا نہیں چاہتا۔ خدا نے اس کی خواہش پوری کی۔ اسے ایک اچھے مقصد کی خاطر جان دینے کا موقع ملا۔ نہ ہم نے ایسا چاہا تھا' نہ خود اس نے سوچا تھا مگر نوشتہ تقدیر میں ایسا ہی تھا۔"

کابل نے پریشان ہو کے کہا "یہ تم لوگ کس بحث میں پڑ گئے' کچھ کرو ورنہ واپس چلو۔"

"ترکیب نمبر چار سو بیس کیا تھی؟" رابعہ بولی۔

"کوئی بہت بڑا جھوٹ بولنا پڑے گا۔" میں نے کہا "تمہارا کارڈ ہے کوئی تمہارے پاس؟"

"کارڈ ابھی کہاں چھپوائے ہیں" رابعہ بولی۔

"دیکھو' میں ایسے ہی کام چلانے کی کوشش کرتا ہوں اور پیغام بھجواتا ہوں کہ لاہور سے رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ملنے کے لیے آئی ہیں۔ اور میں بن جاتا ہوں عبدالودود منشی۔"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟"

"کیا تمہیں یہ ثابت کرنے کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ تم رابعہ قاری ہو؟ ایڈووکیٹ لاہور ہائی کورٹ۔ فرض کرو کہیں تم کو ایسی صورت حال درپیش ہو' تمہیں شناخت کا مسئلہ ہو۔"

"تو میں ثابت کروں گی" رابعہ نے سوچ کے کہا "کیونکہ مجھے کوئی غلط ثابت نہیں کر سکے گا۔ میں شک کرنے والے کو چیلنج کر سکتی ہوں۔"

"یہی کام میں بھی کروں گا" میں نے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور گاڑی روکتے ہی اُتر کے کہیں چلا گیا تھا۔ میں نے اسے بعد میں قیوم اسٹیڈیم کی دیوار کی جانب رُخ کیے بیٹھے دیکھا تو سمجھ گیا تھا کہ اسے اتنی دور جانے کی کیا مجبوری لاحق ہو گئی۔ اس کے واپس آنے تک ہم گاڑی میں ہی بیٹھے رہے تھے۔

اس نے حیرانی سے کہا "کیا بات ہے' تم گیا نہیں اندر؟"

میں نے کہا "باہر اتنے لوگ بیٹھے ہیں" میں نے کہا "ہماری باری کیسے آئے گی' ہم تو کسی کو جانتے ہی نہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "یار! تم کو کچھ نہیں معلوم۔ یہ سب تو وظیفہ خور ہے۔ اپنا وظیفہ لینے آتا ہے۔"

میں نے کہا "کیسا وظیفہ؟"

اس نے وضاحت کی کہ انگریز نے اس علاقے پر اپنا تسلط برقرار رکھنے اور آزاد پٹھانوں کو مطیع رکھنے کے لیے جبر و استبداد کے سارے ہتھکنڈے آزمانے کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی تھی کہ ان لوگوں کے لیے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا جائے جو انگریزی افواج اور حکومت کے خزانوں کو لوٹتے رہتے تھے۔ یہ علاقے میں امن و امان قائم رکھنے کے علاوہ ایک طرح کا خراج تھا جو حاکم اپنی رعایا کو دینے پر مجبور تھا۔ انگریز چلے گئے مگر وظیفہ باقی رہا۔ اس کی رقم میں وقت کے ساتھ برائے نام اضافہ ہوا اور موجودہ دور کی گرانی کو دیکھتے ہوئے یہ وظیفہ مضحکہ خیز حد تک کم لگتا تھا مگر ذرائع معاش کی عدم دستیابی کے باعث نادار افراد اب یہ وظیفہ ہر تین ماہ بعد اسی طرح وصول کرنے آتے رہتے تھے۔

یہ بات جان کے مجھے کچھ اطمینان حاصل ہوا کہ قطاروں میں کھڑے ہوئے مرد و زن ملاقاتی نہیں ہیں اور شاید ہمیں زبانی تعارف پر پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو جائے گا۔ پھر ہوا بھی یہی۔ دروازے پر موجود مسلح محافظوں نے ڈرائیور کی زبانی میری بات سنی اور آہنی دروازے کی ایک کھڑکی سے جھانک کے اندر کچھ کہا۔

ڈرائیور نے مجھے اشارہ کیا "آؤ صاحب!"

میں نے گاڑی کی طرف جاتے ہوئے کہا "کیا اجازت مل گئی؟ تم سے کیا پوچھ رہا تھا وہ محافظ؟"

"پوچھتا تھا کہ تم کون ہو۔ ہم بولا کہ صاحب لوگ کا شوفر ہے اور کون ہے۔ صاحب اور بیگم صاحب بہت بڑا وکیل ہے لاہور ہائی کورٹ کا۔ کام کا ہم کو پتا نہیں۔ کوئی قانونی معاملہ ہوگا۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور سیدھا گیٹ سے گزار کے لے گیا جو ہمارے لیے کھول دیا گیا تھا۔

"قانونی معاملہ تو ہے" میں نے کہا "کیوں مس رابعہ؟"

رابعہ نے کہا "یہ تو سچ ہے۔ جیسے یہ سچ ہے کہ میں رابعہ قاری ہوں اور ایڈووکیٹ ہائی کورٹ بھی ہوں۔ کابل کے بارے میں کوئی بیان نہیں دیا گیا اور قانونی مسئلہ ہے کلیم۔ اب باقی بچے آپ تو اللہ آپ کو اس جھوٹ پر معاف کرے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اگر وہ بھی کہہ رہے تھے تو یہ بے ننگ و نام ہے۔"

گاڑی اندر ایک پارکنگ ایریا میں رک گئی جہاں پہلے سے

www.paksociety.com

ایک فوجی جیپ اور دو کاریں موجود تھیں۔ ضابطے کی کارروائی کرتے ہوئے لیشیا کے ایک جوان نے گاڑی میں جھانک کر دیکھا، رسمی طور پر ڈِکی کھلوائی اور مجھ سے پوچھا "سوٹ کیس میں کیا ہے؟"

"کپڑے، نقد رقم" میں نے کہا "ایک ریوالور میرے پاس ہے۔"

"وہ ادھر دے جائیں" وہ بولا "واپسی میں لے لیں۔"

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ سیکیورٹی کے قواعد کے مطابق وہ میری تلاشی بھی لے سکتا ہے چنانچہ رضاکارانہ طور پر اسلحہ پیش کر دینا بہتر تھا۔ کسی شخص کے پاس ریوالور یا رائفل کا ہونا اور لائسنس کا نہ ہونا اس علاقے میں ایسا ہی تھا جیسے لاہور میں کسی شخص کی کلائی پر گھڑی ہو مگر اس کی رسید کا نہ ہونا۔ ہاں تلاشی میں اسلحہ برآمد ہوتا تو ممکن ہے مجھ پر شک کیا جاتا کہ میں اسے چوری چھپے اندر لے جانا چاہتا تھا۔

پولیٹیکل ایجنٹ ایک نوجوان شخص تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا۔

"آپ لاہور سے تشریف لائے ہیں؟"

میں نے کہا "جی۔ میں عبدالودود منظر ہوں اور یہ میری وائف رابعہ قاری ہیں۔ یہ بھی لاہور ہائی کورٹ میں ایڈووکیٹ ہیں۔"

وہ خاصا مرعوب نظر آنے لگا "ان کا کوئی مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "جی نہیں۔ یہ میری سسٹر اِن لا ہیں۔ مس کاجل۔ مسئلہ ہے اس بچے کا۔"

"کیا مسئلہ ہے؟"

"یہ غیر علاقے کا رہنے والا ہے۔ اس کا باپ بھی مشرقی پاکستان میں مارا گیا اور ماں بھی۔ اس کو وہ ہمارے حوالے کر گئے تھے کہ جب ہم مغربی پاکستان جائیں تو اسے رشتے داروں کے سپرد کر دیں۔ اس کی ایک پھوپی رہتی ہیں یہاں اور کچھ زمین بھی ہے۔"

"آپ خود جائیں گے؟"

"جی۔ اگر آپ مدد کریں۔"

"دیکھیے جی، میں کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ پولیٹیکل ایجنٹ صاحب سے بات کر کے دیکھ لیں۔ اگر وہ اجازت دیتے ہیں۔۔۔"

میں نے کہا "کیا آپ پولیٹیکل ایجنٹ نہیں ہیں؟"

"میں ان کا سیکریٹری ہوں۔ وہ ذرا مصروف ہیں۔ ایک صوبائی وزیر بیٹھے ہیں۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا۔ وہ فارغ ہوتے ہی آپ کو بلا لیں گے۔"

مجھے غصہ بھی آیا اور خفت بھی محسوس ہوئی۔ میں نے رابعہ کی طرف دیکھا تو وہ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن غلطی سراسر میری اپنی تھی کہ میں نے سیکریٹری کو پولیٹیکل ایجنٹ فرض کر لیا۔ خود اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ دراصل میں کمرے کی وسعت اور شان و شوکت سے دھوکا کھا گیا تھا۔ وہ صوفوں پر بیٹھے تھے، وہ بہت شاندار تھے۔ نیچے بیش قیمت قالین اور کھڑکیوں دروازوں پر قیمتی پردے آویزاں تھے۔ سیکریٹری کی میز ایک کونے میں لگی ہوئی تھی۔ باقی حصہ ایک ویٹنگ روم تھا جہاں وی آئی پی قسم کے ملاقاتی اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔

سیکریٹری اپنی کرسی پر جا بیٹھا اور فون گھمانے لگا تو رابعہ نے آہستہ سے کہا "اب پہلے پوچھ لینا کہ آپ پولیٹیکل ایجنٹ ہیں یا سیکریٹری؟"

"شناختی کارڈ نہ مانگ لوں؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"آدمی کی پہچان بھی ہونی چاہیے" رابعہ مسکرائی "بھلا یہ عمر ہو سکتی ہے پولیٹیکل ایجنٹ کی؟"

"تمہارے خیال میں کیا عمر ہونی ہے اس کی؟ پہلے پولیٹیکل ایجنٹ دیکھے ہیں تم نے؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔

اسی وقت اندر والا دروازہ کھلا اور صوبائی وزیر صاحب برآمد ہوئے۔ انہوں نے ایک شانِ استغنا سے مجھ پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی لیکن کاجل کو خاصی توجہ سے دیکھا اور رابعہ کی طرف دیکھ کے انہوں نے سر بھی خم کیا۔ اس کے پیچھے ایک اور سنجیدہ صورت جوان آدمی تھا جو وزیر صاحب کو دروازے کے باہر ان کی کار تک چھوڑ کے لوٹا تو سیدھا ہماری طرف آیا۔

"تشریف لائیے پلیز" اس نے کہا "آپ کو بڑا انتظار کرنا پڑا۔"

"یہ تو ہوتا ہی ہے پاکستان میں" میں نے ناگواری کے جذبات کا اظہار کیا "بڑا آدمی ہی بڑا انتظار کراتا ہے۔"

ایک بار پھر میں دھوکا کھا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں اندر لے جا کے پولیٹیکل ایجنٹ کے سامنے پیش کرے گا اور پولیٹیکل ایجنٹ ہو گا کوئی عمر رسیدہ، بھاری بھرکم، خرانٹ قسم کا شخص۔ مگر عالی شان کمرے میں وہی نوجوان ایک وسیع و عریض میز کے پیچھے بیٹھا تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے اس کی خوش اخلاقی کے جواب میں کتنی بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا تھا۔

میں نے پھر رابعہ کی طرف دیکھا تو وہ میری بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس کی بات غلط ہو گئی تھی مگر مجھ سے جو غلطی سرزد ہوئی تھی اس کی تلافی بہت مشکل تھی۔

"جی فرمائیے۔ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟" اس نے ایک پیڈ پر نظر ڈال کے کہا "مس رابعہ قاری۔۔۔۔۔"

"مسز رابعہ قاری" میں نے کہا "اور میں ہوں عبدالودود منظر۔ یہ میری وائف ہیں۔ قانونی حلقوں میں ان کا اپنا نام چلتا ہے لیکن اپنی بات کرنے سے پہلے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں اپنے رویے پر۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ ہیں یہاں کے ہیڈ پولیٹیکل ایجنٹ ہیں۔"

"اب تو پتا چل گیا" وہ خوش دلی سے ہنسا "ہم آپ کی غلطی نہیں تھی اس لیے میں نے برا نہیں مانا۔ آپ کیوں معذرت

خواہ ہیں؟" اس نے میری بات غور سے سنی۔ اس دوران ایک چپراسی ہم سب کے سامنے چائے کی پیالی رکھ گیا، بسکٹ کی پلیٹ رکھی۔ کچھ سے پاؤں باہر نکل گیا۔ خود کار اسپرنگ کے ذریعے دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔

اس کے بالکل سامنے میں تھا اور میرے ساتھ رابعہ تھی۔ دوسری جانب کاجل اور کلیم اللہ خاموش بیٹھے تھے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا اور ہم اپنے مقصد اور اپنی منزل کے قریب ہوتے جا رہے تھے، کاجل کی خاموشی میں اداسی کا رنگ گہرا ہوتا جاتا تھا۔ وہ بہت کم بولتی تھی اور باتیں کرتی تھی تو کلیم اللہ سے۔ کلیم اللہ خود بھی نادان بچہ نہیں تھا۔ جب کاجل اس سے بار بار پوچھتی تھی کہ کیا تم خوش ہو گے؟ اجنبی لوگوں اور اجنبی ماحول میں گھبراؤ گے تو نہیں، تمہاری یہ زندگی تو بالکل مختلف ہو گی اور بہت ممکن ہے اگر رشتے داروں نے تم سے اچھا سلوک نہ کیا، تمہیں وہ پسند نہ آئے جس کی تم توقع رکھتے ہو تو پھر کیا کرو گے؟ تمہیں جائداد کی خاطر تمہارے ساتھ کسی نے دشمنی کی تو کیا ہو گا؟ تمہیں ہم سب یاد نہیں آئیں گے؟ کبھی تمہارا دل چاہا مجھ سے ملنے کو یا مجھے بلانے کو تو کیا کرو گے؟ ایسے سوال بہت تھے جو وہ اکثر کرتی تھی۔

کلیم اللہ سمجھتا تھا کہ اس نے غلط جواب دیا تو کاجل زیادہ دکھی ہو گی اور اس کے لیے اپنے جذبات پر قابو پانے کا صبر آزما مرحلہ زیادہ دشوار ہو گا چنانچہ وہ سوچ سمجھ کے جواب دیتا تھا۔ اس کے ہر جواب سے کاجل کو مایوسی ہوتی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ میں بہت خوش رہوں گا۔ یہاں اجنبی کون ہو گا؟ میری پھوپی آخر میرے والد کی بہن ہے اور میں زمینوں کا مالک بن جاؤں گا تو پھر کس کی مجال ہے کہ میری طرف آنکھ بھی اٹھا کے دیکھے۔ یہ تو بہت مشکل لیکن جب بھی موقع ملا میں آپ سے ملنے کے لیے ضرور آؤں گا۔ یہاں سے ڈاک تو جاتی نہیں ورنہ میں خط لکھتا اور فون ہوتا تو بات بھی کرتا مگر اس کے لیے تو پشاور جانا پڑتا ہے۔ وہ بے حد ذہین تھا اور محسوس کرتا تھا کہ کاجل کی خاطر اس نے اپنے غم پر ایک جھوٹی خوشی کا پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ بعد میں کاجل کو اس کی جدائی کا صدمہ کم سے کم ہو چنانچہ وہ جذباتی طور پر خود کو لاتعلق اور بے گانہ کرتا جا رہا تھا اور اپنے رویے سے یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا کہ نہ اسے کاجل کی پروا ہے اور نہ ہماری۔ حقیقت اس کے برعکس تھی مگر کاجل خود جذبات کے اندھے پن کا شکار تھی اور کلیم اللہ کی بے مروتی، لاتعلقی کے اظہار اور اجنبیت آمیز لہجے کو اس کے رویے میں چھپے ہوئے جھوٹ کو دیکھنے سے قاصر تھی۔ چنانچہ اس کا دل ٹوٹتا تھا کہ اس نے تو کلیم کو بہت ٹوٹ کے چاہا تھا مگر وہ کتنی جلدی بدل گیا۔ اپنا خون نہیں تھا نا، غیر تو غیر ہی ہوتا ہے۔

کلیم اللہ بڑی بہادری سے کاجل کے بارِ غم کو ہلکا کرنے میں لگا ہوا تھا اور بڑی جوانمردی سے اس بوجھ کو اپنے دکھ کے ساتھ اٹھاتے ہوئے اپنے آنسوؤں کے بند کو خوشی کی مسکراہٹ سے مضبوط کرنے میں کوشاں تھا۔

جتنی دیر میں پولیٹیکل ایجنٹ سے بات کرتا رہا، کاجل خلا میں گھورتی رہی اور ایک میکانکی انداز میں چائے کی پیالی کو اٹھا کے لبوں تک لے جاتی رہی۔ اگر رابعہ نہ کہتی تو اسے چائے میں چینی ڈالنے کا خیال بھی نہ آتا اور احساس بھی نہ ہوتا کہ وہ پھیکی چائے پی رہی ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا کلیم اللہ بڑی بے حسی کے ساتھ مسکراتا رہا اور یہ ظاہر کرتا رہا کہ وہ بے حد مسرور ہے۔

میں نے پولیٹیکل ایجنٹ کو ایک قابلِ قبول کہانی سنائی جس میں کلیم اللہ کے باپ سے ملاقات کا سبب بننے والے اصل حالات کا کوئی حوالہ نہ تھا مگر خود کلیم اللہ کے خاندانی حالات اصل واقعات کے مطابق تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیٹیکل ایجنٹ بعد میں جرح ضرور کرے گا اور خود کلیم اللہ سے بھی تصدیق چاہے گا تو یقیناً وہ بات کرے گا جو ہماری سمجھ میں نہیں آئے گی لیکن ایک بچے کی زبان نے میری کسی بات کو غلط کر دیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا اور ہماری حیثیت مشکوک ہو جائے گی۔

میں نے اپنے حالات کو بہت مختصر رکھا۔ ہم شادی کے بعد ہنی مون کے لیے مشرقی پاکستان گئے تھے۔ وہاں سے سلہٹ گئے اور ڈھاکا لوٹے تو پہلے مجھے ٹائی فائیڈ ہو گیا پھر حالات مخدوش ہو گئے اور ہم وہیں پھنس کے رہ گئے۔ کلیم اللہ کے باپ سے ہماری کوئی شناسائی نہ تھی۔ اس سے ملاقات ایک اتفاق تھی مگر بعد میں اس نے ہمیں پناہ دی۔ باقی سب سچ تھا جو کچھ کلیم اللہ کے گھر میں ہوا تھا۔

پولیٹیکل ایجنٹ نے میری بات سنتے ہوئے ایک پنسل سے پیڈ پر کچھ لکھنے کا شغل جاری رکھا۔ یہ بہت سے لوگوں کی عادت ہوتی ہے وہ مخاطب کو پوری توجہ دیتے ہیں اور کاغذ پر بے مقصد نقش و نگار یا خلا ملی کے نمونے بناتے ہوئے ان کا دھیان پوری طرح ایک ہی طرف رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ڈرائیونگ کرتے ہوئے آدمی کے دونوں پاؤں الگ الگ حرکت کرتے ہیں۔ وہ ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کی باتیں بھی سنتا ہے۔ اس سے مدلل گفتگو بھی کرتا ہے، اس کے لطائف پر ہنستا بھی ہے مگر بنیادی طور پر اس کی ساری توجہ اپنی ڈرائیونگ پر رہتی ہے۔

میری بات سننے کے بعد اس نے پیڈ ایک طرف رکھ دیا اور کلیم اللہ سے بات کرنے کے لیے کرسی پر گھوم گیا۔ حسبِ توقع ان کی تمام گفتگو پشتو میں ہوئی اور آدھا گھنٹا جاری رہی۔ درمیان میں اس نے دو اہم فون سنے اور ایک بار انٹرکام پر ہدایات بھی دیں۔ وہ ایک ذمے دار اور مصروف آدمی تھا مگر غالباً اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جب تک کسی وی آئی پی کا فون نہ ہو یا خود وی آئی پی ملنے نہ آئے، اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ تجربہ کار سیکریٹری ہوا اپنے صاحب

www.paksociety.com

کا موڈ اور مزاج سمجھتے ہیں، وہ خود ہی طے کر لیتے ہیں کہ کون وی آئی پی ہے اور کون نہیں ہے۔

بالآخر وہ دوبارہ مجھ سے انگریزی میں مخاطب ہوا "اب بات تو تمہاری سمجھ میں آگئی ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مقصد ہے اس بچے کو وارثوں کے حوالے کرنے کا۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وارث آئیں اور اسے لے جائیں۔ میرے آفس میں قانونی طریق کار کے مطابق یہ کارروائی مکمل ہو سکتی ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ بعد میں کلیم اللہ کو تحفظ کی ضمانت حاصل رہے گی۔ خدانخواستہ کسی نے اس کے ساتھ پرانی دشمنی کا بدلہ چکانے کی سازش کی یا اسے بچہ سمجھ کے اس کا حق چھینا تو اس معاملے میں پڑنے والے دوسرے لوگ بھی ہوں گے۔ میں قبیلے کے معتبر افراد کو یہ ذمے داری سونپ سکتا ہوں اور ان سے عہد لے سکتا ہوں کہ وہ غیر جانبداری کے ساتھ اپنا فرض پورا کریں گے۔"

میں نے مایوسی سے کہا "اس کا مطلب ہے ہم خود ان سے ملنے نہیں جا سکتے؟"

"او نو۔ آپ لوگوں کے قبائلی علاقے میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ بولا "یہ لوگ مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہیں مگر کسی اجنبی کو اس علاقے میں داخل نہیں ہونے دیتے۔ اجنبی کا مطلب ہے وہ شخص جو ان کی مذہبی روایات اور ثقافت، ان کے مزاج اور عادت سے ناواقف ہو۔ آپ لوگ خود کو خطرے میں نہ ڈالیں۔"

کاجل نے اچانک کہا "آپ کچھ نہیں کر سکتے ہماری حفاظت کے لیے؟"

وہ اس کی انگریزی پر چونکا "نہیں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ غیر ملکی مہمان آتے ہیں تو پہلے سے قبائلی سرداروں کو مطلع کر دیا جاتا ہے اور رسمی طور پر جرگہ منظوری دیتا ہے۔ اس کے باوجود ہم ان کے ساتھ پیرا ملٹری فورس بھیجتے ہیں۔ یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں۔"

"تمہارے لیے نہیں ہے، میرے لیے ہے۔" کاجل نے تیز آواز میں کہا "تم صرف سرکاری قواعد و ضوابط کی بات کر رہے ہو، یہ نہیں سمجھتے کہ رشتوں کا ایک جذباتی پہلو بھی ہوتا ہے۔ انسانی رشتوں کا۔"

صاف ظاہر تھا کہ وہ مایوسی کے ہسٹریا سے مغلوب ہو چکی تھی۔ میں نے کہا "کاجل! مجھے بات کرنے دو۔"

"بات میں بھی کر سکتی ہوں۔" کاجل نے میرے لہجے کی تلخی سے متاثر ہوئے بغیر کہا "میں اپنا حلیہ، لباس، سب بدل سکتی ہوں۔ سر، میں پٹھانوں کے گھر کی عورتوں جیسے کپڑے پہن لوں اور برقع اوڑھ لوں تو کسی کو کیا اعتراض ہوگا؟ پردہ میرے لیے کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ ذہن میں مسلمان ہوں، میں کلیم کی ماں ہوں، پوچھ لو اس سے!"

وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ ایک لمحے سب کو ایک مجرمانہ احساس کی بوجھل خاموشی نے گھیر لیا۔ جس بے رحم شکاری لمحے سے ڈر رہا تھا، وہ اچانک کاجل کو ڈس گیا تھا۔ اس طرح کہ ہمارے لیے اپنے انتظامات دھرے رہ گئے تھے۔

اس صورت حال کو پولیٹیکل ایجنٹ نے سنبھالا "او کے، تم جا سکتی ہو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

کلیم بے اختیار اس سے لپٹ گیا "تم میرے ساتھ رہے گی۔ ہم نہیں چھوڑے گا تم کو۔ ہم بھی نہیں جائے گا اگر تم نہیں جائے گا۔ ہم کیسے رہے گا اُدھر تمہارے بغیر۔"

کاجل کے آنسوؤں نے کلیم کو بھی شکست دے دی جو بڑی جرأت مندی سے خود کو آنے والے جدائی کے لمحے کے لیے آزما ہونے کے لیے تیار کر رہا تھا مگر کاجل کو روتا دیکھ کے اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس کے لیے اپنے جھوٹ کو نبھانا ممکن نہ رہا۔ خوشی کی ساری اداکاری کا اعتراف جرم اس کی آنکھوں سے بہنے والے اشکوں کی تحریر میں ڈھل گیا تھا۔

میں اور رابعہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ خاموشی سے اپنی شرمندگی اور ندامت کی خفیف آزار کو برداشت کرنے کے سوا ہم کر کیا سکتے تھے۔ کاجل نے ہم سے قطع تعلق کر لیا تھا اور کلیم کی ماں بننے کا، کہلانے کا اور تسلیم کیے جانے کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے ساری دنیا کو چھوڑنا قبول کر لیا تھا۔ اسے کون روک سکتا؟

"پلیز! آپ یہ دو دن انتظار کریں۔ میں ان کے معززین کو بلواتا ہوں۔ اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہوا تو آپ جائیے، آپ کو نہیں روکوں گا۔ لیکن میں آپ کے لیے حفاظتی انتظام نہیں کر سکتا۔ ہر آپ کو کلیم اللہ کے علاقے میں لے جانے کسی اجنبی اطلاع کے بغیر۔ علاقے کا کوئی آدمی ہوتا تو وہ یہ ذمے داری قبول کر لیتا۔" پولیٹیکل ایجنٹ نے کہا۔

"اس میں تو کچھ وقت لگے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ دو دن کم سے کم۔" اس نے کہا "آپ کا قیام کہاں ہے؟"

"رات ایک ہوٹل میں تھے۔ اب معلوم نہیں وہاں جگہ ملی یا نہیں۔" میں نے کہا۔

"میں ریسٹ ہاؤس میں بندوبست کر سکتا ہوں، گاڑی آپ کو لے جائے گی۔" اس نے انٹرکام اٹھاتے ہوئے کہا۔

ہم اس کا شکریہ ادا کر کے اور ہاتھ ملا کے کمرے سے باہر آئے۔ ہمیں احساس تھا کہ جاتے وقت ہم ایک تھے، ساتھ ہونے کے باوجود الگ۔ کاجل اور کلیم کا راستہ بدل گیا۔ واپسی صرف میرے لیے اور رابعہ کے لیے تھی۔ کاجل نے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور مشرقی پاکستان سے شروع ہونے

والا سفر بالآخر پشاور پہنچ کے تمام ہو گیا تھا۔ کاجل ابتدا سے ہمارے ساتھ نہ تھی مگر بہت کم وقت میں اس کے اور ہمارے درمیان ایک خاندان کے افراد جیسا جذباتی تعلق استوار ہو گیا تھا۔

ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اگر کوئی گیا تھا تو حالات کی مجبوری کے باعث کچھ دن کے لیے یا کچھ مہینوں کے لیے اور اس کے لوٹ آنے کی امید ہمارے ساتھ رہتی تھی۔ یا ایسا ہوا تھا کہ اعتبار، نیڈی اور شیلا کی طرح کوئی ہماری زندگی سے ہی نہیں دنیا سے بھی چلا گیا۔ تھاورٹ میں اور محسن، غالب اور نانو، نگی اور اکرام کی طرح کاجل بھی آج تک ایک خاندان میں تھی۔ یہ ساتھ رہنے کے لیے کسی نے بھی اپنے ارادے اور اپنی مرضی سے اس خاندان کو نہیں چھوڑا تھا۔ کاجل کا یک طرفہ جذباتی فیصلہ میرے لیے اور رابعہ کے لیے صدمے کی بات تھی۔ اس نے کسی کو اعتماد میں نہیں لیا تھا اور اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

باہر آ کے میں کرائے کی گاڑی میں بیٹھ گیا اور پیچھے پیچھے چلا گیا۔ سرکاری جیپ نے نصف گھنٹے کی مسافت کے بعد ہمیں یونیورسٹی کے قریب واقع ایک ریسٹ ہاؤس میں پہنچا دیا جہاں ہم سب کے لیے ایک ہی کمرے میں قیام و طعام کی ہدایات موصول ہو چکی تھیں۔ راستے میں ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ پیچھے والی سیٹ پر کاجل اور رابعہ کے درمیان کلیم اللہ آفریدی، شرمندگی اور بے بسی کے ملے جلے جذبات میں مبتلا گم صم بیٹھا تھا۔ کاجل ایک کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی تو رابعہ دوسری کھڑکی سے۔ اگلی سیٹ پر میں ان کے چہروں کے تاثرات کا مشاہدہ اس آئینے میں کر سکتا تھا جس میں پیچھے کا سارا منظر نظر آتا تھا۔ واضح طور پر ان کے درمیان کشیدگی کی خلیج حائل تھی۔

ریسٹ ہاؤس اس اعتبار سے بڑی محفوظ جگہ تھی کہ یہاں ہم کسی شکاری کی نگاہ میں نہ تھے اور نہ اس جگہ تک ان کی رسائی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے تعاقب میں کوئی بھی پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر تک نہیں آیا تھا۔ کینٹ اسٹیشن تک کا فاصلہ پیدل طے کرتے ہوئے بھی میں نے گرد و پیش پر نظر رکھی ہوئی تھی اور پھر ایک پرائیویٹ کار میں پولیٹیکل ایجنٹ کے آفس آتے ہوئے خاص طور پر اپنے پیچھے آنے والی گاڑیوں کو دیکھتا رہا تھا کہ کوئی ایک سا فاصلہ رکھتے ہوئے ہماری نقل و حرکت کی نگرانی تو نہیں کر رہی ہے مگر مجھے ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی تھی۔

اس کمرے میں دو بیڈ تھے۔ ایک صوفہ سیٹ بھی بیڈ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا ورنہ قالین پر سونے کے لیے بہت جگہ تھی۔

کلیم اللہ نے ایک سوال سے ماحول کے اعصاب شکن سکوت کا خاتمہ کیا "چاچا! ہم ادھر کیوں آگیا؟"

میں نے مسکرا کے کہا "تمہیں بہت جلدی ہے اپنے گھر پہنچنے کی؟"

"ہم کب جائے گا چاچا؟" کلیم نے میرے سوال کو نظرانداز کر کے کہا۔

"ابھی ساری بات تمہارے سامنے ہوئی تھی۔ تمہارے قبیلے کے لوگ آجائیں گے کل پرسوں تک۔ وہی لے جائیں گے تمہیں۔ ہم تو اجنبی ہیں، غیر ہیں تمہارے علاقے میں، اس لیے ہمیں اجازت نہیں ملی۔" میں نے کہا "ورنہ ہم تو چاہتے تھے کہ تمہارے سب رشتے داروں سے بھی ملیں اور تمہارا گھر بھی دیکھیں۔"

"پھر دیدی کو تم نے اجازت دلوا دی" رابعہ بولی۔

کاجل نظر جھکائے بیڈ پر بیٹھی ایک اضطراری کیفیت میں پاؤں ہلا رہی تھی اور ایک انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کو گھما رہی تھی۔ "آپ ۔۔۔ خفا تو ہوں گے مجھ سے۔" اس نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے ہنس کے کہا "کیسی باتیں کرتی ہو کاجل، ہم بھلا تم سے کیوں خفا ہوں گے۔"

"ہمیں خفا ہونے کا حق بھی حاصل نہیں" رابعہ نے کہا۔

"آپ یقیناً خفا ہیں" کاجل بولی۔

"تمہارے نزدیک ہوگی کوئی وجہ۔۔۔"

"وجہ مجھے معلوم ہے۔ میں نے آپ لوگوں سے پوچھے بغیر کلیم کے ساتھ جانے کا فیصلہ جو کر لیا۔"

میں نے کہا "کاجل! رہنے دو، تم عاقل و بالغ ہو، تمہیں اپنی زندگی پر پورا اختیار حاصل ہے اور تم بالکل پابند نہیں ہو کہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے کسی سے مشورہ لو لیکن میں جو بات محسوس کرتا ہوں وہ ضرور کہوں گا۔ تم نے یہ فیصلہ عجلت میں اور جذبات کی رو میں بہہ کے کیا ہے۔ آج تک کلیم تمہاری ذمے داری تھا لیکن اب تم نے اپنی ذمے داری کا بوجھ کلیم پر ڈال دیا ہے۔ کیا تم یہ بات سمجھتی ہو؟"

"میں کسی پر بار نہیں بنوں گی۔"

"جہاں تم جا رہی ہو وہ ڈھاکا، کراچی یا لاہور جیسا شہر نہیں ہے۔" میں نے کہا "تمہاری ساری زندگی ایک بالکل مختلف دنیا میں گزری ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ مجھے قبائلی علاقے میں جدید زندگی کی ساری آسائشوں سے محروم ہو کے گھر کی چار دیواری میں بند رہنا پڑے گا۔ کلیم مجھے بتا چکا ہے کہ وہاں کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کی ناکامیوں نے تم سے جینے کی امنگ چھین لی ہے، تمہاری خواہشات کا گلا گھونٹ دیا ہے، اپنا سب کچھ گنوا دینے کے بعد تم عملاً ترکِ دنیا پر کمربستہ ہو اور وہی طرزِ زندگی تمہیں سکون، طمانیت اور تحفظ کا ضامن نظر آتا ہے جو رہبانیت کے قریب ہے۔ تم تصویر کا دوسرا رخ نہیں دیکھ رہی ہو۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"کاجل کو تمہارے والد کل اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور نہیں کرسکتے" رابعہ بولی۔

"کاجل اپنا فیصلہ نہ بدلے مگر میرا فرض بنتا ہے کہ میں وہ حقائق بھی اس کے سامنے لاؤں جو اس کی نگاہ سے اوجھل ہیں۔ ایک فرق تو معاشرے کی اخلاقی اقدار کا ہے۔ فرض کرو تم ساری پابندیاں قبول کرلیتی ہو۔ اس کے باوجود مضبوط خاندانی اور قبائلی رشتوں کی شناخت رکھنے والے اس ماحول میں تمہاری حیثیت کیا ہوگی؟ تمہیں اپنے آس پاس دیکھ بھی شخص ایسا نظر نہیں آئے گا جو اپنا کوئی حوالہ نہ رکھتا ہو۔ جدی پشتی رشتوں اور حسب نسب کی حفاظت رکھنے والے خاندانی ماحول میں تم خود کو کیسے سب کے لیے قابل قبول بناؤ گی؟"

"کیا میری ضمانت کلیم اللہ نہیں ہوگا؟"

"کس رشتے سے؟" میں نے کہا "کلیم اللہ کیا جانتا ہے تمہارے بارے میں؟ وہ کیا بتائے گا کسی کو کہ تم کون ہو اور کیا ہو؟ اس کے باپ نے تو کلیم کو ہمارے حوالے کیا تھا کہ یہ امانت ہے ان کی جو [illegible] خون کا رشتہ رکھتے ہیں۔ تمہارا جذباتی تعلق [illegible] خونی رشتوں کے مقابلے میں کچھ [illegible] اس اجنبی ماحول میں جگہ نہیں لے گی [illegible] تم لاکھ کلیم سے جذباتی وابستگی اور محبت کا اظہار کرو [illegible] رشتے کا دعویٰ نہیں کرسکو گی اور کرو گی تو وہ مسترد ہو جائے گا۔ یہاں تم خود کو کلیم کی ماں کہتی ہو تو لوگ تمہارے جذبات کا احترام کرتے ہوئے تمہارے خلوص نیت پر شک نہیں کرتے۔ کلیم کے خاندان کے لوگ تمہیں یہ حق نہیں دیں گے۔ ممکن ہے تم کو دھتکار دیا جائے کہ تو کہاں سے ٹپکی اس کی ماں بن کے۔ یہ ایک پٹھان کا بیٹا ہے اور اس کی ماں بھی پٹھان تھی۔ تم نے ایک آزاد خیال معاشرے میں جتنی زندگی گزاری ہے' انگریزی اسکولوں اور کالج میں جو تعلیم حاصل کی ہے اور ہندوؤں کی تہذیبی معاشرت سے جو قریبی تعلق رکھتی ہو سب تمہارا جرم بن جائے گا۔ کلیم کی پھوپھی کہے گی کہ یہ میرے [illegible] بھائی کا بیٹا ہے کسی بنگالن کا نہیں۔"

"اگر کسی نے ایسا کہا تو میں...." کلیم مشتعل ہوگیا۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی "تم کچھ بھی نہیں کرسکو گے بیٹا کلیم کیونکہ اپنے خاندان اور اپنے رشتوں کے حصار میں تمہاری حیثیت ایک بچے سے زیادہ نہیں ہوگی اور تمہارے بزرگ ہی سب کچھ ہوں گے۔ سب سے پہلے تمہاری پھوپھی' پھر خاندان کے بڑے' قبیلے کے بزرگ اور سردار اور پھر جرگہ تمہاری زندگی کا ہر فیصلہ کرے گا۔ اس معاشرے میں فرد کی آزادی کا تصور بالکل مختلف ہے۔ تم کو مجبور کردیا جائے گا کہ تم اپنے خون کے رشتوں کا پاس کرتے ہوئے ان کے ہر فیصلے کے سامنے سر جھکاؤ۔ کل کو تمہاری شادی کسی چچا تایا کی بیٹی سے ہو جائے گی تو تم پر ایک خاندان کی ذمے داری ہوگی اور تم مانو نہ مانو تمہارا گھر تمہاری بیوی کا ہوگا اور تمہارے بچوں کا ہوگا۔ اس میں شاید کاجل کے لیے کوئی جگہ نہ ہو جو تمہیں اپنے ساتھ لے کر مشرقی پاکستان سے آئی تھی۔ اس سے زیادہ کاجل کا تمہاری زندگی سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ نہ اس وقت جب تمہارے والدین زندہ تھے...."

"بس کرو.... بس کرو۔" کاجل نے چلاّ کے کہا اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کے رونے لگی۔

کلیم نے بگڑ کے کہا "چاچا! تم ایسا بات مت کرو۔"

میں نے بُرا مانے بغیر کہا "کلیم بیٹا! میں جانتا ہوں کاجل آج ہی روئے۔ آج اس کے رونے میں دکھ کے ساتھ عزت ہے اور راحت ہے۔ بعد میں یہ بے عزت ہو کے روئے گی اور دکھ اٹھا کے روئے گی۔ اور شاید بے آبرو ہو کے اور مجبور ہو کے پھر اپنی پرانی دنیا میں لوٹنے گی تو زندہ دل شکستہ اور تنہا محسوس کرے گی۔"

مجھے اپنے الفاظ کے سفاک نشتر سے کاجل کے جذبات کا خون کرتے ہوئے اتنا ہی دکھ تھا جتنا کسی سرجن کو ایک ناسور کو کاٹ کے کسی کو جسم کی معذوری سے اور موت سے بچاتے ہوئے ہوتا ہے۔ کاجل درد سے تڑپ رہی تھی اور تکلیف سے چلا رہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ اس کے مستقبل کو مایوسی اور پچھتاوے کے عذاب سے بچانے کے لیے تلخ حقائق کی یہ گولی اسے نگلنی ہی ہوگی۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے ملازم نے ہمیں اطلاع دی کہ کھانا میز پر لگا دیا گیا ہے۔ بھوک کسی کو بھی نہیں تھی مگر میں نے رابعہ کو اشارہ کیا۔

"بھئی یہ سب تو دنیا کے جھمیلے ہیں' زندگی کے ساتھ رہیں گے مگر زندگی کے لیے کھانا زیادہ ضروری ہے۔"

"بھوک تو مجھے بھی لگی ہے" رابعہ نے اٹھتے ہوئے کہا "آؤ کاجل۔ تم بھی کچھ کھالو کلیم۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے" کاجل نے روتے روتے کہا "آپ کھالیں۔"

"ہم بھی نہیں کھائے گا دیدی کے بغیر" کلیم بولا۔

"تمہاری مرضی۔ ہم زبردستی تو کچھ بھی نہیں کرسکتے" میں نے کہا اور انہیں کمرے میں تنہا چھوڑ کے رابعہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں کھانے کی میز پر جا بیٹھا۔

"کاجل بہت جذباتی لڑکی ہے" رابعہ نے کہا "کلیم تو بچہ ہے۔"

"کلیم نے اسے زندگی میں پہلی بار بے غرض محبت اور اپنائیت کا وہ احساس دیا جس سے کاجل ہمیشہ محروم رہی تھی۔ اس کا اثر تو ہونا تھا" میں نے کہا۔

"ابھی دو دن ہم یہاں نظر بند رہیں گے" رابعہ بولی۔

"اسے فرصت شمار کرو۔ بے فکری اور عافیت کے ایسے دن ہم سے روٹھ گئے ہیں" میں نے کہا "یہاں آرام سے رہیں گے' باہر نکلیں گے' باتیں کریں گے۔ [illegible] گاڑی موجود ہے۔"

رابعہ بولی "مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔ پھر کوئی پیچھے لگ جائے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ اپنا کام کرکے گئے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں مرحوم و مغفور کردیا۔"

"کیا واقعی وہ اتنے بے وقوف ہیں کہ مفروضات کو حقائق سمجھ لیں؟" رابعہ بولی "تمہارا خیال محض خوش فہمی ہے۔"

"نہیں۔ آفریدی کا مارا جانا کسی غلط فہمی کا نتیجہ نہیں تھا۔ تم نے شاید نوٹ کیا ہو کہ وہ عام قسم کی گاڑی نہیں تھی۔ وہ بڑی ماڈرن اسٹیشن ویگن تھی لینڈ روور۔ اس سپر لگژری ماڈل کے شیشے ڈارک تھے اور اندر پردے بھی پڑے ہوئے تھے۔ خان' ارباب اور سردار قسم کے لوگ ایسی ہی گاڑیاں رکھتے ہیں۔ خاص طور پر فیملی کے استعمال کے لیے۔ استاد پیڈرو نے جب گرین ہوٹل کے باہر ہماری گاڑی دیکھی ہوگی تو یقیناً وہ بہت خوش ہوا ہوگا کہ ہم پھر اس کو چکمہ دے کر غائب ہونے میں ناکام رہے اور اس نے پھر بڑی آسانی سے ہمیں تلاش کرلیا۔ لاہور یا کراچی میں شاید اسے ساری رات تلاش کرتے گزر جاتی۔ یہاں اچھے ہوٹل ہی کتنے ہیں۔ گرین ہوٹل میں اس کو کمرہ کیسے ملا یہ مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو آفریدی والا کمرہ دے دیا گیا تھا کیونکہ ریزرویشن کرانے کے بعد وہ پہنچا نہیں تھا۔"

"پیڈرو جیسے لوگوں کے لیے یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہوتا۔ جو کام دولت سے بھی نہ نکلے وہ دھونس اور دھاندلی سے نکال لیتے ہیں۔"

"انہوں نے یہ بھی معلوم کرلیا ہوگا کہ ہم اور آفریدی ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہیں۔ ہم سے مطلب ہم سب۔ یہ اندازہ انہیں نہیں ہوسکتا تھا کہ تم اور کاجل دوسری جگہ ہو۔ بس انہوں نے فرض کرلیا کہ جہاں میں ہوں وہیں باقی سب اور اسی مفروضے کی وجہ سے ہم سب کی جان بچ گئی۔ وہ تو ہماری گاڑی پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اچانک انہیں پتا چلا کہ آفریدی بھی غائب ہے۔ اس کی گاڑی بھی اور ہم بھی۔ شاید انہوں نے آفریدی کی گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھ لیا اور یہ سمجھے کہ وہ ہم سب کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ انہیں دھوکا دینے کے لیے ہم نے اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دی ہے۔ وہ فوراً آفریدی کی گاڑی کے پیچھے لگ گئے اور جب اس کے ساتھ میں ڈنیز ہوٹل پہنچا تو ان پر اپنے اندازے کی غلطی کا راز کھلا۔ تاہم انہوں نے موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یہ بم وہ ہماری گاڑی میں فٹ کرچکے ہوں [illegible] یا کرتے [illegible] اسے انہوں نے آفریدی کی گاڑی میں نصب کرایا۔ اب اسے پھر آفریدی کی بدنصیبی کہو یا یہی بات کہ جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ ہمارا وقت آنے سے پہلے کوئی شکاری ہمیں کیسے شکار کرسکتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم سب آفریدی کے ساتھ ہی [illegible] اور وہ سوچ میں چالاں گھماتا ادھر [illegible] روانگی سے پہلے آفریدی کو ایک احتیاط کا خیال آگیا اور وہ باہر کھڑی ہوئی گاڑی کو اندر پورچ میں لانے چلا گیا۔ اس کی یہ احتیاط ہی ہمارے لیے زندگی کی ضمانت بن گئی اور خود اس کے لیے موت کا بلاوا۔"

"کیا انہوں نے ہمارے روانہ ہونے کا انتظار کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا؟"

"بعض اوقات آدمی کامیابی کے نشے یا طاقت کے غرور میں اپنی ناکامی کے امکانات کو نظر انداز کردیتا ہے اور عقل اسے فریب دیتی ہے۔ وہ ننانوے فی صد کو سو فیصد سمجھ لیتا ہے حالانکہ ایک فیصد امکانات ہی کا نام تقدیر ہے۔ وہ مطمئن ہو کے جائے واردات سے فرار ہوگئے اور شاید اب تک چوہدری دلاور کو رپورٹ دے چکے ہوں گے کہ وہ اپنا فرض ادا کر آئے۔ بس ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"وہ کیا ہے؟"

"آخر پیڈرو نے خود کو ہم پر ظاہر کیوں کیا؟ یہ کام وہ خاموشی سے روپوش رہ کے اور سامنے آئے بغیر بھی تو کرسکتا تھا۔ اس نے تو عمداً اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور ہمیں بتایا کہ وہ ہمارا تعاقب کررہے ہیں۔ اگر ان کا مقصد ہمیں مارنا ہی ہوتا تو یہ کام وہ راستے میں بڑی آسانی سے کرسکتے تھے۔ وہ کہیں بھی ہماری گاڑی پر دستی بم پھینک کر نکل جاتے یا ہمیں مشین گن کا برسٹ مار کے چھلنی کردیتے۔ ہماری جان لینا تو بہت آسان کام تھا مگر چوہدری دلاور نے ہمیشہ اس سے گریز کیا۔ خود اپنی جان بچانے کے لیے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ جس دن ہم میں سے کوئی مارا گیا اس دن کے بعد وہ خود کہیں چلا جائے' کچھ بھی کرلے' اپنی جان نہیں بچا سکتا۔"

میز پر کھانے کے لیے بہت کچھ تھا اور سرکاری خرچ پر ہونے والی اس ضیافت میں کفایت کا خیال رکھنے والا سرکار کا خیر خواہ کون ہوسکتا تھا۔ چنانچہ ہر چیز بکثرت اور بے افراط تھی لیکن ابھی تک میں نے کسی چیز کو چھوا تھا اور نہ رابعہ نے۔ میرا مقصد کاجل اور کلیم کو اکیلے میں یہ سوچنے کا موقع فراہم کرنا تھا کہ میری تلخ محسوس ہونے والی باتوں میں خیر خواہی کا عنصر کتنا ہے۔

مجھے اس وقت ایک خوش گوار حیرت ہوئی جب کلیم کے ساتھ کاجل نے کمرے میں قدم رکھا۔ کلیم اسے کھینچ کر کھانے کی میز تک لایا تھا۔ کاجل کی آنکھیں اب بھی پُرنم اور سرخ تھیں مگر وہ کلیم کے اصرار سے مجبور ہوگئی تھی۔ کشیدگی کے اعصابی دباؤ کو کم کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ باتوں کا موضوع' لہجہ اور موڈ بدل دیا جائے۔

میں نے کہا "دیکھا۔ میں کیا کہہ رہا تھا۔ کاجل کو لائے گا کلیم اور کاجل اس لیے آئے گی کہ ہم بھوکے نہ بیٹھے رہیں۔"

کاجل نے آہستہ سے کہا "آپ لوگ کھائیے۔"

میں نے کہا "بے وقوف لڑکی' بھلا یہ ہو سکتا تھا کہ تمہارے بغیر ہم ایک لقمہ بھی حلق سے اتارتے۔"

www.paksociety.com

رابعہ نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "آؤ بیٹھو میرے پاس۔ دیکھو کیسی پُرتکلف دعوت کا اہتمام ہے۔"

"لگتا ہے چوہدری ولاور کے باپ کا ولیمہ ہے" میں نے کہا "مگر اس کی تو شادی ہی نہیں ہوئی تھی۔ مثال غلط ہو گئی۔"

رابعہ ہنسی "کسی اور کا ولیمہ سمجھ کے کھالو۔"

"چلو یہ ٹھیک ہے۔ سمجھو میرا ولیمہ" میں نے کہا "اف! پھر غلطی ہو گئی شاید۔ کیوں کاجل؟"

کاجل مسکرانے لگی "رابعہ باجی سے پوچھیں نا۔"

"کلیم بیٹا! تم پوچھو۔ تم معصوم بچے ہو نا! تمہاری بات کا بُرا نہیں مانیں گی" میں نے کہا "مجھے تو ڈر لگتا ہے۔"

ذرا سی دیر میں ماحول بدل گیا اور اگرچہ پہلے جیسا نہیں رہا مگر یہ تبدیلی اُمید افزا تھی اور بہتری کی کوشش میں معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ کاجل نے تھوڑا بہت کھایا اور پھر ہمارے مشورے کو قبول کرتے ہوئے آرام کے لیے چلی گئی۔

ریسٹ ہاؤس کا دوسرا بیڈ روم بند تھا۔ میں رابعہ کے ساتھ برآمدے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب منظر سے اپنے اعصاب کے لیے سکون کشید کرنے لگا۔ گردشِ حالات نے اس نعمت سے مجھے پھر محروم کر دیا تھا اور یہ کسی حد تک میری اپنی عجلت پسندی یا کم آمادگی تھی کہ میں نے مسلسل جدوجہد اور مصروفیت کے طویل سفر اور پُرخطر آزمائشوں کے طویل دور سے خیر و عافیت کے ساتھ لوٹ آنے کے بعد چند دن بھی گوشۂ گمنامی میں آرام سے نہیں گزارے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ کسی کو بھی ہماری واپسی کا پتا نہ چلتا۔ ہم دس پندرہ دن یا مہینہ دو مہینہ ذہنی و اعصابی تھکن کو دور کرنے میں گزارتے۔ خاموشی سے اپنی پرانی پُرسکون اور پُرمسرت زندگی کے ایام کی پرانی یادوں کو تازہ کرتے اور جب تازہ دم ہو جاتے تو پھر چوہدری ولاور اینڈ کمپنی سے پرانے قرض مع سود وصول کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتے مگر نصیب میں قرار نہ تھا۔ مزاج میں شورش تھی اور فطرت میں حوصلہ آزمائی کا جنون۔

نتیجہ یہ کہ ہم پھر مفرور اور یہاں روپوش تھے۔ لاہور میں رابعہ کے گھر کی جگہ پر چوہدری غلام محمد گولا بخش والا کے غاصبانہ قبضے سے رابعہ کا حق متاثر نہیں ہوتا تھا اور اس قانونی مسئلے سے آسانی کے ساتھ بھی نمٹا جا سکتا تھا مگر ایک وقتی اور فوری خواہش سے مغلوب ہو کے میں نے رابعہ کے ساتھ وہاں داخل ہونے کی غلطی کی اور اپنے آپ کو مشکل میں ڈالا۔ اب جانی بیگم کے قتل کا الزام بھی ہم پر تھا اور اس جرم کی واقعاتی شہادت سراسر ہمارے خلاف تھی۔ کسی حد تک منظر اور وقار یوسف بھی اعانتِ مجرمانہ کے مرتکب ہو چکے تھے۔ منظر پر الزام آ سکتا تھا کہ اس نے ہمیں پناہ دی اور وقار یوسف نے ہمیں فرار ہونے میں مدد دی۔ اس کی کار گرین ہوٹل پشاور کے سامنے لاوارث کھڑی رہ گئی تھی اور ایک واقعاتی شہادت فراہم کرتی تھی۔

یہ خیال آتے ہی میری تشویش دوچند ہو گئی۔ میں نے کہا "رابعہ! میں نے وقار یوسف سے گاڑی نہ لی ہوتی تو اچھا تھا۔ وہ کیا صفائی پیش کرے گا جب یہ سوال اُٹھے گا کہ آخر وہ گاڑی پنڈی سے پشاور کیسے پہنچ گئی؟ اور کیا شرافت حسین نقوی وہی سکندر بخت نہیں تھا جو فرضی نام سے گرین ہوٹل میں قیام پذیر ہوا تھا؟ آفریدی نام کے ایک شخص کے ساتھ جو بعد میں بم کے دھماکے سے ہلاک ہو گیا۔"

رابعہ نے کہا "کیا وہ گاڑی پولیس نے تحویل میں لے لی ہو گی؟"

"پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے ابھی وہیں کھڑی ہو" میں نے کہا۔

"کیا گرین ہوٹل والوں نے تمہیں اس گاڑی سے اُترتے دیکھا تھا؟ ان کو معلوم تھا کہ وہ تمہاری گاڑی ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ لیکن استاد ریڈیو اور اس کے ساتھیوں کو یقیناً علم تھا۔"

"کیا انہوں نے ہوٹل والوں سے پوچھا ہو گا؟"

"مجھے کیا معلوم۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ کیا حرج ہے اگر میں جاؤں اور گاڑی لے آؤں؟"

"تم خود؟"

"ہاں۔ چابیاں میرے پاس ہیں۔ شام تک شاید کوئی نوٹس نہ لے کہ گاڑی کب سے کھڑی ہے۔ دن میں وہاں گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہوں گی لیکن آج رات اور کل بھی ایک گاڑی اپنی جگہ موجود رہی تو ممکن ہے کہ خود ہوٹل والے پولیس کو مطلع کر دیں۔ لاوارث کھڑی ہوئی گاڑی کو چوری کی سمجھا جا سکتا ہے" میں نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو، یہ خطرہ مول مت لو۔" رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"خطرہ بعد میں زیادہ ہو گا۔ خود ہمارے خلاف ایک شہادت بن جائے گی وہ گاڑی اور بے چارہ وقار یوسف خواہ مخواہ لپیٹ میں آ جائے گا۔" میں نے کہا "تم فکر مت کرو میں محتاط رہوں گا۔ بارہ چودہ میل آنے جانے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "تم اِسی گاڑی میں جاؤ گے؟"

"ہاں۔ شام تک کا کرایہ دیں گے تو شام تک استعمال بھی کر سکیں گے۔"

"ایسا کیوں نہیں کرتے، اس ڈرائیور کو چابیاں دے کر بھیج دو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اگر وہ پکڑا گیا کسی بھی وجہ سے تو پولیس کو سیدھا یہاں لے آئے گا۔"

"ایک آئیڈیا اور آیا ہے میرے ذہن میں۔ وقار یوسف کو فون کر دو۔ فون ہے یہاں؟"

"فون کر کے کیا کہوں؟"

"اس سے کہو کہ گاڑی کے چوری ہو جانے کی رپورٹ درج کرا دے" رابعہ بولی "اسے ساری بات بھی بتا دو۔ وہ سمجھ دار ہے۔ اس سے کہو کہ منظر سے مشورہ کر کے کسی تھانے میں گزشتہ رات کی یا آج صبح کی تاریخ اور وقت ڈلوا دے۔ اثر و رسوخ اور پیسہ دونوں ہی کام آ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "خیال اچھا ہے مگر کیا کسی تھانے میں کل رات کے بعد کوئی رپورٹ درج نہیں کی گئی ہو گی؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وقت آگے پیچھے ہو جائے۔"

"یہ چانس کی بات ہے۔ اگر کل رات کا اندراج ممکن نہ ہو تو آج صبح نو بجے درج کرائی جانے والی رپورٹ سے بھی اس کی جان بچ سکتی ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم رات گاڑی کس وقت چوری ہوئی تھی۔ میں تو جب صبح عدالت جانے کے لیے اٹھا تو دیکھا گاڑی گیراج میں نہیں ہے۔"

"یہ بالکل ٹھیک کہا تم نے مگر پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ گاڑی کہاں ہے۔ پولیس کے پاس یا اپنی جگہ۔ وہیں موجود ہے تو اسے لانا بہتر ہو گا۔ رپورٹ وغیرہ کا کوئی جھنجٹ نہیں ہو گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ رپورٹ سے قانونی طور پر وقار یوسف براہِ راست ملوث نہیں ہو گا اور اس پر اعانتِ مجرمانہ کا الزام نہیں آئے گا مگر وہ اس کے باوجود شک سے بالاتر نہیں ہو گا۔ آخر وہ تمہارا ماتحت ہے اور دوست ہے ہمارا۔"

"تم ذرا ڈرائیور سے بات تو کر کے دیکھو۔ اسے سو دو سو کا لالچ دو۔ بتاؤ کہ یہ ذرا ہوشیاری کا کام ہے۔"

"کیوں بلاوجہ اس کی نظر میں اپنی حیثیت مشکوک بنائی جائے۔ میں خود اس کام میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا۔ ایک گاڑی سے اُتر کے دوسری تک جانے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ چند سیکنڈ کی بات ہو گی۔ کون غور کرے گا میری صورت پر۔"

"اگر یہی بات ہے تو پھر تم بیٹھو، میں جا کے گاڑی لے آتی ہوں۔ برقعے میں مجھے تو کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا۔"

"رابعہ! یہاں برقع پوش گاڑیاں چلانے والی کتنی خواتین ہوں گی۔"

"بہت کم ہوں گی تو دو چار ہوں گی۔ ہوں گی ضرور اور وہ عام گھروں کی خواتین نہیں ہوں گی۔ اتنی ہمت کسی میں نہیں ہو گی کہ ان سے سوال کر سکے کہ یہ آپ اپنی گاڑی لے جا رہی ہیں یا کسی اور کی" رابعہ نے کہا۔

"بات تو تمہاری دل کو لگتی ہے مگر..."

"اگر مگر کچھ نہیں۔ میں جا کے ابھی آتی ہوں۔ گاڑی نہ ملی اپنی جگہ پر تو میں کہیں سے فون کروں گی۔ تم اسی وقت لاہور میں وقار یوسف کا نمبر ملا لینا۔ شام کے وقت وہ آفس میں ہو گا۔ منظر بھی شامل ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ ہم دونوں چلتے ہیں۔ میں گاڑی سے نہیں اُتروں گا۔ اگر وقار یوسف کی کار گرین ہوٹل کے سامنے نظر آ گئی تو تم چابی لے جانا۔ ادھر سے پیچھے پیچھے چند دور آنے کے بعد گاڑی روک لینا۔ میں بھی ساتھ آ جاؤں گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں راستے میں رُکنے کی۔ مجھے ڈرائیو تک آتی ہے اور جب تم پیچھے آؤ گے تو میرے لیے ڈر کی بات کوئی نہیں ہو گی" رابعہ بولی۔

کاجل ایک بیڈ پر سو رہی تھی اور کلیم اللہ صوفے پر تھا۔ میں نے ریسٹ ہاؤس کے ملازم کو بلا کے کہا کہ ہم ایک ضروری کام سے صدر تک جا رہے ہیں۔ بیگم صاحبہ جاگ جائیں تو انہیں بتا دینا کہ ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے تک لوٹیں گے اور کوئی مہمان آ جائے تو بٹھا لینا۔ مہمان والی بات فقط زیبِ داستان کے لیے ہی تھی ورنہ یہاں ہم مسافرانِ غریب الدیار کا صورت آشنا بھی کوئی نہ تھا۔

یہ ٹیکسی کار ہم نے دن بھر کے لیے لی تھی مگر اس کا استعمال بہت کم کیا تھا۔ کینٹ اسٹیشن سے پولیٹیکل ایجنٹ کے آفس تک اور وہاں سے ریسٹ ہاؤس تک دس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ڈرائیور فارغ بیٹھا تھا۔ وہ باتونی تو تھا مگر اس نے ایک حساس موضوع چھیڑ کے ہمیں شرمندہ کرنے کی کوشش کی تھی اور ہم مجبور ہو گئے تھے کہ اس کی زبان کو لگام دیں۔ اس کے بعد سے ہمارے تعلقات دوستانہ نہیں رہے تھے، محض کاروباری ہو گئے تھے۔

ہمیں دیکھتے ہی اس نے پچھلا دروازہ کھول دیا اور خود کپڑے سے ونڈ اسکرین صاف کرنے لگا۔ "ابھی کدھر جائے گا؟"

میں نے کہا "صدر بازار۔"

رابعہ نے کہا "کھانا کھایا تھا تم نے؟"

"ہاں جی۔ اور پیسہ بھی دے دیا تھا" وہ بولا۔

"پیسہ!" میں نے کہا "تم سے کھانے کی قیمت مانگی تھی کسی نے؟"

"مانگا نہیں تھا، ہم خود دیا" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"بابا یہاں سرکاری انتظام ہے۔ یہ کوئی ہوٹل نہیں ہے۔ اس نے پیسے جیب میں ڈال لیے ہوں گے" میں نے کہا۔

"واپس دلوا دیں گے تمہیں، فکر مت کرو۔ بلکہ یہ لو۔ اس سے ہم وصول کر لیں گے۔" رابعہ نے اسے پانچ کا نوٹ دیا جو اس نے مسکرا کر رکھ لیا۔

شام کے وقت صدر کی رونق بڑھ گئی تھی اور گاڑیاں بھی زیادہ نظر آ رہی تھیں۔ میں نے چند فیشن ایبل خواتین کو بغیر پردے کے بھی دیکھا۔ جناح اسٹریٹ اور اس سے ملحق تھوڑے سے علاقے میں پشاور کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں جدید دور کی جھلک محسوس ہوتی تھی جو لاہور کے انارکلی اور کراچی کے بوہری بازار میں دکھائی دیتی تھی۔ دکانیں بڑی چمک دمک والی اور غیر ملکی سامان

www.paksociety.com

سے بھری پڑی تھیں۔

میں نے گاڑی کو گرین ہوٹل سے پہلے ایک جنرل اسٹور پر روکا۔ وہاں سے وقار یوسف کی کار صاف نظر آ رہی تھی۔ یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی کہ ابھی تک کسی نے اس کو نہیں چھیڑا اور قابلِ غور نہیں سمجھا مگر دل میں ایک خلش سی تھی کہ کہیں ہمارے دشمن اس پر نظریں رکھے بیٹھے ہوں۔

میرا پہلا خیال یہی تھا کہ آفریدی کی گاڑی کو بم سے اڑا دینے کا مقصد ہمارا خاتمہ کرنا تھا مگر بعد میں کے آئینے میں چوہدری وِلا اور رابعہ کمپنی کا کردار اور گزشتہ روز استاد پیڈرو کا رویہ اس خیال کی نفی کرتا تھا۔ زیادہ قرین قیاس یہ تھا کہ وہ اپنی موجودگی کا احساس دلا کے وہ ہمیں ایک ذہنی خوف اور اعصابی دباؤ میں رکھنا چاہتے تھے۔ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہم کتنی بھی کوشش کرلیں، ان سے بچنا نہیں چھڑا سکتے، بچ کے کہیں نہیں جاسکتے اور ان کے رحم و کرم پر ہیں۔ آفریدی کو مار کے انہوں نے ایک پیغام دیا تھا کہ دیکھو، غور کرو اور سمجھو کہ یہ انجام تمہارا بھی ہوسکتا تھا۔ اس کے بعد قاتل واپس چلے گئے تھے۔ وہ جس مقصد کے لیے بھیجے گئے تھے وہ پورا ہوگیا تھا اور اس کی رپورٹ چوہدری وِلا والوں کو مل گئی ہوگی کہ ہدایات کا خیال رکھتے ہوئے شکار کو مسلسل فرار پر مجبور کیا گیا۔ اسے ہر لحظہ شکارگاہ میں ہر سمت شکاری نظر آتے رہے اور کھیل ختم کرنے سے پہلے ایک شکار کرکے یہ باور بھی کرا دیا گیا کہ نشانہ تیر کی طرح تھا یا تیر انداز کی، ابھی انہیں نشانہ ہی نہیں بنایا گیا تھا۔

لیکن میں اپنی قیاس آرائی کو حساب کے فارمولے سے حاصل ہونے والے یا سائنسی تجربے اور مشاہدے کے نتائج کی طرح حتمی اور سو فیصد درست سمجھ کے مطمئن نہیں ہوسکتا تھا۔ اس امکان کو بہرحال مسترد نہیں کیا جاسکتا تھا کہ شکاری بے استاد پیڈرو کے لیے وہ آخری سین نہ ہو۔ انہیں آفریدی کے قتل کے بعد بھی ڈراما جاری رکھنا ہوگا تو وہ ہماری واپسی کے منتظر ہوں گے۔

یہی وجہ تھی کہ جب رابعہ گاڑی سے اُتر کے اور مجھ سے چابیاں لے کر چلی گئی تو بالکل سامنے والے جنرل اسٹور سے میں نے اس پر نگاہ رکھی۔ میں نے رابعہ سے کہا تھا کہ وہ براہِ راست گاڑی تک نہ جائے بلکہ پہلے اِدھر اُدھر کی دکانوں میں شاپنگ کے بہانے رُک کے صورتِ حال کا جائزہ لے اور اگر اسے کوئی بھی مشکوک چھوڑ کھائی دے یا اس کی چھٹی حس کسی خطرے کی خبر دے تو وہ گاڑی کو ہاتھ لگائے بغیر لوٹ آئے۔ اس نے برقع یوں اوڑھ رکھا تھا کہ آنکھوں کے سوا اس کے جسم اور چہرے کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا تھا۔

اس دکان میں رُکنے کے لیے کچھ نہ کچھ خریدنا میرے لیے بھی ضروری تھا۔ میں نے ریڈی میڈ شلوار قمیص کی فرمائش کی۔ ان دِنوں پتلون یا سوٹ ہی سرکاری حکام، طبقۂ امرا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کا لباس تھا۔ نجی و سرکاری تقریبات میں یا باہر جاتے ہوئے شلوار قمیص جو عوامی سوٹ کے نام سے مشہور ہوا، کوئی نہیں پہنتا تھا بلکہ اسے معیوب اور اس حد تک غیر مہذبانہ سمجھا جاتا تھا کہ اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں ڈنر کے لیے انگریزی لباس ہونا لازمی تھا اور روزنامہ "مشرق" کے رپورٹر رازی یا اسمبلی کے ایک رکن کو راولپنڈی کے ایک فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ میں داخل ہونے سے اس لیے روک دیا گیا تھا کہ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے۔

تاہم پشاور میں ایسا نہیں تھا۔ مجھے میرے سائز کے مطابق شلوار قمیص پیش کردیے گئے۔ شلوار تانبا رس گز کپڑے کی اور بہت بڑے گھیر والی تھی۔ بادامی سفید کپڑا جو "کے ٹی چار ہزار" کہلاتا تھا، بے حد مقبول تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اسے پسند نہ کروں مگر میں کپڑے کی طرف کم اور باہر اس گاڑی کی طرف زیادہ دیکھ رہا تھا جو گرین ہوٹل کے سامنے کھڑی تھی۔

سیلزمین میری عدم دلچسپی سے پریشان ہوگیا "سر! کیا کپڑا پسند نہیں آیا؟"

"کپڑا.... نہیں کپڑا تو اچھا ہے" میں نے کہا "بہت اچھا ہے۔"

"کوئی اور رنگ دکھاؤں؟" اس نے کہا۔

رابعہ ایک دکان سے کوئی پیکٹ ہاتھ میں لیے نکلی، چند سیکنڈ فٹ پاتھ پر کھڑی رہی اور پھر دوسری دکان میں گھس گئی۔ میری نگاہ جو دوبارہ سڑک کے پار دیکھ رہی تھی پھر کپڑوں پر لوٹ آئی۔

"کیا تم نے کچھ پوچھا تھا؟" میں نے کہا۔

"آپ نے کہا تھا دوسرے رنگ دکھاؤ" سیلزمین بولا۔

"میں نے اسفید رنگ اچھا تھا۔ خیر، میں نے کہا تھا تم سے تو دکھاؤ" میں نے کہا۔

"تین رنگ آپ کے سامنے رکھے ہیں۔"

میں زبردستی مسکرایا "ہاں۔ رکھے تو ہیں۔ بالکل سامنے ہیں۔ نیلا اور یہ کریم کلر.... سب اچھے ہیں۔"

میری نگاہ پھر بھٹک گئی۔ رابعہ دوسری دکان سے بھی نکل آئی تھی اور آہستہ آہستہ کار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ کار سے چند قدم کے فاصلے پر تھی جب گرین ہوٹل سے پولیس کی وردی میں تین افراد باہر نکلے۔ ان میں سے ایک وردی سے بھی افسر لگتا تھا اور رویے سے بھی۔ باقی دو ماتحت ایک فائل اٹھائے اس سے ایک قدم پیچھے تھے۔ رابعہ نے وقار یوسف کی گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ اس کی طرف بڑھے۔

میں نے گھبرا کے کہا "یہ کیا چکر ہے....."

سیلزمین نے ناگواری سے کہا "یہ تو آپ مجھے بتائیں کہ چکر کیا ہے۔ آپ کو سوٹ پسند ہے کوئی یا آپ صرف وقت گزاری کے لیے دکان میں آئے تھے؟ آپ کی توجہ کہیں اور ہے۔"

میں بے اختیار دروازے کی طرف بڑھا مگر پھر میں نے دیکھا کہ رابعہ کار میں بیٹھ چکی ہے اور پولیس والے اس سے تعرض کیے بغیر

کچھ فاصلے پر دوسری گاڑی کی طرف چلے گئے ہیں تو میں لوٹ آیا۔ سیلزمین اب سوٹ واپس پیک کرکے رکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے، سوٹ بیچنا نہیں چاہتے تم؟" میں نے کہا۔

"آپ خریدنا کب چاہتے ہیں؟" اس نے بے رُخی سے کہا۔

"تمہارا کام سوٹ دکھانا ہے" میں نے اس کے غیر کاروباری اندازِ گفتگو پر احتجاج کیا۔

"میں تو دکھا رہا ہوں، آپ کہاں دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ تم کس لہجے میں بات کررہے ہو؟"

"کیا غلط کہا ہے میں نے۔ نہ آپ نے کپڑا دیکھا، نہ قیمت پوچھی۔ اگر اچھے ہیں تو بتایئے دے دوں! کون سا دوں؟" اس کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔

"تمہیں" مجھے غصہ آگیا "لیکن اس سے پہلے کہ میں قیمت ادا کروں، اپنے مالک کو بلاؤ۔ میں شکایت کروں گا کہ اس نے کیسے سیلزمین رکھے ہیں جو شرافت سے بات کرنا نہیں جانتے۔"

"بڑی شوق سے شکایت کریں" اس نے تینوں سوٹ میری طرف کھسکا دیے "اور ادائیگی بھی انہی کو کردیں۔ اسی دروازے کے پیچھے بیٹھے ہیں میرے والد۔ میں سیلزمین نہیں، ان کا بیٹا ہوں۔"

"مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر وہ خود بھی تمہاری جگہ ہوتے تو سیلزمین ہی کہلاتے اور سیلزمین شپ کے کچھ آداب ہیں۔ یہ لنڈا بازار کی دکان نہیں ہے جہاں عام لوگ نہیں آتے" میں نے برہمی سے کہا "اور جو لوگ یہاں ڈبل قیمت ادا کرتے ہیں وہ خوش اخلاقی اور شائستگی کی توقع رکھتے ہیں۔"

اس وقت تک رابعہ بھی گاڑی لے کر آچکی تھی۔ اس نے وقار یوسف کی کار کو اسٹور کے عین سامنے پارک کیا اور دروازہ لاک کرکے اندر آگئی۔ اسٹور کے مالک کا بدماغ بیٹا فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"جی فرمایئے؟"

رابعہ نے دیکھ لیا تھا کہ میں غصے میں ہوں "کیا ہوا؟" اس نے انگریزی میں کہا۔

"ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا ڈیئر" میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا "بس تین سوٹ خریدے ہیں اس بدتمیز سیلزمین سے۔"

"مجھ کو نہ بولو میں سیلزمین نہیں ہوں، مالک ہوں اس دکان کا" نوجوان نے سرکشی سے کہا۔

رابعہ بولی "چلو چھوڑو۔ ابھی نوجوان ہے، سمجھ جائے گا۔"

"پہلے میں اس کے باپ کو سمجھا دوں ورنہ اس کے سمجھتے سمجھتے تو دکان پر لوگ آنا چھوڑ دیں گے۔"

میری آواز سُن کے بند دروازے کے پیچھے سے ایک بھاری بھرکم عمر رسیدہ شخص نکلا جس کے سر اور داڑھی کے سب بال سفید تھے۔

"جی، ہوگیا سر! ادھر آیئے مجھے بتایئے" اس نے دروازہ کھول کے مجھے اندر بلایا اور اپنے جانشین کو ملامت آمیز نظروں سے گھورا۔

بنی بنی زردان شوکیس پر کھنی تک کے ظاہری بے نیازی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس نے اندازہ تو کرلیا تھا کہ اس سے غلطی ہوچکی ہے۔ ہم اپ ٹو ڈیٹ کاروں میں آئے تھے اور رابعہ برقع میں ہونے کے باوجود اپنی گاڑی خود چلا کے لائی تھی۔ اپنے رنگ روپ، قد و قامت، اندازِ گفتار اور اندازِ گفتگو سے بھی ہم عام لوگ نہیں لگتے تھے اور خواص پشاور میں بڑا اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔

ایک مختصر سے کمرے میں مالک نے ہمیں دو کرسیوں پر بٹھایا اور ہمارے انکار کے باوجود ملازم کو اسپیشل چائے لانے کا آرڈر دیا۔ وہ خود میز کے دوسری طرف بیٹھ گیا۔ وہ حد درجہ منکسر المزاج اور نرم خو شخص تھا۔ زندگی کے تجربات نے اسے ہر طرح کی ناخوشگوار صورتِ حال سے نمٹنا اور ہر قسم کے لوگوں سے بات کرنے کا سلیقہ سکھا دیا تھا۔ شاید یہی اس کی کاروباری خوشحالی اور ترقی کا راز تھا۔ یہ بات دوسری نسل کے وہ نوجوان نہیں سمجھتے تھے جنہوں نے دولت اپنی محنت سے خون پسینہ ایک کرکے نہیں کمائی تھی بلکہ پیدائشی طور پر دولت مندی انہیں ورثے میں ملی تھی۔

"سر! آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس نالائق کی طرف سے آپ سے بھی معافی مانگتا ہوں اور بیگم صاحبہ! آپ سے بھی۔"

ظاہر ہے اس کے بعد میرا سب غصہ حباب کی طرح بیٹھ گیا "آپ کو کیا ضرورت ہے معافی مانگنے کی۔ غلطی آپ نے نہیں کی۔"

"نہیں سر.... غلطی ضرور مجھ سے ہوئی ہوگی کہیں نہ کہیں جس کا میں آج خمیازہ بھگت رہا ہوں" اس نے کہا "شاید میں کاروبار میں اتنا مصروف رہا کہ اولاد کی تربیت کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ تعلیم تو اسکول سے بھی دے کر مل جاتی ہے لیکن تربیت گھر میں ہوتی ہے اور میں گھر کی طرف سے غافل رہا۔ اخراجات کے لیے جس نے جتنا مانگا دے دیا۔ سب کی جائز ناجائز ضروریات کی تکمیل کرتا رہا اور مطمئن ہوگیا کہ میں نے اپنی ذمے داری پوری کردی۔ ابتدا میں میں بیس گھنٹے کام کیا تھا میں نے۔ سولہ گھنٹے تو اب بھی کرتا ہوں۔ باقی آٹھ گھنٹوں میں سونا کھانا پینا سب ہی کچھ شامل ہے۔"

میں نے کہا "یہ غلطی بہت سے لوگ کرتے ہیں۔"

"ہاں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بیوی بچوں کو صرف ضروریاتِ زندگی اور آرام و آسائش کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پیسہ دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ بیوی بچوں کو توجہ اور نگرانی بھی چاہیے۔ اس مقام تک آنے میں مجھے کئی سال لگے ہیں لیکن میرے بعد شاید اس کاروبار کو چوپٹ ہونے میں چند ماہ بھی نہیں

www.paksociety.com

لگیں گے۔ یہ لوگ اس کاروبار کو ترقی دینا تو دور کی بات ہے، چلانے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے اور یہ غلطی میری ہے کہ میں نے سیلز مین رکھے ذمے داری کا بوجھ اٹھانے کے لیے اپنے بچوں کی ٹریننگ نہیں کی۔ احساسِ ذمے داری ایک دن میں پیدا نہیں ہوتا۔ کامیاب بزنس مین وہی بنتا ہے جو ایک کامیاب سیلز مین رہا ہو لیکن یہ بچے توہین محسوس کرتے ہیں سیلز مین کہلاتے ہوئے۔"

اس شریف آدمی کے معذرت خواہانہ رویے اور اعتراف کے بعد گلے شکوے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ اگر چائے نہ آگئی ہوتی تو ہم اس سے اجازت لیتے "آپ مجھے یہاں کے رہنے والے تو نہیں لگتے۔"

"میں تقریباً سات سال پہلے پشاور آیا تھا" اس نے چھوٹی سی پیالی میں سبز چائے ڈالتے ہوئے کہا "ڈگری میں چھوٹی سی دکان تھی پھر قصہ خوانی بازار میں جگہ مل گئی مگر وہ کرائے کی دکان تھی۔ کچھ جھگڑا پڑ گیا تو میں نے یہ جگہ خرید لی۔ اس سے پہلے میں لاہور میں تھا۔ میرا نام آصف علی ہے۔"

باتوں کے دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی نظر گھوم پھر کر میرے چہرے پر جم جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں کچھ سوچتی لگتی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے ذہنی طور پر حاضر ہونے کے باوجود وہ غیر حاضر ہے۔ وہ بات مجھ سے کر رہا تھا مگر اس کا خیال کہیں اور تھا۔

میں نے الائچی کی خوشبو والی چائے پیتے ہوئے کہا "بات صرف اتنی تھی کہ میں سامنے گرین ہوٹل کی طرف دیکھ رہا تھا....."

وہ بولا "گرین ہوٹل.... ہاں بڑی عجیب واردات ہوئی ہے۔"

"واردات!" میں نے کہا "کیسی واردات آصف علی صاحب؟"

"آپ کو نہیں معلوم۔ پھر آپ کیا دیکھ رہے تھے؟" وہ بولا۔

"میں تو اپنی واقف کو دیکھ رہا تھا۔ ان کی گاڑی نظر آگئی تھی مجھے دوسری طرف" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "میں بھی تمہاری گاڑی دیکھ کر رکی تھی۔"

"ہوٹل سے پولیس کو نکلتے بھی دیکھا تھا میں نے۔"

آصف علی نے چائے کی چسکی لی "ہاں۔ تفتیش تو چلتی رہے گی۔"

میں نے ذرا سی دلچسپی ظاہر کی "ہوا کیا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ اوپر والے کمرے میں کسی مسافر کا قتل ہوگیا ہے۔ وہ ایک ہفتے سے ٹھہرا ہوا تھا۔ کل کوئی شخص جو شکل وصورت سے ہی بدمعاش لگتا تھا، رات کے وقت ہوٹل پہنچا اور اس نے کمرا مانگا۔ کمرا کوئی خالی نہیں تھا چنانچہ منیجر نے معذرت کرلی۔ اس شخص نے ڈبل اور پھر چار گنا کرائے کی آفر کی اور کچھ مشتعل بھی ہوا منیجر کے انکار سے۔ منیجر میرا دوست ہے اور آج میری اس سے بات ہوئی تو اس نے کہا وہ عجیب پاگل آدمی تھا۔ میں نے کہا کہ جناب کمرا ہوتا تو میں انکار ہی کیوں کرتا۔ یہ ہوٹل ہم نے اس لیے تو نہیں کھولا ہے کہ کمرے خالی پڑے رہیں اور مسافر لوٹ جائیں۔ کرایہ تو ہم نے ایک پیسہ زیادہ نہ کبھی لیا ہے نہ لیں گے۔ آپ فردوسی ہوٹل میں دیکھ لیں۔ اس وقت تو وہ شخص چلا گیا....."

وہ اچانک خاموش ہوگیا اور اس کی نظریں جو خلا میں دیکھتی محسوس ہوئی تھیں پھر میرے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ وہ بات بھی ایسے کر رہا تھا جیسے کوئی بہت پرانا واقعہ سنا رہا ہو اور تفصیلات دہراتے ہوئے اسے یادداشت پر بھروسا نہ ہو۔ وہ کچھ سوچنے لگتا تھا اور جملوں کے درمیان وقفہ آجاتا تھا۔ اس کی یہ ذہنی کیفیت رابعہ نے بھی نوٹ کرلی تھی۔

میں نے کہا "کیا بات ہے آصف علی صاحب....؟"

"بات.... ہاں بات تو میں ہی بتا رہا تھا" وہ چونکا "قتل تو ہوتے رہتے ہیں یہاں۔ دشمنی میں یا ڈکیتی میں قتل کردینا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ کبھی جانی گر یہ معاملہ کچھ اور تھا۔ منیجر بے چارہ خواہ مخواہ پھنس گیا ہے۔ وہ پولیس کو کیا بتائے۔ وہ شخص ٹیکسی کار میں آیا تھا۔"

اب میرے چونکنے کی باری تھی "ڈاج! اس نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ نام بتانے کی ضرورت ہی کہاں پیش آئی۔ اسے کمرا ملتا تو وہ نام لکھواتا۔" آصف علی نے کہا "وہ تو منیجر کے انکار پر خاصا مشتعل ہوکے چلا گیا تھا۔ بعد میں پھر آیا اور کہنے لگا کہ شرافت علی نقوی نام کا کوئی شخص ٹھہرا ہوا ہے یہاں۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ اسے تم نے کمرا دے دیا اور مجھے انکار کر رہے ہو۔ منیجر نے پھر وضاحت کی کہ وہ کمرا تو بک کرایا تھا آفریدی صاحب نے مگر وہ پہنچے نہیں تو نقوی صاحب کو دے دیا گیا۔ اب یہ اتفاق ہے کہ اسی وقت آفریدی صاحب آگئے لیکن انہوں نے آپس میں ڈبل روم شیئر کرنے کا فیصلہ کرلیا۔"

میں نے کہا "اس شخص کا حلیہ تو یاد ہوگا منیجر کو۔"

"ہاں۔ کالا حبشی تھا۔ منہ پر چیچک کے داغ، لمبا چوڑا ڈیل ڈول" آصف علی نے بتایا۔ "کانوں میں پیتل کی مندریاں۔ چھوٹے چھوٹے سخت برش جیسے بال گھنگھریالے..."

رابعہ نے میز کے نیچے میرا پیر دبایا اور مجھے بولنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"آپ جانتے ہیں اسے؟" آصف علی نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے نظر آیا تھا اس جیسا ایک شخص۔ وہ بابا ہودا نامی کراچی کا بدمعاش ہے" میں نے کہا "میں اسے یہاں دیکھ کے حیران ہوا تھا۔"

"پھر آپ پولیس کو ضرور بتائیں۔ منیجر سے مل لیں پہلے۔"

"مل لوں گا۔ آپ مجھے باقی بات بھی بتا دیں" میں نے کہا۔

"منیجر نے اسے دوبارہ انکار کیا تو وہ کہنے لگا کہ میرا ساتھی یہاں ہے میں کہاں جاؤں۔ فردوسی ہوٹل میں بھی جگہ نہیں ہے۔ تم آفریدی کو اس کمرے سے نکالو اور مجھے وہاں جگہ دو۔ پاگل کا بچہ۔ منیجر کیسے مان لیتا یہ بات۔ اس نے کہا کہ "یہ ناممکن ہے میرے لیے۔" پھر وہ ضد ہوا کہ اچھا ساتھ والے سے بات کرو۔ آفریدی اور نقوی ایک کمرے میں ٹھہر سکتے ہیں تو میں بھی کسی کے ساتھ ایک رات گزار سکتا ہوں۔ منیجر پریشان ہوگیا تھا۔ اس نے کہا میں ساتھ والے کسی کمرے کے مسافر سے خود جاکر نہیں کہہ سکتا کہ آپ کسی اور کو ساتھ رکھ لیں۔ تم خود نمبر ملاؤ اور بات کرلو لیکن ہوٹل کی کوئی ذمے داری نہیں اور میرا حوالہ بھی مت دینا۔ کہ منیجر نے کہا تھا میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے اپنے کمرے میں گیا اور اس شخص نے فون پر نہ جانے کیا کہا کہ گیارہ نمبر کمرے والا مان گیا۔ چودہ نمبر میں اس کا ساتھی شرافت علی نقوی اور آفریدی مقیم تھے۔ ظاہر ہے اس کے بعد منیجر کیا کرتا۔ اس نے تو اپنا جان چھڑائی تھی لیکن اس شخص نے سو روپے دیے منیجر کو اور کہا کہ آج کے اخراجات میرے۔ منیجر نے سو روپے جیب میں ڈال لیے۔ گیارہ نمبر والا تو ایڈوانس دے چکا تھا ایک ہفتے کا۔ بہت بڑی غلطی کی منیجر نے اس شخص کی بات مان کے۔ اسے چاہیے تھا کہ اپنا صاف انکار کرتا اور کسی سے بات بھی نہ کرنے دیتا۔ اسی کا خمیازہ بھگتا بعد میں اس نے۔ گیارہ نمبر والے کا مہمان تو نہ جانے کب چلا گیا۔ رات والے منیجر کی ڈیوٹی صبح آٹھ بجے ختم ہوگئی تھی۔ دوسرا جو اس کی جگہ آیا اسے کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ نو بجے ویٹر ناشتا لے کر گیا۔ گیارہ نمبر والا ہر روز اسی وقت ناشتا طلب کرتا تھا۔ ویٹر نے کمرا کھلا دیکھا اور منیجر کو اطلاع دی کہ گیارہ نمبر والا فوت ہوگیا ہے۔ بعد میں پولیس نے قتل کا مقدمہ بنا دیا کیونکہ اسے گلا گھونٹ کے مارا گیا تھا۔"

"کیوں؟" میں نے بے اختیار کہا "میرا مطلب ہے کہ اس اجنبی کو کیسے اس نے جگہ دی تھی....."

"آپ تو جانتے ہوں گے اس بدمعاش کا نام۔"

"ہاں۔ استاد پیڈرو کہلاتا ہے وہ" میں نے کہا "کیا استاد پیڈرو اس کو قتل کرنے آیا تھا؟"

"یہ تو پولیس ابھی سے معلوم کرے گی" آصف علی بولا "یہ تو بڑا پُراسرار معاملہ ہے۔ گیارہ نمبر میں قتل ہونے والے شخص کے پاس کافی بڑی رقم تھی۔ وہ موجود تھی جس کا مطلب ہے کہ قتل لوٹ مار کی وجہ سے نہیں ہوا تھا بلکہ کوئی اور بات تھی۔ وہ دونوں بھی ضرور ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے ورنہ ایک اجنبی کو عام حالات میں کوئی اپنے کمرے میں نہیں ٹھہرا سکتا۔"

"تو شرافت علی نقوی کو بھی جانتا تھا؟"

"ہاں۔ اور اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ گیارہ نمبر والا اور شرافت علی نقوی بھی ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے۔ یہ نقوی بھی جب ہوٹل میں آیا تو ڈرائیور کی وردی میں تھا مگر ڈرائیور لگتا نہیں تھا۔ یہ خود منیجر نے بتایا مجھے کہ اس نے آفریدی سے بڑی شائستگی سے بات کی تھی۔ وہ دونوں کراچی سے آئے تھے۔ ہے نا پُراسرار معاملہ؟"

میں نے کریدنے کے لیے کہا "مجھے تو اس میں کوئی خاص پُراسرار بات نظر نہیں آئی۔"

"یہ پُراسرار معاملہ اس لیے زیادہ پُراسرار ہوتا جارہا ہے کہ صبح پہلے تو شرافت علی نقوی گیا۔ وہ ڈرائیور تھا مگر کسی گاڑی میں نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر بعد آفریدی اپنی اسٹیشن ویگن میں ڈینز ہوٹل گیا اور وہاں کسی نے اس کی گاڑی میں بم رکھ دیا۔ وہ دھماکے سے ہلاک ہوگیا۔"

میں نے سر ہلایا "واقعی۔ بہت عجیب اسٹوری ہے۔"

"پولیس ان چاروں کے درمیان تعلق تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے" آصف علی نے کہا "وہ کیا نام بتایا تھا آپ نے۔ استاد پیڈرو۔ اور نقوی کے درمیان کس قسم کا تعلق تھا؟ اور کیا آفریدی کے قتل کا تعلق گیارہ نمبر میں مارے جانے والے شخص سے بھی تھا؟"

میں نے کہا "دنیا میں تو قتل و خونریزی بہت بڑھ گئی ہے۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔"

"آپ پولیس سے رابطہ کرلیں" اس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے فون کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا "کیوں نہ پہلے میں گرین ہوٹل کے منیجر سے مل لوں۔ وہ خود بلالے گا متعلقہ تھانے سے کسی کو۔ جو بھی تفتیش پر مامور ہوگا۔ میں اپنا بیان لکھوا دوں گا۔ اور بیان کیا ہے میرا۔ میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ استاد پیڈرو کون ہے۔ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ ہوٹل میں قتل کی واردات کرنے والا بھی وہی تھا۔"

"مگر آپ نے اسے پشاور میں دیکھا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ استاد پیڈرو ہی تھا" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "بہت دیر ہوگئی باتوں میں۔ یہ آپ پیسے تو لے لیں۔"

"یہ رہنے دیں" اس نے مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "میری طرف سے....."

میں نے کہا "یہ ناممکن ہے۔"

اس نے اصرار کیا "آپ کو جو ذہنی کوفت ہوئی اس کے بدلے...."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "وہ معمولی بات تھی۔ آپ نے معذرت کرلی اور بات ختم ہوگئی۔ اب آپ نے قیمت نہ لی تو میں سوٹ نہیں لوں گا۔"

اس نے مجبوراً تین سو روپے رکھ لیے "آپ نے نام نہیں بتایا

www.paksociety.com

مجھے ابھی تک۔ یہاں کے رہنے والے تو نہیں لگتے آپ۔"

میں نے کہا "میرا نام عبدالودود مظفر ہے۔ میں اور میری وائف رابعہ لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے ہیں۔ ایک کام سے خیبر ایجنسی کے علاقے میں جانا تھا۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے کل تک کے لیے ریسٹ ہاؤس میں جگہ دے دی ہے۔"

"کوئی قانونی معاملہ ہوگا؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے' غیر علاقے میں سیر کرنے کون جا سکتا ہے؟"

"کون سے ریسٹ ہاؤس میں ہیں آپ؟"

"یونیورسٹی سے آگے" میں نے کہا۔

وہ ہمیں چھوڑنے باہر تک آیا۔ اس نے اپنے تند مزاج بیٹے کو بھی مجبور کیا کہ وہ ہم سے "سوری" کہے اور ہاتھ ملائے۔

"آپ کی وائف کے پاس اتنی شاندار گاڑی تھی پھر آپ نے یہ کرائے کی کار کیوں لی؟" آصف علی بولا۔

"کرائے کی کار......"

"ہاں۔ یہ گاڑی تو پشاور کی ہے۔ میں جانتا ہوں اس بڈھے کو۔"

میں نے کہا "وہ دراصل...... ہماری گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ اسے اب رخصت کرنا چاہئے بیگم۔ سو روپے دے دو اسے۔"

رابعہ نے تعمیل کی اور ڈرائیور نے سو روپے لے کر پوچھا "کل ہمارا ضرورت ہے تو ہم آجائے؟"

میں نے کہا "نہیں' ہماری گاڑی ٹھیک ہو گئی ہے۔"

ڈرائیور کے چلے جانے کے بعد میں نے بھی آصف علی سے اجازت چاہی "ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی' واپسی پر۔"

وہ بولا "ابھی آپ پولیس کے پاس نہیں جائیں گے؟"

"ابھی تو نہیں۔ کل ہمیں خیبر ایجنسی کے علاقے میں جانا ہے۔ مجھے تو جگہ کا بھی علم نہیں۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے سب بندوبست کیا ہے اور یہ پولیس کے معاملات ہوتے ہیں کچھ فرصت طلب۔ یہ لوگ ناک کو سیدھا نہیں پکڑتے' اس لیے ہر شریف آدمی گواہی سے بھی ڈرتا ہے۔"

اس نے فقط سر ہلایا اور ہماری روانگی کے بعد بھی کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔

رابعہ ایک دم پھٹ پڑی "آخر آپ اتنے عقل مند کیوں واقع ہوئے ہیں؟"

میں نے انکساری سے کہا "سب اللہ کی دین ہے۔ اس نے آپ کے حصے کی عقل بھی مجھے دے دی اور پھر آپ کو میرے سپرد کر دیا۔"

"خاک ڈالیے۔ میں کہتی ہوں کیا یہ سب ضروری تھا؟ تمہیں کیا ضرورت تھی استاد پیڈرو کا نام لینے کی؟"

"پھر کس کا نام لیتا؟ تمہارا؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے" رابعہ کا غصہ کم نہیں ہوا۔

"وہ تو آدمی نکاح کے وقت بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ سب پوچھ پوچھ جاتے ہیں کہ بولو' قبول کیا۔"

"سکندر! اس نے ہماری گاڑی کا نمبر نوٹ کرلیا ہوگا۔ وہ شک میں پڑ گیا تھا۔ تم نے یہ بھی بتادیا کہ ہم کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اب وہ آجائے گا پولیس کے ساتھ۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس نے تمہیں بھی پہچان لیا ہے کہ تم ہی شرافت علی نقوی کے نام سے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ایسے ہو سکتا ہے عبدالودود مظفر صاحب کہ ہوٹل کا منیجر آصف علی کا دوست ہے۔ اس نے پیڈرو کا حلیہ بتایا تھا تو شرافت علی نقوی کا بھی بتایا ہوگا۔ دیکھا نہیں وہ تمہیں کیسے گھور رہا تھا۔"

"پھر تم کو میری نظر اتارنی چاہیے۔"

"وہ تو پولیس اتارے گی" رابعہ جل کے بولی "جب معلوم ہوگا کہ نہ آپ شرافت علی نقوی ہیں' نہ عبدالودود مظفر بلکہ سکندر بخت ہیں۔"

"اور کبیر خاں بھی" میں نے اسے یاد دلایا۔

"تم سے بات کرنا بھی فضول ہے" اب وہ سچ مچ ناراض ہو گئی۔

میں نے کہا "خدا کا شکر ہے۔ تم روٹھے ہم چھوٹے۔ شاید اپنی بات کہہ گیا مگر کہنا یہ تھا بقول فلمی شاعر' تم روٹھی رہو میں مناتا رہوں۔ میں تو سمجھتا تھا تمہیں روٹھنا آتا ہی نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی مزہ نہیں جب تک روٹھنا منانا نہ ہو۔ نہ جانے کس کافر نے کہا ہے کہ بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کے۔ بیچ میں کم سے کم ایک بار تو ایسا ہونا ہی چاہیے۔"

"سکندر! اگر تم چپ نہ ہوئے تو میں گاڑی مار دوں گی کہیں۔"

"ضرور مار دو۔ گاڑی کون سی میرے باپ کی ہے۔ وقار یوسف کے باپ کی بھی نہیں۔ اس کے سسر کی ہے۔ وہ تو بہت خوش ہوگا کہ چلو کسی نے تو اس کا خانہ خراب کیا۔ ویسے تمہیں کوئی جگہ نظر آرہی ہے ایسی جہاں اس وقت گاڑی مارنے سے نقصان کم ہو اور کار تباہ ہو' کسی کی گاڑی تباہ نہ ہو' کسی گھر کی دیوار نہ ٹوٹے۔ کھمبے بھی سرکاری ہیں اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچانا بھی جرم ہے۔ کہو تو میں اتر کے سامنے کھڑا ہو جاؤں۔ میرا کیا ہے' پرایا دھن ہوں۔ لنگڑا لولا یا معذور ہو کے بھی رہوں گا تمہارا ہی۔ بس لوگ کہیں گے کہ رب نے کیا خوب بنائی ہے جوڑی۔"

بالآخر رابعہ کے لیے ضبط کرنا مشکل ہو گیا "سچ بہت ذلیل ہو تم۔"

"سچ!" میں نے خوشی سے بے قابو ہو کے ہاتھ آگے بڑھایا۔

رابعہ چلائی "اے سکندر' ہوش میں رہو۔"

گاڑی تھوڑا سا لہرائی اور دو درمیان کی گرین...

جو کچھ رابعہ نے بعد میں کہا وہ ہر عاشق جانباز کو سننا پڑتا ہے۔

تندیٔ باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب۔ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے۔ جب ہم ریسٹ ہاؤس پہنچے تو عقاب خاصا اونچا اڑ رہا تھا۔

کاجل بہت پریشان بیٹھی تھی۔ رات ہوتے ہی ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا اور تاریکی میں ریسٹ ہاؤس کسی ویران' آسیب زدہ گھر کی طرح لگ رہا تھا۔ ملازم نے ہمارے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں لوٹ آنے کی اطلاع دی تھی مگر ہم واپس آئے تھے تین گھنٹے بعد اور یہ وقت خوف زدہ کاجل نے بیگم کے ساتھ اپنے کمرے میں بند ہو کے گزارا تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے تم لوگ؟ جانا تھا تو ہمیں بھی لے جاتے" کاجل نے برہمی سے کہا "ایسا کون سا ضروری کام تھا؟"

میں نے کہا "ہمیں اچانک خیال آیا کہ ہماری گاڑی تو رہ ہی گئی۔ وقار یوسف کو کیا جواب دیں گے۔ اس کی بیوی تو تہمت لگائے گی اسے کہ کیسے لوگوں کو دے دی تھی میرے ابا کی گاڑی۔"

رابعہ نے کہا "ڈرنے کی یہاں کون سی بات تھی؟ یہ سرکاری ریسٹ ہاؤس ہے' اور کون آسکتا ہے یہاں؟"

میں نے سر ہلایا "ہاں۔ کسی کو کیا معلوم کہ ہم یہاں تشریف رکھتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے میں نے وہ گاڑی دیکھی تھی۔ وہی سفید رنگ کی ٹویوٹا زارنٹ" کاجل نے کہا۔

اب مجھے سنجیدہ ہونا پڑا "کیسے اندازہ ہوا تمہیں..... میرا مطلب ہے کہ ویسی گاڑیاں تو بہت ہیں۔ تم نے نمبر دیکھا تھا یا کسی کی صورت دیکھ کے شبہ ہوا تھا؟"

کاجل نے نفی میں سر ہلایا "وہ گاڑی یہیں پھر رہی تھی۔ میں نے ایک بار نہیں' تین بار دیکھا ہے۔ دور سے نمبر کیسے دیکھتی؟"

"کیا پتا وہ یونیورسٹی ٹاؤن میں رہنے والے کسی شریف آدمی کی گاڑی ہو اور آس پاس ہی کوٹھی ہو اس کی۔ تمہیں صورت دیکھنی چاہیے تھی" میں کاجل کی بات سے تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

رابعہ نے کچھ سوچ کر کہا "سکندر' کیوں نہ ہم رات بھر کے لیے کہیں شفٹ ہو جائیں۔"

"کہاں شفٹ ہو جائیں؟ ہوٹل سب سے آسان ٹارگٹ ہوتے ہیں جہاں کسی کو آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے" میں نے کہا۔

"مجھے شک ہے کہ رات کو آصف علی خود آجائے گا یا وہ اپنے لاسٹ ہوٹل کے منیجر کو سب بتا دے گا اور وہ پولیس کے ساتھ پہنچ جائے گا" رابعہ نے کہا۔

"تھوڑے سے اعتماد کی ضرورت ہے" میں نے کہا "پولیس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہم نے یہی کہا ہے ناں کہ استاد پیڈرو نظر آیا تھا۔ تم کو کمرے میں نے دیکھا تھا۔ اس کا نام پتا' ولدیت سب کیا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر تم بیان پر دستخط بھی کر دو تو کیا ہے۔ پیڈرو کی مشکل میں پڑے گا نا۔ پولیس خود تصدیق کرلے گی کہ تمہارا بیان غلط نہیں تھا۔ وہ تمہیں یہاں تفتیش کے لیے نہیں روک سکتے۔ صرف اس وجہ سے کہ تم نے اتفاق سے پیڈرو کو دیکھ لیا تھا۔ دوسری طرف یہی اتفاق ثابت کرے گا کہ تم پشاور میں تھیں۔"

"اور میرے ساتھ کون تھا؟" رابعہ نے طنز سے کہا۔

"پھول کے ساتھ خوشبو۔ چاند کے ساتھ چکور۔ بھینس کے ساتھ عقل اور الو کے ساتھ اس کی دم" میں نے کہا "تمہارے ساتھ میں۔"

"میں یعنی عبدالودود مظفر یا شرافت علی نقوی......"

"کچھ نہیں۔ کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ میں نے اپنا نام غلط بتایا تھا۔ میں تو صاف مکر جاؤں گا کہ میرا کیا کام گرین ہوٹل میں اور میں کیوں پہنوں گا خاکی وردی۔"

رابعہ بولی "سکندر! آصف علی کی نظریں دیکھی تھیں تم نے؟"

"ہاں۔ مجھے کچھ یوں لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے یا پوچھنا چاہتا ہے مگر تذبذب کا شکار ہے۔ جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو اور اسے یاد نہ آرہا ہو کہ مجھے کب اور کہاں دیکھا تھا۔"

"کیا یہ خطرے کی بات نہیں؟ خیر سے تمہاری تصویریں چھپتی رہی ہیں اخبارات میں" رابعہ بولی "شیطان کی طرح شہرت رکھتے ہو تم بھی۔ بلکہ اسے پہچاننے والے کم ہیں' تمہیں ہر جگہ پہچان جاتے ہیں لوگ۔"

میری بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ باہر ایک گاڑی کا ہارن سنائی دیا پھر گاڑی اندر آگئی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا۔

"وہی گاڑی ہے؟" کاجل نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ شاید کوئی ریسٹ ہاؤس میں آیا ہے۔"

"اس وقت کون آسکتا ہے؟"

"سرکاری افسران کو وقت کا پابند کون کر سکتا ہے۔ وہ یہاں قیام کے لیے کسی بھی وقت آسکتے ہیں" میں نے کہا "ابھی تو ایک کمرہ خالی ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ دوسرا بھی آگیا تو ہم ہوں گے باہر۔"

ریسٹ ہاؤس کا ملازم دروازے پر دستک دے کر اندر آیا۔ "کوئی آصف علی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں سر۔"

رابعہ نے میری طرف دیکھا۔ بغیر کہے اس نے کہہ دیا کہ میں نہ کہتی تھی وہ آئے گا۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے کہا "اکیلا ہے یا کوئی اور بھی ہے اس کے ساتھ؟"

"اکیلا ہے سر" ملازم نے جواب دیا "کہتا ہے بیٹھوں گا نہیں۔ ایک منٹ کے لیے آپ باہر آجائیں۔"

میں نے سر ہلایا اور اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ گیٹ کے اندر گاڑی کے ساتھ ہی آصف علی ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اپنے سفید بالوں اور نفاست سے تراشی ہوئی سفید داڑھی کے ... تھا اس کی

www.paksociety.com

شخصیت بڑی پُر وقار لگ رہی تھی۔ اُس کی صحت بھی بہت اچھی تھی۔

"معاف کرنا... میں پیچھے پیچھے چلا آیا۔ دراصل ایک بات پوچھنا چاہتا تھا میں" اس نے ہاتھ ملا کے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "وہاں اتنی دیر بات ہوئی مگر میں سوچتا رہ گیا۔ تمہارے نام کی وجہ سے ہمت نہیں پڑی میری ورنہ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ تم وہی ہو۔"

"وہی کون؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"وزیر خاں کے بیٹے..... کبیر خان" اس نے ایک ہاتھ پیشانی پر رکھا "بالکل وہی ناک نقشہ' وہی چہرہ۔ بہت پرانی بات ہے لیکن مجھے یاد ہے... پندرہ سال بعد تم وہی لگتے ہو۔ تمہیں دیکھتے ہی پہچان لینا چاہیے تھا مجھے۔ شک کی کون سی بات تھی مگر میں سوچتا رہا کہ کہیں تم اس کے ہم شکل تو نہیں ہو۔"

"آصف علی صاحب! آپ کون ہیں؟" میں نے ابتدائی صدمے سے سنبھل جانے کے بعد محتاط لہجے میں کہا۔

"میں..... بتا دوں گا میں بھی کہ میں کون بدبخت ہوں" اس نے ایک گہری سانس لی "پہلے تم کہو کہ میرا یقین بے بنیاد نہیں ہے' اگر تم کوئی اور ہو جس کی صورت ملتی ہے کبیر خاں سے... تو پھر میں چلا جاتا ہوں... وزیر خاں کا تو ایک ہی بیٹا باقی بچا تھا اور اُس کا نام عبدالودود مظفر نہیں' کبیر خاں تھا وہ کہتا تھا آصف علی' اسے میں پڑھنے کے لیے ولایت بھیجوں گا۔ اور مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ ایسا ہی کیا تھا انہوں نے۔"

اب میرے لیے اپنی شناخت کو چھپائے رکھنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے سکندر بخت کی حیثیت سے نہیں جانتا جو ایم آر ایس جیسی تنظیم کے حوالے سے وطن دشمنوں کے لیے شامت اعمال کا دوسرا نام ہے۔ ضمیر فروش غداروں کے لیے موت کا پیغام ہے اور قانون شکن عناصر کے لیے حلقۂ دام ہے۔ شاید اسے نہ سیاست سے دلچسپی تھی اور نہ ہی ان حالات سے جن کی ایک تصویر اخبارات کی شہ سرخیوں میں نظر آتی تھی تو ہر پاکستانی سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ کیا واقعی ہم عدم استحکام اور بے یقینی کی اس منزل کی جانب رواں دواں ہیں جہاں "اتحاد' تنظیم' یقین محکم" کے اصول محض سیاسی نعرے' کھوکھلے الفاظ اور ہمارے قومی کردار میں منافقت کی تصویر بن جائیں گے۔"

آصف علی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "تم کبیر خاں ہی ہو۔ میں سمجھ گیا' تمہاری خاموشی میرے یقین کی تائید کرتی ہے لیکن مجھے پہچان لینے کے بعد تم مجھ سے بات بھی نہیں کرنا چاہتے۔ تم میری صورت دیکھنے کے روادار بھی نہیں ہو۔ تم چاہتے ہو کہ میں دفع ہو جاؤں اور پھر کبھی تمہارے سامنے نہ آؤں۔ میں چلا جاتا ہوں....."

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ میرے بزرگ ہیں اور میرے لیے لائق صد احترام ہیں۔ آپ میرے والد کے پرانے دوست ہوں گے۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں آپ کو نہیں جانتا۔ آپ کے نام سے بھی ناآشنا ہوں۔"

اس نے سر جھکا کے رنجیدہ لہجے میں کہا "یہ تمہاری نہیں میری بدقسمتی ہے۔ میں ملعون اور مردود اسی قابل ہوں کہ تم مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دو۔ مجھے دھتکار دو' ذلیل کر کے..."

"آصف صاحب' اندر آئیں... اور پلیز ایسی باتیں مت کریں کہ میں اپنی نظروں میں رسوا ہو جاؤں۔ میں اتنا ذلیل نہیں ہوں۔ اگر میں نے آپ کو اپنا نام غلط بتایا تھا تو اس کی بھی وجہ تھی۔" میں نے کہا۔

"دیکھو' میں تم سے اکیلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ سب کے سامنے... میرا مطلب ہے تمہاری بیوی کے سامنے میں وہ سب کچھ نہیں کہہ سکوں گا جو میں کہنا چاہتا ہوں" اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ جاتے ہیں۔ میں ملازم سے کہتا ہوں وہ کمرا کھول دے۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ ہم گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔"

میں سوچ میں پڑ گیا "یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"پھر میرے ساتھ چلو۔ میرا گھر یہاں سے تو بہت قریب ہے" اس نے کہا "زیادہ دور نہیں..."

میں نے کہا "آپ سے کیا ڈرنا! آپ میرے والد کے دوست تھے۔"

"نہیں کبیر خاں' میں اس کا دوست نہیں تھا۔ دوست ہوتا تو میرا نام تمہارے لیے اجنبی نہ ہوتا۔ وہ تمہیں میرے بارے میں بھی ضرور بتاتا۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے کبھی کوئی بات مجھ سے نہیں چھپائی۔ جو باتیں مجھے یاد نہیں تھیں" وہ بھی والد ہی بتاتے رہتے تھے۔ ان میں تقسیم ہند سے پہلے کی بہت سی باتیں تھیں۔ میرے بھائی بہن اور رشتے دار' ان کے دوست اور پرانے ساتھی۔ سب ہی کے نام جانتا ہوں میں۔ یہ محض اتفاق ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اتفاق نہیں ہے کبیر خاں' انہوں نے عمداً میرا ذکر نہیں کیا ہو گا۔ ایسا ہی آدمی تھا وہ۔ دوستوں کو یاد رکھتا تھا اور دشمنوں کو بھول جاتا تھا۔ نظر انداز کر دیتا تھا' معاف کر دیتا تھا۔ پہلے میں اس کا دوست تھا مگر میں نے اسے دغا دی۔ میں ایک دشمن ثابت ہوا۔ اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ بس مجھے بھلا دیا۔ میرا نام اپنی زندگی کی کتاب سے کاٹ دیا' خارج کر دیا۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان حالات میں میرا ردعمل کیا ہونا چاہیے۔ میں نے اسے اپنے والد کا دوست سمجھ کے عزت

www.paksociety.com

احترام کے قابل جانا تھا۔ میں ڈرتا بھی تھا اور اس کی باتوں پر اعتبار میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور اب اس اعتراف کے بعد کہ وہ میرے والد کا دشمن تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس سے کیسے نفرت کا اظہار کروں اور کیسے اسے حقائق جانے بغیر رسوا کر کے رخصت کر دوں۔ جب کہ وہ اپنے جرم اپنی شکست اور اپنی ندامت کے ساتھ خود میرے سامنے آگیا تھا۔

میرے لیے یہ بھی مشکل تھا کہ میں اس کی بات نہ سنوں اور اس کو مختصراً اپنا فیصلہ سنا دوں کہ تمہارا جو بھی جرم تھا میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں۔ تم جس کے مجرم تھے وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے اس لیے تم جاؤ اور انتظار کرو یوم حساب کا' جب وہ تمہارے روبرو ہوگا اور عدل مانگے گا۔ میرا تجسس بیدار ہو گیا تھا اور میں اپنے ماضی کے اس باب کو بھی پڑھنا چاہتا تھا جس کے وجود سے میں آج تک بے خبر رہا تھا۔ اس کا جرم جانے بغیر میں یہ وعدہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اسے معاف کر دوں گا۔

"آصف علی۔" میں نے بالآخر فیصلہ کر لیا "اگر تم اپنے ماضی کی کسی غلطی کا اعتراف کرنے آئے ہو تو جرات مندی سے میں تمہیں سب کے سامنے کرو۔ جرم بھی تو سب کے سامنے ہی کیا ہوگا تم نے اور میرے والد کے دوستوں سے اُن کے دشمنوں کی صف میں شامل ہوتے وقت تمہیں بالکل خیال نہیں آیا ہوگا کہ دنیا کیا کہے گی اور کیا سوچے گی۔ اگر تم میرے والد کے دشمن تھے تو میں تمہارے گھر میں قدم رکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہاں آئے ہو تم اپنی مرضی سے' واپس جانا چاہو تو ابھی چلے جاؤ۔ ابھی تم نے کچھ نہیں بتایا ہے' جو بات آج تک کسی کو معلوم نہ تھی کل بھی معلوم نہ ہوگی تو کیا فرق پڑے گا لیکن تمہیں فرق پڑتا ہے تو اندر آکے میرے سامنے اور میری بیوی کے سامنے بتاؤ کہ تم نے کیا کیا تھا۔ اگر تمہیں یہ شرط منظور نہیں تو تم جا سکتے ہو۔"

میں پلٹ کے اندر چلا گیا۔ میں نے ریسٹ ہاؤس کے ملازم سے کہا کہ وہ ملاقاتیوں کے بیٹھنے کا کمرا کھولے اور پھر رابعہ کو بتایا کہ اس وقت آصف علی کے آنے کا مقصد کیا تھا۔ میں پھر باہر آیا تو وہ برآمدے میں کھڑا تھا۔ اُس نے میری شرط قبول کر لی تھی اور اب کچھ پُر اعتماد نظر آرہا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

ملاقاتیوں کا کمرا شاید بند رہتا تھا۔ اس کے صوفے میلے تھے اور میزوں پر گرد تھی۔ چاروں دیواروں پر نصب لائٹس میں سے ایک ٹوٹی ہوئی تھی اور ایک کا بلب فیوز تھا۔ قالین پردوں اور صوفوں کے ڈارک براؤن رنگ کی وجہ سے روشنی کا اجالا بھی بہت ناکافی محسوس ہوتا تھا۔

آصف علی ایک صوفے پر ٹک گیا۔ دوسرے پر میرے ساتھ رابعہ بیٹھ گئی۔ اُس نے کامل سے بھی کہا تھا کہ وہ چاہے تو آجائے مگر اسے ڈپریشن ہو رہا تھا۔ وہ بیزاری اور چڑچڑے پن کا شکار تھی اور کلیم اللہ کے سو جانے کے بعد خود بھی آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ میری باتوں نے اس کے جذباتی حصار کی بنیادیں ہلا دی تھیں اور وہ ایک بار پھر محرومی کا زخم کھا کے اپنے دکھ سے سمجھوتا کرنے میں مصروف تھی اور احساسِ مجبوری کے درد کو صبر کی اسپرین سے دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

آصف علی دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں ملتا رہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کہاں سے شروع کروں۔"

"اگر اختصار سے کام لینا مشکل ہے آپ کے لیے تو آپ تفصیل سے بتا دیں' ہم پوری رات دے سکتے ہیں آپ کو" میں نے کہا۔

"مشکل اب محسوس ہو رہا ہے' جب میں فیصلہ کر کے تمہارے سامنے آگیا ہوں" وہ بولا "پہلے یہ فیصلہ مشکل لگتا تھا۔ اب الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ وزیر خان ہوتا تو شاید میرے لیے بہت آسان ہوتا کہ میں اس کے پاؤں پکڑ لوں۔ اپنا جوتا اتار کے اسے دے دوں اور سر جھکا کے کہوں کہ مجھے مارو مگر تم کبیر خان ہو۔ میرے سامنے تم بچے تھے' آج بھی بچے ہو۔ میرے یہ سفید بال دیکھ رہے ہو نا! میرا کاروبار بھی دیکھا تم نے۔ میری گاڑی کتنی شاندار ہے اور میری کوٹھی دیکھ کے بھی راہ چلتے لوگوں کی آنکھوں میں توصیف و تعریف کے جذبات نظر آتے ہیں لیکن یہ صرف میں دیکھ سکتا ہوں کہ ان سفید بالوں کے باوجود میں روسیاہ ہوں؟ یہ سب شان و شوکت جس کا میں مالک ہوں اور جس پر میری اولاد غرور کرتی ہے۔ میری یہ عزت اور میرا یہ سماجی مرتبہ سب دھوکے' فریب کی لعنتی کمائی ہے۔ میرا اس پر کوئی حق نہیں۔ اس کا احساس مجھے اب ہونے لگا ہے جب زندگی کے راستے کا اختتام نظر آنے لگا ہے اور اس راستے کے آخر میں مجھے اپنی قبر دکھائی دینے لگی ہے۔ اپنی عقل کی عیاری اور اپنی کامیابی کا سارا غرور اب میرا خوف بن گیا ہے کیونکہ انجام قریب ہے اور آصف علی تیموری ایک مشتِ خاک اپنی مٹی کی قیمت جان گیا ہے۔ میں اپنا کتبہ پڑھ سکتا ہوں۔ سب کتبے ایک سے ہوتے ہیں۔ فلاں بن فلاں کا بیٹا تھا' پیدا ہوا اور مر گیا۔ تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات' انا للہ خیر صلا۔ اس نے کیا کیا' کتنے جھوٹ بولے' کتنے دل دکھائے' کتنے کاروبار کھڑے کیے اور مرا تو اُس کا بینک بیلنس کیا تھا۔ اُس کی کتنی کوٹھیاں اور کاریں تھیں اور اس نے کیسے حاصل کی تھیں۔ ذاتی محنت سے یا حرام کی کمائی سے۔ یہ سب کتبے پر نہیں لکھا جاتا مگر ایک کتاب ہے جس میں تمام عمر کا حساب ایک ایک لمحے کے نفع نقصان کی تفصیل کے ساتھ درج ہوتا ہے۔ میں کب سوچتا تھا اس کے بارے میں؟ نامۂ اعمال اور یوم حشر پر میرا اعتقاد عملاً کیا تھا؟ محض ایک عقیدہ جو ورثے میں ملا تھا۔ میری شکل و صورت عادات و اطوار کی طرح۔ میں نے کبھی عقل کو زحمت نہیں دی تھی کہ عقائد کی حقیقت کو سمجھے۔ اس وقت عقل دنیا کے کاروبار میں زیاں میں صرف ہو رہی تھی۔ خیر' یہ تو عمر کا فلسفہ ہے جو عمر کے ساتھ ہی سمجھ میں آتا ہے۔ وزیر خان سے میں اس وقت ملا تھا جب وہ لاہور میں قدم جما چکا تھا۔ میں بھی لٹ لٹا کے اکیلا پاکستان پہنچا تھا۔"

میں نے کہا "آپ کے گھر والے۔ والدین' بیوی بچے؟"

"والدین نے حالات کو دیکھتے ہوئے شادی کر دی تھی" آصف علی نے کہا "وہ میری چچا زاد بہن تھی اور اس زمانے کے دستور کے مطابق مجھ سے بچپن میں منسوب کر دی گئی تھی۔ ہم ایک قافلے کے ساتھ پاکستان کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں دو جگہ قافلے پر حملہ ہوا۔ پہلے حملے میں مردوں نے مقابلہ کیا اور آدھے سے زیادہ کام آئے۔ مرنے والے دوسروں کو اپنی عزت و آبرو کا امین بنا گئے تھے۔ یہ بڑا مشکل کام تھا۔ سب کو اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ کسی اور کا بوجھ کون اٹھاتا۔ ماں باپ کے لیے اُن کا بڑھاپا ہی بوجھ تھا۔ وہ راستے کی صعوبتوں کو بھی برداشت کر رہے تھے۔ پہلے حملے میں وہ زر و مال کی حفاظت کرتے ہوئے زخمی ہو گئے تھے۔ علاج میسر نہ آنے کے باعث ہزاروں لوگوں کی طرح راستے میں ہی دم توڑ گئے اور ہم نے انہیں وہیں دفن کر دیا۔ دوسرا حملہ زیادہ منظم تھا اور رات کو اس وقت ہوا تھا جب قافلے والے نڈھال پڑے سو رہے تھے۔ وہ چن چن کے جوان عورتوں کو لے گئے۔ مقابلہ کرنے کی کسی میں ہمت ہی نہ تھی۔ جنہوں نے مزاحمت کی' وہ مارے گئے۔"

وہ خاموش ہو گیا اور نظریں فرش پر جما کے اپنے ماضی کے کسی نقش سے نظریں چرانے لگا۔ ندامت کی تحریر اُس کے چہرے پر بڑی واضح تھی اور اس کی آنکھوں میں اس بے آبروئی کا عکس اتر آیا تھا جب اُس نے اپنی جان بچانے کے لیے عزت گنوانا منظور کر لیا تھا۔ ایک خود غرض اور بزدل' بے غیرت اور بے ضمیر آدمی بھی موت کی منزل پر پہنچ کے اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا ورنہ اس اعترافِ جرم کی کیا ضرورت تھی۔

"تمہارا خیال ہے کہ تم نے اپنی بیوی کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا ہوگا؟" میں نے بے رحمی سے سوال کیا "تم نے اس عورت کی مدد کی پکار کیا سنی نہیں ہوگی جس نے بچپن سے تمہیں اپنا سب کچھ سمجھ رکھا تھا۔ محافظ و مالک' سرتاج اور مجازی خدا۔ اپنی زندگی کو تم نے ایک پلڑے میں رکھا ہوگا اور اپنے عہد وفا کو دوسرے پلڑے میں' تو تمہیں وفاداری کے لیے جان دینا حماقت محسوس ہوا ہوگا۔ جان ہے تو جہان ہے اور جہان میں تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی کا معاملہ ہے۔ دوسری عورت اور تیسری یا چوتھی بیوی سب مل جاتی ہیں۔"

اُس نے سرد مہری کے باوجود پیشانی سے پسینہ صاف کیا "تم نے ٹھیک اندازہ کیا۔ یہ بات تو میں نے وزیر خان سے بھی چھپائی تھی۔"

"تم جیسا شخص ہی ایسا کر سکتا تھا۔" میں نے کہا "جو کسی کو دوست کہے اور پھر اُس کی پیٹھ میں خنجر بھی گھونپ سکے۔"

اُس نے سر جھکا لیا "ہاں۔ میں ایسا ہی تھا' بزدل اور بے ضمیر۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں شادی سے انکار کر سکتا۔ وہ بھی مجھے پسند نہ تھی' یہ بات میں کہہ دیتا تو..... تو شاید اس عورت کے حق میں بہتر ہوتا۔ اسے کوئی اور مرد اپنی شریک حیات بنا لیتا جو اتنا باہمت ضرور ہوتا کہ مردانگی کے نام پر داغ نہ آنے دیتا۔ اسے دل و جان سے چاہتا یا نہ چاہتا۔ اغوا ہونے سے ضرور بچا لیتا۔ اغوا عورت کبھی نہیں ہوتی' مرد کی عزت اغوا ہوتی ہے۔"

"بہت دیر میں جاگا تمہارا احساس۔ جب کرنے کو کچھ بھی نہ رہا۔" میں نے کہا۔ "خیر چھوڑو اس قصے کو۔ وزیر خان کے ساتھ تم نے کیا دھوکا کیا تھا؟"

"اُن دنوں لاہور بھی آج کا لاہور نہیں تھا۔ وہ بھی ایک اُجڑا دیار تھا۔" آصف علی کچھ دیر بعد بولا "لوٹ مار اور آتش زنی کا دور گزر چکا تھا۔ لٹے پٹے مہاجروں کا ریلا مسلسل یلغار کر رہا تھا اور لاہور کے جیالوں نے ان مصیبت زدہ لوگوں کے لیے گھروں کے اور دلوں کے دروازے کھول دیے تھے پھر آہستہ آہستہ زندگی معمول پر آنے لگی۔ لوگ کاروبارِ حیات میں مصروف ہونے لگے اور جو محنت کر سکتے تھے انہوں نے ماضی کو بھلا کے اپنے اور وطن کے بہتر مستقبل کے لیے جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ انہی میں وزیر خان بھی شامل تھا۔ جس نے خاصی محنت سے ایک فونڈری قائم کی تھی۔ اب میں نے یہ سب کچھ بتا دیا ہے تو یہ بھی بتا دوں کہ جب وزیر خان محنت کر رہا تھا تو میں لوٹ مار میں مصروف تھا۔ میں نے چند سکھوں کے مکانوں اور دکانوں کے تالے توڑے اور جو ہاتھ لگا سمیٹ لیا پھر ایک بار پکڑا گیا اور پولیس نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا سوائے اس کے جو میں نے ایک جگہ دبا کر رکھا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ مر جاؤں گا مگر اس کا پتا نہیں بتاؤں گا۔ حوالات میں وہ میری کھال کھینچتے تھے اور میں بھی اکڑ رہا تھا۔ بالآخر میں خون اگلنے لگا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ اب اس کے پاس کچھ نہیں رہا۔ وہ مجھے اسپتال میں پھینک گئے اور ڈاکٹروں نے مجھے مرنے سے بچا لیا۔ ٹھیک ہونے کے بعد میں نے لوٹ کا باقی مال نکالا اور سوچنے لگا کہ اب اس سے کوئی کاروبار شروع کرنا چاہیے۔ انہی دنوں اتفاق سے میری ملاقات وزیر خان سے ہو گئی۔ ہم دونوں کی کہانی ایک تھی۔ دونوں کے گھربار' بیوی' بچے سب لٹ گئے تھے۔ تم تو اس زمانے میں اسکول میں پڑھتے تھے۔ میں تمہارے والد کی فونڈری کا مال خریدنے لگا۔ وہ مجھے خاصی رعایت دیتا تھا اور یہ مال بازار میں اچھے منافع پر بک جاتا تھا۔ دو سال تک ہمارا تعلق کاروباری بھی رہا اور دوستانہ بھی۔ میں نے ایک دکان برانڈرتھ روڈ پر لے لی اور وزیر خان نے فونڈری کے ساتھ کچھ مشینیں بھی لگا لیں۔ پھر اس کے ایک کاریگر کی بہن سے میری شادی ہو گئی۔ وہ آج بھی میری بیوی

www.paksociety.com

ہے پھر وزیر خاں کو خیال آیا کہ فونڈری کو وسعت دی جا سکتی ہے۔ شاید سے کی طرف زمین خالی پڑی تھی۔ وہاں زرعی آلات کی چھوٹی سی فیکٹری لگانے سے بہت فائدہ ہو گا۔ اس نے مجھے شراکت کی پیش کش کی۔ میرے پاس جو سرمایہ جمع ہوا تھا وہ بھی وزیر خان کی عنایت تھا۔ ایک طرح سے میں بھی اس کا سول ڈسٹری بیوٹر تھا۔ ہم نے مشترکہ سرمائے سے زمین خریدی تھی مگر میں نے چالاکی سے رجسٹری اپنے نام کرا لی۔ مشینری سب وزیر خان کی ہوتی۔

"پھر کیا اس کی نوبت ہی نہیں آئی؟" میں نے اس کی خاموشی سے اکتا کے کہا "تم زمین بیچ کے بھاگ گئے۔"

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا "میں کیا تھا میں نے۔ پچیس ہزار کی زمین تھی۔ میں نے پچاس ہزار میں بیچ دی۔ اتفاق سے سستی مل گئی تھی اور اتفاق سے ایک بے وقوف پھانس لیا میں نے جو دگنی قیمت دینے پر رضامند ہو گیا۔ اس سے میرا ایمان ڈانواڈول ہوا۔ پچیس ہزار کو تم آج کے حساب سے دس لاکھ تو سمجھو۔ دس لاکھ کے کسی کو راتوں رات کچھ کیے بغیر پیسے لاکھ ملیں تو جس کا ایمان کمزور ہو گا وہ آج بھی اپنے دوست کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دے گا۔ اب تو خیر وقت ہی بدل گیا ہے۔ دس لاکھ کی خاطر شاید بیٹا اپنے باپ کو قتل کر دے۔"

میں نے کہا "اگر اپنے باپ کا بیٹا نہیں ہو گا تو بھی کر دے گا۔"

اس کا چہرہ خفت سے زرد پڑ گیا "میں بھاگ کے پشاور آ گیا۔ ہاں ایک بات میں نے نہیں بتائی۔ آصف علی میرا اصل نام نہیں تھا۔ وہ حفیظ احمد تھا جو وزیر خان کے اعتماد کو دھوکا دے کر فرار ہوا تھا۔"

میں نے کہا "کیا تم نے اپنی بیوی کو اعتماد میں لیا تھا؟"

"جب تم نے اپنا نام بدلا تو کیا اسے سچ بتا دیا تھا" رابعہ بولی۔

آصف علی نے نفی میں سر ہلایا "میں نے اسے یہ بتایا تھا کہ وزیر خان پکڑا گیا ہے۔ وہ فونڈری کے لیے مستقل چوری کا مال لیتا تھا۔ بجلی کے کھمبے تک۔ اس کی فونڈری میں گلا دیے جاتے تھے۔ چھوٹی موٹی چیزوں کا تو شمار ہی نہیں۔ اگر ہم فرار نہ ہوتے تو ہم بھی پکڑے جاتے کیونکہ چوری کے مال کو ہم خریدتے تھے۔ اس کی شکل بدل جانے کے بعد۔"

میرا خون رگوں میں ابلنے لگا "ذلیل شیطان، پہلے چوری کرتا رہا پھر ڈاکا ڈالا۔ وزیر خان کی حلال کمائی لے گیا۔ الٹا اسے بدنام بھی کیا..." میں نے چلا کے کہا۔

رابعہ نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا "سکندر، تب ایسے ایسی۔ آج تک تمہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ معلوم ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔"

"کیوں نہیں پڑنا چاہیے؟ جو کچھ اس نے کیا میرے والد کے ساتھ۔"

"کیا سب کا بدلہ لو گے تم؟ خدا کے انصاف پر کچھ نہیں چھوڑو گے سکندر" رابعہ نے مجھے کسی بچے کی طرح سمجھایا۔

"اس دنیا میں تو وزیر خان کو دکھ ہی دکھ ملے۔ اس کے بچے اور چوہدری والا ور جیسے شیطان صفت یہ عیش کرتے رہے۔ دنیا کی ہر نعمت ان کو حاصل رہی، کامیاب یہ کہلائے، عزت دار یہ ہوئے۔"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا "نہیں بیٹا، مکافاتِ عمل دنیا میں بھی ہے۔ اول اول ایسا ہی لگتا ہے کہ ہم نے جو چاہا حاصل کر لیا۔ جائز و ناجائز سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن فرق پڑتا ہے۔ میں ضمیر کی خلش اور احساسِ جرم و ندامت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ وہ ایک الگ آزار ہے۔ میں مادی دنیا کے نفع و نقصان کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی سادہ لوح بیوی کو مطمئن کر لیا۔ میں آصف علی بن گیا۔ چھ مہینے تک ہم روپوش رہے۔ سال بھر میں ہم نے چھ مکان بدلے۔ راولپنڈی میں بھی تین مہینے گزار آئے۔ مجھے ڈر تھا کہ وزیر خان پولیس کی مدد سے مجھے تلاش کرے گا۔ اس نے رپورٹ ضرور لکھوائی تھی مگر وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس اپنے دعوے کی صداقت ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ زمین میری تھی، میں نے بیچ دی۔ اس نے آدھی قیمت مجھے کس کے سامنے لا کے دی تھی۔ کوئی رسید تک تو تھی نہیں اس کے پاس۔ ظاہر ہے پولیس نے بھی کچھ نہیں کیا۔ وزیر خان بڑا صابر و شاکر اور ہمت والا شخص تھا۔ اس نے یہ صدمہ بھی برداشت کر لیا۔ یہاں میں نے جو کاروبار شروع کیا اس میں برکت ہوئی۔ یہ برکت میری کوشش کا نتیجہ نہیں تھی۔ یہ وزیر خان کے پیسے کی برکت تھی۔"

"درمیان میں کبھی تمہیں خیال نہیں آیا کہ تم قرض سمجھ کے ہی اس کی رقم لوٹا دو" میں نے تلخی سے کہا "تم اس کے سامنے چلے جاتے تو کیا وہ تم کو مار ڈالتا؟"

"شاید وہ ایسا ہی کرتا۔ وہ جتنا شریف اور رحم دل تھا اتنا جلالی بھی تھا اور اسی لیے میں ڈرتا تھا۔ میری کبھی ہمت نہ ہوئی کہ اس کے پاس جا کے اپنے جرم کی معافی مانگوں۔ مجھے بعد میں معلوم ہو گیا تھا کہ اس نے کتنی ترقی کی ہے۔ وہ صنعت کار ہو گیا تھا۔ میرے جیسے دس دکاندار کو خرید سکتا تھا۔ میرا پہلا بچہ مردہ پیدا ہوا تھا اور میری بیوی مرتے مرتے بچی تھی۔ دو سال بعد پھر اس کی نوبت آئی تو خدا نے مجھے ایک بیٹی دی جو سزا تھی میرے اعمال کی۔ اس کی شکل میں میرے گناہوں کی ساری بد صورتی مجسم ہو گئی تھی۔ اس کے اعضاء نامکمل تھے۔ وہ جسمانی طور پر معذور تھی۔ تین سال تک وہ گوشت کے بے ڈھنگے لوتھڑے کی طرح پڑی رہتی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے بیٹھنا سیکھا۔ اس کے علاج میں میں نے روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ اس کے کئی آپریشن ہوئے۔ دس سال کی عمر میں وہ چلنے لگی لیکن ذہنی طور پر وہ آج بھی کچھ نہیں۔ بس ایک جاندار ہے جسے کھانا پینا آتا ہے۔ ماں باپ کی شناخت ہے۔

جہاں... مجھے ایک طرف اس کو قدرت کی طرف سے ملے

[..]سزا پر طمانیت محسوس ہو رہی تھی ویسی اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو دیکھ کے میرا دل بھی دکھی ہو رہا تھا۔ آنسو اس کی سفید داڑھی بھگوتے جا رہے تھے مگر اس کو احساس نہیں تھا کہ وہ رو رہا ہے۔ وہ مجھ بیٹھا خلا میں دیکھ رہا تھا۔ اپنی ساری زندگی اس کے سامنے تھی۔ ایک جمع اور حاصل۔ ایک سوداے زیاں۔ حق کا فریب کاری کا مال۔ بالآخر ندامتوں کے انگاروں کا بڑھتا عذاب، ذات کی نارِ جہنم اور یہ خیال کہ اگلے جہاں میں ایک زنداں ہے جو اس سے بھی بڑا زنداں ہے۔

رابعہ نے کہا "آصف علی صاحب، بہت اچھا ہوتا اگر آپ وزیر خان مرحوم سے یہ سب کچھ کہتے جو آج سکندر سے کہنا بے کار ہے۔"

"میں نے کوشش کی تھی بیٹا، دیر سے ہی سہی۔ بہرحال تو میں بیٹا" وہ بولا "کئی برس گزر گئے میں نے سوچنے اور ہمت کرنے میں۔ میری بیوی نے کئی بار پوچھا کہ وزیر خان کا کچھ پتا چلا۔ وہ جیل گیا ہو گا تو اب تک چھوٹ گیا ہو گا۔ عمر قید کاٹنے والے بھی چھوٹ جاتے ہیں چودہ سال بعد۔ میں نے اسے جھوٹ بول کے ٹال دیا کہ اس کا کوئی سراغ نہیں ملا اور اسے ڈھونڈنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ کہیں ہم نہ پھنس جائیں۔ اس نے تو اپنی سزا کاٹ لی۔ اب ہم جیل جائیں گے کیا؟ یہ سن کے میری بیوی خاموش ہو گئی تھی۔ اس بیٹی کے بعد خدا نے انہیں تین بار اولاد دی۔ تینوں لڑکے تھے اور بالکل ٹھیک ٹھاک تھے مگر کوئی بھی نہ بچا۔ وہ دو دو سال کے ہوئے اور کسی وجہ کے بغیر مر گئے۔ بالکل ایک ہی طرح، وہ رات کو سوئے اور صبح نہیں اٹھے۔ ڈاکٹروں نے اپنی اپنی تاویل پیش کی۔ یہ ہو جاتا ہے اور وہ ہو جاتا ہے مگر اصل بات کوئی نہ جان سکا۔ صرف میں جانتا تھا کہ یہ میرے اعمال کی سزا ہے جو مجھے مل رہی ہے۔ میری بیوی کو اور میرے بچوں کو جو سزا ملی تھی وہ کاٹ رہے تھے لیکن سب سے بڑا عذاب تو میرے لیے ہی تھا۔"

"وہ نوجوان کون تھا؟ تمہاری دکان پر، جسے تم نے اپنا بیٹا کہا" میں نے کہا۔

"وہ... بیٹا نہیں ہے میرا۔ ایک لاوارث لڑکا ہے۔ اس کے ماں باپ کا بھی کسی کو پتا نہیں۔ چھ سال کا تھا جب میں ایک خیراتی ادارے سے لایا تھا۔ بعد میں میری بیوی نے بھی اسے اپنا لیا۔ جب اپنے بیٹے نہ رہے۔ اس نے اپنی بیٹی کے لیے ایک سہارا تلاش کیا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ... اپنا سب کچھ ہم بیٹی کے حوالے کر دیں جو قانونی طور پر وارث بھی ہے۔ اور بیٹی کو ہم اس کے سپرد کر جائیں۔ وہ قانونی طور پر اس کا شوہر ہو گا اور وہ اس کی بیوی... حالانکہ وہ کسی کی بیوی نہیں بن سکتی مگر انہیں اس کو تحفظ تو فراہم کرنا ہی تھا۔"

میں اور رابعہ دم بخود بیٹھے رہے "یہ بات اس لڑکے کو معلوم ہے؟"

"ہاں، میں نے اسے صاف بتا دیا ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں یا میری بیوی زندہ ہے، وہ ہماری بیٹی کا شوہر رہے گا اور اس کو حق حاصل ہو گا کہ اس دولت کو جیسے چاہے خرچ کرے۔ کاروبار کو جیسے چاہے چلائے۔ اگر یہ منظور نہیں تو جہاں چاہے چلا جائے۔"

"اور اس نے یہ شرط منظور کر لی؟" رابعہ بولی۔

"ہاں۔ پیسے میں بڑی کشش ہوتی ہے بیٹا۔ اور بڑی منحوس طاقت ہے اس میں۔ کالے جادو کی طرح" وہ بولا "عزت آبرو، شرافت اور انسانیت سب کچھ خرید لیتا ہے آدمی دولت سے۔"

میں نے کہا "اور فرض کرو اس لڑکے نے ایک قاتل خرید لیا اپنی جان چھڑانے کے لیے... پھر؟"

"ہماری زندگی میں تو یہ ممکن نہیں۔ ہم میں سے ایک بھی زندہ رہے تو پھر کچھ بھی نہ ہو۔ ہم اپنے سامنے تو اپنی اولاد پر یہ ظلم نہیں ہونے دیں گے۔ ہم خود اسے نہیں مار سکے تو کوئی اور اسے کیسے مار سکتا ہے ہمارے ہوتے ہوئے۔ جب وہ سال بھر کی تھی، تب سے اب تک نہ جانے کتنی بار سوچا ہے میں نے کہ اس کے لیے اور اپنے لیے عذاب کو ختم کر دوں۔ اس کی زندگی بھی کیا ہے، میرے لیے ایک مسلسل سزا۔ انسان کیا وہ جانور سے بھی بدتر زندگی گزار رہی ہے مگر میں اسے قتل نہیں کر سکا... ناممکن تھا یہ کام میرے لیے۔"

اب وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہا تھا اور مجھ سے زیادہ رابعہ کو اس کی حالت پر رحم آ رہا تھا۔

"چھوڑیے آصف صاحب، سب قدرت کے کھیل ہیں۔ صبر سے کام لیں" رابعہ نے اسے تسلی دی۔

میں نے کہا "جو ہونا تھا ہو چکا۔ آدمی کے اختیار کی بات نہیں کہ وہ خدائی میں دخل دے سکے۔"

"تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں کیوں آیا تھا؟" آصف علی نے اپنے آنسو ایک رومال سے صاف کیے۔

"آپ اعترافِ جرم کرنے آئے تھے۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ وزیر خان مرحوم کے اور آپ کے درمیان جو معاملہ ہے اس کا انصاف تو خدا ہی کرے گا" میں نے کہا "میرے والد ہوتے تو میں کہتا کہ آپ کو معاف کر دیں۔ آپ کو بہت سزا مل چکی ہے لیکن اب میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"تم... تھوڑا سا میرے احساسِ جرم کو، میرے بارِ گناہ کو کم کر سکتے ہو" اس نے عاجزی سے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"دو سال پہلے میں نے وزیر خان کو تلاش کیا" وہ بولا "میرے لیے ناممکن ہو گیا تھا اپنے احساسِ گناہ کے ساتھ زندہ رہنا

www.paksociety.com

اور میرے دل میں ایک ڈر بیٹھ گیا تھا کہ جب تک وزیر خان مجھے معاف نہیں کرے گا میری سزا کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی اس سے زیادہ عذاب برداشت کرنے کی۔ مجھے خیال آتا تھا کہ ... کسی دن اچانک کوئی حادثہ پیش آ جائے گا اور میں لنگڑا لولا یا معذور ہو جاؤں گا۔ اندھا ہو جاؤں گا اور محتاج۔ میری دولت میرے کام نہ آ سکے گی۔ میں سب سے جدا دنیا میں بالکل اکیلا رہ جاؤں۔ بیوی بھی ساتھ چھوڑ جائے اور میں کسی فٹ پاتھ پر بھیک مانگتا مر جاؤں۔ بھیانک خیال ہر وقت چیخا کرتے تھے اور میں محسوس کرتا تھا کہ یہی حالت رہی تو میں نفسیاتی مریض بن جاؤں گا۔"

"پھر وزیر خان ملا آپ کو؟" رابعہ بولی۔

"نہیں، میں اس کی فیکٹری گیا اس سے ملنے۔ وہاں اس کا دوسرا پارٹنر بیٹھا تھا۔ میر شرافت علی۔" آصف علی نے کہا "وہ مجھے نہیں جانتا تھا اور میں اس کو نہیں بتا سکتا تھا کہ میرا وزیر خان سے ملنا کیوں ضروری ہے۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ یہ ایک ذاتی اور کاروباری معاملہ ہے۔ وہ میرے پیچھے پڑ گیا کہ کاروباری معاملہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں بھی اس کا پارٹنر ہوں برابر کا۔ جب میں نے صاف کہا کہ وزیر خان کے سوا میں کسی سے بات نہیں کروں گا تو اس نے کہا کہ وہ باہر ہے اور اکثر باہر رہتا ہے۔ میں نے اسے اپنا ٹیلی فون نمبر اور پتا دیا کہ جب وہ آئے تو میری اس سے بات کرا دے لیکن دو مہینے گزر گئے اور وزیر خان نے مجھے فون نہیں کیا۔ میں مایوس ہو گیا۔ شاید اب وہ مجھ سے بات کرنے کا بھی روادار نہیں تھا۔ ہمت کر کے میں نے اسے فون کیا مگر وہاں نہ جانے کون یہ جواب دے بیٹھا تھا۔ کہنے لگا کہ یہاں کوئی وزیر خان نہیں ہے میں سمجھا نمبر غلط مل گیا ہوگا۔ دوبارہ فون کیا تو اسی شخص نے کہا کہ مر گیا وزیر خان۔ میں نے کہا بھائی یہ کیا کہہ رہے ہو۔ ابھی دو مہینے پہلے میری شرافت علی سے بات ہوئی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ وہ باہر گیا ہوا ہے۔ تم کون ہو؟ اس نے کہا میرا نام ہے چوہدری دلاور۔ کیا کام تھا تمہیں وزیر خان سے؟ میں نے دو پہلے کہا تھا کہ ابھی سے بھی کہہ دیا ہے میرا اور اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے اس کا کچھ قرض ادا کرنا تھا۔ اب وہ انتقال کر چکا ہے تو مجھے اس کے کسی وارث کا پتا بتا دو۔ اس کا ایک لڑکا تھا کبیر خان! اس پر وہ خاموش ہو گیا اور پھر بولا۔ وہ تو یہاں نہیں ہوتا لندن میں عیش کر رہا ہے۔ پھر میں نے تمہارا پتا مانگا تو اس نے کہا مجھے نہیں معلوم اور فون بند کر دیا۔ ایک مہینے بعد میں نے میر شرافت علی کو پوچھا۔ وہ کچھ معقول اور شریف آدمی تھا چوہدری دلاور کے مقابلے میں۔ اس نے کہا کہ وزیر خان مر ہے پر گیا ہوا ہے اس بات نے مجھے چکر میں ڈال دیا۔ میں نے کہا یہ چوہدری دلاور کون ہے؟ اس نے کہا وہ بھی ایک پارٹنر ہے۔ ایم ڈبلیو ڈی اینڈ کمپنی کا مطلب ہے میر وزیر اینڈ دلاور۔ ہم تینوں برابر کے حصے دار ہیں۔ میں نے کہا پھر چوہدری دلاور نے کیوں کہا تھا مجھ سے کہ وزیر خان مر گیا؟ اس پر میر شرافت علی نے کسی سے بات کی پھر مجھے جواب دیا۔ چوہدری دلاور صاحب کہتے ہیں کہ انہوں نے تم سے بھی اس قسم کی احمقانہ بات نہیں کی۔ اس نے مجھے جواب دے دیا تھا۔ اس سے میں شک میں پڑ گیا اور میں نے بعد میں طور پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر میرا وزیر خان سے رابطہ نہ ہو سکا۔ مجھے تمہارا پتا بھی نہیں ملا۔ ادھر میری کاروباری مصروفیات ایسی تھیں کہ میں ہر روز لندن نہیں جا سکتا تھا۔

آصف علی نے بہت پرانے متدل ہو جانے والے زخم کو کرید ڈالا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کہانی کے پیچھے کیسے انسان کو قتل کر کے اس کی لاش کو بے آبرو کرنے والے درندہ صفت شکاری تھے اور انہوں نے کیسے وزیر خان کے بعد اس کے وارث اور نام لیوا کا نام بھی لوح جہاں سے مٹا دینے کی پوری کوشش کی تھی۔

رابعہ نے کہا "اگر وزیر خان تمہیں مل جاتا آصف علی تو اس سے کیا کہتے؟ صرف معافی مانگتے؟ ایسا! تو وہ شاید نہیں کرتے۔ رشتوں کی بے وفائی دیکھی ہے جو اپنوں نے پیٹھ میں خنجر گھونپ کے ملتے ہیں۔"

"ہاں، میں اس سے بہت زیادہ کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنا کاروبار اس کے سپرد کر دیتا۔ میں اسے برابر کا شریک بنا لیتا کیوں کہ اس میں تو حصہ ہے بہرحال وزیر خان کا تھا۔"

"اور تم کیا سمجھتے ہو وہ قبول کر لیتا؟" میں نے نفرت سے "اس وقت شاید حقیقی سارا سکا سارا اندوختہ تھے اب تم اپنا بھی دیتے تو وہ لعنت بھیجتا تمہارے منہ پر۔ تم نے بار بار خود اعتراف کیا ہے کہ وہ تم جیسے دس ریکارڈ اداروں کو خرید سکتا تھا۔ وہ تمہیں کبھی معاف نہ کرتا۔ تمہاری سزا برقرار رکھتا جو تم زندگی آخری سانس تک کاٹتے۔"

"نہیں، وہ ایسا نہیں تھا۔ میں جانتا ہوں، وہ بڑا دل رکھتا تھا۔ وہ دشمنوں کو معاف کرنے کا ظرف اور حوصلہ رکھتا تھا۔ اگر میں اس کے پاؤں پکڑ لیتا تو وہ مجھے ٹھوکر نہ مارتا۔ تم بھی اس کے بیٹے ہو اور تمہیں اس کی صورت دی ہے خدا نے تو یہ بھی ہے کہ سیرت وزیر خان کی نہ ہو۔"

مجھے بھی اب اس کی حالت پر افسوس ہو رہا تھا اور اس کے باوجود کہ آصف علی میرے والد کو دھوکا دینے والا پہلا تھا میں اس کے خلاف دل میں وہ عناد نہیں رکھتا تھا جو مجھے دلاور، میر شرافت علی اور استاد پیدو سے تھی۔ چوہدری دلاور وزیر خان کے واحد وارث یعنی مجھے بھی ختم کرنے کے درپے تھا۔ اس کو دولت اپنی مجرمانہ غلطی پر ندامت تھی اور نہ اپنے اقبال کا اعتراف۔ اس کو غرور تھا اپنی طاقت پر اور اپنی دولت پر۔ پیدو مجھے کرائے کے قاتلوں کی فوج کے ساتھ کرائے پر سوداگروں کی طرح تجربہ تھا۔ اس کے برعکس اس

اپنی زندگی کی ایک غلطی تمام عمر کا پچھتاوا بن گئی تھی۔ اس کے لیے ضمیر کی خلش اس کی روح کا آزار بن گئی تھی اور اب وہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ وزیر خان نے کوئی بددعا نہیں دی ہوگی مگر اسے احساس تھا کہ اس کی زندگی کے سارے عذاب اسی ایک غلطی کی سزا ہیں اور عمر کے ساتھ ضمیر پر گناہ کا بوجھ بڑھ گیا تھا کہ وہ وزیر خان کو تلاش کرتے کرتے تھک گیا تھا مگر ہمت نہیں ہارا تھا یہاں تک کہ تقدیر اسے میرے دروازے تک لے آئی تھی۔ اپنے سفید بالوں کی پروا کیے بغیر وہ میرے سامنے رو رہا تھا۔ اپنے جرم کا اعتراف کر رہا تھا۔ اپنی سزا کے خوف میں مبتلا تھا اور مجھ سے بھی معافی چاہتا تھا۔

نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ میری جگہ میرے والد ہوتے تو اپنے اس دشمن کو بھی گلے لگا چکے ہوتے جو اپنی انا کا خون کر کے اور اپنے مقام اور مرتبے کی پروا کیے بغیر ایک مجرم کی حیثیت سے ان کے سامنے پیش ہو گیا تھا اور اپنی ساری ذلت و رسوائی کو برداشت کرتے ہوئے ان کے سامنے دست بستہ معافی کا خواستگار تھا۔ "غلطی کس سے نہیں ہوتی کبیر خان۔" میرے کانوں میں جیسے کسی پرانی آواز کو گونجنے لگی "جب اولیا اور انبیا علیہ السلام نے اپنی خطا کا اعتراف کیا اور کبھی خود کو مقام بشریت سے بالاتر نہیں جانا ہم انسان ہیں۔ غلطی کے پتلے۔ ہم فرشتے ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے اور غلطیاں فرشتوں سے نہیں ہوتی۔ آخر ابلیس نے بھی تو سرکشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بس ایک بغاوت نے اسے مردود و ملعون کیا ورنہ وہ اللہ تو بڑا رحمان و رحیم ہے اور معاف کرنے والا ہے۔ اسے معاف کرو۔ عفو و درگزر میں بڑائی ہے لیکن اپنی غلطی پر اپنے سے کمتر لوگوں کے سامنے شرمندہ ہو کے معافی مانگنا بہت بڑی بات ہے، ہر شخص ایسا نہیں کر سکتا۔"

مجھے یاد تھا وہ اپنے ملازموں، ماتحتوں اور ساتھیوں کی غلطیوں کو معاف کرنے کے معاملے میں کتنے فراخ دل تھے۔ چھوٹے چھوٹے معاملے بہت سے واقعات مجھے یاد تھے جب انہوں نے خیانت اور بددیانتی کرنے والوں کو پکڑا مگر انہیں معاف کر کے چھوڑ دیا کہ جاؤ... میں نے معاف کیا۔ اللہ بھی تمہیں توفیق دے کہ تم پھر شیطان کے بہکاوے میں آ کر تمہیں پھر نہ بھٹکائے۔"

"آصف علی صاحب، بتائیے آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" بالآخر میں نے اپنا دل صاف کر کے کہا۔

"میں جو قرض وزیر خان سے چاہتا تھا میں اپنا قرض چکانا چاہتا ہوں اصل زر اور سود کے ساتھ یا میری خطا پر جرمانے کے ساتھ۔ تم اس کے قانونی اور اخلاقی وارث ہو، جو میری غلطی کے باعث اس سے محروم ہو گیا اور آج ہو سکتا ہے۔"

"کیا ہو سکتا ہے؟"

"تم میرے کاروبار میں شریک ہو کے آدھے کے مالک بن جاؤ یا جو کچھ میرے پاس ہے اس میں سے ..."

میں نے کہا "یہ ناممکن ہے۔"

"کیوں ناممکن ہے؟ مجھے تمہاری ضرورت ہے کبیر خان۔ تم وزیر خان کے بیٹے نہیں ہو گے تو اور کون لے گا؟"

"میرے پاس خدا کا دیا بہت ہے اور نہ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے نہ خواہش۔ آپ کا کاروبار آپ کو مبارک ہو۔ میرے پاس فرصت بھی نہیں ہے۔"

"تم کچھ مت کرو۔ بس مجھے موقع دو کہ میں اپنے قرض سے سبکدوش ہو جاؤں ورنہ میرا مرنا بھی مشکل ہوگا۔ تم شاید اسے ایک بوڑھے کا پاگل پن کہو۔ سمجھو گے مگر نہ جانے کیوں میرے دماغ سے یہ خیال نہیں جاتا کہ میرے کل سرمائے کا نصف وزیر خان کا تھا۔ نفع نقصان ہر صورت میں نصف آج بھی اس کا ہونا چاہیے۔"

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا "دیکھیے آصف علی صاحب، میرے پاس اس وقت تو تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے ورنہ میں بھی آپ کو بتاتا کہ وزیر خان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ مختصراً یہ سمجھ لیں کہ جب میں لندن میں تھا تو اس کے دونوں پارٹنرز میر شرافت علی اور چوہدری دلاور نے اس سے سب کچھ چھین لیا اور اسے پائی پائی کا محتاج کر کے مار ڈالا۔ یہ سب مجھے لندن میں معلوم نہ ہو سکا۔ پتا نہیں کیوں میرے والد نے بھی سب مجھ سے چھپایا اور جب میں واپس آیا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ سب گزشتہ ڈیڑھ دو سال میں ہوا جب آپ نے ان سے ملنے کی کوشش کی تھی اور ان کے قاتلوں نے آپ کو بھی ٹال دیا تھا۔ بعد میں چوہدری دلاور نے اپنے پارٹنر میر شرافت علی کو بھی مروا دیا اور کوشش کی کہ اس کے قتل کے جرم میں مجھے تختۂ دار تک لے جائے لیکن وہ اپنے مقصد میں ابھی تک ناکام رہا ہے۔ میں ابھی تک اپنے والد کے قاتلوں کو کیفر کردار تک تو نہیں پہنچا سکا لیکن کسی حد تک اپنا حق حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔ مجھے اپنا آبائی گھر مل گیا ہے اور جہاں ان کی فیکٹری تھی وہاں اب ایک رفاہی شفا خانہ ہے جس میں غریبوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ ان کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کر دیا گیا ہے اور ٹرسٹ کی آمدنی سے اسپتال کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ اگر آپ کچھ کرنا ہی چاہتے ہیں تو قرض مجھے لوٹانے کے بجائے وزیر خان ویلفیئر ٹرسٹ کو ادا کر دیں۔ آپ اپنا قرض براہ راست وزیر خان کو چکا سکتے ہیں۔ سود یا جرمانہ ادا کرنے کے بجائے صدقہ جاریہ کا ثواب کما کے آپ سرخ رو ہو سکتے ہیں۔ قدرت نے تو پہلے سے شاید آپ کے لیے ہی انتظام کر دیا تھا۔"

"تم ... تم سچ کہہ رہے ہو ... یہ ہو سکتا ہے؟" اس کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا "پہلے کیوں نہیں بتایا تھا تم نے کبیر خان، اب مجھے لگتا ہے کہ قدرت کی سزا پوری ہو گئی ورنہ مجھے ایسا موقع کہاں ملتا۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ اللہ نیتوں کا حال جانتا ہے۔ وہ معاف کرنے والا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی اس ٹرسٹ کا انتظام کلی طور پر میرے ہاتھ

www.paksociety.com

میں نہیں ہے۔ فرد واحد کے ہاتھ میں ہو گا بھی نہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ میں اس کے ہومذ آف نرسنگ کا رکن نہیں ہوں۔"

"پھر کون ہے؟"

"بدقسمتی سے ابھی تک وہی اس کے منتظم بنے بیٹھے ہیں جو وزیر خاں کے قاتل تھے جن کے دامن پر اس کے بے گناہ لہو کے داغ ہیں۔ نگراں کے ساتھ میرا ایک دوست بھی ہے۔ جس کا نام میں نے آپ کے سامنے استعمال کیا تھا اور وہ یہ ہے" رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔"

"ماشاء اللہ۔ خدا نے تمہیں......"

میں نے کہا "معاف کیجئے گا" میں نے ایک ضرورت کے تحت بہت سے جھوٹ بولے تھے۔ ایک یہ بھی ہے کہ رابعہ میری بیوی ہے۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے جب ایسا ہی ہو گا لیکن ابھی تو یہ میری معاون مددگار بھی ہے اور محافظ بھی۔ میری وکیل بھی ہے یہ سب سے وکیل۔"

"اچھا اچھا! اللہ وہ دن بھی لائے۔ یہ بتاؤ کہ میں اس ٹرسٹ کے لیے کیا روں۔ نقد رقم یا جائداد......"

میں نے کہا "جب وقت آئے گا تو میں آپ کو بتاؤں گا۔ ابھی میں کسی اور چکر میں پشاور آیا ہوا ہوں۔"

"کوئی پریشانی کی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔"

اس سے پہلے کہ میں اُسے اپنی پشاور آمد کا مقصد بتاتا" ملازم نے مطلع کیا کہ کھانا میز پر لگا ہوا ہے۔

میں نے کہا "آئیے۔ اب کھانا کھا کے جائیے۔"

"تم نے تو انکار کر دیا تھا!"

"مگر ہم آپ کو انکار نہیں کرنے دیں گے" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ شاید آپ میری کچھ مدد کر سکتے ہوں۔"

کھانے کی میز پر آصف علی کا تعارف کابل سے ہوا اور کلیم اللہ سے۔ میں نے مختصر الفاظ میں اپنے مشرقی پاکستان جانے اور وہاں پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ کیا۔ پھر اپنے لاہور سے اچانک روانہ ہونے کے اسباب بتائے اور پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات تک پیش آنے والے سارے حالات کی روداد سنائی۔ وہ غور سے سنتا رہا۔

"اب میرے مسائل دو ہیں" میں نے کہا "ایک تو مجھے معتبر قسم کے افراد کی گواہی چاہیے۔ یہ ثبوت چاہیے کہ میں ایک ہفتے سے پشاور میں ہوں۔ اس طرح لاہور سے میری عدم موجودگی ثابت ہو جائے گی۔ اور ہم پر چاندنی کے قتل کا الزام عائد کرنے والوں کی سازش خود ہی ناکام ہو جائے گی۔"

"یہ ہو جائے گا۔ تم فکر مت کرو۔ اتنا عرصہ گزار چکا ہوں میں پشاور میں اور میرے تعلقات ہر سطح پر ہیں۔ تم کو آزادی تنگی کی گواہی دلا دوں۔ تمہیں کسی اسپتال میں داخل دکھا دوں۔"

"دیری گڈ۔ یہ سب سے بہتر ہو گا۔" میں نے کہا "دوسرا مسئلہ یہ تھا کلیم اللہ کا۔ ہم خود جانا چاہتے تھے اور اس کے گھر والوں سے مل کے اپنا اطمینان کر لینا چاہتے تھے مگر پولیٹیکل ایجنٹ نے کہا کہ یہ ممکن نہیں۔ اس کے رشتے دار خود آ کے اسے لے جائیں گے۔"

"اس میں کیا حرج ہے؟"

"حرج تو کوئی نہیں مگر یہ کلیم اللہ انہیں پہچانتا ہے نہ وہ انہیں جانتے ہیں۔ بچے کا معاملہ ہے۔ ایسا نہ ہو دشمنوں کے ہاتھ پڑ جائے۔"

"اس کا کوئی دشمن ہے؟" آصف علی نے کلیم اللہ کو غور سے دیکھا۔

"کیا معلوم! اس کے والد کا دشمن ہو تو کلیم اللہ کا بھی ہو گا یہ دشمنی تو نسل در نسل چلتی ہے یہاں۔ ورثے میں ملتی ہے" میں نے کہا۔

"یہ تو ہے خیر...... کل میں کچھ کروں گا" آصف علی بولا۔

"آفریدی زندہ رہتا تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔"

"اور بھی لوگ ہیں...... میرے تعلقات قبیلے کے سرداروں سے بھی ہیں" آصف علی نے مجھے تسلی دی "وہ خود آ کر لے جائیں گے۔"

وہ صبح آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔ جاتے وقت ایک بالکل مختلف آدمی تھا۔ مطمئن اور مسرور تھا اور قدرت کی اس مہربانی پر شکر گزار جس نے اسے بالآخر اپنے احساس جرم کے بوجھ سے نجات دلانے کا موقع فراہم کیا۔ جب وہ خود وزیر خاں کی تلاش میں تھا تو اسے ناکامی اور مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔ شاید اس کے اعمال کی جتنی سزا لکھی گئی تھی وہ پوری نہیں ہوئی تھی۔ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کام کے لیے بھی ایک وقت مقرر تھا جو اس سے پہلے انسانی کوشش بے سود تھی اور جب یہ وقت آیا تو خود اس کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ جس منزل کی جستجو میں برسوں سے سرگرداں تھا، وہ خود چل کے اس کے پاس آ گئی۔

کھانے کے بعد کابل اور کلیم ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ میں اور رابعہ سامنے لان میں ٹہلتے رہے اور آصف علی کی باتیں کرتے رہے۔ رابعہ کا بھی خیال یہی تھا کہ ایمان کی آزمائش کے ایک لمحے میں آصف علی کی لغزش پر قدرت کی طرف سے ملنے والی سزا بہت کافی تھی اور اب وہ اپنے سابقہ اعمال کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے تو اس کی حوصلہ شکنی اور اس کے ارادوں کی راہ میں مزاحمت نامناسب غلطی ہو گی۔ اگر کوئی برائی کو چھوڑ کے نیکی کا راستہ اختیار کرنا چاہے تو اس کا راستہ روکنا بجائے خود کوئی نیکی نہیں ہو سکتی۔

رات بارہ بجے تک کابل اور کلیم اللہ سونے کے لیے چلے گئے لیکن ہم ہی پرانے وقتوں کی یادوں کے ساتھ جاگتے رہے۔ آصف علی میری کتاب ماضی کا ایک ایسا باب تھا جو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی باتوں نے مجھے اس بچپن کی طرف لوٹا دیا جس کے دھندلے نقوش میں مجھے اپنا اور وزیر خاں کا چہرہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ جو اس کا ماضی تھا وہ میرا حال تھا۔ شاید کل ماضی ہو گا ایک اور تاریخ کا سفر ہو گا جس میں وزیر خاں اور خان کے بعد کوئی قدیر خان اپنی خاندانی روایات پر اسی عزم کے ساتھ گامزن نظر آئے گا۔ انسانی تاریخ کے ہر دور کی طرح اس منزل بھی آصف علی جیسے پشت پر وار کرنے والے دوست ہوں گے اور چوہدری ولادر جیسے دشمن ہوں گے۔ زندگی نام ہے خیر و شر کی رزم گاہ کا جس میں جیتے وہ ہیں جو خیر سے نمو پاتے ہیں۔ شر سے بندھے والے دونوں جہاں ہار دیتے ہیں۔"

آخر شب کا چاند نکلنے تک سردی بڑھ گئی۔ رابعہ سردی سے بچنے لگی۔

"چلو اندر چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا نیند آ رہی ہے؟"

"نیند تو نہیں آ رہی ہے۔ باتیں اندر بھی ہو سکتی ہیں۔"

میں نے کہا "مس رابعہ یہ خاک ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہ نام ہی ہے۔ یہاں نہ آرام ہے نہ گھر جیسی کوئی بات۔"

رابعہ مسکرائی "اچانک آپ کو کیا پریشانی لاحق ہو گئی؟"

"جہاں آدمی کو اپنی مرضی سے جوتے تک ایک کپ نہ ملے" کافی دور کی بات ہے۔ وہاں پریشان ہونا جائز ہے" میں نے کہا۔

رابعہ بولی "ملازم سو گیا ہو گا۔ ورنہ چائے بنا دیتا۔ اس غریب کا تو کام ختم ہو گا۔"

"ظلم کمانہ نہیں ہو رہا ہے خاتون۔ اس کے علاوہ "علامہ اقبال نے تو فرمایا تھا کہ اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو۔ ظاہر ہے انہوں نے کہا ہو گا جو خود جاگ رہے ہوں گے۔"

"چلو میں دیکھتی ہوں کچن کدھر ہے۔ شاید وہاں نصیب سے کچھ مل جائے" رابعہ بولی۔

ہم دبے پاؤں غسل خانے سے برآمدے سے گزرے جہاں ملازم اور چوکیدار رضائی میں لپٹا پڑا تھا۔ کھانے کے کمرے سے گزرتے ہوئے اندھیرے میں ایک کرسی سے الجھا پھر رابعہ اسٹول سے ٹھوکر کھا کے گرتے گرتے بچی۔ اگر ہم لائٹ جلا لیتے تو کچھ بھی نہ ہوتا مگر ایسے اندھیرے میں چوروں جیسی قسمت آزمائی کے ایڈونچر میں مزہ آ رہا تھا۔

کچن میں پہنچ کے رابعہ نے دروازہ بند کیا "اُف! میری تو ایک ٹانگ پر چوٹ لگی ہے اسٹول لگنے سے۔"

"کوئی بات نہیں۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اسٹول سر میں نہیں لگا" میں نے کہا "میرا بھی پیچھے جانا بیچ مڑ گیا ہے ایک پاؤں سیدھا ہے دوسرا الٹا۔"

رابعہ ہنسی۔ اُس کے ہاتھ کچن میں مختلف برتنوں کو اٹھانے اور کھولنے میں مصروف رہے۔ بالآخر اس نے چائے کی پتی اور چینی دریافت کر لی۔ پانی موجود تھا اور دودھ کے بغیر کام چلایا جا سکتا تھا۔ رابعہ نے مٹی کے تیل کا چولہا جلایا اور ایک المونیم کی سیاہ نظر آنے والی کیتلی میں پانی رکھ دیا۔

"آصف علی کے ملنے سے میری آدھی پریشانی دور ہو گئی" میں نے کہا۔

"اس کی بھی آدھی پریشانی ختم ہو گئی۔ بہت عبرت آموز ہے اس کی زندگی" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "رابعہ کیا تم سمجھتی ہو آصف علی نے اپنی معذور بیٹی کے مستقبل کے تحفظ کے لیے جو انتظام کیا ہے وہ ٹھیک ہے؟"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا "وہ لڑکا مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی سرکشی کا ابھی سے یہ حال ہے۔ اسے سمجھنا چاہیے کہ وہ زر خرید ہے اور زر خرید رشتے کبھی محبت کے قابل نہیں ہوتے۔ اسے دولت کی ہوس نے اس مجبوری کی زنجیر میں باندھ رکھا ہے۔ جیسے ہی موقع ملے گا وہ زنجیر کاٹ کے فرار ہو جائے گا۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ آصف علی اسے بھاگنے نہ دے۔ وہ سب کچھ اپنی تحویل میں رکھے اور اس لڑکے کو ایک جھوٹے بے بنیاد رشتے کو نباہنے کی منہ مانگی قیمت ادا کرتا رہے" میں نے کہا۔

"مگر آصف علی کے بعد کیا ہو گا؟"

"اُس کی بیوی شاید کاروبار اور مالی معاملات کو اپنے کنٹرول میں نہ رکھ سکے۔" میں نے کہا "وہ لڑکا جو ساری دنیا کے سامنے ان کا داماد ہو گا انہیں بلیک میل کرے گا۔ جب اسے منہ مانگی قیمت ملے گی تو کیا وہ اس بیوی کا وفادار رہ گا جو در حقیقت بیوی بھی نہیں۔ وہ دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگے گا۔ ممکن ہے دوسری شادی کر لے۔ ایک معذور بیوی کی موجودگی میں اس کے پاس قانونی اور اخلاقی جواز ہو گا۔"

"اتنی دولت ملنے کی امید ہو تو آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے" رابعہ بولی اور ابلتے پانی میں چائے کی پتی ڈالنے لگی۔

"یہ بھی ٹھیک کہا تم نے" آصف علی تو دنیا دیکھ چکا ہے اور تجربہ رکھتا ہے۔ اس کی بیوی کو راستے سے ہٹانا کوئی مشکل نہ ہو گا۔ اس عمر میں غیر طبعی موت کو طبعی موت بنانے میں زیادہ خرچ بھی نہیں ہوتا پھر رہ جائے گی وہ مظلوم و مجبور مخلوق جس کو اپنے آدمی ہونے کا اتنا بھی شعور نہیں جتنا جانور کو اپنے جانور ہونے کا ہوتا ہے۔ اسے آسانی سے کسی پاگل خانے کی دیواروں کے پیچھے پھینک کر بھلایا جا سکتا ہے" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

رابعہ نے کہا "سکندر ہم کچھ نہیں کرسکتے اُس کے لیے!"

میں نے کہا "تم نے اس وقت میرے منہ کی بات چھین لی" اس لیے جی چاہتا ہے تمہارا منہ...."

"چائے پیجیے" رابعہ نے پیالی مجھے تھمائی "فی الحال اسی سے گزارا کیجیے۔"

"مجھے وہ شعر یاد آتا ہے جو چائے کے بارے میں عدم نے کیا خوب فرمایا ہے۔ ایک دوشیزہ کے لبوں کی طرح۔ اس میں گرمی بھی ہے شعلہ سامانی بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"جو تیرے سینہ نام بھی ہے" رابعہ ہنسی اور پھر اچانک سیریس ہوگئی "ہم آصف علی کی اس ذہنی و جسمانی طور پر معذور بیٹی کو وزیر خان اسپتال میں کیوں نہ رکھ لیں۔ وہاں اس کا علاج بھی ہوگا اور دیکھ بھال بھی۔ اسے ساری زندگی وہاں گزارنی پڑے تب بھی خطرہ تو کوئی نہیں ہوگا کہ دولت کی خاطر کوئی اسے قتل کروادے۔"

"بالکل ٹھیک۔ مجھے یقین ہے آصف علی بھی اس انتظام سے خوش ہوگا۔ پہلے ہم اس کی بیٹی کو دیکھ لیں پھر اس سے بات بھی کرلیں گے" میں نے کہا۔

"اس نے ہمیں بڑی مصیبت سے بچالیا۔ اب چوہدری دلاور ثابت کرکے دکھائے کہ ہم چاندنی بیگم سے ملنے گئے تھے" رابعہ بولی۔

ہم چائے کا مگ لے کر کھانے کے کمرے میں آگئے اور لائٹ جلادی مگر ملازم نے کروٹ تک نہ لی۔

"کیا خیال ہے منظر کو بھی جگایا جائے؟" میں نے کہا "کچھ گالیاں کھانے کو جی چاہتا ہے۔"

"ضرور کھاؤ" رابعہ ہنسی۔

"اس سے پوچھا جائے کہ چاندنی کے قتل کے کیس کا کیا بنا؟"

"چاندنی کا قتل! کیا زبردست عنوان ہوسکتا ہے کسی کہانی کا یا نظم کا" رابعہ بولی۔

میں نے فون اٹھالیا جو کمرے کے ایک کونے میں رکھا ہوا تھا اور کھانے کی میز پر لے آیا "اسے بتانا چاہیے کہ ہم نے اپنے دفاع کا بندوبست کرلیا ہے تاکہ وہ ڈٹ جائے مقابلے پر کہ میرے موکل تو یہاں ہیں ہی نہیں، ایک ہفتے پہلے پشاور میں تھے۔ اب پتا نہیں کہاں ہیں۔ باقی سب لوگوں کے بارے میں کوئی اطلاع ہوگی تو وہ بھی مل جائے گی۔"

گھنٹی بہت دیر تک بجتی رہی پھر منظر کی آواز سنائی دی "ابے بھائی کس کے پیٹ میں درد اٹھا ہے آدھی رات کو" اس نے نیند میں ڈوبے ہوئے بیزار لہجے میں کہا۔

"میری بیوی کے پیٹ میں" میں نے روتی آواز میں کہا۔

"اب کیا ہوگا؟"

"ابے یا لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ سالے یہ مجھے جگا کے پوچھا

ضروری تھا۔ میں وکیل ہوں دائی نہیں" منظر نے چلایا "میری نیند خراب کی۔ نہیں بتائی تھی۔"

میں نے کہا "چودہ بچے ہوگئے ہیں۔ اب تو تجھے کا نکلوا دو انچارج بنایا جاسکتا ہے۔ ابھی چودہ تو نہیں ہوئے نا؟ باز آجا اب بھی۔"

"ابے تو تیری تو..." اس نے مجھے تین چار ناقابل اشاعت گالیاں دیں "یہ تو مجھ سے پوچھتا ہے... کہ خود تو شادی کی ہمت نہیں پڑتی۔ جس نے ابھی کھیت نہیں خریدا وہ گالیاں دے رہا ہے کہ ہل مت چلاؤ۔"

میں نے کہا "شرم کر تیری بیوی بھی سن رہی ہوگی۔"

"میں تو کہتا ہوں وہ بھی سن لے جو تیری بیوی نہیں کہا ہے۔"

"بات سن۔ اس چاندنی بیگم والے کیس میں تو بیان داخل کردے کہ میرے موکل تو ایک ہفتے سے پشاور میں ہیں۔ ہم نے گواہی بھی کرلی ہے۔"

وہ گلا پھاڑ کے ہنسا "اب کیسا چاندنی کا کیس میرے چاند... جو بیچتے تھے دوائے دل وہ خود ہی ساری دوا کھا گئے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میرے پڑوس میں سے تیری بھابی سلام عرض کرتی ہے۔" منظر بولا "کیا کہا قتل ور ہے۔ اسے دوری گئی ہوتی ہمارے دشمن۔"

"اپنی طرف سے بکواس مت کر۔ چاندنی کا کیا ہوا؟"

"سب چوپٹ ہوگیا۔ وہ جو گولا ٹھنڈوالا تھا تاب چاندنی کا اب اس سالے نے خودکشی کرلی۔ حرام موت مرگیا۔ حرام زندگی گزارنے کے بعد۔"

میں نے کہا "کیا! خودکشی کرلی... کیسے....؟"

"جب تو آئے گا تو تیرے گلے میں ڈالوں گا رسی کا پھندا۔ اس کا دوسرا سرا باندھوں گا چھت کے پنکھے سے اور نیچے سے اسٹول کو لات مار کے بتاؤں گا کہ ایسے... سمجھ آجائے گی تجھے۔"

"مگر... خیر چھوڑ... جو ہوا اچھا ہوا... یہ بتا اور کسی کی کوئی اطلاع ہے؟"

"ہاں ایک خبر ہے۔ جنگی وہ بن چو خاک جہاں کا خبر تھا وہ تیرے یار کی گل بانو تھی نا۔ ڈاکو ٹیش ناگ کی بہن۔ اس کی تصویر چھپی ہے اخبار میں..."

اچانک لائن کٹ گئی۔ میں نے کہا "ہیلو... ہیلو..." مگر فون ڈیڈ ہوگیا تھا۔ میں نے پھر نمبر ملانے کی کوشش کی مگر فون کے ریسیور میں ڈائل ٹون ہی نہیں تھی۔

اسی وقت باہر سے قدموں کی آواز سنائی دی۔ کوئی بجری کے ٹکڑوں پر چلتا ہوا آرہا تھا اور آنے والا ایک نہیں تھا۔

میں بے اختیار دروازے کی طرف بڑھا "اس وقت کون ہوسکتا ہے؟"

رابعہ نے مجھے روک لیا "ایسے مت جاؤ۔"

"پھر کیسے جاؤں؟ سر کے بل؟" میں نے کہا۔

"پتا نہیں کون لوگ ہیں۔" رابعہ بولی۔

"چاہے میں نہیں جانتا۔ پہلے تم پوچھ آؤ کہ بھئی کون ہو۔ نام پتہ معلوم کرو پھر میں جاؤں گا۔" میں نے اس کی بات مذاق میں اڑا دی۔

رابعہ ضرورت سے زیادہ خوف زدہ تھی۔ باہر آنے والوں کے قدموں کی آواز رک گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کیا دیکھ رہے تھے اور کس بات کے منتظر تھے۔ ایک منٹ کے بعد دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کو گرفت میں لے لیا اور رابعہ کو بھی اشارے سے سمجھادیا کہ فکر کی بات نہیں۔ میں اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہوں۔

میں نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے ایک جیسے حلیے اور صورت شکل میں بھی مشابہت رکھنے والے دو افراد کو دیکھا۔ ان دونوں نے نیلی شلواریں، قمیص پر براؤن فوجی جرسی اور سر پر بینی کیپ پہن رکھی تھی۔ ان کی جسامت اور قد و قامت بھی ایک سی اور چہروں کی حالت بھی۔

"معاف کرنا صاحب" ان میں سے ایک نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھاکے کہا "یہ آپ کا گاڑی ہے؟"

میں نے کہا "ابھی تک تو ہے۔"

اسے میری بات میں کوئی مزاح کا پہلو نظر نہ آیا "خو اس کا پیچھے والا لائٹ جلتا ہے۔"

دوسرے نے کہا "بیٹری ایک دم بیٹھ جائے گا صبح تک۔"

اب پہلے نے کہا "خو ہم لائٹ دیکھا سوچا آپ کو بتادے۔"

مسکرا کر بولا "غلطی کا معافی۔ ہم چوکیدار ہے۔"

میں نے کہا "خان! تم نے کون سی غلطی کی ہے جو معافی مانگ رہے ہو۔ بہت اچھا کیا جو مجھے بتادیا۔"

"ابھی صاحب بہت لوگ ناراض ہوتا کہ ہمارا نیند خراب کردیا۔ بیٹری بیٹھے گا تو ہمارا بیٹھے گا۔" پہلے والے نے کہا۔

دوسرے نے تائید میں سر ہلایا "بہت لوگ ناراض ہوتا کہ تم چوکیداری کرتا ہے دیکھتا ہے گاڑی کا لائٹ جلتا ہے تو بتاتا کیوں نہیں۔ ابھی صاحب ہم اس واسطے ڈرتا ہے۔"

میں نے انہیں دس روپے انعام بھی دینے چاہے مگر انہوں نے مجھ سے انکار کردیا۔ باتوں کی آواز سن کے رابعہ بھی کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ وہ سلام کرکے چلے گئے تو میں نے ٹیل لائٹ آف کی اور اندر چلا گیا۔ باہر سخت سردی تھی اور ہُو کا عالم طاری تھا اور صرف وہ فرض شناس چوکیدار تھے جو سڑکوں پر گشت کر رہے تھے۔

"بے چارے!" رابعہ نے کھڑکی بند کردی "فرض ادا کریں تب بھی لوگ خفا نہ کریں تب بھی خفا۔"

"غلطی اپنی ہو تو کم ظرف ہی دوسروں پر خفا ہوسکتا ہے۔ خاندانی رئیس اور بدمعاش ایسا نہیں کرتے کہ غریب اور کمزور پر بے سبب رعب جھاڑیں۔" میں نے کہا۔

رابعہ مسکرائی "آپ کیا ہیں؟ خاندانی رئیس یا بدمعاش؟"

"دونوں" میں نے کہا "دولت عشق سے دل غنی ہے لیکن نیت اور نظر کی بدمعاشی نہیں جاتی۔"

رابعہ نے شرارت سے کہا "اندر ہو جائیں گے کسی دن۔"

میں نے آہ بھری "اندر تو اس وقت بھی ہیں۔ اگر آپ کی مراد ہے حجلہ عروسی کے اندر تو فرمایئے...."

رابعہ نے جھینپ کے کہا "کمال ہے! ہم نے نہیں دیکھا کہ لائٹس جل رہی ہیں۔"

میں نے کہا "نگاہ سورج کی طرف ہو تو اور کچھ نظر نہیں آتا۔"

رابعہ بولی "رات کے وقت سورج نظر آنے لگا ہے۔ خدا خیر کرے۔"

"یہ تمہارے آفتاب حسن کی تابانی...."

رابعہ نے کہا "شب بخیر، تم آؤٹ ہو رہے ہو۔ نیند کی کمی سے ذہن متاثر ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "ارے بھئی مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔ ابھی یہ وقت ہے تشفی گھمانے بازی کا۔ تم کہاں جارہی ہو؟"

"سونے کے لیے۔ تم شوق سے جاگتے رہو اور آمد ہو رہی ہے تو غزل کہو۔ میں صبح سُن لوں گی۔"

میں نے اس کے پیچھے جاتے ہوئے کہا "تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ منظر کیا کہہ رہا تھا گولا ٹھنڈوالا اور گل بانو کے بارے میں۔"

"کچھ بھی کہا ہو اس نے، مجھے اس وقت جاننے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ بھی صبح سن لوں گی۔" اس نے کاہلی کے ساتھ بیڈ پر دراز ہوکے کہا "تم بھی سوجاؤ تو اچھا ہے۔"

"احتجاجی بھوک ہڑتال کی طرح تمہاری یہ ادا ایک ظالمانہ رومانٹک مظاہرہ ہے۔" میں آہ بھر کے صوفے پر دراز ہوگیا "تم نے میرے جذبات کا قتل عام کردیا ہے۔ اللہ تم سے سمجھے؟"

رابعہ نے ڈانٹ کے کہا "لائٹ بند کردو اور اپنی آواز بھی۔"

میں نے سوئچ آف کردیا "آج خواب میں تم سے سارے بدلے نہ لے لوں تو کہنا۔"

یہ کچھ ماحول کی اجنبیت کا اثر تھا اور کچھ ذہنی انتشار کا کہ میں اندھیرے میں آنکھیں کھولے لیٹا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا منظر نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں نے اسے آدھی رات کو نیند سے جگا کر پریشان کیا تھا۔ بدلہ لینے کے لیے اس نے بھی ایسی بات کہہ دی کہ

www.paksociety.com

میں جاگتا رہوں اور پریشان ہوتا رہوں۔ تفصیل بتائے بغیر اس نے لائن کاٹ دی اور ریسیور ایک طرف رکھ کے سو گیا۔ اب سوچتے رہو سکندرِ اعظم کہ گولا گنڈے والا کیسے قتل ہو گیا' اسے کس نے قتل کرایا اور کیوں۔ اور شیشی ہاؤس کی بہن کی تصویر اخبار میں چھپنا چہ معنی دارد۔ منظر نے تو خودکشی کا ذکر کیا تھا مگر گولا گنڈے والا کیوں خودکشی کرے گا۔ اسے تو قتل ہی ہونا تھا ایک دن۔ پہلوانی کا اکھاڑہ چھوڑ کے بدمعاشی کا بازار گرم کرنے میں فائدہ تو نظر آتا ہے کہ مٹی دھول کے بجائے چاندی ملی مگر اس کوچے بے ننگ و نام میں رسوائیاں بھی ہیں اور موت کو گلے لگانے کی مجبوریاں بھی... پہلوانی میں تن کا فن ہے' بدمعاشی میں دھن کا تن۔ نہ تن تیرا نہ من۔ آتا ہے دھن جاتا ہے من۔ واہ علامہ صاحب۔ تن من دھن......"

خیالوں میں راہ گم کردہ مسافر کی طرح بھٹکتے ہوئے ذہن کو آخرکار نیند کی پناہ ملی۔ میرا خیال ہے سوتے سوتے رات کا آخری پہر ہو گیا تھا۔ دیر تک سوتا رہتا تو شاید نیند کی کمی کچھ پوری ہو جاتی مگر صبح دم آصف علی کا نزول ہوا۔

کاجل نے مجھے ہلا کے کہا "بھائی سکندر! وہ آ گئے۔"

میں ہڑبڑا کے اٹھا "کون آ گئے' باجے والے؟"

کاجل ہنس پڑی "کیا خواب میں بارات دیکھ رہے تھے؟"

میں نے جھینپ کر کہا "واقعی۔ مگر عجیب بارات تھی۔ دولہا کراچی سے گھوڑے پر آ رہا تھا سہرا باندھے اور پشاور پہنچنے والا تھا۔"

کاجل پھر ہنسی "ہم سمجھ گئے۔ اور باراتی پیچھے گھوڑے دوڑا رہے ہوں گے' باجے والے کیا آگے آگے بھاگ رہے تھے؟ گھوڑوں پر ڈھول تاشے' شہنائی اور بھونپو والے باجے بجاتے۔ میں رابعہ باجی کو جگاتی ہوں۔"

دوسرے کمرے کے باہر سے آصف علی نے آواز لگائی "بھئی اٹھ جاؤ کبیر میاں۔ ہم تو آ گئے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔"

میں واقعی ایک بے سروپا خواب دیکھ رہا تھا کہ محسن دولہا بنا چھت پر چڑھا دور دیکھ رہا ہے اور نیچے سے گل بانو چلا چلا کے پوچھ رہی ہے کہ آخر باجے والے ابھی تک کیوں نہیں پہنچے۔ ماہرین نفسیات یا خوابوں کی تعبیر بتانے والے عاملوں کے نزدیک اس خواب کی نہ جانے کیا توضیحات ہوں گی۔ میں اپنی بات پر خود مسکراتا ہوا باہر گیا تو سوچ رہا تھا کہ کاجل جب یہ بات رابعہ کو بتائے گی تو میری شامت آ جائے گی۔

آصف علی نے کہا "بھئی دیکھو سورج کہاں آ گیا۔"

میں نے ادھر ادھر دیکھا "ابھی یہاں تو نہیں پہنچا ورنہ نظر آتا۔"

آصف علی ہنسا "اس عمر میں ہم بھی یونہی لمبی تان کر سوتے تھے مگر نیند پوری کبھی نہ ہوتی تھی۔"

میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا "دراصل رات گئے تک جاگتے رہے۔"

اس نے پھر میری بات کا مفہوم بدل دیا "ہاں بھائی! ہم بھی جاگتے تھے راتوں کو۔ کیا ہے وہ غزل جو ملکہ پکھراج نے گائی ہے' انھیں بھی جگائیں تمام رات..."

میں نے کہا "میں ابھی جگاتا ہوں سب کو۔ کسی کو آپ کے اتنی جلدی آنے کی امید نہیں تھی۔"

"ہاں بھئی' ہم ابھی نہ آتے مگر وہ ہماری گھر والی ہے نا' اس نے مجبور کر دیا کہ ابھی جاؤ اور انھیں ناشتے کے لیے یہاں لے آؤ۔" آصف علی نے برآمدے میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ کے کہا "میں اس وقت نکلا ہوں صبح کی سیر کے لیے۔ اس نے ڈیوٹی لگا دی کہ واپسی میں سب کو ساتھ لیتے آنا۔"

میں نے کہا "آپ نے رات کو ہی بتا دیا تھا ہمارے بارے میں۔"

"کیسے نہ بتاتا۔ اور رات میں نے اسے وہ بات بھی بتا دی جو اسے آج تک معلوم نہ تھی۔" وہ بولا "میں نے اس کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا کبیر خاں' اسے بتا دیا کہ میں نے سب جھوٹ بولا تھا۔ میں وزیر خاں کی امانت میں خیانت کر کے فرار ہوا تھا۔ اور اس... بعد میں جو کچھ ہوا' وہ میرے اعمال کی سزا تھی۔"

"کیا ضرورت تھی انھیں یہ سب کچھ بتانے کی؟"

"ضرورت تھی کبیر خاں۔ جب مجرم پکڑا جائے تو ضروری ہے کہ اس کا چہرہ سب کو دکھایا جائے۔" اس نے کہا "یہ بھی ایک سزا ہوتی ہے مجرم کے لیے۔"

"انھیں یقیناً بہت دکھ پہنچا ہوگا۔"

"دکھ تو ہوا۔ بہت روئی وہ رات بھر لیکن وہ سمجھتی ہے کہ تمہارا مل جانا رحمتِ خداوندی کی طرف سے بخشش کا اشارہ ہے۔ پھر جب میں نے اسے یہ بتایا کہ ہم وزیر خاں اچکزئی کو حصہ دے کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکتے ہیں تو اس نے کہا کہ پھر تم فوری چل کے مل لو اس سے۔ وہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہوگی۔"

میں نے کہا "بس ہم تیار ہو جائیں پھر چلتے ہیں۔"

سورج نکلا ہی تھا کہ ہم بھی ہولے جاگے' ٹھیک آٹھ بجے سڑک پر آ گئے۔ آصف علی کا گھر اس کے کہنے کے مطابق پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا مگر ایک کلومیٹر دور ثابت ہوا۔ کاجل اور رابعہ فریش تھے کیونکہ وہ چھ سات گھنٹے سو کے اٹھے تھے۔ مجھے اور کبیر کو مشکل سے تین گھنٹے کی نیند نصیب ہوئی تھی۔

رابعہ کو اتفاق سے ٹھوکر لگی تو میں نے کہا "نیند میں چل رہی ہو' سو رہی ہو ابھی تک!"

رابعہ نے کہا "تم کیوں نیند میں بول رہے ہو؟"

میں نے کہا "ایسا نہ ہو سوتے میں نکل جاؤ کسی اور طرف دے گیر علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔"

"کہاں سے شروع ہوتا ہے انکل؟" کلیم نے بڑے اشتیاق کے ساتھ ادھر ادھر دیکھا۔

"جہاں سے عقل کی سرحد شروع ہوتی ہے وہاں سے تمہارے انکل کے لیے علاقہ غیر شروع ہو جاتا ہے۔" رابعہ نے کہا "سمجھے بیٹے۔"

"اور بیٹا! غیر علاقے میں کوئی قانون نہیں چلتا۔ کوئی کتنا بھی داویلا کرے' بے کار ہے۔" میں نے کہا "عورت کو تو وکیل بھی نہیں کرنے دیتے۔ وضع دار لوگ ہیں' سر پر چڑھانے کے قائل نہیں۔ پاؤں کی جوتی بنا کے رکھتے ہیں۔"

رابعہ نے جل بھن کے کہا "یہ جو تھڑدلے موچی قسم کے لوگ ہیں نا بیٹا' جو جوتیاں گانٹھتے ہیں اور چمکاتے ہیں' وہی ایسی بات کرتے ہیں' شرفا اور خاندانی لوگ نہیں۔ وہ تو گھر کی عزت کہتے ہیں عورت کو جس کی عزت ہوتی ہے۔"

آصف علی ہنسنے لگا "تم چپ کیوں ہو گئے' بڑا اچھا لگ رہا تھا تمہیں لڑتا دیکھ کے۔"

میں نے کہا "افسوس چچا آصف علی! آپ شرپسند ہیں۔ فتنہ فساد اچھا لگتا ہے آپ کو۔ لڑتا دیکھ کے خوش ہوتے ہیں آپ۔"

"ارے بیٹا! یہ لڑائی کہاں ہے۔ یہ تو چھیڑ چھاڑ ہے محبت کی۔ بے نمک مسالے کے چاٹ اچھی نہیں لگتی نا' ایسے ہی لڑائی نہ ہو تو پیار کا کیا مزہ۔" آصف علی اپنی دھن میں بولتا گیا "ہم بھی بہت لڑتے تھے' اب بھی لڑتے ہیں' بچوں کی طرح۔ فضول باتوں پر جھگڑا کرتے ہیں لیکن ایک بات بتا دوں تمہیں۔ میں نے دنیا دیکھی ہے' بال سفید ہو گئے ہیں میرے۔ میں نے یہی دیکھا ہے کہ جہاں میاں بیوی کا ایک دوسرے سے تعلق ہی نہ ہو' مکمل غیریت ہو ان کے درمیان۔ ایک کو سروکار ہی نہ ہو کہ دوسرا کیا کر رہا ہے' وہاں جھگڑا واقعی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی اپنی دنیا میں' الگ الگ رہتے ہیں۔ بالکل اجنبی سے۔ مگر ایک چھت کے نیچے نظر آتے ہیں تو یہ ایک معاشرتی مجبوری ہوتی ہے۔ ہاں وہ ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرتے ہوں اور ایک دوسرے پر حق رکھتے ہوں تو پھر نوک جھونک ساتھ ساتھ چلتے ہیں' یہ آدمی کا مزاج ہے۔ اور اختلاف کا اظہار اختلاف سے ہی ہوتا ہے۔ جو میرے لیے غیر ہے وہ میری بلا سے زہر کھا لے یا آگ میں کود جائے۔"

اس کا لیکچر گھر آ جانے سے ختم ہو گیا۔ رابعہ کو پہلے تھوڑا سا جانے خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا پھر وہ آصف علی کی باتیں اور سنجیدگی سے سنتی رہی تھی' جیسے یہ سب اس کے لیے انکشاف ہو۔ یہ ایک نیا احساس تھا۔ اس کے لیے اپنی محبت کا ایک نیا پہلو سامنے آیا تھا جو شاید آج تک اس کی نظر سے اوجھل تھا۔ یہ عملی زندگی کی محبت کا وہ انداز تھا جو فلموں اور ناولوں کے مصنوعی جذبات کی یک رخی' بے جان تصویر سے بالکل مختلف تھا۔

آصف علی کا گھر قدیم اور جدید کا امتزاج تھا۔ اس نے کوٹھی کے سامنے والے حصے کو نئے سرے سے تعمیر کرا کے مغربی طرزِ تعمیر کو نمایاں کر دیا تھا مگر اندر پرانی حویلیوں کا ماحول نظر آتا تھا۔ اونچی چھتوں' محرابی کھڑکیوں اور روشندانوں والے کمروں میں ایرانی اور کشمیری قالین بچھے ہوئے تھے اور ڈرائنگ روم کا ایک حصہ پالش سے چمکتے فرنیچر اور سامانِ آرائش سے پُر تھا تو دوسرے حصے میں گاؤ تکیوں کے ساتھ فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ میں نے اسی حصے میں فراغت سے پاؤں پھیلا کے بیٹھنا پسند کیا۔

آصف علی کی بیوی تھوڑی دیر بعد اندر آئی۔ اسے دیکھ کر مجھے غیر متوقع ذہنی صدمہ ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ عمر رسیدہ ضرور ہوگی' ایسے ہی میں نے فرض کر رکھا تھا کہ اس کی صحت بھی آصف علی جیسی ہوگی لیکن اس کے برعکس وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔ بالکل ایک چلتی پھرتی لاش۔ وہ آہستہ آہستہ ڈری کی طرح چلتی آگے آئی تو مجھے دوسرا شاک لگا۔ وہ بینائی سے محروم تھی اور اندازے کی مدد سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ گھر میں کون سی چیز کہاں رکھی ہے چنانچہ وہ تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے بچتی بچاتی چل رہی تھی۔ آصف علی نے کہا تھا کہ وہ میرے والد کے کارخانے میں کام کرنے والے ایک کاریگر کی بیٹی تھی اور یہ شادی خود وزیر خاں نے کرائی تھی۔ بے رحم وقت اپنی ان گنت نشانیاں' ایسی ہی دکھ دینے والی یادوں اور خود غرض یادگاروں کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل گیا تھا۔

آصف علی نے کہا "تمام' یہ ہے وزیر خاں کا بیٹا۔"

تمام نے ہاتھ آگے بڑھائے "کبیر خاں۔ یہی نام ہے نا تمہارا بیٹا؟ مجھے یاد نہیں تھا' آصف نے بتایا تو یاد آیا۔"

میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ اس نے اپنی رعشہ زدہ' کھال منڈھی سوکھی انگلیوں سے میرے چہرے کو چھوا اور محسوس کیا۔

"وزیر خاں بڑا سوہنا جوان تھا۔" اس نے کہا۔

"یہ بالکل وہی ہے نیک بخت۔" آصف علی بولا۔

"بالکل وہی۔ اچھا۔ پھر تو میں دیکھ سکتی ہوں۔"

میرے جذبات بڑے عجیب تھے۔ اگرچہ میں اس شخص کے گھر میں تھا جس نے میرے والد کو بہت بڑا دھوکا دیا تھا۔ اتنا بڑا کہ شاید اس وقت پیٹھ میں گھونپے جانے والے خنجر کے وار کی اذیت نے اسے ہفتوں سوتے جاگتے بے قرار رکھا ہوگا۔ دوست بن کے دغا دینے والا یہ شخص وزیر خاں کے سامنے آ جاتا تو شاید وہ اسے جان سے مار ڈالتا۔ میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ زخم کے مندمل ہو جانے کے بعد بھی وزیر خاں کے دل پر اس کا داغ رہ گیا ہوگا۔ پھر اس کو دلاور نے شریکِ کاروبار بن کے کاروبار سے بھی محروم کیا تھا اور اسے نامعلوم حالات کی مجبوری کے حصار میں لا کے آخرکار مار ڈالا تھا۔ اس طرح کہ وہ مدد کے لیے خدا کے سوا کسی کو نہ پکار سکا۔

www.paksociety.com

وزیر خاں کے ساتھ تقدیر نے عجیب بے رحم مذاق کیا تھا کہ اس کو اپنوں کے اعتبار نے مارا۔ آصف علی نے پہلا وار کیا تھا چوہدری دلاور نے دوسرا۔ اصولاً مجھے آصف علی کو بھی دلاور کی طرح صفِ دشمناں رکھنا لازم تھا مگر اس کو معاف کرنا میری مجبوری بن گیا تھا۔ اگر وہ خود اعتراف نہ کرتا تو مجھے اس کے جرم ماضی کا کبھی پتا نہ چلتا اور یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ دلاور سے پہلے بھی وزیر خاں کو کسی مارِ آستیں نے ڈسا تھا۔

آصف علی نے از خود اپنا قصور تسلیم کر لیا تھا اور غیر مشروط طور پر خود کو میرے انصاف کے رحم و کرم پر چھوڑتے ہوئے اپنی غلطی، اپنے گناہ یا اپنے جرم کی تلافی کے لیے تاوان یا کفارہ ادا کرنے کی ہر سزا منظور کی تھی لیکن قدرت اسے کہیں زیادہ کڑی سزا دے چکی تھی۔ یہ بات وزیر خاں کو بھی معلوم ہو جاتی تو اس کا دل پتھر نہیں تھا کہ دشمن کو جلانے عذاب دیکھ کر سکون حاصل کرتا۔ اگر آصف علی آگ میں جل رہا ہوتا تو وہ اسے بچانے کے لیے آگ میں کود پڑتا اور وہ ڈوب رہا ہوتا تو اسے جان پر کھیل کے بچاتا۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ اس کے چیخنے چلانے اور مدد کی پکار کے جواب میں بے حسی سے کھڑا تماشا دیکھتا اور قہقہے لگاتا رہتا اور اسے احساس دلاتا رہتا کہ دیکھا آصف علی، قدرت نے میرا انتقام کیسے لیا۔

میں اسی وزیر خاں کا بیٹا تھا۔ میرے لیے بھی ممکن نہیں تھا کہ اس پر نازل ہونے والے قدرت کے عذاب پر خوشی منا سکتا کہ یہ تو مکافاتِ عمل ہے۔ کوشش کے باوجود میں اس سے اتنی نفرت نہ کر سکا تھا کہ اسے معاف نہ کرتا اور اس پر ترس نہ کھاتا۔ اس کی نابینا بیوی کی حالت دیکھ کے تو میرا دل اتنا ہی دکھی ہو رہا تھا جتنا برسوں بعد ملنے والے بیٹے کا اپنی ماں کا یہ حال دیکھ کے ہوتا۔ آصف علی تو پھر بھی سزاوار تھا مگر اس عورت نے صرف اس کے دکھوں کی فصل کاٹی تھی کہ وہ صرف سکھ کی ساتھی نہیں تھی۔ شریکِ حیات کی حیثیت سے اس نے اپنے شوہر سے یا تقدیر سے کوئی گلہ نہیں کیا تھا۔ اسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا قصور کیا ہے۔

آنسو رابعہ کی آنکھوں میں ہی نہیں میری آنکھوں میں بھی اُتر آئے تھے مگر میں ضبط پر قادر تھا۔

میں نے کہا "خانم! آپ کو یاد ہیں میرے والد؟ یہاں بیٹھ کے مجھے ان کے بارے میں بتائیں۔"

وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی "بتاؤں گی، جو مجھے معلوم ہے سب بتاؤں گی۔ پہلے تم بتاؤ، تم یہاں کیسے آ گئے؟ کس نے بتایا تھا آخر تمہیں کہ ایک اندھی عورت یہاں تمہارا انتظار کر رہی ہے؟"

میں نے کہا "خانم! یہ ملنا بچھڑنا سب قسمت کے کھیل ہیں۔ اسے آپ اتفاق بھی کہہ سکتی ہیں۔"

"تم بالکل وہی ہو، میں نے دیکھ لیا۔ تمہاری آواز بھی تو وزیر خاں کی آواز ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے ساتھ وہی بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے آصف نے بتایا ہے کہ تم... اکیلے نہیں ہو۔"

میں نے کہا "جی۔ یہ رابعہ ہے میرے ساتھ۔"

"رابعہ... اچھا۔ کہاں ہے؟ ادھر بلاؤ اسے میرے پاس۔"

میں ہٹ گیا اور میری جگہ رابعہ نے لے لی۔ "رو رہی ہیں خانم؟"

"تو تم خود رو رہی ہو اور مجھے منع کر رہی ہو۔" اس نے اپنے ہاتھوں سے رابعہ کے چہرے کو دیکھا "یہ رونے کے دن ہیں بھلا تمہارے۔ خدا نہ رلائے تمہیں کبھی۔ آنسو پونچھ لو۔ تم خوش قسمت ہو وزیر خاں..."

"یہ کبیر خاں ہے پاگل!" آصف علی نے کہا۔

"پاگل ہو تم۔ میں کیوں پاگل۔ کیا فرق ہے اس میں اور وزیر خاں میں؟ میں تو اسے دیکھ رہی ہوں اور سن رہی ہوں۔ پھر کیوں نہ کہوں اسے وزیر خاں۔" اس نے رابعہ کے ماتھے کو چوما "بہت خوش قسمت ہو تم۔ بہت خوب صورت ہے تمہاری رابعہ۔ اللہ نے تمہیں ایک دوسرے کے لیے ہی بنایا ہوگا۔ چاند سورج کی طرح نہیں۔ زمین اور سورج کی طرح۔ چاند تو زمین کا ٹکڑا ہے۔ چاند جیسا تو ہوگا تمہارا بیٹا۔"

آصف نے فوراً صورتِ حال کو سنبھال لیا "چل اب یہ سائنسی انکشافات مت کر۔ میں انہیں سوتے سے جگا کے لایا ہوں۔ بھوکے بیٹھے ہیں بیچارے۔ باتیں بعد میں کر لینا۔ میں دیکھتا ہوں ناشتا لگا ہے کہ نہیں۔"

کاجل اُداس اور الگ تھلگ بیٹھی تھی۔ اس ماحول میں وہ اجنبیت کے رشتے کو زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔

میں نے کہا "خانم! ایک بہن بھی ہے میرے ساتھ۔"

"بہن!" خانم چونکی "تمہاری تو کوئی بہن نہیں تھی۔ تم اکیلے آئے تھے پاکستان۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مگر رشتے صرف خون کے ہی نہیں ہوتے محبت کے بھی ہوتے ہیں۔ میرے سب بہن بھائی تو وہیں رہ گئے تھے لیکن خدا نے یہاں مجھے اکیلا نہیں رکھا۔ موقع ملا تو باقی سب سے بھی ملوا دوں گا۔ میرا ایک بھائی ہے محسن، دوسرا غالب اور تیسرا اکرام شیخ۔ دوسری بہن گل بانو ہے۔"

رابعہ کی جگہ کاجل نے لے لی۔ خانم نے اسے دعائیں دیں تو وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اس محبت کے مظاہرے نے کاجل کے زخموں کو کرید ڈالا تھا۔ اسے اپنے ماں باپ یاد آ گئے تھے جن سے تعلق کی ساری نشانیاں وہ ان راستوں پر چھوڑ آئی تھی جن پر اسے کبھی لوٹ کے نہیں جانا تھا۔ کاجل نے ہی کلیم اللہ کو خانم کے سامنے پیش کیا اور اس کے بارے میں بتایا کہ ہم اسے عزیزوں کے پاس چھوڑنے جا رہے ہیں۔

پھر آصف علی آیا اور ہمیں اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں ایک شاندار ہال میں لمبی میز لگی ہوئی تھی۔ اس کے گرد بائیس کرسیاں تھیں۔ دس ایک طرف، دس دوسری طرف اور دو آمنے سامنے۔ ظاہر ہے یہ سب خاص طور پر بنوایا ہوا فرنیچر تھا اور بہت بیش قیمت۔ اخروٹ کی لکڑی کی کرسیوں پر کھدائی کے نقش و نگار بہت حسین تھے اور میں ان کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکا۔

"بڑا فنکارانہ ہاتھ تھا اس کا جس نے یہ کام کیا۔"

"ہاں۔ ایک بڑھئی تھا۔ پنجابی۔" آصف علی بولا "تنہا میں اکیلا بیٹا تھا۔ بچے پڑھ لکھ کے ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ کوئی دبئی چلا گیا کوئی کراچی۔ لڑکیاں پرائی ہو گئیں اور بیوی بھی مر گئی۔ اس نے اپنا کام نہیں چھوڑا۔ بیٹے پردیس میں ہو گئے تھے۔ انہوں نے بہت اصرار کیا کہ ہمارے ساتھ چلو مگر وہ نہ مانا کہ گھر بھی چھوڑ دوں؟ کام بھی چھوڑ دوں؟ حالانکہ وہ گھر کیا تھا ایک کچی کوٹھری تھی اور کام کرنا اس کے لیے بالکل ضروری نہیں تھا مگر اس کو ادا کرنا یا کچھ اور، جیسے ساری عمر ایک پنجرے میں گزارنے والا پنچھی اُڑنا ہی بھول جاتا ہے۔ لاکھ دروازہ کھلا رکھو وہ باہر نہیں آتا۔ ایسے ہی انسان بھی گھر اور ماحول کا قیدی ہو جاتا ہے۔ یہ قید اس کی مجبوری بن جاتی ہے۔ کام کی عادت بھی مجبوری تھی اس کی۔ جیسے چالیس سال سگریٹ پینے والا سگریٹ پیے بغیر نہیں رہ سکتا بالکل ایسے ہی چالیس سال ایک ہی کام کرتے کرتے اس کے لیے یہ ناممکن تھا کہ کسی دن وہ اپنے اوزار ایک طرف رکھ دے اور کراچی کی کسی کوٹھی کے ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کے نوکروں پر حکم چلانے لگے۔"

خانم نے کہا "تم بولتے جا رہے ہو۔ بچے ناشتا کر رہے ہیں یہ کچھ دیکھو۔"

میں نے کہا "سب ناشتا کر رہے ہیں، آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

ہم سب میز کے ایک کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میز پر کھانے پینے کی اتنی چیزیں تھیں کہ ہم ہر چیز چکھتے تو پیٹ بھر جاتا۔ کئی صرف گنانے کی تھیں جو میری فرمائش پر فوراً حاضر کر دی گئی۔ گھر میں کھانا پکانا ایک ماہر خانساماں کی ذمے داری تھی۔ اس کے علاوہ دو نوکر تھے۔ ایک اندر باہر کے کام کرتا تھا اور دوسرا گاڑی چلانے کے ساتھ باغ کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

آصف علی نے اپنی بات جاری رکھی "وہ بڈھا جب ایک کا کام ہاتھ میں لے لیتا تھا تو وہ کام ختم کرنے سے پہلے کسی کا آرڈر نہیں لیتا تھا۔ اس کے قدر دان بہت تھے جو زیادہ سے زیادہ معاوضہ ادا کرنے پر تیار رہتے تھے مگر پیسے کی اسے ضرورت ہی کہاں تھی۔ وہ ایک ہی جواب دیتا تھا سب کو۔ ابھی ہاتھ میں کام ہے، یہ ختم ہو جائے تو آنا۔ کل کا وعدہ کیسے کر لوں۔ ایڈوانس کیسے رکھ لوں۔ کیا پتا آج رات ہی مر گیا تو کیا ہوگا؟ بائیس مہینے لگے اس نے یہ بائیس کرسیاں مکمل کی تھیں۔ یعنی ایک مہینے میں ایک کرسی۔ اور معلوم ہے معاوضہ کیا لیا؟ بائیس سو روپے ایک کرسی کے۔ بازار میں خریدار ایک کرسی کے ہزار دینے پر بھی تیار ہوں گے مگر بازار کا کام وہ کرتا ہی نہیں تھا اور جن کے گھر میں وہ کوئی چیز بناتا تھا وہ اس کو بازار میں بیچتے نہیں تھے۔"

"اب کہاں ہے وہ؟" میں نے کہا۔

"مر گیا۔ دو سال ہو گئے۔" آصف علی نے کہا۔

"کیسے؟ کیا ہوا تھا اسے؟"

"نہیں۔ رات کو سویا، صبح نہیں اُٹھا۔ بیماری یا تکلیف اسے کوئی نہیں تھی۔"

"پھر کیا اسے قتل..."

"ارے نہیں کبیر خاں۔ تمہارے دماغ میں یہ باتیں اس لیے آتی ہیں کہ تم کو ایسے ہی حالات کا سامنا رہا۔ جو لوگ ملے وہ بھی ایسے ہی ملے۔ ورنہ عام زندگی میں یہ سب کہاں ہوتا ہے۔ اتنی عمر ہو جائے تو بس آتی جاتی سانس کا شمار رہ جاتا ہے کہ نہ جانے کب سانسوں کا کوٹا پورا ہو جائے۔ موت کے بہانے بہت۔ اس کا دل تھک گیا ہوگا چلتے چلتے۔ کوئی مشین ہے ایسی جو اسی سال چلتی رہے اور ایک بار بھی بند نہ ہو؟"

رابعہ نے کہا "یہاں فرض کر لیتے ہوں گے لوگ کہ موت طبعی تھی۔"

"جب تک شک کی وجہ نہ ہو ایسا سمجھنا غلط بھی نہیں۔"

میں نے کہا "پوسٹ مارٹم نہ سہی کم سے کم ڈاکٹر دیکھ کے بتاتے کہ موت کیسے واقع ہوئی۔"

وہ بولا "یہ سب فضول کے جھگڑے ہیں بیٹا۔ گاؤں دیہات میں آج بھی کچھ نہیں ہوتا۔ اور شہروں میں پہلے کب ہوتا تھا؟ یہ تو اب زمین، جائداد کے قبضے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ حقِ وراثت کا مسئلہ آ جاتا ہے۔"

"ذاتی دشمنی یا خاندانی عداوت میں سب سے زیادہ قتل یہاں ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"مگر وہ ایسے نہیں ہوتے۔ یہاں کوئی چھپ کے وار نہیں کرتا۔ پیٹھ میں گولی مارنے والا بزدل اور کمینہ سمجھا جاتا ہے اور یہ مردانگی کے خلاف ہے۔ اس بڈھے کا تو دشمن بھی کوئی نہیں تھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کے سفرِ آخرت میں اپنا کوئی نہیں تھا۔ تین بیٹے تھے، ایک بھی مٹی دینے نہ آیا۔ جو امریکا میں تھا اس کا تو کسی کو پتا ہی معلوم نہیں تھا۔ دوسرا کراچی اور وہ بھی دونوں جگہ رہتا تھا۔ بہت بڑا اسمگلر تھا۔"

"تھا کیا مطلب؟ اب نہیں ہے؟"

"اب بھی ہوگا۔ جو اس دھندے میں پڑ جائے اور دولت اس پر برسنے لگے، وہ اس کاروبار کو کب چھوڑتا ہے۔" آصف علی نے کہا "وہ تو آگے بڑھتا جاتا ہے، کاروبار کو پھیلاتا رہتا ہے۔ اس کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اور ایک فرد سے وہ ایک گروہ بن جاتا ہے۔"

www.paksociety.com

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ ایسے گروہ مافیا کہلاتے ہیں۔ کہیں چھوٹے پیمانے پر تو کہیں بین الاقوامی سطح پر مافیا کی طرز پر سینکڑوں مجرموں کے گروہ ہر قسم کے مذموم کاروبار میں مصروف ہیں اور کچھ تو اتنی طاقت پکڑ گئے ہیں کہ ان سے حکومتیں خوف زدہ رہتی ہیں۔"

"حکومتیں ان کی مٹھی میں رہتی ہیں۔" آصف علی نے کہا۔

میں نے کہا "کیا آپ کو اس اسمگلر کا نام معلوم ہے؟"

"ہاں۔ پہلے وہ اکبر خان تھا پھر ملک اکبر سیٹھ ہو گیا تھا۔ ایک دو بار آیا تھا باپ سے ملنے کے لیے۔ اس کے ٹھاٹ باٹ سے زیادہ اس کے انداز و اطوار میں فرعونیت تھی۔ اس کے ساتھ مسلح محافظ تھے اور اس کی شاندار کالی مرسیڈیز کے آگے پیچھے جیپوں پر سوار تھے۔ ایسا حفاظتی انتظام، یہ کروفر کا مظاہرہ اور ایسا تکبر! اللہ کی پناہ۔"

"کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ اس کے باوجود سیٹھ اکبر نے اپنے اس باپ کو بھلایا نہیں، اس سے رشتہ نہیں ختم کیا اور ساری دنیا کے سامنے اسے اپنا باپ تسلیم کیا؟" میں نے کہا۔

"تم اسے اچھائی کہہ لو مگر میرا خیال ہے اس میں بھی ذاتی پبلسٹی کا پہلو تھا۔ وہ دنیا کو بتانا چاہتا تھا کہ دیکھو میں اس فرش نشین کا بیٹا آج۔ نعوذ باللہ عرش پر ہوں۔ یہ سب میرا کمال ہے۔ بڑی واہ واہ ہوئی اس کی جب وہ بوڑھے کے پاس یہاں آ کے بیٹھا۔ اسی کمرے میں۔ وہ اپنا کام کر رہا تھا کہ باہر گاڑیاں آ کے رک گئیں۔ ایک ملازم نے مجھے روتے ہوئے آ کے بتایا کہ پتا نہیں کون بدمعاش آیا ہے۔ کہنے لگا وہ بڈھا کاریگر یہاں کام کر رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کرسیاں بنانے والے بڈھے کی بات کر رہا ہو گا۔ میں نے کہا "کر رہا ہے لیکن جب تک وہ کام ختم نہیں کرے گا آپ کا آرڈر نہیں لے گا۔" بس جی اس نے ہاتھ مار دیا میرے منہ پر کہ "بھونکنے کی ضرورت نہیں تمہیں۔ اس کو جا کے بولو کہ اکبر خان آیا ہے۔" پھر میں گیا یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ اکبر خان کیا چیز ہے آخر۔ وہ ببر شیر کی طرح ٹہل رہا تھا ہاتھ پیچھے باندھے اور اس کے وفادار کتے ایسے تیار کھڑے تھے کہ اشارہ ملے اور وہ جھپٹ پڑیں۔ میں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ اسے عزت کے ساتھ اندر لے آؤں۔ میں نے کہا "اکبر خان صاحب! یہ گھر میرا ہے۔ تشریف لائیے۔" اس الو کے پٹھے نے اکڑفوں میں جواب دیا کہ "مجھے تمہارے گھر سے کچھ نہیں لینا۔ ایسے بہت گھر ہیں میرے۔ مجھے مرعوب مت کرو۔ میرے باپ کو بلاؤ۔ وقت نہیں ہے میرے پاس فضول باتوں کے لیے۔" تب میں نے جان لیا کہ وہ اکبر خان ہو گا۔ بڈھا بھی کبھی اس کا ذکر کرتا تھا۔ خیر میں نے بڈھے کو بتایا اور اس نے مجھ سے کہا کہ اکبر خان آیا ہے تو میں کیا کروں۔ اٹھ کے اس کا استقبال کرنے جاؤں۔ میں کام کر رہا ہوں۔ بلوا لو اسے یہاں۔" خیر... میں نے یہ اکبر خان سے کہہ دیا اور اکبر خان اندر آ کے باپ کے پاس بیٹھ گیا۔ اتفاقاً میں نے چائے کے لیے پوچھا تو اس نے انکار کر دیا اور مجھ سے بولا کہ تم جاؤ یہاں سے۔ "حرام زادہ مجھے میرے گھر میں حکم دے رہا تھا کہ دفع ہو جاؤ۔ میں جھگڑا نہیں بڑھانا چاہتا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت تھی اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ سو بڈھا اور بیٹا دونوں ایک دوسرے پر چلانے لگے۔ بیٹا کہتا تھا کہ یہ کام کر کے تم میرا نام بدنام کر رہے ہو۔ بے عزتی کروا رہے ہو میری اور بڈھا چیخ رہا تھا کہ یہ بات ہے تو جا باپ بدل لے۔ اپنا باپ بنا لے، تیری عزت بڑھ جائے۔ آئندہ مجھے صورت مت دکھانا حرامی۔ تجھے یاد کر لی مرنی تو پیسہ کمانے میں لگا رہا۔ خرید لینا اپنے جیسے ماں باپ۔ بہت مل جائیں گے۔ تجھ سے تو تیرا بھائی دلاور اچھا کہ آتا تھا تو مجھے بے عزت کرنے نہیں آتا تھا۔"

"دلاور!" میں نے چونک کے کہا "کون دلاور؟"

"اکبر خان سے چھوٹا دلاور خان تھا۔" آصف علی بولا۔ "پہلے دونوں بھائی ایک ساتھ تھے پھر دلاور خان نے بھائی سے علیحدگی اختیار کر لی کہ اسمگلنگ اور بدمعاشی کے دھندے میں کچھ ساتھ۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ اکبر خان کا بہت سا مال لے گیا تھا لاکھوں کا۔ یہ سمجھ لو کہ کہانی وہی وزیر خان اور آصف علی کی تھی، کرداروں کے نام بدل گئے تھے۔ وہ دوست نہیں تھے، سگے بھائی تھے۔ دلاور خان بھی روپوش ہو گیا تھا اور بعد میں اس کا کچھ نہیں چلا۔"

"حیرت ہے کہ اکبر خان جیسا شخص بھی پتا نہیں چلا سکا۔"

"بابا اس نے باہر ہر جگہ معلوم کیا، جہاں جہاں اس کے کاروباری تعلقات تھے۔ سیکڑوں کارندے تھے اس کے اور ان لوگوں کے جو اکبر خان جیسے ہی تھے مگر امریکا برطانیہ کینیڈا اور جرمنی کے رہنے والے تھے اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار تھے۔"

میں نے کہا "آصف صاحب! آپ نے وہ محاورہ سنا ہے۔ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔"

"سنا تو ہے۔ مگر میری بات سے کیا تعلق ہے اس محاورے کا؟"

میں نے کہا "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ دلاور خان ملک میں ہی ہو اور اکبر خان اسے ملک سے باہر تلاش کر رہا ہو۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اتنا لمبا ہاتھ مارنے کے بعد دلاور خان باہر ہی جائے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اکبر خان کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ وہ ملک میں جہاں بھی ہو پکڑا جائے گا ایک دن۔ مگر دنیا واقعی بہت بڑی جگہ ہے۔ اکبر خان کا دھیان ہی نہ گیا ہو اس طرف کہ وہ اسی ملک اور اسی شہر میں اس کی ناک کے نیچے ہو سکتا ہے۔"

آصف علی ہنسنے لگا "یہ بھی ہو سکتا ہے، کیوں نہیں ہو سکتا۔ ضروری تو نہیں کہ زیادہ بڑا اور طاقت ور بدمعاش زیادہ ذہین بھی ہو۔ دلاور خان اپنے بھائی کے مقابلے میں پڑھا لکھا بھی تھا اور ذہین بھی۔"

رابعہ نے کہا "میں ایک دلچسپ واقعہ سناؤں۔ لاہور کا ایک چور تھا جو برسوں پکڑا نہیں گیا تھا۔ ایک تھانے کی حدود میں کچھ کوارٹرز تھے۔ کوارٹرز اور تھانے کا احاطہ ایک ہی تھا۔ پچھلی طرف کوارٹرز کی دیوار کے ساتھ رات کے وقت کچھ ریڑھی والے اپنی اپنی ریڑھی کھڑی کر دیتے تھے۔ ظاہر ہے کسی کا اپنا آدمی تھا تو کوئی بھتہ دیتا تھا۔ بلا اجازت پولیس والے کسی کو سڑک کے کنارے ریڑھی نہیں لگنے دیتے تو تھانے کی حدود میں کوئی کیسے ریڑھی کھڑی کر سکتا ہے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ ریڑھی والے اپنے ہی بندے ہیں۔ ان میں سے ایک وہ ریڑھی پر سو بھی جاتے تھے اور صبح ریڑھی لے کر نکل جاتے تھے۔ کھانا بازار سے کھاتے تھے۔ نہانے دھونے کے لیے پولیس لائن کے باتھ روم اور گھر کی جگہ اپنی ریڑھی۔ وہ کباڑی بھی انہی میں شامل ہو گیا۔ رات کو واردات کے لیے نکل جاتا تھا اور واردات کے بعد اپنی ریڑھی پر آ کے سو جاتا تھا۔ صبح سب کے ساتھ اٹھتا تھا اور ریڑھی لے کر نہ جانے کدھر جاتا تھا۔ ساری وارداتیں اس نے پولیس لائن کے آس پاس بنگلوں میں کی تھیں جہاں سے وہ چند منٹ میں اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتا تھا۔ چوری کا مال ریڑھی کے نیچے والے خانے میں چھپاتا تھا اور سو جاتا تھا۔ کئی بار لوگ اس کے پیچھے بھاگے، پولیس ادھر ادھر تلاش کرتی رہی مگر یہ خیال کسی کو نہیں آیا کہ چور صاحب تھانے میں مزے سے سو رہے ہیں۔"

ہم سب ہنسنے لگے "اسے تو پولیس میں بھرتی کر لینا چاہیے تھا فوراً۔"

"پھر وہ پکڑا کیسے گیا؟" آصف علی نے پوچھا۔

"پکڑا تو جاتا ہے آدمی کبھی نہ کبھی۔ غلطی سے اس نے پولیس لائن کے ایک کوارٹر میں ہاتھ صاف کر دیا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے بیوی کے نام پر کسی کا ایک کنال کا پلاٹ رشوت میں لیا۔ کوئی قتل کا کیس تھا جس میں لمبی رشوت چلتی ہے۔ پلاٹ تھا قاتل کے بھائی کی بیوی کا۔ اس نے ہیڈ کانسٹیبل کی بیوی کے نام کر دیا۔ بیوی نے شوہر کو پاور آف اٹارنی دی اور ہیڈ کانسٹیبل نے اسے فوراً بیچ دیا۔ رقم وہ اٹھا لاؤ لے کر آیا تھا۔ اپنا حصہ رکھ کے اسے باقی ایس ایچ او صاحب کی خدمت میں پیش کرنا تھا مگر نہ جانے کیسے چور کو علم ہو گیا۔ غالباً اس نے کھلی کھڑکی سے میاں بیوی کی باتیں سن لیں۔ اس کی ریڑھی کھڑکی سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ رات کو اس نے مال سمیٹا اور لمبی تان کے سو گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بہت غور کیا اور اس کا شبہ پیچھے پہنچا کہ کوئی گھر کا بھیدی ہے۔ بیوی سے یہ امید نہ تھی کہ وہ کسی کو بتائے اور کسی کو کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ ریڑھی دیکھ کے وہ شک میں پڑ گیا اور اگلی رات اس نے بندے کو اٹھوا لیا۔ حوالات میں چھترول تو کسی کی بھی ہو جاتی ہے۔ مان لے تو مجرم اور نہ مانے تو جائے اپنے گھر۔ وہ چور کچھ کم ہمت ہو گا ورنہ صبح تک برداشت کر لیتا تو بچ جاتا۔ اس نے رات بھر میں ہر چوری کا اعتراف کر لیا۔"

ناشتے کے بعد ہم سب پھر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ میرے ذہن میں دلاور خان کے نام اور اس کی گمشدگی کے ذکر سے کھد بد ہو رہی تھی۔ میں دلاور خان کے بارے میں مزید جاننا چاہتا تھا لیکن آصف علی اب ایک پرانی تصویر لے آیا تھا۔

"دیکھو یہ کون ہے۔" اس نے پہلے رابعہ کو وہ فریم کی ہوئی تصویر دی "اسے پہچانتی ہو؟"

"یہ... سکندر! یہ تم ہو۔" رابعہ نے حیرت سے کہا اور پھر ہنسنے لگی۔

"سکندر! کیا اس نے نام بدل لیا ہے؟" آصف علی بولا۔

"جی۔ یہ نام تو بہت پہلے ہی ہو گیا تھا میرا۔ خود والد نے کبیر خان کہنا چھوڑ دیا تھا۔" میں نے وضاحت کی "اب بہت کم لوگ اصل نام سے واقف ہیں۔"

رابعہ نے تصویر میری طرف بڑھا دی "اتنی پرانی تصویر نہ ہوتی تو میں ہرگز نہ مانتی کہ یہ تم نہیں ہو۔"

میں نے تصویر میں وزیر خان کو دیکھا جو اپنے دوست آصف علی کے ساتھ کھڑا تھا۔ آصف علی نے سہرا تصویر کھنچوانے کے لیے نقاب کی طرح الٹ دیا تھا۔ اس کے گلے میں نوٹوں کا ہار تھا اور دونوں دوست ایک جیسی چمکیلی پھولوں والی شیروانی اور کلاہ پہنے کھڑے تھے۔ تصویر بلیک اینڈ وائٹ تھی مگر اس کی سیاہی میں سرخی شامل ہو گئی تھی۔ شیروانی کے کپڑے سے صرف اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ بروکیڈ کی قسم کا چمکیلا کپڑا ہو گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اپنے والد کی اس سے زیادہ پرانی کوئی تصویر نہیں دیکھی تھی اور میرے والد کے دور شباب کے آخری عہد کا نقش سو فیصد وہی تھا جو آج میں تھا۔ فرق صرف گزر جانے والے وقت اور گزرتے ہوئے وقت کا تھا۔ جیسے بہتے دریا کا عکس جو آئینے میں دکھائی دے۔ آئینہ بھی وہی رہتا ہے، عکس بھی وہی اور دریا بھی وہی مگر بہتا دھارا بہت آگے نکل جاتا ہے اور ویسا ہی نظر آنے والا پانی وہ پانی نہیں رہتا۔ آصف علی نے ٹھیک کہا تھا۔ میں اپنے والد کا نقش ثانی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خانم جو اس وقت ایک لڑکی تھی اور کہیں اوٹ میں ہی بیٹھی ہوگی، آج آنکھوں کے بغیر بھی مجھے دیکھ سکتی تھی۔

میں نے کہا "آصف صاحب! تصویریں تو اور بھی ہوں گی آپ کے پاس۔ ان میں دلاور کی کوئی تصویر ہے؟"

"دلاور کی تصویر میرے پاس!" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

رابعہ نے کہا "آپ کے دماغ میں یہ کیڑا کیوں کلبلا رہا ہے کہ ہیرولال چودھری دلاور ہو سکتا ہے؟"

"آپ دلیل سے ثابت کریں کہ نہیں ہو سکتا۔ اگر سوا ہزار میں ایک کا امکان ہو تب بھی میں اپنا اطمینان کیوں نہ کر لوں۔ کیا نقصان ہے اس میں آپ کا۔"

www.paksociety.com

"آپ ڈائریکٹری لے کر بیٹھ جائیں اور دلاور نام کے ہر شخص کو فون کرلیں۔ اخبار میں اشتہار دے دیں کہ دلاور نام کا ہر آدمی مجھ سے رابطہ کرے۔ انجمن دلاوران پاکستان بنالیں۔"

آصف ہنسنے لگا "پھر لڑنے لگے۔ دیکھو بھئی! تصویر تو کوئی نہیں۔ ہاں دلاور خان کو میں نے دیکھا تھا۔ جب اس کی ماں زندہ تھی تو وہ سال چھ مہینے میں چکر لگاتا تھا۔ عجیب بات ہے، ماں سے بڑی محبت تھی اسے۔ ماں کی گود میں سر رکھ کے روتا تھا......"

میں نے کہا "اتنی ہی محبت تھی تو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتا تھا؟"

"ایک مجبوری تو شوہر کی تھی۔ دلاور کے باپ کی۔ اسے اکیلا چھوڑ کے وہ کیسے جاتی۔" آصف علی بولا "دوسری بات یہ کہ خود دلاور کہتا تھا ماں سے کہ میں بڑا بدقسمت ہوں۔ نہ تیرے ساتھ رہ سکتا ہوں نہ تجھے اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں۔"

"یہ کہتا تھا وہ؟" رابعہ نے افسوس سے سرہلایا۔

"ہاں۔ پتا نہیں کیا مجبوری تھی اسے۔ بڑا والا اکبر خان ایسی کوئی بات نہیں کہتا تھا۔ وہ تو کہتا تھا کہ میرے ساتھ کراچی چلو۔ دلاور خان شاید اسے مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ والدین کو ان کے کالے کرتوت معلوم ہوں اور اپنے ناجائز دھندوں کی وجہ سے بھی ان پر مصیبت آئے تو اس عمر میں بوڑھے والدین کی بھی مٹی پلید ہو۔"

میں نے کہا "مجھے ذرا حلیہ بتائیں دلاور کا۔ آپ نے آخری بار کب دیکھا تھا؟"

"آخری بار۔ چار پانچ سال ہوگئے۔ اس کی ماں پہلے مرگئی تھی۔ باپ دو سال اور جیا مگر اس حساب سے تو ڈھائی تین سال ہوئے۔ ہاں اتنی ہی پرانی بات ہوگی۔ آخری عید تھی وہ جو اس نے ماں کے ساتھ کی تھی۔ وہ جب آتا تھا' ماں باپ کے لیے بہت کچھ لاتا تھا لیکن باپ خبطی اور ضدی تھا۔ ایک پیسہ نہیں لیتا تھا اور دھیلے کی چیز بھی گھر میں نہیں رکھتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ کمائی غلط ہے۔ بعد میں شاید دلاور خان کو پتا چل گیا تھا کہ ماں مرگئی۔ اس کے جنازے میں وہ شریک نہیں ہوسکا تھا۔ سوئم پر پہنچا۔ سیدھا قبر پر گیا فاتحہ پڑھنے کے لیے۔ کسی ٹھیکیدار سے بات کی اور ماں کی قبر کے آس پاس کی زمین خرید کے وہاں ایک مسجد بنوانے کا ٹھیکا دے گیا۔ بعد میں باپ کو بھی وہیں دفن کیا۔ مسجد کے احاطے میں۔ دلاور آیا تھا درمیان میں دوبار۔ یہ دیکھنے کے لیے مسجد بنی یا نہیں۔ صفوں کے لیے اور دوسرے سامان کے لیے کافی رقم دے گیا۔ لاؤڈ اسپیکر اور کلاک وغیرہ خریدے گئے' امام اور مؤذن کا حجرہ بنا۔ اس کے بعد بھی وہ پیسہ بھیجتا رہا کہ ضرورت مندوں کے کفن دفن کا انتظام مفت کیا جائے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔"

میں دم بخود بیٹھا ایک اسمگلر اور بدمعاش کی زندگی کا وہ پہلو دیکھ رہا تھا جو ساری دنیا کی نگاہ سے اوجھل تھا۔ آخر یہ سب کیا تھا؟

ایک فطری جذبہ جسے جہالت کہا جاسکتا ہے کہ دلاور خان کو بھی اپنی ماں سے وہی قربت تھی جو کسی بھی جانور کو ایک خاص عمر تک ماں سے رہتی ہے مگر سوشل اینیمل کہلانے والا آدمی جذبات کی زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے۔ یہ ایک طاقتور، تمام مادی وسائل رکھنے والے' ساری اخلاقی اقدار کو پاؤں کی ٹھوکر میں رکھنے والے اور قانون کو اپنی مٹھی میں رکھنے والے شخص کی زندگی کا وہ خلا تھا جس کو صرف ماں کی محبت پُر کرسکتی تھی۔ یا ضمیر کے جہنم میں جلنے والے کے لیے روح کی تسکین کا واحد وسیلہ وہ جنت تھی جو ماں کے پیروں کے سوا کہیں نہ تھی۔ کیا اسے احساس تھا کہ اس کے سارے گناہ اسی طرح معاف ہونے کی اُمید ہے کہ وہ ماں کے قدموں کی جنت میں کوئی نیکی کا سرچشمہ جاری کردے جس کے صدقے میں اس کا نامۂ اعمال کچھ متوازن ہو جائے گناہوں کے ساتھ ثواب بھی لکھے جائیں اور میدانِ حشر میں اس کی شفاعت کے لیے ان کی دعائیں ہوں۔ ان سب کی دعائیں ہوں جو اس مسجد میں مصروفِ عبادت رہے اور ان کی دعائیں ہوں جن کو یہاں سے سفرِ آخرت کے لیے کفن ملا۔

یہ عجب بات تھی کہ دنیا میں خود کو فرعون سمجھنے والا دلاور اندر سے آخرت کے خوف میں مبتلا وہ شخص تھا جو یقین رکھتا تھا کہ خدا بڑا ہی رحمان اور رحیم ہے اور بخشنے والا بھی ہے۔ شاید یہ ناممکن ہے کہ ساری دنیا پر اقتدار اور اختیار کا مالک اور تکبر میں خدائی کا دعوے دار بھی اپنے اس خوف کو دل سے نکالنے میں ناکام رہتا ہو۔

آصف علی اب رابعہ کو اور کا جل کو میرے بچپن کی اور دزیر خان کے ماضی کی بہت سی ان کہی باتیں بتارہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں بھی توجہ سے سُن رہا ہوں جب کہ در حقیقت میں دلاور خان کا تصور کر رہا تھا۔ آخر وہ کون تھا۔ کیا چوہدری دلاور ہی دلاور خان ہوسکتا تھا؟

میں نے موقع پاتے ہی کہا "آصف صاحب! وہ مسجد کہاں ہے جہاں دلاور خان کے والدین دفن ہیں؟"

"اب وہ قبرستان میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔"

"اور وہاں پیش امام اور مؤذن وہی ہیں جن کو دلاور خان رقم ارسال کرتا رہتا ہے؟"

"پیش امام اور مؤذن ایک ہی شخص ہے۔"

"اس نے تو دلاور کو کئی بار دیکھا ہوگا۔ مسجد کی تعمیر کرنے والے ٹھیکیدار نے بھی دیکھا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیکیدار تو پتا نہیں کہاں گیا۔ سب دبئی جارہے ہیں' وہ بھی نکل گیا ہوگا۔" آصف علی بولا "پیش امام صاحب نابینا ہیں بےچارے۔ حافظ ہیں اور بڑے اچھے قاری۔"

میں نے مایوسی سے کہا "پھر آپ ہی کچھ بتائیں' دلاور خان کے بارے میں۔ میرے پاس اس وقت کوئی تصویر نہیں ہے ورنہ تصدیق ہوجاتی۔"

رابعہ نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میرے ذہنی توازن پر شک ہو "ابھی تک وہی ایک بات سوچ رہے ہو؟"

"ایک خلش پیدا ہوگئی ہے خواہ مخواہ۔ کچھ لو دماغ چل گیا ہے میرا۔" میں نے کہا۔

مگر اس کے بعد آصف علی نے سوچ سوچ کے یادداشت کی مدد سے دلاور خان کی صورت شکل' قد و قامت اور انداز و اطوار کا تفصیلی نقشہ بنانا شروع کیا تو خود بخود سب کے ذہن میں ایک ہی تصویر بنتی چلی گئی۔ یہ چوہدری دلاور کی تصویر تھی۔ میں نے ان گنت سوال کیے اور یہ سوال خود بہت سی باتوں کا جواب تھے۔ میں نے دلاور خان کے نامکمل خاکے میں اپنی معلومات کی مدد سے حقائق کے رنگ بھرے جن سے خود ہی چوہدری دلاور کا نقش واضح ہوتا گیا۔ آصف علی حیران تھا اور مجھے خبطی سمجھنے والی رابعہ شرمسار تھی کہ پوشیدہ امکان کا ایک ذرہ جس کو میں نے آفتاب آمد دلیلِ آفتاب کی طرح دلاور ثابت کردیا۔

"دلاور خان ہی چوہدری دلاور ہے؟" آصف علی نے بے یقینی سے کہا۔

"اس میں شک کی ایک فیصد گنجائش نہیں رہی۔" میں نے دُکھ سے کہا "یقین نہیں آتا تو میرے ساتھ لاہور چلو۔ خود مل کے دیکھو اسے اور پہچانو۔ میں نے کہا تھا نا' اکبر خان اسے باہر تلاش کرتا رہا لیکن وہ نام بدل کے یہیں موجود رہا۔ اس نے شہر بدل لیا' اسلوب بدل لیا۔"

رابعہ نے کہا "اکبر خان اب کہاں ہے؟ دلاور کا بھائی۔"

"ہوگا کراچی میں۔ کیا کہا جاسکتا ہے ایسے لوگوں کے بارے میں کہ کس وقت وہ کہاں ہوں گے' کس نام سے ملیں گے اور ملیں گے تو کہاں ملیں گے۔ جیل میں یا کسی گمنام مدفن میں۔ ایسے لوگ اپنوں کی گولی کا نشانہ بھی بن سکتے ہیں اور غیروں کی گولی کا بھی۔ پولیس کی گرفت سے بچ نکلتے ہیں اور غائب بھی ہوسکتے ہیں۔" آصف علی بولا۔

اب تو بچنے والے تھے۔ مجھے ایک بہت اہم بات معلوم ہوئی تھی کہ چوہدری دلاور کا بھائی ایک نامی گرامی اسمگلر تھا۔ اس نے اسمگلنگ بھائی سے سیکھی تھی اور خون کا رشتہ رکھنے والا بھائی اس کے خون کا پیاسا تھا۔ اس کی داستانِ ماضی کے یہ حوالے میرے ہاتھ میں آجانے والے ترپ کے اضافی پتے تھے جن کو میں اس کے خلاف کبھی بھی استعمال کر کے چوہدری دلاور کا پتا کاٹ سکتا تھا۔ پہلی بار مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس کی ماں کون تھی اور باپ کیا کرتا تھا۔ آج تک اس نے اپنی عمر گزشتہ کو رازداری کے ایک آہنی پردے کے پیچھے چھپائے رکھا تھا مگر قسمت نے خود میری رہنمائی کی تھی اور مجھے اس مقام تک پہنچا دیا تھا جہاں سے چوہدری دلاور نے اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اب میں اس پوزیشن میں تھا کہ دلاور کے بارے میں سب کچھ جان سکوں۔

رابعہ نے دوسری بات شروع کردی "خانم کی آنکھیں کیا کسی بیماری میں خراب ہوئی تھیں؟"

"نہیں بیٹا۔ اسے بھی میں کیا کہوں۔ اپنی بدقسمتی یا میرے اعمال کی سزا جو اس غریب نے کاٹی۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے یہ سوچ کے اگر یہ کسی اور کی بیوی ہوتی تو اچھا ہوتا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو جی...؟ خدا کی مرضی کے خلاف بول رہے ہو۔ وہ آسمان پر جوڑے بناتا ہے۔ زمین پر کسی کے چاہنے نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے تو کوئی گلہ نہیں تقدیر سے۔ بہت خوش ہوں میں۔ میں اس گھر میں ایسی شان و شوکت کی زندگی گزار رہی ہوں۔ خدمت کے لیے کسی کی محتاج نہیں۔ نوکر چاکر ہیں۔ ایک نہیں دو دو گاڑیاں ہیں۔ کسی اور کے ساتھ کیا ہوتا یہ کون جانے۔ کیا پتا میں کہیں بھیک مانگ رہی ہوتی' کسی اسپتال میں خون تھوک کے مرجاتی اور میرے پاس دوا دارو کے پیسے تک نہ ہوتے۔ آخر پچاس سال تو دنیا دیکھی میں نے ان آنکھوں سے۔ وہ بھی تو ہوتے ہیں جو پیدائشی اندھے ہوتے ہیں' ایک دن کا اُجالا بھی ان کے نصیب میں نہیں ہوتا۔"

ایسا صبر و قناعت کا پیکر مجسم میں نے کہیں نہ دیکھا تھا۔ اس کا نحیف و ناتواں جسم ایمان اور عقیدے کی وہ ناقابلِ شکست دیوار تھی جسے آلام و مصائب کے طوفان بھی متزلزل نہ کرسکے تھے۔ میں نے اس پر رشک کیا کیونکہ میں ان آنکھوں والے اندھوں میں شامل تھا جو صرف تیرہ بختی کو دیکھتے ہیں اور خوش بختی کا بہت سا اُجالا پاکے بھی بے یقینی کے راستوں پر بھٹکتے پھرتے ہیں اور شکوہ کرتے ہیں۔

"پانچ سال پہلے تک اس کی نظر ٹھیک تھی۔ پھر اسے پڑھنے میں دشواری ہونے لگی۔" آصف علی نے کہا "کہتی تھی کہ کلامِ پاک کی تلاوت کرتے ہوئے حروف دھندلا جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "چالیس سال کی عمر کے بعد قریب کی نظر کمزور ہونے لگے تو کوئی غیر معمولی بات نہیں۔"

"میری عمر تو پچپن ہوگئی تھی۔" خانم نے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ لیڈی ریڈنگ اسپتال میں کسی امراضِ چشم کے ماہر کو دکھاؤں۔ وہ نظر ٹیسٹ کرکے چشمہ بنادے گا لیکن اس نے کچھ جلدی کی۔ ایک عورت نے کسی پیر کا ذکر کیا کہ ان کی درگاہ سے پیدائشی نابینا بھی بصارت پاکے لوٹتے ہیں۔ ایسے جھوٹے معجزوں کی شہرت ان جعلی پیروں کے ایجنٹ پھیلاتے ہیں اور خاص طور پر عورتوں کے ذریعے۔ ایک دن یہ خود بھی چلی گئی اور وہاں سے کوئی سُرمہ لے آئی۔ پتا نہیں اس میں کیا تھا۔ سُرمہ دینے والے نے کہا تھا کہ لگانے سے تکلیف تو ہوگی مگر فکر مت کرنا' سارے جالے کٹ جائیں گے۔ اس نے بھی بڑی اذیت برداشت کی اور آنکھوں پر پٹی باندھے صبح تک تڑپتی رہی۔ صبح جب آنکھیں دھوئیں تو آرام آیا مگر آنکھوں کی روشنی چلی گئی۔ بعد میں اسپتال

www.paksociety.com

بھی لے گیا میں۔ ٹیکسلا کے مشن اسپتال کے انگریز ڈاکٹروں کو بھی دکھایا مگر انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے ساتھ پیر کی درگاہ پر بھی گیا مگر وہاں کسی نے اپنے جرم کا اعتراف نہیں کیا۔ یہ دیکھ سکتی تو مجرم کو پہچانتی۔ میں اس کی آنکھیں نکال لیتا۔ ہنگامہ بہت کیا میں نے۔ پولیس نہ ہوتی میرے ساتھ تو وہ لوگ اُلٹا مجھے مارتے۔ پولیس مجھے بچا کے وہاں سے نکال لائی۔ میری چیخ پکار سے جاہل عقیدت مند بھی مشتعل ہو گئے تھے۔"

آصف علی یہ سب بتاتے ہوئے جتنا رنجیدہ تھا اس سے زیادہ شرمندہ تھا۔ وہ اس خیال سے دامن نہیں چھڑا سکتا تھا کہ اپنے' اپنی بیوی کے اور بیٹی کے سارے مصائب و آلام اس کے اعمال کی سزا ہیں۔ ابھی تک اس کی بیٹی سامنے نہیں آئی تھی اور نہ اس کا ذکر آیا تھا۔

میں نے ہمت کر کے کہا "آصف صاحب! اپنی بیٹی سے بھی تو ملوائیں۔"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں" آصف علی نے نروس ہو کے کہا "دراصل وہ سو رہی تھی' اب اُٹھ جانا چاہیے اسے۔"

"میں دیکھتی ہوں۔" خانم اُٹھی اور خلا میں راستہ دیکھتی دروازے سے باہر چلی گئی۔

رابعہ نے کہا "نام کیا ہے آپ کی بیٹی کا؟"

"قدرت خانم" آصف علی بولا "اسے دیکھ کر خدا کی قدرت پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ اس کا یہ نام تو میں نے بہت سوچ سمجھ کے رکھا تھا مگر میری بیوی کا نام رکھتے وقت اس کے باپ نے یہ نہیں سوچا ہو گا کہ ایک دن وہ بصارت سے محروم ہو جائے گی تو بصیرت رہ جائے گی۔ اس کا نام بصیرت خانم ہے۔ تقدیر نے بصارت چھین لی مگر بصیرت تو اب بھی میرے پاس ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ بصیرت کو نہ چھوڑتا۔ اس اتفاق میں برکت ہے کچھ تو۔ پھر ان کے خاندان میں عورتوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس کی ماں تھی صولت خانم' اس کی ماں تھی رحمت خانم۔"

اندر سے خانم کی آواز آئی "آ جا۔ آ جا میری بیٹی۔ ہاں ایسے۔ شاباش۔ دیکھ کون آیا ہے آج ہمارے گھر۔ وزیر خاں۔"

ایک عجیب سی ہنسی کی آواز کے ساتھ قدرت دروازے میں نمودار ہوئی۔

جو چیز میرے سامنے کھڑی تھی اسے جسمانی ساخت اور اعضا کی مناسبت سے انسان ہی سمجھا جا سکتا تھا مگر وہ بدہیئتی اور بدصورتی کی بدترین تصویر تھی۔ اس کا قد مشکل سے ساڑھے تین فٹ ہو گا مگر جسم خاصا بھاری اور بے ہنگم تھا۔ اس کے ہاتھ لمبے تھے اور اسی تناسب سے ٹانگیں چھوٹی تھیں۔ چنانچہ ایک نظر میں یوں لگتا تھا جیسے کسی لمبی عورت کا اوپر والا دھڑ ایک پستہ قد عورت کی ٹانگوں پر رکھ دیا گیا ہو۔ اس کا چہرہ بھی پھولا ہوا تھا اور گالوں کا گوشت عجیب طرح سے لٹک گیا تھا چنانچہ اس کی ٹھوڑی ہی نہیں گردن بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور گہرے حلقوں میں مدفون تھیں اور ناک قدرے دبی ہوئی اور پھیلی ہوئی تھی جیسے کسی نے مکا مار کے اس کو بٹھا دیا ہو۔

سب سے عجیب اس کے چہرے کا تاثر تھا۔ وہ کسی جنونی وحشت زدہ اور اذیت میں مبتلا شخص کا چہرہ تھا لیکن اس کے ہونٹ بڑے مصنوعی انداز میں بدنما دانتوں کی نمائش کر رہے تھے اور حلق سے مضحکہ خیز آوازیں نکالتے ہوئے ہنس رہی تھی۔ یہ ایسی آواز تھی جیسے تنگ منہ والی پانی سے پوری بھری ہوئی بوتل کو ایک دم اُلٹ دینے سے پیدا ہوتی ہے۔

جب اس نے قدم بڑھایا تو پہلے ایک پاؤں کو دھپ سے آگے رکھا اور کچھ دیر جیسے اپنا توازن قائم کرتی رہی۔ پھر اس نے دوسرا پاؤں بہت آگے رکھ دیا۔ اور لڑکھڑانے لگی۔ خانم نے اس کو سہارا دیا وہ زور سے ہنسی اور اس کا سارا جسم تھرتھرانے لگا۔ فالتو گوشت اوپر والے دھڑ پر جمع ہو گیا تھا۔ میں نے انسانوں کو فٹ پاتھوں پر ایسی ایسی حالت میں دیکھا تھا کہ ان کا وجود انسانیت کے نام کی تذلیل لگتا تھا۔ وہ جانوروں سے بدتر حالت میں اپنے مکروہ ناقص اور شکستہ اعضا کی نمائش کرتے تھے اور دیکھنے والوں کے جذبۂ ترحم کو بیدار کر کے بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ بیساکھیوں کے سہارے زمین پر جانوروں کی طرح گھسٹتے ہوئے اور ہاتھوں پیروں سے محروم خالی دھڑ کے ساتھ ریڑھیوں پر پڑے ہوئے آدمیت کی توہین کے یہ قابلِ نفرت نمونے پیشہ ور گداگری کے ٹھیکیداروں کی آمدنی کا وسیلہ تھے جن کو وہ ایسا بناتے تھے اور پھر اسی حالت میں زندہ رکھتے تھے۔

لیکن یہ لڑکی جو میرے سامنے کھڑی تھی' ایک مجسم سوال تھی کہ آخر میں کسی اور کے اعمال کی سزا کیوں بنی؟ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو اور پھر مجھے بتاؤ کہ یہ کیسا مکافاتِ عمل ہے؟ کس جرم کی پاداش میں اور کس ضابطۂ انصاف کے تحت کسی اور کے گناہوں کو میری پیدائش سے قبل میری سزا بنا دیا گیا اور یہ سزا ہے تو پھر جزا کہاں ہے؟ میری نجات کہاں ہے اور اس قیدِ حیات میں مجھے کب تک یونہی جینا ہے؟

آصف علی اور اس کی بیوی شاید اپنے دکھ جھیلنے کے عادی ہو چکے تھے اور احساسِ اذیت کو برداشت کرتے کرتے اب بے حسی کی منزل تک پہنچ گئے تھے۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ وہ اپنی بیٹی کو دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہے تھے' اس کے ساتھ ہنس رہے تھے اور شاید انہیں وہ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی نظر آتی تھی۔ ان کی آنکھوں میں اپنی تخلیق پر ندامت کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ سبھی والدین کی طرح وہ اپنی اولاد کو جذبات کی خوب صورتی کے ساتھ دیکھ رہے تھے اور اس پر صرف محبت نچھاور کر رہے تھے۔

وہ آصف علی کوئی اور تھا جس نے میرے سامنے اعتراف کیا تھا کہ اس کے اعمال کی سزا قدرت کا وہ عذاب ہے جو قدرت خانم کی صورت میں نازل ہوا تھا اور جسے وہ خواہش اور کوشش کے باوجود قتل نہیں کر سکا تھا۔ اگر وہ بیٹی کے سامنے ایک باپ کے پرشفقت' محبت سے معمور دل رکھنے والے انسان کا رول کر رہا تھا تو بلاشبہ اداکاری بہت حقیقی تھی۔ ماں کی بات مختلف ہے' اس کی ممتا میں کہیں کھوٹ نہ تھا۔ اس کا اپنی اولاد پر غرور بے ریا تھا اور اس میں ندامت کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔

قدرت اسی طرح بے ڈھنگے پن سے چلتی آگے آئی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا "آؤ قدرت! میرے پاس آؤ۔"

اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا "قد...رت..."

رابعہ نے کہا "تم قدرت ہو نا؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور پھر بے سبب مسکرانے لگی "میں.... قدرت.... ہوں"

وہ بھاری' بھنچی ہوئی آواز میں ایک ایک لفظ بڑی کوشش سے ادا کر رہی تھی۔ اس نے میری طرف اور پھر رابعہ کی طرف دیکھا اور کچھ سوچ کے رابعہ کی طرف بڑھ گئی۔

"میرا نام رابعہ ہے۔ آنٹی رابعہ۔"

"آن...ٹی؟" اس کی آنکھوں میں اُلجھن اور ماتھے پر سوچ کی شکنوں کا جال نمودار ہو گیا۔ غالباً وہ اس لفظ کے مفہوم سے ہی ناآشنا تھی۔

"قدرت کس کی بیٹی ہے؟" آصف علی نے جھک کے اسے پیار کیا۔

قدرت نے باپ کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا "ابو کی...."

"قدرت میری بیٹی ہے۔" خانم نے کہا۔

وہ زور زور سے سر ہلانے لگی "امی کی بیٹی۔"

"اچھا چلو ناشتا کر لو۔ کیا کھاؤ گی بولو؟" ماں نے کہا۔

"لڈو" اس نے بہت سوچ کے جواب دیا۔

خانم نے ایک نوکر کو آواز دی "جا کے لڈو لے آ۔ فوراً گاڑی لے کر جا۔"

"جی خانم" نوکر نے کہا اور کوئی سوال کیے بغیر یا کسی حیرت کا اظہار کیے بغیر واپس چلا گیا۔

میں نے اور رابعہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوال کو آنکھوں میں بھی نہ آنے دیا۔ یہ ماں باپ بڑا مشکل فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ اس اوٹ پٹانگ' جائز ناجائز اور نیک و بد کے شعور سے محروم لڑکی کی ہر خواہش' ہر فرمائش پوری کرنا جیسے ان پر فرض تھا۔ وہ اس کے وسائل بھی رکھتے تھے مگر یہ وسائل کا مسئلہ نہیں تھا۔ بلا چون و چرا تعمیل کا تھا۔ ناشتے میں لڈو کھانے کو مانگنا ایک ایسی خواہش تھی جو شاید تین سال کا بچہ بھی نہ کرتا اور کرتا تو والدین اسے سمجھاتے کہ بیٹا ناشتے میں کون لڈو کھاتا ہے۔ یہ دیکھو ڈبل روٹی' انڈے' جام' مکھن' حلوا پراٹھے' قیمہ' جوس' چائے' کافی' دودھ سب کچھ تو ہے۔ مگر خانم نے فوراً لڈو منگوانے کے لیے ملازم کو گاڑی لے کر دوڑا دیا تھا۔ یہ خیال آنا قدرتی بات تھی کہ وہ کسی ناممکن چیز کی فرمائش کر دیتی۔ مثلاً آم کی یا آئس کریم کی تو اس سردی کے موسم میں یہ چیزیں اس وقت کہاں دستیاب ہوتیں؟

میں نے کہا "آصف صاحب! ہم اب چلتے ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ ہم خود کلیم اللہ کے گھر والوں سے ملنے کے لیے جائیں گے۔"

"ہاں۔ بندوبست ہو جائے گا آج ہی۔" اس نے گھڑی دیکھ کے کہا "پولیٹیکل ایجنٹ کا دفتر تو کھل گیا ہو گا۔ وہ آتا ہے کچھ دیر سے مگر خیر.... چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہم ریسٹ ہاؤس سے اپنا سامان اُٹھا لیں۔"

"سامان گاڑی میں رکھو اور اِدھر ہی آ جاؤ۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔" اس نے کہا۔

ہم خانم سے اجازت لے کر اُٹھے ہی تھے کہ آصف علی نے کہا "تم سب واپس جا کے کیا کرو گے؟ میں کبیر خان کے ساتھ جا کے ابھی آتا ہوں۔"

میں نے بھی کہا "ہاں' تم لوگ ٹھہرو۔"

آصف علی نے کہا "خانم! ان کو گھر دکھاؤ اپنا۔"

میں پھر حیران ہوا کہ ایک بصارت سے محروم عورت آنکھوں والوں کو گھر دکھائے گی! لیکن ان کے لیے یہ روزمرہ کی بات تھی۔

آصف علی نے کہا "کیا خیال ہے' گاڑی لے لوں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ پیدل ہی چلتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ کا راستہ ہے۔"

وہ میرے ساتھ چل پڑا "تم نے قدرت کو دیکھا؟"

"جی۔ اور میں اسی سلسلے میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا "ہم نے رات کو اس مسئلے پر غور کیا تو ہمارے ذہن میں بہت سی باتیں آئیں۔ بے شک آپ فیصلہ کرنے میں مختار ہیں' مگر ہم بھی جو محسوس کرتے ہیں' نیک نیتی سے کہنے کا حق رکھتے ہیں۔"

"اس تمہید کی ضرورت نہیں تھی۔ تم کہو۔"

"آصف صاحب! میں آپ کے اس انتظام کو قطعی غیر محفوظ سمجھتا ہوں جو آپ نے قدرت کے مستقبل کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے کیا ہے۔ یہ بہت پُرخطر اور ناقابلِ اعتبار ہے۔" میں نے کہا "میں نے اس نوجوان کو صرف ایک بار دیکھا ہے لیکن اس کی سرکشی کا رویہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ ایک مجبوری کے تحت اس نے آپ کی شرط قبول کر لی ہے لیکن اس کے ذہن میں یہ خیال ضرور ہو گا کہ آپ نے اس کا استحصال کیا۔ وہ غریب تھا اور آپ نے دولت کے بل پر اپنی بیٹی کو زبردستی اس کے سر منڈھ دیا۔ اگر وہ لالچی نہ ہوتا تو ہرگز ایسی ذمے داری کا بار اُٹھانا منظور نہ کرتا۔ جو شخص صرف دولت کی خاطر اپنی ساری زندگی [illegible] نہیں

www.paksociety.com

جو نکلا۔ میرے الفاظ ممکن ہے آپ کو بے رحم لگیں کہ میں آپ کی بیٹی کو روگ اور عذاب کہہ رہا ہوں مگر سوچئے ایک صحت مند نوجوان آدمی کے نقطۂ نظر سے۔ یہ دولت نہ ہوتی تو کیا وہ قدرت کو قبول کرتا؟ یا اتنی دولت نہ ہوتی' لاکھ دو لاکھ ہی ہوتے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

آصف علی نے ایک آہ بھری "جتنے تم ٹھیک ہو میاں کبیر مگر یہ سب تو میں بھی جانتا ہوں۔"

"جانتے بوجھتے آپ یہ غلطی کر رہے تھے؟"

"غلطی!" وہ تلخی سے بولا "اس غلطی کے سوا میرے پاس کیا ہے کرنے کو۔ کون سا راستہ ہے۔ میں اسے کہاں رکھوں' کس کی پناہ میں دوں؟ کسی ذہنی امراض کے اسپتال یا معذور افراد کے ادارے کے سپرد کرتا ہوں تو مجھے معلوم ہے اس کا انجام کیا ہوگا۔"

"ہم نے رات کو یہی سوچا تھا کہ قدرت کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ جب آپ وزیر خان ٹرسٹ کے نام اپنی آدھی جائداد کر رہے ہیں تو پھر قدرت کو ہمارے سپرد کر دیں۔ وہ وزیر خان ٹرسٹ کی نگرانی میں رہے گی۔ اسی طرح جیسے یہاں رہتی ہے۔ اس کا الگ کمرا ہوگا۔ الگ خدمت گار ہوں گے' ڈاکٹر اس کا علاج کریں گے۔ نرسیں ہوں گی۔ اس کے لیے سیر و تفریح' آرام و آسائش کا سب بندوبست ہم کریں گے۔ یہ ہمارے گھر میں آ جا سکے گی۔ ایک نہیں کئی گھر اس کے گھر ہوں گے۔ یہ اسپتال میں کسی مریضہ کی حیثیت سے نہیں' مالک کی طرح رہے گی۔ یہ ذمے داری ہم ساری عمر کے لیے قبول کر سکتے ہیں۔ آگے آپ کی مرضی۔"

آصف علی چلتے چلتے رک گیا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ فرطِ جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور جب اس نے میرے شانے پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے تو میں نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہا ہے۔

"تم ... اتنا سوچا ہے تم نے میرے لیے' قدرت کے لیے! کیا واقعی تم ایسا کر سکتے ہو؟" اس نے مرتعش آواز میں کہا۔

میں نے کہا "اگر آپ اس تجویز کو قابل عمل سمجھتے ہوں اور آپ کو اعتبار ہو ہماری نیت کے خلوص پر تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

"اس سے اچھا کیا ہو سکتا ہے۔ اس سے بہتر انتظام تو میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ میں مجبور تھا' اکیلا تھا۔ کوئی نہیں تھا جس پر میں بھروسہ کر سکوں کہ وہ ساری عمر قدرت کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اس ذمے داری کا بوجھ کسی نہ کسی کے سپرد کرنا ضروری تھا کیونکہ میں اور میری بیوی کتنے دن اور جئیں گے؟ کسی غرض کے بغیر کون تھا جو یہ بار اٹھاتا؟ پھر ایک غرض مند مل گیا۔"

میں نے کہا "آئیے چلیں۔ خدا ہمارے ارادوں کو تقویت دے اور ہمیں کامیاب کرے۔ میں نہیں سمجھتا کہ دولت سے آپ نیک نیتی' خلوص اور محبت خرید سکتے ہیں۔ جو بھی آپ کی دولت پر اختیار کے عوض یہ سب پیش کرنے کی بات کرتا ہے وہ تو ایک ریا کار تاجر ہے۔ آپ کے پاس کیا ضمانت ہے کہ وہ قدرت کے ساتھ محبت اور عزت سے پیش آتا رہے گا اور اس کے ساتھ ہمدردی کا رویہ رکھے گا؟ اس پر میں کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں مگر ..."

"میں سمجھتا ہوں' سب جانتا ہوں۔" آصف علی بولا "لیکن ہر جگہ دیکھنے کے بعد اور ہر امکان پر غور کرنے کے بعد مجھے یہی صورت سب سے کم خراب لگی۔ نفسیاتی طریقۂ علاج کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگی کا دعوے رکھنے والے پرائیویٹ ادارے محض پیسہ بٹورنے کا ڈھونگ ہیں اور وہاں کسی کو تمام عمر رکھا بھی نہیں جا سکتا۔ وہ سائنٹیفک طریقے سے کھال کھینچنے کے ماہر ہیں۔ سرکاری اداروں کا حال تو عبرتناک ہے۔ وہاں خطرناک پاگل اور عارضی نفسیاتی الجھن میں مبتلا شخص' دونوں کو ایک ہی طرح رکھتے ہیں۔ ان کا کیا علاج ہوتا ہے' کیا کھانے کو ملتا ہے' کیسی رہائش ہے' یہ سب دیکھا ہے میں نے۔ وہ مریض میں اعتماد نہیں' نفرت پیدا کرتے ہیں۔ تشدد کرتے ہیں اس پر۔ مارپیٹ کے لیے بید اور ٹارچر استعمال کرتے ہیں۔ الیکٹرک شاک دیتے ہیں۔ ایسے تو جنگلی جانور بھی سیدھا ہو جاتا ہے۔ شیر کو بکری بنایا جا سکتا ہے مگر یہ علاج نہیں ہے۔"

میں نے کہا "وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کوئی ذہنی یا نفسیاتی مریضوں کی علاج گاہ نہیں ہے۔ وہ تو عام امراض کے لیے وقف ہے جہاں نادار مریضوں کو مفت دوا ملتی ہے اور انتہائی ضرورت مندوں کو داخل رہنے کا کوئی خرچ نہیں اٹھانا پڑتا۔ قدرت کی پوزیشن بالکل مختلف ہوگی۔ جب اتنی بڑی آمدنی اس کی وجہ سے ہوگی تو وہ ٹرسٹ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل ہوگی۔ اس کی رہائش سے آسائش تک سب اس کے شایانِ شان ہوگا اور علاج بھی۔ وہ جب تک زندہ رہے گی اس کی یہ حیثیت برقرار رہے گی۔"

"تم نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔ میرے لیے مرنا آسان کر دیا۔ میں کہاں سے الفاظ لاؤں اپنی ندامت کا اظہار کرنے کے لیے اور شکر گزاری کے جذبات جو میرے دل میں ہیں ..."

"ان کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔"

"ضرورت میں محسوس کرتا ہوں۔ میں مجرم تھا تمہارے والد کا۔ تمہیں مجھ سے انتقام لینا چاہیے تھا۔ تم نے مجھے معاف ہی نہیں کیا' الٹا مجھے احسان کے قرضے سے زیر بار کر دیا۔ شاید یہ بھی قدرت کی طرف سے میرے منہ پر طمانچہ ہے۔"

میں نے کہا "ندامت سوچیں۔ پرانی بات ختم ہو گئی۔ آپ کو غلطی کا احساس ہو گیا' آپ کی طرف سے میرا دل صاف ہے۔ باقی خدائی باتیں خدا ہی جانے۔ جب میں نے گاڑی آپ کے اسٹور کے سامنے روکی تھی اور اندر قدم رکھا تھا تو یہ مشیتِ ایزدی تھی کیا میرا فیصلہ نہیں تھا۔ اس وقت یہ ناممکن تھا کہ میں کسی اور دکان میں اپنی مرضی سے جا سکتا۔"

اچانک آصف علی بولا "یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "کہیں آگ لگی ہے۔ دھوئیں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔"

"لوگ بھی جمع ہیں' پولیس اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بھی ہیں۔" آصف علی نے کہا "ایک منٹ رکو۔"

پہلے میرا بھی خیال تھا کہ واردات ریسٹ ہاؤس کے قریب ہوئی ہے لیکن غور سے دیکھنے پر میرا خیال بدل گیا۔ میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ "شاید ریسٹ ہاؤس میں کچھ ہوا ہے۔" میں نے کہا۔

"بالکل وہیں کوئی بات ہوئی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔ میں دیکھ کے آتا ہوں۔"

"نہیں' میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔"

"پاگل مت بنو۔ یہ انہی کی کارروائی ہو سکتی ہے جو کل صبح آفریدی کو ہلاک کر چکے ہیں۔"

میں نے کہا "مگر ایسی بات ہوگی تو وہ اپنا کام کر کے جا چکے ہوں گے۔"

"کیا پتا' وہ لوگوں کی بھیڑ میں موجود ہوں۔"

"میں پہچانتا ہوں انہیں۔"

آصف علی نے کہا "تم کو کیا معلوم اس بار کون آیا ہوگا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ آفریدی تمہارا ساتھ دے رہا ہے۔"

بات ایک دم میری سمجھ میں آ گئی۔ اگر انہیں میرے اور آصف علی کے درمیان نئے تعلق کا پتا چل جاتا تو شاید آصف علی کا انجام بھی آفریدی سے مختلف نہ ہوتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم آفریدی کی گاڑی میں بیٹھے نہیں تھے۔ یا پھر وہی بات تھی کہ شکاری ہمیں مسلسل خوف کے جال میں گرفتار رکھنا چاہتے تھے اور یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ ہم ہر جگہ' ہر وقت ان کی نگاہ میں ہیں اور آفریدی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک سبق تھا ہمارے لیے۔ ایک اور سبق آصف علی' اس کی اپاہج بیوی اور معذور بیٹی کے محل کو ملبے کا ڈھیر بنا کے دیا جا سکتا تھا جس میں ان کی پرزہ پرزہ ہو جانے والی سوختہ لاشیں دفن ہوں۔

آصف علی کے واپس آنے تک میں سڑک سے کچھ ہٹ کے ایک درخت کی چھاؤں میں بینچ پر بیٹھا رہا۔ اُدھر سے آنے والے ایک راہ گیر نے میرے خدشات کی تصدیق کر دی۔

"بم کا دھماکا ہوا ہے۔" اس نے میرے سوال کے جواب میں مبتلا الجھن کا مظاہرہ کیا اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔

"یہ کس کا گھر تھا؟" میں نے انجان بن کے پوچھا۔

"یہ گھر نہیں جی' سرکاری افسروں کا ڈاک بنگلا تھا۔ عیاشی کے لیے آتے ہیں ادھر۔" اس نے رواں ہندکو میں بات کی۔

"اچھا۔ کیا بہت نقصان ہوا ہے؟"

"یہ سب برابر ہو گیا جی۔ دیکھو کیسا دھواں اٹھ رہا ہے۔ بڑی زبردست آگ تھی۔ اب تو قابو پا لیا ہے فائر بریگیڈ والوں نے۔ ملبہ لگا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا۔"

"پتا نہیں جی۔ کوئی کہتا ہے چھ تھے اور سب ختم ہو گئے۔ ابھی لاش تو نہیں نکالی کسی کی۔ پر بچنا بڑا مشکل ہے کسی کا۔ ادھر ساتھ والی کوٹھی میں میرا یار رہتا ہے۔ میں ادھر خانساماں ہوں۔ ہم دونوں ایبٹ آباد کے ہیں جی۔"

میں نے کہا "مگر تم ہندکو ایسے بولتے ہو جیسے پشاور کے رہنے والے ہو۔"

"وہ تو بندہ سیکھ ہی لیتا ہے جی۔ بارہ سال ہو گئے ادھر۔ ہم اکٹھے آئے تھے گھر سے بھاگ کے۔ اس کے گھر کا بھی بڑا نقصان ہوا ہے۔ دیواریں جل گئی ہیں' کھڑکیوں کے سارے شیشے ٹوٹ گئے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ رات کو چوکیدار نے ایک فیملی کو دیکھا تھا۔ ڈاک بنگلے کا چوکیدار اور ساتھ والی کوٹھی کا چوکیدار رات کو بیٹھ کے گپ لگاتے ہیں۔"

میں نے کہا "کس کی فیملی تھی؟"

"اللہ جانے۔ دو عورتیں تھیں بڑی فیشنی۔ ایک لڑکا تھا کوئی بارہ سال کا اور ایک مرد تھا۔"

"کیا خیال ہے تمہارے دوست کا' اس کارروائی کا مقصد کیا تھا؟"

"مقصد کیا جی۔ کوئی دشمن اپنا وار کر گیا۔"

"چوکیدار کا' تمہارا؟"

"ملوکی' غریب آدمی کا بھلا کون دشمن ہوتا ہے۔ انہی کو مارنا چاہتا ہوگا کوئی جو وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایسے ہی آتے ہیں ادھر سب۔ کوئی کسی عورت کو لے آیا۔ فساد کی جڑ ہے جی عورت۔ بندے کی مت مار دیتی ہے۔ اب جس کی بہن یا بیٹی ہو یا بیوی ہو' اس نے تو کچھ کرنا ہے نا جی۔ عاشقی ماشوقی کوئی کھیل ہے۔"

میں نے اس کی بات نظر انداز کر دی "کتنے بجے ہوا دھماکا؟"

"صبح آٹھ بجے۔ ادھر پولیس والے بات کر رہے تھے کہ ٹائم بم استعمال ہوا ہے۔ تم مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو' جا کے دیکھو۔"

میں نے کہا "میں دور رہتا ہوں ایسی جگہ سے۔ پولیس کا کیا ہے' شک میں کسی کو بھی لے جائے۔ جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ یہ جو ادھر جمع ہیں نا' انہی میں سے آٹھ دس کو جاتے وقت ساتھ لے جائیں گے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ کچھ نہ کچھ کارکردگی کا مظاہرہ تو ضروری ہے۔"

"پیسا بھی ایسے ہی بنتا ہے۔ بم کا کیس تو قتل سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ ہزار پانچ سو میں جان نہیں چھوٹے گی۔"

میں نے حیرانی کا اظہار کیا "اچھا!"

"اور کیا۔ پانچ پانچ تو ضرور لیں گے۔ سیانا بندہ فوراً دے کر بھاگ جائے گا۔ بے وقوف پانچ سو چھتر کھا کے دے گا۔ ایک باتی

www.paksociety.com

میں گواہی میں پکڑا گیا۔ تھانے جا کے پتا چلا کہ میں تو مجرم ہوں۔ ناجائز اسلحہ برآمد ہوا ہے میرے پاس سے۔ لوٹی میں نے غلطی کی شور مچا کے۔ میں نے کہا رپورٹ کروں گا سب کی ڈی آئی جی تک۔ ہائی کورٹ میں کیس کروں گا۔ بس جی اس کے بعد ایسا انصاف ہوا میرے ساتھ کہ توبہ۔ دو ہزار پر بات ختم ہو جاتی۔ منت سماجت اور خوشامد' واسطوں میں پانچ سو پر پہنچ گئی۔ حرامی کہتے تھے کہ دو سو پھر ہم نے فالتو دے۔ زیادہ محنت کرنی پڑی' وقت ضائع ہوا۔ اس کی قیمت دو۔ اور پھر بھی مفت تو نہیں آتے۔ بندہ ذہین ہو تو اسے پیش ہونا پڑتا ہے۔ مار زیادہ تو پیسے زیادہ۔ اللہ غرق کرے سب کو سمندر میں۔"

"آمین" میں نے کہا "گھر جا کے دو نفل پڑھنا کہ آج بچ گئے گواہی سے۔"

"تم کہاں کام کرتے ہو؟ نئے آئے ہو؟"

میں نے اشارے سے کام چلایا "ادھر آ گئے آصف علی کے گھر میں۔"

اس نے سر ہلایا "پہلے تم کو دیکھا نہیں۔"

میں نے کہا "رات کو جو چوکیدار پھرتے ہیں یہاں' وہ کون ہیں؟"

"چوکیدار پھرتے تو کوئی نہیں۔ ہر کوٹھی کا اپنا چوکیدار ہے۔" اس نے کہا۔

میں سوچ میں پڑ گیا "وہ دو بندے کون ہیں؟ لمبی لمبی مونچھوں والے۔ بندوق اٹھا کے گشت کرتے ہیں یہاں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "پتا نہیں۔ ایسے ہی کوئی گزر رہا ہوگا۔ علاقے میں گشت تو کوئی نہیں کرتا۔"

"تمہیں کیا پتا ہے؟"

"سو برس کی خبر ہے ہمیں۔ اتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ تم نئے لگے تو تمہیں فٹ پہچان لیا۔" وہ بولا "چوکیدار کے لیے کوئی انتظام کریں گے تو سب کوٹھیوں والے مل کے ہی کریں گے نا۔ انہیں کیا ضرورت ہے اس کی۔ سب کے اپنے اپنے چوکیدار ہیں۔"

وہ رخصت ہوا ہی چاہتا تھا کہ آصف علی لوٹ آیا۔

"چلو' جلدی سے چلو۔" اس نے مجھے ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔

میں نے کہا "آخر ہوا کیا؟"

"بس میاں اللہ نے جان بچائی آج تمہاری ورنہ دشمنوں نے تو کسر نہیں چھوڑی تھی۔ توبہ توبہ!" وہ سخت خائف اور نروس تھا "ریسٹ ہاؤس کا تو نام و نشان مٹ گیا۔ ایک ڈھیر رہ گیا ہے جلی ہوئی چیزوں کا اور ملبے کا۔ اس میں تمہاری گاڑی کا ڈھانچہ بھی شامل ہے۔ میں نے زیادہ تفتیش نہیں کی کہ پتا نہیں کسے شک ہو جائے۔ پولیس اور فائر بریگیڈ والے کسی کو بھی قریب نہیں جانے دے رہے تھے۔ سادہ کپڑوں میں خفیہ پولیس والے بھی ہیں۔"

"اس کو کہتے ہیں قسمت۔" میں نے کہا "رات کو ہم بہت دیر تک جاگتے رہے تھے۔ رابعہ اور میں تو صبح سوئے ہوئے تھے شاید تین بجے تھے اس وقت۔ آپ نہ آتے تو ہم سوتے ہی رہ جاتے' دھماکا بھی نہ سنتے۔ معلوم ہوتا دوسری دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔"

"کوئی کہہ رہا تھا ٹائم بم تھا۔ ساڑھے سات بجے کا ٹائم سیٹ کیا گیا تھا۔" آصف علی نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

"ہم نو بجے تک یقیناً سوتے۔" میں نے کہا "آپ ناشتے کے لیے زبردستی کھینچ کر لے گئے ورنہ ہم آپ کو بٹھا لیتے تو آپ بھی جاتے ہمارے ساتھ۔"

"بس بھئی میاں! وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے لیکن تم تو واقعی بہت بے پروا۔"

میں نے کہا "ہمارا کیا قصور تھا اس میں؟"

"بھئی جب تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری جان کے دشمن پیچھے لگے ہوئے ہیں تو تمہیں بھی محتاط رہنا چاہیے۔"

"محتاط رہ کے ہم کیا کرتے؟"

"بھئی نظر رکھتے آنے جانے والوں پر۔ آخر کسی نے تو ٹائم بم فٹ کیا ہوگا۔ وہ کون تھا؟ کب آیا اور کیسے ٹائم بم رکھ گیا اور کہاں؟ ظاہر ہے سامنے تو نہیں رکھ گیا ہوگا۔"

میں نے کہا "ہم کچھ بے فکر ضرور ہو گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ آفریدی کو مارنے کے بعد وہ مطمئن ہو کے چلے گئے ہوں گے کہ ساتھ ہی ہمارا بھی کام تمام ہوا۔"

"لیکن ایسا نہیں تھا۔ انہوں نے پتا چلا لیا کہ تم بچ گئے تھے۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب کیا یہ نہیں کہ وہ پھر معلوم کر لیں گے؟"

اس نے متفکر ہو کے کہا "تفتیش کے نتیجے میں یہ بات تو آ ہی جائے گی سامنے کہ ہلاک ہونے والوں کی تعداد کیا تھی۔ کوئی یہ بھی کہہ رہا تھا کہ ایک نہیں' دو بم نصب کیے گئے تھے۔"

میں نے کہا "دو کیا' وہ چار بم رکھ جاتے۔ اگر وقت پورا نہیں ہوا ہے تو ہم ایسے ہی بچتے رہیں گے۔"

"تم مطلب نہیں سمجھے میری بات کا۔ اس کام میں وقت لگا ہوگا۔" آصف علی بولا "دستی بم کی بات اور ہوتی ہے۔ کوئی بھی پھینک کے نکل جائے۔"

میں نے کہا "مجھے ابھی ابھی ایک بات کا پتا چلا ہے۔ صبح تین بجے دو افراد نے دستک دے کر ہمیں بتایا تھا کہ گاڑی کی ٹیل لائٹس جل رہی ہیں' بیٹری ڈاؤن ہو جائے گی۔ لائٹس واقعی جل رہی تھیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور لائٹس آف کر کے اندر چلا گیا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ رات کے گشت پر مامور چوکیدار ہیں۔ ان کے کپڑے بھی ایسے ہی تھے چوکیداروں جیسے۔ اسلحہ بھی تھا ان کے پاس۔ اندر کمرے میں لائٹ جلتی دیکھ کے انہوں نے ہمیں مطلع کرنا بہتر سمجھا۔ اب مجھے شک ہوتا ہے کہ یہ انہی کی کارروائی ہوگی۔ اس علاقے میں تو رات کے وقت چوکیدار گشت

...ہے۔ ہر گھر کا اپنا چوکیدار ہے۔"

"یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ یونیورسٹی ٹاؤن میں ابھی بہت کم مکان ہیں' اس لیے سب نے اپنی اپنی حفاظت کا خود بندوبست کر رکھا ہے۔" آصف علی بولا "تم پہچان سکتے ہو انہیں؟ اگر وہ پھر سامنے آئیں؟"

"وہ پھر کیوں سامنے آئیں گے؟" میں نے ہنس کے کہا "اتنے نادان ان میں سے کوئی بھی نہیں آتا۔"

"ذہن پر زور دو۔ کیا پہلے بھی ان کو دیکھا تھا تم نے؟"

"بہت زور دے چکا میں' مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا۔ وہ بالکل اجنبی تھے۔" میں نے کہا "غالباً ان کی خدمات حاصل کی گئی تھیں اور وہ اپنے کام کے ماہر تھے۔"

"ہوشیار لوگ تھے۔" آصف علی بولا "پہلے خیر خواہ بن کے دیکھا کہ تم جاگ رہے ہو یا سو رہے ہو اور اندر موجود ہو یا نہیں۔ وہ تمہاری صورتیں دیکھنے کے بعد اطمینان سے اپنا کام کر گئے۔"

"بالکل ٹھیک نتیجہ اخذ کیا آپ نے۔ لائٹس خود انہوں نے ہی آن کی ہوں گی۔" میں نے کہا "حیرت کی بات ہے کہ یہ خیال مجھے اس وقت نہیں آیا کہ ٹیل لائٹس جلتی ہیں تو سامنے کی پارکنگ لائٹس بھی جلتی ہیں اور گاڑی ایسے رخ پر کھڑی تھی کہ ہم پیچھے کی لائٹس تو خیر نہیں دیکھ سکتے تھے مگر ہیڈ لائٹس کے نیچے پارکنگ لائٹس تو ہمارے سامنے تھیں اور وہ آف تھیں۔"

"کب آف تھیں؟"

"جب میں رابعہ کے ساتھ باہر ٹہل رہا تھا۔ یہ ناممکن ہے کہ رابعہ کی نظر بھی نہ پڑتی اور میں بھی نہ دیکھتا کہ سامنے کی چھوٹی لائٹس آن ہیں۔ پھر کچھ دیر کاجل بھی بیٹھی رہی تھی۔" میں نے کہا۔

"لیکن اس وقت جب چوکیداروں نے بتایا تو آگے پیچھے کی لائٹس جل رہی تھیں؟" آصف علی بولا۔

"ہاں۔ اور اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ لائٹس خود انہوں نے کار کا دروازہ کھول کے جلائی تھیں۔ لاک عام طور پر پرانے ہو جانے کے بعد گھسی ہوئی ہر چابی سے کھل جاتے ہیں۔ افسوس کہ میری عقل میں اس وقت یہ بات نہیں آئی ورنہ میں...."

"ورنہ تم کیا کرتے؟ انہیں پکڑ لیتے؟ کس جرم میں؟ وہ کہتے کہ صاحب ہم نے غلطی کی ہے تو آپ جلنے دیں لائٹس۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ اس وقت ان کی نیکی اور فرض شناسی کے احساس نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ میں تو انعام دے رہا تھا انہیں۔ انکار کر کے انہوں نے مجھے مزید متاثر کیا۔"

"اور ان کے جانے کے بعد تم کتنی دیر تک جاگتے رہے تھے؟"

"ہم فوراً سو گئے تھے۔" میں نے کہا "رابعہ لیٹ گئی تھی کاجل کے ساتھ اور میں صوفے پر تھا۔ مجھے فوراً نیند نہیں آ رہی تھی مگر رابعہ نے اصرار کر کے لائٹ آف کرا دی۔ میں اندھیرے میں کچھ دیر آنکھیں کھولے پڑا رہا۔"

"اور وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے۔"

"وہ ان کے لیے بہترین موقع تھا۔" میں نے کہا "کسی کا ڈر نہیں تھا انہیں۔ وقت بھی کافی تھا۔"

رابعہ تو میری صورت دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ کوئی بات ہو گئی ہے۔ کاجل نے مجھے خالی ہاتھ دیکھ کے پوچھا "سامان نہیں لائے؟"

میں نے کہا "سامان! کیسا سامان؟ کفن باندھے ہوئے چلنے کو یہاں تیار بیٹھے ہیں۔"

کاجل نے کہا "کیسی باتیں کرتے ہو؟"

میں نے کہا "یہی دنیا ہے کاجل۔ آج یہ ہماری نظروں کے سامنے ہے مگر اوجھل ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کل ہم تھے لیکن آج نہ ہوتے اور آنے والے کل کا کیا بھروسہ۔"

رابعہ نے کہا "یہ فلسفہ بولنے کا وقت ہے!"

کاجل نے کہا "سیدھی طرح بتاؤ کیا ہوا ہے۔"

"وہی جو کل صبح ہوا تھا۔ دھماکا۔" میں نے کہا۔

"دھماکا! کہاں؟" رابعہ اور کاجل نے ایک ساتھ کہا۔

"وہیں جہاں کل ہوا تھا۔ گاڑی میں۔"

"کس کی گاڑی میں؟" کاجل بولی۔

"آفریدی کی گاڑی میں؟" رابعہ کے منہ سے نکل گیا۔

میں نے کہا "افسوس! تمہارا آئی کیو گرتا جا رہا ہے۔ حماقت کی روایات کے شاندار ریکارڈ قائم کر رہی ہو تم۔ آفریدی کی گاڑی میں کیا رہا تھا کہ اس میں پھر دھماکا کیا جاتا۔"

رابعہ کا رنگ اڑ گیا "تو کیا وقار یوسف کی گاڑی....."

"مرحومہ کی یاد میں ایک دن کے سرکاری سوگ کا اعلان کیا جاتا ہے۔ آج میں بالکل نہیں مسکراؤں گا۔ تمہاری طرف دیکھ کے بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"بھئی کمال ہے! اتنی غیر سنجیدگی سے بات کر رہے ہو تم جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔" آصف علی نے حیرانی سے کہا۔

میں نے کہا "ہم عادی ہیں آصف صاحب! موت سے آنکھ مچولی کھیلتے زمانہ ہو گیا۔ اب نہ خوف محسوس ہوتا ہے' نہ پریشانی ہوتی ہے۔ دکھ البتہ ہوتا ہے بے گناہ مارے جانے والوں کا۔ ریسٹ ہاؤس بھی پھر بن جائے گا اور اسے بنانے میں کوئی ٹھیکیدار اور کوئی انجینئر بھی بن جائے گا مگر چوکیدار مفت میں مارا گیا۔ اسے کوئی کچھ نہیں دے گا۔ الزام شاید دے گا کہ اس کی کوتاہی کے سبب ایسا ہوا۔"

کلیم اللہ نے کچھ سمجھا تھا' کچھ نہیں سمجھا تھا "کیا ہوا دیدی؟" کاجل نے اسے اپنے قریب کر لیا "کچھ نہیں بیٹا۔ تمہاری وجہ سے ہم بھی بچ گئے۔"

www.paksociety.com

مجھے آخری کی بات یاد آگئی۔ نہ کوئی کسی کی وجہ سے مارا جاتا ہے نہ کسی کی وجہ سے بچ سکتا ہے۔ زندگی اور موت کے فیصلے تو خدا پہلے ہی کر چکا ہوتا ہے۔ قتل ور آمد کا وقت آجاتا ہے۔ [illegible] لگتا ہے کہ بے گناہ مارا گیا اور جسے نشانہ بنایا گیا تھا وہ بچ گیا۔

"اب ہمیں یہاں ایک منٹ نہیں رکنا چاہیے۔" میں نے کہا "ورنہ آصف علی! اگلا نشانہ تمہارا گھر ہوگا۔ ہم وہ ہدف ہیں جس پر چلائے جانے والے تیر سے ہم شکار نہیں ہوتے۔ آپ خود کو بچائیے۔"

"ایسے اناڑی ہیں شکاری۔"

میں نے کہا "شکاری تو تقدیر ہے۔۔۔"

"تقدیر سے بچ کے کوئی کہاں جا سکتا ہے؟" اس نے میری بات کاٹ دی "لیکن احتیاط اور اپنے دفاع سے غافل ہونا غلط ہے۔ ہم بیٹھے ہیں ایک گاڑی میں۔ میں، تم اور کلیم۔ عورتوں کو دوسری گاڑی میں یہاں سے دور اپنے ایک دوست کے گھر بھیجا جا سکتا ہے۔"

"کیوں؟ کیا ہم ساتھ نہیں جا سکتے؟" کاجل نے کہا۔

"ابھی میں وعدہ نہیں کر سکتا۔ عورتوں کا قبائلی علاقے میں جانا کچھ مناسب نہیں لگتا۔" آصف علی نے کہا "بہت سخت روایات کے پابند لوگ ہیں۔ عورت کا سایہ تک بے پردہ نظر نہیں آنے دیا۔"

"ہم پردہ کر سکتے ہیں۔ میرے پاس برقع ہے۔ کاجل کے لیے کوئی بندوبست ہو سکتا ہے۔"

"بالکل ہو سکتا ہے مگر۔۔۔" آصف علی سوچ میں پڑ گیا "تماشا بن جاؤ گی تم لوگ۔ تمہیں سیدھا کسی حویلی کی چار دیواری میں پہنچا دیا جائے گا جہاں تمہارا ہم سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہوگا۔ وہاں عورتیں ہوں گی جو تمہاری کوئی بات نہیں سمجھ پائیں گی اور ان کی بولی کا ایک لفظ تمہارے پلے نہیں پڑے گا۔ کوئی مترجم بھی نہیں ہوگا۔"

"بے وقوفوں کی طرح ایک دوسرے کی شکل دیکھتی رہو گی۔ جیسے کہ اس وقت دیکھ رہی ہو۔" میں نے کہا۔

"ہمارے فیصلے مرد کرتے ہیں۔ باہر ہی باہر کلیم اللہ کا معاملہ طے ہو جائے گا تمہیں خبر بھی نہ ہوگی۔" آصف علی نے بتایا۔

"میں اس کی پھوپھی سے ملنا چاہتی تھی۔" کاجل نے مایوسی سے کہا۔

"ابھی تم جاؤ ذرا ڈرائیور کے ساتھ۔" آصف علی نے کہا "اگر بات بن گئی تو ہم آجائیں گے تمہیں لینے کے لیے۔ پولیٹیکل ایجنٹ سخت آدمی ہے۔ میں تو جا سکتا ہوں۔ میرے قبیلے [illegible] میں تعلقات ہیں اور اپنے ساتھ میں کسی کو بھی لے جاؤں۔ عورتوں کو نہیں۔"

"کل بھی وہ انکار کر چکا ہے۔" میں نے کہا "پھر کیسے کہ جب کلیم اللہ کے عزیز آ سکتے ہیں تو آپ لوگ کیوں بضد ہیں۔"

"یہ بات مجھ سے نہیں کہہ سکتا وہ۔ میں ذرا عامر کو سمجھا دوں۔ اس سے میں کوئی بات نہیں کہوں گا کہ [illegible] خطرے کی بات ہے۔ وہ جلدی گھبرا جاتی ہے۔" آصف [illegible] معذرت آمیز لہجے میں کہا "میرے دوست کا گھر [illegible] نظارے اور خوبانی کے باغات ہیں اس کے۔ [illegible] بھی چلے جاتے ہیں۔ میں کہوں گا کہ انہیں سیر کرواؤ۔"

صرف چند منٹ کے بعد وہ سب ایک شاندار گاڑی [illegible] کے روانہ ہو چکی تھیں۔ کاجل پہلے سخت دل گرفتہ اور مایوس [illegible] مجھے ڈر تھا کہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے۔ یہ خیال اسے ضرور آئے گا کہ شاید کلیم اللہ کو وہ دیکھ سکے لیکن ذہنی طور پر اس نے خود کو تیار کر رکھا تھا۔ گزشتہ [illegible] کا ہسٹریا ایک جذباتی پریشر والے لمحے کا نتیجہ تھا۔ یہ پریشر اس کے [illegible] میں نہ جانے کب سے پیدا ہو رہا تھا۔ اعصابی دباؤ ختم ہو جانے کے بعد ہماری بات بھی اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ کار میں بیٹھنے کے [illegible] اس نے جاتے جاتے کلیم کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اس کا فائدہ ہوا کہ کلیم نے بھی خود کو سنبھال لیا (بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ [illegible] روتے روتے بے ہوش ہو گئی تھی) کلیم بہت دیر تک دور [illegible] گاڑی کو دیکھتا رہا۔

میں نے کہا "یار تم بلاوجہ اُداس ہو رہے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہم سب چلیں گے۔"

وہ بڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھ کے مسکرایا۔ اس کی نگاہوں کا مفہوم بہت واضح تھا۔ خاموش رہنے کے باوجود اس نے کہہ دیا کہ انکل سکندر میں اتنا چھوٹا بچہ تو نہیں کہ جھوٹ سے بہل جاؤں۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے دیدی مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی۔ شاید اب ہم کبھی نہ ملیں گے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم اس کی امید تو رکھیں گے۔

ہم بھی نکلنے ہی والے تھے کہ آصف علی کا منہ بولا بیٹا آگیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی صورت پر حیرانی اور ناگواری کے تاثرات نمایاں ہو گئے۔ اس نے ناپسندیدگی کے جذبات کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس نے بادل ناخواستہ میرے سلام کا جواب دیا۔

آصف علی نے کہا "بھئی یہ عامر ہے، میرا بیٹا۔"

"آپ کا بیٹا؟" میں نے بھی حیرانی کا اظہار کیا۔

"اسے بیٹا بنا لیا ہے میں نے۔" آصف علی نے کہا۔

"آج دکان نہیں کھولی آپ نے۔" عامر نے مجھے نظرانداز کرتے ہوئے خاصے سخت لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "یہاں بھی تم ایک بدتمیز ملازم کی طرح بات کر رہے ہو حالانکہ یہ گھر ہے اور سامنے کوئی گاہک نہیں تمہارا باپ ہے۔"

"باپ!" اس نے خاصے تلخ لہجے میں کہا "اگر ہے تو [illegible] پریشانی لاحق ہو گئی۔ ہم تو روز اسی طرح بات کرتے ہیں۔"

[illegible] عادی مجرم ہو۔ آصف صاحب نے مروت اور لحاظ میں

رکھا ہے تمہیں۔" میں نے کہا۔

آصف علی نے فوراً مداخلت کی "عامر! آج تم دکان کھولو۔ مجھے ان کے ساتھ کام سے جانا ہے۔"

"کہاں جانا ہے؟" اس نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"ضروری نہیں کہ ہر بات تمہیں بتائی جائے۔" میں نے کہا۔

"میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔" وہ بولا۔

اس کی بات مجھے بہت بری لگی۔ میں نے اسے ایک چھوٹا سا سبق سکھانا ضروری سمجھا "تم ساتھ نہیں چلو گے؟" میں نے ایک قدم آگے بڑھ کے اس کی گردن دبوچ لی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے اس کی کلائی کو بل دے کر اسے اپنے سامنے کر لیا اور گھٹنا اس کی کمر پر یوں لگایا کہ اس کا سانس رکنے لگا۔

"چھوڑ دو مجھے، تمہاری تو۔۔۔"

"کہو سوری ورنہ تمہیں میرے قدموں میں ناک سے لکیریں نکالنی پڑیں گی۔" میں نے اسے ایک جھٹکا دیا۔

وہ کراہا "ایسا کوئی مائی کا لال پیدا نہیں ہوا۔"

"ہو چکا ہے بیٹے! بس آج تک تم اس سے ملے نہیں تھے۔" میں نے کہا اور اس کی گدی پر ہاتھ رکھ کے اسے ایک دم جھکا دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گرا اور اس نے میری گرفت سے آزاد ہونے کی بہت کوشش کی مگر وہ ایک نوعمر ناتجربہ کار لڑکا تھا۔ بھلا پیشہ ورانہ مہارت اور تجربے کا کیا مقابلہ کرتا۔ ایک اور جھٹکے نے اسے زمین بوس کر دیا اور اس سے پہلے کہ اس کے بچاؤ پر آصف علی کچھ کرتا میں نے اس کی ناک کو زمین پر رگڑ دیا۔

میں نے اسے چھوڑا تو وہ تڑپ کر اٹھا۔ اس کی ناک رگڑ سے لال ہو گئی تھی کہ لگتا تھا اس سے خون ٹپکنے والا ہے۔

"آپ کے گھر میں میری تذلیل ہو رہی ہے اور آپ خاموش تماشا دیکھ رہے ہیں!" اس نے چیخ کر آصف علی سے کہا۔

"اس کی ابتدا خود تم نے کی تھی۔" آصف علی نے برہمی سے کہا "تم کو خیال نہیں آیا کہ یہ میرے مہمان ہیں۔ میرے ہی گھر میں تم نے ان کو میرے سامنے بے عزت کیا۔ اب مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟"

"توقعات آپ کو ہیں مجھ سے، یہ مت بھولیں۔"

"تم بھی اپنی اوقات کو مت بھولو۔ یہ سوچ کر تم کیا تھے اور کیا بنا دیا۔" آصف علی کی مجبوری اور رواداری اب ختم ہو چکی تھی۔

"میں داماد ہوں اس گھر کا۔ بیٹا بنایا ہے آپ نے مجھے۔"

"لیکن میں تمہارا زرخرید باپ نہیں ہوں۔ اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ میں نے اپنی عزت کو گروی رکھ دیا ہے۔" آصف علی نے سنجیدگی سے کہا "عزت کرو گے نہیں تو عزت پاؤ گے بھی نہیں۔ سمجھے اور نہیں سمجھے تو ابھی وقت ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ جاؤ دکان کھول کے بیٹھو۔"

اس نے چابیاں عامر کی طرف پھینک دیں۔ عامر کو ابھی تک علم نہیں تھا کہ آصف علی نے مستقبل کے کتنے بڑے فیصلے بدل کر دیے ہیں۔ کل میرے دکان میں قدم رکھنے سے پہلے اس کی جو پوزیشن تھی وہ راتوں رات بدل گئی تھی۔

اس نے چابیاں اٹھائیں اور مجھے خون آشام نظروں سے گھورتے ہوئے بولا "یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ آپ بھی سمجھ لیں۔ میں بھی سمجھ لوں گا سب سے۔"

اس کے الفاظ میں دھمکی تھی "جا کے اپنی ناک کی فکر کرو، کہیں کٹ ہی نہ جائے۔ ابھی تو کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا پھر سب دیکھیں گے۔ آصف علی میرے بزرگ ہیں۔ تم نے پھر ان کے ساتھ غلط لہجے میں بات کی تو پھر نتیجہ وہی نکلے گا جو میرے ساتھ بدتمیزی کا نکلا تھا۔ چلو روانہ ہو جاؤ۔"

میں نے چٹکی بجائی اور اس کی طرف بڑھا تو وہ دروازے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ دروازے میں رک کر اس نے دانت پیستے ہوئے زیرِ لب کچھ کہا۔ ظاہر ہے اس نے مجھے دعا نہیں دی تھی، گالیاں دی تھیں مگر میں نے مسکراتے ہوئے اسے ہاتھ سے ایسے اشارہ کیا جیسے لوگ منڈیر پر بیٹھے ہوئے کوّے کو یا دروازے پر کھڑے کتے کو بھگانے کے لیے کرتے ہیں۔

"آج تو یہ حد سے بڑھ گیا۔" آصف علی بولا۔

"یہ بات نہیں آصف صاحب! احساس آج ہوا ہے آپ کو ورنہ آپ نے اس کی سرکشی اور گستاخی کو نظرانداز کرنے کا رویہ اختیار کیا ہوتا تو اس کی اتنی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ ممکن ہے آپ کو میرا جارحانہ انداز برا بھی لگا ہو۔"

"نہیں بخدا نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ تم نے اسے بہت صحیح وقت پر دوا کی پہلی خوراک دے دی جب اس کی خودسری کا مرض میری عزت نفس کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔ ممکن ہے اب وہ ٹھیک ہو جائے۔"

"ابھی نہ ہوا تو اگلے دو روز میں ہو جائے گا۔ یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔" میں نے کہا۔

"[illegible] میاں۔۔۔ بات یہ ہے کہ لاوارث لڑکا ہے۔ یتیم کے ساتھ زیادتی بھی گناہ ہے۔" آصف علی نے کہا "کل تک اس کا دماغ ساتویں آسمان پر تھا۔ اسے اچانک ذلت کے گڑھے میں پھینک دینا میرے لیے ناممکن ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں، میری نہ اس سے ذاتی عداوت ہے نہ میں اس کے خلاف کسی قسم کی زیادتی ہونے دوں گا۔ آپ نے اسے بیٹا بنایا ہے تو یہ رشتہ قائم رکھیں مگر عزت آبرو کے ساتھ، مساوی احترام کی بنیاد پر۔ عزت و احترام کی مساوات ایسے قائم نہیں ہوتی کہ باپ بھی زیادتی کر جائے اور بیٹے کو تھپڑ مار دے تو جواب میں بیٹا بھی باپ کو مارے۔ نہیں، باپ کا اپنا مقام ہے، بیٹے کا اپنا اور یہ ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتے۔ بیٹا بھی باپ کی جگہ نہیں لے

www.paksociety.com

سکتا۔ فرمانبرداری اور اطاعت بیٹے پر ہی فرض ہے' باپ پر نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو مگر وہ بچے تب..."

"میں سمجھاؤں گا اسے بڑے آرام سے۔" میں نے کہا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تمہاری طرف سے اس کا دل صاف رہے۔ یہ نہ سمجھے وہ کہ تم نے مجھے ورغلایا اور اس کے خلاف کردیا چنانچہ میں نے اپنی جائداد تمہارے ٹرسٹ کو دے دی اور اسے والدی کے عہدے سے ہٹا دیا۔ میں نے قدرت کے مستقبل کی بہتری دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلے سے عامر کا مستقبل متاثر نہیں ہوگا۔ بیٹے کی حیثیت سے اس کے قانونی حقوق برقرار رہیں گے۔ آدھی دولت اور جائداد اگر ٹرسٹ کو ملے گی تو باقی میں اس کا حصہ قدرت کے ساتھ شرع کے مطابق ہوگا۔ وہ حصے اس کے' ایک قدرت کا۔"

"میں آپ کی فراخدلی اور انصاف پسندی کی دل سے قدر کرتا ہوں اور آپ کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگنے دوں گا۔ میری تو خواہش ہے کہ جب میں واپس جاؤں تو آپ کے اور عامر کے رشتے کی بنیاد زیادہ حقیقت پسندانہ سوچ پر استوار ہو۔ آپ کے درمیان حالات کی خلیج حائل نہ ہو اور آپ مستقبل کے لیے مفاہمت کریں تو ایک دوسرے کا سہارا بننے کی اُمید' خواہش اور کوشش کے ساتھ..."

"اللہ تمہیں جزا دے۔ میرے جیسے محسن کش کو تم نے معاف کیا' یہی بڑا احسان تھا تمہارا۔ پھر تم نے میری زندگی کے دکھ سمیٹ لیے' قدرت کی طرف سے مجھے سکون اور اطمینان دیا ورنہ میری روح مرنے کے بعد بھی چین نہ پاتی۔"

میں نے کہا "آپ جذباتی ہو رہے ہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"وزیر خان پر اللہ کا خاص کرم تھا۔ اس کو تم جیسا بیٹا دے کے خدا نے سب کچھ دے دیا اور مجھے اتنا کچھ دے کر بھی کچھ نہیں دیا۔ بیٹا نہ سہی' رابعہ جیسی بیٹی ہی دی ہوتی مجھے خدا نے تو میں دنیا میں بھی سرخرو ہوتا۔ سر اٹھا کے جیتا۔"

زندگی کے مسلسل آلام و مصائب نے اسے شدید جذباتی' نفسیاتی' ذہنی الجھن اور رقیق القلب بنا دیا تھا۔ کوئی بات اس کے دل کو لگتی تھی تو آنسو خود اس کی آنکھوں میں اتر آتے تھے اور اس کا ان آنسوؤں پر اختیار ختم ہو چکا تھا۔

روانگی سے پہلے مجھے خیال آیا کہ میں تازہ ترین واردات سے منظر کو باخبر کروں مگر گھڑی میں وقت دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ منظر اور وقار یوسف دونوں ہی اس وقت کورٹ میں تھے اور دوپہر دو بجے سے پہلے کسی کے گھر میں یا اپنے چیمبر میں ملنے کا امکان نہیں تھا اور بار روم کے نمبر پر ان سے کوئی بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ بار میں دو فون تھے اور ان گنت استعمال کرنے والے۔

وہاں کی لائن ملنا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا چیف جسٹس سے بخت آور تک توفیق کا ملنا۔ پھر بھی ایک نجی فون نمبر ایسا تھا جہاں سے سب معلومات حاصل ہو سکتی تھیں اور یہاں کی خبریں وہاں رہتے ہوئے بھی مل سکتی تھیں لیکن فی الحال مجھے ضرورت نہیں تھی۔ یہ ضرورت نہ تھا بلکہ نامناسب تھا کہ اس طرح منظر کو اور وقار یوسف کو بھی یہ خبر جلد از جلد مل سکتی تھی۔ یہ وقار کے گھر کا نمبر تھا جہاں اس وقت صرف اس کی بیوی انجم باتیں کرنے کے لیے فارغ تھی۔

میں نے اس کا نمبر ملایا تو اس نے چلا کے کہا "ابھی کم بخت لائن کٹ گئی تھی تو انتظار کرتی۔ ادھر سے تو ملا رہی تھی اور مرت میں..."

میں نے زنانہ آواز بنا کے کہا "کم بخت کسے کہہ رہی ہے کم بخت سے کیوں ملاوں گی تیرا نمبر"

وہ بھڑک گئی "یہ کون بدتمیز ہے؟"

میں نے ہنس کے کہا "آپ کا خادم۔ احقر و کمترین منظر حقیر پر تقصیر"

"کون؟" وہ بوکھلا کے بولی۔

"استاد کبیر خاں طبلہ نواز پٹیالہ والے عرف سکندر اعظم رابعہ قاری والے۔" میں نے کہا۔

"اف بھائی سکندر! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ابھی میں کچھ سنا رہی تھی پھر۔" اس نے چلا کے کہا۔

"سنائیے سنائیے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔ کیا سنا رہی ہیں اس وقت باگیشوری یا مالکونس تین تال میں۔" میں نے کہا۔

"سکندر بھائی! آخر کہاں ہیں آپ؟ نہ خیر نہ خبر"

میں نے کہا "ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔"

"کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"جہاں سے سب بولتے ہیں۔ منہ کے لاؤڈ اسپیکر سے۔ تم کیا کر رہی ہو؟ کس مصیبت کی لائن کٹ گئی تھی۔ صاحب بہادر کہاں ہیں؟"

"وہ لڑ رہے ہوں گے عدالت میں کیس۔ گھر میں مجھ سے لڑتے ہیں۔ آپ لوگ بھی ساری دنیا سے لڑتے پھر رہے ہیں۔"

"بس ایک تم ہو امن پسند' صلح جو۔" میں نے کہا "فون اس لیے کیا کہ اس وقت تم ہی ایک خبر رساں ایجنسی ہو۔ کل رات منظر سے بات کر رہا تھا تو اس کم بخت کی بھی لائن کٹ گئی۔ دوبارہ نہیں ملی۔ تمہیں کچھ معلوم ہے لاہور میں کیا ہو رہا ہے؟"

"لاہور میں؟ ہاں۔ ایک تو جہانگیر خان کا میلہ ہو رہا ہے اور آرٹس کونسل میں زبردست نمائش لگی ہے۔ نئی فلم لگی ہے' دیکھ لو مراد کی۔"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ یہ سب خرافات ہیں بابا۔ میں جرائم کی رپورٹ چاہتا ہوں۔ سنا ہے اپنے گولا خنڈہ والا فوت ہو گئے خیر سے۔"

بنجی "خودفوت کیا انھوں نے اپنے آپ کو۔"

"مگر کیوں؟ اور کیسے پتا چلا کہ اس نے خودکشی کی؟ اسے مرنا تو تھا ہی سوچ رہا تھا۔ ہم قتل کر دیتے۔"

انجم ہنسی بہت تھی "یہی وہ کہہ رہے تھے کہ سالا خواہ مخواہ بے ٹک گیا۔ مجھے فون کردیتا' میں جا کے گولی مار دیتا۔ کچھ بے دل کو بھی تسلی ہوتی کہ دشمن کو ختم کردیا اور اس کا بھی کام بنا۔ پھر کوئی میں بھی کہہ سکتا کہ بڑے بڑے بدمعاشوں کو گولی مار اُڑا دی تھی۔"

اب مجھے بھی ہنسی آئی "یہ قتل ہی ہوگا انجم' جسے خودکشی کا رنگ دیا گیا ہے۔"

"کہاں ہے! آپ تو بالکل انہی کی باتیں دہرا رہے ہیں۔ وہ گولا صاحب نے اس دنیا کو خیرباد کہنے سے پہلے ایک خط لکھا تھا خود۔"

"میں نے تو سنا ہے وہ انگوٹھا ٹیک تھا۔"

"پولیس نے اسے گولا صاحب کا خط قرار دیا تھا۔ اس میں انہوں نے صاف لکھا کہ چاندنی کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔"

"حالانکہ یہ غلط ہے۔ آدمی اور پورے دھوپ کے بغیر زندہ رہ سکتے۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "اور سنیں! اس نے لکھا کہ غصے میں ان سے چاندنی کا قتل ہو گیا تھا۔ اس جرم پر وہ خود کو معاف نہیں کر سکتے۔"

"اور اتنا انتظار بھی نہیں کر سکتے کہ ان پر مقدمہ چلے پھر سزا اور پھانسی کی تاریخ مقرر ہو۔ وہ سرکار کو زحمت نہیں دے رہے عدالتوں پر پہلے ہی مقدمات کا کافی بوجھ ہے۔ اس لیے گولا خنڈہ والا اس دنیا سے اپنا بستر خود گول کر رہا ہے۔ فقط والسلام..."

انجم کھلکھلا کے ہنسی "ایسی ہی باتیں تھیں۔ خط لکھ کے اس نے کسی اخبار والے کو فون کیا کہ وقت پر آجائے کیونکہ پولیس تو وقت پر آنے کی نہیں۔ اطلاع اس نے تھانے کو بھی دی اور پھر ختم ہو گیا۔ اخبار والا پہلے پہنچ گیا اور سیدھا اندر گھس گیا۔ اس نے فوٹو وغیرہ بنائیں اس خط کی اور لاش کی اور پھر معصوم صورت بنائے باہر کھڑا ہو گیا۔ پولیس آئی تو ان کے ساتھ اندر گیا۔ پولیس کے ایک سب انسپکٹر نے اخبار والے کو بہت ڈانٹا کہ وہ اجازت سے پہلے کیسے پہنچ گیا۔ کہیں خبر بنانے کے لیے خود اس نے قتل نہیں کیا۔ وہ ایک ڈھیٹ چیز تھا۔ کہنے لگا کہ ایسا ہی ہے تو تم مجھے پھانسی پر چڑھا دو۔ دوسری خبریں بن جائیں گی۔"

"کون تھا وہ آخر؟"

"تاجی کا کوئی دوست ہے پرانا۔ اسی اخبار میں۔ پولیس والے اسے کتے کی دم کہتے ہیں۔"

"یہ تمہیں کس نے بتایا؟"

"تو آپ وکیل کی بیوی ہوں۔ مجھے میرا میاں بتاتا ہے ساری خبریں۔ آدھی وکیل ہو گئی ہوں۔"

"بلکہ نصف بہتر وکیل۔" میں نے کہا "آگے بولو اور کم بولو کیونکہ وقت کم ہے میرے پاس۔ مجھے بھی ایک خبر سنانی ہے۔"

"اچھی خبر ہے کہ بُری؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم بتاؤ پولیس نے کیا کیا۔ خودکشی کو قتل کا کیس بنانے کی کوشش کی؟"

"مانتی ہوں آپ کی استادی کو۔ انھوں نے چوہدری ولاور کو فون کیا۔ اب یہ مت پوچھنا کیوں؟"

"چلو تم خود ہی بتا دو۔"

"ان کا باپ ہے نا وہ' اس لیے۔" انجم بولی "انسپکٹر کا کہنا تھا کہ انھیں گولا خنڈہ والا نے نہیں چوہدری ولاور کے ایک ڈرائیور نے اطلاع دی تھی کہ چاندنی کے بعد کسی نے اس کے چاند کو بھی قتل کردیا ہے۔ اس کے سر پر تو پورا چاند ہی تھا۔" انجم ہنسی "اخبار والا سب سنتا رہا اور جب انھوں نے چوہدری ولاور کے حکم پر خودکشی کے کیس کو قتل کا کیس بنانے کی کوشش کی..."

"تاکہ ہمارا نام اس میں آجائے؟"

"بالکل۔ انھوں نے خط غائب کرکے جیب میں ڈالا اور لاش اُتار کے نیچے رکھ دی تو اخبار والے نے انھیں مطلع کیا کہ وہ خود کو معطل سمجھیں۔ چوہدری ولاور کا باپ بھی ان تصویروں کو نہیں جھٹلا سکتا جو وہ پہلے ہی اُتار چکا تھا ورنہ عدالت اس کی گواہی کو غلط قرار دے سکتی ہے۔ سنا ہے کتے کی دم کو سیدھا کرنے کی بہت کوشش کی پولیس نے بھی اور چوہدری ولاور نے بھی مگر اس نے خبر فراہم کردی سب کو اور گھر اچھی کر دیا اپنے آفس۔"

"مارا جائے گا کسی دن۔ ایسے لوگ زیادہ نہیں جیتے۔"

"مگر اس نے تمہیں تو بچا لیا۔ چاندنی کے قتل کا الزام بھی ختم۔ اب تم واقعی بے گناہ ہو جتنے منظر صاحب"

"منظر نے تو چند ہی گناہ کیے ہیں۔ پہلا شادی کا پھر چودہ بچوں کی پروڈکشن لائن کا۔" میں نے کہا "میرا اس کا کیا مقابلہ۔"

"اچھا اب آپ جلدی سے سنائیں' کیا خبر ہے؟"

"شربت بنفشہ اور خمیرہ ہے گھر میں تو قریب رکھ لو۔ ضرورت پڑ سکتی ہے تمہیں۔ بُری خبر ہے۔"

"یا اللہ! کیا ہو گیا۔ جلدی بتائیں ورنہ میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔" وہ گھبرا کے بولی "آپ لوگ خیریت سے ہیں نا؟"

"ہاں ہم تو ٹھیک ہیں مگر وہ..." میں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

"وہ کیا؟"

"تمہارے ابا کی گاڑی آج صبح دشمنوں کو پیاری ہو گئی ایک دھماکے میں۔ کچھ بھی نہیں بچا۔"

"اف! آپ نے مجھے اتنا ڈرا دیا تھا۔ بھاڑ میں جائے گاڑی۔ ویسے بھی انشورڈ تھی۔" انجم نے کہا "ذرا تفصیل سے بتائیں۔"

میں نے کہا "اختصار وقت کی ضرورت ہے۔"

www.paksociety.com

میں نے کم سے کم الفاظ میں آفریدی کی ہلاکت اور پھر ریسٹ ہاؤس میں ہونے والے دھماکوں کے بارے میں بتادیا۔ درمیان میں اس نے بار بار سوال کیے اور نتیجہ یہ کہ دو منٹ میں ختم ہونے والی بات دس منٹ میں پوری ہوئی۔

"اب ہم جا رہے ہیں کلیم اللہ کو اس کے گھر چھوڑنے۔"

"رابعہ باجی اور کاجل کے ساتھ؟"

"نہیں۔ وہ کہیں اور گئی ہیں سیر کرنے۔" میں نے کہا "کسی کے گھر۔"

"وہاں فون ہے؟" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"پوچھ کے بتاتا ہوں۔" میں نے کہا اور آصف علی سے پوچھ کے اسے نمبر بتا دیا "یہ ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ سارا دن ایک دوسرے کے کان کھاؤ۔ بھلا تو ٹیلی فون والوں کا ہوگا۔ ہاں ایک بات اور معلوم ہے تو بتاؤ۔ منظر نے مذاق کیا تھا شاید۔ یہ گل کا کیا قصہ ہے؟"

"آپ کو نہیں معلوم؟"

"معاف کرنا۔ کیا یہ سوال کچھ احمقانہ نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں تم سے پوچھتا۔"

"یہ گل کون تھی؟ کسی ڈاکو شیش ناگ کی بہن؟"

"ہاں مگر یہ تو بہت پرانی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شیش ناگ اگر سو سال انسانوں میں رہے تو کیا انسانیت سیکھ جائے گا؟" وہ فطرت سے بولی۔

"کیا کہنا چاہتی ہو تم؟"

"یہی کہ ناگ منی کو تم سب کی محبت گل بانو نہ بنا سکی۔ معلوم نہیں کیسے اتنے دن گزارے ہوں گے اس نے۔ آخرکار لوٹ گئی اپنی دنیا میں۔ فطرت نے مجبور ہوگئی۔"

"تم سوچ سمجھ کے بات کرو۔ تم نہیں جانتیں اسے۔"

"جو بات ساری دنیا جانتی ہے وہ آپ نہیں جانتے جناب۔ اخبار والوں کو بھی جھوٹا کہو گے تم سب مل کے۔ اس لیے کہ تم سب کے یقین کو شکست ہوتی ہے حقیقت کو تسلیم کرنے سے......"

"اخبار میں کیا آیا ہے اور کب؟" میں نے ڈرتے دل سے کہا۔

"پرسوں کا اخبار مل جائے تو دیکھ لینا۔ پشاور کے کسی نیوز ایجنٹ یا اخبار کے دفتر سے نہ ملا تو لائبریری سے مل جائے گا۔"

مجھے صدمے سے زیادہ غصہ تھا "ٹھیک ہے میں دیکھ لوں گا۔ تم وقار یوسف کو اور منظر کو یہ سب بتا دینا۔ خدا حافظ۔"

وہ ہیلو ہیلو کرتی رہی تھی کہ میں نے ریسیور کو غصے سے رکھا "دماغ خراب کردیا میرا۔"

"کیا ہوا؟ کیسی کیا بات ہوگئی؟"

میں نے کہا "لاہور کا ایک اخبار چاہیے مجھے۔ پرسوں کی تاریخ کا۔ کہاں مل سکتا ہے؟"

"صدر کے نیوز ایجنٹ سے مل جائے گا۔ اس کے پاس نہ ہوا تو وہ منگوا دے گا۔" آصف علی نے کہا۔

"بس تو پھر چلیں۔" میں نے کہا اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے شکوک کے غبار میں ابھر آنے والے گل بانو کے معصوم چہرے سے نظریں چرانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

جب ہم گاڑی میں جا رہے تھے تو گل بانو کا چہرہ وڈ اسکرین پر آگیا۔ میں باہر دیکھنے لگا تو اس کا عکس پچھلی خیال کی طرح ساتھ ساتھ پرواز کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں سوالی تھیں۔ بھائی سکندر! کیا تم نے یہ بات مان لی۔ تم نے یقین کرلیا۔ فرض کرو اخبار میں ایسا ہی نظر آیا تو کیا یہ سچ ہو جائے گا؟ کیا سچ وہ نہیں ہے جس کی گواہی تمہارا دل دیتا ہے۔ آخر میں وہی گل بانو ہوں جسے تم نے گل بہ بنایا تھا۔ کیا ایسے عارضی 'مٹ جانے والے نقش تھے گل بانو کی شخصیت کے۔ تم سب اپنے انازی نقش گر تو نہ تھے۔ پھر انجام قصہ ایک بازگشت بن گیا۔ شیش ناگ اگر سو سال انسانوں میں رہے تو کیا انسانیت سیکھ جائے گا؟ اگر شیش ناگ کی بہن ناگ منی تھی۔ گل بھی تھی 'کیا آج بھی ہے۔ درمیان میں کہیں گل بانو کا روپ دھار لیا تھا اس نے 'کینچلی بدلی تھی۔ شیش ناگ سو سال بعد انسان کا روپ دھار لیتا ہے۔ سپیرے جانتے ہیں۔ شاید ناگ منی کو انسان بننا اچھا نہیں لگا تھا۔

"جھوٹ بکواس۔ سپیرے جاہل ہوتے ہیں 'بے وقوف ہوتے ہیں۔" میں نے چلا کے کہا۔

آصف علی نے حیرانی سے میری طرف دیکھا "سپیروں کا کیا مسئلہ ہے؟ بڑے فراڈ کرتے ہیں مگر سب نہیں......"

میں نے نفرت سے کہا "اس نیوز ایجنٹ کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اخبار کیوں چاہیے۔"

"مجھے معلوم ہوگا تو بتاؤں گا۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں بتایا ہے۔" اس نے کار کو صدر کی ایک بغلی سڑک پر موڑ لیا اور ایک کتابوں کی دکان میں گھس گیا۔ اس کے باہر دنیا بھر کے اخبارات و رسائل آویزاں تھے۔

"اس وقت تو نہیں ہے' شام تک دستیاب ہو جائے گا۔" آصف علی نے واپس آکے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا "ویسے کیا ہے اس اخبار میں؟"

میں نے کہا "ابھی خود مجھے نہیں معلوم تو آپ کو کیا بتاؤں۔"

"پھر بھی کیا دیکھنا ہے اس میں؟"

"بعد میں بتاؤں گا تفصیل سے۔" میں نے کہا۔

پولیٹیکل ایجنٹ نے مجھے دیکھتے ہی کہا "آپ؟"

میں نے کہا "جی میں۔ زندہ سلامت' جسم اور اپنی روح کے ساتھ۔"

اس نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں "مجھے اطلاع ملی تھی......"

"اطلاع غلط تھی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "ہم ریسٹ ہاؤس میں نہیں تھے۔"

"لیکن اس گاڑی کے ڈرائیور نے جو آپ کو چھوڑنے گئی تھی یہ بتایا تھا کہ آپ سب وہیں ٹھہرے ہیں۔"

اب آصف علی بولا "شام تک یہ سب وہیں تھے پھر ان کو میں اپنے گھر لے گیا۔ یہ میرے ایک محسن اور دوست کے فرزند ہیں۔"

پولیٹیکل ایجنٹ نے انٹرکام کا ایک بٹن دبایا "اس آلو کے پٹھے ایس پی کو بتاؤ۔ غلط رپورٹ گھر بیٹھ کے سائن کردی۔ یہ تفتیش ہے ان کی۔ میں سب کو معطل کرادوں گا۔ اور دیکھو میری بات آئی جی صاحب سے کراؤ۔"

میں نئی پریشانی میں مبتلا ہوگیا "کیا رپورٹ میں یہ لکھا ہے کہ ہم سب کی لاشیں برآمد ہوگئی ہیں؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "آخر کیسے ثابت کریں گے وہ کہ وہاں سے پانچ لاشیں نکلی ہیں۔ جلی ہوئی اور ناقابل شناخت حالت میں۔"

"اس کا مطلب ہے ہمیں عدالتی تحقیقات میں خود کو پیش کرنا پڑے گا؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ آپ لوگوں کو مردہ ظاہر کیا گیا ہے۔ عدالت آپ سب کو دیکھ کر ہی یقین کرے گی تاکہ یہ جھوٹ ہے اور غلط بیانی ہے۔"

میں نے کہا "کیا صرف میرا بیان کافی نہیں؟"

اس نے سوچ کے کہا "ٹھیک ہے۔ آپ بیان حلفی داخل کریں' کسی مجسٹریٹ سے تصدیق کرا کے۔ میں نے اس لڑکے کے وارثوں کو مطلع کروا دیا تھا۔"

"اب ہم خود جا رہے ہیں۔" آصف علی نے کہا۔

"خواتین کے ساتھ؟" پولیٹیکل ایجنٹ نے کہا "آئی ایم سوری۔ کل ابھی میں نے وضاحت کردی تھی......"

"ہم سے مراد ہے ہم تین۔" آصف علی نے کہا "انھیں میں اپنے ذمے داری پر لے جا رہا ہوں۔ سردار یوسف خان تیمواری کے ڈیرے پر۔"

"ٹھیک ہے آصف صاحب۔ آپ کی بات اور ہے' آپ جا سکتے ہیں۔" پولیٹیکل ایجنٹ نے کہا "واپسی پر بیان حلفی ضرور دے کر جایئے۔"

میں نے کہا "میں اپنی قانونی ذمے داری کو سمجھتا ہوں۔"

تاریخی درۂ خیبر سے گزرتے ہوئے میرے خیالات کا رخ وقتی طور پر بدل گیا۔ میں نالہ کرخ اور ناگ منی کے الجھاؤ سے نکل آیا اور تاریخ کے دھارے میں شامل ہوگیا۔ اُدھر سے آریہ آئے۔ سکندر اعظم تسخیر عالم کے لیے گزرا۔ محمود غزنوی نے ہندوستان دیکھا۔ پھر مغل آئے اور چار سو سال مسلمانوں کے جاہ و جلال کی حکمرانی رہی۔ سب تاریخ کے صفحات میں نام رہ گئے۔ درۂ خیبر آج بھی وہیں ہے۔ اب نہ کوئی سکندر آتا ہے' نہ محمود غزنوی۔ تورخم... وہ سرحد ہے جو پاکستان کو افغانستان سے جدا کرتی ہے اور علاقہ غیر ہے۔ غیور پٹھانوں کی سرزمین جن کو انگریز کی طاقت بھی زیر نہ کرسکی کیونکہ ان میں نہ کوئی میر جعفر تھا' نہ صادق جیسا وطن فروش۔ جعفر از بنگال و صادق از دکن۔ ننگ دنیا ننگ دین ننگ وطن۔ نہ جانے کون ستم ظریف شاعر تھا جس نے اس کو حالات حاضرہ کے مطابق یوں کردیا۔

بھونڈے از بنگال و گاندھی از دکن۔ ننگے پاؤں ننگے سر ننگے بدن۔

میں مسکرانے لگا اور آصف علی نے جو میرے موڈ کی خرابی کے باعث خاموش تھا اطمینان کی سانس لی۔ ایک بار پھر میرا ذہن گل بانو کی طرف پلٹ گیا۔ وہ محسن سمیت کراچی سے غائب ہوگئی تھی۔ اس کو آرام سے شیخ کے پاس پہنچنا تھا مگر حالات اشارہ کرتے تھے کہ وہ شیش ناگ کے ٹھکانے پر پہنچی جہاں شاید اس کے بچے کھچے ساتھی ملے ہوں گے اور انھوں نے پھر گل بانو کو ناگ منی بن جانے پر مجبور کردیا ہوگا۔ اس نے بھائی کی جگہ گروہ کی قیادت سنبھال لی ہوگی لیکن ایسا فرض کرنے سے میرا دماغ ماؤف ہونے لگتا تھا کیونکہ مجھے گل بانو پر اتنا ہی اعتماد تھا جتنا رابعہ پر۔ اس کی فطرت کی نیکی پر میرا یقین اتنا ہی مکمل ہو چکا تھا جتنا رابعہ پر بیٹے سے تھا۔ وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی اور وہ اکیلی نہیں گئی تھی۔ اس کے ساتھ محسن تھا۔ کیا محسن اسے اجازت دے سکتا تھا کہ وہ گل بانو سے دوبارہ ناگ منی بن جائے۔ یہ اتنا ہی بعید از قیاس تھا جتنا محسن کا شیش ناگ بن جانا۔ محسن کی خاطر وہ ناگ منی ہوتی تو گل بانو بن جاتی۔ پھر یہ کیا چکر ہے۔ کوئی شیطانی چکر ہے اس میں۔

تقریباً دو گھنٹے کے سفر میں زیادہ تفصیل کے ساتھ میں نے چوہدری دلاور کے ساتھ اپنے رشتۂ عداوت کی وضاحت کی۔ موجودہ حالات میں کچھ بھی چھپانا بے مقصد ہوتا۔ آصف علی اب ہمارے ساتھ تھا اور ہم نے اس کی پیشکش قبول کرلی تھی۔ وہ وسیع تر بنیادوں پر وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کی انتظامیہ میں شامل تھا۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا اور غیر ضروری تفصیل کو خارج کرتے ہوئے اس کا سب سے تعارف کرا دیا تاکہ وہ سمجھ سکے کہ میں گل بانو کے بارے میں کیوں متفکر تھا۔

وہ خاموشی سے سنتا رہا اور ڈرائیو کرتا رہا "میں تم سے اتفاق کرسکتا ہوں۔ گل بانو پھر ناگ منی نہیں بن سکتی۔"

"لیکن منظر نے بھی اخبار کی خبر کا حوالہ دیا تھا۔"

"چلو اخبار بھی دیکھ لیں گے۔ یہ سازش بھی تو ہوسکتی ہے کسی کی۔ کوئی جھوٹی خبر لگوا سکتا ہے۔ یا ہوسکتا ہے یہ وہ مرد ناگ منی ہو جس کا گل بانو سے کوئی تعلق نہ ہو۔"

اس وضاحت نے مجھے تھوڑی دیر کے لیے مطمئن کیا مگر علم نے تصور کا بھی ذکر کیا تھا۔

www.paksociety.com

"بھئی ابھی سے پریشان ہو کے کیا ملے گا۔ فرض کرو ایسا ہی ہے پھر؟ کیا کر سکتے ہو تم؟"

"یہ ناممکن ہے۔"

"اچھا ناممکن ہے پھر پریشان کیوں ہو؟" اس نے کہا۔

گاڑی ایک کچے راستے پر دھول اُڑاتی جارہی تھی۔ دونوں جانب بلند پہاڑ تھے جن پر کہیں کہیں بلند فصیلوں والے گھر بھی نظر آنے لگے تھے۔

"یہ غیر علاقہ ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہوشیار رہو۔ کوئی گولی کسی بھی سمت سے آسکتی ہے۔" آصف علی نے کہا۔

"کیا مطلب؟ ہم سے کچھ پوچھے بغیر کہ ہم دوست ہیں یا دشمن کوئی ہمیں گولی مار دے گا؟" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا "یہ تو دشمن کو بھی خبردار کر کے گولی مارنے والے لوگ ہیں۔"

اچانک پہاڑوں میں ایک فائر گونجا۔ گولی کار کے بونٹ سے ٹکرائی تھی۔ آصف علی نے گاڑی فوراً روک لی اور اتر کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ میں نے اس کی تقلید کی اور پہاڑ کی ڈھلوان پر سے اُترنے والے چار افراد کو دیکھا۔ انہوں نے شلوار قمیص پر کوٹ پہن رکھے تھے۔ ان کے سروں پر اونی ٹوپیاں تھیں اور ہاتھوں میں رائفلیں۔ ان میں دو نسبتاً زیادہ عمر کے تھے اور ان کی داڑھیوں کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے۔ تیسرے کی داڑھی کالی تھی اور چوتھا ایک نوعمر جوان تھا۔

قریب آ کے انہوں نے ایک آواز میں کہا "السلام علیکم۔"

ہم نے ایک آواز ہو کے جواب دیا۔ پھر آصف علی کے اور ان کے درمیان پشتو میں گفتگو شروع ہوئی۔ یہ ابتدائی تفتیش تھی۔ انہوں نے پہاڑ کی کسی چیک پوسٹ سے ایک اجنبی گاڑی کو آتا دیکھ کر فائر کیا تھا۔ یہ وارننگ شاٹ تھا جس کا مقصد ہمیں نقصان پہنچانا ہرگز نہ تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ہاتھ ملا کے جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی لوٹ گئے۔

"یہ صرف پوچھنے آئے تھے کہ ہم کون ہیں اور کہاں جارہے ہیں۔"

میں نے کہا "عجیب طریقہ ہے۔ پہلے فائر کر دیا پھر پوچھ رہے ہیں کہ کون ہو۔ گولی ہمیں لگ جاتی تو جواب کون دیتا!"

آصف علی ہنسا "ان کا نشانہ ایسا نہیں ہوتا۔ فائر صرف ہمیں روکنے کے لیے کیا گیا تھا۔"

"اس سے ٹائر برسٹ بھی تو ہو سکتا تھا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "گولی کا نشانہ بونٹ کو بنایا گیا تھا بلکہ بمپر کو۔ بمپر کے علاوہ گولی کہیں بھی نہیں لگی۔ ایک انچ کا فرق بھی بہت ہے۔ یہ پانچ پیسے کا سکہ ہوا میں اُچھال کے نشانے کی مشق کرتے ہیں اور مہارت کی حد تب ملتی ہے جب دس میں سے ایک بار بھی نشانہ خطا نہ ہو۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو ورنہ یہاں تو میرے قتل کا مقدمہ بھی درج نہیں ہوگا۔" میں نے کہا "اور میں ہوں ذرا دوسری قسم کا پٹھان۔ کاغذی پٹھان۔ میرے خاندان میں کون بدلہ لینے والا ہے۔"

"فکر نہیں کرو۔ اب ہمیں پروانۂ راہداری مل چکا ہے۔ آگے کوئی نہیں روکے گا۔" آصف علی بولا "ہم اس علاقے میں داخل ہو جانے کے بعد اجنبی نہیں رہے۔"

"یہ چار حضرات پاسپورٹ ویزا دیتے ہیں وہ زبانی۔ آگے کوئی پھر پوچھ لے تو؟"

"یہاں آنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ اجنبی پہلی چیک پوسٹ پر ہی روک لیے جاتے ہیں اور جب تک کوئی انہیں شناخت کرنے والا نہ ہو وہ آگے نہیں جا سکتے۔"

"تمہیں پہچان لیا تھا انہوں نے۔ مجھے تو خیر کوئی نہیں جانتا۔"

"میں نے بتا دیا کہ مجھے کس کے پاس اور کہاں جانا ہے۔ ہمارے نام اور حوالے درست تھے۔ تم سے انہیں کوئی غرض نہیں کیونکہ تم میرے ساتھ ہو۔"

"اب کتنی دور جانا ہے؟"

"بس پہنچ گئے سمجھو۔ آدھے گھنٹے میں یوسف خان شنواری کا ڈیرہ آجائے گا۔" وہ بولا۔

بظاہر ویران نظر آنے والے ان پہاڑوں کے درمیان مختلف قبائل کی بستیاں تھیں۔ میں نے پہاڑوں پر چڑھتے اُترتے لوگوں کو دیکھا جو کندھوں پر بوریاں لادے یا سروں پر لکڑیاں اُٹھائے جارہے تھے۔ جگہ جگہ مویشی چرانے والے بچے بے فکری سے گھوم رہے تھے۔ یہاں نہ سڑکیں تھیں اور نہ ذرائع آمدورفت تھے۔ کہیں کہیں زمین ہموار کر کے چھوٹے چھوٹے کھیت کاشت کیے گئے تھے۔ بجلی کا نام شاید یہاں کے لوگوں نے ضرور سنا ہو مگر بجلی صرف بڑے قصبوں اور شہروں تک محدود تھی۔ یہ لوگ اپنی اہم ضروریاتِ زندگی کے لیے انہی بستیوں کا رخ کرتے تھے ورنہ مقامی دُکاندار عام ضرورت کی چیزیں رکھتے تھے۔ اسپتال، اسکول، تھانے وغیرہ کا یہاں کوئی تصور نہیں تھا۔ سب سے مشکل مسئلہ پانی کا حصول تھا جو بعض اوقات میلوں دور سے لانا پڑتا تھا اور یہ انتہائی مشقت طلب کام عورتیں سرانجام دیتی تھیں۔ یہاں میں ابتدائی دور کے انسان کی زندگی کی عملی تصویر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ شہروں کے پُرآسائش ماحول کا پروردہ کلیم اللہ یہاں کیسے رہے گا مگر وہ پٹھان کا بچہ تھا۔ عزم و ہمت کا پیکر۔ جفاکشی، سخت جانی اور مشکل پسندی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔

یوسف خان شنواری کو نہ جانے کیسے پہلے سے خبر مل چکی تھی کہ اس کے مہمان آرہے ہیں۔ ضرور ان کے درمیان رسل و رسائل کا کوئی نامعلوم قسم طریقہ رائج تھا جس کی مدد سے وہ چیک

پوسٹ والوں نے یہ اطلاع آگے بھیج دی تھی۔

آصف علی اور یوسف خان دوست تھے۔ وہ بڑی گرمجوشی سے ملے پھر میری باری آئی۔ شنواری قبیلے کے سردار نے کئی بار مجھے خوش آمدید کہا اور پھر استقبالیہ کمیٹی کے ارکان سے ملوایا جو سب اس کے بھائی، چچا، تایا وغیرہ تھے۔ ان سب کے کندھوں پر رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ میں اور آصف علی تو دوست تھے جو ہمارے مہمان ہونے کی نشانی تھی۔ آصف علی نے مختصراً کلیم اللہ کا تعارف کرایا۔

ایک دم سب سنجیدہ ہو گئے۔ ان کی نظریں کلیم اللہ پر مرکوز ہو گئیں۔ پھر یوسف خان آگے بڑھا اور اس نے کلیم اللہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس نے کلیم اللہ سے کچھ پوچھا اور کلیم اللہ نے ہر سوال کا جواب اعتماد سے دیا۔ چند سوالات کے بعد ان کے شکوک رفع ہو گئے کیونکہ وہ سب مسکرانے لگے اور انہوں نے باری باری اسے گلے سے لگا کے چوما۔

پھر یوسف خان کی قیادت میں یہ قافلہ ایک بلند فصیل والی عمارت میں داخل ہوا۔ ہمیں ایک بہت بڑے کمرے میں ٹھہرایا گیا جس کی دیواریں انہی پہاڑوں کے پتھروں کو چن کے کھڑی کی گئی تھیں اور چھت میں درختوں کے تنے شہتیر کی جگہ استعمال ہوئے تھے۔

یہاں لوگ دو وقت کھانا کھاتے تھے۔ صبح سورج نکلنے کے بعد اور شام کو سورج غروب ہونے کے فوراً بعد لیکن ہمارے لیے کھانے کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔

یوسف خان نے کہا "قبیلے کی طرف سے رات کو دعوت ہوگی۔"

میں نے کہا "کیا یہ دعوت نہیں ہے؟"

وہ ہنسنے لگا "ہماری میزبانی کی کچھ روایات ہیں۔ تم شاید ان سے واقف نہیں۔ ابھی گھر میں جو کچھ تھا وہی رکھا ہے۔ تم صرف میرے نہیں پورے قبیلے کے مہمان ہو۔"

میں نے کہا "آصف صاحب! کیا ہم رات سے پہلے واپس پشاور نہیں جا سکتے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے، اب جانا ان کی مرضی سے ہوگا۔" آصف علی بولا۔

یوسف شنواری نے خوش دلی سے کہا "مہمان زیادہ عزیز ہو تو ہم اس کو ہمیشہ کے لیے رکھ لیتے ہیں۔"

"زبردستی؟" میں نے کہا۔

"محبت سے۔ مزار شریف بنا کے۔" وہ بولا اور قہقہہ مار کے ہنسا۔

کلیم اللہ اپنے خاندان کے بزرگوں سے متعارف ہو رہا تھا اور زنانہ حصے میں خالہ چچی پھوپی قسم کی خواتین میں متبرک بن گیا تھا۔ غالباً وہ اس سے ساری باتیں پوچھ رہی ہوں گی جن کا تعلق اس کے والدین سے تھا۔ ممکن ہے اس کی پیدائش سے پہلے کے واقعات سن رہی ہوں۔ یہاں اس کی حیثیت وہی تھی جو کبھی گاؤں میں ولایت پلٹ نوجوان کی ہوتی تھی۔

رات کو واقعی خالص پٹھانوں کی روایات کے مطابق دعوت کا اہتمام تھا۔ دنبے ذبح کر کے ان کا گوشت چاولوں کے ساتھ کھال میں بھروایا گیا اور کھال کو سی کر زمین میں دبا دیا گیا۔ پھر اوپر آگ روشن کی گئی اور نہ جانے کیسے پلاؤ کو ٹھیک وقت پر نکال لیا گیا جب چاول بھی گل چکے تھے اور گوشت بھی کچا نہیں رہا تھا۔ اس میں روغن کی جگہ دنبے کی چربی استعمال ہوئی تھی اور مسالے میں صرف نمک تھا مگر اس کا ذائقہ بہت منفرد تھا۔ شرمندگی مجھے اس وقت ہوئی جب میں اپنے میزبانوں کی خواہش کے مطابق ایک سالم دنبہ نہ کھا سکا۔ میری خوراک ان کے نقطۂ نظر سے افسوسناک حد تک کم تھی۔

"یوسف خان! ہم شہری لوگ اتنا ہی کھاتے ہیں۔ کھایا جا نہیں۔ جو نہیں کھایا وہ معاف کرو۔" میں نے کہا "کہیں ایسا تو نہیں کہ پورا دنبہ نہ کھانے میں نے تمہاری روایات کی توہین کی ہو؟"

یوسف خان نے سنجیدہ ہو کے کہا "یہ توہین نہیں تو اور کیا ہے۔ جتنا تمہارے سامنے رکھا گیا تھا وہ تو تمہیں کھانا ہی پڑے گا۔"

"ورنہ..... ورنہ کیا ہوگا؟"

"ورنہ یہ میزبان کی بے عزتی تصور کی جائے گی کہ اس کے مہمان کو کھانا پسند نہیں آیا۔ یہاں کسی کو ذلیل کرنا مقصود ہو تو مہمان ایک نوالہ کھا کے ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔" یوسف خان شنواری نے اپنی رائفل کندھے سے اتاری "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

اس کے ساتھ ہی درجن بھر رائفلیں شانوں سے ہاتھوں میں آگئیں۔

آصف علی نے مجھے ٹھوکا دیا "کھاؤ یار۔"

میں نے کہا "آصف علی! ان سے کہو مجھے بیٹے اور بدہضمی سے مرنا منظور نہیں۔ شہید کر کے مزار شریف بنائیں میرا۔"

ایک ساتھ کئی قہقہے بلند ہوئے۔ یہ ایک لطیفہ تھا۔ میرے ساتھ مذاق کیا گیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا مگر میں نے بھی اس کو کامیاب بنانے کے لیے خوف اور وحشت کی بھرپور اداکاری کی۔

یوسف خان شنواری ٹوٹی پھوٹی سے بہتر اردو بول سکتا تھا۔ اس کے مشیر بات آسانی سے سمجھ لیتے تھے مگر اردو میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنا انہیں دشوار ہوتا تھا۔ اس کے لیے وہ اپنے سردار کی طرف دیکھتے تھے جو یہاں ایک زبان داں کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی پر بھی قادر تھا۔ زبان کو صرف وسیلۂ اظہار سمجھنے والے گرامر کو بہرحال ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ ڈنر کے بعد محفل برخاست ہو جائے گی اور کوئی تصفیہ طلب معاملہ جب ہے ہی نہیں تو کلیم اللہ اپنے

www.paksociety.com

آباؤ اجداد کے جانشینوں میں پہنچ گیا۔ ہم اپنا بارِ امانت اُتار کے سبکدوش ہوئے فوراً مطلوب۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔

یوسف خان نے کھانے کے بعد مہمانوں کو قہوہ پیش کیا یعنی سبز چائے جس میں الائچی اور دار چینی کی خوشبو تھی۔ پھر کچھ نوجوان آگئے جنھوں نے سفید شلوار قمیص پر کالے مخمل کی واسکٹ پہن رکھی تھی۔ واسکٹ پر سنہرے تاروں کا اور شیشوں کا کام تھا۔ انھوں نے ہاتھوں میں بڑی آب و تاب رکھنے والی تلواریں اُٹھا رکھی تھیں جن کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اصلی ہیں یا نقلی۔ یہ سوال کرکے میں کم بنتا نہیں چاہتا تھا چنانچہ میں خاموشی سے خٹک ڈانس دیکھتا رہا جو رقص اور فن حرب کی متوازن حرکات و سکنات کا خوب صورت امتزاج تھا اور جنگجو پٹھانوں کی صدیوں پرانی تہذیب و ثقافت کی بھرپور عکاسی کرتا تھا۔ وہ صرف ایک ڈھول کی لے پر ناچ رہے تھے جس کی آواز کی گونج پہاڑوں میں سنائی دیتی تھی۔ چاروں طرف لگی ہوئی مشعلوں کی روشنی میں تلواریں بجلی کی طرح لہراتی محسوس ہوتی تھیں اور شعلوں کا عکس رقص کرنے والوں کی واسکٹ کے شیشوں میں جھلملاتا تھا۔ ان کے تیزی سے متحرک سائے سمٹتے پھیلتے تھے اور آپس میں گڈمڈ ہو جاتے تھے۔

میں رقص دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ مجھے اپنے میزبان کی عدم موجودگی کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ نہ جانے کب اپنے مشیروں کی کابینہ کے ساتھ اٹھ گیا تھا۔ میں نے اچانک دیکھا تو آصف علی کے ساتھ اس کی جگہ خالی تھی۔

"یوسف کہاں گیا؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"اندر جرگہ ہو رہا ہے قبیلے کا۔"

"اچانک کیا مسئلہ آگیا؟" میں نے کہا۔

"مسئلہ ہمارے ساتھ ہی آیا تھا۔ کلیم اللہ۔"

"اس کا کیا مسئلہ ہے؟" میں نے کہا۔

"ابھی تو مجھے بھی نہیں معلوم لیکن کوئی خاندانی مسئلہ ہے۔"

میں نے کہا "کیا اس کی چچی اسے قبول کرنے پر تیار نہیں؟ یا کوئی زمین کی ملکیت کا جھگڑا ہے؟"

"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بعد میں معلوم ہوگا۔"

"بعد میں کب؟" میں پریشان ہو گیا۔

"جب جرگہ کسی فیصلے پر پہنچ جائے گا۔" آصف علی نے مجھ سے نظر ملائے بغیر کہا "تم رقص دیکھو۔"

"اب میری کوئی دلچسپی نہیں رہی رقص میں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو۔" میں نے کہا۔

اس نے کہا "مجھے کیا ضرورت ہے تم سے کچھ چھپانے کی۔"

"کیا ہم جرگے کی کارروائی میں شریک نہیں ہو سکتے؟"

"نہیں۔ یہ خاندانی معاملہ ہے ان کا۔"

میں نے کہا "ہم بطور گواہ تو پیش ہو سکتے ہیں۔"

"جب ضرورت محسوس ہوگی گواہی کی تو ہم سے پوچھ لیں گے۔ اور اس معاملے میں ہم کیا گواہی دیں گے جس کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں۔"

میں نے کہا "کون سا معاملہ آصف علی! تم جانتے ہو تو مجھے کیوں نہیں بتا دیتے؟"

"اچھا بتا دوں گا۔ یہاں سب کے بیچ میں بیٹھ کے یہ باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہم رقص نہیں دیکھ رہے ہیں۔"

"دیکھئے وہ۔ اندر چلیں گے یا الگ کہیں جا کے مجھے بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔" میں نے کہا۔

اسی وقت رقص ختم ہو گیا اور لوگ اٹھ اٹھ کے ہم سے معانقہ کرنے لگے اور شب بخیر کہہ کر رخصت ہونے لگے۔ یہاں مہمان کو حقیقی معنوں میں اللہ کی رحمت سمجھ کے وہ عزت دی جاتی ہے کہ سر آنکھوں پر بٹھانے کا محاورہ درست نظر آنے لگتا ہے۔ ایک ایک کرکے سب چلے گئے تو ایک شخص نے ہمیں مطلع کیا کہ ہمارے سونے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ آصف علی نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اس کے سامنے کوئی بات نہ کروں۔ اس نے بعد میں بتایا کہ وہ سردار کا مخبر تھا۔

میرے اور آصف علی کے لیے ایک ہی کمرے میں دو چارپائیاں ڈال دی گئی تھیں۔ میدانی علاقے کے مقابلے میں یہاں ابھی سردی کی شدت میں کمی نہیں آئی تھی چنانچہ ہمیں اوڑھنے کے لیے کمبل فراہم کیے گئے تھے۔ ان بیش قیمت غیر ملکی ساخت کے کمبلوں کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

"ابھی تم نے کیا دیکھا ہے۔ یہاں ہر چیز امپورٹڈ ملتی ہے۔"

"کہاں سے آتی ہے؟"

"افغانستان کے راستے۔ روسی سامان براہِ راست آتا ہے۔ امریکی، برطانوی سامان ایران سے افغانستان پہنچتا ہے اور پھر یہاں سے آگے بھی جاتا ہے۔ پشاور اور لنڈی کوتل۔ یہ تجارت مخصوص راستوں پر ہوتی ہے جو انتہائی دشوار گزار ہیں لیکن سیکڑوں میل کی مسافت طے کرکے سامان لانے والوں کو بہت کم منافع ملتا ہے۔ اصل کمائی تو پشاور کے تاجر کرتے ہیں یا لنڈی کوتل والے۔"

میں نے کہا "تم نے خاموش رہنے کا اشارہ کیوں کیا تھا؟"

"وہ شخص ہماری خدمت پر مامور ہے بظاہر وہ جاہل ہے۔ اردو نہیں سمجھتا تو انگریزی کیا سمجھے گا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ شاید وہ پشاور یونیورسٹی کا گریجویٹ ہوگا۔ ایم اے پاس بھی ہو سکتا ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "اور کام یہ کر رہا ہے وہ؟"

"اس کی ظاہری حالت پر مت جاؤ۔ اس کو ملنے والا معاوضہ ڈپٹی کمشنر کی تنخواہ سے چار گنا ہوگا۔" آصف علی بولا "یہاں قبیلوں کے سردار حالات سے باخبر رہنے کے لیے اور آنے جانے والوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اس قسم کے افراد کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ گونگے بہرے بنے

رہتے ہیں مگر سب سنتے ہیں اور سردار کو بتا دیتے ہیں۔"

"تب لوگ انھیں پہچان لیتے ہوں گے تو پھر محتاط ہو جاتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"محتاط لوگ تو سب ضرور ہوتے ہیں۔ یہ انتظام صرف حریفوں اور خاندانی قبیلے کے مشکوک افراد کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے یا پھر کسی اجنبی کی آمد پر۔"

"کیا ہم مشکوک ہیں؟"

"میں تو نہیں۔ تم پہلی بار آئے ہو میرے ساتھ اس لیے تم پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ دو چار مرتبہ آؤ گے تو سب مطمئن ہو جائیں گے یا پھر تمھیں خبردار کرکے روک دیا جائے گا۔"

میں نے گھڑی دیکھی "جرگے میں ایسی کون سی پیچیدہ عدالتی کارروائی جاری ہے کیا مشکل فیصلہ درپیش ہے؟"

آصف علی نے ایک تھرماس میں سے چینی کی پیالی میں قہوہ انڈیل کے مجھے پیش کیا "قہوہ پیو" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے کہا۔

وہ اٹھ کے دروازے تک گیا اور ایک دم دروازہ کھول دیا۔ عین دروازے کے قریب کھڑا ہوا سردار کا خاص آدمی جو ہماری ہر بات سن رہا تھا ایک دم پیچھے ہٹا۔

"چینی رکھنا بھول گئے تم۔" آصف علی نے اطمینان سے کہا۔

"چینی... رکھی تھی میں نے۔" پکڑے جانے کی وجہ سے وہ بوکھلا گیا تھا اور آصف علی کی بات کا جواب بھی اس نے اردو میں دے دیا تھا حالانکہ اس سے پہلے وہ ظاہر کر چکا تھا کہ اسے پشتو کے سوا کچھ نہیں آتا۔

چینی خود آصف علی نے چھپائی تھی۔ خادم نے اندر آ کے دیکھا اور پھر سر کھجاتا ہوا چینی لینے چلا گیا۔

"مسئلہ یہ ہے" آصف علی نے کہا "کہ کلیم اللہ کا باپ اپنی منگ کو چھوڑ کے۔ منگ سمجھتے ہو؟ وہ لڑکی جس کے ساتھ اس کا خاندانی رشتہ طے تھا۔ ایک اور شخص کی منگ کو لے گیا تھا۔ ظاہر ہے وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے مگر یہاں لو میرج کا کوئی تصور نہیں۔ شادیاں بزرگ طے کرتے ہیں اور وہ قبیلے کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ انھیں چھوڑنا بدترین بدعہدی سمجھا جاتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی منگنی توڑ کے قبیلے میں رہ سکے۔ لڑکی والے اس بےعزتی کے بعد مجبور ہوتے ہیں کہ انکار کرنے والے کو مار دیں۔"

"اور انکار لڑکی کرے تو؟"

"تب بھی عموماً لڑکی والے خود ہی اس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔ طے شدہ رشتے کو ٹھکرانا عزت کو للکارنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ کلیم اللہ کے باپ کا دہرا جرم تھا۔ اس نے اپنی منگیتر کو چھوڑا اور وہ ابھی تک کنواری بیٹھی ہے۔"

"ابھی تک۔ سولہ سال بعد بھی؟"

"وہ مرتے دم تک کسی اور سے شادی نہیں کر سکتی۔ وہ جس کی ہو چکی ہو چکی۔ اب وہ مر گیا ہے تو اس کی موت کی تصدیق کے بعد ممکن ہے قبیلہ اس کو کسی اور سے شادی کی اجازت دے دے مگر سولہ سال بعد یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی نوجوان اس کو قبول کرے۔ یہ داغ تو اس پر آ گیا کہ اس کا ہونے والا شوہر اسے چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ قصور کسی کا بھی ہو وہ مسترد شدہ ہے اور اب کسی کی دوسری بیوی ہی بن سکتی ہے۔"

"کیا جرگہ یہی غور کر رہا ہے؟"

"ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ شاید خود یوسف خان شنواری اس سے عقد کرنے پر رضامند ہے۔" آصف علی نے کہا "سولہ سال تک ٹھکرائے جانے کا طعنہ سننے والی بدقسمت لڑکی آخرکار خوش قسمت ثابت ہوئی ہے۔"

"وہ لڑکی جو اب عورت ہو گی انکار کر سکتی ہے؟"

"کر سکتی ہے اگر اس سے کوئی پوچھے۔ اقرار تو اس کا باپ کرے گا۔ اور وہ بھی بے وقوف ہو گی تو اس سوچنے سے فائدہ نہیں اٹھائے گی۔ اسے خود سردار قبول کر رہا ہے اور کیا چاہیے اسے۔" آصف علی بولا "دوسرا مسئلہ ہے اس شخص کا جس کی منگیتر کو کلیم اللہ کا باپ بھگا کے لے گیا تھا۔ سولہ سال سے وہ بے غیرت ہونے کا طعنہ سن رہا تھا اور ابھی تک اس شخص کو قتل نہیں کر سکا تھا جو اس کی عزت کے منہ پر تھوک کے چلا گیا تھا۔ اگر مفرور کہیں مل جاتے تو وہ انھیں قتل کرکے اپنا انتقام لیتا اور ثبوت قبیلے کے سامنے پیش کرتا کہ اس نے اپنی بے عزتی کرنے والوں کو ختم کر دیا ہے اور بے غیرتی کے الزام سے بری ہو چکا ہے۔"

"کیا وہ بھی کنوارا بیٹھا ہے ابھی تک؟"

"نہیں۔ مرد تو دو تین کیا چار شادیاں کر سکتا ہے۔ اس نے دوسری کر لی تھی لیکن مشرقی پاکستان فرار ہو کے کلیم اللہ کے والدین سزا سے بچے رہے تھے۔ یہ اطلاع اس کے لیے باعث شرمندگی ہے کہ اس کے مجرم اس کے ہاتھوں نہ مارے گئے وہ انتقام نہ لے سکا۔"

مجھے آفریدی کی بات یاد آئی "چنانچہ اب وہ کلیم اللہ سے انتقام لے گا۔ یہی بات ہے نا؟"

"ہاں یہ قاعدہ ہے یہاں کا۔"

"اچھا قاعدہ ہے۔ ایک بچے سے انتقام لینا کون سی مردانگی ہے جس کا قصور کوئی نہیں۔"

"یہ تمھارا نقطۂ نظر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ گناہ کی پیداوار ہے۔ برائی سے اچھائی جنم نہیں لے سکتی۔ زہر ملنے سے تریاق پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے ان کا فلسفہ۔ تمھارا اس سے اتفاق کرنا ضروری نہیں۔ اب یہ غور ہو رہا ہو گا کہ کلیم اللہ ابھی تو بچہ ہے کل وہ باپ کے جرم کی سزا کیسے کاٹے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ قبیلہ سفارش کرے اور انتقام لینے و

www.paksociety.com

انتہا پسند نہ ہو تو کہ کے اللہ کے نام پر معاف کیا۔ ذیکن ... کچھ کفارہ ادا کرے۔ جب وہ شادی کے قابل ہو جائے تو اس عورت کے خاندان میں کسی ایسی لڑکی سے شادی کرے جس کو کسی نے مسترد کیا ہو یا قبیلے کی کسی بھی عورت سے۔ ایک بات اور بتاؤں۔ اگر سردار یوسف خان شنواری نے عقد ثانی کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو عین ممکن تھا بلکہ یقینی تھا کہ کلیم اللہ کو اس عورت سے شادی کرنی پڑتی جس کو اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔"

میں بھونچکا رہ گیا "اس عورت سے! اس کی تو بہت عمر ہوگی۔"

"عمر سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارے مذہب میں زیادہ عمر کی عورت سے شادی جائز ہے بلکہ سنت ہے۔ یہ ابھی چودہ سال کا ہے' وہ ہوگی تیس بتیس کی۔ یہ اٹھارہ کا ہوگا تو وہ ہوگی چھتیس کی۔ ابھی تو یہ عمر دُگنی نظر آتی ہے مگر بعد میں فرق اتنا نہیں رہتا۔ جب وہ ساٹھ سال کا ہوگا تو..."

مجھے اس وکیل نے ذہنی طور پر قائل نہیں کیا تھا مگر بات اس لیے لاحاصل رہ گئی کہ ملازم چائے لے آیا تھا۔ آصف علی نے قہوہ پیا اور کمبل لپیٹ کر سو گیا۔ میں بہت دیر تک جاگتا رہا اور اس معاشرے کے عدل و انصاف کے قوانین پر غور کرتا رہا۔ میرا ذہن مختلف ماحول کا پروردہ تھا اور مجھے یہ سب بہت عجیب لگ رہا تھا لیکن اس میں کوئی بات غیر فطری اور غیر منطقی نہیں تھی۔ ہر معاشرہ بیرونی دنیا کی اقدار سے الگ اپنی قدروں پر قائم رہے تو اسے غلط نہیں سمجھا جا سکتا۔

رات کی خاموشی کو اچانک فائرنگ کی آوازوں نے منتشر کر دیا۔ میں گھبرا کے اُٹھ بیٹھا۔ آصف علی کی آنکھ بھی کھل گئی۔

میں نے کہا "یہ کیا ہوا۔ قبیلوں میں جنگ چھڑ گئی آدھی رات کو؟"

آصف مسکرایا "یہاں خوشی کا اظہار بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔"

"گولیاں چلا کے؟ لاحول ولا قوۃ۔"

"اس میں لاحول پڑھنے کی کون سی بات ہے۔ تم خوشی کے موقعے پر بھی روتے ہو اور غم میں بھی روتے ہو۔" آصف علی بولا اور دروازے تک گیا مگر باہر کوئی نہیں تھا جو کچھ بتا سکتا۔

"تمہارا کیا اندازہ ہے' کون خوشی منا رہا تھا؟" میں نے فائرنگ کا شور تھم جانے کے بعد پوچھا۔

"خوشی سردار بھی منا سکتا ہے عقد ثانی کے اعلان پر۔ کیا معلوم نکاح ہو گیا ہو۔" آصف علی بولا "پھر ہمیں کل دوپہر تک رکنا پڑے گا۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"سب ممکن ہے کبیر خان۔ یہاں انگریز کا حکم نہیں چلا تھا تو تمہاری کون سنے گا۔ ابھی سو جاؤ آرام سے' صبح معلوم ہو جائے گا سب۔"

وہ پھر سو گیا مگر میں کافی دیر بستر میں کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ کچھ ضرورت سے زیادہ کھانے کا نتیجہ بھی تھا۔ مجھے میزبانوں نے بڑی محبت سے اور بہت اصرار کے ساتھ کوٹ کوٹ کے اوپر تک بھرا تھا۔ مجھے خطرہ ناحق ہونے لگا تھا کہ کہیں میری شرافت میں کمی کوئی بات بگڑ نہ جائے اور میں واقعی پیٹ سے ہی بدہضمی سے ہلاک ہو جاؤں۔ یہاں نہ حکیم نہ ڈاکٹر۔

لیکن رات خیریت گزر گئی اور صبح آنکھ کھلتے ہی مجھے آصف علی نے مسکرا کے مبارکباد دی "جرگے نے فیصلہ کر دیا۔"

"کیا فیصلہ ہوا؟" میں نے کہا۔

"کلیم اللہ اب اس عورت سے شادی کرے گا۔ لڑکی کے خاندان والوں کا یہی مطالبہ تھا۔ صرف اسی شرط پر اسے معاف بھی کیا جا سکتا تھا۔"

"اس سے تو سردار شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"ہاں' مگر خاندان والوں کی مرضی بھی تو ضروری تھی۔ بے عزتی انہی کی ہوئی تھی سولہ سال پہلے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ آج سردار سے عقد ثانی اس بے عزتی کا بدلہ نہیں۔ یہ کفارہ تو کلیم اللہ ادا کرے گا۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "اور کلیم اللہ نے مان لیا؟"

"اس کے نہ ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رات اس کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ سردار خود گواہ بنا اور وہ شخص جس کی منگیتر کو کلیم اللہ کا باپ لے گیا تھا۔ آج شام ولیمہ ہے۔ کلیم اللہ کی پھوپی کی طرف سے دعوت کا انتظام ہے۔ کلیم اللہ اپنے باپ کی جگہ لے گا خاندان میں۔"

میرا افسوس یا احتجاج کرنا بے سود تھا۔ اس فیصلے کے خلاف کہیں اپیل نہ تھی اور خود کلیم اللہ اس فیصلے سے بہت مطمئن اور مسرور تھا۔ وہ مجھے دن میں ملا تو اس نے یہی کہا کہ اپنے باپ کا قرض اتارنا میرا فرض تھا اور اس طرح دو خاندانوں کی دشمنی بھی ختم ہو گئی ہے۔

میں نے کہا "پھر شادی مبارک ہو۔ رخصتی کب ہوگی؟"

"جب وقت آئے گا۔" اس نے متانت سے جواب دیا۔

میں نے طنز سے کہا "کبھی تم اپنی بیوی کے ساتھ۔ اب تو آصف علی صاحب کی معرفت رابطہ ممکن ہے۔"

"ہاں۔ مگر ہمارا گھروں کا عورت صرف ملنے کی غرض سے غیروں کے گھر میں نہیں جاتا۔" اس نے کسی بالغ شخص کی طرح کہا۔

میں نے سوچا' اسے کہوں کہ اب ہم غیر ہو گئے ہیں مگر پھر میں نے غور کیا تو مجھے اس کی بات غلط نہیں لگی۔ ہمارے اور اس کے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں تھا جس کی بنیاد پر ہم کوئی توقع رکھتے۔ محرم اور نامحرم کا فرق بہت واضح ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اسے بھول جاتے ہیں۔ جیسے ہم بیشتر احکام دین کی پیروی بھولتے جا رہے ہیں۔

میں نے کہا "تمہاری بیوی کا جل بہت خوش ہوگی یہ جان کر کہ تم واپس پہنچتے ہی اپنا گھر بھی بسا لیا۔"

"اللہ اس کا گھر بھی بسائے گا۔" وہ بولا۔

اس نئی شخصیت میں عجیب انقلاب رونما ہو چکا تھا۔ وہ اچانک بالغ ہو گیا تھا۔ اس کے قبیلے اور خاندان کی ساری روایات کا امین اور پاسبان بن گیا تھا۔ یہ صدیوں پرانا رشتہ تھا جو اس کے باپ کی ایک غلطی کے باعث صرف سولہ سال منقطع رہا تھا۔ اب وہ مطمئن تھا کہ اس نے کفارہ ادا نہیں کیا' وہ اپنی نسلی تہذیب کے دھارے میں پھر شامل ہو گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ خوش تھا مگر ناخوش نہیں تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ وہ بچہ ہے اور نہیں جانتا کہ اس کا یہ فیصلہ کل خود اس کی زندگی پر خوشگوار اثرات مرتب کرے گا یا ناخوشگوار۔ کچھ یہ احساس بھی تھا کہ ہم یہاں اسے خاندان والوں کے حوالے کرنے کے لیے لائے تھے' کسی عہد رفتہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے نہیں۔ اور یہ بھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ شادی خانہ آبادی نہیں بلکہ اس کے والدین کے اعمال کی سزا ہے جو اس نے ایک فرض شناس اور فرمانبردار بیٹے کی حیثیت سے اپنا فرض سمجھ کے قبول کر لی ہے۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کاجل کو میرے ساتھ آنے کی اجازت نہیں ملی ورنہ وہ جذباتی عورت نہ جانے کیا کر گزرتی۔ بنگال کا ماحول زیادہ ہی آزادانہ اختلاط کی اجازت دیتا تھا اور وہاں اس کے بچے گھر کا ماحول بہت مختلف تھا۔ تعلیم اور ذہنی تربیت کے باعث وہ اپنی سوچ کو کلیم اللہ کی سوچ سے ہم آہنگ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ متاثر ہوتی اور شاید دُکھی بھی۔

چونکہ رخصتی نہیں ہوئی تھی اس لیے ولیمہ بھی نہیں ہوا مگر اس رات شادی کی دعوت ہوئی جس میں ایک پرانا' خاندانی تنازعہ ختم ہونے اور نئے رشتے استوار ہونے پر بہت خوشی منائی گئی۔ اس وقت میرا ذہن اس عورت کے بارے میں سوچتا رہا جو کسی گھر میں دلہن بنی بیٹھی تھی' جس نے دلہن بننے کے لیے بہت انتظار کیا تھا' بہت اذیت اور ذلت برداشت کی تھی۔ جب اسے کلیم اللہ کے باپ کے لیے مانگا گیا ہوگا تو اس نے ایک صورت کو دل میں بسا لیا ہوگا اور اسی دن سے خواب میں خود کو دلہن دیکھنے لگی ہوگی۔ پھر وہ خواب ٹوٹ گیا اور سولہ سال وہ ٹھکرائی ہوئی عورت کے طعنے کی ذلت برداشت کرتی رہی۔ تقدیر کیسی ستم ظریف ہے کہ سولہ سال بعد وہ دلہن بنی بھی تو کس کی۔ اس کے بیٹے کی جو اسے ذلت کے گڑھے میں دھکیل کر پرائی عورت کو اس پر ترجیح دے کر بھاگ گیا تھا۔ کیا وہ خوش ہوگی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اسے سولہ سال پرانی اصل خوشی جذبات کے انہی شوخ رنگوں کے ساتھ ملی ہو جو اس عمر میں سانسوں کو مہکاتے تھے؟ نہیں' وہ عمر گزر گئی۔ جذبات کا آتش کدہ ٹھنڈا ہوا۔ اب یہ شادی کہاں' ایک بندھن ہے زندگی کی آخری آخری سانس تک کھینچتے رہنے کے لیے۔

خرید یے خوش عمل نے والی بہترین کتابیں

HOW TO WRITE A LETTER
خطوط نویسی کے لیے قیمت

HOW TO WRITE AN ESSAY
مضمون نگاری کے لیے قیمت

HOW TO WRITE AN EXPLANATION
وضاحت و تشریح کے لیے قیمت

صحیح ہجے لکھنے کے لیے قیمت

ادراک و فہم کا اظہار کرنے کے لیے قیمت

پری پوزیشن کے صحیح استعمال کے لیے قیمت

HOW TO PUNCTUATE
رموز اوقاف جاننے کے لیے قیمت

10 DAYS TO TRANSLATION
اُردو سے انگلش میں ترجمہ کرنے کے لیے قیمت

پاکستانی روپے ○ بیرون ملک کتابیں منگوانے کے لیے رقم بذریعہ ڈرافٹ روانہ کریں۔ ڈرافٹ پر نام اس طرح لکھوائیں۔

MAKTABA NAFSIAT A/C ... H. B. L.
MANSFIELD STR. BR. KARACHI

ڈاک خرچ حاصل کرنے کے لیے:

34- RAMZAN CHAMBERS, Near Daily "JONG"
I.I. CHUNDRIGAR ROAD, KARACHI-74200
PH: 2628517 FAX: 2627960

مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس کراچی

www.paksociety.com

اس رات کی دعوت کے لیے رکنا آصف علی کی مجبوری تھا جس کو نبھانا میرا بھی فرض بن گیا ورنہ اب میرے لیے وہاں بیٹھنا کافی دشوار ہو رہا تھا۔ مجھے رابعہ اور کاجل کی فکر تھی کہ نہ جانے وہ کیا سمجھ رہی ہوں گی اور کیا سوچ رہی ہوں گی۔ مجھے ان کی سلامتی اور تحفظ کے خیال سے بھی پریشانی تھی اور آفریدی کے قتل کے بعد ریسٹ ہاؤس کے دھماکوں نے میرے ذہن میں اس احساس کو پختہ تر کر دیا تھا کہ شکاری مسلسل تعاقب میں ہیں اور ہم واقعی آہوئے صیاد دیدہ ہیں۔ خوف سے مسلسل پناہوں کی تلاش میں سرگرداں۔ آخر ایسے ہم کب تک بھاگتے رہیں گے۔ ہمیں آخر کار جنگ کا یہی فلسفہ اپنانا ہو گا کہ جارحیت ہی سب سے بہتر دفاع ہے۔

علی الصبح ہمیں میزبانوں نے واپسی کی اجازت دینا منظور کیا۔ وہ سب ہمارے شکر گزار تھے کہ ہم ان کی امانت کو اتنی حفاظت کے ساتھ پہنچانے آئے تھے۔ دو خاندانوں کے ملاپ اور عداوتوں کی آگ کو بجھا کے امن کا وسیلہ بنے۔ ہمیں رخصت کرنے کے لیے دونوں طرف کے خاندان کے تمام سرکردہ افراد موجود تھے اور خود کلیم اللہ ایک معزز رشتے دار فرد کی طرح سب سے آگے تھا۔

واپسی کا سفر مجھے بہت طویل لگا۔ دوپہر سے پہلے ہم پشاور میں تھے۔

"ہم سیدھے ناصر پور چلتے ہیں۔" آصف علی نے کہا۔

میں نے کہا "پہلے اس نیوز ایجنٹ سے ملیں گے۔ وہ پرسوں شام سے اخبار لیے بیٹھا ہو گا۔"

"ٹھیک یاد دلایا تم نے۔" آصف علی بولا اور اپنی گاڑی کو صدر کی جانب موڑ دیا "مگر آج تو چھٹی ہے اتوار کی۔ بازار بند ہو گا۔"

"تب تو اس کی دکان بھی بند ہو گی۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ کیوں نہیں۔ دراصل مجھے خیال آیا تھا اپنی دکان کا۔ دو دن سے کوئی خبر نہیں لی تھی مگر آج تو بند ہو گی۔"

"یہ لڑکا عامر کہاں رہتا ہے؟"

"کہاں رہتا ہے؟ میرے ساتھ اور کہاں۔" آصف علی بولا "اس کا اپنا کوئی گھر ہے نہ رشتے دار۔"

نیوز ایجنٹ کی دکان تو بند تھی مگر وہ خود باہر اخبارات اور رسائل کے ساتھ موجود تھا "آپ کدھر غائب ہو گئے تھے جناب؟ ہم نے تو اسی دن اخبار بیچ ڈالا تھا۔"

"میں ایک ضروری کام سے گیا ہوا تھا۔" آصف علی نے کہا "اخبار کہاں ہے؟"

"وہ تو گھر بھیج دیا تھا ہم نے۔ اسی روز رات کو۔"

"اچھا۔ پھر ہم دیکھ لیں گے۔" آصف علی نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

میں نے کہا "ہم پہلے گھر جائیں گے۔"

"اخبار اتنا ضروری ہے؟" آصف علی بولا۔

"ہاں لیتے ہوئے نکل جائیں گے۔ کیا پتا وہ سب بھی ناصر پور سے لوٹ آئی ہوں۔" میں نے کہا "دو دن نہ رکی ہوں وہاں۔"

آصف علی نے نفی میں سر ہلایا "میں کہہ گیا تھا کہ جب تک میں نہ کہوں واپس نہیں آنا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم سیدھے آگے چلے جائیں۔"

"آپ نے بتا دیا تھا؟"

"ہاں۔ ایسے کسی اطلاع کے بغیر چلے جاتے تو ابھی برا دھرنا شروع ہو جاتا۔" آصف علی بولا۔

"کیا آپ کو اندازہ تھا پہلے سے کہ کاجل اور رابعہ ہمارے ساتھ نہیں جاسکیں گی؟"

"وہ تو معلوم تھا۔" آصف علی نے کہا "کاجل کے سامنے میں صاف کہتا تو وہ سمجھتی کہ ہم نے جانا نہیں چاہتے۔"

"اس کا نہ جانا ہی بہتر تھا۔" میں نے کہا "کلیم اللہ اپنوں میں پہنچ کے بالکل بدل گیا۔ مجھے غیر کہہ رہا تھا۔ کاجل کو زیادہ صدمہ ہو تا۔ وہ اس پر بہت احساس تفاخر کرتی تھی۔"

"یہ عارضی رشتے عارضی ہی ہوتے ہیں کبیر خان۔ خون کے رشتے کا بدل نہیں ہو سکتے۔" آصف علی نے کہا "عامر کو ہی دیکھ لو۔"

"یہ غرض کے رشتے ہیں۔ بے غرض رشتوں کی مضبوطی خلوص اور اپنائیت دیکھنی ہو تو ہمارے ساتھ رہ کے دیکھو۔ یہ خون کے رشتے تمہیں بے وقعت محسوس ہوں گے۔ یہ حسن اتفاق ہے یا قدرت کا حسن انتظام کہ اس نے سب اکیلے رہ جانے والوں کو ایک دوسرے سے ملوا دیا اور وہ سب ایک خاندان بن گئے۔ محسن کے والدین کا انتقال ہو چکا۔ ایک بہن تھی' وہ شادی ہو کے گئی تو پھر نہ آئی۔ میرے بارے میں آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ رابعہ کی صرف ماں تھی۔ وہ اس لیے ہاری گئی کہ رابعہ میری مدد کر رہی تھی اور میرا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ غالب کا بھی یہی حال ہے۔ ہاں اکرام شیخ اور نازو سگے بہن بھائی ہیں۔ کاجل اور گل بانو کی کہانی آپ سن چکے ہیں۔ ان کا بھی دنیا میں کوئی نہیں مگر ہم سب ایک دوسرے کے ہو گئے ہیں اور حالات کی سخت آزمائش سے گزرنے کے بعد ان رشتوں میں وہی مضبوطی آگئی ہے جو تجربے کی بھٹی میں تپ کے ملتی ہے۔"

"خدا کرے تم ایسے ہی رہو۔ ان رشتوں کے احترام کو بھی کسی کی نظر نہ لگے۔" آصف علی نے کہا اور گاڑی کو اپنی کوٹھی کے مین گیٹ پر روک کے ہارن دیا۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا تو آصف علی نے اسے قریب بلایا "پرسوں رات کو کوئی آیا تھا اخبار دینے کے لیے؟"

"آیا تھا جناب۔ میں نے اندر پہنچا دیا تھا۔"

"اندر کون تھا؟ اچھا جا کے وہ اخبار لاؤ۔ جسے بھی دیا تھا اس کو معلوم ہو گا کہ کہاں رکھا ہے۔"

میں نے کہا "یہاں بیٹھ کے انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ ہم خود اندر چلیں۔ ہاتھ منہ بھی دھولیں اور کپڑے بھی بدل لیں۔ پرسوں سے کیا کیا کیسے رکھے بیٹھا ہے۔"

"ہاں۔ گئے تو ہم ایک رات کے لیے تھے۔ یہ کسے معلوم تھا کہ دو راتیں گزارنی پڑ جائیں گی۔" وہ اتر کے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔

چوکیدار ابھی اندر اخبار تلاش کر ہی رہا تھا کہ ہم بھی پہنچ گئے "کیا بات ہے؟ ابھی تک تمہیں اخبار نہیں ملا۔"

"وہ جناب' عامر صاحب نے لیا تھا۔" چوکیدار نے کہا۔

"تو کہاں ہے عامر؟ بلاؤ اسے۔"

"وہ تو نہیں ہیں جناب۔" چوکیدار نے کہا۔

"کہاں گئے ہیں؟ دکان تو بند ہے آج۔" آصف علی نے کہا۔

"کل سب کے ساتھ گئے تھے جناب۔" چوکیدار بولا۔

آصف علی نے حیرانی سے کہا "کون سب؟"

"بیگم صاحب' چھوٹی بی بی اور آپ کے مہمان۔"

"وہ لوٹ آئے تھے ناصر پور سے۔ کیوں؟ میں نے تو منع کیا تھا کہ جب تک میں نہ آؤں' وہیں رہنا ہے۔"

"ہم کو نہیں معلوم جناب۔" چوکیدار نے کہا۔

"اچھا تم جاؤ۔" آصف علی نے کہا "میں پوچھ لیتا ہوں۔ ذرا کچن میں بولو کہ چائے لے کر آئے۔ فوراً۔"

میں نے کہا "وہ واپس آ گئے اور پھر عامر کے ساتھ کہیں چلے گئے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

آصف علی نے ایک فون نمبر ملایا "ابھی سمجھ میں آ جائے گی۔ ہاں ہیلو۔ کون۔ ہاں میں آصف بول رہا ہوں۔ یار' یہ تم نے بھائی کو کس نے بھیجا تھا۔ ہاں' دو مہمان خواتین کے ساتھ۔ انہوں نے کہا تھا واپس رہنا تھا کچھ ایسا ہی مسئلہ۔ میں گیا تھا غیر علاقے کی طرف اور بچے نہ گئے تھے۔ بعد میں بتاؤں گا۔ کیا۔ اسی دن' کس کے ساتھ۔ عامر کے ساتھ۔ کیوں؟ میرا مطلب ہے عامر کیوں پہنچ گیا ان کو واپس لانے کے لیے۔ نہیں۔ میں نے بتایا تاکہ ان کو میں نے سختی سے تاکید کی تھی۔ میں نے۔ یار میں ابھی ابھی واپس پہنچا ہوں۔ ابھی گھر میں قدم رکھا ہے۔ میں کیسے بتا سکتا تھا انہیں۔ غیر علاقے سے فون تو کر نہیں سکتا تھا۔ تمہیں یقین ہے عامر نے یہی کہا تھا۔ اچھا اچھا میں آتا ہوں۔ بس ابھی ایک گھنٹے میں۔"

اس نے ساتھ ہی بے یقینی' برہمی اور پریشانی کے جذبات کا کرب میں اندازہ کر سکتا تھا اور اس کی یک طرفہ گفتگو سے میں نے پوری بات سمجھ لی تھی۔

"عامر نے کوئی گڑ بڑ کی ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "وہ ایسا کر تو نہیں سکتا۔"

"اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے ایک کم ظرف اور کم ہمت آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔" میں نے کہا "اس کا اچھا تو نہ تھے مجھے۔"

وہ کچھ نہیں بولا اور کچھ سوچتا رہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا۔ اس کی اتنی ہمت نہیں ہو سکتی۔ خیر۔ چلتے ہیں پہلے ناصر پور۔"

"ناصر پور جا کے کیا معلوم ہو گا۔ وہی جو ابھی ٹیلی فون پر آپ معلوم کر چکے ہیں۔ اور جو ہو گیا ہے تو پوچھ لیں۔" میں نے کہا "ورنہ اپنے نوکروں سے پتا کریں۔"

آصف علی نے پھر چوکیدار کو بلایا "عامر کب گیا تھا؟ صحیح وقت بتاؤ۔"

"آٹھ بجے رات کو وہ دکان بند کر کے لوٹے تو تھیلی ان کے ساتھ تھی۔"

"کیا تھیلی دکان پر بیٹھی تھی؟" آصف علی نے بگڑ کر کہا۔

"نہیں۔ میں کیا بتاؤں جناب۔ میں نے جو دیکھا وہی بتا رہا ہوں۔ اسی وقت دکان سے لوٹے تھے عامر صاحب۔ باقی سب بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ اور میں نے کچھ نہیں پوچھا کسی سے۔ میرا کام بھی نہیں تھا۔"

"اور وہ یہاں سے کب گئے؟"

"تقریباً آدھے گھنٹے بعد۔ ہاں کل شام کوئی آپ سے ملنے آیا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ نہیں ہیں تو انہوں نے بیگم صاحب کو پوچھا۔ میں نے کہا کہ وہ ناصر پور گئی ہیں۔"

"تم نے بتایا انہیں۔ کون تھا وہ؟"

"یہ میں نہیں جانتا جناب۔ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ لال رنگ کی گاڑی میں آئے تھے ایک شوفر کے ساتھ۔"

"احمق کہیں کے۔ کس نے کہا تھا تم سے کہ ہمارے گھر والوں کے بارے میں بتاؤ کہ کون کہاں گیا ہوا ہے۔" آصف علی نے چلا کے کہا "اور وہ بھی ایک اجنبی کو جسے تم صورت سے نہیں پہچان سکتے۔ کیا اتنا کہنا کافی نہیں تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

"وہ جناب! انہوں نے عامر صاحب کو پوچھا۔ میں نے کہا کہ آتے ہی ہوں گے۔ سب کو جانتے تھے وہ جناب تو میں نے سمجھا کہ ملنے والے ہی ہوں گے۔" چوکیدار نے وضاحت کی "یہ بھی تو پہلی بار آئے تھے..."

"بکواس۔" آصف علی نے دہاڑ کے کہا "پھر کیا تم نے انہیں گھر میں بٹھا لیا تھا؟"

"جی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم انتظار کریں گے۔ پھر میں نے ڈرائنگ روم کھلوا دیا۔ ان کی گاڑی پورچ میں کھڑی تھی۔ عامر صاحب کو میں نے بتا دیا تھا اور اخبار بھی دے دیا تھا۔"

اب تفتیش میں نے اپنے ہاتھ میں لے لی "کتنی دیر بیٹھے رہے تھے وہ لوگ؟ کچھ یاد ہے۔"

"شاید آدھا گھنٹا۔"

"اور کیا وہ ساتھ ہی گئے تھے؟" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"نہیں۔ آگے پیچھے نکلی تھیں گاڑیاں۔"

"آگے کون سی گاڑی تھی؟" میں نے کہا "مہمانوں کی یا اپنی۔"

"اپنی جناب۔ عامر صاحب چلا رہے تھے۔"

میں نے کہا "چوکیدار، ان سے تمہاری پانچ منٹ تو بات ضرور ہوئی ہوگی۔ تم نے پانچ منٹ میں کیا دیکھا؟ ان صاحب کا چہرہ کیسا تھا؟ بال کیسے تھے؟ کپڑے کیسے تھے کچھ یاد ہے؟"

چوکیدار نے ذہن پر زور دیا "تھوڑا تھوڑا یاد ہے جناب۔"

اس نے جو حلیہ بتایا وہ میرے ذہن میں پہلے سے موجود کسی بھی تصویر سے نہیں ملتا تھا یا پھر سب سے ملتا تھا۔ جب دوسرا نوکر چائے لے کر آیا تو میں نے اس سے بھی یہی سوال کیا کیونکہ اس نے آدھے گھنٹے میں چائے پیش کی تھی۔ وہ دونوں کنفیوژن کا شکار تھے اور ان کے بیان کا فرق مزید کنفیوژن پیدا کرتا تھا۔

"وہ عامر صاحب کے انتظار میں تھے۔ ان کی آپس میں کیا باتیں ہو رہی تھیں؟" میں نے کہا۔

"پتا نہیں جی۔" ملازم بولا "جب میں آیا تو وہ چپ تھے۔"

"اچھا۔ ان کی خاموشی میں تم نے کوئی خاص بات نوٹ کی۔"

"خاص بات۔۔۔"

"ہاں۔ ایک تو آدمی کوئی پرائیویٹ بات کر رہا ہوتا ہے اور تیسرا شخص کمرے میں آ جائے تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ یا ایک مجبوری کی خاموشی ہوتی ہے۔ جیسے کوئی بزرگ آ کے بیٹھ جائے نوجوانوں میں تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ یا کشیدگی ہوتی ہے اس کا سبب۔ کشیدگی سمجھتے ہو؟ نفرت اس کا سبب ہوتی ہے بعض اوقات۔ یا کوئی ناپسند کرتا ہو کسی کو مگر اس کے پاس بیٹھنا پڑے۔ وہ بات بھی نہ کرنا چاہے۔۔۔۔"

"یہ سب میں نے نہیں دیکھا تھا جناب۔ میں تو چائے رکھ کے چلا گیا تھا۔ اس وقت مہمان وہ اخبار دیکھ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے کو کچھ بتایا تھا۔"

"کون سا اخبار۔ جو چوکیدار دے کر گیا تھا؟"

"ہاں جی وہی۔ مجھے دیا تھا اس نے اور میں نے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا تھا کہ صاحب آئیں تو دیکھ لیں۔"

میں نے کہا "اچھا۔ ایسی کیا بات تھی اخبار میں؟ وہ پرانا اخبار تھا۔"

لیکن میری تمام تفتیش بے نتیجہ رہی۔ ایک خیال پہلے سے میرے ذہن میں تھا کہ عامر نے کمینگی کا ثبوت دیتے ہوئے اور کسی خطرے کو محسوس کرتے ہوئے مجھ سے اپنی تذلیل کا بدلہ لیا ہو۔ وہ رابعہ اور کاجل کو کہیں بھی لے جا سکتا تھا مگر آصف علی کی بات سمجھ میں آتی تھی کہ وہ اغوا جیسی واردات کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ وہ عادی مجرم نہیں تھا کہ اتنا بڑا قدم اٹھا سکے۔ اس کا پکڑا جانا یقینی تھا اور اس حماقت کا انجام یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سات سال کے لیے جیل جانا پڑے۔ ابھی جائداد سے محرومی کا اندیشہ بھی بے بنیاد تھا کیونکہ اسے آصف علی کے منصوبوں میں کسی تبدیلی کی مصدقہ اطلاع نہیں ملی تھی۔

تاہم میرے اندیشوں میں خوف کا نیا پہلو بہت سے امکانات کی نشاندہی کرنے لگا تھا اور ان میں سب سے قوی امکان یہ لگتا تھا کہ عامر کہیں چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے مقاصد کی تکمیل کا آلۂ کار تو نہیں بن گیا۔ ایک طرف پیشہ ور اور کھاگ شکاری تھے تو دوسری طرف ایک ناپختہ شعور کا مالک احساسِ محرومی کا مارا ہوا۔ لالچ اور ہوس کا اسیر نوجوان تھا جو انتقام کی آگ میں بے بسی سے جل رہا تھا۔ کوئی بھی اس کے جذبات سے کھیلنے کے لیے اسے خرید سکتا تھا۔ اسے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا گر سمجھا سکتا تھا کہ یہ لو دو لاکھ یا پانچ لاکھ۔ کسی طرح مہمانوں کو اپنے ساتھ باہر لے جاؤ۔ تھوڑی دیر کے لیے کہیں بھی لے جاؤ۔ سیر کرانے کے بہانے یا کھانا کھلانے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ کون ہیں۔ دور سے دیکھ لیں گے۔ اور اگر اس احمق لڑکے نے جال کو نہیں دیکھا ہوگا تو لالچ اور حسد سے شکار ہو کے خود بھی مارا گیا ہوگا۔ باہر نکلنے کے بعد اسے اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ سب جھوٹ تھا۔ دور رہنے کا وعدہ کرنے والے بہت قریب آ کے انہیں گن پوائنٹ پر کہیں لے گئے ہوں گے۔ دلاور جیسے لوگوں کے لیے پانچ لاکھ کی کوئی اہمیت نہیں مگر وہ بھی انہیں واپس مل گئے ہوں گے اور انہوں نے آسانی سے عامر کو کہیں بند کر دیا ہوگا یا اس کی گواہی کے خطرے کا سدباب کرنے کے لیے اس کو وہاں بھیج دیا ہوگا جہاں سے کوئی بھی دنیا کی کسی عدالت میں گواہی دینے کے لیے نہیں آ سکتا۔

میرا دل کہتا تھا کہ رابعہ اور کاجل کو اغوا کیا گیا ہے لیکن ان کو اغوا کرنے والوں نے عامر کو آلۂ کار بنایا اور اسے دھمکی سے یا دولت سے مجبور کر دیا کہ وہ ان کے مقاصد کی تکمیل میں آسانی پیدا کر دے۔ وہ نہ مانتا تب بھی وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کے نہ جاتے۔ وہ عامر کو خاموش کرنے کے لیے اس کے سر پر بندوق کا بٹ مار کے بھی کام چلا سکتے تھے اور وہ اسے گولی بھی مار سکتے تھے۔ ملازم اور چوکیدار مل کے بھی ان کا راستہ نہیں روک سکتے تھے مگر انہوں نے خون خرابے اور شور ہنگامے سے گریز کیا۔ یہ کام خاموشی سے ہو جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو تو بہتر۔ گڑ سے مرنے والے کو زہر کیوں دیا جائے۔ خانم اور اس کی بیٹی تو محض ساتھ ہونے کی وجہ سے ساتھ گئے۔ نہ کوئی ان کا دشمن تھا اور نہ آصف علی کا۔

میں یہ بات آصف علی کو بتاتے ہوئے ڈرتا تھا حالانکہ اس اندیشے کا اظہار میں پہلے بھی کر چکا تھا۔ ہماری مدد کرنے کے جرم میں آفریدی مارا گیا تھا اور وہ بھی مصیبت میں پڑ سکتے تھے۔ اگر خود آصف علی یہ بات سمجھتا تھا تو اس نے بھی مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ بے شک ان حالات کے ذمے دار ہم تھے لیکن ہم خود چل کے اس کے پاس نہیں آئے تھے اور نہ ہم نے اس سے مدد کی درخواست کی تھی۔ وہ خود بہت اصرار کے ساتھ ہمیں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اتنی جلدی وہ اپنا رویہ بدل لیتا۔ دو دن پہلے وہ میرا اتنا احسان مند تھا کہ اس کے پاس تشکر کے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ میں نے اسے معاف کر دیا تھا۔ اسے وہی عزت دی تھی جو میں اپنے والد کے کسی ساتھی کو دیتا اور میں نے اس کی زندگی کے سب سے بڑے دکھ کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔

"اب کیا کرنا ہے کبیر میاں؟" اس نے ادھر ادھر فون کرنے کے بعد ریسیور رکھتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

"میری خود سمجھ میں نہیں آتا۔ پولیس کو رپورٹ تو لکھوا دیں۔"

"کیا لکھوائیں رپورٹ میں؟ کیا بتائیں کہ ہمیں کس پر شک ہے اور کسی پر شک نہیں ہے تو ہم نے کیوں فرض کر لیا ہے کہ وہ غائب ہو گئے ہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں گئے ہوں۔ ایمرجنسی میں۔"

"وہ پیغام چھوڑ کے جا سکتے تھے۔"

"کس کے لیے؟ ہم تو یہاں تھے نہیں مگر تم نے ٹھیک کہا۔ وہ چوکیدار کو یا ملازم کو بتا سکتے تھے مگر درمیان میں ایک رات ہی تو گزری ہے۔ پولیس کہے گی کہ رات کو آپ خود کہاں تھے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ گئے ہوں تھوڑی دیر کے لیے اور ان کا ارادہ باہر رکنے کا نہ ہو مگر مجبوراً انہیں رکنا پڑا ہو۔"

"وہ فون کر سکتے تھے۔"

"ہاں مگر دونوں طرف کے امکانات کو ذہن میں رکھو۔ انہیں فون کرنا یاد نہیں رہا یا اس کا موقع نہیں ملا۔ وہاں فون تھا ہی نہیں یا خراب تھا۔ کہیں ان کی گاڑی خراب نہ ہو گئی ہو واپسی میں۔ اور بہرحال حادثے کے امکانات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ پولیس بھی کہے گی کہ اغوا یا گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے میں آپ عجلت سے کام لے رہے ہیں۔"

"پھر کیوں نہ ہم اسپتالوں سے معلوم کر لیں۔"

آصف علی نے بے دلی سے کہا "کر لو لیکن حادثہ پیش آتا تو اطلاع مل جاتی ہمیں۔ یہ فرض کرنا تو محال ہے کہ حادثے میں سب اللہ کو پیارے ہو گئے یا شدید زخمی ہو کے کسی اسپتال میں بے ہوش پڑے ہیں۔"

خدا نہ کرے ایسا ہو مگر اسپتال اور پولیس اسٹیشن کے سوا ہم کہاں سے آغاز کریں؟"

"گاڑی میں شناخت کے کاغذات تھے۔ خانم اور قدرت کے پاس بھی کارڈز ہوں گے۔ ایسی کوئی بات ہوتی تو اب تک فون آ جاتا کسی کا۔ پولیس کیا بتائے گی۔ انہیں کوئی تھانے لے جائے تو بند کرنے سے رہا۔"

میں نے کہا "پھر آپ دور و نزدیک کے جاننے والوں سے بھی پوچھ لیں۔ کیا پتا کسی کے گھر جانا پڑا ہو۔ خوشی کی تقریب کا تو پہلے سے علم

موسیقی کے شائقین کے لیے
اپنے طرز کی اچھوتی کتاب

امجد موسیقی

سازوں کی سنگت میں گانا ایک مشکل فن ہے

سُر، لے، سنگیت، راگ، ٹھاٹھ اور
موسیقی کے دیگر اسرار و رموز
آشکار کرنے والی بے حد کارآمد کتاب

برصغیر کے نامور گلوکار اس کتاب کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

مہدی حسن کا تفصیلی تبصرہ
مع اُن کی رنگین تصویروں کے
اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں

کتابیات پبلی کیشنز

www.paksociety.com

ہوتا ہے مگر موت کی خبر اچانک ملتی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تھوڑی دیر میں آجائیں۔"

آصف علی نے نفی میں سر ہلایا "کبیر میاں! حقیقت جو تم بھی جانتے ہو اور میں بھی سمجھتا ہوں' یہ ہے کہ انہیں کوئی ان کی مرضی کے خلاف لے گیا ہے اور ایسا کرنے والے وہی ہو سکتے ہیں جو ہماری عدم موجودگی میں آئے تھے کسی لال گاڑی میں۔"

"چوکیدار سے پوچھیں' شاید اس نے گاڑی کا نمبر لکھا ہو۔"

"نمبر تو لکھا ہوا ہوگا اس کے پاس۔" آصف علی نے انٹرکام کا ایک بٹن دبایا۔ انٹرکام دیوار پر نصب تھا۔

"جی" چوکیدار کی آواز اسپیکر سے آئی۔

"تم نے ڈائری میں اس لال گاڑی کا نمبر ضرور لکھا ہوگا۔"

"جی سر۔ پی آر او۔ زیرو سیون ایٹ۔"

"پی آر ڈبل زیرو سیون ایٹ تو نہیں تھا؟"

"ہو سکتا ہے دوسرا نمبر تھا پی آر آئی۔ ون ڈبل ٹو۔"

"دوسرا نمبر؟ کیا دو گاڑیاں تھیں؟"

"نہیں سر' گاڑی تو ایک تھی۔"

آصف علی بگڑ گیا "کیا گھاس کھا گئے ہو! ہوش میں تھے تم یا نہیں۔ کل مجھ کو پتا تو نہیں تھا ہمارے جانے کے بعد۔ ایک گاڑی کے دو نمبر ہوتے ہیں۔"

"اس کے تھے سر۔ آگے پیچھے کے نمبر الگ تھے۔ آپ یقین کریں' میں نے دیکھا تھا۔"

"پھر بتایا کیوں نہیں تھا ابھی تک؟"

"مجھے ڈر تھا سر آپ یہی کہیں گے جو ابھی کہا۔" چوکیدار بولا۔

میں نے کہا "دوسرا نمبر بھی مشکوک ہے۔ پی آر۔ ون ون ٹو ٹو بھی ہو سکتا ہے۔ اول تو یہ نمبر جعلی لگتے ہیں۔ ایسے نمبر کنفیوژن پیدا کرنے کے لیے لکھے گئے ہوں گے۔"

"مگر ایک کار کے دو نمبر...."

"وہ بھی ممکن ہے۔" میں نے کہا "جب ہم پشاور آ رہے تھے تو ایک ڈاج ڈارٹ نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ اس میں آگے پیچھے کے نمبر الگ تھے۔ کبھی وہ پیچھے والے کو آگے لگا دیتے تھے تو کبھی آگے والا پیچھے۔ اور اب مجھے کوئی شک نہیں رہا کہ یہ وہی لوگ تھے۔ مجرم اپنے طریقۂ واردات سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔"

"پھر تم ہی کرو جو کرنا ہے۔ میری تو عقل ماؤف ہو رہی ہے پریشانی سے۔" آصف علی صوفے کی پشت پر گر گیا۔

میں نے کہا "گھبرانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ خود ہم سے رابطہ قائم کریں گے۔ اغوا کرنے والے ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان کے جو بھی مقاصد ہیں سامنے آجائیں گے اور انشاء اللہ آپ کی یا آپ کی فیملی کو کوئی گزند نہیں آئے گی۔ وہ ہمارے دشمن ہیں' آپ کے نہیں۔ جال انہوں نے ہمارے لیے پھینکا تھا۔ ناظم قدرت اور عامر اس میں رابعہ اور کاجل کے ساتھ ہونے کی وجہ سے پھنس گئے۔ انہیں وہ چھوڑ دیں گے۔"

"اور ان دو لڑکیوں کو نہیں چھوڑیں گے؟"

"وہ ان کے اور ہمارے معاملات ہیں۔ ہم نمٹ لیں گے جیسے بھی ہوگا۔" میں نے کہا اور فون اپنی طرف کھینچ لیا۔

آج اتوار کی چھٹی تھی چنانچہ منظر کے گھر پر ملنے کی امید تھی۔ گھنٹی کچھ دیر بجتی رہی پھر اس کی اولاد میں سے کسی نے ریسیور اٹھا لیا اور ان کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی "میں بات کروں گا' نہیں میں بات کروں گی۔" پھر غالباً طاقتور نے کمزور کو مار بھگایا اور مظلوم نے گلا پھاڑ کے فریاد و فغاں کی "ہیلو" ایک بچے نے کہا۔

میں نے کہا "تمہارا باپ کہاں ہے؟ اس سے بات کرنی ہے۔"

بچے نے چیخ کے کہا "اباجی آپ کا فون ہے۔"

اباجی غسل خانے میں تھے۔ چند منٹ بعد آئے "کیا مصیبت ہے! باتھ روم میں بھی سکون نہیں۔ کون ہے۔ ہیلو۔"

"باتھ روم میں فون لگوا لے۔" میں نے کہا "سکون کے بچے۔"

منظر نے حسب عادت سلام دعا کے طور پر مجھے چند خطابات سے نوازا کے کہا "جیسے شیطان نے جنت میں سکون سے نہیں رہنے دیا تھا باوا آدم کو' ایسے ہی تم لوگ مجھے قبر میں بھی نہیں رہنے دو گے سکون سے۔ اب کیا پڑی اور کیا پڑی کا سوپ۔ سالے آرمے سکندر اعظم تم' آدھی تمہاری ڈم چھلی وہ کیپٹن۔ چہ قابل وہ صحافی اور چہ تعالیٰ اس کی بلیک بیلٹ حسینہ۔ باقی سب ملا کے ایک۔ یہ ہوئی ڈھائی افراد کی ایم آر ایس۔ دنیا میں فتنہ و فساد پھیلا رکھا ہے۔"

"دیکھ بات سن۔ وقت کم ہے اور معاملہ سیریس ہے۔"

"ہاں۔ بس میں ہی سیریس نہیں ہوں۔ یا ہوں تو پلیز پلاننگ والوں کے منصوبے خاک میں ملانے کے لیے۔ تم لوگ تو کچھ کرو گے نہیں۔ نامراد دنیا سے بے مراد جاؤ گے۔ اپے بھوتنی کے! میں کہتا ہوں' اب واپس آنے میں کیا ہے۔ کیوں پشاور میں بھٹک رہے ہو دونوں بدروح بن کے' چاندنی کے بعد اس کے خصم کو بھی فلاں کرا دیا میں نے اور کیسا گیج بیان دلوایا اس سے۔ تم صاف بچ گئے۔"

"یہ تو نے کیا ہے؟"

"اور کیا تیرے باپ نے کیا ہے۔ میرا مطلب تھا اس کی روح نے۔ خیر کیوں نکالا ہے مجھے باتھ روم کی خلوت سے باہر۔ جلدی بول۔ رات کچھ حلوا زیادہ کھا لیا تھا ایک حاجی کے گھر۔ آنتیں لاحول ولا پڑھ رہی ہیں۔ یہ سالا ازار بند بھی دغا دے رہا ہے۔"

میں نے کہا "ہم یہاں دو قاتلانہ حملے ہوئے۔"

"اچھا۔ مبارک ہو۔" وہ بولا "کوئی کامیاب ہوا؟ اس دنیا سے بول رہا ہے نا تو۔"

[...] نے کہا "او کے بچے! مجھے اب ڈر ہے کہ رابعہ اور کاجل [...] نوا ہو گئی ہیں۔"

[...] مشکل ہے۔ وہ خود فرار ہو گئی ہوں گی۔ ماشاء اللہ بالغ ہیں' [...] مرضی ہے کسی کے ساتھ بھی جا سکتی ہیں۔ تیرے ساتھ کب [...] فرار ہو تھیں۔ اچھا ہے تیری بھی جان چھوٹی۔ اب میں دیکھتا [...] کوئی اچھا سا رشتہ تیرے لیے۔ میری سالی ہے۔ بہن جیسی [...] زرخیز ہوئی۔ گھر بھر دے گی۔"

"منظر پلیز یار! میں آ کے ساری بات بتاؤں گا۔ ابھی ایک کام [...] وہ اخبار نکال جس میں گل بانو کی تصویر اور کوئی خبر چھپی [...]"

"وہ کہاں سے نکالوں۔ میں تو سرخیاں پڑھ کے چلا جاتا ہوں' [...] میں خیر سے چودہ بچے آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔ چھوٹا والا تیوز [...] بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ اس سے بڑا ستی بچاتا ہے۔ سب سے بڑا اب اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ گلی میں جو لڑکی جھاڑو دینے آتی ہے اسے کاغذ کی گولیاں مارتا ہے...."

"اف منظر! وہ خبر کیا تھی؟ مجھے یہاں اخبار نہیں ملا۔"

"خبر اچھی تھی۔ کم سے کم ایک نے تو فضول کام چھوڑ کے برانا پیشہ اختیار کر لیا۔ تمہاری وہ کیپٹن بھی لوٹ آئیں وکالت کی طرف۔ وہ سالا غالب کی دم پھر صحافت شروع کر دے حماقت چھوڑ کے۔"

میں نے چلا کے کہا "کیوں اس کے جا رہا ہے۔ خبر سنا مجھے۔ کیا یہ تھا ہے کہ گل بانو پھر ناگ منی بن گئی ہے؟"

"نہیں۔ اخبار نے آخر میں نوٹ لگا دیا تھا کہ آج ساری خبریں جھوٹی شائع کی گئی ہیں۔ اب اتنی بڑی واردات کی اس نے اپنے گروہ کے ساتھ۔ تصویر شائع ہو گئی۔"

"جب واردات ہو رہی تھی تو کیا اخبار کا فوٹو گرافر بھی ساتھ تھا کہ تصویر بنا لی؟" میں نے کہا "منظر' یہ کوئی سازش ہے یا فراڈ۔ واردات کسی اور نے کی' نام گل بانو کا استعمال کیا۔ پرانا نام ہے۔"

"یہ ہو سکتا ہے۔ اس نام کی ایک گڈول تھی' ساکھ تھی۔" منظر نے مجھ سے اتفاق کیا "اس کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی خبیث ناگ بھی دوبارہ پیدا ہو سکتا ہے۔ بہرام ڈاکو اور سلطانہ ڈاکو پھر جنم لے سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "واردات کیا تھی؟"

"کوئی کروڑ روپے لوٹا تھا۔ پھر انہوں نے اخبار کے دفتر فون کر کے خود ہی اطلاع دی کہ یہ کارنامہ کسی اور سے منسوب نہ کیا جائے میں ناگ منی ہوں' دسکی۔ تم کانپ رہے ہو دہشت سے' میں خود آگئی! کوئی سب ایڈیٹر تھا' اس نے مذاق سمجھا۔ تصدیق پر بات درست ثابت ہوئی۔"

"چنانچہ اس نے ریکارڈ سے ناگ منی کی پرانی تصویر نکالی اور لگا دی۔ خبر کے ساتھ۔ میں سمجھ گیا۔" میں نے محسوس کیا کہ میرے ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا۔

"مجھے وقار یوسف کی بیوی نے ایک کہانی سنائی تھی۔ کب لگانے میں اس کا ثانی نہیں۔ جاسوسی ناول پڑھتی ہے' جب فلمیں دیکھتی ہے۔"

"وہ سب میں نے بتایا تھا اُسے۔ وہ سچ تھا۔"

"اس نے تو کہا تھا کہ تم باڑے سے کوئی توپ خرید کے لا رہے ہو۔ اتنی بڑی کہ ایک گولا چلاؤ گے اور سب خلاص۔ یہ بھی سچ ہے۔ اچھا میں چلا واپس سونے میکائد۔ میرا مطلب ہے غسل خانے۔ دوبارہ کال کر لینا۔"

"اتنا تو بتا جا کہ ان کی کوئی خبر ہے۔"

"خیر یہ ہے کہ کوئی خبر نہیں۔" اس نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ میں نے چشم تصور سے اسے پاجامہ پکڑے باتھ روم کی جانب فرار ہوتے دیکھا اور اس کی حالت پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

میرا شک تو دور ہو گیا تھا مگر میں سوچ رہا تھا کہ اخبار مل جاتا تو میں خود خبر پڑھ لیتا اور مجھے اطمینان ہو جاتا کہ یہ گل بانو کے خلاف سازش تھی یا واقعی دوسری ناگ منی کہلانے کے لیے کوئی خاتون شوقیہ ڈاکے ڈالنے لگی ہے۔ ہر صورت میں نقصان گل بانو کا تھا۔ اگر پولیس' ناگ منی کی پرانی فائلیں پھر کھول دے۔ خیر ان معاملات سے واپس لاہور جا کے نمٹا جا سکتا تھا۔ منظر سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وقار یوسف کی بیوی انجم سے میری جو بات ہوئی تھی وہ اس نے اپنے انداز میں نمک مرچ لگا کے شوہر کو بھی بتا دی تھی اور منظر کو بھی۔ غالب اور نازو چھوڑ لایا تھے اور ناگ منی والی خبر سے تو یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اب اگر محسن بھی ناگ منی کے ساتھ ڈاکو بنا ہوگا تو شاید اس نے اپنا نام ابھی تک سپنس کے لیے استعمال نہیں کیا ورنہ بہرام ڈاکو اچھا نام تھا۔ محسن کو ایک ڈاکو کے روپ میں دیکھنے کا خیال ہی مضحکہ خیز تھا۔ ایسے موقع ملتا تو وہ فلموں میں بھی لٹ جانے والے کا کردار قبول کرتا' ڈاکو بھی نہ بنتا۔

آصف علی میری طرح پرسکون نہیں رہ سکتا تھا۔ عام آدمی کا ایسے حالات سے سابقہ نہیں پڑتا جن کے ہم عادی تھے۔ پھر اس کی عمر کا تقاضا بھی تھا چنانچہ اس کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔

"بھئی کبیر میاں! میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر تم کیا کر رہے ہو۔ یہ فون پر تم کس سے ہنسی مذاق کر رہے تھے؟ یہ وقت ہے ایسی باتوں کا!"

میں نے کہا "پھر آپ بتائیں میں کیا کروں؟"

"میں بتاؤں! اجی تم خود کچھ نہیں کر سکے۔ بس ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہو گے اور انتظار کرو گے؟"

"دیکھئے میں نے ابھی اپنے دوست کو بھی نہیں بتایا کہ رابعہ اور کاجل کو واقعی اغوا کرایا گیا ہے۔ صرف اندیشے کا اظہار کیا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ ابھی میں خود یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

www.paksociety.com

ایسے تو عامر کے خلاف رپورٹ لکھوانا ہی کیا مشکل ہے کہ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کے انتہائی کارروائی کی ہے' وجہ بھی بنتی ہے مگر کیا یہ مناسب ہوگا؟ آپ چاہیں گے ایسا؟"

"نہیں۔ یہ تو نہیں چاہتا میں لیکن۔"

اس کی بات انٹرکام کے بزر سے ادھوری رہ گئی۔ اس نے ریسیور اٹھا کے کہا "کیا بات ہے؟"

"سر! پولیس آئی ہے۔" چوکیدار نے کہا۔

"پولیس!" آصف علی گھبرا گیا "کیوں؟ خیر تو ہے۔ اچھا چھوڑو' میں خود پوچھ لوں گا۔ اندر لے آؤ کسی افسر کو۔ بس ایک آدمی کو' باقی کو باہر روک لو۔"

"جناب! وہ زبردستی اندر گھس آئے تھے۔۔۔"

اسی وقت اندر سے ملازم نے چلا کے کہا "کہاں جا رہے ہو تم لوگ منہ اٹھا کے؟ ادھر کچن ہے۔ صاحب اُدھر ہیں۔"

کسی نے دروازے کو دھکا دیا پھر ایک پولیس انسپکٹر اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے تین پولیس والے تھے۔

"یہ کیا تماشا ہے؟" آصف علی نے چراغ پا ہو کے کہا "اس طرح گھر کے اندر داخل ہونے کی جرأت کیسے کی تم نے؟"

میں نے بھی کہا "وارنٹ کے بغیر کسی کے گھر میں گھسنا بھی جرم ہے۔"

پولیس والوں نے اپنی بندوقوں کا رخ میری طرف کر دیا تھا جیسے میں ان پر فائر کرنے والا ہوں یا فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ان کی اس حرکت نے مجھے چوکنا کر دیا۔ یقیناً دال میں کچھ کالا تھا۔

"وارنٹ ہیں ہمارے پاس۔" انسپکٹر نے ایک کاغذ لہرا کے دکھاتے ہوئے کہا "تم ہو شرافت علی نقوی؟"

میں نے کہا "اگر ہوں تو پھر؟"

"یہ شرافت علی نقوی نہیں ہے۔" آصف علی نے برہمی سے کہا۔

"آپ خاموش رہیں جی۔ پوری اطلاعات ملنے کے بعد چھاپا مارا ہے ہم نے۔ ہمیں معلوم ہے' یہاں یہ کبیر خاں کے نام سے چھپا ہوا تھا۔"

"چھپا ہوا کیا مطلب! یہ مہمان ہے میرا۔"

"سوری آصف علی صاحب۔ ہم اسے گرفتار کرنے آئے ہیں۔" انسپکٹر نے کہا "بہتر ہے آپ مداخلت نہ کریں ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا۔ تم مجھے سرکاری فرائض کی انجام دہی میں رکاوٹ کا مجرم بنا کے میرے ہاتھوں میں بھی ہتھکڑی ڈال دو گے۔ میں بات کرتا ہوں ڈی آئی جی سے۔" آصف علی نے چلا کے کہا۔

"ضرور کریں۔ میرا نام ہے انسپکٹر نذیر چوہدری۔" اس نے رعونت سے کہا اور پھر سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "کس بات کا انتظار ہے تمہیں؟"

سپاہی مجھے پکڑنے کے لیے آگے بڑھے۔ ان میں سے ایک نے بیلٹ کے ساتھ ہتھکڑی لٹکا رکھی تھی۔

میں نے کہا "میرا جرم تو بتا دیں مجھے۔"

"آپ پر ایک قبائلی سردار آفریدی کے قتل میں ملوث ہونے کا الزام ہے۔ اسے گاڑی میں بم رکھ کے ہلاک کیا گیا تھا۔ وہ آپ سے ملنے آیا تھا مگر آپ فوراً جائے واردات سے فرار ہو گئے۔ ہمارے پاس بیانات ہیں' چشم دید گواہوں کے۔"

میں سمجھ گیا کہ انکار کی گنجائش نہیں رہی۔ پولیس بعض اوقات حیرت انگیز ذہانت اور مستعدی کا ثبوت دیتے ہوئے گم شدہ سراغ بھی ڈھونڈ نکالتی ہے۔

"میں بھی بیان دینا چاہتا تھا۔" میں نے ہتھکڑی پہن کے کہا۔

"ضرور دینا۔ ہم بھی بیان لینے کے لیے ہی تھانے لے جا رہے ہیں تمہیں' سہرا باندھنے کے لیے نہیں۔"

"سہرا بعد میں چڑھے گا جی گلے میں۔" ایک ہیڈ کانسٹیبل نے ہاتھ سے پھانسی کا پھندا بنا کے سہرے کا مفہوم واضح کیا "چلو دولہا جی۔"

میں نے کہا "ایک منٹ آصف صاحب! اب اغوا کی رپورٹ لکھوانے میں دیر مت کریں۔ یہ رپورٹ آپ لکھوائیں گے۔"

"لو جی۔ ہم پر دن دہاڑے دولہا کے اغوا کا الزام آ رہا ہے۔" حوالدار بولا۔

میں نے اسے گھور کے دیکھا "پولیس میں خواہ مخواہ آ گئے تم' کامیڈین ہونا چاہیے تھا تمہیں فلموں میں۔"

انسپکٹر نے ناگواری سے کہا "کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے یہ سبق مت پڑھاؤ ہمیں۔ شرافت سے چلو شرافت علی نقوی۔"

میں نے کہا "آصف صاحب! کسی وکیل سے بات کر لیں ورنہ ایک فون نمبر نوٹ کر لیں۔"

اب انسپکٹر نے مجھے دھکا دیا "کس کا نمبر ہے۔ گورنر کا! وزیراعظم کا؟ اونچا فنکار ہے بھئی' ذرا تلاشی لو اس کی۔"

حوالدار اچھل کے میرے سامنے آ گیا۔ وہ چھوٹے قد کا گول مٹول سا شخص تھا جسے دیکھ کر جنگلی مینڈک کا خیال آتا تھا جو برسات میں رات کے وقت کبھی کبھی کرخت آواز میں ٹرانے لگتا ہے۔ اس کی آواز بھی ایسی ہی تھی۔

"کھڑا ہو جا!" اس نے مارا مجھے ایک گالی دے کر کہا۔ کسی بھی شریف آدمی کو وہ ابتدا ہی سے مجرم فرض کر لیتے ہیں اور ملزم ہونے

کی صورت میں حاصل ہونے والی مراعات سے فوراً محروم کر دیتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو وہ محض الزام پر بھی قتل کے ملزم کو خود پھانسی چڑھا دیں۔

جامہ تلاشی میں آفریدی کا ریوالور برآمد ہو گیا۔ یہ بارے کا بنا ہوا دیسی ساخت کا ریوالور تھا جسے سب ہی پہچان سکتے تھے۔ اور یہاں کون نہیں جانتا تھا کہ ایسے کھلونے راہ چلتے دس میں سے نو افراد کے پاس ہوتے ہیں مگر میری حیثیت ذرا مختلف ہو گئی تھی۔

"آلۂ قتل برآمد ہو گیا چوہدری صاحب۔ مبارک ہو۔" حوالدار نے بے حد مسرت سے اعلان کیا۔

انسپکٹر نے کہا "لکھو کہ گرفتاری کے وقت ملزم مسلح تھا۔ اس کے پاس بغیر لائسنس کا اسلحہ تھا۔"

"تم نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ لائسنس ہے؟"

انسپکٹر نے میرے ایک تھپڑ مارا "مجھے معلوم ہے۔"

اگر لائسنس ہوتا تو میں اس تھپڑ کا جواب دیتا مگر اب مجھے بلاوجہ بول کے تھپڑ کھانے کا افسوس ہوا۔ میں ان کے ساتھ باہر نکلا اور پولیس کی وین میں دھکیل دیا گیا جو گیٹ سے اندر آ کے پورچ میں کار کے پیچھے رک گئی تھی۔ اگر ہم رکے بغیر باہر چلے جاتے تو شاید میں ایسے گرفتاری دینے پر مجبور نہ ہوتا لیکن ہونے والی بات ہو کے رہتی ہے۔

پولیس کی گاڑی روانہ ہوئی تو میں نے آصف علی کو ہاتھ ہلایا جو سخت زخمی اور پریشان اکیلا کھڑا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی کے اغوا کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا کہ میں نے گرفتار ہو کے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس کے لیے پریشانیوں کا نیا باب کھول دیا۔ شاید وہ سوچنے پر مجبور ہو کہ مجھے خوش قسمتی نہیں' اس کی شامت اعمال یہاں لے آئی تھی۔ جسے وہ ایک سزا کا اختتام سمجھ رہا تھا وہ اسی سزا کا تسلسل تھا یا دوسری سزا تھی۔

بظاہر گردش حالات ہمارے لیے ابھی بدلی نہیں تھی۔ وقت ضرور بدل گیا تھا اور ہم مسافرت کے پُر مصائب دور سے گزر کے ایک سعی ناحاصل کے بعد اور احساس زیاں کے ساتھ وطن لوٹ آئے تھے مگر یہاں آتے ہی میں زندگی نے دوسرا کھیل شروع کر دیا تھا جو زیادہ خطرناک تھا۔ زیست سے موت تک ہزار جان لیوا مرحلوں سے گزر کے میں نے رابعہ کے ساتھ اور غالب نے نادو کے ساتھ واپسی اختیار کی تھی اور جب سلامتی کی منزل آ گئی تو ہم سب بچھڑ گئے تھے۔

رابعہ اور میں قتل کے الزام سے بچنے کے لیے لاہور سے بھاگے تھے مگر یہاں آ کے رابعہ اور کاجل لاپتا ہو گئیں اور میں شرافت علی نقوی بن کے ایک ہمدرد دوست کو قتل کرنے' بلا لائسنس اسلحہ رکھنے اور بہت سے دوسرے جرائم میں ملوث ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھ پر ٹائم بم جیسا مشتبہ اور خطرناک اسلحہ رکھنے کا جرم بھی ثابت ہوگا۔ نام بدل کے پولیٹکل ایجنٹ کو دھوکا دینے سے لے کر ریسٹ ہاؤس کو بم سے اڑانے تک ان گنت مقدمات قائم ہو جانے کے بعد میری ضمانت بھی ممکن نہیں رہے گی اور "دیگر" جرائم کی تفصیلات جاننے کے لیے پولیس مجھ سے جس طرح تفتیش کرے گی' اس کا سوچ کے ہی مجھے ہول آتا تھا۔ نہ یہاں منظر میری مدد کر سکتا تھا نہ وقار یوسف۔ میری وکیل صفائی مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور تو خود شریک جرم قرار دی جا سکتی تھیں چنانچہ [illegible] "تھیں"۔

[illegible] جیسے کائنات کی تمام پُراسرار شیطانی قوتیں مل کے ایم آر ایس کو نہس نہس کر دینے پر تل گئی تھیں۔ غالب اور نادو کو بھی کسی نے اغوا کر لیا تھا اور اغوا کرنے والا اتنا دلیر تھا کہ نوشہرہ کے ملٹری اسپتال میں غالب کا بھائی بن کے پہنچا اور انہیں نکال لے گیا۔ ناقابل یقین انداز میں محسن اور گل جن کو ہم نے بحفاظت سب سے پہلے ہوائی جہاز سے کراچی بھیجا تھا' اکرام شیخ سے ملے بغیر نہ جانے کس طرف نکل گئے تھے اور اب ہم ایسی ناقابل یقین کہانیاں خبروں کی صورت میں سن رہے تھے کہ گل پھر آگ متی بن گئی ہے۔ ڈاکوؤں کے گروہ کی سردار اور وہ ڈاکے ڈالنے لگی ہے۔

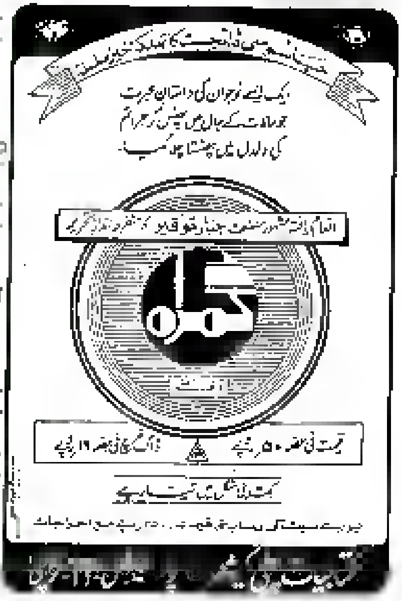

www.paksociety.com

اور محسن یقیناً اس کے ساتھ تھا۔ ہم سب جو وطن عزیز کے امن، سکون اور عافیت کی زندگی گزارنے کا عزم رکھتے تھے، مجرم بن چکے تھے یا مجرموں کے یرغمال تھے۔ قانون کے لمبے ہاتھ ہماری طرف بڑھ رہے تھے اور ہم محصور ہوتے جا رہے تھے۔ اگر یہ پرانے شکاری تھے جو ہمارے لیے جال بچھانے میں کامیاب ہو رہے تھے تو ہم جو ایم آر ایس کی تنظیم کو ختم کر چکے تھے، بڑا کمزور شکار ثابت ہو رہے تھے۔

پولیس کی وین میں کسی نامعلوم منزل کی طرف جاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ایم آر ایس کو ختم کرنا ہماری جذباتی غلطی کے سوا کچھ نہیں۔

ایم آر ایس یا مافیا از رائٹ سوسائٹی بھلا کیسے ختم ہو سکتی ہے۔ جس معاشرے میں انصاف اور عدل کے اصولوں پر لاقانونیت اور جبر و استبداد کے علمبردار، دولت مندی کے غرور میں جلا فرعون صفت افراد اور اخلاقی قدروں کو پاؤں کی ٹھوکر میں رکھنے والے حکمران ہوں وہاں جنگل کا قانون ہی چلتا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

اور وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے ایم آر ایس کو پھر بحال کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔ فی الحال صرف اپنے لیے۔ باقی لوگ میرے خیال اور تصور سے بھی دور تھے اور نیلی چھتری سے بھی میں اپنا فیصلہ انہیں نہیں سنا سکتا تھا۔

میں پشاور کے راستوں سے ناواقف تھا لیکن گاڑی کو چلتے ہوئے بیس منٹ ہو گئے تو مجھے خیال آیا کہ آخر اس تھانے کی عملداری کی حد کہاں سے کہاں تک ہے۔ کسی بھی شہر میں ایک تھانے کا علاقہ میلوں تک نہیں پھیلا ہوتا۔

میں نے کہا "تمہارا کیا نام ہے چھوٹے موٹے حوالدار..."
حسب توقع اس نے مجھے گالی نہیں دی اور اس گستاخانہ طرز تخاطب پر جھانپڑ سے سرفراز بھی نہیں کیا "کندن نام ہے میرا" وہ مسکرا کے بولا۔
میں نے کہا "تم دل کے برے نہیں لگتے مجھے۔"

وہ مسکراتا رہا "صورت کا برا ہوں کیا؟"
"معاف کرنا، تمہاری صورت دیکھ کے مجھے جنگلی مینڈک کا خیال آیا تھا۔ عام مینڈک کے مقابلے میں اس کا منہ بڑا ہوتا ہے وہ جتنا کنویں کے مقابلے میں گولا۔ ویسے ہی ٹراتے بھی ہو تم۔ کیا یہ خاندانی صفات ہیں؟"

وہ مشتعل نہیں ہوا تو مجھے مزید حیرانی ہوئی۔ دونوں کانسٹیبل مستعد ضرور تھے مگر دانت نکال رہے تھے "ہم اسے کندو شاہ بولتے ہیں۔"

میں نے کہا "کندو شاہ! یہ آخر پشاور کا تھانہ چترال میں کیوں بنایا گیا ہے؟ پشاور تو غیر علاقہ نہیں ہے کہ وہاں تھانہ قائم کرنا مشکل ہو۔ بہت دور آ گئے ہیں ہم اور بستی دور ہو گئی۔ یہ کون سی جگہ ہے یہ؟"

"یہ جی ٹی روڈ ہے" کندو شاہ نے کہا۔
کچھ دیر بعد شہر کی نئی آبادی شروع ہو گئی جو ڈیفنس ہاؤسنگ یا لاہور کے گلبرگ جیسی تھی۔ اب مجھے تشویش لاحق ہونے لگی۔ آخر یہ لوگ مجھے کس تھانے میں لے جا رہے ہیں؟ اور کیا واقعی تھانے لے جا رہے ہیں؟ شہر میں تھانے بھی تو ہوتے ہیں۔

وین ایک کوٹھی کے گیٹ پر رکی تو میرا شک یقین میں بدل گیا کہ مجھے تھانے نہیں لایا گیا۔ گیٹ کھلا اور وین کے گزرتے ہی پھر بند ہو گیا۔
"یہ کیا جگہ ہے؟" میں نے کہا "یہ تھانہ نہیں ہے۔"
"تھانے جائیں آپ کے دشمن دلہا میاں۔" حوالدار کندو شاہ نے خوش دلی سے کہا "تشریف لائیے، یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔"
میں نے نیچے اتر کے عالی شان کوٹھی کو دیکھا۔ وین کے اگلے حصے سے اتر کے آنے والا انسپکٹر بھی اب بالکل مختلف آدمی لگ رہا تھا۔

"سوری مسٹر سکندر بخت! وہ سب ضروری تھا جو رویہ میں نے آپ کے ساتھ روا رکھا۔" اس نے انگریزی میں کہا۔
"کون ہو تم لوگ؟ تم پولیس میں نہیں ہو؟" میں نے کہا۔
"مجھے ڈر تھا کہ تم فوراً سمجھ جاؤ گے۔ اس کا مطلب ہے میری ایکٹنگ اچھی رہی۔"

میں نے ایک دم لات گھمائی "ایکٹری اولاد۔"
وہ بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا "یہ سب نہ کریں پلیز! میں سوری کہہ چکا ہوں۔ اگر مقابلہ ایسے ہی کرنا ہے تو پھر کریں گے۔ تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ہم تمہیں اسلحے کی مدد کے بغیر بھی گرفتار کر کے لا سکتے تھے۔"
حوالدار کندو شاہ نے کہا "یہ جو سپاہی تم کو ہتھکڑی لگائے کھڑا ہے، یہ بھی بلیک بیلٹ ہے۔ بس میں ہی نہیں ہوں" کندو شاہ بولا "وہ جنگلی مینڈک۔"

اسی وقت پیچھے کا دروازہ کھلا اور برآمدے میں ایک شخص نمودار ہوا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا اور حیرت سے میرا منہ کھلا رہ گیا۔

● ●

میرے سامنے میرا پرانا حریف سب سے خطرناک شکاری چوہدری دلاور موجود تھا۔ اس کی صورت پر وہی مسکراہٹ تھی جس کا مطلب سب ہی جانتے تھے۔ جب اس کے دل میں کینہ اور عناد زیادہ ہوتا تھا تو اس کے لبوں پر شہد سے زیادہ مٹھاس آ جاتی تھی۔ اس کے وجود میں نفرت کا زہر ابلتا تھا تو ہونٹوں پر محبت کے پھولوں کی خوشبو میں مسکراہٹ جاگ اٹھتی تھی۔ وہ ایک ایسا جادوگر تھا جو اپنے ظاہر میں باطن کا عکس دکھاتا تھا کہ دیکھنے والے کی نظر کو فرق کا احساس ہی نہ ہو۔ اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کی مسکراہٹ کے دھوکے میں وہ اتنا کامیاب رہتا تھا کہ دیکھو اندر سے خوش رنگ پھول کھلے ہوئے ہیں اور کیسی دل نواز خوشبو ہے۔ تو یہ بھی سچ تھا ورنہ کون نہیں جانتا کہ گٹر میں خباثت اور تعفن کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اسے اچانک روبرو دیکھ کے میرے ذہن کو جھٹکا لگا تھا مگر یہ جھٹکا ویسا ہی تھا جیسا جنگل میں اپنے سامنے زہریلے ناگ کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے۔ میں حواس کی تمام طاقتوں کے ساتھ مستعد اور ہوشیار ہو گیا۔
وہ کھیل جس میں اب تک چوہدری دلاور کے شاطرانہ ہتھکنڈوں نے پیادے استعمال کیے تھے ایک ایسے موڑ پر آ گیا تھا جہاں اس نے خود سامنے آ کے کوئی نئی چال چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔
وہ مسکراتا ہوا آگے آیا "کیا مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہو؟ اتنا تو نہیں بدلا ہوں اسپچ سکندر اعظم صاحب۔"
میں نے اپنے لہجے میں نفرت اور حقارت بھر کے کہا "تم چاہو تب بھی بدل نہیں سکتے دلاور۔ سانپ صرف کینچلی بدلتا ہے۔ اس کی فطرت کبھی وہی رہتی ہے، عادت بھی اور صورت بھی۔"
اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "چھوڑو جی یہ پرانیاں گلاں۔ ہتھ ملاؤ۔ وقت کو دیکھو کہاں سے کہاں نکل گیا۔"
"میرا اور تمہارا وقت ابھی ختم نہیں ہوا۔ اور جب تک گزرے ہوئے وقت کا حساب برابر نہیں ہو جاتا، میں اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤں گا تو صرف تم پر وار کرنے کے لیے..."
وہ ہنسا "اوئے ذرا دل وڈا کر۔ اب وار کی بات بھول جاؤ۔ بہت وار کر لیے تم نے بھی، میں نے بھی۔ اور ہاتھ کیا آیا؟ تمہارے اس وار میں چلا میرا ہاتھ۔ تم نے گزرے ہوئے وقت کے حساب کی بات کی ہے تو کر لیتے ہیں حساب بھی۔"
میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا "تم جس وار کی بات کر رہے تھے دلاور، کاش اس میں تم میرا ساتھ دیتے تو شاید ایک ہموطن ہونے کے ناطے میں بھی سوچتا کہ اپنا معاملہ روز محشر کی عدالت انصاف کے حوالے کر دوں۔ ذاتی انتقام کے جذبات حاوی ہوں تو خون کیسے منصف ہو سکتا ہے مگر میرے اور تمہارے درمیان اب صرف ذاتی دشمنی نہیں۔ تم غدار اور وطن دشمن بھی ہو۔ تم نے میرے وطن کو دولت کرنے والوں کے ہاتھ مضبوط کیے تھے۔ تم ان دشمنوں سے بدتر ہو جو مذہب یا قومیت کی دلیل پر میرے دشمن ہیں۔ مجھے جب بھی موقع ملا میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ تمہیں بھی اور تمہارے ان حواریوں کو بھی جن کے چہرے بے نقاب ہو چکے ہیں۔"
دلاور کی مسکراہٹ کافور ہو گئی "تم بہت وہ ہو۔ ہیں جی کیا کہتے ہیں اسے۔ ناعاقبت اندیش؟ اردو اپنی ایسی ہی ہے ناعاقبت نااندیش۔ خیر دفع کرو۔ گئے کی دُم سے بات سمجھ آ جائے تو پھر فارسی بولنے کی کیا ضرورت ہے۔"
"اگر تم بڑے دور اندیش ہو تو موقع سے فائدہ اٹھاؤ دلاور اور اپنے ان حکم کے غلاموں سے کہو کہ مجھے زندہ لوٹ کر نہ جانے دیں۔ میں بالکل خالی ہاتھ اور تنہا ہوں، یہ سب مل کر مجھے شوٹ کر سکتے ہیں اور یہیں گاڑ سکتے ہیں۔ میں بالکل تیار ہوں مرنے کے لیے دلاور۔ کم سے کم ایک دشمن تو کم ہو گا تمہارا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے فرق کوئی نہیں پڑے گا۔ تم جانتے ہو سکندر ایک نام نہیں ہے۔ یہ ایک جذبہ ہے، ایک طاقت ہے، یقین اور اتحاد کی۔ اور ایک تنظیم ہے۔"
"ایم آر ایس؟" اس نے طنز اور تمسخر کے ساتھ کہا۔
"ہاں ایک ایم آر ایس تم جیسے لوگوں کی ہے جو معاشرے میں لاقانونیت، بے ضمیری، ناانصافی اور بدباطنی کے فروغ میں وہی کردار ادا کر رہے ہیں جو ابلیس ساری دنیا میں کرتا ہے۔۔۔"
"اور یہ دوسری ایم آر ایس تم جیسے فرشتوں نے بنائی ہے۔"
دلاور نے برا مانے بغیر طنزیہ انداز میں میری بات کاٹ دی "ہم جیسے لوگوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے۔ ہیں جی۔ یار یہ نیکی بدی کی جنگ تو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی مگر شیطان کے وجود کو ختم کرنے کے لیے فرشتے بھی مقابلے پر نہیں آئے۔ خدا نے بھی اسے کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ بندوں کو سمجھانے کے لیے نبی اور ولی ضرور آتے رہے۔ تم کیا چیز ہو آخر اپنے سکندر صاحب! کبھی غور فرمایا آپ نے؟"
میں نے کہا "میں خدائی فوجدار ہوں۔ تم جانتے ہو۔"
وہ خوش دلی سے ہنسا "اچھا جی ہم مان لیتے ہیں۔ اب اندر چلو۔ میں نے تمہیں نیک نیتی کے ساتھ بلایا ہے۔ کچھ باتیں کرنے کے لیے اور کچھ تمہیں سمجھانے کے لیے۔"
میں نے کہا "اپنی نیک نیتی کا ثبوت تم نے پہلے ہی دے دیا ہے۔"
مگر میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ پلٹ کے اندر چلا گیا تھا اور شاید جاتے جاتے پولیس کی وردی میں ملبوس افراد کو اشاروں کی زبان میں ان کا فرض یاد دلا گیا تھا۔
انسپکٹر غرایا "اب آپ اپنے پاؤں پر چل کے اندر جاؤ گے یا بس؟"

www.paksociety.com

میں نے مسکرا کے کہا "کیا تم مجھے موقع دو گے؟"

"کس بات کا موقع؟" وہ حیران ہو کے بولا۔

"یہی کہ میں اپنے پیروں پر چل کے اندر جاؤں مگر تمہاری لاش اٹھانے کا ... مجھے اٹھا کے لے جاؤں۔ باری باری تم سب لیں۔"

وہ مسکرایا "تمہیں شکایت ہے ہم نے تمہیں کوئی موقع فراہم نہیں کیا اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کا۔ یہ موقع ضرور ملے گا تمہیں۔"

چھوٹے قد کے گول مٹول حوالدار نے دانتوں کی نمائش کی "مجھ سے لڑو گے ٹارزن؟"

"ٹارزن کا کسی جنگلی مینڈک سے کیا مقابلہ؟" انسپکٹر نے اسے بڑا واضح اشارہ کیا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی مناسب جواب دیتا، حوالدار نے مجھ پر بالکل کسی جنگلی مینڈک کی طرح جست لگائی اور اس کے پاؤں میرے سینے پر دھم سے گُرز کی طرح لگے۔ اس قد و قامت اور جسامت کے ساتھ ایسی پھرتی کا مظاہرہ میرے لیے بعید از قیاس تھا۔ اس کی قوت میں ایک وحشیانہ شدت تھی جس کا اندازہ حوالدار کے مضحکہ خیز اطوار اور مظلوم و مسکین چہرے سے نہیں ہوتا تھا۔

میں ایک دم لڑکھڑا کے پیچھے گرا۔ میرے اٹھنے سے پہلے ہی حوالدار دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہوا مگر اب میں بھی خطرے کو محسوس کرنے والے حیوان کی فطری ذہانت کے ساتھ مقابلے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں اور عین اس وقت جب وہ میرے اوپر آیا میں نے ٹانگوں کو جھٹکے سے اوپر اٹھایا۔

میرے دونوں پاؤں اس کے پیٹ پر لگتے تو وہ توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح اُڑتا ہوا جاتا اور دیوار سے ٹکراتا مگر سیکنڈ کے ہزارویں حصے کا فرق بھی بعض اوقات ساری امیدوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ شاید اس نے بھی اندازہ کر لیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

اس نے ایک دم سر جھکا کے غوطہ مارا اور میں فضا میں ٹانگ چلا کے رہ گیا۔ میرے پاؤں میں جھٹکا آیا مگر اس کے باوجود میں تیزی سے پلٹ گیا اور حوالدار کو میری ٹانگوں میں گھسنے کا موقع نہ ملا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گیا۔

کوئی اور ہوتا تو اس صدمے سے فوراً سنبھل نہ پاتا مگر اس نے ریچھ کی طرح غرا کے بلند آواز میں کہا "یا علی مدد" اور ایک سیکنڈ میں پھر کھڑا ہو گیا۔

یہ ایک سیکنڈ کی مہلت بھی میرے لیے بہت تھی۔ میں نے اس کو اپنے مقابل دیکھا تو اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ اس کی ناک سے خون کی ایک لکیر سی ہونٹوں تک آ رہی تھی۔ ہونٹوں کے ایک پھٹے ہوئے کنارے سے خون رس رہا تھا اور ماتھے کی کھال پھٹ جانے سے پیشانی بھی لہو آلودہ دکھائی دیتی تھی۔

میں نے بائیں پاؤں کی ایڑی پر گھوم کے لات کو ایک دائرے میں حرکت دی۔ یہ ایک انتہائی خطرناک داؤ تھا۔ میری ٹائمنگ بھی غلط نہ تھی اور مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی حوالدار کھڑا ہو گا، میری لات اس کے ... پر یوں لگے گی جیسے بجلی کے پنکھے کے تیزی سے گردش کرنے والے پنکھے کا ایک بازو کسی سے ٹکرا جائے چنانچہ مجھے اس وقت سخت حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب میں اپنے ہی زور میں دوسری بار گھوم گیا۔

ناقابل یقین سُرعت کے ساتھ حوالدار نے خود کو میری لات کی سویپ سے بچا لیا تھا۔ کچھ قدرتی فائدہ اسے اپنے قد کی کوتاہی سے بھی حاصل رہا اور وہ مخالف سمت میں نکل گیا۔

میری لات کلاک وائز حرکت میں تھی یعنی میں نے بائیں ایڑی پر دائیں جانب لات گھمائی تھی۔ وہ کلاک وائز آیا یعنی بائیں طرف سے اور دوسرے لمحے اس نے پیشہ ورانہ مشاقی کے ساتھ میری ٹانگ کو نیچے سے پکڑ لیا۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ میں نے خود کو فضا میں زمین سے چند فٹ اوپر یوں گھومتا پایا جیسے رسی کے سرے پر بندھا ہوا پتھر۔

میں اتنا ہلکا پھلکا بھی نہیں تھا اور نہ وہ جسمانی اعتبار سے مجھ پر برتری رکھتا تھا مگر یہ مارشل آرٹس کے وہ داؤ پیچ ہیں جن میں جسمانی طاقت سے زیادہ تجربہ، مہارت اور حاضر دماغی کام آتی ہے۔ میرا حریف جسے میں نے صورت شکل قد و قامت اور اطوار کے باعث جنگلی مینڈک کا خطاب دیا تھا، جو دوسری نہیں آتی کو اندازہ بھی جانتا تھا لیکن وہ مجھے دھوکا دینے میں کامیاب رہا تھا۔ انتہائی احمق اور بے ضرر نظر آنے والا شخص اتنا خطرناک تھا کہ مجھے اپنا انجام صاف نظر آنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مختصر پست قامت اور بھاری بدن شخص زیادہ دیر مجھے اوپر اٹھا کے گردش میں نہیں رکھ سکتا۔ اس نے تو میرے وجود کی حرکت پذیری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک جھٹکا دے کر مجھے گھما دیا تھا اور اب یہ بات یقینی تھی کہ توازن بگڑنے سے پہلے وہ مجھے چھوڑ دے گا۔ میں نیوٹن کے دوسرے قانون حرکت کے مطابق سیدھا اُڑتا ہوا جاؤں گا اور دیوار سے ٹکرا کے وہیں ڈھیر ہو جاؤں گا۔ فنون حرب کی کسی کتاب میں اور کسی نصاب میں ایسا کوئی طریقہ درج نہ تھا جسے یاد کر کے میں اپنے حریف کی گرفت سے بحفاظت نکل سکتا یا اسے مجبور کر سکتا کہ وہ میرے پنجے کو نہ چھوڑے۔

میرے بازو خود بخود پھیل گئے تھے اور میں کسی گلائیڈر کی طرح پرواز کر رہا تھا۔ یہ سب ایک دو سیکنڈ کی بات تھی۔ حسب توقع اس نے میرے پنجے کو اپنی گرفت سے آزاد کیا تو میں دیوار سے متصادم ہونے کے لیے بڑھا۔ اپنی گردن کو ٹوٹنے سے بچانے کی لاشعوری کوشش میں میرے ہاتھ خود بخود سر کے اوپر آ گئے اور میرا سر جھک گیا۔

اسی وقت وہ معجزہ رونما ہوا جس کی امید رکھنے کا خیال بھی

مجھے نہیں آ سکتا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے میں کسی تنے ہوئے ... سے ٹکرایا ہوں۔ میں دیوار سے ٹکرایا تو نہیں ... مضبوط ... ٹکرایا نہیں ہوا تھا۔ اسپرنگ ... نے مجھے روک لیا تھا۔

میں ایک جھٹکے سے رُکا اور فرش پر گر گیا۔ یہ دوسرا حیران کن صدمہ تھا جس سے سنبھلنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ جب مجھے یقین آیا کہ میں بالکل خیریت سے زندہ سلامت زمین پر اُتر چکا ہوں تو میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔

مجھے اس صدمے سے دوچار کرنے والا حوالدار کدو کچھ فاصلے پر کھڑا ہاتھ جھاڑ رہا تھا اور اس کے ساتھی ہنس رہے تھے۔

"ارے واہ رے کدو" یہ آواز انسپکٹر کی تھی۔

انسپکٹر مجھ پر پیر رکھے اور اپنے ریوالور کا رخ میری طرف کیے کھڑا تھا۔ ریوالور کی نیلگوں چمک والی سرد سفاک نالی کے اندر کہیں کوئی گولی بے چینی سے منتظر تھی کہ اسے اشارہ ملے تو میرے دل میں اتر جائے۔

جب فرش پر گرا تو مجھے یاد آیا کہ ایسی ہی چمک میں نے پہلے بھی دو تین بار ضرور دیکھی تھی۔ پھر دلاور کے دہاڑنے کی آواز آئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے ... گالیاں بولے فراٹے کے ساتھ دیں "کیا کہا تھا تم سے میں نے، یہ ہی؟"

انسپکٹر نے اپنا پاؤں ہٹا لیا اور اپنا ریوالور بھی جیب میں ڈال لیا "سر جی اس نے ہمیں مجبور کر دیا۔"

"مجبور کر دیا... اور تم مجبور ہو گئے!" دلاور نے حقارت کے ساتھ اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے انسپکٹر کہ تم اتنی آسانی سے مجبور ہو جاتے ہو۔ بڑے کمزور بندے ہو تم یار۔"

"آپ میری بات نہیں سمجھ رہے ہیں..." انسپکٹر مشتعل ہونے لگا۔

"اچھا! تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں بے وقوف اور کوڑھ مغز بھی ہوں، خیر ہے؟" دلاور بولا۔

میں خفت اور شرمساری کے جذبات سے مغلوب کھڑا تھا اور اس حوالدار سے نظریں چرا رہا تھا جس نے میرے غرور کو خود میری نظروں میں عبرت آموز شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ میں پولیس والوں سے اچھی طرح واقف تھا اور ماسوا چند ایک کے مجھے اس محکمے میں نیچے سے اوپر تک کاہل، جاہل، حرام خور اور بے ضمیر لوگ ہی ملے تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حوالدار کدو جیسا شخص میرے سارے تصورات کو باطل کر دے گا۔ چھپے رستم تو مجھے پہلے بھی ملے تھے مگر اس جنگلی مینڈک جیسے حوالدار کدو کہلانے والے باکمال اور ماہر فن شخص کا پولیس کی وردی میں نظر آنا میرے لیے ایک ناقابل یقین تجربہ تھا۔ اگرچہ وہ میرا دشمن تھا مگر میں اس کمال کے اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ فن حرب میں اس کی مجھ پر برتری کو

تسلیم کروں۔

جب فائر کی آواز آئی اور حوالدار نے اچھل کے سینہ پکڑا اور میں نے اس کی دلخراش چیخ سنی تو میرا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔ میں نے پیچھے گرتے ہوئے حوالدار کی طرف دیکھا اور پھر چوہدری دلاور کی طرف دیکھا جو اپنے ریوالور کی نال کو رومال سے صاف کر رہا تھا۔

"سؤر کے بچے!" میں نے چیخ کے کہا "یہ کیا کیا تو نے؟"

دلاور کے لبوں پر ایک سفاک مسکراہٹ آئی "مجھے ظلم پسند نہیں۔ خاص طور پر اس وقت جب میرے زر خرید غلام میرے معزز مہمانوں کے ساتھ غلط سلوک کریں۔"

زر خرید غلام، معزز مہمان، غلط سلوک..... میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ میری نظروں کے سامنے دلاور نے ایک سرکاری اہلکار کو قتل کر دیا تھا۔ سرکاری اہلکار زر خرید بھی ہوتے ہیں مگر ایک ایسی خطا پر جو خطا بھی نہیں تھی، قتل کی یہ سفاکانہ سزا بہت بڑا جرم تھی۔ قانونی طور پر بھی اور اخلاقی اعتبار سے بھی۔ حوالدار نے اگر تھوڑی سی زیادتی کی تھی تو میرے ساتھ اور میری اشتعال انگیزی پر۔ میرے اور اس کے درمیان خالی ہاتھ ایک بے ضرر سا مقابلہ ہوا تھا جس میں اپنی برتری ثابت کرنے کے سوا حوالدار نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

اب وہ میرے سامنے ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور میں ... دکھ کے ساتھ اسے مرتا دیکھ رہا تھا۔ پشیمانی کا یہ احساس میرے ضمیر میں کانٹا بن کے اتر گیا تھا کہ اس خون کے داغ سے میرا دامن بھی داغدار ہے۔

میں نے چلا کے انسپکٹر کو گالی دی "بے غیرت ذلیل کتے! تم یہ سب کچھ سن کے اور دیکھ کے بھی کچھ نہیں کر رہے ہو۔ لعنت ہے تم پر خدا کی! قتل تمہارے سامنے ہوا ہے۔ قاتل تمہارے سامنے موجود ہے۔ تم نے یہ وردی پہن رکھی ہے جو تمہیں اختیار دیتی ہے کہ اسے پکڑ لو۔ ریوالور بھی ہے تمہارے پاس۔"

چوہدری دلاور نے ایک قہقہہ لگایا "الٹی چھوڑو یار۔ اپنے سکندر اعظم صاحب! یہ ایسی تقریروں کا وقت نہیں ہے۔ اور یہ تقریر کرنے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ وہ کیا فرمایا ہے جی اپنے علامہ صاحب نے۔ اللہ نے آج تک اس ملک کی حالت نہیں بدلی جس کو احساس نہ ہو اپنی حالت خود بدلنے کا۔ تو یہ اپنا ملک ایسا ہی ہے۔ تقریروں سے کچھ ہونا ہوتا تو کیا بات تھی۔"

میں ہکا بکا اس شخص کی صورت دیکھ رہا تھا جو اس قتل پر ذرا بھی پشیمانی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ جسے ذرا بھی خوف نہیں تھا کہ قانون اس کو گرفت میں لے سکتا ہے۔ میں دکھ کے ساتھ اس قانون کے رکھوالے کو بھی دیکھ رہا تھا جس نے چند سکوں کے عوض اپنی وفاداری ہی نہیں، خودداری بھی بیچ دی تھی۔ وہ سرکاری اہلکار نہیں رہا تھا۔ دلاور کا کتا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ایک ماتحت کے

www.paksociety.com

قتل پر زبانی احتجاج تک نہیں کیا تھا۔ وہ خاموش کھڑا تھا اور وہ دور کی فضا میں گھور رہا تھا۔ اس کی اتنی ذلت پر مجھے اتنا ملال اور اشتعال تھا کہ میرے بس میں ہوتا تو بار بار اسے ... بیٹا۔ اسے سرعام ننگا کرکے ذلیل کرتا اور اسے ... پاگل کے مجبور کرتا کہ کتے کی طرح بھونکے اور پھر قانون کے حوالے کردیتا کہ اس کو سزا دے۔

اچانک دلاور کی آواز سن کے میں پھر ہوش میں آگیا۔ اب وہ انسپکٹر سے مخاطب تھا۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا اپنے تھانیدار صاحب ہیں جی۔ آخر کس ... نے افسر بنا دیا تمہیں؟ کنٹرول ذرا بھی نہیں تمہیں کسی ماتحت پر۔ اور ایسے کمزور افسر کا کیا بھروسہ۔ کل کسی کے کہنے پر میرے خلاف کچھ کر بیٹھے۔"

"آپ کیسی بات کرتے ہیں سرجی!"

"سرجی کے بچے! جو میرے مہمانوں کے ساتھ ہوا وہ کیا میرے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ میرے حکم کی اگر اتنی ہی اہمیت ہے تمہارے لیے تو پھر کیا فائدہ میرے پیسوں کا ... تم میں سے کوئی مجھ پر بھی ریوالور نکال سکتا ہے۔"

انسپکٹر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا مگر اچانک اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ چلانے لگا "چوہدری صاحب خدا کے لیے ایسا مت کریں۔ مجھے معاف کردیں۔"

میں نے دلاور کی طرف دیکھا اور پھر انجام کی پروا کیے بغیر میں نے اس پر ایک جست لگائی مگر مجھے بہت دیر ہو گئی۔ اتنی ہی سرد مہری اور بے نیازی کے ساتھ دلاور نے انسپکٹر کو بھی شوٹ کردیا تھا۔ میں خوف سے اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ کسی نادیدہ قوت نے میرے قدم روک لیے تھے۔ مجھے خبردار کردیا کہ اس شخص کے ریوالور کا رخ میری طرف ... باقی گولیاں میرے سینے میں اتر جائیں گی اور اتنی ہی بے بسی کے ساتھ میں بھی مرجاؤں گا جیسے پولیس کا ایک حوالدار اور ... انسپکٹر مر گئے تھے۔ کسی بھی قانون کی طاقت دلاور کو ... نہیں بچا سکتی تھی۔ اس کی طاقت کے مقابلے میں قانون بے بس ہو جاتا ... اتنی آسانی سے اور اتنے سکون کے ساتھ وہ دو قتل کرکے ... سکتا تھا۔ اچانک مجھ پر عجیب کیفیت ... مجھے خیال آگیا رابعہ کا اور کامل کا، غالب اور نازو کا۔ ان سب کا جو میرے ساتھی، دوست، عزیز و اقارب اور زندگی کے رفیق و ہمسفر تھے جن کے بغیر میرے لیے اپنی زندگی کا مفہوم کچھ نہ تھا۔ ان سب کا پتا صرف دلاور سے حاصل ہو سکتا تھا۔ میں ان سے پھر مل سکتا تھا مگر اس کے لیے شرط اول یہی تھی کہ میں زندہ رہوں۔

وہ میرے لیے عجیب تبدیلی کا لمحہ تھا۔ جب میں نے زندگی کی چاہت کو محسوس کیا اور یہ چاہا کہ میں اپنی جدوجہد کا رخ زندگی کے راستوں کی طرف رکھوں۔ مر کے تو میں سب کچھ کھو دوں گا۔ وہ خواب جو تشنہ تعبیر تھے، وہ ارمان جو ادھورے تھے، وہ ارادے جو کل کی امید تھے، وہ تھے دن جو منتظر تھے کہ فرصت کشاکش غم دوراں سے گر ملے تو وہ حقیقت بن جائیں گے۔

میری یہ زندگی صرف میری نہیں تھی۔ اس پر دوسرے بہت سے لوگوں کا حق تھا اور اس زندگی کا ایک مقصد و مصرف بھی تو تھا۔ کسی شرابی، جواری، ناکارہ و ناکام، غلط رو اور گمراہ شخص کی زندگی نہیں تھی جو معاشرے کے لیے داغ ندامت ہو۔ جو مر جائے تو خلق کی جان کا عذاب ختم ہو اور کہنے والے کہیں کہ خس کم جہاں پاک۔ نہیں، مجھے تو اس زندگی سے بہت کچھ حاصل کرنا تھا۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ جینے کا حق، انصاف، انسانیت کا احترام اور آدمی کی عزت۔ مجھے اس زندگی کے ہر لمحے سے ایک مشن کی تکمیل کی خاطر بھرپور استفادہ کرنا تھا اور یہ مشن تھا دلاور، چیمہ اور حاجی عبداللہ جیسے لوگوں کے جرائم کی پردہ دری۔ مجھے اپنی بساط کی حد تک انہیں ہر غلط کام سے روکنا تھا اور ہر غلطی کی سزا دلوانی تھی۔ ان سے اپنے اور دوسروں کے غصب شدہ حقوق حاصل کرنے تھے۔ مجھے اپنے والد کے قاتلوں کو تختہ دار تک پہنچانا تھا اور وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کا کنٹرول حاصل کرنا تھا۔ مجھے اجڑے گھر بسانے تھے اور بچھڑ جانے والوں کو تلاش کرنا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ کرنے کے لیے مجھے طاقت سے زیادہ اپنی عقل پر انحصار کی ضرورت تھی۔ یہ تسلیم کرنا ضروری تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں دلاور کا مقابلہ بندوق کی گولی یا دولت کی طاقت سے نہیں کیا جا سکتا۔ وہ پہلے بھی کمزور حریف نہیں تھا مگر اب تو پہلے سے زیادہ طاقتور ہو گیا تھا۔ اس کے مادی وسائل، اس کا اثر و رسوخ، اس کی قوت خرید، اس کی بدمعاشی کا دائرہ، اس کی دولت کی زنجیر سے بندھے ہوئے شکاری کتے، ان سب کا مقابلہ ہم جذبات کے اندھے پن کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر میں سینہ تان کے اس کو للکارتا کہ ہمت ہے تو مجھے گولی مارو، کھا دلاور تو وہ کتنا اچھا ہی! اپنے سکندر اعظم آپ کہتے ہو تو پھر لیجیے ہے اسے بہادری نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی عقل کی جذباتی کمزوری ہی آدمی کو ... یہی ہے ... دشمن کو اپنی وجہ جذباتی ... کہ وہ خودکشی کرلے۔

میں کمزور ... کہ اس وقت میں ایک قدم آگے بڑھاتا تو زندگی کی سرحد عبور کرجاتا۔ کسی تذبذب کے بغیر دلاور مجھے شوٹ کردیتا اور میرے جسم میں ہونے والے ایک سوراخ سے میرا خون ہی نہیں میرے مستقبل کے سارے ارادے بھی خاک میں مل جاتے۔ میں کسی گمنام قبر میں جا لیٹتا۔ اپنے والد کی طرح۔ دلاور ایسے ہی اپنی دادا ... کے دعوؤں کے ساتھ زندہ رہتا اور زمین پر غرور و نخوت سے گردن اکڑا کے چلتا ... اور غالب دنیا سے پوچھتے پھرتے کہ کوئی تو بتادو سکندر کہاں گیا جو ہمیں تلاش کرنے نکلا تھا۔ رابعہ خاک بسر راہ گزاروں سے سوال کرتی۔ ☆

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی

دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

... ایک ... لمحہ تھا جس نے میری زندگی کی راہوں کا ... میں نے ... اپنے ذہن کو جذبات کے جالوں سے آزاد ہوتا محسوس کیا۔ میں نے ٹھنڈے دل اور دماغ ... دلاور سے مذاکرات اور گفت و شنید کی اہمیت کو تسلیم کیا ... کیا کہ طاقت کے توازن کو نئی بنیادوں پر استوار ہونا ہے۔ اگر دلاور اینڈ کمپنی کے پاس دولت کی طاقت ہے تو دوسری ... ہم ذہانت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ منافقت کا مقابلہ ... سے کیا جائے۔ مصلحت اور مصالحت کے ساتھ حالات ... نظر رکھی جائے اور اپنی حکمت عملی کو دشمن کی ... کے کمزور پہلو دیکھ کر مرتب کیا جائے تو بازی پلٹ سکتی ہے۔

حالات بدل چکے تھے۔ وقت کے تقاضے ... اور ... دشمنی کا ... دوستی اور دشمنی کی قدریں بدل رہی تھیں چنانچہ ... تھا کہ ہم بھی اپنے لائحہ عمل پر نظرثانی کریں۔ اگر دلاور میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے تو اس کی منافقت کو سمجھتے ... اس کا ہاتھ نہ جھٹکوں۔ میں سکندر رہتے ہوئے بھی ... انداز فکر اختیار کرلوں۔ دشمن کے قلعے میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ قلعے کے اندر کا نقشہ معلوم ہو۔ دلاور کیا ... اور کیا کرتا ہے جاننے کے لیے ضروری ہے کہ میں ... اسی طرح رسائی حاصل کروں جیسے دشمن کا ... کے اہم رازوں تک رسائی کے لیے ہر ممکن ذہنی و ... صلاحیت کا استعمال کرتا ہے۔

بظاہر میں چار افراد پر مشتمل پولیس پارٹی پر نظر جمائے کھڑا تھا ... میں سے آدھے اپنی وردی کے تمام اختیارات، اپنا ایمان اور ... سب چوہدری دلاور کی دولت کے عوض گروی رکھنے کے بار ... جان ... تھے۔ جو باقی بچے وہ ماتحت تھے اور ... پھٹی آنکھوں ... اپنے افسران کی لاشوں کو دیکھ رہے تھے یا چوہدری دلاور کے ہاتھ ... نظر آنے والے اس فولادی کھلونے کو گھور رہے تھے جس سے ... ہونے والی دو ... گولیاں ... ایک ... اس میں تبدیلی ... تھی۔ ... یہ سوال ہوگا کہ کیا اب ان کی باری ... چوہدری دلاور صاحب جو آج تک ایک آقا اور ... کے روپ میں دکھائی دیتے تھے اچانک ... ان کی ... تھے کہ وہ ... زندگی جیسی انمول نعمت کو بے دام چھین لیں گے۔

اس ... آبادی میں ... ایک دوسرے سے فاصلے پر تھیں ... سے سنائی دینے والی فائرنگ کی آواز ... کو ... تھی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ اگر ... اپنے دشمن کو ... تو اچھا کیا۔ اگر کسی نے خوشی کا ... کرتے ہوئے ... ہوائی فائر کیے تو تعریف کیا اور ... نشانے بازی ملی اپنے اسلحے کی کارکردگی کو چیک کیا تب بھی غلط نہیں کیا۔

"آؤ جی اپنے سکندر صاحب" چوہدری دلاور نے بڑے بے تکلف اور دوستانہ انداز میں خوشدلی سے کہا "مرنے والے مردود ... ان کی فاتحہ نہ درود۔ ان کا غم مت کرو۔ ہیں جی۔ کام کرنے والے بندے تھے کام آگئے۔ جیسے یہ ریوالور کام کی چیز ہے۔ گولیاں تو اس میں خرچ ہوتی ہیں نا جی۔ ایسی کون سی مہنگی چیز ہوتی ہے ان لوگوں کی جان جو خود کو بیچتے پھرتے ہیں اور خرید لیں گے بہت بکاؤ مال ہے بازار میں۔"

میں نے خود پر قابو پا کے بڑی مشکل سے کہا "مگر چوہدری صاحب..."

میرے لہجے کی تبدیلی کو دلاور نے فوراً نوٹ کرلیا "اپنے سکندر صاحب، یہ وہ کتے ہیں بکنے والے لوگ ایسے ہی انجام کے مستحق ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں بار بار سمجھایا تھا کہ تم جس بندے کو لینے جارہے ہو وہ کوئی ویسا نہیں ہے اور معمولی آدمی بھی نہیں ہے۔ عزت دار آدمی ہے اور بڑا آدمی ہے۔"

میں نے کہا "میں سمجھا نہیں دلاور آخر کیا مجبوری ہے تمہاری کہ تم میرے منہ پر ایسی باتیں کررہے ہو!"

"سب سمجھ جاؤ گے بادشاہو۔" وہ خوش دلی سے بولا "وقت بڑا ظالم استاد ہے۔ اس نے چوہدری دلاور کو بہت کچھ سکھایا ہے۔ ہمارے کس بل نکال دیے ہیں جی۔ شاید تم بھی سمجھ لوگے کہ تم نے دلاور کو سمجھنے میں غلطی کی یا بہت دیر کی۔ ورنہ یہ سب کچھ نہ ہوتا۔۔۔ جو کل تھا وہ آج نہیں ہے۔"

میں نے کہا "سوائے اس کے کہ ہم کل بھی دشمن تھے، آج بھی ہیں۔ اور کل بھی رہیں گے۔ مگر یہ ٹھیک ہے کہ بڑے آدمی چھوٹی چھوٹی باتوں پر دشمنی کو تماشا نہیں بناتے۔ میں نے تمہیں ہمیشہ ایک بڑا اور بہادر دشمن تسلیم کیا ہے۔ مجھے امید ہے تم نے مجھے دھوکے سے ہلاک کرنے کے لیے اغوا نہیں کیا ہوگا۔ ورنہ تم جانتے ہو تو تمہارا انجام کیا ہوگا۔"

دلاور میری بات پر خوش ہوا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کو میرے خیالات میں تبدیلی اس حد تک نمایاں نظر آئی کہ وہ شک میں مبتلا ہو جائے یا غلط فہمی میں کہ میں ڈر گیا ہوں۔

"چلو اوئے تم دونوں ایسے شکلیں بنا کے مت کھڑے رہو۔" چوہدری دلاور نے اپنی جیب سے سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کے ان کی طرف اچھال دی۔

دس ہزار روپے دو لاشوں کے درمیان گرے۔

"کیا یہ کم ہیں؟ چلو یہ لو" اس نے دوسری گڈی بھی پھینک دی۔ "فٹافٹ اپنا کام شروع کرو۔ کام پتا ہے نا؟ ایک تو اپنا منہ بند رکھنا ہے۔ سمجھے؟ تم نے کچھ نہیں دیکھا اور کچھ نہیں سنا۔ کچھ کیا بھی نہیں۔ رات کو پھر اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو جانا۔ کوئی بھی تم سے سوال نہیں کرے گا۔ دوسرا کام ہے ان بندوں کو غائب کرنا۔ ... پہنچے

www.paksociety.com

کچا کنواں ہے۔ اس میں ڈال کے مٹی بھر دو۔ مٹی بھی ہے اور وہیں سب سامان بھی مل جائے گا۔ زمین برابر کر کے گھر جاؤ یا چاہو تو پہلے نہا دھو لو ادھر ہی۔"

دوسری گڈی حوالدار کی لاش پر گری تھی۔ میں نے ایک سپاہی کو آگے بڑھ کر دس ہزار کے نوٹ اٹھاتے دیکھا مجھے اس کے چہرے پر عجیب سی غیر انسانی خوشی اور کمینگی نظر آئی۔ پھر دوسرا سپاہی آگے بڑھا اور اس نے جھپٹ کے دس ہزار روپے اٹھائے۔ اپنی خوش نصیبی کا یقین ان کے لیے دوہری مسرت کا باعث تھا۔ وہ زندہ تھے اور انہیں توقع سے کہیں زیادہ مل گیا تھا۔ شاید یہی رقم ان کے افسران تقسیم کرتے تو تین چوتھائی خود رکھتے اور انہیں ایک چوتھائی ملتا۔ وہ ہوس کے مارے ہوئے کمینہ خصلت اور ضمیر فروش لوگ تھے ورنہ دلاور کے زر خرید کیوں ہوتے۔ انہیں کوئی دکھ نہ تھا کہ دو انسان جو کچھ دیر پہلے ان کے ساتھ تھے اور ان ہی جیسے تھے اب مردہ جسم ہیں جن کا ٹھکانا وہی زمین ہے جو ازل سے اپنی بھوک مٹانے کے لیے لاشوں کو نگلتی جا رہی ہے مگر پھر بھی بھوکی ہے۔

میں اسی وقت جب میں پلٹ کے دلاور کے ساتھ اندر جانے والا تھا میری نظر بھٹک گئی۔ میں نے حوالدار کی اور پھر سب انسپکٹر کی لاش کو دیکھا۔ دونوں سپاہی ان کی بغلوں میں ہاتھ دے کر انہیں اٹھا چکے تھے اور گھسیٹ کر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

چودھری دلاور نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "آؤ بھائی سکندر اعظم صاحب! اندر آؤ میرے ساتھ۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے ہوش سے کام لیا۔ جوش میں بندے کی مت ماری جاتی ہے تو بندہ خود بھی مارا جاتا ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "سچ فرماتے ہیں آپ۔ مرنا تو ایک بار ہی ہوتا ہے سب کو مگر کیڑے مکوڑوں کی زندگی گزارنے والے تو بار بار مرتے ہیں۔ نہ مر کے جیتے ہیں اور شاید جیتے ہی مرنے کے لیے ہیں۔"

چودھری دلاور نے سر کھجایا "اب بھئی سکندر صاحب! آپ تو پڑھے لکھے بندے ہیں جی۔ ہم ٹھہرے ان پڑھ۔ اتنا فلسفہ نہیں جانتے۔"

میں نے کہا "دلاور اس سے پہلے کہ تم کو غصہ تمہیں کوئی ایسا قدم اٹھانے پر مجبور کرے جس سے ناقابل تلافی نقصان ہو جائے میں تمہیں بتا دوں کہ تمہیں مار کے خود مر جانا ہر وقت میرے اختیار میں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس وقت بھی جب تم خالی ہاتھ میرے ساتھ چل رہے ہو اور تم نے ریوالور بھی جیب میں ڈال لیا ہے، تمہاری جان کی حفاظت کرنے والے پوری طرح چوکس ہیں۔ میں انہیں دیکھ نہیں سکتا مگر وہ ہر سمت سے مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہوں گے۔ میں بڑی آسانی سے تمہاری گردن توڑ سکتا ہوں مگر اس کے بعد ہر سمت سے آنے والی گولیاں مجھے بھی چھلنی کر دیں گی۔ ابھی میرا موڈ مرنے کا نہیں ہے اس لیے تم محفوظ ہو۔ مگر مجھے خوف زدہ کرنے کی یا بلیک میل کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

وہ خاموشی سے سنتا رہا اور میرے ساتھ چلتے ہوئے زیر لب مسکراتا رہا۔ اس کا رویہ میرے لیے خاصا پراسرار و حیرت ناک تھا۔ میری نگاہیں اس عالی شان کوٹھی کی آرائش کو دیکھنے کے بجائے ان لوگوں کو تلاش کر رہی تھیں جو چودھری دلاور کی حفاظت پر مامور تھے مگر سامنے آئے بغیر اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔

اس سے پہلے میری اور چودھری دلاور کی ملاقات کئی بار ہو چکی تھی اور ہر بار اس کی فطرت کی سفاکی اور عیاری کا کوئی نیا پہلو بے نقاب ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بہت بڑا اداکار ہے اور اس سے بھی بڑا ہدایت کار ہے۔ اس نے متعدد بار ایسے ڈرامے پیش کیے تھے جو حقیقی زندگی کا منظر لگتے تھے اور چودھری دلاور کی ذہنی ذہانت کا ثبوت تھے۔ وہ بے مقصد کچھ نہیں کرتا تھا۔ ابھی جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ بھی چودھری دلاور کی فطرت اور سوچ کی کامیاب عکاسی کرتا تھا۔ ایک جگہ دلاور مجھ سے جدا ہو گیا اور دو محافظ میرے ساتھ ہو گئے۔ میں خاموشی سے چلتا رہا۔ گزشتہ چند دنوں کے واقعات کا ہر نقش میرے ذہن میں تازہ تھا۔ ہمارے مشرقی پاکستان سے لوٹ آنے کے بعد بہت کچھ ہوا تھا جو ناقابل فہم تھا۔ محسن اور گل کراچی ائیرپورٹ پر اتر کے غائب ہو گئے تھے اور اخبار میں خبریں آئی تھیں کہ گل نے پھر ڈاکوؤں کے اس گروہ میں شمولیت اختیار کر لی ہے جس کا سرغنہ کبھی اس کا بھائی جیمس ہاک تھا اور وہ گل یاقوت دوبارہ ناگ منی بن گئی ہے۔ یہ ناقابل یقین تھا مگر سچ نظر آتا تھا۔ غالب کو نازو کے ساتھ ہی ایم این اے ہاسٹل سے اغوا کر لیا گیا تھا اور ابھی تک ان کا کہیں بھی سراغ نہیں ملا تھا۔ پیڈرو مسلسل ہمارے تعاقب میں تھا اور اس نے ہمیں ہراساں رکھنے کی پالیسی کے تحت پہلے آفریدی کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا تھا پھر ریسٹ ہاؤس میں دھماکا کیا تھا۔ بظاہر اس کا مقصد ہمیں ختم کرنا تھا مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ پیڈرو کو واضح ہدایات تھیں کہ ہمیں نقصان نہ پہنچے اور یہ ہدایات دینے والا چودھری دلاور کے سوا کون ہو سکتا تھا۔ آخری کارروائی رابعہ اور کاجل کا اغوا تھا جن کے ساتھ آصف علی کے بیوی بچے بھی اٹھائے گئے تھے اور یہ اضافی فائدہ دلاور کو ایک کمینے بد زبان اور احسان فراموش شخص کی وجہ سے حاصل ہوا تھا جسے آصف علی نے بیٹا بنا رکھا تھا۔

شاید اب وقت آ گیا تھا کہ چودھری دلاور کسی ماہر پتے باز کی طرح ترپ کے سب پتے سمیٹ لینے کے بعد مجھ سے پوچھے کہ اب بولو، بازی جاری رکھو گے یا ہار مان کے پتے پھینک دو گے۔ اس نے مجھے ہر طرف سے محصور کر لیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ جب تک میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا اس کی زندگی سکون سے نہیں گزرے گی۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجھے خریدا نہیں جا سکتا، خوف زدہ نہیں کیا جا سکتا اور کسی طرح بھی اپنے اصولوں سے منحرف نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایم آر

نہیں توڑ سکتا تھا تو ان رشتوں کو کیسے ختم کر سکتا تھا جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھے۔ وہ محسن، غالب، ابدال یا نازو کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے خاتمہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے یقین اور اعتماد کا رشتہ ایک ایسی زنجیر تھا جسے وہ اپنی تمام قوت کے ساتھ ساری عمر توڑنے کی کوشش کرتا رہتا تو بھی دم ختم ہو جاتا مگر دیوار پر خراش تک نہ آتی۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ دلاور کے پاس مجھے جواب دینے کے لیے کیا ہے۔ وہ بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر کون سی نئی پیشکش کرتا ہے۔ وہ اور کیا چاہتا ہے اور کن شرائط پر۔ اور اس نے دشمنی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو کیا سوچ کے ایسا کیا ہے۔ میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ پرسکون تھا اور آہستہ آہستہ خود کو نئے حالات کے لیے تیار کر چکا تھا۔ مجھے یہ بات بھی بعید از ذہن دکھائی نہ دیتی تھی کہ وہ باری باری رابعہ کو، نازو کو، غالب اور ابدال کو، محسن اور گل کو اور ان سب کو میرے سامنے لائے جو میرا ساتھ دینے کی پاداش میں آج تک آلام و مصائب کا شکار رہے تھے۔ ان سب نے بہت دکھ جھیلے تھے۔ تشدد برداشت کیا تھا اور وفاداری کے رشتے کی آبرو پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ ان کو میرے سامنے اذیت دے کے ہلاک کرتا جائے۔ میرا حوصلہ توڑنے کے لیے، میری برداشت کی طاقت کا امتحان لینے کے لیے۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ میرے اعصاب نے گردش حالات کا اثر کس حد تک قبول کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ لوہا بھی تپ کے فولاد ہو جاتا ہے مگر گوشت پوست کے انسان کے اعصاب فولادی نہیں ہوتے۔ مسلسل سختی ایام، تلخی اوقات، ہجوم رنج و تشدد، شب و روز کا ذہنی و جسمانی عذاب اور اذیت انتہائی مضبوط قوت ارادی رکھنے والے ناقابل شکست انسان کو بھی اندر باہر سے توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ وہ مقابلے کی ہمت سے محروم ہو جاتا ہے اور ذہنی ناامیدی سے مغلوب ہو جائے تو آزمائش کے نام سے بھی خوف کھاتا ہے۔

ابھی میں نے حوصلے میں کوئی کمی محسوس نہیں کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں ایک بار پھر اس اعصاب شکن اور استبداد سے گزر سکتا ہوں جو لندن سے میری آمد کے ساتھ شروع ہوا تھا اور میرے مشرقی پاکستان سے لوٹ آنے کے بعد بھی اختتام پذیر نہیں ہوا تھا مگر مجھے یہ اندازہ ہونے لگا تھا کہ سب کی کیفیت ایک سی نہیں ہو سکتی۔ سب کی قوت برداشت ایک سی نہیں ہو سکتی تھی۔ انسان کسی فیکٹری نے تیار کی ہوئی مشین نہیں ہوتا کہ ایک ہی ڈیزائن اور ماڈل کے ہزاروں لاکھوں نمونوں کی کارکردگی میں سر مو فرق نہ ہو۔ رابعہ نے سب سے پہلے حالات سے سمجھوتا قبول کیا تھا اور کاجل تردد کے بغیر اس سے پہلے ہی ہتھیار ڈال چکی تھی۔ محسن کا زور بھی ٹوٹ گیا ہوگا۔ کاجل کے اعصاب بھی منتشر ہو چکے تھے۔ صرف غالب اور نازو نے ابھی شکست کو قبول نہیں کیا تھا۔

جب تک جنگ جاری تھی میں ذہنی طور پر صدمہ جھیلنے کے لیے ہر وقت تیار تھا مگر کیا اب بھی یہ ممکن ہوگا کہ میں وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں جس کا تصور بھی مجھ پر لرزہ طاری کر دیتا تھا۔ کیا میں رابعہ کے ساتھ انسانیت سوز درندگی کے کسی مظاہرے پر خاموش رہ سکوں گا۔ محسن، غالب یا نازو کو تشدد سے ہلاک ہوتا دیکھ کے بھی میرے ارادوں کی استقامت باقی رہے گی؟ اگر اس نے ایک ایک کو میرے سامنے تھوڑا تھوڑا کر کے قتل کیا تب بھی میں اپنے اصولوں پر ڈٹا رہوں گا اور ان سب کو گنوا دینے کے بعد بھی اپنے نظریات پر قائم رہوں گا؟ نقصان کچھ بھی ہو میں دلاور سے کوئی سمجھوتہ نہیں کروں گا اور کسی قیمت پر بھی اپنے ضمیر کا سودا نہیں کروں گا؟

ان سب سوالات کا جواب میرے ذہن میں بہت واضح تھا۔ نہیں، میں آخری انتہا سے بہت پہلے ہی ہار مان لوں گا۔ اگر دلاور مجھ سے اور صرف مجھ سے کہے کہ اے سکندر اعظم میں تم کو دس سیکنڈ دیتا ہوں مجھ سے میری شرائط پر صلح کر لو ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ تو میں بے خوفی سے مسکراتے ہوئے کہہ سکتا ہوں کہ دس سیکنڈ کیوں ضائع کرتے ہو دلاور، پانچ سیکنڈ میں اپنا ریوالور مجھ پر خالی کر دو۔ لیکن خود زندہ رہتے ہوئے اپنے سب دوستوں اور ساتھیوں کو مجرم عذاب موت سے ہمکنار کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ میں جانتا تھا کہ بلند بانگ دعوے کرنا اور بات ہے، عملاً ان پر پورا اترنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ جو کروڑوں میں ایک، صدیوں بعد سقراط یا حسین ہوتے ہیں وہ میرے جیسے عام انسان نہیں ہوتے۔ انہیں صبر و رضا کے ساتھ ظلم و استبداد کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت کے علاوہ عفو و درگزر کی الہامی صفات عام انسانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ میرا شمار ان میں نہ تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب محافظوں کے ساتھ میں اس کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں پہنچا تو میرے ذہن میں کوئی انتشار نہ تھا۔ میں کسی کنفیوژن کا شکار نہ تھا اور میری قوت فیصلہ ہر قسم کی صورت حالات سے نمٹنے کے لیے تیار تھی۔ اس ملاقات سے مجھے دوسری جنگ عظیم میں جاپان کی شکست کے بعد شہنشاہ اور امریکی جنرل کی ملاقات یاد آ گئی جو ایک بحری جہاز پر ہوئی تھی۔ میں نے اس کی فلم دیکھی تھی۔ فاتح جنرل اپنے مصنوعی غرور و فتح مندی کے باوجود شہنشاہ کے وقار اور حوصلے کو شکست نہ دے سکا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ جاپانیوں نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ جنگ ہارے تھے ہمت نہیں۔ آج پھر امریکا ہی ان کا دست نگر ہے۔

کوٹھی میں مکمل خاموشی تھی۔ یہ آسیب زدہ ویرانی کا تاثر میرے احساس کے خانے سے پیدا ہوا تھا یا دلاور نے خوف کی فضا کو مجھ پر مسلط رکھنے کے لیے اس کا اہتمام کیا تھا۔ یہ طے کرنا مشکل تھا۔ میں نے بے خیالی میں ان سب اشیا کو دیکھا جو سجاوٹ کے لیے دنیا بھر سے لا کے اکٹھی کر دی گئی تھیں۔ نوادرات۔ آرائش

www.paksociety.com

ظروف، مصوری کے نمونے، کرسٹل کے فانوس اور لیمپ، قالین اور صوفے جو بعض معدنوں کی دستکاری کا شاہکار تھے۔ معلوم نہیں یہ کوٹھی کس کی تھی اور دلاور کے استعمال میں کیوں تھی۔ جب دولت کی ریل پیل ہو تو ساری دنیا خود اپنی ہو جاتی ہے۔ ہر ملک اور ہر شہر میں ہر کوٹھی، اسباب عیش، سامان نشاط، آرٹ اور ثقافت کے نمونے۔ مونالیزا کی مسکراہٹ سے خود مونالیزا تک سب اسی کو ملتا ہے جو قوت خرید رکھتے ہیں۔

دلاور اچانک اندر آیا اور میرے سامنے پہنچ کے رک گیا "مجھے پتہ ہے ایسا لگتا ہے کہ تم کچھ سیانے ہو گئے ہو۔"

میں نے کہا "ہاں، جب تم دولت سمیٹنے میں مصروف تھے تو میں تجربہ حاصل کر رہا تھا جو عقل کی کسوٹی ہے۔"

"دولت کیا عقل کے بغیر ہی حاصل ہو جاتی ہے؟" وہ ہنسا "بھئی میں تو پہلی بار دیکھ رہا ہوں کہ تم آتش فشاں نہیں بنے ہوئے ہو اور نہ چالاکی چلانے بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ ہیں جی۔ بھول گئے ہو ساری سختی، ورنہ تم اور وہ تمہارا ہونے والا... کیا نام تھا اس کا شیروانی۔ بڑا خیال ہے مجھے مل کے۔"

میں نے کہا "تم نے مل کے ڈرایا بھی بہت تھا تم کو۔"

"پتہ ہے اس کا، آج کل کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ ہم نے تو سنا تھا ڈاکے ڈال رہا ہے کسی نئی لڑکی کے ساتھ مل کے۔ وہ پہلے بھی ڈاکو تھی۔ اپنی لائن پر لگا دیا اس نے تمہارے یار کو۔ پہلی بیوی کے مرنے کے بعد پاگل ہو گیا تھا نا، اس کا اثر ہے شاید۔ وہ بھی کون سی شریف زادی تھی۔ کسی کلب میں ڈانسر تھی شاید۔ اور کرسچین تھی، بھاگی ہوئی تھی۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ ان باتوں کا مقصد مجھے اشتعال دلانا ہے اور غالباً وہ میرے ظاہری پرسکون رویے سے کچھ پریشان ہے۔

میں نے کہا "بولتے رہو، میں سن رہا ہوں۔ تمہیں اجازت ہے کہ رابعہ پر تبصرہ کرو یا اس کے کردار پر۔ غالب اور نازو کے بارے میں انکشافات کرو۔ تم جو چاہو کہو، یہ تمہارا گھر ہے۔"

اٹھارہ بیس سال کی ایک لڑکی چائے کی ٹرالی کو بڑی نزاکت سے دھکیل کر لائی۔ اس کی صورت، اطوار اور لباس سب اس کے بنگالی ہونے کی چغلی کھاتے تھے۔ اپنے سانولے رنگ کے باوجود وہ بے حد دلکش تھی اور اس کا گدرایا ہوا بدن ہر پہلو سے دعوت نظارہ دیتا تھا۔ اس کے کھلے بال کمر سے نیچے تک پہنچتے تھے۔

"جیسے تم کاجل کو ترس کھا کے اپنے ساتھ لے آئے ہو۔" دلاور نے طنز سے کہا "ایسے ہی یہ میرے ساتھ آ گئی ہے۔ اچھی چیز ہے نا؟"

میں اس ٹالی کو پی گیا "ہیں ایک ہی چیز لائے ہو۔ مال تو بہت تھا وہاں، اور تمہارے پاس پیسہ کم نہیں تھا۔"

دلاور کے چہرے پر تاریک سایہ سا آ کے گزر گیا۔ میں نے بات کا جواب بات سے دیا تھا مگر غالباً میری بات میں سچ کی کڑواہٹ شامل ہو گئی تھی۔ دلاور کی بات میں جھوٹ تھا جو مجھے ناگوار گزرا تھا مگر اچانک اس نے اپنے ردعمل سے اعتراف کر لیا کہ غدار وہ خانہ جنگی کے حالات سے ایک فائدہ حاصل کرنا نہیں بھولا تھا۔ "یہ وہ آگ تھی بہت سی بھولی بھالی نوجوان لڑکیوں کو تحفظ اور عافیت کا جھانسہ دے کر خرید لیا تھا جن کو وہ اپنے ناجائز مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا سکتا تھا۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ یہاں وہ سب غریب لڑکیوں کی خانہ آبادی کے کار خیر سے شہرت بھی پا سکتا تھا اور انہیں اپنی ضرورت کے لیے سکہ رائج الوقت کے طور پر بھی استعمال کر سکتا تھا۔ اس جیسے ضمیر فروش کاغذ کے نوٹ اور عورت کے جسم کو رشوت میں دیتے یا لیتے وقت کسی تکلف سے دوچار نہیں ہوتے۔

ذرا سی دیر کے لیے میرے لہو کی حرارت بڑھی اور میں نے سوچا کہ دلاور کی گردن دبوچ لوں اور اس سے پوچھوں کہ دنیا کے سب شیطانی دھندے کیا کم منافع بخش تھے کہ وہ بردہ فروش بھی بن گیا۔ کیا اسے بالکل خیال نہیں آتا کہ آج نہیں تو کل اس کی بیٹیاں ایسی ہی ہوں گی۔ بے گھر ہونے والی لڑکی کیا ہے؟ آبرو ہوتی ہے اور وہ بھی اپنے ہم وطن اور ہم مذہب لوگوں کے سامنے، جو دولت سے انہیں گھر نہیں دیتے جنس بازار بنا دیتے ہیں۔ مگر میں نے خود کو یاد دلایا کہ میرا انتخاب عمل کسی جذباتی ردعمل کا نتیجہ ہوگا تو میں عقل کے سارے فوائد سے محروم ہو جاؤں گا۔

وہ لڑکی چلی گئی تو میں نے ایک گہری سانس لے کر چائے کا کپ اٹھا لیا "مجھے امید ہے تم نے اس میں زہر نہیں ملایا ہو گا۔"

چوہدری دلاور کے ماتھے کی شکنوں میں کمی آ گئی "اگر تمہیں مارنا ہی میرا مقصد ہوتا اپنے سکندر صاحب، تو اپنے ایمان سے کہو کیا یہ کوئی مشکل کام تھا؟ ہیں جی۔ ایک بندے کے لیے ایک گولی بہت ہوتی ہے اور گولی چلانے والے تو کرائے پر ملتے ہیں۔ لیکن تم کو میں نے ہمیشہ ایک بچہ سمجھا۔ ایک بگڑا ہوا، روٹھا ہوا، سرکش اور باغی بچہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات مجھے غصے میں خیال بھی رہتا تھا کہ تمہاری اور میری عمر میں بہت فرق ہے۔ تم وزیر خان کے بیٹے ہو اور میں وزیر خان کا ساتھی تھا۔ بے شک میں نے اس کے ساتھ جو بھی کیا، غلط تھا۔ اسے تم میرا گناہ یا میرا جرم جو چاہو سمجھو، تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ مجھ سے انتقام لو۔ میں نے تمہارے والد کے ساتھ ظلم کیا، تم مجھ پر ظلم کرو۔"

میں نے محسوس کیا کہ ایسی باتوں سے میری قوت برداشت کسی بھی لمحے جواب دے سکتی ہے "کیا تم مطلب کی بات نہیں کر سکتے؟"

"ہاں، مطلب کی بات کے لیے ہی یہ اعتراف کر رہا ہوں تمہارے سامنے کہ میں مجرم ہوں تمہارا۔ بہت پہلے بھی میں نے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہا تھا۔ میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا، جس سے تمہارے جذبات کی آتش فشانی ختم ہو سکتی، لیکن تم انتقام کے راستے پر نکل گئے اور معاملات اس حد تک بگڑ گئے

کہ ہم دشمن بن کے ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ حالانکہ تمہاری کیا دشمنی۔ میں کچھ ہی کم تھا عمر میں وزیر خان سے، عمر میں بہت بڑا ہوں۔ میں، میر شرافت علی اور وزیر خان ایسے تھے جیسے تم، محسن اور غالب ساتھی ہو۔"

"بکواس بند کرو اپنی" میں نے چلا کے کہا "کس منہ سے تم ایسا دعویٰ کرتے ہو۔ تم قاتل ہو میرے باپ کے، میر شرافت علی کے۔ تم موازنہ کرتے ہو اپنی ذلالت کا ہماری رفاقت سے۔ ہاتھ اپنے ساتھیوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لیے جان کا نذرانہ دینا دوستی کا بہت معمولی حق سمجھتے ہیں۔"

"غور سے میری بات سنو اپنے سکندر اعظم صاحب" اس نے ماتھے پر ہاتھ پھیر کے شکنیں ہٹاتے ہوئے کہا "میں کوئی دعوے نہیں کر رہا ہوں۔ میں آج ایک سال کے بعد خود کو تمہاری عدالت میں پیش کر رہا ہوں۔"

"بہت خوب عدالت ہے یہ جہاں مجھے سزائے موت دینے کو مجرم کی طرح لا کے بٹھا دیا گیا ہے۔ میرے چاروں طرف زرخرید قاتل ہیں جن کی بندوقوں کی نالیوں کا رخ میری طرف ہے اور یہاں تم کہتے ہو کہ منصف بن کے میں تمہیں انصاف دوں۔ کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ تختہ دار پر کھڑے ہوئے مجرم سے کوئی جج کہے کہ تم بے گناہ ہو تو یہ پھندا گلے میں ڈال لو۔"

"سکندر میں تم سے یہ بات کروں گا، جب تم سمجھنے کے قابل ہو گے کہ ان حالات میں میرا اعتراف جرم کوئی ڈرامہ نہیں، حقیقت تھی۔ صورت حال پر غور کرو گے تو خود ہی سمجھ لو گے کہ میں کسی طرح بھی مجبور نہیں، مجبور تم ہو۔ تم اکیلے ہو اور تمہیں کسی معجزے کی امید بھی تمہارے کام نہیں آ سکتی۔ یہ طریقہ آزمانا بھی نہیں چاہتا ورنہ آج نہ سہی ایک ہفتے بعد تم کسی مرنے والے کتے کی طرح اپنے آپ کو گھسیٹ کے میرے قدموں تک لا رہے ہوتے اور میرے جوتوں پر ناک رگڑ کے رحم کی بھیک مانگتے، روٹی کا ایک ٹکڑا۔ اور کیا پتا رابعہ بھی کتیا کی طرح میرا تلوا چاٹ رہی ہو۔ اور نہ جانے کتنے اس کے..."

میں یہ کہنا بھول گیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے پرسکون رہ کے بات چیت کے ذریعے مسائل کو حل کرنے کا عہد کیا تھا۔ سینے میں ایک شعلہ سا بھڑکا اور دوسرے لمحے میں نے کسی درندے کی طرح چلاتے ہوئے اس پر حملہ کر دیا۔ یہ ثبوت تھا اس کا کہ میرے اعصاب معمولی سی اشتعال انگیزی کے بھی متحمل نہیں تھے۔ میرا خود اپنے آپ پر کنٹرول نہیں رہا۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ اس سے پہلے کہ میں دلاور تک پہنچتا، پیچھے سے رسی کا پھندا سا آ کے پڑا۔ بالکل اسی طرح جیسے امریکن کاؤبوائے گھوڑے پر بیٹھ کے کسی ... پکڑنے، گرفتار کرنے کے لیے پھینکتے ہیں اور ... سرکش جانور بے قابو ہو کے گر جاتا ہے۔

رسی نے مجھے ایک جھٹکے سے روک لیا اور حلقہ میری گردن میں تنگ ہوا تو میں واپس صوفے پر گرا اور میری سانس رک گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آ گیا لیکن میں نے بے حس ہونے سے پہلے پوری جدوجہد کی اور اپنے ہاتھوں سے رسی کا پھندا گردن سے نکال دیا۔ سانس آتے ہی میں پھر اٹھا۔ اس بار پیچھے سے میرے سر پر ڈنڈا مارا گیا۔ صوفے کے پیچھے کوئی نہ جانے کب سے موجود تھا لیکن مجھے معلوم نہ تھا۔

دلاور ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ محفوظ ہے اور اس کے محافظ مستعد ہیں۔ سر کی چوٹ نے مجھے ایک دم ناک آؤٹ کر دیا۔ ہوش آنے پر میں نے خود کو دوسرے کمرے میں پایا۔ یہ ایک آرام دہ بیڈ روم تھا جس میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ سر کی بھاری چٹان کو اوپر اٹھایا اور ہاتھ بڑھا کے بیڈ سائڈ پر رکھے ہوئے جگ سے منہ لگا کے پانی پیا۔ اس سے میری طبیعت بحال ہونے میں مدد ملی۔ جگ رکھتے ہوئے مجھے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر اسپرین کی گولیاں نظر آ گئیں۔ اس "حسن انتظام" پر دل ہی دل میں دلاور کو گالیاں دیتے ہوئے میں نے تین گولیاں نکال لیں اور آدھا جگ خالی کر دیا۔ تھوڑا سا پانی میرے کپڑوں پر اور بستر پر بھی گرا تھا۔ قالین کے خراب ہونے کی پروا کیے بغیر میں نے جگ کے باقی پانی سے منہ پر چھینٹے مارے اور پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

دس منٹ بعد میری طبیعت سر درد میں نمایاں کمی سے مزید بہتر ہوئی تو میں بستر سے اترا۔ کمرے میں دائیں بائیں دو دروازے تھے مگر وہ مقفل تھے۔ تیسرا دروازہ باتھ روم کا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پردے ہٹائے تو باہر کا اجلا منظر میرے سامنے پھیل گیا۔ میں اس کوٹھی کی اوپر والی منزل پر تھا اور لوہے کی جالی سے ایک سرسبز لان کو دیکھ سکتا تھا۔ لان پر قدرت قلابازیاں کھا رہی تھی اور اس سے کچھ فاصلے پر کاجل اداس بیٹھی تھی۔

میں نے چلا کے کہا "کاجل، قدرت...!"

لیکن یہ کھڑکی ایک کاریڈور میں کھلتی تھی، جس میں لمبائی کے رخ چھ سات فٹ چوڑا اور دس فٹ لمبا شیشہ نصب تھا اور میری آواز اس شیشے کی دیوار سے گزر کے لان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ کاریڈور کی چوڑائی دس فٹ سے زیادہ تھی اور کمرے میں ایسی کوئی چیز نہ تھی جو میں شیشے پر مارتا تو شیشہ ٹوٹ جاتا۔ میں نے گرل کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ اسے اکھاڑنا یا توڑنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں بیڈ کو توڑ دوں اور اس کی پٹی سے شیشے پر وار کروں مگر ایک تو پٹی صرف چھ فٹ کی تھی اور شیشہ کم سے کم ... دور تھا۔ پھر گرل کے خانے چھوٹے تھے اور پٹی ان میں ... نہیں ...

www.paksociety.com

سکتی تھی۔ جنگل کی الیش زدہ جنگل کا منظر ان سب سے مختلف تھے۔

میں نے کرسی توڑنے کا فیصلہ کیا اور اس کے بازو اور ٹانگیں الگ کر لیں... مگر مجھے اس وقت سخت مایوسی ہوئی جب لکڑی کے یہ ٹکڑے میں نے کرائی سے گزار کے شیشے پر مارے تو شیشے کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ لکڑی کے ٹکڑے اس سے ٹکرا کے کاریڈور میں گر گئے۔ ظاہر ہے چھ سات فٹ چوڑا اور آٹھ دس فٹ لمبا شیشہ جو دیوار میں نصب... تھا کوئی عام شیشہ نہیں تھا۔

میں نے بے بسی سے قدرت کو دیکھا وہ لان پر گول گول گھوم رہی تھی۔ پھر نیچے کسی دروازے سے رابعہ برآمد ہوئی اور اس نے کاجل کو بلا لیا۔ میرا چیخنا چلانا بے کار تھا۔ میری آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں غور سے ان کی صورتوں کو دیکھتا رہا۔ وہ اداس اور متفکر ضرور نظر آتی تھیں مگر جسمانی طور پر مستعد اور صحت مند تھیں۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کوٹھی میں وہ آرام سے تھیں اور ان کے ساتھ کسی قسم کا تشدد آمیز سلوک نہیں ہوا۔ تاہم ان کی یہاں موجودگی مجھے خطرات اور تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کی کمزوری تھے اور دلاور کو کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا فن آتا تھا۔

میں کھڑکی سے ہٹنے ہی والا تھا کہ لان پر عامر نمودار ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی مرضی سے وہاں نہیں آیا ہے۔ وہ چند قدم چل کے رکا اور پھر پلٹ کے دیکھنے لگا۔ شاید کسی نے اسے اور آگے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ پھر چند قدم چلا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی صورت پر ناگواری کے ساتھ مجبوری کی تحریر کو میں اتنے فاصلے سے بھی پڑھ سکتا تھا۔

"غور سے دیکھتے رہو اپنے سکندر اعظم صاحب"

یہ آواز کمرے کے اندر سے سنائی دی تو میں اچھل پڑا مگر میں نے پلٹ کے دیکھا تو بات کرنے والا نظر نہ آیا۔

"یہ بہت سرکش اور باغی لڑکا ہے۔ اور احسان فراموش بھی۔" چوہدری دلاور نہ جانے کہاں تھا مگر اس کی آواز چھت میں نصب اسپیکر سے صاف سنائی دے رہی تھی "اگر یہ تعاون نہ کرتا تو ہم اتنی آسانی سے تمہارے مہمانوں کو یہاں نہیں لا سکتے تھے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ رابعہ اور کاجل کہاں ہیں۔"

میں نے کہا "کیا تم میری آواز سن سکتے ہو؟"

"ہاں۔ میں تمہیں دیکھ بھی رہا ہوں خیر سے۔ اور ابھی جب تم کرسی توڑ رہے تھے تو میرا خیال تھا کہ تمہیں منع کر دوں۔ پھر میں نے سوچا کہ چلو تم بھی تھوڑا سا غصہ نکال لو۔ ایک کرسی کا کیا ہے۔"

میں نے کہا "یہی لڑکا تمہیں ناصر پور لے گیا تھا؟"

"مجھے نہیں، وہ میرے آدمی تھے۔ اس لڑکے نے ان کی مدد کی۔" دلاور بولا "اس نے کہا کہ ایک شرط پر میں رابعہ کو بھی لا سکتا ہوں اور کاجل کو بھی۔ الو کا پٹھا! اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کوئی شرط لگانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اسے پتے کی ضرورت تھی اور میں نے کہا تھا کہ اسے دے دیتا وہ چار لاکھ۔ مگر اس کے دماغ میں کچھ اور تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے پیسہ نہیں چاہیے۔ گھر میں ایک پاگل اور معذور لڑکی رہتی ہے۔ اس کو ٹھکانے لگا دو۔"

میرے منہ سے بے اختیار ایک غلیظ گالی نکلی "کمینہ حرام زادہ آصف علی کی ساری دولت حاصل کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے کوئی ذمے داری قبول کیے بغیر۔"

"ہاں جی۔ اس نے کہا تھا کہ بعد میں آصف علی اور اس بڑھیا سے وہ خود نمٹ لے گا۔"

"میں خود نمٹ لوں گا اس حرام زادے سے۔"

"کیا تم چاہتے ہو اسے سزا دی جائے؟" دلاور بولا۔

"میں چاہتا ہوں اسے عبرت ناک سزا دی جائے۔" میں نے کہا۔

"اچھا! پھر دیکھو تماشا اپنے سکندر اعظم صاحب"

میں نے پلٹ کے کھڑکی سے جھانکا۔ عامر اب بھی وہیں کھڑا ہوا تھا اور سخت برہم نظر آتا تھا۔ وہ نہ جانے کس سے مخاطب تھا۔ اچانک وہ واپس ہوا اور لان عبور کر کے اسی سمت آیا جدھر شاید دروازہ تھا۔ کاجل اور رابعہ بھی ادھر ہی سے آئی تھیں مگر میں نیچے کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دس فٹ کے کاریڈور کی چوڑائی درمیان میں حائل تھی اور میری نظر شیشے سے دکھائی دینے والے منظر تک محدود ہو کے رہ گئی تھی۔

مجھے عامر سے سخت نفرت تھی اور میں واقعی چاہتا تھا کہ اس محسن کش، ننگ انسانیت شخص کو سزا دے کر دریں عبرت بنا دیا جائے مگر دلاور کی بات نے مجھے پریشان کر دیا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ آخر دلاور کو مجھ سے یہ سوال کرنے کی ضرورت تھی۔ میں اپنا کام خود بھی کر سکتا تھا۔

اس کا جواب مجھے فوراً ہی مل گیا۔ عامر آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ پھر وہ خوف زدہ ہو کے پلٹا اور چند قدم دوڑا۔ لان تین طرف قد آدم جھاڑیوں کی سرسبز دیوار کی طرح استادہ تھی۔ اینٹوں کی دیوار ان کے پیچھے مکمل طور پر چھپ گئی تھی۔ بیچ میں شاید وہ راستہ تھا جس سے کوٹھی کے رہنے والے لان پر آتے جاتے ہوں گے۔ اس راستے سے ایک بھیانک شکل کا کتا نمودار ہوا۔ وہ بڑی تیزی سے عامر کی طرف لپکا۔

عامر خود کو بچانے کے لیے بھاگا مگر کتا اس سے زیادہ تیز رفتار تھا۔ ایک دیوار کے قریب پہنچ کے عامر نے جھاڑیوں پر چڑھنے اور دیوار عبور کرنے کی کوشش کی مگر کتے نے ایک جست لگائی اور اسے ٹانگ سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ عامر کی پنڈلی پر کتے کے دانت جما دیے تھے اور عامر یقیناً تکلیف میں تھا۔ دہشت زدہ ہونے اس نے کتے کا مقابلہ کیا۔ نیچے گرتے ہی اس نے تھوتھنی پکڑ کے کتے کو جھٹکا دیا اور لاتیں مارتے ہوئے اس کے خونی دانتوں سے اپنی ٹانگ چھڑالی۔ وہ اٹھ کے پھر بھاگا مگر کتا اس کے تعاقب میں رہا۔ زخم کے باعث عامر تیز دوڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ کتے نے اسے دوبارہ گرا لیا اور اب ان کے درمیان براہ راست جسمانی برتری کا مقابلہ شروع ہوا۔

میں سانس روکے اس مقابلے کو دیکھتا رہا جس میں ایک فریق انسان تھا اور دوسرا حیوان مگر وہ بقا کی جنگ میں درندے بن گئے تھے۔ عامر نوجوان آدمی تھا لیکن ایک شکاری کتے کے مقابلے میں وہ کسی شہ زور کا بس نہیں چلتا... اسے بچنے کے ساتھ دانت بھی استعمال کر رہا تھا اور عامر صرف ہاتھ... کتے کے پنجے بھی گوشت کو ادھیڑنے اور ٹکڑے کر کے چیرنے پھاڑنے میں تیز تھے۔ نتیجہ یہ کہ عامر لہولہان ہو گیا تھا اور بلا کی طرح چمٹ جانے والے کتے کے مقابلے میں آہستہ آہستہ اس کی مزاحمت کم ہوتی جا رہی تھی۔

میں دیکھ رہا تھا کہ عامر دہشت زدہ ہونے کے باوجود زندگی کے لیے لڑ رہا ہے۔ مدد کے لیے چیخ رہا ہے مگر اس کی سننے والے کان بہرے ہو گئے تھے اور جو اس کو بچا سکتے تھے وہ اس خونی تماشے کو بے بسی کے ساتھ دیکھنے پر مجبور تھے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ عبرت ناک سزا سے دلاور کی مراد کیا ہے ورنہ میں اس سے کچھ بھی نہ کہتا۔ ویسے بھی میں نے جو کہا تھا مجھے یہی کہنا تھا۔ میرے ذہن میں سخت ترین سزا جو عامر کو دی جا سکتی تھی یہ تھی کہ اس کی کھال میں بھس بھر دیا جائے۔ محاورے کے مطابق اور اسے پولیس کے حوالے کر کے... یا کل کی مار لگا کے رخصت کر دیا جائے۔ آصف علی اس سے لاتعلق ہو جائے۔

پشیمانی اور احساس جرم میرا عذاب بن گئے تھے۔ دلاور نے وہی کیا تھا جو وہ کرنا چاہتا تھا مگر اس کا سارا الزام مجھ پر آ گیا تھا۔ زندہ انسان کو بھوکے کتوں کے سامنے ڈلوانے کی بہیمانہ سزا نہ میں نے سنی تھی اور نہ بیسویں صدی کے مہذب معاشرے میں ممکن تھی۔ آج کل تو سزائے موت کے لیے پھانسی کا طریقہ بھی ظالمانہ سمجھا جاتا ہے اور الیکٹرک چیئر، گیس چیمبر اور انجکشن سے موت کی نیند سلانے کا مقصد یہی ہے کہ کم سے کم اذیت کے ساتھ سزائے موت کے فیصلے پر عمل درآمد ہو لیکن یہاں میری نظروں کے سامنے ایک جیتے جاگتے انسان کو ایک کتا اسی طرح شکار کر رہا تھا جیسے جنگل میں بھیڑیا کر سکتا ہے۔

اچانک میں نے عامر کو کتے کے چنگل سے نکلتے دیکھا۔ نہ جانے کیسے اس نے کتے کی گردن توڑ دی تھی۔ زخم توڑنے والا کتا پھڑک رہا تھا اور لہولہان زخموں سے چور عامر اپنے تار تار لباس اور دریدہ بدن کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ یہ بڑا بھیانک نظارہ تھا۔ میں نے دلاور کی ہدایت کاری میں تیار ہونے والی ایک اور دہشت ناک (HORROR) فلم کے رونگٹے کھڑے کرنے والا حقیقی سین دیکھا تھا جس نے میرے رگوں میں خون کو منجمد کر دیا تھا۔ یہ ایک خاموش فلم تھی۔ میں نے کتے کے غرانے اور عامر کی چلانے کی کوئی آواز نہیں سنی تھی مگر میرے ذہن میں ان آوازوں کی خیالی بازگشت موجود تھی۔

عامر کو جان بچا کے فرار ہوتے دیکھ کے مجھے دلی طمانیت حاصل ہوئی۔ میں زمانۂ قبل از مسیح کا رومن نہیں تھا جو تربیت یافتہ غلاموں (GLADIATORS) کو شیروں سے لڑاتے تھے اور اگر کبھی ہزاروں میں سے ایک غلام شیر کو ہلاک کر کے آزادی حاصل کر لیتا تھا تو وہ مایوس ہو جاتے کہ کھیل میں مزا نہیں آیا اور شیر جب غلام کو چیر پھاڑ کے رکھ دیتا تھا تو وہ خوشی کے نعرے بلند کرتے تھے۔ یہی تماشا وہ دو غلاموں کو لڑا کر بھی دیکھتے تھے۔ ایک مارا جاتا تھا دوسرا قتل کر کے آزادی کا انعام پاتا تھا۔ عامر کی جگہ میرا بدترین دشمن خود دلاور یا میرے باپ کا قاتل چوہدری ہوتا تو زیادہ سے زیادہ میں انہیں اپنے ہاتھ سے گولی مار سکتا تھا۔ اس سے بڑھ کے سفاکی اور بربریت کا مظاہرہ میرے لیے ممکن ہی نہ ہوتا۔

لیکن میرے سامنے جو کچھ ہوا ایک ایسے شکاری کا کھیل تھا جس کے انسانی وجود میں بیک وقت شیطان کی اور خونی درندے کی روح حلول کر گئی تھی۔ عین اس وقت جب عامر زندگی کی امید میں لان کو عبور کر چکا تھا ایک اور کتا نمودار ہوا۔ یہ پہلے والے کتے کی نسل کا تھا مگر زیادہ توانا اور خونخوار نظر آتا تھا۔ مایوسی کی جو کیفیت میں نے عامر کے چہرے پر دیکھی وہ یاد کر کے آج بھی میرا دل کانپ جاتا ہے۔ جب کتے نے اس پر جست لگائی تو عامر کو اپنی بھیانک موت کا یقین آ چکا تھا۔ اس نے مقابلہ کیا مگر اب معاملہ یک طرفہ تھا۔ عامر کا اتنا خون بہہ چکا تھا کہ اس میں کھڑے رہنے کی توانائی بھی قوت ارادی کی محتاج تھی۔ تازہ دم کتے نے اسے ذرا سی دیر میں چیر پھاڑ کے رکھ دیا۔

میں نے عامر کی موت کا آخری منظر نہیں دیکھا۔ میں کھڑکی سے ہٹ کے پیچھے آ گیا اور اپنا سر ہاتھوں میں تھام کے بیٹھ گیا۔ دلاور نے یہ سب کچھ مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس نے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ زبانی طور پر ہی نہیں وہ عملاً کسی کو بھی کتوں کے آگے ڈال سکتا ہے۔ وہ شکاری کتے اسی مقصد کے لیے پالے گئے تھے۔ شاید انہیں پہلے سے بھوکا رکھا جاتا تھا۔

ایک خوف ناک سناٹے میں دلاور کی آواز گونجی "خیر سے تم ٹھیک تو ہو نا اپنے سکندر اعظم صاحب! بندے کا دل ذرا مضبوط ہونا چاہیے ورنہ اسے عبرت ناک سزا دینے کی بات نہیں کرنی چاہیے۔"

میں نے کراہ کے کہا "میں سمجھ گیا تمہاری بات دلاور۔ تم جو کہنا چاہتے تھے..."

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ تم نے ہی خواہش ظاہر کی تھی کہ اس لڑکے کو سزا دی جائے جیسی۔"

www.paksociety.com

میں وہ بات بھی سمجھ گیا جو تم نے نہیں کہی۔ تم یہی سلوک میرے ساتھ بھی کر سکتے ہو۔ رابعہ اور کابل بھی تمہاری قید میں ہیں۔"

وہ ہنسا "ابھی تو سکندر کا پیٹ بھر گیا ہے۔ دو دن کے لیے بہت ہے اس کے کھانے کو۔ افسوس ہے مجھے رابعہ کا۔ لو جی یہ تو میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں اپنے سکندر اعظم صاحب کہ رابعہ اور سکندر کی جوڑی میں نے کہاں سے حاصل کی تھی۔ یہ جرمن شیپرڈ اور وولف ٹیریئر کی مخلوط نسل ہے۔ انتہائی خونی اور وحشی۔ تم غور تو میں نے بتایا ہے ان کے نام میں نے تمہارے نام پر رکھے تھے۔ اب سکندر کے لیے مجھے دوسری رابعہ کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے تم ایک رابعہ کی جگہ دوسری کو قبول کر لو گے؟"

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ جتنی ذہنی اذیت میں جھیل چکا تھا اس کے بعد دلاور کی بکواس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس کی آواز ضرور سن رہا تھا اور اس کی بات بھی سمجھ رہا تھا مگر سوچ کچھ اور رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری ایک ایک نقل و حرکت، میری صورت کے تاثرات اور میری ذہنی کیفیت کا ردعمل دیکھ رہا ہے۔ اب میری کوشش تھی کہ میں جلد از جلد ذہنی صدمے کی کیفیت پر قابو پا لوں۔ صورت حال کا تقاضا بھی یہی تھا اور مجھے سوچنے سمجھنے کے لیے پرسکون ذہن کی ضرورت تھی۔

میں نے جگ سے گلاس بھر کے پانی پیا تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے کیا میرے اعصاب بالکل جواب دے چکے ہیں؟ کیا میں اتنا بزدل اور کم ہمت ہوں؟ چوہدری دلاور جیسے شکاری سے مقابلہ ہو تو کیا مجھے بدترین عذاب کے لیے تیار نہیں رہنا چاہیے؟ میں نے سوچا اور اگر میں چوہدری دلاور کا مقابلہ اسی کی سوائی سطح پر آ کے نہیں کر سکتا تو پھر مجھے مقابلہ کرنا بھی نہیں چاہیے۔ آدمی کا مقابلہ کتے سے ہو تو یوں نہیں ہوتا جیسے عامر نے کیا۔ ایک زہر آلود بوٹی کتے کا کام تمام کر سکتی ہے۔ بندوق کی ایک گولی شیر کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ طاقت میں آدمی کا مقابلہ آدمی سے تو ممکن ہے اس دلاور سے نہیں جو بھیڑیے سے زیادہ مکار، بھیڑیے سے زیادہ خونی، سانپ بچھو سے زیادہ زہریلا اور تمام درندوں سے بڑھ کر خبیث ہو۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ہو اپنے سکندر اعظم صاحب؟ برا مان گئے ہو شاید کہ میں نے کتوں کے نام تمہارے نام پر کیوں رکھے تھے۔ تو بات دراصل یہ ہے..."

میں نے پرسکون لہجے میں کہا کہ "نہ تمہیں اپنی ماں کا نام معلوم نہ باپ کا۔ ورنہ ان کی یاد میں تم انہی کا نام رکھتے۔ خیر چھوڑو، نام میں کیا رکھا ہے۔ اگر میں خود کو دلاور کہنے لگوں یا تم سکندر بن جاؤ تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔"

چوہدری دلاور کی آواز آئی "فرق پڑ بھی سکتا ہے۔ اگر تم نے عامر کی جگہ قدرت کو رکھا ہوتا۔ تمہارے لیے تو وہ نام تھا عامر اور قدرت۔ عامر چاہتا تھا کہ قدرت کا وجود حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔ تم ایسے ہی جذبات عامر کے لیے رکھتے تھے۔ تمہاری خواہش میں نے پوری کرا دی۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم نے وہی کیا جو تم کرنا چاہتے تھے۔" میں نے کہا "اور اس کے بعد بھی تم مجھ سے پوچھے بغیر نہیں کرو گے۔ تم مجھے دھمکی دے رہے ہو تاکہ اگلی باری قدرت کی بھی ہو سکتی ہے۔ تم ایسا کیوں کر رہے ہو دلاور؟"

"میں چاہتا ہوں کہ بات اب ختم ہو جائے۔ تم حالات کو سمجھتے ہوئے کوئی سمجھوتہ کر لو۔ میں نے تم سے معافی مانگی، تمہیں سارے نقصانات کا ہرجانہ ادا کرنے کا وعدہ کیا، تمہاری ہر شکایت دور کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ اور بھی کوئی شرط ہے تو مجھے بتاؤ لیکن اس کے بعد کھیل ختم۔"

میں کچھ دیر سوچنے کی اداکاری کرتا رہا "اچھا تم کہتے ہو تو میں بات کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ابھی تک تمہیں اندازہ نہیں کہ میری شرائط کیا ہوں گی اس لیے تم بہت بڑھ بڑھ کے بول رہے ہو۔ میرا حوصلہ تم نے بہت آزما لیا، اب تمہاری باری ہے۔"

"اچھا جی اپنے سکندر اعظم صاحب! میں بھی آپ کو یہ موقع دے کر دیکھتا ہوں۔ کسی کو آزمانا بھی مشکل کام ہے، ہیں جی۔ خیر ابھی حاضر ہوتا ہوں میں۔" دلاور نے کہا۔

لیکن خود آنے کے بجائے اس نے مجھے طلب کر لیا۔ دو افراد نے باہر سے قفل کھولا اور کہا "باہر آ جاؤ۔"

وہ اندر آ کے کسی غیر متوقع حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میرے لیے باہر جا کے بھی انہیں زیر کرنا اور ان کا اسلحہ چھین لینا مشکل نہ تھا مگر میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ میرا اولین مقصد اپنی اور ان سب کی رہائی تھا جو دلاور کی قید میں تھے۔ طاقت کے بل پر یہ کام ناممکن تھا چنانچہ میں نے سیاست سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دلاور اسی کمرے میں تھا اور اس کے لبوں پر وہی پرفریب مسکراہٹ تھی جو اس کے خیالات اور جذبات کو بڑی خوبی سے چھپا لیتی تھی۔ اگرچہ درمیانی وقفے میں شام بھی ڈھلنے لگی تھی مگر وہاں ہر چیز بالکل ویسی ہی تھی جیسی میں نے آخری بار دیکھی تھی۔ چائے کی ٹرالی بھی موجود تھی اور ایک کپ میں وہ چائے بھی جو میں نے پی نہیں تھی۔ یہ چائے گرم تھی۔ چوہدری دلاور نے جادو کی چھڑی یا فلم کے وقت کے ایک لمحے کو وہیں روک دیا تھا جہاں سے گفتگو کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔

جب میں بیٹھ گیا اور میرے ساتھ آنے والے خاموشی سے باہر چلے گئے تو دلاور نے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے کہا "عرض میں یہ کر رہا تھا اپنے سکندر اعظم صاحب کہ ایک سال بعد پھر میں تمہارے سامنے ہوں۔ تمہارے مجرم کی حیثیت سے۔ تم بتاؤ کہ میرے خلاف کیا الزامات ہیں ___ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا، اب کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ بھی تم خود ہی کرو۔"

"میں کیسے یقین کروں کہ تمہاری یہ باتیں ٹھیک نیتی پر مبنی ہیں۔" میں نے کہا۔

"بندے کو آزمانا تو چاہیے۔"

"میں جانتا ہوں دلاور کہ تم نہ احمق ہو نہ کوتاہ اندیش۔ تم تو ایک چال چلنے سے پہلے آگے کی دس ہوائی چالوں کا حساب کر لیتے ہو اور ذہین دشمن ہی سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ جس کی سادگی میں بھی پرکاری ہوتی ہے اور سادہ لوحی میں عیاری۔ مگر تم کہتے ہو تو میں مان لیتا ہوں کہ تم واقعی ماضی کی ہر غلطی کا کفارہ ادا کر کے مستقبل کے لیے پرامن بقائے باہمی کا سمجھوتہ چاہتے ہو۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ ہم سب کے حق میں بہتر نہیں ہو گا کہ ہم سمجھوتہ کر لیں اور اپنی توانائی کا بہتر استعمال کریں۔ خواہ وہ کسی بھی سمت میں ہو۔" دلاور بولا۔

"کسی بھی صحیح سمت میں ___" میں نے کہا "ماضی کے کھاتے بند کر کے تم آئندہ کے لیے اس سمجھوتے کو غلط کاری کا لائسنس سمجھو گے تو بات نہیں بنے گی۔"

"دیکھو، ہم اپنی اپنی زندگی گزارنے کے لیے کسی دوسرے شخص کے ذہن اور سوچ کے محتاج نہیں ہیں۔" دلاور نے ناگواری سے کہا "نہ میں تمہارے قول و فعل اور اخلاق و کردار کا ذمے دار ہوں اور نہ تم میرے۔ اسے لگتے ہو کہ میرے پیچھے لگے رہو۔ میں غلطی کروں گا تو خود نقصان اٹھاؤں گا، جرم کروں گا تو پکڑا جاؤں گا۔ گناہ کروں گا تو اللہ میاں کو جواب دوں گا۔ تم اپنے مستقبل کی فکر کرو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ بات ان معاملات پر ہوگی جو آج تک اختلاف کا سبب بنے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر وزیر خان کا معاملہ سب سے پہلے۔"

میں نے کہا "چلو ٹھیک ہے۔ میرا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ تم وزیر خان کے قتل کا اعتراف کر لو اور خود کو قانون کے حوالے کر دو۔"

"میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اسے میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ اس کی موت طبعی تھی۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تم نے اس کے حالات کو جینے کے لیے ناقابل بنا دیا تھا۔ اسے ہر طرف سے محصور کر لیا تھا اور اس انتہا کو پہنچا دیا تھا جہاں موت کے سوا نجات کی صورت باقی نہیں رہی تھی اور وہ جو تمہارا یار غار تھا، لاکھوں کا مالک تھا، وہ مفلسی اور کسمپرسی کے عالم میں بیمار پڑا تو اس کے پاس علاج کے لیے پیسہ تک نہ تھا۔ وہ ایک گھریلو ملازم کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ کون تھا آخر اس کا ذمے دار؟" میں چلانے لگا۔

"میر شرافت علی!" دلاور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اس کا نام تم اس لیے لے رہے ہو کہ وہ تردید کرنے کے لیے واپس اس دنیا میں نہیں آ سکتا۔" میں نے کہا "تم نے اسے بھی قتل کرا دیا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ تمہارے خلاف گواہ نہ بن جائے۔ تمہارا پول نہ کھول دے۔"

"یہ غلط ہے۔ اسے قتل کرنے والا پیڈرو تھا۔"

"پیڈرو کس کے حکم کا غلام تھا؟"

"میں نے اسے کبھی نہیں کہا تھا کہ میر شرافت علی کو راستے سے ہٹا دو۔ یہ کام اس نے خود کیا۔"

"اس کی میر شرافت علی سے کیا دشمنی تھی؟"

"کچھ نہیں۔ اسے موقع ملا تھا کہ قتل کے جرم میں تم کو پھنسا دے اور اس نے موقعے سے فائدہ اٹھا لیا۔"

"پھر تم نے اس کی پیٹھ ٹھونکی کہ شاباش، ایک تیر سے دو شکار کر لیے۔ سکندر کو قتل کے کیس میں تختہ دار کی جانب روانہ کر دیا اور میر شرافت علی کو عالم بالا کی طرف۔ نہ وزیر خان کا وارث رہا نہ تمہارا کوئی پارٹنر۔ تم بلا شرکت غیرے کاروبار پر قابض ہو گئے۔"

"مگر یہ ٹھیک ہے کہ میں نے خود کچھ نہیں کیا تھا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وزیر خان کو راستے سے ہٹا دوں۔ یہ خیال تھا خود میر شرافت علی کا۔ بس میں نے اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ پھر وہ جو کچھ کرتا رہا تم مجھے اس کی تائید کا قصوروار سمجھ سکتے ہو لیکن اصل مجرم وہی تھا۔"

"کتنی ڈھٹائی سے تم خود کو بے قصور ثابت کر رہے ہو۔ کیا ایک جرم میں شریک تمام افراد مجرم نہیں ہوتے۔ قتل کا ارادہ کرنے والا، منصوبے بنانے والا، قتل میں شریک، قتل کے جرم میں معاون اور قتل کو چھپانے والا ایک سے مجرم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی قتل ہوتے دیکھتا ہے اور خاموش رہتا ہے تو وہ بھی مجرم ہے۔"

"تم قانونی موشگافی کے چکر میں پڑ جاؤ گے تو بات آگے نہیں بڑھے گی۔" دلاور نے بے بسی سے کہا "تم بھی ثابت نہ کر سکو گے کہ قتل کا الزام مجھ پر آتا ہے۔ قانون کی نظر میں تو مجرم تم ہو مگر میں بات کر رہا ہوں ان معاملات کی جو قانون کی آنکھ سے اوجھل ہیں۔ میر شرافت علی اصل مجرم ہے جس کے ذہن میں وزیر خان کو الگ کر دینے کا خیال آیا تھا اور جب وزیر خان شرافت سے اپنا حصہ لے کر الگ ہونے پر رضامند نہیں ہوا تو میر شرافت علی نے ہی کہا تھا کہ ہمارے پاس دوسرے طریقے بھی ہیں۔ خود اس نے مجھے اکسایا تھا اور دوسرے طریقے بتائے تھے۔"

"اور تم نے کہا تھا ٹھیک ہے، ایسا ہی کرو۔"

"نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ میں کچھ نہیں کروں گا۔ تم خود جو چاہو کرو۔" دلاور بولا "اس نے پیڈرو کی خدمات مانگی تھیں اور میں نے پیڈرو کو میر شرافت علی کے حوالے کر دیا تھا۔"

"اچھا اگر سب کچھ میر شرافت علی اور استاد پیڈرو نے ہی کیا تھا تو پیڈرو کو میرے حوالے کر دو۔ میں خود اس سے حقیقت اگلوا لوں گا۔"

"پیڈرو سے اب میرا کوئی تعلق نہیں۔ مجھے نہیں معلوم وہ

www.paksociety.com

کہاں ہوگا۔" دلاور نے کہا "میں اسے بہت پہلے نکال چکا ہوں۔"

"جھوٹ بکتے ہو تم۔ وہ مسلسل ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ اس نے دو بار ہماری جان لینے کی کوشش کی تھی۔ ایک بار آفریدی مارا گیا' دوسری بار ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار۔ کس کے حکم پر کر رہا تھا وہ یہ کارروائی؟"

"یقین کرو میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تم سے کیسے بات ہو سکتی ہے دلاور۔ تم تو اس سے بھی انکار کرو گے کہ رابعہ اور کاجل کے ساتھ آصف علی کے گھر والوں کو اغوا کرانے والے تم نہیں تھے۔" میں نے کہا۔

"نہیں' یہ کام میرا تھا۔ وہ میرے ہی آدمی تھے جو تم سب کو یہاں لائے تھے۔ میں تم سے لاہور میں بات کر لیتا لیکن تم تو لاہور میں ٹھہرے ہی نہیں۔"

"تم چاہتے ہو میں اس بات پر یقین کر لوں کہ پیڈرو تمہاری مرضی کے بغیر ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا اور اس نے ہماری جان لینے کی جو ناکام کوشش کی اس کا تمہیں کوئی علم نہیں۔"

"علم تو ہے مگر مجھے نہیں معلوم کہ پیڈرو نے ایسا کیوں کیا۔" دلاور بولا "تم میری قسم پر بھی اعتبار کرنے والے نہیں ہو ورنہ میں حلف اٹھا سکتا تھا اس بات پر کہ پیڈرو خود میرا ساتھ چھوڑ گیا تھا اور میں نے اسے واپس نہیں بلایا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ میں بہت جلد اس سے پیچھا چھڑا لوں گا۔ ہو سکتا ہے وہ تم سے خطرہ محسوس کرتا ہو کیونکہ تم بھی اسے ہی اپنے والد کا اور میر شرافت علی کا اصل قاتل سمجھتے تھے۔ جب تک اسے میری پشت پناہی حاصل رہی وہ بے خوفی سے سب کچھ کرتا رہا اب اس نے ہمیشہ کے لیے تمہارے خطرے کو ختم کرکے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا سوچا ہوگا۔"

میں اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا "تم واقعی نہیں جانتے کہ پیڈرو کہاں ہے؟"

"وہ... بے تو پشاور میں۔ شاید واپس چلا گیا ہو لیکن نہ اسے میں نے بھیجا تھا اور نہ اس نے میری مرضی سے کچھ کیا۔ مجھ سے الگ ہونے کے بعد سے وہ روپوش ہے۔ اسے ڈر ہے کہ میں اس کا قصہ ہی پاک نہ کر دوں۔"

"یہ اچانک تمہارے اور پیڈرو کے درمیان اختلافات اتنے سنگین کیوں ہو گئے؟"

"دیکھو سکندر' میرے اور تمہارے درمیان بہت سے اصولی اور نظریاتی اختلافات ہیں۔ تم خود کو شریف زادہ کہتے ہو' میں خود ایسا دعویٰ نہیں کرتا۔ میرے کاروبار کو بھی تم غیر قانونی سمجھتے تھے۔ میرے نزدیک کاروبار صرف کاروبار ہے۔ مجھے اپنی بات ختم کر لینے دو۔ تم مجھے غدار قرار دیتے ہو کیونکہ میں نے وطن دشمنوں کو اسلحہ فراہم کیا لیکن تم سطحی حقیقت کو دیکھ رہے ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ میرے اس کاروبار کو اعلیٰ سرکاری حکام کی سرپرستی حاصل تھی؟

میں ان کا نام نہیں لے سکتا مگر مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا صرف دلاور کی وجہ سے نہیں ہوا۔ یہاں بڑے بڑے ایئرکنڈیشنڈ دفتروں میں بیٹھے ہوئے بیورو کریسی کے نمائندوں نے' منافق ملاؤں اور خود غرض سیاست دانوں نے دلاور سے کہیں بڑھ کے اس سازش میں حصہ لیا۔ سازشی عناصر کی حوصلہ افزائی کی۔ انھیں وسائل فراہم کیے اور تحفظ کی پوری ضمانت دی۔ تم ایک چوہدری دلاور کی کیا بات کرتے ہو' یہاں جو ملک کے دو حصوں کے درمیان خلیج کو بڑھا رہے تھے اور انتشار پھیلا رہے تھے خانہ جنگی کے اسباب پیدا کر رہے تھے بین الاقوامی سپر پاور کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے اور ان سے بھاری رقوم وصول کر رہے تھے۔ ان سب کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ ٹھیک ہے' میں نے پیسہ کمایا اور غلط طریقے سے کمایا مگر اس کی راہ مجھے کس نے دکھائی اور کیا تمہیں معلوم ہے اس میں سے کتنا پیسہ انھوں نے وصول کیا۔ جو اصل غدار اور مجرم ہیں مگر ان کے معصوم چہرے پبلک نے نہیں دیکھے کیا یہاں پہلے سے وطن دشمن نہیں تھے جو ہر سال کروڑوں اربوں کا غبن کرتے تھے۔ ٹھیکوں میں اور بوگس بلوں میں۔ کاغذی منصوبوں میں اور ناقص پلاننگ میں۔ ان کو ہدایات باہر سے ملتی تھیں وہ غلط بجٹ بناتے تھے جو غلط اعداد و شمار اور غلط گوشواروں کا گورکھ دھندا ہوتا تھا۔ غیر ملکی آقاؤں کے یہ زر خرید ایجنٹ کون ہیں' کیا تم جانتے ہو انھیں جو اس ملک کی تاریخ میں نفاق اور انتشار کے ذمے دار ہیں جنھوں نے کبھی اس ملک میں سیاسی اور معاشی استحکام نہیں آنے دیا۔ جو وزارتوں اور اسمبلیوں کو توڑتے رہے' کبھی مارشل لا کے نام پر فوج کو استعمال کرتے رہے تو کبھی سیاست کے لیے مذہب کو۔ انھوں نے ملک کو پیچھے دھکیلنے والے ہاتھ مضبوط کیے اور اس کو ترقی کی راہ پر کبھی گامزن ہی نہ ہونے دیا تاکہ ہم مقروض رہیں' محتاج رہیں اور خود کفالت کی منزل کبھی نہ پا سکیں۔ تم دلاور کو مار سکتے ہو مگر ان کو جو ملک کے اصل دشمن ہیں تم پہچانتے ہی نہیں۔ ان کا کچھ بگاڑ سکتے ہو تم؟ میں تمہیں بتا تا ہوں سکندر کہ جس دن تم نے ایک بھی چہرہ شناخت کرنے کی غلطی کی اور اسے بے نقاب کرنا چاہا اسی دن تم غائب ہو جاؤ گے۔ چیونٹی کی طرح مارے جاؤ گے کیونکہ وہ ہاتھی ہیں۔ وہ محاورہ مت دہراؤ کہ چیونٹی ہی ہاتھی کی موت کا سبب بنتی ہے۔ یہ خلائی دور ہے' جس میں ہاتھی کے پاس جدید ترین آلاتِ سراغ رسانی ہوتے ہیں اور چیونٹی حرکت بھی کرے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے۔"

وہ بول رہا تھا اور میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ دلاور نہیں کوئی اور تھا۔ اس کا لب و لہجہ انداز گفتگو اور خیالات سب مختلف تھے۔ وہ ایک پڑھے لکھے آدمی کی طرح روانی سے بول رہا تھا۔ آج تک وہ جاہلوں کی زبان بولتا رہا تھا اور وہ بھی ایک مخصوص اسٹائل میں۔ میرے لیے یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ اتنا عرصہ وہ میرے سامنے اداکاری کرتا رہا اور مصنوعی لہجے میں بات کرتا رہا۔

شاید یہ اس کا نیا بہروپ تھا۔ اس نے اپنی شخصیت کو نئے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ ایک سیاست دان کی طرح مجھ سے مخاطب تھا اور میں آہستہ آہستہ اس تبدیلی کے اسباب کو سمجھنے لگا تھا۔ عملی سیاست میں قدم رکھنے کے بعد چوہدری دلاور کو اپنے ماضی کے کردار کو یکسر بدل دینا ضروری تھا۔ اس نے پیڈرو سے پیچھا چھڑا لیا تھا اور اب وہ مجھ سے تمام معاملات پر مصالحت اور مفاہمت کے لیے تیار تھا۔

"توقع پاتے ہی میں نے کہا "چوہدری دلاور۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"تم نے ٹھیک سنا ہے۔ اس ملک کو نئی قیادت کی ضرورت ہے۔" چوہدری دلاور بولا۔

"اور نئی قیادت فراہم کریں گے تم جیسے لوگ جو کل تک اسمگلر تھے' مجرم اور غدار تھے۔ جرائم کی دنیا سے سیاست کی دنیا میں آکے تو تم بڑے شکاری بن جاؤ گے۔ یہی بات ہے نا؟" میں نے تلخی سے کہا۔

چوہدری دلاور کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے فق ہوا "تم اپنی رائے قائم کرنے کے لیے آزاد ہو۔ مگر کیا میں نے غلط کہا ہے۔ میں نے اپنے ماضی کی کتاب کو بند کر دیا ہے اب نہ میرا کسی استاد پیڈرو سے کوئی تعلق ہے نہ کسی حاجی عبداللہ سے۔"

"اس لیے کہ تم ان کے محتاج نہیں رہے۔ تم نے اتنا کالا دھن اکٹھا کر لیا ہے کہ سیاست کے بازار میں اپنی دکان کھول سکتے ہو۔ اس بزنس میں لاکھوں کی سرمایہ کاری کروڑوں کی ضامن ہوتی ہے۔ کل کو تم اسمبلی کے ممبر یا وزیر بن کے زیادہ اثر و رسوخ کے مالک ہو جاؤ گے۔ قانون سے بالاتر ہو جاؤ گے۔ میرے جیسے لوگ تمہیں سلام کریں گے۔ تمہاری سفارش تلاش کریں گے۔ روٹ پرمٹ کے لیے' امپورٹ لائسنس کے لیے' نوکری کے لیے۔"

چوہدری دلاور نے کہا "ہم موضوع سے ہٹ گئے ہیں۔ تم اپنے والد کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتے تھے۔ میں استاد پیڈرو کی گرفتاری میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ اسے تمہارے حوالے بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"لیکن تمہیں تو معلوم ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے؟"

"وہ کہیں بھی روپوش ہو جائے۔ چوہدری دلاور کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔"

"ٹھیک ہے' استاد پیڈرو کو میرے حوالے کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔ اس کے بعد ہی فیصلہ ہوگا کہ میرے والد کے قتل کی ذمے داری کس کس پر عائد کی جا سکتی ہے۔"

"دوسرا معاملہ ہے اس جائداد کا جس کے تم وارث تھے تو وہ بھی تمہارا ہی ہے۔" دلاور نے کہا "وہ زمین تمہاری تھی جس پر بحروز ایڈ ایسٹی لمیٹڈ قائم تھی۔ وہ کمپنی اب نہیں رہی مگر وہاں جو ... والد کے نام پر تھا وہ تمہارا ہے۔ میں بورڈ آف

ڈائریکٹرز کا ایک رکن ہوں۔ اس حیثیت سے میرا نام باقی رہے گا۔ چیئرمین تم ہو جاؤ۔"

"میں یہ شرط نامنظور کرتا ہوں۔ تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"ایک دن آئے گا جب تم اس فیصلے پر افسوس کرو گے۔ میری ذات سے تمہیں بہت سے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں مسٹر سکندر بخت۔"

"میں ان سب فوائد پر لعنت بھیجتا ہوں جو مجھے تمہاری ذات سے حاصل ہوں۔ اپنے چوہدری دلاور صاحب۔"

"تمہارے والد کا گھر ابھی تک موجود ہے۔ مجھے معلوم ہے اس میں کتنا عرصہ رابعہ تنہا رہی۔ واقعات کی گواہی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس تمام عرصے میں کسی نے رابعہ کی طرف بری نظر سے بھی نہیں دیکھا۔ تم اغوا یا نہ مانو۔ میں خود اس کی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں تھا۔"

میں نے تلخی سے کہا "گویا آج تم میرے محسن بھی ہو گئے؟"

"یہ احسان کی بات نہیں۔ خدانخواستہ رابعہ کو کچھ ہو جاتا تو تمہارا شک خود بخود میری طرف انگشت نمائی کرتا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کب رعایت دی تھی تم نے رابعہ کو یا نازو کو۔ شملا کے ساتھ جو کچھ تم نے کیا۔"

"غلط۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ نہ وہ میرے کہنے پر ہوا۔ وہ تمہارے جانے کے بعد کتنا عرصہ یہاں رہی۔ مسٹر اور مسز رضا حسن رضوی کے ساتھ۔ کسی نے انھیں کچھ کہا؟"

"یہ الزام دوسروں کو مت دو۔ یہ ثابت مت کرو کہ تم کو کچھ معلوم نہیں تھا اور تم بالکل بے گناہ ہو۔" میں نے چلا کے کہا "وہ تمہارے ہی کارندے تھے' تمہارے احکامات کے تابع تھے اور تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرتے تھے۔ تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ تم اور حاجی عبداللہ "ایس پی سراج اور وڈی سوڈا۔"

"اچھا اچھا' چلاؤ مت۔ جو بھی ہوا اس کی ذمے داری اگر میں قبول کر لوں تو تم کیا کرو گے۔ زیادہ سے زیادہ تم مجھے قتل کر سکتے ہو۔" دلاور نے میز کو لات ماری "یہ لو شوٹ کر دو مجھے۔"

اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر میرے سامنے پھینک دیا۔ ریوالور صوفے پر میرے قریب گرا۔

"اٹھاؤ ریوالور' خالی کر دو مجھ پر۔ اگر اس سے تمہارا ہر مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو ہمت کرو۔ یہ خالی نہیں ہے۔"

میں نے ریوالور اٹھا لیا "تمہیں شوٹ کرنا واقعی بہت ہی آسان ہوتا۔ اگر میں تمہاری قید میں نہ ہوتا۔ میرے سامنے ڈرامہ مت کرو دلاور۔ صرف حملہ کرنے کی نیت کی تھی میں نے تو تمہارے محافظوں نے میرے گلے میں پھندا ڈال دیا تھا۔ ایک طرف تم اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہو۔ یہ بتانے کے لیے کہ اس بدبخت عامر کی طرح تم کسی کو بھی شکاری کتوں کے سامنے ڈال سکتے

www.paksociety.com

ہو۔ ہم سب تمہاری قید میں ہیں۔ تمہیں مار کے کون اپنی جان سلامت لے جاسکتا ہے۔ ہاں میں تمہاری مصالحت کی پیشکش پر اس وقت غور کرسکتا ہوں جب تم اپنی نیک نیتی کا عملی ثبوت دو۔"

"اور کیسے ثبوت دوں آخر؟"

میں نے ریوالور اس کی طرف بڑھایا۔ "سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ یہاں میرے علاوہ کس کس کو قید کر رکھا ہے تم نے؟"

"یہ قید خانہ نہیں ہے۔ جب تم ان سے ملو تو پوچھ لینا کہ کیا انہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف تھی۔ رابعہ اور کاجل کو شاید یہ بھی احساس نہیں ہوگا کہ وہ قید میں ہیں۔ ابھی تک ان کا اور میرا آمنا سامنا نہیں ہوا۔" چوہدری دلاور بولا۔

"وہ اتنی بے وقوف بھی نہیں ہیں کہ اپنے اغوا کو اور اس اسیری کو مذاق سمجھتی ہوں اور یہ فرض کیے بیٹھی ہوں کہ وہ سرکاری مہمان ہیں۔" میں نے کہا "استاد پیڈرو مسلسل ... را اچھا کر رہا تھا اور ہماری جان کا دشمن ہو رہا تھا۔ وہ تمہارا ساتھی ہے۔ ان کے علم میں ہوگا کہ کس طرح عامر نے ان سب سے دغا کی اور انہیں دھوکے سے پیڈرو کے حوالے کردیا۔ تمہاری پنڈال چوکڑی کے سوا یہ حرکت کون کرسکتا تھا دلاور۔ رابعہ کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ اس واردات میں تمہارا ہاتھ ہے اور ایسا صرف نمک حرام عامر کی وجہ سے ممکن ہوا۔"

"عامر کو اس کے کیے کی سزا مل چکی ہے۔"

"کیا یہ سب رابعہ نے نہیں دیکھا ہوگا۔ جو میں نے دیکھا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ تم خود غرضی کی کس انتہا تک جاسکتے ہو دلاور۔"

"کیا تمہارے خیال میں عامر کے ساتھ زیادتی کی میں نے؟ وہ اچھا آدمی تھا؟" دلاور نے بگڑ کے کہا "سوچو ذرا اس نے کس کی زندگی کو فروخت کیا تھا۔ اس معذور اور بے بس لڑکی کو وہ صرف دولت کی خاطر قتل کرنا چاہتا تھا۔ وہ دولت جس پر اس کا کوئی حق تھا تو اسی معذور لڑکی قدرت کی وجہ سے۔ جس شخص نے اس لاوارث ... کو باپ کی محبت اور شفقت دی۔ اپنا وارث بنایا۔ وہ اسی کے خون کا سودا کر رہا تھا۔ جب مجھے ساری بات معلوم ہوئی تو میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اسے کتے کی موت ماروں گا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ میرے اندر بھی ایک حیوان چھپا ہوا ہے۔ کبھی کبھی وہ مجھ پر غالب آجاتا ہے۔ اگر میں عامر کو بخش دیتا تو کل کسی اور بہانے وہ قدرت کی جان لیتا۔ کسی نہ کسی طرح وہ قدرت کو قتل کردیتا۔ یا کرادیتا۔"

"مجھے اس پر اعتراض نہیں کہ تم نے اسے مار دیا۔ مگر تم نے جو طریقہ اختیار کیا..." میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم صرف مجھے دہشت زدہ کرکے مجھ سے اپنی بات منوانا چاہتے تھے۔ تم نے دھمکی بھی دی تھی کہ رابعہ یا قدرت کا یہی انجام ہوسکتا ہے۔"

"اسے نظر انداز کردو۔ وہ محض دھمکی تھی اور اس کا نتیجہ ہے کہ تم میری بات سن رہے ہو اور سمجھ بھی رہے ہو۔ آج نہ سہی اگلی بار جب ہماری ملاقات ہوگی تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہوچکی ہوں گی۔ رابعہ کے گھر کی تباہی کا ذمے دار میں تھا تو میں نے اس سے بڑا ایک عالی شان محل بنا دیا ہے وہاں۔"

"کس کے لیے؟ ایک طوائف زادی چاندنی کے لیے اور ایک بدمعاش کو لاشخور والا کے لیے؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔" دلاور نے کہا "ایک خاص مقصد کے تحت میں نے انہیں اس خوش فہمی میں رکھا کہ وہ اس محل کے مالک ہیں۔ حالانکہ قانونی طور پر یہ ناممکن تھا۔ تمہیں اور رابعہ کو کسی کے خلاف حق ملکیت کا دعویٰ دائر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم جب چاہو اس کا قبضہ لے سکتے ہو۔"

"تمہاری یہ فیاضی مجھے رشوت کی طرح لگتی ہے۔ تم مجھے خریدنا چاہتے ہو دلاور۔ لیکن ایسا ممکن نہیں ہے۔ رابعہ اس کا پرانا گھر خود اپنے پیسے سے بھی بنا سکتی تھی۔ اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو بس اتنا کرو کہ اس کی ماں اسے واپس لادو جس کو تم نے اسپتال میں قتل کرایا تھا۔" میرا خون کھولنے لگا "مجھے بکاؤ مال مت سمجھو دلاور۔ میں وہ سب نہیں بھول سکتا جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا۔ جو انسانیت سوز تشدد میں نے اور رابعہ نے جھیلا۔ تمہارے اشارے پر پولیس نے میرے ساتھ کیا کیا تھا؟"

"وہ سب باتیں پرانی ہوگئیں۔"

میں نے چیخ کر کہا "تم کہتے ہو میں ان سب باتوں کو بھلادوں؟ یہ بھی بھول جاؤں کہ تم ہی استاد نیٹری کے قاتل بھی ہو۔ تمہارا دامن ان گنت انسانوں کے خون سے داغدار ہے۔ آج تم اپنے ماضی کا ہر سیاہ نقش مٹانے کے لیے مجھے قائل کرنا چاہتے ہو کہ جو کچھ بھی ہوا تھا اس کے ذمے دار تم نہیں تھے۔ وہ دوسرے تھے یا تیسرے تھے۔ تم یقین دلانا چاہتے ہو کہ راتوں رات تم بدل گئے ہو۔ انسانی زندگی، انسان کی عزت اور انسانیت کی آبرو کی تجارت کرتے کرتے تم اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بننا چاہتے ہو۔ سیاست کے میدان میں اترے ہو تو تمہاری کتاب زندگی کا ہر ورق کیسے سادہ نظر آئے گا جبکہ اس میں تمہارے کالے کرتوتوں کی سیاہی اور بے گناہوں کے خون کی سرخی کے سوا کچھ نہیں۔"

"اس وقت تم ذہنی طور پر حالات کی تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو۔" دلاور نے اٹھتے ہوئے کہا "فی الحال اتنا ثبوت دے سکتا ہوں میں اپنی نیک نیتی کا جو تمہیں قائل کرلے کہ وقت کے ساتھ انسان بدل بھی سکتے ہیں۔ نیچے گاڑی تیار ہے تم لوگ میرے مہمان تھے قیدی نہیں۔ گاڑی میں چابیاں موجود ہیں۔ تم اس میں کہیں بھی جاسکتے ہو۔"

"مثلاً جیل۔ آدھے راستے میں پولیس ہمیں چوری کی کار چلاتے ہوئے پکڑ لے گی۔"

"مجھے اندازہ تھا کہ تم شک کرو گے۔" وہ بولا "اس لیے گاڑی آج ہی رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور کے نام ٹرانسفر کردی گئی ہے۔ تمام قانونی دستاویزات گاڑی میں ہیں۔ اگلی ملاقات میں شاید ہمارے درمیان غلط فہمیاں کم ہوں گی اور ہم بہتر ماحول میں گفتگو کریں گے۔ خدا حافظ۔"

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں اس سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ دلاور کے ہر عذر بے گناہی کو میں نے مسترد کردیا تھا۔ کل کا شیطان آج فرشتہ ہونے کا دعویٰ کیسے کرسکتا تھا۔ وہ مجبور ہوگیا تھا کہ ہم سے اپنے گناہ بخشوائے ورنہ ہم اس کے سیاسی مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہوں گے۔ اس کا دست تعاون بڑھانا بھی سیاسی چال تھی جس کا مقصد اپنے سب سے خطرناک دشمنوں سے ہر قیمت پر صلح کرنا تھا خواہ اس کے لیے اسے اپنی انا کو بھی قربان کرنا پڑے۔

اس کے جانے کے بعد میں جھنجلاہٹ، کنفیوژن اور غصے میں اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ مجھے ایک فیصد شبہ نہیں تھا کہ میں نے دلاور کو سمجھنے میں غلطی کی ہوگی۔ یہ سب جھوٹ اور مکر و فریب کا وہ ڈرامہ تھا جس پر دلاور نے بہت محنت کی تھی۔ صرف ہمیں قائل کرنے کے لیے کہ کل اور آج کے دلاور میں بہت فرق ہے۔ کل وہ ہمارا دشمن تھا مگر آج دوست ہے۔ وہ اپنی غلطی، گناہ، جرم سب کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہے اور ہر قیمت پر ہم سے معافی کا خواستگار ہے۔ بھیڑیے نے اب بھیڑ کی کھال اوڑھنے کا فیصلہ کیا تھا تو وہ چاہتا تھا کہ جو لوگ اس کی حقیقت سے آشنا ہیں وہ اس کے ہمنوا نہ ہوں تو خاموش رہ کے تماشا دیکھنے پر تیار ہو جائیں۔ دل ہی دل میں اسے ان گنت گالیاں دیتے ہوئے میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس کے اور میرے درمیان دشمنی کا رشتہ باقی رہے گا۔ ایک ذاتی وجہ کو میں نے آج تک نظر انداز کیا تھا کیونکہ میں وسیع تر بنیادوں پر اس کے خلاف محاذ بنا چکا تھا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ ایک جنگ ختم ہوجانے سے صورت حال نہیں بدلی۔ اب ہم دوسری جنگ میں ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ کل وہ غدار تھا اور آج محب وطن ہونے کی سند حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کرکے اسے فروخت کرنے والا لوٹ اس ملک کے عوام کی تقدیر کا مالک بننا چاہتا تھا۔ وطن کے دشمن وطن کے رہنما بننے کی سازش کر رہے تھے۔ مجھے ہمیں اس سازش کو ناکام بنانا تھا۔

فوری فیصلے سے کسی مثبت نتیجے کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں نے اس معاملے کو مشورے کی حالت تک ملتوی کردیا۔ وقت خود بتادے گا کہ دلاور کے عزائم کیا ہیں اور اس کے جھوٹ سچ کا پول کب کھل جائے گا۔

کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے صوفے کے پیچھے جھانک کر دیکھا اور پردے ہٹا کے دیکھا مگر دونوں ... محافظ بھی پراسرار طور پر غائب ہوچکے تھے۔

میں ایک دروازے سے باہر آیا تو میرے کانوں نے کاجل کی آواز سنی۔ وہ رابعہ کو پکار رہی تھی۔

میں نے چلا کے کہا "کاجل کدھر ہو تم؟"

ایک سیکنڈ کی خاموشی کے بعد دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور کاجل نے کہا "بھائی سکندر۔"

دوسرے لمحے وہ باہر کھلنے والے دروازے سے میرے سامنے آگئی۔ اس کے پیچھے رابعہ آئی اور وہ بھی مجھے دیکھ کر اتنی ہی حیران ہوئی۔

کاجل نے کہا "آپ یہاں... میرا مطلب ہے کب آئے؟"

میں نے کہا "اصولاً سوال کرنے کا حق مجھے حاصل ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہم نے آپ کو نارووال بھیجا تھا۔"

رابعہ نے کہا "اور ہم نے آپ کو بھیجا تھا کلیم اللہ کے ساتھ۔ اسے چھوڑ کے واپس آنے میں دو دن لگ گئے۔ آج تیسرا دن ہے۔"

کاجل بولی "تم آصف علی کے ساتھ گئے تھے تو کل تمہیں اس کے ساتھ واپس آنا چاہیے تھا۔"

"انہیں روک لیا ہوگا کسی نے زور کس پر ہوا۔ کس کا پر۔"

رابعہ بولی "کوئی بہت ضروری کام پڑ گیا ہوگا۔"

میں نے عاجزی سے سر جھکا کے کہا "شادی سے زیادہ ضروری کام کیا ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد ولیمہ بھی ضروری تھا۔ میں کیا کرتا۔"

کاجل ہنسنے لگی "پہلے لوگ ولایت جاتے تھے تو شادی کے بغیر نہیں آتے تھے۔ اب غیر علاقے میں جاتے ہیں شادی کرنے کے لیے۔"

میں نے کہا "یقین کرو اس میں میری مرضی کو قطعی دخل نہیں تھا۔ میں نے آخر وقت تک مزاحمت کی۔ کسی نے میری ایک نہیں سنی۔ زبردستی شادی کردی۔"

کاجل کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی "مذاق چھوڑیے۔"

میں نے مظلوم اور دکھی لہجے میں کہا "خدا کی قسم یہ مذاق نہیں ہے کاجل۔ بس سب کچھ اچانک ہوگیا۔ کسی پروگرام کے بغیر۔"

اب رابعہ نے میری طرف یوں دیکھا جیسے پولیس آزاد کردی میں پکڑے جانے والوں کو دیکھتی ہے کہ کہیں وہ نشے میں تو نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ میں قسم کھانے کا عادی نہیں۔ "جھوٹی قسم مذاق میں بھی نہیں کھانی چاہیے۔"

"آخر میں کیسے یقین دلاؤں تمہیں رابعہ۔ مجھے معاف کردو۔ میں مجبور تھا۔" میں نے کہا "نہ میری مرضی تھی اور نہ کسی نے مجھ سے پوچھا۔ وہ تو سب اچانک ہی ہوگیا۔ وہاں ہر فیصلہ جرگہ کرتا ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اختلاف کرے۔"

"سکندر یہ کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔" رابعہ کا رنگ اڑ گیا تھا۔

میں نے مزید مظلومیت کا مظاہرہ کیا "دیکھو رابعہ۔ تم شاید

www.paksociety.com

یقین نہیں کر رہی ہو مگر یہ حقیقت ہے۔"

کاجل نے کہا "آپ کے دماغ پر اثر معلوم ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ پریشان کیوں کر رہے ہیں ہمیں۔"

"کاجل مجھے اندازہ تھا کہ تمہیں دکھ ہوگا۔ پریشانی تو بہت معمولی لفظ ہے لیکن تقدیر کے لکھے کو بدلا نہیں جا سکتا۔ تم خود جانتی ہو یہاں سے میں شادی میں شرکت کے لیے نہیں گیا تھا۔ خود آصف علی کے خواب و خیال میں یہ بات نہیں تھی۔" میں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "کلیم اللہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔ بچہ ہے نا۔"

رابعہ نے ایک دم میرے سامنے آ کے کہا "سکندر! میں تھپڑ ماردوں گی۔ ایسا بے ہودہ مذاق مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"رابعہ۔ تمہاری قسم یہ مذاق نہیں ہے۔ تم سے زیادہ بھلا کون عزیز ہے مجھے اس دنیا میں پھر بھی یقین نہیں آتا تو آصف علی سے پوچھ لینا۔ یہ مجھے معلوم ہوتا پہلے سے تو میں اُدھر جاتا ہی کیوں۔ مگر قبائل کی رسم و روایت کی بات تھی۔ وہاں فیصلے ہوتے ہیں گن پوائنٹ پر۔ انکار کرے کوئی تو کشت و خون ہوتا ہے۔ میں بھی ایک حد تک مخالفت کر سکتا تھا۔"

رابعہ کی حالت کا تغیر مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں اس سنگدلانہ مذاق کو ختم کردوں مگر ابھی کلائمکس نہیں آیا تھا۔

کاجل نے دل آزار اور مشتعل لہجے میں کہا "یہ تم نے کیا کیا؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔ آخر کون ہے وہ؟"

جذباتی اداکاری کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ میں تو اس وقت گم صم بیٹھا رابعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

رابعہ کا نروس بریک ڈاؤن ایک دم ہو گیا "بکتے ہو تم۔ جھوٹ بولتے ہو۔ میں جان سے ماردوں گی تمہیں۔"

"لیکن میرا قصور؟" میں نے سہم کے کہا "میں بتا چکا ہوں کہ یہ شادی میری مرضی سے نہیں ہوئی۔ سب اوپر ہی اوپر مجھ سے پوچھے بغیر طے کر لیا گیا۔ میری سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میں مجبور کر دیا گیا۔"

رابعہ کانپنے لگی "سکندر کمینے، دھوکے باز۔ کتنی بے غیرتی سے مجبوری کی بات کر رہے ہو۔ کوئی اور بات ہے، تم جھوٹ بول رہے ہو کہ تم انکار کرتے تو وہ تمہیں گولی مار دیتے۔ مرنے سے ڈرتے تھے تم۔ مجھے دھوکا دینے سے بہتر تھا تم مر جاتے۔ اتنی آسانی سے تم میرے منہ پر مجبوری کی بات کر رہے ہو۔ کتنے ذلیل ہو تم۔"

کاجل نے کہا "رابعہ باجی۔ مرد کی ذات ہی بے وفا ہے۔"

میں نے کہا "تم تو سمجھنے کی کوشش کرو کاجل۔"

"میں سمجھاؤں گی تمہیں اس مجبوری کا مطلب۔" رابعہ نے چیخ کے کہا "تم کیا سمجھتے ہو میں معاف کردوں گی تمہیں۔ میں تمہیں بھی جان سے ماردوں گی اور خود بھی مر جاؤں گی۔ میرے بیٹھے ہی تم کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔"

"بھائی سکندر۔ آپ کو ایک لمحے کے لیے خیال نہیں آیا کہ آپ کے لیے رابعہ نے اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا رکھی ہے۔"

میں نے احمقوں کی طرح کہا "اچھا؟ خیر ایسا ہے تو میں کرلوں گا ان سے شادی۔ انہوں نے کبھی صاف کہا نہیں۔"

"لعنت بھیجتی ہوں تم پر؟" رابعہ نے ایک دم چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور بھاگنے کے لیے پلٹی "جاؤ اسی کے ساتھ خوش رہو۔ جس سے نکاح کرنا ایسی مجبوری بن گیا تھا۔"

میں نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا "میرا نکاح۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو رابعہ؟"

کاجل نے آگ بگولہ ہو کے کہا "تمہارا کیا خیال ہے کہ ایک کے بعد دوسری شادی کرو گے رابعہ سے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ ایسی گھٹیا باتیں کرتے تمہیں شرم نہیں آتی کاجل۔ کیا میں اتنا ذلیل ہوں کہ محبت کسی سے کروں اور شادی کسی سے۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔ ابھی کیا کہہ رہے تھے شادی کر کے آیا ہوں۔ ولیمے میں شریک ہونا پڑا۔"

"پاگل تم ہو۔ کیا میں اپنی شادی کی بات کر رہا تھا۔ یہ میں نے کب کہا تھا کہ وہ میری شادی تھی۔"

رابعہ نے بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھا "تم نے نہیں کہا تھا کہ تم مجبور ہو گئے تھے۔ تمہاری کسی نے نہیں سُنی۔"

مجھے ایک دم ہنسی آ گئی "یہ تو خیر کہا تھا مگر اس سے تم نے یہ نتیجہ کیوں اخذ کیا کہ فیصلہ میری شادی کا تھا۔ اور میں نے اپنی شادی کی مخالفت کی تھی۔"

کاجل نے جل کے کہا "اور کیا آصف علی کی شادی تھی۔"

"شادی کلیم کی تھی" میں نے کہا "اب تم پھر کہو گی میں مذاق کر رہا ہوں یا جھوٹ بول رہا ہوں۔ لیکن میں پہلے بھی سچ بول رہا تھا اور اب بھی سچ عرض کر رہا ہوں لیڈیز۔ اگر کلیم تمہارا بیٹا تھا تو اب تم ساس کے عہدے پر فائز ہو چکی ہو کاجل اور تمہاری بہو وہی ہے جو شاید کلیم کی ماں ہوتی مگر اب اس کی بیوی ہے۔ عمر میں تم سے ڈگنی ہے وہ۔"

"تم ہمیں پاگل کر دو گے۔" کاجل نے سر پکڑ لیا۔

"انشاء اللہ؟" میں نے کہا "ویسے کیا تمہیں یقین ہے کہ تم پاگل نہیں ہو؟ یہ بات پہلے کسی نے نہیں کہی؟"

رابعہ نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "سیدھی طرح بات کرو ورنہ؟"

"ورنہ کیا؟ دھمکی مت دو مجھے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم میں کتنا حوصلہ ہے۔" میں نے کہا "کتنا اعتماد ہے مجھ پر۔ تم نے مجھے نہیں میری محبت کو ذلیل کیا ہے اور دکھا جا مجھے تم سے تم کو ایک بار تو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے۔ یہاں کوئی انڈر گراؤنڈ ٹینک ہے؟"

"سکندر! تمہیں کسی نے دھوکے سے تو کچھ نہیں پلا دیا ہے؟" رابعہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہاں، تم نے" میں نے چلا کے کہا "بقول فلمی شاعر ظالم تری آنکھوں نے کیا چیز پلا دی ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے آ گئیں؟"

رابعہ اب خفت کا شکار تھی اور آنسو صاف کرتے ہوئے اس میں مجھ سے نظر ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ مگر وہ مسکرا رہی تھی۔ یہ خوشی تھی کہ یہ سب مذاق تھا "تم بہت بدمعاش ہو سکندر۔ یہ بھی ہم سے پوچھ رہے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ ہم یہاں ہوں گے؟"

"بی بی! خدا کا نام لو۔ مجھے کیا عالم غیب سمجھ رکھا ہے تم نے۔"

"ہاں یہ تو آپ ایسے ہی گزر رہے تھے ادھر سے کہ ہم سے ملاقات ہو گئی۔" کاجل نے تمسخر اڑایا "آپ کا کیسے تشریف لانا ہوا آخر؟"

میں نے سوچ کے کہا "میں سمجھ گیا تم کو عامر نے کوئی پیغام دیا ہوگا ہماری طرف سے کہ آپ لوگ یہاں آ جائیں۔ وہ خود کہاں ہے؟"

"وہ گیا ہے آصف علی کی بیوی کو گھر چھوڑنے۔" کاجل نے کہا۔

"تم نے... دیکھا تھا اس کو جاتے ہوئے۔"

"دیکھا تو نہیں تھا لیکن وہ کہہ کے گیا تھا کہ میں اماں کے ساتھ جا رہا ہوں۔ آپ لوگ یہاں ٹھہریں، سکندر اور آصف صاحب یہاں پہنچ جائیں گے شام تک۔"

"وہ تاصر پور آیا تھا؟ کیا کہا تھا اس نے؟ اور کون تھا اس کے ساتھ؟"

"آصف علی کے کوئی دوست تھے جو دوسری گاڑی میں ساتھ آئے تھے" کاجل نے کہا "عامر نے بتایا کہ یہاں کچھ خطرہ ہے اور آصف علی نے پیغام بھیجا ہے کہ ہم دوسری جگہ شفٹ ہو جائیں پھر ہم اس کے ساتھ آ گئے۔ کل کے بعد آج دوبارہ اس وقت نظر آیا تھا وہ جب آصف علی کی بیوی اور بیٹی کو گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔"

"تم نے پوچھا نہیں کہ انہیں ساتھ لے جانے میں کیا حرج ہے۔ صاحب خانہ سے تمہاری ملاقات ہوئی؟"

کاجل نے نفی میں سر ہلایا "سوائے نوکروں کے یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ ظاہر ہے رات میں کوئی کیا نہیں گھر ملنے کوئی نہیں آیا۔ نہ صاحب خانہ، نہ گھر کی کوئی عورت۔ عامر نے کہا تھا کہ سکندر بھی آئے گا۔ تم کو اس کے ساتھ واپس جانا ہے۔"

میں کچھ دیر سوچتا رہا "اچھا کیا تم نے کسی نوکر سے پوچھا کہ یہ کوٹھی کس کی ہے، کون رہتا ہے یہاں؟"

"رابعہ باجی نے پوچھا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آفریدی صاحب کی کوٹھی ہے۔ وہ آج کل فیملی کے ساتھ لندن میں ہیں۔ معلوم نہیں کیا چکر ہے۔ تم بتاؤ ابھی کیا بے سروپا باتیں کر رہے تھے؟"

میں نے کہا "میری باتوں کا سر پیر سب ہے۔ چلو میں راستے میں بتاؤں گا۔ ہم فوراً واپس جا رہے ہیں۔ تم لوگ چل کے گاڑی میں بیٹھو۔"

"کون سی گاڑی میں؟"

"گاڑی باہر موجود ہے۔ رابعہ کی گاڑی۔" میں نے کہا "جاؤ بابا ہر بات مذاق نہیں ہوتی۔ دیکھ لینا گاڑی میں جو کاغذات رکھے ہیں ان میں کس کا نام لکھا ہوا ہے۔ میں آتا ہوں۔"

ان کی حالت عجیب تھی۔ میری ہر بات ان کے لیے معما بن گئی تھی۔ خود میں بہت سی باتیں کہنے سے قاصر تھا۔ اگر میں رابعہ اور کاجل کو دلاور سے ملاقات کا حال بتا دیتا تو دہشت سے ان کی جان نکل جاتی۔ صاف ظاہر تھا کہ نہ انہوں نے دلاور کو دیکھا، نہ انہیں شک ہوا کہ کل سے وہ دلاور کی نگرانی میں اور اس کی قید میں ہیں۔ دلاور ان کے سامنے آیا ہی نہیں تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ انہیں عامر کے انجام کی خبر بھی نہ تھی جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے بھوکے شکاری کتوں سے لڑتے اور ایک پُرعذاب موت مرتے دیکھا تھا۔ چند منٹ پہلے کاجل اور قدرت اسی لان پر موجود تھیں جہاں شکاری کتوں نے عامر کو چیرا پھاڑا تھا۔ کیا انہوں نے کوئی شور نہیں سنا تھا؟ عامر کی چیخ پکار اور کتوں کے غرانے دھاڑنے کی آوازیں ان کے کانوں تک بھی نہیں پہنچی تھیں؟

یہ ناممکن نہیں تھا۔ شاید وہ کسی ائرکنڈیشنڈ کمرے میں ہوں گی جو کوٹھی کے آخری حصے میں لان سے بہت دور ہوگا۔ دلاور وہ منظر صرف مجھے دکھانا چاہتا تھا۔

میں نے کوٹھی کا ایک چکر لگایا۔ اس کے اوپر نیچے کے تمام کمروں میں جا کے دیکھا مگر دلاور کہیں بھی نہیں تھا۔ مجھے اس کے گانٹو اور ملازم بھی دکھائی نہ دیے۔ گھر کے دیگر ملازم عام قسم کے نوکر تھے جو مجھے اس کے سوا کچھ بتانے کو تیار نہ تھے کہ کوٹھی آفریدی صاحب کی تھی اور آفریدی صاحب قالینوں کے بیوپاری تھے جو لندن آتے جاتے رہتے تھے۔ وہ کسی چوہدری دلاور کو نہیں جانتے تھے۔ گھر میں کچھ مہمان ضرور ٹھہرے ہوئے تھے مگر مہمانوں سے کچھ پوچھنا ان کے فرض میں شامل نہیں تھا۔

شک تو مجھے پہلے ہی تھا کہ حقائق کو عمداً چھپایا جا رہا ہے اور یہ چوہدری دلاور کے ڈرامے کے کردار ہیں جو اپنا اپنا رول اس کی ہدایات کے مطابق نبھا رہے ہیں۔ میں نے کچن میں دو نوکروں کو سامنے کھڑا کر کے غور سے دیکھا تو میرے شبہات کی تصدیق ہو گئی۔ وہ میری جرح سے کچھ پریشان نظر آ رہے تھے۔

باہر نکل کے میں نے عقبی حصے کے لان کا معائنہ کرتے ہوئے پولیس کی دو وردیاں دیکھیں جو دھونے کے بعد خشک ہونے کے لیے ڈال دی گئی تھیں۔ میں نے قریب جا کے ان کا معائنہ کیا۔ ان پر اب بھی کہیں کہیں سرخی موجود تھی۔ دونوں وردیاں ساتھ لے کر

www.paksociety.com

میں پھر اندر گیا۔

"مسٹر خانساماں!" میں نے چھوٹے قد کے گول مٹول شخص کو مخاطب کر کے کہا "کبھی حوالدار کو دستے ملتے ہو تو بالکل نئی سینڈک کا خیال آتا ہے اسے دیکھ کر؟"

اس کے ہونٹ کانپنے لگے "جی! جی نہیں۔"

"جی اور جی نہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ تم دونوں وہی ہو جو کل میرے سامنے مقتول ہو گئے تھے۔"

"آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی جناب۔" دوسرا بولا۔

"آنی بھی نہیں چاہیے۔" میں نے کہا "تم صرف چوہدری دلاور کی بات سمجھ سکتے ہو۔ بہت اچھا ڈراما پیش کیا تھا تم سب نے مل کے۔ پہلے تو میں بھی دھوکا کھا گیا تھا کہ اس نے تمہیں گولی مار دی ہے اور تم واقعی فوت ہو گئے ہو مگر اس وقت جب تمہارے ماتحت لاشیں گھسیٹ کر لے جا رہے تھے میں نے دیکھ لیا تھا انسپکٹر صاحب کہ تم نے اس سے زیر لب کچھ کہا تھا اور پھر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ یہ وہی وردیاں ہیں جو کل تم نے زیب تن فرمائی تھیں۔ میک اپ سے تمہارا ناک نقشہ بھی بہت بدل دیا گیا تھا اور آج اس گھر میں تمہیں نوکر کی حیثیت سے کام کرتے دیکھ کے کون کہہ سکتا ہے کہ تم دوسری دنیا سے دوسرا جنم لے کر دوسرا رول کرنے کے لیے واپس آ گئے ہو۔ اس وقت جب دلاور نے تم پر گولی چلائی تھی تو میرا ذہن ماؤف تھا ورنہ میں دیکھ لیتا کہ گولی لگنے کے بعد تم خاموش تڑپے تھے مگر خون کا ایک قطرہ نہیں نکلا تھا۔ مگر میں نے بعد میں دیکھ لیا تھا۔ اس وقت جب تمہاری لاشیں چوہدری دلاور کے حکم پر کنوئیں میں ڈال کے مٹی برابر کرنے کے لیے لے جائی جا رہی تھیں۔"

"یہ سب تم ہمیں کیوں بتا رہے ہو؟" حوالدار نے جارحانہ لہجے میں کہا "دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

مجھے اس کے ردعمل کا اندازہ تھا "میں جا رہا ہوں لیکن تم میری بات چوہدری دلاور کو ضرور بتا دینا۔ ایسے ڈرامے وہ کرتا رہتا ہے یہ ہم جانتے ہیں۔ تم شاید ایک بات نہیں جانتے کہ ہر بار اس کے ریوالور میں نقلی گولیاں نہیں ہوتیں۔ اگلی مرتبہ ہوشیار رہنا۔"

انسپکٹر نے ایک دم مجھ پر گالی دے کر حملہ کیا مگر میں اس کے لیے تیار تھا۔ وہ میری طرف آیا تو میں نے ایک دم دروازہ اپنی طرف کھینچ لیا جس پر میں ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ وہ لمبائی کے رخ پٹ کی ڈیڑھ انچ موٹی پٹی سے ٹکرایا اور یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ بے اختیار اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ وہ لڑکھڑایا تو میں نے اس کی گدی پر ہاتھ مارا اور اس کی گردن کی ہڈی سوکھی ٹہنی کی طرح چٹخ کے ٹوٹ گئی۔

اصل خطرہ موٹے حوالدار کی طرف سے تھا جو پیشہ ورانہ تجربے کار فائٹر تھا لیکن میں نے اسے مقابلے کا موقع ہی نہیں دیا اور دروازے کو پورا کھینچ کے باہر سے کنڈی لگا دی۔

وہ مجھے گالیاں دینے لگا اور دروازے کو ٹکریں مارنے لگا لیکن میں نے بھاگ جانے میں عافیت جانی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دروازہ توڑ کے زخمی شیر کی طرح نکلے گا تو اس پر خون سوار ہوگا۔ وہ مجھ پر پیچھے سے فائر بھی کر سکتا تھا۔

میں دوڑتا ہوا باہر آیا اور کار میں بیٹھ گیا۔

"کہاں چلے گئے تھے؟" رابعہ نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"میں ذرا عالم ارواح تک گیا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ دو مقتولوں کی روحیں وہاں پہنچ گئی ہیں یا نہیں۔" میں نے کار کو اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور روک لیا۔

رابعہ بولی "کسی بات کا ڈھنگ سے بھی جواب دے دیا کرو۔"

"خاتون محترم' بندہ بالکل صحیح عرض کر رہا ہے۔ وہاں ایک مقتول کی روح تھی۔ دوسرا مردود بڑا دھوکے باز نکلا۔ جنگلی مینڈک کی اولاد ابھی تک اسی دنیا میں پھر رہا ہے۔"

"اچھا اب چلیے بھی انتظار کس کا ہے؟" کاجل نے کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ ہم ایک دوسرے کا کہا سنا معاف کر دیں۔" میں نے کہا "آخری بار ایک دوسرے کو دیکھ لیں کیا پتا چابی گھماتے ہی پتا چلے کہ ہم تو دوسرے جہاں میں ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے گاڑی میں بم نصب ہو سکتا ہے۔"

"یہ سائنسی ترقی کا دور ہے خاتون۔ بم گاڑی میں 'جھاڑی میں' 'داڑھی میں' 'ساڑھی میں' کہیں بھی نصب ہو سکتا ہے۔" میں نے بونٹ کھول کے کہا "رابعہ ذرا خیال رکھنا گھر کے اندر سے جو بھی برآمد ہوا اسے گولی مار دینا۔"

"خالی ہاتھوں سے گولی مار دوں؟"

"اچھا تو نظروں سے مار دینا۔" میں نے بونٹ میں جھانک کے تاروں کا بغور جائزہ لیا مگر مجھے کوئی مشکوک کنکشن نظر نہیں آیا۔

میں واپس گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ حوالدار برآمد ہوا۔ حسب توقع اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر کار کو اسٹارٹ کیا اور گیئر چھوڑ کر ایکسیلیٹر دبا دیا۔ کار کسی پنجرے سے رہائی پانے والے وحشی درندے کی طرح بھاگی۔ میں نے اپنے عقب میں فائر کی آواز سنی۔ گولی شاید کار کی باڈی سے ٹکرائی تھی۔

"اپنا سر نیچے کر لو۔" میں نے چلا کے کہا مگر میرے انتباہات موصول کرنے سے پہلے ہی رابعہ اور کاجل کو خطرے کے احساس نے سرنگوں کر دیا تھا اور وہ پچھلی سیٹ پر تقریباً سجدے میں پڑی تھیں۔ دوسرا فائر ہوا تو میں گیٹ پر تھا لیکن گیٹ بند تھا اور اسے کھولنے کے لیے اترنا اپنے قاتل کو آسان ہدف فراہم کرنے کے مترادف ہوتا۔

لوہے کا گیٹ خاصا بڑا اور مضبوط تھا مگر مجھے یقین تھا کہ ایک نئی کار کی بھرپور قوت کے سامنے نہ ٹھہر سکے گا۔ اس سے کار کے اگلے حصے کا بیڑا غرق ہونا تو لازمی تھا۔ امکان یہ بھی تھا کہ گیٹ پلٹ

کے گاڑی پر گرے تو پہلے چھت کو اور پھر چھت کے نیچے ہمارے سروں کو چپٹا کر دے مگر یہ رسک لیے بنا چارہ نہ تھا۔

گاڑی ایک دھماکے سے گیٹ کو گرا کے گزری تو میں نے اس کی ہیڈ لائٹس کے بکھرنے کا چھناکا بھی سنا۔ یہ بات یقینی تھی کہ سامنے سے بمپر اور جالی بھی سخت مجروح ہوئے ہوں گے مگر ایک مفت میں ملنے والی قیمتی گاڑی کو تباہ کرنے کا یہ پہلا تجربہ خاصا سنسنی خیز ثابت ہو رہا تھا۔

سڑک پر آ کے میں نے بڑی مشکل سے ایک تانگے کو بچایا اور کار گھوڑے کی ناک کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ غالباً گھوڑے کے لیے بھی یہ ایک سنسنی خیز تجربہ تھا مگر تانگے والے کے اعصاب زیادہ کمزور ثابت ہوئے جب وہ ہمیں پشتو میں گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکال سکتا تھا اس وقت وہ سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔

کچھ دور آنے کے بعد شوں شوں کی آواز کے ساتھ میں نے ونڈ اسکرین کے سامنے بادل سے اٹھتے دیکھے تو میری نظر ڈائل پر گئی۔ ٹمپریچر میٹر کا کانٹا لال نشان سے بھی آگے پہنچ گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ گیٹ سے گزرتے ہوئے ریڈی ایٹر شہید ہو گیا تھا اور اس کا پانی جو انجن کے رگ و پے میں حرکت سے پیدا ہونے والی حرارت کو جذب کرتا تھا بہہ چکا تھا۔

میں نے گاڑی کو فوراً روک دیا ورنہ وہ خود رک جاتی۔ سڑک پر آگے پیچھے مکان ضرور نظر آ رہے تھے مگر آبادی کی علامات مفقود تھیں۔

"نیچے تشریف لے آئیے تو ایبل لیڈیز۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے سر نکال کے کہا "کیا ہوا؟"

"میرے سلوک سے کار کا دل ٹوٹ گیا۔" میں نے کہا "جیسے دل پورے جسم میں خون پہنچاتا ہے ایسے ہی ریڈی ایٹر پانی۔"

"یہ اچانک مار دھاڑ اور ایکشن سے بھرپور فلم کیسے شروع ہو گئی۔" کاجل نے نیچے اتر کے کہا "اندر کیا ہوا تھا؟"

"اندر مجھے حکم ہوا تھا کہ میں کچھ کروں۔ کسی سے پنگا لوں۔ کچھ سکوت اور سکون محسوس ہو رہا تھا زندگی میں۔" میں نے کہا۔

"پھر اب کیا ہوگا۔ ایک تانگہ تک نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"ہم دو ٹانگوں پر جائیں گے۔" میں نے خوش دلی سے کہا "میں خود کو ایک درویش کی طرح محسوس کر رہا ہوں۔ نہ جیب میں مال نہ اہل و عیال۔ نہ ہم سواری پر نہ کوئی ہم پر سوار۔ نہ مال و زر نہ کوئی آزار۔ یوں ہی چلتے رہے تو بشرط زندگی اپنے ڈیرے پر بھی پہنچ جائیں گے۔"

رابعہ نے کہا "سکندر یہ کس کا گھر تھا؟"

میں نے کہا "یہ ظالم اور بے مروت شخص جو ہم پر دن دن گولیاں برسا رہا تھا تانا چوہدری دلاور کا سالا تھا۔ ممکن ہے دلاور اس کا سالا ہو۔ کل میری اس سے ملاقات بڑی پرلطف رہی۔"

"دلاور ملا تھا تمہیں کہاں؟"

"اسی گھر میں جہاں آپ مہمان تھیں۔" میں نے کہا "قصہ لمبا ہے اس لیے لمبی بات کرتا ہوں۔ شروع کرتا ہوں وہاں سے جب ہم بچھڑے تھے۔ مس کاجل' یہ داستان ہوشربا آپ کی خصوصی توجہ کی طالب ہے کیونکہ اس کا سب سے دلچسپ حصہ آپ کے منہ بولے بیٹے کی شادی خانہ آبادی کا قصہ ہے۔"

"جلدی سے بتاؤ۔ یہ کلیم کی شادی کا کیا چکر ہے؟"

"بے چارہ کلیم" میں نے آہ بھر کے کہا "ابھی عمر ہی کیا تھی اس کی لیکن باپ کے اعمال کی سزا اولاد کو ملتی ہے اگر اس کا باپ شادی کر لیتا تو اس پر یہ ظلم کا پہاڑ کیوں ٹوٹتا۔ چونکہ معاملہ ایک خاتون کا ہے اس کو تم ظلم کی پہاڑی کہہ سکتی ہو۔ سنا ہے خاصی بھاری بھر کم ہے۔"

کاجل نے کہا "بھائی سکندر سیدھی طرح بتاؤ۔"

میں نے کہا "تم کو خدا عقل دے۔ میں سیدھی بات کر رہا ہوں۔ کلیم کی شادی اسی خاتون سے ہوئی ہے جس سے اس کے باپ کی نسبت طے پائی تھی مگر وہ بزدل تھا یا بہت عقلمند کہ بھاگ گیا۔ پکڑا گیا اس کا بیٹا آخر کار۔ وہی لڑکی اب اس سے باندھ دی گئی جو اس کی ماں کے برابر ہوگی۔"

اس نئی مضافاتی بستی کی سڑکیں رات کو زیادہ ویران نظر آ رہی تھیں۔ ابھی یہاں اسٹریٹ لائٹ نصب نہیں ہوئی تھی۔ سڑکوں پر اندھیرا تھا اور خود سڑکوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس میں گڑھے تھے اور پختہ سڑک بنانے کے لیے جو پتھر بچھائے گئے تھے ان پر پیدل چلنا آسان کام نہ تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک نیم پختہ سڑک شروع ہوئی تو مجھ سے زیادہ رابعہ اور کاجل نے سکون کا سانس لیا اور خدا کا شکریہ ادا کیا کہ اس راستے پر انہوں نے اونچی ایڑی کے ساتھ چلنے کا امتحان پاس کر لیا' نہ ایڑی جوتے سے الگ ہوئی اور نہ ان کے پاؤں میں موچ آئی۔

میں نے ایک مختصر مگر جامع بیان جاری کیا جس سے کلیم کی شادی کے واقعات اور اس کا معاشرتی پس منظر واضح ہو گیا۔ کاجل کو سخت ملال تھا کہ کلیم پر ظلم ہوا اور کسی حد تک رابعہ بھی اس کی ہم خیال تھی کہ یہ کیا جاہلانہ رسم و رواج ہیں۔ میں نے ان کو یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ خود کلیم نے اس شادی کے خلاف کوئی جذباتی مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ بے حد مطمئن اور خوش تھا کہ آخر کار اس نے وہ قرض ادا کر دیا جو باپ پر واجب الادا تھا اور سارے جھگڑے خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔

"کمال ہے۔ وہ مطمئن کیسے ہو سکتا ہے ایک ایسی عورت کو بیوی بنا کے جو عمر میں اس سے اٹھارہ سال بڑی ہے۔"

"بیشتر شوہر صبر و قناعت کے پتلے ہوتے ہیں۔" میں نے کہا "جیسی اللہ نے ان کے مقدر میں لکھ دی اسی پر خوش رہتے ہیں۔ یا کم سے کم ایسا ظاہر ضرور کرتے ہیں۔ عورتوں کی طرح ساری عمر روتے پیٹتے نہیں۔"

www.paksociety.com

"عورتیں مفاہمت نہیں کرتیں نا۔" رابعہ نے کہا۔
"میں نے آج تک وہ عورت نہیں دیکھی جو کہے کہ میں حالات سے بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ بے حد خوش قسمت سمجھتی ہوں خود کو کہ میری شادی اس شخص سے ہوئی اور اب مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں۔" میں نے کہا "اماں حوا جنت میں خوش نہیں تھیں۔"
"یہ ایک متعصبانہ بیان ہے۔" رابعہ نے کہا۔
"میری بڑی خواہش تھی کہ میں کلیم کی بیوی کو دیکھ سکتی۔" کاجل نے چلتے چلتے کہا "آخر کلیم نے کیا دیکھا اس میں؟"
"یہ سوال تو کسی بھی مجنوں سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے لیلیٰ میں کیا دیکھا تھا آخر کہ اس کی خاطر صحراؤں میں بھٹکتا پھرا۔"
"کلیم اس کو جانتا تک نہیں تھا۔" کاجل بولی۔
"اور تم نہیں جانتیں کہ وہ کتنا مجبور تھا۔ اس معاشرے کی روایات کے خلاف آواز اٹھانا کلیم کے لیے ناممکن تھا۔ اسے وہاں رہنا تھا اور زندہ رہنا تھا۔ بہتر ہے کہ اب اسے بھول جاؤ۔ اس کی زندگی پر تمہیں جو تھوڑا بہت اختیار حاصل تھا وہ اب نہیں رہا۔" میں نے کہا۔
میرے الفاظ میں حقیقت کی بے رحمی تھی جس سے مفر نہیں تھا اور میں چاہتا تھا کہ کاجل اسے تسلیم کر لے۔ یہ بھی ایک معمولی سا جذباتی حادثہ تھا۔ جسے ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا لاحاصل تھا۔
رابعہ نے فوراً موضوع بدل دیا "اب ہم کہاں جائیں گے؟"
میں نے کہا "آسان جواب یہ ہے کہ جہاں تقدیر لے جائے۔"
"میرا مطلب تھا کہ ہم آصف علی کے گھر جا سکتے ہیں۔ وہ بہت پریشان ہوگا۔" رابعہ بولی۔
"وہاں جا کے ہم اس کی پریشانی کم نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ خود مزید پریشانی میں مبتلا ہو جائیں۔" میں نے کہا "میں دلاور پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ وہ ایک جھوٹا اور فریبی شخص ہے۔ اس نے بیک وقت اپنی طاقت سے مجھ پر دہشت بٹھانے کی کوشش کی اور میری طرف دوستی کا ہاتھ بھی بڑھایا۔ بظاہر وہ جیو اور جینے دو کی پالیسی کا پرچار کر رہا تھا مگر ساتھ ہی مجھے دھمکی بھی دے رہا تھا کہ میں تم سب کے ٹکڑے کر کے کتوں کے سامنے ڈال سکتا ہوں۔ اس کے بے قابو ہونے والے کتوں نے مجھے قتل کرنے میں کون سی کسر چھوڑی تھی۔"
رابعہ نے کہا "ہو سکتا ہے جو الفاظ تم کو بھی تمہیں خوف زدہ ہی کر رہا ہو اس کا ارادہ تمہیں شوٹ کرنے کا نہ ہو۔"
"کس کا ارادہ کیا ہے یہ وقت بتائے گا۔ ابھی تو میرا ارادہ ہے کہ آصف علی کو خطرات سے خبردار کر دوں۔ یہ بتا دوں کہ عامر بھی دلاور اینڈ کمپنی میں شامل ہو چکا ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے اس کو فوری طور پر قدرت کی حفاظت کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔"
"وہ کیا کر سکتا ہے؟"
"وہ اپنی بیوی کو اور قدرت کو ہمارے پاس لاہور بھیج سکتا ہے اور اپنا نقد سرمایہ اور کاروبار سمیٹ کر خود بھی لاہور آ سکتا ہے۔ یہاں تو ہم اس کی مدد نہیں کر سکتے۔"
"وہ ہماری مدد قبول بھی نہیں کرے گا۔" رابعہ بولی "اسے فکر ہے تو صرف قدرت کی زندگی کی۔ اسے ہمارے حوالے کرنے کے بعد خود بھی بزدلوں کی طرح فرار ہونا شاید پسند نہ کرے۔"
"خیر یہ اس کی مرضی۔ ہم اسے مجبور تو نہیں کر سکتے۔ پیشکش ضرور کر سکتے ہیں اپنے تعاون کی۔" میں نے کہا "باقی سب کارخوالا تو وہی ایک اللہ ہے جو ہماری حفاظت کر رہا ہے ورنہ ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔"
مجھے پشاور شہر میں چھوڑ دیا جاتا تو شاید میں آصف علی کے گھر جا پوچھے بغیر نہ پہنچ پاتا۔ یہ تو کوئی نواحی بستی تھی اور میرے لیے رات کے وقت سمت کا تعین بھی مشکل ہو رہا تھا۔ تین چار میل پیدل چلنے کے بعد آخر کار ہمیں ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں اور اس شریف آدمی نے ہاتھ کا اشارہ دیکھنے سے پہلے ہی گاڑی روک لی۔ دو عورتوں کے ساتھ اس وقت کسی مرد کا سڑک پر نظر آنا یہاں غیر معمولی بات تھی جب سڑکوں پر چور رہتے یا پولیس والے ہی پھرتے ہیں جو سب شریف آدمی کے دشمن ہوتے ہیں۔
میں نے اسے گاڑی کے حادثے کی جھوٹی کہانی سنائی اور اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے درخواست کی کہ وہ ہمیں یونیورسٹی ٹاؤن پہنچا دے۔
وہ کچھ پریشان ہوا "خوچہ یونیورسٹی ٹاؤن۔ وہ تو بہت دور ہے۔"
میں نے کہا "ہاں قریب ہوتا تو ہم پیدل ہی چلے جاتے۔"
"اچھا مجبوری اللہ مالک ہے۔" اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کے کہا "تم شریف آدمی نظر آتا ہے۔"
راستے میں اس نے بتایا کہ اس علاقے میں ہر طرح کے لوگ مل جاتے ہیں۔ بے پردہ عورتوں کے ساتھ رات کو نکلنے والا عام طور پر قابل اعتبار اور شریف آدمی نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایسے لوگ لفٹ لینے کے بہانے لوٹ بھی لیتے ہیں۔ اس نے صاف تو نہیں کہا مگر اشاروں میں واضح کر دیا کہ ایسی خواتین کا کردار بھی مشکوک ہوتا ہے۔
آصف علی کے گھر کے دروازے پر میں نے اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا "یہ میرا ہی گھر ہے۔ کبھی آدھی رات کو تمہیں مدد کی ضرورت پڑے خدانخواستہ تو اس گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہوں گے۔"
"آپ کا بڑا مہربانی" اس نے ہاتھ ہلا کے کہا۔
آصف علی ہمیں دیکھ کے پہلے حیران اور پھر بے حد خوش ہوا "میری تو زندگی عذاب ہو گئی تھی۔ پولیس کو رپورٹ کی۔ نیچے سے اوپر تک سب کی سفارش کی۔ دباؤ تھا مگر تمہارا پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ تم نے بھی حد کر دی کہیں سے فون کر دیتے۔ اطلاع دے دیتے۔"
میں نے کہا "پہلے غلطی معاف کیجئے۔ یہ بتائیے قدرت تو خیریت سے ساتھ گھر پہنچ گئی اور آپ کی وائف؟"
"ہاں وہ تو عامر کو گالیاں دے رہی تھی کہ جھوٹ بول کے ہمیں نہ جانے کہاں لے گیا تھا اور پھر خود غائب ہو گیا۔"
میں نے کہا "خدا کا شکر ادا کیجئے جس نے بروقت عامر کی اصلیت کو عیاں کر دیا۔ آپ ایک سانپ کو پال رہے تھے۔"
"میں اس کا سر بھی کچل سکتا ہوں۔" آصف علی نے مشتعل ہو کے کہا اور رابعہ سے مخاطب ہو گیا "جاؤ تم لوگ آرام کرو۔"
"شاید اب اس کی ضرورت نہ پڑے۔" میں نے کہا "وہ ادھر کا رخ ہی نہیں کرے گا۔"
"کیوں کہاں ہے؟"
"ابھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس دنیا میں بھی ہے یا نہیں۔" میں نے رابعہ اور کاجل کے جانے کے بعد کہا۔
"کیا مطلب؟"
میں نے اسے مختصراً ساری بات بتائی "دلاور نے پہلے میرے ساتھ ایک ڈرامہ کیا تھا۔ مجھے گرفتار کر کے لے جانے والے پولیس مین نہیں تھے۔ پولیس کی وردی میں اس کے بدمعاش تھے۔ اس نے انہیں شوٹ کر دینے کا ڈرامہ کیا۔ ان کی طرف نوٹوں کی گڈیاں پھینک کے مجھ پر ظاہر کیا کہ وہ پولیس کو خرید سکتا ہے اور جسے چاہے قتل کر سکتا ہے۔ قانون اس کے سامنے بے بس ہے۔
بعد میں اس نے مجھے مفاہمت کی پیشکش کی جو سب فریب تھا۔ جو قتل ہو گئے تھے انہیں میں نے نوکروں کے روپ میں زندہ دیکھا اور انہوں نے بھی مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ آپ ابھی دلاور کو نہیں جانتے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ اپنی حفاظت کا بندوبست کریں۔ خصوصاً قدرت کا۔"
"میں کیا کر سکتا ہوں قسمت کے لکھے کو تو نہیں مٹا سکتا۔ تم پر بھروسہ کر کے قدرت کو تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔"
میں نے کہا "آپ کو وہ اخبار ملا؟"
"اخبار تو نہیں ملا۔ مگر ایک فون آیا تھا تمہارے لیے۔ فون کرنے والے نے کہا کہ وہ غالب ہے۔"
میں اچھل پڑا "غالب؟ کہاں سے بات کر رہا تھا وہ؟"
"معلوم نہیں اس نے تمہارے بارے میں پوچھا۔ رابعہ اور کاجل کے متعلق معلوم کیا اور پھر کہا کہ جب وہ واپس آئیں تو منظر کے گھر فون کر لیں۔"
"آپ کو یقین ہے کہ وہ غالب تھا؟"
"بھئی اس نے کہا۔ میں نے مان لیا۔ میں اسے جانتا نہیں اور نہ اس کی آواز پہچانتا ہوں۔"
"اچھا صرف غالب نے بات کی تھی یا نازو نے بھی؟"
"نازو نے تو بات نہیں کی تھی۔" آصف علی نے کہا۔
اچانک باہر سے ایک فائر ہوا۔ غالباً چوکیدار نے اس کا جواب دیا۔ پھر مسلسل فائرنگ شروع ہو گئی۔
آصف علی نے گھبرا کے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔"
اس نے اپنی رائفل اٹھائی اور باہر لپکا۔ ابھی وہ دروازے میں ہی تھا کہ کسی نے اسے دھکا دیا اور وہ واپس کمرے میں آ گرا۔
"خبردار!" کسی عورت نے زنانہ آواز میں مصنوعی مردانہ بھاری پن پیدا کر کے کہا "ایک ایک کو گولی مار دوں گی میں" جانتے ہو میں کون ہوں؟"
اسے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یقیناً ناگ منی تھی۔

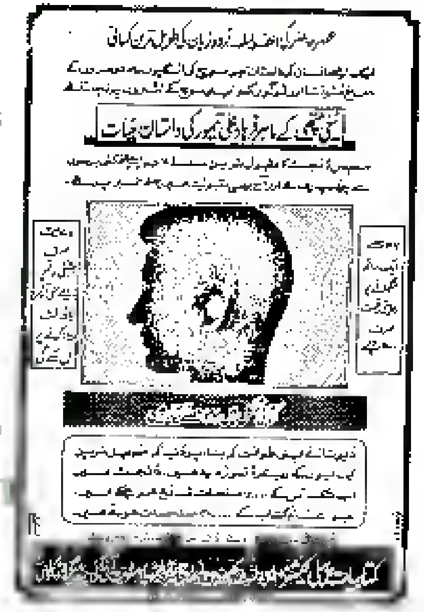

www.paksociety.com

میرے سنبھلنے سے پہلے ہی وہ عورت اندر آگئی جو سر سے پیر تک سیاہ برقع نما لبادے میں تھی۔ اس نے بڑی خوبی اور مہارت کے ساتھ روپوشی اختیار کی تھی۔ وہ خود تو برقعے کے اوپر والی جالی سے باہر کا پورا منظر دیکھ رہی ہوگی لیکن میرے لیے اس کو دیکھنا عملاً ناممکن تھا۔ اس کی صورت یا رنگ و روپ اور عمر کا اندازہ کرنا بھی محال تھا۔

میں صرف یہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ نہ پستہ قامت ہے نہ دراز قد۔ وہ دبلی پتلی بھی نہیں تھی اور اسے موٹا بھی نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ اگر میں اس کے ہاتھ دیکھ سکتا تو شاید اس کی عمر کا کچھ اندازہ کر پاتا مگر جن ہاتھوں میں اس نے خودکار مشین گن سنبھال رکھی تھی وہ کہنیوں تک سفید دستانوں میں چھپے ہوئے تھے۔

بہت نیچے جہاں برقع ختم ہوتا تھا، وہاں کلف لگے سفید لٹھے کی شلوار کا بالشت بھر حصہ تھا اور پھر پائنچوں کے سفید اسپورٹس شوز جو سائز میں اتنے بڑے تھے کہ مردانہ لگتے تھے۔

تاہم اس مشاہدے سے حاصل ہونے والے نتائج کے پیش نظر میں اسے پرانی ناگ منی تسلیم نہیں کر سکتا تھا جو اب محسن کی گل بانو تھی۔ گل بانو دراز قد تھی اور دبلی پتلی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے پاؤں کتنے نازک اور چھوٹے ہیں۔ اگر وہ اصل سائز سے اتنے بڑے جوتے پہن کے آتی تو ڈھیلے جوتوں میں اس کے پاؤں مضحکہ خیز نظر آتے مگر میرے مقابل کھڑی ہوئی عورت کو یہ جوتے فٹ تھے۔

جعلی ناگ [illegible] کے پیچھے ایسے ہی حلیے میں دو ڈاکو بھی اندر آگئے تھے۔ ان کی نیاز مندی کا انداز ہی ان کے ماتحت ہونے کا اعلان کر رہا تھا مگر وہ مشین گن کو خطرناک طریقے پر ہماری طرف کیے خالص فلمی پوز میں ٹانگیں پھیلا کے کھڑے ہو گئے تھے اور اب اپنی سردارنی کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ حکم ہو تو ان کے جسم میں اتنے سوراخ کر دیے جائیں جتنے چھلنی میں چھید نہیں ہوتے، اور کفایت شعاری مطلوب ہو تو سر میں فقط ایک گولی اتار دی جائے۔ ان کی مردانگی کو برقع پوش ہونا گوارا نہ تھا۔ وہ سر اور منہ پر ڈھاٹے باندھ کے آئے تھے۔ غالباً ڈھاٹے باندھنے کے فن میں وہ نو آموز تھے یا ویسے ہی ڈر رہے تھے کہ کہیں فری اسٹائل مارپیٹ کی نوبت آگئی تو ان کا چہرہ بے نقاب ہو جائے گا چنانچہ انہوں نے ڈھاٹوں پر ہر طرف ٹیپ چپکا دیے تھے۔

ان کے جسم پر ڈھیلی اور پرانی خاکی رنگ کی وردی تھی۔ یہ کسی چپراسی، ڈرائیور یا چوکیدار سے چھینی ہوئی وردی ہو سکتی تھی جو ان کے لیے بہرحال نہیں بنائی گئی تھی۔ اگر ایک کا قد کم ہوتا اور دوسرے کا وزن میں پونڈ بڑھ جاتا تو وردیاں ان کے جسم پر فٹ آجاتیں۔

وردیاں کثرت استعمال سے گھس چکی تھیں اور ان کے اصل رنگ پر اب دوسرے بہت سے رنگ غالب آگئے تھے جو اُن کی زندگی کے معمولات کی رنگین تصویر پیش کرتے تھے۔ تیل یا ہلدی یا لا کے غالباً چوٹوں پر لگائی گئی تھی۔ چوٹیں اس پیشے میں اتنی لازم و ملزوم ہیں جتنی مے خواری میں خواری۔ کبھی شامت اعمال سے پکڑے گئے تو پہلے پبلک میں ہر شخص ہیرو بن جاتا ہے اور پولیس کے آنے تک ٹھکائی کے کار خیر میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا ہے۔ اس کے بعد مال غنیمت کے برآمد اور "منصفانہ" تقسیم ہونے تک پولیس بھی فرض شناسی کا بھرپور مظاہرہ کرتی ہے اور بڑی محنت سے ٹھوک بجا کے اپنا حق وصول کرتی ہے۔ کھٹے چھڑنے کے رنگ سے پان کے دھبے اور قورمے کے رنگ تک ان کے دامن کا پیرہن سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات کی عملی تفسیر تھا۔

خوف اور تحیر کے چند لمحے گزر گئے اور وہ سسپنس ختم ہو گیا جو گل بانو کو ناگ منی کے روپ میں دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ میں نے آصف علی کی طرف دیکھا۔ دہشت سے اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔

"آصف صاحب، پریشان مت ہوں،" میں نے کہا "نقلی پستول کی طرح نقلی ڈاکو سے کیا ڈرنا!"

"تم سمجھتے ہو میں نقلی ڈاکو ہوں؟" اس نے پاؤں پٹخ کے برہمی سے کہا۔

"تم نقلی ناگ منی ہو۔" میں نے کہا "نقل کے لیے بھی عقل چاہیے اور تمہارے پاس عقل ہوتی تو تم یہ نام ہی اختیار نہ کرتیں۔"

"اس نام کی ایک دہشت ہے... میرے نام کی۔"

"گویا تم اپنے آپ کو ناگ منی تسلیم کرانے پر مصر ہو۔ چلو ٹھیک ہے بلکہ الزبتھ دوم کی طرح تم ناگ منی دوم کا لقب اختیار کر سکتی ہو۔ مجھے کیا؟ اب اپنے معاونین خصوصی سے بھی متعارف کرا دو۔ یہ کیا زیر تربیت ہیں؟ یعنی اپرنٹس جیسا پارٹ ٹائم ڈاکو ہیں؟ ایک تو پوسٹ مین لگتا ہے مجھے علاقے کا۔"

یہ گویا اس شخص کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا جسے میں نے ڈاکو سے ڈاکیہ بنا دیا۔

"بکواس مت کرو۔"

"یار میں نے تمہیں اتنی عزت دی کہ پوسٹ مین سمجھا اور تم ہو کہ برا مان رہے ہو۔" میں نے کہا "پوسٹ مین ایمانداری اور محنت سے روزی کماتا ہے۔"

ناگ منی نے کہا "تم مذاق سمجھ رہے ہو۔ یہ کوئی بھی ڈرامے جیسا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اچھا تو ناگ منی دوم معاف کرنا۔ ناگ منی دوم! ابھی تک تم نے مجھے نہیں بتایا کہ آخر تمہاری تشریف آوری کے مقاصد کیا ہیں؟"

"میں چاہتی ہوں کہ تم خاموشی سے میرے ساتھ چلو۔"

"ساتھ چلنے میں تو شاید اعتراض نہ ہو لیکن خاموش رہنا

www.paksociety.com

میرے لیے بہت مشکل ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لی "مسلسل پانچ منٹ کی خاموشی سے مجھے اختلاج ہونے لگتا ہے۔ دس منٹ زبان نہ کھولوں تو جگر کا فعل بگڑ جاتا ہے۔ چند رہ منٹ بعد..."

"دیکھو سکندر، مجھے سختی پر مجبور مت کرو۔" اس نے جھنجلا کر میری بات کاٹ دی۔ "میں تمہیں زبردستی بھی لے جا سکتی ہوں۔"

"صرف مجھے یا باقی لوگوں کا کیا بنے گا؟"

اس نے کہا "تمہیں، رابعہ اور کاجل کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"یعنی تم ڈاکو ہو۔ بلکہ ڈاکن ہو" میں نے کہا "ڈاکا ڈالو اور مال غنیمت لے کر جاؤ۔ بندوں کو لے جا کے تم کیا کرو گی۔ یہ تو اغوا کا کیس ہو جائے گا تم پر۔"

"ہونے دو، تمہیں کیوں فکر ہے میری؟"

میری باتوں نے آصف علی کے خوف اور پریشانی کو کچھ کم کر دیا تھا، میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا "تم کھڑی کیوں ہو آخر... بیٹھو۔"

"وقت نہیں ہے میرے پاس بیٹھنے کا۔ تم میری شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو سکندر۔" وہ لہجے کو خطرناک بنا کے بولی۔

"کوئی اور شاید نہ مانے کہ ڈاکو کا شرافت سے کیا تعلق مگر میں تسلیم کرتا ہوں کہ ابھی تک تمہارا رویہ شریفانہ ہے اور اسی لیے میں نے تم سے بیٹھنے کو کہا تھا کہ جانے سے پہلے کچھ ضروری باتیں ہو جائیں۔ ڈرنے کی کیا بات ہے، تمہارے حکم کے غلام بے حد مستعد ہیں اور خود تمہارے ہاتھ میں بھی آتش فشاں توپ ہے۔"

وہ ایک دم صوفے کے کنارے پر ٹک گئی "میں ڈرتی نہیں ہوں مگر یہ مت سمجھنا کہ تم مجھے باتوں میں لگا کے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ تم کو چلنا ہوگا میرے ساتھ۔"

"اور اگر میں نہ جاؤں تو؟"

"کیا انکار کرنا تمہارے اختیار کی بات ہے؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یعنی زندہ یا مردہ، ہر حال میں تم ہمیں لے کر ہی جاؤ گی؟"

"ایسا ہی سمجھ لو۔"

میں نے کہا "کہاں لے کر جاؤ گی؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتی۔"

"چلو یہ بتا دو کہ ہمیں اغوا کر کے تمہیں کیا ملے گا؟"

"معلوم ہو جائے گا وقت آنے پر" اس نے جھنجلا کے کہا۔

میں نے مظلوم لہجے میں کہا "ابھی معلوم ہو جاتا تو اچھا تھا میں کچھ کر لیتا۔"

"کیا کر لیتے؟"

"کچھ وصیت وغیرہ" میں نے آہ بھر کے کہا "تم کسی ویرانے میں لے جا کے گولی مار دو گی اور پھر کہو گی کہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ تو کیا فائدہ۔ کسی کو سزائے موت بھی دی جاتی ہے تو اس کی آخری خواہش ضرور پوچھتے ہیں۔"

مجھے یوں لگا جیسے وہ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہے "کیا ہوگی تمہاری آخری خواہش ایسی صورت میں؟"

"مس ناگ منی، ویسے تو ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے... لیکن میں ایک پر اکتفا کروں گا۔ میں دنیا سے چھڑا چھانٹ کنوارا نہیں جانا چاہتا۔ یہاں تو کرائے پر مکان اٹھانے والے بھی پوچھتے تھے کہ شادی شدہ ہو نا! کیا پتا دوسری دنیا میں پھر یہی سوال اٹھ کھڑا ہو۔"

میں اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہونے لگا تھا اور ناگ منی اس حد تک پُرسکون ضرور ہو گئی تھی کہ اس کے ہاتھوں بلا ارادہ فائرنگ سے میری بلا وجہ شہادت کے امکانات نہیں رہے تھے ورنہ جب وہ آئی تھی تو شدید اعصابی دباؤ کے باعث اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں مشین گن لرز رہی تھی اور وہ خود بھی لرزہ براندام تھی۔ یہ ناتجربہ کاری تھی یا اس خیال کی دہشت کہ مقابلہ ایم آر ایس سے ہوگا۔ جو جانتے تھے، وہ جانتے تھے کہ صرف خالت سے ایم آر ایس کو شکست دینے کی خواہش نے چوہدری ڈالا اور اینڈ کمپنی کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔

ناگ منی نے کہا "تم ہمارے ساتھ جانے سے پہلے رابعہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

ظاہر ہے اس نے یہ سوال سنجیدگی سے نہیں کیا تھا مگر میں نے جواب سنجیدگی سے دیا "میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے جی۔ ایسی صورت میں وہ کب مانے گی۔ دنیا کی کوئی عورت اس شخص کو قبول نہیں کر سکتی... جو تختۂ دار پر کھڑا ہو۔ لیکن تم چاہو تو میری یہ آخری خواہش پوری ہو سکتی ہے۔"

"میں... یعنی میں رابعہ کو قائل کروں۔ یا زبردستی..."

میں نے نفی میں سر ہلایا "تم خود مجھ سے شادی کر لو۔ آصف علی صاحب نکاح پڑھا دیں گے۔ تمہارے گواہ یہ کھڑے ہیں۔"

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی "تم ایسے ماننے والے نہیں ہو۔ تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ چالاکی سے کام لے کر تم کچھ کر سکتے ہو۔ تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو اس امید میں کہ شاید کوئی تمہاری مدد کے لیے آ جائے گا یا مجھے باتوں میں لگا کے تم فائدہ اٹھا لو گے۔"

اس نے غلط نہیں سمجھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس مہلت سے رابعہ یا کاجل ضرور فائدہ اٹھا لیں گی۔ ان کے پاس زندگی کے حالات کا وہ تجربہ تھا جو کسی بھی پُرخطر صورت حالات سے نمٹنے میں کام آ سکتا تھا اور انہیں عقل و ہوش کی راہنمائی فراہم کر سکتا تھا مگر اتنی دیر گزر جانے کے بعد بھی نہ رابعہ نے کچھ کیا تھا اور نہ کاجل نے۔ انہیں خبر ہی نہ تھی کہ یہاں اس گھر کے ایک کمرے میں ہم پر کیا بیت رہی ہے۔ وہ کسی دوسرے کمرے میں اتنی بے خبر کیسے رہ سکتی ہیں؟ یہ بات میرے لیے ناقابل فہم تھی۔ کیا انہوں نے باہر ہونے والے فائر کی آواز نہیں سنی تھی اور ان کے کانوں تک پہرے دار کے چلانے کی آواز نہیں پہنچی تھی؟

"اس گھر میں ایک اندھی عورت ہے، اسے چھوڑ دو" جلدی ناگ منی نے حکم چلاتے ہوئے کہا "ایک معذور پاگل لڑکی بھی ہوگی، اس کو بھی کچھ نہیں کہنا ہے۔ باقی سب کو گاڑی میں ڈال کے لے جاؤ۔"

بظاہر یہ بات اس نے انہی دونوں سے کہی تھی جو اس کے قریب مشین گن کے ٹریگر پر انگلی رکھے اشارے کے منتظر کھڑے تھے لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے تو میں سمجھ گیا کہ زیر نقاب کوئی پیغام رسانی کا آلہ ہے یا مائیکرو فون ہے جس کے ذریعے اس کا رابطہ باہر یا اندر دوسرے لوگوں سے بھی قائم ہے اور وہ سب اس کے حکم کی اطاعت کے پابند ہیں۔

معلوم نہیں جواب میں کیا کہا گیا تھا۔ جو آواز اس کے کانوں نے سنی ہوگی وہ ہم نے نہیں سنی۔

"بے وقوف ہو تم سب۔"

میں نے کہا "محترمہ ناگ منی صاحب! مؤدبانہ التماس ہے کہ آپ نے فی الحقیقت ہم سب کو اجتماعی طور پر بالجبر اغوا فرمانے کا تہیہ کر لیا ہے تو از راہ بندہ پروری احکامات صادر فرمائے جائیں کہ سفرِ آخرت میں، دمِ آخر تک ہمارے عہدِ رفاقت پر کاربند رہنے کے عزائم کی راہ میں کوئی مزاحم نہ ہو۔"

"ہم ایک ساتھ جائیں گے" یہ الفاظ رابعہ کے تھے جو احتجاجی مارچ کے انداز میں کاجل کے ساتھ اندر آ گئی تھی۔

"میں بھی یہی کہہ رہا تھا۔ سلیس اردو میں" میں نے دانت نکال کے کہا۔

کاجل نے گویا اس اعلان کی تائید کی "ہم ایک ساتھ جئیں گے اور مریں گے۔"

میں نے سر ہلا کے کہا "تحت... تحت... مریں ہمارے کمینے دشمن۔ تم صرف جینے کی بات کرو۔"

ایک ڈاکو نے مشین گن سے اشارہ کیا "چلو ادھر لائن میں لگ جاؤ تم بھی۔ خبردار جو کسی نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی۔"

میں نے کہا "ڈاکو صاحب! یہ بے چاری کیا چالاکی دکھائیں گی جو برضا و رغبت تمہاری خدمت میں خود حاضر ہو گئی ہیں۔ ان میں اگر عقل ہوتی تو اتنی دیر میں باہر سے کسی کو مدد کے لیے نہ بلا لیتیں؟"

"یہ باہر جا سکتی تھیں!" ناگ منی نے تمسخر اڑایا "ہمارے آدمی ہر طرف موجود ہیں۔"

"آدمی نہیں، شکاری کتے کہو" میں نے کہا "جو ایک عورت کے پیچھے دم ہلانے پر مجبور ہیں۔"

اب دوسرے ڈاکو کی قوت برداشت جواب دے گئی "چپ کر کے، بھونکنا بند کر نہیں تو..." اس نے ایک دم مشین گن اٹھا کے چھت کی طرف فائر کیا۔

شاید وہ نشانہ لیتا تو خطا ہو جاتا مگر سمت کا تعین کیے بغیر چلائی جانے والی گولی فانوس کو آویزاں رکھنے والی سنہری زنجیر پر لگی اور زنجیر کے ٹوٹتے ہی شیشے کا بھاری فانوس نیچے آیا۔ اس کے عین نیچے گلاس ٹاپ والی گول سینٹر ٹیبل تھی۔ فائر کی گونج ابھی باقی ہی تھی کہ شیشے بکھرنے کا زبردست چھناکا ہوا اور غیر ارادی طور پر کمرے میں موجود ہر شخص نے ہر طرف اڑنے والے تیز دھار ٹکڑوں سے اپنا چہرہ اور آنکھیں محفوظ رکھنے کے لیے ہاتھ آگے کیے۔

یہی وہ لمحہ تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔ جو کوشش سے نہیں آتا اور کسی کو بتا کے نہیں آتا۔ یہ کھیل تقدیر کھیلتی ہے کہ سب پتے اپنے ہاتھ میں رکھنے والا ایک غلط چال سے بازی ہار جاتا ہے۔

مجھے یہ موقع فراہم کرنے والوں کو اس وقت ہوش آیا جب میں جست لگا کے ناگ منی پر گر چکا تھا اور اسے پیچھے سے دبوچ کے اتنا بے بس کر چکا کہ اس کے جاں نثار محافظ اور اطاعت گزار سب دم بخود کھڑے رہ گئے تھے۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ یہ عورت زندہ رہے تو ایسے ہی کھڑے رہو۔ بالکل بُت کی طرح" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "مجھے حرکت کا شک بھی ہوا تو میں اس کی گردن کو نہ لکڑی کی طرح توڑ دوں گا۔ شاید تم یہ پہلے سے جانتے ہو گے کہ خالی ہاتھوں سے میں سخت لکڑی کی طرح اکڑی ہوئی گردن بھی توڑ سکتا ہوں۔"

بُت بن جانے والے ایک شخص نے صرف لب ہلائے "کیا تم جانتے ہو کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"میرے ساتھ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ تم سب اپنی اپنی مشین گنوں کے راؤنڈ مجھ پر چلا دو مگر اس کے بعد؟ تم واپس جا کے کیا کہو گے، کوئی تو پوچھے گا تم سے کہ غلطی کس نے کی تھی؟"

ناگ منی کی مشین گن نیچے گر گئی تھی۔ وہ خود میری گرفت میں بری طرح تڑپ رہی تھی اور ہر طرف ہاتھ اور لاتیں چلانے کے ساتھ دانتوں سے مجھے کاٹنے کی کوشش ناکام میں مصروف تھی۔

میں نے اسے دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑ کے پیچھے کھینچ لیا۔ لات مار کے میں نے مشین گن کو بھی کونے میں پہنچا دیا اور خود بھی اس عورت کو ڈھال بنا کے کونے میں کھڑا ہو گیا۔ اب کسی بھی سمت سے آنے والی گولی کا پہلا نشانہ وہی تھی۔

یہ اندازہ تو میں نے فوراً ہی کر لیا تھا کہ میرے بازوؤں کے حلقے میں گرفتار جسم کسی عورت کا نہیں ہو سکتا۔ میرے ہاتھ عورت کے بدن کے لمس کی نرمی، گداز اور نشیب و فراز کی نزاکت و لطافت کو سمجھتے تھے اور محسوس کر سکتے تھے۔ پھر جس طرح اس نے میری گرفت سے نکلنے کے لیے مزاحمت کی وہ کسی بھی عورت کے لیے ممکن نہیں تھا۔

اس کشمکش میں نقاب کا اُتر جانا لازمی تھا۔ نقاب کے نیچے ایک سوالی صد مردانہ چہرہ تھا۔ اس کا رنگ کالا تھا لیکن چہرے پر بڑھی ہوئی شیو کے سخت بالوں میں سفیدی غالب تھی۔ وہ کم سے کم

www.paksociety.com

پچاس سال کا آدمی تھا جس کے سر کے بیشتر بال اُڑ چکے تھے اور باقی بالوں کو مہندی سے رنگ کے اس نے پیچھے کی طرف چُٹیا سی باندھ رکھی تھی۔ اس نے بہت موٹے فریم والی عینک لگا رکھی تھی۔ رابعہ اور کاجل ہکا بکا کھڑی تھیں اور آصف علی اتنا حیران تھا کہ وہ رائفل تک اٹھانا بھول گیا تھا جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گئی تھی۔

"تو تم ہو ناگ منی' بلکہ گل بانو" میں نے کہا "کیا چیز ہو آخر تم؟ نہ ادھر کے نہ اُدھر کے۔"

اب اس نے قطعی بدلی ہوئی مردانہ آواز میں کہا "سکندر بابو! ہم کو چھوڑ دے ورنہ پچھتائے گا' بہت پچھتائے گا۔"

اس کی آواز حیرت انگیز طور پر پاٹ دار اور پُر تحکم ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے ٹِلّے جیسے سر پر ہاتھ مارا "لوگوں کے ٹُکڑے ایکٹر کی اولاد۔ سیدھی طرح بتا کون ہے تو ورنہ دُھلے ہوئے کپڑے کی طرح نچوڑ دوں گا۔"

اس نے بے خوفی سے قہقہہ مارا "ارے تو نہیں جانتا' کچھ نہیں جانتا نادان کہ ہم کون ہیں۔ ارے ہم قہر ہیں' بلا ہیں۔ ہم سے مت ٹکرا سکندر بابو۔ ہم فولادی چٹان ہیں اور تو مٹی کا پتلا۔"

اب آصف علی نے رائفل اٹھائی "اس فولادی چٹان کو میں ابھی کنکر بناتا ہوں۔"

وہ ہنستا رہا۔ اس کے قہقہے معنوی تھے۔ اسٹیج پر کام کرنے والے ولن کی طرح وہ جھوٹے اعتماد کا سہارا لے کر بے خوفی کی اداکاری میں مصروف تھا اور ہمیں نفسیاتی طور پر کمزور کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کی اداکاری سے زیادہ صداکاری کے کمال کا معترف ہو چکا تھا۔ اس نے ناگ منی کا زنانہ رول حد درجہ مہارت کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے پاؤں اور جوتے دیکھ کر مجھے یقین آگیا تھا کہ وہ گل بانو نہیں ہے لیکن یہ شک مجھے بہرحال نہیں ہوا تھا کہ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگار میں جس کی داڑھی مونچھیں' گنجا سر اور مردانہ خدوخال ہیں۔ مجھے تھوڑا سا تجسس اور اشتیاق تھا کہ میں اس عورت کو دیکھوں جو ناگ منی ہے۔ اس کی آواز اتنی پُر فریب تھی کہ میں اپنے ذہن میں ایک حسین نہ سہی قبول صورت' نوجوان نہ سہی جوان' گوری نہ سہی سانولی عورت کا تصور قائم کر چکا تھا۔ چنانچہ نقاب کشائی کے بعد حیرت اور مایوسی کے ساتھ مجھے خفت کا سامنا بھی ہوا کہ میری عقل جس پر مجھے بڑا ناز تھا اتنی آسانی سے دھوکا کھا گئی۔

مسکراہٹ رابعہ اور کاجل کے لبوں پر بھی نظر آ رہی تھی اور میری طرح وہ بھی ناگ منی کے اصل روپ کو دیکھ کر شرمندہ و حیران تھیں۔ ہماری ذہنی کیفیت کسی سانپوں پر ریسرچ کرنے والے پروفیسر کی حالت سے مختلف نہ تھی جسے کوئی چالباز سپیرا یقین دلا دے کہ پٹاری میں شیش ناگ ہے مگر وہ پٹاری کھولے تو اس میں سے ربر کا سانپ بھی نہ نکلے۔ ایک چوہا نکلے اور بھاگ جائے۔

آصف علی کی بات پر اس نے کڑک کے کہا "خبردار جو آگے بڑھے! وہیں رک جا۔ تو چٹان کو کنکر بنانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ کیا ہے تو؟ نفرت کی دیوار ہے بڑھے تو۔ چراغِ سحری ہے اور پھونک مار کے بجھانا چاہتا ہے آفتاب کو۔"

اس نے پھر ایک قہقہہ مارا جو کسی طمانچے کی آواز کی طرح تھا۔ رسوا کن' اشتعال انگیز' ذلت آمیز۔

غصے کی لہر نے مجھے اتنا مغلوب کر لیا تھا کہ شاید میں اس ڈائیلاگ بولنے والے ایکٹر کی آواز ہمیشہ کے لیے بند کر دیتا۔ اس کی گردن کے گرد میرا ایک ہاتھ تھا اور دوسرے سے میں نے اس کا دایاں بازو تھام کے اپنے سامنے اس کی کمر سے لگا رکھا تھا۔ میں اس کی کمر پر گھٹنا مارتا اور گردن کو پیچھے موڑ کے جھٹکا دیتا تو اس کا منکا ٹوٹ جاتا۔

آصف علی نے اسے گالی دی "سُور کے بچے! میں تجھے مار کے ہی مروں گا۔ چھوڑ دو اسے سکندر' ہٹ جاؤ ایک طرف۔ میں اسے گولی مارتا ہوں۔ مجھے اس کا حق حاصل ہے۔ یہ میرے گھر میں مجرمانہ عزائم کے ساتھ داخل ہوا۔ اسلحے کے زور پر اس نے مجھے ہراساں کیا' میرے اہلِ خانہ کو یرغمال بنایا۔ میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں۔ میرا ہارٹ فیل ہو سکتا تھا۔"

میں نے اسے چھوڑ کے مشین گن اٹھالی "آپ غصے میں نہ آئیں۔ ولاور جیسے لوگوں سے نمٹ چکا ہوں میں' یہ اس کی اوقات ہی کیا ہے؟"

"اوقات!" اس نے پھر قہقہہ بلند کیا "مجھ سے میری اوقات پوچھتا ہے۔ تو نہیں جانتا' بالکل نہیں جانتا کہ تیری اوقات بھی کچھ نہیں ہے۔ تو غبارہ ہے غبارہ۔ اونچا اُڑ رہا ہے ابھی۔ بہت اونچا اُڑ رہا ہے۔"

وہ ایک ایک لفظ کو واضح ڈرامائی تاثر کے ساتھ بھرپور لہجے میں یوں ادا کرتا تھا جیسے وہ اسٹیج سے سامعین کو مخاطب کر رہا ہو یا حجرۂ خاص سے برآمد ہو کے عقیدت مند مریدوں کے اجتماع سے خطاب کر رہا ہو۔

ابتدا میں اس نے اپنی شناخت کو چھپائے رکھنے کے لیے کچھ مزاحمت کی تھی لیکن اس کے بعد وہ پُرسکون ہو گیا تھا۔ نہ وہ اس وقت پریشان ہوا تھا جب آصف علی نے رائفل اٹھائی تھی اور نہ میری گرفت سے آزاد ہونے کے بعد اس کے سکون میں فرق آیا تھا۔ مشین گن کا رخ اپنی طرف دیکھ کے وہ اتنا بھی خوف زدہ نہیں تھا جتنا صورت حال کو پوری طرح اپنے قابو میں رکھنے کے باوجود آصف علی خائف تھا۔ بے خوفی کا مظاہرہ میں نے بھی کیا تھا لیکن اندر سے میں کتنا پریشان تھا' یہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ خود رابعہ اور کاجل کے رنگ اس بحران سے نکل جانے کے بعد بھی اُڑے ہوئے تھے اور وہ نروس دکھائی دے رہی تھیں لیکن اس شخص کی بات جدا تھی۔ وہ اندر سے بھی پُرسکون اور پُراعتماد تھا۔

دراصل اپنا راز فاش ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ آغا حشر کے اسٹائل میں ڈائیلاگ بول رہا تھا۔ اس کا اندازِ تخاطب' اس کے قہقہے اور اس کی گونج دار آواز سب میں ایک جارحانہ چیلنج تھا۔ ناگ منی کے رول سے اس نے یکلخت اپنی شخصیت کو یا نے خلف اور متضاد کردار میں یوں ڈھال لیا تھا جیسے یہ سب سوچی ہوئی بات تھی۔ جیسے وہ انسان نہیں ٹی وی ہے۔ بٹن دبایا اور چینل بدل گیا۔ ابھی ایک عورت گا رہی تھی' اچانک وہیں کوئی بارش مولانا درس دینے لگے۔ پھر بٹن دبایا' ڈونالڈ ڈک کی مخصوص ہنسی کے ساتھ کارٹون آگیا۔ یا وہ ڈبل چال والا پنکھا ہے کہ ایک ڈوری کھینچی تو سیدھا چلنے لگا۔ دوسری کھینچی تو الٹا۔ ایک آدمی کا یوں قالب بدلنا اور ہر سروپ میں اتنا حقیقی نظر آنا بلاشبہ کمال تھا۔ مجھے اس شخص میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور میں زندگی کے ڈرامے میں پہلی بار یکی نمودار ہو کے حیران کر دینے والے اس کردار کے بارے میں زیادہ تفصیل سے جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور کیا ہے۔ فقط اداکار اور ایک صداکار یا ہدایت کار بھی خود ہی ہے۔ تو ایسے ڈرامے وہ کب سے پیش کر رہا ہے اور کیوں؟

مجھے اونچا اڑنے والا غبارہ قرار دیتے ہوئے اس کی نظریں اوپر چھت کی طرف اٹھ گئی تھیں اور ہاتھ آسمان کی بلندی کو واضح کرنے لگے تھے۔ وہ ایک ایسا کامیاب مداری تھا جو دیکھنے اور سننے والوں کے ذہن پر ان کی بصارت اور سماعت پر اور عقل و ہوش پر نفسیاتی غلبہ حاصل کرتا آتا تھا۔ غالباً اسی کو عرفِ عام میں نظربندی کہا جاتا ہے کہ تماشا دیکھنے والے وہی دیکھنے اور محسوس کرنے لگتے ہیں جو مداری انہیں بتاتا ہے۔ حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ خصوصی مہارت حاصل کر لی جائے تو یہی ہپناٹزم ہے جس میں عامل اپنے معمول پر صرف ذہنی غلبہ ہی حاصل نہیں کرتا' جسمانی طور پر بھی اسے مسخر کر لیتا ہے۔

ایک لمحے کے لیے میں نے بھی محسوس کیا کہ ہلکا پھلکا ہو کے میں غبارے کی طرح بلند ہو گیا ہوں اور کھلے آسمان کی وسعت میں پرواز کر رہا ہوں۔ دوسرے لمحے میں اس طلسم سے آزاد ہو گیا۔

میں نے اس کے ایک لات رسید کرنے کی کوشش کی مگر وہ تھوڑا سا دور ہو گیا۔ میرا پاؤں اس کو چھو کے واپس آگیا "بند کر اپنا یہ بکواس حرام زادے ورنہ......"

"ورنہ کیا..... کیا کرے گا تو..... بول..... اس اندھی عورت کو مروا دے گا؟" اس نے میری بات کاٹ کے کہا اور پھر اپنا ہاتھ مٹھی کر کے گھمانے لگا "میرے قبضے میں ہے اس کی جان۔ وہ اندھی ہی نہیں ایک منٹ میں مر جاتی ہے۔ تو دیکھ سکتا ہے مگر جانتا نہیں کہ تو کچھ نہیں کر سکتا۔ بالکل کچھ نہیں کر سکتا" ایک بار پھر اس کا منحوس قہقہہ بلند ہوا اور اس نے اپنی لال لال آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ ابھی تک مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ اس گھر میں ہمارے علاوہ بھی دو افراد ہیں۔ آصف علی کی نابینا بیوی اور

اس کی ذہنی و جسمانی طور پر معذور بیٹی قدرت خانم۔ وہ اس منظر سے غائب تھیں اور ابھی تک میں نے ان کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ پہلے ہی فائر نے اور پھر چوکیدار کے چلانے کی آواز نے آصف علی کی بیوی کو متوجہ نہ کیا ہو۔ وہ بصارت سے محرومی کے بعد اپنی سماعت پر زیادہ انحصار کرتی تھی۔ پھر اس نے دوسرے فائر اور فانوس کے گرنے کی آواز کو در خورِ اعتنا کیوں نہیں سمجھا تھا؟ اس کے کان تو دوسرے کمرے میں یا گھر کے کسی بھی حصے میں اجنبی آوازوں پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ پھر اس کی غیر حاضری کا کیا مطلب ہے؟ اس نے ابھی تک یہاں آ کے پوچھا کیوں نہیں کہ یہ سب کیا ہے' یہ کیسا شور ہے' یہ کون لوگ ہیں جو اس طرح ہمارے گھر میں در آئے ہیں اور وحشت پھیلا رہے ہیں۔

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا "رابعہ....."

"مجھے نہیں معلوم" رابعہ نے گویا اعترافِ جرم کر لیا "میں اپنے کمرے میں تھی۔ پھر میں نے دیکھا تو وہ آدمی کھڑے تھے وہاں' ایسے ہی۔"

"آدمی....." اس شخص نے نعرہ لگایا جو پہلے ناگ منی کی آواز میں بول رہا تھا اور ابھی تک برقعے کا نچلا حصہ پہنے کھڑا تھا "کون ہے آخر آدمی۔ کوئی نہیں جانتا۔ بالکل نہیں جانتا۔ ہم سب بہروپیے ہیں اور ایکٹر ہیں۔ حاکم ہیں اور محکوم ہیں۔ ظالم اور مظلوم۔ قاتل اور مقتول ہیں۔ لیڈر اور ووٹر ہیں۔ مزدور اور شاعر۔ چوہدری' ڈاکو اور مولوی۔ استاد اور طالب علم ہیں۔ آدمی کہاں ہے؟"

تقریر کرتے کرتے اس نے آخری جملہ یوں کہا جیسے اپنے آپ سے سوال کیا ہو۔ وہ بلند آواز میں ہاتھ اٹھا کے بول رہا تھا مگر اچانک اس نے آخری الفاظ سرگوشی میں کہے اور پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کا بھی ایک ڈرامائی تاثر تھا۔

میں نے اسے نظرانداز کر دیا اور سوالیہ نظروں سے کاجل کو دیکھا۔

"میں باتھ روم میں تھی" اس نے کہا "انہوں نے مجھے بھی یہاں دھکیل دیا۔ پہلے وہ کہہ رہے تھے کہ باہر چل کے گاڑی میں بیٹھو لیکن ہم نے انکار کر دیا تھا۔"

"شاباش' بڑی بہادری کا ثبوت دیا تھا" میں نے طنز سے کہا۔

"اور ہم کیا کرتے؟" رابعہ بولی "ہمیں موقع ہی نہیں ملا۔"

"اور حلق سے آواز نکالنے کا خیال نہیں آیا ہو گا!"

خاکی وردی والے دونوں بے حس و حرکت کھڑے ہوئے تھے اور ان کی نظریں اب اپنے ایکٹر سردار کی طرف تھیں۔

اس شخص نے اچانک کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا "ان کو بھی یہاں لے آؤ۔"

پہلے میں نے غور سے دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے کوئی خفیہ مائکروفون نظر نہ آیا۔ اندر کہیں سننے والوں نے اس کا فرمان موصول کر لیا تھا اور جواب میں بھی کچھ کہا تھا جس پر اس نے

www.paksociety.com

سہلا کے کہا تھا "ٹھیک ہے" لیکن پھر میں نے یہ راز دریافت کرلیا۔ اس کی عینک کی کمانی کا جو سرا کانوں کے پیچھے تک پہنچتا تھا اس میں ایک طرف دھاگے جیسا تار تھا جو ایک کان میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ غالباً آلۂ سماعت جیسا ریسیور تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ دوسری طرف کی کمانی میں کوئی بہت حساس مائکروفون ہو۔

اس پُراسرار شخص کو سمجھنے کی کوشش میں میرا دماغ چکرا کے رہ گیا تھا۔ وہ بیک وقت مسخرہ بھی لگتا تھا اور فلاسفر بھی۔ وہ بہروپ بہروپ، آواز و انداز بدل سکتا تھا لیکن باعث تشویش یہ بات تھی کہ وہ ایک گروہ کا سرغنہ تھا جس میں پیشہ ور مجرم شامل تھے۔ ظاہر ہے وہ بہ لحاظ صلاحیت ان سب سے افضل و برتر تھا۔ اس نے ڈاکا ڈالنے کی کوشش میں ناگ منی کا نام استعمال کیا تھا جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ ناگ منی کے ماضی سے بے خبر نہیں۔ اس سے ہمارے تعلق کی نوعیت کے بارے میں بھی وہ یقیناً سب کچھ جانتا ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ہمارے بارے میں تمام معلومات اسے کس نے فراہم کی تھیں؟ بظاہر اس کا ایک ہی جواب تھا کہ ہمارے پرانے دشمنوں نے، مگر اس سے دوسرا سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا وہ ہمیں انہی کے اشارے پر اغوا کرکے ساتھ لے جانا چاہتا تھا؟ یہ بات بالکل ناقابل فہم تھی۔ ہمیں خود بلا کر اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا لیکن اس نے تو ہمیں "باعزت" طور پر رہا کردیا تھا۔ تاہم وہ اور خود ایک سمجھ میں نہ آنے والی چیز تھا۔

آصف علی کی بیوی بدحواس اور دہشت زدہ، چیختی چلاتی اندر آئی "آصف علی کہاں ہو تم؟ تم ٹھیک تو ہو نا!"

"ہاں ہاں۔ بالکل ٹھیک ہوں میں۔"

"یہ ہمارے گھر میں کیا ہو رہا ہے، کون لوگ گھس آئے ہیں، کیا چاہتے ہیں یہ لوگ؟" وہ چلا کے بولی۔

میں نے اسے آصف علی کے ساتھ بٹھا دیا "آپ یہاں خاموش بیٹھ جائیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"فکر کی بات کیسے نہیں۔ انہوں نے مجھے پکڑ کے باندھ دیا تھا۔ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس رکھا تھا۔ قدرت کہاں ہے؟" وہ بدستور چلاتی رہی "خدا غارت کرے انہیں۔ کون ہیں یہ ظالم کمینے....."

آصف علی نے کہا "شور کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ قدرت کو ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ تم نے بک بک جاری رکھی تو سب کچھ ہو جائے گا۔"

وہ ڈر گئی۔ "کیا ہو جائے گا؟ دیکھو ان لوگوں سے کہو کہ سب کچھ لے جائیں۔ جو بھی انہیں چاہیے تم خود دے دو۔ لیکن ان سے کہو ہمارے گھر سے چلے جائیں۔ ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ پولیس کو بھی کچھ نہیں بتائیں گے۔"

میں نے اب اپنے سامنے بڑے قلندرانہ جاہ و جلال اور تاجدارانہ عزم کے ساتھ کھڑے ہوئے بہروپیے کو دیکھا "اپنے ساتھیوں سے کہو کہ قدرت کو بھی لے آئیں اور ہتھیار ڈال دیں۔"

اس کی نظریں مجھ پر جم گئی تھیں "تو حکم دیتا ہے مجھے؟ مجھ پر حکم چلاتا ہے؟ جانتا نہیں، میں کون ہوں۔ بالکل نہیں جانتا تو جاہل، تیری آنکھیں کھلی ہیں مگر تو دیکھ نہیں سکتا اندھے۔"

میں نے کہا "چلو تم خود بتا دو اپنے بارے میں کہ تم کون ہو؟"

"میں بادشاہ ہوں" اس نے یوں کہا جیسے یہ بات تو ساری دنیا کو معلوم تھی اور میرا سوال انتہائی احمقانہ تھا جیسے میں سورج کے بارے میں پوچھوں کہ یہ کیا چیز ہے۔

"اور آپ کی بادشاہت کہاں قائم ہے؟" میں نے کہا۔

"یہاں۔ اسی جگہ۔ تیرے سامنے بھی ہم بادشاہ ہیں، لیکن تو نہیں جانتا، بالکل نہیں جانتا۔"

بظاہر یہ اس کا تکیۂ کلام تھا "تو نہیں جانتا۔ بالکل نہیں جانتا۔" مگر مجھے اس میں بھی شک تھا۔ جو شخص دھوکا دینے کے لیے جنس اور آواز تک بدلنے پر قادر ہو، وہ انداز کلام بھی بدل سکتا ہے اور ابھی کیا معلوم، یہ بھی اس کی شخصیت کا اصل روپ تھا یا نہیں۔ نقاب اٹھ جانے کے بعد اس کا جو روپ سامنے آیا تھا وہ بھی دھوکا ہو سکتا تھا۔

میں نے کہا "تم اب کیا کرسکتے ہو بادشاہ سلامت، تم محصور ہو۔ یہاں سے تم کیسے نکلو گے؟"

اس نے ایک قہقہہ مارا "اپنے آپ سے کرو یہ سوال ابو جہل۔ بادشاہ کا راستہ کس نے روکا ہے؟"

"تم سب کی لاشیں ہی جائیں گی یہاں سے۔"

اس نے انگلی لہرائی "نا.... تم سب کی نہیں.... ہم سب کی۔ دیکھو ذرا ان بندوقوں کی طرف۔ ان میں جھانک، پڑھ کس گولی پر کس کا نام لکھا ہے اور سمجھ لے کس کو کہاں جانا ہے۔ ہم سب کو ساتھ جانا ہے، جہاں بھی جانا ہے۔ اندر..... باہر..... اوپر۔"

اس نے سر اٹھا کے چھت کو دیکھا اور پھر ہاتھ بلند کرکے انگشت شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ کرنے لگا۔

یہ بڑی عجیب صورت حال تھی۔ میں اور آصف علی ان پر بندوقیں تانے کھڑے تھے اور وہ ہم پر۔ آصف علی کی بیوی کا ہونا نہ ہونا برابر تھا بلکہ اس کی موجودگی ہمارے دفاع کو کمزور کرتی تھی۔ رابعہ اور کاجل بھی خالی ہاتھ بے بس تھیں اور ان سے کوئی کارنامہ سر انجام دینے کی توقع رکھنا عبث تھا۔ ہاں ان کی جگہ نازو ہوتی تو میں بہت پُریقین اور پُراعتماد محسوس کرتا اور کسی نہ کسی موقعے سے فائدہ اٹھا کے ہم بساط الٹ دیتے۔ اس وقت بھی جب میں نے بادشاہ سلامت کو دیکھا تھا میں نے شدت سے نازو کی کمی کو محسوس کیا تھا۔ نازو ساتھ ہوتی تو اسی لمحے باقی وہ کو لمبا لٹا دیتی۔ وہ اس محاذ پر کامیابی کے بعد ہم مشترکہ حکمت عملی سے آصف علی کی بیوی اور قدرت کو بھی رہا کرا لیتے لیکن اکیلا میں ہر جگہ نہیں ہو سکتا تھا۔

ابھی تک مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اندر گھر کے باقی حصے میں کتنے حملہ آور موجود ہیں اور ان کے کتنے ساتھی باہر ہیں۔

خلاف توقع وہ قدرت کو چھوٹی دروازے کی طرف سے اندر لائے۔ قدرت کا ذہن ایک ننھے بچے کی اوسط ذہانت سے بھی محروم تھا۔ وہ کیسے اندازہ کرسکتی تھی کہ صورت حال کتنی سنگین ہے اور اس گھر میں کس قسم کا خطرناک کھیل جاری ہے۔ وہ تو خطرے کے مفہوم سے ناآشنا تھی اور اس کے لیے اجنبی یا آشنا چہروں پر جذبات کی مدوجزر کا مطالعہ اتنا ہی دشوار اور ناممکن تھا جتنا نظام کائنات کے اسرار و رموز کو سمجھنا۔

قدرت کے دائیں بائیں وہ تنومند محافظ تھے۔ شناخت کو ناممکن بنانے کے لیے انہوں نے حلیوں میں یکسانیت کی آڑ لی تھی۔ ان کے جسم پر بھی خاکی وردیاں تھیں اور انہوں نے بھی منہ پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔

آصف علی کی بیوی دیکھنے سے قاصر تھی مگر اس کی ماں نے اولاد کی قربت کو محسوس کرلیا "قدرت..." وہ چلائی۔

"ام م۔... ماں" قدرت نے خوش ہوکے کہا اور آگے بڑھی مگر دو مضبوط ہاتھوں نے اسے روک لیا۔

آصف علی نے مضطرب ہوکے کہا "اسے چھوڑ دو۔ اس کے بدلے کچھ بھی لے لو مجھ سے۔"

"ہاں۔ جو بھی ہمارے پاس ہے، سب لے لو" اس کی بیوی اضطراب میں مبتلا ہوگئی "روپیہ پیسہ زیور۔ میں ہر چیز دے سکتی ہوں مگر خدا کے لیے اسے چھوڑ دو۔ یہ کچھ نہیں جانتی، کچھ نہیں سمجھتی۔ یہ خدا کی امانت ہے، خدا کی قدرت ہے۔"

بادشاہ ہنسنے لگا "خدا کی قدرت دیکھو سکندر اعظم!! اچھی طرح دیکھو اور سمجھو، اس کی قدرت کو اور اپنی مجبوری کو۔"

رابعہ نے کہا "تم اس معصوم پہ ظلم کرو گے۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو۔"

کاجل نے کہا "اتنے سنگدل مت بنو۔"

بادشاہ ان کی طرف پلٹا "لڑکی! تو نہیں سمجھتی، بالکل نہیں سمجھتی۔ ہم ظلم نہیں کرتے۔ ہم تو بڑے رحم دل ہیں۔ اس کے دشمن ہو تم سب لوگ جو مقابلے پر کمربستہ ہو۔ تمہاری ضد کا نقصان اس کو ہوگا جسے کچھ معلوم نہیں۔ ہم تو بچوں کو ٹافی دیتے ہیں۔ میٹھی میٹھی۔"

قدرت کے ساتھ آنے والے محافظوں میں سے ایک نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لالی پاپ نکال کے قدرت کو دی جو قدرت نے خوش ہوکے لے لی اور چوسنے لگی۔

"جب یہ ٹافی ختم ہو جائے گی تو ہم اسے دوسری ٹافی دیں گے میٹھی نیند کی ٹافی۔ پھر جیسے یہ ٹافی ختم ہو رہی ہے آہستہ آہستہ۔ ایسے ہی آہستہ آہستہ قدرت ختم ہو جائے گی.... ہم سب ختم ہو جائیں گے۔"

قدرت کی ماں نے ایک چیخ ماری "قدرت! پھینک دے اسے۔ مت کھا یہ ٹافی۔"

"نا۔ نی۔ اچھی۔" قدرت مضحکہ خیز انداز میں ہنسنے لگی۔

"سکندر یہ بڑے سفاک لوگ ہیں" آصف علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ان سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ انسان مقابلہ کرسکتا ہے انسان کا۔ ہم شیطان سے نہیں جیت سکتے۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"تمہارے ساتھ میں بھی چلتا ہوں۔"

میں نے مشین گن پھینک دی "نہیں، آپ اس کھیل میں مت شریک ہوں۔ یہ تقدیر یا گردش حالات تھی جس نے مجھے آپ سے ملوا دیا ورنہ پوری کوشش کے باوجود آپ تو ناکام ہی رہے تھے۔ مجھے اس کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ تجدید تعلق سے حاصل ہونے والے نیک مقاصد پورے ہوکے بھی پورے نہ ہوئے اور ہماری بدبختی کے تاریک سائے آپ کی زندگی پر بھی پڑے۔"

"ایسا مت کہو سکندر۔ میں ایسا نہیں سمجھتا۔"

"آپ کے اور ہمارے درمیان نہ پہلے کوئی تعلق تھا اور نہ آئندہ ہونا چاہیے" میں نے کہا "ماضی کی سب باتوں کو بھول جائیں۔"

"کیا تم جا رہے ہو؟" آصف علی کی بیوی چلائی۔

"ہاں، کتنا اچھا ہوتا اگر ہم پہلے ہی چلے جاتے" رابعہ نے افسوس سے کہا۔

"لیکن قدرت..."

میں نے آصف علی کی بات کاٹ دی "بشرط زندگی ہم اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ لیکن خدا کے لیے جب تک ہم خود نہ آئیں، آپ ہم سے ملنے یا ہم سے رابطے کی کوشش بھی نہ کریں۔ قدرت کو اور اس کی ماں کو آپ کی ضرورت ہے، ہماری نہیں۔ اپنی زندگی کی حفاظت کریں اور ان خطرات سے دور رہیں جو ہمارے تعاقب میں ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس صورت حال سے میں بہت مایوس تھا۔ مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ حالات میری توقعات کو دھوکا دے رہے ہیں۔ وہ ایک پوری زندگی تھی جو ہم نے ولولہ انگیز کیفیتی میں شامل وطن کے دشمنوں اور غداروں کے خلاف محاذ آرائی کے آلام و مصائب کی نذر کردی۔ دل کے خوش رکھنے کو یہ خیال بھی کافی نہ تھا کہ ہم اس طویل سفر کے تمام مراحل طے کرکے کامران لوٹ آئے جس میں ہر قدم پر سامان اجل تھا۔ بس قسمت ساتھ تھی اور بچانے والا ہاتھ مارنے والے ہاتھ سے زبردست تھا کہ اس معرکۂ زیست میں ہم نے جان کی بازی لگائی اور ہارے نہیں۔ لیکن ہم نے اور بہت کچھ گنوایا۔ اپنا یقین اور یہ اعتماد کہ آج بھی جیت راہ حق پر چلنے والوں کی ہوتی ہے۔ ملک اور قوم کے ساتھ ہم نے

www.paksociety.com

بھی ایک بے مقصد جنگ میں سب کچھ لٹا دیا تھا اور تہی دست لوٹ رہے تھے۔ ہم نے اس احساس سے سمجھوتا کر لیا تھا کہ شکست و فتح مقدر سے ہے۔ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔ وقت گزرے گا تو وہ سب زخم بھی مندمل ہو جائیں گے جو اپنوں کی بے وفائی کا صلہ تھے۔ اغیار تو پھر اغیار ہیں۔ اپنوں نے سازشوں کے جال پھیلانے اور ہماری قومی یک جہتی کے تصور کو رسوا کیا تو ان سے کیا گلہ!

مجھے امید تھی کہ شکست کے صدمے سے سنبھل جانے کے بعد رفتہ رفتہ حالات معمول پر آجائیں گے اور ہم زندگی کے لیے حوصلے کو جمع کر کے پھر پُریقین مستقبل کی راہ پر گامزن ہوں گے مگر میری توقعات کا سفر تو ایک سراب کی آرزو ثابت ہو رہا تھا۔ معاملات سلجھنے کے بجائے الجھتے جا رہے تھے اور میری ہر کوشش کی ناکامی سے میرے صبر و ضبط اور ذہانت کی قوت برداشت کا سرمایہ کم ہو رہا تھا۔ پھر میں اکیلا رہ گیا تھا۔ یہ تقدیر کی عجب ستم ظریفی تھی کہ ہم دیارِ غیر میں اور مسافرت میں تھے تو یکجا تھے اور لوٹ کے گھر آئے تو بچھڑ گئے۔

ہم ایک نیک مقصد لے کر پشاور پہنچے تھے اور وہ مقصد تھا کلیم اللہ کے والدین سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق ان کی امانت کو بحفاظت وارثوں تک پہنچانا لیکن اس سفر میں بھی بد بختی نے ساتھ نہ چھوڑا اور یہ سلسلہ ابھی جاری تھا۔ وصف علی نے میرے والد کے ساتھ برائی کی تھی۔ میں نے اسے معاف کر کے احساسِ جرم کے آزار سے نجات دلائی اور اس کی نیک نیتی سے مدد کرنی چاہی تو یہ نیکی بھی ہمارے گلے پڑ گئی اور ایک سزا بن گئی۔

ان حالات میں کچھ بھی نہ کرنے اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ احساسِ شکست خوردگی نے مجھے اتنا بددل و مایوس اور مجبور کر دیا کہ میں نے بہتری کے لیے کوشش کو بھی لاحاصل سمجھ لیا اور مزاحمت کا خیال چھوڑ دیا۔ "جو ہو گا دیکھا جائے گا" کے قومی فلسفے کو تسلیم کرنے کے بعد میں نے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال بادشاہ سلامت کی بالادستی کو قبول کر لیا جائے۔ یہ سب سوچنا بے سود اور فضول تھا کہ وہ کون ہے؟ کس کا آلۂ کار ہے اور ہمیں اغوا کر کے کہاں لے جائے گا۔

اپنی زندگی کو داؤ پر لگانا ہمارے لیے ایک ایسا کھیل بن گیا تھا جس میں ہم ہار جیت کی پروا کیے بغیر شریک ہونے کے عادی تھے۔ ہم کسی تذبذب اور خوف کے بغیر جان پر بھی کھیل جاتے لیکن یہاں سوال ایک اور معصوم جان کا تھا جسے ہم نے تحفظ کی ضمانت فراہم کی تھی اور وصف علی سے وعدہ کیا تھا کہ قدرت کا مستقبل ہماری ذمے داری ہو گا۔

"آپ جیت گئے بادشاہ سلامت" میں نے کہا "معاملہ صرف ہماری زندگی کا ہوتا تو ہم مقابلہ کرتے اور فیصلہ یوں نہ ہوتا۔ یہاں سے وہی اپنے پیروں پر چل کے جاتا جسے تقدیر فاتح قرار دیتی۔"

"جب تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو تقدیر یاد آجاتی ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کے کہا "واہ سکندرِ اعظم واہ! ہم نے تو بہت تھوڑا سا تھا مقدر سے ناآشنا نہ تجربہ ہونے کا۔"

"یہ میدانِ جنگ نہیں، ایک گھر ہے اور گھر گہوارہ ہوتا ہے امن اور سلامتی کا۔ اور یہ گھر بھی ہمارا نہیں ہے۔ ہم یہاں مہمان تھے۔ ہم اس کی تباہی میں شریکِ جرم نہیں ہو سکتے بادشاہ سلامت! اور یہی ہماری مجبوری ہے۔ ورنہ تمھیں شوق ہے تو ہمیں اپنے گھر جلا کے دیکھو۔ نہ ہم تمھاری بیوی کو یرغمال بنائیں گے نہ بچی کو۔ یہ وعدہ ہے میرا۔ پھر تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارا راستہ موت بھی نہیں روک سکتی۔"

اچانک قدرت نے لالی پاپ کی ڈنڈی پھینک دی جسے وہ بڑے انہماک سے چوس رہی تھی۔ اس نے پھر ہاتھ پھیلا دیے "ماما! نانی ...ما...ما...نا...نی۔"

بادشاہ مسکرانے لگا "مجھ سے نہیں، بچے اس ماما سے سوال کرے۔"

میں نے کہا "اب اسے چھوڑ دو۔ ہم تمھارے ساتھ ہر جگہ جانے کو تیار ہیں۔"

آصف علی نے کہا "یہ تم کیا کر رہے ہو سکندر؟"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "آپ قدرت کو اپنے پاس بلائیں اور اس کی ماں کے حوالے کر دیں۔"

"نہیں۔" بادشاہ نے بلند آواز میں حکم دیا "یہ ایسے نہیں ہو گا جیسے تم چاہو گے۔ بادشاہ ہم ہیں۔ حکم ہمارا چلے گا۔"

قدرت ثانی کے لیے ضد کر رہی تھی اور اس کو قابو میں رکھنے والا ایک ہاتھ سے اس کا بازو تھامے کھڑا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں زہر آلود لولی پاپ تھی۔ ہم جو بم، بارود، ریوالور اور مشین گن کی گولیوں اور توپ کے گولوں کا مقابلہ کرتے ہوئے خوف زدہ نہیں ہوئے تھے، ایک لولی پاپ سے ڈر گئے۔ وہ چوسنے والی ٹافی جو لکڑی کے ایک تنکے پر لگی رہتی ہے اس تمام اسلحے سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئی تھی جو اس وقت بھی بادشاہ سلامت کی فوج نے اٹھا رکھا تھا۔ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔ معذور اور معصوم قدرت کے ہاتھ اپنے لیے موت مانگ رہے تھے اور یہ ناممکن تھا کہ ہم اس کے ہونٹوں کو قطرہ قطرہ لذت سے بھرپور رنگین، میٹھی اور خوشبودار موت کا رس حلق سے اتارتا دیکھتے رہتے اور اپنے احساس کو ایک دلیل سے دبا دیتے کہ ذہنی اور جسمانی طور پر معذور قدرت کا جینا کیا اور مرنا کیا۔

"آخر کیا ہے تمھارا حکم؟" رابعہ نے بے بسی سے کہا۔

اس نے بڑے شاہانہ انداز میں ہاتھ اوپر اٹھایا "سنو، غور سے سنو اور سمجھو۔ باہر تین گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں۔ لڑکیاں پہلے جائیں گی اور درمیان والی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائیں گی۔ اس کے بعد میرے آدمی نکلیں گے۔ وہ آگے پیچھے کی گاڑیوں میں پوزیشن سنبھال لیں گے۔ یہاں رہ جائیں گے ہم دونوں۔"

"جیتی نام کے بادشاہ سلامت اور سکندرِ اعظم" میں نے کہا۔

اس نے دخل در معقولات پر ناگواری سے مجھے دیکھا "اگر تم نے چالاکی سے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو بُرا ہوگا۔ بہت بُرا ہوگا۔"

میں نے کہا "ہم خالی ہاتھ ہوں، تم مسلح ہو، پھر بھی ڈرتے ہو۔"

"تم کو بھی ڈرنا چاہیے کیونکہ تم خوش فہم ہو۔ تم نہیں جانتے، بالکل نہیں جانتے کہ خوش فہمی اور غلط فہمی کے بیچ جو فرق ہے وہ تلوار کی دھار ہے۔ اس پر چلنے کی کوشش مت کرنا۔ زندگی اور موت کی سرحد کے درمیان آتی جاتی سانس کا فاصلہ ہے، صرف ایک سانس کی دوری پر دوسری دنیا ہے مگر وہاں سے یہ دنیا بڑی لمبی مسافت ہے۔ قیامت تک طے نہ ہونے والی۔"

میں نے جھلا کے کہا "مت بیزار کرو مجھے اپنی اداکاری سے اور آغا حشر کی نقالی سے۔ تم انسانوں کی طرح بات نہیں کر سکتے؟"

اس نے اپنی بات اسی لہجے میں جاری رکھی "تم کیا کر سکتے ہو جو تمہیں نہیں کرنا چاہیے۔ میں بتاتا ہوں۔ تم کو میرے ساتھ زندہ رہنا چاہیے۔ اکیلے نہیں۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اپنی زندگی کی قیمت وصول کر لی تھی۔ منہ مانگی قیمت تو نہیں تھی، مجبوری کی قیمت تھی۔"

"اچھا خریدار کون تھا؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"خریدار تو بس خریدار ہوتا ہے۔ اس کے نام اور ولدیت، ذات اور مذہب سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے مارو گے تو گھاٹے میں تم رہو گے کیونکہ تم زندگی کو انمول سمجھتے ہو اور تم نے کسی سے اس کی قیمت وصول نہیں کی ہے۔ میری ایک جان کے بدلے تم تین جانیں گنواؤ گے۔ شمار کر کے دیکھو۔ ایک اور تین کا سودا ہے۔ یہ جو میرے ساتھ آئے ہیں، صرف میرے حکم کے تابع ہیں۔ میں نہ رہا تو تم سب بھی نہ رہو گے۔ انہیں یہی ہدایت ہے کہ..."

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ تمہاری جان کے بدلے یہ ہم سب کی جان لے لیں گے۔ اب چلو جہاں چلنا ہے۔ بہت دیر سے سب کی جان سولی پر اٹکی ہوئی ہے۔ چلو رابعہ، کاجل، جیسا بادشاہ سلامت نے فرمایا ہے ویسا ہی کرو۔"

"او نہ! صورت دیکھو مسخروں کے بادشاہ کی" رابعہ نے جاتے جاتے حقارت سے کہا "خدا حافظ آصف انکل۔"

"اسے تو کسی پاگل خانے میں ہونا چاہیے، بادشاہ سلامت کا گھوڑا بلکہ گدھا" کاجل نے جاتے جاتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

"خدا حافظ بیٹا۔" آصف نے گلوگیر لہجے میں کہا "دیکھو اپنا خیال رکھنا۔ ایسی ویسی کوئی بات نہ ہو۔"

میں نے کہا "آپ پریشان نہ ہوں۔ ایسے مسئلے تو ہماری زندگی میں صبح و شام کا معمول بن گئے ہیں۔"

"موقع ملتے ہی اپنی خیریت کی اطلاع دینا سکندر" آصف علی کی بیوی نے روتے ہوئے کہا "تھوڑا سا سکھ ملا تھا تمہارے ملنے سے۔ دکھ زیادہ ہے کہ تمہیں دیکھ نہ سکی۔ پرانے گناہوں کا قرض چکایا بھی نہیں تھا کہ تمہارے احسان۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ایسی رسمی باتیں مت کریں۔ افسوس تو ہمیں ہے کہ ہماری وجہ سے آپ لوگوں کی زندگی کا سکون بھی برباد ہوا۔ ایسے سبز قدم ہیں ہمارے۔"

"ایسا مت کہو۔ تمہارے قدم بہت مبارک ہیں" آصف علی بولا "تم نے مجھے احساسِ جرم کی اذیت سے آزاد کیا۔ میرے دل کو وہ سکون عطا کیا جس سے میں محروم تھا۔"

بادشاہ نے پھر برقع اوڑھ لیا تھا۔ اندر سے اس نے ایک خودکار پستول نکال کے مجھے اشارہ کیا "روانگی اختیار کی جائے۔"

اس کے ساتھ آنے والے پہلے ہی جا چکے تھے۔ اب صرف قدرت تھی جو اپنی مضحکہ خیز چال چلتی ماں کی طرف آ رہی تھی اور بے سبب ہنس رہی تھی اور کچھ بول رہی تھی۔ اس گھر میں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس کے لیے نہ باعثِ تشویش تھا اور نہ باعثِ مسرت۔ زندگی کے حادثات اور واقعات کو سمجھنا اس کو آتا ہی نہ تھا۔

میرے باہر آنے تک کاجل اور رابعہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ ان کا موڈ بے حد خراب تھا جو ایک قدرتی بات تھی۔ عین اس وقت جب ہمارے مسائل سے نمٹ کے ہم واپسی کا سفر اختیار کرنے والے تھے، ایک نئی مصیبت نازل ہو گئی تھی اور کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ اب ہماری منزل کیا ہوگی۔ میرے بیٹھتے ہی گاڑیاں روانہ ہو گئیں۔ کاجل اور رابعہ اپنے خیالوں میں گم تھیں۔ ان سے زیادہ الجھن کا شکار میں تھا جس نے ولاور سے ملاقات کے دوران سمجھ میں نہ آنے والے تجربات کا مشاہدہ کیا تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ مصالحت کی پیشکش میں ولاور کس حد تک مخلص تھا۔ اس نے پیڈرو کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ کس حد تک درست تھا اور میں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا تھا وہ کس حد تک قابلِ یقین تھا۔

ولاور ایک مجسم فریب اور عیار مداری تھا اور ایسے تماشے دکھانے کا ماہر تھا جن کی حقیقت کو ظاہری آنکھ سے دیکھنے والا نہیں سمجھ پاتا تھا۔ پیڈرو کے ساتھ اپنے اختلافات کا ذکر محض مجھے قائل کرنے کی خاطر بولا جانے والا جھوٹ تھا۔ وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس نے اپنے ماضی کو ہی نہیں، اس دور کے ہر نقش کو مٹانے کے لیے پرانے ساتھیوں کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے۔ میدانِ سیاست میں قدم رکھنے والا شکاری اب پارسائی کا چولا بدلنا چاہتا تھا۔ نیکی، راست بازی، خدا ترسی اور حب الوطنی کی صفات کو مشتہر کرنے کے لیے اسے ایک نئی ٹیم کی ضرورت تھی۔ ان کا تعاون درکار تھا جو اس کے نفرت انگیز اور شرمناک حد تک مجرمانہ ماضی کے ہر رسوا کن راز سے آشنا تھے اور اس کی منافقت کا پردہ چاک کر سکتے

تھے۔ وہ سر تا پا غلاظت میں لتھڑا ہوا تھا اور اس کا دامن ہزاروں بے گناہوں کے لہو سے رنگین تھا مگر وہ دنیا کے سامنے آنے کے لیے صاف ستھرا اور اُجلا، بے داغ اور بے عیب، انسان دوست، علم پرست اور فرشتہ صفت شخص نظر آنا چاہتا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ جب تک ہم جیسے سر پھرے اس کے حریف بنے رہے، اس کی ہر کوشش ناکام ہوگی اور ہم اس کو ایک خون آشام بھیڑیا، ایک درندہ صفت، بے ضمیر اور ریاکار آدمی اور وطن فروش غدار ثابت کرتے رہیں گے اور اس کے ماضی کے ان پہلوؤں کو بھی بے نقاب کرتے رہیں گے جن سے ہمارے سوا کوئی واقف نہ تھا۔

وہ ہمیں لوحِ جہاں سے حرفِ مکرر کی طرح مٹانے کی کوشش کر کے بھی دیکھ چکا تھا اور یہ تسلیم کر چکا تھا کہ نہ اس کی طاقت ہمارے نفس کو شکست دے سکتی ہے اور نہ اس کی دولت ہمارے ایمان کو خرید سکتی ہے۔ ایم آر ایس کچھ بھی نہیں تھی۔ نہ یہ فوجی تنظیم تھی، نہ گوریلا فورس۔ یہ تو میرے جیسے دیوانوں کا ایک نظریاتی اتحاد تھا جو ہم خیال تھے، ہم نفس تھے اور ہمدم و ہمراز تھے۔ جذبات اور احساسات کی آشفتہ سری کے راستوں پر قدم ملا کے چلنے والے وہ سودائی جو انسانیت کے رشتوں کی آبرو کو اپنی زندگی سے عزیز تر جانتے تھے۔

مجھے وہ وقت یاد تھا جب ہم نے مذاق ہی مذاق میں اپنے دشمنوں کے خلاف اصولی اتحاد کو ایم آر ایس کا نام دے دیا تھا۔ اس وقت ہم تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل، یعنی محسن، رابعہ اور سکندر، ایک ایسے معاشرے کے خدائی فوجداروں کے خلاف صف آرا ہو چکے تھے جس میں کوئی قاعدہ قانون، کوئی ضابطۂ اخلاق اور کوئی اصول کسی کے لیے بھی اہم نہیں رہا تھا اور پورا معاشرہ جنگل کے قانون پر عمل پیرا تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ ہم نے اسے مائٹ از رائٹ سوسائٹی قرار دیا تھا اور جب ولاور اینڈ کمپنی کے شکاری کھل کر سامنے آئے تو محسن، رابعہ اور سکندر، ایم آر ایس بن گئے۔ پھر حالات کے ساتھ اس حلقۂ احباب میں نئے لوگ شامل ہوتے گئے اور ایم آر ایس نے ایک وطن فروش گروہ کے خلاف بے سروسامانی کے باوجود طویل جنگ لڑی۔ جان کی بازی لگا کے بھی ہم بازی ہار گئے تو ہمیں اس کا دکھ نہیں تھا۔ اصل کامیابی یہ تھی کہ ایم آر ایس ناقابلِ شکست رہی تھی۔

اور اب ولاور پینترا بدل کے ایم آر ایس کے خلاف نئی جنگ کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ یہ طاقت سے زیادہ ڈپلومیسی کی جنگ تھی مگر اس کا پہلا راؤنڈ اس نے طاقت کے مظاہرے سے شروع کیا تھا۔ اس نے ہمیں اغوا کرایا، قتل کرانے کے لیے پیشہ ور قاتلوں کو ہمارے پیچھے لگایا مگر ہمیں صرف یہ باور کرانے کے لیے کہ ہمارے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹانا تو ہر جگہ، ہر وقت ان کے اختیار کی بات تھی۔ اس نے ہم سب کو قید میں رکھا، ہم پر واضح کیا کہ آج بھی وہ اس قابل ہے کہ جسے چاہے اپنے شکاری کتوں کے سامنے ڈال دے اور وہ اس کی بوٹیاں نوچ کھائیں۔ وہ قانون اور اس کے محافظوں کی گرفت سے بالاتر ہے لیکن چوہدری ولاور اب دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے سکندرِ اعظم کی طرف۔ کتنا عظیم ہے وہ کہ اپنی ہر غلطی کو تسلیم کرتا ہے اور اس غلطی کے نتیجے میں ہونے والے تمام نقصانات کی تلافی کے لیے بھی تیار ہے۔

مدت کے بعد ملنے والی پہلی اچھی خبر یہ تھی کہ غالب نے فون پر ہم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ میری پشاور میں آمد اور آصف علی کے گھر میں موجودگی کا پتا اسے مخبر سے ہی معلوم ہو سکتا تھا یا پھر رابعہ کے مخلص ماتحت وقار یوسف سے۔ مجھے تصدیق کا موقع ملنے سے پہلے یہ بحران مثلِ کافیہ نازل ہو گیا جو اتفاقی نہیں تھے تو شکاری بھی نہیں تھے۔ ابھی تک انہوں نے کچھ بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ کہاں لے جا رہے ہیں اور کیوں؟

جی ٹی روڈ پر تینوں گاڑیاں ایک ہی رفتار سے آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں اور ان کے درمیان فاصلہ برقرار تھا۔ ایک نظر دیکھنے والے کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ تینوں گاڑیوں کا آپس میں کوئی تعلق ہے۔ سب سے آگے ایک کھلی جیپ تھی اور اس میں دو ہی افراد تھے۔ ایک ڈرائیونگ کر رہا تھا اور دوسرا بظاہر کچھ بھی نہیں کر رہا تھا مگر غالباً عقب نما آئینے پر نظر جمائے بیٹھا تھا۔ پیچھے والی گاڑی فاکس ویگن تھی اور اس میں بھی روانگی کے وقت میں نے دو ہی افراد کو دیکھا تھا۔ درمیان میں اوریل ریکارڈ کو چلانے والا وہی تھا جس نے قدرت خانم کو لولی پاپ پیش کی تھی۔ اس کے ساتھ بادشاہ سلامت تشریف فرما تھے لیکن ضرور شاہ پھر نقاب پوش ہو گئے تھے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے حفاظتی انتظامات دیکھ لیے تھے۔ پیچھے کے دونوں دروازوں کا وجود ہی نہیں تھا۔ یعنی یہ دو دروازوں والی گاڑی تھی۔ پیچھے صرف کھڑکیاں تھیں اور ان کے بھی شیشے نہیں اتارے جا سکتے تھے۔ گہرے رنگ کے شیشوں سے میں باہر کا منظر دیکھ سکتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ باہر سے کوئی چاہے بھی تو اسے کچھ نظر نہیں آئے گا۔

نوشہرہ سے گزر آنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں سیدھا تن کے بیٹھا ہوں اور اعصابی کشیدگی کے باعث میں نے سیٹ کو یوں مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے جیسے کوئی دیہاتی پہلی بار ہوائی جہاز میں پرواز کرتے وقت خوف سے سنبھل کر بیٹھتا ہے۔ میرے جبڑے مضبوطی سے بند تھے اور چہرے پر کھنچاؤ کی کیفیت تھی۔ ابھی تک ہم نے آپس میں بھی بات نہیں کی تھی۔ یہ فکر و تردد، خوف اور پریشانی کا اثر تھا مگر ایسے صورتِ حال کی سنگینی تو کم نہیں ہو سکتی تھی۔ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ہماری ذہنی صلاحیت ضرور متاثر ہو رہی تھی۔

ایک لمبی گہری سانس لے کر میں نے پیٹھ پیچھے لگا دی اور جسم کو

www.paksociety.com

اصیلا چھوڑ دیا۔ میں دائیں طرف ڈرائیور کے عین پیچھے تھا۔ میرے ساتھ کاجل تھی اور پھر دوسری کھڑکی سے رابعہ لگی بیٹھی تھی۔

میں نے پُرسکون ہو جانے کے بعد مسکراتے ہوئے کہا "لیڈیز! یہ بڑی غلط بات ہے۔"

رابعہ نے سر گھما کے سوالیہ نظروں سے مجھے گھورا "کیا ہو گیا؟"

"آپ لوگوں کی وجہ سے دنیا کی سب عورتوں پر الزام آ رہا ہے۔" میں نے کہا "دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ بھی سچ ثابت ہو رہا ہے کہ ایک جگہ دو عورتیں بیٹھی تھیں اور خاموش تھیں۔"

"میں اس پُرانے گھسے پٹے لطیفے پر ہنس نہیں سکتی۔" رابعہ نے کہا۔

"ایک دوسرے کی روتی شکل دیکھ کے تو ہنس سکتی ہو۔ آئینہ ہوتا تو میں سامنے رکھ دیتا۔"

"بھائی سکندر۔" کاجل ٹھنڈی سانس لے کر بولی "مجھے واقعی رونا آ رہا ہے قسمت پر۔"

رابعہ نے کہا "بس قسمت ہی کو رو سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھی تجویز ہے۔ چلیں آپ بسم اللہ کریں۔ رابعہ بی بی! آپ پہلے رونا شروع کریں باقاعدہ آنسوؤں کے ساتھ اور دھاڑیں مار مار کے، پھر کاجل آپ کا ساتھ دے گی۔ میں غیر جانبداری کے ساتھ فیصلہ کروں گا کہ کس کی پرفارمنس بہتر ہے جس کے رونے سے قسمت بدل جانے کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے۔ اسے ہم اپنی طرف سے بھی جی بھر کے رونے کا موقع دیں گے۔"

آہستہ آہستہ رابعہ کے چہرے کی تلخی کم ہوئی۔ پھر کاجل کا چہرہ پُرسکون ہو گیا۔

میں نے کہا "یہ کیا۔ اتنی جلدی ارادہ بدل گیا؟ غور کرو، ہم کتنے دکھی اور مظلوم ہیں۔ مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں ہم پر۔ ہم سب سے بچھڑے ہوئے ہیں اور اب اغوا بھی کیے جا رہے ہیں۔ ایسے دردناک حالات میں مسکرانے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

کاجل مسکرانے لگی "آپ کو بالکل فکر نہیں ہے؟"

"مجھے سخت فکر لاحق ہے آپ دونوں کی طرف سے۔ رنج و غم کی اس المیہ اداکاری سے آپ لوگوں کے چہرے کی خوب صورتی متاثر ہو رہی ہے۔"

رابعہ نے کہا "اس بہروپیے سے پوچھو تو سہی کہ جانا کہاں ہے آخر؟"

میں نے کہا "کیا تم کاجل سے مخاطب ہو؟ مجھے بہروپیا کہا ہے تم نے؟"

کاجل نے کہا "میں ہٹ جاتی ہوں بیچ میں سے۔ آپ لوگ براہِ راست لڑیں۔"

"تمہارا ظالم سماج کی طرح بیچ میں رہنا ضروری ہے" میں نے کہا۔

رابعہ نے بُرا سا منہ بنا کے خود ہی کہا "بادشاہ سلامت! کیا پنڈی جا رہے ہیں ہمیں؟ کون ہے وہاں، کس کی خدمت میں پیش کیا جائے گا ہمیں؟"

اس نے سو فیصد زنانہ آواز اور لہجے میں کہا "اگر میں کہوں! صدر صاحب کو بڑا اشتیاق تھا تم سے ملنے کا، تو تم مان لو گی؟"

"میں مان لوں گا" میں نے کہا "اور پھر پوچھوں گا کہ آج ایوانِ صدر میں کیا پکا ہے دوپہر کے کھانے کے لیے۔ حالت یہ ہو رہی ہے کہ میں ٹھنڈا گوشت بھی کھا سکتا ہوں۔"

اس نے کہا "اٹک کا پل پار کر کے ہم چائے پئیں گے۔"

"تم لوگ بیٹا۔ میں اس وقت سے بہت پہلے ہی جاں بحق ہو جاؤں گا بھوک پیاس سے" میں نے کہا۔

"فضول باتیں مت کرو" رابعہ بولی۔

"اٹک کے پل سے پہلے چائے پینے پر پابندی ہے۔ کسی کے فوت ہونے پر پابندی نہیں ہے" میں نے کہا۔

میری بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ نہ جانے اس نے اگلی کار کو کیا سگنل دیا کہ جیپ کی رفتار کم ہوئی اور اس کے ساتھ ہی تینوں گاڑیاں سڑک سے اُتر کے ایک کنارے پر رک گئیں۔

"تمہیں مرنے نہیں دیا جائے گا بشرطیکہ خود تم نے مرنے کی کوشش نہ کی" بادشاہ نے قدرے خوش گوار لہجے میں کہا۔

"تمہاری حسین صورت نہ دیکھی ہوتی تو اس آواز پر ہی مر جاتا" میں نے کہا۔

تینوں گاڑیوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہا تھا۔ تینوں ڈرائیور اب بھی خاکی وردیوں میں تھے مگر انہوں نے ڈھاٹے اتار دیے تھے۔ ان کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ آصف علی کے گھر میں بھی موجود تھے۔ چوتھا خود بادشاہ تھا۔ باقی دو کے چہرے دیکھ کے میں شک میں پڑ گیا۔ نہ جانے میں نے انہیں پہلے کب اور کہاں دیکھا تھا۔ بس صورت آشنائی کا مبہم سا احساس تھا جو ایک سوال بن کے ذہن میں موجود رہا۔ وہ صورت سے عام کے شریف اور معزز آدمی لگتے تھے اور بے ضرر بھی..... لیکن ان کے انداز و اطوار میں یا چہرے کے نقوش کی کرختگی میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اس خیال کی نفی کرتی تھی۔ شاید یہ صرف میرا خیال تھا اور میرا ذہن سنگین مجرمانہ پس منظر کے ساتھ ان کی شخصیت پر چڑھے ہوئے شرافت کے خول سے دھوکا نہیں کھاتا تھا۔

بادشاہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ڈرائیور نے اُترنا چاہا تو بادشاہ نے اسے بھی روک دیا۔ جیپ میں سے اترنے والے ایک شخص نے بادشاہ کو ایک بیگ تھما دیا اور پھر جیپ میں جا بیٹھا۔

"اس میں سے جو چاہیے وہ لے لو" بادشاہ نے بیگ پیچھے

بڑھاتے ہوئے کہا۔

"واہ! یہ عمرو عیار کی زنبیل ہے کیا؟" میں نے کہا "ہر چیز مل سکتی ہے اس میں۔ لاؤ رابعہ! مجھے ایک بھرا ہوا ریوالور نکال دو تاکہ میں پہلے بادشاہ سلامت کا قصہ پاک کروں۔ پھر دو دستی بم دے دینا۔ آگے پیچھے کا راستہ صاف کر کے چلتے ہیں۔"

بادشاہ بولا "تم بہت چہک رہے ہو۔ میں نے ٹھیک ہی سنا تھا کہ پیدائشی مسخرے ہو۔"

میں نے رابعہ سے چائے کا مگ لے لیا "پیدائشی طور پر تم کیا ہو؟"

"وہی جو تم دیکھ رہے ہو" اس نے بھی چائے کا مگ پکڑ لیا مگر بسکٹ لینے سے انکار کر دیا۔

"اداکار بہت دیکھے ہیں میں نے لیکن تم غضب کے صداکار ہو" میں نے ندیدوں کی طرح بسکٹ چرتے ہوئے اور چائے کے ساتھ نگلتے ہوئے کہا "تمہارا زنانہ رول بھی بالکل اصلی لگتا ہے اور مردانہ بھی۔ اصل کردار کیا ہے؟ میرا مطلب ہے حقیقی طور پر کیا ہو تم؟ کہیں درمیان میں..."

رابعہ ہنسی تو تھوڑی سی چائے مجھ پر گری "ان کی تو پوری پارٹی ہو گی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ تالی بجانے، ٹھمکنے اور ٹھمکا لگانے والوں کی۔"

بادشاہ نے کسی قسم کے ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کیا "میں کسی بات کا بُرا نہیں مانتا۔"

"تمہاری قابلِ رشک صحت اور قابلِ دید جوانی کا کیا راز ہے خالہ؟" میں نے کہا "ایک بات پوچھوں؟"

"ابھی وقت ہے، پوچھ لو" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"بادشاہ سلامت تمہارا اصلی نام نہیں ہو سکتا۔ خیر نام سے فرق نہیں پڑتا لیکن خود کو چھپانے کے لیے تم نے مردوں کی طرح ڈھاٹے باندھنے سے کیوں گریز کیا؟ یہ برقع کیوں اچھا لگا تمہیں؟ یہ مردوں کا کام نہیں۔"

اس نے کہا "میں مرد کہاں ہوں۔ اور تم مجھے عورت بھی تسلیم نہیں کرتے تو تمہاری مرضی۔"

وہ پہلے والی زنانہ آواز میں ہی بات کر رہا تھا اور یہ انتہائی کمال کی بات تھی کہ جب وہ مرد کی آواز بناتا تھا تو وہ بھی مصنوعی نہیں لگتی تھی۔ وہ یقیناً ایک پُراسرار شخص تھا۔ اسے میں دلاور کی نئی دریافت قرار دے سکتا تھا۔ وہ مختلف مقاصد کے لیے جوہرِ قابل کی تلاش میں رہتا تھا اور کام کے آدمی کی قدر کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا ساتھ دینے والے کبھی ساتھ نہیں چھوڑتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو خوف ہو سکتا تھا۔ دلاور سے بغاوت کا خیال ایک بار دل میں لانے والا سو بار اپنے عبرتناک انجام کے بارے میں سوچتا ہو گا۔ دلاور اپنی طاقت کی دہشت بٹھانے کے فن میں ماہر تھا لیکن اس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ دلاور کے ساتھ رہنے والے کو مکمل قانونی تحفظ حاصل ہو جاتا تھا اور مالی مسائل پیدا ہی نہیں ہوتے تھے۔ دلاور کے اثر و رسوخ کے باعث وہ ہر قسم کے غیر قانونی ذرائع اختیار کرتے ہوئے معاشی طور پر خود کفیل رہتے تھے۔ وہ لوٹ مار کریں، ڈاکے ڈالیں، بلیک میلنگ کریں یا اسمگلنگ، ان کی کمائی سے دلاور کو سروکار نہ تھا۔ پکڑے جانے کی صورت میں دلاور کے لمبے ہاتھ انہیں تھانے کچہری اور جیل کاٹنے سے صاف بچا لیتے تھے۔ جب دلاور انہیں کسی مخصوص مقصد کے تحت کوئی خطرناک مشن سونپتا تھا تو صرف ہدایات یا دھمکیاں ہی نہیں دیتا تھا، ان کی توقعات سے کہیں زیادہ معاوضہ بھی دیتا تھا۔ ان سب عوامل کے پیشِ نظر مجھے پیڈرو کا دلاور کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ یہ دلاور ہی تھا جس نے پیڈرو کو استاد پیڈرو بنایا تھا اور اپنے دستِ راست کے طور پر اس کی ہیبت قائم کر کے چھوٹے موٹے غنڈوں، بدمعاشوں کو بالواسطہ طور پر اپنا مطیع و باج گزار بنایا تھا۔ استاد پیڈرو اس کا اہل نہ ہوتا تو دلاور اس مقام تک لانے سے پہلے ہی اسے نظر سے گرا دیتا اور جو عیاری، مکاری، بدمعاشی و بدکرداری، بے خوفی اور بے ضمیری میں دلاور کا نقشِ ثانی سمجھا جا سکتا ہو، وہ اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارے اور دلاور کا جانشین بننے کی آرزو میں اس کا تختہ الٹنے کی سوچنے لگے۔ پیڈرو میں ہزار خرابیاں تھیں مگر عقل کے ساتھ وفادار رہنا اس کی وہ خوبی تھی جس سے انکار ناممکن تھا۔

سڑک پر سے دوسری گاڑیاں گزرتی جا رہی تھیں۔ پنڈی اور پشاور کی طرف سے آنے جانے والی بسوں اور کاروں میں سفر کرنے والے سیکڑوں افراد نے سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی تین گاڑیوں کو دیکھا ہو گا۔ ان سب کے لیے اس نظارے میں حیرانی یا پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی کہ کوئی فیملی پشاور سے پنڈی یا لاہور جاتے ہوئے تازہ دم ہونے کے لیے رکی ہے۔ ہم اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ کسی کو متوجہ کر سکتے یا کوئی ہنگامہ کھڑا کرتے۔

پندرہ منٹ بعد سب کھانے سے فارغ ہو گئے۔ کھانے کے وقت بسکٹ اور چائے بھی بہت غنیمت محسوس ہوئے اور میں نے ایک ڈبا ختم کرتے ہوئے چائے کے دو کپ حلق میں انڈیلے۔ کاجل اور رابعہ نے اتنی خوش خوراکی کا مظاہرہ نہیں کیا لیکن ان دونوں نے مل کر ایک بسکٹوں کا ڈبا بہرحال خالی کر دیا۔

گاڑی کا ڈرائیور آگے جیپ میں جا بیٹھا تھا اور وہیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھانے پینے میں مصروف تھا۔ صرف بادشاہ نے چائے کے ایک کپ پر قناعت کی۔

میں نے کہا "تمہیں بھوک نہیں لگتی یا تم بھوک کو کنٹرول کر رہے ہو؟"

وہ سپاٹ لہجے میں بولا "ابھی تم کچھ بھی سمجھ لو۔"

"بعد میں تم سمجھو گے ہم سے" میں نے کہا "ٹھیک ہے..."

www.paksociety.com

سلامت' یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ..."

اس نے میری بات کاٹ دی "اور وہ وقت اب دور نہیں ہے" اس نے ڈرائیور کو اشارے سے بلایا اور چلنے کا حکم دیا۔

میں نے کہا "تمہاری نقاب پوشی کا معاملہ مجھے بہت پُراسرار لگتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم جیل سے بھاگے ہو یا اس علاقے میں تمہاری تصویر ہر تھانے میں آویزاں ہو۔ ایسی صورت تو ہے نہیں تمہاری کہ کسی کی نظر لگ جائے۔"

"میں نے کہا نا کہ وقت آنے پر سب اسرار کھل جائیں گے۔"

"اچھا یہ تو بتادو کہ اس واردات میں تم نے ناگ منی کا نام کیوں استعمال کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"اس نام کی ایک دہشت ہے" وہ بولا۔

"دہشت تو سلطانہ ڈاکو اور بہرام ڈاکو کے نام کی زیادہ تھی" میں نے کہا "سلطانہ ڈاکو کی بیٹی' بہرام کی نواسی کہ رام ڈاکو۔ ڈاکو تو مرد ہوتے ہیں۔ عورت کے لیے مؤنث کا صیغہ ڈاکن کیسا رہے گا؟"

اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے لیے بولنا کچھ مشکل ہو گیا ہے۔ زبان کا ساتھ الفاظ نہیں دے رہے تھے اور الفاظ کا ساتھ خیالات۔ زبان کچھ سُست روی کا شکار تھی۔ پھر مجھے غنودگی کا احساس ہوا اور میں نے سر کو جھٹکا۔ پیٹ بھر جانے سے تھوڑی سی آسودگی ضرور لگی تھی مگر یہ ذہنی اور اعصابی تھکن تھی اور بے حسی کی کیفیت تھی جو رفتہ رفتہ حواس پر غالب آنے لگی تھی۔

میں نے سر کو تھوڑا سا ہلا کے دائیں جانب دیکھا تو کاجل اور رابعہ ایک دوسرے کے سہارے پر قائم آنکھیں بند کیے سو رہی تھیں۔

"خبیث... بادشاہ کی ناجائز اولاد" میں نے بڑی مشکل سے غنودگی پر قابو پا کے کہا "کیا تھا... اس چائے... میں...؟"

"چائے تو ہم سب نے ایک ہی تھرمس سے پی تھی۔ تم نے ہی مجھے بھی نکال کر دی تھی" میں نے اس کی آواز جیسے دور سے سنی۔

"تو... تو پھر... بسکٹ... زہر..." میں نے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اندھیرے اُجالے کو یوں ملتے دیکھا جیسے طوفانی ہوا سے فانوس جھول رہے ہوں اور لالٹینیں جل بجھ رہی ہوں۔ یا روشنی بڑے بڑے گردش کرتے آئینوں سے منعکس ہو کے تاریک سُرنگ میں آنکھ مچولی کھیل رہی ہو۔ میرا سر خود بخود سیٹ پر جا لگا۔ میرے اعصاب شل ہو چکے تھے اور حواس معطل لیکن ابھی میں سوچ سکتا تھا اور اس وقت مجھے صرف یہی خیال تھا کہ ہمیں اغوا کرنے والوں نے بڑی ہوشیاری سے زہر دے دیا تھا۔ زہر چائے میں ہوتا تو وہ بھی متاثر ہوتے۔ انہوں نے شکوک و شبہات کی فضا پیدا ہی نہیں ہونے دی تھی اور ہم اعتماد کے دھوکے میں مارے گئے تھے۔ اطمینان کا پہلو صرف اس احساس میں تھا کہ ان کا مقصد ہمیں ہلاک کرنا نہیں ہو سکتا۔ ہلاک کرنے کے لیے انہیں کسی حیلے بہانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صرف ہمیں ہوش سے بے گانہ رکھنا چاہتے تھے تاکہ ہمیں اپنی منزل کے راستے نہ معلوم ہوں۔

اس مقصد میں وہ کامیاب رہے۔ جب میں نے دوبارہ دنیا کو دیکھا تو یہ بالکل مختلف اور بدلی ہوئی دنیا تھی۔ کچھ دیر مجھے یوں لگا جیسے ابھی تک میں حالتِ سفر میں ہوں لیکن سفر ایسے تو نہیں ہوتا جیسے کوئی تیر پر سوار ہو اور تیر ہوا کو چیرتا جا رہا ہو۔ ایک جھلک اِدھر دوسری اُدھر بالکل جیسے کارٹون فلموں کی جادوگرنی یا چڑیل لیے ڈنڈے والی جھاڑو پر اڑتی نظر آتی ہے۔

جب میں نے سر اٹھانے کی کوشش کی تو میرا توازن بگڑنے لگا۔ میں ایک دم گول گول گھومنے لگا۔ گرداب میں پھنس جانے والے حقیر تنکے کی طرح۔ میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ مارے تو کوئی چیز میری گرفت میں آ گئی اور گھومتا ہوا کمرا ساکت ہو گیا' بلب کی روشنی ٹھہر گئی اور میری نظر میں وہ منظر واضح ہونے لگا جس میں میرے لیے ہر چیز اجنبی تھی' سوائے ایک چیز کے۔ اسے چیز کہنا بھی غلط ہو گا کیونکہ وہ ایک چہرہ تھا۔

میرے ہاتھوں نے ایک بیڈ کی سائڈ کو پکڑ رکھا تھا اور میں ایک آرام دہ صاف ستھرے بستر کی راحت کو محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس آراستہ کمرے میں فرنیچر' پردے' قالین اور وال لائٹس ہر چیز نئی ہے اور میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ اس انداز آرائش سے بھی میری آنکھیں آشنا تھیں لیکن وہ چہرہ نیا نہیں تھا۔ وہ دنیا کا سب سے زیادہ بدصورت اور قابلِ نفرت چہرہ تھا جسے میں صرف ایک جگہ دیکھنا پسند کرتا۔ تختۂ دار پر پھانسی کے پھندے سے لٹکا ہوا۔ یا لمبی گردن اور باہر نکلی ہوئی زبان کے ساتھ مُردہ خانے میں لاوارث لاشوں کے ساتھ۔ یا قبر کی گہرائی میں کھلی آنکھوں کے ساتھ۔

میری آنکھیں بند تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ خواب میں مجھے استاد پیڈرو نظر آیا تھا اور اس کے بعد ہی نفرت انگیز جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے اس کی مکروہ لاش کے بارے میں سوچا تھا۔

دوبارہ آنکھیں کھولنے پر وہ مجھے وہیں نظر آیا۔ اب اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے کی خباثت اور نحوست میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہی کالا چمکتا ہوا رنگ۔ موٹے گھنگریالے سخت بال' پچکی ہوئی ناک' تنگ پیشانی اور کانوں میں وہی سونے کی مُندریاں۔ فرق صرف لباس کا تھا۔ وہ کریم کلر کی شرٹ اور پینٹ میں اور سفید رنگ کی میچ کلر کے جوتوں میں تھا۔ کسی تھرڈ ریٹ ذوق کے مالک تھرڈ کلاس شہدے اور بازاری آدمی کے بجائے وہ معزز اور بڑے بدمعاش کے حلیے میں تھا۔

مجھے اپنی طرف متوجہ پا کے وہ مسکرایا "کیا حال ہے شہزادے؟"

"بہرام زادے! تو نے اغوا کرایا تھا مجھے؟" میں نے کہا۔

"اغوا کا اور ہوتا ہے' میں نے بلوایا تھا تمہیں۔ اپنے مہمان کے طور پر' پوری عزت کے ساتھ۔"

"لعنت اس عزت پر جو تیرے جیسے شیطان سے ملے اور لعنت مجھ پر اگر میں تیرا احسان کہلاؤں" میں کوشش کر کے اٹھ بیٹھا "وہ کہتے ہیں 'بادشاہ سلامت کا نطفہ ناتحقیق'۔ کہاں ہے وہ؟"

"کیوں بگڑ رہے ہو اس پر۔ اگر کوئی زیادتی کی تھی اس نے تمہارے ساتھ' یا کسی اور کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آیا تھا تو مجھے بتاؤ' میں اسے یہاں بلا کے تمہارے سامنے اس کی کھال میں بھس بھروں گا۔ اس نے مجھے یہی بتایا ہے کہ کسی نے تم پر انگلی تک نہیں اٹھائی اور تمہارا سفر بھی آرام سے گزرا۔" پیڈرو نے ایک ٹانگ کو دوسری پر رکھتے ہوئے سگریٹ کیس اور لائٹر نکال کے مجھے پیش کیا۔

"میں سگریٹ نہیں پیتا۔" میں نے کہا۔

"چھوڑ دی ہے یا میری پیش کی ہوئی سگریٹ نہیں پیو گے؟" اس نے اپنے لیے سگریٹ سلگائی۔

"رابعہ اور کاجل کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"اسی گھر میں ہیں' بالکل محفوظ اور بہت آرام سے۔"

"تمہاری قید میں آرام سے ہیں؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"تمہیں یقین کر لینا چاہیے کہ یہ قید نہیں ہے۔" اس نے ایک کش لیا اور دھواں چھت کی طرف یوں چھوڑا کہ گول رنگ سے اوپر اٹھ کے پھیلتے گئے۔

"اچھا... میں یقین کر لوں گا' اگر ہمارا راستہ کوئی نہ روکے۔ میں اب ایک پل نہیں ٹھہر سکتا یہاں... مہمان تو آزاد ہوتے ہیں' اپنی مرضی سے آنے اور جانے کے لیے۔"

وہ سگریٹ کو دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا "ہم اتنے بے مروّت لوگ نہیں ہیں سکندر صاحب۔ ہماری کچھ روایات ہیں۔ کیا تم نے کبھی ایسا کیا ہے یا کرو گے کہ گھر آئے مہمان کی مرضی پر سب کچھ چھوڑ دو۔ جاتا ہے تو جائے' کھاتا ہے تو کھائے' پسند نہیں تو باہر جا کے کھا لے۔ ہم تو بہت اہتمام اور تکلف سے کام لیتے ہیں اور مہمان بھی زبردستی کا برا نہیں مانتے۔"

"صاف کہو نا کہ ہم تمہاری اجازت کے بغیر نہیں جا سکتے۔"

"میزبان سے اجازت لینا تو آداب میں شامل ہے۔ اور ابھی تو تم آئے ہو' تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

میرا دل چاہتا تھا کہ میں استاد پیڈرو کو نتائج کی پروا کیے بغیر جان سے مار دوں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں اسے دبوچ کے ایک منٹ میں اس کی بھینسے جیسی گردن توڑ سکتا تھا۔ وہ دنیا میں میرا سب سے پہلا اور بدترین دشمن تھا۔ وہ میرے باپ کا قاتل تھا اور اس کے بارے میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اس نے پوسٹ مارٹم سے پہلے وزیر خان کی لاش قبر سے نکال کے کسی نامعلوم مقام

سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی سچی کہانیاں

مرزا امجد بیگ کی یادداشتیں
شیطان صفت
سبز قدم
قانونی پیچیدگیاں' عدالتی کارروائی کے اہم رموز و نکات
زن' زر اور زمین کے تنازعوں سے جنم لینے والے مقدمات

ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی ہولناک تحقیقات کی ڈائری
دستِ انتقام
اسیرِ ہوس
ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی پیشہ ورانہ زندگی کے پیچیدہ کیسوں کی روداد
جرم و سزا کی وہ کہانیاں جو انسانی حرص و ہوس کا آئینہ ہیں

www.paksociety.com

پر کاڑودی تھی۔

یہ احساس میرے جذبات کی آتش فشانی پر تیل چھڑک رہا تھا کہ میں اس شخص کی قید میں ہوں جس کو بدترین اذیت کے ساتھ قتل کرنا میری اولین آرزو تھی۔ لیکن میں اپنے جذبات کے طوفان کو ہر طرف سے عقل کی دیواروں میں محصور کرنے پر مجبور تھا۔ ایک مجبوری جسمانی تھی۔ میں خود کو اتنا توانا محسوس نہیں کرتا تھا کہ پیڈرو پر قابو پاسکوں۔ دوسری مجبوری اس یقین کی تھی کہ پیڈرو اکیلا نظر آنے کے باوجود اکیلا نہیں ہوگا۔ میں نے اس کی طرف ایک قدم بڑھایا تو ہر طرف سے اس کی حفاظت پر مامور گُرگے نکل آئیں گے۔ تیسری مجبوری کاجل اور رابعہ کے تحفظ کا خیال تھا۔ چوتھی مجبوری یہ جاننے کی خواہش تھی کہ استاد پیڈرو نے مجھے کیوں اغوا کرایا تھا۔ اور اب وہ کیوں اپنے بدترین دشمن کو معزز مہمان بنا کے رکھنے پر مصر تھا۔

میں نے نفرت کے جذبات کو مصلحت کے تقاضوں سے دبانے کی بے عزتی گوارا کرلی "مجھے کافی کی ضرورت ہے۔ ہاٹ اینڈ بلیک۔ اور میں فوراً کاجل اور رابعہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

پیڈرو نے میرے لہجے کی تبدیلی کو پسند کیا "ابھی لو" اس نے شاہانہ انداز میں تالی بجائی۔

اسٹیج ڈرامے کے کردار کی طرح پردہ ہٹا کے ایک غلام نمودار ہوگیا جس کا حلیہ بھی غلامانہ بنایا گیا تھا۔ وہ کسی فرسٹ کلاس ہوٹل کے ویٹر کی وردی میں تھا "یس سر" اس نے سر جھکا کے کہا۔

کسی پرانے رئیس ابن رئیس اور خاندانی شخص کی طرح اس نے نخوت سے کہا "صاحب کے لیے کافی لاؤ۔ ہاٹ اینڈ بلیک۔"

"اینڈ نو شوگر؟" ویٹر بولا۔

"اتنا ہی سنو اور سمجھو جتنا کہا جائے" پیڈرو نے غرا کے کہا "چینی کو کس نے منع کیا ہے؟"

"نو شوگر" میں نے صرف پیڈرو کو بے عزت کرنے کے لیے کہا۔

"میرے لیے چائے" چینی میں پیتا ہوں" پیڈرو نے اسی لہجے میں کہا۔

یس سر" ویٹر زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ پلٹ گیا۔

"تمہاری منڈلی میں ایک سے بڑھ کر ایک ایکٹر شامل ہے۔ دلاور کے تھیٹر میں کام کرکے تم بھی ہر رول کرنے لگے ہو۔"

"کیسا رول؟" پیڈرو انجان بن کے بولا۔

"تم کیا تھے پیڈرو! کیا تھی تمہاری اوقات! تم دلاور کے ٹکڑے تھے۔ اس کے ٹکڑوں پر پلنے والے اور اس کے اشارے پر دُم ہلانے والے۔ آج تم میرے سامنے بگ باس کی اداکاری کر رہے ہو۔ ایک سیٹ لگا رکھا ہے تم نے مجھے متاثر کرنے کے لیے' یہ بتانے کے لیے کہ تم اب کوئی عام قسم کے غنڈے' بدمعاش نہیں رہے بلکہ ایک گینگ لیڈر ہو' خود مختار ہو۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم ایسی باتوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو یہ حقیقت ہے" پیڈرو بولا "تمہارے سامنے میں کیسے انکار کرسکتا ہوں کہ کل میں کچھ نہیں تھا۔ بلکہ وہی تھا جو تم نے کہا۔ مگر آج کی بات مختلف ہے' تم مانو یا نہ مانو۔"

"سنا میں نے بھی تھا کہ تم نے اپنے آقا کے خلاف بغاوت کردی ہے۔ نمک حرامی تو خیر تمہارے آباواجداد کے حرامی خون میں..."

"دیکھو باپ دادا تک مت جاؤ۔ انہوں نے کچھ نہیں بگاڑا تھا تمہارا" پیڈرو نے مشتعل ہو کے کہا۔

"اس زمین کو تمہارے غلیظ وجود سے ناپاک کرنے کا الزام ان پر آئے گا۔ ان کی رُسوائی کے ذمے دار تم نہیں تو اور کون ہے؟"

"خیر چھوڑو یہ باتیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرا دلاور سے کوئی تعلق نہیں رہا' تمہیں یہ کس نے اطلاع دی؟"

"خود تمہارے سابق مالک و آقا نے۔ اور اپنی طرف سے تو اس نے مجھے مرعوب اور متاثر کرنے کے لیے اس سے کہیں بہتر ڈراما اسٹیج کیا تھا جو تم کر رہے ہو۔ لیکن اس کا ڈراما فلاپ ہوگیا۔ میرے سامنے اس نے دو پولیس والوں کو گولی ماردی۔ محض اس جرم میں کہ انہوں نے میرے ساتھ نامناسب سلوک کیا تھا۔ لیکن نہ وہ پولیس مین تھے اور نہ ہلاک ہوئے تھے۔ انہیں میں نے زندہ سلامت دیکھا۔ کچن میں کام کرتے ہوئے۔ ان کی وردیاں بھی دیکھ لیں۔ کیا رنگ تھا اس لیے صاف ہوگیا تھا۔ خون کا داغ اتنی آسانی سے نہیں جاتا۔ پھر اس نے میرے کہنے پر حالانکہ وہ بات میرے منہ سے غصے میں نکل گئی تھی ورنہ تمہارے ہوا میں کسی کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ مگر اس نے میری بات پکڑی اور ایک شخص کو بھوکے شکاری کتوں کے سامنے ڈال دیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی کوئی شعبدہ بازی تھی۔ حقیقت اس کے برعکس ہوگی جو میں نے دیکھا تھا۔ اس نے مجھے میری شرائط پر صلح کی پیشکش کی۔ مجھ سے اپنے سابقہ جرائم کی معافی مانگی۔ ہر نقصان کی تلافی کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ کیا میں یقین کرلیتا اس پر؟"

"وہ جھوٹا اور مکار آدمی ہے۔"

"بہت خوب! یہ تم کہہ رہے ہو پیڈرو!" میں نے حقارت آمیز طنز کے ساتھ کہا "چھاج بولے سو بولے' چھلنی کیا بولے' جس میں نو سو چھید۔ تم اسے جھوٹا اور مکار کہہ رہے ہو۔ خود تم کیا ہو۔ اس نے بھی مجھے معزز مہمان بنا کے رکھا تھا اور تحفے میں ایک کار دے کر رخصت کیا تھا۔ تم اسی کے چیلے ہو' تم یہ ڈراما کیسے پیش کروگے؟"

"بالآخر تم مان جاؤ گے کہ یہ ڈراما نہیں تھا۔"

"ہاں۔ ابھی ویٹر جب کافی لائے گا اور کافی ٹھنڈی ہوگی تو تم فوراً ریوالور نکال کے اسے شوٹ کردو گے۔ پھر ڈنڈی بجاؤ گے دوسرے غلام آئیں گے۔ تم کہو گے اس گستاخ نافرمان کی لاش لے جاؤ اور گٹر میں ڈال دو۔ اس نے ہمارے معزز مہمان کو نافرمانی کا حکم دیا نہ کرتے ہوئے ٹھنڈی کافی پیش کی تھی۔ دوسرے کمرے میں بیٹھے ہی میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کھڑا ہو گا اور...."

ویٹر کے نمودار ہونے سے میری بات ادھوری رہ گئی۔ اس کے سر پر کلف دار پگڑی تھی۔ نیچے سفید قمیص اور پتلون پر کالی واسکٹ جس کے بٹن چمک رہے تھے۔ اس کی داڑھی بھی تھی لیکن میں نے اس کی صورت پر غور کیا تو کسی دشواری کے بغیر میں نے اسے شناخت کرلیا۔ بدلے ہوئے حلیے میں وہ وہی ڈرائیور تھا جو ہماری گاڑی چلا رہا تھا۔

میں نے کہا "پیڈرو! آخر کیا حاصل ہے ان سب باتوں سے۔ یہی نے یہی بات دلاور سے بھی کہی تھی اور تم سے بھی کہتا ہوں کہ سانپ صرف کینچلی بدلتا ہے' فطرت نہیں۔ میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ میرے سامنے اگر تم دین دار یا پابند شرع یا رشی مونا کے روپ میں آجاؤ تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بھیس بدلنے سے خصلت نہیں بدلتی۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ میں بدل گیا ہوں۔"

"اور کیا کہہ رہے ہو تم؟ تمہارا رویہ یہی کہہ رہا ہے کہ تم شرافت کا چولا پہن کے شریف آدمی کہلانا چاہتے ہو۔ معزز آدمی بن گئے ہو۔ یہ ویٹر وہی ہے جو گاڑی ڈرائیو کرکے لایا تھا۔ کل اس نے خاکی وردی پہن رکھی تھی' آج سفید وردی پہن لی ہے۔ اس کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا۔ اگر تم نے بھی وہی باتیں شروع کردیں جو دلاور کرتا رہا تھا تو میرا جواب پہلے سن لو۔ نہ میں تمہارا معزز مہمان ہوں' نہ میں تم سے ان معاملات پر کسی قسم کا کوئی سمجھوتا کروں گا جو میرے اور تمہارے درمیان تصفیہ طلب ہیں۔ کسی قیمت پر تم اپنے لیے کوئی رعایت حاصل نہیں کرسکتے اور میں نے آج تک کسی دباؤ کو قبول نہیں کیا۔ آئندہ بھی نہیں کروں گا کہ پرانے معاملات کو بھول کے تمہیں معاف کردوں یا رحم و عفو اور درگزر سے کام لیتے ہوئے تمہیں ایک موقع دوں کہ تم...."

"تمہاری بھی پرانی عادت گئی نہیں" پیڈرو نے بے رخی سے میری بات کاٹ دی "بہت دیر سے میں برداشت کر رہا ہوں۔ تمہاری بکواس سن رہا ہوں مگر بوا میرے ہے تمہاری زبان کو۔ کس نے کہا ہے کہ میں فرشتہ بن گیا ہوں۔ کون.... دعویٰ کر رہا ہے پارسائی کا۔ کس.... نے بات کی ہے بدلنے کی۔"

اس نے ایک دم اپنی مادری وفادری زبان میں فصاحت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین غیر فصیح گالیوں کو جملوں میں فٹ کیا پھر اس نے پولیس کی ڈکشنری سے نصف درجن منتخب گالیاں دلاور کو دیں۔

"....اس نے جو کہا ہے وہ میں کیوں کہوں گا۔ لعنت اس پہ جو تم سے معافی مانگے اور تم سے رحم کی درخواست کرے۔ استاد پیڈرو کو توپ میں رکھ کے گولہ چلادو پھر بھی وہ ہاتھ نہیں جوڑے گا تمہارے سامنے۔ تم کرتے رہو جو کرنا چاہتے ہو۔ میرے شریفانہ رویّے کا غلط مطلب نکالنے والے تم ہو تو دماغ تمہارا خراب ہے' میرا نہیں" وہ چلانے لگا۔

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "اور کیا مطلب نکالا جاسکتا ہے اس کا؟ پہلے کبھی تم نے اس لہجے میں بات کی تھی؟ میرا دماغ بالکل ٹھیک کام کر رہا ہے پیڈرو۔ تم مجھے اذیت دے کر ہلاک کرنے یا پرانے بدلے چکانے کے لیے اغوا کرتے تو مجھے شک نہ ہوتا مگر اس شرافت کے سلوک کا یقیناً کچھ اور مطلب ہے۔"

پیڈرو نے اپنے اشتعال کے بھڑکتے الاؤ پر آتش سیال اُنڈیلی۔ اس نے ایک بوتل سے جام شراب میں چند گھونٹ ڈالے اور انہیں حلق کے راستے سینے میں لگی ہوئی آگ پر ڈال دیا۔

"سنو مسٹر سکندر اعظم!" اس نے ایک لمبی گہری سانس لے کر کہا "یہ بالکل ٹھیک ہے کہ میں نے دلاور کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔"

"کیا ساتھ چھوڑنا تمہارے اختیار کی بات تھی؟ تمہارے ان کالے دھندوں کی دلدل میں اُترنے والا ڈوب سکتا ہے۔ باہر نکلنا چاہے تو سہارا دینے والے ہاتھ ہی اسے غرق کردیتے ہیں۔"

"ہاں۔ ایسا ہی ہوتا ہے" پیڈرو بولا۔

"اور دلاور کا ساتھ چھوڑ کے تم نے وہ سب دھندے چھوڑ دیے ہیں چنانچہ دلاور تمہیں ختم کرنے کے درپے ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے۔"

www.paksociety.com

پیڈرو نے جام کو زور سے ٹیبل پر دے مارا "تم امتحان لے رہے ہو میری قوت برداشت کا۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے نہیں یار خان۔"

میرا اندازہ پھر غلط ہو گیا "اچھا پھر کیوں بلایا ہے تم نے مجھے؟"

"پرانے دھندے دلاور نے چھوڑ دیے ہیں" پیڈرو کچھ دیر بعد پرسکون ہونے میں کامیاب ہو گیا "اس لیے کہ اب اسے پیسہ کمانے کے لیے ان دھندوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اس سے زیادہ کھاؤ نے کاروبار میں قدم رکھنے کا فیصلہ کر چکا ہے جس میں سرمایہ کاری بڑی ہے تو نفع بھی زیادہ ہے اور عزت شہرت بونس میں ملتی ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ سیاست میں آ گیا ہے۔"

"اس نے سیاست کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ اس لیے کہ وہ کروڑ پتی ہے اور اسے کوئی ضرورت نہیں رہی بدنامی کے ساتھ دولت کمانے کی۔ وہ ملک و قوم کی خدمت کے نام پر عوام کو لوٹے گا' ملک کے خزانے پر ڈاکا ڈالے گا اور اس کے باوجود عزت دار کہلائے گا' وی آئی پی ہو گا۔ اس کی گاڑی پر جھنڈا لہرائے گا اور گھر پر سرکاری گارڈ ہوں گے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عقلمندی سے کام لے رہا ہے؟ جب آدمی کروڑوں کما لے تو اس کا راستہ کون روک سکتا ہے۔ وہ سب کچھ خرید لیتا ہے۔ ایک گروہ کی قیادت کرنے والا ایک قوم کا لیڈر بن جاتا ہے۔ یہاں تو سیاست کا یہی دستور ہے۔ عام آدمی' شریف آدمی' پڑھا لکھا آدمی' قانون کا احترام کرنے والا آدمی زکھو سکتا ہے جو کسی کام کا نہیں۔ نہ وہ لیڈر بن سکتا ہے' نہ ووٹر ہوتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اس نے مجھے سب سے پہلے اپنے پروگرام کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا" پیڈرو بولا "اس نے کہا تھا کہ پیڈرو' اب کوئی ضرورت نہیں مجھے قانون کا مجرم کہلانے کی۔ وہ سب کاروبار اب بند' حالات بہت موافق ہیں۔ میں لیڈر بن سکتا ہوں۔ الیکشن لڑ سکتا ہوں اور کامیابی یقینی ہے۔ سب بچے کے کھیل ہیں اور پیسہ بہت اکٹھا کر لیا ہے میں نے۔ اب مجھے عزت اور شہرت کی منزل تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس کے بعد تو پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ ہمیں قوم کو کیا دینا ہے۔ نعرے اور وعدے۔ سب یہی دیتے آئے ہیں۔ مگر اس کے بدلے میں جو کچھ اس ملک میں ہے اور اس قوم کے پاس ہے وہ اپنا بلکہ اپنے باپ کا۔"

"اور تم نے اس سے اختلاف کیا؟"

"میں اس کا ساتھ دے سکتا تھا" پیڈرو بولا "لیکن اس نے خود ہی کہہ دیا کہ اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ اس نے مجھے اپنے ماضی کا بدنما داغ قرار دیا۔ یہ کہا کہ نئے کاروبار کے لیے اسے نئے لوگوں کی ضرورت پڑے گی جو نیک نام ہوں' پڑھے لکھے ہوں اور ذہین ہوں۔ میں نے کہا کہ ایسے لوگ تمہارا ساتھ کب دیں گے تو وہ ہنسنے لگا۔ اس نے کہا کہ پیڈرو' تم نے بھی تو میرا ساتھ دیا تھا۔ تم کیا میرے کزن تھے یا بچپن کے دوست تھے۔ میں نے تم کو بازار سے اٹھایا تھا۔ نقد قیمت ادا کی تھی تمہاری۔ تم کیچڑ اور گندگی میں پڑے ہوئے تھے کسی حقیر کانچ کے ٹکڑے کی طرح۔ میں نے تمہیں ہیرے سے زیادہ قیمت کا کر دیا۔ تم پڑھے لکھے ذہین لوگوں کو کیا سمجھتے ہو' کیا انہیں نہیں خریدا جا سکتا! بے وقوف ڈگری تو زیادہ فروخت ہو رہے ہیں ہمارے ملک کے بازار میں۔ بے روزگار تم جیسے لوگ نہیں ہیں' وہی احمق ہیں جو کتابیں چاٹ چاٹ کے ڈگریاں جمع کرتے رہے' علم کے خزانے سمجھتے رہے اور اب دانشوری کی دال بگھارتے پھرتے ہیں جو کہیں نہیں گلتی۔"

میں نے متفکر ہو کے کہا "یہ بات بھی دلاور نے غلط نہیں کہی تھی۔"

"مجھے اس کی باتوں سے اختلاف نہیں تھا۔ افسوس اس بات کا تھا کہ اس نے ضرورت پوری ہوتے ہی مجھے دودھ میں پڑی ہوئی مکھی کی طرح باہر نکال پھینکا۔ کیا میں اتنا بے مصرف ہو گیا تھا کہ کوئی کام نہیں کر سکتا تھا میں؟ اگر وہ سیاسی لیڈر بننا چاہتا ہے تو کیا اسے بدمعاشوں کی ضرورت نہیں ہو گی؟ ووٹروں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے' مخالفین کو پٹوانے اور اغوا کرانے کے لیے' ان کے انتخابی جلسے درہم برہم کرنے کے لیے' ان کے پوسٹر اتارنے اور جلانے کے لیے' الیکشن والے دن بیلٹ بکس اٹھانے کے لیے اور بوتھ میں ہنگامہ آرائی کرنے کے لیے۔"

میں نے کہا "اس کے بغیر تو وہ جیت بھی نہیں سکتا۔"

"میں نے یہی کہا تھا کہ کاروبار بدلنے سے تعلق تھوڑا بدلتا ہے مگر وہ نہیں مانا۔ اس نے کہا کہ پیڈرو' مجھے ایک نیا ماضی چاہیے۔ ایسا ماضی جس میں میرے لیے کوئی ندامت نہ ہو' جس پر میں فخر کر سکوں۔"

میں نے کہا "وہ سب کچھ کر لے گا۔ وہ اپنی ولدیت تک بدل لے گا۔ باپ کے باپ کا نام' کام' رتبہ اور خاندان سب تبدیل کروا دے گا۔"

"یہ اتنا آسان تو نہیں ہو گا۔"

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات سولھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

پسندیدہ ناول و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں
[illegible]

پھانک

معاشرے کے ان ناسوروں کی روداد جو گوشت پوست
سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اتر رہے تھے۔ ایک
کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے روز و شب موت
کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن، سلگتی راتیں
تشنہ پیاس، خوف و ہراس، شیریں خواب، تلخ حقیقتیں۔

"نا ممکن بھی نہیں ہو گا۔ کیے معلوم ہے کہ اس کا باپ لکڑی کا کام کرتا تھا۔ بڑھئی یا ترکھان کہلاتا تھا۔" میں نے کہا "پشاور کے قریب ایک چھوٹے سے گمنام گاؤں کا کاریگر جو مرتے وقت تک اپنی مہارت فن سے امیروں کے ڈرائنگ روم کے لیے فرنیچر پر نقش و نگار بناتا رہا اور اس کی ہنرمندی کے یہ شاہکار آج بھی رئیسوں کے لیے باعث افتخار ہیں۔"

پیڈرو کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا "یہ... تم جانتے ہو؟"

"ہاں۔ افسوس کہ میں اس سے مل نہیں سکا" میں نے کہا "وہ مر چکا ہے لیکن اس کے ہاتھوں کا کمال فن میں نے دیکھا ہے۔ وہ ایسا زبردست فنکار تھا کہ باہر شاید اس کے شاہکار موتیوں میں تل کے بکتے لیکن یہاں اسے بمشکل تمام اتنا نصیب ہوتا تھا کہ وہ پیٹ بھر سکے۔ آج بھی یہاں ایسے لوگوں کی کیا اوقات ہے اور کیا عزت ہے۔ وہ ترکھان ہی کہلاتے ہیں۔ کم ذات اور کم حیثیت ہی سمجھے جاتے ہیں۔ اکبر خان اور دلاور خان نے عملاً تو اپنی ولدیت کو بہت پہلے ترک کر دیا تھا۔"

"دلاور خان، سا چا چودھری دلاور؟"

"بالکل، اپنا چودھری دلاور۔ اکبر خان اس کا بھائی تھا۔ ایک ساتھ ان دونوں نے اپنا آبائی گاؤں اور پیشہ چھوڑا تھا اور ہاتھوں کی محنت سے حق حلال کی روزی کا وسیلہ چھوڑا تھا۔ اس میں انہیں کوئی برکت نظر نہیں آئی ہو گی۔ آباؤ اجداد سب ترکھان کہلاتے ہوں گے۔ عزت تو انہیں کبھی مل بھی نہیں سکتی تھی۔ پیسہ بھی ان کے نصیب میں نہ تھا۔ شاید اس سے بڑھ تو وہ خود کو سمجھتے ہوں گے جو عزت کی پروا نہیں کرتی مگر وہ سمجھتے ہیں کہ پیسہ تو کمائی ہے۔ وہ اپنے نصیب کے لکھے کو بدلنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے ایک مقصد میں وہ کامیاب رہے۔ انہوں نے دولت حاصل کر لی۔ اب دلاور کی اگلی منزل عزت اور شہرت ہی ہو سکتی تھی۔"

پیڈرو نے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کا بھائی اکبر خان اب کہاں ہے؟"

میں نے کہا "آج کے بارے میں تو شاید کسی کو نہیں معلوم"

"مجھے معلوم ہے" پیڈرو بولا۔

"کیا وہ زندہ ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ مجھ سے مل چکا ہے" پیڈرو نے کہا "بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اس سے بہت پہلے ملا تھا۔ پھر درمیان میں اس سے کوئی رابطہ نہ رہا۔ مجھے دلاور نے ہی بتایا تھا کہ وہ ایک پولیس مقابلے میں مارا گیا۔"

"کہاں مارا گیا؟"

"کہیں باہر کھلے سمندر میں مقابلہ ہوا تھا۔ اس کی لانچ پر دستی بم پھینکا گیا اور وہ ڈوب گئی تھی۔ اس پر جتنے لوگ سوار تھے سب سمندر میں غرق ہو گئے تھے۔"

"تم نے تصدیق نہیں کی تھی؟"

"مجھے تصدیق کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دلاور خود اپنے بھائی کے بارے میں بتا رہا تھا کہ وہ مارا گیا تو میں کیوں شک کرتا" پیڈرو بولا "اس نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ شاید یہ پولیس مقابلہ نہیں تھا بلکہ پولیس کی وردی میں ہمارے کاروباری حریف تھے جو ہمیں راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"آٹھ دس سال پرانی۔ بھارت پاکستان کی پہلی جنگ سے پہلے کی۔"

"تم اس وقت بھی دلاور کے ساتھ تھے؟"

اس نے رنج سے کہا "یہی تو افسوس ہے مجھے کہ اس کا اور میرا ساتھ بہت پرانا تھا۔ چودہ سال سے ہم ہر کام مل کے کر رہے تھے۔"

"ڈی سوزا اور حاجی عبداللہ۔ سابق ایس پی سراج؟"

"یہ سب بعد کی پیداوار ہیں۔ ایسے لوگ جو آتے جاتے رہتے ہیں" پیڈرو بولا "جس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس سے سودے کی بات ہو جاتی ہے۔"

"جس شخص نے اپنے باپ کو چھوڑ دیا' سگے بھائی سے رشتہ توڑ لیا' وہ تمہاری وفاداری کے بدلے ساری عمر کا رشتہ تو نہیں جوڑ سکتا تھا تم سے۔ مجھے یقین ہے اس نے یہی کہا ہوگا۔"

"ہاں۔ اس نے کہا کہ پیڈرو تم نے میرے لیے کام کیا تو مجھ پر کون سا احسان کیا۔ یہ کاروباری تعلق تھا۔ کاروبار میں مال میں نے بھی بنایا اور تم بھی گھاٹے میں نہیں رہے۔ سوچو ذرا کہ اتنے بڑے مواقع تمہیں اور کون فراہم کر سکتا تھا۔ اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی تو الگ کیا۔ تم جہاں چاہو جاؤ' آئندہ مجھ سے تعلق کی بات بھی منہ سے نہ نکالنا۔ تم جو چاہو کرو لیکن مجھے معلوم ہوا کہ تم میرے نام سے فائدہ اٹھا رہے ہو یا تمہاری وجہ سے میری بدنامی ہو رہی ہے تو پھر ٹھیک نہیں ہوگا۔"

پیڈرو نے ایک بار پھر دلاور کی شان میں ذم بالحسن کا قصیدہ پڑھا "وہ عزت دار بننا چاہتا تھا تو کیا میں ساری عمر بے عزت رہوں۔ میں بھی کم ذات اور پنچ خاندان کا ہوں۔ میرے باپ دادا کے مقدر میں ذلت لکھ دی گئی تھی اور نوشتۂ تقدیر کو مٹانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ میرا باپ میراثی تھا اور میرے چچا کے ساتھ گاؤں گاؤں میلوں میں سوانگ بھرتا تھا۔ زمینداروں کی حویلیوں میں شادی بیاہ کے موقعے پر اور عید بقرعید بخشش لینے جاتے تھے۔ گلے میں ڈھول ڈال کے ہاتھوں میں چمڑے کے بڑے بڑے سول جیسے ٹکڑے لے کر وہ ایک دوسرے کو مارتے تھے اور جگت بازی کرتے تھے۔ بھبی مذاق' پھکڑپن' ٹھٹھول' ایک دوسرے کی تذلیل تاکہ اونچی ذات والے ہنس لیں اور لطف اندوز ہوں۔ وہ نیچے ان کے قدموں میں بیٹھتے تھے۔ جوتے پہن کے پھرنا ان کے لیے ممنوع تھا گاؤں کی حد تک۔ وہ پکا مکان بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ دنیا کا ہر ذلیل کام انہی سے لیا جاتا تھا جو کمی کہلاتے ہیں۔ کمینے' کم ذات لوگ۔ اس بیسویں صدی کے مہذب معاشرے میں بھی ان کی حیثیت وہی ہے۔"

وہ بولتے بولتے جیسے تھک گیا یا آزردہ ہو گیا تھا۔ اس نے بوتل سے پھر جام بھرا اور خالی کر دیا۔

"چھوڑو اپنے سکندر اعظم صاحب" اس نے تلخی سے دلاور کے لہجے میں کہا "آدمی واقعی نصیب کے لکھے کو نہیں بدل سکتا۔"

"یہ غلط سوچ ہے۔"

"نہیں۔ ہاتھوں کی لکیریں سب بتا دیتی ہیں۔"

میں نے کہا "عزت' ذلت سب خدا کی طرف سے ہے۔"

"تم کتابی باتیں کرتے ہو۔ شہر کے اسکولوں' کالجوں میں پڑھ کے تم ولایت چلے گئے تھے۔" اس نے تلخی سے کہا "جا کے دیکھو کسی وڈیرے' زمیندار' جاگیردار یا خان' ارباب' حکمرانی کے علاقے میں۔ ان کی رعیت کو دیکھو اور ان کی حالت کو دیکھو۔ تم سب بھول جاؤ گے انسان کی مساوات کے دعوے اور مذہب کی وہ تعلیمات جن میں کہا گیا ہے کہ اسلام ذات پات کی تفریق سے بالاتر ہے اور کسی کو برتری ہے تو تقوے اور پرہیزگاری سے۔ نہ کہ نام و نسب سے۔"

"تعلیمات تو آج بھی یہی ہیں' یہ الگ بات ہے کہ ہم نے ہندوؤں کے ساتھ رہ کے انہی کے معاشرے کی سوچ اپنا لی۔"

"مجھے بتاؤ کیا شرفا کی کسی شادی میں کسی مسلمان گورکن کو سب معزز مہمانوں کے ساتھ بٹھایا جائے گا؟ اگر وہ سڑکوں پر جھاڑو دیتا ہو یا کچرا صاف کرتا ہو۔ جوتے گانٹھتا ہو یا راج مزدور ہو۔ افسر اور مال دار لوگ کیا' ایک کلرک اس گلاس کو منہ نہیں لگائے گا جس سے کوئی جمعدار پانی پی لے خواہ وہ نہا دھو کے اور پاک صاف ہو کے آیا ہو۔ کیا وہ اپنے بچوں کو سکھاتا ہے کہ جمعدار جو اس گندے گلاس میں پانی پیا۔ کوئی دانشور' پروفیسر بھی اپنی بیٹی کی شادی کسی نائی قصائی یا دھوبی سے نہیں کرتا خواہ وہ حق حلال کی کماتا ہو' تعلیم یافتہ ہو اور شریف ہو۔ کسٹم کے حرام خور کلرک سے کر دیتا ہے۔ آج بھی اونچی ذات کے لوگ ہیں اور نیچی ذات ہے۔ گاؤں کی بات نہیں کر رہا ہوں میں' شہروں کی بات کر رہا ہوں۔ پڑھے لکھے ہی اپنی ذات کا رشتہ تلاش کرتے ہیں۔ یہ کون سا اسلام ہے؟ سید' شیخ' قریشی' صدیقی۔ کیا یہ سب برابر نہیں ہوتے؟"

میں حیران تھا کہ پیڈرو یہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔ میں اسے ایک جاہل آدمی سمجھتا تھا اور اس کی زبان سے میں نے فحش کلامی اور گندی گالیوں کے سوا کچھ نہیں سنا تھا۔ تاہم یہ بھی حقیقت تھی کہ میری اور اس کی کبھی یوں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ہم جب ملے تھے کسی محاذ پر ملے تھے۔ ایک دوسرے کے دشمن بن کے سامنے آئے تھے۔ دشمنی کے اسباب آج بھی وہی تھے مگر یہ موقع پہلی بار آیا تھا کہ ہم نفرت اور عناد کے جذبات پر قابو پا کے ایک دوسرے سے مخاطب ہوں۔

"میں مجبور ہوں کہ تم سے اتفاق کروں پیڈرو اور مجھے حیرت ہے کہ یہ باتیں تم کہہ رہے ہو۔ اتنی سمجھ بوجھ تھی تم میں تو تم دلاور جیسے لوگوں کے راستے پر کیوں چلے؟"

اس نے ایک قہقہہ لگایا "بے وقوف آدمی ہو تم جو ایسا سوال کرتے ہو۔ اور کون سا راستہ رہ جاتا ہے ہم جیسوں کے لیے؟ جو حق ہمیں معاشرہ نہیں دیتا' وہ ہم ڈاکا ڈال کے نہ حاصل کریں تو کیا تمام عمر خیرات میں بے عزتی قبول کرتے رہیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں دس سال کی عمر میں بھاگ کے شہر آ گیا تھا۔ دس سال کا بچہ گھر سے نکلتے ہوئے بھی ڈرتا ہے مگر میں تو تین سال کی عمر سے ماں کے ساتھ جاتا تھا۔ وہ زمیندار کے گھر کا کام کرتی تھی۔ ہم ان کی اترن پہنتے تھے اور بچا کھچا کھاتے تھے۔ اس وقت مجھے سمجھ نہیں تھی کہ لوگ مجھ پر کیوں ہنستے ہیں۔ وہ سب حاسد لوگ تھے۔ وہ بھی زمیندار کے گھر کی اترن اور اس کا بچا کھچا کھانا چاہتے تھے کیونکہ محنت کی سوکھی روٹی کے مقابلے میں وہ ایسا کھانا تھا جو انہیں شادیوں میں ہی میسر آتا تھا یا کسی کے چہلم پر۔ میرا مطلب ہے زمیندار کے گھرانے کی شادیوں اور چہلموں پر۔ خود ان کے ..... گھر کی شادیوں میں گڑ کے میٹھے چاول ہوتے تھے اور چہلم پر گوشت روٹی کھلانے والا مغرور ہوتا تھا کہ اس نے ماں باپ کی بخشش کا سامان کر دیا۔ ہم ہر روز اچھا کھاتے تھے۔ میری ماں ریشم پہنتی تھی اور مجھے جوتے میسر تھے۔ اترن ہونے کے باوجود یہ چیزیں قیمتی تھیں۔ ایسی چیزیں کون خرید سکتا تھا اور خرید بھی لیتا تو پہننے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اعزاز صرف ہمارے گھر کو حاصل ہوا۔ ایک کم ذات میراثی کی بیوی نے صرف اپنے شوہر کو اور اپنے بیٹے کو ان نعمتوں کا حقدار کر دیا کیونکہ' کیونکہ وہ.... بہت خوب صورت تھی' موٹی چنی اور صحت مند جنی تھی۔ کسی میراثن کو ایسا نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہی ہوتا ہے جو میرے ساتھ ہوا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ وہ زمیندار کی اور اس کے بھائیوں کی' اس کے مہمانوں کی خدمت گار ہے۔ ان کا سارا کام وہی کرتی ہے۔ اس میں دن رات کی تخصیص نہیں تھی۔ اسے کسی بھی وقت بلایا جا سکتا تھا۔ اور اس کی بے عزتی اور بے شرمی کا چلتا پھرتا اشتہار ہم سب تھے۔ میں' میرا باپ' میرے بھائی بہن۔ ہمارے کھانے' ہمارے کپڑے اور ہمارے چہرے۔ حسد کرنے والے صاف کہتے تھے کہ تمہیں کیوں نہیں کرے گا بھئی تو آخر بیٹا کس کا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میری صورت اپنے باپ سے نہیں' زمیندار سے ملتی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ موقع ملتا تو وہ خود بھی اپنی بیویوں کو' بہنوں کو اور بیٹیوں کو زمیندار کی خدمت کے لیے وقف کر دیتے مگر وہ بدصورت اور بدمزاج تھیں۔ سوکھی سڑی یا موٹی بھینس جیسی۔ سلامتی تو میرے باپ کے نام نکلی تھی۔"

میں دم بخود بیٹھا استاد پیڈرو کی داستان حیات کا وہ باب سن رہا تھا جس کو اپنی زندگی کی کتاب سے پھاڑ پھینکنے کے بجائے اس نے سنبھال کے رکھا تھا اور اپنے ماضی کے یہ اوراق رسوائی وہ خود مجھے پیش کر رہا تھا۔

میں نے کہا "تمہارے باپ نے بھی تو گاؤں یا خاندان میں ہی شادی کی ہوگی؟"

"یہی تو ساری خرابی ہوئی۔ وہ خود لمبا تڑنگا خوبرو جوان تھا۔ زبان اس کی خوب چلتی تھی اور میراثی اگر لطیفہ گو' حاضر جواب اور مسخرہ نہ ہو تو بھوکا مرتا ہے۔ وہ باتوں کی کمائی کھاتا تھا۔ سال بھر کے لیے اسے زمیندار نے کسی کام سے شہر بھیجا تھا۔ وہ کام دکھا گیا۔ مال ہضم کر کے روپوش ہو گیا اور تین سال غائب رہا۔ پھر کسی نے اسے دیکھ لیا اور اسے گرفتار کر کے لایا گیا۔ اس نے شادی کر لی تھی اور یہی شادی اس کا معافی نامہ بن گئی ورنہ زمیندار اسے زندہ گاڑنے کا حکم صادر کر چکا تھا۔ عین وقت پر میری ماں مدد آ پہنچی' زمیندار کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنی سونے کی بالیاں' چوڑیاں سب زمیندار کے قدموں میں ڈال دیں اور شوہر کے لیے جان بخشی کی درخواست کی۔ درخواست کے قبول نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ زمیندار کی نظر اپنے قدموں میں پڑی ہوئی سونے کی مورت پر جم کے رہ گئی تھی۔ اس نے بالیاں' چوڑیاں واپس کرتے ہوئے اس کا سہاگ اسے بخشا اور وہ جاں بلب سرتاج کو چارپائی پر ڈال کے گھر لے گئی۔ ہفتہ دس دن بعد میرا باپ مار کو بھول کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد اسے کام کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔ میرا چچا اسے بہت ذلیل کرتا تھا کہ بے غیرت' چھوڑ دے اس عورت کو یا ڈوب کے مر جا۔ تنگ آ کے میرے باپ نے بات اوپر پہنچائی اور ایک دن زمیندار نے میرے چچا کو ڈھول کی طرح بجا بجا کے پھاڑ دیا۔ چاچی' اس پھٹے ڈھول کو گلے میں ڈالے کچھ دن گاؤں میں پھیلی رہی۔ پھر وہ شہر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے خاصی کمائی کی۔ خود میں نے ایک بار انہیں دیکھا۔ میرا چچا ایک ریڑھی میں پڑا تھا اور میری چچی اس ریڑھی کو دھکیل رہی تھی۔ بھیک مانگنے کا فن انہوں نے شہر میں ہی سیکھا ہوگا۔

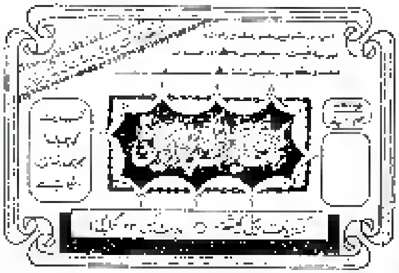

www.paksociety.com

میرے چچا کے ہاتھوں پیروں پر لال پیلے پینٹ تھے اور اس کے ننگے بدن پر مکھیاں بھنک رہی تھیں لیکن اسی کمرہ و نظارے پر منہ پھیر لینے والے ان کی طرف نوٹ پھینکتے جا رہے تھے۔ خود میں نے چاچی کو سو کا نوٹ دیا تو وہ حیران ہوئی مگر اس نے مجھے پہچانا نہیں۔ پھر میں نے کہا کہ چاچی "عیش کر رہی ہے تو بھی شہر آ کے"۔ وہ پریشان ہو گئی اور میں گاڑی میں آگے بڑھ گیا۔

"اس کے بعد تم نے ان کے لیے کچھ نہیں کیا؟"

"وہ خود اپنے لیے بہت کچھ کر چکے تھے، مجھے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی" پیڈرو نے کہا "میرے چچا کے ہاتھ پاؤں کی ہڈیاں اور کچھ پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ گاؤں کے حکیم اور پہلوان انہیں جوڑنے میں تو کامیاب ہو گئے تھے مگر ہڈیوں کو ٹھیک نہ بٹھا سکے۔ نتیجہ یہ کہ میرے چچا کے دونوں پاؤں مخالف سمت میں مڑ گئے۔ ایک پاؤں تھوڑا سا دائیں طرف گھوم گیا اور دوسرا بائیں طرف۔ جب وہ چلتا تھا تو اس کے گھٹنے مل جاتے تھے اور پنڈلیاں انگریزی کا آٹھ والا ہندسہ بناتی تھیں۔ اس کا ایک ہاتھ ٹھیک تھا لیکن دوسرا سوکھ گیا تھا۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں وہ دنیا کا کون سا کام کر سکتا تھا سوائے بھیک مانگنے کے۔ چاچی کے ساتھ وہ اپنی حالت کو زیادہ قابل رحم بنا کے نکلتا تھا۔ اپنے گھر میں وہ نہا دھو کر کپڑے بدل کر آرام سے پھرتا تھا اور کرسی پر بیٹھ کے ٹی وی دیکھتا تھا۔"

"تم ان کے گھر گئے تھے؟"

"ہاں۔ مجھے جانا تو نہیں چاہیے تھا مگر میں تجسس سے مجبور ہو کے چلا گیا کیونکہ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ چچا کی اس حالت کا ذمے دار میں ہی ہوں۔ میں اسے یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ اس نے جو کیا بالکل ٹھیک تھا اور بعد میں میں نے اپنی زندگی کے داغ رسوائی کو کس طرح دھویا تھا۔ لیکن وہ تو مجھے دیکھتے ہی بگڑ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا کہ نکال اس حرامی بچے کو میرے گھر سے۔ یہ میرے بھائی کی اولاد نہیں ہے۔ مجھے چاچا کیوں کہتا ہے۔ جا کے زمیندار کے بھائی کو تایا بنا۔ چاچی نے بھی میری ایک نہیں سنی۔ میری مالی امداد کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ اس نے اپنے بچوں کو میرے پیچھے لگا دیا۔ وہ سات تھے اور سب سے بڑا تو جوان ہی تھا۔ وہ مجھ سے بھوتوں کی طرح چمٹ گئے اور انہوں نے مجھے مار کے اور دھکے دے کے گھر سے نکال دیا۔ میرا حلیہ بگاڑ دیا انہوں نے مار مار کے۔"

"اور تم نے مار کھا لی؟"

"ہاں۔ اچھی لگی مجھے وہ مار۔ اپنوں کی مار تھی نا۔ مار تو ہم اور ہمارے باپ دادا سب رزق کے ساتھ کھاتے تھے۔ جو نصیب میں ہو وہی رزق۔ سو پیاز اور سو جوتے ہوں تو وہ بھی ٹھیک۔ لیکن میں پیار کی مار کا ترسا ہوا تھا۔ باپ نے بھی نہیں مارا۔ کیسے مارتا؟ زمیندار کی اولاد پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت کہاں تھی اس میں۔ شاید وہ اتنی نفرت کرتا تھا مجھ سے کہ میرے وجود کو مجبوراً برداشت کرتا تھا۔ میری نیکی بدی کا اور پرورش کا اس کے رشتے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی طرح ماں ہمیشہ مجھ پر مہربان رہی۔ مائیں تو مہربان ہی ہوتی ہیں۔ ماواں ٹھنڈیاں چھاواں۔ لیکن وہ صرف میری ماں کہاں تھی۔ وہ تو بہت سے بچوں کی ماں تھی۔ کچھ پیدا ہی نہیں ہوئے، کچھ پیدا ہوتے مر گئے، کچھ مار دیے گئے۔ جو زندہ بچے وہ بن باپ کے تھے اور زمیندار کی حویلی میں اس کے بھائیوں، بھتیجوں، سالوں اور چاچے مامے، ان کی اولادوں اور آنے جانے والوں تک کی صورت میں اپنی صورت تلاش کرتے تھے۔ وہ ماں کیا پیار دیتی مجھے۔ اس نے مجھے جب مارا اپنے آپ سے نفرت کے باعث مارا۔ وہ مار میرے مقدر میں بھی نہ تھی جو تربیت، اصلاح اور مستقبل کو سدھارنے کے لیے ماں باپ اور بڑے بھائی بہنوں سے پڑتی ہے۔ کیا تم اس کا موازنہ پولیس کی مار سے کر سکتے ہو۔ یہی وجہ تھی سکندر صاحب کہ میں نے اپنے چچا کی گالیاں سن کے خوشی محسوس کی۔ وہ سب میرے کزن تھے، چاچے دے پتر، جنہوں نے مجھے مارا۔ اس لیے کہ میں ایک بڑا آدمی تھا اور ان کے والدین ایسا سمجھتے تھے۔ وہ فقیر تھے مگر ان میں غیرت تھی۔ جو مجھ میں بھی تھی...."

میں نے کہا "یہ انکشاف ہے میرے لیے۔"

"آج رات بہت سے انکشافات ہوں گے تم پر۔"

میں نے کہا "میں ضرور سنوں گا تمہاری باتیں لیکن پہلے میں کاجل اور رابعہ سے ملوں گا۔"

اس نے پھر تالی بجائی۔ وہی حکم کا غلام حاضر ہو گیا "یس سر؟"

"جا کے دیکھو، مہمان خواتین کیا کر رہی ہیں۔ معلوم کر کے آؤ۔"

"یس سر" غلام سر جھکا کے غائب ہو گیا۔

"تمہیں بھوک بھی لگی ہوگی؟"

میں نے کہا "میں اکیلا کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

"کھانے میں ابھی کچھ دیر ہے۔ کیوں نہ ایک کپ کافی اور ہو جائے" اس نے کہا "کیسی پیو گے؟"

"ہاٹ اینڈ بلیک مگر کریم اور شوگر کے ساتھ۔"

غلام پھر نمودار ہوا۔ "ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ مہمان بالکل ٹھیک ہیں مگر سو رہی ہیں۔ انہیں اس وقت اٹھانا مناسب نہیں۔"

"کون ڈاکٹر صاحب؟ میں خود بات کروں گا۔ بلکہ میں انہیں دیکھوں گا" میں نے کہا۔

پیڈرو اٹھ کھڑا ہوا "جیسی تمہاری مرضی۔ آؤ میرے ساتھ۔"

رابعہ اور کاجل واقعی سو رہی تھیں۔ ان کے بیڈ روم کے باہر ایک نرس موجود تھی اور ایک خادمہ اسٹول پر بیٹھی تھی جو پیڈرو کو دیکھتے ہی سلام کر کے کھڑی ہو گئی۔

"تم جاؤ اندر" پیڈرو نے وہیں رک کے کہا۔

میں اس شائستگی کے مظاہرے پر حیران ہوا مگر حالات جس طرح ایسی تیزی سے رو بہ تغیر تھے کہ میں نے اپنی حیرت کا اظہار نہیں کیا اور دروازہ کھول کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ادھیڑ عمر کی ایک لیڈی ڈاکٹر نے احتجاجی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"یہ میری واقف ہیں۔ اور یہ نہیں" میں نے کہا "ان کی طبیعت کیسی ہے؟"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے سر" وہ مرعوب ہو گئی "ان پر تھوڑا سا اثر تھا SEDATIVES کا۔ اگر یہ صبح تک اسی طرح سوتی رہیں گی تو خود بخود ختم ہو جائے گا کسی دوا کے بغیر۔ ویسے میں ان کو انجکشن دوں تو یہ تین منٹ بعد بالکل چاق و چوبند ہوں گی مگر شاید پھر رات بھر جاگتی رہیں گی۔ دوبارہ TRANQUALISER دینا پڑیں گے۔ اس سے کیا فائدہ؟"

"او کے۔ او کے۔ ڈاکٹر تم ہو، میں نہیں" میں نے انگریزی میں کہا اور باہر نکل آیا۔ میں باہر نکلا تو پیڈرو غائب تھا۔

"سر اپنے کمرے میں ہیں" نرس نے کہا "کہہ گئے تھے آپ وہیں آ جائیں۔"

شاید پیڈرو کا خیال ہو گا کہ میں بہت دیر رکوں گا یا اصرار کروں گا کہ رابعہ اور کاجل کو بیدار کیا جائے۔ اگرچہ اس احساس سے مفر نہ تھا کہ میں اپنے بدترین دشمن کی قید میں ہوں اور اپنی مرضی سے جانا چاہوں تو نہیں جا سکتا۔ لیکن ابھی تک کوئی بات میری مرضی کے خلاف نہیں ہوئی تھی اور پیڈرو کے انتظامات بھی ٹھیک تھے۔

وہ مجھے دیکھ کے تھوڑا سا حیران ہوا۔ وہ جام شراب ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ "بڑی جلدی آ گئے۔"

میں نے کہا "ان کا سوتے رہنا ہی بہتر ہے۔"

پیڈرو نے کہا "کافی پیو گے.... یا...."

میں نے کہا "اس سے میں اس وقت بھی دور رہا جب ولایت میں ہر جگہ اور ہر وقت مفت مل سکتی تھی۔"

وہ مسکرایا "اب میں کون سی قیمت مانگ رہا ہوں۔"

"بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اس کی۔ تم بھی جانتے ہو" میں نے کافی بناتے ہوئے کہا "اس کے لیے مجھے اپنے ایمان کی قربانی دینی پڑے گی اور اصل قیمت کا حساب بعد میں ہو گا۔"

"ہم تو پیدائشی جہنمی ہیں" اس نے کہا "دنیا میں بھی جہنم اور آخرت میں بھی۔"

"آدمی اپنی جہنم خود بناتا ہے" میں نے کہا "اور پھر اس میں اکیلا نہیں جلتا، وہ سب بھی جلتے ہیں جو اسے اپناتے ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ تم میں اپنے باپ کے بنائے ہوئے جہنم میں نہ پیدا ہوتا تو شاید استاد پیڈرو نہ ہوتا۔ بدرالدین ہوتا۔"

"یہ تمہارا اصل نام ہے؟"

"ہاں۔ بدرالدین سے میں بدرو بنا، پھر استاد بدرو ہوا۔ جب قلم قتل، جسم پارا اور تیغ مختار کی۔ استاد پیڈرو تو میں نے خود اپنا نام استاد پیڈرو رکھ لیا۔ اس جہنم میں میری ماں تو اپنی خوشی سے رہی۔ میں سمجھتا ہوں سارا قصور اس کا تھا۔ وہ کیوں گئی تھی میرے باپ کے لیے زندگی کی بھیک مانگنے۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ تھانے دار کسی کو رشوت لیے بغیر نہیں چھوڑتا اور وہ تھانے دار تو ان داتا بھی تھا۔"

"تم زیادتی کر رہے ہو۔ یہ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا؟"

"او نہ! کیا وہ کسی بہت بڑے گھر کی بیٹی تھی، بڑے اونچے طبقے سے آئی تھی؟" پیڈرو نے نفرت کے زہر آلود لہجے میں کہا "ایسی لڑکی میرے مراثی باپ کے ساتھ شادی کر کے اپنا گھر چھوڑ آئی؟"

"تم نہیں جانتے اس کے خاندان کے بارے میں؟"

"کیسے جانتا۔ اس نے کبھی بتایا ہی نہیں۔ اس سے ملنے بھی کوئی نہیں آیا اور نہ وہ کسی سے ملنے گئی" پیڈرو بولا "بعد میں اس نے کبھی کچھ کہا تو کبھی کچھ۔ وہ کوئی شریف زادی پہلے بھی نہیں تھی۔ ایسی ہی زندگی کی عادی تھی وہ، ورنہ اتنی آسانی سے زمیندار کو منہ مانگی قیمت ادا کرنے پر تیار نہ ہوتی۔"

"مجبوری آدمی سے سب کچھ کراتی ہے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ عزت دار عورت ایک مجبوری سے سمجھوتا کرتی ہے تو خودکشی پر مجبور ہو جاتی ہے۔ وہ خودکشی نہ کرتی، شوہر کے ساتھ واپس وہیں چلی جاتی جہاں سے آئی تھی۔ لیکن وہ اپنی مرضی سے وہاں رہی۔ سب کچھ سن کے اس پر بھی کوئی اثر نہیں ہوا اور میرے باپ کو بھی اسی نے قائل کر لیا ہو گا کہ کیا رکھا ہے عزت غیرت کے چکر میں۔ بھوکے مرنے اور جوتے کھا کے جینے سے یہ بہتر ہے کہ جو بھونکتا ہے اسے بھونکنے دے، اپنے کان بند کر لے اور آنکھیں بھی۔ فراغت نے میرے باپ کو بھی غیرت سے محروم کر دیا۔ خوف کا اس میں اتنا دخل نہیں تھا۔ جب میں دس سال کا ہوا تو میرے چاچا کو غیرت مندی کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس کے گاؤں سے چلے جانے کے بعد لوگوں نے اور تھو تھو کی۔ میری عمر کے لڑکے جو باتیں گھر میں سنتے تھے وہ میرے منہ پر کہتے تھے۔ وہ کہتے تھے بدرو! تو حرامی ہے۔ پکا حرامی ہے سولہ آنے۔ حرامی ان میں بھی بہت ہوں گے۔ سولہ آنے نہ سہی، چودہ آنے، بارہ آنے، آٹھ آنے۔ مگر کچھ ہوتے ہیں ایسے راز جو راز نہیں ہوتے مگر سرعام کھولے بھی نہیں جاتے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ گٹر کے ڈھکن کے نیچے غلاظت بہتی ہے۔ اسے سب چھپاتے ہیں۔ کوئی اسے گلی میں بہتا دیکھے گا تو ناک منہ پر رومال رکھ کے گزرے گا۔ ایسا ہی میرے ساتھ ہوا۔ میرا حرامی ہونا سربستہ راز نہیں رہا۔ بلکہ ہر شخص کی زبان پر آنے والی بات بن گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے وجود کی گندگی سے خود مجھے گھن آنے لگی اور میں اپنے آپ سے نفرت میں مبتلا ہو گیا۔ ایک دن میں نے اپنی ماں سے وہ کہہ دیا جو میں نے دوسروں سے سنا تھا.............. میرا خیال تھا کہ اس بات پر وہ

www.paksociety.com

بھڑک اٹھے گی اور مار مار کے میری چمڑی اُدھیڑ دے گی لیکن وہ تو عادی تھی یہ باتیں سننے کی۔ وہ صرف حیران ہوئی میری زبان سے ایسا سن کے اور پھر اپنی تیاری میں مشغول ہو گئی "ہاں ہوں۔۔ پھر" اس نے کہا۔ میں نے کہا "لوگ مجھے حرامی کہتے ہیں تیری وجہ سے" اس نے کہا "تو بھی کہہ دیا کر وہ سب حرامی۔ بڑے آئے حرامی کہنے والے۔ انھیں معلوم ہے ان کا باپ کون تھا۔ ذرا پوچھیں جا کے اپنی اپنی ماؤں سے" لیکن اس کے جواب نے مجھے مطمئن نہیں کیا۔ میں نے کہا "تو کیوں جاتی ہے زمیندار کے گھر؟" اس نے کہا "تم سب کے جہنم بھرنے کے لیے۔ تمہارے پیٹ خالی باتوں سے نہیں بھر سکتے اور تمہارا لنگڑا باپ کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا "کوئی ضرورت نہیں ہے ہمارے لیے کہیں جانے کی۔ ابا بھی کام کرے گا اور میں بھی کام کروں گا" وہ ہنسنے لگی "کیا کام کرے گا تو؟ وہی جو تیرا ابا کرتا تھا' تیرا چاچا کرتا تھا۔ ڈھول بجائے گا' بھانڈوں کے ناچ گا۔ جوتیاں چٹخائے گا اور کیا بنے گا۔ اس میں بڑی عزت ہے؟" میں نے کہا "میں کچھ بھی کروں مگر میں تجھے گھر سے نہیں جانے دوں گا" اس نے کہا "چل ہٹ حرامی' بڑا آیا مجھے روکنے والا" وہ کپڑے پہن کے میک اپ کر چکی تھی۔ میں اس کے راستے میں کھڑا ہو گیا مگر وہ مجھے دھکا دے کر چلی گئی۔ میں زمین پر گر پڑا۔ مجھ سے کچھ بڑے لڑکے یہ دیکھ کے ہنسنے لگے۔ فحش اشارے کرنے لگے اور میرا مذاق اڑانے لگے۔ ذلت کی انتہا نے مجھے پاگل کر دیا۔ میں کپڑوں پر اور ہاتھوں پیروں میں لگی ہوئی مٹی جھاڑے بغیر گھر میں گیا۔ وہاں سے ٹوکا اٹھایا اور اس خیال سے کہ کوئی نہ دیکھے' پچھلی طرف کی کھڑکی سے باہر کود گیا۔ اگر کسی نے مجھے ٹوکے سمیت جاتا دیکھ لیا ہوتا تو مجھ سے پہلے یہ اطلاع زمیندار کی حویلی میں پہنچ جاتی۔ میری ماں حویلی سے گزر کے زمیندار کی بیٹھک میں داخل ہو رہی تھی کہ میں بھی پہنچ گیا۔ کسی نے مجھے نہیں روکا کیونکہ میں حویلی میں آتا جاتا رہتا تھا۔ راستہ طے کرتے ہوئے میرے جوش میں کچھ ہوش کے جذبات غالب آ گئے تھے ورنہ میں ٹوکا لہراتا ہوا اور گالیاں بکتا ہوا داخل ہوتا تو دروازے پر ہی دھر لیا جاتا۔ میں ٹوکے کو چھپا کے لے گیا۔ اتنی بڑی چیز کو چھپانا آسان نہیں ہوتا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح بیٹھک تک فاصلہ طے کر لیا اور بس آگے کچھ تقدیر نے مدد کی۔ میری ماں زمیندار کے ساتھ .... بیٹھی ہوئی تھی مگر ان کا رخ دوسری طرف تھا۔ بید سے بنے ہوئے کاؤچ کی پشت سے ان کے صرف سر نظر آتے تھے ....

جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ چونک اٹھے ...... اور انھوں نے پلٹ کے دیکھا۔ میں نے انھیں اٹھنے کی یا کوئی سوال کرنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ مجھے ٹوکا استعمال کرنا آتا تھا۔ چارہ کاٹنے میں اب میں باپ کی مدد کرنے لگا تھا۔ میرا پہلا وار زمیندار پر ہوا۔ اس کا سر درمیان سے دو ٹکڑے ہو گیا اور اس کا خون اُبل اُبل کر نکلا تو اس میں مغز بھی بہہ گیا۔ میری ماں نے چیخ ماری ہی تھی کہ میں نے ٹوکا چلا دیا۔ اس کا سر اس لیے بچ گیا کہ وہ اٹھنے لگی تھی۔ ٹوکا اس کی گردن پر پڑا اور وہ وہیں گر گئی۔ اس کا سر جسم سے الگ نہیں ہوا تھا' بس ایک طرف کی کھال کے ساتھ لٹکا رہ گیا تھا۔ اس کی چیخ نے حویلی میں کھلبلی مچا دی تھی۔ اچانک مجھے اپنے جرم کی سنگینی کا احساس ہوا۔ میں نے دو قتل کیے تھے۔ میں نے اپنی ماں کو مار ڈالا تھا اور میں نے پورے گاؤں کے ان داتا کو' بادشاہ سلامت کو ہلاک کر دیا تھا۔ آلۂ قتل میرے ہاتھ میں تھا اور میں موقعِ واردات پر پکڑا جاتا تو وہیں میری تکا بوٹی ہو جاتی۔ اس وقت ایک دم عقل لوٹ آئی اور میں نے پہلا کام یہ کیا کہ دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ وہ سب دروازہ کوٹتے رہ گئے اور میں کھڑکی کھول کے باہر کود گیا۔ پھر میں بھاگا اور بھاگتا چلا گیا۔ تب سے آج تک میں بھاگ رہا ہوں۔"

"کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "اب کیوں بھاگ رہے ہو؟"

"زری کا عمر بند ہو تو وہ بھاگتا رہتا ہے" پیڈرو بولا۔

"تمہارے منہ سے ایسی فلسفیانہ گفتگو میں پہلی بار سن رہا ہوں اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ مجھ سے چوہدری دلاور نے بھی جس لہجے میں گفتگو کی' وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ یہ اچانک دنیا کیسے بدل گئی ہے۔ میری تو عقل حیران ہے کہ وہ سب غلط تھا جو میں نے آج تک دیکھا' سنا محسوس کیا اور سمجھا۔ یا اب جو میرے سامنے آیا ہے وہ غلط ہے؟"

"تم آج تک ایک ہی رخ سے حالات کو دیکھتے آئے تھے۔ تصویر کا دوسرا رخ تم نے پہلے کب دیکھا تھا؟"

میں نے کہا "شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن تمہارا تو اندازِ بیاں ہی بدل گیا ہے۔ تم پڑھے لکھے لوگوں کی طرح بول رہے ہو۔"

وہ ہنسا "تم مجھے ہمیشہ جاہل سمجھتے رہے؟"

"ظاہر ہے۔ تم ویسے بات کرتے تھے۔"

"وہ بھی ضروری تھا۔ جیسا کام ویسا کلام۔ پولیس بھی اگر آپ جناب کرنے لگے تو ملزم قابو نہ آئیں۔ ان کی مجبوری ہے بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاشی کی زبان استعمال کرنا۔"

"یہ غلط دلیل ہے۔ تم اپنی مثال دے سکتے ہو' پولیس کی نہیں۔ وہ تو شریف آدمی کے ساتھ بھی ویسے ہی پیش آتے ہیں جیسے بدمعاش کے ساتھ۔"

"شریف نہیں غریب کہو۔ پیسے والے ان کی زبان خرید لیتے ہیں۔" پیڈرو بولا "عادت رفتہ رفتہ ان کی فطرت بن جاتی ہے جیسے میری فطرت بن گئی تھی۔ چلو پہلے ہم کھانا کھا لیں پھر میں بتاؤں گا کہ گاؤں سے شہر آنے کے بعد میں بدرالدین سے استاد پیڈرو کیسے بنا۔"

میری مجبوری ایک وجہ تھی۔ میں اس کوٹھی کے زنداں میں ایک پل نہ ٹھہرتا مگر میں اپنی مرضی میں مختار نہ تھا۔ پھر کاہل اور رابعہ سو رہی تھیں اور یہاں ان کو پوری توجہ بھی مل رہی تھی۔ استاد پیڈرو کی باتوں سے متاثر ہو کے اپنی دشمنی کے جذبات کا رخ بدلنا میرے لیے ناممکن تھا۔ پیڈرو کے حالات خواہ کچھ بھی رہے ہوں' میں اس تلخ حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا کہ میری زندگی کی ساری بدبختی کے آغاز و انجام میں سب سے بڑا ہاتھ اسی کا تھا۔ اس کی باتیں غور سے اور دلچسپی کے ساتھ سننے کا ایک مقصد اور بھی تھا۔ شاید مصالحت کے چکر میں وہ میرے والد کے قتل اور اس سے پہلے ان کی زندگی کے آخری پُرالم دور کے حالات اور اسباب پر کچھ روشنی ڈال سکے اور مجھے بالآخر معلوم ہو جائے کہ ان کو آرام و آسائش کی زندگی سے محروم کر کے غربت اور ذلت کے انجام تک پہنچانے والا کون تھا۔ اس بھیانک سازش کا تانا بانا کس نے بُنا تھا۔ اس کی تکمیل کس نے کی' قاتل ہاتھ کس کا تھا اور دستِ قاتل میں خنجر تھمانے والا کون تھا۔ میرے والد کے اور میر شرافت علی کے قتل کے بعد مجھے تختۂ دار تک دھکیلنے والے کون لوگ تھے اور انھوں نے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل سے کیا فوائد حاصل کیے۔

میں نے کہا "یہ کوٹھی کس کی ہے؟"

"کیا اس سے فرق پڑتا ہے" وہ بولا "اگر میں کہوں کہ میری ہے۔"

میں نے تسلیم کیا "نہیں۔ مگر یہ خادم اور خادمائیں۔ وغیرہ..."

"یہ سب عارضی انتظام ہے" وہ بولا "تمہاری دلچسپی کے لیے میں بتا رہا ہوں کہ کوٹھی اکبر خان کی ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "وہی اکبر خان؟"

"وہی اکبر خان۔ دلاور خان کا بڑا بھائی جسے وہ مرحوم کر چکا تھا۔"

"وہ زندہ ہے اور پاکستان میں ہے؟"

"آج کل نہیں ہے۔ ویسے آتا جاتا رہتا ہے" پیڈرو بولا۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہے؟"

"خود میں نے معلوم کیا۔ حال ہی میں" وہ بولا "جب ضرورت نہیں تھی تو میں بھی بھول گیا تھا۔ مجھے اس کے پرانے ٹھکانوں کا بھی علم تھا اور پرانے کارندوں کو بھی میں جانتا تھا۔ انٹرنیشنل ڈرگ مافیا میں شامل ہے وہ۔"

"کیا اسے خود دلاور نے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"میرا خیال ہے' وہ ایسا نہیں سمجھتا۔ وہ اٹلی کے ایک شخص کو اس واقعے کا ذمے دار قرار دیتا ہے" پیڈرو بولا "اس سے قبل دونوں بھائیوں کے درمیان کاروباری معاملات پر اختلافِ رائے تھا۔ دلاور میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مافیا سے مخالفت مول لے سکے۔ اس نے خود ہی اکبر خان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پیسے کے لین دین پر دونوں بھائیوں میں خاصی گرماگرمی بھی ہوئی تھی مگر اکبر خان وسیع ظرف کا مالک ہے اور بڑا ہے۔ اس نے دلاور کو معاف کر دیا بلکہ اپنا حصہ بخش دیا۔ دلاور جو کچھ ہے اسی کی وجہ سے ہے۔"

"اس نے تم سے پوچھا نہیں کہ اب میرے پاس کیوں آئے ہو؟" میں نے کہا۔

"پوچھا تھا اور میں نے اسے سچ بتا دیا۔ جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ وہ سچ معلوم کر لیتا" پیڈرو بولا "میں نے کہا کہ دلاور خان نے مجھے مایوس کیا ہے۔ اب تم مجھے جگہ دو۔ اس نے وعدہ تو نہیں کیا مگر میرا خیال ہے کہ وہ مجھے مسترد بھی نہیں کرے گا۔"

"تم نے اسے کیوں نہیں بتایا کہ اس پر حملہ کرانے والا خود اس کا چھوٹا بھائی ہے؟"

پیڈرو نے نفی میں سر ہلایا "وہ سمجھتا کہ میں اپنے پرانے باس کا دشمن ہو رہا ہوں اور اختلاف کی وجہ کچھ اور ہے۔ اسے بدنام کرنے کے لیے میں یہ کہانی گھڑ رہا ہوں۔ ایسے لوگوں کو کوئی پسند نہیں کرتا جو ذاتی اختلافات کی بنا پر وفاداریاں بدلتے ہوں۔ اوّل تو اسے حقیقت کا پہلے سے علم ہو گا۔ اس کے وسائل بے پناہ ہیں۔ اگر اس کو یہ بات معلوم ہوئی کہ اس کے خلاف سازش کرنے والا دلاور ہی تھا تو اس نے یہ بات مجھ سے چھپائی۔ اسے میری صاف گوئی پسند آئی ہو گی کہ میں نے دلاور پر کوئی الزام نہیں لگایا' بس یہ کہا کہ وہ فیلڈ سے الگ ہو رہا ہے اور اس نے مجھ سے کہا ہے کہ اپنا بندوبست کر لو جہاں چاہو۔ فیلڈ میں اعتبار کے قابل کم ہی لوگ ہیں اور باہر کے آدمی پر تو کوئی بھی اعتماد نہیں کرتا' کیا سمجھا جاتا ہے کہ وہ سُن گُن لینے اور اندر کے بھید معلوم کرنے کے لیے آیا ہو گا۔ خوش قسمتی سے میں اکبر خان کے لیے بھی کام کر چکا تھا اور وہ مجھے جانتا تھا کہ میں کام کا آدمی ہوں۔ وہ اپنے طور پر تصدیق کرے گا کہ میری کہانی میں کتنی افسانہ طرازی تھی اور کتنی حقیقت۔ اس کے بعد وہ مجھے بلا لے گا۔"

"گویا تم تمام عمر اسی دھندے میں گزارنے کا فیصلہ کر چکے ہو؟"

"ہاں۔ جما جمایا کاروبار کوئی نہیں چھوڑتا۔ نہ مجھے کسی اور کام کا تجربہ ہے اور نہ کسی کام میں اتنی آمدنی ہے" پیڈرو نے صاف گوئی سے کہا۔

کھانے کے لیے وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں مجھے دیگر تین افراد بھی نظر آئے جو ہمارے اغوا کرنے والوں میں شامل تھے مگر یہاں ان کی حیثیت ذاتی خدمت گاروں سے زیادہ نہ تھی۔

"یہ تم نے کیسے لوگ جمع کر لیے ہیں؟" میں نے کہا "کیا یہ بھی دلاور کے سابق ساتھی ہیں؟"

"ہاں۔ یہ سب آج کل میرے ساتھ تھے۔ مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف کارکن ہوتے ہیں اور وہ کام کی نوعیت کے اعتبار سے ان کا انتخاب بھی خود ہی کرتے ہیں" پیڈرو نے کہا "اگر غلطی سے نقصان ہو جائے تو ذمے داری انتخاب کرنے والے کی۔ وہ نقصان بھی پورا کرے اور غلطی کرنے والے کو خود ہی سزا دے یا معاف

www.paksociety.com

کروے۔"

"لیکن یہ تو مجھے بالکل اناڑی لگتے ہیں۔"

"پہلے سب اناڑی ہوتے ہیں۔ یہ سب وفادار ہیں۔ جتنا کہا جائے اتنا ہی کرتے ہیں۔ نہ زیادہ نہ کم۔ سب اسلحہ استعمال کرنا جانتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ لاوارث ہیں۔ کسی کا گھر ہی نہیں تھا۔ اگر جاتے تھے تو بڑے گھر۔ میں نے ہمیشہ ایسے لوگ تلاش کیے۔ میرے ساتھ ان کے لیے خطرہ کوئی نہیں اور فکر بھی کوئی نہیں۔"

"وہ کارٹون کہاں ہے؟ بادشاہ سلامت..."

"کون بادشاہ سلامت؟" پیڈرو حیران ہو کے بولا۔

"وہی نیم مردانہ نیم زنانہ۔ ڈبل رول والا؟"

پیڈرو ہنسنے لگا "اس کا یہ نام تو نہیں ہے۔ تم کیوں بادشاہ سلامت کہتے ہو؟"

"اس نے خود ہی کہا تھا کہ ہم بادشاہ سلامت ہیں۔ کیا وہ پاگل ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بڑے کام کا آدمی ہے۔ لڑنے بھڑنے میں تو ایسے ہی ہے مگر وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کا ماہر ہے۔ مشکل سے مشکل مسئلہ چٹکی بجاتے میں حل کرتا ہو تو اس کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً جاسوسی اور سراغ رسانی سے کوئی خبر لانی ہو' کسی کا کھوج لگانا ہو' کسی بات کی تصدیق کرنی ہو' کسی کو گمراہ کرنا ہو یا [illegible] عورت بن جائے تو مرد دھوکا کھا جاتے ہیں۔ پاگل' شرابی اور فقیر سب کے رول کر لیتا ہے اور بہت ماہر میک اپ آرٹسٹ ہے۔ پہلے کسی تھیٹر میں کام کرتا تھا۔ وہ گاؤں قصبوں کے میلوں میں ناٹک کرتے تھے لیکن ان کا اصل کام کچھ اور تھا۔ وہ جہاں جاتے تھے' وہاں سے ایک آدھ لڑکی غائب ہو جاتی تھی۔ کچھ ان کے ورغلانے سے تھیٹر کے راستے فلموں میں جانے کا خواب دیکھتی ہوئی خود آجاتی تھیں اور پھر بلیک میل ہو کے واپس جانے کے قابل نہیں رہتی تھیں۔ کچھ انھوں نے دھوکے سے بھی اٹھائیں اور ان میں سے بیشتر تو خاموشی سے ادھر اُدھر ہو گئیں لیکن سب تو بے وقوف اور بزدل نہیں ہوتیں۔ ان کے خلاف مسلسل تین شہروں میں رپورٹیں درج ہوئیں۔ رپورٹ درج کرانے والے اثر و رسوخ رکھتے تھے ورنہ ان بے چاری دیہاتی لڑکیوں کی کون سنتا۔ ایک عورتوں کی تنظیم تھی جس نے سارا کیس تفتیش کرایا۔ دوسرا ایک وکیل تھا اور تیسرا خود ایک خریدار تھا جس نے ایک لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ بالآخر یہ لوگ پکڑے گئے اور سب کو لمبی سزائیں ہو گئیں۔ آغا اس وقت بھی بھیس بدل کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔"

"کون آغا۔ وہی بادشاہ سلامت؟"

"ہاں۔ آغا حشر کا بڑا مداح تھا۔ تھیٹر میں ان کے ڈرامے ہر جگہ بہت مقبول تھے اور فنکار انہی کو کاپی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کا اثر آج تک ہماری فلموں میں نظر آتا ہے۔ لوگ آغا حشر کہتے تھے مگر یہ منع کرتا تھا کہ کہاں وہ کہاں میں! میں تو ان کی خاک پا بھی نہیں۔ بس آغا کافی ہے۔"

"کیا وہ اسی لیے ہر وقت ہر جگہ بھیس بدل کے پھرتا ہے؟"

"ہاں۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں" پیڈرو نے کہا "پانچ چھ سال پہلے کا اسکینڈل ہے۔ اس کے سب ساتھی 'تھیٹر کا مالک اور ڈرامہ کے ڈائریکٹر تک جیل میں چکی پیس رہے ہیں۔ یہ اس خوف سے پہلے تو روپوش رہا کہ مخبری کرنے والے پکڑوا نہ دیں۔ اسے پہچاننے والے بہت تھے۔ پھر اتفاق سے مجھے مل گیا تب سے میرے ساتھ ہے۔"

میں نے کہا "اسے بلاؤ تو سہی' میں اس کی اصل صورت دیکھوں۔"

بادشاہ سلامت یا آغا بڑے سکون سے آیا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا وہ کالا رنگ اور گنجا سر' چشمہ اور پونی ٹیل سب غائب تھے۔ میرے سامنے پینتیس چالیس سال کا ایک شریف صورت آدمی تھا' جس کے بال گھنے تھے اور خاصے اسٹائلش بھی تھے۔ اس کا رنگ گندمی تھا اور جب اس نے اپنی اصل آواز میں گفتگو کی تو میں نے اس کی تیسری آواز سنی۔ میرے سوالوں نے اسے نروس کر دیا حالانکہ میں نے سوائے اس کی اداکاری' میک اپ کے کمال اور تھیٹر کے تجربے کے اور کوئی بات نہیں کی تھی مگر وہ سمجھ گیا تھا کہ پیڈرو مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔

اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اجازت لی اور مجھ سے جان چھڑا کے بھاگ گیا۔

میں نے کہا "اسے سمجھا دو کہ میں اس کا راز افشا نہیں کروں گا۔"

پیڈرو نے سر ہلایا "اس کی فکر مت کرو۔"

میں نے کہا "تمہاری بات پوری نہیں ہوئی تھی۔ تم اپنے بارے میں بتا رہے تھے کہ بدرالدین سے استاد پیڈرو کیسے بنے تھے؟"

"ہاں۔ دس سال کی عمر میں دُہرا قتل کر کے میں بھاگا تو سیدھا شہر آیا" پیڈرو نے کہا "گیدڑ بدنام ہے کہ شامت آتی ہے تو شہر کا رخ کرتا ہے۔ میری حالت گیدڑ سے بدتر تھی۔ اتنی عقل کہاں تھی مجھ میں کہ پولیس کی' زمیندار کے خاندان کے نمک خواروں کی اور رشتے داروں کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا۔ یہ تو معمولی عقل رکھنے والا بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ شہر کے سوا میں کہیں نہیں جا سکتا۔"

"کس شہر کی بات کر رہے ہو تم؟"

"لاہور کی اور کس کی" وہ بولا "آس پاس کے گاؤں میں دس دس کوس تک میں جہاں جاتا' پہچانا جاتا اور اگلے ہی دن واپس پہنچا دیا جاتا۔ اتنے بڑے شہر نے مجھے چھپا لیا۔ وہ تو مجھے گلی گلی ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ میری تصویریں اخباروں میں چھپ رہی تھیں'

دیواروں پر میری تصویر کے پوسٹر تھے۔"

"اس کے باوجود تم پکڑے نہیں گئے تھے؟"

"میں پکڑا گیا تھا" استاد پیڈرو نے کہا۔

"کس نے پکڑا تھا؟ انہی لوگوں نے؟"

"وہ پکڑ لیتے تو آج میں تمہارے سامنے ہوتا۔ میری تو ہڈیاں بھی قبر میں گل چکی ہوتیں" وہ بولا "مجھے پولیس نے پکڑا تھا۔ میں منٹو پارک میں سو رہا تھا کہ گشتی پولیس کے دو سپاہی مجھے اٹھا کے آوارہ گردی کے الزام میں پکڑ کر لے گئے۔ میں نے ان کے سوالوں کے الٹے سیدھے جواب دیے اور انھوں نے مجھے بہت مارا۔"

"کیا اس تھانے میں تمہاری تصویر نہیں تھی؟"

"تھی لیکن رات کے وقت کسی نے زیادہ غور نہیں کیا۔ ان کے بورڈ پر تو درجنوں افراد کی تصویریں لگی رہتی ہیں" پیڈرو بولا "لیکن صبح ایک تھانے دار آیا تو اس نے مجھے پہچان لیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں دُہرے قتل کی واردات کے بعد فرار ہونے والا بدرالدین ہوں؟ تو میں نے اقرار کر لیا۔ اس نے مجھے اپنے پاس بٹھا کے تفصیل پوچھی تو میں نے کہا کہ سب کے سامنے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اس نے باقی سب کو کمرے سے نکال دیا اور پھر میری کہانی سنی جو میں نے حرف بہ حرف وہی سنائی جو ابھی تم نے سنی ہے۔ قتل کرنے کے بعد سے اب تک میں نے کسی کے سامنے اعتراف جرم نہیں کیا تھا اور میرے سینے پر ایک بوجھ تھا۔ ایک یہ احساس تھا کہ میں قاتل ہوں اور دوسرا یہ کہ میں نے اپنی ماں کو قتل کیا ہے۔ زمیندار کے قتل کا مجھے دکھ نہیں تھا۔ میرے لیے اطمینان اور سکون کا احساس صرف اس خیال میں تھا کہ میں نے اصل مجرم کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ لیکن ماں جیسی بھی تھی میری ماں تھی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرا باپ کون تھا؟ اگر باپ وہ زمیندار تھا تو اسے اپنے کیے کی سزا ملی۔ جنم دینے والی تو ایک ہی عورت ہوتی ہے' خواہ ولدیت کے خانے میں کسی کا بھی نام درج ہو اور پہلے اگر میرا باپ نہیں تھا تو اب ماں بھی نہیں رہی تھی۔ یہی رنج و غم کا بوجھل احساس تھا کہ تھانے دار نے ہمدردی سے میری بات سنی تو میں بہت رویا۔ روتے روتے میری حالت خراب ہو گئی تو اس نے دوبار مجھے پانی بھی پلایا۔ میری کہانی نے اس کے دل پر اثر کیا۔ میرا خیال ہے دس سال کے ایک بچے کی زبان سے اس اعتراف حقیقت کے بعد کسی بھی شخص کے دل پر اثر نہ ہو' یہ ناممکن تھا۔ اس نے میری پیٹھ تھپکی کہ "شاباش' غیرت مند جوان۔ تو شیر ہے شیر۔ مردوں والا کام کیا ہے تو نے۔ تیری جگہ میں ہوتا تو ایک بندے کو اور گراتا۔"

میں نے کہا "وہ اس وقت گاؤں میں نہیں تھا ورنہ میں اسے بھی نہ چھوڑتا۔ اپنے باپ کو" تھانے دار بولا "بالکل ٹھیک سمجھا تو' اس بے غیرت کو بھی نہیں چھوڑنا تھا" میں نے کہا "نہیں چھوڑوں گا اگر موقع ملا" تھانے دار نے کہا کہ "ابھی دڑ وٹ جا کاکا" (مطلب یہ کہ چپ کر کے غائب ہو جا) بعد میں نمٹ لینا اس سے۔ ابھی تو

روشنی کے مینار
اسلام کے خاموش مبلغوں اولیائے کرام کے دلچسپ اور ایمان افروز واقعات ضیاء تسنیم بلگرامی کے قلم سے

عظمت کے مینار
ضیاء تسنیم بلگرامی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ

ایمان کا سفر
محی الدین نواب کی معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ وہ فن پارے جن کی آپ کو تلاش ہے

کچا گھر
محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے

آدھا چہرہ
محی الدین نواب کا پہلا طویل معاشرتی ناول

کالی کہانیاں

تیرے پیچھے ساری پولیس فورس لگی ہوئی ہے اور پتا نہیں کتنے بندے تجھے قتل کی دیکھتے پھر رہے ہوں گے۔ تیری قسمت تھی کہ ابھی تک ان کے ہتھے نہیں چڑھا۔" اس کے کہنے کے مطابق میں وڈروٹ گیا۔ اس کا موقع خود تھانے دار نے مجھے فراہم کیا۔ اس نے بعد میں ایس ایچ او سے مشورہ کیا اور یہ معاملہ ایسا تھا کہ مجھے ایس ایچ او کی ہمدردی بھی حاصل ہو گئی۔ سارا تھانہ ہی میرے ساتھ تھا۔ سب میری بہادری اور غیرت مندی کے معترف ہو گئے تھے۔ قانون سے لاعلمی کے باعث میرا خیال تھا کہ مجھے پھانسی ضرور ہوگی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ نابالغ کو سزائے موت نہیں ہوتی اور یہ حالات ایسے ہیں کہ شاید عدالت مجھے سال چھ مہینے کے لیے بچوں کی جیل میں رکھنے کا حکم دے یا صاف بری کر دے اور مجھے کسی کی نگرانی میں دے دے۔ ایس ایچ او نے بڑی ہوشیاری سے ایک رپورٹ لکھی جس میں میرا بیان شامل تھا۔ اس میں وقت اور تاریخ کا ہیر پھیر کرتے ہوئے اور حالات کو زیادہ میرے حق میں رکھتے ہوئے میرا بیان تیار کیا گیا۔ ایس ایچ او نے لکھا کہ بدرالدین خود تھانے پہنچا اور اس نے خود کو قانون کے حوالے کرتے ہوئے اپنا بیان رضاکارانہ طور پر دیا اور قتل کی واردات کا اعتراف کیا۔ اس نے بتایا کہ آلۂ قتل کو وہ جائے واردات پر چھوڑ کے فرار ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے بیان کو ازبر کر لیا جس میں میرے باپ سے اور زمیندار سے بچو اور اشتعال انگیز باتیں منسوب کی گئی تھیں۔ بیان پر میرے دستخط لینے کے بعد ایس ایچ او نے تحریر سے ایک اور اندراج کرایا۔ میری گرفتاری کا وقت رات بارہ بجے دکھایا گیا تھا۔ دو بجے رات کے اندراج میں لکھا گیا کہ ایک شخص نے جو خود کو مقتول زمیندار کا وارث کہتا تھا، تھانے کے عملے سے مطالبہ کیا کہ قاتل کو اس کے حوالے کر دیا جائے اور عملے کے انکار پر اس نے عملے کو دھمکیاں دیں اور فائرنگ کرتا ہوا فرار ہو گیا۔ زمیندار کے جوان بیٹے کا نام اور حلیہ خود میں نے بتایا تھا۔ صبح ساڑھے پانچ بجے تھانے پر مسلح حملے کی رپورٹ لکھی گئی۔ حملہ آور تعداد میں پانچ تھے اور ان کی قیادت زمیندار کا سالا کر رہا تھا جسے میں نے شناخت کیا۔ اس کے ساتھ زمیندار کا بھائی تھا اور بہنوئی تھا۔ ان سب کے نام بھی میں نے بتائے۔ ان سب کے خلاف جوابی کارروائی کی گئی اور وہ فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے خلاف ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ایک سو نو، تین سو سات، ایک سو اڑتالیس کا پرچہ کاٹا گیا۔ یہ سب انتظام مجھے بچانے اور ان سب کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے تھا جو میرے خلاف انتقامی کارروائی کر سکتے تھے۔

جب ان سیشن کورٹ میں پیش ہوا تو مجھے عدالت کی طرف سے سرکاری وکیل پیش کیا گیا مگر میں نے ایک بہت بڑے وکیل کا نام لے کر سب کو حیران کر دیا جو فوجداری مقدمات میں خصوصی شہرت رکھتا تھا۔ ظاہر ہے اس کی فیس تھانے دار نے ادا کی تھی مگر اسے تمام واقعات بتا دیے تھے اور اس وکیل کو قائل کر لیا تھا کہ میں بے قصور ہوں اور یہ قتل اشتعال انگیزی کا نتیجہ تھا۔ مخالف وکیل نے معلوم کرنا چاہا کہ اتنے بڑے وکیل کی فیس میں نے کہاں سے ادا کی تو عدالت نے یہ اعتراض مسترد کر دیا اور میرے وکیل نے کہا کہ وہ میرا مقدمہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر مفت لڑ رہا ہے۔ بس اس کے بعد حالات میرے حق میں ہوتے چلے گئے۔ میرے مخالفین وہی تھے جن کے نام میں لکھوا چکا تھا۔ ان کے وکیل نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر عدالت خود میرے حالات سے متاثر نظر آتی تھی۔ فیصلہ میرے حق میں ہو گیا اور مجھے صاف بری کر دیا گیا۔ البتہ حفاظت اور نگرانی کے لیے مجھے کسی شریف آدمی کی تحویل میں دینے کا مسئلہ اٹھا تو اسی تھانے دار نے ایک نام تجویز کیا۔ جس کا نام تجویز کیا گیا تھا وہ تھانے دار کا سالا تھا اور شریف آدمی تو خیر نہیں تھا۔ ایک پرانا نامی گرامی پہلوان تھا جو بدمعاش بنا، مسٹری ٹھیکے رہا اور پھر اچانک تائب ہو کے حج کرنے چلا گیا۔ وہ حاجی بن کے آیا تو دنیا نے اس کا بدلا ہوا روپ دیکھا۔ وہ تمام احکامات شرعی کی پابندی کرنے لگا تھا اور اس کا حلیہ بھی ایسا ہی ہو گیا تھا۔ گھٹا ہوا سر، ٹخنوں سے اونچی شلوار، ایک بالشت سے زیادہ داڑھی اور ہاتھ میں تسبیح۔ تم جانتے ہو وہ کون شخص تھا؟"

میں چونکا "میں کیسے جان سکتا ہوں۔ ابھی تک تم نے اس کا نام کہاں لیا ہے؟"

بدرو مسکرایا "وہ حاجی عبداللہ تھا۔"

میں بھونچکا رہ گیا "وہی حاجی عبداللہ؟"

"بالکل وہی۔ نام کا حاجی ہے وہ اور اس کا ظاہر ایک پردہ ہے اس کی خباثت باطن کا۔ اس میں اور چودھری واوڑا میں صرف [illegible] فرق ہے۔ اندر سے وہ ایک ہیں۔ ان کے سارے دھندے ایک ہیں اور فطرت ایک ہے۔"

"کیا اس تھانے دار کو یہ بات معلوم نہیں تھی؟"

"اس وقت معلوم نہیں تھی۔ وہ نیا نیا حاجی بنا تھا اور اس کی تبدیلیٔ قلب کی شہرت تھی۔ عدالت نے مجھے اس کے سپرد کر دیا اور اس نے ابتدا میں مجھے واقعی گھر کا تحفظ اور ماحول فراہم کیا۔ پڑھنے لکھنے کا مجھے پہلے بھی شوق تھا۔ بڑی آسانی سے میں نے تین سال میں ساتویں جماعت تک کا کورس ختم کر لیا۔ حاجی نے کہا کہ اب آٹھویں کو چھوڑو، میٹرک کی تیاری کرو اور اگلے سال ہی میں نے پرائیویٹ امتحان دے کر میٹرک بھی کر لیا۔ اس وقت میری عمر چودہ سال تھی۔"

"کیا تمہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ حاجی اندر سے کچھ ہے، باہر سے کچھ؟" میں نے پوچھا "اور اس کے دھندے کیا ہیں؟"

"دھندوں کا تو خیر پتا نہیں تھا" اس نے کہا "وہ گھر میں ایسے کاروبار کی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ ہاں ظاہر و باطن کا فرق مجھ پر عیاں ہو گیا تھا اور میں سمجھ چکا تھا کہ حاجی جیسا دنیا کے سامنے خود کو بتاتا ہے ویسا ہرگز نہیں ہے۔"

"اس عرصے میں تمہارے دشمنوں کی طرف سے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی؟"

"وہ گاؤں تھا جہاں ان کی بادشاہت تھی۔ شہر میں ان کی بدمعاشی نہیں چل سکتی تھی۔ انہیں یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ تھانے دار میری طرف داری کر رہا ہے اور اس نے غالباً سب کو تڑی بھی لگائی کہ بندے دے چڑھ جاؤ ورنہ سب کو اندر کرا دوں گا۔ ایسے کیس بنواؤں گا کہ عمر گزر جائے گی پیشیاں بھگتتے میں اور سارا خاندان جیل میں سڑ گیا تو مقدمات لڑتے لڑتے دیوالیہ ہو جائے گا۔ حاجی کے گھر میں کسی کا داخل ہونا بھی آسان نہ تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مرنے والا مر گیا تھا اور وارث اسے بھول کے جائداد اور زمین کی تقسیم کے معاملات میں الجھ گئے تھے۔"

"حاجی عبداللہ نے تمہیں اپنی لائن پر کب ڈالا تھا؟"

"بہت بعد میں۔ اس نے مجھے تعلیم حاصل کرنے کے پورے مواقع فراہم کیے اور میں نے بی اے تک کالج میں تعلیم حاصل کی۔ شاہزادوں کی طرح" استاد بیڈرو بولا "ہاتھ کھول کے خرچ کرنے کا اس نے مجھے شروع سے عادی بنا دیا تھا۔ میں نے جب جتنا مانگا مجھے ملا۔"

"کیا اس کی اپنی اولاد نہیں تھی؟"

"اس کے دو بیٹے تھے۔ بظاہر اس کا سلوک بالکل الٹا تھا۔ وہ سگے بیٹوں کے ساتھ سوتیلوں جیسا سلوک کرتا تھا۔ ان کو لگا بندھا جیب خرچ ملتا تھا۔ اپنے کام کے علاوہ گھر کی ذمے داریوں میں ماں کا ہاتھ بھی بٹانا پڑتا تھا اور باپ کا بھی۔ ان کے لیے وقت پر سونے اور جاگنے کی پابندی تھی اور ان کے کھیل کود کا بھی وقت مقرر تھا۔ ان کی ماں بہت چیختی چلاتی تھی کہ یہ کیا الٹی گنگا بہہ رہی ہے اس گھر میں۔ جو مالک ہیں وہ قیدیوں جیسی زندگی گزار رہے ہیں اور یہ جو نہ جانے کہاں سے آیا ہے اور کس کا ہے، وہ عیش کر رہا ہے۔ حاجی اسے سمجھاتا بھی ہو گا مگر ایسا بھی ہوا کہ اس نے جھانپڑ مار کے بیوی کی زبان بند کر دی کہ الو کی پٹھی، گھر چلا اپنا، زبان مت چلا۔ یہ دنیا کے معاملات ہیں، ان میں ٹانگ مت اڑا اپنی۔ عورت ذات کو خدا نے اتنی ہی عقل دی ہے کہ ایک گھر کو چلانے کے لیے کافی ہو۔ دنیا اور اس کے مسائل بہت بڑے ہیں۔ اس کے لیے ہم مردوں کو بنایا گیا ہے۔ اس کے بیٹے بھی باپ کے اس سلوک سے نالاں تھے اور اس کی تربیت کے سخت اصولوں کے خلاف بغاوت بھی کرتے تھے مگر دبے دبے سے کیونکہ حاجی عبداللہ ان کے ساتھ انتہائی سختی سے پیش آتا تھا۔ میرے معاملے میں اس نے مجھے مکمل ڈھیل دے رکھی تھی۔ تم سمجھے اس کے حرامی پن کو؟"

"ہاں۔ وہ بیٹوں کی صحیح تربیت کر رہا تھا۔ ان کو دنیا اور آخرت دونوں کے لیے عملی زندگی کے اصولوں پر چلنے اور سرخرو ہونے کا راستہ دکھا رہا تھا اور کامیابی کے ساتھ نیکی اور نیک نامی کی راہ پر گامزن رہنے کا طریقہ سکھا رہا تھا۔ تمہیں وہ اسی لائن پر چلنے کے لیے تیار کر رہا تھا جس پر چل کے تم اس کا قرض مع سود ادا کر سکو۔"

"بالکل ٹھیک سمجھے تم۔ مگر اس وقت میں یہ بات نہیں سمجھ سکا تھا۔" استاد بیڈرو بولا "کہ وہ بیٹوں کے ساتھ نہیں میرے ساتھ سوتیلوں جیسا سلوک کر رہا ہے۔ برائی کی طرف مجھے دھکیل رہا ہے مگر اس خوبی سے کہ مجھے احساس تک نہ ہو اور میں اندھیرے کو روشنی سمجھ کے خود اس کی طرف بھاگتا جاؤں۔ پیسے کی افراط نے مجھے کس طرح بگاڑا، یہ الگ کہانی ہے اور تمہیں سنانے کا فائدہ بھی نہیں۔ تم خود سمجھ دار ہو، اندازہ کر سکتے ہو کہ نوجوانی کا دور ہو، بلا روک ٹوک اور بغیر پیسہ ملتا ہو تو آدمی کس قسم کی صحبت اختیار کرتا ہے۔ مطلب پرست اور بدخواہ، حاسد اور احساسِ محرومی کے مارے ہوئے خود اسے گھیر لیتے ہیں۔ اس کے گرد ایسے جمع ہو جاتے ہیں جیسے گڑ پر مکھیاں جمع ہوتی ہیں۔ ان دوست نما دشمنوں نے مجھے ہر بری لت میں مبتلا کیا۔ میں سگریٹ پینے لگا۔ حاجی نے میری حوصلہ افزائی اس انداز سے کی کہ میں اس کی روشن خیالی کی تعریف کرتا رہا۔ اس نے کہا کہ چھپ کے کیوں پیتے ہو، برائی سمجھتے ہو تو چھوڑ دو ورنہ میرے سامنے پیو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ رہی عزت تو وہ تو دل سے کرتا ہے۔ کسی بزرگ کے سامنے سگریٹ نہ پینے سے عزت افزائی نہیں ہوتی اور سگریٹ پینے سے کسی کی عزت کم نہیں ہوتی۔ سگریٹ سے اگلا قدم چرس کا تھا مگر اس کا نقصان دیکھ کر میں خود ہی تائب ہو گیا۔ کالج میں بی اے تک پہنچنے سے پہلے ہی میں جوان ہو گیا تھا اور شراب چکھ چکا تھا۔ عورت کے جسم کی لذت سے آشنا ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے اس عیاشی کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی کافی نہیں ہوتا۔ حاجی عبداللہ جتنا مجھے دیتا تھا اس سے زیادہ خرچ کرنے کے لیے میں نے خود ہی وسائل تلاش کر لیے۔ سب سے آسان راستہ بلیک میلنگ کا تھا۔ کالج میں ہم نے چار لڑکوں کا ایک گروہ بنا لیا تھا۔ ان سب کے حالات مجھ سے مختلف نہ تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اپنے باپ سے لیتے تھے جن کی حرام کی آمدنی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ایک کا باپ پولیس انسپکٹر تھا اور دوسرے کا کسٹم انسپکٹر۔ تیسرا یتیم اور لاوارث تھا۔ سوتیلے ماں باپ کے گھر سے نکلا تو چچا ماموں سب کے گھروں میں اس کے ساتھ ایک سا سلوک ہوا اور اس نے گھر سے چوریاں شروع کر کے باہر لوٹ مار شروع کی۔ وہ اور ایک لڑکا رات کو سنسان گلیوں میں راہ گیروں کو لوٹتے تھے، نقلی پستول سے ڈرا کے عورتوں کے پرس چھین لیتے تھے۔ وہ میٹر ریڈر بن کے گھروں میں گھس جاتے تھے اور اکیلی عورت کے زیورات اتروا لیتے تھے اور موقع دیکھ کے عزت پر بھی ہاتھ صاف کر آتے تھے۔ جعلی رسیدیں چھاپ کے انہوں نے سیلاب زدگان کے لیے، جنگ کے متاثرین کے لیے، مسجدوں کی تعمیر کے لیے، ہر کام کے لیے چندہ جمع کیا۔ بقر عید پر ایک مشہور سیاسی جماعت کے نام کی رسیدیں جاری کر کے کھالیں اکٹھی کرتے رہے۔ کون سا فراڈ تھا جو انہوں نے

www.paksociety.com

نہیں کیا۔ بس وہ کوئی کام مستقل نہیں کرتے تھے۔ پکڑے جانے سے پہلے کوئی دوسرا چکر چلا دیتے تھے اور ان کے چھوٹے موٹے جرائم کی رپورٹ پولیس تک پہنچتی ہی نہیں تھی۔ جس آدمی کے کوئی اچکا سو دو سو روپے چھین لے' وہ تھانے نہیں جاتا یا کسی بیٹر ریڈر کے بھیس میں کوئی سونے کی چوڑیاں یا بالیاں اتروا کے لے جائے تو شوہر بیوی کی بے وقوفی اور جہالت کو برا بھلا کہہ کے صبر کر لیتا ہے۔ بے چارہ شوہر سونے کی بالی کا نقصان تو دیکھ سکتا ہے' کسی نے عزت بھی خراب کی تھی' یہ اسے کیسے معلوم ہو سکتا ہے جب تک خود بیوی نہ بتائے اور ہر عورت شوہر سے یہ بات کہتے ہوئے ڈرتی ہے خواہ اسے شوہر پر کتنا ہی اعتماد کیوں نہ ہو۔ قصہ مختصر وہ کبھی پکڑے گئے تو سب انسپکٹر نے انہیں چھڑوا لیا یا ہم گواہ بن کے پہنچ گئے۔ جب ہم نے ایک گروہ بنا لیا تو ہماری سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ میں ذرا بدصورت تھا' اب بھی ہوں لیکن مار دھاڑ میں ہیرو تھا چنانچہ ٹارزن کہلاتا تھا۔ وہ واقعی ہیرو تھے اور لڑکیوں کو اپنی صورت اور سیرت سے متاثر کرنے کا فن جانتے تھے۔ جوانی کے دام میں گرفتار ہوتی تھیں وہ سب کی دولت مشترکہ الگ تھیں اور ہمارا جو تھا ساتھی جو ایک ماہر فوٹو گرافر تھا' ان کی بدنامی کے ثبوت کا عکس یوں محفوظ کر لیتا تھا کہ سند رہے اور کام آئے۔ ہر لڑکی کو ہم اسی حد تک نچوڑتے تھے جتنی اس کی استطاعت ہو۔ اتنا پریشان نہیں کرتے تھے کہ وہ تنگ آ کے خودکشی کرے یا مستقبل کی پروا کیے بغیر ہمارا پتا ظاہر کرنے پر تل جائے پھر ہم لڑکی بھی دیکھ بھال کے منتخب کرتے تھے۔ کسی پولیس افسر، صحافی یا فوجی افسر، وکیل یا جج کے خاندان کے ساتھ اس قسم کی شرارت ہمیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیتی۔"

"تمہاری سب حرکتوں سے حاجی بے خبر رہا؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مالی جس پودے کی نشوونما میں خصوصی دلچسپی لے رہا ہو' اس کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کی رفتار نہ دیکھتا ہو۔ حاجی نے مجھ میں بدی کے جو بیج بوئے تھے ان کے پھوٹنے سے اگنے اور پھر بڑھ کے پودے کی صورت اختیار کرنے اور تناور درخت بننے تک ہر مرحلے کی اسے پوری رپورٹ ملتی تھی اور وہ میری ترقی سے مطمئن تھا۔ جب میں نے بی اے پاس کر لیا تو اس نے اچانک مجھے اپنے آفس میں طلب کر لیا۔

اس نے کہا "بدرالدین! ماشاء اللہ سے تم نے بی اے بھی پاس کر لیا۔ اب انشاء اللہ سے اپنی ذمے داریاں بھی پوری کرو گے۔ الحمدللہ سے ہم نے تو جو ذمے داری قبول کی تھی وہ بطریق احسن پوری کرنے کے لیے اس معبود حقیقی نے ہمیں توفیق بخشی۔ ہمارا قرض تھا ہم نے چکا دیا۔ تمہارا قرض تم چکاؤ گے۔"

پہلے تو میں سمجھا نہیں تھا کہ وہ کیا بات کر رہا ہے مگر پھر اس نے کھل کے کہا کہ "میاں پیسے پیسے کا حساب رکھنا تو ممکن نہیں تھا مگر دیکھ لو' تاریخ وار اس میں سب کچھ درج ہے۔ میں ایک بات بتانا بھول گیا۔ وہ جب مجھے رقم دیتا تھا' ایک ڈائری میں تاریخ ڈال کے لکھ لیتا تھا اور مجھ سے دستخط ضرور کرواتا تھا۔"

"اور تم کر دیتے تھے؟"

"دراصل میں سمجھتا تھا کہ وہ پاگل ہے۔ وہ اسی طرح بیوی سے دوسری ڈائری میں دستخط لیتا تھا اور معلوم ہے وہ دلیل کیا دیتا تھا؟ ایک حدیث سناتا تھا کہ ارشاد نبویؐ ہے کہ لین دین کے معاملات کو لکھ لیا کرو۔ حرام زادہ' کاروبار اور گھر کے معاملات کو ایک کرنے کی کیسی غلط تاویل لاتا تھا۔ بیوی اس کی عادی تھی' بیٹے بھی مجبور تھے پھر میں کیوں انکار کرتا۔ انتہا یہ ہے کہ اس نے جب میری شیروانی اور میرے لیے کتابیں خریدی یا جوتے کپڑے لیے' ان کا بھی اندراج کیا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ میں اپنے حساب کتاب کو درست رکھنے کے لیے کرتا ہوں اور آنے والے کل کے لیے۔ زمانہ بڑا خراب جا رہا ہے۔ نافرمان اولاد کا کیا بھروسا! کل کو ہمارے سامنے سینہ تان کے کھڑی ہو جائے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہے کہ ابا میاں' پیدا کرنے کے سوا آپ نے ہمارے لیے کیا کیا۔ اور وہ بھی ہم نے تو نہیں کہا تھا۔ سو میاں' اس وقت یہ دستاویز ایک آئینہ ہوگی' اندازہ کرو وہ کتنا خبیث اور ذلیل آدمی تھا۔ ایسے باپ کہیں دیکھے ہیں تم نے؟ جب اس نے ڈائری میرے سامنے رکھ کے مجھے بتایا کہ تمہارے ذمے اتنے واجب الادا ہیں تو میں بگڑ گیا۔ میں نے لاکھوں کے حساب کو پھاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ وہ داڑھی پر ہاتھ پھیرتا رہا اور سکون سے دیکھتے ہوئے "استغفراللہ استغفراللہ" کا ورد کرتا رہا۔ میں بہت چیخا چلایا کہ کیا وہ سب قرض تھا اور قرض تھا تو مجھے بتایا کیوں نہیں۔ اس نے کہا کہ میاں' ماشاء اللہ سے تم خود سمجھ دار ہو۔ اس میں بتانے والی تو بات بھی نہیں تھی۔ جو کچھ آدمی غیروں سے لیتا ہے سب قرض ہوتا ہے۔ اولاد کا تو حق بنتا ہے مگر تمہارا حق ثابت نہیں ہوتا' الحمدللہ سے۔ قرض تو باقی رہے گا خواہ تم حساب کتاب کو دس بار پھاڑ دو یا سو بار جلا دو۔ میں نے کب اصل حساب پیش کیا تھا' یہ فوٹو اسٹیٹ کاپی تھی۔ مزید نقلیں درکار ہوں تو بتا دینا۔ اور خیر سے یہ بات مت بھولنا کہ جو لوگ قرض دیتے ہیں وہ سب بے وقوف نہیں ہوتے۔ اپنا قرض وصول کرنا جانتے ہیں ہم۔ اس دن کے بعد وہ اچانک بدل گیا۔ شاید وہ اسی دن کے انتظار میں تھا۔ اس نے مجھ سے تمام جذباتی رشتے منقطع کر لیے جو در حقیقت اپنا کوئی وجود بھی نہیں رکھتے تھے۔ بس مجھے احساس تھا کہ میری پرورش کرنے والا میرے باپ کی جگہ ہے۔ میری خوشی کی خاطر سب کچھ کرتا ہے اور دوسروں کے مقابلے میں بڑھ کر۔ لیکن وہ ایک شکاری تھا جو مجھے اپنے قرض کے جال میں جکڑ رہا تھا۔ اس کی مہربانیاں مکڑی کے جالے کی طرح میرے چاروں طرف وہ جال بن رہی تھیں جن سے نکلنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ پہلے میں نے سمجھا تھا کہ مجھ سے بڑا شکاری کون ہو سکتا ہے جس کے صبح و شام ہی شکار میں بسر ہو رہے ہیں مگر رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آیا کہ وہ بھی میری بھول تھی اور میں حاجی کے پھیلائے ہوئے جال میں خود الجھ رہا تھا۔ اسے میری ایک ایک حرکت کا علم تھا۔ میری تمام عیاشیوں کا پتا تھا۔ میری سب قانون کی خلاف ورزیوں کا پتا تھا' اس کے پاس دن تاریخ کے حساب سے میرا نامہ اعمال لکھا ہوا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ وقت ضرورت وہ ثبوت' گواہ سب فراہم کر دے گا۔ اچانک اس نے تمام مہربانیوں سے ہاتھ کھینچ لیا' مجھے خرچ دینا بند کر دیا اور اس کے جاسوس میرا تعاقب کرنے لگے۔ میں تنگ دستی کا شکار ہو گیا اور وہ دوست میرا ساتھ چھوڑ گئے جو صبح و شام رفاقت کا دم بھرتے تھے۔ حاجی نے انہیں ڈرایا' مجھ سے بدظن کر دیا یا ان پر میری حقیقت آشکارا کر دی کہ میں اس کا بیٹا نہیں ہوں' ایک میراثی کی ناجائز اولاد ہوں جس نے اپنی بدچلن ماں کو اس کے آشنا کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر دس سال کی عمر میں قتل کر دیا تھا۔ نہ جانے کیسے وہ سب لڑکیاں جو مجھے اپنی عزت کا خراج دیتی تھیں' باغی ہو گئیں اور میں نے کسی سے رابطہ قائم کیا تو مقررہ مقام پر مجھے مطلوبہ رقم ملنے کے بجائے بے بھاؤ کی پڑیں۔ وہ نامعلوم لوگ میری ہڈی پسلی ایک کر کے اور مجھے دھمکی دے کر چلے گئے کہ دوبارہ میں نے کوئی توقع رکھی تو میرے ساتھ اس سے بری ہوگی اور میں نے بلیک میلنگ کا حربہ آزمایا تو میری لاش کا پتا نہیں چلے گا۔ ایک بار نہیں' مسلسل تین مرتبہ ایسا ہوا۔ میرے لیے راستے بند ہوتے جا رہے تھے اور میں اکیلا ہر طرف سے محصور ہونے لگا تھا۔ کسی پیشہ ور اور ماہر شکاری کی طرح حاجی عبداللہ فرار ہونے والے شکار کو گھیر کر اپنے جال میں لایا تھا۔ میری شکست اس وقت ہوئی جب اچانک میرے پرانے دشمن نمودار ہو گئے۔ زمیندار کے خون کا بدلہ لینے والوں نے مجھے گھیر لیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ابھی تک میں حاجی عبداللہ اور اس پولیس انسپکٹر کی پناہ میں تھا اور ان کی وجہ سے کسی کو جرأت نہیں ہوئی تھی کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا! زمیندار کے وارث اب خود زمیندار تھے اور انہیں برسوں پرانا انتقام اچانک یاد آ گیا تھا۔ دراصل انہیں بھی کہا گیا تھا کہ چلو اب اپنا بدلہ لے لو۔ تمہارا مجرم اکیلا اور بے بس ہے۔ وہ انسپکٹر ڈی ایس پی ہو چکا تھا۔ اس کے حکم پر پرانے قتل کی فائل پھر کھل گئی اور مدعی خون کا دعویٰ لے کر آ گئے۔ شہ چاہیے کے بارسوخ والوں میں ڈی ایس پی کے حکم سے سر اٹھانے کی مجال نہ تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب یا تو وہ خود مجھے نوکے سے دو ٹکڑے کر دیں گے۔ میرا کون والی وارث تھا جو میرے خون کا دعویٰ کرتا۔ یہ نہ ہوتا تو وہ اعلیٰ حکام کو یا عدالت عالیہ کو درخواستیں دے کر پرانے کیس کو پھر زندہ کرتے اور یہ بھی نہ ہوتا تو ایک ڈی ایس پی میرے سر کسی کا خون بھی تھوپ سکتا تھا۔ کسی بھی قتل میں مجھے فٹ کر دیا جاتا اور باقی کام پولیس خود کر لیتی۔ تمہیں معلوم ہے وہ کون ڈی ایس پی تھا جس نے انسپکٹر کی حیثیت سے مجھے تحفظ فراہم کیا تھا' عدالتی کارروائی میں میری مدد کی تھی اور بالآخر مجھے حاجی عبداللہ کے سپرد کر دیا تھا۔"

میں نے سوچ کے کہا "کیا وہ بعد میں ایس ایس پی ہو گیا تھا۔ ایس ایس پی سراج؟"

پیڈرو نے بے ساختہ کہا "بالکل ٹھیک۔ سو فیصد صحیح اندازہ کیا تم نے۔ وہ اور حاجی عبداللہ پہلے سے دلاور کے ساتھ تھے۔"

میں نے کہا "یہ اس وقت کی بات ہوگی جب دلاور نے میرے والد کے ساتھ کاروبار میں شرکت اختیار نہیں کی تھی۔ میرے والد پہلے اکیلے تھے پھر میر شرافت علی سے ان کی پارٹنرشپ ہوئی۔ چوہدری دلاور کے شامل ہونے کے بعد میر وزیر اینڈ کمپنی ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کیلکس بنی تھی۔"

"یہ تقریباً اسی زمانے کی بات ہے۔ اس وقت تو سراج ایس پی تھا اور اسی نے دلاور کو مشورہ دیا تھا کہ وہ شاہدرہ کی ایک فیکٹری میں سرمایہ لگا کے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔ تمہارے والد کی فیکٹری میں زرعی مشینری کے پرزے اور آلات بنتے تھے۔ سراج کے ذہن میں سب سے پہلے اسے ایک اسلحہ ساز فیکٹری میں بدلنے کا خیال آیا تھا۔ ساری اسکیم اس نے سوچی تھی اور دلاور کو بتایا تھا کہ مستقبل میں اس سے کیا فائدہ ہوگا۔"

میں نے کہا "سراج مر چکا ہے۔ اب تم اس سے کچھ بھی منسوب کر سکتے ہو۔"

"کیا تم جانتے نہیں کہ ہماری اصل طاقت سراج تھا؟"

"ضرور ہوگا مگر اس کے مرنے سے کیا فرق پڑا؟"

"فرق یہ پڑا کہ دلاور اس کاروبار کو بند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ خوف خدا کے باعث اس نے فیکٹری کی جگہ خالی نہیں کی تھی اور اپنے دوست کے ساتھ دغا کرنے کی شرمندگی نے اسے وہاں ایک اسپتال قائم کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کبھی قائم نہ ہوتا اگر ایس ایس پی سراج نہ مارا جاتا۔ وہ ایک رابطہ تھا ہمارے اور اوپر والوں کے درمیان جو ہمارے لیے راستے کھلے رکھتے تھے۔ کوئی عام آدمی یہ کام نہیں کر سکتا تھا کہ بھارت پاکستان کی سرحدوں کو ہمارے لیے کھلوا دے۔"

میں اس کی باتوں سے عجب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ مجھے یہ خیال آ رہا تھا کہ قصوروار پیڈرو نہیں تھا' دلاور تھا یا حاجی عبداللہ تھا اور ایس ایس پی سراج تھا جو جہنم رسید ہو چکا تھا۔ آج تک میری نظر میں استاد پیڈرو کی حیثیت ایک پیشہ ور مجرم اور قاتل کی تھی اور میں اس کے خون کا اس لیے پیاسا تھا کہ میں اسے اپنے والد کے قاتل کے روپ میں دیکھتا تھا اور اسے تختہ دار پر پہنچانا میری زندگی کا مشن تھا۔ اچانک اس یقین کی بنیادیں شک کے زلزلے سے ہلنے لگی تھیں۔ پیڈرو اپنی باتوں سے مظلوم کی حیثیت اختیار کر رہا تھا۔ وہ ثابت کر رہا تھا کہ اس نے جو کچھ بھی کیا اس میں حالات کی مجبوری کا دخل تھا۔ اسے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا

www.paksociety.com

گیا تھا اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو خود بھی مارا جاتا۔

میں نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا پیڈرو کہ میں کیسے تمھاری باتوں کا یقین کروں۔ چوہدری دلاور کہتا ہے کہ میرے والد کے قاتل تم ہو۔ قتل صرف تم نے کیا تھا۔ تم کہتے ہو اپنی مرضی سے تم نے کچھ نہیں کیا تھا۔ سب کچھ تم سے ایس ایس پی سراج نے کروایا تھا۔ یا حاجی عبداللہ نے۔ میں نے تو تمھیں پہلے دن سے دلاور کے ساتھ دیکھا تھا۔"

"تم نے مجھے بہت بعد میں دیکھا۔ جب حاجی عبداللہ اور سراج نے اپنی اپنی نیک نامی کا بھرم رکھنے کے لیے بندوق دلاور کے کندھے پر رکھ دی تھی۔ ایک کو اپنے حاجی ہونے کی وجہ سے دنیا میں داغ رسوائی منظور نہ تھا' دوسرے کو اپنے عہدے کے باعث کسی قسم کا الزام گوارا نہ تھا۔ انھوں نے مجھے دلاور کے سپرد کردیا تھا۔ مجھ سے پہلے ڈی سوزا تقریباً ایسے ہی حالات میں ان کی غلامی قبول کرچکا تھا۔

میں نے کہا "مجھے کبھی احساس نہیں ہوا کہ تم یا ڈی سوزا بے بس ہو اور جو کچھ کرتے ہو' مجبوری میں' ڈر یا خوف کے باعث کرتے ہو۔ تم اپنی عقل اور ذہانت کا پورا استعمال کرتے تھے' مجھے ہر ذہنی و جسمانی اذیت دینے کے لیے۔"

"غلام کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار نظر آئے۔"

"میں نہیں مانتا۔ دلاور تم پر الزام عائد کرتا ہے۔ تم دلاور کو مجرم ٹھہراتے ہو۔ وہ مجھے تاوان ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔ مجھ سے مصالحت کی ہر شرط اسے منظور ہے' سوائے ایک شرط کے۔ وہ خود کو قانون کے حوالے کرنا نہیں چاہتا۔ وہ پھر مجھے خریدنے کی کوشش کررہا ہے مگر اس بار مختلف انداز سے۔ تم آج اچانک میرے سامنے صفائی پیش کررہے ہو کہ تم کو سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ تم ظالم نہیں' تم تو مظلوم ہو' میں سب سمجھتا ہوں تمھاری عیاری اور مکاری کو۔ دلاور اور تمھارے درمیان اختلاف کی وجہ کچھ بھی ہو' ایک بات پر تمھارے درمیان اتفاق ہوگیا ہے کہ سکندر بخت کو اب پیار محبت کے جھوٹ کا جال پھیلا کے' دوستی کا فریب دے کر' معافی تلافی کے وعدوں پر بے وقوف بنا کے زیر دام لانا ہے۔ تم سب وہی پرانے شکاری ہو۔ بس تم بدلے ہوئے حالات میں اپنی حکمت عملی بدل چکے ہو۔ تم دونوں کو میری دشمنی کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ اب تم اس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ تم دونوں اپنے اپنے مفاد میں یہ چاہتے ہو کہ میں کل کی باتیں بھلا دوں..."

"تم سے میں نے کچھ بھی نہیں مانگا ہے ابھی تک۔" استاد پیڈرو نے میرے خاموش ہو جانے کے بعد کہا۔

میں فرط جذبات میں آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ مجھ پر دشمنی کے پرانے جذبات غالب آگئے تھے۔ پیڈرو کی باتوں نے وقتی طور پر مجھے اس کا ہم خیال بنادیا تھا اور میں سوچنے لگا تھا کہ شاید مجھ سے پیڈرو کو سمجھنے میں غلطی ہوگئی تھی حالانکہ غلطی یا غلط فہمی کا کوئی سوال نہ تھا۔ ایسے ان گنت واقعات کے زخم میرے سینے میں سُلگ رہے تھے جو پیڈرو کے شیطانی کی کارستانی کا نتیجہ تھے۔ وہ دلاور سے بڑھ کے میرا دشمن تھا اور اس نے ایک اذیت پسند' سفاکانہ اور انتقامی طرز عمل اختیار کرتے ہوئے مجھ پر انسانیت سوز مظالم توڑنے کی انتہا کردی تھی۔ اب وہ اس دلیل کی آڑ لے رہا تھا کہ اس کے لیے دلاور اور سراج کو اپنی اعلیٰ کارکردگی سے مطمئن رکھنا ضروری تھا۔

"اگر تمھیں مجھ سے کچھ نہیں چاہیے تو پھر یہاں کیوں بلایا ہے تم نے مجھے؟" میں نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا "صرف اپنی مظلوم و مجبور و محکوم زندگی کی کہانی سنانا تو تمھارا مقصد نہیں تھا۔"

"ہرگز نہیں" وہ بولا "میں تو تمھیں کچھ دینا چاہتا تھا۔"

"تم! تم کیا دوگے مجھے' میرا سب کچھ لینے کے بعد؟" میں نے تلخی سے کہا "دلاور نے مجھے بتادیا ہے پیڈرو کہ کس طرح تم نے میرا تعاقب کیا' میری جان لینے کی کوشش کی۔"

"اور تم نے یقین کرلیا اس پر؟"

"میں کیوں یقین نہ کرتا؟ میں نے دیکھا تھا تمھیں' رابعہ نے اور کاجل نے دیکھا تھا۔ تم ایک گاڑی میں مسلسل ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے" میں نے غصے میں میز پر مُکا مارا۔

"یہ ٹھیک ہے۔"

"کیا یہ ٹھیک نہیں ہے کہ تم نے ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے اپنی موجودگی کا احساس دلایا؟ تم نے اشارے کیے رابعہ اور کاجل کو؟ اور تم اس ہوٹل میں ٹھہرے تھے جس میں میرا قیام تھا۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم نے آفریدی کی جیپ میں بم رکھ کے اسے تباہ کردیا تھا۔ ہم بال بال بچ گئے تھے۔ پھر تم نے ریسٹ ہاؤس کو اڑادیا تھا؟"

"تم پھر بال بال بچ گئے تھے" پیڈرو غیر سنجیدہ لہجے میں بولا "تم کو میں اتنا احمق نہیں سمجھتا سکندر۔ غصے نے تمھاری عقل کو مفلوج کردیا ہے۔ جب پیڈرو کسی کو نیست و نابود کرنا چاہے تو وہ بال بال بچتا نہیں۔ پیڈرو کا نشانہ اتنا کچا نہیں ہے کہ جسے وہ شکار کرنا چاہے وہ بچ کے نکل جائے۔"

"کیا یہ غلط ہے کہ راولپنڈی سے پشاور تک تم ہمارے پیچھے لگے رہے تھے اور اس گاڑی کا نمبر لیے رہے تھے؟"

"مگر اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ میں تمھاری جان لینے کے لیے ایسا کررہا تھا۔ میں تو خود تم سے ملنا چاہتا تھا" پیڈرو بولا "لیکن تم نہ جانے کیا سمجھ کے آگے آگے بھاگتے رہے۔ مجھے کوئی موقع نہیں ملا تم سے بات کرنے کا۔"

"یعنی تم انکار کرتے ہو تمام تخریبی کارروائیوں کی ذمے داری قبول کرنے سے؟"

"بالکل۔ یہ دلاور کا کام تھا۔"

میں نے طنز سے کہا "وہ تم پر الزام لگاتا ہے۔ تم دونوں سمجھتے ہو شاید"

"میں جانتا ہوں' تم آسانی سے قائل نہیں ہوسکتے لیکن اب جو باتیں میں تمھیں بتانے والا ہوں وہ شاید ایک ثبوت ہو۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے دوست کہاں ہیں؟"

"نہیں۔ اور اس کے ذمے دار بھی تم ہو۔ تم یا دلاور۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تمھارا ایک دوسرے سے اختلاف بھی ڈراما ہو۔ محض نورا کشتی ہو۔ دلاور نے ہی یہ اسکیم بنائی ہو کہ تم میرے دشمنوں سے مل جاؤ اور انھیں قائل کرو کہ اب دلاور سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا بلکہ ہم تو ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔"

پیڈرو نے دونوں ہاتھ پھیلائے "تمھارے اندیشے غلط نہیں۔ تم جو بھی فرض کررہے ہو ماضی کے تجربات کی بنا پر کررہے ہو۔ خیر وقت آنے پر ہر ثبوت مل جائے گا تمھیں۔ ابھی تو میں تم کو صرف غالب اور نازو کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔"

ہم ابھی تک کھانے کی میز پر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے اور یہ بڑی عجیب صورت حال تھی جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ کبھی میں پیڈرو جیسے دشمن کے گھر میں' اس کی میز پر اس کے ساتھ بیٹھ کے اسی کا نمک کھاؤں گا۔

میں جھنجلاہٹ اور بیزاری کا شکار تھا اور کسی قدر نادم اور رنجیدہ تھا کہ میں نے مجبوری کے باوجود پیڈرو کی میزبانی کیوں قبول کی۔ میں اپنی انا کی خاطر اپنی ہٹ پر قائم رہتا' دشمنی کا رشتہ برقرار رکھتا' اس کی ہر پیشکش کو ٹھکرا دیتا' اس کی بات نہ سنتا اور اس کے گھر میں بھوکا مرجاتا مگر اس کے ساتھ کھانے کی میز پر نہ بیٹھتا۔ یہ سب جوش کے جذبات تھے اور قوت فیصلہ سے محرومی کا نتیجہ تھے۔ میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ دلاور اور پیڈرو میں کے کتنا جھوٹ بول رہے تھے اور کتنا سچ۔ ان پر یقین کرنا غلط تھا' خلاف مصلحت تھا اور ناممکن تھا۔ مگر دوسری طرف واقعات اور حالات کا رخ دیکھ کے میری عقل چکرا جاتی تھی۔

غالب اور نازو کا نام شاید ترپ کا پتا تھا جس کو پیڈرو نے ابھی تک سنبھال رکھا تھا اور بازی کمزور پڑنے لگی تو اس نے یہ پتا بھی میرے سامنے ڈال دیا اور اس پتے نے خاطر خواہ طور پر بازی پھر پیڈرو کے حق میں کردی۔ میں وہ سب کچھ بھول گیا جو کہہ رہا تھا یا سوچ رہا تھا اور کہنے والا تھا۔

میری سماعت سے یہ الفاظ یوں ٹکرائے کہ ان کی بازگشت میرے ذہن میں خیالوں کے درمیان کیے جانے والے فائر کی طرح بار بار سنی۔

"تم نے غالب اور نازو کا نام لیا تھا!" میں نے سکتے کی کیفیت سے نکل کے بے یقینی کے ساتھ پیڈرو کو دیکھا۔

"ہاں۔ کیا تمھیں اندازہ تھا کہ وہ کہاں ہوسکتے ہیں؟"

"ہاں۔ انسپکٹر ایم ایچ نوشہرہ سے اس کا بھائی ان کے کوئی لے گیا تھا" میں نے مشتعل ہوکے کہا "مگر ان کو اغوا کیا گیا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ تم نے قید کررکھا ہے انھیں؟"

"میں نے!" پیڈرو اٹھ کھڑا ہوا "دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے پیڈرو نہیں کررہا ہے۔ ساری خرابی کا ایک میں ہی ذمے دار نہیں بن گیا ہوں۔ آؤ اندر چل کے بات کرتے ہیں۔"

ایک بار پھر ہم اس کمرے میں پہنچ گئے جس کو ڈرائنگ روم ہی کہا جاسکتا ہے۔ دشمن بھی ایک مدت کے بعد صرف کمزوریوں سے ہی واقف نہیں ہوتے' ایک دوسرے کے مزاج آشنا بھی بن جاتے ہیں۔ پیڈرو کو معلوم تھا کہ میں کافی شوق سے پیتا ہوں' خصوصاً کھانے کے بعد۔ کمرے میں کافی پہلے سے موجود تھی۔

"غالب اور نازو میری قید میں نہ تھے' نہ ہیں" پیڈرو نے میری اضطراری کیفیت کو دیکھتے ہوئے کہا "ان کو اغوا کرانے میں دلاور کا ہاتھ تھا۔ اب تم پھر کہو گے کہ یہ بات میں دشمنی میں کہہ رہا ہوں۔ لو کافی پیو' میں بتاتا ہوں تمھیں۔"

"اگر تم جانتے ہو تو پہلے مجھے ان کے پاس لے چلو یا وہ اس گھر میں پہلے سے موجود ہیں تو ختم کرو یہ ڈراما اور انھیں بلاؤ۔ وہ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"وہ ٹھیک ہی ہوں گے" پیڈرو بولا۔

"کیا مطلب ہوں گے؟ جب تم جانتے ہو..." میں نے بگڑ کے کہا۔

"میں یہ جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہیں۔ میں تم کو ان سے ملوانے کے لیے نہیں لے جاسکتا۔ تمھیں ان کا پتا بتا سکتا ہوں۔ آخری اطلاعات تک وہ ٹھیک ٹھاک تھے" پیڈرو بولا۔

میں نے کافی کو چند گھونٹ میں حلق سے اتار لیا "اچھا پھر چلو۔ تم نے وہ بات آخر میں بتائی جو سب سے پہلے بتانی ضروری تھی۔ اپنی لائف اسٹوری سناتے رہے۔ چلو اٹھو..."

اس نے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا "گھبراؤ نہیں۔ اتنی جلدی کی ضرورت نہیں۔ ہم صبح جائیں گے۔"

"میں صبح تک انتظار نہیں کرسکتا" میں نے چلا کے کہا۔

"اس وقت میں تم کو نہیں لے جاسکتا سکندر۔"

"تمھارا تو باپ بھی جائے گا میرے ساتھ" میں نے ایک دم اسے دبوچ لیا اور اس کی گردن قابو میں کرلی۔

اس نے بالکل مزاحمت نہیں کی اور کسی کو مدد کے لیے آواز نہیں دی' تالی بجا کے کسی کو طلب نہیں کیا مگر اس کے بھی نادیدہ محافظ تھے جو سامنے آئے بغیر اس کی حفاظت کرتے تھے۔ دو طرف کے پردے ہٹا کے دو ملازم ریوالور کا رخ میری طرف کیے نمودار ہوئے۔ یہ وہی ویٹر تھے جو اس سے پہلے ڈرائیور کی ڈیوٹی بھی دے چکے تھے۔ تیسری نال مجھے اوپر ایک روشندان سے بھی جھانکتی دکھائی دی۔ اس کا رخ بھی میرے سینے کی طرف تھا۔ پیڈرو نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں واپس کردیا۔

www.paksociety.com

"آرام سے بیٹھو سکندر، تم کو مہمان کہا ہے میں نے تو تمہارے ساتھ کسی کو زیادتی کی اجازت نہیں دے سکتا" پیڈرو بولا "میں بتاتا ہوں تمہیں، پہلے میری بات سمجھ لو پھر جو چاہو فیصلہ کرنا۔"

میں نے اسے چھوڑ دیا اور پھر اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میں شستی یا بزدلی کی وجہ سے صبح تک انتظار کرنے کا نہیں کہہ رہا تھا" وہ بولا "رات کے وقت تمہارے لیے زیادہ مشکلات ہوں گی۔ ایسا نہ ہو کہ ان سے ملنے کے چکر میں تم خود کسی مصیبت میں پڑ جاؤ۔"

"اور دن میں کیا انہیں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے؟ گارڈ ہٹالی جاتی ہے؟"

"دن میں راستے کی رکاوٹیں صاف نظر آتی ہیں۔ میں نے ان تک تمہارا پیغام پہنچا دیا ہے۔"

"کیا پیغام؟" میں نے بے چینی سے کہا۔

"یہی کہ ایک تو دو دن میں تم پہنچنے والے ہو۔ کیا اس نے تم سے بات نہیں کی تھی؟"

"اس نے فون تو کیا تھا لیکن میری اس سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس نے منظر کے گھر سے فون کیا ہو گا۔"

"نہیں۔ فون تک ان کی رسائی نہیں تھی۔ لیکن میں نے اندر ہی اندر ایسا انتظام کیا کہ ان کو موقع مل گیا۔ ان کی حفاظت کرنے والوں میں سے ایک نے یہ کام کیا مگر دوسرے لوگوں نے ولاور سے شکایت کر دی۔ ولاور نے وہاں سے فون کی لائن ہی کٹوا دی اور اس نمک حرام کو ٹیلی فون کے کھمبے پر لٹکا دیا۔ بے چارے کو موقع ہی نہ مل سکا وہاں سے نکلنے کا ورنہ وہ میرے پاس آنے والا تھا۔ بڑی اذیت ناک طریقے پر اس کی موت واقع ہوئی۔ ولاور نے کھمبے میں کرنٹ چھوڑ دیا اور وہ جھٹکوں سے تڑپ تڑپ کے دوست ہو گیا۔ اس کا جسم کالا پڑ گیا تھا۔"

"مجھے افسوس ہوا یہ سن کر" میں نے کہا "مگر کیا ٹیلی فون کا کھمبا اس کے گھر میں لگا ہوا تھا؟ کسی نے دیکھا نہیں؟"

"رات کے وقت اسے قتل کیا گیا تھا۔ کپڑے اتار کے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کے۔ اسے سب ملازموں کے سامنے ہلاک کیا گیا۔ ظاہر ہے اب دوسرے زیادہ چوکس ہیں۔"

میں نے متفکر ہو کے کہا "پھر ہم کیسے اندر جائیں گے؟"

"ایک طریقہ تو یہ ہے کہ تم پولیس کے ساتھ چھاپا مارو۔ تم کہہ سکتے ہو کہ کچھ مجرموں نے ایک صحافی کو اس کی بیوی کو یہاں قید کر کے یرغمال بنا رکھا ہے۔"

میں نے کہا "مگر میں کس حیثیت میں پولیس اور مجسٹریٹ کو مجبور کر سکتا ہوں کہ وہ اتنا بڑا قدم اٹھائیں؟"

"میرا خیال تھا کہ تم سب کچھ کر سکتے ہو۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا "اندر کتنے محافظ ہوتے ہیں، وہ جگہ کہاں ہے؟ اس کا نقشہ سمجھاؤ مجھے اور یہ بتاؤ کہ چھاپا پڑنے کی صورت میں غالب اور نازو کی زندگی کو کسی قسم کا خطرہ تو لاحق نہیں ہو گا؟"

"انہیں کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟"

"یہ دیکھتے ہوئے کہ اب انہیں قید نہیں رکھا جا سکتا، ان کو گولی مار دی جائے۔"

"کس کے حکم سے؟ ولاور کا حکم ہے کہ انہیں مہمانوں کی طرح عزت سے رکھا جائے اور چھاپا اچانک پڑے تو کسی کو سوچنے کی کہاں ملے گا کہ ولاور سے ہدایات لے سکے۔ اندر زیادہ سے زیادہ چند افراد ہوں گے۔ وہ از خود اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ مجرموں کا ایک ذہن ہوتا ہے۔ چوری کی نیت سے ڈاکا ڈالنے کے لیے آنے والا قتل بھی نہیں کرتا۔ ایک قتل کا ارادہ رکھنے والا دوسرے قتل کا مرتکب ہونے سے گریز کرتا ہے۔ کسی صحافی کو زندہ قید میں رکھنا خاصا بڑا جرم ہے۔ اسے مار دینا تو ناقابل تلافی جرم ہو جائے گا۔ خود ولاور موجود ہوتا تو وہ بھی ایسا حکم نہ دیتا۔ اب صبح تک آرام کرو اور سوچو کہ تم کیا کر سکتے ہو۔ مجھے نہ ہوا تو میں دوسرا مشکل اور خطرناک طریقہ اختیار کروں گا۔"

"وہ کیا ہے؟"

"براہ راست حملہ، تصادم۔ دو چار ادھر کے مارے جائیں دو چار ادھر کے اور کام ہو جائے۔"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ نہ میں ایسا کر سکتا ہوں، نہ تمہیں کرنے دوں گا۔ ہر تو کی جان کی قیمت ہوتی ہے۔"

"لیکن ایک نہیں ہوتی" پیڈرو نے کہا۔

"یہ غلط ہے" "اپنے لوگوں کا خون۔"

"یہ صحیح ہے کیا دوست کی جان اور دشمن کی جان کی تم ایک قیمت لگاؤ گے؟" پیڈرو نے میری بات کاٹ دی "مجھے معلوم ہے اپنے سکندر صاحب! تم مجھے، ولاور کو اور میرے جیسے دس کو مار سکتے ہو اپنے ہر ساتھی کے لیے۔"

"تم کو میں یقیناً مار سکتا ہوں اور اپنے ہر دشمن کو کسی بھی مقصد پر قربان کرنا قتل نہیں ہوتا۔ لیکن تم میری خاطر اپنے آدمی مرواؤ، یہ خون کا قرض میں نہیں لے سکتا۔ اس احسان کو قبول کر لینے کے بعد کیا جواز رہ جائے گا تم سے دشمنی کا؟ تم بھی احسانوں سے خریدنا چاہتے ہو مجھے۔ یہ نا ممکن ہے۔"

"بات احسان کی نہیں۔ مگر تم بعد میں سمجھو گے" پیڈرو بولا "ویسے کیا تمہاری جان بخشی میرا احسان نہیں؟"

"یہ مجبوری ہے تمہاری۔"

وہ طنز سے ہنسا "مجبوری؟ کیا مجبوری ہے مجھے؟ تم کو یہ عزت و آرام دینے کے بجائے میں کسی کوٹھری میں ڈال دیتا اور بھوکا پیاسا رکھتا تو تم کیا بگاڑ لیتے میرا؟ اور کیا یہ احسان شمار نہیں ہو سکتا"

نے تمہیں غالب اور نازو کا پتا دیا۔ میں لے جاؤں گا تمہیں اس جگہ تک جہاں وہ قید ہیں۔ ان کی رہائی میری وجہ سے ہو گی۔ تم خود جگہ ڈھونڈتے رہتے ساری عمر تو تمہیں ان کا پتا نہ ملتا۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس کی باتوں کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا "کہ ایک دن ولاور خود چھوڑ دیتا انہیں۔"

"اس دن جب وہ تم سے اپنی ہر بات منوا لیتا۔"

"باتیں تو ابھی تم نہیں منواؤ گے؟" میں نے کہا "جو کچھ تم کر رہے ہو نیک نیتی سے، کسی مقصد کے بغیر تو نہیں کر رہے ہو۔"

"جب ماں باپ، اولاد کے لیے دکھ اٹھاتے ہیں تو ان کے سامنے بھی ایک مقصد ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں اولاد ان کو دکھ نہ ہونے دے" پیڈرو بولا۔

"بہتر ہو گا اگر تم اپنے مطالبات اور اپنی شرائط مجھے ابھی بتا دو تاکہ میں صبح تک ان پر غور کر لوں اور پھر فیصلہ کروں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"میرا کوئی مطالبہ نہیں، کوئی شرط نہیں۔ میں نے اپنی صفائی پیش کر دی، وضاحت کر دی کہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں میرا قصور تھا تو کس حد تک۔ تمہیں بتا دیا کہ اب ولاور میرا دشمن ہو رہا ہے۔ ایک بڑے دشمن کے خلاف دو کمزور دشمن مل جائیں تو۔"

"یہ ہے تمہارا مقصد!" میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔

"تم انکار کر سکتے ہو" وہ بولا "مگر میں بہت مدد کر سکتا ہوں، تمہارے کام آ سکتا ہوں۔ ولاور کے عزائم بہت خطرناک ہیں۔ میں تو ایک عام سا مجرم ہوں۔ ناجائز دھندوں سے پیسہ کمانے والا۔ اسمگلر اور ہر قسم کے غیر قانونی کاروبار سے پیسہ کمانے والا۔ میرے خلاف تو بہت سے ادارے ہیں۔ پولیس، اسپیشل پولیس، خفیہ پولیس، سی آئی اے، ایف آئی اے اور انٹرپول تک۔ ولاور بھی کل تک ساتھ تھا مگر اب وہ اونچی پرواز کرنے کے لیے پر تول رہا ہے۔ تم جیسے غدار اور وطن فروش کہتے تھے، وہ اسی قوم کا لیڈر اور اس ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بننا چاہتا ہے۔ اس کے خلاف کسی قانون کے تحت کارروائی کرنے والا کوئی ادارہ موجود ہی نہیں۔ اس کا مقابلہ کر سکتے ہو تم؟"

"میں اس کا مقابلہ ضرور کروں گا۔"

"الیکشن میں اس کے خلاف کھڑے ہو کے؟"

"نہیں۔ میں الیکشن والا آدمی نہیں ہوں۔ سیاست سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میری تو ولاور جیسے لوگوں سے دشمنی ہے اور ان کو بے نقاب کرنا میرا قومی فریضہ ہے۔ ایسے لوگوں کے اصل چہرے پبلک کو دکھانا میرا مقصد تھا اور رہے گا۔"

"تو اس کام میں مجھ سے زیادہ تمہاری مدد کون کر سکتا ہے جو ولاور کے ہر راز سے واقف ہے" پیڈرو بولا "آگے تمہاری مرضی، تم انکار کر دو۔ تم میرے خلاف بھی لڑتے رہو اور ولاور کے خلاف بھی

مگر سکندر! پہلے بھی تم نے اپنی اور اپنے سب ساتھیوں کی زندگی داؤ پر لگائی، کیا ملا تمہیں؟ کچھ بھی نہیں۔ محب الوطنی کی سند تک نہیں ملی تمہیں۔ پبلک میں دو چار لوگ تمہارے کارناموں پر واہ واہ کرنے والے ضرور ہوں گے مگر اس سے زیادہ تو تمہارے مخالفین ہیں۔ پہلے تم مجھ سے اور ولاور سے ایک محاذ پر لڑ رہے تھے، اب دو محاذ کھولو گے۔ اس پہلو سے بھی سارے معاملے کا جائزہ لینا۔ رابعہ اور کاجل سے بھی مشورہ کر لینا۔ میں صبح تمہیں بہر حال غالب اور نازو تک پہنچا دوں گا۔"

وہ مجھے اپنے بیڈ روم میں چھوڑ کے چلا گیا تو میرے دماغ میں خیالوں کا انتشار تھا۔ مخالف اور موافق سوچوں کی یلغار نے میرے وجود میں خانہ جنگی بپا کر رکھی تھی۔ میں جھوٹ کو سچ سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جانا تو محاورے کی بات ہے، عام آدمی کیسے جان سکتا ہے کہ دودھ میں کتنا پانی ہے یا پانی میں کتنا دودھ ہے۔ اس کے لیے سائنسی آلات ہوتے اور تجربہ کرنے کے سائنسی آلات اور لیبارٹری نہ ہوں تو یک جان ہو جانے والے پانی اور دودھ کو کس کی نظر الگ الگ دیکھ سکتی ہے۔ میرے ذہن میں بھی ایسا کوئی آلہ موجود نہ تھا جس سے میں ولاور اور پیڈرو کے بیانات میں سچائی کے عنصر اور جھوٹ کے تناسب کو الگ الگ کر کے دیکھ سکتا۔

حالات نے اچانک پلٹا کھایا تھا۔ کل کے دشمن آج میری خیر خواہی کے دعوے کر رہے تھے اور مجھے اپنی اپنی ضرورت کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ہر ایک اپنا کیس اپنے حقائق کی بنیادوں پر پیش کر رہا تھا اور میں اتنے کم وقت میں سوچے سمجھے اور پرکھے بغیر فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ میں کس کو انکار کروں اور کس کی پیشکش قبول کروں۔ میں کسی کا آلۂ کار بننا نہیں چاہتا تھا، کسی کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا اور کسی سے وعدہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کے اور میرے درمیان دشمنی کا رشتہ ایک احسان کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو جائے گا۔

صرف ایک بات واضح تھی کہ ولاور کے عزائم زیادہ خطرناک تھے اور اس سے مصالحت کا مطلب تھا اپنے عقائد، نظریات اور اصولوں سے روگردانی۔ اس کی ہر پیشکش ایک رشوت تھی کہ مجھ سے جو چاہو لے لو۔ اپنے نقصان کا معاوضہ ایک کی جگہ دس مانگ لو۔ ماضی و حال کے سارے وعدے ایک وعدے پر بخش کرا لو کہ تم میری مخالفت چھوڑ دو گے اور مجھے اپنا، اس ملک اور قوم کا لیڈر مانتے ہوئے میری سیاسی منزل کی راہ میں کانٹے نہیں بچھاؤ گے۔

پیڈرو اس سے بہت کم مانگ رہا تھا۔ وہ واقعی ایک عام مجرم تھا اور اس کے غیر قانونی کاروبار سے نمٹنے کے لیے درجنوں ادارے تھے۔ اب یہ ان کی نااہلی، کوتاہی اور حرام خوری تھی کہ سارے قوانین کا فائدہ مجرم اٹھا رہے تھے اور یہ نظام عام آدمی کا نصیب تھی۔

www.paksociety.com

ولاور کا معاملہ مختلف تھا۔ اس جیسے لوگ عام آدمی کے مقابلے میں بڑے آدمی تھے، عزت دار کہلاتے تھے، قانون اور دستور کے رکھوالے سمجھے جاتے تھے مگر در حقیقت وہی سارک بد عنوانی کا نقطۂ آغاز تھے، ساری خرابی کی جڑ تھے اور اس معاشرے کو اخلاقی، معاشی اور معاشرتی قدروں کی تباہی کے راستے پر لے جانے کے ذمے دار تھے۔ ان سے نمٹنا نہ آسان تھا اور نہ کسی کا فرض منصبی.... یہ کام تھا باکردار اور باضمیر لوگوں کا۔ آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی کے نعرے پر عملاً یقین رکھنے والوں کا گروہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھے اور جو تھے وہ خاموش اور چپ بیٹھے تھے۔ اس خوف سے کہ ان کی جرأت اظہار اور طاقت گفتار کا خمیازہ ان کے اہل و عیال کو نہ بھگتنا پڑے۔ خود غرضانہ مصلحتوں کے باعث یا کم ہمتی کی بے حسی کے باعث سب سوچتے تھے کہ یار چھوڑو، اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ اس قوم کو خدا اور اس کے رسولوں کے فرمان سدھار سکے، نہ آئین اور قانون بنانے والے اور نہ مارشل لا لانے والے، تو ہم کس شمار قطار میں ہیں۔ بس اپنا الو سیدھا کرو یعنی سب کو الو بناؤ اور خود الو کی طرح بیٹھے دیدے گھماتے رہو اور کبھی کبھی آواز بھی نکالتے رہو۔ اپنا وجود ثابت کرنے کے لیے۔

میں صبح تک سو نہ سکا۔ غالب اور نازو کے چہرے جیسے ہر دیوار پر نقش ہو گئے تھے کہ میں جدھر دیکھتا تھا ان کی سوالیہ نگاہیں یہ پوچھتی نظر آتی تھیں، چیف کے لو پھر اب کیا فیصلہ کیا ہے تم نے۔ فیصلہ کرنا بہر حال تمہارا کام ہے اور خواہ دوست بن کے سوچو یا مشن کمانڈر بن کے۔ قوت فیصلہ کو بعد از خرابیٔ بسیار بروئے کار لانے کے تمام نقصانات کے ذمے دار تم اور صرف تم ہو گے۔

پیڈرو کو معاف کر دینے کا سوال ہی نہ تھا اور ابھی وہ وقت آیا بھی نہیں تھا کہ میں اس سے وزیر خان کے بے گناہ لہو کا حساب لوں۔ فوری مسئلہ غالب اور نازو کی رہائی کے لیے اس کی مدد قبول کرنے یا نہ کرنے کا تھا۔ اس حد تک وہ میری مدد کر چکا تھا کہ اب غالب اور نازو تک رسائی خواب و خیال نہیں رہی تھی۔

رات کے دو بجے میں نے کاجل اور رابعہ سے مشورے کا فیصلہ کیا کیونکہ میں متضاد خیالوں اور ایک دوسرے کو مسترد کرنے والے نتائج کی رسہ کشی کا شکار تھا اور جیسے ایک رسے کو ایک طرف سے کھلاڑیوں کی پہلی ٹیم کھینچتی ہے تو دوسری طرف سے زور آزمائی کی دوسری ٹولی، ایسے ہی میں خیالات کی کھینچ تان میں ادھر سے ادھر ہونے کے باوجود وہیں تھا۔

رابعہ کو جاگتا دیکھ کے مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ اس کا صبح تک سوتا رہنا ممکن تھا لازمی نہیں تھا۔ دو گھنٹے بعد ہی اس کی نیند اڑ گئی تھی اور اس نے ڈاکٹر کے مشورے سے گرم دودھ پی لیا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس گھر میں سکندر صاحب بھی ہیں مگر خواب آور دوا کا اثر باقی ہے چنانچہ انہیں صبح سے پہلے جگانا مناسب نہیں ہو گا۔

یہی بات لیڈی ڈاکٹر نے مجھے سمجھائی تھی اور میں نے مان لی تھی تو رابعہ کیوں نہ مانتی۔ کاجل البتہ سو رہی تھی لیکن بار بار کروٹ بدل رہی تھی۔

میں نے کہا ”کیسی ہے طبیعت؟“

”ٹھیک ہے۔ تم کیسے اٹھ کے آ گئے؟“ وہ بولی۔

”میں تو پہلے بھی آیا تھا تمہیں دیکھنے۔ لیڈی ڈاکٹر نے جگانے سے منع کر دیا تھا چنانچہ واپس لوٹ گیا۔“

”یہ سب ان بسکٹوں کے کھانے سے ہوا تھا۔“

”میں نے تو پورا ڈبا صاف کر دیا تھا پھر بھی تم سے پہلے بیدار ہو گیا“ میں نے کہا ”تمہیں معلوم ہے ہم کہاں ہیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا ”نرس، ڈاکٹر، خادمہ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔“

میں نے کہا ”ہم استاد پیڈرو کے معزز مہمان ہیں اور صبح انشاء اللہ... ہم غالب اور نازو سے ملیں گے۔“

اس پر نیم غنودگی کی کیفیت طاری تھی۔ میرے الفاظ کا وہی اثر ہوا جو اس کے سر پر ڈنڈا مارنے کا ہوتا۔ وہ چونک کے اٹھ بیٹھی۔ ”کیا کہہ رہے ہو۔ تم ہوش میں ہو نا؟“

”میں نے تمہیں ہوش میں لانے کے لیے یہ بات کہی تھی۔“

وہ مایوس نظر آنے لگی ”یعنی جھوٹ بولا تھا؟“

”یہ تو نہیں کہا میں نے، جھوٹ میں نے کبھی بولا ہے تم سے؟ اور تم سے کیا میں نے تو آج تک جھوٹ کسی سے نہیں بولا۔ ماشاء اللہ سے....“

رابعہ ہنسی ”اس سے بڑا جھوٹ کیا ہو گا؟“

میں نے کہا ”میں تم سے مشورہ کرنے آیا ہوں۔ ہر چند کہ عورت ذات کی عقل کے بارے میں میری رائے اتنی اچھی نہیں ہے۔“

”تو پھر جاؤ، خود فیصلہ کرو۔“ وہ بگڑ گئی۔

”دیکھو نا مجبوری میں سب جائز ہے۔“ میں نے کہا ”لوگ گدھے کو باپ بنا لیتے ہیں۔ میں مان لیتا ہوں کہ تم میری طرح عاقل و بالغ ہو۔“

”کوئی ضرورت نہیں۔“

”ضرورت مجھے ہے“ میں نے ڈانٹ کر کہا ”کان کھول کے سنو لڑکی، میں تم پر ایسے انکشافات کرنے والا ہوں کہ تم سنتے ہی ہائے کر کے بے ہوش ہو جاؤ گی۔ لخلخہ نہیں ہے میرے پاس، اس لیے بے ہوش پھر کبھی ہونا۔“

اس کے بعد میں نے اسے اپنی اور پیڈرو کی گفتگو کا خلاصہ سنایا۔ یہ خلاصہ بھی ”تلخیص طلب“ تھا کیونکہ اس میں ایک گھنٹا لگ گیا مگر ایک گھنٹے میں شاید انسٹھ منٹ تو رابعہ کے سوالات کی نذر ہوئے تھے۔

”اب کیا کرو گے تم؟“ وہ ساری بات سن کے بولی۔

”لاحول ولا قوۃ۔ یہی تو میں تم سے پوچھنے آیا تھا۔ ہونا وہی ہے۔ میں سچ بولوں گا تو برا لگے گا۔“

”تم خود کوئی چکر چلاؤ، کسی صحافی سے مدد لو۔ غالب کو بہت لوگ جانتے ہوں گے۔“ رابعہ بولی ”کسی اخبار کے کرائم رپورٹر کو ساتھ ملاؤ۔ اس کو بتاؤ کہ غالب کو اغوا کرنے والوں نے فلاں جگہ رکھا ہے مگر یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔“

”پھر وہ کیا کرے گا؟ یقین کی بنیاد پر تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“

”سب کچھ ہو سکتا ہے سکندر۔ پولیس کو بھلا کون روک سکتا ہے۔ وہ من مانی کرتے ہیں اور قانون کی آڑ تو اس وقت لیتے ہیں جب وہ کچھ نہ کرنا چاہیں“ رابعہ نے کہا ”کرائم رپورٹر کے لیے ایک سب انسپکٹر اور دو چار سپاہیوں کے ساتھ چھاپا مارنا کوئی مشکل کام نہیں۔“

”بغیر مجسٹریٹ اور وارنٹ؟“

”کون پوچھتا ہے وارنٹ کو اور وہ دکھاتے کب ہیں۔ چادر اور چار دیواری کے تقدس کی تو محض اصطلاح ہے۔ بیان بازی کے لیے۔ اور مجسٹریٹ کیا تم نہیں ہو سکتے؟ آج تک کسی نے مجسٹریٹ سے شناختی کارڈ مانگنے کی ہمت کی ہے؟“ رابعہ بولی ”جیسے پولیس مقابلے بوگس ہوتے ہیں اور بعد میں ثابت نہیں کیے جا سکتے، ایسے ہی پولیس کے چھاپے ہوتے ہیں۔ کون ہو گا دیکھنے والا اور فریاد کرنے والا۔ وہ صاف مکر بھی سکتے ہیں۔“

میں نے سخت جذباتی ہو کے کہا ”رابعہ! تم نے اس وقت پھر مجھے اتنا شرمندہ کر دیا ہے... اتنا کہ....“

”چلو چلو، فضول بکتے ہو تم۔ تمہاری مرد کی کھوپڑی سے وہ بات نکل ہی نہیں سکتی کہ عورت ذات ناقص العقل ہے۔“

”نہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں اس وقت۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ بس تمہارا منہ....“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

رابعہ نے بگڑ کے کہا ”پاگل ہوئے ہو، میں ماروں گی قریب آئے تو۔“

”منہ میٹھا کرا دوں مگر افسوس کہ یہاں چینی تک نہیں ہے، مٹھائی کا بھلا کیا ذکر۔ یہ تمہارا منہ کیوں لال ہو رہا ہے آخر؟“ میں نے پھر بیٹھتے ہوئے کہا۔

رابعہ خفت سے مسکرائی ”منہ.... نہیں تو۔“

”نہیں کیا۔ قلم جیسا منہ تھا، چقندر ہو گیا“ میں نے ڈانٹ کر کہا ”کیا سمجھا تھا آخر تم نے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں ابھی تک۔ شادی کے بعد نہ رہوں تو اور بات ہے۔ کوئی نہیں رہتا۔“

”اب تم جاؤ۔ دفع ہو جاؤ“ رابعہ بولی ”ورنہ میں کاجل کو اٹھاتی ہوں۔“

”ارے نہ، ہم کاجل سے ڈرتے ہیں نہ شرم سے۔ اور دفع ہم ہوتے نہیں، تشریف لے جاتے ہیں، وہ بھی کوئی درخواست کرے تو۔ شرافت سے۔“

”اچھا حضور، آپ کی بڑی عنایت ہوگی، تشریف کا ٹوکرا اٹھائیے اور لے جائیے یہاں سے“ رابعہ نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

میں نے دانت نکال کے کہا ”اس کے بغیر بھی میں چلا ہی جاتا۔“

صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ ناشتے کی میز پر ہم سب یکجا ہوئے تو میں رابعہ اور کاجل کو دیکھ کے حیران رہ گیا۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے کپڑے بدلے ہوئے تھے بلکہ نہا دھو کے باقاعدہ سولہ سنگھار بھی کیے تھے۔ سولہ نہ سہی دس بارہ میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ہمارا میزبان غائب تھا۔ صرف ایک ویٹر باادب باملاحظہ ہوشیار کھڑا تھا۔ اسے میں نے چلتا کر دیا۔

”قسمت میں یہ ذلت بھی لکھی تھی۔“ میں نے ناشتے کے لوازمات سے بھری ہوئی میز کو دیکھا۔

”کچھ خدا کا خوف کرو۔ خدا کی نعمتوں کو ذلت کہتے ہو۔“

”نہیں، تمہیں نا، بابا میں حالات کی ذلت کو رو رہا تھا۔ یہ دیکھو کہ ہم کہاں ہیں، کس کا دیا کھا رہے ہیں اور کس کا دیا پہنا ہے تم نے۔“

”اللہ جسے چاہے وسیلہ بنا دے“ رابعہ نے کہا ”اور کیا پتا کل کو تمہارے خیالات ہی بدل جائیں۔“

”کس کے بارے میں؟ پیڈرو کے بارے میں، ناممکن۔“

”ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔ آدمی جذبات کی عینک سے برسوں غلط دیکھتا رہتا ہے پھر کسی دن عقل کی خوردبین مل جاتی ہے تو پتا چلتا ہے

www.paksociety.com

کہ ہمیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا! "تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ کواکب یعنی ستاروں کو خوردبین سے نہیں دوربین سے دیکھا جاتا ہے۔ خوردبین سے تو جراثیم نظر آتے ہیں۔ تمہاری عقل کے جراثیم شاید اس سے بھی نظر نہ آئیں۔"

کاجل نے کہا "تم نے کے بجائے کسی سے پوچھو کہ پیڈرو کہاں گیا ہے آخر؟"

"وہ جہنم میں جائے میری بلا سے" میں نے کہا۔

"ٹھیک وہیں جہاں بالآخر تم جاؤ گے" رابعہ نے کہا۔

"بالکل۔ تمہارے ساتھ۔ ایجاب و قبول کے بعد" میں نے کہا "اور جہوار سے بات کرو۔"

کاجل ہنسنے لگی "عورت تو گھر کو اپنی جنت سمجھتی ہے۔"

"شوہر وہ بالکل ٹھیک سمجھتی ہے۔ تم نے دیکھا ہے کسی فلم میں کسی شوہر کو گاتا کے یہ اعتراف کرتے ہوئے..."

اسی وقت پیڈرو نمودار ہوا "مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ دراصل تم سے زیادہ رات کو میں اس مسئلے کا حل سوچتا رہا۔"

"ہم نے مسئلے کا حل تلاش کر لیا ہے۔"

"میں تو حل کو اپنے ساتھ لے آیا ہوں" پیڈرو بولا "ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے۔ ناشتا کر لیا ہے تو آؤ اس سے مل لو۔"

ڈرائنگ روم میں ایک بھالو نشین رہا تھا مگر وہ پلٹا تو بالکل انسان کا بچہ ثابت ہوا۔ اس کا قد چھوٹا تھا اور جسم اتنا بھاری کہ وہ بھالو کی طرح چلنے پر مجبور تھا۔ اس کے سر پر الجھے ہوئے بالوں کا ڈھیر تھا۔ ناک پر گول شیشوں والا چشمہ اور غالباً اس نے ایک ہفتے سے شیو نہیں بنائی تھی۔ یا وہ خشخشی داڑھی تھی۔

اس نے لپک کے مجھ سے مصافحہ کیا اور پھر مجھے گلے لگا لیا۔ اس کے جسم سے بیک وقت عطر حنا، تمباکو، نسوار اور میل کی بو آ رہی تھی۔

"ہم عاجز ہیں۔"

"کس سے؟" میں نے کہا اور دل میں کہا کہ عاجز تو شاید تم سے زمانہ ہوگا۔

"ارے بھئی ہمارا نام ہے عاجز۔"

پیڈرو نے کہا "انہوں نے پولیس کو بھی ایسا ہی عاجز کر رکھا ہے جتنا مجرموں کو۔ یہ بڑے رہا نسوسم کے کرائم رپورٹر ہیں اور کرائم جہاں بھی ہو وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اسکول میں ہاکی کے میدان میں بیٹا باز رہے۔ یہ غالب کے بڑے مداح ہیں۔"

میں نے ان سے ہاتھ ملایا "آپ جانتے ہیں غالب کو؟"

"غالب کو بھلا کون نہیں جانتا۔ پورا دیوان پڑھا ہے میں نے۔ واہ واہ۔ کیا شعر لکھا ہے ظالم نے۔ کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب، شرم تم کو مگر نہیں آتی۔ ابھی تک حج پر گیا کہ نہیں۔ ہر مسلمان کے لیے بڑی شرم کی بات ہے۔"

میں نے اپنا سر پیٹنا چاہا مگر مجبوری تھی۔ اس جاہل شخص کو

خدا نے وسیلہ بنا دیا تھا تو فائدہ اٹھانا بھی ضروری تھا۔

وہ بدستور غالب کی تعریف میں رطب اللسان تھا "یار اس نے شراب چھوڑی کہ نہیں۔ ہم نے شعر پڑھا تھا اس کا۔ غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی۔ پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں۔ یہ بارش کے موسم میں شراب پیتا ہے۔ افسوس بارش میں تو آدمی پکوڑے کھاتا ہے اور آم کھاتا ہے۔ اور یہ ماہتاب کون ہے؟ اس کے کوٹھے پر جا کے پیتا تھا کبھی کبھی۔"

میں نے کہا "چھوڑیں عاجز صاحب۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اسے ماہتاب کے کوٹھے پر سے ہی بدمعاشوں نے اٹھا لیا اور یہاں قید کر رکھا ہے۔"

"ایسی کی تیسی کر دیں گے ہم سب کی۔ اتنے مشہور آدمی کو اغوا کر لیا۔ ہمارا اخبار ہے "خانہ خراب" اس میں ہم خانہ خرابی کے سب واقعات لکھتے ہیں جن سے اس ملک کا خانہ خراب ہو رہا ہے۔ ابھی آپ چلیں میرے ساتھ۔ کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ انسپکٹر اپنا آدمی ہے۔ یوں نکال لے گا آپ کے دوست کو یوں!" اس نے چٹکی بجائی اور پھر اس چٹکی سے نسوار نکال کے دانتوں میں دبا لی۔

مجھے یقین نہ آیا کہ یہ شخص صحافی ہو سکتا ہے مگر ہر جگہ ایسے بہت سے نام نہاد اخبار اور صحافی ہوتے ہیں جن کو سنجیدہ قاری کبھی تو نہیں ملتے مگر وہ بلیک میلنگ سے ہر جگہ اپنا کام ضرور نکال لیتے ہیں۔ ایسے اخبار چیتھڑے بھی کہلاتے ہیں اور زرد صحافت کے علمبردار بھی۔ جو اس پیشے کو بھی بدنام کرتے ہیں اور انہیں بھی جو اس پیشے سے متعلق ہیں۔

میں نے رابعہ اور کاجل کو پیچھے چھوڑا اور عاجز صاحب کے ساتھ پیڈرو کی گاڑی میں روانہ ہو گیا۔ راہنمائی کرنے والا خود پیڈرو تھا مگر عاجز صاحب کو پورا پتا سمجھانے کے بعد وہ راستے میں گاڑی سے اتر گیا۔ غالباً وہ پولیس کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔

پولیس کا سب انسپکٹر ایک جیپ میں عاجز صاحب کا منتظر تھا اور خاصا بے زار نظر آتا تھا "خو یار عاجز صاحب آپ ہم کو بہت عاجز کیا۔ اپنا ادارا افسر لوگ کو پتا چلا تو۔"

"یار کیسے پتا چلے گا؟ اور تم کون سا غلط کام کرنے جا رہے ہو۔ اغوا شدہ آدمی کو بازیاب کرنا کیا تمہارا کام نہیں ہے؟ علاقہ بھی تمہارا ہے پھر ڈر کیسا؟ بندہ برآمد کرو اور مجرموں کو پکڑو۔ کل دیکھو کیسی دھوم مچے گی تمہارے کارنامے کی۔"

"مجرم مسلح ہیں؟" اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

"تم ڈرتے ہو؟" عاجز صاحب نے کہا "وہ ایسے مجرم نہیں ہیں جو پولیس سے مقابلہ کریں۔ بس اب چلو اب دیر مت کرو۔"

نامعلوم راستوں سے گزرتے ہوئے بیس منٹ بعد ہم لوگ ایک بستی کے مضافات میں خالی نظر آنے والے گھر کے سامنے رک گئے۔ میرا دل اس خیال سے دھڑک رہا تھا کہ شاید چند منٹ میں غالب اور نازو سے پھر ملاقات ہو جائے گی۔ میرے دل میں پیڈرو

کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہونے لگا تھا جو کچھ عرصہ پہلے ایک ناممکن سی بات ہوتی مگر میں اس حقیقت سے روپوشی اختیار نہیں کر سکتا تھا کہ غالب اور نازو کی بازیابی صرف اسی کی وجہ سے اس کی مدد اور کوشش سے ممکن ہوئی۔

سب انسپکٹر نے موقع واردات کا جائزہ لیا اور اپنے دو سپاہیوں کو حکم دیا "تم ادھر والے مکان سے چھت پر چلے جاؤ۔ تم پیچھے جاؤ۔ مجرم گلی سے نہ فرار ہو جائیں۔"

دو سپاہی اس کے حکم کے مطابق پیچھے والی گلی میں اور ساتھ والے مکان کی چھت پر پہنچ گئے۔ ساتھ والے مکان میں اکیلی عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ کمرے میں چھپ گئی۔ اس کے لیے تو قانون کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا اور پولیس سے اپنے گھر میں داخل ہونے کا اختیار نامہ طلب کرنا ہی بہت بڑا جرم تھا۔

ادھر ادھر کے بہت سے گھر آباد تھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ قریب آ کے پولیس سے اس کارروائی کا سبب معلوم کرتا۔ جو یہ حماقت کرتا وہ اصل مجرم سے پہلے مشتبہ افراد میں شامل ہو جاتا اور وہ حل در معقولات کی سزا تھانے جا کے پاتا۔

وہ متوسط طبقے کی آبادی تھی اور جس گھر کا پولیس نے محاصرہ کیا تھا وہ بھی عام قسم کا گھر تھا۔ اس کے دروازے کھڑکیاں بند تھے۔ مکان پر حال ہی میں پلستر مکمل ہوا تھا مگر رنگ نہیں ہوا تھا۔ بظاہر اس میں زندگی کے آثار مفقود تھے لیکن میں جانتا تھا کہ غیر قانونی طور پر کسی کو محبوس رکھنے کے لیے ایسی ہی آبادیاں اور اسی قسم کے گھر بہترین پناہ گاہ ثابت ہوتے ہیں۔

ہر طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد سب انسپکٹر نے دروازے پر دستک دی۔ اس کے دستک دینے کا انداز بھی اتنا کرخت تھا کہ نیا دروازہ بھی ہل گیا۔ اس کے باوجود اندر خاموشی رہی۔ اس نے دوسری بار لات ماری اور چلا کے کہا "اوئے اندر کون ہے۔ باہر نکل۔"

اس جملے میں وہ الفاظ محکمہ جاتی تھے جو صرف پولیس استعمال کرتی ہے اور ان کا اثر بھی وہی ہوتا ہے جو طلسماتی غار پر علی بابا کے "کھل جا سم سم" کہنے سے ہوا تھا۔ ایک دم دروازہ کھل گیا اور ایک داڑھی والا جوان آدمی معصوم صورت بنائے سامنے آ گیا۔

"السلام علیکم تھانے دار صاحب، خیر را نغلے۔ حکم؟" اس نے تھانے دار سے مصافحہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"اوئے حکم دا بچہ۔ دوڑا ہے۔ پہلی باری میں دروازہ کیوں نہیں کھولا تھا؟" تھانے دار نے گرج کے کہا۔

"وہ حضرت صاب! ہم ادھر تھی۔ اجابت خانہ شریف میں۔" اس نے مسکینی سے منمنا کے کہا۔

"اجابت کا بچہ۔ چل ہٹ ایک طرف۔ اندر کس کو چھپا رکھا ہے؟" تھانے دار نے اس کی داڑھی پکڑلی اور زور زور سے ہلانے لگا۔

یہ بات غلط تھی کہ اس وقت میں بھونچکا رہ گیا جب داڑھی

تھانے دار کے ہاتھ میں آ گئی اور میں نے اپنے سامنے ایک کلین شیو شخص کو دیکھا۔ اس نے ایک دم جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تھانیدار سے پہلے میں نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ میں نے اس کے بازو پر شانے کے نیچے ہاتھ مارا اور وہ بلبلا کے دوہرا ہو گیا۔

تھانے دار نے اس کی جیب میں سے ریوالور نکال لیا اور اس پر پل پڑا۔ اس وقت تک باقی سپاہی بھی اندر پہنچ چکے تھے۔

میں نے اندر جاتے ہی چیخ کے کہا "غالب! کدھر ہے تو؟"

پولیس والے دھڑ دھڑ کمروں کے دروازے کھول رہے تھے۔

میں نے پھر چلا کے نازو کو آواز دی۔ "میں سکندر ہوں" لیکن اس آسیب زدہ گھر کی ویرانی اور خاموشی میں کوئی ولدار جواب نہ آیا۔

عاجز صاحب نے کہا "یہاں تو کوئی نہیں ہے جی۔"

سب انسپکٹر نے کہا "مروا دیا نا ہمیں عاجز صاحب۔ ابھی چلو۔"

میں نے کہا "ایک منٹ یہ راستہ جو نیچے جا رہا ہے، اسے بھی دیکھ لیں۔"

میرے کانوں کو دھوکا ہوا تھا یا شاید چیخ میں نے غالب کی آواز سنی تھی۔ پولیس والوں سے پہلے میں دوڑتا ہوا تہ خانے میں جانے والی سیڑھیوں پر اتر گیا۔

آخری سیڑھی کے بعد دروازہ تھا۔ میں نے لات مار کے اسے کھولا اور اپنی جگہ پتھر کا بت بن گیا۔

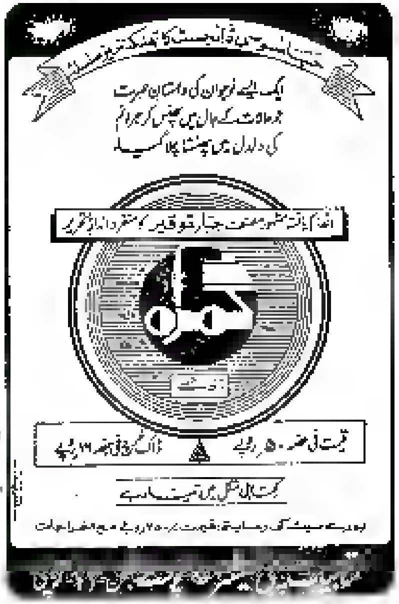

www.paksociety.com

نیچے ایک نیم تاریک ہال سا تھا جس کی دیواروں پر گرے سیمنٹ کا رنگ بھی سیاہی مائل محسوس ہوتا تھا۔ مکان حال ہی میں مکمل ہوا تھا یا ہنوز تعمیر کے مراحل میں تھا۔ چنانچہ اس کے بند دروازوں اور دریچوں میں محبوس ہوا میں نمی گیلی سیمنٹ اور تازہ لکڑی کی مخصوص بو تھی۔ فرش پر لکڑی کے ٹکڑے اور بڑھئی کے رندے سے اترنے والے پتلے پتلے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔

دیواروں پر لائٹس کے پوائنٹ ضرور نظر آ رہے تھے لیکن فٹنگ ابھی باقی تھی۔ روشنی کا عارضی انتظام ایک بلب ہولڈر لگا کے کیا گیا تھا جو چھت کے وسط میں پنکھے کے لیے مخصوص ہک سے معلق تھا مگر سو واٹ کے اس بلب کی روشنی تہ خانے کی تاریکی کو چیرنے میں یوں ناکام تھی جیسے گہری کہر آلود دھندلی صبح کے ماحول میں کار کی ہیڈ لائٹس الجھ کے چند گز تک محدود ہو جاتی ہے۔

میری نظروں کو تہ خانے کی ویران دیواروں سے ٹکرا کے مایوسی کے زخموں کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔ غالب اور نازو کہیں نہ تھے اور میرے لیے یہ ذہنی صدمہ اس شاک سے کم نہ تھا جو یقین کامل کی غیر متوقع شکست سے ہوتا ہے۔ جب آدمی ایک خیال یا ایک تصور کو حقیقت تسلیم کر لیتا ہے' وہ سپاٹ دیوار پر بنی ہوئی تصویر کو دروازہ مان لیتا ہے اور اس میں سے گزرنے کی کوشش کرتا ہے یا یہ سمجھ لیتا ہے کہ بجلی بند ہے اور ننگے تار کو اطمینان اور اعتماد کے ساتھ پکڑ لیتا ہے۔

مجھے بھی یقین تھا کہ دروازہ کھلے گا تو ایک بار غالب روبرو ہو گا اور نازو کا چہرہ نظر آئے گا اور میرے اس یقین میں ایک فیصد بے یقینی بھی شامل نہ تھی۔ انہیں غیر موجود پا کے بھی کچھ دیر تو مجھے یقین نہ آیا کہ حقیقت وہی ہے جو میری نظر میں ہے اور وہ فقط آرزو کا نقش خیال تھا جسے میں نے جذبات کے اندھے پن میں حقیقت مان لیا تھا۔ میں نے ہر گوشے کو اور سپاٹ "اندھی" دیواروں کی بے حسی میں چھپی ہوئی ویرانی کو بار بار کھنگالا مگر وہاں کچھ ہوتا تو مجھے نظر آتا۔ کمرے کے فرش پر دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان پر دریاں تھیں اور دریوں پر جو چادر تھی' اس کی ہر شکن وہاں کچھ دیر پہلے کسی کی موجودگی کا اقرار کرتی تھی۔ تکیوں پر چکنائی کا ہلکا سا پھیلا ہوا دھبا خبر دیتا تھا کہ اس پر کسی نے اپنا سر رکھا تھا۔ درمیان میں لگی ہوئی چھوٹی سی میز پر دو خالی مگ رکھے ہوئے تھے اور شیشے کے ایک گلاس میں تھوڑا سا پانی تھا۔

میں نے گلاس اٹھایا اور اس کے کناروں کو دیکھا۔ ان سے غالب یا نازو کے لب مس ہوئے تھے۔ کسی ارادے کے بغیر اور سوچے سمجھے بغیر میں نے دو چند گھونٹ پی لیے۔ مجھے یوں لگا جیسے اس پانی میں بھی غالب کی خوشبو تھی یا شاید نازو کی۔ ایک گلاب اور دوسرے گلاب کی خوشبو میں فرق کہاں ہوتا ہے۔ ویسے بھی وہ الگ نہیں تھے کہ ان کے وجود کا ایک دوسرے سے الگ کوئی تصور ممکن ہوتا۔

آہستہ آہستہ جھک کے میں نے بستر کی ایک ایک شکن پر ہاتھ پھیرا اور اس لمس نے خود مجھ سے کہا "کیا تم مجھے نہیں جانتے۔ میں تو دوستی کے لمس کی مہک ہوں اور صبر رفاقت کی وہ خوشبو ہوں جس سے تم آشنا ہو۔"

میں نے تکیہ اٹھایا۔ وہ ایک معصوم بچے کی طرح مسکرا دیا تھا جسے ماں کی آغوش کا محبت بھرا احساس مل گیا ہو۔

رابعہ نے میرا بازو پکڑ کے کہا "سکندر!"

اس کی آواز میں رقت تھی' درد کا مجروح اعتراف تھا اور ناامیدی کے آزار کا ملال بے نوا تھا۔

میں نے کہا "رابعہ! وہ یہیں تھے۔ دیکھو وہ کہاں گئے۔ آخر کہاں جا سکتے ہیں وہ؟ ان دیواروں سے کون گزر سکتا ہے؟"

"سچ بولی حضرت صاحب۔ بند دروازے میں سے گزر سکتا ہے۔" یہ آواز عاجز صاحب کی تھی "جنات کا معاملہ مختلف ہوتا ہے لیکن ان کو قید کون کر سکتا ہے۔"

رابعہ نے چلا کے کہا "اس نقلی داڑھی والے کو سب معلوم ہو گا کہیں وہ نہ نکل جائے۔"

"ابھی ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید کیے ہیں؟" اس نے اپنے سر پر خودرو گھاس کی طرح اگنے والے جھاڑ جھنکاڑ کو مٹھی میں پکڑ لیا "کیا سمجھے؟ ہم تجربے کی بات کرتے ہیں اور تجربہ دھوپ میں جھک مار کے ملتا ہے' گھر میں بیٹھ کے نہیں حضرت صاحب۔ غالب نکل گیا سو نکل گیا' اب ملزم نکل جائے تو ہم خانہ خراب کرائیں پولیس کے سارے محکمے کا۔"

تھانے دار نے سہلایا "خانہ خراب تو ہو چکا اپنا۔ عاجز صاحب! آپ نے میری پیٹی اتروا دی۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"مگر کیوں نہیں ہے؟ یہی تو سوال ہے انسپکٹر" عاجز صاحب نے اپنی خشخشی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے فرمایا "وہ کہاں گئے جو یہاں قید میں تھے؟"

"کوئی بھی نہیں تھا یہاں۔ آپ کے کہنے پر چھاپا مارا میں نے کسی اختیار کے بغیر" تھانے دار کی آواز میں رقت آ گئی۔

"تمہاری پیٹی اترے گی' ضرور اترے گی" عاجز صاحب نے انگلی اٹھا کے کہا "لیکن اس وقت جب تم نے نالائقی کا مظاہرہ کیا۔ غضب خدا کا! اردو کا اتنا مشہور شاعر۔ اسے ظالموں نے یہاں قید کر رکھا تھا۔ زمانہ کیا کہے گا۔"

"یہ کیا بولتے ہو عاجز صاحب! کیسا غالب' کون غالب؟ مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا" تھانے دار بولا۔

"دیکھو' یہ دیکھو.... غور سے ہر چیز کو دیکھو۔ سراغ رسانی کرو تھانے دار! عقل استعمال کرو" عاجز صاحب نے ہاتھ سے ایک ایک چیز کی طرف اشارہ کیا "آخر کوئی تو تھا یہاں۔ وہ کہاں گیا؟ یہ چائے کس نے پی تھی؟ پانی کس کے لیے رکھا ہوا ہے۔"

"عاجز صاحب' مکان زیر تعمیر ہے۔ رہتے ہوں گے یہاں مزدور۔"

"فرض مت کرو' پتا کرو۔ جس کی داڑھی اتاری تھی تم نے' اس کی کھال بھی اتار لو۔ وہ جانے گا' اس کا باپ بھی بتائے گا۔"

میں صدمے سے سنبھل جانے کے باوجود گم صم کھڑا ہوا ان کے مکالمے سن رہا تھا۔ اگر مجھے شک ہوتا کہ پیڈرو نے جھوٹ بولا تھا اور وہ مجھے بے وقوف بنانے کے لیے یہاں لایا تھا تو میں اس سے نمٹ لیتا مگر مجھے یقین آ چکا تھا کہ پیڈرو کا مقصد مجھے دھوکا دینا نہیں تھا۔ اس کی معلومات بھی درست تھیں۔ شاید اس سے کہیں کوئی بھول ہو گئی تھی اور کسی نے قبل از وقت اس کے ارادوں کی خبر آگے پہنچا دی تھی۔ غالب اور نازو کو قید رکھنے والے انہیں بروقت نکال کر کہیں اور لے جانے میں کامیاب ہو چکے تھے اور سانپ نکل جانے کے بعد لکیر ہی کو پیٹا جا سکتا تھا۔ خواہ اس سے کچھ حاصل ہو یا نہ ہو۔ پولیس اور عاجز صاحب یہی کر رہے تھے۔

عاجز صاحب کی بات نے مجھے یاد دلایا کہ ہمیں اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایک ملزم ہمارے قبضے میں تھا اور اس سے یقیناً کچھ نہ کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا۔ کوئی کتنا ہی سخت جان کیوں نہ ہو اور قوت ارادی کا کیسا ہی مظاہرہ کیوں نہ کرے' جب پولیس والے اسے گنے کی طرح بیلتے ہیں' بار بار نکالتے ہیں اور پھر نچوڑتے ہیں تو رس کی طرح وہ معلومات اگلنے لگتا ہے ورنہ پھوک کی طرح رہ جاتا ہے۔ جن بیلوں میں تیل نہ ہو' انہیں بھی پولیس اپنے تشدد کے کولھو میں ڈال کے رگیدتی ہے تو تیل خود بخود باہر آ جاتا ہے اور اسی کو یہاں تفتیش کا عمل کہا جاتا ہے جس کے لیے مجسٹریٹ بھی جسمانی ریمانڈ دیتے ہیں۔ ملزم کی جسمانی صحت اور قوت برداشت کے مطابق ایک ہفتے کے لیے یا دو ہفتے کے لیے۔ اس سے ہمیشہ دو حیرت انگیز نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ یا وہ ملزم ثابت ہو جاتا ہے یا ملزم ثابت نہیں ہوتا۔ دوسری صورت میں کہا سنا معاف' دل صاف۔ رشوت کا صدقہ نذرانہ دے کر زیر تفتیش بحوالات کے گھر آتا ہے تو رسوائی اور مار کے خوف سے آواز نہیں نکالتا اور پولیس کے خلاف بے سبب ایذا رسانی اور ہتک عزت کے قانونی مسائل کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی ڈرتا ہے کہ یا وقت ضائع ہو گا یا وہ خود۔ جو اقرار کر لیتے ہیں اور بیشتر ملزم کے مرتبے سے بڑھ کے مجرم بن جاتے ہیں' ان کی خوب تشہیر ہوتی ہے اور تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ پولیس ہر جرم کا سراغ لگا لیتی ہے حالانکہ پکڑے جانے والوں اور چھاپے میں ہاتھ آنے والوں کی اکثریت مخبروں کو دعا دیتی ہے جو ملزموں کے درمیان رہتے ہیں اور انہی کے ساتھی نظر آتے ہیں مگر وہ ایک ہاتھ سے مال غنیمت وصول کرتے ہیں تو دوسرے ہاتھ سے مخبری کا انعام۔

اوپر سے نقلی داڑھی والے کے چلانے کی آواز آ رہی تھی اور اس سے زیادہ انسپکٹر کے دہاڑنے کی۔ تڑ تڑ کی آوازیں واضح طور پر جوتا کاری سے پیدا ہو رہی تھیں۔ تفتیش بذریعہ چھتروں کا آغاز ہو چکا تھا۔

عاجز صاحب نے کہا "آؤ جی حضرت صاحب! اب ادھر کیا رہ گیا ہے دیکھنے کو۔ اوپر چل کے تفتیش دیکھتے ہیں۔ یہ تھانے دار دیکھنے میں تو پڑھا لکھا' شریف اور احمق لگتا ہے مگر جملہ صفات معکوس رکھتا ہے۔ غالب صاحب کو یوں برآمد کرے گا یوں" اس نے چٹکی بجائی۔

میں نے کہا "غالب کیا مال مسروقہ ہے کہ یوں برآمد ہو جائے گا؟ ایک تھانے کے مال خانے سے کچھ سامان منگوا کے کسی آوارہ گرد کے ساتھ تصویر بنوائی' کرائم رپورٹرز کو بیان دیا کہ رنگے ہاتھوں پکڑا جانے والا ملزم فلاں فلاں وارداتوں میں ملوث تھا' اتنی چوریوں اور اتنی ڈکیتیوں کا اعتراف کر چکا ہے۔ یہ خبر اخبار میں' مال واپس مال خانے میں اور آوارہ گرد سرکاری مہمان خانے میں۔"

عاجز صاحب نے گردن ہلائی "کہتے آپ بھی سچ ہو مگر خانہ خراب بھی سچ لگتا ہے۔ ابھی حضرت صاحب! مال مسروقہ نہیں غالب تو پھر کیا ہے؟ اتنا بڑا شاعر' ایک قومی اثاثہ' اردو زبان کی آبرو۔ اسے کوئی اغوا کرے اور حبس بے جا میں رکھے پھر دوسرا اچکا کے لے جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

میں اس کے ساتھ اوپر گیا "ایسا ہو چکا ہے۔"

"آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا" عاجز صاحب نے کہا "بے چارہ ویسے ہی دل کا مریض تھا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "غالب دل کا مریض تھا؟"

"اور کیا۔ ہم نے خود اس کا شعر پڑھا تھا دسویں جماعت میں۔"

"کون سا شعر؟"

"وہی یار۔ دل بدبخت تجھے ہوا کیا ہے۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟" عاجز صاحب نے کہا۔

"بدبخت نہیں' دل ناداں......"

"وہی۔ ناداں ہی بدبخت ہوتا ہے" عاجز صاحب نے کہا "مگر دیکھو' اس میں صاف انجائنا کا ذکر ہے۔ ہمارا بھی دل میں ادھر درد ہوتا ہے۔ ایک گولی رکھتا ہے ادھر زبان پر۔ دل بدبخت کا درد غائب۔"

میرا دل چاہتا تھا کہ اپنا سر پیٹ لوں یا عاجز صاحب کو پیٹ ڈالوں۔ اس نے شاید میٹرک تک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد زندگی میں پھر کبھی کتاب سے یا اہل کتاب سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھا تھا چنانچہ غالب کے جو شعر اس نے شرح کے ساتھ رٹ کے یاد کیے تھے' وہ اب بھی حافظے میں محفوظ تھے مگر اسے یہ علم نہ تھا کہ غالب زمانۂ حال کا شاعر تھا یا گزرے وقتوں کا۔ کتاب میں تو سب ہی کے فرمودات تھے۔ میر' غالب اور اقبال سے فیض اور قتیل شفائی تک۔ کون مر گیا ہے اور کون جیتا ہے۔ نہ اس نے

www.paksociety.com

معلوم کیا' نہ کسی نے اسے بتایا۔ اس سے زیادہ تو وہ مجرموں کے بارے میں معلومات رکھتا تھا کہ فلاں ڈاکو مارا گیا اور فلاں مفرور ہے اور زندہ ہے مگر اس نے خود کو مُردہ مشہور کروا دیا ہے۔ پولیس کی مدد سے۔

ادھر عجیب تماشا جاری تھا۔ سپاہی ہر طرف سے ملزم کو گھیرے ہوئے تفتیش کے کارِ خیر میں بڑے زور و شور سے حصہ لے رہے تھے۔ زور ان کا تھا' شور ملزم کا۔ ایک کے ہاتھ میں وہ نقلی داڑھی تھی جو ملزم کی بدقسمتی کے باعث تھانے دار کی دراز دستی کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کے رخِ پُرنور کو داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ ایک سپاہی اسے یوں لہرا رہا تھا جیسے کھیل کے میدان میں فاتح کپتان ٹرافی اٹھاتا ہے۔ باقی سب کانسٹیبل ایک جوتا پکڑے کھڑے تھے' دوسرا ان کے ہاتھ میں تھا۔ ان کے افسر کے لیے پاؤں کی جوتی اپنے دستِ مبارک سے اٹھانا شایانِ شان نہ ہوتا' وہ کرسی کی بیلٹ کھول کے شمشیر بکف سپہ سالار کی طرح کھڑا تھا۔

"ذ" اس آواز کے ساتھ ہی ملزم اچھلا اور اس نے ایک ایسی چیخ ماری جو رمضان کے مہینے میں بجائے جانے والے سائرن کی آواز تھی "ہائے ہم مرگیا۔ بالکل مرگیا ابھی.... ہائے ہائے ہم پھر مرگیا۔ کلمہ شریف پڑھتی ہے' درود شریف پڑھتی۔"

ایک کانسٹیبل نے سانس اندر کھینچ کے جوتا سر سے اوپر اٹھا لیا تھا۔ اس کا ہاتھ نیچے آگیا۔ اس کی صورت پر تاسف کے ساتھ کچھ بے بسی کی جھنجلاہٹ تھی۔

"سر چپ کروا دو اس حرامزادے کا۔ رک کیوں گئے؟"

ایک سپاہی نے دوسرے کی طرف دیکھا "سر! یہ درود شریف پڑھ رہا ہے۔"

تھانے دار نے جھنجلا کے کہا "ارے یہ حرامی چالاک ہے بہت۔ اس کے بعد تلاوت شروع کردے گا۔"

نقلی داڑھی والے نے بلند آواز میں قرأت شروع کردی۔ چھترول کرنے والے تذبذب میں پڑ گئے۔ ان کے نزدیک کسی تلاوت کرنے والے کے سر پر جوتے سے طبلہ بجانا یقینی گناہ کی بات تھی۔

رابعہ بالکل خاموش اور حد درجہ دل زدہ سی میرے قریب کھڑی تھی "کچھ حاصل نہیں اس سے سکندر' یہ سب احمق ہیں اور جاہل۔"

"ہم بہت عقلمند ہیں' ہم کیا کرسکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"واپس جا کے بیٹھ رہتے ہیں۔"

"اتنی جلدی کیا ہے؟ کچھ پتا نہ چلا تو ظاہر ہے واپس جائیں گے۔ کچھ دیر انتظار کرو' شاید تفتیش کا کوئی مفید نتیجہ نکل آئے۔ میرا دل کہتا ہے کہ اس مکار مولوی کو ضرور علم ہوگا کہ غالب کو کہاں لے جایا گیا ہے۔" میں نے کہا۔

تھانے دار نے حکم دیا "اس کا والیوم بند کردو۔ نیچے لے جاؤ اسے۔"

نقلی داڑھی والا زیادہ اونچی آواز میں خوب مل مل کے تلاوت کرنے لگا۔ اس کا یہ حربہ مؤثر ثابت ہو رہا تھا۔ مشکل یہ آپڑی تھی کہ پکے مسلمان سپاہی اس منہ میں کچھ ٹھونسنے پر بھی آمادہ نہ تھے جس سے قرأت کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ بے شک یہ کلامِ الٰہی کا غلط استعمال تھا اور کوئی مجرم اگر گناہ کا مرتکب ہو تو قابلِ درگزر نہیں ہوسکتا۔

"سر جی! حکم ہے کہ جب کوئی خدا کا کلام پڑھے تو ادب سے سنو۔" ایک کانسٹیبل نے کہا "اب یہ کب تک بچے گا' یہ ذرا خاموش ہو جائے۔"

"یہ حافظ ہوا تو پورا دن اور پوری رات گزار دے گا۔ تم اس انتظار میں یہاں کھڑے رہوگے؟" تھانے دار نے جھنجلا کے کہا۔

عاجز صاحب نے اس کی تائید کی "یہ چالاکی ہر مجرم دکھا سکتا ہے۔ مسجد میں گھس کے نماز پڑھنے لگے یا پھانسی کے تختے پر قرأت شروع کردے تو کیا وہ بچ جائے گا؟"

تھانے دار خود بیلٹ کو استعمال کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کج فہم ماتحت اس کی حرکت پر مشتعل ہو کے بغاوت نہ کردیں۔ خود میں منتظر تھا کہ تھانے دار اس مشکل کا کوئی حل نکالے۔

اس نے فوراً حل نکال لیا "اچھا مولوی کو تلاوت کرنے دو۔ بے شک نقلی داڑھی بھی لگا دو واپس اس کے چہرے پر۔ اس کے گھر جاؤ اور اٹھا لاؤ جو ہے۔ اس کا باپ یا بھائی۔ گھر تو معلوم ہے نا؟"

سپاہی سے پہلے میں نے کہا "مجھے معلوم ہے' کون جائے گا میرے ساتھ؟"

مجھے اندیشہ تھا کہ احمق کانسٹیبل فوراً لاعلمی کا اعلان کردیں گے اور تھانے دار نے تھوڑی سی ذاتی عقل استعمال کرتے ہوئے جو چال چلی ہے وہ بےکار ہو جائے گی۔

"چلو تم دونوں جاؤ" تھانے دار نے کہا۔

ابھی ہم دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ مولوی کا حوصلہ جواب دے گیا "آپ خلقت پر ظلم کرتی' اللہ کا عذاب نازل ہوتی۔ قرآن شریف میں آئی ہے۔"

مگر اس سے پہلے کہ وہ آیت کا حوالہ دیتا' تھانے دار نے اس کو ناہنجار بیلٹ مار مار کے لٹایا۔ وہ ہر مرتبہ "ہم مرگیا' بالکل مرگیا" کہہ کر مرغی کی گردن کے ساتھ فرش پر اچھلتا اور چلاتا رہا۔ تھانے دار نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور گھسیٹ کر اسے نیچے لے گیا۔ عاجز صاحب کی رہنمائی میں ایک غلط کام کرنے کے بعد وہ سنجیدہ ہوگیا تھا کہ اس چھاپے سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں گے۔

"رابعہ نے مجھ سے چمٹ کے کہا "سکندر! بس...."

"یہ کیا؟" میں نے اس سے بازو چھڑایا "ملاؤں کے بھوت کو تم باتوں سے منا سکتی ہو تو کوشش کرکے دیکھ لو۔ میں تھانے دار کو منع کرتا ہوں۔ اور ہاں' یہ عام ایسی بے تکلفی صرف فلموں میں دکھائی جاتی ہے بلکہ پسند کی جاتی ہے مگر ہم شوٹنگ پر نہیں آئے ہیں۔ تین فٹ کا شرعی فاصلہ رکھو اپنے اور میرے درمیان۔"

"یہ لوگ غالب کو کہاں لے گئے ہوں گے؟"

"میرا ہوتا تو شاید مری لے جاتے مگر وہاں سردی ہوگی ابھی۔"

"مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں میں۔"

"مجھے معلوم ہے آپ حماقت کے موڈ میں ہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ میں اس سوال کا کیا جواب دوں۔ یہ ساری محنت اور تفتیش اسی سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہو رہی ہے۔ میں بتا سکتا کہ غالب کو وہ کہاں لے گئے ہوں گے تو پھر ہم سیدھے وہاں نہ چلے جاتے۔"

رابعہ نے جھینپ کر کہا "خواہ مخواہ مست رہا تو مجھے۔ تمہارا خیال پوچھ لیا تھا میں نے۔"

"چلو پہلے تم اپنا خیال بتاؤ۔ جب تک خود ملزم صحیح سمت میں راہنمائی نہ کرے' ہم اندازوں کا کھیل کھیلتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کس کا اندازہ درست ثابت ہوتا ہے۔"

"میں سخت ڈپریشن کا شکار ہوں۔ آج اگر غالب اور نادیہ نہ ملے تو بہت برا ہوگا۔"

"اس سے زیادہ برا کیا ہوگا۔ پاگلوں جیسی باتیں تم اس وقت بھی کر رہی ہو۔" میں نے کہا "آج کی شرط میں کون سی تک ہے۔ وہ تو جب ملنا ہوگا ملیں گے۔"

رابعہ واقعی نروس بریک ڈاؤن کے قریب تھی۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا اور اسے شدید جذباتی دباؤ کا نتیجہ نہ ہوتا تو وہ ایسی باتیں کبھی نہ کرتی۔ میرے رویے کا بھی کوئی جواز نہ تھا۔ مجھے سمجھنا چاہیے تھا کہ وہ میرے غیر ہمدردانہ اور کسی حد تک مایوسی اور دل شکنی میں اضافہ کرنے والے رویے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ یہ بحث کہ کون زیادہ قوتِ برداشت رکھتا ہے۔ مرد کہ عورت۔ نفسیات اور میڈیکل سائنس کی ریسرچ کے اعداد و شمار سے کچھ بھی ثابت ہو' میں یہ جانتا تھا کہ میرے مقابلے میں رابعہ میں جذباتی مزاحمت اور طاقتِ برداشت کم ہے۔ اس کا مظاہرہ وہ ایک بار پہلے بھی کرچکی تھی جب ہم سب مشرقی پاکستان کے محاذ پر ایک سے مخالف حالات کے مقابل نبرد آزما تھے مگر وہ حوصلہ ہار چکی تھی اور چپکے سے لاہور لوٹ گئی تھی۔

اچانک اس کی آنکھوں میں اشکوں کی نمی ابھر آئی جیسے برسات میں ایک دم کالی گھٹا اٹھے۔ پھر یہ نمی سیلِ اشک میں ڈھل گئی۔ ایسا برساتوں کے بادل ڈوب گئے ہوں۔

"اُف' ارے بھئی رابعہ! اتنا حوصلہ ہار دو گی؟" میں نے جھک کے کہا "موقع محل دیکھ کے رونا چاہیے۔ کیوں عاجز صاحب؟"

دراصل عاجز صاحب کی موجودگی کے باعث ہی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کرنے کے سوا میں کچھ نہ کرسکا ورنہ ایسا تو پہلے بھی ہوا تھا جب میں نے اسے بانہوں میں قید کرلیا' تھوڑا سا مسکایا' پچکارا اور اس کی اشک بار آنکھوں سے بہتے دھاروں کو اپنے لبوں سے بند کردیا۔

عاجز صاحب نے کہا "یار! کچھ کرو۔ رابعہ صاحبہ کو چپ کراؤ۔"

میں نے کہا "آپ فرمائیے کیا کروں؟"

"علاج بالمثل" وہ بولے "رونا اگر شدید ہو۔"

"میں سمجھا نہیں" میں نے بے بسی سے کہا۔

"ردِ عمل جو ہسٹریا ہے' یہ ردِعمل ہوتا ہے اور اس کا علاج بھی ردِعمل ہے۔"

"رابعہ پلیز! آئی ایم سوری..." میں نے عاجز صاحب کے ارشادات کو نظرانداز کرتے ہوئے رابعہ کا ہاتھ پکڑ لیا مگر اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

عاجز صاحب میری حالت سے لطف اندوز ہو رہے تھے "آپ ایک کو نہیں سنبھال سکتے' خیر سے اپنے گھر میں چار ہیں۔ بلحاظ عمر بھی نمبر ایک سینئر ہے۔ وہ غم اور موسم کی خانہ جنگی کے اسباب پیدا کرسکتی ہے۔ ورنہ خود نہیں لڑتی' انہیں لڑا کے الگ ہو جاتی ہے۔ پھر جناب انجیر وان ریفری کے فرائض سنبھالتی ہے۔ مگر وہ ناکام رہے تو پھر ہم اپنے ہاتھ کا کمال دکھاتے ہیں۔ ایک جھانپڑ رسید کرنا ہے جناب جو عام دوا کے کارگر نہ ہونے کی صورت میں اینٹی بایوٹک..."

اینٹی بایوٹک سے پہلے میں نے بھی وہ نسخۂ شفا استعمال کیا جس میں پیار محبت کا مکسچر اور منت سماجت کی گولیاں تھیں اور علاج کے لیے فرصت بے حد ضروری تھی۔

عاجز صاحب نے بغلیں جھانکتے ہوئے فرمایا "ٹھیک ہے۔ اپنا اپنا طریقہ ہے۔ میں ذرا نیچے جا کے دیکھتا ہوں' تفتیش کیسے ہو رہی ہے۔"

میں نے انہیں بھاگنے پر مجبور کردیا تھا۔ سسکیاں لے کر روتی ہوئی اور منہ چھپا کے لرزتی ہوئی رابعہ کو میں کب تک دیکھتا رہتا۔ بالآخر میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا اور یہ بھول گیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں اسے شرعی فاصلہ برقرار رکھنے کی تاکید کر رہا تھا۔

"چھوڑ دو مجھے' پاگل ہوا ہے میں" رابعہ نے مچل کے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔ میں بھی تو پاگل ہوں۔ تمہیں کیسے چھوڑ دوں" میں نے اسے منانے کے لیے راست اقدام کیا "پاگل کی گرفت سے خود کو چھڑا سکتی ہو تو چھڑا لو۔"

اس کا جوش و خروش ایک دم سرد پڑ گیا "چھوڑ دو مجھے خدا کے لیے' ابھی آجائے گا کوئی بدتمیز' جاہل..... بے شرم۔"

www.paksociety.com

"اور بھی جو کہنا ہے کہہ لو۔ چھوڑوں گا میں اس وقت جب تم مسکرا کے دکھاؤ گی ورنہ جو دیکھتا ہے دیکھتا رہے' مجھے کسی کا ڈر نہیں" میں نے مزید جارحانہ عزائم کا مظاہرہ کیا۔

اس وقت وہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اور عاجز صاحب کی فراہم کردہ خلوت کا مختصر وقفہ طویل بحث اور روٹھنے منانے کے لیے ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ روتے روتے مسکرانا تو رابعہ کے بس میں نہ تھا مگر اس کا ہسٹریا اس خوف میں دب گیا کہ پیچھے سے کوئی نمودار ہو گیا تو جگ ہنسائی ہو گی۔

"ایک منٹ دوں گا میں مسکرانے کے لیے" میں نے اسے چھوڑتے ہوئے کہا۔

اس نے سکون کی گہری سانس لی اور فوراً دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں خشک کر لیں "بلیک میل کرتے ہو' بدمعاشی دکھا کے۔"

میں نے ڈھٹائی سے دانت نکال کے کہا۔ "تم ہی مجبور کرتی ہو کہ ہم شرافت چھوڑ دیں۔ بدمعاشی کے بغیر کہاں مانتی ہے تمہاری قوم' ایکٹریس ہے ذات عورت کی۔"

"آ گئے نا اوچھے پن پر۔"

"آنسو اور ہسٹریا' یہ جذباتی بلیک میلنگ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ ہٹلر بھی ہتھیار نہ ڈالے تو کیا کرے" میں نے کہا "جواب نہ ہو کسی بات کا یا زبردستی کچھ منوانا ہو تو۔۔۔"

میری بات عاجز صاحب کے نمودار ہونے سے نامکمل رہ گئی۔ انہوں نے پہلے مجھے اور پھر رابعہ کو غور سے دیکھا اور غالباً مطمئن ہو گئے کہ ایک کامیاب شوہر کی طرح میں علاج نمبر ایک یعنی پیار سے صورت حال پر قابو پانے میں کامیاب رہا اور علاج نمبر دو یعنی جھانپڑ کی نوبت نہیں آئی۔

ان کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی "خوش خبری سب معلوم ہو گیا۔"

میں نے مضطرب لہجے میں کہا "کیا۔۔۔ غالب کا پتا چل گیا؟"

"کیسے نہ چلتا۔۔۔ ہم پر لعنت' ہماری صحافت پر لعنت اور اعلیٰ تعلیم پر لعنت' اگر ہم غالب جیسے شاعر کے لیے بھی کچھ نہ کریں۔ ہم تو پولیس کے سارے محکمے کا خانہ خراب کر دیتے۔"

سیڑھیوں سے ہاتھ جھاڑ کے پیٹی باندھتا ہوا تھانے دار پہلے اوپر آیا۔ اس کے پیچھے ملزم تھا جو اب صاف مجرم نظر آ رہا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے' آنکھوں کے گرد نیل تھے۔ ایک آنکھ تو تقریباً بند تھی اور دوسری سے دنیا اسے یقیناً بدلی ہوئی نظر آ رہی ہوگی۔ ممکن ہے دن میں تارے نظر آ رہے ہوں یا سورج چاند ایک ساتھ چمکتے دکھائی دے رہے ہوں۔ فضا دھندلی ہو یا زمین الٹی گھوم رہی ہو۔ جب وہ نیچے گیا تھا تو اس کے حواس خمسہ ضرورت سے زیادہ تیز تھے اور وہ سب کو چکر دے رہا تھا۔ اوپر آیا تو خود چکرا رہا تھا۔ بقول شاعر چلے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا۔

وہ ایسے چل رہا تھا جیسے نشے میں ہو۔ یہ نشہ پالش تھا اور خمار چھترول تھا۔

"چل بے پدر سوختہ" تھانے دار نے اس کے ایک لات ماری "پڑھ کلمہ شریف اور پھر درود شریف پڑھ کے بتا غالب صاحب کہاں ہیں؟"

اس نے یکبارگی جانے والے تار کے ساتھ چلنے والی گاڑی کی طرح بولنا شروع کیا "جناب اٹک کے پل شریف سے آگے نہیں۔۔۔ پیچھے اکوڑہ خٹک شریف سے آگے۔۔۔"

تھانے دار نے اسے ایک اور لات ماری "آگے پیچھے کی اولاد! جگہ کیا ہے' تو ساتھ جا ان کے۔۔۔ راستہ بتا۔"

وہ جھٹکے کھڑے کی طرح لڑکھڑا گیا اور پھر چلانے لگا "اللہ قسم مر گئے۔ بالکل مر گئے۔ پھر مر گئے۔ ہم بتاتی۔ تو۔۔۔ غالب صاحب فرمائی' کوئی صورت نظر نہیں آتی' آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاتی ہے۔"

"آپ جائیں جی اس ولد۔۔۔ فلاں فلاں کے ساتھ" تھانے دار نے اپنی فادری زبان میں اس کے شجرۂ نسب میں خود کو شامل کر کے کہا "اور عاجز صاحب! آپ اس کا خانہ خراب کر دینا کل کے اخبار میں لیکن میرا ذرا خیال کریں۔ بہت بڑا کیس میں نے یوں حل کر دیا۔"

"ایسے چٹکی بجا کے تم سارے مجرم کیوں نہیں پکڑ لیتے؟ اور یہ تو ہم نے بتایا اور تم مجبوراً ہمارے ساتھ آ گئے۔ خیر ہم خیال رکھیں گے" عاجز صاحب بولے۔

"وہ دراصل۔۔۔ ابھی کچا تھانے دار ہوں نا جی' اس لیے ذرا ہوں قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے۔"

"پکے ہو جاؤ گے تو طوطے کی طرح نظریں پھیر لو گے ہم سے۔ خیر ہم نے بھی یہ بال دھوپ میں سفید کیے ہیں۔ نسخہ لیں گے بعد میں۔ ابھی تم ایسا کرو' آدھا سیر بکرے کا گوشت اور کچھ پھل ہمارے گھر میں بھجوا دینا۔ میں ذرا ان کے ساتھ جاؤں گا پوری رپورٹ دینے کے لیے جانے واردات پر میری موجودگی ضروری ہے۔ تمہاری نفری بھی ساتھ جائے گی نا؟ یہ جیپ چھوڑ جاؤ۔"

"جیپ چھوڑ جاؤں! خود کیا پیدل جاؤں؟"

"پیدل چلنے والے ہوتے تو یہ تربوز اتنا بڑا نہ ہوتا" عاجز صاحب نے اس کے پیٹ میں انگلی چبھوئی "چالان کر لینا کسی کا۔ وہ خود تمہارا جنازہ ذمہ کر لے جائے گا۔"

اس کے ماتحت دانت نکالنے کی گستاخی پر آمادہ تھے۔ تھانے دار نے ان پر ایک نگاہ غضب ڈالی۔ "او بے حرام خورو' ملزم کا خیال رکھنا۔ یہ ایک نمبر کی حرامی چیز ہے اور تم ہو الو کے پٹھے۔ آنکھوں میں دھول جھونک کے نہ نکل جائے۔ واپسی میں بیان ہو گا سب کا۔ غالب صاحب کا بھی۔"

"کیوں نہیں' کیوں نہیں" عاجز صاحب چہکے "ذرا تھانے میں استقبال کا اچھا انتظام کرنا۔ خاطرداری میں کمی نہ ہو۔ اردو کا اتنا بڑا شاعر پہلی بار تھانے آئے گا۔"

میں نے کہا "پہلی بار کہاں عاجز صاحب! وہ تو اکثر تھانے جاتے تھے۔"

عاجز صاحب نے پہلے اسے مذاق جانا اور نظر انداز کر دیا۔ پولیس کے دو سپاہی ملزم کے ساتھ خود کو باندھ کر جیپ میں بیٹھ گئے کہ راستے میں وہ کودنے کی کوشش کرے تو اس کے ساتھ ہی قانون کے محافظ بھی سڑک پر گریں۔ تیسرے نے ڈانواڈول جیپ کی باگ ڈور سنبھالی۔ عاجز صاحب نے کار کی پچھلی سیٹ پر تشریف کو رکھا اور مجھے جیپ کا تعاقب کرنے کی تاکید کی۔ رابعہ آگے میرے ساتھ تھی اور اب ہم جی ٹی روڈ پر راولپنڈی کی جانب رواں تھے۔ ڈرائیونگ رابعہ کر رہی تھی۔

عاجز صاحب نے کچھ دیر بعد خاصی تشویش کے ساتھ کہا "وہ آپ جو کہہ رہے تھے غالب صاحب کے بارے میں' وہ مذاق تھا نا؟"

"بالکل نہیں۔ وہ اکثر تھانے جاتے تھے۔"

"آخر کس جرم میں؟"

"ایک بار جوا کھیلتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ قرض خواہ پکڑوا دیتے تھے۔ قرض کی پیتے تھے مے" میں نے مذاق میں ایک حقیقت بیان کی۔

"شراب پیتا تھا ادھار لے کر۔ توبہ توبہ!" عاجز صاحب نے اپنے گالوں پر تھپڑ مارے "جوا کھیلتا تھا۔ توبہ توبہ۔ اسی لیے تو بیڑا غرق ہو رہا ہے نونہالانِ قوم کا۔ میں اس پر کالم لکھوں گا۔ نصاب سے اس کے سب شعر نکال دیے جائیں۔ ایسے بدکردار شاعر کا کلام اسکول کالج کی کتابوں میں بالکل نہیں ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "غالب کی اصلاح کے لیے بھی کچھ کریں آپ۔"

"کیوں نہیں۔ ہم اسے اپنے پیر صاحب کی خدمت میں پیش کریں گے۔ ان کے ہاتھ پر بیعت کرے' ان کی خدمت کرے' انشاءاللہ ٹھیک ہو جائے گا۔ آخر اردو زبان کا اتنا بڑا شاعر ہے جتنے ڈاکٹر صاحب۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کون ڈاکٹر صاحب؟"

"اپنے ڈاکٹر علامہ سر اقبال صاحب سیالکوٹ والے" عاجز صاحب کی معلومات مکمل تھیں "والد صاحب فرماتے تھے' اللہ نے بڑی شفا دی تھی ان کے ہاتھ میں۔"

میں نے کہا "اچھا! آپ بھی ملے ان سے؟"

انہوں نے ایک آہ بھری "جی ایسی قسمت کہاں۔ بس آج غالب سے ملاقات ہو جائے تو ساری عمر فخر کریں گے۔ والد صاحب نے شرف ملاقات بخشا تھا۔"

"ڈاکٹر اقبال شاعر مشرق کو؟" رابعہ نے طنز سے کہا۔

"جناب والد صاحب خاص طور پر پشاور سے لاہور گئے تھے۔ خود مجھے بتاتے تھے کہ ان کے ساتھ لاہور والوں نے کیا سلوک کیا" عاجز صاحب نے شکایتی' پُرسوز لہجے میں کہا "وہ اُدھر اسٹیشن پر اترے تو شیو بڑھی ہوئی تھی۔ باہر نکلتے ہی فٹ پاتھ پر بورڈ دیکھا اسلامی ہیئر کٹنگ سیلون کا تو بیٹھ گئے۔ بغیر ٹکٹ کے سفر کیا تھا۔ ٹکٹ چیکر آیا تو وہ گھس گئے بیت الخلا میں۔ چیکر کافر تھا' ہندو۔ اسے معلوم ہو گیا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا مگر جناب' والد صاحب بھی باہر نہیں نکلے۔ سنا ہے لاہور پر اترا تو اپنی شکست کی خفت کو چھپانے کے لیے کہہ رہا تھا کہ سالے مُسلے کو رات بھر ٹھنڈا اس میں بند رکھا۔ خیر کہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ رات بھر کھڑے رہے تھے اور جاگتے رہے تھے۔ ذرا سی جھپکی آئی ہو گی۔ اتنی دیر میں اس خانہ خراب اسلامی باربر نے سر صاف کر دیا۔ ایک دم اُسترا پھیر کے والد صاحب کی برسوں کی محنت خاک میں ملا دی۔ انہوں نے تو ڈاکٹر اقبال صاحب کے کہنے پر عمل کیا تھا۔ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر۔ سر میں خالص مکھن ملتے تھے' پھر روغن آملہ۔ مربہ آملہ ناشتے میں نوش کرتے تھے۔ گیسوئے تابدار کی جگہ تابدار سر رہ گیا اور انہیں پتا ہی نہیں چلا۔"

میں نے ہنسی کو بڑی مشکل سے ضبط کر رکھا تھا "پھر کب پتا چلا۔ جب اولے پڑے؟"

"اولے؟" عاجز صاحب نے سوچ کے کہا "نہیں۔ بہت تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ گھنے بال تھے تو پتہ کم لگتی تھی۔ حجامت کا واقع تھا۔ ڈائریکٹ مغز گرم ہوا تو والد صاحب جلال میں آ گیا۔ چلانے لگا کہ خانہ خراب۔ اب ہم ڈاکٹر اقبال صاحب کو کیسے بتائے گا کہ ہم نے گیسوئے تابدار کو کتنا تابدار کیا تھا۔ غصے میں اسلامی باربر کے گھونسا رسید کر دیا۔ خاندانی بندوق ساتھ ہوتی تو شاید۔۔۔ شاید کیا' یقیناً وہیں اس کو فنا کر دیتے۔ باربر اُدھر ہی لیٹ گیا۔ خانہ خراب مکر کرتا تھا جیسے فوت ہو گیا۔ اس کا ایک شاگرد باری کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ وہ پہلوان تھا۔ روز اکھاڑے جانے سے پہلے وہ کونڈے دہی کی لسی پیتا تھا اور سر کی شیو کراتا تھا۔ اس نے والد صاحب کو پکڑ لیا اور اُدھر ہی چت کر دیا۔ وہ دب گئے گوشت کے پہاڑ کے نیچے۔ ویسے بھی پردیسی مسافر تھے۔ ایک خانہ خراب شاہی دندان ساز اُدھر بیٹھا تھا۔ اس نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور والد صاحب کا دو دانت زنبور سے کھینچ لیا۔ فٹافٹ سے۔"

اب میرے لیے ہنسی کو روکنا محال تھا "وہ کس لیے؟ کیا بقر عید قریب تھی؟"

"بقر عید! آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" عاجز صاحب بھونچکے رہ گئے۔

"اس نے کسی بکرے کے لگائے ہوں گے دو دانت۔ ان کی بڑی مانگ ہوتی ہے" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

عاجز صاحب نے بُرا نہیں مانا "بھائی یارا تم بولو، پڑوسی مہمان کے ساتھ ایسا سلوک اچھا بات ہے؟ آپ کے ساتھ کسی نے کوئی غلط بات کیا؟"

میں نے انہیں پشاور میں پیش آنے والے جان لیوا واقعات کے بارے میں بتانے کا سوچا اور پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ مجھے ان کی باتوں میں مزہ آ رہا تھا اور خود رابعہ بھی بہت لطف لے رہی تھی۔ اس کی ہنسی روکے نہیں رُک رہی تھی۔ ہم وقتی طور پر بھول گئے تھے کہ اس سفر کے اختتام پر کیا ہوگا؟ ہماری تلاش بار آور ہوگی یا ایک بار پھر مایوسی کا سامنا ہوگا؟ غالب اور نازو مل گئے تو کیا ہوگا اور نہ ملے تو کیا ہوگا؟ غالب کی رہائی کے لیے خطرات کی رزم گاہ میں کودنا پڑا تو ماکانہ بندوقوں والے روتا اہل سپاہی کون سی توپ چلا گئے تھے۔ ایک جاہل، مجہول، نام نہاد صحافی خانہ خراب کرنے کی دھمکی دے کر ہمیں کیسے بچائے گا؟ اور کسی خانہ خرابی کے بغیر غالب اور نازو ہمیں مل گئے تو پھر اس پیر تسمہ پا بن کے عاجز کر دینے والے عاجز صاحب سے پیچھا چھڑانے کی کیا صورت ہوگی؟ قانون کے محافظوں سے کیسے جان چھوٹے گی؟ یہ سب سوالات فی الحال پس منظر میں چلے گئے تھے۔

میں نے سنجیدگی اختیار کر کے کہا "آپ کے والد صاحب کے ساتھ واقعی لاہور والوں نے زیادتی کی تھی۔ خیر یہ بتائیے، ڈاکٹر صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی یا نہیں؟"

انہوں نے افسوس سے سر ہلایا "کدھر جناب۔ ان کا ایک خدائی فوجدار ملازم تھا۔ اللہ بخش۔ ہر بار اس نے روک دیا کہ ابھی لوگ بیٹھے ہیں۔ وہ ہر روز جاتے، ہر روز یہی ہوتا۔ پھر ایک دن والد صاحب نے کہا کہ میں اپنا کان دکھانا چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب کو۔"

"کان میں کیا ہوا تھا؟"

"وہ..... دراصل پہلوان نے ان کو چت کرنے کے بعد کان بھی کھینچے تھے۔ وہ خانہ خراب تو کان اکھاڑ لیتا مگر پولیس آ گئی اور سب کو تھانے لے گئی۔ والد صاحب نے تین یوم تھانہ گڑھی شاہو میں قیام و طعام فرمایا۔ وہاں سے ڈاکٹر اقبال صاحب کا غریب خانہ قریب تھا۔ میرا مطلب ہے دولت خانہ۔ والد صاحب کے ایک کان میں واقعی تکلیف تھا۔ وہ کان تھوڑا باہر بھی نکل آیا تھا۔ انہوں نے بولا کہ کاغذ دو، میں رقعہ لکھ کے دیتا ہوں۔ تمہاری شکایت بھی لکھوں گا کہ میں پشاور سے آیا ہوں اور تم نے دروازے پر روک رکھا ہے۔ بس جناب" اس نے پرچی دیا اور والد صاحب نے اپنا تکلیف بیان کیا اور خدا بخش کا بھی بہت شکایت کیا۔ وہ رقعہ اندر لے گیا اور واپس آ گیا۔"

ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے "پھر کوئی نسخہ لکھا تھا ڈاکٹر صاحب نے اور اس ملازم کو کیا ہوا؟"

"نسخہ بھی لکھا تھا ایک شعر میں۔ ملازم کی شکایت کے جواب میں یہ لکھا تھا کہ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر۔ مطلب یہ کہ اس جاہل کو معاف کر دو۔ والد صاحب کے لیے لکھا تھا کہ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔ یہ معلوم نہیں ہوا کہ کون سے پھول کی پتی سے ورنہ ہیرے کا جگر کاٹ کے استعمال کرنے سے ضرور فائدہ ہوتا۔"

رابعہ کا برا حال تھا "بس کرو سکندر۔"

میں نے پیٹ پکڑ کے کہا "عاجز صاحب! ہیرے کا جگر نہیں، کھیرے کا جگر لکھا ہوگا۔ اور پھول ہوگا گوبھی کا۔ آپ کے والد صاحب سمجھ نہیں سکے۔ حکیم الامت تمام سبزیوں کے خواص ضرور جانتے ہوں گے۔ ویسے کیا یہ ان کا اپنا ہینڈ رائٹنگ تھا۔"

"شاید کمپونڈر کو نسخہ لکھوایا ہوگا" رابعہ بولی۔

عاجز صاحب کچھ آزردہ تھے کہ ہم ان کے والد صاحب کی جہالت پر ہنس رہے ہیں "والد صاحب ہماری طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھے مگر بڑے علم دوست تھے۔ ایک دوست تھا محمد عالم، دوسرے کا نام علم الدین۔"

میں نے کہا "آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی؟"

"جناب، ڈگری اور تعلیم میں بڑا فرق ہے۔ ہم ابھی تک طالب علم ہی سمجھتے ہیں خود کو حالانکہ میٹرک کی ڈگری بہت پہلے لے لی تھی۔"

میں نے کہا "صحافت کا خیال کیسے آ گیا آپ کو؟"

"بس ہم نے محسوس کیا کہ ہم میں صلاحیت ہے۔ ملک کا خانہ خراب ہو رہا تھا۔ ہم نے قلم اٹھایا اور کود پڑے میدان میں۔"

میں نے آہستہ سے کہا "کاش آپ مینارِ پاکستان سے کود گئے ہوتے۔"

رابعہ زور سے ہنسی لیکن اس نے فوراً میری بات کو دبا دیا "اخبار کب جاری کیا آپ نے؟"

"بہت پرانی بات ہے، کئی سال ہو گئے" انہوں نے گول مول جواب دیا "چور، ڈاکو، راشی افسر، بدعنوان پولیس والے، بدمعاش اور اسمگلر سب کا خانہ خراب کر دیا۔ خانہ خراب کے نام سے ڈرتے ہیں سب۔ عاجز کے قلم سے سب عاجز ہیں۔"

"اشاعت کتنی ہے؟" میں نے کہا۔

"لاکھوں قاری ہیں اس کے" عاجز صاحب نے چالاکی سے جواب دیا "اصل بات اشاعت نہیں ہوتی۔ بہت سے اخبار ہیں جن کو پڑھتا ہی کوئی نہیں یا ان کا اثر نہیں ہوتا۔ ہم خاص خاص لوگوں کو خاص طریقے سے پڑھواتے ہیں۔ عام لوگوں کو عام طریقے سے۔"

"یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی" میں نے کہا۔

"اس کی اعزازی کاپی خاص خاص لوگوں کو مفت پہنچائی جاتی ہے۔ اسمبلی کے ممبر، ڈپٹی کمشنر، ایس ڈی ایم، پولیس کے اعلیٰ افسران، صوبائی وزرا اور گورنر، مرکزی حکومت کے ارکان۔ اور

ان کو جن کے بارے میں سرخیاں ہوتی ہیں۔ جو کاپیاں بچ جاتی ہیں وہ ہم پوسٹر کی طرح سارے شہر میں لگا دیتے ہیں۔ نیچے سے اوپر تک کو معلوم ہو جاتا ہے۔ بس اسٹاپ، ریلوے اسٹیشن، سینما۔ ہر جگہ لوگ خود دیکھ لیتے ہیں۔ اور مجرم کے ساتھ ہم اس کے خاندان کی تصویر بھی لگا دیتے ہیں کہ یہ ہے اس کا باپ، یہ بھائی اور یہ سب سے خبردار۔ بڑی بے عزتی ہوتی ہے ان کی جو ہمارا کہنا نہیں مانتے۔"

میں نے کہا "عاجز صاحب! یہ صحافت ہے یا بلیک میلنگ؟"

عاجز صاحب چراغ پا ہو گئے "کیا بولتے ہیں جناب! یہاں شرافت سے کام چلتا ہے؟ صبح سے شام تک ہر شخص بلیک میل ہوتا ہے اور کرتا ہے۔ میری ماں بلیک میل کرتی ہے مجھے کہ میں نے تجھے پیدا کیا اور پالا۔ میری مان ورنہ میں دودھ نہیں بخشوں گی۔ ایک بیوی کہتی ہے، میکے چلی جاؤں گی، دوسری کہتی ہے خودکشی کر لوں گی، تیسری کا بھائی بدمعاش ہے۔ اس سے ڈراتی ہے مجھے۔ اور میری بات چھوڑو، معاشرے میں کیا ہو رہا ہے؟ محبت میں کیا بلیک میلنگ نہیں ہوتی۔ فرہاد کو کتنا بلیک میل کیا شیریں نے۔ ہوتی ہے یا نہیں؟"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا "بہت زیادہ ہوتی ہے۔"

"اور خانہ خراب سیاست میں بلیک میلنگ کے سوا کیا ہے۔ امریکا بولتا ہے یہ مت کرو ورنہ امداد بند، وہ مت کرو ورنہ ہم خانہ خراب کرے گا۔ ابھی بنگلہ دیش کے معاملے میں مجیب نے کتنا بلیک میل کیا۔ ابھی اس تھانے دار کو ڈر نہ ہوتا تو وہ تمہاری مدد کرتا؟ صحافت میں کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے۔"

میں نے کہا "چار بیویوں کی حاضر اسٹاک میں موجودگی بھی آپ کی کامیابی کا ثبوت ہے ورنہ لوگ تو ایک بھی افورڈ نہیں کر پاتے۔ یقیناً آپ کا گھر بھی بہت بڑا ہوگا۔ بڑے گھر کی آبادی بھی بڑی ہوگی اور ان کا خرچ بھی بڑا ہوگا۔ ظاہر ہے اس کے لیے بڑی آمدنی چاہیے۔"

"اللہ کے فضل سے دو بسوں کی آمدنی ہے۔ پشاور، پنڈی کا روٹ پکڑ رکھا ہے۔ دو ٹرک ہیں۔ کوئٹہ تک جاتے ہیں اور ہر قسم کا مال لاتے ہیں" عاجز صاحب نے فخر سے کہا۔

"انہیں کوئی بھی نہیں پکڑتا ہوگا، وہ چرس لائیں یا اسمگلنگ کا سامان۔ کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ ان سے بھتہ لے یا محصول۔ ان کا چالان بھی نہیں ہوتا ہوگا۔ کون پولیس افسر یا کسٹم انسپکٹر اپنی اور خاندان کی تصویریں پوسٹر کی صورت میں دیکھنا چاہے گا۔ آپ نے جو کوٹھی یا حویلی بنائی ہوگی، اس کے ماتھے پر 'ہٰذا من فضل ربی' ضرور لکھا ہوگا۔ آپ خیراتی اداروں کو چندہ بھی دل کھول کے دیتے ہوں گے۔"

"بالکل ٹھیک سمجھے آپ... لیکن..."

"میں ایک حاجی کو جانتا ہوں جو درحقیقت بہت بڑا پاپی ہے۔ نام اس کا عبداللہ ہے مگر یہ بھی غلط ہے۔ وہ شیطان کا چیلا ہے۔ اللہ کا بندہ ہوتا تو اپنی قبر کے لیے جہنم کے انگارے جمع نہ کرتا جس کو وہ بینک بیلنس کہتا ہے۔ اس کی ایک فٹ کی داڑھی ہے۔ تم بھی رکھ لو، پھر اس میں اور تم میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ وہ پھلوں کا آڑھتی ہے اور تم زرد صحافت کے آڑھتی ہو۔ لعنت خدا کی تم دونوں پر!"

عاجز صاحب کو آگ لگ گئی "کیا بکتے جا رہے ہو؟"

"بہت دیر تمہاری بکواس سن لی تھی میں نے۔ اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا میں" میں نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا اور اپنی نظر سڑک پر کر لی۔

"میں خانہ خراب کر دوں گا تمہارا۔"

"تمہاری چار بیویوں کے بیوہ ہونے کا خیال نہ ہوتا تو میں تم کو جہنم رسید کرنے کا ثواب ضرور حاصل کر لیتا" میں نے کہا "تم کیا خانہ خراب کرو گے میرا۔ جس نے اپنی عاقبت خراب کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ تم صحافت کے مقدس پیشے کے نام پر کلنک کا ٹیکا ہو۔"

"میں بتاؤں گا تمہیں" عاجز صاحب نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا "تم کو پتا چل جائے گا کہ میں کیا ہوں۔"

"تمہیں بھی پتا چل جائے گا بیٹے کہ ہم کیا ہیں۔ اور دنیا کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ تم کیا ہو۔ تم ساری دنیا کو بے نقاب کرنے کی دھمکی دے کر اپنا الو سیدھا کرتے رہے ہو، اب ہم بے نقاب کریں گے تمہیں۔"

"تم کیا چیز ہو؟" اس نے حقارت سے کہا۔

"ایک نام یاد رکھنا۔ ایم آر ایس" میں نے کہا "مائٹ از رائٹ سوسائٹی" تم ان پڑھ ہو اس لیے بتاتا ہوں کہ اس کا مطلب ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے قانون کو ملک کا دستور بنانے والوں کی دشمن جماعت جس میں باضمیر، مخلص اور محبِ وطن اچھے لوگ شامل ہیں۔ کبھی نہ کبھی تمہارا بھی واسطہ اس سوسائٹی سے پڑے گا۔"

"یارا، پھر کیا ہوگا؟ ایسے لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہیں اور آج تک انہوں نے کیا تیر مارا ہے؟"

"وقت بدلتے دیر نہیں لگتی عاجز صاحب۔ دل میں قوم کا درد رکھنے والے، حق اور انصاف پر عملاً یقین رکھنے والے اور اصول پرست لوگ اپنی آواز رکھتے ہیں۔ وقتی طور پر اس آواز کو دبانے والے کتنا ہی شور کیوں نہ کریں، نقارے بجائیں یا ڈھول، پاگل کتوں کی طرح بھونکتے رہیں یا پھر بندوق سے دھماکے کریں، ان کی آواز کو ختم نہیں کر سکتے۔ منافق اور دوہرے معیار رکھنے والے ہی اس ملک کے سب سے بڑے دشمن ہیں، جن کا ایمان ہے مفاد پرستی لیکن تم دیکھو کہ اتاترک، چو این لائی، قائداعظم اور مصر کے صدر ناصر جیسے لوگوں نے کیا کیا۔ پہلے ان کی ایک آواز تھی مگر پھر

سب ان کے ہمنوا ہو گئے اور انھوں نے تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دیا‘ قوموں کی تقدیر بدل دی۔“

”اور اب یہ کام تم کرو گے؟ تم تو خود مفرور اور مجرم ہو‘ دنیا سے منہ چھپائے پھرتے ہو۔“

”تم جیسے بڑے مجرموں نے ہی ہمیں مجرم بنایا ہے تاکہ تم ہمارے مقابلے میں بے قصور نظر آؤ لیکن ایم زرائیں جھوٹ اور فریب کا یہ پردہ ضرور ہٹائے گی اور تمہارا اصلی چہرہ ضرور دکھائے گی بے ایمان تاجر‘ بدعنوان انتظامیہ‘ کرپٹ افسر‘ راشی محکموں کے تھیٹرے‘ عوام کی جان و مال اور آبرو کے دشمن‘ منافق مُلّا اور تم جیسے جعلی صحافی۔ ان سب کے خلاف ہماری کھلی جنگ ہے۔ تمہیں ہم تمہاری بساط پر تمہاری ہی چالوں سے شکست دیں گے۔ ہم تمہارے ہی جال سے تم کو شکار کریں گے۔“

عاجز کچھ متاثر اور مرعوب نظر آنے لگا تھا۔ ”اگر میں تمہیں پکڑوا دوں تو یہ سارے دعوے جھوٹے اور بے معنی ہو جائیں گے۔“

”پہلی بات تو یہ کہ اس وقت تم ہمارے قبضے میں ہو‘ ہم تمہارے قبضے میں نہیں ہیں۔“ میں نے کہا ”میرے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے کہ تمہاری یہ بیٹھے بیٹھے گردن توڑ کے تمہیں چلتی گاڑی سے باہر گرا دوں۔ دوسری بات یہ کہ ایم زرائیں صرف میں نہیں‘ یہ تو ایک جذبہ‘ ایک یقین اور ایک طاقت ہے جس کی جڑیں اس ملک کے عوام میں اور ان کے خون میں‘ زمین کے رشتوں میں اور فضاؤں میں‘ نہ جانے کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ تم نے امر بیل تو دیکھی ہوگی۔ وہ کسی درخت سے چمٹ جائے تو پھر نہ اس کی ابتدا کا پتا چلتا ہے نہ انتہا کا۔ تم سمجھ لو کہ ایم زر ایسی بدکرداری کے درخت سے چمٹ جانے والی امر بیل ہے۔ بدکرداری بہت وسیع لفظ ہے جو ہماری تمام قومی خامیوں اور خرابیوں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ یہ درخت سوکھ جائے گا اور اپنی موت آپ مر جائے گا۔ یا اسے گرانا پڑے گا۔ سارے وطن دشمن اور عوام کے دشمن اکٹھے ہو کے خود کو بہت طاقتور محسوس کرنے لگے ہیں مگر میں ایک سچ کی بات بتاتا ہوں تمہیں‘ اس پر غور کرنا۔ دنیا میں اگر ناقابلِ شکست کوئی چیز ہے تو وہ ایک نظریہ ہے۔ جب گلیلیو نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ یہ دنیا ہے جو سورج کے گرد گھومتی ہے تو اس کا سر قلم کروا دیا گیا مگر کیا اس سے نظریہ ختم ہوا؟ نظریۂ پاکستان کو انگریز اور ہندو اپنی طاقت‘ عیاری‘ ذہانت اور سرمائے سے ختم کر سکے؟ ایک کرپٹ معاشرہ بالآخر خودکشی کر لیتا ہے۔“

”تم تو بہت قابل آدمی ہو“ عاجز صاحب نے کہا ”تم کس چکر میں پڑ گئے ہو؟ تم سی ایس ایس کر کے سیاست میں آتے‘ تجارت کرتے۔“

”سیاست سے تجارت اور ملازمت سے صحافت تک ہر اچھا کام تم جیسے لوگوں کی وجہ سے ایک گالی بن کے رہ گیا ہے۔ تاجر کو چھوڑ دو‘ اس کا نام تو پہلے سے بدنام ہے مگر سیاست داں‘ علما اور صحافی‘ یہ تو قوم کی راہنمائی کرتے ہیں‘ احتجاج کے امانت دار کہلاتے ہیں‘ نیک و بد اور حق و باطل کا فرق بتاتے ہیں۔ علما ہمیشہ ظالم حکمرانوں کے خلاف کلمۂ حق سے جہاد کرتے رہے۔ ظفر علی خاں اور حسرت موہانی جیسے صحافی کاروانِ آزادی میں قائداعظم جیسے محسن کے دستِ راست رہے۔ جب یہی لوگ بے ایمان اور بے کردار ہو جائیں تو پھر قوم کا نہ بھٹکنا ناممکن ہے۔ تمہارا نام بھی ہم نے اسی فہرست میں لکھ لیا ہے۔“

”بہت احسان فراموش ہو تم۔ میں نے کیا برائی کی تمہارے ساتھ کہ تم میرے ہی دشمن بن گئے ہو؟ یہ صلہ ہے نیکی کا؟“

”احسان ہوتا ہے شریف زادی کا اور نیکی کرنے والے صلے کی تمنا نہیں رکھتے“ میں نے کہا ”تم نے محض اپنی سنسنی خیز صحافت کی دکان چمکانے کے لیے ہمارا ساتھ دیا۔ رابعہ! ذرا گاڑی روکنا۔“

رابعہ نے بریک پر پاؤں رکھا ”کیا ہو گیا؟“

عاجز صاحب نے کہا ”پولیس کی گاڑی آگے نکل جائے گی۔“

میں چند سیکنڈ میں پیچھے جا بیٹھا ”اب چلو۔ ذرا رفتار بڑھاؤ۔“

”فکر مت کرو‘ میں انہیں نظر سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی“ رابعہ بولی۔

”اب ایک راز کی بات بتاؤ“ میں نے بے تکلفی سے عاجز صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ”استاد پیڈرو سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا ”کوئی تعلق نہیں۔ ویسے شہر کا ہر بدمعاش جانتا ہے مجھے۔“

”کیا تم ہمدردی بھی کرتے ہو ان سب کی؟“

”لاحول ولا قوۃ۔“

”استاد پیڈرو بھی بہت بڑا بدمعاش ہے۔ تم اس کی مدد کے لیے کیسے آمادہ ہو گئے؟ کہ اس کے گھر پہنچ گئے۔“

”مجھے غالب کے بارے میں معلوم ہوا۔۔۔“

”میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔“

”یہی سچ ہے“ وہ بضد رہا۔

میں نے کہا ”استاد پیڈرو نے تمہیں کیا فیس ادا کی تھی اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کی؟“

وہ بری طرح چونکا ”تم الزام لگا رہے ہو مجھ پر۔“

”ہاں۔ تم صفائی پیش کرو۔“ میں نے کہا ”ثابت کرو کہ تم نے اس سے کچھ نہیں لیا تھا۔“

اس کا رنگ اڑ گیا تھا ”میں قسم کھا سکتا ہوں۔۔۔“

”قسم جھوٹے لوگ زیادہ کھاتے ہیں“ میں نے کہا ”تم بعد میں کہو گے کہ میں نے جان بچانے کے لیے جھوٹی قسم کھائی تو کوئی گناہ نہیں کیا۔ جان خطرے میں ہو تو حرام بھی حلال ہو جاتا ہے لیکن میں استاد پیڈرو کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور اب تمہیں بھی

جان گیا ہوں۔ وہ مجھے بتا دے گا۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہا ”پانچ ہزار۔“

”کہاں ہیں وہ پانچ ہزار؟ نکالو“ میں نے ہاتھ بڑھایا۔

وہ کچھ سٹ پٹایا ”تم کیوں۔۔۔ چھیننا چاہتے ہو؟“

”ہو بھی تو میں مانگ رہا ہوں“ میں نے کہا۔

”لیکن کیوں۔۔۔“

”مجھے ضرورت ہے“ میں نے کہا ”تمہیں پانچ ہزار سے کیا فرق پڑے گا؟“

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ اپنی جیب میں گیا۔ میں بظاہر بے پروا نظر آنے کے باوجود بہت محتاط تھا چنانچہ اس نے ایک دم ریوالور نکالا تو کسی دشواری کے بغیر میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

”یہ بھی دے دو۔“ میں نے اس کی کلائی کو موڑ کے کہا۔

وہ درد کی شدت سے بلبلایا اور ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ”یہ میں اپنی حفاظت کے لیے ساتھ رکھتا ہوں۔“

”مگر میرے خلاف تم نے جارحیت کا ارتکاب کیا“ میں نے ریوالور اٹھا کے جیب میں ڈال لیا۔

”تم نے مجبور کر دیا تھا مجھے۔“

”تم واقعی مجبور ہو۔ لاؤ نقد نکالو کتنا ہے جیب میں؟“

”جیب میں۔۔۔ تو بہت زیادہ ہے“ اس کا حلق خشک ہونے لگا۔

”ہمیں بھی بہت زیادہ کی ضرورت ہے اور اپنی ضرورت ہم ایسے ہی پوری کرتے ہیں۔ تم جیسے لوگوں سے خراج وصول کرنا کارِ ثواب ہے۔ تمہاری کون سی حلال کی کمائی ہے جس کے جانے کا دکھ ہو رہا ہے۔“

”تم نے سب بکواس کی تھی میرے سامنے کہ تم یہ ہو اور وہ ہو۔ تم صرف ڈاکو ہو‘ غنڈہ گردی کرتے ہو“ وہ چلانے لگا۔

میں نے کہا ”میں بتا چکا ہوں کہ ہم تمہیں تمہاری بساط پر تمہاری ہی چال سے مات دیں گے۔ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔ یہ تمہارا روپیہ ہوگا تم نے مگر ہمارے پاس یہ سرمایہ قومی تعمیر کے مقاصد میں استعمال ہوگا جو تم جیسے لوگوں کی تجوری سے نکلے گا۔ مثلاً ہم ایک اخبار نکالیں گے‘ بہت بڑے پیمانے پر اور اس میں صحافت وہ ہوگی جس کی کسوٹی ہے دیانت داری۔ ہم جہاد کریں گے باطل کے خلاف‘ بددیانت لوگوں کے پیچھے سے۔ ہر میدان میں اپنے حریفوں کا مقابلہ انہی کے سرمائے کی طاقت سے ہوگا۔“

”اخبار نکالنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔“

”ہاں۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ تم جیسے لوگوں کو چوک کے اڈے پر ہونا چاہیے یا بدکاری کے اڈے پر“ میں نے کہا ”اس کے بعد جیل میں اور بالآخر جہنم میں ہونا چاہیے اور انشاءاللہ ہم تمہیں منتہائے مقصود تک پہنچا کے دم لیں گے۔ دلوں میں نفرت پالنے والے لسانی اور منافق مُلّا کا بھی وہی ٹھکانا ہوگا اور وہ ظالم‘ وطن فروش سیاست کاروں کا بھی۔ چائے کی جگہ دال کے چھلکوں کا عرق پلانے والوں سے لے کر نقلی دواؤں سے معصوم بچوں کو موت کی نیند سُلانے والوں تک سب سے نمٹ لیں گے ہم۔“

”تم شیخ چلی کے خاندان سے ہو؟“ وہ بولا۔

”اور تم غالباً ابوجہل کی نسل سے ہو۔ تمہیں یہ معلوم نہیں کہ اُردو کا وہ عظیم شاعر جسے دنیا مرزا غالب کے نام سے جانتی ہے‘ سو سال پہلے مر کے زندہ جاوید ہو گیا۔ یہ غالب جو ہمارا دوست ہے‘ ایک بہت بڑا صحافی ہے۔ حقیقی اور سچا صحافی۔ وہی نکالے گا اخبار جس میں تمہارا بھی خانہ خراب ہوگا۔“

”یار! مجھے بخش دو۔“ وہ منت سماجت پر اُتر آیا ”میں تم سے ہر طرح تعاون کروں گا۔ بے شک تم یہ پانچ ہزار لے لو۔“

”ہم تمہارا سب کچھ لے لیں گے مگر رشوت میں نہیں۔ یہ تو پبلک کا مال ہے‘ پبلک کے کام آئے گا“ میں نے کہا ”ہم مالِ حرام کو حلال کریں گے جیسے بلیک منی کو وائٹ کیا جاتا ہے یا کافر کو مشرف بہ اسلام کیا جاتا ہے۔ ہمارا پروجیکٹ بہت بڑا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جس کا حق تھا اسے ملے اور جس نے حق غصب کیا تھا وہ ہرجانہ ادا کرے۔ اپنا حساب تم خود لگا لو کہ آج تک تم نے کس کس سے سچائی کو زندہ دفن کرنے‘ سچ کے چہرے کو جھوٹ کی آمیزش سے مسخ کرنے‘ مظلوم کو انصاف کے حق سے محروم رکھنے‘ ظالم کو قانون کی گرفت سے بچانے اور بے گناہوں کو پسِ دیوارِ زنداں پہنچانے کا کتنا معاوضہ لیا ہے۔ تمہیں سب یاد ہوگا۔ ممکن ہے تم نے حقائق کو بدلنے میں پولیس کی مدد کی ہو۔ اس سے کوئی قتلِ عمد کا کیس خودکشی کی واردات بن گیا ہو‘ کسی غریب کی بیٹی کی آبرو ریزی کے خلاف اٹھنے والی آواز دب گئی ہو‘ پھانسی کا پھندا ذاتی دشمنی اور عناد کے باعث کسی بے گناہ کے گلے میں پڑا ہو۔“

اس نے کانپتے ہاتھوں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کے مجھے تھما دی ”یہ لو۔۔۔ سب لے لو۔ اور بھی جو کچھ میرے پاس ہے‘ تم لے سکتے ہو مگر میرا خانہ خراب مت کرو۔ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں‘ بہت کچھ بتا سکتا ہوں جو تم بھی نہیں جانتے اور دنیا بھی نہیں جانتی۔ بہت سے لوگوں کے ظاہر اور باطن کا فرق مجھے معلوم ہے اور وہ بڑے اچھے عزت دار لوگ ہیں۔ بس مجھے بخش دو۔“

میں نے غور کرتے ہوئے کہا ”گویا تم سلطانی گواہ بننا چاہتے ہو؟ تمہارے ساتھ رعایت کے امکان پر غور کیا جا سکتا ہے مگر ابھی میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ اس کا انحصار حالات پر ہوگا اور مستقبل میں تمہارے رویے پر۔“

رابعہ نے کہا ”یہ سلطانی گواہ بعد میں منحرف نہ ہو جائے۔“

میں نے کہا ”یہ جاہل ضرور ہے مگر احمق نہیں ہے۔ استاد پیڈرو سے یہ ایم زرائیں کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرے گا تو ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ یہ رسوا ہو کے مرنا۔ میرا مطلب ہے خودکشی کرنا پسند نہیں کرے گا کیوں عاجز صاحب؟“

www.paksociety.com

جان ہے نوجوان کا عشق ہے۔"

"ٹھیک.. بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ یہ رقم رکھ لیں" نن کر۔" وہ ہکلا کے بولا۔

"چار بیویوں کا شوہر بن کے جینے اور چار بیواؤں کا مرحوم شوہر کہلانے میں بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو کبھی مت بھولنا" میں نے نوٹ جیب میں ڈال کے کہا "اور آئندہ جھوٹ بھی مت بولنا ہم سے۔ یہ پانچ ہزار نہیں دس ہزار ہیں جو پیر صاحب نے تمہیں دیے تھے تمہارے حصے کے ہیں؟"

وہ چونکا "سرکار... نہیں اٹھارہ۔"

"پھر سوچ لو۔"

"انیس" اس نے انگلیوں پر ٹوٹل کر کے قطعی جواب دیا۔

"کوئی نہیں بیچے جہنم ہو جائیں گیا یہ ہم بھی نہیں چاہتے۔ تمہارے اس ریوالور میں کتنی گولیاں ہیں؟"

"چھ۔" وہ بڑی مشکل سے بولا۔

"ایک خرچ ہو گئی تو یہ پانچ بچ جائیں گی" میں نے ریوالور کی نال پر انگلی پھیر کے کہا "تمہیں معلوم ہے میرا نشانہ کیسا ہے؟ ایک مرتبہ میرا ایک مرغابی کا شکار کرنا چاہتا تھا جو ڈار میں بلند اڑ رہی تھی۔ اچانک رائٹ آف کے انڈا دینے کا ٹائم ہو گیا اور اس نے فلائنگ انڈا دیا۔ جیسے انٹر نیشنل لاٹ پر تلیوری کے کیس ہیں۔ عین اس وقت نیچے میرا ایک پرانا حریف کھڑا ہوا نظر آیا جس نے لندن میں تقریر کے دوران مجھ پر انڈا مارا تھا۔ میں نے ارادہ بدل دیا اور بدلہ لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے مرغابی کے انڈے کو نشانہ بنایا۔ بالکل صحیح رفت پر جب انڈا میرے حریف کے سر پر تھا، انڈا ٹوٹ کے گرا اور میرے حریف..."

رابعہ نے کہا "آگے راں کا ڈی اندازی کہہ دے رہی ہے۔"

"لے لو" میں نے متانت سے کہا "انکار کرنا بری بات ہے۔"

جیپ بائیں جانب ایک نیم پختہ اور شکستہ سڑک پر مڑ گئی۔ جا کیجو اور اکوڑہ خٹک پیچھے رہ گئے تھے۔ اندازہ یہی تھا کہ اب ہماری منزل بھی دور نہیں ہوگی۔ پھر جیپ رک گئی اور ہماری کار اس کے برابر جا کھڑی ہوئی۔

ایک سپاہی نے کہا "سر جی! یہ آخری ہے میں آگے نہیں جا سکتا۔ وہ مجھ کو گولی مار دیں گے۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا "اس سے آگے کہ ہم تھا اس کا بدلہ لیں گے۔"

نقلی داڑھی والے نے لرزہ براندام ہو کے ہاتھ جوڑ دیے "حضرت صاحب! آپ نہیں جانتی یہ بڑا ظالم لوگ ہوتی۔"

میں نے کہا "کون لوگ؟ کہاں ہیں یہ ظالم لوگ؟ مجھے تو یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

اس نے کہا "اس پہاڑی کے پیچھے ایک مزار شریف ہوتی۔"

میں نے غور فرماتے ہوئے کہا "اچھا۔ مزار ہے کسی ملنگ مجاور، کون ہے؟"

"وہ گرمچھ سے زیادہ ظالم ہوتی۔ ریچھ سے زیادہ ظالم ہوتی" اس نے مثالیں دیتے ہوئے کہا "اس کا مرید بدمعاش ہوتی۔"

سامنے سے ایک تانگہ نمودار ہوا جس میں آٹھ دس افراد گھوڑے کی دم سے تانگے کی دم تک ہر جگہ سوار تھے۔ ایک شخص لمبے ڈنڈے پر دائیں طرف ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا تو دوسرا بائیں طرف دوسرے ڈنڈے پر تانگے سے باہر جھکا ہوا تھا اور دونوں گھوڑے کی لہراتی دم کی ہوا خود بھی رہی تھی۔ بالکل پیچھے پائدان پر وہ بچے رکھ دیے گئے تھے مگر ان کے پیر بھی سڑک کو چھو رہے تھے ان کا منہ گھوڑے کی مخالف سمت میں تھا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ مزار شریف کے زائرین شریف ہیں جو کسی پیرے اپنی اپنی دعاؤں کے مستجاب ہونے کی ضمانت لے کر لوٹے ہیں۔ شاید سامنے تو بہو نے بھی اولاد ہی مانگی ہوئی مگر دل میں ساس سے جان چھوٹنے کی خواہش بھی شامل کر دی ہوگی اور ساس نے پوتا طلب کیا ہوگا تو خاموشی سے یہ بھی کہا ہوگا کہ ایسا ممکن نہیں تو پھر اس نامراد بہو کو اٹھا لے تاکہ میں دوسری لاؤں۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" رابعہ نے کہا "دیکھو، پیچھے سے کوئی گاڑی آ رہی ہے۔"

"آنے دو۔ میرا مطلب ہے جانے دو۔ مرادیں مانگنے والے ہوں گے" میں نے کہا "عاجز صاحب! ہم بھی چلتے ہیں سوات تک۔ پولیس کو واپس جانے دیں۔"

"ہم تو ملزم کو ساتھ واپس لے کر جائیں گے" ایک کانسٹیبل بولا۔

"اور آپ کو بھی۔ جان تو سب کا ہوگا" دوسرے نے کہا۔

میں نے کہا "اچھا پھر تم لوگ کہیں انتظار کرو۔ بعد میں آ جانا۔ یہ ظاہر مت کرنا کہ ہمارے ساتھ تھے بلکہ پیر صاحب سے کہنا کہ ادھر کسی مفرور مجرم کو تلاش کر رہے ہو جو اٹک جیل سے بھاگا ہے۔ کسی بہانے وہیں موجود رہنا اور اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔"

عاجز صاحب زیادہ باخبر تھے "یہ نہ ہو کہ بھنگ کے پیالے چڑھانے بیٹھ جاؤ۔ مال مفت اور کار ثواب سمجھ کے۔"

میں نے کہا "اگر ذرا دیر کر لیاں چلیں تو سلسلہ چلتا کہ کس پر فائر کرنا ہے۔ یہ اپنے بدلے کے لیے عاجز صاحب کو مت شہید کر دینا۔ تم ملزم کے ساتھ ٹھہرو۔ ہم چلتے ہیں۔"

رابعہ نے گاڑی بڑھائی "سوال کیا کرو گے؟"

"نیک بخت! اللہ نے سب دیا ہے سوائے اولاد کے۔ سات سال ہو چکے ہیں شادی کو۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے!" رابعہ گھبرا کے بولی۔

"تو عاجز صاحب! اس میں کون سی بات ہے! بیبی۔ اولاد کی خواہش تو سب کو ہوتی ہے اور آدمی شادی کرتا ہی کیوں ہے؟ اب

آپ خود حساب لگا کے بتائیں۔ سات سال میں چار بیویوں نے سات اور تو آپ کو ضرور اب بتایا ہوگا۔"

عاجز صاحب نے سوچ کے کہا "آٹھ بار۔"

"اور خیر سے انیس ہیں ابھی۔ شاید ستائیس ہوں۔ مزید ہے جاتے جاتے نصف سنچری تو ہو جائے گی۔ ہم ایک بھی نہ مانگیں پیر صاحب سے۔"

"منحوس! ایسی بے ہودہ بات مت کرنا" رابعہ نروس ہو گئی۔

"تم مت کرنا۔ میں کر لوں گا" میں نے کہا "عاجز صاحب! کیا نام ہے ان پیر صاحب کا؟ جو زمین کے نیچے ہیں ان کا بھی اور جو اوپر بیٹھے ان کی چھاتی پر مونگ دل رہے ہیں ان کا بھی۔"

"مزار تو ہے پیر کنکر شاہ کا۔ سنا ہے وہ کنکر پر پیدا ہوئے تھے کنکر پر رہے تمام عمر کنکر کھاتے رہے اور مزار کے سرہانے بھی ایک کنکر ہے" عاجز صاحب نے بتایا "آج گدی نشین ہے ان کا پوتا خلیفہ کنکر۔"

"خلیفہ! کیا وہ نائی بھی ہے" میں نے کہا "اور یہ بھی کنکر ہے۔"

"ان کے سب مجاور کنکر کہلاتے ہیں۔ چھوٹا کنکر، بڑا کنکر۔ جسے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا جائے وہ کنکر کہلاتا ہے۔"

"اور ان کے بچے کیا کہلاتے ہیں کنکر کے کانٹے؟"

کنکر شاہ کا مزار اچانک بہت سے کیکروں کے ایک جھنڈ کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ ہر کنکر پر کوئی چھوٹا بڑا نیلا پیلا جھنڈا لہرا رہا تھا.... عین وسط میں کنکر اول کا مزار شریف تھا جس کا احاطہ کم سے کم چار ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ چار دیواری محرابی دروازوں کی تھی جو محض آرائشی تھے۔ ان میں نہ چوکھٹ تھی اور نہ پٹ تھے۔ وسطی دروازے پر کنکر شاہ اول کا نام معہ نصف درجن القاب و آداب کے آب زر سے لکھا گیا تھا۔ ہر دروازے کے ستون سے ٹیک لگائے کوئی کنکر بیٹھا تھا۔ وہ سب ایک سے گیرے اور سبز لمبے کرتے پہنے ہوئے تھے اور ان کی ٹوپیاں زرد تھیں۔ ان کی ایک جیسی داڑھیاں دیکھ کر مجھے شبہ ہوا کہ وہ نقل ہیں کیونکہ ان میں سر مو فرق نہ تھا۔ ان سب کے سامنے چھوٹے سائز کی دیگ تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید اس میں سے زائرین کو بطور تبرک کچھ دیا جاتا ہوگا مگر معاملہ برعکس نکلا۔ جب کوئی اندر جاتا تھا تو کنکر دیگ کا ڈھکنا اٹھا دیتا تھا جس کا مطلب صاف یہ ہوتا تھا کہ اس میں نذرانہ ڈالو۔

ایک نظر میں ان کو شمار کرنا تو محال تھا مگر میرے اندازے کے مطابق اس مزار کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے کر بیٹھنے والے کنکر تعداد میں پچاس سے کم نہیں ہو سکتے تھے اور وہ پچاس دیگوں میں مال جمع کر رہے تھے۔ کسی بھی سمت سے آنے والے کے لیے کچھ دیے بغیر اندر جانا اتنا ہی مشکل تھا جتنا بغیر ٹکٹ سینما میں داخل ہونے کی کوشش کرنا۔ ان کی خونخوار صورتیں اور قہر کی نگاہیں اس بات کی آئینہ دار تھیں کہ وہ خدمت گار یا مرید نہیں محافظ اور جاسوس قسم کے لوگ ہیں جو آنے جانے والوں پر نظر رکھتے ہیں اور ممکن ہے آپس میں کسی قسم کے خفیہ مواصلاتی رابطے سے ایک دوسرے کو خبردار بھی کر دیتے ہوں۔

احاطے کے باہر پہلے سے ایک درجن ایک کھٹارا قسم کی بسیں اور پرانی کاریں اور تھوڑے فاصلے پر چند تانگے موجود تھے۔ ان میں نواح کے دیہات سے عقیدت مند لد کر آئے تھے۔ ان میں سے زیادہ اندر شرف باریابی حاصل کر چکے تھے اور ان کی زبان میں کنکر کے سائے میں تھے۔ جو ایک چھپر کے نیچے بیٹھے ہوئے خوری ہوٹل میں ماحضر تناول فرما رہے تھے اور بہو بس میں اونگھ رہے تھے۔

ہماری گاڑی رکی تو باہر بیٹھے ہوئے ہر کنکر کی نگاہیں سوالیہ انداز میں ہم پر مرکوز ہو گئیں۔ ہم گاؤں دیہات کی اس بدبخت بدحال اور بد اطوار مخلوق سے یکسر مختلف تھے جو اپنے خستہ تن و دریدہ پیرہن اور تحتی ایام کی تصویر.... چہروں کے ساتھ ہر روز آتے تھے اور من کی مراد پوری ہو نہ ہو ذہنی سکون اور اطمینان حاصل کر کے لوٹ جاتے تھے۔ خدائی رضا کے لیے کسی مردہ یا زندہ پیر کی سفارش اور اس سفارش کے لیے نذرانے کی رشوت دینا ان کے عقائد میں شامل تھا لیکن ہم جیسے خوشحال اور تعلیم یافتہ نظر آنے والے شہری ایسے ڈھکوسلوں پر بہت کم یقین رکھتے تھے مگر جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتے تھے تو پھر عقل کا سارا فلسفہ بھول کے امید کے ہر ٹھکانے سے رجوع کرتے تھے۔ ظاہر ہے ہم جیسے احمقوں کے ساتھ صحیح رویہ اختیار کیا جائے تو وارے نیارے ہو جاتے تھے جتنا ایک پورا گاؤں نہیں دیتا تھا اتنا شہر کا کوئی ایک حاجت مند دے جاتا تھا۔

میں نے رابعہ سے کہا "اب یہ لال پیلا ہونا چھوڑو۔ اگر تم نے اس ڈرامے میں میرا ساتھ نہیں دیا تو ہم پھنس جائیں گے۔ بہت خطرناک لوگ لگتے ہیں مجھے۔"

رابعہ بولی "ان کا رولا دے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"وہی جو ایک بدمعاش کا دوسرے سے ہوتا ہے۔ کیا پتا یہ بھی رولا دیا کا کوئی سائڈ بزنس ہو" میں نے کہا "ذرا دوپٹہ اچھی طرح منہ اور سر کے گرد لپیٹ لو اور دکھاوے کی نظر ڈالنے کی کوشش کرو۔"

وہ مسکرانے لگی "تم تو ابھی سے نقلی فریادی بن گئے ہو۔"

"اور کیا گاڑی سے سینہ بجاتا اتروں۔ پیر صاحب کے حضور پہنچنے تک تھرکتا رہوں اور پھر ایک دم اداس اور غمزدہ ہو جاؤں۔ بابا مجھے اولاد کا دکھ ہے اور تم کو بھی ایک مظلوم بیوی کا رول کرنا ہے جس کو بے وفا اور بے مروت شوہر اولاد کی خاطر چھوڑنے پر آمادہ ہو اور دوسری کرنے کی سوچ رہا ہو۔"

"سچ بولا انہوں نے۔ یہ سب بدمعاش ہیں۔ ان کے اڈے کو بڑے بڑے سیاسی گرائی لوگوں کی سرپرستی حاصل ہے جن میں پولیس افسران بھی شامل ہیں" عاجز صاحب بولے "یہ ہر قسم کا غلط دھندا

راز ان پر آتا ہے مانتی تھی، نوشتۂ تقدیر کو کسی زناپیر کے اختیار میں سمجھتی تھی اور زندگی سے موت تک ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوک اور مجبور تھا کے سارے عذاب کئی صدیوں سے اسی طرح جھیل رہی تھی۔ اگر ان کا ایمان ناپختہ اور یقین کامل نہیں تھا یا وہ شرک اور بدعت کے مرتکب ہو رہے تھے تو وہ یہ بات بھی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ بڑے خلوص اور اعتقاد کے ساتھ اپنے آبا و اجداد کے مسلک پر کاربند تھے اور قابل رحم حد تک معصوم تھے۔

ہمیں ابھی باری کے انتظار میں کسی کیکر کے نیچے بیٹھ جانا تھا مگر ان کو یہ اطلاع موصول ہو چکی تھی کہ دس ہزار کی پارٹی آئی ہے۔ علامہ اقبال نے قوم حجاز کے بارے میں صحیح فرمایا تھا کہ آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز تو ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔ مگر یہ چودھویں صدی تھی۔ اب محمود اگر کسی سیاسی مصلحت کے تحت نماز پڑھنے جاتا تھا تو اس کے لیے اگلی صف مخصوص تھی۔ وہ عید کی نماز بھی سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ مخصوص مقامات پر ادا کرتا تھا جہاں ٹی وی کے کیمرا مین اسے نمایاں ہوتا دکھا سکیں۔ کسی ایاز کی مجال نہ تھی کہ پچھلی صفوں سے اٹھ کے امیر المومنین سے بغلگیر ہونے کے لیے آگے بڑھے۔ سادہ کپڑوں میں سیکیورٹی والے وی آئی پی یا وی وی آئی پی سے گلے مل لیتے تھے تاکہ خبر بنائی جا سکے کہ وہ لوگوں میں گھل مل گئے۔

جب دستور مملکت یہ ہو تو پھر یہی سب کا معمول بن جاتا ہے خواہ وہ کاروباری ادارہ ہو۔ این جی او کا دفتر یا پیر کا آستانہ۔ کار والا۔۔۔ پیسے والا بڑا آدمی پہلے جائے گا۔ جو اس پر احتجاج کرے گا' مساوات کی بات کرے گا اور حق کی بات کرے گا وہ راندۂ درگاہ ہو گا اور بے فیض رہے گا۔ پچھتائے گا اور دوسروں کے لیے درسِ عبرت بنے گا۔

احاطے کے وسط میں بنے ہوئے حجرۂ خاص کے چاروں طرف سنگِ مرمر کا کھوسا تھا۔ پھر چند سیڑھیاں چڑھ کے ایک چبوترا آتا تھا اور دروازہ جس کے اندر پیر کیکر شاہ کے مزار کا مجاور لوگوں کی ہر مراد پوری کرنے کا ٹھیکیدار بنا بیٹھا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا کمرا تھا مگر چبوترے پر سے گزرتے ہوئے مجھے قدموں کی دھمک سے یوں لگا کہ چبوترے کے نیچے بھی کمرے ہوں گے ٹھوس چبوترے پر قدموں کی صدا سنائی بھی نہ دیتی۔ کمرے کے چاروں طرف جالی تھی جس میں نیلی پیلی لال گلابی' سنہری روپہلی گوٹے کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ان کا رنگ روپ اور آب و تاب بھی دھوپ سے لٹ چکے تھے اور وہ لوگ نہ جانے کہاں تھے جنھوں نے منت مانتے وقت یہ کچھ باندھی تھی۔ ان کی تقدیر کی گرہ ان کے اپنے ہاتھ ہی کھول سکتے تھے اور کوشش کرنے والوں کو خدا کی تائید و رضا بھی حاصل ہو جاتی ہے مگر یہ سادہ دل بندے۔۔۔ جائیں تو کہاں جائیں۔ کہ سلطانی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری۔ پیر کیکر شاہ کے سبز ٹائلوں والے چمکتے گنبد کے سائے میں بیٹھا ہوا خلیفہ کیکر انھیں

کہیں جانے بھی تو نہیں دیتا۔ مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے۔ پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے۔ تاکہ یہ نہ خود کو سمجھے نہ خودی سے آشنا ہو۔

وہ پیر کیکر ثانیا' خوشامدانہ انداز میں مجھے' عاجز صاحب اور رابعہ کو خصوصی حضوری میں لے گئے۔ رنگ برنگی ریشمی گوٹا لگی چادروں کے ڈھیر میں دبی ہوئی قبر' عطر و عود کی مہک سے معطر' نیم تاریک فضا اور پُراسرار ماحول میں خلیفہ کیکر ایک تخت پر شاہانہ تمکنت کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ وہ چالیس پچاس سال کا سرخ و سفید اور صحت مند شخص تھا جس نے سبز ریشم کی قبا پر کالے مخملی کی چادر ڈال رکھی تھی۔ اس کے سر پر زرد رنگ کا عمامہ تھا اور اس کے ہاتھوں میں روشن دانوں والی بہت بڑی تسبیح تھی۔ اس میں شاید ایک ہزار دانے ہوں گے۔ ہر دانہ بڑے بیر جتنا تھا اور تاریکی میں فاسفورس یا کسی چمکیلے مرکب سے خارج ہونے والی مدھم چمک بھی زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ ظاہر ہے عقیدت مند اس نورانی حصار کے طلسم میں اسیر ہو کے تھوڑی بہت عقل سے بھی محروم ہو جاتے ہوں گے۔

عاجز صاحب نے جھک کے پیر صاحب کے ہاتھوں کو چوما تو میں بھی نامعقولیت کے اس مظاہرے پر مجبور ہو گیا۔ خلاف توقع رابعہ نے بھی یہی حرکت کی تو مجھے اچھا نہیں لگا۔ وہ ادب سے سلام کر کے بھی بیٹھ سکتی تھی۔ پھر جب کیکر شاہ نے اس کا ہاتھ زیادہ دیر تھامے رکھا اور اپنی جلالی آنکھیں اس کے چہرے پر مرتکز رکھیں تو مجھے عجیب سی بے کلی محسوس ہوئی۔ کہیں ہوا پرستی کے اس دربار میں رابعہ کو پیش کر کے میں نے غلطی تو نہیں کی تھی؟

اسی وقت خلیفہ نے رابعہ کو آزاد کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ خاصی گھبرا گئی تھی اور اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

"بڑے لوگ آئے ہیں۔ اخبار والے آئے ہیں۔ کیا کسی خبر کی تلاش ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کی آواز میں بڑی نرمی اور شائستگی تھی۔ مصنوعی انکساری اور جھوٹی کسر نفسی تھی۔ عاجز صاحب پہچان لیے جانے کے بعد کچھ پریشان تھے۔

"ہم تو حضور کی قدم بوسی کے لیے بہت پہلے آ جاتے۔"

"پھر آج کون سی ضرورت لے آئی؟"

"یہ ہمارے عزیز اور دوست ہیں" عاجز صاحب نے خود کو سنبھال کے کہا۔

خلیفہ نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "بچہ۔ کہو کیا مسئلہ ہے؟"

میں نے سر جھکا کے کہا "خلیفہ جی' شادی کو سات سال ہو گئے' ہر علاج کرا لیا' ہر جگہ جا کے دیکھ لیا۔"

"اچھا؟" اس نے معنی خیز لہجے میں یوں کہا کہ یہ نہ سوال تھا نہ حیرت کا اظہار اور نہ شک کا "ہم سے کیا چاہتے ہو؟"

کرنے والوں کے لیے ایک مقدس پردہ ہے جس کی آڑ میں جُوا بھی ہوتا ہے' سٹہ بھی۔ یہاں شراب اسمگل بھی ہوتی ہے اور دیسی شراب کشید کرنے کا بھی کوئی زیر زمین کاروبار ہے۔"

میں نے کہا "بردہ فروشی تو پھر لازمی ہوتی ہو گی؟"

"بالکل۔ گاؤں دیہات کی لڑکیاں بھی اغوا کی جاتی ہیں اور شہروں سے بھی ادھر ٹریفک چلتی ہے۔ سنا ہے حجرے عیاشی کے اڈے ہیں۔ حرام کا پیسہ اکٹھا کرنے والے حرام کار تو آتے ہی ہیں' سنا ہے کچھ پردہ نشین بھی ہیں جن کا تعلق معزز گھرانوں سے ہے۔"

میں نے کہا "اس اطلاع کا شکریہ۔ آپ کب سے جانتے ہیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"مدت سے۔۔۔"

"کیسے جانتے ہیں؟ سنی سنائی ہے یا۔۔۔"

"بہت سی شہادتیں ہیں۔ انھوں نے بھی بتایا جو یہاں آتے ہیں اور یہاں اندرون خانہ ایک دوسرے کے خلاف سازش کرنے والوں نے بھی اطلاعات دیں۔ اتفاقی شہادت ملتی رہی۔۔۔"

"اور اس کے باوجود آپ نے کچھ نہیں کیا؟"

"میں کیا کر سکتا تھا؟"

"یہی جو ایک صحافی کو کرنا چاہیے تھا مگر آپ تو خود انھی کے گروہ کے آدمی ہیں۔"

"ان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں تم کو بھی مشورہ دوں گا کہ کسی خوش فہمی کا شکار مت ہونا۔ یہ تمھارے جیسے بہت سے مجاہدین کو یوں غائب کر چکے ہیں جیسے ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ میں کچھ کرتا تو آج میرا نام و نشان بھی مٹ چکا ہوتا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ یہاں آنا ہو گا تو میں پہلے ہی سب بتا دیتا اور تمھیں بھی روک لیتا۔"

"عاجز صاحب! ہم کسی کے روکے رکنے والی چیز ہی نہیں ہیں' تختہ یا تخت۔ یہ ہمارا نعرہ ہے۔"

رابعہ نے کہا "کیا یہاں لوگ تمھیں پہچانتے نہیں ہوں گے؟ تم تو شیطان کی طرح مشہور ہو۔"

"ضرور پہچانتے ہوں گے" وہ پریشانی سے بولا۔

"پھر تم یہ ظاہر کرو کہ ہمیں یہاں لانے والے تم ہو" میں نے کہا "ہمیں ایک بات کا خاص خیال رکھنا۔ ہم کمانڈوز اسلحہ میں اپنا دفاع بھی کرتے ہیں اور جارحیت ناگزیر ہو تو پھر ادھر یا ادھر۔ مجھے ذرا بھی شک ہوا تو میں سب سے پہلے خلیفہ کیکر کو یرغمال بناؤں گا اور تمھیں زد پر رکھوں گا۔ چھ کیکر تو میں اس ریوالور سے گرا سکتا ہوں۔۔۔ دو چار خالی ہاتھ بھی۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کرنا" عاجز کا رنگ فق ہو گیا۔

"یہاں ہم کچھ نہ کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں" اگر غائب اور تازہ یہاں ہیں تو ہم انھیں ساتھ لے کر جائیں گے۔"

"یہ تازہ کون ہے؟"

"تازہ ایک خبر ہے' بلا ہے' بجلی ہے" میں نے کہا "ہم کو خدا

بچائے اس کے عتاب سے۔"

اچانک ایک شخص نے جو وہی سبز پوش زرد ٹوپی والا کیکر تھا کھڑکی سے منہ اندر ڈال کے کہا "زمین پر قدم رکھو۔ کیکر ہو جاؤ۔"

رابعہ اچھل پڑی اور بے اختیار اس نے میرا بازو تھام لیا۔

کیکر نے لاؤڈ اسپیکر کی طرح کہا "پیر کیکر شاہ کے آستانے پر بھی کار کی چھت کے نیچے ہو۔ کیکر کے سائے میں آ جاؤ' کیکر ہو جاؤ۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ ہمارے پاس کیوں آیا تھا۔ اس نے کار کے مسافروں کو تاڑ لیا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ اتنی دیر سے ہم کیا باتیں کر رہے ہیں۔ یہاں حاضری دینے والے تو جلد از جلد اپنے من کی مراد پانے کے لیے بے چین ہوتے تھے۔

"کیکر ہو جاؤ" ان کا نعرۂ مستانہ تھا۔

میں نے کہا "یہ میری گھر والی کچھ ڈر رہی تھی۔ اسے سمجھا رہا تھا کہ پیر کیکر شاہ تو بڑے کرامات والے اور کرم نواز ہیں۔ ہمارے دل کی مراد ضرور پوری کریں گے۔ آؤ اب اندر چلیں۔"

عاجز صاحب نے بھی خشک لبوں پر زبان پھیری "ہاں۔ اتنی دور آخر کس لیے آئے ہیں۔"

رابعہ ادب سے سر پر لپیٹ کر اتری اور میرے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ میں ایک متفکر شوہر نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ ایک لٹی پٹی ہوئی بیوی بن گئی تھی جو ہماری حسرت ہماری صورتوں سے عیاں تھی یا نہیں تھی۔ یہ ہم نہیں جان سکتے تھے مگر کوشش ضرور کر رہے تھے کہ ہم مجسم حسرت و یاس کی تصویر ہو جائیں۔

میرا ایک ہاتھ اس جیب میں جانے کے لیے تیار تھا جس میں بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔ میں نے اس کا سیفٹی کیچ بھی ہٹا دیا تھا کہ ضرورت پڑے تو ایک لمحے کی تاخیر نہ ہو۔ یہ ایک قابل اعتماد ریوالور تھا۔ درّے کے بنے ہوئے اعلیٰ قسم کے ریوالور اعلیٰ معیار کے اسلحے سے کسی طرح کم نہیں ہوتے تھے۔ شاید صدیوں کی مہارت اور تجربے کے باعث درّے کے ہنرمند اسلحہ ساز جدید ترین مشینوں پر فوقیت رکھتے تھے۔

ایک وردی والے نے پر بیگ کا ڈھکنا کھولا۔ میں نے بلا تذبذب اس میں سو سو کے نوٹوں والی دس ہزار کی وہ گڈی ڈال دی جو مجھے عاجز صاحب نے بڑی عاجزی سے پیش کی تھی۔ جب ڈھکن بند ہوا تو مجھے عاجز صاحب کی صورت دیکھ کر تھوڑی سی خوشی ہوئی۔ انھیں امید نہ تھی کہ مال مفت کو لٹاتے ہوئے میں ایسی بے دردی کا مظاہرہ کروں گا۔

"جا' کیکر کی ٹھنڈی چھاؤں میں جا" بیگ پر بیٹھے ہوئے مرید نے گویا مجھے ویزا جاری کر دیا۔

احاطے کے اندر پچاس ساٹھ دیہاتی مرد' عورتیں' بوڑھے' بچے جمع تھے۔ وہ آسمان کی کھلی چھت کے نیچے خدا کی زمین پر مجرم بنے بیٹھے تھے۔ یہ مظلوم مخلوق رزق بھی خدا سے نہیں کسی اور

www.paksociety.com

"وہی جو کہیں نہ مل سکا۔ آپ دلوں کا حال جانتے ہیں" میں نے کہا۔

"ہم تو تمہیں بھی جانتے ہیں سکندر بخت اور اسے بھی یہ رابعہ ہے نا؟"

میرے دل میں ایک اندیشہ ضرور تھا مگر مجھے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ آغاز ہی اتنا بڑا انکشاف اور سنسنی خیز ہوگا۔ ڈرامے کے پہلے سین کے لیے پردہ اٹھے گا اور ایک دم ڈراپ سین۔"

میرا چونک پڑنا ایک فطری بات تھی اور میں افسوس ناک حد تک اپنے ردعمل پر قابو پانے میں ناکام رہا۔ ظاہر ہے اس کے بعد ادھر ادھر کی باتوں سے اپنی شناخت پر کسی بھی جھوٹ کا پردہ ڈالنا مزید احمقانہ بات ہوتی۔

میں نے محتاط ہو کے کہا "بہت خوب خلیفہ صاحب! آپ تو واقعی صاحب کشف و کرامات ہیں۔ میں پیروں فقیروں کو فراڈ سمجھتا ہوں لیکن آپ نے مجھے قائل کر لیا۔"

خلیفہ کے چہرے پر مسکراہٹ واضح ہوگئی "چھوڑو میاں سکندر بخت! کیا ضرورت ہے یہ جھوٹ کا سکہ چلانے کی۔ ساری عمر کے خیالات کیا ایک انکشاف کے لمحے میں بدل جاتے ہیں اور پھر یہ کون سا انکشاف تھا؟ جو بات ہمیں معلوم ہوئی وہ ہم نے تمہیں بتا دی۔ بتانے والے کوئی جنات یا فرشتے نہیں تم جیسے ہی لوگ تھے۔"

"پھر تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میرے یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟" میں نے صاف بات کی۔

"ہاں۔ تم اپنے دوست مرزا غالب کی تلاش میں ہو اور اس کے ساتھ جو لڑکی ہے 'نازو' جیسٹ فائٹر قسم کی۔"

"بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔"

"اس کے لیے پولیس کو ساتھ لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ پولیس کیا کر سکتی ہے؟"

"ہاں' وہ بے چارے تو سرکار کی وردی میں ملبوس ور حکم کے غلام ہیں۔ سب سے نچلے درجے کے ملازم جن کی نہ کوئی حیثیت ہے نہ طاقت۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں ان کے بھروسے پر آیا بھی نہیں۔ وہ تو ایک شخص کی حفاظت کے لیے ہم رکاب تھے جو..."

"رک کیوں گئے؟ وہی تمہیں راستہ بتا سکتا تھا" خلیفہ کیکر نے اپنی زبان کی حلاوت اور لہجے کی نرمی میں فرق نہیں آنے دیا۔

"یہ بات نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب عاجز صاحب آپ کے آستانۂ عالیہ کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے تو انہوں نے پولیس کو بلاوجہ زحمت دی۔ یہ خود بھی تو ہمیں یہاں لا سکتے تھے۔"

"انہیں اپنی حفاظت کی فکر ہوگی۔ شاید خدا پر اور اپنی قوت بازو پر انہیں بھروسہ نہیں" خلیفہ نے عاجز صاحب کی طرف دیکھا اور کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔

عاجز صاحب نے دائیں بائیں دیکھا "جی۔ خلیفہ صاحب' مجھے تو کوئی... میرا مطلب ہے ڈر کی کون سی بات تھی میرے لیے؟"

"تم نے کئی بار پیغام بھجوایا ہمیں۔ ہم نے جواب دینا ضروری خیال نہیں کیا۔ اس کے بعد ہم منتظر رہے کہ تم ہمارا بھی نہ خراب کرو مگر تم نے کچھ بھی نہیں کیا۔"

عاجز صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ "یہ ضرور کسی بدخواہ نے شرانگیزی کی ہوگی۔ ہماری کیا مجال جناب پیر صاحب۔ دنیا و عاقبت عزیز ہے ہمیں۔"

"یہ کہو زندگی عزیز ہے" خلیفہ کے چہرے پر ایک فاتحانہ رعونت نظر آنے لگی "ہمارے پاس ابھی وقت نہیں ہے ورنہ مکھیوں کے لیے۔ شیر جب جنگل سے گزرتا ہے تو ادھر ادھر حشرات الارض' کیڑے مکوڑے' گرگٹ اور نیولے' گیدڑ' بجو' بزدل اور لومڑی جیسے عیار جانور اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔"

آہستہ آہستہ خلیفہ کے اندر کا مغرور 'فرعون صفت' نمرود کی طرح خدائی کا دعوے دار شیطان جیسا سرکش و باغی اور خود سر بے مہار انسان نمودار ہو رہا تھا۔

ہمارے استقبال کے لیے خصوصی باڈی گارڈ تعینات کرنا اور ہمیں کسی وی آئی پی کی طرح خلیفہ معنی صاحب بصیرت و مالک بصارت' رہنمائے طریقت و مفسر شریعت جناب محترم پیر فیض بخش جانشین کیکر سوم سجادہ نشین آستانۂ عالیہ۔ وغیرہ وغیرہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو خلوت کا اہتمام کسی مقصد کے تحت کیا گیا تھا۔

میں ابھی حرف مدعا زبان پر لانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دونوں خصوصی معاون پھر اندر آئے اور انہوں نے ایک ٹرے میں سے ڈھکی ہوئی ٹرے پیش کی۔ خلیفہ نے سرپوش ہٹا کے ڈش سے ایک کی گنڈی اٹھائی جو ہم نے دیگ میں ڈالی تھی اور میری طرف بڑھا دی۔

"اس کی ضرورت شاید تمہیں زیادہ ہو۔"

میں نفرت اور غصے کی کیفیت میں یہ کہتے کہتے رک گیا کہ مال و دولت کی ضرورت سے اتنے ہی بے نیاز ہو تو پھر یہ کاروبار کیوں پھیلا رکھا ہے۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ بلا سبب اشتعال انگیزی سے حالات کو نہ بگاڑا جائے اور جہاں تک ممکن ہو جارحانہ طرز عمل سے گریز کرتے ہوئے دفاعی کھیل کھیلا جائے۔

"میاں عاجز! تم دیکھ رہے ہو سب۔ چاہو تو سب لکھ دو اپنے کثیر الاشاعت 'صحافت کے متکبر سکل' اور زبان اردو کے سب سے بڑے اخبار میں" خلیفہ نے طنز اور تذلیل کے تیر برساتے ہوئے کہا "ہمارا خانہ خراب کرو۔ اور بھی تم جیسے بہت سے ہیں جو ہمارے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔ ہم نے کسی سے تعرض نہیں کیا۔ ہاں ایک وہ راولپنڈی کا مبصر تھا جسے پشت پناہی حاصل تھی کسی سرکاری ایجنسی کی۔ اس سے ہمیں کچھ شکایت پیدا ہوئی تھی مگر اس کی گمشدگی میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔"

جیسا ارشاد۔ آپ کے بدخواہوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کے آپ کو بدنام کرنے کے لیے یہ چال چلی ہوگی" میں نے کہا۔

پیر کے انکار میں واضح اقرار جھلکتا تھا اور عاجز صاحب کے لیے کھلی دھمکی بھی کہ حد سے مت بڑھنا ورنہ پتا بھی نہیں چلے گا کہ تمہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ در پردہ اپنی غزل میں مستی نے جو کہا اس کا مفہوم بھی واضح تھا کہ آپ جیسے لوگ گناہ کے بعد عذر گناہ بدتر از گناہ پیش کرتے ہیں۔ اس نے کسی کی پشت پناہی پر سر اٹھایا تھا یا اس کا قلم خود ہی حق گوئی و بے باکی کی راہ پر خار پر چل پڑا تھا اور وہ بیچ بیچ تو اب صحافت کی پاسداری کرتے ہوئے دریدہ دہنی کے ساتھ رازِ درون سے خانہ افشا کرنے پر تل گیا تھا' یہ جاننے کے لیے وہ عدم سے وجود میں نہیں آ سکتا تھا مگر خلیفہ کیکر ایک عبرت کی مثال دینے کے لیے موجود تھے۔ شہر کی طرح سیاست کے جنگل میں بھی بادشاہ ہوتے ہیں۔ اخلاق و کردار کی بدحالی نشوونما کے ٹھیکے دار اور دوسری دنیا میں نجات اور بخشش کے ضامن بن جانے والے خدائی فوجدار۔ تجارت کی دنیا کے آکاس بیل' کانٹن کنگ' سب ہی حشرات الارض کو اور کمزور مخلوق کو نظرانداز کرنا اپنے آپ کو صاحب ظرف ثابت کرنے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اور اپنی کشادہ دلی کی تشہیر کا ذریعہ بھی مگر ان کے راستے میں کوئی ناخلف شیر کا بچہ کھڑا ہونے کی کوشش کرے یا گدھا شیر کی کھال پہن کر غرانے لگے تو اسے ٹھکانے لگانا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔

رابعہ اس صورت حال سے خاصی ہراساں تھی۔ اس سے زیادہ وہ پیر کی گستاخ نگاہی سے پریشان تھی جو نظروں ہی نظروں میں اس کے جسم کے تمام نشیب و فراز سے گزر چکے تھے۔ اس کے بدن کی نرمی اور گرمی اور لمس کی لذت سے پوری طرح لطف اندوز ہو چکے تھے اور اسے اپنی نیت سے ریپ تک فرما چکے تھے۔ ہوس تو بھری محفل میں سر سے پاؤں تک جبہ' عمامہ یا سوٹ بوٹ میں ملبوس شخص کو بالکل ننگا کر دیتی ہے۔ خواہ اس کی زبان اپنی پاک بازی کے دعوے کرتی رہے۔

میں نے معاملے کو مختصر کرنے کے لیے حرف مدعا زبان پر لانے کا فیصلہ کر لیا "خلیفہ جی..."

"ایسے تو نائیوں کو مخاطب کیا جاتا ہے میاں سکندر۔ بہتر ہے کہ تم ہمارا نام لے کر بات کرو" اس نے ناگواری سے کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں خلیفہ صاحب" میں نے کہا "اب بہتر ہوگا اگر ہم صاف بات کر لیں۔ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔"

میں نے پھر خود کو کوسا کہ آخر میں طنزیہ اور ذو معنی گفتگو سے گریز کیوں نہیں کر رہا۔ آدمی کو پہلے کوشش ضرور کرنی چاہیے کہ فتنہ و فساد کے بغیر ہی ڈنکا بجے بغیر ہی بات بن جائے۔

"وقت تمہارا بھی قیمتی ہے میاں سکندر اعظم۔ بس تم اس کی قدر سمجھو تو بات ہے" خلیفہ کیکر نے کہا۔

"کیا غالب اور نازو یہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا "وہ ہماری حفاظت میں ہیں' کیکر کے سائے میں ہیں" یہ کہتے ہوئے وہ خود ہی اپنی بات پر مسکرایا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ آپ کے سایۂ عاطفت میں کیسے آ گئے' کون چھوڑ گیا انہیں آپ کی تحویل میں؟"

"کیا وہ اپنی مرضی سے نہیں آ سکتے؟"

"نا ممکن" میں نے کہا "بہ رضا و رغبت' ہوش و حواس میں کسی مجبوری کے بغیر ان کے یہاں آنے کا سوال ہی... اگر ہے تو میری آپ سے درخواست ہے کہ انہیں میرے حوالے کر دیا جائے۔"

خلیفہ نے انکار میں سر ہلایا "میاں' کسی کی امانت ہیں وہ۔ ہم اس سے تو پوچھ لیں۔"

"وہ بچے نہیں جناب' خود مختار اور آزاد انسان ہیں' کوئی اشرفیوں کا توڑا یا مال تجارت نہیں کہ آپ امانت دار سے پوچھیں۔"

"مگر ہم ایسا ضروری سمجھتے ہیں" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"آخر وہ کون ہے جو ان کو لایا تھا؟ چوہدری ولاور' استاد پیڈرو یا۔" میں نے بے ہی سے کہا مگر پھر رابعہ نے میرا ہاتھ دبا کے مجھے احساس دلایا کہ میں کہاں اور کس کے سامنے ہوں۔ میں خاموش ہو گیا۔

"ہمیں کب تک انتظار کرنا ہوگا خلیفہ صاحب؟" رابعہ نے کہا۔

"زیادہ نہیں" خلیفہ نے نرمی سے کہا "آج تم ہمارے مہمان رہو۔ خدا نے چاہا تو کل صبح ہم تمہیں الوداع کہیں گے۔ تمہارے دوستوں کے ساتھ۔"

ایک دم وہی دونوں خصوصی معاون ہمارے دائیں بائیں آ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اشارے سے ہمیں اٹھنے کو کہا۔ میں نے عاجز صاحب کی طرف دیکھا اور پھر رابعہ کی طرف۔ ان کی رضا صاف ظاہر تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ موقع محل دیکھے بغیر اور صورت حال کو سمجھے بغیر کسی قسم کی مزاحمت کی جائے یا تصادم کی راہ اختیار کی جائے۔ سب کے سامنے پیر صاحب کی تعظیم و تکریم کا ڈراما ناگزیر تھا۔ ہم سب نے ان کے ہاتھ چومے اور مراجعت اختیار کی۔

دستور کے مطابق ہم الٹے پاؤں واپس ہوئے۔ ان کی طرف پشت کرنا بے ادبی کے زمرے میں آتا تھا۔ حجرۂ خاص کے دروازے سے باہر نکلنے تک ہم ریورس گیئر میں گئے جہاں ایک کیکر سب کے ساتھ ہماری جوتیوں کی رکھوالی بھی کر رہا تھا۔ اس کی مونچھیں کلف سے اکڑی ہوئی لگتی تھیں اور گلوں کے دونوں جانب یوں چپکی ہوئی تھیں کہ اس کے گول چہرے کو دیکھ کر کلاک کا خیال آتا تھا۔

میں نے جوتے پہنتے ہوئے کہا "تم بھی کیکر ہو' چھوٹے کیکر

www.paksociety.com

اس نے بڑے فخر سے بتایا "پیر سائیں کا خاص کرم ہے مجھ پر۔ میں ان کے در کا کتا ہوں۔"

"معاف کرنا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ خلیفہ صاحب چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی اہمیت دیتے ہیں۔" میں نے کہا "میں نے تو ایسے ہی پوچھا تھا کہ آپ کے مرید آپ کے حکم پر کیا کرسکتے ہیں۔ انہوں نے کہا سب کچھ۔ میں نے کہا کہ یہ جو باہر جوتوں کا ٹھیکیدار بیٹھا ہے کیا وہ آپ کے کہنے پر اپنی مونچھیں منڈوا دے گا۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے کہنے کی ضرورت نہیں، تم میرا نام لے کر اس سے کہو گے تو وہ کہے گا بسر و چشم۔ وہ تو میرے پاس آنے والے عقیدت مندوں کے جوتوں کی خاک کو سرمہ سمجھتا ہے۔"

"حق ہے" ٹکر نے نعرہ لگایا "صدا رہے نام ٹکر کا۔ مونچھیں تو کیا میری جان بھی قربان۔"

رابعہ نے مجھے گھور کے دیکھا۔ عاجز صاحب میرے جھوٹ پر دم بخود رہ گئے۔ بعد میں مجھے بھی خیال آیا کہ مرید خود جاکے نہ پوچھے۔ پیر صاحب اس کا صفا چٹ چہرہ دیکھیں گے اور سوال کریں گے کہ کلاک کی سوئیاں کہاں ہیں تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

میں نے چلتے چلتے کہا "رہنے دو تم نہ چاہو تو کوئی بات نہیں۔ اچھی لگتی ہیں تمہارے چہرے پر۔"

وہ کچھ نہیں بولا مگر اس کے تیور بتاتے تھے کہ مرشد کی خواہش کے مطابق اپنی تابعداری کا مظاہرہ نہ کیا تو کچھ نہ کیا۔ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت تسلیم کرچکا تھا۔ پیر صاحب نے ایک آزمائش کا اہل جانا۔

دونوں بڑے ٹکر چبوترے پر کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے اور مجہول عقیدت مندوں کے ایک اور گروہ کو ٹکر اعظم کے دربار میں پیشی کے لیے منتخب کر رہے تھے۔ میں نے اس میں چھ جوان عورتوں کو دیکھا۔ ان میں دو غالباً غیر شادی شدہ تھیں۔ دو واقعی رنگین شباب کی مالک تھیں۔ اس غول میں دو قدبان قسم کی خرانٹ بوڑھیاں بھی شامل تھیں اور دو مسکین قسم کے مرد بھی جو بہت کم عمر لگتے تھے۔

میں نے چلتے چلتے کہا "بڑا فائدہ مند پیشہ ہے یہ بھی عاجز صاحب۔ آپ کس چکر میں پڑ گئے۔ کوئی ایسا ہی چکر چلا دیجیے پیری فقیری کا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔ یہ میں کیسے کرسکتا ہوں؟"

میں نے کہا "کیوں نہیں کرسکتے۔ ذرا گھوم پھر کے موقع کی جگہ تلاش کریں۔ دس بیس میل کے دائرے میں کوئی پیر نہ ہو تو وہیں ڈیرا ڈال دیں۔ ایک قبر، ایک جھونپڑی، رنگین جھنڈا۔ کچھ منفرد قسم کا لباس۔ جو لگا سکے والا۔۔۔ چند اوٹ پٹانگ نعرے اور شعبدے۔"

رابعہ نے مجھے ٹوکا "یہ جگہ نہیں ہے ایسی باتوں کی۔"

میں نے کہا "کتنا زبردست بزنس چل رہا ہے۔ ہر قسم کا مال ہے۔"

"میں دیکھ رہی تھی تمہاری نظر کو" رابعہ بولی "بڑے غور سے ملاحظہ فرما رہے تھے آپ انہیں۔"

"حق ہے" میں نے کہا "تم خود ہی سوچو رابعہ کہ اس پیر کی جگہ میں بیٹھا ہوتا تو ایسے عقیدت مندوں کو مایوس لوٹاتا۔ سبحان اللہ۔"

"تو خود بن جاتا پیر" رابعہ جل کے بولی۔

"سوچیں گے۔ یہ ٹکر شاہ ہو سکتا ہے تو سائیں پیڈرو کیوں نہیں ہو سکتا اور اندھوں کو اس سے کیا کہ وہ ٹکر کے سامنے جا رہے ہیں یا پیڈرو کے سامنے۔"

"یہ لوگ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں آخر؟"

عاجز صاحب بولے "ان کا ایک مہمان خانہ بھی ہے۔ وی آئی پی قسم کا۔"

میں نے کہا "کیا پتا کوئی پرائیویٹ ائرپورٹ بھی ہو۔ ابھی جہاز میں بٹھا کے روانہ کردیں اور جہاز ہمیں قندھار کے قطعے میں اتار دے۔"

دونوں بڑے ٹکر ہم سے خاصے فاصلے پر چل رہے تھے اور ہم بھی آہستہ بول رہے تھے۔ ابھی تک کسی نے نہ ہماری تلاشی لی تھی اور نہ کسی قسم کی نگرانی ضروری سمجھی تھی۔ شاید انہیں یقین تھا کہ اس احاطے سے فرار ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ ہم جس دروازے سے بھی گزریں گے وہاں بیٹھا ہوا ٹکر رجسٹر میں ہاتھ ڈال کے نوٹ نکالے گا اور دعاؤں سے رخصت کردے گا۔ ہم پیدل رہے ہوں گے۔

عقبی حصے کی سیڑھیاں اتر کے ہم مہمان خانے میں پہنچے تو اندازہ درست ثابت ہوا۔ چبوترے کے نیچے پختہ کمرے تھے۔ داخل ہوتے ہوئے مجھے ایک لمحے کے لیے راناؤں کا قول یاد آیا کہ اندر جانے والے کو پہلے باہر نکلنے کا راستہ ضرور دیکھنا چاہیے۔ یہاں آنے جانے کا یہی ایک راستہ تھا۔ یہ راناؤں کی بات تھی مگر غالب اور نازو کے قریب ہونے کے خیال میں اتنی کشش تھی کہ ہم مجبور تھے۔ میں تصور کرنا چاہتا تھا کہ ان کمروں میں وہ ہم سے کتنے فاصلے پر موجود ہو سکتے ہیں مگر یہ ناکام تھا کیونکہ ٹکر کی بات میں کوئی گہری چال نظر آتی تھی۔ امانت دار سے اجازت لینے کا مطلب صرف دلاور کو مطلع کرنا ہو کہ آؤ اور سب کو لے جاؤ۔ حسب منشا شکار خود دانہ دیکھ کے جال میں اتر آیا ہے۔ پیر ٹکر تو بس بہانہ تھا اور شاید دلاور بھی اس کی شکار گاہ کو استعمال کرتا تھا۔

عاجز صاحب کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں پیر ٹکر شاہ ایک بہت طاقتور چیز نظر آتا تھا اور اس سے ٹکر لینا اس کی پناہی کرنے والے ہر شکاری سے ٹکر لینے کے مترادف تھا۔ ابھی یہ واضح نہیں تھا کہ پیر ٹکر نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی راستہ کیوں نہیں روکا تھا۔ اگر اسے میرا نام اور رابعہ کا نام

معلوم تھا تو یہ بھی علم ہوگا کہ ہمیں اس جگہ پہنچانے والا عاجز نہیں استاد پیڈرو ہے۔ یہ اسی کی کوشش اور مدد کا نتیجہ تھا کہ ہم پولیس کے ساتھ وہاں چھاپا مارنے پہنچ گئے جہاں غالب اور نازو کو رکھا گیا تھا۔ اب یہ پیڈرو کی ناکامی تھی یا چوہدری دلاور کی پیش بندی کہ اس نے دونوں اسیروں کو پہلے ہی وہاں سے منتقل کردیا تھا۔ اس امکان کو بھی مسترد نہیں کیا جاسکتا تھا کہ چھاپے کی اطلاع کسی نے قبل از وقت دے دی اور چوہدری دلاور کو اتنی مہلت مل گئی کہ قیدی نکال لے۔

ناقابل فہم بات یہ تھی کہ جب چوہدری دلاور خود مصالحت چاہتا تھا، مجھے ہر قسم کی وجاہت دینے کی پیش کش کرچکا تھا، سارے نقصانات کی تلافی پر تیار تھا، یہاں تک کہ ماضی کی ہر غلطی کا کفارہ معافی کی صورت میں بھی ادا کرنے پر آمادہ تھا تو وہ غالب اور نازو کو قید میں رکھنے پر کیوں مصر تھا؟ کیا ہم پر دباؤ قائم رکھنے کے لیے؟ وہ اپنے سارے پتے پھینک دیتا تو اگلی چال چلنے کے لیے اس کے پاس کیا رہ جاتا۔

دوسری طرف پیڈرو بھی ایک نئے روپ میں میرے سامنے آیا تھا اور اگرچہ پرانے شکاری بیک وقت ایک دوسرے سے اختلاف کی بنا پر علیحدگی کے اسباب بتا چکے تھے مگر مجھے دونوں ہی ناقابل اعتبار لگتے تھے۔ مجھے شک تھا کہ یہ نورا کشتی بھی دلاور کی چال ہوگی ورنہ وہ اتنا احمق نہیں تھا کہ پیڈرو سے مار کھا جاتے۔ وہ نہ چاہتا تو پیڈرو کے فرشتے بھی اس جگہ کا سراغ نہیں لگا سکتے تھے جہاں غالب اور نازو کو رکھا گیا تھا۔ پیڈرو تو پولیس کو سیدھا وہاں لے گیا اور وہاں کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا۔ نقلی دلاور جو جوتے کھاکے پیر ٹکر شاہ کے آستانے کا پتا بتانے پر تیار ہو گیا، چوہدری دلاور کو معلوم ہوگا کہ مولوی میں کتنا دم ہے اور وہ سو پیاز اور سو جوتوں میں سے پچاس جوتے اور پچاس پیاز کھانے کا حوصلہ رکھتا ہے یا پچاس جوتے ہی کافی ہوں گے۔

غالباً چوہدری دلاور اور استاد پیڈرو آپس میں مل کے اس ڈرامے کی ریہرسل کرچکے تھے جس کا ہدایت کار دلاور کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ دلاور نے کہا ہوگا کہ پہلے تم انہیں تھوڑا سا ہراساں کرو۔ پشاور تک ان کے ساتھ رہو اور ان کو دو لاتیں۔ پیڈرو نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے پہلے آفریدی کی گاڑی کو بم سے اڑایا مگر ہمارے بیٹھنے سے پہلے۔ پھر ریسٹ ہاؤس کو اڑایا مگر اس وقت جب ہم وہاں نہیں تھے۔ دوسرے سین میں چوہدری دلاور آگیا اور اس نے ہمیں ایک کوٹھی میں منگوا کے دوستانہ باتوں سے ماحول سازگار کیا، صلح صفائی کی پیش کش کرکے ہمارے موڈ کا اندازہ کیا اور ہمیں ایک ڈراؤنی HORROR فلم جیسا ڈنر کھلانے کے بعد نئی کار کا تحفہ دے کر آزاد کردیا۔ تیسرے سین میں پیڈرو نمودار ہو گیا اور اس نے اپنے حالات زندگی سنا کے ہمارے جذبات کا رخ بدلنے کی کوشش کی، پتھر کو موم کرکے اپنی ضرورت کے سانچے میں

ڈھالنے کے لیے اس نے اپنے آپ کو مظلوم کے روپ میں پیش کیا پھر چوہدری دلاور سے اختلاف کی کہانی سنا کے اپنی نیک نیتی یوں ثابت کی کہ سیدھا غالب اور نازو کے پاس لے گیا۔ اس کے لیے وسائل بھی خود اس نے پیدا کیے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ چوہدری دلاور میرے والد روزی خان کا قاتل استاد پیڈرو کو ثابت کرتا تھا لیکن استاد پیڈرو کی کہانی میں قاتل خود دلاور تھا۔ چوہدری تیار تھا کہ پیڈرو کو ہمارے حوالے کردے گا اور پیڈرو کو دعویٰ تھا کہ وہ چوہدری دلاور کے خلاف ثبوت شہادت سب فراہم کرسکتا ہے۔ اب یہ پیر ٹکر شاہ کا نیا کردار سامنے آگیا تھا۔ اور یہ فیصلہ ہونا باقی تھا کہ اس ڈرامے کی کہانی کون سا نیا رخ لے گی۔

مہمان خانہ واقعی شاندار تھا۔ اس موسم میں پنکھے یا ائرکنڈیشنڈ کی تو ضرورت نہ تھی مگر یہ چیزیں کمرے میں موجود تھیں۔ فرش پر بچھے ہوئے ایرانی قالین اتنے دبیز تھے کہ ان میں پاؤں دھنسے تھے۔ کمرے میں فریج غالباً ہماری ضرورت پوری کرنے کے لیے لگا دیا گیا تھا اور خاصے فاصلے پر تھا۔ آرائشی اشیا کی کثرت نے مجھے حیران کردیا۔

"یہ سب تحائف ہیں" رابعہ نے کہا۔

"تحفے دیے جاتے ہیں برابر کے لوگوں کو، دوستوں کو۔ یہ تو نذرانے میں پیش کیے جاتے ہیں" میں نے کہا۔

"یہ سب امپورٹڈ چیزیں ہیں" عاجز صاحب بولے۔

"پیر ٹکر شاہ کی کرامات کا ڈنکا غالباً چار دانگ عالم میں بج رہا ہوگا۔ ملک افرنگ سے روس اور چین تک۔ بس ہم بدبخت بے فیض رہ گئے تھے آج تک" میں نے افسوس سے کہا "پیر ٹکر شاہ کی مرید بنیں بھی ہوں گی، یہ سوچ کر میرا ارادہ پکا ہوتا جا رہا ہے کہ میں سائیں پیڈرو کے منصوبے پر پہلی فرصت میں عمل پیرا ہو جاؤں۔ دو چار سال تو لگیں گے کاروبار جمنے میں اور ساکھ قائم ہونے میں۔ کوئی اچھی سی اشتہاری کمپنی ہو تو ٹھیکہ دے دیا جائے پبلسٹی کا۔"

رابعہ نے کہا "بہت رال ٹپک رہی ہے۔"

میں نے بیڈ پر دراز ہو کے کہا "ہاں یہ جو سنبھال رکھا ہے اس کی خود بہ سری میں۔ نہ دین کے رہے نہ دنیا کے اور ٹکر شاہ کو دیکھو، رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ عاجز صاحب! بمزہ ہے آپ۔ اللہ کو پیارے ہو جائیں۔"

عاجز صاحب لیٹے لیٹے اٹھ کر بیٹھ گئے "کیا فضول بات ہے!"

میں نے کہا "میں آپ کا مزار شریف بناؤں گا۔ ہر جمعرات کو قوالی اور لنگر، سال کے سال عرس۔ آپ کی چادروں پر آدھا حصہ آمدنی میں۔"

"بیکار باتیں کرنے کے بجائے سوچو کہ یہاں سے کیسے نکلیں گے" عاجز صاحب نے کہا۔

"یہ تو آنے سے پہلے سوچنا تھا" میں نے مصنوعی غصے کا اظہار

کیا مجھ پر لازم آتا ہے کہ آپ کو گولی مار کے آپ کا مزار بنالوں۔ جب آپ کو معلوم تھا کہ یہاں آنا خطرے سے خالی نہیں تو آپ اپنے ساتھ انہیں کیوں لے آئے؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ تم لائے ہو مجھے اپنے ساتھ زبردستی۔ میرا سب کچھ چھین لیا۔ ریوالور بھی پیسہ بھی۔ غالب اور نازو سے تمہیں ملنا تھا۔"

"آہستہ نام لو ریوالور کا ورنہ پہلی گولی تم پر چلانی پڑے گی۔"

رابعہ نے کہا "مجھے یقین نہیں آتا کہ اسی جگہ ہم سے کچھ دور غالب اور نازو موجود ہو سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "تو کس نے کہا ہے تم سے یقین کرنے کو؟"

"کیا پتا وہ اس دیوار کے پیچھے ہوں؟" رابعہ بولی۔

"دیوار گرا کے دیکھ لو" میں نے کہا "مجھے تو بھوک لگ رہی ہے اور سخت نقاہت کا عالم ہے۔ پورا غصہ تک نہیں آ رہا ہے۔"

رابعہ نے عاجز صاحب سے سوال کیا "میں نے بجلی کے کھمبے تو دیکھے نہیں تھے۔ یہ پنکھے اور اے سی کیسے چلتے ہوں گے؟"

جواب میں نے دیا "پیر صاحب کی روحانی قوت سے جو برقی توانائی اور ایٹمی قوت سے زیادہ ہے۔"

"عاجز صاحب! پیر کیکر شاہ کی کتنی بیویاں ہیں؟"

"پیروں کی ذات تمام پابندیوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ دس بیس تو ہوں گی اور مس رابعہ! مجھے تو سخت تشویش لاحق ہو رہی ہے۔ وہ حرام زادہ تمہیں کیسی نظروں سے دیکھ رہا تھا... اور تم تھیں کہ لال ہوئی جا رہی تھیں۔"

"اور میں کیا کرتی۔ منہ نوچ لیتی اس کا، آنکھیں نکال لیتی اس کی؟" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"تم کو لال ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ اور زیادہ حسین نظر آنے کے لئے؟ مجھے تو فتور نظر آتا ہے اس کی نیت میں۔ کہیں تمہیں داخل حرم ہی نہ کر لے۔"

"تم کچھ نہیں کر سکتے؟"

"میں صبر کر سکتا ہوں" میں نے آہ بھر کے کہا "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ تمہارا نعم البدل عطا کر دے گا۔ اس کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔"

ہمیں اس مہمان خانۂ خاص تک لانے والے کیکر کچھ کہے بغیر لوٹ گئے تھے اور اب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ اسیری ہے یا مہمانی ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں گھوم پھر کے مزار شریف کا جائزہ لوں لیکن دروازہ باہر سے بند تھا اور بند نہ ہوتا تب بھی مجھے آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت نہ ملتی۔ زیرزمین عمارت نہ جانے کیسے کیسے رازہائے سربستہ کا خزانہ تھی اور ہر کس و ناکس کو ان سے آگاہی کا مطلب تھا چھوٹے بڑے ہر کیکر کا خاتمہ۔ لوگ جو بے وقوف تھے اور مزید بے وقوف بنے تھے، دھوکے بازوں کے اس ٹولے کو نیست و نابود کر دیتے اور خلیفہ کیکر صاحب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتے۔

ایک دروازہ ملحقہ غسل خانے میں کھلتا تھا۔ باقی تین دروازے... باہر سے بند تھے۔ دیوار پر لگے ہوئے مختلف بٹن دبانے سے لائٹ جلتی تھی یا پنکھا گھومنے لگتا تھا۔ کوئی بٹن کال بیل کا نہیں تھا۔ میں نے ایک دروازے کو بجا کے اور چلا کے کہا "کوئی ہے ہماری فریاد سننے والا؟ اللہ کے نام پر بھوکوں کو کھانا کھلانے والا۔"

رابعہ نے کہا "کیا ہو گیا ہے تمہیں! خواہ مخواہ شور مچا رکھا ہے۔"

"خواہ مخواہ!" میں نے چڑ کے کہا "ایک تو بھوک سے میری آنتیں ہائے اللہ پڑھ رہی ہیں۔ اچھی مہمانی ہے یہ کہ کمرے میں بند کر کے چلے گئے ہیں جیسے آسمان سے من و سلویٰ اترے گا۔ مجھے تو افسوس ہے کہ میں نے ان خبیث کیکروں کے جانے سے پہلے کچھ نہیں کیا۔ اچھا ہوتا اگر میں ایک کو روک لیتا۔"

اسی وقت دروازہ کھلا اور ایک نئی شکل نمودار ہوئی۔ یہ کوئی بڑا موذی قسم کا کیکر تھا۔ انسانوں سے زیادہ اس کا تعلق جنات کے قبیلے سے لگتا تھا۔ وہ ساڑھے چھ سات فٹ لمبا اور تین ساڑھے تین فٹ چوڑا دیوزاد خوفناک حد تک کالا تھا۔ اس کے بازو بلا مبالغہ میری رانوں کے برابر تھے۔ لمبے لمبے بالوں اور جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں وہ زمانہ قبل از تاریخ کا وحشی انسان نظر آتا تھا۔ اس کا لباس بھی بہت مختصر تھا۔ ایک انڈرویئر اور بنیان میں اس کا پورا بالوں بھرا جسم عجب کراہیت انگیز منظر پیش کرتا تھا۔ اس نے پاؤں میں لانگ بوٹ پہن رکھے تھے اور ہاتھوں میں فولادی کڑے۔

اس ابنارمل انسان کو زیادہ بھیانک مخلوق بنا کے پیش کرنے کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ کمزور انسانوں پر اس کی دہشت بٹھائی جائے۔ ممکن ہے کیکر شاہ کا وارث اسے شاہ جنات بنا کے مریدوں کو مرعوب کرتا ہو کہ انسان تو انسان، میرے مرید جنات بھی ہیں جو میرے اشاروں پر چلتے ہیں۔

وہ ایک میز اٹھا کے لایا تھا جو اس نے ہمارے درمیان رکھ دی۔ اس پر میزبانی کے جملہ لوازمات موجود تھے۔ بھنے ہوئے مرغ اور بٹیر، روسٹ کی ہوئی دنبے کی ٹانگ، قورمہ، بریانی اور پیروں کی مرغوب ترین غذا علاوہ۔ یہ سب پانچ فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی میز پر سجایا گیا تھا اور اس نے میز کو کسی کھلونے کی طرح اٹھا رکھا تھا۔

میں نے کہا "تم بھی کیکر ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور اپنی لال لال آنکھوں سے رابعہ کو گھورنے لگا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟ ٹارزن، ہرکولیس، سیمسن؟"

اس نے غرا کے کہا "اور کچھ چاہیے؟"

"ہاں۔ کیا تم میری ہر خواہش پوری کر سکتے ہو چراغ کے جن؟" میں نے کہا "مثلاً کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ کتنے کمرے ہیں اور

ان کمروں میں کیا کچھ ہے؟"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "خاموشی سے کھانا کھاؤ۔"

میں نے اسے مشتعل کرنے کے لیے کہا "کیا تم مجھے اپنی بیوی سے ملوا سکتے ہو؟ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمہارے سائز کی عورت کیسی ہوگی اور آخر کہاں سے ملی تمہیں؟ ضرور آرڈر پر بنوائی ہوگی۔"

"میری کوئی بیوی نہیں" وہ بولا۔

"تم اس خلیفہ کیکر کے غلام ہو" میں نے کہا "تھو کرتا ہوں اس پہ لعنت تمہارے اس بھاری بھرکم وجود پر۔ کیا فائدہ اس کا جب تم اس کے اشاروں پر کتے کی طرح دم ہلانے پر مجبور ہو۔ وہ سب کے سامنے تمہیں گالیاں دیتا ہوگا، مارتا ہوگا۔ کیوں برداشت کرتے ہو یہ ذلت؟ اس کی گردن مروڑ سکتے ہو تم۔ اسے مچھر کی طرح مسل سکتے ہو۔ اس گینڈے جیسے جسم کے باوجود تم چوہے ہو، بزدل ہو اور بے غیرت ہو۔ میں ہوتا تو کیکر شاہ کی داڑھی اکھاڑ کے اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔"

آہستہ آہستہ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا اور اس کے نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔ اس کی لال آنکھیں خونی نظر آنے لگی تھیں اور مجھے اپنے مقصد میں کامیابی کے امکانات روشن نظر آنے لگے تھے۔ اتنی بڑی باڈی کے ساتھ اس کے دماغ میں عقل ایک اوسط آدمی کے برابر بھی نہیں تھی۔

رابعہ نے مجھے کئی بار ٹوکا "ابھی سے چھیڑ خانی مت کرو، انتظار کر لو کچھ دیر۔"

عاجز صاحب بھی بولے "کھانا کھالو سکون سے۔"

میں نے کہا "اگر کھانے میں کوئی خواب آور چیز ہوئی پھر؟ ویسے ہی مرغن غذا پیٹ میں بھر جائے تو آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔ میں کچھ ہلچل پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے اسیری میں رہ کے من و سلویٰ بھی ملے تو آخر کب تک۔ ہم یہاں قید کاٹنے نہیں آئے تھے۔ میں فوراً غالب اور نازو سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن یہ ہمارے اختیار میں تو نہیں ہے۔"

"اختیار اپنے ہاتھ میں ہم خود لیں گے تو بات بنے گی۔"

"ابھی تو تم بھوک بھوک چلا رہے تھے۔"

"بہانہ تھا کسی کو بلانے کا۔ اب یہ ہاتھی کا بچہ آیا ہے تو میں اس موقع سے فائدہ ضرور اٹھاؤں گا۔ تم دیکھتے جاؤ" میں نے کہا۔

ہم بہت آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے تاکہ اس دیوزاد کو ہمارے عزائم کا علم نہ ہو۔ اب میں نے پھر اسے مخاطب کیا۔

"ادھر تو کتے کے بچے" میں نے کہا اور ایک بوٹی زمین پر ڈال دی "یہ کھا کے دکھاؤ ہمیں تاکہ پتا چلے کھانے میں زہر نہیں ہے۔ چلو او عفریت، یہ سب کھاؤ۔"

میں ہر چیز میں سے تھوڑا تھوڑا فرش پر ڈالتا گیا۔ دیوزاد کا غصہ بڑھتا گیا۔ اپنا ریوالور میں نے خاموشی سے رابعہ کو دے دیا۔

"کیا تم بہرے بھی ہو ولیکن بچے؟" میں نے دہاڑ کے کہا "سنا نہیں، میں کیا کہہ رہا ہوں۔ کس نسل کی کتیا تھی آخر تمہاری ماں۔"

وہ ریچھ کی طرح غراتا میری طرف آیا۔ میں نے اسے ایک اور گالی دے کر قورمے کا ڈونگا اس پر کھینچ مارا۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر گئیں اور وہ بلبلایا تو مجھے یوں لگا جیسے چڑیا گھر کا شیر دہاڑ رہا ہو۔ اس کی دہاڑ میں جنگل کے بادشاہ کی گھن گرج تو نہیں تھی مگر پھر بھی شیر کی آواز تو ہوتی ہے۔

اسے حملے کی دعوت دینے کے لیے میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس کے ایک لات رسید کی جو اس کی ٹانگوں کے درمیان لگی۔ ایک دم اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ اپنے بازو اٹھا کے مجھ پر حملہ کرنے آیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ صرف ہوّا ہے جسے دیکھ کے آدمی ڈر جائے۔ اس کے پاس جسمانی طاقت بھی تھی مگر پھرتی نہیں تھی اور وہ کسی بھی فن حرب سے نا آشنا تھا۔ بڑی آسانی سے میں نے اس کو بازو پکڑ کے کھینچا اور لات مار کے منہ کے بل گرا دیا۔ وہ پھر اٹھا اور پلٹ کے میری طرف آیا۔ میں نے اس کے دوسرے حملے کو یوں ناکام بنایا کہ اسے سیدھا گزار دیا اور وہ اپنے ہی زور میں سیدھا دیوار سے ٹکرا کے گرا مگر آدمی سخت جان تھا۔ اب وہ کسی وحشی درندے کی طرح غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ وہ تیسری بار میری طرف آیا تو اس کے ناک اور منہ سے خون جاری تھا۔ عین وقت پر نیچے بیٹھ کے میں نے اسے اوپر سے گزارا اور دوسری طرف کمر کے بل گرا دیا۔ اس کا ساڑھے تین چار سو پونڈ سے زیادہ کا بھاری جسم فرش پر بڑی آواز کے ساتھ گرتا تھا اور دھمک سے دیواریں ہل جاتی تھیں۔

اب اس کا حوصلہ جواب دینے لگا تھا مگر میں چاہتا تھا کہ وہ اٹھنے کے قابل نہ رہے۔ عاجز صاحب کی سٹی گم تھی اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے کبھی مجھے دیکھتے تھے تو کبھی اس دیوزاد کو جو ٹارزن نظر آتا تھا مگر مجھ سے بچے کی طرح پٹ رہا تھا اور بے بس تھا۔ ٹارزن نے مجھ پر چند حملے اور کیے مگر اب اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ میں نے اسے اتنی بار ادھر سے ادھر گھما کے پھینکا تھا، اچھالا تھا اور دیوار سے ٹکرایا تھا کہ اس کا دیوہیکل جسم ہر طرف سے چوٹ کھا کے زخمی ہو چکا تھا۔

رابعہ نے میرے کہنے پر دروازہ بند کر دیا تھا اور ریوالور نکال لیا تھا۔ اوکھلی میں سر دینے کے بعد ڈرنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ وہ قائل ہو گئی تھی کہ ہم یہاں مہمانی کے نام پر اسیری قبول کر کے خود کو کیکر شاہ کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو صورت حالات پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ جیسے جیسے وقت گزرے گا، معاملات بگڑتے جائیں گے۔ ہمیں کیکر شاہ نے دوستانہ انداز میں خوش آمدید نہیں کہا تھا۔ اس کے دوستانہ رویئے کے پیچھے دشمنی کا منافق جذبہ تھا جسے وہ چھپانے میں ناکام تھا۔ اس مضبوط قلعے سے نکلنا آسان نہ تھا مگر کیکر شاہ کو ایک بار دروازے

بند کرنے کا موقع مل جاتا تو ہم مر کے ہی اس زنداں سے نکلتے۔ ابھی ہم جال کے اندر تھے مگر ٹیگر شاہ نے جال کی ڈوریاں نہیں کھینچی تھیں۔ غالب اور نازو یہاں تھے تو ہم خود بھی انہیں تلاش کر سکتے تھے۔ اس امید میں کہ ٹیگر شاہ خود انہیں ہم سے ملوائے گا ہم اس قید خانے میں تمام عمر انتظار کرتے رہتے۔ ٹیگر شاہ ہماری حقیقت سے باخبر تھا۔ وہ یہ رسک کیسے لے سکتا تھا کہ ہم اس کے ٹھکانے تک پہنچ کے اس کے سارے شیطانی دھندوں سے واقف ہو جائیں اور اس کو دنیا میں رسوا کر کے جمے جمائے کاروبار کو چوپٹ کر دیں۔ اسے معلوم ہوگا کہ غالب بھی صحافی ہے۔ عاجز صاحب جیسے بھی تھے اسی پیشے سے تعلق رکھتے تھے اور غالباً پہلے بھی پیر ٹیگر شاہ کو بلیک میل کرنے کی ناکام کوشش بھی کر چکے تھے۔

کھانا لانے والا دیوزاد حادثاتی طور پر ہلاک ہو گیا۔ وہ کھانے کے ساتھ ایک چھری بھی لایا تھا جو پھل کاٹنے کے لیے تھی۔ اس نے آخری بار چھری اٹھا کے حملہ کیا اور میں نے پہلے کی طرح اسے ٹانگ اڑا کے اور تھوڑا سا اٹھا کے منہ کے بل گرایا تو چھری غلط زاویے پر آگئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہی جسم کے نیچے دب گیا اور چھری اس وزن سے اس کے دل میں پیوست ہو گئی۔

اس نے ایک بھیانک چیخ ماری اور دونوں ہاتھوں سے چھری کو پکڑ کے کھینچنے لگا۔ اس کوشش میں اس نے اپنا سینہ چاک کر لیا اور شاید دل کو بھی۔ اس کا خون ابل ابل کر کے اچھلنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک منٹ تڑپ کے ساکت ہو گیا۔

عاجز صاحب تھر تھر کانپ رہے تھے اور بے ہوش ہونے کے قریب تھے "یہ... یہ کیا کر دیا... قتل..."

میں نے رابعہ سے کہا "باہر دیکھو۔ کوئی آ رہا ہے۔ تم ایک طرف ہو جاؤ۔ اگر ضروری ہو تو گولی چلانا ورنہ مجھے نمٹنے دینا۔"

ایک ساتھ دو افراد دوڑتے ہوئے آئے۔ یہ وہی ٹیگر تھے جو ہمیں مہمان خانے میں لائے تھے۔ میں دیوار سے لگ کے کھڑا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک میرے پاس سے گزرا تو میں نے ٹانگ اڑا دی۔ وہ دھڑام سے منہ کے بل گرا۔ دوسرا اس کے پیچھے تھا، وہ میری طرف پلٹا۔ میرا سیدھا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس سے پہلے کہ وہ ریوالور سے فائر کرتا میں نے اس کی گردن پر اپنی کھڑی ہتھیلی سے بھرپور وار کیا۔ اس کی گردن جھکولے کے باعث جھٹکا کھا گئی ورنہ ٹوٹ جاتی۔ میں نے دوسرا ہاتھ اس کی کلائی پر مارا اور پلک جھپکنے میں اسے اپنی طرف کھینچ کے اس کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ وہ وہیں گر گیا اور میں نے اس کا ریوالور اٹھا لیا۔

رابعہ نے منہ کے بل گرنے والے کو اٹھنے ہی نہیں دیا تھا۔ وہ ریوالور کے ساتھ اس کے سر پر جا کھڑی ہوئی تھی اور میں نے اس کی آواز بھی سنی تھی۔ وہ بتا چکی تھی کہ اگر اس نے سر اٹھایا تو وہ اس میں سوراخ کر دے گی۔ وہ دم سادھے لیٹ گیا تھا اور لیٹے لیٹے اس نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ فرش پر ایک حیوان نما انسان اپنے ہی خون میں تھڑا پڑا ہے۔ اس نے اپنے ساتھی کو مقابلہ کر کے مرتے دیکھا ہوگا۔ مسلح ہونے کے باوجود وہ ایک منٹ سے کم وقت میں بازی ہار چکے تھے۔

خاموشی سے لڑی جانے والی اس جنگ میں گولی چلانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ خانقاہ کے کارپردازوں کو ابھی تک کچھ معلوم نہیں تھا ورنہ وہ اپنی ساری مسلح قوت کے ساتھ حملہ کرتے تو ہمارا حشر نشر کر دیتے۔ وہ جو دو ٹیگر بھی اس دیوزاد کی چیخ سن کر مرنے آگئے تھے ان میں سے ایک نے اپنے سر پر رابعہ جیسی حسین بلائے بے درماں، اس کے ہاتھ میں اصلی طمنچہ اور اس کی سر پھاڑنے کی دھمکی سن کر چپ رہنے میں ہی عافیت جانی تھی اور جان بچانے میں کامیاب رہا تھا۔

عاجز صاحب ہر طرف کشتوں کے پشتے لگے دیکھ کر اوسان کھو رہے تھے اور ان کے ہونٹوں سے بے ربط جملوں کے سوا کچھ نہیں نکل رہا تھا۔ "الف۔ یا خدا۔ ایک نہ شد دو شد۔ دو لاشیں۔" انہوں نے سر کو اپنے ہاتھوں میں تھام کے فرمایا "کس مصیبت میں پھنس گیا میں خدایا!"

میں نے راستے میں پڑے ہوئے شخص کو ٹانگ پکڑ کے کھینچا اور گھسیٹ کر باتھ روم میں لے گیا تو وہ اس منظر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ ایک انسان کی لاش کو میں کتے کی لاش کی طرح کھینچ کے باتھ روم میں ڈال آیا تھا۔ رابعہ اسی طرح لیٹے ہوئے شخص پر ریوالور تانے اور اس کی کمر پر اپنا پیر رکھے کھڑی تھی۔

"عاجز صاحب!" میں نے ڈانٹ کے کہا "ایسے کھڑے کھڑے کیا منہ دیکھ رہے ہیں۔ آپ سے تو ایک عورت اچھی جس نے ایک موذی کو قابو کر رکھا ہے۔"

"میں... میں کیا کر سکتا ہوں یار..." انہوں نے ہکلا کے کہا۔

"چلو میرے ساتھ، یہ دوسری لاش اٹھواؤ۔ یہ جنگلی بھینسا بہت بھاری ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بادل ناخواستہ دہشت سے لرزتے آگے بڑھے۔ بڑی احتیاط کے ساتھ ہاتھوں کو خون کے داغ سے بچاتے ہوئے انہوں نے دیوزاد کی ایک ٹانگ پکڑی جو کسی تناور درخت کے تنے جیسی تھی اور زور لگانے لگے۔

میں نے کہا "یہ کیا عاجز صاحب! آپ کی تو شلوار گیلی ہو رہی ہے۔"

ان کا چہرہ خفت سے زرد ہو گیا۔ ایک ابکائی کے ساتھ وہ فرش پر بیٹھ گئے اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ خون دیکھ کر اور اس کی بو محسوس کر کے ان کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔

میں نے کہا "مرد بنیں عاجز صاحب۔ قلم سے لوگوں کی ایسی تیسی کر دینا اور دھمکیاں دے کر مال سمیٹنا بہت آسان کام ہے جو بزدل کرتے ہیں۔ آپ نے تو صحافت کو ہی نہیں پٹھانوں کے نام کو بھی رسوا کر دیا ہے۔"

میری باتوں کا ان پر کیا اثر ہو سکتا تھا۔ وہ بیڈ پر جا کے لیٹ گئے اور غالباً تقویت قلب اور سکون کے لیے آیت الکرسی پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ یا جل تو جلال تو کا ورد کرنے لگے۔

جب میں دوسری لاش بھی باتھ روم میں ڈال کے آیا تو رابعہ نے واحد زندہ ٹیگر کو کھڑے ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا اور رابعہ اس کی گدی پر ریوالور رکھے اس کی جیبوں کی تلاشی لے رہی تھی۔ عاجز صاحب نے ایسے مناظر شاید انگریزی فلموں میں دیکھے ہوں تو دیکھے ہوں "کوئی پاکستانی لڑکی حقیقی زندگی میں یہ سب کچھ کر سکتی ہے" اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

رابعہ نے خنجر اور ریوالور برآمد کیا اور میری طرف اچھال دیا۔ یہ میں نے عاجز صاحب کو پیش کیا "ضرورت پڑنے پر اس کا استعمال کر سکتے ہیں آپ یا ایسے ہی لوگوں پر رعب ڈالنے کے لیے ساتھ لیے پھرتے تھے؟"

"یار! اب ایسی بات بھی نہیں" عاجز صاحب اٹھ بیٹھے "ہم پٹھان تو اسلحے کو مرد کا زیور کہتے ہیں مگر آدمی کو ایسے نہیں مارتے اور نہ مرنے کے بعد اس کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں۔ میری طبیعت خون دیکھ کے اور سونگھ کے بگڑ گئی تھی۔"

"سچ بتائیں، آپ نے آج تک کسی پر گولی چلائی ہے؟ میں پاگل کتے یا ناکارہ گھوڑے، ہرن یا فاختہ کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ کسی کو قتل کیا ہے کبھی؟ دشمنی تو شیوہ ہے آپ کی قوم کا۔ کسی دشمن کو مارا ہے کبھی؟"

"کیوں نہیں..." انہوں نے سینہ نکال کے جھوٹ میں سچ کا زور پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"ان کے جسم سے خون کے بجائے کیا روح افزا نکلتا تھا یا کوکا کولا؟" میں نے کہا "عاجز صاحب..."

رابعہ نے کہا "گولی مارو عاجز صاحب کو۔ ادھر آؤ" اس ٹیگر سے بات کر لی ہے میں نے "یہ تعاون پر تیار ہے۔"

میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑ لیا "تم دھوکا دے رہے ہو۔ جان بچانے کی خاطر جھوٹ بول رہے ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ایسی بات نہیں۔"

"پھر تم خلیفہ ٹیگر سے بدعہدی کیوں کر رہے ہو؟ اس کے جاں نثار نمک خوار اور وفادار عقیدت مندوں میں تمہاری حیثیت تو دست راست کی ہے۔ تم نے اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے بہت قربانیاں دی ہوں گی، بڑی محنت کی ہوگی۔"

اس نے سر ہلایا "پہلے ایسا ہی تھا۔"

"اب کیا فرق پڑ گیا ہے؟"

"اس نے میری اکلوتی بہن کو غائب کر دیا ہے جس سے اس نے باضابطہ نکاح کیا تھا۔ مجھے معلوم ہے وہ غائب نہیں ہوئی۔ نہ وہ فرار ہوئی ہے۔ اسے خلیفہ نے ختم کرا دیا ہے اور کہیں گاڑ دیا ہے۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی۔ اگر اسے کہیں جانا ہوتا تو وہ مجھ سے کہتی، مجھ سے مدد مانگتی۔"

"ممکن ہے وہ تم سے ڈرتی ہو کہ تم خلیفہ سے کہہ دو گے۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں تھی" وہ بولا "خلیفہ شادیاں کرتا رہتا ہے اور جو دل سے اتر جائیں انہیں رخصت کرتا رہتا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ ایک وقت میں اس کی بیویوں کی تعداد کیا ہے۔ اس کے حرم میں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ جو عورت ایک بار اس کے جال میں پھنس جائے وہ مر کے ہی نکل سکتی ہے۔ میں نے سمجھایا تھا اپنی بہن کو کہ خلیفہ ہوس کا شکاری ہے اور اس کا کھیل دیکھنا ہے تو میرے ساتھ چل۔ آئے دن عقیدت مندوں کی بہو بیٹیوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ تجھے خود اندازہ ہو جائے گا مگر کیا غلطی کی میں نے کہ اسے ساتھ لے گیا۔ میں اسے دوسرے گاؤں بھیج دیتا یا اس کی رخصتی کر دیتا۔ وہ سال بھر سے منسوب تھی لیکن میرے ماں باپ ہی جہیز مکمل نہ ہونے کی وجہ سے معاملے کو ٹال رہے تھے۔ خلیفہ میں کوئی خاص بات ہے کہ عورتیں اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔ کوئی وظیفہ ہے یا روحانی قوت ہے جس سے وہ عورتوں کو مطیع کر لیتا ہے۔"

میں نے طنز سے کہا "مرد اس وظیفے یا روحانی قوت سے متاثر نہیں ہوتے؟"

"میں نے یہی دیکھا ہے۔ مرد بھی اسے پیر مانتے ہیں مگر زیادہ تر عورتیں انہیں خلیفہ کے پاس لاتی ہیں۔ میں نے تو بہت تماشے دیکھے ہیں۔ بڑے بڑے عزت دار گھروں کی عورتیں گھر سے بھاگ کے آگئیں پھر ان کے شوہر کبھی پولیس لے کر آئے اور کبھی لٹھ بردار... مگر لے کر کیا گئے... لٹی ہوئی عزت تو انہیں واپس نہیں مل سکتی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ کتنی ہی عورتوں کو غیرت مند شوہروں نے، بھائیوں نے یا چاہنے والوں نے خود مار ڈالا اور فرار ہو گئے۔ میری بہن پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی تو لوٹ کر نہیں گئی۔ میں نے تو یہ بھی سنا تھا کہ پیر انہیں کوئی خاص خوشبو سنگھا کے مست کر دیتا ہے۔ اس کے پاس کوئی ایسی جڑی بوٹی ہے وہ انہیں کچھ پلا دیتا ہے جس کے اثر سے۔ خیر مجھے یہ سب بتاتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میری بہن کے ساتھ کیا ہوا۔ جب اس نے مجھے بتایا تو میں نے خلیفہ کو مجبور کر دیا کہ وہ اس سے شادی کرے... مگر اس سے کیا ہونا ہے۔ وہ مشکل سے چھ ماہ زندہ رہی پھر خلیفہ نے خود پولیس میں رپورٹ لکھوائی کہ وہ کیا کچھ لے کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ میری بہن کو وہ کہیں گاڑ چکا تھا۔ اس نے ایک باغی مرید کو بھی مروا دیا جو اس کے کرتوت جان کے باغی ہو رہا تھا۔ میرے بھی ماں باپ نہ ہوتے اور چھوٹے بھائی بہن نہ ہوتے تو میں اس کو مار کے پھانسی چڑھ جاتا لیکن بعد میں خلیفہ ٹیگر شاہ چہارم گدی نشین ہوتا تو میرے گھر والوں کی شامت آجاتی۔

www.paksociety.com

میں محتاط تھا اور موقع کی تلاش میں تھا۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا تو مجھے اس کہانی میں ایک جھول نظر آیا "تمہاری بہن نے تم سے کیوں نہیں کہا کہ وہ نکلنا چاہتی ہے؟"

"یہی تو شک کی وجہ ہے۔ میں اسے یوں نکال دیتا کہ خلیفہ کو کانوں کان خبر نہ ہوتی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کو پہلے سے اس کے ارادوں کا علم ہو گیا تھا۔ کیا پتا اس پاگل نے غصے میں خلیفہ کے سامنے کچھ بک دیا ہو۔"

میں نے کہا "اب تم ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"میں سب کچھ بتا سکتا ہوں، تم پوچھو۔"

"اچھا یہ بتاؤ غالب اور نازو یہاں ہیں یا نہیں؟"

"وہ اسی جگہ ہیں مگر آج رات انہیں نکال دیا جائے گا۔ ان کا سودا ہو گیا ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "سودا ہو گیا ہے! کیا مطلب؟"

"کوئی استاد پیڈرو ہے" وہ بولا "اس نے غالب کو اور اس کی بیوی کو چوہدری دلاور کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔"

غصے سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ "اب اور کتنے میں ہوا تھا یہ سودا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ چوہدری دلاور لاہور سے آیا تھا اور سودا ہوا تھا خلیفہ کی معرفت۔ سنا ہے پیڈرو ان کو تو شہر سے پشاور لے گیا تھا اور وہیں چوہدری دلاور کے حوالے کر دیا گیا۔"

میں نے غصے میں رابعہ کی موجودگی کا خیال کیے بغیر دلاور کو اور استاد پیڈرو کو فحش گالیاں دیں۔ ان کا میں یہ کروں گا وہ کروں گا۔

رابعہ نے میرا غصہ ٹھنڈا کیا "اس کے سامنے چلانے کا فائدہ۔ یہ پوچھو کہ اب کس سے سودا ہوا ہے۔"

"کوئی سیٹھ اکبر ہے۔"

میں اچھل پڑا "سیٹھ اکبر، اکبر خان دلاور کا بڑا بھائی؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔ پہلے چوہدری دلاور نے جو سودا کیا تھا اس میں خلیفہ برابر کا شریک تھا۔ اس پر کچھ گرما گرمی ہوئی تھی۔ دلاور کہتا تھا کہ چھوڑو میں خود نمٹ لوں گا پیڈرو سے۔ خلیفہ نے کہا کہ پیڈرو کے پاس اب کیا ہے۔ مال تو ہمارے پاس ہے اور ہم سے تم نقد سودا کرو تو اچھا ہے۔ طاقت کے استعمال میں تمہارا نقصان ہو گا، یہ تم جانتے ہو۔ دلاور نے بھی کہا کہ خلیفہ ایسی بات نہیں۔ فائدے میں تم بھی نہیں رہو گے۔ میرا نام چوہدری دلاور ہے لیکن میں ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہوں ورنہ اپنے ساتھ تم کو بھی لے ڈوبتا۔ اس کے بعد سودا ہو گیا۔ یہ ابھی چند دن پہلے کی بات ہے۔ سیٹھ اکبر تو کل رات آیا تھا۔"

"اسے کس نے بتایا اور اس کو کیا ضرورت پڑ گئی غالب اور نازو کی؟" میرا دماغ چکرانے لگا۔

"کیا پتا، خود پیڈرو نے کوئی چکر چلایا ہو۔" رابعہ بولی "ادھر سودا کیا ادھر دلاور کے حریف کو اطلاع دے دی۔"

"خلیفہ کو دلاور کی دھمکی نے بہت مشتعل کیا تھا۔ بعد میں نے کہا کہ اچھا بیٹا۔ تیری تو میں... معاف کرنا... میرے منہ سے گالی نکل گئی۔ اس نے سیٹھ اکبر کو بلا کے پوری قیمت وصول کر لی۔"

"اور اب وہ دلاور کو کیا جواب دے گا؟"

"کہہ دے گا وہ بھاگ گئے۔ اب تو اور آسان ہو جائے گا کام۔ وہ لڑکیاں تمہیں پڑی ہیں یہاں۔ تم اسے نکال کر لے جاؤ۔ چوہدری دلاور کیسے الزام دے گا خلیفہ کو۔"

"او کے۔ سیٹھ اکبر سے ہم بعد میں بات کریں گے۔ تم بتاؤ وہ کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا" وہ بولا "تمہیں نقشہ سمجھا سکتا ہوں اور کمروں کی چابیاں دے سکتا ہوں۔ مجھے بھی باندھ کر لٹا جاؤ اور کمرے کو باہر سے تالا لگا دو۔ ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ آگے تم خود نقشے کی مدد سے جانا۔ کوئی مشکل نقشہ نہیں ہے۔"

اس نے جیب سے ایک نوٹ بک نکالی اور اس کا ایک ورق پھاڑ کے قلم سے زمین دوز کمروں کا نقشہ اور راستہ مجھے سمجھانے لگا۔ پانچ منٹ بعد ہم اسے ناک آؤٹ کر کے باہر نکل آئے مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں اپنے ساتھ کیے جانے والے دھوکے کا اندازہ ہو گیا۔

ہم جس شخص کو ادھ موا کر کے آئے تھے اس نے شور مچا دیا۔ لاتوں اور مکوں سے دروازہ پیٹ رہا تھا اور مدد کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا حالانکہ اس نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کم سے کم آدھا گھنٹہ خاموش لیٹا رہے گا۔

"حرام زادہ۔ دھوکے باز۔ ہو گیا بھروسے میں" میں نے کہا۔

"بے وقوفی تمہاری ہے کہ دشمن پر بھروسہ کیا" رابعہ بولی۔

"ہاں۔ مجھے اس کو صحیح ناک آؤٹ کرنا چاہیے تھا" میں نے رابعہ کا ہاتھ پکڑ کے دوڑ لگائی۔

عاجز صاحب ہانپتے ہوئے ہمارے پیچھے دوڑے "یا اللہ! خیر کر... نہیں آئے۔ ساری عمر کا حساب کیا آج ہی برابر ہو گا۔"

میں نے پہلے کمرے کے دروازے میں چابی لگائی تو اوپر سے تین چار آدمی نمودار ہوئے۔ میں نے دروازہ کھول کے رابعہ کو اندر کھینچ لیا۔ عاجز صاحب جلدی میں دروازے سے ٹکرائے۔

"کیا کرتے ہو۔ مجھے باہر چھوڑ رہے تھے" انہوں نے فریاد کی۔

میں نے رابعہ سے کہا "تیار رہو جاؤ۔ وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔"

رابعہ نے سر ہلایا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ دوسری طرف میں نے پوزیشن سنبھالی۔ عاجز صاحب ایک پلنگ کے نیچے گھس گئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس مورچے سے وہ اپنی حفاظت بھی بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔

ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا شخص دروازے سے ٹکرا کر

اندر آئے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ ہم نے دروازہ اندر سے مقفل کر لیا ہو گا۔ پہلا شخص اپنے ہی زور میں دروازے سے گزرا تو میں نے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مار دیا۔ اس کی چیخ نے پیچھے والے کو چوکنا کر دیا تھا مگر وہ بریک نہ لگا سکا۔ میں نے اسے اندر کھینچ لیا اور رابعہ کی طرف پھینک کر تیسرے کے سامنے آ گیا۔

وہ ریوالور نکال کے نشانہ لے رہا تھا۔ میں غوطہ مار گیا اور گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ وہ دوسرے فائر سے پہلے میں نے اس کو بھی اندر گھسیٹ لیا اور اٹھا کے فرش پر دے مارا۔ اس وقت تک رابعہ کی گولی نے دوسرے شخص کا کام تمام کر دیا تھا مگر فائروں کی آواز نے نیچے سے اوپر تک کھلبلی مچا دی تھی۔

میں نے عاجز صاحب سے کہا "باہر نکلیے، اب کھلی جنگ ہو گی۔"

وہ لرزتے ہوئے باہر آئے "یا اللہ۔ میری ساری خطائیں معاف کر۔ پھر کبھی خطا کروں تو جو چور کی سزا وہ میری۔ بس آج جان بچ جائے۔"

"جان ایسے نہیں بچے گی۔ یہاں کھڑے رہے تو ابھی کوئی اندر آ کے گولی مار دے گا" میں نے کہا "آیئے ہمارے ساتھ۔"

ہم درمیانی دروازے سے گزر کے دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں دو بیکر سوئے پڑے تھے مگر فائرنگ کی آواز پر اٹھ بیٹھے تھے۔ ہم نے انہیں سنبھلنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ دو گولیوں نے انہیں ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔

عاجز صاحب چلائے "اب دو اور قتل۔"

میں نے کہا "کچھ تو حیا کیجئے۔ ایک عورت دو دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار چکی ہے۔ آپ کم سے کم ایک گولی ہی چلا دیں یا محض نمونہ لگا کے شہیدوں میں نام لکھوائیں گے۔"

رابعہ نے کہا "باتیں مت کرو۔ آگے چلو۔"

"میری سمجھ میں آنے والے نقشے کے مطابق اگلے کمرے میں غالب اور نازو کو ملنا چاہیے" میں نے کہا۔

"کاش مجھے وہ جانی" رابعہ نے بے تابی سے کہا۔

"حوصلہ۔ حوصلہ" میں نے اپنے بے قرار دل کو سمجھاتے ہوئے درمیانی دروازے کا قفل کھولا۔

کسی بگولے کی طرح اندر داخل ہو کے میں نے آواز دی "غالب!" لیکن غالب اس کمرے میں ہوتا تو جواب دیتا۔

رابعہ نے خالی کمرے کو دیکھا "یہاں تو نہیں ہیں وہ سکندر۔"

"اس سور کے بچے نے دھوکا دیا تھا ہمیں" میں نے کہا "ساری کہانی جھوٹی ہو گی اس کی۔ ہمارے نکلتے ہی اس نے شور مچا دیا تھا۔"

اور اسی وقت جب غصے اور مایوسی کی انتہا کو پہنچ کے مجھ پر دیوانگی طاری ہونے لگی اچانک میرے کانوں نے ایک آواز سنی۔ ایک ایسی آواز جسے سننے کے لیے میرے کان ترس گئے تھے۔ میں بری طرح چونکا۔ کیا یہ فریب آرزو تھا؟ میرے کان بج رہے تھے لیکن میرے ساتھ رابعہ بھی حواس باختہ ہو گئی تھی۔

"سکندر! یہ تو... یہ تو غالب کی آواز ہے" وہ چلائی اور دیوانہ وار اگلے دروازے کی طرف دوڑی۔ "ادھر آؤ، ادھر۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے دروازہ کوٹنا شروع کیا "غالب! تم ہو تو ادھر۔ بولو، نازو! جواب دو۔"

میں نے رابعہ کو کھینچ کے الگ کیا اور دروازے کو لات ماری "میں توڑ دوں گا اسے، ہٹ جاؤ... غالب!"

اب میں نے غالب کی آواز واضح طور پر سنی "سکندر! یہ تم ہو، تمہاری آواز ہے، رابعہ ہے تمہارے ساتھ؟"

رابعہ چلائی "ہاں، میں رابعہ ہوں، ہم تمہیں لے جانے کے لیے آئے ہیں۔"

نازو دوسری طرف سے چلائی "رابعہ باجی، رابعہ باجی۔"

رابعہ تو جیسے پاگل ہو رہی تھی۔ شاید دوسری طرف یہی حال نازو کا ہو گا۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے کھینچ کر دروازے سے دور کیا ورنہ وہ دروازے سے چمٹی ہوئی تھی اور رو رہی تھی۔ "ہٹو۔ میں اسے گولی سے اڑاتا ہوں" میں نے کہا اور پھر چلا کے غالب کو خبردار کیا "سامنے سے ہٹ جا غالب۔ میں تالے پر فائر کر رہا ہوں۔"

یقیناً دوسری طرف غالب اور نازو بھی دروازے سے چمٹے کھڑے تھے۔ میں نے غالب کی آواز سنی۔ وہ نازو کو پچکار رہا تھا۔ "بس جان! بس... حوصلہ کرو۔ وہ آ گئے ہیں، تھوڑی سی دیر کی بات اور ہے۔ آؤ ادھر آؤ۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔"

"غالب! میں فائر کرنے لگا ہوں۔"

"کرو۔ جلدی کرو یار ادھر سے کوئی آ رہا ہے۔ نازو! الو کی بچی۔ سنتی کیوں نہیں۔ ابھی مرے گی سکندر کی گولی سے۔"

میں نے تالے پر گولی چلائی اور تالا ٹوٹ گیا۔ ایک دھماکے کے ساتھ ہی یکلخت وہ فاصلہ اپنا وجود کھو بیٹھا جو صدیوں پر پھیلا محسوس ہوتا تھا اور جدائی کی وہ خلیج جس کا دوسرا کنارہ ابد کی سرحدوں سے بھی آگے بار رسائی کی انتہا پر تھا، ایک دم سمٹ گئی۔

پھر میں غالب سے چمٹ گیا اور نازو چیخ مار کے رابعہ سے لپٹ گئی۔ اس وقت میں رو رہا تھا اور غالب رو رہا تھا۔ ایسے میں پہلے کبھی نہ رویا تھا مگر مجھے احساس نہ تھا۔ میں اس کے سر اور بازو اور اس کے جسم کو چھو کر محسوس کر رہا تھا اور معلوم نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ شاید وہی جو غالب مجھ سے پوچھ رہا تھا "تو ٹھیک ہے نا، بالکل ٹھیک ہے نا، تجھے کچھ ہوا تو نہیں؟"

پھر میں نے نازو کو دیکھا جو رابعہ سے لپٹی زار و قطار رو رہی تھی اور میں نے غالب کو چھوڑ کر اسے کھینچ لیا "پاگل! بے وقوف! اب کیوں روتی ہے؟"

اس نے کہا "تم کیوں رو رہے ہو؟ تم تو مرد ہو، سکندر اعظم

www.paksociety.com

ہوں"

میں نے کہا "نہیں۔۔۔ میں کہاں رو رہا ہوں' ہوش میں آؤ نازو۔"

غالب اب رابعہ کو دلاسا دے رہا تھا "چپ کرو وکیل صاحب۔ وکیل کہیں روتے ہیں' دیکھو بے ہوش مت ہونا۔"

بس وہ ایک بہت مختصر وقفہ تھا جس میں جذبات کا اظہار کرنے سے ہمارے عقل و ہوش بھک سے اڑ گئے۔ ہم یہ بھی بھول گئے کہ یہ جگہ رونے دھونے اور گلے شکوے کی ساری پیاس بجھانے کی نہیں ہے۔ اب بچھڑے ہوئے ملے ہیں تو جذبات کے اظہار کے لیے بعد میں بہت وقت ملے گا۔ یہاں ہر لمحہ ہمارے گرد خطرے کے حصار کو تنگ سے تنگ تر کرتا جا رہا ہے۔

جب ایک ساتھ ادھر ادھر کے تین دروازوں سے بہت سے لوگ مہلک آتشیں اسلحے کے ساتھ اندر گھس آئے تو ہم بے وقوفوں کی طرح آنسو پونچھتے رہ گئے۔ ہمیں ریوالور اٹھانے کی مہلت بھی نہ ملی۔ خود کار مشین گنوں کے مقابلے میں ریوالور ویسے بھی بے کار تھے۔

اندر آنے والے چھ نیگر تھے۔ سبز قباؤں اور زرد ٹوپیوں والے۔ ان میں سے ایک وہی تھا جس نے اپنی بیگ کا ڈھکنا میرے لیے کھولا تھا۔

"ہاتھ نیچے رکھو اور ریوالور وہیں چھوڑ دو جہاں کھڑے ہو۔ پھر ایک قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

میں نے اور رابعہ نے تعمیل کی۔ پھر ماجد صاحب نے بھوں بھوں کر کے رونا شروع کیا "خدا کی قسم میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے کسی کو نہیں مارا۔ میں تو خود بہت مجبور تھا۔ پھنس گیا تھا مصیبت میں۔"

ایک نیگر نے آگے بڑھ کے ریوالور اٹھائے۔

"اب اپنے چہرے دیوار کی طرف کرو اور ہاتھ اوپر اٹھالو۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا لگتا تھا اور شاید ہم سے بچھڑنے کے بعد اس نے شیو بھی نہیں بنائی تھی۔ وہ کچھ دبلا بھی ہو گیا تھا۔ "لیو آر گریٹ۔ چیف کے نیو۔"

"مرزا غالب کی آرم' نو' ٹلا کیسے ہو گیا؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کٹا نہیں سکے۔ میں نے عہد کیا تھا کہ جب تک ہم ملیں گے نہیں' بال نہیں کاٹوں گا۔" غالب بولا اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

ایک نیگر میری تلاشی لینے لگا۔ میں نے کہا "تیری حجامت میں کروں گا اپنے ہاتھ سے۔"

غالب ہنسا "کیا اب یہ کام شروع کر دیا ہے۔ چل اچھا کیا' جب اولاد ہو گی نا ہماری تو اسے مسلمان بھی خود کرنا۔ بقلم خود نہیں' بہ استرہ خود۔"

نازو اب رابعہ کے ساتھ دیوار کی طرف منہ کیے کھڑی تھی۔

"پہلے خود تو مسلمان ہو جاؤ بے شرم کہیں کے۔"

ہم سب ایک دوسرے سے ملنے کی خوشی میں ایسے دیوانے ہو رہے تھے کہ خطرے کے وجود کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ اب جو ہو سو ہو۔ ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت۔ مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم سب خلیفہ نیگر کے فیصلے کو خوشی خوشی قبول کر چکے تھے۔

غالب ہنسا "ابے تو کیا کھا کے اتنا سور ہو رہا ہے۔ نازو نہیں کرتی۔ نہال ملتا ہو روز کھانے کو۔"

"ابھی کہاں یار۔ ابھی تو رستے کھا رہے ہیں۔ نیگر کیا اپنی بیوی کا وزن بڑھ گیا ہے؟"

"بالکل بڑھ گیا ہے' کیوں نازو؟"

"ماشاء اللہ سے صحت اچھی ہو رہی ہے۔ رابعہ باجی' آپ بھی بڑے لشکارے مار رہی ہیں۔" نازو بولی۔

رابعہ نے جھینپ کے کہا "لشکارے کی بچی۔ چلنے لگی زبان تیری بھی۔"

"اوئے بند کرو اپنی بک بک اور چلو۔" سب پر حکم چلانے والے نیگر نے جھلا کے کہا۔

میں نے کہا "یار نیگر یاد سے ہوتے چلنے کو یہاں سب تیار بیٹھے ہیں۔"

"آج بازار میں پابجولاں چلو" غالب نے کہا "دست برفشاں چلو۔"

میں نے چلتے ہوئے گانا شروع کیا "چل چل رے نوجوان' اونچی تیری شان۔"

اب غالب بھی میرے ساتھ گانے لگا "چل چل رے نوجوان۔ اونچی تیری شان۔"

سارے نیگر یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم پاگل ہیں یا نشے میں ہیں۔ ہم ان کے پیچھے چلتے ہوئے مسلسل ہنس رہے تھے اور ایسی باتیں کر رہے تھے کہ واقعی پاگل نظر آنے لگے۔

"یہ میں اور محسن لال کے گانے تھے لندن میں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "یہ ایم آر ایس کا قومی ترانہ ہے۔ مجھے تو یاد ہے۔ چل چل رے نوجوان۔ اونچی تیری شان۔ اونچی تیری ناک۔ اونچی تیری سوچ۔ اونچے تیرے کان' چل چل رے نوجوان۔"

جب ہمیں خلیفہ نیگر کے سامنے پیش کیا گیا تب بھی ہم ہنس رہے تھے۔ لیکن اس کے دربار میں پہنچانے کے بعد باقی نیگر چلے گئے تو ہم سب کی رفتہ رفتہ خوشی ختم ہو گئی۔ ایک بار پھر صورت حال کی سنگینی کا احساس ہمارے اعصاب پر سوار ہو گیا۔ خلیفہ نیگر ہمارے غیر سنجیدہ رویے پر سخت حیران تھا۔ اسے یقین ہو گا کہ اتنے دخول کے بعد ہم مجرم کی حیثیت سے سامنے لائے جائیں گے۔ ہمارے رنگ فق ہوں گے' سر جھکے ہوئے ہوں گے اور نظر شرمندہ

ہو گی۔

اس کے سامنے ایک اور شخص بیٹھا ہوا تھا جس کی شخصیت کا سب سے نمایاں حصہ اس کا سرخ و سفید رنگ اور مہندی سے رنگے ہوئے بال تھے۔ وہ پچاس سال سے زیادہ عمر کا بارعب شخص تھا۔ اس کی صحت اچھی تھی بلکہ قابل رشک تھی۔ اس کی آنکھیں بھوری تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے اس نے بالوں سے میچ کرنے کے لیے لینس لگا رکھے ہیں۔ وہ بہترین سلے ہوئے سفاری سوٹ میں تھا اور اس کے پیروں میں پیٹنٹ لیدر کے انگلش بوٹ تھے۔

"جو کچھ تم نے کیا میاں سکندر! اس پر تم پشیمان بھی نہیں ہو" خلیفہ نیگر نے ہمارے بیٹھ جانے کے بعد دانتوں میں خلال کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ ہم غلطی کرتے ہیں تو پچھتاتے ہیں' شوقیہ نہیں۔"

خلیفہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں "اور یہ جو تم نے اتنے بے گناہوں کا خون کر دیا۔ یہ ہمارے وفادار لوگ تھے۔ ان کی قدر تم نہیں جانتے۔ ان میں سے ایک کی جان کے بدلے ہم چاہیں تو تم سب کے سر اتار لیں۔"

"تمہاری طرف سے اجازت ہے" میں نے اس کی باتوں سے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کے ارادے کی راہ میں یقیناً کوئی مجبوری حائل ہے۔

"کیا ضرورت تھی آخر اس کی؟ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ جس کی امانت ہے پہلے اس سے اجازت لے لیں" خلیفہ نیگر زخمی ہو کے بولا۔

"ہم اور تمہارے جاں نثار" میں نے تلخی سے کہا۔

"خاموش ہو جاؤ" خلیفہ نے دہاڑ کے کہا "یہ نہ ہو برداشت کا حوصلہ نہ رہے ہم میں۔ اکبر خان جتنی جلدی ممکن ہو' ان بدبختوں کو ہماری نظروں سے دور لے جاؤ۔ کہیں ہم سودا منسوخ نہ کر دیں۔"

"خلیفہ صاحب! میں وعدہ کر چکا ہوں سارے نقصانات کی تلافی کا۔ آپ سے بعد میں بات ہو جائے گی۔ چلیں انہیں معاف کر دیں۔" اکبر خان بولا۔

"نہیں۔ یہ نہیں ہو گا اکبر خان۔ میں انہیں کیسے معاف کر سکتا ہوں۔ ایک بار تم انہیں لے جاؤ' اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ معافی کا کیا سوال ہے۔ ان کو سزا ضرور ملے گی" اس نے نفرت سے کہا اور اپنا منہ پھیر لیا۔

اکبر خان اٹھ کھڑا ہوا "اچھا تو پھر ہم چلتے ہیں' خدا حافظ۔"

خلیفہ نیگر نے اس کو جواب نہیں دیا۔ وہ بہت غصے میں تھا اور اکبر خان کی مجبوری نہ ہوتی تو یقیناً ہمیں عبرتناک سزا ملتی۔ معلوم نہیں لالچ کی یہ مجبوری کتنی بڑی تھی کہ وہ ہمارے ہاتھوں مارے جانے والوں کے لہو کی قیمت بھی وصول نہ کر سکا۔ بات صرف پیسے کی ہوتی تو وہ اکبر خان کی ادا کی ہوئی قیمت اس کے منہ پر مارتا اور کہتا کہ میرے مجرم چھوڑ جاؤ مگر ایسا لگتا تھا کہ وہ عہد شکنی سے بھی ڈرتا ہے۔

تعارف کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ جیسے ہی خلیفہ نیگر نے اس کا نام لیا تھا میں سمجھ گیا تھا کہ وہ چوہدری دلاور کا بڑا بھائی ہی ہو سکتا تھا جسے دلاور اپنی دانست میں ہلاک کروا چکا تھا مگر وہ زندہ تھا۔ یہ بات دلاور کو بھی معلوم تھی یا نہیں اور اکبر خان ہم سے کیا کام لینا چاہتا تھا' اس کا فیصلہ آنے والے حالات ہی کر سکتے تھے۔ ابھی تو یہ سودا بھی ایک معما بن گیا تھا۔ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

باہر شاید ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا تھا اور دفعہ ایک سو چوالیس نافذ کر دی گئی تھی کہ مشتاقان دید مایوس ہو کے مزار لوٹ رہے تھے اور اپنی قسمت کو کوستے ہوئے منتشر ہوتے جا رہے تھے۔ خانقاہ کے اندر فائرنگ کے بارے میں جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ ہر دروازے پر بیگ کے ساتھ موجود نیگر ایک دوسرے سے اشاروں میں پوچھ رہے تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ کیا خلیفہ نیگر مرشد کا تختہ الٹ دیا گیا؟ خلیفہ چہارم نے گدی پر قبضہ کر لیا۔ چھاپا پڑ گیا یا کوئی "نیگر گزیدہ" انتقام کے جنون میں مرنے مارنے کے لیے اندر جا گھسا۔

باہر ایک بالکل نئی چمکتی رنگتی لمبی سی زارٹ کار کھڑی ہوئی تھی اور باوردی شوفر اپنی ٹوپی بونٹ پر رکھے بڑے پیار سے اس کی صفائی میں مصروف تھا اور ساتھ سگریٹ بھی پیتا جاتا تھا۔ کار کی پالش کو صفائی کی ضرورت نہیں تھی مگر کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنے کو بہتر سمجھتے ہوئے وہ اپنا کام کر رہا تھا۔ اس طرح وہ مرید اپنا باصفا اور عالموں اپنا بے حیا کے ساتھ رابطے کی ضرورت سے بھی بے نیاز تھا۔

اکبر خان کو دیکھتے ہی اس نے بڑی پھرتی سے ٹوپی سر پر رکھی اور دروازہ کھول کے کھڑا ہو گیا۔ ایک دروازے سے رابعہ کے بعد میں داخل ہوا تو دوسرے سے نازو کے پیچھے غالب آیا۔ سیٹ خاصی کشادہ تھی مگر چار کے لیے قدرے تنگ ثابت ہوئی۔ اکبر خان آگے بیٹھ گیا تو شوفر نے گاڑی بڑھا دی۔

ابھی تک ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ کار کے روانہ ہوتے ہی اکبر خان نے کہا "میرا نام ہے۔"

میں نے کہا "اکبر خان ہے۔ آپ چوہدری دلاور کے بڑے بھائی ہیں۔"

وہ ایک دم چونکا "یہ کون کہتا ہے؟"

"میں کہہ رہا ہوں" میں نے سکون سے جواب دیا "اگر یہ بات غلط ہوتی تو آپ کو شاک نہ لگتا۔ میری غلط معلومات پر حیرانی ہوتی اور آپ تردید کر دیتے۔"

"گویا تم مجھے پہلے سے جانتے ہو۔۔۔ اور کیا جانتے ہو میرے بارے میں؟" اس نے حقیقت کو تسلیم کر لیا۔

"آہستہ آہستہ سب معلوم ہو جائے گا سیٹھ اکبر۔ آپ تو بیوپاری ہیں انسانوں کے" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"میں بزنس مین ہوں۔ تم سے کسی نے غلط کہا کہ میں انسانوں کا بیوپاری ہوں" اس نے برا مانے بغیر کہا اور سگریٹ کا پیکٹ میری طرف بڑھانے کے لیے پلٹا۔

"تھینکس۔ ہم میں سے کوئی اسموکر نہیں" غالب نے کہا۔

"آل رائٹ کیپ" اس نے بڑے شائستہ لہجے میں کہا "مجھے امید ہے لیڈیز مائنڈ نہیں کریں گی۔"

وہ ایک مہذب آدمی تھا اور اس کے اپنی کیٹس ہی نہیں لہجے سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی وقت بیرونِ ملک یورپ میں گزار چکا ہے۔

رابعہ نے انگریزی میں کہا "آپ اپنا شوق پورا کریں لیکن پھر اے سی بند کر کے کھڑکی کھول دیں۔"

"شیور۔" اس نے کہا اور کھڑکی کا شیشہ اتار دیا "اب میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ میں سے مسز رابعہ قاری کون ہے؟ غالباً آپ ہی ہیں خاتون؟"

"آپ کا اندازہ غلط نہیں۔"

"پھر یہ دوسری خاتون مس نازو ہوں گی' یہ کچھ عجیب سا نام ہے غالباً نِک نیم (NICK NAME)"

"مس نزاکت شیخ۔ صرف گھر والے مجھے نازو کہتے ہیں۔"

"رائٹ۔ میں خیال رکھوں گا مس نزاکت" وہ بولا "آپ ایک مشہور صحافی ہیں مسٹر غالب۔"

"تھا" غالب نے تلخی سے کہا "پرانی بات ہے۔"

وہ ہنسا "وائنڈ از گونڈ۔ صحافی تو پیدائشی طور پر صحافی ہوتا ہے اور اس میں ایک خداداد صلاحیت ہوتی ہے جو مرتے دم تک نہیں مرتی۔ جیسے آرٹسٹ ہر حال میں آرٹسٹ رہتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ معاش کے لیے وہ بس کنڈکٹر بن جائے یا کلرک۔ اس سے فرق نہیں پڑتا۔ تم بہت کام کے آدمی ہو۔"

"تو آپ نے غالب کی صلاحیت کو خریدا ہے۔ میں سمجھ گیا سیٹھ اکبر خان" میں نے کہا۔

"یہ تم کیا بار بار خریدنے کی بات کرتے ہو۔ کیا یہ کافی نہیں کہ میں نے تم کو اس خبیث فراڈ خلیفہ کے چنگل سے نجات دلائی۔"

"تھینک یو ویری مچ سر۔ بڑی مہربانی کی۔"

"مہربانی میری نہیں' تقدیر کی مہربانی تھی تم پر۔ مجھے تو معلوم بھی نہ ہوتا اور تم چوہدری ولاور کے پاس پہنچ جاتے" وہ بولا۔

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں بلکہ لے جائے جا رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں اپنے گھر لے جا رہا ہوں تمہیں لیکن تم نہ جانا چاہو تو تمہاری مرضی۔ میں تم کو کہیں بھی ڈراپ کر سکتا ہوں۔ تم لاہور جانا چاہو تو شوفر تمہیں چھوڑ آئے گا۔"

اچانک مجھے عاجز صاحب کا خیال آیا "رابعہ! وہ عاجز صاحب کہاں رہ گئے۔ میں تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔"

رابعہ نے کہا "وہ ہمارے ساتھ کب نکلے تھے۔"

"پھر۔ وہ وہیں رہ گئے" میں نے تشویش سے کہا۔

"ہاں۔ خلیفہ کیلر نے روک لیا تھا اسے" سیٹھ اکبر نے جواب دیا "ڈونٹ وری۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔"

"بزنس مین تو اپنی پسند کا مال اٹھاتا ہے مگر مجھے اس کے بارے میں تشویش ہے سیٹھ اکبر" میں نے برہمی سے کہا۔

"بہت دیر میں خیال آیا تمہیں اس کے ساتھ نہ ہونے کا۔"

"میں اپنے دوستوں سے ملنے کی خوشی میں اسے بھول گیا تھا۔ مجھے اپنی کوتاہی کا اعتراف ہے لیکن۔۔۔"

"فارگیٹ ہم۔" اکبر خان بولا "اسے کچھ نہیں ہو گا۔ خلیفہ کیلر جانتا ہے کہ وہ ایک صحافی ہے۔ جیسا بھی ہے اچھا یا برا۔ اور ہم سب کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے۔ خلیفہ اس سے کوئی ڈیل کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تو اسے بھی لا سکتا تھا مگر خلیفہ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ خود اسے پشاور پہنچا دے گا۔ میرا گھر اسلام آباد میں ہے۔ میں زیادہ وقت لندن میں رہتا ہوں لیکن پاکستان آتا رہتا ہوں۔ ہم وہاں ایک بزنس پروپوزل کو ڈسکس کریں گے۔ اگر آپ سب نے منظور کیا تو بات آگے ہو گی ورنہ ختم۔"

"بہت بڑا جوا کھیلا ہے تم نے" غالب بولا۔

"قاری' لائف از اے گیمبل" وہ بولا۔ (میرے لیے زندگی ایک جوا ہے)

"کتنا کمایا تھا اوپر؟" میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ "اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں پیشہ ور جواری ہوں۔ لاس ویگاس اور مونٹی کارلو کے جوئے خانوں میں اس سے کہیں زیادہ ہار جاتا ہوں ایک رات میں۔ یو سی' خلیفہ ایک گھٹیا درجے کا اخلاقی مجرم ہے۔ قانونی طور پر بھی وہ غلط کام کرتا ہے تو بہت گھٹیا۔ صرف پیسے کی خاطر۔ جب آدمی پیسے کو مقصد بنا لیتا ہے تو پھر وہ ذلیل ہوتا ہے۔ پیسہ تو ایک ذریعہ ہے۔ عیش و عشرت کی زندگی کے لیے' عزت اور شہرت کے لیے' خوشی کے لیے' تھرل THRILL کے لیے۔ اور ڈونٹ مائنڈ میں ذرا صاف گو ہوں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک ثواب کمانے اور دوسری دنیا کی زندگی میں جنت کا سودا پکا کرنے کے لیے۔"

"میں تم سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے ہم خیال ہیں میں اور تم" وہ بولا "ایسا ہوتا ہے مسٹر سکندر بخت۔ ایک آدمی ساری عمر روکھی سوکھی کھاتا ہے' چیتھڑے پہنتا ہے اور سلمز (SLUMS) میں رہتا ہے۔ جب وہ مر جاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ لکھ پتی تھا۔ اس کے لیے پیسہ ایک مقصد ہوتا ہے۔ وہ جمع کرتا رہتا ہے' جمع کرتا رہتا ہے۔ مرتے دم تک۔ ایک خاص حد تک بزنس مین بھی اس چکر میں پڑتا ہے۔ وہ لکھ پتی ہو تو کروڑ پتی اور کروڑ پتی ہو تو ارب پتی بننا چاہتا ہے۔"

"تم مجھے بتا رہے ہو کہ تم اس چکر سے آگے نکل چکے ہو۔" میں نے کہا۔

"مرعوب ہوا سیٹھ اکبر" میں نے کہا۔

"میرا مقصد مرعوب کرنا نہیں تھا۔ سیدھی سچی بات بتا رہا تھا مرعوب ہوا۔ میں فکر نہیں کرتا کہ پیسہ کہاں سے آئے گا اور کیسے آئے گا۔ یا ختم ہو گیا تو کیا ہو گا۔ اتنی جگہ انویسٹمنٹ ہے میری کہ خود مجھے یاد نہیں۔ میں اپنے چیف اکاؤنٹنٹ سے پوچھ کے بتا سکتا ہوں۔ میں اپنی بڑائی نہیں کرنا چاہتا۔ سمندر کی مثال لے لو۔ اسے کیا معلوم کہ کہاں کہاں سے ندی نالے اس میں کتنا پانی ڈال رہے ہیں۔ یہ اطمینان کافی ہے میرے لیے کہ مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہتے ہیں کم از کم اس جنم میں" وہ ہنسا۔

"ایک اور جنم کی خواہش رکھتے ہو تم؟"

"خواہش سب ہی رکھتے ہیں مگر یقین نہیں رکھتے۔ یہ جو خلیفہ ٹائپ لوگ ہیں نا' ان کو تو یہ جنم بھی نہ جانے کیوں ملا۔ کیا پایا انہوں نے زندگی سے؟ بے اطمینانی' بے سکونی' احساسِ جرم' ڈر' خوف۔ بے شک میں نے بھی اتنی دولت شریفانہ کاروبار سے نہیں کمائی مگر اب میں محفوظ ہوں اور مطمئن۔"

"ضمیر کی خلش سے بھی؟"

"وہ تو بہت جلد مطمئن ہو جاتا ہے۔ شروع میں کچھ دن تنگ کرتا ہے جیسے کوئی جنگلی جانور شروع میں قید کر کے لایا جاتا ہے تو قابو میں نہیں آتا مگر پھر شیرزادے سدھا لیتے ہیں' وہ پالتو ہو جاتا ہے" اکبر خان بولا "جیسے آدمی چاہے ویسے ہی مطمئن ہو جاتا ہے اور جو عام لوگوں کے اخلاقی پیمانے کے مطابق غلط ہو اس پر شور مچانا چھوڑ دیتا ہے۔ ویسے یہ الگ بحث ہے کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا' غلط کیا ہے اور صحیح کیا۔ ہر آدمی کا اپنا حوالہ ہے۔ FRAME OF REFERENCE- جس کے مطابق وہ فیصلے صادر کرتا ہے۔ بعض اوقات بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے ایک چیز کو غلط سمجھتا ہے مگر خود وہی کرتا ہے تو کسی دوسرے حوالے سے اس کو جائز قرار دے کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہی ہے ضمیر کو اپنی مرضی پر چلانا جس کو ہم ضمیر کا اطمینان سمجھنے کے عادی ہیں۔"

"سیٹھ اکبر! میری معلومات کے مطابق تم پشاور کے ایک قبائلی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ تمہارا باپ لکڑی پر نقاشی کے کام کا بہت اعلیٰ فرنیچر بناتا تھا۔ وہ ایک عظیم فنکار اور بڑا آدمی تھا۔"

"اچھا!" اکبر طنز سے بولا "بہت بڑی کوٹھی اور کار ہوگی اس کے پاس' نوکر چاکر ہوں گے اور جب وہ باہر نکلتا ہو گا تو سب ہاتھ سلام کے لیے اٹھ جاتے ہوں گے۔ بڑا آدمی ہے آخر۔"

"بات وہی ہے۔ تمہارے اور میرے حوالے میں فرق ہے۔ تم بڑا آدمی اس کو سمجھتے ہو یا دولت مند کو اور خلیفہ کو۔ میرے نزدیک ایک خوددار' کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانے والا' حلال کی روزی کمانے' قناعت سے زندگی گزار دینے والا فنکار بڑا آدمی ہے۔ اصولوں پر سودا نہ کرنے والا ادیب۔"

وہ ہنسا۔ "تم بیسویں صدی میں اٹھارویں صدی کی سوچ رکھتے ہو۔ یہ باتیں کتابوں میں اچھی لگتی ہیں۔ یا فلموں میں اسٹیج کے ڈائیلاگ کی طرح بولی جائیں تو اگلی صفوں والے ان سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ وہ سب جو امیر نہ بن سکے' امیروں کی زندگی کو جہنم سے بدتر' ان کی کمائی کو حرام اور انہیں دنیا ہی میں رسوا ہوتا دیکھ کے سکون حاصل کرتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے ہم اچھے ہیں۔"

میں نے اس سے بحث کرنا لاحاصل سمجھا "اچھا چھوڑو ساری باتیں' یہ بتاؤ کہ تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی ہماری؟ کس کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہو تم ہمیں؟"

"ایسی جلدی کیا ہے" وہ بولا "ٹیک اٹ ایزی۔ اس موضوع پر فرصت سے بات کریں گے۔ بس اب کچھ دیر میں ہم گھر پہنچنے والے ہیں۔"

رابعہ اور نازو سر جوڑے باتوں میں مصروف تھیں بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ ایک دوسرے کے کان کھا رہی تھیں۔ ان کی زبانیں قینچی کی طرح چل رہی تھیں اور وہ درمیان میں "ہائے اللہ" "اوئی" "اللہ سچ" جیسے الفاظ کا آزادانہ استعمال کرنے کے علاوہ حیرت اور خوف سے بھرپور چیخوں سے بھی گفتگو کو زنانہ انداز میں پُر اثر بنا رہی تھیں۔ انہیں کم سے کم وقت میں ایک دوسرے کو فرقت کے شب و روز کا سارا احوال' غم و الم کی ساری کیفیات اور دورِ جدائی کے ہر لمحے کا فسانہ غم سنانے کی جلدی تھی۔ کس پر کیا بیتی' کون کس کو کتنا یاد کر کر کے کتنا آنسو بہاتا رہا۔ آٹھ آٹھ کے سولہ سولہ۔ اور بقول فلمی شاعر کیسے دن بیتے کیسے بیتی رتیاں۔ یہ سب بڑی افراتفری میں گوش گزار کیا جا رہا تھا۔ اگر وہ نظم و ضبط سے باری باری ایک دوسرے کو حالات کا خلاصہ سنانا چاہتیں تو ان کا کام آسان ہو جاتا مگر ایک تو اس قسم کے حالات میں خواتین جذبات سے اتنی مغلوب ہوتی ہیں کہ عقل تو فوراً خدا حافظ کہہ کے کہیں چرنے چلی جاتی ہے۔ دوسرے خلاصے میں بات کرنا ویسے بھی ان کی عادت اور فطرت کے خلاف ہے۔ نتیجہ یہ کہ دونوں بول رہی تھیں اور شاید سُن بھی رہی تھیں۔

غالب خاموش تھا۔ آپس کی باتیں کرنے کے لیے یہ جگہ اور وقت دونوں ہی نامناسب تھے ورنہ باتیں تو ہمارے پاس بھی بہت تھیں۔ پھر بھی عمومی نوعیت کی باتیں کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ غالب نے سر گاڑی کی نشست سے ٹکا رکھا تھا اور آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس نے میری اور اکبر خان کی گفتگو میں بالکل دلچسپی نہیں لی تھی۔

میں نے کہا "مرزا جی! کوئی خواب دیکھ رہے ہو؟"

غالب آنکھیں کھول کے مسکرایا "خوابوں کے آسرے پہ کٹی ہے تمام عمر"

"بے مقصد خواب جن کی تعبیر سراب" میں نے کہا "تم لوگ کیا سب فلمی اور صوفیہ' رہبار مراد اور بےخبر۔ خواب نہیں دیکھتے

www.paksociety.com

تھے؟ ایک ایسی دنیا کے جس میں اچھے انسان ہوں اور صرف اچھائی ہو۔۔۔ اور انہی کے خوابوں سے دنیا میں سائنس، علم وادب، تہذیب اور انسانیت کے شعور کا تصور پیدا ہوا۔"

"میں کب خوابوں کو برا کہہ رہا ہوں" غالب بولا "یہ بتا باقی سب کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "محسن اور گل ابھی تک لاپتا ہیں۔ گل کے بارے میں ایک افواہ اب خبر بن چکی ہے کہ وہ پھر ناگ منی بن گئی ہے۔ میں نے خود اخبار میں پڑھا تھا۔"

"جعلی اخبار ہوگا" غالب نے کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا مرزا جی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مجھے یہ خیال نہیں آیا۔ تمہاری ناقص عقل میں فوراً آ گیا۔"

"یہ عقل کی نہیں، تجربے کی بات ہے۔ ہم اخبار میں سرخی کیسے بدلتے تھے؟ اندرون ملک جانے والے اخبار اور شہر میں تقسیم ہونے والے ایک ہی تاریخ کے اخبار اٹھا کے دیکھو۔ بہت فرق ہوتا ہے خبروں کے صفحات میں اور کسی اخبار کے کسی صفحے پر ایک خبر کی جگہ دوسری خبر لگانا یا سرخی بدلنا روز کی بات ہے۔ آخری کاپی سے ایک قلم ہٹا کے دوسری لگائی اور نئی پلیٹ چڑھا دی مشین پر۔"

میں نے سر ہلا کے کہا "میں سمجھ گیا وہ خبر بھی کچھ ایسی ہی ہوگی۔"

"کیا تھا اس خبر میں؟"

"ڈکیتی کی ایک واردات کی خبر تھی۔ ناگ منی کی تصویر کے ساتھ مگر تصویر پرانی تھی۔"

"فائل سے نکالی گئی ہوگی" غالب بولا "تم نے کوشش بھی نہیں کی ان کا پتا چلانے کی؟"

"کہاں کوشش کرتے، کس سے پوچھتے۔ یہ تو ان کا فرض تھا کہ خود ہم سے رابطہ قائم کریں۔ سب کے سیل فون نمبر تو ان کے پاس اور رہتے تھے" میں نے کہا۔

"کیا پتا یار ان کے لیے رابطہ ممکن بھی تھا کہ نہیں۔ ورنہ اتنے بے خوف تو نہیں تھے وہ اور نہ ایسے بے مروت۔"

"ہاں۔ اسی خیال سے میں بھی دل کو تسلی دیتا ہوں کہ انہیں ضرور کوئی مجبوری درپیش ہوگی۔"

غالب نے کہا "ڈاکوؤں کے کسی گروہ سے معلوم کریں گے۔"

"وہ کیسے؟ ڈاکوؤں کا کیا کوئی دفتر ہوتا ہے تعلقات عامہ کے لیے یا وہ کوئی پی آر او رکھتے ہیں۔"

غالب مسکرایا "یار اخبار والوں کو پتا ہوتا ہے سب کا۔"

"وہ کراچی میں پھنسا ہوا ہے" میں نے کہا "تمہارا اور محسن کا انتظار کر رہا ہے اکیلا۔"

"کاجل کا حال؟"

"وہ تو باقاعدہ دیوانی ہو رہی ہے۔ پہلے اس لڑکے کلیم اللہ پر ساری ممتا لٹاتی رہی۔ اسے ہم جبر علاقے میں اس کے رشتے داروں کے حوالے کرنے گئے تو بہت روئی۔"

"تم اسے چھوڑ آئے؟"

"اور کیا یہاں تم کو لینے آئے تھے" میں نے کہا "ایک عجیب بات بتاؤں، کلیم اللہ کی شادی ہو گئی ایمان سے۔"

"کس سے؟ کاجل سے؟" غالب دم بخود رہ گیا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ وہ تو ماں کی طرح تھی اس کے لیے اور جس سے شادی ہوئی ہے وہ بھی ماں کے برابر ہے" میں نے ہنس کے کہا "اس کا باپ بھاگ گیا تھا شادی کے وقت۔ دستور کے مطابق لڑکی اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ وہ خود تو آیا نہیں اس کا بچہ آ گیا اور باپ کے گناہ کی سزا اسے ملی۔ فیصلے والوں نے کہا کہ اب اس کو تم اپنے گھر میں بسا لو تو معافی مل سکتی ہے۔"

"حد ہے یار۔ یہ کوئی انصاف ہے۔"

"ہر جگہ انصاف کے معیار الگ ہوتے ہیں اور معاشرہ انہیں جائز قرار دیتا ہے" میں نے کہا "کاجل کچھ دن بہت سوگوار رہی۔ دیکھو وہ اپنے بھائی رنگل ایس آئی کے چکر میں پڑ گئی ہے۔"

"اور اپنے بھائی رنگل ایس آئی کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلے کے؟"

"اس کی مجال کہ انکار کر سکے" نادر نے اچانک اپنا اخبار چھوڑ کے کہا۔

"یا میرے خدا! ایک کان ادھر ایک ادھر۔ تم اپنی اخبار پڑھ رہی تھیں یا ہماری سن رہی تھیں؟" غالب بولا "اچھا ہوا خدا نے زبان ایک دی۔"

میں نے اس کی تائید کی "ہاں۔ ورنہ ہماری ہر بات میں بھی رخنہ اندازی جاری رہتی۔"

"اور یہ تم نے کیا بات کی۔ کوئی زبردستی ہے۔ ہمارا بھائی رنگل ایس آئی اگر نہ چاہے تو تم کیا کر لوگی؟"

"میں اس کا دماغ درست کر دوں گی۔"

"پہلے اپنا تو ٹھیک کر لو۔ سارے پیچ ڈھیلے ہیں۔"

نادر نے کہا "جیسا بھی ہے دماغ تو ہے۔"

"یہ بھی تم کہتی ہو، عام زبان میں اسے بھوسہ کہا جاتا ہے جو عقل سے بڑی چیز کھاتی ہے۔ جس کو موسیقی سے ذرا شغف نہیں ہوتا اس کے سامنے بین بجائی۔"

"تو ایسے ہی سر ہلاتی رہتی ہے جیسے دوسری خاتون بیٹھی تھیں" میں نے لقمہ دیا۔

گاڑی ایک ریم موڑ کاٹ کے گیٹ سے ایک کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی۔ اتنے دن بعد غالب اور نادر کی نوک جھونک دیکھی تو بہت لطف آ رہا تھا۔ ان کی عادت نہ بدلی تھی نہ بدلنی تھی۔ مستقل ہو جائے تو عادت بھی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے اور

زوائی میں جتنا پیار تھا آج قلموں کے پیار و محبت سے بھرپور رشتہ گھر میں بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس میں تصنع نہیں تھا اور بناوٹ نہیں تھی۔ یہ حقیقی زندگی کا جیتا جاگتا عکس تھا جس میں محبت کے بھی ان گنت روپ رنگ تھے۔

شوفر نے پہلے ہمارے لیے دروازہ کھولا۔ وہ اپنے مالک کی طرح ایسی کیفیت جانتا تھا۔ سالار کا شوفر ہوتا تو پہلے مالک کے لیے دروازہ کھولتا اور ہم جیسے مہمانوں کے لیے شاید تکلیف ہی نہ کرتا۔

اکبر خان کی کوٹھی بالکل جدید وضع کی اور سرسبز درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ یہ درخت نہ جانے کہاں کہاں سے لا کے بڑے سلیقے سے۔۔۔۔ لگائے گئے ہوں گے کہ اب کوٹھی کے چاروں طرف بڑے آرائشی انداز میں اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ مجھے چودھری سالار کی لاہور والی کوٹھی اس کے مقابلے میں یوں لگی جیسے کسی باغ کے مقابلے میں پولیس اسٹیشن۔

اکبر خان کا ایک اور ملازم اندر سے نمودار ہوا۔ اب شام ہو رہی تھی۔ اکبر خان نے کہا "آپ لوگ اپنے کمروں میں جا کے فریش ہو جائیں پھر چائے پئیں گے۔ جس چیز کی ضرورت ہو کسی کو بھی بتا دیں۔"

بظاہر سیٹھ اکبر اونچا آدمی تھا۔ اس کا رہن سہن ٹھاٹ باٹ اور انداز و اطوار سب اس کے بڑا ہونے کی دلالت کرتے تھے۔ اس نے بلا جھجک تسلیم کر لیا تھا کہ یہ دولت اس نے شریفانہ طریقے سے حاصل نہیں کی تھی مگر اب وہ شرفا میں شامل تھا۔ سالار ابھی اس سے ایک منزل پیچھے تھا۔ وہ دولت کی منزل تک پہنچ گیا تھا اس سے اگلی منزل عزت کی تھی جو کسی کو ایک اسمگلر اور غیر قانونی کاروبار میں ملوث بدنام آدمی کی سطح سے اٹھا کے اس مقام پر لے آتی ہے جہاں کوئی اس کے ماضی کا حوالہ نہیں دیتا اور اس کے دھندوں کے ناجائز ہونے کے باوجود سر عام تذکرہ نہیں ہوتا۔ اس کو سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے میں وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے جہاں اس سے پہلے اس جیسے موجود ہوتے ہیں مگر وہ اپنے حلقے۔۔۔۔ میں ہر ایرے غیرے کو داخل نہیں ہونے دیتے۔ شرافت کی سند اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک پولیس آپ کے پیچھے لگی ہے یا اخبار میں آپ کے کارناموں کا ذکر آتا رہے۔ شرفا اور امرا میں آپ اس وقت شمار کیے جاتے ہیں جب پولیس کے اعلیٰ افسر خود بھی آپ کے کاروبار میں شامل ہو جائیں، آپ کے گھر معزز مہمان بن کے آتے ہوں اور آپ کو اپنے گھر کی تقریبات میں مدعو کرتے ہوں۔ شریفانہ طور پر آپ انہیں ماہ بہ ماہ ان کے حصے باعزت گھر پہنچاتے ہوں اور آپ کے کسی کالے دھندے کا ذکر اخبار میں کسی حوالے سے نہ آتا ہو۔ پکڑے جاتے ہوں تو چھوٹے موٹے کارندے، جن کو آپ کا نام بھی معلوم نہ ہو اور آپ کسی ذرا تنگ لوم میں جیل کے انگلی پڑتے ہوں تو ان کی رہائی عمل میں آ جاتی ہو۔

اتنی عزت خریدنے کے لیے بھی پیسہ پانی کی طرح بہانا پڑتا ہے اور کوئی ایک بڑے "مافیا" کو کنٹرول کرتا ہو تو لازمی ہے کہ اس کے پاس ہر سطح کے مجرموں، بدمعاشوں اور ہر قسم کے غیر قانونی کاروبار کرنے والے ماہرین کا منظم گروہ ہو جس میں بدرجہ بدرجہ اوپر تک بہت سے خفیہ ہاتھ اس کی مدد کرتے ہوں۔ وہ "بگ باس" کی حیثیت سے پس پردہ رہتا ہو اور ایک پراسرار شخصیت ہو جس کی دہشت نچلے درجے کے کارکنوں پر اس حد تک قائم ہو کہ اس کے نام سے ہی ان کا پتا پانی خطا ہوتا ہو۔ یہ سب کچھ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت بڑی ذہانت سے کیا جاتا ہے اور عام آدمی نہیں کر سکتا۔ غیر معمولی صلاحیت رکھنے والا ایک جینئس اگر زندگی کی راہوں پر مثبت سمت میں قدم بڑھاتا رہے تو کسی بین الاقوامی ادارے کے سربراہ سے لے کر صدر مملکت تک کچھ بھی بن سکتا ہے۔ اس کا انحصار بہت حد تک اس کی خوش نصیبی پر بھی ہے جو حالات کو اس کی ضرورت کے مطابق سازگار کر لیتی ہے۔ منفی راہ اختیار کرنے والا اکبر خان کی طرح کسی مافیا کا، جرائم کی کسی زیر زمین ان دیکھی سلطنت کا سربراہ بن جاتا ہے۔

قوت کی اس منزل کے بعد شہرت کا بھوت سر پر سوار ہوتا ہے تو آدمی سیاست کے میدان میں قدم رکھتا ہے۔ اسمبلی کا رکن، سینیٹ کا ممبر، صوبائی وزیر، گورنر یا وزیر اعظم تک بننے کے لیے دولت کے انبار لٹانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ سمجھدار فرد آہستہ آہستہ پبلک میں اپنا امیج بناتا ہے۔ کچھ ریٹائرڈ نیک نام اور دور اندیش مشیر رکھ لیتا ہے جو اسے بتاتے ہیں کہ لیڈری کیا ہے اور لیڈر بننے کے لیے اسے کب کیا کرنا چاہیے اور کیسے کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ پبلسٹی کے ماہرین آہستہ آہستہ اخباروں میں بیانات، تصاویر، تقاریب کی رپورٹوں اور تصویروں سے اس کو معاشرے کا خیر خواہ، مخیر اور بے غرض، دولت کو ہاتھ کا میل سمجھنے والا، غریبوں کا ہمدرد اور فرشتہ صفت انسان ثابت کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ اسے انتخابات میں ایک تہائی ووٹ پروپیگنڈے سے مل جائیں تو باقی ایک تہائی وہ پیسے سے خرید کر منزل مراد تک پہنچ جاتا ہے۔ شاید یہی منزل مراد۔

اکبر خان کیا کر رہا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے ہو گیا تھا مگر میں نے غالب سے ذکر نہیں کیا تھا۔ چودھری سالار جلد بازی سے کام لے رہا تھا۔ وہ عزت کی منزل تک پہنچے بغیر شہرت کے آسمان کو چھونا چاہتا تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ اتنی اونچی جست اسے راس نہیں آئے گی اور آسمان تک پہنچنے کی کوشش میں وہ زمین پر منہ کے بل گرے گا لیکن قبل از وقت یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ آخر وہ بھی اکبر خان کا بھائی تھا اور سیاست میں کوئی بات حتمی نہیں ہوتی۔ پرانے قصے کہانیوں کی بات ہے کہ بادشاہ لاولد مر گیا تو اعلان کیا گیا کہ کل صبح سب سے پہلے شہر پناہ میں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ مشرق کی طرف سے داخل ہونے والے کو تخت پر

بٹھلایا جائے اور خوش نصیبی سے قرعۂ فال ایک فقیر کے نام نکال دیا جو دیر ہو جانے کے باعث رات بھر شہر کی فصیل کے دروازے پر بھوکا پیاسا پڑا رہا تھا۔ صبح دم شہر میں قدم رکھا تو لوگوں نے پکڑ کے بادشاہ بنا دیا۔ امریکی نائب صدر کو آج بھی الیکشن لڑے بغیر دنیا کا سب سے طاقتور عہدہ اسی وقت ملتا ہے جب تقدیر یاور ہو اور صدر امریکا اپنی میعاد پوری کیے بغیر اللہ کو پیارا ہو جائے۔

اکبر خان کی وسیع و عریض کوٹھی میں سناٹا تھا۔ رہائش کے لیے ہمیں اوپر والے حصے میں دو کمروں کی انیکسی دی گئی تھی جسے گیسٹ ہاؤس بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ اس میں دو بیڈ رومز کے سامنے لاؤنج نما ٹیرس تھا جو دو طرف سے کھلا ہوا تھا اور وہاں پڑے ہوئے بید کے کشن اور آرام کرسیوں پر بیٹھ کے باغ کا دلکش نظارہ بھی نظر آتا تھا اور اسلام آباد کی سرسبزی و شادابی' پس منظر میں سرسبز پہاڑ اور گہرے نیلے آسمان کی خوب صورتی پر کسی بہت بڑے کینوس پر قدرت کے سب رنگوں سے بنے ہوئے لینڈ اسکیپ کی پینٹنگ کا گمان ہوتا تھا۔ ہوا میں آمد بہار کی خوشبو تھی اور درختوں نے شوخ گہرے رنگ کے چمکیلے پتوں کا نیا لباس زیب تن کر لیا تھا۔

رابعہ اور نازو کی باتیں ختم ہونے والی نہ تھیں۔ وہ سارا راستہ بولتی آئی تھیں اور اب زیادہ فراغت کے ساتھ تصورات کی گہرائی میں ڈوب کے ماضی' حال اور مستقبل پر اپنے نقطۂ نظر سے روشنی ڈال رہی تھیں ورنہ خاموشی تھی۔

میں نے کہا "یہاں تو الو بول رہے ہیں۔"

غالب نے سر ہلایا "نر الو۔ مادہ الو۔ کیا الو کا مونث ہوتا ہے؟"

نازو نے ڈانٹ کے دیکھا "جی نہیں۔ الو ہمیشہ مذکر ہوتا ہے بزرگو۔"

میں نے کہا "کبھی ہم اردو لغت مرتب کریں گے تو اس میں الّی کے لفظ کا اضافہ کر دیں گے۔ الو الّی۔ جیسے شیر سے شیرنی' بھوت سے بھتنی۔"

"بھتنی تمہاری ساس" غالب بولا "میرے سسر محترم بھوت ہیں مگر بڑے گارڈین قسم کے۔ اس تمام عرصے میں انہوں نے مجھے بھی تنگ نہیں کیا۔ چاہتے تو سب دشمنوں کو ہوا میں الٹا لٹکا دیتے۔"

"غالب! پھر شروع ہو گئی تمہاری بدتمیزی" نازو بگڑ گئی۔

"بھوت کو بھوت کہنے میں کون سی بدتمیزی ہے۔ ہاں گارڈین کہا ہے میں نے۔ اس کا برا مانے گا تو میرا سسر' تم کو کیا؟" غالب نے کہا۔

"اچھا چلو جاؤ دوسرے کمرے میں۔ باتیں کرنے دو ہمیں۔"

"بہت باتیں کر لیں تم نے۔ اب ہماری باری ہے" "تم جاؤ۔"

"ہم کیوں جائیں؟ کیا تم نے ریزرو کرا لیا تھا یہ کمرا؟" نازو نے کہا۔

"خاتون! حکم کی تعمیل تم پر فرض ہے" غالب بولا۔

"بالکل۔ آخر ہم تمہارے مستقبل بعید کے خداوندگان مجازی ہیں۔" میں نے تائید کی۔

"مانا کہ تم اس قابل نہیں ہو... مگر خیر ہم فراخ دل لوگ ہیں اور مجبوری میں صبر شکر سے مرغ قورمہ چھوڑ کے بھنڈی توری بھی زہرمار کر لیتے ہیں" غالب نے متانت سے کہا۔

"یہ وضاحت فرما دیں کہ آپ نے بھنڈی کسے کہا ہے اور توری کسے؟" میں نے رابعہ اور نازو کی طرف دیکھا۔

رابعہ اٹھ کھڑی ہوئی "چلو نازو۔ ان کی زبان کھل گئی ہے۔ یہ اور بڑھتے جائیں گے اگر انہیں جواب دیا۔"

"جاؤ جاؤ' نکلو یہاں سے۔ ورنہ..." غالب بولا۔

"ورنہ کیا؟" نازو جاتے جاتے رک گئی "آگے بولو۔"

"ورنہ ہم نکل جائیں گے یار۔ خفا ہونے کی اس میں کون سی بات ہے" غالب نے دانت نکال کے شرافت سے کہا۔

تھوڑا سا تخلیہ میسر آیا تو میں نے کہا "مولانا! یہ تو میں بعد میں پوچھوں گا کہ آپ نوشہرہ کے ملٹری اسپتال سے اغوا کیسے ہو گئے تھے۔"

"مگر میں یہ پہلے بتاؤں گا" غالب بولا "لیکن اس سے بھی پہلے اپنی منت پوری کروں گا۔"

"کون سی منت؟"

اس نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا "مولانا غالب سے میں مرزا غالب بننا چاہتا ہوں۔ کیا باتھ روم میں آلات خلافت ہیں۔ آپ شروع کریں اپنا کام خلیفہ سکندر۔"

باتھ روم میں ایک ڈریسنگ کیبنٹ سے قینچی دستیاب ہوئی' کنگھا اور برش کمرے میں ہی تھے۔ میں نے کسی تجربہ کار باربر کی طرح غالب کو ایک کرسی پر بٹھایا۔ اس کی گردن کے گرد ایک میز پوش باندھا اور صفائی شروع کر دی۔ بچپن سے اب تک میں نے سیکڑوں بار سر جھکا کے بال کٹواتے ہوئے اس عمل کا اتنی بار مشاہدہ کیا تھا کہ پروفیشنل اسٹائل میں غالب کی داڑھی میں کنگھی پھیر کے قینچی چلانا مجھے بہت آسان کام لگا۔

"آغاز کہاں سے کروں؟" غالب نے کہا "جب ہم جہاز سے کودے اور برف میں گرے۔"

میں نے کہا "اس طرح تو داڑھی کے ساتھ تمہاری ناک بھی کٹ جائے گی' اپنا منہ بند رکھو۔"

"اوہ" غالب چلایا "یہ ناک نہیں کان ہے۔"

"سوری۔ ذرا ہاتھ بہک گیا مگر فکر کی بات نہیں۔ ابھی تک کان اپنی جگہ پورا موجود ہے۔ روایت یہ ہے کہ باربر قینچی کی طرح زبان بھی چلاتے ہیں اور گاہک مجبوراً خاموشی سے سب سنتے ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ آپ لوگوں سے بچھڑ کے ہم پر کیا گزری۔ ہمیں فوجیوں نے پکڑ لیا تھا۔ ہم تلاش میں تھے تم دونوں کی۔ پتا نہیں کدھر نکل گئے تھے لیکن کرنل جعفری کے ذہن میں وہی لاشیں تھا۔

یہ بھی جانتا تھا کہ ہم کون ہیں مگر اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ ہمیں مہمان رکھا اور پھر گلگت پہنچا دیا..."

حوالات سے گریز کرتے ہوئے میں نے بعد کے واقعات کا خلاصہ پیش کیا اور چند منٹ بعد جب میں جھاڑ جھنکار زدہ زمین کو اس حد تک صاف کر چکا تھا کہ غالب کا پرانا چہرہ... پہچانا جا رہا تھا' میری بات بھی ختم ہو گئی۔

"یار کمال کر دیا تو نے تو" غالب بولا۔

میں نے کہا "قسمت ساتھ نہ دیتی تو ہم کیا کر لیتے؟"

"بھائی میں آپ کے کمال باربری کی بات کر رہا تھا۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ لندن میں تم نے پڑھائی وڑھائی نہیں کی' یہی کام کیا ہو گا" وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کے بولا جس پر ہفتے بھر کی شیو جتنی داڑھی رہ گئی تھی "محسن ہو گارڈش راشر۔ یہاں کچھ بھی کہتے رہو' اس کے گواہ تم اور تمہارا گواہ وہ۔"

میں نے کہا "حکم ہو تو سر کی حجامت بھی کر دوں۔ جو اسٹائل بھی پسند ہو۔ کیو اسٹائل ہے اور ولی برینر کا اسٹائل ہے۔"

اچانک اکبر خان اندر آ گیا۔ اس منظر نے تھوڑی دیر کے لیے اسے مبہوت کر دیا پھر وہ قہقہہ مار کے ہنسا "واٹ از دس! ہم کہہ رہے... میں باربر کو بلوا دیتا' اتنی جلدی کیا تھی؟"

غالب نے کہا "میں نے منت مانی تھی کہ جب تک یہ لوگ نہیں مل جائیں گے بال نہیں کٹواؤں گا اور سکندر نے قسم کھائی تھی کہ یہ کام خود کرے گا۔ اس مقدس فریضے کی ادائیگی کے لیے باربر کی ضرورت نہیں تھی۔"

"ارے۔ ارے۔ اب جلدی سے تیار ہو لو۔ میں تو چائے پر تمہارا انتظار کر رہا تھا' کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم آ رہے ہیں چند منٹ میں" غالب نے کہا۔

اکبر خان لوٹ گیا تو میں نے کہا "یار یہ کیا چاہتا ہے؟"

"یہ ہمیں استعمال کرنا چاہتا ہے۔"

"مگر کیسے؟ کس کے خلاف؟" میں نے کہا "اور اسے کیوں یقین ہے کہ ہم قابل استعمال ہیں؟"

"اچھا رات کو کریں گے فرصت سے باتیں۔ پہلے اس کی سن لیں۔ میں آتا ہوں شیو اور غسل سے فارغ ہو کے" غالب بولا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

دوسرے کمرے سے رابعہ کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ اب وہ نازو کو آصف علی کی معذوری اور منہ بولے بیٹے کے بارے میں بتا رہی تھی اور بہت تفصیل سے بتا رہی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ انہیں اپنی باتوں میں مصروف رہنے دیا جائے۔ اکبر خان سے میں اور غالب بات کر سکتے تھے اور وہ بعد میں باتھ روم کو فراغت سے استعمال کر سکتی تھیں۔

غالب نہا دھو کے نکلا تو پھر وہی پرانا غالب تھا۔ شیو کرنے اور بال بنانے کے بعد اس کا چہرہ کچھ کمزور لگ رہا تھا مگر فریش بھی ہو گیا تھا۔ اکبر خان نے پہلے سے سب بندوبست کر رکھا تھا۔ وارڈ روب میں ہر قسم کے مردانہ زنانہ کپڑوں کے جوڑے استری کیے ہوئے موجود تھے۔ غالب نے بھی میری طرح قمیص شلوار کا انتخاب کیا اور ابھی ہم تیار ہی ہوئے تھے کہ اکبر خان پھر آ گیا۔

رابعہ اور نازو ابھی تک باتیں کرنے سے تھکی نہیں تھیں۔ میں نے کہا کہ اب آپ لوگ بھی باتھ روم استعمال کر لیں تو نازو نے جواب دیا کہ ہم ایسے ہی ٹھیک ہیں۔ ہماری چائے یہیں بھجوا دینا۔

اکبر خان ہمیں ٹیرس پر لے گیا جہاں چائے کی ٹرالی کھانے پینے کی بہت سی چیزوں سے لدی کھڑی تھی۔ اس نے ایک اور ملازم کو حکم دیا کہ لیڈیز کے لیے دوسری ٹرالی اندر پہنچا دی جائے۔ چائے کے ساتھ کافی بھی تھی اور بہت اعلیٰ تھی۔ دولت کی فراوانی دنیا کی اعلیٰ ترین چیزوں کے حصول کی خواہش کو ممکن کر دیتی ہے۔ اکبر خان جیسے لوگ تو فرمائش پر چارٹرڈ پلین سے دنیا کے ہر گوشے سے کوئی بھی چیز فراہم کر سکتے تھے۔

"اس سے پہلے کہ تم کچھ کہو' میں اپنی قیمت جاننا چاہتا ہوں؟" غالب نے کہا "جو تم نے ادا کی ہے۔"

"چھوڑو یہ بات۔"

"نہیں۔ ایک زر خرید کو یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ سکۂ رائج الوقت میں اس کی قدر و قیمت کیا ہے" غالب نے کہا۔

"مسٹر غالب! نوری کے بدلے پیسہ مانگنے والے کیا آدمی ہوتے ہیں اور تم جیسے لوگ کیا بک سکتے ہیں؟" اکبر خان بولا "قیمت تو لی تھی خلیفہ کیکر نے اپنی ذلالت کی۔ کسی باصلاحیت آدمی یا فنکار کا مول کون لگا سکتا ہے۔ محبت اور وفا کی بھلا کوئی قیمت مقرر کر سکتا ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ وہ عورت جو طوائف کہلاتی ہے' اس کا بھی صرف جسم بکتا ہے۔ وہ خود کہاں بکتی ہے اور اس کے مقابلے میں تم رابعہ قاری جیسی عورت کو رکھو۔ یا اپنے جیسے غیر معمولی صحافی کو رکھو۔ تو یہ سوال ہی بے معنی لگتا ہے۔ مجھے تمہاری خدمات کی ضرورت تھی اور میں نے تمہیں آزاد کرا لیا۔ وہ لالچی آدمی ایسے نہ مانتا تو میں دوسرا طریقہ اختیار کرتا۔ کتا اگر ہڈی ڈالنے سے چپ ہو جائے تو اسے گولی مارنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تم نے یہ کیوں فرض کر لیا کہ میں تمہارا کوئی کام کروں گا؟ مجھے معلوم ہے تمہارے کاروبار کی نوعیت کیا ہے؟"

وہ ہنسا "یہ تم کیسے جان سکتے ہو' چاہو تو بعد میں کوشش کر کے دیکھ لینا۔ میں ایک شریف اور معزز آدمی ہوں اور میرے سارے کاروبار قانونی اور جائز ہیں۔"

"چوہدری دلاور کی طرح؟" میں نے کہا۔

"وہ بے وقوف ہے۔ بہت دیر میں عقل آئی ہے اسے" اکبر خان بولا "اور ابھی تک میں نے اسے نظرانداز کیے رکھا تو اس کی

وجہ بھی یہی تھی۔ تم جانتے ہو کہ وہ سیاست میں قدم رکھنے کی سوچ رہا ہے۔ انتخابات میں حصہ لینا چاہتا ہے۔"

"اس سے تمہیں خطرہ محسوس ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ مجھے کسی سے بھی خطرہ محسوس نہیں ہوتا لیکن میں نہیں چاہتا کہ اس جیسے لوگ عوام کے نمائندے منتخب ہو کے اسمبلی میں جا بیٹھیں۔"

"کیونکہ تم خود کو اس کے لیے انتہائی موزوں اور بہترین امیدوار سمجھتے ہو" غالب نے طنز سے کہا۔

"موازنہ تم خود کر لو گے تمہارے اپنے وسائل ہیں۔ جیسے چاہو معلوم کرو۔ جاسوسی اور سراغ رسانی کے لیے ذہانت شرط ہے اور وہ تمہارے پاس ہے۔ میں تمہاری راہ میں کسی کو حائل نہیں ہونے دوں گا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تم چوہدری دلاور جیسے سب لوگوں کو پبلک کے سامنے بے نقاب کرو۔ ان کا سارا کچا چٹھا کھول دو۔ ان کے مجرمانہ ماضی پر پڑے ہوئے سارے پردے ہٹا کے لوگوں کو بتاؤ کہ یہ قوم کے راہنما کہلانے کے لائق نہیں۔ تم قلم کے مجاہد ہو، قلم سے اپنی لڑائی لڑو۔ پہلے کی طرح۔"

غالب اسے گھور کے دیکھتا رہا "اکبر خان! تم اچھے شکاری ہو، صحیح جال بچھایا ہے تم نے۔"

"یہ جال نہیں ہے۔ میں تم کو ایک پیش کش کر رہا ہوں۔ جس دن تمہیں احساس ہو کہ تم نے میری پیش کش قبول کر کے غلطی کی تھی، اس دن تم مجھے صاف بتا دینا۔ میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایک اخبار نکالنے کی تیاری کرو۔ ایک بہت بڑا اخبار۔"

"تمہاری تشہیر کے لیے؟"

"قطعی نہیں۔ اس کی پالیسی تمہاری اپنی ہو گی۔ تم اس کے ایڈیٹر ہی نہیں، مالک بھی رہو گے عملاً۔ نام پبلشر کی حیثیت سے میرا ہو گا، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں تو یہاں رہتا بھی نہیں، نہ مجھے فرصت ہے اپنے کاموں سے کہ اخبار کے بکھیڑے میں پڑوں۔ تمہیں مکمل خود مختاری حاصل ہو گی کہ اسے جیسے چاہو چلاؤ۔ اس میں جو چاہو چھاپو، میرے خلاف بھی کوئی بات ہو تو لکھو۔" وہ ہنسا۔

غالب کی بے یقینی اور تذبذب کی کیفیت اس کی صورت پر پڑھی جا سکتی تھی۔ بے شک ہر بڑے صحافی کی طرح یہ اس کے خواب آرزو کی معراج تھی کہ وہ ایک بڑے اخبار کا خود مختار ایڈیٹر ہو مگر کیا یہ ممکن ہو گا؟ یہی سوال میرے ذہن میں بھی تھا اور اکبر خان کی تمام یقین دہانیوں کے باوجود میں یہ ماننے پر تیار نہ تھا کہ اکبر خان صرف غالب کی خواہش پوری کرنے کے لیے یا ملک اور قوم کے مفاد میں یہ کام کرنا چاہتا ہے۔

میں نے خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد کہا "یہ سب تم صرف ایک انتقامی جذبے سے مغلوب ہو کے کر رہے ہو۔"

"مجھے کسی سے انتقام نہیں لینا" وہ بولا۔

"چوہدری دلاور سے بھی نہیں؟"

"چوہدری دلاور نے میرا کیا بگاڑا ہے؟ ہاں تم اس کے دشمن ہو۔ اس کے خلاف ایم آر ایس کی تنظیم بنا کے لڑتے رہے ہو لیکن اس جنگ سے تمہیں نقصان کے سوا کیا حاصل ہوا؟ اگر تمہارا اپنا اخبار ہو گا تو تم یہ جنگ زیادہ مؤثر طور پر لڑ سکو گے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم لوگوں کا مشن کیا ہے۔"

"کس نے بتایا ہے تمہیں یہ سب؟"

وہ ہنسا "بابا! میں اسی دنیا میں رہتا ہوں۔ سب سنتا ہوں، دیکھتا ہوں اور پڑھتا ہوں۔ حالات سے پوری طرح باخبر ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں یہ نہیں مان سکتا اکبر خان کہ تم نے اپنے بھائی دلاور خان کو معاف کر دیا ہو گا۔ تم پٹھان ہو، بدلہ ضرور لیتے ہو۔ اس نے تمہاری جان لینے کی کوشش کی تھی مگر تمہاری خوش قسمتی کہ تم بچ گئے۔ اب تم اس کو آسانی سے مارنے کے بجائے پریشان اور ہراساں کر کے، سیاسی اور معاشی طور پر اس کا مستقبل تباہ کر کے، اس کی زندگی برباد کر کے انتقام لو گے۔ تم اسے اذیت دے کر، رسوا کر کے، محصور کر کے مارو گے۔"

وہ مجھے یوں دیکھتا رہا جیسے میری بات سمجھنے سے قاصر ہو، میں کوئی ایسی زبان بول رہا ہوں جس کا وہ ایک لفظ نہیں جانتا یا میں اچانک ہوش کھو بیٹھا ہوں۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو، کس دلاور خان کی بات کر رہے ہو؟ وہ جو میرا بھائی تھا، وہ اب کہاں ہے؟" اس نے بالآخر کہا۔

"وہ چوہدری دلاور ہے اب۔"

"یہ کس نے بتایا ہے تمہیں؟ وہ چوہدری ہے، دلاور خان تو نہیں ہے" اکبر خان نے مجھ پر نظر جما کے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ وہی دلاور خان ہے" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ میں نہیں جانتا اور یہ بات تمہیں بھی جان لینی چاہیے کہ چوہدری دلاور سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "تم مانتے ہو کہ تمہارا ایک بھائی تھا۔ دلاور خان۔"

"بالکل تھا۔ ہم ایک ساتھ گھر سے نکلے تھے۔"

"اس کے بعد تمہارے اور اس کے درمیان کاروباری معاملے میں کوئی اختلاف رائے ہوا۔ یا کسی کے دل میں بے ایمانی آئی۔ تم الگ ہو گئے اور اس نے تمہیں راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔"

"یہاں تک سب ٹھیک ہے۔"

"اس نے کھلے سمندر میں تمہاری لانچ ڈبو دی تھی۔"

"لانچ اس کی ڈوبی تھی، میری نہیں۔ تمہیں کسی نے غلط اطلاع دی ہے، زلزلہ کی ہو گی" اس نے کہا۔

"اگر وہ دلاور خان نہیں ہے تو وہ سال میں ایک بار یہاں آ کر تمہارے والدین کی قبروں پر کیوں حاضری دیتا ہے؟ تم مانتے ہو کہ تمہارا والد ایک ترکھان تھا، فرنیچر بناتا تھا۔ گاؤں سے نکلنے کے بعد تم بھی لوٹ کر نہیں گئے تھے۔"

"یہ بھی غلط ہے۔ ایک بار میں گیا تھا جب میری ماں کا انتقال ہوا تھا" اس نے کہا۔

"لیکن باپ کی موت پر صرف دلاور خان گیا تھا۔"

"دلاور خان کیسے جا سکتا ہے، وہ مر چکا تھا۔"

"گاؤں والوں نے دیکھا تھا اسے۔ اس نے قبرستان میں تمہارے والدین کی قبروں کو پکا کروایا تھا، وہاں مسجد تعمیر کرائی تھی، اس مسجد میں پیش امام مقرر کیا تھا جس کو ماہانہ وظیفہ دیتا تھا اور مسجد کی دیکھ بھال کے اخراجات بھی وہی ادا کرتا تھا۔"

"یہ سب تمہیں کس نے بتایا؟"

"پشاور میں ایک شخص آصف علی نے۔ میں اسی کا مہمان تھا، وہاں میں نے تمہارے والد کے ہاتھ کا بنا ہوا فرنیچر دیکھا تو تعریف کی اور آصف علی نے بتایا کہ وہ ہنرمند کون تھا، اس کے بیٹے کون تھے۔ سب باتیں اسی سے معلوم ہوئی تھیں۔"

"کیا آصف علی نے خود بھی دلاور خان کو دیکھا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ دیکھا ہو گا۔"

"اچھا۔ کیا اس نے چوہدری دلاور کو دیکھ کے کہا تھا کہ یہی دلاور خان ہے؟"

میں نے کہا "اس کا اور چوہدری دلاور کا آمنا سامنا نہیں ہوا۔"

"تم نے کوئی تصویر دکھائی تھی اس کی؟"

میں نے کہا "بدقسمتی سے اس کی کوئی تصویر بھی میرے پاس نہیں تھی۔"

اکبر خان نے ایک گہری سانس لی۔ "پھر یہ کوئی غلط فہمی ہے جو وقت آنے پر خود دور ہو جائے گی۔ فی الحال تم میری پیش کش پر غور کرو اور مجھے سوچ کے بتاؤ، سرمایہ کتنا درکار ہو گا، اخبار کہاں سے شائع ہو گا، دفتر کے لیے کہاں اور کتنی جگہ چاہیے؟ اسٹاف تو بعد میں تم خود رکھو گے۔ اس سے پہلے ایک اچھے آفس کے لیے سامان کا بندوبست ہو گا۔ پلاننگ کا سارا کام میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ تمہارے پاس اچھی ٹیم ہے، بہترین ایڈوائزر ہیں اور قانونی مشیر ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم دیانت دار اور مخلص ہو اور تمہاری COMMITMENTS اصولوں کے ساتھ ہیں۔"

میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔ "تم نے فرض کر لیا ہے کہ ہم یہ آفر قبول کر چکے ہیں؟"

"کوئی معقول وجہ تو نظر آتی نہیں مجھے۔"

غالب جو ابھی تک خاموشی سے خلا میں دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا اچانک بولا "سکندر! ہم کریں گے یہ کام۔ اگر واقعی ہمیں اپنی مرضی کے مطابق آزادانہ طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔ جس دن ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں غلط مقصد یا ذاتی مفاد کی خاطر استعمال کیا جا رہا ہے اسی دن ہم اخبار سے الگ ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "غالب! اتنی جلدی میں فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہ ایک غیر مشروط پیش کش ہے" اکبر خان بولا۔

"یہی میرے لیے ناقابل فہم بات ہے۔ تم ایک بزنس مین ہو، کاروباری نقطۂ نظر سے تمہارے لیے اس کاروبار میں کون سا منافع بخش ہے؟"

"ہر اخبار بالآخر منافع دیتا ہے۔ یہ تو اس کی کامیابی پر ہے اور کامیابی کے لیے میں تم پر بھروسا کرنے کا رسک ضرور لے رہا ہوں مگر مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی رسک نہیں۔ چھ مہینے سال میں نتائج سامنے آ جائیں گے۔ ساری دنیا میں یہ ایک اعزاز ہے اور کامیابی کا راز ہے ریڈر شپ۔ ریڈر شپ بڑھے گی تو اشتہار خود بخود ملیں گے اور اصل منافع وہی ہو گا۔"

میں نے ابھی تک ذہنی طور پر یہ تسلیم نہیں کیا تھا کہ اکبر خان

www.paksociety.com

جیسا شخص صحافت کے پیشے میں محض زبانی صرف اشتہارات سے ہونے والی آمدنی کے لیے آ رہا چاہتا ہے اور بطور خاص اس نے اہم ذرائع کو اس کے مشن کی تکمیل کے وسائل فراہم کرنے کے لیے ایک اخبار کا طاقتور ہتھیار کسی شرط کے بغیر عطا قبول کر لیا ہے۔ وہ ایسا کہاں قوم کا خیر خواہ اور ملک کا بہی خواہ تھا کہ خدمت خلق اور صحافت کی اعلیٰ قدروں کی پاسداری کے لیے لاکھوں کا سرمایہ داؤ پر لگا دے۔ صحافی اور بھی تھے۔ اس نے ہمیں ہی کیوں خریدا؟

اس کی سیدھی سادی بے غرض پیش کش کے پیچھے یقیناً کوئی سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ شاید اس نے دانہ پھینک کے دام پھیلایا تھا۔ صرف یہ دیکھنے کی خاطر کہ ہم کس طرح شکار ہونے کے لیے تیار ہیں۔

غالب اس کی چال کو سمجھے بغیر جال میں پھنس گیا تھا۔ اسے تو اپنے خواب کی تعبیریں مل رہی تھیں جیسے بیماری کا انعام ملتا ہے۔ اس نے اکبر خان کی پیش کش منظور کر لی تھی اور میں مجبور تھا کہ اس کی تائید کروں۔

مزید گفتگو سے پہلے ملازم نے کسی ملاقاتی کی آمد کی اطلاع دی اور وہ معذرت کر کے اٹھ گیا "اب آپ لوگ آرام کریں۔ بھول جائیں ماضی کو اور مستقبل کی پلاننگ میں مصروف ہو جائیں۔ کسی چوہدری دلاور یا استاد پیڈ رو سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اکبر خان اب تمہارے ساتھ ہے۔"

میں نے کہا "جب اکبر خان ہمارے ساتھ نہیں تھا تب بھی ہم کسی ڈر کے پیچھے سے نہیں ڈرتے تھے۔ ہمارا خدا ہمارے ساتھ تھا اور ہمارا حوصلہ ہمارے ساتھ تھا۔"

"سوری۔ میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا۔ تم بہت اچھے ہو۔ کیا کہتے ہیں حساس کو؟ SENSATIVE اور TOUCHY۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاؤ گے۔ ایک اخبار کے مقابلے میں چوہدری دلاور کیا چیز ہے۔ رات کے کھانے پر شاید ملاقات نہ ہو سکے۔ صبح پھر بات ہو گی۔"

میں نے کہا "کیا یہ ضروری ہے کہ معاہدہ ہونے تک ہم یہاں رہیں بفرض کہ ہم انکار کر دیتے ہیں؟"

وہ جاتے جاتے رک گیا "آف کورس۔ تم کسی وقت بھی جا سکتے ہو۔ تم مہمان ہو، قیدی نہیں، ابھی تو رات ہو گئی ہے ورنہ میں خود فخر کے ساتھ گاڑی دے دیتا۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے بے اختیاری سے کہا "مرزا جی! تم کو ایسی کیا جلدی تھی، تم جواب دینے کے لیے مہلت لے سکتے تھے۔ صبح تک ہم مشورہ کر لیتے۔"

"ڈر تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہے ہو۔ چلو رابعہ اور نازو پر چھوڑ دیتے ہیں فیصلہ۔"

"اب کیا رہ گیا ہے فیصلہ کرنے کو!"

"انہیں فیصلہ کرنے دو کہ میرا فیصلہ درست ہے یا غلط۔"

انہوں نے کہا کہ میں نے غلطی کی ہے تو صبح میں اکبر خان کو انکار میں جواب دے دوں گا کہ میرے ساتھی مجھ سے اتفاق نہیں کرتے، چنانچہ میں مجبور ہوں، یہ بات ختم سمجھی جائے۔" غالب بولا۔

"اس میں کوئی چال ہو گی مرزا جی۔ اکبر خان جیسا آدمی بھی کرے کسی کے ساتھ تو اسے راس نہیں آ سکتی جس کے ساتھ نیکی کی جائے۔ وہ لندن میں رہتا ہے۔ ساری عمر اس نے ہر کاروبار سے پیسہ اکٹھا کیا۔ آج بھی وہ تسلیم کرتا ہے کہ اس کے دھندے شریفانہ نہیں مگر اس کے خلاف ثابت کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اور ہم اس کے لیے کام کریں؟ یہ سوچو کہ اس نے ہمیں ہی کیوں چنا ہے ہمیں۔"

"ہم یہ کیوں نہ سوچیں کہ قسمت نے ہمیں ایک سنہری موقع دیا ہے جو ہر کسی کو نہیں ملتا؟ تاریک پہلو کے بجائے ہم روشن پہلو کو کیوں نہ دیکھیں؟ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم سب کی مرضی کے بغیر میں کچھ نہیں کروں گا۔ ہم آج بھی وہی ہیں جو کل تھے۔"

نازو نے دروازے سے سر نکال کے کہا "کل تم لوگ یہ عہد کرو گے کہ ہم وہی ہیں جو پہلے تھے اور بس خواب دیکھتے رہیں گے۔"

غالب نے حماقت سے کہا "یہ میں ضرور بھی کر سکتا ہوں، ہو گا؟ آزمائش شرط ہے۔"

میں نے کہا "تم لوگ کب سے ہماری باتیں سن رہی تھیں؟"

"بہت دیر سے۔ ہم نے دخل در معقولات سے گریز کیا۔" نازو نے رابعہ کے ساتھ کمرے میں قدم رنجہ فرمایا۔

وہ نہا دھو کے اور کپڑے بدل کے نئی لگتی تھیں۔ باہر شہر کا اندھیرا پھیل گیا تھا مگر ہم نے لائٹ نہیں جلائی۔ افق سے طلوع ہونے والا چاند کا ٹھنڈا اجالا زیادہ پُرسکون محسوس ہو رہا تھا۔ دور تک اسلام زہار کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں مگر یہ منظر کے پس منظر اور وسعت تاریکی کا حصہ بن چکے تھے۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب بھی کسی خواب کا جال نہیں ہے اور ہم آزاد ہیں۔ ہم استاد پیڈرو، چوہدری دلاور اور خلیفہ گنگر کے چنگل سے نکل آئے ہیں اور محفوظ ہیں.... پھر غالب اور نازو کو اپنے قریب دیکھ کے میں سوچنے لگا تھا کہ شاید اکبر خان کو بھی اللہ نے ہی وسیلہ بنا کے بھیجا تھا ورنہ ہم تو بابو جی کے صحرا میں بھٹک رہے تھے، ایک بے سود تلاش میں۔

رابعہ نے کہا "مبارک ہو تمہیں، ایڈیٹر ہو گئے۔"

"میرے ابا کہتے تھے کہ گدھا حج کر آئے تب بھی گدھا ہی رہتا ہے۔"

غالب نے اسے گھورا "تم خود بھی تو حاجی تھے۔ کیا حج سے واپس آنے کے بعد بھی انہوں نے اپنی حرکتیں نہیں چھوڑی تھیں؟"

"حرکتوں سے کیا مطلب ہے تمہارا؟" نازو نے برا مان کے کہا۔

"حرکت کا مطلب ہے چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا۔ حرکت میں برکت ہے۔" غالب نے عیاری سے کہا۔

"غالب، میں سب سمجھتی ہوں۔ حج کرنے کے بعد یہ سب کون چھوڑتا ہے، چلنا پھرنا، کھانا پینا۔" نازو نے غصے سے کہا۔

"تو ناراضی کی کون سی بات ہے اس میں۔ سیدھی طرح جواب میں کہہ سکتی ہو تم کہ انہوں نے اپنی حرکتیں نہیں چھوڑی تھیں۔ تم نے ہی اپنے ابا کا قول سنایا تھا کہ گدھے کے بارے میں۔ کوئی گدھا کیا ہو گا ان کے ساتھ حج کرنے۔ واپسی میں انہوں نے ہو سکتا ہے کہا ہو۔"

"یہ تاریخی کی ضرب المثل تھی۔" نازو جھلا کے بولی۔

"یعنی تمہارے ابا کا ذاتی تجربہ نہیں تھا؟ خیر۔" غالب نے بے معصومیت سے کہا "مجھے کیا معلوم تھا۔"

رابعہ ہنسنے لگی "اچھا چھوڑو لڑائی۔ یہ بتاؤ اخبار کا نام کیا ہو گا؟"

"روزنامہ بھوت" غالب نے کہا "اس کے اوپر لکھا ہو گا۔ زندگی کے سنسنی خیز انکشافات کا ترجمان۔ روزنامہ بھوت پاپ کے معاشرے کو چمٹ جانے والے لالوں کے ہر بھوت کا دشمن۔ روزنامہ بھوت۔ نیچے لکھا ہو گا بیارِ شہر صاحب بھوت انجہانی۔"

نازو نے جھنجھلا کے کہا "میں بچے پچنگ مردوں کی حکایت ہے۔"

"تھوڑی میں رہ کے بات کرو لڑکی۔ تم کوئی معمولی نندی نہیں ہو۔ سارا کیا چٹھا چھاپ دیں گے تمہارے سارے خاندان کا۔ سب کو پتا چل جائے گا کہ تم بھتنی ہو بلکہ چڑیل ہو۔ نذر خود قسم کی۔"

اتنی برداشت نازو میں کہاں تھی۔ وہ پہلے ہی تاؤ کھا رہی تھی۔ غالب نے جان بوجھ کے اس کو براہ راست چھیڑا تو وہ بگولے کی طرح اٹھی مگر غالب کو پہلے سے اندازہ تھا کہ اس کی بات کا ردعمل کیا ہو گا۔ اس نے کرسی الٹی اور چھلانگ مار کے اندر بھاگ گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

رابعہ نے نازو کو بٹھالیا "بس بھگا دیا نا اسے۔ اتنا ہی کافی ہے۔ تم خواہ مخواہ چڑ گئی ہو۔"

"وہ بھوت کیوں کہتا ہے میرے ابا کو؟" نازو بچوں کی طرح بولی۔

میں نے کہا "اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ بھوت تو نہیں تھے۔"

خود بخود رات کے کھانے پر ان کی صلح ہو گئی۔ ہم اخبار کی باتیں کرتے رہے۔

نازو نے کہا "مجھے کرائم رپورٹر رکھ لینا۔"

"مشکل ہے۔ تم تو مار مار کے سب کو سیدھا کر دو گی۔ کرائم ہی نہیں ہوں گے تو رپورٹنگ خاک ہو گی؟"

"جب تک پولیس ہے جرائم کیسے ختم ہو سکتے ہیں؟" رابعہ نے کہا۔

غالب کے اعصاب پر اخبار سوار ہو گیا تھا۔ وہ بنیادی طور پر صحافی تھا اور اچانک اسے اپنی دنیا میں لوٹنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ ایک زبردست رہنما کے ساتھ پھر صحافت کے میدان میں کودنے کے خیال سے ہی بہت خوش تھا۔ اس کی ساری گفتگو کا محور یہی تھا کہ اب وہ بتا سکتا ہے کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ ایسی کی تیسی نہ کر دی چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کی تو کہنا۔ یہ سمجھو اب ایم زرائع کے پاس انجام رکھا ہے۔ اب کل اور محسن کا بھی پتا چل جائے گا۔ اکرام شیخ کو ہم واپس پولیس کے محکمے میں پہنچا کے دم لیں گے۔ وہ ضامن رضوی مرحوم کا جانشین بنے گا۔

اس کے خیالات کی پرواز شیخ چلی کے منصوبوں جیسی تھی۔ ہم سب اس کا مذاق بھی اڑاتے رہے مگر وہ متاثر نہیں ہوا۔ اس کی بہت سی باتیں میرے دل کو بھی لگی تھیں مگر وہ جو ایک خلش سی تھی وہ باقی رہی کہ آخر اکبر خان کو یہ سب کرنے کی اور ہم سے کرانے کی کیا ضرورت تھی؟

رابعہ اور نازو ایک کمرے میں سو گئیں۔ میں اور غالب دوسرے کمرے میں بہت دیر جاگتے رہے۔ رات کے بارہ بجے میں نے سوچا کہ اب سونا چاہیے مگر نیند ہنوز آنکھوں سے اوجھل تھی۔ غالب نے ایک ملازم کو طلب کیا اور اس سے کافی منگوائی۔ ہم پھر ٹیرس پر آ بیٹھے۔ اکبر خان یقیناً گھر سے باہر تھا ورنہ ملنے ضرور آتا۔ زیادہ تر بستہ روشنیاں گل ہو گئیں اور گھر کے نوکر چاکر بھی سو گئے۔ سڑکوں پر رات کا سناٹا تھا اور باہر اچھی خاصی سردی تھی۔

شاید ایک بجے کا وقت تھا اور ہم اٹھنے ہی والے تھے کہ سڑک سے گزرنے والی ایک گاڑی نے رخ بدلا اور اس کی ہیڈ لائٹس آف ہو گئیں۔ پھر وہ گاڑی گیٹ سے اندر آ گئی۔ یہ لینڈ روور قسم کی جیپ تھی۔ ڈرائیور نے انجن بند کر دیا تھا اور گاڑی خاموشی سے پورچ تک آ گئی تھی۔

ایک ایک کر کے اس میں سے چھ آدمی اترے۔ ان سب کے چہرے اوجھل تھے۔ وہ سیاہ کپڑوں میں تھے اور انہوں نے کندھوں پر خودکار قسم کی رائفلیں لٹکا رکھی تھیں۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھے۔

www.paksociety.com

میں نے کہا "غالب خیرے سسرالی مہمان آگئے بارات لے کر۔"

غالب نے سرہلایا "ہاں یار۔ لگتے زبردست ہی ہیں۔"

"جاکے ذرا یہ بات نازو کو بتادے" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "ملیحی یہ کہوں کہ تمہارے میکے والے آئے ہیں اور یہ بات بھی اسے سوتے سے اٹھاکے کہوں" غالب نے سرہلایا۔ "ٹھیک بھائی۔"

میں نے پھونک پھونک کر آگے قدم بڑھانے والوں پر نظر رکھی جو تاریکی میں سایوں کی طرح متحرک تھے "رابعہ کو بھی اٹھادینا۔ ہمارے پاس تین ریوالور ہیں۔ ایک رابعہ کو دے دینا۔ ایک اپنے پاس رکھ لینا۔"

"اور تیسرا؟"

"تیسرا نازو کے حوالے کردے۔"

"اور آپ کیا بیٹھی ہوں گے اگر شوٹنگ کا مقابلہ ہوا؟"

"ممکن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی" میں نے کہا "لازم ہے کہ ہم علامہ صاحب کے فرمودات نہ بھولیں۔"

غالب نے آگے جھک کر دیکھا "یہ کچھ قبل از مرگ واویلا نہیں ہے؟"

"بعد از مرگ ہم کیسے واویلا کریں گے؟"

"لیکن سر! آپ اپنے اکبر اعظم کے مہمان ہیں جو ہمارا بھی میزبان ہے۔"

میں نے کہا "مہمان ایسے نہیں آتے۔"

غالب تذبذب میں کھڑا رہا "کیا معلوم یہاں ایسے ہی آتے ہوں۔ ہر جگہ کا اور ہر گھر کا دستور الگ ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "یار! کیا میں جاؤں؟ مجھے ان لوگوں کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔ دال میں کچھ کالا ہے۔"

"رات بھی کالی ہے اور دال بھی" تو کالا کیسے نظر آسکتا ہے؟ خیر میں جاتا ہوں ابھی فتنۂ محشر کو جگانے" غالب بولا "مگر پھر عرض کروں ایسا نہ ہو اور قسم کے مہمان کسی وجہ کے بغیر ایک دوسرے پر تلوار سونت لیں اور کشتوں کے پشتے لگانے کے بعد۔۔۔"

اب خود مجھے جانا پڑا کیونکہ آنے والے رینگتے بھی گھر میں داخل ہوچکے تھے۔ ہم دوسری منزل پر تھے اور وہ بہت چھپتے چھپاتے درختوں کی اور جھاڑیوں کی آڑ لیتے نچلی منزل کے صدر دروازے تک پہنچے تھے۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اکبر خان جیسے شخص نے کوٹھی کے دروازے پر کوئی گارڈ نہیں رکھا تھا۔ نہ وہ کسی باڈی گارڈ کو ساتھ لے کر پھرتا تھا۔ خطرہ ہونہ ہو زیر خاص پر استادہ مسلح پہرے دار "فری کے بڑے ہونے کی دلیل ہوتا ہے بہت سے لوگوں کو دشمن بنائے بغیر۔۔۔ ان کا حق یا مال دبائے اور ایذا غصب کیے بغیر بڑا آدمی بننے کا دور بھی شاید اس صدی کے پہلے حصے میں ختم ہوا۔ دوسرے نصف حصے میں بڑا کہلانے کے لیے وہ

سب کرنا شان سمجھا جاتا ہے جو کبھی پرانی کتابوں کہانیوں رغیبو کے حوالوں سے غیر اخلاقی تسلیم کیا جاتا تھا۔

گرمی رات کے وقت اندھیرے میں تاریکی کا لبادہ پہنے آنے والے نقاب پوش تھے۔ خود اکبر خان کے بعض سفاک تھے مگر اس سے ملاقات کے لیے آنے والے کسی خوف یا ڈر کے بغیر روز روشن میں سینہ تانے" سر اٹھانے آتے ہوں گے زمانہ ہی گزر گیا جب چور ڈاکو چھپتے پھرتے تھے اور شرفا گلیوں میں سر اٹھاکے چلتے تھے۔ اب معاملہ اس کے برعکس ہے شرفا چھپتے ہیں اور پھر بھی مجرمان بستہ میں شامل ہو جاتے ہیں کسی ذی اقتدار دوستی ختم ہے پنگا لیں۔ اور دست سب کے مجرمانہ شرافت کی سند رکھتے ہیں۔

گھڑے کرنے والی آواز سننے کی کوشش کی مگر کان بیٹھے رہے۔ ابھی تک سکوت طاری تھا۔

کیا آنے والوں نے یہاں قدم رنجہ فرمانے سے قبل ہی حفاظتی اقدامات کر لیے تھے یہ بندوبست کرلیا تھا کہ دربان نیند کی گولی لے کر سوجائے اور ملازم گھوڑے بیچ کے سونے کی اداکاری کرتے رہیں" خواہ ان کو خوف کے مارے باتھ روم جانے کی حاجت محسوس ہوا تک خرابی کا خیال پسلیوں میں ٹھونک دے یا یہ قدری دونا چاہتا نہیں مگر پرانے درختوں کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ تاریخ میں ایک دو بار ہی ایسا ہوا کہ کسی لشکر نے رشوت دے کر فصیل شہر کے دروازے کھلوائے۔ جعفر از بنگال و صادق از دکن نے غداری کے لیے رشوت لے کر تاریخ میں اپنا نام ایسے ہی میں لکھوالیا اور ننگ دین ننگ ملت ننگ وطن کہلائے۔

لیکن پہلے رشوت دے کر عام فرد سے ناجائز یا اس کے قانون کے خلاف کوئی کام نہیں کرایا جاسکتا تھا۔ جدید عہد کی سہولتوں نے بہت سی مشکلات کو آسان بنادیا ہے۔ مثلاً شہروں میں ناکام عاشقوں کے لیے مرگ ناگہاں کو زندگی سے اچھے دن رکھن نے غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام کرانا بھی بہت آسان ہے نمک کا یا خون کا رشتہ اتنا اہم نہیں رہا جتنا سکۂ رائج الوقت۔

اکبر خان کے ملازموں کا ہوشیار نہ ہونا" مزاحمت نہ کرنا گھر میں چوروں کی طرح داخل ہونے والوں کے عزائم سے بے خبر رہنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ وہ لوگ آپس میں بھی بات نہیں کر رہے تھے اور خاموشی سے یوں لگتا تھا جیسے وہ باجماعت تہجد کی نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے ہوں۔

غالب نے میرے کندھے کے قریب منہ لاکے میرے کان میں کہا "ابھی تک کچھ نہیں ہوا؟"

عجیب سوال تھا۔ مہذب ہوم کے باہر کھڑے ہوئے ڈر رہے ہیں" میں نے کہا "کیا ہونا چاہیے کوئی کیا کرے؟"

مجھے علم نہیں تھا کہ میرے پیچھے نازو بھی ہے اور اس

ساتھ رابعہ بھی "آپ تو خاصے تجربہ کار معلوم ہوتے ہیں" رابعہ نے کہا۔

میں نے بوکھلا کے پیچھے دیکھا "دیکھو! ایسا ہوا نہیں مگر ہو گا تو سہی" میرا مطلب ہے ہر ایک کے ساتھ۔ مقدر سے کس کو رستگاری ہے۔"

اسی رات ایک ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا جیسے کسی نے کمرے کا دروازہ بند کرتے وقت احتیاط سے کام نہیں لیا۔

"یہ لوگ کیا تلاش کر رہے ہیں بچے؟" نازو بولی۔

"ہونا رک کا پنیر" نیوزی لینڈ کا مکھن اور بناسپتی۔" غالب نے کہا "تم جاکے نازو کو بتاؤ کہاں رکھی ہے۔"

"ہم موجود۔ شرم کرو" نازو نے کہا۔

غالب بولا "شرم عورتوں کو زیادہ آتی ہے۔ میں عورت ہی ٹھیک ہوں۔ آج سے میرا نام غالبا۔ تم موہن کے جاؤ۔ ویسے بھی تمہارے ہی گھر والے ہیں۔ سب بھوت لگتے ہیں۔ یہ سکندر نے کہا تھا میں نے نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اب اپنی مقدار بند کرو تم دونوں۔"

نازو نے برا مان کے کہا "کیا بند کروں؟"

میں نے کہا "چونچ کو کہتے ہیں منقار۔ مطلب تھا کہیں اندر میں کر اپنی بکواس بند کرو اور مرزا جی! تم جاؤ رابعہ کے ساتھ بیٹھے۔"

غالب نیچے چل پڑا۔ میں نے اسے روکا "کہاں ہے؟" جاتو رہا ہوں مرنے کے لیے۔ شاید اپنے سسر کا حوالہ دوں نوجان بچ جائے۔"

"یار! ایک طرف سے تم نیچے اترنے کا راستہ رکھو۔ پچھلی طرف سے کوئی صورت پیدا کرو نیچے اترنے کی" میں نے بھنا کے کہا "پھر دائیں بائیں سے الگ الگ گھوم کے جاؤ اور دیکھو نیچے کیا ہو رہا ہے۔"

"اور تم مزے سے یہاں کھڑے گیلری سے اوپر کا نظارہ کرتے رہو گے" غالب بولا "یار ان کی ہوگی ریاض ہماری ہے۔"

میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ ہمیں نیچے تلاش کرنے میں ناکام ہو کے وہ اوپر ہی آئیں گے۔ یہاں ہم ان کا استقبال کریں گے لیکن تم جا رہے ہو تاکہ بندی کے لیے ان کو واپس جانے وقت احساس ہو کہ عقلمندوں نے غلط نہیں کہا تھا۔"

"یہ کہ کسی کی ماں کب تک خیر منائے گی" غالب نے نازو کی طرف دیکھ کر کہا "ایک دن تو بکرا نانے کا گھوڑے پہ سہرا لے۔"

"اف یار! تم مجھے کہاں نہیں کہ وقت کم ہے۔"

غالب نے رابعہ کا ہاتھ پکڑا اور کہا "چلو جی وکیل صاحب۔ ہم نیچے جاکے کسی اسٹور میں چھپ کے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ اب ادھر آئیں گے۔ نیچے کی تلاشی کا کام تو ختم ہوا۔"

نازو مسکرائی "مگر انہوں نے پوچھا کہ قربانی کا بکرا کہاں ہے تمہیں بتادوں گی۔"

غالب نے آہ بھری "ہاں۔ تمہیں تو بیوی بنے بغیر بیوہ ہونے کا شوق ہے" وہ نیچے جاتے جاتے پھر رک گیا "بھائی سکندر! ایک آخری بات۔"

"پوچھو" جلدی پوچھو۔" میں نے کہا۔

غالب بولا "وہ تم کیا بتا رہے تھے کہ عقل مندوں نے کیا کہا تھا؟"

"یہ کہ آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے اور جانا دوسرے کی مرضی سے۔"

"بالکل ٹھیک۔ میں بھی تمہاری مرضی سے جارہا ہوں۔ مرنے" وہ مجھے اور نازو کو ہنسی ضبط کرتا چھوڑ کے نکل گیا۔

ایک بار پھر نیچے سے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی پھر کوئی دہشت زدہ ہوکے چلایا مگر اس کی آواز دبادی گئی۔

"اب تو کوئی شک نہیں رہا کہ یہ اکبر خان کے ملاقاتی نہیں ہیں؟ وہ گھر پر نہیں ہے" انہیں تو یہ بھی معلوم ہوگا۔"

نازو نے سہلایا "پھر یہ کس سے ملنے آئے ہیں۔ ہم سے؟"

"ہمارے سوا کون ہے یہاں؟"

"ان کی ملاقات شامت اعمال یا فرشتۂ اجل سے بھی تو ہوسکتی ہے۔"

"یہ کون حتمی طور پر بتا سکتا ہے کہ آج کس کی اپائنٹ منٹ ہے فرشتۂ اجل سے" میں نے کہا "چلو اب پیچھے آجاؤ۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ اوپر آنے ہی والے ہوں گے۔"

مجھے یقین تھا کہ اتنی بڑی عمارت کے کسی حصے میں کہیں کوئی ایسی کھڑکی ہوگی یا پچھا ہوگا جس پر قدم جما کے رابعہ اور غالب کے لیے گراؤنڈ فلور تک پہنچنا مشکل نہیں ہوگا۔ شاید انہیں کوئی رسی مل جائے ورنہ چادر پھاڑ کے رسی بنانے اور پلنگ کے پیچھے اترنے کا پرانا طریقہ بھی انہیں آتا ہے۔

میں نازو کے ساتھ راہداری میں کھڑا ہوگیا۔ ہمارے پیچھے آمنے سامنے کے دو کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ایک غلطی یا عقلمندی غالب سے یہ سرزد ہوئی تھی کہ وہ انجبیں کی لالٹین جلتی چھوڑ آیا تھا۔ انجبیں یا مہمان خانے میں ہمارا قیام تھا۔ اس حصے کو چھوڑ کے کوٹھی کے اوپر والے حصے میں اندھیرا تھا۔

نازو نے سرگوشی میں کہا "سکندر! یہ کون لوگ ہوسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ شریف لوگ نہیں ہوسکتے۔"

"میرا مطلب تھا کس کے دشمن؟"

"دیکھو یہ اکبر کے دشمن نہیں ہوسکتے۔ چالاک آدمی کے دشمن بھی چالاک ہوتے ہیں۔ بظاہر اپنی حفاظت کے خیال سے بے پروا نظر آنے والا اکبر خان بھی یہ بات جانتا ہوگا کہ اس کے دشمن

www.paksociety.com

کون ہیں، ان کی طاقت کیا ہے اور وہ کب حملہ کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی دشمنوں کر سب معلوم ہوگا کہ وہ کب کہاں ملا ہے؟ "میں رفت کہاں نہیں ملا۔ اور اس پر ہاتھ ڈالنا جنگل کے بادشاہ کو زندہ پکڑنے سے کم مشکل اور خطرناک نہیں ہوتا۔ بادشاہ کا کیا پتا کہاں مل جائے۔ نا رہیں ہو یا خود شکار کی تلاش میں نکلا ہوا ہو۔ یہ آپ نے ہمیں سبق سکھایا۔"

"اور ان استادوں کو بھیجنے والا ہیڈ ماسٹر کون ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "چوہدری ولاور، استاد ہیڈ ہو یا خلیفہ ٹنگر۔ میری دشمنی جس کسی سے ہے وہ ٹنگر ہیں، خلیفہ نے انہیں بھیجا ہوگا۔"

نازو بولی "میں سمجھ گئی۔ اس وقت تو اکبر خان کے سامنے وہ کچھ نہیں بگاڑ سکا تمہارا۔ اب بزدلوں کی طرح تم سے اپنے دست راست کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ کتنے ٹنگر مارے تھے تم نے؟"

"تاکہ وہ اس کے لیے آزری کیا ہیں؟ ٹنگر۔ ایک رخصت کر گیا تو دوسرا بڑھ جائے گا" میں نے کہا "میری دشمنی جس مزید قربانی ہے کہ یہ معاملہ مختلف ہے۔ یہ رابعہ کو لے جائیں گے۔"

نازو نے گھبرا کے کہا "کیا کہہ رہے ہو؟ رابعہ باجی..."

میں نے کہا "ہم لے جانے نہیں دیں گے، فکر مت کرو۔ دیکھو نا ایک ہی تو رابعہ ہے جو تنہا تھیں۔ دوسری ہوتی کہیں تو ہم کہتے کہ لے جاؤ بھئی۔"

"یہ کیسا مذاق ہے! رابعہ نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟"

"ان کا نہیں۔ خلیفہ ٹنگر کے ذہن، عقل و ہوش کو رابعہ کے حسن کی تجلی نے خاکستر کر دیا تھا۔ یہ میں نے دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں" میں نے کہا "ممکن ہے رابعہ نے بھی محسوس کیا ہو۔"

نازو آہستہ سے بولی "جب تم نے قدم لیا تھا تو رابعہ نے کیسے نہ محسوس کیا ہوگا۔"

"وہ تو اکبر خان پہنچ گیا اس کی دلیری تھی ورنہ رات کو خلیفہ ٹنگر موقع آنجہانی ہو جاتے۔ خلیفہ ٹنگر جابر کی گدی پر کسی نا اہل کو بٹھانا پڑتا۔ ابھی پتا چل جائے گا کہ یہ ٹنگر ہیں تو..."

میری بات قدموں کی چاپ کے باعث ادھوری رہ گئی۔ میں نے زینے پر ایک گول سا سر دیکھا۔ یہ ایک کالے کپڑے میں لپٹا ہوا سر تھا۔ سر کے نیچے کا حصہ رفتہ رفتہ طلوع ہوا۔ اس نے دالان خود اپنی آواز سے بھی ڈر رہا تھا یا حد درجہ محتاط تھا۔ اس کے پیچھے دوسرا تاریک سایہ نمودار ہوا۔ قالین کی وجہ سے ان کے چلنے سے کوئی آہٹ پیدا نہیں ہو رہی، جو آہٹ میں نے سنی تھی وہ غالباً کسی کے ٹھوکر کھانے یا ہاتھ لڑھک جانے کا نتیجہ تھی۔

میں اور نازو پیچھے ہو گئے اور کھلے دروازوں کی تاریک پناہ میں آنے والوں کا انتظار کرنے لگے۔ نازو کے ہاتھ مجھے بہت سہارت تھی اور میں بھی مسلح تھا۔ ابھی خائف نہیں تھا۔ تھ مجھے نازو

کی حفاظت کرنے کی فکر تھی اور نہ اسے ہدایات دینے کی ضرورت۔ مجھے یقین تھا کہ چاروں سے وہ تنہا بھی نمٹ سکتی ہے۔ بعض اوقات اس کا اسکور بڑھ جاتا تھا کیونکہ کسی بھی محاذ پر حریف اس کی نسوانیت، نزاکت اور معصومیت کے دھوکے میں مجھ سے تو مقابلے کے لیے تیار ہوتا تھا مگر اس کے سامنے بے فکری سے مرنے چلا جاتا تھا اور بے خبری میں خود کشی کر لیتا تھا۔ جب وہ مجھ کے شعلے کو چھو لیتا تھا۔

ہراول دستے کے دو افراد جن کر پہلے نمودار ہوا تھا، ایک ہی وقت میں دروازے کے سامنے سے گزرے اور تقریباً ایک ساتھ میں نے اور نازو نے انہیں یوں اندر کھینچ لیا جیسے کہ وہ مارے گئے ہوں۔ آنے میں سرکار چلے۔ میرے قابو میں آنے والا خاصا گرانڈیل تھا مگر میں نے بائیں ہاتھ کو اس کی گردن کے گرد گھما کے شکنجہ بنا لیا تھا۔ اس کے لیے سانس لینے کے دونوں راستے بند ہو گئے اور آواز نکالنے کے بھی۔ اس نے لاتیں چلائیں اور ہاتھ گھمائے مگر میں ان حالات میں ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے گھٹنا اس کی کمر پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے بال پکڑ کے اس کے سر کو پیچھے کی طرف ایک جھٹکا دیا تو آواز ایسے آئی جیسے کسی نے سوکھی ٹہنی توڑی ہو مگر یہ سوکھی ٹہنی نہیں، اس کی نرم نازک اور پھولی ہوئی گردن تھی جس کے اندر سے حرام مغز کی گھن لائن اور زندہ گزر رہے تھے۔ حرام مغز ریڑھ کی ہڈی کے اندر سے پورے جسم کو کنٹرول کرتا ہے اور عملاً اسی میں زندگی کی جان ہے اور دماغ میں زندگی کے احساس کا وجود ہے جس کو ہم حواس خمسہ بھی کہتے ہیں۔ شاہراہ حیات کے منقطع ہوتے ہی جسم بے روح ہو کے گرا اور میں نے اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ شاید ایسا ہی نازو نے بھی کیا ہوگا مگر غیر ارادی طور پر ہم سے ایک ہی غلطی ہو گئی۔ میں نے اسے تڑپنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا اور اس نے مرتے مرتے لات مار کے ایک میز گرا دی۔ وہ میز بھی کیا تھی، دشمن پایوں کا ایک لمبا سا اسٹول تھا جس پر پیتل کا گلدان یا ٹیبل لیمپ رکھا ہوا تھا۔ اندھیرے میں مجھے صاف تو نظر نہیں آیا مگر ان کے گرنے کی آواز یں گن کے میں دہل گیا۔ مزید غضب یہ ہوا کہ میز گری تو میرے سر پر۔ غنیمت ہے کہ پیتل کا بھاری گلدان یا ٹیبل لیمپ نہیں گرا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا تھا، مزید اندھیرا چھا گیا۔ مجھے روشن جگنو سے اڑتے نظر آئے اور اس سے پہلے کہ جگنو غائب ہوتے، کسی نے لائٹ جلا دی۔

میں نے ریوالور کا سہارا لے کر خود کو سنبھالا اور چند سیاہ پوش دھندلی نظروں سے اپنے مقابل رو سیاہ پوش دیکھے۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور کی نالی کے اندر بھی مجھے اندھیرا نظر آیا۔

"سیدھا کھڑا ہو جا۔" ان میں سے ایک نے غرا کے مجھے کہا ہی

دوسرا سخت صدمے کی حالت میں تھا "مر گیا اس نے تو

ٹنگر کو شہید کر دیا۔"

میں نے زبردستی مسکرا کے کہا "تو میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ تم سب ٹنگر ہو۔"

"ہاں ہم ٹنگر ہیں" پہلے نے دھمکی اور فخر کے ساتھ کہا۔

"موسی کی صرف گردن ٹوٹی ہے۔" میں نے کہا "چھوڑ کے پھر کھڑا کر لو۔ کسی ٹنگر کی پھونک نکل جائے تو خلیفہ جھاڑ پھونک کر لیتا ہوگا۔"

"بھونک مت کتے" دوسرے ٹنگر نے میرے ایک لات مار کے اپنا غم و غصہ ٹھنڈا کیا "حکم نہیں ہے ورنہ تمہاری بھی پھونک نکال دیتا میں۔"

"حرامی نہیں ہوتا ہے زاہد ماجد کی سب عادتیں آ گئی ہیں تم میں۔ وہ بھی ایسے ہی دولتی مارنے والوں کے" میں نے کپڑے جھاڑ کے کہا۔

میرا مقصد یہی تھا۔ اسے مشتعل کرکے نفسیاتی طور پر کمزور کر دیا اور پھر اس کی کمزوری کے کسی لمحے سے فائدہ اٹھاتا مگر اس کا ساتھی یقیناً کم جذباتی تھا۔

"تمہاری ماں کہاں ہے؟"

میں نے کہا "خدا انہیں غریق رحمت کرے۔ بہت عرصہ ہوا انتقال کو۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا کوٹھا وہیں ہے اب بھی؟"

اس نے پیچ کے مجھے بہت ہی ناقابل اشاعت گالیاں دیں "رابعہ کہاں ہے؟"

میں نے سوچ کے کہا "یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ سوری۔"

"تمہارا تو باپ بھی بتائے گا۔ سوری کے۔"

"ہاں۔ وہ شاید بتا دیں۔ ان کی قبر کا علم استاد ہیڈ ہو کر ہے" میں نے کہا۔

"مجھے غصہ مت دلا۔ میں چھلنی کر دوں گا۔"

"تمہیں حکم نہیں ہے اس لیے بس اپنی خیر مناؤ۔ ہم کسی للو پنجو کا مال نہیں ہیں۔ اکبر خان نے بڑی قیمت ادا کرکے اٹھایا ہے ہمیں۔ اس کا مال ضائع کیا تو تم نے تو وہ سارے ٹنگروں کو بھول جائے گا۔" میں نے کہا اور اس بات کی مزید تفصیلات سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ وہ خلیفہ صاحب کس کے ساتھ کیسا شرمناک سلوک کرے گا۔

ادھر بھی اشتعال کی حد میں رہا۔ اس نے دوسرے سے کہا "رستے جا تو دیکھ وہ دشتی بھی کہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "تم کو خلیفہ ٹنگر کی بھتیجو کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کرنے سے ڈرنا چاہیے۔ وہ جا کے اپنے بھائی کو بتا دے گی تو..."

اب اس نے مجھ پر ریوالور مارنے کی کوشش کی۔ غصے سے پاگل ہو کے وہ مجھ پر گولی بھی چلا سکتا تھا مگر اپنی کمزوری کا راز اس نے پہلے ہی افشا کر دیا تھا کہ خلیفہ ٹنگر نے صرف رابعہ کو اٹھا کر

لانے کا حکم دیا تھا، باقی سب کو جان سے مارنے کا نہیں۔ شاید خلیفہ ٹنگر بھی اکبر خان کو برابر کی طاقت تسلیم کرتا تھا اور اس سے بگاڑ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ خدا نخواستہ وہ اپنے شیطانی عزائم میں کامیاب ہو جاتے تو اکبر خان کی واپسی سے پہلے ہی رابعہ کو واپس بھجنگ جاتے اور بعد میں ہمارے لیے خود اپنے کئے کی موت مارا لازمی ہو جاتا۔ اکبر خان کے سامنے تو وہ مکار منافق صاف انکار کر دیتا کہ اغوا! آبرو ریزی کے کسی راستے سے اس کا کسی قسم کا بالواسطہ تعلق بھی تھا؟ کوئی ٹنگر ایسا کر ہی نہیں سکتا۔

میں جانتا تھا کہ غصے کو برداشت کرنے کی حد ضرور ہوتی ہے۔ کسی کی زیادہ تو کسی کی کم۔ جاہل، اجڈ اور بدمعاش جلد مشتعل ہوتا ہے۔ اپنے پیر و مرشد کی ممانعت آڑے نہ آتی تو وہ بہت پہلے ہی مجھے قتل کر دیتا مگر میں اسے باتوں سے اس انتہا تک لے گیا جہاں حکم بھی اسے نہ روک سکا۔ اب اس کے پاس حکم عدولی کا بھی جواز تھا۔ میں نے براہ راست روحانی باپ کو بڑی ذلت آمیز گالی دی تھی اور کوئی بھی عقیدت مند باپ کو گالی برداشت کر سکتا ہے، پیر صاحب کو نہیں۔

مجھ پر حملہ کرنے سے قبل وہ اپنے ساتھی کو احکامات جاری کر رہا تھا کہ رابعہ کو تلاش کرے اور وہ بھی روانگی کے لیے پلٹ چکا تھا جس نتیجے مجھے بڑا اچھا موقع ملا۔ میں نے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا اور ایکدم کلائی موڑ کے اسے کھینچنے ہی جھٹکا دیا تو وہ بلبلا کے خود اپنے زور میں اوپر اچھلا۔ میں نے اڑنگی مار کے اسے گھمایا اور یوں دیوار پر دے مارا کہ وہ نیچے سے اوپر تک دیوار پر چھپکلی کی طرح چپاں ہو گیا۔ اس کا سر، ناک اور دانت اس تصادم سے اتنے ہی متاثر ہوئے ہوں گے جتنے اس کے گوڈے گٹے۔ وہ الٹا پیچھے گرا تو میں نے پھر اسے ایک ہاتھ پر سنبھال لیا اور ایک پورا چکر دے کر دوسری دیوار پر پھینک دیا۔

"اے ٹنگر کے نطفے۔ آ میں تمہیں رابعہ کا پتا بتاؤں" میں نے کہا اور اس کے خلیفہ کی شان میں ایک اور قصیدہ پڑھا۔ ریوالور تو اس کے ہاتھ سے پہلے ہی چھوٹ گیا تھا، اب تو ناک اور منہ سے خون پھوٹ رہا تھا۔ وہ آدھا ایک بیڈ پر اور آدھا نیچے لٹکا ہوا ہانپ رہا تھا اور اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ٹنگر نمبر دو رابعہ کی جستجو میں روانہ ہوا تھا، نازو کے پیچھے چھپ گیا۔ وہ اپنی کمین گاہ سے نکل کے میری مدد کرنے نہیں گئی لیکن یہ دشمنی دیکھ کے باہر ہی ٹھہر گئی تھی۔ دوسرا ٹنگر نے بڑھا ہی تھا کہ پیچھے سے ٹنگر نمبر ایک کے ساتھ میری فائٹ شروع ہو گئی اور وہ رکا کہ اپنے ساتھی کے لیے کچھ کرے تو نازو نے اس کو باہر سے نکل مار کے ذبح کر دیا۔

جب مجھے فرصت ملی تو میں نے دیکھا کہ وہ نازو کو پیچھے سے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں جکڑ کے خود نازو سے یوں چپٹا ہوا تھا کہ نازو نہ لات چلا سکتی تھی نہ ہاتھ لیکن نازو بہرحال نازو تھی۔ اس

www.paksociety.com

نے ایک دم اس کے بازو پر رائفل کا دستہ اور تاکا بارش آ گیا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور نازو کو گالی دی۔ دوسرے لمحے اس کی گالی بھی چیخ میں بدل گئی۔ نازو نے ایڑی پر گھوم کے اس کی گردن پر لات ماری اور وہ کھڑے کھڑے دھم سے فرش پر گر گیا۔ خود کو بچانے کے لیے اس نے دیکھے بغیر فائر کیے اور یہ اتفاق تھا یا ہماری خوش قسمتی کہ وہ نشانہ لینے میں ناکام رہا تھا۔ اس کی گولیاں چھت اور دیوار کے اوپر والے حصے میں پیوست ہو گئیں مگر فائرنگ کی آواز نے صورت حال بدل دی۔

مجھ سے پٹ کر لیٹا ہوا اکبر اسے گالیاں دینے لگا "حرامی دے پتر! کیا کہا تھا خلیفہ نے؟"

وہ گھبرا ہو گیا "ارے میں کیا کروں؟ زنانی سے مار کھا رہا ہوں۔ ریوالور اٹھانے کیوں تھے ہم؟"

ان کے ریوالور ہم نے ٹھوکر مار کے بیڈ کے نیچے کر دیے تھے "چلو ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہو جاؤ" میں نے کہا۔

انہوں نے بادل ناخواستہ تعمیل کی۔ اسلحے سے محروم ہوتے ہی ان کی اکڑفوں بھی ختم ہو گئی تھی اور اب وہ سخت گھبراہٹ میں مبتلا تھے۔

"چلو اب ایک دوسرے کو تھپڑ مارو" میں نے کہا "پہلے تم شروع کرو۔ ہر تھپڑ کے ساتھ کہو 'تنگر شاہ کی قسم' رابعہ میری بہن ہے۔"

ان کو سخت ذہنی جھٹکا لگا "ہرگز نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا پھر میں جا رہا ہوں۔ تمہارے دو ساتھی ابھی اندر ہی ہیں۔ فائرنگ سن کے آنے والے ہوں گے شاید۔"

نازو بولی "اگر اس قابل ہوئے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "ہاں۔ ہمارے بھی دو بندے ان کی خاطر تواضع کے لیے اسٹور میں تھے۔"

نازو بولی "لگتا ہے وہ تنگر انہوں نے بھی کر دیا ہے۔"

میں نے کہا "میں دیکھتا ہوں جا کے 'تم ان سے نمٹ لو۔"

نازو نے کہا "ہاں بھئی بہتر جاؤ۔ تم نے سنا ہمارے خلیفہ جی نے کیا حکم دیا تھا؟ شروع ہو جاؤ۔"

انہوں نے پھر کہا "یہ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "ارے یہ اچھی بات ہوگی۔ ایک زنانی مار مار کے تم کو ٹھنڈا کر دے گی۔ پولیس میں رپٹ ہے 'کھال بھی آنا رکے ہاتھ میں پکڑا دے گی اور مرچیں بھروئے گی۔"

وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے تو میں کمرے سے نکل گیا۔ مجھے اب یقین آنے لگا تھا کہ رابعہ اور غالب نے باقی دو کو بھی خاموشی سے خلاص کر دیا ہے ورنہ فائرنگ کی آواز پر وہ ضرور لپکتے کہ جنگ تو ادھر ہو رہی ہے۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ نہ غالب اور نہ رابعہ نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ گولیاں کیسے چلی گئیں اور کس نے چلائیں۔

میں نے زینے میں کھڑے ہو کے آواز دی "غالب!" اندر کمرے میں ایک تنگر چلانے لگا "ہائے ہائے میں مر گیا۔" پھر دوسرے نے کہا "بچا لے تنگر شاہ۔ سدا تیرے تنگر شاہ اور مجھوں ماف کر ظالماں!"

لیکن ظالم حسینہ یعنی نازو انہیں معاف کرنے والی کہاں تھی۔ وہ ان کی خاطر تواضع میں مصروف تھی۔ میں نیچے اتر گیا اور راہداری سے گزر کے باہر نکلا۔ غالب اور رابعہ کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں نے ایک چکر پیچھے کا لگایا تو مجھے پورچ میں کھڑی ہوئی گاڑی کے پیچھے ایک تنگر ملا جس کا سر تو سلامت تھا مگر وہ مر چکا تھا۔ خون اس کی ناک سے بہہ رہا تھا۔ یہ شاید کسی شدید اندرونی ضرب کا نتیجہ تھا۔

ایک اور تنگر مجھے پچھلی طرف پانی اوپر پہنچانے والی موٹر کے علاوہ نظر آیا۔ پانی کی موٹر کے تار توڑنے سے کرنٹ اس کے جسم سے گزرا تھا اور وہ تھری فیز موٹر تھی۔ غالباً اسے چار سو چالیس وولٹ نے ہلاک کیا تھا۔ کرب و اذیت سے اس کا جسم اکڑ گیا تھا اور چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیانک طریقے پر حلقوں سے باہر آ رہی تھیں اور زبان باہر نکلی ہوئی تھی مگر دانتوں میں دب گئی تھی۔ کہتے ہیں زبان کا حلق سے نکل آنا ایک حیوانی جبلت ہے اور جسم کی آخری خاموش پکار جو وہ مدد کے لیے کرتا ہے۔ ذبح ہونے والے بکرے کی حالت بھی یہی ہوتی ہے اور پھانسی پانے والے انسان کی زبان بھی باہر آ جاتی ہے۔

باہر وہ گاڑی بھی موجود تھی جس میں سارے تنگر بھر کے لائے تھے اور میں نے اس جیپ اور ویگن ٹائپ کی گاڑی کے اندر بھی جھانک لیا تھا۔ اب اس میں کوئی نہیں تھا۔ یہ ان کی بے وقوفی تھی۔ انہیں کم سے کم ایک تنگر کو پیچھے ہی چھوڑ کر جانا چاہیے تھا جو گاڑی کی حفاظت کرتا اور خطرہ ہوتا تو نکل جاتا۔ مگر یہ سب ہمارے سیدھے سادے مرید ٹائپ لوگ بد معاش ضرور تھے مگر ویسے نہیں جیسے چوہدری ولادو یا اکبر خان جیسے لوگ رکھتے تھے۔ یہاں کے مسائل ان کے علاقہ اثر تک محدود رہتے ہیں اور تنگر شاہ تو بھی کوئی ملکی شہرت کا حامل نہیں تھا۔ وہ تو ایک صوبے کی سطح پر بھی نیچے کا ضلع یا تحصیل کا پیر تھا۔ اس کے ماننے والے بیس یا سو پچاس میل کے دائرے میں تھے۔ آگے جہاں کسی دوسرے پیر کی روحانی عملداری کا علاقہ شروع ہوتا تھا وہاں تنگر شاہ کے معتقدین نہیں ہوں گے۔ یہ بالکل ضلعی انتظامیہ جیسا سلسلہ تھا۔ تھانے کی حد 'تحصیل دار کی حکومت' ڈپٹی کمشنر کی سلطنت اور کمشنر کی بادشاہت۔ گورنر تو غیب تو ہوتے ہیں شہنشاہ۔

چنانچہ تنگر شاہ کو سو پچاس میل کے علاقے میں اپنے ذاتی معتقدین کو راہ راست پر رکھنے اور ان کے یقین کو متزلزل ہونے سے بچانے رکھنے اور ان کے دلوں میں تنگر شاہ کا احترام برقرار رکھنے اور شرپسند یا بد ظن ہو کے دوسروں کے ایمان میں خلل ڈالنے والوں کی گوشمالی کے لیے اس قسم کے نمائشی بد معاش

تھے جو حکم پر کسی بد باطن 'بدکردار کو ٹھوک بجا کے اس کے چولیں ڈھیلی کر دیں۔ خلیفہ محترم کی نظر کرم کسی پر ہو جاتی تو اس مرید کی چادر اور چار دیواری' عزت نفس اور اکڑفوں کا جنازہ نکال سکتی تھی اور معترض سوال کوئی بالکل ہی "کافر" ہو جاتے تو اس کا اپنا جنازہ بھی۔ لیکن بین الاقوامی سطح پر ہونے والے جرائم سے نا آشنا رہتے تھے اور ان کا کسی "مافیا" یا مافیا کے رشتوں سے واسطہ نہیں رہا تھا جو یہ فائرنگ سونے سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے لوگوں کو ریوالور جیسے اسلحے سے دہشت زدہ کر سکتے تھے۔

اکبر خان ذرا بلکہ خاصا اوپر کی سطح کا کسی حد تک بین الاقوامی مجرم تھا۔ حقیقی معنوں میں "مافیا" یا منظم گینگ تو بہت بڑی تنظیم ہوتی ہے اور چوہدری ولادو یا اکبر خان کے ٹولے کا ان سے موازنہ کرنا ایسا ہی غلط ہوتا ہے جتنا ایم کیو ایم کا پی ایل او (تنظیم آزادی فلسطین) سے۔ پھر بھی اکبر خان کے پاس ملکی معیار کے جنونی بد معاش ہو سکتے تھے جو اسٹین گن سے دستی بم تک استعمال کر سکتے ہوں اور جن کے لیے ایک قتل کوئی خاص بات نہ ہو مگر وہ بطور خاص قتل عام کرنے کے بھی اہل ہوں۔

یہی وجہ تھی کہ وہ چھ تنگر جن کو یقین تھا کہ بہ آسانی ایک عورت کو اٹھا لائیں گے جیسے وہ دیہاتی سوہنیوں کو ادھر ادھر سے لاتے تھے' آسانی سے پٹ گئے اور خلیفہ تنگر سو تم کی ہوس پر قربان ہو گئے۔ عقیدہ ایسی ہی چیز ہے جس میں عقل کو دخل نہیں ہوتا اور جذبات میں تو یہ حرام موت بھی مرے تو ثواب سمجھ کے جان دیتا ہے۔

ذرا گرفتار ہونے والوں کے لیے بڑی ذلت تھی۔ ایک صدمہ تو انہیں زنانی سے مار کھانے کا تھا اور زنانی بھی کیسی۔ ہر کسی جنی اور عمر شمار کے مقابلے میں نصف بھی نہ تھی۔ ہاں دیکھنے میں سخت ہوشربا تھی مگر اس کی "کراٹے" اس سے زیادہ ہوش اڑانے والی تھی۔

غالب کو آوازیں دیتا میں پورے محل کا چکر لگا کے دوبارہ سامنے آ گیا۔ اب مجھے ان کی طرف سے فکر ہونے لگی تھی۔ کہیں ہاتھ کی توا سٹور میں چھپے نہیں بیٹھے مگر وہ ان کی بات تھی۔ نہ وہ اتنے بزدل تھے اور نہ ان مردہ تنگروں کا خاتمہ کوئی اور کر سکتا تھا جن کی لاشیں میں دیکھ چکا تھا۔

میں نے اندر جا کے ایک ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور لائٹ آن کر کے دیکھا۔ تین مختلف مقامات سے تین بے ہوش نوکر اور کچن میں سے ایک بے سدھ جوڑا دریافت ہوا۔ پولیس انہیں دیکھتی تو قابل اعتراض حالت میں قرار دیتی۔ غالباً وہ میاں بیوی تھے جو سونے کے لیے دروازہ بند کر کے لائٹ بجھا رہے تھے۔

تین بے ہوش نوکروں اور کچن کے جوڑے کو فوری طور پر میں اکیلا ہوش میں نہیں لا سکتا تھا اور ان کا طبی معائنہ کرنے سے پہلے میں رابعہ اور غالب کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔

میں رابعہ اور زینا تو کمرے میں دلچسپ مقابلہ جاری تھا۔ دونوں تنگر صرف انڈرویئر میں ملبوس ایک دوسرے کو تھپڑ مار رہے تھے اور وہی جملہ دہرا رہے تھے جو میں نے انہیں بتایا تھا۔ ان کے چہرے احساس ذلت اور ہاتھ چوٹوں سے لال ہو رہے تھے۔ نازو جنگلی جانوروں کو سدھانے والے ٹرینر کی طرح ان کے سر پر سوار تھی اور ان کی وحشیانہ سرکشی پہلے ہی ختم کر چکی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ پٹاخے جیسی آواز نہیں آ رہی ہے" نازو نے ڈانٹ کے کہا "ابھی سے ہاتھ ڈھیلے پڑ رہے ہیں۔"

مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں ایک ساتھ فرش پر گرے اور میرے قدموں سے لپٹ کے دہاڑیں مار کے رونے لگے "باؤ جی! ہمیں ماف کر دو۔ ہماری توبہ۔"

میں نے کہا "اچھا سیدھے کھڑے ہو جاؤ انسان کے بچوں کی طرح۔"

نازو نے کہا "ان کا کیا کرنا ہے؟"

میں نے کہا "انہیں باندھ دو۔"

نازو نے ریوالور اٹھایا "ابھی لو۔ کہاں مارنی ہے؟ آر پار کرنی ہے یا۔۔"

وہ چلانے لگے حالانکہ نازو بالکل سیریس نہیں تھی۔

میں نے کہا "وہ تنگر باہر کرے پڑے ہیں لیکن ہمارے بچوں نہیں ہیں۔ نہ مجھے غالب ملا اور نہ رابعہ۔"

غالب نے دوسری طرف کے کمرے سے چلا کے کہا "ہم یہاں ہیں 'کانٹا ان کے کھٹکے ہیں تمہاری آنکھوں میں؟ رابعہ بڑی بے عزتی ہو رہی ہے تمہاری۔ شہر یہ تمہیں گلاب کا پھول اور موتیے کی کلی یا رات کی رانی وغیرہ کہتا ہو گا۔"

رابعہ سامنے آ گئی "تمہاری بے عزتی اب ہو گی۔ بتاؤ تم نازو کو تم کیا کہہ رہے تھے؟"

غالب نے گھبرا کے کہا "کیا غضب کرتی ہو۔ میں نے تو انڈر ویئر بھی نہیں رہنے دیا۔"

مجھے پہلے غصہ آیا پھر ہنسی آئی "تم یہاں چھپے بیٹھے تھے؟"

"چھپنا کیا مطلب" غالب بولا "ہم تو آ رہے تھے تم کو پڑھتے گولی کی آواز پر۔ یہاں دو مرا ڈرامہ چل رہا تھا ہم دیکھتے رہے۔"

"اور میں جنگ مار رہا تھا" میں نے کہا۔

"بھائی رہی بات تمہارے تو جو تمہارے نصیب میں ہے۔ یار یہ بد صورتی کے نمونے ہٹاؤ میری نظروں کے سامنے سے" غالب بولا "تعفن ہو گئی بہت۔"

میں نے دونوں ملزموں سے باتھ روم میں جا کے کپڑے پہننے کو کہا۔

"اور یہ جو گھونسوں کے نشے لگائے ہیں ہم نے" رابعہ بولی "وہ یہاں پڑے ہیں زرد سے۔"

میں نے کہا "غالب! انہیں گاڑی میں ڈال اور گاڑی کو کہیں

www.paksociety.com

دور چھوڑ کے آجاؤ۔ جن کو اٹھانا ہو گا اٹھالیں گے۔"

"مگر کیسے؟ گاڑی چھوڑ دوں کا تو خود کیا پیدل آؤں گا؟"

میں نے ہنس کے کہا "پورچ میں ایک کار تو ہے... اسے اسٹارٹ کر کے جاؤ تو رابعہ کو ساتھ لے جانا۔"

"انجن کو ہاٹ وائرڈ کر لیتے ہیں ہم" غالب نے کہا۔ ہاٹ وائر کرنے کا مطلب ہوتا ہے چابی کے بغیر تار ملا کے گاڑی کو اسٹارٹ کرنا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے، تم جاؤ، کوشش کرو۔"

"یہ دو مردے بھی میں ڈھو کے لے جاؤں؟ دوسرا انھیں باتھ روم میں ہے۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ انھیں معلوم نہیں ہونا چاہیے کچھ بھی۔ ان سے تو ہم کہیں گے کہ تمہارے دو ساتھی لاشیں لے کر چلے گئے۔"

"اور ان کا کیا کریں گے بعد میں؟"

"انھیں بطور سلطانی گواہ پیش کریں گے۔ پہلے اکبر خان کے سامنے پھر خلیفہ کیکر کے حضور۔"

"میں تو سمجھی تھی انھیں پیڈرو نے بھیجا ہو گا" نازو بولی۔

"یہی تو غلطی ہے تمہاری کہ تم جو سمجھتی ہو وہ کوئی اور نہیں سمجھتا۔ بلکہ شاید تم خود بھی سمجھتی نہیں ہو، بول پڑتی ہو" غالب نے کہا۔

رابعہ بولی "آج صبح سودا کیا تھا خلیفہ نے۔ شام ہوتے ہی بے ایمانی آگئی اس کے دل میں۔"

"دل میں" غالب نے کہا "ہاں دل میں۔ دل ہی تو بے ایمان ہوتا ہے۔"

"کیا اسے اندازہ نہیں تھا کہ اکبر خان خاموش نہیں بیٹھے گا؟"

"ہم کب خاموش بیٹھنے والے تھے۔"

"وہ تمہیں خاموش کر کے لے جاتے۔" رابعہ بولی۔

غالب نے کہا "اگر ہم خاموش رہتے تو تمہیں لے جاتے۔"

"صرف مجھے کیوں؟"

"بس تم ہی اچھی لگی تمہیں خلیفہ کیکر کو۔ کیوں کا کوئی سوال نہیں۔ دل جس پر آجائے وہی لیلیٰ وہی محبوب و مطلوب۔"

"غالب کے بچے! کیا بولتے جارہے ہو؟" رابعہ چلائی۔

"میں سچ بولتا جارہا ہوں۔ تم ہی..."

میں نے کہا "اب چھوڑو یہ بات۔"

"لیکن... کیا یہ ٹھیک ہے؟" رابعہ کا رنگ لال ہو گیا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا "یہ کچھ ایسی ہی نیت لے کر آئے تھے جو اپنے انجام کو پہنچے۔ اب فکر کیسی۔"

"رابعہ کی نظر میں وزن ہے" غالب بولا "یاد کرو وہ قصہ کنگ رابرٹ بروس اور مکڑی کا۔ فرض کر لو خلیفہ ہے وہی رابرٹ بروس

اور مکڑی ہے رابعہ۔ ذرا ٹرائی اگین۔"

"تمہارا مطلب ہے ایک ناکامی کے بعد وہ پھر کوشش کرے گا؟ ناممکن" میں نے کہا۔

"ارے یار! یہ نمرود ہوتے ہیں۔ خدائی کے دعوے رکھنے والے۔ نعوذ باللہ۔ ان کی مجروح انا اتنی آسانی سے شکست تسلیم نہیں کرتی۔ میرا مشورہ مانو تو خواتین کو یہاں سے رخصت کر دو۔"

میں نے کہا "خواتین کو ہی کیوں؟ ہم سب کیوں نہ رخصت ہو جائیں اسی وقت؟"

غالب بولا "مجھے ابھی اکبر سے معاملات طے کرنے ہیں اور تمہیں بھی..."

میں نے نازو اور رابعہ کی طرف دیکھا "صبح ہونے والی ہے۔ تم لوگ تیار ہو واپس لاہور جانے کے لیے؟"

"لاہور۔ اکیلے؟ ہم دونوں؟" رابعہ نے کہا۔

"ہم دونوں۔ اکیلے" غالب نے اس کی نقل اتاری "اکیلا ایک ہوتا ہے۔ دو مل کے گیارہ ہو جاتے ہیں۔"

نازو نے کہا "ہم جاسکتے ہیں مگر ایک شرط پر۔"

"تمہارے جانے سے پہلے میں ہاں کروں؟" غالب شرما کے بولا "اللہ کیسی باتیں کرتی ہیں آپ سب کے سامنے۔"

مجھے اور رابعہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ نازو کا جھنجلاہٹ سے برا حال ہو گیا "بعد میں مت کہنا مجھے کچھ۔ پہلے خود بلاوجہ بولے جاتے ہو۔ سوچے سمجھے بغیر" وہ بگڑ گئی۔

غالب نے معصومیت سے کہا "میں تو یہی سمجھا تھا۔ خفا کیوں ہوتی ہو۔"

نازو نے مجھ سے کہا "ہمارے جانے کے بعد آپ لوگ کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیں گے۔ کسی پھڈے میں نہیں پڑیں گے۔"

"ہم کچھ نہیں کرتے۔ بس کچھ ہو جاتا ہے خود بخود" غالب بولا۔

"تمہیں عادت ہے پنگا لینے کی" نازو نے کہا۔

"یہ ہم نے پنگا لیا تھا۔ تمہاری رابعہ باجی کو کیا ضرورت تھی خلیفہ کیکر کے من کو بھانے کی۔"

"بدتمیزی مت کرو غالب" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"کیا غلط کہا ہے میں نے... تمہاری وجہ سے یہ سب ہوا۔"

"کیا میں نے جان بوجھ کے کچھ کیا تھا؟" رابعہ روہانسی ہو گئی۔

"میں کب تمہیں قصوروار کہہ رہا ہوں۔ قصور ہے تمہارے اس حسن کا جو بیشتر حسن ہے یا نہیں ہے۔ کیوں سکندر، یہ تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے نا بابا۔"

"غالب کے بچے" میں نے ہاتھ گھما کے اس کی کمر پہ مارا "... ساتھ سب سے پنگا۔ اتنا ماریں گے ہم سب مل کے۔"

"مارنے کے بعد کہتے ہو ماریں گے" غالب نے کراہتے ہوئے

کمر ہری کرتے ہائے ہائے شروع کی "نازو! میری ریڑھ کی ہڈی کے تمہیں تینتیس مہرے ٹوٹ چکے ہیں۔ میری صوفیہ لارین۔ آج کے بعد تمہارا کبڑا عاشق کہلاؤں گا۔ ہنچ بیک آف اسلام آباد عرف انتھونی کوئن میڈ ان پاکستان۔"

صورت حال کی سنگینی کے باوجود ہم سب کو اس کی اداکاری پر ہنسی آگئی۔ خود نازو ہنسنے پر مجبور ہو گئی۔ اس زمانے میں صوفیہ لارین اور انتھونی کوئن کی شاہکار فلم

HUNCH BACK OF NOTREDAM کا بہت شہرہ تھا۔ اس میں صوفیہ لارین کا حسن و شباب الگ تہلکہ خیز تھا اور انتھونی کوئن کی لاجواب اداکاری کا کمال الگ۔

صبح کاذب کا اجالا افق پر نمودار ہونے لگا تھا جب مرزا غالب نے پورچ میں کھڑی ہوئی کار کا دروازہ کھولا۔ اس کے لیے گھر میں کوئی چابی دستیاب نہ تھی چنانچہ ایک اسٹیل وائر سے عقدہ کشائی ہوئی۔ بونٹ کھول کے اس نے سیٹ کے تاروں کو ملایا اور اندر سے کار کو ریٹر کو ریس دی۔ دو کوششوں کے بعد انجن اسٹارٹ ہو گیا۔

پھر میں اور غالب باری باری دو لاشوں کو اوپر سے اٹھا کے لائے۔ باقی دو مردے کوٹھی کے احاطے سے اٹھائے اور انھیں اس گاڑی کے پچھلے حصے میں ڈال دیا جس میں وہ بڑے طمطراق اور بدمعاشی کے زعم میں آئے تھے۔ یہ عجیب سی گاڑی مقامی ماہرین کی مشترکہ کوشش سے وجود میں آئی تھی جو انھوں نے کار سازوں کی محنت پر پانی پھیرنے کے لیے کی تھی۔ ولادت کے وقت یہ یقیناً نئے ماڈل کی بہت خوب صورت کار قرار دی گئی ہو گی۔ پرانی ہو جانے کے بعد اسے چھکڑا کہا گیا ہو گا۔ شاید کسی حادثے میں اس کی باڈی ناقابل مرمت ہو گئی تھی یا کسی نے ضرورت کے تحت اختراع کرتے ہوئے کار کے حصے پر ٹرک بنانا چاہا ہو گا۔ نتیجے میں آدھا تیتر آدھا بٹیر حاصل ہوا تھا۔ سامنے سے یہ کار تھی، پیچھے سے ویگن جیسا ایک بدنما ڈبا جو منی ٹرک کے طور پر ایسے ہی مال کو ادھر سے ادھر لانے لے جانے میں کام آتا ہو گا جس کو دنیا کی نظر سے چھپانا ضروری ہو۔

"تم تو جاؤ سید حسن گھر" غالب نے ٹرک میں بیٹھ کے کہا "تم کو خدا کی امان میں دیا۔ جب تک میں نہ آؤں، تمارد منہ مجھے یاد کرنا اور دن میں تین بار آٹھ آٹھ آنسو بہانا۔ رات کو کھانے کے بعد تارے گننا۔"

"تمہارے تجویز کردہ نسخے پر میں ساری عمر عمل کر سکتی ہوں بشرطیکہ تم کبھی لوٹ کر نہ آؤ" نازو نے ہنس کے گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈال دیا۔ رابعہ نے مجھے ہاتھ ہلا کے خدا حافظ کہا۔

"کیسی کٹھور ناری عرف سنگدل حسینہ ہے" غالب غم میں ڈوبے لہجے میں بولا۔

میں نے اسے تسلی دی "سب اوپرے دل سے کہتی ہے۔ اب تم جاؤ اور اس مصیبت سے چھٹکارا پاکے فوراً آؤ۔ ذرا خیال رکھنا کوئی دیکھ نہ لے۔"

غالب نے ٹرک کو اسٹارٹ کیا اور پیچھے لے جاکے موڑا پھر سیدھا گیٹ کی طرف گیا۔ میں کھلا گیٹ بند کرنے گیا تو میری نظریں باہر ایک مختصر سے کیبن پر گئیں۔ یقیناً یہ دربان کے لیے بنایا گیا تھا مگر دربان اس میں نہیں تھا۔ میں نے اندر باہر اسے تلاش کیا اور حیران ہو کے یہ سوچتا ہوا لوٹ آیا کہ کیا اکبر خان کا محافظ نمک خوار بھی سازشیوں کے ساتھ مل چکا تھا کہ وہ سیدھے اندر آگئے یا اسے پہلے ہی ٹھکانے لگا دیا گیا تھا؟

احتیاطاً میں نے صدر دروازے کو بھی اندر سے مقفل کر دیا اور اندر آنے کے سب راستے چیک کیے۔ تمام کھڑکیاں مقفل تھیں اور دروازے پہلے ہی بند تھے۔ جب میں نے خواب غفلت کے مارے نوکروں کو ہوش میں لانے کی کارروائی شروع کی تو کچن میں موجود ہونے کی آواز آرہی تھی۔ مرد آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا۔

انھیں بے ہوش کرنے والوں نے سر پر ڈنڈا مارنے کا کوئی طریقہ استعمال نہیں کیا تھا۔ وہ کلوروفارم لے کر آئے تھے جس کی خفیف سی بو اب بھی فضا میں تھی۔ یہ طریقہ ذرا سی بے احتیاطی سے مہلک بھی ثابت ہو سکتا تھا لیکن خاموشی کا ضامن تھا۔ حملہ آور اپنی آمد کو خفیہ رکھنے میں کامیاب ہو جاتے اگر اتفاق سے میں اور غالب انھیں نہ دیکھتے۔ ہم دونوں کو نیند نہیں آرہی تھی اس لیے ہم دونوں الو نیرنگی پر تشریف فرما تھے۔

نوکر نمبر ایک پانی کے چھینٹے پڑنے کے انتظار میں ہی تھا کہ فوراً اٹھ بیٹھا اور مجھے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے اسے ہلا کے کہا "کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ؟"

اس نے سر کو گھڑے کی طرح ہلاتے ہوئے کہا "جھولے میں آرام سے بیٹھو۔ مجھے بھی کراؤ گے۔"

میں نے اسے زیادہ سختی سے جھنجھوڑا تو وہ لیٹ گیا اور چھت کو دیکھنے لگا اور بولا "مجھے بھوک لگی ہو رہی ہے۔ کچھ چیز کھانے کو بھی جی چاہتا ہے۔"

میں نے اس کے گالوں پر طمانچے مارتے ہوئے کہا "ہوش میں آجاؤ۔ تم عورت نہیں مرد ہو۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

وہ پٹ پٹ آنکھیں جھپکانے لگا "مراد علی۔ ماں کہتی ہے نامراد۔"

اس کے ہوش و حواس کی مکمل بحالی کے لیے وقت درکار تھا یا اسے چائے کافی پلانے کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے اپنے حال پر چھوڑ دینا مناسب سمجھا اور کچن کی طرف چلا گیا۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو ایک ادھیڑ عمر عورت باہر نکلی اور منہ چھپا کے بیٹھ گئی۔ ابھی اس کی طاقت اس حد تک بحال نہیں ہوئی تھی کہ وہ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرنے لگے۔ وہ لڑکھڑا کے گری۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے مجھے دیکھا اور پھر اٹھ کے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے سے

نکل گئی۔

اب میں نے دروازے میں کھڑے ہوئے اس بیرو کو دیکھا جس کا قد قوی ہیکل بنیان سے نکلا ہوا تھا۔ پتلے پتلے کالے ہاتھ بنیان کے سوراخوں کو چھپانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے اور اس کی سوکھی سیاہ ٹانگیں ڈنڈیوں کی طرح نیکر کے غلاف میں سے نکلی ہوئی تھیں اور کانپ رہی تھیں۔ وہ جوان آدمی تھا مگر اس کی بدحالی بھی بڑھاپے کی شہادت تھی۔

میں نے کہا "تم کون ہو؟"

"اپنے... اپن رشید رسو رسوئیا۔ کھونا پکا تا۔"

تھوڑی سی کوشش سے میں نے اس کے جملے کو سمجھ لیا "تم رشید رسوئیا ہو۔ کھانا پکاتے ہو۔ کچھ کھا بھی لیا کرو۔ یہ تمہاری بیوی کو کیا ہوا؟ ایسے کیوں بھاگ گئی؟"

"اپنا بیوی" وہ بوکھلا کے بولا "اچھا... وہ... ہاں وہ اپنا بیوی۔ ایک دم سو رہا تا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھ کے کہا "الو کے پٹھے بکواس کرتا ہے مجھ سے۔ سچ بتا کس کی بیوی تھی وہ؟ تیری یا کسی اور کی؟"

وہ ایک دم نیچے بیٹھ گیا۔ "شور کارا کوئی ہوا۔ ابھی ایک دم شوخ ہو جائے گا۔ آپ مالک لوگ کو نہیں بولیں گا نہیں تو وہ اپنا بیچ مڑی کو زور آ جائے گا اور اپنا شور پہ مارے گا۔"

مجھے ہنسی آ گئی "تمہاری کالی چمڑی کے جوتے بنا کے تمہارے ہی سر پہ مارے گا۔ اتنا ڈرتے ہو تو ایسے کام کیوں کرتے ہو؟ ٹھیک ہے' میں کسی کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ' رات کو کیا ہوا تھا؟"

اس کا رنگ اڑ گیا "ہم کو نہیں مالوم۔ کوئی شالا لوگ اندر آیا' اپنا ناک منہ بند کیا۔ باپ رے' اپن سمجھا مر گیا۔"

اس نے جو کچھ دیکھا تھا اسے معلوم تھا کہ بعد میں دوسروں پر کیا گزری۔ اسے تو اپنے اسکینڈل کی فکر تھی کہ کس کس نے نہ جانے کیا دیکھا ہو گا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ کمرے میں میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ اسی وقت غالب نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ میں نے رشید سے کہا کہ وہ کافی بنا کے اوپر لے آئے اور خود دروازہ کھولنے گیا۔ ہم اوپر چلے گئے۔ غالب خاصا خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے واپس آنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گیا۔

میں نے کہا "کہاں چھوڑ آئے وہ مردہ خانہ؟"

غالب ہنسا "ایک احاطے میں' کسی ٹھیکیدار کا یا کنسٹرکشن کمپنی کا ہو گا۔ بہت سی ناکارہ مشینری کے درمیان کھڑا کر دیا۔"

"کوئی چوکیدار نہیں تھا؟"

"وہ سب بھاری مشینری تھی جو نہ جانے کب استعمال ہوئی ہو گی۔ شاید اسلام آباد کی تعمیر کے ابتدائی دور میں۔ وہاں سے کوئی کیا لے جائے گا؟ ممکن ہے یہی سوچ کے چوکیدار بھی آرام سے گھر میں سوتا ہو۔"

"ٹرک تو اسکریپ بھی نہیں چھوڑتے۔"

"اچھا ہے وہ ٹرک بھی لے جائے کوئی" غالب بولا "واپسی پر ایک ہندو مل گیا اس نے اسکوٹر پر لفٹ دے دی یہاں تک۔"

"بہت عقل مند ہیں آپ" میں نے کہا "کل اگر اخبار میں خبر آئی تو وہ ضرور سوچے گا کہ وہیں مرزا غالب ملے تھے اور ان کو اس نے اکبر خان کی کوٹھی کے دروازے پر اتارا تھا۔"

"صرف سوچے گا' بولے گا نہیں" غالب نے کہا "کوئی نہیں پڑتا ایسے چکروں میں۔ اس کے علاوہ مجھ پر عقل مند ہونے کا الزام لگا ہے۔ میں کافی آگے آ کے اسکوٹر پر سوار ہوا تھا اور اتر گیا تھا سو کر پیچھے ہی۔"

"اچھا بھئی تم عقل مند نہیں ہو" میں نے کہا۔

"تم کیا مذاکرات کر رہے تھے اس بنگالی سے؟"

"تم جانتے ہو کہ وہ بنگالی ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا "رشید رسوئیا کو زور آ گیا تھا۔ شالا ایک دم ہو وہاں ہے۔"

میں نے اسے ہنستے ہنستے بتایا تھا کہ میں نے کمرے میں کس کو بے ہوش پڑا پایا تھا اور کچن میں کیا دیکھا تھا۔ "بکا چور تھا' فوراً پکڑا گیا اور فوراً مان گیا کہ وہ کسی اور کی بیوی تھی۔"

"اس کی اپنی کوئی نہیں ہو گی نا۔"

"ہو تب بھی کہتے ہیں کہ اپنا بچہ اور پرائی بیوی تو اچھے ہی لگتے ہیں اور وہ اس کے مقابلے میں بہرحال بہت اچھی تھی" میں نے کہا پھر اچانک مجھے اپنے دو زیر تفتیش حوالاتیوں کا خیال آیا۔ "یار مرزا ان قیدیوں کو چھوڑ دیں یا اکبر خان کے سامنے پیش کریں؟"

"وہی تو گواہی دیں گے ہمارے حق میں۔ خود بتائیں گے خلیفہ نیکر کی بدمعاشی کے بارے میں ورنہ ہمارے پاس کیا ثبوت ہو گا۔"

"ویسے تو اکبر خان ہمیں جھوٹا نہیں کہہ سکتا لیکن مجرم خود اس کے سامنے جرم کا اعتراف کر لیں' یہی بہتر ہے" میں نے کہا۔

صبح کا اجالا اب کھڑکیوں کے شیشوں پر دھند کی طرح اتر رہا تھا۔ رخصت ہوتے ہوئے موسم سرما اور آمد بہار کا اعلان کرتی اسلام آباد کی صبح میں بڑی مفرح خوشبو کی خنکی تھی۔ میں نے کھڑکی کھول دی اور خاموشی سے چہکنے والے پرندوں کی چل بل آواز سننے لگا۔

اکبر خان کی لمبی سیاہ کیڈی لاک بڑی خاموشی سے گیٹ میں داخل ہوئی۔ ابھی ہیڈ لائٹس آف کرنے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ سڑک پر سے گزرنے والی اکا دکا گاڑیوں کی روشنی کہیں کہیں درختوں کے پیچھے جھلملاتی نظر آ رہی تھی۔ اندھیرا اتنا گہرا بھی نہیں تھا کہ کچھ دکھائی نہ دے مگر مجھے یوں لگا جیسے اکبر خان نے اپنی آمد کو خفیہ رکھنے کے لیے اندر آنے سے پہلے ہیڈ لائٹس بجھا دینا بہتر سمجھا تھا۔ اس کی کار کے انجن کی آواز صرف سرسراہٹ تھی۔ اس سے زیادہ شور تو سرخ بجری بچھے راستے پر ٹائر کر رہے تھے۔

میں نے اوپر سے ہاتھ ہلایا اور غالب سے کہا "اکبر اعظم آ گیا چوروں کی طرح۔ پتا نہیں رات بھر کیا کرتا رہا۔"

"جھک مارتا رہا۔ آپ اتنے متفکر کیوں ہیں لوگوں کے بارے میں کہ وہ رات کو کیا کرتے ہیں؟ بھائی! رات کس لیے ہوتی ہے؟" غالب بولا۔

اسی وقت رشید کافی لے کر اندر آیا۔ میں نے کہا "رشید کو معلوم ہو گا۔"

رشید بوکھلا گیا "کیا شاب جی؟"

"رات کس لیے ہوتی ہے' انہیں بتاؤ۔" میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ بدحواس اور شرم سے زمین میں گڑ جانے کا خواہش مند رشید کچھ فرماتا' اکبر خان اندر آ گیا۔ اگر وہ مجھے کھڑکی میں کھڑا دیکھ کے حیران ہوا تھا تو اس نے اپنی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔

"صبح صبح کافی" وہ بولا "رشید! اور کچھ نہیں ہے کھانے کو؟"

میں نے کہا "ناشتا ہم بعد میں کریں گے۔ ہم تمہاری واپسی کا انتظار کر رہے تھے' اسی لیے جاگ رہے تھے۔"

"کیا رات بھر نہیں سوئے؟" اس نے میری اور غالب کی صورتوں پر غور کر کے کہا "ایسی کیا پریشانی تھی؟"

میں نے چبا کے کہا "اسی لیے بھاگ گئے تھے تم گھر سے؟ تمہیں معلوم تھا کہ یہاں کیا ہو گا۔"

غالب کے لیے بھی میرا یہ رویہ غیر متوقع تھا مگر اس نے میرا ساتھ دیا۔ "ان حالات میں تم پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے اکبر خان؟"

اس نے بے بسی سے کہا "آخر کچھ بتاؤ مجھے بھی....."

میں نے کہا "تمہیں بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم خود دیکھ لو اسٹور روم میں۔"

وہ ایک دم اٹھا اور اسٹور روم تک گیا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کا ہاتھ ہینڈل پر جما رہ گیا۔ اس نے پلٹ کے ہمیں دیکھا اور پھر دونوں ملزمان کو باری باری باہر کھینچ لیا۔ وہ رات بھر کے جاگے ہوئے اور تفتیش سے نیم جاں تھے۔ اکبر خان کے دھکے سے وہ ہمارے قریب آ گرے۔

"کون ہو تم؟ جلدی بولو نہیں تو..." اکبر خان دہاڑا۔

میں نے کہا "کیا واقعی تم انہیں نہیں جانتے اکبر خان؟ تمہارے تو خاصے مراسم ہیں خلیفہ نیکر سے۔"

غالب بولا "کاروباری بھی اور ذاتی بھی۔"

"ہاں لیکن میں انہیں نہیں جانتا۔ اب یا تو تم بتا دو یا پھر مجھے پوچھ لینے دو۔"

میں نے کہا "یہ نیکر ہیں۔ خلیفہ نیکر کے حکم پر رابعہ کو اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔"

"رابعہ کو... کیوں؟" اکبر خان کا منہ کھلا رہ گیا۔

میں نے کہا "کتنی معصومیت ہے تمہارے سوال میں اکبر خان۔ کیا تم نے کسی کی خوب صورت عورت کو آج تک نہیں اٹھوایا؟"

"نہیں" مشتعل ہو کے اس نے میز پر مکا مارا "اکبر خان کو کبھی ایسی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ کسی شریف عورت کے ساتھ میں نے زبردستی نہیں کی' جس نے جو قیمت مانگی وہ ادا کی میں نے۔"

"ایسی کوئی نہیں تھی جس نے عزت کی قیمت اپنی جان سے ادا کرنا منظور کر لیا ہو لیکن تمہاری لگائی ہوئی بولی نامنظور کر دی ہو؟"

"ہاں۔ ہاں" وہ چلانے لگا "سب ہوتا ہے دنیا میں لیکن وہ بے غیرت شوہر' باپ اور بھائی بھی ہوتے ہیں جو خود قیمت وصول کرتے ہیں۔ اس عورت کی عزت کرتا ہوں میں جو برائے فروخت نہیں ہوتی۔ کسی بھی قیمت پر۔ پھر میرے گھر میں کس نے ہمت کی زبردستی داخل ہو کے میرے مہمانوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی؟ بولو... کے بچے۔"

اس نے ان دونوں کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا "اور کون تھا تمہارے ساتھ؟ ہمت کیسے ہوئی تمہاری اکبر خان کے گھر میں گھسنے کی؟ میں تمہارے خلیفہ نیکر کی...."

"یہ غلط کہتا ہے" ان میں سے ایک چلانے لگا۔

پھر دوسرے نے واویلا کیا "یہ بکواس کر رہا ہے۔ جھوٹ بول رہا ہے۔"

میں ان کی دیدہ دلیری اور ڈھٹائی پر دم بخود رہ گیا۔ "میں جھوٹ بول رہا ہوں' بکواس کر رہا ہوں۔ اکبر خان! اپنے نوکروں کو بلاؤ۔ ان سے پوچھو۔"

اکبر خان ایک ایک کو آواز دینے لگا۔ سب سے پہلے رشید آیا اور اس نے تھر تھر کانپتے ہوئے بتایا کہ کس طرح وہ کچن میں سو رہا تھا جب اچانک دو آدمی اندر آئے جن کے منہ اور سر پر کالے نقاب تھے اور انہوں نے اس کا منہ دبا کے ناک پر رومال رکھ دیا۔ اس میں کوئی دوا تھی جس کی بو سے وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے نہیں معلوم کہ بعد میں کیا ہوا۔

وہ ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "اپن کو یہ شاب بول دیا۔"

"میں نے کیا بول دیا ہے تجھے؟" میں نے بگڑ کے کہا۔

"بل۔ پانی شاب" وہ عاجزی سے بولا "بول دیا۔ آپ تو اپن کو ہوش آیا۔ اپنا مالک دیکھا آپ کہ نہیں؟ اپن ادھر اپنا مورو کا بیٹھا لیٹا تھا۔ اکیلا۔ ایک دم اکیلا۔"

"بالکل۔ تم بالکل اکیلے لیٹے ہوئے تھے" میں نے کہا

www.paksociety.com

"مردے کی طرح۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟ انہیں بھی بلاؤ۔"
میرے بیان سے اس کی جان میں جان آئی "آتا ہے شاب۔ ان کو سوکر آتا ہے۔ ہم ابھی اٹھائے دیا۔"
"سوکر آتا ہے!" غالب بولا "کیا مطلب؟ ذیابیطس ہے؟"
"چکر آتا ہے" میں نے کہا "پتا نہیں یہ سین کی جگہ شین اور شین کو سین بولنا کیوں ضروری سمجھتے ہیں۔"
باقی ملازمین حاضر ہوئے تو لرزتے کانپتے ہوئے انہوں نے بھی رشید کے بیان کی تائید کی۔ انہیں سوتے میں بے ہوش کردیا گیا تھا کچھ سنگھا کر۔
"چوکیدار کہاں تھا؟ اسے بلاؤ۔"
میں نے کہا "چوکیدار! میں نے تو کوئی چوکیدار نہیں دیکھا ان کے جانے کے بعد بھی۔ ممکن ہے چوکیدار کو بھی ٹھکانے لگا کے اندر آئے ہوں۔"
"ہوں۔ وہ کتنے آدمی تھے؟"
میں نے کہا "چھ۔ دو پکڑے گئے' چار فرار ہو گئے۔"
ملازمان نے پھر احتجاج کیا "یہ غلط ہے۔ جھوٹ ہے۔"
غصے کی وہ لہر جس نے اکبر خان کو پاگل کردیا تھا گزر چکی تھی اور اب وہ کافی پیتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ کیکر موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیان بدلنا چاہتے ہیں۔ جھوٹ اور سچ دونوں کو اپنے حق میں' اپنی بے گناہی اور ہمارا ظلم و جبر ثابت کرنے کے لیے استعمال کرکے اکبر خان کو ہمارے خلاف کرنا چاہتے ہیں۔
لیکن اکبر خان اب ان کی سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔ میں نے جھپٹ کے اس کا ہاتھ نہ پکڑا ہوتا تو وہ ان دونوں کو وہیں شوٹ کر دیتا۔ "میرے سامنے بھونکتے ہو کتے۔ میرا نام اکبر خان ہے اکبر خان' خلیفہ کیکر نہیں" اس نے خلیفہ کیکر کی شان میں ایک اور قصیدہ پڑھا۔
"اکبر خان! یہی تو اصل گواہ ہیں ہمارے پاس۔ ان کو ماردیا تو اُلٹے ہم مجرم ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔
اس نے ایک لمبی گہری سانس لی "ٹھیک کہتے ہو تم۔ یہ بتاؤ وہ تو خیریت سے ہیں نا؟"
"رابعہ اور نازو؟" میں نے کہا "وہ تو... نہیں ہیں۔"
"نہیں ہیں... کیا مطلب؟" وہ چونکا "کہیں... کہیں خدانخواستہ..."
میں نے کہا "نہیں اکبر خان۔ ایسا ہوتا تو ہم تمہیں زندہ ملتے۔ وہ ہماری لاشوں پر سے گزرے بغیر ان کو کیسے لے جاسکتے تھے۔ وہ چلی گئیں۔"
"ان کا جانا ہی بہتر تھا" غالب بولا۔
"کہاں چلی گئیں؟ کیسے؟"
"لاہور چلی گئیں۔ تمہاری دوسری گاڑی میں" غالب بولا "اس کی چابی نہیں تھی ہمارے پاس۔ میں نے ڈائریکٹ اگنیشن سے اسٹارٹ کرکے دی تھی۔ گاڑی واپس پہنچ جائے گی تمہارے پاس۔"
اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "دفع کرو گاڑی کو۔ اور یہ تم بھی شکل گم کرو۔ ان خنزیروں کو نیچے بند کرو۔ اگر یہ بھاگ گئے تو میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا" وہ نوکروں سے مخاطب ہو کر بولا۔
"اللہ نے بہت خیر کیا۔ اب تم مجھے شروع سے بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔ خلیفہ کیکر نے ایسی گندی کوشش کیوں کی آخر؟"
میں نے کہا "ہوس میں اندھا ہو کے آدمی ایسا ہی کرتا ہے۔ میں تو اس کی نظر کو تاڑ گیا تھا لیکن مجھے اس سے یہ امید نہیں تھی۔"
"میں نمٹ لوں گا اس... سے" اکبر خان گالی دے کر بولا۔
"نہیں اکبر خان۔ جن کی عزت کا معاملہ ہو' یہ انہی کا حق ہے۔"
"بالکل ٹھیک۔ تم میرے مہمان تھے۔ سوال میری عزت اور غیرت کا ہے۔ لعنت اس پٹھان پر جو مہمان کی حفاظت نہ کر سکے۔ ابھی میں رات بھر جاگا ہوں۔ ایک ضروری کام سے گیا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کروں گا پھر ناشتا ایک ساتھ کریں گے۔ تم بھی آرام کرو۔ تم چاہو تو سیر کرکے آؤ یا اخبار دیکھو۔ شوق ہے تو نیچے گانے والے سنو" وہ اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔
میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ سبزے پر شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے' نئے کھلے ہوئے پھولوں پر اٹکے ہوئے تھے اور بہار کے شگوفوں پر چمک رہے تھے۔ پس منظر میں مری کے پہاڑوں کی سرمئی لکیر واضح ہو گئی تھی۔ میں اور غالب دامنِ کوہ میں آباد پاکستان کے اس نئے' حسن قدرت سے مالا مال اور انتہائی سرسبز و شاداب شہر کی سڑک پر چہل قدمی کرنے نکل آئے۔
"اب مجھے یقین آنے لگا ہے کہ ہم کسی کی قید میں نہیں ہیں" میں نے سڑک کے کنارے خود رو پودوں کے خوش رنگ پھولوں کو مسرت سے دیکھا۔
"قیدی آزاد کرائے ہیں اکبر خان کی دولت نے" غالب بولا "اور انہیں سونے کی زنجیر پہنا دی ہے۔"
"کس نے کہا ہے تم سے کہ یہ زنجیر پہنو؟"
"یہ خواہشوں اور خوابوں کی زنجیر ہے۔ یہ میرے تمہارے ہم سب کے خواب ہیں جو اب تعبیر پا گئے ہیں۔" غالب نے کہا۔
"کیا ان خوابوں کو تعبیر بھی اکبر خان جیسے لوگ دیں گے؟" میں نے افسوس سے کہا "اور اس کے بدلے وہ ہم سے کیا لے گا؟"
"یار! ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ دنیا کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر چل رہی ہے۔ یہ بزنس ہے۔ اکبر خان ہمارے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنے گا تو اس کا بھی یقیناً کوئی مقصد ہوگا۔"
"اس کا مقصد میں جانتا ہوں۔ وہ استاد پیڈو اور چودھری ولاور جیسے لوگوں کے خلاف ہماری مدد اس لیے کرنا چاہتا ہے کہ اس کے مفادات پر زد پڑنے آئے۔ وہ اپنے لیے ایک حفاظتی فصیل چاہتا ہے اور اخبار کے مالک کی حیثیت سے وہ حکومت کا چوتھا ستون بن جائے گا جسے خود حکومت نہیں گرا سکتی۔ تم جس قسم کی صحافت کرنا چاہتے ہو مرزا جی اس کی گنجائش اکبر خان کے خیالی منصوبے میں نہیں ہوگی۔ وہ پریس کو خریدنا چاہتا ہے۔"
غالب نے سوچ کے کہا "ایک اخبار تو پریس نہیں ہوتا۔"
"صحافت کے معیار پر ایک ہی ہوتا ہے۔ تم کیا کرو گے؟ جس کا کھاؤ گے اسی کے گن گاؤ گے؟" میں نے کہا "ابھی تو اس نے کچھ نہیں کہا بلکہ جو کہا ہے وہ تمہیں بہت اچھا لگا ہے مگر یہ مت بھولو کہ وہ ذرا مختلف قسم کا شکاری ہے۔ جب تم اس کے جال میں پھنس جاؤ گے تو پھر شاید نکل نہیں پاؤ گے۔ آہستہ آہستہ اس کے اغراض و مقاصد کی نوعیت تم پر واضح ہونے لگے گی اور اس وقت تم اختلاف کرو گے تو وہ دودھ میں پڑی ہوئی مکھی کی طرح نکال پھینکے گا۔ ایک بہت بڑے اخبار کے لیے وہ کسی بھی ایڈیٹر کو خرید لے گا جو اس کے مفادات کا تحفظ کرے۔ اور اسے اپنے مطلب کا آدمی آسانی سے مل جائے گا۔ ابھی اس کے پاس دولت کی طاقت ہے۔ کل جب وہ ایک بہت بڑے اخبار کا مالک بن چکا ہوگا۔ تمہاری محنت سے۔ تو اس کی طاقت اتنی بڑھ چکی ہوگی کہ تم جیسے اس کی مٹھی میں ہوں گے۔ پھر کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اس کا۔"
"یہ بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ کل ایسا ہی ہو شاید لیکن میں تو آج کی فکر کر رہا ہوں" غالب نے کہا "آج ایم آر ایس کو طاقت حاصل ہو رہی ہے چودھری ولاور اینڈ کمپنی کے خلاف۔ پہلے ان سے نمٹ لیں۔ اس وقت تک یہ کھیل ایسے ہی چلے گا۔ اکبر خان اس خوش فہمی میں رہے گا کہ اس نے ہمیں خرید لیا اور اب ہم اس کی مرضی کے مطابق چلنے کے پابند ہو گئے۔ کل جب وہ کاروبار یا سیاست کی دکان چمکانے کے لیے صحافت کا سہارا لے گا تو ہم اس کے ساتھ ہوں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوگا دوست۔ اسے سوچنے دو کہ ایسا ہوگا۔"
"یعنی ہم اسے مطلب براری کے لیے استعمال کریں گے اور جب مطلب نکل جائے گا تو چھوڑ دیں گے؟"
"وہ بھی تو یہی کر رہا ہے۔ ہمیں اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے" غالب نے کہا "گارنٹی کوئی نہیں۔ وہ کسی وقت بھی ہماری چھٹی کر سکتا ہے اور ہم بھی جب چاہیں اسے خدا حافظ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں اعتماد یا اصول کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ جیسے کو تیسا والی بات ہے۔ ہر ایک اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے اور اگر ہم معاشرے کو ولاور جیسے لوگوں کے اصل چہرے دکھاتے ہیں یا ان کے عزائم کی اصل حقیقت سے خبردار کرتے ہیں' ان کے مجرمانہ ماضی سے پردہ اٹھاتے ہیں اور پیڈو یا حاجی عبداللہ کی بدکرداری کا کچا چٹھا بیان کرتے ہیں تو یہ خدمت خلق ہے۔ ہم جان پر کھیل کے اور تمام خطرات مول لے کے ایسا کریں گے مگر اکبر خان خدمت خلق نہیں کرنا چاہتا اور اسے کوئی خطرہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہ تو خود ایک خطرہ ہے اس معاشرے کے لیے' ان نسلوں کے لیے جو اسکولوں اور کالجوں میں پروان چڑھ رہی ہیں اور آنے والے وقت کی امین ہیں۔"
"میں قائل ہونے لگا ہوں تمہاری لفاظی سے۔"
"یہ لفاظی نہیں' حقیقت بیانی کا کمال ہے" غالب نے آداب بجالا کے کہا۔
سامنے سے ایک ہاکر تیز تیز پیڈل مارتا گزرا تو میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس کی اتنی رفتار تھی اور بریک اتنے کمزور کہ رکتے رکتے بھی وہ سو گز کے قریب آگے چلا گیا۔ پھر اس نے پیڈل کو سرکس کے بازی گروں کی طرح ایک پاؤں زمین پر ٹکا کے موڑا اور ہمارے پاس آ کے اس نے پھر جوتے سڑک پر گھستے ہوئے بریک لگائے۔
میں نے کہا "ایک اخبار انگریزی کا اور ایک اردو کا۔"
وہ کچھ حیران ہوا "کون سا دوں جناب؟ سنڈے ایڈیشن ہے۔"
"اچھا۔ یہ سنڈے ایڈیشن یہاں اتوار کو شائع ہوتا ہے۔ کمال ہے۔" غالب نے کہا۔
میں نے کہا "یاد ہے جب ہم لندن میں تھے تو گارڈین ویڈ سے بھی بیشتر مجھ کو پڑتا تھا۔ خیر ایک اچھی تصویروں والا دے دو۔"
"ایک اچھی تصویروں والا" غالب نے میری تائید کی۔
اس نے دو اخبار لپیٹ کر مجھے پکڑائے۔ اب مسئلہ ادائیگی کا آیا۔ میں نے غالب سے اور غالب نے مجھ سے کہا مگر پیسے ہم دونوں ہی لے کر نہیں نکلے تھے۔
اخبار والے لڑکے نے پریشانی سے کہا "جلدی کریں سر۔ مجھے اخبار بھی ڈالنا ہے۔ ذرا دیر ہو جائے تو باتیں سننی پڑتی ہیں۔"
میں نے کہا "سوری یار۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ واپسی پر کل ادھر سے گزرتے ہوئے تم پیسے اکبر خان کے گھر سے لے لو؟ ہم وہیں مقیم ہیں۔"
"وہاں تو میں اخبار ڈال چکا ہوں" وہ بولا۔
"چلو کوئی بات نہیں۔ ہم آج دوبارہ پڑھ لیں گے" غالب بولا "ایک بات بتاؤ۔ یہ جو تم پاؤں زمین پر لگا کے جوتے گھستے ہو' بریک لگانے کے لیے' تو کیا بریک ٹھیک کرانے میں زیادہ خرچ آتا ہے؟ سال میں کتنے جوتے یوں گھس کے ختم کرتے ہو؟"
اب اس کی نظر پڑی "سر آپ یہاں تو نہیں رہتے۔"
"اچھا۔ پھر کہاں رہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

urdupaksociety.com

"یہاں رہنے والوں کو میں جانتا ہوں اور آپ کی صورت میں نے دیکھی ضرور ہے کہیں مگر اکبر خان کی کوٹھی میں نہیں۔ اسلام آباد میں بھی نہیں۔ چھوٹا سا شہر ہے یہ تو ابھی" وہ کچھ دیر پہلے کی بات بھول چکا تھا کہ اسے اخبار ڈالنے میں دیر ہو رہی ہے "پھر کہاں دیکھا ہے؟"

"کل تک سوچ لینا۔"

اسے ایک دم یاد آگیا "آپ۔۔۔ آپ کی تصویر تو اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ بالکل ٹھیک۔ میں روز دیکھتا تھا۔ سکندر بخت نام ہے آپ کا۔"

اس کا حافظہ اور مشاہدہ بالکل ٹھیک تھا بلکہ عام لڑکوں کے مقابلے میں اس اعتبار سے بہتر تھا کہ سب لوگ باقاعدگی سے اخبار نہیں دیکھتے اور اتنے بہت سے اخبارات نہیں دیکھتے۔ اس کی نظر سے ہر روز کئی اخبار گزرتے ہوں گے۔ اس کا زیادہ باخبر ہونا ایک فطری بات تھی۔

میں نے انجان بن کے کہا "سکندر بخت! وہ کون ہے؟"

اس نے سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور بڑے جوش کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا "آپ مجھے دھوکا نہیں دے سکتے سر! جو کچھ آپ کرتے رہے، میں باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ مجھے بہت شوق تھا آپ سے ملنے کا۔ بہت عظیم آدمی ہیں آپ۔ سب پاکستانی آپ جیسے ہوتے تو ہم کب کا کشمیر فتح کر چکے ہوتے۔ سارے مسلمان آپ جیسے ہوتے تو اسرائیل کیا چیز ہے، روس امریکا فتح کر لیتے ہم۔"

میں نے کہا "فرض کرو فتح کر لیتے" اس کے بعد کیا ہوتا؟ ہم ان ممالک کا بھی وہی حشر کرتے جو پاکستان کا کیا۔ بنایا تو ہم نے بڑے جذبے کے ساتھ تھا۔"

اس نے کہا "آپ اکبر خان کے مہمان ہیں؟ عجیب بات ہے!"

"کیا عجیب بات ہے اس میں؟" میں نے کہا۔

"مطلب یہ کہ کہاں اکبر اعظم، کہاں سکندر اعظم۔ ان کے درمیان کوئی دو ہزار سال کا فرق ہے۔" غالب نے کہا۔

"اکبر خان اور طرح کا آدمی ہے۔" وہ بولا "آپ کے اور اس کے درمیان۔۔۔ خیر۔"

میں نے کہا "سنو بیٹے! تم جذباتی ہو بہت۔ سڑک پر اس قسم کی گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

"یہاں کوئی دیوار نہیں ہے" غالب نے کہا "فرض کر لو درختوں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

"اگر تم نے مجھے پہچان لیا ہے تو اس کا اعلان کرنے میں ہمارے لیے خطرہ ہے اور جو کچھ تم اکبر خان کے بارے میں کہہ رہے ہو، اس میں تمہارے لیے خطرہ ہے۔" میں نے کہا "اب سارا دن ڈھول مت پیٹتے رہنا کہ آج میری ملاقات سکندر بخت سے ہوئی اور وہ اکبر خان کی کوٹھی میں ٹھہرا ہوا ہے۔"

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں سر۔"

"ہر شخص سمجھتا ہے کہ وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے جتنا وہ ہوتا ہے۔" غالب نے ایک فلسفیانہ نکتہ پیدا کیا "تم یہاں کے حالات پر گہری نظر رکھتے ہو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ جو کچھ فاصلے پر احاطہ سا نظر آ رہا ہے، اس میں یہ بھاری مشینری کب سے پڑی ہے اور کیوں؟"

"وہ" اس نے انگلی سے اشارہ کیا "ایک بلڈنگ کنسٹرکٹر تھا جو یہاں سڑکیں اور پل بنا رہا تھا۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ کوئی کہتا ہے کروڑوں کا غبن کر کے فرار ہو گیا بیوی بچوں کے ساتھ۔ لیکن۔۔۔"

"تم کیا کہتے ہو؟" میں نے اسے غور سے دیکھا۔

"کچھ نہیں جی میں چلتا ہوں" اس نے سائیکل اٹھائی۔

میں نے سائیکل کے پیڈل پر ہاتھ رکھ دیا "اخبار والے ہو کے حقیقت کو چھپا رہے ہو۔"

"میں کہاں سے اخبار والا ہو گیا جی۔ میں تو اخبار بیچتا ہوں اور اس سے اپنی ٹیوشن فیس ادا کرتا ہوں۔ شام کو ٹیوشن پڑھاتا ہوں تو گھر کا خرچ چلتا ہے۔ ایک معمولی ہاکر ہوں میں۔ شوق بہت تھا رپورٹر بننے کا مگر نصیب میں دھکے کھانے لکھے ہیں۔ بی اے کر لوں گا اس سال تو نوکری بھی نہیں ملے گی۔"

"رپورٹر بھی تو دھکے ہی کھاتے ہیں" غالب بولا "لیکن ہر کام کے لیے ایک وقت ہوتا ہے۔ تم رپورٹر بنو گے ایک دن بلکہ بہت جلد۔"

"لیکن ابھی تو تم ایک رپورٹ کو گول کر گئے۔" میں نے کہا "ہم یہ کیسے فرض کر لیں کہ تم میں بہت بڑے صحافی بننے کی؟ کوئی چانس دیا جا سکتا ہے تم کو بشرطیکہ تم خود کو اس کا اہل ثابت کرو۔ ہم ایک اخبار نکالنے والے ہیں۔"

اس کا چہرہ چمک اٹھا "آپ دلوائیں گے مجھے چانس؟ اچھا جی میں پھر آؤں گا۔ بہت سی باتیں بتاؤں گا۔ ابھی تو مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

وہ چلا گیا تو ہم بھی واپس ہوئے۔ اس احاطے میں جہاں غالب نے چار نگیروں کی لاشیں چھوڑی تھیں ابھی تک کوئی ہلچل نہیں تھی۔ فوری طور پر اس کا امکان بھی کم تھا۔ اس جگہ کا والی وارث کوئی نہیں تھا جو رپورٹ کرتا کہ کسی نے ایک ٹرک جیسی گاڑی میرے احاطے میں کھڑی کر دی ہے۔ چار مردہ لاشوں کے ساتھ۔ اس کا پتا تو تب چلے گا جب لاشیں سڑنے لگیں گی اور بو پہلے گدھوں اور مردار خوروں کو متوجہ کرے گی پھر ان کے بھائی بند پولیس والوں کو۔

ہمیں گھر سے نکلے ہوئے ایک گھنٹا ہونے والا تھا۔ سورج اب پہاڑوں کی اوٹ سے جھانکنے لگا تھا اور نباتات سے ایک خوش گوار خنکی آمیز خوشبو کے بخارات اٹھنے لگے تھے۔

"آپ کو کیا پریشانی لاحق تھی آخر؟" میں نے کہا "اس احاطے تک پرانی مشینری پڑی ہے یا میرے جواہرات؟ صبح سے اب تک اپنے خلاف دوسرا محاذ پیدا کر لیا ہے تم نے ایک گھنٹے میں۔"

"واقعی یہ شرح پیداوار بہت زیادہ ہے۔"

"تم بھول نہیں سکتے اس بات کو۔ بیشتر مجرم اسی طرح پکڑے جاتے ہیں کہ وہ جائے واردات پر دوبارہ جاتے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ سب ٹھیک ہے۔"

"لڑکا کچھ زیادہ ہی باخبر تھا۔ کیا خیال ہے اس کو لیٹر آف اپائنٹمنٹ دے دوں؟" غالب نے کہا "اس نے مزید سنسنی خیز انکشافات کا وعدہ کیا ہے۔"

میں چلتے چلتے انگریزی اخبار کے پہلے اور آخری صفحے کی سرخیاں دیکھتا جا رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا اور میرے قدم خود بخود رک گئے۔ پچھلے صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر کے ساتھ ایک انچ کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ یہ خانہ خراب کے مدیر اعلیٰ عاجز صاحب تھے۔

"مروا دیا! افسوس، کسی نے عاجز صاحب کا خانہ خراب کر دیا" میں نے خبر پڑھتے ہوئے کہا "ان کی لاش پشاور سی این جی روڈ پر ایک اخبار فروش نے شناخت کی۔"

غالب نے فوراً اردو اخبار کے صفحات پر نظر ڈالی "اس میں تو یہ خبر نہیں ہے۔"

"انگریزی اخبار کے رپورٹر کو پہلے مل گئی ہوگی۔ آخری کاپی پریس میں جانے سے پہلے" میں نے کہا۔

"اسے تو ہم خلیفہ گیگر کے پاس چھوڑ کے آئے تھے۔ لاش چارسدہ میں ملی ہے۔"

میں نے کہا "لاش کہیں بھی مل سکتی تھی یا کہیں نہ ملتی۔ یہ تو بیچ جاتے انسان کو لاش بنانے والوں کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ لاش سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔ شاید وہ سب جن کو عاجز نے عاجز کر رکھا تھا، دنیا میں اس جیسے دوسرے سرپھروں کو بتانا چاہتے ہوں گے کہ دوسروں کا خانہ خراب کرنے والے کا بھی ایک دن خانہ خراب ہوتا ہے۔"

غالب نے سر ہلایا "یا شاید عاجز صاحب کی موت میں ہمارے لیے کوئی وارننگ ہے۔ چوہدری اللہ دو کی طرف سے۔"

ہمارا میزبان ہماری طویل غیر حاضری سے پریشان تھا "بہت پہلے نکل گئے آپ لوگ۔ بہت دیر سے ناشتا لگا ہوا ہے۔ بھوک سے برا حال تھا میرا۔ یہ کیا، اور اخبار خرید لائے تم؟"

"ہاں بس ایسے ہی اخبار والا سامنے آگیا تھا" میں نے کہا۔

"دو اخبار دے کے گیا ہو گا یہاں۔"

میں نے انگریزی اخبار کو پلٹ کر اس کے سامنے کر دیا "یہ دیکھو اکبر خان۔ کل تک یہ شخص بھی زندہ تھا۔"

اس نے اخبار لے لیا "اوہ نو۔ یہ تو وہی ہے جو تمہارے ساتھ آیا تھا۔"

"اسے خلیفہ نے روک لیا تھا" اکبر خان نے سر ہلایا "چلو جلدی سے ناشتا کر لو پھر ہم چلتے ہیں۔"

"کہاں چلتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"خلیفہ کے پاس۔ وہ بتائے گا کہ یہ سب کیا ہے، کیوں مروایا ہے اس نے تمہارے ساتھی اخبار والے کو اور کیا مقصد تھا میرے گھر پر چڑھائی کرنے کا۔ اسے ایک موقع ضرور دوں گا میں کہ وضاحت کرے۔"

"اور وضاحت نہ کر سکا وہ، اس نے وضاحت سے انکار کر دیا یا تم وضاحت سے مطمئن نہ ہوئے پھر؟"

"پھر دیکھیں گے کچھ کریں گے" اس نے مسکرانے کی کوشش کی "چلو ابھی تو ناشتا کرو۔"

میں نے کہا "اس خبر نے میری بھوک ختم کر دی ہے۔"

"اتنا جذباتی اور حساس نہیں ہونا چاہیے آدمی کو۔ فکر کرنے سے الٹی صحت خراب ہوتی ہے۔ آدمی کھانا پینا بھی چھوڑ دے تو کسی اور کا نہیں اپنا نقصان کرتا ہے۔ پیٹ خالی ہو تو دماغ بھی ٹھیک کام نہیں کرتا۔"

ہم اس کے اصرار سے مجبور ہو گئے۔ ناشتا کرتے ہوئے میں نے کہا "ہم ادھر ادھر کے معاملات میں ملوث نہیں ہو سکتے۔"

"تمہاری وہ سختی سے تاکید کر گئی تھیں" غالب نے کسی زن مرید کی طرح منمنا کے کہا۔

"کیا کہہ گئی تھیں؟" اکبر خان مسکرانے لگا۔

"یہی۔۔۔ کہ کسی سے پنگا مت لینا۔"

میں نے کہا "پہلے تم اچانک پہنچ گئے تھے ورنہ وہ ہمارے ساتھ نہ جانے کیا کرتا۔ اب وہ پوری طرح منتظر ہوگا، پوری تیاری کے ساتھ۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح اپنی حفاظت کا بندوبست کیے بغیر ہمارا خلیفہ کے ہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔"

"میں کسی حفاظتی انتظامات کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔ اور ایسے تو خلیفہ کے خلاف کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مریدوں کا اور عقیدت مندوں کا اژدہام ہو گا اس وقت۔ ہم صرف بات کر سکتے ہیں۔ اس کا ردعمل دیکھنے کے بعد سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہیے۔ صرف جانا اور آنا ہے۔ دوپہر کا کھانا ہم واپس آ کے کھائیں گے۔"

"ہم تین ہوں گے اور وہ خلیفہ کے مجرم اور۔۔۔"

"اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے۔ وہ سامنے نہیں آئیں گے اور ساتھ بھی نہیں جائیں گے" اکبر خان بولا "انہیں روانہ کر دیا ہے میں نے۔ وہ اندر باہر راستے میں اور واپسی پر ہماری حفاظت کے ذمے دار ہیں۔ وہ ہم سے پہلے وہاں پہنچ کے عقیدت مندوں کے ہجوم میں شامل ہو جائیں گے۔"

اکبر خان کی بات نے مجھے مطمئن کر دیا۔ رابعہ اور نازو کی تشویش غلط نہیں تھی کہ ہم بعد میں کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے لیکن

www.paksociety.com

عاجز صاحب کے قتل کی خبر پڑھ کے میں بھی خلیفہ کیگر سے ملنا چاہتا تھا اور اس پر واضح کرنا چاہتا تھا کہ رابعہ کے اغوا کی کوشش کوئی قابل معافی جرم نہیں تھا اور عاجز صاحب کی موت کے بعد اس کے خلاف ایک اور سنگین الزام ہے۔ وہ اپنی بے گناہی ثابت کرے ورنہ سزا کے لیے تیار رہے۔ ایسی دھمکی ہم مناسب حفاظتی انتظامات کے بغیر نہیں دے سکتے تھے اور میری خواہش تھی کہ میں اس کو کسی بلند مرتبہ' واجب الاحترام روحانی شخصیت کے مقام سے نیچے ایک اخلاقی و قانونی مجرم کی سطح پر لا کے ذلیل کروں۔

جب ہم اکبر خان کی بیاہ کیڈلاک میں روانہ ہوئے تو اکبر خان نے مجھے اشاروں سے بہت کچھ سمجھا دیا۔ اس کی کوٹھی کے سامنے سے گزرنے والی سڑک کے اگلے موڑ پر ایک سفید فاکس ویگن کھڑی تھی۔ پچھلے موڑ پر ایک جیپ تھی۔ ہماری گاڑی کے گیٹ سے نکلتے ہی فاکس ویگن بھی چل پڑی اور جیپ بھی حرکت میں آگئی۔

گاڑی کی اگلی سیٹ پر اکبر خان کا باڈی گارڈ خطرناک قسم کی خودکار مشین گن کے ساتھ مستعد بیٹھا تھا۔ اکبر خان نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس ممنوعہ بور کے اسلحے کا لائسنس ہے جو اسے خصوصی طور پر گورنر کے حکم پر جاری کیا گیا تھا۔

دونوں قیدیوں کو منہ بند کرکے اور ہاتھ پاؤں باندھ کے لمبی چوڑی گاڑی کی ڈکی میں ڈال دیا گیا تھا۔ پچھلی سیٹ پر میں اور غالب بھی مسلح تھے۔ اسلام آباد سے حسن ابدال اور کیمبل پور تک میں نے کئی بار دیکھا تو سفید فاکس ویگن مجھے آگے اور جیپ پیچھے نظر آتی رہی۔ اٹک کا پل پار کرنے کے بعد میں نے انہیں نہیں دیکھا مگر اکبر خان نے مجھے یقین دلایا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی ہیں۔ اٹک کا پل پار کرتے ہوئے مجھے صرف فاکس ویگن کی ایک جھلک نظر آئی لیکن ہم جب کیگر شاہ کی خانقاہ پر پہنچے تو نہ ہمارے آگے کوئی گاڑی تھی اور نہ پیچھے۔

اکبر خان کی حیثیت وہاں ایک وی آئی پی کی تھی۔ گزشتہ روز کی طرح بیرونی دروازوں پر سادہ لوح عقیدت مندوں کو لوٹنے والے دیگ لیے بیٹھے تھے اور خلیفہ کی روحانیت کا خراج وصول کر رہے تھے۔ مجھے اور غالب کو انہوں نے چونک کے ناگواری سے دیکھا اور ایک دوسرے سے نظروں ہی نظروں میں سوال کیا کہ یہ دونوں وہی نہیں ہیں جو ہمارے بڑے بڑے کیگر گرا کے کل بھی صاف نکل گئے تھے۔ ان کی اتنی جرأت کہ پھر یہاں آگئے۔

لیکن ہم اکبر خان کے ساتھ تھے اور ان سب کو معلوم تھا کہ اکبر خان کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ میں نے صحن سے گزرتے ہوئے اس انبوہ پر نظر کی جو اپنی اپنی حسرتوں اور محرومیوں کی تصویر بنے منتظر تھے کہ خلیفہ کیگر ان کا نذرانہ قبول کرے اور خصوصی نظر کرم سے ان کی تقدیر کی ساری خرابی پلک جھپکتے میں دور ہو جائے۔ یہ ضعیف الاعتقادی صدیوں کا اثاثہ تھی جس نے بالآخر بے حسی کی صورت اختیار کر لی تھی اور ان کا انداز … منفی رویوں کے تضادات کا مجموعہ بن کے رہ گیا تھا۔ … کاتب تقدیر کو قادر مطلق مانتے تھے' تسلیم کرتے تھے کہ یہ ازلی ہے اور زندگی اور موت کی طرح کامیابی اور ناکامی' خوشی اور صدمے لحد تک عمر کے ہر لمحے کو کسی کام کے لیے لکھا جا چکا ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی سمجھتے تھے کہ ایک شعبدہ باز اور بزعم خود پہنچے ہوئے پیر کے اختیار میں ہے کہ … کے نوشتہ تقدیر میں اس کی خواہش کے مطابق ترمیم کر … رنج تھا وہاں خوشی لکھ دے' جہاں بیٹی تھی وہاں بیٹا لکھ دے' جہاں موت تھی وہاں زندگی لکھ دے۔ وہ اس بات پر غور بھی نہیں کرتے تھے کہ دنیا و عقبیٰ میں جو کچھ ہے' … کا ہے' کسی کی سفارش کا نہیں۔ اکبر خان کی گاڑی … ایسی جگہ پر کھڑی تھی جہاں صرف بڑے لوگ ہی اندر تک شاہانہ سواریاں لا سکتے تھے۔ اس کا باڈی گارڈ گن لیے گاڑی کے قریب موجود رہا۔ وہ نہ ہوتا تب بھی کوئی ڈکی کے قریب پھٹکنے کی جرأت نہ کرتا۔

لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے میں نے … ایک طرف مردوں کو اکڑوں بیٹھے دیکھا۔ ان میں بچے بوڑھے جوان سب ہی شامل تھے۔ ان کے میلے کپڑے' میلے … کے تیل سے مسخ چہرے' تلخی ایام اور ذہنی و جسمانی … تصویر تھے۔ مفلسی کا عذاب ایک ایسا مشترک تھا جو … ارادوں اور حوصلوں کو شکست دے چکا تھا اور غالباً ان سب کی خواہشوں اور خوابوں کی تعبیر ایک ہی دعا کا مستجاب ہونا تھا … مدفون خزانے کا سراغ' کوئی چھپن کھدڑی … کم پر … بانڈ کا انعام' کوئی پارس پتھر کہ جسے وہ چھوئیں سونا بن جائے … پٹواری کی نوکری مل جائے۔ باقی … اصوات سے … یہ چاہتے تھے کہ ان کے دشمن سب نیست و نابود ہو جائیں۔

عورتیں دوسری طرف بالکل اسی انداز میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ غالباً یہ اس بارگاہ عالی میں حضوری کے آداب تھے کہ کوئی … لے کر اندر نہیں آ سکتا تھا۔ آلتی پالتی مار کے بے فکری سے … منع تھا۔ ایسی بے فکری ہے میاں تو یہاں کیوں آئے ہو' … کھل کے ہنسنا مسکرانا ممنوع تھا۔ بدبختو۔ اب بھی اپنی تقدیر پر … کے بجائے ہنستے ہو۔ سائل بن کے بیٹھو' محتاج نظر آؤ۔ باادب باملاحظہ' ہوشیار رہو۔ نگاہ نیچے' سر گھٹنوں میں۔

اس طرح بیٹھنا ان عورتوں کے لیے خاص طور پر مشکل تھا … آخری ایام میں یہ عرض تمنا کرنے آئی تھیں کہ پیر صاحب اپنی نظر کرم سے تولد ہونے والے کی جنس بدل ڈالیں۔ … ایسا نہ ہوگا۔ جب تک ان کا مجازی خدا ناک چوٹی کاٹ کے گھر سے نہیں نکال دے گا کہ حرام زادی' جنے جا رہی ہے بیٹیاں' جو ساتھ لاتی ہیں جہیز کی فہرست۔ کل کھیتوں میں کام تیرا باپ کرے …

… ٹوٹے جائیں گے بڑھاپے۔ جن کے بیٹے ہیں … کیسے روشن … بال بھیج رہے ہیں … اور مجھے دینے سے … عورت اپنی مرضی سے بیٹا جننے کا اختیار … بہت ہوا ہوتا ہے۔ … اسے یقین ہے کہ آنے والی سوکن یہ کام اپنی مرضی سے کر سکتی ہوگی جبھی تو گھر والا اس کے چکر میں ہے۔ خدائی انتظام … خدا رحم … خدائی … سب ہے۔

چنانچہ حضرت علیؓ نے کہا کہ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا۔

ہماری آمد کی اطلاع یقیناً اندر پہنچ گئی تھی لیکن خلاف توقع حجرۂ خاص کا دروازہ کھول کے کوئی ہمارے استقبال کے لیے نہیں آیا۔ وہاں کھڑے ہوئے کیگر نے ایک شان استغنا سے کہا "حضوری میں حوائج خاص حائل ہیں۔"

میں مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ اکبر خان مجھے دیکھ کر مسکرایا "ہم کچھ دیر انتظار کر سکتے ہیں۔"

بے علم مریدوں اور عقیدت مندوں کے لیے اس بھاری بھرکم جملے کے مفہوم کی پُراسراریت کو سمجھنا مشکل تھا جو ان کی عقل کو چکرا دینے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ سیدھی بات یہ تھی کہ وہ طعام فرما رہے ہیں یا باتھ روم میں ہیں' شغل جام و مینا میں مصروف ہیں یا بیوی کی خلوت میں۔ گوشت پوست کے بنے ہوئے' دانۂ گندم کھانے والے گنہگار ابن آدم کی حاجات میں تخصیص کیا؟ مگر سادہ دل' سادہ لوح اور سادہ فلسفۂ حیات رکھنے والوں کے نزدیک شاید اس مرصع جملے کا مفہوم کچھ اور تھا جو ان کی سمجھ میں خود نہیں آ سکتا تھا۔ چنانچہ انہیں سمجھایا گیا تھا کہ ان پر الہامی کیفیت طاری ہے' ساعت کشف ہے۔ وہ عالم ارواح میں ہیں۔ شاہ جنات کے ساتھ مجاہدے میں مصروف ہیں یا (نعوذ باللہ) پیام بر فرشتوں سے ہمکلام ہیں۔ اصل بات اس وقت یہ تھی کہ ہماری آمد نے خلیفہ کو ہنگامی صورت حال سے دوچار کر دیا تھا اور وہ اپنے خاص خاص کیگروں کو الرٹ کر رہا تھا۔

میں نے ایک نظر مردوں' عورتوں کے ہجوم پر ڈالی "کیا یہ سارا دن ایسے ہی اکڑوں بیٹھے رہیں گے؟ مٹی دھول میں اور دھوپ میں؟"

کیگر نے مجھے گھور کے کہا "اور کیا ایرانی قالین بچھوائے جائیں ان کے لیے جس پر یہ استراحت فرمائیں؟ یا صوفے لگوائے جائیں؟"

"خاصا مشکل کام ہے یوں انتظار کرنا۔" غالب بولا۔

"حاجت مند کو عرض دعا کے لیے نفس کی آزمائش کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ حاجت روا خود اس کے پاس چل کے نہیں جاتا۔" وہ بولا۔

"اچھا جملہ ہے۔" میں نے کہا "میری لغت میں حاجت روا صرف خدا کی ذات ہو سکتی ہے۔ تم شاید یہ کہہ رہے ہو کہ خلیفہ کیگر تو ان کے گھر جانے سے رہے۔ حضرت عمرؓ تو رات کو گندم کی بوری ڈھو کے ایک بیوہ کے گھر لے گئے تھے جس کے بچے بھوکے تھے۔ وہ خلیفہ تھے مگر رعایا سے خود کو کمتر سمجھتے تھے۔"

اکبر خان نے ناگواری سے مجھے دیکھا "اس سے بحث مت کرو۔"

میں نے کہا "بحث کہاں' میں تاریخ کا ایک حوالہ دے رہا تھا۔"

"یہ تاریخ ہی نہیں سمجھتا" کیگر نے غرا کے کہا۔

"یعنی یہ بھی نہیں جانتے کہ آج کیا تاریخ ہے؟" میں نے افسوس سے سر ہلا کے کہا "خیر یہ تو بتا سکتے ہو کہ ان عورتوں مردوں کو الگ الگ بٹھانے میں کیا مصلحت ہے؟"

"یہ مصلحت کی بات نہیں' شرع کا حکم ہے۔ عورت اور غیر مرد کا اختلاط جائز نہیں ہے۔"

غالب نے کہا "یہ سب تو بے پردہ ہیں۔ اور دیہات میں مرد عورت کھیتوں میں مل کے کام کرتے ہیں۔ عورتیں برقع پہن کے تو نہیں پھرتیں۔"

"تم کو فضول باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے" اکبر خان نے مجھے جھڑکا۔

غالب نے اس کو نظرانداز کر دیا "یہ عورتیں اکیلی تو نہیں آئی ہوں گی۔ باپ یا شوہر۔ کوئی مرد تو آیا ہوگا ان کے ساتھ۔ کیا ان کا اندر ایک ساتھ جانا بھی خلاف شرع ہے؟"

"اندر صرف ایک جا سکتا ہے۔ حقیقی حاجت مند۔ دل کی بات تخلیے میں ہی ہوتی ہے۔ تم میں سے بھی ایک جائے گا۔"

میں نے تعریفی انداز میں سر ہلایا "سبحان اللہ۔ تحلیل نفسی کا بھی یہی اصول ہے۔ سائیکاٹرسٹ۔"

اکبر خان کی برہم نظروں کی تو مجھے پروا نہیں تھی مگر میری نظر نے اچانک ہجوم نامراداں کے پیچھے ایک ننھا سا چہرہ دیکھ لیا۔ وہ صرف ایک لمحے کے لیے مجھے اندر نظر آیا "یہ یہاں..." میں نے بے اختیار کہا۔

"کون؟" اکبر خان گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی غالب نے پلٹ کے دیکھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں اکبر خان کو اخبار فروش لڑکے کی صورت دکھاتا' حوائج خاص کا وقفہ ختم ہو گیا اور دروازہ کھولنے والے نے اکبر خان سے کہا "آؤ جناب! خلیفہ صاحب آپ کے منتظر ہیں۔"

ایک بار پھر ہم باری کے اصول سے مستثنیٰ قرار دیے گئے تھے' یعنی پہلے سے بیٹھے ہوئے امیدواروں نے جذبات و تاثرات سے بھی احتجاج نہیں کیا تھا۔ ایسا ہوتا رہتا تھا اور وہ اس کے عادی تھے۔ وہ دور صرف فخر کرنے کے لیے رہ گیا تھا جب عام آدمی' خلیفہ وقت کا دامن سرعام تھام سکتا تھا۔ یہ خلیفہ کیگر کا زمانہ تھا۔ اب تو

www.paksociety.com

اس وقت کی زبوں حالی پر رونے والا کوئی حالی یا اقبال بھی پیدا ہو جاتا تو نقار خانے میں طوطی کی طرح اس کی صدا کوئی نہ سنتا۔ اجازت نہ ملنے کے باعث غالب کو باہر ہی رکنا پڑ گیا۔

خلیفہ نیگر نے خالص تجاہلِ عارفانہ کا مظاہرہ کیا "تو بھائی اکبر خان! خیریت تو ہے نا؟"

اکبر خان اس کے سامنے ڈٹ گیا "نہیں۔ خیریت نہیں ہے۔"

خلیفہ نے مجھے بادلِ ناخواستہ بیٹھنے کو کہا "اس کو پھر ہماری نظروں کے سامنے نہ لاتے تو اچھا تھا۔"

کسی تمہید کے بغیر اکبر خان نے کہا "یہ ایک شکایت لے کر آیا ہے تمہارے پاس۔ میں ساتھ نہ آتا تو اسے کون آنے دیتا تمہارے پاس؟"

"ہم سے شکایت ہے!" خلیفہ نے بے حد تعجب کا اظہار کیا۔

میں نے کہا "بندے کو خدا سے بھی شکایت ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال کا شکوہ..."

اکبر خان نے کہا "بس اپنی بات کرو۔ زیادہ پڑھے لکھے ہونے کا یہی تو نقصان ہے کہ آدمی ہر جگہ کتابی باتیں کرنے لگتا ہے۔"

میں نے کہا "خلیفہ صاحب! آپ کے نیگر میری بیوی کو اٹھا لائے ہیں۔"

اکبر خان میری غلط بیانی پر چونکا مگر نہ جانے کیا سوچ کے خاموش ہو گیا۔

"کیا بکتا ہے بدبخت' بدزبان' ہم پر ایسا بے ہودہ الزام۔"

میں نے کہا "ابھی سے گالیاں مت دیں۔ الزام آپ پر نہیں لگایا میں نے۔ آپ کے مرید تھے وہ۔ چھ نیگر تھے جو اکبر خان کے گھر میں پرسوں رات کو داخل ہوئے۔ وہ مسلح تھے اور نقاب پوش تھے۔ انہوں نے کلوروفارم سنگھا کے تمام نوکروں کو بے ہوش کیا۔"

اکبر خان بولا "میں رات گھر پر نہیں تھا۔ میرا چوکیدار بھی غائب ہے۔"

"بھئی ایسی وارداتوں سے میرا کیا تعلق؟" خلیفہ نے پھر اپنا نرم' غیر جذباتی لہجہ اختیار کر لیا "بدمعاشی بہت بڑھ گئی ہے ملک میں۔"

میں نے کہا "پوری بات سُن لو میری۔ وہ کسی گاڑی میں آئے تھے۔ اس کا کیا نمبر تھا اور کیا حلیہ' سب معلوم ہے مجھے۔ گھر کے نوکر بھی انہیں پہچان لیں گے اگر وہ سامنے آئے۔"

"وہ سامنے کہاں آئیں گے؟" خلیفہ نے کہا۔

"ان میں سے چار نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے" میں نے کہا "اور وہ رابعہ کو بھی بے ہوش کر کے اٹھا لے گئے۔ اسی گاڑی میں مگر دو پکڑے بھی گئے تھے۔ وہ سب کے سامنے لائے جا سکتے ہیں۔"

"تمہارے سامنے بھی" اکبر خان بولا۔

"وہ نیگر نہیں ہو سکتے اکبر خان" خلیفہ نے جلالی لہجے میں کہا "تم جانتے ہو ہمارے مرید کون ہوتے ہیں۔"

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں" اکبر خان نے تحقیر سے کہا "اسی لیے تو سکندر بخت کو یہاں لایا ہوں ورنہ وہیں اس کا ... کے کہتا کہ تم بکواس کرتے ہو' خلیفہ نیگر کے مرید تو فرشتے ہیں۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟" خلیفہ نے دہاڑ کے کہا۔ اس کا چہرہ غیظ و غضب میں لال چقندر تھا۔

"ثبوت یہاں دیکھو گے یا... تھانے میں؟" اکبر خان بولا۔

"تھانہ۔ تھانے کا نام لیتا ہے ہمارے سامنے... بدبخت۔ ہم مزہ چکھائیں گے تجھے اس گستاخی کا۔"

اکبر خان نے سکون سے کہا "خلیفہ! شور مچانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ میں اکیلا نہیں آیا ہوں۔"

"پھر کیا لشکر لایا ہے؟ چڑھائی کی ہے پیر نیگر شاہ کے ... القدس پر۔ توپ خانہ اور ٹینک ہیں تیرے ساتھ؟"

اس کے چلانے کی آواز سن کے ایک ساتھ بہت سے ... اندر آ گئے تھے۔ ان سب کی نگاہوں میں خون اترا ہوا تھا ... کے ہاتھ گھیردار شلواروں سے اسلحہ نکالنے کے لیے بے قرار تھے۔

اکبر خان نے انہیں بے نیازی سے دیکھا "خلیفہ! اچھا ہے اگر بات آپس میں طے ہو جائے اور جنگ و جدال کی نوبت نہ آئے ورنہ واقعی میرا لشکر توپ خانے اور ٹینک کے ساتھ آ جائے گا۔"

میں نے اطمینان سے ریوالور نکالا اور کہا "اگر تم نہیں چاہتے کہ کل تمہاری جگہ نیگر چہارم کی دستار بندی ہو اور ... ساتھ تمہارا بھی سوئم ہو تو اپنے لشکر کو حکم دو کہ پیچھے ہٹ جائے۔ تمہاری پیری فقیری کے اس کاروبار پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اب معاملہ ہے میری عزت اور غیرت کا۔ میں رابعہ کو واپس لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ تم وہ چاروں مجرم بھی میرے حوالے کرو گے جو اسے اغوا کر کے لائے تھے۔ پھر یہ معاملہ پولیس کے پاس ... میں نہیں جائے گا۔ انہیں میں خود سزا دے سکتا ہوں۔"

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے کینہ پرور نظروں سے گھورتا رہا "تو یہ بات ہے۔ اکبر خان' تمہارے کہنے پر ہم نے اسے بخش دیا تھا۔"

"آدمی سے غلطی ہو جاتی ہے۔ ایک بھول کے بدلے تمام عمر کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا پڑ جاتا ہے" میں نے کہا "اچھی طرح سمجھ لو کہ اس حجرے سے صرف ایک لاش باہر جائے گی۔ میری اور تمہاری لاشیں ایک ساتھ اٹھائی جائیں گی۔ تمہارے نیگر مجھے چھلنی کر دیں پھر بھی مرتے مرتے میں تمہارے ... میں دو چار گولیاں اتار دوں گا۔"

اس نے ہاتھ کے اشارے سے اندر آ جانے والوں کو واپس کر دیا "جاؤ' اس بدبخت کو اس کی شامت یہاں لائی ہے۔ ... ہم نمٹ لیں گے۔"

میں نے کہا "تمہاری یہ خوش فہمی بھی دور ہو جانی چاہیے کہ ہم اس حجرے سے نکلنے کے بعد اس احاطے میں محصور ہو جائیں گے۔ تم ایک خونی جنگ کے متحمل نہیں ہو سکتے خلیفہ۔ بہت سے بے گناہ بھی مارے جائیں گے اس میں اور تمہارا جدی پشتی کاروبار ختم ہو جائے گا۔ تم اتنے بڑے پیر نہیں ہو کہ اپنی روحانی طاقت سے قانون کے لمبے ہاتھوں کو روک سکو۔ جو زندہ بچے وہ حوالات میں بند ہو جائیں گے اور پھر پولیس ان سے سب اگلوا لے گی کہ یہاں مریدی کی آڑ میں یہاں کیا ہوتا آیا تھا۔ یہ کہانی سب اخبارات میں چھپے گی اور جب تمہارے نیگر عدالت سے ملنے والی سزا کاٹ رہے ہوں گے تو یہ خانقاہ محکمہ اوقاف اپنی تحویل میں لے چکا ہو گا۔"

"یہ بہت بڑھ چڑھ کے بول رہا ہے اکبر خان' اسے بتاؤ۔"

میں نے کہا "مجھے کچھ جاننے کی خواہش نہیں۔ رابعہ کہاں ہے اور وہ چاروں مجرم کہاں ہیں جو اسے اغوا کر کے لائے تھے تمہارے حکم پر؟"

"میں نے کسی کو ایسا شیطانی کام کرنے کا حکم نہیں دیا۔"

"جھوٹ بکتے ہو تم۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں ایک شیطانی شرارتی چمک دیکھی تھی خلیفہ' جب رابعہ تمہارے سامنے آئی تھی۔"

"اگر کسی نے میرا نام لے کر ایسی حرکت کی ہے تو میں خود اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" خلیفہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "لیکن تم کو ثابت کرنا ہو گا کہ وہ میرے مرید تھے۔"

اکبر خان نے کہا "دو قیدی میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ وہ خود تمہارے سامنے اعترافِ جرم کریں گے۔"

"کہاں ہیں وہ؟" خلیفہ نیگر نے کہا۔

"میری گاڑی میں۔ گاڑی کی ڈکی میں۔"

خلیفہ نے تالی بجائی۔ ایک نیگر پردے کے پیچھے سے نکل آیا جس کی موجودگی سے میں قطعی بے خبر تھا۔ خلیفہ میری حیرانی پر مسکرایا "ہم کبھی اکیلے نہیں ہوتے۔ یہ ہمارا نائب ہے۔"

"خلیفہ نیگر چہارم" میں نے کہا "یہ بیٹا ہے تمہارا؟"

"ہاں۔ میں جانشین ہوں اس گدی کا اور محافظ بھی۔" اس نے رواں انگریزی میں کہا "تم خوش قسمت ہو کہ ابھی تک مجھے اشارہ نہیں ملا تھا اس لیے زندہ ہو۔"

"میں یہاں مرنے کے لیے ہی آیا ہوں" میں نے کہا "میرے مرنے سے کوئی خاندانی گدی خالی نہیں ہو گی۔"

خلیفہ نیگر بولا "ہمارے اور تمہارے معاملات آج ختم ہو گئے اکبر خان۔"

"میں بھی یہی چاہتا تھا" اکبر خان بولا "آپ اپنے جانشین سے کہیں کہ سکندر کے ساتھ جائے اور قیدیوں کو یہاں لے آئے۔"

"یہ کام کوئی بھی کر سکتا ہے" جانشین نے کہا۔

"نیگروں کی اگلی نسل کانونٹ کی تعلیم یافتہ ہو گی" میں نے طنز سے کہا "اور کیوں نہ ہو' اس سے زیادہ منافع بخش کاروبار کیا ہو گا۔"

"میرا باڈی گارڈ شاید کسی کو گاڑی کے قریب نہ جانے دے' اس کے لیے میرا یا سکندر کا ساتھ جانا ضروری ہو گا۔" اکبر خان بولا۔

خلیفہ نیگر نے کہا "ٹھیک ہے۔ یہ جائے گا مگر اسلحہ لے کر کوئی نہیں جائے گا۔ اس معاملے کا فیصلہ ہونے تک کوئی کچھ نہیں کرے گا۔"

میں نے کہا "اپنے ولی عہد کو یہ سمجھا دو کہ اسلحہ میری طاقت نہیں ہے۔ باہر اس نے کسی جاں نثار کو اشارہ بھی کیا تو میں ایک ہاتھ مار کے اس کی گردن توڑ دوں گا۔ اس کی گردن تو خاصی نازک ہے۔ مظاہرے کے لیے میں تمہاری گردن۔ اچھا چھوڑو۔ یہ دیکھو۔"

میں نے خلیفہ کے سامنے رکھی ہوئی اسٹول جیسی میز پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ میز درمیان سے دو ٹکڑے ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے خلیفہ اور اس کا جانشین پلک جھپکنا بھول گئے۔

میں کھڑا ہو گیا "او مسٹر تو ولی عہد بہادر۔ مردوں کی طرح ہاتھ ملاؤ مجھ سے۔ ڈرو نہیں' تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ ہم اپنا اپنا اسلحہ جیب میں ڈال کر رکھیں گے۔ واپس آنے تک۔"

وہ میری باتوں میں آ گیا۔ میرے ساتھ ہی اس نے بھی ریوالور جیب میں ڈالا اور مجھ سے ہاتھ ملا کے بولا "اگر تم یہ سمجھتے ہو..."

میں نے اسے جملہ مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ بڑی مہارت اور نزاکت کے ساتھ میں نے اسے اپنی طرف کھینچ کے اٹھایا اور ہوا میں گھما کے پھر پیروں پر کھڑا کر دیا۔ شاید اس کی سمجھ میں بھی نہ آیا ہو گا کہ چند سیکنڈ میں کیا ہوا تھا۔ زمین اس کے پیروں سے نکل گئی تھی یا چھت ٹانگوں میں سے گزر گئی تھی۔ اس نے بدحواسی پر قابو پانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے پھر اسے ایک کرتب دکھایا اور اس بار اپنے سر کے اوپر سے گزارا اور پھر ایک دم پلٹ کے سنبھال لیا۔ دو بار الٹا اور جیسے بازی گر چھڑی کو گھماتا ہے' میں نے اسے گھما کے خلیفہ کے سامنے چھوڑ دیا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟" خلیفہ نے برہمی سے کہا۔

میں نے کہا "دیکھ لو اگر اسے کہیں خراش بھی آئی ہو۔ تم چاہتے ہو کہ یہ اسی طرح خیر و عافیت واپس آئے تو اسے نصیحت کر دو کہ اچھے بچوں کی طرح رہے۔ باہر کسی کو معلوم نہ ہو کہ ہمارے درمیان کسی مسئلے پر اختلافِ رائے ہے۔"

میں اور خلیفہ کا جانشین ایک ساتھ باہر نکلے' انتظار کا عذاب جھیلنے والوں کے درمیان سے گزرے اور سیاہ کیڈلاک تک گئے۔ اس دوران میری نظروں نے اسی اخبار فروش لڑکے کو ہر طرف تلاش کیا جو ہمیں یہاں تک لایا تھا اور جسے غالب اپنے اخبار کا رپورٹر بنانا چاہتا

www.paksociety.com

تھا۔ میں اس کی یہاں موجودگی کو محض اتفاق نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ کسی مقصد کے تحت ہی ہمارے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ کیا وہ بھی اکبر خان کی محافظ فوج کا رکن تھا؟ میں نے سوچا۔ لیکن صبح ہی اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ جیسا آدمی اکبر خان کا مہمان کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر کیا وہ اکبر خان کے تعاقب میں تھا یا میرا پیچھا کر رہا تھا؟ بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا یہاں نظر آنا اتفاق ہی تھا۔ شاید وہ کسی کے ساتھ آیا تھا اور اب جا چکا تھا۔

اکبر خان کا رکن میں بہت مستعد کھڑا تھا۔ میرے کہنے پر اس نے ڈگی کا لاک کھولا اور باری باری دونوں قیدیوں کو نکال کے باہر کھڑا کر دیا۔ جب وہ ان کے ہاتھ کھول رہا تھا تو میں نے خلیفہ کے دلی عہد سے کہا "ان کو سمجھا دو کہ شور نہ کریں' خواہ مخواہ تماشا بنے گا۔"

اس نے سر ہلایا "من لی ہے نا پوری بات؟" وہ قیدیوں سے مخاطب ہوا جو اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کار کی ڈگی میں دست و پابستہ لیٹے رہنے سے ان کے ہاتھ پاؤں اکڑ گئے تھے اور انہیں حرکت کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ عقیدت مندوں کا مجمع حیرت سے آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہا تھا مگر کسی میں سوال کرنے کی جرأت نہ تھی۔ قیدیوں کو واپس اٹھتے ہوئے میری نظر نے باہر کا جائزہ لیا۔ سفید فاکس ویگن موجود تھی لیکن جیپ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ان لوگوں کی صورت نہیں دیکھی تھی جو فاکس ویگن میں سوار تھے۔ شاید وہ بھی انہی لوگوں میں شامل ہو گئے تھے جو خلیفہ کیکر کے حضور شرف باریابی کے منتظر بیٹھے تھے۔ غالب بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

خواتین کے مجمع میں بھی اکثریت دیہاتی عورتوں کی تھی جو گندے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ جوان عورتوں نے چھینٹ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھیں مگر کسی کی جوانی میں مجھے شباب کی وہ رعنائی اور دلکشی نظر نہ آئی جو دوبارہ دعوت نظارہ دے۔ ایک جوان لڑکی ہسٹریا کے دورے میں سر ادھر سے ادھر مار رہی تھی۔ اس کو سنبھالنے والی بوڑھی عورت رو رہی تھی اور آس پاس کی ہمدرد عورتوں کو سمجھا رہی تھی کہ اس کی بچی پر بڑا "وڈا جن" آیا ہوا ہے کیونکہ یہ کیکر کے نیچے کھلے بال سکھانے کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے ایک آہ بھری۔ شاید آج رات خلیفہ کیکر اس جن سے لڑکی کا پیچھا چھڑا دے۔ وہ خوب صورت تو نہیں تھی مگر اس کا بدن بہت گدرایا ہوا تھا۔

غربت زدہ غریب عورتوں کے اس ہجوم میں دو سفید برقعہ پوش عورتیں بھی تھیں جو خلاف معمول بات نہیں تھی۔ ابھی اس علاقے میں متمول گھرانوں کی یا تعلیم یافتہ مڈل کلاس کی عورتوں نے پردے کا فیشن نہیں شروع کیا تھا بلکہ اسے ضرورت سمجھ کے اختیار کیا تھا چنانچہ رنگ برنگے' ہر ڈیزائن اور کٹ کے سیاہ یا میرون کلر کے "ریشمی ساٹن اور لیڈی ہمکنن کے برقعوں نے رواج نہیں پایا!

تھا۔ عورتوں کے مجمع عام میں دو جدید ترین وضع کے برقعے [illegible] میں تھوڑا سا حیران ہوا۔

ہم مجرم کیکروں کو لے کر روانہ ہوئے تو میں نے ایک [illegible] کے جانشین پر رکھی اور دوسری سے باہر کا جائزہ لیتا رہا۔ [illegible] بسوں کی قطار کے پاس بہت سی ریڑھیاں کھڑی تھیں۔ مستقل دکانیں بھی تھیں جہاں مزار پر حاضر ہونے والوں کی ضرورت کا سب غیر ضروری سامان بھی ملتا تھا۔ الغرض [illegible] کے طفیل بہت سے لوگوں کے لیے رزق کے وسیلے پیدا [illegible] جو ہار پھول' دم کرانے والوں کے لیے بوتلوں میں پانی یا [illegible] لیے تیل' نقش والی مٹی کے برتن اور کیکر کی چھال سے [illegible] ہر چیز کو متبرک بنا کے بیچ رہے تھے۔

انہی کے ساتھ میلے ٹھیلوں میں کھانے پینے کی [illegible] تھیں۔ بے افراط مرچوں والے آلو چھولے اور بارہ مسالہ چاٹ جس کو کھا کے ہم جیسے نازک مزاج شہریوں کے کانوں سے سیٹیاں بجنے لگتی ہیں اور بیک وقت ناک اور آنکھ سے [illegible] خارج ہوتی ہے۔ دیسی شکر کا شربت مع حکیموں کے نسخہ [illegible] کے اور تنگ سائز جلیب جو شہری بچیوں کا ذکر کیا [illegible] اور گنج میں مجھ جیسے لوگ اس کا پچاس فیصد کھا کے "سیر" تھے مگر کھانے والے تو جیسے مقابلے پر آمادہ تھے۔ [illegible]

دس سال کے ایک نور چشم کو اس کے والد ماجد نے جھانسا [illegible] کر کے فرمایا "کھوتے دا پتر' سے ادھ سیر جلیب کھان نئیں [illegible] تے کو لیں ہے۔"

باقی بات میں نے نہیں سنی کہ جو آدھا سیر جلیبی نہ کھا [illegible] ماؤنٹ ایورسٹ سر نہیں کر سکتا یا آباؤ اجداد کا نام روشن نہیں کر سکتا۔ کچھ ایسی ہی بات ہو گی۔ میری نظر اچانک [illegible] والے لڑکے پر چلی گئی تھی جو غالب کے ساتھ کٹوری [illegible] گلاس میں خالص دودھ ملائی والی چائے پی رہا تھا۔ اس بار [illegible] اس نے ہاتھ ہلا کے مجھے وش کیا۔ معلوم نہیں وہ کیا کہنا چاہتا [illegible] کس چکر میں وہاں موجود تھا۔

ہم حضرات و خواتین کو شرع کے مطابق جدا کرنے [illegible] راستے پر سے گزر رہے تھے کہ ایک سیاہ برقعے والی عورت نے لجاجت سے کہا "چھوٹے پیر سائیں! ہم بڑی دور سے آئے [illegible]"

میرا دل ایک دم گر کر ابھرا اچھلا اور سینے میں قلابازیاں [illegible] شاید معدے میں اتر گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے [illegible] کنٹرول کیا۔ میری صورت دیکھنے والا یقیناً میری جذباتی کیفیت سے آگاہ ہو جاتا مگر چھوٹے پیر سائیں تو اس چمکیلے نقاب والی [illegible] کے چکر میں پڑ گئے تھے جس کے گورے جوان ہاتھ اس کے [illegible] نظر تھے۔ وہ آواز نازو کی تھی جسے میں ہزاروں آوازوں میں [illegible] پہچان جاتا۔

جانتے بوجھتے اس نے مجھے وہاں اپنی موجودگی کا احساس [illegible]

چھوٹے پیر سائیں سے سوال اس نے کچھ اور کیا تھا لیکن [illegible] تھا۔ [illegible] مجھے پیغام دیا تھا کہ فرصت کرنا' ہم بھی ہیں میدان میں۔ کود میں [illegible] یہ پیغام ہی میرا دماغ خراب کرنے کے لیے کافی تھا۔ تمہارے ساتھ [illegible] کا اثر کم ہوا تو میرے خون میں ابال آنے لگا۔ میں اور جب [illegible] نے دل ہی دل میں اسے وہ گالیاں دیں جو میں اس کے سامنے بھی دے سکتا تھا اگر مجھے موقع ملتا۔

چھوٹے پیر سائیں نے کہا "بی بی! غرض مند کو تو آنا ہی پڑتا ہے' دور کیا اور نزدیک کیا۔"

اب دوسری فیشن ایبل برقعے والی خاتون کھڑی ہو گئی جو رابعہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ "چھوٹے پیر سائیں! آپ کچھ سفارش کر دیں' ہمیں واپس بھی جانا ہے۔"

"کوشش کریں گے۔ آج اتنا رش نہیں ہے لیکن فکر کی بات نہیں۔ یہاں شب بسری کے لیے بھی انتظام ہے۔"

میں نے دانت پیس کے معنی خیز لہجے میں کہا "انتظام کا واقعی جواب نہیں۔ تمہاری باریابی تو خلوت خانہ خاص تک ہو گی۔"

مجھے معلوم تھا' وہ میرے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے پر زیر نقاب مسکرا رہی ہوں گی اور بہت خوش ہوں گی کہ انہوں نے بڑی چالاکی سے ہمارے پروگرام کا اندازہ کرتے ہوئے راستہ بدل دیا اور لاہور جانے کے بجائے وہاں پہنچ کے ہمیں حیران کر دیا جہاں ہمارا پایا جانا ان کے لیے باعث حیرانی نہیں ہوا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ بچا نے لینے کی سخت ہدایت کی ہمارے نزدیک اتنی بھی اہمیت نہیں جتنی سرکاری سرکلر کی جس میں نااہلی اور بدعنوانی کے مرتکب افسران کو سخت تادیبی کارروائی کے نتائج سے آگاہ کیا جاتا ہے یا اس سیاسی بیان کی جس میں اکثر واضح کیا جاتا ہے کہ کسی کو عوام کے جذبات سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

ہم ان کی توقعات پر پورے اترے تھے اور بچا لینے کے عزم مصمم کی راہ میں ان کی سخت تاکید سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ انہوں نے بھی وہی کیا جو ان کو کرنا چاہیے تھا۔ میں نے بعد میں غور کیا تو مجھے ان کا ہمارے پیچھے پیچھے یہاں پہنچ جانا اتنا حیران کن اور اشتعال انگیز نہیں لگا۔ وہ نہ احمق تھیں اور نہ بزدل۔ وہ ہمارے مزاج اور ہماری طبیعت کے تقاضوں سے آشنا تھیں اور عام فہم الفاظ میں ہماری رگ رگ سے واقف تھیں۔ ہم ان سے اپنے خیال کو چھپانے کی کوشش کرتے تو اس میں بھی ناکام رہتے۔ ان کے سامنے ہم نے کیکروں کے ایک حملے کو ناکام بنا دیا ہو' ان کے جاں نثاروں کو جہنم رسید کرنے کی مجاہدانہ کوشش میں وہ ہمارے ساتھ برابر کی شریک رہی ہوں' ہم نے دو طلبان کو تفتیش کے لیے گرفتار کیا ہو تو پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ان کو لاہور روانہ کرنے کے بعد ہم اکبر خان کے آنے کے بعد کچھ نہ کریں۔ بس زیر حراست طالبان کو [illegible] کے حوالے کریں اور خود بھی شرافت سے لاہور کا رخ کریں۔

انہوں نے ہمیں دھوکا دیا تھا۔ وہ مزاحمت کرتیں تو ہم سختی کے ساتھ انہیں اپنی قسم دے کر مجبور کر دیتے کہ وہ خطرے سے دور چلی جائیں۔ جو ان کے لیے ناممکن تھا۔ ان وفا کی پتلیوں نے گوارا نہ کیا کہ ہمارا ساتھ ایسے وقت میں چھوڑ دیں اور باہمی مشورے سے طے کیا کہ کریں گی وہی جو ہمیں کرنا ہے مگر انہیں بتائے بغیر۔ اکبر خان کے گھر سے روانگی کے بعد انہیں کامل آزادی حاصل ہو گئی تھی کہ وہ اپنے پروگرام پر عمل کریں۔ اب وہ برقعے میں منہ چھپائے یہاں موجود تھیں جبکہ ہم انہیں لاہور میں تصور کیے مطمئن بیٹھے تھے۔

واپس جاتے ہوئے میں نے سوچا کہ کیا نازو اور رابعہ کے یہاں پہنچ جانے کی خبر غالب کو بھی ہے یا نہیں۔ ایڈیٹر صاحب' اخبار والے لڑکے یعنی اپنے مستقبل کے کرائم رپورٹر کے ساتھ نہ جانے کیا ڈسکس کر رہے تھے۔ اخبار کی پالیسی "اس کالے کوٹ یا کچھ اور۔ سائیں کیکر شاہ کی خانقاہ پر کسی بھی وقت چھڑ جانے والی جنگ کی حکمت عملی یا حافظ صاحب کی وفات حسرت آیات کے اسباب کی تحقیق اور اسے قتل ثابت کرنے کے امکانات؟

ایک بار پھر ہم خلیفہ کیکر شاہ کے حجرۂ خاص میں پہنچے تو صورت حال سخت کشیدہ تھی۔ میرا ذہن بہت سے انکشافات سے پیدا ہونے والے مسائل میں بھی الجھا ہوا تھا اور میری عدم موجودگی میں اکبر خان کے ساتھ خلیفہ کیکر نے جو خصوصی مذاکرات کیے تھے' وہ ناکام ہو گئے تھے۔ اس کا پتا ان کے چہروں سے چلتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اکبر خان اور خلیفہ کیکر کے درمیان پرانے روابط تھے جو نامعلوم وجوہ کی بنا پر کشیدگی کا شکار تھے۔ عدم اعتماد اور بدنیتی کسی بھی کاروبار میں شریک افراد کی علیحدگی کا سبب بن جاتی ہے۔ اکبر خان کے دھندوں کا بھی میں اندازہ کر سکتا تھا اور پیری فقیری کے پردے میں جاری رہنے والے خلیفہ کیکر کے غیر قانونی کاروبار کا بھی۔ اب شاید اکبر خان کسی پیری کی سرپرستی کا محتاج نہیں رہا تھا اور اسے اندیشہ لاحق تھا کہ خلیفہ کیکر کی حد سے بڑھی ہوئی فرعونیت کا غرور ٹوٹا تو ذلت و رسوائی کے چھینٹے اس کے دامن پر بھی آئیں گے اور خلیفہ کی پیری کا بھانڈا پھوٹا تو خاص حواری کی حیثیت سے اس کی حیثیت بھی متاثر ہو گی۔ اسے ایک بہانے کی ضرورت تھی جو ہم سے تعلق کے بعد خود ہی فراہم ہو گیا تھا۔

میں نے دونوں ملزموں کو آگے دھکیل کر خلیفہ کے قدموں میں گرا دیا "یہ ہیں تمہارے کیکر۔ پوچھ لو ان سے کہ یہ کس کے ساتھ آئے تھے اور کیوں آئے تھے؟"

وہ گرتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور چلانے لگے "یہ کیا ہے' کون ہے یہ آدمی؟ ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

دوسرے نے بھی واویلا کیا "کیا قصور ہے ہمارا اور یہ کیسی بدمعاشی ہے؟"

میں نے کہا "بند کرو اپنی بکواس اور بتاؤ اپنے خلیفہ کیکر کو کہ

www.paksociety.com

تمہارے باقی چار ساتھی کہاں ہیں؟"
"کون سے چار ساتھی؟" پہلے نے چیخ کر کہا۔
"دو سور کے بچے جو رات کی تاریکی میں اغوا کرنے آئے تھے۔ منہ پر کالی نقاب ڈال کے۔" میں نے بھی مشتعل ہو کے کہا "تم جیسے کیکر۔"
اب خلیفہ نے مداخلت کی "سکندر میاں! تمہیں کوئی غلط فہمی ہے۔ یہ کیکر نہیں ہیں۔ میں نے کہا تھا نا کہ ہمارے مرید ایسا نہیں کر سکتے۔"
"یہ غلط ہے۔ انہوں نے تسلیم کیا تھا کہ یہ کیکر ہیں۔ آپس میں بات کرتے ہوئے نہیں' بلکہ میرے پوچھنے پہ۔"
"یہ جھوٹ ہے' الزام ہے ہم پر" ان میں سے ایک نے شور مچایا۔
"ہم اسے نہیں جانتے۔ یہ ہمیں کہاں لایا ہے' کون سی درگاہ شریف ہے یہ" دوسرے نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا "پیر صاحب! آپ سمجھائیے اس مرید کو۔ ہمیں جانے دے۔"
غصے سے میرا برا حال ہو گیا "جھوٹے' مکار! تم نہیں جانتے کہ یہ پکر کیکر شاہ کی خانقاہ ہے۔ یہ خلیفہ کیکر ہیں۔"
خلیفہ کیکر نے کہا "زبردستی منوانا چاہتے ہو ان سے؟ ایسا کرو پولیس کی مدد سے اقبالی بیان حاصل کر لو ورنہ مجھے ان کی بات بھی سننے دو۔"
ان کے جھوٹ پر اکبر خان بھی پریشان ہو گیا تھا "ٹھیک ہے۔ تم بھی سن لو ان کی' یہ کیا کہتے ہیں۔۔۔ پولیس کے حوالے تو ہم انہیں ضرور کریں گے۔"
"کس جرم میں؟ کیا بگاڑا ہے ہم نے تمہارا؟" ایک دہاڑیں مار مار کر رونے لگا "ہم شریف لوگ ہیں' تمہیں جانتے ہی نہیں۔"
دوسرے نے مظلوم لہجہ بنا کے فریاد کی "سرکار! ہم تو مزدور لوگ ہیں۔ صبح کام پر جانے کے لیے نکلے تھے۔ پیچھے سے ان کی گاڑی آئی اور اس آدمی نے ہمیں پکڑ کے مارنا شروع کر دیا۔"
اس نے میری طرف اشارہ کیا تھا۔ اکبر خان مجھے نہ روکتا تو میں اس دیدہ دلیری سے انکار' مجھے مجرم بنانے کی سزا اسے ضرور دیتا۔
"آخر کیوں۔۔۔ ایسی کیا بات ہوئی تھی؟ کوئی پرانی دشمنی تھی تمہاری اس شخص سے یا تم نے کوئی غلط حرکت کی تھی؟"
"مائی باپ! ہم غریب لوگ کیا دشمنی کریں گے کسی سے۔ غلط حرکت اگر سڑک پر چلنا ہے' مزدوری تلاش کرنا ہے یا آپس میں باتیں کرنا ہے تو بے شک ہم نے غلط حرکت کی ہے۔"
"ہم نے تو ان کی گاڑی کا راستہ تک نہیں روک رکھا تھا۔ ہم کنارے پہ چل رہے تھے۔ ہم نے انہیں گھور کے بھی دیکھا ہو تو یہ بتائیں۔ کیا غریب آدمی کا سانس لینا بھی غلط حرکت ہے' جینا بھی غلطی ہے۔۔۔"
"بس اس نے گاڑی روک کے ہمیں بلاوجہ مارنا شروع کر دیا؟" اکبر خان نے گرم ہو کے کہا "آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اتنا بڑا جھوٹ بولتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی۔ ذرا خوف کرو کہ قسم پر یہ بہت نہ کر جائے۔ قسم کھا کے کہہ سکتے ہو کہ تم سچ کہہ رہے ہو؟"
"آپ کہاں اعتبار کریں گے ہماری قسم کا۔ باندھ کے جس طرح مارا ہے جی پیر صاحب۔ اٹھا اٹھا کے پٹخا' کبھی ادھر کبھی ادھر۔"
"اور یہ کسی نے نہیں دیکھا؟" میں نے اسے گالی دی۔
"صبح صبح کون تھا وہاں دیکھنے والا؟ یہ تو پہلوان ہے جی' بس چٹنی کر دے۔ ہم دونوں کی ہڈیاں توڑ دیں اس نے۔ پھر ڈال دیا باندھ کے اور اب نکالا ہے یہاں آپ کے سامنے لا کے۔"
"میرے سب نوکروں نے دیکھا تھا تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو' تمہاری گاڑی کو۔" اکبر خان نے دہاڑ کے کہا۔
"وہ آپ کے نوکر ہیں جی۔ وہی کہیں گے جو آپ کہو۔ کچھ بھی الزام لگا دو ہم پر' لیکن ہم بے گناہ ہیں۔"
"پتا نہیں یہ کس جرم کی سزا ملی ہے ہمیں" دھاڑیں مار کے رونے والے نے کہا "پیر سائیں' ہماری مدد کرو۔ خدا کے لیے ان ظالموں سے بچاؤ۔ آپ کو اللہ رسولؐ کا واسطہ۔ ہمیں بچا دو۔"
اکبر خان اٹھ کھڑا ہوا۔ "ٹھیک ہے۔ اب تک ہم نے کوئی رپورٹ نہیں کی تھی۔۔۔"
"یہ کام پہلے کرنے کا تھا" خلیفہ کیکر نے کہا "خیر اب بھی پرچہ کٹوا دو۔"
"ان کو میں ساتھ لے جاؤں گا۔"
"یہ اب ہماری پناہ میں ہیں۔ خدا اور رسولؐ کے واسطے! کیسے نظر انداز کر دیں؟ جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا تفتیش سے۔ انہیں پولیس کے حوالے کر سکتے ہیں' تمہارے حوالے نہیں کر سکتے" خلیفہ کیکر نے کہا۔
"جرم انہوں نے میرے گھر میں کیا تھا۔"
"یہ تم کہتے ہو۔ ہم کیسے مان لیں کہ تم سچے ہو اور یہ نہیں؟ تم نے کہا تھا کہ یہ ہمارے مرید ہیں' کیکر ہیں۔ یہ بھی جھوٹ اور ہم پر الزام تھا۔ ہمیں بدنام کرنے کی کوشش کی تھی تم نے۔ ہمارے خلاف بھی رپورٹ لکھوا دو۔ پولیس اگر کسی راجہ کو گرفتار کر سکتی ہے تو کرے اور ہمیں ہتھکڑی ڈال کے لے جائے۔" وہ اب شیر کی طرح دہاڑنے لگا تھا۔
خلیفہ کے جانشین نے بھی گرج کے کہا "یہاں تمہاری بدمعاشی نہیں چلے گی اکبر خان۔"
"مجھے بدمعاش کہتے ہو۔ میں جانتا ہوں تمہاری حقیقت خلیفہ کیکر کی اولاد۔" اکبر خان بپھر گیا۔

"میں بھی جانتا ہوں تیری اصلیت کو" ولی عہد نے ایک دم ریوالور نکال لیا "میں خون خرابہ نہیں چاہتا۔"
خلیفہ نے کہا "خیریت اسی میں ہے کہ جیسے آئے ہو ویسے ہی خاموشی سے لوٹ جاؤ۔ ان دو مظلوموں کو ساتھ لے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوبارہ اس کی کوشش بھی مت کرنا اور بھولے سے بھی ادھر مت آنا ورنہ۔۔۔"
"ورنہ کیا؟" اکبر خان چیخ کے بولا "میں پھر آؤں گا خلیفہ اور اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا اس دھوکے بازی کے اڈے کی۔"
اس کے جانشین نے فائر کرنے کے لیے ریوالور اٹھایا ہی تھا کہ میں نے اس کو فلائنگ کک ماری۔ گولی اوپر نکل گئی۔ میں نے زمین پر گرتے ہی اُلٹی قلابازی کھائی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اوپر گنبد نما چھت کے ایک موکھے سے آنے والی گولی میرا کام تمام کر دیتی۔
سب سے محفوظ جگہ پیر صاحب کی مسند تھی۔ میں اس تخت کے کنارے سے لٹکی ہوئی چادر اٹھا کے نیچے گھس گیا۔ باہر فائرنگ سے بھگدڑ مچ گئی تھی۔ خلیفہ کیکر نے چیخ کر اپنے سب محافظوں کو طلب کر لیا تھا اور انہیں بڑی افراتفری میں احکامات جاری کر رہا تھا۔
"باہر سب کو رخصت کر دو۔ کہہ دو [illegible] اندر گھس گیا ہے۔ راجا صاحب کو فون کرو۔ تھانے سے نفری منگواؤ۔ اور دیکھو یہ اکبر خان نہ نکل جائے۔ اسے مارنا نہیں ہے۔ باندھ کے اندر ڈال دو۔"
خلیفہ کے جانشین نے کہا "ابا! وہ نیچے گھس گیا ہے۔"
"نیچے گھس گیا ہے' کیسے! الو کے پٹھے تو دیکھ رہا تھا تو اسے گولی کیوں نہیں مار دی؟" خلیفہ نے گھبراہٹ اور پریشانی میں پیری کے مرتبے اور وقار کے تمام ادب آداب بالائے طاق رکھ دیے۔
اکبر خان چلانے لگا "میں ایسی کی تیسی کر دوں گا سب کی۔ جانتے ہو مجھے۔"
"چپ کر تیری۔۔۔" خلیفہ نے چیخ کے کہا "بہت بھونک رہا تھا تو۔ اب تو تیری لاش کے ٹکڑے کتے کھائیں گے۔ تو یہاں سے زندہ جا ہی نہیں سکتا تھا اکبر اعظم کے نطفے۔ لے جا کے پیچھے ڈال اسے۔۔۔ اور دیکھو باہر کون گیا ہے۔ لوگوں کی چیخ و پکار کیسی ہے۔"
وسیع تخت کے نیچے گھستے ہی کچھ دیر تو میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے کی کوشش کرتی رہیں پھر میں نے ایک طرف سے تخت پوش کا کونا اٹھا کے جھانکا تو وہ اکبر خان کو گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔ میرے نشانے پر نہ خلیفہ تھا نہ اس کا جانشین۔ سوچے سمجھے بغیر میں نے اکبر خان کو زبردستی لے جانے والوں میں سے ایک کو نشانہ بنا لیا۔ وہ چیخ مار کے گرا اور تڑپنے لگا مگر باقی چار تیزی سے بھاگنے لگے۔ اکبر خان ان کے ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ غالباً وہ اسے کوئی ضرب لگا کے بے ہوش کر چکے تھے۔ ان کا رخ ایک دروازے کی طرف تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ غائب ہوتے' میں نے ایک اور کیکر گرا دیا لیکن باقی اکبر سمیت اس دروازے کے پیچھے روپوش ہونے میں کامیاب رہے۔
مجمع خاص کے باہر لوگوں کی چیخ و پکار سے ظاہر ہوتا تھا کہ دید کے امیدوار' نگاہ کرم کے طلب گار اور خصوصی شفاعت کے خواستگار سب ہی خوف زدہ ہو کے فرار ہو رہے ہیں۔ پھر باہر سے پہلا فائر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا۔ بس ہنگامہ دار و گیر میں فائرنگ کے دھماکے سن کے اندازہ ہوتا تھا کہ اندر کی جنگ اب باہر کی کھلی جنگ بن چکی ہے اور حریف مقابلے پر صف آرا ہو چکے ہیں۔ ایک طرف خلیفہ کے مرید تھے جو مرید ہونے کے ساتھ ساتھ بدمعاش تھے' مسلح تھے اور جان پر کھیلنے کے لیے تیار تھے۔ دوسری طرف اکبر خان کے محافظ تھے جو اسی لیے ساتھ آئے تھے کہ اکبر خان کی حفاظت کرتے ہوئے اسے خطرے سے نکال کر لے جائیں۔
اور ان سب کے علاوہ رابعہ' غالب اور نازو تھے۔ اکبر خان کا باڈی گارڈ گن مین تھا اور ایک اخبار فروش لڑکا تھا جس سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ ہمارا طرف دار ہو گا۔
تخت پوش کا کنارا اٹھانے سے روشنی بڑھی تو میں نے اپنے نیچے فرش کے وسط میں ایک گٹر کے ڈھکن جیسا دو پٹوں والا فولادی دروازہ دیکھا۔ یہ چار فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا دروازہ بند تھا لیکن مقفل نہیں تھا۔ اس کا ہر پٹ دو فٹ چوڑا اور چار فٹ لمبا تھا۔ اتنا بڑا دروازہ کسی خفیہ تجوری کا نہیں ہو سکتا۔ میں نے سوچا' یہ یقیناً کسی زیر زمین تہ خانے کا راستہ ہو گا۔
گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے میں وسط تک پہنچا اور ایک پٹ کو اٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔
میرے کانوں میں خلیفہ کی آواز آئی "اس۔۔۔ کو نکالو نیچے سے۔ چھلنی کر دو نیچے ہی اسے۔"
خلیفہ کے جانشین نے کہا "اس کے پاس ریوالور ہے اور یہ بھی معلوم نہیں' وہ کس طرف ہے۔"
دوسرا پٹ اٹھائے بغیر میں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ نیچے ایک زینہ موجود تھا۔ سات آٹھ سیڑھیوں کے بعد زینہ گھوم گیا تھا۔ میں لٹک کے نیچے اترا اور میں نے اوپر والے کھلے پٹ کو پھر کھینچ کے بند کر دیا۔ اب مجھے ایک کنڈی بھی نظر آ گئی جسے میں نے کھینچ کر دونوں پٹ ملا دیے۔
خلیفہ چلانے لگا "دیکھو۔۔۔ نیچے اتر گیا۔"
اس کے ہر جملے میں میرے لیے ایک نئی اور فحش گالی تھی لیکن اس سے خلیفہ کیکر کی پریشانی اور بدحواسی بھی ظاہر ہوتی تھی۔ وہ بار بار پوچھ رہا تھا کہ باہر کون گولیاں چلا رہا ہے۔ کسی نے راجا صاحب کو فون کیا ہے کہ نہیں۔ تھانے میں اطلاع دی ہے یا نہیں۔
نہ جانے کس نے چلا کے کہا "[illegible] کتنا ہوا ہے۔"
یہ آوازیں اوپر سے ہی آ رہی تھیں لیکن اس طرف سے نہیں

www.paksociety.com

جدھر سے میں اندر اترا تھا۔ وہ دروازہ بند ہو جانے کے بعد شور کی سمت بدل گئی تھی۔ باہر کی مسلسل فائرنگ اور چیخ و پکار زینے کی طرف سے سنائی دے رہی تھی۔ میں تیزی سے نیچے اترا اور سیڑھی کے ساتھ ساتھ گھوم گیا۔ اپنے اندازے کے مطابق میں مہمان خانے والے حصے میں تھا اور یہاں ہم گزشتہ روز پچھلی طرف سے آئے تھے۔ نیچے بنے ہوئے کمروں کی چھت کے ساتھ ساتھ روشن دان تھے جو باہر کی طرف کھلتے تھے۔ ان سے روشنی اور ہوا کو تہ خانے تک پہنچنے کا راستہ ملتا تھا۔

میں نے ایک روشن دان پر انگلیاں جما کے اپنے وزن کو اوپر کھینچا اور کہنیوں کے بل اتنا اٹھ گیا کہ میری آنکھیں باہر کا منظر دیکھ سکیں۔ وہ حصہ ویران پڑا تھا جہاں مرد و زن عقیدت مندوں کا اجتماع تھا۔ اسی جگہ مجھے پیچھے رہ جانے والی جوتیوں اور ٹوپیوں کے درمیان دو سیاہ چمکیلے ریشمی برقعے بھی پڑے نظر آئے۔ یقیناً رابعہ اور نازو اس کھلی جنگ میں شریک ہو چکی تھیں۔ احاطے میں دو فقیروں کی لاشیں پڑی تھیں اور ایک زخمی تڑپ رہا تھا۔ باقی مختلف گوشوں میں پوزیشن سنبھالے بیٹھے تھے اور باہر سے فائرنگ کرنے والوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ دائیں طرف مجھے اکبر خان کی سیاہ کیڈلاک نظر آئی جو دھڑ دھڑ جل رہی تھی۔ پھر ایک دھماکے سے دروازے کو توڑ کے گراتی سفید فاکس ویگن اندر آگئی۔

میرے ہاتھوں کی طاقت جواب دے گئی تھی۔ میرے پیچھے والے حصے میں بھی بھاگ دوڑ جاری تھی اور غالباً ٹیکر فورس مجھے تلاش کرتی ہوئی زینے کی طرف آ رہی تھی۔ روشندان تھوڑا سا بڑا ہوتا تو میں خود کو اس میں سے گزار دیتا اور باہر جا گرتا لیکن بنانے والوں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہوا اور روشنی کے سوا آمد و رفت کے لیے یہ راستہ کوئی نہ استعمال کر سکے۔

میرے پاس ریوالور میں چار گولیاں تھیں۔ تنگ زینے میں چھپنے کی جگہ نہیں تھی جہاں مورچہ بند ہو کے میں اپنے دشمنوں کا نشانہ لے سکتا اور چار گولیوں سے چار ٹیکر گرا دیتا۔ میں ایک گولی چلا سکتا تھا۔ زینے سے آنے والا ایک شکاری ختم ہو سکتا تھا مگر اس کے بعد باقی شکاری اپنا تمام اسلحہ مجھ پر صرف کر دیتے۔

اب پیچھے جانا بھی مجھے اتنا ہی مشکل نظر آ رہا تھا جتنا واپسی اختیار کرنا۔ میرے پاس سوچنے کے لیے بھی بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ میں زینے کی طرف آنے والوں کی چیخ و پکار سن سکتا تھا۔ وہ اس یقین کا اظہار کر رہے تھے کہ میں بچ کے نہیں جا سکتا اور مجھے زینے سے اترتے ہی گولی مارنا بہت آسان ہوگا۔ ان کی مغلظات کا سلسلہ الگ جاری تھا۔

"آگے مت جاؤ" کسی نے چلا کے کہا "چاروں طرف اپنی اپنی جگہ جما لو' وہ جیسے ہی سامنے آئے۔"

کسی اور نے کہا "بے وقوف کے بچے! یہ سب کیا اپنے باپ کو سنا رہا ہے۔"

اب میں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ آگے جانا صریحاً خودکشی کے مترادف تھا اور اس راستے سے گزر کے دوبارہ اوپر زینے تک پہنچنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ اوپر والوں کو معلوم تھا کہ میں نیچے بھاگ گیا ہوں اور نیچے ہی محصور ہو کے مارا جاؤں گا۔ انہیں میری واپسی کی امید نہ ہو۔

میں پلٹا ہی تھا کہ ایک خوفناک دھماکے نے تہ خانے کے در و دیوار ہلا دیے۔ کسی نے روشن دان کے راستے دستی بم پھینک دیا تھا۔ یہ اکبر خان کی اسی محافظ فورس کا کارنامہ ہوگا جو فاکس ویگن کو ٹینک کی طرح چلاتے ہوئے اندر آئے تھے۔ دھوئیں اور گرد و غبار سے میرا دم گھٹنے لگا اور میں واپس بھاگا۔ مجھے یہ خطرہ بھی لاحق ہو رہا تھا کہ میں بھی ان ٹیکروں کے ساتھ اسی تہ خانے میں دفن نہ ہو جاؤں۔ دستی بم کے دھماکے نے تہ خانے کا ایک حصہ گرا دیا تھا اور ملبے نے وقتی طور پر میرے پیچھے آنے والوں کی پیش قدمی کو روک دیا تھا مگر وہ بھی زخمی نہیں ہوئے تھے۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد میں نے پھر ان کی آوازیں سنیں۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کس کا کارنامہ تھا۔ کسی نے دیکھا اسے۔ وہ اکبر خان کا آدمی تھا یا کوئی اور۔ لیکن کسی نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ دستی بم نے دیوار کا حصہ منہدم کر کے باہر سے آنے والوں کے لیے ایک [illegible] مارا تھا مگر وہ سب محفوظ رہے تھے جو مجھے پکڑنا چاہتے تھے۔

کسی نے کہا "سب ٹھیک ہے نا۔ چلو جلدی سے آگے چلو وہ نکل جائے گا۔"

"شاہ جی! کہاں سے نکل جائے گا؟"

"ادھر سے۔ یہ جو نیا راستہ بن گیا ہے۔"

"ہم بھی تو جا سکتے ہیں ادھر سے باہر شاہ جی۔"

"چلو باہر چلو ورنہ وہ دوسرا بم پھینک دیا کسی نے تو سب مر جائیں گے۔"

"بکواس مت کرو۔ بزدل مت بنو۔ آگے بڑھو۔ اس کا راستہ تو ابھی تک وہ زینہ ہی ہے۔ اوپر سے گیٹ بند کرا دیا ہے۔ جائے گا کدھر سے۔" شاہ جی نے کہا۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ زینے کا راستہ میں نے پیچھے سے بند کیا۔ انہوں نے اوپر سے بند کر دیا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اب میں صرف آگے جا سکتا تھا' پیچھے نہیں۔ اگر میں موقعے سے فائدہ اٹھاتا تو دستی بم سے دیوار میں شگاف پڑتے ہی ادھر کا رخ کرتا اور فائر کرتا ہوا باہر نکل جاتا۔ اس میں میرے بچ جانے کے [illegible] امکانات تھے لیکن اب اس راستے تک رسائی بھی محال تھی۔ شکاری اس سے آگے بڑھ آئے تھے۔

میں نے ریوالور نکالا اور دیوار سے چپک کے کھڑا ہو گیا۔ میرے سر کے اوپر ایک بلب تو روشن تھا۔ مگر اسے بجھانے کی صورت نظر نہ آئی تھی اس کا سوئچ نہ جانے کہاں تھا۔ شاید ایک گولی ضائع کرتا تو دہرا نقصان ہوتا۔ میرے دشمنوں کو فوراً معلوم ہو جاتا کہ میں کہاں ہوں۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے دیوار کے پلاسٹر کی ناہمواری کا احساس ہوا۔ میں نے ناخن گاڑ کے چونے کا ایک خاصا بڑا ٹکڑا الگ کر لیا۔ اسے میں نے تاک کے بلب پر مارا۔ بلب ایک دھماکے سے پھٹا اور اس کی کرچیاں میرے اوپر آئیں۔ میں فوراً سر پیچھے نہ کرتا تو یہ تیز دھار شیشے کے باریک ذرات میری آنکھوں میں گرتے اور پردۂ بصارت کو کاٹ ڈالتے۔

"شاہ جی! ادھر! ابھی بلب توڑا ہے اس نے۔"

"ہاں ہاں۔ میں نے بھی سنی ہے آواز۔ وہ اندھیرے میں کھڑا ہوگا۔ آگے مت جانا۔ میں ٹارچ منگواتا ہوں۔"

"ٹارچ خود ہی جلانا تاکہ وہ تمہارا نشانہ لے۔"

اس وقت جب میں زندگی سے تقریباً مایوس ہو چکا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اوپر والا دروازہ توڑنے کے بعد دوسری طرف سے بھی فرار کے راستے بند کر لیے جائیں' اگلے روشندان سے ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے دوسرا دستی بم زینے پر پھینک دیا۔ میں ایک دم لیٹ گیا ورنہ میرا بچنا بھی مشکل تھا۔ دستی بم مجھ سے تین قدم دور زینے کے موڑ پر گرا تھا۔

خوفناک دھماکے کے ساتھ تہ خانے کا ایک اور حصہ مسمار ہو گیا۔ اس میں زینے کا بھی کچھ حصہ شامل تھا۔ میری جان کے طلب گار اس کا براہ راست نشانہ بنے۔ میں نے ان کی بھیانک چیخوں اور کراہوں کی آواز سنی۔ اس سے مجھے بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "خس کم جہاں پاک" اور آزادی کی خوشبو کا سراغ دینے والے نئے راستے کی طرف لپکا۔ جہاں پہلے صرف ایک فٹ مربع روشن دان تھا وہاں اچھا خاصا بڑا شگاف نمودار ہو چکا تھا۔ ملبے کے ڈھیر پر قدم جما کے میں نے گردن باہر نکالی اور صورت حال کا نقشہ دیکھا تاکہ کھلی جنگ میں شریک ہونے سے پہلے اپنی سلامتی اور تحفظ کا اطمینان حاصل ہو جائے۔

موکھے میں سے پورا محاذ نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے پھر وہی منظر دیکھا جو پہلے بھی ملاحظہ کر چکا تھا۔ کیڈلاک اب بھی شعلوں کی لپیٹ میں تھی۔ اتنی خوب صورت اور بے حد قیمتی کار کے جل کر ضائع ہونے پر مجھے دکھ ہوا حالانکہ وہ میری کار نہیں تھی' اکبر خان کی تھی اور اسے شاید نقصان کی پروا بھی نہ ہوگی کیونکہ عموماً دولت مندوں کی ہر چیز بیمہ شدہ ہوتی ہے۔ ان کی قیمتی کار' ان کی زندگی' ان کا گھر' زیورات' بچوں کا تعلیمی مستقبل' لڑکیوں کی شادی کے اخراجات سب کی ذمے داری انشورنس کمپنی لے لیتی ہے چنانچہ وہ اپنے لیے پیدا ہونے سے پہلے مسئلے کا حل خرید لیتے ہیں۔ تفکرات کی چکی میں وہ غریب پس جاتا ہے جس کے دن رات' نان جویں' سترپوشی کے لیے موٹا جھوٹا کپڑا' سر چھپانے کے لیے چھت کا سایہ اور زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کرنے کے لیے کولہو کے بیل کی طرح کام کرنے میں گزر جاتے ہیں' وہ مستقبل کے لیے بے فکری کا پریمیم کہاں سے ادا کرے؟

اس کے باوجود کہ کار انشورڈ تھی اور اکبر خان کی تھی' مجھے انتہائی افسوس ہوا جتنا کشمیر جنت نظیر میں چنار کا کوئی خوب صورت درخت گرائے جانے سے ہوتا ہے یا ایک حسین عورت کو مقتول دیکھ کے۔ چنار کے اس درخت یا اس عورت پر میرا کوئی حق ملکیت نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ احساس حسن تو ایک دولت مشترکہ ہے۔

دو فقیروں کے لاشے اسی طرح اوندھے پڑے تھے اور تیسرا زخمی ابھی تک تڑپ رہا تھا لیکن اندر کی طرف سے جوابی فائرنگ کا سلسلہ بہت حد تک موقوف ہو چکا تھا۔ میں نے سارس کی طرح گردن باہر نکالی تو ایک گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے فوراً سر کو واپس اندر کر لیا۔ کیا نامعقولیت ہے۔ فائر کرنے سے پہلے دیکھ تو لینا چاہیے کہ سر اپنا ہے یا پرایا۔ فائر کرنے والے کی نظر بالکل ٹھیک نہ ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ رابعہ' نازو اور غالب کی نگاہ تو بالکل ٹھیک تھی۔ پھر یہ کون تھا جس نے سکندر اعظم کی کھوپڑی کو نہیں پہچانا؟

دوسرا دستی بم پھینکنے والا بھی دور نہیں ہو سکتا تھا۔ غالباً اس کے سپرد یہی کار خیر کیا گیا تھا کہ وہ جہاں بھی روشن دان دیکھے وہاں اللہ کا نام لے کر ایک دستی بم ڈال دے۔ ایم آر ایس کی اتحادی فوج میں اکبر خان کے کمانڈوز شامل تھے اور شاید وہ اخبار فروش لڑکا۔

میں نے منہ اندر رکھتے ہوئے منہ کے سامنے ہاتھ رکھ کے بھونپو سا بنایا اور چلا کے کہا "غالب' او غالب کے بچے۔ رابعہ' نازو! ارے کوئی ہے یا سب مر گئے ایک ساتھ۔ یہ میں سکندر ہوں۔"

ایک شخص نے بالکل میرے سامنے منہ لا کے کہا "تم سکندر ہو تو اس کا اعلان یوں چلا کے کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا "یہ دستی بم پھینکنے کی حماقت تم نے کی تھی؟"

اس نے مونچھیں ہلا کے کہا "مجھے جو چیز دی گئی تھی وہی پھینک سکتا تھا میں۔ پھول کہاں سے لاتا تمہارے لیے ٹیکر کے بچے۔"

میں نے کہا "برگد کے الو! میں ٹیکر نہیں ہوں۔ میں ہی آیا تھا اکبر خان کے ساتھ۔ تم مجھے پہچانتے نہیں؟"

اس نے کہا "اچھا' معاف کرنا۔ دراصل اس ہنگامے میں میری عینک کے دونوں شیشے گر گئے۔ میری قریب کی نظر کمزور ہے۔"

"تم ذرا دور سے دیکھو۔ میں باہر آتا ہوں۔ مجھے باہر کھینچو۔"

اس نے مجھے باہر کھینچ لیا۔ "اندر کتنے لوگ ہیں اب؟"

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ باہر کی کیا پوزیشن ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم" اس نے کہا "ابھی خطرہ ہے۔"

"مجھ پر گولی کس نے چلائی تھی؟"

"میں نے۔ چھینک آ جانے سے نشانہ خطا ہو گیا' سوری۔" وہ پھر چھینک کر بولا۔

www.paksociety.com

مجھے سخت غصہ آیا۔ "اکبر خان کو وہ لوگ اندر لے گئے تھے۔"

"سب ہم باہر لے آئے ہیں" اس نے کہا "جیپ کر کے دیوار کی اوٹ میں میرے ساتھ آؤ۔ دوسری طرف سے دیکھتے ہیں۔"

"اب تو فائرنگ نہیں ہو رہی ہے۔ کیا سارے ٹیگر مارے گئے؟" میں نے کہا "بھاگ گئے یا پکڑے گئے؟"

"خاموش رہو۔ جہنم میں گئے ٹیگر۔"

"جہنم میں ہی جانا تھا ان کو۔ پہنچ گئے وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ لیکن تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے کہا "وہ دیکھو سامنے ایک دیگ اور دیگ کے پیچھے ٹیگر کا سر۔"

میں نے نشانہ لے کر فائر کیا۔ دیگ کے پیچھے چھپا ہوا ٹیگر چیخ مار کے اچھلا اور الٹ کے دیگ میں یوں گرا کہ اس کا سر نیچے تھا اور ٹانگیں دیگ سے باہر ہوا میں قینچی کی طرح چل رہی تھیں۔

"تمہارا نشانہ اچھا ہے" وہ بولا "نظر بھی ٹھیک ہے لیکن دماغ خراب ہے۔ تم اپنی بیوی اور سالی کو یہاں کیوں لائے تھے؟"

"سائیں ٹیگر شاہ کے مزار پر کیوں آتے ہیں لوگ؟ میری بیوی کی خواہش تھی کہ ہر بار اس کے دو بچے ہوں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔"

"ابھی کتنے ہیں؟ ہر سال ایک ہوتا ہے کیا؟"

"ابھی شادی کہاں ہوئی ہے ہماری۔ میرا مطلب ہونے والی بیوی سے تھا" میں نے معذرت آمیز لہجے میں وضاحت کی "سالی سے تو خدا بچائے۔"

"ارے اس نے تو کر دیا تھا مجھے لنگڑا لولا۔ بال بال بچ گیا میں۔ تمہاری سالی کا سالا... میرا مطلب ہے اس کے گھر والے نے کہا تھا کہ نازو یہ ٹیگر نہیں ہے۔ توبہ توبہ" اس نے کان پکڑ کے کہا۔

"اب کہاں ہیں وہ؟" میں نے کہا "اندر یا باہر؟"

"مجھے تو دستی بم دے کر بھیجا گیا تھا کہ تہ خانے کو اڑا دو۔ ابھی دو بم اور ہیں میرے پاس۔" وہ بولا "تم یہاں ٹھہرو۔ میں دوسری طرف سے اندر ڈالتا ہوں۔ اس طرف بھی دو روشن دان ہیں۔ خلیفہ ٹیگر کا ہیڈ روم بھی ادھر ہے۔ یعنی ٹیگر شاہ کے مزار کے نیچے۔"

"تم اس سفید فاکس ویگن میں اندر آئے تھے؟"

"نہیں۔ ہم پچھلی طرف سے جیپ میں آئے تھے۔" وہ بولا "اب تم یہیں بیٹھو۔ میں آتا ہوں اپنا کام کر کے۔ پھر میں تمہیں لے جاؤں گا۔"

"کہاں لے جاؤ گے؟"

"باہر اور کہاں۔ مجھے واپس جیپ تک جانا ہے۔ تم نہیں جاؤ گے؟"

"پہلے میرے ساتھیوں کا کچھ پتا چلے۔"

اچانک نیچے ایک دھماکا ہوا "یہ کیا تھا؟"

"پتا نہیں۔ تمہارے ہی ساتھی ہوں گے۔"

"دستی بم تو اور کسی کے پاس نہیں تھے" وہ بولا اور دیوار کا موڑ کاٹ کے غائب ہو گیا۔ خاموشی میں ایک ... میں نے فائر کرنے والے کو ایک لمحے کی تاخیر سے دیکھا مگر اس شخص کی موت بن گیا جو چند سیکنڈ پہلے میرے ساتھ تھا۔ بچ جانے والے وہ دستی بم تہ خانے میں پھینکنے گیا تھا۔ اس پر چلانے والا احاطے کے اندر ایک ٹیگر کی اوٹ سے نکلا تھا۔

میں نے ایک اور گولی کا استعمال کرتے ہوئے اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیا۔ میرے لیے کفایت شعاری ضروری تھی۔ میں اندھا دھند فائرنگ کرتا تو خالی ہاتھ رہ جاتا۔ میرے ریوالور میں صرف تین گولیاں رہ گئی تھیں۔

اچانک میرے کانوں نے فاکس ویگن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ پھر گرجتی کار میرے سامنے سے گزر گئی۔ ... چلا رہا تھا۔

"غالب!" میں نے چیخ کے کہا "غالب کے گھوڑے۔"

اس نے میری طرف دیکھا اور چلایا "سکندر! سکندر تم یہاں چھپا بیٹھا ہے؟" وہ فاکس ویگن کو ایک طرف لے گیا۔

میں اٹھ کے گاڑی کی طرف دوڑا "رابعہ اور نازو کہاں ہیں؟"

"بصیرت تو پہلے ہی نہیں تھی بصارت بھی گئی" اس نے آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلا کے کہا۔ پیچھے کی سیٹ پر نازو بھی ...

غالب نے کہا "بے چارہ اندھا ہو گیا تم نہیں رہتی ہو۔"

میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "اندھا نہیں کانا۔ مجھے نازو نظر آ رہی ہے۔ رابعہ کہاں ہے؟"

"باہر جیپ میں بیٹھی ہے" نازو بولی "تم کہاں تھے؟"

"میں تہ خانے میں اتر گیا تھا۔ دو دستی بم پھینکے گئے مجھ پر میں پھر بھی بچ گیا۔" میں نے کہا "وہ کوئی اکبر خان کا آدمی تھا۔ چارہ ابھی مجھ سے باتیں کر رہا تھا کچھ دیر پہلے کہہ رہا تھا جیپ تک لے کے چلتا ہوں۔ بس یہ دو دستی بم رہ گئے ہیں یہ پھینک دوں۔ اسی چکر میں مارا گیا۔"

"اتنا ضروری تھا انہیں پھینکنا؟" غالب بولا۔

"آرڈر از آرڈر۔ اس نے وہی کیا جو اسے کہا گیا تھا۔ ٹیگر کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ ٹیگر کو میں نے مار دیا۔ اس کے ... اٹھا لیں؟"

"اٹھا لو" غالب نے کہا "میرا خیال ہے اب کوئی نہیں بچا۔"

"کیا مطلب؟ سب مارے گئے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اوپر تو صرف چار ہلاک ہوئے۔ نیچے کا پتا نہیں اندر تھے اور دو دستی بم سے کتنے مرے۔"

"مگر یہاں تو بہت ٹیگر تھے۔ ٹیگروں کا جنگل تھا۔"

"سب فرار ہو گئے۔ خلیفہ ٹیگر سمیت" غالب بولا "تم نے ایک دھماکا سنا تھا؟ پیچھے سے آواز آئی تھی۔"

"ہاں پچھلی دیوار توڑ کے نکل گئے" غالب بولا "پیچھے کوئی سرنگ تھی۔ ان میں ایک جیپ تیار رہتی تھی۔ برا وقت آ جائے تو خلیفہ ٹیگر سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل جائے۔"

میں نے کہا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ کس نے بتایا یہ سب؟"

"وہ اخبار والا یاد ہے جو صبح ملا تھا؟ وہ محرم راز درون خانہ تھا۔ تم کیا سمجھے۔ اس کو اندر باہر کا سب نقشہ معلوم ہے۔ میں نے دیکھا تھا اسے تمہارے ساتھ۔ یہاں کیا لینے آیا تھا وہ؟"

غالب نے کہا "میں نے بھی پوچھا تھا مگر وہ جواب گول کر گیا۔ کہنے لگا کہ ایسے ہی ایک کام تھا۔ جب ہنگامہ شروع ہوا تو سیدھا میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ جیسا میں کہوں ویسا کریں۔ میں اندر کے راستوں سے واقف ہوں۔ خلیفہ ٹیگر پیچھے سے فرار ہو جائے گا۔ اس وقت تو میں نے یقین کیا تھا اکبر خان کی فوج کے کمانڈر ایجنٹ نے اس کی بات مانی۔"

"اب وہ کہاں ہے؟ فرشتہ غیب؟"

"اکبر خان کے ساتھ پیچھے گیا ہے۔ یہ ثابت کرنے کہ جو کچھ اس نے بتایا تھا وہ کس حد تک درست تھا۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اصل مجرم تو بچ کے نکل گئے" غالب نے کہا "اس نے کہا تھا کہ تم پیچھے جیپ کے پاس آ جانا۔ ہم اسی راستے سے آئیں گے جدھر سے خلیفہ ٹیگر فرار ہوا ہے۔"

میں نے ڈانٹ کر کہا "پھر فضول باتیں کر کے وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔ چلو۔"

غالب نے جیپ کو دروازے کی طرف موڑا۔ ہم اس شخص کے پاس سے گزرے جس نے دستی بم پھینکنے کی ذمے داری پوری کرتے ہوئے جان دے دی تھی۔ یہ تابعداری کی انتہا تھی کہ اس نے اپنی عقل کے دخل کو ضروری نہیں سمجھا اور خود فیصلہ نہیں کیا کہ اب آخری دو دستی بم بچ گئے ہیں اور ان کے استعمال کا جواز باقی نہیں رہا تو وہ اکبر خان کی خدمت میں حاضر ہو کے کہے کہ سرفرازی تو ختم ہو چکی تھی چنانچہ میں نے یہ دو بم استعمال کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری، یہ فیصلے آقا اور مالک کرتے ہیں۔ فوج میں ایک دستے کی، بریگیڈ کی یا ڈویژن کی اور فوج کی کمان کرنے والے کرتے ہیں۔ ماتحت سے صرف تعمیل کی توقع کی جاتی ہے۔ میں نے میٹرک میں ایک نظم پڑھی تھی جو سال ہا سال سے شامل نصاب تھی۔ چارج آف دی لائٹ بریگیڈ۔ یہ نظم ضوابط کے اصولوں پر ایک شہرۂ آفاق اور مستند دستاویزی حوالہ بن گیا ہے۔ اس کا ایک بند مجھے یاد آیا۔

THERE IS NOT TO REASON WAY
THERE IS BUT TO DO AND DIE

اور اس شخص نے یہی کیا تھا۔ کیوں اور کیسے کی بات ہی نہیں۔ حکم ہے مر جانے کا تو مر جاؤ۔ خواہ حکم صریحاً غلط، بے جواز اور ناجائز ہو۔

میں نے اس کے قریب بیٹھ کے دو غیر استعمال شدہ دستی بم اٹھاتے ہوئے یوں محسوس کیا جیسے اس کی کھلی آنکھیں مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ جب وہ مجھ سے ملا تو اجنبی تھا مگر اس نے شناسائی کے بعد چند منٹ میں اجنبیت کے احساس کو ختم کر دیا تھا۔ وہ بہت پرسکون تھا۔ موت کی کوئی تحریر اس وقت بھی مجھے اس کی صورت پر نظر نہ آئی۔

معاف کرنا دوست۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ میں چوری نہیں کر رہا ہوں۔ میں اکبر کو بتا دوں گا کہ موت حائل نہ ہوتی تو تم کو ادائے فرض سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔

معلوم نہیں وہ کون تھا۔ میں صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ اکبر خان کا ایک کارندہ تھا اور اکبر خان جیسے لوگ اپنی دولت کی قوت خرید میں جاں نثاری کا ایک جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ جب کوئی ان کی خاطر جان دے دیتا ہے تو یہ ان کے لیے کوئی جذباتی صدمے کی بات نہیں ہوتی۔ پہلے سے طے شدہ اور متوقع انجام ہوتا ہے۔ آخر اسے معاوضہ بھی تو اسی جاں نثاری کا ملتا تھا۔ جو معاوضہ لے اور جان نہ دے وہ نمک حرام کہلاتا ہے۔ کیا وہ بعد از مرگ اسے کوئی تمغۂ جاں نثاری دے گا؟ اس کے اہل و عیال کو وہ سہارا فراہم کرے گا جو شوہر یا باپ کی حیثیت سے وہ تمام عمر اپنا فرض سمجھ کے کرتا؟

جنگ میں یہی ہوتا ہے۔ آدمی کچھ بھی محسوس کیے بغیر دشمنوں کو ہلاک کرتا جاتا ہے۔ خنجر یا سنگین کی نوک سے، گولی سے یا دستی بم سے۔ بعض اوقات وہ توپ کا گولا چلا دیتا ہے یا ایٹم بم گرا دیتا ہے اور یہ بھی نہیں دیکھتا کہ اس نے کس کو اور کتنوں کو فنا کی نیند سلا دیا۔ اور کبھی وہ اچانک سامنے آ جانے والے دشمن کی صورت تک نہیں دیکھتا اور اسے سنگین گھونپ کے یا چھلنی کر کے آگے بڑھ جاتا ہے مگر پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہی دشمن کو اس کی زندگی بخش دیتا ہے یا اس کو مار کے دکھی ہو جاتا ہے اور دکھ کے اس لمحے کی یاد کو کنکر بنا کے سینے میں محفوظ کر لیتا ہے۔

یہ بھی ایسا ہی جذباتی کمزوری کا لمحہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ دو دستی بم اکبر خان کو واپس کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ شاید وہ ناگواری سے کہے گا۔ کیسے کاہل اور نااہل آدمی پر بھروسہ کر لیا تھا میں نے۔ چار دستی بم پھینکنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ غیر ذمے دار آدمی اس سے پہلے ہی مر گیا۔ میرا تو خیال ہے کہ کہیں چھپا بیٹھا ہو گا۔

غالب نے چلا کے کہا "کیا مردہ اجازت نہیں دے رہا ہے؟"

میں نے کہا "کچھ ایسی ہی بات ہے۔ تم دو منٹ رکو۔"

"ارے بھائی۔ اے بھائی! کدھر جا رہا ہے مت اٹھا کے؟"

غالب میرے پیچھے دوڑا "پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "اندھیر زیادہ ہے دیر کم ہے۔"

www.paksociety.com

بائیں طرف گھومتے ہی مجھے روشن دان نظر آگئے۔ میں نے ایک دستی بم کی پن منہ سے کھینچ کے نکالی اور اسے پہلے روشن دان سے اندر پھینک دیا۔ میں دوڑ کر دوسرے روشن دان تک پہنچا ہی تھا کہ دھماکا ہوا اور پیر گیگر کے مزار کا سامنے والا حصہ منہدم ہو گیا۔ گرد اور غبار کا ایک بگولا اٹھا جس میں غالب ذرا سی دیر کے لیے روپوش ہوا۔ میں نے دوسرا بم پھینکا اور واپس بھاگا اور غالب کا ہاتھ پکڑ کے جیپ کی طرف دوڑ لگائی۔

مزار کی مرکزی عمارت کے نیچے تہہ خانے تھے اور جیسا کہ مجھے علم ہو چکا تھا' نیچے صرف مہمان خانہ ہی نہیں تھا' خلیفہ گیگر کا عشرت کدہ بھی تھا۔ دوسرے دھماکے نے وہ بنیاد ہی باقی نہ رہنے دی جس پر حجرۂ خاص قائم تھا۔ اور جب ہم نے جیپ کے پاس پہنچ کے پیچھے دیکھا تو اس ڈبا پیر کے مزار کی عمارت دھوئیں اور گرد کے مرغولے میں منہدم ہو رہی تھی۔ جیسے بڑا جہاز رفتہ رفتہ ڈوبتا ہے' ایسے ہی عمارت کا مرکزی گنبد والا حصہ گر رہا تھا اور یہ سین ایسا تھا جیسے فلموں میں سلو موشن میں دکھایا جاتا ہے۔ پہلے اس کی دیواریں زمیں بوس ہوئیں پھر گنبد سرنگوں ہوا اور اس کی پُرفریب اور گمراہ کن بلندی دراڑوں سے بکھرنے لگی اور اس کی گولائی بے ہنگم ٹکڑوں میں بدل کر گرنے لگی۔ اس پر لہرانے والا کوے کی چونچ والا کھوتا پرچم جو سائیں گیگر شاہ کے دور اقتدار کی علامت تھا' خلیفہ گیگر سوم کے عہد میں سرنگوں ہو کے ملبے میں دفن ہوا۔

نازو اور غالب حیرتی اور مبہوت نظروں سے گرد و غبار اور دھوئیں کے اس طوفانی بگولے کو دیکھ رہے تھے جو گیگر شاہ کے جھوٹ' فریب' ظلم و جور' ناانصافی اور استحصال ہوس اور حرص کے ایوان رفعت کو خاک میں ملا چکا تھا۔

"یہ کام باقی رہ گیا تھا یار" میں نے کہا "اب چلو۔"

غالب سہارا دے کے فاکس ویگن میں بیٹھ گیا "مس رابعہ جائز طور پر تمہاری مغفرت کی دعا کر چکی ہوں گی اور اس قبل از عقد بیوگی پر آٹھ آٹھ آنسو بہا رہی ہوں گی۔"

نازو نے کہا "نہ تم لوگ ایسے مرنے والے ہو اور نہ کوئی تمہیں رونے والا ہے' خوش فہمی ہے تمہاری۔"

"تم مجھے اتنا غصہ دلاتی ہو کہ..."

"کہ تمہارا جی چاہتا ہے سچ مچ مر جاؤ" نازو بولی۔

"نہیں۔ کوئی ارادہ ہو تمہیں اور تمہاری وصیت کے مطابق وعدہ کر لوں کہ آٹھ آٹھ آنسو بہاتا رہوں گا۔ کس کے آٹھ' نہ سات نہ نو" غالب نے کہا۔

"میں کیوں کروں گی ایسی وصیت؟ اچھی طرح معلوم ہے مجھے تم کتنے وفا شعار ہو۔ چہلم کے بعد پوچھو گے' نازو؟ کون نازو؟"

"یہ سراسر زیادتی ہے" غالب نے احتجاج کیا "چہلم تک انتظار نہیں کر سکتا میں۔"

مجھے نازو کی صورت دیکھ کے ہنسی آگئی "تم بڑی دکھی نظر آ رہی ہو جیسے سچ مچ ایسا ہو چکا ہے۔"

درگاہ کے دائیں جانب جہاں سے کیکروں کا جھنڈ شروع ہوتا تھا' رابعہ جیپ کے بونٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ … فاصلے پر کھڑا اس کے حسن سوگوار کا نظارہ کر رہا تھا لیکن … احساس نہ تھا۔ فاکس ویگن کو دیکھ کے اس نے … ایک دم اس کا اداس چہرہ کھل اٹھا تھا۔

قریب ہی وہ کار بھی موجود تھی جس میں ہم نے رابعہ کے ساتھ نازو کو لاہور روانہ کیا تھا۔ اس کار میں اکبر خان پچھلی سیٹ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے گارڈ … پُراسرار طور پر ہماری حفاظت کرتے رہے تھے' اب پھر قریب تھے۔

رابعہ واقعی سخت پریشان تھی اور اس کی ذہنی کیفیت کا اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مجھے زندہ و سلامت دیکھ کے خود پر کنٹرول نہ رہا۔ یہ یاد نہ رہا کہ یہاں اور لوگ بھی ہیں جو دیکھ رہے ہیں۔ وہ دوڑ کے مجھ سے چمٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اس کے ہاتھ اور اس کی نظریں مجھے ٹٹولتی رہیں ... "تم ٹھیک ہو نا سکندر؟ کچھ ہوا تو نہیں تمہیں؟"

غالب آہ بھر کے بولا "جو ہونا تھا ہو گیا مس رابعہ۔ امید ہے کیا ہو گا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

رابعہ ایک دم الگ ہو گئی۔ جذبات پر اپنی بے اختیاری کے خیال سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

نازو بھی مذاق اڑانے میں غالب کی ہمنوا ہو گئی "… ہو گا' یہ بھی ہتھارو۔"

غالب نے اسے حسرت سے دیکھ کے کہا "یہ تو تم … تا سکو گی جب وقت آئے گا۔ بس تصویر دیکھتی رہو گی۔"

"کس کی تصویر' تمہاری... خدا نہ کرے۔"

"بابا' بڑی خوب صورت فریم کی ہوئی تصویریں … مثول' پیارے پیارے بچوں کی۔ ان کی بات کر رہا تھا میں۔"

"بے غیرت' بے شرم" نازو چلائی "ہوش کی دوا کرو۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "ہوش کی دوا ہے کوئی تو اس بابا کو بھی دو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں رابعہ؟"

وہ آنسو پونچھ کے اور نظر جھکا کے بولی "کچھ نہیں۔ میں … تھی کہ کہیں تمہیں کچھ نہ ہو جائے۔ تم نیچے کیوں اترے تہہ خانے میں؟"

اکبر خان کار سے اتر آیا "یہ کھیل تو ختم ہوا۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "تمہارے ایک بیان … واقعی حق نمک ادا کر دیا۔ اس نے مجھے ٹالا ورنہ میں بھی … دفن ہو جاتا۔ آخری دستی بم پھینکتے ہوئے وہ خود بھی … نے تو اسے روکا تھا مگر وہ نہیں مانا کہ باس کا حکم ہے۔"

غالب میری صورت دیکھ رہا تھا اور میں اکبر خان کے … مسکراہٹ دیکھ رہا تھا۔ اسے ایک وفادار کی جان جانے کا قلبی ملال نہیں تھا۔ فخر تھا اس بات پر کہ اس نے غلط … کا انتخاب نہیں کیا تھا اور اسے اتنا عرصہ جاں نثاری کا جو معاوضہ دیا تھا وہ رائیگاں نہیں گیا۔ یہ جان تو آنی جانی ہے' اس جان کی کوئی بات نہیں۔

میں نے ٹوہ لینے کے لیے کہا "اس کے بیوی بچے تو ہوں گے۔"

اکبر خان نے میری طرف حیرانی سے دیکھا "تم اس کے لیے اتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہو؟ یہاں تو بہت لوگ مارے گئے' ان سب کے گھر تھے اور بیوی بچے تھے۔"

میں نے کہا "مگر انہوں نے میری جان نہیں بچائی تھی۔ وہ محسن تھا میرا۔"

"اس کے بیوی بچے اب میری ذمے داری ہیں۔ میں بہادر اور جاں نثار دوں کی قدر کرتا ہوں۔ میں ایسا نہ کروں تو میرے لیے کسی پر بھروسہ کرنا مشکل ہو جائے۔"

"کتنا دو گے تم انہیں؟" میں نے کہا۔

اس کی صورت پر ناگواری آئی "جتنا ضروری ہو گا اس سے زیادہ۔ ان کو زندگی میں کبھی تنگی نہیں ہو گی۔ وہ جیسے پہلے رہتے تھے ویسے ہی رہیں گے۔"

"اس آدمی کے بغیر بھی جو شوہر تھا اور بچوں کے لیے باپ بھی۔ اس کا بدل پیسہ ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے" اکبر خان نے بے رخی سے کہا "ہر عورت جانتی ہے کہ اس کا شوہر کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ اتنی ہی عزیز ہو اس کی جان تو وہ اس کو ساتھ لے کر کہیں چلی جائے۔ سب بیویوں کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے شوہر کا ذریعہ آمدنی کیا ہے۔ اس میں کتنا جائز ہے اور کتنا ناجائز۔ وہی اچھے گھر' اچھے کپڑے' شان اور آن کی خاطر مردوں کو آمادہ کرتی ہیں رشوت لینے پہ۔ وہ قناعت نہیں کرتیں۔ مقابلے پر آ جاتی ہیں ہر معاملے میں۔"

"سب عورتوں کو الزام دے کر تم خود کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتے ہو۔ تو مرد کیا خواہشات نہیں رکھتے؟" نازو بگڑ کے بولی۔

"سوری۔ میری مراد آپ سے نہیں تھی۔ بی بی ------ EXCEPTIONS ARE ALWAYS THERE مگر ہم عمومی بات کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ کون سا موقع ہے عمومی یا خصوصی موضوعات پر بحث کرنے کا؟"

غالب نے کہا "اب کس کا انتظار ہے؟"

"کسی کا نہیں۔ فوراً نکل جانا چاہیے ہمیں یہاں سے" اکبر خان نے کہا "وہ خبیث الزماں چور دروازے سے نکل بھاگا ہے اپنے حواریوں سمیت۔"

"کیا وہ واپس آئے گا؟"

"واپس کیوں نہیں آئے گا۔ اسے تو ہم نے موقع فراہم کر دیا ہے تشہیر کا۔ وہ آس پاس کے گاؤں دیہات میں مریدوں کے جذبات بھڑکائے گا۔ میرے خلاف زہر افشانی کرے گا۔ مقامی پولیس اور حکام بالا سے رجوع کرے گا۔ راجا حق نواز اس کے ساتھ ہے۔"

"وہ بار بار کسی راجا کو اطلاع دینے کا کہہ رہا تھا۔"

"راجا حق نواز ایس پی ہے علاقے کا۔ وہ اس کا مرید ہے۔ اس کی بیوی تو سخت عقیدت مند ہے۔ خلیفہ نے ہی اسے اولاد کی نعمت دی۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "خلیفہ گیگر کی طاقت کم نہیں ہے یہاں۔ وہ اپنی جدی پشتی گدی سے کیسے دستبردار ہو سکتا ہے۔"

"یہ بھی ایک انڈسٹری ہے" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ خلیفہ نکل گیا۔ ابھی تو مجھے اس سے حاجی صاحب کے خون کا حساب لینا تھا۔" غالب بولا۔

"چلو یار زندہ صحبت باقی۔ پھر آئیں گے کبھی۔ جب اس کا بزنس جم چکا ہو گا" میں نے کہا۔

"میں آگے جیپ میں چلتا ہوں' تم لوگ پیچھے کار میں آؤ۔ فاکس ویگن چھوڑ دو۔" اکبر خان بولا۔

اب ڈرائیونگ مجھے کرنی پڑی۔ غالب نے مجھ سے پہلے ہی عذر پیش کر دیا تھا "داد شجاعت دیتے ہوئے میں غازی سے شہید کے مرتبے پر فائز ہوتے ہوتے رہ گیا۔ زخموں سے چور ہوں۔"

میں نے کہا "دیکھنے میں تو پہلے سے زیادہ چنگے بھلے لگ رہے ہو۔"

"اندرونی چوٹیں ہیں" غالب نے مکاری سے کہا "ویسے بھی اب تو میں اس سیٹ پر بیٹھ گیا تھا تم سے پہلے۔ اب تم مجھے اٹھا کے وہ تو کرو گے جیسی بزم ناز میں اپنے مرزا غالب کے ساتھ ہوئی تھی۔"

میں نے کار اسٹارٹ کر کے کہا "بزم ناز چاہیے غیر سے تہی' سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں۔"

رابعہ ہنسی تو نازو نے کہا "مجھے بھی مطلب سمجھاؤ تاکہ میں بھی ہنسوں۔"

غالب نے کہا "کیا ہم واپس وہیں جا رہے ہیں' اکبر اعظم کے محل میں؟"

"میں وہاں ایک منٹ نہیں رکنا چاہتی" نازو بولی۔

"ٹھیک ہے۔ ایک گھنٹا رک جائیں گے" غالب بولا۔

"اس سے پوچھیں تو سہی کہ اس نے ہمارے کندھے پر رکھ کے بندوق کیوں چلائی ہے؟" میں نے کہا "اس کو بھتیجے خلیفہ گیگر کے ساتھ کسی پرانی دشمنی کا حساب بے باق کرنا تھا۔ بہانہ اس نے مہمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو بنا لیا۔ حالانکہ اسے معلوم

www.paksociety.com

ہو گیا ہے کہ ہم نے جھوٹ بولا تھا خلیفہ کے سامنے۔"

"کیسا جھوٹ بولا تھا؟" رابعہ نے کہا۔

"میں نے کہا تھا کہ تمہارے ککر۔ خدا نخواستہ میرے منہ میں خاک۔ تمہیں اغوا کر کے لے گئے۔ اکبر خان نے پھر بھی نہیں پوچھا کہ اس جھوٹ کی کیا ضرورت تھی اور یہ جھوٹ ہے تو سچ کیا ہے۔ کیا واقعی جو آدمی آئے تھے رابعہ کو اٹھانے مگر تم نے چار کو بھاگنے پر مجبور کر دیا اور وہ کو پکڑ لیا۔"

غالب بولا "اور جب گاڑی میں چار لاشیں ملیں گی تو اسے پتا چل جائے گا۔"

"تمہیں تو اس نے ایک اخبار کا خود ساختہ ایڈیٹر بنا کے بھیجا کرایا تھا" میں نے کہا "رابعہ کو اغوا کرنے کی ناپاک جسارت پر خلیفہ ککر کو ایسی عبرتناک سزا دے کے اس نے گویا مجھے ممنون بنا لیا ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے۔"

"اصل بات وہ تمہیں نہیں بتائے گا۔ شرط لگا لو" غالب نے کہا "یہی کہتا رہے گا کہ خلیفہ نے میرے گھر میں گھس کے میرے مہمانوں کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ ایک پٹھان کو مہمان کی عزت جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ اصل بات بعد میں معلوم ہو گی۔"

"تم نے میری بات سنی؟" نازو نے کہا "ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے سیدھے لاہور چلو۔"

"سیدھے تو نہیں جا سکتے۔ تم جو چاہو کر لو۔" غالب بولا۔

"آخر کیوں نہیں جا سکتے؟"

"اس لیے کہ بہت سے موڑ ہیں راستے میں" غالب نے سادگی سے کہا۔

میں نے کہا "تم سیدھی لاہور کیوں نہیں گئی تھیں؟ ابھی تک ہم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں تھا۔"

"ہماری مرضی۔ کیوں نازو" رابعہ ہنسی۔

"بالکل ہماری مرضی۔ تم اپنی مرضی کرتے ہو تو ہم کیوں مانیں تمہاری بات۔ ہم نے کتنا سمجھایا تھا کہ کسی چکر میں مت پڑنا۔"

"یہ مقدر کے چکر ہیں۔"

"تم نے ہمیں چکر دیا تھا۔ میں نے تو بتا دیا تھا رابعہ باجی کو کہ یہ اتنے سیدھے بھی نہیں ہیں جتنی کہنے کی رسم ہوتی ہے۔"

"میں نے ایک کتا دیکھا تھا جس کی دُم ایک انچ تھی۔ بالکل سیدھی۔ باقی کٹ گئی تھی" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ آپ لوگوں نے ہمیں بالکل سچ سمجھ کے اپنے ناقص العقل ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ ہم راضی ہو گئے تھے کہ خلیفہ ککر کو چھوڑیں گے نہیں۔ اس سے پوچھیں گے ضرور کہ یہ اس کے ایما پر ہوا تھا تو کیوں؟"

"اس سے تو ہماری دور اندیشی ثابت ہوتی ہے" رابعہ نے احتجاج کیا۔

"دور اندیشی ہوتی تو نہ خود جاتیں نہ ہمیں کہیں جانے دیتیں۔ اپنے ساتھ لے جاتیں" میں نے کہا۔

"دراصل کیا نکتہ پیدا کیا ہے استاد۔ ثابت کر دیا ناقص العقل" غالب نے خوش ہو کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"شکریے ہو تم لوگ۔ ہم نے سمجھ لیا۔"

"تم نے خاک سمجھا" غالب بولا "کون سی توپ چلا دی ہے؟ کوئی ککر اٹھا کے لے جاتا تو ساری عمر غالب کو روتیں۔"

"رو رہی ہے میری جوتی۔ تم میں کون سے لعل لگے ہیں؟" جل کر بولی۔

"میں خود لعل بنی ہوں۔ کوہ نور ہیرا ہوں۔ تم ہو مسکین کی جوتی اور یہ اعزاز ہے تمہارے لیے۔" غالب بولا۔

میں نے فوراً مداخلت کی "مرزا جی! وہ اخبار فروش کا پُراسرار کریکٹر ہے۔ میں تو اسے تمہارے ساتھ دیکھ کے حیران تھا۔ وہ کہاں ہے؟"

"معلوم نہیں کس وقت غائب ہو گیا۔"

"وہاں کیا کر رہا تھا وہ؟"

"مجھے تو کہہ رہا تھا کہ کسی کے ساتھ آیا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ وہ اکبر خان کے محافظوں کے ساتھ تھا۔ معلوم نہیں تو کر کے ان کے ساتھ ہی یہاں پہنچ گیا تھا۔ بے پُراسرار ہے۔"

"نام پوچھا تھا اس کا؟"

"اس نے تو کہا تھا کہ میں بیک وقت شہزادہ بھی ہوں اور زادہ بھی۔ کیا مطلب ہو سکتا ہے اس احمقانہ بات کا؟ اس نے خلیفہ ککر کے بارے میں بڑی تفصیلی معلومات فراہم کی تھیں۔ ککر کے نقطے سے وہ ایسے واقف تھا جیسے یہاں رہ چکا ہو حالانکہ کا چوہڑ نگی ہے۔"

"چوہڑ نگی؟" نازو بولی۔

"اپنے کان کا میل صاف کراؤ۔ چوہڑ کہا تھا میں نے۔ ایک محلہ۔ وہاں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا ہے۔ باپ کا توازن کچھ ٹھیک نہیں ہے اور ماں معذور ہے۔"

"کیا معذوری ہے؟" میں نے کہا۔

"دونوں ٹانگیں بیکار ہیں۔"

"پیدائشی طور پر؟"

"نہیں۔ ایک حادثے میں ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی تھی۔ مہرے ٹوٹ گئے تھے یا سرک گئے تھے۔ اخبار کے معاملے میں دلچسپی تھی اس کی۔ میں نے بتایا کہ برخوردار وہ مذاق کی بات تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ بھی رپورٹر ہو سکتا ہے۔ عجیب بات کی اس نے۔ کہنے لگا میں ایک بہت بڑی اسٹوری لایا اخبار کے لیے۔ اکبر خان کے بارے میں۔"

"پھر تم نے معذرت کر لی؟"

"ظاہر ہے۔ میں نے کہا کہ سب سے پہلے وہ

ذہنیاں بندی کر رہے ہیں۔ وہ تھوڑا سا مایوس ہوا پھر وہی جس ... نے لگا۔ میں نے پھر پوچھا تو اس نے اپنا نام نشان تمہاری بات کی تصدیق اکبر خان نے کی۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ چلا۔ اس کی ... وہ اخبار والا لڑکا نشان تم سے کیا باتیں کر رہا تھا۔ ایسے ہی پوچھا اس نے بار بار ... پریشان ہوا تھا نشان کو دیکھ کر۔"

"اگر ہوا تو اس نے مجھ پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ جب ہنگامہ شروع ہوا تو مجھے اس کا خیال نہیں رہا۔ نہ جانے کس وقت غائب ہو گیا۔"

"یار تو نہیں کیا نے جانا؟"

"نہیں، میں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا ہر جگہ" غالب نے کہا۔

"اس سے ملنا ضروری ہے۔ اس نے کچھ کام کی باتیں بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ یار ہے نا؟" میں نے غالب کو آنکھ ماری۔

"یہ کیا گڑبڑ اور بدمعاشی ہے۔ رابعہ باجی! یہ لوگ ایک دوسرے کو آنکھیں مار رہے ہیں۔"

"اور کیا مارتیں؟ لاتیں مُکے؟" غالب نے کہا۔

"ارے بھئی آنکھ مارنے میں کیا بدمعاشی کا پہلو ہے؟" میں نے کہا "یہ خود دیکھنے والے کی نظر کا قصور ہے۔"

"اور دماغ کا فتور ہے" غالب بولا "حق حلال ہوتی ہے کسی کی تو میں پیار سے سب کے سامنے آنکھ مار سکتا ہوں۔"

"تم کچھ کہہ رہے تھے غالب سے لیکن اس کا مطلب کچھ اور تھا" نازو نے کہا۔

"اچھا تم نے سمجھ لیا۔ ماشاءاللہ بہت سمجھدار ہو" میں نے کہا "دراصل اس اخبار والے نے کہا تھا کہ وہ ہیما مالنی اور زینت امان کے گھر کا پتا دے گا اور ہم بھاگ جائیں گے بمبئی۔ میں اور غالب۔"

"اور پردہ سیمیں پر جلوہ گر ہوں گے انہی کے ساتھ۔"

"کیا بات ہے ہیما مالنی کی" میں نے کہا "ساری اردو شاعری اس پر قربان۔"

"اور جواب نہیں زینت امان کا۔ مصوری کے سارے رنگ اس کے سراپا کا ایک نقش نہیں کھینچ سکتے۔"

"جلو جاؤ" نازو بولی "ہمیں کیا بتا رہے ہو۔ ہم نے پہلے روک رکھا تھا کیا۔"

"تم نے کیا وہ جھوٹ ہے نا میرا سسر وہ بھی ہوتے تو میں اسی ملتانی دھی لے دوں اس کی" غالب نے ذہنی ہچکی ...

"زاہد صاحب، وہ تمہیں لے جائے گا بھرت بنا کے اپنے ساتھ۔"

غالب نے سر ہلایا "ہاں تمہیں زیادہ علم ہو گا والد مرحوم کی طرز و اطوار کا۔ تم بھی تو جیت گئی ہو بلا کے مجھ سے۔"

"مکھو ذرا دیکھو اب اس نے جھوٹ کہا ہے میرے ابا کو تمہارے سامنے" نازو نے بگڑ کے کہا۔

"میں نے نہیں، خود تم نے کہا ہے۔"

"کیا میں بلا بن کے جیتی ہوں تم سے؟" اس نے روتی آواز میں کہا۔

"ہاں۔ مگر خوب صورت بلا بن کے" غالب نے فوراً پینترا بدل لیا "اور کیا فرق ہے۔ مقناطیس لوہے سے جیتے یا لوہا مقناطیس سے۔ چھری گرے خربوزے پر یا خربوزہ گرے چھری پر۔"

"خربوزے ہو تم واقعی۔ ذرا سی دیر میں لڑھک جاتے ہو۔"

"اور تم وہ چھری ہو جس نے مجھے حلال کر دیا ہے۔ مگر اس کے باوجود۔ آہ زینت امان" غالب بولا "اور وائے زینت امان۔"

ایک بار پھر ہم اکبر خان کے گھر پہنچے تو کھانے کے بعد نازو نے ضد شروع کی "ہمیں اب نکل چلو۔"

رابعہ نے اس کا ساتھ دیا "وہاں سب پریشان ہوں گے۔"

غالب نے کہا "یار! اتنی جلدی کیا ہے۔ مظفر کو فون کر لیجئے۔ ذرا اپنے اکبر خان سے مذاکرات کا ایک راؤنڈ اور ہو جائے۔ اخبار کا معاملہ کا حل ہو جائے۔"

"لاہور سے فون کر لینا" نازو بولی "مجھے لگتا ہے کہ ہم یہاں رکے تو اور کچھ ہو جائے گا۔"

رابعہ نے کہا "اکبر خان کا کیا ہے لندن بھاگ جائے گا۔ ہم نے خلیفہ ککر کی خانقاہ کو تباہ کر کے اپنے دشمنوں میں ایک اور خطرناک دشمن کا اضافہ کر لیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہتی ہو تم۔ مجھے بات اس حد تک بڑھ جانے کی امید نہیں تھی۔ نہ میں ایسا چاہتا تھا۔"

"یہ سب اکبر خان نے کرایا ہے۔ اس نے عزت کا مسئلہ بنا کے بات کو بڑھایا اور ہمیں ننگے کر دیا۔ اس کے محافظوں نے فائرنگ شروع کی اور درحقیقت اس جھگڑے معاملے کا انجام ذمے دار وہی ہے مگر نام ہمارا لیا جائے گا۔ میں تو یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ گزشتہ رات جو لوگ آئے تھے یہ بھی اکبر خان کی سازش تھی۔ اسی لیے وہ خود غائب ہو گیا تھا۔"

میں نے کہا "کبھی کبھی تم اتنی عقلمندی کی باتیں کرنے لگتی ہو کہ میں سوچتا ہوں اپنی رائے پر نظرثانی کروں۔"

"نہیں، تم سمجھتے رہو ہمیں ناقص العقل" نازو بولی۔

"رائے تو مقدر بدل رہا ہے، میں اپنی رائے پر قائم رہوں گا۔ جب تک تم بھی کوئی عقل کی بات نہیں کرو گی۔ قرار غلطی سے کرو۔"

"تم جیسے کسی احمق کے سامنے عقل کی بات کرنے سے فائدہ؟"

"یار، یہ لڑائی مت شروع کرو۔ ذرا سنجیدگی سے صورت حال پر غور کرو۔ ہمیں واقعی یہاں سے نکل جانا چاہیے" میں نے کہا

www.paksociety.com

"ایک تو استاد پیڑو کو معلوم ہے کہ ہم یہاں ہیں۔ میں دوبارہ اس شخص کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ کیا پتا دلاور کی دشمنی میں اس نے خلیفہ کے ساتھ مل کے یہ سب کیا ہو۔"

"اسے کیا فائدہ ہوگا؟"

"ایک احسان تو اس نے یہ کیا کہ ہمیں آزاد کرا دیا۔ دوسرا احسان اکبر خان کی معرفت یہ کیا کہ ہمیں ایک اخبار نکالنے کا منصوبہ پیش کر دیا۔ اس پیش کش کو ہم ٹھکرا بھی نہیں سکتے۔ اس نے اکبر خان کی مدد کی' اسے وہ کرائے کے بدمعاش فراہم کیے جو درحقیقت ککر نہیں تھے۔ وہ خلیفہ کے [illegible] نہیں تھے۔"

غالب بولا "فرض کرو انھوں نے جھوٹ بولا تھا خلیفہ کے سامنے۔ پھر یہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی کہ ہم نے انھیں راہ چلتے اٹھا لیا تھا؟"

"اور کیا وہ اعتراف کرتے کہ اکبر خان کے گھر میں گرفتار ہوئے تھے؟ پھر تو انھیں باقی ساتھیوں کے بارے میں بھی سب کچھ بتانا پڑتا۔ جب وہ ہاتھ پاؤں سے بندھے تھے تو انھوں نے متوقع حالات کے پیش نظر ایک کہانی بنالی تھی اور انھوں نے اتفاق رائے سے خلیفہ کے سامنے ایک ہی بات کی۔ میرا خیال ہے ان کو خود اکبر خان کے محافظوں نے مار دیا ہوگا۔ وہ بھاری معاوضے کے لالچ میں آئے ہوں گے۔ ممکن ہے انھیں ایڈوانس ادائیگی بھی کر دی گئی ہو' اس یقین دہانی کے ساتھ کہ ان کا کام بہت آسان ہوگا۔ چھ مسلح افراد کی راہ وہ غیر مسلح افراد کیسے روک سکتے ہیں۔ گھر کے اندر انھیں کسی ملازم کی طرف سے مزاحمت کا سامنا نہیں ہوگا مگر افشائے راز سے پہلے ہی ان کو ختم کرنا ضروری تھا۔"

"رائٹ" غالب نے کہا "بات سمجھ میں آتی ہے۔ اسی لیے چوکیدار بھی نہیں تھا۔"

"اکبر خان تو کہتا ہے کہ وہ مارا گیا" رابعہ نے کہا۔

"مارا گیا تو اس کی لاش کہاں ہے؟ اکبر خان کو فکر کیوں نہیں ہے اس کی۔ شاید اس نے کسی سے کہا کہ چوکیدار کو تلاش کریں' نہ رپورٹ لکھوائی اور نہ پولیس کو بتایا" نازو نے کہا "سب کچھ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد' ہر تفصیل پر غور کرنے کے بعد پلان کیا ہوگا مگر ایسی ہی کوئی نادانستہ بھول ہر مجرم سے ہو جاتی ہے۔"

غالب بولا "سچ کہتی ہو عزیزہ۔ زندگی میں ایک ایسی ہی بھول مجھ سے بھی ہوئی تھی۔ بھگت رہا ہوں آج تک۔"

"غالب!" میں نے اسے ٹوکا "سنجیدہ بات ہو رہی ہے۔"

"او سوری' میں سنجیدہ کے بجائے رنجیدہ ہو گیا تھا۔ خیر آپ اپنا بیان جاری رکھیں مس نازو۔"

میں نے کہا "آپ ذرا شروع سے سلسلۂ حالات اور واقعات پر غور کرو تو کڑیاں آپس میں ملتی نظر آتی ہیں۔ دلاور نے پبلک لائف میں اپنا امیج بنانے کے لیے جو حکمت عملی مرتب کی ہے اس کے مطابق یہ اشد ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ پرانے دشمنوں کے خطرے کا سدباب کرے جو اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ ایسی باتیں جو کوئی اور نہیں جانتا۔ اس کے [illegible] یعنی ہم بلیک میلر تو ہیں نہیں کہ اس کے ماضی کی ہر خامی [illegible] غلطی گنوا دیا جرم کے بارے میں اپنی زبان بند رکھنے کی قیمت طلب کریں۔ ہم قابل خرید بھی نہیں ہیں کہ وہ منہ مانگی قیمت دے کر ہمیں اپنا ہمنوا بنا لے۔ ایسی صورت میں مصالحت کی پیش کش واحد طریقہ تھا جس کے لیے اس نے ایک منصوبہ بنایا۔

اس نے لاہور سے پشاور تک استاد پیڑو کو ہمارے پیچھے لگایا اور اس کے دو مقاصد پورے ہوئے۔ اس نے ہمیں ہراساں کیا اور ہمارا سراغ گم نہیں ہونے دیا۔ پیڑو نے پشاور میں ہم پر قاتلانہ حملوں کا ناٹک کیا۔ یہ احتیاط ملحوظ رکھتے ہوئے کہ ہم کو خراش بھی نہ آئے۔ وہاں بیچ میں آ گیا آصف علی۔ آصف علی کو اس نے فوراً کاٹ دیا اسے وحشت زدہ کرکے اور ناٹک کا دوسرا سین خود چودھری دلاور نے پیش کیا۔ ہمیں اغوا کرکے آصف علی کے گھر سے اٹھوا لیا گیا' آصف علی کی بیوی اور [illegible] سمیت۔ دلاور نے ہم سے براہ راست بات کی۔ ہمیں یقین دلایا کہ سارا ڈراما استاد پیڑو کا تھا۔ وہی میرے والد وزیر خان کا قاتل تھا اور اسے میرے حوالے کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہم اس کی [illegible] چھوڑ دیں۔ وہ پبلک لیڈر بننا چاہتا ہے اور اپنے بدنام ماضی کو [illegible] کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اسے ہماری ہر شرط منظور تھی۔ وہ مستقبل کی نیک نامی کی گارنٹی چاہتا تھا۔ ہمیں اس بات کا یقین دلانے کے بعد کہ اب اس کے اور ہمارے درمیان دشمنی کا [illegible] ختم اور مصالحت کی کوشش کے آغاز کے طور پر اس نے ہمیں ایک قیمتی کار تحفے میں دے کے عزت کے ساتھ رخصت کیا۔

چودھری دلاور نے واضح کیا تھا کہ اب وہ استاد پیڑو جیسے [illegible] زمانہ اور بدکردار لوگوں سے تعلق نہیں رکھ سکتا اور نہ پرانے دھندے جاری رکھنا چاہتا ہے۔ اسے ضرورت بھی نہیں کیونکہ بہت کما چکا ہے اور اب یہ کمائی خدمت خلق اور ملک و قوم کی نذر ہے۔ بقول اس کے یہ عز و شرف۔ انتخابات میں حصہ لینا تو ملک کی محبت اور قوم کے درد کا نتیجہ ہے۔ ہوس جاہ وغیرہ کا نہیں۔ اتنا تو دلاور سمجھتا تھا کہ ہم آنکھیں بند کرکے اس کی بات کا یقین کر لینے والے بہرحال نہیں ہیں۔

اب تیسرے سین میں نمودار ہوتا ہے استاد پیڑو۔ اس نے پوری زندگی کی مظلومیت' تلخ حالات' نفرت انگیز ماحول سے ملنے والے احساس محرومی کو اپنی مجرمانہ زندگی کا سبب بنا کے ہماری ہمدردی سمیٹی۔ یہ بتایا کہ اسے دلاور نے بھی دھوکا دیا۔ پہلے اس نے ہر غلط کام لیا' اب خود قوم کا لیڈر بننا چاہتا ہے تو پاکیزگی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے اور اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا ہے۔ اس نے ہمیں دلاور کے خلاف اشتراک کی پیش کش کی۔ اس نے کہا' مجھے بھی جینا ہے اور تمھیں بھی۔ ہمارے خلاف ایک طاقتور دشمن ہے۔ ہم مل کے اس کا مقابلہ کریں۔

پیڑو نے دلاور کے الزامات کی تردید کر دی اور الٹا یہ ثابت کیا کہ خود چودھری دلاور نے وزیر خان کی المناک موت کے حالات پیدا کیے تھے اور اصل مجرم وہی ہے۔ وہ اس کا ثبوت فراہم کرے گا۔ اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کے لیے اس نے ہمیں آگہی میں [illegible]۔ بقول اس کے ہم دلاور کی قید میں تھے اور اسے علم تھا کہ ہمیں کہاں رکھا گیا ہے۔

چودھری دلاور نے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمیں خلیفہ ککر کی خانقاہ تک پہنچایا۔ اکبر خان ویسے تو انکار کرتا ہے کہ چودھری دلاور اس کا بھائی نہیں ہے۔ اس کا بھائی دلاور خان تھا اور وہ مارا گیا تھا۔ اب تضاد ملاحظہ ہو۔ اکبر خان کے بارے میں استاد پیڑو نے بتایا تھا کہ اسے دلاور نے غرق کر دیا تھا۔ اکبر خان کہتا ہے کہ غرق ہونے والا دلاور تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سا دلاور تھا؟ چودھری دلاور یا اس کا بھائی دلاور خان؟ اور وہ دلاور خان تھا تو پھر یہ چودھری دلاور پشاور کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں کے قبرستان میں والدین کی قبر پر کیوں حاضری دیتا ہے؟ کیوں اس نے وہاں ایک مسجد بنوائی ہے؟ اگر یہ کوئی اور دلاور ہے تو پھر اکبر خان کے گاؤں میں اس کے باپ سے ملنے کیوں گیا تھا اور اس کی موت کے بعد جنازے میں کیوں شریک ہوا تھا؟ جنازے میں یا شاید سوئم میں۔ ظاہر ہے وہ دلاور ہی کا باپ تھا۔ اگر میں تصویر دکھاؤں گا تو آصف علی بھی پہچان جائے گا اور اس گاؤں میں بہت سے لوگ ہوں گے جو دلاور خان کو چودھری دلاور کی حیثیت سے بھی پہچان لیں گے۔

ساری بات بہت واضح ہے۔ چودھری دلاور اور اکبر خان دونوں سگے بھائی ہیں جن کا باپ لکڑی کا کام کرنے والا ایک ہنرمند مگر غریب اور گمنام آدمی تھا۔ کسی مشترک مقصد کے تحت وہ آپس کے اختلافات بھلا کے پھر مل گئے ہیں۔ چودھری دلاور نے اکبر خان کو ٹپ دی ہوگی کہ خلیفہ ککر کی خانقاہ سے سب بندے "اٹھالو" خرید لو۔ براہ راست قیمت ادا کرکے تو یہ کام کیا نہیں جا سکتا۔ ان پر احسان کرو' ان کے ساتھ کوئی نیکی کرو' انھیں سلیقے سے رشوت دو۔ مثلاً وہ سب پڑھے لکھے' خبطی قسم کے لوگ ہیں۔ ان کو لائن دو اخبار کی۔ اخبار نکالو اور معاشرے سے لڑو۔ انھیں بہت شوق ہے معاشرے کی اور ساری دنیا کی اصلاح کا۔ یہ کہو کہ چودھری دلاور جیسے لوگوں کے خلاف جہاد میں تم ان کے ساتھ ہو۔ دامے درمے سخنے یعنی جان اور مال کے ساتھ اور اصولی طور پر۔

ہم ٹپ ہو گئے۔ اکبر خان بہت بڑا اور ذہین شکاری تھا۔ اس کے ساتھ مل گیا دلاور جیسا پرانا شکاری۔ آپس میں مل کے انھوں نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بعد میں معلوم ہوگا کہ انھیں خلیفہ ککر کو اپنے راستے سے ہٹانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی تھی۔ لیکن یہ کام انھوں نے ہمارے ذریعے کیا۔ بندوق ہمارے کندھے پر رکھی۔ پیڑو نے اناڑی قسم کے بدمعاش فراہم کیے۔ دلاور نے معاوضہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم ککر ہیں اور ہم رابعہ کو اٹھانے آئے ہیں۔ جیسے میں نے خلیفہ کی آنکھوں میں ہوس کی چمک دیکھ لی تھی' ایسے ہی اکبر خان نے بھی دیکھی ہوگی۔ اس نے جعلی ککروں کو سمجھایا کہ وہ رابعہ کو اٹھا لیں۔ خود کو ککر کہیں۔ جیوے ککر کے نعرے لگائیں اور اس کام کا معاوضہ اتنا بڑا ہوگا کہ وہ تیار ہو گئے۔

اب مجھے یقین ہے کہ اکبر خان اور دلاور نے ان حملہ آوروں کو بھی غلط فہمی میں مروا دیا۔ انھیں یقین دلایا کہ مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن خود انھیں معلوم ہوگا کہ وہ مارے جائیں گے۔ ہم کو جتنی اچھی طرح دلاور جانتا تھا' وہ جعلی ککر نہیں جانتے تھے۔ انھیں یہ بھی غلط بتایا گیا کہ ہم مسلح نہیں ہوں گے۔ نوکروں سے شاید کہا گیا ہوگا کہ آج رات کوئی زبردستی گھر میں گھس آئے تو شور ہنگامہ مت کرنا۔ وہ حکم کے غلام' ان کی کیا مجال جو پوچھیں کہ آنے والے کون ہوں گے اور کیا کریں گے۔ قاضی کے گھر کے چوہے ہیں نا۔ سیانے تو تھے۔ خاموشی سے لیٹے رہے۔

مارے گئے وہ بے چارے جن کو دولت کی چمک نے اندھا کر دیا تھا۔ انھیں بدمعاش ہونے کا زعم بھی ہوگا اور پیسہ بھی بہت مل رہا تھا ایک معمولی سے کام کا۔ یہ تو کام میں ہاتھ ڈالنے کے بعد پتا چلا ہوگا کہ وہ پھنس گئے ہیں۔ چار مارے گئے' دو پکڑے گئے۔ اکبر خان نے ان کو شکوہ شکایت کا موقع ہی نہیں دیا اور نہ ان کی سنی۔ ان کے ہاتھ پیر باندھ کے اسی طرح [illegible] خلیفہ کے سامنے لے جایا گیا۔ وہاں بھی انھوں نے بعد کے خطرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اکبر خان یا دلاور خان پر کوئی الزام نہیں عائد کیا۔ انھوں نے ہمیں مجرم بنا دیا۔ وہ ککر تھے ہی نہیں تو خود کو ککر کیسے مانتے۔ خلیفہ ککر خود اکبر خان کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہو گیا۔ وہ طے کرکے گیا تھا کہ اس کی جعلی خانقاہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا اور اس کی تیاری پوری تھی۔ اس نے بہانہ بنا لیا کہ تم نے رابعہ کو اغوا کرانے کے لیے میرے گھر میں اپنے مریدوں کو بھیجا اور میں پٹھان ہوں' مہمان کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والے کی ایسی تیسی کرنا میرا فرض ہے۔

اس نے یہ فرض پورا کیا اور اب صورت حال یہ ہے کہ ہم ہر طرف سے چودھری دلاور' استاد پیڑو اور اکبر خان کے دوستانہ رشتے اور احسانات سے زیربار ہیں۔ تم اخبار کی پیش کش قبول کر چکے ہو۔ خلیفہ ککر کے سارے مرید بھی ہماری جان کے بدترین دشمن ثابت ہوں گے۔ ایسے لوگ جو روحانی عقیدت رکھتے ہوں' بڑے جنونی ہوتے ہیں اور پیر صاحب کے حکم کے بغیر بھی ان کی خاطر جان دینے کو عین سعادت تصور کرتے ہیں۔ ان میں نہ جانے کتنے ایسے ہوں گے جو ہمیں مار کے "جیوے ککر" کے نعرے لگاتے

www.paksociety.com

پھانسی چڑھ جانا پسند کریں گے۔ ہمارے لیے ایسے حالات پیدا کردیے گئے ہیں اور آگے بھی پیدا ہوں گے کہ بالآخر ہمارے لیے چوہدری ولاورسے مصالحت ناگزیر ہوگی۔ ہم اکبر خان کا سہارا لیں گے یا استاد پیڈرو سے مل جائیں گے۔ یہ ایک مثلث ہے ہم اس مثلث کے کس کونے پر قدم رکھیں گے یہ فیصلہ ہونے تک کچھ نہیں ہوگا۔ استاد پیڈرو، ولاور اور اکبر خان خاموشی سے نتائج کا انتظار کریں گے۔ ہمیں اگلی چال چلنے سے پہلے بہت سوچنے کی ضرورت ہے۔ طریقِ جنگ دو ہی ہیں۔ کھلی جنگ یا گوریلا جنگ۔ مگر ایک تیسرا طریقہ وہ ہے جس میں جنگ کسی کو نظر نہیں آتی محسوس بھی نہیں ہوتی لیکن جاری رکھی جاسکتی ہے۔ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اسی جنگ کا فلسفہ ہے۔"

میں نے کھل کے واقعات اور حالات کا تجزیہ کردیا تھا اور وہ سب کہہ دیا تھا جو میرے دل میں تھا لیکن یہی سب کچھ دوسروں کے دل میں بھی تھا۔ مختلف خیالات اور نظریات، احساسات اور اندیشوں کے غیر مربوط ٹکڑے تھے جن کے بارے میں سب سوچتے تھے۔ بہت سی باتیں ذہن میں آئی ہیں لیکن وہم، شک یا وسوسے، غیر مبہم خیال کا عکس بن کے اور منتشر پرچھائیوں کی طرح۔ ہر ایک کے پاس JIG SAW PUZZLE کا ایک پیس تھا جو آپس میں سیٹ ہوکر ایک مکمل تصویر بناتے ہیں۔ میں نے انھیں جوڑا تھا اور اصل صورتِ حال امکان کی حد تک واضح ہوکے سامنے آگئی تھی۔

اس وقت جب میں اپنا تجزیہ پیش کررہا تھا غالب بڑی سنجیدگی سے غور و فکر میں ڈوبا ہوا تھا اور ایک ایک لفظ کو اپنے ذہن میں پرکھ رہا تھا، تول رہا تھا اور جانچ رہا تھا۔ اس کے مثبت اور منفی پہلو دیکھ رہا تھا اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کا موازنہ اپنے اندازوں سے کررہا تھا۔ خود نازو بھی پوری طرح متوجہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ کسی بھی جگہ غالب اور نازو نے اختلافِ رائے نہیں کیا اور اس اختلاف کو بنیاد بنا کے ایک دوسرے سے لڑنا نہیں شروع کیا۔ ان سب سے الگ ردِعمل رابعہ کا تھا جو حیرت کے ساتھ ایک پُرمسرت احساسِ تفاخر کے ساتھ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی اپنے گھر میں آویزاں مصوری کے کسی شاہکار پر زبان سے کچھ نہ کہے مگر جذبات سے ظاہر کرے کہ یہ تخلیق چغتائی یا زین العابدین کی نہیں میرے گھر کی ہے۔

ایک انتہائی سنجیدہ ماحول میں انتہائی نازک اور اہم موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے میں نے رازداری کے بنیادی اصولوں کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔ میں نے کئی بار کھڑکی کھول کے نیچے جھانکا اور بند دروازے کے باہر کوریڈور میں دیکھا کہ اکبر خان یا اس کا کوئی جاسوس تو ہماری باتیں نہیں سن رہا ہے۔ اس کمرے میں خفیہ مائیک، فون کی موجودگی کے امکان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا مگر خصوصی آلات کے بغیر ان کا سراغ لگانا محال تھا۔ کمرے کی آرائش کے اسباب میں ہمارے سامنے ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس پر شک کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود ہم سر جوڑے بیٹھے تھے اور میں تقریباً سرگوشی میں بول رہا تھا۔

میرے تجزیے سے کسی کو اختلاف نہیں تھا۔

نازو نے تو سب سے پہلے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا "مجھے سو فیصد بلکہ ایک سو ایک فیصد اتفاق ہے اور اسی لیے میں تو یہاں چلی۔"

رابعہ نے کہا "تم کیا کہتے ہو غالب؟"

"میں اپنی ذاتی عقل رکھتا ہوں اس لیے فوراً اتفاق نہیں کرسکتا اس نازو کی طرح" غالب نے کہا۔

"تم اختلاف کرہی نہیں سکتے" نازو نے کہا۔

"کیوں نہیں کرسکتا۔ زبردستی ہے؟" غالب نے تیوری چڑھا کے کہا۔

نازو نے آستین چڑھائی "ہاں ہے۔ تم اختلاف کرکے دکھاؤ اگر ہمت ہے تو۔ کوئی جمہوریت نہیں ہے یہاں۔"

"تمہاری حکومت بھی نہیں ہے۔"

"ہے" نازو نے چلا کے کہا "ایسے نہیں مانوگے تو پہلے پر روٹھ جاؤں گی پھر رونے لگوں گی زاروقطار۔"

"آنکھیں تا عورت کے اوچھے ہتھیاروں پر مگر تمہارے آنسوؤں سے میں بلیک میل نہیں ہوسکتا۔ رو کے بھی دیکھ لو۔"

"میں رُلا کے کیوں نہ دیکھ لوں" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

میرے روکنے سے پہلے اس نے چھلانگ لگائی۔ غالب بیڈ کے نیچے گھس گیا اور شور مچانے لگا "یار، یہ کیا غنڈہ گردی ہو رہی ہے سکندر۔ بالکل جن کا دورہ پڑگیا ہے اس بھوت کی بچی کو۔ یہاں تو میرے سسر تو ایسے شریف النفس بھوت ہیں۔ میں آپ ہی کو فون دے دوں گا انھیں کہ مجھے تو معاف کرو۔ شاہ جنات کے سپرد ہو تو امی۔"

نازو بیڈ کے نیچے بھی گھس جاتی مگر میں اور رابعہ درمیان میں حائل ہوگئے تھے چنانچہ غالب نیچے سے ہی بولتا رہا۔

"آخر کب تک نہیں نکلوگے باہر؟" نازو نے کہا۔

"نکلوں گا جب تم معافی مانگوگی ہاتھ جوڑ کے، ناک رگڑ کے میرے جوتوں پر۔ ورنہ صورِ اسرافیل پر بھی نہیں نکلوں گا۔" غالب بولا۔

میں نے نازو کو ایک طرف ہٹا دیا "چلو اتنا غصہ کافی ہے۔"

رابعہ نے کہا "اس نے تو خود ہی ثابت کردیا کہ تم سے کتنا ڈرتا ہے۔"

"ارے بابا، ڈر لے گئے اور بھوت سے تو ہر شریف آدمی ڈرتا ہے" غالب نے نیچے سے نکل کے کہا "نازو تو پکی سہیلی ہے میری۔ اس سے کون ڈرتا ہے۔ ہمارا آپس میں مذاق چلتا ہے۔ کیوں نہ چلے تم میری سہیلی ہو ایسے ہی میں تمہارا بوائے فرینڈ ہوں۔" بولا کر۔

نہیں؟"

نازو ہنس پڑی "بہت ڈھیٹ ہو تم بھی۔"

"یعنی کا مطلب ہے کہ سکندر تو خیر ہے۔"

شام تک تقریباً تین گھنٹے سے ہم اپنے کمرے میں تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے اتنی بڑی کوٹھی میں بس ہم ہی ہیں، ہمارے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ ہمارے میزبان کا کچھ پتا تھا، نہ کسی نوکر نے آکے جھانکا تھا۔ مجھے اور غالب کو چائے کی سخت طلب محسوس ہورہی تھی۔ رابعہ اور نازو نے ہماری خواہش کی تکمیل سے صاف انکار کردیا۔

"یہ کوئی منظر کا یا یوسف کا گھر نہیں ہے کہ میں اپنا گھر سمجھ کے گھس جاؤں کچن میں اور چائے بنا لاؤں۔" نازو نے کہا۔

"مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ عجیب آسیب زدہ اور پُراسرار قسم کا ماحول ہے" رابعہ بولی "اتنے بڑے گھر میں رونق کے آثار تک نہیں۔ قبرستان جیسی خاموشی رہتی ہے ہروقت۔ گھر میں گھر والے نہ ہوں تو وہ مکان.... نہیں، بھوتوں کا ڈیرہ لگتا ہے۔ آخر اس شخص کا گھر کہاں ہے؟"

"کچھ لوگ گھر کا روگ نہیں پالتے۔ تمہاری مراد بیوی بچوں والے گھر سے ہے نا؟" غالب نے کہا "خاندان، محلہ، شہر، وطن۔ ان کا کسی سے کوئی جذباتی تعلق نہیں ہوتا۔ ساری فکروں سے آزاد رہتے ہیں۔"

"یہ بھی کوئی زندگی ہے" رابعہ نے کہا۔

"اپنا اپنا اندازِ فکر ہے۔ اکبر خان شاید ان سب کی زندگی کو روایتی قیدِ شریعت سمجھتا ہوگا جو اپنی آزادی کو بہ رضا و رغبت اور جانتے بوجھتے ہوش و حواس صرف ایک عورت اور اس کی پیداوار پر قربان کردیتے ہیں اور تمام فکروں کو ہی خوشی سمجھتے ہیں" میں نے کہا۔ "یار، کسی نوکر کو بلانے کے لیے یہاں کوئی کال بیل قسم کی چیز نہیں ہے۔"

نازو بولی "یہ ٹیلی فون ہے یا انٹرکام ہے۔"

میں نے ریسیور اٹھا کے دیکھا۔ اس میں ٹون نہیں تھی "حد ہوگئی یار۔ یہ انٹرکام ہی تو ہے۔ اب پتا نہیں کون سا نمبر کس کا ہے۔"

غالب نے کہا "ایک نمبر یقیناً اکبر خان کا ہوگا۔ تم تو نمبر سے شروع کرو۔"

میں نے نو کے عدد والے بٹن کو دبایا۔ ہلکی سی موسیقی چند سیکنڈ گئی پھر کسی نے کہا "یس سر!"

میں نے کہا "یہ کون سی جگہ ہے، میرا مطلب ہے تم کون ہو؟"

"آپ حکم کریں سر۔"

"مجھے کچن کا نمبر دو۔ چائے چاہیے اور گیسٹ ہاؤس میں۔"

"سات نمبر ہے سر۔ میں کہہ دیتا ہوں۔"

"اکبر خان صاحب کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"ایک نمبر پر بات کرلیں۔"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا اور لائن کاٹ کے ایک نمبر کا بٹن دبایا۔ پھر چند سیکنڈ نرم گھنٹیاں سی بجتی رہیں پھر ایک مترنم شائستہ اور میٹھی آواز والی لڑکی نے کہا "یس سر؟"

اس نے سر نہیں کہا تھا جس سے صاف واضح تھا کہ جب اسے کوئی کال کرتا تھا تو وہ نیچے یا کم تر درجے کا ملازم ہوتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اکبر خان کی پرسنل سیکریٹری یا ورکی پرسنل اسٹاف ہوسکتی تھی۔

میں نے کہا "یہ اکبر خان کہاں ہے؟"

"تم کون ہو؟" اس نے انگریزی میں پوچھا مگر بہت تلخ لہجے میں۔

"یہ پوچھنے والی تم کون ہو؟" میں نے بھی انگریزی میں خاصی رعونت اور بے نیازی کا انداز پیدا کرکے کہا "اس کی وائف یا مسٹریس؟"

"آپ غالباً گیسٹ ہاؤس سے بول رہے ہیں سر۔ آئی ایم سوری۔" وہ بوکھلا گئی "اکبر خان صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ رات تک واپس آئیں گے۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا "کمال ہے۔ نوکر چاکر سب موجود ہیں۔

www.paksociety.com

"ایک بہت ہی سیکرٹ قسم کی میٹنگ ہے! تاہم چچا بھی ہے۔ اس کے باوجود گھر میں الو بول رہے ہیں۔"

"تین گھنٹے سے ایک ہی کمرے میں" غالب نے کہا۔

"اکبر خان پھر غائب ہے" میں نے کہا "اب پتا نہیں کس چکر میں نکلا ہوگا۔ ویسے تو آپ کے سو چکر ہیں۔"

"اس سے پہلے کہ ہم کسی نئے چکر میں پڑیں' نکل چلیں تو ہم نکل جائیں۔" نازو نے کہا "جب وہ ہمیں بتائے بغیر کہیں جا سکتا ہے تو ہم بھی آزاد ہیں۔"

"رائٹ۔ ہم آزاد ہیں یا نہیں' یہ بھی معلوم ہو جائے گا" میں نے کہا۔

"ہم جا کے پھر آ سکتے ہیں۔ لاہور جا کے فون پر بات کر سکتے ہیں" غالب بولا "اسے بتا سکتے ہیں کہ ہمیں اچانک جانا پڑا۔"

"ہم وضاحت کے پابند نہیں۔ جانا تھا' چلے گئے۔ اکبر خان ہوتا تو اسے بتا جاتے" رابعہ بولی۔

"اس کے آنے سے پہلے نکل چلو" نازو بولی "خاموشی سے۔"

"ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ہم چوروں کی طرح کیوں جائیں۔ بتا کے جائیں گے" میں نے کہا "ویسے بتانا بھی ضروری نہیں۔"

"بالکل ضروری نہیں۔ کس کی مجال ہے جو ہم سے پوچھے کہ کہاں جا رہے ہو اور کیوں؟" غالب نے کہا "خود اکبر خان پوچھے تو ہم صاف کہہ سکتے ہیں کہ جہنم میں جا رہے ہیں' تمہاری مرضی۔ تم کو کیا پریشانی ہے۔"

نازو ہنسی "مجھے چوہوں کی وہ میٹنگ یاد آ رہی ہے جس میں بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی قرارداد پیش کی گئی تھی۔"

"مسئلہ یہ! اتنا تم نے" کتنی بے عزتی ہوتی ہے تمہاری۔ تمہارے بہادر اور شیر سے زیادہ دلیر آباؤ اجداد کی ارواح تڑپ اٹھی ہوں گی تم کو چوہا کہنے پر" غالب افسوس سے سہلانے لگا۔

میں نے کہا "تڑپ تو تم رہے ہو۔ کیا تم میرے آباؤ اجداد کی روح ہو؟"

ایک خادم نے دروازے پر ناک کیا اور چائے کی ٹرالی اندر چھوڑ گیا۔ چائے اور کافی کے ساتھ تازہ پھل' ڈرائی فروٹس اور اسنیکس بڑے سلیقے اور وافر مقدار میں سجائے گئے تھے۔

"یہ ڈرائی فروٹ تو میں جیب میں ڈالوں گا۔ معذرت کے ساتھ" غالب نے کہا اور پستوں کی پلیٹ اٹھالی۔

"چھی۔ ندیدے..." نازو نے اسے ڈانٹا "رکھو پلیٹ۔"

غالب نے پلیٹ خالی کر کے رکھ دی "یہ میں راستے میں کھاؤں گا۔ خبردار جو کسی نے مجھ سے ایک دانہ بھی مانگا۔"

میں نے دوسری پلیٹ اٹھا کے کاجو کو اپنی جیب میں منتقل کیا "[illegible]"

"یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟" رابعہ بولی۔

غالب بولا "تمہاری ناک کٹوانے کے کام کر رہے ہیں ہم ندیدے لوگ۔"

اسی وقت انٹرکام کا بزر بولا۔ میں نے ریسیور اٹھالیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اکبر خان آگیا ہو مگر نمبر چوکیدار نے ملایا تھا "میں گیٹ سے بول رہا ہوں سر۔ چوکیدار۔ وہ لڑکا جو اخبار ڈالتا ہے ادھر میں' بولتا ہے کہ آپ نے اخبار کے پیسے نہیں دیے تھے صبح۔"

"ٹھیک بولتا ہے۔ اسے اوپر گیسٹ ہاؤس میں پہنچا دو۔"

"یس سر۔"

"اور چوکیدار! تم تو کل چھٹی ہو گئے تھے نا؟"

"جی! آپ کیا بولا سر؟"

"کل رات تم کہاں تھے؟" میں نے کہا۔

"ہم کو صاحب چھٹی دیا تھا۔ ہم اپنا بی بی کے پاس گیا تھا اسپتال۔ اپنا نیا بچہ کو دیکھنے کے لیے۔"

"تم صاحب کو بتا کے گئے تھے کہ رات کو لوٹ کر نہیں آؤ گے؟"

"رات کو کیسے آتا سر۔ لارنس پور سے۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا "اکبر خان کا چوکیدار کل رات چھٹی لے کر گیا تھا۔ لارنس پور میں اس کی بیوی کے اسپتال میں بچہ ہوا تھا۔ وہ رات کو لوٹ کے آ ہی نہیں سکتا تھا پھر وہ قتل کیسے کر سکتا تھا۔ یہ سوچنے کی بات! شان کو لے کر آ رہا ہے چوکیدار۔"

چائے پیتے ہوئے ہم نے اکبر خان کی سازش کی تفصیلات کا مزید پوسٹ مارٹم کیا۔ چوکیدار کے بیان سے میرے شبہات کی تصدیق ہوگئی تھی۔ اس نے خود ہی راستہ کھلا چھوڑا تھا مگر ہمارے سامنے اس نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔

جب دس منٹ تک کوئی اوپر نہیں آیا تو میں نے سات نمبر دبایا۔ یہ کچن کا نمبر تھا "یس سر!"

"گیٹ کا نمبر کیا ہے؟ میں گیسٹ ہاؤس سے بول رہا ہوں۔"

"نمبر آٹھ سر۔"

"تھینک یو" میں نے کہا اور آٹھ نمبر دبایا۔ ہلکی ہلکی آواز میں گھنٹی جیسی میوزک کی آواز آتی رہی۔ ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔ میں نے لائن کاٹ کے دوبارہ کوشش کی۔ ابھی ایک منٹ پہلے چوکیدار نے مجھ سے بات کی تھی اور اب کوئی جواب دینے والا نہیں تھا۔

ایک دم میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ اخبار فروش لڑکا شان بھی اوپر نہیں آیا تھا۔ دس منٹ اسے اوپر آنے کے لیے بہت کافی تھے۔ دو منٹ میں خود چوکیدار اسے گیسٹ ہاؤس تک چھوڑ کے جا سکتا تھا۔ راستے میں کسی نے چوکیدار کو روک لیا یا شان کو۔ سوال یہ تھا کہ کس نے اور کیوں؟

میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا "چلو' ہم جا رہے ہیں۔" اسی وقت

نازو سب سے پہلے کھڑی ہو گئی "میں تیار ہوں۔"

غالب نے کہا "کیا ہوا؟ شان اوپر کیوں نہیں آیا؟ چوکیدار کہاں ہے؟"

میں نے کہا "یہ گیٹ پر پہنچ کے معلوم ہوگا۔ پہلے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔"

میں اور غالب آگے نکلے۔ ہم سے چند قدم پیچھے نازو کے ساتھ رابعہ قدم ملا کے چلنے لگی۔ بظاہر سب مطمئن اور پُراعتماد تھے مگر شان کے اوپر نہ پہنچنے سے میرے دل میں خلش سی پیدا ہوئی تھی اور یہ خلش دوسروں کے دل میں تھی تو ان کی صورتوں سے بھی عیاں تھی۔

ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے قدم بے اختیار رک گئے۔ میں نے ایک آواز سنی جو ہم میں سے کسی کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ اکبر خان کی آواز تھی۔ ابھی چند منٹ پہلے ہی مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے اور اس کے رات سے پہلے لوٹ آنے کا کوئی امکان نہیں ہے مگر وہ گھر میں موجود تھا اور نہ جانے کس سے باتیں کر رہا تھا۔

پھر اس سے زیادہ حیرت مجھے دوسرے شخص کی آواز سن کے ہوئی کیونکہ یہ دوسرا شخص خود میں تھا جو اکبر خان سے باتیں کر رہا تھا۔ میرے کان خود اپنی آواز سے دھوکا کھانے والے نہیں تھے اور ایک میں ہی کیا' میرے ساتھ یہ آواز رابعہ اور نازو بھی سن رہی تھیں اور غالب بھی سن رہا تھا۔

کسی سے کچھ پوچھے بغیر بات سب کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے جو طویل تقریر کی تھی اور جس میں استاد پہلوان' چودھری دلاور اور اکبر خان کی ملی بھگت سے ہونے والی سازش کے ڈرامے کا تفصیلی تجزیہ کیا تھا' اکبر خان اسی کی ریکارڈنگ سن رہا تھا۔ میری گفتگو کا ایک ایک لفظ بہت واضح تھا۔ مجھے یاد تھا کہ کچھ دیر پہلے میں نے کیا کہا تھا۔ کسی نامعلوم مقام پر پوشیدہ خفیہ آلے نے اس کو ٹیپ ریکارڈر تک پہنچا دیا تھا اور اب یہ ساری بات ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو چکی تھی۔ شاید ان سب تک پہنچانے کے لیے جن کے نام میں نے اصل صورت حالات کی عکاسی کرتے ہوئے استعمال کیے تھے۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے سب کو دبے پاؤں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ مجھے یہ احتیاط لاحاصل محسوس ہو رہی تھی۔ میرے ذہن میں یہ خیال ضرور تھا کہ اتنی رازداری سے ہمیں دھوکا دے کر ہماری گفتگو ٹیپ کرنے والا کیا ہمیں دیکھ نہیں رہا ہوگا۔ خوف کے آثار نازو سے زیادہ رابعہ کی صورت پر عیاں تھے۔

ابھی ہم چند قدم ہی چلے تھے کہ ہلکا سا کھٹکا ہوا اور ایک دروازہ آہستہ سے کھلا۔

میں نے ایک شعلۂ جسم کو روبرو دیکھا۔ آتشیں' سرخ پیراہن سے نکلتی اس کے بدن کی گلابی آنچ کسی بھی مرد کے خرمنِ عقل و ہوش کو خاکستر کر سکتی تھی۔ سرسراتے ریشم کی میکسی کے نیچے اس کے موج در موج بدن کے نشیب و فراز کا ہر تلاطم انتہائی ہیجان انگیز تھا۔ سلیولیس یعنی بغیر آستین کی میکسی کا گریبان بھی اتنا کشادہ تھا کہ وہ مرمریں شانوں سے ڈھلکنے پر آمادہ نظر آتا تھا لیکن ڈھلکتا نہیں تھا اور تشنہ دید نگاہوں کی پیاس بڑھا دیتا تھا۔ اس کی تراشیدہ سنہری زلفیں ان شانوں پر آ کے شوخی سے پھسلی جاتی تھیں اور تصور میں وہ نرم ریت کے ساحل آتے تھے جن کو صبح دم شفق رنگ سمندر کی آہستہ خرام موجیں چوم رہی ہوں۔ گھیرے نیچے میکسی میں دونوں جانب چاک تھے۔ جب اس نے ایک قدم آگے بڑھایا تو گھٹنوں سے اوپر اس کی ٹانگوں کا اُجالا بس ذرا سی دیر کے لیے جھلکا۔ شاید اس کی عمر چالیس سال ہو مگر اس کے شباب میں تیس سال کی بھرپور عورت کی سرکشی تھی تو حسن میں بیس سال کی لڑکی کی نازکی و شگفتگی۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جو ہوش سنبھالتے ہی جان لیتی ہے کہ قدرت نے اسے حسن و شباب کی لامحدود قوت تسخیر رکھنے والا اسلحہ کتنی فراخ دلی سے عطا کیا ہے مگر وہ اپنی ذہانت سے عشوہ و غمزہ و ادا کی تربیت حاصل کر لیتی ہے اور اپنی فتوحات کو اپنا حق سمجھتے ہوئے دلوں کو مطیع کرتی جاتی ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ چاہے تو پتھر کے بت بھی اس کے آستانۂ حسن پر سجدہ ریز ہو جائیں۔

مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس سے زیادہ حسین' مکمل اور خطرناک عورت سے میرا کہیں واسطہ نہ پڑا تھا۔ اکبر خان جیسے شخص کی داشتہ ایسی ہی ہو سکتی تھی لیکن صاف ظاہر تھا کہ اس عورت کے لیے اکبر خان بھی ایک سیڑھی ہے۔ اوپر جانے کے لیے۔ اس کے قدم نیچے بہت سی سیڑھیوں کو روند چکے تھے۔ اخلاق و شرافت' عصمت و عفت کی مروجہ اقدار کا اس کے نزدیک کوئی مفہوم اور مقصد نہیں تھا۔ ایسی ہی عورت مارلن منرو تھی جس نے کینیڈی فیملی کے دل جیتنے کے لیے اپنے حسن و شباب کا سارا خزانہ لٹا دیا تھا مگر وہ امریکا کی فرسٹ لیڈی نہ بن سکی تھی۔ تخت کا خواب دیکھنے والوں کو تقدیر دھوکا دے تو ان کا انجام تختے پر ہوتا ہے لیکن جوا کھیلنے والے ہارنے کی کب سوچتے ہیں؟

میرا اور غالب کا اس حسن کی چکاچوند اور اس کے انداز بے حجابی سے متاثر ہونا ایک فطری سی بات تھی۔ دھوپ کتنی ہی اُجلی ہو' ویلڈنگ کا شعلہ پل بھر کے لیے نگاہوں کو ضرور خیرہ کرتا ہے لیکن حاسد اور شکی فطرت رکھنے والی عورت کسی سے محبت بھی کرتی ہو تو کسی منطق و وضاحت سے بھی مطمئن نہیں ہوتی۔

میں اور غالب کچھ شاک کی کیفیت میں تھے جسے رابعہ اور نازو نے محبت سمجھ لیا۔ اس وقت تو انہوں نے صرف ماتھے پر ناگواری کے آثار پیدا کرکے اور ہمیں گھور کے خبردار کر دینا کافی سمجھا مگر بعد

www.paksociety.com

میں بہت کچھ کہا جو میں نے اور غالب نے خندہ پیشانی اور فراخ دلی یعنی ڈھٹائی کے ساتھ برداشت بھی کیا۔

"میرا نام روزینہ ہے" دروازے کے فریم میں تصویر حسن بنی ہوئی اکبر خان کی سیکرٹری نے مسکرا کے کہا۔ ہمارے رد عمل پر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور کسی حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔ یہ سب اس کے لیے متوقع تھا۔

"روزینہ عرف روزی ۔۔ روز... یعنی گلاب" غالب نے بوکھلا کے کہا۔

میں بھی گہرے صدمے سے دوچار تھا۔ ایک تو ہم سب چوروں کی چوری فرار ہوتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ پھر پکڑنے والی بھی پولیس نہیں تھی' روزینہ تھی جس کے پاس ہتھکڑی سے زیادہ موثر اس کے حسن کا جال تھا۔

میں نے رابعہ سے نظر چرا کے کہا "مس روزینہ! یہ تعارف کچھ نامکمل ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم چلتے ہیں بھیا" رابعہ نے جل کے کہا "تم ان سے اچھی طرح متعارف ہو کے آ جانا۔"

"ہاں۔ اپنا تعارف بھی کرا دینا تفصیل سے" نازو نے لہجے کی تلخی کو جھوٹی مسکراہٹ کی مٹھاس میں دبا دیا "بتا دینا کہ تم ابھی غیر شادی شدہ بھی ہو۔ پھر ان سے بھی پوچھ لینا کہ شادی ہوئی ہے یا نہیں۔ نہیں ہوئی تو کیوں اور کب تک ارادہ ہے۔"

وہ ہنس پڑی "ڈونٹ وری... میں ان کو ہتھیانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ ویسے اتنی کمزور تم بھی نہیں نظر آتیں کہ تمہارے قیدی آسانی سے چھوٹ جائیں۔"

"ہم نے کسی کو بند نہیں کر رکھا ہے" نازو تنک کے بولی "جو کام تم کر سکتی ہو وہ ہمارے بس کا نہیں۔"

رابعہ نے سہلایا "ہماری فکر مت کرو تم۔"

وہ پھر ہنسی "سب بیویاں اسی طرح خود کو تسلی دیتی رہتی ہیں کہ انہیں کسی سے خطرہ نہیں' وہ اپنے گھر میں بہت محفوظ ہیں کیونکہ ان کے شوہر بڑے وفادار ہیں۔ حقیقت میں جانتی ہوں ایسے شوہروں کی۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا "ان فضول باتوں کا مقصد کیا ہے مس روزینہ؟ تمہیں بھی خوش فہمی ہے کہ تم حقیقت جانتی ہو اس لیے کہ تم نے آج تک اکبر خان جیسے لوگوں کا شکار کیا ہے جو خود شکاری ہوتے ہیں۔ ہوس کے شکاری جو دولت کا جال لیے پھرتے ہیں اور تم جیسی عورتیں قید ہو کے بھی خود کو فریب دیتی ہیں کہ انہوں نے حسن کے جال میں ایک اور کاٹھ کا الو پکڑ لیا ہے۔"

غالب نے کہا "یار سکندر! اس کو سمجھا رہے ہو یہ فلسفہ۔ کیوں وقت ضائع کر رہے ہو۔"

روزینہ نے شریر نظروں سے رابعہ اور نازو کی طرف دیکھا "تم ہمیں کچھ غلط وقت پر اور غلط جگہ ملے ہو ورنہ میرے ساتھ تمہیں زندگی کے حسین ترین لمحات ملتے۔"

رابعہ تو خون کے گھونٹ پی کے رہ گئی مگر نازو برداشت نہ کر سکی۔ اس نے نفرت اور حقارت سے کہا "کیسی بے شرم ہے۔"

روزینہ کی ہنسی اسے مزید مشتعل کر سکتی تھی چنانچہ میں نے فوراً صورت حال کو سنبھال لیا۔ "اکبر خان کہاں ہے؟"

اس نے کندھے اچکائے "مجھے کیا معلوم۔ ہو گا کسی اور روزینہ کے پاس۔"

"جھوٹ مت بولو۔ وہ اندر ہے" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"نہ تم میرے غیرت مند شوہر ہو اور نہ میں تمہاری بیوی کہ اندر غیر مرد کو چھپا رکھا ہو مگر تم سے کہوں کہ کوئی نہیں ہے' وہم ہے تمہارا۔" اس نے پرخوف آواز بنا کے کہا اور پھر خود ہی ہنس پڑی "وہ ...... ہوتا میرے ساتھ تو میں دکھا دیتی تم کو۔"

شرم و حیا اس کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کی بات کا رابعہ اور نازو پر کیا اثر ہوا ہو گا کیونکہ خود میرے کان گرم ہونے لگے تھے۔

غالب نے کہا "ابھی ہم نے آواز سنی تھی اس کی۔"

"ضرور سنی ہو گی۔ ابھی تو فون آیا تھا اس کا۔ کہہ رہا تھا کہ آج رات کو شاید نہ آ سکوں۔ نہ آئے میری بلا سے۔"

میں نے کہا "وہ ٹیلی فون کی آواز نہیں تھی۔"

روزینہ گھوم گئی "وہ دیکھو اس فون کا ریسیور نہیں اٹھانا پڑتا۔ جب کال آتی ہے تو میں ایک بٹن دبا دیتی ہوں اور اسپیکر بولنے لگتا ہے۔"

اس بات نے مجھے قائل نہیں کیا۔ آدمی کی اصل آواز اور کسی ٹیلی فون کے اسپیکر سے سنائی دینے والی آواز میں بہت نمایاں فرق ہوتا ہے۔

اس نے بازو پھیلا دیے "آؤ' دیکھ لو خود اندر آ کے۔ ویسے تو تم اکبر خان کے معزز مہمان ہو۔ یہاں جو مہمان آتے ہیں وہ سب بڑے معزز ہوتے ہیں۔ میری طرح" وہ ڈھٹائی سے ہنسی۔

کسی تذبذب کے بغیر میں اندر چلا گیا۔ وہ دروازے سے ہٹنے پر آمادہ نہ تھی اور محض رابعہ کو جلانے کے لیے یہ چاہتی تھی کہ میں اس کے جسم کو دبا کے اپنے لیے راستہ بناؤں مگر میں نے اسے ایک ہاتھ سے دھکیل کر اندر کر دیا۔ وہ لڑکھڑائی اور پھر ہنسی۔ اس کی ہنسی کا اضطراری انداز بتاتا تھا کہ اس پر تھوڑا بہت شراب کا نشہ غالب ہے۔ اکبر کی عدم موجودگی کا یقین کرنے کے علاوہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میری آواز کا کیسٹ کس نے ریکارڈ کیا تھا اور کون سن رہا تھا۔ اگر کسی طرح وہ کیسٹ مجھے مل جاتا تو ہم سب کی پریشانی کا ایک بہت بڑا سبب باقی نہ رہتا۔

میرے پیچھے غالب تھا۔ رابعہ اور نازو نے چند سیکنڈ بعد اندر آنے کا فیصلہ کیا۔ روزینہ کے رویے پر وہ سخت برافروختہ تھیں

مگر اس کا کردار سامنے آ جانے کے بعد یہ ناراضگی لاحاصل تھی۔

اکبر خان کا بیڈ روم اس کے مزاج اور اس کی خواہشات کی عکاسی کرتا تھا۔ صرف دولت سے عیاشی کے اسباب میں رنگین مزاجی کا انداز پیدا نہیں کر سکتا۔ اندر ہر چیز انتہائی بیش قیمت تھی اور دولت مندی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ پردوں اور چھتوں سے لے کر ایک طرف سجی ہوئی غیر ملکی شراب کی بھری اور کچھ خالی بوتلیں ہر گوشے میں موجود بیڈ کے لیمپس کی مدھم روشنی کو منعکس کر رہی تھیں۔ ڈریسنگ ٹیبل پر فرانس کی بیش بہا پرفیوم کی خوب صورت شیشیاں اور آرائش حسن کے لوازمات بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں مجھے کچھ ایسی چیزیں بھی نظر آئیں جو عیش و عشرت کے دلدادہ رئیسوں کے لمحات لطف و انبساط کے لیے بطور خاص بنائی جاتی تھیں اور لندن کی مخصوص سیکس شاپس میں دستیاب تھیں مگر یہاں اتنی عام نہ تھیں کہ غالب بھی انہیں دیکھ کے حیران ہوتا۔ رابعہ اور نازو کی تو ان پر نظر بھی نہیں گئی۔ وہ اس جیولری کو دیکھتی رہیں جو "امیٹیشن" بھی ہو سکتی تھی اور اصلی بھی۔ پہچان ہم میں سے کسی کو نہ تھی۔

بیڈ روم کے وسط میں ایک بہت وسیع اور گول بیڈ تھا جس کے بارے میں ایسے ہی مجھے خیال آیا کہ یہ گھومنے والا بیڈ ہو گا۔ ایک دلائی شاہانہ عشرت کدے کی تکمیل میں روشنیاں اور آئینے بہت اہم ہوتے ہیں چنانچہ روزینہ نے اچانک کرسٹل کا فانوس روشن کیا تو اس آئینہ خانے میں چراغاں سا ہو گیا اور ہر سمت میں تاحد نگاہ روشنیوں کے ساتھ ہمارے عکس پھیل گئے۔ اس نظر فریب ماحول میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی چھت اور دیواروں والے کمرے میں نہیں بلکہ کسی جگمگاتے شاپنگ سینٹر کے چوک پر کھڑے ہیں لیکن اس کے باوجود مجھے یہاں عجیب سی گھٹن ہو رہی تھی۔

رابعہ اور نازو بھی اتنی نادان نہ تھیں کہ اس انداز آرائش کے اغراض و مقاصد کو سمجھ نہ پاتیں۔ یہ دولت کی ہوس خیزی کے نمونے تھے۔ روزینہ ان کی خفت اور گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور اس نے اپنے لیے ایک نازک سے جام میں کچھ اور شراب ڈال لی تھی۔

"تم سے تو پوچھنا ہی بے کار ہے" وہ بولی "تم اس نعمت سے محروم ہو۔"

"لعنت اس کو نعمت سمجھنے والے پر" نازو بولی۔

رابعہ نے کہا "اور لعنت اس کی عقل پر۔"

میں نے جھنجلا کے کہا "لیڈیز! اپنے پند و نصائح کے دفتر بند رکھو۔ ہم یہاں تبلیغ و تحسین کے لیے نہیں آئے ہیں۔ اتنا کافی ہے کہ تم صراط مستقیم پر ہو۔ اس عورت کو جانے دو جہنم میں۔"

"تم جاؤ باہر۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چوکیدار اس لڑکے کے ساتھ اس کمرے تک جا کے لوٹ جائے" غالب بولا "بلکہ گیٹ تک دیکھ لو۔"

رابعہ اور نازو بھی جیسے اشارے کی منتظر تھیں۔ وہ بڑا منہ بنا کر نکل گئیں۔ باہر جا کے یقیناً انہوں نے سکون کا سانس لیا ہو گا۔ بیڈ روم کے ماحول میں وہی گناہ گار فحاشی تھی جو کسی طوائف کے کوٹھے پر محسوس بھی کی جا سکتی ہے۔

میں نے روزینہ سے کہا "یہ فانوس اور سب لائٹس بجھا دو' صرف ایک لائٹ رہنے دو۔"

اس نے تعمیل کی "ایک کی بھی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا "روشنیوں میں عکس دھوکا دیتے ہیں۔ اندھیرے میں سیاہ و سفید کی تمیز بھی نہیں رہتی۔"

غالب پردے ہٹا کے دیکھ رہا تھا اور مختلف سمت میں کھلنے والے دروازوں اور کھڑکیوں کو چیک کر رہا تھا۔ سوائے ایک دروازے کے جو باتھ روم میں کھلتا تھا' سب اندر سے بند تھے اور ادھر سے کسی کے باہر نکل جانے کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ اکبر خان کو باہر نکال کے خود روزینہ نے کسی کھڑکی یا دروازے کو بند کیا ہو اور پھر باہر نکلی ہو۔

میں نے ایک ٹیلی فون' ٹی وی اور ریڈیو گرام کے ہر خانے کو دیکھا مگر مجھے کہیں کوئی ٹیپ ریکارڈر نظر نہ آیا۔ وقت کم تھا اور میرے لیے پورے کمرے میں کسی جگہ چھپے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کو تلاش کرنا محال تھا۔ ٹیپ ریکارڈر بیڈ کے نیچے بھی ہو سکتا تھا' صوفوں کے اندر بھی اور کسی دیوار کے نظر نہ آنے والے خلا میں بھی۔

"آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" روزینہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی "تم نے اکبر خان کو پوچھا تھا اور وہ کوئی نوٹ بک تو ہے نہیں جسے تم کہیں سے بھی برآمد کر لو۔ تمہیں تلاشی لینے کی اجازت اس لیے نہیں دی تھی میں نے۔"

"فرض کرو" میں نے کہا "ہم یہ کام بلا اجازت کر رہے ہیں۔"

"تم غلط کر رہے ہو" وہ برہمی سے بولی "صرف ایک بٹن دبانے کی دیر ہے۔"

غالب بولا "اور کسی دیوار کے شق ہوتے ہی اکبر خان نکل آئے گا۔"

"تم مہمان ہو اس لیے میں نے ابھی تک سیکیورٹی والوں کو نہیں بلایا ہے" وہ جام پھینک کے اٹھی۔

میں نے اسے دھکیل کر پھر بٹھا دیا "میں تمہارے ساتھ سختی کرنا نہیں چاہتا۔ بہتر ہے' ایسے ہی بتا دو کہ وہ ٹیپ کہاں ہے جو اکبر خان سن رہا تھا؟"

"تم پاگل تو نہیں ہو؟" وہ مشتعل ہو گئی "کیا اکبر خان کوئی چوہا تھا کہ کسی سوراخ سے نکل گیا؟ یہاں سوراخ تو کیا دروازے کے نیچے بھی اتنی جگہ نہیں ہے کہ ایک کاکروچ گزر سکے۔ تم دیکھ چکے ہو

www.paksociety.com

کہ سب دروازے کھڑکیاں اندر سے بند ہیں۔"

میں نے کہا "مس روزینہ! اکبر خان کی آواز میں نے ہی تھیں، ہم سب نے سنی تھی اور ہم حلفیہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس کی اپنی آواز تھی مگر تمہاری بات مان لی جائے کہ وہ نقلی فون پر تم سے مخاطب تھا تو کیا وہ ٹیپ تم سن رہی تھیں جس پر میری آواز ریکارڈ کی گئی تھی؟ کہاں ہے وہ ٹیپ اور ٹیپ ریکارڈر؟ جلدی سے بتاؤ۔"

"میں... میں کیسے بتاؤں؟ مجھے نہیں معلوم۔"

میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ بڑی نرمی سے میں نے اس کا خوب صورت ہاتھ تھاما جو نشے یا خوف کے اثر سے کانپ رہا تھا "تمہاری انگلیوں میں کتنی نزاکت ہے۔ اور یہ انگوٹھی۔ اصلی ہیرے کا نگ نظر آتا ہے اس میں۔ میں کانچ کے ٹکڑے اور ہیرے میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔ کیا یہ اکبر خان کا تحفہ ہے؟"

اس نے اپنا ہاتھ کھینچا "یہ... منگنی کی انگوٹھی ہے۔"

میں نے سہلایا "بہت خوب! تم منگنی بھی کرتی ہو۔ کس کس سے ہو چکی ہے تمہاری منگنی... اور کتنی بار...؟"

وہ چلانے لگی "یہ کیا کر رہے ہو۔ مجھے درد ہو رہا ہے۔"

میں نے اس کی انگلی کو تھوڑا سا اور دبایا "آج کل تمہارے منگیتر کے عہدے پر کون فائز ہے؟"

"میری انگلی ٹوٹ جائے گی۔"

"ہاں۔ نازک چیزیں آسانی سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ دل کو شاعروں نے شیشے کا بنا دیا ورنہ دل بڑی مضبوط مشین ہے۔ آسانی سے ٹوٹتا نہیں اور مرمت بھی ہو جاتا ہے۔ انگلی بھی جڑ جائے گی۔"

میں نے ایک دم دبایا تو اس کی انگلی کسی کچی پنسل کی طرح ٹوٹ گئی۔

اس نے ایک چیخ ماری اور تڑپ کے اپنا ہاتھ کھینچا مگر میری گرفت سے خود کو نہ چھڑا سکی۔ میں نے اپنا ایک پاؤں اس کے پاؤں پر رکھ دیا تھا۔ وہ اٹھتے ہی پھر گر گئی "ذلیل۔ وحشی۔ درندے..."

میں نے نرمی سے کہا "ٹیپ ریکارڈر کہاں ہے؟"

اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ کرب سے بل کھا رہی تھی۔ میں اس کی ٹوٹی ہوئی انگلی کو آہستہ سے ہلاتا تھا تو درد کی شدت سے اس کا بدن جھٹکا کھاتا تھا۔ غالب اپنے کام میں مصروف تھا اور صوفوں کو الٹ چکا تھا، بیڈ کے نیچے جھانک کر دیکھ چکا تھا اور میری کارروائی سے بے نیاز تمام کونوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس نے انٹر کام کو تکیے کے نیچے ڈال دیا تھا اور ٹیلی فون کا تار توڑ دیا تھا۔ اس نے وہ دروازہ بھی بند کر دیا تھا جس سے ہم اندر آئے تھے اور سب پردے برابر کر دیے تھے۔ چنانچہ روزینہ کی چیخوں کے باہر سنائی دینے کا امکان بہت کم تھا۔

تکلیف سے روزینہ کے سارے جسم سے پسینہ چھوٹنے لگا تھا اور گالیاں چھوڑ کے اب وہ منت سماجت پر اتر آئی تھی "خدا کے لیے... اُف... آہ... یہ مت کرو میں مر جاؤں گی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "انگلی ٹوٹنے سے آج تک کوئی نہیں مرا مس روزینہ۔ ہم تمہیں بے ہوش ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اگر تم وہ ٹیپ ریکارڈر دے دو تو..."

اس نے سر کو ادھر ادھر ہلاتے ہوئے کراہ کے کہا "میں نہیں... کر سکتی... مجھ پر خدا کے لیے... اوف... ایسا ظلم مت کرو۔ رحم کرو مجھ پر۔"

مجھے خوب اندازہ تھا کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے۔ یہ اذیت ہی کم نہیں ہوتی۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی کو ہلانے سے ناقابل برداشت درد ہوتا ہے۔ ایک نرم و نازک عورت جس نے کبھی تکلیف نہیں جھیلی تھی، بے رحمانہ اور پُر تشدد کارروائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ منٹ میں اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ جیسے کسی گلابی رنگ کے کپڑے کو کسی نے بلیچنگ پاؤڈر میں ڈال کے نچوڑ دیا ہو۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔

میں اس کی مجبوری کو سمجھتا تھا اور اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ مجھے ریکارڈ کیا ہوا ٹیپ دینے پر تیار نہیں۔ وہ اکبر خان سے وفائی اور غداری کے جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے اس کا صورت میں عیش زندگی کے بدصورت، بھیانک انجام سے ڈرتی تھی۔ اکبر خان ان لوگوں میں سے تھا جو ایک ادائے زر و جواہر لٹاتے ہوئے انتہائی فراخ دل نظر آتے ہیں تو کسی کی سزا دیتے ہوئے اتنی ہی سنگدلی کا مظاہرہ بھی کر سکتے ہیں۔ ایک عورت اور دوسری عورت میں کیا فرق ہے۔ روزینہ ایک خوب صورت اور نایاب قسم کی چیز تھی۔ جیسے مصوری کا کوئی شاہکار چوری ہو جائے تو صدمہ ہوتا ہے کہ اب کسی اور کے پاس ہے۔ خود ضائع کرنا پڑے تو بس احساس زیاں۔ روزینہ استعمال کی چیز تھی "استعمال میں ضائع ہو گئی تو کیا؟"

غالب نے کہا "یہ الو کی پٹھی زیادہ ہی مزاحمت کر رہی ہے کیوں نہ اسے ساتھ لے چلیں؟"

"کیا فائدہ؟"

"اطمینان سے پوچھ لیں گے جو پوچھنا ہے۔"

"مرزا! کیا عقل گھاس چرنے گئی ہے؟ جو پوچھنا ہے ابھی پوچھنا ہے۔ اس نے بعد میں بتایا کہ ٹیپ فلاں جگہ ہے تو ہم واپس آئیں گے؟" میں نے کہا "اس سے پہلے تو اکبر خان اپنا کام کر جائے گا۔"

غالب نے سر کھجایا "وہ تو شاید اپنا کام کر گیا۔ اب مجھے ہو رہی ہے ان بلاؤں کی جو باہر کھڑی منتظر ہیں ہماری۔ روزینہ کیا سمجھ رہی ہوں گی۔ وہ دروازہ بھی تو بند ہے جس سے ہم آئے تھے۔"

"سمجھنے دو۔ جو ان کا جی چاہے۔ وہ ٹیپ حاصل کرنا ضروری ہے ہمارے لیے" میں نے ایک گلاس اٹھا کے روزینہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔

پانی کے آتے ہی وہ رونے لگی۔ پہلے آہستہ آہستہ پھر بولی۔ اس کا خوف اب وحشت آمیز ہسٹریا بن رہا تھا۔ اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس پر ہاتھ رکھ کے چیخنے کی تو میں نے اسے دبا لیا۔

وہ تڑپ کے اٹھنے لگی تو میں نے اسے دبا لیا۔

"اب تمہارے حلق سے آواز بھی نکلی نا تو میں تمہاری یہ دوسری انگلی بھی اسی طرح توڑوں گا جیسے انگلی توڑی تھی۔ میں ناز نخرے نہیں سہتا۔ تمہارا اور نہ طلب گار۔ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تمہارے آنسوؤں کا یا تمہاری حالتِ زار کا" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

غالب میرے ساتھ جھک گیا "ابھی تو کچھ نہیں ہوا ہے تمہارے ساتھ۔ تم نے نہ بتایا کہ ٹیپ کہاں ہے تو پھر بہت کچھ ہوگا جس کا تمہیں کوئی اندازہ نہیں۔ بولو بتاؤ گی... یا..."

روزینہ نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور سر ہلایا۔

میرے بوجھ سے آزاد ہوتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "وہ مجھے مار ڈالے گا۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔"

میں نے بڑی نرمی سے کہا "ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔"

غالب بولا "اکبر خان کے آنے سے پہلے ہی تم جا سکتی ہو۔ اب تک تم نے بہت کچھ تو وصول کر لیا ہوگا۔ اور بھی جو ملتا ہے یہاں سے وہ سمیٹ لو۔ اگر جان عزیز ہے تو مال کو چھوڑنا ہی پڑے گا۔"

میں نے کہا "تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک اکبر خان کا مال نہ سہی دوسرے کا سہی۔ تم جیسی عورت کو اکبر خانوں کی کیا کمی۔"

وہ اپنا ہاتھ دبا کے بولی "تم بے وقوف ہو۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں کہیں نہیں جا سکتی۔ کہیں نہیں۔"

"تم ملک سے باہر جا سکتی ہو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں نے کہا نا کہیں نہیں۔ نہ ملک کے اندر نہ باہر۔ اس نے سب سمجھا دیا تھا مجھے کہ اس گھر میں آنے کے بعد میرے لیے واپس جانے کے سب دروازے بند ہو گئے تھے۔ وہ ایسا ہی آدمی ہے۔ جس چیز کو خرید لیتا ہے پھر وہ اس کی ہو جاتی ہے ہمیشہ اسی کی رہتی ہے ورنہ نہیں رہتی۔"

میں نے کہا "تو کیا یہ... منگنی کی انگوٹھی..."

"منگنی!" اس نے تلخی سے کہا "وہ روز منگنی کرتا ہے اور روز شادی۔ وہ کہتا ہے میں خوش قسمت ہوں کہ میں نے اکبر خان کے دل میں اور اس کے گھر میں جگہ بنالی ورنہ خوب صورت عورتیں دنیا کے بازار میں بوتلوں کی طرح بکتی ہیں۔ کسی بھی ملک میں کسی بھی دکان سے خریدو اور استعمال کرو۔ جب دل بھر جائے کسی کو دے دو یا پھینک دو۔"

میں نے حیرانی سے کہا "تم ساری عمر گزار دوگی اس کے ساتھ؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم سے کبھی اس کا دل نہیں بھرے گا؟"

"کل کا مجھے نہیں معلوم لیکن آج میں اس کو نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ عیش و عشرت کی زندگی، مال و دولت سب کچھ میرا ہے اور اکبر خان میرے لیے اچھا ہے۔ جوان مرد ہے اور مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور کیا چاہیے مجھے؟ بڑی مشکل سے میں نے یہ سب حاصل کیا ہے جو مجھے اور کوئی نہیں دے سکتا تھا۔"

"یعنی تم اس قید خانے میں خوش ہو؟" میں نے نفرت سے کہا۔

"میں قید میں نہیں ہوں۔ میں کہیں بھی آ جا سکتی ہوں۔ میرے پاس ایک نہیں دو کاریں ہیں۔ شوفر ہیں۔ لندن، پیرس، نیو یارک کے ٹکٹ میرے پاس پڑے رہتے ہیں۔ میں جو چاہوں کروں یا خریدوں۔ جتنا مال چاہے خرچ کروں۔ شرط صرف یہ ہے کہ جب اکبر خان یہاں آئے تو میں اسے یہاں ملوں اور اس کے سوا کسی سے تعلق نہ رکھوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میری نگرانی ہوتی ہے۔ وہ کہیں بھی ہو، اسے میری مصروفیات کی خبر ملتی رہتی ہے۔ میں اسے ناراض نہیں کر سکتی۔ میں بہت مطمئن ہوں اس زندگی سے۔ خدا کے لیے میری مجبوری کو سمجھو" وہ روتے اور کراہتے ہوئے بولی۔

میں نے متاثر ہوئے بغیر کہا "وہ ٹیپ حاصل کرنا ہماری مجبوری ہے۔"

غالب بولا "تم کہہ سکتی ہو کہ ہم نے تشدد سے وہ ٹیپ حاصل کر لیا تھا۔ ثبوت کے طور پر تم اپنی یہ انگلی دکھا سکتی ہو اور مزید ثبوت چاہو تو..."

اس نے دہشت سے غالب کو دیکھا "دیکھو، بات ٹیپ کی نہیں۔ ٹیپ تو میں دے سکتی ہوں تمہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پھر وہ مجھ سے پوچھے گا کہ تم نے کیا سنا تھا؟ سب بتانا پڑے گا مجھے۔"

"تم غلط بھی بتا سکتی ہو" غالب نے کہا "کہہ سکتی ہو کہ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے تھے اور پھر سو گئے تھے۔"

"ادھر ادھر کی باتیں؟"

"ہاں۔ ہم تمہیں بتا دیں گے کہ اس سے کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"کیا تم اسے اتنا بے وقوف سمجھتے ہو؟ جھوٹ بولنا آسان نہیں ہوتا۔ میں تو اچھی ایکٹریس بھی نہیں ہوں۔ وہ فوراً پکڑ لے گا مجھے۔ دیکھو میری انگلی کتنی سوج گئی ہے۔" اس نے ایک ہاتھ سے بوتل اٹھا کے اپنے لیے دوسرے جام میں تھوڑی سی انڈیلی "تم اتنے سفاک آدمی لگتے نہیں۔"

"ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے" میں نے کہا "اور ہم کوئی خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے۔"

"تم ٹیپ لے جاؤ گے پھر بھی خطرہ تو باقی رہے گا۔ خطرہ مت چھوڑو۔"

"کیا منانا چاہتی ہو تم؟" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"یہی کہ ٹیپ حاصل کرلینے کے بعد تمہارے لیے بے حد ضروری ہوگا کہ مجھے بھی ختم کردو" اس نے جام اپنے حلق میں انڈیل لیا۔

"ہم بلاوجہ قتل نہیں کرتے۔"

"مجھے معلوم ہے' تم کیا کرو گے۔ تم مجھ پر تشدد کرو گے۔ عورت پر کوئی بھی مرد سو طرح سے تشدد کرسکتا ہے" اس نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "کبھی تھانوں میں جاکے دیکھو۔ مرد کے ساتھ وہ سب نہیں ہوسکتا جو عورت کے ساتھ ہوتا ہے۔"

میں نے برہمی سے کہا "تمہیں کیا معلوم۔ سنی سنائی باتیں کررہی ہو یا اس کا بھی تجربہ ہے؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "تجربہ ہوچکا ہے مجھے۔ اور مجھے اپنی قوتِ برداشت کا بھی اندازہ ہے۔"

"ہم پولیس والے نہیں ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟" اس نے کہا "بس وہ جانور بن جاتے ہیں۔ مانا تم وہ سب نہیں کرو گے مگر ایک کے بعد دوسری انگلی توڑو گے پھر تیسری۔ دس انگلیاں ہاتھوں کی' دس پیروں کی۔ دوسری انگلی ٹوٹنے سے پہلے ہی میں ٹیپ تمہارے حوالے کردینا بہتر سمجھتی ہوں۔ میں اتنی اذیت نہیں جھیل سکتی۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹیپ ہمیں دے دو ایسے ہی" میں نے کہا۔

"وعدہ کرو اس کے بعد تم میرا گلا گھونٹ دو گے۔"

"میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔"

"پھر تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں اکبر خان کو سب بتادوں گی۔ میں نے بہت توجہ سے ایک ایک لفظ سنا تھا۔"

غالب نے کہا "اس میں تو بہت رسک ہے سکندر۔"

"اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں کہ جانے سے پہلے مجھے۔۔۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ تم۔۔۔ خودکشی کرلو۔ بعد میں جو چاہو کرو" میں نے کہا۔

اس نے منت کے انداز میں کہا "دیکھو' میری مدد کرو۔ میں بہت بزدل عورت ہوں۔ خود اپنی جان نہیں لے سکتی۔ اکبر خان بھی بہت ظالم اور بے رحم آدمی ہے۔ میں اس سے جھوٹ بولوں گی تو وہ بہت اذیت دے کر ہلاک کرے گا مجھے۔ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ خنجر' نہ پستول' نہ خواب آور گولیاں۔"

وہ مسلسل پی رہی تھی اور اب نشے میں بول رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے بوتل چھین کے رکھ دی "اس سے پہلے کہ تم عقل اور ہوش گنوا بیٹھو' ہمیں بتادو کہ ٹیپ ریکارڈر کہاں ہے؟"

اس نے ہچکی لی اور زبردستی ہنسی۔ پھر اس نے بیڈ کی سائڈ پر لگا ہوا کوئی بٹن دبایا۔ میری حیرت زدہ نظروں نے ایک تصویر کے فریم کو کسی تجوری کے پٹ کی طرح کھلتے دیکھا۔ اس کے پیچھے ٹیپ ریکارڈر موجود تھا۔ غالب نے اسے باہر نکال لیا۔

"دیکھ لے یار کہ ٹیپ وہی ہے" میں نے کہا۔

غالب نے ٹیپ ریکارڈر آن کرکے چلایا۔ ٹیپ کو تھوڑا ری وائنڈ کیا اور پھر پلے کا بٹن دبادیا۔ اس کے اسپیکر سے میری آواز ابھری۔ غالب نے اسے فوراً آف کردیا اور کیسٹ نکال کے جیب میں ڈال لیا۔

"اب اس عورت کا کیا کریں؟" غالب بولا۔

میں نے کہا "ہم کیا کرسکتے ہیں' اکبر خان کرے جو کرنا ہے۔"

"پھر اتنا وقت ضائع کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ اسے یونہی چھوڑ جاتے" غالب نے کہا۔

دروازے پر دستک سن کے میں چونکا "یہ کون آگیا؟"

روزینہ نے سر اٹھایا "ڈرو نہیں۔ اکبر خان نہیں ہوگا۔ شاید کوئی ملازم ہوگا۔ انٹرکام توڑ کے تم نے غلطی کی تھی۔"

غالب آہستہ آہستہ دروازے کی طرف گیا۔ اس سے پہلے وہ سوال کرتا' باہر سے نازو کی آواز آئی "غالب! تم اندر ہو ابھی تک؟"

غالب نے کہا "نہیں۔ اندر کوئی نہیں ہے۔"

"بکومت۔ دروازہ کھولو۔"

"ابھی ہم مصروف ہیں' بعد میں آنا" غالب بولا "اندھی ہو کیا؟ نظر نہیں آتا؟ باہر لکھا ہوا ہے۔ ڈونوٹ ڈسٹرب۔"

رابعہ ہنسی "یہ کہاں لکھا ہوا ہے؟ مجھے تو نظر نہیں آتا۔"

"اچھا نہیں لکھا ہوا ہے تو خود لکھ لو" غالب بولا۔

"غالب کے بچے!" نازو نے دروازے پر لات ماری۔

"غالب کے بچے ابھی نہیں ہوئے" غالب نے کہا "جب ہوں گے تو سب سے پہلے تمہیں ہی معلوم ہوگا۔"

میں نے کہا "کیوں شامت آئی ہے تمہاری مرزا جی۔ اور کون سا شوق ہے مار کھانے کا۔ کھول دو دروازہ۔"

اس نے دروازہ کھولا اور دوڑ کے میرے ساتھ آکھڑا ہوا۔ رابعہ کو شاید نازو نے سمجھا لیا تھا کہ آپے کو کنٹرول میں رکھے۔ چنانچہ بگولے کی طرح اندر آنے کے بعد اس نے غالب کو خونخوار نظروں سے گھورا لیکن کچھ کہا نہیں۔ غالب بڑی عاجزی' معصومیت اور ڈھٹائی سے اسے چڑانے کے لیے دانتوں کی نمائش کرتا رہا۔

میری سوالیہ نظروں کے جواب میں رابعہ نے کہا "چوکیدار گیٹ پر ابھی موجود ہے لیکن وہ نہیں ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ "وہ" سے اس کی مراد ہے وہ ڈرائیور لڑکا۔

"کیوں' وہ کہاں گیا؟" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "ہم نے چوکیدار سے کہا تھا کہ اسے اندر آنے دے۔"

"اس کا کہنا ہے کہ پہلے وہ اندر آنے پر رضامند ہوگیا تھا پھر نہ جانے کیوں اس کا ارادہ بدل گیا۔ وہ کہنے لگا کہ میں پھر آؤں گا اور واپس چلا گیا" رابعہ نے کہا۔

"یہاں کیا ہورہا ہے؟ ابھی تک تعارف کے مرحلے طے ہورہے ہیں یا" نازو بولی "بات کچھ آگے بڑھی؟"

"تمہارے منہ سے یہ جلی کٹی باتیں ایسی ہی لگتی ہیں جیسے بلبل بھی کوے کی طرح کائیں کائیں کرنے لگے" غالب بولا۔

میں نے جیب سے کیسٹ نکال کے دکھایا "یہ کام تو ہوگیا۔"

"پھر چلو" نازو جھینپ کے بولی۔

میں نے مختصراً ان کو روزینہ کا مسئلہ بتایا "اسے چھوڑتے ہیں تو خرابی' ساتھ لے جائیں تو اس سے بڑی خرابی۔ یعنی خانہ خرابی"

غالب نے کہا "کیوں نہ ہم کام کرلیں۔"

میں نے کہا "یہ فیصلہ ایسا نہیں ہے کہ اسے ہم تقدیر پر چھوڑ دیں۔ ذرا سوچو کہ ہم سب کی گفتگو اکبر خان کے کانوں تک پہنچ گئی تو کیا ہوگا۔ ہمارے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اکبر خان کے اعتماد سے محروم ہوکے ہم چودھری ولا دریا استاد پیارو جیسے لوگوں کا کیسے مقابلہ کریں گے؟"

رابعہ نے میری تائید کی "اس وقت اکبر خان کو دشمن بنالینا سب سے بڑی بے وقوفی ہوگی۔ وہ پہلے ہی ہمیں بے وقوف بنا کے پیر کبیر شاہ سے لڑوا چکا ہے۔"

"لڑاوے ممولے کو شہباز سے' یہ علامہ صاحب نے فرمایا تھا" غالب بولا۔

"ممولا کس کو کہا ہے تم نے؟" نازو بولی "اس سے پہلے یہ بتاؤ کہ ممولا ہوتا کیا ہے؟"

"ممولا۔ نیولا اس کا ماموں زاد ہوتا ہے ایک رشتے سے" غالب نے سرکھجا کے کہا۔

میں نے کہا "یہ جہالت کی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ ممولا چھوٹی سی چڑیا ہوتی ہے۔ تم دونوں سیریس نہیں ہوسکتے تو باہر جاؤ۔"

رابعہ نے کہا "کیا خاتون ہمارے ساتھ جانا پسند کریں گی؟"

روزینہ نے نفی میں سرہلایا "کوئی فائدہ نہیں' یہاں سے بھاگ کر کسی کے ساتھ جانے کا۔"

مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگی "فائدہ یہ ہے کہ تم کچھ دن اور جی لوگی۔ کوشش کیے بغیر حوصلہ ہارنے کی کیا ضرورت ہے۔ بھئی! تو سامنا کرنا اکبر خان کا اور اسے یقین دلانا کہ ہم نے دھمکی ویسی کوئی بات نہیں کی تھی اور۔۔۔"

"ایک منٹ" غالب بولا "میرے بہت اعلیٰ دماغ میں ایک بہت اعلیٰ خیال آیا ہے۔ سارا معاملہ ہے کیسٹ کا۔ ہم یہ کیسٹ نہیں چھوڑ سکتے اور روزینہ کو بھی نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ کیسٹ اس کے ذہن میں ہے اور اکبر خان کو کیسٹ نہ ملا تو وہ روزینہ کو بجائے گا۔ سب اس سے سن لے گا۔ اب فرض کرو کہ ہم کیسٹ بھی چھوڑ جائیں اور روزینہ کو بھی لیکن ہمارا حرج بھی نہ ہو۔"

"تم جب بولو گے ایسی ہی بے تکی بات کرو گے" نازو نے کہا۔

موسیقی کے شائقین کے لیے
اپنے طرز کی اچھوتی کتاب

امجد موسیقی

سازوں کی سنگت میں گانا ایک مشکل فن ہے

سُر' لے' گیت' راگ' ٹھاٹھ اور
موسیقی کے دیگر اسرار و رموز
آشکار کرنے والی منفرد کارآمد کتاب

برصغیر کے نامور گلوکار اس کتاب کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

مہدی حسن کا تفصیلی تبصرہ
مع اُن کی رنگین تصویر کے
اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں

قیمت: ۱۵۰ روپے ○ ڈاک خرچ: ۱۸ روپے
پیشگی رقم بذریعہ منی آرڈر بھیجنے پر ڈاک خرچ معاف

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس نمبر ۲۳ رمضان چیمبرز' ... کراچی

www.paksociety.com

میں نے نازو کو گھورا "پہلے پوری بات سُن لو۔"

"نہیں۔ پہلے ان کی سُن لو جن کو سر خدا نے دیا تھا صرف خوب صورت بال اُگانے کے لیے۔ اندر کھوپڑی میں بھوسا ہوگا بس۔ گوبر کی کھاد" غالب گرم ہوگیا "ڈیڑھ تولہ عقل ہوگی کہیں اس کھاد میں۔"

"ہاں۔ باقی ڈیڑھ من عقل تو تمہارے سر میں کُشتہ بنا کے بھری گئی ہوگی" نازو جل کے بولی۔

میں نے سر پہ ہاتھ مارا "یار! یہ کیا مصیبت ہے آخر؟ تمہیں ذرا احساس نہیں کہ وقت کم ہے۔ ایسا نہ ہو اکبر خان آجائے...."

"آج رات وہ باہر رہے گا" روزینہ نے کہا "وقت بہت ہے۔"

"مس روزینہ! تمہارے پاس کوئی دوسرا کیسٹ ہے؟" غالب بولا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہاں تو نہیں ہے۔ ہے تو مجھے نہیں معلوم کہ کہاں ہے۔"

"چلو ہم یہی کیسٹ دوبارہ ریکارڈ کرلیتے ہیں۔" غالب نے کہا "ہمیں اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔"

"ہمیں اس کی بالکل ضرورت نہیں" میں نے غالب کی بات سمجھی تھی "اسے ہم ضائع کردیتے ہیں؟"

"کیسٹ ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ اسی پر ہم کچھ اور ریکارڈ کرواتے ہیں" غالب نے کہا "اس میں ایک گھنٹہ تو لگے گا مگر یہ مسئلے کا بہترین حل ہے۔"

میں قائل ہوگیا۔ "نازو! اب تمہیں فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے مان لینا چاہیے کہ تمہاری رائے غلط تھی۔"

"بلکہ تم کو اپنے الفاظ واپس لے کر مجھ سے معافی مانگنی چاہیے۔ نہایت عاجزی کے ساتھ ہاتھ باندھ کے۔"

رابعہ نے فوراً نازو کی حمایت کی "چلو اب تم بھی زبان سے مت چوکو۔ جو کرنا ہے فوراً کرلو۔"

میں نے کیسٹ غالب کو پیش کیا "یہ لو۔ اسے واپس ٹیپ ریکارڈر میں لگادو۔ اور مس روزینہ! آپ اسے اپنی جگہ رکھ دیں۔"

"تم بھی کرسکتے ہو یہ کام۔ تصویر اپنی اصلی جگہ آئے گی تو خانہ خود بخود لاک ہوجائے گا۔" روزینہ نے کہا۔

میں نے کیسٹ لگا کے اسے "آن" کیا اور خفیہ خانے میں رکھ کے فریم کو دوبارہ بند کردیا۔ "یہ بھی بتادو کہ تم نے اس کو کیسے کھولا تھا۔ وہ بٹن کہاں ہے؟"

"تم کیا کروگے دیکھ کر؟" روزینہ بولی لیکن اس کی نشاندہی سے پہلے ہی غالب نے وہ بٹن تلاش کرلیا۔ شاید وہ پہلے زیادہ غور سے دیکھ چکا تھا کہ روزینہ کا ہاتھ کہاں گیا تھا۔

میں نے دوبارہ فریم ہٹا کے ٹیپ کو آف کیا اور کیسٹ کو "ریکارڈر" کی پوزیشن پر لانے سے پہلے کہا "اب آپ سب خاموشی سے نکل جائیں اور اپنے کمرے میں میرا انتظار کریں۔ میں مس روزینہ کو ساتھ لے کر آتا ہوں۔"

"میں یہیں ٹھیک ہوں" روزینہ نے للچائی نظروں سے [illegible] کی بوتلوں کو دیکھا۔

"احتیاط ضروری ہے مس روزینہ" میں نے کہا "کیونکہ ہمارے جاتے ہی تم اصل کیسٹ نکال کے چھپا لو اور کوئی اور کیسٹ لگادو۔"

اس نے زخم خوردہ نظروں سے مجھے دیکھا "تمہیں اعتبار نہیں ہے مجھ پر؟"

"یہ اعتبار کا کھیل ہی نہیں ہے۔"

وہ افسردگی سے مسکرائی "اچھا۔ مجھے اس بات کی اجازت تو دو کہ میں اپنے ساتھ کچھ لے چلوں۔ پیاس بجھانے کے لیے تمہارے پاس کیا ہوگا؟"

غالب بولا "ہم سیدھے سادے لوگ پانی سے پیاس بجھاتے ہیں۔"

وہ ہنس پڑی "سیدھے سادے لوگ! احمق، جو پیاس پانی سے بجھتی ہے۔ اور تم پیاس کو بجھاتے نہیں، دباتے ہو۔ اس سے پیاس اور بھڑکتی ہے جیسے آگ جو اندر لگی ہو۔"

میں نے اسے ٹوک دیا "فضول باتیں چھوڑو۔ تم ایک گھنٹے میں مر نہیں جاؤ گی۔"

وہ خاموشی سے اٹھی اور میرے سامنے کھڑی ہوگئی "کیا میں اس لڑکی سے کم خوب صورت ہوں؟ کیا نام ہے اس کا۔ رابعہ۔"

میں نے کہا "رابعہ کے حسن کو تمہاری نظر نہیں دیکھ سکتی۔"

"تم اس سے محبت کرتے ہو نا؟" وہ میرے سہارے [illegible] لگی۔

"تم جانتی ہو تو پوچھ کیوں رہی ہو؟"

"کتنی محبت ہے تمہارے پاس اس کے لیے؟"

"میں کیا جواب دوں اس بات کا۔ محبت کو تول کر [illegible] چھٹانک میں بتانا یا حساب کے کسی قاعدے سے اس کی پیمائش تو سائنس کے لیے اتنا ہی ناممکن ہے جتنا خلا کا رقبہ بتانا۔"

"اچھا۔ بہت محبت ہے تمہارے دل میں!" وہ بولی "اکبر کی دولت زیادہ ہے یا تمہاری محبت؟"

میں نے جھنجلا کے کہا "میری محبت لامحدود ہے۔ اکبر خان کی دولت کا اس سے کیسے موازنہ کیا جاسکتا ہے؟ یہ دولت ایک [illegible] ہوجانے والی اور ختم ہوجانے والی چیز ہے۔"

"اس کے باوجود اکبر خان بڑی فراخ دلی سے مجھ پر لٹاتا رہتا ہے۔ مجھ سے پہلے بھی نہ جانے کس کس پر [illegible] اسے یہ خوف نہیں ہے کہ کسی دن یہ دولت ختم ہوجائے گی۔"

"پھر۔ کیا ثابت ہوتا ہے اس سے؟"

"کچھ نہیں" وہ بے خیالی میں بولی "کیا تم اس خیال سے نہیں ڈرتے کہ تمہاری محبت کم نہ ہوجائے؟ تمہارا ساتھ نہ چھوڑ دے؟"

"محبت سچی ہو تو ایسا خیال آتا ہی نہیں" میں نے کسی فلمی ہیرو کی طرح ڈائیلاگ بولا۔

"اچھا۔ تو پھر اس میں سے تھوڑی سی محبت مجھے دے دو۔ بس تھوڑی سی" اس نے اچانک میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں "سمندر سے پیاسے کو شبنم دو تو سمندر خشک نہیں ہوتا۔"

میں نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے "تم پاگل ہوگئی ہو نشے میں۔"

"نہیں۔ میں جاگتی ہوش و حواس میں ایسا کہہ رہی ہوں۔ ساری زندگی تم رابعہ سے محبت کرتے رہنا بعد میں لیکن آج اس مے خانے سے ایک جام میرے نام کردو.... خیرات کے طور پر۔ اپنی محبت کی اور اپنی زندگی کے حسین مستقبل کی زکوٰۃ سمجھ کے۔"

پہلے میں نے غصے میں اس کو طمانچہ رسید کرنے کا سوچا لیکن پھر مجھے اس پر رحم آگیا "کیا تم سمجھتی ہو کہ یہ محبت کوئی ایسی چیز ہے جس میں لین دین، نقد اور اُدھار ممکن ہے؟ جو خریدی یا بیچی جاسکتی ہے، کسی کو استعمال کے لیے دی جاسکتی ہے اور وقتِ ضرورت لی جاسکتی ہے؟"

"مجھے۔۔ واقعی نہیں معلوم۔ وہ سب جو مجھ سے محبت کرتے رہے اور جن سے میں نے محبت کا اظہار کیا.... وہ ایسا ہی سمجھتے تھے۔ میں تو دوسری محبت مانگ رہی ہوں تم سے۔"

"بے وقوف عورت! اب نہ وہ محبت میری ملکیت ہے اور نہ میرے تصرف میں ہے۔ یہ رابعہ کی ایک مقدس امانت ہے اور اس خزانے کی چابیاں بھی میرے پاس نہیں۔ رابعہ کے پاس ہیں۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ باتوں سے بے وقوف بناتے ہو مجھے۔ تم متعصب اور تنگ نظر ہو.... خسیس ہو اور جان بوجھ کے میری تذلیل کررہے ہو۔ کوئی ایسا مرد نہیں جو روزینہ کو ٹھکرا سکے۔" اس کی انا میرے انکار سے مجروح ہوچکی تھی۔

"اونٹ جب تک پہاڑ کے دامن سے نہ گزرے اپنی بلندی پر غرور کرتا رہتا ہے۔ میں ہوں وہ مرد۔"

"نامرد ہو تم۔ بزدل ہو.... ڈرتے ہو رابعہ سے" اس نے چلا کے کہا۔

اب میں نے اس کے گال پر اُلٹے ہاتھ سے چانٹا مارا۔ اس کے گلابی رنگ پر انگلیوں کے نقش نمودار ہوگئے "ایک جسم فروش عورت کی ہوس کے جذبات کی تسکین کوئی حیوان ہی کرسکتا ہے اور میں انسان ہوں۔ تم جس خوب صورت جسم پر نازاں ہو اس کے اندر کی روح میں مجھے انسانیت کی بدصورتی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں تم سے صرف نفرت کرسکتا ہوں۔"

وہ ایک ہاتھ گال پر رکھے مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اور ان آنکھوں کی ویرانی میں مجھے احساسِ ذلت سے پیدا ہونے والے انتقامی جذبات کی خوں آشامی نظر آرہی تھی۔ "جب مرد کے پاس دلیل نہ رہے تو وہ ہاتھ اٹھاتا ہے۔"

میں نے تھوڑی سی شرمندگی محسوس کی "آئی ایم سوری۔ تمہاری یہ گالی میں برداشت نہ کرسکا۔"

"تمہارا سچ تو میں نے سن لیا تھا۔" وہ آہستہ سے بولی اور پھر ایک دم باہر نکل گئی۔ میں ٹیپ ریکارڈر آن کرکے گیا۔

"بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے" غالب نے مجھے دیکھ کے دیدے گھماتے ہوئے کہا۔

نازو نے اسے مصنوعی غصے میں ڈانٹا "بعض ہوگی ایسی کوئی بات جو ہم سب کی موجودگی میں نہیں ہوسکتی تھی۔"

غالب نے لفنگے کی طرح سر ہلایا "اور بات کچھ مشکل ہوگی۔ سمجھنے سمجھانے میں دیر لگی۔"

"ویسے اپنے سکندر صاحب ہر بات سمجھ لیتے ہیں اور کسی کا دل توڑنا تو ان کے مسلک میں حرام ہے" نازو شرارت پر آمادہ تھی۔

غالب نے کان میں انگلی ڈال کے ہلائی "خیر جی ہمیں کیا۔ دیر ہوا اندھیر۔ مس رابعہ! ایک لطیفہ سناؤں آپ کو؟ آپ کچھ اداس اور متفکر نظر آرہی ہیں۔"

میں نے ظاہر یہ کیا کہ میں ان کی بکواس کو ایک کان سے سن کے دوسرے سے اُڑا رہا ہوں لیکن غالب کے قریب جاکے میں نے اسے ایک دم اٹھایا اور دھوبی پٹکا دے کے بیڈ پر دے مارا۔

غالب نے واویلا کیا "آہ۔ اف.... ارے نازو! بھوت کی بچی.... تیرا سہاگ خطرے میں ہے اور تو خاموش ہے۔ تماشا دیکھ رہی ہے۔"

"اور میں کیا کروں؟ تمہاری مغفرت کی دعا۔"

"بے وفا۔ آگے بڑھ کر جان کی بازی لگادے۔ اس پیار کے دشمن کا جھٹکا کردے۔ قربان ہوجا وفا کی راہ میں۔"

"تم خود وفا کی راہ میں قربان کیوں نہیں ہوتے؟ باتیں تو بہت کرتے تھے پیار میں جان دینے کی" نازو نے لہجہ بنا کے کہا۔

غالب ایک دم اٹھ بیٹھا "قسم خدا کی! میں بہت سخت اداریے لکھوں گا اپنے اخبار میں۔ ایک محبت کے خلاف، ایک دوستی کے خلاف۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" رابعہ ہنسی۔

نازو نے کہا "تیسرے دن اخبار بند ہوجائے گا یا ایڈیٹر۔"

میں نے کہا "چلو اب مذاق بہت ہوگیا۔ کچھ کام کی باتیں بھی کرلیں۔ ہم سب سے پہلا مسئلہ ہے اخبار کی پالیسی۔"

غالب نے کہا "سب سے کامیاب پالیسی یہ ہوگی کہ کوئی پالیسی نہ ہو۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ کامیاب وہی ہیں جن کا اصول ہے کہ کسی اصول کی بات نہ کی جائے۔ لیکن ہم ایسا نہیں کرسکتے۔"

"اور یہ بات ہم اکبر خان پر واضح بھی کرچکے ہیں" رابعہ بولی۔

روزینہ بے زار اور خاموش بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اچانک اس نے سر اٹھا کے میری طرف دیکھا تو میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"جو باتیں ہم کررہے ہیں' وہ ریکارڈ ہورہی ہیں۔ اس میں تمہاری آواز شامل نہیں ہونی چاہیے" میں نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا اور اسے پکڑا دیا۔

اس نے مجھ سے پین لے کر لکھا "ویسے میں خاموش نہیں بیٹھ سکتی' مجھے خاموشی کی دوا چاہیے۔"

میں سمجھ گیا کہ خاموشی کی دوا سے اس کی کیا مراد ہے۔ میں نے غالب اور نازو کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی باتیں جاری رکھیں اور خود بادل ناخواستہ روزینہ کے لیے شراب کی بوتل لینے چلا گیا۔ واپس آکے میں نے واش بیسن میں ہاتھ اچھی طرح دھوئے۔ اس کے باوجود مجھے یہ احساس رہا کہ میں نے ایک حرام اور ناپاک چیز کو چھوا تھا۔

غالب اور نازو کو میں نے باتیں کرنے کے لیے کہا تھا چنانچہ وہ لڑ رہے تھے۔ ان کی باتیں شروع بھی لڑائی سے ہوتی تھیں اور ختم بھی لڑائی پر ہوتی تھیں۔

"تم تو خود بھوت ہو" نازو بولی۔

"ہاں میں بھوت ہوں' اسی لیے تو ایک بھوت نے اپنی فرزندی میں قبول کیا ہے مجھے" غالب نے چلا کے کہا۔

"مجھے آتا ہے بھوت اتارنا۔"

"اپنے اباّ سے سیکھا ہوگا تم نے۔"

میں نے کہا "کبھی خود بھی خاموش ہوجایا کرو۔ میں نہ منع کروں تو شاید تم سارا دن لڑتے رہو۔"

رابعہ بولی "ایسے ہی ایک دوسرے کا دماغ کھاتے رہتے ہیں۔"

غالب نے کہا "دماغ یہ کھاتی ہے میرا۔ اس سے کہو۔"

"واہ" نازو چہک کر بولی "تم کچھ نہیں کھاتے۔"

"میں تو بھوسہ کھاتا ہوں۔ جو ملے گا وہی کھاؤں گا نا۔"

میں نے کہا "خاموش ہوجاؤ۔ خدا کے لیے دونوں چپ ہوجاؤ' ایک دوسرے کی طرف دیکھو بھی مت۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ادھر منہ کرلیتا ہوں" غالب نے پیٹھ پھیرلی "سامنے ہے پاؤں کی جوتی جو زیادہ خوب صورت ہے۔"

نازو نے جل بھن کے دوسری طرف منہ کرلیا "مجھے بھی نظر آرہا ہے باتھ روم کا لوٹا۔ بے پیندے کا نہیں ہے۔ بدصورت ہے تو کیا ہوا۔"

رابعہ کو ہنستا دیکھ کے مجھے بھی ہنسی آگئی۔ اب سب کا رابطہ رو بہ رو تھا لیکن نازو اور غالب ہمارے دائیں بائیں دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھے تھے اور نادان' ضدی بچوں کی طرح روٹھے ہوئے تھے۔

میں نے کہا "مرزا جی! تم نے اخبار کا کوئی نام سوچا ہے؟"

"سوچا ہے۔ مغلوب لوٹا۔" غالب نے کہا۔

"مظلوم جوتی بھی اچھا نام ہے" نازو بولی۔

رابعہ نے کہا "نام ایسے نہیں رکھا جاتا۔"

"میرا ایسے ہی رکھا گیا تھا۔ دادا جان کا خیال تھا کہ ... بڑا فرق پڑتا ہے۔ اسداللہ غالب ثانی بن کے میں شاعری میں ... پیدا کردوں گا کہ لوگ اصل غالب کو بھول جائیں گے۔ ... ایک شعر نہیں گھڑ سکا میں۔ اب ایک خاتون ہیں بڑی خوش ... مگر نام ہے ان کا نزاکت۔"

"انہیں چھوڑو' یہ میرپھیں نہیں ہوسکتے" رابعہ بولی "میرا ... ہے کہ اس اخبار کے لیے دفتر میرے آفس کو بنالیا جائے۔"

"انتخاب تو برا نہیں" میں نے کہا۔

"اس سے بہتر اور موزوں جگہ اخبار کے لیے کہاں ..." رابعہ نے مجھے قائل کرنے کے انداز میں کہا "قریب ہی ... اخبارات ہیں۔"

"امروز اور پاکستان ٹائمز" میں نے کہا "حسرت کی ... آگے کیا بات کیا ہوگئے۔ پروگریسو پیپرز کی ملکیت تھے تو ان کا ... تھا۔ اب نرست کا نام ہے مگر نرست نہیں۔"

"مرحوم سول اینڈ ملٹری گزٹ بھی آگے سے شائع ہوتا ... آج تک بلڈنگ کا وہی نام ہے" رابعہ بولی "کیسا المیہ ہے ... سال سے زیادہ عرصہ جاری رہنے والا اخبار بند ہوگیا جس ... کپلنگ (RUDYARD KUPLING) جیسے ایڈیٹر ... رہے۔"

غالب نے آہ بھری "مجھ پر رقت طاری ہورہی ہے ... سے کہ ایک دن وہ اخبار بھی بند ہوجائے گا جس کو ہم ... بلکہ دوڑائیں گے۔ یوں کہ سارے اخبار پیچھے رہ جائیں گے۔"

میں نے کہا "اس میں میرا کالم روز چھپے گا۔ عنوان ... "جھوٹی باتیں" اور لکھنے والا ہوگا۔ سچا آدمی" "یہ قلمی نام ہوگا ..."

"ونڈر فل۔" رابعہ نے خوش ہوکے کہا "مجھے یقین ... اسی کی مقبولیت پر اخبار چل جائے گا۔"

غالب نے ایک دم پلٹ کے کہا "اخبار چلتا ہے ایڈیٹر ... پر۔ کامریڈ چلتا تھا مولانا محمد علی جوہر کے نام پر۔ زمیندار ... مولانا ظفر علی خاں کے دم سے تھا۔ پھر چراغ حسن حسرت ... عبدالمجید سالک۔"

میں نے کہا "اچھا یار! ہم مان لیتے ہیں مروت میں کہ ... تمہارے نام پر چلے گا۔"

"اچھا تو وہی اپنے کالم میں چوہدری رلا ور جیسے لوگوں کے بارے میں انکشافات کرے گا تو تہلکہ مچ جائے گا" غالب بولا۔

میں نے کہا "روزنامہ جنگ عزت کا نوٹس لے گا یا کوئی دھمکی ملے گی۔"

اب نازو نے پلٹ کے کہا "بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ یہ تو بڑا اچھا ہوگا اگر ہمارے خلاف مقدمات قائم ہوجائیں۔ مفت کی پبلسٹی ملے گی ہمارے دشمنوں کے ذریعے۔"

"رہی سہی کسر عدالت میں پوری ہوجائے گی جب ہماری قانونی مشیر مس رابعہ قاری جرح میں ان کے بخیے ادھیڑیں گی" غالب خوش ہوکے بولا۔

"مس رابعہ نہیں' مسز رابعہ سکندر۔ لیگل ایڈوائزر۔ یعنی مشیر قانونی" نازو نے اسے ٹوکا۔

"اور جرائم کی دنیا کے راز فاش کریں گی ہماری کرائم رپورٹر مسز نزاکت غالب" میں نے فوراً جوابی حملہ کیا "بڑے بڑے مجرم ان کے نام سے تھر تھر کانپتے نظر آئیں گے۔ پولیس والے سر پکڑ کے رو دیں گے۔"

"سر پکڑ کے نہیں' پیٹ پکڑ کے" غالب بولا "جوان کی شخصیت کو زیادہ رُسوا کرتا ہے۔ جب پلٹ اترتی ہے تو اسی پیٹ پر ہے۔"

آدھے گھنٹے بعد غالب نے روزینہ کے کمرے میں جا کے ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ کو پلٹ کے لگایا۔ اکبر خان نے یہ کام روزینہ کے سپرد کیا ہوگا مگر وہ ہمارے کمرے میں بے خبر سورہی تھی۔ وہ میری طرف سے ٹھکرائے جانے کی ذلت کے احساس کو مٹانے کے لیے مسلسل پیتی رہی تھی۔ اس کی طرف رابعہ کی پیٹھ تھی لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی نگاہوں میں رابعہ کے لیے نفرت کا کتنا زہر ہے۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ اس کی قوتِ تسخیر اور غرورِ حسن کو شکست اس عورت کی وجہ سے ہوئی جو اس کے نزدیک ایک معمولی عورت تھی۔ اس میں مجھ سے نظر ملانے کی ہمت نہ تھی۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹتی رہی اور ایک مرحلے پر مجھے یوں لگا جیسے جذبات کا وہ آتش فشاں جو اس کے وجود میں اُبل رہا ہے' اس کی عقل اور ضبط کے حوصلے کو جلا کے خاک کردے گا۔ میں ہر قسم کے طوفانی ردِعمل کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا مگر روزینہ کے اندر کی مغرور اور خود پسند عورت نے مزید ذلت اٹھانا منظور نہ کیا۔ اس کی آنکھوں سے جو آنسو چھلکے ان پر اس کا اختیار نہ تھا۔ کسی نے ان خاموش آنسوؤں کو دیکھا بھی تو سمجھا نہیں اور وہ اپنے آپ سے لڑتے لڑتے تھک گئی تو جہاں بیٹھی تھی وہیں گر کے روتے روتے سوگئی۔ سرہانے میز کے آہستہ بولا

ایک گھنٹے بعد میں نے باہر جھانک کے دیکھا تو کوٹھی میں اندر اور باہر خاموشی تھی یا رات کا پُراسرار اندھیرا تھا جو ہر جگہ جلنے والی روشنی کو جل دے کر چوروں کی طرح ہر کونے میں چھپا بیٹھا تھا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے اور کوئی ملازم کسی بھی وقت ڈنر کے لیے پوچھنے آسکتا تھا۔ ابھی تک قسمت ساتھ دے رہی تھی۔ آج رات اکبر خان موجود نہیں تھا۔ پھر ہم وہ کیسٹ ضائع کرچکے تھے جو ہمارے سارے راز فاش کردیتا اور اب اکبر خان کے لیے وہ کیسٹ رہ گیا تھا جس میں نہ ہمارے لیے خطرے کی بات تھی اور نہ اکبر خان کے لیے شک کی۔ بس ایک خیال کی خلش تھی جو صرف میرے دل کو بے قرار کررہی تھی۔ کیا روزینہ اپنی تذلیل کا بدلہ یوں نہیں لے سکتی کہ اکبر خان کو اصل صورتِ حالات سے آگاہ کردے' اسے وہ سب بتادے جو کیسٹ پر سے تو حرفِ غلط کی طرح مٹایا جاچکا تھا مگر اس کے دماغ سے نہیں کھرچا جاسکتا تھا۔ سچ بول کے وہ زیادہ معتبر ہوسکتی تھی اور یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں تھا۔ اکبر خان کو شک بھی نہ ہوتا کہ وہ کسی انتقامی جذبے سے مغلوب ہوکے سچ بول رہی ہے۔ تذلیل کا داغ نظر نہ آتے مگر اس کی اپنی ذات مظلوم و معصوم نظر آئے۔

غالب نے میرا کندھا ہلا کے کہا "بڑے بھائی! کیا دل نہیں چاہتا یہاں سے جانے کو؟ داغِ مفارقت کے خیال سے دل پریشان ہے؟"

"ہاں۔ پریشانی تو ہے" میں نے چونک کے کہا۔

"تو رابعہ! تمہارے سکندرِ اعظم عرف ہرجائی بام نے کیا نکا سا جواب دیا ہے تمہیں" غالب آواز میں رقت پیدا کرکے بولا "کیا ہے وہ دردناک فلمی شعر۔ لاکے منجدھار میں ساجن نے انہیں چھوڑ دیا۔"

میں نے خفت سے رابعہ اور نازو کی طرف دیکھا جو میری محویت کا کچھ اور ہی مطلب نکال رہی تھیں "کیوں یہ۔ پریشانی کا سبب کچھ اور ہے جو میں نے ابھی تک تمہیں نہیں بتایا تھا۔"

"معلوم ہے ہمیں۔ سب کو نظر آرہا ہے۔ اندھے نہیں ہیں ہم سب" غالب نے بولنا شروع کیا "تم بھلا کیوں بتاؤ گے ایسی بات ہمیں لیکن تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ماری گئی رابعہ۔"

"مارے جاؤ گے تم میرے ہاتھوں" میں نے بگڑ کے کہا "فضول بولتے جارہے ہو۔ اصل بات کا پتا ہی نہیں۔"

"اچھا تو تم کچھ بولو۔"

نازو نے کہا "آپ بتائیں اصل بات۔"

"کیا بتاؤں" میں نے سر کھجا کے کہا "شرم آتی ہے۔ مجھے اس بے شرم سے امید نہ تھی ایسی بات کی۔ میرا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔"

رابعہ کا رنگ فق ہوگیا "سکندر۔"

غالب اور نازو بھی ایک دم سیریس ہوگئے۔ انہیں میرے سوز سے اندازہ ہونے لگا تھا کہ اب بات مذاق کی نہیں رہی۔

"تم لوگ غلط سمجھ رہے ہو" میں نے بے بسی سے کہا "رابعہ!

urduspaksociety.com

سوچ بھی رہے ہو تم تو پھر میرے لیے واقعی شرم کی بات ہے اور یہ بڑے دکھ کی بات ہے۔ اگر اتنا کمزور اور ناقابلِ اعتبار ہے ہمارے درمیان اعتماد کا رشتہ..."

"مت کرو ایسی دل دکھانے والی باتیں سکندر" رابعہ نے افسردگی سے کہا "میرے اعتماد کو بلاوجہ الزام مت دو۔"

"نہ تم چور ہو نہ تمہاری داڑھی ہے اور نہ اس میں کوئی تنکا جس کی طرف تمہارا ہاتھ جائے" غالب نے کہا "پھر یہ پریشانی کیسی؟"

میں نے انہیں بتادیا کہ کس طرح ملازمہ نے مجھے ورغلانے کی پوری کوشش کی تھی اور کس طرح میں نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اس کے بعد یہ اندیشہ باقی رہتا ہے کہ وہ اپنی ذلت کا انتقام لینے کے لیے اکبر خان کو ہمارے خلاف بھڑکائے۔ یہ بتا دے کہ اصل کیسٹ تو ہم نے زبردستی حاصل کر لیا تھا۔ بعد میں جو کچھ ریکارڈ ہوا، سب کیوں اس نے۔ اصل بات کو وہ بڑھا چڑھا کے بھی بتا سکتی ہے۔

غالب اور نازو کے ہونٹوں پر بڑی سرسری مسکراہٹ تھی جو مجھے مزید خفت میں مبتلا کر رہی تھی لیکن رابعہ بھی اپنے بے بنیاد شک اور حسد کے جذبات پر شرمندہ تھی چنانچہ وہ ذہنی طور پر میرے ساتھ ہو گئی تھی۔ اس نے کہا "اسے چھوڑ جانے کی صورت میں یہ خطرہ تو باقی رہے گا۔"

غالب نے سرہلایا "اور اسے ساتھ لے جانے کی صورت میں کیا ہوگا، یہ بھی سوچ لو مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ۔"

میں نے کہا "چلو فیصلہ تم کرو۔ میں تو یہ کام نہیں کر سکتا۔ تم اس کا گلا گھونٹ سکتے ہو تو آگے بڑھو۔ ختم کرو سارا جھگڑا۔"

غالب بے اختیار ایک قدم پیچھے ہو گیا "میں.... تم بھی ورد تو میں ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ تو قتلِ عمد ہوگا۔"

"تم نازو؟ تم تو بہت بیدار ہو۔" میں نے تلخی سے کہا "ایک ہاتھ مار کے اس کی گردن توڑ دو۔"

نازو زرد سی ہو گئی "یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"تم بھی تو بہت بول رہی تھیں۔ باتیں کرنا واقعی آسان ہوتا ہے" رابعہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

نازو نے مجروح نظروں سے اسے دیکھا "رابعہ باجی! آپ جانتی ہیں ہم سب مذاق ہی کر رہے تھے۔"

"اچھا ختم کرو یہ باتیں۔ اسے ہم ساتھ لے جائیں گے اور بعد میں سوچیں گے اس کے بارے میں" میں نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

لیکن اسی وقت ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ کسی نے بند دروازے پر دستک دی۔

"کوئی ملازم ہوگا۔ اب ڈنر کا کہنے آیا ہوگا" میں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا "میں دیکھتا ہوں۔ تم ذرا اس پر کوئی چادر ڈال دو۔ وہ ننگی پڑی ہے۔"

میں نے دروازہ تھوڑا سا کھولا تھا کہ شان اسے دھکیل کر اندر آ گیا اور پھر بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کی صورت پر بدحواسی کے آثار تھے۔

"شان! تم...." میں نے حیران ہو کے کہا "کیا بات ہے؟"

"تم اندر آنے سے پہلے کہاں غائب ہو گئے تھے؟" رابعہ اپنی حیرت کے صدمے سے سنبھل کے بولی۔

"یہ سب میں پھر بتاؤں گا" وہ بولا "میں بڑی مشکل سے پہنچا ہوں یہاں۔ یہ بتانے کے لیے کہ آپ سب لوگ خطرے میں ہیں.."

میں نے اسے تسلی دینے کے انداز میں کہا "آرام سے بیٹھو اور پوری بات بتاؤ۔ واپس کیوں چلے گئے تھے تم؟"

"بیٹھنے کا وقت نہیں ہے" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے کہا "جب میں پہلے آیا تھا تو اکبر خان نظر آیا تھا مجھے۔ وہ دیکھ لیتا مجھے یہاں تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔"

"وہ جانتا ہے تمہیں۔ تم ہر روز اس کو اخبار دیتے ہو۔"

"ہاں۔ مگر وہ میری اصلیت نہیں جانتا۔"

"تمہاری اصلیت کچھ اور ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا "اگر میں آپ سے ملنے آتا تو شاید اسے شک ہو جاتا، اس لیے میں واپس چلا گیا تھا۔"

"تم پُراسرار بننے کی کوشش کر رہے ہو نورِ چشم" غالب نے کہا "ایسی کیا بات ہے؟"

"یہی بات تو بتاؤں گا آپ کو" اس نے تڑپ لہجے میں کہا "میں باہر انتظار کر رہا تھا کہ اکبر خان چلا جائے یا آپ باہر آ جائیں تو میں بات کروں۔ میں دور سے گیٹ کو دیکھ رہا تھا۔"

"اسے تو گئے ہوئے دیر ہو گئی" رابعہ بولی۔

"ہاں۔ اس کی کار نکلی تو میں بھی نکلا۔"

"تم چھپے ہوئے تھے کہیں؟"

"پارک میں بیٹھا ہوا تھا ایک بینچ پر۔ بینچ کے چاروں طرف گھنی اگی ہوئی جھاڑیاں ہیں" اس نے وضاحت کی "اکبر خان کی گاڑی کے گزرتے ہی ایک اور گاڑی گیٹ پر آ گئی۔ وہ کافی بڑی گاڑی تھی اور کافی دیر سے وہیں تھی اس لیے میں نے پہچان لیا۔ اس میں سے کوئی اترا جس کا چہرہ اور جسم چادر میں لپٹے ہوئے تھے وہ چوکیدار کے کیبن میں گیا۔ میرا خیال تھا کہ اکبر خان کا کوئی ملنے والا ہوگا۔ پتا چلے گا کہ وہ ابھی ابھی گیا ہے تو لوٹ جائے گا۔ انتظار کرنا چاہے گا تو کار اندر چلی جائے گی مگر کار دس منٹ تک وہیں کھڑی رہی۔ اس کا انجن چلتا رہا۔"

غالب بولا "بہت غور سے نوٹ کرتے ہو تم ساری باتیں۔"

"پورا سراغ رساں ہے یہ تو" رابعہ بولی۔

"وہ... دراصل.. اس سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں ہے۔ جب آدمی فارغ بیٹھا ہو تو سب دیکھتا رہتا ہے۔ ایک ہی کار نظر آ

www.paksociety.com

تھی مجھے اور اس کا رنگ بھی عجیب سا تھا۔ کچھ ہرا کچھ پیلا۔ لیمن جیسا۔ اس لیے نمایاں تھا۔"

میں نے کہا "گاڑی کس رنگ کی تھی؟"

"جی…… نہیں جی۔ بڑی گاڑی تھی۔ سامنے سے یوں لگتا تھا جیسے اس کے لمبے لمبے دانت ہوں۔"

"میں سمجھ گیا۔ بیوک تھی پرانی لیکن پھر بھی بہت مہنگی گاڑی ہے اور اتنی عام بھی نہیں ہے" میں نے کہا۔

"اس کا سامنے والا حصہ بہت ٹوٹا پھوٹا تھا۔ دونوں لائٹس بھی نہیں تھیں۔ پیچھے سے ٹھیک تھی۔" شان نے کہا "اور میرا خیال ہے کہ اس گاڑی کو میں نے وہاں دیکھا تھا۔ کیکر شاہ کے مزار پر۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے "کیکر شاہ کے مزار پر! تمہیں یقین ہے؟"

"بالکل جناب۔ وہاں جب دھماکے ہو رہے تھے تو اسی وقت یہ گاڑی نہ جانے کہاں سے نکلی تھی اور کچے راستے پر کھیتوں کے بیچ میں اڑتی ہوئی غائب ہو گئی تھی۔"

"وہ کیکر کی اولاد اس میں فرار ہو گیا تھا۔ کسی خفیہ راستے سے نکل گیا تھا" میں نے کہا۔

غالب بولا "اب یہاں کیا لینے آیا تھا وہ؟"

"تم شان کو بھی تو کچھ بتانے دو۔ بیچ میں اپنی جرح شروع کر دیتے ہو" نازو نے کہا۔

شان نے بیانات شروع کی "وقت ضرور نوٹ کیا تھا میں نے اس لیے کہ کانٹا آگے گئی نہیں نہ پیچھے۔ اور اس کے پیچھے سائلنسر سے ہلکا سا دھواں خارج ہو رہا تھا۔ اس سے اندازہ کیا میں نے کہ انجن چل رہا ہے۔ دس منٹ بعد جو شخص منہ سر چادر میں لپیٹ کر اندر گیا تھا اسے وردی والے چوکیدار نے کندھے پر اٹھا کے گاڑی میں ڈال دیا۔"

"کیا مطلب؟ مار کے ڈال دیا؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ وہ زندہ تھا یا صرف بے ہوش تھا لیکن وہ اس چادر میں لپٹا ہوا تھا جو پہلے اس نے اوڑھ رکھی تھی۔" شان نے کہا "چوکیدار نے اسے ڈگی میں ڈالا۔ ڈگی ایک اور شخص نے کھولی تھی۔ پھر گاڑی واپس چلی گئی۔ جدھر سے آئی تھی۔ وہ آدمی زندہ ہوتا تو اسے ڈگی میں کیوں ڈالا جاتا؟"

"تمہارا کیا خیال ہے اسے چوکیدار نے قتل کر دیا ہو گا؟"

"میں وہیں رک کے بہت دیر تک سوچتا رہا کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ چوکیدار نے اسے کیوں قتل کیا۔ اور اتنی آسانی سے کون قتل ہوتا ہے؟ میرا مطلب ہے لڑائی ہوتی ہے، مقابلہ ہوتا ہے۔ کوئی کا سنہ بلکہ کوئی نہیں کر سکتا گھر میں سے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی۔"

میں نے کہا "ایک چیز ہوتی ہے سائلنسر۔ اگر وہ ریوالور کی نال پر لگا دیا جائے تو فائر کی آواز دب جاتی ہے۔"

"جانی! خیر کچھ ہوا ضرور تھا۔ اگر خنجر سے قتل ہوا تو اس چادر پر خون بھی نظر آتا۔ چھوٹا سا کیبن ہے جس میں چوکیدار کو گلا گھونٹ کر کیسے مار سکتا تھا۔ چوکیدار خود کون سا نامعلوم شخص پھر آخر کوئی وہاں مرنے کے لیے کیوں آیا تھا؟ اور جو اسے لایا تھا وہ خود کون تھا؟ کیا وہ خود یہ کام نہیں کر سکتا تھا؟ یہ تو ایسے ہی ہوا جیسے کوئی مرغی ذبح کرانے کے لیے قصائی کے پاس لے جائے۔ گھر میں ایک اور عجیب بات تھی کہ کسی نے اکبر خان کے جانے کا انتظار کیا۔"

"اس میں کیا عجیب بات ہے؟" میں نے بات سمجھ لینے کے باوجود اسے غور سے دیکھا۔

"دیکھیں نا جی کیا چوکیدار نے کہا تھا کہ اچھا اپنے شکار کو شام کے وقت لے آنا۔ اتنے بجے سیٹھ باہر جائے گا۔ اس وقت میں تمہارا کام کر دوں گا۔ یعنی اس بندے کا کام تمام کر دوں گا۔ چوکیدار کو میں جانتا ہوں۔ وہ بہادر ہے، وفادار ہے مگر پیشہ ور قاتل نہیں ہے۔ نیک دل شخص ہے۔ دو سال سے میں صبح اسے ہی اخبارات کا بنڈل پکڑاتا ہوں۔ ہمیشہ دعا دی اس نے مجھے کہ بیٹا محنت کرنے والے ہو۔ اللہ ضرور کامیاب کرے گا تمہیں۔ ایک دن بڑے آدمی ہو گے مگر اکبر خان جیسے نہیں۔"

"یہ کتنا تھا نام اسے اکبر خان کا چوکیدار؟"

"ہاں۔ چوکیدار پرانا تھا، سب جانتا ہو گا" شان بولا "کافی دیر سوچنے کے بعد جب اندھیرا ہو گیا تو میں نے کہا بیٹا شان یہ معاملہ کچھ اور ہے اور یہ تمہاری شان کے خلاف ہو گا اگر تم اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنے کے بعد آنکھیں بند کر کے سو گئے۔ بس جی میں نے کہا اب جو ہوتا ہے ہو۔ میں گیٹ تک پہنچا اور سیدھا اندر جانے لگا۔ اسی وقت چوکیدار نے کرخت لہجے میں کہا "اوئے چھوکرے! کدھر جاتا ہے اندر۔ تیرے باپ کا گھر ہے کیا؟ گالی بھی دی اس نے مجھے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "تمہارا مطلب ہے ... وہ چوکیدار نہیں تھا؟"

"نہیں جناب۔ اس کی آواز سنتے ہی میرا تو ہارٹ فیل ہونے لگا تھا مگر میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے خود کو سنبھال لیا اور کہا "تم نئے چوکیدار ہو شاید۔ میں ملازم ہوں اس گھر کا! اور رات کے وقت آتا ہوں اور صبح جاتا ہوں" اس نے کہا "اچھا پھر باہر کیوں کھڑا ہے؟" بس میں دل ہی دل میں دعائیں پڑھتا آگے بڑھا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری جان بچالی۔ میری عاجزی اور مظلومیت دیکھ کے اسے شک نہیں ہوا ورنہ جس نے چوکیدار کو قتل کر دیا تھا وہ مجھے بھی مار کے وہیں ڈال دیتا۔"

"گویا تم سمجھ گئے تھے۔"

"میں بالکل سمجھ گیا تھا جناب کہ چادر میں چوکیدار کی لاش تھی اور چوکیدار کی وردی میں اس کا قاتل کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کیبن میں داخل ہوتے ہی چوکیدار کو گولی ماری ہو گی۔ فائر کی آواز

میں نے نہیں سنی۔ سائلنسر والا ریوالور استعمال کیا ہو گا اس نے۔ پھر اس نے چوکیدار کے کپڑے پہنے اور اتنی دیر میں گاڑی والا آ گیا۔ کیبن کے سامنے گاڑی رکی۔ پھر اس میں چوکیدار کی لاش ڈال دی گئی اور گاڑی چلی گئی۔"

"پھر تم نے اندر جا کے کیا کیا؟"

"میں اندر آ کے برآمدے میں چھپ گیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں سے میں کسی کو نظر نہ آؤں اور گیٹ پر نظر رکھ سکوں۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی اور بہت کچھ ہو گا۔ چوکیدار کی جگہ اپنا آدمی کھڑا کرنے والے ضرور لوٹ کر آئیں گے۔ آج رات کیکر شاہ کے مرید انتقامی کارروائی کریں گے اور اکبر خان کے ساتھ آپ لوگوں کو بھی سزا دیں گے۔"

"بہتر ہوتا اگر تم فوراً ہمیں بتا دیتے یا گھر کے ملازموں کو خبردار کر دیتے" غالب نے کہا۔

"کیسے بتاتا جناب؟ میرے لیے تو اندر داخل ہونا بھی مسئلہ بنا ہوا تھا۔ وہ لوگ چاروں طرف موجود ہیں" شان نے کہا "کوٹھی کے اندر بھی۔ وہ ٹیلی فون کے تار کاٹ رہے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ بجلی کا خیال رکھنا۔ شاید وہ مین سوئچ بند کریں گے۔"

رابعہ اور نازو پریشان ضرور نظر آتی تھیں مگر خوف زدہ نہیں تھیں۔ میں صورت حال کی سنگینی کو سمجھ رہا تھا اور شاید غالب کو بھی محصور ہو جانے کا یقین آ گیا تھا۔

"کیا باہر بھی کیکر موجود ہیں؟" غالب نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ ضرور ہوں گے" شان نے کہا "کچھ کریں جناب۔"

"کر رہے ہیں بابا۔ فکر کر رہے ہیں اور غور بھی کر رہے ہیں" غالب نے کہا۔

صورت حال ایک بار پھر ویسی ہی نظر آ رہی تھی جیسی پہلی بار تھی جب خلیفہ کیکر کے غلاموں نے اپنے آقا کی خواہش پر رابعہ اور نازو کو اغوا کر کے لے جانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ شاید آج دوبارہ منظم طریقے پر منصوبہ بندی کر کے نئے جذبے اور زیادہ قوت کے ساتھ۔ انہیں بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ مقابلے پر کمزور حریف نہیں ہے۔

حیرت اور غصہ مجھے اس بات پر تھا کہ اکبر خان جیسے شخص نے کیکر شاہ کی خانقاہ کو نیست و نابود کرنے کے بعد جوابی کارروائی کے خلاف اپنے دفاعی انتظامات پر قطعی توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے دروازے پر وہی ایک پرانا چوکیدار تھا جو اب مارا جا چکا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو ایک نہیں دس مسلح افراد کو ہر طرف مشین گنوں کے ساتھ تعینات کر دیتا۔ ایک بار پھر وہ ہمیں گھر میں چھوڑ کے خاموشی سے نکل گیا تھا۔

اکبر خان سے ہم بعد میں بھی نمٹ سکتے تھے۔ فوری مسئلہ یہاں سے نکلنے کا تھا جو شان کے بیان کی روشنی میں ناممکن کام لگتا تھا مگر اندر بے دست و پا ہو کے بیٹھے رہتے اور مقابلہ نہ کرتے تو کیکروں کے انتقام کا نشانہ بننا بھی کوئی عقل مندی نہ تھی۔ کیکر یقیناً بہت مشتعل ہوں گے۔ پہلی شکست کی ذلت کو وہ پی گئے تھے لیکن اس میں خلیفہ کیکر شاہ کی ہوس پرستی کو دخل تھا مگر خانقاہ کی تباہی ان سب کے لیے جذباتی سانحہ تھا جو کیکر شاہ کے عقیدت مند تھے اور اسے اپنا اوتار یا دنیوی روحانی پیر و مرشد تسلیم کرتے تھے۔ وہ گدی کے مجاور ان سادہ لوح مریدوں کے جذبات سے کھیلتے ہوئے انہیں یقین کی اس منزل تک لا سکتے تھے جہاں وہ ہمارے قتل کو فرض عین جانیں اور تختۂ دار کو براہ راست جنت میں داخلے کا ذریعہ سمجھتے ہوئے پھانسی چڑھ جائیں۔

ہمارے پاس اپنے دفاع میں استعمال کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس گھر میں ہر قسم کے اسلحے کی موجودگی بعید از امکان نہ تھی مگر اس تک رسائی مشکل ہی نہیں ناممکن تھی جب تک کوئی محرم راز اس کی نشاندہی نہ کرے۔

یہ خیال آتے ہی میری نظر روزینہ پر گئی۔ میں نے غالب کی طرف دیکھا "شاید اسے معلوم ہو کہ گھر میں اسلحہ ہے تو کہاں ہے۔"

غالب نے کہا "اسے جگا کے پوچھ لیتے ہیں۔"

یہ کام رابعہ کے سپرد کیا گیا۔ نشے کا بھرپور اثر باقی تھا مگر روزینہ بے ہوش نہیں تھی۔ تھوڑا سا جھنجھوڑنے اور ہلانے سے وہ جاگ گئی۔ رابعہ نے اس پر پانی کے چھینٹے مارے۔

"روزینہ! اٹھو، آنکھیں کھول کے دیکھو۔"

"کیا…… کیا دیکھوں…… کچھ نہیں دیکھنا مجھے۔ وہی خواب اچھا تھا جو میں دیکھ رہی تھی" وہ کسمسائی اور کروٹ لے کر پھر سو گئی۔

رابعہ نے پھر اس پر پانی ڈالا "روزینہ! دیکھو باہر ڈاکو آئے ہیں۔ انہوں نے چوکیدار کو بھی قتل کر دیا ہے۔ اٹھو ورنہ وہ اندر آ کے ہمیں بھی مار ڈالیں گے۔ چلو اٹھ کے بیٹھو۔"

"اچھا ہے مار دیں سب کو۔ مجھے بھی……" اس نے بیٹھنے کے بعد بھی جھومتے ہوئے کہا "ان سے کہو پہلے اکبر خان کو میرے سامنے گولی مار دیں۔ پھر۔۔۔ پھر تم کو۔ تم بھی بہت ظالم ہو اکبر خان کی طرح۔ اس نے مجھے باندھ رکھا ہے۔ سونے کی زنجیر سے۔ اور تم نے ... تم نے سکندر کو باندھ رکھا ہے زلفوں۔۔۔ زلفوں کی زنجیر سے۔ تمہارے بال سنہرے ہیں۔ یہ بھی سونے کی زنجیر ہے۔"

اب نازو نے خاصی خفت سے روزینہ کے گالوں پر طمانچے مارے "اٹھتی ہو یا میں تم کو اٹھا کے نیچے پھینک دوں۔"

"پھینک دو، پھینک دو لیکن مارتی کیوں ہو؟" وہ نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولتی رہی۔

میں نے کہا "روزینہ! خدا کے لیے عقل سے کام لو۔"

"عقل!" اس نے ہاتھ ہلایا "کہاں ملتی ہے عقل؟ مجھے اور

www.paksociety.com

تھوڑی سی۔ شراب میں ملا کے پی لوں۔"

"ہم خطرے میں ہیں روزینہ۔ ہمیں اسلحہ چاہئے ان ڈاکوؤں سے مقابلے کے لئے۔" میں نے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے اکبر خان اسلحہ کہاں رکھتا ہے؟"

وہ ہنسی "وہ الو کا پٹھا ہے۔ سمجھتا ہے مجھے کچھ معلوم نہیں۔ سب جانتی ہوں میں۔ نیچے تہ خانے میں اسٹور ہے۔ اس میں سب کچھ ہے۔ جا کے دیکھ لو۔ دھوکا دینے کے لئے اس نے اوپر... کاٹھ کباڑ ڈال رکھا ہے مگر وہ سب ہٹا کے دیکھو۔ سب ہے وہاں۔ ٹینک اور توپیں نہیں ہیں... مگر مال بہت ہے... ٹینک اور توپیں تم بازار سے خرید لینا۔ بازار میں تو سب کچھ ملتا ہے۔ روزینہ بھی ملتی ہے۔" رابعہ بھی 'بس ایک سکندر نہیں ملتا۔ انگریز بڑا دردی گریٹ۔ آئی لو یو۔ آؤ... میرے ساتھ۔"

رابعہ نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ کچھ دیر ہاتھ پھیلائے مجھے دیکھتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ پیچھے گر گئی۔ اس کی باتوں کا رابعہ نے برا نہیں مانا تھا مگر ناپسندیدگی کے وہ جذبات اس کی صورت سے عیاں تھے جو کسی بھی محبت کرنے والی عورت کی دلی کیفیت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ جب کوئی اس سے زیادہ حسین عورت اس کے محبوب کو اس سے چھیننے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے اور اس کی محبت کو بدنام کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ ایک فاحشہ تھی اور شراب نے اسے ... جو اس ... معطل کر رکھے تھے مگر ... میں ... جو وہ کہہ رہی تھی غلط نہیں تھا۔ نشے میں عقل کی منشی بھی باقی نہیں رہتی اور آدمی نتائج و عواقب کی پروا کیے بغیر وہ سب کچھ بک دیتا ہے جو اس کے دل میں ہو۔ ہوش میں مصلحت کے تقاضے اور اندیشۂ سود و زیاں کا احساس زبان پکڑ لیتا ہے۔

"یہ تو بہت آسان ہو گیا" غالب نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا "اس محل میں ایک تہ خانہ ہے۔ تہ خانے میں ایک اسٹور۔ اسٹور میں کباڑ اور اس کے نیچے کوہ مقصود۔ جاؤ اور یوں نکال لو۔ چٹکی بجاتے میں۔ پھر لگا دو کشتوں کے پشتے۔"

میں نے کہا "کام مشکل ہے ناممکن نہیں۔"

نازو نے کہا "ہم سب نکل جاتے ہیں۔ تہ خانے کا راستہ تلاش کرنے کے لئے یا نوکروں سے پوچھ لیتے ہیں۔"

"اور وہ پوچھیں کہ تہ خانے سے کیا دلچسپی ہے آپ کو تو یہ بھی بتا دینا کہ ہم اسلحہ تلاش کر رہے ہیں اس گھر کو میدانِ جنگ بنانے کے لئے۔ اس کارِ خیر میں ہماری مدد کرو۔" غالب بولا۔

"یہ بات تو اختر کام پر بھی پوچھی جا سکتی ہے۔"

"پوچھو۔ پوچھ کے دیکھو" غالب نے کہا "وہ ہرگز نہیں بتائیں گے۔"

"نہیں بتائیں گے تو خود بھی مارے جائیں گے۔ ہم ان کو اور اس گھر کو بچانے کے لئے جان کی بازی لگا رہے ہیں" رابعہ نے کہا اور اختر کام کا ریسیور اٹھا لیا۔

"سب سے آسان کام ہے فرار ہونا۔ جان بھی بچ جاتی ہے اور آدمی کو شکست کی شرمندگی بھی نہیں اٹھانی پڑتی" غالب نے "کیوں نہ ہم بھی میدان چھوڑ کے بھاگ جائیں۔ واک اوور دیں دشمنوں کو کہ میاں لڑتی ہے ہماری جوتی۔ کیا ہے سانپ کا اب لکیر پیٹا کر۔"

"اختر کام تو کام نہیں کر رہا ہے" رابعہ مایوسی سے بولی۔

"میرا دماغ بھی کام نہیں کر رہا ہے" غالب بولا۔

میں نے کہا "یہ دماغ کا مسئلہ ہی نہیں رہا۔ اب تو ہم ... سے اور دیکھو اسلحہ کہاں ہے۔ یہ جو تھوڑی سی مہلت ملی ہے اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔"

"میں پھر کہتا ہوں بزدل ہو بزدل۔ بھاگ جاؤ اپنی ... بچا کے۔ مقابلے میں نقصان ہے۔"

میں نے جھنجھلا کے کہا "کیسے بھاگ جائیں؟ کوئی راستہ ہے ... سے نکلنے کا؟ ہر طرف تو شکاری بیٹھے ہیں گھات میں۔ تم جاؤ نا ... ساتھ۔"

"کہاں جاؤں؟"

"جہنم میں" نازو بگڑ کے بولی۔

"اور اس وقت کہاں ہوں میں؟ خیر۔ تمہاری خواہش ہے تو پھر چلو۔ ویسے جنت میں جاتے تو وہاں خوش رہتے" غالب نے کہا۔

نازو نے اسے دھکیلا "نکلو باہر۔"

"ہاں آگے مجھے رکھو۔ تاکہ میں سے کوئی آکے میرے ... لگے۔ تم تو چاہتی ہو بیوہ ہونا" غالب بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ "زمانہ آ گیا ہے۔ بیوی بننے سے پہلے بیوہ ہونے کا شوق ہے لڑکیوں کو۔"

"ہم نچلی منزل پر دائیں طرف دیکھیں گے، تم بائیں ... دیکھنا" میں نے نازو کو ہدایت دی "اگر کوئی نوکر مزاحمت کرے اس سے نمٹ لینا۔ کسی رعایت کے بغیر۔"

نازو رک گئی "جو تہ خانے کا راستہ دریافت کرے وہ دوسرے کو بتا دے۔ بلاوجہ کوئی نہ بھٹکتا پھرے۔"

میں نے ان کے نکل جانے کے بعد پانچ منٹ انتظار کیا اور ... رابعہ کے ساتھ باہر نکلا۔ گیلری میں اندھیرا تھا کیونکہ باہر کی لائٹ جلائی ہی نہیں تھی یا غالب جاتے ہوئے بجھا گیا تھا۔ کمروں کے سامنے جالی کے کٹہرے کی آڑ لیتے اور ایک محراب کے ستونوں کی اوٹ سے نکل کر دوسرے کے پیچھے ... زینے تک پہنچے۔ اس وسیع گھر میں اوپر کم سے کم آٹھ کمرے تھے لیکن سب تاریک اور مقفل تھے۔ اکبر خان اتنے بڑے گھر میں ملازموں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ خود بتا چکا تھا کہ اس کا ... باہر گزرتا ہے۔ اسے اتنے بڑے گھر کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

شان امارت کے مظاہرے سے زیادہ یہ اس کی پُراسرار کاروباری مصروفیات کی ضرورت تھا۔ شاید یہاں اس کا گودام ہو۔ ان کمروں میں سب اسمگل کیا ہوا یا اسمگل کیا جانے والا سامان رکھا جاتا ہو یا ان کمروں میں اس کے وہ مہمان ٹھہرتے ہوں جو اکیلے نہیں آتے۔ ان کے ساتھ ذاتی محافظ اور ملازم سے خانہ 'شباب و شراب اور ان کی دلبری کے لئے عالی بازار حسن سے منتخب سوغات بھی ہوتی۔

نیچے کی منزل پر قدم رکھتے ہی میرا سامنا ایک ملازم سے ہو گیا۔ "میں آپ ہی کے پاس آ رہا تھا سر! ڈنر کا کہنے کے لئے" اس نے کہا۔

"چلو ہم خود آ گئے" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"سوری سر۔ کھانے میں کچھ دیر ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں۔ ابھی ہمارا موڈ بھی نہیں تھا۔ یہ بتاؤ اکبر خان صاحب آئے ہیں یا نہیں؟ ہم نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب ان کی گاڑی بھی نہیں ہے باہر۔"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے سر، وہ آج رات نہیں آئیں گے۔"

"اچھا۔ یہ بتاؤ تم نے کوٹھی میں یا اس کے آس پاس کوئی ایسی ویسی بات دیکھی؟ میرا مطلب ہے کوئی مشتبہ شخص نظر آیا یا کوئی آواز سنی۔"

"کیسی آواز سر؟"

"اچھا چھوڑو۔ اس گھر میں ایک تہ خانہ ہے۔"

اس نے جواب دینے سے پہلے سوچا "تہ خانہ ... ہے تو سہی، آپ کیوں پوچھ رہے ہیں سر؟"

"ہم وہ تہ خانہ دیکھنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا "اکبر خان نے کہا تھا کہ وہ کچھ مصوری کے نمونے ... سے لایا تھا جو ابھی تہ خانے میں ہی رکھے ہوئے ہیں اور ... کے پاس مختلف ممالک کے نکالے ہوئے دلچسپ نوادرات ہیں۔ سو ویئر سمجھتے ہو نا تم؟"

مجھے بڑی خوشی ہوئی جب ملازم نے تائید میں سر ہلایا اور بولا "آئیے میرے ساتھ۔"

میں نے بہت نفاست اور ذہانت سے جھوٹ بولا تھا اور وہ ملازم کچھ پڑھا لکھا، مہذب اور فرمانبردار تھا۔ اسے تہ خانے میں میری دلچسپی کی وجہ معقول لگی۔ اگر میں اس سے کہتا کہ تم کون ہوتے ہو مجھ سے سوال کرنے والے یا کہتا کہ میں ایسے ہی تہ خانہ دیکھنا چاہتا ہوں تو شاید وہ شک میں پڑ جاتا اور مجھے ٹالنے کی کوشش کرتا اور میں زبردستی پر مجبور ہو جاتا۔

مختلف کمروں سے گزار کے وہ مجھے پچھلے حصے میں لے گیا جہاں ملازموں کے کوارٹرز تھے۔ کوٹھی اور سرونٹ کوارٹرز کے بیچ میں ایک باڑ حائل تھی۔ آقا اور غلام کی مساوات محض ہمارے شاندار

ماضی کی قابل فخر روایت بن کے تاریخ کے صفحات میں زندہ تھی۔ حضرت عمرؓ اور غلام باری باری ایک ہی اونٹ پر سفر کرتے تھے۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔ اب آقا کو یہ بھی گوارا نہیں کہ غلام کو اس کے محل کا سایۂ دیوار بھی ملے۔ سرونٹ کوارٹرز دور بنائے جاتے ہیں اور بات افروز کرنے کی نہیں۔ عمداً امتیاز برتنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ انہیں زندگی کی بنیادی سہولیات روٹی کپڑے اور مکان تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ نہ اس سے زیادہ کی خواہش کرو نہ مانگو۔

سرونٹ کوارٹرز تک آنے جانے کے لئے ایک لمبا برآمدہ سا تھا جس پر سیمنٹ شیٹ کی چھت ڈال دی گئی تھی تاکہ آتے جاتے دھوپ اور بارش سے تحفظ حاصل رہے۔ ملازموں کو نہیں، ان چیزوں کو جو مالکان کی ملکیت ہوتی ہیں مگر نوکر لاتے لے جاتے ہیں۔

اس کاریڈور جیسے راستے پر دائیں جانب ایک کمرا بنا ہوا تھا جو بظاہر واٹر سپلائی کا پمپنگ اسٹیشن نظر آتا تھا۔ عموماً ایسے پانی میں ٹیوب ویل اسی طرح بنائے جاتے ہیں لیکن اس میں داخل ہونے کے بعد میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ یہ موٹر ورکشاپ تھی جہاں پرانے ٹائر پڑے ہوئے تھے، آئل کے ڈبے تھے اور کاروں سے لے کر گھر کے تمام حصوں میں چھوٹی موٹی مرمت اور دیکھ بھال میں کام آنے والے اوزار تھے جن کی ضرورت کسی الیکٹریشن، پلمبر یا کارپینٹر کو پڑ سکتی تھی۔ یہاں ایک بہت پرانا فریج بھی پڑا ہوا تھا جسے شاید ملازمین نے کباڑی کو دینے کے بجائے مرمت کر کے اپنے استعمال کے لئے رکھ لیا تھا۔

ہمارے ساتھ آنے والے ملازم نے ایک دروازے سے داخل ہو کے سامنے والے دوسرے دروازے کو کھولا تو میں اپنے سامنے چار فٹ کے فاصلے پر ایک اور دیوار دیکھ کے حیران ہو گیا۔ باہر سے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کمرے کی ڈبل دیوار کے بیچ میں کوئی زینہ بھی ہو گا۔

"لائٹ کا سوئچ نیچے ملے گا سر۔ دروازے کے پاس" ملازم نے مجھے راستہ دکھانے کے بعد کہا۔

"تم ساتھ نہیں آؤ گے؟"

"نہیں سر۔ مجھے کام ہے" وہ بولا "اور سر! شکایت کرنے والے تو موقع تلاش کرتے ہیں۔ آج تک کسی نے تہ خانہ دیکھنے کی فرمائش نہیں کی تھی۔ آپ معزز مہمان ہیں لیکن شریف لوگ کہتے ہیں اس لئے میں آپ کو لے آیا۔ پلیز! کسی کو یہ نہ بتائیں۔"

رابعہ نے کہا "پھر کیا کہیں؟ فرض کرو کوئی آ جائے تو؟"

"آپ تو کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ گھومتے پھرتے ادھر آ گئے تھے۔ دروازے مقفل نہیں تھے، آپ اندر چلے گئے یہ دیکھنے کے لئے کہ یہاں کیا ہے۔ رائٹ سر" وہ پیچھے پلٹ کر باہر نکل گیا۔

رابعہ نے کہا "یہ کچھ پُراسرار بندہ نہیں تھا؟"

"ہم سب کسی نہ کسی پہلو سے پُراسرار ہوتے ہیں" میں نے

www.paksociety.com

کہا۔

"دیکھا جائے تو اس نے خشک مزاجی کی" رابعہ بولی "ایک ایسا کام کیا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ مالک اس سے ناراض ہوگا۔"

میں نے اندھیرے میں سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔ "دیکھا جائے تو تمہاری بات بھی ٹھیک ہے۔"

"کہیں وہ اوپر جا کے دروازے لاک نہ کر دے۔"

"وہ اتنا احمق بھی نہیں تھا۔ اسے معلوم ہے کہ ہم اندر سے دروازے کو توڑ سکتے ہیں، کاٹ سکتے ہیں، سارے اوزار ہیں اندر۔"

ایک چیخ کے ساتھ رابعہ مجھ پر گری۔ خود کو منہ کے بل گرنے سے بچانے کے لئے میں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور دیوار کو گرفت میں لینے کی ناکام کوشش میں میرا ہاتھ بجلی کے سوئچ پر پڑ گیا۔ جب میں ایک سیڑھی بچپل کے دروازے سے گلے ملا تو رابعہ تقریباً میری پشت پر سوار تھی۔ دروازہ کھلا ہوتا تو میں اندر جا کے گرتا۔ میری ناک چپٹی ہو جاتی یا سامنے والے دانت بس دکھانے کے رہ جاتے۔ رابعہ بہرحال محفوظ رہتی۔

رابعہ نے شرمندگی سے کہا "وہ... پیر پھسل گیا میرا۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے" میں نے کہا۔

"جان بوجھ کے تو نہیں گری تھی میں پھر طنز کیوں کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ میں تو ایک حقیقت کا اعتراف کر رہا ہوں کہ تمہارا پیر آخری سیڑھی پر پھسلا۔ پہلی سیڑھی پر پھسل جاتا تو ہم جیک اینڈ جل کی طرح نیچے جاتے کھل مل کے۔ خیر مزا تو اب بھی آیا۔"

وہ تھوڑا سا شرمائی اور مسکرائی تو میں نے دروازہ کھول کے اسے اندر کھینچ لیا اور اپنی باہوں میں بھر لیا۔

"بد تمیز، موقعے سے فائدہ اٹھا رہے ہو۔" اس نے خود کو چھڑانے کی آدھی ادھوری کوشش کی۔

میں نے اسے چوم کے چھوڑ دیا "کون فائدہ نہیں اٹھاتا موقعے سے عزیزم۔ اب اپنی مثال لو۔ پیر پھسلنے کا تو بہانہ تھا۔"

اس نے احتجاج کیا مگر اس کا مطلب بھی اس بات سے زیادہ مختلف نہیں تھا جو میں نے کہی تھی۔

میں دروازے کی کنڈی لگا کے پلٹا تو مجھے اپنے مقابل ایک وسیع ہال نظر آیا۔ اس میں ٹینس کورٹ تھا اور ایک طرف کچھ ورزش میں کام آنے والی مشینیں نصب تھیں۔ یہ انڈر گراؤنڈ ہال یقیناً ائر کنڈیشنڈ ہوگا مگر اس وقت اندر خاصا حبس اور گھٹن تھی۔ فولڈ ہو جانے والی ٹیبل ٹینس کی میز شاید کبھی استعمال نہیں ہوئی تھی۔ یہ اکبر خان کا جمنازیم تھا جہاں وہ خود کو فٹ رکھنے کے لئے ایکسرسائز کرتا ہوگا اور ممکن ہے ٹینس بھی کھیلتا ہو۔ ظاہر ہے ایسی جگہ مقفل نہیں رہتی۔

"یہیں کہیں ہے اسٹور؟" رابعہ نے مایوسی سے کہا۔

"یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ جو ہے سامنے ہے۔"

"وہ کتنا بھونک رہی ہوگی اپنے جی میں، تم نے یقین کر لیا ہے۔"

میں ہنس پڑا "مزہ نہیں آیا۔ ذرا کھل کے گالیاں دو، اپنی زنانہ لعنت نکالو، یعنی ابھی تک غصہ آ رہا ہے تمہیں۔ اب تو دیر سے جل بھن رہی تھیں اندر ہی اندر۔ کمال ہے بھئی، یہ غصہ آنے کی تو بات ہے۔ کوئی شریف عورت کر سکتی ہے ایسی باتیں؟" رابعہ جھینپ کر بولی۔

"بابا تو اس نے کب دعویٰ کیا ہے شرافت کا۔ وہ بھی اس نے ایسی ہی بات کی۔ بھول جاؤ اسے۔ کل کوئی شرابی بدچلن آدمی تم پر مرمٹے اور میرے سامنے تم سے اظہار کر دے تو میں اسے کوئی اہمیت نہیں دوں گا۔ اس کا کیا قصور۔ ایک تو تمہارا یہ حسن، پھر شراب کا نشہ۔ وہ آدمی جذبات پر کنٹرول کرے جس نے عقل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہو۔ سچ کہتا ہے 'مناق ہوتے ہیں وہی ہوش۔'"

"تمہارا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آتا" رابعہ بولی اور اچانک چلائی "اے سکندر! یہ دیکھو اس ٹیبل ٹینس کی میز کے پیچھے۔"

"کیا ہے؟" میں نے سیدھی کھڑی ہوئی میز کو دیکھا۔

"دروازہ" رابعہ نے کہا "یہ میز ہٹاؤ سامنے سے۔"

میں نے میز کو دیوار کے ساتھ کھسکا کے کہا "عقل جو تم ہو۔" رابعہ نے اس چھوٹے سے دروازے کو کھولا جس میں ایک وقت میں ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا۔ یہ ایک اسٹور روم جس کی چوڑائی تو صرف چھ فٹ تھی مگر لمبائی کے رخ یہ ہال چوڑائی کے برابر تھا۔ یعنی کم سے کم تیس فٹ۔

اندر ایک سوئچ کو دبانے سے ٹیوب لائٹ جل گئی۔ اسٹور کے آخری حصے میں وہ سب کاٹھ کباڑ دیکھا جس کا ذکر اس نے کیا تھا۔ پرانے قالین، ٹوٹی ہوئی کرسیاں میزیں، ایک ٹوٹی خوردہ سائیکل، پانی کی دو خراب موٹریں۔ ہر چیز پر مٹی کی دھول جمی تھی۔ میں ایک ایک کر کے ان چیزوں کو اٹھا کے دیکھتا گیا۔ خیال تھا کہ اگر وہاں کوئی چیز چھپائی جا سکتی تھی تو صرف قالینوں یا ان کے نیچے اور میرا یہ خیال بالکل ٹھیک تھا۔ ایک لپٹا ہوا قالین مجھے ضرورت سے زیادہ وزنی محسوس ہوا۔ میں نے اس والی گرد کی پروا کیے بغیر اس کو کھول دیا۔

اس میں سے پلاسٹک کے دو بیگ نکلے۔ ایک بیگ میں مشین گنوں کے اجزا تھے جن کو آپس میں جوڑ کے استعمال کیا جا سکتا تھا اور یہ کام دو منٹ میں ہو جاتا تھا۔ یہ سوئیڈن کی بنی انتہائی بیش قیمت اور خطرناک مشین گنیں تھیں۔ اکبر خان جیسے لوگ باہر سے اسمگل کر کے لا سکتے تھے۔ پاکستان میں غیر ملکی سامان کی مارکیٹ سے پستول اور ریوالور تو شاید مل جاتے مگر اس چیز کا ملنا

بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مشین گن کے راؤنڈز دوسرے بیگ میں تھے۔ اسی بیگ میں سے اٹلی کے بنے ہوئے بتیس بور کے دو بہترین ریوالور بھی نکلے اور گولیوں سے بھرا ہوا ایک ڈبا بھی برآمد ہوا۔

"ریوالور ہیں اصل کام کی چیز" میں نے باری باری دونوں ریوالور تولتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ یہ مشین گن۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "مشین گن میں جلدی چلتی ہے اور اس کے لئے کہیں مورچہ قائم کرنا پڑتا ہے۔ اس کا 'ریکا کل' اتنا ہوتا ہے کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چلتے پھرتے دوڑتے بھاگتے اس کا استعمال نہیں کیا جا سکتا۔"

"پھر کیا انہیں چھوڑ دیں؟"

"ابھی ان کا بوجھ اٹھانا بے سود ہے۔ بعد میں لے جائیں گے اگر ضروری ہوا۔ کام کی چیز تو یہ ہے۔ پتا نہیں اکبر خان نے یوں چھپا کے کیوں رکھا تھا یہ سب کچھ۔ وہ ڈرنے والا آدمی تو ہے نہیں۔ اسلحہ بھی اس کے لئے کوئی ایسی چیز نہیں۔ یہ لو۔ تم پکڑو یہ ریوالور۔"

رابعہ نے کہا "اس دوسرے قالین کو بھی دیکھو۔"

میں نے کہا "اچھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پہلے غالب اور نازو سے مل لیں پھر سب یہاں آ کے اطمینان سے..."

میری بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ باہر ایک فائر ہوا اور کسی نے بڑی دلخراش چیخ ماری۔ رابعہ ڈر کے میرے پیچھے آ گئی۔

"یہ... یہ کیا ہوا سکندر؟"

"اسے انگریزی میں فائر کہتے ہیں۔ فائر ہوا ہے" میں نے کہا "تم تو ایسے خوف زدہ ہو جیسے پہلی بار یہ آواز سنی ہے۔ ابھی چل کے دیکھ لیتے ہیں۔"

چند سیکنڈ کے وقفے سے دوسرا فائر ہوا پھر تو جیسے جنگ سی چھڑ گئی۔ تہہ خانے میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہمارے اوپر نیچے دائیں بائیں ہر سمت گولیاں چل رہی ہیں۔ سمجھ میں نہ آنے والی بات یہ تھی کہ فائرنگ اگر کیکر شاہ کے چیلے کر رہے ہیں تو ان کے مقابلے پر کون ہے۔

"اب شاید اس کی ضرورت پڑے۔" میں نے پلاسٹک بیگ میں سے ایک مشین گن نکالی اور سابقہ تجربے کی بنیاد پر اس کے مختلف حصوں کو کھٹا کھٹ ایک دوسرے میں پھنسا کے فٹ کر دیا۔ اچانک لائٹ آف ہو گئی۔ رابعہ مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" میں نے خود کو چھڑاتے ہوئے درشتی سے کہا۔ "ریوالور سنبھال کے آگے چلو۔"

"مجھے... کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"نظر مجھے بھی نہیں آ رہا ہے مگر مجھے اندازہ ہے کہ دروازہ کہاں تھا۔ تم بھی اندازے سے چلو۔"

"تم ساتھ تو رہنا۔" وہ منمنا کے بولی۔

"میں تمہارا ہاتھ پکڑ کے چلوں؟ بے وقوف! مجھے مشین گن اور اس کا میگزین اٹھانا ہے۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "اپنا راستہ خود بناؤ اور باہر نکل کر میرا انتظار کرو۔ ذرا دھیان سے جانا۔ خیال رکھنا کہ راستے میں بہت سی چیزیں پڑی ہیں۔ ہال میں پہنچ جاؤ گی تو پھر باہر کے دروازے تک راستہ صاف ملے گا۔ میں بھی آ رہا ہوں۔ تم چلو۔"

میں نے اندھیرے میں وہ شاپنگ بیگ اٹھایا جس میں مشین گن کے راؤنڈ تھے۔ یہ بہت بھاری بیگ تھا اور اسے اٹھا کے اسٹور کے گیٹ تک پہنچتے ہوئے میں دو بار گرا۔ ہر بار رابعہ کی آواز مجھے بہت قریب سے سنائی دی۔ "سکندر! کیا ہوا؟"

دوسری بار میں نے جھنجلا کر کہا۔ "تمہارا سر ہوا۔ تم ابھی تک اندر ہی ہو۔"

باہر نکلنے کے بعد میں نے پھر اسے دیکھا تو وہ اندھیرے میں بت بنی کھڑی تھی۔ "سکندر، مجھے غالب اور نازو کا خیال پریشان کر رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "پریشانی سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ تم اندر جاؤ۔ وہ خود تمہیں تلاش کر لیں گے۔"

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں چھت پر جا رہا ہوں۔ جلدی کرو، اپنے دوپٹے سے یہ بیگ میری کمر پر باندھ دو۔ ذرا پیچ کر کے مضبوطی سے باندھو تاکہ سلپ نہ کرے۔" میں نے کہا اور مشین گن کو کندھے پر لٹکا لیا۔ اس کا شولڈر اسٹریپ اچھا تھا۔ بیگ کو میں نے کندھے کے اوپر سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کا وزن دس پندرہ سیر تو ہوگا۔

"تم کیسے جاؤ گے چھت پر؟"

میں نے کہا۔ "ڈرین پائپ سے۔ تم فکر مت کرو۔ بہت پریکٹس ہے مجھے۔ ایک بار چھت پر پہنچ کے مورچہ قائم کر لیا میں نے تو سب کو بھون کے رکھ دوں گا۔"

"سکندر! کیا یہ لوگ آپس میں لڑ رہے ہیں؟"

"کیا فضول بات ہے۔" میں نے پائپ کو ہلا کے دیکھا۔

"پھر مقابلہ کن کے درمیان ہے؟ کیا یہ اکبر شاہ کے محافظ اور ملازم ہیں جو کیکر شاہ کے مریدوں کی فائرنگ کا جواب دے رہے ہیں؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے جوتے اتار کے قدم جمائے اور پائپ پر چڑھنے لگا۔ کام میری توقع سے کہیں زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ میں نے غلط کہا تھا رابعہ سے کہ مجھے بہت پریکٹس ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ آخری بار میں تین سال پہلے ایسے ہی ایک پائپ کے راستے لندن میں ایک فلیٹ میں گھسا تھا۔ فلیٹ پہلی منزل پر تھا اور اس کی کھڑکی میرے لیے ہی کھلی ہوئی تھی۔

www.paksociety.com

تین سال بعد اس پائپ پر چڑھتے ہوئے مجھے اس وقت کی یاد آئی جب میں اور محسن ایسی ہی مہماتِ عشق سر کرتے تھے اور اپنا اپنا حساب ڈائری میں لکھتے جاتے تھے۔ محبوبہ کا نام، پتا، ٹیلی فون نمبر، باپ کا نام، عشق کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا۔ اس عشق سے کیا حاصل ہوا۔ نقد رقم الگ، رومال، ٹائیاں اور دیگر تحائف الگ۔ یہ عشق ہم ایک مشن کے تحت کرتے تھے اور ہمارا مقصد تھا انگریزوں سے دو سو سالہ دورِ حکومت اور ان کے نسلی تعصب کا انتقام لینا۔ وہ جو ہمارے انتقام کا نشانہ بنتی تھیں کوئی شریف زادیاں نہیں ہوتی تھیں مگر حسب نسب کے اعتبار سے اس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں جن کے دماغ سے ابھی تک دورِ حکومت کی فرعونیت اور نسلی احساسِ برتری کا فتور نہیں گیا تھا۔

اوپر پہنچتے پہنچتے میری حالت غیر ہو گئی۔ تصور میں وہ زمانہ تھا جب عشق کا جادو سر چڑھ کے بولتا تھا تو ہم پرواز کرنے لگتے تھے اور حال کی حقیقت یہ تھی کہ میری پیٹھ پر چند سیر وزن کا اسلحہ تھا اور میری جان ہی نہیں، عزت بھی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ ہر لحظہ مجھے یہ ڈر تھا کہ میرے ہاتھ سے پائپ چھوٹ جائے تو میں پیٹ سے نیچے جا گروں گا اور ساری عمر وہیل چیئر پر پھروں گا۔ اب بھی رابعہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ او خدا! کہتے تھے بڑی پریکٹس ہے مجھے۔

اللہ نے میری آبرو رکھی اور میں بالآخر چھت کی منڈیر تھام کے خود کو اوپر کھینچنے میں کامیاب رہا۔ اوپر سے میں نے یوں ہاتھ ہلایا جیسے ماؤنٹ ایورسٹ پر کھڑا ہوں لیکن بالکل تازہ دم ہوں۔ اگر مجھے اوپر سے "ہیلو" کہنا پڑتا تو میرے دھونکنی کی طرح چلتے ہوئے سینے سے صرف ہوا نکلتی۔ میرے ہاتھوں پیروں کا دم بالکل ہی نکل چکا تھا۔

رابعہ اندر چلی گئی تو چند منٹ میں نے اپنی حالت پر قابو پانے میں صرف کیے اور اس دوران فائرنگ کی آوازیں سننے کے علاوہ شرم سے پانی پانی بھی ہوتا رہا۔ پہاڑ خاک سر کروں گا میں اور آسمان کے تارے خاک توڑ کے لاؤں گا رابعہ کے لیے۔ اتنی سی چڑھائی میں کیا حال ہو گیا ہے میرا۔ یہ سب ایکسرسائز اور جاگنگ وغیرہ سے لاتعلق ہونے کا نتیجہ تھا۔ میں تین کلومیٹر جاگنگ کرتا ہوا جاتا تھا اور برٹش نیوی کے ایک افسر کی بیوی کو ہر صبح تازہ پھول پیش کر کے دوڑتا ہوا واپس آتا تھا۔ ایسا تین مہینے تک ہوتا رہا۔ تیسرے مہینے کے آخر میں اس نے مجھے اندر بلا لیا۔ ویل یو کالا آدمی۔ بہت ڈھیٹ ہو تم۔ کیا تم واقعی مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو؟ اور جواب میں نے یہ دیا تھا کہ ڈارلنگ، تم خود اندازہ کر لو۔ میں اڑ سکتا تو تین مہینے میں چاند تک پہنچ جاتا۔ خیر اب زمین پر ہی چاند مل گیا ہے تو میں گیا سو کلومیٹر کی دوڑ جیت گیا ہوں۔ اس زمانے میں جھوٹ بولنے کی بھی بہت پریکٹس تھی مجھے۔

یہ سب غیر متعلقہ باتیں اس وقت یاد کرنے کی کوئی تک نہیں تھی مگر ساری بات ایک ذرین پائپ سے شروع ہوئی تھی اور خیالات کی قلم خود بخود چل پڑی تھی۔ مشین گن کو چھت کی منڈیر پر نصب کرتے ہوئے میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ تمام لائٹس آف تھیں اور اندھیرے میں یہ اندازہ کرنا محال تھا کہ اندر یا باہر قاتل ہیں کتنے، مقتول اور کس کی جنگ کس سے چل رہی ہے۔

ایک افسوس ناک بات یہ تھی کہ ابھی تک پولیس جائے واردات تک نہیں پہنچی تھی۔ سنسان آبادی میں عام لوگ تو کھڑکیاں دروازے بند کیے اپنے گھروں میں دبک گئے تھے اور یا جلال تو کا ورد کرنے میں حق بجانب تھے مگر اتنی فائرنگ کا پولیس نے بھی نوٹس نہیں لیا تھا۔ پولیس والے بے وقوف نہیں ہوتے کہ اس قسم کی معرکہ آرائی میں اپنی پرانی لاٹھیاں اور زنگ خوردہ تاریخی بندوقیں لے کر کود پڑیں۔ وہ ایسی صورت حال کو سمجھتے ہیں اور کوئی خطرہ نہ ہو تو مال کی کشش خود انہیں کھینچ لیتی ہے ورنہ وہ بعد میں پہنچتے ہیں اور جو بھی احمقوں کی طرح منہ کھولے تماشا دیکھنے رک گیا ہو، اس کو باندھ لاتے ہیں۔ مجرم نہ سہی ملزم تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔

جنگ کے دو فریق تھے۔ تیسرے فریق کے طور پر ابھی ہم یعنی ایم آر ایس کے مجاہدین جنگ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ ایک فریق تھے کیکر۔ کیکر شاہ کے مرید لیکن دوسری طرف کون تھا جو باہر ہی سے کیکروں کی بیخ کنی کر رہا تھا۔

چھت پر میری پناہ گاہ ایک چمنی تھی یا ایک واٹر ٹینک تھا جو مناسب بلندی پر اور پچھلے حصے میں واقع تھا۔ چمنی سامنے کی طرف اور غالباً نچلی منزل پر ڈرائنگ روم کے آتش دان کا حصہ تھی۔ اس کے پیچھے سے میں نے اسٹریٹ لائٹس کے برائے نام اجالے میں میدانِ کارزار کا نقشہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن مجھے درختوں کے سیاہ ہیولوں اور کوٹھیوں کو منقسم کرنے والی دیوار اور ویران باغ کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اس علاقے میں پڑوسی اور ہمسائیگی کے تصورات محض نظریاتی تھے۔ ایک کوٹھی کا دوسری کوٹھی سے نہ کوئی جذباتی رشتہ تھا اور نہ معاشرتی، نہ ان کی دیواریں ملتی تھیں نہ ان دیواروں میں مقید رہنے والے انسانوں کے دل۔ دونوں جانب بند کھڑکیوں کے پیچھے میں روشنی دیکھ سکتا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ فائرنگ کی آوازیں انہوں نے نہ سنی ہوں مگر عام رویہ یہ تھا کہ پرائے معاملات میں اور خصوصاً قانونی چکروں میں لاتعلقی اور لاعلمی کا اظہار آدمی کو پریشانیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ کسی بچے نے کہا ہو گا کہ "ڈیڈی! فائرنگ ہو رہی ہے پڑوس میں" تو عقلمند ڈیڈی نے فرمایا ہو گا۔ "بے وقوف اپنا کام کرو۔ کوئی فلم چل رہی ہو گی ان کے گھر میں۔ مار دھاڑ سے بھرپور۔ کل یا کبھی کوئی پوچھے تو یہی کہنا ہے اور بس۔"

فائرنگ اب ختم ہو گئی تھی۔ میں نے پھر مطمئن ہو کر چمنی کے پیچھے سے سر نکالا ہی تھا کہ باہر سے ایک تیز سرچ لائٹ کی روشنی نے اندھیرے کو کھنگالنا شروع کیا۔ روشنی اس کوٹھی کے احاطے

شاید دیوار کے پار پڑی۔ اس نے دیوار کی بلندی اور اوپر درختوں تک کا جائزہ لیا۔ یہ روشنی کسی جیپ کے اوپر نصب تھی جس کا رخ واضح ہو گیا۔ میں اسے دیکھ سکتا تھا اور اگر چاہتا تو اسے نشانہ بھی بنا سکتا تھا مگر میں نے انتظار کیا۔

روشنی آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اچانک ایک درخت پر فائر ہوا۔ جوابی فائر کے ساتھ ہی کسی نے کرب ناک چیخ ماری "مجھے... تکبیر" اور پھر ایک لمحہ بعد وہ زمین پر گرا۔ شاید گن والے کو روشنی نے تیزی سے اندھا کر دیا ہو گا۔ چنانچہ وہ صحیح نشانہ لینے میں ناکام رہا تھا مگر خود نشانہ بن گیا تھا۔

اس سے ایک بات تو ثابت ہو گئی کہ باہر سے فائرنگ کرنے والا ہمارا دشمن نہیں بلکہ مددگار ہے جو کیکروں کا خاتمہ کر رہا ہے۔ کیکروں کے بارے میں شان کی اطلاع درست تھی کہ انہوں نے کوٹھی کو ہر طرف سے محصور کر لیا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ ان کو نیست و نابود کرنے والا کون تھا؟ اسے کس نے اطلاع دی تھی اور وہ عین وقت پر کیکروں کو جامِ شہادت پلانے کے لیے آ گیا تھا۔

میری عقل تو یہی کہتی تھی کہ کیکروں کو صاف کرنے والے اکبر خان کے محافظ تھے جن کو کوٹھی کے ملازموں نے سب حالات سے آگاہ کر دیا تھا مگر اس سوال اور سوال کے جواب میں بھی بہت سے پہلو ناقابلِ فہم تھے جن پر غور کرنے کی مجھے فرصت نہ تھی۔

روشنی کا دائرہ سا مسلسل آگے سفر کر رہا تھا۔ ابھی روشنی کچھ دور تھی کہ ایک درخت پر سے میں نے کسی کو اندر کودتے دیکھا۔ وہ ایک شاخ سے بندر کی طرح لٹک رہا تھا اور زمین اس کے قدموں سے دو تین فٹ نیچے تھی۔ میں نے اطمینان سے نشانہ لے کر فائر کیا اور وہ ڈال سے پکے ہوئے پھل کی طرح نیچے گرا۔ اس نے بھی بزعمِ خود شہادت پائی تھی۔ گولی لگتے ہی اس نے "جئے کیکر" کا نعرہ بلند کیا اور پھر ایک کیاری میں پھولوں کے تختوں پر تڑپنے لگا۔ اس کا خون پی کر پروان چڑھنے والے پودوں پر بہار میں زیادہ شوخ رنگ کے پھول کھلیں گے۔

میرے فائر نے جنگ میں تیسرے فریق کی موجودگی کا اعلان کر دیا تھا جو پہلے سے لڑنے والوں کے لیے حیران کن بات تھی۔ سرچ لائٹ ایک دم گل ہو گئی۔ شاید انہیں خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کسی بلندی سے سرچ لائٹ کو نشانہ بنا لوں گا لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔ وہ سرچ لائٹ کو صحیح سمت میں یعنی مجھ پر فوکس کر رہے تھے۔ جب وہ چکا چوند کرنے والی روشنی مجھ پر پڑی تو ایک لمحے کے لیے میں اندھا ہو گیا۔ اس لائٹ کے پیچھے دیکھنے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ میں فوراً غوطہ مار کے چمنی کے پیچھے چھپ گیا۔ ایک گولی سیٹی بجاتی اور شاید میرے کان کو چھوتی گزر گئی لیکن یہ گولی اس طرف سے نہیں آئی تھی جدھر سے مجھ پر سرچ لائٹ پڑ رہی تھی۔ یہ پیچھے سے آئی تھی۔ کوئی چلانے والا اناڑی تھا یا اس نے جلدی میں فائر کیا ورنہ تیز روشنی میں چھ فٹ کا ٹارگٹ بہت آسان تھا۔

سرچ لائٹ بند ہوئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا ورنہ مجھے انتخاب کرنا مشکل ہو جاتا کہ سامنے والی گولی کا نشانہ بنوں یا پیچھے والی کا۔ نادیدہ دشمن دونوں طرف تھے اور یقیناً بہت خوش بھی ہوں گے کہ بے وقوف آدمی مرنے کے لیے چھت پر چڑھ گیا۔

مجھے اپنے تین ساتھیوں پر غصہ آنے لگا جو نیچے چھپے ہوئے تھے اور کچھ بھی نہیں کر رہے تھے۔ شاید کسی کھڑکی کے پیچھے سے ایک دلچسپ مقابلہ دیکھ رہے تھے کیونکہ اس میں وہ شامل نہ تھے۔ کون کس کو مارنا چاہتا ہے اور کیوں۔ انہیں اس سے کیا۔ ان کے لیے دونوں ہی دو شکاری تھے جو ایک شکار کی خاطر آپس میں لڑ رہے تھے۔ رابعہ نے انہیں بتایا ہو گا کہ سکندر تو مشین گن سمیت اوپر چھت پر چڑھ گیا ہے تو انہوں نے کہا ہو گا کہ واہ۔ اوپر سے تو بہترین نظارہ ہو گا۔ انہیں کیا معلوم کہ اوپر میں بہترین نشانہ ثابت ہو رہا ہوں۔

میں نے دل ہی دل میں محلے والوں اور پولیس والوں کو ایک جیسی گالیاں دیں جو اندھے، بہرے اور گونگے ہو گئے تھے۔ جس ملک کے عوام اتنے بے حس، خود غرض اور قانون سے اتنے بیزار ہوں اور قانون کے محافظ اتنے بزدل اور کام چور ہوں، وہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون نہیں چلے گا تو اور کیا ہو گا۔ یہ پورا معاشرہ مافیا ازم پر یقین رکھنے پر مجبور ہے۔ ایم آر ایس ہے۔

میں منتظر تھا کہ پیچھے سے کوئی مجھ پر کوئی دوسرا فائر کرے مگر فائر کرنے والا غالباً سرچ لائٹ کا انتظار کر رہا تھا کہ سرچ لائٹ ہی میرا سب سے بڑا مسئلہ تھی۔ میرے خیال میں وہ اکبر خان کے آدمی تھے جو کیکروں کی یلغار کا مقابلہ کر رہے تھے اور سرچ لائٹ انہیں تلاش کرنے کے لیے ضروری تھی۔ میری طرف تو اس کا رخ غلطی سے ہو گیا تھا۔ شاید مجھے دیکھتے ہی انہوں نے لائٹ بند کر دی تھی۔

ایک منٹ تک کچھ بھی نہیں ہوا پھر باہر سے کسی نے چلا کے کہا۔ "سکندر! نیچے اتر آؤ لنگور کے بچے۔ خیریت چاہتے ہو تو۔"

اس بے تکلفی نے مجھے سخت جز بز کیا۔ "زبان سنبھال کے بات کرو سور کے بچے۔ میں اکبر خان سے شکایت کروں گا تمہاری۔"

"ایسی کی تیسی اکبر خان کی۔ تم آتے ہو نیچے یا ہم اوپر آ کے پکڑیں تم کو؟"

میں نے چیخ کے کہا۔ "مشین گن سے بھون کے رکھ دوں گا سب کو۔"

"او بے ہم بھی ٹینک لے کر آئیں گے چھت پر۔" اسی بدتمیز شخص نے چلا کے کہا۔

میں شک میں پڑ گیا۔ مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے والا اکبر خان کا کوئی ملازم نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر وہ کون تھا؟ شاید وہ مشین گن والی بات کو مذاق سمجھ رہا تھا۔ وہ بڑے اکھڑ لہجے میں بول رہا تھا

www.paksociety.com

اور اس کی آواز لاؤڈ اسپیکر جیسی تھی۔ میں نے اسے سبق سکھانے کا فیصلہ کیا اور اندازے سے رُخ متعین کرتے ہوئے اسٹین گن کو سرچ لائٹ کی طرف کیا۔ ایک سیکنڈ اور گزر جاتا تو میں پورا راؤنڈ چلا دیتا اور اس سے جو نقصان ہوتا اس کی تلافی میں تمام عمر نہ کر پاتا۔

ایک دم کوٹھی میں لائٹ آگئی۔ گیٹ لائٹ سے پورچ تک اور کمروں کے اندر تک اجالا ہو گیا۔ میں فوراً چمنی کے پیچھے ہو گیا۔ اندر باہر کا پورا منظر اپنی ساری ہولناکی کے ساتھ میرے سامنے آگیا تھا۔ دو کیکر ٹائپ مُردے گیٹ کے اندر ڈرائیو وے پر اوندھے پڑے تھے۔ ایک لان کے وسط میں یوں چت لیٹا ہوا تھا جیسے تارے گن رہا ہو۔ بیرونی فصیل کے ساتھ ایک تو وہی تھا جسے میں نے شکار کیا تھا' دوسرا چند سیکنڈ قبل ہلاک ہوا تھا۔ ایک کیکر کو میں نے فصیل پر بیچ و بیچ دونوں پیچھے بھول دیکھا۔ اس کی ٹانگیں دیوار کے باہر لٹکی ہوئی تھیں اور دھڑ اندر تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ جیسے اندر کی زمین کو چھونے کی کوشش میں تھے۔

سڑک پر میں نے ایک ماکنگ بس دیکھی جو ریورس گیئر میں گیٹ سے اندر آ رہی تھی۔ سرچ لائٹ شاید اسی کی چھت پر نصب تھی مگر اب نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں اس کے اندر ڈرائیور کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا اور نہ اندر موجود دیگر افراد کو۔

چھت پر میں نے خود کو قطعی احمق محسوس کیا۔ میں سخت کنفیوژن میں مبتلا تھا۔ نہ یہ پولیس والے تھے اور نہ اکبر خان کے محافظ اور ملازم۔ تو پھر یہ کون لوگ تھے جو کیکروں سے کھلی جنگ لڑ رہے تھے۔ جو مجھے جانتے اور پہچانتے تھے اور اب بڑی بے خوفی سے اندر آ رہے تھے۔ میرے لیے ان پر فائر کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ جو بھی تھے میری جان کے دشمن نہیں تھے ورنہ وہ مجھے اتنی مہلت نہ دیتے۔

دائیں اور بائیں طرف کی دیواروں پر سے دو افراد کود کر اندر آئے۔ ان کے جسم پر سرتاپا سیاہ لباس تھے۔ سیاہ جوتے' سیاہ چُست پتلون پر سیاہ فیان اور سر پر سیاہ جراب کی نقاب۔ نائیلون کی جراب کو کھینچ کر گردن تک لانے کے بعد اس میں آنکھوں کی جگہ دو سوراخ کرلیے گئے تھے۔ چُست لباس کی وجہ سے ہی میں نے یہ دیکھ لیا کہ دیوار پر سے کودنے والوں میں ایک عورت بھی شامل ہے۔

"ہے!" میں نے اوپر ہی سے کہا۔ "کون ہو تم لوگ آخر؟"

ایک سیاہ پوش نے سر اٹھایا۔ "تمہارے باپ۔ ابھی اوپر آ کے بتاتا ہوں تمہیں۔" یہ وہی اکھڑ لہجے والا تھا۔

اب میں نے نیچے آ کر ان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ جارحانہ لہجے کے باوجود ان کے عزائم خطرناک نہیں لگتے تھے اور میرے پاس اپنی حفاظت کے لیے اسٹین گن تھی جس پر میں انحصار کر سکتا تھا۔ اچانک پیچھے سرونٹ کوارٹرز کی طرف فائرنگ ہوئی۔ دو سیاہ پوش ایک کیکر کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ کیکر کے پاس شاید … نہیں تھا یا وہ اپنے ریوالور کی آخری گولی بھی خرچ کر چکا تھا اور … گولیوں سے کام چلا رہا تھا جس کا جواب تعاقب کرنے والے گالیوں سے دے رہے تھے۔ غالباً یہ وہی کیکر تھا جس نے عقب سے مجھ پر گولی چلائی تھی اور وہی اس کی آخری گولی تھی۔ ظاہر ہے … چھپ کر فرار کے موقع کا انتظار کرنے کے سوا کچھ … تھا۔ اب فاتح فوج نے اسے تلاش کر لیا تھا اور وہ قسمت کا … غازی بنا تھا نہ شہید ہوا تھا بلکہ جنگی قیدی بن گیا تھا۔

پائپ سے پھسل کر نیچے اترتے ہوئے میں نے … گن کو کندھے پر لٹکایا لیکن چند سیر گولیوں کے وزن کو برابر … کرنے کے گرد باندھنے کے بجائے میں نے اپنا … جیسے کوئی ڈول کو رسی باندھ کے کنویں میں لٹکائے۔ جنگی قیدی کی چلانے کی آواز سے میں نے اندازہ کر لیا کہ اس کے ساتھ "جنیوا کنونشن" کی قرارداد کے مطابق سلوک نہیں ہو رہا ہے بلکہ … تھانوں کی زندہ روایات کے مطابق اس کی چھترول لگائی جا رہی تھی۔

ابھی میں آدھے راستے میں تھا کہ میں نے رابعہ کے چلانے کی آواز سنی۔ "چھوڑو۔۔۔ چھوڑ دو مجھے۔۔۔ ذلیل۔۔۔ کمینے۔۔۔ حیوان تو نے ہاتھ لگایا مجھے۔" پھر وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ میری حرکتِ قلب ایک لمحے کے لیے بند ہوئی اور میں چھ سات فٹ کی بلندی سے چھلانگ مار کے اترا۔

ایک بار پھر رابعہ کی آواز آئی۔ "سکندر۔۔۔" پھر جیسے کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے چیخ کے کہا۔ "رابعہ! میں آ رہا ہوں۔"

لیکن ہیروئن کی پکار پر لبیک کہنے والے ہیرو کو اپنی بہادری دکھانے کا موقع ہی نہ ملا۔ جیسے ہی میں ایک دروازے سے ہوا کی طرح اندر داخل ہوا میں نے دو سیاہ پوشوں کو دیکھا جو غالب اور نازو کو کندھوں پر اٹھا کے لے جا رہے تھے۔ رابعہ فرش پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔

غصے میں پاگل ہو جانے کے باوجود میں نے گولی چلانے کی حماقت نہیں کی۔ غالب اور نازو کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ وہ مر چکے ہیں یا صرف بے ہوش ہیں۔ میں فائر کرتا تو ممکن تھا کہ گولی انہیں لگ جاتی اور ان کو بے ہوشی میں قتل کرنے کا الزام مجھ پر آ جاتا۔

وہ دوسرے کمرے میں غائب ہو رہے تھے کہ میں نے گن اٹھا کے اور چیخ کے کہا۔ "ٹھہرو۔۔۔ رک جاؤ ورنہ۔۔۔" اس سے زیادہ کہنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پیچھے سے کسی نے مجھ پر وار کیا اور میں نے روشنی کو اندھیرے میں بدلتے دیکھا۔ اس اندھیرے میں جگنو سے جھلملائے اور میں نے انہیں پکڑنے کی کوشش کی مگر جگنو بھی غائب ہو گئے اور مجھے یوں لگا جیسے میں کسی بلندی سے خلا میں اتر رہا ہوں۔

جب مجھے پھر ہوش آیا تو میں نے آنکھیں کھول کر گرد و پیش پر ایک نظر ڈالی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ میرے سر میں شدید درد تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر میں کہاں ہوں۔ اپنی قبر میں؟ آج تک نہ سمجھا نہ سنا تھا کہ قبر میں مُردے کو لٹو کی طرح گھمایا بھی جاتا ہے۔ دیواریں یقیناً گردش میں تھیں اور قبر میں روشنی کا کیا سوال۔ میں نے تو ایک لالٹین دیکھی تھی۔ ایک نہیں دو۔ ایک دائیں طرف کی دیوار پر دوسری بائیں طرف۔ میں چارپائی پر ہوں اور آج تک کسی مُردے کو چارپائی سمیت دفن نہیں کیا گیا۔

ایک بار پھر آنکھیں کھول کے میں نے زیادہ غور سے اس وحشی دنیا کو دیکھا جس سے پہلے کبھی میرا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس خالی کمرے کی بوسیدہ دیواریں رنگ و روغن سے بے نیاز تھیں اور لالٹینوں کی مدھم' زرد روشنی میں ماحول بھی آسیب زدہ لگتا تھا۔ میں چھت پر رینگنے والی ایک چھپکلی کو نوٹس کر رہا تھا جب دوسری طرف آہٹ سی ہوئی۔

میں نے سر گھما کے دیکھا اور پھر ایک دم اٹھ بیٹھا۔ ایک پرانی کرسی پر مجھے ایک جیتا جاگتا کارٹون نظر آیا۔ وہ کرسی میں پھنسا ہوا گول مٹول شخص تھا جو اب مجھے اپنی الو جیسی گول گول آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اس کا سر بالوں سے بے نیاز تھا۔ ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے وہ بار بار گہری ٹھنڈی سانسیں لے رہا تھا جس سے اس کا پیٹ پھولتا تھا تو کرسی کی حدود سے باہر نکل آتا تھا۔

"تم کون ہو؟" میں نے کہا۔

"میں کون ہوں؟" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "میں شامت کا مارا ہوں۔ بے چارہ ہوں' گھسیارا ہوں۔ میں گردش میں ہوں' آسمان کا تارا ہوں۔ آوارہ ہوں۔ آج تک میں خود کو ڈاکٹر سمجھتا تھا۔ دنیا بھی مانتی تھی۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "پھر آج کیا ہوا؟"

"آج۔۔۔ آج یہ ہوا عزیزم کہ دو ڈاکو میرے کلینک پہنچے جب میں چھٹی کر کے گھر جانے والا تھا۔ وہ مجھے یہاں لے آئے اور اب میں تمہارے ساتھ یہاں قید ہوں۔ میری بیوی نے اپنے میکے والوں کو یہ اطلاع دے دی ہوگی کہ بالآخر میں بھاگ گیا اسی نرس کے ساتھ جسے میں نے گزشتہ ہفتے ملازم رکھا تھا۔ بتاؤ میں کیا کروں؟" اس پر رقت طاری تھی۔

میں نے اسے مخلصانہ مشورہ دیا۔ "جب تمہاری یہاں سے رہائی ہو تو پہلا کام یہی کرنا۔ اسی نرس کے ساتھ بھاگ جانا۔"

"تم مذاق کر رہے ہو۔ میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ اس کا باپ اور میرے سالے۔ وہ مجھے گولے کے ساتھ توپ میں ڈالیں گے اور پھر توپ چلا دیں گے۔" اس کی آواز میں بھی رقت آ گئی۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "معاف کرنا۔ تم نے مذاق کیا تو میں نے بھی مذاق میں مشورہ دے دیا۔"

"میں نے کون سا مذاق کیا تھا آپ کے ساتھ؟"

"تم نے کہا تھا کہ تمہیں ڈاکو اٹھا لائے تھے۔"

"بیٹے! آپ کو ابھی تک یقین نہیں آیا میری بات پر؟" اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ہوش میں آتے ہی تم فلمی ہیرو کی طرح پوچھتے کہ میں کہاں ہوں تو میں کہتا کہ یہ ڈاکوؤں کا ڈیرا ہے۔ ڈاکو تمہیں بھی اٹھا کے لائے ہیں اور تمہارے ساتھ پتا نہیں کس کس کو۔"

اب میرے حواس پوری طرح بیدار ہو چکے تھے۔ "تم نے دیکھا ہے کسی ڈاکو کو۔ میرا مطلب ہے تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ ڈاکو ہیں؟"

"لاحول ولا۔ خود انہوں نے بتایا تھا مجھے۔"

"اور تم نے مان لیا؟"

"نہ مانتا تو وہ وہیں مار دیتے مجھے۔ کسی دوسرے ڈاکٹر کو لے آتے۔ اور نہ ماننے والی بات بھی نہیں تھی۔ وہ صورت شکل سے اور بات چیت سے علما یا حافظ جی نہیں لگتے تھے۔"

میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ "یہ کب کی بات ہے؟"

"بات تو ہے گزشتہ رات کی جس کی صبح اب ہونے والی ہے۔ چھ گھنٹے ہو گئے مجھے یہاں آئے ہوئے۔" وہ بولتا تھا تو لگتا تھا کہ رو رہا ہے اور یہ ایک فطری صلاحیت تھی۔ "میں نے انجکشن لگا دیا' دوا دے دی۔ بتا دیا کہ بے ہوشی عارضی ہے' معمولی چوٹ ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں رہی۔ اب جانے دو مجھے مگر ڈاکو تو میاں ڈاکو ہی ہوتا ہے۔ وہ سنتے ہیں کسی کی۔"

میں نے کہا۔ "اور کون ہے میرے ساتھ؟"

"کیا چیز ہو تم بھی؟ یہ مجھ سے پوچھ رہے ہو۔"

"ڈاکٹر صاحب! مجھے تو انہوں نے سر پر گُرز مار کے لٹا دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ اور کون کون پکڑا گیا تھا؟"

وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "دیکھو' ان کو معلوم نہ ہو کہ میں نے کچھ بتایا تھا تمہیں۔ بیوی تو شاید بخش دے' یہ نہیں بخشنے والے۔ چار تو وہ اٹھائے ہوئے تھے انہوں نے کہیں سے۔ دو عورتیں اور دو مرد۔ تم اور ایک عورت تو شرافت سے یہاں تک آ گئے مگر ایک عورت اور ایک مرد راستے میں غائب ہو گئے۔"

"کیا مطلب؟ کر گئے کہیں یا کھو گئے؟ وہ بھوت تو نہیں تھے کہ غائب ہو جاتے۔" میں نے کہا۔

"سچ واللہ اعظم۔ میں نے تو سنا تھا۔ ان کا جو سردار ہے نا' وہ بہت گرج برس رہا تھا کہ تم سب الو کے پٹھے ہو۔ میں نے بتا دیا تھا' سمجھا دیا تھا۔ شرم نہیں آتی' خود کو مرد کہتے ہو۔ ایک لڑکی کو نہیں سنبھال سکے۔ تمہاری ٹھکائی لگا کے نکل گئی وہ اور ساتھ اسے بھی لے گئی۔"

میں ساری بات سمجھ چکا تھا مگر ڈاکٹر کی زبان سے تصدیق چاہتا تھا۔ "یہاں ایک خاتون کو لایا گیا تھا میرے ساتھ۔ وہ کہاں ہیں؟"

"دوسرے کمرے میں۔"

www.paksociety.com

"اس ساتھ والے کمرے میں؟" میں نے پلنگ پر سے چھلانگ لگائی۔

ڈاکٹر میرے پیچھے لپکا۔ "یار! کیوں مروائے ہو۔ دوسرے کمرے کا مطلب ساتھ والا کمرا نہیں ہے۔ ابھی تمہیں اجازت نہیں ہے اٹھنے کی۔"

میں مایوس ہو کے پھر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ "کسی کی اجازت نہیں چاہیے مجھے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"دیکھو، ابھی وہ آئے گی تو اسے بتا دینا یہ بات تاکہ میری بھی جان چھوٹے۔"

"کون آئے گی؟" میں نے کہا۔

"وہی۔ ڈاکو ناگ منی جس کا یہ ڈیرا ہے۔"

یہ الفاظ بم کے دھماکے تھے جو میری سماعت پر گرے۔ میں کچھ دیر دم بخود بیٹھا ڈاکٹر کو گھورتا رہا۔ "یہ...... ناگ منی کا ڈیرا ہے؟ تم نے دیکھا ہے اسے؟ تم ملے ہو ڈاکو ناگ منی سے؟"

"اتنے بدحواس کیوں ہو گئے؟ تمہاری ملاقات بھی ہو جائے گی۔ وہ بڑی عجیب چیز ہے میاں۔ بس خدا کی قدرت ہے اور کیا کہوں۔ نہ صورت سے ڈاکو لگتی ہے، نہ بات چیت سے اور نہ اطوار سے مگر سچ کے ڈاکو اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ اس کے دائیں بائیں محافظ بن کے رہتے ہیں۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ یہ حقیقت ہے یا کوئی بھیانک خواب۔ فلموں میں دیکھا تھا ایسا کہ ڈاکوؤں کی سردار کوئی حسینہ ہے۔ ناچ گانا بھی جانتی ہے اور پیار بھی کرتی ہے کسی شہزادہ گلفام سے۔ اب یقین کرنا پڑا ہے کہ فلموں میں جو اتفاقات نظر آتے ہیں وہ سب بے بنیاد نہیں ہوتے۔ کچھ حقیقت بھی ہوتے ہیں۔"

میں حیرت کے جذبات کی اس انتہا پر تھا جہاں حیرت بے معنی ہو جاتی ہے۔ وہ ڈاکو ناگ منی اور اس کے ساتھی تھے جنہوں نے نیکلر شاہ کے مریدوں کا مقابلہ کیا تھا اور ان کے حملے کو ناکام بنا دیا تھا۔ وہ ہماری اپنی گل بانو تھی جو سچ مچ ڈاکو ناگ منی کے روپ میں نمودار ہوئی تھی اور ہمیں اکبر خان کے گھر سے نکال لائی تھی۔ آخر وہ عین وقت پر وہاں کیسے پہنچ گئی تھی؟ کس نے بتایا تھا اسے کہ ہم اکبر خان کے مہمان ہیں اور محصور ہو گئے ہیں اور اگر وہ گل بانو ہی تھی تو کیا وہ اکبر خیمے میں مجھ سے بات کرنے والا محسن تھا؟ اندازہ تو رہی تھا اس کی بے تکلفی کا مگر آواز؟ شاید وہ آواز بنا کے بول رہا تھا۔ ڈاکٹر کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ نازو راستے میں ہی انہیں مل گئی ہے گرفتار ہو گئی اور جاتے جاتے اپنے ساتھ غالب کو بھی لے گئی۔ یہ سوچ کر میں مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ نازو آخر نازو ہے۔ اس نے مگر کیا ہوگا۔ یہ دیکھ لیا ہوگا کہ مقابلہ بے سود ہے تو اس نے غالب کو بھی سمجھا دیا ہوگا کہ مگر کے پڑے رہنا اور جب میں اشارہ دوں تو بس میرے ساتھ ہی چھلانگ مار دینا یا ایسا کوئی ڈراما کیا ہوگا اس نے راستے میں کہ اغوا کر کے لانے والے احمقوں کی طرح منہ

دیکھتے رہ گئے اور جنہوں نے اس کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کی وہ مارے گئے۔ نازو نے ان کو اچھی چکر لگا دیا ہوگا۔

"ابھی کیا بات ہے میاں کہ مسکرا رہے ہو؟ بڑے خوش ہو۔" ڈاکٹر نے طنز سے کہا۔

میں نے کہا۔ "خوشی کی بات تو ہے۔ ہر ایک کے نصیب میں کہاں کہ گل بانو... میرا مطلب ہے ناگ منی اسے اغوا کرے۔ کیا کہا ہے کسی شاعر نے کہ وصال یار فقط آرزو کی بات نہیں ہے۔"

صدمے سے ڈاکٹر کا برا حال ہو گیا۔ "یہ خواہش تم تمہاری؟"

"ڈاکٹر صاحب، خواہش کا کیا ہے۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ فرض کریں میری خواہش ہو کہ مجھے امریکا اپنے پوتے کی رسم عقیقہ میں مدعو کرے۔ تو کیا یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے؟ کبھی نہیں۔ ابھی تو پوتا کیا نہیں ہے اس کا ہوگا تو عقیقہ نہیں ہوگا اس کا اور بفرض محال ہوتا تو وہ مجھے کیوں بلاتا؟ کیا میں ماموں ہوں اس کے پوتے کا؟"

ڈاکٹر کو یقین ہونے لگا تھا کہ سر کی چوٹ کا اثر اب ظاہر ہونے لگا ہے کہ اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اسے کیا پتا تھا کہ اس وقت میرے دلی جذبات کیا ہیں۔ ایک طرف مجھے خوشی تھی گل بانو اور محسن سے ملاقات کی تو دوسری طرف دل ایک صدمے سے بھی دوچار تھا۔ اب تک میں نے جو کچھ سنا جانا تھا مگر اب تصدیق ہو گئی تھی کہ ڈاکو حسینہ ناگ کی... تھی جسے ہم نے بڑے خلوص، بڑی اپنائیت اور محبت سے گل بانو بنایا تھا، وہ پھر اپنے اصل کی جانب لوٹ گئی ہے۔ وہ پھر ڈاکوؤں کے گروہ کی سردار ہے اور میں نے اس کے بارے میں جتنی باتیں سنی تھیں وہ غلط نہیں تھیں۔

آخر اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا مجبوری تھی جس نے گل بانو کو دوبارہ ناگ منی بنا دیا؟ اگر ابتدا میں ایسا ہوتا تو مجھے نہ حیرت ہوتی اور نہ دکھ ہوتا۔ شریفانہ زندگی کے طور طریقے، ادب و آداب، ڈسپلن کی پابندی انہیں کہاں راس آتی ہے جو بے راہ روی کی زندگی کے عادی ہوں۔ چور، ڈاکو، غنڈے یا بدمعاش... بازاری عورت کے لیے بیوی بن کے شوہر کی اطاعت کرنا اور گھر کی چار دیواری میں قید رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

افسوس کی بات یہ تھی کہ گل بانو نے خود بھی ناگ منی کے ماضی سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں ہم سے بھرپور تعاون کیا تھا۔ ناگ منی اس کے گزشتہ ماضی کی بھولی بسری یاد بن بھی گئی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اچانک وہ پرانی ناگ منی پھر زندہ ہو جائے گی اور گل بانو کا وجود خیالوں میں خواب اور سراب کی طرح گم ہو جائے گا۔ یہ نا ممکن لگتا تھا مگر حقیقت اس سے کہیں زیادہ تلخ اور بھیانک تھی۔ صرف گل بانو ہی نے ناگ منی کا روپ اختیار نہیں کیا تھا، وہ اپنے ساتھ میرے اس دوست محسن کو بھی

لے گئی تھی جو روز اول سے میری زندگی میں شامل تھا اور میرے وجود کا ایک حصہ تھا۔ میرا اپنا وجود کسی ارض کی طرح تھا جس میں زمان، سمندر اور پہاڑ، آبادیاں اور ویرانے سب ہی شامل تھے۔ میرا ماضی، حال اور مستقبل میں بٹا ہوا تھا۔ ماضی میں میرے والدین، بھائی بہن اور بہت سے لوگ شامل تھے جو اب صرف یادوں میں رہ گئے تھے مگر محسن نے ماضی سے حال تک میرا ساتھ دیا تھا۔ رابعہ بھی میرے سفر حیات میں بہت دیر سے شریک ہوئی تھی اور اب میں مستقبل کا تصور کرتا تھا تو رابعہ کو شریک حیات سمجھتا تھا۔ بالکل اسی طرح محسن کو بھی میں نے اپنے مستقبل میں ساتھ دیکھا تھا۔ غالب اور نازو بھی میرے ساتھ تھے اور میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان میں سے کوئی اچانک اپنی راہ الگ کرے گا لیکن محسن نے ایسا ہی کیا تھا۔ وہ گل بانو کو روکنے کے بجائے خود اس کے ساتھ نکل گیا تھا۔

ڈاکٹر میری صورت کو بڑے غور سے ملاحظہ کر رہا تھا جس پر حیرت، خوشی، دکھ اور پچھتاوے کے سارے جذبات کا عکس باری باری جھلک دکھا رہا تھا۔ ظاہر ہے میری جذباتی کیفیت کا یہ اتار چڑھاؤ اور میرے ناقابل فہم رویے کی تبدیلی سے وہ پریشانی کا شکار تھا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ میری اور اس کی یہاں موجودگی کے پیچھے وہ کہانی ہے جو میں اسے سمجھانا چاہوں تو وہ سن کے پاگل ہو جائے۔

اب میرے دل میں رابعہ سے، محسن سے اور گل بانو سے ملنے کی خواہش جاگ اٹھی تھی اور ہر لمحہ شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے اچانک چلا کے کہا۔ "ڈاکٹر! اوئے میتوں وس او ناگ منی کتھے اے۔ اونوں آکھ میرے سامنے آوے۔ میں اوہدے ٹوٹے کر دیاں گا۔ بے او ناگ منی اے تے میں وی شیش ناگ آں۔"

ڈاکٹر اچھل پڑا۔ "یہ... یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں اچانک؟"

میں نے اسے دبوچ کے کہا۔ "اوئے توں تکیا جا بندا میتوں۔ میں تیرے وی ٹوٹے کر دیاں گا لوٹے... ہا ہا ہا... کتھے ہے میرا گنڈاسا۔"

میری ہنگامہ آرائی کا مقصد کسی کو متوجہ کرنا تھا اور میں اس مقصد میں کامیاب رہا۔ باہر سے کسی نے دروازے کا قفل کھولا اور ایک دم گل اندر آ گئی۔ اس کے پیچھے صورت اور حلیے سے ڈاکو نظر آنے والا اور ایک شخص تھا جس نے اپنی اسٹین گن کا رخ میری طرف کر لیا تھا۔

ناگ منی عام استعمال کے کپڑوں میں تھی اور اس میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جب پہلی بار وہ مجھے ناگ منی کے روپ میں ملی تھی تو اس کا حلیہ بالکل مختلف تھا۔ ہمارے ساتھ رہنے سے وہ گل بانو بنی تو اس نے اپنا حلیہ بھی بدل لیا، انداز و اطوار بھی بدل ڈالے تھے۔ اس وقت بھی میرے سامنے وہی گل بانو تھی اور میرا ذہن اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریزاں تھا کہ وہ ناگ منی ہے۔

چند سیکنڈ ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے خاموش کھڑے رہے۔ گل بانو کے ساتھ آنے والا محافظ اور میرے ساتھ کھڑا ہوا ڈاکٹر منتظر رہے کہ ہم کوئی بات کریں۔

بالآخر گل نے اپنے ساتھ آنے والے کو حکم دیا۔ "تم جاؤ اس ڈاکٹر کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

"خدا کے لیے اب تو مجھے جانے دو۔" ڈاکٹر نے فریاد کی۔ "شادی کے بعد آج تک کبھی میں پوری رات گھر سے باہر نہیں رہا۔ میری بیوی بڑی ظالم ہے۔"

"اگر اس کی ضرورت نہ ہو تو اسے واپس چھوڑ آؤ۔" گل نے کہا۔

"اب میری کیا ضرورت ہے ڈاکو صاحب۔ دیکھ لیں آپ کا بندہ ٹھیک ٹھاک کھڑا ہے آپ کے سامنے... میری بیوی..."

ڈاکو نے اسے باہر کھینچ لیا۔ "بیوی سے اتنا ڈرتا ہے۔ شرم کر۔"

دروازہ بند ہو گیا تو میں نے کہا۔ "کس نام سے مخاطب کروں میں آپ کو؟ گل بانو کہوں یا ناگ منی؟"

گل ایک دم آگے آئی اور میرے گلے لگ کے رونے لگی۔ "مجھے معلوم تھا، آپ بہت ناراض ہوں گے۔ آپ سب کو میرے نام سے نفرت ہوگی مگر سکندر بھائی! میں وہی گل ہوں۔ خدا کی قسم۔"

میں نے اسے ایک جھٹکے سے دور کر دیا۔ "جھوٹی قسم کھا کے مزید گناہگار کیوں ہوتی ہو۔ جو حقیقت ہے، میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔"

"نہیں بھائی سکندر، ابھی آپ کو کچھ بھی نہیں معلوم مگر میں سب بتا دوں گی کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا۔"

"مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ نالی کا کیڑا نالی ہی میں خوش رہتا ہے۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"ابھی آپ غصے میں ہیں جو چاہیں کہیں۔ میں بہت پہلے آپ کی غلط فہمی دور کر دیتی مگر آپ لوگ تو پاکستان آ کے بھی اپنی چکروں میں پڑے ہوئے ہیں۔" گل نے کہا۔

"ہاں، ہم وہی ہیں۔ ہماری مصروفیات اور معمولات سب وہی ہیں اور ایسا ہی تم نے بھی کیا ہے۔ تم اپنی پرانی دنیا میں واپس چلی گئی ہو جس سے ہمارا پہلے کوئی تعلق تھا اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔"

گل سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑی رہی۔ "میں نے اور محسن نے آپ لوگوں کو بہت تلاش کیا۔ بالآخر گل آپ کا پتا چلا اور خدا کا شکر ہے کہ ہم بروقت پہنچ گئے۔ میں نے رابعہ باجی کو سب بتا دیا ہے۔"

"رابعہ... کہاں ہے رابعہ؟" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"محسن سے باتیں کر رہی ہے۔" گل نے مسکرانے کی کوشش کی۔

رابعہ اور محسن کے نام پر میرے جذبات کی آگ سرد پڑنے لگی۔ یوں بھی نہ جانے کیوں گل کو دیکھتے ہی میرے دل میں کچھ ہونے لگا تھا۔ مجھے اس پر اتنا غصہ تھا کہ میرا خیال تھا میں اس کو برا بھلا کہوں گا' اسے گالیاں دوں گا' اسے صاف بتا دوں گا کہ ہم سب اس سے نفرت کرتے ہیں اور اب اس کے اور ہمارے درمیان کوئی رشتہ ہے تو دشمنی کا۔ کسی ڈاکوؤں کے گروہ سے ہمارا کیا تعلق۔ اب ایک طرف ہم ہیں اور دوسری طرف چوہدری دلاور ہے' ناگ سنگھ ہے اور وہ سب قانون شکن' ملک دشمن عناصر ہیں جن کے خلاف ایم آر ایس کی کھلی جنگ ہے۔

لیکن گل بانو سامنے آئی اور اس نے میرے سینے سے لگ کر رونا شروع کیا تو میں اپنی ساری نفرت اور غصہ بھول گیا۔ مجھے وہ پہلے جیسی معصوم اور پرانی گل بانو لگی۔ میں نے غصے میں جو بھی کہا وہ مجھے غصے کی ایکٹنگ لگا۔ میں سوچنے لگا کہ میں گل بانو کو صفائی اور وضاحت کا موقع دیے بغیر اس سے نفرت کیسے کر سکتا ہوں۔

گل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "آیئے میرے ساتھ۔ محسن کی بات تو مانیں گے آپ؟ وہ تو آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس سے پوچھ لیں کہ ہم نے جو بھی کیا ضرورت اور مجبوری کے تحت کیا۔"

"ضرورت اور مجبوری!" میں نے تلخی سے کہا۔ "میں بھی سخت ضرورت محسوس کر رہا ہوں اس حرامزادے کو جوتے مار مار کر گنجا کرنے کی اور مجبوری میری یہ ہے کہ میں اسے گولی نہیں مار سکتا۔"

گل نے کہا۔ "اب وہ ٹھیک ہے اور اس کو ڈپریشن کے دورے بھی کم پڑتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ پہلے اس کا حال کیا تھا۔ کتنا عرصہ وہ شاک کی کیفیت میں رہا تھا۔ بہت کم امید تھی کہ وہ شملا کی اور اپنے بیٹے کی موت کا ذہنی صدمہ بھول پائے۔"

ایک دم میرا دل اپنے دوست کے لیے محبت اور ہمدردی کے جذبات سے بھر گیا۔ وہ سارا دکھ اور اذیت میرے احساس کا حصہ بن گئے جو محسن نے برداشت کیے تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ میرا دوست تھا اور اس کو میرا ساتھ دینے کی اتنی بڑی سزا ملی تھی جو خود مجھے نہیں ملی تھی۔ گل کی بات نے یادوں کا دریچہ کھول دیا اور میں نے گزرے ہوئے وقت کے بہت سے بے رحم لمحات کی وہ تصویر دیکھی جس کے نقش محسن کے ہر زخم دل میں آج بھی تازہ ہوں گے اور اگر گل کی محبت کا اعجاز مسیحائی نہ ہوتا تو ناسور بن چکے ہوتے۔ یہ گل ہی تھی جس نے محسن کے دل میں جینے کی امنگ کو مرنے نہیں دیا تھا اور ایک موہوم امید کے سہارے پر اپنے نخل محبت کے لیے اس کے دل کی بنجر زمین سے نمو کی بھیک مانگتی رہی تھی اور خواہشوں کی خوشبو سے ارمانوں کی بہار کشید کرنے کی دیوانہ وار کوشش سے کبھی دستبردار نہیں ہوئی۔ آج یہ اس کی قربانیوں اور اس کی محبت کا کرشمہ تھا کہ محسن ایک بار پھر اپنے ماضی کے پُر آزار زمانے [illegible] باہر آ کے ہم سب کے ساتھ امیدوں کے سفر میں پورے جوش اور ولولے کے ساتھ شریک تھا۔

"جب تک ہم یہاں نہیں آئے تھے۔" گل نے کچھ دیر بعد کہنا شروع کیا۔ "محسن کی حالت بظاہر ٹھیک ہو گئی تھی مگر یہاں آنے کے بعد ہم جب کراچی کے ایئرپورٹ سے نکلے تو اس کی حالت میں پھر جنون کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے لاہور جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ تم سب کے لیے لاہور وہی لاہور ہو گا مگر میرے لیے وہاں اب کیا ہے۔ ہر جگہ' ہر طرف یادوں کا ایک قبرستان ہے۔ کیا میں اس قبرستان میں کسی بدروح کی طرح بھٹکتا رہوں۔ میں اس کی بات سمجھ گئی۔ وہ پرانے ماحول میں واپس جاتے ہوئے ڈر رہا تھا اور یہ تو میرے اختیار میں نہیں تھا کہ اس ماحول سے پرانی یادوں کو الگ کر دوں۔ گھر میں ایک کمرا بدلا جا سکتا ہے مگر میں یا تم لاہور کو کیسے بدل سکتے تھے۔ ان گلیوں اور سڑکوں' گھروں اور بازاروں' دکانوں اور ہوٹلوں کو دیکھ دیکھ کر محسن پھر پاگل ہو جاتا جہاں شملا اس کے ساتھ تھی۔"

میں نے کہا۔ "تم نے بہت اچھا کیا گل۔"

"مجھے امید تھی کہ تم سب آ جاؤ گے تو شاید محسن کو سنبھال لو گے اور ممکن ہے ہم مل کے کوشش کریں تو محسن میں حقیقت کو سمجھنے اور اسے تسلیم کرنے کا حوصلہ بحال ہو جائے لیکن اس کی وحشت میں جنون کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ اس نے [illegible] سے مجھے بھی انکار کر دیا۔ اب میں کیا بتاؤں آپ کو۔ میں تو گھبرا گئی تھی۔ وہ میرے کنٹرول سے بھی باہر ہو جاتا اگر میں اس کی نہ مانتی۔ اس نے کہا کہ گل مجھے تنہا چھوڑ دو۔ تم جاؤ سکندر اعظم کے ساتھ' مرزا غالب کے ساتھ اور رانو کے ساتھ۔ میں کسی کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں نے اپنا سب کچھ تو لٹا دیا اور کچھ نہیں ہے میرے پاس کسی کو دینے کے لیے۔ میں اسے ایک ہوٹل میں لے گئی اور بڑی مشکل سے اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوئی کہ میں بھی لاہور نہیں جانا چاہتی اور کسی سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔ ایک دن تو وہ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلا' نہ اس نے مجھے باہر جانے دیا۔ وہ خوف کے آسیب کا شکار تھا۔ کہتا تھا باہر جاؤ گی تو دلاور اٹھا کے لے جائے گا تمہیں۔ استاد پیڈرو مل جائے گا۔ بس یہاں بیٹھو میرے پاس۔ مجھ سے باتیں کرو۔ وہ بولتا رہا اور میں سنتی رہی۔"

"کیا باتیں کرتا رہا وہ تم سے؟"

"پرانی باتیں۔ جب تم لندن میں تھے تو کیا کرتے تھے' کہاں رہتے تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس نے شملا کی کوئی بات نہیں کی اور نہ اپنے بچے کی۔ نہ اس وقت کی جو اس نے لاہور میں گزارا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اپنی زندگی سے اس نے ایک پُر عذاب یادوں سے معمور وقت کا ٹکڑا کاٹ کے الگ کر دیا ہے۔ وہ صرف یاد رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے وہ لندن کے بارے میں بتاتا رہا۔ بہت خوب صورت شہر ہے' وہاں کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ اس کے کچھ حصے تو ایسے ہیں کہ لگتا ہے ہم پاکستان میں ہیں۔ بس ہم وہیں رہیں گے۔ کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ ہم کہاں ہیں۔ ہم ایسٹ اینڈ پر چھوٹا سا ریسٹورنٹ کھول لیں گے۔ میں اور تم مل کے اسے چلائیں گے اور دیکھنا ایک دن وہ ترقی کر کے مشرقی بلکہ پاکستانی کھانوں کے لیے لندن اور پورے انگلستان میں مشہور ہو جائے گا۔ ابھی تو میں کاؤنٹر پر بیٹھوں گا اور تم سروس کرنا۔ وہاں کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ بہت سے میاں بیوی مل کے کاروبار چلاتے ہیں۔ بچے بھی شریک ہوتے ہیں۔ پاکستانی لباس میں تم جیسی لڑکی ہوئی تو دیکھنا گاہک ٹوٹ پڑیں گے۔ میں سب سنتی رہی اور اس کی حوصلہ افزائی کے لیے تائید بھی کرتی رہی۔ میں نے یہ بالکل نہیں پوچھا کہ ہم لندن جائیں گے کیسے؟ نہ پاسپورٹ ہے نہ رقم۔ کاروبار کیا خالی ہاتھوں سے اور جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ وہ خواب کو حقیقت کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا اور میں نے اس کھیل میں محسن کا پورا ساتھ دیا۔ ایک پورا دن ہم ہوٹل کے کمرے میں بند رہے۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے قائل کیا کہ روم سروس سے کھانا اور چائے وغیرہ منگوانے میں کوئی خطرے کی بات نہیں۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی ویٹر ہمیں پہچان کے چوہدری دلاور یا استاد پیڈرو کو نہ بتا دے۔ ہمارے دشمن بہت ہیں۔ گل تم نے دیکھا ہو گا کہ لوگ ہر جگہ ہمیں پہچان جاتے تھے۔ محسن مجھے قائل کرنے کے لیے کہتا تھا۔ ہم تو راتوں رات چپکے سے یہاں سے نکل جائیں گے۔ بڑی مشکل سے مجھے ایک ویٹر سے بات کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت محسن باتھ روم میں تھا۔ میں نے ویٹر کی منت سماجت کی اور اسے بتایا کہ صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے مگر وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے تیار نہیں۔ تم کسی ڈاکٹر کو بھیج دو۔ اسے سمجھا دینا کہ نفسیاتی مسئلہ ہے۔ وہ خود کو ڈاکٹر نہ کہے ورنہ صاحب کا بھروسہ نہیں۔ ویٹر کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا مگر اس نے قریب ہی کسی ڈاکٹر سے بات کی۔ وہ سمجھ دار آدمی تھا۔ اس نے ڈاکٹروں والا سفید گاؤن پہنا اور چائے کی ٹرے لے کر آ گیا۔ کہنے لگا کہ میں تو ویٹر ہوں۔ وہ چائے میں کوئی خواب آور دوا ملا کے لایا تھا شاید۔ محسن نے چائے پی اور چند منٹ بعد باتیں کرتے کرتے سو گیا۔ رات سے وہ مسلسل جاگ رہا تھا اور اسے اٹھارہ گھنٹے ہو گئے تھے باتیں کرتے ہوئے۔ یہ بات بھی میں نے ویٹر کو بتا دی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر دوبارہ آیا اور اس نے مجھ سے بات کی۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ اس نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ یہ اثر عارضی ہے۔ ویسے تو علاج میں ایک مہینہ بھی لگ سکتا ہے لیکن ایک جوا بھی کھیلا جا سکتا ہے جس میں کامیابی اور ناکامی کے امکانات برابر ہیں۔ اگر آپ کی ضمانت ہے تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کو کیا کرنا ہو گا؟ میں نے کہا کہ ایک مہینے تک علاج کرانا میرے بس کی بات نہیں۔ میں اکیلی ہوں۔ نہ میرے پاس پیسہ ہے اور نہ وقت۔ ہاں میں جوا کھیل سکتی ہوں۔ آپ بتائیں مجھے کیا کرنا ہو گا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ آپ اس ہوٹل سے کسی دوسرے ہوٹل میں شفٹ کر جائیں۔ تب ان کو نیند کے انجکشن لگا دوں گا۔ یہ کم سے کم چھ گھنٹے تک بے ہوشی کی نیند سوئیں گے۔ چھ گھنٹے میں آپ سب کچھ کر لیں۔ ہوٹل بالکل مختلف ہو۔ اس کے کمرے کا ماحول بالکل مختلف ہو۔ آپ اپنے کپڑے بدل لیں اور ان کا لباس تبدیل کر دیں۔ جب ان کی آنکھ کھلے گی تو آپ کا اصل کام شروع ہو گا۔ یہ حیران ہوں گے۔ آپ سے پوچھیں گے کہ ہم کہاں آ گئے۔ آپ انہیں یقین دلائیں کہ ہم شروع سے یہیں ہیں۔ یہ پرانی باتیں دہرائیں گے جو یہ آپ سے کر چکے ہیں۔ آپ صاف انکار کر دیں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ کے کپڑے اور اپنے کپڑے دیکھ کے اور ہوٹل کے کمرے کا بدلا ہوا ماحول دیکھ کر یہ شک میں مبتلا ہو جائیں گے کہ انہوں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ آپ اس شک کو یقین میں بدل دیں کہ یہ خواب ہی تھا۔ سب کچھ آپ کی پُر اعتماد اداکاری پر منحصر ہے۔ اگر انہوں نے آپ کی بات مان لی تو غالب امکان یہ ہے کہ آپ جیت جائیں گی اور ان کا اپنی ذات پر اعتماد باقی نہیں رہے گا۔ یہ آپ پر انحصار کریں گے۔ اس وقت آپ جو بھی کہیں گی یہ مانیں گے لیکن آپ نے یہ موقع گنوا دیا اور انہیں شک ہو گیا کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں تو آپ جُوا ہار جائیں گی۔ بس سکندر بھائی! اس کے بعد میں نے کہا کہ اب ادھر یا ادھر۔ میں نے وہی کیا جو ڈاکٹر نے کہا تھا۔ جب محسن جاگا تو پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا کہ تم نے کمرا بدل لیا ہے یا ہوٹل؟ میں پہلے سے تیار تھی۔ میں نے کہا کہ کیسی باتیں کرتے ہو۔ کل سے ہم اسی ہوٹل میں ہیں۔ اس نے اپنے کپڑے دیکھے پھر میرے۔ کہنے لگا کہ یہ ہم نے کب خریدے تھے۔ میں نے کہا کہ کل شام کو بازار گئے تھے تو خود تم نے پسند کیے تھے۔ وہ چکرا گیا اور سب پوچھتا رہا۔ کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا' وہ نہیں کہا تھا۔ میں برابر اسے جھٹلاتی رہی کہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ہم تو اتنے تھکے ہوئے تھے کہ بس سوتے رہے تھے۔ شام کو نکلے تھے تو کھانا باہر ہی کھا کے لوٹے تھے اور واپس آ کے پھر سو گئے تھے۔ اس نے پوچھا کہ کھانا کہاں کھایا تھا۔ میں نے ایک ریسٹورنٹ کا نام لیا۔ وہ کہنے لگا۔ "گل! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔ کیا میری یادداشت چلی گئی ہے؟" میں نے ہنس کے کہا کہ یادداشت نہ رہتی تو تمہیں میرا نام کیسے یاد رہتا؟ سکون آور دواؤں سے اور مسلسل سونے سے یہ فائدہ ہوا تھا کہ اس کے اعصاب پر خوف کا اثر باقی نہیں رہا تھا۔ اس کا ذہن دوسری الجھن میں گرفتار ہو گیا تھا۔ قصہ مختصر میں نے جُوا کھیلا اور جیت گئی۔ محسن کا خوف دور ہو گیا لیکن وہ کسی "بچے" کی طرح قوتِ فیصلہ سے محروم ہو گیا۔ میری ہر بات پر وہ کہتا تھا کہ گل! تم کہتی ہو تو میں مان لیتا ہوں۔ بہت سی ایسی باتیں

www.paksociety.com

بھی ہو گئیں جو میں بتا نہیں سکتی۔ محسن بتائے گا آپ کو۔"

میں نے اسے شرم سے لال ہوتے دیکھا اور کہا۔ "ممکن ہے اسے وہ باتیں یاد ہی نہ ہوں۔ کیا اس نے...."

"نہیں سکندر بھائی۔ وہ خوف زدہ تھے یا عدم اعتماد کا شکار تھے مگر پاگل نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے.... پوچھا مجھ سے.... کہ گل! میری اور تمہاری شادی تو نہیں ہوئی ہے نا؟" میں نے کہا کہ "آپ کا کیا خیال ہے؟" محسن نے کہا کہ "یہاں ہوٹل کے رجسٹر میں تو یہی لکھا گیا ہوگا کہ ہم میاں بیوی ہیں لیکن مجھے معلوم ہے یہ غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "غلط ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" محسن نے کہا "گل! تم کو مجھ سے ڈر نہیں لگتا؟" میں نے کہا "تم کیسی باتیں کرتے ہو۔" محسن نے کہا "بہت رسک لیا تم نے میری خاطر گل۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا...." میں نے کہا "میں جانتی ہوں آپ کو۔ آپ خود میری حفاظت کر سکتے ہیں۔" محسن کہنے لگا "گل! اتنا بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کسی پر بھی۔ ہر مرد کے اندر ایک انسان ہوتا ہے اور ایک حیوان۔" میں نے کہا "آپ کے اندر کا انسان ہی تو میرا محافظ ہے جس نے اس حیوان کو قید کر رکھا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ حیوان میرا کچھ بگاڑ سکے" میری باتوں کا بڑا عجیب اثر ہوا۔ محسن رونے لگا۔ کہنے لگا "گل! میں بہت برا آدمی ہوں۔ میں نے بہت پریشان کیا تھا تمہیں لیکن تم نے مجھے مرنے نہیں دیا۔ میں ضرور مر جاتا شملا کی موت کے بعد مگر تم نے اپنی زندگی مجھے دے دی۔ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور مجھے بچا لیا۔ تم نے مجھے چھوڑا تو پھر کوئی مجھے بچانے نہیں آئے گا۔" میں نے کہا "میں آپ کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟" محسن نے کہا "مجھے شملا نے چھوڑ دیا تھا۔ تمہارا کیا بھروسہ۔ وعدہ کرو کہ مجھے اکیلا نہیں چھوڑو گی۔ ہمیشہ میرے ساتھ رہو گی۔ اب تم ہی میرا سب کچھ ہو۔ میری زندگی' میرا احساس' میری آنکھیں' میرے ہاتھ' میری طاقت' سب تم ہو۔" میں نے وعدہ کیا اور اس کے بعد ایک بڑی خوش گوار تبدیلی آئی۔ محسن کہنے لگا کہ اب ہم لاہور میں اپنا گھر بسائیں گے۔ ایک گھر سکندر کا اور رابعہ کا ہوگا' ایک غالب کا اور نازو کا۔ کوئی چوہدری ہوا اور اور کوئی استاد پیڈرو ہے تو ہوا کرے۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ پھر وہ دن سکون سے گزر گئے۔ جانتے بوجھتے میں نے اکرام شیخ کی بات نہیں کی اور نہ تمہارا ذکر کیا لیکن میں نے لاہور فون کر کے وکیل صاحب سے بات کی تھی اور انہیں بتا دیا تھا کہ میں کراچی میں ہوں۔"

"یہ بھی بتا دیا تھا کہ ہوٹل میں کیا کر رہی ہو؟"

"ہاں۔ سب بتا دیا تھا اور منظر صاحب نے کہا کہ شاباش لڑکی۔ ڈٹی رہو مقابلے پر جب تک وہ انسان کا بچہ نہ بن جائے۔ آپ تو ان کی عادت جانتے ہیں۔ کہنے لگے.... اتنا کیا ہے تو ایک کام اور کرو۔"

میں نے کہا "ایسی کیا بات کہہ دی تھی اس نے؟ خاموش کیوں ہو؟"

گل نے شرما کے کہا "منہ پھٹ آدمی ہیں وہ۔ کہنے لگے اسے پکڑ کے لے جاؤ کسی قاضی کے پاس اور دو بول پڑھوا لو۔ وغیرہ سب مل جاتے ہیں ہی ہی۔ بس کسی طرح وہ تیر آجائے پھر ساری عمر تمہارا غلام۔ بندر کی طرح نچانا ساری زندگی تمہارے ہاتھ میں رہے گی ہمیشہ۔ اور بھی بہت سی باتیں کی تھیں۔ میں کیا بتاؤں۔"

میں نے ہنس کے کہا "مجھے معلوم ہے اس نے اور کیا کہا ہوگا۔ کہا ہوگا کہ شادی کے بعد ہر سال ایک بچہ ہو جائے۔"

گل نے کہا "بھائی سکندر! آپ تو مت کریں نا ایسی باتیں۔" اس وقت شرم سے منہ چھپا کے ہنستی ہوئی وہ مجھے ایسی لگی کہ میں یہ بھول گیا کہ اس وقت میرے سامنے گل ناگ سنی ہے اور یہ ڈاکوؤں کا ڈیرا ہے جہاں کچھ دیر پہلے نوعیت بالکل مختلف تھی۔

"یہ سب تو واقعی قابل تعریف ہے۔ تم نے وہ کام کیا جو کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے کہا "لیکن اس کے بعد حماقت' اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ جانے کا فیصلہ وارد؟"

"وہ بھی بتاتی ہوں۔ آپ ایک حادثہ سمجھ لیں اسے۔ میرے ذہن میں یہ خیال آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا" گل نے کہا۔ "تیسرے دن میں نے ڈرتے ڈرتے محسن سے کہا کہ ہمیں سکندر اور غالب کا بھی پتا کرنا چاہیے۔ اس کی ذہنی کیفیت بڑی عجیب تھی بھائی سکندر۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا کہ "وہ کہاں ہیں؟" میں نے کہا کہ "کیا تمہیں کچھ یاد نہیں ہے؟ ہم انہیں پیچھے چھوڑ آئے تھے" محسن بولا کہ "اچھا! تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔ اب وہ کہاں ملیں گے؟" میں نے کہا "انہوں نے ہم سے کہا تھا کہ اکرام شیخ سے مل لینا ورنہ لاہور چلے جانا۔ کیا پتا وہ پہنچ چکے ہوں اور اکرام شیخ کے گھر میں منتظر ہوں۔" محسن نے کہا "اکرام شیخ کہاں رہتا ہے؟" میں نے کہا "مجھے تو نہیں معلوم" اس نے کہا "مجھے بھی نہیں معلوم۔ چلو ہم لاہور چلتے ہیں۔ وہاں سب مل جائیں گے" میں نے اس کی بات مان لی اور ہم چار دن بعد لاہور جانے کے لیے ٹرین میں بیٹھ گئے۔ میں نے روانہ ہونے سے پہلے منظر کو بتانے کی کوشش کی مگر ان کا نمبر ہی نہیں ملا۔ ملتان سے ذرا آگے ٹرین کا حادثہ ہوا تھا۔ کوئی مال گاڑی پٹری سے اتر گئی تھی۔ اس سے ٹریک بند ہو گئی اور معلوم ہوا کہ صبح سے پہلے لائن کلیئر نہیں ہوگی۔ اس وقت رات کے سات بجے تھے۔ بہت سے مسافروں کی طرح میں نے سوچا کہ چار پانچ گھنٹے کا سفر ہی تو رہ گیا ہے۔ بس یہاں بیٹھ کے انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ "اتر کے سڑک تک چلتے ہیں اور بس پکڑ لیتے ہیں۔ جن کے پاس سامان کم تھا اور جوان تھے وہ ٹرین سے اتر کے روانہ بھی ہو چکے تھے۔ ہمارے پاس

ایک سوٹ کیس ہی تھا جو محسن نے اٹھا لیا اور ہم نے ٹرین چھوڑ دی۔ ٹریک سے جی ٹی روڈ دور نہیں لگتی تھی۔ میں گاڑیوں کی لائٹس دیکھ رہی تھی مگر جب پیدل چلنا پڑا تو کوئی دو میل کا فاصلہ تھا اور وہ بھی کچا اور ناہموار۔ ہم شاید رات دس بجے مین روڈ پر پہنچے۔ اس وقت تک ہم سے پہلے بہت مسافر ملتان کی طرف آنے والی گاڑیوں میں سوار ہو چکے تھے اور پھر بھی کافی سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے تھے۔ رات گیارہ بجے بالآخر ہمیں بھی ایک بس میں جگہ مل گئی۔ یہ ملتان سے روانہ ہونے والی بس تھی جس میں تھوڑے بہت مسافر ہی جاتے تھے مگر بعد میں خبر ملتان پہنچی تو ایک کمپنی نے اسپیشل سروس چلا دی۔ خالی بسیں سب کو سمیٹ کر لے گئیں۔ ہم جس بس میں تھے وہ تو آدھی خالی رہی۔ دو گھنٹے بعد اوکاڑہ سے پہلے ہی جنگل میں ڈاکوؤں نے بس کو روک لیا۔ وہ مسافر لگتے تھے مگر بس میں سوار ہوتے ہی انہوں نے ریوالور نکال لیے۔ ایک نے مسافروں کو سامنے سے کور کیا اور دوسرے نے پیچھے سے۔ تیسرے نے ڈرائیور کو مجبور کر دیا کہ بس کو ایک ویران سائیڈ روڈ پر موڑ لے۔ بس کنڈکٹر نے مزاحمت کی تو اسے ڈاکوؤں نے ریوالور کا بٹ مار کے بس کے اندر ہی لٹا دیا۔ مین روڈ سے ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر انہوں نے باری باری سب مسافروں کو اتارا اور ایک ایک کی تلاشی لی۔ ان کا سامان کھول کے دیکھا۔ عورتوں کے زیور اتروا لیے۔ اس وقت تک میں نے کسی کی شکل غور سے نہیں دیکھی تھی کیونکہ انہوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ جنگل میں جب انہوں نے ڈھاٹے اتارے تو مجھے وہ وقت یاد آیا تھا جب میں اپنے بھائی شیش ناگ کے ساتھ مل کر ڈاکے ڈالتی تھی۔ ہم نے کبھی کسی بس کے نہتے مسافروں کو نہیں لوٹا تھا۔ ہمارا نشانہ وہ ہوتے تھے جن کے پاس حرام کا پیسہ جمع ہو جاتا تھا اور جو غریبوں کا خون چوس کے رئیس بن جاتے تھے۔ ہم وہ پیسہ غریبوں میں تقسیم نہیں کرتے تھے مگر ایک بات ضرور تھی۔ ہمارے لوٹنے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا جو ہم سے بڑے لٹیرے تھے۔ نہ وہ غریب ہوتے تھے اور نہ ان کے گھر میں فاقہ کشی کی نوبت آتی تھی۔ نہ کسی کی بیٹی جہیز نہ جانے کے بعد گھر بیٹھتی تھی اور نہ کوئی مالی مشکلات میں مبتلا ہو کے خودکشی کرتا تھا۔ ان کی زمینیں' کارخانے' جائیدادیں اور بینک بیلنس سلامت رہتے تھے۔ اس بس کے مسافروں کی حالت دیکھ کے مجھے بہت افسوس ہو رہا تھا اور سچی بات یہ ہے بھائی سکندر کہ ایک تو آپ کو بہت یاد کیا میں نے اور ایک ذرا خود محسن بار بار کہتا رہا کہ اس وقت پستول ہوتا تو میں تینوں کو ختم کر دیتا اور ان کی لاشیں یہیں گاڑ کے ہم بس کو لاہور لے جاتے۔ جب میری باری آئی تو میں نے محسن سے کہا کہ خاموشی سے سب ان کے حوالے کر دو۔ خواہ مخواہ کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سمجھنے والے لوگ نہیں ہیں اور نہ شرمندہ ہونے والے۔ ہم نے اپنا سوٹ کیس ان کے حوالے کر دیا اور انہوں نے وہ ساری رقم نکال لی جو ہم اسپتال سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ وہ ہر مسافر کو لوٹنے کے بعد بس میں بھیج دیتے تھے جہاں ان کا ایک ساتھی موجود تھا۔ دوسرا نیچے کھڑے ہوئے مسافروں پر ریوالور تانے کھڑا تھا اور تیسرا مال جمع کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو اس کی صورت مجھے دیکھی ہوئی لگی۔ میں نے ذہن پر زور دیا اور ایک دم مجھے اس کا نام بھی یاد آگیا۔ میں نے کہا "تم خلیفہ گوجر ہو نا' تم شیش ناگ کے ساتھی تھے' کمینے نامراد۔" وہ اتنے زور سے اچھلا جیسے اسے چار سو میں وولٹ کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا اور ہکلا کے بولا "کون۔۔۔ تم کون ہو؟" ریوالور اس کے ہاتھ میں کانپنے لگا تھا۔ میں نے پلٹ کے دوسرے کو دیکھا اور کہا "ادھر آ تو ذرا میرے سامنے۔ میں دیکھوں تیری شکل بھی سؤر کی۔" اب میں کیا بتاؤں کہ گھبراہٹ سے ان کی حالت کتنی غیر تھی۔ یہ میری بہت بڑی غلطی تھی کہ میں نے ایک کو پہچانتے ہی فرض کر لیا کہ باقی بھی اسی گروہ کے لوگ ہوں گے جس کا سردار کبھی میرا بھائی تھا اور اس وقت خود میری حیثیت گروہ کے سردار سے کم نہیں تھی۔ بس میرا پارہ چڑھ گیا کہ جو کل تک میرے سامنے سر اٹھا کے بات نہیں کرتے تھے وہ آج مجھے لوٹ رہے ہیں۔ اس کا الٹا اثر بھی ہو سکتا تھا۔ وہ گھبراہٹ اور پریشانی میں مجھے گولی بھی مار سکتے تھے۔ ڈاکو تو ڈاکو ہی ہوتے ہیں۔ وہ کسی رشتے کا لحاظ نہیں کرتے اور اب تو رشتہ بھی پرانا ہو گیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خلیفہ گوجر بعد میں کسی اور ڈاکو کا ساتھی بن گیا ہو۔ خیر اس وقت تو اللہ نے بچا لیا۔ اتنی ہمت آگئی تھی مجھ میں کہ میں خلیفہ گوجر کو چھوڑ کے دوسرے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اسے بھی میں نے پہچان لیا "کمینے۔ تو لال دین پہوٹ ہے نا؟ شیش ناگ کی ناک میں دم کیا تھا' پلیس بھرتا تھا اس کی" محسن مجھے روکتا ہی رہ گیا کہ "یہ تم کیا کر رہی ہو۔ تم تو مجھے منع کر رہی تھیں کہ ان کے منہ مت لگنا" مگر میں نے کہا "تم خاموش رہو جی۔ میں ان نمک حراموں کو جانتی ہوں جو کل تک میرے تلوے چاٹتے تھے۔" لال دین پہوٹ نے مجھے فوراً پہچان لیا "آپ.... باجی! باجی آپ۔" اس کے منہ سے بدحواسی میں اور کچھ نہ نکلا۔ میں نے ایک ہاتھ مار کے اس کا ریوالور نیچے گرا دیا "باجی کے بچے.... آگے بول' نام یاد ہے میرا یا وہ بھی بھول گیا ہے۔ چلا مجھ پر گولی اگر ہمت ہے تو۔" بس اس کے بعد تو نقشہ ہی بدل گیا۔ خلیفہ گوجر اور لال دین پہوٹ دونوں ہی معافیاں مانگنے لگے اور برابر واسطے دینے لگے۔ ان کا تیسرا ساتھی نیا تھا۔ اس صورت حال پر وہ ناخوش تھا۔ اس نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ خلیفہ اور پہوٹ دونوں ہی اس پر چڑھ دوڑے۔ میں نہ روکتی تو شاید وہ اسے ختم کر دیتے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "آج عزت اور وضع داری ہوتی ہے ان ڈاکوؤں میں بھی؟"

"سب کا تو میں نہیں کہہ سکتی لیکن میرے بھائی شیش ناگ کا

www.paksociety.com

گروہ اس کا خاندان تھا۔ اس میں وہ باپ کی جگہ تھا۔ مجھے وہی عزت و احترام حاصل تھا جو ماں کو ملتا ہے۔ وہ سب شیش ناگ کے بیٹے تھے اور وہ ان کا خیال بھی بیٹوں کی طرح رکھتا تھا۔ یہ اسی کے سلوک اور تربیت کا نتیجہ تھا کہ خلیفہ اور پہلوٹ میرے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلے ہوتے تھے۔

مسافر اس صورت حال پر خوش بھی تھے اور حیران بھی۔ یہ سب کے لیے انتہائی ناقابل یقین بات تھی کہ ان کے ساتھ سفر کرنے والی ایک لڑکی نے جو صورت سے بھی شریف اور معزز نظر آتی تھی، ڈاکوؤں سے ہتھیار رکھوا لیے اور پھر سب کا مال واپس کروا دیا۔ سب مسافر بس میں سوار ہو گئے تو بس پھر لاہور کے لیے روانہ ہوئی۔ میں نے مسافروں سے کہا کہ "اب آپ لوگوں کو سب کچھ واپس مل گیا ہے۔ کسی نے لاہور جا کے پولیس کو رپورٹ کرنے کی کوشش کی یا اس معاملے کو اخبار والوں تک پہنچایا تو پھر نتائج کا ذمے دار وہ خود ہو گا۔ یہ ڈاکو نہ اسے چھوڑیں گے نہ اس کے خاندان والوں کو۔" ظاہر ہے اس کے بعد کسی کے دل میں یہ خیال تھا تو اس نے فوراً توبہ کر لی۔ تقریباً ایک گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد خلیفہ اور پہلوٹ نے اترنے کے لیے بس رکوائی تو میں بھی ان کے ساتھ ہی اتر گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب یہاں سے ان کا ٹھکانا قریب ہے۔ لاہور پہنچ کے کوئی پولیس چوکی پر یا بھرے بازار میں شور مچا دیتا کہ بس میں ڈاکو ہیں تو مشکل ہو جاتی۔ سب کے ساتھ ہم بھی پکڑے جاتے۔ [illegible] نہیں رہتے۔ خلیفہ اور پہلوٹ تو خود کو اور مجھے بچانے کے لیے سارا اسلحہ پھونک دیتے اور آخری وقت تک مقابلہ کرتے۔ بلاوجہ کشت و خون سے بچنے کے لیے میں وہاں اتر گئی۔ ان کا اصرار بھی تھا کہ ڈیرے پر چلو۔ بس روانہ ہو گئی تو ہم کچے راستے پر دائیں گئے۔ ایک جگہ درختوں کے پیچھے ان کی جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ صبح کا اجالا پھوٹ رہا تھا جب میں پھر وہاں پہنچی جو میرا گھر تھا۔ میرے ذہن میں گھر کا سب سے پہلا تصور اسی جگہ کا ہے جہاں میں اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔ گروہ کے دیگر ارکان بھی مجھے دیکھ کے بہت حیران ہوئے۔ وہاں حالات زیادہ تبدیل نہیں ہوئے تھے مگر میں بہت بدل گئی تھی۔ وہ سب مجھے یوں دیکھتے رہے جیسے میں آسمان سے اتری ہوئی مخلوق ہوں۔"

"انہوں نے محسن کے بارے میں نہیں پوچھا؟"

"پوچھا تھا۔" وہ تھوڑا سا شرمائی۔

"پھر کیا بتایا تم نے؟"

"وہی جو مجھے بتانا چاہیے تھا۔ ان سب کے لیے یہ انتہائی حیرت اور خوشی کی بات تھی کہ میں شریفانہ اور باعزت زندگی گزار رہی ہوں۔ گروہ کے دو پرانے ارکان مارے جا چکے تھے۔ ان کی جگہ دو نئے بندے آ گئے تھے۔ وہ سب آٹھ آدمی تھے اور آج کل ان کا سردار طافو من موجی تھا۔ اس کا نام تو لطیف تھا مگر سب طافو کہتے تھے۔ من موجی اس لیے کہ وہ شوقین مزاج آدمی تھا۔ گاتا بہت اچھا تھا اور چمٹا بھی بہت اچھا بجاتا تھا۔ بہت موڈ میں ہوتا تو ناچنے بھی لگتا تھا۔ کبھی ہم لمبا ہاتھ مار کے آتے تھے تو جشن ہوتا تھا۔ بکرا بھونا جاتا تھا اور شراب تو سب کا [illegible] پیتے سوائے طافو من موجی رات کو سب کے بیچ میں [illegible] الاپتے کے بول سناتا تھا اور رقص کرتا تھا۔ ایک خود فراموشی کی کیفیت میں۔ یوں کوئی اس سے لاکھ کہے کہ طافو یار [illegible] انکار کر دیتا تھا۔ اس کا موڈ بنتا تھا چودھویں کی رات کو جب چاند نکلتا تھا۔ ایک بڑی عجیب بات یہ تھی کہ جب وہ مستی میں گاتا تھا اور ناچتا تھا تو اس کے آنسو بہنے لگتے تھے۔ [illegible] اپنے آنسوؤں کا راز اس نے کبھی کسی کو نہیں بتایا لیکن [illegible] ضرور تھی۔ طافو من موجی نے گروہ کی قیادت سنبھالی تو [illegible] بڑا نڈر اور سفاک بھی تھا اور میرا بھائی شیش ناگ اسے [illegible] رکھتا تھا اور سمجھاتا بھی تھا کہ 'پتر لطیف' بندے کو [illegible] چاہیے۔ ہاں وہ دیوار بن جائے تو اسے بے شک گرا دو [illegible] دے تو چھوڑ دو۔ تو من موجی بھی ہے اور جلاد بھی ہے [illegible] اچھی بات نہیں ہے۔" عام خیال یہی تھا کہ وہ سردار [illegible] سخت گیر اور ظالم ہو گا۔ بلاوجہ خون بہائے گا مگر مجھے [illegible] من موجی تو شیش ناگ کی موت کے بعد بالکل بدل گیا ہے [illegible] اس نے گانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ چاندنی راتوں میں اکیلا [illegible] اور اداس بیٹھا رہتا تھا۔ کوئی گانے کی فرمائش کرے تو [illegible] لیکن اس کی جلاد صفت خون آشام فطرت بھی بدل گئی تھی [illegible] وہ دوسروں کو سفاکی اور بے رحمی سے روکتا تھا اور وہی کہتا تھا [illegible] استاد نے اسے ہمیشہ کہا تھا۔ بندے کو بندہ سمجھو۔ میں [illegible] کس طرح میرے گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ دن تو جشن کی [illegible] رہی اور ہماری اتنی خاطر تواضع ہوئی کہ محسن بھی حیران [illegible] کہتا تھا "کل یہ کیسے ڈاکو ہیں؟ ان کو دیکھ کر تو میرا بھی [illegible] کہ ڈاکو بن جاؤں۔" ایک رات وہ لاہور سے ناچنے والیاں [illegible] لائے تھے اور معلوم ہے یہ سب کیوں ہوا تھا؟ یہ میرے [illegible] ملنے کی خوشی کا جشن نہیں تھا۔ جشن تھا میری شادی کا [illegible] کہتا تھا کہ استاد شیش ناگ ہوتا تو کیا شادی ایسے ہی ہو جاتی [illegible] دور سے مہمان آتے تھے لیے کر۔ ہم تو بس اپنا دل خوش کر [illegible] ہیں۔"

میں نے کہا "یہ مہمان کون ہوتے؟"

"مہمان بھی ڈاکو ہوتے گرد و نواح کے۔" گل بانو نے [illegible] تو باقاعدہ جیجا جی بن گئے تھے اور ان کی طافو سے [illegible] دوستی ہو گئی تھی۔ تعارف تو میں کرا ہی چکی تھی کہ کون کیا ہے۔ محسن نے پہلے دن ہی رات کو فرمائش کر دی کہ استاد [illegible] دیکھو آج چودھویں کی رات ہے۔ کوئی گانا سناؤ۔ سنا ہے [illegible] بہت اچھا گاتے ہو اور ڈانس بھی کرتے ہو۔" میرا دل دھک سے [illegible] باقی سب بھی ایک دم خاموش ہو گئے۔ سب ڈر رہے تھے کہ [illegible]

من کی مستی پلید ہوئی۔ طافو کچھ دیر محسن کو گھورتا رہا پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر سختی کم ہونے لگی۔ اس نے پہلوٹ کی طرف دیکھا اور بولا "پہلوٹ! تجھے معلوم ہے نا میرا چمٹا کہاں رکھا ہے۔" اور پہلوٹ خوش ہو کے دوڑا۔ "ابھی لایا استاد جی۔" اس رات پھر ہم سب نے پرانے طافو من موجی کو دیکھا۔ اسی طرح گانے کے بول سناتے ہوئے، چمٹا بجاتے ہوئے، رقص کرتے ہوئے اور روتے ہوئے۔ اس نے میرا مان رکھ لیا تھا۔ جب وہ تھک گیا تو اس نے محسن کو سمجھایا۔ "اب یہ ساتھ لے جانا اور پھر کبھی نہ کہنا مجھ سے گانے کے لیے۔ آج تو یہ مُردہ تیرے کہنے پر زندہ ہو گیا تھا۔" طافو من موجی عمر میں میرے بھائی سے بھی بڑا تھا اور گروہ کے باقی سب ارکان کی طرح مجھے باجی نہیں کہتا تھا۔"

"تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارا اپنے قبیلے میں جو استقبال ہوا اور جس طرح انہوں نے تمہاری خانہ آبادی کا جشن کیا اس کے بعد تمہارے اندر یہ تبدیلی آئی" میں نے کہا۔

"کیسی تبدیلی؟"

"جس نے تمہیں ہم سے دور کر دیا اور تم نے اپنے ماضی سے رشتہ توڑ کے یہاں رک جانے کا فیصلہ کیا۔"

گل نے نفی میں سر ہلایا "ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اپنی خوشی سے یہاں نہیں رکی ہوئی ہوں۔ ایک مجبوری ہے۔"

"جذباتی مجبوری...؟"

"نہیں۔ میرے سب جذباتی رشتے آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔ میرا خیال تھا کہ تین دن بعد مجھے جانے کی اجازت مل جائے گی اور ان کی روایت کے مطابق یہ تحفے تحائف دے کر مجھے رخصت کریں گے لیکن تیسرے دن ایک اور بات ہوئی۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ بات ہو گی۔ جب تک شیش ناگ زندہ تھا، اس کے گروہ میں وہی انتظام تھا جو ایم آر ایس میں ہے۔ بس مقصد کا فرق ضرور ہے۔ ایم آر ایس مثبت قوت ہے اور یہ ڈاکو نہ شریف تھے اور نہ کوئی اچھا کام کرتے تھے۔ وہ سب مجرم تھے مگر ان کے درمیان برادرانہ داری تھی۔ میرا بھائی شیش ناگ ہر بار مال غنیمت تقسیم کرتا تو سب کے حصے برابر رکھتا تھا۔ سردار کی حیثیت سے وہ زیادہ لے سکتا تھا مگر اس نے کبھی نہیں لیا تھا۔ گروہ میں دو افراد شادی شدہ تھے۔ ان میں سے ایک مارا گیا تو اس کا حصہ باقاعدگی سے اس کے خاندان کو ملتا رہا۔ دراصل یہ ایک معاہدہ تھا جو انہوں نے آپس میں پہلے سے کر رکھا تھا۔ ہر ڈاکو اپنے حصے کے مال غنیمت کا ایک چوتھائی شیش ناگ کے حوالے کر دیتا تھا اور یہ مال سب کی امانت کے طور پر جمع ہوتا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے ایک چوتھائی حصہ بہت ہوتا ہے۔ گروہ سب اپنے مستقبل یا اپنے خاندان کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے یہ قربانی دیتے تھے۔ یہ ایک طرح کی انشورنس تھی یا پنشن اسکیم کہ جس کی بنیاد سرکاری قواعد و ضوابط پر نہیں، باہمی اعتماد پر تھا اور یہ سلسلہ بڑی کامیابی سے چل رہا تھا۔ ایک ڈاکو معذور ہو گیا تھا تو اسی جمع شدہ مال میں سے اس کو شہر میں دکان خرید کر دی گئی تھی اور اب سنا ہے وہ بہت بڑا بزنس مین بن گیا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ شیش ناگ یہ مال کہاں رکھتا ہے۔ مال غنیمت میں سونا چاندی بھی ہوتا تھا۔ ظاہر ہے اسے محفوظ رکھنا مشکل کام تھا چنانچہ اسے بیچ کر رقم حاصل کی جاتی تھی اور یہ لاکھوں کی رقم برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ خود مجھے معلوم نہیں تھا کہ بھائی نے رقم کسی بینک میں جمع کر رکھی ہے یا کہیں دفن کر رکھی ہے۔ اب طافو من موجی کہتا ہے کہ حالات بہت خراب ہیں۔ اس علاقے میں مسلسل وارداتوں کے باعث پولیس پر پبلک اور پریس کا بہت دباؤ ہے اور پولیس والوں کا کہنا ہے کہ ہم اپنی سرگرمیاں کسی اور علاقے میں جاری رکھیں۔ یہاں ان کی نوکری کا سوال ہے۔ بڑے افسر بدل گئے ہیں اور نئے افسر خاص طور پر اسی مقصد کے لئے بھیجے گئے ہیں کہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ کو باقی نہ رہنے دیں۔ وہ ایماندار اور فرض شناس مشہور ہیں اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ انہیں لامحدود اختیارات دیے گئے ہیں یعنی وہ چاہیں تو قانونی چکروں میں نہ پڑیں۔ پولیس مقابلے میں جسے چاہیں ختم کر دیں اور جسے چاہیں پکڑ کے لنگڑا لولا یا اندھا کر دیں تاکہ پھر وہ ڈاکو بھی نہ بن سکے۔ اس کے بعد قانونی کارروائی ہوتی رہے گی۔ ان باتوں سے ڈاکوؤں میں بڑا خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے اور بہت عرصے بعد انہوں نے ایک بس کو لوٹنے کی کوشش کی تھی تو اسے بھی میں نے ناکام بنا دیا۔ اب ڈاکو چاہتے ہیں کہ گروہ کے ارکان ایک دوسرے کو خدا حافظ کہیں اور منتشر ہو جائیں۔ جیل جانے یا حرام موت مرنے سے بہتر ہے کہ یہ دھندا چھوڑ دیں اور جس کا جو دل چاہے کرے۔ ان چاہے تو ڈاکے ڈالے یا کسی دوسرے گروہ میں شامل ہو جائے مگر ایک بار الگ ہو جانے کے بعد ان کا آپس میں کوئی رابطہ نہیں ہو گا۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ ایک کو پولیس پکڑے تو باقی سب لوگوں کے بارے میں پوچھ نہ اگلوا سکے۔ طافو من موجی نے مجھ سے کہا کہ وہ سب رقم جو شیش ناگ کے پاس تھی، دس بندوں آٹھ کے درمیان ہونی چاہیے۔ اس کی موت کے بعد کسی کو اس میں سے کچھ نہیں ملا۔ برابر تقسیم کی جائے تو ہر ایک کو دو دو لاکھ مل جائیں گے۔ کچھ اور بھی جمع کر لیا ہے سب نے۔ امید ہے جو عقل سے کام لے گا اس کو پریشانی نہیں ہو گی۔" میں نے کہا کہ میں تو اپنا حصہ چھوڑتی ہوں۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اس نے کہا کہ تمہاری مرضی مگر وہ رقم ہے کہاں؟" میں نے کہا "یہ تو مجھے نہیں معلوم" طافو نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ اس نے کہا "تم شیش ناگ کی بہن تھیں۔ گروہ میں اس کے بعد تمہاری حیثیت تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہیں پتا نہ ہو۔" اس مسئلے پر طافو سے میری متعدد بار گفتگو ہوئی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ رقم کسی بینک میں ہوئی تو اسے حاصل کرنا بہت مشکل ہو گا۔ بینک والے قانونی وارثوں کے علاوہ کسی کو حقدار تسلیم نہیں کرتے اور اس کے لیے وراثت کا سرٹیفکیٹ عدالت

www.paksociety.com

دیتی ہے۔" طافو نے کہا کہ ہر صورت میں یہ تمہاری ذمے داری ہے۔ تم شیش ناگ کی حقیقی بہن ہو' اس کی واحد وارث ہو۔ عدالت میں جانا ہے تو جاؤ۔ خود کو حقدار ثابت کرو اور پھر ہمارا حق ہمیں ادا کرو۔" میں نے کہا کہ تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ عدالت میں ثبوت گواہ پیش کرنے پڑتے ہیں۔ میں کس بنیاد پر اس رقم کا دعویٰ کروں کہ میرے ڈاکو بھائی کی جمع پونجی میرے حوالے کی جائے۔ میں تو خود گرفتار کرلی جاؤں گی۔" طافو نے کہا کہ شیش ناگ بے وقوف نہیں تھا کہ رقم بینک میں رکھتا۔ اسے معلوم ہوگا کہ کسی دن اچانک کوئی گولی اس کے نام کی آئی تو بینک کا سارا کھاتا دھرا رہ جائے گا۔ کوئی اور چیک نہیں کاٹ سکے گا اور نہ رقم حاصل کر سکے گا۔ اس نے وہ نقد رقم کہیں محفوظ مقام پر جمع کی تھی۔ اس مدفون خزانے کے بارے میں وہ خود جانتا تھا لیکن اس نے تمہیں بھی ضرور بتایا ہوگا تاکہ اچانک اسے کچھ ہو جائے تو دوسروں کی امانت کو کچھ نہ ہو۔" میں نے ہر طرح سے اس کو یقین دلایا مگر وہ نہیں مانا اور میں جان چکی ہوں کہ وہ بڑا سفاک ڈاکو ہے۔ اب وہ مجھے کھلی دھمکی دے رہا ہے کہ ایسے کام نہیں چلے گا گل بانو۔ تم تو بن گئی ہو شریف زادی مگر ہمیں بھی تو جینے کا حق ہے۔ ہم بھی شریفانہ زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے ہیں تو تم چاہتی ہو کہ ہمارا حق بھی نہ ملے اور ہم پولیس مقابلوں میں مارے جائیں۔" اب صورتِ حال یہ ہے کہ میں اور محسن یہاں قید ہیں۔ طافو من موجی نے مجھے ایک ہفتے کی مہلت دی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ تم خود کر سکتی ہو۔" اس نے مجھے بتادیا تھا۔

میں گل بانو کی بات سمجھ رہا تھا اور اس کی مجبوری کا عذاب میرے لیے باعثِ تشویش ہو رہا تھا "اگر یہ بات تھی تو تم نے ہمیں پیغام کیوں نہیں بھیجا؟ ہم کسی طرح بھی چودہ پندرہ لاکھ کی رقم فراہم کر دیتے۔"

"مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔"

"تم منظر کو فون کر سکتی تھیں" میں نے کہا "خود اس سے مل کے اسے ساری بات بتا سکتی تھیں۔"

"میں نے طافو سے کہا تھا کہ مجھے وکیل سے بات کرنے دو۔ اگر رقم کسی بینک میں ہے تو کس بینک میں ہے اور کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ مسئلہ کسی وکیل کی مدد کے بغیر حل نہیں ہوگا لیکن وکیل کے نام سے طافو ڈرتا ہے۔ اسے یہ بھی یقین ہے کہ رقم بینک میں نہیں ہو سکتی۔ [illegible] کہیں موجود ہے اور اس جگہ کی نشاندہی میں ہی کر سکتی ہوں۔ [illegible] چالاکی سے کام لیتے ہوئے میں نے طافو سے کہا کہ [illegible] خواہ کہیں سے بھی [illegible] میرے شوہر کے بڑے بھائی صنعت کار ہیں لیکن بھائیوں کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ [illegible] ہے کہ وہ محسن کے کسی دوست کو بلا [illegible] رقم فراہم کردے۔ میں نے اور محسن نے مل کے یہ [illegible]

دلاور سے استاد پیڈرو کی رہائی کا معاوضہ پندرہ لاکھ طلب [illegible] مگر استاد پیڈرو نے کچھ اور ہی کہانی سنائی۔ اس نے بتایا کہ [illegible] اور چودھری دلاور کے درمیان شدید قسم کے اختلافات [illegible] ایک [illegible] رہے گا۔ ممکن ہے ایک لاکھ دے اور [illegible] کو مارنے کہیں [illegible] کردو تو میری طرف سے انعام۔ استاد پیڈرو [illegible] ہی تمہارے بارے میں اطلاع فراہم کی کہ تم آج کل [illegible] محسن کے ساتھ یہ ڈاکو اکبر خان کے گھر کا محاصرہ کر چکے تھے۔ وہاں ٹیگر شاہ کے مرید قتل تو ہوئے۔ باقی تم جانتے ہو۔"

"وہ... وہ محسن ہی تھا؟"

گل مسکرائی "ہاں۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارا [illegible] کیا بات ہوئی تھی۔"

"غالب اور نازو کیسے فرار ہوگئے؟"

"انہیں محسن نے موقع فراہم کیا تھا۔ اس نے کہا [illegible] پکڑے کو اٹھالائے ہو۔ ان کو دفع کرو۔ ڈاکوؤں نے [illegible] میں ہی اتار دیا۔ وہ لاہور پہنچ چکے ہوں گے۔"

"کیا محسن نے انہیں کچھ بتایا تھا؟"

"محسن نے ایک رقعہ انہیں تھمادیا تھا۔ اس میں مختصر [illegible] لکھ دیا تھا اور مجھے امید ہے اب باقی معاملات کو غالب اور [illegible] سنبھال لیں گے۔" گل نے کہا "وہ قانونی کارروائی کریں [illegible] پیسہ فراہم کریں گے..."

"تمہیں کیوں اغوا کیا تھا تم نے؟"

"مقصد یہ نہیں تھا کہ تمہیں اغوا کیا جائے۔ محسن تم [illegible] اور تمہیں سارے حالات بتاتا لیکن اکبر خان کی [illegible] ہونے سے پہلے ہی ٹیکروں سے واسطہ پڑگیا۔ طافو کو ہم نے [illegible] تھا کہ ہمارے دوست سکندر تمہارا مسئلہ حل کردیں گے۔"

"مسئلہ حل کرنے کے لیے غالب اور نازو بھی ساتھ [illegible] اچھا تھا" میں نے کہا "خیر۔ ایک سے دو بھلے۔ ہم [illegible] نمٹ لیں گے من موجی سے بھی۔"

"وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"ہم کیا کم خطرناک ہیں" میں نے کہا "ہر آدمی کی فطرت [illegible] دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ وہ من موجی بھی ہوتا ہے اور [illegible] بھی۔ طافو من موجی کی اچھائی تم نے دیکھ لی اب [illegible] آیا ہے تو ہم بھی سامنے آگئے ہیں۔"

ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور دیو [illegible] والا اندر آگیا "اچھا ہوا جو تم سامنے آگئے۔ میں [illegible] بے تاب تھی۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ تم [illegible] تمہاری فطرت بھی بدل گئی ہوگی..."

اس خونخوار شخص کے ہاتھ میں روسی مشین گن [illegible] خان کی کوٹھی کی چھت پر لیے بیٹھا تھا۔

اس کے عقب میں استاد پیڈرو کا مکروہ چہرہ تھا [illegible] وہی پرانی پُرخباثت مسکراہٹ تھی۔

طافو من موجی چالیس سال کا یا اس سے بھی زیادہ عمر کا [illegible] اس کی صورت کے نقوش سے نرمی ٹپکتی تھی [illegible] حالات نے اس کے جسم کو چٹری کی طرح سخت کردیا تھا۔ شاید اس من موجی کو بھی چٹری کی طرح کردیا تھا جو اپنے [illegible] کے بولوں میں رہے [illegible] معصوم محبت کے گداز سے بھرپور گیت گاتا تھا تو خود اپنی ہی [illegible] کے موڑ میں ڈوب جاتا تھا اور جذبات کی لے پر رقص کرتے [illegible] اس کی مدہم کا تمام کرب آنکھوں سے اشک بن کر بہہ [illegible] گیا تھا۔ اس کی حقیقت کو بھی کوئی نہ جان سکا تھا۔ [illegible] ایک گروہ کی قیادت سنبھالنے کے بعد اس نے کوشش [illegible] کہ طافو کے اندر خوابیدہ من موجی کو قتل کردے لیکن من موجی بڑا سخت جان ثابت ہوا تھا۔ وہ زندہ رہا تھا اور ناوانستگی میں محسن نے اسے پکارا تھا تو وہ اپنے مدفن سے اٹھ کے باہر آگیا تھا۔ مجھے یقین ہے اور یہ میرا ایمان ہے کہ دنیا کے بدترین مجرم کے وجود میں بھی ایک معصوم فرشتہ اور ایک محبت سے بھرپور دل رکھنے والا من موجی ہر حال میں زندہ رہتا ہے۔ وہ دب جاتا ہے' چھپ جاتا ہے' مغلوب ہو جاتا ہے مگر مرتا کبھی نہیں۔

طافو ایک پیشہ ور ڈاکو تھا اور مشہور تھا کہ وہ سفاک اور بے رحم ہے۔ شاید خون آشامی اور بے رحمی اس کی فطرت کے بنیادی اجزا نہیں تھے مگر بعد میں دنیا کے تجربات اور حوادث نے اس کی شخصیت کو یوں مسخ کرکے قابلِ نفرت بنا دیا تھا۔ جیسے غلاظت کے چھینٹے کسی تصویر کے ہر رنگ پر غالب آکے حسن کو بدصورتی کے احساس میں بدل دیں۔ نہ کسی کو ضرورت تھی اور نہ یہ فرصت کہ [illegible] غلاظت کی گرد کے پیچھے دب جانے والے زندگی کے اصل رنگوں کی [illegible] سوچے کیونکہ طافو اب صرف ایک ڈاکو تھا۔

میں اور گل اپنی باتوں میں اتنے محو ہوگئے تھے کہ ہمیں نہ وقت کے گزرنے کا احساس رہا تھا نہ یہ خیال کہ کوئی چھپ کے ہماری گفتگو سن رہا ہوگا۔ دروازہ بھی پوری طرح بند نہیں تھا۔ طافو نہ جانے کب سے باہر کان لگائے کھڑا تھا مگر ہمیں معلوم نہ تھا۔ باہر [illegible] دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ سورج طلوع ہوئے ایک گھنٹا تو ہو گیا [illegible]

طافو سخت مشتعل نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے کی لکیریں گہری ہوگئی تھیں اور وہ اپنی لال آنکھوں سے مجھے پلک جھپکائے بغیر گھور رہا تھا۔ اس کے برعکس پیڈرو خوش اور مطمئن نظر آتا تھا۔ اس نے جب مجھے غالب سے ملوایا تھا تو اس جنگ میں پہلی اخلاقی فتح [illegible] کی تھی پھر اپنی مظلوم اور حالات کی گردش سے پامال ہونے والی زندگی کی کہانی سنا کے اس نے مزید اخلاقی ہمدردی حاصل کرلی تھی اور اسے اپنا بدترین دشمن سمجھنے کے باوجود میں [illegible] کہ اسے شک کا فائدہ دیتے ہوئے اسی طرح چھوڑ دیا [illegible] جیسے عدالت کسی قتل کے مجرم کو ضمانت پر رہا کرتی ہے۔ [illegible] نے ہمارا پتا معلوم کرنے کے لیے اغوا کیا تھا اور اس نے ہمارے بارے میں صحیح اطلاع فراہم کرکے گل کی حمایت بھی حاصل کرلی تھی۔ اخلاقی طور پر ہمارے دیرینہ جذبۂ عداوت کے خلاف جنگ میں یہ اس کی تیسری فتح تھی اور اس حقیقت کو تسلیم کیے بنا چارہ نہ تھا کہ ایم آر ایس کی منتشر ہو جانے والی قوت کو پھر سے یکجا کرنے والا وہی شکاری تھا جس کے خلاف ایم آر ایس نے روزِ اول سے اعلانِ جہاد کر رکھا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے شر کی تمام قوتوں کے خلاف انبیاء و اولیاء سے آج تک نیکی کے تمام علمبرداروں نے اپنی جنگ کو ایک مقدس فریضہ سمجھتے ہوئے مسلسل جاری رکھا۔

یہ قدرت کی ایک اور ستم ظریفی تھی کہ جس شکاری کو ہم نے مادی وسائل میں برتری کے باوجود ہر محاذ پر شکست کی ذلت سے دوچار کیا تھا' وہی آج احسانات اور خیرسگالی کے جذبات سے ہمارے خلاف مسلسل اخلاقی فتوحات حاصل کر رہا تھا۔ ماضی کے حقائق کتنے ہی تلخ سہی اور یادوں کے مندمل ہو جانے والے زخموں کے نشان کتنے ہی بدنما سہی۔ بظاہر حالات خود ہمارے لیے حوصلہ شکن تھے اور پیڈرو کے خلاف عداوت و انتقام کے جذبات کو اسی شدت کے ساتھ زندہ رکھنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے اس نے مجھے اور رابعہ کو خاصی مشکلات پر قابو پا کے اور بظاہر خطرات مول لے کر ملوایا تھا۔ ایسے وقت میں جب ہم اپنی کوشش میں ناکام ہو کے ملاقات کی امید کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ چکے تھے۔ اس نے ہمیں گل اور محسن تک پہنچانے میں بھی بھرپور معاونت کی تھی اور یہ ماننا پڑتا تھا کہ اس کی مدد کے بغیر یہ ملاقات بھی اس وقت تک ممکن نہ ہوتی جب تک تقدیر اس کے لیے سازگار حالات فراہم نہ کرتی۔ ایسی صورت میں یہ سوچنا بھی عجیب لگتا تھا کہ ہم سب مل کے پھر اس شخص کے خلاف متحد ہو جائیں اور اس کو عبرتناک سزائے موت دینا اپنے لیے مقصدِ حیات بنالیں جس نے ہم سب بچھڑے ہوئے ریگستانِ حیات کو اپنی کوشش سے یکجا کیا تھا۔ اس کے پس پردہ عوامل کچھ بھی ہوں' ممکن ہے اس طرح وہ اپنی مجرمانہ غلطیوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہو۔ ممکن ہے وہ سزا کے ناقابلِ تنسیخ فیصلے میں رعایت کی امید رکھتا ہو' ممکن ہے وہ ہمارے جذبات کا رخ ایک مشترکہ دشمن چودھری دلاور کی طرف موڑنا چاہتا ہو اور یہ بھی اب بعید از امکان نہیں رہا تھا کہ وہ ہماری بنیادی غلط فہمی رفع کرنا چاہتا ہو کہ وزیر خان کا قاتل وہ بھی نہ تھا مگر اصل قاتلوں نے واقعاتی شہادت کو موڑ کے اس پر قاتل کا لیبل لگا دیا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو' قانون کی نظر میں وہ مجرم بھی رعایت کا مستحق ہو جاتا ہے جو اعتراف کرنے کے بعد قانون کی معاونت کرے اور صلے میں اس کی سزا معاف ہو جائے۔ موجودہ حالات اور درپیش حقائق کو دیکھتے ہوئے رابعہ' نازو یا گل' غالب اور محسن میں سے کوئی بھی مجھ سے اتفاق نہ کرتا کہ استاد پیڈرو اپنے تمام جرائم کی سنگینی کے باوجود کسی رعایت کا استحقاق نہیں رکھتا۔ اس کا مقصد

www.paksociety.com

کچھ بھی ہو گیا اس نے ہمیں اس لیے تہہ خانے میں بلوایا تھا کہ ہم ایک فائرنگ اسکواڈ بن کے اسے ہدف پر رکھ لیں اور کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟

اس وقت میرے سامنے وہی شخص تھا جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ میرے والد وزیر خان کو ایک پُر اذیت، پُر عذاب موت دینے والا وہی تھا۔ یہی نہیں، بعد از مرگ اپنے ابدی مدفن سے محروم کر کے ان کی ہڈیوں کو کسی گمنام گڑھے میں دبانے کا گھناؤنا جرم بھی اسی سے منسوب تھا۔ آج تک میری دلی آرزو تھی کہ میں اس سے بدترین انتقام لوں اور اسے ایک عبرتناک موت کے رسوا کن انجام تک پہنچا دوں لیکن اب میرے یقین کی ٹھوس بنیاد میں شک کی دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ میں خود سے یہ سوال کرنے لگا تھا کہ کیا میرے یقین کو بنیاد فراہم کرنے والے حقائق وہی تھے جو ویسے ہی تھے جیسے کسی ثبوت کی عدم موجودگی میں مجھے نظر آئے تھے اور محسوس ہوئے تھے یا شاید اب میرے جذبات کی نوعیت بدلنے لگی تھی۔ میں یہ بھی سوچنے لگا تھا کہ انتقام لینے والا زیادہ بہادر ہوتا ہے یا عفو و درگزر سے کام لینے والا اور فیصلے کو عرصۂ محشر کی عدالت انصاف پر چھوڑ دینے والا؟

پیڈرو کی مسکراہٹ سے بھی کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ ہماری بے بسی پر مسکرا رہا ہے یا اپنی کامیابی پر۔ گل نے اسے ایک مجرم کی حیثیت سے طلب کیا تھا اور شاید اس کا خیال ہوگا کہ وہ پیڈرو سے تشدد کے ذریعے معلومات حاصل کرے گی مگر خلاف توقع پیڈرو نے اسے بتایا کہ وہ اب دشمن نہیں، دوست ہے۔ اس نے سکندر، غالب، رابعہ اور نازو کو ہزار خطرات مول لے کر بلوایا اور وہ گل اور محسن کو بھی وہاں پہنچا سکتا ہے جہاں ان کے باقی چار یار انہی کی طرح منتظر ہیں کہ دست قدرت راہ نما ہو تو بچھڑے ہوئے پھر مل جائیں۔ اچھا ہوا جو گل نے خود پیڈرو کو بلوا لیا ورنہ سب ایک دوسرے کو ڈھونڈتے رہ جاتے۔ پھر اس نے گل اور محسن کو ملاقات کی راہ میں حائل سب دشواریوں سے آگاہ کیا ہوگا اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد حصول مقصد میں ہر قدم پر ان کی راہنمائی کی ہوگی۔ محسن اور گل اس کے کتنے ممنون ہوں گے۔

گل اچانک طافو کے آجانے سے تھوڑی سی نروس ہو گئی تھی۔ پھر شاید اسے خیال آیا کہ یہاں اس کی حیثیت کیا ہے۔ وہ نہ مجرم تھی اور نہ قیدی۔ وہ اس قبیلے کے سردار کی بہن تھی اور قبیلہ اس کے لیے آج بھی وہی جذبات رکھتا تھا جو پہلے۔

اس نے طافو کی بات میں چھپی ہوئی دھمکی کو نظرانداز کر دیا۔ "یہ کوئی اچھی حرکت نہیں کہ تم نے طافو۔۔۔ چھپ کے باتیں سنتا۔۔۔"

"ہم اچھے لوگ نہیں ہیں ناگ منی۔" طافو نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ہم آج بھی برے ہیں کل کی طرح۔ بس تم اچھی بن گئی ہو ان اچھے لوگوں میں رہ کے۔"

میں آگے بڑھا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم ہی طافو [illegible]"

اس نے ایک قدم پیچھے ہٹا لیا۔ "سب تو تمہارا دیا ہے [illegible] منی نے ٹھیک کی اب کون سی بات رہ گئی ہے؟"

میں نے کہا۔ "پھر بھی ہم ملے تو تمہیں مجھے [illegible] صورت دیکھی ہوگی۔ میں نے تو پہلی بار دیکھا ہے تمہیں [illegible]"

گل نے کہا۔ "آخر اس طرح بندوق لے کر اندر [illegible] کیا مطلب ہے طافو؟ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟"

"ہاں۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔" طافو نے [illegible] کہا۔

"اور تمہارا خیال ہے کہ وہ حد آ گئی ہے؟" میں نے [illegible]

"تم مت بولو بیچ میں۔" طافو نے بندوق کا رخ [illegible] کر دیا۔

میں مطمئن اور پُرسکون کھڑا رہا۔ "ورنہ تم گولی مار [illegible] مجھے؟"

گل نے نفرت سے کہا۔ "بڑی اچھی روایت قائم کی [illegible] طافو! نمک حرامی کی۔ شیش ناگ جسے تم اپنا باپ کہتے تھے [illegible]"

"شیش ناگ مر چکا ہے۔"

"اور اس کے بعد تم شیش ناگ کے جانشین بن [illegible] لیے کہ اس کے سارے خاندان کو ختم کر دو۔ کیا ہم [illegible] سب ایک خاندان نہیں سمجھتے تھے خود کو؟ آج وہ سب [illegible] منی ہو گئے ہیں تمہارے لیے؟ تمہارے جذبات بدل گئے [illegible]" ناگ منی پھنکارتے ہوئے بولی۔

"سب کچھ بدل گیا ہے ناگ منی۔ بھول جا [illegible] سارے رشتے ضرورت کے رشتے تھے۔ آج تمہاری ضرورت [illegible] ہے مگر ہماری ضرورت وہی ہے۔ ہم کیا کریں؟" طافو نے [illegible] میں کہا۔

میں نے کہا۔ "تم صرف اپنی بات کر رہے ہو یا [illegible] ترجمان بن کر آئے ہو؟"

گل نے نفرت سے کہا۔ "باقی سب آج بھی میرے اشارے [illegible] تمہاری تکا بوٹی کر دیں گے طافو۔"

طافو حقارت سے مسکرایا۔ "باقی سب تیرے [illegible] ناگ منی۔ نہ پہلے تھے۔ [illegible] ملے تو وہ بھی [illegible] لے۔ وہ پیسہ ہی تھا جس نے شیش ناگ کے خاندان [illegible] زنجیر میں باندھ رکھا تھا اور کچھ نہیں۔ [illegible] اور وہ کوئی خیرات [illegible] تھا کسی کو۔ خود کما کے ان کے پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ یہ سب [illegible] طاقت تھے۔ اپنی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے جاتے تھے [illegible] ڈال کے جو مال لاتے تھے وہ ان کا حق تھا۔ زور بازو کی [illegible] اس میں سے ہم سب نے تھوڑا تھوڑا شیش ناگ کے [illegible] تھا۔ وہ سردار تھا۔ ہم اعتبار کرتے تھے اس پر۔ [illegible] برا وقت آیا یا ضرورت پڑی تو ہمارا جمع کیا ہوا [illegible] تو جو ادا کر رہی ہے ہم سب کے اعتماد کو۔ کیا برائی کی تھی آخر ہم نے شیش ناگ کے ساتھ یا تیرے ساتھ؟ بول کیوں ہمارا حق [illegible] غصب کرنا چاہتی ہے تو؟"

"[illegible] وہ سب میرے پاس نہیں۔"

"مجھے بے وقوف مت بنا۔ میں سب کو جمع کر لیتا ہوں۔ انہیں بتا کے [illegible] تیری بات؟" طافو نے کہا۔ "ابھی نہیں۔ ان [illegible] گرم کرے گی تو وہ سب رشتے بھول جائیں گے ناگ منی۔ یہ [illegible] جنہوں نے تجھے اور تیرے گھر والے کو اتنی عزت دی، اتنی [illegible] مدارات کی۔ یہی تیری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔ اسی لیے میں سمجھا رہا ہوں تجھے کہ بات بگڑنے سے پہلے اپنی جان اور اپنا سامان بچا کے چلی جا یہاں سے۔"

"[illegible] میری جان کو؟ کس کی ہمت ہے کہ میری جان کو ہاتھ لگائے؟" گل نے چیخ کے کہا۔ "بلا لے سب کو طافو۔ میں چاہتی ہوں آج یہ فیصلہ بھی ہو جائے۔"

"تیرا ساتھ نہیں دیں گے ناگ منی۔ آزما لے۔"

"ہاں میں آزمانا چاہتی ہوں۔ یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ انسان [illegible]"

طافو نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ڈاکو ہیں وہ ناگ منی۔ تو شریف زادی بن گئی ہے مگر ان کی زندگی تو وہی ہے۔ کتے کی زندگی۔ وہ اس مالک کے وفادار رہتے ہیں جو انہیں کھانے کو دے۔ اسی کے پیچھے دم ہلاتے ہیں جو مالک ہو۔ اسی سے ڈرتے ہیں جو طاقتور ہو۔"

پیڈرو ابھی تک پیچھے کھڑا ہوا تھا اور اس کا رویہ قطعی بے نیازی کا تھا۔ وہ اس صورت حال سے لاتعلق نظر آتا تھا اور یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ تم جانو، تمہارا کام۔ نہ میں کسی کا دوست نہ دشمن۔ ویسے جس کا جو دل چاہے سمجھے۔

اچانک اس نے پیچھے سے طافو کی بندوق پر ہاتھ ڈال دیا۔ "چھوڑو یار، اس بحث میں پڑ گئے۔"

طافو کی بندوق کا رخ نیچے ہو گیا۔ "تمہاری تو۔۔۔"

پیڈرو نے گالی کو نظرانداز کر دیا۔ "کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔ دس بیس لاکھ کا معاملہ ہے نا۔"

"تمہیں کیا تمہارا باپ دے گا؟" طافو بگڑ کر بولا۔

"کوئی بھی دے سکتا ہے۔ باپ، چچا، تایا۔ اس کے لیے بندوق کی زبان میں بات کرنا ضروری نہیں۔" پیڈرو مشتعل ہوئے بغیر بولا۔ "میں نے بتایا تھا تمہیں کہ یہ سکندر کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ تم پیچھے کھو گے مل جائیں گے مگر ایسے نہیں۔"

پیڈرو کی حرکت نے پھر مجھے ششدر کر دیا تھا۔ "ہاں، ایسے تم کو کچھ نہیں ملے گا طافو۔ سوائے عبرت ناک سزا کے۔ تم یہ سمجھ لو کہ میں پرانے شیش ناگ کا نیا روپ ہوں۔ مجھ سے جسارت کی ہمت ہے جس میں وہ مقابلہ کر کے دیکھ لے۔ ایسے کھلونوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں میں طافو۔"

طافو نخوت سے مسکرایا۔ "جب تک اس کھلونے کا رخ تمہاری طرف تھا، تمہاری آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اب اچانک تم بہادر بن گئے ہو۔"

یہ ایک چیلنج تھا مگر میں غصے کو پی گیا۔ "وقت آنے پر اس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا طافو۔ تم اس اسلحے کے ساتھ آ جانا، میں خالی ہاتھ تم سے لڑوں گا مگر اس شرط پر کہ ہارنے والا رعایت نہیں مانگے گا اور نہ معافی۔"

"مجھے منظور ہے۔" اس نے طنزیہ، تلخ لہجے میں کہا۔ "کل معلوم ہو جائے گا کہ تم شیش ناگ کا نیا روپ ہو یا اس کی کینچلی بدل لینے والی بہن کے کمزور سہارے پر اکڑنے والے کینچوے۔ طافو من سوکی کی طاقت کا بھی غلط اندازہ کیا تو نے ناگ منی اور اس کی شرافت کا بھی۔"

وہ ایک دم پلٹا اور دروازے سے نکل گیا۔ اس کی بات ایک ایسی گالی تھی جسے برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا ہی تھا کہ گل نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"چھوڑو۔ جانے دو اسے بھائی سکندر۔"

استاد پیڈرو معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔ "ویسے بھی وہ ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔ زخمی سانپ بل میں گھس گیا ہے۔"

"میں اسے بھی باہر نکال سکتا ہوں۔" میں نے گل سے بازو چھڑایا اور باہر نکل کے دیکھا مگر طافو کہیں نہ تھا۔

میں ایک برآمدے میں کھڑا تھا جو انگریزی کے حرف ایل کی شکل میں دائیں جانب بھی پھیلا ہوا تھا۔ برآمدوں میں دو ہی کمرے نظر آ رہے تھے اور اس کی ساخت پرانے ڈاک بنگلوں جیسی تھی۔ دیواروں کی خستہ حالی کہتی تھی کہ عمارت کا ذاتی وارث اور دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ شاید کسی نئے ریسٹ ہاؤس کی تعمیر کے بعد رفتہ رفتہ پرانے ڈاک بنگلے کو بھوت بنگلہ مشہور کر دیا ہوگا۔ ناجائز قابضین عموماً پرانے مجرم ہوتے ہیں جو اپنی لاقانونیت کی سلطنت میں کہیں اپنا دائرہ اختیار بھی رکھتے ہیں۔ کوئی ایسا ٹھکانہ جہاں عام آدمی کا گزر نہ ہو اور جسے وہ پناہ گاہ کے طور پر استعمال کر سکیں۔ گودام بنا لیں یا سب کے رہنے اور آرام کرنے کی جگہ۔ اب یہاں شیش ناگ ڈاکو کے گروہ کا ڈیرا تھا اور گل کی بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایک مدت سے انہوں نے اپنا ٹھکانہ نہیں بدلا تھا۔

اونچی پختہ چھت والے کمروں کے سامنے نیچی کھپریل کی چھت کا برآمدہ تھا اور اس کو سہارا دینے والے لکڑی کے سال خوردہ شہتیر بے رنگ ہو چکے تھے مگر ان کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔ برآمدے کی دیوار کے ساتھ ساتھ پرانی اینٹوں کی سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں۔ چار کمروں پر مشتمل ڈاک بنگلے کی عمارت کے گرد پکی اینٹوں کی چار دیواری ہوگی جو اب آثار قدیمہ کی طرح ختم ہو رہی تھی۔ شاید ضرورت مند اس کی اینٹوں کو اکھاڑ کر لے جا رہے تھے

www.paksociety.com

اور یہ عمل ہنوز جاری تھا۔ پھاٹک کی جگہ ایک خلا رہ گیا تھا لیکن اس کی نشاندہی وہ ستون کرتے تھے جن پر پہلے گیٹ نصب ہوں گے۔ احاطے کے وسط میں اگر باغ یا لان تھا تو اب صرف اس کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ لان میں خشک گھاس اور خودرو پودوں کی جھاڑیاں تھیں اور ان پر گھنے درخت سایہ فگن تھے۔ ان درختوں نے کافی حد تک ڈاک بنگلے کی عمارت کو چھپا لیا تھا۔

گل نے میرے پیچھے آ کے کہا۔ "وہ باہر نکل گیا ہوگا۔"

میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ "یہ کیا جگہ ہے گل؟ میرا مطلب ہے ہم کہاں ہیں اس وقت؟"

"لاہور یہاں سے چالیس میل ہے۔" گل نے کہا۔ "یہ شکستہ انبار کا پرانا ڈاک بنگلا ہے۔ قریب ترین گاؤں بھی یہاں سے ایک میل دور تھا۔"

"تھا۔ یعنی اب نہیں ہے؟"

"نہیں۔ اس گاؤں کے لوگ خوف سے گھر چھوڑ گئے تھے۔"

"خوف کس کا تھا؟ شیش ناگ کا؟"

گل مسکرائی۔ "نہیں۔ ڈاک بنگلے میں بھوت تھے جو رات کو جنگل میں گھومتے تھے، گاؤں میں پہنچ جاتے تھے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "وہ بھوت رات کے وقت اکیلے مسافروں کو ڈراتے ہوں گے، دن میں اکا دکا نظر آنے والی جوان عورت کو اٹھا لیتے ہوں گے، بھیڑ بکریاں غائب کر دیتے ہوں گے۔ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ تمہارے بھائی نے یہ ٹھکانہ کیسے حاصل کیا ہوگا۔ اب یہاں کتنے لوگ ہیں؟"

گل نے کہا۔ "سب پرانے لوگ ہیں مگر اس وقت کوئی بھی موجود نہیں۔"

"کیا دن میں جاتے ہیں یہ لوگ واردات کرنے؟"

"نہیں۔ دن میں چھاپہ پڑنے کا ڈر ہوتا ہے۔ آج یہ لوگ زیادہ ڈرے ہوئے ہیں۔ غالب اور مازو کے فرار ہو جانے کی وجہ سے۔" گل نے کہا۔ "نہ جانے انہیں کس نے بتا دیا کہ ان میں ایک اخبار والا تھا۔"

پیڈرو نے اطمینان سے کہا۔ "یہ میں نے بتایا تھا اور یہ بھی کہ غالب کے ساتھ جو لڑکی تھی، وہ دوسرے اخبار کی رپورٹر تھی۔"

"کیوں؟" گل نے تیوری چڑھا کے کہا۔ "اس جھوٹ کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ آدھا تو سچ ہے۔ مجھ سے بھی تم نے کہا تھا کہ جھوٹ مت بولنا۔" پیڈرو مسکرانے لگا۔ "مگر تمہاری دھمکیوں سے ڈر کے سچ نہیں بولا تھا میں نے۔ دھمکی طافو مسن موتی نے بھی دی تھی کہ جھوٹ بولا تو تمہیں مار کے اسی جنگل میں گاڑ دیں گے۔ مجھے کیا ضرورت تھی جھوٹ بولنے کی اور مرنے کی۔"

میں نے کہا۔ "میرے بارے میں بھی سچ بک دیا تم نے......"

"سچ بولا جاتا ہے، جھوٹ بکا جاتا ہے۔" پیڈرو بولا۔

"تمہارے بارے میں اگر یہ کہا میں نے کہ تم سیٹھ ہو اور تمہارا کیس... میرا مطلب ہے مس رابعہ کے بارے میں کہ ہائی کورٹ کی بہت بڑی وکیل ہیں تو یہ بھی برا نہیں کیا۔ ڈرے ہوئے ہیں یہ لوگ۔"

"یہ ڈرنے والے لوگ نہیں ہیں استاد پیڈرو۔" گل نے ... سے کہا۔

"پھر روپوش کیوں ہو گئے ہیں جنگل میں؟"

گل نے کہا۔ "اپنی حفاظت کے خیال سے لیکن اس کا تم یہ مت سمجھنا کہ انہوں نے تمہارے لیے فرار کے راستے کھلے چھوڑ دیے ہیں۔"

"قید میں ہم سب ہیں۔ اور میں نے بھی جو کچھ کہا اس کا مقصد اپنا دفاع تھا۔" پیڈرو بولا۔ "میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ ہم لاوارث لوگ نہیں ہیں۔ ہماری کوئی حیثیت ہے اور..."

"اچھا اچھا۔ فی الحال اپنی حیثیت کو میری حیثیت سے الگ رکھو۔" میں نے کہا۔ "تمہاری حیثیت کو میں جانتا ہوں۔"

"تم ابھی تک بدگمانی میں مبتلا ہو سکندر۔ حالانکہ میں تعاون نہ کرتا تو ان لوگوں کا تم تک پہنچنا دشوار ہو جاتا بلکہ ناممکن۔ اگر یہ پہنچ بھی جاتے تو تمہیں کیکڑوں کے نرغے سے بحفاظت نکال لانا کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ پوچھ لو گل سے۔ آپریشن ڈائنامائٹ کی کمان کون کر رہا تھا؟ محسن یا میں۔"

گل نے سر ہلایا۔ "یہ تو ٹھیک ہے بھائی سکندر۔"

"اور یہ بھی بتا دو اپنے بھائی سکندر کو کہ میری مدد کے بغیر غالب اور مازو کا فرار ہونا بھی مشکل تھا۔"

نہ جانے کیوں یہ سب مجھے اچھا نہیں لگا۔ پیڈرو کے ماتحت اس کے احسانات کا بار اٹھانا، اس کی مدد پر شکر گزار ہونا اور اس کے لیے دوستانہ جذبات کا اظہار۔ حقائق کو تسلیم کر لینے کے باوجود میرا دل اس خیال سے مفاہمت نہیں کرتا تھا کہ میرے باپ کا قاتل میرا دوست بھی ہو سکتا ہے۔ اگر آج اپنے قول و عمل سے وہ اپنے ماضی کی بداعمالی کے داغ ندامت کو مٹا دینا چاہتا تھا تو اس غرض کے پیچھے بھی نیکی اور خیرسگالی کے جذبات نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کی فطرت کو سمجھنے کے باوجود اگر کوئی سانپ یا بچھو کے دوستی کے دعوے کو تسلیم کرے تو یہ اس کی سادہ لوحی نہیں، بلکہ نادانی ہوگی۔

میں نے کہا "گل آپا، محسن اور رابعہ ابھی تک سو رہے ہیں؟ میں فوراً ملنا چاہتا ہوں۔"

"پہلے کس سے ملو گے؟" گل مسکرائی۔

"محسن سے" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔

"رابعہ سے کیوں نہیں؟ تمہیں تو بہت تشویش تھی۔"

"لیکن اب نہیں رہی۔ مجھے معلوم ہے وہ خیریت سے ہے، سونے دو۔" میں نے کہا "مجھے تو حیرت ہے محسن پر کہ اسے ..."

لا جتنی جلدی نہیں۔"

"وہ تو رات بھر جاگتا ہی رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اور پھر میں نے سمجھایا کہ صبح ہونے سے پہلے نہ کسی کو جگانا بہتر ہے اور نہ کسی کی نیند خراب کرنا۔ بڑی مشکل سے گیا تھا۔"

"مگر تم نے تو کہا تھا کہ رابعہ اور محسن باتیں کر رہے ہیں؟"

"معاف کرنا بھائی سکندر۔ تھوڑا بہت جھوٹ تو بولنا ہی پڑتا ہے بچوں کو بہلانے کے لیے اور بیماروں کو مطمئن کرنے کے لیے۔"

"میں نہ بچہ ہوں اور نہ بیمار۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت باتیں بنانے لگی ہو۔ چلو اب سیدھی طرح" میں نے کہا۔

"کیا میرا ساتھ جانا ضروری ہے؟" وہ بولی "یہ سامنے کمرا ہے، خود چلے جاؤ۔"

"یہ ... کمرا" میں نے حیرانی سے کہا "واقعی۔ مجھے پہلے ہی دیکھ لینا چاہیے تھا۔ خواہ مخواہ انتظار کرتا رہا کہ تم مجھے لے کر جاؤ گی۔"

جب میں نے اس کمرے کی طرف قدم بڑھائے تو میرے دل کی اضطرابی کیفیت اپنی انتہا پر تھی۔ بہت دیر سے میں خود کو ذہنی طور پر اس وقت کے لیے تیار کر رہا تھا جب ایک مدت کے بعد محسن پھر میرے سامنے آئے گا۔ اس ملاقات میں ڈرامائی عنصر باقی نہیں رہا تھا۔ وہ مجھے پہلے ہی دیکھ چکا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ میرے اور اس کے درمیان حائل فاصلے ختم ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود میں نے اندر قدم رکھا تو ایک دم آتش شوق بھڑک اٹھی۔

میں نے دروازے پر دستک دی مگر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی چلا کے کہا "ابے محسن خان شیروانی کے بچے... اچکن کی اولاد... اٹھ تیری تو..."

میرا خیال تھا کہ میرے ایک دھماکے سے اندر داخل ہونے پر محسن ہڑبڑا کے اٹھے گا، چند سیکنڈ احمقوں کی طرح میری صورت دیکھتا رہے گا اور پھر جواب میں مجھے پرانی مکسچر گالیوں سے نوازتے ہوئے مجھ سے چمٹ جائے گا۔ ہم ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے نعرے ماریں گے اور رو دیں گے۔ بچھڑے ہوئے دوست تو ایسے ہی ملتے ہیں۔

لیکن جو کچھ ہوا وہ میری توقعات کے اتنا خلاف تھا کہ چند سیکنڈ کے لیے میں مفلوج اور حواس باختہ کھڑا رہ گیا۔ اندر ایک عورت دیوار پر لگے ہوئے آئینے میں اپنی صورت دیکھ کے لپ اسٹک لگا رہی تھی۔ اس نے دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا اور آئینہ ایسے زاویے پر تھا کہ میں اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کے رنگین ... مجھے دیکھتے ہی میں رک گیا تھا مگر اس نے ایک ایسی چیخ ماری جس نے میرے اوسان خطا کر دیے۔

میں نے ہکلا کے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میرے حلق سے بے معنی آوازوں کے سوا کچھ نہ نکلا۔ ایک اجنبی عورت کے کمرے

میں یوں دیوانہ وار گالیاں بکتے ہوئے داخل ہونے کا شاک اتنا شدید تھا کہ مجھے پسینہ آ گیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ ایسا کیوں ہوا۔ شاید اس وقفے میں جب گل مجھ سے باتیں کر رہی تھی یا طافو اور پیڈرو بھی وہاں تھے، محسن اٹھ کے رابعہ کی طرف چلا گیا تھا یا کہیں اور۔ اس کمرے میں موجود عورت طافو کی بیوی تو ہو نہیں سکتی تھی مگر کسی دوسرے ڈاکو کی گھر والی ہو سکتی تھی۔ غلطی گل سے ہوئی تھی اور مجھ سے بھی..... میں نے زبان کی لکنت پر قابو پا کے کہا "میں... معاف کرنا بہن، میں سمجھا تھا..... وہ دراصل... گل نے مجھے بتایا تھا۔"

دوپٹے سے منہ چھپا لینے والی عورت نے چلانا شروع کر دیا "مجھے کیا بتا رہا ہے بے شرم... بے غیرت... اندھے کہیں کے۔ پاگل شرابی کی طرح گالیاں بکتا چلا آ رہا ہے اندر۔ کسی کی ماں بہن کی عزت کا خیال نہیں تجھے، تیرے اپنے گھر میں نہیں ہے کوئی نامراد۔"

میں پلٹ کے بھاگنے ہی والا تھا کہ میرے ذہن کو ایک اور جھٹکا لگا۔ میں پلٹا اور اس عورت کو دیکھنے لگا جو بڑے فراٹے سے مجھے کوس رہی تھی۔ زنانہ لغت سے منتخب گالیوں کے ساتھ۔ یہ خیال تو مجھے پہلے بھی آیا تھا کہ عورت غیر معمولی طور پر صحت مند اور قد آور ہے۔ اب اس کی آواز نے مجھے متوجہ کیا تھا۔ یہ مصنوعی آواز تھی اور عورت کی آواز بنا کے چلانے والا مرد محسن کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔

جب میں فرار ہوتے ہوتے رکا اور پھر پلٹا تو وہ میری طرف دیکھ رہا تھا اور بلاشبہ بہت ضبط سے کام لے رہا تھا۔ میری گھبراہٹ اور بدحواسی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے وقت اس کے لیے اپنی ہنسی پر قابو پانا یقیناً ایک مشکل کام تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ بھانڈا پھوٹ چکا ہے تو اسے اپنے دفاع کی فکر لاحق ہو گئی۔

میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا "کوئی مارو ماں بہن کو میری جان۔ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے..."

محسن جان بچا کے بھاگا "ابے سکندر اعظم کے سالے... دیکھ تیرا تو پجامہ بھی گیلا ہو رہا ہے۔" ہنستے ہنستے اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی "ذرا اپنی حالت دیکھ..."

میں اس کے پیچھے لپکا "ابھی بتاتا ہوں تجھے میں..."

وہ مجھ سے بچنے کے لیے پلنگ کے نیچے گھس گیا اور چلانے لگا "ہائے ہائے، کوئی بچاؤ مجھے اس موئے مردوئے سے۔ پرائی بہو بیٹی کی عزت خطرے میں ہے۔"

میں اس کے تعاقب میں رہا اور پلنگ کے نیچے اس کو پکڑنے کی کوشش کی "پرائی کہاں... تمہاری عزت میری عزت۔"

وہ شور مچاتا دوسری طرف نکل گیا "ارے رابعہ آپی!"

رابعہ اور گل اس ڈرامے کے آخری سین کے لیے پہلے سے تیار تھیں اور ان سب نے مل کر ریہرسل بھی کر لی تھی۔ وہ ایک

www.paksociety.com

ساتھ اندر آگئیں۔ محسن ان کے پیچھے چلا گیا اور انہوں نے مجھے دھکیل دیا۔ ان کا برا حال تھا، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ہنسی روکے نہیں رک رہی تھی۔

میں سخت خفت کا شکار تھا۔ رابعہ اور گل کی ہنسی مجھے مزید شرمندہ کر رہی تھی۔ ان کے پیچھے اپنے مضحکہ خیز حلیے میں کھڑا ہوا محسن بھی پیٹ پکڑ کے ہنس رہا تھا۔ پھر میں اس صورت حال پر کیسے نہ ہنستا۔

"تم سب بدمعاش ہو، تم سب" میں نے کہا۔

محسن مجھ سے لپٹ گیا "ہم بدمعاش ہیں۔ سنا تم نے رابعہ۔ ایمان سے کیا حال ہوا تھا بھائی کا اندر آتے ہی۔ کون رابعہ اور کیسی محبت..... سب بھول گئے۔"

میں نے ہنستے ہوئے اسے دو مکے مارے "الو کے پٹھے، گل اجازت دے تو میں ابھی نکاح پڑھوا لوں تجھ سے۔"

گل آنسو پونچھ کے پھر ہنسنے لگی "مجھے کیا۔ رابعہ باجی سے پوچھو۔"

رابعہ کو پھر ہنسی کا دورہ پڑا "خدا کے لیے اب بس کرو یہ بے ہودگی۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ ایسا مت کرو، تماشا بن جائے گا۔"

گل نے کہا "کوئی نہیں ہے یہاں ہمارے سوا۔"

میں نے کہا "شکر ہے خدا..... وہ کہاں گیا؟"

"اسے میں نے طارق کے پاس بھیجا ہے" گل نے کہا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا "بڑی نامعقولیت کا ثبوت دیا تم نے۔ وہ دیکھ لیتا پھر؟"

رابعہ بولی "اس کے علاوہ بھی تو لوگ تھے۔"

گل نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا "منع تو میں نے بھی کیا تھا مگر یہ کہاں ماننے والے ہیں۔"

"یہ آئیڈیا کس کا تھا؟" میں نے کہا۔

"آئیڈیا بھی میرا تھا اور کیا لاجواب آئیڈیا تھا۔ قسم خدا کی پہچان ہو گئی آج کہ محبت کیا ہوتی ہے اور ہوس کیا۔ میں کہتا ہوں، اب بھی وقت ہے رابعہ! سنبھل جاؤ۔ یہ جو تمہارا چاہنے والا بنتا ہے نا، ایسا فریفتہ ہوا تھا مجھ پر کہ۔"

میں نے کہا "محسن تو کیوں مار کھانا چاہتا ہے مجھ سے۔ چل جا اپنا حلیہ ٹھیک کر سٹور کے پیچھے۔ ابھی آ جائے گا کوئی۔"

چند منٹ میں وہ لباس بدل کے آ گیا اور سارا ہنگامہ ختم ہوا تو سب کو ناشتے کا خیال آیا "کیا ملے گا یہاں تمہاری سسرال میں محسن؟" میں نے کہا "ڈاکوؤں کے والد۔"

محسن نے غیر موجود مونچھوں پر تاؤ دیا۔ "بے ادب منہ سے بول۔ جو کہے گا وہ حاضر کریں گے۔ بڑا خوش قسمت ہے تو۔"

"خاک خوش قسمتی ہے یہ۔ ایک کا سسر بھوت ہے، ایک کے سسرالی عزیز ہیں ڈاکو۔"

"یہ بھی تو خوش قسمتی ہے تمہاری کہ ملتے ہیں ایسے کہ جو چاہو وہ فراہم کر دیں۔ سوری کہنا تو جانتے ہی نہیں۔ "ساری دنیا میں جہاں کوئی چیز ہو گی وہاں سے لے آئیں گے سامنے۔"

"ناشتے میں کیا کھاؤ گے بھائی سکندر؟" گل مسکرائی۔

"پوچھ تو ایسے رہی ہو جیسے جنگل میں سینڈوچ، آملیٹ ہر چیز آرڈر پر مل جاتی ہے۔"

"یار کہا ہے نا تجھ سے کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ کہے گا تو مرغ کے انڈے کا آملیٹ آ جائے گا۔ بس ذرا دیر لگے گی۔ جانے میں کچھ دیر لگے گی۔ یہ سمجھ لے کہ تو لاہور کے ہوٹل میں بیٹھ کے آرڈر دے رہا ہے اور یہ ہے ویٹرس۔" اس نے گل کی طرف اشارہ کیا "آپ بولیں۔"

"یہ بات ہے" میں نے کہا "تو ویٹرس! ہم امریکن بریک فاسٹ لیں گے، ملے گا؟"

"وائی ناٹ سر" گل نے مؤدبانہ لہجے میں سر جھکا کے کہا اور رابعہ کے ساتھ ہنستی ہوئی باہر چلی گئی۔

"کیا واقعی..... یہاں انتظام ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ ہم ہیں تو پھر کیا غم ہے۔ ہم نے پہلے ہی سب کچھ منگوا لیا تھا لاہور سے۔ کچھ دور سے یہ لوگ لا دیتے ہیں" محسن نے کہا "پہلے دن تو میں نے گزارا کیا تھا انہی چیزوں پر جو یہ کھاتے تھے ناشتے میں۔ پراٹھے اور مکھن۔ مرغی بھی ہوتی تھی تو رات کی بدستور۔ چائے بھی وہی تھی دیسی اسٹائل کی۔ دودھ میں پتی ڈال اُبال لیتے تھے۔ پھر گل نے خود ہی میری مرضی کے مطابق انتظام کر لیے۔ ڈاکوؤں کے ڈیرے پر قیام کا پہلا تجربہ برا نہیں رہا۔ دل کے اچھے ہیں یہ لوگ۔"

"پھر کیوں نہ ہم بھی انہی جیسے ہو جائیں؟ دل کے ہم بھی اچھے ہیں۔" میں نے کہا "تمہی گزرے گی ہماری بھی۔ جیسے تمہاری گزری۔"

"میرا یہ مطلب بہرحال نہیں تھا۔"

"پھر کیوں ڈیرا ڈال رکھا تھا یہاں؟" میں نے کہا۔

محسن بولا "مجبوری تھی یار۔ گل نے بتایا نہیں تجھے؟"

"مجبوری کے گھوڑے۔ تیرا دماغ درست ہوا یا نہیں ابھی؟ بہت پریشان کیا گل کو اور تیری وجہ سے ہی وہ یہاں آئے" میں نے کہا۔

محسن کی صورت پر دکھ اور شرمندگی کے آثار نظر آنے لگے "یہ تو ٹھیک کہا تو نے۔ گل میرے ساتھ بری پھنسی۔ یہ اسی کا حق تھی اپنے سکندر صاحب کہ آج میں ٹھیک ہوں اور دوسری ملاقات پاگل خانے میں نہیں ہو رہی ہے۔ گل نے مجھے پاگل نہیں ہونے دیا، حالانکہ میں نے اپنی پوری کوشش کی تھی۔ وہ مجھے واپس زندگی کی طرف کھینچ لائی۔ کہنے کو بڑی کمزور اور نازک ہوتی ہے عورت

لیکن کون مقابلہ کر سکتا ہے اس کے عزم اور حوصلے کا۔ میں تو شرمندہ ہوتا ہوں جب اپنی محبت کا موازنہ گل کی محبت سے کرتا ہوں۔ احساس کمتری ہوتا ہے مجھے۔ میری محبت شاید ایسی کسی آزمائش کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایسی قربانی میں نہیں دے سکتا تھا جو گل نے دی۔ اتنا ظرف نہیں تھا میرا۔ یہ ماننا پڑا ہے مجھے سکندر، اور دیکھا جائے تو یہی ہے اصل محبت جس میں طلب کی اہمیت ہی نہیں تھی۔ بس اپنا سب کچھ ہار دینے، وار دینے کی تمنا تھی۔"

میں نے پرانی یادوں میں گم ہو کے کہا "ہاں۔ تو بالکل ٹھیک کہتا ہے محسن۔ گل نے اس لیے نہیں چاہا تھا تجھے کہ بالآخر تجھے پا سکے۔ یہ تو بس قسمت کے کھیل ہیں۔"

"تو ڈرتا ہے شملا کا ذکر کرتے ہوئے؟" محسن نے کہا "اب ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت میں نے گل کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس کی محبت کے بدلے میں نفرت دی تھی کیونکہ میں شملا کے ہوتے کسی اور کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتا تھا، کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن گل کو دیکھو، وہ کبھی مایوس اور بددل نہیں ہوئی۔ یک طرفہ محبت کے پاگل پن میں مبتلا رہی اور کسی کے سمجھانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔"

"ہاں، ہم بہت سمجھاتے تھے اسے کہ محسن کا خیال دل سے نکال دو مگر وہ ایک ہی بات کہتی تھی کہ میں نے کچھ مانگا تو نہیں ہے محسن سے۔ لیکن اس سے محبت نہ کرنا میرے اختیار کی بات نہیں۔ عجیب لڑکی ہے یہ گل۔ بھئی میں اور غالب تو انکار نہیں کر سکتے اس حقیقت سے کہ ہماری محبت کی منزل بالآخر وہی ہے۔ شادی خانہ آبادی۔ یہ ہجر کے صحرا کا بے سمت سفر نہیں ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی گل کی طرح محبت نہیں کر سکتا۔"

"مجھے یقین ہے کہ آج بھی شملا زندہ ہوتی تو گل کو فرق نہ پڑتا۔ وہ اسی طرح خاموشی سے میری محبت کے آزار میں مبتلا رہتی اور مجھے عذاب میں مبتلا رکھتی۔"

"عذاب کیسا؟"

"یار، یہ جاننا کہ آپ کسی کو محبت کے جواب میں نفرت دے رہے ہیں اور مجبور ہیں، کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ نفرت کرنا بھی تو مشکل ہو جاتا ہے۔ اب مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے کہ خدا نے سب کی مشکل آسان کی ورنہ زندگی کیسے گزرتی؟ ایسے کب تک گزرتی؟ شملا مر گئی تو اس کے لیے بھی عذاب ختم ہوا۔ سوائے انتظار، دکھ جھیلنے اور مسلسل ہجر کے صدمے اٹھانے کے اس نے کیا پایا تھا زندگی سے؟ زندہ رہتی تو مزید دکھ اٹھاتی۔ شاید گل بھی اس کے لیے آزار ہو جاتی۔ میں کتنا بے بس ہوتا۔ گل کو قتل بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ نہ گل مایوس ہو کے خودکشی کا سوچتی تھی۔ ہم سب مل کے بھی اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتے تھے جو خدا نے یوں حل کر دیا کہ کوئی بھی کسی کو الزام نہیں دے سکتا۔ بڑی صابر عورت تھی شملا بھی مگر یہ گل تو اس سے بھی کئی ہاتھ آگے ہے۔ نہ پہلے کبھی اس نے شملا سے حسد کیا تھا اور نہ اب ایسی کوئی بات ہے۔ کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ شملا کے مرنے کا غم مجھ سے زیادہ اسے ہوا۔ وہ دل ہی نہیں اس کا جو کسی سے حسد یا نفرت کرے۔"

"چل یار، جو ہوا اچھا ہوا۔" میں نے کہا "وقت گزر گیا اور یادیں چھوڑ گیا۔ اب ان کے سہارے زندگی تو نہیں گزاری جا سکتی۔"

"لیکن ان یادوں کو زندگی سے خارج بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہاں۔ البم رکھے رہتے ہیں گھر میں۔ کبھی فرصت ملتی ہے تو سب ہی دیکھ لیتے ہیں ورنہ عکس بند واقعوں میں رہتیں، وہ محو ہو جاتے ہیں۔ تصویر میں منجمد لمحے پھر بھی زندہ رہتے ہیں۔ آدمی کا دل چاہتا ہے تو اپنے ماضی میں گھوم آتا ہے لیکن اپنے مستقبل کی جانب سفر تو جاری رکھتا ہے۔"

"سفر جاری ہے دوست" محسن آہ بھر کے بولا اور کچھ دیر خاموشی سے خلا میں گھورتا رہا۔

گل نے رابعہ کی مدد سے خود ہی ناشتا تیار کیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے حسن انتظام سے اس نے جنگل میں منگل منانے کا معجزہ کر دکھایا تھا۔ ناشتے میں کارن فلیکس، انڈے، مکھن اور ڈبل روٹی کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا اور چائے کے ساتھ کافی بھی تھی۔ گل نے بتایا کہ انڈے، مکھن تو گرد و نواح میں ہی دستیاب ہیں، باقی چیزوں میں سے صرف ایک کے لیے کوئی ہر روز شہر جاتا ہے اور وہ ہے ڈبل روٹی۔ نہ ان لوگوں کے پاس پیسے کی کمی ہے اور نہ وسائل کی۔ ایک جیپ تو ہر وقت تیار کھڑی رہتی ہے، دوسری آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

"پہلی جیپ آمد و رفت میں استعمال نہیں ہوتی تو پھر تیار کیوں کھڑی رہتی ہے؟" رابعہ نے پوچھا۔

"ان کا ایک مسئلہ جو سر پر ہر وقت لٹکنے والی تلوار کی طرح ہے، چھاپے کا ڈر ہے" گل نے کہا "کیا پتا کب کوئی مخبری کر دے۔ ویسے تو مخبر بھی پولیس کے اپنے ہی آدمی ہوتے ہیں۔"

"اور پولیس ان کی اپنی ہے" محسن بولا "وہ چھاپا مارنے سے پہلے بتا دیتے ہیں کہ خبردار، ہوشیار، ہم آ رہے ہیں۔"

"پھر ڈرنے کی وجہ؟"

"بعض اوقات پولیس پر اوپر والوں کا دباؤ ہوتا ہے۔ اچانک کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی آئی جی یا ایس پی بدلتا ہے تو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ نیا حاکم مزاج کا کیسا ہے۔ پولیس خود بتا دیتی ہے کہ ابھی ذرا ہاتھ روک لو۔ یہ بندہ ذرا مختلف ہے اور اسے کچھ دن تو فرض شناسی کا ڈراما کرنا ہی ہے تاکہ اخباروں میں بیانات چھپ جائیں اور پبلک وقتی طور پر دہائی دینا بند کر دے۔ کچھ پکڑ دھکڑ لازمی ہو جاتی ہے۔ کرائم رپورٹرز کی مدد سے سرخیاں لگوا دی جاتی ہیں کہ اتنے چور پکڑے گئے، تصاویر مع برآمد شدہ سامان مسروقہ ملاحظہ ہوں۔ اتنے ڈاکو پکڑے گئے۔ منہ پر نقاب کے ساتھ ان کی

www.paksociety.com

نصار ہے۔ ان سے ملنے والا اسلحہ' چند پرانی ڈکیتیوں کا حوالہ کہ یہ فلاں فلاں واردات میں ملوث تھے۔ گرفتاری دینے والے اور نصار بر خوانے والے پرانے پاپی ہوتے ہیں جو پولیس کے کام آتے ہیں۔ مال بحق سرکار مال خانے سے آتا ہے۔ جس علاقے کی خبر اور تصویر ہوائی مشہور ہو' وہاں فراہم کردیا جاتا ہے۔ کچھ دن بعد لوگ مطمئن ہوجاتے ہیں کہ واقعی سب ٹھیک ہو رہا ہے۔ پھر نیا افسر بھی پرانے رعب پر آجاتا ہے۔ دنیا کے سب کام پہلے کی طرح ہونے لگتے ہیں۔

"تمہارا مطلب ہے اصلی چھاپا کبھی نہیں پڑتا ہے؟"

"پڑتا ہے۔ جب کبھی غلطی سے ڈاکو کسی وزیر یا مشیر یا اعلیٰ سرکاری افسر وغیرہ کے کسی عزیز کو لوٹ لیتے ہیں۔ افسر کو چیف آف نے کا' لائن حاضر ہونے کا یا تنزلی کا خطرہ لاحق ہوجاتا ہے اور اس سے زیادہ خبر شائع ہونے کی رسوائی کا تو پھر وہ کچھ کارکردگی دکھاتا ہے۔ اسے علم تو ہوتا ہے کہ واردات کہاں ہوئی تھی اور اس علاقے میں کون کون سے گروہ ہیں۔ وہ ایک گروہ کو گھیرلاتا ہے۔ اگر وہی مجرم ہوں تو مال مسروقہ قیمت کی پائی پائی واپس۔ انہیں پابہ زنجیر متعلقہ افسر کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اس کے لٹنے والے عزیز کو تھانے میں مجرموں کے پٹنے کا منظر دکھانے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ مقدمہ بھی درج ہوتا ہے اور چھترول بھی اصلی ہوتی ہے مگر یہ چند دن کی بات ہوتی ہے۔ بعد میں کون پوچھتا ہے کہ پکڑے جانے والوں کا کیا انجام ہوا' انہیں کس عدالت میں پیش کیا گیا اور کیا سزا ہوئی۔ سب کو سو کام ہوتے ہیں۔ جسے مال واپس مل جاتا ہے وہ مطمئن ہوکے بیٹھ جاتا ہے کہ مجرم پکڑے گئے۔ اگر غلطی سے غلط گروہ پکڑا جائے تو وہ خود بتا دیتے ہیں کہ واردات فلاں نے کی تھی چنانچہ انہیں مجبور کرکے فلاں کو لے آتے ہیں۔"

میں نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا "گل! تمہاری معلومات ہمارے علم میں اضافہ کررہی ہیں۔ یہ بتاؤ کبھی یہاں چھاپا پڑا؟"

"کیوں نہیں پڑا۔"

"تمہاری موجودگی میں؟ میرا مطلب ہے تم کو بھی گرفتار ہونے کی سعادت نصیب ہوئی؟"

گل مسکرائی "جیش ناگ ایک با اصول ڈاکو تھا۔ پولیس کو اور اس کے مخبروں کو بھی ناخوش نہیں کرتا تھا۔"

غالب بولا 'جدید اصطلاح میں اس کی پی آر اچھی تھی۔"

"ہاں۔ اس کے باوجود ایک بار چھاپا پڑا۔ سب گرفتار ہوئے اور تھانے میں بھی رہے۔ وہاں ان کے ساتھ وہ سب ہوا جو دوسروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ دو سال میں ایک بار سب کو حاضری لگوانی پڑجاتی ہے تھانے میں۔ باری باری۔ پولیس کا کہنا ہے کہ آخر ہم نے وردی پہنی ہے اور تنخواہ لیتے ہیں اس بات کی تو پھر کچھ کرکے دکھانا ضروری ہے۔ آپس میں مل جل کے ایک دوسرے کا کام چلاتے ہیں۔ میں اس لیے نہیں پکڑی گئی کہ چھاپے سے پہلے ہی بھائی مجھے روپوش کررہا تھا۔ مجھے ایک گاؤں کے چوہدری کی حویلی میں جگہ مل جاتی تھی۔ چوہدری میرا حقیقی چچا تھا۔"

میں بھونچکا رہ گیا "حقیقی چچا....."

محسن نے کہا "تم نے آج تک بتایا نہیں تھا کہ تمہارا کوئی چچا ہے....."

"اب اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ وہ پہلے بھی نام کا چچا تھا۔"

"وہ بھی ڈاکو تھا؟" محسن نے پوچھا۔

"پہلے تھا پھر حج کرکے آیا تو اس کی کایا کلپ ہوگئی۔ ماشاءاللہ کی سفید داڑھی رکھ لی۔ ٹخنے سے اونچی شلوار' سر پہ ٹوپی اوڑھ کے' اونچے پائینچے والی شلوار پہن کے اور ہاتھ میں تسبیح لے کر دنیا بھر کو روزے نماز کی تلقین کرتا پھرتا تھا۔ ایک دن میرے بھائی سے الجھ گیا اور اسے لیکچر دینے لگا کہ تم جہنمی ہو اور شیطان ہو۔ اس نے کہا کہ چچا! کل تک تم خود بھی یہی تھے آج ہوئے۔ جب تمہاری عمر کو پہنچوں گا تو حج کرنے جاؤں گا اور واپسی پر یہی ڈراما شروع کردوں گا جو تم کررہے ہو۔ مال تو بہت جمع ہوجائے گا اس وقت تک۔ باقی عمر ثواب کمانے میں لگادوں گا۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا۔ اگر میرے ساتھ رہتا کہ تم نے یا کسی نے کچھ کیا تو تمہاری خیر نہیں۔ میں تو چلا جاؤں گا جیل لیکن تم سے نمٹنے والے بہت ہوں گے۔ انہیں تاکید کردی ہے میں نے کہ تمہاری داڑھی مونڈ کے ہاتھ پر رکھ دیں اور منہ پر کالک مل کے اور تمہارے کپڑے اتار کے تمہیں مال روڈ پر چھوڑ دیں۔ تصویریں اتارنے کے بعد۔ اوہو! میں محفوظ رہی۔ چاچا کو عزت اور دولت دونوں سے پیار تھا۔"

ہم سب گل کی بات پر ہنسنے لگے تھے۔

میں نے کہا "گل! تمہاری بات سے تو ثابت ہوتا ہے کہ پولیس میں نہ کوئی ایماندار ہے نہ فرض شناس۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ برے لوگ کہاں نہیں ہوتے۔ کچھ محکمے ایسے بھی ہیں جہاں ان کا تناسب زیادہ ہے۔"

"پولیس میں اچھے ایماندار اور فرض شناس لوگ آج تک تم نے کتنے دیکھے ہیں؟" محسن بولا۔

"ایک تو اپنے انکل ضامن رضوی مرحوم تھے ایک اپنا ذیل ایس آئی سب انسپکٹر سید اکرام شیخ تھا۔"

"ایک اللہ کو پیارے ہوگئے دوسرے کہیں چلا گیا ہے۔ کراچی میں ایماندار افسر کو وہاں رہنا مشکل کردیا جاتا ہے۔"

"پھر بھی ضامن رضوی جیسے لوگ زندہ رہتے ہیں۔ انہوں نے ملازمت پوری کی اور تنگی بھی کمائی۔ ان کے بدترین دشمن بھی اعتراف کرتے ہیں ان کی مثالی فرض شناسی کا اور اصول پرستی کا۔"

"مسئلہ کیا ملا ان کو اس کا؟ ایک گھر تو بنا نہیں سکے اور دوسرا پولیس کے اعلیٰ افسر بھی تنخواہ میں گزارا کریں تو آنے والوں کا حال معلوم ہوجائے۔ ضامن رضوی کی تعریف کرنے والوں نے ان کے بیوی بچوں کے لیے کیا کیا؟ کون ان کے کام آیا؟ ان کی بیوہ جو اسکول چلارہی تھی وہ بھی ختم ہوگیا۔ ضامن رضوی پرانے وقتوں کے آدمی تھے۔ ان کا انجام دیکھ کے ان نئے افسروں نے ایمانداری اور فرض شناسی سے توبہ کی ہوگی۔ حکومت نے ایک تمغۂ خدمت تک نہیں دیا۔ نہ انعام میں زمین ملی۔ پھر پولیس ڈاکوؤں اور چوروں سے نہ ملے تو کیا کرے۔ ویسے بھی اس معاشرے میں چور ڈاکو زیادہ ہیں اور وہ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں نیچے سے اوپر تک۔"

میں نے گل سے کہا "یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔"

"ایسی باتوں کے لیے وقت کب آئے گا؟" محسن نے میز پر مکا مار کے کہا۔

"ہم بتا دیں گے تمہیں" میں نے کہا "ابھی تو یہاں سے نکلنے کی فکر کرو۔"

"مسٹر پیڈرو گیا تھا مذاکرات کے لیے" گل نے کہا۔

"اسے ہماری طرف سے بات کرنے کا اختیار دینا غلط ہے۔ ہم خود بات کرسکتے تھے" میں نے احتجاج کیا۔

محسن بولا "بدمعاشوں سے بدمعاش ہی بات کریں تو اچھا ہے۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔ آہستہ آہستہ وہ ہمارے درمیان جگہ بنارہا ہے' ہماری صفوں میں گھس رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نے ٹھیکہ لے لیا ہے ہمارے سب مسائل حل کرنے کا۔ یہ اس کی چالبازی ہے۔"

"میں مانتا ہوں مگر۔"

"مگر کیا؟ میرے لیے اس شخص کا وجود ہی باعث آزار ہے۔ میں بہت ضبط سے کام لیتا ہوں مگر پھر بھی اسے دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ مجھے وہ سب یاد آجاتا ہے جو اس نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔ اب اس کی پالیسی بدل گئی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم پرانی باتیں بھلادیں اور اسے معاف کرکے اپنے ساتھ شامل کرلیں۔"

"یہ ناممکن ہے" محسن بولا۔

"اسے معاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" گل نے کہا۔

میں نے کہا "دیکھو گل! فی الوقت فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ حالات اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ پیڈرو کہتا ہے کہ محمد عبداللہ کو چوہدری دلاور نے قتل کیا تھا اور اسے پھنسادیا تھا لہٰذا اسے ہم سے کوئی پرخاش نہیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے اس نے ہماری مدد بھی کی ہے۔ ہم سب اس کی کوشش کے نتیجے میں ایک دوسرے سے ملے مگر مجھے اس کوشش کے پیچھے بھی چوہدری دلاور کا ہاتھ نظر آتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" محسن بولا۔

"چوہدری دلاور اب گل کے چاچا کی طرح نیک نامی کمانے کے چکر میں ہے۔ وہ سیاست میں قومی لیڈر بن کے سامنے آنا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ اپنے ماضی کے ہر نقش کو مٹانا چاہتا ہے۔ پبلک کو تو کچھ معلوم نہیں اور پبلک ہوتی ہے ریوڑ کی طرح جدھر ہانک دو چل پڑتی ہے۔ ان کا حافظہ بھی کمزور ہوتا ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ کل کس نے ان سے جو وعدے کیے تھے وہ کیوں پورے نہیں ہوئے۔ بعد میں آنے والا زیادہ برا ثابت ہوتا ہے تو وہ مردہ باد مردہ باد چلانے لگتے ہیں۔ پہلے والے کے کہنے پر اور پھر زندہ باد کے نعرے لگاکے پرانے حاکم کو واپس لے آتے ہیں۔ ان کا بھلا نہ مردہ باد سے ہوتا ہے نہ زندہ باد کے نعروں سے مگر یہ سیاست کا کھیل ایسے ہی چل رہا ہے۔ اب تم خود سوچو کہ چوہدری دلاور اگر کل کو اسمبلی کے انتخابات میں جیت گیا تو وہ وزیر بھی ہوجائے گا۔ اس کے بعد کون روکے گا اس کا راستہ؟ وہ ایوانِ صدر تک جاسکتا ہے۔"

"ہم اس کا راستہ روکیں گے" محسن نے میز پر ہاتھ مارا۔

"راشد یہ بات وہ بھی جانتا ہے" میں نے کہا "اور وہ چاہتا ہے کہ جب وہ ایک دیانت دار' خدا ترس' نیک دل' شریف اور ایماندار محب وطن پاکستانی شہری کے روپ میں سامنے آئے تو کوئی اس کے چہرے سے نقاب اتارنے والا نہ ہو۔ جب وہ تقریروں میں روشن مستقبل کے خوابوں کا ذکر کرے تو کوئی اسے تاریک ماضی کا حوالہ نہ دے۔ وہ تو اپنے لیے ایک قابل فخر ماضی بھی خریدنا چاہتا ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ پیدائشی طور پر فرشتہ صفت ہے اور ایک قابل تقلید لیڈر کی جملہ صفات اس کی ذات میں روز اول سے موجود ہیں چنانچہ اسکول میں' کالج میں اور اس کے بعد خدمت خلق کے سوا اس نے کچھ نہیں کیا۔ کتنے یتیموں کے سر پہ ہاتھ رکھا' کتنی بیواؤں کی بیٹیوں کے لیے رخصتی کا انتظام کیا' غریبوں' بیماروں کی کتنی مدد کی' اس کے گواہ بہت مل جائیں گے..... ہم اور مسکین خود اس کی خدا ترسی کے بھی گواہ ہوں گے۔ باقی کام اس کا پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کرے گا۔ بس خطرے کی گھنٹی بجانے والے ہم ہیں جو خود رستے سے ہٹ نہیں رہے۔ اب اس نے اپنی حکمت عملی بدل ڈالی ہے۔ ایک تو اس نے پیڈرو کو الگ کردیا ہے وہ خود بھی کہتا ہے اور پیڈرو بھی۔ بظاہر ان کے درمیان عداوت پیدا ہوگئی ہے مگر میرا خیال ہے کہ یہ ڈراما کشتی ہے۔ اس نے پیڈرو کو اپنا خاص فرنٹ مین کہتے ہوئے یہ مشن سونپا ہے کہ وہ ہمیں رام کرے' ہماری صفوں میں گھس کے انتشار پھیلائے' ہمارے خیالات اور نظریات کو بدل دے۔ اور اگر یہ نہ ہو تو پھر ہمارے درمیان رہ کے چوہدری دلاور کو ہمارے عزائم سے باخبر رکھے۔ ہمیں جدا کرنے کا ڈراما چوہدری دلاور نے کیا' ملوانے کا ڈراما پیڈرو نے۔ اور ظاہر ہے' ہمارے جذبات کی نوعیت اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ پھر ایک شک بھی پیدا کرلیا ہے اس نے ہمارے دل میں کہ آج تک ہم غلط فہمی کی بنا پر اس سے دشمنی کرتے رہے۔ بظاہر وہ چوہدری

www.paksociety.com

دلاور کی مخالفت کر رہا ہے مگر یہ ہماری موافقت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ چوہدری دلاور کا ایک بھائی بھی تھا؟"

"ہاں۔ پیڈرو نے بتایا ہے۔"

"اس نے غالب کو خرید لیا ہے۔ ایک اخبار کی پیش کش کرکے اور غالب نے ایڈیٹر بننے کے شوق میں اسے قبول بھی کر لیا ہے۔"

"صحافت اس کا شوق بھی ہے اور اس کی کمزوری بھی لیکن یہ کتنا زیادتی ہوگی کہ غالب بک گیا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"یہ چکر ایسے ہی چلائے جاتے ہیں رابعہ۔ پہلے تو فری جاتی ہے۔ اگر آپ ایک بدکردار، بے ضمیر اور زر پرست فرد کے لیے کوئی کام کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں تو گویا آدھی بازی اس نے جیت لی۔ اگر آپ صاف انکار کرنے کے بجائے ہمدردانہ غور کرنے کا وعدہ کر لیتے ہیں تب بھی وہ سمجھ لیتا ہے کہ آپ نے راستہ رکھ لیا ہے، آپ رو رام میں بھی آ جائے گا اور ایسے شکاری بڑے تجربے کار، جہاں دیدہ اور مردم شناس ہوتے ہیں، جو ہم جیسے خوداروں کا شکار کرتے ہیں۔ چوہدری دلاور اور اکبر خان ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ غالب کو اصولی طور پر رضامند کرکے انہوں نے بڑی خوش مناتی ہوگی کہ کام آسان ہو گیا۔ اس کے بعد جو بھی ہوگا آہستہ آہستہ ہوگا۔ عزت، شہرت اور دولت کے جال میں غالب خود گرفتار ہوتا جائے گا اور اسے اصل مقاصد سے دور کرنے والے ذریاں کھنچتے رہیں گے۔ غالب ایک بہت نیک نام 'حق گو' بے باکی کے ترجمان اخبار کی حیثیت سے صحافتی و حکومتی حلقوں میں اور پبلک میں اخبار کی پوزیشن مستحکم کرے گا تو اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر پھینکا جائے گا۔ نیا ایڈیٹر پرانی ساکھ اور بہت بڑی اشاعت رکھنے والے اخبار میں چوہدری دلاور کی تعریف و توصیف کرے گا تو اسے سچ ہی تسلیم کیا جائے گا۔ کوئی کہے گا کہ یہ اخبار جھوٹا ہے، زر خرید ہے اور رائے عامہ کو گمراہ کرتا ہے تو اسے پاگل، شرپسند اور دشمن کا ایجنٹ قرار دیا جائے گا۔ اتنا بڑا اخبار بھلا غلط لکھ سکتا ہے۔ اس کی گڈول پوری طرح چوہدری دلاور کی پبلسٹی میں کام آئے گی۔"

محسن بولا "اگر تم ایسا سمجھتے ہو۔۔۔۔"

"میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں" میں نے کہا۔

"یار! میں نے تو ایڈیٹری قبول نہیں کی، مجھے کیوں سمجھا رہے ہو؟ اسے سمجھانا۔ غالب کے زخم چھلنے کو۔"

"ابھی تازہ ہے" گل نے مذاق میں بات بدلنے کی کوشش کی۔

"وہ تو زخم رہتی ہے" محسن بولا۔

رابعہ نے کہا "تم ابھی سے اتنے سیریس کیوں ہو رہے ہو؟ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"جب سب کچھ ہو جائے گا انتظار کروں میں؟ پھر سیریس ہونے میں کوئی حرج نہیں" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ ہم غالب کو سمجھائیں گے۔ ابھی اس نے صرف تجویز سے اتفاق کیا ہے کہ اخبار نکالا ہے، ممکن سب ہوا جس کا تمہیں اندیشہ ہے کہ ہوگا۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے" محسن نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ یہاں بیٹھ کے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ سو جو بات جو اصل بات تھی" میں نے کہا "پیڈرو کو فوراً چھڑانا ہے۔"

گل نے کہا "کیسے پیڈرو کو وہ کہاں جانے دیں گے۔ جانتا ہو ہم سب کے ساتھ۔ پھر ظاہر ہے، ہمارے راستے الگ ہو گئے۔"

میں نے کہا "آخر تم خود کیوں فرنٹ ہو بات کرنے ہوئے؟ تمہیں معلوم نہیں کہ طافو کہاں ہوگا؟"

"معلوم تو ہے۔ وہ سب اسی جنگل میں آس پاس چھپے بیٹھے ہیں۔ میں نے پیڈرو سے کہا تھا کہ طافو کو بلا لائے، بات ہم خود کر لیں گے" گل نے کہا "اصل بات تو ان کا مطالبہ پورا کرنے کی ہے۔"

"ان کا مطالبہ پورا کر دیا جائے گا" میں نے کہا "وہ جتنی رقم مانگتے ہیں انہیں مل جائے گی۔"

"کیسے مل جائے گی؟" محسن بولا۔

"بس مل جائے گی" میں نے چڑ کے کہا "کسی نہ کسی ذریعے سے۔ ظاہر ہے ہماری جیب میں تو ہے نہیں۔"

رابعہ نے کہا "منظر ہے کہیں گے بایوسف سے۔"

"کیسے کہیں گے؟ یہاں فون تو ہے نہیں" میں نے کہا۔

گل مسکرائی "سب کچھ ہے بھائی سکندر۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

اچانک مجھے کچھ یاد آیا "رابعہ! وہ لڑکا کہاں ہے؟ شان۔"

رابعہ کا رنگ ایک دم اڑ گیا "شان۔۔۔"

"ہاں۔ وہ اخبار فروش لڑکا" میں نے کہا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟" رابعہ نے افسردگی سے کہا۔

"کیا خدانخواستہ۔۔۔"

"ہاں۔ وہ مارا گیا غالباً، اسے گولی لگی تھی سینے پر۔ میں نے اسے گرتے بھی دیکھا تھا۔" رابعہ نے کہا "وہ تو صاف ذخمی تھا۔"

"خدا کرے وہ بچ گیا ہو" میں نے افسوس سے کہا۔

"دستگیر شاہ کے مریدوں سے بچ گیا تو اکبر خان مار دے گا۔ زندہ رہا تو وہ خود آ جائے گا۔" رابعہ نے کہا "مجھے تو اب بے چارے کا بھی خیال آیا ہے۔"

میں نے کہا "اس جیسی عورتوں کو تم بے چاری کہہ رہی ہو؟"

"مجبور تو وہ بھی تھی۔ سب کچھ حاصل تھا اسے سوائے زندگی پر اختیار کے۔" رابعہ نے کہا "تم بھی کیا کم ہو اکبر خان سے۔"

"کیا! تم میرا مقابلہ اکبر خان سے کر رہی ہو" میں نے بگڑ کر کہا۔

"تو اکبر اعظم تھا تو تم سکندر اعظم ہو۔ ایسی سنگدلی کا مظاہرہ کرو، وہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ دل توڑ دیا تم نے اس کا۔ بے چاری کی محبت آلودہ تھی۔ ابھی تو لڑنا ہے۔"

"ابھی یہ نیا قصہ ہے؟" محسن چونکا "کون تھی وہ۔۔۔؟"

رابعہ نے خوب نمک مرچ لگا کے سب بتایا لیکن میں مشتعل ہوا اور شرمندہ بھی نہیں ہوا۔ میرا دھیان ادھر تھا ہی نہیں۔ میں ایک بہانا تھا کہ صبح سے دوپہر ہونے کو آئی ہے لیکن ابھی تک ہمارے لیے رکے ہوئے ہیں۔ ہم سب یوں گپ شپ میں مگن ہو جاتے ہیں جیسے ڈاکوؤں کا ذکر نہیں "اپنے گھر کا ڈرائنگ روم ہو۔ محسن تو جیسے گل کے مل جانے کے بعد دور مفارقت کے آلام اور اندیشے تو ختم ہو چکے تھے اور یہ بات بھی باعث اطمینان تھی کہ غالب اور نادر بحفاظت نکلنے میں کامیاب رہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ سب فکر اور تمام پریشانی سے آزاد ہو گئے۔ ان ڈاکوؤں کے چنگل سے رہائی کا مسئلہ صرف پیسے سے حل ہو سکتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں سے رقم اکٹھی کر لے گا۔ رابعہ کی فرم کو ویسے بھی جاننا تھا۔ زبرخان ٹرسٹ اس کی نگرانی میں چل رہا تھا۔ اس کے اپنے بھی تھوڑے بہت وسائل تھے۔ وہ یوسف سے بھی کہہ سکتا تھا جس کا سسر کوئی بڑی خوب قسم کی چیز تھا۔ اور ان سب کے بعد پیچھے پر میں نے علی محمد بدلا کہ میرے لیے اس اعتبار سے بڑی رقم نہیں تھی کہ اب چوہدری دلاور بھی مجھ سے میری شرائط پر صلح کے لیے تیار تھا۔ رابعہ کو اس کی نوکری کا بقیہ مل گیا تھا اور مجھے اپنے ناتی قیمت کا۔ چوہدری دلاور میرے والد وزیر خان کے کارخانے کی جگہ قائم ہونے والے وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کا انتظام و انصرام میرے حوالے کرنے پر راضی تھا اور میرے اب تک ہونے والے نقصانات کی تلافی پر بھی آمادہ تھا۔ کسی اصولی مسئلے پر مفاہمت کیے بغیر ہی محسن سے پرانے قرض کا حساب لینا جائز تھا۔

جب دوپہر ہو گئی تو باقی سب کو بھی تشویش لاحق ہونے لگی۔ محسن نے کہا "زوال میں رکھ کالا ہے مس گل بانو۔"

"کر رہا تھا کالا ہے جتنا خود پیڈرو یا اس کا اقبال نامہ۔" میں نے کہا "ان کے اور طافو کے درمیان کیا مسئلہ کھڑا ہوا؟ اگر بات طول پکڑ گئی تو ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔"

میں نے تو اس طافو کے لیے پیغام بھیجا تھا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ سب کے ساتھ آ جائے اور بات کرے۔" گل نے کہا۔

"سب کے ساتھ شاید نہ آئے" محسن نے کہا۔

"اکیلا آ جائے۔ تم نے تو یہ کہا کہ پیڈرو کو بھی بٹھا لیا" رابعہ نے کہا۔

"کیا کھانا ہوگا" محسن نے کہا "قبر میں۔۔۔"

"کس نے کس کے لیے ستایا ہو؟ طافو نے پیڈرو کو یا پیڈرو نے طافو کو؟ جواب کوئی بھی کم نہیں ہے" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "مذاق مت کرو۔ گل! میرے ساتھ چلو۔ تم میں جاؤں۔"

"ہاں۔ تمہیں تو اندازہ ہے نا کہ وہ کہاں ملیں گے۔ ہم خود انہیں تلاش کر کے لاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں معاملہ کیا ہے۔ ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ وہ سامنے آنے سے ہی ڈرتے ہیں۔ انہیں تم پر تو اعتماد ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "تم اتنے بڑے جنگل میں انہیں کہاں تلاش کرو گے اور کیسے؟"

میں نے کہا "گل نے بتایا تھا کہ ایک جیپ یہاں ہر وقت تیار رہتی ہے۔"

گل نے اثبات میں سر ہلایا "جیپ تو ہے۔"

"چابیاں نہیں ہیں" میں نے کہا "کوئی بات نہیں، میں چابی کے بغیر بھی اسٹارٹ کر لوں گا۔"

رابعہ نے کہا "ایسے ہی مت جاؤ۔ میرا مطلب ہے خالی ہاتھ۔"

"پھر کیا توپ لے کر جاؤں اور توپ ہے کہاں جو لے جاؤں۔ ویسے بھی میں صلح صفائی کی بات کرنے جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

گل اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ میں ڈاک بنگلے کے پیچھے گیا۔ وہاں سے ایک راستہ درختوں کے بیچ میں سے شیب کی جانب جاتا نظر آ رہا تھا۔ گل میرے ساتھ چلتی گئی اور چند منٹ بعد میں نے پلٹ کے دیکھا تو پرانے ڈاک بنگلے کی عمارت درختوں میں چھپ گئی تھی۔

میں نے کہا "گل! تمہیں تو معلوم ہوگا، یہ لوگ اپنا مال غنیمت کہاں رکھتے ہیں؟"

گل نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

میں نے ہنس کے کہا "ڈرو نہیں۔ میرا ڈاکہ ڈالنے کا ارادہ نہیں ہے اس پر قبضہ کرنے"

گل نے کہا "۔۔۔ کرنا بھائی سکندر! میں اس سوال کا جواب نہیں دوں گی۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتی آپ سے اور سچ بول کے اپنا اعتبار گنوانا نہیں چاہتی۔"

میں نے کہا "اسلحہ بھی بہت ہوگا ان کے پاس۔"

"ڈاکو ہیں آخر۔ اسلحہ ان کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "اسلحے کی ضرورت ہمیں بھی ہے۔"

گل نے کہا "میں بات کروں گی طافو سے۔"

"ہم قیمت بھی ادا کر سکتے ہیں۔"

"اگر اسے اعتراض نہ ہوا تو وہ بلا معاوضہ دے گا۔ قیمت کیسے مانگ سکتا ہے وہ مجھ سے" گل نے کچھ غرور سے کہا۔

"تمہیں ابھی تک خوش فہمی ہے کہ تم ان کی سردار ہو؟"

"میرا حکم کوئی نہیں ٹال سکتا۔ آزما کے دیکھ لو" وہ بولی۔

www.paksociety.com

"پھر تم کہو ان سے کہ وہ خود کو قانون کے حوالے کردیں۔" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"میں ایسا کوئی حکم نہیں دوں گی جو ان کے مفاد کے خلاف ہو یا جس سے ان کو نقصان ہو۔ اسی لیے وہ اعتماد کرتے ہیں مجھ پر۔ ان کے لیے میں آج بھی ناگ منی ہوں۔ وہ کسی گل بانو کی اطاعت نہیں کریں گے۔ یہ محض ایک اتفاق تھا جس نے مجھے پھر ان کے درمیان پہنچادیا تھا۔ اس کے بعد تو یہ خود بھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ میں واقعی چاہتی ہوں کہ ان کی مدد کروں۔ جتنا عرصہ میں یہاں رہی' ان کو قائل کرتی رہی کہ وہ یہ پیشہ چھوڑ دیں۔"

"اور تمہارا کیا خیال ہے' تمہاری نصیحت نے ان کے دل پر اتنا اثر کیا کہ وہ مان گئے؟"

"نہیں۔ وہ پہلے ہی یہ سوچ رہے تھے۔ حالات بہت بدل گئے ہیں اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ آہستہ آہستہ ان کے لیے مواقع محدود ہوتے جارہے ہیں۔ تعلیم نے رائے عامہ کو متاثر کیا ہے' رائے عامہ کا اثر اخبارات پر ہے اور اخبارات پہلے سے زیادہ کھل کر پولیس کے خلاف لکھنے لگے ہیں اور انتظامیہ کی بدعنوانی پر تنقید نے قانون کے محافظوں کو صورت حال کی نزاکت کا احساس دلادیا ہے۔ وقت اور بدلے گا اور پھر عوام میں شعور بھی پیدا ہوگا کہ وہ لاقانونیت کے سیلاب کو ویرا دہن کے روکنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ یہ سب میں نے بھی اچھی طرح سمجھایا انہیں اور ان کے سامنے ایک پُرسکون' شریفانہ زندگی' ایک گھر' بیوی بچوں کے دم قدم سے ملنے والی خوشی اور طمانیت کا نقشہ کھینچا۔ خواب تو یہ لوگ بھی ہمیشہ دیکھتے ہیں ایک ایسی زندگی کے جس میں کوئی خوف اور ڈر نہ ہو' پکڑے جانے کا اور جیل کی ذلت اور صعوبت کا' کسی پولیس مقابلے میں مارے جانے کا یا تختۂ دار کا۔ خواب کون نہیں دیکھتا مگر یہ سمجھتے ہیں کہ کسی خواب کی تعبیر ان کی دسترس میں نہیں ہے۔ میں نے اور محسن نے یہاں رہ کے اور کیا کام کیا۔ یہی کہ انہیں بے یقینی سے نکالا۔ انہیں بتایا کہ وہ اپنے ماضی سے رشتے توڑ کے پھر دنیا میں جاسکتے ہیں' عزت حاصل کرسکتے ہیں اور سکون کے ساتھ آرام کی زندگی بھی بسر کرسکتے ہیں۔ ان کے سامنے راستے نہیں تھے یا انہیں نظر نہیں آتے تھے۔ ہم نے انہیں یہ راستے دکھائے۔ کون کیا کرسکتا ہے' کہاں جاسکتا ہے۔ ایک نئی زندگی کی طرف پہلا قدم اٹھانا ہی سب سے کٹھن مرحلہ ہوتا ہے' اس کے بعد تو آدمی خود آگے بڑھتا جاتا ہے..... یہ ہے وہ جیپ۔"

میں گل کی باتوں میں اتنا منہمک ہوگیا تھا کہ مسافت کا پتا ہی نہیں چلا۔ اس لڑکی نے جو دیکھنے میں سیدھی سادی اور کم عقل لگتی تھی' نازو کی تیزی طراری اور رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ کی عقل و ذہانت پر کسی طرح سے برتری حاصل کرلی تھی۔ اس کی شخصیت کا ہر پہلو اتنا بھرپور' جاندار اور گہرا تھا کہ حیرت ہوتی

تھی۔ وہ ناگ منی تھی تب بھی اس کے حوصلے کو ان کی [illegible] اور قوت عمل کی حمایت حاصل تھی۔ جب اس نے [illegible] تب بھی اس کی فطرت کی یہی نمایاں صفات سامنے آئیں [illegible] واپس زندگی کی طرف لانے کے بعد آج ایک بار پھر [illegible] دوسرے روپ میں غیر معمولی اعتماد کا مظاہرہ کررہی تھی [illegible] جدوجہد نے ڈاکوؤں کے ایک گروہ کو صراط مستقیم [illegible] اٹھانے کے لیے سوچنے پر مجبور کردیا تھا اور وہ بہت [illegible] ان بھٹکے ہوئے لوگوں کو اس گھر تک پہنچادے گی جو ان [illegible] خوابوں کی تعبیر تھا۔ نیکی کرنے کے مواقع بھی وسائل کا [illegible] کرتے۔ چھوٹی بڑی نیکیاں سب کے راستے میں [illegible] طرح بکھری پڑی رہتی ہیں۔ جو نیت اور ارادہ کرلے وہ [illegible] اٹھالے۔ گل نے تو بہت بڑا کام کرنے کا سوچا تھا۔ وہ [illegible] اپنی جگہ سے سرکانا چاہتی تھی۔

جیپ وہی پرانا ملٹری ماڈل تھی جس کی صورت [illegible] دیکھا۔ مضبوطی میں جیسی وہ بیس سال پہلے تھی [illegible] شاید اگلے بیس سال میں بھی کوئی فرق نہیں پڑسکتا تھا۔ [illegible] پر اور زمانہ امن میں' ریگستانوں میں اور جنگلوں [illegible] راستوں پر اور دلدلی علاقوں میں اپنی افادیت ثابت کرچکی [illegible] ور سپاہی اسے کہیں بھی قابل اعتماد ساتھی کے طور پر لے [illegible] وقت ایسا بدلا تھا کہ وہی سواری اب ڈاکو بھی استعمال [illegible] اور اسمگلر بھی۔

گل کی بات پر یقین کرتے ہوئے کہ اس کو وقت [illegible] کے لیے بالکل فٹ اور ریڈی رکھا جاتا تھا' میں نے [illegible] اٹھاکے سیلف کے تار الگ کیے اور سوئچ کو ایک [illegible] گھما کے آن کیا۔ یہ نہ ہوتا تو میں اس کے بھی [illegible] ایک بار غرانے کے انداز میں گھوما اور بند ہوگیا۔ دو [illegible] کرنے سے پہلے میں نے گل سے کہا "اور بیٹھ کے [illegible] جب میں کہوں۔"

گل ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی "میں یہاں ہوں۔"

میں نے پھر تار ملاکے کہا "چلو [illegible]"

انجن پھر گھوما اور ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہوگیا۔ اس [illegible] نے بتائی تھی کہ ٹیوننگ بالکل ٹھیک ہے۔ میں گل کے ساتھ [illegible] "اب بتاؤ چلے کس طرف۔"

گل نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ "وہ جو پہاڑی [illegible] پر ایک درخت نظر آرہا ہے سب سے الگ؟"

"بالکل صاف نظر آرہا ہے۔"

"یہ فرض کریں بارہ کا ہندسہ۔ اسے دونوں بازو [illegible] دایاں ہاتھ چھوٹی سوئی' بایاں ہاتھ بڑی سوئی۔ دائیں [illegible] شروع کریں تو پانچ بج کے دس منٹ بائیں جانب [illegible] پچاس منٹ والی پوزیشن پر چلیں۔"

میں نے کہا "دس کی پوزیشن؟ چھوٹی سوئی کی یا بڑی سوئی کی؟"

گل نے کہا "بڑی سوئی سے ہی منٹ کی سمت معلوم ہوسکتی [illegible]"

میں نے کلاک وائز گھومنے کا فیصلہ کیا۔ "شروع کہاں سے [illegible]"

"[illegible] درخت سے۔ وہاں پہنچنے کا راستہ میں بتاتی ہوں۔"

[illegible] جنگل کے راستوں سے اس طرح واقف تھی جیسے شہر کا لڑکا [illegible] گلیوں سے ہوتا ہے۔ گل راہنمائی نہ کرتی تو نہ جانے [illegible] جو مجھے راستہ بند ملتا یا جیپ کہیں اور نکل جاتی۔ وہ پہاڑی [illegible] مٹی کا ٹیلہ ثابت ہوئی۔ گل نے جس درخت کی [illegible] فرض اشارہ کیا تھا وہ انگریزی حرف وائی یا غلیل کی شکل کا تھا۔ اوپر [illegible] اس کا تنا بڑی صفائی سے دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔

اب جیپ کو ایک دائرے میں سفر کرنا تھا اور مجھے یہ فرض کرنا [illegible] ہے واقعی میں ایک بہت بڑی گھڑی کا ڈائل ہے جس پر نظر [illegible] آنے والے ہندسے لکھے ہوئے ہیں۔ باقی سب مجھے چشم تصور سے [illegible] دیکھنا تھا کہ بارہ کے بعد ایک کا ہندسہ کہاں ہوگا اور دو کا اس سے [illegible] کتنے فاصلے پر۔ یہ تقریباً ایک فرلانگ نصف قطر کا ڈائل بنتا تھا۔ [illegible] جماعت میں پڑھا ہوا گولڈن حساب' گولڈن الجبرا اور گولڈن [illegible] جیومیٹری میں امتحان دیتے ہی بھول گیا تھا۔ اب عام زندگی میں جمع' تفریق اور ضرب تقسیم کے علاوہ کبھی جیومیٹری کی ضرورت پڑتی تھی [illegible] کمرے کی لمبائی چوڑائی ناپنے کے لیے یا کسی دیوار کا رقبہ معلوم کرنے کے لیے۔ مدرسے میں "قطرے پانی اور سیر چھٹانک' تولہ' ماشہ" [illegible] تم اوپچے تھے۔ روز مرہ کے لین دین کی رقم گننے کے سوا بھی [illegible] اکاؤنٹس سے بھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ یہ کون کم بخت یاد رکھ سکتا [illegible] نصف قطر ایک فرلانگ کا ہو تو دائرے کا محیط کتنا ہوگا اور اس کو بارہ سے تقسیم کیا جائے تو ہر ہندسہ کتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد آئے گا۔

میری زیادہ توجہ ڈرائیونگ پر تھی اور کان گل کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ "ادھر سے موڑو' ادھر چلو' اس درخت کے پیچھے نالہ ہے' ادھر کو جاتا ہے' بائیں طرف پول ہے' دائیں جانب خاصا بڑا [illegible] جیسا پتھر ہے۔"

میں نے کہا "کیا اب تک سب ویسا ہی ہوگا؟"

"ابھی کچھ نہیں ہوگا۔ یہاں کون سا ترقیاتی کام ہورہا ہے۔ مجھے تو ایک درخت بھی کم نہیں لگا۔"

"کیا تم نے گن رکھے تھے؟" میں نے کہا "تم کو تو ہونا چاہیے تھا جنگلات میں۔"

"یہ ایک کا ہندسہ سمجھو۔" اس نے ایک جھونپڑے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں ایک فقیر کا ڈیرا تھا۔ لوگ خواہ مخواہ اس کے مرید [illegible] پھر وہ ایک مریدنی کے ساتھ بھاگ گیا۔"

"فقیر تو مطلب یہ کہ مطلب بھی یہی تھا۔ اچھا پیشہ

ہے یہ بھی۔ جب کرتے کرتے کچھ نہ رہا تو یہی کریں گے۔"

جیپ چلتی گئی۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا مگر راستہ ایسا تھا کہ لگتا تھا میں "پیرس۔ ڈکار" ریلی میں شریک ہوں جو دنیا کی مشکل ترین کاروں کی ریس ہے اور اس کا راستہ بحر ظلمات کے علاوہ ہر جگہ سے گزرتا ہے۔

ہر جگہ جہاں کسی ہندسے کا وجود فرض کیا جاسکتا تھا' گل نے رک کے کچھ دیکھا تھا اور پھر دو انگلیاں منہ میں ڈال کے سیٹی بجائی تھی۔ پہلی بار تو میں دنگ رہ گیا تھا کیونکہ میں نے کبھی لڑکیوں کو یوں سیٹی بجاتے نہیں دیکھا تھا۔ خود میں اس فن سے نابلد تھا۔ ابا مرحوم کا خیال تھا کہ یہ سب کام شہدے لفنگے کرتے ہیں۔ مثلاً گولیاں کھیلنا' پتنگ بازی' بٹیر بازی' لٹو گھمانا اور ایسے سیٹی بجانا..... اگلے وقتوں کے تھے وہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو!

گیارہ بج کے پچپن منٹ کی پوزیشن پر اچانک طافو جیپ کے سامنے آگیا۔ میں یوں چونکا جیسے آدمی نہیں' میری راہ میں کوئی آدم خور شیر آگیا ہو۔ یہ جگہ ڈاک بنگلے سے بھی ایک فرلانگ دور تھوڑا سا بائیں ہاتھ کی جانب تھی جہاں ہم نصف دائرے کا سفر طے کرکے پہنچے تھے۔ طافو کی رائفل اس کے کندھے پر تھی۔

میں نے کہا "مسٹر موتی صاحب! بالآخر ہم نے آپ کو تلاش کرلیا۔"

لیکن مسٹر موتی کی نظر گل پر رہی "یہ جیپ اس لیے نہیں تھی۔"

میں نے کہا "ضرورت پڑنے پر حرام بھی حلال ہوجاتا ہے اور اس کا استعمال تو حرام کے زمرے میں بھی نہیں آتا۔ یہ بتاؤ کہ تم آئے کیوں نہیں؟ ہم صبح سے انتظار کررہے تھے۔"

اس نے میرے سوال کو نظرانداز کردیا۔ "جیپ اسٹارٹ کیسے ہوئی؟"

"مجھ سے پوچھو نا یار۔" میں نے کہا "میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔ بغیر چابی کے بھی گاڑی چلاسکتا ہوں اور بغیر پہیوں کے بھی۔"

گل نے کہا "گاڑی میں بیٹھو۔ تمہارا دماغ خراب ہورہا ہے شاید۔ کیا تم مجھ پر بھی اعتبار نہیں کرتے۔"

"یہ کون کہتا ہے؟"

"پھر میں نے بلایا تھا تو آئے کیوں نہیں تھے؟" گل کا لہجہ واقعی ڈاکوؤں کی سردار جیسا ہوگیا تھا۔

"مجھے کوئی بلانے کے لیے نہیں آیا۔"

"میں نے پیڑو کو بھیجا تھا" گل نے کہا "تم کہیں گئے ہوگے۔"

طافو نے نفی میں سرہلایا "وہ مجھے نہیں ملا۔ میں نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ چکر دے کر نکل گیا ہوگا۔"

"چلو جانے دو اسے۔ اگر وہ چلا گیا ہے تو ہماری بلا سے۔ تم بیٹھو" گل نے کہا۔

www.paksociety.com

"نہیں ۔۔۔ وہ پولیس کو نہ لے آئے۔ وہ آدمی ایسا ہی تھا۔ اس نے کہا تھا ۔۔۔" طافو سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا کہا تھا؟"

"اس نے کہا تھا کہ طافو بیٹا! اب تمہاری خیر نہیں۔ یہ جو تمہاری ناگ منی کے ساتھی ہیں' یہ سب بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ وہ جو فرار ہو گئے' انہیں بھی جان بوجھ کے موقع دیا گیا تھا۔ ایک اخباری نمائندہ تھا' دوسری رپورٹر تھی اور ۔۔۔ اس کے بارے میں بتایا تھا کہ یہ کمانڈو ہے۔ جو اس کی ساتھی ہے وہ کوئی بہت بڑی وکیل ہے۔ یہ سچ ہے؟"

"سچ ہے پھر؟ تم کو میرے ساتھیوں سے کیا؟"

"دیکھ ناگ منی! ہم نے تو شیش ناگ کی بہن سمجھ کے اعتبار کیا تھا تجھ پر اور تجھے مہمان بنا کے رکھا تھا مگر تو نے جھوٹ بولا تھا ہم سے کہ تو نے شادی کر لی ہے ۔۔۔ وہ تیرا گھر والا تو نہیں تھا۔"

"طافو! میں تو وہی ہوں ۔۔۔"

"نہیں ناگ منی۔ تو اب گل بانو ہے اور تیری نیت ٹھیک نہیں لگتی مجھے۔ تو ہم سب کو پکڑوانا چاہتی ہے۔" طافو بولا "چیذ مد نے کہا تھا کہ ذرا بچ کے رہنا' یہ سب خدائی فوج دار ہیں۔ ساری دنیا کو ٹھیک کرنے کا ٹھیکا لے رکھا ہے انہوں نے۔ تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا اور سب اندر نظر آؤ گے۔ کہہ دے کہ یہ بھی جھوٹ ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ جھوٹ ہے سب طافو۔ میں یہاں کسی کو پکڑوانے کے لیے نہیں آئی تھی۔ مجھے تو تم لوگ یہاں لائے تھے۔"

"لیکن باقی سب لوگوں کو تو نے بلوایا تھا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ کون لوگ ہیں۔"

"وہ میرے ساتھی ہیں اور ان کی ذمے دار میں ہوں۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ تم کو کچھ نہیں ہو گا تو یہ ان سب کا وعدہ ہے۔"

میں نے کہا "چیذ مد حرامی بنا کر گیا ہے جاتے جاتے۔ گل ٹھیک کہتی ہے۔ ہم تمہیں گرفتار کرانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ تم بلاوجہ محاصرہ کیے بیٹھے ہو۔ ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ جتنی رقم کو تم اپنا حق سمجھتے ہو وہ تمہیں مل جائے گی۔ وہ قرض شیش ناگ کا ہے تو اسے ناگ منی چکائے گی مگر ناگ منی اب میری بہن گل بانو ہے' اس کا قرض میرا قرض ہے۔"

"ناگ منی! کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

گل نے کہا "تم کو اعتبار کر لینا چاہیے طافو۔"

"قسم کھا اپنے بھائی کے خون کی۔ کہ اس میں کوئی دھوکا' فریب نہیں ہے۔"

"میں قسم کھاتی ہوں شیش ناگ کے خون کی جو میرے لیے باپ کی جگہ تھا" گل نے چلا کے کہا "اس میں کوئی دھوکا نہیں۔ دھوکا تو تم نے کیا تھا میرے ساتھ کہ مہمان رکھا اور پھر قیدی بنا لیا۔

کہاں سے لا کے دیتی میں وہ رقم تم کو جس کے بارے میں مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ یہ شیش ناگ نہیں' سکندر ہے۔ یہ بھی جو مردوں کی طرح قول دے کر نبھانا جانتا ہے۔ طرح اعتبار کا فریب نہیں دیتا۔ تم کیا چیز ہو طافو' تمہارا بھی کچھ نہیں۔ ایک منٹ میں تم جیسے چار ہوں تو اس کو چت ہو جائیں لیکن ابھی تک اس نے تمہیں کچھ نہیں کہا تو کوئی وجہ ہے ۔۔۔"

"لیکن اب بھی انکار کیا تم نے تو میں تمہیں ۔۔۔ گا" میں نے اس کی شلوار کے نیفے کو پکڑ کے جھٹکے سے اوپر دائیں ہاتھ سے کمال کے اعتماد کے ساتھ جیپ کی سیٹ اس کی رائفل پہلے ہی پیچھے گر گئی تھی۔

طافو چند سیکنڈ ہکا بکا بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ ۔۔۔ ہوا تھا۔ آسمان گھوم کے اس کی ٹانگوں میں سے نکل گیا لیکن میرے سامنے آتے وقت وہ بھی اپنی حفاظت سے غافل نہیں تھا۔ اس کے ساتھی وہیں پیچھے بیٹھے تھے۔ میں تین طرف سے تین آدمی بندوق کا رخ میرے طرف کیے ہو گئے۔

میں نے ہتھیار ڈالنے کے انداز میں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ لشکر سے مقابلے پر تو رستم بھی نہیں لڑ سکتے' مروانا ہے تم نے گل "کم از کم کہا جیسے مجھے اپنی حماقت پر ندامت ہے۔

وہ میرے قریب آ گئے "اس کے لیے کیا حکم ہے سردار؟" میں سے ایک نے رائفل سیدھی کر کے کہا "مار دوں اسے؟ سات؟"

"پاگل ہوا ہے۔" طافو نے اسے گالی دی "گولی مار وورنہ اس کی چیخ آواز سن لے گی تو سیدھی ادھر لے آئے گی پولیس کو۔"

"طافو! پاگل تم ہو رہے ہو۔ کہاں ہے پولیس؟"

"مت بکو رے ہمیں ناگ منی" طافو نے کہا "انتظام نہ کیا ہوتا تو تیرا بھائی مجھے ویسے ہی پکڑ کے لے جاتا۔ اسے کیوں لے کر آئی تھی یہاں آخر؟ مار کے نیا ڈال دو اسے۔"

یہ آخری بات طافو نے اپنے ساتھیوں سے کہی تو تین طرف سے مجھ پر پل پڑے۔ ان کا ارادہ مجھے بندوقوں سے مار مار کے لہا ڈالنے کا تھا۔ وہ سخت جان اور مضبوط جوان مرد تھے جن کا مقابلہ عام آدمی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے انہیں جان بوجھ کر قریب آنے کا موقع دیا تھا۔ پہلے شخص نے مجھ پر حملہ کیا' ادھر میں نے گھوم کے اس کو اور وہ اپنے ہی زور میں جیپ کی باڈی پر جا کر ا۔ میرے ہاتھ سے اس نے دوسرے کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ تیسرے کا شانے پر پڑی اور وہ درد سے بلبلایا۔ تیسرے کو البتہ موقع ملا اور اس نے مجھ پر رائفل کا بٹ مارا۔ میں نے خود کو بچا

رائفل کا بٹ ہوا سے گزرا۔ پھر میں نے اسے بھی بٹ والا سرکا ہوا نہیں گزرا۔ پھر میں نے اسے رائفل کا پھر بھی پیچھے جھکایا اور پلٹ کے اوپر اچھال دیا۔ وہ جیپ کے دوسری طرف چت گرا۔ اتنی دیر میں پہلا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور طافو بھی صورت حال کی سنگینی دیکھتے ہوئے پیچھے سے رائفل اٹھا رہا تھا۔ میں نے اس کو بھی ٹھوکر ماری وہ اس کی گردن پر لگی اور وہ ہاتھ اوپر اٹھا کے پیچھے جیپ کے پہیے پر گرا۔ اب یہ تھی کہ رائفل لوڈ کر کے گھر میں نے اس کی کوشش کی ۔۔۔ کھینچ لیا اور تیسرے شخص پر دے مارا۔ تیسرا بیل کی طرح مجھے ٹکر مارنے آ رہا تھا۔ ان کے آپس میں ٹکرانے کا خواہ نتیجہ نکلا۔ اس کے سر ٹکرائے اور وہ کراہ کے ایک ساتھ نیچے گرے۔ گل نے میری خاصی مدد کی اور فوراً ان کی رائفلوں پر قبضہ کر لیا۔ طافو ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ جیپ کے دوسری طرف گرنے والے نے رائفل سنبھال لی۔

"ہتھیار پھینک دو ورنہ میں گولی مار دوں گا" اس نے چیخ کے کہا۔

اس نے جھپٹ کے طافو کو اپنے سامنے کر لیا "مارو۔ تمہارا نشانہ بھی آزما لیں۔ معلوم ہے نا گولی کہاں ہوتا ہے۔"

طافو ۔۔۔ بے بسی سے پھنکار رہا تھا اور میری گرفت میں مچل رہا تھا۔ گل نے اسے پیچھے سے آ کر لات لگا دی تھا۔ وہ اب گالیاں بک رہا تھا "تو نے جھوٹی قسم کھائی تھی بے غیرت۔ دھوکے باز۔ شیش ناگ کے خون کو رسوا کیا تو نے۔"

گل آگے آئی۔ اس نے طافو کے منہ پر تھپڑ مارا "مجھے اپنے بھائی کا خیال نہ ہوتا تو میں چار لاشیں چھوڑ کے جاتی۔ لیکن میں اب بھی کہتی ہوں کہ سیدھی طرح ہمارے ساتھ چل۔"

طافو نے اسے لات ماری "دفع ہو یہاں سے کنجری۔"

تب میں نے پیچھے سے سر کو گرز کی طرح استعمال کیا اور اس کے سر کے پچھلے حصے پر ضرب لگائی۔ "جان سے مار ڈالوں گا اگر تو نے گالی دی گل کو۔ میرے ہاتھ پاؤں گل کے وعدے نے باندھ دیے ہیں طافو ورنہ تمہیں تو لاش کے ٹکڑے کر دیتا میں۔ چیر کے ڈال دیتا۔"

مجھ پر فائر کرنے کی دھمکی دینے والا بھی حواس باختہ ہو گیا تھا اور اس کے ہاتھ میں رائفل کانپ رہی تھی۔ اچانک گل نے پلٹ کے ایک رائفل کو اس کے ہاتھ پر ڈنڈے کی طرح مارا۔ میں نے طافو کو پیچھے سے اٹھایا اور اوپر سے اچھال کے اس کی طرف پھینکا۔ وہ دوسری طرف گرا ابھی نہ تھا کہ میں پھر پہنچ گیا۔

گل نے رائفل کا رخ طافو کی طرف کر لیا "بس طافو! بہت ہو گیا۔ اب میں گولی مار دوں گی۔ جس نے بھی سکندر پر ہاتھ اٹھایا اس کی لاش گرے گی۔"

طافو جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا "گل ۔۔۔ تو جا۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے" اس نے بڑی مشکل سے ہانپتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو گے" گل نے کہا "باقی سب کو بھی سمجھا دو کہ آدھے گھنٹے میں ڈیرے پر پہنچ جائیں۔"

"ہمیں کچھ نہیں چاہیے ۔۔۔ تو چلی جا سب کے ساتھ۔"

"اب میں قرض چکائے بنا نہیں جا سکتی۔ جیسا میرا پہلا بھائی تھا ویسا ہی یہ بھائی ہے۔ جان بچانے کے لیے اس نے جھوٹا وعدہ نہیں کیا تھا۔ یہ میرے وعدے کا پاس رکھنے کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔ چند سال کو تو کیا چیز ہے طافو" گل نے یوں کہا کہ فخر سے میرا سر بلند ہو گیا۔

میں نے نرمی سے کہا "طافو سن سوچ! یہ سب کچھ نہ ہوتا اگر تم اعتبار کرتے۔ خیر' اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ چلو ہم سب مل کے بیٹھیں گے اور بات کریں گے مردوں کی طرح۔ اس وقت جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ سمجھو ہم کل کی طرح آج بھی مہمان ہیں اور تم میزبان ہو۔"

طافو کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے سر ہلایا اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا "میں ڈیرے پر جا رہا ہوں۔ تم سب بھی پہنچو۔ ان کو ہوش میں لانے کے بعد آ جانا ورنہ ویسے ہی اٹھا لانا۔"

"یہ ہوش میں ہیں" میں نے زمین پر پڑے ہوئے دونوں افراد کی طرف دیکھا جو اب کلبلا رہے تھے۔

جیپ کا انجن چل رہا تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سنبھالی۔ طافو پچھلی والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کی رائفل سے میگزین نکال کے گل نے واپس کر دی تھی۔ جیپ کے روانہ ہوتے ہی میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا تو طافو کا ہاتھ آہستہ آہستہ سیٹ کے نیچے بڑھ رہا تھا۔

میں نے کہا "طافو! کیسے مرد ہو تم۔ شرم آنی چاہیے تمہیں کہ تم خود کو ڈاکو کہتے ہو لیکن بزدل ہو کسی اناڑی لٹیرے کی طرح۔"

اس کا ہاتھ رک گیا۔ گل نے پلٹ کے دیکھا تو وہ پھر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ "تم پھر کچھ کرنا چاہتے تھے طافو؟"

"غالباً سیٹ کے نیچے کوئی ریوالور ہو گا۔" میں نے کہا "فرار کے وقت خالی جیپ ہی تو کام نہیں آتی' اسلحے کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اس میں پولیس کی پوری بٹالین سے مقابلے کے لیے کافی اسلحہ ہو گا۔ دو چار ریوالور ہوں گے شاید دستی بم بھی ہوں۔ میں نے تلاشی نہیں لی ورنہ سب برآمد کر لیتا۔"

چند منٹ میں جیپ ڈیرے کی شکستہ دیوار سے گزر کے احاطے میں داخل ہوئی تو رابعہ اور محسن پہلے سے برآمدے میں کھڑے تھے۔ انہوں نے جیپ کے انجن کی آواز سن لی تھی۔ میں نے جیپ بالکل ان کے سامنے روکی۔

"اب یہ ہمارے مہمان ہیں" میں نے طافو کی طرف اشارہ کیا اور جیپ سے اتر گیا "بڑی مشکل سے منا کے واپس لائے ہیں۔ یہ روٹھ گئے تھے ہم سے بلاوجہ۔"

"چیذ مد کہاں ہے؟" محسن بولا "اسے ساتھ نہیں لائے؟"

"حسب توقع اس نے اپنی فطرت کی کمینگی کا مظاہرہ کیا۔ وہ

www.paksociety.com

نکل گیا اور جاتے جاتے ہمارے خلاف بدگمانی اور نفرت کا زہر پھیلا گیا۔"

محسن نے طافو کو غور سے دیکھا۔ "لگتا ہے انھیں منا کے لانے کے لیے بھی تمھیں خاصی کوشش کرنی پڑی۔"

گل نے دوستانہ لہجے میں کہا "چلو طافو! اندر آؤ۔ غلط فہمی دوستوں میں بھی ہو جاتی ہے۔"

میں نے کہا "نیت صاف ہو تو دل بھی صاف ہو جاتے ہیں۔"

طافو کے ساتھی آدھے گھنٹے سے پہلے ہی وہاں جمع ہو گئے۔ وہ سب کچھ پریشان، خوف زدہ اور ناراض لگتے تھے۔ ان میں سے غنی کے ساتھ میں نے جو سلوک کیا تھا وہ ان کی حالت سے ظاہر تھا۔ باقی سب اس پر خفا تھے اور ان کی نظروں میں ہاگ منی کے خلاف احتجاجی جذبات کی جھلک محسوس کی جا سکتی تھی۔

تھوڑا سا وقت ان سب کے لیے دوستانہ فضا پیدا کرنے اور ان کا اعتماد بحال کرنے میں لگا۔ ہم سب کی کوشش سے بالآخر انھیں یقین آگیا کہ استاد بھڈ بولے نے بکواس کی تھی۔ ہم شریف اور پُرامن شہری ہیں۔ بے شک چوروں، ڈاکوؤں اور ملک دشمن عناصر سے رعایت کرنا ہمارا شیوہ نہیں لیکن یہاں مسئلہ ذرا مختلف ہے۔ ہاگ منی اگرچہ اپنے بھائی کا قرض ادا کرنے کی پابند نہیں مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شبش ہاگ کے پاس ان کی کمائی کا جو اندوختہ محفوظ تھا وہ ایک امانت تھی۔ یقیناً شبش ہاگ نے غلطی کی تھی کہ مرتے وقت اس کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا تھا اور یہ سب کمائی غیر قانونی ہونے کے باوجود خون پسینے کی کمائی تھی۔

میں نے کہا "نہ کسی نے ہاگ منی کو براہِ راست رکھوایا تھا اور نہ ہاگ منی نے کبھی یہ کہا تھا کہ وہ کوئی ذمے داری قبول کر رہی ہے۔ اس پر کسی کا قرض نہیں ہے لیکن اس تعلق کی بنا پر جو تمہارے اور اس کے درمیان رہا تھا، اپنے بھائی کی روح کو قرض کے بوجھ سے نجات دلانے کے لیے اور اس مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جو اس کے دوبارہ محسن کے ساتھ یہاں آنے پر ہوئی، گل بانو نے اخلاقی طور پر سب کو ان کی جمع کردہ رقم کے برابر دینے کی ذمے داری قبول کر لی ہے۔ آج میں اس کے بھائی کی جگہ ہوں۔ جس کا دعویٰ ہے میرے سامنے پیش کرے، میں سب کی پائی پائی ادا کر دوں گا۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد طافو نے کہا "حساب تو کسی کے پاس بھی لکھا ہوا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "تمہیں یاد ہوگا کہ تم نے شبش ہاگ کو کتنی رقم دی تھی۔ جو کسی کے پاس امانت رکھواتا ہے وہ اس کا زبانی حساب ضرور رکھتا ہے۔"

طافو نے اقرار میں سر ہلایا "میرے چار لاکھ تھے۔"

"پورے چار لاکھ؟" میں نے کہا۔

"پورے چار لاکھ۔ میں رقم اور تجھے نہیں رکھتا تھا … سے یاد ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ تم بولو" میں نے دوسرے کو اشارہ کیا۔

"میرے سوا تین لاکھ تھے" خلیفہ نے کہا۔

"میرے ڈھائی لاکھ۔" پوپٹ بولا۔

"میں جب دیتا تھا، پچیس ہزار دیتا تھا۔ غالباً دس دفعہ…"

"میں نے دس بار" پوپٹ نے تائید میں سر ہلایا۔

"میں دو لاکھ دے رکا تھا۔" چوتھے شخص نے کہا۔

وہ سب باری باری اپنا حساب بتاتے گئے۔ سب سے … دینے والا ساتواں شخص تھا جس نے صرف ایک لاکھ … خیال ٹھیک تھا۔ کسی نے آنکھیں بند کر کے شبش ہاگ کو حساب کتاب کے معاملے میں آزاد نہیں چھوڑ دیا تھا۔ اعتبار … زبانی ان سب کو اپنی اپنی جمع پونجی کا علم تھا۔ مجموعی رقم … پچاس ہزار ہو چکی تھی۔

ابھی ایک شخص باقی تھا اور یہ وہی شخص تھا جس … سب کے مقابلے میں خراب نظر آئی تھی۔ وہ … جھنجلا رہا تھا اور کڑھ رہا تھا۔

"تم کیوں خاموش بیٹھے ہو؟" میں نے کہا۔

"اور کیا کروں۔ میں نے بھی ایک لاکھ جمع کرائے تھے … بعد میں واپس لے لیے تھے" اس نے ندامت سے سر جھکایا۔

"کیوں لے لیے تھے؟" طافو نے برہمی سے کہا۔

"میری مرضی… اور دینے والے کی مرضی" وہ … "مجھے ضرورت تھی۔"

"ایسی کیا ضرورت تھی جس کا ہمیں بھی پتا نہیں چلا؟"

وہ تھوڑے سے تذبذب کے بعد بولا "میں نے شادی کی تھی۔"

سب ہنس پڑے۔ طافو نے کہا "اوئے شادی کی تھی تو کیا جرم کیا تھا۔ چھپانے کی کیا بات تھی۔"

خلیفہ نے کہا "کب کی تھی شادی؟"

"شبش ہاگ کی موت سے ایک مہینہ پہلے" وہ بولا۔

"ہم نے دھوم دھام سے شادی کی تھی نواب کے بچے … لاکھ اڑا دیے" طافو نے کہا۔

اس نے آہستہ سے کہا "شادی پر تو کوئی خرچ نہیں ہوا…"

پوپٹ بولا "پھر؟ ولایت سے منگوائی تھی کوئی میم؟ … کر کے۔"

وہ سب پھر ہنسے "بے حق مہر اس نے پہلے … یہ شرط تو یہی ہے۔"

"یہ کون سا مولوی ہے سالا" طافو بولا "کون مرے ہے … پہلے دینا ہو۔ بولتا کیوں نہیں، کیا بات تھی؟"

"وہ… استاد! معاملہ ہی ایسا تھا" مجرم نے اپنے سامنے … طرف معذرت طلب نظروں سے دیکھا "اس نے ایک قتل کر دیا تھا … بدلے مارے گئے تھے۔"

"بھئی شاباش ہے۔ کون سیرنی تھی وہ؟" طافو بولا۔

"کس کو مارا تھا… اب تم بتا دو" خلیفہ نے گالی بکی۔

طافو نے اسے گھورا "خلیفہ! لگام دے زبان کو۔ تیری بہن بیٹی بیٹھی ہے سامنے۔"

"معاف کرنا استاد، بُری عادت پڑ گئی ہے" خلیفہ شرمندہ ہو گیا۔

ہاگ منی نے فخریہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ "جب میں تیرے ساتھ ہوتی تھی تو کسی کی مجال نہ تھی کہ گالی بکے۔ شبش ہاگ منہ توڑ دیتا تھا گندی گالی دینے والے کا۔ ہاں تو یہ کیا قصہ ہے شادی شادی کا؟ اب تو تجھے بھی شوق ہو گیا ہے۔"

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اور آنکھوں میں ایک خواب ناک روشنی کی کرن جھلملانے لگی "اسی علاقے کی لڑکی ہے اس لیے بھی … جب تھا۔ گاؤں کا نام میں نہیں بتاؤں گا ورنہ تم خود ہی سمجھ جاؤ گے۔ بڑا مشہور کیس ہے۔ ایک تانگے والے کی بیٹی تھی نوراں۔"

پوپٹ کی آنکھیں چمکنے لگیں "اس کے باپ کا نام…"

طافو نے سختی سے کہا "منہ بند رکھ اپنا…"

صاف ظاہر تھا کہ نام سنتے ہی انھوں نے سب کچھ جان لیا تھا مگر وہ تفصیلات کا راز ہمارے سامنے افشا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ غالباً اس لیے کہ ہمارے درمیان رابعہ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ بھی موجود تھی اور یہ قانونی معاملہ تھا۔

"اس کو چودھری کا بڑا لڑکا اٹھا کے لے گیا تھا۔ وہ اس پر بہت سے بُری نظر رکھتے تھے۔ تم نے تو سنا ہوگا۔ میں نے دیکھا اسے تو حیران رہ گیا۔ بالکل اپنی نیلو جیسی ہے۔"

"اپنی نیلو" خلیفہ نے تمسخر اڑایا "بھوتنی کے… وہ اکیلی سب کی ہو گئی، اپنی نیلو!"

"ہاں کوئی بھی نہیں اس کے مقابلے میں یار۔ یہ چودھری اور اس کے سارے حرامی بچے سب سور ہیں۔ انھوں نے نوراں کو دو ہفتے رکھا۔ اندر ہی اندر اسے سب نے خراب کیا۔ اس کا باپ فریاد لے کر تھانے گیا تو تھانے دار نے اسے ٹرخا دیا۔ اس کا تانگہ گھوڑا سب غائب ہو گیا۔ جہاں اس کا مکان تھا وہاں چودھری نے ٹیوب ویل لگوا دیا۔ نوراں کا باپ دو ہفتے اندر رہا۔ پھر نوراں نے ایک رات باپ بیٹا دونوں کو مار دیا۔ ذبح کر دیا انھیں سوتے میں۔ بڑی کلہاڑی ہاتھ لگی تھی اس کے۔ اس نے باری باری ان کے گلے پر … چودھرانی اس کی ہمدرد تھی۔ وہ ان کے پاس گئی، اس نے سب کچھ بتایا کہ تمہارے شوہر اور بیٹے دونوں کا خون کر دیا ہے … ان سے کہا کہ آج موقع ملا ہے، مجھے نکال دو باہر۔ چودھرانی نے اسے باہر نکال دیا اور وہ سیدھی چلی گئی شہر۔ وہاں کوئی وکیل ہے۔ اس کے پاس گاؤں کا ہی ایک لڑکا کام کرتا تھا۔ یہ کبھی نوراں کا بڑا عاشق تھا مگر نوراں کی بات سن کے اس کا عشق تو ہو گیا ختم لیکن اس نے نوراں کو وکیل صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ وکیل نے ساری بات سنی اور اس کا کیس لے لیا۔ مقدمہ درج کرا کے اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ پھر یہ خبر سارے اخباروں میں آئی۔ نوراں نے اعترافِ جرم کر لیا تھا۔ وکیل کا زور تھا اس لیے تھانے میں تفتیش کوئی نہیں ہوئی۔ اسے جیل بھیج دیا گیا اور چالان بھی پیش ہو گیا۔ جیل میں ہی اس کے بچہ ہوا۔"

"تیرا بچہ؟" پوپٹ نے بے اختیار سوال کیا اور پھر شرمندہ ہو گیا۔

"نہیں یار۔ چھوٹے بڑے کسی چودھری کا ہوگا۔ میں تو اس وقت تک نوراں سے ملا بھی نہیں تھا۔ وکیل کے پاس جو گاؤں کا آدمی کام کرتا تھا اس سے میری جان پہچان تھی پہلے سے۔ اس نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا کہ اب کیا ہوگا؟ اس نے کہا کہ سزا تو ہوگی مگر زیادہ نہیں۔ ہو سکتا ہے جج بالکل معاف کر دے۔ مجبوری میں، غصے میں، اپنے بچانے میں قتل ہو جائے تو رعایت ملتی ہے۔ وکیل نے اس کی ضمانت کے لیے درخواست دی۔ جج نے ایک لاکھ کی ضمانت منظور کر لی۔ ایک لاکھ وہ کہاں سے لاتی اور اس کے لیے ایک لاکھ کی ضمانت دینے والا شہر میں کون تھا؟"

"وہ وکیل ضمانت دے سکتا تھا؟" پوپٹ پھر بولا۔

"وکیل؟ وہ ملزموں کی ضمانت دینے لگیں تو خود اندر ہو جائیں۔ تو چپ کر کے نہیں بیٹھ سکتا" طافو نے اسے ڈانٹا۔

"پھر یار میں نے سوچا کہ چلو ایک لاکھ اور جمع ہو جائیں گے۔ اس وقت تک میرے دل میں شادی کا کوئی خیال نہیں تھا۔ میں نے تو بس ایسے ہی سوچا تھا کہ مفت کا مال ہے، کسی مصیبت زدہ کے کام آ جائے تو اپنا کیا جاتا ہے۔ جیسے زندگی گزر رہی ہے گزر جائے گی۔ جب وہ جیل سے چھوٹی تو پھر سوال پیدا ہوا کہ اس کی زندگی کیسے گزرے گی اور کس کے ساتھ۔ وکیل نے کہا کہ بھئی میرے گھر میں تو ویسے ہی جگہ نہیں ہے اور میری بیوی بڑی بدذات ہے۔ اس وقت ایک دم میں نے فیصلہ کر لیا شادی کا اور بس۔ میری شادی ہو گئی تو وکیل نے کہا کہ اب بھاگ جاؤ۔ ضمانت ضبط ہو جانے دو۔ دوبارہ کسی کے سامنے مت آنا اور اسے گھر میں رکھنا چھپا کے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ مجبوری تھی ورنہ تمھیں ضرور بتاتا لیکن میں ڈرتا تھا کہ بات کھل جائے گی۔ میرے ایک لاکھ حرام جائیں گے۔ پولیس پھر گرفتار کر لے گی اسے اور شاید لمبی جیل ہو جائے گی۔"

طافو نے سب سے پہلے اس کی پیٹھ پر دھپ ماری "شاباش ہے، بھئی شاباش ہے تجھے۔ جوانمردوں والا کام کیا ہے تو نے۔"

"خاک مردوں والا کام کیا" خلیفہ نے نیچے تھوک دیا "تھوکا ہوا چاٹ لیا۔ چودھریوں کے حرامی…"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے طافو نے ایک جست لگا کے

www.paksociety.com

اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ اپنے غصے میں تھا کہ دوسرے مداخلت نہ کرتے تو شاید وہ خلیفہ کا گلا گھونٹ کے جان سے مار دیتا۔

"تجھے اپنا پتا ہے کنگلے۔ تیری ماں نے جنا تھا تجھے۔ کبھی اس سے پوچھ کے دیکھنا اپنے باپ کے بارے میں" طافو جو کچھ دیر پہلے خلیفہ کو گالی دینے پر ٹوک چکا تھا اب اتنا مشتعل تھا کہ اسے فری اسٹائل گالیاں بک رہا تھا۔

"تیرا دل جگرا چاہیے اس کے لیے۔ تیرے جیسے نامرد یہ کام نہیں کرسکتے بے خلیفہ۔ نوراں ہم سب کی بھابی ہے۔ اس کے خلاف تو نے ایک لفظ بھی اپنی گندی زبان سے نکالا تو یہ سب تیرا خون پی جائیں گے۔"

پہوٹے نے سرہلایا "بعد میں بھی اپنی زبان بند رکھنا خلیفہ ورنہ ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

خلیفہ کو ایسے شدید ردعمل کی توقع نہ تھی۔ وہ پٹے ہوئے کتے کی طرح زہر پی کے بیٹھ گیا۔ باقی سب نے آپس میں مشورہ کیا اور پھر اعلان کردیا کہ وہ اپنے اپنے حصے میں سے ایک لاکھ پورے کریں گے۔

میں نے کہا "تمہارا یہ جذبہ قابل قدر ہے لیکن اب ایک بات اور بتاؤ کہ زندہ کے لیے تم سب نے کیا سوچا ہے؟"

"ابھی کچھ پتا نہیں۔ اس دھندے کو چھوڑنا تو سب چاہتے ہیں مگر کسی کو اور کوئی کام نہیں آتا" طافو نے کہا۔

"ہمیں تو لاہور میں تانگا چلانے کا" نوراں کے شوہر نے کہا۔

"اب پکڑا جائے گا۔"

"پھر تو یار۔ ایک تانگے والے پر کون شک کرسکتا ہے کہ اس نے ایک لاکھ کی نقد ضمانت جمع کرائی تھی۔ نام بھی بدل لوں گا اپنا۔"

میں نے کہا "تم سب بھی بہت کچھ کرسکتے ہو۔ ہم جانے سے پہلے تم کو اپنا پتا بتا کے جائیں گے۔ وہاں اور بھی بہت لوگ ہیں جو تمہاری مدد کرسکتے ہیں۔ کسی نہ کسی کاروبار میں فٹ کردیں گے۔ ابھی تو تمہاری بات کراتا ہوں۔"

"لاہور میں کس سے؟" طافو نے کہا۔

میں نے کہا "میں دو فون نمبر دیتا ہوں۔ کل تک رقم آجائے گی۔"

"رقم کہاں آئے گی؟"

"جہاں تم کہو گے" میں نے کہا۔

"رقم کے ساتھ پولیس تو نہیں آئے گی؟"

"تم کو اعتبار کرنا چاہیے۔ ابھی تو ہم سب تمہاری قید میں ہیں" میں نے کہا۔ "ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"تمہیں مار کے ہمیں کیا ملے گا؟ ہم خود بھی مارے جائیں گے بعد میں" طافو نے کہا۔

"پندرہ لاکھ کے لیے ہم میں سے کوئی مرنا نہیں چاہے گا۔ کسی کی زندگی کی قیمت صرف چار لاکھ نہیں ہے طافو۔ اور ... لاکھ دے کر بھی ہم کنگال نہیں ہوں گے۔ ہم ... رہے ہیں تم سے ڈر کے نہیں۔ ایک تو کل ... پاس ہے لیکن دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ... کسی کی طرح ہم بھی چاہتے ہیں کہ تم یہ دھندا چھوڑ دو ... پاس اتنا ہے کہ سوچ سمجھ کے استعمال کرو تو اچھا خاصا ... ہو اور زندگی عیش و آرام سے گزار سکتے ہو۔ ... کرتے ہو مگر تمہیں صرف عیش کا موقع ملتا ہے ... سکون سے محروم ہو اور مستقل خوف کے سائے میں ... رہے ہو۔ تم ارادہ کرلو تو تم بھی شادی کرکے اپنے ... ہو۔ جیسے نوراں کے شوہر نے تانگا چلانے کا فیصلہ کرلیا ... کوئی فیصلہ کرسکتے ہو اپنے لیے۔ تم تانگا نہ چلاؤ ... چلاؤ، منڈی سے مال اٹھاؤ اور شہر میں لاکے بیچو۔ مکان ... دو۔ بے شک یہ سب تجربے کے کام ہیں مگر تجربہ بھی آجاتا ... میں ایک نہیں سیکڑوں کاروبار ہیں اور جیسا کہ میں ... وہاں ہم سب تمہاری مدد کرنے والے ہیں۔ جب تم ... ہمارے پاس آؤ گے تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ ...

طافو اٹھ کھڑا ہوا "چلو میرے ساتھ۔ میں تمہاری ... کرادیتا ہوں۔"

"کہاں جانا ہوگا؟" میں نے کہا "میرا مطلب ہے۔"

"کیا اعتبار کی بات کرتے کرتے تم خود بے اعتبار ... ہوگئے؟" طافو نے طنز سے کہا "تم کو تو مجھے ... چاہیے تم سے۔"

میں اس کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ جیپ ... ایک کچے راستے پر چلتی رہی جس پر ... اور تانگوں کے پہیوں نے متوازی لکیروں کا جال سا پھیلا ... جیپ گزرتی تھی تو پیچھے گرد کا غبار رہ جاتا تھا۔ ... ایک بیل گاڑی ملی جس کو مشکل سے رستہ ملا ... بیل اتنی تیزی سے چلتے تھے کہ گھنگرو ... اور وہ اپنی مرضی سے چل رہے تھے۔ اس کے بعد ... مشتمل بارات ملی۔ آگے رالا تھا جس میں ... شخص ڈھول کو بڑے انتہائی جذبے کے ساتھ ... نفیری والا مٹک جیسے پیٹ کو دھونکنی کی طرح استعمال کر... "دیہ میرا گھوڑی چڑھیا" کی دھن کو مسخ کرکے بجارہا تھا ... شخص متحرک بجے میں ڈانس کرنا چاہتا تھا مگر جھٹکوں کی وجہ ... بابا، نفیری والے پر گرتا تھا۔ غالباً اسے ڈھول والے نے ... تھا کہ اسے نہ بجانے لگے۔ دوسرے تانگے میں ... دولہا اپنے ہاروں میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کے ... ماتھے پر اور آنکھوں کا سرمہ ناک کی سرحد تک ... پگڑی کے شملے سے بھی صاف نہیں کرسکتا تھا۔ ... دولہا کے لواحقین تھے جو یوں چاچا کے باغیں ...

... نظر آرہے تھے۔

جب کسی گاؤں کے مضافات میں واقع تھانے کی عمارت کے سامنے ... تو میں حیران ہوا۔ ایک کمرے اور احاطے پر مشتمل اس بار تھانے کا مخصوص سرکاری رنگ دور سے بھی اپنی دہشت ... محسوس ہوتا تھا۔

طافو نے اندر گھستے ہوئے کالی مخلوق سے کہا "ملک صاحب ہیں؟"

اس نے طافو کو غور سے دیکھا اور سر ہلایا۔ پھر اشارے سے مجھے دیکھ کے سوال کیا کہ یہ اپنے ساتھ کسے پکڑ لائے ہو اور طافو نے نظروں ہی نظروں میں اسے بتادیا کہ فکر مت کرو، اپنا ہی بندہ ہے۔ مجرموں کے ساتھ پولیس کے تعاون کی ایسی عملی مثال میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

طافو نے ہی اٹھا کے کہا "سلام! بیگم ملک صاحب" اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا "آؤ جی اپنے سکندر صاحب۔"

میں اندر داخل ہوا تو مجھے ویران کمرے کی خستہ حال میز کے پیچھے ایک مثالی تھانیدار نظر آیا۔ مثالی یوں کہ اس کا چہرہ سختی اور بے رحمی کے جذبات کی عکاسی کرتا تھا۔ اس کا پیٹ کرسی کی حدود سے باہر لوا اور تنگ پھیلا ہوا تھا۔ اس کی مونچھیں "رعب دار" تھیں اور آنکھوں میں خون کی سرخی۔ نہ اس نے طافو کے سلام کا جواب دینے کی زحمت گوارا کی اور نہ مجھ سے ہاتھ ملانے کی۔ چونکہ میں تھانیداروں کی عادات و اطوار کو سمجھتا تھا اس لیے میں نے بھی نہ سلام کیا تھا اور نہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔ ابھی وہ کرسی پر بیٹھنے کے لیے اشارے کا منتظر ہی تھا کہ میں بیٹھ گیا۔

"مجھے ایک ٹیلی فون کال کرنی ہے۔"

تھانیدار نے مجھے گھورا "پہلے بتاؤ تو سہی کہ تم ہو کون؟ اسے کیا کروالی ہو؟ بات کرتے ہوئے تو بڑا کرنٹ مارتے ہو۔"

طافو نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "ملک صاحب! اپنے سکندر صاحب بہت بڑے صنعت کار ہیں لاہور کے۔ ان کی رائفل رکھی پیالا ہور ہائی کورٹ میں ہے۔"

تھانیدار سیدھا ہو کے بیٹھ گیا "اچھا جی۔ خیر سے ادھر کیسے تشریف لائے؟ لطیف صاحب کے مہمان ہو؟"

اس نے مہمان کا لفظ طنزیہ انداز میں استعمال کیا تھا۔

"کچھ بھی کہہ لو" میں نے کہا "فون کہاں ہے؟"

"فون تو خراب ہے" اس نے ناک میں انگلی گھماتے ہوئے کہا۔

اب طافو اسے اشارہ کرکے باہر لے گیا "ذرا ایک منٹ میری عرض تو سنیں جناب۔"

جب وہ واپس آئے تو تھانیدار کا موڈ بدل چکا تھا۔ اس نے میز کی دراز میں سے فون نکالا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے اسے شکریہ کہنا غیر ضروری سمجھتے ہوئے منظر کا نمبر ملایا۔ شام کے چار بجنے والے تھے۔ مجھے امید تھی کہ وہ اس وقت رابعہ کے آفس میں ہوگا۔ فاصلہ کم تھا اس لیے کال فوراً مل گئی۔

"کون بول رہا ہے؟ یوسف......"

"جی۔ آپ کون....؟"

"یوسف! میں سکندر ہوں۔ منظر صاحب ہیں؟"

یوسف نے شور مچادیا "سکندر صاحب! کہاں ہیں آپ؟ کہاں سے بات کررہے ہیں؟ منظر صاحب، منظر صاحب! سکندر صاحب کا فون ہے۔ رابعہ باجی کہاں ہیں سکندر صاحب؟ آپ ٹھیک ہیں نا؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ریسیور منظر نے چھین لیا "ابے سکندر کے گھوڑے۔ مجھے کے سالے۔" منظر نے حسب عادت سلام دعا کا آغاز کیا۔

وہ جواب آں غزل میں نے بھی بہت کچھ کہا جس کو سن کے تھانیدار کا موڈ خراب ہوگیا مگر اس سودے میں اپنے مالی مفاد کے پیش نظر اس نے صبر و ضبط سے کام لیا۔

"منظر! رابعہ غالب پہنچی کہ نہیں؟"

"پہنچ گیا یار۔ جاتا کہاں سالا۔ جیلر کی بچی اسے کہیں جانے دیتی ہے۔ انہیں دیکھ کے تو وہ شعر یاد آتا ہے۔ قفس میں ہے بلبل صیاد مسکرائے۔ بلبل سمجھ لے غالب کو۔ یہ تو الٹا معاملہ۔ تو اپنی سنا کب آرہا ہے اپنی مغویہ کے ساتھ؟" وہ گلا پھاڑ کے ہنسا۔

"بکواس بند کر۔ دیکھ میری بات سن۔"

"ابے پہلے میری سن۔ خوش خبری ہے تیرے لیے۔ آج ہی چندرہ ہوئے ہیں۔"

میں نے بے خیالی میں کہا "چندرہ کیا؟"

"ابے تیرے بھانجے۔ یار بڑا خوش قسمت ہے تو۔ چندرہ کا ماموں ہوگیا تو میری کوشش سے" وہ قہقہہ مار کے بولا "جب تیرا آخری وقت آئے گا تو کوئی درجن بھانجے بھتیجے گھر کے آنسو بہارہے ہوں گے چاروں طرف۔ آخر ان کی اولادیں بھی تو ہوں گی۔ ما تو اور کل کی۔ مقابلہ ہوگا بڑا سخت۔"

"مقابلے کے بچے! اپنی بیوی پر رحم۔"

"یار! گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شاید اسٹرکی تعداد ہے۔ ابھی تو ایک چوتھائی بھی نہیں ہوئے۔ اب میں اس کو کہتے ہیں....."

"دیکھ یار منظر! میں اس وقت لمبی بات نہیں کرسکتا۔ میں ایک پولیس اسٹیشن سے فون کررہا ہوں۔"

وہ چلانے لگا "پھر پکڑا گیا۔ ابے بھوتنی کے کیوں دشمن ہورہا ہے تو میرے چھوٹے سے خاندان کا۔ تو چاہتا ہے سب فاقے کریں، گلی گلی بھیک مانگیں۔ بچوں کی فریاد سن تجھے فاقے پھریں......"

"لاحول ولا قوۃ۔ کیسی باتیں کرتا ہے تو۔"

"ابے جب میرا کام صرف تیرے مقدمات کی پیروی رہ جائے گا اور نیتی وہ بھی نہ ہونے والی جو ہر دم تیرے پیچھے لگی رہے گی تو میں

www.paksociety.com

کہاں سے کماؤں گا۔ تو نہیں دیتا ہے کیا مجھے جو روز اندر ہو جاتا ہے کسی کیس میں۔ اب کیا پھڈا لیا ہے، کس کے ساتھ لیا ہے اور کہاں ہے؟"

میں نے کہا "پھڈا کوئی نہیں لیا۔ دراصل اس علاقے میں بھی ایک ٹیلی فون دستیاب تھا۔" میں نے کہا "میری بات سن کے شور مت کرنا۔ مجھے کچھ رقم چاہیے۔ فوراً۔"

"کتنی؟ میری جیب میں تو اس وقت ساڑھے دس روپے پڑے ہیں۔ ڈال دوں ادھر سے ریسیور میں۔ تو اُدھر سے نکال لے فوراً کے بچے۔ اس وقت بینک، ڈاک خانے سب بند ہیں۔"

میں نے کہا "کل دوپہر تک رقم کا بندوبست ہو جانا چاہیے۔ بہت زیادہ رقم نہیں ہے۔ سولہ لاکھ۔"

حسبِ توقع اُدھر سے منظر نے غل مچایا "اوہ۔ ارے یار یوسف! افسوس۔ سکندر پاگل ہو گیا۔ رابعہ، تمہاری باجی اور تمہاری باس رخصت ہو کے پاگل خانے جائے گی۔ شاید غلط سنا میں نے۔ بیٹا سکندر، یہ بتا کیا کہا تھا تم نے؟ سولہ روپے مانگے تھے نا۔"

"سولہ لاکھ۔۔۔ ایک لاکھ میں ہوتے ہیں سو ہزار۔"

"یوسف۔۔۔ مخلوف۔" منظر چلایا "جلدی سے مجھے تفصیل سناؤ ورنہ میں گیا۔ سکندر نے سولہ لاکھ روپے مانگے ہیں فوراً۔ اف ابھی تک میں بے ہوش نہیں ہوا۔ کل تک سب کو بیچ دوں گا۔ ایک لاکھ میں ایک بچہ۔ یہ ہو گئے چند لاکھ۔ بیوی کے کون دے گا مجھے ایک لاکھ؟ مفت میں بھی کوئی نہیں لے گا۔ یوسف! تمہاری بیوی۔"

میں نے ہنس کے کہا "دیکھ بلاوجہ شور مت مچا۔ تیرے پاس ہوں گے۔ کچھ ٹرسٹ کی رقم ہو گی۔"

"تو مجھے غبن کا مشورہ دے رہا ہے؟"

"ٹرسٹ بھی تو ہمارا ہے۔ عارضی ضرورت کے لیے اس میں سے قرض لیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا "اس سے بھی پورا نہ ہو تو پشاور فون کرنا۔ آصف علی کو۔۔۔ وہ پورا کر دے گا۔"

"وہ سب میں کر لوں گا مگر یار مجھے بتا کر اتنی بڑی رقم کی پولیس اسٹیشن پر کیا ضرورت پڑ گئی؟ کیا خرید لیا ہے پولیس اسٹیشن، ایس ایچ او اور حوالات میں بند قیدیوں سمیت۔"

"تمہاری ملاقات ابھی تک غالب سے نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔ مگر یوسف نے بتایا تھا کچھ۔ عجیب سی اسٹوری تھی کہ تم سب کو ڈاکو اُٹھا کے لے گئے تھے۔ پاگل ہوں گے سالے اُٹھا کے بھی کیا چیزیں لے گئے۔ راستے میں دو عدد فالتو سمجھ کے پھینک دیے۔ اس نے نام بتایا ہو گا مرزا غالب اور ڈاکو ڈر گئے ہوں گے کہ ابھی مشکل شعر کہنا شروع کر دے گا۔ اور نازو تو بے چارہ۔۔۔ مجھے تو یہ گپ لگتی ہے۔"

"انہوں نے کیا بتایا تھا تجھے؟"

"مجھے کہاں بتایا یار۔ وہ گئے سیدھے اخبار کے دفتر۔"

میں چونکا "اخبار کے دفتر کیوں؟"

"بال کٹوانے۔" منظر بولا "اب مُلا کی دوڑ مسجد تک۔ سالا کہاں جائے گا۔ غالب نے کوئی دھماکا کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ خبر دے دی ہے؟ کیا دماغ خراب ہے اس کا؟"

"وہ تو خیر ہے تم سب کا ہے۔"

میں نے کہا "منظر! اسے روکو۔ یہ خبر رُک گئی ہے۔ اسے پیچھے بھی ہو، یہ خبر نکلوا دے۔ ابھی تو کاپی بھی ختم نہیں ہوئی۔"

منظر نے کہا "اچھا کوشش کرتا ہوں مگر بات کیا ہے؟ منٹ۔۔۔ یہ یوسف کچھ کہہ رہا ہے۔ لو خود بات کرو۔"

یوسف نے کہا "سکندر صاحب! غالب اور نازو میرے گھر پہنچے تھے۔ وہاں بیٹھ کے غالب نے کوئی خبر بنائی ہے۔ کہا ہے کہ لاہور کے نواح میں فیشن ہاؤس کا پُرانا گروہ ہے اور وہ ڈکیتی کی وارداتوں کے ساتھ اغوا برائے تاوان میں ملوث ہیں۔ اس نے آئی جی پولیس، ملٹری پاکستان اور گورنر سے خصوصی اپیل کی ہے۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ تمہارے، رابعہ کے علاوہ اسی گروہ نے محسن اور گل کو بھی پکڑ رکھا ہے۔"

"یہ غلط ہے۔ غلط بتایا ہے اسے جس نے بھی بتایا ہے۔" میں نے کہا "آپ تم کسی طرح بھی غالب سے رابطہ قائم کرو اور اسے سمجھاؤ کہ یہ خبر چھپ گئی تو بہت بُرا ہو گا۔ ہم سب کل شام تک لاہور پہنچ سکتے ہیں مگر اس خبر کی اشاعت کے بعد شاید یہ نہ ہو سکے۔"

"میں ابھی جاتا ہوں، دیکھتا ہوں وہ کہاں ہے۔" یوسف نے پریشان ہو کے کہا "نازو کہہ رہی تھی۔ میری بیوی کے ساتھ جانے والی تھی۔"

"کہاں جانے والی تھی؟"

"میرا خیال ہے۔ میرے سسر کے پاس۔ آپ کو شاید نہیں معلوم وہ بڑی توپ چیز ہے۔"

"مجھے معلوم ہے یوسف مگر ہمیں اس وقت کوئی توپ کی ضرورت نہیں۔ سارا نقصان ہمارا ہو گا۔ فوراً فون کر کے غالب کو ایک شوہر کی طرح اور اسے روک دو۔ تم روکو، تمہارا حکم ہے۔ گھر سے قدم باہر نہ نکالے اور نہ اپنے آپ سے کوئی بات کرے۔ نازو کو بتا دینا کہ یہ سکندر نے کہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ جیسا آپ نے کہا ویسا ہی ہو گا۔" یوسف نے ریسیور پھر منظر کو تھما دیا۔

"یار سکندر! تو پھر سوچ لے۔ سولہ لاکھ دے کر رہا ہو گا؟ ہے تو سستے۔"

"یار، یہ کس الو کے پٹھے نے کہا ہے کہ سولہ لاکھ لے کر چھوڑ دیتے ہیں؟" میں نے بے بسی سے کہا "ہم قید میں ہیں اور رہ سکتا ہے تمہیں قید میں۔ ہم سب جا ہی باہر آ سکتے ہیں۔"

"ہو آ جاؤ نا یار۔ سولہ لاکھ بہت ہوتے ہیں۔" منظر نے روتی آواز میں کہا "ایمان سے میرا بلڈ پریشر بڑھ رہا ہے۔ اختلاج تک ہونے لگا ہے مجھے۔ اگر میں فوت ہو جاؤں تو بُرا مت ماننا۔"

"رقم ارسال کر کے فوت ہو جا۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ کل تک یہ کام کرنا ہے جیسے بھی ہو۔"

"ہو جائے گا یار، ہو جائے گا۔ اب تو نے کہا ہے تو میری کیا مجال کہ انکار کروں۔" وہ لہجہ بدل کے بولا "سولہ لاکھ کیا، سولہ کروڑ۔ بھائی تو ہوشیار ہے۔ بدجواب گھر آ جا۔ اپنی اس نورِ چشم سے کہہ کر ضمانت کرائے اور تو اپنا کھول کے کیس کر کے اس کی پیکس چلا۔ ورنہ تو میں سمجھ تجھ پر ابھی کرتا ہوں بدمعاشی، مار پیٹ اور وہ سب جو کرنا ہے۔"

"منظر! کل ہم آ جائیں گے اگر رقم مل گئی۔ شام پانچ بجے۔"

"پھر بھی کہتا ہے کہ یہ تاوان نہیں ہے۔"

"تاوان نہیں ہے یار۔ میں آ کے بتاؤں گا۔ بھلا کوئی پولیس اسٹیشن میں بیٹھ کے تاوان کی رقم منگواتا ہے؟ یہ ایک نیک مقصد کے لیے ہے۔"

منظر بولا "ابے مجھے مت چکر دے۔ یہ سب وعظ دے اور کہاں ہوتے ہیں؟ کوئی مسجد میں بیٹھ کے منگواتا ہے سولہ لاکھ اور وہ بھی نازو کی فلاح و بہبود کے لیے۔ نیک کام اور تھانے میں! اچھا یہ تو بتا کیسے پہنچائی جائے؟ کس قسم کے نوٹ ہوں، کتنے پرانے۔ بینک ڈرافٹ یا پے آرڈر چلے گا؟"

"مجھے تو رقم چاہیے۔ ایک منٹ ہولڈ کر۔" میں نے کہا اور مالزادہ کی طرف دیکھا۔ "رقم کہاں وصول کی جائے گی؟"

تھانے دار نے بے نیازی سے کہا "جہاں آپ بیٹھے مزے کی باتیں کر رہے ہو۔ دل کھول کے گپ لگا دی۔ بل تو مجھے دینا ہے۔"

میں نے کہا "اس تھانے کا ایڈریس بتاؤ۔"

اس نے بلا جھجک سب بتا دیا اور میں نے منظر کو سمجھا دیا۔ ریسیور رکھنے کے بعد میں نے طافو سے کہا "تم نے ساری گفتگو سن کے اندازہ تو کر لیا ہو گا کہ صورتِ حال خراب ہوتے ہوتے رہ گئی اور تھوڑی دیر ہو جاتی تو قابو سے باہر ہو جاتی۔"

طافو مضطرب نظر آ رہا تھا "کیا پیڈرو نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ اخبار والا ہی تھا۔"

"ہاں۔ مگر میں نے سب رکوا دیا ہے۔ اخبار چھپتا ہے رات کو، ابھی تو شام بھی نہیں ہوئی۔"

تھانے دار نے طافو کی طرف دیکھا "کبھی کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آتا۔"

میں نے کہا "جس بات کا پتا نہ ہو اس کے بارے میں بولنا بھی مکروہ ہے۔ غلط مثال دی تم نے۔ صحیح مثال میں دیتا ہوں۔ تم جب کسی کو تفتیش کے لیے لاتے ہو تو کیا قانون کے مطابق فوراً ایف آئی آر درج کرتے ہو اور اسے چوبیس گھنٹے کے اندر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیتے ہو؟ نہیں۔ تم اس شکنجے کو بنیاد بنا کے سودا کرتے ہو کہ ابھی وقت ہے، پرچا نہیں کاٹا میں نے۔ تو ایسا ہی معاملہ یہ ہے۔ ابھی معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔"

تھانے دار کا موڈ خراب ہو گیا "تم طافو کے ساتھ نہ ہوتے تو میں سمجھاتا تمہیں کہ میں ذرا مختلف قسم کا تھانے دار ہوں۔"

"میری بھی مجبوری یہ ہے کہ بیچ میں کوئی اور ہے جس کے وعدے کا پاس ہے مجھے ورنہ تم اپنا حصہ وصول کرتے وقت پکڑے جاتے تھانے دار صاحب، رنگے ہاتھوں۔ خبر نہیں، تصویر شائع ہوتی تمہاری۔ میں کل اکیلا آؤں گا یہاں۔ شام پانچ بجے۔"

"ٹھیک ہے۔ پانچ بجے حوالات خالی ملے گی۔"

میں نے ہنس کے کہا "ایک وکیل آئے گا رقم لے کر۔ اور یہ مت بھولو کہ طافو سے نہیں، اپنا حصہ تم کو مجھ سے وصول کرنا ہے۔ ذرا ہوشیار رہنا۔"

"میں بند کر دوں گا تمہیں۔ اسی وقت۔"

"کس جرم میں؟ میرا ایک دوست مجھے سولہ لاکھ دینے آ رہا ہے۔ رقم میں تھانے سے باہر بھی وصول کر سکتا ہوں اور رقم وصول کیے بغیر اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کے بھی جا سکتا ہوں۔"

اس نے وکیلی ہنسی کے ساتھ کہا "سرجی! آپ تو مذاق کا بُرا مان گئے۔"

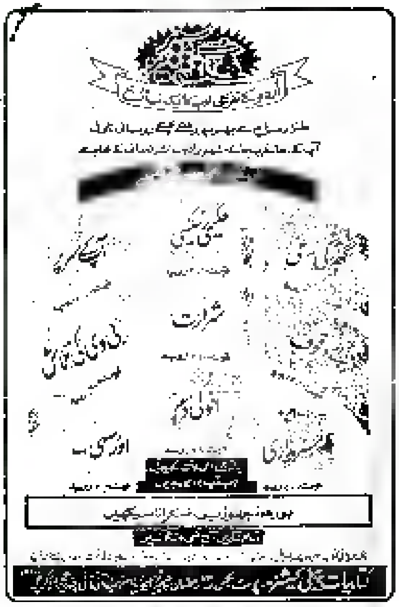

www.paksociety.com

"یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا کہ پولیس والے بھی مذاق کرسکتے ہیں۔ پہلے تو صرف تفتیش کرتے تھے۔" میں نے طنز آمیز تمسخر کے ساتھ کہا "پھر شاید وہ تفتیش ہی مذاق ہو گئی تھی۔ مذاق مذاق میں بندے کی کھال میں بھس بھروا کے اسے ننگا کرکے الٹا لٹکا دیا اور مذاق ہی مذاق میں چھتر مار مار کے کسی ناکردہ گناہ کا اعتراف کرا لیا۔"

تھانے دار کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ "یہ سب تم جیسے پڑھے لکھے لوگوں کا اور کیا کہتے ہیں انہیں۔ دانشور۔ دانشوروں کا اور اخبار والوں کا قصور ہے کہ انہوں نے ہمیں ایسا بنا دیا ہے جیسے ہم انسان ہی نہیں، سب شیطان ہیں۔ بیڑہ غرق ہو ان اخبار والوں کا۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں اسے اسٹوری کہتے ہیں۔ اچھائی کسی کو نظر آتی ہی نہیں۔ برائی ایک انچ کی ہو تو اسے ایک میل کی بنا دیتے ہیں۔ میرا بس چلے نا تو میں سارے اخبار بند کرا دوں۔ سب اخبار والوں کو سڑک کوٹنے پر لگا دوں۔ خبریں سننے کے لیے ریڈیو ہے، ٹی وی ہے اور ہم ہیں۔ جو پوچھنا ہے ہم سے پوچھ لو۔"

میں نے ہنس کے کہا "خدا ابھی گنجے کو ناخن نہیں دیتا۔"

وہ گنجا بھی تھا۔ اس کا علم مجھے اچانک اس وقت ہوا جب ٹوپی اتار کے اس نے اپنے سر کی شبنم کو ہوا دی۔ چنانچہ اس نے مزید برا بھلا اور میز پر مکا مار کے وہ ارشادات عالیہ کا نیا باب شروع کرنے ہی والا تھا کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ بداخلاقی میرے مزاج میں نہیں مگر اخلاق میں کسی بردہ فروش، غدار وطن یا دشمن انسانیت کے ساتھ شرافت سے پیش نہیں آسکتا۔ میں نے تھانے دار کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ کو بھی نظرانداز کیا اور مصافحے کے بغیر باہر آ گیا۔

طافو نے شاید ایک منٹ میں تھانے دار سے معاملہ پکا کیا۔ اسے ایڈز میں "تعاون" کا یقین دلایا اور میری بدتمیزی کی معافی مانگی۔ جب وہ باہر آیا تو اس کی صورت ناگواری کے جذبات کی بدصورت تصویر بنی ہوئی تھی۔

"تم نہیں جانتے اس تھانے دار کو۔" عادت کے مطابق اس نے جملے میں ایک گالی کو یوں شامل کیا جیسے کچھ لوگ کھانے میں اچار یا سلاد کو رکھتے ہیں۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں ہر تھانے دار کو جانتا ہوں۔ وہ صرف تھانے دار ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ باقی سب اسے تم جیسے لوگ بناتے ہیں۔ وہ پیدائشی طور پر حرام خور، راشی اور سفاک نہیں ہوتا۔ وہ تو پولیس فورس میں شامل ہوتے وقت بھی عام آدمی ہوتا ہے مگر پھر اس کا واسطہ پڑتا ہے تم جیسے لوگوں سے جو اسے خراب کر دیتے ہیں۔ مجرموں سے اور قانون شکن عناصر سے۔ خوشامدی اور مطلب پرست، بدکردار اور بے ضمیر لوگ اسے آہستہ آہستہ فرض شناسی کا دوسرا مفہوم سمجھا دیتے ہیں۔ اسے احساس دلا دیتے ہیں کہ وہ جس قانون کی محافظت کا ذمے دار ہے وہ تو محض ایک کاغذی کتاب کی بے معنی تحریر ہے۔ اصل اختیار کا مالک تو وہ خود ہے جو قانون کو توڑ بھی سکتا ہے، خرید بھی سکتا ہے، مفلوج اور مسخ بھی کرسکتا ہے۔"

میرا لیکچر طافو کو بھی برا لگ رہا تھا اور اس کے لیے یہ بھی آفریدی اور نکتہ سنجی محض بکواس تھی چنانچہ کان تو اس نے بند کر لیے تھے، میری زبان بند کرنے کے لیے اس نے … کے پانی ملانا شروع کیا اور ایک درخت کے سائے … لگا۔ مجھے بھی احساس ہوا کہ میں بھینس کے آگے بین بجا رہا … پرانے لوگوں نے تجربے کی بنا پر ہر موقعے کے لیے … کی اچھی خاصی لغت بنا دی ہے۔ اب کوئی استعمال نہ … کرکے دیکھ لے۔ بھینس اور بین کے مطلوم … المثل۔ اندھے کے آگے روئے اپنی آنکھیں … اسے لطیف پیرائے میں منظوم کردیا۔ … پر کلام … بے اثر۔

واپسی پر میں نے رابعہ اور گل کو مبارک باد … MISSION IMPOSSIBLE کی کامیابی … کچھ ایسا ہی اعلان طافو نے بھی کیا ہوگا کہ چلو بھئی … کرو، اپنا اپنا حصہ لو اور اپنی اپنی راہ لو۔ … ظاہر ہے … جذبات کی نوعیت میں قطبین کا فرق تھا۔ ہم خوش تھے کہ … دن کی بات ہے پھر وہی لاہور ہوگا، وہی اس کی … کے حسین لمحوں سے آراستہ اور مستقبل کے خوابوں کی … منور۔ یاران خوش خصال و خوبان خوش ادا کی … شب و روز اور وہی پرانی بزم آرائی سے رزم آرائی … سارے مرحلے ہوں گے اور ہم ہوں گے۔ جیسے ایک وقت … اور یہ خیال بنائے رکھنے والے ڈاکو افسردہ تھے کہ … کا سفر بالآخر تمام ہوا اور اب اس چوک سے ہر راہ الگ ہو گی۔ برے تھے وہ سارے جہاں کے لیے لیکن ایک دوسرے کے لیے اچھے تھے۔ دکھ سکھ میں ساتھ رہنے والے، عہد وفا کا احترام کرنے والے اور آپس کے اتحاد کو کسی مقدس عقیدے کی طرح ماننے والے اور اس پر قائم رہنے والے۔ شاید انہیں بہت دکھ ہوگا۔ کون کیا تھا اور کیا بن گیا۔ زندگی کے کون سے پیچ … پر بھٹکا ہوا اب اس گھر تک پہنچا تھا جو شیش ناگ کا زیر اثر … اپنے اس گھر کو بھول گیا تھا جہاں اس کو خون کے رشتوں نے … رکھا تھا۔ شیش ناگ مر چکا تھا۔ اور بھی نہ جانے کتنے تھے جو … زندگی کی تاریک راہوں میں مارے گئے تھے۔ کسی کی لاش کو کفن بھی نہ ملا، صرف رسوائی کی تشہیر ہی … نے گمنام مٹی کے لیے نشان مدفن میں دبا دیا اور بھول گئے۔ آج وہ جو محض سلسلۂ اتفاقات کے سبب قانون کے شکنجے … ناکام سے یا تحفظ وار سے محفوظ رہے تھے، خود مجبور ہو گئے … اجنبی زندگی کے نا آشنا راستوں پر تنہا ہو جائیں۔

رفتہ رفتہ ان کی اداسی کا تحمل بھی اس کیفیت میں … جیسے حالات کے جبر سے مفاہمت کا نام بھی دیا جا سکتا تھا …

… پہلے اپنا ہر رفتہ کو الوداع کہنے کے لیے آخری محفل کا اہتمام کیا۔ طافو کے ہرکارے شہر گئے اور ہیرا منڈی سے وہ چہرے … لائے جن کے حسن و شباب اور غمزہ و ادا کی آب و تاب نے … کے دل اور بینک اکاؤنٹ لوٹ لیے تھے۔ انہوں نے … ادا کی اور ایک رات کے لیے جنگل میں منگل … کر دکھایا۔

میرے لیے یہ بہت انوکھا اور کسی حد تک دلچسپ تجربہ بھی تھا … کے لیے جو تماشا تھا وہ احساس کے لیے درس عبرت … ایک طرف وہ دولت تھی جو ان ڈاکوؤں نے طاقت اور دہشت … بے سوچے سمجھے بغیر کہ مال غنیمت کسی کی ساری عمر کی اندوختہ ہے یا کسی کے مستقبل کی روشنی۔ اس سے کسی کو … نئی زندگی ملنے والی تھی، یہ کسی کی لیے خوش … کی ضمانت تھی اور کاروبار یا ملازمت کے حصول کا … سہارا تھی یا کسی بیٹی کے لیے باپ کے گھر سے رخصت ہو کے اپنا گھر آباد کرنے کی امید تھی۔ دوسری طرف وہ عورتیں تھیں جن کے جسم کی خوب صورتی، شباب کی شوخی اور دلربائی کی … برائے فروخت تھی اور ہر رات پھر سجا سنوار کے نئے خریداروں کے سامنے پیش کر دی جاتی تھی۔ ایک کم ظرف وہ کہتے … لوگ ہوتے ہیں جو کسی مجبوری سے بھی اس لیے شادی نہیں … کر چیزوں کی طرح انہیں سیکنڈ ہینڈ عورت قبول نہیں ہوتی۔ دوسری طرف وہ ذلیل ہوتے ہیں جو طوائف کو بھی عورت … قبول کر لیتے ہیں۔

ڈاکوؤں نے رات بھر شراب پی اور خوب غل غپاڑہ کیا۔ گل اور رابعہ تو اس محفل میں شریک ہی نہیں ہوئی تھیں اور ان کی … یہ ہوئی کہ ہم بھی اس لہو و لعب سے دور … رہنے کی کوشش … محسن کو اور محسن نے مجھے مجبور کیا کہ ہم … عبرت پکڑنے کے لیے بحیثیت تماشائی شریک ہوں گے … کس ساد کو۔ نازو ہوتی تو غالب کی ایک … صاف انکار کر دیتی کہ آنکھیں توڑ کے ڈال دوں کی چارپائی پر … رابعہ اور گل نہ صلح پسند اور صابر و شاکر قسم کی خواتین … ان کا یہ اعتبار بھی تھا کہ ہم واقعی برائی کو دیکھ کر برائی سے … اور صلاحیت رکھتے ہیں۔

… ہوا یوں کہ میں اور محسن قطعی غیر جانبدار تماشائی اور عبرت پکڑنے کی بات بالکل بھول گئے۔ ایک مرحلہ … آیا جب مس بجلی گجرات والی اور موتی جان نے ایک … گیت کی لے پر رقص شروع کیا تو جملہ حاضرین کے … تالیوں سے … اس کے بعد محسن نے وہ … نوٹ ڈال کے سیٹی بجائی اور میں نے نعرہ لگا کے کہا … موتی جان واقعی ایک گوہر یکتا تھی مگر اس کوچے میں جہاں … کے مول بکتے ہیں۔ مس بجلی بھی واقعی شرارے بھرے ہوئے تھے اور ان کا رقص … رقص شرر ثابت ہوا۔ پہلے شراب کے نشے میں پوچھ ان کے ساتھ ناچنے لگا۔ اسے ناچنا نہیں آتا تھا اور نشے کے باعث ویسے بھی اسے اپنی حرکات و سکنات پر قابو نہیں تھا۔ اس کا ڈانس دیکھ کر حاضرین کی آنکھوں میں ہنستے ہنستے آنسو آ گئے۔ خود مس بجلی، موتی جان اور ان کا سارا طائفہ ہنسی میں شریک تھا اور سب بہت خوش تھے۔ ایک تو ڈاکو بے حد "شریف" ثابت ہوئے تھے اور کسی نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے دست درازی نہیں کی تھی۔ پھر انہیں دل کھول کر داد دی تھی۔ شاعر کے لیے واہ واہ اور داد ہوتی ہے تو طوائف کے لیے وہ نوٹ جو اس پر نچھاور ہوتے ہیں۔

ایک بار محسن نے سیٹی بجاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولا "کیا بات ہے خان صاحب! مال نہیں ہے گرہ میں۔ مفت کا تماشا دیکھنے آگئے ہو۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "مال ان پر لٹانے کے لیے نہیں ہے۔"

محسن نے جیب میں سے پانچ پانچ کے نوٹ نکال کے اور مجھ پر وار کے پھینکنے شروع کیے تو ڈاکو بہت محظوظ ہوئے۔ انہیں قطعی امید نہ تھی کہ ہم جیسے "شرفا" بھی اس تماشے میں اس حد تک شریک ہو سکتے ہیں۔ ساری بات وقت اور ماحول کی تھی۔ وہاں ہم کمرے میں منہ لپیٹ کر سو بھی نہیں سکتے تھے اور آنکھیں یا کان بند کرنا بھی محال تھا۔ رابعہ اور گل کا مسئلہ مختلف تھا۔ وہ شرم و حیا کی پتلیاں اس محفل سے دور رہنے پر مجبور تھیں۔ محسن کے بعد میں نے بھی مال مفت کو لٹانے میں حرج نہ سمجھا لیکن بہت جلد ہماری جیبیں خالی ہو گئیں۔ ڈاکوؤں کی طرف سے دولت کی بارش صبح تک جاری رہی۔

مس بجلی اور موتی جان نے آخری آئٹم پیش کیا تو فرط جذبات میں محسن ان کے ساتھ رقص کرنے پر آمادہ تھا مگر میں نے اسے شرمندہ کیا۔

"کیوں اپنے آباؤ اجداد کی ارواح کو رسوا کرتے ہو شیروانی صاحب۔"

"کیمر خاں صاحب! ہمیں کم رسوا کیا آباؤ اجداد نے۔ اچھی بھلی سلطنت گنوا دی۔" محسن بیٹھ گیا "اور کیا پتا جوانی میں وہ کیا کرتے رہے تھے۔ پھر ظلمات میں گھوڑے دوڑانے کے علاوہ۔"

میں نے کہا "وہ لہو و لعب سے کوسوں دور تھے۔ سلطنت آنی جانی چیز ہے۔ شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر۔ یہی ان کا شیوہ تھا۔"

"اچھا؟ پھر تو ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ شمشیر و سناں سے پہلے یہ سب کرتے تو غلط ہوتا۔ بعد میں تو گویا اجازت ہے۔"

"اجازت کے بچے! اپنی اوقات مت بھول۔ میں سب جانتا ہوں

www.paksociety.com

کا گُل کو کہ آپ کیا گُل کھلا رہے تھے۔"

"میں بھی لفظ بہ لفظ رابعہ کو آپ کی عرمستی کا حال سناؤں گا۔"

بعد میں ایک معاہدے کے تحت ہم نے گل اور رابعہ کے سامنے ایک ہی بیان دیا کہ سوائے عبرت پکڑنے کے ہم نے رات بھر کچھ نہیں کیا اور جو کچھ ہوتا رہا اس پر سوبار "ہزار بار لعنت" سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ ایکٹنگ ہم دونوں اچھے تھے یا رابعہ اور گل عام عورتوں کی طرح سب جان کے بھی انجان بنی رہنے والی فراخ دل مخلوق تھیں کہ انہوں نے ہماری معصومیت کا بھرم رکھا اور یہ بھی انکشاف نہیں کیا کہ وہ چھپ کر سب دیکھتی رہی تھیں۔ یہ بات رابعہ نے بہت عرصے بعد بتائی جب میں اسے بھول بھی چکا تھا۔

صبح کے آثار نمودار ہوئے تو محفل برخاست ہوئی۔ طافو نے کہا "چلو بھئی اٹھاؤ اپنا تان طنبورہ۔ اذان کا وقت ہے۔"

ناچنے گانے والیوں نے یا ان کے لواحقین نے زیادہ حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔ شاید ایسا بھی ہوتا ہوگا۔ رات بھر شراب و شباب کے نشے میں ڈوبے رہنے والے صبح سربسجود ہو کے خدا سے کہتے ہوں گے کہ اس بندے کے یہ گناہ معاف کر۔ تو بڑا غفور الرحیم ہے۔ اگلی رات یا اگلی محفل تک وہ توبہ بھی بھول جاتے ہوں گے اور اپنا وعدہ بھی۔

ڈانسرز تھکے ہارے سازندے اور ان کے ملازم آرام کرنے چلے گئے تو رنگِ محفل بدل گیا۔ سب اچانک خاموش اور سنجیدہ ہو گئے۔ اس جنگل میں آواز اذان کہیں سے بھی نہیں آ رہی تھی مگر ایک اندر کی آواز تھی جس سے کسی مفر نہ تھا۔ جو ہم بھی ایسے ہی سُنتے تھے جیسے ڈاکو من موجی نے سُنی۔ کھلے احاطے میں وہ سب حلقہ بنائے منتظر تھے کہ طافو اٹھے تو باقی سب بھی اٹھیں۔

محسن نے مجھے کہنی مار کے آنکھ سے اشارہ کیا مگر میں تجسس میں جلا ہو گیا تھا اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اختتام کس کیسے آتا ہے۔ جنہیں سب کی آنکھیں بوجھل تھیں۔ شراب کے نشے نے ہیجان انگیز رقص نے اور طوائفوں کے نرم "معنی خیز اشاروں" نے سب کے جذبات میں آگ سی لگادی تھی۔ وہ سب آتش فشاں کی طرح اندر ہی اندر پک رہے تھے۔

طافو نے اچانک کہا "پوپٹ پترا میرا اکتارا کہاں ہے؟"

پوپٹ لپک کے اٹھا "ابھی لایا استادجی۔"

وہ واپس لوٹ کے آیا اور اس نے ساز طافو کو تھمادیا۔ طافو کچھ دیر اس پر ہاتھ پھیرتا رہا پھر اس نے آہستہ سے ساز کے تاروں کو چھیڑا اور کھنکار کے گلا صاف کیا۔

"لو بھئی جوانو! دن چڑھنے والا ہے۔ کل کے دن کا بھروسہ نہیں" اس نے کسی کی طرف دیکھے بغیر کہا "ادھر کس نے پھر ملنا ہے۔ ملیں گے حشر والے دن تو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ سوہنا رب تم سب کو جہاں رکھے خوش رکھے اور اپنی امان میں رکھے۔ ... سے اس کی چھوٹ کہ ہم ابھی جیتے ہیں۔ کسی کی کوئی ... ہم جیل کے باہر ہیں لیکن بندے کو اشارہ سمجھنا چاہیے ... مہلت دی تھی۔ ساری زندگی کا لائسنس نہیں دیا ... جوان تھا تیجس ناگ۔ اس کی مہلت ختم ہوگئی ... سے فائدہ اٹھالیا۔ تم نے دیکھا اب وہ ناگ ... ہے۔ سوچتے رب نے کیسا اس کی زندگی کو بدلا۔ ہم سمجھے تھا وہ تو بندہ بن جائے گا اور ہم بدبخت نہیں ... پھر رب راکھا۔ کتنے عرصے بعد ناگ منی پھر آئی اور ... سیدھا راستہ دکھادیا۔ یہ بھی بتادیا کہ اس پر چل سکے ... سکتی ہے تو ہم سب بھی چل سکتے ہیں۔ کیا زور تھا ... دیکھو نگی بانو نے سب کو حق دلوادیا۔ سوہنا رب ... دے جو بھی وہ مانگے۔ لو بھئی جوانو! میں کوئی مولوی ... کروں۔ طافو تو بڑا گنہگار بندہ ہے۔ تم بے شک ... لیکن من موجی کو یاد رکھنا۔ آج من موجی کو آخری بار ... طرح دیکھ لو کہ وہ کیسا جوائی تھا..."

وہ شراب کے نشے سے اور جذبات سے مغلوب ... باتیں بے ربط تھیں اور وہ بڑی مشکل سے اپنا مافی الضمیر ... تھا۔ وہ کوئی مقرر تھا نہ واعظ نہ سیاسی لیڈر اور ... زبان میں اس نے وہی کہا جو اس کے دل میں تھا۔ ... خوب صورت الفاظ کا فصاحت و بلاغت کا اور حسنِ ... نہ تھا۔ دل کی بات تھی دلوں میں اتر گئی۔

طافو من موجی کے جن ساتھی "ہم پیشہ" "ہم راز" ... ماتحت "دکھ سکھ" موت اور زندگی کی ہر گھڑی میں ... رہنے والے "اس کا حکم ماننے والے اور اس کے ... خاندان کی طرح رہنے والے" سب شراب کے ... بوجھل دل و دماغ کے ساتھ خاموش بیٹھے اس کی باتیں ... سن رہے تھے جیسے روحانی مرید اپنے پیر کے ... فرمودات کو ایک پُرتقدس انہماک کے ساتھ سنتے ہیں ... تھے "بداطوار تھے" قانون کے مجرم تھے اور ملعون ... انسان بھی تھے اور اپنی بنیادی حسیات سے محروم نہیں ... میں نے اور محسن نے دیکھا کہ خلیفہ رو رہا ہے اور ... آنسو بہنے لگے ہیں۔ ایک عمر کی رفاقت کے بعد ... آتا ہے۔ کبھی کسی ایئرپورٹ پر "کبھی ایسے جنگل میں ... پر۔ راستوں کا ایسٹ کے لیے الگ ہونا اور موت ... تجربے کے دو روپ ہیں۔

من موجی نے اپنی آواز اٹھائی اور صبح کے سکوت ... صرف میں نے ہی نہیں "نگی جنگل کے ہر درخت ... ساتھ کھڑا تھا۔ پرانے ڈاک بنگلے کے در و دیوار ... فضا نے بھی جو برسوں سے ان ڈاکوؤں کے ہر لمحے کی ... ہوں گی اور نئی صورتیں مگر تم یہ چہرے پھر ... نہ ہوں گی ایسی آواز کوئی نہ ہوگی۔

... کے بول گائے ان کا اُردو ترجمہ ... پنجابی کے جو اشعار تھے اور بول ... طافو نے ... تھا ہوگا۔

پتے سب گرجائیں گے
اس بار خزاں میں ہم
کیا جانے کدھر جائیں گے

اس کی پُرسوز آواز چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہوئی اور پھر ابھری۔

نئے پھول بھی کھل جائیں گے
آئے گی بہار مگر
ہم گھر نہیں آئیں گے

صبح کا افق سے جھانکتا اُجالا "جنگل کا سنسناتا دھندلکا" فضا اور ہوا سب دم بخود آواز تھے۔

مجھے اور نہیں کہنا
جب عید کا دن آئے
گلے یاروں سے مل لینا

آنسو اب من موجی کے رخساروں پر لکیریں بنانے لگے تھے لیکن اس کی درد بھری آواز کا جادو ہر آنکھ کو نم کر رہا تھا۔

کیا لطف ہے جینے میں
ہم تم سے جدا ہوئے ہیں
ساون کے مہینے میں

وہ ایک بے خودی کی کیفیت میں اٹھا اور آہستہ آہستہ ہم سب کے درمیان رقص کرنے لگا۔ اس کی آواز میں دل کا سارا درد آگیا تھا۔

مٹی کا نہیں ہے ٹھکانا
اللہ تم سے کہتے ہم
لو پھول چڑھا جانا

ان بے ربط سے سارے بولوں میں جذبات کا خلوص تھا اور سچائی تھی۔ زندگی کے سات رنگ تھے جو موسیقی کے سات سُروں سے ظاہر ہوتے تھے جیسے منشور سے گزرنے والی سورج کی کرن کی رنگت کے سارے رنگ۔ یہ کوئی بہت بلند پایہ "ادبی حیثیت کی" شاعری نہیں تھی۔ اس میں صوفیانہ کلام کے الہامی اسرار و رموز بھی نہیں تھے۔ یہ ہم جیسے ملنے بچھڑنے "پیدا ہو کے زندگی کے" رشتے ساتھ جینے اور مرنے کے دل میں یاد کی طرح رہنے والے ماضی کی انتظار اور لاحاصل کی کہانی تھی۔ مجھے نہیں معلوم "وہ کب تک" یہ باتیں کرتا رہا اور روتا رہا کیونکہ خود میں اس کے ساتھ رونے لگا تھا۔ میرے ساتھ محسن رو رہا تھا اور طافو من موجی کے سنگی جن کا مذہب تھے۔ نئی صبح کی ہوا "مسرت کی پہلی کرن" قطرۂ شبنم سب کسی کو نہیں پتا تھا کہ کیا ہوتا ہے جب گیت کا ایک بول "ایک نغمہ ساز" ایک یاد کی نعش یا ایک خیال کا نقش طافو من موجی جیسے ڈاکو اور میرے جیسے شخص کے جذبات پر ایک ہی طرح اثر کرتا ہے اور ایک درد مشترک کا احساس اشکوں میں ڈھل جاتا ہے۔ آنسو تو ایک جیسے ہوتے ہیں۔

اچانک نغمہ ساز خاموش ہو گیا "رقص ختم ہو گیا۔ کائنات جیسے مجسمہ ہو کے خلا میں ٹھہر گئی۔ میں نے مشرق کے روشن افق کو دیکھا۔ "کل کا سورج کون کہاں دیکھے گا؟" میں نے ایک ایک ڈاکو کی صورت کو دیکھ کے سوچا۔ وہ سب خاموش اور ساکت بیٹھے تھے "ان سب کے آنسو تھم گئے تھے۔ من موجی اپنے ساز کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے محسن کے اشارے پر پیچھے دیکھا۔ رابعہ اور گل برآمدے کے ستون سے لگی کھڑی تھیں۔

"اچھا بھئی جوانو! دن چڑھ گیا" من موجی نے لہجہ بدل کے اور مسکرا کے کہا "چلو جاکے سو جاؤ۔ رات تک تیاری کرلو چلنے کی۔"

پوپٹ نے آنسو پونچھ کے کہا "استادجی..."

"ہاں پتر۔ سوہنا رب جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے" طافو نے اس کے دل کی بات کو الفاظ میں ادا ہونے سے پہلے سمجھ لیا "اس کی یہی مرضی ہے۔"

خلیفہ نے کہا "کہا سنا معاف کرانا ہوو۔"

من موجی ہنس پڑا "معافی دے گھوڑے۔ کس بات کی معافی؟ آخر کیا کیا ہے تو نے؟ اوئے کسی نے بھی کسی سے معافی نہیں مانگی۔ جن یار تھے ہم سارے۔ کبھی ملے کسی کے ساتھ برائی کی ہوتی تو وہ جن کہاں ہوتا۔ دشمن ہوتا۔"

پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے اپنے ساز کو گھٹنے پر مار کے اس کے دو ٹکڑے کردیے "پوپٹ پترا! اس لاش کو دفنا دینا کہیں مگر مجھے مت بتانا۔ سمجھ آگئی ہے نا میری بات؟ یہ بھی اپنا سنگی تھا۔"

اس نے ساز کے دونوں ٹکڑے نیچے پھینکے اور پلٹ کے تیز تیز قدم چلتا برآمدے سے گزرتا ہوا اپنے کمرے میں غائب ہو گیا۔ پوپٹ نے ساز کے ٹکڑوں کو ایسے احترام اور عقیدت سے اٹھایا جیسے وہ سچ مچ کسی لاش کے اعضا ہوں۔ اس نے انہیں چوما اور آنکھوں سے لگایا۔

محسن نے مجھے ٹھوکا دیا "چل یار۔ تماشا ختم ہو گیا۔"

میں نے ایک آہ بھری "ہاں یار۔ عجب تماشا تھا۔ پہلے نہ دیکھا نہ سُنا۔"

مس نگی اور سوہنی جان کا خیال بھی پرانے خواب کی طرح رہ گیا تھا۔ وہ وقت بہت پیچھے رہ گیا تھا جب میں اور محسن ان کے رقصِ شرربار میں سب کے ساتھ پروانوں کی طرح جل رہے تھے۔ خوشی کے جذبات کا اثر کتنا وقتی اور سطحی ہوتا ہے "درد روح میں کتنی گہرائی تک اترتا ہے" یہ تجربہ کسی ثبوت کا محتاج نہیں تھا۔ جب میں اور محسن دل گرفتہ لوٹے تو ڈاکو منتشر ہو رہے تھے۔ پوپٹ

www.paksociety.com

اپنے استاد کی ہدایت کے مطابق من موہنی کے گیتوں کی تدفین کے لیے جنگل کی طرف کہیں پیش کیا تھا۔

رابعہ اور گل کی آنکھیں بھی اب خشک تھیں مگر صاف لگتا تھا کہ وہ بھی روتی رہی ہیں۔ ایسا جانے کسی کمرے میں مس بجلی گجرات والی اور موتی جان سوئی پڑی تھیں۔ جذبات میں جو آگ انہوں نے اپنے حسن و شباب کی جلوہ نمائی سے لگائی تھی وہ صبح ہونے سے پہلے ہی ان آنسوؤں نے بجھا دی تھی جو من موہنی کی آواز کے ورود کا ثمر تھے۔ شہر کی وہ مشہور رقاصائیں ہار گئی تھیں جن کو اپنی آواز کے جادو پر اور اعضا کی شاعری پر غرور تھا کہ وہ چاہیں تو محفل کو دیوانہ کر دیں، پتھر کو موم کر دیں اور برف کے صحرا میں آگ کا دریا روشن کر دیں۔ طافو جیت گیا تھا۔

رابعہ نے کہا "بڑا درد ہے اس کی آواز میں۔"

محسن نے کہا "ان کے دل ابھی تک درد شناس ہیں، پتھر نہیں ہوئے۔"

"شاید دل کبھی پتھر نہیں ہو سکتے۔" گل نے کہا "یہ احساس مجھے پہلے بھی ہوا تھا۔ یہ لوگ ذرا بھی نہیں بدلے، میں کتنا بدل گئی ہوں۔"

"کیا تمہیں افسوس ہو رہا ہے؟" محسن نے کہا۔

"مجھے بدلنے والے تم ہو۔ کیا تمہیں افسوس ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟" گل نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا "مجھے تو غرور ہے تم پر گل۔ افسوس کیسا۔"

"پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"اچھا بابا! معاف کرو۔ غلطی ہو گئی۔ آئندہ نہیں پوچھوں گا۔" محسن نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

رابعہ نے مسکرا کے کہا "تم لوگ تو رات بھر جاگتے رہے۔"

محسن نے چور نظروں سے مجھے دیکھا "وہ ہاں! بس بیٹھ گئے تو بیٹھ گئے۔ محفل سے اٹھنا ذرا معیوب لگتا تھا۔"

"پھر جب محفل ایسی ہو" میں نے اعتراف جرم کے انداز میں کہا "تم بھی تو دور سے نظارہ کر رہی تھیں۔ بلکہ نگرانی۔"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا "ہم طافو کی آواز پر جاگے تھے۔ وہ سب بے ہودگی ہم نے نہیں دیکھی۔"

"اچھا! جب آپ نے کچھ دیکھا ہی نہیں تو یہ فیصلہ کیسے کر لیا کہ وہ بے ہودگی تھی؟"

"آوازیں جو آ رہی تھیں تالیوں اور سیٹیوں کی۔"

"ہاں۔ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئے تھے یہ لوگ۔" میں نے محسن کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

"اور آپ لوگ تو جیسے بڑی شرافت سے سر اور نظریں جھکائے بیٹھے تھے؟" رابعہ نے طنز سے کہا "بس میرا منہ مت کھلواؤ۔ دیکھا تھا ایک بار باہر آ کے ہم نے۔ کیوں گل! کیا کر رہے تھے یہ لوگ؟"

گل ہنسی "چلیں چھوڑیں رابعہ باجی۔ معاف کر دیں بے چاروں کو۔"

"بے چارے! کون بے چارے؟" محسن نے ... "شرفا پر تہمت لگاتے ہوئے آپ کو کچھ شرم آنی چاہیے رابعہ۔"

"شرم تمہیں آنی چاہیے" گل بگڑ گئی۔

"اچھا شام کو دیکھیں گے آتی ہے یا نہیں۔ ابھی تو نیند آ رہی ہے" محسن نے منہ پھاڑ کر جمائی سے کہا۔

دوپہر تک میں بھی بے خبر پڑا رہا اور گزشتہ شب کا ... ہوئی تو آنکھ خود بخود کھل گئی۔ کمرے میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ محسن مجھ سے پہلے ہی بیدار ہو چکا تھا اور مجھے باہر سے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ موضوع سخن مس بجلی گجرات والی اور موتی جان تھیں۔ محسن پریشان کرنے کے لیے گل کے سامنے ... افشانی کر رہا تھا کہ سبحان اللہ۔ مس بجلی فتنہ محشر تھی تو موتی جان قیامت۔ کیا رقص تھا اور کیا رقاصہ تھی۔ کیا نزاکت ... اک شعلہ جوالہ تھا یا برق طور تھی....

رابعہ اسے شرمندہ کرنے کی بے سود کوشش کر رہی تھی۔ گل غصہ سے فنا ہو رہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ محسن کا مقصد اسے جلانے کے سوا کچھ نہیں، وہ جلی کٹی باتیں سنا رہی تھی ... تھیں تو چلے جاتے انہی کے ساتھ۔ مجھے کیا پرواہ ہے۔ وہ گل تھی، نازو نہیں ورنہ محسن کی ایسی جرأت نہ ہوتی ... دیکھتی تھی کہ نائب کے دماغ کی رو کچھ زیادہ ہی بہک رہی ہے ... اپنی خفگی کا عملی اظہار یوں کرتی تھی کہ نائب کا دماغ فوراً راست پر آ جاتا تھا۔

خیال تو میرا بھی یہی تھا کہ اپنی "بے راہروی" کا اعتراف پردے میں چھپانے کی حکمت عملی ہی سب سے بہتر ... کی صورت ہوگی۔ اس سے پہلے کہ رابعہ ہماری شوخیوں ... مزاجی پر مزید طعنہ زنی کرے اور زنانہ حسد کا فطری ... میں بھی محسن کی طرح دعیت ہو جاؤں۔ جارحیت ہی کو ... میں بہترین دفاع سمجھا جاتا ہے۔ مگر اب مجھے اس کی ... محسوس نہیں ہوتی تھی۔ محسن یہ فریضہ بطریق احسن انجام ... تھا اور میں بھی ذرا ابھر کرتا تو خلاف ہو جاتا۔

پلنگ سے اترتے میں دبے پاؤں دروازے تک گیا ... میری طرف پیٹھ کیے برآمدے کے کنارے ... رابعہ کے پیچھے جا کے میں نے چلا کے کہا "بھوک لگی ہے ..."

گل نے باقاعدہ سینے پر ہاتھ رکھ کے چیخ ماری اور ... کہا۔ رابعہ اچھل پڑی اور اس نے ایک دم پلٹ کے ... نکال کے مجھے گھورا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟"

"میرا تو دل اتنے زور سے دھڑک رہا ہے" گل نے کہا۔

محسن پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ "دل کا تو کام ہی دھڑکنا ہے۔ بلکہ دھڑک کر لگی ہے تو شور بھی نہ مچائے۔"

میں نے اس حمایت پر محسن کا شکریہ ادا کیا "سچ فرمایا ہے آپ نے۔"

"میں بھوکے کی بات کر رہا تھا۔ آپ گھوڑے کی طرح ہنہناتے ہیں تو جائیے گھاس کھائیے" اس نے سامنے احاطے میں لہلہاتی ہوئی لمبی گھاس کی طرف اشارہ کیا "آپ کی عقل تو رات ہی گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ اسے بھی ساتھ لے آئیے گا۔ کہیں زیادہ چرنے سے بدہضمی نہ ہو جائے۔"

میں رابعہ کے ساتھ بیٹھ گیا "رابعہ! مجھے معاف کر دو۔"

رابعہ حیران ہوئی "اب خیال آیا ہے؟"

"میں رات بھر سوچتا رہا۔"

"کیا سوچتے رہے؟" رابعہ نے دل ہی دل میں خوش ہو کے کہا۔ اس کو یقین تھا کہ میں اسی کے بارے میں سوچنے کی بات کہوں گا اور معافی بھی میں اپنے اس بے ہودہ طرز عمل کی مانگ رہا ہوں جو میں نے سر محفل اختیار کیا تھا۔

"یہی... کہ میں موتی جان کے ساتھ بھاگ جاؤں۔"

رابعہ کا موڈ محسن کے قہقہے سے اور خراب ہو گیا "سوچتے کیوں رہ گئے؟ کوشش کرتے۔"

"بس تمہارا خیال آ گیا۔ تمہیں تو کوئی رونے والا بھی نہیں رہے گا۔"

رابعہ نے اٹھنے کی کوشش کی "بہت ہیں مجھے رونے والے۔ تم جاؤ۔"

میں نے اس کی کلائی پکڑ لی "تم اجازت دے رہی ہو، خوشی سے؟"

"ہاں میں خوشی سے کہہ رہی ہوں۔" اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"معافی بھی ایک شرط ہے۔ تم بعد میں چوہدری ولاور سے..."

"شکریہ! میں اور بیٹھوں گی" رابعہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا "کتنے بے ہودہ ہو تم۔ مجھ سے مذاق میں بھی برداشت نہیں ہوتی۔"

محسن نے ہنستے ہوئے کہا "جب معلوم ہے کہ یہ مذاق ہے تو ناراض کیوں ہو رہی ہو؟"

گل نے بھی کہا "باجی! آپ تو مجھے سمجھا رہی تھیں۔"

میں نے اسے پھر بیٹھنے پر مجبور کر دیا "دوسروں کو سمجھانا تو بہت آسان لگتا ہے، خود سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔ کیوں گل؟"

رابعہ کا غصہ کچھ کم ہوا "مت بات کرو مجھ سے۔"

میں نے کہا "میں منانے کا ایک ہی طریقہ جانتا ہوں۔ معلوم ہے؟"

محسن نے انجان بن کے کہا "وہ کون سا طریقہ ہے یار؟"

"ڈی اے ڈی آر۔ برخوردار" میں نے کہا۔

"بزرگوار! ذرا وضاحت فرمائیے" محسن بولا۔

(DIRECT ACTION FOR DESIRED RESPONSE)

میں نے کہا "یعنی مطلوبہ ردعمل کے لیے راست اقدام۔"

"استاد محترم! اس کا عملی مظاہرہ ہو تو سمجھ میں آئے۔"

میں نے سر گھما کے رابعہ کی طرف دیکھا "یہاں... سب کے سامنے..."

رابعہ ایک دم پیچھے کود گئی۔ غصے کے ساتھ اب حیا سے بھی اس کے چہرے پر کچھ اور لالی آ گئی تھی۔ گل بھی سمجھ گئی تھی کہ ڈی اے ڈی آر کیا بلا ہے۔ اس نے رابعہ کا ساتھ دیا اور وہ پاؤں پٹختی اندر چلی گئیں۔ میں نے محسن سے ہاتھ ملایا اور ہم انہیں چڑانے کے لیے مسخروں کی طرح حلق سے مضحکہ خیز آوازیں نکال کے ہنستے رہے۔

"ڈی اے ڈی آر۔ یہ کیا تھیوری ہے بائی دا وے؟"

میں نے کہا "الّو کی اولاد! چھٹے کے بعد پوچھتا ہے لطیفہ کیا تھا۔ اب اس کا مطلب تو صاف ہے۔ لڑکی روٹھ جائے تو پکڑ کے چومو اور اس کا سارا غصہ پی جاؤ۔ ایسے جیسے سپیرا زہر چوس لیتا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا" محسن بولا "اندر چلیں؟"

"یہاں اتنا سناٹا کیوں ہے؟"

"وہ تو پنچھی تھے ڈیرے والے، وہ اڑان اپنی بھا گئے۔"

"کیا مطلب؟"

"مس بجلی اور موتی جان صبح دم رخصت ہو گئیں۔ ڈاکو نہ جانے کدھر نکل گئے ہیں۔ شاید الوداعی ملاقاتیں کر رہے ہوں گے۔"

"کس سے؟ دوسرے ڈاکوؤں سے؟"

"ہاں۔ ان سے بھی" محسن بولا "ممکن ہے کوئی سابقہ تجربے کی بنا پر کسی متبادل جگہ تلاش کر رہا ہو۔ کہ فدوی اتنا عرصہ شیخ ہاگ اینڈ کمپنی میں سینئر ڈاکو کے فرائض منصبی سرانجام دے چکا ہے۔ فدوی نے اس عرصے میں چار افراد کو تین گولیوں سے قتل کیا، دو کو خنجر گھونپا۔ سترہ بار پولیس مقابلے میں بال بال بچا۔ ایک سو سترہ وارداتوں میں سترہ لاکھ نقد اور سترہ سو تولے خالص سونا جواہرات کے زیورات لوٹے مگر کبھی پولیس پکڑ سکی نہ انکم ٹیکس والے۔ گزارش ہے کہ فدوی کو اپنے زیر سایہ خدمت خلق کا موقع فراہم کیا جائے۔ ناچیز عرض گزار طافو عرف من موہنی۔"

میں نے کہا "مجھے نہیں لگتا کہ ان میں سے کوئی پھر یہ کام کرے۔"

"بھائی! جب چور کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ہیرا پھیری سے نہیں جاتا تو ڈاکو کیسے تائب ہو کے رزق حلال پر اکتفا کر سکتا

www.paksociety.com

ہے؟"

میں نے کہا "وروں کا پتا نہیں مگر طافو من سوئی کے بارے میں مجھے یقین ہے اور یوسف کے بارے میں بھی۔"

"چلو جی نہیں کیا۔ کوئی چور بنے یا سادھو۔ ہم تو شام کو خالی ہاتھ بھاڑ کے روانہ ہو جائیں گے اور خدا کا شکر ادا کریں گے جس نے بچھڑے ہوؤں کو ملایا اور بھٹکے ہوؤں کو گھر کا راستہ دکھایا۔"

میں نے کہا "مجھے شام کو سولہ لاکھ بھی وصول کرنے ہیں۔"

محسن بولا "اکیلے مت جانا سکندر اعظم۔"

"پھر کیا تمہیں ساتھ لے جاؤں مسٹر ٹارزن؟"

"کیا خیال ہے رقم کون لے کر آئے گا؟ پولیس یا اینٹی کرپشن والے ہم رکاب ہوں گے؟" محسن نے کہا۔

"میں حضرت ایسی عظیم الشان حماقت کی توقع نہیں رکھتا۔ ایسا ہوا تو ہم سب بھی مارے جائیں گے۔"

"بھی کا کیا مطلب ہے؟"

"ڈاکو اور پولیس والے تو خیر مریں گے۔ مقابلہ ضرور ہو گا۔ ڈاکو اس جنگل کے چپے چپے سے واقف ہیں اور تھانے دار ان سے ملا ہوا ہے۔ وہ ہر طرف سے تھانے کے گرد مورچہ بند بیٹھے ہوں گے۔ ان کے بدلے پہ سولہ لاکھ کی خاطر یہ خونریزی قانون نافذ کرنے والوں کے نقطۂ نظر سے تو جائز سمجھی جائے گی مگر ایسا کیا ہم پولیس مقابلے میں ڈاکوؤں کے ساتھ مارے جائیں؟ شہادت تو خیر نصیب میں نہ تھی، حرام موت کیوں قبول کریں۔"

"خدا کرے خیریت سے چھپی ہو اور یوسف کا وہ توپ مشہر کوئی گولہ نہ چلائے۔" محسن بولا۔

"میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے" میں نے کہا "میری چھٹی حس کہتی ہے کہ میرا مغل کے سامنے جانا خطرے سے خالی نہیں۔"

محسن نے مجھ سے ہاتھ ملایا "میری تو میری ساتویں حس بھی کہہ رہی تھی۔ ترکیب کیا ہے؟"

"پیٹ خالی ہے۔ دماغ سے ہر بات نکل کے معدے میں چلی جاتی ہے۔ ناشتے کے بعد بتاؤں گا۔" میں نے کہا "بلڈ پریشر کی طرح عقل کا بھی پریشر ہوتا ہے جو اس وقت صفر کے قریب ہے۔ پیٹ بھرے گا تو عقل کا پریشر نارمل پر آجائے گا، پھر بات ہو گی۔"

خواتین نے 'جو در حقیقت تین نہیں دو تھیں' ٹھنڈے ناشتے کو گرم کر لیا تھا اور قابلِ استعمال بنا کے اپنے سگھڑ ہونے کا ثبوت دیا تھا ورنہ ٹھنڈی چائے پی کے تو تعلقات اتنے کشیدہ ہو جاتے کہ ڈی اے زی آر کا طریقہ بھی ناقابلِ عمل اور غیر موثر ہو جاتا۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمارے تشریف لاتے ہی رابعہ نے گل کو مخاطب کیا "میں نے تو پہلے بھی کہا تھا نا دوست کو مجھے بھگا دو۔"

گل نے سرہلایا "جوڈو کراٹے سیکھے بغیر کام نہیں چلے گا۔"

"ملاقاتوں کے بھوت واقعی باتوں سے نہیں مانتے" رابعہ بولی۔

میں نے محسن کو مخاطب کیا "یہ غالب کے سسر کی بات کر رہی ہیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ بھوت ہے؟"

"یعنی یہ غالب کے سسر کو لاتیں مار رہی ہیں گی۔ توبہ توبہ! یہ تو پیر زادیوں کے چلن ہیں" محسن نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"اور وہ سب جو تم رات میں بجلی اور سوئی جان کو دکھا رہے کر رہے تھے وہ شریف زادوں کے چلن تھے؟" گل چیخ کے بولی۔

میں نے کہا "گل بانو! تم کب سے جاگ رہی ہو؟ تم کب سوئی تھیں؟"

"صبح تو ہو گئی تھی جب ہنگامہ ختم ہوا تھا۔ اس کے بعد نیند ہی نہ آئی۔ ہم جنگل میں پھرتے رہے۔ بڑا مزہ آیا" رابعہ بولی۔

"بڑا مزہ آیا" محسن نے اس کی نقل اتاری "گل جاتی کوئی شیر یا چیتا تو بریک فاسٹ میں لے بھی بڑا مزہ آتا۔ ایسی لذیذ اور حسین لڑکیاں روز کہاں ملتی ہوں گی۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "افسوس محسن! ہماری بدقسمتی ہے کہ اس جنگل میں نہ شیر ہیں نہ چیتے۔"

محسن بولا "ڈاکو تو ہوں گے اور بھی۔"

"ہاں۔ ادھر ادھر کے کچھ لوگ آج آئے تھے۔ تجربہ کار ڈاکوؤں کی اسامی ہمیشہ خالی رہتی ہے" گل نے کہا "آفر تو پہلے بھی آئی تھیں مگر کیا کوئی نہیں۔"

"آج کیا ہوا؟"

"طافو نے تو صاف انکار کر دیا۔ باقی کے بارے میں کہا کہ انہی سے پوچھ لو میری طرف سے کسی پر کوئی بندش نہیں۔"

"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے طافو نے بتایا تھا۔ وہ خاصا رنجیدہ تھا۔ بہت شرمندہ بھی تھا کہ اس نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ دراصل اسے امید نہیں تھی کہ ہم اتنی شرافت کا ثبوت دیں گے اور تم میرا مان رکھنے کے لیے سولہ لاکھ اتنی آسانی سے پھینک دو گے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ناگ متنی میرا کوئی ارادہ نہیں تھا تیرے ساتھ زیادتی زبردستی کرنے کا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تو جھوٹ نہیں بول رہی ہے اور تجھے واقعی معلوم نہیں کہ تیرے بھائی نے وہ رقم کہاں رکھی تھی لیکن مجھے دوسروں نے مجبور کر دیا کہ جیسے بھی ہو رقم دلواؤ۔ وہ سب کہتے تھے کہ ہم سے پیشہ چھوڑنے کی بات بھی کرتے ہو اور یہ بھی چاہتے ہو کہ ہم خالی ہاتھ جائیں۔ کیا کریں گے ہم؟ ڈاکے نہیں ڈالیں گے تو کیا بھیک مانگیں گے؟ پیٹ بھرنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی پڑے گا اور کچھ کرنے کے لیے پیسہ چاہیے۔ طافو کو اب یہ خیال پریشان کر رہا ہے کہ وہ پیسہ لے کر بھی یہ دھندے نہیں چھوڑیں گے اور کسی دوسرے گروہ میں شامل ہو جائیں گے یا کہیں اور جا کے اپنا گروہ بنا لیں گے۔ وہ تو نیا سردار بنانے کی باتیں بھی کر رہے تھے۔ ایک گروہ شریف ڈاکو کا ہے یہاں۔ اس کا نام شریف ہے۔"

میں نے کہا "اگر یہ بات ہے تو پھر ہمیں بھی سوچنا پڑے گا۔"

"کیا سوچنا پڑے گا؟" محسن بولا "زبان دے کے پھر جاؤ گے؟"

"زبان ہم نے دی تھی اس یقین دہانی پر کہ یہ پیسہ لے کر وہ شریفانہ زندگی بسر کریں گے۔ انہوں نے عہد کیا تھا۔"

محسن نے کہا "ایک ڈاکو کے عہد کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔"

"تو پھر ہمیں بھی ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے جس کے وہ مستحق ہیں۔ ہم ان کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ گل بانو کے سامنے انہوں نے عہد کیا تھا کہ وہ ڈاکو کا پیشہ چھوڑ دیں گے۔ انہیں اپنے عہد کا پاس نہیں تو ہم کیوں کریں۔ ایک ڈاکو کو شریف آدمی بنانے کی قیمت تو ادا کی جا سکتی ہے، کسی ڈاکو کو نذرانہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔"

"جذباتی معاملات سے قطع نظر ڈاکو صرف ڈاکو ہوتے ہیں اور ان کے لیے جان سے زیادہ مال کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس قسم کے حالات میں وہ طافو کے خلاف بغاوت بھی کر سکتے ہیں۔ انہیں پیسہ مل جائے تو شاید وہ کسی سے کچھ نہ کہیں۔ پیسہ نہ ملا تو وہ طافو کو قصور وار ٹھہرائیں گے کہ تم نے ہمارے ساتھ غداری کی۔ تم نے ہماری باتیں دشمن کے آگے پہنچا دیں اور ہمیں سولہ لاکھ سے محروم کیا۔ وہ طافو کو جان سے بھی مار دیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ گل کے لیے بھی پریشانی کے اسباب پیدا کریں۔"

میں نے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں ذرا دلچسپی سے کام لینا ہو گا۔ گل! تمہیں معلوم ہے وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟"

"اپنا اپنا اسباب سمیٹ کر کہیں لے گئے ہیں۔ یہاں اب ان کا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ میں نے گھوم پھر کے دیکھ لیا ہے۔ سارے کمرے خالی پڑے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا۔ اس کا مطلب ہے وہ روپوش ہو گئے ہیں۔ انہیں خطرہ ہے کہ پولیس چھاپہ مارے۔ اصلی چھاپا۔"

"ہاں۔ غالب کی وجہ سے وہ کچھ ڈرے ہوئے تھے" گل نے کہا۔

"اس خبیث تھانے دار نے انہیں مشورہ دیا ہو گا کہ کسی کے بھروسے میں مت رہنا۔ یہ اخبار والے بڑے چالاک اور خطرناک لوگ ہوتے ہیں" محسن بولا۔

میں نے کہا "اس نے کل ٹیلی فون پر میری باتیں سن کے اندازہ لگایا ہو گا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ خیر شام کو دیکھیں گے وہ اپنا حصہ کیسے وصول کرنے آتے ہیں۔ وہ یقیناً ہم پر نظر رکھیں گے اور شہر آنے والے راستے پر بھی کہ رقم لانے والے کون ہیں اور کتنے ہیں۔"

"تمہاری عقل کا پریشر نارمل ہو گیا ہے بقلم؟ اب تم بتا سکتے ہو کہ تمہاری اسکیم کیا تھی؟"

میں نے سرہلایا "اس کے لیے مجھے کم سے کم دو گھوڑے درکار ہوں گے۔ اصلی اور جاندار۔"

"گھوڑے!" محسن بولا "گرد و نواح میں حشرات الارض تو بہت ہیں مگر مجھے سب سے بڑا چوپایہ ایک کتا نظر آیا تھا۔"

گل نے کہا "گھوڑے تو کسی گاؤں سے ہی مل سکتے ہیں۔"

"اور قریب ترین گاؤں یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

"چار پانچ میل۔ ادھر۔" گل نے اشارے سے بتایا "یہ بھی یقین نہیں کہ وہاں گھوڑے ہوں اس وقت اور وہ ہمیں مل جائیں۔"

"ہم گھوڑے خرید سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور پھر بیچ کے سو سکتے ہیں" محسن بولا۔

"کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے" میں اٹھ کھڑا ہوا "چلو محسن! ہم ذرا گھوم پھر کے آتے ہیں گھوڑوں کی منڈی تک۔"

"وہ... جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے، ناچیز کی جیب تو خالی ہے اور آپ بھی ماشاء اللہ سب کچھ لٹا چکے تھے کل رات۔ سوائے اپنی جوانی کے" محسن بولا "گھوڑے خریدنے کے لیے کیا ہے آپ کے پاس؟"

میں نے کہا "یار! تو اپنی سسرال میں ہے بیوی سے کہہ۔"

محسن نے مظلوم صورت بنا کے گل کو دیکھا "بیوی! بھری عزت کا سوال ہے۔ ڈوب مرنے کا مقام ہو گا اگر..."

گل کا چہرہ گلابی ہو گیا "فضول باتیں مت کریں۔ میرے پاس چار پانچ ہزار پڑے ہیں وہ لے جائیں۔"

"چار پانچ ہزار لے کر ہم کوئی فضول بات نہیں کریں گے۔ وعدہ۔" میں نے کہا "بلکہ کوئی بھی بات نہیں کریں گے۔"

رابعہ نے کہا "تمہیں یقین ہے کہ تم اس جنگل سے نکل کے کہیں جا سکو گے؟ وہ محاصرہ کیے بیٹھے ہوں گے ہر طرف۔"

میں نے کہا "آخر ہم تمہیں کس لیے چھوڑ کے جا رہے ہیں؟ یہ ضمانت کافی ہے ہماری طرف سے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم واپس نہ آئیں؟"

"اور بالفرض ہم نہ آئیں، گھوڑے کو ایڑ لگائیں اور نکل جائیں ملک پرستان کی طرف یعنی بمبئی کی طرف جہاں زینت امان اور ہیما مالنی ہمارے لیے چشم براہ ہیں۔ تو برا مت ماننا" محسن نے کہا۔

میں نے سرہلایا "نیک بیبیوں کی طرح ہماری سلامتی اور خیر و عافیت سے واپسی کے لیے دعا کرنا۔ فی امان اللہ۔"

جنگل سے ہم یوں گزرے جیسے ہمارا مقصد تفریح کے سوا کچھ نہیں۔ ہم بے فکری سے درختوں کے پرندوں کو اور گرد و پیش کی ہر چیز کو ایسے دیکھتے جا رہے تھے جیسے شہر کے باسی پہلی بار جنگل میں پکنک... منانے جاتے ہیں تو مظاہرِ قدرت کو حیرانی اور تجسس سے دیکھتے ہیں۔ کبھی میں محسن سے کہتا تھا "وہ دیکھو یار! کبوتر" اور محسن کہتا تھا "کبوتر نہیں، یہ فاختہ ہے۔ بے شک پوچھ لو اس سے۔" ایک جگہ محسن نے کہا "یہ انگور کا درخت ہے۔"

www.paksociety.com

"بے وقوف! انگور کی بیل ہوتی ہے اور انگور یہاں نہیں ہوتے" میں نے کہا "یہ سوہنگ پھلی کا درخت ہے۔"

شہر کے ماحول میں پلنے والے بچے ایسی باتیں کریں تو گاؤں میں رہنے والے ہنستے ہیں اور پھر ترس کھا کے کہتے ہیں۔ ان بے چاروں کو کیا پتا۔ یہ تو بڑی بھی بڑی دیکھتے ہیں انگور اور سوہنگ پھلی۔

ہمارا اصل مقصد ارد گرد کے ماحول کا کسی جاسوس کی نظر سے جائزہ لینا تھا کہ کوئی چھپ کر ہمیں دیکھ رہا ہے یا ہمارے تعاقب میں ہے تو معلوم ہو جائے۔ اچانک ادھر ادھر دوڑ کر جانا بظاہر ایک معصوم اور بے ضرری حرکت تھی مگر ایسے ہی ہم مشکوک سی نقل و حرکت کو بھی نوٹ کر سکتے تھے۔ تقریباً ایک میل دور آجانے کے بعد محسن نے اس یقین کا اظہار کیا کہ سب ٹھیک ہے۔

گل نے ہمیں راستہ سمجھانے کے لیے چند نشانیاں بھی بتائی تھیں۔ کسی دشواری کے بغیر ہم نے انھیں تلاش کر لیا اور گھومتے پھرتے دو گھنٹے میں اس گاؤں تک جا پہنچے جس کی آبادی مشکل سے ایک ہزار نفوس ہوگی۔ یہ گاؤں مایوس کن حد تک چھوٹا تھا اور یہاں سے دو گھوڑوں کا ملنا مشکل نظر آتا تھا۔ ابھی ہم گاؤں کی حدود میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے کہ پیچھے سے ایک تانگے کی شکل نظر آئی جو کچے راستے پر ہچکتا ہوا آرہا تھا۔

"مبارک ہو۔ ایک پارس باور کا ایک گھوڑا رضائے الٰہی یا قضائے الٰہی سے خود ادھر آرہا ہے" محسن نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا۔

میں نے کہا "کیا مطلب؟ اس سے گھوڑا لے کر تانگا اس کے پاس چھوڑ دیں گے کہ اسے خود لے جاؤ۔"

"تھوڑی دیر کے لیے وہ خود کو گھوڑا فرض کرلے تو فائدے میں رہے گا۔"

"اور اس نے کہا کہ میں جتا ہوں گھوڑے پر، تم تانگہ لے جاؤ" تم تھوڑی دیر کے لیے خود کو گھوڑا فرض کر سکتے ہو گدھے۔"

تانگا قریب آیا تو محسن پنجابی میں مخاطب ہوا "پہلوان! یہ گھوڑا بیچو گے؟"

جھاڑو کے تنکے جیسے لمبے پتلے نوجوان نے محسن کو یوں دیکھا جیسے زندگی میں پہلی بار کوئی مستند احمق دیکھا ہو "مسخری کرتے ہو۔"

میں نے اسے روک لیا "وہ دراصل ۔۔۔ ہم دو گھوڑے خریدنا چاہتے تھے۔"

"یار مجھے کیا؟ پورا اصطبل خرید لو۔ میرا راستہ مت کھوٹا کرو۔"

"کہاں سے خرید لیں؟ تمہیں کچھ معلوم ہے گھوڑے کہاں سے مل سکتے ہیں؟"

محسن نے کہا "بالکل اصلی۔ ایسا نہیں جیسا تمہارا۔"

اس نے خاصا برا مانا "یہ بھی نقلی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ دو ٹانگے کے گھوڑے؟ چل ہٹ" اس نے گھوڑے کو ٹھکل دیا۔

میں نے کہا "ایک منٹ۔ آس پاس کسی گاؤں میں اگر کوئی گھوڑا بیچنا چاہے تو ہم اچھی قیمت دے سکتے ہیں۔ سمجھ گئے۔ سو روپے دیں گے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "سو روپے۔ اچھا۔ سنا ہے ملک صاحب کے دو گھوڑے چوری ہو گئے ہیں مگر کرموں بڑا حرامی ہے، دو ہزار کے دے گا۔"

میں سمجھ گیا کہ کرموں صاحب خود چور ہیں یا چوری کا مال کے منافع پر بیچتے ہیں۔ دوسرا مقدار گاؤں میں مشکل سے ہے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ چور سے براہ راست سودا ہوگا۔

میں نے کہا "ہم خرید لیں گے۔"

وہ کچھ حیران ہوا "تمہیں پکڑے جانے کا کوئی ڈر نہیں؟"

"جب کرموں کو ڈر نہیں تو ہم کیا کرموں سے بھی گئے گزرے ہیں پہلوان؟" محسن بولا اور تانگے کی اگلی نشست پر براجمان ہو گیا۔

مجبوراً مجھے ایک ڈھلوان سطح پر بیٹھنا پڑا۔ تانگا راہی ابو راستے پر روانہ ہوا جس پر چل کے آیا تھا۔ ہر گڑھے کے جھٹکے میں چند انچ نیچے سرک جاتا تھا اور بڑی مشکل سے خود کو سجدہ ریز ہونے سے بچاتا تھا۔ گھوڑے کے بارے میں بھی محسن نے مبالغے سے کام لیا تھا۔ وہ آدھے پارس باور کا تھا۔

"بائی دا وے، کیا یہ گھوڑے کرموں صاحب نے جیب میں چھپا رکھے ہیں؟" محسن بولا۔

"ابھی تک کسی کو معلوم نہیں؟" میں نے کہا۔

"مگر مجھے معلوم ہے۔ پوچھو وہ کیسے؟" تیلے پہلوان نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کیسے؟" محسن نے کہا۔

پہلوان نے اس کے کان میں سرگوشی کی "کرموں میرا سُسر ہے۔"

جب مجھے یقین آگیا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا ہے تو اس مضحکہ خیز صورت حال پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی "اور تم اتنی بے خوفی سے سودا کر رہے ہو؟ تمہیں ڈر نہیں کہ ہم پکڑے گئے یا ہم نے ملک صاحب کو بتا دیا۔"

تیلا پہلوان کانپنے لگا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ہنس رہا تھا "مجھے معلوم ہے کہ تم گھوڑے لے کر بھاگ جاؤ گے۔ یہاں رکو گے نہیں۔ تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو۔ تمہیں کیا پتا ملک صاحب کا؟"

میں اس کی ذہانت پر دم بخود رہ گیا "یہ اندازہ کیسے لگایا تم نے کہ ہم گھوڑے پر بیٹھ کے فرار ہو جائیں گے؟"

اس نے مجھے آنکھ ماری "تم مجھے جیل سے بھاگے ہوئے لگتے ہو۔"

میں اور محسن کچھ دیر صدمے سے سکتے میں بیٹھے رہے۔ پھر کسی نے ہماری صورت دیکھ کے اتنا غلط اور شرمناک اندازہ لگایا تھا مگر ہم نے تیلے پہلوان کے خیال کی تردید نہیں کی۔

"بالکل ٹھیک سمجھے تم" میں نے کچھ دیر بعد کہا "ہم رات خوف ناک گھوڑوں کو کھلا چھوڑ دیں گے اور گاڑی پکڑ لیں گے۔"

"پٹھان ہو؟ لاہور والی کہ کراچی والی؟"

"یہ ہم نہیں بتائیں گے" محسن نے کہا "تم بھی کسی کو کچھ مت بتانا۔ گھوڑے بھی ملک صاحب کو کچھ نہیں بتا سکتے۔"

کرموں صاحب ایک رفت میں ایک سے مخاطب ہوئے تھے اور ایک آنکھ سے ایک ہی کو دیکھ سکتے تھے مجھے اس میں بھی شک تھا کہ وہ تیلے پہلوان کا سُسر ہو سکتا ہے۔ وہ کسی آلو کی بوری کی طرح تھا۔ جب وہ تانگے میں میرے ساتھ بیٹھا تو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ تانگا فضا میں معلق ہو جائے گا۔ تیلے پہلوان نے مجھے آگے منتقل کیا اور تانگا پھر چلا تو مجھے گھوڑے کی مظلوم آنکھوں میں اپنے لیے ملامت نظر آئی کہ سکندر تم بھی۔

بالاخر نیست ایک کھنڈر عمارت میں گھاس کھا رہا تھا۔ کرموں صاحب نے انکشاف کیا کہ ادھر کوئی نہیں آتا۔ یہ ایک جن کا ڈیرا ہے۔

تیلے پہلوان نے مجھے ایک طرف لے جا کے کہا "پیسے مجھے دے دو۔"

میں نے کہا "تمہیں کیوں؟ تمہارے سُسر محترم۔"

"بڑا حرامی ہے۔ ابھی شہر چلا جائے گا اور اڑا دے گا۔ گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں دے گا۔"

"تم بھی اسی کے داماد ہو۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم دغا نہیں کرو گے؟" میں نے کہا "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم ہمیں ٹھگ رہے ہو؟ ایک ہزار اپنی جیب میں ڈال لو۔"

محسن نے مجھے آواز دی "کمی بیشی ہزار میں بات پکی۔ ذرا کرموں صاحب کو ہزار روپے دو۔ گن کر پورے ایک ہزار۔"

میں نے تیلے پہلوان کو گھورا۔ وہ مجھے اور محسن کے علاوہ ٹیلیفون کے جذبات کا شکار تھا کہ قیمت اس نے پہلے ہی کیوں وصول نہیں کی۔ عین وقت پر سارا کام خراب ہو گیا۔

میں نے ہزار کرموں کو دیے اور ایک سو کا نوٹ تیلے پہلوان کو تھما دیا "گن لو پہلوان! پورے سو ہیں۔ دیکھ لو اچھی طرح۔"

اس نے جل بھن کے کہا "ایک نوٹ کو کیا سو بار گنوں؟ خیر میں کرموں سے وصول کر لوں گا آدھے ورنہ۔"

"قرض کے بچے! ہم سے بدمعاشی کرتے ہو" میں نے کہا "معلوم ہے ہم تمہیں قتل کر کے جیل گئے تھے، چو تھا قتل تمہارا ہوگا۔"

محسن نے بھی غرا کے کہا "آج تو فرصت نہیں ہے لیکن ہم پھر کسی دن آکے تمہیں فوت کر دیں گے۔ خبردار جو اپنے سُسر کو بتایا۔"

کرموں نے شور مچایا "سُسر! کون سُسر، کس کا سُسر؟ خدا نہ کرے جو میں اس ٹٹو کے بچے کا سُسر ہوں۔ میری بیٹی ہوتی کوئی تو کسی اندھے کنویں میں دھکیل دیتا۔"

ہم نے دونوں پر لعنت بھیجی اور گھوڑوں پر آزمائشی سواری کی۔ محسن کے حصے میں خاصا مہذب اور تابعدار قسم کا گھوڑا آیا تھا۔ میرے گھوڑے نے پہلے مجھے دھوبی پچھاڑ دینے کے لیے تھوڑی سی اچھل پھاند کی مگر میں نے شہسواری کے کورس میں گھوڑوں کی نفسیات پر بھی تحقیق کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے تعلقات ایسے ہو چکے ہوں گے جو ایک دوسرے کو برداشت کرتی ہوں۔ گھوڑا احتجاجی انداز میں چلنے لگا۔

میں نے کہا "میاں شیر دلائی! تم بالکل دولہا لگتے ہو۔ اگر تمہارے گھوڑے پر سہرا ہوتا، آگے بابو بینڈ ہوتا اور پیچھے باراتی ہوتے۔۔۔"

"پہلے ہم مفرور مجرم لگ رہے تھے، اب چور بھی لگ رہے ہیں۔ نکل چلو جلدی سے، کہیں ملک صاحب کے بندے نہ آجائیں۔"

میں نے کہا "ایسی کی تیسی ملک صاحب کی۔ گھوڑے ہمارے ہیں۔ ہم ان پر کسی کریں گے وہ چاہیں تو ہم سے دو ہزار میں سودا کر لیں۔"

"اب جانا کہاں ہے۔ تھانے؟"

"بالکل ٹھیک۔ شام ہونے والی ہے" میں نے کہا "مسئلہ اگر سولہ لاکھ لے کر آیا نہیں ہوگا تو آسے روانا ہوگا۔ ایک مسئلہ اور ہے۔"

"گھوڑے تو مل گئے، اب کیا باقی چاہیے؟"

میں نے کہا "مجھے ڈاکوؤں جیسا ملبوس چاہیے۔ عام قسم کی شلوار قمیص، منہ پر۔۔۔ باندھنے کے لیے ڈھاٹا۔ کام پگڑی سے بھی چل جائے گا۔"

"جب ہم ڈاکوؤں کے درمیان تھے تو تمہیں خیال نہیں آیا۔"

میں نے کہا "میں کسی کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ انھیں شک ہو جاتا کہ میری نیت ٹھیک نہیں۔"

محسن نے ایک طرف اشارہ کیا "ادھر دیکھو۔ کوئی کسان ہے شاید۔ ہل بیل کے ساتھ لوٹ کے گھر جا رہا ہے۔"

"اس سے بات کر کے دیکھتے ہیں" میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور چند منٹ میں حیران پریشان دیہاتی کو جا لیا جو واقعی سر سے پیروں تک مٹی دھول میں اٹا ہوا تھا۔ محسن نے اس کا راستہ روک لیا۔

میں نے کہا "ہمیں یہ کپڑے اتار دو۔"

وہ ہاتھ جوڑ کے گھگھیانے لگا "کپڑے اتار دوں؟ گھر کیا ننگا جاؤں؟"

www.paksociety.com

میں نے فوراً کہا "ٹھیک ہے۔ ہم اپنے کپڑے دے دیں گے تمہیں۔"

محسن نے کہا "اور پانچ سو روپے بھی دیں گے زبان بند رکھنے کے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ ہم ڈاکو ہیں۔"

"سمجھ گیا" اس نے بڑی مشکل سے کہا "میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم میرے بیل تو نہیں چھینو گے؟"

مجھے اس پر ترس آیا "نہیں بابا۔ بیل تمہیں مبارک ہوں۔ ہم کسی کے رزق کا وسیلہ نہیں چھینتے۔"

پتلون قمیص پہن کے وہ خوش نہیں تھا۔ شاید اسے خیال تھا کہ وہ دیکھنے والوں کو اس تبدیلی کی کون سی قابل قبول وجہ بتائے گا کہ وہ ہل چلانے گیا تھا تو دیسی لباس میں تھا اور لوٹا ہے تو بابو بن کے لیکن پانچ سو روپے اس کے لیے اتنی بڑی دولت تھی کہ وہ ایک کی جگہ دس جھوٹ بول سکتا تھا۔

میں نے محسن کو گھوڑوں کے ساتھ تھانے سے کچھ فاصلے پر درختوں کے پیچھے ایک محفوظ مقام دیکھ کر انتظار کرنے کو کہا اور خود منہ پر ڈھاٹا لپیٹ کر آگے بڑھا۔ سامنے کے بجائے میں نے عقبی حصے کا رخ کیا اور ایک کھلی کھڑکی کے نیچے جا بیٹھا جو میرے اندازے کے مطابق تھانے دار کے کمرے کی کھڑکی تھی۔ ابھی چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ میرے کانوں نے ایک جانی پہچانی آواز سنی اور میں دم بخود رہ گیا "کوئی بھی نہیں آیا ابھی تک تو"

انتہائی حیرت کے صدمے سے سنبھل جانے کے بعد میں نے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی بے سود کوشش کی کہ آخر اکبر خان یہاں کیسے آ گیا۔ رقم لے کر یا تو خود عبدالودود منظر آ سکتا تھا یا رابعہ کا معاون وکیل اور سب سے مخلص دوست وقار یوسف۔ اکبر خان کے سوال سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرا انتظار کر رہا ہے۔

تھانے دار کے جواب نے صورت حال اور واضح کر دی "وہ جناب! کیا نام بتایا تھا آپ نے؟ اکبر خان صاحب... یہ معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ نہ وقت پر ٹرین آتی ہے نہ دفتر کا بابو آتا ہے نہ مہمان خصوصی۔ ڈاکو تو پھر ڈاکو ہیں۔ تاخیر سے آ جائیں تو پکڑے جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ ابھی وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ آگے پیچھے اور کون ساتھ آیا ہے۔ اس راستے پر کھڑے ہوں گے جدھر سے آپ آئے تھے۔ صبح سے نگرانی شروع کر دی ہو گی۔ رات تک کریں گے۔"

"آخر کتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا مجھے؟ تم تو ان معاملات میں خاصے تجربے کار لگتے ہو۔"

"چوبیس گھنٹے واسطہ ہے چوروں اور ڈاکوؤں سے جی۔ آپ جیسے شریف اور معزز لوگ تو ادھر آتے نہیں۔ آتے ہیں تو بس ایسے ہی جیسے آپ کو آنا پڑا۔ جلدی کیا ہے؟ تسلی سے بیٹھیں۔ چائے اور منگواتا ہوں آپ کے لیے۔"

"نو۔ ٹھیک ہے۔"

"مرضی آپ کی جی۔ چاہے دو گھنٹے اور لگ جائیں یا دو گھنٹے بعد پیغام آ جائے کہ فلاں جگہ آ جاؤ۔ وہاں سے کہیں اور جائیں۔"

"یہ تو بڑی غلط بات ہے۔"

تھانے دار ہنسا "حضور! صحیح بات کا تو سوال ہی نہیں۔ ایسے معاملات میں۔ لینے والے ڈاکو ہیں، دینے والے آپ جیسے لوگ۔ اور سودا ہے بندوں کا۔ یہ کوئی بزنس ڈیل نہیں ہے جو کسی بہت بڑے ہوٹل میں بزنس مین کرتے ہیں۔"

"مگر میں ساری رات خوار نہیں ہو سکتا" اکبر خان جھنجلا کر بولا۔

"کس نے کہا ہے جی خوار ہونے کو۔ بھروسا ہے تو رقم میرے پاس چھوڑ کے تسلی سے گھر جاؤ۔"

"بھروسا اور تم پر؟" اکبر خان نے تلخی سے کہا "سولہ لاکھ نہیں چھوڑ سکتا میں تمہارے پاس۔ سولہ لاکھ کی تو بات نہ کرو۔"

"چھا مت کریں بھروسا ہم پر لیکن ایک بات بتائیں۔ فرض کریں ابھی یہاں ڈاکو آ جائیں۔ ایک تو کیں طافو ہے۔ سنا ہے اس کا حریف بھی ہے۔ ایک شریف ڈاکو۔"

"ڈاکو اور شریف!"

"نام شریف ہے حرامی کا" تھانے دار بولا "اس کی دشمنی ہے طافو سے۔ سنا ہے اس کے بندے توڑ رہا ہے۔"

"تم یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہو؟ شریف ڈاکو ہو یا بدمعاش مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ میں اپنی حفاظت کر سکتا ہوں۔ عقل ہوتی خدا نے تو میں بھی تمہاری طرح کسی گاؤں کے تھانے میں مارا مارا پھرتا۔ شہر میں اتنا بڑا بزنس نہ ہوتا میرا۔ سولہ لاکھ جیب میں ڈال کر نکلنے سے پہلے میں نے پکا انتظام کر لیا تھا کہ ڈاکو تو شاید دھوکا دیں لیکن تم ڈاکوؤں کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلا سکتے ہو۔"

"کیا مطلب ہے جی اس فضول بات کا؟"

"مطلب صاف ہے اور تم سمجھ گئے ہو۔ تم مجھے لوٹ بھی سکتے ہو اور الزام کسی کو بھی دے سکتے ہو۔ شریف ڈاکو کو بھی" اکبر خان نے کہا۔

یہ سب باتیں سنتے ہوئے میرا ذہن صورت حالات کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا اور مجھے اچانک احساس ہوا تھا کہ غیب نے ہماری مدد کے لیے کیا خوب بندوبست کیا ہے۔ اپنی طرف سے تو میں نے بس یہ انتظام کیا تھا کہ جیسے بھی ہو اپنے دماغ سے کام لاتے ہوئے سولہ لاکھ ان ڈاکوؤں کی نذر کر دوں۔ اس میں نقصان صرف میرا نہیں تھا۔ نقصان رابعہ کا بھی تھا اور ان ٹرسٹ کے زیر انتظام چلنے والے اسپتال کا بھی تھا اور ان مددگار دوستوں کا بھی جو کسی نہ کسی طرح سولہ لاکھ کی رقم کر کے ہم سب کو ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑانے کے اخلاقی پابند تھے اور اس قرض کی ادائیگی کو تقاضائے دوستی کا حق

کر چکے تھے۔

اکبر خان وہاں کیسے پہنچا تھا، یہ بعد میں معلوم کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال غنیمت تھی کہ وہ سولہ لاکھ لے کر آیا تھا اور یہ رقم ڈاکوؤں تک نہ پہنچنے کی بات تھی۔ اس طرح کر کے میں خود بھی نقصان سے بچ سکتا تھا اور دوستوں کے بار احسان سے بھی۔ ایک معزز ڈاکو کی جیب سے مال دوسرے ڈاکو کے پاس چلے جانے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ میری اسکیم اچانک دوہرے فائدے کی حامل ہو گئی تھی۔ ایک طرف میں طافو اینڈ کمپنی کو وعدے کے مطابق ادائیگی کر کے ثابت کر سکتا تھا کہ شریف آدمی تو ڈاکو کے ساتھ بھی شرافت کے اصول نہیں چھوڑتا۔ دوسری طرف میں اکبر خان جیسے بدمعاش کا احسان قبول کرنے سے انکار کر سکتا تھا۔

خاموشی کا مختصر وقفہ آتے ہی میں نے بجلی کی طرح کمرے کے اندر جست لگائی۔ یہ اندازہ میں پہلے ہی کر چکا تھا کہ میری طرف تھانے دار کی پشت ہو گی اور مجھے اکبر خان کی نظر پہلے دیکھے گی۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی میں کنٹرول سنبھال لوں گا۔ اکبر خان نے زندگی میں سایہ سا رکھا ہو گا۔ پلک جھپکتے میں وہ سایہ ایک حقیقت بن کے سامنے آ گیا تھا۔

میں نے چادر کے نیچے ہاتھ چھپا کے ایک انگلی کو یوں ابھار رکھا تھا کہ دیکھنے والے کو وہ پستول کی نال نظر آئی تھی۔

"خبردار! کوئی بلا اپنی جگہ سے تو اس کی لاش بھی کی نظر آئے گی" میں نے مصنوعی آواز بنا کے خوف ناک لہجے میں کہا۔

اکبر خان کا جیب کی طرف بڑھنے والا ہاتھ رک گیا۔ اس کی نظر بھی انگلی یعنی ریوالور کی نال پر جم کے رہ گئی تھی۔ تھانے دار کا حال زیادہ ابتر تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاید یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ میں کون ہوں۔

یہ سوال پہلے اکبر خان نے کیا "کون ہو تم؟"

میں نے دہاڑ کے کہا "یہ اپنی ماں سے پوچھنا۔ دوسرا سوال کیا احمقانہ ہو تو مجھے معلوم ہے۔ میں کیا چاہتا ہوں۔"

اکبر خان نے غیر ارادی طور پر اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے کہا "پیسہ۔ میں سولہ لاکھ روپے لینے آیا ہوں، کسی کی جان لینے نہیں لیکن سولہ لاکھ بچانے کے لیے کوئی جان دینا چاہے تو اس کی مرضی۔ میری تو ایک گولی خرچ ہو گی۔ سولہ لاکھ میں پھر بھی لے جاؤں گا۔"

اکبر خان کا سارا غم و غصہ تھانے دار کی طرف منتقل ہو گیا "یہ تمہارا ڈاکو کہتا ہے نا!؟ لیے ڈرامے بہت دیکھے ہیں میں نے۔"

تھانے دار نے خشک لبوں پر زبان پھیری "بہت دیکھے ہیں تو پھر یہ بھی دیکھ لو۔ میں انکار کروں گا کہ اس میں میرا ہاتھ نہیں تو تم ثابت کر سکتے ہو تو کر لو۔"

میں نے تھانے دار کے لات ماری۔ لات اس کے شانے پر لگی اور وہ کرسی سمیت گر گیا۔ میں نے اسے مشتعل ہو کے ریوالور نکالتے دیکھا اور دوسری ٹھوکر اس کے ہاتھ پر ماری۔ وہ بلبلایا اور ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کے میز کی سطح سے ٹکرایا۔

"اٹھ تیری..." میں نے اُجڈ لہجے میں اسے گالی دے کر اس کی پسلیوں میں ٹھوکر لگائی "کھڑا ہو جا سیدھا الف کی طرح۔ ہاتھ اوپر۔ خبردار جو کوئی اس کی۔ منہ دیوار کی طرف۔"

تھانے دار کو ایک لات اور دو ٹھوکریں کھا کے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ ریوالور کے بغیر بھی حریف اس کے مقابلے میں زیادہ جاندار ہے۔ اس نے تعمیل کی۔ میں نے پورا خیال رکھا تھا کہ میرا ہاتھ چادر سے باہر نہ آنے اور میری انگلی کی دہشت ریوالور کی نال کی طرح قائم رہے۔ جب مجھے اصل ریوالور اٹھانے کا موقع ملا تو میں نے دیر نہیں لگائی۔ فلمی ولن کی طرح ایک قہقہہ لگا کے میں نے کہا "بس او تھانے دار! اتنی تھوڑی عقل ہے تیرے سر میں؟ اکڑ فوں ساری دو منٹ میں ختم ہو گئی۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا لیکن اب ہے۔ جس کی جو بولی اس کا سر۔ تیرے ریوالور کی گولی تیری ہی کھوپڑی نکال دے گی۔"

اس نے بڑی مشکل سے کہا "تم طافو کے ساتھی ہو؟"

میں نے طافو کو ایک غلیظ گالی دی "میں شریف ڈاکو کا ساتھی ہوں۔ اس نے ہی بھیجا ہے مجھے کہ جا کے تھانے سے سولہ لاکھ لے آؤ۔"

"تمہیں ضرور طافو کے کسی غدار نے بتایا ہو گا۔"

"اس... کا نام مت لے یار۔ اس نے ڈاکوؤں کے نام کو بدنام کر دیا۔ بزدل، نامرد۔ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مروا دیا۔ خود الگ ہوتا تھا تو سردار کیوں بنا تھا؟ اس کے بندے اور کہاں جائیں گے۔ ایک ہی شیر باقی رہ گیا ہے جنگل میں... شریف ڈاکو۔"

اکبر خان ابھی تک خاموش تھا۔ اس نے کہا "شریف ڈاکو خود کیوں نہیں آیا؟ تم کو مرنے کے لیے بھیج دیا۔"

"ایسا کون مائی کا لال ہے جو یہ دعوے کرتا ہے؟"

"میرے ذاتی محافظ گاڑی میں موجود ہیں" اکبر خان بولا۔

"کون سی گاڑی؟" میں نے حقارت سے کہا۔

"گاڑی یہاں نہیں ہے۔ تمہیں نظر نہیں آئے گی لیکن محافظ سب سن رہے ہوں گے" اکبر خان مسکرایا "وہ آتے ہی ہوں۔"

اب مجھے خطرے کے وجود کا احساس ہونے لگا۔ اکبر خان سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ بلف کھیل رہا ہو لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کی جیب میں کوئی موبائل فون ہو یا واکی ٹاکی قسم کی چیز ہو۔ وہ تھانے دار کو بھی بتا چکا تھا کہ سولہ لاکھ کی رقم کے لیے اس نے حفاظتی انتظام میں کمی نہیں چھوڑی تھی۔

"یہاں تو مجھے اکیلے ہی آنا تھا۔" اکبر خان اپنی بات کا خاطر خواہ اثر دیکھ کے بولا "مگر میں اتنا احمق بہرحال نہیں ہوں کہ ڈاکوؤں کو تھانے میں ادائیگی کرنے جاؤں تو کسی کو ساتھ نہ لے

www.paksociety.com

جاؤں۔"

اب تھانے دار کا بھی حوصلہ بڑھا "تھانے کے باہر بھی ایک کانسٹیبل ہے۔ دو بندے گشت پر ہیں۔ وہ بھی آنے والے ہیں۔"

میں نے سوچ کے کہا "یہ سب کتنے آدمی ہو گئے؟ چار۔ تمہیں ملا کے۔ کوئی بات نہیں۔ چھ گولیاں ہوں گی ریوالور میں۔ پہلے اسے بلالو جو باہر کھڑا ہے۔ تم اسے حکم دے سکتے ہو کہ تم پر قربان ہو جائے۔ تم افسر ہو۔"

اپنی بات ختم ہونے سے پہلے ہی میں نے ریوالور کا بٹ اس کے سر پر مارا۔ اس کے حلق سے "اوغ" کی آواز نکلی اور اس کا بھاری بھرکم وجود لڑکھڑا کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

"تم کیا چاہتے ہو سیٹھ؟" میں نے خونخوار نظروں سے اکبر خان کو گھور کے کہا "تمہیں میں نے آتے ہی بتا دیا تھا کہ میں جان کسی کی نہیں لینا چاہتا۔"

"مجھے مار کے تم بھی نہیں بچو گے۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن ایک سیٹھ کے مقابلے میں ایک ڈاکو کی زندگی کی کیا حیثیت ہے۔ ڈاکو تو روز مارے جاتے ہیں۔ پولیس والوں سے ہماری پرانی دشمنی ہے۔ تم سے نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ رقم بریف کیس میں ہے" اس نے سمجھایا۔

"تو بے نہیں سیٹھ۔ بریف کیس کھول کے دکھاؤ۔"

"کیا تمہیں اعتبار نہیں؟"

"نہیں۔ بریف کیس میں بم بھی ہو سکتا ہے۔ جو کھولے وہ ایک دھماکے میں نیچے سے اوپر پہنچ جائے" میں نے کہا "اللہ میاں کے پاس۔"

"بہت چالاک آدمی ہو تم" اکبر خان بولا اور اس نے نمبر ملا کے بریف کیس کھول دیا۔

اگر میں یہ احتیاط نہ کرتا تو وہی ہوتا جس کا مجھے ڈر تھا۔ وہ مجھے قتل کیسی جیتن بنا دیتا اور شاید اس سے کوئی سرکٹ پورا ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ہی میری زندگی کا سفر بھی۔ یہ سائنس یا فکشن کی بات نہیں۔ اس قسم کے "بوبی ٹریپ" اکبر خان جیسے لوگ ہی استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ایسی کوئی بات نہ ہو اور میرا خوف میرا وہم بن گیا ہو۔

"رقم پوری ہے" اکبر خان نے بریف کیس میری طرف سرکا دیا۔

"آپ اپنے بندوں سے کہو کہ جہاں ہیں وہیں رہیں۔ ادھر تشریف لا رہے ہیں تو واپس چلے جائیں" میں نے کہا "اس طرح تم محفوظ رہو گے ورنہ میرا راستہ تو تمہارا باپ بھی نہیں روک سکتا۔ میں تم کو ڈھال بنا کے ساتھ لے جاؤں گا اور شریف ڈاکو کے حوالے کر دوں گا۔ آگے اس کی مرضی کہ تمہیں زندہ گاڑے یا تمہاری لاش کا تحفہ بھیج دے۔"

وہ میری باتوں سے ڈر گیا۔ اس نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا اور رک کے کہا "تمہیں ریوالور نہیں نکال رہا ہوں۔"

"میری طرف سے اجازت ہے۔ گولی تو پہلے میں ہی چلاؤں گا اور میرا نشانہ ایسا ہے کہ سوراخ بالکل تمہاری پیشانی کے بیچ ہو گا۔ ایک سوت کا فرق نہیں ہو گا۔"

اس نے جیب سے دو انچ چوڑا اور چار یا پانچ انچ لمبا واکی ٹاکی نکالا۔ اس میں سے ایریل باہر کھینچا اور ریسیور والا حصہ کان سے لگا لیا۔ میں نے اپنا کان اس کے کان سے ملا دیا۔

"ہیلو۔"

"یس باس۔" کسی نے بڑی مستعدی سے کہا "کیا حکم ہے؟"

"کوئی حکم نہیں۔ کہاں ہو تم؟"

"وہیں باس۔" ٹیلی فون کے مقابلے میں اس ریسیور کی آواز اتنی زیادہ تھی کہ مجھے بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ وہیں ٹھہرو اور انتظار کرو" اکبر خان نے کہا اور ایریل کو پھر اندر کر دیا۔

"یہ کھلونا مجھے دے دو" میں نے کہا "پہلے تم نے جھوٹ بولا تھا کہ تمہارے ساتھی ساری گفتگو سن رہے ہیں۔"

"اس میں جھوٹ کیا ہے؟"

میں نے اس کے گال پر الٹے ہاتھ کا طمانچہ مارا "یہ الو اور اس کا ایریل جب تک باہر نہ کھینچا جائے اس کی آواز کب سے باہر نہیں جا سکتی۔"

اس نے واکی ٹاکی مجھے تھما دیا "یہ تمہارے لیے ہے۔"

میں نے اسے جیب میں ڈال کے کہا "اس تھانے دار کو اٹھا کے حوالات میں پہنچا دو۔ اس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ کے منہ میں کپڑا ٹھونس دو۔"

"رسی کہاں ہے؟" اکبر خان مجبوراً اٹھا۔

"حوالات میں ہو گی۔ یہاں ہتھکڑی کا کام رسی سے لیا جاتا ہے۔"

اکبر خان بڑی مشکل سے تھانے دار کو گھسیٹ کر حوالات تک لے گیا۔ وہاں رسی موجود تھی۔ جب وہ تھانے دار کو باندھ کے فارغ ہوا تو میں نے اسے ایک کپڑا دیا جو شاید گرد جھاڑنے کے لیے آتا ہو گا۔ میری نظر باہر کی طرف تھی۔ گشت پر جانے والے بندے کسی وقت بھی آ سکتے تھے۔ تھانے دار نے اکبر کے ساتھ ان کو کہیں بھیجا ہو گا تاکہ وہ سولہ لاکھ میں سے اپنا حصہ وصول کرے۔ دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔ گیٹ پر موجود کانسٹیبل بھی اپنی جگہ سے اندر نہیں آ سکتا تھا لیکن یہ مہلت محدود تھی۔ آدھا گھنٹہ گزرا اور اگلے آدھے گھنٹے میں مجھے بہت کچھ کرنا تھا۔

اکبر خان سیدھا ہوا ہی تھا کہ میں نے اس کے سر پر پستول کے دستے کی ضرب لگائی۔ اس نے گرنے سے پہلے میری طرف دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں غصے کے بجائے حیرانی نظر آئی۔

مجھے اس طرح کامیابی کی امید نہیں تھی۔ میں نے اسی رسی کے باقی حصے سے اکبر خان کے ہاتھ پاؤں باندھنے میں استعمال کیا اور جھاڑن کے بچے ہوئے ٹکڑے سے اس کا منہ بند کر دیا۔

خالی حوالات کے فولادی گیٹ پر تالا لٹک رہا تھا اور اس کی چابی معلوم نہیں کہاں تھی۔ یہ کھٹکے والا تالا تھا۔ دروازہ بند کر کے میں نے تالا لگایا اور پھر کھڑکی کے راستے باہر نکل گیا۔ بریف کیس کو میں نے چادر کے نیچے چھپا لیا تھا۔

محسن میرے انتظار میں بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا "کیا ہوا؟ اتنی دیر کیوں لگی؟"

میں نے بریف کیس اسے پکڑا دیا "یہ لے جاؤ ڈاک بنگلے۔ اس میں پورے سولہ لاکھ ہیں۔"

"کون لایا ہے؟ منظر یا یوسف؟"

میں نے کہا "اکبر خان۔"

محسن نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "اکبر خان!"

"ہاں۔ بعد میں ساری بات بتاؤں گا۔ یہ رقم گل کے حوالے کرنا۔ اس سے کہنا کہ طاہرہ کو دے دے یا سب لوگوں میں تقسیم کر دے۔ میرا انتظار مت کرنا۔ تم لوگ فوراً نکل جانا۔ دو گھوڑے ہیں۔"

"اور تم؟"

"میں بعد میں آ جاؤں گا۔ منظر کے گھر پہنچ جاؤں گا" میں نے کہا۔

"لیکن کب؟" محسن پریشان ہو گیا۔

"آج ہی رات تک" میں نے کہا "اب تو جا۔ ایک گھوڑے پر سواری کرنا، دوسرے کی رکاب تھام لے۔"

"لیکن کیا چکر ہے؟ ہم ایسے نہیں جا سکتے۔"

"یار محسن! مجھ پر یقین کرنا چاہیے" میں نے کہا "فکر کی کوئی بات نہیں۔ جانے سے پہلے اپنے کپڑے دے جا مجھے۔"

"یار! تُو کیا کر رہا ہے آخر؟" محسن جھنجھلا گیا۔

"ابھی مت پوچھ۔ یہ پتلون قمیص اور جوتے مجھے دے۔ میرے کپڑے پہن اور بھاگ جا" میں نے کہا "دو گھوڑوں پر تم یہاں آسانی سے نکل جاؤ گے۔ گل سے کہنا محفوظ راستہ اختیار کرے۔ سڑک کی طرف سے جاؤ گے تو راستے میں اکبر خان کے آدمی کھڑے ہیں۔ چل اپنا منہ دوسری طرف کر۔ ہاتھ پیچھے کر کے کپڑے اتار۔"

میں نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا اور چند منٹ میں میرا لباس محسن کے جسم پر اور محسن کا میرے بدن پر آ گیا تو ہم نے پلٹ کر ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنسے۔ پھر محسن گھوڑے پر سوار ہوا اور اس نے دوسرے گھوڑے کی لگام اسے تھما دی۔ دوسرا گھوڑا بھی حسب معمول سر جھکا کے ساتھ چل پڑا۔ وہ سرکش گھوڑا جس نے مجھے بیٹھنے کی کوشش کی تھی محسن کے معاملے میں نہ جانے کہاں سب سرکشی بھول گیا۔

محسن نے مجھے غور سے دیکھا "دیکھا ساری ہیکڑی بھول گیا سالا۔"

میں نے لاپروائی سے کہا "یہ پچھلے جنم میں تیرا ماما ہو گا۔"

جب محسن ڈاک بنگلے کی طرف جانے والے راستے پر غائب ہو گیا تو میں نے ہاتھ سے بال سنوارے۔ اپنا حلیہ ٹھیک کیا اور پکی سڑک کی طرف سے سیدھا تھانے کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس بار میں گیٹ کی طرف سے گیا تھا چنانچہ سنتری نے بہت دور سے ہی مجھے دیکھ لیا تھا۔

اگر میں سیدھا گزرنے کی کوشش کرتا تو شاید وہ مجھے روکتا مگر میں نے بڑے دوستانہ طریقے پر اس سے ہاتھ ملایا "کیا حال ہے سنتری بادشاہ؟ اپنے انچارج صاحب ہیں؟"

"جی۔ پر کوئی مہمان بیٹھا ہے۔"

"اچھا تم جا کے انہیں بتا دو کہ سکندر صاحب آئے ہیں۔ انہیں ملنا ہو گا تو بلا لیں گے ورنہ میں پھر آ جاؤں گا" میں نے کہا۔

سنتری میری شرافت سے متاثر ہوا "دراصل انہوں نے منع کر رکھا ہے کہ اندر کوئی بھی نہ آئے میری اجازت کے بغیر۔ میں ابھی پوچھ کے آتا ہوں۔"

حسب توقع ایک منٹ بعد اس نے اندر سے شور مچا دیا۔ اس کے شور کو قتل عیارانہ کہا جا سکتا تھا کیونکہ بیک وقت وہ اپنے "سر" کو پکار رہا تھا اور ان سے پوچھ رہا تھا کہ آپ کو کیا ہو گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ "سر" اپنے مضروب سر کے باعث [illegible] ہیں۔ شراب کے نشے میں دُھت نہیں پڑے ہیں۔ پھر وہ مدد کے لیے پکار رہا تھا حالانکہ میرے سوا مدد کی پکار سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

اخلاقاً میرا اندر بھاگ کر جانا اور صورت حال پر بے حد تشویش کا اظہار کرنا بھی ضروری تھا۔ میں نے کہا "ارے یہ کیا! انہیں کس نے بند کر دیا حوالات میں؟ اوہو ہو۔ ان کے تو ہاتھ بھی بندھے ہوئے ہیں اور ان کے منہ میں بھی کچھ ہے۔ کیا یہ کپڑا کھا رہے ہیں؟"

"نہیں جی۔ منہ بند کرنے کے لیے کپڑا ٹھونسا ہے کسی نے۔"

اس نے نادانستگی میں مجھے گالی دی جس کا میں نے برا نہیں مانا "یہ بے ہوش ہیں۔"

"اچھا اچھا" میں نے سر ہلایا "بے ہوش بھی ہیں۔ یہ تو بڑی بری بات ہے۔ مگر کیوں بے ہوش ہیں؟ کمزوری ہے یا دل کا دورہ پڑا ہے؟"

"یار! تم بڑے ہی بے وقوف ہو" کانسٹیبل جھلا کے بولا "اتنا بھی نہیں سمجھتے کسی نے ان کو مار کے اندر ڈال دیا ہے۔"

"اچھا!" میں نے احمقوں کی طرح اسے دیکھا "مگر کس نے؟"

"میں کیا جانوں؟"

میں نے کہا "کیوں؟ تم باہر کھڑے تھے کوئی تو اندر گیا ہو گا۔"

www.paksociety.com

"اندر تو بس یہ مہمان گئے تھے" وہ پریشان ہو کے بولا۔
"تو پھر کیا انھوں نے ایک دوسرے کو ناک آؤٹ کر دیا اور ایک دوسرے کو باندھ کے...؟"
کانسٹیبل نے مجھے خونی نظروں سے دیکھا۔ "ارے پاگل دے پتر! کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ نہ کچھ کرتا ہے نہ کرنے دیتا ہے؟"
میں نے کہا "تم تالا کھولو تو میں کچھ کروں۔ باہر سے کیا ہو سکتا ہے۔"
"تالا کیسے کھولوں؟" وہ بدحواس ہو گیا تھا۔
"چابی سے۔" میں نے معصومیت سے کہا۔
"چابی کہاں سے لاؤں؟ چابی تو.... خیر میں تالا توڑتا ہوں"
اس نے بندوق اٹھا کے اس کا کندا مارنے کی تیاری کی۔
"سوچ لو۔ سرکاری تالا ہے" میں نے کہا۔
اس نے مجھے گھور کے تالے پر وار کیا اور بندوق ایک طرف پھینک کے "سر" کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اکبر خان کے ہاتھ پیر کھولے اور کانسٹیبل نے اپنے افسر اعلیٰ کے۔ ہم انھیں گھسیٹ کر باہر لائے اور کمرے میں لے گئے۔ کمرے میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کانسٹیبل نے مجھ سے کہا کہ میں "سر" کو اٹھا کے چارپائی پر لٹانے میں اس کی مدد کروں۔ اس نے تھانے دار کو بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھایا، میں نے ٹانگیں پکڑ کے لیکن ایک مرتبہ میں نے جان بوجھ کے ٹانگیں چھوڑ دیں۔ تھانے دار کا آدھا دھڑ فرش پر گرا۔ میں نے "سوری" کہہ کے اسے پھر اٹھایا اور چارپائی پر ڈال دیا۔ پھر اکبر خان کی باری آئی۔ کانسٹیبل پانی لے کر آیا اور ہم نے ان کے منہ پر چھینٹے مارے۔ موقع پاتے ہی میں نے اکبر خان کا واکی ٹاکی پھر اس کی جیب میں ڈال دیا۔ چند منٹ کے بعد جب وہ ہوش میں آنے لگے تھے تو گشتی پارٹی بھی پہنچ گئی۔ تھانے کے اندر ہونے والی اس واردات نے خاصی سنسنی پھیلا دی تھی۔
گشتی پارٹی میں ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ اس نے سنتری کو ڈانٹنا شروع کیا "اندھے، کھوتے! تم نے نہیں دیکھا کسی کو اندر جاتے ہوئے تو پھر کیا یہ کام جن کر گئے؟"
"قسم خدا کی، میں نے کسی کو اندر جاتے نہیں دیکھا۔ نہ باہر آتے" کانسٹیبل نے اپنی بے گناہی ثابت کی "ان صاحب سے پوچھ لو۔ جب یہ آئے تو میں ڈیوٹی پر تھا۔"
میں نے اقرار میں سر ہلایا "اس وقت تو یہ موجود تھا۔ اس سے پہلے کا میں نہیں بتا سکتا۔"
"اس سے پہلے بھی میں یہیں موجود تھا۔ سر جی نے کہا تھا کہ کسی کو اندر مت آنے دینا۔"
سر جی بالآخر ہوش میں آ گئے اور کچھ دیر آنکھیں کھول کھول کر گھمانے کے بعد اٹھ بیٹھے۔ ان کا سر اب بھی ڈانواڈول تھا۔ ظاہر ہے وہ غصے میں آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ ان کے سب ماتحتوں کے سامنے ان کی سخت بے عزتی "خراب" ہوئی تھی۔ انھوں نے تھانے دار صاحب کو حوالات میں بند دیکھا تھا اور ناگفتہ بہ حالت میں۔ اس وقت تک اکبر خان بھی ہوش میں آ گیا تھا۔
تھانے دار نے ایک ماتحت کو چائے بنانے کے لیے کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ "میں اس... کو نہیں چھوڑوں گا" اس نے سر ہلا کے کہا اور پھر مزید اعلانات کیے کہ وہ شریف ڈاکو اور اس کے اہل خانہ کے ساتھ کیا کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔
اکبر خان نے پہلے پانی پیا اور پھر سگریٹ کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو واکی ٹاکی اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، پھر اس کا ایریل کھینچ لیا "ہیلو۔" اس نے کہا "جتنی جلدی ممکن ہو یہاں آ جاؤ۔" اور جواب کا انتظار کیے بغیر اسے بند کر دیا۔
اب میں نے کہا "یہ کیا قصہ ہے اکبر خان... تم یہاں؟"
"تھانے دار صاحب بتائیں گے تمھیں سب۔ میں تو رقم لے کر آیا تھا تمھیں دینے کے لیے۔ ایک اکیلا ڈاکو کھڑکی کے راستے آیا اور لوٹ کر لے گیا۔" اس نے پولیس کی شان میں، تھانے دار کی بہادری کی شان میں اور پورے محکمے کی فرض شناسی کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا۔
میں نے بے حد حیران ہو کے کہا "صرف ایک ڈاکو!"
"صرف ایک آدمی۔ خالی ہاتھ آیا تھا وہ۔ بعد میں تھانے دار سے ہی ریوالور چھینا اس نے" اکبر خان نے بتانا شروع کیا۔
تھانے دار نے دہاڑ کے کہا "اوئے کدھر مر گئے ہو سب!؟ پرچا کاٹو شریف ڈاکو کے خلاف۔ سولہ لاکھ کی ڈکیتی، اقدام قتل، سرکاری فرائض میں مداخلت، اغوا، سب لکھ دو۔"
"مت کرو یہ ڈراما میرے سامنے تھانے دار" اکبر خان نے گرج کے کہا "مجھے اندیشہ تھا کہ یہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔ تھانے دار" اکبر خان "اگر کا اچھا نہیں ہے کہ تمھاری چالاکی نہ سمجھوں۔ تم احمق ہو۔ میں نے تمھیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہ پہنچایا تو اپنے باپ کی نہیں کسی کتے کی اولاد سمجھوں گا خود کو۔ میں اوپر خود سب بتاؤں گا۔"
تھانے دار کی حالت غیر ہو گئی "یہ... آپ کیا فرما رہے ہیں؟ میں تو رپورٹ لکھ رہا ہوں۔ شریف ڈاکو کے سارے کرتوت"
"شریف ڈاکو!" اکبر خان نے طنز سے کہا "کون شریف ڈاکو؟ تھانے دار؟ وہ تمھارا آدمی تھا۔ تم نے اسے سب بتایا تھا۔"
"یہ جھوٹ ہے" تھانے دار دہاڑ کے بولا "مجھ پر الزام ہے"
"میں ایک ایک پیسہ وصول کر لوں گا تم سے" اکبر خان گرجا ہوا "میری بہت بے عزتی ہوئی ہے۔"
"میری بے عزتی نہیں ہوئی؟" تھانے دار گرجا۔

"تمھاری عزت ہوتی ہے؟" اکبر خان نے تلخ لہجے میں نفرت سے کہا۔
باہر ایک گاڑی آ کے رکی اور ایک ساتھ چار مسلح افراد اندر آ گئے۔ وہ اکبر خان کے باڈی گارڈ تھے۔ "میں جا رہا ہوں تھانے دار۔ کل تک کی مہلت ہے تمھارے پاس۔"
تھانے دار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر پکڑے بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔ ڈاکا ڈالنے والا اس کے خیال میں شریف ڈاکو ہی تھا مگر اکبر خان یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ کسی طرح بھی اکبر خان کو یقین نہیں دلا سکتا تھا کہ اس نے کوئی ڈراما نہیں کیا تھا اور اس سے یہ وعدہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کل تک ساری رقم ڈاکو سے وصول کر لے گا۔
میں نے کہا "اکبر خان! تم نے مجھے بتایا نہیں کہ رقم لے کر تم کیوں آئے تھے؟ میں نے تو منظر سے کہا تھا۔ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"
"مجھے غالب نے بتایا تھا" اکبر خان بولا "تمھارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟"
"وہ کہاں ہو سکتے ہیں اکبر خان، غالب نے یہ نہیں بتایا تھا؟"
"تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کل تک رقم کا پھر انتظام کر لوں گا مگر اس تھانے دار نے جو حرامی پن کیا ہے..."
میں نے اس کی بات کاٹ دی "شکریہ اکبر خان۔ میں تمھارا احسان مند ہونا نہیں چاہتا۔ اچھا ہوا کہ وہ رقم شریف ڈاکو لے گیا۔ ورنہ لے جاتا پھر بھی میں قبول نہ کرتا۔ تمھیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے میرے وسائل کم نہیں ہیں۔ یہ میں غالب سے بعد میں پوچھوں گا کہ اس نے تم سے مدد کے لیے کیوں کہا؟"
"اس نے مدد کے لیے تو نہیں کہا تھا مگر میں خود آ گیا تھا۔ کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟"
"بہت فرق پڑتا ہے اکبر خان۔ دوبارہ کوئی انتظام مت کرنا۔ نااہلی کی غلطی سے تمھارا نقصان ہوا اس کا مجھے افسوس ہے۔"
اکبر خان نے آہستہ سے سر ہلایا اور نہ جانے کیا سوچ کے خاموشی سے باہر چلا گیا۔
"بہت خوب تھانے دار صاحب!" میں نے موقع پاتے ہی کہا "تھانے کچھ دیکھا تو نہیں لیکن جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے اس کے بعد پولیس پر سے میرا رہا سہا اعتبار بھی اٹھ گیا ہے۔"
"کیا ہو گا تمھارا اعتبار اٹھ جانے سے؟ پولیس کا محکمہ ٹوٹ جائے گا؟" اس نے چراغ پا ہو کے کہا "یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا۔"
"میری وجہ سے!" میں نے کہا "تھانے دار! مجھ سے پنگا مت لو۔ اکبر خان کے بعد مجھے دشمن مت بناؤ۔ تم نہیں جانتے کہ میں کیا ہوں اور کیا کر سکتا ہوں۔ ابھی تو میں جا رہا ہوں۔"
"جاؤ، دفع ہو جاؤ۔ کمینو اس... خافو سے کہ نہیں ہیں سولہ لاکھ۔ تم سب کو لائن میں کھڑا کر کے گولی مار دے۔ مجھ پر بڑا احسان ہو گا" تھانے دار چیخ کے بولا۔
صدمے، احساس ذلت اور غصے میں وہ پاگل ہو رہا تھا۔ میں اطمینان سے باہر نکلا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک گل، محسن اور رابعہ شہر روانہ ہو چکے ہوں گے ورنہ رات تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ ان کے لیے اب کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔ خطرہ خانو ایجنڈ کمپنی کے لیے بھی نہیں تھا۔ انھیں سولہ لاکھ مل گئے تھے مگر ڈکیتی ان کے حریف شریف ڈاکو کے کھاتے میں لکھی گئی تھی۔
اکبر خان گاڑی میں سوار ہو چکا تھا کہ میں نے اسے ہاتھ دے کر روک لیا "اگر تم شہر جا رہے ہو تو..."
"کیوں نہیں۔ بیٹھو" اس نے میرے لیے دروازہ کھولا۔
اسی وقت دوسری گاڑی میرے قریب آ رکی۔
"ادھر کہاں جا رہے ہو سرکار؟ ہم بھی تو تمھیں ہی لے جانے کے لیے آئے ہیں۔" کار سے اترنے والوں نے مجھے دونوں جانب سے گھیر لیا۔
"یک نہ شد دو شد" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ آگے کھائی تو پیچھے کنواں۔ فیصلہ مجھے کرنا تھا کہ مجھے کس میں کودنا چاہیے۔

گاڑی بہت بیش قیمت تھی مگر جو لوگ اس میں سے اُترے تھے وہ شکل سے بدمعاش کم اور جوکر زیادہ لگتے تھے۔ وہ ایک ہی قدوقامت کے جوان تری تھے اور شرٹ پتلون پہنے ہوئے تھے مگر کپڑے ان کے اپنے نہیں لگتے تھے۔ ایک جوڑا کسی لمبے آدمی کا تھا تو دوسرا پست قد اور موٹے تری کا مگر انہوں نے تقسیم ایسے کی تھی کہ لمبی پتلون والے نے چھوٹی شرٹ پہن رکھی تھی جو چھوٹی بھی تھی اور تنگ بھی۔ لمبی شرٹ کے ساتھ پتلون جھولتی ہوئی گھٹنوں تک پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔ انہوں نے شام کے دھندلکے میں بھی سیاہ چشمے لگا رکھے تھے اور اپنی اداکاری سے وہ فلمی ولن بننے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس ایٹ کنڈائی کے باوجود میں نے غالب کو پہچان لیا لیکن رابعہ کے سب سے ہونہار اور قابلِ اعتبار ساحران وقار یوسف ایڈووکیٹ کو پہلی بار بدلے ہوئے روپ میں دیکھ کر نہ شناخت کر سکا۔ غالب اپنی آواز سے سلطان راہی کی کاپی کر رہا تھا اور وقار یوسف مصطفیٰ قریشی کی۔

لیکن یہ سب کچھ میں نے بعد میں دیکھا۔ میرا پہلا ردِعمل یہ تھا کہ وہ بھی سیٹھ اکبر کے محافظ ہیں۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور میں نے پیچھے سے سیٹھ اکبر کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ سیٹھ اکبر اگلی سیٹ پر انتہائی بے بس تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی ٹانگیں چلا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا ڈرائیور اور باڈی گارڈ مسلح ہونے کے باوجود اسے میری گرفت سے نہیں چھڑا سکتا تھا۔ اگر وہ اس کی کوشش بھی کرتا تو سیٹھ اکبر کی گردن کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی۔ وہ تجربے کار اور سمجھدار آدمی تھا چنانچہ اس نے صورتِ حال کو مداخلت سے زیادہ خطرناک اور جان لیوا بنانے سے گریز کیا۔

سیٹھ اکبر کی سانس رکنے لگی تھی اور اس کی آنکھیں حلقوں سے اُبلنے پر آمادہ تھیں۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "یہ ۔۔۔ کیا ۔۔۔ ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ وہی کنواں ہے جس میں کنواں کھودنے والا زندہ گرتا ہے۔ تمہاری زندگی کا خاتمہ انہی کی وجہ سے ہو جائے گا جن کو تم نے زندگی کی حفاظت کے لیے رکھا تھا۔ خصوصی اور خفیہ انتظام کے طور پر۔"

اس نے نفی میں گردن ہلانے کی کوشش کی۔ "غلط ...... غلط ......"

اس کے ڈرائیور نے سیٹھ اکبر کی مدد کی۔ "صاب بولتا ہے کہ آپ نے غلط سمجھا۔"

"ہز ماسٹرز وائس (His Master's Voice) کے کتے تم اپنا بھونکنا بند رکھو اور سیدھا سامنے دیکھو۔ اگر موت کا فرشتہ ادھر آتا دکھائی دے تو اپنے صاب کو بتا دینا۔"

"اوئے چھوڑ دے بندہ ساڈا۔" یہ غالب کی آواز تھی جو مجھے للکار رہی تھی۔

"ایہہ گل سمجھ لے چنگی طرح کہ اسی بڑے ظالم لوک ہیگے آں۔" وقار یوسف نے سر ہلایا۔

سیٹھ اکبر کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ میں نے بازو تھوڑا سا ڈھیلا کیا تو اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "سکندر! یقین کرو یہ میرے آدمی نہیں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "پھر یہ تمہیں کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ یہ تم کو اپنا بندہ کیوں کہتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ یہ کوئی چال ہے میرے دشمنوں کی۔" سیٹھ اکبر نے کہا۔ "تم انہی سے پوچھو کہ انہیں کس نے بھیجا ہے۔"

"ارے سیٹھ صاحب۔۔۔ کی پئے کہندے او۔ اسی جاں نثار پرانے۔" غالب نے لہجے میں حیرانی کے جذبات شامل کیے۔

"تواڈے حکم دے غلام آں جناب عالی۔" وقار یوسف بولا۔

میں نے سیٹھ اکبر کی گردن پھر دبائی۔ "اب کیا فرماتے ہیں آپ؟ اب بھی اصرار ہے کہ یہ تمہارے آدمی نہیں ہیں؟ یہ اپنی زبان سے تمہارے منہ پر خود کو جاں نثار اور حکم کے غلام کہہ رہے ہیں۔"

"ایک ۔۔۔ ایک منٹ ۔۔۔ چھوڑو مجھے ۔۔۔" سیٹھ اکبر نے کہا۔ "میں پوچھتا ہوں ان حرام زادوں سے۔ یہ مجھے مروانا چاہتے ہیں۔"

ڈرائیور کی حالت سب سے عجیب تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس کی مانے اور کس کی نہ مانے، کس کی حمایت میں بولے اور کس کو سمجھائے۔

ڈرائیور نے پھر کہا۔ "سر یہ کوئی دھوکے باز ہیں۔ ان کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔"

میں نے کہا۔ "بڑے لوگوں کے چکر بھی بڑے ہوتے ہیں۔ یہ آپ خود پوچھ کے مجھے مطلع فرمائیں کہ یہ دھوکے باز کون ہیں، کیا چاہتے ہیں اور بلا معاوضہ آپ کی خاطر ۔۔۔ کیوں اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔"

ڈرائیور نے ہمت سے کام لیا۔ "اوئے تم کون ہو؟ ۔۔۔ کون ہو تم ۔۔۔ کیوں پنگا لے رہے ہو بلاوجہ۔ چلو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

غالب نے پریشانی سے وقار یوسف کی طرف دیکھا۔ "اوئے لالے ۔۔۔ ایہہ کی ہو ریا اے۔ سیٹھوں نے سمجھ نہیں آئی۔"

"بس جی اساں بھانا بائی ۔۔۔ جے ساڈی لوڑ نہیں سی تے فیر ساہنوں سدیا کیوں سی۔" "اگر ہماری ضرورت نہیں تھی تو ہم سے کہا کیوں تھا۔"

سیٹھ اکبر پھٹ پڑا۔ "بکواس بند کرو ۔۔۔ کس ۔۔۔ کس نے کہا تم سے ۔۔۔ میں نے؟"

غالب نے سر ہلایا۔ "آہو جی۔ آپ نے ہی تو بکنگ کی تھی۔"

"یہ گاڑی میری نہیں ہے۔ سکندر۔ تم اس کا نمبر نوٹ کر کے دیکھ لو۔" سیٹھ اکبر نے بڑی مشکل سے کہا۔

میں نے کہا۔ "تم اپنے ڈرائیور سے کہہ سکتے ہو کہ وہ باہر نکل کے نمبر پڑھ کر ہمیں بتائے۔"

"ہز بار شاہو! نمبر ای پڑھ دیندے آں۔ ویکھو جی ...... تھری فور نائن۔" غالب نے کہا۔

"تھری فور، تھری نائن۔" ڈرائیور نے حیرانی سے دہرایا۔ "یہ نمبر سیٹھ صاحب کی گاڑی کا ہے۔"

"مگر گاڑی سیٹھ صاحب کی نہیں ہے۔" میں نے طنز سے کہا۔ "یہ گاڑی تو خود پکار پکار کے کہتی ہے کہ میں کسی معمولی آدمی کی ملکیت نہیں ہوں۔ ایسی گاڑی سیٹھ اکبر جیسے لوگ ہی رکھ سکتے ہیں۔"

"تے سوہنیو تُسی نے پنج پنج ہزار ساہنوں کار دے لئی دتے سن؟ آپ نے پانچ پانچ ہزار روپے اسی لیے دیے تھے؟"

"یہ کوئی سازش ہے۔ حرامی پن ہے۔" سیٹھ اکبر غصے میں آگ بگولا ہو گیا۔ "گاڑی میری نہیں ہے۔ انہوں نے میری گاڑی کی نمبر پلیٹ لگا رکھی ہے۔ تم خود دیکھ سکتے ہو۔"

"میں نہیں دیکھ سکتا۔ انہی سے پوچھو۔"

غالب نے کہا "بادشاہو! ساڈی گڈی دا نمبر ہے۔ ایل ای۔ زیرو فور زیرو فور۔ کیوں بھئی لالے؟"

"سچ آکھدے ہو بھا جی۔" وقار یوسف نے سر ہلایا۔

"بکواس! جھوٹ۔" سیٹھ اکبر چیخا۔ "یہ میری گاڑی کا نمبر کیسے ہو سکتا ہے۔ غلط نمبر ہے۔ غور سے دیکھو۔"

ڈرائیور نے گاڑی کے پیچھے جا کر دیکھا اور بولا "نمبر تو یہی ہے سیٹھ صاحب۔ آپ کی گاڑی کا۔ زیرو فور۔ زیرو فور۔"

"اور یہ میری گاڑی کا؟"

"اس کا بھی ۔۔۔ تھری فور تھری نائن۔" ڈرائیور نے کہا۔

سیٹھ اکبر خاموش ہو گیا۔ اس تمام صورتِ حال کو وہ خود نہیں سمجھ پا رہا تھا تو کیا سمجھاتا۔

"اب کیا فرماتے ہیں آپ بیچ اس مسئلے کے؟" میں نے کہا "کیا یہ تمہارے اشارے پر نہیں آئے تھے؟ یہ سازش تم نے نہیں کی تھی کہ عین موقع پر یہ ایک دم پہنچ جائیں۔ کیا یہاں صورتِ حال یہ ہو سکتی ہے کہ یہ گاڑی تمہاری ہے اور تم نے ان مسخروں کی خدمات پانچ پانچ ہزار روپے ۔۔۔"

اکبر خان نے سر ہلایا۔ "میں ابھی کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ میرا مذاق بن گیا ہے۔"

میں مسکرایا۔ میں نے کہا "اکبر خان! یہ بہت ہو گئی۔ اب ان کو حکم دو کہ خاموشی سے لوٹ جائیں۔ ہمارا وقت نہ ضائع کریں۔"

[illegible] بے بسی میں اکبر خان نے چلا کے کہا "اچھا تمہاری [illegible] اب جاؤ دفع ہو جاؤ۔۔۔ میں نے بلایا تھا تا کہ تمہیں اب میں ہی کہہ رہا ہوں کہ جان چھوڑو میری۔ میں معلوم کر لوں گا بعد میں کہ میرے ساتھ یہ حرامی پن کس نے کیا تھا، کس نے بھیجا تھا تمہیں۔"

"تُسی، ہور کون ۔۔۔ تُسی آپ ای۔"

"چل چھڈ یار لالے۔ ساڈوں کی۔" غالب نے وقار یوسف کا بازو پکڑ کے کھینچا۔ "اسی تے چلے جانے آں ۔۔۔ پاگل ہو گئے نے، رجھیں سی وٹا یا ساڈوں۔" (ہمارا کیا ہے؟ چلے جاتے ہیں، ہمیں پاگل کتے نے تو نہیں کاٹا تھا)

غالب نے جاتے جاتے کہا "گڈی کتھے چھڈیے؟" (گاڑی کہاں چھوڑیں؟)

جواب میں اکبر خان نے انہیں نصف درجن گالیوں سے نوازا۔ غالب نے وقار یوسف کی طرف دیکھا اور سر کے پاس انگلی گھما کے واضح کیا کہ سیٹھ کا دماغ پھر گیا ہے۔ وقار یوسف نے اقرار میں سر ہلانے کے علاوہ ہاتھ کے اشارے سے جام اٹھا کے حلق میں انڈیلنے کا منظر پیش کیا کہ سیٹھ نے بہت پی لی ہے۔ پھر وہ دونوں کار میں بیٹھ کے جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی لوٹ گئے۔ ان کی سمجھ بوجھ اور دلچسپ اداکاری سے میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

"اب بولو، اگر تمہارے آدمی نہ ہوتے تو تمہارے حکم پر جاتے؟" میں نے اکبر خان کو چھوڑ دیا اور گاڑی سے اتر گیا۔

اکبر خان نے ایک گہری سانس لی۔ "تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے سکندر۔ اب تک میں نے پوری کوشش کی ہے تمہارے ساتھ مخلص رہنے کی۔ میں نے تم سے پورا تعاون کیا ہے اور تمہیں شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری شکایات بے سبب نہیں۔ ایسے ہی ڈرامے وہ تمہارا بھائی چوہدری دلاور بھی کرتا رہتا ہے جن کا مطلب آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔" میں نے کہا "مگر اب میں اس کے ذہن کو پڑھ لیتا ہوں۔ کسی حد تک سمجھ لیتا ہوں کہ ظاہر کے پردے میں نہاں کیا ہے؟"

"تم سے خدا سمجھے اور خدا تمہیں سمجھائے۔" سیٹھ اکبر خان نے میری بات پر بے بسی سے ہاتھ ہلائے۔ "میں سوا لاکھ لٹا کے بھی تم کو یہ یقین نہیں دلا سکا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"اکبر خان، ایک بات ابھی اسی وقت سمجھ لو۔ میں نے تم سے یہ سوا لاکھ مانگے تھے، نہ یہ میرے کسی کام آئے۔ اگر یہ مجھ تک پہنچ جاتے تو یقیناً تمہارا احسان ہوتا مگر میرے ہاتھوں میں آنے سے پہلے ہی وہ رقم شریف ڈاکو لے گیا۔ مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ وہ شریف ڈاکو تھا یا تمہارا ہی کوئی ساتھی۔ مگر میرا مسئلہ وہیں ہے۔ شاید تمہاری مداخلت کے باعث پہلے سے زیادہ الجھ گیا ہے۔ اس معاملے میں تم ٹانگ نہ اڑاتے تو اچھا تھا۔"

"میں تو مدد کرنا چاہتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔"

"لیکن نتیجہ کیا نکلا اس کا؟ اب مجھے نہیں معلوم کہ تمہاری

www.paksociety.com

اس حرکت کے بعد محسن اور گل کے لیے کیا مشکلات پیدا ہوں گی۔ یہ شریف لوگوں کے شریفانہ قانونی مسائل نہیں ہیں جن میں عیاری اور چالاکی سے کام لینے والے کا کام ہو جاتا ہے۔ یہ چوروں ڈاکوؤں کی بات ہے جو زبان پر اعتبار کرتے ہیں۔ مردوں سے مردوں کی طرح نمٹنا جانتے ہیں اور زبان دے کر دغا کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتے۔"

"یہ سب تم مجھے سمجھا رہے ہو؟" اکبر خان جھلا کے بولا۔

"پھر کیا کروں۔ تم نے ایسی نادانی کا ثبوت دیا ہے کہ ہم سب کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ کیا ضرورت تھی تمہیں بیچ میں کودنے کی، باڈی گارڈ ساتھ لے کر آنے کی۔ تمہارا کیا خیال ہے یہاں ڈاکو لمبی تان کے سوتے رہتے ہیں۔ کسی غار میں یا زیرِ زمین ٹھکانے پر۔ اس جنگل میں پتا بھی ہلے تو انہیں خبر ہو جاتی ہے اکبر خان۔ کوئی نہیں جان سکتا کہ کہاں سے کہاں تک ان کی آنکھیں ہر طرف دیکھتی ہیں۔"

اکبر خان سخت پریشانی اور پشیمانی میں مبتلا تھا "مجھ سے تو غالب نے کہا تھا کہ... کچھ مسئلہ درپیش ہے... سولہ لاکھ کا... کہیں سے ہو نہیں پا رہے تھے... میں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں... قرض سمجھ کے لے لو۔ جب ہوں دے دینا۔"

"تمہیں یہ کچھ کرنا ہی تھا اکبر خان تو یوں نہ کرتے۔ کیا غالب پر اعتماد نہیں تھا تمہیں؟ شاید تم نے سوچا ہو گا کہ غالب جھوٹ بول کے تم کو ٹھگنا چاہتا ہے۔"

"نہیں... ایسی کوئی بات نہیں..."

"اور کیا بات تھی؟ تم خود اس لیے آئے تھے اکبر خان کہ تم خود کو بہت چالاک سمجھتے ہو۔ تم تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ ڈاکوؤں کی اس کہانی میں حقیقت کتنی ہے۔ ورنہ تم سولہ لاکھ غالب کو بھی دے سکتے تھے۔"

وہ جھینپا ہوا اور لاجواب نظر آنے لگا "اس نے مجھے شریف ڈاکو کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"کیسے بتاتا اور کیا بتاتا۔ یہ تو مجھے بھی یہاں رہ کے معلوم ہوا۔ غالب اور نازو تو فرار ہو گئے تھے۔ اور ابھی کتنے دوسرے ڈاکو اس جنگل میں سرگرمِ عمل ہیں، کون جانے۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہاری نیکی ہمارے حق میں برائی بن گئی اور تم اپنی حماقت سے لٹ گئے۔ اب تو میں اس پوزیشن میں بھی نہیں ہوں کہ تمہارے نقصان کی تلافی کر سکوں۔"

اس نے ناگواری سے کہا "گولی مارو نقصان کو۔"

"سولہ لاکھ کوئی اہمیت نہیں رکھتے تمہارے لیے تو ٹھیک ہے۔"

"اکبر خان کو لوٹنا آسان نہیں ہے" اس نے تھانے دار کی طرف دیکھا "میں پورے ضلعے کی پولیس کو شریف ڈاکو کی گرفتاری پر لگا دوں گا۔ ڈی آئی جی سے کہوں گا کہ خصوصی ٹیم تشکیل دی جائے۔ ایک لاکھ کا انعام میری طرف سے اس کی زندہ [illegible] گرفتاری پر۔"

میں نے ہنس کے کہا "سرکار تو پہلے ہی پانچ لاکھ [illegible] شریف ڈاکو کے سر کی قیمت ایک لاکھ..."

"میں دس لاکھ لگا دوں گا" اکبر خان مشتعل ہو گیا۔

"اچھا جو تمہارا جی چاہے کرو مگر اس وقت تم [illegible] مشورہ ہے کہ فوراً اعلیٰ افسران سے رجوع کرو۔ تمہارا اثر [illegible] ہے۔"

تھانے دار کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں "وہ مجھ پر [illegible] شامت آ جائے گی۔"

"کیوں؟ تمہارا کیا قصور ہے اس میں؟"

"وہ جی... افسرانِ اعلیٰ کہاں سنتے ہیں کوئی بات [illegible] کہ جس کے علاقے میں واردات ہوئی تھانہ انچارج [illegible] اخبار والوں کے سامنے اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے [illegible] کرنا پڑتا ہے۔ بے چارے انچارج تھانہ کو قربانی کا بکرا [illegible] ان کی انتظامی صلاحیت پر الزام نہیں آتا۔ اب آپ دیکھیں [illegible] میں اکیلا ہر وقت ہر ڈاکو کے ساتھ لگا رہوں..."

میں نے کہا "تھانے دار! فضول باتیں مت کرو۔ حقیقت [illegible] ہے میں جانتا ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں سب کو ان [illegible] مذاکرات کی تفصیل بتاؤں جو میرے تمہارے اور غافو کے درمیان ہوئے تھے۔"

چند سیکنڈ کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے تھانے دار [illegible] ہو گیا ہے "آپ... کیسی باتیں کرتے ہیں جی..."

اکبر خان نے اسے حقارت سے دیکھا "مجھے کیا سمجھتے [illegible] میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں؟ جانتا نہیں کہ ڈاکو تمہارے ساتھ [illegible] اور تم ڈاکوؤں کے۔ شریف ڈاکو رہ سکتا ہے اس جنگل میں تمہارے ساتھ حصہ بانٹے بغیر۔ سولہ لاکھ میں سے تمہارا حصہ کتنا [illegible] بولو..."

"آپ کسی ثبوت کے بغیر الزام لگا رہے ہیں مجھ پر۔"

"ثبوت کے بچے۔ جب تمہاری پیٹی اترے گی اور تم [illegible] ہو کے جاؤ گے یہاں سے تب پتا چلے گا تمہیں۔"

ایک دم تھانے دار کا رویہ بدل گیا "کیا پتا چلے گا جی [illegible] میری پیٹی۔ اپنے ساتھ لے جائیں اور پیش کر دیں آئی جی صاحب کو۔"

اس نے پیٹی اتار کے اکبر خان کی طرف پھینک دی۔

"بہت کرو گے تم تو مجھے ملازمت سے برطرف کرا دو۔ اب ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں رہی مجھے اس نوکری [illegible] اتنا ہے میرے پاس کہ اس گاؤں میں رہنے کے بجائے [illegible] کراچی میں کوٹھی بنا کے رہوں۔ لاہور والی کوٹھی کا کرایہ [illegible] ہے ویسے تو۔ اور معلوم ہے اس میں کون رہتا ہے؟ ایک ایس پی۔ ہوتی اور چھٹہ نوری!"

اکبر خان چراغ پا ہو گیا "میں تمہیں اندر کرا دوں گا۔ ایک ایک پیسہ وصول کر سکتا ہوں میں جو تم نے اکٹھا کیا ہے۔"

"اور آپ نے کیسے اکٹھا کیا ہے جی؟ یہ بھی بتا دیں" وہ بیچ میں بولا "جو کچھ تم جیسے لوگوں کے پاس ہے وہ کیا حلال کی کمائی ہے؟ پھر نہیں سرتی یہ باتیں۔ آپ بھی حصہ دیتے ہیں اوپر اور ہم بھی۔ اوپر والوں کی تڑی مت دیں۔ آپ صرف ایک گاؤں کے تھانے دار کے سامنے بول سکتے ہیں۔ شہر کا تھانے دار تو ذرا سا [illegible] آپ کو اور رات بھر میں سارا بخار اتار دیتا۔ صبح بے شک آپ ضمانت کرا لیتے یا اسے معطل کرا دیتے۔ ہفتہ بھر سیدھے چلنا مشکل ہو جاتا۔ ولایتی کموڈ استعمال کرنا پڑتا۔ اور باتھ روم جاتے تو سارے محلے کو پتا چلتا..."

احساسِ ذلت سے اکبر خان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ تھانے دار کو گولی مار دیتا اور اپنے حکم کے غلاموں سے کہتا کہ اس کی لاش کے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دو مگر یہاں وہ برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ ہر کمزور جانور ایک حد تک ڈرتا ہے مگر اس کی جان پر بن جائے تو چوہا بھی بلی کے مقابلے پر آ جاتا ہے اور بلی شیر بن جاتی ہے۔

تھانے دار کا بیچ ایک جوابی طمانچہ تھا۔ وہ مجبور ہو گیا تھا کہ اس کو مسلسل طمانچے مار کے ذلیل کرنے والے "بچے آدمی" کے منہ پر نازک بیچ کا ایک ہی طمانچہ مار کے اس کا منہ بند کر دے۔ بڑا چور اور ڈاکو ایک بہت کم حیثیت چور کو دھمکی دے رہا تھا کہ وہ اس کا بھانڈا پھوڑ دے گا۔ چھاج بولے سو بولے چھلنی کیا بولے جس میں نو سو چھید۔

اکبر خان نے ڈرائیور کو چلنے کا حکم دیا۔

تھانے دار نے بیچ کی مار سے بھاگنے والے پر ایک اور وار کیا "اکبر خان! ہمت ہو تو ڈی آئی جی سے ہی پوچھ لینا کہ ضلع کے چور ڈاکو اور بدمعاش جو بھتہ دیتے ہیں وہ اسے کون پہنچاتا ہے اور کتنا ہوتا ہے ہر ماہ۔"

جب گاڑی نو دم سے نکل گئی تو میں نے تھانے دار سے ہاتھ ملایا "تم نے بیچ لال کے ثابت کر دیا کہ کچھ پولیس والے بہادر بھی ہوتے ہیں۔"

"اور کیا جی... اس نے تو... سمجھ لیا تھا" اس نے ایک ادھم [illegible] فعل کو بطور گالی استعمال کیا "خود کیا تھے کل تک... آج ہم پر چڑھتے ہیں بدماشی لے کر۔"

میں نے کہا "کہتے تو ٹھیک ہو تم لیکن ایک فارسی کی ضرب المثل ہے کہ زبانِ [illegible] مطلب یہ کہ [illegible] اکبر بھی اور ڈی آئی جی بھی تو مارے صرف تم جانتے ہو یہ بات [illegible]"

"مجھے معلوم ہے جی۔ لعنت اس نوکری پر جس میں صرف پیسہ ملا، عزت نہیں ملی۔ اس سے جان چھوٹے گی تو ہم بھی شہر کے رئیسوں اور سیٹھوں میں شامل ہو جائیں گے معززین کے رہیں گے۔"

"تم نے دیکھا میرے ساتھ کیا حرامی پن کرنا چاہتا تھا وہ؟ اپنے بندے لایا تھا۔ گاڑی اس کی اپنی تھی۔ کیسے انکار کر رہا تھا۔"

"آپ فکر مت کریں جی۔ میں نے سب دیکھا اور سنا۔"

"تم بھی فکر مت کرو۔ بھئی گواہ میں بھی ہوں۔"

"سچی! آپ کے تو دوست ہیں اخبار والے" وہ ایک دم خوشامد پر اتر آیا "اخبار والوں کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔"

"مگر اخبار والے اس معاملے میں کیا کر سکتے ہیں۔ وہ نہ چور کا ساتھ دے سکتے ہیں نہ تم جیسے کوتوال کا" میں نے کہا "ہم تو آج چلے جائیں گے۔ میرا مشورہ مانو تو تم بھی اب یہ علاقہ چھوڑ دو یا یہ نوکری۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ غافو کے بعد شریف ڈاکو تمہیں کوئی نقصان پہنچائے۔"

اس نے سر ہلایا "غافو میں لحاظ تھا۔ شریف ڈاکو حرامی تو اپنے باپ کا بھی نہیں۔ خیر خیال رکھنا سر ہم غریبوں کا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "تم غریب ہو تو پھر خدا سب کو غریب کرے۔ سنا ہے اس علاقے کے کسی زمیندار کے دو قیمتی گھوڑے چوری ہو گئے ہیں۔"

"آپ کو معلوم ہے۔ ملک صاحب بہت پریشان تھے۔"

میں نے کہا "غافو کل تمہیں بتائے گا کہ گھوڑے کہاں ہیں۔ ہو سکتا ہے مسروقہ گھوڑوں کو برآمد کرنے پر ملک صاحب خوش ہو جائیں اور تمہارا کام بن جائے۔ کچھ اثر و رسوخ ان کا بھی ہو گا۔"

وہ بے حد مسرور نظر آنے لگا "ملک صاحب بڑی اونچی چیز ہیں جی۔ آپ نے تو دل خوش کر دیا میرا۔ اب دیکھتا ہوں اکبر خان کیا بگاڑتا ہے میرا۔ وہ گھوڑے اس وقت کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "ہمارے پاس ہیں مگر ابھی ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ تم نے جلدی کی اور تعاقب کا سوچا تو تمہیں فائدے کے بجائے نقصان ہو جائے گا۔"

"میری توبہ جی" تھانے دار بولا "کہا سنا معاف۔"

دل ہی دل میں اپنے ڈبل ایکشن پلان کی کامیابی پر خوش ہوتا میں اس طرف چل پڑا جہاں ایک گھوڑا جو ملک صاحب کے اصطبل کی ناز برداریوں کا عادی تھا اندھیرے جنگل میں لاوارث کھڑا تھا۔ میں تھانے دار کی طرف سے مطمئن تھا لیکن وہ اندر جا کے بیٹھ گیا تھا اور شاید اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا جو بیک وقت مخدوش بھی تھا اور خوش آئند بھی۔ اس نے اکبر خان سے پنگا لیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ممکن تھا کہ اسے یہ نوکری چھوڑنی پڑتی جو لاکھ رسوائی، ذلت اور غلامی ہو مگر سونے کی کان بھی تھی

www.paksociety.com

جس سے ابھی مزید سونا نکالا جا سکتا تھا لیکن دوسری طرف فکرِ معاش کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ملازمت ایک عادت ہوتی ہے تو بزنس ایک چیلنج ہوتا ہے۔

گھوڑے نے اپنے ساتھ کیے جانے والے ظالمانہ سلوک پر کچھ برہمی کا اظہار کیا مگر میں نے اسے رام کر لیا۔ اناکر تھوڑی آئی پی گھوڑے ہو دوست مگر ہمیں بھی دیکھو، ہم بھی تو اس جنگل میں تمہارے ساتھ خوار ہو رہے ہیں۔

میں ڈاک بنگلے پہنچا تو خلافِ توقع وہاں تاریکی تھی اور سناٹا تھا۔ میں نے گھوڑے کو احاطے کے اندر باندھا اور دوسرے گھوڑے کی تلاش میں ادھر اُدھر دیکھا۔ گھوڑا آخری حصے میں لمبی لمبی گھاس کے درمیان سائے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

میں نے برآمدے سے گزر کے پہلے کمرے کا دروازہ کھولا اور محسن کو آواز دی۔ میری جیب میں نہ ماچس تھی کہ میں موم بتی کی تلاش کر سکتا اور نہ ٹارچ تھی۔ چند سیکنڈ اندھیرے میں گھورنے کے بعد میری آنکھیں کمرے کی ویرانی سے مانوس ہو گئیں۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

ایک نامعلوم خطرے کے احساس نے مجھے چوکنا کر دیا۔ جو کچھ تھانے میں ہوا تھا اس کے بعد غیر متوقع کوئی بات نہ تھی۔ اکبر خان اور اس کے ساتھی مجھ سے پہلے روانہ ہوئے تھے لیکن یہ بات بعید از قیاس لگتی تھی کہ وہ محسن اور گل کے علاوہ طافو کے پورے گروہ سے نمٹ لیں۔ طافو اپنے سب ساتھیوں کے ساتھ آس پاس ہی موجود ہوگا اور محسن کے سولہ لاکھ سمیت پہنچ جانے کے بعد وہ اپنا اپنا حصہ وصول کرنے آئے ہوں گے۔

اس کے باوجود امکانات لامحدود تھے۔ کہیں طافو نے یا اس کے کسی ساتھی نے راہ میں ہی تو محسن کو... نہیں نہیں میں نے اس دہشت زدہ کرنے والے خیال کو مسترد کر دیا۔ وہ گل کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا نہیں کر سکتا مگر بڑو کر تو ڈاکو ہی ہوتے ہیں اور سولہ لاکھ کی رقم بھی معمولی نہیں سمجھی جا سکتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اکبر خان نے جتنے آدمی اپنی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑے تھے ان سے چار گنا ڈاک بنگلے کی طرف بھیج دیے ہوں کہ وہاں تو نے اسے پکڑنا ہے اور کیا پتا اس نے پولیس کو مطلع کر دیا ہو کہ آج فلاں جگہ پر سودا ہونے والا ہے، بہت مال ملے گا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے دوسرے کمرے میں جھانکا اور محسن کو آواز دی... پھر گل کو پکارا مگر خاموشی کا بوجھل پن ختم نہ ہوا۔ اندر ہی اندر خوف اب میرے دل میں اپنے خونی پنجے گاڑنے لگا تھا۔ میں نے بڑی چالاکی سے اکبر خان کو لوٹ لیا تھا مگر باگھی سے مکھّے چھیننا آسان نہیں ہوتا۔ وہ ایسا اناڑی شکاری نہیں کہ سولہ لاکھ لے کر جنگل میں ڈاکوؤں سے معاملہ کرنے جائے اور اپنی حفاظت کے خیال سے غافل ہو۔

باری باری میں نے ہر کمرے میں دیکھ لیا مگر ہر جگہ وہی آسیب زدہ ویرانی اور دل دوز سناٹا تھا۔ خوف زدہ کرنے والے خیالات زیادہ شدت کے ساتھ میرے ذہن پر یلغار کرنے لگے تھے اور ناامید منفی سوچ کی صلاحیت میں کمی کے ساتھ حوصلہ شکن امکانات کو اپنے اعصاب پر غالب آتے محسوس کر رہا تھا۔ خوف زدہ تھا اور اندر کی بہت سی چور آوازوں کا شور مجھے رہا تھا۔ یہ آوازیں میری کوتاہیوں اور غلطیوں کے امکانات، اندازوں کی خوش فہمی کے نقصانات اور میرے حد سے بڑھے ہوئے خود اعتمادی کے جذبات پر طعنہ زن تھیں۔

میں نے تقریباً دوڑتے ہوئے اس برآمدے کے دو چکر لگائے اور ہر بار خالی کمروں میں اپنی آواز کی کھوکھلی بازگشت کی دہشت سے پاگل کر دینے والے احساس کا ریلا میرے حوصلے کو بہائے لیے جانا چاہتا تھا جیسے سیلاب خس و خاشاک کو لے جاتا ہے۔ میں اپنے آپ سے ڈر رہا تھا۔ میں ایک بار پھر سب سے بچھڑ جانے کے تصور سے بھی بچنا چاہتا تھا۔ یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ ہم سب کے دشمن اپنی کسی مکروہ سازش میں کامیاب ہو گئے ہیں اور میں اب ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو۔ میں زندگی کے پُرعذاب راستوں پر اپنے پچھتاوے سمیٹنے کے لیے اور یادِ رفتگاں کے سایوں کا تعاقب کرنے کے لیے اکیلا رہ گیا ہوں۔

میں نے حسبِ عادت حلق میں آ کے طافو کو آوازیں دیں، غلط اور پوپٹ کو پکارا۔ میرے وجود میں ایک زلزلہ آیا ہوا تھا اور کس قوت کے ساتھ خوف کا عفریت مجھے جھنجھوڑ رہا تھا اور وہ اپنی تمام ستم ظریفی کے ساتھ مجھ پر قہقہے لگا رہی تھی۔ سکندر اعظم، کہاں تمہاری ذہانت کو مات ہوئی۔ تمہاری کون سی چالاکی تمہاری شکست کا سبب بنی۔ تم نے کیا کیا جو تمہیں نہیں کرنا چاہیے تھا اور کیا نہیں کیا جو کرنا تھا۔ خوش قسمتی کے ساتھ ہار کے امکانات لامحدود ہوں مگر آدمی کی قوتِ تسخیر تو تقدیر کے تابع اور تمام اتفاقات کی موافقت پر انحصار کرنے لگے تھے۔

میری خود اعتمادی میں دراڑ پڑنے لگی تو مجھے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگا۔ وہ اندھیرا جس میں ہر طرف میرے شکاری چھپے ہوئے تھے اور مجھے محصور کر چکے تھے۔ وہ میرے قوا کیا اس جہدِ مسلسل کا حاصل یہی تھا۔ یہ انجام تھا ایک بڑی جدوجہد کا جو صرف اچھے مستقبل کے لیے تھی۔ اپنے لیے اور رابعہ کے لیے۔ غالب اور نازو کے لیے، گل اور محسن کے لیے اور ان سب کے لیے جو ایم آر ایس کو انسان کے اندر کی نیکی، آدمیت، عدل کی طاقت اور پُرامن بقائے باہمی کی علامت سمجھتے تھے اور اس پر یقین رکھتے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ اگر اسی طرح میں منفی خیالات کے سامنے جھکتا رہا تو میرا وجود شکست سے پہلے ہی شکست کا شکار ہو جائے گا۔ خوف مجھے اتنا کمزور کر دے گا کہ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی ہار جاؤں گا۔ محض ناامیدی کے تصورات سے...

ضروری ہے۔ میں تاریک سرنگ کے دوسرے دہانے پر آ پہنچا ہوں مگر سکا نہیں رکا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ محسن اور گل میرا انتظار کیے بغیر چلے گئے ہوں... مگر نہیں وہ مجھے چھوڑ کے کیسے جا سکتے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں اور محسن سے میں نے یہی کہا تھا کہ ابھی آتا ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ غالب اور وقار یوسف نے گاڑی میں واپس شہر کی طرف روانہ ہوئے مگر پھر ادھر آ گئے ہوں۔ انہوں نے محسن اور گل کو بتایا ہو گا کہ سکندر تو اکبر خان کی ناکہ بندی میں پھنس چکا تھا اور وہ واپس لاہور جا رہا تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد گل اور محسن اس کار میں روانہ ہو گئے جو بطورِ خاص انہیں واپس لانے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ وقار یوسف کے سسر کے بارے میں سب ہی جانتے تھے کہ وہ حکومت میں بڑی توپ چیز ہے۔ اس کا میں نے کبھی نہیں پوچھا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ اس کے پاس بڑا منصب ہے... فضل ربی "کا کرشماتی طلسم ہے۔ دولت کی خیرہ کن دلیل عظیم الشان کوٹھیوں اور کاروں کی افراط ہے اور ظاہر ہے سب کسی انتہائی اثر و رسوخ والے اور لامحدود اختیارات والے عہدے کا کمال ہے۔

اچانک میں نے خود کو تاریک سرنگ کے باہر پایا جہاں صرف امید کی روشنی تھی اور میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوا کہ ذرا سی آزمائش کا مرحلہ آیا تو میرا حوصلہ اور اعتماد کتنا ناقابلِ اعتبار ثابت ہوا۔ مجھے ناز تھا۔ اتنی سی دیر میں کیا کچھ نہیں سوچا میں نے جو مجھے پاگل کرنے کے لیے کافی تھا حالانکہ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ میں نے سامنے کی حقیقت کو کیوں نہیں دیکھا اور دور افتادہ امکانات کے آسیب سے خوف زدہ ہو گیا۔ آخر کیوں؟ کیا یہ سب سکون کے مسلسل آزار کا نتیجہ ہے کہ میرے اعصاب کے تار ٹوٹنے لگے ہیں اور میں ذہنی طور پر قنوطی اور یاسیت زدہ (PASSIMIST) بننے لگا ہوں۔

میں نیا حوصلہ پا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ صورتِ حال کی تصویر میرے سامنے بالکل واضح ہو گئی تھی۔ میں نے منظر سے کہا تھا کہ وہ کسی بھی طرح سولہ لاکھ کا بندوبست کرے اور اس نے غالب سے ذکر کر دیا۔ غالب نے کہا ہو گا کہ تم پہلے مجھے بھی کوشش کرنے دو۔ اگر میں کچھ نہ کر سکا تو پھر ہم سولہ لاکھ کا بندوبست مل کر کریں گے۔ تھوڑا بہت اندوختہ منظر کا بھی ہو گا۔ وزیر خان ٹرسٹ سے رقم نکلوائی جا سکتی تھی اور ایمرجنسی میں وقار یوسف کی بیوی اپنے ڈیڈی سے کہہ سکتی تھی کہ وہ سرکاری اختیارات والی جادو کی چھڑی گھمائیں اور سولہ لاکھ حاضر کر دیں۔ ایک وسیلہ پشاور میں قدرت خانم کے والدین کا بھی تھا جو اپنی سب جمع پونجی وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کے نام کرنے کا وعدہ کر چکے تھے لیکن غالب نے ایک "ضرورت مند" کو پکڑا۔

یہ ضرورت مند اکبر خان تھا جسے ہر قیمت پر غالب کی معاونت اور ایم آر ایس کی حمایت کی ضرورت تھی۔ ابھی تک اس کے

سپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی سچی کہانیاں

مرزا امجد بیگ کی یادداشتیں
شیطان صفت
سبز قدم

ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی ذاتی ڈائری
دستِ انتقام
اسیرِ ہوس

نازک پیچیدگیاں، عدالتی کارروائی کے اہم و متنوع نکات
ذہانت اور ذہن کے تنازعوں سے جنم لینے والے مقدمات

ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی پیشہ ورانہ زندگی کے پیچیدہ کیسوں کی روداد
جرم و سزا کی وہ کہانیاں جو انسانی جسم میں دہوس کا آئینہ ہیں

کتابیات پبلی کیشنز

www.paksociety.com

مقاصد واضح۔۔۔نہیں تھے مگر حقائق ایک ہی سمت میں اشارہ کرتے تھے کہ چوہدری دلاور سامنے آئے بغیر ہم سے مفاہمت چاہتا تھا۔ اس نے استاد پیڈرو کو ہمارے پیچھے لگایا تھا کہ وہ کسی طرح بھی ہماری نظر میں اپنی پوزیشن کلیئر کرے۔ ہماری حمایت حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے تو ہم سب کو جو ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے تھے اس طرح ملوائے کہ یہ سب اس کی کوشش کا نتیجہ نظر آئے اور ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ اس نے جان جوکھوں میں ڈال کے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے تاکہ ہم اس کی نیت کے خلوص کو تسلیم کرلیں۔ یہ چوہدری دلاور کے طویل ڈرامے کا پہلا ایکٹ تھا جس میں سب کچھ اس کی مرضی اور ہدایات کے مطابق ہوا۔ دوسرے ایکٹ میں اکبر خان نمودار ہوا اور اس نے چوہدری دلاور کے اشارے پر ہمیں احسانات کے بار گراں سے خریدنے کی کوشش کی۔

غالب نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اکبر خان کو موقع دیا کہ کرنا چاہتے ہو تو یہ احسان کرو اور اکبر خان نے سولہ لاکھ داؤ پر لگا دیے۔ اس نے کہا ہوگا کہ اب تم فکر مت کرو، میں جاؤں گا اور انہیں لے آؤں گا۔ غالب اور وقار یوسف نے بھیس بدل کے اس کا تعاقب کیا۔ شاید وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اکبر خان اپنا وعدہ پورا کرتا ہے یا نہیں۔ وہ سولہ لاکھ ادا کرے گا یا طاقت اور بدمعاشی سے ہمیں چھین کر لانے کی کوشش کرے گا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ غالب اور وقار یوسف اپنے طور پر سولہ لاکھ لے کر چلے ہوں۔ عمداً انہوں نے ایسی گاڑی استعمال نہیں کی تھی جو پہچانی جائے۔ گاڑی کا انتظام وقار یوسف کی بیوی نے کردیا ہوگا۔ نیبوں کی ہیرا پھیری غالب کا آئیڈیا تھا اور یقیناً شبہ اس نے اکبر خان کو منتقل کردیا تھا۔

اگر صورت حال خطرناک ہوتی اور ڈاکو وعدہ خلافی کے جرم کی سزا کے طور پر ہماری رہائی سے انکار کردیتے یا ہماری قید حیات سے رہائی پر تل جاتے تو غالب فوراً ریفری بن کے بیچ میں کود پڑتا اور کہتا کہ سوری، یہ غلط آدمی تھا جس نے غلط کام کیا۔ ہم فاؤل نہیں کھیلتے۔ یہ لو سولہ لاکھ اور لاؤ ہمارے بندے۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ اکبر خان سولہ لاکھ دے چکا ہے تو پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق انہوں نے دوسرا ڈراپ شروع کردیا۔ یہ شرارت غالب کے سوا کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ اکبر خان تو اسے پہچان ہی نہیں پایا مگر وہ جاتے جاتے اکبر خان کی مٹی پلید کرگئے اور اس کی نیکی کے رنگ میں بھنگ ڈال گئے۔

ابھی غالب اور وقار یوسف کو علم نہیں تھا کہ میں نے اکبر خان کے ساتھ کیا ہاتھ کھیلا ہے۔ اس عیار اور شاطر آدمی نے ہمیں شکار کرنے کے لیے دولت کا جال پھیلایا تھا لیکن وہ ناکامی کے دوہرے صدمے سے دوچار ہوکے گیا۔ اس نے شکار بھی گنوایا اور جال بھی۔ اس کا احسان الٹا اس کے حق میں ندامت اور ملامت کا سبب بن گیا۔ مجھے اس خیال سے خوشی ہونے لگی کہ باقی سب اکبر خان کے شریف ڈاکو کے ہاتھوں لٹنے کا الم ناک واقعہ سن کر خوش ہوں گے کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ سولہ لاکھ گئے کے ساتھ ہی عزت بھی گئی اور حاصل کچھ نہ ہوا۔ ہم نے اپنی کی کمائی کا اندوختہ بچالیا اور ڈاکوؤں کے مال غنیمت کا نقصان خان جیسے ڈاکو کے مال حرام سے پورا کردیا مگر خود پر نہ اتار دیا نہ احسان کا بار۔ بدنام ہوا شریف ڈاکو جس کے فرشتوں کو بھی اس کے نام پر ہونے والی واردات کی خبر نہ ہوئی اور جانے کہاں سے آئے اور کہاں گئے۔ قیاس آرائیوں کا سلسلہ چلتا رہے گا۔

فوری طور پر میرے سامنے لاہور شہر پہنچنے کا مسئلہ تھا۔ معلومات کے مطابق چالیس میل کی مسافت تھی۔ اندازے سے منہ اٹھا کے چل پڑتا تو کسی نہ کسی سڑک تک پہنچ جاتا۔ کوئی آبادی مل جاتی تو صبح تک قیام کرتا اور صبح آگے بس یا ٹرین سے لاہور پہنچنا آسان ہوجاتا مگر میں جلد از جلد ہم کے درمیان پہنچنے کے لیے بے چین تھا اور ایک رات بھی انتظار میں نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ سفر کا آسان اور میری دسترس میں تھا۔ میں گھوڑے پر یہ فاصلہ آسانی سے طے کرسکتا تھا۔ لاہور تو لاہور سے بیس میل پہلے ہوجاتا تھا چنانچہ جنگل کے ویران راستے کا سفر زیادہ نہ تھا۔ اس کے بعد بس، ویگن، رکشا یا ٹیکسی مل جاتی تھی۔

میں نے تھانے دار سے وعدہ کیا تھا کہ اسے گھوڑے "برآمد" کرکے ملک صاحب کے سامنے موقع فراہم کروں گا لیکن اب ضرورت اور حالات کا تقاضا میں اپنا پروگرام بدل دوں۔ میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی کے آٹھ بجے تھے۔ دس بجے تک میں لاہور پہنچ سکتا تھا۔

میں نے گھوڑے کو کھولا اور پیار سے تھپکی دی لاہور کی سیر کرائیں۔ ملک صاحب کی غلامی سے تیری جان میں نے گھوڑے پر سوار ہوکے دل ہی دل میں کہا مگر گھوڑا کی بات سمجھنے کی چھٹی حس رکھتا تھا۔ اس نے مجھے نظروں سے دیکھا اور نہ جانے کیسے میں وہ بات سمجھ گیا جو زبان سے کہہ سکتا تو ضرور کہتا کہ یہ جسے تم غلامی کہہ رہے ہو، یہ بدترین غلامی کی بدقسمت زندگی ہوگی صاحب۔ آپ تو مجھے کہیں بھی چھوڑ کے چل دیں گے مرضی مگر میری مرضی خاک ہوگی۔ جس نے چرایا وہ کسی تانگے والے کو بیچ ڈالے گا اور ملک صاحب کے اصطبل کی ناز و نعم والی زندگی کے بعد باقی عمر تانگے میں سواریاں ڈھوتے جائے گی۔

گھوڑے کے جذبات اپنی جگہ مگر میں بھی مجبور تھا اور لاہور کی جانب مائل نہیں کرسکتا تھا۔ آہستہ آہستہ سمت کا تعین کیا اور گھوڑے کو اندھیرے میں آگے بڑھایا۔ گھوڑا سواری کے بھی آداب جانتا ہے۔ ریس کورس میں نمبر ون آنے والا گھوڑا اور جو کبھی میدان جنگ کے لیے پولو کھیلنے کے لیے ویرانے سے گزرنے کے لیے بالکل بے کار ثابت ہوں کبھی ریس کے گھوڑے پر سوار تھا۔ جنگل کے اونچے نیچے راستوں پر سفر کا تجربہ نہ مجھے تھا اور نہ گھوڑے کو۔ کئی جگہ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور مجھے احتجاجاً گرانے کی کوشش بھی کی تیز ہوا بھی بھوت کی طرح چیختا رہا۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے مشکل سے ایک میل کا فاصلہ طے کیا تو دوران میں اس خیال سے پریشان تھا کہ اس رفتار سے تو میں صبح تک بھی لاہور نہ پہنچ پاؤں گا۔ پہنچا بھی تو دونوں کی حالت قابل رحم ہوگی۔ گھوڑا مجھے گالیاں دے رہا ہوگا اور میں گھوڑے کو۔ اس سے بہتر ہوگا کہ میں گھوڑے کی جان بخشی کروں اور خود زیادہ کے ساتھ پیچھے آتا ہوا پیدل چل پڑوں۔

معلوم نہیں گھوڑے کی دعا قبول ہوئی یا میری۔ اچانک میں نے فارم کی طرف سے کسی کو اپنی جانب دوڑ کر آتے دیکھا۔ ایک لڑکا دور سے وہ مجھے چلا چلا کے آوازیں دے رہا تھا۔ یہ طافو تھا اور اسے دیکھ کے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں چھلانگ مار کے گھوڑے سے اترا اور خود بھی طافو کی طرف دوڑنے لگا۔

طافو نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا "آپ۔۔۔ آپ کدھر چلے گئے تھے جی؟ حد کردی!"

میں نے بمشکل تمام کہا "حد میں نے کردی یا تم نے۔ میں ڈاک بنگلے کی جانب گیا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ کہاں گئے سب لوگ؟"

"وہ سب۔۔۔ ایک گاڑی آئی تھی۔ سب کو لے گئی۔ سب چلے گئے۔"

میں نے غصے سے کہا "اور مجھے چھوڑ گئے؟"

طافو نے کہا "انہوں نے بتایا تھا کہ آپ کسی سیٹھ اکبر خان کی گاڑی میں لاہور چلے گئے ہو۔"

میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا مگر پھر بھی مجھے سب پر غصہ آرہا تھا۔ انہیں میرا انتظار ضرور کرنا چاہیے تھا۔ یہ ضرور سوچنا چاہیے تھا کہ ان سب کو وہاں چھوڑ کے میں اکیلا اکبر خان کے ساتھ کیسے لاہور جاسکتا ہوں۔ میں تو مجبوراً گاڑی میں بیٹھا تھا اور ممکن ہوتا تو میں اکبر خان کو بھی ڈاک بنگلے ہی لاتا۔ غالب اور وقار یوسف نے خواہ مخواہ فرض کرلیا کہ میں اکبر خان کے ساتھ لاہور چلا گیا ہوں۔ باقی سب کے لیے ان کے بیان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

"تم ڈاک بنگلے میں چھوڑ گئے تھے؟"

"ہاں۔ بہت دیر انتظار کیا میں نے۔ پھر میں نے سوچا کہ تھانے جاکے پوچھوں۔ اس نے بتایا کہ اکبر خان کے ساتھ کیا ہوا؟" وہ ہنس پڑا۔

میں نے کہا "تمہیں اپنا اپنا حصہ مل گیا؟"

"مل گیا جی۔" اس نے بوجھل لہجے میں کہا اور ایک آہ بھری۔

"اب کس بات کا دکھ ہے؟"

"بس جی! میں نہیں چاہتا تھا یہ سب۔۔۔ کچھ بھی نہیں چاہتا تھا میں۔ مگر میں مجبور ہوگیا۔ باقی سب لحاظ بھول گئے تھے۔ وہ بھی مجبور تھے۔ مجبوری آدمی سے سب کچھ کرا سکتی ہے۔ میں نے سوچا کہیں وہ میرے بھی دشمن نہ ہوجائیں، گل کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اس لیے میں نے سب کی طرف سے وہ بات کی جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

"چلو چھوڑو۔ جو ہونا تھا ہوگیا" میں نے کہا۔

"اس بات کا تو دکھ ہے جی۔ جو نہیں ہونا چاہیے تھا وہ ہوگیا۔ اب آپ جارہے ہیں تو میری طرف سے یہ بات ناگ منی۔۔۔ میرا مطلب ہے گل بانو کو بتادینا۔ ہم تو بس ناگ منی کو جانتے تھے۔" وہ بے حد افسردہ اور جذباتی نظر آرہا تھا اور سر جھکائے کھڑا تھا۔ "وقت کے ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ بدل جاتا ہے نا جی؟"

میں نے کہا "کیا تمہیں شک ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "شیش ناگ کے مرنے سے سب بدل گیا۔ یہی سب تھے جو اس لڑکی ناگ منی کی طرف نظر اٹھا کے دیکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔ میلی نظر سے دیکھنا تو دور کی بات ہے۔ سب جانتے تھے کہ شیش ناگ کے دل میں ان کے لیے باپ جیسی شفقت کم نہیں ہے۔ وہ بڑی سے بڑی غلطی معاف کرسکتا تھا مگر نیت کا کھوٹ برداشت نہیں کرتا تھا۔ ناگ منی بڑی لاڈلی تھی اس کی۔ بیٹی سے زیادہ بیٹی تھی اس کے لیے اور۔۔۔" وہ ذرا سی دیر کے لیے رکا "ایک بار کسی کے منہ سے اس نے کچھ سن لیا تھا۔ اس نے ناگ منی کے بارے میں کوئی گندی بات کی تھی۔ سب کے سامنے شیش ناگ نے اسے چیر پھاڑ کے رکھ دیا۔ اس کی انتڑیاں نکال دیں اور اسے اوپر سے نیچے تک ادھیڑ دیا۔ حالانکہ وہ پرانا آدمی تھا، بہت سر چڑھا ہوا تھا۔ شاید اسی لیے اتنی ہمت ہوگئی تھی اس کی۔ بعد میں کس کی مجال تھی جو ناگ منی کے بارے میں پیٹھ پیچھے بھی بات کرتا۔۔۔ لیکن شیش ناگ مرگیا۔ نیت تو اس نے بس کی ایسے کی تھی جیسے وہ گروہ کی سردار ہوگی مگر شیش ناگ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا جو اس نے کیا تھا۔ عورت کیسی بھی دلیر اور نڈر ہو، عورت ہی ہوتی ہے، جوان اور خوب صورت عورت شریفوں کی بستی میں آج بھی اکیلی نہیں رہ سکتی تو ان ڈاکوؤں کے ساتھ کیسے رہ سکتی تھی۔ اچھا کیا اس نے جو ناگ منی کو تمہارے حوالے کردیا تھا لیکن وہی ناگ منی جب گل بانو بن گیا ہوا۔ جو اس کے سامنے نظر نہیں اٹھاتے تھے وہی اس کا راستہ روک کے کھڑے ہوگئے تھے۔ لحاظ مروت سب بھول گئے تھے۔۔۔ اور سینہ تان کے اس کے سامنے آگئے تھے۔"

www.paksociety.com

"اتنی خاطر مدارات کیوں کی تھی پہلے؟" میں نے طنز سے کہا۔

"وہ ایک رسم کی بات تھی" طافو بولا "انھوں نے کہا کہ ہم نے کوئی کمی نہیں کی۔ اپنا قرض ادا کر دیا' اب ہمیں ہمارا حق ملنا چاہیے۔ میرے سمجھانے کا بھی ان پر اثر نہیں ہوا۔ انھیں اپنا قرض بھی یاد تھا جو انھوں نے شیش ناگ کو دیا تھا۔ ایک امانت کے طور پر۔۔۔ اور انھیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ گل بانو یہ قرض چکا سکتی ہے۔"

میں نے کہا "گل کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے بھائی نے دوسروں کا پیسہ کہاں رکھا تھا؟"

"ہو سکتا ہے کہ معلوم نہ ہو۔۔۔ ہو سکتا ہے۔"

"اب تمہیں مان لینا چاہیے۔۔۔ جو تم چاہتے تھے تمہیں مل گیا' خواہ کہیں سے بھی ملا۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"اسی بات کا تو دکھ ہے مجھے۔ ان سب نے زبردستی کی۔ وہ جو تمہارے ساتھ تھا نا ایک کالا سا۔ گھنگریالے بالوں والا۔ جس نے کانوں میں مُندیاں پہن رکھی تھیں سونے کی۔"

"استاد پیڈرو۔ شیطان کی حرامی اولاد۔"

"اس نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ موقع اچھا ہے۔ گل بانو اتفاق سے پھر یہاں آ کے پھنس گئی ہے۔ تم نے اسے چھوڑ دیا ایسے ہی تو ساری عمر پچھتاؤ گے۔ وہ پھر نہیں آنے والی۔ جو وصول کرنا ہے ابھی وصول کر لو۔ اس کے ساتھ جو لوگ ہیں سب موٹی اسامی ہیں۔ سولہ لاکھ کیا تمھیں لاکھ بھی دے سکتے ہیں۔ ذرا صحیح طریقے سے دباؤ ڈالو۔ آسانی سے کچھ نہیں ملتا دنیا میں۔"

میں نے سینے میں دہکتی ہوئی نفرت کی آگ کو الاؤ کی طرح بھڑکتے محسوس کیا۔ میں نے اسے ایک سے ایک غلیظ گالی دی "یہ سب اس کی کارستانی تھی' مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا۔ خیر' اس سازش کو بھی میں نے اس کی فردِ جرم میں لکھ لیا ہے۔ اس کے خون کا ہر قطرہ میرے انتقام کا مقروض ہے طافو۔"

"آپ مجھے بھی بُرا آدمی سمجھتے ہوں گے' بُرا تو میں ہوں۔ ڈاکو نیک کب ہوتے ہیں" وہ بولا "مگر یہ گھر کی بات تھی۔ بیٹی یا بہن کے ساتھ تو کوئی بھی بدمعاشی نہیں کرتا۔۔۔ لیکن وقت بدل گیا ہے جی۔ شرم اٹھ گئی ہے رشتوں کی۔ میں یہ بتانے نہیں آیا کہ میں سب سے الگ تھا اور میں نے کوئی احسان کیا تھا۔ نہیں جی' میں مجبور تھا۔ میں کچھ نہ کرتا تو معاملات قابو سے باہر ہو جاتے۔ میں نے سب کو ٹھنڈا ڈال کے رکھا اور انھیں یقین دلایا کہ انھیں ان کا حق مل جائے گا لیکن وہ ایسی کوئی بات نہ کریں کہ آخری وقت میں برسوں کے ساتھ کا بھرم بھی نہ رہے۔ دوستی کے رشتے دشمنی میں بدل جائیں اور کل تک جیسے مرنے کے ساتھی ایک دوسرے کا خون بہانے پر اتر آئیں۔ خلیفہ اور پوپٹ بھی میرے ساتھ تھے نا جی۔ ہم نے کہا کہ کسی نے ناگ منی کو گل بانو سمجھ کے لوٹنے کی کوشش کی تو خون خرابا ہو گا۔ ہم ماریں گے اور مر جائیں گے۔ یا وہ خوشی سے چھوڑ دے نہ لے لو۔ اگر وہ دباؤ میں کچھ کر سکتی ہے تو یہ کام … دو۔ شرافت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے والا خود سے …"

میں نے کہا "تم میرے سامنے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں جی" وہ بولا "گل نے تو کچھ نہیں کہا۔ کسی کو بھی شرمندہ نہیں کیا۔ اس نے سولہ لاکھ پھینک دیے جیسے کوئی بھوکے کے سامنے روٹی پھینکے۔ اس نے ایک کو اس کا حصہ خود دیا اور کہا کہ خدا کا شکر ہے جس نے اپنے بھائی کا قرض ادا کرنے کے قابل کیا۔ یہ کاغذ کے … سوا ساتھ نہیں دیتے۔ رشتے تمام عمر کے ہوتے ہیں … جائیں تو نظریں بھی بدل جاتی ہیں۔ رشتے بھی … اپنا اپنا حق لے کر بڑے ذلیل ہوئے۔ خود اپنی نظر میں … تھا جی۔ مگر ان میں ہمت نہ تھی کہ گل بانو سے' گل کی … سے۔۔۔ معافی مانگ لیتے۔"

میں نے کہا "معافی مانگنا بڑی بہادری کا کام ہوتا ہے … اس میں اپنی انا کو پہلے مارنا پڑتا ہے۔"

"کسے جی؟ خیر' آپ پڑھے لکھے بندے ہو۔"

میں نے کہا "اپنے غرور کو۔"

اس نے سر ہلایا "دوسروں کو میں کیا الزام دوں' میں … سے نہ کہہ سکا کہ ناگ منی' میں بڑا کمینہ ہوں۔ مجھے معاف کر دے۔ وہ کہاں تھی میری۔ کیسے معاف کر دیتی مجھے۔ … جو ظاہر کر دی تھی میں نے لیکن اب آپ مہربانی کرو۔ آپ … طرف سے اس کو بتانا کہ طافو من موجی بڑا مجبور تھا' … نہیں تھا۔ اس نے دوسروں کی مجبوری کو اپنی مجبوری بنا لیا تھا۔ … بانو کو کچھ نہ ہو۔ اس کا گھر آباد رہے۔ اللہ اس کے گھر کو … سے بھرا رکھے۔ اسے ممتا کی دولت کے سارے خزانے … دے۔ وہ سب بھی جو میرے نصیب میں نہ تھے۔"

میں نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "تم … طافو من موجی۔"

"کہاں من موجی؟ من موجی مر گیا۔ دفن کر دیا اسے میں نے … بار۔ جیسے ناگ منی مر گئی' ایسے ہی من موجی بھی مر گیا۔ … اور سنگیت مر گیا۔"

میں نے کہا "غلط سمجھے ہو تم۔ طافو مر سکتا ہے مگر من موجی … مر سکتا ہے۔ ساز اور سنگیت امر ہیں۔ تمہارے اندر زندہ … رہیں گے۔ آدمی اپنے وجود کی برائی سے لڑ سکتا ہے اور اسے … بھی کر سکتا ہے مگر اچھائی کو نہیں۔"

"پتا نہیں جی۔ اب تو لگتا ہے زندگی ضائع ہو گئی۔ کیا ملا … اس سے مجھے یا کسی اور کو۔ جب ہوش سنبھالا تو اس … کو دکھ دیا۔ سکھ خود بھی نہیں دیکھا تھا۔ دوسروں کو بھی … دیکھ سکا۔ آج سوچتا ہوں سب کے سکھ چھین کے کیا ملا مجھے … نہیں۔ میں اور دکھی ہو گیا۔ اپنے بیگانے ہو گئے۔ دوست … مگر دشمنی اللہ واسطے رکھی۔ ڈاکو کا دوست کون … ہوتا ابھی نہیں چاہیے۔ پیسہ' مال و دولت سب یہیں … کو نہ کفن ملا نہ قبر کی مٹی ملی۔ بس جی … نصیب۔ اپنے ساتھ بھی یہی ہو گا۔ من دکھی ہونے کا …

… پریشانی کا شکار ہو۔"

… نظریں اٹھائیں "یہ بیماری ہوتی ہے کوئی؟"

میں نے سوچ کے کہا "ہاں۔ بیماری ہی ہوتی ہے۔"

"… لوگوں کو' ہم جیسوں کو ہوتی ہے؟"

میں نے مسکرا کے کہا "نہیں بھئی۔ شریف لوگوں کو بھی …"

"… ہو جاتی ہے' کوئی دوا ہے اس کی؟"

میں نے کہا "جب آدمی حالات سے سمجھوتا نہ کر سکے اور یہ … حالات پر اس کا اختیار نہیں رہا تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ … حالات تو آدمی خود پیدا کرتا ہے۔ وہ خود حالات کے سانچے … ڈھل جائے تو حالات سے لڑنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی … شکوہ رہتا ہے۔ اس کی دوا بھی یہی ہے کہ خود پر اور … کرو۔ پیچھے مت دیکھو۔ آگے نظر رکھو اور پچھتانے … ضائع کرنے کے بجائے وہ کرو جو تم کرنا چاہتے تھے لیکن نہ … سکے۔"

وہ خاموش کھڑا رہا جیسے میری بات کو سمجھنے اور ذہن میں … کی کوشش کر رہا ہو۔ "عجیب لگتی ہیں آپ کی باتیں مگر غلط … نہیں۔"

میں نے کہا "بعد میں سوچنا' غور کرنا اور سمجھنے کی کوشش کرنا … اور کوئی فیصلہ کر لو تو میرے پاس آ جانا۔"

"فیصلہ! کیسا فیصلہ جی؟"

"یہ کہ تم کون ہو۔ طافو یا من موجی" میں نے کہا۔

"اچھا جی۔ چلیں آپ کو چھوڑ آؤں۔"

"نہیں' میں چلا جاؤں گا من موجی۔" میں نے عمداً اس کو … نہیں کہا۔

"آپ غلط راستے پر جا رہے ہو جی۔ ادھر سے آگے کھائی ہے۔"

… وہ بولا "اندھیرے میں جنگل کے راستے میں آنکھوں پر … کے بھی دیکھ سکتا ہوں۔"

… گھوڑے پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے ہاتھ بڑھا کے … میں اس کے پیچھے جم کے بیٹھ گیا۔

"… کہیں قریب سے لاہور جانے والی سڑک گزرتی ہو گی' … ملتان کی طرف سے آنے والی۔"

"آپ فکر ہی مت کرو جی۔ آپ کو لاری اڈے پہنچا آتا ہوں … گھوڑے کو ایڑ لگائی "ہو سکتا ہے ادھر سے کوئی ٹیکسی … مل جائے۔"

گھوڑا اب خاصی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ شاید جانور بھی انسان کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں نے سوچا۔ یہی گھوڑا مجھے شرافت سے سیدھے راستے پر نہیں لے جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے بھی راستہ سجھائی نہیں دے رہا۔ اب کیسے نظر آ رہا ہے راستہ؟

تھکن کے جسمانی احساس کو میں نے ابھی تک دبا رکھا تھا۔ گھوڑے کی سواری میں نے عرصہ دراز سے نہیں لی تھی۔ اس وقت یہ سفر میری قوت برداشت کی آزمائش بن گیا۔ رات کے ساتھ ہی جنگل میں خنکی بھی بڑھ گئی تھی اور ٹھنڈی ہوا میرے چہرے کو سُن کرنے لگی تھی۔ جھٹکوں سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ ہل گیا۔ بھوک کا مجھے پہلے خیال نہ تھا' اب لاری اڈے کا تصور کرتے ہی میرے ذہن میں بہت کچھ آ گیا۔ چٹپٹے کھانے جن کی پوری فہرست ہر بیرا ایک سانس میں پڑھ دیتا ہے۔ کسی کے پلے کچھ پڑے نہ پڑے۔ تندور سے نکلنے والی گرما گرم روٹی کی سوندھی مہک اور چائے کی خوشبو۔

ایک گھنٹے بعد مجھے طافو نے ایک روڈ سائڈ ریسٹورنٹ کے سامنے اتارا جہاں ملتان کی طرف سے آنے والی چند بسیں پہلے سے موجود تھیں اور ان کے مسافر رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ یہ ہر بس کے ڈرائیور یعنی استادِ محترم کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ مسافروں کو کس ہوٹل پر کھانا لنچ یا ڈنر تناول فرمانے پر مجبور کریں۔ ہوٹل والے اس تعاون کے بدلے انھیں اور کلینر صاحب کو سب کچھ بلا معاوضہ پیش کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ان کے اخراجات سارا دن آنے والے مسافر ادا کرتے ہیں۔

اگر طافو اس وقت مجھے نہ اتارتا تو شاید میں خود ہی گر پڑتا۔ میری ٹانگوں میں دم نہیں رہا تھا اور میری کمر کے سارے مُہرے ہل گئے تھے۔ میں نے گھوڑے کو دیکھا تو وہ بھی خاصا برہم تھا کہ اس کے عالی نسب گھوڑے کو ایک ڈاکو نے خچر سمجھ کے استعمال کیا اور ٹریک کے بجائے جنگل میں بندہ لاد کے دوڑایا۔

میں نے کہا "شکریہ من موجی صاحب۔ ایک عنایت اور کرو" میں نے ایک چارپائی پر گر کے کہا "مجھے کچھ پیسے دے جاؤ۔"

اس نے گھیر والی شلوار کے اندر سے ایک تھیلی برآمد کی "آپ نے میرا ایک کام کرنا ہے جی۔"

میں نے کہا "یہ کیا ہے؟"

"یہ آپ گل بانو کو دے دینا" اس نے کہا اور گھوڑے پر چڑھ گیا۔

میں نے تھیلی پکڑی تھی "بات تو سنو۔"

"اللہ بیلی" اس نے ہاتھ ہلا کے گھوڑے کو موڑا اور سرپٹ بھگاتا ہوا اسی راستے پر غائب ہو گیا جدھر سے ہم آئے تھے۔

مجھے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ تھیلی میں کیا ہو سکتا ہے مگر میں نے تصدیق کے لیے اس کو کھولا۔ اس میں وہی چار لاکھ کی رقم تھی جو

www.paksociety.com

طافو کا حصہ بنتی تھی اور جو اس نے گل سے قرض خواہ کی طرح طلب کی تھی۔ بعد میں اس کی سوچ میں کیا انقلاب آیا اور کیوں آیا کیسے ایک ڈاکو کے جذبات کا رخ بدلا اور احساسِ ندامت نے اسے کیسے ملامت کی۔ کیا اس کو عمرِ رفتہ کے رائگاں جانے کے احساس نے پشیمانی میں جکڑ لیا اور کیسے وہ میرا راستہ روک کے اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوا۔ یہ کوئی بھی سمجھ سکتا ہے جو وارداتِ قلبی کا شعور اور ادراک رکھتا ہو۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ ہزاروں بے راہرو اور صراطِ مستقیم سے بھٹکے لوگ زندگی کے کسی اچانک آجانے والے موڑ پر اس انقلاب آفریں لمحے سے دوچار ہونے اور اگلے لمحے میں ان کی زندگی کا رخ بدل گیا۔ وہ اپنے ماضی سے یوں کٹ گئے جیسے وہ کسی اور کی زندگی تھی اور جب خدا نے یہ توفیق دی تو پھر ان کا راہبر و رہنما ان کا ضمیر ہوا اور ان کی منزل حضوری ٹھہری۔

کچھ لوگ مجھے حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ایک پُراسرار شہسوار مجھے وہاں چھوڑ کے لوٹ گیا تھا اور میں یوں ہکا بکا بیٹھا تھا جیسے مریخ سے آنے والی اڑن طشتری مجھے ابھی ابھی زمین پر اتار کے کائنات کی بیکراں وسعت میں گم ہو گئی ہے اور میں اس دنیا میں تنہا اور اجنبی مخلوق ہوں۔

اس نے مجھے سوچنے بھی نہیں دیا تھا کہ میں چار لاکھ روپے اسے واپس کر سکتا۔ شاید اسے بھی اندازہ تھا کہ میں بحث کروں گا اور اسے قائل کرنے کی کوشش کروں گا کہ یہ رقم اب اسی کی ہے اور اسے رکھنی چاہیے۔ یہ رقم میری بھی نہیں تھی اور گل کی بھی نہیں تھی۔ یہ اکبر خان کا پیسہ تھا جو گھوم پھر کے میرے پاس پہنچ گیا تھا۔

ایک دیو جن کی طرح نمودار ہوا "حکم جناب!"

میں نے کہا "میں کیا بولوں۔ کچھ تم ہی بولو۔"

"کیا کھاؤ گے؟" وہ بڑی عجلت میں تھا۔

میں نے کہا "جی تو چاہتا ہے سارا ہوٹل کھا جاؤں۔ جو تمہیں اچھا لگے لے آؤ مگر میرے فاقے سے ہلاک ہونے سے پہلے آجانا۔"

اس نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ حلیے سے وہ شاہِ جنات کا ٹھکرایا ہوا کزن ہی لگتا تھا۔ مجھ سے مسخرہ پن کو فضول سمجھتے ہوئے وہ سر ہلا کے لوٹ گیا اور کچھ دیر بعد اشتہا انگیز لوازمات کے ساتھ اس جن کی طرح پھر نمودار ہوا جس کو اللہ دین نے چراغ رگڑ کے طلب کیا تھا اور پہلی فرمائش یہ کی تھی کہ میرے لیے اور والدہ کے لیے مزے مزے کے کھانے لاؤ۔

ابھی میں کھانے سے پورا انصاف بھی نہیں کر پایا تھا کہ ایک ٹیکسی چند مسافروں کو اتارنے آگئی۔ اس سے پہلے کہ ٹیکسی پر کوئی اور قابض ہوتا یا وہ خالی لوٹ جاتی میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ سو کا ایک نوٹ پلیٹ پر پھینک کے میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ جب ٹیکسی روانہ ہوئی تو شاہِ جنات کا ٹھکرایا ہوا کزن مشکوک نظروں سے سو کے نوٹ کا معائنہ کر رہا تھا۔ کسی جعلی نوٹ کی ... باہر کی حیثیت سے۔ پانچ سات روپے کے ٹپ پر ... والوں کی صورت اور حلیہ کیا میرے جیسا ہوتا ہے؟

اچانک میں نے خود کو بہت محفوظ اور پُرسکون ... بالآخر میں بھی اس دلدل سے نکل آیا تھا جس میں ... باعث محسن اور گل نے قدم رکھ دیا تھا۔ ... تک پہنچانے کی ذمے داری ایک کٹھن آزمائش تھی ... شکر گزار تھا کہ اس نے مجھے اس امتحان میں ... رابعہ کی وفا اور غالب کے ساتھ رابعہ کی رفاقت ... خلوص اور اعتماد کے ہر امتحان میں میرے ساتھ ... میری طاقت بن کے رہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ... یوسف جیسے دوست جو بظاہر ہمارے ساتھ نہ تھے لیکن ... ہر وقت انہیں میسر تھا۔

قدرت اپنی جلوہ نمائی کے کتنے حیران کن انداز رکھتی ... ایک امانت سے سبکدوش ہونے کی نیت نہ کرتے تو ... والد کے ایک پرانے نمک خوار نمک حرام سے ... اپنے ضمیر پر احساسِ جرم و گناہ کا بارِ ملامت لیے ... متلاشی تھا کسی سوتے کا جب وہ اپنی تقصیر پر خدا کے ... سے معافی مانگ لے جس کی نیکی کا بدلہ اس نے ... کے دیا تھا۔ اعتقاد رکھنے والے اسے اتفاق کہہ ... کر سکتے ہیں مگر قدرت کے نظامِ انصاف کے توازن کی ... کی بے آواز لاٹھی کے وجود سے انکار ناممکن ہے۔ مکافاتِ ... دستور اس کائنات میں ہر جگہ کارفرما ہے اور اس زمانے ... لیے اس سے نہ یہاں مفر ہے نہ وہاں۔ قدرت خاموش ... تھی اور دیکھنے والے اس پر ترس کھاتے تھے لیکن ... سمجھ سکتا تھا کہ وہ کس کے اعمال کی سزا بھگت رہی ... سزا پانے والا مجرم کون ہے۔ خدا نے مجھے بھی توفیق ... درگزر اور عدل و احسان کے ساتھ اپنے والد کا ایک ... کر سکوں اور ثابت کروں کہ میں اسی سمندر کی ایک ... باراں کی ایک پھوار اور اسی خاک کا ایک زندہ ... باپ کا بیٹا ہوں اسی کی طرح بے ریا کینے سے پاک ... عمل کی نیکی پر یقین رکھنے والا۔

سفر وسیلۂ ظفر۔ اس پرانی کہاوت کی صداقت ... تک ثابت ہوگئی تھی۔ زندگی تو ایک مسلسل ... لیکن وقت کا ہر لمحہ اپنے دامن میں ایک تجربہ ... تجربات کا حاصل وہ عمر ہے جسے کچھ لوگ ماہ و سال ... شمار کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا ... سے نہ ناپ' اور غالب نے کہا تھا کہ ... و سال عندلیب۔ کچھ لوگ سو سال جی کے بھی ... ذہنی طور پر عقل اور تجربے کی اس منزل تک ...

... کی چوتھائی مسافت طے کر کے یا کوئی صاحب ... مرکزِ ادب کے پہنچ جاتا ہے۔

جیسے سند باد لوٹا تو اس کے پاس نئے افسانے تھے اور ... کے قصے تھے۔ اس نے دیکھا تھا کہ مہذب و متمدن دنیا ... کی سنگلاخ وسعتوں میں قبائلی علاقے کے غیرت ... لوگ آج بھی اجداد کی روایات کے امین ہیں۔ ... کے ساتھ دشمنوں کے ان گنت چہرے دیکھے تھے ... کی طرح شکلیں بدل بدل کے سامنے آتے تھے۔ کبھی ... کے نمودار ہوتا تھا اور اپنی مظلومیت کا ... رہا تھا۔ پھر اکبر خان طاقت اور فرعونیت کے بھرپور ... کے ساتھ دوستی کی نقاب ڈال کے سامنے آتا تھا۔ ... کے جبے 'خدا کے سادہ دل بندوں کے پیر و مرشد ... دکھائی دیتے تھے۔ اس سے بہتر طافو جیسے ڈاکو تھے جو ... جرائم پر نیکی اور روحانیت کی نقاب نہیں ڈالتے تھے۔

میں نے اس سفر میں وہ ڈاکو بھی دیکھے تھے جو منافقت سے کام ... کے ساتھ خود کو ڈاکو تسلیم کرتے تھے اور وہ ڈاکو بھی ... کے بغیر اپنے معزز ہونے پر نازاں تھے۔ حالات ... کے اس گورکھ دھندے میں ابھی تک اصل کہانی وہی ... وہی چہرے تھے اور وہی ان کے عزائم۔ جیسے بچوں کی ... آزمانے کے لیے ایک ہی تصویر کو کبھی رنگوں میں گم کر دیا ... کبھی لکیروں میں اور کبھی نقطوں میں اور گہری قوتِ مشاہدہ ... والا اسے پھر بھی شناخت کرلے۔ سارے رنگوں ساری لکیروں اور سارے نقطوں کے درمیان لیکن سب سے الگ۔

زندگی کے ساتھ آزمائش کے مرحلے تھے اور زندگی کا ساتھ ... ختم نہیں ہوا تھا۔ نیا جال لانے والے پرانے شکاری بھی تھے ... جو اس شکار گاہ میں بیک وقت شکار بھی تھے اور شکاری ... چودھری دلاور اینڈ کمپنی کے لیے ایم آر ایس کا وجود ... نہیں ہوا تھا۔ یہ چیلنج اسے بار بار نئے سرے سے جارحیت پر ... پھر مفاہمت پر مجبور کر رہا تھا۔ اس چیلنج سے نمٹے بغیر اس ... کامیابی کا تصور ادھورا تھا۔ وہ ناکامی اور ہزیمت کے خوف ... نہیں چھوڑ سکتا تھا اور اس کے لیے مقاصد کا حصول ... رسائی سے زیادہ اعصاب شکن ہو گیا تھا۔ اس کے ... اب وہ سوڑا نہیں تھا یا ایس ایس پی سراج نہیں تھا تو ... ساتھ استاد حیدری نہیں تھا اور شملا نہیں تھی۔

... دلاور نے جو سب سے خطرناک مہرہ آگے بڑھایا تھا وہ ... اکبر خان تھا جو ڈبل گیم کھیل رہا تھا۔ ڈبل گیم کھیلنے کی کوشش تو ... بھی کی تھی مگر وہ اپنے ماضی پر پردہ ڈالنے میں ناکام ... کا بن کے بھی آجاتا تو ہم اس کو پتلی کے بجائے قبول ... اکبر خان کا معاملہ مختلف تھا۔ اس کی شخصیت ... پراسرار تھی اور اس نے خود کو ناقابلِ فہم بنا رکھا تھا۔

ٹیکسی میں بیٹھ کے میں اپنے خیالات میں ایسا گم ہوا کہ میرے لیے وقت رک گیا۔ میں بھول گیا کہ ٹیکسی کے پہیوں چلتے تیزی سے گھوم رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے زمین کا سورج کے گرد طواف جاری ہے۔ میرے ساکت وجود کے نیچے سے سڑک اسی طرح نکلتی جارہی ہے جیسے مسلسل رواں وقت کے تیزی سے گزرتے ہوئے لمحے میرے احساس کی گرفت میں آئے بغیر نکل رہے ہوں۔

اچانک میں نے خود کو لاہور میں پایا۔ وہی اپنائیت کے احساس کی خوشبو سے معمور فضا تھی جس نے مجھے جھنجوڑ کے ہوشیار کیا۔ میرے شہر کے گلی کوچے آباد تھے روشنیاں مسکرا رہی تھیں اور نیون سائن جل بجھ کے مجھے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ہر گزرنے والے سائن بورڈ کی عبارت پکارتی تھی۔ جی آیاں نوں۔ بظاہر بے معنی الفاظ تو محض جذبات کی علامت ہیں۔ ایک دم میری ساری تھکن اور پژمردگی کی دھند غائب ہو گئی اور میری خوشی ایک بھرپور دن کے اجالے کی طرح غالب آگئی۔

میں نے کہا "کہاں چلے جا رہے ہو بادشاہو۔ پوچھ تو لو کہ مجھے کہاں جانا ہے؟"

"کیا آپ سو گئے تھے جی؟"

میں نے کہا "اگر کوئی سو جائے تب بھی تمہیں دیکھ لینا چاہیے کہ کہیں وہ مر تو نہیں گیا۔"

"اللہ معاف کرے" اس نے بے اختیار کہا "میں تو چلتا جا رہا تھا کہ جہاں آپ کہو گے گاڑی موڑ لوں گا۔ جہاں بولو گے رک جاؤں گا۔"

میں نے کہا "اس نہر کے مال والے موڑ سے صدر کی طرف جانا ہے۔ بازار سے سیدھا راستہ پکڑلو۔ راستوں سے تو واقف ہو نا؟"

وہ ہنسا "لوجی" ہم تو ادھر ہی پیدا ہوئے' ادھر ہی مریں گے۔"

میں نے کہا "اچھا؟ کیا حال ہے لاہور کا؟"

اس نے مجھے پلٹ کے دیکھا "لاہور لاہور ہے جی۔ آپ کہیں باہر سے آئے ہو؟"

میں نے کہا "پتا نہیں میں اندر تھا کہ باہر۔ آدمی اندر ہو تب بھی باہر کا کیا پتا چلتا ہے اور باہر ہو۔۔۔"

اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے فیصلہ کرنا چاہتا ہو کہ میں جیل سے چھوٹا ہوں یا پیچھے بیٹھ کے پی رہا ہوں "کس کے گھر جانا ہے جی؟"

میں نے ہنس کے کہا "کیا تم مجھے عبدالودود مظہر کے گھر پہنچا دو گے؟ اگر میں صرف نام بتادوں۔ بہت بڑا وکیل ہے ہائی کورٹ کا۔ بہت موٹا ہے اور بہت فراڈ ہے۔ پچاس بچے ہیں سالے کے باز نہیں آتا۔"

ٹیکسی ڈرائیور کا شبہ قوی تر ہو گیا کہ میں نشے میں ہوں "آپ گھر کا راستہ تو بتاتے ہو نا جی؟" اس نے کچھ گھبرا کے کہا۔

www.paksociety.com

میں نے کہا "فکر مت کرو، میں نشے میں نہیں ہوں۔ میں بھی اسی زندہ دل شہر کا پروردہ ہوں۔ بہت دن بعد لوٹا ہوں تو پھر ترنگ میں ہوں۔"

"کہاں گئے ہوئے تھے جی؟"

میں نے کہا "یہ ایک بہت لمبی کہانی ہے۔ کیا کرو گے سن کر۔ تمہیں تو ہر روز ہی ملتی ہوں گی ایسی کہانیاں۔ ہر کوئی مسافر ہے اور ایک کہانی ہے۔ چلو اب گاڑی کو موڑ لو دائیں طرف اور سیدھے ہاتھ پر تیسرے کھمبے کے سامنے روک لو۔"

میں نے ڈرائیور کو سو کا ایک نوٹ پیش کیا "کھمبے کی روشنی میں پرکھ لو، یہ جعلی نہیں ہے۔ اور یہ لو دوسرا، یہ بھی اصلی ہے۔"

اس نے سر ہلایا اور نوٹ جیب میں رکھ کے باقی رقم واپس کرنے لگا لیکن میں اتنی دیر میں گیٹ پر پہنچ چکا تھا۔ ڈرائیور کو جب یقین آگیا کہ میں واقعی تو رے روپے واپس لینے کے موڈ میں نہیں ہوں تو اس نے ہاتھ ہلایا اور گاڑی کو یوٹرن کاٹ کے واپس لے گیا۔ مالِ مفت دلِ بے رحم۔ اکبر خان کی دولت سے میں تھوڑی سی خوشی ایک دوسرے کو دے چکا تھا جو شاہ جنات کا کزن تھا اور اب اس ڈرائیور کو ٹپ دیتے ہوئے بھی میں نے نودولتیے کی طرح حاتم طائی کی قبر پر لات ماری تھی لیکن میں خوش تھا اور دوسروں کو خوش دیکھ کے مزید خوش ہونا چاہتا تھا۔

میں کال بیل کو انگلی سے دبا کے کھڑا ہو گیا تھا۔ گھنٹی کچھ دیر بجتی رہی پھر خاموش ہو گئی۔ غالباً گھنٹی کا کوائل جل گیا تھا۔ اس قسم کی گھنٹی کے بٹن کو ایک بار دبا کے نہ چھوڑا جائے تو یہی ہوتا ہے مگر جو یہ بات یا تمیز نہیں جانتے وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ میری بدتمیزی کا مقصد عبدالودود منظر سے گالیاں سننا تھا۔

وہ اندر سے چلاتا ہوا برآمد ہوا "او یار کون آیا ہے بھائی۔ قیامت آگئی ہے ساتھ کیا؟ انگلی پھنس گئی ہے بٹن میں؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور جب منظر نے گیٹ کھولا تو میں چیخ مار کے اس سے لپٹ گیا "اوئے کیدو ننگھا۔ کی حال ہے تیرا گھر تے وے چنگے؟"

منظر کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ پہلے تو جواب میں اس نے بھی کہا "اوئے۔۔۔۔ اوئے ہٹ۔ کون ہے، بھوت کے بچے۔ اب جان چھوڑ میری۔"

پھر اس نے میری آواز پہچان لی اور اس نے کمبل پھینک کے مجھے مکا مارنے کی کوشش کی "کیدو ننگھے کی اولاد۔"

میں اندر بھاگا "ارے بچو! مجھے بچاؤ۔ تمہارا باپ پاگل ہو گیا۔ قتل کرنا چاہتا ہے تمہارے چاچا کو۔"

اندر سے منظر کی بیوی پریشان ہو کے نکلی۔ اس کے چار چھ بچے ماں کے پیچھے نمودار ہوئے۔ اس وقت منظر کمبل اٹھا رہا تھا۔

میں نے کہا "بھابی جی سلام۔"

اس نے مسکرا کر کہا "حد کرتے ہیں آپ بھی سکندر بھائی۔ مجھے ڈرا دیا۔ ایمان سے دل ابھی دھڑک رہا ہے۔"

میں نے کہا "ارے بھابی جان! ابھی تک آپ کا دل [illegible] ہے۔ اس ریچھ کے ساتھ رہ کے بھی؟"

منظر نے کہا "اندر چل بھوتنی کے۔ میری بیوی کو [illegible] مت کر۔"

میں نے اندر جا کر ادھر ادھر دیکھا "بھابی! وہ کہاں ہے؟"

منظر کی بیوی نے تعجب سے کہا "کون بھیا؟"

"چندر سوا [illegible] جو سولہ برس سے پہلے [illegible] ہے اور [illegible] بعد۔ قسم خدا کی مجھے تو بڑی خوشی ہوئی کہ کسی نے تو ہمت [illegible]۔ جانگ والوں کی ایسی تیسی کرنے کی۔ اللہ اور برکت عطا کرے زورِ شباب اور زیادہ۔"

منظر کی بیوی کا چہرہ سرخ ہو گیا "اتنے دن بعد آئے ہو تو آتے ہی۔۔۔"

منظر نے کہا "تم جاؤ۔ اس کی اوجھڑی خالی ہے تو اول فول بک رہا ہے۔ میں کرتا ہوں اس کا دماغ درست۔"

اس کے سارے بچے ہکا بکا کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کا ہجوم میں دو فٹ سے چار فٹ تک کے ملے جلے بچے تھے۔ "شاباش! قطار بناؤ۔ ہاتھ ملاؤ اپنے چاچا سے اور عیدی لیتے چلو۔ بیٹا تم آؤ، یہ لو۔"

پہلے بچے نے سو کا نوٹ پکڑ کے خوشی سے چھلانگ ماری اور غائب ہو گیا۔ اس کے بعد ہڑبونگ مچ گئی۔ جب میدان صاف ہوا تو میں جوتوں سمیت چارپائی پر لیٹ گیا۔

منظر نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا "بچوں کو بگاڑ [illegible] دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "اگر بچوں کی ولدیت جعلی نہیں ہے تو [illegible] اصلی ہیں۔"

"پھر کیا حرام کا مال ہے؟"

"مالِ غنیمت ہے جو حلال ہوتا ہے۔" میں نے کہا "[illegible] ہے کہ یہاں میں تجھے قتل کرنے آیا تھا۔ بچے سامنے آگئے تو جذبات بدل گئے۔ ان کی یتیمی کے خیال سے ارادہ بدل دیا۔"

وہ ہنسنے لگا "اب کیا ملے گا مجھے قتل کر کے۔ [illegible] شوہر کو قتل کر۔ بیوہ سے شادی کا ثواب بھی لے اور [illegible]۔"

میں نے کہا "قتل کی وجہ زیادہ اہم ہے۔ تو نے میری [illegible] پر حرف بہ حرف عمل کیوں نہیں کیا؟ [illegible] سے منگوائے تھے، تو نے اپنے والد ہی کو بھیج دیا۔"

اس نے کہا "یہ سب اس جورو کے غلام کا [illegible] محض نام کا غالب ہے ورنہ ہے مغلوب۔ اس نے کہا [illegible] صاحب، رام رام جپنا، پرایا مال اپنا۔ اکبر خان [illegible] ڈاکو کا مال ہی جائے ڈاکوؤں کے پاس تو اچھا ہے۔ [illegible] ہونے لگا کہ کہیں اکبر خان کوئی ہاتھ نہ کر جائے۔ اس [illegible]

[illegible] کچھ نہیں ہوگا مگر ہمارے سکندرِ اعظم کی فوج کو [illegible] اس پورس کے ہاتھی سے۔"

"[illegible] کے بعد وہ لوٹ آیا۔"

"[illegible] کہاں، وقار یوسف بھی تو ساتھ تھا۔"

"[illegible] اس کا ساتھ آنا حیرت کی بات تھی۔"

"[illegible] نے روک لیا اس بلائے بے درماں کو جسے ناز [illegible] تھی غالب کے ساتھ جانے پر۔ غالب نے مجھ [illegible] صورتِ حال کو سنبھالوں گا کہ اس بھوت کی [illegible] ڈاکوؤں کا۔" منظر نے کہا "یہ اندر گرائے [illegible] میں نے چائے میں خواب آور گولی ملا کے دے [illegible] بھاگ گیا وقار یوسف کے ساتھ۔"

"غالب زندہ ہے یا واپس پہنچتے ہی مارا گیا نازو کے ہاتھوں؟"

"[illegible] نازو کو شک ہوتا تو وہ مجھے بھی معاف نہ کرتی مگر [illegible] آتے ہی اس کو بہت ڈانٹا ڈپٹا کہ کیا ضرورت تھی بعد [illegible] میں تو سمجھا تھا بیگم کی نیند سو گئیں۔ وہ بڑی [illegible] شرمندہ تھی کہ آخر عین وقت پر اسے نیند کیسے آگئی۔ [illegible] غالب کے جانے کے چند گھنٹے بعد۔"

"نیند کی گولی دینے کا خیال کسے آیا تھا؟"

"[illegible] بات تو یہ ہے کہ آئیڈیا غالب کا تھا مگر عمل میں نے کیا" [illegible] قہقہہ مار کے ہنسا۔

[illegible] نے کہا "میرا خیال تھا کہ سب یہاں ہوں گے۔"

"وہ گاڑی وقار یوسف کے گھر سے گئی تھی۔ سب لوگ [illegible] وہیں چلے گئے۔ میرے پاس فون آیا تھا کچھ دیر پہلے محسن [illegible] کی طرف سے کچھ تشویش تھی۔ اس نے سب بتایا مجھے [illegible] اولاد سمجھی میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اتنی ہنسی آئی مجھے [illegible] آج کل کی اولاد اتنی جلدی باپ کو پاگل کیوں سمجھنے لگی ہے؟"

میں نے تو بھر کے کہا "سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ [illegible] بچے بوڑھے باپ کو پاگل سمجھتے تھے، اب وہ وقت آنے [illegible] منظر کے پیدا ہوتے ہی تیرا اگلا بیٹا سوال کرے گا کہ پاگل [illegible] پہلے چند دن تم تھے کہ مجھے پیدا کیا۔"

منظر کی بیوی اسی وقت کھانا لے کر آگئی "بچے تو اللہ کی رحمت [illegible] اب تم خود کو دیکھو۔ پھر رہے ہو شتر بے مہار بنے [illegible] تو آج ماشاء اللہ سے تمہارے بھی ہو گئے بچے ہوں تو [illegible] بے رونق چھوڑ کے باہر جانے کو اور جو صبح کے گئے [illegible] بچے کیسے چھٹتے ہیں باپ سے۔" اس کی زبان کی [illegible] کی۔

[illegible] نے کہا "یورپ میں بچوں کی دُم چھٹی ہے بھابی۔"

[illegible] کہا "وہ تو ہوتی ہیں بے حیا۔"

[illegible] نے کہا "چھوڑیں بھابی، یہ اپنی مشرقی بیویاں کیا خاک محبت کرتی ہیں، دور سے مسکرا کے کہا سلاما علیکم جی اور پھر گھس گئیں کچن میں۔ سمندر سے ملے ہو کبھی؟ مغربی بیویاں ہوتی ہیں پیار کا بپھرا ہوا سمندر۔ ایسے موج کی طرح اچھلتی ہیں اور ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ وہ کیا شعر ہے غالب کا۔ آ تجھے [illegible] تک جا تھاہ کر کے۔"

منظر کی بیوی دم بخود رہ گئی۔ ایسی بے شرمی کی باتیں میں نے اس کے سامنے کبھی نہیں کی تھیں "تمہارا تو دماغ چل گیا ہے بھیا لندن میں رہ کے۔ یہ سب رابعہ کو پتا چلا تو۔۔۔"

میں نے کہا "کون رابعہ؟ کیسی رابعہ؟ ہم تو واپس جا رہے ہیں لندن اور وہیں رہیں گے۔ روز بیاہ کریں گے میموں سے۔ یہ دیسی بیویاں ویسے ہی دماغ خراب کرتی ہیں، ان کا بس چلے تو سال میں چار بار بچے دیں۔"

وہ سخت خفا ہو کے رخصت ہو گئی تو میں نے کہا "یار اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ وہ بولتی رہتی تو ہم خاک بولتے۔ آخر تو اس کی زبان پر تالا ڈال کے کیوں نہیں رکھتا؟"

منظر نے آہ بھری "کس کس چیز پر تالا ڈالے آدمی۔ خیر تو کھانا کھا اور پھر تو سو جا یا فریش ہو جا۔"

"کھانا تو میں نے کھا لیا تھا۔ چائے کافی اب ملنے سے رہی، اس لیے چلتے ہیں وقار یوسف کی طرف۔"

"میں نہیں اس وقت کہیں جانے والا۔ تو گاڑی لے جا۔"

"گاڑی کے گھوڑے! مجھے راستہ معلوم ہوتا تو میں ٹیکسی میں سیدھا اُدھر ہی چلا جاتا۔ تیرے اس چڑیا گھر کے پندرھویں مہمان کو دیکھنے کیوں آتا۔ اس کی صورت کس سے ملتی ہے؟"

اس نے افسوس سے سر ہلایا "وحید مراد سے۔ میری بیوی اس پر عاشق ہے۔"

"بیشتر بیویاں اس پر عاشق ہیں دوست۔ کیا ہو سکتا ہے صبر کے سوا" میں نے کہا "چل تو سو جا۔ مجھے راستہ سمجھا دے اور اپنی گاڑی دے دے۔"

"میں فون کر دوں انہیں؟"

"نہیں۔ تھوڑا سا سرپرائز ٹھیک رہے گا۔"

منظر نے کرولا مارک ون لے لی تھی جو بالکل نیا ماڈل تھا اور اسے چلا کے میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں ہوائی جہاز میں پرواز کر رہا ہوں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ منظر کی پریکٹس خوب چل رہی ہے ورنہ وہ ایسی قیمتی اور صبا رفتار گاڑی کہاں سے لیتا۔

رات کے وقت مال روڈ سنسان تھی۔ بیشتر دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ کافی ہاؤس کھلا ہوا تھا لیکن وہاں اکیلے بیٹھ کے کافی پینے میں کوئی لطف نہ آتا چنانچہ میں گولی کی طرح زمزمہ تک سیدھا گیا اور پھر بائیں ہاتھ کو مڑ گیا۔ آگے سڑک زیادہ ویران تھی۔ میں ماڈل ٹاؤن تک رکے بغیر پہنچ گیا۔ پھر میں نے منظر کے بتائے ہوئے پتے کی نشانیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے راستہ طے کیا اور پون گھنٹے بعد ہی

www.paksociety.com

وقار یوسف کے نئے گھر کے سامنے تھا۔ وہاں وہ گاڑی بھی موجود تھی جس میں محسن اور کل واپس پہنچے تھے اب اس پر ایک سرکاری نمبر نظر آرہا تھا۔

خلاف توقع اندر خاموشی تھی۔ میں نے گھنٹی بجائی تو اندر سے ایک ملازم برآمد ہوا۔

میں نے کہا "گھر کے لوگ کہاں ہیں؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "آپ سکندر صاحب ہیں نا جی؟"

میں نے کہا "یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"وہ لوگ اُدھر ہیں۔ نئی کوٹھی میں" اس نے کہا۔

میں نے کہا "یہ کوٹھی بھی نئی ہے۔"

"گلبرگ والی کوٹھی سر" ملازم نے کہا۔

"مگر مجھے ابھی ابھی وکیل صاحب نے بتایا ہے یہ پتا کہ وقار صاحب اور ان کے مہمان یہاں ہوں گے۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"یہیں تھے جناب، ابھی تھوڑی دیر پہلے گئے ہیں۔ کہہ گئے تھے کہ آپ وہاں آجائیں" نوکر ڈر گیا۔

"یہ پتا میں نے بڑی مشکل سے تلاش کیا تھا۔ جانے سے پہلے منظر کو بتا جاتے تو میں سیدھا اُدھر جاتا۔ خیر، تم بتاؤ یہ گلبرگ والی کوٹھی کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

نوکر نے کہا "ایک منٹ جناب" اور اندر چلا گیا۔ وہ ایک منٹ سے بھی پہلے لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر پتا بھی تھا اور نقشہ بھی۔ میں نے اسے جیب میں رکھ کے گاڑی پھر اسٹارٹ کی۔

"تمہیں معلوم ہے آخر ان کے ایک دم انتقال کی وجہ کیا تھی؟"

"نہیں جی!" نوکر بھونچکا رہ گیا۔

میں نے کہا "میرا مطلب تھا اچانک کیوں چلے گئے وہ؟"

"نہیں جی... وہ کسی کا فون آیا تھا۔ اس کے بعد پروگرام بن گیا۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا اور سوچتا ہوا چل پڑا۔ اسے نقل مکانی برائے ضرورت نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ ایک نئی کوٹھی سے دوسری کوٹھی میں جانا کوئی شریفانہ حماقت بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ غالباً فرار تھا اور شاید فون پر کسی نے کوئی ایسی بات کی تھی کہ انہیں یہاں سے نکل جانے میں عافیت نظر آئی۔ خیر قبل از وقت مفروضات قائم کرنے سے کیا فائدہ۔

میں نے گاڑی کو موڑا ہی تھا کہ اندھیرے میں سے تین افراد سرتاپا کفن جیسا سفید لباس پہنے سڑک پر آگئے۔ ان میں سے ایک سڑک کے وسط میں تھا، باقی دو کناروں پر ایک موٹا رسّہ پکڑے کھڑے تھے۔ اس رسّے کو انہوں نے بڑی پھرتی سے دو کھمبوں پر لپیٹ دیا، ایک کھمبا ٹیلی فون کا تھا اور دوسرا اس کے مقابل بجلی کا۔

ہیڈ لائٹس میں مجھے اندازہ ہوا کہ انہوں نے [illegible] باندھ رکھا تھا۔ درمیان والے کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی جس کا [illegible] پھل چمک رہا تھا۔ باقی دو سریے اٹھائے تھے جو پہلے شاید [illegible] پڑے ہوئے تھے۔

وہ میری چھٹی حس تھی یا قدرت کی طرف سے عطا دفاع کرنے کی صلاحیت کا غیر معمولی کرشمہ کہ میرے ذہن میں [illegible] خیال وحی کی طرح نازل ہوا۔ یوں شوق شہادت میں سر پر کفن باندھ کے مرنے مارنے والے صرف ٹیکر ہی ہوسکتے تھے [illegible] جنون ہی انسان کی جدوجہد کو اس مقام تک لے آتا ہے جہاں [illegible] تو محو تماشائے لب بام رہ جاتی ہے اور عشق بے خطر آتش نمرود میں کود پڑتا ہے۔ وہ ٹیکر تھے اور ٹیکر شاہ کی خدمت بے لوث [illegible] اپنی روحانی عقیدت کا اظہار اپنی جان دے کر اور میری جان [illegible] کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ میں ٹیکر شاہ کی بے حرمتی کا مرتکب ہوا [illegible] اور واجب القتل تھا۔

ایسے اندھے جذبات رکھنے والے اول تو ذہنی طور پر [illegible] ہوتے ہیں پھر ٹیکر شاہ جیسے عیاروں کی شعبدہ بازی اور ساحرانہ [illegible] عقل پر ایسا پردہ ڈالتی ہے کہ وہ خود کچھ نہیں سوچتے۔ [illegible] ہوجانے والے کی طرح ایک معمول بن جاتے ہیں اور [illegible] کے بغیر عامل کے احکامات بجالاتے کوئی ایمان جان لیتے ہیں۔

شاید انہیں علم تھا کہ میری سواری آنے والی ہے اور [illegible] ٹاؤن سے ڈائریکٹ عدم آباد پہنچانے کے لیے ان کی تیاری [illegible] تھی۔ میں ایک کوشش کرسکتا تھا کہ رفتار بڑھا کے اس [illegible] توڑتا ہوا نکل جاؤں مگر عین سڑک کے درمیان ایک [illegible] کلہاڑی لیے حملے کا پوز بنائے کھڑا تھا۔ اسے گرانا بھی [illegible] لیکن آثار بتاتے تھے کہ وہ گاڑی پر چھلانگ مارے گا اور [illegible] اوپر آکے کلہاڑی سے وار کرے گا۔

کسی تیز رفتار گاڑی پر یوں مخالف سمت سے [illegible] والے کا ونڈ اسکرین سے ٹکرا کے سلامت رہنا اتفاق [illegible] تھی۔ اس کی ہڈیاں بھی ٹوٹ سکتی تھیں اور ونڈ اسکرین [illegible] سکتا تھا۔ وہ بچ جاتا تو اس کی کلہاڑی کی ضرب براہ راست [illegible] اور مجھے بیک وقت تین خطرات کا سامنا ہوتا۔ میں ونڈ اسکرین [illegible] شیشے کے ذرات سے زخمی یا اندھا ہوجاتا، کار بے قابو ہو [illegible] کلہاڑی کا پھل میرے سر کو دو نیم کرتا جسم سے گزر جاتا۔

انسانی ذہن عام حالات میں بھی کمپیوٹر کی طرح فیصلے [illegible] غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا [illegible] معروف شاہراہ پر ڈرائیونگ میں آدمی ایک منٹ میں [illegible] بڑے دو سو فیصلے کرتا ہے۔ ہنگامی صورت میں یہ صلاحیت کئی [illegible] جاتی ہے۔

وہ ایک سیکنڈ کی مہلت تھی جس میں سارے خطرات [illegible] کے میں نے ایک لائحہ عمل مرتب کیا اور جان بچانے کے لیے

[illegible] گاڑی۔ میں نے سینٹر فارورڈ کو ڈاج دیا اور ایک دم گاڑی [illegible] جانب موڑ دیا۔ دائیں طرف بجلی کا کھمبا سڑک سے کچھ [illegible] ٹیلی فون کا کھمبا نسبتاً قریب تھا اور میں نے رسّی کو چھوتے [illegible] طرف سے راستہ بناتے ہوئے ایک ٹیکر پر چڑھائی کی۔

[illegible] سینٹر فارورڈ یعنی بیچ والا کلہاڑی بلند کیے "جئے ٹیکر" کا نعرہ [illegible] چکا تھا۔ میرے ڈاج کرنے کے بعد جب اس نے جست [illegible] میں بلند ہوا اور بونٹ پر لینڈ کرنے کے بجائے دائیں [illegible] گرا۔ بائیں طرف والے ٹیکر کے ہاتھ میں بھی سریا [illegible] پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق رائٹ آؤٹ اور [illegible] کو بعد میں حملہ کرنا تھا۔

[illegible] وقت مجھے اپنی جان بچانے کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی منظر [illegible] گاڑی کا خانہ خراب ہونے سے بچانے کی حالانکہ جان [illegible] مقابلے میں اس نقصان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ انشورنس [illegible] گاڑی کا نقصان پورا کردیتی۔ میری تو انشورنس بھی نہیں تھی [illegible] میں ایک خیال تھا کہ میں نے عقل سے کام لیا اور [illegible] تین ٹیکر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بندوق کی گولی کا [illegible] یقیناً نہیں کرسکتا تھا مگر یہ دست بدست لڑائی تھی اور [illegible] کے ہتھیار بھی وہ تھے جو شاید زمانہ قبل مسیح میں بطور [illegible] استعمال ہوتے ہوں گے۔

گاڑی کا رخ بدلا تو لیفٹ آؤٹ بدحواس ہوکے بھاگا۔ ان [illegible] مقابلے کا ایک ہی نقشہ تھا کہ میں رستے کی وجہ سے [illegible] مجبور ہوجاؤں گا "مرکزی رہنما" اپنی جمپ لگا کے بونٹ پر [illegible] اور شیشے کی دیوار پر ایسا وار کریں گے کہ میں خاک [illegible] نظر آؤں گا۔ نقشہ یوں بدلا کہ پہلے تو سپہ سالار سڑک [illegible] منہ کے بل گرے اور گاڑی نے تیزی سے دوڑتے [illegible] کی طرح ایک دم سمت بدل لی۔

میں نے پاؤں کا سارا زور ڈال کے بریک لگائے تو گاڑی پیچھے [illegible] پر گھوم گئی۔ گاڑی کے ٹھہرنے سے پہلے میں نے دروازہ [illegible] کھول دیا تھا۔ میں نے باہر چھلانگ لگائی تو لیفٹ آؤٹ سریا لے کر [illegible] حملہ آور ہوا۔ میں نے اسے وار کرنے کی مہلت دی اور [illegible] میں جھوک دے کر اس کے پیٹ میں گھس گیا۔ رائٹ [illegible] "جئے ٹیکر" کا نعرہ لگاتا اس کے پیچھے چلا آرہا تھا۔ اس نے جو [illegible] میرے سر پر مارنے کے لیے اٹھائی تھی وہ پہلے حملہ آور کی [illegible] کی۔ ظاہر ہے اس سے وہ شہید ہوگئے۔

پہلے حملے کی ناکامی سے زیادہ سینٹر فارورڈ کو سڑک پر سجدہ ریز [illegible] کا صدمہ تھا۔ جوش میں اس نے چھلانگ بھی اونچی لگائی [illegible] بونٹ پر گرتا تو بات کیا تھی ہوتی۔ مزید تین فٹ نیچے [illegible] گرنے سے اس کے گوڈے گٹے متاثر ہوئے اور غالباً [illegible] کے بل سے بھی اس کو نقصان پہنچا۔ وہ دوبارہ شوقِ [illegible] اٹھا تو اس کے جذبات اور ولولے میں خاصی کمی واقع

ہوچکی تھی۔ اس کے ساتھی کو بھی اپنی غلطی کا صدمہ تھا۔ اس کی مجاہدانہ ضرب سے اپنا ہی ایک ساتھی اللہ کو پیارا ہوگیا تھا.... پھر بھی اس نے اور کلہاڑی والے نے اپنی صف بندی کی اور مجھ پر ایک ساتھ لپکے۔

کلہاڑی والے نے "جئے ٹیکر" کا نعرہ مار کے کلہاڑی گھمائی۔ میری گردن کو تن سے جدا کردینے کے عزم صمیم کے ساتھ۔ وہ تربیت یافتہ لوگ نہیں تھے لڑنا تو ہر جانور جانتا ہے۔ وہ حملہ بھی کرسکتا ہے اور اپنی صلاحیت کے مطابق دفاع بھی۔ یہ گاؤں کے سوا شاید خاندانی اور برادری کے فسادات میں داد شجاعت دیتے ہوں گے مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ مقابلہ کسی عام شہری بابو سے نہیں (جو فلموں میں گاؤں کی گوری سے عشق کے بعد بے وفائی کرکے شہر بھاگ جانے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا)

میں نے پہلے سریا بردار شخص کو شہید ہونے کا موقع دیا۔ وہ سریا گھما کے آگے بڑھا تو میں ایک دم لیٹ گیا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ سریا ہوا میں گھوما تو دور میں وہ بھی تھوڑا سا گھوما۔ کلہاڑی والا اس کے ساتھ ہی تھا۔ وہ بال بال بچا مگر مجھ سے ٹھوکر کھا کے پھر زمین پر منہ کے بل گر گیا۔ اب میں نے سریے والے کو ٹانگ پکڑ کے کھینچ لیا "اس کا سر زمین پر لگا ہی تھا کہ میں نے اسے اٹھالیا اور ایک چکر دیا۔ کلہاڑی والا پھر اٹھا ہی تھا کہ دائرے میں گردش کرتا ہوا ٹیکر اس سے ٹکرایا اور ایک کالی بک کے وہ تیسری بار چت ہوا۔ میں نے دوسرے راؤنڈ میں ٹیکر کی ٹانگ چھوڑ دی۔ وہ کسی دُم دار ستارے کی طرح سیدھا گیا اور تن سے اس کا سر ٹیلی فون کے کھمبے پر لگا۔ کھمبا متاثر نہیں ہوا، وہ وہیں گر گیا۔

وہ تمثالی فوج ختم ہوجانے کے بعد سپہ سالار میدان میں تنہا رہ گیا تھا مگر پسپائی اس کا مقصد کبھی نہ تھا۔ مجھے قتل کرنے کی سعادت یا شہادت۔ یہی اس کی دلی تمنا تھی چنانچہ وہ تیسری بار فرش خاک سے اٹھا اور کلہاڑی اٹھا کے میرے سامنے آیا۔ اس کی کلہاڑی کا پھل اتنا تیز تھا اور اس کی سفاک چمک اتنی خون آشام تھی کہ میں ذرا بھی غلطی کرتا تو دو ٹکڑے ہوجاتا۔ میں نے سریا اٹھالیا اور لاٹھی کی طرح گھمایا۔ کلہاڑی اس سے ٹکرائی۔ مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ اس وار کے پیچھے کتنی قوت تھی۔ میرا ہاتھ جھنجھنا گیا اور سریا میری گرفت سے نکل گیا۔ تاہم ایک قاتلانہ حملے سے بچ جانے کے بعد مجھے مہلت مل گئی تھی۔ میں جست لگا کے کار کے پاس پہنچ گیا۔ میرا ہاتھ کار کے دروازے پر تھا۔ میرا حریف کسی وحشی درندے کی طرح بڑھا۔ اس نے پھر کلہاڑی گھمانے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا کہ میں نے کار کا دروازہ پوری قوت سے کھول کے ڈھال کی طرح استعمال کیا۔ دروازہ دھڑ سے اس کے سینے پر لگا۔ نیوٹن کے قانون حرکت کے پہلے کلیے کے مطابق اس کا نچلا دھڑ رک گیا مگر اوپر کے جسم کا سلسلہ سیکنڈ کے ہزارویں یا اس سے بھی کم حصے تک جاری رہا۔ چلتی بس سے کودنے والا جب سڑک پر منہ کے بل گرتا

www.paksociety.com

www.paksociety.com

ہے تو اس گھٹنے کی صداقت کو ثابت کرتا ہے یا اچانک بریک لگانے سے سر آگے جا کے ڈیش بورڈ سے ٹکراتا ہے تب بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

گاڑی والے کی گردن دروازے کے اوپر سے میرے سامنے آئی۔ یہ بڑا شدید جھٹکا تھا جو اس کے نرخرے نے تو برداشت کر لیا مگر پچھلے حصے میں گردن کے نازک مہروں کا توازن بگڑ گیا۔ اس کے حلق سے ایسی ہی آواز نکلی جیسی بکرے کے منہ سے قصاب کی چھری کے نیچے نکلتی ہے...... پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ مجھے سب سے پہلے قتل کر کے جنت میں پہنچنے کی خواہش رکھنے والا اپنے مقصد خودکشی میں کامیاب رہا تھا۔ افسوس کہ دنیا سے سفر کر گیا مگر۔ آنکھیں تو کھلی رہ گئیں پر مر گیا مگر۔

شاید اس معرکہ آرائی کا احوال پڑھنے میں آپ نے جتنا وقت صرف کیا اس سے کم وقت میں یہ یکطرفہ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ لیکن وہ پہلے سے باندھ کے آئے تھے۔ میں نے تدفین کا فریضہ لواحقین پر چھوڑا اور فوراً گاڑی میں بیٹھ گیا کیونکہ دوسری طرف سے میں نے کسی گاڑی کی ہیڈلائٹس کو قریب آتا دیکھ لیا تھا۔

دوسری گاڑی رستے کے قریب آ کر رک گئی۔ اس میں کوئی فیملی تھی جو آدھی رات کے بعد کسی تقریب سے واپس آ رہے تھے۔ زیورات سے لدی پھندی اور سجی بنی خواتین نے وحشت سے چیخ کا کورس بلند کیا مگر مرد کچھ حوصلہ مند ثابت ہوا۔ شاید اس نے دیکھ لیا تھا کہ رستہ گیر لمبے لیٹے ہوئے ہیں اور حرکت بھی نہیں کر رہے ہیں۔ وہ سفید کفن میں لاشوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ سڑک کے کنارے میری کار کی ہیڈلائٹس بھی جل رہی تھیں اور انجن بھی بند نہیں تھا۔

میں نے نیچے اتر کے دوسری گاڑی والے کو ہاتھ ہلایا لیکن اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ممکن ہے خواتین نے اسے روکا ہو مگر وہ اترنے پر مجبور تھا اور میرے رویے سے بھی یہ ظاہر ہوتا تھا کہ میں خود اس منظر پر حیران، پریشان اور حواس باختہ ہوں۔ مرد سوٹ میں تھا اور میرے مقابلے میں بہت معزز نظر آتا تھا حالانکہ گاڑی میری زیادہ قیمتی تھی۔

اس نے عادتاً انگریزی میں سوال کیا "یہ کیا ہے آخر؟"

میں نے کہا "میں بھی اسی سوال کا جواب تلاش کرنے اترا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ میرا کام نہیں۔ یہ کام پولیس کا ہے۔"

"یقیناً ہمیں کچھ نہیں کرنا چاہیے۔"

"کرنا چاہیے۔ ہمیں فوراً بھاگ جانا چاہیے" میں نے کہا "شریف آدمی یہی کرتا ہے اور اس واقعے کو ایسے بھول جانا چاہیے جیسے ہم نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔"

"رائٹ" اس نے مجھ سے اتفاق کیا اور ایک کھمبے کی طرف سے گاڑی نکال کر لے گیا اور میں دوسری طرف سے۔ تینوں نگران کرام وہیں لیٹے رہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ان میں سے کتنے شہید ہوئے اور کتنے زندہ ہیں لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ انجام نہیں آغاز ہے اور نہ جانے کتنے نگران مجھے جہنم رسید کرنے کے مشن پر بھیجے جائیں گے۔

جب میں کچھ پرسکون ہوا تو میری سمجھ میں یہ بات بھی آئی کہ دوستوں نے ایک نئی کوٹھی سے دوسری نئی کوٹھی میں منتقلی کی قربانی دی تھی۔ غالباً فون پر ان کو جو پیغام ملا تھا اس کا تعلق یقینی طور پر انہی نگرانوں کے مذموم عزائم سے ہو گا۔

منظر کے گھر سے روانہ ہوتے وقت میں بہت خوش تھا اور میرے تصور میں مدت کے بعد محفل یاراں کی دلدار شب تھی۔ کچھ کہنے اور اس سے زیادہ سننے کی رات۔ گلے شکوے اور پرخلوص گالیوں کے لطف کی رات۔ بچھڑ کر ملنے کی خوشی میں جاگنے کی اور پھر نہ بچھڑنے کی دعا کرنے کی رات۔ رفاقتوں پر ناز اور تجدید عہد وفا کی رات میں کسی کے دام اجل کے بارے میں سوچ بھی نہیں رہا تھا اور نہ اس کے لیے تیار تھا۔ میرا دل سکون، اطمینان اور مسرت سے بھرا تھا اور خطرہ میرے احساس کی سرحد سے پرے تھا۔

پھر یہ سب کچھ ہو گیا اور ختم بھی ہو گیا۔ اب میں اس کی طرح تھا جسے بھوک اور فاقہ کشی کے بعد خوان نعمت دکھا کے حقے کا پانی پلا دیا جائے۔ اس کی بھوک کیا ہوتی ہے۔ میں مرا تو نہیں تھا مگر میرے دل سے چشمہ کی طرح پھوٹنے والی خوشی مر گئی تھی اور جوش و خروش کا وہ جذبہ مر گیا جو شریر بچے کی طرح مضطرب تھا۔

اس حملے میں میرا کچھ بھی نہیں گیا تھا۔ سوائے اس کے کہ میں ایک غیر متوقع قاتلانہ حملے میں بچ گیا تھا اور وہ اندھے نگران ایک جعلساز پیر کی عقیدت میں میری جان لینے آئے تھے وہ تاریک راہوں میں مارے گئے تھے۔ اس حادثے نے مجھے ڈپریشن میں مبتلا کر دیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا میرے ساتھ رابعہ کی زندگی ایسے ہی بسر ہو گی؟ اس طرح ہم ہر وقت ہر جگہ ایک مسلسل خوف کے سائے میں اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے چوکس اور کمربستہ رہیں گے۔ کیا کوئی لمحہ نہ ہو گا جب ہم صرف ایک دوسرے کے بارے میں سوچیں۔ ہماری آنکھیں صرف ایک دوسرے کو دیکھیں۔ کان صرف ایک دوسرے کی آوازیں سنیں۔ باقی سب کچھ بے وجود ہو جائے۔ خدشات اور خطرات۔ یہ سوال ہی بے حقیقت ہو جائے کہ ہم شکار ہیں یا شکاری۔ کیا اس لمحے میں ہم زندگی کی سرحد پر کھڑے ہوں گے؟ کبھی ایسا ہو گا!

رات ایک بجے میں نے وقار یوسف کا نیا گھر تلاش کیا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ نگرانوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مجھے صرف ایک شخص نے دیکھا تھا جو خوش قسمتی سے معہ اہل و عیال آ گیا تھا۔ اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ قانون کے رکھوالے آ جاتے تو وقت ضائع ہوتا۔ اس وقت میں وقار یوسف کے دروازے کے بجائے کسی متعلقہ تھانے میں بیٹھا ہوتا۔

سب ہی بے چینی سے میرے منتظر تھے اور اندر پہنچ جانے کے بعد ہی تشویش کا جو دورہ پڑا تھا، اس کے اثرات زائل ہو گئے۔

بیک وقت ان سب نے بولنا شروع کیا "کب سے انتظار کر رہے ہیں ہم تمہارا" محسن بولا۔

"آخر اتنی دیر سے کہاں تھے تم؟" غالب نے مجھے ڈانٹا۔

"ہم سب کو تشویش لاحق ہو رہی تھی" نازو بولی اور گل نے سر ہلایا۔

صرف رابعہ نے زبان سے کچھ نہیں کہا مگر اس کی آنکھوں میں شکایات اور صورت پر احتجاجی جذبات صاف پڑھے جا سکتے تھے۔

میں نے کہا "مس رابعہ! آپ بھی کچھ عرض کریں تو میں سب کو ایک ہی انداز میں جواب دینے کے لیے کچھ فرماؤں۔"

رابعہ نے کہا "کیا غلط کہہ رہے ہیں سب لوگ؟"

"سب لوگ الٹے بیٹھے ہیں۔" میں نے کہا "یہ مذکر کا صیغہ ہے چونکہ خواتین خود اپنے لیے متبادل لفظ تلاش کر لیں۔ خوار کر دیا مجھے شرم تم کو مگر نہیں آتی۔ الٹا مجھی کو ڈانٹ رہے ہو۔ دو گھنٹے تلاش میں سرگرداں ہوں۔"

آپ سب نے مجھے ڈانٹا "آتے ہی شروع ہو گئی آوارہ گردی۔ اب ذرا غالب سے پوچھو کہ یہ سیدھے گھر کیوں نہیں آ گئے۔"

غالب نے بھی سہلایا "اس منہ زور گھوڑے کی لگام تمہارے ہاتھ میں ہے خدا کے لیے۔"

وقار کی بیوی میری واحد ہمدرد ثابت ہوئی "یہ کیا فضول باتیں کر رہے ہیں آپ۔ خواہ مخواہ پیچھے پڑ گئے ہو ایک آدمی کے۔"

"کون آدمی؟ یہ تو سکندر اعظم ہے۔" محسن بولا۔

"[illegible] ہے تو" غالب نے کہا۔

"سکندر بھائی! آپ بیٹھیں جوتے اتاریں" وقار یوسف نے کہا "ملازم کو بلاتا ہوں غسل وغیرہ کرنا ہے تو۔"

میں نے ایک کشن چیئر پر گر کے کہا "تم سب کو معلوم ہوتا کہ صرف قسمت نے میرا ساتھ دیا ورنہ ابھی آخری غسل ہوتا۔"

رابعہ اور گل نے ایک ساتھ کہا "کیسی باتیں شروع کر دیں آپ نے۔"

میں نے کہا "میں بکواس نہیں فرما رہا ہوں۔ تم تو ایک نئی کوٹھی سے دوسری نئی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ میں پہنچ جاتا اس دنیا سے دوسری دنیا میں۔"

اب غالب اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "خدانخواستہ یہ حرکت منظر کی تھی؟ کیا وہ قتل کرنا چاہتا تھا تمہیں؟"

غالب نے کہا "تم اس کی گاڑی لے کر بھاگے کیوں تھے؟"

اب نازو نے کہا "غالب! بس بھی کرو۔"

گل نے کہا "سکندر بھائی! آخر ہوا کیا؟"

میں جوتے اتار کے قالین پر دراز ہو گیا "کیا زبردست قصر عالی شان ہے بھئی۔"

وقار یوسف کی بیوی نے خوش ہو کے کہا "ڈیڈی نے اپنے رہنے کے لیے بنوائی ہے۔"

نئی کوٹھی کا وسیع ڈرائنگ روم اتنا ہی پرشوکت اور شاندار تھا جتنا ایک کاٹن کنگ یا آئل کنگ کی کوٹھی کا ہو سکتا تھا مگر اس کا مالک اس مملکت خداداد، جمہوریہ اسلامیہ پاکستان پر حکومت کرنے والی بیوروکریسی کا ایک کنگ تھا جو اس ملک کی سیاست پر، تجارت پر، ملک کے عوام کی قسمت پر، ان کے حال اور مستقبل پر حاوی اور مسلط تھے۔ جو بظاہر تمام فیصلے ملک و ملت کے مفاد میں کرنے کا ڈھول پیٹتے تھے یا پٹواتے تھے مگر درحقیقت وہ صرف اپنے مفادات کے لیے اس ملک کے وسائل کو ایک بے رحمانہ خود غرضی کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ اس ملک کے وسائل سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ انگریز کے دور حکومت کے پروردہ اور انہی کی استحصالی ذہنیت کے مالک لوگ تھے جن کے لیے آزادی پروانۂ حاکمیت ثابت ہوئی تھی۔ گورے صاحب کے جانشین کالے صاحب کے آ جانے سے عوام کو کچھ خوش آئند خواب اور کچھ دلکش نعرے ہی ملے تھے جن کے سہارے وہ آج تک علامہ اقبال کے فرمودے پر عقیدت مندی سے عمل پیرا تھے۔ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ۔ یہ فلسفۂ حیات بھی نئے حاکموں کا عطا کردہ تھا۔

میں نے قالین پر لیٹ کر چھت سے آویزاں فانوسوں کو دیکھا جو کرسٹل کے تھے اور چیکوسلواکیہ سے برآمد کیے گئے ہوں گے۔ ایران کا شاہی قالین، ڈیکوریشن پیس، صوفے، پردے سب امپورٹڈ تھے۔ باہر کے تعلیم یافتہ اور مغربی تہذیب کے نمائندہ علمبردار اعلیٰ افسران دیسی چیزوں کا استعمال اپنے اسٹیٹس کے خلاف اور باعث شرم سمجھتے تھے۔ ملک و قوم کے مفادات کے بدلے وہ سب کچھ حاصل کر رہے تھے۔ وقار کی بیوی کا خیال تھا کہ میں اس کے ڈیڈی کی نئی کوٹھی کو تعریفی نظروں سے دیکھ رہا ہوں چنانچہ وہ مجھے تفصیل سے بتانے پر آمادہ تھی کہ کون سی چیز کہاں کی ہے اور کتنی مالیت کی ہے۔ میرے خیالات اس کے برعکس تھے اگر وہ جان لیتی کہ میں اس کے "توپ" ڈیڈی کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوں تو یقیناً اس کی بڑی دل شکنی ہوتی۔

بالا تحر وقار نے اسے ڈانٹا "ارے بابا بس کرو۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے ڈیڈی بہت بڑے افسر ہیں وزارت خارجہ وداخلہ کے۔ اس محل کے آگے بکنگھم پیلس بیچ ہے۔ مگر یہ کون سا موقع ہے۔"

"سکندر نے پوچھا تھا تو میں بتا رہی تھی" وہ خفا ہو کے بولی۔

"پھر بتا دینا۔ زندگی پڑی ہے" وقار نے کہا "جا کے اپنے ملازموں سے کہو چائے کافی کا بندوبست کریں۔"

"ابھی ملازم کوئی نہیں ہے یہاں۔ میں لاتی ہوں" وہ واک آؤٹ کر گئی۔

میں نے کہا "تمہارے فادر ان لاء کے پاس پہلے رہنے کے لیے جگہ نہیں تھی۔ کتنے افسوس کا مقام ہے۔"

وقار یوسف میرے طنز کو سمجھ گیا "سرکاری کوٹھی میں رہتے تھے نا۔ ایک کوٹھی بنائی تھی وہ کسی سفارت خانے کو کرائے پر اٹھا رکھی ہے اور جتنا کرایہ وہ دیتے ہیں یہاں کون دے گا۔ یہاں وہ ریٹائرمنٹ کے بعد رہیں گے ورنہ اسے بھی کسی منسٹر کو سبلیٹ کر دے کر خود سدھار جائیں گے امریکا۔"

میں نے کہا "وہ کوٹھی بھی نئی تھی جہاں تم اب رہتے ہو۔"

"وہ خود میں نے بنوائی ہے۔ اپنی کمائی سے" وقار یوسف بولا۔

"آدھی رات کو وہاں سے فرار ہونے کا مقصد کیا تھا آخر؟ وہ کس کا فون تھا اور کس نے کیا تھا جس کے بعد تم سب نے انتقال فرمایا؟"

"پہلے تو کسی نے وقار کی ساس کو فون کیا کہ بیگم صاحبہ آپ کی نئی کوٹھی میں کچھ لوگ گھسے ہیں۔ مشتبہ قسم کے۔ کوٹھی ابھی بن کے مکمل ہوئی ہے اور پوری طرح فرنش نہیں ہوئی۔"

"یہ فرنشنگ پوری نہیں ہے؟ سبحان اللہ!" میں نے کہا۔

"اندر کی ڈیکوریشن اور بہت سا فضول کام باقی ہے۔ ابھی یہاں رہنے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ ایک چوکیدار ہے وہ گھوڑے بیچ کے سوتا ہے کیونکہ ابھی چوری کا اندیشہ نہیں۔ فرنیچر، فریج اے سی، ٹی وی کوئی نہیں چرا تا۔ بیگم صاحبہ نے اسے فون کیا تو گھنٹی بجتی رہی۔ پھر انھوں نے بیٹی کو حکم دیا کہ میں جا کے دیکھوں اور میری بیوی نے حکم پاس کر دیا میری طرف۔"

"یہ ٹھہرا زن مرید۔" محسن بولا "غالب کی طرح۔"

"قسمت والے ہوتے ہیں زن مرید" غالب نے کہا "تاریخ میں ان کا نام سنہرے حرفوں سے لکھا جاتا ہے۔ تاج محل بنانے والا شاہجہاں بھی زن مرید تھا۔"

"بادشاہ تو زن مرید ہو کے بھی بادشاہ ہی رہتا ہے۔ تم ہو حکم کے غلام یعنی جورو کے۔"

میں نے کہا "آخر تمہاری ساس صاحبہ نے تمہارے سسر صاحب کو کیوں نہیں بھیجا؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ وہ اتنے بڑے آدمی ہیں۔" محسن بولا "اتنے چھوٹے کام چھوٹے آدمی کرتے ہیں۔"

غالب نے تائید کی "اتنے قیمتی مجازی خدا کو خطرے [illegible] رسک کون لیتا ہے۔ اس عمر میں پھر کہاں ملے گا۔ [illegible] ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔"

وقار مسکرایا "دراصل وہ بیمار ہیں۔"

"اوہ نو۔ صاحب فراش ہیں۔ بیمار ہوتے ہیں [illegible] اس سے بڑے علیل ہوتے ہیں۔ سب سے بڑے صاحب [illegible]"

میں نے کہا "وہ کسی نوکر کو بھیج دیتے۔ یا کسی [illegible] فون کر دیتے۔"

"کیا ضرورت تھی انھیں پریشان ہونے کی جب [illegible] فرماں بردار داماد موجود ہے۔" وقار بولا۔

"بس اتنی سی بات پر تم سب جلوس لے کر چل پڑے؟"

"نہیں۔ میں نے تو تسلی دی تھی ساس صاحبہ کو [illegible] کریں، میں ابھی جا کے دیکھتا ہوں۔ میں نے تھانے فون [illegible] دیا تھا کہ ذرا چیک کر کے مجھے بتاؤ اور سسر محترم کا حوالہ [illegible] تھا کہ کوٹھی ان کی ہے۔ وہ تو سر کے بل جاتا اور ضرورت [illegible] جاتا۔ ٹرانسفر بہرحال ہو جاتا۔ لیکن بعد میں ایک فون [illegible] میرے گھر کیا کہ کیا سکندر پہنچ گیا۔ میں نے ریسیور محسن [illegible] دیا۔"

محسن نے کہا "پہلے تو میں سمجھا کہ ایسے ہی کسی نے [illegible] کی ہوگی مگر میں نے بات کی تو اس نے کہا کہ محسن بول [illegible] اب میں چونکا۔ میں نے کہا کہ تم کون ہو؟" اس نے کہا [illegible] ہمدرد" میں نے کہا "ہمدرد دوا خانے۔ تمہارا کوئی نام [illegible] ہے؟" اس نے کہا "میری بات کو مذاق مت سمجھو۔ تم [illegible] میں ہو" میں نے کہا "غلط۔ ہم گھر میں ہیں" وہ کہنے لگا "وقار [illegible] کے گھر میں ہو نا۔ غالب بھی وہیں ہے اور باقی سب کو تم [illegible] آئے ہو۔ محسن اور گل کو، نازو اور رابعہ کو۔" اس نے [illegible] نمبر بھی بتا دیا اور یہ بھی کہ سکندر تمہارے ساتھ نہیں آیا۔ [illegible] نے کہا "آخر تم ہو کون؟" اس نے پھر وہی کہا کہ "تمہارا [illegible]" میں نے کہا کہ ہمدرد صاحب، خطرہ کیا ہے اور کس سے ہے؟ [illegible] نے کہا "خطرہ تمہیں ہے، تم سب کو۔ تمہارے دشمن [illegible] جانتے ہو" میں نے کہا "او کے۔ پھر کیا کرنا چاہیے؟ [illegible] کریں یا دشمنوں پر کالا جادو؟" وہ کہنے لگا "میرا مشورہ ہے [illegible] رات کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔ کہیں بھی بچے جاؤ۔"

میں نے کہا "اس وقت تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ [illegible] کی ساس صاحبہ کو فون کرنے والا بھی یہی شخص تو نہیں تھا؟"

"خیال آیا تھا مگر اس نے کہا تھا کہ کہیں بھی چلے [illegible] بندہ ہو تا تو ہمیں نئی کوٹھی میں رات گزارنے کا مشورہ دیتا۔"

"یہ اندازہ ہو گا کہ تم وہیں جاؤ گے۔"

"ہم کہیں نہ جاتے۔ اور جاتے تو رابعہ کا گھر تھا۔ [illegible] بیگم کی ملکیت نہیں رہا۔ منظر نے اس کا قبضہ حاصل کر لیا۔"

[illegible] بہت تھے مگر یہ تو بڑی بے وقوفی کی بات ہوتی اگر [illegible] گھر چھوڑ کے نکل جاتے" محسن نے کہا [illegible] فون کال پر [illegible] نے فون بند کر دیا تو خواتین نروس ہو گئیں۔ وقار کی [illegible] شوہر تک سے ڈرتی ہے۔"

[illegible] اسی وقت نرالی کو وہ کھلبلی اندر آئی تھی "لال [illegible] سے ضرور ڈرتی ہوں میں مگر یہ کوئی ڈرنے والی چیز [illegible]"

[illegible] نے کہا "جھوٹ تم پر یار وقار یوسف۔ ایک لال بیگ [illegible] سے بھی مجھے کمزور ہو تم۔"

وقار یوسف نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ میں کوئی ڈرانے والی چیز نہیں [illegible] بہت پیاری چیز ہوں۔ پیار کرنے کے قابل۔" کیوں [illegible]

[illegible] بھی مسکرانے پر مجبور ہو گئی "خود آئینہ دیکھ لو۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔"

محسن نے کہا "جناب یہ دوسری چیزیں بھی کون سی بہادر ہیں۔ [illegible] رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ گل کی آنکھیں پھرا گئی تھیں۔ نازو پر [illegible] کے مارے پڑ رہے تھے۔"

"جھوٹ کم بولو" گل نے کہا۔

"ارے میری بات میں پچاس فیصد جھوٹ سمجھ لو۔ لیکن [illegible] کیا تمہیں پسینا نہیں آیا؟" محسن نے کہا۔

"ڈرنے کی تو بات تھی۔ جو ایک ایک کا نام لے کر بات کر رہا [illegible] اس کی بات کو مذاق سمجھ کے نہیں ٹالا جا سکتا تھا" رابعہ نے کہا۔

"یہ سب ہجرت کی تحریک چیئر کر رہی تھیں۔ لیکن ہم نے مسترد [illegible] کی تھی ہمدرد صاحب کی۔ نٹ لیں گے خطرے سے [illegible] خطرہ تو ہماری جیب میں رہتا ہے۔ یہاں رہیں تو کیا اور یہاں [illegible] بھاگ جائیں تو کیا۔ اتنی دیر میں تھانے سے فون آگیا کہ وہاں [illegible] پکڑے ہیں۔ چوکیدار کہتا ہے کہ اسے نہیں معلوم [illegible] وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے چوکیدار کو رات گزارنے کے [illegible] تھے۔ انھیں صبح کی ٹرین سے کراچی جانا تھا اور [illegible] میں جگہ نہیں ملی تھی۔ چوکیدار خود انھیں لایا تھا اور [illegible] رات دو چار مسافر ٹھہرا لیتا ہے وہاں۔ میں نے کہا کہ [illegible] رکھو اور اچھی طرح تفتیش کرو آج رات۔ صبح [illegible] ہو گئے مسافر ہوں تو انھیں جانے دینا مگر چوکیدار [illegible]"

[illegible] ہم سب کو تمہارا انتظار تھا اور ایک گمنام ٹیلی فون [illegible] سب کو تھوڑا بہت پریشان تو کیا تھا۔ پندرہ منٹ بعد دوسرا [illegible] ہمدرد صاحب کا۔ کہنے لگا کہ تم لوگ بیٹھے ہو ابھی [illegible] بات کو مذاق سمجھ رہے ہو نا" میں نے کہا "ہم سکندر کا [illegible]" اس نے کہا "کسی کو چھوڑ جاؤ گھر پر یا پیغام چھوڑ دو۔ سکندر آ جائے گا وہاں جہاں تم جاؤ گے۔ ابھی وقت ہے، بعد میں پھنس جاؤ گے" میں نے کہا "یار کیا سسپنس پھیلا رکھا ہے سیدھی طرح نام بتاؤ اپنا اور پوری بات کرو کہ خطرہ کیا ہے" اس نے کہا "تم نے گیکر شاہ کی خانقاہ کو تباہ کر کے اچھا نہیں کیا تھا۔ اس کے مرید بہت مشتعل ہیں اور آج رات کوئی کارروائی کریں گے انھیں تو نہیں معلوم کہ سکندر تمہارے ساتھ نہیں آیا۔ وہ بچ جائے گا اور تم لوگ مارے جاؤ گے" میں بھی اب پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں نے کہا "بعد میں سکندر یہاں آیا تو کیا ہوگا" اس نے کہا "کہ وہ جائے گا منظر کے گھر اور وہاں سے ادھر آیا تو میں اسے راستے میں ہی روک کے بتا دوں گا کہ وہ رات منظر کے گھر گزار دے۔"

"بس اس کے بعد تم بھاگ گئے؟" میں نے کہا۔

"نہیں یار۔ اتنے جلد باز اور بزدل نہیں ہیں ہم لوگ" محسن بولا "میں نے مشورہ کرنے کے بعد منظر کے گھر فون کیا اور وہاں سے مسٹر ہمدرد کے دعووں کی تصدیق ہو گئی۔ منظر نے بتایا کہ تم وہاں پہنچے تھے مگر زیادہ دیر رکے نہیں اور وقار یوسف کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ظاہر ہے منظر تمہیں کوئی پیغام نہیں دے سکتا تھا چنانچہ میں نے اپنے خادم کو اس کوٹھی کا نیا نقشہ بنا کے دیا اور سمجھا دیا کہ جب سکندر صاحب آئیں تو انھیں بتا دینا۔"

"تم لوگ تھوڑا سا انتظار نہیں کر سکتے تھے؟ منظر کے گھر سے روانہ ہو جانے کے بعد مجھے کتنی دیر لگی؟"

غالب بولا "مگر ہم پہلے آگئے اور تم بعد میں تو اس سے کیا فرق پڑا؟"

"فرق تو بہت پڑا" میں نے کہا "بعض اوقات ایک غلطی بھی تائید ایزدی کا اشارہ بن جاتی ہے۔ سب ساتھ ہوتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ اب تو جو ہوا میں نے اکیلا ہونے کے باعث بھگت لیا۔"

محسن کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا "کیا ہوا؟"

میں مسکرایا "وہی جو مسٹر ہمدرد نے کہا تھا۔ تین کفن پوش گیکر دیا سے میرا بستر گول کرنے آگئے تھے۔"

"گیکر! گیکر شاہ کے مرید؟" غالب نے کہا۔

"ہاں یار۔ گیکر کے درخت تو میرے دشمن ہیں نہیں۔ وہ مسلح تھے۔ کرپان کا اسلحہ خاصا قدیم تھا۔ پتھر کے زمانے کے بعد تاریخ میں لوہے کا زمانہ آیا تھا۔ اسی عہد کی کلہاڑی اور سریے لے کر وہ حملہ آور ہوئے تھے۔"

میں نے ان کو اختصار کے ساتھ گیکروں کے حملے کی روداد سنادی۔ سب خاموشی سے چائے پیتے ہوئے میری بات سنتے رہے۔ رابعہ، نازو اور گل ایک صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھی تھیں۔ ان کے مقابل وقار یوسف کی بیوی تھی اور باقی یعنی ہم سب حضرات قالین پر کشن سر کے نیچے دبائے صوفوں کا سہارا لیے پاؤں پھیلا کے بیٹھے تھے۔ وقار یوسف نے فین ہیٹر چلا دیا تھا جس سے ٹھنڈک کا

www.paksociety.com

احساس ایک راحت بخش حرارت میں ڈھل گیا تھا۔

"کیا مسٹر ہمدرد کو واقعی ہم سے ہمدردی تھی؟" محسن بولا۔

"میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔" غالب نے کہا۔ "ہمدرد … نام تو سامنے آتا۔ اسے ڈر کس کا تھا؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ مسٹر ہمدرد نے صحیح وقت پر مجھے تنہا کر دیا۔" میں نے کہا۔ "اس سازش کا مقصد ہی یہ تھا۔ وہ تعداد میں صرف تین تھے اور تھے بھی احمق! وہ چاہتے ہوں گے کہ اکیلے میں مجھے گھیر لیں۔ سب سے مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔"

"اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ کسی نے انہیں جانتے بوجھتے مروایا۔ یہ جو مسٹر ہمدرد تھے، ان کو یہ بات معلوم تھی تو کیا یہ معلوم نہیں تھا کہ ایک کلہاڑی اور وہ سریے اٹھائے تین سرپھرے مزید تمہارے راستے میں آ جائیں گے تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ غالب امکان اسی بات کا تھا کہ وہ مارے جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔" غالب نے کہا۔ "مقصد تمہیں قتل کرنا ہوتا تو ان کے ہاتھ میں ریوالور بھی دیے جا سکتے تھے۔"

اس دلیل نے مجھے قائل کر لیا۔ "بات دل کو لگتی ہے مگر اس کے لیے باقی سب کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا؟"

غالب نے کہا "ہر احمق ایک حد تک احمق ہوتا ہے۔ ان کو یقین دلایا گیا ہو گا کہ تمہارا مقابلہ ایک ایسے شخص سے ہو گا جو اکیلا ہی نہیں خالی ہاتھ بھی ہو گا۔ تمہارے پاس کلہاڑی ہو گی۔ سریا چلا دینا اس کا۔ سریے مار کے ہڈیاں توڑ دینا۔ اس کے علاوہ مسٹر ہمدرد یہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ کیگر بلا مقابلہ زندہ پکڑ لیے جائیں۔"

میں نے کہا "مقابلہ تو لازمی تھا۔ وہ سر سے کفن باندھ کے آئے تھے۔"

"اس کے باوجود ہم سب ہوتے تو انہیں گھیر لیتے اور شاید انہیں جام شہادت نوش نہ کرنے دیتے۔ وہ گرفتار ہو جاتے تو بہت کچھ بک دیتے۔ شوق شہادت اور چیز ہے۔ تفتیش کا حوصلہ ہر ایک نہیں رکھتا۔ تمہارے مقابلے پر انہوں نے دل کھول کے داد شجاعت دی اور جہنم رسید ہوئے۔" غالب بولا۔

"بزعم خود شہید ہوئے۔" محسن بولا "ان کے مرنے سے کسی کو کیا فائدہ ہوا؟"

"معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا "ابھی تک دو باتیں سامنے آئی ہیں۔ ایک تو مسٹر ہمدرد کو ایک ایک لمحے کی خبر تھی اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب سائے کی طرح کوئی ہمارے پیچھے لگا رہے اور ہماری نقل و حرکت کی مسلسل نگرانی کی جا رہی ہو۔ دوسری بات یہ کہ کسی شکاری نے ہمارے استقبال کے لیے یہ اہتمام پہلے سے کیا تھا۔ تین نیگروں کو میرے ہاتھوں مروانا ایک سازش بھی ہو سکتی ہے جس کے نتائج بالآخر سامنے آئیں گے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ مقصد مجھے مارنا نہیں تھا۔ مجھے تین افراد کے قتل میں ملوث کرنا تھا۔ ظاہر ہے اس وقت میں نے ادھر ادھر کچھ نہیں دیکھا لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کہیں چھپ کر مسٹر ہمدرد یا کوئی … جنگ کو فلم بند کر رہے ہوں گے۔"

محسن متفکر نظر آنے لگا "آتے ہی تم تہرے قتل … میں ملوث ہو گئے۔"

غالب نے کہا "یہ اپنے دفاع کی کوشش تھی۔ … انہوں نے کیا تھا۔"

"میرے جانو! یہ ہے قانونی نکتہ اور دفاع کس کا … عدالت میں۔ اس سے پہلے ضابطے کی کارروائی تو ہو گی … تعین بعد میں ہو گا۔ ابھی تو یہی نظر آئے گا کہ سکندر اعظم … باری تینوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ تین قتل کر دیے۔ قتل … یہ عدالت کا کام ہے کہ وہ مجموعی صورت حال میں فیصلہ دے۔ سکندر کو باعزت بری کر دے کیونکہ مجرم تو حملہ کرنے والے تھے۔ اس نے صرف خود کو بچایا۔ عدالت کا فیصلہ … میں نہیں ہو جائے گا۔ اس میں طریقہ کار وہی ہو گا، ضمانت، بیان اور پیشی۔ گواہی اور جرح۔ تب تک سکندر … گا۔"

"اور حالات ایسے ہیں کہ ہوتے ہیں اہل ہوس … منصف بھی۔ کوئی جج کسی بھی وجہ سے فیصلہ میرے خلاف … ہے۔ وہ مجھے رعایت دینے کا پابند نہیں ہے اور اگر کوئی … کرتا ہے تو میں اسے صرف اپیل میں غلط کہہ سکتا ہوں۔ … ہوتا ہے، اس کی اپنی سمجھ بوجھ ہے اور اس کے جذبات … تعصب سے بھی کام لے سکتا ہے اور اسے دشمن … سے مجبور بھی کیا جا سکتا ہے کہ مجھے سخت سزا دے۔ سزائے … ناممکن ہے مگر تین سال سے سات سال تک قید کی سزا … اسے کون روک سکتا ہے۔ اگر میری اپیل منظور ہو جاتی ہے … تب بھی اس کی ذات پر کوئی حرف نہیں آتا لیکن اپیل … ہونے میں لگ جائیں گے کئی سال۔ کیا سمجھے؟"

"سمجھا یہ کہ اگر تمہارے خلاف سابقہ مقدمات … ہیں تو تمہیں نئے معاملات میں الجھا دیا جائے۔" محسن بولا … "پشاور جاتے وقت تم پر چاندنی بیگم کے قتل کا الزام … ٹھیک ہے کہ بعد میں گولو پہلوان کی خودکشی سے بات … اس واردات کی بازگشت ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ … واقعہ پیش آ گیا۔ تم نے تین بندے مار دیے۔ وجہ … ہے۔ لوگ کہیں گے یار یہ سکندر بخت کے منہ کو خون لگ … واپس آتے ہی قتل و خونریزی شروع کر دی۔"

"اچھا صبح بات کریں گے۔" وقار یوسف جماہی لے …

"مجھے نیند میں پوری بات سمجھ میں ہی نہیں آ رہی ہے۔"

غالب نے بھی کہا "زنانہ خانے میں کیسی خاموشی ہے؟"

محسن ہنسا "ہم اپنی باتوں میں مگن تھے۔"

"کیا ان کے پاس باتوں کا اسٹاک ختم ہو گیا تھا؟" …

"تمہارے آنے سے پہلے ہی کافی زبان چلا چکی تھیں۔ تھکی ہوئی تھیں اس لیے بیٹھے بیٹھے سو گئیں۔"

"میرے سونے کا کیا انتظام ہے؟" محسن بولا۔

"جس کے جہاں سینگ سمائیں۔" غالب نے کہا۔

"تمہارے سینگ تو غائب ہو چکے ہیں۔ محاورہ مشہور ہے۔"

"صبح میں اپنی بیوی سے شکایت کروں گا کہ تمہارے مجازی خدا کو منہ پر گدھا کہا گیا ہے۔" غالب نے مظلوم لہجے میں کہا۔

"بیوی سے کہوں گا۔" محسن نے اس کا مذاق اڑایا "میرے سامنے تم اس کو بیوی کہو، وہ تو مانوں کہ واقعی مجازی خدا ہو۔"

"اور پھر کیا ہوں میں؟"

"ابھی تم خود کو مجازی گدھا کہہ سکتے ہو زیادہ سے زیادہ۔" محسن نے کہا۔

خواتین صوفوں پر آڑی ترچھی سوئی تھیں۔ ہم نے انہیں کھینچ کے قالین پر ڈالا اور ان کے سر کے نیچے کشن لگا دیے۔ پھر ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ کوٹھی میں تین وسیع بیڈ روم تھے۔ ابھی صرف کارپٹ لگایا گیا تھا، بیڈ نہیں تھے۔ وقار نے ائر کنڈیشنر کا ہیٹر آن کر دیا ورنہ سردی میں ہم رات بھر سکڑتے رہتے۔

وقار یوسف اور غالب تو لیٹتے ہی خراٹے لینے لگے لیکن میرا ذہن اس واردات میں الجھا رہا۔ ایک مدت سے میں رات بھر سکون کی نیند سونا بھول چکا تھا۔ زندگی کے صبح و شام کا توازن بگڑ گیا تھا اور معمولات بکھر چکے تھے۔ وہ دن خواب و خیال ہو گئے تھے جب سونے جاگنے اور کھانے پینے کے اوقات میں پابندی کا خیال رہتا تھا اور بے اعتدالی ہوتی تھی تو تفریح کے سبب۔ تفریح کی کوئی حد نہ تھی اور سب کچھ تفریح ہی تھا۔ جینا کوئی مجبوری نہیں تھی یا خوف اور اندیشوں کے سائے میں وقت کے گزرنے کا احساس نہیں تھا۔ جینا ایک ایڈونچر تھا یا ایک پرانبساط تجربہ تھا۔ زندگی کے محدود مقاصد میں خوشی کی جستجو، سنسنی خیز تصورات اور حسین خواب شامل تھے۔ محور و مرکز حیات عشق تھا۔ خوب صورتی سے عشق، صبح کی شفق سے شب ماہتاب تک وقت کے سارے منظر خوب صورت تھے۔ کائنات کے سارے رنگ، سارے گیت خوب صورت تھے۔ عنوان حیات اول و آخر عشق تھا۔ لندن کی سیمابی رنگت اور برفاب سے جسم رکھنے والی لڑکیوں سے عشق کچھ اور تھا۔ فتنہ فزا کا عشق کسی نو آموز مے کش کا نشہ تھا اور پھر رابعہ کا عشق تھا۔

دنیا جیسے اور تھی اور میں اسی میں اپنا وجود گم کر چکا تھا۔ آج سب خواب آرزو کی طرح بے حقیقت تھا۔ رابعہ میرے قریب ہو کے بھی نارسائی کی حد تک دور تھی۔ میں آنے والے دن پر یقین سے محروم تھا اور ایک مسلسل گریزپا انداز زندگی کو میں اپنا مقدر تسلیم کرنے پر مجبور تھا۔ کب تک… آخر کب تک یہ شکار اور شکاری کا تماشائے مرگ و دہشت جس کی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔ تمام عمر ایسے تو نہیں گزاری جا سکتی۔ مجھے کچھ کرنا ہو گا۔ اپنا یقین، اپنا اعتماد اور اپنی زندگی پر اپنا اختیار حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس کے بغیر رابعہ کو حاصل کرنے سے کیا حاصل؟

پھر کیا میں پسپائی اختیار کر لوں باعزت طور پر؟ نہ کوئی جیتا نہ ہارا۔ صلح ہو گئی۔ چودھری دلاور اینڈ کمپنی بمقابلہ ایم آر ایس۔ دلاور خود یہی چاہتا ہے۔ بس اس میں "باعزت" کچھ بھی نہیں ہے۔ ظاہر کچھ نہ ہو مگر ہار جیت ہر باعزت سمجھوتے کے پس منظر میں صاف نظر آتی ہے۔ ٹاس بھی کریں تو سکہ الٹا گرتا ہے یا سیدھا۔ ٹاس برابر نہیں ہوتا۔ مفاہمت سے بہتر تو یہ ہو گا کہ میں سب کے مفادات کا سودا کر لوں۔ چودھری دلاور کے سامنے اپنے مطالبات رکھ دوں جس میں سب کا فائدہ ہو۔ چودھری دلاور ہر مطالبہ منظور کر لے گا۔ اس کے لیے میدان خالی ہو جائے گا۔ ہم فکر جہاں سے چھوٹ جائیں گے۔

میں نے محسوس کیا کہ شاید میرا دماغ چل گیا ہے۔ اس حد تک منفی سوچ سے کبھی ظاہر ہوتا تھا۔ صرف میں ہی نہیں، غالب یا محسن میں سے بھی کوئی ایسا سوچے تو اس کے بارے میں باقی سب کی رائے کیا ہو گی؟ شکست کا خوف کوئی بات نہیں۔ شکست میں کوئی ذلت نہیں۔ آدمی بزدل اور کم ہمت بھی ہو جاتا ہے لیکن خود غرضانہ مفادات کی خاطر مفاہمت کی سوچنا تو بے غیرتی ہے۔ دلاور اینڈ کمپنی کے لیے میدان خالی چھوڑ دینا تو بددیانتی ہے۔ اپنے آپ سے بھی اور اپنے ساتھیوں سے بھی بے وفائی ہے۔ غدار کا ساتھ دینا بھی غداری ہے تو کیا اس کے جرم کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ سوچنا کہ "مجھے کیا" یہ غداری نہیں ہے؟

مجھے اپنے آپ سے شرم آئی اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے انسانوں کو دوسرے انسانوں کے دل کا حال جاننے اور ان کے خیالات پڑھنے کی صلاحیت نہیں دی ورنہ ابھی میں خود اپنے ساتھیوں کی نظر میں کتنا رسوا ہوتا۔ رابعہ کی نظر سے گر جاتا۔ محسن اور غالب کہتے لعنت تم پر سکندر۔ ہم شرمندہ ہیں تمہاری دوستی کے نام سے۔

میں کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ ضرور کوئی ذہنی بیماری ہے۔ نفسیاتی مریض وہ بھی تو ہوتے ہیں جو اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کی سوچتے ہیں۔ کوئی وجہ ہو یا نہ ہو۔ اعصابی دباؤ اور پریشانی میں کبھی آدمی خود کو مار ڈالتا ہے تو کبھی دوسرے کو۔ مگر وہ صحت مند جسم رکھنے والا بیمار آدمی معذور ہوتا ہے۔ شیطان اس کے ذہن کو مطیع کر لیتا ہے اور اسے تخریب کے منفی خیالات کا اسیر بنا رہتا ہے۔ کیا ایسا ہی میرے ساتھ ہو رہا ہے؟ غالباً مجھے کسی سائیکاٹرسٹ سے مشورہ کرنا چاہیے جو میرا دماغ درست کر دے۔ یا شاید مجھے سکون اور آرام کی ضرورت ہے جس سے میرا یقین اور اعتماد بحال ہو سکے۔

"کیا نیند نہیں آ رہی ہے؟" محسن نے سرگوشی میں کہا۔

www.paksociety.com

میں ڈر گیا "تو تم جاگ رہا ہے؟"

"ہاں سب لے رہا ہوں" محسن نے کہا۔

"تمہارے پاس؟"

"میں عادی ہو گیا ہوں ان کا" وہ بولا "پہلے گل نے علاج کے طور پر سکون آور دوائیں استعمال کرائی تھیں۔ ڈاکٹر کے مشورے سے۔ پھر میں خود کھانے لگا۔ گل سے چھپ کر۔ گل نے کئی بار پکڑا اور دوا ضبط کر لی مگر پھر خود ہی دی۔ میری حالت بگڑنے لگتی تھی۔"

میں نے کہا "مگر یہ خطرناک چیز ہے۔"

"میرے لیے نہیں رہی۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ حد سے نہ بڑھوں مگر میرا جسم اتنا عادی ہو گیا ہے کہ پوری شیشی کھا کے بھی مروں گا نہیں۔ مجھے معلوم ہے" محسن نے کہا۔

میں نے شیشی اس سے چھین لی "کتنی گولیاں ہیں اس میں؟"

"چار۔ ریلیم فائیو کی چار گولیوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس سے زیادہ گل چھوڑتی ہی نہیں" وہ بولا "چاروں کھا لے۔"

"میرا دماغ خراب ہو رہا ہے محسن۔"

"سب کا ہو رہا ہے" محسن بولا "عورتیں فائدے میں ہیں۔ اپنا علاج اسٹریا سے کر لیتی ہیں۔ تم پر اس واقعے کا زیادہ اثر ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اچھا ہوتا اگر ہم صبح بات کرتے۔ نیند زیادہ ضروری تھی۔"

محسن اٹھ کے باتھ روم تک گیا اور میرے لیے ایک گلاس میں پانی لایا۔ "ڈاکٹروں کی فیس میں مجھے بہت ٹینشن تھی۔ گل میرے مقابلے میں ابنی تھی۔ زیادہ پُراعتماد تھی۔ لوگ اس کے جاننے پہچاننے تھے اور ماحول بھی اتنا نیا نہیں تھا۔"

میں نے محسن کے اصرار پر ڈرتے ڈرتے چاروں گولیاں نگل لیں "ایسا نہ ہو میں بے ہوش ہو جاؤں۔"

"نہیں یار۔ تجھے ذرا سی ڈوز کی ضرورت ہے" اس نے مجھ سے گلاس لے لیا "صبح میں نوزیہ کے پاس جا رہا ہوں۔"

"نوزیہ کے پاس؟ کیوں؟"

"کیوں! یار وہ بہن ہے میری" محسن بولا "اس کا گھر بھی تو میرا گھر ہے۔ میرا خیال ہے مجھے وہیں سکون ملے گا۔ اس کا شوہر سیالکوٹ میں پروفیسر ہے۔"

"گل بھی جائے گی؟"

"ہاں۔ اور اس سے شادی کر رہا ہوں میں" محسن بولا۔

"اچانک؟"

"مجبوری ہے میری۔ میں اس کے ساتھ ایسے نہیں رہ سکتا۔ تمہاری بات اور ہے" محسن نے اعتراف کے انداز میں کہا "میں نے شملا سے شادی نہ کی ہوتی تو میں بھی انتظار کر لیتا۔ تو سمجھ رہا ہے نا؟"

"سمجھ رہا ہوں شیروانی صاحب۔"

"دیکھ یار! آدمی کو اپنے آپ سے ڈرنا چاہیے۔ کیا خبر کمزوری کے کسی لمحے میں مجھ سے وہ گناہ سرزد ہو جائے جس پر بعد میں ہمیشہ گل کے سامنے شرمندہ رہوں۔ کیا اور کچھ ضروری نہ ہو۔"

میں نے کہا "تو گل کو کیوں نہیں بھیج رہا نوزیہ کے پاس؟"

"گل نہیں جائے گی۔"

"پھر تم بھاڑ میں جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"نوزیہ سب کرے گی۔ کسی تقریب یا ہنگامے کی کیا ضرورت بھی کیا ہے؟ بے شک گل نے اسمان نہیں بنایا پہلی لڑکی کی طرح کہ سب کچھ ہو۔"

وہ نہ جانے کب تک بولتا رہا ہوگا۔ اس کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی۔ آدھے ادھورے الفاظ بے معنی ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ بے ہوشی کی نیند نے مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔

میں سو کے اٹھا تو دوپہر ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں جانے کتنے دنوں کی ذہنی و جسمانی درماندگی تھی کہ مجھے گرد و پیش کی خبر نہ رہی اور بے خبری اور بے فکری کی نیند کے بعد اس پُرسکون ماحول کا بھی احساس تھا جس میں میرے اعصاب پر کوئی دباؤ نہ تھا اور احساس کو تمام اندیشوں سے فراغت میسر تھی۔

میرے اٹھنے تک وقار یوسف اپنی بیوی کے ساتھ جا چکا تھا۔ اسے اپنے گھر سے کورٹ جانا تھا۔ وہ جانے وقت کہہ گئے تھے کہ وہ اس گھر سے کہیں نہ جائیں۔ محسن نے اپنے ارادے سے ان کو بھی باخبر کر دیا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی میرے کانوں میں گل اور محسن کی آواز آئی۔

گل کہہ رہی تھی "تم نے مشورہ بھی نہیں کیا مجھ سے۔"

"یہ فیصلہ ایک الہامی کیفیت کا نتیجہ تھا۔" محسن نے کہا "غیب سے مجھے اشارہ ملا۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تم نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔"

محسن بولا "سوچ تو سب نے رکھا ہے لیکن باقی سب گفتار کے غازی ہیں۔ میں کردار کا غازی ہوں۔ میرے قول اور فعل میں فرق ہے نہ تضاد۔"

"پھر بھی مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"اب زیادہ بنو نہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا۔" محسن نے اسے ڈانٹنا شروع کیا "ایک تو تم لڑکیوں میں بڑی بُری عادت ہے اداکاری کرنے کی۔ سب جانتی ہیں مگر انجان بن کے ادائیں دکھاتی ہیں۔"

"کیا مطلب ہے۔ کیا معلوم تھا مجھے؟"

"یہی کہ میں صرف تم سے شادی کر سکتا ہوں! پھر اللہ سے اس کا تیر پہلے تھا مگر خیر۔"

"میں نوزیہ کے پاس جانے کے فیصلے کی بات کر رہی تھی۔"

"اچھا۔ میں سمجھا تمہیں شکایت ہے کہ تمہیں بتانے کے بعد

نوزیہ منکوحہ کے عہدے پر فائز کرنے کا اعلان کر دیا ہے اس پر تب وہاں تو مجھے جانا ہی تھا ورنہ وہ کہتی کہ مجھے تو بتایا ہے اس لڑکی کو لانے سے پہلے۔ میں تمہارے لیے چاندی بھابی لانی جو تمہارے لائق ہوتی۔"

"کیا۔ میں گھوڑی ہوں۔ تمہارے لائق نہیں ہوں؟" گل چمک کے بولی۔

"جانو! پہچاننے کی کون سی بات ہے۔ میں تو ایک محاورے کی ترجمانی کر رہا تھا" محسن نے کہا "وہ اسی قسم کے جذبات رکھتی ہیں بھابی کے بارے میں۔ جب خود زمانے کی خاک چھان کے لائی تھیں۔ چندے کا آفتاب اور چندے کا ماہتاب قسم کی سب ہی ابا جی کہتی ہیں بعد میں۔"

گل نے کہا "چندے کا نہیں 'چندے آفتاب'۔"

"محاورے بدل گئے ہیں اب۔ تمہیں کیا معلوم۔ پہلے لوگ کہتے تھے 'کیا بنا چاند' 'مسجد میں لاکٹ بنا'۔ اب مسجد بھی چندے سے بنتی ہے۔"

گل ہنسی "قرض کرد میری تند نے مجھے قبول کر لیا۔"

"اس کی مجال ہے" محسن بولا "میری چھوٹی بہن ہے۔ ایک چھوٹا پیار کے منوالیں گا کہ یہ مثالی بھابی ہے۔ ایک راز کی بات بتاؤں۔ تمہارے کان میں؟"

"کیا۔ بدتمیز! چلو پیچھے ہٹو۔"

"سب کو بتا دوں گی نا" محسن بولا "خیر بتا دینا۔ سب کو پہلے ہی معلوم ہے۔ یہ اپنا چیف کے نوٹس میں ہے۔ اس کی شادی پہلے نوزیہ سے ہونے والی تھی۔ سالا میرا سالا ہوتا۔"

میں نے چلا کے کہا "اُلٹی کھوپڑی کے تو سالا ہوتا میرا۔"

محسن دروازے میں نمودار ہوا "تم نے اس شخص کی اخلاقی قدرت دیکھی گل۔ یہ کمرے کے پڑا تھا اور ہماری پرائیویٹ باتیں سن رہا تھا۔"

میں نے کہا "میں دیکھ بھی رہا تھا۔ جب ایک بات کہی تھی تم نے گل کے کان میں۔ تمہارے کان کیوں سرخ ہو رہے ہیں گل؟" گل دروازے کے پیچھے نظر آ رہی تھی۔ وہ فوراً غائب ہو گئی۔

میں نے کہا "یہ دوسرے کمرے میں کیا کھٹ پٹ ہو رہی ہے؟"

محسن نے کہا "مزار شریف بن رہا ہے آپ کا۔ جب نوری اتنی جرنگ ہو تا ہے تو گمان یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کو پیارا ہوا۔"

رابعہ نے اندر آ کے کہا "محسن! بری بات ہی کیوں نکلتی ہے تمہارے منہ سے؟"

"مجھی تو تمہیں صرف سکندر کی باتیں لگتی ہیں۔ کچھ دن بعد تو سب ہی بُرے لگنے لگیں گے" محسن نے احتجاج کیا "بیوی کو دشمنی ہوتی ہے شوہر کے دوستوں سے۔"

رابعہ مسکرانے لگی "پھر تو گل کو بھی دشمنی ہوگی سکندر سے۔"

"سکندر سے تو میری بھی دشمنی ہے" محسن بولا "صوفیہ لورین پر پہلے میں عاشق ہوا تھا۔ نام یہ جیت گیا تھا۔"

میں نے کہا "مرزا مطلوب اور مسز غالب کہاں ہیں؟ ان کے لڑنے کی آواز نہیں آ رہی ہے؟"

رابعہ ہنسی "وہ تو کب کے لڑ کے فارغ ہو گئے۔ اب رو بیٹھے پھر رہے ہیں ادھر سے اُدھر۔ تم اب ناشتا کرو گے یا لنچ؟"

"میں برنچ کروں گا۔"

رابعہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ایک شخص اندر آ گیا۔ وہ چھ فٹ قد کا عمر رسیدہ مگر صحت مند اور وجیہہ شخص تھا۔ اس نے بہترین سوٹ پہن رکھا تھا اور موٹے سیاہ فریم کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایگزیکٹو لیدر کا بریف کیس تھا۔

اس کے یوں اندر آنے سے ہم سب ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے۔ بات صرف اس کے اعتماد کی نہیں تھی، اس کی شخصیت بھی اتنی باوقار اور بارعب تھی کہ کوئی اس کو ناک کیے بغیر اندر آنے پر کچھ کہنے کی ہمت بھی نہ کرتا۔

اس نے ایک نظر مجھ پر، رابعہ کو اور محسن کو دیکھا "میں ذوالجود نقوی ہوں۔ توقع ہے کہ مجھے مزید تعارف کی ضرورت نہیں۔"

اندازہ تو ہم سب کر چکے تھے کہ وہ صاحب خانہ اور وقار کا شہرہ آفاق "توپ" سسر ہے۔

محسن نے فوراً اسے ایک کرسی پیش کی۔ "تشریف رکھیے نقوی صاحب!"

"تم سکندر بخت ہو؟" اس نے بریف کیس نیچے رکھ کے کہا۔

"میں سکندر بخت ہوں" میں نے اب بستر میں بیٹھے رہنا خلافِ اخلاق جانا "یہ میرے دوست محسن خان شیروانی ہیں حالانکہ شیروانی ان کے خاندان میں کسی نے نہیں پہنی۔"

وہ میرے مذاق سے محظوظ نہیں ہوا "اور یہ لڑکی...؟"

"یہ رابعہ ہے۔ رابعہ قاری۔"

"آنجہانی جج ہائی کورٹ" اس نے بڑے طنزیہ لہجے میں رابعہ کو گھور کے کہا "میں بہت مایوس ہوا۔"

میں نے خوش دلی سے کہا "ہم کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ آپ سے غائبانہ تعارف تھا، آج مل کے خوشی ہوئی۔"

نقوی صاحب نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا "بہت بولتے ہو تم۔ بلاوجہ بولنے والے کو میں احمق سمجھتا ہوں۔"

میں نے ہنس کے کہا "ذرہ نوازی ہے آپ کی۔"

وہ مزید خفا ہوا "لک ہیئر ینگ مین۔ میں بڑا اصول پسند قسم کا اور وضع دار آدمی ہوں۔ اپنے سے چھوٹوں کو بے تکلفی کی اجازت بالکل نہیں دیتا۔ تم وقار کے برابر ہو اس لیے مجھ سے بات کرتے ہوئے محتاط رہو۔ بور کرنے کی کوشش مت کرو۔ آئی ہوپ کہ تم سمجھ گئے۔"

www.paksociety.com

اس کے بعد تو جیسے سب کی شامت آگئی۔ توپ کا رخ پہلے میری طرف تھا۔ "تم نے یہ کیا" وہ کہا "مجھے سب معلوم ہے رضوی کو بہت پریشان کیا تھا تم نے۔" ان کی مراد مرحوم ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب سے تھی۔ "کھرا اور درست تھا میرا۔ مجھے بتاتا رہتا تھا کہ تم راہبر سکندر اعظم اور رستم زماں بنے پھرتے ہو۔ میں نے تو کہا تھا کہ تم کیسے پولیس افسر ہو۔ سب کو بند کرو جیل میں۔ وہاں سر منڈوا دو ان کے۔ بیرا آدمی رکھیں "قرآن حفظ کریں اور پانچ سال بعد انہیں محکمہ اوقاف کی کسی مسجد میں امام بنادو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا..... لیکن وہ شریف آدمی تھا۔ اس نے ڈھیل دی تمہیں اور قانون کے چکر میں پڑا رہا۔ میں قانون وانون کی پروا نہیں کرتا۔"

دوسرا نمبر رابعہ کا تھا "تم ایڈووکیٹ ہو۔ ٹیم ان ہو۔ تم نے ایک آؤٹ لا کی حیثیت سے شہرت پائی۔ سوچو ذرا تم کیا کرتی رہیں؟ کس کا ساتھ دیا تم نے۔ تم کو قانون کا ساتھ دینا تھا۔ تم نے اپنی گندی رازداری اور ریاح لے نکل کھڑی ہوئیں سکندر اعظم کے ساتھ۔ سیکھ لیا ہے نا؟"

وہ واقعی توپ قسم کی چیز تھا۔ توپ سے دنادن گولا باری ہو رہی تھی اور کسی میں ہمت نہ تھی کہ مقابلے پر ٹھہر سکے۔ رابعہ نے بھی میری طرح سمجھ لیا تھا کہ اپنا دفاع بھی فضول ہے۔ توپ خانہ اس وقت خاموش ہوگا جب اسلحہ نہیں بچے گا۔ رابعہ کے بعد غالب کی شامت آگئی۔ "تم شاعر ہو؟ صورت تو انتہائی غیر شاعرانہ ہے۔"

غالب نے ہمت کر کے کہا "اس لیے کہ میں شاعر نہیں صحافی ہوں۔"

"صحافی: مائی فٹ" انہوں نے پٹڑی بدل لی "کس قسم کے صحافی۔ بلیک میلنگ سے اور ہر جرم سے شرفا کی پگڑیاں اچھالنے والے۔ فلم اسٹارز کے اسکینڈل بنانے والے۔ رائی کا پہاڑ بنانے والے... اور تم کہاں چھپی کھڑی ہو لڑکی۔ ذرا سامنے آؤ میرے۔"

بانو مسکین صورت بنائے سامنے آگئی۔

"سبحان اللہ! کیا قد و قامت ہے۔ وزن کرنا ہو تو شمار کی ترازو چاہیے۔ گھر میں تلی ہوئی ہو ایٹم بم۔ دنیا میں تباہی پھیلا رکھی ہے۔ بلکہ بلٹ پروف تو بغیر لائسنس کے ریوالور کی طرح ہوتی ہے۔ تمہارے خاندان میں کسی نے رکھا ہے بغیر لائسنس کے ریوالور۔ تم کشتوں کے پشتے لگاتی پھر رہی ہو۔ مردوں سے پانی بھرتی ہو۔ کیا خیال ہے بدھو پولیس والوں کو تمہیں اکیلے کشمیر کو فتح کرنے کے لیے بھیج دیا جائے۔"

سب کا اتنی بے عزتی کے باوجود ہنسی ضبط کرنا محال ہو رہا تھا مگر ہنسنے کا مطلب ہوتا ناقابل معافی زحمتائی اور گستاخی۔ ایک تو کل کو محسن نے سامنے نہیں آنے دیا۔ دوسرے شاید وہ کل کے پس منظر سے ناواقف تھے۔ سب سے کم قصوروار بھی محسن ثابت ہوا۔ نتیجہ یہ کہ درد و دل اس طوفان بلاخیز کی غضبناک سونامیوں سے بچ گئے۔

ان کی آتش فشانی کے دوران ہی مجھے ان کے مزاج اور حاکمانہ رویے کا اندازہ ہو گیا تھا اور یہ بھی کہ وہ ہم سب سے اور ہمارے کارناموں سے واقف تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ہمیں اپنے غضب کا نشانہ بنایا تھا۔ جیل ارسال کرنے کے احکامات جاری نہیں کیے تھے لیکن شکیب قریشی "کبھی نہیں کہا تھا تو اس کا مطلب صاف ہے کہ مرحوم انکل رضوی کی طرح وہ بھی ہمیں "برداشت" کر رہے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ جہاں رضوی صاحب نرم خو اور بردبار تھے نقوی صاحب گرجنے والی توپ تھے۔ رضوی صاحب کے مزاج میں تحمل تھا اور نقوی صاحب مجسم جلال تھے۔ انکل رضوی محبت تھے تو نقوی صاحب آتش کدہ۔

قدر مشترک صرف ایک تھی کہ ہم ان کی نظر میں گستاخ اور بگڑے ہوئے بچے تھے اور اپنے بچوں کو نہیں ہونا۔ ان کی پرورش میں مذہب کا انداز سب جدا رکھتے مگر مقصد سب کا نیک ہوتا ہے۔ اچھے اچھے طور پر سب چاہتے ہیں کہ بچے "سدھر" جائیں اور جیسے سب شریفوں کی اولاد اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سکھ چین کی بنسی بجاتی ہے۔ دودھوں نہائی اور پوتوں پھلتی ہے۔ ایسے ہی ہم بھی اولاد دیکھیں نوافل ادا کریں اور ماں باپ کا نام روشن ہو۔

افسوس ناک بات یہ تھی کہ ہم کسی کی توقعات پر پورے نہیں اترے تھے اور ہم نے روایات سے انحراف کرتے ہوئے بیسویں صدی کے "انجمنی یگ میں "ANGRY YOUNG MAN" کی طرح بزرگوں کی اقدار کو بھی پامال کردیا تھا۔ بزرگوں کی بے بسی یہ تھی کہ وہ ہمارے کردار میں اعمال میں اخلاقی سقم تلاش کرنے سے قاصر تھے اور حقائق کی بنیاد پر یہ کہہ سکتے تھے کہ جو کچھ ہم نے کیا وہ غلط تھا۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا کہ جو ہمارے حریف کر رہے تھے وہ صحیح تھا۔ بالفاظ دیگر معاشرے کی اخلاقی، مذہبی اور سیاسی قدریں تو اس نسل کے لیے باعث شرمساری تھیں جو خود کو کاروان آزادی کا ہراول، پاکستان کا امین رکھوالا اور ایک نئے وطن کا معمار کہتے تھے۔ سقوط مشرقی پاکستان نے ان کے سارے دعووں کی قلعی کھول دی تھی۔ فصل انہوں نے بوئی تھی جو ہم کاٹ رہے تھے۔ اس کے بعد تو یہ سوال کرنا گستاخی تھا کہ "بزرگو آپ نے کیا بویا تھا جو ببول کے تو سب کہاں سے آگئے؟"

ہم سب کی سعادت مندانہ خاموشی ان کو پسند آئی۔ انہوں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بانو کو مخاطب کیا "کیا نام ہے تمہارا؟ بانو۔ چائے لاؤ ہمارے لیے۔"

بانو نے سر جھکا کے کہا "جی۔"

"جی کیا۔ چائے بنانی آتی بھی ہے۔ پڑی میں پڑی زال رہے ہے چائے نہیں بنی۔ یاد رکھنا ذرا کڑک اور تیز ہو۔"

بانو نے پھر کہا "جی" اور باہر نکل گئی۔

بانو کے پیچھے ہی میں نے محسن کو اشارہ کر کے باہر روانہ کیا۔ اس نے میز پکڑ کے اٹھتے ہوئے کہا "میں ابھی حاضر ہوا۔"

انہوں نے فقط سر ہلایا اور مجھ سے کہا "کل کیا ہوا تھا رات کو؟"

میں نے اپنی سرگزشت انتہائی جانبداری کے ساتھ سنائی۔ اس طرح کہ خود کو صرف مظلوم ثابت کر سکوں اور یہ ظاہر ہو کہ میں خاموشی سے پٹتا رہا۔ وہ مجھے مارتے رہے اور پھر اتفاق سے فوت ہوگئے کیونکہ ان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔

"صبح تمہیں کس نے فون کیا تھا؟"

"وہی میں ہے۔" میں نے نہایت معصومانہ بات کی۔

"پھر بہک گئے۔ وہ کیا جہنم سے فون کریں گے!" نقوی صاحب نے کہا "اور کوئی تھا کہنے لگا کہ نقوی صاحب آپ عزت مآب آدمی ہیں۔ ذرا خیال رکھیے آپ کی بیٹی کی کوٹھی میں کون لوگ رہ رہے ہیں۔"

"پھر آپ نے کیا کہا؟"

میں نے کہا "میں تو تمہیں فون کیا تھا کہ میری کوٹھی میں مشکوک افراد گھس گئے ہیں۔ کوئی بھی نہیں بولا۔ آخر کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟ وہاں اس وقت میری بچی موجود ہے۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک کہا تھا آپ نے۔"

"غلط کہا تھا میں نے۔" انہوں نے مجھے ڈانٹا "رکار کے ساتھ تم سب بھی تھے اور اس نے ٹھیک کہا تھا کہ ان میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو تین قتل کر کے وہاں پہنچا ہے۔"

میں نے کہا "تین نہیں۔ قتل... وہ دیکھیے جناب....."

"میں کیا تھا کہ بجھو۔ تم سمجھو کہ ابھی تک تم کو عقل نہیں آئی ہے۔ اپنے لیے پھر سے نئی مشکلات پیدا کر لیتے ہو۔"

میں نے کہا "کیا میں نے انہیں مدعو کیا تھا کہ میں حاضر ہوں۔ فلاں وقت مجھے قتل کرنے کی کوشش فرمائیے۔ اس میں بھی میرا قصور نظر آتا ہے آپ کو؟ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔"

انہوں نے خلاف توقع برا نہیں مانا "وجہ کچھ بھی ہو۔ آخر یہ سب تمہارے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے؟ صرف اس لیے کہ تم نے عجلت سے جان چھڑانے کے بجائے انہیں پیچھے لگا رکھا ہے۔ پاگل کتا کاٹنے کے پیچھے پڑ جائے تو اسے پتھر مار کے بھگانا ٹھیک مگر اس کے ساتھ کرکٹ کھیلنا تو غلط۔ وہ تو پھر جائے گا تمہارے دروازے پر اور جب نکلو تمہیں کاٹ لے۔"

میں نے کہا "معاف کیجیے ابا کتنا پاگل فرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ تو انتہائی چالاک ہے۔"

"تم بھی میاں سکندر اعظم: ختم کرو یہ سب چکر۔ جان چھڑاؤ اپنی ان فضول جھگڑوں سے۔" انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ "کون لوگ ہیں اور کتنے لوگ ہیں آخر جن کے ساتھ تمہاری دشمنی کا سلسلہ چل رہا ہے؟ اور کب تک چلے گا؟ میں جاننا چاہتا ہوں کہ میری مدد سے یہ مسائل کیسے سمیٹے جا سکتے ہیں؟ ہر مسئلے کا ایک حل ہوتا ہے۔"

"میں آپ سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ سوری۔"

وہ چونک گئے "واٹ نان سنس۔"

میں نے کہا "انسان کی شیطان سے ازلی و ابدی دشمنی ہے۔ اس مسئلے کا آپ کیا حل نکالیں گے؟ شیطان کو اندر کرا دیں گے؟"

وہ چڑ کر بولے "فضول بات مت کرو۔ میں انسانوں کی دنیا کے مسائل کی بات کر رہا تھا جو انسان ہی پیدا کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "اور کہ مسئلہ کشمیر کیوں حل نہیں ہوتا؟"

"تم بھول رہے ہو۔ میں بتا چکا ہوں کہ فضول بات نہ میں کرتا ہوں اور نہ برداشت کر سکتا ہوں۔ میں نے صبح رکار سے بات کی تھی اور اس نے کچھ بھی نہیں بتایا۔ اس نے کہا کہ آپ براہ راست سکندر سے بات کر لیں۔ جس شخص نے مجھے فون کیا تھا اس نے مجھے دھمکی دی کہ وہ ثبوت اور شہادت فراہم کر سکتا ہے کہ ایک شخص سکندر بخت پہلے آپ کی بیٹی کے گھر گیا۔ اس کے پاس ایک وکیل عبدالجبار مظہر کی گاڑی تھی اور وہ شاید نشے میں تھا۔ اس کے قابو سے باہر ہو کے گاڑی سڑک سے نیچے اتر گئی۔ تین افراد نے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی تو اس نے تینوں کو مار مار کے ادھ موا کر دیا اور پھر گاڑی لے کر فرار ہو گیا۔ جاتے وقت اس نے تینوں کے کپڑے بھی اتار لیے تھے تاکہ شناخت باقی نہ رہے۔"

"یہ جھوٹ ہے بکواس ہے" میں نے کہا۔

"شٹ اپ: پہلے میری بات سنو" نقوی صاحب نے برہمی سے کہا "تمہارے انکار کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ کچھ اس شخص نے کہا تھا میں وہی بتا رہا ہوں۔ وہ تینوں نیم مردہ سڑک کے کنارے پڑے رہے تھے اور اتنے زخمی تھے کہ انہیں فوراً اسپتال لے جایا جاتا تو بچایا جا سکتا تھا مگر رات بھر سردی میں اکڑ کے وہ مر گئے۔ ان کی لاشیں پولیس کے قبضے میں ہیں۔"

میں نے کہا "پلیز نقوی صاحب! بہت سن لی میں نے آپ کی۔ جس نے بھی آپ کو فون کیا تھا اس کا نام تھا مسٹر بھولا رانا!"

"ہاں۔ یہی کہا تھا اس نے۔"

"اس مسٹر بھولا نے آپ کو جو بھی بتایا سب غلط ہے۔ میں بتاتا ہوں آپ کو صحیح بات۔"

بانو ایک ٹرے میں چائے اور کھانے پینے کی چیزیں رکھ کے

www.paksociety.com

لائی۔

"میں صرف چائے پیوں گا۔" نقوی صاحب نے کپ لے لیا۔

"میں نے ابھی ناشتا نہیں کیا تھا" میں نے ٹرے اپنے سامنے رکھ لی "میں یہ سب کھاؤں گا۔"

انہوں نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا "یہ سب؟ ینگ مین تم کو اپنی صحت سے دشمنی ہے؟ اتنا کولیسٹرول؟"

"وہ کیکر تھے۔ کیکر شاہ کے مرید" میں نے مریدوں کی طرح لوازمات کو صاف کرتے ہوئے کہا "آپ کو معلوم ہے؟"

"معلوم ہے معلوم ہے" انہوں نے بے زاری سے کہا "تم نہیں جانتے" وہ کتنا بڑا کیس بن گیا ہے۔ اخبارات میں اس کو کتنا اچھالا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پاکستان میں روحانیت کا اس سے بڑا مرکز کہیں نہیں تھا جسے صیہونی سازش کے تحت تباہ کرا دیا گیا۔"

"پھر تو حقیقت بھی آپ کے علم میں ہوگی کہ کیکر شاہ کے مزار پر کیا ہوتا تھا؟"

"ایک کیکر شاہ کیا' اس جیسے پتا نہیں کتنے فراڈ ہیں۔ معصوم اور جاہل لوگوں کو لوٹنے والے پیروں کے اڈے ہیں مگر ہم کسی ثبوت کے بغیر کوئی کارروائی نہیں کرتے اور پھر یہ مسئلہ ہوتا ہے جذبات کا۔ حکومت کو کیا ضرورت ہے کہ اہم مسائل کو چھوڑ کر ان ڈبا پیروں کے چکر میں پڑے۔ لاکھوں پاگل قسم کے FANATICS شورش برپا کریں گے جہنم میں جائیں سب۔"

میں نے کہا "مجھ پر حملہ کرنے والے کیکر تھے ان کا خیال ہے کہ کیکر شاہ کے مزار کو تباہ کرنے والا میں ہوں۔ کیا اخبارات میں یہ بھی شائع ہوا ہے؟"

"آف کورس۔ انہوں نے تو ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ آئی جی سے اور حکومت سے مطالبہ کرنے کے لیے اس علاقے میں احتجاج کا پورا ڈراما چل رہا تھا کہ تمہیں گرفتار کر کے عبرت ناک سزا دی جائے۔"

"صرف مجھے؟ اکبر خان کا کسی نے نام نہیں لیا؟"

"کون اکبر خان؟ وہ اسمگلر!"

"جی۔ سب کچھ اسی نے تو کیا تھا۔ میرے کندھے پر رکھ کے بندوق چلائی تھی اس نے۔ خلیفہ کیکر اور وہ بزنس پارٹنر تھے۔ کسی بات پر اختلاف ہوا ہوگا۔ اکبر خان نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ کیکر شاہ کی درگاہ کو تباہ کرا دیا۔ میرا خیال ہے اس کا اصل مقصد کچھ اور تھا۔ وہ اپنا اڈا ختم کرنا چاہتا ہوگا۔ خلیفہ کیکر کے ساتھ کسی قسم کے غیر قانونی دھندے میں ملوث ہونے کے تمام ثبوت مٹانا چاہتا ہوگا۔ بعد میں خلیفہ کیکر نے بھی مجھے قربانی کا بکرا بنایا ہے۔ اکبر خان کا نام لینے کی ہمت نہیں پڑی۔"

"وہ رپورٹ میں نے دیکھی ہے۔ ایک خفیہ ایجنسی نے ساری انفارمیشن دے دی تھی" نقوی صاحب نے کہا "خلیفہ کے خلاف ٹھوس ثبوت مل گئے ہیں اور اسے بہت جلد گرفتار کر لیا جائے گا...... لیکن اکبر خان کے خلاف کچھ نہیں ہے۔"

"یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا" میں نے تلخی سے کہا "اکبر خان کی طاقت آپ کی خفیہ ایجنسی کے اختیارات سے زیادہ ہوگی۔ وہ معزز آدمی ہے اور ملک کا قانون اس پر کیسے ہاتھ ڈال سکتا ہے۔"

"ایسے تو بہت لوگ ہیں" نقوی صاحب نے بے بسی سے کہا "لیکن میں نے سوچا تھا کہ تم کو ٹارگٹ نہیں بننے دوں گا۔ کچھ دوستوں نے مجھے بتایا تھا کہ تم کو بہت سے معاملات میں بلاوجہ ملوث کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ بلاوجہ کوئی تمہیں کیوں ملوث نہیں کرتا۔ اس شہر میں لاکھوں لوگ رہتے ہیں۔ ان کو INVOLVE کیوں نہیں کیا جاتا؟ ظاہر ہے تم بھی ایک وجہ ہو۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔"

"پھر وقار نے کچھ بتایا آپ کو۔ آپ نے یقین کیا؟"

"میرے یقین کی بات نہیں۔ میں بلیک میل ہو گیا۔"

"آپ جیسے لوگ بھی بلیک میل ہو جاتے ہیں!" میں نے طنزاً کہا۔

"ہاں۔ تم تو خیر ابھی بچے ہو۔ ان باتوں کو سمجھنا شاید تمہارے لیے بہت آسان ہے۔ بیوی بھی مجھ سے کوئی ناجائز بات نہیں منوا سکی۔ میں نے اپنے کام میں اسے کبھی دخل نہیں دینے دیا اور اس کے کام میں مداخلت نہیں کی۔ بیٹا ہوتا تو میں اسے عاق کر دیتا' گھر سے نکال دیتا اگر وہ مجھے بلیک میل کرتا مگر معاملہ نواسی کا تھا۔ جب تم باپ بنو گے اور تمہاری ایک ہی بیٹی ہوگی۔ تو شاید تم سمجھ سکو گے۔"

"میں یقین دلا سکتا ہوں آپ کو جناب کہ بیٹی نے آپ کو بلیک میل نہیں کیا ہوگا۔ اس نے آپ کو مجبور کیا ہوگا۔ آپ حقیقت تسلیم کر لیں۔ اس نے سچ بولا ہوگا۔ آپ کے لیے وہ سچ شاید جھوٹ ہوگا۔"

"چھوڑو یہ بات۔ میں چاہتا تھا کہ تمہارے مسائل ختم کرا دوں۔ جو بھی تمہارا دشمن ہے اسے تمہارے سامنے بٹھا کر سمجھاؤں کہ معاملات تمہاری مرضی کے مطابق طے کر لے ورنہ پھر میں اس سے نمٹ لوں گا اپنے طور پر۔ حکومت کی طاقت سے کوئی ٹکر نہیں لے سکتا" نقوی صاحب نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "I CAN FINISH HIM LIKE THAT (میں اسے یوں ختم کر سکتا ہوں)۔"

"نقوی صاحب! بعض اوقات ساحل سے طوفان کی شدت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔"

"تمہارا مطلب ہے مجھے خوش فہمی ہے۔" نقوی صاحب بگڑے "یہ بات نہیں سکندر! مانا کچھ کام مشکل ہوتے ہیں مگر

مشکل میں ڈال دیتے ہیں..... اور یہاں مسئلہ ایسا ہی ہے کہ تم نے نقوی صاحب کو بھی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اب وہی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں ان ککروں کو ایک ایک کا نام چن چن کر ختم کرا سکتا تھا۔ چوہدری اللہ داد اگر پھر کوئی اور ہے تو میں اسے جھکا سکتا تھا، گرا سکتا تھا لیکن اب میں کیا کروں' وہ ادھر بھی ہے کہ پاپا آپ نے کچھ نہ کیا تو میں کچھ کر بیٹھوں گی۔ ایک بے وقوف لڑکی۔ کچھ سننے کو تیار نہیں۔ بتاؤ اس سب کی ذمہ داری میں بابا کیا کرے!"

انہوں نے میرے سامنے ایک لفافہ ڈال دیا۔ میں نے اس میں سے آٹھ تصویریں نکالیں۔ یہ تصویریں انفرا ریڈ کیمرے سے اتاری گئی تھیں یعنی اس کیمرے سے جو اندھیرے میں دیکھ سکتا ہے۔ تصویریں اتارنے والا فنکار تھا۔ ایک تصویر میں میری گاڑی سڑک چھوڑ کے ٹیلی فون کے پول کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس میں وہ رسہ نظر نہیں آتا تھا جو سڑک پر میری گاڑی روکنے کے لیے باندھا گیا تھا۔ دوسری تصویر میں مجھے بڑے جارحانہ انداز میں گاڑی سے نکلتے دکھایا گیا تھا۔ تین تصویروں میں مجھے دیوانوں کی طرح سر پہ ڈنڈے وار کرتا دکھایا تھا مگر میں جس پر حملہ کر رہا تھا اس کی صرف پشت نظر آتی تھی اور یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ شخص سر سے کفن باندھے ہوئے ہے۔ ایک تصویر میں کوئی شخص لاش کے کپڑے اتار رہا تھا۔ وہ میں نہیں تھا مگر یہ ثابت کرنا بھی اتنا ہی مشکل تھا کہ میں نہیں ہوں۔ آخری تصویر میں تین لاشیں سڑک پر پڑی تھیں۔ رسہ غائب تھا اور میری کار بھی منظر سے غائب ہو رہی تھی۔

"ویری گڈ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ شوٹنگ بہت ہوشیاری سے کی گئی اور فوٹو گرافر یقیناً اپنے فن کا ماہر تھا" میں نے کہا "ان سے ذرا بھی ثابت ہوتا ہے کہ میں نے واقعی ان تینوں کو مارا اور پھر کپڑے اتار کے سڑک پر ڈال دیا۔"

"اور کیا ثابت نہیں ہوتا" نقوی صاحب نے ایک سگار کوٹ کی اندر والی جیب سے نکالا جس کو میں پین سمجھ رہا تھا۔

"یہ فوٹو گرافر ایک انفرا ریڈ کیمرے کے ساتھ جائے واردات پر کیسے موجود تھا؟" میں نے کہا اور تصویریں غالب کو دے دیں۔

نقوی صاحب نے پین جیسے کوَر کو توڑ کے اندر سے سگار نکالا "وہ ان کے ساتھ تھا۔"

"اور میں نے اسے بخش دیا تاکہ وہ پورے واقعے کی منظر کشی کر سکے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"غرض کہ وہ فرار ہو کے چھپنے میں کامیاب ہو گیا تھا؟" نقوی صاحب نے سگار کو سلگانا شروع کیا۔

"وہ یقیناً کوئی مشہور فوٹو گرافر ہوگا۔ ہر فوٹو گرافر کے پاس اندھیرے میں تصویریں اتارنے والا کیمرہ نہیں ہوتا۔" میں نے کہا "یقیناً پتا چلایا جا سکتا ہے کہ باقی تین کون تھے جو میرے ہاتھوں مارے گئے؟"

"بتا دے گا اگر ضرورت پڑی۔"

"کیوں نہیں بتائے گا۔ ظاہر ہے وہ اس کے دوست شناسا ہوں گے ورنہ وہ ان کے ساتھ کیوں تھا۔ آدھی رات کے وقت اسے کسی آوازِ غیب نے تو نہیں کہا تھا کہ فلاں مقام پر ایک مار دھاڑ سے بھرپور واقعہ پیش آنے والا ہے۔ تم آدھی رات کے وقت وہاں پہنچ جاؤ تو بڑی نایاب تصاویر اتار سکتے ہو۔ ان تصاویر کی مدد سے خاصی دولت بھی کما سکتے ہو۔"

"سکندر! وہ کون تھا' وہاں کیا کر رہا تھا اور کیسے پہنچا تھا' یہ سب معلوم ہونے یا معلوم نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔" نقوی صاحب نے سگار کو جلانے کا عمل شروع کیا "فرق پڑتا ہے تمہیں۔ تمہارے خلاف یہ ثبوت کافی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے فون کرنے والے نے ایک اور بات بتائی تھی۔ اس سارے واقعے کا ایک چشم دید گواہ بھی ہے۔"

"وہ کون ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ اپنی فیملی کے ساتھ گزر رہا تھا وہاں سے۔ ایک ایس ڈی او ہے۔ اس نے فیملی ساتھ ہونے کی وجہ سے اس وقت کچھ نہیں کیا تھا۔ خاموشی سے چلا گیا تھا۔ مجھے فون کرنے والے نے کہا کہ نقوی صاحب' فلاں ایس ڈی او سے بھی بات کر لیں۔"

"پھر آپ نے فون کیا؟"

"ہاں۔ اور اس نے تصدیق کی۔ لفظ بہ لفظ وہی بتایا جس کی تصویروں سے گواہی ملتی ہے۔ اس نے گاڑی کا نمبر بھی بتایا اور تمہارا حلیہ بھی۔ میں نے اسے بلا لیا اور اسے یہ تصویریں دکھائیں۔ اس نے تمہیں شناخت بھی کر لیا تھا۔"

"ابھی تک آپ نے یہ نہیں بتایا کہ فون تو کسی نے صبح کیا تھا' تصویریں آپ کو کس نے فراہم کی تھیں اور کب؟"

"اس نے کہا تھا کہ تصویریں لیٹر بکس سے نکال لیں۔ یہ شاید نو بج کر دس منٹ کی بات ہے۔ سوا نو بجے میں نے لفافہ خود نکالا۔ ایس ڈی او بہت پریشان تھا کہ وہ تصویریں میرے پاس کیسے آگئیں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ بلیک میلنگ کا مسئلہ ہے۔ تم خاموش ہی رہو تو بہتر ہے۔"

"اور آپ کو یقین ہے کہ وہ آپ کی بات مانے گا۔ ان کی بات نہیں مانے گا جنہوں نے یہ جال پھیلایا تھا اور اسے بطور خاص چشم دید گواہ بنا کے بھیجا تھا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ ایک شادی سے لوٹ رہا تھا۔"

"گویا چشم دید گواہ کی سہولت کے مطابق سب ہو گیا۔"

"یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔ کیا کسی کو اندازہ ہو سکتا تھا کہ تم وہاں کتنے بجے پہنچو گے؟ اور شادی سے اس کی واپسی کتنے بجے ہوگی کہ چند منٹ کا بھی فرق نہ ہو تاکہ وہ سب دیکھ سکے۔"

www.paksociety.com

"پھر فون کرنے والے نے اسے کیسے دریافت کرلیا؟ آدھی رات کے وقت وہ وہاں سے گزرا جب اسے کوئی بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میرے سوا یا اس فوٹوگرافر کے ... جس نے بقول آپ کے جان بچائی اور بعد میں قتل آف ایکشن تصاویر بنالیں۔ کیا اس نے گواہ کی کوئی تصویر نہیں بنائی تھی؟ ایس ڈی او تو آج نہیں کتنے محکموں میں ہوتے ہیں۔ پی ڈبلیو ڈی میں، ٹیلی فون کے محکمے میں۔ اس کے علاوہ ... نہیں کہاں کہاں... انہوں نے صبح تک کیسے پتا چلالیا کہ وہ کس ... کا ایس ڈی او تھا؟ اس سے تصدیق بھی کرلی کہ وہ عینی گواہ ہے اور یہ یقین دہانی بھی حاصل کرلی کہ وقت ضرورت سب بتادے گا۔ اس کا فون نمبر راتوں رات انہوں نے کیسے حاصل کرلیا جو اُن کے کہنے کے مطابق اتفاقیہ وہاں سے گزر رہا تھا اور ایک شادی سے لوٹ رہا تھا؟ اتنی جلدی آپ معلوم کرسکتے ہیں کہ کل رات بارہ بج کر دس منٹ پر جب فلاں جگہ ایک واردات ہوئی تھی تو وہاں سے کار میں کون گزرا تھا؟"

نقوی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ "یہ تو ہے سوچنے کی بات۔"

"صیاد بعض اوقات خود اپنے جال میں گرفتار ہوجاتا ہے۔" میں نے کہا "آپ اسی ایس ڈی او کو پھر بلائیں۔ اس کا بیان ریکارڈ کریں۔ اس طرح کہ اسے معلوم نہ ہو۔ یہ بندوبست میں کروں گا۔ جب وہ ساری بات بتا چکے تو اس سے کہیں کہ اب سچ سچ بتادو ... کتنے پیسے طے ہوئے ہیں یہ بیان دینے کے اور کس نے دیے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کسی ایس ڈی او جیسے معمولی سرکاری افسر سے سچ تو اگلوا ہی سکتے ہیں۔"

"ٹھیک۔ یہ میں کرسکتا ہوں۔ اور کروں گا۔ میں تمہاری ذہانت کی داد نہ دوں تو یقیناً زیادتی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے سر۔ اس کے علاوہ... مجھے یقین ہے کہ مسٹر ہمدرد آپ کو پھر فون کریں گے۔ اپنے فون کو آبزرویشن پر رکھوائیں تاکہ یہ پتا چلے کہ کسی نے کہاں سے فون کیا تھا۔ زیادہ امید تو یہی ہے کہ گمنام کال کسی پبلک کال آفس سے کی گئی ہوگی۔ پھر بھی آپ یہ چانس لیں۔ اس کا پیغام ریکارڈ کریں۔ میں آواز سن کے شناخت کرکے بتاسکوں۔ مسٹر ہمدرد بڑی ہوشیاری سے قدم بڑھا رہے ہیں۔ مرحلہ وار۔ پہلے انہوں نے مجھے ٹریپ کیا۔ میں ان کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔ میری یہ تصاویر اتارلی گئیں۔ آپ کی بیٹی کے گھر فون کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ انہیں وہاں سے رخصت کردیا جائے۔ سب کو۔ اور جب ان کے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر یہ واردات ہو تو میری مدد کے لیے کوئی نہ آسکے۔ آپ کے داماد کا نیا گھر اتنی آباد جگہ نہیں ہے ابھی۔ پھر یہ کہ میرا وہاں جانا تو طے تھا۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے "اوکے۔ آج شام کسی وقت میں پھر بلاتا ہوں اسی ایس ڈی او کو۔ بالکل سچ۔"

"کہاں بلائیں گے آپ... یہاں؟"

"یہاں بلایا جاسکتا ہے اسے لیکن میرا آفس محفوظ نہیں ہے۔ اگر وہ عینی گواہ کسی کا خاص آدمی تھا تو معاملہ [illegible]... فی الحال تم اپنی سرگرمیاں محدود کردو۔ اس گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں۔"

"آپ میری نظربندی کے احکامات جاری کررہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔ تم بہت خطرے میں ہو۔ پہلے مجھے اتنی مہلت دو کہ میں اپنے طور پر تھوڑی سی تفتیش کرالوں۔ خلیفہ کیکر کا معاملہ اخبارات کی حد تک دب گیا ہے۔ ایک انکوائری کمیشن بٹھادیا گیا ہے، خصوصی تحقیقاتی ٹیم تشکیل دی گئی ہے اور یہ سب حربے ہوتے ہیں کسی معاملے کو سرد خانے میں ڈالنے کے۔ ہم خلیفہ کی نگرانی کررہے ہیں اور اسے ایک پیغام دیا گیا ہے کہ وہ "تعاون" کرے بصورت دیگر ہماری تفتیش کے نتیجے میں معلوم ہوگا کہ وہاں زیر زمین اسلحہ خانہ تھا جس میں شارٹ سرکٹ ہونے سے آگ لگ گئی اور خلیفہ کیا بتائے گا کہ کیکر شاہ کے مزار کے زیر زمین یہ اسلحہ کس مقصد کے لیے جمع کیا گیا تھا۔ وہ بھی ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہا ہے مگر اس کی رسائی ضلعے کی سطح پر اعلیٰ افسران تک ہے چند صوبائی افسران بھی ہیں۔ اسے ہم گھیر لیں گے۔ یا تو وہ تعاون کرے گا کہ یہ حادثہ تھا اور بدخواہوں نے اس سے غلط بیان منسوب کردیا۔ وہ اپنے کیکروں کو صبر سے کام لینے کی ہدایت دے گا اور انکوائری ہوگی۔ اس نے پھر وہیں ڈیرا جمالیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ تعاون کرے گا۔ آج میں معلوم کراتا ہوں کہ مرنے والے کیکر تھے یا نہیں؟"

"وہ کیکر تھے سر۔ اور انہیں بھی بے وقوف بنا کے مرنے کے لیے بھیجا گیا ہوگا۔ خلیفہ کے کچھ خصوصی معاون ہیں۔ وہ ان کی شناخت میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔"

نقوی صاحب نے سر ہلایا "ایک وعدہ معاف گواہ بنالیا ہے [illegible] نے اور اس نے خاصے انکشافات کیے ہیں۔"

"میں بہت تقویت محسوس کررہا ہوں۔ آپ بار بار [illegible] ہیں۔ میں کسی تعلق کی بنا پر آپ سے کوئی خصوصی رعایت نہیں مانگتا مگر پلیز آپ سچ کو ضرور تسلیم کریں۔ میں آپ سے جھوٹ بول سکتا ہوں اور نہ باقی لوگ۔ ہم بھی تو اصول پرستی کے چکر میں ہی خوار پھر رہے ہیں۔"

"میری بات سنو تم۔ جب تک میں نہ کہوں یہاں سے مت نکلو۔ کل تک میں بہرحال رابطہ قائم کروں گا۔" انہوں نے دوسری بار سگار جلایا "ایک بات اور ہے۔ ان لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔ اگر تمہاری ان سے دست بدست جنگ ہوئی تو میڈیکل رپورٹ میں بہت کچھ ہوگا جو تمہارے خلاف استعمال ہوسکے۔ ان کے ناخنوں میں تمہارے بال یا کھال کے ریشے [illegible] فنگر پرنٹس اور بہت سے لیبارٹری ٹیسٹ ہیں [illegible] تمہارے اور ان

[illegible] کے درمیان تصادم کو ثابت کرنے کے لیے۔ اب میں چلتا ہوں۔ ذرا شرافت سے رہو تم لوگ۔ اوکے... اور لڑکی... چائے بناسکتی ہو تو ابھی بنا لینی تھی۔"

نازو نے مسکراہٹ کو دبا کے کہا "ٹھیک ہے انکل۔"

"ڈونٹ مائنڈ۔ میں ذرا اپ سیٹ تھا۔ کچھ زیادہ ہی کہہ دیا تم سب سے۔" انہوں نے پہلی بار مسکرانے کی کوشش کی۔

"آپ اس سے بھی زیادہ کہہ سکتے ہیں انکل۔" غالب نے کہا "آپ جانتے ہیں اور ہم بچے۔"

میں نے کہا "اور آپ فخر کرسکتے ہیں اپنی بیٹی پر۔ وہ بلیک میل نہیں کررہی ہے آپ کو۔ وہ جانتی ہے اس لیے۔"

میری بات سنے بغیر انہوں نے سر ہلایا اور باہر نکل گئے۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ ایک عالی شان لمبی سیاہ گاڑی پورچ میں فراٹے مار رہی تھی اور ایک سفید وردی والا شوفر اس کے قریب بالکل اٹین شن کھڑا ہوا تھا۔

غالب نے ایک گہری سانس لی "اُف... رسیدہ بود بلائے..."

میں نے کہا "ولے بخیر گزشت۔ کیا چیز ہے وقار یوسف کا سسر بھی۔ پتا نہیں ان کی آپس میں کیسے بنتی ہوگی۔"

"دل کا برا نہیں۔ ذرا گورا شاہی مزاج ہے اور حاکمیت کا غرور ہے۔ وقار یوسف تو بیوی کو ڈھال بنا کے رکھتا ہے اسے کس بات کا ڈر" غالب نے کہا۔

نازو بولی "میں تو واقعی رعب میں آگئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ بات کی تو چانٹا ماردیں گے۔"

"تی تی کے سوا آواز نہیں نکل رہی تھی حلق سے" غالب بولا۔

دروازے کی اوٹ سے محسن نے جھانکا "تو آپ خانہ گیا؟"

میں نے ہنس کے کہا "تم تو صاف بچ گئے۔"

"شریف آدمی ہوں۔ ریکارڈ بالکل صاف ہے میرا" محسن بولا "بڑا لطف آیا۔ کیا یادگار شامت آئی تم سب کی۔"

گل اندر آکے بیٹھنے لگی "میں تو باہر تھی ورنہ میری باری بھی آتی۔"

"میں بھی اسی لیے بھاگ گیا کہ ان کا کیا بھروسہ سامنے رہتا تو منگنی توڑ دیتے۔" محسن ہنسا "میں نے تو بڑی مشکل سے ہنسی کو ضبط کیا۔ ذرا سوچو کیا مشورہ دیا تھا موصوف نے انکل رضوی کو۔"

غالب نے قہقہہ مارا "محکمۂ اوقاف کی مسجد میں امام۔"

نازو بھی ہنسنے لگی "کیا جھاڑ لگائی رابعہ باجی کو۔ [illegible] یار۔"

محسن بولا "اور اس کے بارے میں تو خیر بالکل ٹھیک رائے دی۔ ساری صحافت دھری کی دھری رہ گئی۔"

غالب نے جھینپ کے کہا "مجھے تو مزہ آیا۔ جب نازو کو [illegible] ڈالا انکل نے ... مردوں سے ہاتھا پائی کرتی ہو۔ کشمیر فتح کرنے بھیج دیں۔"

نازو نے کہا "اس کے سامنے بولتے نا۔ اس وقت تو گھگی بندھ گئی تھی... آخر سکندر نے بات تو کی۔"

میں نے کہا "چلو اچھا ہوا کوئی تو بولا۔ میں بھی خاموش رہتا تو سارا معاملہ چوپٹ ہوجاتا۔ میں نے قائل کرلیا ہے اسے کہ ہم سازش کا شکار ہوئے ہیں اور بہت بڑا سہارا حاصل ہوگیا ہے ہمیں۔"

"کیا یہ شخص واقعی دلاور کو یوں ختم کرسکتا ہے؟" محسن نے چٹکی بجائی۔

"کیا پتا۔ اس نے دلاور کا نام ہی سنا ہے۔ ابھی اسے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی سے براہ راست واسطہ نہیں پڑا۔" میں نے کہا "وہ کیکر شاہ نہیں ختم کرادے ایسی ہمت ہے۔"

محسن بولا "برادران اسلام! میں تو آج جارہا ہوں جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔"

"مجھے امید ہے کہ جب ہم واپس آئیں گے تو آپ سب لوگ زندہ سلامت اور ایسے ہی لاوارث پھر رہے ہوں گے۔" محسن بولا۔

غالب نے کہا "اس کو دوستی کہتے ہیں! شرم آنی چاہیے تم کو۔ ہم ہیں دربدر اور تم کو خانہ آبادی کی سوجھ رہی ہے۔"

"سب نصیب کے کھیل ہیں اور اعمال کی بات ہے" گل کے بھڑکتے ہی محسن نے دانت نکال کے کہا "تمہیں کوئی گھاس نہ ڈالے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔"

"میں گدھا نہیں ہوں کہ مجھے گھاس ڈالے کوئی۔ نہ میں گھاس کھاتا ہوں۔"

"تم مار کھاتے ہو۔ اس سے بہتر تھا تم گدھے ہوتے اور گھاس کھاتے" محسن بولا "تمہارے نصیب میں ذلت ہے دوست۔"

رابعہ نے کہا "سچ محسن! تم ایسے خاموشی سے ہماری شرکت کے بغیر شادی کرلوگے؟"

محسن بولا "میری طرف سے دعوت عام ہے۔ آجاؤ اپنا اپنا کھانا لے کر اور میرے باراتی کہلانے کا اعزاز مفت میں حاصل کرو۔"

"مجھے تو نظربند کردیا گیا ہے ورنہ میں چلتا" میں نے کہا "اور ابھی معاملات ایسے ہیں کہ میں رسک نہیں لے سکتا۔"

غالب نے کہا "مجھے بھی اخبار کا معاملہ سیٹ کرنا تھا۔ شام کو اکبر خان سے میٹنگ ہے۔ اگلے چند دن بے حد مصروفیت کے ہوں گے۔ ویری گڈ لک۔"

رابعہ نے بھی کہا "خدا کرے فوزیہ ٹھیک ہوجائے۔"

میں نے چونک کے کہا "فوزیہ کو کیا ہوا ہے؟"

www.paksociety.com

رابعہ نے حیرانی سے مجھے دیکھا "تمہیں نہیں بتایا محسن نے؟"
محسن نے شرمندگی سے کہا "وہ در اصل مجھے بھی منظر نے بتایا تھا کہ اس کے شوہر کا پیغام ملا تھا۔ مہینہ بھر پہلے۔"
"اس کا شوہر غالباً انجینئر ہے۔"
"ہاں۔ اس نے کہا تھا کہ فوزیہ مجھے دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار میں اس سے ملوں" محسن بولا "یا تو اس کے شوہر نے بات چھپائی اور یہ کہا کہ ایسی کوئی خاص بیماری نہیں یا واقعی فوزیہ نے ایک جذباتی بات کی۔ جیسی کہ عورتیں عام طور پر کرتی ہیں۔"
رابعہ بولی "پھر تم نے معلوم کر لیا ہوتا۔"
"کہاں سے معلوم کرتا اور کیسے؟" محسن نے کہا "پیغام مجھے واپس لاہور پہنچنے کے بعد ملا تھا۔"
"یعنی کل؟" میں نے کہا۔
اس نے اقرار میں سر ہلایا "میں نے سوچا کہ فون کرنے سے بہتر ہے میں خود چلا جاؤں۔ گل نے کہا کہ میں بھی چلوں گی۔"
"اس کے بعد تم نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔"
"یار، میں بڑی عجیب سی کیفیت کا شکار ہوں۔" محسن بولا "یہ خبر ملنے کے بعد میرے دل کو سکون حاصل نہیں رہا۔ پتہ نہیں کیوں اسے [illegible] مجھے ایک ڈر ہے، تشویش لاحق ہے کہ بات اس سے کہیں زیادہ سیریس ہوگی جتنی فوزیہ کے شوہر نے بتائی۔ بیماری میں اس نے پہلے تو کبھی فون نہیں کیا۔ بیماری اگر معمولی ہوتی تو منظر کو فون کر کے میرا پتا پوچھنے اور میرا پیغام دینے کی ضرورت نہ ہوتی... اور پھر میں فوزیہ کو جانتا ہوں وہ ایسی عورت نہیں جو ذرا سی بات پر گھبرا جائے۔ فوزیہ کے شوہر نے بیماری کی نوعیت چھپا کے زیادہ شکوک پیدا کر دیے ہیں۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ یرقان ہے، جنائڈس ہے یا ٹی بی ہے۔ یہ سب واقعی امراض ہیں اور ان میں پیچیدگی مسائل پیدا کر سکتی ہے لیکن یہ قابل علاج ہیں۔ میں رات بھر سوچتا رہا۔ کہیں اسے گردے کی تکلیف تو نہیں یا ہارٹ پرابلم تو نہیں۔ لیور [illegible] تو نہیں۔ یہ بھی خطرناک بیماریاں ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے کینسر کا بھی خیال آیا۔ میری ماں کا اسی بیماری میں انتقال ہوا تھا۔ کینسر موروثی نہیں ہوتا۔ سب سے بہتر ہے کہ میں جا کے دیکھ لوں۔"
"تم کو اتنی دیر بھی نہیں کرنی چاہیے تھی" رابعہ نے کہا۔
میں نے اس کی تائید کی "تم صبح ہی نکل جاتے تو اب تک پہنچ گئے ہوتے۔ خیر اب جاؤ۔"
"جاتا ہوں۔ مجھے کون سی تیاری کرنی ہے" محسن نے کہا۔
میں نے کہا "رابعہ، جہاں میں سویا تھا وہیں تکیے کے پاس ایک بیگ رکھا ہے اس میں پیسے ہیں۔"
"مجھے پیسے نہیں چاہئیں" محسن بولا۔
میں نے کہا "خرچ نہ ہوں تو واپس لے آنا مگر خالی ہاتھ مت جاؤ۔ کیا پتا کہاں ضرورت پڑ جائے۔ کیا بہن کے شوہر سے مانگو گے؟"
غالب نے کہا "آخر شادی کا خرچ بھی تو ہوگا۔"
محسن بولا "یار، تم لوگ یہ مت کہنا کہ مجھے [illegible] تھی۔ ابھی یہ کوئی قطعی فیصلہ بھی نہیں ہے [illegible] ایک خیال آتا ہے کہ خدانخواستہ ایسی ویسی صورت حال [illegible] فوزیہ سے اس کی زندگی میں صرف خون کا [illegible] نہیں۔ [illegible] جب میری شادی شہلا سے ہوئی تو اسے اعلان ہونے تک [illegible] نہیں آئی تھی۔ شہلا کے جیتا ہوا پھر خدا نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ فوزیہ کو کچھ بھی نہیں معلوم۔ [illegible] بیٹے اسے میں نے بھلائے رکھا۔ بس اس کی خوشی کے لیے [illegible] کیا۔ شاید اس طرح وہ خوش ہو جائے۔"
اس نے آنکھوں سے بہہ نکلنے والے آنسو آستین سے صاف کر لیے۔ اچانک وہ بے حد دکھی اور رنجیدہ ہو گیا تھا۔ ہم سب [illegible] کے غم اور ملال، احساس پشیمانی اور دکھ کو اس کے ساتھ محسوس کر رہے تھے اور سب سے زیادہ میں خود کو مجرم محسوس کرتا تھا۔ میں نے فوزیہ کو اپنی محبت کا یقین دلایا اور پھر اسے یوں بھلا دیا جیسے وہ محض خیال تھا یا فریب آرزو کی بات تھی۔ فوزیہ اور محسن کو [illegible] نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے ساتھ دیکھا تھا اور شاید یہ رفاقت قرب کا نتیجہ تھا اور جوانی کے جذبات کی پہلی یلغار تھی۔ [illegible] سب سے قریب فوزیہ کو پا کے میں اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ ایک حقیقت ہے کہ میں نے محبت کی تھی۔ مجھے اس سے محبت [illegible] نہیں تھی جیسے رابعہ سے ہو گئی تھی۔ بچپن سے جوانی تک [illegible] جدائی کے دور میں مجھے اس کا احساس کبھی نہیں ہوا تھا [illegible] بعد وہ لڑکی تو نوشتہ تقدیر ہو کے رہا۔ خدا اس میں میری کوشش [illegible] تھا نہ خواہش کا۔ اس کے لیے ایک وقت مقرر تھا اور [illegible] قدرت نے جس کے تصرف و اختیار میں گردش حالات و کائنات ہے اس مقررہ لمحے میں مختلف سمتوں سے لا کے مجھے اور رابعہ کو یکجا کر دیا اور اسی لمحے کا فیصلہ اٹل ہوا۔
کسی رسمی اعلان کے بغیر بھی یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ میرا اور فوزیہ کا ساتھ تمام عمر کا ہوگا چنانچہ میرے انکار کا سب سے [illegible] شدید جذباتی صدمہ تو خود فوزیہ نے اٹھایا مگر اس کے والدین کو افسوس اور مایوسی ہوئی۔ میں اور محسن پیدائش کے وقت سے دوست تھے مگر اس سے پہلے ہمارے والدین دوست تھے۔ میں نے منافقت سے کام لیے بغیر محسن کو بتا دیا کہ میں کیوں مجبور ہوں [illegible] محسن نے میری بات اس لیے سمجھ لی کہ وہ مجھے سمجھتا تھا۔ [illegible] وقت محسن کی ماں نے بھی مجھے معاف کر دیا تھا۔ محسن کے ابا شیروانی صاحب نے تو اس موضوع پر مجھ سے کبھی بات بھی [illegible] تھی مگر مجھے یقین تھا کہ میرے والد... مرحوم وزیر خاں زندہ ہوتے شاید مجھے معاف نہ کرتے۔

آج بھی میں خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا کیونکہ وہ حالات [illegible] تھے جن کی وجہ سے محسن کو شادی کے بعد بہن [illegible] کی فرصت نہ ملی۔ ماں کے بعد محبت کا بے غرض اور [illegible] رشتہ صرف بہن کا ہو سکتا ہے لیکن محسن نے اس رشتے کو یاد [illegible] رکھا تھا اور آج احساس گناہ اس کے لیے پر اذیت [illegible] ہو گیا تھا۔
رابعہ نے بیگ مجھے تھما دیا۔ میں نے محسن کو گلے لگا کے کہا "ابھی سے دل کے بدشگونی مت کر۔ خوشی خوشی جا۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہوگا۔"
وہ زبردستی مسکرا دیا "ہاں۔ میں بلاوجہ ڈر رہا ہوں۔"
رابعہ نے کہا "فوزیہ کا خیال رکھنا۔ ہماری وجہ سے اس کو چھوڑ کے مت آنا۔ جب تک وہ اجازت نہ دے اپنی خوشی سے [illegible] رہنا۔"
غالب نے کہا "ہاں۔ اس کی صحت کی بحالی تک ضرور رکے رہنا۔"
نازو نے بھی تائید میں سر ہلایا "ہماری بالکل فکر مت کرنا۔ یہاں ایسا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔"
"اگر ضرورت ہو تو انہیں بھی بلا لینا۔ ہم آپ [illegible] کے سارے کام چھوڑ کے" میں نے کہا۔
محسن کا چہرہ روشن ہو گیا "تم لوگ آ رہے ہو؟ واقعی آ جاؤ گے؟"
رابعہ نے کہا "ابھی کیوں نہیں آ رہے تھے۔"
غالب بولا "غالب بخت کے نخرے ان سے کام [illegible] ہے۔"
میں نے بیگ اس کے سامنے رکھ دیا "اس میں تقریباً چار لاکھ [illegible] یہ مال غنیمت ہے خزانہ ہے۔"
"اتنے میں کیا کروں گا؟"
"اچھا آ جاؤ لے جاؤ" رابعہ نے کہا۔
"نہیں۔ میں ایک [illegible] لے جاتا ہوں" محسن نے کہا۔
ہم سب انہیں رخصت کرنے نہیں جا سکتے تھے مجھے تو غالب نے کوٹھی سے باہر نہ جانے کی تاکید کی تھی۔ غالب کو [illegible] ان سے ملنا تھا۔ میں نے رابعہ اور نازو کو بھی ساتھ کر دیا۔
"ان کے چکر میں مت پڑو۔ ہم ایئرپورٹ کار سے لوٹ آئیں گے" گل نے محسن سے گلے مل کے کہا۔
منظر خواہ مخواہ جذباتی ہو گیا تھا۔ گل نے باقاعدہ آنسو بہانے شروع کیے تو میں نے اسے ڈانٹا "یہ کیا ڈرامے بازی ہے۔ دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔"
وہ اور زیادہ رونے لگی "منظر بھائی دعا کریں۔"
رابعہ نے اسے پیار کیا "بے وقوف۔ تجھے محسن کا خیال رکھنا [illegible] پہلے رکھا تھا۔"
[illegible] نے کہا "ہم سب تم پر بھروسہ کرتے ہیں گل۔ محسن کو تمہارے حوالے کر رہے ہیں۔"
نازو بھی رو رہی تھی "ہو سکے تو... واپسی میں فوزیہ کو لے آنا اپنے ساتھ۔"
غالب نے اسے گھورا "خوشی ہو یا غم، تم بے وقوفی کی بات ضرور کرو گی۔"
نازو نے کہا "تمہارا دماغ خراب ہے؟"
"دماغ تمہارا خراب ہے۔ یہاں آ کے فوزیہ کیا کرے گی۔ گھر بار شوہر اور بچوں کو چھوڑ کے ہمارے ساتھ خوار ہو؟"
میں نے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو روک رکھا تھا۔ وہ سب چلے گئے تو میں کمرا بند کر کے بستر پر لیٹ گیا اور نہ جانے کب سے رکا ہوا سیل اشک ضبط کے سارے بند توڑ کے بہہ نکلا۔ اچانک میری عمر گزشتہ کی کتاب کا ہر ورق زندہ ہو گیا اور ذہن کے دریچے سے میں نے گزرے ہوئے وقت کے ہر نقش کو زندہ دیکھا۔ فوزیہ ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ گلے میں بستہ لٹکا کے میرے ساتھ اسکول جاتی تھی۔ پھر وہ لوگ [illegible] گئے۔ سرکاری ملازمت میں ہمارے والدین خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ میں نے اسے پھر دیکھا تو وہ ہائی اسکول [illegible] تھی [illegible] بڑی ہو گئی تھی۔ اس کا تیسرا روپ کالج جانے والی لڑکی کا تھا۔ حسن [illegible] اور آغاز شباب کی دلکشی [illegible] ایک بار [illegible] میں نے کس طرح فوزیہ پر [illegible] اسے اپنی محبت کا یقین دلایا۔ [illegible] سمجھتی تھی۔ اس نے کوئی مزاحمت [illegible] چلے گئے اور وہاں ہم نے [illegible] داستان حیات کا سب سے [illegible] باب تھا [illegible] اب ان کو یاد [illegible] صرف شرمندگی [illegible]
تقریباً ایک گھنٹے بعد رابعہ لوٹی تو میں اسی طرح لیٹا [illegible] چھت کو گھور رہا تھا۔ جیسے وہ [illegible] گزرتے ہوئے وقت کی فلم چل رہی تھی۔ فوزیہ [illegible] تھی۔ میں نے وہ رات ایسے بسر کی تھی جیسے صبح پھانسی پانے والا مجرم جیل میں آخری رات گزارتا ہے۔ اس کے بعد سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ محسن کے والدین تقریباً ایک ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ میری طرح محسن بھی تنہا ہو گیا تھا۔
رابعہ نے میرے قریب آ کے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا تو میں چونکا۔
"تم... اتنی جلدی آ گئیں؟" میں نے اٹھنے کی اور آنسوؤں کو پی کر مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔
رابعہ بولی "لیٹے رہو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔"
میں نے کہا "میں ٹھیک ہوں۔"
"تمہارا ماتھا جل رہا ہے۔ میں کسی سے منگواتی ہوں اسپرین" وہ چند منٹ کے لیے باہر گئی اور پھر لوٹ آئی۔
"رابعہ! میں اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتا ہوں" میں نے

www.paksociety.com

رابعہ کا ہاتھ پکڑ کے اپنے گال کے نیچے رکھ لیا "بتاؤ میں کیا کرتا؟"

اس نے دوسرے ہاتھ سے میرے پریشان بال سنوارے "کیا واقعی یہ تمہارا قصور تھا؟ مجھے بتاؤ کیسے؟ حالات کیا ہم اپنی مرضی سے بناتے ہیں؟"

میں نے کہا "ہم حالات کے ذمے دار تو ہوتے ہیں؟"

"تقدیر کچھ نہیں ہوتی؟ مجھے بھی یقین تھا کہ میں شادی کا فیصلہ کر کے کوئی غلطی نہیں کر رہی ہوں۔ غلطی اس کی تھی جو شادی کے قابل ہی نہیں تھا مگر اس نے آخری وقت تک مجھے بھی دھوکے میں رکھا۔ میری تباہی میں میرا کیا قصور تھا؟ میری رسوائی کے حالات کیا میرے پیدا کردہ تھے؟ پھر تم کیوں دکھی ہو کہ اکیلے تم ساری خرابی کے ذمے دار تھے میرا تم سے ملنا..."

"نہیں اسے خرابی کب سمجھتا ہوں۔ تم سے ملنا میرے نصیب میں تھا اور ہم ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے" میں نے کہا "یہ سب تاخیر تھی۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا تھا یا میرے ساتھ ہوا تھا۔"

"پھر ماضی کو اپنی غلطی کی سزا بنانے سے فائدہ۔ چلو ہم داتا صاحب کے مزار پر چلتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدا فوزیہ کو صحت اور خوشی دے جو اسے اب تک میسر تھی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ویسے تو وہ خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی۔"

"ہم سب کے لیے دعا کریں گے۔ اپنے لیے بھی..."

میں نے کہا "لیکن ہم باہر نہیں جا سکتے... مجھے..."

کوٹھی میں کام کرنے والا ایک کارندہ اسپرین دینے کے لیے آیا۔ "بیگم صاحب! میرے کو چھٹی دیں، آج جلدی جانا ہے۔"

رابعہ بوکھلا گئی مگر میں نے صورتِ حال کو سنبھال لیا "ہاں بھئی ضرور جاؤ۔ پوچھنے کی کیا بات ہے؟"

"وہ... بڑے صاحب ناراض ہوتے ہیں جی۔ تین اور کوئی بھی نہیں ہے یہاں۔ چوکیدار کو نکال دیا تھا انہوں نے۔ مجھے گھر والی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔"

"کتنے بے بس اور مجبور ہوتے ہیں یہ لوگ!" رابعہ نے تاسف سے کہا۔

اسپرین کھانے کے بعد میں دس منٹ آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ رابعہ اتنی دیر میں چائے بنا کے لے آئی۔ میں اب بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ چائے پینے کے بعد ہم نے گھوم پھر کے کوٹھی کو دیکھا۔ اس میں اب پینٹ کا کام ہو رہا تھا اور باتھ روم میں ٹائل لگ رہے تھے۔ چار کنال کے رقبے پر بنی ہوئی کوٹھی بلاشبہ ایک محل تھی جس کی ایک ایک چیز کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ نقوی صاحب نے اپنے اختیارات کو کس حد تک کیش کروایا ہوگا۔ اگر وہ صرف اپنی تنخواہ میں گزارا کرتے تو ریٹائرمنٹ تک شاید مشکل سے وہ دس مرلے کا سیدھا سادا مکان بنا پاتے۔ کوٹھی کا ایک فانوس ہی ان کی پوری مہینے کی تنخواہ سے زیادہ قیمت کا تھا۔

کچن میں کھانے پینے کا سامان ہماری ضروریات کے مطابق فراہم کروایا گیا تھا ورنہ کوٹھی ابھی اسباب سے خالی تھی۔ نوکر اور کام کرنے والے اپنے کام کے کپڑے وہیں چھوڑ گئے تھے اور جاتے وقت وہی صاف ستھرے کپڑے پہن گئے تھے جو وہ پہن کر آئے تھے۔ نیلی جین کی ایک ڈانگری رنگ کرنے والے کی تھی۔ اس پر پینٹ کے داغ کپڑے کے رنگ سے زیادہ نمایاں تھے مگر مجھے وہ اتارتے دیکھا تو رابعہ میرا مقصد سمجھ گئی۔

"یہ پہنو گے؟ اچھی بھلی؟"

میں نے کہا "تھوڑی دیر کسی محنت کش مزدور کی روزی کا لباس پہننے سے کوئی فوت نہیں ہوتا۔ اتنا بھی نازک نہیں ہوں۔ تم باہر نکلو۔"

رابعہ کچن سے نکل گئی تو میں نے وہ ڈانگری پہن لی۔ ڈانگری عرفِ عام میں اس قمیص پتلون کو کہتے ہیں جو ایک ساتھ سی جاتی ہیں اور نیچے سے اوپر کی جانب زپ کے ذریعے آدمی آسانی سے پہن سکتا ہے۔ مجھے ایک پرانی چپل بھی مل گئی۔

رابعہ بہت ہنسی "اس حلیے میں جچ گئے میرے ساتھ۔"

"تمہیں شرم آتی ہے تو نہیں جاتا" میں نے کہا۔

"یہ مطلب نہیں تھا میرا" وہ معافی مانگنے کے انداز میں بولی "شرم کی بات یہ ہے کہ میرا لباس بہت اچھا ہے۔ تمہارے مقابلے میں۔"

"تم خود بھی تو بہت اچھی ہو میرے مقابلے میں" میں نے کہا "چلو۔"

ہم نے سامنے والے دروازے بند کیے اور پچھلی طرف سے باہر آ گئے۔ اچانک رابعہ نے کہا۔

"بعد میں وقار یوسف آیا تو پریشان ہوگا۔ میں اسے فون کر کے آتی ہوں۔" وہ پھر اندر چلی گئی۔

وہ چند منٹ بعد آئی تو میں نے کہا "غالب یا نازو بھی تو آتے ہیں؟"

رابعہ نے کہا "غالب اور نازو اکبر خان سے کاروباری معاملات طے کرنے گئے ہیں۔ دیر لگے گی۔"

"گویا اخبار نکالنے کی تیاری ہے۔"

"غالب بہت سیریس ہے۔ جگہ دیکھ لی ہے اس نے اور اکبر خان کے ساتھ کاروباری اور غیر کاروباری امور پر معاہدہ بھی ہو گیا ہے۔"

"غیر کاروباری امور کیا ہیں؟" میں نے کہا۔

"اخبار کی پالیسی، مدیرِ اعلیٰ صاحب کے اختیارات، اکبر خان کے حقوق۔" رابعہ نے کہا "وہ صرف کاروبار چلانا چاہتا ہے۔ اخبار بھی کاروبار ہے۔"

"لیکن غالب کے لیے اخبار پہلے اخبار ہے پھر کاروبار۔ یہی ان کے درمیان اختلاف کا سبب بنے گا۔"

ہم نے تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کیا۔ رابعہ کو شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ میں بالکل نوکر لگ رہا ہوں۔ اس کی بیگمات کا یوں اپنے کسی ملازم کے ساتھ نظر آنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جب پیچھے سے ایک خالی تانگا آیا تو یہ مسئلہ حل ہوا۔

تانگے کی سواری ایک صبر آزما کام تھا مگر رابعہ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ کے میں نے اس تجربے میں وہی لطف اور سرشاری محسوس کی جو آغازِ عشق میں کالج سے بھاگنے والے نوجوان جذبات سے متعارف ہونے والے لڑکا اور لڑکی محسوس کرتے ہیں۔ رابعہ بھی خوش تھی اور ہم پرانی باتوں پر ہنس رہے تھے۔ یہ مجھے بڑا عجیب لگا کیونکہ ابھی کچھ دیر پہلے میں پرانی باتوں کو یاد کر کے آنسو بہا رہا تھا۔

مغرب سے کچھ پہلے ہم داتا دربار والی گلی میں داخل ہو گئے۔ سڑک کے دونوں جانب پھیلی ہوئی دکانوں میں سے ایک پھولوں کی چادر میں نے لی اور ایک رابعہ نے۔ ہم الگ الگ راستوں سے اندر گئے۔ اس مرکزِ تجلیات پر اس وقت بھی ہم جیسے ہزاروں عقیدت مند موجود تھے۔ میں نے چادر چڑھانے کے بعد آنکھیں بند کر کے انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ دعا کی "میرے خدا! مجھے دنیا کی دولت نہیں چاہیے۔ مجھے شہرت نہیں چاہیے۔ بس مجھے سکون اور خوشی دے اور انہیں جن کے دم سے مجھے سکون اور خوشی ملتی ہے۔"

میں باہر آیا تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ یہی لگتا تھا جیسے میرے ذہن سے مسائل کا بوجھ ختم ہو گیا ہے۔ رابعہ بھی سنجیدہ اور اداس صورت بنائے برآمد ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک اشکوں کی نمی تھی۔ ہمارے باہر آنے تک رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا اور میرے لیے روزِ روشن کے اُجالے کا زمانہ باقی نہیں رہا تھا۔

ہم نے آہستہ آہستہ پیدل چلتے ہوئے ایک مینار والی مسجد تک کا فاصلہ طے کیا۔ وہاں ایک جگہ میری نظر ان اخباروں پر پڑی جو ٹھیلے پر بکتے ہوئے تھے۔ وہ ایک اخبار کا شام کے وقت شائع ہونے والا ضمیمہ تھا جو عام طور پر اپنی گمراہ کن سنسنی پھیلانے والی سرخیوں کے باعث زرد صحافت کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں..... مگر کوئی غلط نہیں ہو سکتی تھی "پوسٹ مارٹم سے پہلے ہی لاشوں کی چوری" اس کی ذیلی سرخی تھی "مردہ خانے سے تین لاشوں کو نکالنے والے پیشہ ور مجرم تھے۔"

ہم نے دو اخبار خرید لیے جن میں ایک ہی خبر کو مختلف انداز سے زیادہ سنسنی خیز بنا کے پیش کیا گیا تھا۔ دونوں اخبارات میں شامل ہونے والی معلومات کا خلاصہ یہ تھا کہ گزشتہ رات ایک پولیس پارٹی نے ٹی پی روڈ پر شاہدرہ اور کالا شاہ کاکو کے درمیان کھڑی ہوئی لاوارث گاڑی سے تین لاشیں قبضے میں لی تھیں اور انہیں پوسٹ مارٹم کے لیے رکھوایا گیا تھا۔ پولیس کے ذرائع کے مطابق ان مقتولوں کا تعلق مجرموں کے ایک بین الاقوامی گروہ سے تھا۔ دوپہر سے قبل ایک جیپ میں آنے والے دو افراد نے ریوالور دکھا کے مردہ خانے کے نگران کو باتھ روم میں بند کیا اور اسپتال کی ایمبولینس میں لاشیں ڈال کے فرار ہو گئے۔ ایمبولینس بعد میں شالامار لنک روڈ پر کھڑی پائی گئی مگر اس میں لاشیں نہیں تھیں۔ پولیس کے اعلیٰ حکام نے فوری تفتیش کا حکم دے دیا ہے۔ سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

رابعہ نے اور میں نے الگ الگ اخبار پڑھا اور پھر آپس میں بدل لیا۔

"نقوی صاحب نے جادو کی چھڑی گھما دی۔" رابعہ مسکرائی۔

"شاید۔ یہ اتنا آسان کام نہیں تھا" میں نے کہا "تاہم میں اس امکان کو مسترد نہیں کرتا کہ خود خلیفہ نگر کے حکم پر لاشوں کو شناخت سے پہلے اڑوا لیا گیا۔"

"پولیس نے تو کہانی ہی بدل دی ہے" رابعہ بولی۔

"ان کے لیے یہ کون سی نئی بات ہے" میں نے کہا۔

"بلاوجہ تو وہ کچھ نہیں کرتے۔ کسی کے ساتھ زیادتی بھی نہیں"

رابعہ بولی "یا الٰہی وہ آ ہے یا چھوڑ۔ اب مسٹر ہمدرد کیا کریں گے؟"

"مسٹر ہمدرد کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ ان کی محنت اکارت گئی۔ نہ ان تصویروں کی اہمیت رہی نہ اس چشم دید گواہ کی۔ کہاں ماڈل ٹاؤن کا وہ علاقہ اور کہاں کالا شاہ کاکو۔"

رابعہ نے کہا "لاوارث گاڑیاں بہت ہوتی ہیں ان کے پاس اور احمد کی پگڑی محمود کے سر ڈالا تھا وہ تو پرانا ہو گیا۔ اب وہ احمد کے گلے کا پھندا محمود کے گلے میں ڈالتے ہیں۔ تمہارے خیال میں یہ مسٹر ہمدرد کون ہیں؟"

"معلوم ہو جائے گا۔ نقوی صاحب کو وہ پھر فون کرے گا۔ اس کی آواز کا ٹیپ تو ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ چودھری دلاور ہے، اس کا بھائی اکبر خان یا کوئی اور..."

"وہ آواز بدل کے فون کرتا ہوگا" رابعہ نے کہا۔

"آواز بدل سکتی ہے، انداز کہیں نہ کہیں چغلی کھاتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "وہ اب کوئی نئی چال چلے گا۔"

"لعنت بھیجو اس کے ذکر پہ۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک ہم محفوظ ہیں اور بظاہر شکاری پھر ناکام ہو گئے ہیں جنہوں نے بڑی ہوشیاری سے یہ جال بچھایا تھا۔ دیکھو انارکلی میں کتنی رونق ہے۔ کھانا کہیں کھاؤ گی؟"

"کیا!" رابعہ ہنسی "میرا موڈ تو دہی بھلے کھانے کا ہے بانو بازار سے۔"

"کمال ہے! میرا بھی یہی موڈ تھا بانو" میں نے کہا "اس وقت

www.paksociety.com

میرا موڈ اچانک اتنا رومانٹک ہوگیا ہے کہ میں چاہتا ہوں تمہارا ہاتھ پکڑ لوں۔"

"خبردار! ہر جگہ بدتمیزی اچھی نہیں ہوتی۔"

"بدتمیزی کیا ہے اس میں۔ وہ دیکھو سامنے کیسے مزے سے جا رہے ہیں محبت کے متوالے۔" میں نے کہا۔

"ان کی تو نئی نئی شادی ہوئی ہے۔" رابعہ بولی "دولہا دلہن ہیں۔"

"یہی تو مسئلہ ہے۔" میں نے آہ بھر کے کہا "تم تو دلہن لگتی ہو لیکن میں دولہا نہیں چولہا لگتا ہوں۔ خیر، جہاں بدتمیزی اچھی لگے بتا دینا مجھے۔"

"سکندر! چلو اپنے گھر چلیں۔" رابعہ نے اچانک کہا۔

"اپنے گھر؟" میں نے کہا "کہاں ہے اپنا گھر؟ میکے کی بات کر رہی ہو یا سسرال کی؟"

"میکے کی۔" رابعہ شرما کے ہنسی "میں اپنے گھر کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "چاندنی بیگم کی اور گولو پہلوان کی روح سے ملاقات ہو جائے۔"

"مظفر نے بتایا تھا کہ وہ قبضہ حاصل کر چکا ہے۔"

"قبضے کی بات نہیں۔ ہم اندر کیسے جائیں گے؟ کھڑکیاں بند ہوں گی دروازے مقفل ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"اگر اپنے گھر کی چابیاں کھو جائیں تو کوئی کیا کرتا ہے؟" رابعہ نے کہا "وہ تالا توڑے تو جرم نہیں کرتا۔ چلو چلیں!"

اس "چلیں" کے بعد میرے اعتراضات اور دلائل بے معنی ہو گئے۔ میں نے کہا "اچھا جی، دہی بھلے تو نوش فرمائیں آپ۔ اس کے بعد آپ کا یہ خادم بلکہ نوکر چائے پلانا چاہتا ہے۔"

"خادم صاحب، اس شیشے میں آپ نہ نیچے ان میں قدم رنجہ فرما سکتے ہیں اور نہ گارڈن سینما میں۔"

"اچھا۔ پھر پاک ٹی ہاؤس کے باہر کی گلی پالیسی کے۔ کبھی تم نے پی ہے وہ گلی؟ ایک مزہ ہوتا ہے۔"

"سکندر! میں پہلے ہی بہت تھک گئی ہوں۔ کہاں سے پیدل آ رہے ہیں ہم؟" رابعہ بولی "اب وہاں تک اسٹیج کرنا پڑے گا۔"

"میں بانو بازار جا سکتا ہوں تمہاری خاطر تو تم کو میرے ساتھ پاک ٹی ہاؤس جانا پڑے گا۔" میں نے اسے ڈانٹا "پیدل چلنا صحت کے لیے مفید ہے۔ تم ویسے ہی موٹی ہو رہی ہو۔"

"واقعی۔ میں بھی محسوس کر رہی ہوں۔"

"بعد میں تم بھی ایسی ہی ہو جاؤ گی، یہ جو ادھم ناتھ چیزیں اسمارٹ قسم کے مردوں کے ساتھ لڑھک رہی ہیں۔"

رابعہ ہنسی "کیوں بددعا دیتے ہو۔ مجھے ویسے ہی ڈر لگتا ہے۔"

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ میں ایک چھٹانک وزن نہیں بڑھنے دوں گا۔ تم میرے ساتھ جاگنگ کرو گی۔"

ہم بانو بازار سے نکل کے مال روڈ تک گئے اور پھر پنجاب اسمبلی کی طرف فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ ہمارے چاروں طرف زندگی اپنی پوری گہما گہمی کے ساتھ رواں دواں تھی۔ خوب صورت اور اپنی تیز روشنیاں چمکاتی زناٹے سے گزرتی گاڑیاں تھیں اور ان میں بیٹھے ہوئے خوش حال اور بے فکرے مرد و عورتیں اور بچے شاید ہم سے زیادہ خوش تھے کیونکہ ان کا گزارا ہوا کل اور آنے والا کل بھی ایسا ہی تھا جب کہ ہم وقت سے مستعار ایک خوشی کے لمحے کو استعمال کر رہے تھے۔ اس احساس کے ساتھ کہ ہماری مسرت کی مہلت تمام ہو رہی ہے اور اس کے بعد ہمیں پھر کے اسی زنداں میں لوٹ کر جانا ہے جسے ہم نے خود اپنے لیے بنایا۔ اب اسے گرا کے رہائی حاصل کرنا ہمارے اختیار کی بات نہیں۔

کالی پیلے کے بعد ہم کسی خالی رکشا یا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے رہے۔ ہنستے کھیلتے بچوں کے ساتھ مرد اور عورتیں ہمارے قریب سے گزرے۔ ان کی آسودہ حال زندگی اور پُراطمینان زندگی میرے لیے باعثِ رشک تھی۔ خوب صورت ساڑیوں پر شال اوڑھے حسین عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ شاپنگ کر رہی تھیں۔ زیورات، میک اپ کا سامان اور بچوں کے کھلونے خرید رہی تھیں۔ ہماری طرف کوئی متوجہ نہ تھا مگر ہم انہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی زندگی ہماری دسترس میں ہوتے ہوئے بھی ہمارے لیے خواب ہو گئی تھی۔ ہم نصیب کے رشتے پر مجبور تھے۔ لیکن ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ اتنی قربت کے باوجود۔

رابعہ نے ایک رکشا روک لیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کے کہا "اداس کیوں ہو گئیں اچانک؟" میں نے راستے میں کہا۔

"کچھ نہیں۔ اداسی تو ہوتی ہے خوشی کے بعد۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا "مجھے معلوم ہے تم کیوں اداس ہو اور کیا سوچ رہی ہو؟"

"میں نے دیکھا ہے، نادان اور معصوم بچے خوب صورت کھلونوں کی دکان میں جا کے کیسے مسحور ہو جاتے ہیں۔" رابعہ بولی "ہر کھلونا لینا چاہتے ہیں۔ اور مجبور ماں باپ انہیں بہلاتے ہیں کہ بیٹا، چلو ابھی یہ لے لو، وہ کل لے لیں گے۔ آج نہیں۔"

میں نے کہا "میں بھی اسی بچے کی طرح محسوس کر رہا ہوں۔"

"کھلونوں کی دکان میں نہیں جانا چاہیے بچوں کو۔" رابعہ بولی "جیسے ہمیں خوابوں کی دکان کے شوکیس میں جھانک کر بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔"

"رابعہ! ایک نہ ایک دن..." میں نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

"مجھے معلوم ہے سکندر۔" رابعہ میری طرف دیکھ کے مسکرائی۔

میں نے کہا "مسکرانے سے کام نہیں چلے گا۔ ہنسو ورنہ..."

رابعہ گھبرائی "پاگل ہو گئے ہو؟" اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں رکشا والے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے رکشا والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "بھائی تم برا تو نہیں مانو گے؟"

رکشا والا حیران ہو کے بولا "کس بات کا جی؟"

میں نے کہا "یہ میری گھر والی مجھ سے ناراض ہے۔ اسے ذرا گدگدی کر کے ہنسا دوں۔"

"وہ جی پتا، ابھی۔ میں خود یہی کرتا ہوں۔ جب گھر والی کا موڈ خراب ہو جاتا ہے تو پھر اسے ہنسانا مشکل ہوتا ہے گدگدی کیے بغیر۔ اس میں بھلا برا ماننے والی کون سی بات ہے۔"

میں رابعہ کا صرف چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ اندھیرے میں یقیناً اس کا رنگ غصے اور شرم سے لال پڑ گیا ہوگا "تم نے بے ہودگی کی انتہا کر دی۔"

"تو کیا؟" میں نے دیدہ دلیری سے کہا۔

"میں دھکا دے دوں گی تمہیں یا خود چھلانگ مار دوں گی۔ چلتے رکشا سے۔"

میں نے سوچ کے کہا "یہ تو بڑا مسئلہ ہو گیا۔ کہیں تمہاری یا میری ٹانگ ٹوٹ گئی تو زندگی کی گاڑی ڈیڑھ پہیے پر کیسے چلے گی؟"

رکشا والا یقیناً دلچسپی سے ہماری گفتگو پر کان لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے شرارت سے کہا "چلو جی، رکشا روک لیتا ہوں۔"

"وہ کس لیے بھائی؟" میں نے کہا۔

"ٹانگ تڑوانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ منالو بھرجائی کو پھر بیٹھ جاؤ۔"

"بکواس مت کرو" رابعہ نے برہمی سے کہا "شرافت سے چلتے رہو۔"

لیکن رکشا والا اب مجھ سے بے تکلف ہو چکا تھا "شادی سے پہلے ایسی ہی کوئی بات تھی جی جناب۔ میری گھر والی نے کوٹھے پر سے چھلانگ مار دی۔ ایک ٹانگ کرچ ہو گئی۔"

میں نے ہنس کے کہا "یعنی سچ مچ تمہاری زندگی کی گاڑی چل رہی ہے ڈیڑھ پہیے پر؟"

"او نہیں جی۔ اپنی گاڑی تو خیر سے ٹھیک چل رہی ہے۔ ٹانگ ٹوٹی تھی میرے سسر کی۔ وہ نیچے کھڑا تھا۔ سمجھی رانی اس کے اوپر بم کے گولے کی طرح گری۔ اب تو خیر ڈیڑھ کنٹا ہو گیا ہے لیکن اس وقت بھی ڈیڑھ سو من وزن تھا۔"

میں تو خیر دل کھول کے ہنسا مگر رابعہ بھی ہنسی کو ضبط نہ کر سکی۔ شاہ کے چوک پر کراؤن سینما کی طرف موڑ کاٹتے ہی رکشا رک گیا۔ میں اسے پیسے دینے لگا تو وہ بولا "پھر کیسی رہی جی ہماری بات؟"

میں نے کہا "کیا مطلب؟"

"ہم نے ہنسا دیا بھرجائی کو۔ جو کام آپ نہیں کر سکے ہم نے کر دیا۔"

میں حیران رہ گیا "وہ سب جھوٹ تھا!"

"اور کیا جی۔ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی" اس نے رکشا اسٹارٹ کر کے موڑا "سلاما لیکم۔"

"بدمعاش" رابعہ نے مسکرا کے زیر لب کہا۔

جدید طرز کی اس شاندار کوٹھی کے سامنے جہاں پہلے رابعہ کے والدین کی بنائی ہوئی پرانی کوٹھی تھی، پان والے کا کھوکھا آباد تھا اور کراؤن سینما میں فلم کا انٹرول ہوا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹا ہال کے اندھیرے میں فلم کی دلچسپی نے سگریٹ کی طلب کو دبا رکھا تھا مگر اب جیسے پندرہ منٹ کے لیے قیدی رہا ہوئے تھے اور چائے، سگریٹ کے رسیا کینٹین پر یلغار کر چکے تھے۔ عین گیٹ کے سامنے ریڑھی پر بن کباب سے آلو اور مونگ پھلی تک ہر چیز یوں فروخت ہو رہی تھی جیسے کرفیو کے وقفے میں گلی سڑی سبزی سے باسی گوشت تک سب کچھ ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے۔

انٹرول ختم ہونے کی گھنٹی بجی تو ایک دم ہجوم چھٹ گیا اور مجھے پان سگریٹ والے سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ اسی نے مجھے چند دن پہلے گولو پہلوان اور چاندنی بیگم کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی تھیں۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور میرے ساتھ رابعہ کو دیکھ کے چونکا۔ میں نے اس سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے اپنے ہاتھ صاف کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ آج میں نے ڈانگری پہن رکھی تھی اور میں حلیے سے کار مکینک یا پلمبر نظر آتا تھا۔ معزز نظر آنے والی رابعہ کے ساتھ میری حیثیت کا فرق زیادہ نمایاں محسوس ہوتا تھا۔

اس نے کہا "تم وہی ہو نا؟"

میں نے اپنی کتھے چونے سے لال ہو جانے والی انگلیوں کو دیکھا "میں وہی ہوں مومن... تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔"

"یاد کیسے نہیں۔ اور تم مومن ہو تو کیا ہم کافر ہیں؟"

میں نے ردی اخبار کے ایک ٹکڑے سے ہاتھ صاف کیے۔ "صورت سے ہم سب ہی مومن لگتے ہیں بھیا پان والے۔ اندر کا حال اللہ جانتا ہے۔ سنا ہے بعد میں یہاں بہت گڑبڑ ہوئی تھی؟" میں نے کوٹھی کی طرف اشارہ کیا "گولو پہلوان نے اپنی چاندنی بیگم کو قتل کرنے کے بعد خودکشی کر لی تھی۔"

اس نے کہا "یہ تو سارا شہر جانتا ہے۔ اور جب تمہیں معلوم ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "آخر بات کیا ہوئی تھی؟ کیوں قتل کر دیا تھا گولو نے اسے؟ چاندنی تو واقعی چاندنی تھی۔ اور یہ گولو نے واقعی خودکشی کی تھی یا اسے بھی کسی نے...؟"

اس نے میری بات کاٹ دی "جاؤ یار، میرے حصے مت لگو۔ مجھے کیا معلوم۔"

میں نے کہا "پہلے تو سب معلوم تھا۔ تم نے ہی بتایا تھا۔"

www.paksociety.com

"بڑی غلطی کی تھی میں نے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا "تم سی آئی ڈی کے بندے ہو۔ تم نے پولیس کو بتا دیا اور انہوں نے مجھے بھی شامل تفتیش کر لیا۔ ابھی تک اسٹول پر گدی رکھ کے بیٹھتا ہوں۔"

میں نے کہا "او دولی والا قوقہ۔ تم الزام لگا رہے ہو مجھ پر بلکہ مجھے گالی دے رہے ہو۔ میں سی آئی ڈی کا نہیں اللہ کا بندہ ہوں۔ ان خاتون کو پہچانتے ہو؟"

وہ تذبذب میں پڑ گیا "نہیں..."

میں نے کہا "یہ اس جگہ کی اصل مالک ہیں۔ رابعہ قادری، ہائی کورٹ کی وکیل ہیں۔"

"اور تم کیا لگتے ہو ان کے؟"

میں نے کہا "یہ انہی سے پوچھ لو۔"

رابعہ نے صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے کہا "یہ بھی وکیل ہیں۔ میرے ساتھ۔"

میں نے مسکرا کے کہا "میرے اس نیچے پر مت جاؤ۔ بس کچھ ایسی مجبوری تھی کہ میں سامنے نہیں آ سکتا تھا۔ کچھ دشمن میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔"

اس نے کہا "کیسے دشمن؟"

میں نے کہا "جیسے دشمن ہوتے ہیں۔ تمہارے دشمن بھی تو ہیں جو تم کو اس جگہ سے ہٹا کے خود یہاں بیٹھنا چاہتے ہیں۔"

"یہ تو ہے" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "آخر میں اُٹھ کے کہاں جاؤں۔ برسوں سے یہاں بیٹھا روزی کما رہا ہوں تو سب کو تکلیف ہے۔ جیسے میں کوئی حرام کا دھندا کرتا ہوں۔ جو کرتے ہیں انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔"

میں نے کہا "سینما کا مالک سیٹھ تمہاری حمایت نہیں کرتا تھا؟"

وہ مجھے گھور کے بولا "پہلے کرتا تھا۔ جب سے پولیس تفتیش کے لیے تھانے لے گئی ہے وہ بھی بدل گیا ہے۔ کہتا ہے کہ شریف سمجھ کے میں تمہارا ساتھ دیتا تھا۔ تم تو نرے حرامی ہو۔ اب میں اسے کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے تو پولیس نے شریف ہونے کے جرم میں بدمعاش بنا دیا ہے۔ وہ "ہسٹری شیٹر" بھی کہتے ہیں مجھے لیکن میں نے بھی پکا ارادہ کر لیا ہے کہ جگہ چھوڑ دوں گا مر وہ سب نہیں کروں گا جو پولیس والے چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا چاہتے ہیں وہ ہمیں بتاؤ۔ شاید ہم تمہاری مدد کر سکیں۔"

اس نے پُرامید لہجے میں رابعہ کی طرف دیکھا "وہ چاہتے ہیں کہ میں مخبر بن جاؤں۔ کوکین والا پان بیچوں۔ ماڑیا رکھوں اور یہاں جو شوقین آتے ہیں، ان کا سپلائر بن جاؤں۔ سپلائر کہتے ہیں نا آپ؟... واہ... اللہ معاف کرے جیسی ان میں کمی ہو، ہیں ان کی چوری ہوں اور دو لاٹری کے نوٹ پکڑوں۔ مجھے تھانے میں روز ہونے والا منظور ہے مگر میں اپنے بچوں کو بھی رزق نہیں کھلا سکتا۔ رزق اللہ دینے والا وہ ہے۔" اس نے سر اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا۔

"تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ حوصلہ ہونا چاہیے آدمی کے پاس۔ ایک دروازہ بند کرتا ہے تو خدا رزق کے دس دروازے کھولتا ہے۔ لیکن کوئی تم کو غیر قانونی طور پر پریشان کرتا ہے تو ہمیں بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں جی۔ پریشان کرنے والے تو روز آ جاتے ہیں سامنے کی دکان سمجھ کے سگریٹ اٹھا لیتے ہیں، پان کھاتے ہیں۔ آج ابھی تک کوئی نہیں آیا لیکن آتا ہی ہو گا۔"

اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ ابھی اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک کار بڑی تیز رفتاری سے آئی۔ ڈرائیور نے ایک دم بریک لگائے تو اس کے ٹائر جام ہو گئے اور سڑک پر ان کی رگڑ سے پیدا ہونے والی آواز نے سب کو متوجہ کر لیا۔ کار کی اگلی سیٹ پر لمبے بالوں والا ایک موٹا تازہ نوجوان بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ والا نسبتاً زیادہ عمر کا تھا اور اس نے اونی قمیص کو بٹن کے نیچے سے گزار کے کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ پان والے نے مجھے آنکھ مار کے کھسک جانے کا اشارہ کیا۔

میں فوراً وہاں سے یوں ہٹ گیا جیسے کسی عام گاہک کی طرح میں پان سگریٹ لینے کے لیے رکا ہوا تھا۔ رابعہ کے ساتھ میں چند قدم کے فاصلے پر جا کے ٹھہر گیا جہاں سے میں ان کی گفتگو سن سکوں۔

رابعہ نے خفگی سے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے، تم کس چکر میں پڑ گئے ہو؟"

میں نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے خاموش کیا "اور مت دیکھو۔ ہم رکشا کا انتظار کر رہے ہیں۔"

کار سے صرف قمیص والا اترا تھا۔ ویسے تو ان دونوں نے خاصی کوشش سے اپنی صورت پر بدمعاشی کی خباثت اور غنڈہ گردی کی صفات کو نمایاں کیا تھا لیکن قمیص والا اطوار سے خود کو خان اور بابا کو خان بھی ثابت کر رہا تھا اور فلمی انداز میں جیسے بدمعاش لیفٹی دادا کا رول کر رہا تھا۔

اس نے سلام کی جگہ ایک پٹھان سے بڑی گالی لڑھکا کے "لگتا ہے اثر نہیں ہوا تجھ پہ ہماری بات کا..."

پان والے نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا اور سے کہا "پہلوان جی! میں نے تھوڑی سی مہلت مانگی تھی۔"

اس نے پان والے کی گردن دبوچ لی "مہلت کے موڑ...

www.paksociety.com

بہت مہلت دے چکے ہیں ہم۔ تو کیا چاہتا ہے؟ ہم یہ سب اٹھا کے سڑک پر پھینک دیں؟"

وہ ہر جملے میں حسب ضرورت مکروہ گالیاں بھی استعمال کررہا تھا۔ چنانچہ میرا خون کھول رہا تھا مگر میری لگام رابعہ نے تھام رکھی تھی۔ اس نے مجھے مظلوم کی حمایت میں کلمۂ حق کہنے سے باز رکھا۔

رابعہ نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اندر جانے کے بجائے تم پان والے سے ملنے کیوں آگئے؟"

میں نے کہا "یہ خالہ کی طرف سے میرا چچا زاد بھائی ہے اور چچا کی طرف سے خالہ زاد...."

"فضول باتیں چھوڑو۔"

میں نے کہا "رابعہ بی بی! یہ پان والا مجھے جانتا اور پہچانتا ہے۔ اس کو سمجھانا ضروری ہے کہ تم ہی اس کوٹھی کی جائز وارث ہو۔ یہ ثابت کیے بغیر ہم کوٹھی میں دیوار پھاند کے داخل نہیں ہوسکتے۔ گیٹ پر اتنا بڑا تالا پڑا ہوا ہے اور اس کی چابی نہ تمہارے پاس ہے نہ میرے پاس۔"

رابعہ نے کہا "مگر اس کے لیے پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانا ضروری نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ضروری کچھ نہیں ہوتا۔ جیسے میرا تم پر فریفتہ ہونا ضروری نہیں تھا اور فریفتہ ہوجانے کے بعد یہ عہد کرنا ضروری نہیں تھا کہ میں بقائمی ہوش و حواس خود کو تمام عمر کے لیے تمہاری غلامی میں رہنا چاہتا ہوں۔"

اچانک کھیس والے نے پان والے کو باہر گھسیٹ لیا۔ پان والا چلانے لگا۔ پھر کار میں بیٹھا ہوا لمبے بالوں والا بدمعاش بھی اتر آیا تو میں نے اپنی آستین کو رابعہ کی گرفت سے چھڑا لیا اور آگے پہنچ گیا۔ عین میدان جنگ میں جہاں کھیس والے نے پان والے کو مارنا شروع کردیا تھا۔ کچھ لوگ صورت حال کو سمجھتے ہوئے انجان بن گئے تھے۔ بیچ بچاؤ کرنے والے بھی میرے بعد ہی آئے۔

میں نے کہا "پہلوان جی! خیر ہو آپ کی جوانی کی اور جان کی۔ لیکن اس غریب کو مار کے گناہگار کیوں ہوتے ہو؟"

اس نے مجھے گھور کے دیکھا "چل دفع ہو ادھر سے۔ تو ماما ہے اس کا؟"

میں نے اس کی کلائی تھام لی "نہیں۔ یہ ماما ہے میرا۔"

غالباً میری گرفت اور میرے انداز تخاطب سے ہی اس نے سمجھ لیا تھا کہ میں دھول دھپے سے مار کھائے بغیر باز نہیں آؤں گا۔

دوسرے نوجوان نے مجھے گالی دی "تیری اور تیرے ماما کی۔"

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کھیس والے کی کلائی کو جھٹکا دیا اور اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن پر کان کے ذرا نیچے کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ وہ گرنے لگا تو میں نے اسے سنبھال کر گاڑی میں ڈال دیا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور انجن چل رہا تھا۔

"تمہارے حق میں بہتر ہے کہ اسے لے کر چلے جاؤ۔" میں نے لمبے بالوں والے نوجوان کو مخاطب کرکے ہاتھ جھاڑے۔ "پولیس آگئی تو مشکل میں تم پڑو گے۔"

نوجوان کے قدم تو کھیس والے کا انجام دیکھتے ہی رک گئے تھے۔ میرے لہجے کی دھمکی نے اسے مزید ٹھنڈا کردیا۔ "یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا۔"

"شٹ اپ۔ میں اس سے بھی برا کروں گا تمہارے ساتھ۔ میرے حلیے پر مت جاؤ۔" میں نے دہاڑ کے کہا "میں تم جیسے بدمعاشوں کو ایک موقع دیتا ہوں۔ جو موقعے سے فائدہ اٹھاتے وہ فٹ پاتھ پر بھیک مانگتے نظر آتے ہیں یا کبھی نظر نہیں آتے۔ سامنے ہے میرا گھر۔ ہمت ہے تو پھر آجانا۔"

وہ بہت کم ہمت آدمی تھا۔ اس نے بے یقینی سے خالی کوٹھی کی طرف دیکھا اور ایک دم گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دوسرے لمحے گاڑی اسی تیزی سے روانہ ہوگئی جس تیزی سے آئی تھی۔ تماشا دیکھنے والے کھڑے ہوئے چند افراد نے اس منظر کو خاصی دلچسپی سے دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک نے قہقہہ لگا کے ایک ناقابل اشاعت بات بھی کی۔

میں نے پان والے کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا "ڈرو نہیں۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

پان والا سخت نروس تھا "آپ کی بات اور ہے۔ میرے جیسے آدمی کے لیے ان کی دشمنی...."

میں نے کہا "دشمنی کس بات پر ہوئی؟ یہ جگہ چاہیے انہیں؟ جگہ انہیں دے دو۔"

"اور خود بھوکا مروں؟" وہ تلخی سے بولا۔

میں نے سکندرانہ شان سے کہا "جگہ ہم دیں گے تمہیں۔ سڑک کے ادھر نہ سہی ادھر سہی۔ اس کوٹھی کے باہر یا اندر۔"

بلا ارادہ اس وقت میری نظر کوٹھی کی طرف گئی۔ میں بھول گیا کہ اس پان والے سے میں کیا کہہ رہا تھا۔ میری نگاہ اس کار پہ رک گئی تھی جو رابعہ کی کوٹھی کے گیٹ پر آ کے رک گئی تھی۔ میں اس گاڑی کو نہیں پہچانتا تھا مگر اس شخص کو جانتا تھا جو گاڑی ڈرائیو کرکے لایا تھا اور اسے بھی جو آگے بیٹھا ہوا تھا۔ یہ چوہدری دلاور تھا۔ گاڑی پیڈرو چلا رہا تھا۔

میں نے پان والے کو چھوڑ دیا اور سڑک عبور کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس وقت پیڈرو گیٹ کا تالا کھول رہا تھا۔

میں نے رابعہ کی آواز پر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں جو مجھے واپس پکار رہی تھی۔

میرا ردعمل فطری تھا۔ دو پرانے دشمنوں کو ایک ساتھ دیکھتے ہی پرجوش کے جذبات غالب آگئے تھے۔ پیڈرو نے خود کو بے قصور اور مجبور ثابت کرنے کے لیے بہت جھوٹ بولے تھے۔ اس نے اپنے ماضی کے پُرستم حالات کا ایسا دردناک نقشہ کھینچا تھا کہ میں اس کی مظلومیت کو تسلیم کرنے لگا تھا اور قائل ہورہا تھا کہ اس نے صرف میری حمایت حاصل کرنے کے لیے چوہدری دلاور سے اپنے اختلافات کی کہانی نہیں سنائی تھی بلکہ ہماری مدد کرکے اس نے ثبوت بھی فراہم کیا تھا کہ اب وہ ہمارا نہیں چوہدری دلاور کا دشمن ہے لیکن اس پُرفریب ڈرامے بازی کا راز فاش ہوگیا تھا۔ میرے سامنے وہ پہلے کی طرح چوہدری دلاور کے ساتھ تھا اور حسب عادت ایک وفادار کتے کی طرح اس کے اشاروں پر دم ہلا رہا تھا۔

رابعہ نے چلا کے کہا۔ "رک جاؤ سکندر۔ ٹھہرو۔"

میں نے پلٹ کے بھی نہیں دیکھا اور ایک جست میں سڑک عبور کرنے کی کوشش کی۔ اچانک دائیں جانب سے آنے والی ایک گاڑی کے ڈرائیور نے مجھے بچانے کے لیے پوری قوت سے بریک لگائے۔ گاڑی کے جام ہوجانے والے پہیے سڑک پر رگڑ کی لکیر بناتے اور احتجاجاً چلاتے ہوئے آگے بڑھے۔ یہ ناممکن تھا کہ گاڑی اپنا بھاری بھرکم وجود حرکت کی ساری توانائی سے محروم ہوکے عین اس جگہ رک جاتا جہاں ڈرائیور نے بریک پیڈل دبایا تھا۔

میں نے تو ایک دم گاڑی کی چندھیا دینے والی روشنی کو چند فٹ کے فاصلے پر دیکھا۔ کسی شکار پر جست لگانے والے چیتے کی چمکتی آنکھوں کی طرح۔ خوف نے مجھے یوں مفلوج کیا کہ مجھے سڑک کا دوسرا کنارا زندگی کی دوسری سرحد سے بھی دور نظر آیا۔ میں نے رابعہ کی چیخ بھی سنی۔ شاید اس کی آنکھوں نے مجھ سے پہلے میری بے بسی کو دیکھ لیا تھا اور آنے والے لمحے کی تصویر کو بھی۔ جب میرا کچلا اور بکھرا ہوا خون آلود جسم سڑک پر دیکھنے والی آنکھوں کے لیے نظارۂ عبرت فراہم کرے گا۔ ان سب پر انسان کی ہستی ناپائیداری کی حقیقت عیاں ہوگئی تھی جو یہ سمجھتے تھے کہ میں نے اپنے جسم کی طاقت اور پھرتی پر اعتماد رکھتے ہوئے یہ نہیں دیکھا تھا کہ دوسری طرف سے ایک بے جان مگر متحرک فولادی مشین کہیں زیادہ طاقت اور تیز رفتاری کے ساتھ مجھے کچلنے کے لیے بڑھتی آرہی ہے۔

ساری بات ایک لمحے کی تھی جو گزر جاتا تو میں بھی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ کوئی فانی انسان (الا کہ دارا اور سکندر ہو گئے) اس لمحے کی گرفت سے نہ بچے جو یکلخت بے خبری میں آلیتا ہے اور اس سے ٹکرا کر حادثے کا شکار ہوجانے والے کے لیے اتنا ہی بے وجود ہوتا ہے جتنا کسی سڑک کے کنارے پڑے ہوئے پتھر کے لیے۔

لیکن وہ لمحہ میرے لیے ابھی نہیں آیا تھا چنانچہ میں اسے جُل دے کر نکل گیا (ذرا میں نے ایسا ہی سمجھا) میں ایک دم اچھلا اور بجلی کی سی آواز کے ساتھ گاڑی کے بونٹ پر گرا۔ گاڑی رک گئی اور ڈرائیور بڑے اشتعال کے عالم میں باہر نکلا۔ اگر میں اس کی گاڑی کے نیچے آجاتا تو یقیناً اس کے لیے بھی پریشان کن قانونی مسائل پیدا ہوجاتے۔ غلطی سو فی صد میری تھی مگر اس کی کون سنتا۔ پبلک اسے مورد الزام ٹھہراتی اور پولیس اسے گرفتار کرکے اس کی کار ضبط کرلیتی۔ اس کا ڈرائیونگ لائسنس رکھ لیتی اور ان قانونی معاملات کے رسوا کن مراحل سے گزر کے اپنی بے گناہی ثابت کرنے تک اس کے ہزاروں خرچ ہوجاتے۔ ایک ذہنی اذیت کی سزا الگ ہوتی اور نہ جانے کب تک حادثے کے منظر کا تصور اس کے لیے سوہان روح ہوتا۔

وہ ایک گالی دے کر کار سے اترا تھا۔ "اندھے ہوکے سڑک پر دوڑتے ہو...." خوف اور غصے سے اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔

میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا بے سود جانا۔ "سوری سر" میں نے کہا اور بونٹ پر سے چھلانگ لگا کے اتر گیا۔ میری نظر گیٹ پر تھی۔ ان سب پر تھی جو وہاں کسی ہنگامے کے منتظر تھے۔ میں نے رابعہ کی طرف بھی پلٹ کے نہیں دیکھا جو سب سے پہلے دیوانہ وار چلاتی ہوئی آگئی تھی۔

میری نظر دلاور پر تھی اور پیڈرو پر تھی۔ وہ رابعہ کی چیخ سے اور ٹائروں کے چلانے سے میری طرف دیکھنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ اتنا تو ان کی آنکھوں نے بھی دیکھ لیا ہوگا کہ ایک بندہ کسی گاڑی کے نیچے آتے آتے رہ گیا۔ اس نے بڑی حاضر دماغی اور دلیری سے کام لیتے ہوئے بونٹ پر کود کے اپنی جان بچالی اور وہ بندہ اکڑتا ہوا چلا آرہا تھا۔

لیکن یہ سمجھنے میں انہیں کچھ دیر لگی کہ ڈرامائی انداز میں بونٹ پر کود کے جان بچانے والا سکندر بخت تھا اور چیخ مارنے والی عورت رابعہ قادری اینڈ دلیٹ پائی کررہی تھی۔ یہ احساس چوہدری دلاور سے پہلے استاد پیڈرو کو ہوا۔ وہ اس وقت گیٹ کھول کے اندر داخل ہوچکا تھا جب اس نے مجھے دوبارہ اپنی طرف دیکھتے دیکھا۔

چوہدری دلاور کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "تم...." اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

میں طوفانی بگولے کی طرح اس کے پاس سے گزر گیا۔ پیڈرو کے لیے واپسی ممکن نہ تھی۔ وہ آگے بھاگا اور اس نے گیٹ کو اندر سے بند بھی کردیا۔ میں اپنی رفتار میں لوہے کے گیٹ سے ٹکرا گیا۔

"سکندر!" چوہدری دلاور نے کہا۔ "میری بات سنو۔"

میں نے اسے جواب میں ایک فحش گالی دی اور گیٹ پر چڑھ گیا۔ "تیری بھی سنوں گا...."

اندر اندھیرا تھا۔ میں نے پیڈرو کو کسی سائے کی طرح پورچ میں غائب ہوتے دیکھا۔ کوٹھی کے دروازے بند تھے اور پیڈرو کے

www.paksociety.com

پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اپنی چابی لگا کے کھول سکتا۔ اس نے یقیناً میرے جارحانہ عزائم کو بھانپ لیا تھا اور اسے اپنی جان بچانے کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔

وہ دائیں جانب آٹھ فٹ اونچی دیوار اور کوٹھی کے درمیان کی تنگ گلی میں بھاگا۔ یہ تقریباً چار فٹ چوڑا راستہ تھا مگر اس میں دیوار کے ساتھ ساتھ گملوں کی قطار تھی چنانچہ خالی جگہ تین فٹ ہی رہ گئی تھی۔ وہ مجھ سے تقریباً بیس گز آگے تھا اور یہ فاصلہ برقرار تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ آگے کہیں نہ کہیں اس کے لیے راستہ مسدود ہو جائے گا۔

اس وقت مجھے بالکل خیال نہیں آیا کہ ایسے بالکل پیچھے رہ کے پیڈرو کا تعاقب کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔ وہ کسی بھی جگہ رک کر اور پلٹ کر مجھ پر فائر کر سکتا تھا۔ تین فٹ کی گلی میں بیس گز کے فاصلے سے اس کا نشانہ خطا ہو جانے کا کوئی امکان نہ تھا مگر نہ جانے کیوں اس نے ایسا نہیں کیا۔

اس نے دوڑتے ہوئے اچانک لات مار کے ایک گملا لڑھکا دیا۔ گملا اوپر سے چوڑا تھا اور نیچے سے اس کا پیندا بہت چھوٹا تھا۔ گملا مٹی اور پودے کے ساتھ گرتے ہی ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی میری راہ میں رکاوٹ بن گیا۔ میں اتنا تیز دوڑ رہا تھا کہ بروقت اپنی رفتار پر قابو پانے میں ناکام رہا اور گملے سے ٹھوکر کھا کے سیدھا منہ کے بل گیا۔ اگر میں گملے سے بچ جاتا تو اس میں آگے ہونے والے دو فٹ اونچے اور گھنے کی باڑ کی تراش خراش سے باہر تک پھیلے ہوئے کیکٹس سے بہرحال نہیں بچ سکتا تھا۔

میں نے اپنا منہ اور سر تو بچا لیے لیکن فرش پر گرنے سے میرے گھٹنے اور میری کہنی بری طرح چھل گئے۔ میرے ایک گھٹنے میں خاصی چوٹ آئی جو پتھریلے فرش سے ٹکرایا تھا۔ کانٹے دار شاخوں والے کیکٹس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اس کے سخت کانٹوں نے میرے ہاتھوں پر کہنیوں تک خراشیں ڈال دیں اور میرے کپڑے کئی جگہ سے پھٹ گئے۔ اس وقت پیڈرو بائیں طرف گھوم کے غائب ہو گیا تھا۔ مجھے دوبارہ اٹھنے میں دیر نہیں لگی مگر ایک گھٹنے کی تکلیف کے باعث میں کچھ دیر لنگڑا کے دوڑا۔ میرے کانوں نے خاموشی میں ایک شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنی۔ درد کو برداشت کرتے ہوئے میں بائیں طرف پہنچا تو مجھے ایک کھڑکی کھلی ہوئی دکھائی دی۔

پیڈرو اس کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر چلا گیا تھا۔ اگر وہ عقلمندی سے کام لیتا تو اندر کودتے ہی عین کھڑکی کے نیچے بیٹھ جاتا اور جب میں کھڑکی کے راستے اندر قدم رنجہ فرماتا تو وہ آسانی سے میرے سر پر ریوالور کا بٹ مار کے مجھے لٹا دیتا یا مجھے ہینڈز اپ کرا لیتا مگر وہ ایک کھلے دروازے سے گزر کے دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔

میں کھڑکی کے راستے سے اندر اترا تو میرے کانوں نے ساتھ والے کمرے سے پیڈرو کی آواز سنی۔

"سکندر! وہیں رک جاؤ ورنہ....." اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

میں رک گیا۔ "ورنہ کیا....؟"

"میں.... گولی.... گولی مار دوں گا۔"

میں نے اپنی سانس کو قابو میں کیا۔ "اب تک کیوں نہیں ماری تھی؟"

"میں موقع دے رہا تھا تمہیں۔"

"کیسا موقع؟"

"میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا تھا سکندر۔" اس نے کہا۔ "تم پاگل ہو رہے تھے۔ میں رک جاتا تو تم مجھے مار ڈالتے۔"

"میں اب بھی تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔" میں نے کہا۔

"دیکھو سکندر! پہلے میری بات سن لو۔" اس نے کہا۔

"باتیں بہت سن لیں میں نے۔" میں نے کہا۔

اس وقت تک میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ میری پھولی ہوئی سانس قابو میں آ گئی تھی اور میرا ذہن آہستہ آہستہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت حاصل کر رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ استاد پیڈرو خوفزدہ ہے۔ مجھے موقع دینے کی بات دھوکا تھی۔ اس وقت وہ مسلح نہیں تھا ورنہ گملا گرا کے میرا راستہ روکنے کے بجائے وہ فائر کر کے مجھے لنگڑا لولا بھی کر سکتا تھا۔ غالباً وہ دوسرے کمرے میں محصور ہو چکا تھا۔ اگلے کمرے سے کسی کے جان بچانے کے لیے فرار کا نیا راستہ تلاش کرنا ممکن نہیں تھا ورنہ اسے رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بھاگتا جاتا، سیڑھیوں سے اوپر چلا جاتا، کھڑکی کو کھول کے پھر باہر نکل جاتا یا چھت پر پہنچ کے کسی طرف سے پھر نیچے گلی میں اتر سکتا تھا اور بچ نکلتا۔ وہ دوسرے کمرے میں جہاں اس کی پیش قدمی رک گئی تھی، دروازے مقفل تھے اور کوئی کھڑکی نہیں تھی۔

میں نے ایک سوئچ بورڈ کی طرف دیکھا جو میری دسترس میں تھا اور ایک ایک کر کے سب سوئچ آن کر دیے مگر کوئی لائٹ جلی نہ چھت سے معلق پنکھے نے حرکت کی۔ باہر سے مین سوئچ آف معلوم ہوتا تھا۔ اس تمام عرصے میں میری نظر ایک لمحے کے لیے بھی درمیانی راستے سے نہیں ہٹی۔

پیڈرو نے یقیناً وہ آوازیں سنی ہوں گی جو سوئچ آن کرنے سے پیدا ہوئی تھیں اور اس نے یہ بھی سمجھ لیا ہو گا کہ اس کی کوشش رائیگاں گئی۔ میں خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔ میں زیادہ پرسکون انداز میں آگے بڑھنے کی تیاری کر رہا تھا۔

یہ ایک بیڈ روم تھا۔ اس میں اپنے مطلب کی مجھے ایک چیز نظر آئی۔ یہ کونے میں رکھا ہوا پیتل کا پیڈسٹل لیمپ تھا جس کا ڈنڈے جیسا حصہ منقش تھا۔ کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر میں اس کے پیچھے ہٹا اور میں نے پیڈسٹل لیمپ کا تار کھینچ کے الگ کر دیا۔ اس کا شیڈ بہت بڑا تھا اور شیڈ سمیت اس کو ہتھیار کے طور پر استعمال مشکل ہو جاتا۔ میں نے بلب ہٹا کے پیتل کے گول رنگ کو کھولا

www.paksociety.com

اور دائیں مشکل سے ایک منٹ میں مکمل ہو گئی اور کاغذ کے شیڈ کو ایک طرف رکھتے ہی میں نے پیڈسٹل لیمپ اٹھا لیا۔

خاموشی کا ہر لمحہ یقیناً پیڈرو کے اعصاب پر اثر انداز ہو رہا تھا لیکن وہ بھی اندازے لگانے میں مصروف ہو گا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ پرانے تعلق کی بنا پر اتنا تو اسے معلوم تھا کہ ہے وزن کے لیے ہو جاتا میرا شیوہ نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ خالی ہاتھ سے بھی ہتھیار کا کام لے سکتا ہوں اور اس جیسے کمزور آدمی تو میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

پھر اس کی آواز آئی۔ "سکندر! کیا تم میری بات سنو گے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔"

اس نے کہا۔ "پاگل مت بنو۔"

میں نے کہا۔ "مجھے اپنا پاگل پن اچھا لگتا ہے لیکن تم مجھے نہیں سمجھتے۔"

"میں نے تمہیں سب بتا دیا تھا۔" اس نے مجبور لہجے میں کہا۔

"ابھی بہت سی باتیں باقی ہیں۔ جو میں پوچھوں گا اور تم بتاؤ گے اب میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ خود کو میرے حوالے کر دو۔"

اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "کیا ہو تم؟ تم پولیس یا مجسٹریٹ ہو؟ گرفتاری کے لیے آئے ہو اور میں کیا مفرور مجرم ہوں؟"

میں ایک ایک قدم آگے بڑھتا گیا۔ "یہ مجھ سے مت پوچھو۔"

"چوہدری دلاور موجود نہیں ہے باہر۔"

میں نے کہا۔ "ایک دن وہ بھی غیر موجود ہو جائیں گے اور پھر بات تک اپنا لحد میں موجود رہیں گے۔"

"اگر تم نے.... کچھ کیا تو...."

"تو اپنے چوہدری صاحب پیدل فوج، توپخانہ اور ٹینک کے ساتھ حملہ کر دیں گے اور مجھے شکست فاش دے کر تمہیں یوں نکال لے جائیں گے جیسے بارات کے ساتھ آنے والا دولہا اپنی دلہن کو لے جاتا ہے۔ پیچھے والے روتے پیٹتے رہ جاتے ہیں۔" میں نے زہر خند کہا۔ "سوال یہ ہے کہ اتنی دیر کیوں کر دی انہوں نے؟ تمہاری مدد کے لیے کیوں نہیں پہنچے؟"

اس سوال کے بعد میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ آخر اتنی دیر کیوں کی؟ وہ تو میرے پیچھے نکلی تھی۔ جتنی احمقانہ عجلت کے ساتھ میں نے گاڑی کے نیچے سے گزرنے کی کوشش کی تھی اور جس عاقلانہ مستعدی کے ساتھ میں گاڑی پر سے کود کے بھاگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں دیوانہ وار کیوں بھاگا تھا اور کس کے پیچھے بھاگا تھا۔ بلاشبہ لوگ ابھی تک وہاں ہکا بکا کھڑے ہوں گے کہ یوں غائب ہونے والا بھوت تھا یا چھلاوہ تھا۔ اور اللہ فقیرین کرام کو قائل کرنے میں مصروف ہو گا کہ وہ بے گناہ تھا لیکن رابعہ سب کی رائے جاننے کے لیے وہاں نہیں

رک سکتی۔ ممکن ہے اتنی دیر میں گاڑی والا تو خدا کا شکر ادا کر کے جا چکا ہو کہ اللہ نے بڑی مصیبت سے بچایا اور ناظرین بھی نہ رہے ہوں۔ رابعہ کو اگلے چند سیکنڈ میں میرے پیچھے پیچھے گیٹ تک اور پھر اندر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میرے تعاقب میں وہ میں ساتھ بھی نہ سکتی تھی۔ اسے روکنے والا کون تھا۔ سوائے چوہدری دلاور کے۔ وہ گیٹ پر موجود تھا۔ اس نے رابعہ کو روکا ہو گا مگر اس کے روکنے سے رابعہ رک گئی؟ یہ تو بعید از قیاس ہے کہ چوہدری دلاور اس عشق کے طوفان کو خام ساحل بن کے روک سکے۔ وہ کہے کہ مس رابعہ! اندر وہ دونوں آپس میں نمٹ لیں گے۔ آیئے ہم یہاں گیٹ پر رک کے باتیں کرتے ہیں۔ موسم کتنا اچھا ہے آج....

اس نتیجے پر پہنچتے ہی میرے دماغ میں ایک اندیشے نے جنم لیا مگر مجھے اس اندیشے پر غور کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ دروازے کی اوٹ سے پیڈرو نے ایک دم سامنے آ کے مجھ پر حملہ کیا۔ اندھیرے میں صرف ایک سایہ سا میری جانب آیا۔ اس کے ہاتھ ہوا میں لہرائے اور کوئی چیز میرے شانے سے رگڑ کھاتی ہوئی گزر گئی۔ پیڈرو کے ہاتھ میں بھی کوئی ایسا ہی ہتھیار تھا جیسا میرے پاس تھا۔ اس نے اندھیرے میں حملہ کیا تھا اور وہ گھبراہٹ کا بھی شکار تھا۔ عام حالات میں اس کا نشانہ میرا سر ہوتا اور وہ چیز میرے سر پر لگتی تو شاید میں ہوش میں آنے کے بعد بھی آئی بی سے سروپا منظوم فرماتا جیسی بعض اوقات سرکاری حکام اور وزرا حقائق کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

میں نے جوابی حملہ پیڈسٹل اٹھا کے کیا مگر اس کا نچلا حصہ میری توقع سے زیادہ بھاری ثابت ہوا۔ میں نے اسے گرز کی طرح گھمایا اور کسی دشواری کے بغیر پیڈرو نے جھک کے خود کو بچا لیا۔ گرز کھڑکی پر لگا اور اس کے سارے شیشے ایک چھناکے سے بکھر گئے۔

مجھے معلوم تھا کہ اب پیڈرو کی باری ہے اور وہ مجھے پھر سنبھلنے کی مہلت نہیں دے گا۔ اس نے رسی میں کوئی بھاری چیز باندھ رکھی تھی۔ بعد میں یہ جان کے مجھے بڑی ہنسی آئی تھی کہ وہ تانبے کا ایک لوٹا تھا جو باتھ روم میں استعمال ہوتا تھا۔ پیڈرو نے ایک چادر پھاڑ کے رسی بنائی تھی اور لوٹے کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کے خاصا مؤثر ہتھیار ایجاد کر لیا تھا۔ مجھ سے پانچ چھ فٹ دور رہتے ہوئے اس نے پھر لوٹا گھمایا اور مجھے کود کے پیچھے ہٹنا پڑا۔

پیڈرو کا وار خالی گیا اور لوٹا ایک ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر لگا۔ میں نے پیڈسٹل پر لعنت بھیجی اور پیڈرو پر جست لگا دی۔ لوٹا بڑی تیزی کی چیز ہوتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی ٹونٹی کہیں پھنس گئی ہو۔ پیڈرو اپنے ہاتھ میں رسی کو جھٹکتا رہ گیا اور میں اس کے اوپر جا گرا۔

وہ آسانی سے مغلوب ہونے والا شخص نہیں تھا۔ ایک بار تو اس نے مجھے ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے اچھال دیا اور پہلے میں

قالین پر گرا پھر ڈریسنگ ٹیبل کا اسٹول مجھ پر گرا اور میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو آئینے کی کرچیوں سے میرے ہاتھ زخمی ہو گئے۔

پیڈرو اٹھ کے کھڑکی کی طرف دوڑا تھا کہ میں نے اس فٹبالر کی طرح ڈائیو ماری جو باؤنڈری سے چند انچ کے فاصلے پر گیند کو روک لیتا ہے۔ میں پیڈرو کی ٹانگ پکڑنا چاہتا تھا۔ میرے ہاتھ میں صرف اس کا جوتا آیا لیکن نتائج میری توقعات کے مطابق نکلے۔ پیڈرو بھدے پن سے منہ کے بل گرا اور اس نے ہاتھ فرش پر جما کے چھپکلی کی طرح آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اس کے ہاتھ بھی کھڑکی کے شیشوں سے زخمی ہو گئے۔

میں نے اس کا پاؤں پکڑ کے ایک جھٹکا دیا اور وہ تھوڑا سا پیچھے سرک آیا۔ میں اس کی کمر پر سوار ہو گیا اور میرے ہاتھ اس کی گردن پر جم گئے۔ میں نے اس کا ایک ہاتھ موڑ کر کمر پر رکھ لیا۔

"بس استاد، بہت ہو گیا مذاق۔" میں نے کہا۔ "ڈاؤ اب وہ ریوالور مجھے دے دو جس سے تم مجھے شوٹ کر رہے تھے۔ اسی سے میں تمہارے جسم میں ایک سوراخ اور کر دوں۔ باقی تو قدرت نے کیے ہیں۔"

وہ چلانے لگا۔ "تم میرا بازو تو چھوڑو۔ ہڈی ٹوٹ جائے گی۔"

"صرف ہاتھ؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "تمام انسانوں کے جسم میں شاید دو سو پانچ ہڈیاں ہوتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے جسم میں چار سو چوراسی ہوں۔ تم سے تم چار سو تین تو ہوں۔ آخر تم استاد ہو۔"

اس نے مزاحمت ترک کر دی تھی۔ "میں اپنی ہار مانتا ہوں سکندر۔ میرے پاس کوئی ریوالور نہیں ہے۔ تم تلاشی لے کر دیکھ سکتے ہو۔"

میں نے اسے کھڑا ہونے کا موقع دیا۔ "اگر فوراً جہنم رسید ہونا نہیں چاہتے تو سیدھے ہو جاؤ۔ نیلام کی طرح اور منہ دیوار کی طرف کر لو۔"

پیڈرو نے تعمیل کی۔ "تمہیں غلط فہمی......"

میں نے اس کے ایک لات ماری۔ "تمہارے بارے میں غلط فہمی صرف تمہارے باپ کو ہوئی ہوگی جو تمہیں اپنی اولاد سمجھتا تھا۔ میرے سامنے یہ بکواس مت کرنا۔"

وہ دیوار سے ٹکرایا۔ اس کی ناک اور دانت یقیناً تصادم سے خاصے متاثر ہوئے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے بولا۔ "یہ سب جو تم کر رہے ہو، اس سے کیا ملے گا تمہیں۔ تمہیں پھر میری مدد کی ضرورت ہوگی۔"

میں نے اسے دوسری بار لات مار کے دیوار پر منتقل کیا۔ "تمہارے مقابلے میں شیطان ہو تو میں اس کی مدد قبول کرنے کو ترجیح دوں گا۔"

وہ نیچے گرا اور آہستہ آہستہ کھڑا ہوا۔ "کل بھی تمہاری مدد کرنے والا میں ہی تھا۔ میں نے ہی بتایا تھا تمہیں کہ غالب اور نازو کہاں ہیں۔ میں نے جان پر کھیل کے تمہاری مدد کی تھی تم بھول گئے۔"

میں نے کہا۔ "آج کی بات کرو۔ اچانک تمہارے اور چودھری دلاور کے سب اختلافات کیسے ختم ہو گئے۔ تم تو ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو گئے تھے۔"

اس نے کہا۔ "ہمارے درمیان دوستی اور دشمنی سب کچھ ضرورت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو رابعہ کو...."

میں نے کہا۔ "رابعہ کو کیا ہوا ہے؟"

وہ عجیب طریقے سے ہنسا۔ "وہ تمہارے ساتھ تھی۔"

"وہ میرے ساتھ ہے اور رہے گی...." میں نے اس کے بال پکڑ لیے۔

"کہاں ہے؟ مجھے تو نظر نہیں آئی۔" وہ اذیت سے بولا۔

میں نے اس کا سر دیوار پر دے مارا۔ "اب بتاؤ کہاں ہے؟"

پیڈرو لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ "بہت دیر ہو گئی.... چودھری دلاور اور رابعہ.... ایک ساتھ.... ایک ہی جگہ...."

میرا اندیشہ ایک دم حقیقت کا بھیانک روپ دھار کے یوں ڈرانے لگا جیسے سنسان جنگل میں آدھی رات کے بعد دہشت بھوتوں اور چڑیلوں کی شکل میں سامنے آ کے ڈراتی ہے۔ میں اس کے سر کو پھر دیوار پر مارنے ہی والا تھا کہ ایک روشنی سی دماغ میں چمکی تھی۔

"چودھری دلاور بھی اندر نہیں آیا۔ وہ بھی اندر آیا۔" استاد پیڈرو مسکرایا۔ "کہاں چلے گئے، یہ نہیں بتاؤں گا میں...."

میرے جسم میں دوڑنے والے خون کا درجۂ حرارت بڑھنے لگا۔ ایک اندر کی آواز چلا چلا کے مجھے الزام دے رہی تھی۔ "تم نے گدھے اور احمق ہو۔ تم مسٹر سکندر اعظم ہو۔ تمہیں بہت غرور تھا۔ اس خیال کو تم نے کیوں اہمیت نہیں دی کہ تم جواب انکار نہ کیا ہو گا کیونکہ بھولی کو اسونی کوئی نہیں کر سکتا۔ صرف تمہارے جذباتی پن کے باعث ایسا ہوا۔ تمہاری ہماری ناعاقبت اندیشی سب خوش فہمی ہے تمہاری۔ حقائق دیکھے سمجھے بغیر تم نے نفرت کے پہاڑ پر چڑھ کے انتقام کے اندھے غار میں چھلانگ مار دی۔ تم نے ایک کم خطرناک دشمن کا تعاقب اس طرح کیا جیسے بلی کسی چوہے کے تعاقب میں دوڑے اور پاگل کتے سے ٹکرا جائے۔ تم نے دانت دیکھا اور دام میں گرفتار ہو گئی رابعہ۔ اسے لے گئے اپنے چودھری صاحب۔ اب تم لے جاؤ استاد پیڈرو کو۔"

میں نے چلا کے کہا۔ "یہ غلط ہے، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

دروازے میں پان والا نمودار ہوا۔ "کیا نہیں ہو سکتا؟"

میں نے پیڈرو کو چھوڑ دیا اور پان والے کی طرف دیکھا۔ "چاچا ادھر آ گئے؟"

"بچے آپ آ گئے جی۔ کھڑکی سے۔" وہ بولا۔

"پر لائٹ تم نے جلائی تھیں؟"

"ہاں جی۔ مین سوئچ آف تھا۔"

میں نے کہا۔ "باہر کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں جی۔" وہ میری بات سمجھے بغیر بولا۔ "سب خیر ہے۔ پہلے بہت بچایا آپ کو اور آپ نے بھی کمال کر دیا۔ بالکل فلموں کی طرح چلتی گاڑی پر جمپ ماری اور یوں نکل گئے۔ ہوا کی طرح۔"

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ "باہر اب کون ہے؟"

"کوئی نہیں جی۔ سب چلے گئے۔ اللہ نے بڑی خیر کی۔ وہ گاڑی والا بھی فوراً بھاگ گیا۔"

میں نے بے خیالی میں کہا۔ "گیٹ پر ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔"

"ہاں جی.... گاڑی تو تھی۔ اب نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "اور.... ایک شخص تھا۔ چودھری دلاور۔"

"کون جی.... میں تو نہیں جانتا کسی چودھری دلاور کو۔"

"اچھا.... وہ خاتون.... جو میرے ساتھ تھیں۔ اس کو تم نے دیکھا؟" میں نے کوشش کی کہ اپنی کمزوری کا اظہار لہجے سے نہ ہونے دوں۔

"وہ.... وہ ادھر ہی تو آئی تھیں جی.... اب تو باہر کوئی نہیں ہے۔" پان والا سوچ کے بولا۔ "وہ شاید گاڑی میں چلی گئیں۔"

میں نے پیڈرو کو نظر بچا کے دیکھا۔ "اگر رابعہ کو کچھ ہوا.... تو تم میری کمال اُترا کے جوتے بنواؤ گے اور.... کے بعد چودھری دلاور کو؟" پیڈرو نے میری بات کاٹ دی۔ "ہم تو شاید اس لیے دوسرے تھے کہ زندگی بھر کتوں کی طرح لوگوں کے جوتے چاٹیں اور جوتے کھائیں۔ جیسے جی بھی ذلیل ہوں اور مرکے بھی۔ لکھا ہوا ہے کہ چودھری دلاور کا تم آج تک کچھ نہیں بگاڑ سکے۔"

میں نے اس کے منہ پر ایک مکا مارا۔ "میں اسے بھی زندہ گاڑ دوں گا۔ اب تک قسمت اسے بچاتی رہی لیکن...."

"لیکن کیا؟" پیڈرو نے آستین سے وہ خون صاف کیا جو بہہ کر ہونٹوں کے کنارے تک آ گیا تھا۔ "آج تمہیں اچانک نواز غیب خیال ہے کہ اب قسمت اس کا ساتھ نہیں دے گی۔"

میں نے اسے مکے مار مار کر اس کے چہرے کا حلیہ بگاڑ دیا۔ "رابعہ دور ہے تمہارے بھونکنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس کے بعد میں نے اسے اندر کے ایک باتھ روم میں بند کر دیا اور لوٹ آیا۔

پان والا گھبرا گیا تھا۔ "جناب.... یہ کیا ہے جی؟"

میں نے کہا۔ "یہ اس بدمعاش کا ساتھی ہے جو رابعہ کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ تم نے تو دیکھا ہوگا؟"

"بدمعاش.... اغوا.... یا میرے خدا!" پان والے نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔ "یہ کس مصیبت میں پھنس گیا میں؟ بھائی میں نے کچھ نہیں دیکھا خدا کی قسم۔ میں چلتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ایک منٹ میری بات سن لو۔"

وہ رک گیا۔ "بات کیا سنوں جی۔ یہاں تو کسی کے ساتھ بھلائی کرنا بھی برائی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ چکر ہی کچھ اور ہے۔ میں کسی کی گواہی میں نہیں پڑ سکتا جی۔"

میں نے اسے تسلی دی۔ "ڈرو نہیں، میں تمہارا نام کسی کے سامنے نہیں لوں گا اور نہ تمہیں گواہی کے لیے بلاؤں گا۔ تم مجھے بتاؤ...."

"دیکھو جی، میں ہوں غریب بال بچوں والا آدمی۔ مجھے تو معاف ہی رکھو۔ ایک طرف وہ بدمعاش ہیں جو میرا پان کا کھوکھا ہٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں نے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں کھوکے کے لیے یہاں جگہ مل جائے گی۔"

"وہ پتا نہیں کب ملے گی جناب۔ ابھی تو صرف وعدہ ہے۔ ان بدمعاشوں سے جھگڑا کر کے آپ نے میرے لیے اور مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ اب وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔" وہ تقریباً رونے پر آ گیا۔

میں نے کہا۔ "وہ تمہیں ویسے بھی نہ چھوڑتے۔ بہتر ہے کہ تم وہ جگہ خود ہی چھوڑ دو۔ آج ہی اپنا سامان اٹھا لو۔"

وہ مجھے احمقوں کی طرح دیکھنے لگا۔ "کیا بات کرتے ہو جی! وہی تو ایک رزق کا وسیلہ ہے۔"

"رزق کے وسیلے خدا فراہم کرتا ہے۔ کوئی انسان نہ کسی کا رزق بند کر سکتا ہے اور نہ خدا کی مصلحت کو کچھ سمجھتا ہے۔ کیا پتا اس میں بھی تمہارے لیے بہتری کا سبب ہو۔" میں نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

وہ کنفیوز ہو گیا۔ "میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا جی۔"

میں نے کہا۔ "اچھا دیکھو، وقت کم ہے۔ پھر بات کریں گے تم سے۔" میں نے گھڑی دیکھی۔ "ابھی یہ بتاؤ کہ باہر کیا ہوا تھا میرے آنے کے بعد؟"

"باہر.... کچھ نہیں۔ وہ گاڑی والا پہلے تو چلاتا رہا، بک بک کرتا رہا کہ.... خیر جی چھوڑیں اس کی بات۔ وہ تو دو منٹ بعد ہی گاڑی لے کر بھاگ گیا تھا۔ کسی نے اسے کہہ دیا تھا کہ مجمع دیکھ کے پولیس نہ آ جائے۔ اس کے جاتے ہی لوگ بھی ادھر ادھر ہو گئے۔ میں وہیں کھڑا وکیل صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے پہلے تو آپ کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ آپ کا نام لے کر چیخ بھی ماری تھی۔ آپ گاڑی پر کود کے نکل گئے تو ان کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ وہ گرنے لگی تھیں مگر میں نے سنبھال لیا اور اندر اسٹول پر بٹھایا، پانی پلایا اور تسلی دی کہ اللہ نے خیر کی، کچھ بھی نہیں ہوا۔ آپ

www.paksociety.com

پریشان مت ہوں۔ ان کو یقیناً آپ کو خراش بھی نہیں آئی ہوگی۔"

میں نے کہا "اب ذرا ذہن پر زور دے کر بتاؤ۔ کیا اس وقت بھی گیٹ کے سامنے گاڑی موجود تھی؟"

"ہاں جی۔ گاڑی وہیں تھی۔ وکیل صاحب اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں اور ان کی حالت بڑی گندی ہو رہی تھی۔ کیا بتاؤں میں کیسی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا ان کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ میں تو گھبرا گیا تھا جناب۔"

"اچھا۔ گاڑی کے اندر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا؟"

اس نے سوچ کے کہا "ہاں جی مگر بعد میں وہ بھی اتر کے اندر آ گیا تھا۔"

میں نے کہا "وہ اندر تو نہیں آیا تھا۔"

"ٹھیک جناب! میں نے جو دیکھا تھا بتا دیا" پان والے نے پریشانی سے کہا "مجھے کیا معلوم گیٹ سے اندر داخل ہو کے وہ کہاں گیا؟"

میں نے کہا "آگے بولو۔"

"اس کے بعد جناب وکیل صاحب نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے کہا کہ میں بھی اندر جا رہی ہوں تو میں نے کہا کہ ضرور جاؤ جناب۔ آپ کا اپنا گھر ہے لیکن یہ صاحب کو اچانک کیا ہو گیا تھا؟ ایسے کیوں بھاگے تھے وہ؟ اللہ نے بال بال بچایا۔ میری بات پر بیگم صاحب نے کہا کہ ذرا نظر رکھنا کوٹھی پر۔ کوئی ایسی ویسی بات نظر آئے تو پولیس کو بتا دینا۔ میں نے کان پکڑ کے کہا وکیل صاحب، میرے باپ کی سو بار توبہ۔ میں پولیس کو دوری سے سلام کرتا ہوں۔ اس پر وکیل صاحب نے ایک نمبر لکھ کے دیا مجھے کہ اچھا اس نمبر پر فون کر دینا۔"

"وہ فون نمبر ہے تمہارے پاس؟" میں نے کہا۔

پان والے نے اقرار میں سر ہلایا "کاغذ کی پرچی پر لکھا تھا۔" وہ پرچی نکال کر مجھے نمبر بتانے ہی والا تھا کہ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا "مجھے معلوم ہے کہ وہ کس کا نمبر تھا۔ اسے سنبھال کے رکھو۔ بعد میں تمہارے کام آئے گا۔"

"وہ بھی کسی وکیل کا نمبر تھا جی۔"

میں نے کہا "ہاں یار! مجھے معلوم ہے۔ مجھے نام بھی معلوم ہے۔ تم آگے بولو۔ اس کے بعد وکیل صاحب اندر آ گئی تھیں؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "انہوں نے آرام سے سڑک پار کی اور اندر چلی گئیں۔"

میں نے کہا "ذرا سوچ کے بتاؤ، اس وقت بھی گاڑی وہاں تھی؟"

"گاڑی تھی جناب، بالکل وہیں تھی۔"

"اور وہ شخص جو اندر بیٹھا ہوا تھا؟"

"میں نے بتایا تھا کہ وکیل صاحب سے پہلے ہی وہ اندر چلا گیا تھا" پان والے نے کہا "شاید پانچ منٹ پہلے۔"

میں نے سر ہلایا "تم نے وکیل صاحب کو گیٹ سے گزر کر اندر جاتے دیکھا تھا؟"

"آپ تو پولیس والوں کی طرح جرح کرتے ہو جی۔ دیکھا نہیں تھا؟" پان والا بولا "پھر پانچ یا دس منٹ بعد میں نے دیکھا گاڑی والا ڈرائیور کی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تو میری نظر گئی۔ ادھر اس سے پہلے میں تھوڑی دیر کے لیے مصروف ہو گیا تھا۔ میں نے لائٹ آف کی اور کھوکھا بند کر دیا۔ اس وقت میں نے دیکھا تو اگلی سیٹ پر وکیل صاحب بیٹھی تھیں۔"

"بیٹھی تھیں؟ کیسے بیٹھی تھیں؟"

"کیسے... جیسے سب بیٹھتے ہیں" وہ میرے سوال پر بوکھلا گیا۔

میں نے کہا "میرا مطلب ہے، بالکل سیدھی تھیں۔ وہ ہوش میں تھیں یا بے ہوش؟ کیا انہوں نے تمہاری طرف دیکھا تھا؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا "میری طرف تو نہیں دیکھا تھا۔ سیدھی نہیں کہ وہ... ہوش میں ہی ہوں گی جی۔ بے ہوش آدمی سیدھا بیٹھ سکتا ہے سیٹ پر۔"

"بالکل ٹھیک خیال ہے تمہارا" میں نے کہا "کیا پچھلی سیٹ پر بھی کوئی تھا؟"

"میں نے دیکھا نہیں جناب۔ سچی بات ہے کہ پیچھے تو نظر نہیں گئی تھی میری۔ اس کے بعد گاڑی چلی گئی۔"

"تم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ پیچھے میرا مطلب ہے وکیل صاحب کے پیچھے کوئی ریوالور لیے بیٹھا تھا یا نہیں؟"

پان والے نے نفی میں سر ہلایا "میں نے نہیں دیکھا جی۔"

میں نے کہا "تو وکیل صاحب بالکل سیدھی بیٹھی ہوئی تھیں اپنے سامنے؟"

"لگتا تو ایسا ہی تھا۔"

میں نے کہا "بے ہوش آدمی کو بھی چند منٹ کے لیے سہارے سے لگا کے سیدھا بٹھایا جا سکتا ہے۔ کیا تم نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ وکیل صاحب باہر کب آئی تھیں اور کیسے آئی تھیں؟ خود آئی تھیں یا کوئی انہیں اٹھا کے لایا تھا؟"

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا "میں نے بتایا نا جناب، سامنے تو میں نے کھوکھا پہلے ہی بند کر دیا تھا۔ ان بدمعاشوں کے جانے کے پیچھے کا حصہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے وکیل صاحب کو پیچھے ہی بٹھا دیا۔ سامنے فٹ پاتھ پر تو لوگ جمع ہو جاتے۔ ان کا تماشا بن جاتا۔ وہ چلی گئیں تو میں نے سوچا کہ اب کھوکھا بند کر کے نکل جاؤں۔ اس میں پانچ دس منٹ لگے تھے۔ دوبارہ میں نے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز پر کوٹھی کی طرف دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سب لوگ چلے گئے ہوں گے مگر گیٹ کا تالا کھلا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا، دیکھتا رہا کہ اندر کوئی ہو گا تو باہر بھی آئے گا۔ اندر سے مجھے شک ہوا کہ کہیں کوئی معاملہ گڑبڑ نہ ہو۔ میں

اندر کون ہے اور کیا کر رہا ہے۔ مجھے پچھلی طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک آواز تو آپ کی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ اندر جھگڑا ہو رہا ہے۔ میں نے پیچھے سے آ کے دیکھا تو کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ باقی سب بند تھے۔ میں نے باہر کی لائٹ جلانے کی کوشش کی تھی تو بٹن کا سوئچ نظر آ گیا۔ اسے آن کرتے ہی اندر بھی لائٹ جل گئی۔ میں کھڑکی کے راستے پیچھے سے اندر آ گیا۔"

میں نے اس کی بات پوری توجہ سے سننے کی کوشش کی تھی لیکن میرا ذہن بار بار رابعہ کے اغوا کے خیال سے مضطرب ہو رہا تھا۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا لیکن پان والے کے بیان پر شبہے کی گنجائش بھی نہ تھی جس نے خود رابعہ کو دلاور کی گاڑی میں جاتا دیکھا تھا۔ لہٰذا غلطی کا امکان بھی اس لیے نہیں تھا کہ جب چودھری اور دلاور آئے تھے تو ان کے ساتھ کوئی عورت نہیں تھی چنانچہ دلاور کے ساتھ بیٹھنے والی عورت رابعہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ بعید از قیاس تھا کہ وہ خود اس کی کار میں جا بیٹھی ہو۔ ظاہر ہے اس کو زبردستی لے جایا گیا تھا یا مجبور کر دیا گیا تھا۔

رابعہ کو اغوا کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ کچھ نہ کچھ مزاحمت ضرور کرتی اور زبردستی کے جواب میں شور ضرور مچاتی۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے موقع ہی نہ ملا ہو۔ اسے دلاور نے اچانک وار کر کے قابو میں کر لیا ہوگا۔ دلاور گیٹ کے اندر تھا مگر کوٹھی کے اندر نہیں تھا۔ اسے یقین ہوگا کہ رابعہ میرے پیچھے ضرور آئے گی اور غالباً رابعہ نے اس کی توقعات کے عین مطابق احتیاط سے کام نہیں لیا۔ اس نے گیٹ سے سیدھا گزر کے اندر آنے کی کوشش کی ہوگی اور گیٹ کے پیچھے چھپے ہوئے دلاور نے پیچھے سے اس کے سر پر ریوالور کے دستے سے اسے ناک آؤٹ کر دیا ہوگا۔ اسے گرنے سے پہلے سنبھال کے وہ گاڑی تک گھسیٹ کر لے گیا ہوگا۔ گیٹ سے گاڑی بمشکل سے پانچ چھ فٹ کا فاصلہ تھا اور گاڑی کے پیچھے ہونے والی اس کارروائی کو رات کے اندھیرے میں دیکھنے والا کون تھا۔ دلاور نے باہر آنے سے پہلے اطمینان کر لیا ہوگا کہ فٹ پاتھ پر کوئی نہیں ہے۔ بالفرض محال دور سے کسی نے کچھ دیکھا ہوگا تو اس کی سمجھ میں کوئی بات آنے سے پہلے گاڑی روانہ ہو چکی تھی۔

رابعہ کوئی عام عورت نہیں تھی۔ وہ ایک مشہور وکیل تھی۔ اس کو اغوا کر کے کہیں قید رکھنا چودھری دلاور اینڈ کمپنی کے لیے بھی مشکلات پیدا کر سکتا تھا اور اس سے دلاور کی نیک نامی کمانے کی تمام خواہش خاک میں مل سکتی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ شہر بھر میں اس واردات کا صرف چرچا ہی نہیں ہوگا، ہر جگہ طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ سب سے پہلے تو ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن اٹھ کھڑی ہوگی۔ بار کی دیگر تنظیموں کے ساتھ ملک بھر کے وکلا بھی احتجاج کریں گے۔ پولیس ان کا ہمنوا ہوگا اور پبلک کے ساتھ ساتھ سیاسی جماعتیں بھی اپنی اپنی دکان چمکانے کے لیے حکومت کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ شروع کر دیں گے۔ پولیس پر چودھری دلاور کو گرفتار کرنے کے لیے اتنا دباؤ ہوگا کہ اس کا روپوش رہنا بھی ناممکن ہو جائے گا۔ اس نے ابھی ابھی اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ وہ اتنی بڑی بدنامی مول لینے کی حماقت نہیں کر سکتا۔ صرف یہی ایک احساس میرے لیے باعثِ اطمینان تھا لیکن دوسری طرف میں سمجھتا تھا کہ عام عورت نہ ہونے کے باوجود رابعہ ایک عورت ہے جس کی عزت و آبرو کا آبگینہ حباب سے زیادہ نازک ہوتا ہے۔ مرد ایک ہفتہ یا ایک مہینہ بھی دشمنوں کی قید میں کاٹ آئے تو اس کی نیک نامی پر حرف نہیں آتا۔ عورت دشمنوں کے ساتھ ایک گھنٹا بند کمرے میں گزار آئے تو اس کے ماتھے پر سب کو کلنک کا ٹیکا نظر آنے لگتا ہے۔ دشمن تو دشمن ہی ہوتا ہے۔ وہ رابعہ کو انگلی بھی نہ لگائے لیکن اپنے لبوں پر ایک معنی خیز فاتحانہ مسکراہٹ سجا لے تو رابعہ کی کوئی دلیل اس کی پاک دامنی کو کھویا ہوا اعتبار عطا نہیں کر سکتی۔

میں قبل از مرگ واویلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں خوف کے ساتھ ایک احساس تحفظ کا بھی تھا۔ چودھری دلاور مجرم تھا اور اس کے جرائم کی فہرست کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ اسمگلر تھا، غدار تھا۔ اس کے نزدیک دولت کا حصول ہی مقصدِ حیات تھا جس کی خاطر وہ کچھ بھی کر سکتا تھا اور اس کے مقابلے میں وہ انسانیت کو محض ایک بے معنی لفظ سمجھتا تھا مگر وہ بے وقوف نہیں تھا۔ اسے اپنے قول و فعل کی اچھائی برائی پر کسی سے رائے لینے کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ نفع نقصان کو ملحوظ رکھے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ وہ رابعہ کے اغوا کے جرم میں ملوث ہونے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ پہلے بھی شیطان تھا مگر اب اس کی تمام کوششوں کا مقصد خود کو فرشتہ ثابت کرنا تھا اور رابعہ جیسی عورت کے اغوا کا جرم اتنا سنگین تھا کہ اس کا نام بھی اس واردات میں آتا تو اس کا سیاسی مستقبل شروع ہونے سے پہلے ہی تباہ ہو جاتا۔

چودھری دلاور اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے والا آدمی نہیں تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جواب میں ایم آر ایس اس کا خانہ خراب کر دے گی۔ ہم میں سے کوئی بھی اس اغوا پر قانون کے مطابق کارروائی کے نتائج کا انتظار کرتے ہوئے خاموش بیٹھنے والا نہیں تھا۔ ایم آر ایس کو قانون کی مجبوری کا بھی اتنا ہی احساس تھا جتنا قانون کے رکھوالوں کی غیر ذمے دارانہ روش کا اور فرض شناسی کے معاملے میں عدم دلچسپی کا۔ ایم آر ایس ایسے تمام معاملات کو اپنے انداز میں طے کرنے کی اہل تھی جو قانونی مسائل کی بھول بھلیوں میں اور سرخ فیتے کی کارروائی میں برسوں الجھے رہنے کے بعد سرد خانے کی نذر ہو جاتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ چودھری دلاور موجودہ حالات میں ایم آر ایس سے براہِ راست تصادم نہیں چاہے گا۔

مجھے رابعہ پر بھی بھروسہ تھا کہ وہ اپنا دفاع کر سکتی ہے اور دلاور کی عقل کو راہِ راست پر لا سکتی ہے۔ جذبات کی رو میں بہہ کے یا اشتعال کی کیفیت میں ایک غلط قدم اٹھانے والے چودھری دلاور کو

www.paksociety.com

سمجھا سکتی ہے کہ اس نے اپنے مستقبل کے لیے کتنے سنگین خطرات کو دعوت دی ہے۔ اس نے مصالحت اور مفاہمت کی جتنی کوشش کی تھی اس کے پیش نظر مجھے دلاور سے ایسی بے وقوفی کی توقع نہیں تھی۔ مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ کہیں رابعہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ نہ گئی ہو۔ دلاور نے اسے کہا ہو کہ وہ کوٹھی کے معاملات پر اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ رابعہ کو یقین دلا دیا ہو کہ سکندر کو پتہ نہیں ہوگا۔ پیڈرو خود اسے گھر پہنچا دے گا۔ پیڈرو مسلح نہیں ہے وہ سکندر کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ شاید وہ رابعہ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو کہ درمیان میں اس کی کوٹھی پر چاندنی بیگم اور گولا پہلوان کے قبضے میں اس کا ہاتھ نہیں تھا اور وہ رابعہ کو بتا سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا تھا اور کیسے ہوا تھا۔

اس کے باوجود رابعہ کا مجھے کچھ بتائے بغیر چوہدری دلاور کے ساتھ چلے جانا میرے لیے ناقابل فہم تھا۔ حقیقت کچھ بھی تھی اور وجہ کچھ بھی ہو، میں اب مزید تاخیر کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اس خیال سے مطمئن نہیں ہو سکتا تھا کہ استاد پیڈرو میرے قبضے میں ہے اس لیے رابعہ محفوظ رہے گی۔ چوہدری دلاور جیسے لوگوں کے لیے استاد پیڈرو جیسے کرائے کے بدمعاش بہت تھے مگر میرے لیے اس زندگی، اس جہان، ارض و سما کی وسعت اور اس کائنات میں رابعہ صرف ایک ہی تھی اور اس سے ایک لمحے کی جدائی کا تاوان کوئی استاد پیڈرو جان دے کر بھی ادا نہیں کر سکتا تھا۔

پان والا میری صورت کے تغیرات کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور غالباً پریشانی کی اس دلدل سے نکل جانے کی دعا مانگ رہا تھا جس میں اس نے شامت اعمال کے باعث قدم رکھ دیا تھا۔ اس کی نگاہ بار بار اس باتھ روم کی طرف جاتی تھی جہاں میں نے استاد پیڈرو کو خاصی بری حالت میں ڈال رکھا تھا۔

بالآخر اس نے کہا "صاحب... جاتا ہوں جی۔ گھر پر میری بیوی بچے پریشان ہوں گے گیارہ بجے تک پہنچ جاتا ہوں میں... آج..."

میں نے کہا "تم جاؤ۔ اور میرا مشورہ مانو تو ابھی چند دن گھر میں رہو۔"

"گھر میں رہوں...؟"

"ہاں۔ کھوکھے کی طرف آؤ گے تو... میرا مطلب ہے کہ تمہارے وہ دشمن کچھ کر سکتے ہیں جو چاہتے تھے کہ تم اپنا کھوکھا خالی کر دو۔ ان سے مقابلہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ قانون تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"مگر آپ نے تو کہا تھا...؟"

میں نے کہا "ہم تمہارا کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور کریں گے۔ کوئی اور جگہ مل جائے گی تمہیں۔ جو اس سے بہتر ہوگی۔ گھر تمہارا اپنا ہے؟"

اس نے مردہ آواز میں کہا "کرائے کا ہے جی۔"

میں نے کہا "اگر ہو سکے تو گھر بھی بدل لو۔ تم کچھ ایسے معاملات میں الجھ گئے ہو... کہ تمہیں اپنی حفاظت کرنی ہوگی... سے کچھ کہنے کی اور کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ کل ... پر فون کر لینا..."

میں فون کی بات کر ہی رہا تھا کہ اندر کہیں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اگر یہ رابعہ کا پرانا گھر ہوتا تو میں اندازہ کر لیتا کہ گھنٹی کہاں بج رہی ہے یا ڈرائنگ روم میں۔ لیکن وہ گھر عرصے کے ایک ملبے سے بہت پہلے ختم ہو چکا تھا اور اب اس عمارت کا نقشہ ... میں رہ گیا تھا یا رابعہ کے تصور میں۔ اسی زمین پر تعمیر ہونے والی نئی کوٹھی میرے لیے اجنبی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اب اس کا فون نمبر کیا ہے۔ ایک مدت سے کوٹھی ویران پڑی تھی۔ اس کے آخری مکین چاندنی بیگم اور گولا پہلوان زیر زمین خاک ہو چکے تھے۔ پھر اس وقت یہ نمبر کس نے ملایا؟ فون کرنے والا کس سے بات کرنا چاہتا تھا؟

میں نے ساتھ والے کمرے میں جا کے سنا تو گھنٹی بجنے کی آواز کہیں اوپر سے آ رہی تھی اور مجھے یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ زینہ کہاں ہے۔ اندر کے سب کمروں کا آپس میں براہ راست یا ... سے رابطہ تھا۔ میں دوسرے کمرے سے کاریڈور میں آیا تو مجھے زینہ نظر آ گیا۔ چکر کھا کے جانے والا یہ زینہ ڈرائنگ روم یا لاؤنج کے آخری حصے میں تھا۔

فون کرنے والا خاصا مستقل مزاج معلوم ہوتا تھا کہ اس ... اس نے لائن ڈس کنیکٹ نہیں کی تھی ورنہ عام طور پر آٹھ دس گھنٹیاں بجنے پر بھی ریسیور نہ اٹھایا جائے تو لوگ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ کوئی موجود نہیں اور ریسیور رکھ دیتے ہیں۔

میرے اوپر پہنچنے تک فون کو مسلسل بجتے ہوئے ڈیڑھ دو منٹ ہو چکے تھے مگر جیسے ہی میں نے اوپر والے بیڈروم نما لاؤنج کے کونے میں رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا، گھنٹی خاموش ہو گئی۔ میرا ہاتھ رک گیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی شخص مجھے پریشان کرنا چاہتا تھا اور کہیں سے چھپ کے سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ جیسے ہی میں ریسیور اٹھانے لگوں وہ لائن کاٹ دے۔ میں چند سیکنڈ خفت، کوفت اور تذبذب کے جذبات سے مغلوب منتظر رہا کہ گھنٹی پھر بجے لیکن فون تو جیسے ڈیڈ ہو گیا تھا مگر ایسا نہیں تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کے دیکھا تو ٹون آ رہی تھی۔

میں ریسیور کو کریڈل پر رکھ کے پلٹا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بج اٹھی۔ اس بار میں نے لپک کے ریسیور اٹھا لیا۔ کسی مرد نے تصدیق کے لیے مجھ سے نمبر پوچھا۔

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ تم نے کہاں فون کیا ہے؟"

"میں نے یہی نمبر ملایا تھا" وہ بولا۔

"بھائی، بات کس سے کرنی ہے؟ یہاں تو کوئی بھی نہیں ..."

"پھر تم کون ہو؟" اس نے نیم سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ "... کوئی تم سے ہی بات کرنا چاہتا ہے۔"

... نمبر مل جانے کے بعد کچھ لوگ بے سبب تفریح بھی لیتے ... خیال تھا کہ یہ بھی کوئی ایسا ہی فارغ شخص ہے یا پھر ... کو ادھر ادھر کی کال ملانے کے لیے بدنام ہیں۔ ... کہیں آواز سنائی دے جائے تو دل لگی کرتے ہیں اور ... سنا ہے ایسے ہی اندھیرے میں ان کا تیر ... جاتا ہے تو رشتے بھی استوار ہو جاتے ہیں۔ کبھی ... کاروباری۔ پیاسے کو کنواں مل جاتا ہے اور کنویں کا کیا ... سب کی پیاس بجھاتا ہے۔ لوگ آتے ہیں ڈول ڈالتے ہیں ... اپنی راہ لیتے ہیں۔ کنواں وہیں رہتا ہے۔

اچانک رابعہ کی آواز سن کے میں یوں اچھل پڑا جیسے کسی ... نے بچ بچ سامنے آ کے میرے کان میں فائر کر دیا ہو۔

"رابعہ..." میں چلایا۔

"ہاں سکندر..."

"تم کہاں ہو رابعہ؟" میں نے چیخ کے کہا "کہاں سے بول رہی ہو؟ اچانک مجھے چھوڑ کے تم کہاں چلی گئی تھیں؟ جانا تھا تو مجھے بتا کے جاتیں۔ میں کس قدر پریشان تھا۔ تم کو اندازہ ہے؟"

"مجھے اندازہ ہے" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "اینڈ آئی ایم سوری۔"

"سوری! مائی فٹ۔ یہ ایسا طریقہ سکھا دیا ہے انگریزوں نے ہمیں۔ جو زیادتی چاہے کرو اور پھر کہہ دو سوری..."

"سنو سکندر! پہلے میری بات سن لو۔"

"پہلے بتاؤ تم ہو کہاں؟"

"یہ میں... پھر بتاؤں گی..."

اس کے تذبذب نے میرے کان کھڑے کر دیے "ایسی کیا بات ہے رابعہ، ابھی بتانے میں کیا ہے؟ کہیں تم اس حرامزادے کی قید میں تو نہیں ہو؟"

اس نے پھر غیر معمولی وقفے سے کہا "یہ تم فرض کر رہے ہو۔"

"کیا فرض کر رہا ہوں؟" میں نے چلا کے کہا "رابعہ! تم کو چوہدری دلاور کی گاڑی میں بیٹھ کر جاتے ہوئے ساری دنیا نے دیکھا ... ساری دنیا کے ساتھ میں بھی دیکھ رہا تھا۔ تم اگلی سیٹ پر بیٹھی ... تمہیں اغوا کر کے لے گیا ہے نا؟"

رابعہ نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا "نہیں، یہ غلط ہے۔"

"یہ بالکل صحیح ہے۔ تم جھوٹ بول رہی ہو کسی کے ڈر سے ... اور کوئی موجود ہے وہاں جو یہ ساری باتیں سن رہا ہے۔ ہے نا ... بات؟ تو سنتے رہو انہیں، میں بھی انہیں بتانا چاہتا ہوں..." ... چباتے ہوئے کہا۔

"کیوں بلاوجہ ہنگامہ کر رہے ہو! میں کسی کے ساتھ نہیں ... مجھے دلاور نے اغوا کیا تھا اور نہ میں اس کے ساتھ گاڑی ... گئی۔ غلط فہمی ہوئی ہوگی تمہیں۔"

"غلط فہمی!" میں نے یوں چیخ کے کہا جیسے یہ لفظ گالی ہو۔

"پریشان ہونے کی بات نہیں، میں خیریت سے ہوں..."

وہ بات جس کا مجھے ڈر تھا، رابعہ کے انداز گفتگو اور اس کے محتاط لہجے سے سچ ثابت ہو رہی تھی۔ اسے یقیناً اغوا کیا گیا تھا اور اس وقت جو کچھ رابعہ کہہ رہی تھی، اپنی مرضی سے نہیں کہہ رہی تھی۔ کسی مجبوری کے باعث وہ ایسا کہہ رہی تھی۔ میں اس مجبوری کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا تھا مگر اتنے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اس کی اپنی ذات کو خطرہ لاحق ہوتا تو وہ جھوٹ نہ بولتی۔ اس جھوٹ سے میرا یا ہم میں سے کسی کا فائدہ وابستہ تھا۔

میں نے کہا "رابعہ! کیا خود تمہیں یقین ہے کہ میں تمہاری بات پر اعتبار کر لوں گا؟ کیا اس طرح میں تمہیں چھوڑ کے جا سکتا ہوں؟"

"میں کل بات کروں گی..."

"سنو رابعہ! فون بند مت کرنا" میں نے چلا کے کہا "دیکھو، میری بات کراؤ چوہدری دلاور سے۔"

"چوہدری دلاور تو یہاں نہیں ہے۔"

"پھر کون ہے؟ اس کا کوئی حکم کا غلام؟ اسے ایک پیغام دے دو... تم کچھ مت کہو مجھے معلوم ہے وہ سب سن رہے ہوں گے۔ خود چوہدری دلاور نہ ہو تو اس کا چمچہ سب سن رہا ہوگا۔ میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ پیڈرو میرے پاس ہے اور کل تک اس نے تمہیں نہ چھوڑا یا اس نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی تو میں اس... کے سارے خاندان کی... ہیلو، رابعہ! ہیلو۔"

میں نے سخت مشتعل ہو کے چوہدری دلاور کو بڑی فحش گالیاں دی تھیں لیکن جیسے ہی مجھے احساس ہوا کہ رابعہ ایسی گالیاں میرے منہ سے سن کے بھی چپ ہے، مجھے شک ہو گیا کہ لائن کٹ چکی ہے۔ میں نے زور زور سے کریڈل کو دبایا اور ہیلو ہیلو کہتا رہا مگر ریسیور سے مسلسل ڈائل ٹون آ رہی تھی۔ رابعہ کی لائن کاٹ دی گئی تھی۔

میں کچھ دیر صدمے کو برداشت کرنے کی کوشش میں گم کھڑا رہا۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ رابعہ مجھ سے چھن گئی ہے جو کچھ دیر پہلے میرے ساتھ انارکلی میں تھی۔ ہم داتا صاحب کے دربار میں حاضری دے کے نکلے تھے تو ہم نے انارکلی میں دہی بھلے کھائے تھے اور پھر کافی پی تھی۔ اپنا گھر دیکھنے کی خواہش خود رابعہ نے ظاہر کی تھی حالانکہ اس گھر کی زمین کے سوا یہاں اس کا کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ باقی سب یادیں تھیں۔ ان یادوں کے مزار تک باقی نہ رہے تھے۔ نہ وہ کمرا کہیں تھا جس میں کبھی رابعہ کا بیڈروم تھا، نہ وہ جس میں اس کی بیمار ماں لیٹی رہتی تھی۔ اس پرانے گھر کا فرنیچر، ساز و سامان، پردے، قالین، رابعہ کے استعمال کی چیزیں، اس کی کتابیں، باہر کا مختصر باغیچہ، ہر چیز خواب فردا کا نقش ہو گئی تھی۔ یہ ایک جذباتی حماقت تھی، ایک بچکانہ خواہش اور

www.paksociety.com

ایک بے سبب دیوانگی۔ بہ الفاظ دیگر شامت اعمال۔ غلطی میری تھی کہ میں نے اس کی بات مانی۔

مجھے اچانک کمزوری سی محسوس ہونے لگی تھی۔ میرا وجود ایک زلزلے کی زد میں تھا اور ایک طرف جذبات کا تلاطم خیز تھا تو دوسری طرف عقل کے اندیشہ ہائے دوروراز کا طوفان۔ یہ کیا ہوا؟ یہ کیوں ہوا اور اب کیا ہوگا؟ ایک نہیں سیکڑوں سوال تھے جو کیڑوں کی طرح کلبلا رہے تھے اور مجھے کاٹ رہے تھے۔ رابعہ نے اپنے لہجے اور انداز کی بے بسی سے مجھ پر واضح کردیا تھا کہ وہ کتنی مجبور ہے۔ دوسری طرف اس کے الفاظ حقائق کی تردید کررہے تھے۔ اچانک میرے لیے سب کچھ بے مقصد ہوگیا تھا۔ اپنی زندگی، اپنا مقصد حیات، اپنی جدوجہد اور اپنا آئیڈیلزم۔ اصول پرستی، شرافت اور انسانیت، اخلاقی اقدار اور قانون کا احترام کرنے والی خیالی دنیا کسی دیوانے کا خواب تھی اور میں پاگل تھا کہ اس خواب کی تعبیر کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

اچانک اس ویرانے میں ایک بازگشت ابھری۔ "یہ سب بے کار ہے۔" پھر دوسری آواز آئی "یہ دنیا ایسے ہی رہے گی۔"

تیسری آواز نے کہا "اس میں چوہدری دلاور ہی حاکم رہیں گے۔" پھر چوتھی آواز گونجی "وہ معتبر ہوں گے اور معزز..."

"وہ صاحب اقتدار ہوں گے۔"

"وہ انصاف کریں گے اور نظام انصاف بھی انہی کا ہوگا۔"

"ایم آر ایس کے چیف کے لوٗ دنیا کی تسخیر کا خواب دیکھنے والے پاگل سکندر اعظم! تم کو ہر چوہدری دلاور کے سامنے سر جھکانا ہوگا۔ اس کی اطاعت کرنی ہوگی۔"

"ورنہ تمہارا وجود صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹادیا جائے گا۔"

"تمہاری جدوجہد لاحاصل ہے۔"

"تمہاری خواہشات فریب خیال ہیں۔"

"جو کچھ تم کررہے ہو سب بے کار ہے۔"

پھر ایک ساتھ سب آوازوں نے کورس شروع کیا۔ سب بے کار ہے سب بے کار۔۔۔ اب بھی مان لو اپنی ہار۔۔۔ سب بے کار ہے سب بے کار۔۔۔ مان لو اب بھی اپنی ہار۔ پھر وہ مجھ پر قہقہے لگانے لگے۔ ہاہاہا۔۔۔

ان آوازوں کے شور سے میرا سر پھٹنے لگا۔ وہ بدروحیں تھیں، شیاطین تھے اور خیالوں کے عفریت تھے جو ایک ہجوم کی شکل میں میرے چاروں طرف رقصاں تھے اور اپنی بھیانک مکروہ شکلوں سے مجھے ڈرا رہے تھے۔ میں جیسے کسی پرانے قبرستان میں تنہا بیٹھا تھا اور اندھیری رات میں قبروں سے نکل نکل کے ان گنت لاشوں کے کڑکڑاتے ڈھانچے اپنے استخوانی پنجے بجاتے میری طرف بڑھ رہے تھے۔

ایک بار پھر گھنٹی بجی تو میں چونکا اور فون کو یوں دیکھنے لگا جیسے وہ کوئی بھیانک تباہ کن چیز ہے جسے ہاتھ لگاتے ہی سب کچھ تباہ ہوجائے گا۔ نہ میرا احساس رہے گا اور نہ میں رہوں گا۔ ہر خواب چور چور ہوگا اور سناٹا اور سرد منجمد کردینے والا اندھیرا ہوگا۔

گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ پُر آسیب آوازوں کا شور تحلیل ہوکے اس خاموشی کا حصہ بن گیا تھا جو شور سے زیادہ اعصاب شکن تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا اور ریسیور اٹھالیا۔

"رابعہ!" میں نے کہا "تم نے اچھا کیا کہ پھر فون کرلیا۔"

"ابے رابعہ کے گھوڑے! میں تیرا مجازی باپ بول رہا ہوں" میں نے منظر کی آواز سنی "بھوتنی کے یہ کیا ڈراما ہو رہا ہے اس وقت؟"

میں نے گہری سانس لے کر کہا "منظر! تجھے کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں؟"

"کیا بتاؤں دوست" وہ آہ بھر کے بولا "میرے غریب خانے کو ایم آر ایس نے ٹیلی فون ایکسچینج سمجھ لیا ہے۔ کبھی ادھر سے کال آتی ہے کبھی ادھر سے۔ مجھے فون کیا تھا رابعہ نے، گویا دوسری دنیا سے بول رہی ہے۔"

"کیا کہہ رہی تھی؟"

منظر نے کہا "میری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔ اس نے یہ نمبر دیا اور کہا کہ سکندر سے بات کرو، میری تو عقل چکرا گئی۔ میں نے کہا بی بی کیا تمہاری آپس میں بات چیت بند ہے؟ تم خود بھی تو فون کرسکتی تھیں۔ اس نے کہا میں نے ابھی بات کی تھی وہ بہت پریشان ہے اور غصے میں پاگل ہو رہا ہے۔ میری بات سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں۔ میں نے کہا یہ کیا پہیلی ہے میری بہن۔ جب وہ تمہارے اشارۂ ابرو کا غلام اور تمہاری محبت کا اسیر تمہاری بات نہیں سن رہا ہے تو میری خاک سنے گا۔ اور ایسی کیا غلط حرکت فرمائی آپ نے کہ وہ غصے میں بھوت بنا ہوا ہے؟ اس نے کہا کہ بھائی منظر! آپ صرف یہ سمجھادیں کہ وہ کچھ بھی نہ کرے۔ میں بالکل خیریت سے ہوں اور پریشانی کی واقعی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ رابعہ، میں احمق ضرور ہوں مگر اتنا نہیں جتنا سکندر، میرے جگری یار، مت مانتا؟ تمہاری بات میں اقرار ہے تمہاری پریشانی کا اور تمہارے خیریت سے نہ ہونے کا۔ آخر تم کہاں ہو اور وہ کہاں ہے؟ رابعہ نے کہا کہ آپ بھی میری بات سمجھ لیں۔ میں آپ کا مطلب ہے آپ میں سے کسی کو ہر روز فون کروں گی لیکن شرط ہے کہ کسی کا فون ٹیپ نہ ہو اور پولیس پر تو نہ کہا جائے۔ اگر نے ایسا کیا تو مجھے معلوم ہوجائے گا اور پھر رابطہ مشکل ہوجائے گا۔ بس یار میں تو ہکا بکا کھڑا اس پُراسرار معمے کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہ گیا اور لائن کٹ گئی۔ اب آپ فرمائیں یہ ماجرا کیا ہے؟ کوئی نیا کھیل شروع کیا ہے تو یار اور میرے چند رہ بچوں کی ماں کی قسم مجھے اس میں مت شامل کرو۔"

میں نے کہا "منظر یہ بہت سیریس معاملہ ہے۔"

اس نے رونی آواز میں کہا "تمہارا کون سا معاملہ سیریس نہیں ہوا بھائی؟ ایک وہ کیس وہاں تھے۔ دیکھ کیا کیا دیا والے۔ وہ بھی بچے نہیں تھے۔ ایک تم کیا خان ہو، غلطی سے بھی کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس میں مصیبت نہ ہو۔ جھیلنے کو رہ گیا ہوں میں بیچارہ۔"

میں نے کہا "یار، فون پر نہیں بتاسکتا ساری بات۔ تم آسکتے ہو اس وقت؟"

"میاں مجنوں! تم ہو ابھی صرف ایک عاشق۔ شوہر نہیں بنے ہو بڑے جہانت عرف لنڈورے خان" منظر بولا "تمہارا کیا ہے رات فٹ پاتھ پر گزارو یا گھر پہ یا حوالات میں۔۔۔ لیکن میں ہوں ایک شادی شدہ۔ میرے جیسے کسی بھی قیدی کو اس وقت بستر سے ہلنا بھی گناہ ہے اور مشکل ہے جیسا مردے کو سوال جواب کے بعد قبر سے نکالنا۔"

"یار فضول باتیں مت کرو" میں نے بے بسی سے کہا "مجھے نہیں معلوم کہ غالب اور ناز اس وقت کہاں ہوں گے۔ وہ اخبار کے چکر میں آفس گئے تھے کیا پتا ابھی تک وہیں بیٹھے ہوں۔ میرے پاس ان کے آفس کا فون نمبر بھی نہیں ہے۔"

"فون نمبر میں بتارہا ہوں۔"

"مجھے مت بتا" انہیں فون کرکے اور کہہ دے کہ وہ رابعہ کے گھر پہنچ جائیں۔ فوراً سارے کام چھوڑ کر اور جتنی جلدی ممکن ہو۔"

"یار کچھ تو بتادے کہ یہ کیا فون بازی ہو رہی ہے اور کیوں ہورہی ہے؟ رابعہ نے تجھے فون کیا پھر مجھے، میں نے تجھے فون کیا اور اب غالب کو فون کرکے کہوں کہ وہ تجھے فون کرے۔ میری تو نیند اڑ گئی ہے اور پریشانی میں بھوک سے برا حال ہوگیا ہے۔ اب میں سو بھی نہیں سکتا۔ میرا ازدواجی مستقبل سخت خطرے میں ہے۔ ہمارے اقبال خیشہ کے باعث اور حالات یہی رہے تو میرے چندہ بچے نہ ہو جائیں گے یا سولہواں ہوگا تو میرا نہیں ہوگا۔"

پس منظر میں اس کی بیوی نے اسے ڈانٹا "بے شرمی کی بھی حد ہوتی ہے۔"

"تمہاری بھابی صاحبہ پوچھ رہی ہیں کہ آخر بے شرمی کی کوئی حد ہے تم لوگوں کی؟ بھئی سکندر کہہ رہا ہے کہ وہ حد ابھی نہیں آئی۔" یہ آخری بات منظر نے اپنی بیوی سے کہی تھی۔ "اچھا یار، میں ابھی بلا خواستہ... میرے پہنچنے تک بقید حیات رہنا۔ میں غالب کو فون کرکے آتا ہوں۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اب میرا اضطراب کسی حد تک بحال ہونے لگا تھا۔ رابعہ یقیناً کہیں قید تھی جہاں اسے صرف اتنی رعایت حاصل تھی کہ وہ ہم سے فون پر بات کرے لیکن یہ اجازت مشروط کردی گئی تھی۔ ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کریں گے کہ کس فون سے بات کرتی ہے اور خود یا پولیس کی مدد سے کال کو ٹیپ بھی نہیں کریں گے بصورت دیگر رابطے کا یہ وسیلہ بھی باقی نہیں رہے گا۔ یہ بات رابعہ کو اچھی طرح سمجھادی گئی تھی کہ اسے ہم سے کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے۔ وہ مجبور تھی کہ ہم سب کے مفاد میں ان کی بات مانے جو اسے کسی نامعلوم مقام پر ہم سب کی دسترس سے دور لے جاچکے تھے۔

غالباً چوہدری دلاور کے ذہن میں رابعہ کے اغوا کا کوئی منصوبہ نہیں تھا مگر میں نے اچانک سامنے آکے پیڈرو کو گرفتار کرلیا تو چوہدری دلاور کے لیے رابعہ کو اپنے ساتھ لے جانے کے سوا چارہ نہ رہا۔ وہ خود وہاں ٹھہرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور اگر رابعہ خود چل کے اس کے پاس نہ جاتی تو وہ اکیلا ہی خاموشی سے کھسک لیتا۔ رابعہ کو دیکھ کے اس نے اچانک یہ بازی جیتنے کے لیے ٹرمپ کارڈ اپنے ہاتھ میں رکھنے کا فیصلہ کیا۔ میرا آدمی واپس کردو، رابعہ کو لے جاؤ۔ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی تو رابعہ بھی خیریت سے رہے گی۔

لیکن رابعہ کے فون سے اندازہ ہوتا تھا کہ بات اتنی آسان اور مختصر نہیں ہوگی۔ دلاور کے عزائم کچھ اور تھے۔ وہ معاملے کو لمبا کرنا چاہتا تھا اور وہ اس پوزیشن میں بھی تھا کہ سودا اپنی شرائط پر کرے۔ اسے پیڈرو کی نہ اتنی فکر تھی اور نہ ضرورت جتنی مجھے رابعہ کی۔ خود اس کی ذات پر براہ راست الزام نہیں آتا تھا۔ وہ معتبر گواہوں کی مدد سے ثابت کرسکتا تھا کہ جس وقت رابعہ کا اغوا (مبینہ طور پر) ہوا، اس وقت وہ جائے وقوعہ سے بہت دور کسی کار خیر میں مصروف تھا۔ نہ جانے کتنے معززین شہر عدالت میں حلفیہ بیان دینے پر تیار ہوں گے کہ عین اس وقت جناب چوہدری دلاور صاحب ان کے گھر میں دیگر معززین کے ساتھ ایک محفل سماع سے لطف اندوز ہو رہے تھے یا فلاں فلاں کی محفل میں سماجی بہبود کے ایک پروگرام کی تفصیلات طے کررہے تھے جس کو چوہدری صاحب کی سرپرستی حاصل ہے، اور ان "معززین" میں ایسے ایسے لوگ ہوں گے جن کی گواہی کو ہر عدالت تسلیم کرے گی۔

میں آہستہ آہستہ نیچے آیا۔ میرے دل پر پچھتاوے کا بوجھ تھا۔ مجھے شدت سے احساس تھا کہ رابعہ نے اس طرف آنے کی جذباتی خواہش کا اظہار کرکے اتنی بڑی غلطی نہیں کی تھی جتنی میں نے استاد پیڈرو اور دلاور کو دیکھ کے کی تھی۔ میں جذبات کو کنٹرول میں رکھتا تو دیوانہ وار بھاگنے کے بجائے پرسکون رہتے ہوئے خاموشی سے سب دیکھتا رہتا اور اطمینان سے اندر جاکے پیڈرو کے ساتھ دلاور سے بھی نمٹ لیتا۔ ساری خرابی میرے اندھا دھند بھاگنے سے ہوئی۔ میں تو خیر مرنے سے بچ گیا مگر میری حرکت نے ان دونوں کو متوجہ کرلیا۔ انہوں نے رابعہ کو بھی دیکھ لیا اور بدحواسی میں رابعہ میرے پیچھے لپکی تو چوہدری دلاور کو موقع مل گیا کہ خود بھی نکل جائے اور اپنے ساتھ میری شکست کے اسباب بھی لے جائے۔

www.paksociety.com

میں نے اس ایک لمحے کی دیوانگی کو کوسا جب میں ہوش کے بجائے جوش کے جذبات سے مغلوب ہوگیا تھا لیکن اب میرے پچھتانے سے کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

پان والا موقع ملتے ہی فرار ہوگیا تھا۔ باتھ روم کا دروازہ باہر سے اسی طرح بند تھا جیسے میں نے چھوڑا تھا۔ اندر پیڈرو ٹائلوں کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی حالت پہلے سے بہتر نظر آتی تھی۔ اس نے واش بیسن سے منہ دھولیا تھا مگر اس کی آنکھوں کے نیچے نیل نظر آرہے تھے۔ اس کی ناک سوج گئی تھی اور ایک ہونٹ کا کنارا پھٹا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس سے خون اب بھی رس رہا تھا۔

میں نے باتھ روم کا دروازہ اپنے پیچھے بند کیا "پیڈرو! تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

اس نے قمیص کی آستین سے ہونٹ صاف کیے "مجھے دلاور نے ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ یہاں کیا لینے آیا تھا۔"

"دلاور آج کل کہاں رہتا ہے؟"

"وہ اپنے ٹھکانے بدلتا رہتا ہے" پیڈرو نے کہا۔

"کہاں کہاں ہیں یہ ٹھکانے؟"

"میں بھی سارے ٹھکانوں سے واقف نہیں۔"

میں نے اس کی ٹھوڑی پر ٹھونگ ماری "اس کے بیوی بچے کہاں رہتے ہیں؟ اس کا گھر تو کہلائے گا۔"

"بیوی بچوں کو اس نے بہت پہلے باہر بھیج دیا تھا" پیڈرو نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

"باہر کہاں؟"

"لندن" پیڈرو نے خون تھوک دیا۔

"عارضی طور پر؟"

اس نے واش بیسن کا نل کھول کے ٹھنڈے پانی سے کلی کی "نہیں۔ بچے وہیں پڑھتے ہیں۔ اس نے کوئی مکان بھی خرید لیا ہے وہاں۔"

"کس کے نام سے؟"

"اپنے نام سے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اس کے پاس برطانیہ کی شہریت بھی ہے" پیڈرو نے کہا "اس نے سرمایہ کاری کی بنیاد پر اور برطانوی شہریت کو بنیاد بنا کے کینیڈا میں رہائش کی اجازت لے رکھی ہے اور وہ کینیڈا کا شہری بن گیا تو امریکا بھی چلا جائے گا۔"

"تم نے کہا تھا کہ وہ سیاست میں حصہ لینا چاہتا ہے" میں نے کہا "یہ اسی کی پیش بندی ہے؟"

پیڈرو نے اقرار میں سر ہلایا "سیاست دانوں پر برا وقت آتے دیر نہیں لگتی۔ وہ پناہ گاہیں پہلے بنا لیتے ہیں۔"

میں نے اسے گردن دبوچ کے اٹھایا "تم بہت کچھ جانتے ہو مجھے مگر وہ سب جھوٹ تھا۔ تم نے اور اکبر خان نے دلاور کے اشارے پر خود کو ہمارا بھی خواہ ثابت کرنے کے لیے بہت ڈرامے کیے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب میں قائل ہو گیا تھا کہ تم واقعی مظلوم اور ہمدردی کے مستحق ہو۔ تم نے اور اکبر خان نے ہماری جتنی مدد کی تھی وہ ایک پُرفریب کوشش تھی۔"

پیڈرو نے پھنسی پھنسی آواز نکالی "تم کچھ بھی سمجھتے ہو۔"

میں نے اسے پیچھے کی دیوار پر دے مارا اور ایک گھٹنا دبا کے اس کے بال پکڑ لیے "اب تم بے نقاب ہو گئے۔ ساری جھوٹ بولنے کے بعد یہ تمہارے لیے بہت مشکل ہو گا کہ تم میری مشکل آسان کردو گے۔"

اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "تم جانتے ہو کہ تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ اس وقت تمہیں روکنے والا کوئی نہیں ہے کر دو میرا کام تمام۔"

میں نے اس کی گردن پر ہاتھ جما کے دیوار سے دبا دیا۔ اس کا سانس رکنے لگا اور اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلنے لگیں۔ اس نے میری گرفت سے نجات پانے کے لیے ہاتھ پاؤں چلائے مگر میری گرفت سخت سے سخت تر ہوتی گئی۔ پہلی بار مجھے اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں موت کی دہشت نظر آئی۔ شاید میں اس لمحے اسے مار ڈالتا۔ مجھ پر ایک جنونی کیفیت غالب تھی اور پیڈرو کی آنکھوں میں جو حالت تھی اس نے میرے دل کو عجیب سفاک خوشی حاصل ہو رہی تھی۔

اچانک کسی نے لات مار کے دروازہ کھولا "یہ کیا ہو رہا ہے! چھوڑو اسے" کسی نے مجھے چلا کے حکم دیا۔

میں نے پیڈرو کو چھوڑ دیا اور پلٹ کے دیکھا تو مجھے پولیس کی وردی میں ایک سب انسپکٹر نظر آیا جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور کے اشارے سے مجھے باہر آنے کا حکم دیا۔

"کون ہو تم؟ کیوں قید کر رکھا تھا تم نے اس شخص کو؟" سب انسپکٹر نے غرا کے کہا "اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔"

سب انسپکٹر کے ساتھ چار ماتحت تھے۔ ان میں ایک حوالدار تھا اور باقی تین کانسٹیبل۔ مجھے ان کے کمرے کی کھڑکی سے اندر آنے کا بالکل پتا نہیں چلا تھا اور میں عین ارتکاب جرم کی حالت میں پیڈرو کو قتل کرتے ہوئے گرفتار ہوا تھا۔

میں نے سب انسپکٹر کے حکم کی تعمیل کی "تم اندر کیسے آئے؟"

سب انسپکٹر نے میرے منہ پر تھپڑ مارا "مجھ سے سوال کرتا ہے۔ تو بتا پہلے کہ تو یہاں کیا کر رہا تھا؟ یہ تیرے باپ کا گھر ہے...؟"

اس ایک جملے میں سب انسپکٹر نے مجھے چار گالیاں دیں لیکن میں سب برداشت کرنے پر مجبور تھا "یہ کوٹھی رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی ہے۔"

"چل بے کنجری... تیری ماں تھی وہ" سب انسپکٹر کے اشارے پر حوالدار کے ساتھ تینوں کانسٹیبل مجھ پر پل پڑے۔ میں نے اپنے دفاع کی کوشش کی اور حوالدار کو دبوچ لیا

تو سب نہیں ہوگا انسپکٹر۔ میں کوئی چور ڈاکو نہیں ہوں۔"

سب انسپکٹر کے ریوالور کا رخ میری طرف رہا۔ "سب معلوم ہو جائے گا۔ ہم نے تو اس کنجری کے قتل کا کیس داخل دفتر کردیا تھا۔ اس کے یار پہلوان کو بھی تو نے ہی مارا ہوگا۔"

میں نے کہا "اس کوٹھی کی مالک جانانی بیگم نہیں تھی۔ یہ رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ کی کوٹھی ہے۔ میں اسی کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ اسے اغوا کرلیا گیا ہے۔"

سب انسپکٹر نے میری بات سنے بغیر کہا "ہتھکڑی ڈالو اسے۔ یہ قتل کیا دیکھ رہے ہو؟ بروقت پہنچ گئے ہم ورنہ ایک اور لاش پڑی ہوتی۔"

پیڈرو نے کہا "آپ نے خود دیکھ لیا... بس ایک منٹ کی دیر ہو جاتی تو میری لاش ملتی یہاں۔"

"ایک منٹ" میں نے تحقیر سے کہا "کاش یہ لوگ صرف دو منٹ لیٹ ہو کر آتے۔"

سب انسپکٹر نے پھر اپنے ماتحتوں کو حکم دیا "خاموش" میں نے دیکھا تو ایک پیچھے سے پکڑ لو پہلے۔"

میں مزید پیچھے ہٹ کے دیوار سے لگ گیا۔ حوالدار کی گردن ابھی ایک بازو کی گرفت میں تھی "میں خود رضاکارانہ طور پر گرفتاری دے دوں گا لیکن ابھی نہیں۔ تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ میرے دوست عبدالودود منظر کو آنے دو۔ وہ بھی وکیل ہے وہ آنے ہی والا ہے۔"

"دیکھو! تم پڑھے لکھے بندے لگتے ہو۔ تم پر ابھی اقدام قتل کا الزام ہے۔ اغوا اور جیسی بے جا کا کیس بھی بن سکتا ہے اور ناجائز طور پر اندر داخل ہونے کا بھی" سب انسپکٹر نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی "تمہیں گرفتار کرنا ضروری ہے۔ ابھی وکیل کا کوئی کام نہیں ہے۔"

ایک کانسٹیبل نے مجھے گالی دے کر کہا "بکواس کرتا ہے جی۔ اسے کیا پہلے سے معلوم تھا کہ اس نے وکیل بلا لیا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ میں پہلے سے وکیل کو سب بتا چکا تھا۔ یہاں اس کے ساتھی نے رابعہ قاری ایڈووکیٹ کو اغوا کیا تھا جس کی گواہی یہ ہے۔ یہ شخص استاد پیڈرو ہے اور اس کا ساتھی چوہدری دلاور تھا جو رابعہ قاری ایڈووکیٹ کو گاڑی میں ڈال کے فرار ہوگیا ہے۔"

"اچھا جو کہنا ہے تھانے چل کے کہنا۔ سب معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا" سب انسپکٹر نے کہا "شرافت کے ساتھ چلو گے تو فائدے میں رہو گے۔"

میں نے طنز سے کہا "تھانے جاکے بھی فائدہ ہوتا ہے! یہ آج معلوم ہوا۔ سب انسپکٹر! تم نے زبردستی کی تو میں اس حوالدار کی گردن توڑ دوں گا۔ گولی چلا سکتے ہو تو چلاؤ۔ میں جانتا ہوں تمہیں کس نے بھیجا ہے یہاں۔"

سب انسپکٹر کے ماتحت اس کے احکامات کی تعمیل سے قاصر تھے اور میری دھمکی نے اس کی پوزیشن خراب کردی تھی۔ میری گرفت میں تڑپنے والے حوالدار کی کیفیت اس... کالے بکرے سے مختلف نہ تھی جسے قصائی نے شہ رگ پر خنجر رکھ کے کسی کا صدقہ اتارنے کے لیے زمین پر لٹا رکھا ہو۔ ایک طرف قانون کو مجرموں پر اپنی بالادستی کا ثبوت فراہم کرنا تھا تو دوسری طرف ایک مجرم نے اسے اپنی جان بچانے کے لیے ڈھال بنایا تھا۔ اگر سب انسپکٹر فیصلہ کرلیتا کہ ادائے فرض پر ایک حوالدار کی جان قربان کی جاسکتی ہے تو وہ فائر کرسکتا تھا۔ حوالدار بے چارہ بعد میں کیا پاتا؟ ایک تعریفی سند، شہادت کا رتبہ یا زیادہ سے زیادہ جان کا معاوضہ دس ہزار روپے۔ یہ بھی اس کے لواحقین کو ملتے، اسے نہیں۔ دوسری طرف میں بھی اس سے رعایت کرنے والا نہیں تھا اور خواہ اسے مار کے مجھے کچھ حاصل نہ ہوتا مگر میرے عزائم بہت واضح تھے۔

سب انسپکٹر بھی غصے میں تھا "تم تو پیشہ ور قاتل لگتے ہو مجھے۔"

میں نے کہا "تم مجھے کچھ بھی بنا سکتے ہو۔ قتل میں نے آج تک ایک بھی نہیں کیا مگر تم مجھے ایک سو ایک افراد کے درندہ صفت قاتل کے روپ میں پبلک کے سامنے پیش کرنے کا ہنر جانتے ہو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ صرف اس وردی کو پہننے کی تنخواہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ تمہیں نمک حلال کرنا ہے اس معاوضے کا جو کسی نے تمہیں ادا کردیا ہے یا ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ کون ہے وہ انسپکٹر صاحب؟"

"شٹ اپ" سب انسپکٹر نے دہاڑ کے کہا "میں نے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے تمہیں اور میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔"

"بہت خوب! یہ بھی بتا دو کہ تمہیں اس ویران اور غیر آباد پڑے ہوئے گھر میں ہونے والی اس واردات کے بارے میں اطلاع دینے والا کون تھا؟ کسی گمنام کال پر تو تم حرکت میں نہیں آتے خواہ سوال کسی معصوم کی جان کا ہو۔ ہاں حرکت میں برکت ہو تو دوڑے چلے آتے ہو۔"

میرا مقصد اسے باتوں میں لگا کے مہلت حاصل کرنا تھا اور اتنا وقت گزارنا تھا کہ منظر یہاں پہنچ جائے یا غالب اور نازو میں سے کوئی آجائے۔ میں اس مقصد میں کامیاب رہا۔ باہر کوئی گاڑی رکی اور اس کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ گاڑی کوٹھی کے اندر آگئی تھی اور میرا خیال تھا کہ آواز منظر کی کرولا کے دروازے کی ہے۔ میں نے اسی وقت حوالدار کو آزاد کردیا۔

چند منٹ بعد منظر کا چہرہ کھڑکی کے فریم میں نظر آیا "ویری گڈ۔ یہاں تو شوٹنگ ہو رہی ہے کسی فلم کی۔ مگر کیمرا کہاں ہے؟"

"شوٹنگ ریوالور سے بھی ہوتی ہے" میں نے کہا "اندر تشریف لائیے وکیل صاحب!"

www.paksociety.com

"میں شریف آدمی ہوں" منظر بولا "دروازے سے ہی گھر میں داخل ہوتا ہوں۔ ویسے بھی کھڑکی چھوٹی ہے۔"

سب انسپکٹر نے اسے گھورا "تمہارے پاس دروازے کی چابی نہیں ہے۔"

"پھر آپ اندر کیسے پہنچے تھانے دار جی؟" منظر بولا "لیکن اس سوال کا جواب دینے سے پہلے آپ خود کو تھانے دار ثابت کریں۔"

"کیا مطلب؟ تمہیں نظر نہیں آتا۔"

"میری قریب کی نظر کمزور ہے" منظر بولا "ویسے بھی جناب عالی! ہم کو آپ کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ معاف کرنا میں شعر پڑھ گیا غلطی سے۔ تم خاک سمجھے ہو گے۔ مطلب یہ تھا کہ اس بھیس میں کہیں علی بابا اور چالیس چور والا ڈراما تو نہیں ہو رہا ہے۔ کوئی شناخت تو کرا دو اپنی۔"

"تم کو کس نے اختیار دیا ہے کہ تم مجھ سے شناختی کارڈ مانگو؟"

"یہ حق قانون ہر شہری کو بہت پہلے دے چکا ہے۔ میں تو اسی قانون کی کمائی کھاتا ہوں جس پر تم اپنی حاکمیت قائم کرتے ہو۔ اگر تم اپنی شناخت کرانے میں ناکام رہے تو میں فرض کر لوں گا کہ تم جعلی لوگ ہو اور اس وردی کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ تمہارا دوسرا جرم ہو گا بلکہ تیسرا۔"

"پہلا دوسرا بھی بتا دیں وکیل صاحب" اس نے طنز سے کہا۔

"یار تم کسی اختیار کے بغیر میری مؤکلہ کے گھر میں داخل ہوئے اور وہ بھی غلط راستے سے۔ وارنٹ ہے تمہارے پاس؟" منظر بولا "اس کے علاوہ تم نے میرے دوسرے مؤکل پر ریوالور تان رکھا ہے۔ میں نہ آتا تو تم اسے گولی مار دیتے۔"

تھانے دار نے مجبوراً اپنا شناختی کارڈ نکالا "تمہاری دور کی نظر تو ٹھیک ہے نا دیکھ کر۔"

منظر نے یوں سرہلایا جیسے واقعی اس نے سب کچھ دیکھ لیا ہے "اب وارنٹ بھی دکھا دو۔ میرے مؤکل پر کیا الزام ہے' یہ بھی بتا دو۔"

"تھانے چل کے دیکھ لینا۔" سب انسپکٹر نے ناگواری سے کہا اور سپاہیوں کو پھر حکم دیا "چلو پکڑ لو اس کو۔ آرام سے۔"

سپاہیوں نے اشارہ سمجھ لیا اور مجھے ہتھکڑی لگانے کے لیے آگے بڑھے "ہاتھ آگے کرو" ایک کانسٹیبل بولا۔

میں نے ہاتھ آگے بڑھائے اور پھر ایک دم ہتھکڑی چھین کے کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ منظر نے بڑی مشکل سے خود کو بچایا! ورنہ وہ زخمی ہو جاتا۔

مجھے امید تھی کہ سب انسپکٹر میری جارحانہ کارروائی کے جواب میں ضرور کچھ کرے گا۔ اس نے مجھے خبردار کرنے کے لیے فائر کیا۔ وہ براہ راست میرا نشانہ نہیں لے سکتا تھا مگر احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں جھک گیا تھا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ بالکل ٹھیک وقت پر ایک شعلہ سا لپکا۔ یہ کیمرے کے فلیش کی لائٹ تھی۔ منظر نے اس وقت تصویر لی تھی جب انسپکٹر مجھ پر فائر کر رہا تھا اور میں خود کو بچا رہا تھا۔

اب انسپکٹر کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے منظر کو نصف درجن غلیظ گالیوں سے نوازا "تم کیا سمجھتے ہو اس طرح اس کو بچا لو گے؟"

منظر نے عیاری سے کہا "میری فکر چھوڑ دو۔ تم خود کو بچاؤ گے؟ میں تو یہ گفتگو بھی ریکارڈ کر رہا ہوں۔"

سب انسپکٹر کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے منظر کو دھمکیاں دی تھیں اور بہت کچھ کہا تھا جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ تاہم مجھے یوں لگتا تھا جیسے منظر پولیس کے ساتھ ڈراما کر رہا ہے۔ مجھے نہ اس کے ہاتھ میں کیمرہ نظر آیا تھا اور نہ وہ کوئی ریکارڈر لے کر جا رہا تھا۔ پولیس کے عملے کے دیگر ارکان مجھے نظروں سے گھور رہے تھے مگر وہ میرے ساتھ روایتی سلوک کرتے ہوئے ڈر رہے تھے کہ کہیں منظر اس پر خود تصویر بھی نہ اتار لے۔

"تھانے دار جی! اب خیر سے جیسے اندر گئے تھے ویسے باہر آجاؤ۔ یہاں کب تک کھڑے رہو گے؟" منظر مسکرایا "باقی باتیں تھانے چل کر کریں گے۔ میں اپنے مؤکل کی نیک چلنی کی ضمانت دیتا ہوں۔ وہ تمہارے ساتھ تعاون کرے گا۔"

سب انسپکٹر نے میری طرف تنبیہ طلب نظروں سے دیکھا۔ میں نے سرہلایا۔ وہ کانسٹیبل پہلے باہر کود گئے اور دوبارہ فلیش چمکا۔ اب میرے لیے شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ منظر اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ غالب اور نازو میں سے کوئی آیا تھا جو صورت حال کو اپنے مطلب کے مطابق پیش کرنے کے لیے اتفاقی شہادت جمع کرنے میں مصروف تھے۔

"یہ کون فوٹو گرافی کر رہا ہے؟" سب انسپکٹر نے دہاڑ کے کہا۔

منظر نے کہا "اخبار والے بھی آگئے ہیں۔ اتفاق ہے۔"

"اتفاق ہے یا تم لائے ہو انہیں؟"

"آخر آپ بھی تو اتفاق سے ہی آئے تھے تھانے دار صاحب یا کسی نے آپ کو بھیجا تھا؟" منظر نے کہا۔

تھانے دار نے اس سوال کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے پہلے پیڈرو کو باہر جا کے دیکھنے کا حکم دیا کہ کیا واقعی اخبار والے موجود ہیں پھر وہ خود کھڑکی سے باہر آیا۔ فلیش کی لائٹ دوبارہ نظر آئی پھر پیچھے رہ جانے والے کانسٹیبلوں کے اشارے پر آگے بڑھا اور کھلی کھڑکی سے کود گیا۔

"اب تصویر کیوں نہیں بنائی؟" سب انسپکٹر نے مشتعل ہو کے کہا۔

"میں تمہاری مرضی کا پابند نہیں ہوں" میں نے غالب کی آواز سنی "یہاں آنے سے پہلے میں اپنے ایڈیٹر کو بتا کے آیا ہوں اور ڈی ایس پی سے بات کر کے۔"

"بہت بکتے ہو تم! ڈی ایس پی کو کیا معلوم؟"

"درانت" غالب نے اس کی بات پکڑلی "ڈی ایس پی کو واقعی معلوم نہیں تھا لیکن اب پتا چل گیا ہو گا۔"

اب صورت حال بالکل بدل چکی تھی۔ تھانے دار کے لیے نئی پریشانی اس وقت پیدا ہوئی جب کانسٹیبل وہ ہتھکڑی تلاش کرنے میں ناکام رہے جو میں نے کھڑکی کے راستے باہر پھینک دی تھی۔

"آخر کہاں گئی ہتھکڑی؟" تھانے دار نے چلا کے منظر سے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم۔ میں تو تمہارے سامنے ہی موجود ہوں۔ چاہو تو میری بھی تلاشی لے لو۔ ہتھکڑی میری جیب میں تو ہو نہیں سکتی۔"

غالب نے کہا "ہو سکتا ہے ہتھکڑی کوئی بلی کھا گئی ہو۔ ابھی میں نے ایک بلی کو چھلانگ لگاتے دیکھا تھا۔"

منظر نے اس سے اتفاق کیا "اس کے پیٹ میں درد ہو گا۔"

سب انسپکٹر غصے میں پاگل ہو گیا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو گالیاں دیں "تم سب کے سب حرام خور ہو۔ سب کی پیٹی نہ اتروا دی صبح تک تو۔"

"سر! ہمارا کیا قصور ہے؟" ایک کانسٹیبل نے کہا۔

پھر دوسرا چلایا "ہماری گاڑی کے ٹائر۔ سب کی پھونک نکل گئی ہے سر۔"

سب انسپکٹر نے منظر کی کار کے پیچھے کھڑی ہوئی جیپ کو بے بسی سے دیکھا۔ اس کے چاروں ٹائر فلیٹ تھے۔ غالب نے اس کی بھی تصویر بنالی۔

"جیسی روح ویسے فرشتے۔ پولیس کی گاڑیاں تک حرام خور ہو گئی ہیں" غالب نے کہا "ناکارہ محکمہ' ناکارہ لوگ' ناکارہ گاڑیاں۔"

اب منظر بولا "یہ تجربہ ہے تمہارا؟"

سب انسپکٹر نے کہا "اگر ہم نہ آتے تو اس شخص کا قتل ہو جاتا۔"

"اور میں نہ آتا تو میرے مؤکل کا قتل ہو جاتا۔ میں تو جانتا ہوں کہ یہ کوٹھی میرے ایک مؤکل کی ہے اور میرا دوسرا مؤکل یہاں مس رابعہ قادری کی ہدایات کے مطابق اور اس کی اجازت سے موجود تھا۔ یہ بندہ آخر کون ہے جو تمہارے بیان کے مطابق یہاں قتل ہونا چاہتا تھا؟ اس کا نام کیا ہے؟ تم نے اس سے معلوم کیا کہ یہ یہاں کیا کر رہا تھا؟"

سب انسپکٹر نے صورت حال کی نزاکت کو بھانپ لیا۔ اس نے کانسٹیبلوں کو حکم دیا کہ رائفلیں نیچے کر لیں "ہم تھانے چل کے بات کرتے ہیں وکیل صاحب!"

"کیا تھانے جانا بے حد ضروری ہے؟" غالب نے سوال کیا "بلاوا سے پوچھ لیتے ہیں جو مقتول تو نہ ہو سکا مگر زندہ ہو سکتا ہے۔"

"زندگی یعنی استاد پیڈرو ہماری چالاکی کو سمجھ رہا تھا اور صورت حال کو بدلتا دیکھ رہا تھا۔ یا تو پولیس کا سب انسپکٹر واقعی اسے نہیں جانتا تھا اور اسے غالباً "اوپر" سے حکم ملا تھا کہ فلاں جگہ فوراً چھاپا مارو.... ہمارا ایک بندہ پکڑ لیا گیا ہے۔ بندے کو اور پکڑنے والوں کو تھانے لے آؤ۔ اوپر والے ہر قسم کے احکامات زبانی صادر کرتے رہتے ہیں اور نیچے والے ان کے آسرے پر بے خوفی سے اپنے اختیارات کا جائز ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ سب انسپکٹر بھی نہ خانہ تلاشی کا وارنٹ لایا تھا نہ میری گرفتاری کا۔ چوہدری دلاور نے رابعہ کو اپنے ساتھ لے جانے کے بعد اوپر والوں سے رابطہ کیا ہو گا اور انہوں نے احکامات آگے ترسیل کیے ہوں گے۔ اس کارروائی میں تھوڑی بہت دیر تو لگتی ہے۔ شاید چوہدری دلاور نے مجھے وہیں روکنے کے لیے رابعہ کو استعمال کیا اور اسے موقع فراہم کیا کہ وہ مجھ سے فون پر بات کرے۔ دلاور نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ایک طرف مجھے رابعہ کی زبانی کچھ بھی نہ کرنے کا پیغام پہنچایا اور دوسری طرف مجھے پولیس کے آنے تک روکے رکھا۔ ممکن ہے دلاور کو پیڈرو کی طرف سے فکر لاحق ہو کہ وہ میرے ہاتھوں مارا نہ جائے۔ ایسی صورت میں قاتل اور مقتول کو پولیس جائے واردات سے لا سکتی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ انسپکٹر نے عمداً استاد پیڈرو کو بچانے سے گریز کیا ہو۔

حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ رابعہ نے منظر کو کیسے فون کیا۔ غالباً رابعہ نے دلاور سے جھوٹ بولا کہ سکندر تو وہاں سے اپنے دوست کو سب کچھ بتا چکا ہے اور یہ ضروری ہے کہ عبدالودود منظر کو بھی یہی سمجھایا جائے کہ وہ قانونی کارروائی نہ کرے۔ فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ دلاور نے اس سے اتفاق کرنے کی غلطی کی اور انتہائی ذہانت سے کام لیتے ہوئے رابعہ نے الفاظ کا سہارا نہیں لیا۔ اس نے اپنے رویے اور لہجے سے بتا دیا کہ دال میں کچھ کالا ہے اور منظر بہرحال سفارش کے سہاروں سے اتنا بڑا وکیل نہیں بنا تھا۔ اس نے بھی سمجھ لیا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اس نے مجھ سے رابطہ کیا تو صورت حال کی سنگینی واضح ہو گئی اور اس نے غالب کو ایس او ایس (SOS) دے دیا۔

پیڈرو پولیس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا لیکن اس کے بعد بازی پلٹ گئی اور اب وہ بھی اتنا ہی پریشان تھا جتنا سب انسپکٹر۔

"دیکھیں جناب وکیل صاحب" سب انسپکٹر نے کہا "اس اخباری نمائندے کو آپ ہی لائے ہیں اپنے ساتھ۔"

غالب نے کہا "میں کسی کے ساتھ نہیں آیا۔ ہم اخبار والے ویسے ہی بہت باخبر لوگ ہوتے ہیں۔ ہمیں سب معلوم ہوتا ہے کہ کیا کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے؟"

"تمیز سے کس اخبار کے نمائندے ہو آپ جی؟" سب انسپکٹر بولا۔

"میں ہر اخبار کا نمائندہ ہوں۔"

سب انسپکٹر نے کہا "ایسا تو کبھی نہیں سنا۔"

www.paksociety.com

غالب نے کہا "تمہارے اور ہمارے درمیان تعاون ہو تو یہ شہر ہی نہیں یہ ملک بچ بچ پاکستان بن جائے جہاں مجرموں کو معاشرے میں سر چھپانے کی جگہ نہ ملے۔ مجرموں کا سراغ ہم بھی لگاتے ہیں اور تم بھی یہی کام کرتے ہو مگر فرق یہ ہے کہ ہم ان کی نشاندہی کرتے ہیں سزا دلوانے کے لیے مگر تم ان کی سرپرستی شروع کر دیتے ہو یا ان سے ٹک مکا کر لیتے ہو۔ تمہارے اور ہمارے درمیان فرق مقصد کا ہے اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ تم جاہل، کاہل اور کوڑھ مغز ہو۔ ہم اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہین اور۔۔۔"

"بس جی بس۔ ہم نے بہت صحافی دیکھے ہیں۔"

"پولیس میں بھی سب بے ایمان، کام چور اور رشوت خور نہیں ہوتے۔" غالب نے اعتراف کیا۔

"میں نے پوچھا تھا کہ تم کس اخبار کے کرائم رپورٹر ہو، نام کیا ہے تمہارا؟ میں نے تمہیں پہلے کبھی دیکھا نہیں۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"میرا نام ہے غالب اور میں بہت جلد شائع ہونے والے بہت بڑے اخبار کا نیوز ایڈیٹر ہوں۔" غالب نے کہا۔

"یعنی ابھی وہ اخبار نکلا ہی نہیں؟" سب انسپکٹر بولا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم خبریں اور تصویریں پول (POOL) کرتے ہیں۔ کچھ نمائندے اور فوٹوگرافر شہر کے ایک حصے کی خبریں لاتے ہیں تو کچھ دوسرے حصے کی۔ بعد میں ہم آپس میں خبروں اور تصویروں کا تبادلہ کر لیتے ہیں۔ جو خبر میں نے حاصل کی ہے وہ کل سارے اخبارات میں تصویروں کے ساتھ شائع ہو سکتی ہے اور میں نہ چاہوں تو۔۔۔" غالب نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

سب انسپکٹر نے اس کا مطلب سمجھ لیا "وکیل صاحب! دیکھو جی ہم تو بس حکم کے بندے ہیں۔ اوپر سے جیسے آرڈر آئے تھے ہم نے ویسا ہی کیا۔ ہماری کسی کے ساتھ ذاتی دشمنی تو ہے نہیں۔ نوکری کا معاملہ ہے، افسروں کی بات ماننی پڑتی ہے۔ آپ ہماری مجبوری کا خیال کرو۔"

منظر نے سہلایا "تمہیں آرڈر کس نے دیا تھا؟"

"مجھے تو جناب ڈی ایس پی نے بولا تھا مگر سنا ہے انہیں ایس ایس پی نے فون کیا تھا۔"

"کون ایس ایس پی؟" غالب بولا۔

"آپ سے تو بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔"

"نہیں۔ تم بولو ہم آف دی ریکارڈ کچھ شائع نہیں کرتے یعنی جو بات ہمیں اعتماد میں لے کر بتائی جائے۔" غالب نے کہا "یہ ہمارا اصول ہے۔"

"نیا ایس ایس پی ہے زمان خان لودھی۔ سفارشی ہے اور خاص آدمی ہے ایڈیشنل چیف سیکریٹری کا۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ ایڈیشنل چیف سیکریٹری کون ہے اور کس کا بندہ ہے؟" سب انسپکٹر بولا۔

"پھر اب تم کیا چاہتے ہو؟" غالب نے بے حد غیر دوستانہ لہجے میں کہا۔

"افسران بالا کے حکم کی تعمیل بہت ضروری ہے۔ میرا مطلب ہے اس بندے کو تھانے پہنچانے کے بعد میری ذمے داری ختم ہو جائے گی۔ آپ ذرا مہربانی کرو۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "حکم کی تعمیل میں تم یہاں آئے۔ اب تم واپس جا کے کہہ سکتے ہو کہ وہاں کوئی بھی نہیں ملا، تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تم نے ایسا نہ کیا تو مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ ابھی اخبار کی آخری کاپی نہیں گئی ہو گی۔ صبح ایک خبر اور ایک تصویر ہر اخبار میں ہو گی جو تمہارا مستقبل تاریک کر دے گی۔ اعلیٰ افسران تمہارے خلاف ضابطے کی کارروائی کرنے پر مجبور ہوں گے اور زمان خان لودھی کو تم جانتے ہی ہو۔ وہ نااہلی کے اس مظاہرے پر تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

چاروں کانسٹیبل ایک نیم دائرے میں ہم سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے لیکن ان کی رائفلوں کا رخ ہماری طرف تھا۔ استاد پیڑو بظاہر بے نیازی سے اور مسکراتا کھڑا ہوا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ اندر سے اس کے دل کی کیا حالت ہو گی۔ اس کی تقدیر کا فیصلہ ان مذاکرات کی کامیابی یا ناکامی پر منحصر تھا جو سب انسپکٹر مرزا غالب اور منظر ایڈووکیٹ کے درمیان ہو رہے تھے۔ میری حیثیت ویسے تو ملزم کی تھی مگر اس الزام سے زیادہ مجھے اپنی جذباتی حماقت کے نتائج کی فکر تھی، رابعہ کا خیال تھا اور یہ احساس تھا کہ غالب اور ماڑو کے علاوہ منظر بھی مجھے کتنا شرمندہ کرے گا چنانچہ میں بوجھل دل کے ساتھ خاموش کھڑا تھا اور مایوسی کے رد عمل کا شکار تھا۔

"آپ کی مرضی جناب" سب انسپکٹر نے کہا اور روپ بدل ڈالا "ملزم تو ہم ہر قیمت پر تھانے لے جائیں گے۔ امید ہے آپ سرکاری فرائض میں مداخلت نہیں کرو گے؟"

غالب نے کہا "ہم صحافی ہیں، بدمعاش نہیں۔ تم غیر قانونی کام کرو گے تو خود بھگتو گے۔"

منظر نے کہا "میں تمہارے جرائم کا عینی گواہ ہوں۔ ثبوت شہادت سب میرے پاس ہیں۔"

"ٹھیک ہے جی۔ آپ کیا کرو گے؟ چٹھی اتروا دو گے؟ معطل کروا دو گے۔ یہ سب تو ویسے بھی ہو گا اگر ہم نے ملزم کو چھوڑ دیا اور خالی ہاتھ گئے۔ اپنے بندے سے کہو کہ مقابلہ نہ کرے اور فرار ہونے کی کوشش بھی نہ کرے ورنہ میں رعایت نہیں کروں گا۔"

منظر اور غالب نے میری طرف دیکھا "ہم اس کی ضمانت دیتے ہیں کہ ہمارا آدمی مزاحمت نہیں کرے گا۔"

"چلو دوستو، تم گاڑی کے تالے کھولو۔ باری باری ایک ایک کو سرا ہوا بھروانے کے لیے ساتھ لے جاؤ۔ دو گاڑیاں آ جائیں گی اور دو کو اینٹھ کر کے باقی دو لے جاؤ۔ دو بندے یہاں رہیں گے وہ بیٹھ کر ٹھیک کریں گے۔ سمجھ آئی میری بات؟" سب انسپکٹر نے کہا۔

منظر اس وقت بہت سنجیدہ بلکہ کسی حد تک رنجیدہ تھا۔ اس کی کوشش ناکام ہو گئی تھی "میں چلتا ہوں، صبح میں سارے کیس فائل کروں گا پولیس کے خلاف۔"

میں نے کہا "یار منظر۔۔۔"

اس نے مجھے روک دیا "کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے ابھی۔ تمہاری کوئی غلطی ہے اور نہ تم نے کوئی جرم کیا ہے۔ تمہارے ساتھ تھانے میں قانون کے مطابق سلوک ہو گا۔ میں ابھی بات کرتا ہوں زمان خان سے۔"

وہ گاڑی میں بیٹھ کے چلا گیا۔ غالب اس وقت تک موجود رہا جب تک پولیس مجھے لے کر روانہ نہیں ہو گئی۔ اس نے ہر تصویر بنائی۔ ایک میں پولیس والے تالا توڑ رہے تھے، دوسری میں تالا توڑ کر بھاگتے ہوئے گیٹ کے باہر لے جا رہے تھے۔

چلتے چلتے اس نے مجھ سے کہا "ان سب کی ذلیل نہ بچا دی میں نے تو غالب نام نہیں۔"

میں نے کہا "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایک معمولی سی غلطی کا اتنا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

"بابا آدم کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ ایک معمولی سی غلطی کی پاداش میں جنت سے نکلنا پڑے گا۔" غالب بولا "غلطی کوئی جان بوجھ کے نہیں کرتا۔ بس غلطی ہو جاتی ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"پریشان ہوں میں رابعہ کی طرف سے۔"

"ارے یار، یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے۔ رابعہ کو کچھ نہیں ہو گا۔ اللہ نے چاہا تو کل سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور کے۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ" میں نے اپنی مایوسی کو چھپاتے ہوئے بشاشت سے کہا۔

اچانک میں ایم آر ایس کے چیف کے بجائے ایک ملزم ہو گیا تھا اور مجھے پولیس گرفتار کر چکی تھی۔ اب نہ مقابلے کی گنجائش تھی اور نہ فرار کے امکانات تھے۔ ایسی کوشش کا انجام چوہدری وقار اور ان جیسی کی خواہشات کے عین مطابق ہوتا۔ میں پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا۔

غالب نے ایک نظر پیڑو پر ڈالی۔ "قربانی کے بکرے! کہہ دینا اپنے چوہدری صاحب سے کہ حالات ضرور بدل گئے ہیں لیکن ہم نہیں بدلے ہیں اور نہ ہی بدلیں گے۔ وہ جتنے روپ چاہیں بدلیں، ایم آر ایس ان کا اصلی روپ پہچانتی ہے اور ایم آر ایس ہر محاذ پر ان کے مقابل ہو گی۔"

استاد پیڑو نے کچھ نہیں کہا۔ جب اسے سب انسپکٹر نے جیپ میں سوار ہونے کا اشارہ کیا تو وہ آگے بیٹھ گیا۔ دو پولیس والے میرے دائیں طرف رہے اور دو بائیں طرف۔ جیپ تھانے کی طرف چل پڑی۔

میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ پولیس سے میرا پہلا سابقہ ایک بھولی بسری بات ہو گئی تھی۔ جب پاکستان پہنچتے ہی مجھ سے میرا باپ اور میرا حق وراثت چھین لینے والے قاتلوں اور مجرموں کے ٹولے نے پولیس کی ملی بھگت سے مجھے تختہ دار تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کے بعد میں سازشی عناصر کا مقابلہ کرنے کے لیے اکیلا میدان میں کود پڑا تھا پھر قانونی مدد کے لیے عبدالودود منظر کے ساتھ رابعہ نے میرا ساتھ دیا تھا اور آہستہ آہستہ وہ جذبہ جو خلوص اور دوستی کی بنیادوں پر استوار تھا ایک بہت بڑی طاقت بن گیا تھا جس نے ضمیر فروشوں اور غدار دشمنوں کے لامحدود وسائل کی پروا نہ کرتے ہوئے ہر محاذ پر ان کا بھرپور مقابلہ کیا تھا۔

مجھے اپنی طویل جدوجہد کا ہر مرحلہ یاد آ رہا تھا۔ کہاں کہاں ہم نے موت سے پنجہ آزمائی کی تھی اور کیسے کیسے جان لیوا خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم نے بڑے بڑے فرعونیت کے دعوے داروں کے غرور کو خاک میں ملایا تھا۔ ہم نے جو حکمت عملی یا فلسفی انداز اور انفرادی تحریک دی تھی وہ بعض اوقات قانون کے دائرے کی حدود سے تجاوز بھی کر جاتی تھی مگر صرف وہاں جہاں قانون دشمن عناصر قانون کے طریقہ کار کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کے انصاف کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے تھے۔ قانون کی بے بسی یہ تھی کہ ثبوت اور شہادت نہ ہو تو مجرم کو مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا مگر ہم بے بس نہیں تھے۔ ہم جیسے کو تیسا کے قائل تھے۔ انگریزی محاورے کے مطابق جس کا بھی ہم سے معاملہ ہوا ہم نے اسی کے سکوں میں ادائیگی کی۔ جس کا کوئی اصول یا ضمیر نہ ہو اس کے ساتھ کیسی شرافت اور کیسی اصول پرستی! جو قانون کو بے آبرو کرنے پر کمربستہ ہو اس سے قانون کی بات کیا کرنی! یہی وجہ تھی کہ متعدد بار خود ہم نے چشم دید گواہ کی حیثیت سے یا اپنے یقین کی بنیاد پر مجرموں کے خلاف اپنے نظام انصاف کے مطابق کارروائی کی اور انہیں سزا بھی دی جو دولت یا اثر و رسوخ کی بنا پر کتابی قانون کی گرفت سے صاف نکل جاتے تھے یا وکیلوں کی اور پولیس کی مدد سے معاملات کی نوعیت بدل کے اور حالات و واقعات کی شہادت مسخ کر کے انصاف کرنے والوں کی بے بسی کا مذاق اڑاتے تھے۔

ہم نے ایم آر ایس کے نام پر بہت بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے تھے مگر خالص نظریاتی قانون کی روشنی میں ہمارے اعمال کو پرکھا جاتا تو ہم نے بہت جرم کیے تھے جن پر ہمیں سزا اس لیے نہیں ہوئی کہ ہم نے مجرموں سے نمٹتے ہوئے کوئی ثبوت یا شہادت باقی نہیں چھوڑی تھی جسے کوئی ہمارے خلاف استعمال کر سکتا۔

www.paksociety.com

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ مغربی پاکستان سے بھارت کے راستے مشرقی پاکستان تک ہم نہ جانے کہاں کہاں اور کس کس کے خلاف معرکہ آرا رہے تھے۔ قید و بند کی صعوبت، ظلم اور تشدد جھیل چکے تھے۔ گولوں کی بوچھاڑ اور بموں کے دھماکوں سے بچ کر نکل آئے تھے لیکن کبھی یوں گرفتار نہ ہوئے تھے جیسے آج میں ایک پاکستان کی پولیس کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ ایف آئی آر کٹوا کر اپنے ساتھ لے جانے والا ایک ایسا شخص تھا جس نے اس کے لڑکے کو بم سے اڑا دیا تھا۔ اسپتال میں اس کی ماں کو مروا دیا تھا۔ اس نے میرے باپ وزیر خان سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا اور اسے غربت و بے کسی کی موت مار ڈالا تھا۔ اس نے ان گنت قتل کروائے تھے مگر وہ آج بھی آزاد تھا۔ قانون ایک بار بھی اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکا تھا اور وہ معزز شمار ہوتا تھا جبکہ میں بے بسی سے ایک مجرم کی طرح پولیس کی معیت میں تھانے جا رہا تھا۔ نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں... سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد۔

تھانے میں گاڑی سے اترتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے یہ اختتام نہیں، ایک نئی جنگ کا آغاز ہے۔ پہلی جنگ میں نے وطن کے لیے لڑی تھی مگر میرے جیسے محب وطن مجاہد اور مخلص سچے پاکستانی یہ جنگ اس لیے ہار گئے تھے کہ ان کے مقابل بین الاقوامی سپر پاور تھیں۔ جو سی آئی اے، کے جی بی، موساد یا را کے نام پر تیسری دنیا کے ممالک کی داخلی سیاست میں اپنی بدمعاشی کا ہتھکنڈا چلاتے تھے اور ان کمزور و مجبور و حقیر عوام کی قسمتوں کے فیصلے واشنگٹن، ماسکو یا دہلی میں بیٹھ کے کرتے تھے جن کے نصیب میں پہلے ہی مفلسی، تہی دامنی، جہالت اور انتشار کے سوا کچھ نہ تھا۔

اب میں نے نصف پاکستان کو اپنی قیادت کی سیاسی غلطیوں کا خمیازہ، اعمال کی سزا یا نوشتہ تقدیر سمجھ کے پورا پاکستان تسلیم کر لیا تھا تب بھی ہم جیسے احمقوں کے لیے کہیں اماں نہ تھی جو انسان کے بنیادی حقوق، جمہوریت کی بالادستی، اسلام کے نام پر قائم ہونے والے ملک میں اسلامی نظام حیات اور نظام انصاف، قانون کے مطابق عدل اور انسانیت کے احترام کی پاسداری چاہتے تھے۔ سیاست میں، معیشت میں اور معاشرے میں چوہدری دلاور جیسے حاکموں کے سامنے سر جھکانا ہمیں منظور نہ تھا چنانچہ ہمارا وجود ان حکمرانوں کو خطرے کا سگنل محسوس ہوتا تھا جو انگریز سے آزادی کی جنگ لڑنے والے، عقیدے کے راسخ اور دل کے سچے پاکستانی عوام کی اکثریت کو اپنے غلاموں کی طرح رکھنا چاہتے تھے اور ان پر یوں حکومت کرنا چاہتے تھے کہ کوئی انہیں مذہب، اخلاق اور قانون کی حدود کا پابند کرنے والا نہ ہو اور وہ کروڑوں انسانوں کی قربانی کے اس ثمر کو مال غنیمت کی طرح اڑا لے جائیں تو کوئی انہیں روکنے کی ہمت نہ کر سکے۔ وہ اس ملک پر یوں غاصبانہ قبضہ کرنا چاہتے تھے جیسے علی بابا کے خزانے کو چالیس چور لوٹنے آ گئے تھے۔ چالیس چوروں نے یہاں بھی اپنے شیطانی عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک ناپاک اتحاد کر لیا تھا مگر جیسے علی بابا نے مرجینا کے ساتھ مل کر چالیس چوروں کا خانہ خراب کر دیا تھا ایسے ہی ہم جیسے لاکھوں جاں نثار تھے جو ایم آر اے کے نام سے آشنا ہوئے بغیر اس کے مقاصد سے متفق تھے اور اس جہاد میں ہمارے ساتھ شریک تھے جو ہم نے ملک دشمنوں کے خلاف شروع کر رکھا تھا۔ جو پاکستان کو دل سے اسلامی فلاحی جمہوریت بنانے کے آرزومند تھے۔ جو قرآن و سنت کے مطابق طرز معاشرت اور حکومت چاہتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ ان کا وطن ایک دن وہ جنت بن جائے گا جس کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا، قائداعظم اور جنگ آزادی کے لاکھوں شہیدوں نے دیکھا تھا۔

تھانے کی عمارت وہی تھی جو ہر جگہ اپنی پُراسرار فضا، دہشت، سفاکی و بربریت کے پُرعذاب سسکتے ماحول کی علامت اور قانون کے نام پر لاقانونیت کا پرچار کرتی نظر آتی ہے۔ یہ مظلوموں کی پناہ گاہ نہیں سمجھی جاتی اور اسے فریادی کی داد رسی کا مرکز نہیں تسلیم کیا جاتا۔ شریف آدمی ظلم اور نقصان برداشت کر لیتا ہے مگر تھانے جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ قتل، اغوا اور آبروریزی کے عینی گواہ سچ بولنے کے لیے تھانے جانے کی ہمت نہیں کرتے اور ہر طرف سے آنکھیں، کان اور لب بند کر کے کسی نہ کسی حیلے سے ضمیر کو بھی مطمئن کر لیتے ہیں۔ عام تاثر یہ ہے کہ یہاں مجرم ان کے پالے سمجھے جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنی آمدنی میں تھانے والوں کو برابر کا شریک کرتے ہیں لیکن جس کا کوئی والی وارث نہ ہو اسے مجرم بنا کے پس دیوار زنداں یا تختہ دار تک پہنچانا ایک معمول کی بات ہے۔

منظر کے اور غالب کے آ جانے سے میری پوزیشن کچھ مستحکم ہو سکتی تھی۔ مجھے ہتھکڑی پہنانے کے لیے ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں محرر اور ڈیوٹی افسر کے سامنے لکڑی کی بنچوں پر کچھ سہمے ہوئے بدحال اور ڈرے ہوئے بیٹھے تھے لیکن ان میں تفریق کرنا مشکل تھا۔ اعتماد سے وہ بھی محروم تھا جو سچ بول رہا تھا۔ یہ تو مرضی ہے سرکار کی کہ جسے چاہے کسی بھی جرم میں شامل تفتیش کر لے اور چوری کی رپورٹ لکھوانے کے لیے آنے والا منشیات کی برآمدگی ہونے کے جرم میں بغرض چھترکاری ڈرائنگ روم کی جانب روانہ کیا جائے۔ چور جناب محرر سے ہاتھ ملا کے نصف کا نذرانہ پیش کر کے اور گھر جا کے سکون سے سو جائے۔

اچانک دو پولیس والے ایک نوجوان پر جھپٹے جو ضرورت سے زیادہ انگریزی بول رہا تھا اور فرمودۂ اقبال پر عمل پیرا تھا۔ آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی۔ پولیس والوں نے اسے لاتوں اور مکوں سے مار مار کے فرش پر گرا دیا اور زبان سے فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہوئے اسے ٹھڈے مارنے لگے۔ وہ ان کے بیچ میں لوٹ رہا تھا اور چلا رہا تھا۔ بنچ پر بیٹھے ہوئے عوام کا دہشت سے برا حال تھا۔ صرف ایک بوڑھا رو رو کے ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

"چھوڑ دیں سرکار۔ نادان ہے، مائی باپ۔ اسے مت ماریں۔ میں سمجھا دوں گا اسے۔ اللہ کے لیے، رسول کے لیے..."

اللہ کے لیے... رسول کے لیے... شاید سب سے زیادہ واسطے اللہ رسول کے ہی دیے جاتے ہیں مگر اس سے تفتیش کرنے والوں پر اثر نہیں ہوتا اور ہر تھانے میں ہر رات کی صبح ہونے تک انسانوں پر وہ انسانیت سوز ظلم ہوتا ہے جس کی فلم بنا کے دکھائی جائے تو لوگ نازی مظالم پر بنی فلمیں بھول جائیں۔

میں انچارج کے کمرے کی چق ہٹا کے اندر داخل ہوا تو سب انسپکٹر پہلے ہی اسے پوری رپورٹ دے چکا تھا۔ روایتی توند اور چہرے کے بے رحمانہ نقوش والا انچارج کچھ متفکر نظر آتا تھا۔ دو کانسٹیبل میری ہتھکڑی کے ساتھ دونوں طرف موجود تھے۔ ان کی وجہ سے میں بھی کھڑا رہنے پر مجبور تھا۔ یوں بھی میں ملزم تھا اور میرا کرسی پر بیٹھنا گستاخی سمجھا جاتا جس کی پاداش میں مجھ پر فوری عتاب نازل ہو سکتا تھا۔

استاد پیڈرو بڑے اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا لیکن اس نے مجھ سے نظر نہیں ملائی۔ ایس ایچ او کچھ دیر مجھے بے حسی سے دیکھتا رہا پھر اس نے قریب آ کے میرا معائنہ کیا۔ اس نے میرے بال پکڑ کے میرا سر دائیں بائیں گھمایا اور چھوڑ دیا۔

"تم سکندر بخت ہو۔ سکندر بخت ولد وزیر خان؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "جی ہاں۔"

"اس شخص کو جانتے ہو تم؟" اس نے پیڈرو کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں۔ یہ استاد پیڈرو ہے۔ اس کے ماں باپ کا تو پتا نہیں مگر یہ چوہدری دلاور کا کتا ہے۔" میں نے کہا۔

"چوہدری دلاور کون ہے؟" ایس ایچ او نے بے زاری سے کہا۔

"ہر وہ شخص جو اس ملک کا دشمن ہے، انسانیت کا دشمن ہے، جو چور ڈاکو اور قاتل ہے مگر معاشرے کو دکھانے کے لیے ایک معزز چہرہ رکھتا ہے۔"

اس نے سر ہلایا "یہ ایم آر اے کیا بلا ہے؟"

"یہ عذاب الٰہی ہے ہر چوہدری دلاور کے لیے" میں نے کہا "خدا نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ پیدا کیا ہے..."

"تم نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی... کیوں؟"

میں نے کہا "میں اس جیسے ہر شخص کو قتل کر سکتا تو ضرور کرتا۔"

اس نے کچھ سوچ کے سر ہلایا۔ "میں بات کرتا ہوں ایس ایس پی صاحب سے۔ لے جاؤ اسے اندر... یہ بھونکتا بہت ہے۔"

"جنگلی کتا ہے مائی۔ صبح تک پالتو کتے کی طرح پاؤں میں لوٹنے لگے گا۔ دم ہلانے لگے گا۔" سب انسپکٹر نے کہا اور پولیس والوں کو اشارہ کیا کہ مجھے لے جائیں۔

یہ دوسرا موقع تھا جب دیار غیر سے وطن لوٹ کے مجھے حوالات کی سلاخوں کے پیچھے عام اخلاقی مجرموں کے ساتھ بند کر دیا گیا تھا۔ پہلی بار میں حصول تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے انگلستان سے لوٹا تھا اور اس بار میں بزعم خود وطن کے دشمنوں سے نبرد آزما رہنے کے بعد انہیں ناقابل تلافی نقصان پہنچا کے واپس آیا تھا۔ کیا مجھے توقع تھی کہ میری شاندار خدمات کے صلے میں حکومت مجھے تمغۂ خدمت عطا کرے گی اور عوام میرے شاندار کارناموں پر مجھے یوں خراج تحسین پیش کریں گے کہ پھولوں سے لاد دیں گے اور میں جہاں جاؤں گا تحفے کے تحفے میرے استقبال کے لیے موجود ہوں گے؟ مجھے ہر شہر میں استقبالیہ دیا جائے گا اور میڈیا اپنے چینل ٹاک شو میں میرے کارناموں کا ذکر یوں کرے گا جیسے میں جنگ عظیم کے ہیرو فیلڈ مارشل منٹگمری سے بھی بڑا ہیرو ہوں۔ ہر شہر میں میرے نام سے سڑکوں، پارکوں اور قومی یادگاروں کو منسوب کیا جائے گا۔ ایم آر اے کی شجاعت اور حب الوطنی کی داستانوں پر فلمیں بنائی جائیں گی، کتابیں لکھی جائیں گی۔ جی نہیں، ایسی خوش فہمی تو شاید اس سے پہلے ستمبر ۶۵ کی جنگ کے ہیروز کو بھی نہیں ہوگی۔

اول تو عزت یا شہرت کی خاطر کوئی بہادری کا بڑا کارنامہ سرانجام نہیں دیتا مگر وہ قومیں زندہ ہوتی ہیں جو اپنے ہیروز کو سر آنکھوں پر بٹھاتی ہیں۔ انہیں عزت ہی نہیں، بے حساب شہرت اور دولت بھی ملتی ہے۔ میں اتنا بڑا ہیرو بھی نہیں تھا اور نہ ایم آر اے کے دوسرے ساتھیوں نے کبھی اس انداز میں سوچا تھا کہ کبھی یہ ملک ان کی خدمات کا صلہ بھی دے گا۔ تقسیم ہند کا پورا المیہ میرے سامنے تھا۔ اس کو کسی شاعر نے فقط ایک مصرعے میں یوں سمو دیا ہے کہ اس پر لمبے چوڑے حوالے اور تاریخی مقالے لکھنے والے بھی حقیقت کو اتنی سادگی کے ساتھ اتنے بھرپور انداز میں پیش نہیں کر سکتے۔ منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔ اس کا دوسرا مصرعہ بھی قابل غور تھا، نیرنگی سیاست دوراں تو دیکھیے۔ اس ملک کی تخلیق میں خلوص کی دولت کے ساتھ تن من دھن قربان کر دینے والے وہ تمام قافلہ سالار تو رخصت ہوئے۔ بعض کس مپرسی کے عالم میں اور بے سروسامانی کا شکوہ زبان پر لائے بغیر گمنامی کی موت مر گئے۔ علاقائی سیاست کے سازشی عناصر جن کی باگ ڈور غیر ملکی آقاؤں کے ہاتھ میں تھی، اپنے مکروہ عزائم کے چہروں پر شرافت کی نقاب ڈال کے سامنے آ گئے۔ ان کے منہ میں جھوٹ کی زبان تھی اور ان کے دلوں میں منافقت تھی۔ وہ لٹیرے تھے جو راہنما ہوئے اور عالمی سیاست کے شاطروں نے انہیں اپنے مقاصد کی تکمیل کا آلۂ کار بنا لیا۔ وہ جنہوں نے کبھی صدق دل سے پاکستان کے وجود کو اور دو قومی نظریے کو قبول نہیں کیا تھا اس ملک کے عوام کو مضبوط، خوشحال اور متحد کیسے دیکھ سکتے تھے۔

میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ سب انسپکٹر (جس کا نام اس کی شرٹ کی پاکٹ پر جلیل لکھا ہوا تھا) حوالات کے باہر نمودار ہوا۔

www.paksociety.com

"تم تو بڑی نامی گرامی چیز ہو یار۔" وہ بولا "ابھی ایس ایس پی صاحب خود تشریف لا رہے ہیں تمہاری سب پرانی فائلوں کے ساتھ۔"

میں نے مایوسی کو ظاہر نہیں ہونے دیا "میرا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔"

"جھوٹ سچ سب پتا چل جائے گا صبح تک۔" اس نے دھمکی کے انداز میں کہا۔

وہ سب مجھے دہشت زدہ کرنے کے حربے تھے۔ یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ قانون کے مطابق ہر مجرم کو چوبیس گھنٹے کے اندر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرکے اس کا جسمانی ریمانڈ حاصل کرنا ضروری تھا اور تشدد کارروائی کے خلاف بھی قوانین موجود تھے مگر پولیس چوبیس گھنٹے میں ہی اتنی طاقت ناجائز استعمال کرتی تھی۔ ان کے پاس وسائل تھے اور ٹریننگ بھی۔ تشدد ایک سائنس کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ وہ نہ آدمی کے جسم پر نشان چھوڑتے تھے اور نہ اسے مرنے دیتے تھے مگر عذاب کی اس انتہا پر پہنچا دیتے تھے جہاں مر جانے کو وہ باعث نجات و رحمت سمجھنے لگتا تھا اور جو ہم سمجھتے تو کتاب میں لکھے ہوئے تھے۔ پولیس ہفتہ دس دن یہاں تک کہ مہینوں کسی کا سراغ بھی نہیں دیتی تھی کہ وہ ان کی تحویل میں ہے۔ بہت عالم فاضل اور اثر و رسوخ رکھنے والے عدالتوں میں تھک ہار کے بھی انہیں برآمد کرنے میں ناکام رہتے تھے۔ انتہائے راز سے پہلے ہی ان کی لاش علاقے کے تھانے کی حدود سے سیکڑوں میل دور مل جاتی تھی۔

یہ سب جانتے ہوئے بھی مجھے اپنی فکر نہیں تھی۔ مجھے اپنی قوت برداشت پر بھروسا تھا اور اپنے ساتھیوں کی مدد پر۔ وہ قانونی طور پر بھی بہت کچھ کر سکتے تھے اور میرے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے جوابی کارروائی کے طور پر کسی بھی شکاری کو شکار کر سکتے تھے۔ زیادہ پریشانی مجھے راجہ کی طرف سے لاحق تھی جس کے بارے میں یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ دشمن سے نیکی کی توقع رکھنے والا احمق ہوتا ہے اور ولاور جیسے دشمن سے واسطہ ہو تو شرافت، انسانیت اور ضمیر کے بارے میں سوچنا بھی غلط تھا۔ راجہ کی یقین دہانی بے معنی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اسے میری کمزور رگ سمجھ کے اٹھالیا گیا ہے۔ مصالحت کی ہر کوشش میں ناکامی کے بعد چوہدری ولاور اینڈ کمپنی نے پھر پرانے طریقے آزمانے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ مجھے ان کے بارے میں کوئی خوش فہمی پیدا ہو گئی ہے تو ختم ہو جائے۔

رات کے بارہ بجے تھے اور تھانے کے عقبی حصے میں معمول کے مطابق تفتیش کا عمل پورے زور و شور سے جاری تھا۔ ملزم دیوانہ وار چیخ رہے تھے۔ تشدد کرنے والوں سے رحم کی بھیک مانگ رہے تھے اور ان کے دل کو موم کرنے کے لیے دنیا بھر کے واسطے دے رہے تھے۔ ان کی دلدوز چیخوں سے میرے اعصاب بھی متاثر ہو رہے تھے اور لامحالہ مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ نہ جانے کب میری باری بھی آ جائے۔ ابھی تک کچھ نہیں ہوا تھا مگر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ کسی دست غیب نے میرے پرانے کیس کھولنے کا اشارہ کر دیا تھا اور یہ سب کیسا ایسے تھے کہ سال چھ مہینے میں قانون کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے مجھے سزائے موت سنائی جا سکتی تھی یا رعایت کرتے ہوئے عمرقید۔

بارہ بجے اچانک بجلی چلی گئی اور تھانے میں ہر شخص الرٹ ہو گیا۔ تفتیش کا شور بھی ختم کیا اور تھانے کا مرکزی اور انتہائی محفوظ ہو گیا پھر تین حوالاتی لائے گئے اور انہیں مردہ کتوں کی طرح اندر پھینک دیا گیا۔ ان میں سے ایک کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ تھوڑی دیر کا مہمان ہے۔ اس کے منہ اور ناک سے خون نکل رہا تھا اور وہ جانکنی کی کیفیت میں فرش پر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور سر ادھر اُدھر جھٹک رہا تھا۔ دوسرا بیمار سیاہ رو نوجوان تھا جس کی صورت پر سختی حالات نے مفلسی رقم کر دی تھی۔ باقی دو بھی اذیت سے تڑپتے ہوئے تھے، لمبے لمبے سانس لے رہے تھے اور کراہ رہے تھے۔ ان میں سے ایک حلق سے ذبح ہونے والے بکرے جیسی آواز نکال کے چلا رہا تھا "ہائے ربا! ہائے میں مر گیا۔ اوئے ظالمو..."

ایک سنتری نے جو حوالات کے باہر اطمینان سے بندوق لیے کھڑا تھا، کہا "چپ کر... ابھی تو پہلی رات ہے تیری۔ ابھی سے ان مرنے دے گا تجھے۔ ایس ایس پی صاحب آ گئے ہیں۔ شور کرے گا تو زمین میں زندہ گاڑ دیں گے..."

ایس ایس پی کے آتے ہی مجھے طلب کر لیا گیا۔ وہ ایس ایچ او کے کمرے میں اسی کی کرسی پر بڑے کروفر کے ساتھ براجمان تھا۔ ایس ایچ او اس کے مقابل ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا تھا۔ ایس ایچ او کے ساتھ والی کرسی پر دوسرا انسپکٹر کے رینک کا افسر بیٹھا تھا جو شاید اس کا پی اے تھا اور صورت سے ذہین لگتا تھا۔ وہ جسمانی طور پر بھی فٹ تھا۔

ایس ایس پی زمان خان اور ہمی کی شخصیت کا تاثر بالکل مختلف تھا۔ وہ صورت سے تعلیم یافتہ اور مہذب نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش میں شائستگی کی نرمی تھی اور وہ بااخلاق شخص تھا۔ جب اس نے کیپ کو میز پر رکھا تو میں نے اس کے تحت چمکیلے کالے بال دیکھے۔ اس کے حکم پر میرے ہاتھ کھول دیے گئے۔ مجھے ہتھکڑی لگا کے لانے والے محافظ کمرے سے باہر چلے گئے۔

اس نے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا "مسٹر سکندر رحمت" اس نے انگریزی میں کہا "جیسا کہ تم جانتے ہو، تمہارے خلاف ایس پی سراج صاحب کے زمانے میں بہت سے مقدمات درج کیے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ انتہائی سنگین تھے اور کچھ مختلف عدالتوں میں زیر سماعت تھے۔ قتل کے ایک کیس میں تمہاری ضمانت بھی منظور کرلی گئی تھی لیکن اس کے بعد تم روپوش ہو گئے اور تمہارے

بارے میں تحقیقات کرنے والی ہر ایجنسی نے رپورٹ دی کہ تم ملک دشمن سرگرمیوں میں اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث رہے۔"

میں نے کہا "غالباً ایسی ہی رپورٹیں آپ کو ایک ہمسایہ دشمن ملک کے تفتیشی اداروں نے بھی دی ہوں گی۔"

اس نے سر ہلایا "نہیں۔ تم بھارت سے بنگلہ دیش چلے گئے تھے اور تم نے ایک گروہ بنالیا تھا جس کے تم سرغنہ تھے۔"

میں نے تلخی سے کہا "مشرقی پاکستان کے باغیوں سے اور بیرونی سرپرستوں سے لڑنا اگر دہشت گردی میں شمار ہوتا ہے تو پھر ہماری فوج بھی۔"

"فوج کے بارے میں بات کرتے ہوئے تمہیں محتاط رہنا چاہیے ورنہ تمہارا کیس خراب ہو جائے گا۔"

"میرا کیس اچھا کب ہے؟" میں نے کہا "اگر حب الوطنی جرم ہے تو وہ سب بھی مجرم ہیں جنہوں نے مشرقی پاکستان میں بھارتی فوج کی جارحیت کا مقابلہ کیا۔"

"بات کو گھمانے پھرانے کی کوشش سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم پر جو کیس مجرمانہ نوعیت کے ہیں جو پہلے سے چل رہے تھے ان کا پورا ریکارڈ اب میری تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ ابھی مجھے ان کا سرسری طور پر مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے لیکن چند باتیں واضح طور پر سامنے آ گئی ہیں۔ ایک یہ کہ تمہارے خلاف مرحوم ایس ایس پی سراج نے غیر قانونی اور مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے پر جب بھی کارروائی کی تمہیں ایس ایس پی ضامن رضوی نے بچا لیا۔"

"یہ غلط ہے۔ میں اس فرشتہ سیرت شخص پر الزام کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہوں جس نے پولیس کے محکمے میں رہ کے اصول پرستی اور فرض شناسی کی وہ مثال قائم کی تھی..."

"مجھے معلوم ہے کہ وہ ایک ایماندار اور ذہین افسر تھے مگر تمہارے معاملے میں وہ رشتے داری کے ہاتھوں مجبور تھے۔"

"وہ میرے رشتے دار نہیں تھے۔"

ایس ایس پی کا موڈ خراب ہو گیا "میں نے تم کو بحث کرنے کے لیے نہیں بلایا ہے اور میں ساری رات بکواس نہیں کر سکتا۔ یہ بھی تمہارے خلاف وہ کیس ہیں جو درج کیے جا چکے ہیں۔"

ایس ایس پی کے پی اے نے ایک فائل کھول کے میرے مبینہ جرائم کی تفصیلات پر مبنی رپورٹ نکالی اور ترتیب وار ہر کیس کا خلاصہ پڑھنے لگا۔ ایک کانسٹیبل ٹرے میں چائے لے کر حاضر ہوا۔ خلاف توقع ایک کپ میرے سامنے بھی رکھا گیا۔ اپنے خلاف مقدمات کی اس فہرست کے مندرجات کو سنتے ہوئے میں نے کسی قسم کے احتجاجی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ کاغذی حقائق کی رو سے زیر سماعت اور زیر تفتیش مقدمات کے وجود سے انکار ممکن نہیں تھا۔ دوسری یہ کہ مقدمات قائم کرنا

بہرحال پولیس کا کام تھا اور بے گناہی کو صرف عدالت میں ثابت کیا جا سکتا تھا۔ تیسری وجہ نقطۂ نظر کا فرق تھا۔ میں پوری نیک نیتی اور ایمانداری سے حلفیہ کہہ سکتا تھا کہ نہ میری نیت کبھی ارتکاب جرم کی تھی، نہ میں مجرمانہ ذہن رکھتا تھا اور نہ اس جرم کو جرم سمجھا جا سکتا ہے جس کا مقصد اجتماعی فلاح ہو یا ذاتی تحفظ ہو۔

اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اشتعال انگیزی کے نتیجے میں ہونے والے قتل یا حملہ آوروں سے خود کو بچاتے ہوئے غیر ارادی قتل پر عدالت معروضی حالات کو پیش نظر رکھتی ہے اور بعض اوقات اس جرم کو سزا کے قابل ہی نہیں سمجھتی۔ نشے کی حالت میں یا پاگل پن کی کیفیت میں ارتکاب جرم کرنے والا بھی بچ جاتا ہے کیونکہ وہ بقائمی ہوش و حواس جرم نہیں کرتا۔ ایک قبائلی معاشرے میں شادی سے پہلے کوئی لڑکی کسی لڑکے سے ملے تو یہ جرم ہے اور جو انہیں ملتا دیکھے وہ قتل کر دے تو یہ ایک قابل تحسین کام سمجھا جائے گا جس سے معاشرے کی اجتماعی فلاح وابستہ ہے۔ شہر کے مہذب اور متمدن سمجھے جانے والے معاشرے میں یہ نقطۂ نظر قابل قبول نہیں ہوگا۔

میرے تمام جرائم قانون کی نظر میں جرائم تھے اور صرف عدالت ہی میری نیت اور میرے جذبات پر غور کرتے ہوئے مجھے رعایت دے سکتی تھی۔ پولیس نے چوہدری ولاور اینڈ کمپنی کی ایما پر بھی کیس بنائے تھے اور سابق ایس ایس پی سراج نے اس کار خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ پتا نہیں چاہے وہی ساکن۔ اعلیٰ افسران کی مرضی ہو تو ماتحت بڑی مستعدی دکھاتے ہیں اور جسے چاہیں کسی بھی جرم میں ملوث کرکے چالان کے سارے لوازمات بھی رضاکارانہ طور پر خود ہی فراہم کر لیتے ہیں۔ جس کا دنیا میں خدا کے سوا کوئی نہ ہو اس کے کھاتے میں کوئی لاش ڈالی جا سکتی ہے۔ آئے قتل تو ہر وقت دستیاب رہتے ہیں۔ وجہ قتل پرانی دشمنی، لین دین کا جھگڑا، ناجائز تعلقات کچھ بھی بتائی جاتی ہے اور گواہ... ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔

ایس ایس پی نے میز پر بید کی چھڑی مار کے مجھے متوجہ کیا "تم نے سن لیا سب؟"

میں نے کہا "سچ تو یہ ہے کہ کچھ سنا کچھ نہیں سنا۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔"

"میں ذاتی طور پر تم سے کوئی عناد نہیں رکھتا مگر تمہیں بے جا رعایت بھی نہیں دوں گا۔ تم متعدد مقدمات میں سماعت کے لیے پیش نہیں ہوئے چنانچہ تمہاری ضمانت منسوخ ہو گئی ہے۔ تم ایک مفرور مجرم قرار دیے جا چکے ہو۔ دیگر مقدمات بہت جلد عدالت میں پیش کیے جائیں گے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے وکیل بہت زبردست ہیں۔"

ایس ایچ او نے کہا "ایک تو سر وہی تھا۔ جس نے گرفتاری کے وقت مداخلت کی تھی۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "عبید الوور منظر۔ وہ خود بتائے گا کہ اس نے کس حد تک مداخلت کی تھی۔ میں اس الزام کی تردید نہیں کروں گا۔"

"وہ بہت سینئر ایڈووکیٹ ہیں" ایس ایس پی نے کہا۔

"ان کی ایک وکیل مس رابعہ قاری بھی ہیں جو نامعلوم وجوہ کی بنا پر اپنی پریکٹس چھوڑ کے ان کے ساتھ چلی گئی تھیں۔ وہ بھارت اور بنگلہ دیش میں بھی ان کے ساتھ تھیں۔"

میں نے کہا "ان پر اعانت مجرمانہ کا کیس بنتا ہے۔"

ایس ایس پی نے میرے طنز کو نظر انداز کر دیا "تم نے کسی قانونی جواز اور اجازت کے بغیر سرحد عبور کی تھی۔ انڈین گورنمنٹ نے اس پر باقاعدہ احتجاج کیا تھا کہ پاکستان کے تخریب کار بھارت میں گڑبڑ پھیلا رہے ہیں۔ تخریب کاروں کی فہرست میں تمہارا نام بھی تھا اور رابعہ قاری ایڈووکیٹ کا بھی۔ وزارت خارجہ نے یہ فہرست وزارت داخلہ کو ارسال کی تھی۔"

ایس ایس پی کے پی اے نے ایک اور فائل کھول کے ایک کاغذ نکالا "یہ اس کی نقل ہے۔"

میں نے نقل کو دیکھے بغیر پرزہ پرزہ کر دیا "اس فہرست میں کیا چوہدری دلاور کا نام ہے یا ایس ایس پی سراج، نواب خسرو جمشید اور وڈی سلوا کے نام ہیں۔ اس شخص استاد پیڈرو کا نام ہے؟ انہوں نے بھی بھارت میں بہت کچھ کیا تھا اور ان سب اسمگلرز اور غیر قانونی طور پر اسلحے کی خرید و فروخت کرنے والے بھارتی ایجنٹوں کے نام ہیں جن کے ساتھ ان کے مستقل کاروباری مراسم ہیں؟ کیا پولیس، تحقیقاتی ادارے، ہماری وزارت خارجہ و داخلہ کو نہیں معلوم کہ یہ لوگ کس قسم کے گھناؤنے کاروبار میں ملوث تھے۔ انہوں نے کتنا اسلحہ مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں کے ہاتھ فروخت کیا اور اس سے کتنی دولت کمائی۔ جب یہ بات ہم جانتے ہیں تو وہ لوگ ضرور جانتے ہوں گے ایس ایس پی صاحب جن کے ہاتھوں میں اس ملک کی سیاست کی باگ ڈور ہے۔ جو اس ملک کی معیشت کو کنٹرول کرتے ہیں اور نظم و نسق چلاتے ہیں۔ ان میں سے کس کس نے کتنا کتنا کمیشن لیا۔"

ایس ایس پی نے میز پر مکا مارا "بند کرو یہ بکواس۔ یہ عدالت نہیں ہے، تھانہ ہے۔ یہاں صرف تفتیش ہوتی ہے۔ اس جرم کی جس کی رپورٹ درج ہو۔ ایف آئی آر ہو۔"

"میں لکھوانا چاہتا ہوں رپورٹ۔ آپ لکھیں گے؟" میں نے کہا۔

"تم اگر یہ لکھو کہ صدر کینیڈی کے قتل میں مادام نور جہاں، پنڈت نہرو اور پاپائے روم ملوث تھے تو میں تمہیں پاگل خانے بھیج دوں گا۔ ان کے خلاف ایف آئی آر کاٹوں گا تو خود بھی وہیں پہنچ جاؤں گا۔ ثبوت لاؤ اور گواہی لاؤ پھر تم جس کے خلاف کہو میں رپورٹ لکھنے کو تیار ہوں۔ نام تم کسی کا بھی لے سکتے ہو مگر میں ریکارڈ دیکھ کے بات کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے چوہدری دلاور نے رابعہ قاری ایڈووکیٹ کو اغوا کیا۔ اس کے چشم دید گواہ ہیں۔"

"نام بتاؤ اس چشم دید گواہ کا" ایس ایچ او بولا۔

میں نے کہا "ایک پان سگریٹ بیچنے والا۔ جس کا کھوکھا عین رابعہ قاری کی کوٹھی کے سامنے ہے۔"

"ہم اسے بلا لیں گے" ایس ایچ او نے ایک کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھ کے ایک کانسٹیبل کو دیا "رپورٹ بھی لکھیں گے انشاء اللہ۔"

"میں رپورٹ لکھوانا چاہتا ہوں پولیس کے خلاف جو رابعہ کی کوٹھی میں کسی قانونی اختیار کے بغیر داخل ہوئی تھی۔ اس کوٹھی پر چوہدری دلاور نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔ پہلے اس سے یہ کوٹھی خالی کرا دی تھی پھر اس زمین پر اس نے کوٹھی بنا کے یہاں ایک طوائف چاندنی بیگم کو رکھا۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی اس کا قتل ہوا تھا۔"

ایس ایس پی نے کہا "صبح تک سوچ لو کہ تمہیں کس کس کے خلاف کیا رپورٹ لکھوانی ہے اور کیا تمہارے پاس ثبوت کے طور پر پیش کرنے کے لیے کچھ ہے؟ کوئی گواہ ہے۔ تم جن کا نام لے رہے ہو انہیں عدالت میں مجرم ثابت کر سکو گے۔ میرا ان سب معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے تو صرف تمہارے کیس دیے گئے ہیں۔ تم اپنی ذمے داری پر جو چاہو کرو۔ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ کچھ بڑے نامی گرامی صحافی بھی ہیں لیکن ایک بات اچھی طرح سمجھ لو مسٹر سکندر بخت۔ تمہارے یہ وکیل اور صحافی دوست انصاف کے عمل کو نہیں روک سکتے۔ وہ پولیس کے خلاف جو چاہیں لکھیں۔ اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ممکن ہے نچلی سطح پر دو چار لوگ معطل ہو جائیں یا کسی ایس ایچ او کا ٹرانسفر ہو جائے۔ پولیس کا محکمہ اور اس کے اختیارات وہی رہیں گے اور پولیس کی تحویل میں رہتے ہوئے سارا نقصان تمہیں ہوگا۔ تمہارے صحافی دوستوں کی ہنگامہ آرائی کا خمیازہ تم بھگتو گے۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ہی ماتحت عملہ بھی حرکت میں آ گیا۔ باہر کھڑے ہوئے کانسٹیبل فوراً ہتھکڑیاں لے کر اندر آ گئے اور انہوں نے مجھے پھر حوالات میں پہنچا دیا۔ میں اتنا دل شکستہ اور مایوس تھا کہ میں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا اور حالات کی اس تبدیلی پر غور کرنے لگا جو کسی طرح بھی غیر متوقع نہیں تھی۔ ایس ایس پی نے غلط نہیں کہا تھا کہ تمام صحافی اور وکیل مل کے بھی پولیس کے محکمے کو ختم کر سکتے نہ کردار بدل بھی نہیں سکتے۔ کوئی تحریک، احتجاجی جلوس، مظاہرے اور بیانات، رائے عامہ یا پبلک سب مقدمات کی نوعیت نہیں بدل سکتے اور کسی عدالت کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ مجرم کو قانون کے مطابق سزا دے۔ مجرم کو مجرم ثابت کرنا یا بے گناہ بنا کے پیش کرنا انہی کے اختیار میں ہے۔ وہ اصل ثبوت اور شہادت لا سکتے ہیں، بنا سکتے ہیں یا مٹا سکتے ہیں۔

...کو دھمکی سے اغوا کرا کے یا مروا کے عدالت تک رسائی نہ کرنے دیں تو ان کی مرضی اور وہ جھوٹے گواہ لے آئیں ... ہاتھ رکھ کے عینی شاہد بن جائیں تو یہ بھی ان کے اختیار میں ہے۔ پیشہ ور گواہ اور ضامن ہمیشہ پولیس کو دستیاب رہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سارے مقدمات میرے ہی خلاف درج ہوئے تھے۔ ہم نے کبھی چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے کسی فرد کے خلاف کبھی رپورٹ نہیں لکھوائی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نواب خسرو جمشید اور ایس ایس پی سراج جو اب اس دنیا میں نہیں تھے خود کچھ نہیں کرتے تھے اور جو کچھ وہ کرتے تھے اس کا کوئی ثبوت باقی نہیں چھوڑتے تھے۔ چوہدری دلاور نے میرے والد کی ساری جائداد پر قبضہ کر لیا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں یہ معاملہ عدالت تک لے جاتا، خود میں ان کے بار ٹینڈر شرافت علی کے قتل میں ملوث کر دیا گیا تھا۔ اس نے رابعہ کی ماں کو اسپتال میں قتل کر دیا اور اصل شکاری غائب ہو گئے تھے۔ رابعہ کی ماں کی تدفین کے بعد ان کے گھر میں بم کا دھماکا ہوا تھا تو وہاں کوئی شکاری نہیں تھا۔ تب ہم سب ہوئے تھے مگر ہم اپنے خلاف انتقامی کارروائی کرنے والے کسی شکاری کو بھی زیر دام نہیں لا سکے تھے۔ ایک انتہا کو پہنچ کے ہم نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے اور ان سے خود نمٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس فیصلے کے نتیجے میں ایم آر ایف وجود میں آئی تھی۔

لیکن آج قانونی صورت حال یہ تھی کہ سارے انسانیت سوز جرائم کرنے والے باعزت طور پر آزاد تھے اور حوالات کی سلاخوں کے پیچھے صرف میں تھا جس کے خلاف نہ ثبوت کی کمی تھی نہ شہادت کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہترین وکیل بھی مجھے باعزت طور پر رہا نہیں کرا سکتے تھے اور غالب جیسے صحافی اس سسٹم کو بدل نہیں سکتے تھے۔

بہت پہلے سمجھانے والوں نے مجھے سمجھایا تھا کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا اور میں نے اس خیال کو جذبات کی رو میں مسترد کر دیا تھا مگر آج میں حوالات میں یوں پڑا تھا جیسے اکیلا چنا ٹھنڈے بھاڑ کی دیواروں میں پڑا ہو۔

تجربے سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں خود میں یہ کہنے میں حق بجانب تھا کہ میرے خلاف مقدمات عدم پیروی کی بنا پر خارج ہو گئے ہیں یا سرد خانے میں پہنچ گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر سال سیکڑوں مقدمات محض اس وجہ سے ختم ہو جاتے ہیں کہ مدعی اور مدعا علیہ یا گواہ حاضر نہیں ہوتے۔ وکیل سرکار کو پیروی سے دلچسپی نہیں رہتی یا اس پر دباؤ نہیں رہتا۔ عدالت کے باہر ہی کٹ مکا ہو جاتا ہے۔ گواہ منحرف ہو جاتے ہیں یا ان کا قتل ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ عدالت زیادہ سے زیادہ اخبار کے اشتہار دے کے دوسرے مقدمات میں مصروف ہو جاتی ہے۔ ہر عدالت میں زیر تصفیہ مقدمات کی تعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ شاید انہیں جلد نمٹانا کسی بھی جج کے لیے ممکن نہیں خواہ وہ دن کے چوبیس گھنٹے عدالت لگائے۔ کیس کو دبانے میں پولیس کے ساتھ وکیل بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں اور وکیل بھی اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرتے۔ بعض اوقات خود مدعی ہاتھ جوڑتا ہے کہ خدا کے لیے میری جان چھڑاؤ۔ آئندہ کوئی میرے باپ کو بھی قتل کر دے تو میں کیس نہیں کروں گا۔ اتنا وقت صرف کرنا بھی ہوگا تو اس کے لیے دعائے مغفرت میں کروں گا۔

میرے کیس بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پرانے ہو گئے تھے اور فائلیں دوسرے مقدمات کی فائلوں کے انبار تلے دب چکی تھیں۔ مجھے مفرور قرار دیا جا چکا تھا اور سرکاری وکیل کی طرف سے عدم پیروی کی بنا پر ان معاملات کے از سر نو اٹھائے جانے کا کوئی امکان نہ تھا لیکن چوہدری دلاور کی طرف سے مصالحت اور مفاہمت کی ہر کوشش میں ناکامی کے بعد یہ کیس بطور خاص نکالے گئے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ دیوانی مقدمات ایک خاص مدت گزر جانے کے بعد دائر تک نہیں کیے جا سکتے اور فریقین حاضر نہ ہوں تو خارج بھی ہو جاتے ہیں مگر فوجداری مقدمات میں ایک فریق تو خود ریاست ہوتی ہے اور تاوقتیکہ حکومت خود ان مقدمات کو واپس نہ لے یہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔

چوہدری دلاور نے مجھے مہلت دی تھی۔ اس نے مجھے استاد پیڈرو کے ذریعے اور پھر اکبر خان کی معرفت پیشکش کی تھی۔ بالواسطہ طور پر مجھے رشوت بھی پہنچائی گئی تھی اور میرے تمام نقصانات کی تلافی کے ساتھ وہ میرے وقت اور میری ذہنی اذیت کی قیمت بھی ادا کرنے پر تیار تھا مگر میں نے غرض کے تحت بڑھائے جانے والے دوستی کے ہاتھ کو جھٹک دیا تھا۔ میں نے اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق فیصلہ کیا تھا اور میرے ساتھ سب کی ایک ہی رائے تھی کہ حالات خواہ کیسے بھی ہوں جو سجدہ خدا کو روا ہے وہ شیطان کو صرف کافر ہی کر سکتا ہے۔ شیطان کیسا ہی پارسا بن کے کیوں نہ آئے اس پر لعنت۔

شیطان مشتعل ہو کے ہمارے خلاف پھر سرگرم عمل ہو گیا تھا۔ چوہدری دلاور کے لیے اپنے سیاسی کیریئر کے آغاز سے پہلے یہ ازحد ضروری تھا کہ وہ اپنے بدنام ماضی کی مجرم پرچھائیوں سے نجات حاصل کرے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک وہ اپنے پرانے دشمنوں کے دلوں سے ہر قیمت پر دشمنی کے جذبات کو ختم کر دے۔ جب یہ ممکن نہ ہوا تو اس نے پھر دشمنوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ایک طرف کیکر شاہ کے خطرناک حد تک جنونی مریدوں کو ہمارے پیچھے لگا دیا تھا۔ کیکر شاہ کے مزار کو اکبر خان نے کاروباری رقابت کے باعث تباہ کرا دیا تھا مگر اس کا الزام ہم پر آ گیا تھا۔ یہ بھی شاید چوہدری دلاور جیسے عیار شکاری کا منصوبہ تھا۔ ہم اس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئے اور اب مجھے یقین تھا کہ پاگل عقیدت مندوں کے مجروح ہونے والے جذبات کی آگ

www.paksociety.com

ہمارا خون ہی بجھائے گا۔ وہ اسے ایک کارِ ثواب اور مقدس فریضہ سمجھتے ہوئے موقعے کی تلاش میں رہیں گے کہ ہمیں جہنم رسید کردیں۔ اس کوشش میں خود شہید ہوکے جنت میں داخل ہونا ان کے نزدیک گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔

اب چوہدری دلاور نے قانون کو ہمارے پیچھے لگادیا تھا اور یہ دوسری قسم کے دشمن بھی جان لے کر ہٹنے والے نہ تھے۔ خود چوہدری دلاور کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ لنگر شاہ کے مریدوں کو بھڑکا سکتا تھا اور ان کی ہمہ وقت رہنمائی کرسکتا تھا۔ وہ ہمارے خلاف تمام مقدمات کو از سرِ نو تازہ کرچکا تھا اور غالب امکان یہ تھا کہ کچھ اور مقدمات بھی پرانی فہرست میں شامل کیے جائیں گے جن میں لنگر شاہ کے مزار پر قتل و غارت گری اور آتش زنی کا جرم سب سے سنگین ہوگا۔ جب اس جرم کی تفصیلات منظرِ عام پر آئیں گی تو گواہ خود سامنے آئیں گے اور ہمارے جرم کی تشہیر ہماری جان کے دشمنوں کو دور دور سے کھینچ لائے گی۔

غالب اور نازو کے بارے میں سمجھا جاسکتا تھا کہ وہ چوہدری دلاور کی شرانگیزی سے کسی حد تک محفوظ رہیں گے۔ رابعہ پر ایک سینئر ایڈووکیٹ کی حیثیت سے ہاتھ ڈالنا آسان نہ تھا چنانچہ اسے ایک عورت کی حیثیت سے اغوا کرلیا گیا تھا۔ اپنے تمام مددگاروں اور دوستوں کی حمایت کے باوجود چوہدری دلاور کا سب سے آسان شکار میں تھا۔ میرے بعد گل بانو کا نمبر تھا جس کو بہ آسانی سابق ڈاکو ثابت کیا جاسکتا تھا۔ اسے ناگ منی کی حیثیت سے پہچاننے والے بھی بہت ہوں گے اور پولیس کے ڈاکوؤں سے خصوصی مراسم ہمیشہ رہے تھے۔ اپنے بھائی شیش ناگ کے گروہ کی ساری مجرمانہ سرگرمیوں میں ناگ منی برابر کی ملوث رہی تھی اور اس کے مجرم ماضی کے بارے میں پولیس سے زیادہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ قانون یہ کیسے تسلیم کرسکتا تھا کہ وہ تائب ہوکے گل بانو بن گئی ہے۔ پولیس کا موقف تو یہی ہوگا کہ اس نے بھیس بدل کے روپوش ہونے کے لیے شرافت کا لبادہ اوڑھا ہے اور تائب ہونے سے وہ جرائم بھی ختم تو نہیں ہوتے جن کی سزا باقی ہو۔ تیسرا نمبر محسن کا ہوتا جو میرا سب سے پرانا دوست تھا اور روزِ اول سے میرے تمام معاملات میں برابر کا شریک۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ محسن اور گل یہاں نہیں ہیں اور وقتی طور پر پولیس کی دسترس سے دور ہیں۔ انہیں سمجھایا جاسکتا ہے کہ فی الحال وہ اس شہر کی جانب رخ بھی نہ کریں۔ سیالکوٹ میں فوزیہ کا گھر ان کی بہترین پناہ گاہ تھا اور صورتِ حال کے بہتر ہونے تک ان کے سامنے نہ آنا ہی بہتر تھا ورنہ محسن کی ازدواجی زندگی کا دوسرا دور بھی ایک داستانِ عبرت بن جائے گا۔

مجھے آج پرانا وقت یاد آرہا تھا۔ پرانے لوگ یاد آرہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک دائرے میں سفر کرکے میں پھر وہیں پہنچ گیا ہوں جہاں سے سب کے ساتھ ایک ایڈونچر کا آغاز کیا تھا۔ ایک عظیم مقصد کے لیے جہاد کا سلسلہ وقت کی طویل مسافت تھی جس [illegible] نے تائیدِ ایزدی، اپنے عزم اور حوصلے کے ساتھ حادثات اور خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان تک سفر کیا تھا۔ ہر قدم پر مرگِ ناگہانی کا خوف حائل تھا مگر ہم پرعزم تھے اور ہم سے کہیں زیادہ طاقتور دشمن ہمارا بال بیکا نہیں کرسکا تھا۔

لیکن وہ سفر کامیابیوں کے تمام غرور اور ناکامیوں کی ساری تلخی کے ساتھ تمام ہوا تو سب کچھ وہی تھا۔ جب میں انگلستان سے آیا تھا تو میرا واسطہ جس قسم کے حالات سے پڑا تھا وہ بدلے نہیں تھے۔ میں وہی لاوارث سکندر بخت تھا جس کے باپ کو اس کی سب دولت چھین کر حقیر کردینے والے قاتل آج بھی آزاد تھے اور اتنے طاقتور تھے کہ قانون ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ نہ میرا گھر میرا تھا، نہ وزیر خان کا وہ کارخانہ مجھے ملا تھا جس کی جگہ اب اسپتال قائم کردیا گیا۔ اس اسپتال پر وزیر خان کا نام لکھا ہوا تھا مگر اس کا سنگِ بنیاد رکھنے والے بھی اس کے قاتل تھے۔ وزیر خان کی قبر سے نکالی جانے والی ہڈیاں آج بھی کسی گمنام مدفن میں میرا انتظار کررہی تھیں۔

میں سخت ڈپریشن کا شکار تھا۔ اب تو رابعہ بھی مجھ سے دور تھی اور مجھے اس کی قانونی مدد سے زیادہ جذباتی سہارے کی ضرورت تھی۔ حوالات میں میرے ساتھ تین مجرم پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک مرچکا تھا۔ پولیس نے اس پر تفتیش کے جو طریقے آزمائے تھے وہ ان کی تاب نہ لاسکا تھا مگر پھر بھی یہ قتل نہیں تھا۔ اس کے خون کا دعویٰ کرنے والا اسے قتل ثابت نہیں کرسکتا تھا۔ پولیس اسے لاوارث لاش قرار دے کر کسی فلاحی تنظیم کے حوالے کرسکتی تھی کہ وہ اسے میڈیکل کے طلبا کو بیچ سکتی تھی۔ اسے کسی شاہراہ پر ٹرک کے سامنے ڈال کر حادثاتی موت کا شکار قرار دیا جاسکتا تھا۔ لواحقین بے رسوخ لوگ ہوں تو لاش ان کے سپرد کرنا بھی مشکل نہ تھا۔ بندے نے حوالات میں اپنے ازاربند کا پھندا بنا کے خودکشی کرلی۔ کرائم رپورٹر اور میڈیکل افسر کی مدد سے بیان بھی جاری کیا جاسکتا تھا کہ متوفی دمے کا یا ٹی بی کا مریض تھا یا ہارٹ فیل ہونے سے مرگیا۔ بفرضِ محال معاملہ اخبارات تک پہنچ جائے تو [illegible] کی عدالتی تحقیقات کا ڈراما بھی چلتا ہے۔

میرے خیالات کی رو اس وقت ٹوٹی جب ایک نئے ملزم کو حوالات کے اندر پھینکا گیا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ وہی پان والا تھا جس کو میں نے چشم دید گواہ کے طور پر طلب کرنے کی حماقت کی تھی۔

اس نے مجھے دیکھا تو جیسے اس پر بجلی سی گر پڑی۔ "آپ یہاں۔" اور سے میں سمجھ گیا۔ "مجھے بھی آپ نے مروایا ہے۔"

میں نے اسے جھوٹی تسلی دی "تم کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ سچ بولنے دو۔"

"کچھ کیا ہوگا جی۔ ان کی جگہ فرشتے آجائیں گے" وہ [illegible]

"میرے دوست اور وکیل آجائیں گے، ہماری ضمانت ہوجائے گی۔"

"آپ نے تو کچھ کیا ہوگا۔ مجھے کیوں پکڑا ہے انہوں نے۔ میری ضمانت کس لیے جی؟" وہ رونے پر آگیا "کون دے گا میری ضمانت؟"

اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ سمجھاتا، حوالات کا دروازہ پھر کھلا اور دو سپاہی اسے گھسیٹ کر لے گئے۔ ایس ایچ او صاحب نے اسے طلب کیا تھا۔

میں نے چلا کے کہا "تم اتنا ہی بتانا جتنا تم نے دیکھا تھا۔"

وہ شور مچاتا رہا "میں نے کچھ نہیں دیکھا جی۔"

پولیس والوں نے اسے وہیں مارنا شروع کردیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں اس کے چیخنے کی دہشت ناک آوازیں سن رہا تھا اور میرے اعصاب جواب دینے لگے تھے "ایس ایچ او صاحب، خالو کو چھوڑ دو۔ ایک لاش تو پڑی ہے یہاں" میں نے حوالات کی سلاخوں والے دروازے کو ہلا کے کہا "کیا اسے بھی مار ڈالو گے۔ اس نے کیا جرم کیا ہے۔ آخر میں تم پر قتل کا کیس کردوں گا۔"

میری ہنگامہ آرائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پولیس مین مجھے بھی حوالات سے نکال کر عقبی حصے میں لے گئے۔ اگر میں چاہتا تو ہتھکڑی ہونے کے باوجود انہیں مار مار کے وہیں لٹا سکتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ اس طرح میرا کیس اور خراب ہوجائے گا۔ اس تھانے سے فرار ہونے کی کوشش کو کسی کانسٹیبل کی رائفل سے نکلنے والی ایک گولی ناکام کرسکتی تھی۔

وہ کمرا تفتیش تھا جہاں مجھے پولیس والوں نے فرش پر بٹھادیا۔ میرے سامنے جو منظر تھا اس نے رگوں میں میرے لہو کو منجمد کردیا تھا۔ میں خود بہت پہلے تفتیش کا نشانہ بنا تھا مگر ایک تماشائی کی حیثیت سے سفاکی اور بربریت کا یہ مظاہرہ دیکھنا بہت سخت سزا تھی۔ پان والے کو چھت سے یوں الٹا لٹکادیا گیا تھا کہ اس کا ایک پیر رسی سے ایک کنڈے میں بندھا ہوا تھا اور دوسرا پاؤں چھت کے دوسرے کنڈے میں۔ اس کے برہنہ جسم پر دو پولیس والے چھترکاری کررہے تھے۔ یہ جوتے کے سول جیسا چمڑے کا ڈیڑھ فٹ لمبا اور آٹھ انچ چوڑا ٹکڑا تھا۔ ہر ضرب کے ساتھ چمڑے کی آواز پٹاخے کی طرح آتی تھی۔ پان والا تڑپ کر چلاتا تھا اور اچھلتا تھا تو پھر جھٹکے سے نیچے آتا تھا۔ اس کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ رہی تھی۔ جب اس کی تمام منت سماجت رائیگاں گئی تو اس نے نیم دیوانگی کی کیفیت میں مجھے گالیاں دینی شروع کیں۔ پھر وہ پولیس والوں کو گالیاں دینے لگا مگر پولیس کے جلاد کسی مشین کی طرح اپنا کام کررہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اندھے بہرے ہوگئے ہوں۔ ان کے ہاتھ احساس سے محروم اور روبوٹ کی طرح چل رہے تھے۔ دیگر دو کانسٹیبل جو اس وقت وردی میں نہیں تھے دونوں کنڈوں میں سے گزرنے والی رسی کو تھوڑا تھوڑا کھینچتے جارہے تھے جس سے الٹے لٹکے ہوئے شخص کی ٹانگوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جارہا تھا۔ ظاہر ہے وہ ٹانگوں کو زیادہ سے زیادہ چار فٹ تک پھیلا سکتا تھا۔ جب کہ کنڈے آٹھ فٹ دور تھے۔ نظر یوں آتا تھا جیسے وہ ملزم کی ٹانگیں چیر کے اسے دو حصوں میں لٹکا ہوا چھوڑ دیں گے۔

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا۔ اس کی عملی تفسیر میں نے اس وقت دیکھی جب چند منٹ کے لیے چھتر مارنے والے دم لینے کے لیے رکے اور ایک منحوس صورت شخص نے بھوسے کپ میں سے ملزم کے زخمی بدن پر نمک والا پانی ڈالنا شروع کیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپا مگر اس کی ٹانگیں اب اتنی کس گئی تھیں کہ وہ اپنے جسم کا صرف زیریں حصہ ہلا سکتا تھا۔ اس نے ہوا میں ہاتھ چلا کے بھیانک چیخیں مارتے ہوئے سر کو جھٹکا اور بالآخر یہ اذیت اس کی قوتِ برداشت سے بڑھ گئی۔ وہ بے حس ہوکے جھول گیا۔ اس کے ہاتھ نیچے لٹک گئے اور اس کی باچھوں سے رال ٹپکنے لگی۔

میں یہ سب دیکھنے پر مجبور تھا۔ اگر میں آنکھیں بند کرلیتا تب بھی جسمانی عذاب سے چلانے والے شخص کی دل کو چیرنے والی آوازیں میرے کانوں میں آتیں اور میرے تصور میں یہ ننگِ انسانیت منظر رہتا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی ایس ایچ او صاحب تشریف لے آئے۔

"ہاں بھئی سکندر بخت۔ تمہارے گواہ نے کیا بتایا؟"

میں نے کہا "تم اسے میرے جرم کی سزا کیوں دے رہے ہو۔ اسے معاف کردو۔ میں نے غلطی کی تھی اس کا نام لے کر گواہ بنایا تھا۔"

"غلطی اور گناہ کے ذمے دار ہم نہیں ہیں۔ ہم جرم کو کچلتے ہیں۔" ایس ایچ او بولا "اب دیکھو نا۔ اتنی سینئر ایڈووکیٹ ہیں یہ

www.paksociety.com

تمھاری مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ۔ تمھارا کیا رشتہ ہے ان سے؟"

"جو ایک انسان کا دوسرے انسان سے ہو سکتا ہے۔"

"ایک عورت کا ایک مرد سے" وہ بولا "کتنا عرصہ ساتھ رہے ہو تم؟"

میں نے کہا "تم کو شرم آنی چاہیے۔"

اس نے میرے منہ پر چانٹا مارا "شرم تجھے نہیں آتی و۔۔۔ کے شادی کی نہیں اور اسے ساتھ لیے پھرتے تھے۔ کس کس کی بیوی تھی وہ؟"

اس کے بعد وہ رابعہ کے بارے میں بکواس کرنے لگا اور اس نے مجھے مشتعل کرنے کے لیے اتنی غلاظت اُگلی کی میرا دماغ بدبو سے بھر گیا مگر میں نے اسے یوں نظرانداز کیا جیسے لوگ گلی میں بھونکنے والے کتّے کو نظرانداز کرتے ہیں۔ اس نے ماؤں کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا حشر بھی وہی ہو جو پان والے کا ہو رہا تھا۔ بے لباس ہو جانے کے بعد آدمی خود اپنی نظر سے گر جاتا ہے اور اس کی عزت نفس باقی نہیں رہتی پھر جب اسے تھانے کے آسیب زدہ ماحول میں کسی جانور کی طرح اُلٹا لٹکا کے مارا جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ انسان ہونے سے گلی کا کتا ہونا بہتر ہے۔

زخموں پر نمک چھڑکنے والا ایک بالٹی کے ساتھ اندر آیا اور ذبح کیے ہوئے اور کھال اُترے ہوئے بکرے کی طرح لٹکنے والے ملزم پر پانی انڈیلنے لگا۔ جیسے قصائی گوشت کو دھونے کے لیے ڈالتے ہیں۔ کچھ دیر بعد بے ہوش شخص کراہنے لگا اور ہوش میں آگیا۔

ایس ایچ او کے حکم پر اسے اُتار لیا گیا۔ وہ زمین پر لوٹنے لگا اور دہائی دینے لگا "میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ تھانے دار صاحب، مجھے معاف کردو۔ تمھیں اللہ کا واسطہ۔ اس کے رسول کا واسطہ۔۔۔ میں مرجاؤں گا۔ میرے بیوی بچے ہیں۔"

ایس ایچ او نے اسے ٹھوکر مار کے دور پھینک دیا "جھوٹ بول کے جان بچانا چاہتا ہے۔ ابھی تیری گواہی کچی ہے۔"

اب اسے نہایت شرم ناک پوز میں ایک میز پر لٹا دیا گیا۔

"ہاں۔ کیا دیکھا تھا تو نے۔۔۔ بول۔"

گالی گلوچ کی زبان تو وہ عادتاً بولتے تھے لیکن میں نے دیکھا کہ اس وقت وہ جسمانی تشدد سے بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ان کو قطعی احساس نہ تھا کہ یہ اذیت برداشت کرنے والا بھی انھی جیسا انسان ہے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ عام آدمی کسی اور کے جسم پر کوئی معمولی زخم دیکھ کر تڑپ اُٹھتا ہے اور اس کے درد کو دل میں محسوس کرتا ہے۔ شاید تھانوں میں ہر روز تفتیش کرنے والوں کا احساس مرجاتا ہے یا پھر وہ ذہنی مریض ہوتے ہیں جو ایک انتقامی جذبے کے تحت انسان کو مارتے ہیں اور اتنی بے رحمی سے کہ وہ بعض اوقات مرجاتا ہے مگر وہ پُرسکون رہتے ہیں اور اتنی ہی بے حسی کے ساتھ دوسرے کو تختۂ مشق بناتے وقت بالکل نہیں سوچتے کہ یہ سب ان کے ساتھ ہو تو کیا ہوگا؟

پان والے کے ساتھ اگلے ایک گھنٹے میں جو شرمناک سلوک ہوا اس کو نہ یہاں بیان کیا جاسکتا ہے نہ یہ بیان قابلِ اشاعت ہو گا نہ میرے قلم میں طاقت ہے کہ اس بہیمیت کی تصویر کھینچ سکے گا اور پڑھنے والے شریف انسانوں کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرے۔ میرا تجربہ ہے ایک گھنٹے تک ایس ایچ او نے اپنی نگرانی میں تفتیش کی۔ میری منت سماجت کہ اس نے سنا ہی نہیں اور بالآخر تم نے ایک بار میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کے مجھے کھمبے سے باندھ دیا۔ وہ شخص کھمبا نہیں عمارت کا ستون تھا جس کے ساتھ میرا وجود بھی جامد ہو گیا۔ میں نے موت جیسی پُر آسیب تنہائی کو محسوس کیا۔ میں خود کو اتنا کمزور اور بے بس اور حقیر تھا کہ میرے دوست احباب معاشرہ اور وکیل "انصاف اور قانون کی بالادستی پر یقین رکھنے والے ملک کی اعلیٰ ترین عدالت" اقوام متحدہ "بین الاقوامی عدالت انصاف" اور ساری دنیا مجھے ایسی ہی عبرت ناک موت سے نہیں بچا سکتے تھے جیسی ایک بے قصور پان سگریٹ بیچنے والے کا مقدر ہوئی۔ اس کا کوئی قصور نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ معاشرے کے سب سے مظلوم اور محکوم طبقے کا فرد تھا۔ وہ کسی بھی وزیر، سفیر، کسی آئی جی، ڈی آئی جی یا مجسٹریٹ کا رشتے دار ہوتا یا واقف کار تک نہیں تھا۔ اگر وہ ایڈیشنل چیف سیکریٹری کے کتّے کو ٹہلانے والا ہوتا یا چیف سیکریٹری کے شوفر کا سالا بھی ہوتا تو کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ اسے ہاتھ بھی لگا سکے۔

میں سمجھ رہا تھا کہ مجھے اس بے گناہ کی عبرت ناک موت کا منظر آخری ہچکی تک دکھانے کا مقصد صرف مجھے دہشت زدہ کرنا تھا اور یہ سمجھانا تھا کہ میرے ساتھ بھی یہ سب ہو سکتا ہے اور میرے ساتھ ہی کیا، رابعہ بھی ان کے قبضے میں ہے۔ جہاں وہ غریب پان والا لٹکا ہوا تھا وہیں رابعہ مجھے دیکھنے کے لیے ضرور آسکتی ہے۔

میری عقل ماؤف ہو چکی تھی۔ یہ گزشتہ رات کی بات تھی کہ میں اور رابعہ خوشی کے ایک لمحے سے بچوں کی طرح خوش تھے۔ ہمیں وقت نے مستعار دیا تھا اور یہ نہیں جانتے تھے کہ آنے والا وقت کتنا بے رحم ہے جو ہم سے سب کچھ چھین لے گا۔ ہمارا اعتماد، ہمارا یقین اور احساسِ تحفظ، رفاقت کی خوشی اور زندگی کی ساری رعنائی سے معمور خوشی کے سب رنگ۔ ہم محبت کے ساحل کی نرم ریت پر موجوں کی گدگدی کو محسوس کرتے تھے اور اس بے رحم اور سفاک لمحے سے بے خبر تھے جو کسی خونی شکاری کی طرح دبے پاؤں چپکے آگے بڑھ رہا تھا۔

میرے ضمیر پر بھی بوجھ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ایک غریب پان والے کی بیوی کا سہاگ اُجڑنے کا ذمے دار میں ہوں۔ میں نے اس کے بچوں کو یتیم کیا ہے۔ میں نے اس کی مدد کرنے کا سوچا تھا۔ جب مجھے ایس ایچ او صاحب کے کمرے میں پیش کیا گیا تو میں نے ایک جھلک ان دونوں کی دیکھی جو کار میں بیٹھ کے پان والے کا کھوکھا اُجاڑنے آئے تھے مگر میری مداخلت کے باعث فرار

ہونے پر مجبور ہوگئے تھے۔

میں نے اعتماد سے محروم لہجے میں کہا "ایس ایچ او صاحب! یہ وہاں کون تھے؟"

"یہ ذی بندے ہیں جی" اس نے بے نیازی سے کہا اور پھر انسپکٹر کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"گاڑی ہے کوئی بندے کو لے جانے کے لیے۔"

"گاڑی پکڑ لیتے ہیں جی" اس نے کہا۔

"یہ کون لایا تھا گھر سے؟"

"حوالدار رحیم بخش جناب۔ سادہ کپڑوں میں گیا تھا۔"

"کسی نے دیکھا تو نہیں تھا؟" ایس ایچ او بولا۔

"نہیں سر جی۔ یہ کھانے کے بعد گلی کے نکڑ پر حلوائی کی دُکان پر بیٹھا تھا اور وہاں آدھی رات تک گپ لگاتا تھا۔ واپسی میں ہم نے گاڑی میں ڈال لیا تھا۔ گلی میں بالکل اندھیرا تھا۔"

"گاڑی کس کی تھی؟"

"اپنی ہی تھی۔ کوئی فکر خطرے والی بات نہیں سر جی۔ ہم کچا کام نہیں کرتے" سب انسپکٹر بولا۔

"اچھا جاؤ پھر اسے چھوڑ آؤ کہیں۔ ذرا ہوشیاری سے۔ کہیں ان کے صحافی دوست وہاں بھی نہ پہنچ جائیں تصویریں بنانے کے لیے" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کسی روڈ پر ڈال دیں جی؟"

"اور نہیں یار۔ وہ اپنا یار ہے۔ اُدھر ملتان روڈ کی طرف پھینکو تاکہ وقت پڑے اس۔۔۔ کو۔"

یہ سب کچھ میں نے دیکھا، سُنا اور برداشت کیا جس کا گواہ کوئی نہیں تھا۔ سوائے میرے، جس کی گواہی کی حیثیت کوئی نہ تھی۔ مجھے اپنی بزدلی پر شرم آئی مگر میری بہادری یہاں بے مصرف تھی۔ میں جو سکندرِ اعظم کہلاتا تھا اور چیف کے نوٹ تھا زنجیر سے بندھا ہوا قانون کی گرفت میں تھا اور خود کو باز کے شکاری پنجے میں قید چڑیا سے بھی زیادہ بے بس اور کمزور محسوس کر رہا تھا۔ میں ساری شوخی اور ظرافت بھول گیا تھا۔ اپنی اعلیٰ تعلیم اور اپنا حسب نسب، اپنے اعلیٰ و ارفع نظریات۔ اپنی جمالیاتی حس، انسانی اخلاقی اقدار پر اپنا یقین، اپنے رشتے اور ان رشتوں کے ناقابلِ شکست ہونے کے دعوے سب بھول گیا تھا۔ اس لمحے کو کوسنے سے کچھ حاصل نہ تھا جب میں نے رابعہ کی بات مان کے اس کی کوٹھی تک جانے کے لیے رکشا روکا تھا۔ میری خوش قسمتی کا کوٹا ختم ہو گیا تھا۔

فلسطین کی جنگِ آزادی میں شامل ایک پاکستانی جاں باز کی ناقابلِ فراموش جدوجہد

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی

علی یار خان کی سرگزشت

مجاہد

کتابی صورت (گیارہ حصوں میں مکمل) میں تیار ہے

قیمت فی حصہ -/50 روپے ۔۔۔۔ ڈاک خرچ -/16 روپے

گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت صرف /450 روپے

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس 23

رمضان چیمبرز۔ بلوریا اسٹریٹ (نزد دفتر اخبار جنگ) آئی آئی چندریگر روڈ کراچی۔ 74200

www.paksociety.com

میں کچھ بھی نہ کرتا تب بھی شاید ایسا ہی ہوتا یا بدتر ہوتا۔
غالب نے ایسے ہی وقت میں کہا ہو گا کہ ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے۔ رات کے دو بج کر چالیس منٹ پر میں نے اس شخص کے بے جان جسم کو جاتے دیکھا جس سے میری دوستی یا دشمنی تو کیا جان پہچان تک نہ تھی۔ جس کا نام تک مجھے معلوم نہ تھا۔ شخص اس جرم میں اسے بے دردی سے مار دیا گیا تھا کہ اس نے نادانستگی میں وہ دیکھ لیا تھا جو اسے نہیں دیکھنا چاہیے تھا اور وہ سن لیا تھا جو اس کے کانوں کے لیے نہیں تھا۔ سبق مجھے پڑھایا گیا تھا کہ دیکھو ’ریاستی تشدد کیا ہوتا ہے اور لاقانونیت کی طاقت کے سامنے سر نہ جھکانے کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ سچ وہ ہے‘ قانون وہ ہے اور لازم وہ ہے جو طاقتور اور حکمران کا فرمان امروز ہے۔ باقی سب جو کتابوں میں اور صحیفوں میں لکھا ہے اور کسی فلسفی یا مفکر کا فرمایا ہوا ہے‘ جو سیمپوزیم اور سیمیناروں میں بولا اور پڑھا جاتا ہے یا اقوال زریں میں شمار ہوتا ہے‘ سب ڈراما ہے۔ زندگی کی اصل حقیقت سے اس کا کیا تعلق۔ بھوک اور مفلسی‘ جبر و استبداد‘ استحصال اور حیوان ناطق کی سطح پر جینے کی مجبوری کا سیاست اور ادب‘ آرٹ اور نظریاتی علم‘ تہذیب کی دانشوری اور آئیڈیلزم سے کیا تعلق؟

ایک بار پھر مجھے حوالات میں پہنچا دیا گیا۔ تشدد سے ہلاک ہونے والے پہلے مجرم کی لاش ابھی تک وہیں پڑی ہوئی تھی اور باقی دو اپنی جسمانی اذیت کے باوجود سو رہے تھے۔ نیند اور بے ہوشی انسان کی جسمانی قوت برداشت کو بحال کرتی ہے۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ صرف میری آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ میں اچانک بدل جانے والے حالات کا تجزیہ کرنے کی کوشش ناکام میں مصروف تھا۔ میرے ذہن میں انتشار تھا اور میں خیالات کو ایک جگہ مرتکز کرنا چاہتا تھا مگر سوچ کے دھارے کبھی ایک سمت میں بہنے لگتے تھے‘ کبھی دوسری سمت میں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت رابعہ کہاں ہوگی اور اس پر کیا بیت رہی ہوگی؟ وہ کیا سوچ رہی ہوگی اور کیا محسوس کر رہی ہوگی؟ میں غالب اور نادو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا وہ کچھ کر سکیں گے؟ مزید کچھ کیا جائے گا؟

صبح کے چار بجے سے کچھ پہلے کا وقت تھا جب اچانک دروازۂ زنداں کھلا اور میں نے اپنے مقابل ایک نیا چہرہ دیکھا۔ وہ ایک اسمارٹ اور خوش پوش‘ نوجوان آدمی تھا ”مسٹر سکندر بخت!“ اس نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا ”میرے ساتھ آئیے۔“

میں نے کہا ”تم کون ہو؟“

اس نے کہا ”میرا نام رفیق ہے۔ رفیق کے معنی ہوتے ہیں دوست۔“

”میرے کسی دوست کا نام رفیق نہیں“ میں نے حوالات سے باہر آتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرایا ”چلیں اب یہ نام بھی شامل کر لیں اس فہرست میں۔“

”کس نے بھیجا ہے تمہیں؟“ میں نے کہا۔

اس نے میری بات کا جواب گول کر دیا ”مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یہ پریشانی اٹھانی پڑی۔ مجھے کچھ دیر ہو گئی ورنہ یہ کارروائی نہیں ہوتی۔“

”کیا مطلب! تم میری رہائی کے احکامات لے کر آئے ہو گورنر کی طرف سے؟“ میں نے کہا۔

خلاف توقع تھانے کے عملے نے نہ میرا راستہ روکا‘ نہ میری طرف نظر اٹھا کے دیکھا۔ وہ ایسی بے نیازی برت رہے تھے جیسے میں کسی کام سے تھانے آیا تھا اور واپس جا رہا ہوں تو ان کی بلا سے۔ باہر ایک سفید فاکس ویگن کھڑی ہوئی تھی ”بیٹھئے پلیز۔“

میں نے کہا ”مسٹر رفیق! جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ اب مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے اور کیوں‘ میں گاڑی میں نہیں بیٹھوں گا۔“

”ویسے تو آپ آزاد ہیں“ اس نے کہا ”آپ کہیں بھی جا سکتے ہیں لیکن میرے ساتھ جانے میں آپ کا فائدہ ہے۔“

”کس قسم کا فائدہ؟“

”اہم سوال آپ کے مستقبل کا ہے۔ آپ کو اس کی فکر نہیں ہے؟ اور آپ کے مستقبل سے میری مراد ہے ان سب کا مستقبل جن سے آپ کا کوئی رشتہ ہے۔“ اس نے خاصے محتاط انداز میں گول مول بات کی ”آپ کو مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ میرے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں ہے۔ آپ تلاشی لے سکتے ہیں۔ اور میں بلیک بیلٹ تو کیا‘ جوڈو کے نام کے سوا کچھ نہیں جانتا“ وہ ہنسا۔

میں اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ”او کے مسٹر رفیق۔ چلو‘ آسمان سے گر کے کھجور میں اٹکنا بھی مجھے منظور ہو گا۔“

”ہو سکتا ہے اس فیصلے کے بعد آپ بحفاظت زمین پر اتر جائیں۔ کھجور میں اٹکے بغیر۔ مگر سیف لینڈنگ کے لیے پیراشوٹ ضروری ہوتا ہے۔ اور جب آدمی ہوا میں معلق ہو‘ یعنی نہ اس کے پیر زمین پر ہوں‘ نہ وہ کشش ثقل کا مقابلہ کر سکتا ہو۔ تو اس کا رفیق پیراشوٹ ہوتا ہے۔“

”مسٹر رفیق! تم بہت چالاک اور عیار آدمی ہو۔ باتوں کے جال بننے کے ماہر“ میں نے کہا ”تم نہیں بتاؤ گے کہ تمہیں کس بااختیار نے بھیجا تھا اور تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔“

”یہ سسپنس بہت جلد ختم ہونے والا ہے۔ تم خود سب جان لو گے“ وہ بولا۔

گاڑی ہوٹل ایمبیسیڈر سے سیدھی گزر رہی تھی۔ آگے آ کے رفیق نے موڑ کاٹا اور ہم اس پتلی سی سڑک پر آ گئے جہاں اعلیٰ حکام کی سرکاری رہائش گاہیں تھیں اور میں نے سنا تھا کہ یہاں بیوروکریسی کے سطح کے بادشاہ لوگ رہتے ہیں۔ گاڑی ایسی ہی ایک

کوٹھی کے گیٹ پر رک گئی۔ دروازے پر کھڑے ہوئے سنتری نے کار کو جھانک کر دیکھا اور مطمئن ہو کے انٹرکام پر اندر بات کی۔ چند لمحوں میں دروازے کا خودکار قفل کھلا اور ہم آہنی پھاٹک سے اندر گاڑی نما ڈرائیو وے پر آگئے جو سیدھی پورچ تک جاتی تھی۔ گو پورچ میں پہلے سے دو کاریں موجود تھیں جن میں سے ایک پر مجھے جھنڈا بھی نظر آ رہا تھا۔

فاکس ویگن بائیں جانب دو چھوٹی گاڑیوں کے ساتھ ٹھہر گئی اور رفیق نے بڑے دوستانہ انداز میں مجھے مخاطب کیا۔ ”لیجئے ہم پہنچ گئے۔ اب تو یقین آجانا چاہیے آپ کو کہ آپ آسمان سے گر کے کھجور میں نہیں اٹکے ہیں بلکہ آپ آسمان سے گرے ہیں تب ہی آپ کو پھر اٹھا کے آسمان پر پہنچایا جا سکتا ہے۔ میری مراد ہرگز دنیا سے نہیں ہے۔ ادھر سے آئیے میرے ساتھ۔“

ہم صبح کے چار بجے اس کوٹھی کے عقبی حصے سے اندر گئے جو بہ یک وقت حاکمیت کے اختیارات اور غرور کا آئینہ دار تھا۔ اس کی ظاہری شان و شوکت اگرچہ حسن تعمیر کا شاہکار نہیں تھی نہ رنگینوں اور دولت مندی کا اشتہار لیکن اس کی فضا میں دبدبہ تھا اور اس کے در و دیوار زبان خاموشی میں پکارتے تھے کہ ’باادب‘ باملاحظہ ہوشیار۔

رفیق اس اہم سرکاری عمارت میں اجنبی نہیں تھا۔ جس طرح اسے دربان نے محض ایک نگاہ ڈال کے داخلے کا اجازت نامہ عطا کر دیا تھا‘ وہی اس کے معتبر ہونے کی سند تھا۔ وہ جتنے اعتماد کے ساتھ مجھے اندر لے گیا اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ محرم راز سیاہ خانہ بھی ہے۔ اس نے مجھے ایک کمرے میں بٹھا کے ساری لائٹس آن کر دیں۔ یہ ڈرائنگ روم نہیں تھا بلکہ لائبریری کی طرح کی جگہ تھی جہاں خصوصی ملاقاتوں کے لیے دیوار کے ساتھ ساتھ صوفے لگوائے گئے تھے۔ وہ سب امور جو دفتر میں یا ڈرائنگ روم میں زیر بحث نہیں لائے جا سکتے تھے‘ اس لائبریری کی تنہائی میں کسی مداخلت کے بغیر زیادہ رازداری کے ساتھ طے کیے جا سکتے تھے۔

میرے دائیں جانب دیوار کے ساتھ وسیع ٹیبل لگی ہوئی تھی جس پر ایک ٹیلی فون اور دو ٹیبل لیمپ رکھے ہوئے تھے۔ بالکل سامنے بہت بیش قیمت ڈرائنگ سیٹ تھا اور درمیان میں ایک بڑا گلوب سنگ مرمر کے چھوٹے سے چبوترے پر نصب تھا۔ لازمی طور پر یہ کسی وزیر با تدبیر کی اقامت گاہ تھی۔ دیواروں پر شفاف شیشوں کی الماریوں میں سرکاری و ضخیم سرکاری مطبوعات مجلد صورت میں مقفل تھیں۔

سمجھنا یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ وزیر موصوف کا ان تمام حالات میں کیا کردار ہوگا۔ وہ مجھے نفسیاتی طور پر مزید دہشت زدہ کرنا چاہتے یا کوئی مصالحتی فارمولا پیش کریں گے جو بیک وقت میرے لیے اور چودھری دلاور کے لیے قابل قبول ہو۔ صاف ظاہر تھا کہ اس ملاقات کے لیے یہ جگہ کسی غیر جانبدار فریق کی تجویز کردہ نہیں تھی۔ خود چودھری دلاور کی خواہش پر مجھے یہاں بلایا گیا تھا بلکہ منگوایا گیا تھا جس سے وزیر موصوف اور چودھری دلاور کے درمیان پہلے سے موجود رابطے کا اظہار ہوتا تھا۔

میں حکومت کے ہر وزیر کو پہچانتا تو درکنار اس کے نام اور چہرے سے بھی واقف نہ تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں عرصہ دراز سے باہر تھا اور ویسے بھی مجھے ملک کا سیاسی نظم و نسق چلانے والوں کے کوائف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں یہ نہیں دیکھتا تھا کہ ملک کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہے‘ یہ دیکھتا تھا کہ ملک ٹھیک چل رہا ہے یا نہیں اور اقتصادی و سیاسی طور پر حالات بہتری کی جانب رواں ہیں یا روبہ تنزل ہیں۔

یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ جھنڈے سے یہ کسی وزیر ہی کی سرکاری کوٹھی ہو۔ بہت سے نچلے درجے کے سربراہان محکمہ‘ بیوروکریسی کی سطح کے لوگ‘ یہاں تک کہ ڈپٹی کمشنر بھی گاڑیوں پر جھنڈا لہراتے پھرتے تھے جو خلاف ضابطہ ضرور تھا مگر ضابطے ان کے مزاج اور ان کی مرضی کے تابع رہتے تھے‘ وہ ضابطوں کے پابند نہیں تھے۔ گاڑی پر جھنڈا لہرانا اپنے اقتدار اور اختیار کے اعلان کے مترادف تھا اور وہ بادشاہت کے نقیب کا کام کرتا تھا جو شاہی سواری کی آمد سے پہلے ہٹو بچو۔ ہوشیار‘ خبردار‘ باادب‘ باملاحظہ کی صدا لگانے پر مامور تھے۔ خاص سواری آ رہی ہے۔ عام آدمی اپنی جان خود بچائے اور اس راہگذر سے دور رہے۔

مجھے وہاں بیٹھے بیس منٹ ہو چکے تھے۔ ایک کلاک کی مترنم آواز نے پانچ بجنے کا بتایا اور اس کے ساتھ ہی چودھری دلاور نے ایک پردے کو ہٹا کے کمرے میں قدم رکھا۔ میں نے حیرت کے کسی رد عمل کا اظہار نہیں ہونے دیا اور اسے یوں دیکھتا رہا جیسے میں اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

چودھری دلاور کو معلوم تھا کہ میں اس سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا۔ اس نے کوشش بھی نہیں کی اور میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”تم پوچھو گے نہیں کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟“ اس نے کہا۔

میں نے کہا ”نہیں۔ پولیس اسٹیشن پہنچا کے مجھے دہشت زدہ کیا گیا تھا‘ یہاں مجھے مرعوب کیا جائے گا۔“

وہ مسکرایا ”ہمارا تو خیال یہ تھا اپنے سکندر صاحب کہ نہ تم دہشت زدہ ہوتے ہو نہ مرعوب۔“

”کم ظرف لوگ اس کی کوشش تو کرتے ہیں“ میں نے تلخی سے کہا۔

”او یار! اپنے سکندر صاحب! ہم کوئی عام آدمی ہیں؟ میں اور تم ہیں نا جی!“ اس نے پاؤں سینٹر ٹیبل پر پھیلا دیے۔ ”اکڑ دکھانی ضروری ہے تو بندے کو خیال کرنا چاہیے اپنے لیول کا۔ ہیں جی! ہم کوئی شہدے لفنگے تو ہیں نہیں کہ دو چار سو کی خاطر ایک دوسرے

www.paksociety.com

سے لڑیں۔ کبھی بس میں' کبھی گلی محلے میں۔ کپڑے پھاڑیں اور ایک دوسرے کے گھر میں گھس جائیں۔ نہ ہم وہ ہیں۔ کیا نام ہے اس کا گینگ لیڈر۔ بدمعاشوں کے گروہ کے لیڈر...... ہیں جی۔"

"بہت جلد تم ثابت کر دو گے کہ ہم ایک ہی ذہنیت اور ایک ہی سطح کے لوگ ہیں چنانچہ ہمارے درمیان کوئی لڑائی نہیں۔"

وہ مسکرایا "لڑائی! اوہ یار! لڑائی تو بڑی گھٹیا بات ہے۔ ہیں جی' لوگ لڑتے ہیں زمین کے پیچھے۔"

میں نے کہا "میرے اور تمہارے درمیان اسی زمین کا مسئلہ ہے جسے میں مادرِ وطن سمجھتا ہوں مگر جس کے ساتھ تم پیشہ ور طوائف جیسا سلوک کرنا چاہتے ہو۔"

"اپنے سکندر صاحب! غلط بڑا مارتے ہو آپ۔ پڑھے لکھے ہو نا۔ ہم اپنی سیدھی سادی زبان بولتے ہیں" دلاور نے کہا "ہمارے درمیان لڑائی نہیں' اختلاف ہے کچھ باتوں پر۔ لیکن وہ...... کیا نام ہے اس کا...... مسئلہ اتنا سنگین نہیں ہے یار۔"

میں نے کہا "چوہدری دلاور! تم جب مجھے یار کہہ کے مخاطب کرتے ہو تو مجھے لگتا ہے کہ یہ لفظ ایک گالی ہے۔ خدا نہ کرے کہ میں تمہارا یار' منافق۔"

"اچھا جی مسٹر سکندر بخت! صبح صبح کا وقت ہے' اچھی بات سے دن کا آغاز کرتے ہیں۔ دشمنی یا اختلاف۔ جو بھی تم کہو۔ کوئی اچھی بات تو نہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ پرانی باتوں کو بھول کے ہم نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ ہیں جی' نیک نیتی کے ساتھ۔"

میں نے کہا "ہاں۔ نیک نیتی کا پہلا ثبوت تم نے رابعہ کو اغوا کر کے فراہم کر دیا ہے۔"

ایک ملازم چائے کی ٹرالی لے کر آیا اور خاموشی سے لوٹ گیا۔

"چائے تو پیو گے نا؟" اس نے درخواست کے انداز میں کہا۔

"اصلاً میں بھی پٹھان ہوں۔ ہم دشمن کے گھر میں کھانے پینے کو حرام سمجھتے ہیں" میں نے کہا۔

"یہ میرا گھر نہیں ہے۔ مجھے بھی بلوایا گیا ہے یہاں تمہاری طرح۔"

"آخر کیوں؟"

"صلح صفائی کے لیے' اختلافات ختم کرنے کے لیے۔"

"وہ کون ہے جو ثالث بن کے چاہتا ہے کہ ہم اختلافات ختم کر دیں! کیا دلچسپی ہے اسے ہمارے معاملات سے اور کیوں؟ اور وہ اتنا ہی بااختیار ہے تو سامنے آ سکے۔"

"یہ اختیار اس نے مجھے دیا ہے" دلاور نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی۔

میں نے ہاتھ مار کے چائے گرا دی "صاف کیوں نہیں کہتے کہ وہ تمہارا آدمی ہے' تمہیں اس کی پشت پناہی حاصل ہے۔ تم اس کا نام کیوں نہیں بتاتے؟"

دلاور نے اس دھبے کو دیکھا جو قالین پر چائے گرنے سے نمودار ہو گیا تھا مگر اس نے کپ اٹھانے کی کوشش نہیں کی "اپنے سکندر صاحب! حالات بہت بدل گئے ہیں۔ کچھ اندازہ تو کر لیا ہو گا تم نے۔ اپنی زندگی کی قدر کرو۔ ہیں جی' بہت کچھ گنوا دیا ہے تم نے مگر ابھی بہت کچھ ہے تمہارے پاس۔ سب سے بڑھ کے یہ خود زندگی ہے ساری زندگی تمہارے سامنے ہے۔ بڑی لمبی ہے یہ سڑک۔ اس پر چلتے جاؤ جہاں تک ہمت ہو۔ خدا نے تمہیں عقل دی ہے اور حوصلہ دیا ہے۔ پہلے مجھے بولنے دو' میری پوری بات سن لو اس کے بعد جو چاہو کہنا۔ میں سنوں گا۔ ہیں جی' دنیا میں تمہارے دوست بھی بہت ہیں اور ابھی تک یاری نبھا رہے ہیں وہ لیکن ذرا سوچو کب تک کوئی ساتھ دے سکتا ہے کسی کا؟ ہر ایک کی اپنی زندگی...... ہوتی ہے۔ اس کا ایک حصہ تو دیا جا سکتا ہے' پوری زندگی نہیں۔ ابھی تک تم نے کچھ بھی نہیں گنوایا ہے سوائے تھوڑے سے وقت کے۔ جو تمہارا تھا وہ سب تمہیں مل سکتا ہے۔"

"بشرطیکہ میں تم سے تعاون کروں؟"

"میں نے کہا تھا کہ پہلے میری بات ختم ہو جانے دو۔ پھر بولنا اپنے سکندر صاحب' بُرے وقت میں سایہ بھی آدمی کا ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ یہ صرف وہ نہیں ہے کیا نام ہے اس کا..... ضرب المثل۔ یہ حقیقت ہے۔ تم چاہو تو تمہیں سب واپس مل سکتا ہے۔ تمہارا گھر' تمہارے والد کی جائیداد' وہ جگہ جہاں اب اسپتال قائم ہے' ان کا پرانا کاروبار۔ تمہارے سارے مالی نقصانات کی تلافی ہو سکتی ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "تمہاری شرائط پر مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں تم سے خیرات میں کچھ بھی نہیں لوں گا۔ میں تو اپنا حق چھین لوں گا۔"

وہ ہنسا "اپنے سکندر صاحب! فلمی ڈائیلاگ بڑے اچھے لگتے ہیں۔ وہ ہے نا اپنا۔ کیا نام ہے اس کا' محمد علی۔ خوب کرتا ہے عدالت میں جج پر۔ ایسے کسی عدالت میں کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تمہاری پوزیشن پہلے بھی نہیں تھی اور اب تو بالکل نہیں ہے۔ میرا مطلب قانونی پوزیشن سے ہے۔"

"مجھے معلوم ہے دلاور کہ میرے خلاف تمام پرانے مقدمات کس کے اشارے پر از سر نو شروع کیے گئے ہیں۔ تم نے بتا دیا ہے خفیہ ہاتھ جو تمہاری پشت پناہی کر رہا ہے" میں نے مینارِ پاکستان کے ماڈل پر لگے ہوئے جھنڈے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ جھنڈا حکومت' اقتدار اور اختیار کی علامت ہے۔"

"غلط۔ یہ ایک جذبے کی علامت ہے' ایک مقصد اور ایک منزل کی علامت ہے جو برصغیر کے مسلمانوں نے طویل جدوجہد اور لامحدود قربانیوں کے بعد حاصل کی تھی۔ یہ میری سربلندی کی علامت ہے کہ میں ایک پاکستانی ہوں اور یہ میرا جھنڈا ہے۔"

"ایک تو اپنے سکندر صاحب! زیادہ پڑھنا بھی بندے کو وہ بنا دیتا ہے' کیا کہتے ہیں اسے؟ خواب پرست اور آئیڈیلسٹ' یار' جو تم کہتے ہو وہ ہونا چاہیے مگر ہے نہیں" چوہدری دلاور نے کہا "جذبات کی زبان مت بولو' عقل سے بات کرو۔ یہ جھنڈا تمہارا ہے تو کسی دن نکلو گاڑی پہ لگا کے' اپنی کوٹھی پہ لہرا کے رکھا کرو۔ خاص دنوں میں نہیں' عام دنوں میں۔ بابا' یہ حاکم لوگ لگاتے ہیں جو حکومت کا اختیار رکھتے ہیں۔ ہم جیسوں کی دشمنی میں اور حکومت سے پنگا لینے میں بڑا فرق ہے۔"

"گویا رابعہ کو بھی حکومت نے اغوا کیا ہے۔ تم نے نہیں؟"

"اغوا کس نے کیا ہے رابعہ کو اپنے سکندر صاحب!" اس نے پرتمسخر انداز میں کہا "غلط فہمی......"

"غلط فہمی!" میں نے برہمی سے کہا "پھر وہی غلط فہمی۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں صرف مجھے غلط فہمی ہوتی ہے۔ ساری دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اسے میں ہی غلط سمجھتا ہوں۔ ورنہ وہ بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔ آخر میں کیا ہوں؟ احمق یا فاترالعقل۔"

وہ سنجیدہ اور خاموش بیٹھا مسکراتا رہا۔ "اب میری سمجھ شریف میں تو دوسرا کوئی لفظ آتا نہیں۔ آخر میں اسے کیا کہوں؟ اغوا کیا ہوتا ہے؟ کسی کو اس کی مرضی کے خلاف زبردستی لے جانا۔ ہیں جی' جب کوئی اپنی مرضی سے کہیں جائے اور وہ عاقل و بالغ بھی ہو......"

"بند کرو یہ فضول بکواس......" میں نے چیخ کے کہا "تم سمجھتے ہو کہ تمہارے جرم کا گواہ کوئی نہیں رہا تو تمہارا کوئی جرم بھی نہیں رہا۔ ایک گواہ تو وہ غریب پان والا تھا۔ یقین رکھو دلاور! اس کے مظلوم بیوی بچوں کی آہ ضرور لگے گی تمہیں۔ تمہارا بھی ایک گھر ہے۔ جب تم دوسروں کے گھر کو آگ لگاؤ گے تو کبھی کوئی دیوانہ تمہارا گھر بھی پھونک دے گا۔"

اس نے ایک لمبی گہری سانس لی "یار! دنیا میں جو بھی ہو رہا ہے دلاور کی مرضی سے نہیں ہو رہا ہے۔ اس پان والے کا اس معاملے سے کیا تعلق۔ اس نے شرافت سے کھوکھا چھوڑنے سے انکار کر دیا تو اور وہ جو بے ڈھنگے لوگ تھے۔ پھر بھی میں کہتا ہوں کہ یہ برا ہوا۔ اسے مارنے کی ضرورت نہیں تھی۔ غریب بندہ تھا' دس بیس ہزار لے کر جگہ چھوڑ دیتا۔"

"تمہیں کس نے بتایا کہ پان والے کا کھوکھا ہٹانے والے کون لوگ تھے؟"

"یہ اپنا رفیق بڑے کام کا بندہ ہے۔ سارے شہر کی خبریں اس کے پاس ہوتی ہیں" چوہدری دلاور نے کہا "میں نے کہا ہے اس سے کہ جا کے اس کے گھر والوں کو بیس ہزار دے آئے میرا نام لیے بغیر۔"

"سبحان اللہ! ایک ہاتھ سے دنیا میں شر پھیلا رہے ہو اور دوسرے ہاتھ سے جنت کا سودا بھی ہو رہا ہے۔ بہت خوب چوہدری دلاور! کیا بات ہے تمہاری سخاوت اور بندہ پروری کی......"

"تم سے تو کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ دنیا داری کی یہی رسم ہو گئی ہے اور سیاست میں تو یہی نسخہ ہے کامیابی کا۔ ہیں جی۔"

"ہاں جی۔ ادھر ایک عورت کو اغوا کیا' ادھر ایک تصویر شائع کرا دی کسی غریب بیوہ کو سلائی مشین دیتے ہوئے۔"

"پھر وہی اغوا! اوہ یار' وہ اپنی مرضی سے گئی تھی میرے ساتھ۔ تم یہ بات سمجھتے کیوں نہیں چاہتے۔"

"اس لیے کہ میں ہی کیا' کوئی بھی ہوش مند آدمی یہ تسلیم نہیں کرے گا اور نہ رابعہ جیسی سمجھدار عورت تمہارے ساتھ جا سکتی ہے۔"

"وہ تم سے زیادہ سمجھ دار ہے' تم سے زیادہ ٹھنڈا دماغ ہے اس کا" چوہدری دلاور بولا "تم بھی آرام سے بات کر لیتے تو کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ تم پہلے پوچھتے تو سہی کہ میں وہاں کیا لینے آیا تھا۔ رابعہ نے پوچھا اور میں نے کہا کہ چلو کہیں بیٹھ کے بات کرتے ہیں' اپنے سکندر کو بھی تم مجھ سے بہتر طریقے پر سمجھا سکتی ہو' وہ کوئی دیہاتی جاہل عورت یا دودھ پیتی بچی نہیں ہے۔ اس نے میری بات مان لی۔ اسے تم پر جتنا اعتماد ہے اتنا ہی اپنے آپ پر ہے۔ ہیں جی۔"

میں اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا "کہاں لے گئے تھے تم اسے؟"

"ہم انڈس ہوٹل کے نیچے گلیکسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے تھے۔ اس نے وہیں سے فون کیا تھا تمہیں...... ہیں جی۔"

"میں نہیں مان سکتا۔" میں نے کہا "کہیں جانے سے پہلے وہ مجھے ضرور بتا دیتی۔ ایسے خاموشی سے تمہارے ساتھ نہ چل پڑتی۔"

"تم مان لو گے اپنے سکندر صاحب' جب تمہاری بات رابعہ سے ہو گی" چوہدری دلاور بولا۔

"اس نے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ وہ گلیکسی ریسٹورنٹ میں بیٹھی ہے؟" میں نے کہا۔

"تمہارے ڈر سے۔ اس کا خیال تھا کہ تم بھی پہنچ جاؤ گے وہاں۔ ہیں جی' اور پھر بات خاک ہوتی۔ بات ذرا دھیان سے سننے والی تھی...... اور لمبی بات تھی' وہ سمجھ سکتی تھی' تم نہیں سمجھتے۔ اس نے تمہارے یار اس وکیل کو بھی فون کیا تھا۔ کیا نام ہے اس کا۔ بڑا مشکل سا۔ عبدالودود منظر کو کہ پولیس کے چکر میں مت پڑنا۔"

"پولیس خود میرے چکر میں پڑ گئی۔ ہے نا کمال کی بات؟"

"وہ سب تو ہونا تھا۔ ہیں جی۔ پولیس تو لاہور آتے ہی تمہارا استقبال کرتی مگر تم نکل گئے پشاور کی طرف۔ انہوں نے انتظار بہتر سمجھا ورنہ وہ جاتے تمہارے پیچھے تو بڑی لمبی قانونی کارروائی ضروری ہوتی۔ ہیں جی' اسپیشل ٹیم بنانی پڑتی اور اسے خصوصی اختیارات دینے پڑتے۔ لوٹ کے تو آنا ہی تھا تمہیں۔"

www.paksociety.com

"تمہیں پولیس کے معاملات کی سب خبر رہتی ہے کہ وہ کیا کررہے ہیں اور کیا کرنے والے ہیں!" میں نے طنز سے کہا۔

"مخبر رکھنی پڑتی ہے جی اپنے سکندر صاحب۔ آپ کے ساتھ تو معاملہ ہی کچھ ایسا ہے۔" اس نے عیاری سے کہا۔

رابعہ کی طرف سے میری تشویش کسی حد تک کم ہوگئی تھی مگر دل میں ایک خلش باقی تھی۔ "دلاور! تم نے کبھی سچ بولا ہے؟"

وہ ہنسا "اوہ ارے جی! بغیر ضرورت کے کون جھوٹ بولتا ہے' میں بھی بولتا ہوں لیکن اس وقت جو بھی تمہیں بتا رہا ہوں سچ ہے۔"

"یعنی رابعہ اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ گئی تھی؟"

"ہاں۔ اس کی تصدیق نہ ہو تو کہنا کہ دلاور اپنے باپ کا نہیں۔" اس نے کہا "ابھی تو بیوی بھی نہیں ہے وہ تمہاری کہ تم سے اجازت لیے بغیر کہیں نہ جائے۔ ہیں جی' وکیل ہے آخر' ایک شادی پہلے بھی کرچکی ہے خیر سے.... تجربہ کار تو تم سے زیادہ ہی ہوئی نا۔"

میں نے اپنے چہرے کو غصے سے سرخ اور گرم ہوتا محسوس کیا "اس وقت وہ کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم ہوسکتا ہے کہ تمہارے دوستوں کے پاس چلی گئی ہو۔ یا اپنے گھر میں ہو۔ پتا چل جائے گا۔"

"کب پتا چلے گا؟ ابھی بات کرنا چاہتا ہوں میں اس سے۔" میں نے چلا کے کہا۔

"کیا وہ بات کرے گی تم سے؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے؟" میں نے کہا۔

"ہوگا لیکن قسمت خراب نہیں ہے میری۔ ہیں جی' میں چاہتا ہوں کہ تم آج فیصلہ کرلو۔"

"کس بات کا فیصلہ؟"

"یہی کہ تمہیں کیا کرنا ہے" وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "میں نے پوری کوشش کی کہ تم کسی طرح مان جاؤ۔ تمہارا سب کچھ تمہارے حوالے کرنے کے علاوہ بھی میں نے بہت کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ہرجانہ' جرمانہ' تاوان۔ کچھ بھی کہہ لو۔ میں نے تمہارے والد کے قاتل کو تمہارے حوالے کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ تم نے میری ہر پیش کش مسترد کردی۔ میں نے ہمیشہ اپنے مقصد کو اہم سمجھا' انسانوں کو نہیں' اسی لیے میں پیڈرو جیسے پرانے وفادار کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔ یہ میرا نہیں' ساری دنیا کی سیاست کا اصول ہے۔ اس میں افراد اہمیت نہیں رکھتے۔ مفادات کی جنگ میں جیت ہی سب کچھ ہے۔ بڑے بڑے سیاسی لیڈر بھی شطرنج کے پیادے ہیں۔ مثال لیاقت علی خان کی دیکھ لو یا کینیڈی کی۔ کتنے محبوب لیڈر تھے وہ لیکن ان کو کتنی آسانی سے سیاسی منظر سے نکال دیا گیا۔ تم تو بہت لائق فائق بندے ہو۔ ساری دنیا کی کیا صرف پاکستان کی تاریخ اٹھا کے دیکھ لو۔"

"اب تم اس تاریخ کے صفحات میں اپنا نام لکھوانا چاہتے ہو؟"

"شہیدوں کے ساتھ نہیں۔ مجھے اصول پرستی اور شرافت کی سیاست کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ ہیں جی' سچ پوچھو تو سیاست کا کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا شرافت اور اصول پرستی سے۔ مغل تاریخ کو دیکھ لو یا اس سے پہلے کی۔ کبھی غلام نے آقا کو خنجر گھونپ کر تخت سنبھال لیا' کبھی بیٹے نے باپ کو جیل میں ڈالا اور بھائیوں کو مروا کے حکومت حاصل کی۔ ہیں جی' پھر انگریز آگئے اور انہوں نے غلام ملک پر کیسے حکومت کی۔ اب ہماری باری ہے تو ہم شرافت اور اصول پرستی' جمہوری حقوق اور اسلامی مساوات کے منشور پر عمل کریں؟ کیسے جی؟"

میں حیرانی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ باہر سورج طلوع ہوچکا تھا اور میں گزشتہ شب کے تلخ تجربات اور شب بیداری کے باعث بہت تھک گیا تھا۔ میرا ذہن اس خیال سے بھی ماؤف ہورہا تھا کہ رابعہ نے میری رائے کو نظرانداز کردیا تھا' مجھ سے مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا اور مجھے اتنی اہمیت بھی نہیں دی تھی کہ دلاور کے ساتھ جانے سے پہلے بتا جاتی۔ یہ سرکشی نہیں تھی' اپنی خودمختاری کا اعلان نہیں تھا۔ خود پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کی حماقت تھی۔ کیا واقعی وہ بھی سمجھتی ہے کہ میں عقل سے کام نہیں لے سکتا' جذبات کی رو میں بہہ کے میں ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ شاید پیڈرو کو دیکھ کر میں نے جس ردعمل کا مظاہرہ کیا تھا اس کے بعد وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب تھی لیکن اسے بعد میں تو میری خیریت جاننی چاہیے تھی۔ غالب اور نادر نے اسے بتادیا ہوگا کہ مجھے پولیس گرفتار کرچکی ہے۔ اس نے تھانے آنے کی یا کال کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی؟

"میں بات مختصر کرتا ہوں اپنے سکندر صاحب' آج کا پورا دن ہے تمہارے پاس" چوہدری دلاور نے کہا "میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ ہیں جی' میں نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے اور مجھے اگلے الیکشن میں کامیاب ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہیں جی' اس کے لیے مجھے فرصت چاہیے' وقت کم ہے' میں یہ وقت اور اپنی ساری توانائی تم جیسے پاگل خانوں کا دماغ درست کرنے میں صرف نہیں کرسکتا۔ تمہارے سامنے دو ہی راستے تھے۔ ایک تم نے پہلے چھوڑ دیا۔ وہ فائدے کا سودا تھا جس میں تم بھی عزت آبرو سے سکھ چین کی زندگی گزار سکتے تھے' ہیں جی' اور مجھ سے تعاون کرتے نہ کرتے' بس اپنی زبان بند رکھتے اور خاموشی سے اپنا کام کرتے' اپنا اسپتال چلاتے' بزنس چلاتے اور گھر چلاتے لیکن تم تو تھے ایم آر ایس کے سربراہ' تم نے تو میرے خلاف اعلان جنگ کردیا تھا۔ جیو اور جینے دو کا فلسفہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ مجبوراً مجھے یہ دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ تم کو اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ میں بازی نہیں ہار سکتا کیونکہ سارے پتے میرے ہیں اور میرے ہاتھ میں ہیں۔ تمہاری حیثیت کیا ہے' یہ ایس ایس پی [illegible] خان لودھی نے تم کو بہت اچھی طرح سمجھادی ہوگی۔"

میں مجبور تھا کہ اپنے اشتعال کے جذبات کو قابو میں رکھوں۔ میرا ذہن چوہدری دلاور کی باتوں سے ماؤف ہورہا تھا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے' غلط ہے لیکن اس سے اتفاق کرنا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں تھی کہ حالات بدل چکے تھے اور میرے لیے موافق بہرحال نہ تھے لیکن مجھے سوچنے کی مہلت درکار تھی اور مجھے مشورہ کرنا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے' اپنے آپ سے۔

"وہ وقت گزر گیا جب تم نے چھپ چھپ کے میرے خلاف مجرمانہ کارروائیاں جاری رکھیں۔ ہیں جی' اور اللہ معاف کرے انہیں' ایس ایس پی خاصی رضوی تمہیں بچاتے رہے" چوہدری دلاور نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "اب تم کو بھلا ختم کیا جاسکتا ہے۔ یوں...."

اس نے چٹکی بجائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"پھر تمہیں تامل کیوں ہے' ڈر کس کا ہے؟ لحاظ کی بات تو تم کچھ بھی نہیں ہو" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک سمجھے تم۔ ہیں جی' صرف ڈر ہے مجھے' لحاظ کوئی نہیں' مجھے معلوم ہے کہ تم آرام سے نہیں بیٹھو گے۔ تمہارے کیس چلیں گے تو تمہارے وکیل بھی پوری کوشش کریں گے مجھے خوار کرنے کی۔ تم بھی بیان دو گے اور مجھے عدالت میں کھینچو گے۔ تمہاری زبان تو میں کھینچنے سے رہا۔ ہیں جی' میں تو تم کو پکڑ سکتا ہوں' تمہارے ساتھ حوالات کے اندر یا جیل میں کون ہوگا مگر وہاں تم کو عقل سکھانے والے ضرور ہوں گے۔ اول تو عقل آجائے گی تم کو' ورنہ دو تین سال تک تم نے مقابلہ کیا اور پاگل خانے نہ پہنچے تو پھانسی کے تختے پر پہنچو گے۔ یہ تم مجھ سے آج لکھوالو کہ آج کی تاریخ سے تین سال کے اندر اگر رابعہ تمہاری قبر پر پھول نہ چڑھارہی ہو۔ خیر... یہ سب میں نہیں چاہتا۔ تم میرا سیاسی کیریئر خراب کرنے کی کوشش کرسکتے ہو۔ اس سے کہیں زیادہ خرابی تمہارے لیے اور تمہارے لواحقین کے لیے پیدا ہوگی۔ دیکھو' ایک محسن کی بہن بھی ہے۔ ابھی تک اسے کسی نے نہیں چھیڑا۔ آرام سے سیالکوٹ میں وقت گزار رہی ہے۔ اس کا شوہر پروفیسر ہے اور ایک بچی بھی ہے ان کی۔"

"میں ان دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں دلاور!"

"دھمکی نہیں بابا' یہ عقل کی بات ہے۔ خود بھی آرام سے رہو' ہمیں بھی رہنے دو۔ دوسروں کی زندگی بھی حرام مت کرو" چوہدری دلاور بولا "سب کے گھر آباد رہیں' اس میں سب کا فائدہ ہے ورنہ سب کی تباہی۔ ابھی فیصلے کا وقت ہے۔ تم میرا راستہ مت روکو' میں تمہارا راستہ صاف کرادیتا ہوں' بتاؤ کیسے' ہیں جی؟"

اس نے پردہ ہٹا کے آواز دی "رفیق! ارے وہ سب ادھر لاکے رکھ۔ تھانے والوں کی سوغات۔"

"یہ ہے تمہارا مستقبل" چوہدری دلاور نے کہا "تمہارے خلاف ہر کیس کی اصل فائل۔ اس میں ہر کیس کی پوری تفتیش کی رپورٹ ہے اور وہ سب کچھ ہے جس کی بنیاد پر تمہیں عدالت سے سزا ہوگی۔ کسی کیس میں چھ مہینے' تو کسی میں چھ سال۔ عمر قید' اور ہاں.... ایک کیس میں سزائے موت بھی ہوگی۔ لازمی.... تم اپیل کرنے جاؤ ہائی کورٹ تک اور سپریم کورٹ تک مگر تمہارا بچنا مشکل ہے۔ بے شک اپنے وکیل منظر صاحب سے پوچھ لینا یا رابعہ سے۔"

"میں رابعہ سے بات کرنا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

"کرلینا۔ یہ کوئی حوالات نہیں ہے۔ ہیں جی' تم جانا چاہتے ہو تو جاسکتے ہو مگر جاؤ گے کہاں؟" چوہدری دلاور بولا "آج رات یا کل کسی بھی وقت تمہیں لے جانے والے پھر لے جائیں گے۔"

رفیق نے کہا "سر! یہ اخبارات۔"

"کیا ہے اخبارات میں۔ ابھی تک کیوں کھڑا ہے تو برخوردار؟"

"وہ جی' یہی بتانے کے لیے..." رفیق نے کہا "بہت سی خبریں اور تصویریں ہیں۔"

"اچھا میں دیکھ لوں گا" چوہدری دلاور نے کہا اور ایک اخبار اٹھالیا۔ "واہ جی واہ۔ بڑی اچھی تصویریں آئی ہیں۔ پولیس والے کھڑکی سے کود کے باہر نکل رہے ہیں... اور یہ" وہ ہنسا "گاڑی کی پھونک نکل گئی ہے۔ لو تم بھی دیکھو۔"

میں نے اخبار لے لیا "اس میں سب وہی تصویریں تھیں جو گزشتہ شب غالب نے اتاری تھیں۔"

"خبر بڑے مزے کی لگائی ہے تمہارے یار نے" دلاور بولا اور خبر پڑھنے لگا۔

"گزشتہ رات پولیس نے رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ کے گھر کا تالا توڑ کے وارنٹ کے بغیر تلاشی لی۔ مبینہ طور پر اس کوٹھی میں جو پہلے چاندنی بیگم نامی... طوائف اور گولو پہلوان کی رہائش گاہ تھی' بہت عرصے سے خالی پڑی تھی۔ چاندنی بیگم کے قتل اور گولو پہلوان کی خودکشی کے بعد یہاں پولیس کی نگرانی میں جوئے کا اڈہ چل رہا تھا۔ واضح رہے کہ رابعہ قاری ایڈووکیٹ کا یہ بنگلا کچھ عرصہ پہلے بم کے ایک دھماکے میں تباہ کردیا گیا تھا جس کے بعد ان کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس جگہ پر ناجائز قبضہ کرلیا گیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ چاندنی بیگم کو شہر کے ایک مشہور بزنس مین نے نیا بنگلا بنوادیا تھا لیکن رابعہ قاری کی واپسی کے بعد قانونی مسائل کے خوف سے چاندنی بیگم کو قتل کردیا گیا جو خود کو اس کا مالک سمجھتی تھی اور اس قتل کو گولو پہلوان سے منسوب کرادیا گیا جو درحقیقت چاندنی بیگم کا محافظ اور دلال تھا مگر خود کو اس کا شوہر بتاتا تھا۔ گولو پہلوان نے پُراسرار حالات میں خودکشی کرلی اور اس کے بعد یہ بنگلا کسی قانونی عذرداری کے بغیر رابعہ قاری کی ملکیت تسلیم کرلیا گیا تھا لیکن بوجوہ انہوں نے اس میں رہائش اختیار نہیں

www.paksociety.com

کی تھی۔ پولیس کو یہاں جوئے کے اڈے کی موجودگی سے آگاہ کرنے والے مشہور بیرسٹر عبدالودود منظر نے گزشتہ شب اخبار والوں کی موجودگی میں بنگلے میں پولیس کو جواریوں سے بھتا وصول کرتے دیکھا' تاہم یہ پولیس والے جواریوں کو بھگانے کے بعد خود بھی کھڑکی کے راستے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ چند چشم دید گواہوں نے بتایا کہ پولیس کی ایک گاڑی بہت عرصے سے بنگلے کے اندر موجود تھی جسے گزشتہ رات وہاں سے ہٹا لیا گیا۔ بیرسٹر عبدالودود منظر اپنی مؤکلہ رابعہ قادری ایڈووکیٹ کی جانب سے پولیس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

چوہدری دلاور نے دوسرا اخبار اٹھا لیا۔ خبر سب میں ایک ہی تھی مگر غالب نے جو تصویریں اتاری تھیں وہ مختلف اخبارات میں الگ الگ شائع ہوئی تھیں۔ ایک میں پولیس والا کھڑکی سے باہر کود رہا تھا تو دوسری میں سب انسپکٹر۔ تیسری تصویر میں وہ گاڑی سے قلیت ہو جانے والے تالے کھول رہے تھے اور جو گتی میں لگاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

"واہ جی واہ! کیا اسٹوری دی ہے اپنے مرزا غالب صاحب نے۔ سنا ہے وہ بھی کوئی اخبار نکال رہے ہیں۔ ہماری تو پھر خیر نہیں۔ ہیں جی اپنے سکندر صاحب!"

خلاف توقع مجھے اخبار میں رابعہ کے اغوا کیے جانے کی کوئی خبر نہیں ملی۔ شاید اس نے غالب کو فون کر کے وضاحت کر دی ہوگی کہ وہ اپنی مرضی سے دلاور کے ساتھ ایک اہم مسئلے پر بات کرنے گئی تھی۔ مجھے اس کی حرکت سے دکھ بھی ہوا تھا اور اس پر غصہ بھی آیا تھا۔

"اب وقت تو ناشتے کا ہے اپنے سکندر صاحب لیکن تم نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ حرام نہیں کھاؤ گے" وہ قہقہہ مار کے ہنسا "دشمن کے گھر میں اس کے ہاتھ سے یا اس کے ساتھ بیٹھ کے کھانا حرام ہی ہوتا ہے۔ خیر آپ کی مرضی۔ یہ فائلیں آپ دیکھ لیں۔"

"میں نے دیکھ لی ہیں" میں نے کہا۔

"تو پھر سوچ لیں کل تک۔ یہ فائلیں میں تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔ اس گارنٹی کے ساتھ کہ پھر کوئی کسی کیس کا نام بھی لے تو ہم چور کی سزا وہ میری۔ نام لے بھی کیسے' اس کا ڈیلی کیسٹ ریکارڈ تو ہے نہیں۔ رہے ثبوت اور گواہ۔ تو اپنے سکندر صاحب' ان کی کیا حیثیت ہے۔ جب چاہا خرید لیا' بدل دیا' ختم کر دیا۔ سب بکنے والی چیزیں ہیں۔ ہم پرامن بقائے باہمی کا سمجھوتا کر لیں گے تو یہ سارے معاملے خود بخود ہی ختم ہو جائیں گے۔ تم بزنس کرنا چاہو بزنس کرنا۔ اللہ نے چاہا تو ہم سے فائدہ ہی پہنچے گا تمہیں۔۔۔ اور باہر جانا ہے تو باہر جاؤ۔ سیاست ہمارا کام ہے' ہمیں کرنے دو۔"

اس نے پھر رفیق کو بلایا اور اسے تاکید کی کہ جہاں بھی میں چاہوں مجھے چھوڑ آئے۔ اس کی سفید فاکس ویگن میں روانہ ہوتے وقت میری ذہنی کیفیت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ میرا تمام جذباتی جوش اور ولولہ سرد پڑنے لگا تھا اور زندگی کے تلخ حقائق کی تصویر دیکھ کے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کیا واقعی جدوجہد بے سود ہے؟ یہ معاشرہ اس کی قدریں' قانون اور انصاف کے معیار' مذہبی اور اخلاقی اقدار سے بیگانگی سے پیدا ہونے والی منفی سوچ' داخلی سیاسی انتشار کے نتیجے میں ملنے والی عدم تحفظ اور بے یقینی کی کیفیت۔ ان سب مخالف عناصر کے ہوتے حالات کو صحیح نہج پر لانے کی کوشش کیسے بار آور ہو سکتی ہے؟ جب لاقانونیت ہی سب سے مؤثر قانون بن جائے اور خاندانی شرافت کے بجائے لوگ اپنی معاشی اور طاقت پر ناز کرنے لگیں' ہر برائی کو ناگزیر سمجھتے ہوئے قبول کر لیں' ذاتی مفاد کی خود غرضانہ جنگ میں رشتوں کے احترام کو بھول جائیں' محب وطن پر غدار کا لیبل لگا دیا جائے اور چور ہو جائے کوتوال تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟ ایک جنگ ہم نے اس لیے ہار دی کہ ہمارے مقابل سپر پاورز تھیں مگر اس سیاسی یا فوجی شکست کے ذمے دار خود ہم بھی تھے۔ ہم نے نفرتوں کے بیج بوئے' سیاسی اختلافات کو ہوا دے کر دشمنی میں ڈھالا۔ اس کا تجزیہ آنے والے وقت کا مؤرخ کرے گا مگر اب اس باقی ماندہ پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا ذمے دار کون ہے؟ یہاں تو ہم کسی دشمن کے خلاف برسرپیکار نہیں۔ یہاں تو ایک زوال پذیر معاشرے کا سیاسی اخلاقی اور مذہبی ڈھانچہ ہے جس کو ہم سب مل کے برباد کر رہے ہیں۔ برائیوں کی بیخ کنی کرنے کے بجائے ان کی جڑیں مضبوط کرنے والے عوامل کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ ہم خود اپنے مستقبل کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں اور اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مار رہے ہیں۔ ہم نے منافقت کو مصلحت کوشی کا نام دے دیا ہے اور برائی کو برائی کہنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

جب گاڑی رکی تو رفیق نے کہا "خدا حافظ سر۔"

میں نے سر ہلایا "رفیق! نہ جانے کیوں تم جیسے شخص کو دلاور کے ساتھ دیکھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔ خیر' خدا حافظ۔"

رفیق نے مجھے یوسف کے گھر کے سامنے اتارا تھا۔ مجھے اندر داخل ہوتے ہی ہڑبونگ مچ گئی۔ یوسف کی بیوی نے چیخ ماری "سکندر!" یوسف ایک موزا پہنتا ہوا دوڑا۔ ایک کمرے سے غالب آنکھیں ملتا برآمد ہوا اور دوسرے سے نازو کا پریشان حال چہرہ۔

"لعنت ہے تم پر! تم سو رہے تھے بے غم ہو کے؟"

غالب نے شرمندگی سے کہا "میں ابھی تو آیا تھا' بس مجھے پہلے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم خیریت سے ہو۔"

"تمہیں معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں؟" میں نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"تمہیں ایک سفید فاکس ویگن لے گئی تھی جسے چوہدری دلاور کا سیکریٹری رفیق چلا رہا تھا۔" غالب نے کہا "ایک دوست نے تھانے سے کنفرم کیا تھا۔"

"پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا۔"

"ہاں۔ اس پان والے کے ساتھ جو کچھ ہوا' افسوس ناک ہے۔"

"صرف افسوس ناک! اسے تشدد سے ہلاک کر دیا پولیس نے اور اس کی لاوارث لاش ملتان روڈ پر پھینک دی۔"

"یہ ہوتا ہے تھانوں میں یار۔ یوسف اس کیس کو اٹھائے گا اور ہم بھی۔ تم بتاؤ۔"

"تم وہاں گئے کیوں تھے؟" نازو ایک دم پھٹ پڑی "اور گئے بھی تو دخل در معقولات کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے رابعہ نے بتایا ہے کہ تم پر دورہ پڑ گیا تھا۔"

"رابعہ کہاں ہے؟" میں نے کہا "مجھے بھی بہت کچھ پوچھنا ہے اس سے۔ مجھے بتائے بغیر وہ کیسے دلاور کے ساتھ چلی گئی تھی؟"

"بے وقوف مت کہو۔ وہ مجبور تھی۔ اسے چوہدری دلاور زبردستی اپنے ساتھ لے گیا تھا" نازو نے کہا۔

"زبردستی! اس حرام زادے نے جھوٹ بولا مجھ سے۔"

"چوہدری دلاور نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ اس نے رابعہ کو دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ اس کے عزائم کیا ہیں۔ وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا رابعہ واپس نہیں آئی تھی؟"

"نہیں۔ اس نے فون کیا تھا منظر کے گھر سے اور اس نے بھی بتا دیا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ چوہدری دلاور نے جو کچھ اسے بتایا تھا' وہ سکندر کو بھی سمجھائے گی۔ تم چوہدری دلاور کے ساتھ تھے اس کے گھر میں؟" غالب بولا۔

میں نے سر ہلایا "میں اسی کے ساتھ تھا لیکن اس کے گھر میں نہیں تھا۔ وہ گھر کسی وزیر کا ہے غالباً۔"

"کس وزیر کا؟" نازو بولی۔

"میں نے نام اور نمبر نہیں دیکھا۔ وہاں تو سب ایک جیسی کوٹھیاں ہیں۔"

"رابعہ باجی نے تمہاری سب فائلیں دیکھی تھیں اور وہ بہت پریشان تھیں" یوسف نے کہا "ہم سب رات بھر جاگتے رہے۔ میں نے کئی بار رابعہ باجی سے بات کی تھی اور پھر منظر صاحب سے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "میرا خیال ہے کہ مجھے وہیں جا کے رابعہ سے بات کر لینی چاہیے۔"

"ناشتا تو کر لو" یوسف کی بیوی نے شور مچایا۔

"وہیں کر لوں گا" میں نے کہا۔

"ایک خبر اور بھی ہے تمہارے لیے" غالب نے افسردگی سے کہا "نرم گرم خان نے اخبار نکالنے کا ارادہ بدل دیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے؟"

"مطلب صاف ظاہر ہے۔ میں پھر بے روزگار ہوں۔ وہ قلم میرے ہاتھ سے چھین لیا گیا ہے جو میری طاقت تھا۔" غالب نے کہا "شاعر کے لیے اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ تو بھیا اور بھی دھندے ہیں دنیا میں صحافت کے سوا۔ میں اور تم مل کے پولٹری فارم کھولیں گے یا دودھ دہی کی دکان۔ نازو وہی بچے کی ریڑھی کے حق میں ہے۔ چچا گھر کے دروازے پر اچھی چل ہوگی۔" غالب نے تلخی سے کہا۔

نازو کی شوخی بھی رخصت ہو چکی تھی "ان کا ایسا ہی موڈ ہو رہا ہے رات سے۔ حالانکہ مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ دوسرے اخبار بھی ہیں اور ہم خود بھی اخبار نکال سکتے ہیں۔"

"بے وقوف لڑکی! اخبار نکالنے کو تم نے کیا سمجھ رکھا ہے دہی میں سے مکھن نکالنا۔۔۔"

"اوکے' یہ سب ہم اس وقت سوچیں گے جب مل کے بیٹھیں گے۔ تم رابعہ کو فون کر دو۔ منظر کورٹ جاتے ہوئے اسے ادھر چھوڑ جائے۔"

نازو اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "شاید وہ نہ آئے۔ معلوم نہیں اس کے ارادے کیا ہیں۔ وہ کسی سے بات کرنا نہیں چاہتی۔ تم جا کے بات کر لو اس سے۔"

میرے لیے یہ بات ناقابل یقین تھی "وہ تم سے بات نہیں کرنا چاہتی؟"

"ہاں۔ منظر نے یہی کہا تھا" نازو نے اداس لہجے میں کہا "ہم سے ایسا کون سا قصور ہوا ہے آخر؟"

"تم بھی جانے سے پہلے فون کر لو" غالب نے دبے دبے الفاظ میں کہا "رابعہ کا رویہ بالکل ناقابل فہم ہے۔"

"میں دماغ درست کر دوں گا اس کا" میں نے فون اٹھا کے منظر کا نمبر ملانا شروع کیا۔

ریسیور منظر کی بیوی نے اٹھایا "رابعہ تو چلی گئی۔"

"چلی گئی۔۔۔ کہاں؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

"کورٹ۔ منظر کے ساتھ۔ کہہ گئی تھی کہ واپسی میں اپنے آفس جائے گی" وہ بولی "آخر یہ معاملہ کیا ہے بھیا۔ کچھ تیور ٹھیک نہیں لگ رہے مجھے اس کے۔ مجھ سے تو کوئی بات نہیں کی اس نے مگر مجھے پتا چلا ہے کہ اس نے اپنا کام پھر شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ خیر کام کرنا تو بری بات نہیں۔ اچھا ہے سب خود سنبھالے' ان پر تھا سارا بوجھ۔ لیکن بھیا یہ الگ رہنے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ دنیا کیا کہے گی۔ اتنی بڑی کوٹھی میں رہ سکتی ہے بھلا جوان عورت۔ وکیل ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "وہ۔۔۔ اپنی کوٹھی میں رہے گی؟"

"ہاں بھیا۔ ابھی تو شاید دو چار دن یہاں گزارے گی۔ کوٹھی میں سامان نہیں ہے نا۔ سب سامان لے کے پھر جائے گی۔ تم سے ناراض ہے کیا؟ ایسی کیا بات ہو گئی ہے آخر؟ مجھے بھی تو پتا چلے" حسب عادت اس کی زبان کی قینچی چل پڑی تھی اور رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

www.paksociety.com

"مجھے کچھ معلوم ہوگا تو ضرور بتاؤں گا" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

غالب اور نازو میری گفتگو سن کے سب سمجھ چکے تھے۔ "یہ سب کیا ہے آخر؟ رابعہ کا دماغ کیوں اتنا خراب ہو رہا ہے؟" نازو نے کہا۔

"اس سے کورٹ میں ملنا تو مناسب نہیں۔ دفتر میں ملاقات ہوگی دوپہر دو بجے کے بعد" میں نے مسکراتے ہوئے اپنے تفکرات اور اندیشوں کو چھپانے کی بے سود کوشش کی "فی الحال تو مجھے ناشتا کر کے سو جانا چاہیے۔"

یوسف کے کورٹ چلے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹا کھلی آنکھوں سے چھت کو گھورتا رہا اور وقت کا ایک ایک لمحہ شمار کرتا رہا۔ میرے خوابوں کے فلک بوس محل زلزلے کی زد میں تھے۔ میرے خیالوں میں بگولے رقص کر رہے تھے۔ اب مجھے یوں لگتا تھا جیسے اس ایک رات میں میرا سب کچھ لٹ گیا ہے۔ مایوسی کے اندھیرے ہر طرف سے مجھے گھیر لیتے تھے تو میں امید کی کسی روشنی کے لیے بھاگتا تھا۔ کبھی ایک طرف تو کبھی دوسری طرف۔ میں خود کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ رابعہ بدلی نہیں ہے، صرف روٹھی ہے۔ میں اسے منا سکتا ہوں، سمجھا سکتا ہوں، اس کی مان سکتا ہوں اور ہم سب مل کے اس بحران کا کوئی حل تلاش کر سکتے ہیں۔ ابھی ہماری قوت منتشر نہیں ہوئی ہے۔ ہمارے درمیان خلوص کے رشتے پہلے جیسے مضبوط ہیں اور ہم آج بھی ایم آر ایس کے پرچم تلے ایک متحد قوت ہیں۔

میں دوپہر تک کروٹیں بدلتا رہا اور گزشتہ رات کے واقعات بار بار میرے تصور کو جھنجوڑتے رہے۔ میں چوہدری داؤد سے ہونے والی گفتگو کے ایک ایک لفظ پر غور کرتا رہا اور باعزت طور پر ان مسائل سے نبرد آزما رہنے کے امکانات تلاش کرتا رہا۔ دو بار میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے کچھ لوگ میری نگرانی پر مامور ہیں پھر میں ہر آدھے گھنٹے بعد جھانکتا رہا اور میرے شبہات کی تصدیق ہوگئی مگر میں نے یوسف کی بیوی کو کچھ نہیں بتایا جو مجھے دو بار چائے پلانے کے علاوہ بہت تسلی بھی دے چکی تھی کہ اس کے پاپا سب کی ایسی تیسی کر دیں گے۔ وہ بڑی توپ چیز ہیں۔

مجھے کسی توپ کی نہیں، رابعہ کی ضرورت تھی۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ میں یہ کیا سن رہا ہوں اور ایسا کیوں ہے؟ اس سے بات کیے بغیر میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ دو بجے میں نے یوسف کی بیوی کے بے حد اصرار پر کھانا زہر مار کیا اور اس کی گاڑی لے کر روانہ ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ رابعہ کا نیا آفس اب بھی وہیں ہے۔

مجھے کونے پر "ریڈی ایجنڈ کمپنی" کے سامنے گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ مل گئی۔ وہاں سے اوپر رابعہ کے آفس جانے والا زینہ چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوا انتہائی پرسکون انداز میں اوپر گیا تو خلاف توقع اس کے آفس کے باہر مسلح محافظ کو دیکھ کر حیران ہوا۔ میں اندر جانے لگا تو اس نے میرا راستہ روک لیا۔

"کدھر جا رہا ہے؟"

میں نے کہا "تم مجھے نہیں جانتے؟ میرا نام سکندر بخت ہے رابعہ سے ملنا ہے مجھے؟"

"کیا کام ہے؟ کوئی کیس ہے؟"

میں نے اسے دھکا دے کر ایک طرف کیا اور اندر داخل ہوگیا۔ کالے کوٹ میں ایک وکیل نے میرا استقبال کیا۔ "جی پلیز!" لیکن میں اسے بھی ایک طرف ہٹا کے سیدھا رابعہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ ماتحت وکیل اور چوکیدار میرے پیچھے پیچھے اور میرے ساتھ ہی رابعہ کے کمرے میں داخل ہوئے۔

رابعہ گھومنے والی کرسی پر ساکت بیٹھی تھی۔ اسے میری آمد کا علم ہو چکا تھا اور وہ پہلے سے طے کر چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

"تم کو اس طرح یہاں نہیں آنا چاہیے تھا" رابعہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم میری بے عزتی کر رہی ہو رابعہ۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟" میں نے برہمی سے کہا "میں تم سے بات کرنے آیا ہوں اور بات کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

رابعہ نے چوکیدار کی طرف دیکھا۔ "تمہیں باہر کس لیے کھڑا کیا گیا تھا؟"

"وہ جی بیگم صاحب! ہم اس کو بولا۔"

"میں نے بھی روکا تھا میڈم" وکیل نے گھبراہٹ میں کہا۔

"تم لوگ جاؤ" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "مجھے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں رابعہ سے۔"

"مسٹر سکندر بخت! یہ میرا آفس ہے، گھر نہیں" رابعہ نے اجنبی لہجے میں کہا۔

مجھے اپنے کانوں پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں کیسے اس وقت میں نے اپنے اشتعال کے تباہ کن سیل بے عناں کو روک لیا۔ وہ میری چھٹی حس تھی یا صورت حالات کو سمجھنے کی صلاحیت جس نے مجھے احساس دلا دیا کہ معاملات حد سے زیادہ بگڑ چکے ہیں۔ اگر میں نے ہنگامہ کیا تو اس سے رابعہ کی پوزیشن بھی خراب ہوگی اور میری بھی۔ مجھے یوں لگا جیسے رابعہ چوکیدار کو اشارہ کرنے کی کہ مجھے دھکے دے کر نکال دیا جائے۔ میں ان چپے دو چوکیداروں کی ایسی تیسی کر سکتا تھا مگر یہ رابعہ کا آفس تھا۔ دو بلند تھا اور اس کی کنٹرول کو تباہ کر کے مزید خرابی کے اسباب پیدا کرنا کوئی عقلمندی نہ ہوتی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں وہ فون کر کے پولیس کو طلب نہ کر لے۔ اس خیال کا میرے ذہن میں آنا مجھے بہت عجیب لگا۔ رابعہ بھلا ایسا کیسے کر سکتی ہے؟

میں نے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پا کے کہا "ظاہر ہے میں جا رہا ہوں۔ آفس میں واقعی کام کی بات کرنی چاہیے۔ رات کو گھر کے کمرے پر تفصیل سے بات ہوگی۔"

رابعہ نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا نہ انکار کیا۔ وہ جذبات سے عاری سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی رہی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ خود پر جبر کر رہی ہے اور اس کے لیے میرے ساتھ بے رخی کا یہ مظاہرہ کتنا دشوار ہوگا۔ اس کے باوجود ایک سوال میرے ذہن میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ آخر رابعہ نے یہ رویہ کیوں اختیار کیا؟ کیا ضرورت تھی اسے میرے ساتھ یہ توہین آمیز برتاؤ کرنے کی؟ میں پہلے بھی تو اس کے آفس میں آتا رہا ہوں۔

میں نیچے اترا اور اپنی گاڑی کی طرف چلنے لگا۔ میرے وجود میں چھپا ہوا آتش فشاں پھٹنے کے قریب تھا۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ اس کیفیت میں گاڑی چلاتے ہوئے کہیں مجھ سے حادثہ نہ ہو جائے۔ اچانک میں نے انہی لوگوں کو دیکھا جو میری نگرانی پر مامور تھے۔ وہ صورت اور حلیے سے خفیہ پولیس کے آدمی نظر آتے تھے لیکن بالکل نمایاں تھے۔

میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی نے مجھے آواز دی اور میں نے پلٹ کے دیکھا تو رفیق کا مسکراتا ہوا چہرہ میرے سامنے آیا۔

"ہم... تم بھی پیچھا کر رہے ہو میرا؟ یو باسٹرڈ!"

وہ بوکھلا کے پیچھے ہٹ گیا "سر! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! یہ ٹھیک ہے کہ میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔"

"تم میرا انتظار کر رہے تھے؟ کیوں۔ کس نے بتایا تمہیں کہ میں اس وقت یہاں ملوں گا؟" میں دہاڑ کے بولا۔

"میں نے... فون کر کے معلوم کیا تھا۔"

"کیوں؟ اس حرام زادے تمہارے باس نے تو مجھے مہلت دی تھی۔"

"آپ غلط سمجھے سر۔ انہوں نے نہیں بھیجا تھا۔ کیا آپ ایک منٹ کے لیے ادھر تشریف لائیں گے؟"

میں نے ادھر دیکھا جہاں سیاہ رنگ کے سیاہ شیشوں والی مرسیڈیز کھڑی تھی۔ "آئی ایم سوری رفیق! تم نے غلط سمجھا مجھے۔ تم جیسے دس مل کے بھی مجھے اغوا نہیں کر سکتے۔ ہمت ہے تو مقابلے پر آ کے دیکھ لو۔"

رفیق نے افسوس سے سر ہلایا "میں بھلا کیسے مقابلہ کر سکتا ہوں آپ کا اور اغوا کا خیال کیسے آیا آپ کو؟"

میں نے کہا "تم گدھا سمجھتے ہو مجھے۔ میں صبح سے دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گرگے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

"لعنت بھیجیں ان پر۔ ان کا تو کام ہے افسروں کے حکم کی تعمیل کرنا۔ میں انہیں منع کر دوں گا۔"

"تم!" میں نے حقارت سے کہا "تم افسر ہو ان کے؟ تمہاری اوقات کیا ہے؟ یہ لوگ؟ ناٹ گیٹ لاسٹ۔"

"پلیز سر!" رفیق نے جلدی سے کہا "ایک خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ آپ کا فائدہ ہے۔"

"فائدہ؛ مائی فٹ۔ تم میرے فائدے کی بات آخر کیوں کرتے ہو؟ میں تو تمہیں اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔" میں بھڑک اٹھا۔

"آپ جو چاہے سمجھیں۔ ایک منٹ کے لیے کسی معزز خاتون سے ملنے میں کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا۔"

اسی وقت کھڑکی کا شیشہ خاموشی سے نیچے سرکا اور ایک ہاتھ باہر آیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہاتھ بہت خوب صورت تھا۔ گلابی اور سفید، نرم و نازک اور بے حد متناسب۔ حسن تخلیق کا لاجواب نمونہ۔ کوئی مجھے ہوس پرستی کا الزام نہیں دے سکتا۔ میں حسن پرستی میں بھی اخلاقی حدود سے تجاوز کا قائل نہیں مگر اس وقت میں اس ہاتھ کے اشارے کو نظر انداز نہیں کر سکا۔ صرف اپنی الجھن رفع کرنے کے لیے کہ آخر مجھ سے ملاقات کی خواہش مند وہ معزز خاتون کون ہے اور کیا چاہتی ہے؟ میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں یہ بھی ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں ڈرتا نہیں۔

میرے قریب پہنچتے ہی گاڑی کا شیشہ پورا نیچے اتر گیا اور میں نے خاتون ڈرائیور کا چہرہ دیکھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس بجلی جھلک نے مجھ پر جادو کر دیا یا میرے حواس مختل کر دیے۔ وہ برق طور تھی جس نے مجھے خاکستر کر دیا یا بجلی تھی جو میرے دل پر گری تو یہ شاعرانہ بات ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ پچیس سال کی تھی مگر یہ ہو سکتا تھا کہ اس کی اصل عمر دس سال زیادہ ہو یا پانچ سال کم۔ اس کے چہرے کی جلد میں صبح بہار کے اولیں شگوفوں کی تازگی تھی اور وہ رنگت تھی کہ لگتا تھا اس میں گلاب، مرمر اور شہد کو ملانے والے فنکار ہاتھ تخلیق حسن میں رنگوں کے تناسب کو سمجھتے تھے۔ اس کے بال ترشیدہ تھے اور اس کے شانوں پر سیاہ ریشم کی طرح بکھرے ہوئے تھے، پھسل رہے تھے اور جھول رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بھی اتنی ہی کالی تھیں اور اتنی حیران کن کہ دیکھنے والا مجسم حیرت ہو جائے۔

اس نے میری حیرت کو بھی تاڑ لیا اور اپنے حسن کی قوت تسخیر کا بھی بخوبی اندازہ کر لیا۔ یہ صفت عورت کی فطرت میں چھٹی حس کی طرح کام کرتی ہے۔ وہ دیکھے بغیر ہی دیکھ لیتی ہے کہ اسے کون دیکھ رہا ہے، کب سے دیکھ رہا ہے اور کیوں دیکھ رہا ہے؟ وہ پوچھے بغیر پوچھ لیتی ہے کہ پوچھنے والا پوچھے بغیر کیا پوچھ رہا ہے اور پھر جواب دیے بغیر جواب بھی دے سکتی ہے۔

اس نے کہا "سکندر بخت صاحب! مجھے آپ سے ایک کام تھا۔"

میں چونکا اور مجھے اپنی نامعقولیت کا احساس ہوا۔ "جی... مجھ سے... مگر میں تو آپ کو نہیں جانتا... کیا ہم پہلے ملے ہیں؟"

"جی ہاں۔" اس نے ایک ادا سے نازک سے بالوں کو پیچھے کیا۔

www.paksociety.com

"کہاں... اور کب؟"
"ابھی دو منٹ پہلے... یہاں" وہ شوخی سے مسکرائی۔
میں سنبھل گیا۔ اس عورت کے عزائم خطرناک معلوم ہوتے تھے "آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟"
"آپ کو بھلا کون نہیں جانتا" وہ مسکراتی رہی "نیچے سے اوپر تک۔ بیچ میں کہیں پولیس بھی آتی ہے"
میں نے کہا "بیچ میں رفیق کی موجودگی مجھے شکوک میں مبتلا کرتی ہے"
"رفیق میرا خاص آدمی ہے جسے میں نے چوہدری دلاور کے پیچھے سائے کی طرح لگا دیا ہے" وہ ہنسی۔
"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟"
"آپ اس سے زیادہ بھی پوچھ سکتے ہیں لیکن یہاں کھڑے کھڑے نہیں۔ ادھر آ کے بیٹھیے میرے ساتھ" اس نے تحکمانہ ادائے دلبری سے کہا۔
"معاف کیجئے میں اپنی گاڑی میں ہوں۔ ویسے بھی کسی جان پہچان کے بغیر میں کسی کے ساتھ جاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔"
"ابھی تو تعارف بھی یک طرفہ ہے۔ میں آپ کو جانتی ہوں لیکن آپ مجھے نہیں جانتے۔ جان پہچان تو ملاقات کے بعد ہی ہوتی ہے۔ رہی بات خطرے کی تو سکندر اعظم کا ایک عورت سے ڈرنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔"
"عورت سے بڑی طاقت تو دنیا میں کوئی نہیں اور پھر کیا معلوم آپ کس مقصد کے تحت کس کی طرف سے آئی ہیں یا بھیجی گئی ہیں۔ آپ نے مجھے ابھی تک کام کی نوعیت نہیں بتائی"
"میں سب بتادوں گی۔ یقین کیجیے میں آپ کو اغوا کر کے نہیں لے جاؤں گی۔ ہم "لارڈز" میں بیٹھ کے چائے بھی پی سکتے ہیں۔ بیٹھیے پلیز!"
میں نے نفی میں سر ہلایا "میرے پاس اپنی گاڑی ہے"
اس نے میری گاڑی کی طرف دیکھا "اس کے تو سارے ٹائر فلیٹ ہیں"
میں اس کی چالاکی پر حیران رہ گیا "گویا یہ انتظام آپ نے پہلے ہی کر لیا تھا۔ مس...؟"
"غزالہ۔ میں چوہدری دلاور کی بہن ہوں" اس نے کہا۔
اس کے یہ الفاظ میری سماعت سے بم کا دھماکا بن کے ٹکرائے۔ میں نے اسے نظر جما کے دیکھا "بہن... چوہدری دلاور کی بہن!"
"جی... اب آپ تشریف رکھیں تو میں کچھ اور فرماؤں۔ ایسے بھاگا بھاگا کھڑے رہیں گے سڑک پر؟" وہ بولی۔
میں نے کہا "کیا ثبوت ہے... کہ یہ سچ ہے؟"
"میں ثبوت بھی فراہم کردوں گی سکندر صاحب۔ اتنا بڑا جھوٹ کون بول سکتا ہے آپ سے" اس نے کہا "میں اس کی سگی بہن نہیں ہوں"
"دیکھیے میں کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ رفیق آپ کا نوکر ہے مگر وہ سیکریٹری ہے چوہدری دلاور کا۔ میں چوہدری دلاور کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ اسے کوئی دھوکا دے سکے۔ آپ کہتی ہیں کہ رفیق آپ کا خاص آدمی ہے۔ وہ بیک وقت آپ کے ساتھ بھی ہے اور دلاور کے ساتھ بھی۔ یہ میری سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے مس غزالہ۔ مجھے یہ چوہدری دلاور کا ڈراما لگتا ہے۔"
"سکندر صاحب! میرا خیال تھا کہ ہم ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں" اس نے مایوسی سے کہا "آپ کو اتنا بزدل نہیں سمجھتی تھی میں۔ آپ چاہیں تو تلاشی لے کر دیکھ سکتے ہیں کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے اور نہ میری کار کی ڈگی میں کوئی آدمی چھپا ہوا ہے"
"آئی ایم سوری مس غزالہ۔ آج اچانک ساری دنیا میرے پیچھے لگ گئی ہے۔ وہ خفیہ پولیس کے احمق ہیں جن کے لیے خود کو خفیہ رکھنا ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ رفیق نہ جانے کیسے یہاں آیا اور اب آپ مصر ہیں کہ میں آپ کے ساتھ چلوں۔"
"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے سکندر صاحب اور یقین کیجیے میں آپ کی بھی مدد کر سکتی ہوں۔ چوہدری دلاور میرا بھائی ضرور ہے ایک رشتے سے لیکن یہ خون کا رشتہ درحقیقت دشمنی سے بدتر ہے۔ بھائی بہن سے زیادہ مقدس کوئی رشتہ ہے تو ماں بیٹے کا۔ لیکن..."
اچانک میں نے اس عورت کے بارے میں جاننے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر وہ بھی شکاری بن کے آئی تھی یا کسی شکاری نے اس کے حسن کو دام بنایا تھا تو میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں تھکا ہوا تھا اور اب اس معاملے کی حقیقت کو سمجھنا ضروری تھا۔ میرا تجسس بیدار ہو چکا تھا اور موجودہ صورت حالات میں ایک موہوم امید کا سہارا بھی آزمانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔
"آپ کی گاڑی رفیق لے آئے گا" وہ بولی "اس میں تو وقت لگے گا۔ ہوا بھری جائے گی سب ٹائرز میں۔"
"آپ انتظار کر سکتی ہیں؟"
"لیکن آپ اعتماد نہیں کر سکتے؟" اس نے طنز سے کہا "اپنے آپ پر بھی۔"
میں نے کہا "او کے مس غزالہ! چلیے"
جب میں گھوم کے اس کی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے دوسری طرف پہنچا تو میری نگاہ بلا ارادہ اوپر چلی گئی۔ اپنے آفس کے باہر گیلری میں رابعہ نہ جانے کب سے کھڑی تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر تھیں اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ رو رہی ہے... میں نے چاہا کہ دروازہ کھول کے اتر جاؤں مگر اس وقت تک مرسیڈیز آگے بڑھ چکی تھی

میرے ذہن میں بے یقینی، خوف اور انتشار کی آندھی چل رہی تھی جس میں میرا وجود کسی تنکے کی طرح بھٹک رہا تھا۔ بے رحم خیالوں کی دھول نے مجھے اندھا کر دیا تھا اور میرے گرد مایوسی کا دلدلی اندھیرا محیط تھا۔ میں اس بچے کی طرح محسوس کر رہا تھا جو اجنبی شہر کی بھیڑ میں کھو جائے اور سہم کر کسی بھی اجنبی کی انگلی پکڑ لے۔ یہ سوچے اور جانے بغیر کہ وہ اجنبی اسے دوبارہ زندگی کے گم کردہ رشتوں کی منزل تک پہنچائے گا یا اس جنگل میں چھوڑ آئے گا جہاں سے جرم اور گناہ کے تاریک راستوں کا سفر شروع ہوتا ہے۔

چوہدری دلاور کی دھمکی نے اور رابعہ کی بے رخی نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو اس حد تک مفلوج کر دیا تھا کہ میں تنہائی سے رفیق کی والہانہ سازش اور غزالہ کی سحر آفریں محبت، ورد آشنائی کے دعوے اور تعاون کی پیش کش کے خلاف مزاحمت نہ کر سکا۔ شاید یہ ایک فطری ردعمل تھا۔ اس شخص کی طرح جو ہر صدمے کے ساتھ بے بسی اور فرسٹریشن کے ساتھ مایوسی کا شکار ہو کے اپنے تفکرات کو جام شراب یا کسی بھی نشے کی کیفیت میں بھول کے سکون اور تقویت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فرار کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ جھوٹے اور کمزور سہاروں پر انحصار کی عادت بالآخر آدمی کو اعتماد سے محروم کر دیتی ہے۔

غزالہ کی چونکا دینے والی نرم آواز میرے کانوں تک یوں آئی جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم۔ جیسے نیند کی ترسی ہوئی بوجھل آنکھوں پر ممتا کے رس میں ڈوبی ہوئی لوری کے خمار آئے۔ سوکھی کھیتی پر برکھا رُت کا سندیسہ لانے والی پھوار گرے۔
"آخر اتنے پریشان کیوں بیٹھے ہو۔ ٹیک اٹ ایزی۔"
میں نے چونک کر اسے دیکھا "یہ اچھا نہیں کیا تم نے... میرا مطلب ہے میں نے..."
وہ مسکرائی اور اس نے آہستہ سے میرے شانے پر ایک ہاتھ رکھا۔ اس کے غیر معمولی لمبے، گھنے کالے بال اس کی پشت پر ایک ریشمی ڈھیر کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور ہوا کے ساتھ اپنی خوشبو اڑا رہے تھے۔ اس کی ٹھوڑی سے گردن کے زیریں حصے تک ایک آرسی بنی تھی۔ اجلی، بے داغ اور نرم و نازک جلد پر پھسلنے والی نظر بے اختیار بلاؤز کے چاک گریبان تک پہنچ کے ٹھٹھک رہ جاتی تھی۔

خشک لبوں پر زبان پھیر کے میں نے ایک لمبی سانس لی اور خود کو سیٹ کی پشت پر گرا دیا۔ ابھی تک میں سیٹ کے کنارے پر یوں بیٹھا تھا جیسے موقع پاتے ہی دروازہ کھول کے باہر کود جاؤں گا۔ میں واقعی بہت TENSE تھا اور بالکل نامعلوم طور پر احساس جرم کی ندامت میں مبتلا ہونے لگا تھا۔ حالانکہ اس کی وجہ کوئی نہیں تھی۔ نہ مجھے احساس تھا کہ اچانک سب کچھ غلط ہونے لگا ہے اور ہر بار کسی غلطی کا سلسلہ تقدیر کی ستم ظریفی سے شروع ہوتا ہے تو میری تدبیر کی کوتاہ اندیشی سے منسوب ہو جاتا ہے۔ چوہدری دلاور اور پیڈرو کا رابعہ کے گھر کے دروازے پر آ جانا کوئی واقعہ بھی نہ تھا مگر تقدیر نے عین اسی وقت مجھے اور رابعہ کو وہاں پہنچا کے اسے ایک ناخوش گوار اتفاق بنا دیا اور میرے جذباتی ردعمل نے رہی سہی کسر پوری کر کے اسے بدبختی میں بدل دیا۔ اسی طرح رابعہ کا مجھ سے یا میرے کسی غلط فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے خفا ہو جانا بھی کوئی واقعہ نہیں تھا۔ ایسا تو محبت میں ہوتا ہے اور چاہنے والے روٹھنے والوں کو منا لیتے ہیں۔ میں اس کے آفس نہ جاتا تو کچھ نہ ہوتا۔ منظر کے گھر میں اسے سمجھا کے "اس سے لڑ کے، پھنسا کے یا رلا کے" جھانپڑ رسید کر کے یا چوم کے منانا کیا مشکل تھا مگر تقدیر نے پھر ایک سازش کا جال پھیلایا اور میں اس دام ہم رنگ زمیں کو دیکھے بغیر غزالہ کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔
غصہ مجھے اپنے آپ پر آ رہا تھا۔ مجھ پر لازم تھا کہ میں رفیق کو لات مار کے بھگا کرتا اور غزالہ سے دوٹوک لہجے میں کہہ دیتا کہ تم واقعی دلاور کی سوتیلی بہن ہو اور مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہو تو منظر کے گھر آجاؤ۔ اس طرح میرا تعاقب کرنے اور میری گاڑی کے سارے ٹائروں کی ہوا نکال کے مجھے اپنے ساتھ کار میں لے جانے کی یہ کوشش انتہائی احمقانہ اور گھٹیا تھی مگر میں غزالہ کی توقعات سے بڑھ کر احمق ثابت ہوا۔ میں نے اس سے یا اس کی باتوں سے متاثر ہو کے ایک چیلنج قبول کر لیا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں ڈرتا نہیں۔ ثابت مگر یہ ہوا کہ میری حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی ہی میری کمزوری ہے۔
واقعات کا تانا بانا میرے گرد ایک ناقابل فہم جال بُن رہا تھا۔ صورت حالات ایک زاویے سے کچھ اور نظر آتی تھی تو دوسرے پہلو سے کچھ اور۔ کسی معمے کی طرح جس میں دائیں سے بائیں الفاظ کا مفہوم کچھ اور بنتا ہو، اوپر سے نیچے کچھ اور۔ پیڈرو نے پشاور تک ہمارا تعاقب کیا اور وہاں بظاہر ایک دشمن کی طرح ہمارے خلاف بھرپور جارحیت کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد وہ ہمدرد اور مددگار بن کے سامنے آیا اور اس نے اپنی زندگی کا فسانۂ عبرت سنا کے ہماری جذباتی ہمدردی حاصل کی۔ پھر ہمیں یقین دلایا کہ چوہدری دلاور اپنے مستقبل کو نیک نامی کی سند بنانے کے لیے اس جیسے وفاداروں کو بھی بدنما داغ کی طرح مٹانا چاہتا ہے۔ اس نے خود کو مظلوم اور بے گناہ ثابت کرتے ہوئے عملاً ہماری مدد کی اور ہم سب بچھڑے ہوئے دوستوں کو ملا کے اپنی نیک نیتی کا ثبوت فراہم کیا مگر یہ سب جھوٹ تھا، فریب تھا اور چوہدری دلاور کا ڈراما تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اکبر خان کا پُراسرار کردار۔ اس نے بھی ہمیں احسان سے خریدنے کی کوشش کی اور خود کو چوہدری دلاور کا بھائی ثابت کرنے کے بعد اپنے درمیان دشمنی کے پرانے اسباب بھی بتا دیے۔ شاید یہ بھی جھوٹ تھا۔ اکبر خان نے ہماری یوں مدد

www.paksociety.com

کی تھی کہ ہم پہلے سے زیادہ مشکلات اور مصائب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اب پیر کیلر شاہ کے سیکڑوں جنونی مرید ہمارے خون کے پیاسے تھے اور ہمارے یہ دشمن سب سے زیادہ خطرناک تھے جو ہمیں فی سبیل اللہ' محض ثواب اور رضائے شہادت حاصل کرنے کے لیے جہنم رسید کرنا چاہتے تھے۔ ایک طرف چوہدری دلاور اینڈ کمپنی' دوسری طرف قانون کے نام پر لاقانونیت کی خلافت کا مظاہرہ کرنے والے' تیسری طرف خون آشام دیوانے گروہ۔ سامنے اور دائیں بائیں ہمارے راستے مسدود تھے' اب ہم صرف پیچھے ہٹ سکتے تھے۔ وہ بھی ایک حد تک۔ جہاں تک یہ دفاعی مراجعت ممکن ہو۔ انگریزی محاورے کے مطابق ہم اس پوزیشن میں تھے کہ پیچھے دیوار تھی۔

چوہدری دلاور کی بہن کا اچانک ہوشربا حسن اور شعلہ فشاں شباب کی بھرپور قوت کے ساتھ نمودار ہونا اس ڈرامے کا نیا موڑ تھا۔ درحقیقت یہ ایک ہی ڈراما تھا جس کا مصنف اور ہدایت کار سامنے آئے بغیر ہر نئے سین میں نئے کردار پیش کرتا رہتا تھا اور حالات کے مطابق کہانی کو آگے بڑھاتا تھا۔ پہلے کبھی نہ میں نے سوچا تھا اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی تھی کہ میں چوہدری دلاور کے بھائیوں' بہنوں یا چچاؤں ماموؤں کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ ان کا میرے معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ مجھے چوہدری دلاور کے خاندانی مسائل سے دلچسپی تھی۔ اکبر خان نے بھی خود ہی ہم سے رابطہ کیا تھا اور اب غزالہ نام کی یہ عورت اس کی سوتیلی بہن ہونے کا دعویٰ لے کر آئی تھی تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ ایسے کتنے کردار ہوں گے جو چوہدری دلاور کے حوالے سے مکر و فریب کا نیا تماشا دکھائیں گے۔

وہ چند منٹ کا فاصلہ تھا جس میں میرے خیالات کا انتشار واضح ہو کے میرے سامنے آیا اور میں نے محسوس کیا کہ مجھے محتاط ہو کے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ عقل سے کام لینے کی جتنی ضرورت آج تھی' اتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ ایک عرصے تک میں نے حالات سے لڑتے ہوئے اور اپنی خوش قسمتی پر انحصار کرتے ہوئے' دوستوں کی مدد اور تائید ایزدی سے کامیابی کے راستوں پر سفر کیا تھا مگر اب حالات مجھے شکست دینے لگے تھے تو یہ سمجھنا غلط تھا کہ تقدیر نے آنکھیں پھیر لی ہیں' دوست دوست نہیں رہے یا میں تائید ایزدی سے محروم ہو گیا ہوں۔ میں عام انسانی کمزوری کا شکار ہو گیا تھا۔ مسلسل کامیابی اسے خوش فہم بنا دیتی ہے اور خود اعتمادی کی انتہا پر پہنچ کے مغرور بھی۔ وہیں سے غرور کا سر نیچا ہونے لگتا ہے اور قدرت خود انسان کو یہ سبق سکھاتی ہے کہ سب کچھ اس کے ارادے یا اختیار سے نہیں ہوتا۔

چند منٹ کے بعد گاڑی رک گئی۔ میں ائرکنڈیشنڈ کار سے باہر نکلا تو مجھے موسم ہی نہیں' فضا بھی کچھ بدلی بدلی سی لگی۔ تبدیلی میرے اندر آئی تھی' باہر اس کا عکس میری آنکھیں دیکھ سکتی تھیں۔ دنیا کے لیے سب کچھ وہی تھا اور ویسا ہی تھا۔ دل اُداس ہو تو بہاروں کے رنگ پھیکے لگتے ہیں اور خوشبو میں افسردگی اُتر آتی ہے۔ زمین و آسمان ویران لگتے ہیں اور ماحول سوگوار۔ خوشی احساس میں شامل ہو تو کائنات رقص میں نظر آتی ہے۔ فضا گنگناتی ہے اور دنیا اچانک بہت خوب صورت ہو جاتی ہے۔

غزالہ نے گلابی سلک کی ساڑی کے سرکش آنچل کو سمیٹا اور بائیں ہاتھ سے سنبھال لیا۔ اس کا مختصر بلاؤز کسی ماہر فن درزی نے سیا تھا کہ جسم پر کہیں ایک شکن تک نہ تھی۔ جہاں بلاؤز نہیں تھا' وہاں اس کی کسی ہوئی کمر کا بانکپن رعب دیتا تھا اور نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا۔ حسین عورت کا اصل سرمایہ تو عطیۂ قدرت ہوتا ہے مگر وہ بلند عزائم رکھتی ہو تو اس سرمائے میں حسب خواہش اضافہ کر سکتی ہے۔ عشوہ و غمزہ و ادا سے' خوش لباسی سے' رنگ و روغن سے' خوش اطواری اور خوش ذوقی سے وہ اپنے سرمایۂ حسن و شباب کی قوت خرید کو لامحدود بھی کر سکتی ہے۔ غزالہ ایسی ہی عورت تھی۔

"کاروز" کے ایک نیم تاریک اور پرسکون گوشے میں بیٹھ کے اس نے کہا "سکندر! آخر بات کیا ہے' تم کیوں نروس ہو؟"

میں نے کہا "نروس... غلط خیال ہے تمہارا۔"

"پھر ایسے کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟ تم مجھے نروس کر رہے ہو۔"

میں نے تحمل سے کہا "میں بہت اپ سیٹ ہوں۔"

"میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔"

"کیا سن رکھا تھا؟"

"یہی کہ تم... بہت سی باتیں ہیں لیکن ایک بات یہ تھی کہ تم پریشانی میں بھی ہنسنا اور ہنسانا جانتے ہو۔" اس نے کہا۔

میں نے سنبھل کے کہا "اچھا... کس نے بتائی تھی یہ بات؟"

"جس نے بتائی تھی' غلط تو نہیں بتائی تھی۔ تم نے بدترین حالات کا مقابلہ کیا۔ سخت ترین آزمائشوں سے گزرے۔ تمہارے دشمن کون تھے اور دوست کون تھے' سب معلوم ہے مجھے اور یہ بھی کہ دشمن تمہارے بارے میں کیا کہتے ہیں اور دوست کیا رائے رکھتے ہیں۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "مجھے بھی بتاؤ مس غزالہ۔"

"ایسے انجان مت بنو۔ مجھے مایوسی ہو رہی ہے تمہارے رویے سے۔"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "آخر کیا توقعات رکھتی ہیں آپ مجھ سے خاتون! میں آپ کو ہنساؤں' لطیفے سناؤں؟"

"نہیں... میں چاہتی ہوں کہ تم نارمل ہو جاؤ۔ مجھ سے پوچھو کہ میں کون ہوں' کب سے تمہارے پیچھے لگی ہوئی تھی اور ایسے بھونڈے طریقے سے تمہیں اپنے ساتھ یہاں لے کر کیوں آئی ہوں۔"

میں نے کہا "تمہیں احساس ہے کہ یہ بھونڈا طریقہ تھا؟"

"کیا یہ شریفانہ طریقہ تھا؟" وہ بولی "کیا فرق ہے آخر مجھ

www.paksociety.com

اور ایک بازاری عورت کے انداز و اطوار میں۔ میرا حلیہ، میرا لباس اور میری ادائیں دیکھ کے کوئی بھی موجود رائے قائم کر سکتا ہے۔"

"یعنی بالوں والی بات کہوں؟"

"کہو" اس نے ویٹر کو کافی لانے کا آرڈر دینے کے بعد کہا۔

"تمہارے پاس وہ سب کچھ ہے جو دنیا کے کسی بھی مرد کو تمہارے اشارۂ ابرو کا غلام بنا سکتا ہے۔"

"میں اسے تعریف سمجھوں یا تذلیل۔"

میں نے جلدی سے کہا "تذلیل کا خیال کیوں آیا تمہیں؟"

"آئینہ دیکھو گے تو اس سوال کا جواب اپنی آنکھوں میں دیکھ لو گے" اس نے اداسی سے کہا "مجھے احساس ہے کہ میں نے اس طرح تم کو اپنے ساتھ لا کے اچھا نہیں کیا۔ تمہاری آنکھوں میں نفرت ہے میرے لیے۔ تم سارا راستہ یوں بیٹھے رہے جیسے چلتی گاڑی سے چھلانگ مار دو گے۔ میں اسے تمہارا خوف نہیں کہہ سکتی۔ تم مجھ پر اعتبار کرنا نہیں چاہتے۔ یہ سمجھے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کوئی مکر و فریب کرنا چاہتی ہوں۔ میں ایک جھوٹی اور مکار عورت ہوں اور تمہیں دھوکا دے کر کسی مصیبت میں ڈالنا چاہتی ہوں۔ مجھے کسی نے تمہیں نقصان پہنچانے کے لیے بھیجا ہے۔"

وہ میز پر آگے جھک کر سرگوشی میں بات کر رہی تھی اور بہت رنجیدہ نظر آتی تھی۔ اس کا لہجہ بہت پرسکون تھا اور اس کی آنکھیں بات کرتے ہوئے خلا میں دیکھتی محسوس ہوتی تھیں۔ میز کے دوسری طرف سے بھی مجھ پر وہ خوشبو حملہ کر رہی تھی جس نے گاڑی میں مجھے بے چین رکھا تھا۔ جب اس نے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو ساڑی کے پلو سے صاف کیا تو مجھے اپنے رویے پر افسوس ہوا۔

میں نے کہا "مس غزالہ! دوستی کے لیے یہ جگہ انتہائی نامناسب ہے۔ آئی ایم سوری۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوگا" وہ زبردستی مسکرائی "آپ بتائیں کیا میں نے غلط سمجھا؟"

میں نے اعتراف کیا "اگر سچ سننے کا حوصلہ ہے تو میں یہی کہوں گا کہ آپ نے ٹھیک سمجھا۔"

"یعنی یہ کہ میں بڑی غلط قسم کی عورت ہوں، آپ سے ملاقات کا مقصد آپ کے خلاف سازش ہے؟"

"دراصل حالات ایسے ہیں میرے ۔۔۔ کہ میں کسی پر بھی بھروسا نہیں کر سکتا۔"

"خصوصاً چودھری دلاور کی بہن پر۔"

"ابھی میں نے آپ کو اس کی بہن تسلیم نہیں کیا۔ آپ خود کو الزبتھ ٹیلر کی بہن بھی کہہ سکتی ہیں۔ اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"مجھے فرق پڑتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ پر اعتبار کرو۔ میں واقعی چودھری دلاور کی سوتیلی بہن ہوں" اس نے کہا "مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے درمیان کوئی محبت کا رشتہ ہے میں اس کی بدترین دشمن ہوں۔"

میں ہنس پڑا "خاتون! مجھے اس کہانی سے بھی قطعی کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ ایسی ہی ایک کہانی مجھے اکبر خان سنا چکا ہے۔ اگر چودھری دلاور تمہارا سوتیلا بھائی ہے تو اکبر خان بھی ہوگا۔"

اس کے چہرے کا رنگ بدلا "سکندر! پلیز۔ اتنی جلدی کوئی فیصلہ مت کرو۔ میں تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتی ہوں۔"

"مگر میں تمہارے لیے کچھ نہیں کروں گا۔ بہتر ہے کہ اس موضوع کو ختم کرو" میں نے کہا۔

"آخر پوری بات سننے میں کیا حرج ہے؟"

"اکبر خان کی باتیں بھی ایسی ہی تھیں۔ وہ میری مدد کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے چودھری دلاور سے انتقام لینا تھا۔ یہ اس کا دعویٰ تھا۔ اس نے مجھے بے وقوف بنایا تھا۔ پیسہ اس کے پاس بھی بہت تھا مگر وہ مجھے خرید نہیں سکا تو اس نے مجھے مصیبت میں ڈال دیا۔ پہلے ہی کم مسائل نہیں تھے میرے لیے۔ اب تم آ گئی ہو" میں نے بے رخی سے کہا۔

"پلیز ذرا آہستہ بولو۔ اکبر خان نے تمہیں دھوکا دیا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بھی دھوکا دوں گی۔ ایک ملاقات میں تمہیں قائل کرنا بہت مشکل ہے مگر ایک نہ ایک دن تمہیں یقین آ جائے گا کہ۔۔۔"

"شاید وہ دن کبھی نہ آئے۔"

"وہ دن بہت جلد آئے گا" وہ کسی ضدی لڑکی کی طرح بولی۔

"آنے والے دن کی بات چھوڑو مس غزالہ! آج کے دن کی حقیقت بھی کتنی ناقابلِ اعتبار ہے۔ میں یہ تسلیم کر لیتا ہوں کہ تمہارا نام غزالہ ہے۔ یہ بھی مان سکتا ہوں کہ وہ عالی شان مرسڈیز تمہاری ہے جس میں تم مجھے اپنے ساتھ بٹھا کے لائی ہو۔ تمہارا یہ لاثانی پیکرِ حسن و شباب بھی ایک ناقابلِ تردید سچائی ہے جس پر شک کرنے والا کافر لیکن اس کے بعد جو کچھ ہے وہ بقول مرزا غالب عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔"

"درست ہے۔ تم نے تعصب میں عقل کے سب دروازے پہلے ہی بند کر لیے ہیں اور اب اس حقیقت کے سوا تمہارے لیے دنیا میں کوئی حقیقت باقی نہیں رہی کہ میری ہر بات جھوٹ ہوگی اور میں چودھری دلاور کی بہن ہوں اس لیے تمہاری دشمن ہوں۔" اس کا چہرہ غصے میں گلابی ہو گیا۔

"اتفاق ہے میں تمہاری ہر بات سن سکتا ہوں" میں نے کہا "مگر مجھ سے یہ توقع مت رکھنا کہ میں اسے سچ بھی مان لوں گا۔ شاید میں صورت سے احمق لگتا ہوں مگر تمہیں معلوم ہے کہ تم مجھے پانی ہو ۔ یہی تمہارے علم میں ہونا چاہیے کہ میں بے وقوف نہیں ہوں۔ میں کیسے تسلیم کر لوں کہ چودھری دلاور کی بہن یہاں" اس روز ریسٹورنٹ میں میرے ساتھ بیٹھ کے کافی پی رہی ہو اور محترم بھائی صاحب کو علم نہ ہو؟ جو میرے پل پل کی خبر رکھتے ہیں اور مجھ پر ان کی ایسی نظرِ کرم ہے کہ وہ خود ساتھ نہ ہوں تو ان کے فرشتے میرے ساتھ سائے کی طرح رہتے ہیں۔"

وہ روہانسی ہو گئی "تم ٹھیک کہتے ہو۔ شاید ایسا ہی ہوگا۔"

"شاید نہیں خاتون! اس وقت بھی جب آپ نے اس ناچیز کو بار بار اور شرفِ ملاقات بخشنے کے لیے ایک قلمی ڈرامائی صورت حال پیدا کی۔ تو وہ سب دیکھ رہے تھے۔ وہ افراد جو صبح سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اب تک وہ اپنے آقائے ولی نعمت کو رپورٹ دے چکے ہوں گے کہ سب بالکل ٹھیک جا رہا ہے۔ بالکل آپ کی مرضی کے مطابق۔ شکار جال میں پھنس چکا ہے اوور۔"

"ول یو پلیز شٹ اپ۔" غزالہ نے اتنی بلند آواز میں کہا کہ ادھر اُدھر کی میزوں پر بیٹھے ہوئے چند افراد نے سر گھما کے دیکھا۔

"اوکے۔ میں اپنی بکواس بند کرتا ہوں۔ اب آپ جو فرمانا چاہیں فرمائیں۔ میری آنکھیں بھی کھلی ہوئی ہیں اور کان بھی کھلے ہوئے ہیں۔ رہا دل کا دروازہ تو وہ پہلے سے بند ہے اور مقفل ہے۔ اس کی چابی کسی اور کے پاس ہے ورنہ میں آپ کو خوش آمدید کہتا۔" میں نے تلخی سے کہا "عقل زدار ہے۔ اسے نہ میں پابند کر سکتا ہوں کہ کیا مانے اور کیا نہ مانے، کس کی سنے اور کس کی نہ سنے۔ عقل کی عدالت میں جذبات کی سفارش نہیں چلتی۔ اس کے سارے فیصلے میرٹ پر ہوتے ہیں۔"

"چلو اچھا کیا تم نے یہ وضاحت کر دی۔ اب مجھے ذہنی تعصب یا کسی مخالف جذبات کی دخل اندازی کا اندیشہ تو نہیں رہا۔"

"تمہیں اندازہ ہوا سے انداز بیاں اپنے چودھری دلاور صاحب کی جہالت آمیز گفتگو سے کتنا مختلف ہے۔ ہے نا؟" میں نے اس کی نقل اتاری۔

"وہ جاہل ضرور ہے مگر کتابی علم پر ناز کرنے والے بہت سے افلاطون اس کی ذہانت کا پاسنگ بھی نہیں۔"

"دشمن ہونے کے باوجود میں یہ مانتا ہوں۔ شاید مسولینی تو عورت کی شیطانی ذہانت ہے سب۔"

"مسٹر سکندر اعظم! میرے یا آپ کے پاس پوری رات نہیں ہے کہ ہم یہاں بیٹھ کے بے مقصد باتیں کرتے رہیں اور کسی نتیجے پر پہنچے بغیر اٹھ جائیں۔ تم مجھے چودھری دلاور کے حوالے سے ذلیل نہ کرو۔ میری ہر بات کا مذاق اڑاتے رہو اور میری ہر دلیل کو نفرت اور عداوت کی بنا پر رد کرتے رہو۔ تم نے ابھی کہا تھا کہ تم میری بات سنو گے" وہ ایک دم بگڑ گئی۔

"میں سن رہا ہوں خاتون۔ اور بھی بہت سے لوگ سن رہے ہیں۔"

"سنیں۔ تمہارا یہ تحقیر آمیز پر تمسخر انداز مجھے بالکل پسند نہیں۔ تم میں اتنی اخلاقی جرأت تو ہونی چاہیے کہ لگی لپٹی رکھے بغیر صاف کہہ سکو کہ میں کوئی بات نہیں سنوں گا۔ ایسی ہی بات تھی تو میرے ساتھ کیوں آ گئے تھے؟"

"تم صاف سننا چاہتی ہو تو سنو مس غزالہ۔ میں نے تمہارے ساتھ آ کے واقعی غلطی کی تھی۔ معلوم نہیں کیوں میں نے تمہارے کہنے پر گاڑی میں بیٹھنا منظور کر لیا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں اس وقت بہت پریشان تھا اور میری قوتِ فیصلہ باقی نہیں رہی تھی۔ تمہاری بات میں کیا سنوں اور کیوں سنوں؟ جب کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہارے منہ میں تو زبان بھی اپنی نہیں۔ جو کچھ بھی تم کہہ رہی ہو یا کہہ رہی ہو، ایک ایسے ڈرامے کا سین ہے جس کا اسکرپٹ چودھری دلاور نے لکھا ہوگا۔ تم نے اس کی خوب ریہرسل کی ہوگی یہاں تک کہ خود دلاور بھی مطمئن ہوگا کہ اب تمہاری اداکاری میں سو فیصد حقیقت نظر آنے لگی ہے۔ تم ایک تھکی ہوئی ہو اور مجھ سے توقع رکھتی ہو کہ میں۔۔۔ خیر چھوڑو۔"

خلافِ توقع وہ مشتعل نہیں ہوئی۔ ذہنی طور پر وہ پہلے سے میرے ردِعمل کے لیے تیار تھی۔ وہ خاموشی سے کافی پیتی رہی اور مجھے جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ دیکھتی رہی۔

"بس یا اور کچھ؟" اس نے میرے خاموش ہو جانے کے بعد کہا۔

میں نے کہا "نہیں۔ عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ میں نے تو وضاحت سے سب کچھ کہہ دیا۔ خیر سے تم جتنی حسین ہو اتنی ہی ذہین بھی نظر آتی ہو لیکن ذہین نظر آنے اور ذہین ہونے میں خاصا فرق ہے۔ حسین نظر آنے اور حسین ہونے میں اتنا فرق نہیں ہوتا۔"

"چلو تمہاری مردانہ انا کی تسکین کے لیے میں مان لیتی ہوں کہ میں ذہین تو بالکل بھی نہیں ہوں۔ ناقص العقل عورت ذات ہوں نا۔ آپ حسین مانتے ہیں تو یہ بھی ذرہ نوازی ہے آپ کی۔" اس

سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول ترین سلسلے
مغرور طالوت
صدیوں کا بیٹا
کتابی شکل میں تیار ہیں
آج ہی خط لکھ کر اپنی کاپی اپنے قریبی بک اسٹال سے حاصل کریں
کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی

نے طنزیہ لہجے میں کہا "یہ بات عام لوگ اکثر کہتے رہتے ہیں مجھ سے لیکن وہ سب اہلِ نظر نہیں ہوتے۔ بیشتر بوالہوس ہوتے ہیں۔ اور شکاری مرد ہر عورت سے تعلق کی کوشش ایسے ہی کرتے ہیں۔ اس کے حسن کی تعریف و توصیف میں شاعرانہ انداز اختیار کرنا تو حرفِ آغاز ہوتا ہے' اس سے اگلا مرحلہ یہ ثابت کرنے کا ہوتا ہے کہ وہ خود دوسروں سے مختلف ہیں اور پھر..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "خاصا تجربہ ہے آپ کا لیکن میں ایسا شکاری نہیں ہوں۔ پہلے تھا... اب نہیں رہا۔ اب میں شکاریوں کا شکاری ہوں۔ آپ سمجھتی ہیں بگ گیم کو خطرناک' آدم خور شیر مارنے والے جری مار نہیں ہوتے۔ جب تم واپس جاؤ تو... اپنے چوہدری صاحب یعنی اپنے نام نہاد بھائی صاحب کی خدمت میں میرا سلام عرض کرنا اور کہنا کہ میں اس لطیفے سے محظوظ ہوا مگر یہ کھیل پرانا ہو گیا ہے۔ کوئی نئی چال چلیں۔"

"تمہاری کافی ٹھنڈی ہو گئی ہے۔" وہ بے نیازی سے بولی "غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا۔ تم گرم کافی منگواؤ۔ اچھا میں منگواتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"اب تھوڑا سا وقت مجھے دو۔ میری بات مداخلت کے بغیر سنو۔ جیسے میں نے تمہاری بکواس سنی۔"

"یہ بکواس نہیں تھی۔"

"میرے لیے تھی" اس نے ویٹر کو اشارہ کیا اور اسے کافی کا آرڈر دے کر بات شروع کر دی۔ "جناب سکندرِ اعظم صاحب! آپ کی ساری فتوحات کا احوال میں نے خاص پڑھا اور تسلیم کیا۔ ظاہر ہے' بالواسطہ حاصل ہونے والی معلومات سو فیصد خالص نہیں ہوتیں۔ سچ زیادہ سے زیادہ نوّے فیصد سچ ہوتا ہے اور جھوٹ میں بھی دس فیصد سچ آ جاتا ہے۔ اس کے باوجود حقیقت کا مجموعی تاثر بے بنیاد نہیں ہوتا۔ تم نے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیے اور جس طرح اپنے دشمنوں کے عزائم کو ناکام کیا' وہ قابلِ تعریف ہے۔ تمہارے پاس وسائل صرف عزم اور یقین کے تھے اور تمہاری قوت تھی تمہارا اعتماد۔ تمہارے دست و بازو تھے تمہارے دوست اور بلاشبہ تمہیں حالات کی موافقت حاصل رہی۔ تم نے تاریخ پڑھی ہے؟"

"کس کی تاریخ؟"

"اپنی تاریخ۔ وہ تاریخ جس کو تم اپنے تہذیبی شعور کا قصہ کہتے ہو" اس نے ایک فلسفیانہ جواب دے کر مجھے حیران کر دیا "سکندرِ اعظم کو جانتے ہو؟ وہ ساری دنیا کی تسخیر کے لیے نکلا اور مسلسل فتوحات نے اسے یقین بلکہ غرور میں مبتلا کر دیا کہ جو وہ چاہتا ہے' کر سکتا ہے لیکن اس نے غالباً ایک ضرب المثل نہیں سنی تھی۔ تدبیر کند بندہ' تقدیر زند خندہ۔"

میں مسکرایا "وہ فارسی نہیں جانتا تھا۔"

"ہر زبان میں یہ بات کہی اور سمجھی جا سکتی ہے" وہ بولی "کہتے ہیں اسے ایک مچھر نے شکست دی۔ اسے مچھر کے کاٹنے سے ملیریا ہوا اور تخت یا تختہ۔ سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔"

"شاعری سے تمہارے ذوق..."

"کوئی مادہ ذوق اور سودا کو" وہ بولی "نپولین کی مثال لو۔ اسے بھی ناقابلِ شکست سمجھا جاتا تھا۔ ہٹلر کو برف نے پسپا کیا۔ برف خفیف سی حرارت سے پگھل جانے والی چیز ہے۔ توپ خانے ٹینک اور بم جس کا راستہ نہ روک سکے' اسے آسمان سے برسنے والی برف کی پھوار نے روک دیا۔ تم کو معلوم ہو گا کہ ہاتھیوں کے لشکر کو ابابیلوں نے کنکریاں مار کے تباہ کر دیا تھا۔"

"اتنی مثالیں کافی ہیں۔ میں نے عبرت پکڑی۔ اب آگے کہو۔"

"میرا خیال تھا کہ آپ سمجھ جائیں گے" وہ بولی "کہنے کا مقصد یہ تھا کہ سکندرِ اعظم' نپولین یا ہٹلر کو ان کی اس خوش فہمی نے مروایا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ناقابلِ تسخیر سمجھنے لگے تھے۔ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی غالباً غرور بن جاتی ہے۔ جب آدمی سمجھنے لگتا ہے کہ بس میں ہی میں ہوں۔ ہم چو من دیگرے نیست۔ اور کوئی ہم سا ہو تو سامنے آئے۔ خدا نے تو ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ پیدا کیا ہے۔"

"آپ نے مجھے فرعون کہا ہے یا خود کو موسیٰ؟"

"میں نے کچھ نہیں کہا۔ یہ سب مجھ سے بہت پہلے لوگ کہہ چکے ہیں" وہ بولی "اصل نکتہ سمجھنے کا یہ ہے سکندر صاحب کہ انسان کو اس وقت سے ڈرنا چاہیے جب اس کے دماغ میں یہ خناس سما جائے کہ صرف میری سوچ ٹھیک ہے' میری عقل راسخ و اٹل ہے' میں غلط فیصلے نہیں کر سکتا اور میں حالات کا مقابلہ کر سکتا ہوں کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ۔ بالکل ٹھیک کہ خدا آپ کے ساتھ ہے مگر کیا خدا صرف آپ کے ساتھ ہے اور وہ بھی غیر مشروط طور پر؟ آپ غلطی نہیں کر سکتے۔ پھر آپ انسان تو نہ ہوئے بندۂ خدا کا پتلا سمجھا جاتا ہے۔"

"مس غزالہ! براہِ کرم مجھے میری غلطی سے آگاہ فرما دیجیے۔"

"غلطی آپ سے ایک ہوئی ہو تو بتاؤں۔ کیا آپ کو سمجھ معلوم کہ اس وقت آپ کے گرد مخالف حالات کا گھیرا تنگ ہوا جا رہا ہے؟ آپ کا خیال تھا کہ یہاں آ کے سب ٹھیک ہو جائے گا؟"

"مجھے اس میں کوئی شک نہیں۔"

"جب آپ نے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے تو کیا آپ کے دل میں کوئی شک تھا؟ آپ کو یقین تھا کہ آپ حق پر ہیں۔ حق کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے اور آپ اپنا حق منوا کر حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ آپ کے ساتھ انصاف ہو گا اور ناانصافی کے مرتکب کیفرِ کردار کو پہنچ جائیں گے۔ سچ کا بول بالا اور جھوٹے کا منہ کالا ہو گا۔ جیسے ہر ظلم کا انجام ہوتا ہے کہ ولن ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ ہیرو ہزار مشکلات و مصائب کا مقابلہ..."

خابلہ کرکے اور بدخواہوں کی ایسی تیسی کرکے کامیاب ہوتا ہے اور ہیروئن کا ہاتھ تھام کر آخر میں دوگانا گاتا ہے۔ تماشائی خوش خوش گھر کی راہ لیتے ہیں کہ پیسے وصول ہوئے۔ مگر فلم دیکھنے والے بچنے FANTASY کی خود فریبی کا شکار ہوتے ہیں۔ زندگی میں کوئی فینٹسی نہیں ہوتی۔"

میں مجبور تھا کہ اس بے حد حسین نظر آنے والی لڑکی کو انتہائی ذہین اور غیر معمولی عقل و شعور کی مالک سمجھتے ہوئے اس کی باتوں کو سنجیدگی سے سنوں۔ میرا یہ عقیدہ غلط ہو رہا تھا کہ ایک انتہائی خوب صورت چہرے کے ساتھ عورت کے سر میں واجبی سی عقل ہوتی ہے جو سلیقے سے زندگی گزارنے کے لیے کافی ہو یا محبت کرنے کے لیے۔ اس لڑکی نے آہستہ آہستہ مجھے متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے خیالات کی گہرائی' قوتِ مشاہدہ کی وسعت اور علم کے ساتھ عقل کی آمیزش نے ثابت کر دیا تھا کہ میں روایتی طور پر اس کے مقابلے میں اپنی ذہنی برتری کا دعویٰ کر کے اسے ناقص العقل ثابت نہیں کر سکتا۔ وہ میرا تمسخر اڑا رہی تھی۔ اس نے مجھے خوش فہم' مغرور' خود فریبی کا شکار' غیر عملی اور ناکام انسان' سب کچھ کہہ دیا تھا۔ ابتدا میں میرے رویے نے اس کو نروس کر دیا تھا مگر اب وہ اعتماد کے ساتھ اپنے قدم جما کے جارحانہ انداز میں اپنی حیثیت تسلیم کروانے کے لیے لڑ رہی تھی۔ یہ ایک خطرناک بات تھی۔

میں نے کہا "آپ کیا ثابت کرنے والی ہیں خاتون؟"

"جو ثابت نہیں تھا وہ پہلے ہی ثابت ہو چکا ہے" وہ بولی "کبھی آپ نے نفسیات والوں کے برین ٹیسٹ دیکھے ہیں؟ کچھ سوالات ہوتے ہیں جن کے جواب سے ایک نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ آپ کتنے سوشل ہیں؟ آپ کا آئی کیو کیا ہے یعنی آپ کتنے ذہین ہیں؟ کیا آپ میں قوتِ برداشت ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی رجحان طبع کے ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ APTITUDE TEST جن سے پتا چل جاتا ہے کہ کوئی بچہ یا بڑا کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا۔ ان سے کسی کے لاشعور کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اندر کا آدمی سامنے آ جاتا ہے۔"

"آپ مجھے کوئی ٹیسٹ دینے والی ہیں؟" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا "مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اندر سے اتنا پُراعتماد نہیں تھا "پہلے مجھے یہ بتا دیں کہ آخر آپ کیا چیز ہیں؟ میرا مطلب ہے۔"

"میں ماہرِ نفسیات یا سائیکاٹرسٹ وغیرہ نہیں ہوں۔ میں ایک عام ڈاکٹر ہوں۔ ایم ڈی' جسے آپ ایم بی بی ایس کے برابر سمجھ لیں۔"

"یہ ڈگری تو باہر کی ہے۔"

"جی۔ میں نے لندن میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد میں نے اسپیشلائز کیا نیورولوجی میں۔ میں نیورو فزیشن ہوں۔"

"اس کے باوجود آپ کا اصرار ہے کہ آپ ماہرِ نفسیات نہیں؟"

"میں ذہنی اور اعصابی امراض کی ڈاکٹر ہوں۔ دواؤں سے علاج کرتی ہوں۔ تحلیلِ نفسی میرا شعبہ نہیں۔"

"یعنی آپ مجھے ایک ذہنی مریض کی حیثیت سے دیکھ رہی ہیں اور مجھے یقین دلانا چاہتی ہیں۔"

"پلیز سکندر صاحب! ڈونٹ بی پرسنل" اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا "میں صرف اپنی پوزیشن کلیئر کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کو یقین دلانے کا مرحلہ بعد میں آئے گا کہ نہ میں چوہدری دلاور کی کچھ لگتی ہوں اور نہ میں اس کی کسی سازش کا حصہ ہوں۔ آپ مردم گزیدہ ہیں۔ بہت دھوکے کھا چکے ہیں اور آپ کی جگہ میں ہوتی تو شاید میرے لیے بھی یہی شکل ہوتی۔ چوہدری دلاور صرف نام کے رشتے سے میرا سوتیلا بھائی ہے۔ یہ بات میں آپ سے چھپا بھی سکتی تھی' اجنبی بن کے مل سکتی تھی آپ سے۔"

"پھر آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"اس سے مجھے وہ فائدہ نہ ہوتا جو میں حاصل کرنا چاہتی ہوں" وہ سوچ کے بولی۔

"یعنی آپ مجھے اپنے کسی فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہیں؟"

"فائدہ صرف میرا نہیں ہے۔ آپ کا بھی ہے۔"

"میرے فائدے کی فکر کرنے والے بہت ہیں خاتون۔ آپ

www.paksociety.com

مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور خود بھی چوہدری دلاور سے بگاڑ مت مول لیں۔ سوتیلا سہی مگر وہ بھائی تو ہے آپ کا۔ اگر کوئی خاندانی جھگڑا ہے تو آپس میں طے کرلیں۔ مجھ سے توقع مت رکھیں۔ مجھے تو اس خیال سے وحشت اور دہشت ہو رہی ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ آ کے بڑی حماقت یا نادانی کا ثبوت دیا تھا۔ اور اتنی دیر سے ہم یہاں بیٹھے ہیں۔۔۔ میرا تو خیر وہ کیا بگاڑے گا۔ آپ کا کیا بنے گا جب آپ لوٹ کے گھر جائیں گی۔ کیا وضاحت پیش کریں گی؟ اگر واقعی آپ اپنی مرضی سے آئی تھیں؟"

"وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا سکندر۔ اسے کیا معلوم۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ رفیق اس کا آدمی ہے۔ اس کے علاوہ دو آدمی صبح سے میرے پیچھے لگا رکھے تھے اس نے۔"

وہ مسکرائی "رفیق کی بات تو میں نے بتا دی۔ وہ چوہدری دلاور کے ساتھ ہے مگر اس کا آدمی نہیں ہے۔"

"چوہدری دلاور کسی شخص کو جانے بغیر اپنے قریب آنے کا موقع نہیں دیتا۔"

"تم نے رفیق کو کہاں دیکھا تھا؟"

"سب سے پہلے حوالات میں۔ وہ مجھے رہا کرا کے لے گیا تھا۔"

"کہاں لے گیا تھا؟"

"وہ غالباً کسی وزیر یا سیکریٹری قسم کے بیوروکریٹ کی رہائش گاہ تھی۔"

"رائٹ۔ وہ چوہدری دلاور کا گھر نہیں تھا۔ یہ تو مانتے ہو نا تم؟ بعد میں یہ بھی معلوم ہو جائے گا تمہیں کہ خود چوہدری دلاور کو وہاں بلایا گیا تھا اور وہ مجبور تھا وہاں آنے پر۔ یہ الگ کہانی ہے۔"

"تم پُراسرار بننے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"پھر میں کیا کروں؟ جب تم میری کوئی بات ماننے کے لیے تیار ہی نہیں۔"

میں نے کہا "تمہیں معلوم ہے وہ کس کی رہائش گاہ تھی؟"

"ہاں۔ وزارت داخلہ کے ایڈیشنل سیکریٹری زیڈ یو نقوی کی۔ وہ غالباً ہوم سیکریٹری ہو جائیں گے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "مسٹر نقوی۔ وہ تو بڑی توپ چیز ہیں۔"

وہ ہنسی "ہر ایڈیشنل سیکریٹری توپ چیز ہوتا ہے اور ہوم سیکریٹری تو زمزمہ ہوتا ہے۔"

"شکریہ۔۔۔ زیڈ یو نقوی صاحب تو۔۔۔ سسر ہیں اس کے۔ وقار یوسف کے۔"

"ہوں گے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"شکریہ۔۔۔ ان کے گھر میں۔۔۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"آ جائے گا آہستہ آہستہ۔ رفیق انہی کا پی اے ہے۔ اسے بھی تم چھوٹی موٹی توپ ہی سمجھو" غزالہ نے کہا۔

"مس غزالہ! پلیز میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔ اس راز پر سے پردہ ہٹا دیں کہ مجھے وہاں لے جانے کا مقصد کیا تھا اور چوہدری دلاور وہاں آنے پر کیوں مجبور تھا؟ اس کے علاوہ رفیق آپ کا آدمی ہے تو پھر۔"

"سکندر صاحب! یہ دنیا جلیبی کی طرح سیدھی نظر آتی ہے لیکن وہ ملک کی سیاست کے کھیل اس سے بھی زیادہ پُرپیچ ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب! آپ نے باہر تعلیم حاصل کی۔ باہر سے ڈگری لی اور وہ بھی نیورولوجی کی۔ کوئی پولیٹیکل سائنس میں ڈاکٹریٹ نہیں کی۔ پھر آپ نے ان چکروں کو کیسے سمجھ لیا جو اس ملک میں رہنے والے میرے جیسے پاکستانی کی سمجھ میں نہیں آتے؟"

"یہ سب آج ہی نہیں بتا سکتی۔ تم کو جلدی ہے؟"

"خیر مجھے اتنی جلدی بھی نہیں ہے" میں نے کہا۔

"تم نے کہا تھا کہ ہم ساری رات نہیں بیٹھ سکتے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ "کار روز" رات بھر نہیں کھلا رہتا" میں نے سر کھجا کے کہا "تم مختصرات کرو تو چار گھنٹے میں اپنی پوری تاریخ جغرافیہ بتا سکتی ہو۔"

وہ مسکرائی "ابھی کچھ بنیادی باتیں غور طلب ہیں۔ پہلی تو یہ کہ آپ کس حد تک میری بات پر اعتبار کر سکتے ہیں۔ دوسری یہ کہ بدگمانی اور تعصب کے جذبات سے بالاتر ہو کے ایک ناقص العقل عورت کے مشورے کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں یا نہیں۔ تیسری۔"

اس کا ہاتھ میز پر تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا "نیٹ از قل مس غزالہ۔ پہلے میں چند سوالات کروں گا۔"

اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا "پہلے آپ میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔"

میں نے خفت زدہ ہو کے اپنا ہاتھ اٹھا لیا "سوری۔"

وہ مسکرائی "میں نے بُرا نہیں مانا۔ لندن میں رہی ہوں اس لیے عادی ہوں۔"

میں نے کہا "آپ چوہدری دلاور کی سوتیلی بہن ہیں۔ کیسے؟"

"سمپل۔ چوہدری دلاور کے باپ نے میری ماں سے شادی کی تھی۔"

"کہاں شادی کی تھی؟"

"لندن میں۔ میری ماں انگریز تھی۔"

"آئی سی۔ اسی لیے تمہاری آنکھیں نیلی ہیں اور بال سنہری مائل مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے چوہدری دلاور کا اور اکبر کا باپ پشاور کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ فرنیچر بناتا تھا اور ہاتھ سے کندہ کاری میں ماہر تھا۔ وہ وہیں غربت کی زندگی گزار کے مر گیا تھا۔"

"تم ملے ہو اس سے؟"

"نہیں۔ مگر لوگ جانتے ہیں یہ بات۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی "اس میں کوئی شک نہیں کہ لندن میں آ کے

کا فرنیچر بہت مقبول تھا۔ جو باتیں مجھے میری ماں نے بتائی تھیں مجھے یاد ہیں۔ اس کا نام بہادر خان تھا لیکن وہ خان بہادر لکھتا تھا خان بہادر ایک خطاب بھی ہوتا تھا۔ خان بہادر فرنیچر کا ہر چیز اینٹیک لگتا تھا۔ بہت انگریز امرا منہ مانگی قیمت پر خریدتے تھے خصوصاً وہ جو برطانوی ہندوستان میں حاکم تھے یا حکمران رہے تھے۔ اس کے بعد اچانک وہ غائب ہو گیا اور میری ماں کو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنا بزنس گڈول کے ساتھ کسی ہندو کو فروخت کر گیا تھا مگر اس میں کوئی قانونی سقم نکل آیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اداری بلیک ہو گیا۔"

"تمہاری ماں نے اس کا پتا چلانے کی کوشش کی تھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اس نے تو خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ ایک کالے انڈین سے جان چھوٹی۔ وہ کالا تو خیر نہیں تھا۔ میری ماں کہتی تھی کہ اس کا رنگ روپ بالکل انگریزوں جیسا تھا اور وہ سوٹ پہن کے وہ انگریز ہی لگتا تھا۔ پر اس وقت کھلتا تھا جب وہ ولایت میں اپنی انگریزی کی ٹانگ توڑتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے انڈیا میں انگریز اردو کی۔ یہ تھوڑی بہت انگریزی بھی اس نے برطانیہ میں رہ کے سیکھی تھی۔ جب وہ وہاں آیا تھا تو بالکل کورا تھا۔"

"وہ برطانیہ پہنچا کیسے؟"

"اس کا بیان تو یہ تھا کہ اپنے ایک انگریز افسر کی جان بچائی تھی جسے قبائلی مار ڈالتے۔ احسان کا بدلہ چکانے کے لیے انگریز اسے اپنے ہمراہ لے آیا اور برطانیہ میں آباد ہونے کے بعد بھی اس کی مدد جاری رکھی۔ بہادر خان فرنیچر کے کاروبار کو طبقۂ خواص میں اسی نے متعارف کرایا تھا۔ باقی سب اس کی محنت اور اللہ کی دین۔ میری ماں کا خیال تھا کہ وہ انڈیا سے فرار ہو کے برطانیہ آیا تھا کیونکہ وہ بہت ڈرا ہوا رہتا تھا اور شروع میں ایسے بہت سے مواقع آئے جب وہ گھر میں چھپا رہا۔ اس نے کئی بار رہائش بدلی اور اپنے ہم وطنوں سے ہمیشہ دور رہا۔ میری ماں اس بزنس کو نہیں چلا سکتی تھی چنانچہ سودا پھر اسی ہندو سے ہوا اور برطانوی نژاد شہری کی حیثیت سے میری ماں نے اپنے قانونی اختیارات استعمال کرتے ہوئے ایک لیگل فرم کے ذریعے اصل سے زیادہ قیمت وصول کرلی۔"

"اصل سے زیادہ کیسے؟"

"کچھ ایسا مسئلہ تھا کہ میرے باپ کے علاوہ اس ہندو خریدار پر اصل مالیت کو چھپانے کا اور انڈر ہینڈ ڈیل "UNDER

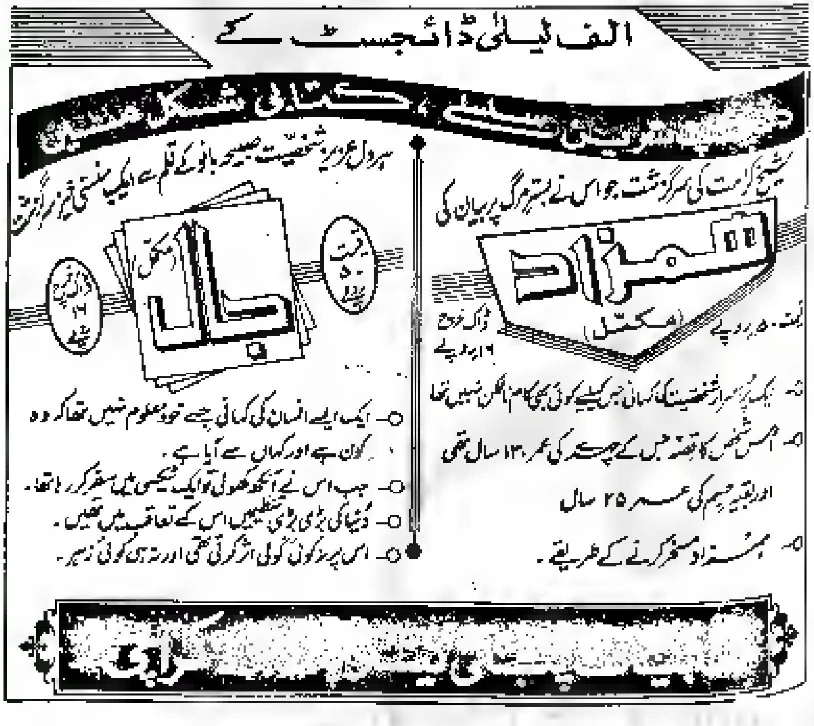

"HAND DEAL" کا الزام نکلا تھا۔ جب میری ماں بہت دولت مند ہوگئی تو اس نے ایک اعلیٰ خاندانی لارڈ سے شادی کی جس کی شرافت' انسانیت' وضعداری اور شفقت کو میں کبھی نہیں بھول سکتی ہوں۔ مجھے یہ بتایا نہیں گیا کہ میری ماں بہت حسین تھی اور جب میں جوان ہو چکی تھی تو لوگ اسے میری بڑی بہن سمجھتے تھے۔ اس لارڈ نے میری پرورش اور تعلیم کا اعلیٰ انتظام کیا اور مجھے بہترین انگلش سوسائٹی کے ادب و آداب سیکھنے کا پورا موقع ملا۔ جب میں میڈیکل کی طالبہ تھی تو میرے کلاس فیلو چند پاکستانی تھے اور ان میں ایک پٹھان تھا۔ میری کہانی سن کے اور میری درخواست پر اس نے وعدہ کیا کہ وہ بہادر خان یا خان بہادر کا سراغ لگانے کی کوشش کرے گا۔ اسے صرف اتنا معلوم ہوا کہ بہادر خان اپنی ایک بیوی اور دو بیٹیوں کو چھوڑ کے فرار ہو گیا تھا۔ غالباً اس نے بے وفائی کے الزام میں اور بدچلنی کے شک میں بیوی کو قتل کر دیا تھا لیکن یہ الزام غلط تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ کسی بدکردار عورت کے چکر میں پڑ گیا تھا اور اپنی بیوی سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ بیوی کے بھائی اور خاندان والے اس کے خون کے پیاسے ہو گئے تو اسے جان بچا کے نکلنا پڑا۔ وہ اس طوائف کے پاس پہنچا تو اس نے بھی بہادر خان کو پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ وہ اسے پناہ دیتی تو خود بھی ماری جاتی۔ پشاور میں اور پورے سرحد میں آج بھی کوئی بازار حسن نہیں ہے۔ کچھ لوگ چوری چھپے یہ دھندا کرتے تھے اور رنجیوں کے عشرت کدے آباد کرنے والی یہ عورتیں بھی باہر سے آئی تھیں۔ بہادر خان اس عورت کے انکار سے مشتعل ہو گیا۔ اس نے ایک رات قیام کرنے کی اجازت حاصل کی مگر اسی رات اپنی بے وفا محبوبہ کا کام تمام کر کے نکل گیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ہم وطنوں سے اور خصوصاً اپنی قوم کے لوگوں کی شکل دیکھ کے ڈرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔"

"سب کچھ تو معلوم ہے تمہیں۔"

"ہاں۔ مگر یہ بہادر خان کی بات ہے۔ میرے باپ کا نام خان بہادر تھا۔ تم کہتے ہو کہ وہ اپنے آبائی گاؤں میں فرنیچر بناتا تھا۔ اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ بہادر خان کوئی اور تھا۔ ورنہ اپنے علاقے میں واپس جاتا تو قتل نہ ہو جاتا!؟ ایک نظریہ میں نے یہ قائم کیا تھا کہ خان بہادر بلاوجہ جمے جمائے کاروبار کو اور بیوی بچوں کو چھوڑ کے فرار نہیں ہوا تھا۔ شاید کسی نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس کے قاتل اسے تلاش کرتے ہوئے لندن میں اس کے گھر یا کاروبار کا سراغ لگا چکے تھے اور اسے یہ بات معلوم ہو گئی تھی۔ بیوی بچوں کو واپس ہندوستان اور قبائلی علاقے میں لے جانا ناممکن تھا۔ وہ اپنی جان بچا کے نکل گیا اور شاید مارا گیا۔ برطانیہ سے نکلنے سے پہلے ہی یا واپس وطن پہنچ کے۔"

"لیکن وہ شخص جو خود کو اکبر خان اور دلاور کا باپ کہتا تھا____"

"اکبر خان اور دلاور بہت چھوٹے تھے۔ ان کی پرورش کی ذمہ داری خاندان میں کسی نے لے لی ہوگی۔" وہ بولی۔ "مجھے میرے پٹھان کلاس فیلو نے بتایا کہ سرحد اور پنجاب کے بعض علاقوں میں رواج ہے یا چھوٹے بھائی کی بیوہ کا کسی بھائی سے نکاح کر دیا جاتا ہے تاکہ گھر کی عزت گھر میں ہی رہے۔ ایک اور سبب یہ بتایا جاتا ہے۔ ایک بھائی کی بیوہ سے دوسرا بھائی اس لیے بھی شادی کرتا ہے کہ زمین کا بٹوارا نہ ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اکبر خان اور چوہدری دلاور کی پرورش کرنے والا ان کا حقیقی باپ نہ ہو' ان کا چچا یا تایا ہو۔"

میں نے کہا "ایسا ہو سکتا ہے۔ اور اب مجھے یہ خیال بھی آتا ہے کہ کہیں اکبر خان اور چوہدری دلاور بھی سوتیلے بھائی نہ ہوں۔ ان کی ماں ایک ہی ہو مگر باپ الگ الگ ہوں۔ چوہدری دلاور شاید وہ ہے جو بعد میں پیدا ہوا ہو۔ خیر۔ اس کی تصدیق ہو جائے گی۔ یہ بتاؤ کہ تم اتنی اچھی اردو کیسے بول لیتی ہو؟ تمہاری ساری زندگی تو برطانیہ میں گزری اور تمہاری ماں بھی انگریز تھی۔"

"ہاں۔ لیکن ہم لندن کے اس علاقے میں رہتے تھے جہاں زیادہ تعداد پاکستانی اور بھارتی باشندوں کی تھی۔ میں نے پاکستان ہائی کمیشن کے اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی جہاں سب کلاس فیلو پاکستانی بچے تھے۔ میرا باپ مجھے انگریز بچوں سے دور رکھنا چاہتا تھا تاکہ میں ان کے تعصب کا نشانہ نہ بنوں۔ کسی انگریز عورت کا کسی غلام ملک کے کاریگر سے شادی کر لینا اس معاشرے کا ناقابل معافی جرم تھا۔ پاکستانی بچوں میں میری حیثیت ممتاز تھی کیونکہ میرا باپ برطانوی شہری اور ایک بزنس مین تھا اور میری ماں کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ اس کا خاندان بھی معزز تھا۔ اس کے علاوہ.... میرا رنگ روپ بالکل انگریز بچوں جیسا تھا۔"

"تعجب ہوگا" آج بھی ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

وہ تھوڑا سا شرمائی "ان بچوں میں رہ کے میں نے اردو بھی سیکھی اور روانی سے بولنے بھی لگی۔ خان بہادر کا کہنا تھا کہ تم پاکستانی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم پاکستانی رہو۔ ایک دن ڈاکٹر بن کر واپس پاکستان جاؤ۔ وہاں ڈاکٹر نہیں ہیں۔ لوگوں کو علاج کرنے والا کوئی نہیں ملتا۔ وہ مجھے بہت کچھ بتاتا تھا پاکستان کے بارے میں۔ مجھے بڑی حیرانی ہوتی تھی یہ جان کر کہ بیشتر علاقوں میں کلینک یا ڈاکٹر اور اسپتال نہیں ہوتے۔ لوگ بیماروں کو چارپائیوں پر ڈال کے پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں پر پیدل چلتے ہوئے بہت دور کسی قصبے یا شہر لے جاتے ہیں اور اگر وہاں پہنچ کے مریض زندہ رہے تو اس کا علاج کراتے ہیں۔ ورنہ بہت سے راستے میں دم توڑ دیتے ہیں تو جنازہ واپس لے آتے ہیں۔ یہاں آ کے دیکھا تو" اس نے ایک جھرجھری لی۔

میں نے کہا "تم یہاں کب آئی تھیں؟"

"زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔" اس نے گول مول جواب دیا۔

"تمہاری ماں کہاں ہے؟"

"شی از ڈیڈ" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ میرا دوسرا باپ انسان نہیں فرشتہ تھا۔ اس میں تعصب نام کو نہیں تھا۔ وہ بہت پڑھا لکھا' فلسفی قسم کا فرد تھا جو انسانیت کی اعلیٰ قدروں پر یقین رکھتا تھا۔ پور اولڈ مین۔ جب میری ماں اس کی طرف ملتفت ہوئی اور اسے بتایا کہ کس طرح وہ تنہا اور اکیلی رہ گئی ہے اور ایک انڈین سے شادی کرنے کے جرم میں اسے خاندان کے رشتوں سے بھی محروم ہونا پڑا ہے تو وہ جذباتی ہو گیا۔ اس کی عمر ستر سال تھی اور میری ماں کی اس سے نصف۔ بلکہ نصف سے بھی کم۔ شادی کے وقت وہ تیس سال کی تھی۔ مجھے شرم آتی ہے یہ سب بتاتے ہوئے مگر وہ کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔ معلوم نہیں اس نے زندگی میں جو کچھ کیا کیوں کیا۔ پہلی بات تو یہ کہ اسے خان بہادر سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس معاشرے کی روایات کو جانتے ہوئے بھی اس نے یہ غلطی کی تو اس کی بنیاد کوئی بہت بڑی جذباتی وجہ ہوگی جسے محبت کی دیوانگی کہا جا سکتا ہے۔"

"کیا محبت دیوانگی ہوتی ہے؟" میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ محبت تو صرف محبت ہو سکتی ہے۔ دیوانگی صرف دیوانگی ہوتی ہے۔ میں اپنی بات کر رہی ہوں۔ اگر مجھے کسی سے محبت ہوگی تو اس کے پیچھے میری پسند ہوگی اور پسند کی بنیاد ہوگی عقل پر' طویل تعلق کے تجربے پر' منطقی وجوہات پر' مشاہدے پر اور خوبیوں پر۔ میں کسی کی سوچ' تعصب' فطرت اور مزاج سے مکمل آگہی کے بغیر اسے کیسے پسند کر سکتی ہوں اور پسند کرنا بھی مرحلہ وار ہے۔ اب میں تمہیں پسند کرتی ہوں دوستی کے لیے۔ تم مخلص ہو یا نیک ہو۔ میں ایک پروفیسر کو پسند کرتی ہوں کیونکہ میں اس کی ٹیلنٹ سے متاثر ہوں۔ ایک ڈاکٹر کی مشنری اسپرٹ کو پسند کرتی ہوں۔ کسی ایکٹر کو پسند کرتی ہوں تو کسی اسپورٹس مین کو مگر میں ان سب سے شادی تو نہیں کر سکتی۔ کسی کی محض ایک خوبی دیکھ کے اپنی طویل زندگی اس کی تحویل میں دے دوں' یہ مجھ سے ممکن نہیں۔ شوہر کا انتخاب تو بہت سوچ سمجھ کے اور چھان پھٹک کے کرنا ہے۔"

"یعنی اب تک تم سب کو چھان پھٹک رہی ہو۔ فائنل میں کوئی نہیں پہنچا۔"

"ابھی نہیں۔ تم ایسا ہی سمجھ لو۔ کچھ کوارٹر فائنل میں آ گئے' کچھ سیمی فائنل میں۔"

"میں تمہاری دلیل سے انکار نہیں کر سکتا مگر یہ فلسفہ حیات بہت عجیب ہے۔" میں نے کہا۔

"میری ماں نے جذباتی دیوانگی میں زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کیا۔ بہت جلد اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا مگر اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ خان بہادر نے اسے دو باتیں اچھی طرح سمجھا دی تھیں۔ ایک یہ کہ اس معاشرے کی روایات کچھ بھی ہوں' بھی اس نے غیر مرد سے دوستی کی بات بھی کی تو وہ اسے قتل کر دے گا۔ طلاق کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قانون کی مدد سے وہ الگ ہو سکتی ہے مگر الگ ہو کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ دوسری بات یہ کہ اس کی اولاد ہمیشہ مسلمان رہے گی' پاکستانی ہوگی اور وہ انہیں انگریز بنانے کی کوشش نہ کرے۔ میری ماں مجبور تھی اور ہمیشہ یہ سمجھتی رہی کہ وہ بلیک میل ہو رہی ہے۔ ایک ردعمل کے طور پر اس نے مجھے بھی وہ محبت نہیں دی جو ایک ماں اپنی بیٹی کو دے سکتی ہے۔ میرے باپ کے فرار ہو جانے کے بعد اس نے دوسری غلطی ایک بوڑھے سے شادی کر کے کی۔ وہ معاشرے میں پھر معزز ہونا چاہتی تھی اور بلاشبہ اس لارڈ کے ساتھ اسے سوشل اسٹیٹس مل گیا مگر میں اس کے ماضی کی جذباتی کا راز بن کے موجود رہی۔ لارڈ اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھتا تھا اور اسے سمجھاتا بھی رہتا تھا کہ غلطی اس نے کی تھی تو سزا مجھے نہیں ملنی چاہیے۔ مگر میری ماں کے لیے مجھ سے نفرت نہ کرنا ممکن نہ ہوا۔ محبت کی کمی کو میرے دوسرے باپ نے پورا نہ کیا ہوتا تو شاید میں نارمل نہ رہتی۔ بگڑ جاتی' بے راہروی کا شکار ہو جاتی یا شخصیت کے عدم توازن کا۔ اس نے مجھے سنبھالا اور میری ذہنی تربیت کی۔ میں سمجھتی ہوں کہ بہت کم باپ اپنی بیٹی کو اتنی توجہ دیتے ہوں گے۔ یہ الٹا معاملہ تھا۔ حقیقی ماں کا رویہ بالکل سوتیلی ماں جیسا تھا اور سوتیلا باپ مجھے حقیقی باپ سے زیادہ چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ میرے لیے ایک آزمائش ہے۔ میں کسی کو ناخوشی کا متحمل نہیں ہو سکتا اور اس ذمے داری کو پورا کیے بغیر میں مروں گا بھی نہیں۔ گڈ اولڈ مین! اس نے جو کہا وہ کر دکھایا۔ زندگی ویسے تو اتنی طویل نہیں ہوتی مگر میرا تجربہ ایسا ہی رہا۔ اچانک باپ کو کینسر ہو گیا۔ میں اپنے دوسرے والد جیسی لارڈ کو باپ کہتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ڈیئر! اپنے اصل کی طرف لوٹ جاؤ۔ تمہاری ماں کا ORIGIN یہی ہے۔ قانونی طور پر تم بھی برطانوی شہری ہو مگر اندر سے تم پاکستانی ہو۔ تم یہاں ہمیشہ اجنبی اور اکیلا محسوس کرو گی کیونکہ تمہارے رشتے بہت کمزور ہیں۔ اور عین ممکن ہے کہ خود تمہاری ماں تمہیں اپنا ماننے سے انکار کر دے' وہ تمہیں DISOWN کر دے۔ یہ میرے اصل باپ بہادر خان کی خواہش بھی تھی اور میری بھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس ماحول میں پرورش پانے کے باوجود میں خود کو ہمیشہ ہی پاکستانی سمجھتی تھی جیسا تعلیم کے لیے آنے والے دوسرے طلبا یا عارضی طور پر قیام کرنے والوں کے بچے۔ پھر میرے ذہن میں ہر وقت ایک خیال تھا جو اکثر میرے تصور میں اور خواب میں نظر آتا تھا کہ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی ویرانی میں کچھ لوگ ایک چارپائی پر کسی بیمار کو ڈالے نشیب کی جانب کے راستے پر کسی قصبے کی سمت رواں ہیں مگر انہیں ابھی تک معلوم نہیں کہ وہ جسے علاج کے لیے لے جا رہے ہیں وہ ایک لاش ہے۔ جب وہ دم لینے کے لیے کہیں چارپائی کو نیچے رکھیں گے تو شاید انہیں یہ بات معلوم ہوگی اور وہ بادل ناخواستہ اور مجبوراً واپسی کا

www.paksociety.com

سفر شروع کریں گے۔ نکلتے ہوئے موسم اور سفر کی سختی سے نیم جاں، غم زدہ اور اپنی سستی کا حاصل پر پشیمان۔ عجیب اتفاق یہ ہوا کہ انہی دنوں میں نے اسپین کی ایک فلم دیکھی جو خانہ جنگی سے متعلق تھی۔ اس میں گوریلا فورس کے کمانڈر اپنے ایک ساتھی کو اسی طرح اٹھا کے لے جا رہے تھے جسے گولی لگ گئی تھی۔ وہ کسی قصبے کے ڈاکٹر تک پہنچانا چاہتے تھے۔ راستے میں ان کا مقابلہ مخالف فوجی دستے سے ہو جاتا ہے اور وہ زخمی ساتھی کو وہیں پھینک کر پناہ کی تلاش میں بھاگتے ہیں مگر سب مارے جاتے ہیں۔ مجروح گوریلا کمانڈر وہیں پڑا رہ جاتا ہے اور اس پر برف گرتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ بھی برف کی تہہ کے نیچے غائب ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں بھی برف میں چھپ جاتی ہیں۔ پھر ایک ڈاکٹر گھوڑے پر بیگ کے ساتھ نمودار ہوتا ہے جسے دراصل پہلے بلایا گیا تھا مگر وہ کسی وجہ سے پہنچ نہیں سکا تھا۔ وہ وہاں سے سیدھا گزر جاتا ہے اور برف پر گھوڑے کے سموں کے نشان باقی رہ جاتے ہیں۔ اس فلم نے مجھے اندر سے ہلا دیا۔ میں نے سوچا کہ کیا اب بھی میرے ملک میں ایسا ہی ہوتا ہوگا؟"

میں نے ایک آہ بھری "ڈاکٹر غزالہ یہاں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ گاؤں تو گاؤں شہروں میں مریض اسپتال کی سیڑھیوں پر دم توڑ دیتے ہیں کیونکہ وہ عام آدمی ہوتے ہیں۔"

"لارڈ مر گیا تو میں نے اپنی ماں سے کہا کہ مجھے واپس جانا ہے۔ میری ڈاکٹری کی تعلیم اور INTERN کی حیثیت سے ہاؤس جاب کا پیریڈ پورا ہو چکا تھا۔ میری ماں نے پوچھا کہ وہاں کس کے پاس جاؤ گی؟ کہاں رہو گی؟ میں نے کہا کہ میرا وطن پھر میرا وطن ہے میں کہیں بھی رہ سکتی ہوں۔ نہ جانے کیوں میری ماں کو پھر میرے باپ کا خیال آ گیا اور اس نے ہائی کمیشن سے رابطہ کیا۔ ایک مہینے بعد اسے اطلاع ملی کہ کچھ مفید معلومات حاصل ہوئی ہیں اور بہت جلد اس کے سابق شوہر خان بہادر کی فیملی کا ایک شخص لندن میں اس سے رابطہ کرے گا۔ پھر پتا چلا کہ خان بہادر تو نہیں مگر بہادر خان کا بیٹا دلاور خان لندن میں ہے۔ میں کراموبل اسپتال میں تھی اور ربیکا ایڈورڈ ماں سے ملنے آئی تھی۔ معاف کرنا یہ بتانا مجھے یاد نہیں رہا کہ میری ماں نے تیسری شادی ایک تجرد سے کی تھی جو مشہور تھا کہ حکومت اسے واپس کینیا بھیج دے گی۔ شہریت حاصل کرنے کے لیے اس بائیس سال کے نوجوان نے دگنی عمر کی عورت سے شادی کر لی۔ وہ ایک عجیب سی ذہنیت رکھنے والا شخص تھا اور میں اس سے سخت نفرت کرتی تھی۔ اس شریف النفس لارڈ کے بعد اس کا وجود ایسا ہی تھا جیسے انتہائی بلندی کے بعد پستی کی انتہا۔ پہاڑوں کی خالص قدرتی برف کی بے داغ سفیدی سے گٹر کی متعفن تاریک فضا کا سفر۔ اس کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ ہوس دیکھ کے مجھے ڈر لگتا تھا۔ اور ایک دن اس نے ذلالت کی انتہا کر دی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ بے بی مجھ سے شادی کر لو۔ میں اس منحوس بڈھے سے تمہاری بھی جان چھڑا دیتا ہوں۔ میں پولیس کو رپورٹ کرتی مگر مسئلہ تھا گواہی کا۔ اس نے بے شرمی سے کہا کہ تمہارے الزام پر یقین کون کرے گا۔ خیر! ایک سنیچر کی صبح مجھے اطلاع ملی کہ میری ماں کا قتل ہو گیا ہے اور پولیس نے اس کے شوہر کو گرفتار کر لیا ہے۔ مجھے اس نے میرے سامنے قسم کھا کے کہا کہ اس چڑیل کو قتل کرنے والا وہ نہیں مگر نہ پولیس نے اس کی مانی اور نہ میں نے۔ تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ میری ماں کو قتل کرنے والا کوئی اجنبی تھا جس نے اپنا نام دلاور خان بتایا تھا۔ وہ کالا حبشی اسی گھر کے ایک کمرے میں اپنی کسی گرل فرینڈ کے ساتھ موجود تھا مگر اس کی بیوی یعنی میری ماں کو علم نہیں تھا۔ انہوں نے سب کچھ چھپ کے سنا اور دیکھا۔ یہ گرل فرینڈ ایک ایشیائی لڑکی تھی جو اپنا گھر چھوڑ کے مشترکہ خاندانی نظام کے تحت اپنے جیسے دوسرے نوجوانوں کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ تین لڑکیاں تھیں اور چار لڑکے۔ قتل ربیکا کے اس پر ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا اور وہ چیخنے لگی۔ میری ماں کا تیسرا شوہر تو کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔ دلاور خان سمجھا کہ وہ لڑکی میری ماں کی بیٹی ہے یعنی میں ہوں۔ اس نے ربیکا لڑکی کو بھی ختم کیا اور اس طرف سے مطمئن ہو گیا کہ اس نے نہ اپنے باپ کی سابق بیوی کو چھوڑا نہ اس کی بیٹی کو جو رشتے میں اس کی سوتیلی بہن ہونے کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ یوں میں بچ گئی اور میری جگہ ایک اور لڑکی قتل ہو گئی۔ جب وہ پکڑا گیا تو اس نے ساری بات بتائی مگر اس کی بات پر کسی نے یقین نہیں کیا اور حالات کچھ ایسے تھے کہ واقعات کی ساری شہادت اس کے خلاف گئی۔ میں تو خاموشی سے واپس کراموبل اسپتال چلی گئی اور ایک ہفتے بعد اپنے برٹش پاسپورٹ پر پاکستان آ گئی۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"تقریباً چھ سال پہلے کی" وہ بولی۔

"اور چودھری دلاور کو ابھی تک معلوم نہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اسے کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟"

"تم چودھری دلاور کو کس حد تک جانتی ہو۔ تو معلوم ہو گیا کہ مجھے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اسے تمہارے بارے میں تم سے زیادہ علم ہوگا۔ کسی دن نہیں بلکہ اب تو بہت جلد تمہیں تعجب بھی ہو جائے گا کہ وہ جانتے بوجھتے انجان بنا ہوا تھا۔ وہ تمہیں یہ بتا دے گا: تمہارا پاسپورٹ نمبر کیا ہے، تم کس فلائٹ سے پاکستان آئی تھیں، تمہارا ٹکٹ نمبر کیا تھا اور سیٹ نمبر کیا۔ تم نے ائیرپورٹ سے کس ٹیکسی میں سفر کیا، اس ٹیکسی کا نمبر اور ڈرائیور کا نام، اس ہوٹل کا نام جہاں تم نے قیام کیا اور تمہارے کمرے کا نمبر۔ یہ سب اطلاعات ملتی رہی ہوں گی اسے۔ آج کے دن تک۔"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی "تم نے اسے سپرمین سمجھ لیا ہے۔ آخر کیوں؟ نعوذ باللہ وہ خدا تو نہیں ہے اور کیا میں یا تم جیسی روحانی اعتبار سے کسی ارض کی مالک ذہن کی نگران ہیں؟"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔"

"جو کچھ تم نے کہا اس سے اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا ڈاکٹر صاحب۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ چالاک، عیار، ذہین، سفاک اور بے رحم ہر صفت رکھنے والا اور دولت کی قوت خرید کا مالک ہے لیکن تم نے مبالغہ آرائی سے اس کو ایف بی آئی یا اسکاٹ لینڈ یارڈ بنا دیا ہے۔"

میں نے اس کے پُراعتماد تمسخر آمیز انداز کے سامنے خود کو ذرا سا احمق محسوس کیا "میرا مطلب صرف یہ تھا کہ تمہارا اس سے واسطہ نہیں پڑا۔ تم اسے صرف اپنی ماں کے قاتل کی حیثیت سے جانتی ہو۔"

"جی نہیں حضور۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ بعد میں کیا ہوا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ جسے وہ غلطی سے اپنی سوتیلی بہن سمجھ کے مار آیا تھا وہ تو ایک لاوارث قسم کی لڑکی تھی۔ اس نے تفتیش کے نتائج پر نظر رکھی ہوگی۔ ہر قاتل خواہ وہ کتنا ہی ہوشیار اور اثر و رسوخ رکھنے والا ہو، قتل کے بعد مطمئن ہو کے نہیں بیٹھ جاتا اور کسی واردات کو ایسے نہیں بھول جاتا جیسے قتل نہ اس نے کیا ہو۔ اس نے صرف خبر پڑھی ہو۔ نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ بعد میں کیا ہوا، پولیس کیا کر رہی ہے اور تفتیش کس رخ پر ہو رہی ہے۔ چودھری دلاور شاید پہلی فلائٹ سے واپس پاکستان پہنچ گیا ہو مگر اس نے کسی لندن کے اخبار میں قتل کی تفصیلات ضرور پڑھی ہوں گی اور جب اسے معلوم ہوا ہوگا کہ اس قتل کا ایک مشتبہ گواہ پکڑا گیا ہے تو وہ فکرمند بھی ہوا ہوگا۔"

"پھر اس نے معلوم کیا ہوگا کہ خان بہادر کی اصلی بیٹی جو ڈاکٹر ہے کہاں ہے۔ کسی ڈاکٹر کا پتا چلانا کیا مشکل ہے۔ کراموبل اسپتال والوں سے پتا چل گیا ہوگا کہ اس کا نام غزالہ خان ہے اور وہ پاکستان جا چکی ہے۔ چودھری دلاور کی جگہ میں ہوتا تو باقی معلومات یہاں سے حاصل کر لیتا۔ ہائی کمیشن، ائرلائن، ٹریولنگ ایجنسی اور امیگریشن والے سب بتا سکتے ہیں۔"

"لیکن تم بھی ذرا بھی ماشاءاللہ کم ذہین نہیں ہو اور خطرہ ہو خداداد صلاحیت کا مالک بھی غیر معمولی صفات کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ کیا تم ایک بہت عقلمند اور دوراندیش مشیر تھا۔ ایک پاکستانی معذور کا ساکن ہے۔"

"وہ صرف مشیر تھا؟"

"کیا نہیں تھا؟ تم مردوں کی کھوپڑی میں ہر وقت یہ خیال کیوں رہتا ہے کہ جب کوئی لڑکی کسی مرد کو کراہت کے الفاظ میں کرے تو سمجھتے ہیں کچھ اور ہو۔ ہمیں دال میں کالا نظر آنے لگتا ہے۔ عجیب نفسیاتی مسئلہ ہے۔ صرف کالا تلاش کرتے ہیں دال کی طرف دیکھتے ہی نہیں۔"

میں نے کہا "ہم مسلمان ہیں۔ دال کی طرف کیوں دیکھیں؟"

"وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ عمر میں میرے باپ کے برابر۔ پہلے وہ سفارت خانے میں تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یہیں سیٹل ہو گیا۔ اس کی بیوی بھی انگریز تھی۔ وہ میرا سب سے اچھا دوست اور ہمدرد تھا اور وہ گھر مجھے اپنے گھر سے زیادہ محفوظ اور پُرسکون لگتا تھا۔ میں اکثر وہاں رک جاتی تھی۔ ایسا ہوتا ہے دنیا میں سکندر صاحب، جن کی پیاس ہر طرف پھیلا ہوا سمندر نہیں بجھاتا ان پر سمندر سے اٹھنے والا بادل برس جاتا ہے۔ ماں باپ اور بھائی بہن کی محبت تو مجھے نہیں ملی مگر محبت ضرور ملی اور سب سے ملی۔ وہ دونوں بے اولاد تھے اور بے اولاد رہے مگر ان کے درمیان محبت روز اول کی طرح درخشندہ رہی۔ انہیں کسی کمی کا احساس بھی نہیں ہوا۔ فرض کر لو اس کا نام تھا شیخ۔ شیخ صاحب نے میری قومیت کے شعور کو بڑی جلا بخشی اور مجھے ہمیشہ احساس دلایا کہ تم پاکستانی ہو اور تمہیں اپنے باپ کی خواہش کے مطابق پاکستان جا کے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ برطانیہ میں تو ساری دنیا سے ڈاکٹر آ جاتے ہیں اور خود ہمارے پاکستانی ڈاکٹر اتنے خودغرض ہو گئے ہیں کہ ذاتی عیش و آرام کی خاطر پرامن ملکوں میں نکل جاتے ہیں۔ مثلاً امریکا، کینیڈا، برطانیہ۔ تم اس کے برعکس کر کے یہ ثابت کرو گی کہ ڈاکٹر کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنی ضرورت کو نہیں دیکھتا۔ اپنے معاشرے، اپنے ملک اور ساری انسانیت کے مفاد کو دیکھتا ہے۔ بس اسی نے میری راہنمائی کی۔ جب میری ماں کا قتل ہو گیا تو اس نے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ میری طرف سے سخت متفکر ہو گیا کیونکہ میرے سارے حالات اس کے سامنے تھے۔ اور یہ بالکل درست ہے کہ اس کی مدد کے بغیر شاید میں اپنے ارادے میں ناکام رہتی۔ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے مگر اس نے شیخ کو وسیلہ بنا دیا۔ وہ کسی زمانے میں سفارت خانے کا افسر تھا اور لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ زیرک ایسا تھا۔ میری خاطر اس نے کوئی چکر چلایا۔ نتیجہ یہ کہ میں نے کراچی تک کسی اور کے پاسپورٹ پر فرضی نام سے سفر کیا۔ پاسپورٹ پر تصویر میری تھی مگر باقی سب غلط تھا۔ اب کہو آیا سمجھ شریف میں؟"

"وہ کیا۔ پاسپورٹ کس کا تھا؟"

"اندرا گاندھی کا۔ آپ کو اعتراض ہے؟"

"قطعی نہیں۔ صورت بھی بہت ملتی ہے آپ کی ان سے۔ تصویر بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑا ہوگا" میں نے دانت نکال کے کہا۔

"اصل بات یہ ہے کہ یہاں میرا کیا نام ہے اور کیا کام ہے اور میری رہائش کہاں ہے؟" وہ بولی "نام میں نے بتا دیا۔ کام ابھی تک کچھ نہیں کیا۔ سوچ رہی ہوں کہ کیا کروں۔"

"آپ کچھ بھی نہ کریں تب بھی آپ کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔"

"ایک عقلمندی کی بات کی آپ نے بالآخر" وہ بولی "میرے کچھ نہ کرنے میں ہی میرا بھلا ہے۔ اگر میں کسی اسپتال میں ڈاکٹرین

www.paksociety.com

جاؤں اور لوگوں کا علاج کرنے لگوں تو پھر چھپ کے نہیں رہ سکتی۔"

"چھپ کے رہنے میں آپ کو کسی کی نظر لگنے کا بھی احتمال نہیں۔" میں نے کہا۔

اس نے مجھے گھورا "سب کی نظر لگے مگر چوہدری ولاور کی نظر نہ لگے۔ فرض کریں اس نے معلوم کر لیا کہ اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ اس نے جسے قتل کیا تھا وہ اس کی سوتیلی بہن نہیں تھی......"

"رفتہ رفتہ معقولات پر معذرت۔ خان بہادر یا بہادر خان نے ولایت میں جس میم سے شادی کی تھی۔ کیا وہ مسلمان تھی یا ہو گئی تھی؟"

"ظاہر ہے۔ خان بہادر تو کرسچن نہیں ہوا تھا۔"

"اور نکاح بطریق شریعت ہوا تھا؟"

"بالکل۔ نکاح نامہ میرے پاس موجود ہے۔ جس مولوی نے نکاح پڑھایا تھا وہ بھی زندہ ہے اور شادی کے گواہ بھی ہیں۔ اس کے علاوہ میری ماں نے نکاح نامے کی رجسٹریشن کرائی تھی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ایک مسلمان کا کیا بھروسا۔ کل کو مجھے چھوڑ کے دوسری کر لے۔"

"حالانکہ دوسری وہ خود تھی۔"

"مگر اسے معلوم نہیں تھا۔ برطانوی قانون کے تحت وہ یکطرفہ طور پر نہ طلاق دے سکتا تھا اور نہ دوسری شادی کر سکتا تھا۔ اس نے ایک غلط حلف نامہ بھی داخل کیا تھا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ نہیں ہے۔ یہ سب دستاویزات میرے پاس ہیں۔ میں اس کی جائز قانونی وارث ہوں۔ ایک مکان کے علاوہ تقریباً ایک لاکھ پاؤنڈ۔"

"غالباً آپ ہزار کہنا چاہتی تھیں۔"

"نہیں سو ہزار کہنا چاہتی تھی۔ ایک لاکھ کہہ گئی۔ سوری" اس نے طنز آمیز شوخی سے کہا۔

میں نے منہ گول کر کے سیٹی بجائی "خاصی قیمتی چیز ہیں آپ۔ اغوا کرنے کے قابل۔"

"چوہدری صاحب مجھے اس سے بھی زیادہ سمجھتے ہیں۔ قتل کرنے کے قابل۔" وہ مسکرائی "اگر انہیں معلوم ہوا ہوگا۔ اگر کی کیا بات ہے، انہیں یقیناً علم ہوگا کہ اصل شکار تو ہاتھ سے نکل گیا۔ اب وہ ادھر ادھر سے پوچھتے پھر رہے ہوں گے کہ میری پیاری بہن کہاں ہے۔ کوئی بتاؤ تاکہ میں اسے دنیا سے رخصت کر کے سرخ رو ہو جاؤں اور میرے لیے کوئی خطرہ نہ رہے۔ ابھی تک میں زندہ ہوں، اس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا ہے کہ انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔"

"اگر میں یہ سب سچ مان لوں۔"

"مت مانو۔ مجبور کس نے کیا ہے؟" وہ برہمی سے بولی۔

"جیسا فی الحال میں اعلانیہ مان لیتا ہوں۔ رسی کا کاٹا ہوا ہوں تو سانپ کے سامنے سے بھی ڈرتا ہوں۔ پہلے تصدیق کر لیتا ہوں کہ سانپ ہی ہے۔ پھر لاٹھی تلاش کرتا ہوں اور ترکیب سوچتا ہوں جس سے لاٹھی ٹوٹ جائے مگر سانپ نہ مرے۔"

وہ ہنسی "پہلی بار تم اپنے اصلی رنگ میں نظر آئے ہو۔"

"میرا اصلی رنگ ابھی کیا میں جانتی" کانسی نظر آ رہا تھا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ بہن بھائیوں کے درمیان اس دشمنی کی کوئی معقول وجہ ہے؟ یعنی غلطی اگر کی تھی تو تم دونوں کے مشترکہ والد نے۔"

"اس صورتِ حال پر یوں غور فرمایئے کہ اگر میں ولاور کو قتل کرا دوں۔ میں خود تو پوسٹ مارٹم تک نہیں کر سکتی۔ تو مجھے صرف سزائے موت ملے گی۔ ولاور کے والی وارث ہیں۔ میرا کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ ولاور کی جائیداد اور دولت کے ساتھ میرا سب کچھ بھی انہی کا ہو جائے گا۔ اگر میں زندہ رہوں تو ولاور کے لیے مستقل خطرہ ہوں۔ میں اسے پکڑوا نہ دوں۔ وہ تو مجھے اور میری ماں کو اس لیے قتل کرنا چاہتا تھا کہ لندن کا مکان اسے مل جائے اور ایک لاکھ پاؤنڈ بھی۔ ذرا اپنے باپ کا ریکارڈ تو ایک رہا ہے۔ کتنا فائدہ ہوا اسے کہ لندن میں ایک مستقل ٹھکانا مل جائے اور رہا ہی جہاں وہ تم جس کے سود کی ماہانہ آمدنی ہی اخراجات کی کفالت کر سکتی ہے۔ مجھے لوحِ جہاں سے حرفِ مکرر کی طرح مٹانا بے حد ضروری ہے اور یہ کام وہ ضرور کرے گا۔"

"تمہیں کوئی ایسا ثبوت ملا کہ وہ تم کو تلاش کر رہا ہے؟"

"ایک ثبوت تو میری ماں اور ایک لاوارث لڑکی کی قبر کی صورت میں موجود ہے" وہ بولی "حال ہی میں مجھے معلوم ہوا تھا۔ کچھ لوگ شیخ کے گھر گئے تھے اور اس سے میرے متعلق پوچھتے رہے تھے۔ انہوں نے خود کو اسکاٹ لینڈ یارڈ کا نمائندہ ظاہر کیا تھا اور کہا تھا کہ کراموئیل اسپتال کی ایک لیڈی ڈاکٹر کا کیس ہے جو اچانک غائب ہو گئی ہے۔ شیخ کو معلوم تھا کہ نہ میں غائب ہوئی تھی اور نہ اسپتال والے اس قسم کی رپورٹ کر سکتے ہیں۔ اس نے بڑی اچھی اداکاری کی اور بہت افسوس کرتا رہا کہ خدا کرے وہ لڑکی خیریت سے ہو۔ وہ ذہین بھی تھی۔ بڑی پیاری لڑکی تھی۔"

"اتا پتا ضرور پوچھا انہوں نے؟"

"ان کے جاتے ہی شیخ صاحب نے اسکاٹ لینڈ یارڈ سے رابطہ کیا تو ثابت ہو گیا کہ وہ جعلی لوگ تھے" غزالہ نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ خطرے میں ہیں۔"

"خطرے سے بچ کے وہ کہاں جا سکتے ہیں۔ ان کا دنیا میں کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔"

"دوسری دنیا میں ہو سکتا ہے" میں نے کہا "یہی لوگ دوبارہ جائیں گے تو شیخ صاحب سے حقیقت اگلوا لیں گے۔ ان کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ وہ پہلے سفارت خانے میں تھے۔ سفارت خانے والے جسے چاہیں، کسی بھی نام سے کسی بھی سمت میں روانہ کر سکتے ہیں۔ ایک ریٹائرڈ آدمی کتنا دباؤ برداشت کر سکتا ہے؟ تو مسٹر شیخ کو بھی معلوم ہے کہ تم نے کس نام سے اور کس راستے سے سفر کیا ہے؟"

"نہیں۔ یہ تو شیخ صاحب بھی نہیں جانتے" وہ افسردگی سے بولی "میں اپنے اصل پاسپورٹ پر لندن سے پیرس گئی اور ان دو شہروں کے درمیان آنا جانا اتنا ہی آسان ہے جتنا لاہور سے اسلام آباد آنا جانا۔ چیک پوسٹ پر صرف پاسپورٹ کی جھلک دیکھتے ہیں اور بس۔ میں کرائے کی گاڑی لے کر گئی تھی جو میں نے پیرس میں رینٹ اے کار والوں کے پاس جمع کرا دی اور وہ بھی کسی اور کو بھیج سکے۔ پھر میں نے اصلی پاسپورٹ چھپا لیا اور دوسرے پاسپورٹ پر ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ وہیں سے فرینکفرٹ گئی۔ فرینکفرٹ میں پھر برٹش پاسپورٹ استعمال کیا اور ٹرین سے ویانا اور ترکی پہنچی۔ استنبول سے نئے پاسپورٹ پر کراچی پہنچی۔"

"ایک حد تک تمہارے سفرنامے میں گڑبڑ ہے" میں نے کہا "کہیں تم نے ایک پاسپورٹ استعمال کیا تو کہیں دوسرا۔ ریڈا ٹھپہ ایک پر لگی ہوگی، دوسرا استعمال کرتے وقت کسی نے اعتراض نہیں کیا کہ آپ یہاں کیسے موجود ہیں۔ اس پر تو ٹھپہ نہیں لگا ہے۔"

"ان ملکوں میں ریڈا ٹھپہ ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد لگائی جاتی ہے اور بہت سے یورپی ملک کے درمیان ریڈا ہی نہیں ہے۔ جب ایسا ہوا کہ امیگریشن سے گزر جانے کے بعد میں نے ایک پاسپورٹ بیگ میں ڈال لیا اور دوسرا ابھی کچھ دیر بعد کہ آپ لوگ کیا کرتے ہیں، پاسپورٹ دیکھا اور مہر نہیں لگائی۔ مجھے ہوٹل سے واپس آنا پڑا۔ انہوں نے کہا کہ سوری میڈم، رش میں ایسا ہو گیا۔ اب اپنے چوہدری ولاور صاحب مجھے تلاش کر کے دکھائیں۔ میں خوب چھپی اور غائب ہو گئی۔ کرائے کی گاڑی جو میں نے لندن سے لی تھی وہ پیرس میں کسی اور نے جمع کرا دی۔"

"ایسا تو جاسوس ہی کر سکتے ہیں۔ میری مراد سراغ رساں سے نہیں ہے۔ میں SPY ایجنٹوں کی بات کر رہا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے نقل کرنے والے کو دھوکا میں ڈال دیا۔ کمال ہے تو لگتا ہے کہ تم نے گرد ہوا میں ڈال۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ شیخ صاحب مارے گئے۔ وہ سچ بھی بولیں گے تو جھوٹ ثابت ہوگا اور..."

"سبحان اللہ اور ان کا قانون وہاں نہیں چلتی۔ چوہدری ولاور کیا چیز ہے، بڑے بڑے مافیا کے ایجنٹ ان کا بال بیکا نہیں کر سکتے جن کو قانون کا تحفظ حاصل ہو جائے۔"

"غزالہ تمہارا اصلی نام ہے؟"

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہی "نہیں، یہ میرا نقلی نام ہے اور سچ یہ ہے کہ ابھی میں نہ یہ مجلس شروع کر سکتی ہوں اور نہ اعتبار۔"

"نہ سہی، بتا دو کہ لندن میں تمہارا کیا نام تھا؟"

"شہلا خان۔ شہلا تھا جو لکھتے وقت شبانہ ہو گیا۔ اسپتال میں مجھے ڈاکٹر شبلی کہا جاتا تھا۔ اصل نام صرف ریکارڈ میں ہوگا۔"

"اب پورا نام کیا ہے؟"

"غزالہ سہگل۔" وہ بولی "پاسپورٹ پر یہی تھا۔ سہگل۔ تمہیں معلوم ہے......"

"مجھے معلوم ہے کہ یہ بہت بڑی فیملی کا نام ہے لیکن اس سے میں بھی معتبر ہو گئی ہوں" وہ بولی "اصل مسئلہ ہے میری ڈگریوں کا جن پر نام بدلا نہیں جا سکتا۔ تم کسی جعلساز کو جانتے ہو؟"

"جعلساز کو لاحول ولا قوۃ۔"

"یار! یہاں سب کچھ ہوتا ہے۔ جعلی نوٹ تک چھپتے ہیں۔ کوئی میری اصل ڈگری میں صرف نام بدل دے۔ ذرا مہارت اور صفائی سے۔ تم تو ماہر ہو جس نے نام اور مقام بدل لیے۔"

"خاتون! آپ کو میرے بارے میں کیا معلوم ہے اور جو کچھ معلوم ہے وہ کیسے معلوم ہوا ہے؟" میں نے سنجیدہ ہو کے کہا۔

"تمہارے نام سے تعارف لندن میں ہی ہو گیا تھا۔ شیخ صاحب نے مجھے بتایا تھا۔ پھر پتا چلا کہ تمہارے اور چوہدری ولاور کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی ہے تو خود مجھے دلچسپی ہو گئی اور میں نے تمہاری سرگرمیوں پر نظر رکھی۔ اخبارات دیکھتی رہی اور لوگوں سے سنتی رہی۔ کراچی میں ہفتہ بھر ایک ہوٹل میں قیام کرتی تھی پھر دوسرے ہوٹل میں چلی جاتی تھی۔ تین ہفتے بعد میں لاہور آگئی۔ یہاں دو تین ہوٹل بدلے۔ کبھی ایک پاسپورٹ، کبھی دوسرا۔ یہاں برٹش پاسپورٹ تو بڑی مقدس کتاب ہے۔ ہوٹل والے ایک جھلک دیکھتے ہی ریشہ خطمی ہو جاتے ہیں۔ میں نے دو ہفتے اسلام آباد میں گزارے، ایک ہفتہ پشاور میں رہی پھر واپس کراچی چلی گئی۔ پرسوں کل لاہور میں اور اس وقت تمہارے سامنے ہوں۔ فلیٹیز میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ اس تمام عرصے میں میرا زیادہ وقت چوہدری ولاور کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اور تمہارے مشن کی تفصیلات جمع کرنے گزرا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ تفریح ایک مقصد تھا، اپنے شک کو دیکھنا دوسرا مقصد اور دیسی تیسرا مقصد۔"

"رائٹ۔ میں مانتا ہوں کہ بالآخر تم نے مجھے قائل کر لیا ہے۔"

"واقعی۔ یار! پھر ملاؤ ہاتھ" وہ خوش ہو کے بولی اور اس نے اپنا ہاتھ بڑی بے تکلفی سے میرے ہاتھ میں دے دیا "چلو اب اس خوشی میں کہیں اور چل کے ڈنر کرتے ہیں۔ میں تمہاری دعوت قبول کرتی ہوں۔"

میرا موڈ بالکل بدل چکا تھا۔ میں اعصابی اور ذہنی کشیدگی کے دباؤ سے نکل آیا تھا اور غزالہ کے خلاف شک اور بے یقینی کے اندیشوں سے بھی۔ میرا تجسس اچانک بیدار ہو گیا تھا اور میں یہ چاہتا تھا کہ غزالہ سے باقی سوالوں کے جواب بھی حاصل کر لوں جو ہنوز میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ ابھی میرے لیے سب سے

www.paksociety.com

بڑی اُلجھن رفیق کا یک لخت ولاور سے اور غزالہ سے تعلق تھا اور دوسرا اہم سوال یہ تھا کہ غزالہ آخر زبیر نقوی صاحب کے گھر کیسے پہنچی؟ نقوی صاحب تو واقعی بڑی توپ چیز تھے۔ انہوں نے مجھے اور ولاور کو کیسے اپنے گھر میں اکٹھا کیا۔ رفیق ان کا پی اے تھا اور غزالہ اسے اپنا خاص آدمی کہتی تھی جسے اس نے چودھری ولاور کے پیچھے لگا رکھا تھا۔ میرے خلاف مقدمات کی فائلیں رفیق لایا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ فائلیں نقوی صاحب کے پاس تھیں۔ وزارت داخلہ کے ایڈیشنل سیکریٹری کے پاس ہر فائل پہنچ سکتی ہے۔ لیکن انہوں نے یہ فائلیں ولاور کو کیوں دکھائیں؟ اور وہ اتنی بڑی چیز ہیں تو پھر ایک معمولی ایس ایس پی نے مجھے کیسے گرفتار کر کے حوالات میں بند کروا دیا؟

"کس سوچ میں پڑ گئے؟" غزالہ نے کہا۔

"میں۔ اپنی گاڑی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"گاڑی پہنچ چکی ہوگی" وہ بولی "باہر چل کے دیکھو۔"

میں نے بل ادا کیا اور باہر نکلا تو واقعی میری گاڑی بہت سی دوسری گاڑیوں کے درمیان اور غزالہ کی مرسیڈیز کے ساتھ موجود تھی۔

"اس کی چابی۔" میں نے رفیق کی تلاش میں ادھر اُدھر دیکھا۔

"ارے چابی تو تمہارے ہی پاس ہوگی؟" غزالہ ہنسی۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ چابی میرے ہاتھ میں آگئی۔ "یہ گاڑی یہاں کیسے آگئی؟" میں نے اس کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "مس غزالہ! مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کسی شیطانی چکر میں پڑ گیا ہوں۔"

"پھر وہی بے اعتمادی" وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

"تم۔ تمہاری گاڑی۔" میں نے کہا "وہ کیسے آئے گی؟"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ مجھے ساتھ بٹھاتے ہوئے ڈر رہے ہو۔"

میں نے سنبھل کے کہا "ڈر کس کا؟" میں نے دوسرا دروازہ کھول دیا۔

"رابعہ کا بھی نہیں؟" وہ انگلی سنبھال کر میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

میں ہنسا "نہیں۔ کوئی جس سے محبت کرتا ہے اس سے ڈرتا نہیں۔ ڈرتا وہی ہے جو بے وفائی کا مرتکب ہو سکتا ہو۔ یا پھر جس سے وہ محبت کرے وہ شکی مزاج ہو۔"

"ہر عورت شکی مزاج ہوتی ہے اور حاسد۔"

"رابعہ نہیں ہے" میں نے یقین کے ساتھ کہا "وہ مجھ سے اختلاف کر سکتی ہے، مجھ سے لڑ سکتی ہے، روٹھ سکتی ہے مگر مجھ پر شک نہیں کر سکتی۔ کیا تمہیں یہ سن کے مایوسی ہوئی؟"

"ہاں۔ میرا خیال تھا کہ تم عاقل و بالغ ہو۔" وہ مسکرائی۔

"میں ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر کی رائے کا احترام کرتے ہوئے خاموش احتجاج کر رہا ہوں۔" میں نے کہا "آپ کہاں چلیں؟"

"بائی دی وے تم سنو تو سہی" وہ بولی۔

اس نے آپ سے تم اور تم سے یار پر آنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ غالباً دیار مغرب میں پرورش پا کے اس کا مزاج ایسا ہو گیا تھا بلکہ اس نظر سے دیکھا جاتا تو اس نے مغربی تہذیب کے اثرات کو بہت کم قبول کیا تھا۔ اس کے اطوار سو فیصد نہ سہی اسی فیصد مشرقی تھے۔ اس کے باوجود میرا محتاط رہنا ضروری تھا۔ پہلی بار ملی کے عام لڑکی نہ اتنی باتیں کرتی ہے، نہ یوں بے تکلف ہو کے کسی اجنبی کے ساتھ آزادانہ گھومتی ہے اور نہ اسے اپنی داستان حیات کا ہر ورق کھول کے دکھاتی ہے۔ غزالہ کا مسئلہ قدرے مختلف تھا۔ غائبانہ طور پر وہ میرے بارے میں بہت پہلے سے سب کچھ جانتی تھی اور جو نہیں جانتی تھی وہ معلوم کر چکی تھی۔ اس کے نہ ماں باپ تھے، نہ سرپرست جو روک ٹوک کرتے اور وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔

مجھے یہ خیال بھی تھا کہ غالب اور نازو میرا انتظار کر رہے ہوں گے اور شاہد منظر کے گھر میں رابعہ بھی میری منتظر ہو۔ اس کا نام روشنی میرے لیے الجھن پیدا کر رہا تھا مگر تو بہت اہمیت میں مجھے لگا تھا کہ اس کے خفا ہونے کی وجہ کیا تھی۔ میں اپنی ہر غلطی پر اڑ جانے والا قوی نہیں تھا۔ غلطی مجھ سے بارہا ہوئی اور کبھی مجھے غالب نے ٹوکا تو کبھی محسن نے۔ نازو "ٹل اور رابعہ میرے لیے سب محترم تھے اور ان کے مشورے کو نظرانداز کرنا میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ ہم الگ الگ قالب رکھتے ہوئے بھی ایک جان تھے۔ بہ ایں علاوت ہمارے مزاج اور خیالات میں اتنی ہم آہنگی نہ ہوتی تو ہم اتنا عرصہ ساتھ نہ رہ پاتے۔ غم اور خوشی کا ساتھی تو ہر کوئی الوقت ہوتا ہے۔ آزمائش اور ابتلا میں حق رفاقت ادا کرنے والے صرف دوست ہو سکتے ہیں اور مجھے ناز تھا کہ جس دنیا میں لوگ ایک دوست نہ ہونے کی شکایت کرتے عمر گزار دیتے ہیں۔ (مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔ از سجاد حیدر یلدرم) وہاں میرے اتنے دوست ہیں۔

افسوس مجھے اس بیکی کا تھا جو میں نے رابعہ کے آفس میں اس کے ماتحتوں کے سامنے اٹھائی۔ میرا وہاں جانا غلط سہی، رابعہ پر بھی لازم تھا کہ وہ معقولیت کے ساتھ یہ بات مجھے سمجھا دیتی کہ میں مصروف ہوں۔ اس کے چپراسی، چوکیدار اور ملازم نے جس طرح مجھے روکا اور میرے ساتھ جو ہتک آمیز سلوک روا رکھا، اس پر رابعہ کو انہیں روکنا چاہیے تھا بلکہ ڈانٹنا چاہیے تھا۔ اب تو ان کی حماقت کی تہہ میں وہ اپنی کوئی جاہل اجنبی ہوں۔

اب میری جھنجلاہٹ اور خفت کے جذبات مجھے میں تو ختم رہے تھے اور غزالہ سے باتیں کر کے میں نسبتاً پرسکون ہو گیا تھا

ذہنی سکون یوں بھی ملتا ہے کہ تم اپنے خیالات اور مصروفیات کی نئی جہت تلاش کرے۔ غم غلط کرنے کے مطابق تو دل شکستہ شراب کا سہارا لیتا ہے یا کسی کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ جاتا ہے جہاں رقص و سرود اور شراب و شباب کی محفل آراستہ ہو۔ میں غزالہ کی باتوں میں الجھ گیا تھا اور اس وقت صورت حال یہ تھی کہ میں اس کے ساتھ "کلارنز" میں وہ مجھے باتوں میں گزار کے اسے اپنے ساتھ ڈنر کے لیے لے جا رہا تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ غزالہ کی باتوں نے مجھے قائل کر لیا تھا مگر اس کی داستان حیات کو جھوٹا افسانہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ داستان اپنے چودھری ولاور صاحب کے ذہن کی اختراع بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جوڑ توڑ کا ماہر اور سازشی ذہانت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا لیکن وہ افسانہ نویس، ناول نگار یا ڈراموں کا مصنف نہیں بن سکتا تھا۔ تخلیق کا اس کی ذہانت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ غزالہ کی باتوں میں سچ خود بول رہا تھا اور اب تک اس نے جو کچھ بتایا تھا وہ تصدیق طلب نہیں لگتا تھا مگر میں اس کی تصدیق کر سکتا تھا۔ میری اور محسن کی زندگی کے چار ہنگامہ پرور سال لندن کی کوچہ گردی میں بسر ہوئے تھے اور میں چند منٹ کی جرح کے بعد ثابت کر سکتا تھا کہ لندن میں رہ کے تعلیم حاصل کرنے کا دعویٰ کس حد تک درست ہے۔ ایسے بہت ہیں جو لندن شہر کا نقشہ دیکھ کر اور اخبارات سامنے رکھ کر لندن کا سفرنامہ لکھ سکتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو چند دن یا چند ہفتوں کے لیے لندن میں قیام کر کے دنیا کو بتانے بیٹھتے ہیں کہ ان کی تو عمریں گزری اور وہ لندن تو جانے ہی رہتے ہیں۔

رابعہ کے لیے میں نے یہ سزا طے کی تھی کہ وہ انتظار کرے اس امید میں بیٹھی رہے کہ میں آؤں گا اور اس سے پوچھوں گا کہ آخر یہ عتاب مجھ پر کس خطا کے بدلے نازل ہوا تھا۔ میں اسے مناؤں گا اور اس سے معافی مانگوں گا۔ غلطی میری ضرور تھی مگر اس نے میری دل آزاری کی اور میری بے عزتی کی۔ یہ غلطی نہیں، جرم جب وہ رو رو نے اور مجھے سمجھائے کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ اپنے رویے پر شرمندہ ہو ورنہ یہ مسئلہ مجلس شوریٰ عرف فیڈرل کورٹ کے سامنے رکھا جائے گا اور پھر وہ فیصلہ جج کریں وہ ٹھیک۔

رابعہ کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد مجھے وقار یوسف کی فکر لاحق ہو گئی۔ بیوی نے اسے بتایا ہو گا کہ سکندر بھائی تو گاڑی لے کر کہیں گئے تھے مگر جاتے وقت کچھ بتا کے نہیں گئے تھے۔ اب انہیں ضرور تشویش ہو رہی ہو گی کہ بندہ گیا تو کدھر گیا۔ میرے سارے ٹھکانے وہ بھی جانتے تھے۔ رابعہ کے آفس سے تصدیق ہو گئی ہو گی کہ میں وہاں پہنچا تھا اور بقول علامہ صاحب آگے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے۔ رابعہ نے یہ بھی بتا دیا ہو گا کہ صاحب بہادر کسی سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی حسینہ کی سیاہ مرسیڈیز میں بیٹھ کے روانہ ہو گئے تھے اور نہ جانے کون یوسف کی

گاڑی کے پہیوں میں ہوا بھروا کے لا رہا تھا اور ہماری بابت گاڑی میں لگا رہا تھا۔ پھر وہ گاڑی بھی لے گیا تھا کہاں؟ یہ کسی کو معلوم نہیں ہو گا۔ ایک امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ رابعہ نے رفیق کا تعاقب کیا ہو یا کسی کو اس کے پیچھے بھیجا ہو کہ وقار یوسف کی گاڑی میں وہ کہاں جاتا ہے اور اسے رپورٹ مل گئی ہو کہ میں "کلارنز" میں تشریف فرما ہوں۔

ایک جگہ گاڑی روک کے میں نے کہا "اجازت ہو تو میں ایک فون کر لوں؟ میرے لواحقین پریشان ہوں گے کہ میں کس دنیا میں ہوں۔"

غزالہ ہنسی "بتا دو کہ ابھی تک تو خیریت سے ہوں اور اپنی مرضی سے راضی خوشی اغوا ہو کے بقائمی ہوش و حواس ایک جھوٹی اور بے وقوف لڑکی کے ساتھ ڈنر کرنے جا رہا ہوں۔"

"یقین حسین و جمیل نہ کہوں؟ بہت چالاک ہو تم بھی" میں نے اترتے ہوئے کہا "جانتی ہو کہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

وہ پوسٹ آفس کے باہر میری گاڑی میں بیٹھی رہی اور میں نے اندر ایک وحشت زدہ ماحول میں بیٹھے ہوئے ادھم بیزار شخص سے فون کرنے کی اجازت طلب کی۔ وہ خود فون پر کسی سے گفتگو میں مصروف تھا۔ اسے میری مداخلت گراں گزری۔

"بہت ضروری ہے فون کرنا؟" اس نے تیوری پر بل ڈال کے کہا۔

"نہیں۔ مگر میں آئین میں دیے گئے بنیادی حقوق کے تحت فون ضرور کروں گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا صبر کرو۔ میں ضروری بات کر رہا ہوں۔"

"مجھے صبر کرنا نہیں آتا اور میرا بات کرنا زیادہ ضروری ہے۔"

"ارے بھائی! میری جان پر بنی ہوئی ہے۔"

"میری جان خطرے میں ہے۔ میرے قاتل گولیاں برساتے میرے تعاقب میں آ رہے ہیں۔ میں پولیس کو اطلاع دے کر فرار نہ ہوا تو وہ یہاں آ جائیں گے اور میرے ساتھ تمہارا بھی انتقال بے ملال ہو جائے گا۔"

بادل ناخواستہ اس نے ریسیور میرے حوالے کیا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ میں تھیٹر کی چیز ہوں۔

میں نے منظر کا نمبر ملانے کا سوچا اور پھر ارادہ بدل کے یوسف کے گھر فون کیا۔ ریسیور اس کی بیوی نے اٹھایا۔

"سکندر بھائی! حد کرتے ہیں آپ بھی۔ سب پریشان ہیں۔"

"اللہ نے ان کے مقدر میں پریشانی لکھی ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں" میں نے کہا۔

"آخر آپ کہاں ہیں صبح سے؟"

پھر ریسیور غالب نے چھین لیا "تم شتر بے مہار کی طرح کہاں پھر رہے ہو؟"

"اونٹ ہے صحرا میں اور ریبان، صحرا کچھ نہیں۔" میں نے کہا

www.paksociety.com

"مقام شکر ہے کہ میری مہار کسی کے ہاتھ میں نہیں۔"

"یار! کہاں سے بول رہے ہو؟" غالب جھنجلا کے بولا۔

"جہاں سے سب بولتے ہیں۔ اپنے منہ سے۔ فون صرف اس لیے کیا تھا کہ یہ ناچیز بدھو کچھ دیر بعد لوٹ کر گھر آئے گا۔ پریشان ہونا چاہو تو تمہاری مرضی ہے" میں نے کہا۔

"تم رابعہ کے آفس گئے تھے؟"

"کوئی اور بات کرو۔" میں نے کہا "اس وقت میں کسی کے ساتھ ڈنر پر جا رہا ہوں۔"

"زمان خان کے ساتھ سرکاری مہمان خانے؟"

"میرے ساتھ نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی ایک طرح دار حسینہ ہے۔ گلابی ساڑی اور سب۔"

"کالی مرسیڈیز میں۔ دو گھنٹے سے تم اس کے ساتھ "گلاروز" میں گھسے ہوئے تھے۔ ہم وہیں سے تم کو لے آتے۔ سرکاری اعزاز کے ساتھ۔ پھر ٹھیک رہتا۔ کون ہے یہ لڑکی؟"

"ایک ڈاکٹر نیورو فزیشن۔ میں شدید اعصابی اور ذہنی دباؤ کا شکار رہا ہوں۔ کچھ دن اس کے زیرِ علاج رہوں گا۔ رابعہ کو ضرور بتا دینا اور تم بھی آیت الکرسی پڑھ کے میز پر سو جانا۔" میں نے کہا۔

"یار! بکواس مت کرو۔ ہم تمہارے ساتھ منظر کے گھر جانا چاہتے تھے۔ رابعہ اور تم دونوں پاگل ہو گئے ہو۔"

"ہم پہلے بھی پاگل تھے۔ آپ نے اس لیے نہیں پہچانا کہ پاگل کو صرف پاگل پہچان سکتا ہے۔ لنی ڈارلنگ شناسا۔ واپس آ کے تم پر حیرت انگیز انکشافات کروں گا۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

باہر آتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ میں نے آنکھیں مل کے دیکھا مگر گاڑی غائب تھی۔ میں نے دائیں بائیں نگاہ ڈالی لیکن گاڑی ہوتی تو نظر آتی۔ میں نے اترتے ہوئے چابی گاڑی میں لگی چھوڑ دی تھی اور یہ میرے لیے ایک اور سبق تھا کہ اعتبار میں دھوکا بھی ہو جاتا ہے۔ گاڑی یوسف کی تھی اور پریشان کن بات یہ تھی کہ چوری کی رپورٹ لکھوانا بہت مشکل کام تھا۔ اس کے لیے مجھے غزالہ کے بارے میں بتانا پڑتا اور ظاہر ہے وہ سب ایف آئی آر میں نہیں لکھا جا سکتا تھا جو اس نے مجھے بتایا تھا۔

میں اپنے آپ سے خفا پیدل روانہ ہوا ہی تھا کہ گاڑی زوم سے میرے پاس آ کے رک گئی۔

غزالہ نے دروازہ کھول کے کہا "تشریف رکھیے۔ گاڑی کے ہوتے ہوئے بھی آپ جوتیاں چٹخا رہے ہیں۔"

میں نے جھنجلا کے کہا "یہ کیا بیہودہ مذاق تھا؟"

"مقصد صرف یہ سمجھانا تھا کہ آپ کو احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ میرے جیسی کوئی دوسری لڑکی آپ کو لوٹ لے گی۔ یقیناً آپ حسن پرست اور خاصے دل پھینک لگتے ہیں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ میں ایسے الزامات مذاق میں بھی برداشت نہیں کرتا" میں نے برہمی سے کہا "اگر تمہارے دل میں بھی یہ خیال ہے کہ تم نے مجھے پھنسا لیا ہے اور اپنے حسن و شباب سے میری عقل خبط کر دی ہے تو ابھی وقت ہے، فوراً اس خیال کو دل سے نکال دو۔"

"ڈنر سے پہلے غصہ بھوک کو نقصان پہنچاتا ہے۔ تمہارا بلڈ پریشر کتنا رہتا ہے، کبھی چیک کیا تم نے؟ اور کولیسٹرول کیا ہے؟ میرا مشورہ ہے کہ سال میں ایک بار سب ٹیسٹ کرا لینے چاہئیں تاکہ اچانک پھوٹ نہ ہو۔ باہر سے آدمی ٹھیک ٹھاک لگتا ہے، اندر خرابی بڑھتی جاتی ہے۔ HDL کے علاوہ اپنے ٹوٹل LIPIDS اور LDL ..... اور ہاں TRI-GLYCIRIDE بھی۔"

"ول یو پلیز شٹ اپ!" میں نے چلا کے کہا "میرا سب کچھ ٹھیک ہے۔ دماغ خراب ہے۔ اچانک مر جاؤں تو پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھی چیر پھاڑ کے بغیر یہی لکھ دینا۔"

"اچھا اچھا، جیسی تمہاری مرضی۔ میں تمہیں کچھ دوائیں دوں گی۔"

"سنکھیا، نیلا تھوتھا اور سائنائڈ تو میں باقاعدگی سے کھاتا ہوں تینوں وقت۔" میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے چڑا کے خوش ہو رہی ہے۔

"مچھلی۔ او مائی گاڈ۔ کیسی خوب صورت مچھلی لٹک رہی ہے۔ میں نے کب سے مچھلی نہیں کھائی" وہ بولی اور گاڑی کو عین سڑک کی اس دکان کے سامنے روک دیا جہاں لوگ بڑے شوق سے مچھلی کھانے آتے تھے۔

"مجھے الرجی ہے مچھلی سے" میں نے کہا "میں چینی کھانا کھاؤں گا اور چونکہ ڈنر میری طرف سے ہے اس لیے تم کو بھی کھانا پڑے گا۔"

"مجھے چینی کھانوں سے الرجی ہے۔ میں یہاں مچھلی کھاتی ہوں۔ پھر ہم چائنیز چلے جائیں گے تم کھا لینا کیکڑے اور مینڈک کا سوپ۔"

مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ "اس جگہ کو دیکھو، یہ کوئی شریفانہ ماحول ہے؟"

"یار! ہم شریف ہیں، اتنا کافی ہے۔ ہم پر یہ ماحول اثر انداز نہیں ہوگا۔" اس نے فیصلہ کر دیا۔

"کہیں سکون سے بیٹھ کے باتیں کرتے۔"

"میں بہت پُرسکون ہوں۔ تمہیں سکون اور دواؤں کی ضرورت ہے اور اس سے زیادہ ضرورت ہے ماحول کو بدلنے کی۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارا نروس سسٹم شدید دباؤ سے متاثر ہوا ہے۔ تم TENSE رہتے ہو۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور آرام سے بیٹھ گیا۔ "میں تم سے اختلاف نہیں کروں گا ڈاکٹر غزالہ لیکن مجھے ایک بات بتاؤ، آدمی اپنے ماحول کو کیسے بدل سکتا ہے؟"

"بدل سکتا ہے" اس نے کہا "مثلاً یار! مچھلی کھاؤ۔ کیا خوشبو ہے۔"

میں نے مچھلی کی پلیٹ سنبھال لی۔ "مجھے تم سے کچھ پوچھنا تھا۔"

"ضرور پوچھو۔ میں جواب نہیں دوں گی۔ میں خاموشی سے کھانے کی عادی ہوں۔ تمہیں بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ کھانے کو انجوائے کرو، نہ ہر بار مت کرو۔ پیٹ بھرنے کے لیے مت کھاؤ، مزہ لینے کے لیے کھاؤ۔"

مجھے اس کے جواب نے مشتعل نہیں کیا، الٹا میں نے محسوس کیا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی ہے۔ اس نے میری باتوں سے یا میرے ملنے سے میرے ذہنی مسائل کی بالکل صحیح تشخیص کر لی تھی اور اعصابی دباؤ کی TENSION کو بھی سمجھ لیا تھا۔ وہ ایک ماہر ڈاکٹر ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔

کھانے کے دوران اس نے نہ میری طرف دیکھا اور نہ ان لوگوں کی طرف جو اسے دیدے پھاڑ پھاڑ کے گھور رہے تھے۔ اس جیسی لڑکی جاذب کہیں بھی جنسی محرومی کے مارے ہوئے جاہل مردوں کے ہوش اڑا سکتی تھی۔ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو میں نے خاصا پُرسکون محسوس کیا۔

"بہت غلط جگہ کا انتخاب کیا تھا تم نے۔ مجھے سخت طیش آ رہا تھا ان سب پر جو تمہیں گھور رہے تھے" میں نے کہا۔

"یار! کسی کے گھورنے سے میرا کیا جاتا ہے۔ کسی کا دل خوش ہوتا ہے مجھے دیکھ کر تو اس میں کیا برائی ہے" وہ ہنسی "ہر مصور اپنی تصویر کی نمائش کرتا ہے داد پانے کے لیے۔ منظر گواہ ہے۔"

"چنانچہ تم اپنے حسن کی نمائش کرتی ہو۔ واٹ نان سینس۔"

"میں نمائش نہیں کرتی۔ لوگوں کو قابلِ رحم سمجھتے ہوئے معاف کر دیتی ہوں۔ کیا تم نے دعوتوں میں نہیں دیکھا، بھوکے لوگ کیسے دیکھتے ہیں کھانے والوں کو۔ پلاؤ زردے، قورمے کی دیگوں کو اور چکن تکوں کو۔ غریب بچے کیسے دیکھتے ہیں شوکیس میں سجے ہوئے رنگ برنگے کیکس کو اور ٹافیوں کو۔ کیا تم انہیں گناہ گار اور مجرم سمجھو گے؟"

"یہ عجیب منطق ہے؟"

"تم نے ساجدہ حیانوی کی نظم پڑھی ہے۔ اونچے ہوٹل کے دروازے پر استادہ ہیں۔ ایسی دلکش کے مضبوط گرانڈیل جوان۔ نظم تو لمبی ہے مگر اس میں کیا ہے۔ کہ بھوکے لوگ منتظر ہیں کہ بوٹ کی نوک سے پھینکے کوئی۔ کوئی ہڈی یا بوٹی، روٹی کا ٹکڑا۔ بڑی سچی ہے اس کی "تنہائیاں" میں ہم اس لیے فرسٹریشن کا شکار ہوتے ہیں کہ ہم بے حس اور خود غرض بننے پر مجبور ہیں۔ ہمیں ایک احساس جرم پریشان کرتا ہے کہ جس ملک میں ایک وقت کی روٹی کے لیے انسان اپنی عزت نفس بیچتا ہو وہاں ہم کاروں میں گھومنے والے کتنی شان سے پیسے اڑاتے پھرتے ہیں۔"

"خدا کے لیے یہ فلسفہ اور اپنے لیکچر بند کرو، پتا نہیں تم کیا چیز ہو؟" میں نے جھلا کے کہا۔

"دیکھو تم TENSION میں مبتلا ہو گئے۔ او کے۔ ہم چلتے ہیں، کہیں پُرسکون سی جگہ۔ دیکھے کے آئس کریم کھاتے ہیں۔ ایک جگہ ہے میری نظر میں۔ اتفاق سے دیکھ لی تھی ورنہ مجھے اس شہر کا کچھ پتا نہیں۔ مال سے انارکلی تک آ جا سکتی ہوں ورنہ راستہ بھول جاتی ہوں۔ پھر کسی سے پوچھنا پڑتا ہے کہ میرا گھر کہاں ہے۔" وہ ہنسی۔

"تم بہت زیادہ بولتی ہو" میں نے کہا "غنیمت یہ ہے کہ غلط نہیں بولتیں اور جاہل نہیں ہو۔ صرف میڈیکل کی ڈگری لے کر یا ایم بی بی ایس اور ایم اے، پی ایچ ڈی کر کے بھی اکثر لوگ جہالت سے نہیں نکل پاتے۔ شاعری کے علاوہ تمہارے کیا شوق ہیں؟"

"یار! میں پڑھتی ہوں۔ جاسوسی ناول اور ڈراؤنے قصے۔ پرانی فلمیں بہت دیکھتی ہوں اور گانے بہت سنتی ہوں۔ کرکٹ میچ ہو تو سب کچھ چھوڑ دیتی ہوں۔ کلینک بھی بند کر دوں اگر میرا بس چلے تو۔ ٹیسٹ میچ کبھی نہیں چھوڑا۔"

"بڑا غیر ڈاکٹرانہ ذوق ہے۔"

"ہاں، ہے تو سہی" وہ بولی "یار! میں نے کبھی کسی چیز کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ زندگی میں سیریس ہونے سے کچھ ملتا نہیں۔ سوائے دکھوں کے۔ وہ کیا شعر ہے......"

"اے شمع تیری عمرِ حقیقی ہے ایک سال۔ رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے۔"

وہ بہت خوش ہوئی "یار! کمال کر دیا تم نے تو۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہ شعر پڑھوں گی؟ خوب یاد آیا تمہیں۔"

"اس کے علاوہ کون سا شعر موزوں ہوتا" میں نے کہا۔

آئس کریم کی دکان ایمبال پر گلوب سینما کے قریب تھی اور ایک سائڈ روڈ کے بنگلے میں کسی نے اپنے لان پر پلاسٹک کی رنگین میز کرسیاں ڈال دی تھیں۔ سرسبز لان کے چاروں طرف رنگین پھولوں کے حاشیے تھے۔ بہار کے آغاز کی رنگینی، لطافت اور خوشبو اس وقت خوابیدہ محسوس ہو رہی تھی۔ خاصت سی تراشی ہوئی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے قمقمے بالکل جگنو لگتے تھے اور انہی سے ہر طرف نرم اجالا پھیل گیا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر بیٹھے ہوئے لوگ سایوں کی طرح نظر آتے تھے اور اس قدرتی ماحول میں آسمان کی چھت کے نیچے اور کھلی ہوا میں سبزے پر بیٹھ کے بھی پرائیویسی یا خلوت برقرار رہتی تھی۔ انہی جھاڑیوں میں کہیں چھوٹے چھوٹے اسپیکر پوشیدہ تھے جو بڑی نرمی سے بیتھوون کی پانچویں سمفنی کے سُر بکھیر رہے تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ ایسی رومان پرور فضا آج تک میری نگاہوں سے اوجھل رہی تھی اور میں کبھی رابعہ کے ساتھ یہاں نہیں آیا تھا۔ لیکن رابعہ کے ساتھ مجھے لاہور میں سکون سے وقت نصیب ہی کہاں ہوا تھا۔ کبھی دوڑ بھاگ اور افراتفری کی زندگی میں فرصت کے چند لمحے چرا کے ہم ان بچوں کی طرح خوش ہو لیتے تھے جو اسکول سے بھاگ کے میلے میں پہنچے

www.paksociety.com

جائیں لیکن تفریح کرتے ہوئے بھی ڈرتے رہیں کہ کوئی انہیں دیکھ نہ لے۔

"ہم تو جناب یہیں تشریف رکھیں گے۔ واہ کیا خوشبو ہے گھاس کی۔" وہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔

آخری کونے میں ایک فیملی جس میں دو بچے بھی تھے، اسی طرح کرسیاں چھوڑ کے گھاس پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بچے گھاس میں قلابازیاں لگا رہے تھے۔

میں نے کہا "اگر اسی طرح سوٹ میں کوئی تم پر بیٹھ جائے تو تمہیں کیسا لگے گا؟"

"کون بیٹھ جائے۔ مکھی، مچھر، شیرا ارنٹ؟"

میں نے کہا "آدمی بدذوق ہے جس نے یہ جگہ بنائی۔"

"میں دو کپ کھاؤں گی۔ ایک ونیلا، ایک ٹوٹی فروٹی۔ تم جو چاہو کھاؤ میرے سر کے علاوہ۔"

"ظاہر ہے میں یہاں تمہارے ساتھ ڈیٹ پر نہیں آیا ہوں۔ مجھے تم سے چار غیاری نوعیت کے سوال پوچھنے ہیں۔"

"پہلے آئس کریم تو لے آؤ۔ سیلف سروس ہے یہاں۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "یہ بھی معلوم ہے تمہیں؟"

"کیا! تمہیں کوئی بے خبر نظر آرہا ہے۔ اور وہ دیکھو! ایک شریف زادی خود لے کر جارہا ہے آئس کریم کے کپ۔ تم چاہو تو اسے دفتر کہہ کے تو اندر وہ اور دیکھو کیا ہوتا ہے۔" وہ ہنسی۔

"تم دستی بھی بہت ہو۔"

"کہتے ہیں کہ جو اندر سے بہت دکھی ہوتے ہیں وہ اپنی شخصیت پر ہنسی کی نقاب ڈال لیتے ہیں۔" وہ بولی۔

"تم کو کیا دکھ ہے؟"

"کوئی نہیں۔ یہ نظریہ غلط ہے۔" وہ بولی۔

میں آئس کریم کے تین کپ لا کے پھر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

یہ سب مجھے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں اسی لڑکی کے بارے میں بڑے معاندانہ خیالات رکھتا تھا جو چوہدری بلاور کی سوتیلی بہن تھی۔ اس نے جس طرح مجھے زچ کیا تھا اس سے میں بہت مشتعل تھا اور میں اس کی کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ میں نے انتہائی بدتمیزی سے کام لیتے ہوئے اسے جھوٹا، فریبی، مکار، گھٹیا اور پتا نہیں کیا کیا کہا تھا مگر داد دینی پڑتی ہے اس کے حوصلے کی کہ وہ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوئی اور بڑی ہوشیاری سے اس نے مجھے یوں قابو کرلیا جیسے شیر کو سدھانے والا کسی نووارد جنگلی شیر کو قابو کرتا ہے۔ اب میں اس کے ساتھ بیٹھا ہوا بہت پُرسکون محسوس کررہا تھا اور اس نے میرا اعتماد ہی حاصل نہیں کرلیا تھا بلکہ بڑی جلدی بے تکلف دوستی کے وہ مراحل طے کرلیے تھے جو رابعہ نے مہینوں میں نہیں کیے تھے۔ رابعہ میں ایک باوقار سنجیدگی اور متانت تھی۔ غزالہ کی فطرت میں شوخی تھی اور لاابالی پن تھا حالانکہ ذہانت اور تعلیمی سطح پر وہ کسی طرح بھی رابعہ سے کم نہ

تھی۔ فرق تھا تو مزاج کا۔ رابعہ ایک شادی کے تلخ تجربے سے گزر چکی تھی اور اس نے پیشہ ورانہ مصروفیات کے علاوہ کسی چیز میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ دنیا میں تنہا تھی اور اس نے زندگی کی رعنائیوں کو خود پر حرام کر رکھا تھا۔ مجھ سے ملنے کے بعد اس کی زندگی کا انداز بدلا تھا لیکن اس کی شخصیت کا نرم ملائم ٹھہراؤ کسی سمندر جیسا ہی رہا تھا۔ غزالہ اس کے برعکس وہ پُرشور تیز رو پہاڑی ندی تھی جو ہر موڑ پر کائنات کے حسن کو ساتھ لے کر چلتی ہو۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا کہ اوپر سے ہر وقت خوش اور ہنستے رہنے والے لوگ اپنے اندر کے آنسوؤں کو چھپاتے ہیں۔ غزالہ کی زندگی کی کہانی میں دکھ ہی دکھ تھے مگر اسے قدرت نے ذاتی کھیل کھیلنے کی صلاحیت دی تھی۔ وہ مصلحت اور مصالحت کے ساتھ اپنا دامن بچائے چلتی رہی اور اس نے اپنے لیے زندگی کی وہ منزل متعین کرلی جو حاصل کرنے کی لگن میں ہنستے کھیلتے آگے بڑھتی گئی۔ رشتے اس کے لیے پہلے ہی بے معنی ہوگئے تھے مگر اس کا رشتوں پر اعتماد باقی رہا۔ اس کے مقابلے میں رابعہ نے ایک جارحانہ مگر قنوطی انداز فکر اپنایا اور اسے ہی مقدر سمجھ لیا۔

مجھے تعجب بھی ہوا اور ندامت بھی ہوئی کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ مجھے رابعہ اور غزالہ میں مطابقت اور مخالفت کے پہلو تلاش کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں یہاں گپ لگانے، دل بہلانے یا آئس کریم کھانے کے لیے تو نہیں آیا تھا مگر عجیب بات یہ تھی کہ میں بالکل بے فکری سے گھاس پر بیٹھا آئس کریم کھا رہا تھا اور غزالہ کو بچوں کی طرح آئس کریم کھاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

"غزالہ! اس وقت تم کہاں ہو؟"

"کمال ہے۔ جہاں تم ہو یار۔ کون سی جگہ ہے یہ؟" وہ بولی۔

"لاحول ولا قوۃ۔ میرا مطلب تھا کہ تمہارا قیام کہاں ہے؟"

"ہوٹل میں۔ ہوٹل کی زندگی بڑی پُرلطف ہوتی ہے۔ کسی بات کی فکر نہیں۔ فون اٹھایا اور آرڈر دے دیا۔"

"تم نذیر نقوی صاحب کے گھر میں نہیں ہو؟"

"اب مجھے لاحول پڑھنی چاہیے۔"

"پھر تم رشتی کو کیسے جانتی ہو؟ تم نے اسے اپنا خاص نوکر قرار دیا تھا۔"

"بس یار۔ پیٹ بھر گیا" اس نے دوسرا کپ آدھا کھا کے رکھ دیا "کچھ مزہ بھی مختلف ہے آج۔ چلو چلیں۔"

"کہاں چلیں؟ تم میری بات کا جواب دینے سے گریز کررہی ہو" میں نے اس کی کلائی پکڑ کے اسے بٹھا لیا۔

"مجھے دیر ہورہی ہے۔"

"تمہیں پوچھنے والا کون ہے۔ کہ ڈیڈی ناراض ہوں گے یہ بہانہ نہیں چلے گا۔" میں نے کہا "میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"اچھا، پوچھو کیا پوچھنا ہے؟" اس نے ناگواری سے کہا۔

میں نے کہا "لندن میں خان بہادر کا قیام کہاں تھا؟ ان کی کمپنی اور وہ شیخ صاحب کہاں رہتے ہیں؟"

"یہ تو پوچھ رہے ہو نا۔ لکھو" اس نے فرفر بولنا شروع کیا۔ [illegible] سڑک سے ادھر، وہاں سے دائیں طرف۔ بس نمبر [illegible] گلی نمبر [illegible] گرانڈز ریلوے کا اسٹاپ۔" اس نے سب کچھ صحیح بتایا۔ میں نے اس سے اور بھی سوال کیے جن کا تعلق لندن کے واقعات سے تھا۔ وہ اس عرصے میں پیش آئے تھے اور مجھے یہ جان کے حیرت ہوئی کہ غزالہ نے تقریباً اسی زمانے میں ٹیوبوٹی کی [illegible] تھی جب میں اور محسن بھی وہاں تھے۔

"ہاں! ابھی بھی" وہ اٹھ کھڑی ہوئی "جو کچھ میں نے بتایا ہے [illegible]... پھر اور بھی باتیں ہوں گی۔"

میں نے کہا "چلو میں تمہیں ہوٹل چھوڑ دوں۔"

"نو تھینکس۔ میں چلی جاؤں گی۔"

"کیسے؟ اکیلی لڑکی کا یہاں سے فلیٹیز تک ٹیکسی میں جانا ٹھیک نہیں۔" میں نے کہا۔

اس نے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈالا "اس کی موجودگی میں مجھے کچھ نہیں ہوسکتا۔"

پھر اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا خوب صورت کولٹ آٹومیٹک پستول دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ "اس کا لائسنس ہے تمہارے پاس؟"

"عزت یا جان بچانے کے لیے لائسنس کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ گاڑی ہے میرے پاس۔" وہ بولی۔

پھر اس کے ساتھ باہر آیا تو سیاہ مرسڈیز گیٹ سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ "تمہاری گاڑی ہمارے تعاقب میں تھی؟"

"ہاں تو کیا یہ غلط تھا۔ میں اپنی حفاظت کے خیال سے کبھی غافل نہیں ہوتی" وہ بولی۔

"کیا تمہیں مجھ سے خطرہ تھا؟ مس غزالہ! تم خواہ مخواہ [illegible] میرے ساتھ" میں نے کہا "کیا ضرورت ہے اتنا [illegible] کی؟"

"کل میں خود رابطہ کروں گی تم سے۔" وہ گاڑی کی طرف [illegible] "ایک بات بتاؤں تم میرے بارے میں سوچتے رہو گے [illegible] تسلی کے لیے ایک بات بتادوں۔ تمہارے تعاقب میں نہ پولیس کے آدمی تھے اور نہ چوہدری بلاور کے۔ انہیں میری [illegible] رشتی نے تمہارے پیچھے لگایا تھا تاکہ مجھے معلوم رہے کہ کیسے اور کہاں ملاقات کرنا مناسب رہے گا۔"

میں نے اس کی گاڑی کے دروازے میں ٹانگ اڑا دی "یہ [illegible] تمہارا کیا لگتا ہے؟ کیوں وہ ڈبل ایجنٹ کا رول کررہا ہے؟ چوہدری بلاور بھی اسے اپنا خاص نوکر کہتا ہے۔ کیا ملے گا اسے [illegible] کو بھی داؤ پر لگا کے؟ یہ پاکستان ہے خاتون، ولایت نہیں۔"

"اچھا کیا تم نے بتادیا۔ اب اپنی ٹانگ ہٹاؤ ورنہ......"

"ورنہ کیا؟ مس غزالہ! میں تمہارے ساتھ بیٹھ جاؤں گا۔ مجھے بتاؤ کہ رشتی نے تمہارے لیے یہ انتظامات کیسے کیے؟ گاڑی کس کی ہے؟ وہ پُراسرار ڈرائیور کون ہے جو کبھی غائب ہوجاتا ہے اور کبھی پھر گاڑی لے کر آجاتا ہے؟ اور تعاقب کرنے والوں کی خدمات رشتی کو کہاں سے حاصل ہوگئیں؟ یہاں تو نہ پرائیویٹ سراغ رساں ہوتے ہیں اور نہ..."

اس نے چلا کے کہا "تماشا ہوتا ہے سب جگہ۔ اب تم ایسے نہ مانے تو میں شور مچادوں گی۔ وہ دیکھو سامنے چوک میں پولیس والا کھڑا ہوا ہے۔"

"ایسی کی تیسی پولیس کی۔ تم مچاؤ شور..."

وہ ایک دم چیخنے لگی "بدمعاش۔ کیا سمجھتے ہو تم خود کو۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ پولیس.... پولیس!"

میں بوکھلا کے ایک دم پیچھے ہٹ گیا "پاگل مت بنو۔"

اس نے دروازہ بند کیا اور گاڑی ایک دم آگے بڑھ گئی۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ لڑکی مذاق میں اس حد تک بڑھ سکتی ہے اور اپنی دھمکی کو عملی جامہ بھی پہنا سکتی ہے۔ پولیس مین زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ بڑی تیزی سے میری طرف آیا۔ ذلت کا احساس، ذلت اور غصے سے میں ہونٹ کاٹ رہا تھا اور سیاہ مرسڈیز کی لائٹ کو رات کے اندھیرے میں دور غائب ہوتا دیکھ رہا تھا۔

پولیس مین نے ہانپتے ہوئے بداخلاقی سے کہا "یہ کیا بدمعاشی ہورہی تھی؟ کون تھی وہ عورت؟ کیوں چلا رہی تھی؟"

میں نے معصومیت سے کہا "کون سی عورت؟"

"وہی جو اس کالے رنگ کی گاڑی میں تھی۔ وہ پولیس کو آواز دے رہی تھی۔"

میں ہنس پڑا "جاؤ میاں اپنا کام کرو۔ اس کی گاڑی میں ریڈیو لگا ہوا تھا اور ڈراما نشر ہورہا تھا۔"

"کیسا ڈراما..." وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا "تم کون ہو؟"

میں نے کہا "میں وقار یوسف ہوں۔ وکیل.... یہ میری گاڑی ہے۔ ابھی ابھی ہم یہاں سے نکلے تھے۔ تم چاہو تو ہوٹل کے لوگوں سے پوچھ لو۔ وہ عورت میری مؤکل تھی۔ مؤکل سمجھتے ہو؟ میں اس کا مقدمہ لڑ رہا ہوں۔ اس نے اپنے شوہر کو قتل کردیا تھا۔ وہ اسے فلمیں دیکھنے سے منع کرتا تھا۔ تمہارے ایس پی زمان صاحب کو پورا کیس معلوم ہے۔ کہو تو تھانے چل کے ان سے بات کرا دوں۔"

پولیس مین پریشان ہوگیا تھا "نہیں سرجی۔ دراصل میں نے غلط سمجھا۔ ریڈیو پر ڈراما ہورہا تھا۔ آپ نے تو بڑی عجیب بات بتائی وکیل صاحب۔ کیسا زمانہ آگیا ہے۔ شوہر کو اتنی سی بات پر قتل کردیا۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور واپس چوک پر جا کھڑا ہوا۔

www.paksociety.com

میں اپنی کار میں بیٹھا اور واپس روانہ ہو گیا۔ غزالہ نے وقتی طور پر اپنی باتوں سے میرا اعتماد حاصل کر لیا تھا مگر چلتے چلتے اس نے پھر ایسی حرکت کی کہ میرا اعتبار ختم ہو گیا۔ وقت ہوتا تو میں غلیشہ ہوٹل جاتا اور تصدیق کرتا کہ وہاں ڈاکٹر غزالہ سہگل یا شیلا خان نام کی خاتون کس کمرے میں قیام پذیر ہیں۔

رات کے گیارہ بجے میں وقار یوسف کے گھر پہنچا تو وہاں صورت حال خاصی ہنگامی تھی۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ میں رابعہ کے آفس گیا تھا لیکن رابعہ نے مجھ سے بات نہیں کی۔ اُلٹا مجھے بے عزت کر کے رخصت کر دیا۔ اس کے بعد میں کسی اجنبی عورت کی سیاہ مرسیڈیز میں بیٹھ کے کہیں چلا گیا جو پہلے سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ رابعہ نے یوسف کی گاڑی ایک نامعلوم شخص کو لے جاتے دیکھا تو خود منظر کی گاڑی میں اس کا پیچھا کیا۔ منظر چند منٹ بعد ہی آ گیا تھا۔ اس نے سیاہ مرسیڈیز کو لاہور کے سامنے دیکھا اور واپس چلی گئی۔ منظر بہت مشتعل تھا اور بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن رابعہ نے اسے کچھ نہیں کرنے دیا۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی غالب کو منظر سے تمام تفصیلات حاصل ہو چکی تھیں اور وہاں سب بے چینی سے میری واپسی کے انتظار میں تھے۔

وقار یوسف تو میرا لحاظ کرنے پر مجبور تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ "مجھے تو اپنی گاڑی کی فکر ہو گئی تھی۔"

اس کی بیوی نے اسے ڈانٹا "گاڑی کہاں جا سکتی تھی؟"

نازو نے کہا "ہم تمہارے لیے پریشان تھے۔ کس کے ساتھ چلے گئے تھے آخر تم اور کہاں؟"

میں نے کہا "آپ لوگ باری باری اپنا غصہ اتار لیں۔ ایک ساتھ سب بولیں گے تو میرے لیے سب کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔"

خلاف توقع غالب سنجیدہ تھا "مجھے حیرت ہے کہ تم پر کوئی اثر نہیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا "کیا ہوا ہے آخر؟"

"تمہاری رابعہ کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی؟" نازو نے کہا۔

"اسے لڑائی تو نہیں کہا جا سکتا۔ میں اس سے ملنے گیا تھا اور صرف یہی پوچھنا چاہتا تھا کہ گزشتہ رات وہ مجھے چھوڑ کے ولاور کے ساتھ کیوں چلی گئی تھی اور جانے کو وہ جہاں چاہے جائے، عاقل و بالغ اور خود مختار ہے لیکن بعد میں اس نے کسی سے بات کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ منظر کے گھر چلی گئی اور وہاں سے کورٹ۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ اس نے ٹھیک کیا تھا؟ نازو! تم کو تعجب نہیں ہوا تھا؟ مرزا غالب! آپ کو حیرانی نہیں تھی؟ مجھے تو غصہ آ رہا تھا لیکن میں اس کے آفس میں کوئی ہنگامہ کرنے نہیں گیا تھا۔ اتنی عقل تو ہے مجھ میں کہ کہاں کیسے بات کی جاتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا؟" میرا غصہ بھڑک اٹھا تھا۔

غالب نے سہلایا "یوسف نے بتایا مجھے تو ... مجھے بھی یقین نہیں آیا۔ رابعہ کو کیا ہو گیا ہے؟"

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔ اس نے مجھے بے عزت کر کے رخصت کر دیا۔ کوئی بات کیے بغیر۔ کہنے لگی کہ میں آفس میں صرف کام کی بات کرتی ہوں۔ اُلو کی پٹھی۔ جیسے میں پہلی بار اس کے آفس گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس آفس میں ہے۔"

غالب نے کہا "نازو! اس کے سر پہ ٹھنڈا پانی ڈالو۔"

"نہیں۔ میرے حلق میں گرم چائے ڈالو۔" میں نے ایک گہرا سانس لی۔

وقار یوسف نے بیوی کو اشارہ کیا مگر وہ اس سے پہلے ہی چائے لانے کے لیے روانہ ہو چکی تھی "سکندر صاحب! آج تو میرے ساتھ بھی بُری ہوئی۔ میں اس آفس میں سب سے سینئر ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ رابعہ باجی کی عدم موجودگی میں یہ آفس میں ہی نے کیسے چلایا تھا۔ یقین کریں مجھے ہر وقت خطرہ رہتا تھا کہ ہاتھیوں کی لڑائی میں یہ ناچیز مینڈک کی طرح نہ پس جائے۔ پھر بھی دوستی میں احسان جتانا ذلالت سمجھتا ہوں۔ ہم سب دوست ہیں اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ مجھے اپنا سمجھتے ہیں اور مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔"

"رابعہ باجی نے آج اسے بُری طرح جھاڑا۔ بلکہ ذلیل کیا" غالب نے اس کے سر پر دست شفقت پھیرا "بہت اداس اور غمزدہ ہے بے چارہ۔"

"بات ہی ایسی ہے غالب۔ ایسی حیرت کے ساتھ انہوں نے کہا کہ مسٹر یوسف! یہ مت بھولو کہ تم میرے ماتحت ہو اور یہ دفتر میرا ہے۔ اپنے کام سے کام رکھو۔ میرے ذاتی معاملات میں دخل مت دو۔ سمجھے؟ میں تو صدمے سے سُن کھڑا رہ گیا۔ مگر انہوں نے کہا۔ اب جاؤ، میری صورت کیا دیکھ رہے ہو۔" میں نے سخت بے عزتی محسوس کی۔ میں باہر آ کے بیٹھا تو مجھے سخت تشویش ہو گئی کہ آخر رابعہ باجی کو کیا ہو گیا ہے۔ ان کی طبیعت یقیناً ٹھیک نہیں تھی لیکن میری ہمت نہ پڑی کہ میں ڈاکٹر کو بلاؤں۔ ان کا تو نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ سکندر کے بعد میری شامت آئی تھی۔ پھر منظر صاحب سے بیچ بچ ہوئی۔ وہ بھلا دبنے والے کہاں ہیں۔ انہوں نے تو صاف کہا کہ بی بی! ہوش میں رہو ورنہ میں ہاتھ مار دوں گا۔ اس کے بعد وہ روتی رہیں اور انہوں نے منظر صاحب سے کہا کہ مجھے اپنی گاڑی دو۔ میں گھر جاؤں گی۔ منظر صاحب نے مجھے حکم دیا کہ رابعہ کو گھر چھوڑ آؤ لیکن رابعہ باجی نے خود ہی انکار کر دیا کہ مجھے ڈرائیور یا محافظ کی ضرورت نہیں ہے۔ تم گاڑی نہیں دو گے تو میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔"

"ایک منٹ" میں نے کہا "کیا درمیان میں رابعہ باجی آفس کے باہر گئی تھیں؟"

"میرے سامنے تو صرف ایک بار گئی تھیں۔"

"تم نے اسے برآمدے میں دیکھا تھا۔ وہ رو رہی تھی؟"

یوسف نے نفی میں سر ہلایا "جب آپ آئے تھے تو میں وہاں تھا۔ ایک کام سے گیا ہوا تھا لیکن میری عدم موجودگی میں جو ہوا اس کی رپورٹ مل گئی تھی مجھے۔ چوکیدار اور وہ دوسرا بھی پریشان تھے۔"

"خیر۔ پھر منظر نے گاڑی دی؟"

"ہاں۔ انہوں نے کہا کہ بی بی! مجھے تمہاری فکر نہیں، اپنی گاڑی کی فکر ہے۔ ذرا ہوش میں رہ کے چلانا۔" یوسف بولا "انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور چابی لے کر نیچے اُتر گئیں مگر چند منٹ میں واپس آ گئیں۔"

"کیا تم نے نیچے اپنی گاڑی دیکھی تھی؟"

"نہیں۔ میری نظر ہی نہیں پڑی ورنہ میں اس کو ضرور پکڑ لیتا جس نے ٹائروں کی ہوا نکالی تھی۔"

"اس کا نام رفیق ہے۔"

"منظر صاحب نے آفس بند کر دیا اور سب کی چھٹی کر دی کیونکہ رابعہ باجی ان کے سر پر سوار تھیں۔ وہ زار و قطار رو رہی تھیں اور ... آپ ..."

"مجھے گالیاں دے رہی تھیں؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"گالیاں تو نہیں۔ منظر سے کہہ رہی تھیں کہ ... اس شخص کی ایک شے نے اپنی زندگی برباد کر لی۔ سب کچھ گنوا دیا۔ ماں باپ، گھر بار، شہرت اور اسے احساس ہی نہیں۔ پھر انہوں نے بتایا کہ آپ کس کے ساتھ ہیں اور کہاں بیٹھے ہیں۔ منظر صاحب کا تو پارہ چڑھ گیا۔ چلانے لگے کہ رو رہی کیوں ہو احمق، جو نا بھی تمہارا ہو گا۔ ... لڑائی ہے تو ہم حرامیوں کے باپ ہیں۔ اس جیسے چند وہ پیدا کیے ہیں۔ وہ رابعہ باجی پر بھی بہت گرجے برسے کہ بی بی! تم بھی کم نہیں ہو۔ عشق لڑا لیا، سارے زمانے میں جھک ماری۔ نقصان اور ذلت برداشت کی۔ نہیں کی تو بس شادی۔ جو کام سب سے ضروری تھا وہ آج تک نہیں کیا۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ خیر آنے دو الو کے پٹھے کو آج۔ رات بارہ بجے سے پہلے تمہارا نکاح کرا دوں گا۔ ہمت ہے تو میرے سامنے انکار کر کے دیکھے۔ سالے کو ایسا سیدھا کروں گا۔"

سنجیدہ موضوع ہونے کے باوجود یوسف کی بات نے مجھے بھی ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا "پھر رابعہ نے کہا کہ اچھا جی، جیسی آپ کی مرضی۔"

وقار یوسف نے نفی میں سر ہلایا "رابعہ باجی نے کہا کہ منظر! تم بکو مت۔ اس سے کچھ مت کہنا۔ مجھے نہیں کرنی شادی کسی سے۔ اس کے بعد منظر صاحب اسے گھر لے گئے تھے۔"

وقار یوسف کی سلیقہ شعار بیوی چائے اور کچھ خشک میوے ٹرے میں رکھ کے لے آئی "مجھے تو لگتا ہے رابعہ باجی کو کچھ ہو گیا ہے ..."

"... ہے کہ اسے عشق ہو گیا ہے" یوسف بولا

"میری طرح۔"

"میں چائے سر پر ڈال دوں گی" وہ آنکھیں نکال کے بولی "رابعہ باجی پر کسی نے کچھ کر دیا ہے۔"

"میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ مجھ پر کیوں خفا ہو رہی ہو۔"

غالب کی اور نازو کی شگفتگی غائب ہو چکی تھی۔ وہ اداس اور خاموش بڑے عجیب لگ رہے تھے۔

میں نے کہا "تم لوگ بلاوجہ پریشان ہو۔ ایسا ہوتا ہے یار۔ تین دن میں دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔"

نازو نے خفگی سے کہا "وہ ہم سے بات بھی نہیں کر رہی ہے۔"

"نہ کرے۔ تم مجھ سے بات کرو۔ غالب سے لڑو" میں نے کہا۔

غالب نے سر ہلایا "یار سکندر! تو اس معاملے کو سیریس نہیں سمجھ رہا ہے۔ میں اس کی ناراضگی سے ڈر رہا ہوں۔ اس مرتبہ کچھ اور بات ہے۔"

"بقول شاعر۔ یوں تو پہلے بھی ہوئے ان سے کئی بار جدا۔ لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جدا۔"

"کوئی بات ہے تو آپ کو معلوم ہو گی" یوسف کی بیوی نے کہا۔

"میں آپ سب کو یقین دلاتا ہوں حضرات و خواتین کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے" میں نے چائے کا مگ اٹھا کے کہا۔

"ایک نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی بات ہے۔"

"بلیک مرسیڈیز کی بات ہے" نازو نے اس کی حمایت کی "کون تھی آخر وہ؟"

"میں نے ایک نیا عشق شروع کیا ہے لیڈیز۔ رابعہ سے عشق رہے گا لیکن عشق میں ورائٹی بھی تو ضروری ہے" میں نے کہا۔

یوسف کی بیوی اور نازو نے مجھے خون آشام نظروں سے گھورا "دو پہ کیوں اکتفا کرتے ہو؟ چار کر لو۔"

"کر لیں گے یہ بھی۔ ہم چاروں صوبوں کو مساوی نمائندگی دے سکتے ہیں یا ہر برّاعظم سے ایک منتخب کر سکتے ہیں لیکن اس وقت ہم مزید بکواس نہیں فرما سکتے۔ کل بات کریں گے" میں نے منہ پھاڑ کے جماہی لی۔

"منظر دس بار فون کر چکا ہے" غالب نے کہا۔

"گیارھویں بار کرے تو اسے میری طرف سے گیارہ گالیاں دینا۔ ایسی کہ اس کا دل خوش ہو جائے" میں نے کہا "شب بخیر۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میں غزالہ کے بارے میں اور اس کی پُراسرار شخصیت کے بارے میں بحث کا آغاز کرتا تو پنڈورا بکس کھل جاتا اور ساری رات سوالوں میں گزر جاتی۔ میرا جواب کسی کو مطمئن نہ کرتا اور ہر شخص اپنے اندیشوں کا اظہار کرتا۔ میں آج کے دن کی ذہنی کوفت سے اتنا پریشان تھا کہ میری اوّلین خواہش پُرسکون نیند کی تھی۔ میں نے لیٹنے کے بعد بھی سوچنے سے

www.paksociety.com

بگر بیٹھا اور پریشان کرنے والے خیالات سے پیچھا چھڑا کے سونے میں کامیاب بھی ہو گیا۔

رابعہ کے بارے میں سب کو یقین تھا کہ اس کی مجھ سے لڑائی ہوئی ہے اور میں ہی اس کے جنون آمیز رویے کا ذمے دار ہوں۔ میرے غیر سنجیدہ رویے نے انہیں تھوڑا سا مطمئن کر دیا کہ کوئی بات ہوئی ہے تو وہ سیریس نہیں ہے۔ چند دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسی لڑائیاں سب کی سب سے ہوتی رہی تھیں۔ تبھی غالب کی کہی سے "کبھی ناز و کی غالب سے اور میری رابعہ سے۔ روٹھنا منانا تو پیار کے انداز اور آداب محبت کے نصاب میں شامل تھا۔ کوئی یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ میں رابعہ کو اذیت پہنچانے کے لیے غزالہ کے ساتھ گیا تھا اور اس طرح میں رابعہ سے اس کے اہانت آمیز سلوک کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ رابعہ کی زیادتی کا اعتراف سب نے کیا تھا لیکن سب کو یقین تھا کہ دو چار دن میں وہ معافی مانگ لے گی یا میں اسے منا لوں گا۔ غزالہ کے بارے میں تجسس سب کو تھا لیکن میرے رویے سے سب نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ورنہ میں خود ہی ساری بات بتا دیتا۔

صبح میری آنکھ خلاف معمول جلدی کھل گئی۔ مجھے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھنے سے باہر اندھیرا نظر آیا۔ گھڑی میں اس وقت ساڑھے پانچ بجے تھے۔ نہ جانے کیسے مجھے رابعہ کے بجائے غزالہ کا خیال آیا اور مجھے گزشتہ شب کی ساری باتیں یاد آ گئیں۔ میں دبے پاؤں کچن تک گیا اور کوئی آواز کیے بغیر میں نے چولہا جلا کے اپنے لیے کافی بنائی۔

واپس اپنے کمرے میں آ کے میں نے پہلے رابعہ کو فون کرنے کا سوچا پھر مجھے خیال آیا کہ میں تو اس سے خفا ہوں اور جب تک وہ خود اپنے رویے پر پشیمان نہ ہو "میں اس سے بات نہیں کروں گا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں جا کے فون اٹھایا اور انکوائری سے فلیٹیز ہوٹل کا نمبر مانگا۔ دروازہ بند کر کے میں نے فلیٹیز کا نمبر ملایا۔

"فلیٹیز سر۔ واٹ کین آئی ڈو فار یو۔"

میں نے کہا "ہوٹل میں ڈاکٹر غزالہ سہگل مقیم ہیں۔"

"غزالہ سہگل۔۔۔ یس سر۔" کلرک نے چند سیکنڈ بعد کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" میں نے کہا "انہوں نے مجھے بتایا تھا۔"

"آئی ایم سوری سر۔"

"اچھا مس شیلا خان۔۔؟" میں نے جلدی سے کہا۔

"جی۔۔۔ وہ ہیں لیکن اس وقت۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔۔۔ ان سے کہو سکندر بخت صاحب کوئی بہت ضروری بات کریں گے۔"

"سوری سر۔ ان کی ہدایات ہیں کہ کسی کو کمرے کا نمبر نہ بتایا جائے، کسی ملاقاتی کو اجازت نہ دی جائے اور کوئی فون کال نہ ملائی جائے۔"

"لیکن۔۔۔ میری بات۔۔۔"

"سوری سر۔ انہوں نے کہا تھا کہ گورنر کا فون بھی ہو تو نہیں" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی لیکن یہ حقیقت ماننے کی فضول سی کوشش تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ فلیٹیز کوئی عام ہوٹل نہیں ہے اور وہاں خواص ہی قیام کرتے ہیں۔ ہوٹل کی انتظامیہ بھی مجبور ہے۔ میں اگر غزالہ کی مرضی کے بغیر اس سے ملنے کی کوشش کروں تو ہوٹل کی سیکیورٹی مجھے باہر پھینکنے سے بھی دریغ نہیں کرے گی۔

میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ غالب خاموشی سے اندر آ گیا "تو یہ حال ہو گیا ایک رات میں۔ ساری اکڑ فوں نکل گئی۔"

"ڈاکٹر اپنی جگہ ہے اور فون اپنی جگہ" میں نے کہا۔

"کیا رابعہ نے پھر انکار کر دیا بات کرنے سے؟ صبح صبح عزت افزائی ہو گئی اللہ کے حکم سے" غالب بولا۔

میں نے کہا "مرزا جی! اپنے چوہدری دلاور صاحب کا ایک بھائی تھا۔ تھا کیا' ہے اب ایک بہن بھی پیدا ہو گئی ہے۔"

"مبارک باد دینا چاہیے چوہدری صاحب کو۔ نومولود کا نام کیا ہے خیر سے؟ زچہ بچہ خیریت سے ہیں نا؟" غالب نے کہا "یہ کافی کہاں سے آئی؟"

"کافی تو برازیل سے آئی تھی۔ یہ مشروب میں نے بقلم خود تیار کیا ہے۔ آپ شوق فرمانا چاہیں تو کچن ادھر ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ ایثار سے کام لیں تو آدھی مجھے دے سکتے ہیں۔" وہ بولا۔

میں نے خالی مگ اسے پکڑا دیا "لے عیش کر۔ تیرے نصیب میں یہی ہے۔ بچا کھچا مانگ کے کھانا۔"

وہ کافی بنا کے لوٹا اور میرے سامنے بیٹھ گیا "یہ اپنے چوہدری دلاور کی بہن وہی ہے' تیلے بال' سنہری آنکھیں۔"

"بالکل وہی ہے" میں نے اسے سب بتا دیا۔ وہ غور سے سنتا رہا۔

"معاملات اُلجھتے جا رہے ہیں۔" غالب نے صورت حال کو سمجھنے کے بعد کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ چوہدری دلاور کی بہن کہاں سے آ ٹپکی اور وہ بھی ایسے وقت میں جب ہم پہلے ہی حالات کے گرداب سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اسے صاف کہہ دینا تھا کہ بی بی! خدا کے لیے ہمیں تو معاف ہی رکھو۔ اپنی دشمنی کے معاملات اپنے بھائی سے طے کرو۔ نہ ہمیں تمہاری مدد چاہیے نہ ہم تمہاری مدد کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔"

"یہی کہا تھا میں نے لیکن اس نے مجھے قائل کر لیا کہ اس سے تعاون میں فائدہ ہی ہو گا۔"

"کیسا فائدہ۔۔۔ مالی فائدہ" غالب نے کہا "ایک لاکھ پاؤنڈ کا۔"

"یہ پہلو بھی قابل غور ہے۔" میں نے کہا "میرا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کا خاص آدمی رفیق ہمارے لیے کیا کر سکتا ہے۔ رفیق پی اے ہے زیدی نقوی صاحب کا۔ رات کو میں یوسف کی بیوی کے سامنے یہ ذکر نہیں چھیڑ سکتا تھا۔"

"نقوی صاحب بڑی توپ چیز ہیں" غالب نے طنزیہ اور پُرشفقت لہجے میں کہا "مجھے تو وہ جنگیوں کی توپ لگتے ہیں جو محض نمائش کی چیز رہ گئی ہے۔"

"یار! میرے سارے مقدمات کی فائلیں اس کے پاس ہیں۔"

"اچھا! وہ چاہے تو مقدمات ختم کرا سکتا ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "قانون میں تو شاید اس کی گنجائش نہیں۔ لیکن ہیرا پھیری کی گنجائش کہاں نہیں ہوتی۔ فرض کرو وہ فائلیں غائب کر دے۔ فائلوں میں سے بنیادی اہمیت کی حامل دستاویزات نکال دے جن سے مقدمے میں جان ہی نہ رہے۔ استغاثہ کا کیس کھوکھلا ہو جائے اور آخر میں شک کا فائدہ مجھے ملے۔"

"یار! نقوی صاحب چاہیں تو پولیس کو صرف اشارہ کر دیں۔ پولیس والے ہر کیس دفن کر سکتے ہیں۔ گواہوں کو غائب کرنے یا منحرف کرانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" غالب نے کہا۔

"میں اسی لیے غزالہ سے پھر ملوں گا۔ اگر رفیق اس کا خاص آدمی ہے تو غزالہ اسے ہم سے ملوائے۔ ہم خود پوچھیں گے کہ نقوی صاحب کے دولت خانے پر دلاور کی اور میری ملاقات کرانے کا مقصد کیا تھا اور وہ فائلیں اب بھی وہیں ہیں تو کیا انہیں غائب کیا جا سکتا ہے؟"

غالب نے چٹکی بجائی "اگر وہ ڈرتا ہے تو ہمیں موقع فراہم کر دے۔"

"ہم وہ فائلیں چوری کرا دیں گے۔ ابھی تو یقیناً ہم دباؤ میں ہیں۔ وہ کیس پھر شروع ہو گئے تو مجھے روپوش ہونا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "مگر فائلیں چوری ہو گئیں تو الزام نقوی صاحب پر آئے گا۔"

"یہ مت بھولو کہ وہ بڑی توپ چیز ہیں۔ بڑا افسر ہمیشہ بچ جاتا ہے' الزام آتا ہے نیچے والے پر۔ ممکن ہے رفیق معطل ہو جائے یا کسی عدالت کا کوئی اہلکار لیکن یہ بہت ضروری ہے مرزا جی۔"

غالب نے افسوس سے سر ہلایا "مجھے ایسا لگتا ہے کہ چوہدری دلاور نے خطرے کو بھانپ لیا اور اکبر خان کو منع کر دیا کہ وہ اخبار نکالنے کی حماقت نہ کرے۔ ایم آر ایس کے ہاتھ میں اپنا خطرناک ہتھیار رہنا خود کشی ہو گی۔"

"تم نے کوئی اور فنانسر تلاش نہیں کیا؟"

"میں کوشش کر رہا ہوں کہ چوہدری دلاور کے ایک سیاسی حریف سے رابطہ ہو جائے۔ مشکل یہ ہے کہ وہ پرانا سیاست داں ہونے کی وجہ سے بااصول اور وضعدار ہے۔ جمہوریت کی بقا کے لیے سیاست میں شرافت کا قائل ہے اور منفی ہتھکنڈے استعمال کرنا غلط سمجھتا ہے۔ پھر یہ کہ اس کے پاس محدود وسائل ہیں۔ اس کا اثاثہ ہے اس کی قربانیاں جو اس نے پاکستان کے لیے دیں۔ وہ خدمت جو اس نے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے سرانجام دیں۔ اس کی جدوجہد اور ایک والہانہ عقیدت جو وہ قائد اعظم کے لیے رکھتا ہے۔"

"اب کون پوچھتا ہے ایسے لوگوں کو۔ سیاست میں پیسہ چلتا ہے۔ رشوت' دھاندلی اور دھونس نے اتحاد' تنظیم اور یقین کی جگہ لے لی ہے" میں نے آہ بھر کے کہا "خیر اللہ مسبب الاسباب ہے۔"

"یار' یہ لڑکی غزالہ۔۔۔ سہگل۔۔" غالب کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"ڈاکٹر شیلا خان" میں نے اس کی تصحیح کی "آگے بولو۔"

"اگر وہ بیچ ہمارے ساتھ ہو جائے تو اخبار کے لیے سرمایہ بھی فراہم کر سکتی ہے" غالب نے خواب زدہ لہجے میں کہا "ایک لاکھ پاؤنڈ۔"

"شاہین کے بچے' اتنی پست کیوں ہوتی جا رہی ہے تمہاری پرواز؟" میں نے کہا "تو حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ کے بارے میں کیوں سوچتا ہے۔ ہم کیا مر گئے ہیں یار۔"

وہ شرمندہ ہو گیا "میں نے امکان کی بات کی تھی۔"

"مرزا جی! جوئندہ یابندہ۔ فارسی میں کہتے ہیں کہ جو تلاش کرتا ہے وہ پالیتا ہے اور عربی میں کہتے ہیں کہ انسان کوشش کرے تو اسے سب مل جاتا ہے۔ آخر کتنا سرمایہ چاہیے ایک اخبار جاری کرنے کے لیے؟"

"جتنا ایک انڈسٹری لگانے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ انڈسٹری چھوٹی ہو تب بھی لاکھوں کا کھیل ہے۔ بلکہ جُوا ہے۔ اخبار چلے نہ چلے' اس کی گارنٹی کون دے سکتا ہے؟" وہ بولا۔

"گارنٹی میں دے سکتا ہوں کہ جس اخبار کا ایڈیٹر انچیف ہو مرزا غالب اور پرنٹر' پبلشر ہوں ایم آر ایس۔ وہ سب کا عزت تحفہ کر سکتا ہے۔" میں نے کہا "اب رہی سرمائے کی بات تو پیارے' اپنا ایک گھر ہے جس کا میں بلاشرکت غیرے مالک ہوں۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" غالب نے کہا "کتنی خواہش اور کوشش سے تو نے اپنے والد کی ایک نشانی پھر حاصل کی ہے۔ تو اسے بیچنے کی بات کر رہا ہے؟"

"پیارے' یہ اینٹ پتھروں کے گھر کیا انسانوں سے زیادہ اہم ہوتے ہیں" میں نے کہا "یہ تو مظہر ہوتے ہیں انسانی خواہشات کے اور خواہشات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ جگی یا جھونپڑی سے لوگ کوٹھیوں میں پہنچ جاتے ہیں تو محلوں کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ کچھ صرف خواب دیکھتے ہیں۔ کچھ تعبیر بھی تلاش کر لیتے ہیں۔"

"یہ گھر بھی تیرے والد کے خوابوں کی تعبیر تھا۔"

"ان کے خوابوں کی تعبیر یہ ملک تھا اور میں تھا' میرا مستقبل

www.paksociety.com

تھا" میں نے کہا "میں اس خواب پر قناعت نہیں کر سکتا جو میرے والد نے دیکھا تھا۔ میں بہت آگے ہوں۔ میں اپنی خواہشات کی پرواز کو محدود کر لوں گا تو وقت کے حصار کا قیدی بن جاؤں گا۔ مجھے اپنے ماضی کے مزاروں کا مجاور بننا منظور نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بعد اگلی نسل ستاروں پر کمند ڈالے۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے مرزا جی کہ میں اس گھر کو بیچ دوں اور پھر خرید لوں۔ اس جیسے دس محل بنا لوں۔ ہر محل بالآخر آثارِ قدیمہ بن جاتا ہے ویسے بھی۔"

"میں افسوس کے ساتھ اس تجویز کو مسترد کرتا ہوں لیکن اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ وسائل تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ میں نے نازو سے بات کی تھی۔"

"غالب! ایک نہ ایک دن میرا حق مجھے ملے گا۔ میں چوہدری دلاور سے ایک ایک پیسہ وصول کر لوں گا جو اس نے وزیر خان سے چھینا تھا لیکن اس سے پہلے بھی ہم مل کے سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں۔ رابعہ، منظر، وقار یوسف' ہمیں اُدھار دے سکتے ہیں' اُدھار دلوا سکتے ہیں۔ کسی بینک سے لون منظور کروانا نقوی صاحب کے لیے کیا مشکل ہے۔ ہم پروگریسو ہیپی لینڈ کی طرح کمپنی بنا کے پبلک کو شیئرز فروخت کر سکتے ہیں۔ ہمارے اثاثے تو کم نہیں۔ میرا گھر ہے' رابعہ اور منظر کا گھر ہے۔ کیا یہ ضمانت کافی نہیں؟؟"

غالب کا چہرہ پُرامید ہو گیا "یو آر ویری رائٹ۔ اس طرح تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ چلو رابعہ سے بات کرتے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل پر ندامت کا اظہار کرے گی تو بات بنے گی۔"

"ورنہ کیا ہو گا؟ کب تک روٹھے رہو گے تم لوگ؟"

"جب تک خدا ہمیں عقل نہیں دیتا اور کسی ایک کا دماغ درست نہیں ہو جاتا۔ زیادہ امید یہی ہے کہ یہ پانچ گھنٹے تک دے گا لیکن ابھی نہیں یار' پیسے تو دماغ خراب ہو جاتا ہے لڑکیوں کا۔"

"بکواس مت کر۔ ابھی وقت ہے۔ سب سو رہے ہیں۔ رابعہ بھی سو رہی ہو گی۔ ہم جا کے جگاتے ہیں" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "دو چار دن ٹھہر جا یار۔"

"کل وہ شفٹ ہو جائے گی اپنے اس محل میں جو چوہدری دلاور نے جانمی بیگم کو ہتھیا کے دیا تھا۔ دلاور نے غیر مشروط طور پر اس کا قبضہ دے دیا ہے۔"

"وہاں وہ کیسے رہے گی اکیلی..."

"چل کے اس سے پوچھ لیتے ہیں۔ منظر کی موجودگی میں بات کرنے سے فائدہ یہ ہو گا کہ نہ آپ کے لیے ناک کا مسئلہ ہو گا نہ رابعہ کے لیے۔ منظر تم دونوں کی ناک پکڑ کے لکیریں نکلوا سکتا ہے۔"

"یہ تو ہے" میں نے کہا۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ غالب نے ریسیور اٹھایا اور پھر مجھے تھما دیا "آپ سے بات کرنا چاہتا ہے کوئی۔"

میں نے ریسیور لے لیا "ہیلو!"

غزالہ کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز نے کہا "ہیلو یار۔ تم نے فون کیا تھا؟"

"جی۔ لیکن آپ کا نادر شاہی فرمان تھا۔"

وہ ہنس پڑی "سوری یار۔ مجبوری ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ گمنام اور روپوش رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے پیغام مل گیا تھا تمہارا۔"

"تمہیں صبح سویرے اٹھنے کی عادت ہے؟"

"ابھی میں اٹھی کہاں ہوں۔ بیڈ ٹی پیوں گی پھر اخبار دیکھوں گی۔"

"سب رئیسانہ چونچلے ہیں۔"

"جلدی اٹھ کے کیا کروں۔ وہاں تو اسپتال پہنچنا ہوتا تھا اور فاصلہ بھی کافی تھا۔ یہاں بے کاری ہے اور پھر پاکستان آ کے وقت کی سمت گڑبڑ ہو گئی تھی۔ پانچ گھنٹے کا فرق بڑی مشکل سے ایڈجسٹ ہوا ہے۔"

"میرا نمبر کہاں سے ملا تمہیں؟"

وہ ہنسنے لگی "کیا تمہارا بھی کوئی نمبر ہے۔ یہ تو وقار یوسف کے گھر کا فون نمبر ہے۔ پہلے میں نے منظر ایڈووکیٹ کے گھر فون کیا تھا۔ میرے پاس سارے نمبر ہیں یار۔"

"منظر سے کیا بات ہوئی؟"

"کچھ نہیں۔ فون رابعہ نے اٹھایا تھا۔"

"پھر... تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا کہ یار ناراض مت ہونا۔ کل میں تمہارے سکندر کو ورغلا کے لے گئی تھی لیکن بری نیت سے نہیں۔ میرا اس پر غاصبانہ قبضہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور نہ ہے۔ ویسے تمہارا بوائے فرینڈ ہے دل پھینک قسم کا۔"

"اُف۔ یہ سب بک دیا تم نے! تم تو پاگل ہو" میں نے چلا کر کہا۔

"کیوں' بلاوجہ کوئی غلط فہمی پیدا ہو جاتی تمہارے درمیان۔ میں نے اپنی صفائی پیش کر دی۔" وہ چڑ کے بولی "وراسے بھی ایک بات سمجھا دی تاکہ وہ بھی محتاط رہے۔ تم دونوں کے حق میں اچھا کیا میں نے۔"

"خاک اچھا کیا۔ کیا ضرورت تھی تمہیں فون کرنے کی آخر؟ اور فون کیا تھا مجھ سے بات کرنے کے لیے تو... خیر اور کیا بات ہوئی؟" میں نے دانت پیس کے کہا "رابعہ نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔ بس یہ پوچھ لیا تھا کہ سکندر کو کب سے جانتی ہو' کیا کام تھا اس سے' کہاں گئے تھے تم لوگ۔ میں نے بتا دیا کہ ملاقات آج پہلی بار ہوئی تھی اور کام کیا... کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی تھیں۔ ہم لارڈز میں بیٹھے رہے پھر سکندر نے مجھے ڈراپ کر دیا۔ یار میں اسے آئس کریم کھلانے لے گئی۔ بڑا اچھا وقت گزرا۔ ہی از اے ونڈر فل مین۔ تم بہت لکی ہو۔"

"بیڑا غرق کر دیا میرا۔ خدا! تم سے سمجھے۔"

"یار' کوئی غلط بات تو نہیں کی میں نے۔ کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ تم بلاوجہ بگڑ رہے ہو۔ وہ کہنے لگی کہ سکندر تو یہاں نہیں آیا۔ میں نے پھر وضاحت کر دی کہ دیکھو' غلط مت سمجھنا۔ وہ میرے ساتھ نہیں رہا رات بھر۔ گیارہ بجے میں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں چلا گیا تھا اور میں گئی تو اس کے ساتھ تھی لیکن پھر میری گاڑی آ گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ تو بڑی رومانٹک جگہ ہے۔ میں کبھی رابعہ کے ساتھ یہاں نہیں آیا جہاں ہم نے آئس کریم کھائی تھی۔"

"اُلو کی بچی..." میں نے دھڑ سے ریسیور رکھ دیا "اتنا بولتی ہے' اوپر سے دعویٰ ہے کہ میں نے کیا غلط کیا' کون سا جھوٹ بولا۔ سچ بولے بغیر کیا کھانا ہضم نہیں ہو رہا تھا۔"

غالب ہنسنے لگا "آخر ہے نا چوہدری دلاور کی بہن۔ خانہ خرابی کے اسباب تو پیدا کرے گی۔"

گھنٹی پھر بجی "یار' آئی ایم سوری۔ رئیلی سوری۔ تم نہ جانے کیا سمجھ رہے ہو۔"

میں نے کہا "میں سب سمجھ رہا ہوں۔"

"نہیں۔ تم بہت غصے میں ہو۔ پلیز مجھے معاف کر دو ورنہ میں رونے لگی تو یہاں کوئی چپ کرانے والا بھی نہیں ہے۔" غزالہ نے پھر کہنا شروع کیا "اصل میں ایک بات بتانا بھول گئی تھی میں۔ آج میں لندن جا رہی ہوں۔"

"واپس تو نہیں آؤ گی؟!"

وہ ہنسی "یہاں کی مٹی میرے نصیب میں ہو گی تو خود کھینچ لے گی۔ میں بھی نہیں چاہتی کہ چوہدری دلاور مجھے لندن میں قتل کرے۔"

"یہاں بھی تم شہید نہیں کہلاؤ گی۔"

"دراصل مجھے وہاں اپنے معاملات نمٹانے ہیں۔ میں نے اپنے اٹارنی سے فون پر بات کی تھی۔ اس نے بتایا کہ مکان کا سودا بھی ہو گیا ہے اور میرے واپس آتے ہی فائنل ہو جائے گا۔ اپنی رقم یہاں منتقل کرنا ہو گی۔ اس کے لیے بھی شیخ صاحب نے کوئی چکر چلایا ہے۔ ڈائریکٹ ٹرانسفر تو ممکن نہیں تھا۔ کمیشن کی بنیاد پر کسی سے بات ہوئی ہے۔ کچھ لوگ کرنسی کو اِدھر سے اُدھر کرتے ہیں۔ پاؤنڈ یہاں مہنگا بک جاتا ہے۔ سرکاری شرح سے زیادہ ہی یہاں نقد لے جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ تین چار دن تو لگ ہی جائیں گے۔ آج کیا دن ہے؟"

"اتوار۔ کب تک واپسی ہو گی؟"

"یار' مجھے اتوار کو ملاقات ہو گی۔ اگر اس سے پہلے نہ ہوئی۔ وہ جو کل مچھلی کھائی تھی نا' اس سے الرجی ہو گئی ہے غالباً۔ یا شاید میں زیادہ کھا گئی تھی۔ خیر شام تک ٹھیک ہو جاؤں گی۔ فلائٹ تو رات کی ہے۔ تم ابھی تک غصے میں ہو؟"

"نہیں۔ اس وقت غصہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب تم واپس آؤ گی تو بتاؤں گا۔"

"یار' تم ذرا ذرا سی بات پر TENSE کیوں ہو جاتے ہو؟ ایزی رہا کرو۔ غم کو ایک قہقہے میں اُڑا دو۔ غصے کو حرام کیوں قرار دیا گیا ہے؟ یہ شراب کی طرح آدمی کی عقل کو..."

"شروع ہو گیا تمہارا لیکچر..." میں نے جھنجھلا کے کہا۔

"تمہیں کچھ TRANQUALISERS لینے چاہئیں۔ یا پھر تبدیلی کے لیے کہیں جانا چاہیے ورنہ تمہاری اعصابی کشیدگی تمہارے ذہن پر ہی نہیں' جسم پر بھی اثرانداز ہو گی۔ یار' تم ایسا کیوں نہیں کرتے... میرے ساتھ چلو۔"

"کیا! تمہارے ساتھ لندن چلوں؟"

"ہاں۔ کیا حرج ہے۔ ایک ہفتے ہی کی تو بات ہے۔"

"ڈاکٹر غزالہ! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ مجھے برطانوی حکومت نے ناپسندیدہ قرار دے کر ڈی پورٹ کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"یار' پھر کیا ہوا۔ تم پیرس میں رک سکتے ہو۔ بلکہ انگلش چینل کے اِدھر میں' اُدھر تم۔ میں دن بھر اپنا کام نمٹاؤں' تم پیرس کی سیر کرو۔ شام کو میں آ جاؤں گی۔"

"سوری۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔"

"دیکھو' مجھے ایک یار غار سے زیادہ ایک محافظ کی ضرورت ہے۔ تمہیں کون سی تیاری کرنی ہے۔ پاسپورٹ تو ہے نا تمہارے پاس۔ ویزا لگوانا میری ذمے داری۔"

"میں نے کہا نا کہ یہ ناممکن ہے۔"

"یار' تمہاری خاطر میں روانگی دو دن کے لیے ملتوی بھی کر سکتی ہوں۔ اِٹ ول بی گڈ فار یو۔ آئی کین بیٹ" (میں شرط لگا سکتی ہوں کہ تمہیں فائدہ ہو گا)

میں نے عاجز آ کے کہا "منحوس غزالہ..."

"ڈونٹ کال می غزالہ۔ یہ تو فرضی نام ہے یار" اس نے مجھے ٹوک دیا "میں شیلا خان ہوں۔ تم شیلی کہہ سکتے ہو۔"

"او کے شیلی۔ اب میری عرض بھی سن لو۔ میں رفیق سے ملنا چاہتا ہوں' آج ہی۔"

"تو ملو یار۔ کس نے منع کیا ہے۔ مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے" وہ بولی۔

"یہ کیا بری عادت ہے تمہیں یار یار کہنے کی؟"

"اس میں کیا برائی ہے؟ تم واقعی ایک ٹوٹلی تنگ نظر اور ایڈیٹ ہو۔ معاف کرنا' مجھے منافقت نہیں آتی۔ میرا خیال ہے کہ تم ایسے تھے نہیں لیکن تم کو حالات نے آدمی سے گھن چکر بنا دیا ہے۔ کیا تم شروع سے ایسے ہی تھے؟ لکیر کے فقیر۔ ہر وقت ذہنی انتشار کا شکار رہنے والے اور مُردہ دل۔"

مجھے اس کی بات نے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کیا واقعی میں ایسا ہو گیا ہوں؟ شیلی جھوٹ کیوں بولے گی۔ اس نے جو محسوس کیا وہ

www.paksociety.com

کہہ دیا۔ جب میں اور محسن لندن میں تھے تو شوخی اور زندہ دلی میں مشہور تھے۔ اپنی دلچسپی کی خاطر معاشقے لڑاتے پھرتے تھے اور زندگی فضا میں اڑنے والا رنگین غبارہ تھی' کسی ڈور سے بندھی ہوئی پتنگ نہیں۔ اب محسن میرے ساتھ نہیں تھا' رابعہ مجھ سے خفا تھی اور میں عہد کرچکا تھا کہ چند دن اس سے نہیں ملوں گا۔ اس نے مجھے شیلی کے ساتھ جاتے دیکھ لیا تھا اور خود شیلی نے رہی سہی کسر یہ بتا کے پوری کردی تھی کہ ہم کہاں گئے تھے اور کیا کرتے تھے۔ رابعہ کے لیے سب سے مناسب سزا یہی ہے۔ اس نے مجھے ذہنی اذیت میں مبتلا کیا' میں بھی اسے ایک جھٹکا تو دے سکتا ہوں۔

اچانک میں نے فیصلہ کرلیا "اچھا شیلی' فرض کرو میں تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہوں؟"

اس نے ایک چیخ ماری اور لبوں سے ایک آواز پیدا کی جو واضح طور پر بوسے کی آواز تھی مگر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے غالب نے کچھ نہیں سنا۔ "او مائی ڈارلنگ۔ مجھے پتا تھا تم مان جاؤ گے۔"

میں نے کہا "جانے سے پہلے تم میری ملاقات رفیق سے کرا دو گی؟"

"کیوں نہیں۔ تم بولو کہ کہاں بلاؤں۔ اور کس وقت؟"

"شیلی! میں اس سے تمہاری موجودگی میں بات کروں گا' تمہارے گھر میں۔ اور میرے ساتھ ایک دوست بھی آئے گا' غالب۔"

"یار' میرے گھر میں کیوں؟"

"بس میں یہی چاہتا ہوں۔ تم اپنی ہر بات منوا رہی ہو' ایک بات میری مانو ورنہ چھوڑو۔"

"لیکن اس میں تُک کیا ہے۔ بلاوجہ خطرہ مول لینے میں۔ ملاقات باہر کہیں بھی ہو سکتی ہے۔"

"اسے تم میری شرط سمجھو ساتھ جانے کے لیے۔"

"اچھا۔ اگر یہ بات ہے تو آجاؤ۔ شام تین اور چار بجے کے درمیان کسی بھی وقت۔ غالب سے میں بھی ملنا چاہتی ہوں۔ لیکن معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا۔ یار مجھے یہ ہوٹل چھوڑنا پڑے گا۔" اس نے آہ بھر کے کہا اور فون بند کردیا۔

غالب ابھی تک برداشت سے کام لے رہا تھا۔ باہر دن نکل آیا تھا اور اندر کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یوسف کی بیوی اٹھ گئی ہے۔

"سکندر' یہ کیا ہو رہا ہے؟" غالب نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا ہو رہا ہے' اور کہاں۔"

"یہ بہت خطرناک کھیل ہے۔ تو اس کے ساتھ کیوں جا رہا ہے؟ مجھے بہت خطرناک لگتی ہے یہ لڑکی۔ تو اس کے چکر میں تو نہیں پڑ گیا؟"

میں نے کہا "میں ایک جہانگیر رسید کروں گا تو ذہن کی عقل ٹھکانے پر آجائے گی۔ میرے اس کے ساتھ جانے کا ایک مقصد ہے۔"

"مجھے اس مقصد پر اعتراض ہے۔ اس سے زیادہ خرابی ہوگی۔"

"پہلے یہ تو پوچھ لیں آپ کہ مقصد کیا ہے؟" میں نے کہا "نمبر ایک' نے مجھے اپنے ذاتی تعلقات سے کام لیتے ہوئے ڈاکٹر شیلا خان کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔"

"اب کون سے ذاتی تعلقات رہ گئے ہیں وہاں؟"

"وہ سب لڑکیاں مجھے مرتے دم تک بھول نہیں سکتیں جن کے نزدیک میں ان کا واحد عاشق صادق تھا۔ جیسا نہ پہلے پیدا ہوا نہ پھر ہوگا۔ میں اور محسن بیک وقت تین تین کو اس یقین میں مبتلا کرنے کی بے مثل صلاحیت رکھتے تھے اور۔ ہائے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ" میں نے آہ سرد بھر کے کہا "ایک لارڈ تھے جن کی بیٹی۔"

"وہ اب کسی کی بیوی اور پتا نہیں کتنے بچوں کی ماں ہوگی۔"

"پھر کیا ہوا۔ کیا آپ نے پڑھا نہیں' بزرگ کیا فرما گئے ہیں اور انہی کے تجربات کا نچوڑ ملتا ہے کتابوں میں۔ کہ عورت اپنا پہلا عشق کبھی نہیں بھولتی۔ خیر یہ تو مذاق کی بات تھی۔ میں لندن نہیں جا سکتا مگر وہاں ایسے دوست ہیں جن کو میں بتا کے ڈاکٹر شیلا خان کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کر سکتا ہوں۔ دوسرا خیال بھی ٹھیک ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ برطانیہ میں لاکھوں پاکستانی ہیں اور انگریز ہیں۔ شیلی کا گھر بڑی اچھی جگہ ہے۔ اگر اخبار وہاں سے نکالا جائے۔"

"کون نکالے گا؟ تیرا تو داخلہ ممنوع ہے۔"

"تمہارا تو نہیں ہے۔ لندن کا اخبار وہاں سے آزاد ہوگا اور وہاں نہ سنسرشپ ہوگی نہ اپنے چوہدری صاحب کی بدمعاشی چلے گی۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "میں سمجھتا ہوں اس سے یہاں پر رائے عامہ متاثر نہیں ہو سکتی۔ اخبار لاہور سے نکلنا چاہیے جہاں ووٹر کا ووٹ بینک ہے' اس کے ووٹر ہیں۔ خیر ایک بیٹھنے کی کوئی بات نہیں لیکن خیر سے یہ ہوا ایک بیٹھنے میں گھر لوٹ آئیں۔ پتا نہیں تم اور محسن ولایت سے کیسے خالی ہاتھ لوٹے ورنہ پہلے تو قاعدہ تھا کہ جو جاتا تھا ایک میم ضرور لاتا تھا۔"

اب یوسف بھی اٹھ گیا تھا اور مازو بھی اندر اس کی بیوی سے ناشتے کے موضوع پر تبادلۂ خیالات کر رہی تھی۔

میں نے غالب کو اشارہ کیا "یار' خاموشی سے نکل چلتے ہیں' کسی کو بتایا تو مُصر ہو جائے گا کہ ناشتا کر کے جاؤ۔"

"ناشتا ہم وہیں کریں گے۔ مظہر کے گھر۔" غالب نے کہا۔

یوسف کی گاڑی کی چابی ابھی تک میرے ہی پاس تھی۔ میں اور غالب ذرا تنگ سے روم کا دروازہ کھول کے یوسف کی نیند میں برآمد ہوئے اور گاڑی لے کر فرار ہو گئے۔ صبح کے سات بجے تھے اور مجھے یقین تھا کہ ساڑھے آٹھ نو بجے سے پہلے مظہر بھی کورٹ نہیں جائے گا۔

مظہر کی گاڑی گیٹ سے اندر جانے والے راستے پر فرنگی میں تھی۔ میں نے دوسری گاڑی اس کے بالکل پیچھے لگا دی اور چابی باہر اپنے تھیلے میں رکھ دی۔ "اب نکال کے دکھائے اپنی گاڑی" میں نے کہا۔

مظہر نے گاڑی کی آواز سن لی تھی۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں ڈھیلے سے سر کھجاتا ہوا باہر آیا۔ "اچھا تم دونوں ایک ساتھ" وہ بولا "خدا خیر کرے۔ صبح صبح دو منحوس چہرے دیکھ لیے۔"

"وہ کیوں' نہیں ہوئے یار۔ شیو بھی تو کی ہوگی تو نے آئینہ دیکھ کر" میں نے کہا۔

"تمیز تو میں گولی بنا دوں ابھی۔ ذرا اندر آ بھونی کے۔ خیر بات نہ' رابعہ۔" مظہر تولیہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا "قسم خدا کی' میں نے اسے کبھی اتنے جلال میں نہیں دیکھا۔ تو یہ آکے ڈال لے سر پہ۔"

"یہ کیا واقعی طلسمات تولیہ ہے' بلائیں دور رہتی ہیں؟"

"اے طلسمات کے بچے' اپنے سر کو بچا" مظہر مجھے گھور کے بولا "اس کا کیا پتا' بیلن مارے یا چمٹا۔ دل کے بعد سر کی چوٹ بُری ہوتی ہے۔ میں کل سے اسے بھڑکا رہا ہوں تیرے خلاف۔ عین ممکن ہے زندگی گھونپ دے تجھے۔"

"یار' یہ تو بڑی کمینگی ہے" میں نے دانت نکال کے کہا۔

"نہیں بیٹے۔ اب یہی علاج ہے تیرا۔" مظہر بولا "تو خود مرنے والا نہیں ہے۔ تیرا باپ ہوتا تو تجھے مرغا بنا کے اتنے جوتے مارتا کہ [illegible] رکھتا تیرے دل سے ہانڈی نکلتی۔"

رابعہ نے اگر میری آواز سنی تھی تو عمداً اپنے انداز تغافل سے مجھ پر واضح کردیا تھا کہ جنگ جاری ہے۔ مظہر کی بیوی نے باہر نکال کے جھانکا۔

"ارے بھئی' تم! کب آئے' اور یہاں کیوں کھڑے ہو۔ مدتیں ہو گئیں تم کو بھی۔ کل سو بار فون کیا ہوگا تمہیں۔"

"ایک سو ایک بار" مظہر نے کہا "سمجھئے کتنی غلطی کرلی ہو' بات کو بھی پورے چودہ بجے تھے' تم نے چھوڑ دیے۔"

"گو' شتوان کی بات۔ اب ان میں سے ایک بچہ گھس کے سو گیا تو کیا اس میں میرا قصور ہے۔ انہیں تو فکر ہوئی نہیں۔ یہ کیا جانیں ماں کا دل۔ میرا دل تو بھنا وحشت سے رہ گیا۔ کونا کونا جہاں مارا' ڈاکٹروں میں پتا کیا پھر مسجد سے اعلان کروایا' تھانے فون کیا۔ لڑکے بُرا حال ہو گیا میرا۔ دل میں ایسے ایسے خیال آرہے تھے' بھیا' زمانہ خراب ہے۔"

حسب عادت اس کی زبان کی قینچی چل پڑی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ ہم برآمدے میں کھڑے ہیں اور اندر ناشتا میز پر لگا ہوا ہے۔ مجھے اور غالب کو بہت ہنسی آئی۔ بچہ بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں۔ والی صحیح مثال تھی۔

بالآخر مظہر نے کہا "تنگ بخت' خلاصہ سنا دے۔ ایک بچہ کھو گیا تھا' بیڈ کے نیچے سے مل گیا۔ انسان کا بچہ ہوتا تو اوپر ملتا نا۔ اب چلو اندر۔ ان عورتوں کو ناشتا کا زوال ہو جانے کا شوق ہے' یار۔ ورنہ کیا پتا نہیں ہوتی۔ اور افسوس ہے کی تو بڑی پر بخشش ہوتی ہے۔ میں نے بہت سمجھایا کہ بھئی ایک نہیں تو نہ سہی۔ پھر ہو جائیں گے چودہ' رونے کی کیا بات ہے۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔"

اس کی بیوی چلانے لگی "شرم تو نہیں آتی۔"

"شرم کیسی۔ یہ تو فخر کی بات ہے۔ تو ان سالوں کو گن نا۔ اس کے آدھے بھی کرلیں یا اس کے تو قسم خدا کی مان لوں گا کہ یہ بھی مرد ہیں۔"

میں اور غالب بے تحاشا ہنس رہے تھے اور مظہر کی بیوی چلا رہی تھی کہ رابعہ اندر آگئی۔ عام حالات میں وہ بہت پہلے ہی آجاتی۔ یا وہ ہنستی ہوئی آتی اور سب کے قہقہوں میں شامل ہو جاتی مگر جانے کیوں مجھے دیکھتے ہی وہ اپنے چہرے پر سنجیدگی مسلط کرکے آئی۔ اس کا فطری رد عمل یہ ہوا کہ ہم سب بھی ایک دم خاموش ہو گئے اور اچھے خاصے بے تکلف ماحول میں کشیدگی یوں پھیل گئی جیسے بجلی کا سوئچ آف کرتے ہی اندھیرا پھیل جاتا ہے۔

"کیا حال ہے سکندر؟" رابعہ نے مصنوعی لہجے میں کہا "اتنے مریل کیوں نظر آرہے ہو؟ بتجو۔"

میں نے بھی باچھیں چیر کے کہا "نہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔"

وہ غالب سے مخاطب ہوگئی "مازو بھی آئی ہے ساتھ؟"

"یہ جنسی تو ہے تمہارے ساتھ" غالب بولا "بھوت کی بچی ہے' غائب ہو جاتی ہے۔ تم بھی غائب ہو۔ کل یہ غائب ہوگئے تھے۔"

"پہلے ناشتا کرلو سب خاموشی سے" مظہر کی بیوی نے ایک ساتھ سب کو ڈانٹا "سکول جانے والے بچوں کو اتنی مشکل سے ناشتا کرایا ہے۔ پانچ ابھی سو رہے ہیں۔ اٹھ گئے تو میرا ناشتا کرنا مشکل ہو جائے گا۔"

مظہر نے بڑی برق رفتاری سے خوش خوراکی کا مظاہرہ شروع کردیا تھا۔ "میں تو کہتا ہوں بیوی' ان کو بھی گود لے لو۔ ٹھیک ہو جائیں گے۔ اپنے ہی بچے ہیں یہ بھی۔ ذرا بگڑ گئے ہیں۔ تم ٹھیک کرسکتی ہو انہیں۔ تم نے تو مجھے ٹھیک کردیا۔ کتے کی دم کو۔"

اس کی بیوی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ثابت کردیا کہ وہ مظہر سے بڑی وکیل ہے۔ مظہر ہائی کورٹ میں دلائل دے سکتا تھا۔ گھر میں بیوی کی زبان مشین گن کی طرح چلتی تھی اور وہ ماکانہ بندوق کی طرح خاموش تھا میں فٹ کرتا رہ جاتا تھا۔ ان کی باتوں سے بھی کشیدگی ختم نہیں ہوئی۔ رابعہ مجھ سے نظر چرا رہی تھی اور میں سوچتا رہا کہ کیا یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ میرا تو

www.paksociety.com

خیال تھا کہ کل سے اب تک اس کا موڈ بدل گیا ہوگا۔ خود غالب اس صورت حال سے پریشان نظر آتا تھا۔

ناشتا ختم کرتے ہی میں نے رابعہ سے کہا "میں تم سے بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔ تمہارا موڈ کیوں خراب ہے آخر؟"

"وہم ہے تمہارا" وہ بولی "اس وقت تو کورٹ جانا ہے مجھے۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے گھسیٹ کر ڈرائنگ روم میں لے گیا "بھاڑ میں گئی کورٹ۔ یہ دفتر نہیں ہے تمہارا جہاں سے تم نے مجھے بے عزت کرکے نکال دیا تھا اور میں خاموشی سے چلا گیا تھا۔"

"میں نے دیکھا تھا" وہ تلخی سے بولی "ہاتھ چھوڑو میرا اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ ایسے بات نہیں ہو سکتی۔"

غالب اور منظر بھی پریشان ہو کے ہمارے پیچھے آ گئے تھے۔

"ہاں ہاں۔ بات ویسے ہی ہوگی جیسے ہوتی ہے۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

"آج تک میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہوا۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔" رابعہ نے سپاٹ لہجے میں کہا "جو تم چاہتے ہو کرو۔"

"کیا مطلب لوں میں اس بات کا؟ تم نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"ہاں۔ صاف سننا چاہتے ہو تو سن لو۔ میں نے بہت کوشش کی تھی تمہارا ساتھ دینے کی۔ کوئی سوال کیے بغیر، کوئی جواز مانگے بغیر۔ بالکل غیر مشروط طور پر۔ اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر دیا تھا اور تم سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا۔ سوائے ایک وعدے کے۔ یہ وعدہ کہ آنے والا کل میرا ہوگا۔ مگر یہ خود فریبی تھی میری۔ تمہاری زندگی میں ایک دن... آنے والا ایک دن بھی میرا نہیں ہے شاید۔"

"تم بہت زیادتی کر رہی ہو۔"

"میں زیادتی کر رہی ہوں!" وہ طنز سے بولی "میں زیادتی برداشت کرتی رہی ہوں اب تک مگر میری قوت برداشت جواب دے گئی ہے۔ تم سمجھ لو کہ میں کمزور تھی، بزدل تھی، بے وقوف تھی یا بے وفا تھی۔"

"دیکھو رابعہ! خواہ مخواہ بات کو مت بڑھاؤ۔"

غالب نے کہا "بہتر ہے ابھی کوئی بات نہ کی جائے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ایسے حقیقت سے نظریں چرا کے کیا ہوگا۔ میں ہر الزام سننے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں تمہیں کوئی الزام نہیں دے رہی ہوں۔ تم خود مختار ہو، اپنی مرضی کے مالک ہو، مرد میدان ہو۔ میں ناقص العقل عورت ذات ہوں۔ تم مجاہد ہو، غفار کے قاتل ہی نہیں گروار کے غازی بھی ہو۔ تم ہیرو ہو۔ سب سے برتر ہو۔ سب وہی کرتے ہیں جو تم چاہتے ہو کیونکہ تم ایم آر ایس کے چیف ہو۔"

"لعنت بھیجو ایم آر ایس پر۔ اس سے رشتوں کا کیا تعلق ہے؟"

"رشتے اب تمہارے لیے ثانوی حیثیت اختیار کر چکے ہیں سکندر۔ تمہارے مقاصد اولیت رکھتے ہیں اور میں تسلیم کرتی ہوں کہ یہ مقاصد بہت بلند ہیں۔ مجھے تمہاری نیک نیتی اور خلوص پر شک نہیں۔ تم عزم اور حوصلے کے پیکر ہو۔ ساری عمر کسی نہ کسی سے لڑتے رہو گے۔ میں ایک بار پہلے بھی پسپائی اختیار کر چکی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ کہیں میری وجہ سے تم ہمت نہ ہار جاؤ اور دوبارہ الزام سے بچانے کے لیے میں پھر شریک سفر ہو گئی۔"

"پھر آج اچانک ایسی کون سی غلطی ہو گئی ہے مجھ سے؟"

"کوئی ایک غلطی ہو تو بتاؤں۔ میرے خیال میں تو تمہاری ساری زندگی اب ایک غلطی کا تسلسل ہے۔ تم زندگی سے مفاہمت بھی نہیں کرو گے۔ تم نے شکست کو انا کا مسئلہ بنا لیا ہے حالانکہ زندگی عبارت ہے کامیابی اور ناکامی کے دو رنگوں سے۔ بید جیسے درخت کا فلسفہ آدمی کو صرف جھکانا ہی نہیں سکھاتا، جھکنا بھی سکھاتا ہے۔"

میں اور غالب دم بخود بیٹھے رابعہ کے زہر بجھے لہجے میں اپنی فرد جرم سن رہے تھے۔ بدلا کچھ بھی نہیں تھا سوائے رابعہ کی نظر کے۔ چنانچہ وہی جو کل "قابل تعریف تھا" آج "قابل تعزیر" بن گیا تھا۔ شاید منظر کو معلوم تھا کہ رابعہ کیا کہے گی۔ رابعہ پہلے ہی اسے اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کر چکی ہوگی کہ وہ خاموش بیٹھا رہا جو اس کی فطرت کے خلاف تھا اور پھر کورٹ جانے کا عذر پیش کرکے اٹھ گیا۔ منظر کی بیوی نے بھی بحث ضرور سنی ہوگی مگر اس نے اندر آ کے نہیں جھانکا۔ اسے منظر نے منع کر دیا ہوگا کہ تم نے دخل دیا تو شاید بات اور بگڑ جائے گی۔

منظر نے کہا "اب یہ جھگڑا ہمارے راستے سے۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے لے آتے ہیں لوگ ایسی چیزیں۔"

غالب کو صرف بہانے کی تلاش تھی۔ وہ فوراً اٹھ گیا "میں ذرا گاڑی ہٹا دوں۔"

میں نے اس کے جاتے ہی رابعہ کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی "دیکھو رابعہ! بحث سے کچھ حاصل نہیں۔"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "میں خود بحث میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔"

"میں سارے الزامات قبول کرنے کو تیار ہوں۔ تم مجھے ایک موقع دو۔"

"موقع دینے کی بات مت کرو۔ مواقع بہت آئے تھے لیکن تم نے گنوا دیے" وہ تند لہجے میں بولی "تم اپنی انا پسند خود فریبی اور خود فریبی کے جال سے نہیں نکل سکے ورنہ حالات بالکل مختلف ہوتے۔ آج معاملات تمہارے اختیار سے باہر ہو چکے ہیں۔ اب تم کچھ نہیں کر سکتے سکندر۔ تم ساری دنیا کو فتح نہیں کر سکتے۔"

میرا غصہ ایک دم بھڑک اٹھا "میں نے کب دعویٰ کیا تھا سکندر اعظم بننے کا۔ میں نے اپنا حق حاصل کرنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا؟ کیا یہ میری غلطی تھی؟"

"دیکھو! عدلیہ میں آنے کی ضرورت نہیں۔ تم میں حوصلہ ہے ناانصافی کا سامنا کرنے کا تو بات کرو ورنہ چھوڑو۔ تم اپنی دنیا میں خوش، میں اپنی دنیا میں" رابعہ نے بے رخی سے کہا۔

"تمہارے بغیر میری دنیا اور میرے بغیر تمہاری دنیا نامکمل ہے۔"

"مجبوری میں نامکمل زندگی بھی قبول کرنی پڑتی ہے۔ اپاہج بھی تو جیتے ہیں لوگ اور ہوش و حواس سے محروم ہو کے جانوروں کی طرح پاگل خانے کے پنجرے میں بھی۔ میرے اور تمہارے نصیب میں یہی تھا۔"

"ایسا مت کہو پلیز! ایسا نہیں ہے۔"

"ایسا ہے سکندر۔ حقیقت کو تسلیم کر لو" رابعہ نے کہا "یہ تمہاری اپنی زندگی ہے، کسی اور کی نہیں ہے جسے تم ضائع کر رہے ہو۔"

"کیسے؟ ذرا مجھے سمجھاؤ۔" میں نے پُرسکون ہونے کے لیے پانی کا ایک گلاس پی لیا اور آرام سے بیٹھ گیا۔

"میں تم سے سوال کروں گی۔ فرض کرو کہ تم عدالت میں ہو۔ تمہیں میرے ہر سوال کا جواب ہاں یا نہیں میں دینا ہے۔ میں کسی آزمائش میں نہیں ڈالوں گی تمہیں۔ ہر سوال کا ایک واضح جواب ہوگا۔"

"او کے۔ میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔" میں ہنس کے اٹھ کے صوفے کے پیچھے چلا گیا۔

"میں نے بہت غور کیا اور چونکہ تمہاری زندگی کی کتاب کا کوئی ورق ایسا نہیں تھا جو میں نے نہ پڑھا ہو، اس لیے میں نے اس بات سے تمہارے حالات میں تمہاری ذمہ داری کو دیکھا۔ جب تم اس قابل تھے کہ ذمہ داری کو سمجھتے تھے اور نبھا بھی سکتے تھے۔ جب تم اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے تو تمہارے والد بوڑھے ہو رہے تھے۔ تمہارے سوا ان کا کوئی نہیں تھا۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔"

"کیا اس وقت تمہارا تعلیم کے لیے بیرون ملک جانا ضروری تھا اور کیا یہ تعلیم یہاں مکمل نہیں کی جا سکتی تھی؟"

"نہیں۔ لیکن میں مجبور تھا۔"

"تم نے اپنے والد کو دل سے قائل کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"ہاں۔ مگر وہ مانے نہیں۔"

"اگر تم انکار کر دیتے تو کیا اس نافرمانی پر وہ تمہیں عاق کر دیتے؟"

"نہیں... لیکن..."

اس نے مجھے آگے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ "ولایت میں جب ہوتے تم تو اپنے والد کا اتنا خیال نہیں رکھا جتنا رکھنا چاہیے تھا۔"

"ہاں... میں اپنی کوتاہی کو تسلیم کرتا ہوں۔"

"تم نے تعلیم بھی مکمل نہیں کی۔ تمہارا زیادہ وقت غیر نصابی سرگرمیوں میں صرف ہوا۔ محسن کے ساتھ... تم ایک غیر ذمے دار بیٹے ثابت ہوئے اور تم اپنے والد کی توقعات پر بھی پورے نہیں اترے۔ رائٹ؟"

"رائٹ" میں نے کہا۔

"تمہیں مجرمانہ سرگرمیوں کی بنا پر ڈی پورٹ کیا گیا۔ تم خود نہیں آئے، نکالے گئے؟"

"ہاں۔ مگر وہ سازش تھی۔"

"میں اسباب پر بحث نہیں کر رہی ہوں۔ حقائق کی نفی کرو یا انہیں مانو۔" رابعہ نے کہا "واپس آنے کے بعد تم نے اندازہ کر لیا کہ تمہارے والد کو چوہدری دلاور اینڈ کمپنی نے تمام املاک سے محروم کیا اور پھر مروا دیا؟"

"ہاں۔ مجھے ثبوت مل گیا تھا۔"

"پھر تم یہ ثبوت لے کر عدالت میں کیوں نہیں گئے؟ تم نے مقدمات کیوں دائر نہیں کیے؟ ایف آئی آر کیوں نہیں کٹوائی؟"

"مجھے معلوم تھا کہ اس سے کچھ نہیں ہوگا۔"

"چنانچہ تم نے قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کیا تمہارا یہ فیصلہ ٹھیک تھا؟"

"نہیں... مگر..."

"اگر مگر چھوڑو۔ تم اپنے حق وراثت کا مقدمہ بھی دائر کر سکتے تھے۔ منظر جیسے دوست اور قابل وکیل کی موجودگی میں تم دلاور سے پائی پائی وصول کر لیتے۔ بے شک اس میں کافی وقت صرف ہوتا لیکن اپنے ہاتھ میں قانون لے کر تم نے کیا پا لیا؟ کیا تمہیں تمہارا حق مل گیا؟"

میں نے جھنجلا کے کہا "نہیں۔"

"تم نے معلوم کر لیا تھا کہ میر شرافت علی کا قاتل کون ہے اور تمہارے والد کا قاتل استاد پیڈرو ہے۔ کیا تم ان کا کچھ بگاڑ سکے؟"

"نہیں... لیکن..."

"تمہارے والد کی لاش پوسٹ مارٹم سے قبل ہی کھود کے نکال لی گئی۔ کیا تمہیں یہ معلوم ہوا کہ اب ان کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں؟"

میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرہ تپ رہا ہے اور میں نے وحشت کی کیفیت میں صوفے کو یوں دبوچ رکھا ہے جیسے وہ دلاور کی گردن ہو اور میں اسے گلا گھونٹ کے جان سے مار دینا چاہتا ہوں۔

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں" میں نے چیخ کے کہا۔

"ابھی سے حوصلہ جواب دے گیا سکندر؟"

"تم حالات کو نظرانداز کر رہی ہو۔" میں نے غصے میں

www.paksociety.com

پُھنکارتے ہوئے کہا۔

"میں صرف نتائج کی بات کر رہی ہوں۔ ریاضی کے دقیق مسائل حل کرنے میں بڑا وقت لگتا ہے اور بہت محنت ہوتی ہے مگر اس کا جواب ایک ہی ہوتا ہے' خواہ طریقہ کوئی بھی اختیار کیا جائے۔ حل کمپیوٹر سے نکالا جائے یا کاغذ پنسل سے۔"

میں تھک کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ "رابعہ! خدا کے لیے بس کرو۔"

"نہیں۔ فیصلہ آج ہو جانا چاہیے۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے چوہدری دلاور کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تھا۔ کیا اسے شکست ہوئی؟"

"نہیں۔"

"تم نے غداروں اور علیحدگی پسندوں کی سازش کے خلاف جہاد کیا۔ کیا اس سے کچھ حاصل ہوا؟ تم اس ملک کو ٹوٹنے سے بچا سکے؟"

"نہیں" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے کہا "میں مانتا ہوں..."

"تمہارے سارے فیصلے غلط تھے سکندر۔ تم ایک خیالی' غیر حقیقی دنیا کے آئیڈیلسٹ تھے۔ اگر تم حقیقت شناس ہوتے تو اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی کو ایک لاحاصل جنگ میں داؤ پر نہ لگاتے۔ تم کو چوہدری دلاور نے ابتدا ہی میں بڑی معقول پیشکش کی تھی۔"

"تم۔ تم یہ کہہ رہی ہو...؟"

"تم اس کے پارٹنر بنتے... جتنا وہ تمہیں نقصانات کی تلافی کے طور پر دے رہا تھا وہ لے کر کہیں بھی سیٹل ہو جاتے۔ اس نے واپس برطانیہ بھیجنے کی آفر بھی دی تھی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو معاف کر دیتا' اس کے ہاتھ اپنا ضمیر بیچ دیتا' اپنے والد کے خون کی قیمت وصول کر لیتا؟"

"بعد میں بھی کیا ملا تمہیں؟ تم اس سے نہ بدلہ لے سکے' نہ اپنا حق۔ الٹا تم نے اپنے ساتھ اپنے مخلص دوستوں کے مستقبل کو بھی ایک بے مقصد جنگ میں جھونک دیا۔"

"اسے تم ایک بے مقصد جنگ کہتی ہو!" میں نے لات مار کے میز الٹ دی۔

"ہاں۔ اس میں اپنی ماں گنوا دی میں نے' اپنا گھر گنوا دیا۔ اپنا کیریئر گنوا دیا۔ محسن کو دیکھو' نازو کو دیکھو۔ ان سب کے پاس کیا رہا؟ محسن کی بیوی بچے اس جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے جو صرف تمہاری جنگ تھی۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہاری سوچ اس حد تک پست ہو جائے گی۔"

"حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا سکندر۔ چھوڑو اسے جو ہو گیا۔ آج کی بات کرو۔ یہ دیکھو کہ تم کہاں کھڑے ہو۔ ایک بار پھر تم نے چوہدری دلاور کی مصالحت کی پیشکش کو مسترد کر دیا ہے حالانکہ وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے تم سے معافی مانگی' اور برملا جرم تسلیم کیا' استاد پیڈرو کو تمہارے حوالے کرنے کا وعدہ کیا' تمہارا حق تمہیں لوٹانے کے علاوہ اس ذہنی و جسمانی اذیت کا تاوان ادا کرنے کا وعدہ کیا جو تم نے برداشت کی لیکن تم نے اس کے خلاف محاذ آرائی ختم نہیں کی۔"

"یہ سب میں کروں گا بھی نہیں رابعہ۔"

"ضد کرو۔ تمہارے خلاف تمام پرانے مقدمات پھر کھل جائیں گے۔ اس دن جب تم میری پروا کیے بغیر استاد پیڈرو کے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے تھے تو مجھے چوہدری دلاور نے روک لیا تھا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اس کی بات سنوں اور میں نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ بس اب بہت ہو چکی' میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اس کے ساتھ چلی گئی اور اس نے مجھے سب سمجھا دیا کہ اس کے کیا عزائم ہیں اور وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔"

"لعنت بھیجو اس پر۔ مجھے بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟"

رابعہ نے کہا "میں یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنی زندگی گزارو۔ اپنے لیے اور اپنی مرضی سے۔ اپنی خوشی کے لیے اور اپنے مستقبل کی خوشحالی کے لیے۔ اپنے دوستوں کے لیے اور چاہنے والوں کے لیے۔ تمہارا گھر تمہیں واپس مل گیا ہے اور میرا گھر دلاور نے میرے حوالے کر دیا ہے۔ وزیر خان مرحوم کی ساری دولت اور جائداد جس پر تمہارا حق تھا' تمہیں کسی قانونی یا غیر قانونی جھگڑے کے بغیر مل جائے گی۔ علاوہ جرمانے یا تاوان کے۔ تم وزیر خان ٹرسٹ ہسپتال چلاؤ۔ سرمایہ فراہم ہو جائے تو اپنا بزنس کرو۔ میں اپنی پریکٹس کروں۔ غالب چاہے تو اپنا ایک اخبار نکالے یا صحافت میں نام پیدا کرے لیکن چوہدری دلاور سے دشمنی کی خاطر نہیں۔ سیاست بڑا بدنام پیشہ ہے اور چوہدری دلاور جیسے لوگوں کو راس آتا ہے۔ تم اس کی جتنی مخالفت چاہو کرو' وہ نہیں ہو گا تو اس جیسا کوئی دوسرا ہو گا۔ تم جیسے چوہدری دلاور کی راہ میں حائل ہوں گے تو حشرات الارض کی طرح روند دیے جائیں گے۔ سیاست کی غلاظت کو سیاست دانوں کے لیے چھوڑ دو۔ ہم سب اپنی صاف ستھری' خوب صورت اور خوشیوں سے معمور زندگی ان سارے خطرات اور مسائل سے بے نیاز ہو کے گزار سکتے ہیں۔ چوہدری دلاور کا وعدہ ہے کہ تمہارے خلاف سارے مقدمات داخل دفتر ہو جائیں گے اور کل اگر وہ اقتدار کی کرسی پر بیٹھے گا تو کسی کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں کرے گا۔ ہمارے تعاون کا بدلہ ضرور ادا کرے گا۔"

میں نے کہا "بس۔ یہی کہنا تھا تمہیں یا کچھ باقی ہے؟"

"نہیں۔ اور مجھے کچھ نہیں کہنا۔ فیصلہ اب تمہارے اختیار میں ہے۔"

میں نے سوچ سوچ کے کہنا شروع کیا "یہ بہت اچھا ہوا مس رابعہ چوہدری ایڈووکیٹ! اگر تم نے مجھے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر کے میری فردِ جرم پڑھ کر سنا دی۔ بلکہ عائد کر دی۔ اس سے میری غلط فہمی دور ہو گئی۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ تم صرف روٹھ گئی ہو۔ جیسے محبت کرنے والے روٹھ جاتے ہیں۔ لیکن مجھ پر انکشاف یہ ہوا کہ تمہارے نظریات اور خیالات یکسر بدل گئے ہیں۔ یہ انقلاب اچانک نہیں آیا۔ یقیناً تمہارے وجود میں شکست و ریخت کا عمل بہت پہلے سے جاری تھا لیکن تم امیدوں کے سہارے پر عہدِ رفاقت نبھا رہی تھیں۔ اچانک کچھ نہیں ہوتا۔ بظاہر تندرست نظر آنے والا اچانک حرکتِ قلب بند ہونے سے مر جاتا ہے۔ خود اسے یا دیکھنے والوں کو اندازہ نہیں ہوتا کہ اندر اس کے دل کی حالت کیا ہے۔ ہائی بلڈ پریشر کو خاموش قاتل SILENT KILLER کہا جاتا ہے۔ کولیسٹرول کی زیادتی اور ذیابیطس کی موجودگی کا بھی پتا نہیں چلتا۔ یہی تمہارے ساتھ ہوا۔ آج میں ایک نئی رابعہ کو دیکھ رہا ہوں جس کے پاس مجھے غلط ثابت کرنے کے لیے ہر دلیل ہے۔ مجھے مسترد کرنے کے لیے ہر جواز ہے۔ میرے نظریات اور خیالات سے اختلاف کی وجہ ہے اور میرے اعمال کو میری فردِ جرم بنانے کی خواہش ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے یہ نئی رابعہ میرے جذباتی استحصال پر یقین رکھتی ہے۔ اس کے پاس اعتماد ہے کہ سکندر کی سب سے بڑی کمزوری اس کی محبت ہے۔ اس کی محبت کو بلیک میل کیا جا سکتا ہے اور اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی ہر بات منوائی جا سکتی ہے۔ آج تک میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آزمائش کی ایسی گھڑی میں میرا فیصلہ کیا ہو گا اور میں واقعی نہیں جانتا کہ بالآخر میں کیا کروں گا۔ وہی جو تم چاہتی ہو یا وہ جو میں چاہتا ہوں۔ لیکن میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ اس دنیا میں انسانوں کے دو گروہ ہمیشہ برسرِپیکار رہے ہیں۔ بے شک غالب وہی نظر آتے ہیں جنہوں نے سقراط کو زہر کا پیالہ پلایا' عیسیٰ کو مصلوب کیا اور حسین کو کربلا میں شہید کیا۔ لیکن شکست بالآخر انہی کی ہوئی۔ دورِ حاضر کی تاریخ اٹھا کے دیکھ لو' پاکستان کی تاریخ پڑھ لو۔ تمہیں مثالیں بہت نظر آئیں گی لیکن ایک تیسرا گروہ سب سے بڑا ہے جو نہ تاریخ کے صفحات میں نظر آتا ہے اور نہ عہدِ حاضر میں اس کا وجود محسوس ہوتا ہے۔ یہ لوگ سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں جو ظلم برداشت کرتے ہیں مگر اس کے خلاف فریاد نہیں کرتے۔ ناانصافی کو محسوس کرتے ہیں مگر آواز نہیں اٹھاتے۔ برائی دیکھتے ہیں' اسے برائی سمجھتے ہیں مگر برائی نہیں کہتے۔ یہ خود غرض اور مفاد پرست لوگ ہی ساری خرابی کی بنیاد بنتے ہیں کیونکہ وہ اکثریت میں ہیں اور اگر وہ متحد ہوں اور ان میں غلط کو غلط کہنے کی ہمت ہو تو کسی کی مجال کہ ظلم کرے' ناانصافی کرے یا استحصال کرے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ چند افراد بزورِ بازو' دولت کی طاقت سے یا شیطانی قوت کی مدد سے خاندان' معاشرے' ملک اور پھر اس دنیا میں ظلم اور ناانصافی' گناہ اور جرم' بدی اور بے ضمیری کے بیج بوتے ہیں اور چند سر پھرے ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اکثریت خاموش تماشائی بنی رہتی ہے کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا' ہمیں کیا۔ ہم کیوں پڑیں اس چکر میں۔ ہم نے کوئی ٹھیکا لیا ہے دنیا کے اخلاق و کردار کا۔ میاں' جس قوم کو انبیاء اور اولیا' مقدس صحیفے' قانون کی کتابیں اور مارشل لاء کے ڈنڈے نہ ٹھیک کر سکے' اسے ہم راہِ راست پر لا سکتے ہیں؟ یہ بے بسی کا اعتراف' بے چارگی کا شکوہ اور شکست خوردہ ذہنیت کی پست ہمتی کی دیمک ہے جو قوموں کو زوال کی طرف لے جاتی ہے۔ میری بدقسمتی ہے کہ تم مجھے اس تیسرے گروہ میں شامل دیکھنا چاہتی ہو۔ آئی ایم سوری رابعہ۔ یہ ناممکن ہے کہ چوہدری دلاور جیسا شخص اس ملک کا لیڈر بنے جس کے لیڈروں میں قائداعظم' قائدِ ملت' سردار نشتر اور مولوی تمیز الدین جیسے لوگ تھے۔ اس قوم کی قیادت کا قبلہ درست رکھنے کی ذمے داری مجھ پر بھی اتنی ہی عائد ہوتی ہے جتنی تم پر۔ اور میں جانتے بوجھتے اس فرض سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔ یہ ناممکن ہے کہ میں اپنے ضمیر کو دھوکا دوں اور مطمئن رہوں۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمہاری بات مان کے میں "راہِ راست" پر آ جاؤں' اپنے کام سے کام رکھوں' پیسے کو مقصدِ حیات بنا لوں۔ ہم شادی کر لیں اور ٹھاٹ سے رہیں۔ چوہدری دلاور وزیر ہو جائے تو ہم اس کے حضور سلامی پیش کرنے جایا کریں۔ مرزا غالب اخبار میں ان کی قصیدہ خوانی کرے اور سرکاری اشتہارات لیتا رہے۔"

اچانک میں نے محسوس کیا کہ رابعہ میری بات سن ہی نہیں رہی ہے۔ میں اپنی دھن میں بولتا جا رہا ہوں مگر اس نے جیسے اپنے کان بند کر لیے ہیں اور ذہن کی سوچ کے سامنے بے حسی کی دیوار کھڑی کر دی ہے۔

میرے خاموش ہوتے ہی اس نے کہا "سکندر! بحث سے کچھ نہیں ہو گا۔ بدلے ہوئے حالات کو دیکھو اور سمجھو۔ ہم نے بہت وقت گنوا دیا ہے۔ کیا تم ساری زندگی گنوا دینا چاہتے ہو؟"

"یہ تو نقطۂ نظر کا فرق ہے۔ جسے تم گنوانا کہتی ہو اسے میں کمانا سمجھتا ہوں۔ کسی نے ایک ہزار ایک مستحق کو دیے تو اس نے سکۂ رائج الوقت میں واقعی گنوایا مگر اس نے بہت کچھ کمایا۔ ثواب' نیکی' سکونِ قلب..."

"یہ فلسفہ ہے اور میں ایک وکیل ہوں۔ وکیل سے بھی پہلے میں ایک عورت ہوں۔ میری فطرت کے تقاضے کچھ اور ہیں جن کو تم مسلسل نظر انداز کر رہے ہو۔ دیکھو گل اور محسن کو' انہوں نے کتنا صحیح فیصلہ کیا۔ آخر وہ کب تک تمہارا ساتھ دیتے؟ غالب اور نازو بھی ایک دن یہ سمجھ لیں گے کہ زندگی سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا ہوں رابعہ۔ ہم اس دوراہے پر آ گئے ہیں جہاں ایک طرف تمہاری زندگی کے مقاصد ہیں اور دوسری طرف میرے

www.paksociety.com

اصول۔۔۔"

وہ ایک دم التجا پر آگئی "سکندر! پلیز! اتنی عجلت میں فیصلہ مت کرو۔"

"فیصلہ تمہیں کرنا ہے رابعہ! مجھے نہیں۔ میں آج بھی وہی ہوں جو کل تھا۔ بدلی تم ہو" میں نے کہا۔

"دیکھو! غالب اور نازو سے بھی مشورہ کرلو۔ ہم سب مل کے بیٹھتے ہیں اور سوچتے ہیں۔"

"تم نے پہلے ہی واضح کردیا تھا کہ تم بہت خود غرض ہوچکی ہو۔ اور سوچ سمجھ کے ہی تم نے میرے خلاف ایک کیس بنا رکھا تھا۔ اس میں مدعی بھی تم ہو اور منصف بھی تم۔ جو تم چاہتی ہو وہ میرے لیے ممکن نہیں۔"

"سب کچھ ہوسکتا ہے سکندر۔" اس کے آنسوؤں کا وہ ریلا جسے وہ بہت دیر سے روکے ہوئے تھی' ایک دم بہہ نکلا۔

"رابعہ! مجھے تمہاری خوشی کی راہ میں اپنے مسائل کے ساتھ حائل ہوکے کچھ نہیں ملے گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنی زندگی گزارو اور خوش رہو۔ مجھے میری مرضی سے جینے دو۔ ہم اچھے دوست بن کے رہیں گے اور کبھی حالات پھر موافق ہوئے تو اپنی زندگی کے بارے میں بھی سوچیں گے۔"

"وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا سکندر۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری توقعات پر پورا نہ اتر سکا حالانکہ تم نے میری خاطر بہت دکھ جھیلے' بہت قربانیاں دیں۔ لیکن اس کے بدلے میں اپنی ساری جدوجہد کو قربان نہیں کرسکتا' اپنے اصول اور آئیڈیل قربان نہیں کرسکتا۔"

"تم نے مجھ سے بھی وعدے کیے تھے" وہ روتے ہوئے بولی۔

"وہ وعدے تھے۔ امیدوں اور خواہشوں کے خواب تھے۔ سر تسلیم خم کرنے کے غیر مشروط عہد نامے نہیں تھے۔ آج تم کہتی ہو کہ خود کو دلاور کے ہاتھ اس کی قیمت پر فروخت کردو میرے لیے تو تمہارے لیے یہ سکندر کی محبت کی توہین نہیں ہے۔ اگر کبھی تم یہ کہنے لگو کہ دلاور کے بزنس پارٹنر بن جاؤ تو کیا تمہاری محبت میں مجبور ہوکے میں یہ بات مان لوں گا؟"

"میرا دماغ خراب نہیں ہے کہ ایسی بات میرے ذہن میں بھی آئے" رابعہ چیخ کے بولی "میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم کچھ نہ کرو۔ چوہدری دلاور پر لعنت بھیج کے سارے معاملات سے لاتعلق ہوجاؤ۔ وہ کچھ بھی کرے۔ غلط کام کرے گا تو وہ خمیازہ بھگتے گا۔ جرم کرے گا تو پکڑنے والا قانون ہے۔ گناہ کرے گا تو خدا اس کے نامۂ اعمال میں لکھے گا۔"

"رابعہ! حقوق العباد کو ترک کرنے کا مطلب سمجھتی ہو؟" میں نے افسوس سے کہا "یہ خود غرضی نہیں' کمینگی ہے۔ وہ شخص انسان کہلانے کے قابل نہیں جو دوسروں کے حقوق کو تسلیم نہ کرے۔ ایک آدمی اپنے خاندان کی پروا نہیں کرتا۔ دوسرا کہتا ہے چوری اور ڈکیتی والے جائیں بھاڑ میں۔ تیسرا کہتا ہے کہ ملک میں جو ہوتا ہے ہوا کرے' مجھے کیا۔ چوتھا کہتا ہے' کیسی انسانیت' کہاں کی انسانیت۔ لعنت سب پر۔ مجھے بتاؤ ہم کس کلاس میں ہیں؟ میرے اور تمہارے جیسے تعلیم یافتہ' مہذب' حساس اور باضمیر شخص کو کیا ہونا چاہیے؟"

"آدمی کو خدائی فوجدار بھی نہیں ہونا چاہیے۔ سارے جہان کے ساتھ اپنی فکر بھی کرلی چاہیے۔ کیا خود کو نظرانداز کرنا اور اپنی ذات کی نفی جائز ہے؟ اپنی زندگی کی کوئی قدر و قیمت' کوئی اہمیت اور کوئی ضرورت نہیں؟ میں کب کہتی ہوں کہ سوسائٹی یا ملک و قوم کے لیے کچھ مت کرو۔ لیکن اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے تم کیا کررہے ہو؟"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "تم نہیں سمجھوگی رابعہ۔ یہ سب میں ایک بہتر مستقبل کے لیے کررہا تھا۔ میرے اور تمہارے لیے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تم اپنا مستقبل تباہ کررہے ہو۔ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہو۔ مجھے بتاؤ' کتنے مقدمات ہیں تمہارے خلاف؟ کتنے مقدمات میں تمہاری ضمانت منسوخ ہوچکی ہے؟ تمہارے خلاف ناقابل ضمانت وارنٹ ہیں اور تم مفرور قرار دیے جاچکے ہو۔ بہت جلد تم پکڑے جاؤگے اور پھر تمہاری باقی زندگی جیل میں گزر جائے گی۔ تمہاری جذباتی سرکشی' باغیانہ خیالات اور انقلابی طبیعت جیل کی سلاخوں کے پیچھے دم توڑ دے گی۔ تم نہیں جانتے کہ جیل کے اندر کیا ہوتا ہے۔ آدمی کی حیثیت ایک جانور سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کا باہر کے قانون' مہذب دنیا اور بنیادی آئینی حقوق اور انسانی حقوق کے عالمی منشور سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ اس کے ساتھ کتے سے بدتر سلوک ہوتا ہے اور اس کی دُم تک سیدھی کردی جاتی ہے۔ اسے بھوکا مار دیا جاتا ہے۔ ذہنی اذیت سے مریض بنا کے پاگل خانے بھیج دیا جاتا ہے' یہاں تک کہ مار بھی دیا جاتا ہے۔ باہر والے آزاد ہوتے ہیں اور طاقتور ہوں تو کچھ بھی کراسکتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ ایسی باتوں سے میں خوف زدہ ہونے والا نہیں ہوں۔" میں نے کہا "میں مرجاؤں گا مگر چوہدری دلاور سے زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا اور رحم کی درخواست نہیں کروں گا۔ یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ چوہدری دلاور جانتا ہے کہ میں اکیلا اور لاوارث نہیں ہوں۔ میں اس کی زندگی کی ضمانت ہوں۔ مجھے کچھ ہوا تو وہ بھی مارا جائے گا۔ اسی طاقت کے توازن کی وجہ سے وہ مجھے آج تک مار نہیں سکا۔ وہ کبھی مذاکرات کرتا ہے' کبھی مجھے خریدنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی میری کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے تمہیں یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کیا ہوگا۔ اس نے تمہیں دہشت زدہ کردیا ہے۔"

"یہ غلط ہے" رابعہ چلائی۔

"تمہاری سوچ اور فطرت میں یہ انقلاب ایسے ہی نہیں آیا۔ ضرور اس نے تمہیں کوئی ڈونری ہے۔ میں سنگل نظم' جادو ٹونے پر تو یقین رکھتا نہیں ورنہ یہ سمجھتا کہ تم پر کسی نے کچھ کردیا ہے۔"

"مجھے نہ کچھ ہوا ہے نہ ہوگا سکندر۔ تم دیکھو کہ جو تمہیں مل رہا ہے تم اسے بھی ٹھکرا رہے ہو۔ مجھے' ایک پُرسکون زندگی کو' بحال مستقبل کو' وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کو۔۔۔"

"جو میرے نصیب میں ہے وہ مجھے مل جائے گا۔ اس کے لیے میں جدوجہد کروں گا اور اپنا حق حاصل کرکے رہوں گا۔"

"تم اب سیاست میں پڑنا چاہتے ہو؟"

"میں چوہدری دلاور کو سیاست سے باہر رکھنا چاہتا ہوں۔ میرے باپ کا قاتل میرا لیڈر بنے' خدا اور وطن کو بیچ کر وطن کی سند لے کر چور ڈاکو اس ملک کے حکمران ہوں' یہ میں نہیں ہونے دوں گا۔"

"تم مزید مشکلات میں گرفتار ہوجاؤگے۔ تمہارے خلاف اور مقدمات بن جائیں گے۔"

"میں ڈرنے والا نہیں ہوں رابعہ۔ چوہدری دلاور بھی جانتا ہے کہ وہ مجھے آسانی سے اپنی راہ سے نہیں ہٹا سکتا ورنہ وہ اتنا تردد نہیں کرتا۔ اس کا کیپٹن بھی داؤ پر لگا ہوا ہے۔ میں' محسن اور گل' غالب' نازو اور رابعہ۔۔۔ معاف کرنا' تمہارا نام میں نے روانی میں لے لیا۔ تم شاید اب ہمارے ساتھ نہیں ہو مگر ہم سب چوہدری دلاور کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں وہ اس کی راتوں کی نیند حرام کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ کس کس کو مروائے گا' کس کس کی زبان پر تالے ڈالے گا۔ اس کا ماضی ہی اس کے مستقبل کا سب سے بڑا آسیب ہے۔"

"جذباتی مت بنو سکندر۔ اپنی قانونی پوزیشن کو دیکھو۔"

"یہ کام تمہارا تھا۔ تم سے پہلے منظر کا تھا" میں نے کہا۔

"پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔"

"اور کب تک تمہاری حد تک میں یہ بھول جاتا ہوں کہ تم میری وکیل تھیں۔ میں وہ وکالت نامہ بھی منسوخ کردوں گا۔ منظر میری نمائندگی کرسکتا ہے۔"

"تم غصے میں ہو۔ غلط مطلب نکال رہے ہو میری بات کا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "جیسا کہ تم نے کہا' ہم اچھے دوست رہیں گے مگر میں کبھی تمہارے آفس میں تم سے ملنے نہیں آؤں گا۔"

"میں اپنے پرانے گھر میں شفٹ ہورہی ہوں۔"

"پرانا گھر!" میں نے تلخی سے کہا "پرانا کیا ہے وہاں؟ صرف وہ سنگ بنیاد ہے جو اس عمارت کے نیچے ہے۔ بالواسطہ طور پر چوہدری دلاور کا یہ تحفہ تمہیں مبارک ہو۔ اس نے یہ محل چاندنی بیگم کو نواز دیا تھا۔ پھر تمہیں بخش دیا۔ سارے نقصانات کی تلافی ہوگئی۔ تمہارے سارے شکوے گلے دور ہوگئے۔ لاکھوں کی مالیت اور کئی گنا مالیت کی جائیداد۔ پھر تمہیں بخش دیا کے بعد چوہدری دلاور کی وکالت کرنا تمہارا اخلاقی فرض ہے۔"

"سکندر! نکل جاؤ۔" رابعہ نے چیخ کے کہا "کمینے' ذلیل انسان۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم۔ میں دلاور کی داشتہ ہوں' طوائف ہوں چاندنی بیگم کی طرح۔"

اس نے دیوانگی کی کیفیت میں مجھ پر چیزیں پھینکنی شروع کردی تھیں۔ چائے کے کپ' چائے دانی' ایش ٹرے۔ وہ ہذیانی طرح چیخ رہی تھی اور سوچے سمجھے بغیر جو ہاتھ میں آرہا تھا پھینک رہی تھی۔ نشانہ خطا ہوجانے سے بہت سی چیزیں کھڑکیوں پر لگیں اور ان کے شیشے بکھر گئے۔ میں جان بچا کے نکل سکتا تھا مگر مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اس ذہنی کیفیت میں خود کو زخمی نہ کرلے یا دیوار سے ٹکرا کے سر نہ پھوڑ لے۔

منظر کی بیوی دروازے سے لگی سب سن رہی تھی۔ وہ ایک دم اندر آگئی۔ اس نے رابعہ کو پکڑ لیا "تم جاؤ بھیا۔ یہ تو دیوانی ہوگئی ہے۔ رابعہ! اے رابعہ! ہوش میں آ۔ یہ کیا پاگل پن ہے۔ یا خدا۔ میں کیا کروں۔ ارے تم تو جاؤ یہاں سے۔ تمہیں دیکھ کے اور پاگل ہورہی ہے یہ تو۔"

میں نے جاتے جاتے دیکھا کہ منظر کی بیوی رابعہ سے چمٹ گئی تھی۔ اندر سے تین بچے روتے دھوتے نمودار ہوگئے تھے۔ باہر سے غالب نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ وہ منظر کے ساتھ باہر گیا تھا تو پھر لوٹ کے اندر نہیں آیا تھا۔ وہ اور منظر باہر نہ جانے کیا باتیں کرتے رہے تھے کیونکہ میں نے کافی دیر بعد منظر کی گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز سنی تھی۔

غالب نے اندر جاکے منظر کی بیوی کی مدد کی ورنہ رابعہ اس کے قابو میں آنے والی نہیں تھی۔ غالب نے اس کا بالکل ٹھیک علاج کیا۔ وہ غالب کی طرف لپکی تھی مگر غالب نے اس کے کھا کے ایک تھپڑ رسید کیا جو اس کے گال پر پڑا اور وہ ایک جھٹکے سے پیچھے جا گری۔

"میں سکندر نہیں ہوں" غالب نے دہاڑ کے کہا "دماغ درست کردوں گا۔"

منظر کی بیوی ڈر گئی تھی مگر غالب نے اسے آنکھ کے اشارے سے سمجھا دیا کہ یہ علاج بالکل ٹھیک ہے اور ناگزیر ہے۔

"تم سب ذلیل ہو۔ تمہارا وہ دوست بھی مجھے الزام دیتا ہے کہتا ہے میں بک گئی ہوں۔" رابعہ چلانے لگی اور پھر غالب کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

غالب نے اس کے دوسرا تھپڑ رسید کیا "بکواس بند کرو اپنی۔ خبردار جو تم نے سکندر کو کچھ کہا۔"

رابعہ صوفے پر گری اور روتے روتے بے ہوش ہوگئی۔ اس کے بعد ہم نے فون کرکے ڈاکٹر کو طلب کیا اور ڈاکٹر نے اسے سکون آور انجکشن دے کر ہمیں تاکید کردی کہ رابعہ پر نظر رکھیں۔

"جب یہ سو کر اٹھیں گی تو ایک نیچرل ری ایکشن ہوگا۔ شدید

www.paksociety.com

جسم کا اپریشن" ڈاکٹر نے کہا "ایسی کیفیت میں یہ خودکشی کی کوشش بھی کر سکتی ہیں۔"

منظر کی بیوی نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہائے اللہ! ڈاکٹر صاحب! آپ کوئی ایسی دوا دیں نا... کہ خودکشی کا خیال بھی نہ آئے۔"

"دوا تو دے دی ہے مگر ایسے نفسیاتی مسائل کا حل ایک گولی یا ایک انجکشن نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "ان کا اعتماد بحال ہونا چاہیے۔ زندگی پر اور اپنے رشتوں پر۔ اپنے آپ پر۔ انہیں احساس دلائیں کہ آپ سب کو ان کی ضرورت ہے اور اگر کوئی مسئلہ ہے تو وہ ان کی خواہش کے مطابق حل ہو جائے گا۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا اور سر ہلایا "اس کے لیے جھوٹ بولنا پڑے گا۔"

"تو بھائی بولو۔ ایک جان بچانے کے لیے ایک جھوٹ نہیں بول سکتے! اور نہ جانے کتنے جھوٹ بولتے ہوگے اپنے فائدے کے لیے۔" بوڑھا ڈاکٹر برہم ہو گیا۔

غالب نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ یہ وقتی ردِعمل تھا۔"

"میں جانتا ہوں اس لڑکی کو۔ تم سے زیادہ" وہ بولا "یہ وکیل تھی اور بہت نامور وکیل تھی۔ اس کا باپ میرا دوست تھا۔ مجھے معلوم ہے اُس کی زندگی کیسی گزری تھی اور اس کے مسائل کیا ہیں۔"

میں نے اسے ایک دم پہچان لیا۔ "آپ..... شملہ پہاڑی کے پاس رہتے ہیں؟"

"ہاں۔ میں نے تو تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ اب میں یہاں شفٹ ہو گیا ہوں" وہ بولا "صبح یہاں کلینک میں بیٹھتا ہوں، شام کو پرانے کلینک میں۔ میں پھر آؤں گا چھ گھنٹے بعد۔ ضرورت ہوئی تو اسے ایک انجکشن اور دے دوں گا ڈرپ میں۔ گلوکوز کی ضرورت پڑے گی بہرحال۔ بارہ چودہ گھنٹے تک کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں نے کہا "غالب! میں جاتا ہوں اور نازو کو یہاں لے آتا ہوں۔"

غالب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "ایسی کوئی تشویش کی بات نہیں یار۔ تو خود کو سنبھال۔"

میں نے کہا "مجھے کیا ہوا ہے؟"

"لگتا تو ایسا ہے کہ ایک انجکشن کی ضرورت تجھے بھی ہے۔" غالب نے کہا۔

"میں گاڑی چھوڑ کے جا رہا ہوں، کہیں بعد میں ضرورت نہ پڑے۔"

"رابعہ نیند میں اٹھ کے تو کہے گی نہیں کہ مجھے شالیمار لے چلو یا جہانگیر کے مقبرے سے چھوڑ لاؤ۔" غالب نے کہا "تجھے واپس آنے کے بعد پھر جانا ہے۔"

"کہاں جانا ہے؟"

اس نے مجھے آنکھ ماری "بھئی ہوٹل۔"

میں نے سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔ اس وقت میری ذہنی کیفیت بڑی عجیب تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے ذہن میں خلا ہے۔ میرا ماضی، حال اور مستقبل۔ سب سراب ہو گئے تھے۔ وہ ایک زلزلہ تھا جس نے میری دنیا کو یوں تہس نہس کر دیا تھا کہ وہ پھر بھی قابلِ شناخت نہیں رہا تھا۔ میں یادوں اور خیالوں کے کھنڈر میں تہی دست و آبلہ پا پھر رہا تھا اور اپنے خوابوں کی کرچیاں چن رہا تھا۔ میرا دل ایک اُجڑا ہوا گھر تھا جس میں حسرتوں کے مدفن پر رونے والا بھی کوئی نہ رہا تھا۔ میرے دماغ میں آندھیوں کی سی شش رہی تھیں اور اسی کالی آندھی میں شجرِ محبت کے تن سے ٹوٹے ہوئے مجروح پتے اُڑ رہے تھے۔ فریاد کناں تھے اور بے بسی کی دیواروں سے سر ٹکرا رہے تھے۔

نازو نے مجھے دیکھا تو گھبرا گئی "کیا بات ہے؟"

میں نے اسے یوں دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں "کیا ہوا ہے تجھے؟ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟"

وقار یوسف کی بیوی نے بھی زبان چلانی شروع کی "سکندر بھائی! آپ تو کاٹنے کو دوڑ رہے ہیں بلاوجہ۔ ٹھیک ہی تو پوچھا ہے بے چاری نے۔ ذرا اپنی صورت دیکھیں آئینے میں۔"

میں نے کہا "آپ کو بلاوجہ بولنے کی عادت ہے۔ نازو! تم چلو میرے ساتھ۔"

"کہاں چلوں؟"

"جہنم میں" میں نے کہا "بھگا کے لے جانا چاہتا ہوں میں اپنے ساتھ۔"

نازو نے تاڑ لیا کہ کوئی بات ضرور ہوئی ہے "چلو۔"

یوسف کی بیوی پکارتی رہ گئی۔ "ارے اس وقت کہاں جا رہے ہیں، کھانا تیار ہے۔ کھانا تو کھا لیں۔ یا وحشت!" انہوں نے کہا کہ چلو اور وہ چل پڑیں "اللہ خیر کرے۔"

میں نے سارے راستے نازو کو کچھ نہیں بتایا۔ مجھے اپنی توجہ سڑک پر رکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں ذہنی طور پر غیر حاضر ہو رہا تھا اور مجھے حادثے کا ڈر تھا۔ نازو نے شاید میری صورت سے میری ذہنی کیفیت کا اندازہ کر لیا تھا اور وہ بھی کچھ ڈری ہوئی بیٹھی تھی۔

میں نے اسے منظر کے گھر کے دروازے پر اتارا اور خود گاڑی لے کر نکل گیا۔ ابھی ایک بجا تھا اور میرے پاس فرزانہ عرف شیلا سے ملنے کے لیے دو گھنٹے تھے۔ میں نے یہ دو گھنٹے واقعی دیوانوں کی طرح گزارے۔ فرق صرف صحرا نوردی اور شہر کی خاک چھاننے کا تھا۔ میں کسی وجہ کے بغیر بہت سے پرانے مقامات پر گیا۔ میں نے اپنے گھر کو دیکھا جس کو وزیر خان مرحوم نے بڑے ارمانوں سے بنایا تھا مگر اسے موت بھی آئی تھی تو پرائی چھت کے نیچے۔ پھر میں نے اسے دوبارہ حاصل کیا اور اسے رابعہ نے اپنے خوابوں سے سجایا۔

میں تاسین رضوی صاحب کے پرانے گھر کی طرف گیا جہاں اب نہ جانے کون رہتا تھا۔ میں نے غالب کا کھنڈر ہو جانے والا گھر دیکھا اور نازو کے مکان کو جو اب کسی اور کی ملکیت تھا۔

میں نے ہر راستے سے پوچھا۔ تم نے رابعہ کو دیکھا ہوگا۔ راستے کے ہر شجر کی گواہی لی۔ تم تو جانتے ہو وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ شہر کی ہوا سے پوچھا، گوشہ بہ بازار سے سوال کیا، بہار کے شگوفوں سے اور چاہت کے راز والی گوشوں سے دریافت کیا۔ وہ سب جیسے اجنبی ہو گئے تھے۔ وہ سب اپنی ویران آنکھوں سے میرے دل کی ویرانی کو دیکھتے تھے۔ فرہاد! تم تو واقف ہو کو مجنوں کے مرنے کی روداد، مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری۔

تین بجے سے بہت پہلے ہی میں فلیٹیز میں جا گھسا۔ "مجھے ڈاکٹر شیلا خان سے ملنا ہے" میں نے انگریزی میں کہا "کون سا کمرا ہے اس کا؟"

"سوری سر... ہم..."

میں نے چلا کے کہا "مجھے معلوم ہے کہ اس نے تمہیں منع کر رکھا ہے لیکن اسے کچھ ہو گیا تو ذمہ داری بھی تم ہی پر آئے گی۔ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ بلاوجہ چھپ کے نہیں رہتی۔"

کلرک گھبرا گیا۔ "آپ..... ایک منٹ ٹھہریں۔ میں منیجر کو بلاتا ہوں۔"

منیجر نسبتاً معقول اور پُرسکون تھا۔ "کیا آپ بتا سکتے ہیں....."

"تم... میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ خطرہ اس کے لیے ہے مگر مشکل تمہارے لیے بھی ہوگی۔ بے شک تم معاملہ دبا دو گے اور..."

"او کے۔ او کے۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں انہیں بلاتا ہوں۔ اپنا نام بتانا پسند کریں گے آپ؟"

"سکندر" میں نے کہا اور اس بورڈ پر شیلا خان کا نام تلاش کرنے کی بے سود کوشش کی جس کے خانوں میں مسافروں کے کارڈ لگائے جاتے ہیں۔ پھر میں ویٹنگ لاؤنج میں ٹہلتا رہا اور ایک صوفے سے اٹھ کر دوسرے صوفے پر بیٹھتا رہا۔ میری حرکات و سکنات، اضطراب اور بے سکونی کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ میں اگر پاگل نہیں ہوں تو نارمل بھی نہیں ہوں۔

دس منٹ گزر گئے۔ کلرک اپنے کام میں مصروف تھا مگر کبھی کبھی نظر اٹھا کے مجھے دیکھ لیتا تھا۔ منیجر واپس اپنے کمرے میں لوٹ گیا تھا مگر اس نے عقلمندی کی تھی کہ سیکیورٹی کو الرٹ کر گیا تھا۔ میری نگاہ ہر دس پندرہ سیکنڈ کے بعد گھڑی پر جاتی تھی لیکن اب میں نے خود کو سمجھا لیا تھا کہ مجھے ضبط سے کام لینا چاہیے۔ اتنا کافی ہے کہ شیلا خان موجود ہے اور ہوٹل کی انتظامیہ نے اسے بلوا لیا ہے۔ ہنگامہ آرائی کا نتیجہ اتنا بھی نکل سکتا ہے۔ یا تو وہ پولیس کو بلا لیں گے یا ان کی اپنی سیکیورٹی والے مجھے اٹھا کے باہر پھینک دیں گے۔

شیلا اس وقت پر ہنس جھلاتی ہوئی نمودار ہوئی جب میرے صبر کا پیمانہ چھلکنے ہی والا تھا "ارے تم یار، حد کر دی تم نے کہاں سے آ رہے ہو؟"

"جہنم سے" میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑی "ہاں صورت سے ایسا ہی لگ رہا ہے۔ میرا خیال ہے بھاگ کر آئے ہو۔"

"تم تو ایسے قلعہ بند ہو کے بیٹھی ہو۔ ابھی فساد ہو جاتا یہاں۔"

"یار، وہ مجبوری ہے۔ تم تو جانتے ہو۔" اس نے بڑی لجاجت سے کہا "میں نے گاڑی منگوائی ہے۔ بیٹھو، ایک کپ چائے پیو۔"

"مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ گاڑی ہے میرے پاس، باہر کھڑی ہے۔"

"اسے باہر ہی کھڑا رہنے دو" وہ بولی "کھانا کھایا ہے؟"

"میرا دل چاہتا ہے زہر کھا لوں۔"

"او کے۔ میں کافی اور سینڈوچ منگواتی ہوں۔ تم زہر ہی سمجھ کے کھا لینا یار۔ پتا ہے آج میں نے بھی لنچ نہیں کیا۔ ہفتے میں ایک بار میں لنچ گول کر دیتی ہوں، ایک بار ڈنر۔ تمہاری خاطر اپنا اصول توڑ رہی ہوں۔"

"میری خاطر کچھ مت کرو" میں نے برہمی سے کہا "کسی کو ضرورت نہیں میرے لیے کچھ کرنے کی۔"

"بڑے گرما گرم نکلے ہو جہنم کے شعلوں سے۔ پہلے کچھ ٹھنڈا پی لو۔ تمہارے تو دل سے ہی نہیں، دماغ سے بھی دھواں اٹھ رہا ہے۔" اس نے بڑی بے تکلفی سے میری کمر میں ہاتھ ڈالا اور مجھے اپنے ساتھ کھینچ کر ایک ٹیبل تک لے گئی۔

"کم آن یار۔ مجھے بتاؤ تو سہی کچھ۔ آخر کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے تھوڑا سا پانی پی کے کہا "سگریٹ ملے گی یہاں؟"

"صرف سگریٹ۔ پینے کی کوئی اور چیز مانگو یار۔ وہ بھی مل جائے گی۔" وہ ہنسی اور اس نے ایک خوبصورت ویٹر کو اشارہ کیا "پہلے سگریٹ، پھر کافی اور دو کلب سینڈوچ جتنی جلدی لاؤ گے اتنا ہی زیادہ انعام ملے گا۔ لے آئے؟ اُف۔ تم تو ابھی کھڑے ہو یہیں۔"

خوبصورت ویٹر نے دانت نکالے اور بھاگ گیا۔

"تم سگریٹ پیتے ہو۔ بہت اچھا کرتے ہو۔" وہ بولی "کل کیا توبہ کر لی تھی؟"

"توبہ تو توڑ دی ہے میں نے۔"

"تمام لوگ یہی کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے تم خاص تو ہو نہیں سکتے۔ مٹی کے پتلے ہو، خطا کے پتلے ہو" وہ بولی "یار، ہے تو بری چیز مگر مجھے وہ مرد اچھے لگتے ہیں جو اسٹائل سے سگریٹ پیتے ہوں۔ رابرٹ مور

www.paksociety.com

ہوتا ہے کہ واقعات' مقامات اور صورتوں کے نقوش کی لائبریری سے اُدری ایک آواز کے بانوس حوالے سے رشتے کو شناخت کرسکے؟

میں نے رفیق کے اور جھکتے کے لیے اپنا تر عاد مزاری میں ڈال دیا۔ "میری نواز سن رہے ہو تم رفیق! میں سکندر بخت ہوں۔"

مجھے یوں لگا جیسے اس نے خفیف سی جنبش سے مجھے اثبات میں جواب دیا ہو۔ اس کے لب ہلے اور اس نے قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے زندگی کے آخری لمحات میں کچھ کہنے کی کوشش کی جو اس کے نقطہ نظر سے اہم تھا۔ اس کے ہونٹ بھی بالکل سفید ہو رہے تھے اور چہرہ بے جان ہو چکا تھا۔

"رفیق! کس نے کیا' چوہدری دلاور نے؟۔ بولو۔"

"بھا۔۔۔ جا۔۔۔" اس کے حلق کی خراہٹ میں یہی دو لفظ میری سمجھ میں آئے۔

"بھائی جان۔۔۔ کون بھائی جان؟" میں نے کہا "دلاور کا بھائی؟"

"جا۔۔۔ جا۔۔۔ با۔۔۔ جا۔۔۔ کے" اس نے سر اٹھانے کی بے سود کوشش کی اور پھر ایک انگلی اٹھائی۔

اس کے ساتھ ہی سانسوں کا وہ کوٹا ختم ہو گیا جو قدرت کی طرف سے اسے دنیاوی زندگی گزارنے کے لیے عطا کیا گیا تھا۔ خالق کائنات یوں اپنے قادر مطلق ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ کسے صرف ماں کے پیٹ میں سانس عطا ہوں گے کون اس عالم آب و گل میں چند سانس لینے کے بعد پھر اسی کی طرف لوٹ جائے گا جس نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور پھر مٹی میں شامل کر دیا۔ یہ کوئی اعجاز مسیحائی کار مو یے رار جو گوشت کے ایک لوتھڑے کو دنیا میں بھیجنے کے لیے سو سال دے سکے' یا جہاں مرگ ناگہاں آئے' وہاں زیادہ نہیں صرف سو سانسوں کی مہلت بڑھا سکے؟

میرے دل میں ایک شبہ سا توٹ کے بکھر گیا تھا اور کرچیاں کانٹوں کی طرح میری روح میں اترگئی تھیں۔ رفیق کی کھلی آنکھیں مجھے الزام دیتی محسوس ہوتی تھیں کہ۔۔۔ بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ کاش ہم پہلے سے باہر سو ہو رہے اور کلب سینڈوچ کھانے اور کافی ختم کرنے میں چند منٹ بھی نہ گنواتے۔ شیلی کی احتیاط بجا لیکن ایک منٹ پہلے شاید رفیق میرے سوال کا جواب دے سکتا تھا۔ وہ بات کہہ سکتا تھا جو مبہم الفاظ بن کے اس کے لبوں پر ادھوری رہ گئی۔

میں نے اس کی آنکھیں بند کرتے ہوئے ان بے معنی الفاظ پر غور کیا اور نامکمل لفظوں کے آگے پیچھے دوسرے حروف شامل کر کے کوئی مطلب اخذ کرنے کی کوشش کی مگر جا۔۔۔ بھا۔۔۔ با اور جا سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ آخر وہ کیا بتانا چاہتا تھا؟ اس کے اشارے کا مقصد کیا تھا جب اس نے ایک انگلی اوپر اٹھائی تھی۔

میں نے سر اٹھا کے اوپر دیکھا تو ڈکی کے اندر والے حصے پر خون کے چھینٹوں کے درمیان مجھے ایک خونی تحریر نظر آئی۔ یہ ٹیڑھے میڑھے الفاظ تھے جو کچھ پھیل گئے تھے اور صاف پڑھے بھی نہیں جا سکتے تھے لیکن اچانک میرا تجسس بیدار ہو گیا تھا۔ رفیق بے بس تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ مرنے والا ہے۔ اس کے لبوں پر سب قاتل نے مہر لگا دی تھی مگر اس نے ہار نہیں مانی کہ خون میں ڈوبی ہیں انگلیاں ہم نے اب یہ لہو سراغ دے گا قاتلوں کا۔ رفیق نے اپنی انگلیوں تک بہہ آنے والے خون کی سرخی کو استعمال کرتے ہوئے ڈکی کے اندر تین حروف لکھے۔ اس وقت شاید اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پاس وقت ہوتا تو بچہ اتنی سکت تھی کہ وہ پورا نام لکھ سکتا۔ ڈکی کی اندرونی سیاہ سطح پر مشکل سے تین حروف لکھے جا سکتے تھے۔

ایک حرف کو آڑا پڑھا جاتا تو وہ "ب" تھا۔ دوسری طرف سے وہ "ن" بھی ہو سکتا تھا۔ دوسرا حرف ڈکی کے اندرونی حصے میں رستاب جگہ پر لکھا گیا تھا' وہ واضح طور پر انگریزی کا "بو" تھا لیکن تیسری جگہ رفیق نے پھر "ڈیا" بی لکھا تھا۔ وہ اٹھ کے بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اس کے ہاتھوں سے خون ابل رہا تھا اور گاڑی کی ڈکی میں اندھیرا تھا۔ اسے جھٹکے لگ رہے تھے اور اس کے لیے ہاتھ اوپر اٹھا کے تین حروف لکھنا بھی سخت ترین مرحلہ تھا مگر اس نے کوشش کی اور کامیاب رہا۔

میں نے ڈکی بند کی ہی تھی کہ صورت سے رشوت خور اور خبیث نظر آنے والے ایک ٹریفک سارجنٹ نے اپنی موٹر سائیکل عین کار کے سامنے روکی۔ شیلی کار کے انجن میں کچھ نہیں کر رہی تھی۔ وہ بار بار مجھ سے کچھ پوچھ رہی تھی مگر میں نے اس کی آواز سننے کے باوجود اسے جواب نہیں دیا تھا۔ میری ساری کوشش اور توجہ رفیق سے چند حروف اگلوانے کے لیے تھی جن سے اس قتل کے یا قاتل کے بارے میں کوئی مضبوط بات معلوم ہو سکے۔

پولیس کو دیکھ کر شیلی گھبرا گئی۔ اس نے ایک دم بونٹ بند کر دیا۔

"یہ گاڑی آپ کی ہے؟" سارجنٹ نے کہا۔

"نہیں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میرا مطلب ہے نہیں۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "اتنا گھبرا کیوں گئی ہو جناب؟ ایک ساتھ ہاں بھی اور نہیں بھی۔"

شیلی نے خود کو سنبھالا "در اصل۔۔۔ میں مالک نہیں ہوں اس گاڑی کی۔ یہ کرائے کی گاڑی ہے۔ لیکن استعمال تو میں کر رہی ہوں۔"

"اچھا جی! کاغذات ہیں آپ کے پاس؟"

"کاغذات۔۔۔ پتا نہیں" شیلی نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔

"پتا نہیں کیا۔۔۔ معاملہ کچھ مشکوک ہے۔" اس نے یہ آخری بات اپنے آپ سے لیکن شیلی کو سنانے کے لیے کی تھی۔

میں اپنے ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ رومال سے خون کو صاف نہیں کیا جا سکتا۔ اتفاق سے ڈکی میں "بینڈ روز آئلیٹ" پیٹرول کا بند ڈبا رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھول کر پیٹرول سے ہاتھ صاف کیے۔ اگر میں گاڑی کے پچھلے حصے میں زیادہ دیر کے بعد ہوتا تو سارجنٹ یقیناً دیکھ لیتا کہ میرے ہاتھوں کو صاف کرنے والے پیٹرول میں سرخی شامل ہے۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ گاڑی میں کام کرتے ہوئے میرے ہاتھوں پر کالک یا گیل کے داغ لگ گئے تھے جن کو اسی طرح صاف کیا جا سکتا ہے۔ پیٹرول کی بو میں خون کی مہک بھی دب گئی تھی۔

اپنے ہاتھوں کو چھپاتے ہوئے میں دوسری طرف گیا اور اندر سے گاڑی صاف کرنے کا کپڑا لے کر اپنے ہاتھ کہنیوں تک صاف کیے۔ میرے انداز بے نیازی سے ظاہر ہوتا تھا کہ میں شیلی کی طرف سے مطمئن ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ٹریفک سارجنٹ سے نمٹ لے گی۔

شیلی نے کہا "دیکھو آفیسر! گاڑی لے کر آتا ہے زراتیو۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ کاغذات ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے جو کمپنی گاڑی بھیجتی ہے وہ ایسے ہی تو نہیں بھیج دیتی ہوگی۔ میں نے نہ بھی ڈرائیور سے پوچھا نہ کاغذات دیکھے۔"

"خیر! اب دیکھ لیں۔ کیا پڑا نیو ہے گاڑی کا؟"

میرے جواب دینے سے پہلے شیلی نے کہا "یار' یہ میرے شوہر ہیں کمال کرتے ہو۔"

سارجنٹ اس کے "یار" کہنے پر چونکا "گاڑی کون چلا رہا تھا؟"

"میں چلا رہی تھی اور کون چلا رہا تھا" شیلی اب جارحانہ موڈ میں تھی "تم ہو تو مسئلہ کیا ہے؟ کوئی جرم کیا ہے میں نے؟"

"جرم نہیں کیا تو کیا میں نے آپ کو گپ شپ کے لیے روکا بھئی!"

"یار' میں یہاں پہلے سے رکی ہوئی تھی۔ تم بعد میں آئے ہو۔"

"تو تم کیا چیز ہو؟ تمہیں پتا ہے یار کیا ہوتا ہے؟" سارجنٹ چڑ گیا "ایسے یاریاں لگاتی پھرتی ہو۔"

شیلی چراغ پا ہو گئی۔ "زبان سنبھال کے بات کرو میرے ساتھ۔ میں ڈاکٹر شیلا خان ہوں اور میں برٹش نیشنل ہوں۔ ابھی برطانوی سفیر کو مطلع کروں گی تو وزارت خارجہ تک بات پہنچ جائے گی۔"

اب سارجنٹ کی حالت دیکھ کے مجھے ہنسی آئی "مرچی کیوں ہر ایک کے سامنے تکتے ہو۔ یہ تو دیکھ لو کہ گاڑی مرسیڈیز ہے تمہارے آئی جی صاحب کے پاس بھی ہوگی تو رشوت سے خریدی ہوگی۔"

"تم نے۔۔۔ تمہاری رائٹ نے دن دیے کی خلاف ورزی کی

تھی۔"

"کب کی تھی۔ اور کہاں؟"

"پچھلے چوک سے پہلے۔"

"تم وہاں کھڑے تھے تو وہیں کیوں نہیں روکا تھا؟"

"مجھے رپورٹ ملی تھی۔ ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبل سے۔ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ انہوں نے رفتار کی حد سے زیادہ تیز ڈرائیونگ کی۔"

"چھوڑو یار۔ ایک کانسٹیبل کی بات پر اعتبار کرتے ہو" شیلی نے پھر اسے یار کہہ دیا "ہم تو ادھر سے گزرے ہی نہیں۔ ادھر سے آئے ہیں۔ کیا تم اسے جھوٹ ثابت کر سکتے ہو؟"

اچانک مجھے خیال آیا کہ جس لڑکی نے تمام عمر لندن میں گزاری ہو' وہ فرنچ بھی جانتی ہوگی۔ زیادہ نہ سہی تھوڑی بہت ضرور سمجھ لیتی ہوگی۔ میں نے اس سے پوچھا "تمہیں فرنچ آتی ہے؟"

"کیوں نہیں!" اس نے حیرت کے رد عمل کو چھپا لیا "میں تمہیں فرنچ سکھا سکتی ہوں۔"

"تو پھر اس سے مت الجھو۔ اسے صرف سو کا ایک نوٹ دے دو جس کے لیے یہ کھڑا ہے اور خواہ مخواہ کے قانونی مسائل پیدا کر رہا ہے۔"

"میرے پاس ٹریولر چیک ہیں اتفاق سے۔ کیا میں اسے ٹیلیفونز کا پتا دے دوں؟ بعد میں آ کے لے جائے۔ جی چاہتا ہے اس کا پیٹ پھاڑ دوں۔"

میں نے ہنس کے کہا "سرکاری پیٹ ہے۔ عوام کے خرچے پر پلا بڑھا ہے۔ میں دے دیتا ہوں جرمانہ۔"

سارجنٹ کی حالت اب واقعی غیر ہو گئی تھی۔ اس نے ٹیلیفونز ہوٹل کا نام بھی سن لیا تھا اور ہماری فرنچ اس کے خاک پلے نہیں پڑی تھی۔

میں نے اپنی جیب میں سے سو کا ایک نوٹ نکالا "لو جناب عالی' اب تو کوئی جرم نہیں کیا نا ہم نے؟ اب جاؤ' اللہ حافظ۔"

اس نے ادھر ادھر دیکھا اور نوٹ لے لیا "ڈاکٹر صاحب تو ایسے ہی ناراض ہو رہی ہیں۔ ہم تو بندہ ابھی فرض نبھا رہے تھے کوئی۔"

"فرض نہیں۔ ایک نقطہ بڑھا دو۔ فرض۔۔۔ بلکہ تمہاری مفروضہ رہتی ہے۔ ہر وقت اور ہر جگہ۔ اور فرض وصول کرنے کے لیے تمہیں وردی میں کے خوار ہونا پڑتا ہے۔ بڑی سخت ڈیوٹی ہے تمہاری" میں نے کہا۔

اچانک اس نے کہا "یہ داغ کیسا ہے؟"

میں نے کہنی کے پاس خون کی سرخی کو دیکھا۔ اس وقت میں ذرا بھی گھبرا جاتا تو اس کے دل میں شکوک پیدا ہوتے "یہ خون ہے۔"

"خون۔۔۔ کس کا؟"

www.paksociety.com

www.paksociety.com

"ابھی کٹ لگ گیا تھا" میں نے جیب سے رومال نکال کے بڑے اطمینان کے ساتھ اس سرخی کو صاف کیا۔

"کٹ تو مجھے نظر نہیں آرہا ہے۔"

"پھر کیا نظر آرہا ہے؟" میں نے بے رخی سے کہا "حد سے زیادہ کے چکر میں پڑو گے تو مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ میری بیوی پاکستان میں نہیں رہتی لیکن میں یہیں کی پیداوار ہوں۔ یقین نہیں تو زمان خان سے پوچھ لینا۔ اور کچھ ضرورت ہو تو ان سے میرا نام لے کر مانگ لینا۔"

وہ فوراً روانہ ہونے کے لیے موٹر سائیکل کو کک مارنے لگا "ایک بات پوچھوں سر جی! ناراض مت ہونا۔"

"یار پوچھو جلدی سے اور سامنے سے گاڑی ہٹاؤ" شیلا نے بیزاری سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی کہ آپ ادھر سے آئے ہی نہیں ہو؟" اس نے شیلا کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔

میں نے کہا "کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ ہم ادھر سے آئے تھے؟"

اس نے روانہ ہوتے ہوئے کہا "ثابت تو آپ بھی نہیں کر سکتے سر جی کہ آپ کے بازو پر کوئی کٹ تھا اور خون آپ کا ہی ہے۔"

جب وہ چلا گیا تو مجھے یوں لگا جیسے فرشتۂ اجل میرے دروازے پر دستک دے کر لوٹ گیا ہو۔ معلوم نہیں کیوں اس نے اپنے شکوک کی تصدیق نہیں کی۔ عام حالات میں کسی وجہ کے بغیر ہی پولیس والے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے جسے چاہتے ہیں "مشکوک" بنا سکتے ہیں۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ رات گئے اخبارات کی آخری کاپی پریس میں بھیج کر گھر لوٹنے والے صحافی اور بعض اوقات سینما کا آخری شو دیکھ کر آنے والے انھیں مشکوک حالت میں پھرتے نظر آجاتے ہیں یا محسوس ہوتے ہیں۔ بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا کلرک "کام کے انتظار میں سر راہ بیٹھا ہوا مزدور" نائٹ کالج میں پڑھانے والا پروفیسر۔ مشکوک کسی کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور پھر اس الزام سے عزت و آبرو کے ساتھ بچنے کا جرمانہ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق ادا کرتا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ تھا کہ ان کے چنگل سے بچ نکلنے کا ہنر صرف صحافی جانتے ہیں جن کی رسائی افسران بالا اور حکومت کے اعلیٰ حکام تک ہوتی ہے اور جو خبر چھاپ کے رائی کا پہاڑ بھی بنا رہے ہیں۔

ہم واضح طور پر انسپکٹر کے شک کی زد میں آچکے تھے لیکن وہ شیلا کی برطانوی شہریت سے ڈر گیا اور فریج نے ہمارے "غیر ملکی" ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا۔ بیک وقت پاکستانی اور برطانوی شہریت رکھنے والے عام لوگ نہیں ہوتے اور شیلا نے تو باقاعدہ دھمکی بھی دے دی تھی کہ وہ برطانوی ہائی کمشنر سے شکایت کرے گی۔ میں نے برطانوی شہری ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا مگر شیلا نے علی الاعلان مجھے اپنا شوہر تسلیم کر لیا تو پھر یہ از خود ثابت ہو گیا کہ میں بھی عام فرد نہیں۔ مسز سعید، فلیٹیز کا حوالہ، برطانوی شہریت اور ڈاکٹر شیلا کے نام کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ انسپکٹر نے ہم سے پنگا لے کر اپنی نوکری کو خطرے میں ڈالنے سے گریز کیا اور سو روپے کی نصیحت جان کے رخصت ہو گیا۔

لیکن وہ میرے لیے پریشانی کے بہت سے اسباب چھوڑ گیا تھا۔ گاڑی چلتے ہی میں نے کہا "شیلا! رفیق مر گیا۔"

"میں بہت نروس ہوں یار۔"

"خدا کے لیے ہر ایک کو یار کہنا چھوڑ دو" میں نے کہا "امریکا یا برطانیہ نہیں کہ جسے چاہا ڈیئر یا ہنی کہہ دیا۔ خصوصاً عورتیں۔"

"آئی ایم سوری۔ تمہارے اس منافق معاشرے پر ہزار لعنت بھیجتی ہوں میں" شیلا کا موڈ بے حد خراب تھا۔ "مرد 'یار' کہے تو اس کا مطلب ہے دوست اور عورت کہے تو یاری کا مطلب ناجائز تعلقات۔ یہ مطلب نکالنے والے بھی تم مرد ہی ہو۔ میں پوچھتی ہوں۔"

"اچھا بحث مت کرو" میں نے بگڑ کے کہا "یہ وقت ہے اس معاشرے کی اخلاقی اقدار پر نکتہ چینی کا۔ تمہاری کار کی ڈکی میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے اور وہ لاش کسی اجنبی کی نہیں "اس شخص کی ہے جسے تم اپنا خاص آدمی کہتی تھیں۔ تمہیں افسوس نہیں ہے اس کی موت کا؟"

"افسوس ہے تو کیا میں جاہل عورتوں کی طرح چلا چلا کے رونے لگوں، سینہ کوبی کروں؟ یار وہ میری وجہ سے مارا گیا۔ مجھ سے زیادہ رنج کسے ہو سکتا ہے" شیلا نے افسردگی سے کہا۔

"جس نے اسے قتل کیا وہ تمہیں بھی قتل کر سکتا ہے۔ یہ اس کی طرف سے پیغام ہے، دھمکی ہے" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو میں نروس ہوں۔ کسی کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے ملتا ہے۔"

"معلوم تو ہونا ہی تھا۔ تم کیا سمجھتی ہو زرینا اندھی ہے یا بے وقوف ہے؟" میں نے کہا۔

"تم ملنا چاہتے تھے اس سے۔ میرے کمرے میں؟" وہ تنک کے بولی۔

"وہ کچھ بتانے کی کوشش کرتا رہا۔" میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا "کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے؟"

"یار مجھے کیا معلوم؟" وہ بولی۔

"اچھا مجھے ذرا تو غور کرنے دو" میں نے کہا "گاڑی روک دو اور میری جگہ آجاؤ۔"

اس نے ایسا ہی کیا "فرض کرو کوئی تعاقب میں ہوا تو تمہیں کیسے معلوم ہو گا؟"

میں نے کہا "تم دیکھتی رہو۔ اس مصیبت سے چھٹکارا تو حاصل کرنا ہی پڑے گا کسی نہ کسی طرح۔"

میں نے مرسیڈیز کو لاہور کی جانی پہچانی سڑکوں پر دوڑانا شروع کیا۔ اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں اقبال ٹاؤن، آرائے بازار اور ائیرپورٹ سے بھی گزرتے ہوئے میں نے اندازہ کر لیا کہ اب کوئی بھی ہمارے تعاقب میں نہیں ہو سکتا۔ میں نے رفیق کے آخری الفاظ بھی شیلا کو بتائے جو اس نے مجھ سے کہے تھے اور جو اپنے خون سے لکھے تھے۔ شیلا نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی مگر وہ ان الفاظ میں کوئی ربط تلاش نہ کر سکی۔

"این یو این۔ باز ڈیو این" شیلا نے ایک ڈائری میں لکھ کے بار بار پڑھا "این یو ڈبلیو۔ نیڈیو یو ڈبلیو۔"

ایک دم میرے ذہن میں حروف نیون سائن کی طرح جگمگانے اور پھر مسلسل جلنے بجھنے لگے "نیڈیو این۔ ریسٹ از راشد۔ رفیق نے کوڈ دیا تھا۔ نقوی صاحب کا۔"

شیلا نے ماتھے پر ہاتھ مارا "حد ہو گئی یار۔ یہ تو سامنے کی بات ہے۔"

"یہی تو انسانی ذہن کا مسئلہ ہے۔ وہ الجھن اور پیچیدگی میں پڑ جاتا ہے۔ چراغ تلے اندھیرا نظر نہیں آتا اور وہ ہر طرف روشنی ڈھونڈتا رہتا ہے۔"

"مگر اسے نقوی صاحب کا نام لکھنے سے کیا فائدہ ہوا؟"

میں نے کہا "اسے کیا فائدہ ہونا۔ وہ تو مرتے مرتے کچھ بتا گیا ہے۔ اب سمجھنا ہمیں کیا چاہیے۔"

"یار مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں واپس کیسے جاؤں گی؟ فلیٹ میں بالکل اکیلی ہوں۔" شیلا نے کہا۔

"تم نے مزید عقلمندی یہ کی تھی کہ فلیٹیز کا نام بھی لیا تھا۔ اس انسپکٹر کے سامنے۔"

"میں نے۔۔۔ مجھے یاد نہیں" وہ بے خیالی میں بولی۔

"تم نے کہا تھا کہ اسے فلیٹیز بلا کے پیسے دوں گی لیکن اس سے کیا فرق نہیں پڑتا۔ جنھوں نے رفیق کو بھی فلیٹیز کے دروازے پر لا کیا، انھیں معلوم ہے کہ تم اسی ہوٹل میں ہو۔"

"ہوٹل کے دروازے پر۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ بولی۔

"ممکن ہے چند منٹ پہلے قتل کیا ہو۔"

"لیکن کس لیے؟ یار یہ کوئی آسان کام تو نہیں تھا نا۔ میرا مطلب ہے ایک فرد کی کلائی کاٹنا۔ اسے باندھنا۔۔۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ کچھ لوگ اس کے ساتھ ہی آئے تھے۔ وہ کم سے کم دو ہوں گے۔ انھوں نے رفیق کو پہلے ہی باندھ کے اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے ڈکی میں ڈال دیا ہو گا۔ ہوٹل کے باہر گاڑی پارک کر کے انھوں نے صرف یہ کیا کہ ڈکی کھولی اور کسی خنجر سے اس کی کلائیاں کاٹ دیں۔ شاید ایک نے یہ کام کیا اور دوسرے نے چابی اندر پہنچا دی۔ راستے میں تو رفیق کو باندھ کے ڈالنا مشکل تھا۔ وہ گھر سے ہی ساتھ روانہ ہوئے ہوں گے اور ظاہر ہے وہ ایسے لوگ تھے جن پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔"

"اور سکندر! اب میرا کیا ہو گا؟ میں وہاں کیسے واپس جاؤں گی؟ میرا تو سامان بھی ہوٹل میں پڑا ہوا ہے۔"

"یہ بعد میں سوچیں گے" میں نے کہا۔

اس نے تائید میں سر ہلایا "ہاں۔ پہلے اس سے تو جان چھڑا لیں۔ کیا تم پولیس اسٹیشن جا رہے ہو؟"

"پولیس اسٹیشن! تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟"

"پھر۔۔۔ لاش کو کہاں چھوڑو گے؟ رفیق کے گھر کا بھی پتا نہیں مجھے" شیلا نے کہا "اپنے بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ بھابی سے بالکل نہیں بنتی تھی۔"

"بیوی بچے تھے؟"

"نہیں یار۔ ابھی شادی نہیں کی تھی بے چارے نے" شیلا نے کہا۔

"اچھا ماں باپ، بھائی بہن۔۔۔؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میرا خیال ہے کہ کوئی نہیں۔"

"چلو یہ بھی اچھا ہی ہے۔ مرنے والا تو مر جاتا ہے دکھ جھیلنے کے لیے رہ جاتے ہیں لواحقین۔ بھائی کی بیوی تو خدا کا شکر ادا کرے گی کہ جان چھوٹی۔ پھر بھائی بھی صبر کر لے گا" میں نے کہا "میرا کام کچھ آسان ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب بھی معلوم ہو جائے گا۔ یہ بتاؤ تم نے رفیق کو ٹیلی فون کر کے بلوایا تھا؟" میں نے کہا۔

"اور کیسے بلواتی یار۔ خود جاتی؟"

"کہاں فون کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"نقوی صاحب کے گھر" شیلا نے کہا "یہ تم کدھر جا رہے ہو؟"

"اپنے گھر۔ خاموش بیٹھی دیکھتی رہو۔ اب جو کچھ میں کروں گا اپنی ذمے داری پر کروں گا" میں نے کہا "تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس وقت تم کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتی تھیں۔"

اس نے مجھے شکر گزار نظروں سے دیکھا "تھینک یو یار!"

"اب اپنے دماغ سے نکال دو یہ خیال کہ تمہارے ہسبنڈ کو تمہارے پاکستان میں موجود ہونے کا علم نہیں تھا۔ اسے تو تمہارے کمرے کا نمبر بھی معلوم ہو گا ڈاکٹر شیلا خان عرف غزالہ سہگل۔"

"تم کیوں مجھے دہشت زدہ کر رہے ہو؟"

"میں تمہیں حقائق سے باخبر کر رہا ہوں۔ دہشت زدہ ہونے سے کچھ نہیں ہو گا ڈیئر شیلا۔ جب جب ڈر ہوتا ہے تب تب سو سو ہوتا ہے۔ یہ بڑا عظیم مقولہ ہے۔"

"کس کا؟"

"کسی کا بھی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ڈر ہی ہوتا ہے جو منظور خدا

ہوتا ہے اور خدا کو کیا منظور ہوتا ہے، یہ کوئی جان نہیں سکتا چنانچہ فکرمند یا پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا "جہاں میں تمہیں لے جا رہا ہوں وہ میرا آبائی گھر تھا۔ بلکہ ہے مگر میں وہاں نہیں رہتا۔"

"پھر اب کون رہتا ہے وہاں یار؟"

"کوئی نہیں" میں نے کہا "ممکن ہے تمہیں وہ گھر آسیب زدہ لگے۔ ویران خوش گوار نہ ہوں تو آسیب بن جاتی ہیں۔"

"وہاں کیا کام ہے؟"

"آج میں اور تم وہیں رہیں گے۔ تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا نا؟"

اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "یار، ڈر کس سے۔۔۔ تم سے؟"

"کوئی لاش۔۔۔ رفیق کی لاش بھی تو ہوگی" میں نے کہا۔ "معلوم نہیں تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ رات بھر ہم اس لاش کے ساتھ بیٹھ کے کیا کریں گے؟"

میں نے کہا "مجھے ذرا سوچنے دو۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے سے تو بچ گئے ہیں لیکن اب اس لاش کا ڈسپوزل باقی ہے۔ کیا یہ کار واقعی کرائے کی ہے؟"

"ہاں۔ ابھی ایسے ہی کام چلا رہی تھی میں۔ سیٹل ہو جاتی تو شاید کوئی گاڑی خرید بھی لیتی۔"

"جس رینٹ اے کار سروس سے تم نے گاڑی منگوائی تھی وہ تمہیں جانتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں یار۔ میں نے تو رفیق سے کہا تھا۔ رفیق نے انتظام کرایا تھا۔ نام پتا اس کا تھا ضمانت اسی کی تھی۔"

"جو بھی گاڑی لے کر جاتا تھا وہ تمہیں جانتا تو ہوگا؟"

"نہیں۔ رفیق کہہ دیتا تھا کہ گاڑی ہوٹل پہنچا دو۔ کوئی ڈرائیور چابی ریسپشن پر چھوڑ جاتا تھا۔"

ایک عرصے بعد میں پھر ماڈل ٹاؤن میں تھا جہاں کے سب راستے میرے جانے پہچانے تھے۔ گھنے پرانے درختوں کے نیچے خستہ حال سڑکوں پر شام کے سائے اترنے لگے تھے۔ پرانی وضع کی کوٹھیوں کے مہیب دالانوں میں نئی بہاروں کا شوخ رنگ نمایاں ہو رہا تھا۔ جھاڑیوں اور پودوں نے پتوں کا لباس پہن لیا تھا لیکن مجموعی طور پر گردوپیش کے ماحول میں کوئی نمایاں تبدیلی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کہیں کسی کوٹھی پر تازہ رنگ ہوا تھا یا کسی نے سامنے کے حصے کو بدل کے جدید طرز تعمیر کا نازیبا اضافہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

مرحوم نواب خسرو جمشید کا بنا ہوا محل اسی طرح ویران اور غیر آباد پڑا تھا۔ اس کے ایک گوشے میں ان کے جد امجد کی قبروں پر سنگ مرمر کی بارہ دری کے سائے میں ایک لمبا ٹاٹ مقبرہ سو رہا تھا۔ کسی دن وہ اس قبر پر گرنے والی لال ریشمی چادر ڈال دے گا۔ اس کے سرہانے اگربتیاں جلا دے گا اور چاروں طرف رنگین

جھاڑیں لگا کے چھت پر کوئی جھنڈا لگا دے گا۔ زیادہ چالاک اور پروفیشنل ہوگا تو کتبہ بدل ڈالے گا یا اسی میں نام کے آگے پیچھے القاب و آداب کا اضافہ کر کے سابق نواب کی قبر کو کسی فرضی ولی کے آستانے میں بدل کے خود گدی نشین ہو جائے گا۔ دو چار سال بعد یہ جگہ مرجع خلائق بھی بن جائے گی۔

میرے اپنے گھر کا پھاٹک بند تھا۔ میں نے کار سے اتر کے اسے خاصی مشکل سے کھولا مگر اس بات کا خاص خیال رکھا کہ گاڑی کے گزر جانے کے بعد پھاٹک پھر پہلے کی طرح بند نظر آئے۔ نیم پختہ سڑک سے پھاٹک تک کچے راستے پر ٹائروں کے نشانات بن گئے تھے۔ میں نے گاڑی صاف کرنے والا کپڑا نکال کے ان نشانات کو مٹا دیا۔ آگے پختہ فرش تھا جس پر باریک گرد جمی تھی۔ گاڑی اس پر سے گزرتی تو ٹائروں کے نقش واضح اور متوازن لکیروں کی صورت نظر آتے۔ یہ سراغ مٹانے کا ایک مشکل طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ میں بعد میں ڈنڈے والا برش لے کر پورے راستے کو صاف کر ڈالوں لیکن میں نے ایک آسان طریقہ سوچ لیا۔

میں نے گاڑی کی ڈکی میں سے کپڑے کا کور نکالا۔ رفیق کی لاش اس کور کے اوپر ہوتی تو کپڑا خون سے تر ہوتا مگر اسے لپیٹ کر بنڈل کی طرح ایک کونے میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ میں نے کور کو پچھلے بمپر کے ساتھ ایسے باندھا کہ جب گاڑی چلے تو فرش پر رگڑتا ہوا اور خود ہی مٹی صاف کرتا جائے۔

شیلا یہ سب دیکھ رہی تھی اور حالانکہ اس نے مجھ سے بہت سے سوالات بھی کیے تھے مگر میں نے اسے ایک جواب دے کر خاموش کر دیا تھا کہ بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی چپ چاپ دیکھتی رہو۔

میری ترکیب کامیاب رہی۔ اب کوئی بھی سراغ دیکھ کر اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ گیٹ سے کوئی گاڑی اندر گئی ہوگی۔ برانے ٹھاٹ گیراج کا گیٹ کھول کے میں نے شیلا کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی اندر لے جائے۔ گیٹ کھولنے کے لیے مجھے اس کی کنڈی میں لگا ہوا زنگ خوردہ تالا توڑنا پڑا تھا اور اب اس تالے کو پھر بند کرنے کے لیے چابی میرے پاس نہیں تھی۔

گیراج میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ میں نے سوئچ آن کیا تو لائٹ جل گئی۔ گیراج کا پچھلا راستہ اندر سے مقفل تھا اور اس کی چابیاں رینی دیوار پر لٹکی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے آنکھ اندازے سے کھینچتے ہوئے قفل کھولا اور شیلا کے ساتھ اسٹور سے گزر کے کچن میں آ گیا۔

"خوب ہے یہاں تم سو" میں نے کہا۔

"کیا ہیں؟ یار! تم کہاں جا رہے ہو مجھے چھوڑ کے؟"

میں نے اسے تسلی دی "کہیں نہیں جا رہا ہوں۔ ذرا یہ تالا باہر سے گیراج میں لگا دوں۔ درست۔۔۔ یہاں بھوت نہیں رہتے۔"

"آج کے بعد یہیں رہنے کے لیے" شیلا نے گرد سے اٹے ہوئے کچن کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

میں کچن کی کھڑکی سے باہر گیا اور گیراج کی کنڈی لگا کے پھر وہ بگاڑا ہوا تالا جو صرف نام میں قفل کہلاتا تھا۔ اس پر بھی زنگ کی افراط تھی مگر میں نے پوری کوشش کی کہ یہ زنگ اصلی حالت میں موجود رہے۔ لان کے آخری حصے میں لوہ گیراج کے سامنے ہمیشہ سے تختے، ایک سیڑھی، ایک پرانا ڈرم اور زنگ سے بیزار ہو جانے والے سریے کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں احتیاط سے اٹھایا اور گیراج کے سامنے ڈھیر کر دیا۔ سیڑھی میں دروازے کے سامنے یوں کھڑی کر دی جیسے پہلے بھی گیراج کی چھت کی صفائی کے لیے رکھی جاتی تھی۔ تختوں کے بعد ڈرم رکھتے ہوئے میں نے اسے زور سے لڑھکایا۔ ڈرم کے اندر سے خشک پتے کے ڈھیلے ابھر کے اور زرد کی چادر بن کے سیاہ چیونٹیاں فرش پر پھیل گئیں۔ سریے کے ٹکڑوں کو میں نے تختوں پر ٹیڑھا ڈال دیا۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ میں نے اپنی کارکردگی کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو گیا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ سب کاٹھ کباڑ برسوں سے پڑا ہوا ہے۔ یہ خیال کسی کے ذہن میں آ نہیں سکتا تھا کہ راستہ صاف کیے بغیر کوئی گاڑی اندر جا سکتی ہے۔

سامنے والے حصے میں پورچ کے پیچھے برآمدے میں کھلنے والے دروازے سے پہلی منزل کی کھڑکیوں تک سب شیشوں پر گرد کی تہ خود اپنی کسمپرسی کی داستان کہتی تھی۔ اندر کی حالت بھی مختلف نہ تھی۔ منڈیروں پر اور چھجوں پر خس و خاشاک جھول رہے تھے اور گھونسلے بنانے والے پرندوں کو یقیناً یہ اطمینان حاصل ہوگا کہ وہ صفائی پسندی کے نام پر گھونسلے اجاڑنے والوں کی چیرہ دستی سے محفوظ ہیں۔

لان میں گھاس سوکھ گئی تھی یا بے ہنگم طریقے پر بڑھ گئی تھی۔ پھولوں کے تختے ویران تھے اور الجھے ہوئے لان کے شجر سوال کرتے محسوس ہوتے تھے کہ گھری گھری پھرنے والے لوٹ کے کب گھر آئیں گے، کب لاؤ گے اپنی بہاریں، کب تک پھول کملائیں گے۔ اداس بام و در پوچھتے تھے کہ سنگ و خشت کی دیواروں میں سفید خوابوں کو تعبیر کب ملے گی۔ عہد رفتہ کی یادوں کے اس مدفن کو وزیر خان کے وارث کب اپنائیں گے۔ تم نے اسے پھر زندہ تو کیا ہے مقصود اور شاید اس سے تمہارے احساس ملکیت کی تسکین بھی ہو لیکن جو مکان آباد نہ ہو وہ گھر نہیں ہوتا۔

میرے پاس نہ کوئی جواب تھا نہ وعدہ اور نہ حرف تسلی۔ واجب سے سوچنے کی تبدیلی نے میرے لیے احساس جرم کی چنگاری بھڑکا دی تھی اور اداسیوں، حسرتوں اور ویرانیوں کے گلاب بن کھلے مرجھانے لگے تھے۔ وہ وقت ابھی میرے تصور کی دسترس میں بھی نہ تھا جب میں بالآخر غم دو جہاں سے فراغت پا کے اس رنگوں سے دھلے ہوئے دنوں سے جگمگاتے اور خوشبوؤں سے مہکتے گھر کے کملائے گوشوں میں اپنی شریک زندگی سے پورے اعتماد و خلوص اور یقین کے ساتھ کہہ سکوں کہ میرا یہ گھر اب تمہارا ہے۔ مجھ سمیت اور ان

بے بہا یادوں کے خزینے سمیت جن سے میری زندگی عبارت تھی اور ان سب توقعات اور نیک خواہشات سمیت جن کے ساتھ میرے باپ وزیر خان نے یہ امانت مجھے سونپی تھی۔

میں لوٹ کے اندر گیا تو شیلا کچن کا دروازہ تھوڑا سا کھول کے اندر جھانک رہی تھی۔ میں نے اپنے پیچھے مڑ کے دروازہ بند کیا تو وہ چیخ مار کے اچھل پڑی۔

"یار، ابھی میرا ہارٹ فیل ہو جاتا" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"یہ اندر کیا دیکھ رہی ہو۔ چلو تمہیں اندر سے دکھا دوں۔ یہ گھر میرے والد نے بنایا تھا" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "میرا بچپن اسی گھر میں گزرا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میں لندن چلا گیا اور میرے والد سے یہ گھر چھین لیا گیا۔ انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ معلوم نہیں کیوں۔ اپنا سب کچھ ہار دیا مگر مجھے خبر بھی نہ ہونے دی۔ پھر ان کو یہاں قتل کروا دیا گیا اور مجھے ابھی تک ان کے قاتلوں کی تلاش ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے یہ گھر بہت زیادہ قیمت ادا کر کے پھر حاصل کیا تھا۔ اس امید میں کہ ایک نہ ایک دن یہ پھر آباد ہوگا لیکن معلوم نہیں وہ دن میرے مستقبل میں کہاں ہے۔ کتنی دور ہے؟"

شیلا بڑی دلچسپی سے راستہ گھر کی ہر چیز کو دیکھتی جا رہی تھی "یہ فرنیچر اور پردے، قالین، یہ اتنے پرانے تو نہیں لگتے۔ مٹی بہت پڑی ہوئی ہے۔"

"ہاں۔ یہ سب رابعہ نے خریدے تھے۔ اس نے گھر کو پوری طرح فرنش کیا تھا۔ بڑے شوق سے۔"

"اس کا ذوق بھی برا نہیں۔"

"برا کچھ بھی نہیں۔ سوائے میرے نصیب کے" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

شیلا ہنس پڑی "نصیب کو کیوں الزام دے رہے ہو یار۔"

"اس لیے کہ اور کسی کو الزام دیا نہیں جا سکتا۔ قصور شاید صرف میرا ہے۔ میرا دماغ خراب تھا۔"

"تھا۔۔۔ یعنی اب نہیں ہے؟" وہ شکک کے لہجے میں بولی۔

میں نے مسکرا کے کہا "شاید تم میرا دماغ درست کر دو گی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "الٹا تم مجھے پاگل کر دو گے۔ ابھی سے میرے اعصاب جواب دینے لگے ہیں یار۔ خاک اعصابی امراض کی ماہر ہوں میں۔"

میں نے کہا "تمہیں کیسی لگی یہ جگہ؟"

اس نے فلسفیانہ موڈ میں کہا "جگہ نہ کوئی اچھی ہوتی ہے نہ بری۔ رہنے والے کھنڈر میں خوش رہتے ہیں ورنہ محل میں رو کے بھی روتے ہیں۔ زندگی ایک رویہ ہے یار۔ ایک ATTITUDE اس کے مثبت یا منفی ہونے پر ہی سب کچھ منحصر ہے۔ ویسے میں یہاں خوش رہ سکتی ہوں کیونکہ اس میں ایک CHARM ہے۔ بڑا

www.paksociety.com

رومانٹک قسم کا جس کا تعلق روایات سے اور گزرے ہوئے وقت کی اچھی یادوں سے ہوتا ہے۔ بس ضرورت ہے اس جگہ کو اور ر بال کرنے کی۔ اس کی ظاہری صورت تبدیل جائے لیکن کلر اسکیم ایک رم تی ہو۔ اور یہ سامان۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ ذرا کی کلیننگ اور نئی پالش وغیرہ کی ضرورت ہوگی۔ ڈیکوریشن بھی اس کی۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی! آپ سے انٹیرئیر ڈیکوریشن پر مشورہ نہیں مانگا تھا میں نے۔ نہ یہ آپ کا کام ہے۔"

وہ کچھ شرمندہ ہوئی "سوری یار۔ میں بس ایسے ہی سوچنے لگی تھی۔ یہ تو بلند سوچ رہی تھی۔ خیر یہ بتاؤ کہ یہاں کیوں آئے ہیں ہم؟"

"اس لیے کہ ہم اور کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آج رات تم گلبرگ میں واپس جاتیں تو صبح تک پتا نہیں کیا ہو جاتا۔"

"کیا ہو جاتا؟ ابھی تک تو کچھ ہوا نہیں تھا۔"

"ابھی تک تم مجھ سے نہیں ملی تھیں۔ اگر ملاور کو تمہارے بارے میں یہ معلوم تھا کہ تم پاکستان میں ہو تو وہ تم پر نظر رکھے یہ دیکھ رہا تھا کہ تم کیا کرتی ہو۔ مجھ پر تو اس کی نظر بہت پہلے سے ہے۔ اب اس نے اپنا پیغام بالکل کسی لگی لپٹی رکھے بغیر پہنچا دیا ہے کہ مجھے چکر دینے کی کوشش کی تو تمہارا انجام بھی رستی سے مختلف نہیں ہوگا۔"

"ہوٹل میں وہ کیا کر سکتا تھا آخر؟" وہ سوچنے لگی۔

"ڈاکٹر صاحب! یہ پاکستان ہے اور چوہدری ملاور کے ذہن کو تم ابھی سمجھے کار روائی نہیں کر سکو گی۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ویسے تو زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اب تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ تمہارا مجھ سے ملنا تمہارے بھائی کو سخت ناگوار گزرا ہے۔ میری مانو تو واپس لندن چلی جاؤ اور وہیں سکون سے رہو۔"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا "میں اپنے ارادے اتنی جلدی نہیں بدلتی یار۔ ملاور سے تو میرا کوئی رشتہ ہے....."

"رشتہ تو ہے۔"

"میں نہیں تسلیم کرتی ایسے رشتوں کو۔ مجھے اس سے کوئی رشتہ بھی نہیں مگر وہ سمجھتا ہے کہ مجھ سے میری دولت چھین لے گا یا مجھے ختم کرا دے گا تو یہ اتنا آسان نہیں ہوگا اس کے لیے۔ میں اپنی حفاظت خود کرنا جانتی ہوں۔ اور اب تو تیرے راری بھی تم نے قبول کر لی ہے۔"

"میں نے..... نہیں ڈاکٹر شیلی۔ یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہے۔"

"پھر یہاں کیوں لائے ہو مجھے یار؟ جانے دیتے واپس اپنے ہوٹل" اس نے خفگی سے کہا۔

"تمہارے ساتھ مجھے اپنی بھی فکر تھی۔ روپوش رہنے کے لیے مجھے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں سوجھی" میں نے کہا۔

"لیکن یہاں ہم کب تک روپوش رہ سکتے ہیں؟"

"بس آج کی رات خیریت سے گزر جائے" میں نے کہا "ایک تو مجھے ان کا ردعمل دیکھنا تھا۔ پھر تم سے کچھ پوچھنا تھا اور اس لاش کا بندوبست کرنا تھا۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔"

"کیا میں پھر ہوٹل نہیں جا سکتی؟"

"کم سے کم آج نہیں۔ کیا ہے تمہارا ہوٹل میں؟ پاسپورٹ وغیرہ؟ نقد رقم ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ایک سوٹ کیس ہے کپڑوں کا۔ نقد رقم تو میں رکھتی نہیں۔ ٹریولرز چیک ہیں امریکن ایکسپریس کے۔ پاسپورٹ بھی میں ساتھ ہی رکھتی ہوں۔"

میں نے کہا "یہاں سونے کا مسئلہ کوئی نہیں لیکن تھوڑی دیر میں رات ہو جائے گی۔ ہم کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں لائے۔"

"کچن میں کچھ نہیں ہوگا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اگر ہوا تو چائے یا کافی کا سامان ہوگا۔ میں پیچھے سے نکل جاتا ہوں۔"

"مجھے اکیلا چھوڑ کے جاؤ گے۔ نہیں یار۔"

میں نے کہا "تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ دس منٹ میں۔ دروازے بند کر کے بیٹھ جاؤ۔ ویسے تو بہت بہادر بن رہی تھیں کہ مجھے اپنی حفاظت کرنا آتی ہے اور ریوالور بھی دکھایا تھا ایک۔ کہاں ہے وہ ریوالور؟"

اس نے بیگ میں ہاتھ ڈالا "یہ۔ لیکن آج تک میں نے کسی کو بھی قتل نہیں کیا۔"

"فوری طور پر کسی کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی" میں نے کہا "تم اتنی دیر میں کچن کا سروے کرو اور دیکھو کہ ہم چائے یا کافی بنا کے پی سکتے ہیں یا رات ایسے ہی گزرے گی۔ پلیز پلیز کرو۔"

میں کچن کے راستے باہر گیا اور دس منٹ بعد جنکٹ کے ڈبے سموسے اور کیک لے کر لوٹا تو کچن کافی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

"یار یہاں تو سب کچھ ہے۔ سوائے دودھ کے" شیلی نے بتایا "الیکٹرک کیتلی مل گئی۔ برتن تو سب نئے ہیں۔ پورے پورے سیٹ بھرے پڑے ہیں۔"

میں نے افسردگی سے کہا "رابعہ کے خریدے ہوئے ہوں گے۔"

"باتھ روم میں تولیہ اور صابن ہے۔ تم چاہو تو منہ دھولو یا نہالو۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ابھی ضرورت نہیں۔ کافی مجھے بلیک ہی دے دو۔ تمہارے لیے میں یہ دودھ لے آیا تھا۔ کنڈینس ملک۔"

"اچھا کیا۔ مگر مجھے تو عادت ہے بلیک کافی پینے کی۔ چینی کے بغیر۔ تمہارے لیے چینی ہے۔"

میں نے کھانے پینے کا سامان شیلف میں رکھ دیا۔ "شیلی! تم کو اندھیرے میں ڈر تو نہیں لگے گا؟"

"لائٹ ہے نا یار۔"

"کچھ دیر بعد میں یہ لائٹ آف کر دوں گا۔" میں نے کہا "جو کھانا ہے کھالو۔ کیتلی میں ڈھیر ساری کافی بنالو۔ اندھیرے میں ہی پلگ لگا کر گرم کرتے رہیں گے۔"

اس کی صورت ایک سوالیہ نشان بن گئی "لیکن کیوں؟"

میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ تمہیں اور مجھے تلاش کرنے والے بالآخر یہاں بھی آئیں گے۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم اندھیرے میں دم سادھے بیٹھے رہیں گے اور باقی کام بعد میں کریں گے۔ یہ وہ مایوس ہو کے لوٹ جائیں گے۔"

"باقی کام.....؟"

"ایک تو ہر بات تمہیں سمجھانی پڑتی ہے اور تم سوال بہت کرتی ہو۔ جو ہوگا تمہارے سامنے ہوگا۔" میں نے کہا "چلو یہ سب سامان اٹھاؤ۔ ہم اندر چلتے ہیں۔ بیڈ روم میں۔"

"بیڈ روم میں....." اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"ڈرو نہیں۔ ہم صرف باتیں کریں گے۔ یہ پاکستان ہے مہذم اور یہاں ہم رشتوں کا لحاظ رکھنے کے عادی ہیں۔ ہم عورت کی عزت کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور جب کسی پر اس کی حفاظت کا فرض عائد ہو جائے تو وہ جان دے کر بھی اپنا فرض نبھا سکتا ہے لیکن یہ کسی کے اعتبار کو دھوکا دے سکتا ہے اور نہ اپنے آپ کو۔ خصوصاً وہ جس کا نام سکندر بخت ہو۔"

"یار میرا خیال ہے کہ ہر لڑکی اپنی عزت کی حفاظت کر سکتی ہے۔ خصوصاً وہ جس کا نام شیلی ہو یا رابعہ ہو یا کچھ اور لیکن وہ سکندر بخت کو جانتی ہو۔" اس نے کہا "چلو میں کافی کی الیکٹرک کیتلی اور کپ لاتی ہوں۔ تم اٹھاؤ یہ کھانے پینے کا سامان۔"

بیڈ روم اوپر تھا۔ پہلے یہ میرے والد کا کمرا تھا۔ بعد میں اسے میں نے پسند کر لیا۔ وہ کچھ ضعیفی کے باعث بھی اوپر کی منزل کے مقابلے میں نیچے رہنے کو ترجیح دینے لگے تھے اور انہیں صحن کھلی ہوا لگتی تھی مگر انہیں نماز باجماعت کے لیے بار بار نیچے اترنا پڑتا تھا۔ جب رابعہ نے اسے نئے سرے سے آراستہ کیا تو اسے بڑی نفاست سے بیڈ روم بنا دیا اور کچھ عرصہ وہ اس میں رہی۔

اب اس کمرے کو دیکھ کر ناصر کاظمی کا شعر یاد آتا تھا۔ ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر اداسی بال کھولے سو رہی ہے۔ اس کمرے میں سبزے کے رنگ کا دبیز قالین تھا۔ دیواروں پر آف وائٹ پینٹ تھا اور کھڑکیوں پر نیند دینے والے ہلکے گلابی رنگ کے پردے تھے۔ ایک مقابل کے کونے میں ٹی وی رکھا ہوا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر کارنر ٹیبل تھی اور اس پر کچھ چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف بیڈ چھت کے ساتھ کی دکٹورین وارڈروب اور ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ پرانے اسٹائل کے مکانوں کی طرح اس کی وائرنگ بھی اوپن تھی لیکن رابعہ نے اسے کینسل کرا دیا تھا۔ اب چاروں دیواروں پر ٹیل وال لائٹس تھیں اور درمیان میں اسی ڈیزائن کے فانوس۔

بیڈ کی ایک سائیڈ ٹیبل پر لیمپ تھا اور دوسری جانب ٹیلی فون۔ مجھے اس آلے کو دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ یہ حیرانی اور بڑھ گئی جب میں نے غیر ارادی طور پر ریسیور اٹھا کے کان سے لگایا۔ اس میں ٹون آرہی تھی۔ نہ جانے کیسے اب تک فون بند نہیں کیا گیا تھا۔ میری عدم موجودگی میں بجلی اور ٹیلی فون کے سارے بل لیٹر بکس میں جمع ہوتے رہے ہوں گے۔ ادائیگی کرنے والا یہاں کون تھا۔ اس کے باوجود بجلی اور ٹیلی فون لائن منقطع ہونے سے بچ گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ استعمال نہ ہونے کے باعث بل کی رقم بہت تھوڑی ہوگی۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ رابعہ نے بلوں کی ادائیگی کی ذمے داری بھی رفتار یوسف کو سونپ دی تھی جو مہینے میں ایک بار کسی کو بھیج کے لیٹر بکس میں سے بل منگوا لیتا تھا۔ فون کا تو صرف لائن رینٹ آرہا تھا مگر بجلی والے اوسط کی بنیاد پر رقم وصول کر رہے تھے۔

شیلی کافی پیتے ہوئے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے میرے والد کی اور میری تصویریں دیکھیں جو ٹی وی پر رکھی ہوئی تھیں اور انہیں اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کر کے پھر وہیں رکھ دیا۔

میں نے کافی کے ساتھ کھانے کا سلسلہ جاری رکھا "تمہیں

مفرور

www.paksociety.com

میرے بارے میں کیا معلوم ہے اور کس نے بتایا؟"

"میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ اور معلوم کرنے والے وسائل تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ ایک ریسرچ ورک تھا۔ سب سے زیادہ مدد شیخ صاحب نے کی۔ ان کے علاوہ اخبارات تھے۔ پھر بھی مجھے کوئی دعویٰ نہیں کہ میں سب کچھ جانتی ہوں۔"

"ابھی تک تم نے رفیق کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"یار، میرا خیال ہے کہ پہلے میں یہ گرد جھاڑ دوں۔ ہم ان کرسیوں پر بیٹھ کے باتیں کر سکتے ہیں" اس نے کہا "بیڈ کی چادر اور تکیوں پر بھی اتنی ہی مٹی ہوگی"

"چھوڑو بیڈ کی چادر کو۔ ابھی اتنی مٹی اُڑے گی۔ سب کمرے میں بھر جائے گی۔ سانس لینا بھی مشکل ہو جائے گا" میں نے کہا۔

"میں باہر ٹیرس پر جا کے جھاڑ رہی ہوں۔ تم لائٹس آف کر دو۔" شیلی نے کہا "ویسے وارڈ روب میں کپڑے ہیں۔ زنانہ بھی اور مردانہ بھی۔"

میں نے لائٹ آف کرنے سے پہلے وارڈ روب میں دیکھا تو اس میں کپڑے استری کیے ہوئے اور ترتیب کے ساتھ ہینگر میں لٹکے ہوئے تھے مجھے رابعہ کے خیال نے ملول کر دیا۔ اس گھر میں اپنی تنہائی کے لمحوں کو اس نے اپنی حسرتوں اور خواہشوں سے سجاتے گزارا تھا۔ کسی بچی کی طرح جو اکیلے میں اپنی گڑیا سے کھیلتی ہو۔ اس سے باتیں کرتی ہو۔ اس کے لیے کپڑے بناتی ہو اور گھر سجاتی ہو۔ اس گھر میں ضرورت کی چیزیں فراہم کرتی ہو اور اس کی شادی رچاتی ہو۔ رابعہ نے بھی اس گھر میں اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دے کر آباد کر لیا تھا۔ کہ نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔ یہ ویسا ہی گھر تھا جیسا وہ میرے ساتھ دل کے بسانی۔ اسے بسا آرزو کہ خاک شدہ میں نے اسے مایوس کیا۔ مرد اس وقت بھی بے رحم ہوتے ہیں جب لڑکے ہوتے ہیں۔ وہ گڑیوں کے گھر اُجاڑ دیتے ہیں اور معصوم بچیوں کے جذبات کی پروا کیے بغیر ان کی گڑیوں کو خراب کر دیتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ہر گڑیا در حقیقت اسی معصوم لڑکی میں چھپی ہوئی عورت ہوتی ہے۔

کیا میں نے رابعہ پر ظلم کیا تھا؟ یا اس نے مجھے یہ فریب دیا تھا کہ وہ بڑی حقیقت پسند ہے۔ جب کہ وہ خواب پرست تھی۔ ہر لڑکی ویسے تو خواب پرست ہوتی ہے مگر وہ ساری عمر تو خوابوں کے پیچھے دوڑتے نہیں گزار سکتی۔ رابعہ کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد میرے سے مردی نہیں تھا اور یہ دھوکا اسے عذر دے دیا تھا پھر اچانک دل شکستگی اور مایوسی کے اس گرداب سے میں نے اسے زندگی کے پُر امید ساحل کی جانب کھینچ لیا۔ اس نے میرے عزم کی شدت کا ساتھ اپنے جذبات کی بھرپور توانائی کے ساتھ دیا مگر آہستہ آہستہ اس پر یہ حقیقت عیاں ہونے لگی کہ وہ میرے پیچھے بھاگ رہی ہے اور میں اپنے مقاصد کے پیچھے سرگرداں ہوں۔ یہ مقاصد جو اس کے نزدیک لاحاصل اور مبہم تھے غیر یقینی مستقبل کے لامحدود افق تک۔ حدِ امکاں سے آگے۔ اس کے خیال کی اور تصور کی انتہا سے بھی دور میری کوئی منزل تھی۔ اور رابعہ نے محسوس کیا کہ زندگی نے دوسری بار اسے فریب دیا ہے۔ اسے اس صدمے نے توڑ پھوڑ دیا کہ وہ میری منزل نہیں تھی اور یہ اس کے اختیار میں بھی نہ تھا کہ وہ میری منزل بن جائے۔ میرے مقاصد کی انتہا سے آگے پہنچ جائے یا میرے عزائم کے سفر کو اپنی ذات تک محدود کر دے۔

شیلی میرے قریب آ کے بیٹھ گئی "رابعہ کے بارے میں سوچ رہے تھے؟"

میں چونکا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"یار، تمہاری جگہ میں ہوتی تو میرے خیالات بھی مختلف نہ ہوتے۔ اس ماحول میں تم اور کسے یاد کر سکتے ہو؟"

"اس کی بات مت کرنا شیلی۔ میں اس کے خیال سے بھی ڈر رہا ہوں۔" میں نے کہا "حالانکہ یہ ناممکن ہے۔"

"شیلی فون کر کے اس کی خیریت تو معلوم کر لو۔"

"وہ سو رہی ہوگی۔ ٹھیک ہوگی" میں نے کہا "ٹی وی چلا دوں؟"

"نہیں یار۔ اندھیرا اچھا لگتا ہے" وہ بولی۔

میں نے سگریٹ جلایا "میں شراب نہیں پی سکتا۔ غم غلط کرنے کے لیے وہ چیز پی رہا ہوں جو میں نے خود پر حرام کر لی تھی۔"

"اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو؟"

"شاید۔" میں نے کہا "کبھی کبھی اچھا لگتا ہے اپنے آپ سے جھوٹ بولنا۔ کل تک میں اس منظر کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایسے تم اور میں یہاں بیٹھے ہوں گے۔ اندھیرے میں چوروں کی طرح چھپے ہوئے اس بیڈ روم میں... اور بلیک کافی پی کے رات گزار دیں گے۔"

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات سترھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

پسندیدہ ناول، ڈائجسٹ کو ابھی حاصل کریں
مفت ڈاؤن لوڈ کرنے کے لیے تشریف لائیں

شکاری

نئی سوچ نیا رنگ نیا انداز نیا آہنگ
احمد اقبال کے شہوار قلم سے

معاشرے کے اُن ناسوروں کی روداد جو گوشت و پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اتر رہے تھے۔ ایک کٹھن پر دو وقت نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلد دن سنگین یعنی آس و یاس، خوف و ہراس، تلخ حقائق، شیریں خواب

"تمہیں کیوں یقین ہے کہ وہ آئیں گے؟"

"پتا نہیں۔ میری چھٹی حس غلط نہیں کہتی۔ دس بجے رات تک انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم ان کے پھیلائے ہوئے جال سے نکل گئے۔ ہر شکاری کے لیے ناکامی ایک چیلنج بن جاتی ہے۔"

میں نے کہا "افسوس یہ ہے کہ رفیق قربانی کا بکرا بنا۔ خود میں نے کبھی شیر کا شکار دیکھا تک نہیں مگر جم کاربٹ کی کتابوں میں قصے بہت پڑھے ہیں۔ شکاری کوئی بکرا یا بچھڑا جنگل میں باندھ دیتے ہیں اور مچان پر بیٹھ کے انتظار کرتے ہیں۔ شیر گارا کر کے چلا جاتا ہے۔"

"گارا کیا؟"

"بکرے یا بچھڑے کو مار کے چلا جاتا ہے اسے گارا کرنا کہتے ہیں۔ اسے کھانے کے لیے وہ پھر آتا ہے۔ اس وقت وہ خود مارا جاتا ہے۔ خیر چھوڑو یہ باتیں تو بڑی دل دہلانے والی ہیں۔ رفیق کے بارے میں بتاؤ کہ تم اسے کیسے جانتی تھیں اور زیدی یا نقوی صاحب کے پی اے سے تمہارا کیسے رابطہ ہو گیا تھا؟"

"مجھے تم سے جو کہا..."

"تم کمال کرتی ہو۔ تم نے کہا تھا کہ رفیق میرا خاص آدمی ہے۔ اس کا چوہدری دلاور سے بھی تعلق تھا۔ یہ تو میری سمجھ میں نہیں آتا" میں نے کہا۔

"میں نے تم سے ایک شیخ صاحب کا ذکر کیا تھا جن کا اصل نام کچھ اور تھا" وہ بولی "انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ پاکستان جا کے رفیق سے ملنا۔ وہ تمہارے سارے مسائل حل کر سکتا ہے۔ انہوں نے رفیق کے نام ایک خط بھی دیا تھا۔ رفیق غالباً زیدی یا نقوی صاحب کی بہن کا بیٹا ہے۔ اس بہن نے تقسیم ہند سے پہلے کسی ہندو سے محبت کی شادی کر لی تھی۔ اس کے نتیجے میں نقوی صاحب نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ حالانکہ وہ ان کی ایک ہی بہن تھی اور وہ خود بھی اس بہن کے ایک بھائی تھے۔ نقوی صاحب پاکستان آ گئے اور وہ بہن وہیں رہ گئی لیکن پاکستان بننے کے بعد حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ محبت پر مذہبی جنون غالب آ گیا۔ انتہا پسند ہندوؤں کے دباؤ میں شوہر نے بیوی کو گھر سے نکال دیا اور خود پاک صاف ہو کے پھر اپنی برہمن برادری میں شامل ہو گیا۔ وہ دولت مند اور والدین کا اکلوتا تھا۔ اس کے ماں باپ ہر قیمت پر اپنا بیٹا واپس چاہتے تھے اور اس کی شادی اپنے جیسے عزت داروں میں کرنا چاہتے تھے۔ پیسہ ہو تو آدمی کی ساری 'غلطیاں' 'کوتاہیاں' 'گناہ' اور جرم معاف ہو جاتے ہیں۔ لیکن نقوی صاحب کی بہن سخت مشکلات میں گھر گئی۔ ایک طرف اس کا کوئی گھر اور خاندان نہیں رہا تھا۔ وہ محبت نہیں رہی تھی جس کو اس نے تمام عمر کا سہارا سمجھ لیا تھا اور نفرت کرنے والوں کے درمیان اپنے پاپ کی گٹھڑی اٹھائے پھرنے پر مجبور تھی۔ کیسی عجیب بات ہے یار۔ وہی بچہ ماں باپ کے گھر میں جنم لیتا ہے تو محبت کا ثمر کہلاتا ہے اور خوشیوں سے گھر بھر دیتا ہے اور کوئی بے ضمیر اور بزدل مرد اپنی جان چھڑانے کے لیے جھوٹ بول دے کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تو وہی بچہ

باعثِ گناہ اور ناجائز ہو جاتا ہے۔ ماں کی بات تو وہی رہتی ہے لیکن اولاد اس کے لیے داغِ رسوائی بن جاتی ہے۔ خیر اس لڑکی نے ہمت سے کام لیا اور دہلی پہنچ گئی۔ یہ واقعہ تھا ہندوستان کا۔ اس نے سنا تھا کہ دہلی سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو لے کر اسپیشل گاڑیاں پاکستان جا رہی ہیں۔ وہ لڑکی غصے میں گھر سے نکل آئی تھی ورنہ عقل سے کام لیتی تو اپنے اونچی ذات والے عزت دار اور رئیس زادے شوہر سے قطع تعلق کی قیمت اچھی خاصی وصول کر سکتی تھی۔ وہ سودا کر لیتی کہ اچھا یار میں تمہاری جان چھوڑتی ہوں۔ اس بچے کی پرورش کے لیے اور میری زندگی گزارنے کے لیے مناسب بندوبست کر دو۔"

میں نے کہا "جذبات غالب ہوں تو عقل سے کون کام لے سکتا ہے۔"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے یار۔ وہ راضی خوشی دیتے اس کو پاکستان بھجوا دیتے بائی اللہ" شبلی نے کہا "وہ دہلی میں نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر بہت عرصہ پڑی رہی کیونکہ اسے کسی اسپیشل ٹرین میں جگہ دلوانے والا کوئی نہیں تھا۔ نہ پیسہ تھا، نہ اثر و رسوخ۔ اس نے کچھ زیور پہن رکھا تھا۔ بالآخر وہ اس کے کام آ گیا اور وہ ایک ٹرین میں بیٹھ کے لاہور پہنچ گئی۔ وہ اپنے بھائی کو تلاش کرنا چاہتی تھی جس کے بارے میں اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ پاکستان پہنچ چکا ہے مگر یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یوں ہی بھٹکتی ہوئی ایک دن وہ شیخ صاحب کے بنگلے میں داخل ہوئی۔ شیخ صاحب ریلوے میں افسر تھے۔ وہ صبح آفس جانے کے لیے نکلے تو انہیں برآمدے میں وہ عورت پڑی نظر آئی جس نے گزشتہ رات ہی ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ انہوں نے فوراً ڈاکٹر کو بلوایا اور عورت کو گھر کے اندر شفٹ کر دیا لیکن اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے شیخ صاحب کو ساری بات بتا دی اور نقوی صاحب کے بارے میں بھی سب کہہ دیا۔ شیخ صاحب سمجھ دار آدمی تھے اور کسی قانونی معاملے میں ملوث ہونا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے پولیس کو اطلاع دی اور ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں نقوی صاحب کی بہن کا پورا بیان ریکارڈ کروا لیا۔ اس نے اپنے دستخط بھی کیے اور انگوٹھے کا نشان بھی لگایا۔ اس بیان کی ایک تصدیق شدہ نقل شیخ صاحب کے پاس آج بھی موجود ہے۔ میں بتا چکی ہوں کہ وہ بے اولاد تھے۔ انہوں نے بچے کی پرورش کی اور اس کا نام رفیق شیخ رکھا۔ ساتھ ہی وہ نقوی صاحب کو بھی تلاش کرتے رہے اور بالآخر ان کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئے مگر اس وقت تک نقوی صاحب بہت ترقی کر چکے تھے اور ان کا مستقبل تو شاندار تھا ہی۔ وہ اپنا ایک شاندار ماضی بھی بنا چکے تھے۔ اپنی خاندانی تاریخ اور شجرۂ نسب کو اپنی حیثیت کے مطابق کرنے کے بعد انہوں نے بوگس کلیم داخل کیے تھے اور لاکھوں کی متروکہ جائیداد اپنے نام الاٹ کرا لی تھی۔ نقوی صاحب نے پہلے تو رفیق کو اپنا بھانجا تسلیم کرنے سے یکسر انکار

کیا۔ اسی بنیاد پر کہ ان کی کوئی بہن نہیں تھی۔ پھر یہ مانا کہ بہن تو تھی مگر ایک ہندو سے شادی کے بعد وہ ان کے لیے مر چکی تھی۔ شیخ صاحب نے انہیں یاد دلایا کہ ان کی بہن ہندو نہیں ہوئی تھی وہ لڑکا مسلمان ہو گیا تھا جس نے اس سے شادی کی تھی مگر بعد میں اس کے خیالات بدل گئے۔ اس پر ذات برادری کا دباؤ بھی بڑھا اور اسے یہ خیال بھی پریشان کرنے لگا کہ وہ ایک لڑکی کے چکر میں ساری دولت اور جائیداد سے محروم ہونے جا رہا ہے۔ لڑکی جیسی بھی تھی 'غیر مذہب' کی تھی اور اب محبت کا بھوت اتر گیا تھا تو اسے باپ دادا کے دھرم سے ایک ناری کے لیے پھٹا ہوا پاپ لگنے لگا تھا۔ شادی سو فیصد جائز تھی اور رفیق ہر طرح سے ان کا بھانجا تھا۔ شیخ صاحب کی معلومات پر نقوی صاحب کو شک ہوا اور شیخ صاحب نے بالآخر ترپ کا آخری پتا ان کے سامنے پھینک دیا۔ ان کی بہن کا پورا بیان جس کی تصدیق ایک مجسٹریٹ نے کی تھی کہ یہ مرتے وقت دیا گیا تھا۔ اس کی صداقت کو قانون تسلیم کرتا تھا۔ نقوی صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس بیان کے سامنے آ جانے سے ان کا ماضی غلط ہو جاتا تھا اور ظاہر ہے 'مستقبل' مخدوش ہو جاتا تھا۔ انہوں نے شیخ صاحب سے وعدہ کیا کہ وہ رفیق کی ہر ممکن طریقے سے مدد کریں گے۔ اسے اپنے گھر میں رکھیں گے اور اس کی حفاظت بھی کریں گے۔ ہر طرح سے مطمئن ہو جانے کے بعد شیخ صاحب نے رفیق کو یہاں بھیج دیا اور نقوی صاحب نے اس سے اپنا تعلق پوشیدہ رکھتے ہوئے اسے ملازمت دلوائی پھر ترقی دلوائی اور بالآخر اپنے پی اے کے طور پر ساتھ رکھ لیا۔ جب مجھے شیخ صاحب نے رفیق کے نام خط دیا تھا تو یہ سب بتا دیا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے پتے سوچ سمجھ کے استعمال کروں۔ رفیق میرے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جس شخص کا پی اے ہے، وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور رفیق سب کچھ کروا سکتا ہے۔ جب رفیق مجھ سے ملا تو میں نے اسے اپنے بارے میں صرف یہ بتایا کہ میں لندن سے آئی ہوں۔ وہاں میں ڈاکٹر تھی اور اب میرا ارادہ پاکستان میں پریکٹس کرنے کا ہے یا پھر کسی اچھے اسپتال میں جاب کرنے کا۔ اس نے کہا کہ وہ میری ہر طرح سے مدد کرے گا۔ پھر میں نے کہا کہ ویسے تو میرا دشمن کوئی نہیں لیکن میں ایک شخص کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں کہ آج کل وہ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے؟ میں نے چوہدری دلاور کا نام لیا تو وہ حیران ہوا کہ آپ کا اس سے کیا تعلق؟ میں نے کہا کہ میرا تعلق سکندر بخت سے بہت قریبی رہا ہے لیکن میں نے سنا ہے کہ چوہدری دلاور کی سکندر سے جانی دشمنی ہے۔ میں سکندر بخت سے ضرور ملوں گی اور اکثر ملوں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میرے پیچھے پڑ جائے۔ رفیق ہنسنے لگا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ چوہدری دلاور آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ میں نے کہا کہ اچھا یہ ساری باتیں ہمارے درمیان رہنی چاہئیں۔"

میں نے کہا "اس کے بعد رفیق نے میری اور چوہدری دلاور کی

ملاقات کی راہ ہموار کی تھی۔ تمہارے کہنے پر۔"

"میرے کہنے پر! نہیں یار۔ میں نے تو اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اور میں کر بھی کیسے سکتی تھی۔ ایسے تو میں براہ راست ملوث ہو جاتی۔"

"پھر یہ کیا چکر تھا؟" میں نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا "اتنی دیر سے ہم باتیں کر رہے ہیں اور ابھی صرف نو بجے ہیں۔"

"باتیں کہاں کر رہے تھے۔ میں بول رہی تھی اور تم سن رہے تھے۔ ایک بات پوچھوں سکندر؟"

"نہیں۔ دو باتیں پوچھو" میں نے کہا۔

"کیا تم رفیق کو یہاں دفن کرنے کے لیے لائے ہو؟"

"خیال تو یہی تھا پہلے۔"

"اب بدل گیا ہے؟"

"ہاں۔ سوچ رہا ہوں کہ یہ معاملہ نقوی صاحب کے سپرد کر دوں۔ وہ اس سے بہتر طور پر نمٹ لیں گے۔"

"شاید اسی لیے رفیق نے نقوی صاحب کا نام لکھا تھا۔"

"مگر وہ لکھا ۔۔۔ جا اور جا۔۔۔ چا۔"

"اگر لفظ مکمل کیے جائیں۔ فرض کرو یہ معما حل کرنا ہو تو بھا اور جا کے نیچے کیا لگایا جا سکتا ہے۔"

"میں نے بھائی جان سمجھا تھا۔"

"بھاگ جاؤ۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

میں اچھل پڑا "رائٹ۔ ویری رائٹ۔ یہی مطلب تھا اس کا۔ تم نے تو کمال کر دیا یار۔"

"اب تو تم بھی بری عادت کا شکار ہو گئے" اس نے طنز سے کہا۔

میں نے کہا "صحبت کا اثر تو ہوتا ہے نا۔ ویسے میں تمہاری دلیل سے قائل ہو گیا تھا کہ یار کہنے میں کوئی برائی نہیں۔ برائی تو ان کے دماغ میں ہوتی ہے جو اس کا برا مطلب نکالتا ہے۔ اگر رفیق کی آدھی بات کا مطلب یہ تھا تو باقی آدھی بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔ جان بچا کے۔ وہ پورا لفظ نہیں بول پا رہا تھا۔ جا کا مطلب جان۔ با۔ چا کا مطلب بچا کے۔۔۔ بھاگ جاؤ اپنی جان بچا کے۔ یہی کہنا چاہتا تھا وہ۔"

"اس کا مطلب سمجھے بغیر بھی ہم نے ایسا ہی کیا۔"

"لیکن بات اس سے زیادہ ہو گی۔ ہم اس وقت خطرے میں تھے تو اس وقت بھی ہوں گے۔ یا تو ہم گاڑی وہیں چھوڑ دیتے۔ گاڑی ہی ہمارے لیے جال تھی جسے ہم ساتھ لیے پھر رہے ہیں۔ یقیناً کوئی یہ رپورٹ دے چکا ہو گا کہ شکار جال میں پھنس گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شکاری کیا کرتے ہیں۔"

"یار ایک دوسرے کی شکل تو دیکھ نہیں سکتے۔ اور کیا دیکھیں گے اندھیرے میں بیٹھے رہیں گے رات بھر۔ کالی بیتے رہیں گے اور جاگتے رہیں گے۔ اُلوؤں کے جوڑے کی طرح جو ویرانے میں۔"

اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ میں نے روشنی کی ایک چمک سی دیکھی اور پھر ایک آواز سنی۔ کوئی گاڑی گھوم کے گیٹ تک آئی تھی اور اس کی ہیڈ لائٹس شیشوں پر پڑی تھیں۔ رات کی خاموشی میں جیپ کے انجن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

میں نے ایک پردے کا کونا ہٹا کے باہر جھانکا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دو سائے گیٹ کھول رہے تھے۔ جیپ سیدھی اندر آئی اور اس کا انجن خاموش ہو گیا۔ ڈرائیور اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر سے دو افراد کود کے باہر آئے۔ گیٹ کھولنے والے بھی بڑی بے خوفی سے قدم بڑھا رہے تھے اور میں ان سب کے ایک جیسے حلیوں سے اندازہ کر سکتا تھا کہ ان موت کے فرشتوں کو کس نے بھیجا ہو گا۔ وہ سب گہرے رنگ کی قمیص اور پتلون پہنے ہوئے تھے اور بے مدچوکس تھے۔ اگر پتا بھی ہلتا تو وہ جیب سے ریوالور نکالنے میں دیر نہ لگاتے۔

مجھے بالکل پتا نہیں چلا کہ عین میرے پیچھے شبلی مجھ سے تقریباً چمٹ کے کھڑی ہوئی ہے۔ جب اس کا جسم خوف سے کانپنے لگا تو مجھے جنبش ہوئی۔

"ڈاکٹر صاحب! اتنا کمزور دل ہے آپ کا تو کوئی موٹی ساتھ والی تھی اعصاب کو تقویت پہنچانے والی۔" میں نے کہا۔

"سکندر! یار فرض کرو یہ اندر آ گئے۔۔۔"

میں نے اطمینان سے کہا "فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اندر ہی آئیں گے۔"

"پھر تم کیا کرو گے؟"

"میں انہیں کہوں گا السلام علیکم۔ پھر ان سے معانقہ کر کے بیوی بچوں کی خیریت معلوم کروں گا۔ ابھی دیکھو یہ کیا کرتے ہیں۔"

حسب توقع انہوں نے ٹارچ کی روشنی میں گیٹ سے گیراج تک آنے والے راستے کو دیکھا۔ میں دوسری کھڑکی کے پاس چلا گیا اور اس کا ایک ٹوٹا ہوا شیشہ دیکھ کے مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے ایک کان شیشے سے باہر رکھتے ہوئے ان کی گفتگو سننے کی کوشش کی۔

"یہاں کوئی گاڑی نہیں آئی" ایک نے کہا۔

"اوئے گاڑی کیسے نہیں آئی؟"

"کیا اڑ کے آئی ہو گی۔ مٹی میں کوئی نشان نظر آ رہے ہیں ٹائروں کے؟"

"میاں جی۔" تیسرے نے کہا "یہ راستہ کچھ ضرورت سے زیادہ صاف نہیں ہے؟"

چوتھا بولا "ہاں۔ کسی نے جھاڑو دی ہے اس پر۔"

"جھاڑو کیا تیرے باپ نے دی ہو گی؟"

"اوئے باپ تک مت جا۔۔۔"

"چلو اس بحث کو اِنے۔ گیراج کو دیکھو۔" پہلے شخص نے کہا

www.paksociety.com

"گاڑی اندر جاتی تو پہلے سامان ہٹانا پڑتا۔"

"گاڑی پیچھے بھی ہو سکتی ہے۔"

"پیچھے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آس پاس کے علاقے میں کسی سڑک پر کھڑی ہو یا کسی دوسری کوٹھی میں۔"

"یا پھر وہ کہیں اور بھی تو جا سکتے ہیں۔"

"پاگل کے بچے! ہم یہاں ایسے ہی نہیں آ گئے ہیں۔ ایک ایک لفظ سنا تھا ہم نے۔ سارے راستے انہوں نے کیا باتیں کی تھیں۔"

"گاڑی میں خفیہ مائیکروفون تھا؟" وارا استاد۔

"اب چلو اندر۔ ایک تو یہاں ٹھہرے، ایک باہر گیٹ پر جائے۔ مر پیچھے سے اندر داخل ہوں گے۔ اپنے اپنے دائیں بائیں آنکھ رکھنا۔ کوئی بھی ایسی ویسی آواز سنے تو دیر نہ کرے۔"

اس انکشاف نے کہ کار میں خفیہ مائیکروفون لگا ہوا تھا اور اس کی مدد سے انہوں نے ہماری ساری باتیں سن لی تھیں، میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔

میں نے شیلی کو پیچھے کھینچ لیا۔ "بڑی غلطی ہو گئی ہم سے۔"

"صرف ایک غلطی... جو کوئی بات نہیں ہے۔"

"تم مذاق سمجھ رہی ہو۔" میں نے اسے گھورا "وہ لوگ اندر آ رہے ہیں۔ اتفاق سے سب کھانے کا سامان۔ کافی کے مگ اور کیتلی۔ اچھا ہوا کہ تم نے صرف کرسیاں صاف کی تھیں۔ بیڈ کی چادر، تکیے نہیں بدلے تھے ورنہ وہ تو فوراً تاڑ جاتے کہ کسی نے صفائی کی ہے۔"

اس نے گھبرا کے کہا "یہ کرسیاں جن پر ہم بیٹھے تھے یار..."

میں نے دونوں کرسیوں کو فولڈ کر کے دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا "چلو وہ کرسیوں پر تو گرد ہے۔"

"اتنی گرد میں فرش پر ہمارے قدموں کے نشانات بھی صاف نظر آ رہے ہوں گے۔"

میں نے چند سیکنڈ سوچا "اب نشانات مٹانے کے لیے تو وقت نہیں ہے۔ تمہارے پاس کوئی ہیئر ہے۔"

"ہیئر پن... کیا بکتے ہو؟"

"کوئی بھی ہو۔ دس بیس کا چارہ تو ہاتھ آئے گا۔"

"کیا کرو گے؟ کیا پاس کرنا ہے؟" اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈالا اور مجھے ایک ہیئر پن تھما دیا۔

"اب تم چلو بیڈ کے نیچے سانس روک کے لیٹ جاؤ۔" میں نے بیڈ کے سرہانے والی لائٹ کا بلب نکال لیا۔

بلب کے اوپر پن رکھ کے میں نے اسے پھر اپنی جگہ ہولڈر میں فٹ کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ دروازے کے ساتھ والے بورڈ پر پہلا سوئچ اسی لائٹ کا ہے۔ جو بھی اندر آئے گا وہ لائٹ جلانے کے لیے پہلا سوئچ آن کرے گا اور اس کے ساتھ ہی فیوز اڑ جائے گا۔ اگر کسی نے فیوز دوبارہ لگانے کی زحمت کی تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ جب تک ہیئر پن بلب کے اوپر موجود ہے شارٹ سرکٹ رہے گا اور فیوز اڑتا رہے گا۔ ان کے لیے فیوز اڑنے کا سبب تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اول تو ان کی عقل میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ فیوز کیوں اڑ رہا ہے۔ اسے وہ پرانے تاروں کی خرابی ہی سمجھتے اور بفرض محال کسی کے ذہن میں یہ خیال آتا تو پورے گھر کے بلب نکال کے فیوز اڑانے والے بلب کو تلاش کرتے کرتے انہیں صبح ہو جاتی۔

ڈبل بیڈ کے اوپر پڑے ہوئے کور کو اٹھا کے میں دوسری طرف سے اندر لیٹ گیا۔ وہاں لیٹنا مجھے بہت عجیب لگا۔ یہ ایک پرتکلف بیڈ روم تھا اور یہ بیڈ روم اس گھر کا حصہ تھا جس کا میں مالک تھا مگر یہاں میں ایسے چھپ کر لیٹا ہوا تھا جیسے میں چور ہوں۔ چور دندناتے ہوئے اوپر آ رہے تھے۔ میں نچلی منزل پر ان کے باتیں کرنے کی، گالیاں بکنے کی اور دروازے دھڑ دھڑ مارنے کی آوازیں سن رہا تھا۔

میرے بہت قریب ایک اجنبی لڑکی لیٹی ہوئی تھی جس کے قرب کی خوشبو اس محدود سی جگہ میں بھر رہی تھی۔ وہ لڑکی بہت اعلیٰ قسم کی پرفیوم استعمال کرتی ہوگی لیکن اس وقت یہ دلنواز مہک بھی مجھے زہر لگ رہی تھی۔ خوشبو بے کل نہ جانے کہیں راز نہ کھول دے... یہ خوشبو پکار کے نہ کہے کہ وہ گل کہاں کھلا ہے جس نے اس ویران اندھیرے کو مہکا دیا ہے۔ شیلی گرد اور دھول کے بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ لڑکی ہر پہلو کے اعتبار سے بہت ماہر ڈاکٹر تھی، لندن کے ماحول کی پروردہ تھی اور تلسیز جیسے ہوٹل میں قیام پذیر تھی، میری طرح مجبور تھی اور خوف زدہ تھی۔ اسے نہ اپنے کپڑوں کا خیال تھا نہ بالوں کا۔ نہ یہ احساس تھا کہ اس وقت فرش خاک پر لیٹی ہوئی وہ لندن میں ایک لاکھ پونڈ کا بینک بیلنس، ذاتی مکان اور گاڑی رکھنے والی ڈاکٹر شیلا خان نہیں بلکہ کوئی بے آسرا، بے گھر اور بے امان فقیر ہے۔ اس شہر میں آسمان کی کھلی چھت کے نیچے ایسے ہی خدا کی زمین پر پڑاؤ ڈالنے والے نہ جانے کتنے مفلس ہوں گے مگر وہ ہم سے یوں بہتر تھے کہ انہیں جان کے خوف سے تحفظ حاصل تھا اور ان کی آنکھوں کو نیند میسر تھی۔

میں نے تاریکی میں آہستہ سے ہاتھ بڑھایا اور شیلی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

"یار! مجھے ایسے لگتا ہے کہ میں مر چکی ہوں اور یہ میری قبر ہے۔ لوگ مجھے دفنا کے جا چکے ہیں اور اب اندھیرا ہے۔"

میں نے کہا "اگر تم مر چکی ہو تو خاموش رہو۔ مردے بولتے نہیں۔"

اس نے اپنی بات سرگوشی میں جاری رکھی "ابھی اب دیکھو یہ میں یہاں منکر نکیر آئیں گے اور مجھ سے سوال کریں گے کہ تم کون ہو۔"

"یہ خوشبو بہت اچھی ہے۔ جس مس شیلی! اگر ہم پکڑے گئے تو اسی خوشبو سے پکڑے جائیں گے۔"

"میں کیا کروں یار۔ عادت ہے مجھے تو... اور تم اسے بری عادت بھی نہیں کہہ سکتے۔"

"شش۔" میں نے آہستہ سے کہا "وہ لوگ اوپر آ گئے ہیں۔"

"اچھا... یار! انہوں نے پکڑ لیا ہمیں تو کیا بالکل مار ڈالیں گے؟" اس نے میرے اور قریب آ کے بالکل میرے کان میں کہا۔

"مجھے ضرور مار ڈالیں گے۔" میں نے فوراً دانت پیس کے کہا۔

"مجھے کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ تم لڑکی ہو، خوب صورت ہو، ایک زخمی تلوار اور ایک قاتل ادا سے سب کو ڈھیر کر دو گی۔"

باہر سے کسی نے گالی دے کر کہا "ارے... یہاں تو بھوت بھی نہیں ہیں۔"

"بھونک مت... گئے تو گئے اور کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔"

"وہ کہاں ہوں گے؟ سب جگہ تو دیکھ لیا۔"

پھر دھڑ سے لات مار کے کسی نے دروازہ کھولا۔ باہر سے تھوڑی سی روشنی اندر آئی۔ اب تک وہ ہر کمرے میں لائٹ جلا کے دیکھتے آئے تھے۔ میں منتظر رہا کہ وہ اس کمرے کی روشنی کے سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھائیں۔

"تو نے بالکل دے پٹیڑا ان کی گاڑی۔"

"پھر وہی بکواس! گاڑی نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خود بھی یہاں نہیں ہو سکتے۔"

"اچھا استاد۔ گرمی کیوں دکھاتے ہو۔ سارے گھر کی خاک تو چھان لی۔"

"کچھ نہیں۔ کوئی سراغ نہیں۔" پہلے نے کہا۔

دوسرا بولا "ہاں یار۔ جہاں آدمی ہوتا ہے کوئی نشانی تو چھوڑتا ہے۔"

"پھر کافی کی خوشبو کیوں تھی کچن میں؟" اس شخص نے دہاڑ کے کہا جو غالباً اس شکاری ٹولے کا استاد تھا۔

"میری تو ناک خراب ہے۔" ایک نے کہا۔

دوسرا بولا "میں نے کبھی کافی پی ہی نہیں۔"

استاد نے کہا "وہ یہاں آئے ضرور تھے۔ الماریوں میں دیکھو۔ باتھ روم میں جھانک کے دیکھو۔ بے وقوفوں کی طرح کھڑے مت رہو۔"

خلاف امید اس نے لائٹ آن نہیں کی تھی۔ شاید باہر سے آنے والا اجالا انہیں کافی محسوس ہوا تھا۔

"استاد جی! ذرا لائٹ تو جلاؤ پھر پتا چلے کچھ۔"

جب لائٹ آن ہوتے ہی ایک دم تاریکی چھائی تو مجھے تھوڑی سی ڈھارس بندھی ورنہ یہ اندیشہ پیدا ہونے لگا تھا کہ ذرا سا بھی سراغ ملا تو استاد بیڈ کے نیچے جھانکنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے اور روشنی میں گرد پر انسانی قدموں کے تازہ نشانات واضح نظر آ سکتے تھے۔

"ارے! استاد کی ہو گیا...؟"

"بیڑی بے بیڑا سر۔ اندھیرا ہو گیا اور کیا ہوا۔ فیوز اڑ گیا۔"

"کیسے اڑ گیا؟"

"جیسے نور جہاں کے ہاتھ سے کبوتر اڑ گیا تھا۔ بول۔ مجھ سے کیا پوچھتا ہے گھونٹ استاد سے پوچھ" جواب دینے والا ہنسا۔

"چلو نکلو یہاں سے۔" استاد نے حکم دیا "یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"استاد جی! فیوز ٹھیک کروں؟"

"رفع کر۔ یہ لائٹ خراب تھی۔" استاد نے ناگواری سے کہا۔ "سب جگہ دیکھ لیا ہم نے۔"

"کوئی کونا نہیں چھوڑا۔"

"راستے میں پانی کا ٹینک دیکھ لیا۔ نیچے والا بھی اور اوپر والا بھی۔"

استاد واقعی استاد تھا۔ "کیا پتا وہاں چھپے ہوں۔"

"پانی کے اوپر یا نیچے؟ انسان کے بچے ہیں یا مچھلی کے؟"

"الو کے پٹھے۔ یہ بہت پرانا طریقہ ہے۔ جس بات کا پتا نہ ہو اس پر بولنا بھی نہیں چاہیے۔" استاد نے جاتے جاتے کہا "مجرم ڈھکن کھول کے اندر اتر جاتے ہیں۔ کوئی ڈھکن کھول کر جھانکے تو پانی میں غوطہ مار جاتے ہیں ورنہ سر اوپر رکھتے ہیں۔ خود میں نے ایک بار پولیس کو ایسے ہی دھوکا دیا تھا۔"

آہستہ آہستہ ان کی آوازیں دور ہو گئیں۔ وہ جاتے وقت دروازہ بند کر کے نہیں گئے تھے۔ میں نے ان کے زینے سے اترتے قدموں کی چاپ بھی رات کے سناٹے میں صاف سنی اور کھسک کے بیڈ کے نیچے سے نکل آیا۔ شیلی نے بھی ادھر سے ہی سرک کے خود کو باہر کیا اور مجھ سے ٹکرائی۔

"یار! رک کیوں گئے؟" وہ ہنسی۔

میں نے ایک دم اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "ڈاکٹر صاحبہ! دماغ کیا ڈھائی میں خرچ کر دیا سارا یا لندن چھوڑ آئی ہو۔"

"تمہارے ہاتھ تو بالکل گنواروں جیسے ہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا "ایسے دباتے ہیں کسی لڑکی کا منہ۔"

"مجھے کسی بے وقوف لڑکی کا منہ دبانے کا پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا ڈاکٹر شیلی۔" میں نے خفگی سے کہا۔

میرے اندیشے ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ استاد نیم تیز ذہن تھا اور اگر کمرے میں روشنی زیادہ ہوتی تو وہ یقیناً گرد پر ہمارے قدموں کے نشانات بھی دیکھ لیتا اور قریب آتا تو شاید کافی کی مہک کو بھی سونگھ لیتا۔ باقی احمقوں کے مقابلے میں استاد کے حواس خمسہ تیز تھے۔ اب بھی مجھے ڈر تھا کہ وہ گیراج میں گھسنے کی کوشش نہ کرے۔

شیلی کا ہاتھ تھام کے میں نے دبے پاؤں اندھیرے میں قدم بڑھایا۔ اس گھر میں میرا بچپن گزرا تھا اور یہاں میں آنکھ بند کر کے

www.paksociety.com

کسی بھی کمرے کے کسی بھی کونے یا دروازے تک پہنچ سکتا تھا۔ ہمارے تعاقب میں آنے والوں نے ایک فاش غلطی کی تھی۔ ان کی جگہ میں ہوتا تو خاموشی سے آتا اور ہر کمرے میں ایسے داخل ہوتا کہ کسی کو پتا نہ چلتا مگر وہ مسلسل بول رہے تھے۔ ان کی قسمت ان کا ساتھ دے رہی تھی اور میں خون خرابہ کرکے اپنے مسائل میں اضافہ نہیں چاہتا تھا ورنہ ان کے آنے کی خبر مجھے پہلے ہی مل گئی تھی اور میں باری باری ان سب کو ایک منٹ سے کم وقت میں لٹا سکتا تھا۔ میں مسائل کے چیستان میں اتنا الجھ چکا تھا کہ اب میری خواہشات کی لگام عقل کے ہاتھ میں تھی۔ میرے جذبات پر جوش سے زیادہ ہوش کا غلبہ تھا اور میں جارحانہ عزائم پر دفاعی حکمت عملی کو ترجیح دے رہا تھا۔

شیلی کے ساتھ میں ایک ایک زینہ سنبھل کے اتر رہا تھا اور اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور دوسرا ریلنگ پر۔ مجھے دوسری طرف سے دیوار کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ سب زینوں پر قالین تھا۔ ان کی چوڑائی اور اونچائی برابر تھی مگر برا ہو اونچی ایڑی کا۔ اچانک شیلی کا توازن بگڑ گیا اور میں نے اسے نہ کھینچا ہوتا تو وہ منہ کے بل گرتی اور لڑھکتی ہوئی نیچے جاتی۔ ظاہر ہے وہ چیخ بھی مارتی اور یہ کوئی ناز نخرے والی چیخ نہ ہوتی جو عموماً خواتین بڑی الاپچی کرکے کاکروچ سمجھ کے بھی مار دیتی ہیں۔ یہ دلخراش' فلک شگاف' قیامت خیز قسم کی چیخ اس ویران حویلی کے گوشے گوشے میں پہنچتی اور وہ شکاری کتے جو مایوس لوٹ رہے تھے' فوراً پلٹ آتے۔ نیچے میں مارا ماری ہوتی اور ایک ہی ہلہ کم سے کم چار افراد کی جان لے لیتی۔

شیلی نے ضبط سے کام لے کر مجھے حیران کر دیا۔ اس نے حلق سے "ہائے اللہ" یا "اوئی اماں" جیسی آواز تک نہیں نکالی۔

"ہو گیا کچھ؟" میں نے اسے سنبھالنے کے بعد کہا۔

"ہاں یار۔ یہ پاؤں کچھ مڑ گیا ہے۔" اس کی آواز سے صاف تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ "موچ آگئی ہے شاید۔"

"اچھا بیٹھ جاؤ یہاں۔" میں نے اسے زینے کے درمیان میں بٹھا دیا۔

"یہ اونچی ایڑی....."

میں نے کہا "تم عورتوں کے فیشن کا تعلق عقل سے بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اچھا بھلا قد ہے تمہارا۔ ساڑھے چار فٹ کی تو ہو نہیں کہ چار انچ کی ہیل ضروری ہو۔"

"یار تمہیں کمپلیکس ہو گیا ہے کہ میرا قد بڑھ گیا۔" وہ کراہ کے بولی۔

"ایک فٹ اونچی ایڑی ہو تو شاید تم میرے برابر آ جاؤ۔" میں نے کہا "تم چل سکتی ہو یا نہیں؟"

"تم جیسا کوئی بن جاؤ تو چل لوں گی۔ ورنہ یار' میرا وزن ہی کتنا ہے۔ ایک سو اٹھارہ پونڈ" وہ ہنسی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

باہر گاڑی کا انجن غرایا اور پھر ہیڈ لائٹس نے اس گھر کے اندھیرے کو ذرا سی دیر کے لیے اجال دیا۔ مجھے ایک انجانی سی خوشی کے احساس نے سرشار کر دیا۔ میری تھوڑی سی ہوشمندی' احتیاط اور چالاکی نے اس شکاری ٹولے کے عزائم کو خاک میں ملا دیا تھا ان کی آنکھوں میں دھول جھونک دی تھی اور ان کی عقل کو گمراہ کر دیا تھا۔ یا پھر اسے بھی میں اپنی زندگی کے ان گنت معجزوں میں سے ایک شمار کر سکتا تھا جب بچانے والے ہاتھ نے زبردست ہونے کا ثبوت دیا اور مارنے والے ہاتھ کو روک لیا۔

میں نے خوشی سے نعرہ لگایا "یہ...ہوو...وہ مارا پاپڑ والے کو۔"

شیلی ہنسی "کسے مارا؟ کون پاپڑ والا؟"

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے گھما دیا "اب چلو واپس۔ دشمن گئے۔ میدان صاف ہے۔"

اس نے چیخ ماری "اف۔ یار میرا پاؤں۔"

میں نے اسے گرنے سے پہلے ہی اٹھا لیا "سوری۔ میں بھول گیا تھا کہ تم لنگڑی ہو اور معذور ہو۔"

اس کا وزن مجھے ایک سو اٹھارہ پونڈ بھی نہیں لگا لیکن یہ بڑا عجیب لگا کہ جس لڑکی سے میں کچھ دیر پہلے لا روز ریسٹورنٹ میں سیدھے منہ بات کرنے کا روادار بھی نہ تھا' اب وہ میری آغوش میں تھی اور حالات نے ایسی کروٹ لی تھی کہ ذہنی طور پر بھی وہ میرے بہت قریب آگئی تھی۔ اسے جذباتی قربت کا نام دینا غلط ہوگا۔ یہ صرف مجبوری تھی جس نے مجھے اور اسے یکجا کر دیا تھا اور اس ویران گھر کی رات میں اعتماد کے رشتے سے باندھ دیا تھا۔ اسے واپس بیڈ روم کی طرف لے جاتے ہوئے میں نے سوچا کہ اگر یہ سب رابعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے یا میں اسے بتاؤں تو وہ کیا سمجھے گی؟ میری فطرت' میری عادت اور میری محبت کو اچھی طرح سمجھنے' جاننے اور ماننے کے باوجود یہ ناممکن ہوگا کہ وہ شک' حسد اور رقابت کے جذبات کا شکار نہ ہو۔ اور ایک رابعہ پر ہی کیا منحصر' شاید نازو اور گل کو بھی یقین نہ آئے کہ شیلی نے میرے قریب آنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ بظاہر معصوم اور بے ضرر محسوس ہونے والے اتفاقات کو حالات کی سازش کا نام دے کر خود کو الزام سے بچانا مشکل ہوگا۔ ممکن ہے محسن یا غالب مجھ پر اعتبار کر لیں مگر عورت ہونے کے ناتے نازو اور گل کا متفقہ فیصلہ جذباتی ہوگا اور وہ مجھے شک کا فائدہ بھی نہیں دیں گی۔ رابعہ کے طرز عمل کے بعد میں نے جان بوجھ کے شیلی کو ملتفت ہونے کا بہانہ فراہم کیا۔ یہ ایک گھٹیا انتقامی جذبہ تھا جس سے مجبور ہو کے میں اسے یہاں لایا ورنہ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ میں غالب کو' منظر یا وقار یوسف کو فون کرکے ساری صورت حال بتا دیتا اور پھر سب مل کے اس مشکل کا کوئی آسان حل تلاش کر لیتے۔

اچانک مجھے اپنے طرز عمل پر ندامت کی خلش پریشان کرنے لگی۔ ان حالات میں کہ یہاں فون بھی ہے' میں نے ابھی تک کسی کو

کیوں اطلاع نہیں دی کہ میں کس مصیبت میں ہوں اور کہاں ہوں۔ وہاں سب لوگ میری پریشانی سے دوچار ہوں گے۔ ایک طرف انہیں رابعہ کی فکر ہوگی جو اپنے ہی جذبات کے آتش فشاں میں خاکستر ہو رہی تھی۔ دوسری طرف میری گمشدگی انہیں تشویش میں مبتلا کرے گی کہ مایوسی اور دل شکستگی کی کیفیت میں نہ جانے مجھ پر کیا گزری کہ وہ لوٹ کے نہیں آیا۔ میری فطرت سے سب ہی واقف تھے کہ میں شدید ترین ڈپریشن کی حالت میں بھی خودکشی نہیں کروں گا۔ فلمی ہیرو کی طرح میرا اس رات کی تنہائی میں راوی کے کنارے بیٹھنا اور چاند کو تکتے ہوئے کوئی دردناک گیت گانا۔ وشتا۔ بہت لگاکے میں نے یہ پھل پایا۔ سدھ بدھ کھوئی چین گنوایا "مشکل تھا۔

شیلی کو گرد آلود بیڈ پر لٹا کے میں نے فیصلہ کیا کہ میرا اس طرح رات بھر یہاں روپوش رہنا میرے مسائل میں اضافہ تو کر سکتا ہے' مسئلے کو حل نہیں کرے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میں منظر یا غالب سے فون پر رابطہ کروں ورنہ میرا کوئی عذر بھی قابل قبول نہیں سمجھا جائے گا کہ جب شکاری ٹولہ واپس چلا گیا تھا اور فون بھی ٹھیک تھا تو آپ اس بیڈ روم میں شیلی کے ساتھ صبح تک صرف باتیں تو نہیں کرتے رہے ہوں گے اور پھر ایسی کون سی باتیں تھیں کہ آپ کو ہم بھی یاد نہ آئے۔

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی! تم ذرا آرام کرو۔"

"آرام خاک کروں۔ اس بیڈ پر تو اتنی دھول ہے۔"

میں نے طنز سے کہا "تمہارا میک اپ خراب ہو رہا ہے' کپڑوں پر داغ لگ گئے ہیں۔ بھول گئیں ابھی کچھ دیر پہلے بیڈ کے نیچے کس حال میں پڑی تھیں۔"

"وہ مجبوری تھی یار...."

"اچھا تو تم چادر جھاڑ دو۔ میں آتا ہوں فیوز چیک کرکے۔ تمہیں ڈر نہیں لگنا چاہیے۔"

"یار' جب آدمی اپنے آپ سے نہ ڈرتا ہو تو پھر صرف خونخوار جانوروں سے ڈرتا ہے۔ مثلاً لال بیگ' مکڑی' چھپکلی وغیرہ سے۔ بھیڑیے یا شیر وغیرہ تو یہاں آ نہیں سکتے۔ جن بھوت پر میرا اعتقاد نہیں۔" وہ بولی "بس تم آ جانا۔"

"اس فضول بات کا کیا مطلب ہے آخر؟ میں فرار ہو رہا ہوں فیوز لگانے کے بہانے؟" میں بگڑ گیا۔

وہ ہنسی "یار کیوں اتنے TENSE ہو رہے ہو۔ ٹیک اٹ ایزی۔ کیا مجھے معلوم نہیں کہ تم ہی میرے محافظ بنے ہو اور اپنی مرضی سے۔ تم مجھے یہاں چھوڑ کے کیسے جا سکتے ہو؟ میں مذاق کر رہی تھی۔"

میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ نیشن کی اولاد۔ بات بات پر کہتی ہے ٹینس کیوں ہو رہے ہو۔ ٹیک اٹ ایزی۔ بابا۔ کوئی ظلم کا سین ہے یا ڈراما چل رہا ہے کہ میں سکون سے بیٹھا دیکھتا رہوں۔ میں نے زینے سے نیچے جاتے ہوئے سوچا۔ اپنا یہ حال ہے کہ پاؤں مڑ گیا تو ہائے میں مر گئی۔ اپنا سایہ دیکھا تو چیخ مار دی۔ فلم میں دردناک منظر دیکھا اور رونا شروع کر دیا۔ ہسٹریا کا تماشا کرکے اندر کا سارا غبار نکال دیا۔ مرد بے چارے چپ رہتے ہیں۔ خاموشی سے برداشت کرتے ہیں تو کہتی ہیں کہ تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی TENSE بھی نہ ہو۔

میں نے ماچس کی تیلی جلا کے فیوز دیکھا۔ دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے فیوز وائر بھی وہیں رکھ دیا گیا تھا۔ اسکریو ڈرائیور بہرحال نہیں تھا۔ کہ میں پرانا جلا ہوا تار ہٹا کے نیا تار فٹ کرتا۔ میں نے فیوز کے دونوں کناروں کو تار سے باندھا اور کٹ آؤٹ لگا دیا۔ ایک شعلہ سا لپکا اور فیوز پھر اڑ گیا۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ اسے کہتے ہیں اپنی ہولی اپنا سر۔ جن کو اندھیرے میں رکھنے کے لیے بلب کے نیچے سکہ لگایا تھا' وہ تو چلے گئے فیوز لگائے بغیر اور سکہ ہٹائے بغیر فیوز لگانے کی حماقت کا اعزاز میرے حصے میں آیا۔ لائٹ ہی بھر کے لیے چلی گئی تھی۔ شیلی اگر عقلمندی سے کام لیتی تو سمجھ جاتی کہ پھر فیوز اڑ گیا اور خود ہی بلب ہٹا دیتی مگر ایک تو اس کے پنجے میں موچ تھی۔ وہ بیڈ کے سرہانے پر چڑھ کے بلب اتارتی تو اس کے دوسرے پنجے میں بھی موچ آ جاتی یا وہ گر کے مر ہی جاتی۔

مجھے خود اوپر جا کے بلب نکالنا پڑا پھر واپس آ کے دوسری بار فیوز لگاتے ہی اوپر نیچے کے سب کمرے روشن ہو گئے۔ یہ لائٹس جلانے والے وہی تھے جو عقل سے پیدل نہ ہوتے تو ہماری موجودگی کا سراغ لگا سکتے تھے مگر عام آدمی ایسا باریک بین' سراغ رساں نہیں ہوتا جیسا کہ شرلاک ہومز تھا ورنہ گیٹ کے باہر کی نشانات دیکھ کے ٹائر کا سائز' گاڑی کا میک اور ماڈل' رفتار اور رنگ سے لے کر چلانے والے یا والی کی عمر اور عادات تک جان لیتا۔

اجالے میں شیلی کو دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی "تم بالکل بھتنی لگ رہی ہو۔"

وہ مسکرائی "ہاں یار۔ آئینہ دیکھا تھا میں نے۔ سب مٹی ہو رہی ہے۔ بالوں میں' کپڑوں میں۔ چادر جھاڑی تھی نا۔"

میں نے کہا "چاہو تو نہا کے دوسرے کپڑے پہن لو۔"

وہ بولی "یہی میں بھی سوچ رہی تھی۔"

اس کے پاؤں میں موچ نہیں آئی تھی۔ مڑ جانے سے کوئی رگ کچھ متاثر ہوا تھا مگر وہ چل سکتی تھی۔ اس نے اپنے لیے وارڈ روب میں سے کپڑے منتخب کیے اور غسل خانے میں بند ہو گئی تو میں نے فون اٹھایا۔ ابھی میں نے دو ہی نمبر ڈائل کیے تھے کہ کھڑکی پر ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی پڑی اور میں ریسیور رکھ کے دوڑا۔ باہر پھر کوئی گاڑی آئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ آنے والے نے اوپر کی منزل کے بیڈ روم کی روشنی ضرور دیکھ لی ہوگی۔ اب اسے گل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں نے پردہ ہٹا کے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے

www.paksociety.com

میری آنکھیں غلط دیکھ رہی ہیں اور میرے اندیشے ہی میرے حواس کو دھوکا دے رہے ہیں۔ کار کی لائٹ بند ہونے ہی وہ سامنے سے اترے تھے اور وہ گیٹ کھول کے اندر آگئے تھے۔ دور سے آنے والی اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی نہ ہوتی تو تب بھی میں انھیں چال سے پہچان سکتا تھا۔ ان میں سے ایک غالب تھا اور غالب کے ساتھ رابعہ تھی۔ مجھے زمین آسمان گھومتے محسوس ہوئے۔ میرے دل میں چھپ کر بیٹھے والا شک کا کالا ناگ ایک دم پھن پھیلا کے سامنے آگیا اور جھومنے لگا۔ کچھ دیر پہلے میں جس خیال سے خائف تھا وہ حقیقت کا روپ دھار چکا تھا اور اب اس رسوا کن دل شکن اور حوصلہ شکن صورت حال سے مجھے اکیلے ہی نمٹنا تھا۔ میں نے خدا سے مدد کی دعا کی کہ وہ مجھے کسی جذباتی طوفان سے دوچار نہ کرے جس میں اس بندہ پر تقصیر کا بیڑا غرق ہو جائے مگر ہر دعا قبول نہیں ہوتی اور ایسی سب دعائیں تو یقیناً مسترد ہو جاتی ہوں گی جب کوئی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے سے پہلے کہے کہ "اللہ میاں میرے قدم نہ لڑکھڑائیں یا پاؤں کٹ جائیں تب بھی میں منہ کے بل نہ گروں!"

حمام بالائے حمام شیلا نے باتھ میں سیٹی بجانی شروع کردی۔ باتھ روم شکر میں بھی تھا اور ان بہت سے لوگوں سے بہتر تھا جن کی آواز سن کے پیچھے ڈھول کی آواز بھی بند ہو جائے یا خوشی سے جھنجھنانے والے گدھے پر رقت طاری ہو جائے۔ شیلی غالباً اس سے بھی برا گانا ہوگی کہ اس نے سیٹی پر اکتفا کی۔ بس وہ دھن انتہائی بیزار کن ثابت ہوئی جو وہ نہ جانے کیسے سنا رہی تھی۔ غسل خانے کے بھی کو با تاکی والی دیواروں کو۔ "تم ہو محبوب میرے' میں کیوں نہ تمھیں پیار کروں۔

میں نے دروازہ بجا کے کہا "اے شیلی! یہ کیا بے ہودگی ہے۔"

اس نے سیٹی روک کے اور ٹھنک کے جواب دیا "گانا ہے یار۔"

"لڑکیاں... شریف لڑکیاں سیٹی نہیں بجاتیں۔ اور یہ بہت فضول گانا ہے" میں نے کان آہٹ پر رکھے۔

"مجھے پسند ہے۔ تم کو میرے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے۔ کیا سیٹی بجانے سے میں لڑکی نہیں رہی... یا شریف لڑکی نہیں رہی؟"

بحث یا زبردستی سے اسے قائل کرنے کے لیے وقت نہیں تھا اور اب تو اس نے یہی گانا بہ آواز بلند خود گانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے آنے والی مصیبت سے بچنے کے لیے آیت الکرسی پڑھنے کی کوشش کی تو وہ بھی مجھے یاد نہ آئی حالانکہ بچپن سے آج تک میں اس دعا کو ہر رات سونے سے پہلے اسی طرح عادتاً دہرا لیتا تھا جیسے صبح اٹھتے ہی کلمہ پڑھتا تھا۔ میری ماں نے مجھے بتایا تھا کہ زندگی کے ہر دن کا آغاز اور اختتام ایسے ہی ہونا چاہیے اور میں یہ بات کبھی نہیں بھولا تھا۔

جب میں نے راہداری میں قدموں کی چاپ اور غالب کی آواز سنی تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ پھر میں نے خود کو سمجھایا کہ جب میں بے گناہ اور حق پر ہوں تو مجھے بے باک بھی ہونا چاہیے کیونکہ سانچ کو آنچ نہیں۔ یہی ایک تو مجھے مشتعل ہونے سے گریز کرنا چاہیے ورنہ شک مجاز ہو گی اور میں حقائق کو معصومیت کے پُر اعتماد انداز میں پیش نہ کرسکا تو ثابت ہو گا کہ سچ کڑوا ہوتا ہے اور چور کی داڑھی میں تنکا ہوتا ہے۔

غالب نے عین دروازے پر آکے کہا "دال میں کچھ کالا ہے۔"

میں نے اس خیال سے کہ وہ بھرپا ہٹ کی طرح دروازہ توڑ کے اور دہاتھ میں رہا اور اٹھ کے داخل نہ ہو کنڈی کھول دی تھی مگر اس نے ایسا ہی کیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے ہی زور میں سیدھا گزرا اور دھڑام سے فرش پر گرا۔ اس کے پیچھے کھڑی ہوئی رابعہ اندر آئی اور چاروں طرف متعجب ہوئی جیسے اس کے سامنے میں نہیں "خلائی مخلوق کا مضوراتی نمونہ ہو۔ کبھی ہم ان کو بھی ان کے گھر کو دیکھتے ہیں۔

غالب شرمندگی اور غصے میں کپڑے جھاڑے بغیر اٹھ کھڑا ہوا "تم..."

میں نے مسکرا کے کہا "میرے گھر میں آخر اور کون ہو سکتا تھا۔"

باتھ روم میں سے آواز آئی "تم ہی... ہی... ہی... ہی..." وہ غالباً سردی سے کانپ رہی تھی۔

غالب نے دروازے کو اور پھر مجھے دیکھا "یہ کون ہی ہی اور ہو ہو کر رہا ہے؟"

"لڑکی ہے" میں نے کہا "یہ شیلی ہے... مسز ڈاکٹر شیلا خان۔"

رابعہ کی نظر دروازے پر جم گئی تھی۔ اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ باتھ روم میں سے شیلی نے چلا کے کہا "کیا ہوا یار؟ یہ دھماکا کیسا ہوا تھا؟ یا تم کس سے کر رہے ہو؟ اپنے آپ سے؟"

میں نے جھنجھلا کے کہا "رابعہ اور غالب آئے ہیں۔ جب یہ آتے ہیں تو دھماکا ضرور ہوتا ہے۔"

اس کا ریاض ختم ہو گیا "واٹ اے سرپرائز۔"

غالب نے سپاٹ لہجے میں کہا "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" سوال کا باقی حصہ اس نے نہیں بولا مگر میں نے سن لیا کہ اس لڑکی کے ساتھ؟ "میں ابھی بتاتا ہوں۔ تم پہلے اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔"

رابعہ نے کہا "مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"دیکھو رابعہ! مجھے یہ شک ضرور تھا کہ تم شک کرو گی مگر یقین نہیں تھا کہ..."

وہ ایک دم پلٹی "غالب! میں جا رہی ہوں۔"

"رابعہ! پلیز ڈونٹ بی سلی" میں اس کی طرف لپکا "جہاں تک آگئی ہو ایسے مت جاؤ۔ میری بات تو سن لو۔"

"شٹ اپ۔ مجھے معلوم نہیں تھا... کہ تم..." نفرت اور جذبات کی شدت سے اس کی آواز گھٹ گئی۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ توہین کر رہی ہو میرے جذبات کی۔ میں اتنا ذلیل ہوں... رابعہ۔"

"تم اس سے کہیں زیادہ ذلیل ہو... جتنا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" رابعہ کے لہجے میں نفرت کا زہر بول رہا تھا "ذلیل مجھے کیا میرے نصیب نے اور غالب نے... یہاں لا کے۔" وہ پھر دروازے کی طرف بڑھی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر وہ جاتے جاتے دروازے کو دھڑ سے مار گئی تھی۔ میں بند دروازے سے ٹکرا کے رک گیا۔

چوٹ کی پروا کیے بغیر میں نے دروازہ کھولا۔ میرے کان رابعہ کے قدموں کی آواز سن رہے تھے۔ وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی باہر کی طرف جا رہی تھی۔ سینڈل کی سخت ایڑی فرش پر گونج پیدا کر رہی تھی اور سکوت میں یہ آواز گولیوں کی طرح تھی جو میرے دل پر چل رہی تھیں۔

میں نے چلا کے کہا "رابعہ..."

اسی وقت غالب نے پیچھے سے میرا ہاتھ پکڑ لیا "کوئی فائدہ نہیں۔ وہ نہیں رکے گی اور نہ تمہاری بات سنے گی۔"

غالب کے لہجے نے مجھے مشتعل کر دیا اور میں بھول گیا کہ ابھی چند منٹ پہلے میں نے اپنے آپ سے پُرسکون رہنے کا عہد کیا تھا "تمہارا بھی دماغ خراب ہو رہا ہے۔"

غالب نے سپاٹ لہجے میں کہا "اور کیا کہہ سکتے ہو تم؟ ہم سب کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ پاگل ہم تھے۔ دیوانے تھے۔ ایک تم سیانے تھے۔"

"بکواس بند کرو غالب..." میں نے دہاڑ کے کہا۔

"میں بڑی مشکل سے اسے یہاں لایا تھا۔ اسے میرے دلائل نے قائل نہیں کیا تھا۔ نازو اور مظفر اسے سمجھانے میں ناکام رہے تھے لیکن اپنے جذبات کے سامنے وہ نہ ٹھہر سکی۔ اسے معلوم ہوا کہ تم لاپتا ہو تو اس نے جو مصنوعی غصے' بیزاری اور لاتعلقی کی نقاب ڈال رکھی تھی' وہ خود اتر گئی۔ یہ اصل... وہی پرانی رابعہ تھی جو کل بھی تمہارے لیے پاگل تھی اور آج بھی ہے۔ پھنسے رہے گی۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی تم نے اسے پاگل خانے پہنچانے میں سکندر..."

گیلے بال بکھرائے' شانے پر تولیہ پھیلائے اور رابعہ کے کپڑے پہنے باتھ روم سے برآمد ہونے والی شیلی کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی سب سن رہی تھی۔ حالات و واقعات کی شہادت نے اس پر بھی وہی فرد جرم عائد کردی تھی جس میں اس کے ساتھ مجھے برابر کا شریک قرار دیا جا چکا تھا۔ میرے پاس ایسی کوئی دلیل نہ تھی جس سے میں اپنے سچ کو سچ ثابت کر سکتا۔ کون کہتا ہے کہ جیت ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے۔ یہاں ایک بے بنیاد الزام کے کوہ گراں نے سچ کے وجود کو کچل کے مسخ کر دیا تھا اور زمین میں دفن کر دیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہاتھی کا پاؤں چیونٹی پر ہو تو چیونٹی کی آواز بے وجود ہو جاتی ہے اور اندھا بے رحمی والوں سے اگر خود اس کے قریب پھرنے والی کوئی چیونٹی بھی اس کی پکار نہیں سنتی۔

میرا دماغ اچانک گھوم گیا۔ جب عقل کا کام ہو تو خون کام آتا ہے۔ احساس ذلت اور قوت برداشت کی انتہا کو پہنچ کے میں مجبور ہو گیا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دوں اور یہ پتھر بھی مجھے پتھر مارنے والے ہاتھوں سے چھین لوں۔ الزام ہوتا تو میں سر جھکاتا کہ مجھے سنگسار کر دو مگر بے گناہی کے جرم میں سزا قبول کرنا میرا مسلک نہیں تھا۔

میں نے ایک دم غالب کو اٹھا کے بیڈ پر پھینک دیا اور ایک دم چھلانگ مار کے اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا "میں تجھے جان سے مار دوں گا غالب۔ تو میرا دوست ہے' اس کے بارے میں تجھے اجازت نہیں دے سکتا کہ تو مجھے ایسی گالی دے..."

شیلی نے چیخ ماری "سکندر! آر یو میڈ۔ یو سلی فول..." (ARE YOU MAD? YOU SILLY FOOL?) چھوڑو اسے۔"

غالب میری آنکھوں میں وحشت کے آثار دیکھ کے ساری مزاحمت بھول گیا تھا۔ اس قفس کی طرح جو کسی ذرا آشنام ارم خور کے پنجے میں ہو۔ وہ سکتے پڑا مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلے کبھی اس نے نہ دیکھا تھا پھر شیلی نے پیچھے سے میرے سر پر کوئی چیز ماری اور ایک دم میرے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ میرے جسم کی ساری توانائی پریشر ککر کے سیفٹی والو سے خارج ہونے والی بھاپ کی طرح نکل گئی اور میں چکرا کے اسی بیڈ پر گر گیا۔ شیلی نے ایک نیم ہو خوشی سے زیادہ ایک ماہر نفسیات ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے میرے پاگل پن کے دورے کا بالکل صحیح علاج کیا تھا۔ سماجی طور پر تو کوئی بھی مجھے زیر نہیں کر سکتا تھا۔

چند سیکنڈ کے لیے میری نظروں کے سامنے اندھیرا آیا پھر میں نے بجھ جانے والے فانوس کی روشنی کو آہستہ آہستہ بڑھتا دیکھا۔ غالب اب میرے قریب کھڑا مجھے تشویش سے دیکھ رہا تھا۔

شیلی مجھ پر جھکی ہوئی میرے گالوں کو اپنے ہاتھوں سے تھپک رہی تھی اور مجھ پر بیک وقت گرم اور ٹھنڈے پانی کے قطرے برس رہے تھے۔ ٹھنڈے پانی کی بوندیں اس کے بکھرے ہوئے گیلے بالوں سے ٹپک رہی تھیں اور گرم قطرے اس کی آنکھوں سے۔

"آئی ایم سوری یار۔ سکندر... پلیز مجھے معاف کر دو۔ تمہیں زیادہ چوٹ آگئی۔ بائی گاڈ میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ میں تو بس تمہیں کنٹرول کرنا چاہتی تھی۔ لو یہ پانی پی لو... آر یو او کے؟"

میں اٹھ بیٹھا "میں ٹھیک ہوں۔ غالب' یار کیا میں پاگل ہو گیا ہوں؟ میں کیا کر رہا تھا آخر... رابعہ۔"

"رابعہ چلی گئی" غالب نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا "چلی گئی... اور تو نے اسے جانے

www.paksociety.com

ہوا؟"

"اس وقت... رابعہ کا جانا ہی مناسب تھا" غالب نے عجیب سی نظروں سے شیلی کو دیکھا "لیکن اس کی فکر مت کرو۔ کہاں جائے گی وہ یار... قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔"

"غالب! وہ جذباتی لڑکی..."

غالب نے نفی میں سر ہلا دیا "نہیں۔ وہ پاگل ہو جائے صدمے سے تب بھی خودکشی نہیں کرے گی۔ تجھے اس دنیا میں چھوڑ کے وہ دوسری دنیا میں پہنچ جائے یہ اسے ہرگز منظور نہیں ہوگا۔ اگر اسے مرنا ہوگا... تو وہ پہلے یہاں آئے گی۔ تجھے گولی مارنے۔ اور جب اسے تیرے مرنے کا یقین آجائے گا تو وہ مرتے وقت بہت خوش ہوگی۔ نہ اسے زندگی میں کوئی تجھ سے جدا کر سکتا ہے، نہ موت..."

مجھے نہیں معلوم کہ غالب نے یہ سب کچھ عمداً شیلی کو یہ بتانے کے لیے کہا تھا کہ وہ کبھی مجھے رابعہ سے نہیں چھین سکتی۔ نہ اپنی دولت، نہ اپنے حسن و شباب کی ساحری سے، نہ اپنی سادگی و پرکاری کے ناز و انداز سے۔ نہ اس بے تکلف، دوستانہ جارحیت سے جو دیار مغرب کے ماحول کی عطا کردہ تھی اور جس کی مدد سے وہ رابعہ کی محبت پر غاصبانہ قبضے کو بھی آداب عشق میں شامل سمجھتی تھی۔ اور اسے عار نہ تھی کہ یہ دل بری کا انداز کسی طرح معیوب یا خلاف اخلاق ہے۔ غالب شاید یہ سمجھتا تھا کہ لندن میں پرورش اور تعلیم پانے والی لڑکی تو ایسا ہی سوچتی ہوگی کہ کیا ہوا اگر اس نے کسی کے بوائے فرینڈ پر قبضہ کرلیا۔ وہ کوئی دوسرا تلاش کرے گی۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔

میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ غلط تھی یا درست غالب کے رویے کا شیلی نے کیا اثر قبول کیا تھا اور اس کا رد عمل کیا تھا۔ میں سخت ذہنی اذیت میں مبتلا ہونے کے باوجود کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح غالب کو اپنے دکھ درد کا ہم راز اور شریک کرلوں۔ ایک دوست کی حیثیت سے یہ اس کا فرض اور میرا حق تھا۔

میں نے کہا "غالب! رابعہ کا مسئلہ نہیں۔"

غالب نے نظر اٹھا کے شیلی کو دیکھا "پھر کس کا مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "ایک لاش کا جو اس وقت بھی گیراج میں موجود ہے۔"

"گیراج میں...؟ کس کی لاش؟" غالب چونکا۔

"رفیق کی۔ اور یہ لاش ہے شیلی کی گاڑی کی ڈکی میں۔"

"گیراج تو بند ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ سامنے سے ایسا ہی نظر آتا ہے لیکن ابھی میں تجھے دکھا بھی دیتا ہوں اور بتا بھی دیتا ہوں کہ میں اور شیلی یہاں کیوں چھپے ہوئے تھے۔"

شیلی نے آہستہ سے کہا "میں خود اپنی نظر سے گر گئی ہوں۔ مجھے سہم تھا ذرا کہ جن کو تم دوست کہتے ہو... اور کہتے ہو... وہ تم پر اعتماد نہیں کرتے، اعتبار نہیں کرتے۔ کیسی دوستی ہے یہ آخر..."

غالب نے دلاسائی انداز میں کہا "میں یہ کیسے بھول سکتا ہوں کہ تم اپنے چوہدری دلاور کی بہن ہونے کا دعویٰ بھی رکھتی ہو۔ ایسا ہی ایک دعوے دار اکبر خان تھا جسے ہم خوب بھگت چکے ہیں۔"

"تمہاری بات کو میں کیسے غلط کہوں۔ وقت کی کسوٹی میرے ہاتھ میں نہیں جس پر دوستی اور دشمنی یا محبت اور ہوس کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اور تو کوئی ایسا آلہ یا مشین ابھی تک ایجاد نہیں ہوئی جس سے جذبات کی تشخیص ممکن ہو۔ اور فرق کو DIAGONISE کیا جا سکے... تم مجھے نفرت سے قتل کرنا چاہتے ہو..."

میں نے شیلی سے کہا "ہم اتنے بے رحم لوگ نہیں ہیں جتنے اس وقت تمہیں نظر آ رہے ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم اپنا حلیہ ٹھیک کرو ڈاکٹر شیلی۔ اس وقت تم خاصی TENSE ہو۔"

وہ تلخی سے مسکرائی "بہت کچی تھی میں یار۔ کہ ٹیک اٹ ایزی۔"

"ہاں۔ ٹیک اٹ ایزی۔ میں آتا ہوں غالب کو جائے واردات دکھا کے" میں نے کہا۔

"کیا واردات بھی یہاں ہوئی تھی...؟"

"نہیں۔ میری مراد تھی وہ جگہ جہاں واردات موجود ہے۔" میں اب ابتدائی صدمے سے خاصا سنبھل گیا تھا لیکن میرا سابقہ اعتماد بحال نہیں ہوا تھا۔

غالب بھی افسردہ اور پریشان تھا "خدا کے لیے تم سے سکندر۔ پتا نہیں تم کیا کرتے پھر رہے ہو اور کیوں...؟"

میں نے برہمی سے کہا "تم سمجھنا نہیں چاہتے تو جاؤ۔ میں خود اپنے معاملات سے نمٹ لوں گا۔"

"بکواس مت فرماؤ۔ چلو" اس نے مجھے کھینچ کے دروازے کی جانب دھکیلا۔

رفیق کی لاش ڈکی میں پڑے پڑے اکڑ گئی تھی۔ اس کا خون جم کے سیاہی مائل ہونے لگا تھا اور اس کی بو کا بھبکا ڈکی کھولتے ہی میرے حواس پر حملہ آور ہوا تو مجھے متلی سی محسوس ہوئی۔

میں نے لائٹ آن کر دی تھی۔ اس کی روشنی ڈکی کے اندر براہ راست نہیں پہنچ رہی تھی مگر منعکس ہونے والا اجالا کم نہ تھا۔ غالب نے ایک نظر رفیق پر ڈالی اور پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے ڈکی بند کرنے سے پہلے اسے وہ حروف دکھائے جو رفیق نے اپنے لہو سے لکھے تھے۔

دس منٹ سے بھی کم وقت میں اس نئی افتاد کی ساری روداد غالب تک پہنچ گئی تھی۔ اب وہ مجھ سے زیادہ متوحش اور پریشان نظر آنے لگا تھا۔ وہ بار بار افسوس یا ملامت کے اظہار میں سر ہلاتا تھا جیسے اسے مجھ سے ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی "حد کر دی تم نے" اس نے کئی بار کہا۔

"یہ کیا حد کر دی، حد کر دی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ اور میں کیا کرتا؟" میں نے بالآخر چڑ کے کہا "اس لاش سمیت تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاتا؟"

"ہاں۔ ہمارے پاس آ جاتے۔ کچھ نہ کرتے اور اس الو کی پٹھی سے کہتے کہ گاڑی لے کر سیدھی پولیس اسٹیشن چلی جاؤ" غالب نے کہا۔

"کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ پولیس کا رویہ کیسا ہوتا...؟"

"بھاڑ میں جائے پولیس کا رویہ۔ تمہیں اتنی ہمدردی کیوں ہے شیلی سے؟" غالب نے کہا "اور پولیس اسٹیشن نہ سہی، وہ نقوی صاحب کے گھر جا کے سب بتا سکتی تھی۔ وہ سب سنبھال لیتے۔ رکار یوسف کی بیوی ہمارے ساتھ ہے۔ وہ اپنے باپ سے سب کچھ منوا سکتی تھی۔"

"اس کا وقت بھی آئے گا۔ میرے سارے مقدمات کی فائلیں اس وقت نقوی صاحب کی تحویل میں ہیں" میں نے کہا۔

"تو پھر کیوں؟ کیوں منگوائی ہیں اس نے یہ فائلیں؟"

"ایڈیشنل ہوم سیکریٹری کو تم کیا سمجھتے ہو؟"

"بظاہر تو وہ چوہدری دلاور کا مددگار ہے۔ اس نے دلاور کو اپنے گھر بلا کے موقع فراہم کیا کہ وہ تمہیں بلیک میل کرے۔ انہی فائلوں کی مدد سے۔ اور دلاور نے تم پر دباؤ ڈالا..."

"میری معلومات کے مطابق اس نے دلاور پر بھی دباؤ ڈالا تھا۔ اور عین ممکن ہے کہ اس نے تمام مقدمات کی فائلیں نظر ثانی کے لیے منگوائی ہوں۔ اس نے دلاور کو موقع فراہم کیا ہو کہ خود معاملات طے کرلو ورنہ میں کیس واپس لینے کے احکامات جاری کرتا ہوں۔"

"یہی تو سوال ہے۔ دلاور کو یہ موقع کیوں دیا اس نے؟ کیا تعلق ہے اس کا دلاور سے کہ اس نے احکامات جاری کرنے سے پہلے دلاور کو بتایا؟ وہ تمہارا ہمدرد ہوتا، تمہیں شک کا فائدہ دینا چاہتا تو کرتا۔ آزاد ہے۔ اسے کون چیلنج کرتا۔ ایڈووکیٹ جنرل یا ڈپٹی ایڈووکیٹ جنرل کی طرف سے عدالت میں مقدمات واپس لینے کی درخواست پیش کر دی جاتی... وہ ضرور دلاور کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہتا تھا۔"

"یا اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا "جو بات ہوگی سامنے آ جائے گی۔ دیکھتے ہیں دوستی کی بات کس حد تک مانتا ہے اور یہ کیا کر سکتی ہے۔ فی الحال ایک بات کی وضاحت کر دوں میں۔ مجھے یقین ہے ڈاکٹر شیلی کسی سازش میں شریک نہیں تھی۔ تم مجھ سے اختلاف کرنے کا حق رکھتے ہو لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے..."

"تمہارا دل...!" غالب نے طنز سے کہا "تمہارے پاس ہے؟ وہ تو غالباً تم رابعہ کو دے چکے تھے۔"

"مگر اس سے کیا فائدہ۔ میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ شیلی نے جو کچھ بتایا ہے اس کی تصدیق ہو جائے گی۔ غلط ثابت ہو تو کہنا کہ سکندر بخت تمہاری عقل کی طرح تمہارا دل بھی ناقابل اعتبار ہے۔ فی الحال میں اس سے لاتعلق نہیں ہو سکتا۔ وہ مدد کی مستحق ہے اور میں اسے چوہدری دلاور کا آسان شکار نہیں ہونے دوں گا۔"

"خواہ اس کوشش میں خود شکار ہو جاؤ؟"

"تمہاری مراد شیلی سے ہے تو وہ مجھے شکار کرنے نہیں آئی تھی۔ اس کے یہاں آنے کا مقصد کچھ اور تھا۔"

"پہلا مقصد کچھ اور تھا۔ ثانوی مقاصد کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔"

"تم اسے بلاوجہ نزاعی مسئلہ بنا رہے ہو۔ اگر بعد میں اسے کچھ ہو گیا تو میں نہ تمہیں معاف کروں گا اور نہ خود کو۔"

"چلو چھوڑو۔ یہ بحث لاحاصل اور تضیع اوقات ہے۔ میں رابعہ کے حق میں اپنے جذبات سے مغلوب ہوں۔" غالب بولا "ابھی تو تم فون اٹھا کے بات کرو ڈیڈی یو نقوی صاحب سے۔ ان سے کہو کہ ہم ملنے آ رہے ہیں۔"

"کیا نہ یہ بات شیلی کرے؟"

"شیلی بات کرے۔ یہ مزید بہتر ہے" غالب نے کہا "ہم گاڑی لے کر ان کے گھر پہنچ جاتے ہیں اور ان سے صاف بات کر لیتے ہیں۔"

"کیا صاف بات...؟"

"یہی کہ ہم رفیق کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو بلیک میلنگ ہوگی۔"

"بیٹے کا حق مانگنے کے لیے سب جائز ہے۔ وہ فائلیں ہمارے حوالے کر دیں" غالب نے کہا۔

"یہ مشکل... بلکہ ناممکن ہے۔ عدالتی ریکارڈ ہے۔"

"اول تو نقوی صاحب جیسے لوگ کوئی کنکر پتھر نہیں جسے کوئی ٹھوکر مار سکے... وہ بہت بڑی چٹان بلکہ ایک پہاڑ ہیں۔ ان سے ٹکرانے والا خود پاش پاش ہو جائے گا۔ پھر یہ کہ وہ قانون کو 'بنانے بگاڑنے' معطل کرنے اور بدلنے کا فن جانتے ہوں گے۔ ہر بڑے بیوروکریٹ کی طرح۔ وہ ایک ڈکیتی کی رپورٹ لکھوا کے عدالتی ریکارڈ کے بارے میں پرانی بات کو سچ ثابت کر سکتے ہیں کہ... آل دفتر را گاؤ خورد... گاؤ را قصاب برد قصاب ہم مرد۔ یعنی فائل کو گائے کھا گئی، گائے کو قصائی لے گیا اور اب تو قصائی بھی فوت ہو چکا۔ لیکن ایک ڈائریکٹ طریقہ بھی ہے۔ وہ ہمارے سامنے ہر کیس فائل پر احکامات صادر فرما دیں۔"

"اور نہ فرمائیں تو...؟" میں نے کہا۔

"تو ہم پولیس اور اخبار والوں کی موجودگی میں رفیق کی لاش کہیں سے برآمد کراتے ہیں۔ چوہدری دلاور کے گودام سے یا اس کے باغ سے... اور پھر تفصیلات جاری کرتے ہیں نقوی صاحب کے حوالے سے..."

ہم پھر پچھلی طرف سے نکلے اور کچن سے گزر کے اوپر پہنچے تو

www.paksociety.com

شیلی گم صم بیڈ پر بیٹھی تھی۔ شاید وہ اپنی بے سبب تذلیل کے احساس پر افسردہ اور دل شکستہ تھی۔ اسے نہ صفائی پیش کرنے کا موقع ملا تھا اور احتجاج کی اس میں ہمت نہ تھی۔ ملامت اور ندامت کے جذبات کی یورش میں اس کی قوت فیصلہ کا متاثر ہونا فطری بات تھی۔ اس کا قصور کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ اس نے مجھ سے مدد مانگی تھی اور میری مدد کا فیصلہ کیا تھا۔ یہی ایک فیصلہ تھا جو اس نے خود اپنی عقل سے سوچ سمجھ کے کیا تھا۔ باقی فیصلے تقدیر کے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ چوہدری دلاور کے باپ کی بیٹی تھی۔ خود کو وہ اس کی سوتیلی بہن کہلوانا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی کی عادت اس کی خود اعتمادی کی مظہر تھی۔ لندن میں پرورش پا کے ڈاکٹر بننے والی کسی لڑکی کے لیے یہ کوئی معیوب بات ہی نہ تھی مگر یہاں معیار مختلف تھے۔ دوہرے معیار تھے اور ان میں لچک نہ تھی ورنہ انصاف سے دیکھا جاتا تو تمام عمر مغربی تہذیب اور مادر پدر آزاد معاشرے میں گزارنے کے باوجود اس کی مشرقیت برقرار تھی۔ وہ بہترین اردو بولتی تھی، پاکستانی لباس پہنتی تھی، بے تکلفی کے باوجود فاصلے برقرار رکھتی تھی اور اس کی نسوانیت کا تقدس کسی حصار کی طرح اس کی غضب گناہ گار نظروں سے تحفظ فراہم کرتا تھا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی! ... اردو کی مجبوری ... IS THE MATTER"

اس نے مجھ سے نظریں اٹھائیں DONT YOU KNOW "کیا تمہیں واقعی نہیں معلوم؟"

میں نے کہا "چھوڑو یار۔ تم جیسی لڑکی کو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"کیوں یار؟ صرف اس لیے کہ میں لندن سے آئی ہوں۔ چوہدری دلاور کا باپ میری بدقسمتی کے باعث میرا بھی باپ تھا۔ میں اس معاشرے کے دوغلے معیاروں کی گھٹن میں پل کے بڑی نہیں ہوئی۔ مجھ پر کوئی بھی الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔ ہر شخص سے میرا تعلق نہیں مگر تم جیسے پڑھے لکھے، روشن خیال اور باشعور کہلانے والے بھی مجھے بے حیا اور آوارہ ... سمجھنے لگیں۔۔"

"... شیلی! ایسا کب ..."

"وہ جو تمہاری نظریں کہہ رہی تھیں ... میرے لیے تمہارے جذبات ہیں مسٹر غالب۔" اس نے تلخی سے کہا "تم صحافی ہو۔ تمہارا ذہن تو مختلف ہونا چاہیے۔ تمہاری OUT LOOK میں وسعت اور فراخ دلی ہونی چاہیے بابا۔ یہ زرد صحافت YELLOW JOURNALISM کا تقاضا نہیں۔"

غالب سخت شرمسار تھا "دیکھو! میں تمہارے الزامات کی نفی نہیں کروں گا اور اپنی صفائی بھی پیش نہیں کروں گا۔ کیچڑ میں جتنے پتھر پھینکے جائیں اتنے ہی چھینٹے اچھلتے ہیں۔ میں تم سے معافی مانگ سکتا ہوں۔ ... سمجھنے میں غلطی کی۔ یار I WAS WRONG۔ کیا ..."

شیلی مسکرانے لگی "تم بھی اب میری زبان بولنے لگے ہو۔" اس نے کہا "اچھا معاف ... ہاتھ ملاؤ۔"

غالب نے اس سے ہاتھ ملایا "HARD FEELINGS اب دل میں رنجش نہیں رہنی چاہیے۔"

میں نے کہا "شیلی! وقت کم ہے۔ تم یہ ریسیور اٹھاؤ اور ... کرو توپ سے۔ میرا مطلب ہے اپنے ڈیڈی نقوی صاحب سے۔"

"یہ توپ کا لفظ بیچ میں کہاں سے آ گیا تھا؟" شیلی نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

"وہ دراصل۔ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ بڑی توپ چیز ہیں۔ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں کہ " HE IS A BIG GUN"

"ان سے کیا کہوں؟"

"کہو کہ میں بڑی مشکل میں ہوں۔ اسی وقت تشریف لانا چاہتی ہوں کیونکہ رشتہ میں آپ ہی میرے مشکل کشا ہیں۔" میں نے کہا "میرا یا غالب کا حوالہ بالکل مت دینا۔ یہ بھی مت بتانا کہ کہاں سے بول رہی ہو اور مشکل کیا ہے۔ بس یہ کہنا کہ میں آنا چاہتی ہوں۔ وہ بہت تاؤ کھائیں گے کہ لڑکی کیا دماغ خراب ہے تمہارا۔ آدھی رات کے وقت کیا قیامت آ رہی ہے۔ صبح آنا۔ مگر تم ایک مت سننا۔"

شیلی نے سر ہلایا "میں سمجھ گئی مگر کیا تم ..."

"ہاں۔ ہم شیلی کو ان کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ایک ماموں کا فرض ہے کہ وہ بھانجی کی آخری رسوم کی ذمہ داری قبول کرے اور اس کی تجہیز و تکفین ..."

میری بات نامکمل رہ گئی کیونکہ شیلی نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ "ہیلو ... سر! میں شیلی ہوں۔ ڈاکٹر شیلا خان۔ سوری سر۔ معاملہ ہی کچھ ایسا تھا کہ میں نے آپ کی نیند خراب کی۔ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے میرے لیے۔ میں نہیں بتا سکتی سر ... فون پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ سخت خطرہ لاحق ہے مجھے۔ نہیں سر۔ پولیس کا نام بھی مت لیں۔ سوری سر۔ میرا مطلب تھا کہ مجھے نہیں لینا چاہیے۔ ناممکن سر ... میں آنا چاہتی ہوں۔ ابھی آپ کے پاس۔ نو سر۔ صبح تک مجھے زندگی کا اعتبار نہیں۔ میں نکل رہی ہوں سر۔ اپنے گارڈ سے کہہ دیں۔ میں نہیں جانتی سر۔ آپ کے دروازے پر میرا خون ہو جائے گا تو لاش پڑی رہے گی صبح تک۔ میں کہیں اور نہیں جا سکتی۔ مرنے کے لیے بھی نہیں۔" اس نے ایک دم ریسیور رکھ دیا۔

"ویلڈن۔ ویری گڈ۔ تمہاری پرفارمنس اچھی رہی۔"

"اب چلو" غالب نے جلدی مچائی۔

"یار میں بھی حلیہ ٹھیک کر لوں۔ بھوت بنا ہوا ہوں۔"

"... تو میں کہتا کہ کوئی میرا ... نہیں ..." ... نے کہا "یہ حلیہ بالکل ٹھیک ہے۔ ایک پریشان حال ..."

"... کے بارے میں ... اب ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

"یار وہ نقوی صاحب اس پر بھی خفا ہوں گے۔ خیر... جہاں میرا یہاں سوا ہے۔" میں نے کہا۔

میں نے لائٹس آف کرتے ہوئے اس خواب گھر کو دیکھا جس کے در و دیوار مجھے خفا خفا سے لگتے تھے۔ میری لاتعلقی اور عدم توجہی پر شکوہ کناں تھے۔ اس بچے کی طرح جو والدین سے گلہ ہو کر اپنی مصروفیت میں دراصل اس کو شفقت دینا بھولے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ دیواروں کے کان تو ہوتے ہیں مگر ان کا دل کس نے دیکھا ہے۔ یہ تو احساس کی بات ہے کہ گھر کی دیواریں، بام و در کس طرح اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ جب صاحب خانہ کی میت اٹھتی ہے تو کیسے وہ سب کے ساتھ آنسو بہاتے ہیں اور جب گھر میں خوشی کے شادیانے بجتے ہیں تو وہ کیسے مسکراتے رہتے ہیں۔ کچھ خواب میرے تھے جن میں اس گھر کے در و دیوار شامل تھے۔ شاید ایسے ہی خواب یہ گھر بھی دیکھتا تھا اور اسے بھی تعبیر کا انتظار تھا جو طویل ہوتا جا رہا تھا۔

نیچے جاتے ہوئے میں نے ایک دیوار پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ ... بہت جلد پھر آ جانے کے لیے۔

نیچے غالب نے گیراج کے دروازے کا راستہ صاف کرنے کے لیے سامنے پڑا ہوا کاٹھ کباڑ ہٹانا شروع کر دیا تھا۔ شیلی اس کام میں غالب کا ہاتھ بٹانے پر مصر تھی۔

"ڈاکٹر شیلی! یہ تمہارے کرنے کا کام نہیں۔"

"کیوں؟ کیا میں معذور ہوں؟" اس نے کہا۔

"یہ کام عورتوں کا نہیں ہے یار" میں نے کہا۔

"تم مرد بڑے خود غرض، متعصب اور سازشی ہو یار۔ تم نے ہمیں ناکارہ بنانے کے لیے صنف نازک کا خطاب دیا۔ زبان سے ضرور کہتے ہو کہ عورتوں کو مرد کے شانہ بشانہ کام کرنے کا حق حاصل ہے مگر اس کے لیے مواقع فراہم نہیں کرتے۔" شیلی نے اپنا کام جاری رکھا "بھئی میں کیا کر سکتی ہوں اور کیا نہیں، اس کا فیصلہ مجھے کرنے دو۔"

اس وقت تک میں نے غالب کے ساتھ مل کے راستہ صاف کر دیا تھا "... ڈاکٹر صاحب! ہم مرد سخت شرمندہ ہیں۔ اب کیا آپ ڈرائیونگ کا بھی شوق فرمائیں گی؟"

"آف کورس۔ ڈرائیونگ میں کروں گی۔ بس تم راستہ بتاتے جانا۔" اس نے چابی کے لیے ہاتھ پھیلایا۔

"سوری۔ میں دونوں کام ... کر سکتا ہوں اس لیے کہ میں آپ کے مقابلے میں زیادہ COMPETANT ہوں۔" میں نے کہا مگر شیلی نے نہیں مانا۔

چند منٹ بعد ہم اس جگہ سے رخصت ہوئے تو سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا کہ ہمارے آنے سے پہلے تھا۔ گزرے ہوئے وقت کا کوئی سراغ تھا تو صرف ہمارے ذہن میں۔ یادوں کی صورت میں۔

کاتب وقت نے عمر گزشتہ کی کتاب میں چند سطریں اور لکھ دی تھیں۔ وقت اور مقام کے ساتھ زندگی کے ایک تجربے کا احوال۔

سڑکیں سنسان تھیں اور ہمارا راستہ روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ شیلی اچھی ڈرائیور تھی اور گاڑی اتنی اچھی تھی کہ اس کی خواہش کی پوری طرح اطاعت کر لیتی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو زیادہ زحمت نہیں اٹھانی پڑ رہی تھی۔ ماڈل ٹاؤن کی خستہ اور خراب سڑکوں پر بھی اس کے عیب ... برداشت کر رہے تھے۔ میں اور غالب سمٹ کر آگے ہی فٹ ہو گئے تھے۔

اچانک غالب نے کہا "تو پھر پینے کا کیا ہے؟"

میں سمجھ گیا "ہاں۔ آگ سی سینے کے اندر لگی ہوئی۔ اس آگ کو آگ ہی بجھا سکتی ہے۔"

غالب بولا "شراب سمجھ کے پی رہے ہو سگریٹ تو حرام ہے۔"

"میں روح افزا سمجھ کے پی رہا ہوں" میں نے شیلی کو مزید ہدایات جاری کرتے ہوئے کہا "یہ گلی ..."

"یار اب مجھے معلوم ہے۔ وہ سامنے والا مکان ہے نا؟" شیلی نے کہا۔

"مکان! افسوس لڑکی۔ تم ایسی توپ چیز کے قصر عالی شان کو صرف مکان کہہ رہی ہو۔ نقوی صاحب کے سامنے ایسی گستاخی کرو گی تو مار کھاؤ گی۔" میں نے کہا۔

شیلی نے گاڑی کو گیٹ پر روکا ہی تھا کہ سائڈ کی کھڑکی سے گارڈ نے جھانک کے دیکھا۔ اس نے شیلی سے نام پوچھا اور اندر ... نقوی صاحب کو گاڑی کا نمبر بھی بتایا۔ ایک منٹ بعد اس نے ہمارے بارے میں پوچھا "صاحب بولتے ہیں کہ مس شیلی کے ساتھ کون ہے؟"

میں نے کہا "ان کو بولو کہ سکندر بخت اور غالب۔"

گارڈ نے یہ اطلاع اندر پہنچائی اور پھر سمجھانے لگا "صاحب بولتے ہیں کہ صرف مس شیلی اندر جا سکتی ہیں۔"

اب شیلی نے چلا کے کہا "یار تو نکل ... صاحب۔ گیٹ کھولتے ہو یا میں یہ دروازہ توڑتی ہوئی گاڑی اندر لے جاؤں۔ کرتے رہنا فائرنگ۔"

گھبراہٹ میں چوکیدار نے فوراً یہ دھمکی اندر پہنچائی اور پھر "یس سر۔ یس سر" کہتے ہوئے گیٹ کھول دیا۔ شیلی نے گاڑی کو غصے میں زیادہ ہی تیز دوڑایا اور پھر ایک دم بریک لگائے۔ رکتے رکتے بھی گاڑی پورچ میں موجود سرکاری کار سے ٹکرا گئی۔ اس وقت تک نقوی صاحب نائٹ گاؤن میں باہر آ چکے تھے اور ہاتھ جیبوں میں ڈالے کھڑے تھے۔ نیچے اترنے سے پہلے ہی میں نے ناگواری کے آثار شکنوں کی صورت میں دیکھ لیے تھے جو ان کے ماتھے پر بہت نمایاں تھیں۔

انہوں نے میرے اور غالب کے مؤدبانہ سلام کا جواب بڑی

www.paksociety.com

نفرت سے سہلا کے دیا۔ مصافحے کے لیے ہاتھ جیب سے نکالنا ان کی شان کے خلاف تھا۔

شیلا نے کہا "معاف کیجئے گا" آپ کی گاڑی...."

"گولی مارو گاڑی کو۔" نقوی صاحب نے کہا "ڈاکٹر شیلا اب میں سمجھ گیا کہ زندگی اور موت کے مسئلے سے تمہارا کیا مطلب تھا۔"

"تو سر۔ آپ کا غلط خیال ہے کہ آپ سمجھ گئے ہیں۔" شیلا نے صاف گوئی سے کام لیا "ابھی آپ کو کچھ نہیں معلوم۔"

نقوی صاحب بگڑ گئے۔ "ان دونوں کو تمہارے ساتھ دیکھنے کے بعد میں تمہارے رویے کو سمجھ گیا ہوں لڑکی۔ اور کون ہو سکتا ہے تمہارے پیچھے شامت اعمال کے سوا۔ میں سب جانتا ہوں۔"

لیکن شیلا ایسے خاموش ہونے والی نہیں تھی "میں پھر کہوں گی سر کہ آپ فرض کر رہے ہیں۔ مسئلے کا ان دونوں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ یہ میرا مسئلہ ہے اور مجھ سے زیادہ آپ کا لیکن یہاں کھڑے کھڑے تو سب باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔"

وہ کچھ کہے بغیر پلٹ گئے۔ آگے شیلا اور اس کے پیچھے ہم مجرموں کی طرح سر جھکائے ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ اتنے صاف ستھرے اور سجے سجائے ڈرائنگ روم میں مجھے اپنا وجود کسی خارش زدہ کتے کی طرح محسوس ہوا جو کسی اسپتال کے وارڈ میں گھس گیا ہو۔ میرے کپڑوں پر، بالوں میں اور ہاتھوں پیروں پر وہ سب دھول تھی جو میں نے اپنے گھر کے فرش سے حاصل کی تھی۔ یہ مٹی مجھے عزیز ہو سکتی تھی، نقوی صاحب کے لیے یہ انتہائی ناقابل برداشت تھی۔

توپ کا رخ اب میری طرف ہو گیا۔ "مسٹر سکندر! مجھے یقین ہے کہ شیلا کے ساتھ تم بلاوجہ نہیں آئے ہو۔ میں بد اخلاق ضرور ہوں لیکن تم جیسے بدتمیزوں کے ساتھ۔ تم کو شاید نہ آئی ہو مگر مجھے شرم آ رہی ہے تمہارا یہ حلیہ دیکھ کر۔"

میں نے کہا "معاف کیجئے گا سر۔ میں کسی جوہڑ کے پانی سے نہیں آیا ہوں۔ اور آپ پریشان ہیں اس خیال سے کہ صوفے اور قالین گندے ہو جائیں گے۔"

"شٹ اپ۔ میں صرف تمہیں احساس دلانا چاہتا تھا کہ کسی مجبوری کی وجہ سے میں نے تمہیں اندر نہیں بلایا۔ نہ میں دھمکی سے ڈرا تھا اور نہ میری اجازت کے بغیر تم اس ڈرائنگ روم میں قدم رکھ سکتے تھے۔ یہ صوفے اور قالین میں روز بدل سکتا ہوں۔ سمجھے۔"

"جی سمجھ گیا۔" میں نے اطمینان سے ایک صوفے پر بیٹھ کے کہا "میں آپ کا احترام کرتا ہوں۔ اس لیے کہ آپ بزرگ ہیں اور ہم جیسے نامعقول بچوں کے لیے بھی دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ کسی ایڈیشنل ہوم سیکریٹری کا عہدہ مجھے متاثر نہیں کرتا۔"

وہ شیلا کی طرف متوجہ ہو گئے "تم کو جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی کہ تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے۔"

"وہ ایسا ہے کہ تھوڑا بہت جھوٹ ضرورت کے مطابق تو سب ہی بولتے ہیں پاپا...." شیلا روانی میں کہہ گئی۔

حسب توقع نقوی صاحب اچھل پڑے "یو کال می پاپا! تمہاری اتنی جرات لڑکی۔ ذرا اپنی عمر دیکھو۔ میرے بچپن کے دوست مجھے یار نہیں کہتے۔ حد ہوتی ہے بے ہودگی کی۔"

"سوری سر۔ ویری سوری۔ بس ایک بری عادت ہے مجھے۔" شیلا نے بگلا کے کہا "اب یہ غلطی نہیں ہوگی۔ میں انکل کہوں گی آپ کو۔ غالباً آپ کا بی پی ہائی ہے۔ دوا کون سی لیتے ہیں آپ؟ ALDOMAT؟ اور نمک کون سا استعمال کرتے ہیں۔ پوٹاشیم کلورائڈ۔ عام نمک تو نہیں...."

نقوی صاحب صوفے پر بیٹھ گئے۔ "میں بھول گیا تھا کہ تم ڈاکٹر ہو۔"

ڈاکٹر شیلا نے نقوی صاحب کی کمزوری دریافت کر لی تھی اور اچانک ان کی ہمدردی حاصل کرنے کا یہ نسخہ کامیاب رہا تھا۔ نقوی صاحب نے چند منٹ اس سے اپنے بلڈ پریشر، ڈاکٹروں کی نااہلی، دواؤں کی بے اثری اور اپنے پرائے سب کے غصہ دلانے والے رویے کا گلہ کیا جن کی وجہ سے انہیں کم خوابی اور ڈپریشن تک ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی بے احتیاطی، تفکرات مول لینے کی عادت، مصروف زندگی ہوس اور اس کے لیے دن رات کی تگ و دو کا ذکر کرنے سے گریز کیا۔ ہم انتظار کرتے رہے کہ وہ ہماری موجودگی بھی نوٹس لیں۔

دس منٹ بعد انہوں نے قدرے مربیانہ لہجے میں کہا "میں تو اس وقت کچھ نہیں پیتا۔ تم لوگ کافی پی لو۔"

وہ پوچھنے کے عادی نہیں تھے۔ حکم دینے کے عادی تھے۔

"اب بتاؤ کیا قیامت آ رہی تھی آدھی رات کو؟"

شیلا نے کہا "آپ ذرا پرسکون رہیں انکل۔ یہ بات کچھ ایسی ہے کہ آپ کو ڈسٹرب کر سکتی ہے۔ میں نے وضاحت تو کر دی تھی کہ مسئلہ میرا بھی ہے اور آپ کا بھی۔"

"اوکے۔ اوکے۔ اتنی تمہید کافی ہے۔" وہ جھنجھلا کر بولے "آگے بولو۔"

"انکل! آپ کا پی اے ہے رفیق" شیلا نے کہا "اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے آپ کو، وہ کہاں ہوگا؟"

"وہ.... ہوگا اپنے گھر میں۔ سو رہا ہوگا۔ ویسے تو لڑکا ٹھیک ہے لیکن اسے پولیس نے پکڑ لیا ہو کسی الزام میں تو مجھے صدمہ نہیں ہوگا۔ زمانہ ہی ایسا ہے۔"

اب میں نے کہا "آپ کے پی اے کو بھلا پولیس کسی جھوٹے الزام میں پکڑ سکتی ہے۔ معاملہ اس سے کہیں زیادہ سیریس ہے۔"

اب وہ متفکر ہوئے "کیا قتل کر دیا ہے اس نے کسی کو؟

ہاتھوں پکڑا گیا ہے؟ دشمن تو کوئی رقیب ہی ہوگا۔ اس عمر میں سب پاگل ہوتے ہیں۔ ایک ہی لڑکی کے لیے مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔"

میں نے کہا "معاملہ اس کے برعکس ہے سر۔"

"کیا مطلب؟ صاف کیوں نہیں کہتے۔ میں یہ چکر والی بات بالکل پسند نہیں کرتا" نقوی صاحب بگڑ گئے۔

"اسے کسی نے قتل کر دیا ہے سر۔" میں نے کہا اور اپنے الفاظ کا رد عمل دیکھنے لگا۔

نقوی صاحب چونکے اور مجھے گھورنے لگے۔ آہستہ آہستہ میرے الفاظ کا مفہوم ان پر عیاں ہو گیا۔ ان کے ماتھے کی شکنوں کا جال گہرا ہو گیا "رفیق کو قتل کر دیا ہے۔ کس نے.... کیوں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ان دونوں سوالوں کا جواب غالباً آپ کی پولیس بھی نہیں دے سکتی۔ نہ آج نہ کل۔ کچھ جواب ایسے ہی ہوتے ہیں جو گول کر دیے جاتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"کیا میں اس ملک کی سیاسی تاریخ کے قتل گنواؤں؟ رفیق کا قتل سیاسی تو خیر نہیں مگر اسی نوعیت کا ہے۔"

"یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟" انہوں نے اچانک دہاڑ کے کہا۔

"آپ بیٹھ جائیں انکل۔ کون سی گولی کھاتے ہیں آپ...."

"گولی مارو گولی کو۔" نقوی صاحب نے گاؤن کی جیب میں سے ایک شیشی نکال کے ایک گولی منہ میں رکھ کے پانی کا ایک گھونٹ لیا۔ گلاس کو ٹرے میں رکھ کے وہ پھر بیٹھ گئے اور انہوں نے شیلا کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ کافی بنائے۔

چند منٹ کی خاموشی کے بعد نقوی صاحب نے ایک گہری سانس لی "کہاں ہے رفیق؟ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھ لیجئے گا۔ جلدی کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں اس کے قاتل کے سارے خاندان کو پھانسی کے تختے تک پہنچاؤں گا۔" انہوں نے شعلہ فشاں لہجے میں کہا۔

"بہت مشکل ہے سر۔ اگر میں آپ کو بتا دوں کہ اس قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے تب بھی۔ تفتیش تک آپ کے اختیار میں نہیں۔"

نقوی صاحب گرجے "تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ رفیق صرف آپ کا پی اے نہیں تھا۔ وہ آپ کا بھانجا تھا۔" میں نے ہمت کر کے توپ کے سامنے گولہ داغ دیا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ ان کا چہرہ کھنچ گیا اور آنکھوں کے نیچے کے عضلات پھڑکنے لگے۔ ان کی نظر مجھ پر ٹھہر گئی اور ان کے ہاتھوں نے صوفے کے کنارے کو یوں جکڑ لیا جیسے وہ کسی کا گلا گھونٹ رہے ہوں۔

شیلا نے فوراً صورت حال کو سنبھالا "انکل! میں نے کہا تھا...."

نقوی صاحب کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی "یہ.... تم کیسے جانتے ہو؟"

میں نے کہا "مجھے ڈاکٹر شیلا یعنی شیلا خان نے بتایا ہے اور ان کو بتایا تھا شیخ صاحب نے۔"

"کون شیخ صاحب؟"

شیلا نے کہا "ان کا اصل نام کچھ اور ہے۔ آپ چاہتے ہیں میں ان کا نام لوں؟ ویسے آپ سمجھ گئے ہوں گے انکل کہ اس راز سے کون واقف تھا؟"

ان کا چہرہ آہستہ آہستہ سپاٹ ہو گیا۔ انہوں نے گاؤن کی جیب میں سے ایک اور گولی نکالی "پانی دو مجھے۔ اور دس منٹ کی مہلت تاکہ میں اس صورت حال کو سمجھنے کے قابل ہو جاؤں۔"

دس منٹ بعد وہ پھر پرسکون ہو گئے تو میں نے کہا "سہولت کی خاطر ہم اصل نام کی جگہ شیخ صاحب کا نام استعمال کریں گے۔ یہ شیخ صاحب آج کل لندن میں ہیں اور...."

"دی بلیک میلر۔ دی باسٹرڈ...." نقوی صاحب زیر لب دانت پیس کر بولے "وہ کیا چاہتا ہے مجھ سے؟"

میں نے کہا "آپ جاننا چاہتے تھے کہ رفیق کے قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ فرض کیجئے میں کہوں کہ اسے مروانے والا چوہدری دلاور ہے تو کیا کریں گے آپ؟ تختہ دار تک پہنچائیں گے اسے؟"

"تمہارے کہنے پر؟" انہوں نے حقارت اور تلخی سے کہا۔

"میں نے نشاندہی کی ہے۔ آپ تفتیش کرانے کا اختیار رکھتے ہیں۔ آپ کو ثبوت بھی مل جائے گا لیکن سر۔ آپ کچھ نہیں کریں گے۔"

"ڈونٹ سے دیٹ اگین۔ DONT SAY THAT AGAIN."

میں نے اپنی بات جاری رکھی "آپ اس لیے کچھ نہیں کریں گے کہ ایک تو چوہدری دلاور معمولی آدمی نہیں، بڑا بزنس مین ہے۔ آپ کو یقیناً معلوم ہوگا کہ اس کے ذرائع آمدنی کیا رہے ہیں۔ آج کل وہ کیا کرتا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً وہ اسمگلنگ کرتا ہے اور ایسے ہی دیگر غیر قانونی کاروبار۔ امور داخلہ کے ماتحت دس قسم کے محکمے ہیں۔ پولیس، 'ایف آئی اے'، 'سی آئی اے'، 'اسپیشل پولیس'، 'انٹیلی جنس بیورو'، 'کوسٹ گارڈز'، 'بارڈر پولیس'۔ ان سب سے آپ کو مکمل معلومات حاصل ہوتی ہیں۔"

"کم ٹو دی پوائنٹ۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "دلاور بہت کچھ نہیں کرتا جو اسے کرنا چاہیے۔ مثلاً اسے پورا انکم ٹیکس دینا چاہیے۔ ملک کا پیسہ ملک میں رکھنا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس ملک میں کوئی ایک چوہدری دلاور نہیں۔ سیکڑوں ہزاروں سے بھی زیادہ تعداد ہے ایسے لوگوں کی لیکن میں

www.paksociety.com

چوہدری دلاور کا ذکر کر رہا ہوں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ اس سے آپ کا یقیناً کوئی تعلق ہے۔ کاروباری یا۔۔۔"

"بکواس بند کرو۔"

"میں کوئی خیالی بات نہیں کہتا نقوی صاحب۔ میں چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے اسی گھر میں چوہدری دلاور سے ملاقات کی تھی۔ کیوں موجود تھا وہ یہاں؟ اس کے پاس میرے تمام مقدمات کی فائلیں کیسے پہنچ گئی تھیں؟"

"یہ جھوٹ ہے" نقوی صاحب نے کمزور لہجے میں کہا۔

"لیکن آپ مانتے ہیں کہ میرا جھوٹ ہی سب سے بڑا سچ ہے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ چوہدری دلاور نے رفیق سے کہا کہ وہ فائلیں لاؤ اور آپ کے پی اے نے اسے تمام فائلیں پیش کر دیں۔ عدالتی ریکارڈ آپ کے گھر میں کیسے آیا؟ رفیق خود تو اتنے اختیارات نہیں رکھتا تھا اور نہ چوہدری دلاور۔ ہاں عدالتی عملے پر اور محکمہ داخلہ کے حکام پر آپ کا حکم چلتا ہے۔ یہ فائلیں آپ نے منگوائی تھیں اور شاید اس وقت بھی آپ کے پاس ہوں گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فائلیں میرے دشمن کے ہاتھ میں دینے والا کون تھا؟ اور میرے جانی دشمن کی مدد کرنے کا مقصد کیا تھا؟ یہاں، اسی کمرے میں اس نے مجھے بلیک میل کیا۔ ان ہی فائلوں کی مدد سے مجھے دھمکی دی کہ میرے خلاف سارے کیس پھر کھول دیے جائیں گے لیکن میں اس کے سامنے ہتھیار ڈال دوں تو سب ختم۔ کیا وہ اتنا با اختیار ہے نقوی صاحب؟ کیسے دعویٰ کر رہا تھا وہ اتنا بڑا؟ یہ بات آپ کہہ سکتے تھے۔ آپ کے باس ہوم سیکریٹری کہہ سکتے تھے۔ آپ کا ماتحت کوئی ڈپٹی سیکریٹری، کوئی انسپکٹر جنرل پولیس کہہ سکتا تھا۔

چوہدری دلاور کیا چیز ہے آخر؟ آپ کہیں گے کچھ نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ کتنا بڑا شکاری ہے۔ آپ بھی ڈرتے ہیں اس سے۔ آج تک آپ کے اختیار اور اس کی دولت کے درمیان ایک توازن تھا جس کی بنیاد پر آپ نے اور اس نے ایک انجمن مفاد باہمی بنا رکھی تھی۔ ایسی کوئی نہ کوئی انجمن ہر جگہ ہے۔ ہر بیوروکریٹ، بدعنوان سیاست داں، نام نہاد قانون کے محافظ، پبلک سرونٹ، بزنس مین، صنعت کار، کارخانے دار۔ ہر سطح پر ایسے لوگ ہیں جو اپنے مفاد کے سودے کرتے ہیں۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ آپ سے بھی چوہدری دلاور نے کوئی سودا کیا ہو گا؟"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں تمہارے مقدمات کی فائلوں پر نظر ثانی کر رہا تھا۔ میں تمہیں شک کا فائدہ پہنچا کے تمہاری مشکلات آسان کرنا چاہتا تھا۔"

"آخر کیوں؟"

"صرف اپنی پاگل بیٹی کی وجہ سے جس نے ایک کنگال وکیل سے شادی کی۔ میری مرضی کے خلاف" نقوی صاحب نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "سب ماؤں کو بلیک میل کرتے ہیں ان کے بچے پیدائش کے وقت سے مرتے دم تک۔ اور میرے جیسے باپ بھی بلیک میل ہوتے ہیں تو صرف بیٹی سے۔۔۔۔"

"میں قدر کرتا ہوں آپ کے اعتراف کی لیکن معاملے کا دوسرا پہلو بھی ہے میری نظر میں۔" میں نے کہا "آپ نے اپنی مجبوری کو بھی کیش کرا لیا۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"ثبوت! کیا اس حقیقت کو ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے جو سب پر عیاں ہو جائے۔ مثلاً شیخ صاحب کی گواہی کے بعد کسی کو ثبوت کی ضرورت نہیں ہو گی کہ رفیق آپ کا بھانجا تھا اور آپ کی خاندانی تاریخ کا ایک سیاہ باب سب کے سامنے آ جائے گا۔"

"تم۔ مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو!" نقوی صاحب چلانے لگے۔

"آہستہ نقوی صاحب! آہستہ۔ ابھی صرف ہم سن رہے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ باہر کا کوئی بھی آدمی کچھ سنے" میں نے کہا "جسے آپ بلیک میلنگ کہہ رہے ہیں وہ میرے نزدیک سودا ہے۔ سودا آپ نے بھی کیا تھا چوہدری دلاور سے۔ اگر میرا مفروضہ غلط ہو تو تردید کر دیں۔ آپ نے اسے بلا کے کہا کہ دیکھو میں مجبور ہوں۔ مجھے سکندر کے خلاف کیس کمزور بنانے ہیں یا ختم کرنے ہیں۔ اس کام کو تھوڑا سا مؤخر کیا جا سکتا ہے مگر ٹالا نہیں جا سکتا۔ درمیانی مدت میں تم کوئی فائدہ اٹھانا چاہو تو سکندر سے بات کر لو۔ دیکھو شاید وہ مان جائے تمہاری بات۔ اور دونوں کا مسئلہ حل ہو جائے۔ ممکن ہے چوہدری دلاور نے کہا ہو کہ نقوی صاحب فائلیں میرے گھر پہنچا دو پھر میں بلاتا ہوں اسے۔ لیکن اتنا بڑا خطرہ آپ نہیں مول لے سکتے تھے۔ آپ نے کہا کہ فائلیں میرے پاس ہیں۔ میری عدم موجودگی میں آ جاؤ۔ رفیق سے فائلیں منگوا لو اور میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کے بات کر لو۔ یہ رعایت کیوں دی آپ نے چوہدری دلاور کو؟ کیوں بتایا اسے کہ آپ میرے خلاف کیس ختم کر رہے ہیں؟ ظاہر ہے ہر بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ اور گستاخی معاف، آپ جیسے یا دلاور جیسے لوگ بلا معاوضہ نیکی بھی نہیں کرتے۔ چلیے میرے معاملے میں آپ مجبور تھے۔ چوہدری دلاور کے ساتھ مجبوری کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ اس سے تو آپ نے قیمت وصول کی ہو گی اس احسان کی۔"

"خدا گواہ ہے" میں نے اس سے ایک پیسہ نہیں لیا تھا اس معاملے میں۔" نقوی صاحب نے کہا۔

"لیکن اور بھی معاملات تھے اس کے ساتھ۔ خیر۔۔۔ یہ میرا درد سر نہیں ہے۔ اگر آج آپ نے اس سے نقد قیمت نہیں لی تو اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ آپ آنے والے وقت کے لیے پیش بندی کر رہے ہیں۔ کل تک دلاور ایک اسمگلر تھا، بدمعاش تھا یا غدار تھا۔ لیکن اب وقت پر اس کی دولت کی گرفت ہے اور اسے یقیناً آپ جیسے بیوروکریٹس کی تائید و حمایت حاصل ہے۔ وہ چاہے گا کہ دوسرا چوہدری بھائی ہی کوتوال ہے تو اپنے وارے نیارے

ہوں۔ آپ کی ملازمت کے دن قریب ہیں۔ آپ غروب ہونے والا سورج ہیں۔ وہ چڑھتا سورج ہے جس کے سب پجاری ہوں گے۔ آپ ان پجاریوں کی صف میں پہلے سے شامل ہو گئے ہیں تاکہ وقت بدلے تو وقت کی نظر نہ بدلے۔ حاکم کل بھی مہربان تھا، حاکم کل بھی مہربان رہے۔ اب آپ پر ساری بات واضح ہو چکی ہو گی کہ میرا الزام بے سبب نہیں تھا۔ رفیق کو قتل کروانے والا چوہدری دلاور ہے مگر نہ اس کے خلاف ثبوت ہے نہ گواہ۔ نہ آپ اس کے خلاف تحقیق کرا سکتے ہیں اور نہ جرم ثابت ہونے پر اسے سزا ہو سکتی ہے۔"

"تمہیں کیوں یقین ہے کہ چوہدری دلاور ہی رفیق کا قاتل ہو گا؟ وہ تمہارا دشمن تھا، رفیق کا دشمن کیسے ہو گیا؟"

میں نے کہا "یہ بہت لمبی بات ہے اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا نہ جاننا ہی آپ کے حق میں بہتر ہے۔ ان کا تعلق چوہدری دلاور سے ہے۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ آپ اس کے بارے میں وہ سب جانتے ہیں جو ہم جانتے ہیں تو وہ آپ کا نام بھی ہمارے نام کے ساتھ دشمنوں میں لکھ لے گا۔ ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے آپ کی شہرت اور نیک نامی کو، جان و مال کو یا مستقبل کو کسی قسم کا خطرہ لاحق ہو۔ ہم تو آپ کو اپنا غائبانہ محافظ سمجھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ آپ بھی محفوظ رہیں۔"

نقوی صاحب کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے کمرے میں ٹہلتے رہے۔ ان کی صورت سے ظاہر تھا کہ وہ صورت حال کو سمجھتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اپنی پوزیشن کا مثبت اور منفی پہلو سے جائزہ لے رہے ہیں۔ دو گھنٹے بعد صبح ہونے والی تھی لیکن ہمارے لیے یہ مہلت کافی تھی۔ میں نقوی صاحب پر جال ڈال چکا تھا لیکن عجلت میں ان سے بھی حماقت سرزد ہو سکتی تھی۔ میں نے کافی کا تیسرا کپ ختم کیا۔ شیلی نے حیرت انگیز طور پر خاموشی اختیار کیے رکھی اور ایک فیشن میگزین کی ورق گردانی کرتی رہی۔ غالب صوفے کی پشت سے سر لگائے چھت کو دیکھتا رہا۔

بالآخر نقوی صاحب نے کہا "واٹ ڈو یو وانٹ فرام می؟ مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "پہلی بات تو یہ کہ جو کار خیر آپ کر رہے ہیں یعنی میرے خلاف مقدمات واپس لینے کا۔ وہ جاری رکھیں۔"

"اس میں وقت لگے گا۔"

"مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ ایک ایک کر کے تمام مقدمات کو واپس لیں یا کوئی ایسی ترکیب کریں کہ شک کا یقینی فائدہ مجھے حاصل ہو۔ میری ضمانت ہو جائے اور بالآخر باعزت رہائی۔"

"اس وقت تم کون سی قید میں ہو؟"

"ابھی میں ایک مفرور مجرم ہوں۔ میری پوزیشن اس حد تک بہتر ہو جائے کہ میں خود کو عدالت میں پیش کر کے ضمانت حاصل کر سکوں۔ تو یہ رہائی ہی ہو گی۔ تفکرات سے اور اندیشوں سے۔"

میں نے کہا۔

"یہ کام چھ مہینے یا سال میں ہو گا۔"

"ہونے دیں۔" میں نے کہا "لیکن اس عرصے میں میرے خلاف نئے مقدمات کھڑے نہ ہوں۔"

"اس کی ضمانت میں کیسے دے سکتا ہوں۔ کل کو تم قتل کر دو۔"

"میں قتل کروں گا تو دو صورتیں ہیں۔ یا تو میں رنگے ہاتھوں پکڑا جاؤں گا اور جائے واردات پر چشم دید گواہ بہت ہوں گے۔ حالات اور واقعات کی شہادت میرے خلاف ہو گی اور ثبوت واضح ہوں گے۔ اگر میں پکڑا نہ گیا تو میں خود فون کر کے یا پیغام بھیج کے بتادوں گا کہ قتل میں نے کیا تھا تو کیوں۔ اور نہیں کیا ہو گا تو بتا دوں گا کہ مجھے بلاوجہ ملوث کیا جا رہا ہے اور ملوث کون کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھ پر جھوٹے مقدمات نہ بنائے جائیں۔"

انہوں نے سر ہلایا اور گویا منظوری دی کہ چلو ایسا ہی ہو گا۔

"آگے بولو۔"

میں نے کہا "آپ کو خدا ہوم سیکریٹری بنائے۔ جب میری ضمانت کی درخواست پیش کی جائے تو سرکاری وکیل اس کی مخالفت نہ کرے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتا۔ میں اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں اور اپنے دشمنوں سے بھی نمٹ سکتا ہوں۔"

"تمہیں بھی میرا مشورہ ہے کہ جینا سیکھو۔ مرنے مارنے نہیں۔ جیو اور جینے دو کے اصول پر۔ دشمن مت بڑھاؤ۔ بی ڈپلومیٹک BE DIPLOMATIC۔ میرے اختیارات کی حدود بھی سیاسی ہیں۔ اگر اوپر سے دباؤ ہو گا تو وہ نیچے منتقل ہو گا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ کچھ عرصے کے لیے تم روپوش ہو جاؤ؟"

ایک دم شیلی نے رسالہ رکھ دیا "یار، میں بھی ان سے یہی کہہ رہی ہوں۔"

"اسٹاپ یوزنگ یار لڑکی!" نقوی صاحب برہمی سے بولے۔

"سوری۔ ویری سوری سر" شیلی بوکھلا گئی "میرا مطلب تھا انکل کہ یہ میرے ساتھ لندن چلے جائیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ ان کو وہاں سے ڈی پورٹ کیا گیا تھا۔ یعنی بے آبرو کر کے رخصت کیا گیا تھا۔ اگر نیا پاسپورٹ مل جائے تو۔۔۔"

شیلی کے نامکمل جملے کو غالب نے پورا کیا "تمہارا مطلب ہے نئے نام سے نا؟ یہ تو بہت چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں انکل کے لیے۔"

"بلکہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہیں۔ عام آدمی دو چار پاسپورٹ رکھتا ہے اپنے پاس" میں نے کہا۔

نقوی صاحب کی خاموشی کو میں نے ان کی رضامندی پر محمول کیا۔ "اب رہ گئی بات بے چارے رفیق کی۔ تو مجھے ماموں چاہئیں۔"

"ماموں؟ کیا مطلب؟" نقوی صاحب چونکے۔

www.paksociety.com

"مطلب یہ کہ اس کی تدفین پوسٹ مارٹم کے بغیر کرائیں یا پوسٹ مارٹم رپورٹ لیں۔ کیس پولیس کو دیں یا نہ دیں۔" میں نے کہا "تفتیش۔"

"تم نے یہ نہیں بتایا ابھی تک کہ اس کا قتل کہاں ہوا اور کیسے؟"

میں نے کہا "یہ تو ہمیں بھی نہیں معلوم۔"

"کیا تم نے اسے قتل ہوتے دیکھا تھا؟"

میں نے شبلی کی طرف دیکھ کر سوچا۔ "نہیں۔ قتل ہوتا دیکھتے تو قاتل کو بھی دیکھتے۔ لیکن اس کا انتقال ہمارے سامنے ہوا۔ اس وقت ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بس وہ چند منٹ میں مر گیا۔ کچھ بتائے بغیر۔"

"لیکن مرتے مرتے وہ اپنے خون سے آپ کا نام لکھ گیا تھا۔" شبلی نے کہا۔

"میرا نام۔ واٹ نان سنس۔۔۔ کہاں لکھا تھا؟" نقوی صاحب اب کچھ نروس ہونے لگے تھے۔

"گاڑی کی ڈکی کے اندر" میں نے کہا "نام کیا۔۔۔ ایک اشارہ تھا۔ زیڈ۔۔۔ ایم۔"

"اس وقت کہاں ہے رفیق کی لاش؟" نقوی صاحب نے مجھے گھورا۔

"اسی گاڑی میں" میں نے عمداً ایک ہی مرتبہ میں پوری بات بتانے سے گریز کیا "گرانے کی مرسیڈیز تھی جو اس وقت باہر کھڑی ہے۔"

"آپ کی پورچ میں" غالب نے کہا۔

نقوی صاحب بے اختیار اٹھے "واٹ؟ یو ایڈیٹس! تم۔۔۔ اتنی دیر سے یہاں بیٹھے بکواس کر رہے ہو۔ جیسے اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ او مائی گاڈ۔ ایک لاش میرے گھر کے اندر گاڑی کی ڈکی میں۔ میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ مجھے بتاؤ تم سیریس ہو؟ یا جوکر۔"

میں نے کہا "اس قسم کا بے ہودہ مذاق ہم نہیں کرتے۔"

غالب نے کہا "ہم نے تو آتے ہی رفیق کی بات کی تھی۔ آپ نے کب پوچھا کہ اس کی لاش کہاں ہے "قتل کب ہوا؟ کیسے ہوا۔"

"آپ تو بس قاتل کا نام پوچھتے رہے تھے جو ہمیں بھی معلوم نہیں تھا" میں نے کہا۔

"شٹ اپ۔ شٹ اپ" نقوی صاحب چلانے لگے "تم سب بدمعاشوں کا ایک ٹولہ ہو۔ بلیک میلرز۔ قاتل اور ڈاکو۔ میں تم سب کو اندر کرادوں گا۔ رفیق کو تم نے ہی مارا ہوگا۔ لاش بھی تم لائے ہو۔"

ان کی یہ کیفیت بڑی جنونی تھی۔ وہ بری طرح کانپ رہے تھے اور اس اندیشے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اچانک وہ فلمی اسٹائل میں سینے پر ہاتھ رکھیں، نیچے جھک کر کلمہ پڑھیں اور اللہ کو پیارے ہو جائیں۔ شبلی نے فوراً اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے انھیں تسلی دی۔

"انکل! پلیز آپ بیٹھیے۔ مجھے پانی" اس نے نقوی صاحب کو بٹھا کے گلاس ان کے لبوں سے لگا دیا۔

نقوی صاحب نے تیسری گولی حلق سے اتاری۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہے تھے اور انھیں پسینہ آ گیا تھا مگر شبلی کے اطمینان سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کیفیت تشویشناک نہیں ہے۔ وہ بڑے غور سے ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ ابھی تک اندر سے ان کی آواز پر کوئی اٹھ کے نہیں آیا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی ایک معذور بیوی تھی جو بیڈ سے اٹھ بھی نہیں سکتی تھی اور اکلوتی بیٹی ان کی مرضی کے خلاف شادی کر کے گھر سے نکل گئی تھی۔ ان کا بیٹا کوئی نہیں تھا چنانچہ انھوں نے سوچا ہوگا کہ دولت، مرتبے اور اثر و رسوخ سے کوئی اچھا سا فرمانبردار گھر داماد خرید لیں گے جو عمر کے آخری حصے میں ان کی خدمت کرے گا لیکن اس خواب کی تعبیر انھیں نہ مل سکی۔ اب صرف نوکر تھے جو معاوضہ لے کر خدمت کرتے تھے۔ آدھی رات کے بعد نقوی صاحب کی آواز سن کے دوڑنا ان کے فرائض میں شامل نہ تھا۔

"مجھے۔۔۔ مجھے بتاؤ۔۔۔ دو منٹ میں" نقوی صاحب نے شاہد سے کہا "مجھے کچھ کرنا ہے۔۔۔ ایسا نہ ہو میں مر جاؤں۔۔۔ یا تمھیں گولی مار دوں۔"

میں نے کہا "نقوی صاحب! ابھی آپ کو ہوم سیکریٹری بننا ہے۔ آپ نے تو بہت بڑے بڑے چیلنج پہلے بھی قبول کیے ہوں گے اور آج بھی اصل اختیارات کس کے پاس ہیں۔ یہی دو چار لوگ چیف سیکریٹری، ہوم سیکریٹری یا فنانس سیکریٹری۔ وزیر صف چاہے آتے جاتے رہتے ہیں۔"

شبلی نے کہا "انکل، یہ گاڑی میں نے منگوائی تھی۔ رفیق کی معرفت۔ وہ نہ جانے کہاں سے روز یہ کار بھجوا دیتا تھا۔ ڈرائیور بھی وہی کرتا تھا۔ آج جب گاڑی آئی تو ڈرائیور نے چابی مجھے بھجوا دی۔ یہ ذرا خلاف معمول تھا۔ ہر روز ڈرائیور خود حاضر ہو کے سلام کرتا تھا۔ میں غصے ہوئی ہوئی۔"

"وہ بھی سٹپٹا گیا ہوگا" میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔

"وہ مجھے معلوم ہے یار۔" شبلی نے مجھے ٹوکنے پر ٹوکا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ نقوی صاحب جیسے کائیاں شخص کو شک نہیں ہوا۔ شبلی نے بڑی خوبی سے بات بنائی تھی۔

"لیکن اب۔۔۔ ان حالات میں میرا وہاں قیام مناسب نہیں انکل۔"

"بالکل۔ تم کو صبح ہونے سے پہلے چیک آؤٹ کرنا چاہیے۔" میں نے تائید کی "ہم تمھیں کسی محفوظ مقام پر شفٹ کر دیں گے۔"

"میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔ تم سب" نقوی صاحب نے انگلش میں کہا "وہ جگہ سب سے محفوظ ہے تمھارے لیے۔ اور دنیا کے لیے بھی جو تمھاری ان مجرمانہ قسم کی سرگرمیوں سے محفوظ ہو جائے گی۔"

"مجرمانہ قسم کی۔ ٹھیک ہے مگر آپ نے مجرمانہ نہیں کہا۔"

اندر کہیں کال بیل بجنے لگی۔ "یہ کون بدتمیز ہے؟" انھوں نے دیوار پر نصب انٹرکام اٹھا کے دو نمبر پش دبا دیا "یہ کیا ہے چوکیدار؟ کیوں ڈسٹرب کر رہے ہو؟ بے وقوف، تمھیں اندر آنے کی بات کرنی چاہیے۔ چوکیدار بولتے کیوں نہیں۔ کیا۔۔۔؟ پولیس۔ تم اندر آ چکے ہو۔ کیسے؟ کسی نے روکا نہیں تمھیں۔ اور تمھاری ہمت کیسے ہوئی؟ کون ہو تم آخر؟ ایس ایچ او۔ علاقہ ایس ایچ او۔ کیا بات ہے؟ خیر جو بھی بات ہے، پہلے تم باہر جاؤ۔ گیٹ سے باہر۔ ورنہ میں بلا اجازت اندر داخل ہونے پر تمھیں برخواست کرا دوں گا۔ ہاں ہاں سن لیا ہے میں نے۔ میرے دروازے سے دور کھڑے رہو۔ تمھاری وہ گاڑی بھی سامنے نظر آئی مجھے۔ میں ابھی آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔ شٹ اپ۔ آسمان نہیں گرے گا چند منٹ میں۔ بیڈروم سے میں نائٹ سوٹ میں باہر نہیں آ سکتا۔ یو فول۔"

انھوں نے غصے سے زیادہ پریشانی کی کیفیت میں انٹرکام رکھا "یہ از دی اینڈ آف ایوری تھنگ THIS IS THE END OF EVERY THING۔ ہو گیا سارا معاملہ چوپٹ۔ دو منٹ میں پہنچ گیا سالا ایس ایچ او صاحب اور انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ میرے گھر کے اندر ایک گاڑی موجود ہے اور اس میں ایک لاش ہے۔ بتاؤ مجھے اب میں کیا کروں؟ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ یا کسی کو شوٹ کر دوں گا۔ تمھیں یا اپنے آپ کو۔"

ڈاکٹر شبلی نے پھر مسیحائی کے فرائض پورے کیے "سر! آپ کو اس CRISIS سے نمٹنا ہے۔ ٹھنڈے دل اور دماغ کے ساتھ۔"

میں نے کہا "ایک معمولی ایس ایچ او سے آپ کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ۔۔۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ فرشتۂ غیب ہے۔"

"ایس ایچ او اور فرشتہ۔۔۔ مائی فٹ۔ شیطان کہتے تو میں مان لیتا جو ایسے ہی نازل ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "سر! آپ سب کچھ اس کے سپرد کر دیں۔ اپنا دورہ درست بتائیں کسی بات کو۔ ایس ایچ او جیسے لوگ اس قسم کے معاملات سے نمٹنا جانتے ہیں۔"

"کیا تمھارا مطلب ہے۔۔۔ میں۔۔۔ زیڈ ایم نقوی۔ ایڈیشنل ہوم سیکریٹری۔ ایک معمولی ایس ایچ او کے سامنے مجرم بن کے اس سے کہوں کہ میں مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے بچا لے۔" نقوی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ چاہیں تو ایس ایس پی یا ڈی آئی جی سے بات کر لیں مگر میرا مشورہ ہے کہ بات کو اتنا اوپر لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ چھوٹے افسر ہی اصل کام کرتے ہیں اور ڈی آئی جی بھی بالا تر اسی سے کہے گا۔ یا وہ ایس ایس پی سے کہے۔ وہ ایس پی سے پھر وہ چینل THROUGH PROPER CHANNEL بات ہوگی تو بلاوجہ کئی لوگ ملوث ہوں گے اور آپ کو ایک نہیں، چار چھ منہ بند کرنے پڑیں گے۔ یہ چھوٹا سا معاملہ ہے، اس کے لیے یہ بڑی بات ہے کہ ایڈیشنل ہوم سیکریٹری خود اس سے کوئی کام کہے۔ اشارے میں انعام کی بات کریں۔ وہ خوشی خوشی دم ہلاتا جائے گا اور سر کے بل واپس آئے گا کہ سر، آپ فکر ہی نہ کریں۔ سب ٹھیک کر لیا ہے میں نے۔"

"انعام! میں اس سے انعام کا وعدہ کروں۔۔۔ ناممکن۔"

"نقوی صاحب! ان کے لیے انعام کیا ہوتا ہے۔ بس ایک پروموشن۔ کندھے پر ایک پھول ہے تو دو کرا دیں۔ وہ چاہتا ہے تو تھانہ اس کی مرضی کے تھانے میں پوسٹنگ کرا دیں۔ اور اس میں آپ کا کیا جاتا ہے۔ کل پرسوں، دو چار دن یا ہفتے بعد بھی ایس ایس پی کے آرڈر سے انعام اسے مل جائے گا تو ساری عمر اس کی زبان آپ کی غلامی کا اقرار کرتی رہے گی۔ آپ کے خلاف تو بھونکنے کی ہمت وہ کر نہیں سکتا۔ اشارے میں بھی آپ یہ واضح کر سکتے ہیں کہ اس نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تو۔۔۔ اور بس۔"

"آئی تھنک، یہی ٹھیک ہے۔ مگر میں اس سے کیا کہوں؟ میری عقل تو بالکل کام نہیں کر رہی ہے۔"

"آپ کہیں کہ مجھے کیا معلوم یہ گاڑی کون چھوڑ گیا ہے۔ تم نے ہی چیک کر کے یہ انکشاف کیا ہے ابھی ابھی۔"

غالب نے کہا "وہ۔۔۔ چوکیدار کی کیا بات تھی؟"

"وہ غائب ہے۔ گیا ہوگا نماز پڑھنے" انھوں نے چوکیدار کو ایک گالی سے نوازا "میں اسے برطرف کر دوں گا۔ ایسے وقت میں چوروں کو اندر آ جانا ہے جب وہ خدا کے سامنے سر جھکائے پڑا ہو۔ لو بس ہو چکا کام۔ کوئی بھی کام تمام کر جائے گا۔ میں صاف کہہ دوں گا آج کہ یا نوکری کر لو یا نمازیں پڑھو گھر بیٹھ کے۔ پیسہ کمانا یا ثواب۔ یہ حرام خوری ہے صاف۔۔۔"

مجھے نقوی صاحب کی فرعونیت پر افسوس ہوا مگر اس سوچ کا کوئی علاج نہیں تھا۔ یہ ان فرنگی آقاؤں کی ذہنیت کا عکس تھی جو ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہب پرستی، عقائد اور دینی شعائر کے دشمن تھے اور جاتے وقت یہ نمرود کی خدائی کا انداز اپنے تربیت کردہ آئی سی ایس افسران کو سکھا گئے تھے۔ اس کے بعد سے یہی نظریاتی تضاد ان حکمرانوں کے طبقے کی سوچ میں رچ بس گیا تھا جو مجبوراً زبان سے خود کو پبلک سرونٹ کہتے تھے مگر عملاً پبلک سے اسی طرح پیش آتے تھے جیسے آج بھی مملکت خداداد پاکستان میں دورِ غلامی ہے اور اسلامی مساوات فقط سیاسی بیانوں اور تقریروں کی اصطلاح رہ گئی تھی۔ البتہ یہ احساس عوام کے ذہنوں میں بیدار ہونے لگا تھا کہ فرنگی سامراج کے دور میں حاکم و محکوم میں اتنے فاصلے حائل نہیں تھے اور وہ غلامی آج کی جمہوریت سے زیادہ جمہوری تھی۔

www.paksociety.com

نقوی صاحب کے باہر جاتے ہی غالب نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا "یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟"

میں نے معصومیت سے کہا "معاف کرنا یار۔ میں نے غلطی سے پولیس کو فون کر کے سب بتا دیا تھا۔ بے وقوف شخص! اس سوال کی ضرورت نہیں تھی۔"

شبلی کا رنگ فق ہونے لگا تھا "تم لوگ سیریس نہیں ہو؟"

غالب نے کہا "میں تو سیریس تھا بلکہ ہوں۔"

"میں کون سا دانت نکال رہا ہوں" میں نے انھ کے ایک پردہ ہٹاتے ہوئے باہر جھانکا۔

غالب میرے دائیں جانب آگیا اور شبلی نے جگہ نہ پا کے صوفے کے اوپر چڑھتے ہوئے میرے کندھے پر ٹھنی ٹکا دی۔ میں نے شانے پر نوکیلی ٹھوڑی کا دباؤ مجبوراً برداشت کیا۔ باہر عجیب منظر تھا۔ کھلے گیٹ کے سامنے نقوی صاحب گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے اور کسی مجسٹریٹ ٹائپ شخص سے بحث کر رہے تھے۔ ایس ایچ او وردی میں پیچھے مظلوم و مسکین شکل بنائے کھڑا ہوا تھا۔ نقوی صاحب کے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔

"غالب! یار میں نے اچانک اپنی چھٹی حس کی آواز سن لی ہے۔ یہ وارنٹ ہیں خانہ تلاشی کے۔"

غالب نے سراہا "ٹھیک فرماتے ہو تم۔ ایسے کون جرأت کر سکتا تھا اور ہوم سیکریٹری کے گھر پر چھاپا مارنے کی۔"

"بڑا کام کیا جس نے بھی کیا۔"

میں نے کہا "شکاری بڑے گھاگ اور تجربہ کار ہیں۔ کوئی مخبر پیچھے لگا ہوا تھا۔"

"یار یہاں سے بھاگنے کی کرو ورنہ پکڑے ہم ہی جائیں گے۔ نقوی صاحب کا کچھ بھروسہ نہیں۔"

"مگر کیسے بھئی۔" شبلی نے گھبرا کے کہا "وہ جانے دیں گے؟"

میں نے کہا "تم ذرا مسکرا کے کہنا۔ انکل کیوٹی پائی۔ ذرا سامنے سے ہٹ جائیے مجھے باہر جانا ہے۔ اُف! پیچھے ہٹو شبلی! میرے ناتواں کندھے اس سے زیادہ بارِ نزاکت نہیں اٹھا سکتے۔"

غالب نے کہا "سکندر! ابھی اب وہی پرانی چالیں۔ تخت یا تختہ۔ پیچھے سے نکلنے کا راستہ بناتے ہیں۔"

سوچے سمجھے بغیر میں نے شبلی کا ہاتھ پکڑا "چلو۔"

شبلی کو سوال کرنے کا موقع دیے بغیر میں ایک دروازے سے اندر گھس گیا۔ غالب مجھ سے آگے تھا۔ یہ کھانے کا کمرا تھا۔ اس سے اگلے ایک دروازے سے جھانک کے دوسری طرف گیا پھر اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم اچانک کچن میں پہنچ گئے۔ وہاں فرش پر دو افراد لمبی تانے سو رہے تھے بعد میں معلوم ہوا کہ ایک سونے کی اداکاری میں مصروف تھا تاکہ اسے کسی کام کے لیے پکارا جائے تو وہ نظر انداز کر دے۔ اب دو پیزا کے انتظار اس نے

اڑ دو "نیپال میں اپنے سوکھے "کالے جسم کی نمائش کرتے ہوئے زور سے کہا "کون ہے۔ کون ہے؟"

میں نے اسے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور ایک ہاتھ مار کے پھر لٹا دیا مگر وہ دوسرے پر گرا جو اس کی آواز پر بیدار پہلے ہی ہو چکا تھا۔ دوسرا بھی قریب البدن تھا اور اس صحت کا راز بدرودہ "کھٹن" انڈے "گوشت ہو سکتے تھے جو عموماً خانساماں قسم کے ملازم فراخ دلی سے چرا کے کھاتے ہیں۔ اس نے ہکلا کے بے کنے کی ناکام کوشش کی کہ اس کی جان بخشی کی جائے مگر میں بے مناسبت وجے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میرا ہاتھ پڑنے سے قبل ہی وہ لیٹنے کے لیے تیار تھا۔

ہم کچن کے دوسرے گیٹ سے باہر نکلے تو آٹھ دس فٹ کا کورٹ یارڈ سامنے تھا اور پھر ایک دیوار۔ ساتھ والے بنگلے کے گیراج یا سرونٹ کوارٹر کی دیوار لگی تھی۔ میں نے شبلی کو دائیں طرف گھسیٹا۔ اونچی ہیل والی سینڈل میں وہ گتی بار گرتے گرتے بچی۔ متعدد بار اس نے ہائے اور اوئی قسم کی آوازوں کے بعد اعلان بھی کیا کہ "میں مری۔" مگر میں متاثر نہیں ہوا۔

ساتھ والے بنگلے کو جدا کرنے والی دیوار چھ سات فٹ اونچی تھی مگر اس پر نوکیلے شیشے جڑے ہوئے تھے۔ خالی ہاتھوں سے اس پر چڑھنے کا انجام یہ ہوتا کہ ڈاکٹر شبلی کی خوبرولی میرے کام نہ آتی۔ مجھے کسی جراح کے زیر علاج رہنا پڑتا۔ تاہم اس وقت میرا ذہن پوری طرح فعال تھا اور اپنی نارمل سے زیادہ کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا تھا جو حالات کے پیش نظر فطری بات تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ دیر کی صورت میں شاید ہم نقوی صاحب کے گھر میں ہی گرفتار کر لیے جائیں اور فرار ہوتے ہوئے پکڑا جانا ہمارے خلاف جرم کی ایک دلیل بن جائے۔ سرچ وارنٹ کی موجودگی میں نقوی صاحب قانون کا راستہ نہیں روک سکتے تھے۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ انسپکٹر جنرل پولیس یا کسی اور سے رجوع کر سکتے۔۔۔ وہ تو بے خبری میں اچانک مجسٹریٹ آگیا تھا ورنہ نقوی صاحب کے کانوں میں بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ پہلے سے بندوبست کر لیتے۔ تیج وہ مجسٹریٹ اور ایس ایچ او دونوں کو معطل کرا دیں یا ٹرانسفر مگر اس وقت وہ مجبور تھے اور ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ اپنی پوزیشن کو بچانے کے لیے وہ ہماری حمایت سے ہاتھ کھینچ لیں اور مزاحمت کر کے عزت کو داؤ پر لگانے سے بہتر سمجھیں کہ انہیں پولیس کے حوالے کر دیں۔

میں نے غالب کو آواز دی "ادھر مرغا بن جاؤ۔"

میری بات سمجھتے ہوئے اس نے فوراً رکوع میں جا کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ لیے "بس اتنا خیال رکھنا کہ جب اوپر پہنچ جاؤ تو ہمیں بھی کھینچ لینا۔"

"بھیا! دنیا میں بڑی نفسا نفسی ہے۔ اوپر جا کے دیکھیں گے۔"

میں نے اس کی کمر پر چڑھ کے اوپر دیکھا۔

"اُف۔ نج مرزا غالب کی روح کو کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ غالب پر ایک گدھا۔ ہونٹوں صحبت چڑھ گیا ہے۔ اُف۔ یار! اب مجھے سیدھا کون کرے گا۔ میں تو مستقل جھک گیا۔"

میں اوپر دیوار کی طرف ہاتھ بڑھا کے اچھلا تھا اور چھت کے کنارے کو پکڑ لیا تھا۔ جھٹکا غالب کی کمر میں آیا تھا لیکن میری پہلی کوشش ناکام رہتی تو میں اس کی کمر پر گرتا۔ پھر ہم دونوں کرتے مگر میرے ہاتھ سرونٹ کوارٹر کی چھت کے کنارے پر جم گئے تھے۔ میں نے خود کو اوپر کھینچا اور چھت پر پہنچ گیا۔ اوپر سے میں نے گیٹ کی طرف دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ نقوی صاحب تلاشی کے لیے آنے والوں کو روکنے میں ناکام رہے تھے۔ پولیس کی گاڑی وہیں موجود تھی۔ ایک کانسٹیبل بڑے جارحانہ انداز میں بندوق تھامے گیٹ پر کھڑا تھا۔ جیسے شاہو جنات بھی نکلنے کی کوشش کریں تو وہ گولی مار دے۔ باقی لوگ اندر پہنچ چکے تھے اور غالباً گاڑی میں لاش کا معائنہ کر رہے تھے یا کمروں میں مجرموں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ وہ کسی وقت بھی کچن کی طرف سے نمودار ہو سکتے تھے۔

غالب نے شبلی کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ خود بہت ڈھیلی ثابت ہوئی۔ اگر وہ جسم کو لکڑی کی طرح سخت کر لیتی تو غالب اسے میرے ہاتھوں تک پہنچا سکتا تھا۔ میں چھت پر الٹا لیٹا ہوا تھا اور میرے ہاتھ نیچے دوفٹ تک لٹکے ہوئے تھے۔ شبلی ہاتھ اوپر اٹھاتی تو دوفٹ اوپر میرے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ دے دیتی مگر وہ گھبرا گئی تھی۔ غالب نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کر کے ایک جھولا سا بنا لیا اور شبلی سے کہا کہ وہ چڑھ جائے پھر اس نے تلوار کے ساتھ ساتھ شبلی کو اوپر اٹھایا اور بڑی صفائی سے ہاتھوں کو سر تک لے گیا۔ اس نے کسی ویٹ لفٹر کی طرح شبلی کو اٹھایا اور پھر انگڑائی کے انداز میں ہاتھ سر سے اوپر تک اٹھا کے اسے میری دسترس تک پہنچانے میں کامیاب رہا۔ شبلی نے ہاتھ اوپر کیے تو میں نے اسے ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ اب مسئلہ غالب کے اوپر آنے کا تھا۔

گھر کے اندر مجھے ہنگامہ آرائی کے آثار دکھائی دے رہے تھے خانہ تلاشی کے لیے آنے والے قانون کے تقاضے ضرور پورے کر رہے تھے۔ غالب نے تھوڑا سا پیچھے جا کے دوڑتے ہوئے ایک پاؤں سامنے کی دیوار پر رکھا۔ اس کا پاؤں تقریباً تین فٹ کی بلندی پر پڑا۔ اپنی پوری قوت کے ساتھ غالب اوپر اچھلا اور میں نے اس کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ اگر میری کوشش ناکام رہتی تو غالب دھڑام سے فرش پر گرتا۔ جب اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا تو میرے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ میری ہدایات کے مطابق شبلی نے پیچھے سے اوپر میرے پاؤں کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ رکھا تھا اور وہ اپنا سارا زور پیچھے کی طرف لگا رہی تھی۔

جھٹکا لگتے ہی میں نے کہا "شبلی! چھوڑنا نہیں مجھے ورنہ میں سر کے بل نیچے جاؤں گا۔"

"نہیں یار۔ تم گئے تو میں بھی جاؤں گی۔ مگر چھوڑوں گی نہیں تمہارا پیچھا" اس نے ایک دو معنی جملہ ہانپتے ہوئے بولا۔

شبلی نے مجھے پیچھے سے نہ پکڑ رکھا ہوتا تو میں یقیناً غالب کے ساتھ ہی نیچے جاتا۔ وہ کوئی شہ زور نہیں تھی مگر مجھے بھی معمولی سے سہارے کی ضرورت تھی۔ میرا جسم کسی چھپکلی کی طرح چھت سے چپٹا ہوا تھا۔ غالب کا ہاتھ پکڑتے ہی میں نے سکون کا سانس لیا اور اسے اوپر کھینچنے کے لیے پیچھے ہٹا۔ غالب نے دیوار پر چلنے کے انداز میں دوسرا قدم آگے بڑھایا اور میں نے اسے ایک جھٹکے سے اوپر کھینچ لیا۔ میرے پیچھے ہٹنے میں لات شبلی کو لگی اور وہ چھت پر ہی لڑھک گئی مگر اس نے اپنی عقلمندی سے کام لیا کہ چیخ نہیں ماری۔

میں نے ہانپتے ہوئے کہا "سوری۔ تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"ذرا دل پر لگا تھا تم نے" وہ بولی "چوٹ اوپر سے کہاں نظر آتی ہے یار۔"

غالب نے کہا "ایسے ہی موقعے کے لیے یہ شعر ہے کہ۔ جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے۔"

میں نے چھت کے پیچھے جھانک کر دیکھا "پتا نہیں یہ کس نوبیل کا گھر ہے اور اس گھر میں چوروں کی طرح کودنے کی کیا سزا ہے؟"

"کودنے کی سزا زیادہ سے زیادہ ٹانگ ٹوٹنا ہو سکتی ہے۔ پکڑے جانے کی سزا چوری کی جیل" غالب نے کہا "یا دونوں۔"

خرابی بعض اوقات خوش قسمتی سے انتہائی بن جاتی ہے۔ یہی اس وقت ہمارے ساتھ ہوا۔ ہم چھت پر ہی تھے کہ نقوی صاحب کے کچن کا دروازہ کھلا اور ایک ساتھ بہت سے لوگ اندر آگئے۔ ہم سب فوراً چھت پر سجدے میں لیٹ گئے۔ مجھے یقین تھا کہ نیچے سے کسی کو بھی اوپر ہماری موجودگی کا احساس نہیں ہو سکتا لیکن میں ذہنی طور پر اس کے لیے بھی تیار تھا کہ کوئی پولیس والا اوپر آجائے تو اس سے نمٹ لوں۔ جب فرار کے راستے ہی مسدود ہوں تو فری مرنے مارنے کے سوا کیا کر سکتا ہے۔

میں ایک شخص کو یا زیادہ سے زیادہ دو کو مار سکتا تھا مگر اس کے بعد جب ثابت ہو جاتا کہ مجرم اوپر تشریف فرما ہیں تو مجسٹریٹ شہر کی ساری پولیس فورس کو تمام دستیاب وسائل کے ساتھ طلب کر لیتا اور وہ کسی بھی دشواری کے بغیر ہمیں نیچے اتر کے خود کو قانون کے حوالے کرنے پر مجبور کر دیتے یا اوپر رہتی بم پھینک دیتے۔ خبر یہ آتی کہ مجرم مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہو گئے۔

لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ میں نے مجسٹریٹ کی آواز سنی "وہ اس طرف سے فرار ہونے ہیں یقیناً۔"

"پھر انتظار کیوں کرتے ہو؟ چڑھ کے تم بھی ادھر اتر جاؤ اگر ہمت ہے" نقوی صاحب نے دہاڑ کے کہا "ارے مرچیف سیکریٹری

www.paksociety.com

رہتے ہیں۔"

مجسٹریٹ نے معذرت کے انداز میں کہا "سر! آپ سے پھر معذرت۔ میں مجبور تھا۔ اوپر سے آرڈر ملے تھے مجھے۔ ایک رسمی قانونی کارروائی ضروری تھی۔"

"شٹ اپ۔ رسمی کارروائی کے لیے تمہارا یہاں آنا ضروری نہیں تھا۔ تم مجھ سے فون پر پوچھ سکتے تھے اور رپورٹ دے سکتے تھے۔ یہ ایس ایچ او خاموشی سے تو کے اپنی کارروائی مکمل کر سکتا تھا۔"

"آئی ایم سوری سر۔"

"افسوس تمہیں صبح ہوگا۔ چند گھنٹے بعد کہ تم نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ تم نے میرے گھر میں گھس کے مجھے ہراساں کیا۔ تم میری بیمار بیوی کے بیڈ روم میں گئے۔ کوئی ملا تمہیں؟" نقوی صاحب آتش فشاں بنے ہوئے تھے۔

"سر! ہم نوکر لوگ ہیں... ہماری مجبوری کا خیال کریں" یہ ایس ایچ او کی آواز تھی "ورنہ ایسی گستاخی کرتے ہم؟"

"نیور مائنڈ۔ تمہیں کسی نے شہ دی تھی ورنہ تم ایسی جرأت نہ کرتے کہ میری بات کا یقین نہ کرو۔ جب میں نے بتا دیا کہ مجھے نہیں معلوم یہ گاڑی کس کی ہے اور رشتی کی لاش یہاں کون چھوڑ گیا ہے۔ تو کیا یہ کافی نہیں تھا؟ وہ میرا پی اے تھا۔ اس کے قتل کی تفتیش ہوگی اور میں قاتلوں کو معاف نہیں کروں گا۔ تم کو بھی معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اتنی بے عزتی میں نے زندگی میں کبھی برداشت نہیں کی۔" نقوی صاحب گرجتے رہے "ورنہ مجھے بتاؤ کہ کس نے جھوٹ بکا تھا، کس نے اطلاع دی تھی تمہیں۔ وارنٹ کس نے نکلوائے؟"

"سوری سر۔ یہ ہم نہیں بتا سکتے۔"

"تو پھر گیٹ آؤٹ۔ ایک منٹ میں دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ مسٹر مجسٹریٹ! تم تو خود کو برطرف سمجھو۔ اور ایس ایچ او! تم میری طرف سے ایف آئی آر لکھو۔ تمہارے بارے میں سوچوں گا میں۔ تم واقعی مجبور تھے۔"

"سر جی! بڑا احسان ہوگا آپ کا۔ میں تو غریب، مسکین سا بندہ ہوں۔ حکام کا غلام۔"

وہ سب جدھر سے آئے تھے، ادھر ہی چلے گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ شاید اتنی دیر سے میں سانس روکے لیٹا ہوا تھا۔ شبلی اور غالب کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔

"اُف۔ بال بال بچے" میں نے کہا "ادھر چیف سیکریٹری صاحب کا بنگلا نہ ہوتا تو مارے جاتے۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ وارنٹ صرف اس گھر کا تھا۔ وہ اس سے آگے ایک قدم نہیں بڑھا سکتے تھے۔ خدا کا شکر ہے نقوی صاحب اپنے بیان پر قائم رہے۔"

"لیکن کیا واقعی وہ ایف آئی آر لکھوائیں گے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ ایسے ہی دھمکی تھی۔ اندر جا کے مجسٹریٹ ان کے پاؤں پکڑے گا اور ایس ایچ او قدموں میں سر رکھ دے گا۔ وہ معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق طے کرا لیں گے۔ مجسٹریٹ کی جان بخشی کر کے اور اسے اس گستاخی پر معاف کر کے۔ ایس ایچ او تو ہے ہی حکم کا غلام۔"

"دیکھو یار! کیا فرعونیت ہے افسر شاہی کی۔ ایک مجسٹریٹ بہرحال ایک عدالتی افسر ہوتا ہے۔ کتنا بے عزت کیا نقوی صاحب نے اسے۔ اختیارات ہیں اس کے پاس توہین عدالت کے مگر وہ استعمال کیسے کرے۔ سرکاری ملازم ہے کوئی ہائی کورٹ کا جج نہیں ہے۔"

"عدلیہ کو انتظامیہ سے جدا ہونا چاہیے۔" میں نے کہا "اب سوچو ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ یہ صبح کاذب کا اجالا ہے۔"

"اس کے بعد صبح صادق ہوگی۔ پھر صبح۔ اور چیف سیکریٹری صاحب اگر لان پر ٹہلنے نکلے اپنے کتے کے ساتھ۔ تو سرونٹ کوارٹر کی چھت پر ہم تینوں کو دیکھ کے بہت خوش ہوں گے۔ سمجھیں گے آسمان سے فرشتے اترے ہیں۔ مہمان رحمت کا فرشتہ ہوتا ہے۔"

شبلی نے کہا "یار! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ذرا دیکھو میں کہاں پھنسی ہوں، کس حال میں۔ ڈاکٹر شبلا خان ہیومن رائٹس ایکٹوسٹ... مائی فٹ۔"

میں نے کہا "اوکے۔ اب ہم ادھر سے اتریں گے اور گیٹ کے اوپر سے باہر نکل جائیں گے۔ دعا کرو ہمارے پیچھے کتے نہ لگ جائیں۔ اندر کوئی خفیہ سسٹم کا الارم نہ ہو اور گارڈ سو رہا ہو۔"

وہ بولی "اتنی دعائیں ایک ساتھ قبول نہیں ہوں گی۔"

"چلو ایک ایک مانگ لیتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

چیف سیکریٹری صاحب کے گھر میں اترنے کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ نقوی صاحب کے گھر میں ابھی پولیس اور مجسٹریٹ دونوں موجود تھے۔ اگر ہم ان کی واپسی کا انتظار کرتے تو سورج نکل آتا اور اس سے پہلے ہی سرونٹ کوارٹرز میں رہنے والے ہمیں دیکھ لیتے۔ ملازمین سے تو نمٹا جا سکتا تھا مگر گارڈ کا مسلح ہونا یقینی تھا۔

میں نے چھت کے کنارے سے پھاٹک کے پیچھے دیکھا اور پھر کنارے کو پکڑ کے لٹک گیا۔ میرے پیر اب بھی فرش سے چار فٹ کے قریب اوپر تھے۔ میں نیچے فرش پر گرتا تو آواز سے کوئی ملازم ضرور جاگ اٹھتا۔ ویسے بھی ملازم جلدی اٹھتے ہیں اور ان کے جاگنے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے غالب کی مدد حاصل کی اور اس نے نیچے لٹک کر میرے ہاتھ پکڑے۔ اب اس کی ایک ٹانگ شبلی نے کھینچی اور غالب نے آہستہ آہستہ آگے جھک کر مجھے فرش پر اتار دیا۔ یہ اندیشہ ہمہ وقت میرے ذہن میں رہا کہ شبلی نے غالب کی ٹانگ چھوڑ دی تو میں نیچے اور غالب میرے اوپر گرے گا یا شبلی ساتھ ہی آئی تو ہم ایک زنجیر کی طرح لٹک جائیں گے۔

زمین پر قدم جماتے ہی مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ پہلے غالب نے شبلی کو لٹکایا اور وہ میرے کندھے پر اتری تو میں نے اس کی کمر کو پکڑ کے اسے نیچے رکھ دیا۔ اتنی احتیاط سے جیسے وہ شیشے کی گڑیا ہو۔ پھر مرزا غالب میرے کندھوں پر سوار ہوئے اور پھر تسمہ پا کی طرح ٹانگیں میری گردن پر لٹکا کے بولے "چلو۔"

میں نے رکوع میں جا کے اسے نیچے گرانے کی کوشش کی مگر گرنے نہیں دیا۔ گیٹ مجھے سامنے نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر شبلا! ایک ایکٹ کا چھوٹا سا ڈراما پیش کر سکتی ہو؟"

"یار! اسکرپٹ بتاؤ۔"

میں نے کہا "اطمینان سے ٹہلتی ہوئی گیٹ تک جاؤ۔ گارڈ بالکل شک نہیں کر سکتا کہ تم چوروں کی طرح دوسری طرف سے دیوار پھاند کے آئی ہو۔ وہ سمجھے گا تم چیف سیکریٹری صاحب کے گھر میں سے ہو۔ کوئی مہمان یا کوئی فرینڈ فار ون نائٹ۔ پتا نہیں وہ کیسے آدمی ہیں مگر عموماً ایسے لوگوں کے مہمان ایسے ہی ہوتے ہیں جو اندھیرے میں آتے ہیں اور اندھیرے میں ہی رخصت ہو جاتے ہیں۔"

"تمہیں شرم نہیں آتی یار" شبلی نے خفگی سے کہا۔

"یار! یہ شرم کی بات تو ہے مگر مجبوری میں شرم کو چھوڑ دینا چاہیے۔ تم کو سمجھنا چاہیے کہ نظریۂ ضرورت کے تحت سب جائز ہوتا ہے۔ جھوٹ بھی۔ تم ان بی اے گڈ گرل۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ بی اے بیڈ گرل۔" (BE A BAD GIRL)

اس نے کہا "گارڈ نے روکا تو؟"

"مانے گا نہیں ڈیئر شبلی۔ تم مسکرا سکتی ہو۔ اس سے کہو دروازہ کھول دے۔ تمہیں جانا ہے باہر۔ جب تم باہر نکلو گی تو وہ پھر گیٹ لاک کرے گا۔ اس سے پہلے ہی ہم اسے لٹا دیں گے آرام سے۔"

"مار ڈالو گے اسے بلاوجہ...؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ لٹانے کا مطلب ہے لٹانا۔ ایک دو گھنٹے چپ لیٹا رہے گا۔ اس سے پہلے ہی کوئی دیکھ لے گا۔ ڈاکٹر کو بلا لے گا۔ پولیس خود آ جائے گی شاید مگر اس وقت تک ہم محفوظ ہوں گے۔ وہ خاک بتائے گا ہمارے بارے میں؟"

شبلا نے گیٹ کی طرف چلنا شروع کیا۔ گارڈ اپنے کیبن میں تھا۔ شبلا نے گیٹ پر پہنچ کے اسے متوجہ کیا تو حسب توقع اس نے کوئی سوال کیے بغیر دروازہ کھول دیا۔ میں اور غالب اتنی دیر میں دیوار کے ساتھ ساتھ تاریکی میں چلتے ہوئے بہت قریب پہنچ گئے تھے۔ گارڈ کی ہماری طرف پشت تھی۔

چند قدم کے فاصلے سے میں نے چیتے کی طرح حملہ کیا اور گارڈ چلاتا ہی تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اسے واپس کیبن میں پہنچا دیا۔ ایک منٹ بعد غالب کے ساتھ میں باہر نکلا اور میں نے گیٹ کو ایسے برابر کر دیا کہ وہ بند ہی نظر آئے۔

اب سکون سے چلتے ہوئے ہم بنگلوں کے درمیان سے گزرے۔ ایک اخبار والے اور ایک دودھ والے نے سائیکل پر گزرتے ہوئے صرف شبلی کو دیکھا۔ ظاہر ہے وہی ایک دیکھنے کی چیز تھی۔ ہماری اشکال پر پھٹکار برس رہی تھی اور ہمارے "بوتھے" ویسے بھی فضول تھے۔

مال روڈ تک کا فاصلہ چند منٹ کا تھا۔ مجھے جو پہلی کار اپنی طرف آتی نظر آئی میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا مگر وہ نہیں رکی۔ پھر شبلی نے کوشش کی اور ہم ایک درخت کے پیچھے چھپ گئے۔ یہ ناممکن تھا کہ صبح دم کوئی اکیلی حسینہ کسی ویران سڑک پر کسی مرد کو روکے اور وہ نہ رکے۔ مرد بوڑھا ہو یا متقی اس سے فرق نہیں پڑتا۔ شبلی کے اشارے پر جو کار رکی اسے ایک درمیانی عمر کا عیاش نظر آنے والا شخص چلا رہا تھا۔ اس نے بہت مسکرا کے شبلی کے لیے دروازہ کھولا ہی تھا کہ ہم دونوں بائیں جانب سے نازل ہوئے اور اس کے احتجاج کرنے سے پہلے پچھلی سیٹ پر قابض ہو گئے۔ شبلی نے اپنا زنانہ ماڈل کا ریوالور میرے حوالے کر دیا تھا۔ وہ پہلے ہی دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ ریوالور دیکھ کے اس کی آواز بھی بند ہو گئی۔

اس نے بڑی مشکل سے کہا "کیا... کیا چاہتے ہو؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "ساری دنیا کا بھلا لیکن ایک ہمارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔"

"یہ... یہ بھلائی ہے؟"

"ہاں۔ ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک تمہاری لاش پیچھے چھوڑ کے بہت دور جا چکا ہوتا۔" میں نے کہا "ہم نے تو صرف لفٹ لی ہے۔ ہم تمہاری کار بھی چھین لیں گے مگر واپس کر دیں گے بالکل اسی حالت میں آج ہی۔ اب چلو۔"

اس نے کار کو آگے بڑھایا "کہاں۔ کیا کرو گے تم؟ کہیں ڈاکا ڈالو گے؟ پولیس تو تمہیں پکڑ لے گی۔"

میں نے اسے تسلی دی "پولیس کو کچھ معلوم ہوگا تو پکڑے گی۔ اب تم ایسا کرو کہ اچھے بچوں کی طرح گاڑی روک کے نیچے اتر جاؤ۔"

وہ چلایا "کیا... نیچے اتر جاؤں... مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ ہم تمہیں اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتے۔ تم ساتھ رہو گے تو سب دیکھو گے۔"

"میں... خدا کی قسم کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

"گڈ۔ ہم بھی نہیں بتائیں گے۔" غالب نے کہا "اس میں نہ تمہارا نقصان ہوگا نہ ہمارا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم تمہیں فون کر کے بتا دیں گے کہ گاڑی کہاں کھڑی ہے۔ چابیاں اندر گلوز کمپارٹمنٹ میں ہوں گی۔ گاڑی روکو۔"

www.paksociety.com

اس نے پارل ناز است بریک لگانے میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ مجھے پولیس کو رپورٹ کرنی پڑے گی۔"
غالب نے کہا "ضرور کرو۔ اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تم پولیس کے چکر میں پڑو گے تو کار مشکل سے واپس ملے گی۔ نذر نیاز پیش کرنے کے علاوہ خاصی منت سماجت کے بعد۔"
"اور یہ بھی ممکن ہے کہ اصل حالت میں نہ ملے۔ پارٹس ہوں تو ایک گھنٹے میں پرانے ہو جائیں۔ کسی چھوٹے تھانے دار کی بیوی کی کار میں فٹ ہو جائیں، کیا پتا ریڈیو، ٹیپ اور بیٹری کسے پسند آ جائیں۔"
غالب نے کہا "ایک گھنٹہ انتظار کرنے میں کوئی نقصان نہیں۔ اس کے بعد جو چاہو کرو۔ فون نمبر بتا دو اپنا۔"
شاید بات اس کی سمجھ میں آگئی "اچھا۔ ایک گھنٹہ انتظار کرتا ہوں میں۔ لیکن یہ تو بتا دو کہ اس ایک گھنٹے میں تم کیا کرو گے؟ یہ میرا کاروبار ہے۔"
"ہم کوئی واردات نہیں کریں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔" غالب نے اس کی جگہ بیٹھ کے گاڑی آگے بڑھا دی۔
شیلا نے یہ سب کارروائی بڑی ناگواری سے برداشت کی تھی "یہ تو جرم ہے یار، کار چھیننا۔"
میں نے کہا "مجبوری آدمی سے بہت کچھ کراتی ہے۔"
شیلی نے مجھے دیکھا "بے چارہ، کیسے پیدل آیا ہے۔ کیا گاڑی چھینے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا؟ یا اس سے درخواست کرتے۔"
"بعد میں وہ نشاندہی کرتا کہ انہیں میں نے یہاں ڈراپ کیا تھا اور تفتیش کا چکر شروع ہو جاتا۔ ڈاکٹر مس شیلا خان عرف غزالہ، سنگل! ابھی اپنے خوب صورت لب بند رکھو! البتہ لبوں سے صرف مسکرا کے بجلی گرانے کا کام لو تو بہتر ہے۔"
"صاف کیوں نہیں کہتے یار کہ شٹ اپ۔"
"ہاں کہ شٹ اپ۔ ہم باہر انتظار کرتے ہیں، تم ہوٹل سے اپنا سامان اٹھاؤ اور چیک آؤٹ کرو" میں نے کہا "ورنہ بعد میں کار والے اور پریشان کرنے والے یا قتل کرنے والے سیدھے یہاں پہنچ جائیں گے۔"
"اور تیسرے راستے سے ہم کہاں جائیں گے؟" غالب نے کہا "جہاں خاتون محفوظ رہیں، جملہ آفات ارضی سے۔"
میں نے کہا "چراغ تلے جہاں اندھیرا ہوتا ہے۔"
"کیا مطلب؟ یہ کسی بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑی رہیں گی۔"
میں نے کہا "ہم نے نقوی صاحب سے جھوٹ بولا تھا کہ یہ ابھی سیڈر ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔ انہوں نے سچ مانا اور یہاں سے نکل کے ہم وہیں جائیں گے۔ نقوی صاحب وہاں پہنچے تو معلوم کریں گے کہ اس نام کی خاتون یہاں مقیم ہیں تو کہا جائے گا۔ وہ اب لابی میں ملے گی۔ بعد میں پولیس تفتیش کرے گی تو نقوی صاحب بتائیں گے کہ وہ ابھی سیڈر ہوٹل میں بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن ہم وہیں ہوں گے۔ ہم سے میری مراد ہے ڈاکٹر شیلا خان جو کسی اور نام سے رجسٹریشن کرائیں گی۔"
اس کے بعد شیلی نے بھی کوئی سوال نہیں کیا۔ ہم قلعہ پہنچے تو سورج طلوع ہو گیا تھا۔ ہم نے کار کو بہت سی دوسری کاروں کے درمیان پارک کیا اور شیلی کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ الگ کھڑی ہوئی گاڑی زیادہ نمایاں ہوتی اور بہت سے لوگ ہماری صورت بھی ملاحظہ کرتے۔
"کیا تم واقعی لندن چلے جاؤ گے؟" غالب نے کہا۔
"کیا بہتر ہے۔"
"شیلی کے ساتھ بہتر نہیں ہے۔ رابعہ پہلے ہی بدگمان ہے، وہ تم سے نفرت کرنے لگے گی۔"
"کیا تم اسے سمجھا نہیں سکتے؟" میں نے کہا۔
"محبت کے پاگل پن میں عقل کے دلائل سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"
"اس وقت ہر صورت میں میرا روپوش ہو جانا ہی میرے مسائل کا حل ہے۔ جب تک نقوی صاحب اپنا وعدہ نہیں نبھاتے، میرے خلاف مقدمات ختم نہیں ہوتے یا کمزور نہیں پڑتے، میں سامنے کیسے آ سکتا ہوں۔"
"روپوشی کے لیے لندن جانا ضروری ہے؟"
"پھر کہاں جاؤں؟ ہمالیہ کی ترائی میں جہاں ارم خود میر سجے یا افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں یا پھر برفانی خطے میں۔ بلا وجہ نیل کے ساحل سے لے کے ذیب خاک کا سفر پھروں۔ اس کے باوجود کیا تم رابعہ کو یقین دلا دو گے کہ میں شیلی کے ساتھ لندن میں نہیں ہوں؟ یا جہاں بھی ہوں، وہ میرے ساتھ نہیں ہے اور میں اس کے ساتھ نہیں ہوں؟ آخر وہ بھی تو غائب ہو گئی، بدگمانی پہلے سے ہے۔"
"تمہیں یقین ہے کہ نقوی صاحب اپنے وعدے پر قائم رہیں گے؟"
"اس کا اندازہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے پولیس سے وہی کہا جو ہم چاہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا جھوٹ چلا نہیں مگر انہوں نے اپنے جھوٹ کو تسلیم ہی نہیں کیا اور یہ نہیں مانا کہ مہمان سکندر بخت، غالب اور ڈاکٹر شیلی ان کے گھر میں تھے۔ اگر رفیق کے قتل کی تفتیش نہیں ہوئی اور خبر عام نہیں ہوئی تو سمجھ لو کہ نقوی صاحب نے معاملے کو دبا دیا۔ ایس ایچ او پر تو انہوں نے واضح کر دیا تھا کہ وہ اسے قصوروار نہیں سمجھتے۔ مجسٹریٹ کو بھی وہ مطمئن کر دیں گے اور وہ رپورٹ دے گا کہ کہیں کچھ نہیں ہوا۔ نہ کوئی قتل ہوا، نہ کوئی گاڑی لی۔ نقوی صاحب کے گھر میں سب سکون سے سو رہے تھے۔ گارڈ ڈیوٹی پر موجود تھا۔ اندر پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ ہم اس کارروائی سے ہمیں ایک اضافی فائدہ ہو گا۔ نقوی صاحب اپنی بے عزتی پر برافروختہ ہیں۔ وہ معلوم کریں گے کہ ان کے گھر چھاپا

پڑوانے کا بندوبست کس نے کیا تھا اور دانستہ رازداری سے ان کے خلاف سازش کس نے کی تھی۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ کوئی ایس پی یا مجسٹریٹ فون پر ان سے دریافت کر لیتا کہ سر ہم نے کچھ ایسا سنا ہے۔ خدانخواستہ آپ کے گھر میں کوئی سانحہ ہو گیا ہے تو ہمیں کھڑی ہوئی ہے جس میں ایک لاش ہے اور نقوی صاحب کہہ دیتے کہ راٹ نان سنس۔ کیا تم نشے میں ہو؟ یہاں صرف میری گاڑی کھڑی ہے۔ بات ختم ہو جاتی۔ مگر ان کے کسی برابر کے حریف نے انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کی اور قربانی کا بکرا مجسٹریٹ کو بنا لیا۔ اب نقوی صاحب سازش کرنے والوں کو معاف نہیں کریں گے۔ ایک ایک کا پتا چلا لیں گے اور میرا خیال ہے کہ ابتدا ہو گی چوہدری دلاور کے نام سے۔"
"آپ کے منہ میں گھی شکر۔ کاش ایسا ہو۔"
"ایسا ہو گا۔ نقوی صاحب خاموش کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ اتنی بڑی توپ ہیں وہ۔ توپ کا رخ جس کی طرف ہو گیا وہ مارا گیا۔"
"میں پھر وہیں آتا ہوں۔ شیلی کے ساتھ لندن مت جاؤ۔ تم یہاں بھی روپوش رہ سکتے ہو۔" غالب نے کہا "رابعہ کی بدگمانی دور ہو جائے گی کہ شیلی تو گئی۔ وہ جو سمجھتے تھے وہ اپنے دل دو کان اپنی بیچ آئے، لیکن اپنا پیار یہیں ہے۔ تم بھی کبھی کبھار اس کے حضور میں حاضری لگوانے جا سکتے ہو۔"
"دیکھو یار، بات تیری معقول ہے، درست۔ مگر میں عورت ذات کے جذبات کی انتہا سے ڈرتا ہوں۔ انتہائی محبت کرنے والی اگر اچانک نفرت کرنے لگے خواہ نفرت کی وجہ کوئی نہ ہو۔ تو اس میں بھی انتہا ہو گی۔ کہیں وہ خود نہ چھوڑ دے مجھے۔ عورت کی نفسیات میں ایک کجی یہ ہے کہ وہ کسی کو حاصل نہ کر سکے تو پھر یہ بھی برداشت نہیں کرتی کہ کوئی اور اس کے محبوب کا ہو جائے۔ تم میرے نہیں تو کسی کے بھی نہیں۔ بس اللہ کو پیارے ہو جاؤ۔ اس فارمولے سے ڈر لگتا ہے۔"
"رابعہ پاگل نہیں ہے۔"
"فی زمانہ وہ ہم سب سے زیادہ پاگل ہے۔ تم سمجھو اس کا رویہ اور ردعمل۔ اسے سمجھاؤ۔ قائل کرو کہ سکندر سے بڑا عاشق نہ مجنوں تھا نہ فرہاد۔ اس کی برین واشنگ کرتے رہو، یہاں تک کہ بدگمانی اور نفرت کا سارا زہر نکل جائے۔ پھر مجھے مطلع کرنا۔ میں سیدھا گھوڑے پر سوار، قاضی کو پیچھے بٹھا کے بگٹٹ دوڑاتا ہوا آ جاؤں گا۔ تم اور محسن گواہ بن کے موجود رہنا۔ جسٹ منگنی کے بغیر بینڈ باجہ، تکلفات ہوائی براتی بھی نہ ہوں اور لطافت منٹ دو دو رخصتی۔ پانچ سات سال میں منظر کو فلسفے، غائب ایک بہن بیٹا چلتا ہے بھی سیدھا دست۔"
غالب نے ہنستے ہوئے کہا "محسن کہتا ہے لندن میں تمہارے رشتے دار موجود ہیں۔ ہیں؟ ایک بھی نہیں۔"
"بکواس کرتا ہے وہ۔ سوال کا حساب تو میرے پاس ہے۔ دراصل یہ اینگلو انڈین نسل انگریز چند روز حکومت میں چھوڑ گئے تھے۔ ہم جوابی انتقامی کارروائی میں مصروف تھے۔ بڑے بڑے لارڈز اور عالی نسب، مغرور اور متعصب انگریزوں سے بدلہ لینا ایک قومی فریضہ تھا۔ ہماری اس تحریک میں انڈین اور پاکستانی بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔"
"تحریک ہی ایسی تھی۔ تحریک، حرامی پن۔ تم کو شرم نہیں آئی؟"
"اب آتی ہے یار۔ بس جوانی دیوانی کا قصور تھا۔"
شیلی کو دیکھ کے میں نے ہاتھ ہلایا اور وہ سیدھی کار کی طرف آئی۔ رات بھر جاگنے سے اور خوف کے باعث اس کا برا حال تھا۔ غالب نے آگے جا کے اس کا سوٹ کیس لے لیا۔ ہوٹل کا ایک بوڑھا لا رہا تھا۔ وہ بخشش لے کر واپس ہو گیا۔ میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہماری مسروقہ کار دیکھے۔
ابھی سیڈر ہوٹل پر میں شیلی کے ساتھ اتر گیا۔ "اب تم گاڑی کہیں چھوڑ کے اس بے چارے کو فون کر دو۔ پھر ٹیکسی لے کر سیدھے گھر جاؤ اور میرے جملہ لواحقین کو تسلی دو کہ صبح کا بھولا شام کو گھر آنے کا وعدہ کر چکا ہے۔"
غالب نے کہا "تم شرفا کے اس ہوٹل میں قیام فرماؤ گے، اس حلیے میں؟"
"حلیہ بدلنے سے کوئی شریف زادی نہیں ہو جاتا۔ میں خود اپنی شرافت کی سند ہوں" میں نے کہا۔
کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے بے حد شائستہ اور صاف ستھرے کپڑوں والے کلرک نے ہم دونوں کو دیکھ کے سر جھکایا مگر خاموشی سے رجسٹر سامنے کر دیا۔ میں نے اپنا اور شیلا کا نام "مسٹر اینڈ مسز جی ٹی مین والا" لکھا اور پتا کراچی کا۔ ظاہر ہے شیلی کو نہ کچھ معلوم ہوا نہ اسے اعتراض ہو سکتا تھا۔
میں نے بے حد غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ ملک اب جنگل ہوتا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے اب یہاں نہیں رہنا چاہیے۔"
کلرک نے رجسٹر پر ایک نظر ڈال کے کہا "کس قسم کا روم پسند کریں گے آپ؟"
میں نے فرنچ میں شیلی سے کہا "رجسٹر میں نے خود کو اور تمہیں میاں بیوی لکھا ہے۔ ظاہر ہے ہم لوگ الگ الگ کمروں میں نہیں رہ سکتے۔ دوسری بات یہ کہ میری جیب میں تو پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ اسے ایڈوانس دے دو۔ ایک ہزار کے قریب۔"
"میرے پاس ٹریولر چیک ہیں۔"
"امریکن ایکسپریس کے چیک چلتے ہیں؟" میں نے کہا اور کلرک سے مخاطب ہو گیا "ہمارے پاس نقد رقم نہیں ہے۔ فی الحال امریکن ایکسپریس ٹریولر چیک ہیں۔"
"نو پرابلم سر۔" کلرک ہماری فرنچ سے سخت متاثر ہوا تھا اور

www.paksociety.com

میرا گرد و غبار سے اٹا ہوا لباس اور مشکوک تر حلیہ اس کے لیے غیر اہم ہو گیا تھا۔

"ہم آئے تھے شکار کے لیے، خود شکار ہو گئے۔ بدمعاشوں نے ہماری گاڑی بھی چھین لی۔" میں نے خفگی سے کہا "بڑی مشکل سے یہ ایک سوٹ کیس دیا جس میں کپڑے تھے۔ زیور، چیک اور کے لیے بے کار تھے اس لیے بچ گئے۔"

"آئی ایم سوری سر، کیا آپ نے رپورٹ کی پولیس کو؟"

"ہاں۔ کی ہے مگر اس سے کیا ہوگا؟" میں نے مایوس لہجے میں کہا "ہم نے رات کو دس میل پیدل سفر کیا جنگل میں۔ کچھ لفٹ لے کر یہاں پہنچے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں نو وزیٹرز نو فون کالز۔ "No

VISITORS- NO PHONE CALLS

شیلی نے کہا "کمرا پچھلی طرف اور پرسکون ہو۔ اوپر جہاں سے شہر نظر آئے مشرق کی طرف۔"

کلرک مزید متاثر ہوا اور اس نے ایک پورٹر کو بلا کے ہمارے ساتھ کر دیا جس نے شیلی کا سوٹ کیس اور بیگ اٹھا لیا۔ جب وہ ٹپ اور ناشتے کا آرڈر لے کر چلا گیا تو میں نے بیڈ پر گر کے کہا "اُف۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ بھوک اور نیند سے میرا برا حال ہے۔"

"تم تو عادی ہو" شیلا صوفے پر بیٹھ گئی "یہ میرے لیے تو بہت اعصاب شکن تجربہ تھا۔"

ناشتا کرتے ہی میں پڑ کے سویا تو شام کی خبر لی۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں لائٹس آن تھیں۔ شیلی مشرق کے رخ کھلنے والی کھڑکی سے شہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ میں نے پیچھے سے جا کے "ہیلو" کہا تو وہ اچھل پڑی۔

"تم نے تو ڈرا دیا مجھے یار، دیکھو میرا دل کیسے دھڑک رہا ہے۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا۔

میں نے ہاتھ اس کے دل پر رکھنے کے بجائے نرمی سے چھڑا لیا "دل کا تو کام ہی دھڑکنا ہے ڈاکٹر شیلی۔ تم سوئی نہیں؟"

"ابھی اٹھی تھی کچھ دیر پہلے یار۔ سوچا چائے پی لوں۔ پھر سوچا تمہیں اٹھاؤں۔ پھر سوچا کہ انتظار کروں" وہ ہنس پڑی۔

"مسٹر رستم جی مین والا! تم نے تو نادر موسی کے کپڑے بدل لیے تھے۔ میں ابھی تک بھوت بنا ہوا ہوں۔ اس طرح میرا باہر جانا بھی ممکن نہیں۔ تم ایسا کرو کہ غالب کو فون کرو" میں نے کہا "اچھا چھوڑو۔ ایسا نہ ہو اس کے پیچھے چھپے کوئی یہاں بھی پہنچ جائے۔"

"میں بازار سے کپڑے لے آتی ہوں" اس نے مجھے نظروں سے ناپ کے میرے سائز کا اندازہ کیا۔

"یہاں ہوٹل سے کار لو۔ ان کے اپنے آدمی قابل اعتبار ہوتے ہیں۔ انار کلی میں یا مال پر بہت سی دکانیں ہیں۔ کسی بھی بڑے اسٹور میں چلی جاؤ۔ وہ ٹریولر چیک لے لیں گے۔"

"یار مجھے شیخ صاحب کو کال بھی کرنی ہے۔۔۔ لندن۔"

"وہ کیوں؟"

"انہیں بتا دوں کہ اب میں یہاں ہوں۔ وہ پریشان نہ ہوں۔"

"انہیں بتا دینا کہ آئندہ تم خود انہیں فون کرو گی۔ وہ زحمت نہ کریں۔ انہیں سمجھا دینا کہ رفیق لاپتا ہے اور ان حالات میں تم خود کو غیر محفوظ محسوس کرتی ہو اس لیے ایک ہی ہوٹل میں زیادہ عرصہ قیام کرنا ممکن نہیں۔"

"یار تمہارے بارے میں۔۔۔ کیا کہوں؟"

"کچھ نہیں۔ کسی کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔ جیسے ابھی تک نہ تم کسی سے ملی ہو نہ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس کا ذکر کیا جائے۔ ہاں یہ کہہ دینا کہ تمہارا ارادہ واپس لندن آنے کا ہے۔"

"اگر وہ پوچھیں گے نہیں کہ کیوں؟"

"کہہ دینا کہ رفیق کے لاپتا ہو جانے کے بعد تم کو شبہ ہے کہ کچھ لوگ تمہارا تعاقب کرتے ہیں۔ اسی لیے تم نے ہوٹل بدل لیا ہے اور شاید پھر بدلو۔ زیادہ خطرہ محسوس ہوا تو تم یہاں نہیں رہو گی۔۔۔ رائٹ؟"

"رائٹ۔ اگر تم کہتے ہو" وہ مسکرائی۔

میں نے فون اٹھا کے روم سروس کو کافی کے لیے کہا اور شیلی کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ میں نے اسے اندازے سے بتایا کہ ادھر پہلے خاص رضوی کا گھر تھا۔ ماڈل ٹاؤن کا وہ گھر کہاں ہے جہاں ہم گزشتہ رات تھے۔ شاہی مسجد کے مینار نظر آ رہے تھے۔ مقبرۂ جہانگیر کے بھی تین مینار دیکھے جا سکتے تھے۔

"یہ ایک عجیب بات ہے۔ جہانگیر کے مقبرے کے کسی بھی مینار پر چڑھ کے دیکھو بادشاہی مسجد کے تین مینار نظر آئیں گے اور بادشاہی مسجد کے ہر مینار سے مقبرے کے تین۔"

"واقعی؟ تم نے دیکھا ہے یار؟" شیلی نے بے حد حیرانی سے کہا۔

"نہیں۔ ہر مینار پر چڑھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ ویسے بھی میں نے جب بھی دیکھا ایک ہی مینار پر جانے والا راستہ کھلا دیکھا۔ باقی تین بند تھے۔"

"اور اس مینار سے۔۔۔"

"وہاں سے تو تین ہی نظر آئے مجھے۔ یہ بات بہت مشہور ہے۔ ایسا کوئی شخص آج تک ملا نہیں جو کہے کہ میں نے یہ تجربہ کیا ہے۔ مقبرۂ جہانگیر کے چاروں اور بادشاہی مسجد کے چاروں میناروں پر چڑھ کے۔ ہو سکتا ہے یہ روایت ہو۔"

"کیا روایات غلط ہوتی ہیں یار؟"

"روایات۔ بس روایات ہوتی ہیں۔ یہ بھی سنا تھا کہ قلعۂ لاہور سے شالیمار باغ تک زیر زمین راستے ہیں۔ بیشتر لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔"

"یار تم میرے ساتھ ایک اچھے ٹورسٹ گائیڈ بن کے چلو۔ میں سب دیکھنا چاہتی ہوں۔ پاکستان ایک اجنبی وطن ہے میرے لیے۔ اس کا گوشہ گوشہ مجھے بلاتا ہے۔"

"شامت اعمال آپ کو بلاتی ہے میڈم۔ گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے" میں نے کہا۔

"تم مجھے گیدڑ کہہ رہے ہو۔ میں بزدل نہیں ہوں یار۔"

"تم یہاں ٹورسٹ نہیں ہو۔ اپنے مقصد کو مت بھولو اور یہ بھی کہ نہ میں ٹورسٹ گائیڈ ہوں۔ نہ یہ ساتھ مستقل ہے۔ حالات کی مجبوری نے ہمیں ایسے ہی یکجا کر دیا ہے جیسے بارش سے پناہ لینے کے لیے دو اجنبی ایک ہی درخت کے نیچے کھڑے ہوں۔"

اس کا چہرہ ایک دم بجھ گیا "ہم اچھے دوست بھی نہیں ہو سکتے؟"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تو تمہیں جانتا تک نہیں۔ جو تم نے کہا وہ میں نے FASE VALUE پر مان لیا۔ تصدیق کے بغیر۔ میں نے زندگی میں بہت فریب کھائے ہیں اس لیے انسانیت پر اعتماد کے باوجود انسانوں پر اعتبار مشکل سے کرتا ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر وہ سب سچ ہوا جو تم نے مجھے اپنے بارے میں بتایا ہے۔"

"اور جھوٹ ہوا تو۔۔۔؟" وہ خلا میں دیکھنے لگی۔

"تو میں رعایت دیے بغیر تمہیں جان سے بھی مار سکتا ہوں۔"

"تم۔۔۔ بڑے بے رحم ہو یار۔" اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

"میں کیا کروں۔ دنیا بڑی بے رحم ہے۔"

دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے دروازہ کھولا تو ویٹر نے اندر آ کے کافی رکھی۔ واپس جانے سے پہلے اس نے ایک نظر شیلی کو اور پھر مجھے دیکھا۔ اس ایک لمحے میں مجھے اس کی آنکھوں میں الجھن اور تذبذب کی جھلک نظر آئی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا مگر وہ پلٹ چکا تھا۔ میں شیلی پر اپنے شک کا اظہار کر کے اسے خوف زدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"ویٹر!" میں نے کہا۔

وہ رک گیا اور واپس آیا "یس سر۔"

"میڈم کو شاپنگ کے لیے جانا ہے۔ یہاں رینٹ اے کار سروس ہے؟"

"ہے سر۔ آپ نمبر کو بتا دیں" اس نے پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھا۔

میں نے یاد کرنے کی کوشش کی مگر مجھے اس کے چہرے یا آواز میں شناسائی کی رمق تک محسوس نہ ہوئی "او کے۔ تم جاؤ۔"

شیلی کے جاتے ہی میں نے دوبارہ کافی منگوائی لیکن اس بار کافی لانے والا ویٹر دوسرا تھا۔

میں نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے کافی کون لایا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم سر۔ اس روم سروس کے لیے تو میں ہوں۔"

میں نے کہا "کیا کوئی اور نہیں آ سکتا؟ فرض کرو تم نہ ملو۔ مصروف ہو۔"

"یہ دس کمرے میرے ہیں سر۔ اس فلور پر۔ میں کہاں جا سکتا ہوں۔ چند منٹ تو لگ جاتے ہیں۔ اور کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔۔۔"

میں نے کہا "اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہاں تمہاری ڈیوٹی ہے؟"

وہ گھبرا گیا "آپ منیجر کو فون کر سکتے ہیں سر۔ یہ میرا نمبر ہے۔ میرا نام ہے مراد خان۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے، تم جاؤ۔"

اس کے باہر نکلتے ہی میں نے چند منٹ توقف کیا پھر دروازہ کھول کے راہداری میں دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کے آپریٹر سے کہا کہ منیجر سے بات کرائے۔

"میں رستم جی مین والا بول رہا ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے چیک ان کیا ہے میں نے" میں نے انگریزی میں کہا۔

"یس سر، اینڈ واٹ کین آئی ڈو فار یو۔ (میرے لیے کوئی خدمت؟)"

"اس کمرے میں ویٹر کون ہے؟ روم سروس کے لیے۔"

"کیا بات ہے سر؟ کوئی شکایت؟"

"کچھ نہیں۔ اس کا نام۔ نمبر اور حلیہ۔۔۔"

"نام ہے شاہ دین۔ نمبر نوسیون۔ لمبا قد ہے۔ ایبٹ آباد کی طرف کا رہنے والا ہے۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور کافی کو گھورنے لگا۔ یہ کافی لانے والا ویٹر پستہ قد، فربہی مائل اور گورا تھا۔ اس کا نمبر بھی غلط تھا۔ وہ اٹھانویں نمبر تھا۔ اچانک تحفظ اور سکون کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ مجھے شک نہیں، یقین تھا کہ کافی میں زہر ہوگا یا خواب آور دوا ہوگی مگر ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ میں اس کافی کا تجزیہ کسی لیبارٹری سے کرا سکتا یا یہ کافی کسی اور کو پلا کے اپنے شکوک رفع کر سکتا۔ جرائم کی کہانیوں میں تو عموماً کتے بلی کو زہر آلود چیز کھلا کے مار دیا جاتا ہے اور ہیرو صاف بچ جاتا ہے مگر یہاں کتے بلی ہوتے تب بھی کافی شاید نہ پیتے۔ میں کسی اور کو مثلاً خود منیجر کو دعوت دیتا تو غیر ارادی قتل کا مرتکب ٹھہرتا اور لمبے چکر میں پڑ جاتا۔ صورت حال کی سنگینی واضح ہو کے سامنے آنے لگی تھی۔ شیلی کے یا میرے تعاقب میں کوئی دشمن کے اندر پہنچ چکا تھا۔ شاید اب اس کا سراغ لگانا مشکل ہو جائے۔ وہ اپنا کام کر کے نکل جائے گا اور جس نے بھی اسے بھیجا تھا اسے رپورٹ دے گا کہ وہ کام نہیں رہا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون کی طرف یوں دیکھا جیسے اس خطرناک آلے سے سوائے اس شخص کے کسی کی آواز نہیں نکلے گی جس کا خیال میرے ذہن میں خطرے کا احساس پیدا کر رہا تھا۔ میں نے واضح ہدایت دی تھی کہ مجھے کوئی بھی فون کرے میرا نمبر نہ ملایا جائے۔ میں نے اس خیال سے ریسیور اٹھا لیا کہ شاید میرا خوف بے بنیاد ہو اور منیجر مجھ سے مزید وضاحت چاہتا ہو کہ۔۔۔

کے بارے میں کیوں پوچھ رہا تھا۔

ویٹر نے کہا "سوری سر۔ آپ کی یہ بات مجھے معلوم نہیں لیکن روم سروس ختم کا ہے۔"

"ہو رکے۔ میں بات کروں گا۔"

شیلی نے کہا "ر حتم! میں نے لندن کال کی تھی۔"

"کیوں۔ پریشانی کی کیا بات ہے....؟"

"یار وہ..." شیلی نے اپنی بات فرنچ میں کی "اس پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ اس کی بیوی مر گئی۔ وہ اسپتال میں ہے۔ کیا میں۔ بالکل بے ہوش....."

اسی وقت میری نظر دروازے کی طرف گئی۔ کسی نے ایک لفافہ نیچے سے سرکا دیا تھا۔

شیلی کو جواب دیے بغیر میں نے ریسیور کو تہ سے نیچے رکھا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اونچی آواز میں بولتا رہا جس سے یہ ظاہر ہو کہ میں نے لفافہ نہیں دیکھا اور میں بدستور کسی سے فون پر گفتگو میں مصروف ہوں۔

اگرچہ مجھے بہت کم امید تھی کہ لفافے کو نیچے پُراسرار انداز میں کھسکانے والا دروازے پر کھڑا ملے گا مگر ایک مبہم سا خیال تھا کہ شاید وہ اپنا کام کر کے راہداری میں کہیں جا نہ دکھائی دے تو میں اسے جا لوں۔ اس قسم کے دھندے عموماً روم سروس کے وہ ویٹر کر سکتے ہیں جن کو معقول معاوضہ مل جائے لیکن پکڑے جانے کا خطرہ بالکل نہ ہو۔ وہ خود سامنے نہیں آتے اور انہیں یہ فکر بھی نہیں ہوتی کہ لفافے میں کیا ہو گا۔ لفافوں میں صرف پیغام ہوتے ہیں۔ محبت کے یا نفرت کے۔ کوئی کسی سے کچھ کہنا چاہتا ہو مگر روبرو کہنے کی ہمت نہ رکھتا ہو یا کوئی فون پر اس کی صدا اور محبت کے بغیر ہی ریسیور رکھ دیتا ہو تو پھر آخری طریقہ کسی گمنام نامہ بر کے ذریعے فسانۂ دل بقلم خود تحریر کر کے ارسال کرنے کا رہ جاتا ہے۔ یہ سب ایسا وہ کرتا ہے جو کسی کو بلیک میل کرنا چاہتا ہو یا دھمکی دینا چاہتا ہو۔

ایسے بڑے سب ہوٹلوں کے ویٹر ہوتا ہے سب روز تماشا میرے آگے کی تفسیر ہوتے ہیں۔ ہر وقت ہر قسم کے مسافر آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے کیا لکھتے ہیں اور کیا کہلواتے ہیں اس کا خاموش مشاہدہ یہ بڑائی کھلی آنکھوں سے اور کھلے کانوں سے کرتے ہیں مگر وہ قطعی بے ضرر معصوم اور لاتعلق نظر آتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ کوئی انہیں بالکل اہمیت نہیں دیتا اور ایسا نہیں سوچتا کہ وہ دوست کے نامہ بر ہو سکتے ہیں تو دشمن کے زر خرید کیوں نہیں ہو سکتے۔

دائیں طرف کاریڈور کے آخر میں کوئی ویٹر ہاتھ پر چائے کی ٹرے لیے جا رہا تھا۔ بائیں طرف کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ چند سیکنڈ میں وہ بڑائی وہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ جب تک کہ وہ لفافہ نیچے سے اندر ڈالنے ہی دروازے تک آ ۔ چائے کے برتنوں کی ٹرے کے ساتھ یہ مشکل کام تھا اور اس کے بعد وہ اتنے سکون سے چل بھی نہیں سکتا تھا۔

میں نے اسے سیٹی بجا کے متوجہ کیا اور انگلی کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ اطمینان سے مڑا اور میرے قریب آ کے بولا "یس سر؟"

میں نے کہا "یہ چائے کس نے منگوائی تھی؟"

اس نے حیران ہوتے ہوئے بغیر اشارے سے کہا "چار سو تیس میں سر۔"

"اچھا۔ دراصل میں نے کچھ دیر پہلے ایسے ہی کسی ویٹر سے کہا تھا کہ مجھے کافی چاہیے.... ابھی تک کوئی لے کر نہیں آیا۔"

"آپ روم سروس کو فون کر دیجیے سر۔"

"وہ.... اس وقت فون پتا نہیں کیوں کام نہیں کر رہا تھا۔ خیر.... تم جاؤ" میں نے کہا اور اندر آ کے دروازہ بند کر لیا۔

تقریباً بیس سیکنڈ کے بعد میں نے پھر باہر آ کے دیکھا تو ویٹر اسی بے نیازی کے انداز میں جا رہا تھا۔ اس کی خود اعتمادی کا یہ سکون مجھے مصنوعی نہیں لگا۔ اگر وہ مجرم ہوتا تو اس کی صورت چغلی کھاتی۔ وہ مجھے دیکھ کے زرد ہوتا اور بعد میں پیچھے پلٹ کے ضرور دیکھتا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں یا نہیں۔ وہ عام ویٹر تھا کوئی پیشہ ور مجرم یا اداکار نہیں تھا۔ میری بات میں بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے وہ مجھے مشکوک سمجھتا۔

اب میں نے سامنے والے دو کمروں کے دروازوں کو دیکھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اندر کسی بھیجنے والے کے سوراغ سے کوئی میری پریشانی کا نظارہ کر رہا ہو اور لطف لے رہا ہو۔ اپنی چالاکی پر اور میری سراغ رسانی بننے کی ناکام کوشش پر۔ لفافہ ارسال کرنے والا دائیں اور بائیں جانب کے کسی کمرے میں بھی ہو سکتا تھا۔ ان کے بارے میں معلومات بعد میں حاصل کی جا سکتی تھیں۔

میں نے دروازہ بند کر کے پھر ریسیور میں کہا "شیلی!"

لیکن دوسری طرف سے شیلی کی آواز سنائی نہ دی۔ وہ یقیناً پریشان ہوئی ہو گی کہ باتیں کرتے کرتے میں کہاں غائب ہو گیا۔ لائن کٹی بھی نہیں تھی اور میں نے اسے ہولڈ کرنے کے لیے بھی نہیں کہا تھا۔ لیکن یہ وہ کچھ دیر ہیلو ہیلو کرتی رہی ہو اور اس نے دوبارہ نمبر ملایا ہو لیکن ریسیور تو دور رکھا ہوا تھا "لائن کیسے مل سکتی تھی۔

میں نے مایوسی سے ریسیور کریڈل پر رکھا۔ میں نے تو اس سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں سے بات کر رہی ہے۔ کسی پبلک کال آفس سے یا کسی دکان سے۔

گھنٹی پھر بجی تو میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا "شیلی!"

جواب میں کوئی انتہائی بے ہودہ طریقے پر ہنسا "شیلی نہیں۔ کہو شیلی میری جان۔ کہاں ہو تم۔ تمہارے بغیر میں یہاں تڑپ رہا ہوں۔"

"شٹ اپ۔ کون ہو تم؟" میں نے کہا۔

"نام زلمت بچا۔ سب چاؤل پیارے" اس نے میرا تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا "صرف نام سے کیا ہو گا۔ بات کرو گے شیلی سے۔"

ایک لمحے کے لیے میرا ذہن خوف سے مفلوج سا ہو گیا۔ کیا کسی نے شیلی کو اغوا کر لیا ہے مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ ابھی چند منٹ پہلے تو وہ مجھ سے بات کر رہی تھی اور اس کی کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی کی قید میں ہے یا جبر کے تحت بات کر رہی ہے۔ لیکن کچھ ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ چند سیکنڈ پہلے بستہ لے کر گھر سے نکلنے والا اور حصول علم کی طلب میں مکتب کی جانب قدم بڑھانے والا بچہ اچانک کسی تیز رفتار بس یا ٹرک کے نیچے آ کے دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ مستقبل کا معمار پلک جھپکنے میں داستانِ ماضی ہو جاتا ہے۔ آنکھوں میں خواب بسائے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کسی کے نام سے تحفہ وصول کرنے والی لڑکی کو پارسل بم کے دھماکے پر حیران یا زخمی ہونے کی مہلت تک نہیں ملتی۔ ہنی مون کے لیے مری یا نتھیا گلی جانے والے نئے شادی شدہ جوڑے کے ہونٹوں پر محبت کے غرور سے مسکراہٹ اور آنکھوں میں بسے ہوئے جنت کے نظارے بس کے کھڈ میں گرتے ہی جہنم کے شعلوں میں خاکستر ہو جاتے ہیں۔

کیا پتا اس آخری جملے کے بعد جو شیلی نے مجھے مخاطب کر کے کہا تھا کسی نے....

"بڑا دھکا لگا ہے دل کو پیارے۔ گنگ ہو گئی زبان...." اس شخص نے مجھے اپنے لہجے کی حقارت آمیز کاٹ سے چونکا دیا۔

صاف ظاہر تھا کہ وہ آواز بنا کے بول رہا ہے۔ ریڈیو ڈرامے کے کردار کی طرح جسے صرف آواز سے اپنی بد باطنی کا اظہار کرنا ہو۔ وہ اپنے طرزِ تخاطب سے میرے دل میں نفرت اور اشتعال کے جذبات پیدا کرنے میں کامیاب تھا۔

"میں نے پوچھا تھا کہ تم کون ہو؟" میں نے سنبھل کے سخت لہجے میں کہا۔

"یہ بھی جان لو گے کسی دن۔ اور ہم کیا کہیں جب تم جانتے بوجھتے انجان بن رہے ہو۔ سچ کہو کیا تم جانتے نہیں ہمیں پیارے۔"

"پیارے کی اولاد۔ شیلی سے کیا تعلق ہے تمہارا؟"

"شیلی سے.. تمہارا کیا تعلق ہے پیارے؟" وہ پھر ہنسا "تم کو کے کہو کچھ نہیں۔ تو ہم بھی کہیں گے کہ کچھ نہیں۔ بس اچھی چیز ہے۔ دلا تی مال ہے۔"

میں نے دہاڑ کے کہا "بکواس بند کرو اپنی۔ کیا تم نے شیلی کو اغوا کر لیا ہے؟"

"اغوا! اجی توبہ توبہ۔ ایسا کام ہم نہیں کرتے پیارے۔ ہم تو بس بجے دھماکے سے باجے بجاتے ہیں اور پھر چلے آتے ہیں سرکار۔

بند سے کیا سمجھے؟" اس نے مکروہ طریقے پر ہنس کے کہا۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ لہجہ اور یہ آواز بنانے والا کون ہو سکتا ہے مگر میرے ذہن میں کوئی صورت واضح نہیں ہو رہی تھی۔ میرے تصور میں ایک بدصورت اور بدکردار چہرہ تھا جس کے قرب سے گھن اور کراہیت کا احساس جاگتا ہو۔

"تم جھوٹ بکتے ہو۔" میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے اندھیرے میں تیر چلا دیا "شیلی تمہارے پاس کیسے ہو سکتی ہے؟"

"کل رات تو وہ تمہارے پاس تھی پیارے۔ کیا ہم نے کوئی اعتراض کیا تھا؟ اور کیا ہے کہ.... آج تم کل ہماری باری ہے۔ کیا سمجھے؟"

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ شخص مجھے مشتعل کر کے لطف اندوز ہو رہا ہے اور یہ میری بے وقوفی ہے کہ میں اس کے بہکنے سے مشتعل ہو رہا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ چیخ چلا کے یا جواب میں گالیاں دے کے میں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ ابھی تو اس کا جھوٹ سچ بھی ثابت نہیں ہوا۔

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے قدرے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"چاہتے ہیں خوبرو لوں کو اسد۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اب اتنا تو سمجھو پیارے کہ یہی اپنا نام بھی ہے۔ اسد۔ کیا سمجھے؟"

"سب سمجھ گیا۔ تم جو بھی ہو بہت اچھے صداکار ہو۔ میں تمہیں نہیں پہچان سکا" میں نے کہا "دوستوں کی بات الگ ہے۔ کسی بازاری دشمن سے پہلی بار واسطہ پڑا ہے۔ چلو میری بات کراؤ شیلی سے۔"

"رات بھر کیا باتیں کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی کہ اتنے بے تاب ہو رہے ہو۔" وہ ہنسا "اجی اس کی باتوں میں پھولوں کی خوشبو اور کیوں نہ ہو اس رنگ روپ اور جوانی کی خوشبو ہی تو دیوانہ کرتی ہے آدمی کو۔ ہم ہوتے تو ہم ہوتے کہ میر ہوتے...."

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم نے دل لگی کی ہے میرے ساتھ۔ شیلی نے ابھی فون کیا تھا مجھے۔"

"یہ بھی سچ ہے۔ ایسا ہوتا ہے پیارے کہ شکار خود کھنچا چلا آتا ہے جال کی طرف۔ کیا سمجھے؟ ہم نے بھی کہا کہ چلو فون کے بہانے ہی سہی۔ وہ ذہین گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔ کیا سمجھے۔ ہم نے تو سمجھا کہ حضور آئے اپنی مرضی سے اب جانا ہماری مرضی سے ہے۔"

میں اپنی بات پر اڑا رہا "یہ سب بکواس ہے مجھے شیلی بھی بتا سکتی ہے پیارے۔ اگر تم جھوٹ نہیں بول رہے ہو تو فون اسے دو۔ ابھی سب معلوم ہو جائے گا۔"

"ایسا لگتا ہے کہ ابھی تک تم نے ہمارے پیغام کو قابلِ توجہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں سمجھایا شاید تم کو معلوم ہی نہیں پیارے کہ۔"

میں نے اپنے ہاتھ کے لفافے کو دیکھا "یہ خط تم نے بھیجا ہے۔ کیوں؟"

اس نے پھر تو بھری "خط لکھیں گے کہ جو مطلب کچھ نہ ہو۔ ارے پیارے ہم تو عاشق ہیں۔"

اب میرا شک تقویت پکڑنے لگا تھا کہ اس کی باتیں محض باتیں ہیں اور فی الحقیقت وہ شیلی کا نام مجھے مشتعل یا خوف زدہ کرنے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

میں نے پھر پانسہ پھینکا "خدا، دیکھ لیا ہے میں نے۔"

"پھر کیا سوچا ہے پیارے۔ یہ بھی تو فرماؤ۔"

"سوچ کے فرماؤں گا۔" میں نے کہا "پہلے تم فرماؤ کہ شیلی سے بات کرانے میں تامل کیا ہے؟"

"تامل کیسا... لیکن پہلے اپنی باتیں تو ہو جائیں۔"

"فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے ایک جوا کھیلا تھا۔ میں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ نہ میں اس کی باتوں سے خوف زدہ ہوا ہوں نہ میں نے اس کی بکواس پر اعتبار کیا ہے۔ میں نے اس کے خط کو قطعی اہمیت نہیں دی اور بلیک میل ہونے پر بھی تیار نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے رویے سے دل برداشتہ نہیں ہوگا لیکن دوبارہ فون کرے گا تو فضول باتوں میں وقت گنوانے سے گریز کرے گا۔

اگر میں چاہتا تو ریسیور رکھ سکتا تھا یا آپریٹر سے پوچھ سکتا تھا کہ میری واضح ہدایات کے باوجود ایک غیر متعلق شخص کی فون کال مجھے کیوں دی گئی؟ شیلی کی بات اور تھی۔ اس نے آپریٹر کو بتا دیا تھا کہ وہ کون ہے اور آپریٹر نے اس کے باوجود مجھ سے پوچھا تھا۔

گھنٹی پھر بجی مگر اب آپریٹر نے کہا "مسز آلکی مسٹر اسد ہیں۔"

میں نے کہا "وہ بھی تم نے اس کی کال ملائی تھی۔ کیوں؟"

"سوری سر میں سمجھا تھا آپ کی مسز کی کال شاید ڈس کنکٹ ہو گئی تھی۔"

"تم نے میری مسز کی اور مسٹر اسد کی آوازوں میں فرق کو محسوس ضرور کیا ہوگا۔" میں نے خفگی سے کہا۔

"وہ... سر پہلے بھی مسٹر اسد نے بات کی تھی اور کہا تھا کہ آپ کی وائف بات کرنا چاہتی ہیں... ایسا ہوتا ہے سر بیک کال آفس سے پہلے کوئی مردی بات کرتا ہے۔ کنفرم کرتا ہے پہلے۔"

"اوکے اوکے۔ لائن دو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

اسد کی آواز دوبارہ سنائی دی "بڑا انتظار کراتے ہو پیارے۔"

میں نے کہا "میں تمہیں دس سیکنڈ دوں گا۔ یا تو میری بات کراؤ شیلی سے ورنہ میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا۔ ابھی تک میں نے صرف آپریٹر کو تاکید کی تھی مگر اب یہ انتظام کرنا پڑے گا کہ میرے نام کوئی کال آئے تو اس کا نمبر ٹریس ہو جائے۔"

وہ ہنسا "یہ پاکستان ہے پیارے۔ یہاں اس قسم کے انتظام میں بڑی دیر لگتی ہے۔ ٹیلی فون کے محکمے والے ایسے کماں کہ تم کو اور وہ مان لیں۔"

میں نے کہا "یہ بندوبست کریں گے ہوٹل والے۔ انہیں مستعدی پیدا کرنے کے طریقے آتے ہیں۔ تم یہ بات نہیں جانتے تو جان لو کہ ہر اچھے ہوٹل کو اپنی نیک نامی عزیز ہوتی ہے اور اس کی حفاظت کی قیمت وہ سب کو ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں کبھی کوئی غلط خبر نہیں چھپتی۔ ورنہ ہوٹلوں میں کیا نہیں ہوتا۔ لیکن مہمانوں کو پریشانی نہ ہو یہ بات وہ ہر قیمت پر یقینی بناتے ہیں۔"

مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔ جو کچھ میں ریسیور میں بول رہا تھا وہ صرف میرے کان سن رہے تھے دوسری طرف نہ جانے کب ریسیور رکھا جا چکا تھا۔

میں نے ایک بار "ہیلو" کہا پھر سخت کوفت اور جھنجلاہٹ کے ساتھ ریسیور رکھنے پر مجبور ہو گیا۔ مجھے پھر اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا تھا کہ اس شخص کو باتوں میں لگا کے اس سے کچھ اگلوانے کے بجائے اسے دھمکی دے کر میں نے عقلمند ہونے کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ میں پہلی بار ریسیور رکھنے کے بعد آپریٹر سے کہہ سکتا تھا کہ اب جو بھی کال آئے اسے ٹریس کرنے کا فوری بندوبست کیا جائے اور ہوٹل کے کسی دوسرے فون سے ایکس چینج کا نمبر ملا کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ اسد کہاں سے بات کر رہا ہے۔ کچھ ہوٹل والے کال کا بل تو مہمان کے کھاتے میں ڈالتے ہیں لیکن ان کے اور ٹیلی فون کے محکمے کے آپریٹرز کے درمیان مفاد باہمی کا معاہدہ ہوتا ہے چنانچہ ہوٹل کی فون کالز کا بل محدود رہتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ ناممکن نہیں تھا کہ میں اسد کو باتوں میں الجھا لیتا اور ہوٹل والے اپنے خصوصی ذرائع استعمال کرتے ہوئے اس کا نمبر معلوم کر لیتے۔

اسد نام کا یہ شخص دوست بہرحال نہیں تھا لیکن دشمن تھا تو ملاور اینڈ کمپنی کے شکاری ٹولے میں نیا شامل ہوا تھا یا اسے ہم پر نگرانی سونپی گئی تھی۔ وہ ہوٹل کے اندر بھی ہو سکتا تھا جہاں خاموشی سے ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہوئے اپنا کام بھی جاری رکھ سکتا تھا اور "اضافی خدمات" کا معاوضہ بھی وصول کر سکتا تھا۔ اپنی طرف سے میں نے احتیاط کے تمام تقاضے پورے کیے تھے مگر کوئی مسلسل ہمارے تعاقب میں تھا اور یہ جانتا تھا کہ گزشتہ شب شیلی میرے ساتھ تھی۔

انتہا یہ کہ اسے کچھ دیر پہلے دروازے کے نیچے سے کمرے میں پہنچائے جانے والے خط کے بارے میں بھی معلوم ہو چکا تھا۔ اگر وہ ہوٹل کے باہر کہیں تھا تو چند منٹ میں یہ اطلاع اسے کوئی اندر کا آدمی ہی پہنچا سکتا تھا۔

پریشانی اور فکر کے ساتھ میری فرسٹریشن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شیلی سے بات نامکمل رہ گئی تھی۔ اس نے میرے اچانک خاموش ہو جانے کا نہ جانے کیا مطلب لیا ہوگا اور بفرض محال اس کے فوراً بعد اسد اچانک اسے اغوا کرنے پہنچا ہوگا تو شیلی نے مجھے ضرور پکارا ہوگا۔ اسے جسمانی طور پر مغلوب کرنے کے لیے اور اس کی آواز کو دبانے کے لیے انہوں نے کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال استعمال کیا ہوگا یا شاید بے خبری میں پیچھے سے اس کے سر پر وار کر کے اسے بے ہوش کر دیا ہوگا۔ میرے تصور میں نہ اسد کا چہرہ تھا اور نہ کسی حملہ آور کا۔ میں صرف شیلی کو دیکھ رہا تھا جس کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہو گیا تھا اور وہ بے جان ہو کے اغوا کرنے والوں کے بے رحم ہاتھوں میں جھول رہی تھی۔

اسد نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن مجھے وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو ضروری تھا۔ مجھے خبردار کرنے کے لیے، میری حوصلہ شکنی کے لیے اور مجھے یہ سمجھانے کے لیے کہ میں لاکھ اپنی ذہانت اور ہوشیاری پر بھروسہ کرتے ہوئے کہیں بھی چلا جاؤں، ان کی دسترس سے دور نہیں جا سکتا۔

میرے ذہنی انتشار کا یہ عالم تھا کہ ابھی تک میں نے اس خط کو کھول کے نہیں دیکھا تھا جو تازہ خرابی کا نقطۂ آغاز تھا۔ میں ریسیور رکھنے کے بعد ایک ہاتھ ریسیور پر رکھے بیٹھا تھا اور خلا میں دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ یہ اعصابی کشیدگی کے نتیجے میں ہونے والی ایک اضطراری حرکت تھی۔ میں نے خود کو اچانک تنہا اور بے سہارا محسوس کیا۔ ایسے وقت میں غالب اور محسن، رابعہ اور نازو کے ساتھ ہونے سے کتنی تقویت حاصل رہتی تھی۔ وہ صرف حوصلہ اور تسلی ہی نہیں دیتے تھے، میری پریشانی کو بانٹ لیتے تھے اور پھر ہم سب مل کے سوچتے تھے کہ ان حالات سے مقابلے کے لیے کیا لائحۂ عمل اختیار کیا جائے۔ میں کبیر خان یعنی سکندر بخت عرف سکندرِ اعظم، چیف کے ٹو مشن کمانڈر ایم آر ایس۔ جو کچھ بھی تھا انہی کے دم سے تھا جو ایک متحدہ قوت تھے، ایک جذبے کی طاقت تھے، خلوص اور محبت کی علامت تھے۔ ان کے بغیر میں کچھ نہیں تھا۔ سوچ ہے دنیا میں اور یہ ہوں تو دنیا کچھ نہیں!

دروازے پر دستک ہوئی تو میں بری طرح چونکا۔ پھر شیلی اندر آگئی اور اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ میں فالج زدہ شخص کی طرح ساکت بیٹھا اسے پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ میری آنکھیں ابھی تک ایک حقیقت کو خواب کی طرح دیکھ رہی تھیں۔ یہ بے یقینی نتیجہ تھی غیر متوقع صدمے کے بعد ملنے والی لامحدود خوشی کے احساس کی اور پُرمسرت حیرت کی اس انتہا کی جو آدمی کو پاگل کر دے۔ جب کوئی خبر اچانک بے بنیاد ثابت ہوتی ہے کہ کسی کے مرگِ ناگہاں، کسی پر عائد ہونے والے الزام بے وفائی یا کسی ناقابلِ تلافی نقصان کی اطلاع غلط تھی۔

شیلی نے دونوں ہاتھوں میں جنرل اخبار کے تھے جو اس نے بیڈ پر پھینک دیے "کیا بات ہے یار! تم پاگل ہو گئے ہو؟ ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟ کیا بجلی کا کرنٹ لگا ہے؟ مجھے تو ہارٹ اٹیک کے آثار لگتے ہیں۔"

میں نے چونک کر مسکرانے کی کوشش کی "اس سے بھی زیادہ۔"

وہ دھم سے صوفے پر گر گئی۔ "کیا اس سے بھی زیادہ؟ تم نے تو مجھے پریشان کر دیا یار۔"

"میں نے...؟"

"اور کیا میں نے۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی یار" وہ برہمی سے بولی "بڑی مشکل سے ایک فون ملا تھا ایسا جہاں میری بات سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ہر جگہ تو لوگ کھڑے ہوتے ہیں باری کے انتظار میں۔ وہ دکان دار بھی مہذب تھا۔ خود ہی دور جا کھڑا ہوا تھا۔ اور تم نے پوری بات نہیں سنی۔ کیا ہو گیا تھا تمہیں بات کرتے کرتے؟"

"ہارٹ اٹیک۔" میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔

"میں تو پریشان ہو گئی تھی یار۔ بے وقوفوں کی طرح ہیلو ہیلو کرتی رہی۔ پھر نمبر ملایا۔ کم سے کم دس بار۔ آخر یہ کیا حرکت تھی یار؟ ریسیور رکھ کے اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"وہ... دراصل... پرانی عادت ہے غائب ہو جانے کی۔ ہم خاندانی قسم کے بھوت ہیں۔"

اس نے فریج سے بوتل نکال کے منہ سے لگائی "سخت احتجاج کرتی ہوں۔ یہ بدتمیزی ہے بلکہ بے عزتی کی ہے تم نے میری یار۔ بات کیے بغیر ریسیور رکھ دیا ایک طرف۔ کیا میں بے وقت کی راگنی گا رہی تھی یا بور کر رہی تھی تمہیں اپنی باتوں سے؟"

"جب تمہارے دل کا سارا غبار نکل جائے تو بتا دینا۔ اس وقت تک میں صرف مسکراتا رہوں گا" میں نے کہا۔

"کیوں؟" وہ چراغ پا ہو کے بولی "بتا نہیں سکتے مجھے کہ ایسی کیا آفت آگئی تھی؟"

میں نے کہا "تم یقین نہیں کرو گی۔"

"یار کیوں یقین کروں گی میں۔ جیسا میں چھوڑ کے گئی تھی ویسے ہی بیٹھے ہوئے ہو۔ مجھے تو ڈر تھا کہ تمہیں کچھ ہو گیا ہے۔"

"ہارٹ اٹیک...؟"

"سچ بتاؤں۔ بڑے برے برے خیال آ رہے تھے دل میں۔ کہیں اچانک تمہیں کسی نے ناک آؤٹ تو نہیں کر دیا۔ پیچھے سے سر پر ڈنڈا مار کے یا کلوروفارم سنگھا کے۔ کسی نے خنجر تو نہیں گھونپ دیا۔ سائلنسر والے پستول سے گولی تو نہیں مار دی۔ ہارٹ اٹیک کا خیال بھی آیا تھا کہ کھڑے کھڑے ہٹ سے گرے اور

www.paksociety.com

بس۔ وہی اینڈ۔"

میں نے کہا "تم کیسی لڑکی ہو۔ ایسی باتیں کرتی ہو میرے منہ پر۔"

"یار پھر کیا کروں۔ جھوٹ بولوں؟"

"لڑکیاں تو بری بات منہ سے نکالتے ہوئے ڈرتی ہیں۔ کوئی اور کرے تو کہتی ہیں۔ ہائے اللہ... دشمنوں کے منہ میں خاک۔"

"میں اللہ وسائی بخت اللہ رکھا نہیں ہوں اور نہ مجھے کیا کسی سے کوئی۔ بجائے شرمندہ ہونے اور معافی مانگنے کے الٹا تم مجھے الزام دے رہے ہو یار۔ تم کو ذرا احساس نہیں کہ پریشانی اور بدحواسی میں میرا کیا حال تھا۔ میں سب کچھ چھوڑ کے بھاگی۔ راستے بھر ڈرائیور کو کہتی رہی کہ جلدی کرو۔ تیز چلو۔ خوف سے میرا ہارٹ فیل بھی ہو سکتا تھا۔ کتنی TENSE ہوں میں۔ یہاں تم آرام سے بیٹھے مسکرا رہے ہو..."

میں نے اس کا ہاتھ تھام کے کہا "دل پہ بلا... اپنے تیز شیلی تک۔ میں بھی بول سکوں؟"

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ کس کا خط ہے؟" ذرا ... بغیر اس نے ایک ہاتھ سے اپنی زلفوں کو پیچھے ہٹایا۔

"تمہاری خرابی کا ثبوت ... ہے" میں نے کہا اور لفافے کو کھولا۔

شیلی اٹھ کر میرے قریب آئی اور جھک کر اس کاغذ کو دیکھنے لگی جو میں نے ابھی کھولا ہی تھا۔ اس کے سارے بال پھسل کر چہرے پر آ گئے تھے اور اس کا چہرہ مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ اس کے وجود سے پھوٹنے والی مشکبو تیز مہک میرے حواس پر حملہ آور ہوئی۔ میرے لیے یہ بھی ناممکن ہو گیا تھا کہ میں اپنی نظر کو زلف و رخسار سے پیچھے اور سایہ زلف کے دامن میں نہاں حسن کی جلوہ گاہ تک پھسل جانے سے روک لوں۔

میں نے گھبرا کے اسے پیچھے دھکیلا "ابھی ایسی کیا بے تابی ہے۔ تم کیا مجھ سے بھی پہلے دیکھو گی۔"

اس نے کاغذ میرے ہاتھ سے اچک لیا اور سیدھی ہو گئی۔

"ہاں۔ رابعہ کا خط ہے نا..."

اچانک اس کی آواز بند ہو گئی اور اس کی نظر ٹھہر گئی۔ میں نے اس کے تیزی سے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھا اور کاغذ اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ اس پر کسی نے اخبار سے ایک تصویر کاٹ کے چپکا دی تھی۔ اصل تصویر جنوبی افریقہ کی سفید فام اقلیت کی نسل پرست حکومت کے ظلم و بربریت کا منہ بولتا ثبوت تھی جو سیاہ فام اکثریت کو انسانیت سوز قوانین کی مدد سے عبرت ناک سزائیں دے کر شیطانی انصاف کا بول بالا کرتی تھی۔ یہ سب قوانین متعصبانہ اور یکطرفہ تھے۔ مثلاً سفید فام مرد کے لیے کسی نیگرو عورت کی آبروریزی محض "غلطی" تھی۔ اس کے برعکس سیاہ فام کے خلاف کسی گوری عورت کا صرف الزام ہی اسے پھانسی دینے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ پھانسی سرعام دی جاتی تھی۔ یہ تصویر ایسے ہی کسی "مجرم" کی تھی جس کی لاش رسی کے پھندے میں لٹکی ہوئی جھول رہی تھی۔

مجھے خط بھیجنے والے نے اس تصویر کا اصل چہرہ ہٹا کے اس کی جگہ میرا چہرہ لگا دیا تھا۔ یہ کام بڑے بے ڈھنگے پن سے کیا گیا تھا۔ رسی سے جھولنے والے سیاہ فام کے جسم کے مقابلے میں میرا سر بہت بڑا تھا۔ اس تصویر کی دوبارہ بلیک اینڈ وائٹ تصویر بنائی گئی تھی مگر نتیجہ پھر بھی مضحکہ خیز ہی رہا تھا۔ میں نے کبھی کسی پھانسی پانے والے کی تصویر تک نہیں دیکھی مگر میں نے پڑھا اور سنا ہے کہ ... کی آنکھیں حلقوں سے ابل آتی ہیں۔ زبان باہر لٹک جاتی ہے اور گردن لمبی ہو جاتی ہے۔ شاید مرنے والے کی صورت ... بھیانک ہوتی۔ مگر میرے چہرے پر موت کا کوئی تاثر ... تھا۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی اور میری آنکھیں میری طرح زندہ تھیں۔ تاہم کٹنے والے نے تصویر کی نشاندہی میں سب کہہ دیا تھا اور دکھا دیا تھا۔

"کمال ہے!" شیلی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "... آخر اس کا؟"

میں ابتدائی ذہنی صدمے سے سنبھل چکا تھا۔ خود کو بھی ... پھندے سے لٹکا دیکھنا یقیناً ایک دہشت زدہ کرنے والا تجربہ تھا مگر میں نے شیلی کے سامنے کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یوں بھی اس تصویر میں اور تحریری طور پر الفاظ میں دی جانے والی قتل کی دھمکی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ فرق صرف اثر یا IMPACT کا تھا۔ مجھے ایک جملہ لکھا ہوا ملتا کہ "تمہیں جان سے مار دیا جائے گا" تو میں اسے فوراً پھاڑ کے پھینک دیتا اور بھول جاتا۔ یہی بات کوئی مجھ سے فون پر کہتا کہ ... اب تمہیں پھانسی سے کوئی نہیں بچا سکتا تو اثر یقیناً زیادہ ہوتا اور میں کچھ عرصہ تصور میں وہی آواز سنتا رہتا لیکن سب سے زیادہ اثر تصویر کا ہوا تھا۔ فارسی کی پرانی کہاوت ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ یعنی سنا ہوا دیکھے ہوئے کے برابر کیسے ہو سکتا ہے؟

"ڈاکٹر شیلی! اپنے بیگ میں سے دو چار سکون آور گولیاں نکال کے کھاؤ" میں نے مسکرا کے کہا "ایک تصویر نے اتنا نروس کر دیا ہے تمہیں۔"

اس نے کہا "یہ تصویر مذاق نہیں ہے یار؟"

"ہاں۔ یہ ایک خواہش کا عکس ہے۔" میں نے کہا "اور ہر شخص کے دل میں خواہشات اس کی ذہنیت کے مطابق ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے میرا ہر دشمن یہی خواہش رکھتا ہے اور خود میں بھی کیا ان کا بھلا چاہتا ہوں۔ نہیں۔ میں بھی انہیں کتے کی موت مارنا چاہتا ہوں مگر نہ میرے چاہنے سے کچھ ہو گا نہ میرے دشمنوں کے خواہش کرنے سے۔ یہ تو تقدیر کے مسائل ہیں جن پر خدا کا اختیار کامل ہے۔"

"تمہیں دھمکی دی ہے کسی نے؟" وہ غصے سے بولی۔

"پھانسی تو نہیں دی۔ پھر گھبرانے کی کون سی بات ہے؟ اس وقت جب میں تم سے فون پر بات کر رہا تھا تو کسی نے یہ لفافہ دروازے کے نیچے سے اندر سرکایا تھا اور ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر میں ریسیور رکھ کے دوڑا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ شاید باہر کوئی ہو۔ مگر وہاں صرف ایک ویٹر جا رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ یہ حرکت اس کی نہیں تھی۔"

وہ ہکا بکا بیٹھی سب سنتی رہی۔ میں نے اسے اسد نام کے کسی شخص کی ٹیلی فون کال کے بارے میں تفصیل سے بتایا "یہ شخص میرے بات کرتے ... تمہارے غائب ہو جانے کی اصل وجہ ... کی وجہ تم بتا کر ... بھول..."

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہے یار۔" شیلی متفکر ہو گئی "کون ہے جو سائے کی طرح ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے؟"

"اگر تم بتا دو تو میری طرف سے منہ مانگا انعام ہے۔"

"دیکھو میں بتا دوں گی۔ بعد میں کرامت بابا" وہ مسکرائی "انعام ...؟"

... نے سینے پہ ہاتھ رکھا "جان مانگ ... جاں ... سکندر ... نہیں ... کہتا ... قول ..."

"تمہاری جان لے کے کیا کروں گی میں یار۔ ہاتھ ملاؤ" وہ ... کی ... ؟"

میں نے ہاتھ ملا کے کہا "منظور۔ تم بتاؤ کون ہے وہ مگر نام بتانا پڑے گا۔"

"چوہدری داؤد" اس نے کہا "ثابت کرو کہ یہ غلط ہے۔"

میں نے سر ہلا کے کہا "غلط تو نہیں ہے..."

"اگر غلط نہیں ہے تو پھر صحیح ہے" اس نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "یار تم شرط ہار گئے۔"

"اوکے چالاک لڑکی" میں نے کہا "انعام کیا مانگتی ہو؟"

اس کی نظر میرے ہاتھ پر جم گئی "اوہ یار یہ انگوٹھی مجھے دے دو۔"

میری مسکراہٹ کافور ہو گئی "یہ انگوٹھی...؟"

"کیا بہت قیمتی ہے؟" اس نے تیور سے کہا "بہت زیادہ مانگ لیا میں نے؟"

میں نے محسوس کیا کہ جو بات میں نے مذاق میں کی تھی وہ ایک سنگین غلطی بن گئی ہے "بات قیمت کی نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟ ایک آؤٹ کر دیا؟ اتنی جلدی۔"

"نہیں... دراصل یہ انگوٹھی رابعہ کی ہے۔ تم کچھ اور مانگ لو۔"

"یار، رابعہ کی ہو یا فوزیہ کی، مجھے یہی چاہیے ورنہ چھوڑو۔ پھر کبھی قول سے پھرنے کی یا اپنے مرد ہونے کی بات مت کرنا۔"

غصے سے میرے کان گرم ہو گئے "یہ تو بہت تم کر رہی ہو ڈاکٹر شیلا خان! یہ غلط ہے۔ بد اخلاقی ہے۔ غلط فہمی ہے تمہاری۔"

"چلو یار کیسی ہی ہے میں مان لیتی ہوں۔ مگر تم اتنے خوف زدہ کیوں ہو اپنے آپ سے؟ کیا رابعہ کی دی ہوئی انگوٹھی مجھے دے دو گے تو رابعہ کی محبت ختم ہو جائے گی؟ اس انگوٹھی میں بند ہے ساری محبت؟ جیسے جادوگر کی جان ہوتی تھی کسی طوطے میں یا جن کی طاقت تھی الہ دین کے چراغ میں۔"

میں نے بڑی مشکل سے غصے کو ضبط کیا "شیلی! خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کرو۔ رابعہ پہلے ہی بدگمان ہو گئی تھی۔"

"محبت میں بدگمانی نہیں ہوتی۔ بدگمانی کے بغیر محبت ... ہوتی ہے یار۔ پہلے بھی آزمایا تھا تم نے رابعہ کو؟ نہیں آزمایا نا؟ تم کو اعتماد نہیں تھا۔"

"یہ غلط ہے۔"

"یار سونے کو دس بار کسوٹی پہ دیکھو۔ خالص ہو گا تو ہر بار سونا ہی ثابت ہو گا۔ ذرا وہم ہے نہ شک ہو کہ ملاوٹ ہوئی تو پتا چل جائے گا۔ حالات کی آزمائش نے کیا ثابت کیا آخر؟ یہی نا کہ تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔"

"پلیز شٹ اپ۔"

"سچ کڑوا ہے یار۔ جھوٹ ہے تو میرے منہ پر تھپڑ مارو۔ پہلے بڑے دعوے ہوتے ہیں دکھ سکھ میں ساتھ دینے کے، ساتھ مرنے جینے کے۔ وقت آنے پر سب کھوکھلے ... ثابت ہوتے ہیں۔"

شیلی نے کسی سفاک مسیحا کی طرح نشتر زنی جاری رکھی "ایک بے بنیاد فضول بات پر وہ بدگمان ہو گئی۔ اس نے تم پر شک کیا۔ اپنے اعتبار کو رسوا کیا۔ یار یہ محبت ہے؟ ہائی فٹ! اس نے تم سے پوچھا تک تو گوارا نہیں کیا۔ تمہاری وضاحت نہیں سنی۔ تم تھے کون؟ کیا جرم کیا تھا تم نے؟ ہوں تو تم نے کوئی جرم کیا ہی نہیں تھا۔ یہ تم بھی جانتے ہو یار اور مجھے بھی معلوم ہے۔ مگر وہ کیوں تمہیں گالی دے گئی۔ چلو یار میں طوائف بھی سہی مگر تم نے جرم کیا تھا تب بھی کیا وہ تمہیں معاف نہیں کر سکتی تھی؟ اتنی گنجائش بھی نہیں ہے اس کے دل میں یار؟"

"بند کرو اپنی بکواس۔ تم کیا جانو محبت کو۔"

"میں جانتی ہوں سر! محبت کیا ہوتی ہے۔ محبت اور ملکیت میں ... فرق ہوتا ہے۔ وہ میں سمجھتی ہوں۔ وہ تمہیں OWN کرنا چاہتی ہے۔ مجھے یہ محبت نہیں غلامی ہے۔ کبھی تم نے یہ دیکھا تو نے کی خواہش بھی کی تو تمہارا یہ جرم ناقابل معافی ہو گا؟ ایسی ہوتی ہے محبت تو لعنت اس محبت پر۔"

میرا سارا وجود شیلی کے خلاف نفرت کی آگ میں دہک رہا تھا اور اس کی تپش مجھے اندر سے جلا رہی تھی۔ میرے منہ سے نکلنے والی ایک بے ضرر سی بات وہ چنگاری بن گئی تھی جس سے یہ آگ بھڑکی تھی۔ اب وہ اس آگ کو ہوا دے رہی تھی اور میرے لیے یہ اذیت ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔

میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا "اس کے آگے کچھ مت کہنا۔"

وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہٹی "ایک تھپڑ مار کے تم کیا سمجھتے ہو یار' سچ بدل جائے گا؟ یا تم خود کو سچا ثابت کرلو گے؟ سچ میں بتاتی ہوں۔ اگر مجھے محبت ہو کسی سے تو میں اسے اپنی ملکیت نہیں سمجھوں گی۔ وہ غلام نہیں ہوگا میرا۔ میں اس سے یہ توقع نہیں رکھوں گی کہ ہر قیمت پر صرف میری خوشی کا اور میرے جذبات کا خیال رکھے اور اپنے آپ کو' اپنی ہستی کو مٹا دے۔ نہیں. مجھے اس کی خوشی عزیز تر ہوگی' اس کے جذبات کا پاس ہوگا۔ باقی کا وہ جسے چاہے گا وہ بھی میرا محبوب ہوگا۔ وہ جس سے چاہے شادی کرلے' جس سے چاہے جسمانی تعلق قائم کرے۔ مجھے کیا یار' میں اس سے محبت کرتی ہوں تو بس کرتی رہوں گی۔ کسی شرط اور پابندی کے بغیر' کسی لالچ کے بغیر۔ مگر تم تو غلام ہو محبت کی زنجیر میں جکڑے ہوئے" وہ ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی میں ہسٹیریا تھا۔ درحقیقت یہ آنسو تھے جو آنکھ سے نہیں نکل سکتے تھے تو ہنسی بن کے نکل رہے تھے۔ جیسے پریشر ککر میں پانی اُبلتا ہے تو بھاپ بن کے نکلتا ہے۔

میں نے کہا "اسٹاپ اٹ ڈاکٹر شیلی۔ تم اپنی بے بسی پر کیوں رو رہی ہو؟ اپنے ساتھ یہ ظلم مت کرو۔ آنسوؤں کو بہنے دو۔ انہیں زبردستی ہنسی کی چٹان کے نیچے مت دباؤ ورنہ تم پاگل ہوجاؤ گی۔"

وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی "آئی ایم آل رائٹ یار۔ تم تو مجھ سے بھی زیادہ بے بس ہو۔ میں اپنے آپ پر ہنس بھی سکتی ہوں اور آنسو بھی بہا سکتی ہوں لیکن تم مرد ہو' رونا تمہاری شان کے خلاف ہے' تمہاری انا کی شکست ہے اور اپنے آپ پر ہنسنے کا تم میں حوصلہ نہیں ہے۔"

"تم یہ سب کتابی باتیں بھول جاؤ گی شیلی۔ محبت اور محبت کا فلسفہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ جو کچھ تم نے کہا وہ عقل کی بات تھی۔ محبت جذبات کا کھیل ہے۔"

"کھیل...؟ واقعی محبت کو کھیل سمجھ کے کھیلتے ہیں لوگ یار۔ جیسے ایکٹرز سینما کے اسکرین پر محبت کی اداکاری کرتے ہیں۔ ان کے جذبات بھی کتنے حقیقی نظر آتے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے آخر تمہارا؟ میں یا رابعہ اداکاری کررہے تھے؟" "مجھے اب غصہ نہیں' ترس آتا ہے تم پر کیونکہ تم نے کسی سے محبت نہیں کی۔ نیورولوجی سے تم ذہن اور اعصاب کے مسائل کو سمجھ سکتی ہو محبت کو نہیں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ تم اس کے سوا میرے بارے میں کیا جانتے ہو جو خود میں نے تمہیں بتایا ہے؟" اس نے میرا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا "تمہارے نزدیک تو محبت ایک جذبہ نہیں یار' ایک فارمولا ہے خوش گوار ازدواجی زندگی کا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے مجنوں کرے اور لیلیٰ کے سامنے دوزانو ہوکے اور سینے پر ہاتھ رکھ کے کہے کہ میں تم پر مرتا ہوں لیلیٰ' تم نہ ملیں تو میں مرجاؤں گا۔ لیلیٰ کا ملنا شرط اول ہے یار۔ محبت کی تان شادی پر آکے ٹوٹتی ہے۔ ایک پیارے سے گھر کے خواب پر آکے محبت کا ڈراپ سین ہوجاتا ہے۔ ہر فلم کی طرح۔ شادی کے بعد مایوسی کا اینٹی کلائمکس آتا ہے جب جذبات کی حدت اور شدت ختم ہوجاتی ہے اور شوہر کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ یار اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ محبوبہ جب بیوی بنتی ہے تو عام عورت ہوجاتی ہے۔"

اس سے بحث لاحاصل تھی اور خجلت کے ساتھ اب مجھے یہ احساس بھی ہورہا تھا کہ اس نے مجھے غلط وقت پر غلط مسئلے میں اُلجھا لیا ہے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی جذبات کے فوری ردعمل سے مغلوب ہوگیا تھا اور اسے جھانپڑ مار کے میں نے گویا تسلیم کرلیا تھا کہ میرے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ اصولاً مجھے نہ دلیل دینے کی ضرورت تھی اور نہ بحث میں پڑنے کی۔

میں نے کہا "شیلی! پلیز کوئی اور بات کرو۔ آئی ایم رئیلی سوری۔ میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا۔ مجھے معاف کردو۔"

"معافی کی کون سی بات ہے یار۔ یہ تو ساری دنیا کے مردوں کا ہتھیار ہے۔ مرد کی آخری دلیل یہی ہوتی ہے۔ یورپ' امریکا کے مہذب معاشرے میں بھی عورت صنف نازک ہے اور مرد طاقتور۔ وہاں بھی وہ ایسا ہی کرتے ہیں کہ پہلے عورت کو چپ کرادیتے ہیں پھر سوری کہہ کے بات ختم کردیتے ہیں۔"

"خدا کے لیے میرا دماغ خراب مت کرو۔ خاموش ہوجاؤ۔"

"میں خاموش ہوجاؤں گی مگر بات جو تم نے کہی تھی۔ قول مرداں والی۔ وہ تو باقی رہے گی یار" وہ آہستہ سے اٹھی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

میں ایک بار پھر مشتعل ہوگیا۔ وہ مسلسل میری' میری محبت کی' میری مردانگی کی اور میرے جذبات کی تذلیل کررہی تھی۔ "اوکے۔ احمق اور ضدی لڑکی۔ یہ لو" میں نے غصے میں اپنی انگلی سے انگوٹھی کو کھینچ کے اتارا اور اس کی طرف پھینک دیا "پہن لو اسے اپنی انگلی میں۔ اگر یہی کفارہ ہے میری غلطی کا تو ٹھیک ہے۔ جی چاہے تو نمائش کرو اس کی۔ ساری دنیا کو بتادو کہ یہ انگوٹھی مجھے سکندر نے دی ہے۔ مگر کیا فرق پڑے گا اس خود فریبی سے؟"

اس نے انگوٹھی کی طرف نگاہ اٹھا کے نہیں دیکھا جو دیوار سے ٹکرا کے قالین پر گرگئی تھی۔ "ماشاء اللہ سکندر صاحب! آپ پڑھے لکھے اور مہذب نظر آتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں۔ ولایت پلٹ ہیں۔ ادب آداب اور ماڈرن سوسائٹی کے ایٹی کیٹس کو سمجھتے تو ہوں گے۔ بُرا مت مانئے گا میرے سوال کا۔ کیا رابعہ نے ایسے ہی دی تھی یہ انگوٹھی آپ کو؟"

"رابعہ کو بیچ میں مت لاؤ۔ اٹھاؤ انگوٹھی۔"

"وہ پڑی ہے آپ کی انگوٹھی۔ آپ کی چیز ہے' آپ چاہیں تو اسے باہر بھی پھینک سکتے ہیں" وہ پھر باہر دیکھنے لگی "میں گری پڑی چیزیں نہیں اٹھاتی۔"

اب میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں انگوٹھی اٹھاکے اس کی خدمت میں پیش کروں۔ اس کی ضد نے مجھے شکست کی شرمندگی کو برداشت کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ رابعہ سے یکسر مختلف' خودسری کی حد تک خوددار' انا پرست اور بے باک لڑکی تھی۔

"یہ لیجئے خاتون" میں نے انگوٹھی کو ہتھیلی پر رکھ کے کہا "قبول فرمایئے' ایک حماقت کا تاوان۔"

وہ مسکرائی "شرط ہارنے والے کو ظرف کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔"

"اب اگر آپ کی خواہش ہو تو میں انگوٹھی آپ کو رسمی کلمات اور ماڈرن ایٹی کیٹس کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے پہنا بھی دوں؟"

"او۔ ٹھیک ہے یار۔ بس شرط پوری ہوگئی" اس نے انگوٹھی اٹھاکے میری طرف بڑھادی "YOU MAY KEEP IT یو مے کیپ اٹ۔ پہن لو اسے۔ کم آن' اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔ انگوٹھی اتاری اور پھر پہن لی تو کوئی آسمان نہیں ٹوٹا۔ سمجھو کہ ایک دوستانہ مذاق تھا۔"

لیکن میرے لیے اب یہ دوستانہ مذاق نہیں رہا تھا۔ شیلی نے بڑی چالاکی سے اور بڑی معصومیت سے رابعہ کی محبت کا اور میرے جذبات کا پوسٹ مارٹم کردیا تھا اور اس تصویر پر جو میری اور رابعہ کی محبت کا حسین شاہکار تھی' ایک بدہیئت سیاہ کراس لگادیا تھا۔ میرے جذبات کے سارے رنگ جو اپنی انفرادیت کے انداز جدا رکھتے تھے یوں خلط ملط ہوگئے تھے جیسے سورج کی روشنی کے سات رنگ مل کے سفید ہوجاتے ہیں اور سفید کوئی رنگ نہیں ہوتا۔

اب میرے لیے یہ ناممکن تھا کہ میں اس انگوٹھی کو دوبارہ پہن کے بھول جاؤں کہ یہ رابعہ کی نشانی نہیں' شیلی کی دین ہے۔ یہ شیلی کی عنایت تھی کہ جو انگوٹھی وہ مجھ سے لے چکی تھی اور جس کی ملکیت پر اس کا اخلاقی حق بھی میں نے تسلیم کرلیا تھا' وہ اب اس کو پھر میری انگلی میں دیکھنا چاہتی تھی۔ لو' یہ اب میری طرف سے قبول کرو۔

میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا "سوری ڈاکٹر شیلی۔ ویٹ واز نو جوک۔ THAT WAS NO JOKE جو چیز تمہاری ہوچکی' اسے میں جذباتی خیرات کے طور پر قبول نہیں کرسکتا۔"

اس نے کافی بے نیازی سے انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی "تمہاری مرضی یار' تمہاری چھوٹی انگلی مساوی ہے میری درمیانی انگلی کے۔ تم نے اپنے کپڑے دیکھے۔ دیکھنا کیا' بس بدل ڈالو یہ خاکروبوں والا لباس۔"

میرا موڈ بہت خراب ہوگیا تھا اور میرا دل چاہتا تھا کہ میں اسی وقت شیلی سے لڑ کے چلا جاؤں۔ اس سے صاف کہہ دوں کہ اپنے معاملات کو میرے مسائل سے الگ رکھو۔ چوہدری بلاور کی سوتیلی بہن' تم جانو اور تمہارا سوتیلا بھائی جانے۔ میں تمہارا وبال نہیں پال سکتا۔

مشکل یہ تھی کہ میں نے دلدل میں قدم رکھ دیا تھا اور اس سے نکلنا میرے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ اسی ہوٹل کے اندر کسی نے ویٹر کے روپ میں آکے مجھے یا شیلی کو زہر دینے کی کوشش کی تھی۔ کسی ثبوت کے بغیر بھی میں خاصے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ اس کافی میں زہر ملایا گیا ہوگا جو اس وقت بھی میز پر رکھی ہوئی تھی اور ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ مگر روم سروس سے کوئی ابھی تک خالی برتن اٹھانے نہیں آیا تھا۔ ایک گمنام شخص نے فون کرکے مجھے بتادیا تھا کہ میری روپوشی کا ڈراما فلاپ ہوچکا ہے اور شاید اسی نے مجھے میرے مستقبل کی تصویر دکھادی تھی کہ تم پر رشتی کے قتل کا جرم ثابت ہے اور پھانسی تمہارا مقدر ہوگئی ہے۔ اب بچ کے دکھاؤ۔

ان حالات میں میرا یہاں سے فرار ہونا بھی انتہائی خطرناک تھا جتنا یہاں قیام کرنا۔ اگر کوئی شخص یہ جانتا تھا کہ تقوی صاحب کے گھر سے بھاگ کے میں یہاں آگیا ہوں تو وہ شخص یہ بات پولیس کو یا میرے کسی دشمن کو بھی بتا سکتا تھا۔ ابھی تک اس نے ایسا نہیں کیا تھا تو کیوں؟ یہ ایک الگ سوال تھا مگر میں محسوس کرتا تھا کہ پولیس کسی بھی وقت اچانک دستک دے کر اندر آسکتی ہے۔ تقوی صاحب کا کیا بھروسہ کہ بعد میں وہ اپنا بیان بدل دیں۔ اپنے موقف سے دستبردار ہونے پر مجبور کردیے جائیں۔ انہوں نے تسلیم کیا تھا کہ وہ سیاسی دباؤ کا مقابلہ نہیں کرسکتے اور انہیں ہوم سیکریٹری کے عہدے تک پہنچنے کے لیے اوپر والوں کی خوشنودی بہرحال درکار ہوگی۔ قبل از وقت ریٹائرمنٹ وہ میری خاطر کیوں قبول کریں گے۔

میں بیڈ پر سیدھا لیٹا چھت کو گھور رہا تھا اور میرا ایک ہاتھ پیشانی پر تھا۔ مجھے فیصلہ کرنے سے پہلے سوچنے کے لیے سکون اور مہلت کی ضرورت تھی لیکن ہوٹل کے اسی کمرے میں شیلی کے ساتھ یہ ناممکن سی بات لگتی تھی۔ میں نے غالب کو فون کرکے بلانے کا سوچا اور پھر یہ ارادہ بھی ترک کردیا۔ اگر کوئی کہیں بیٹھے سے سب دیکھ رہا تھا تو وہ غالب کو بھی دیکھے گا۔ غالب آئے گا تو تازو بھی ساتھ ہوگی۔ مجھے تو اب یہ شک ہوچلا تھا کہ اس کمرے میں کہیں کوئی خفیہ آلہ ہے یا کوئی مائیکروفون نصب ہے۔ حالانکہ یہ بعید از قیاس بات تھی۔ ہم کسی پروگرام کے بغیر ہی اور اچانک یہاں پہنچے تھے۔ پھر یہ جانتے کیسے کوئی یہاں بھی پہنچ گیا تھا۔

شیلی نے میرے قریب بیٹھ کے میرا ہاتھ پیشانی پر سے ہٹایا "تم بہت غصے میں ہو یار۔"

www.paksociety.com

"نہیں ہے میں بہت پریشان ہوں۔"

"مسٹر شیلی! وہ ہے کیا؟" وہ بولی "طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"بروقت ڈاکٹر سرت تک رہا ہوں۔" میں نے ہنس کے کہا "شیلی! ہمیں کسی طرح یہاں سے نکل جانا چاہیے مگر سمجھ میں نہیں آتا کیسے نکلیں؟"

"تمہیں یہاں سے نہیں یار! اس ملک سے نکل جانا چاہیے۔ یہاں تم کہیں بھی چھپ کے نہیں رہ سکتے۔ تمہارے دشمن ہر طرف موجود ہیں اور تمہارے لیے خطرات بڑھتے جا رہے ہیں۔ میری مانو اور میرے ساتھ چلو۔"

"تیرے ساتھ چلوں؟ ٹکٹ لے کر ہوائی جہاز میں بیٹھ جاؤں؟" میں نے جھنجھلا کے کہا "اتنا آسان ہے فرار ہونا ملک سے؟"

"ذرا ... صاحب سے وعدہ کیا تھا۔"

"ابن ... اعتبار ہے تمہیں؟" میں نے کہا "... آسانی سے تو نہیں بنتا اور جعلی پاسپورٹ پر بھی تصویر تو ... ہی ہوگی نا ... صورت تو نہیں بدلی جا سکتی ..."

"... تو کیا صورت بدلی نہیں جا سکتی؟"

"... صورت بدلی جا سکتی ہے یار! بدلی جا سکتی ہے۔"

"تو پھر پرابلم کیا ہے یار؟" اس نے خوشی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔

میں نے کہا "یہاں ہم کسی عارضی ضرورت کے لیے صورت بدلتے تھے اور واسطہ رہتا تھا یہاں کے مجرموں سے یا یہاں کی پولیس سے۔ مجرم زیادہ ہو جاتے ہیں وہ دھوکا کھا جاتے تھے تو پولیس کی ... والے مگر پاسپورٹ کے لیے صورت کو میک اپ سے بدلنا مشکل ہے۔"

"یار کیا مشکل ہے اور کیوں مشکل ہے؟ اگر داڑھی مونچھیں..."

"اس لیے کہ امیگریشن والے یہاں بھی عقاب کی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی چھٹی حس شکاری کی طرح تیز ہو جاتی ہے۔ فوراً تاڑ لیتے ہیں کہ یہ بندہ جعلی ہے یا پاسپورٹ جعلی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔

"تمہارا پاسپورٹ جعلی نہیں ہوگا۔"

"لیکن حلیہ تو جعلی ہوگا۔ کسی کو شک ہوا اور اس نے داڑھی پکڑ کے کھینچ لی تو مولانا اعلام الدین کے خول سے برآمد ہوگا سکندر بخت۔"

"... مجال ہے کہ ایسی گستاخی کرے..."

... نے کہا "یہاں دھوکے کے کام میں بھی دھوکا ہو جاتا ہے۔ ... ایجنٹ ہیں جو لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ ... جعلی اللہ

نصیب! ابھی خاصی دولت ہوگی۔ تمہیں نام ولدیت حلیہ سب ... کے جعلی پاسپورٹ پر امریکا کینیڈا پہنچانے کا سارا بندوبست کرتے ہیں۔ ویزا تک لگ جاتا ہے۔ مگر وہی لوگ ایئرپورٹ پر اپنے کسی آدمی کو مطلع کر دیتے ہیں۔ یہ بدمعاش ایجنٹ کا اپنا بندہ ہوتا ہے جو آخری وقت میں خرچے سے مدد مارنے والے کو اسی وقت پکڑ لیتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ سارے مرحلے طے ہو گئے۔ اللہ کا شکر ہے۔ وہ سامنے جہاز کھڑا ہے۔ اس میں بیٹھے تو امریکا۔ وہیں تقدیر کی ... ہے۔ اب ذہنی طور پر خود کو دبئی یا امریکا میں ... کرنے والے کے لیے یہ بڑا جان لیوا صدمہ ہوتا ہے۔ یا تو وہ جیل جائے یا راستہ روکنے والے کا مطالبہ پورا کرے۔ ظاہر ہے وہ ... جیب خالی کراتا ہے اور کہیں نہ کہیں سے چندے کی صورت میں مطلوبہ رقم فراہم کر کے جانے والے کو ہوائی جہاز تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس آمدنی کا نصف وہی پکڑنے والے لے جاتے ہیں جو ہانکا کرنے والوں کی طرح شکار کو شکاری تک پہنچاتے ہیں۔ میرے کیس میں ایسا ہوا تو پکڑ لے دے کر بات نہیں بنے گی کیونکہ میں عام آدمی نہیں ہوں۔ ایک مجرم ہوں اور مجھے فرار میں مدد دینے والا خود بھی مشکل میں پڑ سکتا ہے۔"

"یار تم حلیہ مستقل طور پر بھی بدل سکتے ہو۔"

"وہ کیسے؟ داڑھی بڑھا لوں اور مونچھیں رکھ لوں۔ اس کے لیے کئی ماہ انتظار چاہیے۔ جیسے نہ کسی ..."

"تو ابھی تم ایک اسٹینڈرڈ حلیہ بنا لو یار۔ میرا مطلب ہے ایسا جو بعد میں اصلی ہو جائے۔" "تم فرنچ کٹ داڑھی رکھ لو اور جب تک اصلی داڑھی تیار نہ ہو اسی رنگ کی نقلی سے کام چلاؤ۔ کیا سمجھے؟ مونچھیں بھی چھوٹی اور واجبی سی۔ ہیئر اسٹائل بدلنا کوئی مسئلہ نہیں یار۔ کوئی بھی اچھا ہیئر ڈریسر تمہارے اچھے بھلے بالوں کا ستیاناس کر سکتا ہے۔ مثلاً سیدھے شریفانہ بالوں کو تم آئن اسٹائن جیسے الجھے ہوئے بے ترتیب بنا لو گھنگھریالے۔ ان کا کلر براؤن کر لو۔ تم براؤن کنٹیکٹ لینز بھی پہن سکتے ہو یا چشمہ بھی لگا سکتے ہو۔"

"مگر میری نظر کمزور نہیں ہے۔"

"نہ ہو۔ تم دن میں سن گلاس اور رات کو زیرو پاور کے لینز والا چشمہ لگا کے خود کو زیادہ سنجیدہ جیسے یا جعلی مذہبی اسکالر ... ظاہر کر سکتے ہو اور جب تک چاہو اسی حلیے میں رہ سکتے ہو یار۔ کون پہچانے گا تمہیں جب تم واپس آؤ گے۔"

"میں نے ابھی طے نہیں کیا کہ میں تمہارے ساتھ جا رہا ہوں۔ میں یہاں بھی روپوش رہ سکتا ہوں۔"

"تم نہیں رہ سکتے یار۔ تمہاری اپنی فطرت میں ... آفت تمہیں ڈھونڈتی ہے اور شامت اعمال کو تم آواز دیتے ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی مشکل اس ماحول میں اور ان حالات

میں۔ تم نے بکھیڑے بہت پھیلا رکھے ہیں اور تمہارے جذباتی مسائل بھی ہیں۔ مائنڈ یو۔ میں رابعہ کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ تمہارے دوست اور ساتھی ہیں۔ دشمن کے ساتھ بھی نفرت کے جذبات کا رشتہ تو ہوتا ہے اور یہ جذبہ زیادہ خرابی پیدا کرتا ہے۔ تمہاری نجات ان سب معاملات سے مکمل قطع تعلق میں ہے۔ کچھ دنوں کے لیے سب سے دور چلے جاؤ۔ سب کو بھول جاؤ۔ اتنی دور کہ تم چاہو یا کوئی اور چاہے تب بھی تمہیں مسائل کی دنیا میں نہ گھسیٹ سکے۔"

"فرض کرو میں کسی دور افتادہ گاؤں کے یا کسی خانقاہ کے حجرے میں جا بیٹھوں۔ کسی انڈر گراؤنڈ کمرے میں دو مہینے گزاروں جس کا کسی کو بھی علم نہ ہو۔"

"یار خود کو عذاب میں ڈالنے سے فائدہ۔ جو کام آسانی سے ہو جائے اسے اتنے مشکل طریقے سے کرنے کی ضرورت کیا ہے اور پھر اس میں سو فیصد ضمانت نہیں ہے اس بات کی کہ تم خود پریشان ہو کے یا کوئی بات سن کے دوبارہ میدان عمل میں نہیں کودو گے یا اکتاہٹ اور بیزاری سے تنگ آ کے چلے نہیں آؤ گے۔ رسک ہمیشہ رہے گا اور میں چاہتی ہوں کہ فی الحال تم اس دنیا سے ہی نکل جاؤ جس میں جینا تمہارے لیے روز بروز مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔"

"تم مجھے دوسری دنیا میں بھیج رہی ہو؟ ابھی سے؟"

"یار تم تیسری دنیا کے رہنے والے ہو۔ تمہیں دوسری دنیا میں لے جانا ہی تمہاری صحت اور سلامتی کی ضمانت ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کچھ عرصے کے لیے تم خود بھی بھول جاؤ کہ تم سکندر بخت تھے۔ اس وقت تک جب تک یہ دنیا سکندر بخت کو نہ بھول جائے۔"

"یہ ناممکن ہے۔ چند مہینے کیا چند سال بعد بھی۔"

"یار ممکن ہے۔ سو فیصد ممکن ہے۔" اس نے زور دے کر کہا "واٹ از ان اے نیم (نام میں کیا رکھا ہے) تم سکندر بخت سے پہلے کبیر خاں تھے۔ درمیان میں تم نے اپنا حلیہ کئی بار بدلا۔ کیا فرق پڑا اس سے؟ نئی پہچان ہوگی تو کیا فرق پڑے گا؟ تم دھوتی باندھ لو یا شیروانی پہن لو رہو گے وہی تم۔ ساری دنیا کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں کہ اصلیت کیا تھی۔ تمہیں معلوم ہے اور میرے علاوہ کتنے چند افراد کو معلوم ہے کہ مسٹر ... تو چار خانے کی لنگی باندھتے ... پر ... رکھا کرتا پہنتے ہیں اور قراقلی ٹوپی لگاتے ہیں۔ یا مولوی نعمت اللہ کی ریشمی دراز جناح کیپ اور شیروانی میں ملبوس سکندر بخت ہے۔ اس گیٹ اپ میں تم سب تک جا اور رہ سکتے ہو۔ سب کے درمیان رہ کے بھی سکندر بخت سب کی نگاہ سے اوجھل ہو۔ IS THAT IMPOSSIBLE (کیا یہ ناممکن ہے) نہیں یار۔ یہ تو بہت آسان ہے اور بہت پریکٹیکل۔ تم انجوائے کر سکتے ہو ایک نئی شخصیت کے نئے تجربات کو۔ ایک نئی لائف کے ایڈونچر کو جس کا ماضی روپوش ہو اور مستقبل محفوظ۔ ایک دیوار کھڑی کر دو گزرے ہوئے وقت اور آنے والے وقت کے درمیان جس کے پار کوئی تمہیں نہ دیکھ سکے۔ وہ دیوار تک نظر آئے کسی کو۔ بس تمہیں معلوم ہو کہ دیوار کے ادھر تمہارا ماضی ہے اور وہ سب ہے جو سکندر بخت کے نام سے منسوب ہے۔ دیوار کی دوسری طرف بھی تم ہو مگر ایک محفوظ مستقبل کے ساتھ۔ تمہارے تعاقب میں لگے ہوئے شکاری بھی اس دیوار کو عبور کر کے تم تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ تمہاری بو تک نہیں پا سکتے۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات کو یار؟"

میں اسے پلک جھپکائے بغیر حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی اسکیم کو یکسر احمقانہ اور ناقابل عمل سمجھ کے مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ قابل غور تھا۔ جیسے FANTASY پر مبنی کسی فلم کا خیال جسے ایک کامیاب فلم بنا کے پیش کیا جا سکتا ہو۔ ایک ABSTRACT خیال جس کو مصور رنگ دے کر تصویر کے قالب میں ڈھال سکتا ہو اور شاعر الفاظ کا پیراہن دے کر طویل نظم لکھ سکتا ہو۔ شکوہ اور جواب شکوہ کی طرح۔ یا نظریہ اضافت کی طرح جس کو بنیاد بنا کے ہیرو شیما پر ایٹم بم گرایا جا سکتا ہو۔

"کیا سوچ رہے ہو یار؟ میں نے کوئی بہت احمقانہ بات کی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے لیے یہ بہت بڑا چیلنج ہے۔ تمہاری صلاحیت ... سے تو حوصلے سے زیادہ۔"

میں نے اٹھ کے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا "معلوم نہیں تمہارے دماغ میں یہ خیال کیسے آیا۔ میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا۔"

"ہر خیال ہر شخص کی کھوپڑی میں نہیں آ سکتا۔ قطعی طور پر یہ ایک حقیقت ہے۔" اس نے گویا اعلان کیا۔

"ہاں۔ کسی اور نے بھی ایسا نہیں سوچا کبھی۔"

"یار میں نے سوچا تو کیا غلط سوچا؟ بس یہ بتاؤ مجھے۔"

"نہیں۔ غلط کہنا تو مشکل ہے لیکن آسان سمجھنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ مجھے مشورہ کرنا ہوگا اور سوچنا پڑے گا۔ جو تم نے کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے مس شیلی کہ میں سکندر بخت کو اس کے ماضی کے ساتھ دفن کر دوں۔ کم سے کم وہ دنیا کے لیے مر جائے اور اس کی جگہ آ جائے ایک اجنبی۔ وہ اچانک اس دنیا میں وارد ہو جائے اور اپنی جگہ بنا لے۔ اس کا ماضی کوئی نہ ہو۔ یا ایک پراسرار، مبہم سا حوالہ ہو جس سے وہ معتبر ہو جائے، مشکوک نہ رہے۔ لیکن اس کی تصدیق اور تردید کوئی نہ کر سکے... رائٹ؟"

"رائٹ۔ یہی ہے وہ گریٹ آئیڈیا۔" شیلی نے مسرت سے کہا۔ "میں کسی جادوگر کی طرح تم کو اڑن چھو کر کے ساتھ لے جا رہی ہوں یار۔ لندن میں تمہاری شخصیت کو نیا قالب دینے میں ...

www.paksociety.com

وقت ضرور لگے گا لیکن اس کے بعد جب تم واپس آؤ گے تو تمہارے سر پر ہوگی سلیمانی ٹوپی' تم چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے ہنر شکاری کو دیکھ سکو گے مگر وہ اندھوں کی طرح ادھر سے ادھر دوڑتے رہیں گے اور سکندر بخت کی تلاش میں پاگل ہو جائیں گے مگر سکندر بخت انہیں نہیں ملے گا۔"

شیلی کی تجویز نے میرے ذہن کی تاریک سرنگ کے دہانے پر روشنی پھیلا دی تھی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے سوچ سمجھ کے پلاننگ کی ضرورت پڑے گی اور دوستوں کے تعاون کی۔ یہ چال ابھی چوہدری دلاور کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ وہ خود کوئی ایسی چال اس لیے نہیں چل سکتا کہ اسے چوہدری دلاور کے نام پر سیاست کی دکان چلانی ہے۔ چوہدری دلاور کے قانونی اور غیر قانونی کاروبار پر اس نام کی چھاپ ہے۔ اس کے لیے اپنا نام بدلنا ممکن ہی نہیں۔ وہ جس عورت کا شوہر ہے اس کے بچوں کا باپ چوہدری دلاور ہے۔ وہ غائب نہیں ہو سکتا۔ میرے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ قانونی طور پر میں نہ کسی کاروبار کا مالک ہوں نہ کسی کا شوہر نہ کسی کا باپ۔ مجھے کسی سے اپنے نام پر ووٹ نہیں مانگنے ہیں' پوسٹر اور بینر نہیں بنانے ہیں۔ مجھے کسی کے حلقہ انتخاب میں اس نام کی شناخت کا مسئلہ نہیں۔ صرف ایک ہی مسئلہ ہو سکتا ہے میرے لیے اور وہ ہے مرحوم وزیر خاں کے حق وراثت کا۔ تو اس کا میں نے پہلے ہی انتظام کر رکھا ہے۔ میرے وکیل اور تمام معاملات کے لیے جنرل پاور آف اٹارنی رکھنے والا محسن ہے اور وہ سب اٹارنی کے اختیارات منظر کو بھی دے سکتا ہے' رابعہ کو بھی اور غالب کو بھی۔ قانونی طور پر کسی لاپتا ہو جانے والے شخص کو سات سال کا عرصہ گزرے بغیر مردہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ فیصلہ بھی کسی درخواست پر کوئی عدالت مجاز ہی صادر کر سکتی ہے۔ ساتویں سال کے آخری دن میں اچانک نمودار ہو جاؤں تو بہ حیثیت سکندر بخت میرے تمام شہری اور قانونی حقوق بحال۔ سات سال تک بقول ڈاکٹر شیلی میں سلیمانی ٹوپی پہن کے سب کے بیچ میں رہوں مگر کسی کو نظر نہ آؤں۔ شکاری میرے تعاقب میں آسمان سے زمین تک اور پاتال تک چھان ماریں۔ بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑائیں یا خلا میں تلاش کریں۔ سکندر بخت سب کچھ دیکھتا رہے مسکراتا رہے اور وہ کرتا رہے جو سکندر بخت ہی کر سکتا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں کو سکندر بخت دکھائی نہ دے۔ چند آنکھوں کے سوا اسے کوئی نہ پہچانے۔

آہستہ آہستہ مجھ پر اس خیال کی افادیت عیاں ہوتی جا رہی تھی اور میں نے اصولی طور پر اس کے عملی پہلو پر غور کرنا شروع کر دیا تھا لیکن یہ ایسا فیصلہ نہیں تھا جو میں تنہا کر سکتا۔ اس کے لیے مجھے مشورے اور سوچ بچار کی ضرورت تھی۔ اصل فیصلہ نام اور شخصیت بدل کے نیا جنم لینے کا نہیں تھا۔ مشکل فیصلہ انتخاب کا تھا کہ اگر میں اس دنیا میں کسی اور نام' چہرے اور حلیے کے ساتھ نمودار ہوتا ہوں تو یہ راز کی بات کس کس کو معلوم ہونی چاہیے۔ ایک طویل عرصے تک کس میں رازداری کے امتحان میں پورا اترنے کا حوصلہ ہوگا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا کہ کوئی اپنی ہی دنیا میں اجنبی بن کے زندگی گزار سکے۔ یہ کوئی عام زندگی بھی نہیں ہوگی۔ اس کے مرحلے اور مسئلے سب وہی ہوں گے جو آج ہیں۔ مجھے سب سے اسی طرح نمٹنا ہوگا جیسے آج نمٹتا ہوں۔ اس نئی زندگی میں یہ خوف دامن گیر نہیں ہوگا کہ میں پکڑا گیا تو مجھے سیدھا تختہ دار پر پہنچا دیا جائے گا لیکن افشائے راز کا خوف بہرحال ہر قدم پر لاحق ہوگا۔ مجھے ہی نہیں' مجھے جاننے پہچاننے والوں کو بھی بہت زیادہ احتیاط لازم ہوگی۔

شیلی بیڈ پر نیم دراز مجھے غور سے دیکھ رہی تھی اور یہ بات یقیناً اس کے لیے باعث طمانیت اور مسرت ہوگی کہ وہ مجھے پٹری سے اتارنے اور کانٹا بدل کے دوسرے ٹریک پر لانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اس اسکیم کی موجد و خالق کی حیثیت سے وہ اپنا کردار بھی اتنا ہی لازم و ملزوم سمجھ رہی ہوگی جیسے روشنی کے ساتھ سائے کا ساتھ مگر میرے ذہن میں ایسا نہیں تھا۔ یہ میرے مسائل کا حل اور مستقبل کی حکمت عملی میں مددگار ثابت ہونے والا فیصلہ ہو سکتا تھا مگر اس میں ڈاکٹر شیلی کے ہونے نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ شاید اس کا نہ ہونا ہی میرے حق میں زیادہ سودمند ہوتا مگر اسے اسکیم سے خارج کرنا عملاً اتنا ہی ناممکن تھا جتنا کسی مشینی نظام کو متحرک رکھنے والے کسی پرزے کو الگ کرنا۔ کسی گھر کا نقشہ ایک باتھ روم کے بغیر بھی مکمل نہیں ہوتا' خواہ باتھ روم کے مسائل کتنے ہی ناپسندیدہ کیوں نہ ہوں۔

"اُف یار۔ اب بس بھی کرو۔ کیا سیارے کی طرح ایک ہی مدار میں گھوم رہے ہو۔" شیلی کے صبر کا جو پیمانہ بالآخر جواب دے گیا "خواہ مخواہ خالی دماغ پہ۔ میرا مطلب ہے' خالی پیٹ والے دماغ پر اتنا زور ڈال رہے ہو۔"

میں نے اس کے سامنے بیٹھ کے کہا "اچھا کیا جو مجھے یاد دلا دیا کہ کھانا بھی ضروری ہے۔"

"تم چاہو تو چلتے رہو یار۔ پیٹ سے گردے جب ٹانگوں میں جان نہیں رہے گی اور پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا جائے گا کہ فاقے سے ہلاکت ہوئی۔"

"تم بڑی ہولناک باتیں اتنی آسانی سے کر لیتی ہو۔ یہ سب نتیجہ ہے کاکروچ اور مینڈک سے لے کر انسانی لاشوں تک سب کو کاٹنے کا۔"

"میڈیکل سائنس کے اصول جذبات کے تابع نہیں ہوتے۔"

میں نے کہا "مگر ہم نے یہاں کھانا منگوایا تو ہماری پوسٹ

مارٹم رپورٹ میں لکھا جائے گا۔ زہر خورانی سے ہلاکت ہوئی۔ لیٹ اس گو آؤٹ سم ویئر LET'S GO OUT SOME WHERE (چلو کہیں باہر چلیں)"

"کہاں جانا چاہیے؟" ایک منٹ۔" وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

میں نے اپنے حلیے پر نگاہ ڈالی "یہ لباس فاخرہ تبدیل لوں۔"

وہ میرے لیے دو شرٹس پتلونیں اور جوتے لائی تھی جو حیرت انگیز طور پر بھی میرے سائز کے ثابت ہوئے۔ میں نے دس منٹ میں غسل کیا اور باہر نکلا تو بالکل بدلا ہوا شخص تھا۔ میری نظر شیلی پر پڑی تو ایک لمحے کے لیے میں پلک جھپکانا بھول گیا۔ اس نے وہ کمال ساری بدل لی تھی جو گزشتہ چوبیس گھنٹے سے اس کے جسم پر تھی۔ اب اس نے ہلکے سبز رنگ پر ننھے ننھے شوخ زرد رنگ کے پھولوں والا شلوار قمیص سوٹ پہن لیا تھا جسے دیکھ کر بسنت رت اور سرسوں کے پھولوں کی بہار یاد آتی تھی۔ اس کے سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں کے ساتھ یہ رنگ اور بھی نکھر آیا تھا۔

مگر اس سے پہلے کہ میں اظہار کرتا اس کے حسن کو خراج تحسین پیش کرتا اس نے خوش ہو کے کہا "یو آر لکنگ ہینڈسم" YOU ARE LOOKING HANDSOME (تم اچھے لگ رہے ہو تم)

یہ مغربی تہذیب کے ماحول کی پرورش کا نتیجہ تھا کہ اس نے شرمائے بغیر وہ بات کہہ دی جو مجھ سے کبھی رابعہ نے نہیں کہی تھی۔ حیا اور جھجک ہمارے ماحول میں بہت سی پابندیاں عائد کر دیتی ہے۔ خصوصاً عورت پر جو اپنے جذبات کا اظہار تک نہیں کر سکتی' خواہ یہ جذبات کتنے ہی حقیقی اور معصوم کیوں نہ ہوں۔ میں نے بھی جب شیلی سے کہا کہ وہ بے حد حسین لگ رہی ہے تو اس نے ایک فطری خوشی کے ساتھ "تھینک یو" کہا۔ یورپی اقوام کی کچھ عادات یقیناً اچھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ تنقید سے گریز کرتے ہیں۔ خصوصاً دل آزار تنقید سے۔ وہاں کوئی کہے کہ "یار یہ کیا پہن لیا" تو سخت بد اخلاقی کی بات ہوگی۔ لوگ ایک دوسرے کے گھر جاتے ہیں تو گھر کی آرائش کیا باغ کی تعریف لازمی ہے۔ اسی طرح نئے لباس میں کسی کی تعریف نہ کرنا بد تہذیب ہونے کا ثبوت دینے کے مترادف ہے۔

"تمہارا چوائس میرے لیے بھی بہت اچھا ہے" میں نے کہا۔

"رنگ۔ تمہیں پسند آیا میرا انتخاب؟"

"تم تو جیسے مجھ سے پوچھ کے گئی تھیں۔ سائز' رنگ' ڈیزائن سب پرفیکٹ۔ کیسے اندازہ کر لیا تھا تم نے؟" میں نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر انسانی جسم کی رگ رگ سے واقف ہوتے ہیں یار۔ ایک نظر میں سب دیکھ لیتے ہیں۔" وہ مسکرا کے بولی "اب چلو۔ مجھے ڈر ہے کھانا کہیں نہیں ملے گا۔ یہ کوئی وقت ہے۔"

"اور سب چلتا ہے ڈاکٹر شیلی۔ ہر وقت ہر چیز ملتی ہے۔ رات کے دو بجے ریلوے اسٹیشن سے لے کر گوال منڈی تک سب کچھ ملتا ہے۔ تکے کباب' لسی' برف اور ربڑی' پوری چھولے' پراٹھے اور کٹا کٹ۔"

"اُف۔ سب ہائی کولیسٹرول۔ ہائی بلڈ پریشر اور ذیابیطس اور جگر کی خرابی کے اسباب۔"

میں نے کمرے کو لاک کرتے ہوئے کہا "پنجاب کے جیالوں کی صحت دیکھو ڈاکٹر صاحبہ۔ ان کے رنگ روپ' قد کاٹھ کو دیکھو۔ انہیں اکھاڑوں میں اور کھیل کے میدانوں میں دیکھو۔ ملک کی دفاعی قوت میں دیکھو۔"

"بعد میں دیکھوں گی یار۔ ابھی اتنا وقت نہیں ہے اور میں کھانا چاہتی ہوں چاہیے۔ خواہ اس کے لیے مجھے چین جانا پڑے۔" وہ ہنسی۔

"افسوس ناک بات یہ ہے کہ میری جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔ دیکھنے میں تمہارے ساتھ چلتے ہوئے میں ڈپٹی کمشنر کا سالا لگتا ہوں۔"

"میں نے ٹریولر چیک کیش کرا لیے تھے۔ تقریباً چالیس ہزار کے۔ کچھ تم رکھ لو۔"

"ابھی رہنے دو۔" میں نے کہا "غالب کے پاس میرے پیسے پڑے ہیں۔"

نیچے اترتے ہوئے میں نے ہر طرف نگاہ رکھی۔ اگر کوئی ہمارے ساتھ ہی کسی کمرے سے برآمد ہوتا تو میں محتاط ہو جاتا۔ چوتھی منزل سے لفٹ میں سوار ہو کے میں تیسری منزل پر اتر گیا اور شیلی کے ساتھ ایک طرف کھڑا رہا لیکن نہ کوئی زینے سے اتر کے آیا اور نہ لفٹ اوپر گئی۔

ہال میں ایک میز پر چار افراد بیٹھے تھے' دوسری پر ایک مرد اور عورت۔ میں نے چابیاں کاؤنٹر پر دیں اور باہر نکلا تو ایک شخص فوراً آگے آیا۔ "کار سر؟" وہ ڈرائیوروں جیسی وردی میں تھا۔

شیلی نے کہا "نہیں۔ تھینک یو" اور پھر مجھ سے فرنچ میں بات کی "یہ وہی ہے جس کے ساتھ میں شاپنگ کے لیے گئی تھی۔"

ڈرائیور کی آواز سے مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں نے پہلے بھی یہ آواز سنی ہے۔ شیلی کی بات نے میرے شک کو ہوا دی "کیا اس نے پریشان کیا تھا؟"

"نہیں۔۔۔ پریشان تو نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں بار بار کہاں غائب ہو جاتا تھا۔ دوبارہ میں شاپ سے نکلی تو کار موجود مگر ڈرائیور ندارد۔"

"اچھا۔ پھر فوراً ہی آ جاتا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ معلوم نہیں کہاں چھپ کے کھڑا ہو جاتا تھا۔"

میں نے کہا "ہم اسی کے ساتھ چلیں گے۔"

ڈرائیور کچھ نہیں سمجھا تھا اور اس نے اپنے تاثرات کو چہرے سے بھی عیاں نہیں ہونے دیا تھا۔ میں سب سمجھ گیا تھا۔ میں نے اسی کی آواز فون پر سنی تھی۔ وہ یقیناً لہجہ بدل کے بول رہا تھا مگر

www.paksociety.com

اس کی آواز کی PITCH وہی تھی۔ "پچ" کا متبادل اردو لفظ کوئی نہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ آواز پتلی تھی یا بھاری تھی۔ یا یہ کہ درمیانی تھی۔ سن بلوغت کے ساتھ ہی لڑکوں کی آواز کی پچ بدل جاتی ہے اور تبدیلی کے دوران سب کو ان کی آواز مضحکہ خیز لگتی ہے۔

ڈرائیور کے غائب ہونے کی بات سن کے ساری صورت حال مجھ پر واضح ہوتی گئی۔ وہی تھا جس کا سب [illegible] تھا اور کسی نے اسے بھاری معاوضے پر ہماری نقل و حرکت کی نگرانی کے علاوہ یہ ذمہ داری بھی سونپ دی تھی کہ وہ ہر خبر آگے پہنچائے۔ شاید دولت کی قوت خرید نے اسے جائز ناجائز ہر کام پر بھی مجبور کردیا تھا۔ شاید اس نے کسی بیرے سے مل کے ذرا سی دیر کے لیے اپنی وردی پہنی تھی اور ہمارے کمرے میں کافی پہنچانے کے بعد واپس کردی تھی۔ ڈرائیور سے بیرا اور پھر سے ڈرائیور بن جانے کے بعد اس کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ اس نے خود اپنی کار شبلی کے سامنے لا کھڑی کی ہوگی اور شاید کرایہ بھی کم بتایا ہوگا کہ ہوٹل کی انتظامیہ نے اسے بلایا۔ قصور انتظامیہ کا تھا نہ رینٹ اے کار سروس چلانے والوں کا۔ انہیں کیسے معلوم ہوسکتا ہے کہ عام حالات میں ایمانداری اور شرافت سے ڈرائیونگ کرنے والا شخص [illegible] قیمت وصول کرکے خلاف قانون کام کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ یہ بات تو ہر دور جانتے تھے کہ [illegible] فروخت [illegible] نہیں ہوتا۔

یہ ساٹھ [illegible] سال پہلے کی اولڈ ماڈل کار تھی۔ [illegible] نے بڑے پیار سے سنبھال کے رکھا تھا اور کرائے کی کار [illegible] کے معمول استعمال ہونے کے باوجود یہ بہت سی اچھی [illegible] ماڈل کاروں سے زیادہ خوب صورت اور آرام دہ تھی۔ اس کا نمبر میں نے پہلے ہی ذہن نشین کرلیا تھا۔

"تم اس شہر سے تو واقف ہوگے؟" میں نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کہا "کب سے کررہے ہو یہ کام؟"

"دس سال ہوگئے سر!" اس نے جواب دیا اور میں نے پھر اس کی آواز پر غور کیا تو شک کی گنجائش نہ رہی۔

شبلی پیچھے میرے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کچھ حیران تھی کہ میں نے اس کے انکار کو اہمیت کیوں نہیں دی تھی اور وہی گاڑی کیوں لے لی تھی مگر اس نے وجہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ "تمہیں تو معلوم ہوگا کہ اس وقت [illegible] ریسٹورنٹ کہاں کھلے ہوں گے؟"

شبلی نے سوال مجھ سے کیا تھا مگر جواب ڈرائیور نے دیا "یس میڈم! میں آپ کو لے چلتا ہوں۔ گلبرگ میں رات بارہ ایک بجے تک ریسٹورنٹ کھلے رہتے ہیں۔ ابھی تو گیارہ بجے ہیں۔"

اس نے گاڑی کو بائیں طرف موڑ لیا تھا اور یہ سڑک [illegible] آباد نظر آتی تھی۔ "نام کیا ہے تمہارا... ڈرائیور؟"

اس نے پیچھے دیکھے بغیر کہا "افضل دین سر۔"

شبلی چونکی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر انگلی سے لکھا "افضل... خان" جو مجھے یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ ہمیں ڈرائیور نے اپنا نام افضل خان بتایا تھا اور غالباً یہ بات بھول گیا تھا۔

اچانک میں نے فون پر گفتگو کرنے والے کا لہجہ بنایا "ذرا ہوشیار ہو۔ پھر پڑھے لکھے بھی ہو یار۔"

اس نے اپنے ردعمل کو ظاہر نہیں ہونے دیا مگر میں نے اسٹیئرنگ وہیل پر اس کی گرفت سے اندازہ کرلیا کہ تیر ٹھیک نشانے پر لگا ہے۔ گاڑی ذرا سی لہرائی اور پھر سیدھی دوڑنے لگی تھی "جی... یس سر... میٹرک کیا تھا۔ کالج جانے کا شوق تھا۔ حالات نے مجبور کردیا۔"

"مجبوری بڑی بری چیز ہے یار۔ آدمی کو اپنا ضمیر اور ایمان بھی بیچنا پڑے تو وہ پیٹ کی خاطر بیچ دیتا ہے۔ وہ کام کرسکتا ہے جو نہیں کرنا چاہتا۔ کیا سمجھے؟ ایک حد ہوتی ہے ہر شخص کی جہاں تک وہ مزاحمت کرتا ہے۔ ضرورت اور پریشانی میں دس ہزار بھی بڑی رقم لگتے ہیں اور جب کوئی پچیس دلا دے کہ یہ بہت [illegible] تمہیں [illegible] دیکھو ایک [illegible] کام بھی مشکل نہ لگے [illegible] کیا اب تخت یا تختہ [illegible] حوصلہ دے [illegible] چھ [illegible] بیٹا [illegible] تمام [illegible] کریں گے تو پھر افضل دین ہو یا افضل خان ڈرائیور ہو یا [illegible]۔"

اس نے [illegible] تمام کہا "میں... مطلب نہیں سمجھا سر؟"

"سمجھ لوگے یار... یہ بتاؤ تمہیں کچھ شعرو شاعری سے بھی شوق ہے؟" میں نے کہا "یا ایکٹنگ کا۔ مجھے ایسا لگتا ہے یار کہ تمہاری آواز میں نے کسی ریڈیو ڈرامے میں سنی ہے [illegible] بڑا ہوا تھا۔"

اس نے ایک دم گاڑی روک لی "کیا کہنا چاہتے ہو؟" [illegible] کے بولا تو اس کا لہجہ ہی نہیں چہرہ بھی خطرناک ہوگیا تھا۔

میں نے اس کی گردن کو پیچھے سے پکڑنے میں دیر نہیں کی۔ [illegible] جوان اور طاقتور آدمی تھا مگر اسے میری پروفیشنل گرفت کا اندازہ نہیں تھا۔ اس نے اوپر نیچے ہاتھ چلائے اور مجھے پکڑنے کی کوشش کے ساتھ ہی اپنی گردن چھڑانے کے لیے زور لگایا۔

میں نے کہا "بیکار ہے یار۔ کیوں اپنی گردن تڑواتے ہو۔"

اس کا پاؤں کلچ پر سے ہٹ گیا۔ گاڑی نے ایک جھٹکا [illegible] اس کا انجن بند ہوگیا۔ شبلی خلاف توقع پریشان نہیں ہوئی [illegible] نے دروازہ کھولا، نیچے اتر کے وہ آگے گئی اور اس نے [illegible] کر کے گاڑی کی چابیاں نکال لیں۔ میں نے اس کی [illegible]

اور جانے [illegible] کا اعتراف کیا۔ ڈرائیور نے اس وقت تک مزاحمت چھوڑ دی تھی۔

"اب بولو۔ تم افضل دین ہو یا افضل خان؟ جھوٹ نہیں چلے گا بعد میں تمہارے کاغذات بھی دیکھوں گا" میں نے کہا "یہاں کوئی تمہاری مدد کرنے نہیں آئے گا۔ وہ بھی نہیں جنہوں نے تمہیں ایک پیشہ ور قاتل بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ایک بار تم اس راستے پر چل پڑے تو وہ تمہیں بلیک میل کرتے یا تم خود ہی جرم کی راہ اختیار کرتے۔ دس سال ڈرائیونگ کرکے تم نے اتنا نہیں کمایا ہوگا جتنا ایک دن کی کارگزاری پر ملا۔ بولو کتنا پیسہ لیا تھا؟"

آخری جملے کے ساتھ ہی میں نے ایک جھٹکا دیا تھا۔ وہ اگلی سیٹ پر الٹا پڑا ہوا تھا اور اس کا سر سیٹ پر ایسے دبا ہوا تھا کہ وہ صرف میرے پیروں کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پہلے میری کمر کے گرد تھے اور وہ مجھے دبانے کے لیے زور بھی لگا رہا تھا مگر اس کا سانس رکنے لگا تو ہاتھ خود بخود نیچے لٹک گئے اور وہ ٹانگیں چلانے لگا۔ اس کے پاؤں ڈیش بورڈ سے ٹکرانے لگے۔

"میں... میں بتاتا ہوں۔"

شبلی نے کہا "دیکھو یہ مر نہ جائے کہیں۔"

میں نے کہا "مر جائے تو مجھے کیا۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ کیوں یار۔"

میری گرفت ڈھیلی پڑی تو اس نے لمبی سانس لی "تم وہ نہیں... نہیں جانتے..."

میں نے پیچھے سے گھٹنا اوپر اٹھا کے اس کی ناک پر مارا "تم مجھے نہیں جانتے۔"

وہ بلبلایا "انہوں نے دھمکی دی تھی..."

"دھمکی میں بھی دے رہا ہوں۔" میں نے کہا "تم نے مجھے سب کچھ اسی وقت نہ بتایا تو تمہاری لاش یہاں صبح تک پڑی رہے گی۔ آسان کام ہو تو معاوضہ کوئی زیادہ نہیں دیتا۔ اور جو [illegible] تمہاری زندگی جان کی بازی لگاتے ہیں کیونکہ [illegible] نہیں اپنی جان زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میں سچ تمہارے حلق سے یوں اگلواؤں کہ تم بعد میں جھوٹ بولنے کے قابل ہی نہ رہو۔"

"بتاتا ہوں۔" اس نے کراہتے ہوئے کہا "مجھے چھوڑو۔"

اب شبلی نے پھر میری مدد کی۔ اس نے اپنے بیگ سے زنانہ [illegible] کا ریوالور نکال کے اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ "یار اس سے تمہارے سر میں چھوٹا سا سوراخ ہوگا۔ نہ کوئی فائر کی آواز سنے گا نہ تمہارے مرنے کا کسی کو علم ہوگا۔ آرام سے پیچھے چلے جاؤ۔ [illegible] چلاؤں گی۔"

وہ سخت دہشت زدہ ہوگیا تھا۔ اس نے شبلی کے حکم کی تعمیل کی اور اگلی دونوں سیٹوں کے درمیان سے گزر کے میرے ساتھ آبیٹھا۔ شبلی نے باہر جاتے ہوئے کھڑکی میں سے ریوالور کا رخ اس کی طرف رکھا۔ میں خود بھی اس سے نمٹ سکتا تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا حوصلہ جواب دے چکا ہے۔ وہ پیشہ ور مجرم نہیں تھا۔ شاید اس نے زندگی میں پہلی بار بڑے معاوضے کے لالچ میں بڑا جرم کرنے کی کوشش کی تھی۔ چھوٹے موٹے جرائم تو ہم سب ہی کرتے ہیں خواہ وہ ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کی صورت میں ہوں یا انکم ٹیکس کے غلط گوشوارے کی صورت میں۔

شبلی نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور آہستہ آہستہ چلانے لگی "مجھے راستہ بتاتے رہنا۔"

"ابھی ناک کی سیدھ میں چلو۔ آگے سے بائیں جانب" میں نے کہا اور اس شخص کی طرف متوجہ ہوگیا جو اب سسکیاں لے کر رو رہا تھا اور ناک سے ٹپکنے والے خون کو آستین سے صاف کرتا جارہا تھا "بولو یار۔"

"میں اسے نہیں جانتا... اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔"

"اس کا حلیہ بتاؤ۔ نام ہم بتادیں گے۔"

"وہ... کالا سا... بلکہ [illegible] کا تھا جیسے اپنے بلوچستان کی طرف بھی ہوتے ہیں۔"

"مکرانی تھا؟" میں نے کہا "موٹے ہونٹ، پکوڑا ناک اور چھوٹے سخت اور سیاہ گھنگریالے بال؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "آپ... جانتے ہیں؟"

"ایک کان میں [illegible] کی مندری" میں نے کہا "کب آیا تھا وہ تمہارے پاس؟"

"آج دوپہر۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے آپ کے بارے میں کس سے پوچھا تھا" وہ بولا "اور کس نے اسے میرے پاس بھیجا تھا۔ میں ادھر کھڑا ہوا تھا جب اس نے گاڑی میں بیٹھ کے بولا کہ چلو۔ میں چل پڑا تو اس نے بھی یہ پوچھا کہ نام کیا ہے، کب سے گاڑی چلا رہے ہو۔ اس ہوٹل میں رینٹ اے کار سروس کے ساتھ مہینے میں کتنا کما لیتے ہو۔ میں نے بتایا کہ گاڑی میری اپنی ہے اور مہینے کے دو تین ہزار بچ جاتے ہیں مگر اب شاید گاڑی بیچنی پڑے گی۔ مکان بیچ کے گاڑی لی تھی۔ ہر مہینے کچھ بچاتا رہا۔ وہ سب ماں کی بیماری اور ایک آپریشن میں لگ گیا۔ ماں پھر بھی مرگئی۔ اب ایک بہن کی شادی کرنی ہے۔ ماں نے رشتہ کیا تھا اور مرتے وقت کہا تھا کہ تاریخ مت بڑھانا۔ ایسا نہ ہو کہ یہ منگنی بھی ٹوٹ جائے۔ پہلی بار مجبوری تھی۔ لڑکا دبئی چلا گیا تھا اور وہاں اسے نوکری ہوگئی تھی۔ یہ دوسرا رشتہ قسمت سے آگیا تھا۔ وہ لوگ تھے۔ تیاری کے لیے ہم پہلے بھی کافی وقت لے چکے تھے۔ ابھی اس لڑکے کی ماں نے [illegible] خود بتایا تھا کہ میں مجبور ہوں اور دیر کی تو ماں [illegible] اور رشتہ [illegible] دے گی۔"

www.paksociety.com

"یہ سب خود تم نے بتایا یا وہ پہلے سے جانتا تھا؟"

اس نے کہا "میں نے بتایا تھا۔ وہ بڑا ہمدرد نظر آتا تھا۔ آدمی دکھی ہو تو دل کی بات کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ماں کو مرے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ آج گیارھواں دن ہے۔ اس کے چہلم سے پہلے رخصتی ہوگی۔ ظاہر ہے اس کے لیے گاڑی ہی بیچی جا سکتی ہے۔ پھر میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ زندگی گزارنے کے لیے کچھ بھی کروں گا۔"

میں نے کہا "اس نے معلوم کر لیا ہوگا کہ تم زیادہ مجبور ہو۔ تمھیں آسانی سے خریدا جا سکتا ہے۔"

اس نے کہا "فضل دین۔ یہی اصلی نام ہے میرا سر۔ آپ میرا ڈرائیونگ لائسنس دیکھ لیں۔" وہ بولا "اس نے کہا کہ گاڑی مت بیچو۔ ایک کام ہے میرا۔ اگر ہمت ہے تو یہ لو پچاس ہزار ایڈوانس۔ آدھی رقم بعد میں۔ اس نے تو سر ایک دم نوٹوں کی گڈی میرے سامنے ڈال دی۔ بس میں کیا بتاؤں' اتنی بڑی رقم دیکھتے ہی مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ایک لاکھ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ اندازہ تو میں نے کر لیا تھا کہ کام مشکل اور خطرناک ہوگا ورنہ وہ خود کر لیتا۔ میں نے کہا کہ قتل کے سوا میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ پکڑا گیا تو جیل ہوگی نا۔ ہو جائے۔ میں چھ سات سال اندر کاٹ لوں گا لیکن میں پھانسی قبول نہیں کر سکتا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس ہوٹل میں مسٹر اور مسز رستم جی بھن والا ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان پر نظر رکھنی ہوگی اور مجھے رپورٹ دینی ہوگی۔ میں سامنے نہیں آؤں گا مگر تم پر نظر رکھوں گا اور جب ضرورت ہوئی ہدایات دینے آجاؤں گا۔ دوپہر کے بعد اس نے کہا کہ فضل دین' کسی ویٹر کو اپنے ساتھ ملا لو یا خود ویٹر بن کے اندر جاؤ۔ وہ کافی ضرور منگوائیں گے شام کو۔ تمھیں کافی میں یہ دوا ملانی ہوگی۔ یہ زہر نہیں ہے' نیند کی دوا ہے۔ میں ڈر گیا۔ میں نے کہا کہ کیا ثبوت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مجھ پر ایک ساتھ دوہرے قتل کا الزام آجائے۔ بہن کی شادی کے لیے میں زندگی کے پانچ چھ سال تو قربان

کر سکتا ہوں' یہ میری زندگی کی قیمت نہیں ہو سکتی۔ اس نے مجھے ایک ڈاکٹر کا نسخہ دیا کہ تو خود جا کے کسی کیمسٹ سے معلوم کر لو اور یہ دوا خرید لو۔ بس اس کے بعد میں کچھ مطمئن ہو گیا۔"

میں نے کہا "تم نے خود وہ دوا کافی میں ملائی تھی؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "پہلے میں نے سوچا تھا کہ کسی ویٹر کو ساتھ ملا لوں لیکن اس میں خطرہ تھا۔ ویٹر شکایت کر دیتا تو پولیس مجھے پکڑ لیتی۔ عین وقت پر میں بہن کی رخصتی کے معاملے کو بگاڑ دیتا تو ساری عمر یہ خیال رہتا کہ اس کی زندگی کو میں نے تباہ کیا۔ پھر شاید کبھی اس کی رخصتی نہ ہوتی۔ اس سے تو بہتر یہی تھا کہ میں گاڑی بیچ کے بڑے بھائی کا قرض ادا کروں اور میرے ضمیر پر بوجھ کوئی نہ ہو۔ اگر کوئی ویٹر مان بھی جاتا تو آدھی رقم ضرور مانگتا۔ شاید زیادہ کیونکہ

اصل کام تو اسے ہی کرنا تھا۔ اور پچاس ہزار بھی نہ ملیں تو ایسے کام میں ہاتھ ڈالنے سے کیا فائدہ۔"

"یعنی ایک لاکھ میں تمھارے نزدیک وہ کام جائز ہو تا جو پچاس ہزار میں برا تھا؟" میں نے طنز سے کہا۔

"آپ جو مرضی سمجھ لیں جی۔ بندہ کنویں میں جانتے بوجھتے گرتا ہے تو دیکھ لیتا ہے کہ کنواں کتنا گہرا ہے۔ اس میں پانی ہے کہ یا پتھر روڑے ہیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں ہی ٹوٹیں گے یا لاش ہی باہر آئے گی۔"

"پھر تم نے یہ کام کیسے کیا؟"

"میں اندر آتا جاتا رہتا ہوں۔ سب مجھے جانتے ہیں۔ کچھ سمجھتے ہیں کہ کسی مسافر سے کوئی بات کرنی ہوگی یا کسی نے مجھے بلایا ہوگا۔ مجھے معلوم تھا کہ لانڈری کدھر ہے اور اسٹور کہاں ہے۔ میں نے وردی حاصل کر لی اور وہیں اسٹور میں بدل لی۔ اس پر جو نمبر تھا وہ پرانا تھا۔ شاید کبھی کسی ویٹر کو ملا ہوگا۔ اس نمبر کے ساتھ پکڑا جانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ویٹر سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ میں نے نمبر ہٹا دیا اور پھر روم سروس کے قریب ہی ٹرے لے کر دروازے کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ جب کوئی ویٹر گزرتا تھا تو میں منہ دوسری طرف کر لیتا تھا۔ بالآخر فون پر بٹلر نے آپ کے کمرے کا آرڈر سنا۔ بٹلر نے آرڈر آگے پاس کیا اور میں نے دیکھا کہ ایک ویٹر ٹرے میں پیالیاں' چمچے وغیرہ رکھ رہا ہے۔ میرا خوف سے برا حال تھا۔ میرے جسم پر پسینہ بہہ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔ کوئی مجھے پہچان جائے گا اور کچھ کرنے سے پہلے ہی میں پکڑا گیا تو کیا بتاؤں گا کہ میں نے یہ وردی کیوں پہنی ہے۔ لیکن ایک لاکھ کا لالچ مجھے قدم پیچھے نہیں ہٹانے دیتا تھا۔ اب جو ہو سو ہو۔ میں نے سوچا اور جب آپ کے کمرے میں کافی لے جانے والا ویٹر کچن سے نکلا تو میں اس سے پہلے ہی اوپر پہنچ چکا تھا۔ اتفاق سے مجھے ایک بند دروازے کے باہر خالی برتن رکھے ہوئے نظر آگئے۔ میں وہ برتن لے کر چل پڑا۔ میں نے ٹرے میں سو کا ایک نوٹ ڈال دیا۔ لفٹ نیچے پہنچی اور دروازہ کھلا تو اوپر آپ کے کمرے میں کافی

لے جانے والا ویٹر تیار کھڑا تھا۔ میں نے اسے سوچنے کا موقع دیے بغیر اپنی ٹرے اسے پکڑا دی اور اس کی ٹرے اٹھا لی۔ میں نے کہا کہ یہ برتن تو لے جا' کافی میں پہنچا دیتا ہوں۔ اس نے پوچھا کہ یہ ٹپ ہے کس کا آیا ہے؟ تو میں نے سر ہلا دیا۔ اس کی نظر سو کے نوٹ پر گئی تو وہ خاموش ہو گیا اور اتنی دیر میں لفٹ کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔"

"اسے شک نہیں ہوا تھا؟"

"ہوا ہوگا تو اس نے اظہار نہیں کیا۔ وہ سمجھا ہوگا کہ کسی نے مجھے سو روپے ٹپ دی تھی جو میں اس کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔ شاید کوئی خاص بات ہے کہ میں اس کی جگہ کافی لے جانا چاہتا ہوں۔"

ایسا ہوتا ہے بعض اوقات۔ مستقل قسم کے مہمان مخصوص ویٹرز کے ساتھ رابطہ رکھتے ہیں جو ان کے خاص کام کرتے ہیں اور ان کے رازدار ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک لینڈلارڈز ہیں ملتان کے۔ وہ ہمیشہ یہیں گاڑی لیتے ہیں۔ ہر ہفتے ایک رات کے لیے قیام کرتے ہیں۔ ہوٹل کے اندر بھی خاص بندوبست ہے۔ کمرا انھیں کوئی بھی ملے' وہ اسی ویٹر کو طلب کرتے ہیں۔ وہ کہیں فون کرتا ہے اور پھر ان کی مہمان کو لانے کے لیے مجھے بھیجتا ہے۔ صبح میں اس مہمان کو واپس چھوڑ آتا ہوں۔ دوپہر سے پہلے وہ خود بھی ملتان چلے جاتے ہیں اور مجھے دو طرف کرایہ دیتے ہیں۔ ملتان سے وہ اسی ویٹر کو فون کرتے ہیں کہ گاڑی بھیج دو اور وہ مجھے بتاتا ہے کہ ملک صاحب کو لے آؤ۔"

میں سمجھ گیا "آگے بولو۔"

"میں جی۔ میں نے کافی میں وہ دوا ملائی جو میں نے پیس کے سفوف کر لی تھی۔ کافی آپ کے کمرے میں پہنچائی اور بھاگ لیا۔ آپ کو شک ہو گیا تھا؟"

"ہاں۔ تم گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے دوبارہ کافی منگوائی تھی تو دوسرا ویٹر آیا تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا تھا کہ اس کی جگہ کوئی اور کافی لے آیا تھا" میں نے کہا۔

"وہ سمجھ گیا ہوگا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ کیسے مان لیتا کہ سو روپے دیکھ کر اس نے ٹرے کسی اور کو دے دی تھی۔ میں نے آپ کے کمرے میں آنے سے پہلے نمبر لگا لیا تھا۔ اس سے بھی گڑبڑ ہوئی تھی۔ میں تو واپسی میں سیدھا اسٹور ہی گیا۔"

"کیا اسٹور ہر وقت کھلا رہتا ہے؟"

"وہ لانڈری کا اسٹور ہے جی۔ وہاں میلے کپڑے بھرے رہتے ہیں۔ ہر روز صبح بیڈ شیٹ وغیرہ بدل جاتی ہیں۔ اس کے بعد لانڈری والا سب سمیٹ کر لے جاتا ہے۔ ویٹر بھی وردی بدلتے ہیں تو پہلی وردی وہیں ڈال دیتے ہیں۔ بلاوجہ دن میں وہاں کون جاتا ہے۔ میں نے فٹافٹ بیرے کی وردی اتار کے اپنی ڈرائیور کی وردی پہنی اور ہوٹل سے نکل آیا۔ مجھے اس کام میں ایک گھنٹا بھی نہیں لگا ہوگا مگر میرا یہ حال تھا کہ دروازے پر گیٹ کیپر نے مجھ سے پوچھا کہ کیا بات ہے فضل دین۔ بڑا بیمار لگ رہا ہے تو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اور میں

خدا کا شکر ادا کرتا ہوا اپنی گاڑی میں جا کے لیٹ گیا۔ میں نے اپنا کام کر لیا تھا۔ اب میں باقی پچاس ہزار کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ایک لاکھ کے خیال سے مجھے نشہ ہونے لگا تھا۔ یہ ایک لاکھ میں نے جان ہتھیلی پر رکھ کے کمائے تھے۔"

"تمھاری جان کی بازی لگ گئی۔ تم نے یہ پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا کہ ہمیں خواب آور دوا دینے کا مقصد کیا ہے؟"

"پوچھا تھا۔ اس شخص نے کہا کہ تم اپنا کام کرو۔ تفتیش مت کرو۔ ہم اپنا کام کریں گے اور تمھیں کچھ نہیں بتائیں گے۔ ابھی تک آپ کے پتا ہی تھا کہ وہ آگیا۔ اس نے پوچھا کہ کام ہو گیا اور میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ اس نے باقی پچاس ہزار مجھے دے کے کہا کہ کیا خیال ہے' ایک لاکھ اور کماؤ گے؟' میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا کہ مجھے معاف کرو۔ وہ ہنسنے لگا کہ مشکل کام تو تم نے کر لیا' اب آسان کام کے ایک لاکھ مل رہے ہیں تو انکار کر رہے ہو۔ خیر یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے۔ بس جی' مجھ پر دوبارہ لالچ غالب آگیا۔ میں نے کہا کہ اب کیا کام ہے۔ اس نے کہا کہ تم یہاں موجود رہو۔ ہو سکتا ہے' تمھیں ہمارے ساتھ جانا پڑے۔ پھر وہ غائب ہو گیا اور میں گاڑی میں لیٹا ایک لاکھ کے تصور میں آسمان پر اڑتا رہا۔ اب میں بہن کو بڑی دھوم دھام سے رخصت کروں گا اور اسے اتنا جہیز دوں گا کہ ساری عمر کوئی اسے کچھ نہ کہہ سکے۔ وہ لڑکا اچھا نہیں تھا۔ اس کی ماں کا منہ بند کرنا ضروری تھا۔ مزید ایک لاکھ کی امید ہوئی تو میں اپنی شادی اور اپنا گھر بنانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آدھی رقم سے کوئی پانچ مرلے کا مکان خرید لوں گا' باقی محفوظ رکھوں گا۔ گاڑی میرے پاس ہوگی تو نہ آمدنی کا مسئلہ ہوگا نہ رہائش کا۔ باقی زندگی چین سے گزر جائے گی۔ شام کو میڈم کو گاڑی کی ضرورت پڑی تو میں ہی انھیں انارکلی بازار لے گیا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں سے سب کچھ دیکھتا رہتا تھا۔ میری تو مت ماری گئی تھی اتنی دولت دیکھ کر جناب۔ اندھا ہو گیا تھا میں کہ مجھے کوئی خطرہ نظر نہیں آیا۔ میں نے اس پر یقین کر لیا کہ خطرہ کوئی نہیں۔ حالانکہ ایسے دھندے میں خطرے کے سوا ہوتا کیا ہے اور جہاں کوئی لاکھوں لٹا رہا ہو اتنی بے دردی سے' وہاں خطرہ بھی بہت بڑا ہوگا' یہ میں نے نہیں سوچا یا سوچا تو اہمیت نہیں دی۔ انارکلی میں میڈم ایک اسٹور میں گئیں تو وہ میرے پاس آگیا۔ وہ ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ فضل دین' تمھیں ایک فون کرنا ہے۔ مسٹر رستم جی بھن والا کو۔ وہ ہوٹل میں اکیلا ہوگا۔ میں نے پوچھا کہ کیا کہنا ہے تو اس نے کہا کہ ڈائیلاگ میں سمجھاؤں گا۔ تم اپنی اصل آواز کو اور لہجے کو بدل سکتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہاں۔ تھوڑا بہت لیکن تم یہ سب کیا کر رہے ہو اور کیوں؟ اس نے پھر وہی جواب دیا کہ کام کرو' سوال مت کرو۔ نہیں کر سکتے تو انکار کر دو۔ لو جناب' اس وقت پھر میرے سامنے پچاس ہزار آگئے۔ میری تو آنکھیں چندھیا جاتی تھیں' عقل پر پردہ پڑ جاتا تھا اور میں سارے سوال بھول جاتا تھا۔"

شیلی نے کہا "یار' میرا بھوک سے دم نکل جائے گا۔ تمھاری باتیں ختم نہیں ہوں گی۔"

میں نے کہا "تم ڈاکٹر ہو' یہ جانتی ہو کہ بنا کھائے پیے آدمی کتنے دن جی سکتا ہے۔ غیر ضروری باتیں فرنچ میں کرو۔"

"کیا میں صبح تک اسی سڑک پر ادھر سے ادھر آتی جاتی رہوں؟" اس نے فرنچ میں کہا "معلوم ہے یہ کون سا چکر ہے؟"

"یہ تقدیر کا چکر ہے" میں نے کسی فلسفی کی طرح جواب دیا۔

www.paksociety.com

"یار یہ چوتھا چکر ہے۔ بارہ بجنے والے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہمارے پیچھے کوئی لگا ہوا ہے۔"

"کیا؟ آر یو شیور؟" (تمھیں یقین ہے؟)

"تقریباً۔ ویسے تم خود بھی تصدیق کرسکتے ہو۔ ایک گاڑی اوورٹیک کیے بغیر تقریباً ایک فرلانگ پیچھے چل رہی ہے اس میں چار آدمی ہیں۔"

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" میں نے پلٹ کے پیچھے دیکھا لیکن مجھے دور تک کوئی گاڑی نظر نہیں آئی۔

"اب کیا کروں یار؟ یہ بتاؤ۔"

"وہ شاید ہماری راہ میں ہے۔ حضور۔" میں نے کہا "تم زیادہ سے زیادہ کتنی رفتار سے گاڑی دوڑا سکتی ہو؟ سابقہ ریکارڈ کیا ہے؟"

"دو اسپیڈ کا ریکارڈ تھا۔ یہ لاہور کی سڑکیں ہیں۔ یہاں وہ ریکارڈ توڑنے کی کوشش کی تو ریکارڈ کے سوا ہر چیز ٹوٹ جائے گی۔ اس گاڑی کے اور میرے تمھارے پرزے۔۔۔"

"چلو پھر جتنی رفتار سے ممکن ہے اس خطرے کو پیچھے چھوڑ دو۔ سیدھی سڑک پکڑو۔ اور ٹرن کرو تاکہ انھیں پتا نہ چلے۔" میں نے پلٹ کے دوبارہ سڑک پر نگاہ دوڑائی۔ "تاکہ اب آخری پھیرا ہو تو اللہ نے تمھیں بروقت عقل دی اور تم نے مجھے بتا دیا۔"

میرا خیال تھا کہ وہ شکار اور شکاری کی خطرناک دوڑ کے مقابلے سے گھبرائے گی مگر اس نے بڑی خوش دلی سے جواب دیا "بات صرف اتنی ہے کہ سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ اور گاڑی کی طاقت بھی طوفان سے کم نہ تھی۔ زخم خوردہ درندے کی طرح جست لگا کے بھاگی۔

میں نے چلا کے کہا "شاباش۔ میری طرف سے اجازت ہے جہاں چاہو مڑ جاؤ، جہاں دل چاہے کوئی بھی کھمبا یا پیڑ گرا دو لیکن کے پیچھا کرنے والوں سے کم از کم ایک میل آگے رہو۔"

گاڑی اس کے کنٹرول میں تھی۔ آدھی رات کے وقت سڑکیں خالی تھیں اور سوائے ایک دو جگہوں کے جہاں پیچھے آنے والی گاڑی سے دوسرے کار والوں نے فوراً اپنی گاڑی کو بچا لیا کہیں حادثے کے امکانات پیدا نہیں ہوئے۔ رات کے وقت سڑک پر گشت کرنے والی پولیس کی ایک وین بھی بال بال بچی۔ انھوں نے اس تیز رفتاری کا نوٹس لیتے ہوئے کیا کچھ کیا ہو شاید تعاقب کی کوشش بھی نہیں کی۔ انھیں اپنی طرح اپنی گاڑی کی مستعدی اور کارکردگی کے معیار کا علم نہ تھا۔ کیوں موت کے منہ میں جاتے۔ نتیجہ یہ کہ پولیس تو مرد ہوگئی۔ فضا میں سنسنی ضرور تھی اور بار بار پیچھے دیکھ رہا تھا۔ خود میرا بھی یہ حال تھا۔ آخر قریباً پانچ منٹ بعد مجھے یقین ہو گیا کہ

ہمارے پیچھے کوئی نہیں ہے تو میں نے شیلی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "اوکے۔ تم کوئی بھی ریس جیت سکتی ہو۔ اب آرام سے چلو۔"

اس نے قہقہے میں کہا "یار! ایسے ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔ کہیں اس گاڑی میں خفیہ مائکروفون نہ لگا ہوا ہو۔" میں چونکا رہ گیا۔ "کمال کر دیا تم نے تو۔ ایسا شاندار خیال کیسے آیا تمھیں؟ تم تو واقعی ذہین بھی ہو۔"

وہ خوش ہو کے بولی "جاسوسی اور ایکشن فلموں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے بہت فلمیں دیکھی ہوئی ہیں۔"

"کبھی بری عادت کا بھی فائدہ ہو جاتا ہے۔ اب دیکھو اس گاڑی میں جو ریڈیو ہے وہ آن کر دو۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" اس نے ریڈیو کھول دیا۔

"شور میں ہماری گفتگو کوئی نہیں سنے گا۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ شور کا تجزیہ کرتے ہوئے آجائیں گے اگر ہماری گاڑی میں سگنل وصول کر رہے ہیں تو۔۔۔"

میں نے ندامت سے سوچا "کاش میں نے فلموں سے کچھ سیکھا ہوتا۔"

شیلی نے کہا "یار یہ کار ریڈیو کا ایریل۔ تم نے دیکھا یہ کتنا اوپر نکلا ہوا ہے۔ حالانکہ ریڈیو بند تھا۔"

"سگنل اسی سے نشر ہو رہا ہوگا۔" میں نے چلا کے کہا "اسے بند کر دو۔"

شیلی نے دائیں ہاتھ کو باہر نکال کے ایریل کو اندر کھینچا تو ریڈیو میں شور آنے لگا۔ پاکستان کے ریڈیو اسٹیشن اپنے پروگرام ختم کر چکے تھے۔ ریڈیو پر شاید بی بی سی سے موسیقی نشر ہو رہی تھی۔ شور میں دب گئی۔

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ ایک ہاتھ سے گاڑی چلاؤ اور دائیں ہاتھ سے ایریل کو پکڑے رہو۔ پھر یہ کام نہیں کرے گا۔"

غالباً شیلی بھی میری بات سمجھ گئی۔ اس نے ریڈیو کا والیوم کم کیا مگر اسے آن رکھا اور ایریل کو نہیں چھوڑا۔ کیونکہ ریڈیو کا ایریل اس کی باڈی کو نہیں چھوتا تھا لیکن جیسے ہی کار کی باڈی سے جوڑا جاتا ہے اور جیٹ کے پیچھے دھات کی تار ایک کام کرتی ہے۔ ایریل کو شیلی نے پکڑا تو وہ ارتھ ہو گیا۔

میں نے کہا "اب مواصلاتی رابطہ تو نہیں رہا لیکن رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم سیدھی چلتی جاؤ اور جیسے ہی کوئی مناسب جگہ نظر آئے گاڑی کو سائڈ میں کہیں روک لو۔"

مناسب جگہ فوراً ہی آگئی۔ سڑک کے کنارے ایک بہت بڑا سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ اور اس کے بالکل سامنے ایک گاڑی کھڑی تھی۔ بس شاید خراب تھی۔ جب شیلی نے بورڈ کے پیچھے روکا تو میں نے دیکھا کہ بس کی شناخت نہیں تھی

سائن بورڈ کے پیچھے جہاں اسے سہارا دینے والے تین فولادی ستون تھے ہماری جاں بچانے کی باڑھ تھی۔

شیلی نے کہا "بڑا مزہ آرہا ہے یار اس ایڈونچر میں۔ لگتا ہے کسی شوٹنگ کرا رہی ہوں۔"

"شوٹنگ بھی ہوسکتی ہے۔ اصلی۔" میں نے کہا "اچھا ریوالور مجھے دے دو۔ تم سڑک پر نظر رکھو۔ انجن بند مت کرنا اور ایریل کو مت چھوڑنا۔"

ہم اندھیرے میں خاموش بیٹھے رہے۔ رات کے سکوت میں انجن کے آہستہ چلنے کی آواز بھی نہیں زیادہ محسوس ہو رہی تھی حالانکہ باہر کھڑا ہوا کوئی شخص سنتا تو اسے ہوا کی سرسراہٹ سنائی دیتی۔

شیلی نے سرگوشی میں کہا "اگر پولیس آجائے یار اور پوچھے کہ آپ ہم تو یہ کیوں پیچھے ہو کے یہاں کھڑی ہو۔ تو کیا جواب ہوگا؟"

میں نے اس کے کان میں کہا "ہوگا ایک نوٹ۔"

"اب ادھر دیکھو۔" شیلی نے کہا "یار یہ وہی گاڑی ہے۔"

سفید رنگ کی ایک بڑی سی کار ادھر سڑک کے بہت آہستہ آہستہ سڑک پر ہمارے سامنے سے گزر رہی تھی۔ "تمھیں یقین ہے؟"

"سو فیصد۔" شیلی نے کہا "یہ لوگ کنفیوز ہو گئے ہیں یار۔"

میں نے کہا "انھیں جانے دو۔ اب تم پیچھے آؤ اور گاڑی میں چلاؤں گا۔"

اس نے نیچے اترتے ہوئے بھی ایریل کو نہیں چھوڑا۔ پھر جب میں نے اس کی جگہ لے لی تو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور میں نے ایریل کو پکڑا تو وہ پیچھے چلی گئی۔ فضا میں کی طرف سے اب تک کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ پیچھے ہوئے کتے کی طرح دم دبائے بیٹھا تھا اور سخت خوف زدہ تھا۔ اگر اسے تھوڑی بہت امید تھی کہ اسے لاڈلی منیجر والے اس کو بچانے آجائیں گے تو اب یہ آس بھی دم توڑ گئی تھی۔ اب تک شاید یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ کسی کے لیے چکر تھا۔ کیا ہے اور پیچھے دو ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک بھی بچ سکتے ہیں۔ وہ خطرناک قسم کے مجرموں کی مخالف آرائی میں دو دھارا تھا۔ معاوضہ وصول کرتے ہوئے اس نے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ بھتہ اتنا ہے کہ مخالف گروہ کے چنگل میں پھنسا دے گی۔ کام تمام ہو گیا تو اس کی جان بطور جان گروی جیسی تھی۔ اور۔۔۔ انھیں تو کار دینے کے جرم میں وہ ہم سے کم رعایت کی توقع کیسے کر سکتا تھا۔

لیکن یہ بھی کچھ لیا تھا کہ میں خالی ہاتھوں سے اس کی دُڈی بھی الٹ کر سکتا ہوں تو شیلی واقعی اس کے سر میں سوراخ کر سکتی ہے۔ ہم کسی بے تکلف زبان میں بات کرتے تھے اور ہمارے دشمن بھی کم تربیت والے عام قسم کے بدمعاش نہیں تھے اس سے یہ ثبوت ملتا تھا کہ ہم بین الاقوامی سطح کے دہشت گرد یا مجرم ہیں۔

ایک ۔۔۔۔۔ ایسے حالات میں تو کوئی ۔۔۔ پوچھنے سے ۔۔۔ رکھا تھا۔

میں نے گاڑی کو واپس سڑک پر لا کے یو ٹرن دیا اور جدھر سے آئے تھے پھر ادھر ہی روانہ ہوئے۔ اگر اس وقت بھی ہم کوشش کرتے تو آدھے گھنٹے میں فیبرک مارکیٹ پہنچ سکتے تھے اور شیلی کی چائنیز کھانے کی خواہش پوری ہو سکتی تھی مگر بات یہ ہوا کہ ہر خواہش محض ارادے سے پوری نہیں ہوتی۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

پہلی غلطی میں نے یہ کی کہ ہیڈ لائٹس کو آن نہیں کیا حالانکہ مخالف سمت میں سفر کرتے ہوئے دشمنوں سے سامنا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اپنے ذہن میں محفوظ نقشے کے مطابق میں نے ایک شارٹ کٹ لیا۔ وہاں موڑ پر کسی نے گاڑی کھڑی کی تھی مگر تیز رفتاری سے موڑ کاٹتے ہوئے میں پوری کوشش کے باوجود اپنی گاڑی کو نہ بچا سکا۔ میری گاڑی کا اگلا بایاں حصہ اس کار کے پچھلے بائیں کونے سے ٹکرایا تو بڑا دھماکا ہوا۔ کھڑی ہوئی گاڑی کی ٹیل لائٹ کے پرخچے اڑ گئے اور ۔۔۔ کا شیشہ بکھرنے کی آواز الگ آئی۔

مجھے یقین تھا کہ گاڑی کی ۔۔۔ ہوئی مگر اس وقت رکنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ۔۔۔ اچھل کر تھوڑا سا آگے ہو چکی تھی۔ مجھے گاڑی ۔۔۔ کا راستہ مل گیا تھا۔ اندر شور مچ گیا ۔۔۔ ایک چوکیدار شور مچانے لگا تھا ۔۔۔ آواز تو سنائی نہیں دی۔ اس مختصر سی گلی سے نکل ۔۔۔ بائیں جانب ہوئی ۔۔۔ ہوٹل بالکل نظر نہیں آیا۔

گاڑی میں ہوٹل ۔۔۔ کھانا کھا کے نکلی تو اس کی رفتار کم ہو گئی ۔۔۔ کہ میں کیا اور قسمت اچھی تھی کہ نکل گیا ۔۔۔ اب گاڑی ۔۔۔ دوڑ رہی تھی۔

"تم تو یار کمال کی ڈرائیو ۔۔۔" شیلی نے کہا۔

میں نے کہا "یہ گاڑی ۔۔۔ تمھارے بس کی نہیں تھی اسی لیے میں نے گاڑی لے لی۔"

شیلی نے کہا "۔۔۔ اس کے کار کٹ کے ۔۔۔ شاید اسے ۔۔۔ ہوا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی چل رہی ہے۔ فضل ۔۔۔ شاید ۔۔۔ گاڑی کہیں چھوڑنی پڑے۔"

وہ مڑ کے ۔۔۔ بات نہیں ہے۔ میں ۔۔۔ کہ صبح گھر والوں کا گاڑی ۔۔۔

میں نے کہا "فرق ۔۔۔ بات ۔۔۔ خطرے کی بات ۔۔۔ سے پہلے ۔۔۔ تم گاڑی اغوا ۔۔۔

www.paksociety.com

دشمن اب تمہارے بھی دوست نہیں رہے۔"

"مقسوم کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے سر۔"

میں نے کہا "وہ رقم کہاں ہے جو انہوں نے دی تھی؟"

وہ رونے پر اتر آیا "مجھ غریب کو مت لوٹیں جناب۔"

میں نے چلا کے کہا "غریب کے بچے! میں چھپے ہو تو تمہارے بھانپڑ مارتا اس بات پہ۔ شیلی! اس کے ایک علاقتی چپت لگاؤ۔ اسے سمجھاؤ کہ ہم ڈاکو یا چور اچکے نہیں' بہت شریف لوگ ہیں۔"

"وہ تو اسے اندازہ ہو چکا ہے بلکہ تجربہ۔ سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں یار۔" شیلی نے کہا۔

"فضل دین! وہ تمہاری جان بھی لے سکتے ہیں۔ مال واپس لینے کے بعد کیونکہ تم نے ان کا سارا کھیل بگاڑ دیا۔"

"میں نے کیا؟" وہ فریادی لہجے میں بولا۔

"ہاں تم نے۔ غلطی تمہاری تھی یا نہیں' یہ کوئی نہیں دیکھے گا۔ الزام تم پر آئے گا کہ تم نے عقل سے کام نہیں لیا اور تم بزدل ثابت ہوئے۔ اب تمہارے بچنے کی ایک ہی صورت ہے۔ ہم تمہیں مار کے باہر پھینک دیتے ہیں۔"

"کیا۔۔ مجھے مار کے؟" وہ چلانے لگا۔

"مارنے کا مطلب جان سے مارنا نہیں تھا۔ سوری' ہم تمہیں ناک آؤٹ کرکے سڑک پر گرا دیتے ہیں اور تمہاری گاڑی لے کر بھاگ جاتے ہیں۔ کوئی صبح ہونے سے پہلے تمہیں اٹھالے گا۔ اسے بتا دینا کہ بسٹر اور مسز رستم جی بنجن والا نے تمہاری گاڑی لی تھی لیکن راستے میں ان کی نیت خراب ہو گئی۔ وہ تمہیں مار کے باہر پھینک گئے اور گاڑی لے گئے۔ ہو سکے تو تھانے جا کے رپورٹ لکھوا دینا۔ خواہ رپورٹ لکھوانے کے لیے رشوت دینی پڑے۔ پھر ہوٹل پہنچ جانا روتے پیٹتے۔ جب وہ لوگ تم سے رابطہ کریں تو خوب شور کرنا کہ مجھے مروا دیا۔ جیب دے کر غلط کام کرا دیا۔ مجھ سے کہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ تو بڑے خطرناک لوگ تھے۔ مجھے قتل کر دیتے۔ اچھا ہوا گاڑی ہی لے گئے۔ گاڑی کے ساتھ پیسہ بھی گیا لیکن خدا کا شکر ہے جان بچ گئی۔ بس اسی قسم کے ڈائیلاگ ذرا رونے پیٹنے بولنا اور کہنا کہ اب بتاؤ میں کیا کروں۔ میری تو گاڑی بھی گئی اور حاصل کچھ نہیں ہوا۔ ان کے گلے پڑ جانا کہ میرا نقصان پورا کرو۔ عین ممکن ہے تم ان سے کچھ اینٹھنے میں کامیاب ہو جاؤ لیکن اصل بات یہ ہے کہ تمہاری جان صرف اسی طرح بچ سکتی ہے۔ انہیں یقین دلاؤ کہ تم نے ہمیں کچھ بھی نہیں بتایا حالانکہ رستم جی بنجن والا نے تمہیں رستم ہند کی طرح مارا۔ وہ تو جوڈو کراٹے سب جانتا ہے اور اس کے ساتھ جو لڑکی تھی وہ بار بار گولی مار رہی تھی۔ میرا مطلب ہے' یہ کہنا کہ گولی مارنے کی دھمکی دے رہی تھی۔ میری بات سن رہے ہو نا غور سے؟"

"سن رہا ہوں جناب!"

"اگر تم نے ایسا نہ کیا اور انہیں شک ہوا کہ تم نے بلا مقابلہ کئے بغیر سب بتا دیا ہے تو تمہاری خیر نہیں۔ تم ان سے وفاداری اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرنے کا انعام اور معاوضہ مانگ سکتے ہو' رحم کی بھیک نہیں۔ انہیں یقین دلانا بے حد ضروری ہے کہ تم نے ہم سے تعاون نہیں کیا تھا اسی لیے تمہارا حشر برا ہوا۔"

"وہ پوچھ سکتے ہیں کہ انہوں نے تمہیں قتل کیوں نہیں کیا؟" شیلی نے نکتہ اٹھایا۔

"گڈ پوائنٹ۔ فضل دین! عقل سے کام لوگے تو تمہارے ڈیڑھ لاکھ بھی محفوظ رہیں گے۔ ممکن ہے نقصان کی تلافی کے طور پر مزید پچاس ہزار مل جائیں۔ انہیں بتانا کہ رستم ہند کا ارادہ یہی تھا کہ تمہیں جان سے اڑا دیا جائے مگر تم نے اپنی بہن کی زندگی کے لیے زندگی کی بھیک مانگی۔ خدا رسول کے واسطے دیئے تو مسز رستم جی بنجن والا کے دل پر اثر ہوا اور اس نے سفارش کی کہ اس کی جان بخشی کر دو ورنہ بہن گھر بیٹھی رہ جائے گی۔ اور اس طرح تمہارے قتل کا فیصلہ بدل گیا۔ ایسی باتیں عورتوں کو جذباتی بلکہ اشکبار کر دیتی ہیں۔" میں نے کہا "اور ہم چمن پہنچ گئے۔ اب وقفہ برائے چینی طعام۔ اس کے بعد ماریں گے فضل دین کو۔"

"بھوکے پیٹ تو مجرم کو بھی پھانسی نہیں دیتے۔" شیلی نے کہا۔

"مگر اب میں کیا کروں یار؟ میری تو بھوک ہی مر گئی ہے۔"

فضل دین نے کہا "میں کچھ نہیں کھا سکتا جی۔ میرا تو دل ڈوب رہا ہے۔"

"دل کو تھوڑا سمجھاؤ" میں نے کہا اور گاڑی کو ایک چائنیز ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑی ہوئی بہت سی گاڑیوں کی قطار میں شامل کر دیا۔

"یار' ہم اندر نہیں جائیں گے؟" شیلی نے کہا۔

"جا بھی نہیں سکتے" میں نے کہا "یہیں منگوا لیتے ہیں ڈنر طلب۔"

ہارن بجایا۔ شہید ہو چکا تھا یا صدمے سے گنگ تھا۔ میں نے ایک بیرے کو خالص لاہوری اسٹائل میں بلایا "پہلوان جی! اسلامی دل دی چھیرا پاؤ۔"

پہلوان جی نے اس خطاب کو طنز سمجھا۔ وہ بانس جیسا لمبا اور صورت سے فاقہ زدہ لگتا تھا۔ میرے ہاتھ میں مینو کارڈ تھمانے کے بعد اس نے گردن کو ہر سوال پر دائیں بائیں ہلانا شروع کر دیا۔ مجھے شک ہوا کہ شاید کسی معذوری کے باعث وہ سر کو اوپر نیچے نہیں کر سکتا۔

شیلی نے کارڈ مجھ سے چھین کے اسے تھما دیا "اب تم جو چاہے لے آؤ یار۔ میرا مطلب ہے جو بھی بچا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ایسا نہ ہو تم مزید آدھا گھنٹا سر ہلاتے رہو اور اُدھر ریسٹورنٹ بند ہو جائے۔"

اس نے پھر بڑی حقارت سے گاڑی کے اگلے حصے پر نظر ڈالی تو میں نے مجبوراً نیچے اتر کے دیکھا۔ گاڑی کا دایاں بمپر ٹوٹ گیا تھا اور بہت سی شاندار کاروں کے بیچ میں وہ یوں لگ رہی تھی جیسے مقابلۂ حسن کی حسیناؤں کے درمیان بیچ نظر آتا ہے۔ ہمارے استعمال میں آنے سے پہلے یہ گاڑی بھی شاندار تھی۔

میں نے فضل دین کو تھوڑا سا اور بریف کیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ ساری رقم اسی گاڑی میں موجود ہے۔

"اسی گاڑی میں! عجیب بے وقوف آدمی ہو تم۔"

"اور کہاں لے جاتا سر؟" وہ بولا "بینک میں جمع کراتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ وہ پوچھ نہ بیٹھیں کہ کہاں سے آیا اتنا پیسہ؟"

شیلی نے اسے ڈانٹا "بینک والے یہ کیسے پوچھ سکتے ہیں۔ قانونی طور پر وہ ایسا سوال کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی! قانون کی بات کرتے وقت یہ مت بھولا کرو کہ تم لندن میں نہیں ہو۔ فضل دین ٹھیک کہتا ہے۔ یہ غریب تو ڈرتا ہے اس لیے سچ بھی بولے تو جھوٹ بولنے کے جرم میں پکڑا جا سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ گزشتہ روز کی ڈکیتی میں وہ شریک تھا۔"

"کون سی ڈکیتی میں؟"

"کسی بھی ڈکیتی میں۔ یہ تو الزام عائد کرنے والوں کی مرضی ہے کہ جس پر جو الزام چاہیں عائد کر دیں۔ اگر وہ اپنا دفاع نہ کر سکتا ہو۔" میں نے کہا "فضل دین! وہ رقم کہاں چھپائی ہے؟ نکال کے ہمیں دے دو۔"

وہ مجھے پاگلوں کی طرح دیکھنے لگا "آپ کو۔۔۔ نہیں جی۔"

میں نے کہا "بابا کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔ اول تو وہی چھین سکتے ہیں تم سے جنہوں نے دی تھی۔ ورنہ پولیس نکال لے گی۔ گاڑی جب ملے گی تو پولیس کی تحویل میں جائے گی اور تھانے میں کھڑی رہے گی۔"

"یا مولا! کس مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ مجھے معاف کر دے" فضل دین رونے لگا۔ "بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے رب جی۔"

میں نے کہا "رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمت سے کام لو جیسے پہلے ہمت سے کام لیا تھا تو ہمیں زہر تک دے دیا تھا۔"

ایک کے اوپر ایک ٹرے اٹھائے بیرا ہماری طرف آیا تو شیلی نے کہا "چپ کر جاؤ یار۔ اللہ کی یہی مرضی تھی۔"

میں نے بھی کہا "موت سے کس کو رستگاری ہے۔ اللہ تمہاری خالہ کی مغفرت کرے اور خالو کو نعم البدل عطا کرے۔ لو تکے کھاؤ۔"

دھاڑیں مارتے ہوئے فضل دین کو پُرتعزیت نظروں سے دیکھا اور شاید حیران ہوا کہ اس زمانے میں بھی خالہ کی موت پر رونے والے ہیں۔ میری بھوک بھی فوت ہو چکی تھی مگر کھانوں کی خوشبو سے پھر زندہ ہو گئی۔ جو کچھ میں نے کھایا' وہ زندگی میں پہلے نہیں کھایا تھا اور شاید دوبارہ بھی نہیں کھاؤں گا مگر اس وقت پسند ناپسند کا سوال نہیں تھا۔ میں نے دل میں خدا سے دعا مانگی کہ وہ سب حلال ہو جو میں نے کھایا۔ شیلی کے اشتہاک کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ کیکڑے (CRAB) کا سوپ' کھمبیاں MUSHROOM اور بانس BAMBOO SHOOTS پر مشتمل ڈنر بہت لطف لے کر کھا رہی تھی۔ اس نے کھانے کے ذائقے کی تعریف بھی کی۔ اس کے جذبات کا پاس کرتے ہوئے میں نے یہ نہیں کہا کہ بقائمی ہوش و حواس کوئی بھی ایسا نہیں کہہ سکتا۔

فضل دین بالآخر قائل ہو گیا تھا کہ ہم اس کے قاتل اور ڈاکو وغیرہ نہیں ہیں۔ اس نے ڈگی میں کاٹھ کباڑ کے ساتھ اور اسپیئر وہیل کے نیچے پڑی ہوئی نوٹوں کی گڈیاں نکال کے یوں حسرت بھری نظر کے ساتھ میرے حوالے کر دیں جیسے کوئی اپنی محبوبہ کو دوست کے حوالے کرتا ہے کہ یار تم ہی اسے ڈنر پر لے جاؤ۔ میں تو صاحب فراش ہوں۔

میں نے اسے تسلی دی کہ ہم اس کے ساتھ فراڈ نہیں کریں گے۔ اسے منظر ایڈووکیٹ کا ٹیلی فون نمبر ازبر کرایا اور بار بار پوچھا۔ پھر سمجھایا اور کہا کہ وہاں رقم بینک سے زیادہ محفوظ ہوگی اور اگر وہ چاہے تو قانونی طور پر ہر قسم کی مدد بھی حاصل کر سکتا ہے۔ اسے پولیس سے گاڑی چھڑانے کے لیے یا جان چھڑانے کے لیے کسی وکیل کی ضرورت بہرحال پڑے گی۔

شیلی نے کہا "یار' وہاں ایک نہیں' دو وکیل ملیں گے۔ ایک ہی گھر میں۔"

میں نے کہا "ایک وکیل' اس کی بیوی اور پندرہ بچے۔ اور ایک وکیلن۔ خاتون وکیل۔"

"ان کے کتنے بچے ہیں؟" فضل دین نے بلاوجہ سوال کیا۔

"ان کی نظر میں۔ سب بچے ہیں۔ نادان ہیں" میں نے کہا "ویسے ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی۔"

پہلوان جی دوبارہ برتن سمیٹنے اور بل کے نام پر ہماری کھال کھینچنے آئے۔ فضل دین نے کچھ چکھا تک نہیں تھا مگر شیلی کو اس کی قیمت دینی پڑی۔ غصے میں شیلی نے اسے ٹپ نہیں دی اور جو کچھ اس نے زیر لب کہا اسے بھی نظر انداز کر دیا۔ "یہ تو لوٹتے ہیں۔ میری بھوک پھر مر گئی یار۔"

میں نے کہا "چلو تم بچ گئیں۔ کسی کو تو مرنا ہی تھا۔ کھانے سے بھوک مر گئی۔ نہ کھاتے تو تم مر جاتیں اپنے وعدے اور اعلان کے مطابق۔"

گاڑی کی باگ ڈور اب شیلی کے ہاتھ میں تھی کیونکہ بھاگ دوڑ میں اس نے مجھ پر اپنی برتری ثابت کر دی تھی۔ میں دانتوں میں شرتیہ خلال کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ مناسب جگہ نظر آتے ہی

www.paksociety.com

اچانک فضل دین کو ہاتھ لہرا دیا۔ وہ بڑا سہما ہوا بیٹھا تھا اور مجھے آئینے میں دیکھ رہا تھا جیسے کہ وہ عید کی نماز پڑھنے آنے والوں کو دیکھتا ہے۔ اگر میں اسے بتاتا کہ تیار ہو جاؤ، ہمیں تیز مارتے ہوئے دوڑ نکلنا ہے تو تمہیں کہنے سے پہلے ہی وہ چلانے لگتا یا بے ہوش ہو کے گر جاتا۔

وہ گاڑی جسے ہم ڈاج کر چکے تھے، اچانک ایک سائڈ سے نمودار ہوئی۔ وہ شاید اتنے وقت میں بڑی مستعدی سے ہمیں تلاش کرتے پھر رہے تھے اور رات کے وقت خالی سڑک پر دو گاڑیوں کا بچھڑنا اور پھر مل جانا کوئی محض اتفاق نہیں سمجھا جا سکتا۔

فضل دین کی گاڑی کے تجربے ہی نہیں نوٹ کئے تھے، چال میں بھی فرق آ گیا تھا اور اب وہ کسی بیوہ کی طرح نہیں رو رہی تھی۔ اس کی ایک آنکھ بھی ضائع ہو چکی تھی۔ شبلی کے اوپر [illegible] وہ تو بھینس کی طرح بھاگی جس کے تعاقب میں کوئی بلاؤں والے ہوں۔ دوسری گاڑی جب بالکل ہمارے پیچھے آ گئی تو شبلی نے ایک دم یوٹرن لیا اور میں نے ہاتھ باہر نکال کے ٹائر کا نشانہ لیا۔

بائیں پہلو کے ریوالور کی آواز بھی رات کے سناٹے میں توپ کے گولے کی طرح گونجی مگر اس سے زیادہ شاندار آواز وہ تھی جو ٹائر برسٹ ہونے کے بعد گاڑی کے ایک کھمبے سے ٹکرانے اور پھر ایک دیوار میں گھس جانے سے پیدا ہوئی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو بجلی فون کا کھمبا سڑک پر پڑا تھا اور کار کا اگلا حصہ ایک بنگلے کی دیوار کے اندر پہنچا ہوا تھا۔

تعاقب کرنے والوں کو یہ امید نہیں تھی کہ میں گولی چلا دوں گا۔ وہ خود بھی فائرنگ سے گریز کر رہے تھے۔ اس سے سارے علاقے میں ہنگامہ ہو جاتا اور کہیں نہ کہیں سے پولیس بھی نمودار ہو جاتی۔ گاڑی ہمارے ساتھ ہی مڑی تھی مگر بے قابو ہو گئی تھی اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کرتا، حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔

"گریٹ۔ رئیلی گریٹ یار" شبلی نے چلا کے کہا۔

میرے پاس جواب دینے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے پیچھے آنے والی کار میں جتنے بھی لوگ تھے شدید زخمی ہوئے ہوں گے۔ معجزے کی بات اور ہے۔ اس قسم کے حادثے میں ڈرائیور اور اس کے ساتھ بیٹھا ہوا کوئی شخص مشکل سے ہی بچتا ہے۔ جواب میں کسی نے گولی نہیں چلائی تھی اور دھماکا ہونے کے بعد گاڑی بھی دیوار کے ملبے میں پھنس کے رک گئی تھی۔ میرے لیے اپنے پروگرام پر عمل کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ میں نے وحشت سے نیم جاں فضل دین کے ایک ہاتھ مارا اور اسے دروازہ کھول کے باہر گرا دیا۔ شبلی نے گاڑی کی رفتار کچھ کم کی تھی مگر اس کی رفتار پہلے بھی زیادہ نہیں تھی۔

فضل دین گرا تو کچھ دور سڑک پر پھسلتا گیا۔ "خدا کرے اس کی ایک آدھ ہڈی تو ٹوٹے۔" میں نے کہا "ہاتھ پاؤں کی۔"

شبلی نے کہا "ایسے بریک لگا رہا ہے جیسے [illegible] دو۔"

"بے وقوف! دعا کر رہا ہوں کہ اس نے [illegible] آگے ریڑھ کی ہڈی محفوظ رہے" میں نے کہا "گاڑی روک لو۔"

شبلی نے بریک لگائے تو گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ اس کا وہیل الائنمنٹ بھی خراب ہو چکی تھی۔ قریب ہی ایک [illegible] پودوں کی حفاظت کے لیے لگایا جاتا ہے اور جب وہ تناور ہو جاتے ہیں تو پھر اسے لوگ اکھاڑ کے لے جاتے ہیں۔ [illegible] انہیں گٹر کے [illegible] کی طرح [illegible] ہے کہ نل پاس ہوتے ہی ٹینکی [illegible] کے ٹھیلے میں کام آتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شبلی نے ایک چیخ ضرور ماری تھی مگر اسے تقاضائے فطرت نسوانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ خود بالکل ٹھیک تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور سڑک سے دور لے گیا۔ اس کی ایڑی کے ساتھ اس نے خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا۔ پھر اچانک رک گئی "ایک منٹ۔"

"کیا ہوا؟" میں نے پریشانی سے کہا اور اسے کھینچا۔

"وہ..... ایک جوتا نکل گیا پاؤں سے" اس نے دوسرے پیر کو جھٹک کے کہا۔

دوسرا جوتا تھوڑا سا فضا میں بلند ہوا اور پھر نیچے دوڑتا ہوا وہ میرے سر یا منہ پر لگتا۔ جائے حادثہ پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے جو سب آس پاس کے بنگلوں سے برآمد ہوئے تھے۔ ان میں اکثریت نوکروں اور چوکیداروں کی ہوگی۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کے دوسری کار کی جانب اشارہ کر رہے تھے جو فٹ پاتھ پر بھی تھی اور سڑک پر بھی۔

سوچے سمجھے بغیر ہم ایک ایسی کوٹھی میں گھس گئے جہاں نہ چوکیدار تھا نہ کتا اور کوٹھی والے بھی سکون سے سوتے ہوئے تھے۔ شبلی اب ننگے پاؤں تھی اور میرے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ اس پوٹلی میں ڈیڑھ لاکھ روپے تھے۔ سو سو کے نوٹوں کی چند گڈیاں۔ پورچ میں ایک کار کھڑی تھی اور ایک ہی لائٹ جل رہی تھی۔ میں دائیں جانب پچھلی گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ گلی جہاں ختم ہوئی جہاں دو تخت بچھے ہوئے تھے۔ کپڑے سوکھ رہے تھے اور ایک ڈربے میں مرغیاں بند تھیں۔ تخت کے قریب بچوں اور بڑوں کے جوتے بکھرے ہوئے تھے۔ شبلی نے فوراً ان میں سے دو سلیپر منتخب کر لیے۔ ایک اسے بڑا تھا اور ایک چھوٹا کیونکہ ایک زنانہ تھا دوسرا مردانہ۔ شاید ایسی ہی ایک جوڑی تخت کے نیچے ہوگی مگر اسے نکالنے کے لیے وقت نہیں تھا۔

میں تخت پر اور پھر ڈربے پر چڑھا تو مرغیاں کڑکڑانے لگیں۔ ان کی نیند ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ مرغے نے مداخلت کا زیادہ برا منایا تھا۔ میں نے مرغے کی طرح گردن نکال کے درمیانی دیوار کے دوسری طرف جھانکا اور پھر دیوار پر چڑھ گیا۔ شبلی ذرا بھی زوس نہیں تھی۔ اس کے لیے تو یہ سب ایڈونچر تھا۔ ایکشن۔ ہم پکڑے جاتے تو دوسرا ایکشن شروع ہوتا۔

میں نے شبلی کو اوپر کھینچا تو وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کے اوپر پہنچی۔ میں دوسری طرف لڑھک گیا۔ جب میں کھڑا ہوا تو وہ دیوار پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی اور بیک وقت دو گھروں میں تھی۔ میں نے اس کی ٹانگ کھینچی تو وہ میرے اوپر آ گری۔

"یہ کس کا گھر ہے؟"

"میرے ہم زلف کی خوشدامن کا" میں نے جھنجھلا کے کہا "خاموش رہو۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ ہم زلف اور خوش دامن سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ نام تو خیر عجیب سے ہیں یار۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے پھر دائیں جانب والی گلی میں چلنا شروع کیا۔ ہر کوٹھی میں یہ گلی نوکروں کے لیے رکھی جاتی تھی اور غلام لائن کے لیے۔ ایک کوٹھی کا عقبی حصہ دوسری کوٹھی کے عقبی حصے سے ملا تھا اور ایسے ہی میرے دائیں ہاتھ پر ساتھ والی کوٹھی کی گلی تھی۔ اس کوٹھی میں بھی لوگ سو رہے تھے اور دروازے بند تھے مگر میں احتیاطاً دیوار سے لگ کے چل رہا تھا۔ ہمارے سر پر دوسری منزل کے چھجے کا سایہ تھا۔ اچانک اوپر کوئی کھڑکی کھلی۔ میں اور شبلی دبک کے کھڑے ہو گئے۔ اوپر سے کسی نے کنکار کے بلغم تھوکا "آخ..... تھو....." کھڑکی پھر بند ہو گئی۔

اگر اس کوٹھی میں کتا ہوتا تو اب تک الارم کی طرح بج رہا ہوتا یا ہمیں کاٹ چکا ہوتا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ یہاں کوئی چوکیدار نہ ہو۔ یہ سیدھی چھوٹی کوٹھیاں تھیں۔ دو سے کنال یا کچھ زیادہ پر عمارت۔ تھوڑا سا خالی حصہ ملا کے رقبہ شاید ایک کنال ہوگا۔ پورچ میں یہاں ایک کار کے ساتھ موٹر سائیکل بھی تھی۔ پھر گیٹ کے قریب مجھے ایک سائیکل نظر آ گئی۔ میں نے شبلی سے کہا کہ وہ دروازہ کھولے لیکن ذرا احتیاط کے ساتھ۔ اس نے پہلے تو دیے کا کنڈا اٹھاتے ہوئے آواز کی پھر گیٹ چرچرایا۔ میں سائیکل اٹھا کے روانہ ہوا ہی تھا کہ اوپر والی کھڑکی پھر کھل گئی اور آخ تھو کرنے والا چلانے لگا۔ "اوئے کون ہے۔ سامنے آ چور ہے تو۔"

میں نے کہا "کوئی نہیں بابا جی۔ سو جاؤ۔" اور شبلی کو سائیکل پر آگے بٹھا کے روانہ ہو گیا۔ برسوں بعد سائیکل چلاتے ہوئے مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے پہیے گول نہیں ہیں یا ہینڈل ٹیڑھا ہے۔ شبلی بے تحاشا ہنس رہی تھی اور میری ڈانٹ ڈپٹ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

"تم سائیکل چلا رہے ہو یا رکشا چلا رہے ہو؟"

میں نے کہا "تمہارے ہنسنے کی وجہ سے توازن بگڑ رہا ہے۔ گر ہو گی تو ساری ہنسی نکل جائے گی۔ سائیکل سب ایسے ہی چلاتے ہیں۔" "بچے اور ہوتے اس میں تو اچھا تھا۔ خیر کالج کی شرم ہے مجھے پہلے تین پہیوں والی چلاتا تھا پھر دو..... آئندہ بھی۔ موقع ملا..... تو ایک پہیے والی۔ کسی سرکس میں۔ ڈاکٹر شبلی! تم کو اپنا وزن کم کرنا چاہیے۔"

شبلی پھر ہنسی "تم ذہنی مریض لگ رہے ہو۔ ارے وہ بڈھا آ رہا ہے پیچھے دوڑتا ہوا۔"

"اچھا!" میں نے ایک دم پیڈل مارے اور پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔ سائیکل صراط مستقیم سے بھٹک کے سڑک کے کنارے لگی ہوئی جھاڑیوں میں گھس گئی۔ گرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ شبلی نے جھوٹ بولا تھا مگر میں آرام سے لیٹا آسمان کو دیکھتا رہا اور اپنی پھولی ہوئی سانس پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف رہا۔ میرا دشمنانہ افسوس ایک حد تک کم ہو چکا تھا۔

شبلی جھاڑیوں میں الجھ گئی تھی اور بہت خفا تھی "تمہیں تو گرانا تک نہیں آتا یار۔ میرے کپڑے دیکھو، ہاتھ دیکھو۔"

واقعی اس کے ہاتھوں پر خراشیں تھیں اور کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے "تمہیں شکایت نہیں، خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے مس شبلی۔ اتفاقات مسلسل ہمارے ساتھ رہے۔ میرا نشانہ خطا نہیں گیا اور گاڑی ان کی تباہ ہوئی۔ پھر ہم آسانی سے فرار ہو گئے اور تم نے گاڑی فٹ پاتھ پر ہی چڑھائی، کسی دیوار پر نہیں۔ آگے غور فرمائیے۔ ہم آسانی سے ایک گھر میں گھسے اور پھر دوسرے سے گزر آئے۔ کسی نے ہمیں نہیں پکڑا۔ حد یہ ہے کہ تمہیں تو چپل تک مل گئے ورنہ تمہیں ننگے پاؤں میرا ساتھ دینا پڑتا تو تمہارے پیروں میں چھالے پڑ جاتے۔ یہ سائیکل بھی شاید کسی نے ہمارے لیے ہی ایجاد کی تھی مگر آج ہمارے کام آئی۔ مزید یہ کہ وہ بے خواب بڈھا ہمارے پیچھے نہیں دوڑا اور جب اس نے آخ تھو کیا تھا تو تھوک تمہارے منہ پر نہیں گرا تھا۔ اسے علم ہوگا غالباً کہ چاند پر تھوکا تو اپنے ہی منہ پر آ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے کہ تم نے مجھے چاند کہا۔ اب اٹھو، معلوم ہے کیا وقت ہے؟"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "وقت رما ہے اور راستہ بہت ہی۔ تمہاری آنکھ سب وقت پڑا ہے۔ ابھی تک اس علاقے میں مجھے چوکیدار بھی نظر نہیں آیا جو رات کو سائیکل پر سیٹیاں بجاتے پھرتے ہیں۔"

"کیا یہاں کے چور سیٹیوں سے ڈر جاتے ہیں یار؟"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ چوروں کو خبردار کرتے ہیں کہ ہم یہاں ہیں، تم وہاں اپنی کارروائی جاری رکھو جہاں بھی ہو۔"

"پھر یہاں سب چور رہتے ہوں گے یا سب کوتوال" شبلی نے کہا۔

ہم نے سائیکل وہیں چھوڑ دی۔ آدھی رات کے بعد سائیکل پر ایک مرد اور ایک عورت کا ڈبل سواری کرنا شکوک پیدا کر سکتا تھا

www.paksociety.com

اور جو ہمیں دیکھتے' وہ ہمارا حلیہ نہ بھول سکتے۔ پیدل چلنے میں کسی سے لفٹ ملنے کا امکان تھا مگر یہ عجیب سنسان علاقہ تھا جہاں سڑکوں اور گلیوں میں مکمل سناٹا تھا۔ غور کرنے پر مجھے اس کا محلِ وقوع سمجھ میں آیا۔ ہم دماغی امراض کے شفاخانے' عرفِ عام میں پاگل خانے کے پیچھے کی آبادی میں تھے۔

حادثے کی جگہ بہت دور رہ گئی تھی۔ شاید اب تک پولیس آگئی ہوگی۔ کسی نے فون ضرور کیا ہوگا۔ مارا گیا وہ شخص جس کی دیوار توڑ کے ایک گاڑی اندر آگئی۔ اب پولیس تفتیش کرے گی۔ ایک ٹائر کوئی نکلنے سے برسٹ ہوا تھا۔ ممکن ہے' ایک دو حادثے میں مرگئے ہوں۔ باقی زخمی ہوں گے تو اسپتال لے جائے جائیں گے اور پولیس انھیں اپنی تحویل میں رکھے گی۔ ان کا بیان لے گی اور ان سے رشوت لے گی۔ فضل دین کو میں نے صحیح وقت پر اپنا بیان سمجھا دیا تھا۔ اس طرح وہ بچ جائے گا وہ کیا بتا کہ اس نے کس پر گولی چلائی تھی اور کیوں چلائی تھی۔ آلۂ قتل کہاں ہے اور مال کہاں ہے؟

"تم کو معلوم ہے' میں کیا سوچ رہا تھا؟" میں نے چلتے چلتے کہا۔

"ہاں' تم اس حادثے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "یہ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"اس لیے کہ میں بھی یہی سوچ رہی تھی یار" وہ بولی "تمھارا کیا خیال ہے' وہ سب مارے گئے ہوں گے؟"

"یہ خیال کی بات نہیں ہے' زندگی اور موت کا فلسفہ ہے۔ وہی مرے ہوں گے جن کا وقت پورا ہو گیا ہوگا" میں نے کہا "مارنا تو وہ مجھے اور تمھیں چاہتے تھے مگر بقول شاعر' آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ اور موت تو دور کی بات ہے' آنے والے لمحے کا کچھ پتا نہیں۔ آج ہوٹل سے نکلتے وقت کیا میں تصور کرسکتا تھا کہ ٹھیک دو گھنٹے بعد میں تمھیں سائیکل پر آگے بٹھا کے یہاں سے گزروں گا اور میرے ایک ہاتھ میں ڈیڑھ لاکھ نقد ہوں گے' تمھارے پاؤں میں چوری کے جوتے۔"

"اسی کا نام ایڈونچر ہے۔ میں نے کب سوچا تھا کہ آج ہی اتنا زبردست ایکشن ہوگا۔ بڑا مزہ آیا یار۔"

"مزہ تو تب آتا جب وہ پکڑ لیتے یا پہلے تمھاری لنگڑی کار پر گولی چلا دیتے" میں نے کہا "اب آگے کی سوچو' صبح ہونے سے پہلے ہی پولیس نہ پہنچ جائے مسز رستم جی جن والا۔ ہمیں اسی وقت وہاں سے چیک آؤٹ کرنا ہوگا۔"

"اسی وقت؟" اس نے پریشانی سے خود کو دیکھا "زبردستی ہمیں کوئی روک تو نہیں سکتا یار مگر شک ہوگا۔ فرض کرو' ہم نہ جائیں واپس۔"

"تمھارا سامان بھی تو ہے۔"

"بس کپڑے ہیں یا میک اپ کا سامان۔ پرفیوم وغیرہ۔ پاسپورٹ اور ضروری کاغذات' نقد رقم اور ٹریولر چیک تو میں بیگ میں رکھتی ہوں یار اور بیگ میرے کندھے پر ہے۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ گویا ہم آزاد ہیں کہیں بھی جانے کے لیے۔ ہوٹل جانے میں رسک تھا۔ کوئی پوچھتا کہ یہ حال کیسے ہوا تو کیا بتاتے۔ لوگ سمجھتے... خیر جانے دو' بری بات ہے۔"

"کیا سمجھتے لوگ؟ ایسی کی تیسی لوگوں کی۔ مجھے بتاؤ۔"

"یہی کہ شاید میں نے دست درازی کی ہوگی۔ اور تمھارا کیا بھروسہ' کسی کے ورغلانے میں آکے میرے خلاف بیان دینے پر راضی ہو جاتیں۔"

"شٹ اپ۔ تم ایسا سمجھتے ہو مجھے؟"

میں نے کہا "میں تمھیں سمجھتا ہی کہاں ہوں۔ بلکہ عقل مند کہتے ہیں کہ جو عورت کو سمجھنے کا دعویٰ کرے' وہ سب سے بڑا احمق۔ تم نے رابعہ کا رویّہ دیکھا تھا؟ اب ہم جا رہے ہیں غالب اور نازو کی طرف۔ تم نازو کا رویّہ بھی دیکھنا۔ مجھے دعویٰ ہے کہ میں اسے سمجھتا ہوں اور وہ مجھے جانتی ہے۔"

رات کے دو بجے ہم ٹیپل روڈ پر پہنچے جہاں سے اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ان میں ٹیکسی کوئی نہیں تھی اور پہلی دو گاڑیاں میرے اشارے کو نظرانداز کر کے گزر گئیں۔ ایک میں عورتیں بچے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ دوسری خود ایک عورت چلا رہی تھی اور لفٹ دینے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ تیسری گاڑی میں ایک خوبصورت مہذب جوڑا تھا۔ وہ نئے شادی شدہ تھے یا بچے ہم بچے تو اب گریز۔ انھوں نے ہمیں پیچھے بٹھالیا۔ حسبِ توقع عورت نے ہماری حالتِ زار کے بارے میں تجسس کا مظاہرہ کیا۔ میں نے اسے ایک دل گداز کہانی سنائی کہ ہم گھر سے ریلوے اسٹیشن جانے کے لیے نکلے تھے مگر راستے میں ٹیکسی کا حادثہ ہو گیا۔ دراصل ڈرائیور کی نظر کمزور تھی اور وہ چشمہ گھر بھول آیا تھا۔ وہ چشمہ لینے گھر جا رہا تھا کہ ہم نے روک لیا۔ کوئی ایک فرلانگ کے بعد نہ جانے کہاں سے سڑک کے بیچ میں بھینس آگئی مگر وہ کتا سمجھا۔ اس نے سائڈ سے نکالنے کی کوشش کی اور بھینس نے مشتعل ہو کے ٹکر ماردی۔ اس کا ریڈی ایٹر... اس کی گاڑی کا ریڈی ایٹر اور چشمہ ٹوٹ گیا۔ گاڑی کا نہیں' اس کا..."

عورت بولی "مگر تم نے ابھی کہا تھا کہ وہ چشمہ بھول آیا تھا۔"

"ہاں۔ اس کی دور کی نظر بھی کمزور تھی اور قریب کی بھی۔ الگ الگ چشمے تھے۔ وہ دور دیکھنے والا چشمہ بھولا تھا۔ قریب دیکھنے والا چشمہ گاڑی میں موجود تھا۔ وہ لگا لیا تھا اس نے..."

مرد نے اسٹیشن کے قریب گاڑی روک کے مجھے گہری نظروں سے گھورا۔ اس پر یقیناً میری کہانی کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تھا۔ جب کہ عورت تقریباً آبدیدہ تھی۔ مرد غالباً سنگدل اسی لیے مشہور ہیں۔ میں نے بھی اس کا شکریہ ادا نہیں کیا کیونکہ اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ یہ اخلاقی فریضہ شیلی نے سرانجام دیا مگر بات نہیں بنی۔ عورت نے شیلی کے اترنے کے بعد روشنی میں دیکھا تو اسے ایک بڑی اور ایک چھوٹی چپل نظر آئی۔ ایک مردانہ' ایک زنانہ۔ ظاہر ہے کہ گھر سے ریلوے اسٹیشن جانے کے لیے روانہ ہوتے وقت کوئی عورت ایسی غلطی نہیں کرتی اور ٹکر جیسے بے ہوا تجزیے' حادثے کے نتیجے میں چپل نہیں بدلتی۔

جب ہم وہاں سے ٹیکسی لے کر روانہ ہوئے تو میں نے کہا "ڈاکٹر غلطی' انھوں نے یقین نہیں کیا ہم پر۔ کتنے افسوس کی بات ہے' دنیا سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔"

"ہاں یار۔ بے چاری کتنی رو رہی تھی وہ عورت۔"

"آخر ہماری کیا غلطی تھی؟ بس ہم جھوٹ نہیں بول سکتے۔ پکس جو نہیں ہے" میں نے کہا "اور تم نے اگر غلطی سے ایک مردانہ اور ایک زنانہ سلیپر پہن لیا تو کیا ہوا؟ ہر شخص کو اس آزاد ملک کے آزاد شہری کی حیثیت سے یہ آزادی ہے۔"

حسبِ توقع زیادہ بڑی مصیبت ہماری منتظر تھی۔ میں نے ٹیکسی والے کو ایک گلی پیچھے ہی رخصت کر دیا تھا۔ میں نے وقار یوسف کے گھر کی کال بیل بجائی تو غالب برآمد ہوا۔

"آئیے' تشریف لائیے۔ بالکل صحیح وقت پر آئے آپ۔" اس نے دروازہ کھول کے کہا "میں کہہ رہا تھا نازو سے کہ سکندر نے ڈھائی بجے کا وقت دیا ہے تو ڈھائی بجے ہی آئے گا۔"

نازو نے دروازے کے پیچھے سے سر نکالا "وہی ہیں' میں نے کہا تھا کہ آدھی رات کے بعد بھلا کون آسکتا ہے۔ خیر سے بدھو گھر کو آئے۔"

میں نے بولی اسے سمجھا کے کہا "لڑکی! یہ ہم پر ذاتی حملہ ہے اور بیچارگی قسم کا۔ ہم بدھو نہیں ہیں اور نہ یہ گھر ہے ہمارا۔"

نازو نے بڑی چبھتی ہوئی نظروں سے میرا اور پھر شیلی کا جائزہ لیا "بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ یہ تو ہوٹل ہے۔ آپ نے عزت بخشی ہمیں۔ فرمائیے کس قسم کا کمرا چاہیے؟"

غالب نے کہا "اور آپ بدھو نہیں۔ ماشاءاللہ اتنے سیانے ہیں۔ خیر سے کوئی معرکہ سر کرکے لوٹے ہیں۔"

اس طنزیہ گفتگو سے شیلی کی پوزیشن زیادہ خراب ہو رہی تھی لیکن میں نے اسے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ اس کا استقبال کرنے والوں کا رویّہ اچھا نہیں ہوگا۔ اس کی ظاہری حالت بھی ایسی تھی کہ زبانِ حال کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ۔ مگر سمجھنے والے غلط سمجھ رہے تھے اور وہ بلاوجہ مجرم محسوس کر رہی تھی۔

میں نے کہا "مرزا جی! ہم اس وقت جھاڑ مار کے تمھارا دماغ درست کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ صبح دم رنگا فساد شرفا کا شیوہ ہے۔ بعد میں تمھیں دنداں شکن جواب دیں گے یا تمھارے دانت کھٹے کریں گے۔"

غالب نے کہا "اتفاق سے ہم اس کے برعکس سوچ رہے تھے۔"

میں نے کہا "یار' میں نے ڈاکٹر شیلی سے کہا تھا کہ تم جیسے بااخلاق لوگ ہو اور صورت بری سہی' دل کے برے نہیں ہو۔ کچھ تو میرے جھوٹ کا خیال کرو۔ یہ بہت تھکی ہوئی ہیں' انھیں اندر لے جاؤ۔"

غالب نے نازو کو ڈانٹا "آدھی دیر سے میں اور کیا کہہ رہا ہوں مگر اس لڑکی میں نہ عقل ہے نہ تمیز۔ بس زبان چلا سکتی ہے۔"

نازو نے آنکھیں نکال کے کہا "ہاتھ بھی چلا سکتی ہوں میں لیکن خیال ہے ڈاکٹر شیلی کا۔"

شیلی نے کہا "نہیں... تم جو کرنا ہے کرو۔ میری کوئی بات نہیں یار۔"

نازو ہنس پڑی "آپ آجائیں میرے ساتھ۔ سکندر' یہ کیا تھمادیا تھا مجھے؟"

میں نے کہا "نہ یہ باپ کی گٹھڑی ہے' نہ باپ کا مال۔ کسی کی امانت ہے۔ ایک پیسہ بھی کم ہوا تو یومِ حشر حساب دینے پڑیں گے۔"

"نیت میں فتور ہے تمھاری" غالب نے کہا۔

"اور تمھاری عقل میں بھی فتور ہے' نظر میں فتور ہے" نازو نے پلٹ کے کہا۔

"ظاہر ہے۔ فتور نہ ہوتا تو تمھارے ساتھ کیوں جھک مارتا۔ میرا مشر بھوت کیوں ہوتا۔"

"دیکھو! پھر تم نے مجھے بھوت کی بچی کہا۔"

"یار سکندر! دیکھو خواہ مخواہ گلے پڑ رہی ہے۔ میں نے ایسی کوئی بات کی ہے؟ اور ویسے بھی یہ کون سی بری ہے۔"

"چلو صبح فیصلہ کریں گے" میں نے غالب کو ڈرائنگ روم کی طرف کھینچ لیا۔ "یہ بتاؤ اتنی دیر سے ہم سب تو آرہے ہیں۔ یوسف اور اس کی بیوی اپنی خواب گاہ سے نہیں نکلے۔"

غالب لائٹ جلا کے میرے سامنے بیٹھ گیا "وہ خواب گاہ میں نہیں ہیں۔"

میں نے جوتے اتار کے ٹانگیں صوفے پر پھیلا دیں۔ نیا جوتا ایک انگلی پر کاٹ رہا تھا۔ "وہ کہاں ہیں پھر؟"

غالب نے جواب سے گریز کیا "تم دونوں کہاں سے آرہے ہو؟"

میں نے کہا "لمبی کہانی ہے۔ فل آف ایکشن۔ تمھیں سنانے کے بعد زبردستی بھی کرنی پڑے گی سونے کے لیے۔ اس وقت میں سونا چاہتا ہوں۔ شب بخیر۔"

غالب نے کہا "وقار اور اس کی بیوی گئے ہوئے ہیں۔ نقوی صاحب کے گھر۔ ہم ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئے ہیں اسپتال سے۔"

"اسپتال سے؟ نقوی صاحب اسپتال میں ہیں؟" میں اٹھ بیٹھا۔

"آئی سی یو میں" غالب نے کہا "ان کی حالت خیر تھی۔ ہے۔ وہ ابھی تک کوما سے باہر نہیں آئے۔"

میں نے کہا "کیا ہوا تھا انھیں۔ ہارٹ اٹیک؟"

www.paksociety.com

نے اٹی میں سر ہلایا "فوڈ پوائزننگ۔ ڈاکٹروں نے زہر تو معدے سے صاف کردیا ہے مگر اثرات خون میں سرایت کر گئے ہیں۔ سارا خون بدلا گیا ہے لیکن جسم نے پوری طرح قبول نہیں کیا۔ ANTI- REJECTION دوائیں دی جا رہی ہیں۔ پھر بھی گردوں کا فنکشن نارمل نہیں ہے۔"

میں دم بخود بیٹھا رہا "کھانے میں زہر کس نے دیا؟"

"ابھی کچھ پتا نہیں۔ ڈاکٹروں نے کسی کو بھی کچھ بتانے سے صاف انکار کردیا ہے۔" غالب نے کہا "ہو سکتا ہے صبح انہیں لندن روانہ کردیا جائے۔ اگر وہ صبح تک زندہ رہے۔"

"اتنی سیریس بات ہے؟"

"پولیس نے سارے ملازمین کو حراست میں لے لیا ہے۔ بہت اونچی سطح پر تحقیقات جاری ہیں" غالب نے کہا۔

"یہ تو سخت تشویش کی بات ہے۔ یہ کب ہوا؟ میرا مطلب ہے زہر دیے جانے کا واقعہ.....؟"

"انہیں شام چھ بجے داخل کیا گیا ہے۔ رپورٹ ایک ملازم نے کی تھی" غالب نے کہا "غالباً انہیں کافی میں زہر دیا گیا ہوگا۔ وہ شام کو اپنی اسٹڈی میں کافی پیتے تھے۔ وہیں بے ہوش پڑے ملے تھے۔ ملازم اتفاق سے اندر چلا گیا تھا۔ یہ بتانے کے لیے کہ اسلام آباد سے فون آیا ہے۔ ظاہر ہے کوئی اہم فون ہوگا ورنہ انہیں کوئی ڈسٹرب نہیں کر سکتا تھا۔"

"شکر..." میں نے کہا "یہ کام تو ان کے پی اے کا تھا..."

"پی اے۔" غالب نے تلخی سے کہا "ان کا پی اے تھا رفیق۔ تم جانتے تو ہو گے وہ غائب ہے۔"

میں نے سکون کا سانس لیا "کسی کو نہیں معلوم وہ کہاں ہے؟"

"نہیں۔ پولیس کو اسی پر شک ہے" غالب بولا "خدا کا شکر ادا کرو یار کہ وقار کو ابھی کچھ معلوم نہیں۔ نہ اس کی بیوی کو۔"

"معلوم تو مجھے بھی نہیں تھا۔ میں سارا دن ہوٹل سے نہیں نکلا تھا۔"

"اس مصیبت کو یہاں کیوں ساتھ لے آئے۔ وہ بیچارے کی نادرہ کو۔ اور نادرہ کی حد تک ٹھیک ہے۔ اگر وقار کی بیوی کو معلوم ہوا کہ رفیق کا ڈاکٹر شبلی سے خصوصی تعلق تھا اور اس نے درمیان میں کیا پارٹ ادا کیا تھا تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"میں اسے منع کردوں گا" میں نے کمرے میں چکر لگاتے ہوئے کہا "مگر یار! نقوی صاحب نے تو رفیق والے معاملے سے نمٹ لیا تھا.... تو پھر یہ کیسے ہوا؟"

"ظاہر ہے یہ اس کے بعد ہوا۔ اور اسی وجہ سے ہوا کہ نقوی صاحب تمہاری مدد کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ اس لیے نہیں کہ انہیں تم سے ہمدردی تھی بلکہ اس لیے کہ ان کی اکلوتی بیٹی یعنی وقار یوسف کی بیوی نے مجبور کردیا تھا لیکن تمہارے دشمن یہ نہیں چاہتے تھے۔ ان کو اس مجبوری کا احساس نہیں تھا۔ وہ نقوی صاحب کو انہیں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اپنے ٹرمپ کارڈ کے طور پر۔ نقوی صاحب نہیں مانے تو انہوں نے اوپر سے بندوبست کیا اور ان کے گھر پر چھاپہ مارا گیا۔ پوری قانونی کارروائی خاموشی سے عمل میں آگئی اور اگر تم...."

"یہ کیا تم تم کی تکرار لگا رکھی ہے۔ ہم کیوں نہیں کہتے؟ تم بھی تو میرے ساتھ نہیں تھے؟"

"اگر ہم بروقت فرار ہونے میں ناکام رہتے اور پکڑے جاتے تو نقوی صاحب معطل ہو جاتے۔ ان کے خلاف اعانت مجرمانہ کا کیس بن جاتا اور ان کا چوبیس سالہ سول سروس کا بے داغ ریکارڈ اتنا خراب ہو جاتا کہ وہ ہوم سیکریٹری بننا تو دور کی بات ہے، پنشن اور سروس کی ساری مراعات سے محروم ہو کے جیل کی ہوا کھاتے۔ ہم نہیں ملے تو پانسہ پلٹ گیا۔ نقوی صاحب نے رفیق کے قتل کا معاملہ دبا دیا کیونکہ اس معاملے کا تعلق اوپر سے نہیں تھا۔ ایس ایس پی، ایم اور ایس ایچ او نے اپنی نوکری بچانے کے لیے ان سے تعاون کیا اور معلوم نہیں اس وقت رفیق کی لاش کہاں ہے۔ لاوارث قرار دے کر کسی سرد خانے میں رکھوا دی گئی ہے، میڈیکل کالجوں کو لاشیں فراہم کرنے والے کسی ٹھیکے دار کو بیچ دی گئی ہے یا کسی ویرانے میں گڑھا کھود کے گاڑ دی گئی ہے۔"

"یہ تو نقوی صاحب کی کامیابی تھی۔"

"لیکن یہ ناکامی بن گئی کسی بہت بڑے شکاری کی جس نے ایک بڑی مچھلی کے لیے بڑا جال ڈالا تھا" غالب نے کہا "بڑی مچھلی اس سے صاف بچ کے نکل گئی۔ اب خطرہ یہ تھا کہ بڑی مچھلی جال ڈالنے والوں کا خانہ خراب کردے گی۔ نقوی صاحب یقیناً اپنے گھر پر چھاپے سے بہت مشتعل ہوں گے اور انہوں نے معلوم کرلیا ہوگا کہ اس سازش کے پیچھے اصل ہاتھ کس کا ہے؟"

"مرزا جی! اصل ہاتھ کس کا تھا؟" میں نے سوچ کے کہا۔

"ظاہر ہے چوہدری دلاور کا۔ ہمارے خلاف کیس ختم ہو جاتے تو اس کی ساری منصوبہ بندی دھری رہ جاتی۔ اسے یہی خطرہ لاحق ہوگا کہ نقوی صاحب ہوم سیکریٹری بن گئے تو اس کا سیاسی مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ ایک طرف ہم اس کے مخالف، دوسری طرف بیورو کریسی۔ ہم تو خیر نہ تین میں نہ تیرہ میں لیکن بیورو کریسی کی پشت پناہی کے بغیر سیاست کا چلنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا پٹرول کے بغیر کار کا چلنا۔"

"اس ملک میں؟" میں نے کہا۔

"ہاں اس ملک میں" غالب نے مجھ سے اتفاق کیا "بیورو کریسی کے ہاتھ میں ہر حکومت کی نکیل رہتی ہے اور جو حکومت شامت اعمال کو دعوت دے وہ بیورو کریسی کو نکیل ڈالنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کا تختہ الٹ دیا جاتا ہے۔ چوہدری دلاور کی سوچ ہے۔ دولت کی کنجی اس کے ہاتھ میں ہے چنانچہ سیاست کا دروازہ اس نے کھول لیا ہے۔ اب آنے والے وقت کو پہچانتے ہوئے اس نے بیورو کریسی کے دو ایڈمنسٹریٹو گیمز جو کل سیکریٹری ہوں گے، اپنی طاقت بڑھانے کے لیے چوہدری دلاور کو طاقت ور دیکھنا چاہتے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے ہمارے لوگ سال بھر پہلے ہی بکرے کا بچہ لے کر پالتے ہیں اور خوب کھلا پلا کے اسے تگڑا بناتے ہیں۔ آخر کس لیے؟ بکرے کی صحت اور فلاح و بہبود کی خاطر نہیں۔ اپنے فائدے کے لیے۔ بقرعید پر ایک شاندار بکرا قربان کرنے کا اعزاز تو انہی کو حاصل ہوگا۔ یا جیسے بیل فائٹ کے لیے بیل پالے جاتے ہیں اور سدھائے جاتے ہیں۔ آخر میں مرنا تو بیل ہی ہے اور نیک نامی بیل کا مقابلہ کرنے والے کے حصے میں آتی ہے۔ تو بیورو کریسی بھی سیاست میں بکرے پالتی ہے اور ان کی قربانی دیتی رہتی ہے یا انہیں لڑاتی رہتی ہے۔ نقوی صاحب کو آؤٹ کرکے ہوم سیکریٹری کے عہدے پر اس شخص کو لایا جائے جو غالب کا طرف دار نہ ہو، سکندر کے کیس ختم نہ کرے بلکہ ان میں مزید اضافہ کرے اور چوہدری دلاور کی پشت پناہی کرے۔ نقوی صاحب کو ذلت و رسوائی کے ساتھ رخصت کرنے کا منصوبہ ناکام ہوگیا اور ڈر پیدا ہوگیا کہ وہ سازشی عناصر کو رخصت کردیں گے تو ان کے سوا چارہ نہ رہا کہ انہیں دنیا سے ہی رخصت کردیا جائے۔ ابھی یہ کہنا تو مشکل ہے کہ کامیاب کون ہوگا؟"

"کیا نقوی صاحب کے بچنے کی امید بالکل نہیں ہے؟"

"یار! اس قسم کے کیس میں حقیقت کبھی سامنے نہیں آتی۔ لیاقت علی خان کی شہادت کا مسئلہ آج بھی ایک معما ہے جو کبھی حل نہیں ہوگا۔ اس کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ قیاس آرائیوں کی انتہا کوئی نہیں ہے۔ یہ بھی کہا جاتا رہا کہ انہیں اسپتال میں بچانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ حسین شہید سہروردی کے بارے میں ایک خیال یہ بھی ہے کہ انہیں بیروت کے ہوٹل میں زہر دے کر مارا گیا۔ یہ سب بین الاقوامی سیاست کے خدائی فوجدار کراتے تھے اور کراتے ہیں۔ اب کیا معلوم وہ نقوی صاحب کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ ممکن ہے انہیں ہارٹ اٹیک ہی ہوا ہو لیکن کیس زہر خورانی کا بنا دیا گیا ہو۔ یا معاملہ اتنا سنگین نہ ہو جتنا ظاہر کیا جا رہا ہے۔ سیاسی خداؤں نے نقوی صاحب کے حق میں فیصلہ دیا تو وہ بچ جائیں گے۔ ان کے مخالفین غالب رہے تو کہا جائے گا کہ ڈاکٹروں کی بہترین کوشش کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکے۔ جن کے ہاتھ لمبے ہوں، وہ آئی سی یو کے اندر بھی من مانی کر سکتے ہیں یا کرا سکتے ہیں۔ یہ میرا اندازہ ہے ورنہ سچ پر پابندی تو ہم جیسوں کے لیے ہے یا اخبار والوں کے لیے جو ہمیشہ سچ کی کرید میں رہتے ہیں۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد میں نے کہا "نقوی صاحب کے گھر میں جو کچھ بھی ہوا تھا وہ کس کس کو معلوم ہے؟"

"ظاہر ہے آپ کے علاوہ آپ کی ڈاکٹر شبلی ہیں..."

"اور آپ کی نادرہ ہیں" میں نے کہا "اس کے علاوہ......"

"نادرہ بعض اوقات حیرت انگیز ذہانت کا مظاہرہ کرتی ہے" غالب نے کہا "یہ اسی کا مشورہ تھا کہ میں خاموش رہوں۔ سارے معاملے سے یوں لاعلمی کا انداز اختیار کروں جیسے تمہارے ساتھ میں تھا ہی نہیں۔"

"ایسا چاہنے کی وجہ؟"

"وہ نہیں چاہتی تھی کہ وقار یوسف کی بیوی کو باپ کی طرف سے پریشانی ہو۔ اس نے تو ہماری ہر سوچ پر نیک نیتی سے مدد کی ہے اور اس نے ضد کرکے باپ سے یہ بات بھی منوالی تھی کہ تمہیں قانونی الجھنوں کی دلدل سے نکالا جائے۔ اسے کیا اندازہ تھا کہ باپ کے لیے اتنی پریشانیاں پیدا ہوں گی۔ اس کی نیک نیتی میں شک نہیں لیکن وہ سمجھتی کہ اس کے باپ کی اس رسوائی اور مصیبت کے ذمے دار ہم ہی ہیں۔ بس نادرہ کے کہنے پر میں نے خاموشی اختیار کی۔ نہ وقار یوسف کو کچھ بتایا نہ رابعہ اور منظر کو۔ اگر نقوی صاحب خود مجھ سے بات کرتے اور کہتے کہ تمہاری ضد کی وجہ سے مجھے یہ دن دیکھنا پڑا، تمہارے دوستوں اور مہمانوں کی حرکتوں کا خمیازہ میں نے بھگتا اور [illegible] کے ساتھ چھاپا مارا گیا میرے گھر پر، خانہ تلاشی ہوئی۔ اتنی بے عزتی کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن انہوں نے بھی کسی سے کچھ نہیں کہا۔"

میں نے کہا "چلو یہ اچھا ہی ہوا۔ اب وقار یوسف کی بیوی کو اپنے ابا پر قاتلانہ حملے کے سیاسی پس منظر کا علم نہیں ہوگا۔ وہ رفیق ہی پر شک کرتی رہے گی جو غائب ہے یا پھر نوکروں پر۔ میری تمہاری اور ڈاکٹر شبلی کی پوزیشن خراب نہیں ہوگی۔"

"ڈاکٹر شبلی کی پوزیشن پہلے ہی سے خراب ہے اور خراب رہے گی۔ خواتین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس کو تم نے جان بوجھ کے لفٹ دی اور شبلی نے غلط فہمیاں پیدا کرکے صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔"

"یہ غلط ہے۔ رابعہ کے طرز عمل کو بھی دیکھو۔"

"ایک غلطی کا جواب دوسری غلطی نہیں ہوتی۔ رابعہ کو سمجھایا جا سکتا تھا۔ وہ خود بھی سمجھ لیتی کہ اس کا غیر سنجیدہ رویہ نہیں چلے گا۔ اسے اپنی ذاتی خواہشات اور تمہارے عزائم کے درمیان کوئی سمجھوتے کی راہ نکالنی پڑے گی" غالب نے کہا "شبلی نے اس کے امکانات کو معدوم کردیا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں اب میرے معاملات میں بہتری کی امید کوئی نہیں رہی" میں نے مایوسی سے کہا "میرے لیے قانونی مسائل سنگین سے سنگین تر ہوتے جائیں گے۔ میں چوہدری دلاور کی شرائط پر اس سے صلح نہیں کر سکتا اور وہ مجھے برداشت نہیں کر سکتا۔"

"پھر؟ کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"وہی جو میں پہلے بھی بتا چکا ہوں، مجھے روپوش ہو جانا چاہیے۔"

"یعنی شبلی کے ساتھ لندن چلا جانا چاہیے؟" غالب طنز سے

www.paksociety.com

ہوتا۔

"وقتی طور پر مگر اس کے بعد میری روپوشی ختم نہیں ہوگی۔ میں ہمیشہ کے لیے غائب" میں نے کہا "نہ ہوگا بانس یعنی یہ خاکسار اور نہ بجے گی بانسری یعنی یہ مصیبت ختم۔ ایک فلمی شعر کے مطابق۔ ہمارے دم سے ہے ہر غم، نہ ہم ہوں گے نہ غم ہوگا۔"

"خودکشی کا ارادہ ہے تو سبحان اللہ۔ نیک کام میں دیر کیسی۔ فرمایئے کیا حاضر کروں۔ سنکھیا، خنجر آب دار، طمنچہ۔"

میں نے کہا "کیا شیلی واقعی سو گئی ہے؟"

غالب اندر گیا اور واپس آ کے تصدیق کی کہ شیلی اور نازو واقعی سو رہی ہیں۔ اسے تازہ ترین واقعات اور میری پلاننگ سے آگاہ کرنا بھی ضروری تھا۔ تھکن کے باعث نیند کی خواہش بھی شدید تھی۔ غالب نے نقوی صاحب کے گھر فون کیا۔ وقار یوسف کی بیوی کا اسپتال سے براہ راست رابطہ تھا۔ اس نے بتایا کہ صورتِ حال جوں کی توں ہے اور ڈاکٹر ابھی ان کی حالت کو خطرے سے باہر قرار نہیں دیتے۔ اگلے چوبیس گھنٹے اہم ہیں۔ میں نے بھی وقار یوسف کی بیوی سے بات کی اور اسے تسلی دی کہ وہ فکر نہ کرے۔ انہیں بہترین طبی سہولیات حاصل ہیں اور آج کل تو میڈیکل سائنس کی جدید ترین تحقیق سے پاکستان میں بھی ان امراض کا علاج ممکن ہے جو پہلے ناقابل علاج تھے۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

ظاہر ہے میں نے کسی یقین کے بغیر جھوٹ بولا مگر سچ نہ مجھے معلوم تھا اور نہ مجھ میں بولنے کی ہمت تھی۔ یہ ایک رسمی "اخلاقی فریضہ" تھا جو میں نے ادا کیا۔ ایسے وقت میں آدمی جذباتی سہاروں پر انحصار کرتا ہے۔ ہمدردی اور غمگساری کے الفاظ اسے کھوکھلے محسوس نہیں ہوتے۔ وہ یقین کرنا چاہتا ہے چنانچہ مان لیتا ہے کہ واقعی۔۔۔

اس نے مجھ سے بھی پوچھا کہ سکندر بھائی، آپ کہاں تھے؟ ہم سب آپ کو مطلع کرنا چاہتے تھے۔ میں نے ٹال دیا کہ میں اپنے مسائل میں الجھا ہوا تھا لیکن فی الحال تم میری فکر مت کرو۔ اپنا خیال رکھو۔ جاگنے سے کیا فائدہ۔ سو جاؤ۔ اللہ سب ٹھیک کرے گا۔

اس نے کہا "وقار بھی یہی کہتے ہیں مگر میں کیا کروں۔ نیند نہیں آتی۔ میں تو وہیں آئی سی یو کے باہر بیٹھی رہتی۔ یہ مجھے گھر لے آئے۔"

"بالکل ٹھیک کیا وقار نے۔ تمہیں سکون کی ضرورت ہے۔ کوئی گولی کھاؤ اور سو جاؤ۔ ہم صبح معلوم کریں گے خیریت، شب بخیر۔"

کچن میں اسٹول پر بیٹھ کے میں نے غالب کو ان واقعات کی رپورٹ دی جن سے وہ بے خبر تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ سنسر کی قینچی بھی چلاؤں اور سین کاٹ دوں جو اسے قابلِ اعتراض لگیں گے لیکن ڈر یہ تھا کہ بعد میں شیلی کسی نہ کسی بات پر کوئی حوالہ دے گی تو میرا جرم سنگین تر ہو جائے گا کہ میرے دل میں چور تھا جو میں نے بات کو گول کیا تھا۔ کافی بناتے ہوئے غالب خاموشی سے سب سنتا رہا پھر ہم ڈرائنگ روم میں چلے گئے اور وہاں سے کرسیاں اٹھا کے پورچ میں جا بیٹھے۔

"کیا ان حالات میں تمہاری اسکیم پر نظرثانی کی ضرورت نہیں؟" غالب نے غور و خوض کے بعد کہا "وہاں یعنی ولایت میں تمہارے جو مہربان اور قدردان تھے، کوئی شیخ صاحب اور یہ نقوی صاحب، ایک ساتھ ایک جیسی حالت میں ہیں۔ کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "میں کسی کی مدد پر انحصار نہیں کر رہا تھا۔"

"لیکن یہاں تمہیں ایک آسرا تو تھا کہ نقوی صاحب تمہیں کسی اور نام کے ساتھ پاسپورٹ بنوا دیں گے۔"

"یہ کام کراچی میں کوئی بھی ایجنٹ کر سکتا ہے۔ وہاں اکرام ٹیکسی چلا رہا ہے۔ اسے سب معلوم ہوگا۔"

"اکرام شیخ کے نام پر یاد آیا" غالب بولا "وہ ڈی ایس پی شیخ۔ سابق سب انسپکٹر سید اکرام شیخ۔ حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا۔"

میں نے کہا "کیا ہوا اسے؟"

"پہلے تو وہی نامراد مرض ہوا تھا جس کا کوئی علاج نہ دوا۔ مرضِ عشق۔ بالآخر کابل کو پیارا ہوا" غالب نے آہ بھری "آخر ایسے ہی تھے بھائی۔"

میں نے سر ہلایا "چلو اس کی ناؤ بھی کنارے لگی۔"

"پتا نہیں یار، بیڑا پار ہوا کہ غرق ہوا۔ وہ تو گیا ہمیشہ کے لیے۔"

"اب بھی ٹیکسی چلا رہا ہے؟"

"اور کیا۔ بحری جہاز چلانے لگے گا اتنے کم عرصے میں۔ کہتا ہے بہت خوش ہوں" غالب بولا "فون آیا تھا مظہر کے گھر۔ اتفاق سے میں اور نازو وہیں تھے۔ رابعہ تو ظاہر ہے پہلے سے تھی۔ نازو کو بہت خوشی ہوئی۔ میں نے تعزیت کی اور دلاسا دیا کہ چلو جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب تو بس بچے ہوں گے یا جھگڑے ہوں گے۔ نازو بہت خفا ہوئی۔"

میں نے کہا "عشق کا دوسرا رُخ ان خواب پرست لڑکیوں کو اچھا نہیں لگتا۔ وہ لاہور کیوں نہیں آجاتا؟"

"میں نے بھی پوچھا تھا۔ کہنے لگا کہ تم ادھر آجاؤ۔ زندہ ہے تو آگ کے دریا میں کیا، سمندر میں ڈوب کے دیکھو۔ کابل کوئی مکان کرائے پر لے کر اسکول چلا رہی ہے۔ تمہارے اور میرے بارے میں بہت متفکر تھی کہ آخر ہم بھی اس کے نقشِ قدم پر کیوں چلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ لومڑی کی اپنی دُم کٹ گئی تو سب کو مشورہ دیتی ہے کہ دُم کٹوا لو۔ یہ بھی کہا تھا میں نے۔"

"بھلا اکرام شیخ ہو گیا کراچی والا۔۔۔ پکا۔۔؟"

"ہاں۔ وہ شاید پاسپورٹ بنوا دے گا مگر اس کے باوجود یہ کام خطرناک ہے" غالب نے کہا "لندن کی پولیس کا حافظہ اتنا کمزور نہیں ہو سکتا۔"

"حافظے کی کیا بات ہے۔ اگر میری صورت کسی سکندر بخت سے ملتی ہو تو اس کو قدرت کا حسین اتفاق کہا جا سکتا ہے۔"

"اس حسنِ اتفاق پر تم اندر بھی جا سکتے ہو۔"

"کیوں؟ پاسپورٹ جعلی تو نہیں ہوگا۔ حکومتِ پاکستان کی جانب سے جاری ہوگا" میں نے کہا "اس کے علاوہ ڈاکٹر شیلی کی شہریت دوہری ہے۔ پاکستانی بھی اور برطانوی بھی۔"

"آئی سی۔ تم اس کے نامزد شوہر کی حیثیت سے جاؤ گے۔ ظاہر ہے اس کے بغیر ویزا نہیں ملے گا۔" غالب نے خفگی سے کہا "یہ بھی سوچا ہے کہ رابعہ پر کیا بیتے گی؟"

"یار، تم سب یکطرفہ طور پر اس کی حمایت کرتے ہو۔ اسے کسی نے کہا کہ وہ بھی قصور وار ہے۔ اس نے مجھ سے بات کیے بغیر، بغیر نوٹس دیے بغیر اپنا رویہ ایک دم کیوں بدلا؟ وہ پہلے بھی اسی طرح مجھے اکیلا چھوڑ کے بھاگ آئی تھی۔ کتنے حیلے بہانے کیے تھے اس نے۔ صاف اور سیدھی بات یہ تھی کہ اس میں حوصلہ نہیں تھا میرے ساتھ حالات کی سختی جھیلنے کا۔"

"یہ آپ بکواس مت فرمائیں۔ اس نے جتنی قربانی دی تمہارے لیے۔"

"یار، کیا میں نے کہا تھا کہ قربانی دو۔ اسے تو محبت کا دعویٰ تھا۔ محبت میں قربانی تم نے نہیں دی، نازو نے نہیں دی۔ محسن کو دیکھو، سب سے زیادہ مصیبت اس نے جھیلی۔ اس کے بیوی بچے۔"

"وہ ٹھیک ہے مگر سب کی ہمت کو ایک ہی ترازو سے تولنا بھی غلط ہے۔" غالب نے کہا "رابعہ نے تمہارا بہت ساتھ دیا۔ اپنا کیریئر تباہ کر لیا۔"

"تھا۔ اس کی کیمسٹری اپنی جگہ ہے۔ اس کے کاروبار کو سنبھالنے والا منظر بھی تھا اور وقار یوسف بھی۔ وہ واپس آ کے اپنے آفس میں جا بیٹھی ہے۔ اس کی جو کوٹھی تباہ ہو گئی تھی، چوہدری دلاور نے اس کی جگہ محل بنا دیا ہے۔ مجھے کیا ملا؟ میں تو بدستور انہی مسائل سے دوچار ہوں۔ میرے خلاف مقدمات اپنی جگہ قائم ہیں۔ حالات ہمیشہ ایسے نہیں رہیں گے۔"

"ہم نے سمجھایا تھا اسے۔"

"کیا فائدہ ہوا؟ کیا اس نے اپنی غلطی تسلیم کی؟ وہ تو مجھے قصوروار سمجھتی ہے کہ میں نے چوہدری دلاور کے ساتھ پنگا کیوں لیا۔ شروعات سے میں اس کی نظر میں غلطی پر غلطی کرتا آیا تھا۔ مجھے والد کو چھوڑ کے لندن نہیں جانا چاہیے تھا، دلاور سے جھگڑا مول نہیں لینا چاہیے تھا۔ یہ نہیں کرنا چاہیے تھا، وہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب اس کا نظریہ ہے کہ میں یہ سارے معاملات راتوں رات سمیٹ لوں۔ اور اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ میں چوہدری دلاور کی پیش کش قبول کر لوں۔ وہ صلح کرنا چاہتا ہے تو صلح کر لوں، معافی مانگتا ہے تو معاف کر دوں۔ نقصانات کی تلافی کرتا ہے تو کہوں کہ ٹھیک ہے۔ آج کے بعد ہم دوست ہیں۔ میں اپنے باپ کے قاتل کو معاف کر دوں اور جو ہوا سو ہوا کہہ کے سب بھول جاؤں۔ اپنی جائداد کا قبضہ لوں اور اپنا کام کروں۔ یہ کیوں نہیں سمجھتی وہ کہ میں بے وقوف یا کوتاہ اندیش نہیں ہوں۔ بہت بڑی قیمت لگائی تھی چوہدری دلاور نے میری۔ اس نے مجھے قابلِ خرید سمجھ لیا تھا۔ بہت آسان تھا میرے لیے اس کا پارٹنر بن جانا اور اس کے کاروبار میں شریک ہو کے لاکھوں کے کروڑ بنانا مگر سکندر اور دلاور میں جو فرق ہے، وہ ہے اور رہے گا۔ پھر آج میں کیسے اس کی اطاعت قبول کر لوں؟ کیسے اس غدار اور ضمیر فروش سے ہاتھ ملاؤں؟ کیسے بیٹوں کو معاف کر دوں؟ یہ سب کرنا ہوتا تو میں اتنا نقصان کیوں اٹھاتا؟ سو پیاز کھا کے سو جوتے کھانا مجھے منظور نہیں مرزا غالب۔ رابعہ کوئی ناسمجھ بچی تو نہیں ہے۔ کیا اتنے عرصے میں میرے ساتھ رہ کے اس نے اندازہ نہیں کر لیا تھا کہ میں کس مٹی کا بنا ہوا ہوں؟ اسے معلوم نہیں تھا کہ میرا ساتھ دینے کے نتائج کیا ہوں گے؟ اسے پتا نہیں تھا کہ حالات کا رخ کس سمت میں ہے؟ پھر وہ آج کیوں توقع رکھتی ہے مجھ سے کہ میں حالات کے ساتھ بدل جاؤں؟ اپنے نظریات، خیالات سب کو اپنے مفادات کے سانچے میں ڈھال لوں۔ وہ وکیل ہے، اچھی طرح جانتی ہے کہ ان مقدمات سے جان چھڑانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔"

"یہ سب وہ سمجھتی ہے مگر اس کا خیال ہے کہ تم حالات میں بہتری کے لیے نہیں، ابتری کے لیے کوشش کر رہے ہو۔"

"بڑی فضول بات ہے یہ۔ مجھے کیا پاگل سمجھتی ہے وہ؟" میں نے سخت برہمی سے کہا "مجھے شوق ہے گڑھے میں گرنے کا یا آگ میں کودنے کا؟ یہ ٹھیک ہے کہ کہیں مجھ سے غلطی بھی ہوئی۔ آخر انسان ہوں میں۔ لیکن یہ حالات میری غلطی کی پیداوار نہیں ہیں۔ میرے گرد شکاری اپنا حصار پہلے ہی قائم کر چکے تھے۔ اب وہ حلقہ تنگ سے تنگ تر نہیں کریں گے تو میں ہار کیسے مانوں گا؟ وہ تو اپنی فرعونیت کے زعم میں 'نعوذ باللہ خدا' بنے بیٹھے ہیں۔ رابعہ چاہتی ہے کہ میں ان کی بندگی قبول کر لوں۔ آخر کیوں؟ وہ مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہے خود اپنی نظر میں، دنیا کی نظر میں۔ اتنا بزدل اور کم ہمت نہ میں تھا اور نہ اس خوف سے بن سکتا ہوں کہ میرا دشمن قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔ شیطان بہت قوی ہے مگر میں کبھی مصلحت یا مصالحت کے فارمولے سے اسے رحمان مانوں تو میں کافر۔ پھر دلاور سے کیوں شکست کی ذلت اٹھاؤں! رابعہ ساتھ نہیں دے سکتی نہ دے۔ اپنی وکالت کرے۔ انتظار نہیں کر سکتی نہ کرے۔ مجھے ابھی نہ فرصت ہے نہ حالات کی اجازت مگر وہ مجھے بزدلی اور ضمیر فروشی کی ترغیب تو نہ دے۔"

www.paksociety.com

غالب کی خاموشی یہ ظاہر کرتی تھی کہ اسے میرے خیالات سے اختلاف نہیں۔

"وہ اپنے گھر میں شفٹ ہو گئی ہے۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے" میں نے تکلف سے کہا "ہاؤس وارمنگ HOUSE WARMING (نئے گھر کی خوشی) کی دعوت کب ہو رہی ہے۔ پرانا گھر تو میں نے دیکھا تھا۔ والد نے مع سود تمام قرض بے باق کر دیا۔"

غالب نے موضوع بدلنے کے لیے کہا "یہ سکندر بخت کی جگہ کسی اور کو لانے کی اسکیم ویسے تو مجھے ٹھیک لگتی ہے۔"

"خرابی کیا ہو سکتی ہے؟"

"خرابی بھی تیرے ساتھ ہے بھائی۔ اور مجھے لگتا ہے کہ ساتھ رہے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رابعہ کا سکندر ہمیشہ کے لیے کھو جائے۔"

"سکندر بھی نہیں بدلے گا۔ اس کا نام اور حلیہ کچھ بھی ہو۔ ہاں رابعہ اس کی واپسی کا انتظار نہ کر سکے تو اور بات ہے۔"

"کہتے ہیں آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ شیلی سامنے ہو گی تو رابعہ خود بخود تصور سے بھی غائب ہو جائے گی۔"

"میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہیں اعتماد ہونا چاہیے مجھ پر۔ آخر تم دوست ہو میرے۔"

"دوست ہیں اسی لیے تو فکر مند ہیں ورنہ ہم کہتے کہ بھاڑ میں جائیں آپ بھی مع رابعہ اور ڈاکٹر شیلی کے۔ سکندر! آدمی کو آزمائش سے بچنا چاہیے۔ یہ دعویٰ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ سیف تھا ہے۔ میری آنکھیں جب دور تک دیکھتی ہیں تو منظر بدلا بدلا لگتا ہے۔"

"قصور تیری آنکھوں کا ہے۔ دور کی نظر کا چشمہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"نہیں دوست۔ شیلی کوئی عام لڑکی نہیں۔ وہ حسین ہے' ذہین ہے' مخلص ہے تمہارے ساتھ۔ دولت مند ہے' اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ تمہیں اس گرداب سے بحفاظت نکال کے لے جا رہی ہے۔ کون جانے اس کے دل میں کیا ہے اور تمہارے جذبات کل کیا ہوں گے؟"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "یار غالب! شیلی بھی ایک ضرورت مند ہے۔ اسے حالات نے ہماری طرف دھکیل دیا ہے تو اس کے حسن' اس کی دولت یا تعلیم کا کیا قصور۔ وہ چاہتی ہے کہ ہم اس کی مدد کریں اور وہ ہماری مدد کرے۔ تو کیا ہمیں اس کو دھتکار دینا چاہیے؟ مشترک مقصد ہونے کے باوجود انکار کر دینا چاہیے؟ اس کی نیت پر شک کو بنیاد مت بناؤ۔ دیکھو اور سمجھو کہ وہ لڑکی بری نہیں ہے۔ وہ ہمارا ساتھ دینا چاہتی ہے۔ جیسے کہ کل نے دیا' شہلا نے دیا' نازو دے رہی ہے۔ اس سے بلاوجہ نفرت مت کرو۔ وہ ہم سب کے لیے بہت کچھ کر سکتی ہے اور ہم اس کے لیے بہت کچھ

نے کی بزنس ڈیلنگ میں ہیں۔ ضرورت صرف اعتماد کی ہے۔"

غالب نے کہا "یار سچ بتاؤں' رابعہ کی جگہ میں ہوتا تو میرا اعتبار بھی ختم ہو جاتا۔ عورت بڑی حساس اور حاسد ہوتی ہے محبت میں اور کوئی شک نہیں لیکن الزام دے سکتی ہے۔"

"قطع نظر اس سے کہ کل شیلی کی جگہ رابعہ ہو گی یا رابعہ کی جگہ شیلی۔"

"ظاہر ہے ایک ہو گی۔ ایک نیام میں ایک ہی تلوار ہو سکتی ہے ورنہ عاشقی کی بات مت کرو۔ دو سے نہیں' چار سے نکاح پڑھوا لو۔ ایک دل میں تو ایک ہی محبت رہتی ہے۔ ایک گھر میں چار سوکنوں کو ٹھونس دو اور بس۔"

"غالب! میں بہت اپ سیٹ ہوں۔ مجھے مشورہ چاہیے' ہمدردی اور دوستی چاہیے۔ رابعہ کی طرح بے رحم مت بنو" میں نے سر تھام کے کہا "مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ حالات تو تمہارے سامنے ہیں۔ میں نے فوری فیصلہ نہ کیا تو انجام وہی ہو گا جس کی خبر مجھے شکاری دے چکے ہیں۔"

میں نے وہ تصویر غالب کو دے دی جو مجھے ہوٹل میں پہنچائی گئی تھی۔ اس نے روشنی کے رخ کر کے اسے دیکھا "یہ کس کا حرام کی پن ہے؟"

"یہ دھمکی ہے' مذاق نہیں ہے غالب۔"

"میں سمجھتا ہوں۔"

"لیکن پھر بھی اعتماد نہیں ہے مجھ پر؟ تو بھی سمجھ رہا ہے کہ میں شیلی کے ساتھ فرار ہو رہا ہوں اور لوٹ کے نہیں آؤں گا؟ یہ جو پیپر PAPER MARRIAGE میں ضرورت کے تحت نہیں' تم سب کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کروں گا۔"

"نہیں یار۔ میری طرف سے اپنی اوکے۔ مجھے بھروسہ ہے تیرے وعدے پر" غالب نے کہا "اللہ تجھے اس آزمائش میں سرخرو کرے اور کل ہم پشیمان نہ ہوں اور تو شرمسار نہ ہو۔ لیکن عورتوں کے جذبات کی نوعیت کچھ اور ہے۔ نازو یا گل میں سے کوئی کسی وکیل بہ تیری حمایت نہیں کر سکتی۔ ان کی جذباتی ہمدردیاں یک طرفہ طور پر کسی وکیل یا جواز کے بغیر رابعہ کے ساتھ ہوں گی۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن تم اور محسن انہیں سمجھا سکتے ہو۔"

"میں نے کہا نا کہ یہ عقل کا مسئلہ نہیں ان کے لیے۔ ہم خاک سمجھائیں گے۔ تو محسن سے بات کر کے دیکھ لے۔ وہ ان جانے کا کل نہیں مانے گی۔"

"وقت خود منوا لے گا سچائی کو۔"

اندر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی' غالب اٹھا "خدا خیر کرے۔ جب گھنٹی بجتی ہے تو مجھے ریسیور اٹھاتے ہوئے خوف آتا ہے۔ تو سو جا دو چار گھنٹے کے لیے۔"

میں نے کہا "پانچ بجے ہیں۔ کوشش کرتا ہوں' نیند آ جائے۔"

فون وقار یوسف کا تھا۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن میں

نے غالب سے اشارے سے سمجھایا کہ ٹال دے۔ اس نے کہہ دیا کہ سکندر تو سو گیا ہے۔ رات کو ڈاکٹر شیلی کے ساتھ آیا تھا۔ دونوں بہت تھکے ہوئے تھے۔ کچھ بتائے بغیر ہی سو گئے تھے۔

"بات کیوں نہیں کی اس سے؟" غالب نے ریسیور رکھ کے کہا۔

"دیکھو یار! یہ جو باتیں تم سے اور میرے درمیان ہوئی ہیں' ان کا مطلب کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔ سب ٹھیک۔ وقار یوسف قابل اعتبار ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ بات نہ تم اور ان کو معلوم ہو۔ مجھے اس معاملے میں ایک منتقب مرد ہونے کا الزام قبول کرنا ہے لیکن رسک نہیں لے سکتے۔ میں سمجھتا ہوں' عورتیں راز کو راز رکھنے کی اہل نہیں ہوتیں۔"

"کیا مطلب؟ نازو کو یا رابعہ کو بھی نہیں بتاتے؟"

"چاہتا تو میں بھی تھا مگر یہ تعلق ہے اور ویسے بھی رابعہ یا نازو اور گل کی آزمائش ہو چکی ہے۔ جب میں لندن سے واپس آیا تو مجھے پتے افراد کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی نازو کو بتانے میں کوئی حرج نہیں مگر میرے سامنے بات مت کرنا۔ وہ مجھ سے لڑے گی۔"

"بعد میں تجھ سے لڑے گی۔"

"تم تو لڑتے رہتے ہو یار۔ اچھا موضوع بدو گا یہ بھی" میں نے کہا۔

"نہیں یار۔ اس سے آپ بالکل صاف بات کریں۔ دونوں سے رابعہ اور منظر کو بھی بتا دیں' انہیں اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ آپ چھتی ہے۔"

"کس بات کی؟"

"تو وار ہے یار" غالب نے کہا۔

"مجھے نہ دن یاد' نہ مہینہ' نہ تاریخ" میں نے کہا۔

"ابھی چلتے ہیں منظر کی طرف۔ ناشتے کے بعد۔ ان سے ڈسکس کر لیں گے پورا پلان۔ وہیں سے محسن کو فون کر دینا۔"

"کل سیٹ ہو گئے چھ افراد۔ میں اور شیلی آٹھ" میں نے کہا "زبان کوئی نہیں ہو گا جس کے کانوں میں بھنک بھی پڑے۔ غلطی سے بھی کسی کے منہ سے کوئی بات نکل گئی تو میرا سارا پلان فیل اور بیڑہ غرق۔ یہ بہت خطرناک کھیل ہو گا جس میں انتہائی احتیاط کے سارے تقاضے ہم سب کو پورے کرنے ہوں گے ورنہ راز فاش ہو جائے گا۔ میں نے اسی لیے وقار یوسف سے بات نہیں کی تھی کہ وہ زیادہ کرید تا۔ زیادہ تفصیلات میں اسے بھی بتانا نہیں چاہتا۔ میں شیلی کو بھی منع کر دوں گا۔"

"یہ ڈاکٹر شیلی ابھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یا تو یہ انتہائی چالاک ہے یا بہت احمق ہے۔ احمق سے میری مراد تھی' سادہ لوح۔"

"اس کی پرورش ذرا مختلف ماحول میں ہوئی ہے اس لیے گھلنا ملنا سیکھ رکھا ہے۔ وہ کچھ بے باک لگتی ہے اور جوش زیادہ ہے۔ جذباتی

بھی ہے مگر بعض اوقات اپنی شخصیت کا بالکل متضاد رخ دکھاتی ہے۔ جب اچانک ڈاکٹر شیلا خان بن جاتی ہے۔ ایک ایسی باوقار خاتون ہوتی لیکن میں کہوں گا تو وہ انبار لگائے پر بھی تیار ہو جائے گی۔"

"ہاں بھائی' تمہاری نہیں تا شیلی تو اور کس کی مانے گی۔"

"یہ بات نہیں کہ میرا لئے ہیں سیدھی بات اس سے منوالی جا سکتی ہے۔ لندن سے وہ ... شن لے کر اخبار شائع کرنے کا آئیڈیا کیسا ہے؟"

"آئیڈیا کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز ہے حالات کی روشنی میں قابل عمل کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔" غالب نے کہا "تجربے کے بغیر ہر آئیڈیا غلط ثابت ہو سکتا ہے یا صحیح سمجھا جا سکتا ہے۔"

چار گھنٹے بے سدھ سونے کے بعد میں جاگا تو کوٹھی پر سکوت تھا۔ وقار یوسف کی عدم موجودگی میں گھر ویسے سنسان لگتا تھا اور اس کا اثر گو ہم چار مہمانوں کا وجود ختم نہیں کرتا تھا۔ وقار یوسف کی بیوی بہت تیز طرار ... ہر وقت مہمان نوازی پر مستعد رہتی تھی اور سب کی خدمت پر کمربستہ۔ وہ عادات' مزاج اور فطرت میں اپنے صاحب کے برعکس تھی۔ ممکن ہے اس میں اپنی ماں کی صفات کا عکس ہو جو نہ جانے کب سے مفلوج پڑی تھی۔ اس میں غرور یا بڑے نام کا بھی نہ تھی۔ اتنے بڑے باپ کی اکلوتی بیٹی اپنے شوہر کے گھر میں سارے کام خود کرتی تھی۔ صبح سے شام تک مصروف رہنا اور جتنے کھلانے سب کے کام کر دینا اسے اچھا لگتا تھا۔ ہم وقت بے وقت چائے کی فرمائش کرتے تھے یا کافی مانگ لیتے تھے۔ اکثر وہ خود ہی سمجھ لیتی تھی کہ اب ہمارا موڈ کیا ہے۔ اس کے نہ ہونے سے گھر کی چہل پہل مفقود تھی۔ باپ موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ میں تصور کرتا تھا تو مجھے اس کا چہرا افسردہ اور دکھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آتے تھے۔ اسی سے گھر کے سکوت میں اداسی کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔

میں نے اس بیڈ روم میں جھانک کر دیکھا جہاں نازو نے شیلی کو اپنے ساتھ سلا لیا تھا۔ اب وہاں شیلی تکیے کو دبوچے اوندھی پڑی تھی۔ باہر سے نازو کے چلانے اور غالب کے چیخنے کی آوازیں سن کے میں برآمدے کی طرف گیا۔ وہاں غالب اسی کرسی پر بیٹھا تھا۔ میری جگہ نازو نے لے لی تھی۔

میں نے کہا "السلام علیکم حضرت اور خاتون۔ دیکھئے میں آپ کے گھریلو جھگڑے میں دخل نہیں دوں گا۔ چلیے اپنا کام کیجیے۔"

غالب چیخنے لگا "جھوٹ تو بنایا عورتوں کے لیے ایجاد کرنا پڑا ہو گا۔ کسی میرے جیسے مجبور مرد کو۔"

"اسی لیے تو مرد جھوٹے ہوتے ہیں۔" نازو نے کہا "جھوٹے اور دغا باز۔"

"کیا کریں ہم' جب تم میں سچ سننے کا حوصلہ ہی نہیں۔ پچاس سال کی عورت بھی پانچ دس سال کی رعایت نہیں' تھتی پڑنے

www.paksociety.com

اسکالرشپ مانگتی ہے۔ عمر میں تم سے لڑکی دو بھی ہوتی ہی نہیں۔ اب ہم سب سچ بولیں کہ خاتون یہ بال کیا دھوپ میں سفید ہو گئے جن کو آپ نے کالا کولا ہیئر کلر سے براؤن کیا ہے؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "تم بھی زیادتی کر رہے ہو یار۔ نازو ابھی پچاس کی کہاں ہوئی ہے۔ کالا کولا ہیئر کلر ایسے ہی آزمایا ہوگا اس نے۔"

نازو نے مجھے گھورا "تم مت بولو سکندر۔"

غالب نے سہلایا "کیوں نہ بولے۔ تم نے مجھے جھوٹا کہا تھا اسے دغابازہ۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں یار۔ ہم بھی کتنا جھوٹ بولتے ہیں ان کے سامنے۔ دل پر پتھر رکھ کے ان کے حسن کی تعریف میں زمین زمان کے قلابے ملاتے ہیں۔"

"کسی چڑیل کو حور کہنا بڑے دل گردے کا کام ہے" غالب نے مجھ سے اتفاق کیا۔

نازو چلانے لگی "کیا میں چڑیل ہوں؟ ہمت ہے تو صاف کہو۔"

"نہیں۔ چڑیل کی نسل الگ ہے۔ بھوت جن کے قبیلے سے میرے سسر محترم کا تعلق ہے۔ اپنے بھانجے نہیں ہوتے" غالب نے اسے غور سے دیکھ کے کہا۔

نازو اس کی طرف لپکی "سکندر کو دیکھ کے ادب ہوا۔"

غالب فوراً میرے پیچھے آ گیا "دیکھا، سچ برداشت نہیں ہوا نا۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ سارا دن آئینہ دیکھتی رہوں اور قصیدے پڑھتا رہوں تمہارے حسن کے تو خوش رہو گی۔"

"اچھا۔ تو الو بنانے ہو تم مجھے؟" وہ میرے پیچھے آئی تو غالب دوسری طرف چلا گیا۔

"توبہ توبہ۔ بندے کی کیا مجال کہ خدا کے کام میں دخل دے۔ ویسے بھی الو کے پٹھے کی مؤنث ہوتی ہے الو کی نہیں۔"

میں نے نازو کو روک لیا۔ اسی وقت میری نظر نیلی پر گئی جو نہ جانے کب دروازے کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ابھی تک رات والے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے بال بھی بکھرے ہوئے تھے اور ہاتھوں کی خراشوں پر خون کی لکیریں جم گئی تھیں۔

نازو نے کہا "آ جاؤ نیلی۔ چھپ کے کیا دیکھ رہی ہو؟"

نیلی باہر آ گئی "وہ یار۔ میرا طبیعت ذرا خراب تھا۔ رات میں اتنی تھکی ہوئی تھی۔ کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔"

غالب نے کہا "نازو! نیلی ڈاکٹر نیلی کو باتھ روم دکھا دو، کپڑے دو بدلنے کے لیے، ناشتا بنا دو ہم سب کے لیے۔ آخر اتنی دیر سے کیوں ہو تم۔ لڑکیوں کو صبح صبح یہ دنگا فساد زیب دیتا ہے؟"

نازو نے اسے خون آشام نظروں سے گھورا مگر بولی نہیں۔ وہ نیلی کو لے گئی تو غالب نے مجھے اخبارات کی طرف متوجہ کیا جو وہاں ڈھیر کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک ایک کر کے میں نے

سب کی سرخیاں دیکھ لیں مگر کسی میں شہزی کے قتل کی خبر نہیں تھی اور نہ ڈپٹی ہوم سیکرٹری کے گھر پر چھاپا پڑنے کی۔ ایک مختصر خبر نقوی صاحب کے صاحب فراش ہونے کی مخصوص اخباری زبانوں میں دی گئی تھی کہ ہارٹ اٹیک کے بعد وزارت داخلہ کے ایک اعلیٰ افسر کو اسپتال میں داخل کروا دیا گیا ہے جہاں ڈاکٹران کی جان بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے کہا "غالب! نقوی صاحب کے گھر میں صرف بیٹی داماد ہوں گے۔"

"نوکر چاکر بھی ہوں گے" غالب بولا۔

میں نے کہا "وہ فائلیں۔ میرے مقدمات کی فائلیں بھی تو شاید وہیں ہیں۔"

"کیا پتا نقوی صاحب نے واپس کر دی ہوں۔"

"چانس تو لیا جا سکتا ہے" میں نے کہا "اگر آج رات ہم بھی رہیں ہوں تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔"

غالب سوچ میں پڑ گیا "نقوی صاحب کی نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"ابھی تو ان کی زندگی خطرے میں ہے۔ اللہ انہیں شفا دے پھر وہ ضرور رکھو گے کریں گے لیکن بغرض محال۔۔۔ خدا نخواستہ۔"

غالب نے سہلایا "اگر انہیں زبردستی ہٹا کے کسی کے لیے راستہ صاف کیا گیا ہے تو آنے والا ہمارا نصیب ہمارے دشمنوں کا ساتھی ہوگا۔ نقوی صاحب پر بھی کاریاز نہ ہوا تو وہ بھی نقد سودا کر لیتے۔ اللہ انہیں معاف کرے اپنے اختیارات کو کیش کرانے کے معاملے میں وہ بہت بدنام تھے۔ یہ کوٹھیاں، گاڑیاں ایسے ہی تو نہیں بن گئی تھیں۔ چوہدری دلاور اور رابعہ گیتی کی دوستی کے ساتھ بنی دیوار بن گئی تھی ورنہ پیسے کی تو اہمیت ہی نہیں تھی۔ وہ بلیک میل بھی ہو سکتے تھے۔"

"یار! یہ کام بہت ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آج رات کوشش کرتے ہیں لیکن ایک شرط ہے" غالب نے کہا "اگر نقوی صاحب صحت یاب ہو کے لوٹ آئے تو ہم یہ فائلیں واپس وہیں رکھوا دیں گے یا رکھ دیں گے۔"

"فائلیں ان کے جانشین کے ہاتھ نہیں لگنی چاہئیں" میں نے کہا۔

"کیوں نہ ہم وقار یوسف سے کہہ دیں۔۔۔ وہ اس گھر کے بارے میں ہم سے بہتر جانتا ہے اور زیادہ اعتماد کے ساتھ۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ ایک پیشہ ور وکیل ہے۔ اسے غیر قانونی کام میں ملوث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میرے کیس سنگیا رابعہ کے پاس ہیں اور وقار یوسف دونوں کا معاون ہے۔ ایسے اگر مقدمات کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا تب بھی وہ ضمیر کا مجرم بن جائے گا۔ اسے احساس ہو گا کہ اس نے اپنے پیشے کی حرمت کو برقرار نہیں رکھا۔"

ناشتے کی میز پر میں نازو اور نیلی کو دیکھ کے حیران ہوا۔ نیلی نے نازو کے کپڑے پہنے تھے اور اسے فٹ آتے تھے کیونکہ وہ بھی نازو کی طرح نازک اور دبلی پتلی تھی۔ ان کے درمیان دوستی کے مراحل بڑی تیزی سے طے ہوئے تھے اور وہ آپس میں ایسی بے تکلف ہو چکی تھیں جیسے برسوں کا یارانہ ہو۔ ان دونوں کی فطرت میں خاصی مماثلت تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ ایک ڈاکٹر تھی تو دوسری جوڈو کی ماہر۔ نیلی تو خیر عادت کے مطابق سب ہی کو یار کہتی تھی مگر نازو بھی اسے یار کہہ رہی تھی اور راستا بنا کے لگائے ہوئے ان کی زبانیں ایک ساتھ چل رہی تھیں۔ یہ کمال غالباً تراغین ہی کو حاصل ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت بولتی بھی ہیں اور ایک دوسرے کی سن بھی لیتی ہیں۔

غالب نے زیر لب کے شعر پڑھا "بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا۔"

میں نے آہ بھری "جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔"

نازو اسے بتا رہی تھی کہ نقوی صاحب کون ہیں اور حادثہ کیسے پیش آیا ہوتا ہے۔ ان کی بیٹی سے ہمارا کیا تعلق ہے اور ان کو زہر دینے والا کون ہو سکتا ہے۔

میں نے میز کے نیچے سے نیلی کو ٹانگ مار کے متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر یہ لات غلطی سے نازو کے لگی۔

اس نے غالب کو گھورا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"جو بھی ہو رہا ہے اچھا نہیں ہو رہا ہے" غالب نے کہا۔

"اپنے پیروں کو قابو میں رکھو۔"

"تم اپنی زبان کو قابو میں رکھو" غالب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے فریج کا سہارا لیا اور نیلی کو مخاطب کر کے کہا "کل رات کی کوئی بات مت بتانا۔"

نازو مجھ پر خفا ہونے لگی "کیا کہا ہے تم نے؟ ایسی کون سی خفیہ بات تھی جو پہلے تم اور محسن فائدہ اٹھانے تھے۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ اب یہ ڈاکٹر نیلی آ گئی ہیں۔ نازو! کیوں نہ تم بھی فریج سیکھ لیں؟"

میں نے کہا "میں صرف یہ بتا رہا تھا کہ صبح وہ میرے ساتھ غیر رقت نہیں آئیں گی۔ ڈاکٹر نے نسخے میں لکھا تھا۔"

نازو نے نیلی کی طرف دیکھا "یہی کہا تھا سکندر نے؟"

نیلی نے آنکھ میں سہلایا تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ الو کی بچی۔ سمجھی کیوں نہیں کہ میں فریج استعمال کرنے پر مجبور تھا۔

نیلی نے کہا "اس نے کہا تھا کہ یہ لڑکے نہیں محبت کرتے ہیں یار۔"

میں نے سکون کا سانس لیا اور شکر گزار نظروں سے نیلی کو دیکھا۔ اس نے بڑی خوب صورتی سے میری بات کا بھرم رکھ لیا تھا۔ اس بات سے نازو کی ساری خفگی اچانک سرخ ہنسی میں ڈھل

گئی تھی۔

"سکندر! کیا میں اسپتال جا سکتی ہوں؟" نیلی نے کچھ دیر بعد اچانک کہا "یار میں نقوی صاحب کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"نہیں۔ مگر کیوں۔ اور یہ بھی بہت مشکل" میں نے کہا۔

"ہاں۔ انتہائی نگہداشت کے شعبے میں ہر ایک کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی" غالب نے میری تائید کی۔

"میں ہر ایک نہیں ہوں ڈاکٹر ہوں" نیلی نے کہا "اور میں عام ڈاکٹر بھی نہیں ہوں۔ مجھے کون روک سکتا ہے یار۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ جو ڈاکٹر ان کے علاج پر مامور ہیں، ہر کوئی اندر جا سکتے ہیں۔ وہ تمہیں دخل در معقولات کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"میں ڈاکٹرز سے بات کروں گی۔" وہ اتنی ضدی ہے کہ مجھے نہیں ٹال سکتے۔ میں بتاؤں گی کہ میں لندن سے کوالیفائیڈ ہوں اور نیورو لوجسٹ ہوں یار۔"

"یہ نیورولوجی کا کیس نہیں ہے۔"

"نہ ہو۔ وہ مجھے کیس اسٹڈی کرنے سے منع نہیں کریں گے یار۔ یہ زہر سیدھا دماغ کو اور اعصابی نظام کو مفلوج کرتے ہیں۔"

غالب نے کہا "یار سکندر! کیا حرج ہے اگر ڈاکٹر نیلی کو وہاں پہنچا دیا جائے۔ شاید کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے۔۔۔۔۔"

میں نے کہا "غالب! کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔"

نیلی نے کہا "یار! میں چیک کروں گی کہ رپورٹس ٹھیک ہیں یا نہیں اور علاج رپورٹس کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں؟"

"تم کون ہوتی ہو یہ چیک کرنے والی؟"

غالب نے کہا "فرض کرو یار، یہ نقوی صاحب کی بہن بن کے پہنچ جائیں۔"

"بہن بن کے؟ ناممکن۔"

"ہاں۔ یہ کہہ سکتی ہیں کہ میں تو بھائی کی بیماری کا سن کے لندن سے آئی ہوں۔ ان کا پاسپورٹ اس کا ثبوت ہوگا۔ یہ لندن کے کسی اسپتال میں ہیں۔ اس کے حوالے بھی کام دیں گے اور ان کا ایک طرح سے قانونی حق بھی بن جائے گا اور اخلاقی بھی۔"

"یار، خدا کے لیے سوچو، وہاں اور لوگ بھی ہوں گے جو ہمارے اور ان کے مشترکہ دشمن ہیں" میں نے کہا۔

"یار، مجھے کوئی نہیں پہچانتا۔ بس کوئی مجھے سیدھا آئی سی یو تک لے جائے۔ اس سے پہلے کہ کسی کو کچھ پتا چلے میں ڈاکٹروں سے بات کر کے اور نقوی صاحب کو دیکھ کے نکل آؤں گی۔"

نازو نے کہا "انہیں وقار یوسف کی بیوی لے جا سکتی ہے اپنے ساتھ۔"

میری مخالفت رائیگاں گئی۔ نیلی کو غالب کے ساتھ اب نازو کی حمایت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ غالب نے اسی وقت فون کیا اور وقار یوسف کو بتا دیا کہ ہم ان کی طرف آ رہے ہیں۔ وقار یوسف کی

کا آرام دہ بیڈ روم تھی اور شاید ہمارے استقبال کے لیے ہی چھوڑی گئی تھی۔ نقوی صاحب کے گھر میں اس سے کئی گنا قیمتی دو کاریں تھیں۔ ان کاروں میں شان و شوکت کے ساتھ سر پر غرور اٹھا کے بیٹھنے والا اسپتال کے بیڈ پر کومے میں پڑا ہوا تھا۔

نازو پر شبلی نے نہ جانے کیا منتر پھونکا تھا کہ اس کے جذبات کا رخ ہی بدل گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ رابعہ کی حمایت میں وہ غالب سے بڑھ کر شبلی کی مخالفت کرے گی لیکن وہ تو بالکل ایک جان دو قالب ہو رہی تھیں۔ وقار یوسف نے شبلی کا استقبال قدرے سرد مہری سے کیا اور اس کی بیوی نے بے رخی سے مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے شبلی نے اسے بھی ہمنوا بنا لیا۔

وقار یوسف کی بیوی نے حیرانی سے کہا "تم دیکھو گی پاپا کو؟"

نازو نے کہا "ارے یہ بڑی توپ ڈاکٹر ہیں۔ ولایت کی ڈگری ہے۔"

وقار یوسف کی بیوی کا چہرہ پرامید ہو گیا "اچھا... یہ تو بڑا اچھا ہوا کہ تم آ گئیں۔ تم کچھ کر سکتی ہو؟"

میں نے کہا "وہ تو بڑے ڈاکٹر کر رہے ہیں پہلے ہی..."

نازو نے میری بات کاٹ دی "ہمیں تو معلوم نہیں نا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور وہ بتاتے بھی نہیں۔"

"مجھے اطمینان ہو جائے گا۔ ڈاکٹر شبلی! چلو میرے ساتھ۔ میں لے کر چلتی ہوں تمہیں" وقار یوسف کی بیوی نے بے چینی سے کہا۔

وقار یوسف نے اسے ٹوکا "ابھی ایسے نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر تو بہت ہیں لیکن جس کا کیس ہو علاج اسی کا چلتا ہے۔"

"یار میں علاج میں دخل نہیں دوں گی۔ میں تو بس دیکھوں گی کہ کیا حالت ہے ان کی؟"

نازو نے کہا "تجویز یہ ہے کہ انہیں نقوی صاحب کی بہن بنا دیا جائے۔ کہا جائے کہ یہ بیماری کا حال معلوم ہوتے ہی لندن سے آئی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بڑی ڈاکٹر بھی ہوں گی۔"

اب وقار یوسف بھی مجبور ہو گیا۔ "او کے۔ میں تمہیں لے چلتا ہوں۔ تمہارے پاس تو کچھ نہیں ہے ڈاکٹر شبلی۔ اسٹیتھوسکوپ وغیرہ جس سے تم ڈاکٹر نظر آؤ۔"

وہ ہنس پڑی "کیسی باتیں کرتے ہو یار۔ ڈگری دیکھیں گے وہ میری تو میں ڈگری دکھا دوں گی۔ پاسپورٹ ہے میرا۔ اور جو کچھ ہے وہ تو یہاں ہے" اس نے اپنے سر پر انگلی رکھی "دو منٹ میں معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کتنا بڑا ڈاکٹر ہے۔"

وقار یوسف شرمندہ ہو گیا۔ میں نے اور غالب نے عمداً ان کے ساتھ جانے پر اصرار نہیں کیا۔ وقار یوسف جانتا تھا کہ خطرہ تو شبلی کے لیے بھی ہے مگر نسبتاً کم۔ آئی سی یو کے ڈاکٹر یقیناً اسے چوہدری ولاور کی بہن کی حیثیت سے شناخت نہیں کر سکتے تھے ورنہ اسپتال کے اندر ان کی بدمعاشی چل سکتی تھی۔ میں نے وقار یوسف کو سمجھایا کہ وہ اپنی بیوی کو اور ڈاکٹر شبلی کو بھی آئی سی یو کے سامنے ڈراپ کرے اور انہیں وہیں سے سیدھا گھر لے آئے۔

شبلی نے مجھے تسلی دی "فکر مت کرو۔ میں جانتی ہوں کہ اس میں کتنا رسک ہے لیکن میں انہیں چکر دے سکتی ہوں یار۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم تمہاری بحفاظت واپسی کے لیے دعا کریں گے" میں نے کہا۔

اس گھر میں اب میں اور غالب ہی رہ گئے تھے۔ اگر میرے مقدمات کی فائلیں اسی گھر میں کہیں موجود تھیں تو ہم آسانی سے تلاش کر سکتے تھے۔ ہمارے پاس وقت بھی کم نہیں تھا اور نہ کوئی ہمیں روکنے والا تھا۔ گھر کے ملازم اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ نقوی صاحب کی بیمار اور معذور بیوی کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا اور اس وقت میاں بیوی کی ایک سی کیفیت تھی۔ وہ اس دنیا میں تھے اس دنیا کو دیکھ سکتے تھے "اس دنیا کی آوازوں کو سن سکتے تھے اور وہ سب محسوس کر سکتے تھے جو ان کے گرد و پیش کا حصہ تھا لیکن وہ زندہ انسانوں کی جدوجہد حیات اور تگ و دو میں شامل نہیں تھے۔

گھر کے اندر ملازمین کی تعداد چار تھی۔ ان میں سے ایک تو پرانے عمر رسیدہ خانساماں اور اس کی بیوی تھے جو اولاد کے ہوتے ہوئے بھی بے اولاد تھے۔ نہ جانے یہ ان کے اعمال کی سزا تھی یا ان کی آزمائش کہ اولاد نے انہیں تمام عمر کے حق خدمت کا معاوضہ بڑھاپے میں سکھ پہنچا کے ادا نہیں کیا تھا۔ ان کے علاوہ ایک مالی تھا اور ایک شوفر جو سرکاری طور پر مہیا کیے گئے تھے بیشتر گھر کے باہر ہی رہتے تھے اور باہر کے سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے۔

غالب کی سوچ بھی میرے خیالات کا عکس تھی "یہ اچھا موقع ہے" میں نے سر ہلایا "آغاز کہاں سے کریں؟"

"فائلیں جن میں تو ہوں گی نہیں۔ نقوی صاحب کی اسٹڈی میں ہی ان کا آفس بھی ہو گا جہاں وہ آفس کا کام بھی کر لیتے ہوں گے۔"

میں نے اور غالب نے اطمینان سے گھر کے اندر کا جائزہ لینا شروع کیا۔ گھر میں تین بیڈ روم تھے۔ پہلا شاید مدتوں سے نقوی صاحب اور ان کی بیگم کے زیر استعمال ہو گا۔ اب ان کے ازدواجی تعلقات محض وضع داری کی زنجیر کا اظہار تھی جو صرف رشتہ حیات کے منقطع ہونے سے ٹوٹ سکتی تھی۔ وہ جو زندگی کی گاڑی کے دو پہیے تھے اب ایک مجبوری کے بوجھ کو گھسیٹ کر اس مقام تک لے آئے تھے جہاں ایک کو دوسرے کی طرف دیکھنے کی نہ فرصت تھی نہ ضرورت اور اب تو ان کے درمیان فاصلے اتنے بڑھ چکے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے وجود سے بھی بے نیاز و بے خبر تھے۔ بیوی کے ساتھ خادمہ رہتی تھی جو رات کو بھی انہیں مقررہ وقت پر پانی یا دوا دے دیتی تھی۔ نقوی صاحب کے زیر استعمال

دوسرا بیڈ روم تھا جہاں وہ اپنی تنہائی کی الگ دنیا بسائے صرف پڑھنے لکھنے اور سونے کے لیے ہی رہتے تھے ورنہ شاید ان کی زندگی بھر کی خواہش پوری ہو چکی تھی۔ تیسرا بیڈ روم بند تھا۔ یہ شاید پہلے وقار یوسف کی بیوی کے لیے مخصوص ہو گا۔

سامنے لونگ میں ڈرائنگ روم کا ایک دروازہ کھلتا تھا اور اس وسیع ڈرائنگ روم کے پچھلے حصے میں ایک پردے کے پیچھے باتھ روم تھا تو دوسرے کے پیچھے ان کا آفس یا مطالعے کا کمرا تھا۔ مہمان باہر سے ہی ڈرائنگ روم میں لائے جاتے تھے اور نقوی صاحب بردہ ہٹا کے اپنے آفس سے طلوع ہوتے تھے۔

آفس بارہ بائی چودہ فٹ کا کمرا تھا جس کے دائیں ہاتھ پر مہاگنی کی میز تھی اور اس کے پیچھے لیدر سیٹ والی کرسی۔ میز پر دونوں جانب لیمپ تھے اور چھت پر شیڈ والی ڈبل ٹیوب لائٹس تھیں۔ میز کے تین طرف شیشے کی سلائیڈنگ ڈور والی کتابوں کی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں اور انہیں دیکھ کے نقوی صاحب کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ سب ہسٹری اور پولیٹیکل فلاسفی پر جدید اور قدیم اسکالرز کی ریسرچ تھی۔ ہم جیسے شعر و شاعری یا ناول افسانے کا ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے وہ بہت ثقیل اور غیر دلچسپ کتابیں تھیں۔

ان کی کرسی کے عین سامنے پشت کی دیوار کے ساتھ ایک صوفہ سیٹ ان ملاقاتیوں کے لئے تھا جو دفتر کے بعد دفتری امور اور مسائل لے کر حاضر ہوتے تھے۔ سرکار کے قواعد و ضوابط کے مطابق ہونے والے کام تو دفتری اوقات میں بھی ہو جاتے تھے مگر ان معاملات کو قواعد و ضوابط میں لچک پیدا کرنے اور خصوصی صوابدیدی اختیارات کے تحت رعایت دینے کا ہو وہاں دفتری فضا سازگار نہیں رہتی۔ آپس کی بات ایسے ہی گوشۂ خلوت میں بگڑنے نہیں پاتی اور کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر بن جاتی ہے۔

بکل کے اوپر چند فائلیں دفتری تھیں۔ سماجی بہبود کے ایک ادارے کی خفیہ سرگرمیوں کے بارے میں خفیہ پولیس کی رپورٹ۔ ایک قبائلی علاقے میں امن و امان کی صورت حال کے بارے میں ڈی سی کی تجاویز۔ پولیس کے چند نیک نام افسران کی پوسٹنگ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے چند صفحات کے نوٹ پڑھ کے فائلوں کے مندرجات کا اندازہ کر لیا۔

غالب نے دائیں طرف کی درازوں کو دیکھا۔ ان میں نوٹ بکس ڈائریاں اور "سمری شیٹس" SUMMARY SHEETS تھیں جو ادھر ادھر سے موصول ہوئی تھیں۔ بائیں طرف والی دراز پیچھے خانے میں تالا تھا۔ غالب نے ایک کاغذ کاٹنے والے نوکدار چاقو کی مدد سے تالا کھولنے کی ناکام کوشش کی۔ کنڈی توڑنے کی کوشش میں نازک سے چاقو کا دستہ ٹوٹ گیا۔

آفس میں چھتی ہتھوڑی یا لوہے کی سلاخ جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ پیپر ویٹ واحد بھاری چیز تھی جس سے شاید کسی کے سر میں گومڑ تو پیدا کیا جا سکتا تھا مگر وہ تالا نہیں توڑا جا سکتا تھا۔ غالب نے اس مسئلے کو بزور شمشیر حل کیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں گیا اور ایک تلوار لے آیا۔ کراس کی شکل میں یہ خنجر نما چھوٹی تلواریں ایک دیوار کی آرائش کا حصہ تھیں۔ تلوار سے شاید آج تک کسی چور نے بھی تالا نہیں توڑا ہو گا۔ یہ تاریخی کارنامہ غالب نے سرانجام دیا۔

اس خانے میں نیچے سے اوپر تک فائلیں بھری ہوئی تھیں۔ مجھے شک تھا کہ آفس میں سے سنائی دینے والی آوازیں ہمیں خادمہ کو یا اس کے خانساماں شوہر کو متوجہ نہ کر لیں۔ وہ ہمیں روک تو نہیں سکتے تھے لیکن نقوی صاحب کے آفس میں ہماری سرگرمی انہیں شک میں مبتلا کر دیتی جہاں ان کے ہوتے پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا بلکہ بیوی تک قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔

میں نے دروازے کو بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ اب میں نے اور غالب نے آمنے سامنے بیٹھ کے ایک ایک فائل کا یوں مطالعہ شروع کیا جیسے ان پر ہمیں احکامات صادر فرمانے ہیں۔ یہ ٹاپ سیکرٹ فائلیں تھیں جن پر لال رنگ کے کراس اور اسٹار نمایاں تھے۔ یہ سب انتہائی حساس نوعیت کے ایسے معاملات تھے جن کے بارے میں عام طور پر سرکاری موقف یہ رہتا ہے کہ ان کا تعلق براہ راست قومی سلامتی سے ہے اور خدانخواستہ افشائے راز ہوا تو اسی دن ملک اور قوم کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ بات اگر رائی کے برابر ہو تو پیرو کرسی اسے پہاڑ بنا کے پیش کرتی ہے اور طول دیتی ہے۔ کون شرپسند ہے کون تخریب کار ہے کون دشمن کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے اور کون سرکار کے اقتدار کی کرسی کے لیے خطرہ ہے۔ یہ ساری رپورٹس ایسے ہی افراد اور اداروں یا جماعتوں کے بارے میں تھیں۔ اور ظاہر ہے غلط تھیں لیکن مستند تھا ان کا فرمایا ہوا۔

"یہ معلومات اخبار والوں کو مل جائیں تو ہو جائے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی" غالب نے کہا۔

"دودھ کہاں... صرف پانی ہو گا ڈوب مرنے کے لیے" میں نے کہا۔

"حد ہے غلط بیانی غلط فہمی اور غلط بیانی کی" غالب بولا "ملک خطرے میں ہے اسلام خطرے میں ہے۔ امن و امان خطرے میں ہے۔ اصل خطرہ نظر آتا نہیں یا کسی کو دیکھنے نہیں دیتے۔ بے بنیاد خطرات کا طومار ہے۔"

میں نے فائلیں سمیٹ کے کہا "ان میں تو اس ناچیز کے سوا ہر اہم سیاسی شخصیت کے بارے میں کچھ نہ کچھ فرمایا گیا ہے۔"

"یہ شکر کا مقام ہے کہ سابقہ مشرقی پاکستان کے ذمے داروں میں آپ کا اور میرا یا ایم آر ایس کا نام ابھی تک نہیں آیا" غالب نے کہا۔

"نقوی صاحب نہ رہے تو آ جائے گا۔ ہمارے نئے...

www.paksociety.com

اپنے مہرے کو آگے بڑھاویا تو ثابت کیا جائے گا کہ ایم آر ایس کو یہودی لابی' کے جی بی یا را کی امداد و حمایت حاصل تھی۔" میں نے کہا "اب کیا کریں؟"

غالب نے ساری فائلوں کو پھر اسی ترتیب سے دراز میں رکھ دیا جیسے وہ پہلے رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے بھی تاکید کی کہ جس چیز کو ہاتھ لگاؤ اسے بعد میں کپڑے سے ضرور صاف کرتے جاؤ۔

"ہم احتیاط نہیں کرتے۔ ہر جگہ فنگر پرنٹ چھوڑ دیتے ہیں۔ اس امید میں کہ یہاں کون دیکھتا ہے لیکن بعض معاملات میں دیکھنے والوں کو سب نظر آجاتا ہے۔ ذرے ذرے میں' جو نہ ہو وہ بھی" غالب نے کہا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا" میں نے کہا۔

"ان الماریوں میں تو بڑی وحشت زدہ کر دینے والی کتابیں ہیں۔ فائلوں کا کوئی خانہ نظر نہیں آتا۔ خفیہ خانے کے امکان کو میں مسترد نہیں کرتا مگر اسے تلاش کرنا صرف شرلاک ہومز کے لیے ممکن ہے۔"

"تم کہو تو اسے بلوا لیں۔ میرا مطلب ہے' اس کی روح آجائے ہماری رہنمائی کے لیے۔"

"ہم اب سرچ کرتے ہیں نقوی صاحب کے بیڈ روم کا۔ دوسری جگہ وہی ہو سکتی ہے۔ لحاظ اہمیت" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "اگر میں نقوی صاحب کی جگہ ہوتا تو ایسی خفیہ فائل یا تھ روم کے فلش ٹینک کو خالی کرکے اندر رکھتا۔"

"یہاں تو ساری فائلیں ایسی ہیں۔ اور نقوی صاحب نے کبھی خطرہ محسوس نہیں کیا ہوگا کہ کوئی فائل چوری بھی ہو سکتی ہے ورنہ گھر میں اسٹرانگ روم بنوانا کیا مشکل تھا۔"

نقوی صاحب کا بیڈ روم بھی مقفل تھا مگر دور لاک کھولنے میں غالب کی مہارت نے یہاں کوئی مشکل پیدا نہیں ہونے دی۔ اندر داخل ہونے کے بعد ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ ان کی بیٹی کا بیڈ روم تھا اور ایک باپ کے لیے اس کے بچپن کی یادوں کا میوزیم۔ نقوی صاحب نے اس کی ہر چیز کو بڑی احتیاط اور قرینے سے کمرے میں جمع کر دیا تھا۔ دیواریں اس کی تصاویر کے فریم سے چھپ گئی تھیں۔ پہلی تصویر وہ تھی جس میں نقوی صاحب کی بیگم کسی اسپتال کے بیڈ پر دراز تھیں اور ساتھ چھوٹے سے بیڈ پر نوزائیدہ بیٹی آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ نقوی صاحب اس کے اوپر جھکے ہوئے حیرت' مسرت اور فخر کے جذبات سے معمور مسکراہٹ کے ساتھ اپنی تخلیق کے شہکار کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی بیوی جو اس زمانے میں حیرت انگیز طور پر حسین تھیں' آنکھیں بند کیے مسکرا رہی تھیں۔

بعد کی تصویریں زمانۂ شیر خواری سے اسکول اور کالج کے ہر دور کی عکاسی کرتی تھیں۔ اس کی ہر سالگرہ کی رنگین تصویر الگ فریم میں تھی اور چند فریم ایسے تھے جن میں آٹھ آٹھ دس دس تصاویر تھیں۔ وادی کاغان اور سوات کے پس منظر میں۔ کالج کے اندر اور کانووکیشن کے موقعے کی۔ فینسی ڈریس شو میں۔ یہ سب ایک ہی جذبے کے عکس تھے۔ یہ اولاد سے محبت کا نور تھا جس کی کرنوں کے ہزار رنگ تھے اور ایک باپ کے بیٹی سے پیار کا وہ گلستان تھا جس میں ہر پھول کی خوشبو جدا تھی۔

چاروں دیواروں کے ساتھ فرش پر شوکیس ان کھلونوں سے بھرے ہوئے تھے جن سے نقوی صاحب کی بیٹی کھیلتی رہی تھی۔ درجنوں گڑیوں سے لے کر ہر قسم کے چابی والے جانوروں تک۔ کاریں' ہوائی جہاز اور ہیلی کوپٹر۔ ریل گاڑیاں اور کشتیاں۔ اون کے بنے ہوئے بھالو اور خرگوش۔ وہ کپڑے جو نقوی صاحب کی بیٹی نے چار سال کی عمر سے جوان ہونے تک پہنے۔ ان کا ایک ایک یادگار نمونہ وہاں موجود تھا۔ اس کے اسکول کی یونیفارم۔ کالج میں پہنے ہوئے کیپ۔ مجمل ٹینس کے ریکٹ۔ اس کی کتابیں اور قلم کیا تھا جو وہاں نہیں تھا۔ اس کا بستر ویسے ہی بچھا ہوا تھا جیسے وہ چھوڑ گئی تھی۔ انتہا یہ تھی کہ ایک شوکیس میں مختلف اقسام کی دودھ پلانے والی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔

ان سب چیزوں سے دو باتیں ثابت ہوتی تھیں۔ ایک یہ کہ نقوی صاحب ہر چیز کو سنبھال کے رکھنے کے عادی تھے اور دوسری یہ کہ وہ بیٹی کو پاگل پن کی حد تک چاہتے تھے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ نقوی صاحب جیسا روکھا' تودم بیزار اور متکبر شخص کسی سے اتنا پیار بھی کر سکتا ہے۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ بیٹی ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ ایسی ہی بیٹی انہیں مجبور کر سکتی تھی کہ وہ قانون اور غیر قانونی کسی بھی فیصلے کو اس کی خواہش پر بدل دیں۔

میری طرح غالب بھی دم بخود کھڑا تھا اور کچھ رنجیدہ بھی۔ اس بیٹی نے نقوی صاحب کی توقعات پر پورا نہ اتر کے انہیں شدید جذباتی صدمے سے دوچار کیا تھا۔ وقار یوسف ہر لحاظ سے بہترین انسان اور مثالی شوہر تھا مگر اس کا کیا علاج کہ وہ نقوی صاحب کے معیار STATUS پر پورا نہیں اترتا تھا۔ معلوم نہیں انہوں نے بیٹی کے لیے کیا سوچا ہوگا۔ نیلے گھوڑے پر سوار ہو کے چاند نگر کے شہزادے تو اب نہیں آتے مگر انہیں فارن سروس میں کوالیفائی کرنے والا' کسی مغربی ملک کے سفارت خانے میں فرسٹ سیکریٹری کے عہدے پر فائز۔ کوئی ڈپٹی کمشنر۔ کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا بزنس ایگزیکٹیو۔ ملک کے امیر ترین بائیس خاندانوں کا کوئی باہر کا تعلیم یافتہ خوبرو نوجوان۔ سب انہیں مل سکتے تھے مگر بیٹی نے پسند کیا کیا؟ ایک معمولی وکیل کو جس کا سارا اثاثہ تھا اس کی شرافت اور محبت۔ ہائی فٹ۔ یہ وہ کوٹھی کے لوگ اپنے احساس کمتری کو کیسے چھپاتے ہیں۔ طبع جاننے سے کیا پتنگ بھی سوا ہو سکتا ہے۔

غالب نے کہا "آؤ یار چلیں۔"

میں نے ایک آہ بھری۔ "آپ میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو۔ بے چارے کونے میں پڑے ہوئے ڈیڈ یو نقوی ایڈیشل ہوم یک ہاؤزی۔"

غالب نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "تقدیر آدمی کو کیسے تماشے عبرت بنا دیتی ہے۔ اپنی ساری دولت اور طاقت کے باوجود اسے پیار نہیں ملا۔ پیار کے سمندر سے شبنم تک نہیں ملتی۔"

نقوی صاحب کے بیڈ روم کا نقشہ بالکل مختلف تھا۔ ہم نے الماریوں میں جھانکا مگر ان میں سوٹ ہی سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں میں بنیان اور موزے بھرے ہوئے تھے۔ کتابیں یہاں بھی تھیں لیکن وہ نہیں جو اسٹڈی کی شیشے والی الماریوں میں قید تھیں۔ یہاں تمام قسم کے سستے جاسوسی ناول تھے۔ ابن صفی اور اکرم الہ آبادی کے علاوہ نسیم حجازی کے اور ایم اسلم کے ناول تھے۔

غالب نے افسوس سے سر ہلایا "کیسی نقاب دار شخصیت تھی نقوی صاحب کی۔ یہاں کو اب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ کی عملی تفسیر وہ اندر سے کھوکھلے تھے۔ اسٹڈی میں مرعوب کرنے والی کتابیں تھیں جن سے لوگوں پر ان کی علمیت کا رعب پڑے۔ شاید زندگی میں بھی انہوں نے کوئی کتاب کھول کے نہیں دیکھی ہوگی۔"

غالب نے اچانک کہا "یار' تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟ بہت دیر سے میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے۔"

"ناز کے سامنے سچ بولنے سے ڈرتے تھے اب میرے سامنے بھی تکلف۔۔۔"

"تکلف کی نہیں' تکلیف کی بات ہے۔ تمہارے جذبات نے کچھ کہنے نہ دیا تھا مگر اب کہنا ضروری ہو گیا ہے۔ یہ لڑکی' ڈاکٹر شیلا خان یا فرزانہ سہگل۔ مجھے اس کے ڈاکٹر ہونے میں شک ہے۔"

"تمہیں تو ہر بات میں شک ہے۔"

"ہاں ہے۔ مجھے شک ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ نہ وہ دلاور کی سوتیلی بہن ہے' نہ ہماری ہمدرد۔ اس کی شخصیت کچھ مصنوعی ہے۔ میں کیا بتاؤں۔۔۔"

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو حقیقت ہوگی سامنے آجائے گی" میں نے کہا "میری آنکھیں' میرے کان سب کھلے ہیں اور میری عقل پر جذبات کا پردہ بھی نہیں پڑا ہے۔ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوا۔ میں معلوم کرلوں گا۔"

"کیسے معلوم کرو گے؟' اس کے ساتھ جاگ کے۔۔۔۔ فرض کرو۔۔"

"فرض بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ ابھی تک ثابت کچھ نہیں ہوا۔"

غالب نے کہا "رات کار کے حادثے میں کوئی مرا یا زخمی ہوا تھا؟"

"میں کیا بتاؤں؟"

"شیلی کے بیان کے مطابق تعاقب کرنے والا استاد پیڈرو تھا اور اس کے ساتھ تین افراد تھے" غالب نے کہا "یہی بات ہے نا؟"

"ہاں۔ اس کا بیان کردہ حلیہ سو فیصد استاد پیڈرو کا نقشہ تھا۔"

"مگر استاد پیڈرو کو میں نے اور ناز نے کہیں اور دیکھا تھا۔ عین اسی وقت جب وہ گاڑی میں تمہارا تعاقب کر رہا تھا" غالب نے کہا۔

"تمہیں دھوکا ہوا ہوگا۔"

"مجھے بھی اور ناز کو بھی؟ صرف تم نے جو اندازہ کیا' وہ درست تھا' ہم نے جو دیکھا وہ بھی غلط۔ تم نے جو نہیں دیکھا' وہ صحیح" غالب نے برہمی سے کہا۔

"اچھا یار! فرض کرلو کہ وہ کوئی اور تھا۔ میں نے غلط سمجھا تھا کہ ہمارا پیچھا استاد پیڈرو کر رہا ہے" میں نے کہا۔

"سکندر صاحب! اکبر خان کو ہم نے چوہدری دلاور کا بھائی مان لیا تھا۔ کیا فرق ہے اکبر خان کی کہانی میں اور ڈاکٹر شیلی کی کہانی میں؟ واقعات اور کردار الگ ہیں مگر مقصد میں کوئی فرق نہیں۔ اکبر خان نے بھی ہماری حمایت حاصل کرکے ہمیں نقصان پہنچایا تھا۔ شیلی نے بھی تمہاری ہمدردی حاصل کرلی ہے۔ یہ وہی چال ہو سکتی ہے سکندر۔ پہلے ایک مرد تھا' یہ ایک خوب صورت اور خطرناک عورت ہے۔ زیادہ ذہین اور زیادہ عیار۔"

میں نے کہا "مرزا غالب! ایسا نقصان ہوا ہے ابھی تک شیلی کی ذات سے؟ میں دن رات اس کے ساتھ ہوں۔ ایسی کوئی بات ہوتی تو۔"

اچانک ڈرائنگ روم میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے غالب کو باہر کھینچ لیا اور دروازہ بند کر دیا۔ ریسیور غالباً خادمہ نے اٹھایا تھا۔

"صاحب جی! آپ سے بی بی بات کریں گی" اس نے بڑی بدحواسی میں کہا "پتا نہیں کیا ہو گیا۔ رب خیر کرے۔"

میں نے کہا "روتی کیوں ہو۔ دعا کرو۔"

خادمہ نے زار و قطار رونا شروع کر دیا "میں اب کیا دعا کروں۔"

غالب ڈرائنگ روم میں چلا رہا تھا "یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔ وقار کہاں ہے۔ پولیس۔۔۔ اچھا اچھا۔۔۔ دیکھو خدا کے لیے حوصلے سے کام لو۔ سنو۔۔۔ ہاں میں رابعہ کو بھی بتا رہا ہوں۔"

وہ دیوانوں کی طرح دروازے میں نمودار ہوا "دیکھا تم نے۔" وہ چیخ کے بولا "تمہاری اس ڈاکٹر شیلی نے کیا کیا؟"

غالب کی صورت دیکھ کے میں ڈر گیا "کیا۔۔۔ کیا ہوا؟"

"اس نے۔۔۔ نقوی صاحب۔۔۔ انہیں مار دیا۔۔۔ اور خود بھی مر گئی۔۔۔" غالب کے منہ سے مغلظات اُبلنے لگیں "اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ تمہاری وجہ سے سکندر۔"

اس نے پاگلوں کی طرح میری گردن دبوچ لی اور مجھے زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ میں نے بوڑھی خادمہ کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں نہ جانے کہاں سے ایک چھری آگئی تھی اور وہ دیوانہ وار میری طرف بڑھ رہی تھی۔

www.paksociety.com

غالب بھی کم مشتعل نہ تھا مگر اس نے خادمہ کے اور میرے درمیان حائل ہونے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے خادمہ کے ہاتھ سے چھری چھین لی اور اسے دھکیل کر کمرے سے نکال دیا مگر میں اپنی جگہ منجمد کھڑا رہا۔

یہ اطلاع اتنی وحشت ناک، الم انگیز اور کربناک تھی کہ میرا پہلا فطری ردعمل بے یقینی کا تھا۔ میرے ذہن نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ غیر متوقع صدمے کی شدت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کسی محفل میں آپ کے ساتھ بیٹھ کے کسی لطیفے پر قہقہے لگانے والا اچانک خاموش ہو جائے اور اچانک آپ کو پتا چلے کہ وہ تو حرکت قلب بند ہو جانے سے مر چکا ہے تو آپ کے لئے اس حقیقت کو تسلیم کرنا اتنا ہی ناممکن ہو گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اوہ نو۔ یہ نہیں ہو سکتا!

غالب نے سپاٹ نظروں سے مجھے دیکھا اور وہیں منجمد کھڑا رہا۔

"میں نے کہا۔ "غالب... یہ جھوٹ ہو گا۔ اس میں ضرور کوئی دھوکا ہے۔ میں کیسے مان لوں... یہ ہو سکتا ہے یار کہ کسی نے ہمیں ڈرانے کے لئے فون کیا ہو... بے وقوف بنایا ہو۔ کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ آواز اسی کی تھی؟ وقار یوسف کی بیوی کی؟ ویسے بھی آج یکم اپریل ہے نا۔ اپریل فول..."

"آج مارچ کی اکتیس تاریخ ہے سکندر صاحب اور تمہیں شک ہے کہ میرے کانوں نے غلط سنا تھا یا میں نے وقار یوسف کی بیوی کی آواز نہیں پہچانی تھی۔ تو یہ رکھا ہے تمہارے سامنے ٹیلی فون۔ اسپتال کا نمبر لو اور کسی سے پوچھ لو۔ اگر تمہارے یقین نہ کرنے سے حقیقت بدل جائے تو کتنا اچھا ہو۔" اس کے لہجے میں زہر آلود تمسخر کی کاٹ تھی۔

"سوری۔" میں نے محسوس کیا کہ شاید میرے لئے کھڑا رہنا بھی ممکن نہیں۔ "میں چاہتا تھا یار کہ یہ بات جھوٹ ثابت ہو جائے مگر یہ تو بہت بھیانک سچ ہے۔ میرے اختیار کی شکست ہے... میں کیا کروں۔"

غالب اس آزمائش کی گھڑی میں میرے ساتھ تھا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ وہ میری ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا تھا اور ایک دوست کی حیثیت سے اس نے میرا حوصلہ بحال رکھنے اور مجھے ڈپریشن سے بچانے کے لئے اپنا سارا خلوص صرف کر دیا۔ نقوی صاحب کی موت طبعی تھی یا قتل۔ اس کے پس پردہ ذاتی دشمنی وجہ تھی یا سیاسی عوامل کارفرما تھے۔ یہ سب فوری توجہ طلب مسائل نہیں تھے۔ غالب کے لئے زیادہ اہم میری سلامتی تھی۔

"ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہئے۔" غالب نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے باہر کھینچا۔ "ابھی کسی کو کچھ معلوم نہیں۔"

میں نے واجبی سی مزاحمت کی۔ "ایسے ہی بھاگ جائیں۔ کسی کو بتا کے چلو..."

غالب نے جھنجلا کے کہا۔ "اس وقت کون ہے یہاں؟ کسے بتائیں گے آپ اور کیا بتائیں گے۔ پولیس یہاں کسی وقت بھی پہنچ سکتی ہے۔"

غالب نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ نقوی صاحب کوئی عام آدمی نہیں تھے جس کا قتل بھی ہو جائے تو پولیس مقدمہ تک درج کرنے سے گریز کرتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب قانون کے ہاتھ لمبے ہوں اور ان کی رسائی ارباب اختیار تک ہو۔ بے رسوخ اور بے نوا آدمی کا قتل اگر خودکشی نہ ثابت کیا جا سکے تو پھر اسے ہی پکڑا جاتا ہے جس کے گلے میں پھندا فٹ آ جائے۔ قتل کو گھریلو، جائیداد یا خاندانی دشمنی کا شاخسانہ قرار دے کر انہی لواحقین اور پسماندگان کو سب سے پہلے شک ہی میں دھر لیا جاتا ہے جن کے لئے دنیا بھی بے دلی سے صبر جمیل کی دعا کرتی ہے۔

نقوی صاحب کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ خاص آدمی تھے اور اس محکمے کے بڑے توپ افسر تھے جو خود جرم و سزا کے معاملات کا براہ راست ذمے دار ہوتا ہے۔ ان کا قتل بھی عام قتل نہیں تھا۔ طے شدہ طور پر ان کے قاتل بھی عام قاتل نہیں ہو سکتے تھے۔ توپ کے بچے کو بڑا توپ کا بچہ ہی کاٹتا ہے۔

میرے مقدمات کی فائلیں یہاں نہیں تھیں۔ انہیں واپس محفوظ عدالتی ریکارڈ میں پہنچا دیا گیا تھا یا پھر نقوی صاحب نے ان کو بحفاظت رکھنے کے لئے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں کسی کی آسانی سے رسائی ممکن نہ ہو۔ اگر وقت ملتا تو ہم خفیہ خانوں، الماریوں اور درازوں کو تلاش کرتے لیکن خطرے کی گھنٹی کسی ٹائم بم کے کلاک کی طرح مسلسل خبردار کر رہی تھی کہ گزرتے ہوئے ہر لمحے کے ساتھ ہماری گرفتاری کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں۔

میں نے غالب کے ساتھ باہر آتے ہوئے اس کمرے میں سے اپنی موجودگی کے سب آثار مٹا دیے اور ڈور لاک کو اندر سے دبا کر دروازہ بند کر دیا۔ اب کمرا مقفل ہو چکا تھا اور اسے صرف چابی کی مدد سے کھولا جا سکتا تھا۔

برآمدے میں پہنچ کر میں نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ "حیرانی کی بات ہے یار کہ گیٹ پر کسی کا پہرا نہیں۔ کل تو تھا۔"

غالب نے سر ہلایا۔ "اصولاً تو یہاں پولیس کو بھی موجود ہونا چاہئے۔ سادہ کپڑوں میں انہیں آنے جانے والوں پر نظر رکھنی چاہئے۔"

گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ "مجھے تو کوئی بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"بس اسے تائید ایزدی سمجھتے ہوئے نکل چلو۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا۔ "مرزا جی۔ کیا نقوی صاحب جیسے توپ افسر کے معاملے میں پولیس اتنی بڑی کوتاہی کی مرتکب ہو سکتی ہے؟ یہ سب مجھے سوچی سمجھی سازش لگتی ہے۔ میں نے تو سنا تھا کہ انہوں

نے ان کے نوکروں کو گرفتار کر لیا تھا۔"

"پولیس کو شبہ تھا کہ زہر گھر کے ہی کسی فرد نے دیا ہو گا۔"

"پھر کوئی پکڑا کیوں نہیں گیا اور پکڑا گیا تھا تو اتنی جلدی آزاد کیسے ہوا؟" میں نے کہا۔

غالب سوچ میں پڑ گیا۔ "ممکن ہے نقوی صاحب کی بیگم نے گھر کے نوکروں کو بچا لیا ہو کہ یہ تو پرانے نمک خوار ہیں۔ اس کے علاوہ قتل کی ایک وجہ ہوتی ہے۔"

"بعض اوقات قتل کرنے والا اپنی مجبوری کو وجہ بنا لیتا ہے۔ سب سے بڑی مجبوری ہوتی ہے غربت۔ عام حالات میں غریب آدمی خوف خدا، ضمیر یا ایمان کے خیال سے گناہ اور جرم کی ترغیب کو قبول نہیں کرتا۔ چوری، ڈاکے یا قتل کا راستہ اختیار کر کے مالی مسائل حل کرنے اور معیار زندگی بہتر بنانے کے بارے میں نہیں سوچتا۔"

"سوچتا تو شاید ہو گا مگر سزا کے خوف سے مغلوب ہو کے دہل جاتا ہو گا اور ایسے گمراہ کن شیطانی خیالات سے پیچھا چھڑاتا ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ اسے دل بہلانے کے لئے صبر و قناعت کا فلسفہ دے دیا گیا ہے اور یہ یقین دلا دیا گیا ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ نوشتۂ تقدیر کا نظریہ بھی اسی کے لئے ہے۔ لیکن جب اس کی ماں کی زندگی محض دوا علاج کی استطاعت نہ ہونے کے باعث خطرے میں پڑتی ہے یا اس کا بچہ دودھ جیسی بنیادی ضرورت پوری نہ ہونے سے قریب المرگ ہوتا ہے تو غریب آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس کی مزاحمت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور پھر وہ پیسہ حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کرتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے گھر کے کسی نوکر کی ایسی ہی مجبوری کو خریدا گیا اور نقوی صاحب کو زہر اسی نے دیا تھا؟"

"اور کون کر سکتا تھا یہ کام۔ نقوی صاحب کی مطلقہ بیوی؟ ان کی بیٹی؟"

"داماد کو شک سے مبرا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بیوی کی جائیداد اور دولت کے لالچ میں؟ وقار یوسف بہت شریف اور خوددار شخص ہے لیکن اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دولت مند نہیں ہے۔"

"وہ غریب بھی نہیں ہے اور بیوی اس کی خاطر باپ کا گھر چھوڑ آئی تھی۔ آج بھی اس کے شوہر پر کوئی انگلی اٹھائے تو وہ اپنے حق وراثت سے دستبرداری کا اعلان کر سکتی ہے۔ وقار یوسف کی پوزیشن بہت محفوظ ہے۔ میری مراد تھی ان نچلے درجے کے ملازموں سے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ابھی تک پولیس نے ٹھیک سے تفتیش نہیں کی۔ شاید انہیں اوپر سے روک دیا گیا ہو گا۔ ورنہ یہ معلوم کرنا کیا مشکل تھا کہ کافی کس نے بنائی۔ کس نے جا کے دی۔ درمیان میں کون آیا، کون گیا۔ ظاہر ہے فرشتوں نے تو کافی میں زہر

نہیں ملا دیا تھا۔ گھر کے ملازمین میں سے دو پرانے نمک خواروں کو خارج کر دیا جائے تو نئے عارضی ملازمین میں سے کسی پر شک کیا جا سکتا ہے۔ کس کے حالات ایسے تھے کہ معاوضے کے لالچ میں وہ یہ زہریلی حرکت کر سکتا تھا۔ مجھے تو کہیں بھی تفتیش ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔"

غالب نے کہا۔ "لیکن اب تفتیش ہو گی سکندر اور اس کے نتیجے میں جو حقائق سامنے آئیں گے وہ اس جرم میں پھر تمہاری شرکت اور معاونت ثابت کریں گے۔"

"صرف اس لئے کہ ڈاکٹر شیلی میرے ساتھ تھی۔"

"قاتل کا ساتھی کیا شریک جرم نہیں سمجھا جاتا؟ اور اب شیلی خود بھی زندہ نہیں تو تمہارے سوا کون پکڑا جائے گا؟"

"میں بھلا نقوی صاحب کے قتل کی سازش میں کیسے شریک ہو سکتا ہوں۔ زبردستی کی بات الگ ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"زبردستی کیسی۔ اس کی معقول وجہ بنتی ہے۔ تم چاہتے تھے کہ وہ تمہارے خلاف قانونی مقدمات ختم کرا دیں۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھے اور الٹا تم پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ چودھری دلاور سے صلح کر لو۔ اس کی شرائط پر۔ تم خود ایک ایسی عورت کے ساتھ پھر رہے تھے جس کے بارے میں وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون تھی۔ اس نے خود کو چودھری دلاور کی سوتیلی بہن کہا۔ دلاور سے عداوت کا سبب بتانے کے لئے تمہیں ایک ایسی کہانی سنائی جو بہت زیادہ قابل یقین لگتی تھی کیونکہ اس میں سارے حوالے معتبر تھے مگر کیا ابھی تک کسی حوالے کی تصدیق کی تم نے؟"

میں نے کہا۔ "تصدیق ہو جائے گی۔"

"کب ہو جائے گی؟" غالب نے بگڑ کر کہا۔ "اور اب کیا ہو گا تصدیق سے بھی۔ میں شرط لگا سکتا ہوں سکندر کہ اس نے جو کچھ بتایا تھا وہ سب جھوٹ تھا۔ آج تک دلاور نے جتنی چالیں چلی ہیں یہ ان میں سب سے زیادہ خطرناک چال تھی۔ اس نے پہلے اکبر خان کو بڑی ہوشیاری سے آگے بڑھایا تھا۔ اکبر خان پر اعتبار کر کے ہم نے یہ نقصان اٹھایا کہ پاگل قسم کے جاہل اور خطرناک مذہبی جنون میں مبتلا لوگوں کو اپنا جانی دشمن بنا لیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پیر نگر شاہ کے مرید اپنے مرشد کے حکم کو نعوذباللہ خدا کے حکم سے بڑھ کر سمجھتے ہیں اور مشرک ہیں مگر حقیقت کون سمجھتا ہے۔ اکبر خان نے اپنی دولت کا جال بھی پھیلایا تھا مگر ہم بچ گئے۔ اکبر خان خود ہی پیچھے ہٹ گیا۔"

میں نے اعتراف کیا۔ "وہ بہت عیار اور چالاک آدمی تھا۔ اس کی کہانی بھی ایسی تھی کہ کہیں جھول محسوس نہیں ہوتا تھا۔"

"اور اب دلاور نے ایک ذہین اور حسین عورت کو استعمال کیا جس نے تمہاری ہی نہیں ہم سب کی عقل پر اعتبار کا ایسا پردہ ڈالا کہ کسی کی نظر نہ دیکھ سکی۔ مجھے بتاؤ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ اس کا نام وہی تھا جو اس نے بتایا تھا۔ تم نے سیٹی ہوٹل کے

www.paksociety.com

رجسٹر میں اندراج دیکھا تھا؟"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔ یہ مشکل تھا۔"
"کبھی تم نے اس کا پاسپورٹ دیکھا تھا؟"
"نہیں۔"
"کبھی رفیق سے پوچھا تھا کہ وہ اس عورت کے بارے میں کیا جانتا ہے؟"
"نہیں۔ موقع ہی نہیں ملا۔"
"ان سے معلوم کیا تھا جو کرائے کی گاڑی بھیجتے تھے؟"
"نہیں۔" میں نے خود کو پرلے درجے کا احمق محسوس کیا۔
"ایک آخری بات۔ کیا شیلی نے تمہارے سامنے لندن کے شیخ صاحب سے بات کی تھی؟"
"نہیں۔ اس نے باہر جا کے فون کیا تھا۔"
"تمہارے پاس فون نمبر یا پتا ہے شیخ صاحب کا؟ ہم ابھی معلوم کر لیتے ہیں۔"
میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ان کا تو نہیں لیکن جس اسپتال میں وہ کام کرتی تھی...."
"وہ سب جھوٹ ہو گا دوست۔ مجھ سے لکھوا لو۔ اس اسپتال میں فرزانہ بیگم یا شیلی خان نام کی کوئی ڈاکٹر نہیں ہو گی۔ نہ کبھی رہی ہو گی۔ نہ تمہیں کوئی شیخ صاحب ملیں گے۔ یہ ایک دلچسپ کہانی تھی جو یقیناً بڑی محنت سے تخلیق کی گئی تھی۔ اس میں کمال تھا۔ رالا ور کی ہدایت کاری کا جس نے واقعات کو اتفاقی حقیقت پسندانہ تفصیلات کے ساتھ شامل کیا تھا۔ تم خود سوچو کہ کیا لندن کے کسی اسپتال میں کام کرنے والی نو وارد فریشن کسی انتقام کے اس فلمی چکر میں پڑ سکتی ہے؟ وہ صاحب جائیداد تھی۔ بقول اس کے سوا لاکھ پونڈ کا ترکہ تھا اس کا اور وہ خود چلی آئی یہاں اپنی ماں کے قاتل کو قتل کرنے کے لیے۔ پھر یہاں آ کے اس نے تمہارے ساتھ اشتراک کے منصوبے پر عمل کیا۔ اس نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ۔ میرا مطلب ہے حسن و شباب کی خوبصورتی سے تمہیں اعتماد میں لے لیا۔ تم نے مزاحمت ضرور کی لیکن اس کے بعد رابعہ کی معمولی سی بدگمانی نے تمہیں اس سے بدظن کر دیا اور شیلی نے غلط فہمی کو ہوا دے کر پورا فائدہ اٹھایا۔ سوچو تم اس کے ساتھ کہاں نہیں گئے۔ تم نے کیا نہیں کیا۔ اسی شہر میں کتنے گواہ پیدا کر لیے تم نے ہوٹل میں 'سیفٹ' اسے کا ڈرامے۔ وہ پولیس انسپکٹر جو شیلی کی دھمکی سے ڈر کے چلا گیا تھا۔ اس وقت تم رفیق کی لاش ڈکی میں ڈالے پھر رہے تھے۔ تم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ لاش وہیں چھوڑ کے جانے والے وادور اینڈ کمپنی کے لوگ نہیں تھے اور یہ بات شیلی کو معلوم نہیں تھی؟ اس نے پوری طرح تمہیں اس جرم میں ملوث کر لیا۔"
میں نے اپنے دفاع کی کمزوری کوشش کی۔ "پادرو ہمارے تعاقب میں آ گئے تھے۔ ہم نے گاڑی گیراج میں چھپا دی تھی ورنہ۔"
"سکندر میں نہیں مان سکتا کہ کسی کو گیراج میں کھڑی ہوئی گاڑی نظر نہ آئے۔ وہ شکاری کیا جو سارا جنگل چھان مارے اور اسے گھاس پھونس میں کھڑا ہوا ہاتھی نظر نہ آئے۔ انہوں نے ڈراما کیا تھا تلاش کا ورنہ تم چیونٹی بن کے بل میں گھس جاتے تب بھی وہ تمہارا سراغ لگا کے تمہیں برآمد کر لیتے۔ یہ بھی ڈراما تھا اور جو گزشتہ رات ہوا وہ بھی۔ کسی استاد پیڈرو نے تمہارا پیچھا کیا ہوتا تو تم اتنی آسانی سے بچ کے نہ نکل آتے۔"
"یہ تو معلوم ہو جائے گا۔ اگر وہ زخمی حالت میں ملا۔"
"ہاں۔ بالکل معلوم ہو جائے گا۔" غالب نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔
ہم اس وقت تک مال روڈ کا کچھ حصہ پیدل طے کر چکے تھے۔ میرا ذہن خالی تھا۔ تصور کے پردے پر بہت سی پرچھائیاں تھیں۔ یہ سب شیلی کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کی متحرک تصویریں تھیں۔ وہ شب بڑی دغا باز تھی جس نے مجھے اور شیلی کو رفاقت کا فریب دیا تھا۔ وہ میرے گھر میں میرے ساتھ تھی۔ نقوی صاحب کے گھر میں ساتھ تھی۔ وقار یوسف کے گھر میں ساتھ تھی۔ اگر وہ ڈراما تھا تو تعاقب کے اس کھیل میں بھی وہ میرے ساتھ تھی۔ جب میں جان بچا کے فرار ہوا۔ جب میں نے چوروں کی طرح دیواریں پھاندیں اور کسی کی سائیکل چرا کے میں نے اسے آگے بٹھایا تو خطرے کے اس کھیل میں بھی وہ میرے ساتھ تھی لیکن یہ ٹھیک ہے کہ وہ خوفزدہ نہیں تھی۔ شاید اسے معلوم تھا کہ یہ ترا تک ہے۔ خطرے کا الارم ہے مگر خطرہ کہیں نہیں تھا۔ نہ سہی۔ وہ اسے ایڈونچر "ایکشن فلم کی طرح انجوائے کر رہی تھی۔ شامت اعمال کے بھی کتنے حسین روپ ہوتے ہیں۔ پرکشش اور جان لیوا۔ موت کیسے کیسے بہروپ اختیار کرتی ہے۔ شاید سب سے خطرناک روپ میں وہ ایک عورت بن جاتی ہے۔ ادائے حسن اور معصومیت' ناز و ادا کی سادگی و پرکاری اور شباب کی بے خبر نظر آنے والی جارحیت گر قوت کے ساتھ اور ایک فطری جبلت کے ساتھ مرد ہی اس کا آسان شکار ہوتا ہے۔ تاریخ ایسی عورتوں کے کارناموں کے ذکر سے بھری پڑی ہے جنھوں نے اپنے حسن و شباب کی آبکاری سے زیادہ تباہی کی کیوں کہ قدرت نے انھیں چہرہ اور جسم ہی نہیں قابل رشک عقل و ذہانت بھی بخش دی تھی۔
میں یہ تصور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر شیلی نے کیسے نقوی صاحب تک رسائی حاصل کی ہو گی۔ آئی سی یو (I.C.U) میں پہنچ کے اس نے کیسے نقوی صاحب کو ہلاک کیا ہو گا۔ انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں ہر وقت ڈاکٹر موجود ہوتے ہیں اور نرسیں سب دیکھتی رہتی ہیں۔ مریض کے سرہانے مانیٹر لگے ہوتے ہیں جو دم سانس کی خبر دیتے ہیں۔ نبض کی، دل کی اور دوران خون کی کیفیت کو مسلسل ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ آکسیجن کے ماسک اور اسٹینڈ میں

آتی ہوئی خون یا گلوکوز کی تھیلیاں براہ راست رگوں سے منسلک نظر آتی ہیں۔ ونس میں دوا بھی شامل کی جا سکتی ہے اور زہر بھی ڈالا جا سکتا ہے لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسپتال کا عملہ قاتل نہ ہو یا عمداً چشم پوشی نہ کرے جو بعید از امکان تھا۔
پھر کیا نقوی صاحب کو راستے سے ہٹانے والوں نے یہ بندوبست بھی کر لیا تھا کہ پہلی کوشش کی ناکامی کی صورت میں دوسری کوشش کو کامیاب کرانے کی ذمے داری کس کی ہو گی۔ کیا شیلی کے پاس پہلے سے کوئی قاتل زہر موجود تھا یا زہر اسے اسپتال میں فراہم کیا گیا تھا؟ اگر وہ کامیاب ہو گئی تھی تو پھر اسے جان دینے کی کیا ضرورت تھی؟ ناکامی کی سزا کا خوف اسے خودکشی پر مجبور کر سکتا مگر کامیابی کے بعد شیلی نے ایسا کیوں کیا؟ میں چلتے چلتے سوچتا گیا۔
شاید یہ خودکشی نہیں تھی۔ شیلی کو بھی قتل کیا گیا ہو گا۔ اس کے سپرد جو کام کیے گئے تھے وہ پورے ہو گئے تھے۔ اسے جو معاوضہ ادا کیا گیا ہو گا وہ یقیناً بہت بڑا ہو گا مگر اس کی ایک قسط واجب الادا ہو گی۔ اس بقیہ معاوضے کا نام موت تھا اور یہ بات شاید شیلی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گی کہ وہ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ سفاک اور عیار ہیں جو اس کی ذہانت اور اس کے حسن و شباب کے اسلحے کو استعمال کرنے کے لیے دولت کے انبار لٹا دیتے ہیں۔ آلۂ قتل کتنا ہی قیمتی اور خوبصورت کیوں نہ ہو جب اس کے استعمال کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر اسے غائب کر دیا جاتا ہے۔
میرا تصور ناکام تھا۔ میں جتنی کھینچی خوبصورت معصوم اور زندہ دل شیلی کو ایک قاتل اور پھر مقتول کی حیثیت سے دیکھنے میں ناکام تھا۔ یہ تسلیم کرنے میں ناکام تھا کہ وہ وادور اینڈ کمپنی کی آلۂ کار تھی اور اس نے جو کچھ مجھے بتایا تھا وہ جھوٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کچھ جھوٹ حقیقت کے کتنے قریب ہوتے ہیں اور کچھ سچ بالکل کھوکھلے۔
میں حالات اور واقعات کے اسباب کا اور نتائج کا تجزیہ کرنے میں ناکام تھا اور یہ سمجھنے میں ناکام تھا کہ آخر شیلی کے وجود اور عدم کے پیچھے اصل مقاصد کا تعین کس نے کیا تھا۔ کیا اسے تقدیر کا نام دیا جائے گا؟ اگر مجھے ہدف بنا کر شیلی کو تیر کی طرح چلانے والے شکاری تھے تو ان کے ہاتھوں میں کمان کس نے دی تھی۔ اگر نقوی صاحب پہلی کوشش میں ہی اللہ کو پیارے ہو جاتے تو شیلی کیا کرتی؟ اگر اس نے رفیق کے قتل میں مجھے ملوث کر دیا تھا اور غالب کے لگائے ہوئے سارے الزامات ٹھیک تھے تو پھر میں کہاں پہنچا تھا اور شیلی کیوں ماری گئی تھی؟
لغت حسرت تصدیق طلب جھوٹ اور سچ کے انبار مفروضات اور قیاس آرائیوں کے سلسلے چھوڑ کے شیلی مر گئی تھی۔ کسی شہاب کی طرح وہ میری زندگی کے افق پر نمودار ہوئی۔ پل بھر کے لیے اس نے خیرہ کن روشنی کی ایک ہلکی اور پھر خاکستر ہو کے تاریکی میں شامل ہو گئی۔ ہر شہاب ثاقب کو انسان اپنے خیالات کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ کچھ اسے منحوس قرار دیتے ہیں اور اس کے نحس اثرات سے ڈرتے ہیں۔ کچھ اس کے برعکس کہتے ہیں کہ جب تارا ٹوٹتا ہے تو اسے دیکھتے ہی مانگی جانے والی دعا قبول ہوتی ہے۔ علامہ صاحب نے خوب فرمایا تھا۔

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

کسی ستارے سے ٹوٹ کے الگ ہونے والے ٹکڑے کی طرح جو زمین کی انجمن فضا میں داخل ہوتے ہی جل جائے۔ شیلی بھی نہ جانے کہاں سے آئی تھی اور کیوں آئی تھی۔ وہ شیلی تھی یا نہیں تھی۔ یہ سارے سوال اور ان کے سب جواب بے معنی ہو چکے تھے۔ آج کی حقیقت سامنے تھی کہ اس کا نام میرے لیے ایک الزام ہو گیا تھا۔ ایک طرف رابعہ کی پرملامت' پرحسرت نظر کا سامنا تھا کہ اس چھری کی خاطر تم نے میرے شیشۂ دل کو بدگمانی سے غبار آلود کیا تھا؟ دوسری جانب وقار یوسف کی بیوی کی آنکھوں کے آنسو سوال کرتے تھے؟ کیوں لے کر آئے تھے تم اپنے ساتھ ایک قاتل کو جس نے میرے گھر سے میرے ساتھ جا کے میرے ہی باپ کی جان لی۔
میں غالب کے ساتھ ایسے چل رہا تھا جیسے کوئی خلا میں چلتا ہے۔ مجھے گرد و پیش کی خبر ہی نہ تھی۔ اچانک میں نے خود کو اس ہوٹل کے "گلیکسی ریسٹورنٹ" میں پایا۔ میرے چاروں طرف عام لوگ تھے۔ زندگی کے دکھ ان کے ساتھ بھی تھے مگر ان کا روگ نہیں بنے تھے۔
میں نے کہا۔ "غالب۔ یہ ہم کہاں آ گئے؟"
غالب نے کہا۔ "تم کہاں جانا چاہتے تھے؟"
"شاید میں واپس جانا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب یہ ممکن نہیں رہا۔"
"دیکھو یار سکندر' میں تمہارا دوست ہوں یا نہیں ہوں؟" غالب بولا۔ "فرض کرو یہ سوال میں نے سب کی طرف سے کیا ہے۔"
"نہیں۔ تم سب دوست نہیں۔ میرے اپنے ہو۔ میرے دست و بازو' میرے وجود کا حصہ ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ کون کہتا ہے کہ میرے ہاتھ میرے دوست ہیں یا میری آنکھیں اور میرے حواس خمسہ میرے دوست ہیں۔ یہ تو بس میرے اپنے ہیں۔ جن کے بغیر میں تصور ہی نہیں کر سکتا کہ میں کیا ہوں۔"
"شاید ایسا ہی تھا یہ رشتہ۔ ہم تمہارے دست و بازو تھے لیکن ہم پر تمہارا اختیار تھا۔" غالب نے کہا۔ "ہم وہی کر سکتے تھے جو تم چاہتے تھے۔"
میں نے احتجاج کیا۔ "غلط مطلب مت نکالو میری بات کا۔"
"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں سکندر۔ ایک وقت تھا جب

www.paksociety.com

ضرورت کے تحت اور ایک مقصد کی خاطر ہم نے رضاکارانہ طور پر انہیں یکجا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"اس وقت بھی میں ہر معاملے میں مشورہ کرتا تھا۔"

"لیکن آخری فیصلہ بہرحال تمہارا ہوتا تھا اور ڈسپلن کی خاطر ہم اس سے اختلاف کو غلط سمجھتے تھے۔ ایک ٹیم کے مورال اور اسپرٹ کا اس کے عزائم، مقاصد اور نتائج سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ اسی اتفاق اور اتحاد کا کرشمہ تھا کہ محدود وسائل کے ساتھ ہم نے اپنے سے کئی گنا طاقتور دشمن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ یہی ہماری کامیابی تھی۔ اس ... جدوجہد کے سیاسی انجام سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔" غالب نے ایک لمحے توقف کیا اور پھر اپنی بات کا اثر دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "آج صورت حال قطعی مختلف ہے۔ جنگ میں ... ملکی قانون کی خلاف ورزی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ آپ دشمن کے جتنے آدمی چاہیں ماردیں۔ ان میں بے گناہ بھی ہوں گے لیکن آپ کے خلاف ضابطۂ فوجداری کی کسی دفعہ کے تحت قتل عمد، غیر ارادی قتل یا نیت قتل کا کوئی مقدمہ نہیں بنتا۔ دشمن کی ملکیت کو تباہ کرنے پر دیوانی مقدمہ درج ہوتا ہے۔ دشمن تو دشمن اپنی زمین پر محاذ جنگ ہو تو اپنے ہی گھر کھیت کھلیان برباد ہوتے ہیں اور گولہ باری سے اپنے شہری بھی مارے جاتے ہیں۔ زمانۂ امن کی بات کچھ اور ہے۔"

"کیا میں یہ بات نہیں سمجھتا؟"

"سمجھتے ہو تو اس پر عمل کیوں نہیں کرتے۔" غالب نے ... لہجے میں کہا۔ "جب تم کردستان میں تھے تب تم اس ملک کے قانون کی دسترس سے باہر تھے۔ قانون آج بھی وہی ہے اور تمہارے خلاف الزامات کی فہرست طویل سے طویل تر ہوچکی ہے۔ قانون تو قانون میں ایسی کوئی گنجائش نہیں کہ تمہارے شاندار مجاہدانہ کارناموں، تمہارے حب الوطنی اور جذبۂ قومیت کے عظیم مظاہرے پر تمہارے خلاف مجرمانہ الزامات ختم کردیے جائیں۔ دوسرے یہ کہ ایسی گنجائش ہوتی تب بھی ہم یہ کیسے ثابت کرتے کہ ہم نے کیا کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ وطن کے دشمنوں اور غداروں کی سازش کو کب کہاں اور کیسے ناکام بنایا۔ کوئی ثبوت اور شہادت کے بغیر کوئی دعویٰ سند نہیں رکھتا۔"

"میں نے کب کہا تھا کہ مجھے ایک عظیم مجاہد تسلیم کریں۔ مجھے کسی اعزاز کی تمنا نہیں۔"

"جب دشمن کا سامنا ہو تو ملک کا ہر شہری مجاہد بن جاتا ہے اور وہ کسی بھی حیثیت میں جہاد کرے تو وہ اپنا قومی فریضہ انجام دیتا ہے۔ ہم محبِ وطن تھے۔ جہاد ایک فرض ہے اور وطن کی خاطر جان دینا بھی اسی فرض کا تقاضا ہے۔ ہر پاکستانی پینسٹھ کی جنگ میں فوج کے ساتھ لڑ رہا تھا اور اس جنگ میں بھی صورت حال مختلف نہ تھی۔ جہاد میں وہ بوڑھا بھی شریک ہوتا ہے جو بسترِ مرگ پر معذوری کی حالت میں دل سے دعا کرتا ہے اور وہ بچہ بھی جو بلیک آؤٹ کے وقت لائٹ کا سوئچ آف کرتا ہے۔"

"مجھے اس لیکچر کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے بے رخی سے کہا۔

"سکندر .... یہ لیکچر نہیں ہے۔ میری کوشش ہے کہ تم بدلے ہوئے حالات میں اپنے طرزِ عمل کو بدل دو۔" غالب نے میرے ہاتھ پر تھپکی دی۔ "جنگ ختم ہوگئی مگر ہمارے آپس کے تعلقات کی نوعیت جو پہلے تھی وہ آج بھی ہے۔ ہم آج بھی ایم آر ایس کے رکن ہیں اور جذباتی طور پر ایک دوسرے سے اسی طرح وابستہ ہیں جیسے ایک جسم کے اعضا۔ جسم کے وجود کا انحصار تمام اعضا کی مضبوط کارکردگی پر ہے۔ آدمی کا ایک ہاتھ پیچ کو کس رہا ہو اور دوسرا کھولنے لگے۔ ایک ہاتھ وزن اٹھائے لیکن دوسرا ساتھ نہ دے۔ ایک ہاتھ مشرق کی طرف بڑھے اور دوسرا مغرب کی جانب کیا یہ ہوسکتا ہے؟"

"تم سمجھتے ہو میں ایسا ہی کر رہا ہوں؟"

"صرف میں نہیں، ہم سب سمجھتے ہیں کہ تم اپنی مرضی سے من مانی کرتے رہے ہو اور تم نے ابھی تک بدلے ہوئے حالات کے مطابق نئی حکمت عملی اپنانے کے لئے کسی سے اشتراک نہیں کیا ہے۔ خدا کے لئے سمجھو سکندر۔ رابعہ نے بھی غلط نہیں کہا تھا۔ یہی بات وہ بھی سمجھانا چاہتی تھی لیکن تم نے ....."

"جو رویہ اس نے میرے ساتھ اختیار کیا، کیا وہ ٹھیک تھا؟" میں بھڑک اٹھا۔ "اس نے میری جتنی بے عزتی کی تھی۔ اس کا کیا جواز تھا؟"

"آہستہ! آرام سے گفتگو۔" غالب نے ادھر ادھر دیکھا۔ "چلانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں دوسرے لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر تحسین ہوتا تو یہ ناخوشگوار فریضہ وہ ادا کرتا۔ یا ہم ہی کرتے ویسے تو اکرام، شیخ، نازو، رابعہ اور گل کا بھی تم پر اتنا ہی حق ہے مگر میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ تم کسی پینل یا فل بینچ کے سامنے الزامات کا سامنا کرو۔ میرے اور تمہارے درمیان براہِ راست گفتگو زیادہ بہتر ہے۔ تم بھی دل کھول کے کہو۔ میں بھی کچھ لگی لپٹی نہیں رکھوں گا۔ اختلافات کا مطلب مت یہ نکالو کہ ہماری دوستی کے جذبات بدل گئے ہیں۔ اختلافات کا مقصد ہے مشترکہ مسائل کا بہتر حل تلاش کرنا خواہ مسائل تمہارے ہوں یا میرے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہئے۔ ہم ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سننے کے بعد مشورے سے بگڑے کام سنوار سکتے ہیں اور مزید خرابی کے امکانات ختم کرسکتے ہیں۔ مجھے صاف نظر آرہا ہے کہ اب معاملات کو التوا میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں رہا۔ کیوں کہ وقت کی مقررہ مہلت ختم ہو رہی ہے۔ اس بار تم پکڑے گئے تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں نہیں چھڑا سکے گی۔ ہم سب اتنے بے بس اور مجبور ہوجائیں گے کہ ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکیں گے۔ تمہارے خلاف تمام سابقہ الزامات ختم نہیں ہوئے تھے جو محض اسے ختم کرا سکا تھا

اسے ختم کرا دیا گیا ہے اور ختم کرانے والے وہی شکاری ہیں جو ہم سب کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ یہ کام انہوں نے ایسے کیا ہے کہ نقوی صاحب کا قتل بھی تمہارے فردِ جرم میں شامل ہوجائے اور معاف کرنا، جتنا ذہین و فطین ہونے کا ثبوت یہ شکاری دے رہے ہیں۔ اتنا ہی تم اپنے آپ کو آسان شکار ثابت کر رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم گرفتار ہوگئے تو تمہاری ضمانت پر رہائی بھی ناممکن ہو گی۔ تم پہلے ہی مفرور مجرم قرار دیے جاچکے ہو اور تمہاری زندہ یا مردہ گرفتاری پر انعام بھی ہے۔ یہ معاملہ اب تک دبا ہوا تھا لیکن اب پورے زور و شور سے اٹھایا جائے گا۔ تمہاری وجہ سے ہم سب کی پوزیشن غیر محفوظ ہوگئی ہے جو تمہارے دوست ہیں۔"

مجھے اس بات سے دلی رنج ہوا۔ "ایسا ہے تو مجھ سے لاتعلقی کا اعلان کردو۔ چھوڑ دو مجھے۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔" غالب نے کہا۔ "اس اعلان سے کون سا فرق پڑ جائے گا۔ ایک مجرم اور قاتل کے ساتھی اور مددگار تو کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے کسی جرم میں ساتھ نہیں دیا۔ ڈاکوؤں کے کسی گروہ میں شامل ہوکے وارداتیں کرنے والا کسی دن اخبار میں یہ اعلان شائع کرا دے کہ اب اس کا اس گروہ سے کوئی تعلق نہیں رہا تو اس کے ماضی کے جرائم ختم نہیں ہوجاتے۔ قانون میں توبہ کوئی چیز نہیں۔ یہ صرف خدا قبول کرسکتا ہے بشرطیکہ کوئی سچے دل سے تائب ہو۔ کوئی مجرم عدالت میں حلف اٹھا کرکے کہ آئندہ کے لئے میری توبہ تو عدالت یہ نہیں کہہ سکتی کہ جاؤ معاف کیا۔ اب شرافت سے رہنا۔ آئندہ کی آئندہ دیکھی جائے گی پہلے جو کیا تھا اس کا حساب پہلے ہوگا۔ ساری دنیا کے قانون میں ایسا ہی ہے۔"

"پھر کیا سوچا ہے تم سب نے؟ میرے ساتھ شامل جاؤ گے؟" میں نے طنز سے کہا۔ "یا تمہیں بچانے کے لئے میں اپنی گرفتاری پیش کردوں؟"

"قانونی مسائل پر قانونی ماہر کی رائے مستند سمجھی جاسکتی ہے۔ حسن اتفاق سے ہمیں بیک وقت دو ماہرین کی خدمات حاصل ہیں۔ مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ اور عبدالودود منظر ہائی کورٹ و سپریم کورٹ۔ بات ان کی موجودگی میں ہوگی۔ اس وقت تک نقوی صاحب کے قتل کی رپورٹ بھی مل جائے گی اور صورت حال واضح ہوجائے گی۔ رابعہ اور منظر کی پوزیشن محفوظ ہے۔ پولیس ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ محسن اور گل یہاں ہوتے تو ضرور پکڑے جاتے۔ میں نے انہیں بتادیا ہے کہ وہ ادھر کا رخ بھی نہ کریں بلکہ بہتر ہوگا کہ فوزیہ کا گھر بھی چھوڑ دیں۔ اس سے کوئی رابطہ نہ رکھیں۔"

"ان سے کب بات ہوئی تھی؟"

"کل۔ نقوی صاحب کی موت سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ حالات کس سمت میں جا رہے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"تمہاری اپنی پوزیشن کیا ہے؟"

"زیادہ اچھی نہیں ہے لیکن میں نے اپنا بندوبست کرلیا ہے۔ مجھے کراچی کے ایک بہت بڑے روزنامے کا بیورو چیف بننے کی پیشکش ہوئی تھی۔ میں اسے قبول کر رہا ہوں۔ لاہور آفس کے بیورو چیف کی حیثیت سے میری یہ تقرری اس وقت بڑی کارآمد ثابت ہو گی۔"

"اور نازو....؟"

"اسے میں نے کرائم رپورٹر لگا دیا ہے اسی اخبار میں جہاں کبھی یہ کام میں کیا کرتا تھا۔" غالب نے کہا۔ "ایڈیٹر بہت دبنگ اور کھرا آدمی ہے۔"

"تم خود اسی اخبار میں کیوں نہیں گئے؟"

"یار! چلا تو جاتا ایڈیٹر انکار بھی نہ کرتا مگر وہ مشکل میں پڑ جاتا۔ میں نے اسے آزمائش میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ کیا یہ کم ہے کہ میری بات مانتے ہوئے اس نے اتنی اہم ذمے داری نازو کو سونپ دی حالانکہ اس کا صحافت میں کوئی تجربہ نہیں۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ نازو بہترین کرائم رپورٹر بن سکتی ہے۔ اس میں ہمت ہے، ذہانت ہے اور وہ اپنی حفاظت آپ کرنا جانتی ہے۔ رہی بات تجربے کی تو کچھ دن اسے بطور اپرنٹس کسی کے ساتھ منسلک کردیا جائے۔ وہ کرائم رپورٹر یا کورٹ رپورٹر کے ہمراہ ہر جگہ جائے اور رپورٹنگ دیکھے۔ میں نے اسے یقین دلایا ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایک مہینے بعد نازو کو کسی کی مدد یا رہنمائی کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"اخبار میں پہلے کون کرائم رپورٹر تھا؟"

"وہ بنیادی طور پر کامرس کا آدمی تھا۔ کامرس رپورٹر بن کر زیادہ خوش ہوگا۔" غالب نے انگلیوں کے اشارے سے مال بنانے کا حوالہ دیا۔

"چلو یہ اچھا کیا تم نے۔ مگر گرفتاری سے کیسے بچو گے تم؟"

"اول تو پولیس سنجیدگی سے کوشش نہیں کرے گی۔ وہ ایسے بھڑ کے چھتے پر ہاتھ نہیں ڈالتے جو بعد میں ان پر ہاتھ ڈالے اور مجھے پکڑنے کے بعد پریشانی اٹھا کے چھوڑنا پڑے۔ صحافی چھوٹا ہو یا بڑا۔ صحافی برادری کا اتحاد اس کی سب سے بڑی طاقت ہوتا ہے۔ پشاور سے کراچی تک سارے اخبار والے ایک آواز ہو کر چلانے لگتے ہیں کہ حکومت آزاد صحافت کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ آزادیِ اظہار کا قتل عام کر رہی ہے۔ خدانخواستہ پولیس نے کسی اوپر والے کے دباؤ میں یہ سوچا کہ ہمیں شامل تفتیش کیا جائے تو اس کی خبر بھی ہمیں پہلے مل جائے گی۔ پولیس خود اطلاع کرے گی کہ جناب اپنا بندوبست کرلو۔ ہماری نوکری کا خیال کرتے ہوئے ہم فوراً ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست داغ دیں گے اور ضمانت ہوجائے گی۔ سب سے اہم نکتہ جو تمہاری عقلِ شریف کو قبول کرلینا چاہئے یہ ہے کہ جب تک ہم تمہارے ساتھی ہیں ہم تمہاری مدد نہیں کر سکتے۔"

www.paksociety.com

"یہ کیا بات ہوئی؟ مدد کیا خیر کرسکتے ہیں؟"

"ہاں۔ قانونی معاملات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ پہلے تو ہم عملاً ثابت کریں گے کہ ہمارا سکندر رجٹ کے جرائم سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہے۔ دوستی ایک الگ چیز ہے۔ ہم نہ مجرم کے ساتھ رہتے ہیں نہ اسے چھپا کر انصاف کی راہ میں رخنہ اندازی کرتے ہیں اور نہ حقائق چھپا کر مجرمانہ حوصلہ افزائی۔ اس اظہار لاتعلقی کے بعد ہم تمہارے لئے جو بھی کریں گے حصول انصاف کے نام پر کریں گے۔ ایک ساتھ وکیل برادری اور صحافی برادری انصاف کے خلاف تحریک شروع کردے گی اور نعرہ ایک ہی ہوگا۔ سکندر بجٹ کو سیاسی عداوت اور ذاتی انتقام سے بچایا جائے۔"

میری اعصابی کشیدگی اب بہت کم ہوگئی تھی۔ "اور یہ تحریک چلائے گا کون؟"

"ظاہر ہے ہم اور ہمارے ہم نوا دوست۔ بیشتر صحافی اور وکیل جانتے ہیں کہ تمہارے خلاف سب کارروائی چوہدری ولاور، سابق ایس ایس پی سراج اور سابقہ حکومت کے چند کرپٹ بیوروکریٹ نے شروع کی تھی۔ ہم اسباب و عوامل کی تشہیر کریں گے اور ولاور اپنے سیاسی پلیٹ فارم یا اپنی دولت کی طاقت سے ہماری آواز کو دبانے میں ناکام رہے گا۔ اسے تو اپنی فکر پڑ جائے گی کہ سکندر کی دشمنی غالب سے دشمنی بن گئی ہے اور غالب سے دشمنی صحافت سے جنگ۔ سیاست کے میدان کا شہسوار صحافت کو نظرانداز کرے تو اپنے زور میں چلتے ہی منہ کے بل گرتا ہے۔ وکیل ناانصافی کے راستے کی دیوار بنتے ہیں تو صحافی سیاست میں بدعنوانی کا سدباب کرتے ہیں۔ ان دو طاقتوں کی عدم موجودگی میں انارکی پھیل جاتی ہے۔ لاقانونیت اور بدمعاشی حاوی آ جاتی ہے۔ آئی بات سمجھ میں!"

"بالکل آگئی۔ آگے بولو۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"آگے آتی ہے اصل بات جس کی یہ تمہید تھی۔" غالب نے کہا۔ "رابعہ نے تمہارے ساتھ جو رویہ اختیار کیا تھا اس کا مقصد بھی یہی تھا۔ دنیا کے سامنے تم سے لاتعلقی کا اظہار۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"نہیں، یہ سچ کا باپ ہے۔" غالب بولا۔ "سب کے سامنے اس نے تمہیں اپنے آفس سے بے عزت کر کے نکالا تھا تو اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ سب دیکھ لیں اور سن لیں۔ جب وہ ولاور کے ساتھ گئی تھی تو اس نے کسی حد تک ولاور کو قائل کرلیا تھا کہ وہ تمہیں سمجھانے گئی۔ کوشش کرے گی کہ تم بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے 'جیو اور جینے دو' کی پالیسی اپنا لو۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا تھا اور کہا تھا کہ میں وعدہ نہیں کرسکتی۔ سکندر خودسر اور ضدی آدمی ہے۔ ہوسکتا ہے میری مان لے۔ آج نہ سہی کل پرسوں۔ ایک ہفتے یا ایک مہینے بعد اور چوہدری ولاور اس کی باتوں میں آگیا۔ اس نے رابعہ سے کہا کہ صرف تم ہی یہ کام کرسکتی ہو۔ یہ جھگڑا ختم کراؤ خود بھی آرام سے رہو اور مجھے بھی موقع دو کہ میں اپنی جرنیلی سے ہونے والے تمام نقصانات کی تلافی کر دوں۔ اس نے رابعہ پر زور دیا کہ وہ اپنی محبت کا واسطہ ڈال سکتی ہے اور سکندر کی سب سے بڑی کمزوری بن کے اسے مجبور کرسکتی ہے۔"

"یہ رابعہ سے کہا تھا اس نے؟"

"ہاں۔ بات گول تھی۔ الفاظ گول مول تھے۔ رابعہ نے بھی انجان بنتے ہوئے پھر کہا کہ چوہدری صاحب! میں بھی تنگ آ گئی ہوں اس شب و روز کی بے مقصد بھاگ دوڑ اور معرکہ آرائی سے لیکن سکندر کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیا کرے گا۔ اس کا کچھ بھروسا نہیں کہ وہ مجھے بھی چھوڑ دے۔ رابعہ ایسا کہتی تو ولاور نرا کانیاں کرتا ہے۔ تاڑ جاتا کہ رابعہ اسے بے وقوف بنانے پر آمادہ ہے۔ اگر وہ صاف کہتی کہ اپنے چوہدری صاحب تسلی سے نگران نہ کرو۔ تیر کی طرح سیدھا کر دوں گی میں سکندر کو۔ وہ میرے قابو میں ہے۔ میری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا۔ ایک دفعہ دھمکی دوں گی قطع تعلق کی تو ساری اکڑفوں بھول جائے گا۔ رابعہ نے ایسا نہیں کہا۔ اس نے بڑے تذبذب اور بے یقینی کے ساتھ صرف کوشش کرنے کی بات کی اور نتیجے کے بارے میں مایوسی کا زیادہ اظہار کیا۔ اس سے ولاور کی امید بندھی کہ رابعہ واقعی کچھ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے بعد وہ تم سے ایسے پیش آئی تھی۔ وہ اس کے پلان کا حصہ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی بے رخی، تمہاری خفگی اور تعلقات میں کشیدگی کا چرچا ہو تو بات ولاور تک پہنچ جائے۔"

میں نے سخت ندامت محسوس کی۔ "میری عقل پر پتھر کیوں پڑ گئے تھے!"

"عاشقوں کے نصیب پتھری ہوتے ہیں مسٹر مجنوں۔ سر اٹھایا تھا کہ سنگ یاد آیا۔" غالب نے کہا۔ "پتھر لیلیٰ کے دیوانے پر پڑیں یا اس کی عقل پر۔۔۔"

"کیا تم لوگ بھی ایسا ہی ڈرامہ کرو گے۔"

"ضرورت پڑی تو کرلیں گے۔" غالب نے کہا۔ "ابھی تو پہلا مسئلہ تمہیں غائب کرنے کا ہے۔ سب پرانے ٹھکانے خطرے کی جگہ ہیں۔ پولیس ایک دم مستعد ہو کے چھاپے مارے گی تو انہی گھروں پر جہاں تم مل سکتے ہو۔ مظفر کا گھر سرفہرست ہے مگر وہاں مجسٹریٹ خانہ تلاشی کی قانونی کارروائی کرے گا اور مظفر اس کے ساتھ پورا تعاون کرے گا۔ نقوی صاحب کے دو بار گھر اور ان کی نئی زیر تعمیر کوٹھی بھی غیر محفوظ ہوگی۔ وقار یوسف کی معقولیت میں شک نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب فریم اپ ہے یعنی تمہیں پھانسنے کی سازش لیکن وہ دہری مشکل میں ہے۔ ایک دولت مند سسر کے غریب اور ہاتھ پہ رکھے داماد کی حیثیت سے اس نے اپنی خودی کو ہمیشہ بلند رکھا تھا مگر پولیس یہ سب کہاں دیکھتی ہے۔ انہیں تو خوشی ہے سید جماعتی کے گلے میں پھندا ڈالنے سے۔ اسے دولت مند سسر کے اکلوتے داماد کی دلی خواہش نہیں ہوتی کہ بزرگوار فوراً اللہ کو پیارے ہوں تو اپنے وارے نیارے ہوں۔ وہ پولیس سے تعاون کرے گا ورنہ خود ہی شریک جرم سمجھا جائے گا۔ دوسرا مسئلہ ہے اس کی بیوی کا جو بے حد جذباتی ہوگی۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے شوہر اور باپ کے درمیان خلیج کو پاٹنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور نقوی صاحب نے بالآخر داماد کو وہ حیثیت دے دی تھی جس کا وہ مستحق تھا۔ خود وقار یوسف نے بھی اپنے رویے میں لچک پیدا کرلی تھی۔ اس عرصے پر وہ بیوی کے جذبات کو عقل کی دلیل سے کیسے مسترد کرسکتا ہے۔ عورتوں کا تو یہ بین الاقوامی مسئلہ ہے کہ جذبات غالب ہوں تو عقل اتنی دور گھاس چرنے نکل جاتی ہے کہ اسے واپس ہی نہیں لایا جاسکتا۔ اسے قائل کرنے میں دیر لگے گی کہ تم نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ ابھی تو اس کے نزدیک یہ بھی تمہاری غلطی ہوگی کہ تم نے شبلی پر اعتبار کیا تھا حالانکہ اس کے خلاف تھے۔ اس غلطی کو وہ کیسے نظرانداز کرسکتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کے ابا جان کی جان گئی۔ پی الحال وقار یوسف اور اس کی بیوی کا نام بھی اپنے ہمدرد یا دوستوں کی فہرست میں سے خارج کردو۔ میں اس بات کو بھی خارج از امکان نہیں سمجھتا کہ فوزیہ اور اس کے شوہر سے بھی پوچھ گچھ ہو۔ بھائی کے لئے ان کا گھر ہی ایک ٹھکانا ہوتا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ تمہاری تلاش بڑے زور و شور سے جاری رہے گی اور ہر جگہ سادہ کپڑوں میں خفیہ پولیس اور سی آئی ڈی کے لوگ ہماری نگرانی کریں گے۔ ان کا یہی طریقہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مفرور مجرم کبھی نہ کبھی کسی رشتے دار دوست یا ساکے گھر ضرور پہنچتا ہے خواہ آدھی رات کو آئے یا حلیہ بدل کے آئے۔ اس وقت تک ہم سب بھی چپ رہیں گے۔"

"اور میں کہاں رہوں گا؟"

"انڈر گراؤنڈ۔ زیر زمین۔" غالب نے کہا۔ "لندن میں تو ریلوے لائن بھی انڈر گراؤنڈ۔ یہاں سیوریج لائن ہے۔"

"کیا مطلب۔ میں گٹر میں رہوں گا۔ اس سے بہتر نہ ہوگا کہ میں کسی مدفن میں رہوں۔" میں نے کہا۔ "زندہ گاڑ دیں مجھے آپ سب مل کے۔"

غالب ہنسنے لگا۔ "ایک تیسری جگہ بھی ہے میرے ذہن میں۔ اسے تہ خانہ کہتے تھے آج کل ہیں منٹ (BASEMENT) کہتے ہیں۔ شاہی قلعے میں ایک تہ خانہ ہے لیکن وہاں رہنے سے کنز میں رہنا کم عذاب دہ ہوگا۔ تہ خانے بڑی پراسراریت رکھتے ہیں۔ ان میں زندان بھی ہوتے تھے اور ان ہی میں عشرت کدے بھی۔"

میں نے کہا۔ "آج بھی ایسا ہی ہے۔"

"اب زیر زمین بہت کچھ ہوتا ہے۔ مجرم گاہیں۔ عقوبت خانے کو ادام الکھ میں نے سنا ہے کہ پورے پورے شہر زمین کے نیچے آباد ہیں۔ جہاں ایٹم بم بنتے ہیں۔ ہزاروں افراد کام کرتے ہیں۔ باہر سے بیں گراؤ ویران صحرا یا جنگل نظر آتا ہے۔ آپ کو ایسی ہی جگہ رہنا پڑے گا۔ جہاں سے آپ کو باہر آنے کی قطعی اجازت نہیں ہوگی۔ گویا آپ قیدی ہوں گے۔"

"ایسی جگہ کہاں ہے؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"ایک جگہ ہے لیکن میں ابھی بتا نہیں سکتا۔" غالب نے گھڑی دیکھی۔ "میرا خیال ہے اگر ہمارے تعاقب میں کوئی ہوتا تو اب تک معلوم ہو جاتا۔ میں شیشوں سے مسلسل باہر دیکھتا رہا ہوں۔ پولیس بہت تیزی سے حرکت میں آئے گی مگر اس کے باوجود قانونی کارروائی میں دو تین گھنٹے صرف ہو جائیں گے۔ میں جا کے صورت حال کا جائزہ لوں گا اور پھر رات کو آؤں گا۔"

"مجھے کیسے معلوم ہوگا؟"

"میں تمہیں فون کروں گا۔ تم کسی کو فون نہیں کرو گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم سب کے فون ٹیپ کرنے کے احکامات صادر ہو جائیں۔ تفتیش کا صرف ڈرامہ نہیں ہوگا۔ سچ مچ تفتیش ہوگی۔ اس بار چوہدری ولاور نے تمہیں تو پکا شکار کرلیا ہے۔ اگر تمہاری کال ٹریس کر کے پولیس یہاں آگئی تو پھر تم فرار بھی نہیں ہوسکتے۔ یہاں کافی اندھیرا ہے اور کوئی تمہاری طرف متوجہ بھی نہیں ہے۔ کل صبح تک خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

"کل صبح کیا ہوگا؟"

"یار کچھ تو عقل کو حاضر رکھو۔ کل صبح کے اخبارات میں نقوی صاحب کے قتل کی خبر اور ان کے قاتل کی تصویر شائع ہوگی۔ اخبار یہاں بھی آئے گا تو کیا ویٹر یا منیجر نہیں دیکھیں گے۔ کل صبح کے بعد تمہارا کسی بھی ہوٹل میں قیام ناممکن ہو جائے گا۔ اگلے چند روز میں چوہدری ولاور پوری کوشش کرے گا کہ تمہاری تصویر والے پوسٹر لاہور کے ہر گلی کوچے میں بازاروں میں اور تفریحی مقامات پر لگ جائیں تاکہ تم یہ چہرہ لے کر کہیں بھی نہ جاسکو۔"

"میں تو لندن جا رہا تھا۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"ہم سیدھے جیل اور وہاں سے تختہ دار کی طرف جا رہے تھے۔ بالکل اس شعر کی تفسیر بن کے۔ جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ اب سب سے اہم مسئلہ تمہاری حفاظت کا ہے اور یہ اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ میں اکیلا اس سے نہیں نمٹ سکتا۔" غالب اٹھ کھڑا ہوا۔۔

"سوال اگر چھونے کا ہو تو۔۔۔"

غالب نے میری بات کاٹ دی۔ "ہیک اپ سے کام نہیں چلے گا۔ میک اپ عارضی ضرورت کے لئے ہوتا ہے اور تمہارا مسئلہ مستقل ہے۔ جب مل کے بیٹھیں گے تو سوچیں گے کہ کیا حل نکالا جائے؟"

ہم نے وہیں بیٹھے بیٹھے کافی پی تھی اور پھر کھانا منگوا لیا تھا۔ مجھے بھوک بالکل بھی نہیں تھی۔ میرا ذہن بدستور الجھنوں کا شکار

www.paksociety.com

تھا۔ غالب نے بڑی عقل مندی کی تھی کہ مجھے اس گوشۂ عافیت میں لے آیا تھا۔ اپنی باتوں سے اس نے میرا کھویا ہوا اعتماد بحال کر دیا تھا اور میرے خیالات کا انتشار بھی کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔

ہوٹل میں کمرا حاصل کرنا مشکل نہ تھا لیکن میں نے استقبالیہ پر بیٹھے ہوئے شخص سے سامنا کرنے سے گریز کیا۔ یہ کام غالب نے کیا۔ ہمارے ساتھ سامان نہیں تھا مگر ہم بہت بڑے ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے اور بظاہر عام لوگوں کی طرح پُرسکون بھی نظر آتے تھے صورت سے بھی شریف اور مہذب لگتے تھے۔ غالب نے مزید وضاحت کر دی تھی کہ ہم ایک کاروباری معاملہ طے کرنے کے لئے کراچی سے صرف دن بھر کے لیے لاہور آئے تھے اور شاید پی آئی اے کی نائٹ کوچ سے واپس چلے جائیں گے یا پھر علی الصبح۔ چوبیس گھنٹے کا کرایہ پیشگی ادا کرنے کے بعد غالب نے مجھے اشارہ کیا اور ہم ایک ساتھ اوپر چلے گئے۔

"اب تم یہاں لمبی تان کر سو جاؤ۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "مجھے تو اکیلے پن کے خیال سے وحشت ہو رہی ہے۔ نیند کہاں آئے گی ایسی پریشانی میں۔"

"کوئی دوا دوں؟"

"نہیں یار! ایسے کب تک سکون لے گا۔ بے سکونی کی عادت ہو جائے تو اچھا ہے۔" میں نے کہا۔

غالب نے جانے سے پہلے ایک کام یہ کیا کہ اپنے کپڑے مجھے دے دیے اور خود میرے کپڑے پہن لیے۔ ہماری جسمانی ساخت میں بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ قدوقامت کے اعتبار سے غالب کچھ کم تھا۔ میرے کپڑے اس کو معمولی سے ڈھیلے رہے مگر ایسے نہیں تھے کہ وہ مضحکہ خیز نظر آتا۔ اس کے کپڑے مجھے ٹائٹ فٹ رہے لیکن بہت سے لوگ یہی جسمانی پیمائش کے مطابق کپڑے پہننا پسند کرتے ہیں خواہ اس میں جسم بے آرام رہے۔

غالب نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ ریسٹورنٹ سے گزر کر جائے گا تو دور کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف اس کی پشت ہوگی اور وہ دیکھے گا تو یہی سمجھے گا کہ جس نے کمرا بک کراتے وقت رجسٹر میں دستخط کیے تھے وہ تو اوپر ہی ہے۔ یہ اس کا ساتھی ہے جو باہر گیا ہے۔ غالب ایسا نہ کرتا تو اسے کمرے کی چابیاں استقبالیہ کو دینا پڑتیں یا وضاحت کرنی پڑتی کہ کمرا لاکڈ ہوا ہے اور گیسٹ اوپر ہے۔

کمرے میں تازہ اخبارات بھی تھے اور ایک کونے میں ٹی وی بھی لگا ہوا تھا مگر اس وقت خاموش تھا۔ میں نے بستر پر دراز ہو کر اخبارات دیکھنے شروع کئے کچھ دیر بعد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میری نظریں سطور پر ہیں لیکن سوچ میں شیلی کے بارے میں رہا ہوں۔

غالب کے تمام دلائل اور ناقابل تردید حقائق کے باوجود میرے دل کے کسی گوشے میں یہ خیال اب بھی راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی طرح موجود تھا کہ ڈاکٹر شیلی کی داستان میں حرف اول سے آخر تک سارا جھوٹ نہیں ہوگا۔ کہیں نہ کہیں تھوڑا بہت سچ بھی شامل ہوگا۔ سو فیصد جھوٹ میں اتنا حقیقی رنگ کیسے آ سکتا ہے۔

غالب نے کہا تھا کہ حقیقت ضرور معلوم ہو جائے گی۔ میرے پاس لندن کے اس اسپتال کا فون نمبر تھا جہاں ڈاکٹر شیلا خان نیورو فزیشن تھی۔ یہی اس کا واحد حوالہ تھا جس کی تصدیق کی جا سکتی تھی۔ یہ سوچ کر میں نے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

آپریٹر کی آواز سنتے ہی میں نے کہا "ایک ٹرنک کال لندن کے لئے پلیز!" اس نے روم نمبر کے بعد میرے نام کی تصدیق کی اور کہا "میں کوشش کرتی ہوں سر۔"

آدھے گھنٹے تک میں سوچتا رہا کہ کہیں میری یہ بھی غلطی نہیں بن جائے گی۔ غالب نے مجھ سے کہا تھا کہ تم کسی سے بات نہیں کرو گے مگر اس کی مراد یہاں کے ان شعبوں سے تھی جو آبزرویشن پر رکھے جا سکتے تھے۔ لندن کے اس اسپتال کی کال کون چیک کر سکتا تھا جو ایک بوگس نام سے کی گئی تھی۔

انتظار کا وقت میں نے بے چینی سے ٹہلتے ہوئے اخبار کے صفحے پلٹتے اور کھڑکی سے باہر جھانکتے یا جماہیاں لیتے ہوئے گزارا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں ایک قیدی ہوں جس کا باہر کی دنیا سے رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔ میں اکیلا تھا اور ڈرا ہوا تھا۔

چند سوالات تھے جو میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے اور سامنے آ جاتے تھے۔ اس ہاتھی یا گھوڑے کی طرح جو چڑیا گھر کے جھولے میں سواری کے لئے نکالا جاتا ہے۔ ایک جگہ کھڑے رہ کر شخص نہ دیکھے تو ایک ہی ترتیب سے وہ لکڑی کے جانور گزرتے جاتے ہیں۔ نیلا گھوڑا 'لال ہاتھی' 'پیلا گھوڑا' 'ہرا ہاتھی'۔ اس اسپتال میں کیا سین ہوگا؟ شیخ صاحب کی لاش ایمبولینس میں رکھی جا چکی ہوگی یا گھر پہنچ گئی ہوگی۔ شیلی کی لاش مردہ خانے میں پڑی ہوگی۔ اس کے چہرے کا تاثر کیا ہوگا؟ ڈاکٹر یوسف کی ذہنی حالت کیا ہوگی؟

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی اور آپریٹر نے کہا "آپ کی کال مل گئی ہے۔ ہولڈ کریں سر۔"

میں دو منٹ تک ریسیور کان سے لگائے بیٹھا رہا۔ اس دوران دوبار آپریٹر نے مجھے ہولڈ آن کرنے کو کہا۔

آخر کار کسی نے کہا "گڈ مورننگ سر! البرٹ ہوسپٹل۔"

بات کرنے والی کی آواز میں آپریٹر کے لہجے کی مخصوص خوش مزاجی اور شائستگی تھی۔

میں نے جانتے بوجھتے فرنچ میں پوچھا "کیا میں نیورولوجی شعبے میں کسی سے بات کر سکتا ہوں؟"

حسب توقع مجھے روکھے لہجے میں جواب ملا "نیورو فزیشن کیس یا نیورو سرجن کا؟"

میں نے کہا "نیورو فزیشن پلیز! اگر کوئی انڈین ڈاکٹر

پنجابی ہو تو پہلا اس سے میری بات کرا دیں۔"

اس نے کہا "آپ انڈین ہیں تو انگریزی میں بات کیوں نہیں کرتے؟"

میں جانتا تھا کہ انگریز بھی فرنچ کو اتنا ہی ناپسند کرتے ہیں جتنا فرانسیسی انگلش کو۔ "اس لئے کہ میں انگریزی کو ان غاصب آقاؤں کی زبان سمجھتا ہوں جنہوں نے ڈیڑھ سو سال ہندوستان کو غلامی میں رکھا تھا کیا یہ وضاحت کافی ہے۔ ویسے یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

اس نے مزید کچھ کہے بغیر کہیں لائن ملا دی۔ کسی نے خالص پنجابی لہجے میں کہا "گڈ مارننگ جی! ڈاکٹر چرن سنگھ۔"

میں نے پنجابی شروع کر دی۔ تاکہ آپریٹر خوش نہ ہو۔ "سردار چرن سنگھ جی! میں یہاں لاہور سے بول رہا ہوں۔"

"او ہو جی۔ بولو بولو۔ اپنا لاہور تے فیر لاہور اے۔ حکم کرو۔" چرن سنگھ نے خوش ہو کے کہا "کیہڑی سوہنی زبان ہے اپنی بھی۔ یہاں انگریزی بول بول کے زبان بگڑ ہی گئی ہے۔"

میں نے کہا "سردار جی! آپ کب سے ہیں یہاں؟"

انہوں نے ایک آہ بھری۔ "بس جی اب تو ایسا لگتا ہے کہ پیدا ہوئے تھے اپنے لاہور میں۔ پھر آ گئے ولی اور اب مرنے تک یہیں ہیں۔"

میں نے کہا "یہاں بھارتی پاکستانی ڈاکٹر تو کم ہی ہوں گے۔ مجھے معلوم کرنا تھا۔ ایک لڑکی شیلا خان کے بارے میں۔"

"شیلا خان۔ وہ تو گزر گئی ہے جی اتھوں۔ ہاں وادوا کڑی سی۔"

"آپ کا مطلب ہے یہاں۔ اس اسپتال میں اس نام کی ڈاکٹر تھی۔" میں نے صدمے سے سنبھل کر کہا۔

"آہو جی۔ تھی اسی لئے تو آپ پوچھ رہے ہو۔ نا ہوتی تو کیوں پوچھتے جی۔ اور میں کیا بتاتا۔"

"آپ کو معلوم ہے وہ لندن میں کہاں رہتی تھی۔ اس کے گھر کا فون نمبر یا پتہ مجھے....."

"وہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن ایک بندہ ہے ادھر۔ اس کی بڑی یاری تھی شیلا خان سے۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے۔ پیار و محبت شادی ہو گئی تھی۔ پھر ٹوٹ گئی....."

"منگنی طلاق ہو گئی؟"

"آہو جی۔ یہاں تو ایسے ہی ہوتا ہے۔ آج ملے۔ کل شادی۔ پرسوں طلاق۔" سردار جی بولے۔ "پر تھے دن بیوی چلے آتی ہے کسی ڈاکٹر ان بات ملو۔ یہ ہیں میرے دوسرے شوہر اور بیچارا بے غیرت ہنس ہنس کے ہاتھ ملاتا ہے اور کہتا ہے جی کہ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر....."

میں نے کہا۔ "سردار جی۔ اسی سے ملوا دیں۔ لمبی بات نہیں کر سکتا۔ یہ ٹرنک کال بڑی مہنگی پڑتی ہے۔"

"اچھا اچھا۔ ابھی دیکھتا ہوں بندہ ہے کہ نہیں۔" سردار جی نے کہا اور شاید آپریٹر سے کہا کہ لائن ٹرانسفر کر دے۔

اب کسی مرد نے کہا۔ "ہیلو۔ ڈاکٹر ماجد علی خشتی۔"

میں نے کہا "ماجد صاحب۔ میں رضا خان بول رہا ہوں لاہور سے۔"

"فرمایئے کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی۔" وہ اردو میں بات کر رہا تھا اور مہذب آدمی تھا۔

"بات ہے آپ کی سابقہ بیوی شیلا کی۔"

"میں اس کے بارے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ پلیز!"

میں نے کہا۔ "بات کا غلط مطلب لیا آپ نے۔ مجھے صرف اس کے گھر کا فون نمبر چاہئے۔"

"وہ تو چلی گئی پاکستان۔ گھر بند ہے۔" اس نے مختصراً کہا۔

"اچھا یہاں کوئی شیخ صاحب تھے۔"

"تھے کیا مطلب۔ ہیں۔"

"وہ اس اسپتال میں داخل ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ کس نے بتایا تمہیں۔ مجھے تو نہیں معلوم۔ تمہی سے پوچھ لوں۔" ماجد علی خشتی نے کہا۔

میں نے کہا۔ "اگر وہ نہ ہوں تو پلیز مجھے ان کا فون نمبر چاہئے۔ میں ان سے خود بات کر لوں گا۔ مجھے اطلاع ملی تھی کہ وہ کوما میں ہیں۔"

"کسی نے بے ہودہ مذاق کیا ہے آپ کے ساتھ۔ وہ شیلی... میرا مطلب ہے ڈاکٹر شیلا خان کے مشیر خاص تھے۔ اس نے شیلی کو گمراہ کیا ورنہ وہ بری لڑکی نہیں تھی۔ خیر یہ سب آپ کو بتانے کا کیا فائدہ۔ آپ ان کا نمبر لکھ لیں۔" ماجد علی نے کہا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ریسیور رکھ دیا۔ ڈاکٹر شیلی کے بارے میں غالب کا دعویٰ جزوی طور پر غلط ہو گیا تھا۔ اس نام کی لڑکی اسپتال میں تھی اور ڈاکٹر بھی تھی نیورو فزیشن بھی تھی۔ شیخ صاحب کا وجود بھی تھا اور یوں شیلی کا جھوٹ توقع سے زیادہ سچ ثابت ہو گیا تھا۔ جھوٹ یہ تھا کہ وہ شادی اور طلاق کے مراحل سے گزر چکی تھی اور اس شادی کے بعد خانہ بربادی میں شیخ صاحب نے کوئی غلط کردار ادا کیا تھا۔ ماجد علی نے تسلیم کیا تھا کہ شیلی اچھی لڑکی تھی جسے شیخ صاحب نے خراب کیا تھا۔

اس انکشاف سے میری الجھن اور بڑھ گئی۔ اگر مجھے اسپتال سے کورا جواب ملتا کہ سوری! اس نام کی کوئی بھی ڈاکٹر نہیں رہی تو مجھے اطمینان ہو جاتا اور میں مان لیتا کہ وہ کوئی دھوکے باز عورت تھی جسے دلاور نے پٹی پڑھا کے میرے پاس بھیجا تھا۔

اپنی الجھن رفع کرنے کے لئے میں نے اگلا قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا اور شیخ صاحب کو فون کیا۔ اس بار کال ملنے میں آدھا گھنٹہ بھی نہیں لگا۔ کسی بھاری آواز والے مرد نے ریسیور اٹھا کے کہا۔ "شیخ سپیکنگ۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا۔ "شیخ صاحب! السلام و علیکم۔ بڑی خوشی ہوئی اس وقت آپ کی خیریت دریافت کر کے۔"

"میاں بھائی۔ کون ہو تم پہلے یہ تو بتاؤ۔"

"میں ایک دوست ہوں شیلا خان کا۔ ڈاکٹر رضا۔ نہ جانے کس نے اسے بتایا تھا کہ خدانخواستہ آپ اسپتال میں داخل ہیں اور کومے میں ہیں۔ وہ بہت پریشان تھی۔"

"لاحول ولا قوۃ پریشان تھی تو بات کرتی مجھ سے۔ وہ خود کہاں ہے؟ لاہور سے صرف ایک بار فون کیا ہے اس نے مجھے۔ اتنی مصروف ہو گئی ہے وہ؟"

میں نے کہا۔ "وہ کچھ قانونی مسائل میں الجھ گئی تھی۔"

"یہ تو ہونا ہی تھا۔ میں نے تو منع کیا تھا کہ لعنت بھیجو اس پر وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے..."

میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ "کون... چوہدری دلاور۔"

"ہاں وہی اور کون۔ اسی نے بلایا تھا شیلی کو۔"

میں نے پھر جوا کھیلا۔ "دیکھئے۔ سگا نہ سہی۔ سوتیلا بھائی تو تھا۔"

"میاں! مجھے سوتیلے کی بات نہیں۔ اتنا عرصہ وہ کہاں تھا۔ آج تک اسے سوتیلی بہن یاد نہیں آئی۔ اب اچانک محبت جوش مارنے لگی۔ خون کا رشتہ یاد آ گیا۔"

"بڑی غلطی کی تھی اس نے آپ کا مشورہ نہ مان کے اب مشکل میں پڑ گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ واقعی بہت غلط آدمی ہے۔ وہ ضرور استعمال کرنا چاہتا ہو گا شیلی کو۔ کس غلط مقصد کی خاطر۔"

"آخر ہوا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ۔"

"یہ ذرا لمبی بات ہو جائے گی۔ وہ خود آپ کو فون پر بتا دے گی۔ مجھے تو آپ کی خیریت دریافت کرنی تھی اور یہ پوچھنا تھا کہ چوہدری دلاور نے اسے کیوں بلایا تھا میاں۔"

"میاں جو ہم جانتے ہیں وہ تو صرف اتنا ہی ہے کہ لاہور میں کسی ٹرسٹ کا اسپتال ہے۔"

"وزیر خان ٹرسٹ۔" میں نے کہا۔

"شاید یہی نام تھا۔ دلاور چاہتا تھا کہ شیلی اس کا انتظام سنبھال لے سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہو گا۔ بس وہ لالچ میں آ گئی۔ کچھ پاکستان جانے کا شوق تھا۔ ایک اسپتال کی منتظم اعلیٰ بننے کی آفر اس کے لئے بہت پرکشش ثابت ہوئی۔ چوہدری دلاور نے یہ بھی کہا کہ رہنے کی جگہ کار کوٹھی سب کچھ ملے گی۔ ویسے اپنا گھر بھی ہے۔ معاوضہ کوئی مسئلہ نہیں، تمہیں تمام امور میں مکمل خود مختاری حاصل ہو گی... مجھے کھٹکی تھی یہ بات کہ کیا وہاں اسپتال کا انتظام و نسق سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا کہ شیلی کو بلایا گیا۔ جسے کوئی تجربہ بھی نہیں انتظامی امور کا۔ آخر اس سے پہلے اسپتال کون چلا رہا تھا۔ اس کے علاوہ میاں۔ ٹرسٹ میں تو ہوتا ہے بورڈ آف ڈائریکٹرز۔ اس کا ایک چیئرمین بھی ہوتا ہے۔ شیلی کیسے منتظم اعلیٰ ہو گی اور عام طور پر ٹرسٹ کے اسپتالوں میں رضاکارانہ خدمات ہوتی ہیں۔ ایسی کرسی کار کی شاہانہ مراعات تو اپنے ملک میں بڑے بڑے ڈاکٹروں کو حاصل نہیں۔ ٹرسٹ کہاں سے دے گا اتنا معاوضہ۔"

"آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ دلاور نے اسے دھوکے سے بلایا اور مصیبت میں پھنسا دیا۔"

"میاں! میں دل کا مریض ہوں۔ شیلی مجھے بہت عزیز ہے کہ مجھے زیادہ مت ہلاؤ۔ کس مصیبت کا ذکر کر رہے ہو تم...؟"

میں نے کہا۔ "مجھے تو پیغام ملا تھا اس کا کہ شیخ صاحب کی خیریت دریافت کرواؤ اور انہیں بتا دو کہ سب ٹھیک ہے مگر سب ٹھیک نہیں ہے وہ بہت پریشان لگتی تھی۔ مجھے بھی تفصیل سے کچھ نہیں بتایا اس نے۔ کوئی بہت سنگین قانونی معاملہ ہے۔ بس آپ دعا کریں اس کے لئے یا چوہدری دلاور سے معلوم کریں۔"

"میرے پاس تو اس کا فون نمبر نہیں ہے۔ ہیلو..."

لیکن میں ریسیور رکھ چکا تھا۔ غیر ضروری تفصیلات میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جو بات میں معلوم کرنا چاہتا تھا وہ بات مجھے معلوم ہو گئی تھی۔

شیلی نے مجھ سے سو فی صد جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس کا چوہدری دلاور سے وہی رشتہ تھا جو اس نے مجھے بتایا تھا۔ وہ خود میں نیورو فزیشن بھی رہی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس کی ماں کے متعلق بھی اس نے جو کچھ بتایا ہو گا سچ ہی بتایا ہو گا کہ ماں کو قتل کرنے والا دلاور تھا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ اس کی کہانی پر آسانی سے اعتبار نہیں کیا جائے گا اور ہم اس کے بیان کردہ کوائف کی تصدیق ضرور کریں گے۔

اس حد تک غالب کا قیاس غلط تھا کہ شیلی نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ سب کچھ بے بنیاد اور بے حقیقت تھا۔ غالب کو یقین تھا کہ نہ اس کا نام شیلی ہو گا اور نہ وہ دلاور کی بہن ہو گی اور نہ وہ لندن کی ڈاکٹر۔ اس نے کسی شیخ صاحب کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ یہ سب چوہدری دلاور کی گھڑی ہوئی کہانی تھی۔

غالب کے یقین کے غلط ثابت ہونے سے مجھے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی بلکہ اس سے میرا اعتقاد بحال ہو گیا تھا۔ خرابی شیلی کی نیت اور اس کے مقاصد میں تھی۔ جس کا اندازہ نہیں کر سکا تھا۔ خود شیلی نے اپنے بارے میں جو بتایا تھا وہ مجھے حقیقت لگا تھا۔ میرا موقف یہ تھا کہ چوہدری دلاور اچھا ڈرامہ کرنے والا ضرور ہے مگر اس کے پاس کسی کہانی کار کا تخلیقی ذہن نہیں ہے اور وہ خیال آرائی کی بنیاد پر شیلی کو ایک ایسی داستان حیات تو پوری کتاب مرتب کر کے نہیں دے سکتا تھا جس میں جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ زندگی بالکل جیتی جاگتی حقیقت محسوس ہو۔ مجھے یہ بھی دھڑکن لگتا تھا کہ شیلی جیسی کوئی لڑکی دلاور کا پڑھایا ہوا سبق یوں رٹ لے اور ایسی بے مثل اداکاری کے ساتھ سنائے۔

اس کے ماضی کا ہر ورق آپ بیتی محسوس ہو جگ بیتی نہ لگے۔ اس کی گزری ہوئی زندگی کے ماہ و سال اس آئینے میں اپنا عکس خود اپنی سچائی کا ثبوت بن کر پیش کرتے تھے۔ مگر کتنی بھی حقیقت سے قریب کیوں نہ ہو اس میں دیکھنے والی آنکھ کوئی نہ کوئی خامی پکڑ لیتی ہے۔ اسٹیج کے پرانے ایکٹرز جو آغا حشر کے ایک ہی ادارے کے تحت مسلسل ایک ہی شو میں مکالمے دہراتے رہتے تھے اور سین کے مطابق اداکاری میں ماہر ہو جاتے تھے وہ بھی بعض اوقات بھول چوک کا شکار ہو جاتے تھے اور نادانستہ طور پر ان کی اداکاری میں جھول آ جاتا تھا۔

شیلی نے کوئی غلطی نہیں کی تھی کیوں کہ اس نے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی۔ اس نے مجھے وہی بتایا تھا جو وہ اپنے بارے میں خود جانتی تھی۔ انسانوں کو سمجھنے اور ان کے کردار کو پرکھنے میں میرے مشاہدے اور تجربے کی کسوٹی نے مجھے دھوکا نہیں دیا تھا۔ قصور اس کی نیت کا تھا جو میں نہ دیکھ سکا اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی کسی کے ذہن کو پڑھ کے بتا سکے کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔

تازہ معلومات کی روشنی میں جو تصویر ابھر کر سامنے آئی تھی وہ اس کے جذبات ابھارتی تھی۔ نفرت کے قابل شیلی نہیں تھی انسانی فطرت میں شامل ہوس کے جذبات تھے۔ شیلی کو خدا نے کیا نہیں دیا تھا۔ حسن بے مثال، اعلیٰ تعلیم، ذہانت، دولت اور عزت... لیکن دلاور نے اس کے سامنے زیادہ پرکشش جال پھیلا دیا۔ دلاور کے پاس کوئی آلہ نہیں تھا لیکن ایک شیطانی صلاحیت ضرور تھی جس سے وہ انسانوں کی کمزوری اور ان کی قوت مزاحمت کی پیمائش کر لیتا تھا پھر کسی تجربہ کار شکاری کی طرح ڈور ڈالتا تھا۔ جتنی بڑی مچھلی اتنی بڑی ڈور اور اتنا ہی پرکشش نوالہ۔

سہ پہر ڈھلتے ہی مال روڈ پر گاڑیوں کی آمد بڑھ گئی تھی اور ایک رونق سے معمور شام بڑی تمکنت کے ساتھ اترنے لگی تھی۔ میں اس ماحول کا حصہ ہو کر بھی سب سے الگ تھا اور میری تنہائی کی رفاقت صرف ذہنی خیالات تک محدود تھی۔ شاید اب تک وہ سب ختم ہو چکا ہو گا جو ہونا ہے۔ تقوی صاحب کا جسد خاکی۔ جو نرمی توپ چیز تھے عام انسانوں کی طرح کورے لٹھے کے کفن میں قبر کی گی مٹی میں جانے کے لئے تیار ہو گا اور سفر آخرت پر روانہ کرنے والے وہی ہوں گے جو ان کے اقتدار کو سلام کرتے تھے اور سرکار نام پر دو گھول یا رسم دنیا نبھانے کے لئے ثواب کی خاطر اپنے انجام سے خیال سے وہاں پہنچے ہوں گے۔ ان میں وہ بھی ہوں گے جن کے لئے یہ غم کا نہیں شادمانی کا موقع ہو گا اور وہ نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو اپنی کامیابی پر مبارکباد بھی دے رہے ہوں گے کہ دیکھا! وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہو گا۔ بڑی توپ بنا پھرتا تھا۔ ہم نے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ سانپ مر گیا اور لاٹھی اپنے ہاتھ میں ہے۔ کل کوئی دوسرا سانپ پھن پھیلا کر سامنے آئے گا تو اس کا سر بھی کچل دیں گے۔ انشاء اللہ۔

پھر مجھے شیلی کا خیال آیا۔ اس کا لاوارث جسم کہاں ہو گا؟ کیا اب چوہدری دلاور اس سے خون کا رشتہ نبھائے گا؟ اسے اپنی بہن تسلیم کرتے ہوئے اسے دنیا سے ایسے ہی رخصت کرے گا۔ جیسے ہم سب اپنے پیاروں کو کرتے ہیں؟ نہیں۔ وہ شیلی نہیں ایک آلۂ قتل تھی۔ دلاور قتل کرنے کے بعد اسے پھینک چکا تھا۔ ضائع کر چکا تھا۔ وہ تو اسے پہچانے گا بھی نہیں۔ ڈاکٹر شیلا خان؟ کون شیلا خان۔ نیورولوجسٹ؟ نہیں۔ میں نے تو یہ نام بھی نہیں سنا۔

شاید اسی چوہدری دلاور نے لندن میں شیلی سے رابطہ کیا ہو گا تو اس کا انداز بالکل مختلف ہو گا۔ مکاری اور عیاری اس کی بدذات کے دو نمایاں اوصاف تھے۔ شیلی کے سامنے وہ بالکل مختلف آدمی بن کے بیٹھا ہو گا۔ اس نے کہا ہو گا کہ شیلی۔ دیکھو میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ تم لاکھ انکار کرو مگر خون کے رشتے کی حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ میں اپنی کوتاہی کو تسلیم کرتا ہوں کہ آج تک تمہاری خبر لینے نہیں آیا تھا۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ تمہاری ماں کو میں نے قتل کیا لیکن وہ میری مجبوری تھی۔ تم کو بھی معلوم تو ہو گا کہ وہ کس قماش کی عورت تھی۔ اس عورت کو میں اپنی ماں نہیں تسلیم کر سکتا تھا مگر تمہیں اپنے باپ کی اولاد مانتا ہوں۔ میرا باپ مجبور تھا ورنہ تمہیں چھوڑ کے نہ جاتا۔ یہ تمہاری ماں تھی جس نے اسے جان بچا کے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آخر اس نے اپنے شوہر کی ساری دولت ہتھیا لی اور اس شخص سے شادی کر لی جس سے اس کے دیرینہ مراسم تھے۔

حالات کیا تھے کیا نہیں تھے۔ یہ چوہدری دلاور کو بھی علم نہیں ہو گا یا اس نے کوشش کر کے معلوم کر لیا ہو گا۔ کسی انگریز عورت کا جو اپنی غلطی سے ایک انڈین کار ڈیلر سے شادی کر بیٹھی تھی۔ اس معاشرے میں آزادی کے لئے کوشش کرنا بعید از امکان نہ تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ اس عورت نے ایک دیسی شوہر سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں کسی سے مدد لی ہو۔ یہ بھی ایسے حالات پیدا کر دیئے ہوں کہ کالا آدمی بھاگ جائے۔ بعد میں سب کچھ اسی کو ملا تھا اور شاید دلاور نے معلوم کر لیا تھا کہ اس نے اپنے دیسی شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد کس قسم کی زندگی گزاری تھی۔ شیلی کو دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی ماں بھی حسین ہو گی اور ایک ایسے معاشرے میں جہاں عورت پوری طرح خود مختار ہو۔ کسی حسین اور دولت مند بیوہ کا تنہا رہنا ممکن نہیں تھا۔ یہ روایات صرف مشرق سے منسوب ہیں جہاں آج بھی وفا شعار اور شوہر پرست بیویاں جوانی میں بیوہ ہو جاتی ہیں تو سفر حیات کے آخری لمحے تک صرف یادوں کو ساتھ رکھتی ہیں اور اپنی عفت و شرافت کا سرمایہ بحفاظت میدان حشر میں پیش کرنے کے لئے ساتھ لے جاتی ہیں تاکہ وہاں ان کے عزت مند مجازی خداؤں کا سر نیچا نہ ہو۔

اگر میرے مفروضات غلط نہیں تھے تو یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ چوہدری دلاور کے پھیلائے ہوئے جال میں شیلی آسانی سے پھنس

www.paksociety.com

گئی ہو گی۔ اس نے کہا ہو گا کہ چلو بھول جاؤ اس بدکردار عورت کو اور چلو میرے ساتھ۔ میں تمہارا بڑا بھائی ہوں جو تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ تمہارے در پر سوالی بن کے پہنچا ہوں۔ مجھے مایوس مت لوٹاؤ۔ ایسے ڈائیلاگ تو وہ جذباتی اداکاری کے ساتھ کسی تیاری کے بغیر بول سکتا تھا۔ اس نے تنہائی کی بات بھی کی ہو گی کہ یہاں اب کون ہے تمہارا۔ واپس وطن چلو۔ یہی تمہارے اور میرے والد کی خواہش تھی۔ یہاں تم ملازم ہو۔ وہاں اسپتال تمہارا ہو گا۔ تم مالک کہلاؤ گی اور تم جیسے وہاں کئی ملازم ہوں گے۔ وہ ایک خیراتی شفاخانہ ہے لیکن تمہیں کسی چیز کی کمی نہ ہو گی۔

شیلی کو واقعی کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اچانک قدرت کی طرف سے فیاضی کا مظاہرہ ہوا تھا۔ اس کا بڑا بھائی اسے اپنانے پہنچ گیا تھا۔ وہ رشتوں سے محروم نہ تھی اور حقیقی رشتوں کی منزل خود اس کے سامنے آ گئی تھی۔ وہ اپنے باپ کی خواہش کے مطابق پاکستان جا کے غریبوں اور ضرورت مندوں کی خدمت کرنا چاہتی تھی اور ایک خیراتی اسپتال کی صورت میں اسے اپنی خواہشات کی تکمیل کے سارے اسباب میسر آ رہے تھے۔ اسے خودمختاری حاصل ہو رہی تھی اور زیادہ سے زیادہ نیک نامی عزت اور ثواب کمانے کا موقع مل رہا تھا۔ پیسہ اس کے ذہن میں پہلے بھی کم تر تھا اور وہ خود بھی کما سکتی تھی۔ پاکستان میں اس جیسی تعداد فرشتہ شاید ایک بھی نہیں تھی۔

لاہور پہنچنے تک شیلی مطمئن ہو گی کہ اس کی زندگی کا یہ نیا دور اس کی خواہشات کی بھرپور تکمیل ثابت ہو گا۔ وہ کسی سکندر بخت کے نام سے بھی واقف نہ ہو گی۔ یہاں پہنچنے کے بعد بھائی نے اسے بتایا ہو گا کہ ویسے تو سب ٹھیک ہے لیکن میرا تمہارا مشترکہ دشمن سکندر بخت ہے جو اس راستے کا معمولی کانٹا ہے اور اسے ہٹایا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے طور پر شیلی کو وزیر خاں کے بارے میں کچھ بتایا ہو گا کہ اسپتال اس کے نام پر لیز ہے اور میں اس کی ملکیت کا دعوے دار ہوں۔

دلاور منفی پروپیگنڈے کا ماہر تھا۔ اس نے شیلی کے دماغ میں میرے خلاف زہر بھر دیا ہو گا اور کشتیاں جلا کے وطن آنے والی شیلی کی سوچ کو اس موڑ تک لے آیا ہو گا جہاں وہ بھائی کے نیک مقاصد کی آلۂ کار بننے پر بھی تیار ہو گئی۔ شاید دلاور نے خود اسے لندن سے فرار ہونے پر مجبور کیا ہو گا اور جب وہ غیر قانونی طور پر پاکستان پہنچی ہو گی تو دلاور نے اس کا پرتپاک استقبال کرنے کے بعد آہستہ آہستہ اس کے گرد سازش کا جال پھیلا دیا ہو گا۔ بالکل انجانے میں شیلی غلطیاں کرتی گئی جو اس کا جرم بن گئیں اور دلاور کے لئے اسے بلیک میل کرنا آسان تر ہو گیا۔ ایک وقت وہ آیا کہ شیلی نے سکندر بخت کو شکار کرنے کے لئے اپنے شکاری بھائی کے ساتھ مل کے جال پھیلانا منظور کر لیا۔

یہ سب میری قیاس آرائیاں تھیں۔ اصل حالات کچھ بھی ہوں۔ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ شیلی نے کسی مجبوری کے تحت [illegible] دلاور کا ساتھ دیا تھا۔ وہ ایسی لڑکی بہرحال نہیں تھی جو کسی غرض یا مفاد کی خاطر اس بہیمانہ کھیل میں شریک ہوتی جس کا انجام رسوائی بھی ہو سکتا تھا اور موت بھی۔ اس کے سابق شوہر نے [illegible] تسلیم کیا تھا کہ وہ بری لڑکی نہیں تھی اور میں نے اس کی چند روزہ رفاقت میں یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ آخر یہ مجبوری تھی جو اسے آلۂ کار بننے پر مجبور کر سکتی تھی۔ وہ خود نہ میری دشمن تھی نہ بدخواہ۔ اس کے سابق شوہر نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ لندن میں اس خاندان کے رشتے دار کوئی شیخ صاحب تھے جن کو وہ باپ کی جگہ سمجھتی تھی۔ پاکستان میں اسے ذلت کی موت مارنے والا دلاور تھا جسے شاید اس نے اپنا بھائی سمجھنے کی غلطی کی تھی۔

بدنیت اور بدباطن شخص کا انجام عبرتناک ہو [illegible] نہیں ہوتا۔ سیمابال میں دلہن کے المناک انجام پر [illegible] لیکن شیلی جیسی لڑکی کے یوں مارے جانے کا مجھے واقعی [illegible] اسے دلاور نے قتل کیا تھا۔ کبھی کی آنکھوں پر محبت کی [illegible] کے اسے تباہی کے راستے پر دھکیل دیا اور کیا سمجھا جائے [illegible] راستہ جس کا اختتام موت کے تاریک اور [illegible] دلاور نے اس کے دماغ میں نفرت کا زہر بھرا پھر اس کے [illegible] سمجھا کے کہا کہ جاؤ۔ اپنی خوشیوں کے اور خوابوں کے [illegible] دشمن کا کام تمام کر دو۔ یہ کام تم ہی کر سکتی ہو اور [illegible] گا۔ اس نے منتقی انداز میں شیلی پر غلبہ حاصل کیا [illegible] عامل اپنے معمول پر حاصل کر لیتا ہے۔ اسے ہر طرف سے [illegible] معطل کیا اور محصور کر لیا پھر اس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ [illegible] گیا اور شاید وہ مجبور ہو گئی کہ دلاور کے پلان کے مطابق چلے۔

اب وہ مر چکی تھی۔ اس کی موت کا دکھ تھا تو صرف اس لئے کہ میں نے اسے قریب سے دیکھا تھا اور سمجھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لڑکی بری نہیں تھی۔ وہ برائی کی دلدل میں [illegible] اسی برائی نے اسے نگل لیا۔ غالب [illegible] میرے خیالات سے اتفاق نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے نزدیک [illegible] بری تھی اور برائی پر اعتبار کرنا بڑا تھا۔

میں ایمانداری سے دل کو ٹٹولتا تھا تو مجھے شیلی کے خلاف [illegible] کا کوئی جذبہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ بے شک اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا اور اپنے بارے میں غلط بیانی کی تھی لیکن جس طرح [illegible] میرا ساتھ دیا تھا اسے دیکھتے ہوئے میرا ذہن اسے مجرم [illegible] پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ مجبور تھی اور دلاور کی آلۂ کار [illegible] شاید وہ اس مجبوری کی دلدل سے نکلنا بھی چاہتی تھی [illegible] کی پوری سازش کا بھانڈا پھوڑتے ہوئے ڈرتی تھی۔ [illegible] کے منصوبے کے مطابق میرا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ [illegible] میں شاید وہ اپنی مجبوری بھی بتا دیتی۔ یہ اعتراف [illegible] نے کہا یا کیا وہ دلاور کی سازش کا حصہ تھا اور وہ خود ایک [illegible] تو سب نہ کرتی۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دلاور نے شیلی کی نیت کے تیور کو بھی بھانپ لیا تھا۔ اس کے شکاری کتے مسلسل شیلی کے تعاقب میں رہتے تھے۔ اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے اور پل پل کی خبر پہنچاتے تھے۔ شاید دلاور کو شک ہو گیا تھا کہ شیلی جو شکار کرنے گئی تھی خود شکار ہو گئی ہے اور سکندر بخت کا جادو اس پر چل چکا ہے۔ وہ منحرف ہو کے دشمن کے کیمپ میں شامل ہو سکتی ہے۔ یہ خیال بھی اس کے لئے پریشان کن ہو گا۔

شیلی کی بغاوت اور سرکشی ناقابل معافی جرم تھا۔ دلاور اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ اس کی سوتیلی بہن اس کے دشمنوں سے مل جائے اور اس کی آلۂ کار بننے کے بجائے اس کے مخالفوں کی طاقت ہو جائے۔ ان حالات میں شیلی کی خودکشی کا راز بھی سمجھ میں آتا تھا۔ یہ خودکشی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ صریحاً قتل تھا۔ نقوی صاحب کو مارنے والے بھی اس کے آدمی تھے اور پھر شیلی پر اس قتل کا الزام تھوپ کے اس کی جان لینے والے بھی وہی تھے۔

مسئلہ اور اس کا حل۔ نقوی صاحب کو مار دو۔ الزام شیلی پر [illegible] اور پھر شیلی کو مار دو اور اس کو خودکشی کا کیس بنا دو۔ کیسی بہن اور کیا خون کا رشتہ۔ اتنی خود غرضانہ سفاکی، بے غیرتی اور بدضمیری کا مظاہرہ صرف چوہدری دلاور ہی کر سکتا تھا جس کی نظر میں مقاصد کتنے ہی مذموم کیوں نہ ہوں۔ رشتوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی مقدس کیوں نہ ہوں۔ رشتے توڑے جا سکتے ہیں۔ مقاصد نہیں چھوڑے جا سکتے۔ آفرین۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ (بڑا مردوں والا کام کیا تو نے!)

رفتہ رفتہ شام کے سائے تاریک ہونے لگے اور مال روڈ کی چہل پہل میں روشنی کی چمک بھی شامل ہو گئی۔ اوپر سے یہ رنگ و نور کا ایک سیل رواں لگتا تھا۔ مرکری بلبوں کی دودھیا نیلی روشنی کی قطاریں۔ نیون سائن کے نارنجی اور جامنی رنگ۔ جلتی بجھتی روشنی کی تحریریں۔ بے آواز کاروں کی ہیڈ لائٹس اور شوکیسوں کو رنگین بنانے والی اسپاٹ لائٹس۔

میں بہت دیر سے ایک ہی جگہ ایک ہی پوز میں کھڑا ہوا تھا اور دیکھنے کے باوجود کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میری نظر کہیں اور خیال کہیں اور۔ بند کمرے میں اندھیرا در آیا تھا اور مجھے حیرت ہوئی تھی جب میں نے گھڑی دیکھی تو سوا سات بجے تھے۔

لائٹ جلا کے میں نے فون اٹھایا اور کافی کا آرڈر دیا۔ میرا جسم [illegible] دماغ بھی تھکن سے بے حال تھا۔ ایک منحوس دن کی جگہ [illegible] واقعات نے لے لی تھی۔ قید تنہائی میں میرے لئے انتظار کا عذاب تمام نہیں ہوا تھا۔ شعور کے پس منظر میں ایک خاموش فلم [illegible] مناظر بھی جیسے شہر خموشاں کی پرہول تاریکی میں مجھ [illegible] نقوی صاحب کی دنیا سے رخصتی مکمل ہو چکی تھی اور میں ان قبروں کے درمیان ایک تازہ گیلی مٹی کے ڈھیر کا تصور کر سکتا تھا جس پر پھول بھی تازہ تھے۔ صبح تک ان کی خوشبو اور رنگت بھی ساتھ چھوڑ جائے گی اور عناصر کی ترتیب ختم ہو گی تو زندگی کے اجزا کا انتشار شروع ہو گا۔

ماٹی کہے کمہار سے تو کیوں گوندھے موہے
اک دن ایسا آئے گا میں گوندھوں گی توہے

ہاں ایک لاش بے گور و کفن رہ جائے گی جس کا وارث سامنے نہیں آئے گا۔ کیا اس سے فرق پڑتا ہے؟ جسم زیر زمین دفن کیوں ہو جائے یا سرکاری مردہ خانے میں سڑ جائے۔ تقسیم ہو جائے اور تفتیش یا تحقیق میں صرف ہو کے کوڑے کی نذر کر دیا جائے۔

ویٹر سٹنگ روم میں کافی اندر لایا تو میں نے اسے اسپرین لانے کو کہا۔ میرے سر کا درد شدید اعصابی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ اب ویٹر کو اسپرین باہر سے لانی تھی۔ اس کی واپسی سے پہلے میں نے غسل کیا تو مجھے خاصا سکون ملا۔ کافی اب بھی گرم تھی۔ اسپرین نے مزید فائدہ پہنچایا اور میں کافی پی کے لیٹا تو مجھے بہت آرام ملا۔ میں نے ٹی وی آن کیا اور پھر بند کر دیا۔ اس پر کوئی مزاحیہ پروگرام چل رہا تھا۔ اسٹیج شو میں شریک خوش پوش اور خوش باش لوگ ہنس رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ سب بے حس اور خود غرض لوگ ہیں جن کو ذرا بھی خیال نہیں کہ رات کتنی سوگوار ہے اور نوحۂ غم میں نغمۂ شادمانی کتنی اذیت دیتا ہے۔ یہ ایک مضحکہ خیز اور احمقانہ خیال تھا۔ دنیا میں ہر روز ہر لمحہ جانے کتنے گھروں پر اجل شب خون مارتی ہے مگر وقت کا یہ کارواں تو ایسے ہی رواں رہتا ہے۔

ساڑھے آٹھ بجے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ہمت کر کے ریسیور اٹھا لیا اور بے دلی سے کہا۔ "ہیلو۔"

غالب نے کہا۔ "سکندر، کیا سو رہے تھے؟"

میں نے کہا "نہیں سو رہا تھا۔ کوئی خاص خبر؟"

"نہیں! نقوی صاحب کی تدفین ہو گئی۔"

"پوسٹ مارٹم ہوا تھا۔"

"ہاں! لیکن تفصیلات اخبار والوں کو جاری نہیں کی گئیں۔ اندر کی ایک اطلاع کے مطابق ڈاکٹر شیلی کے معاملے کو دبا دیا گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ نقوی صاحب کی موت میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ انہیں زہر خورانی کے کیس میں اسپتال لایا گیا تھا تو وہ بے ہوش تھے اور کوما میں ہی انتقال کر گئے۔ ڈاکٹر اپنی پوری کوشش کے باوجود ان کی جان نہیں بچا سکے۔" غالب نے کہا۔

"او۔ وہ جو ان کی بیٹی نے کہا تھا۔"

"وہ ٹھیک تھا۔ مگر جیسے ہی پولیس کے اعلیٰ افسران پہنچے انہوں نے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور پابندی عائد کر دی کہ ذاتی حیثیت میں کوئی بھی بیان جاری نہیں کیا جائے گا۔

www.paksociety.com

اسپتال کی انتظامیہ نے پولیس اور وارثوں کی مرضی کے مطابق بلیٹن جاری کیا اس میں نقوی صاحب کی موت کا سبب حرکت قلب کا بند ہو جانا بتایا گیا ہے۔"

"یعنی... طبعی موت؟"

"نہیں۔ طبعی موت تو نہیں۔ دل کے مریض تھے وہ۔ ان کا بلڈ پریشر بھی بہت ہائی رہتا تھا۔" غالب نے کہا۔ "ان کی خوراک میں شامل کئے جانے والے زہر سے الرجک ری ایکشن ہوا اور ASTHAMA جیسی کنڈیشن میں دل نے کام کرنا چھوڑ دیا جسے ڈاکٹر CARDIC ARREST کہتے ہیں۔"

"کیا یہ پوسٹ مارٹم رپورٹ ہے؟"

"جی پوسٹ مارٹم رپورٹ ہی بتا رہا ہوں لیکن غیر مصدقہ۔"

"ڈاکٹر شبلی کے خلاف قتل کا کوئی کیس نہیں؟"

"نہیں۔ اس کیس سے اسپتال کی بدنامی ہوتی تھی۔ پولیس اور پبلک کو کیا بتایا جاتا کہ اتنی نگرانی کے باوجود یہ کیسے ہوا؟"

"کیسے ہوا تھا؟"

"ہونے والی بات تھی اسے کون روک سکتا تھا۔" غالب نے کہا۔ "میں فون پر سب نہیں بتا سکتا۔"

"کہاں سے بات کر رہے ہو؟"

"ایک اخبار کے دفتر سے۔ یہیں سے وہ ساری باتیں معلوم ہوئی ہیں جو چھپ گئیں مگر ان کی خبر نہیں بنے گی۔" غالب نے کہا۔ "تم باہر مت نکلنا۔ پولیس ایک دم الرٹ ہو گئی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے میں اس کمرے میں قید رہوں گا؟"

"نہیں۔ صبح ہونے سے پہلے تمہیں دوسرے قید خانے میں منتقل کر دیا جائے گا جہاں تم احتیاطی قوانین کے تحت تاحکم ثانی رہو گے۔" غالب ہنسا۔

فون بند ہو گیا اور میں سوچتا رہ گیا کہ اس سے شبلی کے بارے میں بات کروں یا نہیں۔ میں اس سے یہ تو پوچھ سکتا تھا کہ شبلی کی لاش کس کی تحویل میں ہے اور اس کو رسم دنیا کے مطابق کون سپرد خاک کرے گا۔ داور کی غیر انسانی بے حسی میرے لئے باعث اشتعال تھی۔ اہمیت تو اس کے لئے کسی زندگی کی نہیں تھی مگر ڈاکٹر شبلی سے اس کا کوئی تعلق ضرور تھا۔ اسی تعلق کو بنیاد بنا کے اس نے شبلی کو استعمال کیا تھا اور اب وہ مر چکی تھی تو اس سے یوں بے تعلق ہو گیا تھا کہ اسے دو گز کفن اور دو گز زمین دینے کا روادار نہ تھا۔

کیا پولیس نے اس کے بیگ سے برآمد ہونے والے پاسپورٹ اور امریکن ایکسپریس کے ٹریولر چیک نہیں دیکھے ہوں گے؟ اگر دیکھے ہوں گے تو کیا ان سے معلوم نہیں ہو جائے گا کہ شبلی کون تھی۔ یہ تو بہت آسان تھا کہ پولیس لندن سے تمام معلومات حاصل کر لے۔ ایک فون کر کے میں نے اسپتال سے بہت کچھ معلوم کر لیا تھا اور اب باقی باتیں شیخ صاحب نے بتا دی تھیں۔

شیخ صاحب کا خیال آتے ہی مجھے افسوس ہوا۔ شبلی نے ان کے بارے میں مجھ سے غلط بیانی سے کام لیا تھا کہ وہ اسپتال میں [illegible] ہوئے ہیں۔ ان کی بیوی قاتلانہ حملے میں ماری گئی اور وہ [illegible] ہیں۔ ظاہر ہے اس نے یہ جھوٹ اس لئے بولا تھا کہ میں شیخ صاحب سے رابطہ کروں نہ کوئی اور ان سے بات کرے۔ وہ [illegible] کرنا چاہتی تھی کہ شکاری اس کے ہی نہیں شیخ صاحب کی جان کے بھی دشمن ہو رہے ہیں جب کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ باہر جا کے وہ ڈاور سے ملی ہو اور اس نے شبلی کو [illegible] ہو۔ وہ میرا اعتماد حاصل کر چکی تھی۔ یہ رپورٹ ڈاور کے لئے حوصلہ افزا ہو گی۔ اس نے شبلی کو مزید ہدایات دی ہوں گی کہ اب اسے کیا کرنا ہو گا۔ اس نے شبلی کو زہر بھی فراہم کیا ہو گا جو اسپتال پہنچ کے نقوی صاحب کو دینا تھا اور اسپتال کے آئی سی یو وارڈ میں رسائی کا طریقہ بھی سمجھا دیا ہو گا۔

مشکل یہ تھی کہ بیکاری میرے لئے ذہنی پریشانی کے ابہام پیدا کر رہی تھی اور حقائق سے بے خبری نے مجھے قیاس آرائی میں الجھا دیا تھا۔ میں صرف فرض کر سکتا تھا کہ ایسا ہوا ہو گا یا ہوا ہو گا۔ تصدیق کے بغیر یہ خام خیالی تھی اور میں وسوسوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے پر مجبور تھا۔ یقین کا راستہ نہ جانے کہاں تھا۔

میں بیڈ کے کنارے پر بیٹھا ہوا ہاتھوں سے اپنے [illegible] رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ غالب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے ابھی چند منٹ پہلے کسی اخبار کے دفتر سے بات کی تھی اور اسے میری یہاں موجودگی کا علم ہی نہ تھا پھر مجھے خیال آیا کہ ابھی کافی منگوائی تھی اس کے برتن میز پر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ویٹر ہو گا جو خالی برتن اٹھانے کے لئے آیا ہو گا۔

دروازہ کھولتے ہی مجھ پر جیسے بجلی گری۔ میں جہاں جس پوز میں کھڑا تھا اسی حالت میں پتھر کے مجسمے کی طرح منجمد ہو گیا۔ میرے سامنے رابعہ کھڑی تھی۔ وہی تصویر رعنائی، وہی انداز محجوبی، فسوں سازی میں وہی انکار کی ادا۔ لبوں کے تبسم میں وہی اقرار [illegible]

اس نے آہستہ سے کہا۔ "کیا میں واپس چلی جاؤں؟"

میں چونکا۔ ابھی تک میں دروازے میں اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ "کیا ایسے ہی جانے کے لئے آئی تھیں؟" میں نے ہاتھ پکڑ کے اسے اندر کھینچ لیا اور دروازہ بند کر دیا۔

اس نے نہ جانے کہاں سے وہی ساڑی نکال لی تھی جس پر شوخ نیلے رنگ اور زرد پھولوں سے میری یادوں نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ جب وہ پہلی بار جیل میں مجھ سے ملنے آئی تھی تو اس ساڑی میں تھی اور مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس بد [illegible] تاریک کمرے کی دیواروں پر تاروں بھرا روشن آسمان پھیل گیا ہے اور وہ منظر ابھی میرے تصور میں اپنی تمام تابناکی کے ساتھ زندہ تھا۔

رابعہ ساڑی کے ایک کونے کو انگلی پر لپیٹ اور کھول رہی [illegible]

"نہیں۔ مجھے نہیں آنا چاہئے تھا یہاں۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ہاں۔ آنا مجھے چاہئے تھا تمہارے پاس۔ تمہارا مجرم ہوں میں۔"

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "فضول باتیں مت کرو۔"

"تم خفا ہو نا مجھ سے؟" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھوں میں دبا لیا۔

"خفا تو تم بھی ہو جاتے ہو۔" وہ مسکرائی۔ "یہ کون سی انوکھی بات ہے۔"

میں نے اسے کھینچ کر اپنے قریب کر لیا۔ اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور کہا .... "سچ رابعہ تم خفا نہیں ہو مجھ سے۔ نہیں۔ تم میرا دل رکھنے کو ایسا کہہ رہی ہو۔ میں نے دل دکھایا تھا تمہارا۔ میں جانتا رہا ہوں۔ میں نے جانتے بوجھتے یہ سب نہیں کیا تھا لیکن میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ تمہاری بدگمانی..."

رابعہ نے بڑی مشکل سے خود کو چھڑایا۔ "خدا کے لئے ایسا مت کہو۔ کون کہتا ہے میں بدگمان ہوں تم سے۔ بھلا یہ ممکن ہے!"

میں نے اسے بیڈ پر بٹھا دیا اور خود گھٹنوں کے بل اس کے سامنے قالین پر بیٹھ گیا۔ آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ یہاں آنے سے پہلے یقیناً اس نے نہ رونے کا عہد کیا ہو گا۔ اپنے آنسوؤں سے وعدہ لیا ہو گا کہ وہ اس کے عہد کو شکست نہیں دیں گے مگر وہ جذبات کا رکا ہوا سیلاب تھا جو ضبط کے سارے بند توڑ کے ہر عہد کو بہا لے گیا تھا۔

میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے رخساروں پر بہنے والے آنسوؤں کو صاف کیا۔ "تمہیں روتا دیکھ کے میرا احساس جرم بڑھ جاتا ہے رابعہ۔"

اس نے اپنی انگلیوں سے بالوں کو پیچھے کیا۔ "میں کہاں رو رہی ہوں؟ یہ آنسو تو بس ایسے ہی نکل آتے ہیں آنکھوں سے۔"

میں نے اس کی گود میں سر رکھ دیا۔ "میں بہت شرمندہ ہوں رابعہ۔"

"کس بات پر؟" اس کی انگلیاں میرے بالوں سے کھیلنے لگیں۔

"یہ سب تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ محض غلط فہمی تھی۔"

"ہمارے درمیان غلط فہمی کا کیا کام۔ تم مجھے سمجھتے ہو۔ میں تمہیں جانتی ہوں۔"

"پھر بھی۔ بہت کچھ ہو گیا جو نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ تمہارا دل دکھانے کا نہیں سوچا تھا میں نے۔ کبھی نہیں۔"

"محبت بڑی حاسد ہوتی ہے سکندر۔ شک کی پرچھائیں بھی برداشت نہیں کرتی۔" اس نے کہا۔ "میں پاگل ہو گئی تھی۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم صرف میرے ہو مگر میں کیا کروں اندر سے میں بہت کمزور ہوں۔ میرے دل میں ایک ڈر چھپا رہتا ہے۔ شاید ہر عورت کے دل میں ہوتا ہے۔ یہ ڈر کہ کہیں پانے سے پہلے میں تمہیں کھو نہ دوں۔"

"تمہیں بھروسا نہیں اپنے آپ پر۔"

"بھروسا ہے۔ مگر شک کا وہ تو چوروں کی طرح آتا ہے۔ اس سے بچنا آسان نہیں ہوتا۔ آدمی ہر وقت روشنی میں رہنا چاہتا ہے مگر کیا یہ ممکن ہے۔ سائے کے بغیر روشنی کا تصور بھی نہیں؟ محرومی کا خوف بھی محبت کے ساتھ ہے۔ مجھے غالب نے بتایا..."

"کیا بتایا؟"

"یہی۔ کہ وہ سب میرے دماغ کا فتور تھا۔" وہ جھینپ کر ہنس پڑی۔

میں نے کہا۔ "تمہارے رونے پر مجھے بہت غصہ آیا تھا.... مجھے بھی غالب نے بتایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا۔"

"تم ہر ایک پر اعتبار کرتے ہو۔ اس لئے کہ خود تم کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔"

"مجھے بہت افسوس ہے اس بے وقوف لڑکی کے مارے جانے کا..."

"تمہیں افسوس ہے؟" رابعہ نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ وہ لڑکی بڑی بدنصیب تھی۔ اس کی قسمت خراب تھی کہ برائی کی دلدل میں قدم رکھ بیٹھی۔" میں نے کہا۔ "خیر چھوڑو۔ یہ تو دنیا کا چلن ہے اور زندگی اسی کا نام ہے۔ تم بتاؤ کیسے پہنچ گئیں۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں چھپا ہوا ہوں۔ یہ بات صرف غالب کو معلوم تھی۔"

"اس نے مجھے بتا دیا۔"

"لیکن ابھی ابھی اس کا فون آیا تھا۔ اس نے کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا تمہارا۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو اس نے سختی سے منع کیا تھا کہ نہ باہر جاؤں نہ کسی سے بات کروں۔"

"میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں۔ چلو اٹھو۔"

"کہاں لے جاؤ گی مجھے آخر؟"

"اپنے ساتھ۔ اپنے گھر۔ ایک وہی جگہ ہے جو ابھی تک پولیس کی نظر میں نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "سب یہی سمجھتے ہیں کہ میں منظر کے گھر میں ہوں۔"

"تمہارا یہ نیا گھر... کب تک محفوظ رہے گا۔ بالآخر معلوم ہو جائے گا کہ تم نے مجھے چھپا رکھا ہے۔ غالب نے کہا تھا کہ خانہ تلاشی کے وارنٹ کے ساتھ مجسٹریٹ چھاپے خود ماریں گے۔"

"آج اس کا کوئی امکان نہیں۔ میں نے معلوم کر لیا ہے۔"

"کل یا پرسوں پولیس نے مجھے تمہارے گھر سے برآمد کر لیا تو بلاوجہ تم بھی مشکل میں پڑو گی۔"

وہ ہنسی۔ "اتنا بے وقوف مت سمجھو مجھے۔ خطرہ ہوتا تو میں تمہیں ساتھ کیوں لے جاتی۔ ابھی کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ بس ایک بار تم اندر پہنچ جاؤ پھر وہ دس بار بھی تلاشی لیں۔"

www.paksociety.com

"کیا کرو گی آخر تم۔ جادو منتر سے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دو گی؟ یا مجھے مکھی مچھر بنا کے ماچس کی ڈبیا میں بند کر دو گی۔"

"یہ تم خود دیکھ لینا کہ میں کیا کرتی ہوں۔ چلو اب باتوں میں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ گھر چل کے باتیں کریں گے۔"

دس منٹ بعد میں نے ریسپشن ڈیسک پر جا کے چیک آف کیا تو میرے بل میں لندن کی دو کالیں شامل تھیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں نے کتنی دیر گفتگو کی تھی۔ عام شرح پر مجھے کال چار گنا زیادہ لگے لیکن میں مجبور تھا کہ ہوٹل کے ریٹ اور آپریٹر کے بتائے ہوئے ٹائم کے مطابق ہی ادائیگی کروں۔

باہر نکل کے میں نے کہا۔ "اب ٹیکسی لیں۔"

اس نے مسکرا کے مجھے دیکھا۔ "سکندر صاحب۔ یہ گاڑی آپ کی ہی ہے جس کو آپ اتنے غور سے دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ سرخ فاکس ویگن۔ اسے میں غور سے نہیں۔ رشک سے دیکھ رہا تھا۔ یہ تمہاری ہے؟" میں نے کہا۔

"تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟"

"قطعی نہیں۔ میں حسد سے کباب ہو گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ویسی ہی ایک لال فاکس ویگن پہلے بھی تھی تمہارے پاس۔ بڑا لاابالی تھا۔"

"جی۔ اس کو آپ نے بڑی کوشش اور ہمت سے کباڑ بنا کے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ بڑی محنت سے تباہ کیا تھا۔"

"اسے بھی کر دیں گے انشاء اللہ۔" میں نے بالکل نئے ماڈل کی گاڑی میں بیٹھ کے کہا۔ "بڑے رئیسانہ ٹھاٹھ ہیں تمہارے۔"

رابعہ نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ "ایک نئی زندگی کا آغاز ہے تو ہر چیز نئی ہونی چاہیے۔"

"نئی کوٹھی تو مفت میں مل گئی۔"

"مفت میں کیوں!" رابعہ نے خفگی سے کہا۔ "دلاور سستا چھوٹ گیا۔ دھوکے، فراڈ اور ناجائز قبضے کے دس کیس کر دیتی میں تو اس کوٹھی کی مالیت سے دگنا ہرجانہ وصول کر لیتی۔"

"حیرت ہے تم وکیل ہو کے ایسی بات کرتی ہو۔ بی بی دیوانی مقدمہ نہ جانے کتنے سال چلتا۔ اتنا آسان نہیں تھا اس سے کچھ وصول کرنا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ بس وہ ڈر گیا کہ پبلک میں بدنامی ہو گی۔ کوٹھی پر قبضہ تو رکھ نہیں سکتا تھا وہ۔ اس نے کہا کہ کوٹھی لو اور میری جان چھوڑو۔ میں نے بھی کہا کہ اچھا جاؤ معاف کیا۔ حساب کتاب برابر۔ ویسے کوٹھی اس نے بڑی زبردست بنوائی تھی۔"

"اس نے بنوائی تھی یا چاندنی بیگم کے لئے اس کے پرستار نے؟ دلاور نے تو خالی زمین پیش کی ہو گی کہ یہ پلاٹ پڑا ہوا ہے۔ تم لے لو۔ حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ۔"

"اس کا نتیجہ یہی تھا کہ میرا بہت خرچہ ہو گیا۔"

"تم نے پوچھا نہیں حرامزادے سے کہ کسی اور کے پلاٹ پر اس نے یہ خرچہ کیوں کیا تھا۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ غیر قانونی کام تھا؟"

"غیر قانونی چکر تو بہت لمبا تھا۔ اس کے بہت سے پہلو تھے۔ چاندنی بیگم پر عنایت تھی کہ اس قتل سے محروم پہلوان کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلائی گئی تھی۔ چاندنی کا قتل اور اس کے شوہر۔"

"خاک شوہر۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ ایک طوائف کا کیا شوہر اور بوالہوس کی کیسی بیوی۔ دنیا اندھی نہیں ہے کہ اس نام نہاد رشتے کی حقیقت کو نہ سمجھتی ہو۔"

"مجھے ان معاملات سے کیا۔ جب میں یہاں نہیں تھی تو جو ہوا غلط ہوا لیکن اس کی ذمے داری مجھ پر نہیں آتی۔ بھاڑ میں جائیں سب میری طرف سے۔ زمین میری تھی۔ چاہیں تو اپنا گھر اٹھا کے لے جائیں اور خالی پلاٹ چھوڑ دیں۔ یہ دلاور کے لئے مسئلہ ہو جاتا۔ میں نے اس کی وضاحت قبول کر لی۔"

"وضاحت یا چالاکی!"

"جو بھی تم سمجھو۔ اس نے کہا کہ مس رابعہ۔ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ جرمانے کے طور پر یہ عمارت آپ کی۔ آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ قانون کے چکر میں مت پڑیں اور میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ میں نے بات ختم کی۔ یہ نہیں پوچھتی کہ یہ کیا چکر تھا۔ ایسا کیوں کیا تھا۔ ویسا کیوں کیا تھا۔ قانوناً یہ غلط تھا، وہ غلط تھا۔ نوٹس دیتی۔ کیس کرتی۔ سزا اسے کیا ہوتی۔ مجھے قبضہ ملنا مشکل ہو جاتا۔ میں نے خود کو پریشانی سے بچایا اور دلاور نے خود کو۔"

"چاندنی بیگم کے قتل اور پہلوان کی خودکشی کا کیس داخل دفتر ہو گیا؟"

"اور کیا ہو سکتا تھا۔ نہ مدعی نہ شہادت۔ حساب پاک ہوا۔" رابعہ نے کہا۔

"فرض کرو کل یہ مسئلہ کھڑا ہو کہ تمہارے مکان میں وہ بھی رہتے تھے؟" میں نے کہا۔

"اول تو مسئلہ اٹھے گا نہیں۔ اٹھا تو میں نمٹ لوں گی۔ میرا اٹارنی تھا وقار یوسف۔ اس نے کرائے دار رکھے تھے۔ کرایہ نامہ ضروری نہیں لیکن پچھلی تاریخ میں بھی بنایا جا سکتا ہے۔"

"اور یہ مکان کس نے بنایا؟ تمہاری عدم موجودگی میں۔ ان کا نقشہ وغیرہ۔ کیا اخراجات ہوئے۔ ان کی تفصیل!"

"سکندر۔ قانون میں بہت کچھ ہے مگر دنیا کے معاملات ایسے ہی چلتے ہیں۔ ایک قانون ہو تو دس طریقے لوگ ایجاد کر لیتے ہیں اس قانون سے بچنے کے۔ بدقسمتی سے میں نے کچھ نہیں کیا مگر خود کو بچانے کے لئے کچھ کر لوں گی۔ تم بے فکر رہو۔ مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ خود پکڑنے والوں کو کس نے پکڑا ہے آج تک۔ بیشتر سرکاری ملازم جو پبلک سرونٹ کہلاتے ہیں اتنی جائیداد رکھتے ہیں کہ ان کی تمام عمر کی تنخواہ جوڑی جائے تب بھی مالیت کا دس فیصد نہ بنے گی۔ سارا محکمہ کسٹم ان میں شامل نہیں۔ ریلوے، واپڈا، چیک پوسٹ، پی آئی اے، پولیس اور وزارت تجارت و صنعت، ورکس ڈیپارٹمنٹ، جنگلات کا محکمہ، چیف کارپوریشن، امپورٹ آفس۔ سب میں معمولی حیثیت کے لوگوں کی کوٹھیاں ہیں۔ بڑے بڑے کاروبار ہیں۔ یہ کون نہیں جانتا۔ حکومت جانتی ہے۔ عوام جانتے ہیں۔ عوام کے نمائندے جانتے ہیں۔ سب کو معلوم ہے لیکن جاننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ خرابی تو بڑھتی جا رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری کار تم سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔ "مجھ سے زیادہ خوبصورت تو چیلی تھی۔"

میں نے آہ بھر کے کہا۔ "کیا فائدہ اس خوبصورتی کا جس کے ساتھ ایسی بدبختی اور نحوست ہو۔ ذلت کی موت ہو اور مر کے بھی رسوائی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم سب اس کو ساری خرابی کا ذمے دار سمجھتے ہو اور اس کے لئے نفرت کے جذبات رکھتے ہو لیکن آج مجھے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوئی ہیں جو پہلے معلوم نہیں تھیں۔"

"چنانچہ تمہیں دکھ ہو رہا ہے۔"

"دکھ تمہیں بھی ہو گا رابعہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے ساتھ جو بھی ہوا وہ اپنی ہی نیت کا پھل سمجھا جا سکتا ہے لیکن چوہدری دلاور نے اسے دھوکا دیا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ وہ مجبور ہو گئی۔ اس نے کوشش کی تھی کہ مجبوری کی دلدل سے نکل جائے مگر اس وقت تک بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ اتنی بے بس تھی کہ کچھ نہ کر سکی اور دلاور نے اسے قتل کرا دیا۔"

"قتل۔ تم اس کی خودکشی کو قتل کہہ رہے ہو۔"

"ہاں۔ مگر اسے قتل ثابت نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

گاڑی اب پرانے راستے سے کراؤن سینما کی طرف مڑ گئی تھی۔ رابعہ کی کوٹھی کے دروازے پر چوکیدار کھڑا تھا۔ اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے کار کے اندر جھانکا۔ اس کے پاس ریوالور بھی تھا۔

رابعہ نے کہا۔ "ٹھیک ہے دین محمد۔"

"یہ کون ہیں بیگم صاحب جی؟" اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

رابعہ نے کہا۔ "یہ میرے دوست ہیں سکندر بخت۔"

اس نے سر ہلایا اور پیچھے چلا گیا۔ پچھلے شیشے میں سے اس نے کار کے اندر جا کے کیا دیکھا اور پھر مطمئن ہو کے گیٹ کھول دیا۔

میں نے کہا۔ "یہ کس قسم کا چوکیدار ہے؟"

رابعہ مسکرائی۔ "اسے غالب نے سیکیورٹی کے بارے میں خصوصی ہدایات دی ہیں کہ جب تک خود نہ پہچانو کسی کے لئے دروازہ مت کھولو۔ رابعہ کے ساتھ کوئی ہو تو اچھی طرح دیکھ کے دروازہ کھولنا۔ اگر بی بی اندر ہوں تو ہر آنے والے کا نام پوچھو۔ گاڑی کا نمبر نوٹ کرو اور اندر بتاؤ۔ چند افراد کے سوا جن کا نام حلیہ اسے بتا دیا گیا ہے۔ کسی اجنبی کو گاڑی اندر لے جانے کی اجازت نہیں۔"

میں نے کہا۔ "غالب نے تو حد کر دی۔ کیا تلاشی بھی ہوتی ہے گیٹ پر؟"

"مشکوک افراد کی تلاشی بھی لی جا سکتی ہے باہر ہی۔ دین محمد ریٹائرڈ فوجی ہے اور ملٹری پولیس میں تھا۔ سیکیورٹی کا مطلب سمجھتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

میں اس کوٹھی میں پہلے بھی آ چکا تھا۔ رابعہ نے اس کی تزئین و آرائش بدل دی تھی لیکن اسباب وہی تھے۔ ڈرائنگ روم میں مجھے کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔

پرانے مکان کی زمین کا رقبہ دس مرلے تھا مگر نقشہ ایسا تھا کہ یہ ایک کنال کی کوٹھی لگتی تھی۔ ڈیزائن کی خوبصورتی کے علاوہ اس میں کشادگی کا احساس ہوتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ طرز رہائش بدلتا ہے تو گھر کے نقشے بھی تبدیل ہوتے ہیں۔ پرانے گھروں میں چھوٹی سلاخوں والی کھڑکیاں تھیں جن کے چھوٹے چھوٹے مستطیل شیشے تھے۔ اب سلائیڈنگ پٹ والی المونیم کی کھڑکیاں تھیں جن میں لمبے اور بڑے بڑے ٹنٹڈ (TINTED) شیشے تھے۔ دہلیزیں اتنی ہی چوڑی ہو گئی تھیں جتنی دیواروں کی موٹائی تھی۔ حفاظت کے لئے باہر لوہے کی ڈیزائن والی گرل نصب کر دی گئی تھی۔ پرانے دروازے بہت بلند اور بھاری تھے۔ ان کے اوپر محرابی روشن دان تھے جن کے نصف دائرے میں مختلف رنگ کے شیشے لگے ہوتے تھے اور شیشوں کے پیچھے نرم کی کھڑکیاں ابھرتے سورج کی کرنوں کا تاثر دیتی تھیں۔ اب فلش ڈور آ گئے تھے جن میں جدید ڈور لاک تھے۔ اسی طرح چھت سے ذرا اونچے جو ہوادان رکھے جاتے تھے وہ بھی غائب ہو چکے تھے۔ ان کی جگہ ایگزاسٹ فین لے چکے تھے۔ بیڈ روم کے ساتھ باتھ روم کا تصور ناپید تھا۔ سارے کنبے کے لئے ایک باتھ روم گھر کے دور دراز حصے میں بنایا جاتا تھا۔ اب فلش وغیرہ نے اٹیچ باتھ کو ایک ضرورت بنا دیا تھا۔

مکان میں تین بیڈ روم تھے اور ڈرائنگ روم سب سے الگ تھا۔ تقریباً پورے گھر میں سینتھیٹک کارپٹ بچھا دیا گیا تھا جس کا رنگ بالکل تازہ گھاس جیسا گہرا سبز تھا اور آنکھوں کو تراوٹ دیتا تھا۔ گھر کی ساخت اور طرز آرائش پر یقیناً بہت پیسہ خرچ کیا گیا تھا مگر میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ چوہدری دلاور جیسا ہوشیار آدمی یہ حماقت کیوں کر بیٹھا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہو گا کہ یہ گاؤں دیہات نہیں جہاں زمیندار کسی پٹواری کے ساتھ مل کے کسی غریب کسان کی زمین ہتھیا لے۔ یہ شہر تھا اور زمین بھی ایک وکیل کی تھی۔ اس نے کیوں سمجھ لیا تھا کہ رابعہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی اور زمین کا کوئی والی وارث اس قبضے کے خلاف نالش نہیں کرے گا۔ یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ خود کو بہت عقلمند اور بہت طاقتور سمجھنے والا بھی بعض اوقات ایسی غلطی کر بیٹھتا ہے جو اس

www.paksociety.com

کے گلے پڑ جاتی ہے اور اسے پیچھا چھڑانے کے لئے اپنی غلطی کا خمیازہ ایسے ہی بھگتنا پڑتا ہے۔

پورے مکان کا معائنہ فرمانے کے بعد میں نے کہا۔ "مس رابعہ بال! تاخواستہ میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی۔ اس کے برعکس تمہارے پرانے مکان کی تباہی میں بھی قدرت کی مصلحت پوشیدہ تھی۔ دیکھو اس پرانے مکان کے بدلے تمہیں اس نے کیا دے دیا۔"

"مگر وہ مکان میرا اپنا تھا......"

"خاتون۔ مکان کسی کے نہیں ہوتے۔ اینٹ چونے کے حصار ہوتے ہیں۔ بہت کم مکان ایسے ہوتے ہیں جن میں ایک کے بعد دوسری یا تیسری نسل بھی اپنی زندگی گزار سکے۔ اس سے پہلے ہی مکان بک جاتے ہیں۔ تقسیم ہو جاتے ہیں گروائے جاتے ہیں۔ ان میں رہنے والے دوسرے شہروں یا ملکوں میں کوچ کر جاتے ہیں۔ مکانوں میں کرائے دار آتے جاتے رہتے ہیں۔ آدمی جہاں آباد ہو وہ گھر ہوتا ہے اور یہ آج تمہارا گھر ہے۔"

"پرانے گھر سے میرے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں۔"

"اس گھر سے جوانی کی اور پھر ہمارے بچوں کی یادیں منسوب ہوں گی۔ یہ تو آغاز سفر ہے۔ آنے والے وقت کا ہر لمحہ ایک سنگ میل ہو سکتا ہے۔"

وہ تھوڑا سا شرمائی پھر اداس ہو گئی۔ شاید اس خیال سے کہ وہ وقت جس کا اسے انتظار ہے نہ جانے کب آئے گا۔ ابھی تو اتنے بڑے گھر میں اس کی رفیق وہی تنہائی تھی جس کے ساتھ وہ عمر کا نصف سفر طے کر چکی تھی۔ شاید ضعف سے کچھ کم احساس بڑی عجیب چیز ہے۔ بچپن اور جوانی کے پُرلطف ماہ و سال پر لگا کر اڑتے ہیں اور زندگی کا پہلا نصف حصہ احساس زیاں ہونے سے پہلے تمام ہو جاتا ہے۔ آخری ایام میں آدمی اپنی مجبوری، معذوری اور تنہائی کے ساتھ زندگی کا بوجھ ڈھوتا ہے اور وقت کے بے رحم ہاتھ اسے زبردستی آگے دھکیلتے ہیں۔ اس کے انجام کی جانب۔ وہ نئی دنیا کے ماحول اور نئے چہروں کے درمیان پرانا آدمی ہو جاتا ہے۔ بے مصرف اور بے وقعت۔

رابعہ نے کہا "یہ کس سوچ میں پڑ گئے؟"

میں نے اپنے خیالات کو چھپا لیا "سوچ رہا تھا کہ تمہارا پرانا گھر سلامت رہتا تو تم اسے ہرگز گرا کر اتنا جدید اور ایسا شاندار بنگلہ نہ بنواتیں۔"

"ظاہر ہے۔"

"وقت کا ساتھ دو رابعہ! وقت کے ساتھ چلو۔ تبدیلی کو قبول کرو ورنہ تم پیچھے رہ جاؤ گی۔" میں نے کہا۔ "اپنے ماضی سے جذباتی طور پر زنجیر کی طرح بندھے رہنے والے ترقی نہیں کرتے۔ آثار قدیمہ صرف دیکھنے کے لئے ہوتے ہیں۔ رہنے کے لئے نہیں۔"

"ابھی تو بہت کچھ نہیں دیکھا ہے تم نے" وہ بولی اور آگے چل پڑی۔

"اب اپنی اور دیگر خواتین کی سب سے پسندیدہ جگہ دکھاؤں، کچن۔" میں نے ہنس کے کہا "میری اور تمہاری دادی پردادی کچن کوئلے اور اپلے جلاتی آئی تھیں۔ اگلی نسل نے بڑا انقلاب دیکھا۔ جب مٹی کے تیل والے چولھے آگئے جن میں دھواں نہیں ہوتا تھا اور برتن کالے نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ دور ختم ہو گیا۔ اب گیس اور کوکنگ رینج ہیں لیکن کچن میں پکتا وہی ہے جو آبا و اجداد کھاتے تھے۔ خاندانی نسخے کے مطابق بنا گوشت، دہی، پلاؤ، زردے، قورمے اور شامی کباب۔ سب اسی بے تکلفی سے کیا کھ دیا۔ زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا، پیٹ میں چوہے گھوڑوں کی طرح دوڑنے لگے ہیں۔"

رابعہ ہنسی "کھانا تو جناب یہاں نہیں مل سکتا۔"

میں نے کہا "تف ہے اس شاندار کچن پر۔ مبارک تو دھواں، دہی، لکڑیوں والا چولھا جس پر آدھی رات کے وقت آنے والے مہمانوں کے لئے بھی گرما گرم روٹیاں اترتی تھیں۔"

"بابا میں مذاق کر رہی تھی۔"

"بابا۔ کون بابا۔ ایک تو وہ ہوتا ہے جسے کہا جاتا ہے کہ موز کرو بابا۔ جیسا کہ تم نے ابھی مجھ سے کہا۔ دوسرا ہوتا ہے ہوا بابا۔ جس سے بچوں کو ڈرایا جاتا ہے کہ چپ ہو جاؤ نہیں تو ہوا بابا آجائے گا۔"

رابعہ کھلکھلا کر ہنسی "تم تیسری قسم کے بابا ہو۔ انگریز جو مذہب کے کھلے بچوں کو دیسی آیا بابا کہتی تھی۔ جس کی جمع تھی بابا لوگ۔ چلو اب اپنا کمرا بھی دیکھ لو پھر کھانا وہیں کھائیں گے۔"

"میرا کمرا۔ سب کمرے تو دیکھ لیے......" میں نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا "تم نے یہاں کچھ نہیں کیا۔ تعریف ادائی کے علاوہ۔"

"یہ کارپٹ میں نے ڈلوائے ہیں۔ اس بیڈ روم کا سارا سامان بدلا ہے۔ جس میں چاندنی کا خون ہوا تھا اور اس کے پیارا... نے خودکشی کی تھی۔ اس کا رنگ تک تبدیل کرا دیا ہے میں نے۔"

"پھر بھی ان کی بدروحیں تو نہیں نکلی ہوں گی۔"

"سچ بتاؤں! مجھے بڑا ڈر لگتا ہے اس کمرے میں۔ میں نے اسے مقفل کر دیا ہے۔ گیسٹ بیڈ روم بنا دیا ہے۔"

"اچھی مہمان نوازی کی روایات ڈالی ہے جو آئے اسے بھوتوں کے حوالے کر دو۔ خود گزر جائے گا یا رات گزار کے بھاگا تو پلٹ کر نہیں آئے گا۔" میں نے کہا "نوکر نہیں رکھے تم نے؟"

"بس ایک خادمہ کی ضرورت ہے۔ منظور نے وعدہ کیا ہے کہ کسی کو لائے گا۔ کوئی بیوہ ہے جس کا دس بارہ سال کا لڑکا بھی ہے۔ میری ضرورت کے لئے کافی ہیں۔" رابعہ نے اپنے بیڈ روم کی الماری کھولی۔

"چشم بد دور، ملبوسات کی نمائش ہے۔ ناچیز کی رائے ہے؟"

"آپ لباس سے نہیں لباس آپ سے حسین لگتا ہے۔ خوب چمک رہے ہو۔" رابعہ ہنسی اور الماری میں داخل ہو گئی۔

میں نے اسے کپڑے ہٹا کے وارڈ روب کی پچھلی دیوار میں کچھ کرتے دیکھا۔ ایک دم پچھلا حصہ دروازے کی طرح اندر کی جانب کھل گیا۔

"تشریف لائیے!"

میں نے حیرانی سے کہا "یہ دولت خانہ ہی نہیں عجائب خانہ بھی ہے۔"

"تم جیسے عجوبے جہاں رہیں گے وہ عجائب خانہ ہی کہلائے گا۔" رابعہ اس دروازے سے نیچے اترنے لگی۔

میں اس کے پیچھے گیا۔ "اس عجوبے کو یعنی مجھے واقعی نیچے رکھا جائے گا۔ انڈر گراؤنڈ۔"

رابعہ نے کہا "اپنے پیچھے دروازے کو لاک کر دو۔" میں نے دروازہ بند کیا تو کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی دروازہ لاک ہو گیا۔ اب میں تصور کر سکتا تھا کہ باہر کی طرف سے وہ دیوار کا حصہ بن گیا ہو گا۔ ایک نظر میں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وارڈ روب کے پیچھے دیوار نہیں لکڑی کا دروازہ ہے۔ اس کا رنگ و روغن ایسا تھا کہ کمرے کی دیواروں سے مل گیا تھا۔

میں نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ "حیران تو میں پہلے بھی تھا اب پریشان بھی ہوں کہ چودھری دلاور نے یہ تہ خانہ کیوں تعمیر کرایا تھا۔"

"یہ پرانا تہ خانہ ہے۔ ہمارے گھر میں پہلے سے تھا۔"

"پرانے گھر میں!"

"ہاں۔ اس زمانے میں یہ رواج تھا۔ ہندوؤں کے گھروں میں تہ خانے عام تھے جہاں ایک کمرے میں بھگوان رہتے تھے۔"

"یہ انکشاف ہے میرے لیے کہ بھگوان آکاش پر نہیں پاتال میں رہتے تھے" میں نے کہا "مجھے یہ تہ خانہ پرانا تو نہیں لگتا۔"

"اس کا رنگ و روغن نیا ہے۔ پہلے یہاں کباڑ بھرا رہتا تھا اور ہوا کی آمد و رفت نہیں تھی چنانچہ نیچے آکر دم گھٹتا تھا۔ راستے کی تعمیر نے اسے بڑی صفائی سے چھپا دیا ہے۔" رابعہ نے ایک بٹن دبایا۔

ایک جانی پہچانی سرسراہٹ سے میں نے اندازہ کر لیا کہ کہیں ائیر کنڈیشنر نے کام شروع کر دیا ہے۔ لائٹ بھی ذرا سی دیر کے لئے کم ہوئی تھی۔ "یہاں اے سی بھی جدید پیشی ہے؟"

"جو میں نے لگوایا ہے۔"

"اپنے قیدی کے لئے" میں نے کہا "بہت پُرتکلف قید خانہ بنوایا ہے تم نے۔"

"تم جو چاہو سمجھو لیکن تمہاری حفاظت کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے اور ہم نے مل کے طے کیا ہے کہ جب تک حالات کا یہ خطرناک دور گزر نہیں جاتا تم یہیں رہو گے۔"

میں نے کہا "زنجیریں ڈال کر رکھو تو اور بات ہے۔ ورنہ۔"

"ورنہ کیا۔ تم بھاگ جاؤ گے" رابعہ نے کہا "آرام سے بیٹھ جاؤ یہاں میں کھانا لے کر آتی ہوں۔"

"بازار سے؟"

"میں نے خود پکایا ہے۔ میں صرف وکیل ہی نہیں ہوں۔"

وہ لوٹ کے اوپر چلی گئی تو مجھے سچ مچ ایسا لگا جیسے میں مجرم ہوں، دہشت گرد ہوں، جان بچانے کے لئے چھپ کے رہنا میری مجبوری ہے اور میں اپنے لئے ہی نہیں دوسروں کے لئے بھی باعث خطرہ ہوں۔ بات صرف میرے احساس کی تھی ورنہ بارہ فٹ چوڑے اٹھارہ فٹ لمبے کمرے میں آسائش کے تمام لوازمات فراہم کیے گئے تھے۔ بیڈ بہت آرام دہ تھا۔ لائٹ بہت خوب صورت تھیں اور کارپٹ بہت قیمتی تھا۔ ایک طرف لکھنے کی میز تھی اور کتابوں کی الماریاں تھیں۔ چودھری دلاور کا پڑھنے لکھنے سے اور کتابوں سے دور کا بھی رشتہ نہیں تھا۔ یہ انتظام رابعہ نے کیا تھا اور ظاہر ہے بڑی عجلت میں کیا تھا شاید گزشتہ چند روز میں غالب اور نازو کے ساتھ مل کے یہ طے کر لیا گیا تھا کہ روپوشی کے لئے مجھے ہرگز لندن نہیں جانے دیا جائے گا۔ انہوں نے آپس میں سارا پروگرام بنا لیا تھا کہ میں یہاں رہوں گا۔ پھر انہوں نے میری ضروریات اور خواہش کے مطابق یہاں ہر چیز فراہم کی تھی۔ کمرے کی دوسری دیوار کے ساتھ ایک کونے میں ٹی وی موجود تھا تو دوسرے کونے میں بالکل نیا خریدا ہوا ریڈیو گرام رکھا ہوا تھا اور اس کے نچلے خانوں میں ریکارڈ بھرے ہوئے تھے۔

آخر انہوں نے کیسے فرض کر لیا تھا کہ میں غیر معینہ مدت کے لئے اس قید تنہائی کو قبول کر لوں گا؟ میں نے برہمی سے سوچا۔ کیا وہ مجھے زبردستی اس جیل میں رکھ سکتے تھے؟ یہ ناممکن تھا۔ بزدلی کے ساتھ جان کے خوف سے چھپ کر رہنا تو موت سے بھی بدتر ہے۔ اتنا ہی پیارا ہوتا مجھے زندگی سے اور اتنا ہی کم ہمت ہوتا تو دلاور سے صلح کر لیتا۔ میں اتنے غصے میں تھا کہ کسی سے لڑنا چاہتا تھا۔ وہ رابعہ ہو، غالب ہو یا نازو۔ کوئی میرے سامنے آکے مجھے بتائے کہ مجھ سے پوچھے بغیر انہوں نے یہ فیصلہ کیوں کیا تھا۔

ایک باغیانہ جذبے کے ساتھ میں اوپر چڑھ گیا اور الماری کے دروازے سے گزر کے بیڈ روم میں آگیا۔ رابعہ کچن میں تھی اور میز پر کھانا لگا رہی تھی۔ چار افراد کے لئے چھوٹی سی گول میز کچن کے ایک حصے میں تھی۔ دوسری بڑی ڈرائنگ روم سے ملحق کھانے کے کمرے میں لگی ہوئی تھی جس پر بارہ افراد بیٹھ سکتے تھے۔

میں نے کرسی پر بیٹھ کے کہا۔ "میں اس لئے گلاس جیل سے بھاگ آیا ہوں اور واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

رابعہ نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ "غالب اور نازو بھی پہنچ رہے ہیں۔ کھانا ساتھ ہی کھائیں گے یہاں۔"

www.paksociety.com

میں نے میز پر مکا مارا۔ "اچھا ہے وہ بھی آجائیں۔ ان سے بھی پوچھنا ہے مجھے کہ یہ اہتمام آخر کیا کس کا تھا۔"

اسی وقت باہر کا دروازہ کھلا اور نازو سیدھی کچن کی طرف گئی۔ اس کے پیچھے غالب تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا لگتا تھا۔

"اف، کیسی جان لیوا خوشبوئیں میرے حواس پر یلغار کر رہی ہیں۔ کتنی بڑی ٹریجڈی ہوگی اگر میں کھانے کی میز پر فوت ہو گیا۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا۔ "تمہاری قربانی کا وقت تو آ گیا ہے۔ کھانا چھوڑ جاؤ دنیا میں کسی کے لئے۔"

"سکندر جب گیا دنیا سے تو دونوں ہاتھ خالی تھے مگر پیٹ تو بھرا ہوا تھا۔ بھوکا مرتا تو سکندر اعظم کون مانتا اسے۔ اور کھانا میں کس کے لئے چھوڑ دوں؟"

"تمہارے سوئم کی فاتحہ ہو سکتی ہے اسی کھانے پر..."

نازو نے گھبرا کے کہا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو تم؟"

میں نے کہا۔ "لڑکی۔ ادھر آ کے بیٹھو۔ تم سے بھی خوفناک لڑائی لڑنی ہے مجھے۔"

غالب نے کہا۔ "بھوکے زیادہ دیر نہیں لڑ سکتے۔ کھا پی کے کچھ توانائی تو آ جائے پھر خوب لڑیں گے صبح تک۔"

"میں نے کہا۔ "بات یہ بھی ٹھیک ہے۔"

رابعہ نے ابھی پوری طرح کھانا سرو بھی نہیں کیا تھا کہ میں اور غالب اس پر ٹوٹ پڑے۔ گھر کی فضا میں ایک پر تحفظ اپنائیت آ گئی تھی۔ پہلی بار رابعہ کے اپنے گھر میں تھا اور اپنوں کے درمیان تھا۔ اس گھر کی ہر چیز سے ان لوگوں کی محبت تک سب پر میرا حق ملکیت تھا۔ زندگی کا ایک پر آشوب دن مجھ پر اپنی نحوست کا سایہ ڈالے بغیر گزر گیا تھا۔ اجل کے شکاری ہاتھ اس حفاظتی حصار سے گزر کے مجھ تک نہ پہنچ سکے تھے جو مجھ سے محبت کرنے والوں نے قائم کر رکھا تھا۔

جب رابعہ اور نازو ہمارے ساتھ آ کے بیٹھیں تو غالب نے مڑ کے پیچھے سے مجھے لات ماری۔ "یار یہ کیسا قورمہ ہے۔ لگتا ہے ویل کا تڑکا دیا گیا ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "گوشت بھی پتا نہیں کس چوپائے کا ہے۔"

غالب بولا۔ "بریانی کے چاول تو بالکل بھوسے کی طرح ہیں۔"

"ٹھنڈے پانی میں ڈال کے نکال لئے گئے ہیں۔ انہیں کھانا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے۔" میں نے کہا۔ "کس ہوٹل سے منگوایا تھا کھانا مس رابعہ!"

رابعہ نے آنکھیں نکال کے کہا۔ "ہونہہ۔ کھانا میں نے پکایا ہے۔"

میں نے بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ "آپ نے ابھی پہلے کیوں نہیں بتا دی تھی یہ بات۔"

غالب نے کہا۔ "ہاں۔ ہم سچ تو نہ بولتے۔"

میں نے کہا۔ "اگر آپ نے اچار کی ہیں یہ چیزیں تو بخش دو... اللہ۔ اور ماشاء اللہ۔ ذرا نام تو بتاؤ ان کھانوں کا۔"

"جو ہم قورمہ بریانی سمجھ کے کھانے پر مجبور ہیں۔" غالب نے میز پر مکا مار کے گہری سانس لی۔ "خنجر کیا حلق سے اترا..."

نازو نے اسے گھورا۔ "موقع ملا اور دونوں نے ایک تماشا شروع کر دیا۔"

"ڈراما بکواس ساڑھے تین تال میں۔ اسے ... راگنی بھی کہتے ہیں اور یہ رات کے کھانے کے وقت گایا جاتا ہے۔" غالب نے کہا۔

کھانے کے بعد بھی ہم وہیں بیٹھے رہے۔ نازو نے برتن ... اور سنک میں دھونے لگی۔ رابعہ نے چائے رکھ دی۔

میں نے کہا۔ "مرزا جی۔ تم اسپتال گئے تھے؟"

"ہاں۔ میں نے آج پکا حفاظتی انتظام کر لیا تھا۔ نیا ... بنوا لیا تھا۔ سرکاری ایکریڈیشن کارڈ تو پہلے بھی تھا میرے پاس ... سے بڑی سند ہوتی ہے وزارت اطلاعات و نشریات کی طرف سے صحافی ہونے کی۔" غالب نے کہا۔ "ورنہ پولیس تو کسی کو ... نہیں پھٹکنے دے رہی تھی۔"

"کچھ معلوم ہوا... یہ سب ڈرامہ کیا تھا۔ نقوی صاحب ... قتل کا۔"

"ڈرامہ کیسا۔" نازو پلٹ کے بولی۔ "تم سمجھتے ہو انہیں ... نہیں کیا گیا؟"

میں نے کہا "ہاں میرا خیال ہے کہ انہیں اسپتال میں ... نہیں کیا گیا۔ ان کی موت کا سبب وہی زہر ہوگا جو کسی نے ... گھر پر دیا تھا۔"

غالب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "نہیں یار۔ اس زہر سے ان کی موت واقع نہ ہوئی۔ ڈاکٹروں نے ان کا معدہ واش ... غالباً وہ ہوش میں بھی آ گئے تھے۔ رات کسی وقت انہوں نے کسی ڈاکٹر کو بلایا اور کہا کہ میں اپنا بیان ریکارڈ کرانا چاہتا ہوں۔ اس قسم کے بیان جو دفعہ ۱۶۴ کے تحت رضاکارانہ طور پر مجسٹریٹ کی موجودگی میں دیے جائیں تو ان کی قانونی حیثیت ہوتی ہے مگر رات کے وقت مجسٹریٹ کہاں سے آتا۔ ڈاکٹر نے ... کہ آپ صبح تک انتظار کر لیں لیکن نقوی صاحب کو شاید ... تھا کہ انہیں مہلت نہیں دی جائے گی۔ بعد میں انہوں نے نرس سے کہا کہ مجھے کہیں سے کوئی ٹیپ ریکارڈر لا دو ... کیسٹ بھی ہو۔ نرس پہلے تو تیار نہ تھی پھر نقوی صاحب نے ... اپنے تکیے کے نیچے رکھے ہوئے پرس میں سے ایک ہزار روپے ... تمہارا انعام ہے۔ وہ گئی وہاں ایک مریض کے ساتھ تیمار دار ... طور پر رہنے والی کسی خاتون کے پاس چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر ... خاتون ٹہلنے کے لئے باہر گئی ہوئی تھیں۔ یا باتھ روم میں ... مریض شاید سو رہا ہو گا کہ نرس چپکے سے ٹیپ ریکارڈر اٹھا لائی۔"

"... بتائے بغیر؟" نازو نے کہا۔ "یہ تو چوری ہوئی۔"

"اور تمہیں یہ سب کس نے بتایا آخر؟" رابعہ نے سوال کیا۔

"اگر آپ لوگ خاموش بیٹھنے سے قاصر ہیں تو کہیں اور چلی جائیے" غالب نے انہیں ڈانٹا۔ "سوالات بعد میں کرنا۔ ہم صحافی جب کوئی ... تمہارے جیسے نہیں۔ اندر تک کی خبر لا سکتے ہیں ہم خواہ اندر ... جائیں۔"

میں نے کہا۔ "بیان جاری رکھئے۔"

"نقوی صاحب نے اس ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے کوئی بیان ریکارڈ کیا تھا۔ کیسٹ تو ایک گھنٹے کا ہوتا ہے لیکن انہوں نے ایک سائڈ استعمال کی تھی اور اس کے آخری دس منٹ رہ گئے تھے۔ ... منٹ تک بولتے رہے تھے وہ۔ پھر انہوں نے اسی نرس کو طلب کیا اور ٹیپ ریکارڈر اسے دے کر کہا کہ "دیکھو یہ انتہائی اہم پیغام ہے جو میں نے ریکارڈ کیا ہے۔ تم اس کیسٹ کی حفاظت کر سکتی ہو؟" نرس نے کہا "سر یہ کوئی مشکل کام نہیں۔" نقوی صاحب نے پوچھا کہ کیا کسی نے تمہیں ٹیپ ریکارڈر لاتے ہوئے دیکھا تھا۔" نرس نے تسلیم کیا کہ وہ ٹیپ ریکارڈر ایسے ہی اٹھا لائی تھی۔ "جس صاحب کا ٹیپ ریکارڈر ہے اسے بھی نہیں معلوم۔" نقوی صاحب مطمئن ہو گئے اور بولے۔ "ویری گڈ۔ مگر اسے معلوم ہو جائے گا۔" نرس نے کہا۔ "میں ابھی اسے واپس کر دوں گی۔ کہوں گی کہ میں ذرا دل بہلانے کے لئے لے گئی تھی۔ یہاں کوئی بھی نہیں تھا جس سے ... زیادہ سے زیادہ سوری کہہ دوں گی۔" نقوی صاحب نے کہا "مگر یہ کیسٹ اسے واپس نہیں کرنا ہے۔" نرس نے کہا۔ "یہ تو مسئلہ بن جائے گا سر۔" نقوی صاحب نے کہا۔ "اس سے شک بھی پیدا ہو گا کہ آخر تم نے کیسٹ کیوں نکالا۔ تم ایسا کرو کہ ٹیپ ریکارڈر غائب کر دو۔ اپنے ساتھ لے جاؤ اور کہیں چھپا دو۔ تمہاری ڈیوٹی کب ختم ہو گی؟" نرس نے کہا۔ "صبح آٹھ بجے سر۔" نقوی صاحب نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ صبح اسے بھی اپنے بیگ میں ڈال کے لے جانا۔" نرس پریشان ہو گئی۔ "سر ایسے تو چوری کا الزام بن جائے گا۔ کسی نے پکڑ لیا مجھے تو میری نوکری چلی جائے گی۔" نقوی صاحب نے کہا۔ "دیکھو لڑکی۔ اگر میں زندہ رہا تو ... فہرست کرو۔ جیسی نوکری تم کو چاہو گی مل جائے گی۔ جہاں تم ... یہ میرا وعدہ ہے۔ ابھی تم ہی یہ کام کر سکتی ہو۔ چاہو تو ٹیپ ریکارڈر کہیں پھینک دو لیکن کیسٹ ضرور نکال لو اور اپنے ساتھ لے جاؤ۔" پھر انہوں نے نرس کو اپنا کارڈ دیا۔ اس کے پیچھے لکھا کہ "یہ ... کیسٹ پہنچا دے تو اسے منہ مانگا انعام دیا جائے۔ احسان کی ... میں ہوں اور مجھ پر اس کے احسان کا قرض ہے۔" ... پیغام کے نیچے اپنی بیٹی کا فون نمبر لکھا تھا۔ نرس نے ... کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ انہیں زہر دیا گیا تھا۔ یہ بھی ... سمجھ گئی کہ کیسٹ میں کوئی ایسی بات ہے جس

کی قانونی اہمیت ہے۔ اسے علم تھا کہ نقوی صاحب کوئی توپ چیز ہیں۔ وی آئی پی وارڈ میں ایرے غیرے نہیں آتے۔ اس نے کہا۔ "سر میری ایک بہن ہے۔ اس نے بھی نرسنگ کا کورس کیا ہے۔ اسے میری جگہ لگوا دیں اور مجھے باہر بھجوا دیں۔ بہت ڈاکٹر اور نرسیں سعودی عرب جا رہے ہیں۔" نقوی صاحب نے کہا۔ "میرا وعدہ ہے تم سے۔ اگر میں آفس گیا تو پہلا کام یہی کروں گا۔" نرس نے کہا کہ "سر آپ تو اب ٹھیک ہیں۔ ایک دو دن میں آپ کو ریلیز کر دیا جائے گا۔" نقوی صاحب نے ایک آہ بھری اور کہا کہ "میرے لئے دعا کرنا۔ جاؤ اب وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔ چوری کا الزام تم پر کیسے آ سکتا ہے جب تم کو کسی نے دیکھا ہی نہیں تھا اور موقع ملے تو بعد میں نظر بچا کے ٹیپ ریکارڈر واپس رکھ آنا جہاں سے اٹھا کے لائی تھیں۔ تم ہوشیار لڑکی ہو۔" وہ نرس ٹیپ ریکارڈر لے کر چلی گئی۔ اس نے کیسٹ نکال کے اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال لیا اور ٹیپ ریکارڈر کو چھپا دیا۔ نرس کوئی پیشہ ور چور نہیں تھی۔ نوجوان لڑکی تھی۔ چاہتی تو ٹیپ ریکارڈر کو کھڑکی سے باہر سڑک پر پھینک دیتی۔ اس نے بے وقوفی کی اور اسے دواؤں کی الماری میں رکھ دیا۔ رات کے وقت تو کچھ نہیں ہوا۔ صبح ہوتے ہی وہ عورت ڈیوٹی آفیسر کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے شکایت درج کی کہ کمرے میں سے میرا ٹیپ ریکارڈر چوری ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے میڈیکل آفیسر نے پہلے اسٹاف کا دفاع کیا کہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ آپ پہلے اپنے کمرے میں ہی دیکھ لیں۔ عورت ذرا بددماغ تھی۔ شور کرنے لگی کہ آپ کا کیا خیال ہے میں اپنے کمرے میں دیکھے بغیر آپ سے شکایت کرنے آ گئی ہوں۔ پہلے کی بات میں نہیں جانتی کہ کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا۔ آج میرا ٹیپ ریکارڈر چوری ہوا ہے تو میں یہ بات میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کو بھی ضرور بتاؤں گی خواہ ٹیپ ریکارڈر مجھے مل جائے مگر اسپتال میں جو چور ہے وہ پکڑا جانا چاہئے۔ یہ سب اس نرس نے بھی سنا لیکن وہ انجان بنی رہی۔ رات کے وقت ڈیوٹی پر وہ اکیلی نہیں تھی کہ اس پر الزام آتا۔ اس نے ڈیوٹی افسر کا ساتھ دیا اور عورت کو یقین دلایا کہ ہم معلوم کریں گے ٹیپ ریکارڈر آپ کو مل جائے گا۔ وہ نہ ملا تو دوسرا دے دیا جائے گا مگر وہ عورت ٹیپ ریکارڈر کے نقصان پر نہیں اسپتال میں چوری پر برہم تھی۔ آٹھ بجے وہ جانے لگی تو اس نے خود ہی میڈیکل آفیسر آن ڈیوٹی سے کہا کہ "دیکھیں جی۔ بعد میں بلاوجہ میرا نام نہ آئے اس معاملے میں۔ آپ میری تلاشی لے لیں۔" ڈیوٹی افسر نے کہا۔ "ارے وہ پاگل عورت ہے۔ مل جائے گا اسے کمرے میں ہی ٹیپ ریکارڈر۔" مگر نرس نے جاتے جاتے اپنا بیگ کھول کر دکھا دیا اور یہیں اس سے ایک معمولی سی غلطی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اس میں کیسٹ دیکھ لیا۔ اس پر لتا کی تصویر تھی اور وہ فلم "پریچے" کے گانے تھے۔ ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا۔ "یہ کیسٹ کیوں لئے پھر رہی ہو اپنے ساتھ۔" آسان جواب یہ تھا کہ میں نے آتے ہوئے بازار سے خریدا تھا۔ اس نے

www.paksociety.com

کہا کہ کسی نے میری بہن کے لئے دیا تھا کل مگر میں اسے دینا بھول گئی تھی۔ خیر یہ بات بھی چل جاتی لیکن بعد میں ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ کچھ نروس ہو گئی تھی۔"

"بعد میں تفتیش ہوئی تھی؟"

"ہاں۔ یہ بڑے لوگ بعض اوقات عجیب ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ عورت بھی کسی ڈی ایس پی کی بیوی تھی اور اسپتال میں اس کا بھائی داخل تھا۔ یہ لوگ خود تو ہوتے ہیں بڑے چور۔ سرکاری خزانے پر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ انکم ٹیکس نہ دے کر پبلک کو لوٹتے ہیں مگر ان کا تنکا بھی چوری ہو جائے تو یہ ہر ذرا سی والے کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہی چور ہے۔ الٹا کا مسئلہ بن جاتا ہے کہ چور کی یہ مجال کہ کوتوال کی چیز چرا لے۔ اس عورت نے آٹھ بجے کے بعد میڈیکل سپرنٹنڈنٹ اور ایک سینئر ڈاکٹر سے راؤنڈ کے وقت شکایت کر دی۔ پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ معلوم ہوا کہ رات کے وقت وہاں چار نرسوں کے ساتھ ایک ڈاکٹر تھا۔ اس طور پر۔ وارڈ وائف اور ماسی قسم کی چیزیں تھیں۔ وہ سب جا چکے تھے۔ چوکیدار کیا جا سکتا تھا کہ کون اپنے ساتھ جاتے وقت کیا چیز لے گیا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر بڑا ہوتا تو کسی کے ہاتھوں میں نظر آتا۔ چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر کسی کے ہینڈ بیگ میں تھا تو اسے کیا معلوم۔ وہ کسی باہر جانے والے کی تلاشی لینے کا مجاز نہیں تھا۔ نیچے یا اوپر کے طور سے بھی کسی کے آنے جانے پر پابندی نہیں تھی اور وی آئی پی وارڈ میں ملاقاتی کسی وقت بھی آ سکتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ عام لوگوں کی طرح وہ مقررہ اوقات میں وقت کے پابند نہیں۔ جب کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی مگر یہاں تو دستور ہی ایسا ہے کہ وی آئی پی کو قاعدے قوانین سے بالاتر سمجھ لیا جاتا ہے پھر آئی سی یو کے باہر برآمدے یا ٹیرس جیسی جگہ میں کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ وہاں ہر مریض کے ساتھ آنے والا ایک آدمی ٹھہر سکتا ہے۔"

"پھر نقوی صاحب کی بیٹی وہاں کیوں نہیں رکی تھی؟"

"اچھا سوال کیا تم نے برخوردار۔" غالب نے کہا۔ "وہ رکنا چاہتی تھی لیکن اسے وقار یوسف زبردستی گھر لے آیا تھا۔ وہ وہاں بہ آواز بلند رونے سے باز نہیں آئی تھی۔ آنے جانے والے ڈاکٹروں کو پریشان کر رہی تھی۔ وقار یوسف نے گھر آنے کے بعد اسے ڈبل ڈوز دے کر سلا دیا تھا۔ خیر۔ اصل بات تھی ٹیپ ریکارڈر کی۔ چوری یوں پکڑی گئی کہ صبح کی شفٹ میں آنے والی نرس نے کوئی دوا تلاش کی اور وہ اسے ملی نہیں تو اس نے کیبنٹ کو اچھی طرح کھنگالا۔ پیچھے سے وہ ٹیپ ریکارڈر برآمد ہو گیا۔ اس نے وہ ڈیوٹی افسر کو پیش کر دیا اور اس نے بات ختم کرنے کے لئے خاتون کو دیا مگر خاتون تھی ڈی ایس پی کی بیوی۔ کڑوا کریلا نیم چڑھا۔ اس نے کہا کہ اس میں جو کیسٹ تھا۔ وہ کہاں ہے۔ ایک اور مسئلہ۔ ڈاکٹر سمجھدار تھا۔ اس نے سوچا کہ اسٹاف کی بدنامی ہوتی ہے بات کو لمبا کرنے سے۔ اس نے پوچھا کہ کون سا کیسٹ تھا۔ خاتون نے فرمایا کہ قلم بیچنے کا۔ ڈاکٹر نے یقین دلایا کہ وہ بھی مل جائے گا۔ اس نے کسی لڑکے کو پیسے دیئے۔ بازار سے قلم بیچنے کا کیسٹ آ... وہ ایسا کیا کہ دوپہر کے وقت لوٹا اور درمیان میں آ گیا ... بحران۔ اچانک نقوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ چند منٹ پہلے راؤنڈ ہوا تھا تو وہ بالکل ٹھیک تھے اور انہوں نے اصرار کیا تھا کہ انہیں ڈسچارج کر دیا جائے۔ ان کے فزیشن نے انکار کر دیا تھا کہ کچھ بلڈ ٹیسٹ ہوں گے اور رپورٹ دیکھنے کے بعد فیصلہ کیا جائے گا لیکن اس میں مزید دو دن بہرحال لگیں گے۔ اب اس کے بعد کیا ہوا وہ واضح نہیں ہے بلکہ خاصا کنفیوژن ہے۔ ڈیتھ رپورٹ۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ۔ پولیس رپورٹ اور چشم دید شاہدوں کی رپورٹ میں بہت زیادہ فرق ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اگر ہم اس موضوع پر آپ کی رپورٹ بھی سن لیں مگر اطمینان سے بیٹھ کے۔"

"میں بھی تھک گیا ہوں بہت۔ آج سارا دن بھاگ دوڑ اور مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کرنے میں لگا رہا۔"

"نیچے چلتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے احتجاج کیا۔ "تم کیوں مجھے اس جیل خانے میں ٹھونسنے پر مصر ہو۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ ہم تمہارے ساتھ ہوں گے۔ محفوظ جگہ ہے۔" رابعہ نے کہا۔

غالب نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ "رابعہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ حالات کا کچھ بھروسا نہیں۔ آج رات بھی یہاں چھاپا پڑ سکتا ہے۔ مظہر کی خانہ تلاشی تو ہو چکی؟"

"اچھا کس وقت؟" رابعہ نے کہا۔

"ابھی دو گھنٹے پہلے۔ مظہر نے خود اخبار والوں کو اطلاع دی۔ ایک مجسٹریٹ اور ڈی ایس پی کے علاوہ لیڈی سرچ ساتھ تھی۔ وارنٹ تھے۔ مظہر نے پوری طرح تعاون کیا۔ اس شرط پر کہ ہر چیز جہاں سے اٹھائی جائے گی وہیں رکھی جائے گی۔ ٹوٹ پھوٹ نہیں ہونی چاہئے اور غائب ایک پیسہ نہیں ہونا چاہئے۔ ڈی ایس پی اور مجسٹریٹ خود بڑے گھاگ تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں بندہ تلاش ہے۔ سوئی نہیں کہ ہم میزوں کی درازیں اور الماریوں کے خانے دیکھیں۔"

"انہوں نے میرے بارے میں پوچھا ہوگا؟"

"ہاں۔ مظہر نے کہہ دیا کہ یہ میرا گھر ہے۔ ایک بیوی اور دو بچے۔ سولہواں ہوگا تو دکھا دوں گا۔ ان کے علاوہ یہاں کوئی نہیں رہتا۔ ظاہر ہے اس کے بعد پولیس یہاں آ سکتی ہے۔"

ہم سب باری باری الماری سے گزر کے نیچے چلے گئے۔ رابعہ نے کوٹھی کی ساری لائٹس آف کر دی تھیں۔ بیڈ روم لاک کر دیئے تھے اور چوکیدار کو سمجھا دیا تھا کہ کوئی بھی آئے۔ تم یہی کہنا کوٹھی میں کوئی نہیں ہے۔ بیگم صاحبہ نکل آئی تھیں۔ اس کے بعد

معلوم نہیں کہاں گئی ہیں۔ میں نوکر ہوں۔ وہ مجھے بتا کے نہیں جاتیں۔"

دوسری بار سب کے ساتھ مجھے وہ جگہ واقعی بہت محفوظ اور آرام دہ لگی۔ یہاں ایک فون بھی تھا جو گیٹ کے انٹرکام سے بھی منسلک تھا اور گھر کے دوسرے حصوں سے بھی۔

"داماد اور بیٹی جب ڈاکٹر شبلی کے ساتھ اسپتال پہنچے تو پہلے نقوی صاحب سے ملے۔ وہ ٹھیک تھے اور انہوں نے وقار یوسف سے ڈاکٹروں کے رویے کی شکایت کی جو انہیں زبردستی وہاں لٹائے رکھنے پر بضد تھے۔ اس وقت وہاں ایک ڈاکٹر تھا جس نے ڈرپ بھی اور اس کے قطرہ قطرہ ٹپکنے کی رفتار کو چیک کر لیا۔ اس کے جاتے ہی نقوی صاحب نے داماد کو ہاتھ پکڑ کے اپنے پاس بٹھا لیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "وقار مجھے لے چلو اپنے ساتھ۔ ابھی۔ اسی وقت۔" ظاہر ہے وقار نے مخالفت کی۔ "پاپا۔ جلدی نہ کریں۔ ڈاکٹرز ٹھیک کہتے ہیں۔" نقوی صاحب نے گھبرا کے کہا۔ "تم احمق ہو۔ سمجھتے کیوں نہیں۔ میں ایک منٹ نہیں ٹھہرنا چاہتا یہاں۔" وقار ان کی ذہنی کیفیت کو سمجھتا تھا۔ اسپتال میں کون رہنا پسند کرتا ہے اور نقوی صاحب تو چوبیس گھنٹے کا سرکاری افسر۔ جس نے کبھی بیماری میں بھی چھٹی نہ لی ہو۔ بستر پر بے کار لیٹے رہنا ان کے لئے ذہنی اذیت تھا۔ وقار یوسف نے سمجھایا کہ "میں ڈاکٹروں کو مجبور نہیں کر سکتا۔" پھر نقوی صاحب منت سماجت پر اتر آئے۔ وہ بے حد پریشان اور نروس لگ رہے تھے۔ "وقار۔ جو بات میں محسوس کر رہا ہوں۔ وہ تم نہیں سمجھتے۔ مجھے ایک سازش کے تحت یہاں لایا گیا ہے اور تم کیا سمجھتے ہو یہ مجھے جانے دیں گے۔ نہیں۔ یا تو میں خود بھاگ جاؤں خود اپنی مرضی سے یا تم مجھے لے جاؤ۔ ورنہ میں بتا رہا ہوں کہ میں لوٹ کے زندہ گھر نہیں جاؤں گا۔" وقار یوسف ان کی بات سن کے فکرمند ہو گیا۔ وہ ان کو ذہنی عدم توازن کا شکار نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے بقائمی ہوش و حواس کہہ رہے تھے اور کسی حد تک وقار یوسف کو بھی اندازہ تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس نے کہا۔ "اوکے پاپا۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ ابھی آپ کو لے جاؤں لیکن پلیز آپ اپنی بیٹی کو کچھ مت بتایئے وہ مجھے کچھ نہیں کرنے دے گی۔" نقوی صاحب نے اسے کچھ اور بھی بتانا چاہا تھا کہ شبلی اندر آ گئی۔ وقار یوسف کے کہنے کے مطابق سوا دس بجے اس کے ساتھ کوئی ڈاکٹر بھی تھا مگر وہ نہیں جس کو وقار نے ڈرپ کی رفتار کم کرتے دیکھا تھا۔

"ایک منٹ کیا اس ڈاکٹر نے صرف فلو کو ایڈجسٹ کیا تھا یا ڈرپ میں کوئی دوا بھی ڈالی تھی سرنج کی سوئی سے پلاسٹک کی تھیلی میں کوئی بھی انجکشن براہ راست محلول میں شامل کر دیا جاتا ہے۔"

"وقار سے یہ سوال پولیس نے بھی کیا تھا اور میں نے بھی۔ اس نے پورے یقین کے ساتھ کہا کہ میری موجودگی میں اس نے کچھ نہیں کیا تھا مگر وہ پہلے سے موجود تھا۔ اس کی ڈیوٹی تھی۔ وقتے وقتے سے وہ تمام پرائیویٹ وارڈز میں جاتا تھا۔ وی آئی پی وارڈ میں ہر مریض کو بہرحال زیادہ توجہ دینی پڑتی ہے۔ شبلی کے ساتھ آنے والا وہ فزیشن تھا جو نقوی صاحب کا معالج تھا۔ ان کی حالت کے مطابق کوئی دوا وہی کھلا سکتا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر اس میں کسی ردوبدل کا مجاز نہیں ہوتا۔ وہ صرف ایمرجنسی میں مریض کو سنبھالتا ہے ورنہ دوا دینا نرسوں کی ذمے داری ہے۔"

"فزیشن نے شبلی کو کیسے اجازت دے دی تھی؟"

"اس نے وہی کہا تھا جو اسے سمجھایا گیا تھا۔ شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کیوں کہ نقوی صاحب کی بیٹی اس کے ساتھ تھی۔ وقار کی موجودگی میں ڈاکٹر شبلی نے وہ چارٹ دیکھے جو بیڈ سائیڈ پر لگے ہوئے تھے۔ فزیشن سے ان کی حالت کے بارے میں بات بھی کی جو کوئی ڈاکٹر ہی کر سکتا تھا۔ ایک دوا سے اختلاف کیا کہ اس کے سائیڈ ایفیکٹ نسبتاً ضرر رساں ہیں اور دوسری متبادل دوا تجویز کی۔ فزیشن نے اعتراف کیا کہ اس کی بات ٹھیک ہے لیکن یہ دوا ابھی پاکستان میں دستیاب نہیں جو لندن میں استعمال ہو رہی ہے۔ اس کے بعد فزیشن چلا گیا۔ یہ بات ساڑھے دس بجے کی ہے۔ شبلی نے بعد میں کہا کہ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ جو دوا ایک سال سے استعمال ہو رہی ہے اور جو ملٹی نیشنل دوا ساز کمپنی پاکستان میں ہر دوا بنا رہی ہے ابھی تک اس نے یہاں وہ دوا نہیں بنائی۔ اگر متبادل طور پر نفع ہو تو بڑے بڑے کیمسٹ تو خود باہر سے ہر دوا امپورٹ کرتے ہیں یا اسمگل کر لیتے ہیں۔

"اس کی بات سے وقار یوسف نے بھی اتفاق کیا۔ اس نے کہا کہ میں فون کرتا ہوں۔ اپنے ایک کلائنٹ کو۔ وہ ہول سیل کیمسٹ ہے کہیں نہ کہیں سے منگوا دے گا۔ نقوی صاحب نے اسے روکنے کی کوشش کی کہ یہ سب مت کرو۔ وہی کرو جو میں نے کہا ہے لیکن وقار یوسف نکل گیا۔ نقوی صاحب کی بیٹی باہر ٹیرس میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ وقار نے اسے بتایا کہ شبلی تو بڑی قابل ڈاکٹر ہے۔ اس نے ایک نئی دوا بتائی ہے اور میں پتا کرتا ہوں کہیں سے مل جائے۔ اس نے بیوی کو نقوی صاحب کی ضد سے بھی آگاہ کیا کہ وہ ڈاکٹروں کی مرضی کے خلاف اسپتال سے بھاگنا چاہتے ہیں مگر اس نے سازش یا خطرے کی بات گول کر دی کہ بیوی خواہ مخواہ پریشان ہوگی۔ یہ سب بتانے میں کتنا وقت لگا؟ وقار نے بہت غور کر کے بتایا تھا کہ شاید پانچ سے سات منٹ۔ اس نے یقین کے ساتھ کہا کہ دس منٹ نہیں ہو سکتے۔ اس عرصے میں نقوی صاحب کے پاس صرف شبلی تھی لیکن شبلی کا کہنا تھا کہ ایک نرس آ گئی تھی جس نے بلڈ پریشر اور ٹمپریچر وغیرہ لیا تھا اگر اس نے ڈرپ میں کچھ ڈالا تھا تو شبلی کی پیٹھ تھی اس نے نہیں دیکھا۔ شبلی باہر آئی تو نقوی صاحب کی بیٹی اندر گئی۔ ایک وقت میں ایک ہی وزیٹر اندر جا سکتا تھا۔ دس بج کر چالیس منٹ سمجھ لو۔ ایک منٹ آگے پیچھے ہو سکتا ہے۔ اس

نے جا کے دیکھا تو نقوی صاحب پر نزع کا عالم تھا۔ اس نے چیخ مار کر اور ڈاکٹروں کو بلایا۔ ڈاکٹر فوراً پہنچ گیا تھا مگر اس کے کچھ کرنے سے پہلے ہی نقوی صاحب فوت ہو گئے۔ اس وقت شیلی باہر تھی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس نے کچھ کیا ہوتا تو کیا اس کے لئے یہ مہلت کافی نہیں تھی۔ وہ فرار ہو سکتی تھی مگر وہ وہیں بیٹھی رہی پھر جانے کس نے چلا کے کہا۔ "پکڑ لو اسے۔ یہ جعلی ڈاکٹر ہے۔" شیلی نے بتایا تھا کہ چلانے والا کمرے سے برآمد ہوا تھا۔ اس وقت نقوی صاحب کے گرد دو ڈاکٹر اور تین نرسوں کے علاوہ کتنے لوگ تھے۔ یہ کسی نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اچانک آئی سی یو کے گیٹ پر مامور سنتری نے شیلی کو پکڑ لیا۔ شیلی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس شخص نے کہا۔ "اس نے قتل کر دیا ہے مریض کو۔ پولیس کو بلاؤ۔" شیلی نے چلا کے کہا "تم کون ہو۔ جھوٹ کہتے ہو تم۔" مگر وہ شخص تیزی سے کاریڈور میں غائب ہو گیا اور شیلی کو زبردستی اسٹور میں بند کر دیا گیا۔ وقار یوسف ٹیلی فون کرنے نیچے گیا تھا۔ اس کے واپس آنے تک ہڑبونگ مچ گئی تھی۔ اس نے پہلے تو بیوی کو سنبھالا جو پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی "اس نے میرے باپ کو مار دیا۔ وہ قاتل ہے۔ میں اسے جان سے مار دوں گی۔" بڑی مشکل سے وقار یوسف کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ ڈاکٹر شیلی کا نام لے رہی ہے۔ پتا نہیں وقار یوسف کی بیوی سے یہ کس نے کہا تھا۔ شاید جو شخص کمرے سے نکلا تھا اور ڈاکٹر نظر آتا تھا اسی نے اندر بھی یہ شوشہ چھوڑا تھا۔"

میں نے بہت سکون محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یقین ہے کہ شیلی پر بے بنیاد الزام لگایا گیا تھا۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔"

رابعہ اور نازو نے ایک ساتھ مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ان نظروں میں ایک ہی سوال تھا۔ کیا ابھی تک تمہارے سر سے شیلی کا بھوت نہیں اترا۔

غالب نے ایک آہ بھری۔ "حالات اور واقعات کی شہادت سے وہ بے گناہ ثابت ہوتی ہے دوست اور میں مخالفت کے جذبات میں اس پر کوئی الزام کیسے عائد کر دوں۔ میں نے تو حقائق اکٹھے کئے ہیں آج سارا دن۔ کچھ یہاں سے کچھ وہاں سے۔ میرے صحافی دوست بھی ہیں۔ ان سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ ان کے اندر تک پرانے سورس (SOURCE) ہیں۔ سب کرائم رپورٹر تھے۔ میں نے انہیں نازو سے بھی متعارف کرا دیا۔"

"بہت متاثر ہوئے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"نہیں برادر۔ سب فریفتہ ہو گئے۔" غالب نے فریادی لہجے میں کہا۔ "سالوں نے مجھے لفٹ دینا ہی چھوڑ دی اور نازو نے خاصی انفارمیشن لے لی۔ پھر میں نے اسے وقار یوسف کی بیوی کے ساتھ گھر بھیج دیا۔ اس کی حالت غیر تھی۔ ڈاکٹرز نے اسے پکڑ کر انجکشن لگا دیا تھا تاکہ وہ گھر پہنچ کر سو جائے۔"

"وہ راستے میں ہی سو گئی تھی۔" نازو نے دکھی دل کے ساتھ کہا۔

"اسپتال میں وقار یوسف کا رہنا ضروری تھا۔ اسے قانونی کارروائی کی تکمیل کرانی تھی۔ میں اس کے ساتھ رہا۔" غالب نے اپنی بات جاری رکھی۔ "دس منٹ میں پولیس آ گئی اور کیا سوچ کے ڈاکٹر شیلی کو پولیس نے باقاعدہ رپورٹ لکھ کے گرفتار کر لیا۔ ساڑھے گیارہ بجے پوسٹ مارٹم کے لئے وقار لاش کے ساتھ ایمبولینس میں سرکاری اسپتال گیا۔ میں وہیں رک گیا۔ گیٹ تک میں بھی وقار کے ساتھ تھا اور ایمبولینس میرے سامنے روانہ ہوئی تھی۔ وقار بڑے حوصلے سے کام لے رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ میں ابھی کچھ دیر میں پہنچتا ہوں۔ جب میں لوٹ رہا تھا تو ایک دم شور مچا اور میں نے کچھ لوگوں کو جمع ہوتے دیکھا۔ میری نظروں نے اوپر سے کسی کو گرتے دیکھا تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ڈاکٹر شیلی ہو گی۔ بس اپنا تجسس رفع کرنے کے لئے میں نے وہاں جا کے دیکھا تو شیلی کی لاش پکے فرش پر پڑی تھی۔ دیوار کے ساتھ جو تین فٹ چوڑا راستہ تھا وہ سیدھی اس پر گری تھی اور سر کے بل۔ نتیجہ یہ کہ اس کا سر پاش پاش ہو گیا تھا۔ مغز اور خون ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور اس کی گردن بھی یوں مڑی ہوئی تھی کہ ایک نظر میں ہی میں نے سمجھ لیا کہ ٹوٹ چکی ہے۔ میں تیزی سے اوپر گیا۔ پولیس والے بھاگم بھاگ پیچھے آ رہے تھے۔ میرے سوال کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ اوپر ایک سب انسپکٹر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ملزمہ نے خودکشی کر لی ہے۔

میں نے کہا "کیسے خودکشی کر لی؟" تو وہ گرم ہو گیا کہ تم میرے افسر لگتے ہو کیا جو تمہیں بتاؤں۔ میں بھی گرم ہو گیا۔ میں نے کہا کہ میں تمہارے افسر کو رکھتا ہوں جوتی کی نوک پہ۔ اور سوئی قلم کی نوک پہ۔ میں چشم دید گواہ ہوں پولیس کی تحویل میں ایک ڈاکٹر کی نام نہاد خودکشی کا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ ایسے تمہارا جرم چھپ جائے گا۔ میں ابھی رپورٹ بھیجتا ہوں اس قتل کی۔ بس اس کی تو شاید پتلون ہی خراب ہو گئی۔ کہنے لگا۔ "سر! آپ تو خواہ مخواہ الزام لگا رہے ہیں۔ ہم تو بس تفتیش کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "تفتیش میں اس کی گردن ٹوٹ گئی اور تم نے اسے یہاں سے نیچے پھینک دیا سر کے بل۔" دوسری بار شاید اس کی پتلون پیچھے سے خراب ہو گئی۔ کہنے لگا۔ "سر جی۔ قسم لے لیں جو ہم نے ہاتھ بھی لگایا ہو۔ ہم نے تو بس پوچھا تھا کہ تم نے نقوی صاحب کو کیسے مارا اور کیوں مارا۔" میں نے کہا "تھانیدار جی۔ میں جانتا ہوں تم لوگ کیسے پوچھتے ہو لیکن ایک تو وہ عورت تھی۔ دوسرے لیڈی ڈاکٹر تھی۔ تیسری بات یہ کہ وہ پاکستانی شہری ہونے کے علاوہ برطانوی شہری تھی۔"

"تیسری بار اس کی پتلون کہاں سے خراب ہوئی؟" میں نے کہا۔

رابعہ اور نازو ہنس پڑیں۔ "یعنی اس نے پتلون بدل لی ہو گی۔"

غالب افسردہ ہو گیا۔ "یار تم لوگ ہنس سکتے ہو۔ تم نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ میں نے نقوی صاحب کی لاش بھی دیکھی تھی۔ پوسٹ مارٹم کے بعد لیکن شیلی کی لاش نے میرا نروس بریک ڈاؤن کر دیا تھا۔ یار ہمارے سامنے شیلی گھر سے گئی تھی۔ اس وقت کتنی پرسکون تھی۔ نازو نے مجھے بتایا کہ راستے میں وہ ہنس ہنس کے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ وہ ذرا بھی پریشان یا متفکر نہیں تھی۔ آئی سی یو میں جا کے کسی کو قتل کر دینا آسان کام تو نہیں تھا اور قتل بھی اس عورت کے والد کا جس کے گھر میں وہ رات بھر رہی۔ جس کی گاڑی میں وہ اسپتال جا رہی تھی۔"

"پھر تمہارا کیا نظریہ ہے؟ یہ سب کس نے کیا تھا؟"

"ایک ڈاکٹر یا ڈاکٹر کے بھیس میں کوئی شخص تھا جس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ وہ اپنا کام کر کے نکل گیا اور جاتے جاتے شیلی کو مجرم بنا گیا۔ وہ مجرم تھی یا نہیں۔ یہ تو بعد میں معلوم ہو جاتا لیکن پولیس فوراً آ گئی اور انہوں نے اس کا کام تمام کر کے قاتل بنا کر دیا۔ اب کہاں کی تفتیش اور کیسی تفتیش! قاتل نے خودکشی کر لی۔ پولیس سب انسپکٹر میری بات سے اتنا پریشان ہوا کہ اس نے فوراً اعلیٰ افسران کو طلب کر لیا۔ ایک ایس پی اور ڈی ایس پی کے ساتھ ہی کرائم برانچ والے آ گئے۔ ان کے سامنے سب انسپکٹر نے یہ موقف اختیار کیا کہ ملزمہ کو اسٹور میں بند کیا گیا تھا اس نے اعتراف جرم بھی کر لیا تھا کہ اس نے نقوی صاحب کو زہر دیا تھا۔"

"کون سا زہر۔ کیسے دیا تھا؟"

"پولیس کا کہنا ہے کہ وہ ڈاکٹر تھی۔ اس نے کوئی ایسی دوا ڈرپ میں ڈال دی جس سے ان کی موت واقع ہوئی۔ اتنا زود اثر صرف ایک زہر ہو سکتا ہے سائنائیڈ۔"

میں نے کہا۔ "لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کچھ اور ہے۔"

"ہاں۔ اس میں تو لکھا ہے کہ اس دوا سے الرجی ہوئی۔ ان کا سانس لینا مشکل ہو گیا اور نتیجے میں ہارٹ فیل۔ یہ غلط ہے۔ ان کی موت فوری ہوئی تھی۔ نازو، وقار یوسف اور اس کی بیوی گواہ ہیں مگر پوسٹ مارٹم رپورٹ کو کیسے چیلنج کیا جا سکتا ہے۔"

"کیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"بعد میں سب کچھ ہو سکتا ہے مگر کون کرے گا؟ کیا حاصل ہو گا اس سے؟ کون پکڑا جائے گا؟ نہ کسی پر الزام آئے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈرپ کے محلول میں اس شخص نے جو ڈاکٹر بن کے پہنچا تھا۔ سائنائیڈ بھی شامل کیا ہو گا۔ بعد میں وہ ڈرپ بدل دی گئی۔ یقیناً اندر کا کوئی آدمی اس سازش میں شریک تھا جس نے صحیح وقت اور موقع دیکھ کے قاتل کی مدد کی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں سائنائیڈ کا کوئی ذکر نہیں لیکن ڈرپ کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس میں فلاں فلاں دوا شامل تھی۔ فزیشن۔ ڈیوٹی آفیسر اور نرسنگ اسٹاف اس بیان پر قائم ہیں کہ انہیں نسخے کے مطابق دوا دی گئی۔ جس دوا کو موت کا سبب بتایا جا رہا ہے وہ ڈرپ کے محلول میں شامل تھی مگر یہ ذمے داری کوئی قبول نہیں کرتا کہ ایسا کس نے کیا تھا۔ الزام صرف شیلی پر آتا ہے جو پانچ سات منٹ اکیلی کمرے میں تھی۔ سب انسپکٹر نے مجھے بتایا کہ تفتیش کے دوران ملزمہ نے اعتراف جرم نہیں کیا تھا لیکن یہ تو سب مجرم کرتے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ اس وقت ایک نرس آئی تھی۔ وہ معمول کے مطابق ٹمپریچر وغیرہ لے رہی تھی اس لئے شیلی نے توجہ نہیں دی۔ شاید وہی کچھ کر گئی تھی مگر اسپتال کے عملے کا کہنا ہے کہ اس وقت کوئی اس کمرے میں نہیں گیا۔ ٹمپریچر اور بلڈ پریشر دو دو گھنٹے کے وقفے سے لیا جا رہا تھا۔ آٹھ بجے کے بعد دس بجے لیا گیا تھا پھر بارہ بجے لینا تھا۔ دس بج کر پینتیس یا چالیس منٹ پر ان کے چارٹ میں کوئی اندراج نہیں ہوا۔ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ دس بجے کی کیفیت موجود ہے۔ ظاہر ہے شیلی کی بات پر یقین کون کرتا۔ میں نے تین چار کرائم رپورٹرز کے گھر فون کر دیے تھے وہ سو رہے تھے مگر میری بات پر فوراً اسپتال پہنچ گئے۔ ان کے سامنے ایس پی نے کہا "ملزمہ کو یقین تھا کہ اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اس کا جرم تو پہلے ہی ثابت تھا۔ چشم دید گواہ بھی تھے۔ اسے جیسے ہی موقع ملا وہ اسٹور کے دروازے سے نکل بھاگی۔ سب انسپکٹر نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ الٹی چھلانگ لگا کر گر گئی۔" میں نے سوال کیا کہ "چشم دید شاہد کون ہیں؟" تو ایس پی نے جواب دیا کہ "ہم عدالت میں پیش کریں گے۔" میں نے کہا۔ "اب کس کے خلاف چالان پیش ہو گا عدالت میں؟" اس نے کہا کہ "نقوی صاحب کی موت کی عدالتی تحقیقات تو ہوں گی۔" اس نے مزید سوالات کا جواب دینے سے انکار کر دیا۔ شیلی کی لاش بھی اٹھوائی گئی تھی اور ساڑھے بارہ بجے پوسٹ مارٹم کے لئے پہنچا دی گئی۔ میں اور چند دوسرے کرائم رپورٹرز کو میں نے شیلی کے بارے میں آف دی ریکارڈ بہت کچھ بتا دیا تھا۔ میرے ساتھ ہی سرکاری اسپتال بھی پہنچے۔ ہم نے پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی تو نہیں مگر ہمیں معلوم ہو گیا کہ اس میں کیا لکھا گیا ہے۔ ایک بجے نقوی صاحب کی میت گھر بھیج دی گئی۔ میں وہیں موجود رہا۔ میں شیلی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھنا چاہتا تھا مگر پوسٹ مارٹم نہیں ہوا۔ پتا چلا کہ اعلیٰ حکام کی مداخلت پر خصوصی تفتیشی ٹیم بنائی گئی ہے۔ اس میں وہی ایس پی اور ڈی ایس پی تھے اور وہی سب انسپکٹر۔ انہوں نے کچھ بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ ملزمہ کے پاس سے شناختی دستاویزات ملی ہیں تو ان سے کیا ثابت ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا تم نے آف دی ریکارڈ یہ بھی بتا دیا تھا کہ شیلی اپنے چوہدری دلاور کی سوتیلی بہن تھی؟"

"ہاں مگر آف دی ریکارڈ بات کی جائے وہ اہم ہو۔ تب بھی عام نہیں کی جاتی۔ اخلاقی طور پر ہم رازداری کے پابند ہوتے ہیں۔ ہاں اپنے طور پر کوئی اس کیس پر کام کرنا چاہے اور کچھ معلوم

کرے تو اس کی مرضی لیکن مجھے معلوم ہے یہ کوئی نہیں کرے گا۔ اول تو اس سے کچھ حاصل نہیں پھر یہ کہ اپنے چوہدری صاحب یقیناً صحافی برادری کے بہت سے لوگوں کا منہ بند کر دیں گے۔ جن کا کام ہی بلیک میلنگ پر اپنی صحافت کی دکان چلانا ہوتا ہے۔ سنجیدہ قسم کے صحافی اس میں دلچسپی نہیں لیں گے۔"

"یہ تو بڑی غلط بات ہے۔"

"یہ بات کرنے سے کسی کو پریشانی کے سوا کیا ملے گا۔ پولیس کے موقف کو، ڈاکٹروں کے موقف کو اور جو بھی شاہد لائے جائیں گے ان کے موقف کو غلط ثابت کرنا آسان نہیں ہوگا۔ سب سے دشمنی لو وہ بھی بے سبب۔ اصل مجرم کبھی سامنے نہیں آئے گا۔"

"میں اور تم جانتے ہیں کہ اصل مجرم کون ہے۔"

"ہم ایک ذاتی وجہ رکھتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "میں نے اسپتال سے نقوی صاحب کے قیام کی میڈیکل فائل نکلوائی ہے۔ وہ بڑی دلچسپ اور مختلف کہانی کہتی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جب انہیں داخل کیا تو ان کی کیا کیفیت تھی۔ پھر کیا کیفیت ہوئی اور کیا علاج ہوئے۔ یہ سب ہے۔ لڑ بڑ ہے گزشتہ رات کے ریکارڈ میں۔ ایک خون کی رپورٹ کے مطابق ان کے خون میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار ساٹھ فیصد پائی گئی۔ یہ خصوصی ٹسٹ ہے جو ہر لیبارٹری میں نہیں ہوتا۔ ایسی کیفیت میں مریض کو بہت بے چینی اور غشی کی سی ہونا چاہئے جب کہ نقوی صاحب بالکل ٹھیک تھے۔ مزید یہ کہ انہیں آکسیجن نہیں دی جا رہی تھی۔"

"تمہارا مطلب ہے رپورٹ غلط ہے۔"

"ایک نرس رپورٹ ہے۔ اس کے مطابق صبح چھ بجے نقوی صاحب کی حالت غیر اطمینان بخش قرار دی گئی ہے۔ یہ لکھا ہے کہ ان کے ذہن پر اثر ہے۔ وہ بے ربط باتیں کر رہے ہیں اور ان کا رویہ جارحانہ ہے۔ یہ سب بکواس ہے پھر آٹھ بجے اس میں اندراج ہے۔ آکسیجن کی کمی سے یادداشت متاثر ہوئی ہے اور وہ بے سروپا گفتگو کر رہے ہیں۔ ان کو ILLUSIONS ہو رہے ہیں یعنی جو بات نہیں ہے وہ محسوس ہو رہی ہے۔ وہ خیال کو حقیقت سمجھ رہے ہیں اور تصور سے دھوکا کھا رہے ہیں۔ آوازیں سن رہے ہیں اور غیر موجود چیزیں دیکھ رہے ہیں یعنی HELLUCINATIONS کا شکار ہیں۔ اس حساب سے ان کی دوائیں بھی لکھی گئی ہیں۔"

"دوائیں تو ان کا فزیشن تجویز کرتا تھا۔"

"یار اسے جو بتایا جائے گا وہ اس کے مطابق دوا لکھے گا۔ وہ خود دوا نہیں دیتا اور انحصار کرتا ہے نرسوں کی رپورٹ پر۔ نقوی صاحب کا بلڈ پریشر، ٹمپریچر وغیرہ سب غلط لکھا گیا تھا۔ پہلے سے اسباب بنائے گئے تھے ان کا خوف بے جا نہیں تھا۔ ایسے وقت میں آدمی کی چھٹی حس بھی رہنمائی کرتی ہے اور خطرے کی گھنٹی بجا دیتی ہے۔ نقوی صاحب تو گرگ باراں دیدہ آدمی تھے۔ انہیں اپنا انجام سامنے نظر آ رہا ہوگا۔ اب وقار یوسف رو رہا ہے کہ ہم نے ان کی بات کیوں نہیں مان لی تھی۔ اسپتال میں ان کو اس اتوار رخصت کرنے کا پورا انتظام مکمل تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ زندہ آتے تو بچ جاتے۔ شاید کچھ مہلت انہیں اور مل جاتی لیکن ان کا وقت پورا ہو گیا تھا۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ الزام شبلی پر آیا اور پھر اسے بھی قتل کر دیا گیا۔ ہم سب جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکے۔ اب میں اسپتال کے ریکارڈ کو چیلنج کرواؤں تو پہلے تو یہ سوال اٹھے گا کہ میرے پاس یہ ریکارڈ آیا کیسے۔ ظاہر ہے میں نے تو فوٹو کاپی اسمگل کروائی تھی پھر اس ریکارڈ، پولیس کے بیانات اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ عدالت میں جاؤں گا اور لاشیں نکلوا کے دوبارہ پوسٹ مارٹم کرانے کے احکامات حاصل کرواؤں۔ دوسرا میڈیکل بورڈ ہو جو پوسٹ مارٹم کرے۔ بہت لمبا ہے یہ کام دوست لیکن میں ساری رپورٹس اپنے پاس رکھوں گا۔"

"وہ کس لئے؟" نازو نے کہا۔

"کیا اپنے چوہدری دلاور صاحب کو ہم ایسے ہی بخش دیں گے؟ ڈاکٹر شبلی نے کہا تھا کہ وہ آپس میں سوتیلے بہن بھائی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا غالب۔ تمہیں دعویٰ تھا کہ جو بھی اس نے کہا تھا سب غلط ثابت ہو جائے گا۔ نہ ڈاکٹر ہوگی نہ شملا خان۔ وہ لندن کے اسپتال میں تو رجسٹریشن نہیں ہوگی اور نہ کوئی شیخ صاحب ہوں گے۔ میں نے معلوم کر لیا ہے۔ سب سچ تھا۔"

غالب کی صورت تصویرِ حیرت بن گئی۔ "وہ سچ تھا!"

"سو فیصد۔" میں نے کہا۔ "اپنے بارے میں جو کچھ بھی اس نے بتایا تھا اس میں کوئی بات بھی غلط نہیں تھی۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہو گیا اچانک؟"

"اچانک کیا۔ میں نے لندن فون کیا۔ اسپتال والوں سے بات کی۔ ان سے شیخ صاحب کا فون نمبر لیا پھر ان سے بات کی۔"

رابعہ، نازو اور غالب مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں نے انہیں زمین پر مریخ کی مخلوق کی آمد کے صحیح وقت اور دن سے مطلع کیا ہے۔

"اس میں تھوڑا سا جھوٹ بھی تھا۔" میں نے کہا۔

"آٹے میں نمک کے برابر یا نمک میں آٹے کے برابر؟"

"اس کا تعلق دوسروں سے تھا۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ پہلے اس کی ایک شادی طلاق پر ختم ہوئی تھی۔ اس کا سابق شوہر ایک پاکستانی ماجد علی تھا جو اسی اسپتال میں ہے۔ شیخ صاحب کے گھر کا نمبر اسی نے بتایا۔ شیخ صاحب کے بارے میں اس نے جھوٹ بولا تھا کہ ان کی بیوی کو کسی نے قتل کر دیا ہے اور وہ اسپتال میں بے ہوش پڑے ہیں۔ وہ مجھے گھر پر ملے۔"

"تم اسے تھوڑا سا جھوٹ کہتے ہو!"

"غالب تم کچھ بھی سمجھو۔ مجھے شیخ صاحب سے معلوم ہوا ہے

کہ اسے پاکستان بلانے والا خود چوہدری دلاور تھا۔ اس نے ڈاکٹر شبلی سے کہا تھا کہ وہ یہاں آ کے وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کا سارا انتظام سنبھال لے۔"

"یہ کہا تھا۔ دلاور نے؟"

"ہاں۔ اور شیخ صاحب نے شبلی کو منع کیا تھا۔ ان کی رائے چوہدری دلاور کے بارے میں بہت خراب تھی۔" میں نے کہا۔

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد غالب بولا۔ "تم نے اپنے متعلق کیا کہا تھا۔ اپنا نام بتایا تھا؟"

"نام غلط بتایا تھا۔" میں نے کہا۔

غالب سوچ میں پڑ گیا۔ "یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کال کس نمبر سے کی گئی تھی۔ دن تاریخ وقت سب کا پتا چل سکتا ہے۔ تم نے ہوٹل کی آپریٹر سے ہی کہا ہوگا۔ اسے نمبر دیا ہوگا اور بل میں تمہارے نام کے ساتھ کال چارجز ہوں گے۔ روم نمبر ہوگا۔"

"ہوا کرے۔ وہ کون سا سچ تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کے لئے خواہ مخواہ کی پریشانی کون مول لے گا۔ نہ ماجد علی کو شک ہو سکتا تھا نہ شیخ صاحب کو لیکن ہمیں مفید معلومات حاصل ہوئی ہیں جو بعد میں بھی کام آ سکتی ہیں اور فوراً بھی۔"

"فوراً کیسے؟"

"ابھی اپنے چوہدری دلاور سے اظہار تعزیت کیا جائے کہ بڑا افسوس ہوا یہ جان کر کہ آپ کی سوتیلی ہمشیرہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ سوتیلی بھی اپنی ہی ہوتی ہے خون کے رشتے سے۔ سنا ہے خودکشی کر لی تھی انہوں نے۔ وہ بہت پریشان ہوگا کہ یہ کون ہے اور اس نے یہ کہاں سے سن لیا۔"

غالب ہنسا۔ "اچھا آئیڈیا ہے۔"

رابعہ بولی۔ "وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ سوائے ہمارے یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے۔"

غالب نے کہا۔ "کیا میں فون کر کے اس سے پوچھوں کہ تدفین کب ہوگی؟"

"پوچھ لینا مگر یہاں سے فون کرنے کی ضرورت نہیں۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا۔ "میں سارا دن سوچتا رہا کہ شبلی نے ایسا کیوں کیا۔ محض چوہدری دلاور کی آلۂ کار کیوں بنی تھی؟ اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ بلیک میل ہوئی۔ چوہدری دلاور نے اسے لالچ دے کر بلایا۔ بہترین معاوضہ، 'کار'، رہنے کے لئے بنگلہ اور ایک پورے اسپتال کے مکمل انتظامی اختیارات۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ پاکستان جائے۔ باپ نے ہمیشہ یہی چاہا تھا۔ چوہدری دلاور کو شاید یہ بھی معلوم ہوگا۔ اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے بلا لیا اور شبلی اپنی خواہش کے دام میں گرفتار ہو گئی۔ اس نے تو سمجھا ہوگا کہ یہ تائید ایزدی ہے ورنہ اتنا اچھا چانس کہاں ملتا ہے لیکن مجھے شک ہے کہ اس نے اپنے رشتے کو چھپایا ہوگا۔"

"پھر شبلی نے یہ راز کیوں فاش کیا؟"

"میرا خیال ہے کہ شبلی یہاں آ کے پھنس گئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ دور کے ڈھول سہانے لگ رہے تھے۔ اسپتال تو ٹرسٹ کا ہے اور اسے چلانے والا بورڈ ہے جس کے ڈائریکٹرز میں دلاور کے علاوہ بھی بہت سے لوگ ہیں۔ ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ واپس کیوں نہیں چلی گئی تھی۔ اس کی کوئی نہ کوئی کمزوری تھی جس کو استعمال کرتے ہوئے چوہدری دلاور نے اسے یہاں روکا اور پھر میرے پیچھے لگا دیا۔"

"وہ برطانوی نیشنل تھی۔ اسے کون روک سکتا تھا؟"

"یہی تو معلوم کرنا چاہئے کہ دلاور نے اسے کس طرح اپنے جال میں گرفتار کر لیا۔" میں نے کہا۔ "دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ کیا واقعی شبلی اپنے بھائی سے بدلہ لینا چاہتی تھی۔ اگر اسے بدلہ لینا تھا تو اس نے دلاور کا ساتھ کیوں دیا اور اس کا ساتھ دیا تھا تو مجھے یہ بات کیوں بتائی۔"

"تم اس سے زیادہ قریب رہے ہو۔ تم ہی بتاؤ۔"

"میرا صرف خیال ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے کہ شبلی مجبوری کے جال سے نکلنا چاہتی تھی لیکن وہ اعلانیہ ہمارے ساتھ مل کے دلاور کے خلاف کسی قسم کی انتقامی کارروائی کرتے ہوئے ڈرتی تھی۔ شاید اس نے دلاور سے اپنی نفرت کا بھی اظہار نہیں کیا تھا اور نہ یہ پتا چلنے دیا تھا کہ اس کے عزائم کیا ہیں۔ دلاور کے چنگل سے نکلنے کے لئے پہلے اس نے وہی کیا جو دلاور نے کہا۔ بعد میں آہستہ آہستہ اس نے میرا اعتماد حاصل کیا اور مجھے وہ باتیں بتا دیں جو شاید دلاور کو بھی معلوم نہیں تھیں لیکن دلاور کو معلوم ہو گیا۔"

"کیا معلوم ہو گیا۔ اور کیسے؟" غالب نے کہا۔

"یہی کہ شبلی اس کی گرفت سے نکل گئی ہے۔ اس کا رویہ کچھ ایسا ہی ہو گیا تھا۔ جذباتی وابستگی کی اداکاری اور حقیقی جذباتی وابستگی میں فرق کا پتا چل جاتا ہے۔ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے دلاور کو رپورٹ دے دی کہ لڑکی گئی ہاتھ سے۔ اس کا بندوبست کرو۔ دلاور نے اس کی نگرانی سخت کر دی مگر شبلی نے انہیں بھی مروا دیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد دلاور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے پکا بندوبست کیا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ شبلی انتقام کیا لیتی۔ خود تصویرِ عبرت بن گئی۔"

"بیچاری۔" رابعہ نے بڑے دکھ سے کہا۔ "ماری گئی اس چکر میں۔"

نازو نے کہا۔ "بے غیرت بھائی اس کی لاش بھی نہیں لے جائے گا۔"

غالب نے انہیں ٹوکا۔ "پلیز۔ جذباتی نہ ہو۔ یہ ایک خیال تھا۔ مصدقہ بات نہیں تھی۔"

"تصدیق ہو سکتی ہے دو منٹ میں۔ ایک فون کرو دلاور کو اور دیکھو۔ تم تو خود بھی مل سکتے ہو۔"

www.paksociety.com

"میں یہی سوچ رہا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "آج نقوی صاحب کے جنازے میں کافی لوگ تھے۔ بیشتر سرکاری افسران اور ان کے ماتحت تھے۔ میں بھی قبرستان تک گیا تھا اور تدفین کے وقت موجود رہا۔"

میں نے کہا۔ "خاتون کرائم رپورٹر اس وقت کہاں تھیں؟"

"میں اسپتال میں تھی۔ اس چکر میں کہ شیلی کی لاش کا پوسٹ مارٹم کب ہوتا ہے اور اس کا کوئی وارث سامنے آتا ہے یا نہیں۔"

"تم اکیلی تھیں؟"

"نہیں، پہلے ایک پرانا کرائم رپورٹر تھا میرے ساتھ۔ بڑی سرپرستی کر رہا تھا میری۔ سمجھا رہا تھا کہ یہ کام کیسے کرنا چاہیے۔ گر کی باتیں بتا رہا تھا۔ خاصا فری ہو گیا تھا بعد میں۔"

غالب نے میز پر مکا مارا۔ "اس آخری جملے کی وضاحت کی جائے۔ میرے دل میں رقابت کی آگ بھڑکنے لگی ہے۔"

"اس نے ایک بار میرا ہاتھ پکڑا۔ قلم پکڑانے کے بہانے سے، دو بار انجانے میں مجھ سے ٹکرایا۔ اس نے مسکرا کے سوری کہا پھر وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔"

"کمرے میں لے گیا۔" غالب نے گرج کر کہا "اور تم چلی گئیں؟"

"ہاں۔ پولیس سرجن کا کمرا تھا۔" نازو نے معصومیت سے کہا۔

"اور وہاں تم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا؟" غالب چلایا۔

"ہاں، دو منٹ تک پھر پولیس سرجن آ گیا باتھ روم میں سے نکل کے۔" نازو نے کہا۔

ہم سب ہنس پڑے اور غالب نے جھینپ کر کہا۔ "اگر تم کرائم رپورٹر رہو گی تو ہر روز ایک کرائم میں کروں گا۔ روز کوئی مارا جائے گا میرے ہاتھوں۔"

"پولیس سرجن نے رازداری سے بتایا کہ شیلی کی لاش فی الحال کولڈ اسٹوریج میں رکھوا دی گئی ہے اور بڑے سخت آرڈر ہیں کہ اس کو ابھی نہ چھیڑا جائے۔ کوئی لاش لینے آئے تو اسے روک لیا جائے۔ ظاہر ہے اس کے بعد میرا وہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ میں اسی رپورٹر کی کار میں بیٹھ کے گھر آ گئی۔ بڑی اچھی کار ہے اس کی۔ گھر چھوڑ کر گیا۔"

"یہ کہو کہ گھر دیکھ گیا۔" غالب بولا۔ "اس سے تو میں نمٹ لوں گا۔ جو بات میں بتانے والا تھا وہ بیچ میں رہ گئی۔ تدفین کے وقت میں نے دلاور کو دیکھا۔ میں کھسکتا ہوا اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ میں نے کہا "اپنے چوہدری صاحب! آپ کے لا رہے ہیں آپ نقوی صاحب کی جگہ؟" وہ مجھے گھورنے لگا مگر کچھ بولا نہیں۔ میں نے کہا "اب میں بیورو چیف ہو گیا ہوں۔" اسے اخبار کا نام بتایا تو اس کی صورت کا تاثر بدل گیا۔ سیاست کے میدان میں قدم رکھا ہے تو کسی صحافی سے بگاڑ نہیں مول لے سکتا۔ میں نے پھر دہرایا تو کہنے لگا "غالب صاحب، یہ تو ہم سے زیادہ آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے" میں نے بڑے معنی خیز لہجے میں کہا "معلوم ہو جائے گا آپ کو بھی اپنے دلاور صاحب!" اور وہ چلا گیا۔ اس نے دھمکی ہی سمجھا ہوگا میرے الفاظ کو۔ جنازے کے بعد میں پھر اس سے اور پوچھا کہ "رفیق کا کچھ پتا چلا؟" وہ مسکرا کر بات ٹال گیا "یہ سوال تو آپ کو پولیس والوں سے پوچھنا چاہیے۔ اتنے بڑے بڑے افسران ہیں یہاں۔" میں نے بڑی حیرانی کا اظہار کیا "اچھا۔ آپ پہچانتے ہیں سب کو؟ سادہ کپڑوں میں ہوں گے مجھے بتائیں کہ کس سے پوچھوں؟" اس نے ایک شخص کی طرف اشارہ کردیا کہ وہ ہیں ڈی آئی جی صاحب۔ میں سیدھا اس کے پاس چلا گیا اور دلاور کے حوالے سے کہا۔ "ڈی آئی جی صاحب چوہدری دلاور کا خیال ہے کہ رفیق کے قتل اور لاش کی گمشدگی کے بارے میں آپ بتا سکتے ہیں۔" وہ گرم ہو گیا کہ کون ہے یہ الو کا پٹھا۔ چوہدری دلاور؟ میں نے اسے اشارے سے بتا دیا اور خود پیچھے ہو گیا۔ بعد میں دلاور کی اور ان کی گفتگو تو میں نے نہیں سنی کمال اور کی صورت دیکھ کے مزے لیتا رہا۔

قبرستان سے باہر وہ پھر مجھے مل گیا بلکہ ٹکر گیا۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ رہا تھا اور ناچیز ہمیشہ کی طرح ذاتی ٹانگوں پر سوار تھا۔ اس نے بڑی محبت اور خلوص سے مجھے پیش کش کی کہ "آئیے غالب صاحب۔ ہمارے ساتھ آ جائیے۔ جہاں کہیں گے چھوڑ دیں گے۔" میں نے کہا۔ "آپ چھوڑنے والے کہاں ہیں چوہدری صاحب۔ ایک کو چھوڑتے ہیں تو دوسرے کو پکڑ لیتے ہیں۔ سنا ہے آج کل سیاست کے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔" "بے غیرت آدمی ہے نا۔ بیٹھے گا اور مجھے زبردستی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ میں سمجھ رہا تھا اس عنایت خسروانہ کا مطلب۔ وہ صحافت میں میری سابقہ ساکھ سے واقف تھا اور اسے اندیشہ تھا کہ میں اس کے مستقبل کے خوابوں کو راکھ کر سکتا ہوں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اس سے شیلی کے موضوع پر بات کروں پھر اس خیال سے خاموش رہا کہ وہ قبل از وقت نہ بھڑک جائے اور کرائم رپورٹنگ کے میدان میں تو وارد ہماری خاتون رپورٹر کی پہلی اسائنمنٹ متاثر نہ ہو۔ اس نے خود ہی راستے میں بات چھیڑ دی کہ "اپنے غالب صاحب خیر سے تمہاری بڑی عزت ہے۔" میں نے کہا۔ "کہاں چوہدری صاحب۔ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ نہ کوٹھی نہ کار نہ بینک بیلنس۔ کاروبار نہ کمال۔ ملکوں کے بھی پانچ لگے ہوتے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہوگا۔ کتنی کچھ کڑاہی کرپان اور کیس۔ اب بڑے آپ جیسے سمجھے جاتے ہیں جن کو پانچ کاف حاصل ہوں۔ کوٹھی، کار، کیش، کاروبار اور کمال۔" وہ جان چھڑانے کے لئے بولا کہ ہم تو ہیں ان پڑھ بے کمال لوگ۔" میں نے پھر پکڑ لیا کہ۔ "نہیں چوہدری صاحب آپ کے کمال میں جو شک کرے وہ کافر۔ ایک سے دس اور دس

کے ہزار بنانے میں آپ کا کمال۔ سب کچھ کرتے اور پکڑے نہ جانے میں آپ کا کمال۔ اس کی پگڑی مجھ کے سروالی مثال ذرا پرانی ہو گئی۔ اس کا پھندا محمود کے گلے میں ڈالنا آپ کا کمال۔ اداکاری بھی آپ کا کمال۔ سیاست میں آپ کا کمال۔ وزیر خان جیسے کسی بھی دوست کی پیٹھ میں خنجر گھونپنا آپ کا کمال۔" وہ کہنے لگا "اپنے صحافی صاحب۔ میں نے سوچا تھا آپ سے کوئی کام کی بات ہوگی۔ آپ صرف بے عزتی کرنے آئے ہو ہمیں تو اپنا شوق پورا کرو۔" میں نے کہا۔ "عزت ہوتی آپ کی تو میں ضرور بے عزتی کرتا اپنے چوہدری صاحب۔ تیرے یخ کا بھی برا مانتے ہو آپ تو سوری۔ کیا حکم ہے بھئی؟" وہ بولا۔ "تمہارا وہ سکندر اعظم اپنی بات تو مانا نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دل صاف کرو۔ غلطی ہوئی تو معاف کرو۔ وہ نہیں کیا چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "سچ پھر آپ کو برا لگے گا۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ تجارت، سیاست اور عداوت، منافقت اور خباثت وغیرہ چھوڑ کے رحلت اختیار کریں اس دنیا سے۔" وہ بولا کہ "دیکھتے ہیں اب رحلت کون کرتا ہے۔ کیا کم مقدمات تھے اس کے خلاف۔ بس قسمت کی بات ہے کہ ابھی تک پھندا گلے میں نہیں پڑا مگر خیر یہ بہت بڑا کام کیا ہے اس نے۔ نقوی صاحب کو قتل کر کے اس نے اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔ اس کی گرفتاری کے لئے پولیس کی ساری نفری لگا دی ہے۔ ڈی آئی جی صاحب نے۔ دیکھتے ہیں اب وہ اس شہر میں یا اس ملک میں کیسے چھپ کے رہتا ہے۔ کل ہر اخبار میں اس کی تصویر ہوگی۔ گلی کوچوں میں پوسٹر لگوا دوں گا۔ خیر سے اتنی مشہوری ہوگی کہ شیطان بھی شرمائے۔ یہ نقوی صاحب تو شاید کچھ کرتے اور اب جو آئے گا وہ کسی وقار یوسف کا سسر نہیں ہوگا۔" میں سب سنتا رہا کیوں کہ میں جاننا چاہتا تھا کہ حالات کس رخ پر جا رہے ہیں۔ اس نے بتایا کہ آج ہی رات سے سکندر کے لیے کہیں پناہ لینا مشکل ہو جائے گا۔ جو اسے پناہ دیں گے وہ بھی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ سارے جائیں گے سب۔ اس کی ساری کھوا اس نے کے میں نے کہا کہ اپنے چوہدری صاحب۔ گاڑی یہیں روک لیں۔ مجھے واپس قبرستان جانا ہے۔ اپنے لیے میں قبروں کا آرڈر دے دوں۔ دنیا میں ایک ساتھ رہے مرنے کے بھی ساتھ رہیں گے۔ آپ نے اچھا کیا کہ پہلے سے بتا دیا مگر ایک بات میں بھی بتاؤں۔ پنجابی کا محاورہ ہے کہ کوؤں کی بددعا سے ڈھور ڈنگر نہیں مرتے اور اب کہتے ہیں کہ مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ احتیاطاً آپ بھی اپنے ساتھ چھ ناموں کے کتبے بنوا کے رکھ لیں۔ کیا پتا ان کو کہیں لگانے پڑیں۔" بس اس کے بعد میں اتر گیا۔ اسے میں اپنے ساتھ یہاں تک تو لا نہیں سکتا تھا۔"

نمائے کہا۔ "اس سے پوچھ لیتا تھا کہ استاد چیف صحیح سالم اور زندہ ہے یا۔"

"نمائے پوچھا تھا۔ کہنے لگا کہ وہ مزے میں ہے اور مزے میں رہے گا۔ خواری تمہارے نصیب میں لکھی ہے۔" غالب بولا۔

"کل رات جس گاڑی نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ اس میں کون تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اس حادثے کی خبر مل گئی تھی۔ تھانے کی رپورٹ کے مطابق اس میں چار افراد تھے جو سب نشے میں تھے۔ گاڑی چلانے والا ایک کھلنڈرا تھا اور گاڑی کے مالک کو کرائی دے رہا تھا۔ وہ مارا گیا۔ مالک زخمی اور سرکاری اسپتال میں ہے۔ جس شخص کے بنگلے کی دیوار ٹوٹی تھی اسے دیوار بنوا کے دینے کا وعدہ کر چکا ہے۔"

"یہ سب جھوٹ ہے۔"

"بجا ارشاد۔ آپ کیوں توقع رکھتے ہیں ان سے سچ کی۔ جس کار کو آپ اور ڈاکٹر شیلی چھوڑ کے فرار ہوئے تھے وہ پولیس کی تحویل میں ہے اور اس پر واقعی ریسرچ ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے تمہارے فنگر پرنٹ تک اتارے جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ایک اہم بات تو رہ گئی۔ وہ کیسٹ اب کہاں ہے جس پر نقوی صاحب کا آخری پیغام تھا۔"

"اس نرس کے پاس۔"

"اور وہ نرس کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ "زندہ ہے یا نہیں؟"

"شام چار بجے تک تو زندہ تھی۔" غالب نے کہا۔ "اس کو نقوی صاحب کی موت کا علم ہو گیا تھا۔ شاید کسی ساتھی نرس نے بتا دیا ہوگا کہ بعد میں کیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے وقار یوسف کے گھر فون کیا اور کہا کہ مجھے نقوی صاحب کی بیٹی سے بات کرنا ہے۔ وہ اس وقت نیند میں تھی اور وقار یوسف تدفین کے انتظامات میں مصروف تھا۔ گھر میں جنازہ تیار تھا اور باہر لوگ جمع تھے۔ اس نے کہہ دیا کہ بعد میں فون کرنا۔ اس نے پھر فون کیا اور وقار سے کہا کہ یہ انتہائی اہم بات ہے جو مجھے صرف ان کی بیٹی سے کرنی ہے۔ وقار یوسف نے کہا کہ "دیکھو بھئی ان کے والد کا جنازہ تیار ہے لیکن ہم انہیں نہیں جگا رہے ہیں کیوں کہ ان کے ذہن پر صدمے کا شدید اثر ہے۔ باپ کا جنازہ اٹھتے دیکھ کر اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو سکتی ہے۔ اگر ایک منٹ میں بتا سکتی ہو تو مجھے بتا دو۔" وہ کہنے لگی "بات ذرا لمبی ہے مگر صبح پتا نہیں کیا ہو جائے۔" وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ وقار یوسف نے تحمل سے کام لیتے ہوئے اسے رابعہ کا فون نمبر دے دیا۔ تم ان کی بیٹی کو بتا دو۔ نقوی صاحب کی بڑی بیٹی ہیں رابعہ قادری ایڈووکیٹ۔ پھر وہ ریسیور رکھ کے بھاگ گیا۔ نقوی صاحب کے گھر میں تین فون تھے۔ وہ سرکاری تھے مگر ایک پرائیویٹ نمبر چند ہی لوگوں کو معلوم تھا۔ سرکاری ٹیلی فون کی گھنٹی تو مسلسل بج رہی تھی اور وہاں نقوی صاحب کا پی اے بیٹھا ہوا پیغامات وصول کر رہا تھا۔ آگے رابعہ سے سنو۔"

رابعہ نے گھڑی دیکھی۔ "بارہ بج رہے ہیں۔ صبح بات کر لیں گے۔"

www.paksociety.com

"ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔ "ہم ایک بجے بھی سو سکتے ہیں۔ صبح دس بجے تک جاگتے رہیں گے تو کون ڈسٹرب کرے گا۔"

غالب نے جماہی لی۔ "اللہ کے نام پر کوئی نیک دل خاتون ہم فقیروں کو ایک ایک کافی ہی پلا دے۔"

"فقیر صاحب!" نازو نے کہا۔ "اس وقت کچن میں کوئی نہیں جا سکتا۔"

رابعہ نے کہا۔ "انتظام یہاں بھی ہے۔ دیکھو اس الماری میں سب کچھ ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "واہ! اے کلاس قیدی کو ہر سہولت فراہم کر دی گئی ہے لیکن میں پھر صاف کہے دیتا ہوں کہ اس آزاد پنچھی کو سونے کے پنجرے میں بھی قید نہیں کیا جا سکتا۔"

غالب نے غیر موجود مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "سکندرِ اعظم! ہمیں چیلنج مت کرو ۔۔۔ ہم وہ ہیں جن کے بارے میں علامہ صاحب نے فرمایا تھا۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

میں نے کہا۔ "مومن میں بھی ہوں بیٹے۔ اس شعر کا اطلاق مجھ پر نہیں ہوتا۔"

نازو نے الماری میں سے الیکٹرک کیٹل نکالی اور پلگ میں لگا دی۔ کافی کے دیگر لوازمات ڈبوں میں پیک تھے۔ رابعہ نے میری پسند کا خاص خیال رکھتے ہوئے "نیس کیف گولڈ" کافی کے ساتھ کافی میٹ 'نان ڈیری کریم' کے بڑے بڑے جار خریدے تھے۔ کافی کے لئے نئے فرنچ مگ بھی بہت خوبصورت اور قیمتی تھے۔

کمرے میں بڑی خوشگوار ٹھنڈک تھی جو بے آواز ائرکنڈیشنر نے پیدا کی تھی ورنہ زیرِ زمین کمرے میں ہمارا دم گھٹ جاتا۔ باہر مکمل خاموشی تھی کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس ویران اور تاریک کوٹھی کے زیرِ زمین کمرے میں اتنی روشنی ہے اور رونق ہے۔

رابعہ نے موقع پاتے ہی اپنی بات شروع کی۔ "میرے پاس اس نرس کا فون ساڑھے پانچ بجے آیا تھا اس کا نام شاہدہ ہے۔ پہلے اس نے مجھ سے تصدیق کی کہ میں نقوی صاحب کی بیٹی رابعہ قاری ہوں۔ یوسف نے تو مجھے نہیں بتایا تھا مگر میں سمجھ گئی کہ یہ غلطی نہیں ہو سکتی جس نے اسے میرے گھر کا نمبر دیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہوگا کہ نقوی صاحب کی بیٹی کا نام رابعہ قاری ہے۔ صرف یہ جاننے کے لئے کہ یہ جھوٹ کس نے بولا تھا اور کیوں میں نے کہہ دیا کہ "ہاں میں رابعہ قاری بول رہی ہوں۔" وہ کہنے لگی کہ "آپ رابعہ نقوی کیوں نہیں ہیں کیا شادی ہو چکی ہے آپ کی؟"

"میں نے کہا کہ تم سمجھدار ہو۔ یہ بتاؤ بات کیا ہے؟ کیوں فون کیا ہے مجھے؟" اس نے مجھے ساری بات بتا دی۔ یہ بھی بتا دیا کہ کیسٹ اس نے سن لیا ہے۔ اس کے بعد سے میری پریشانی بڑھ گئی ہے۔ پتا نہیں کیوں میں اس چکر میں پڑ گئی۔" میں نے کہا۔ "شاہدہ نے بہت زبردست کام کیا تھا۔ اب اس کیسٹ کی حفاظت کرو اور اپنی بھی ۔۔۔ ہو سکے تو اسی وقت کیسٹ لے کر میرے پاس آ جاؤ۔ اس نے کہا میں بری طرح پھنس گئی ہوں تب۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ میں نے لالچ میں یہ کام کیا اور ایک ہزار روپے تو نوکری کے برابر تو نہیں ہوتے۔ نقوی صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے بھی میری پسند کی نوکری مل جائے گی اور میری بہن کو بھی لیکن میں نے سنا ہے کہ انہیں قتل کر دیا گیا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ فون پر ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ وہ میرے پاس آ کے مجھے تفصیل سے ساری بات بتائے۔ اگر نقوی صاحب نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ میں بھی بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ اس پر شاہدہ نے کہا کہ وہ ایک گھنٹے میں نکلے گی اور ساڑھے چھ بجے تک پہنچ جائے گی۔ میں نے اسے اچھی طرح اپنا پتا سمجھا دیا تھا اور چوکیدار کو سمجھا دیا تھا کہ اگر شاہدہ نام کی لڑکی اکیلی آئے تو اسے میرے پاس پہنچا دے۔ وہ پونے سات بجے پہنچی۔ کہنے لگی کہ بس دیر سے ملی اور پھر کوٹھی تلاش کرتے میں آگے نکل گئی تھی۔ خیر ڈرائنگ روم میں اس نے مجھے ساری بات بتائی کہ کس طرح اس نے ٹیپ ریکارڈر نقوی صاحب کو لے جا کر دیا تھا جسے انہوں نے پیغام ریکارڈ کر کے دیا تھا اور بعد میں وہ کیسے کیسٹ کو نکال کر لے گئی تھی۔ "مجھے تو اندازہ نہیں تھا کہ ایک معمولی سے ٹیپ ریکارڈر کے لئے اسٹاف کے خلاف چوری کا الزام آ جائے گا اور وہ عورت اتنا ہنگامہ کرے گی۔ جلدی میں مجھے سوچنے کا موقع نہیں ملا ورنہ میں اس سے ٹیپ ریکارڈر لے کر آتی اور اسے وہیں چھپا دیتی۔ یہ بھی میری غلطی تھی۔ میں کیسٹ نکال کر کمرے میں رکھ دیتی۔ باہر پھینک دیتی۔" وہ بعد میں وہیں وارڈ کی الماری میں مل گیا۔ ظاہر ہے وہ چار آدمی ہیں جن پر شک ہوگا۔ ڈاکٹر کی حیثیت ایسی ہوتی ہے کہ وہ بچ جائے گا۔ میں اور ایک وارڈ بوائے پکڑے جائیں گے۔" اب میں اس سے کیسے کہتی کہ پکڑے جانے سے زیادہ خطرہ اس کے مارے جانے کا ہے۔ حالات و واقعات کی کڑیاں اسے مجرم ثابت کر دیں گی۔ اس ڈاکٹر نے بتایا کہ شاہدہ کے بیگ میں ٹیا کی تصویر اور فلم "پرچھائیں" کا کیسٹ تھا اور ڈی ایس پی کی بیوی نے تصدیق کر دی تھی کہ وہی کیسٹ غائب ہوا تو سمجھنے والے سمجھ جائیں گے کہ اس نے ٹیپ ریکارڈر چرایا تھا اور وہی کیسٹ نکال کر لے گئی۔ اس کے بعد سوال پیدا ہوگا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا تو جواب بھی آسان ہوگا۔ وہ نقوی صاحب کی خدمت پر مامور تھی۔ نقوی صاحب نے اس کی معرفت کوئی پیغام باہر بھیج دیا۔ شاہدہ نے مجھے وہ کاغذ دیا جس پر نقوی صاحب کا گھر کا نمبر تھا۔ میں نے کہا۔ "تم نے واقعی بہت بڑا کام کیا ہے۔" کہنے لگی "میرا انعام کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "کیسٹ مجھے دے دو میں سن کر طے کروں گی۔" وہ کہنے لگی۔ "نقوی صاحب نے تو ایسی کوئی شرط نہیں لگائی تھی کہ پہلے آپ کیسٹ سنیں گی۔" میں نے کہا۔ "اچھا تم بتاؤ۔ تم کیا چاہتی ہو۔" اس نے کہا۔ "دس ہزار روپے۔" میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تمہیں دس ہزار روپے مل جائیں گے۔ کیسٹ نکالو۔" وہ کہنے لگی۔ "کیسٹ تو میں نہیں لائی تھی۔ برا نہ مانیں بی بی۔ یہ معاملہ ہی ایسا تھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ وہاں کسی نے مجھ سے کیسٹ چھین لیا تو میں کیا کروں گی۔ آپ کے لئے کیسٹ اہم ہے۔ میرے لئے میری زندگی اہم ہے۔" میں نے کہا۔ "تم بے وقوف ہو۔ جب تک وہ کیسٹ تمہارے پاس ہے تمہاری زندگی کو لاحق خطرہ کم نہیں ہوگا۔ تمہارے گھر میں اور کون ہے؟" اس نے کہا۔ "ایک ماں ہے ایک بہن اور ایک چھوٹا بھائی۔ باپ مر چکا ہے۔" میں نے پوچھا۔ "کیسٹ کہاں رکھا ہے؟" اس نے کہا۔ "یہ میں نہیں بتاؤں گی۔" مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے کہا۔ "اچھا گھر جاؤ اور کیسٹ لے آؤ۔ کیسٹ دو اور دس ہزار کا چیک لے لو۔" اس نے چیک لینے سے صاف انکار کر دیا۔ مجھے اس کی توقع تھی۔ "میں نقدی لوں گی۔ ایک کاغذ کا پرزہ ہوتا ہے چیک تو۔ آپ کے حساب میں رقم ہے یا نہیں مجھے کیا معلوم۔" میں نے کہا۔ "شاہدہ یہ کوٹھی میری ہے۔ یہ کار میری ہے اور میں وکیل ہوں۔ عام وکیل نہیں ۔۔۔ بہت مشہور وکیل ہوں۔ میں دس ہزار کے لئے تم سے دھوکا نہیں کر سکتی۔" اس نے کہا۔ "آپ ٹھیک کہتی ہیں بی بی لیکن چیک سے آدمی پکڑا جاتا ہے۔ میں صبح آ جاؤں گی۔ ابھی تو ویسے بھی اسپتال جا رہی ہوں۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "بے وقوف لڑکی۔ اسپتال کیوں جا رہی ہو۔ تمہیں نہیں معلوم بعد میں وہاں کیا ہوا تھا۔ تم کو تو ابھی گھر میں بھی نہیں رہنا چاہئے۔ جاؤ اسی وقت کیسٹ لے کر آؤ۔ میں تمہارے لئے نقد رقم کا انتظام کرتی ہوں مگر یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ دس ہزار کے مقابلے میں تمہاری زندگی کی قیمت کچھ لوگوں کے لئے بہت زیادہ ہے۔ میری مانو تو اپنے گھر والوں کے ساتھ کہیں شفٹ ہو جاؤ۔" وہ چلی گئی اب یہ نہیں معلوم کہ وہ اسپتال گئی تھی یا اپنے گھر۔"

"گھر کا پتا لیا تھا تم نے؟"

"نہیں ۔۔۔ گھر کا تو اسپتال سے بھی مل جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "وہ پلٹ کر نہیں آئی؟"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے اسپتال فون کیا تھا مگر اس وقت تک شاہدہ کی ڈیوٹی شروع نہیں ہوئی تھی پھر میں تمہاری طرف چلی گئی تھی۔"

غالب نے کہا۔ "فون اس وقت بھی کیا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو تم نے منع کر دیا تھا کہ کہیں فون مت کرنا۔ کیا اب یہ خطرہ نہیں رہا کہ اس فون نمبر کو ٹیپ کیا جا رہا ہوگا۔"

"شاہدہ سے رابطہ بے حد ضروری ہے۔"

نازو نے کہا۔ "وہ کیسٹ تو اہم ہے۔ شاہدہ کے پورے گھرانے کو تباہ کر دے گا اور انہیں مل گیا تو نقوی صاحب کے قاتل ۔۔۔"

"ابھی سے کچھ فرض مت کرو۔ کیا پتا اس کیسٹ میں نقوی صاحب نے وصیت کی ہے یا انکشافات کئے ہیں۔" غالب بولا۔

میں نے کہا۔ "جب وہ کیسٹ ہی لینے گئی تھی تو اسے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آ جانا چاہئے تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ واپس جا کے وہ پھنس گئی۔"

غالب نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ کیسٹ کے خریدار دوسرے لوگ بھی ہوں انہوں نے زیادہ قیمت لگا دی ہو۔ مس رابعہ آپ اگر تھوڑی سی عقل اور ہمت سے کام لیتیں تو اسے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کے لے جاتیں اس کا گھر بھی دیکھ لیتیں اور راستے ہی میں کسی سے دس ہزار روپے پکڑ کے اسے دے دیتیں۔"

میں نے کہا۔ "اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس وقت ہم سب کا دماغ تھکن اور پریشانی کے باعث کام نہیں کر رہا ہے۔ سب کا دن پریشانی میں گزرا ہے چند گھنٹے آرام کر لیں۔ باقی باتیں صبح۔" میں نے سب کے دل کی بات کہی تھی۔ ذرا سی دیر میں رابعہ اور نازو بیڈ پر لیٹ گئیں اور لیٹتے ہی سو گئیں۔ میں اور غالب وہیں قالین پر صوفوں کے کشن کا تکیہ بنا کر لیٹے رہے اور مستقبل کے بارے میں اپنے اپنے اندیشوں کا اظہار کرتے رہے۔ کل کی فکر سب کو تھی کہ کل کیا ہوگا آنے والے وقت کے مسائل سے ہم کیسے نمٹیں گے۔ یہ ہزار جہت رکھنے والا ایسا مسئلہ تھا جس کا حل آسانی سے تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بالآخر ہم بھی سو گئے۔ اس زیرِ زمین خواب گاہ میں آرام آسائش سکون اور خاموشی اتنی مکمل تھی کہ ہم دس گھنٹے دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے رہے۔

سب سے پہلے گیارہ بجے اٹھنے والا میں تھا۔ میری آنکھ بھی ان ہی آوازوں سے کھلی تھی جو اوپر سے سنائی دے رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے تہ خانے کے اوپر پورے گھر میں زلزلہ آیا ہوا ہے۔

میں نے فوراً غالب کو ہوشیار کیا۔ "یہ کیا ہے؟"

غالب کے حواس پوری طرح بیدار ہو گئے۔ "اوپر کون لوگ یہ توڑ پھوڑ کر رہے ہیں۔"

ہماری آوازوں پر رابعہ بھی اٹھ گئی اور اس نے نازو کو بھی جگا دیا۔ ہم سب آنکھوں میں سوال لئے ان اٹھانے پٹخنے اور توڑنے پھوڑنے کی آوازوں کو سنتے رہے جو مختلف حصوں سے پہنچ رہی تھیں۔ میں اور غالب سیڑھیاں چڑھ کے اس دروازے تک پہنچے جو درحقیقت کمرے کی الماری کا پچھلا حصہ تھا یہاں سے شور میں لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔ "یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟"

"پولیس والے ہو سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"چوکیدار بھی تو تھا دروازے پر؟"

"ایک غریب چوکیدار کی حیثیت ہی کیا ہے انہوں نے اسے بھی مارا ہوگا کہ فرائض کی ادائیگی سے روکتا ہے۔" غالب نے

www.paksociety.com

کہا۔

رابعہ اور نازو بھی چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں اور خاصی خوفزدہ تھیں۔ ہم اس پناہ گاہ سے نکل بھی نہیں سکتے تھے اور مجبور تھے کہ لاقانونیت کے اس طوفان کے گزرنے کا خاموشی سے انتظار کریں۔ قانون کے محافظوں نے خانہ تلاشی کے احکامات اور اختیارات کے ساتھ یلغار کی تھی اور انھوں نے چوکیدار کے بیان کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی کہ گھر کے مکین موجود نہیں۔ انھوں نے طاقت کے بل پر بند دروازے کھول لئے تھے۔ تالے توڑ ڈالے تھے اور اب وہ پورے گھر میں دندناتے پھر رہے تھے۔ خانہ تلاشی کے نام پر لوٹ مار اور توڑ پھوڑ کر رہے تھے اور بے خوف تھے کہ انھیں روکنے والا کوئی نہیں۔ ان کے خلاف گواہی کون مائی کا لال دے گا اور کس میں ہمت ہے کہ انھیں مجرم ثابت کر سکے۔

رابعہ ہی نہیں۔ ہم سب ہی مشتعل تھے مگر کوئی بھی اس قید تنہائی سے نکل کر انھیں للکارتا تو مجرم نا ہونے پر بھی مجرم بن جاتا۔ چوکیدار غلط بیانی کے الزام میں دھر لیا جاتا اور یہ جگہ جو ایک حفاظت گاہ تھی۔ قانون کی نظر میں آجاتی تو مجرموں کا ٹھکانا کہلاتی۔

آدھے گھنٹے تک ہم اندر ہی اندر کھولتے رہے اور یہ سوچتے رہے کہ پولیس نے اتنی جرأت کیسے کی۔ ہائی کورٹ کی ایک بیرسٹر ایڈووکیٹ کے گھر میں اس کی عدم موجودگی میں داخل کیسے ہو گئی اور اتنی توڑ پھوڑ کیسے مچا گئی۔ کیا منظر کو یا وقار یوسف کو بھی اس خفیہ کارروائی کی اطلاع نہیں ملی تھی۔

جب آوازوں کا سلسلہ موقوف ہو گیا تو سب سے پہلے غالب نے اوپر طلوع ہونے والے راستے پر قدم رکھا۔ کوئی آہٹ کیے بغیر لاک کھولا اور بے پاؤں الماری میں داخل ہو گیا۔ اس کی خواہش کے مطابق ہم نے دروازہ پھر اندر سے لاک کر دیا۔

دس منٹ کے بعد اس نے پہلے دو بار' پھر تین بار' پھر تین انگلیوں سے دروازہ بجایا۔ باری باری ہم سب نکل کر اوپر گئے تو بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی تباہی کا پورا منظر ہمارے سامنے آگیا۔ تلاشی لینے والوں نے بیڈ اُلٹ دیا تھا۔ صوفے اُلٹ دیے تھے۔ انھوں نے بیڈ کو ایسے پھاڑا تھا کہ اندر کے اسپرنگ تک باہر نظر آرہے تھے۔ یہی حشر صوفوں کا ہوا تھا۔ ان کے کشن بھی اُدھیڑ دیے گئے تھے۔ الماریوں میں سے ہر چیز نکال کر باہر پھینک دی گئی تھی۔ رابعہ کے سلیقے سے لٹکے ہوئے کپڑے فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے باتھ روم کیبنٹ گرا دی تھی۔ فلش ٹینک کا ڈھکن اتار کر پھینک دیا تھا۔ سب سے خراب حالت میں کچن تھا جہاں سب الماریوں کے ہر ڈبے کو کھولا گیا تھا اور ڈرسیٹ کے دراز نکالتے ہوئے بہت سے برتن گرا دیے گئے تھے۔ فرش پر شیشہ ہی شیشہ بکھرا ہوا تھا۔

رابعہ کو غصے کے ساتھ صدمہ بھی تھا۔ اس کے سجے سجائے گھر کی حالت کباڑ خانے سے بدتر ہو گئی تھی۔ غالب آتش فشاں بنا ہوا تھا۔

"میں ابھی بتا تا ہوں سارے پریس کو' کوئی چیز مت اٹھاؤ' کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔" غالب نے کہا۔ "فون کہاں ہے۔ میں ایس پی سے بات کرتا ہوں۔"

نازو نے کہا "پہلے چوکیدار کی خبر تو لو۔"

چوکیدار ہمیں گیٹ کے اندر اور دیوار کے ساتھ بے ہوش پڑا ہوا ملا۔ اس کا سر پھٹا ہوا تھا اور زخم سے نکلنے والا خون بالوں میں جم کے خشک ہو گیا تھا۔ مار پیٹ کے نشانات اس کے چہرے پر بھی تھے۔ وہ ریوالور بھی غائب تھا جو اسے حفاظت کے لئے دیا گیا تھا لیکن گیٹ اسی طرح مقفل تھا جیسے کسی نے اسے چھوا تک نہ ہو۔

غالب نے فون کرنے کی کوشش کی تو اسے فون ڈیڈ ملا۔ اس نے باہر کٹی ہوئی لائن دریافت کی اور اسے جوڑ لیا۔ غالب کہاں کہاں فون گھماتا رہا۔ آخر میں اس نے ایس پی سے بات کی۔ اس کے چیخنے چلانے سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایس پی غالب کی بات ماننے پر تیار نہیں۔ اس نے جھٹ سے ریسیور رکھا اور اسے ایک گالی دی۔ "حرام زادہ کہتا ہے کہ پولیس اگر خانہ تلاشی کے لئے گئی تو ہرگز ایسا نہ کرتی۔ ہم قانون کے دائرے میں رہتے ہیں اور یہ ثابت ہو گیا کہ کسی نے اختیارات سے تجاوز کیا تو میں اس کی پٹی اتروا دوں گا۔ میں نے کہا کہ اخبار والے آرہے ہیں تم خود بھی آکر دیکھو کہ تمہارے کارندوں نے کیا تباہی پھیلائی ہے۔"

میں نے کہا کہ "وہ نہیں مانا کہ پولیس کا کام تھا۔"

"ایسے وہ لوگ ڈراما کرتے ہیں۔ میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا۔ "مرزا جی! کیا پتا وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ یہ دیکھو کہ تلاشی لینے والے کیوں آئے تھے۔ پولیس میری تلاش میں آئی تو صوفے اور بیڈ کیوں پھاڑتی' کیا مجھے وہ کچن کے ڈبوں میں سے برآمد کرنا چاہتے تھے۔"

نازو نے میری تائید کی۔ "یہ پولیس نہیں ہو سکتی۔ کیسٹ تلاش کرنے والے تھے۔"

رابعہ نے سر ہلایا۔ "خدا معلوم شاہدہ کے ساتھ انھوں نے کیا ظلم کیا۔ کیسٹ مل گیا ہوتا تو وہ یہاں نہ آتے۔"

غالب نے کہا۔ "پریس کا سامنا کریں گے میں اور رابعہ۔ رابعہ کا بیان ہو گا کہ میں گھر میں اکیلی تھی اور سو رہی تھی۔ انھوں نے مجھے اٹھا کر بیڈ روم سے ملحق باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھے۔ میں صورت دیکھ کر کم سے کم دو افراد کو شناخت کر سکتی ہوں۔ میں یہ کہوں گا کہ مجھے گیارہ بجے آنا تھا۔ دروازے پر موجود چوکیدار کو نہ پا کر مجھے حیرانی ہوئی۔ اسے سخت ہدایت دی تھیں کہ باہر موجود رہے اور کسی غیر متعلق شخص کو بلا اجازت اندر نہ جانے دے۔ میں گیٹ پھاند کے اندر آیا تو میں نے چوکیدار کو زخمی اور بے ہوش پڑا دیکھا پھر اندر کا حال دیکھا اور ایک باتھ

روم میں سے رابعہ کو برآمد کیا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کے ہاتھ پیچھے باندھے گئے تھے اور انھیں ٹونٹی کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "اخبار والے اور پولیس والے نشانات دیکھیں گے۔"

غالب نے کہا۔ "یہ کیا مشکل ہے۔"

اس نے ایک چادر پھاڑ کر رابعہ کے دونوں ہاتھ سختی سے پیچھے باندھے "بس ایک منٹ تکلیف برداشت کرلو۔ ذرا نشان گہرے ہو جائیں۔"

رابعہ نے سر ہلایا۔ "تم دونوں تو جاؤ۔ ابھی کوئی آجائے گا۔"

"آئے گا تو باہر سے کال بیل بجائے گا۔" میں نے کہا۔

غالب نے رابعہ کے ہاتھ کھولے اور چادر کا وہ لمبا سا ٹکڑا باتھ روم میں ڈال دیا۔ رابعہ نے اٹھنے کے بعد ہاتھ منہ بھی نہیں دھویا تھا چنانچہ اس کے بال پریشان تھے۔ آنکھ کھلتے ہی نازل ہونے والی اس پریشانی کے آثار سب کی طرح اس کے چہرے پر بھی عیاں تھے۔

بیل گھنٹی بجی تو میں اور نازو نیچے اُتر گئے۔ دروازے کو ہم نے مقفل کر دیا۔ رابعہ نے کیموفلاج کے تاثر کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے بکھرے ہوئے کپڑے پھر اس میں لٹکا لیے تھے۔

غالب کی پریس کانفرنس اور پولیس کی تفتیش میں ایک گھنٹا صرف ہو جانا معمولی بات تھی۔ میں نے نازو سے کہا کہ وہ کافی بنائے۔ اگر یہ افتاد نہ آتی تو ہم سکون سے ناشتا کرتے مگر اب بھوک بالکل مر چکی تھی۔ کال بیل وقفے وقفے سے بجتی رہی جس سے میں نے اندازہ کیا کہ غالب کی صدائے احتجاج صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوئی۔ اس کے ہم پیشہ صحافی لاقانونیت کے خلاف جہاد میں اس کا ساتھ دینے کے لئے پہنچ رہے تھے۔ شاید پولیس والے بھی فرض شناسی ثابت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ صرف ایک بار میں نے اوپر والے کمرے سے غالب کی آواز سنی۔ وہ کسی کو بتا رہا تھا۔ "یہ دیکھو یہ شرافت ہے۔ کوئی قانون ہے اس ملک میں؟ چادر اور چار دیواری کا کوئی خیال ہے کسی کو؟ اکیلی عورت گھر میں تھی اور آپ لوگ جانتے ہیں وہ عورت کون تھی۔۔۔"

جواب میں کسی نے کہا۔ "میں جو بات سمجھا رہا ہوں اس پر بھی آپ لوگ غور کریں۔"

"غور آپ کریں ایس پی صاحب' یہ آپ کا علاقہ ہے۔ واردات رات کے اندھیرے میں نہیں ہوئی' دن دہاڑے ہوئی ہے۔" غالب کی آواز آئی۔

پھر وہ لوگ دوسری طرف چلے گئے اور میں نیچے اُتر آیا۔ میں نے دوسری دفعہ کافی پی اور نازو بے چینی سے ٹہلتی رہی۔ بالآخر غالب نے دستک دی اور ہم باہر نکلے۔ چوکیدار کو ایمبولینس میں اسپتال بھیج دیا گیا تھا اور پولیس تفتیش کی رسمی کارروائی کرکے جا

چکی تھی۔ غالب کے بلائے ہوئے پریس فوٹو گرافروں نے مخصوص زاویوں سے تصویریں اتاری تھیں۔ وہ رائی کو پہاڑ یا پہاڑ کو رائی دکھانے کا فن جانتے تھے۔

پولیس نے کیسٹ کی بات نہیں کی تھی مگر یہ واضح کر دیا تھا کہ جو لوگ رابعہ کی کوٹھی میں توڑ پھوڑ مچا گئے تھے ان کا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں تھا۔ وہ کوئی چیز تلاش کر رہے تھے جو ان کے خیال میں کہیں بھی چھپائی جا سکتی تھی۔ انھوں نے رابعہ سے اور غالب سے پوچھا تھا کہ آپ بتائیں ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے۔ کوئی خط' ڈائری یا تصویر۔ آپ کا شک کس پر جاتا ہے۔ کون کر سکتا ہے یہ قابل مذمت کارروائی۔ ایس پی نے رابعہ کے گھر پر گارڈ بٹھانے کی پیشکش کی تھی جسے غالب نے مسترد کر دیا تھا۔ نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف مقدمہ بھی درج کر لیا گیا تھا اور ایس پی نے بڑی سیاسی سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے اخبار نویسوں کے سامنے وہی پرانا گھسا پٹا بیان دے دیا تھا کہ لاقانونیت کے ایسے مظاہرے پر پولیس خاموش نہیں بیٹھے گی۔ مجرموں کی گرفتاری کے لئے سارے وسائل بروئے کار لائے جائیں گے اور انھیں عبرتناک سزا دلوائی جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ اس نے واضح الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ نہ پولیس نے مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ کے بنگلے کی تلاشی کے لئے وارنٹ حاصل کئے تھے اور نہ پولیس کا ایسا کوئی ارادہ ہے۔

قیاس آرائی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ حملہ آور اس کیسٹ کو تلاش کر رہے تھے جس میں نقوی صاحب نے اپنے خدشات کا اظہار کیا ہو گا اور یہ بتایا ہو گا کہ کن لوگوں سے ان کی جان کو خطرہ لاحق ہے۔ وہ دوپہر کے بارہ بجنے والے تھے اور کسی نے نہ منہ دھویا تھا اور نہ ناشتا کیا تھا۔ باورچی خانے کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہاں ناشتا بنایا جا سکتا۔ میں نے رابعہ کی مدد کی اور اس نے صفائی شروع کی۔ غالب اس کی گاڑی لے کر حلوہ پوری لینے چلا گیا اور جاتے جاتے نازو کی ڈیوٹی لگا گیا کہ وہ اسپتال سے نرس شاہدہ کے گھر کا پتا معلوم کرے۔

حسب توقع شاہدہ کی کوئی خبر نہ تھی۔ وہ گزشتہ رات ڈیوٹی پر بھی نہیں آئی تھی اور کچھ لوگ اسے پوچھتے ہوئے اسپتال پہنچے تھے۔ اس کی تلاش پولیس کو بھی تھی کیوں کہ ڈی ایس پی صاحب کی بیگم نے اپنے ٹیپ ریکارڈر کی چوری کا کیس بنا دیا تھا اور اس نے شک ظاہر کرنے کے بجائے صاف شاہدہ کو چور قرار دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ باتھ روم میں تھی جب شاہدہ اس کے کمرے میں آئی تھی اور اس نے آواز سن کر دیکھا تو وہ ٹیپ ریکارڈر اٹھا کر نکل رہی تھی۔ نازو نے کرائم رپورٹر کی حیثیت سے فون کیا تھا اور یہ معلومات اسے دوسری نرس نے فراہم کر دی تھیں۔ جسے اپنی ہم پیشہ نرس سے ہمدردی تھی اور وہ اس کے بارے میں قسم کھانے کو تیار تھی کہ وہ چور نہیں ہو سکتی۔ اس نے ایک واقعہ بھی بتایا کہ اس نے کس طرح ایک مریض کے سات ہزار روپے لوٹا دیے تھے جو وہ

ڈسچارج ہوتے ہوئے کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔

ناشتے کے ساتھ غالب اخبارات بھی لے آیا تھا۔ ان سب میں ایک چھوٹی سی خبر نقوی صاحب کے بارے میں ان کی تصویر کے ساتھ چھپی تھی اور جیسا کہ غالب نے بتایا تھا کہ ان کی موت کو اسپتال والوں نے کوئی سازش یا قتل قرار نہیں دیا تھا۔ خبر میں تو یہ بھی واضح نہیں کیا گیا تھا کہ کسی نے انہیں کافی میں زہر دیا تھا بلکہ فوڈ پوائزننگ کا امکان ظاہر کیا گیا تھا۔ خوراک کے زہریلے اثرات کو کسی بھی چیز سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات آدمی غلطی سے ایسی چیز کھا لیتا ہے جو اسے موافق نہیں آتی۔ کوئی سالن میں غلطی سے نمک کے بجائے ڈی ڈی ٹی ڈال لے تو زہر خورانی کا کیس بن جائے گا۔

ڈاکٹر شیلی کی موت کی خبر اندرون صفحات میں لگائی گئی تھی جہاں مقامی خبریں نہیں ہوتیں۔ وہ صفحات ملک کے اندرونی علاقوں، چھوٹے قصبوں اور ضلعی نمائندوں کی رپورٹ کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ یہ عمداً ایک خبر کو دبانے کے لئے کیا گیا تھا اور جس نے بھی یہ کوشش کی تھی اس نے دھن یا دھونس کا دباؤ استعمال کیا تھا۔ خبر کے ساتھ تصویر بھی کوئی نہیں تھی اور خودکشی والی بات بالکل گول کر دی گئی تھی۔ صرف ایک اخبار نے لکھا تھا کہ ”پولیس کی تحویل میں مشکوک عورت کی خودکشی۔“ باقی سب وہی تھا جو پولیس اور اسپتال کی انتظامیہ کا مشترکہ موقف تھا کہ ملاقات کے اوقات میں کسی مریض کی عیادت کرنے جانے والی عورت اوپر سے گر کر ہلاک ہو گئی۔ وہ کہاں سے گری؟ کیسے گری؟ اس کا نام حلیہ سب گول کر دیا گیا تھا۔

تیسری اہم خبر کی طرف مجھے غالب نے متوجہ کیا۔ یہ وزارت داخلہ کے ایک ڈپٹی سیکریٹری کے امریکا سے واپسی پر ایڈیشنل ہوم سیکریٹری کی حیثیت سے تقرر کے بارے میں تھی۔ جناب بدرالحسن فاروقی اس وقت اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کرنے والے پاکستانی وفد کے رکن ہیں اور انہیں فوری طور پر [illegible] نقوی صاحب کا چارج لینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جن کا گزشتہ روز انتقال ہو گیا تھا۔

غالب نے ایک آہ بھری۔ ”ویسے تو مرنے والوں کو ہمیشہ کون یاد رکھتا ہے لیکن سرکاری نظام کی بے حسی پر تو انسانیت شرماتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں، وہاں ایک آدمی نہیں مرتا۔ ایک پوسٹ خالی ہوتی ہے۔ جس پر بہت سے آس لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اب انہیں ہوم سیکریٹری بننا تھا۔ نقوی صاحب کو۔۔۔ نہ جانے کتنے پہلے سے ان کے حلقہ بگوش بن چکے ہوں گے۔ آج اچانک وفاداری اور خدمت گزاری کے جذبات کا رخ بدرالحسن فاروقی کی طرف ہو گیا ہو گا۔ کل تک جو نقوی صاحب کے تلوے چاٹتے ہوں گے وہ اب ہار لے کر ایئرپورٹ پہنچ جائیں گے۔“

غالب نے کہا۔ ”اور افسری کا نشہ بھی ایسا ہے کہ آدمی اصل اور نقل کا فرق نہیں دیکھ سکتا۔ یہ نہیں سمجھتا کہ خوشامدی جو راگ الاپ رہے ہیں کیوں الاپ رہے ہیں۔ اسے یہ سرخ پیچ اور پھندنے لگتے ہیں اور اپنی ذات والا صفات لائق تحسین نظر آنے لگتی ہے۔“

غالب بولا۔ ”صاف ظاہر ہے کہ اب بدرالحسن فاروقی کو ریٹائر ہونے والے ہوم سیکریٹری کی جگہ لایا جائے گا۔ چنانچہ بیوروکریسی کا ایک گروہ اقتدار سے محروم ہو گیا، دوسرا گروہ جو اب تک معتوب یا ناپسندیدہ عناصر میں شامل ہو گا برسر اقتدار آ گیا۔ بہت سے لوگوں کے کام ہوتے ہوتے رک گئے۔ کچھ لوگ اب اقربا پروری اور دوست نوازی کا سلسلہ شروع کریں گے جیسے تاریخ میں ایک خاندان کی حکومت ختم ہوتی تھی اور دوسرا خاندان برسراقتدار آتا تھا تو سب کچھ بدل جاتا تھا۔ ایسے ہی وزارتوں میں ڈویژن اور سیکشن کی سطح پر افسران اعلیٰ کی تبدیلی سے ہوتا ہے۔ اب نیچے سے اوپر تک اتھل پتھل ہو گی۔ ایک سیکشن افسر جو کسی کا منظور نظر ہو گا۔ اسسٹنٹ سیکریٹری بن جائے گا۔ ایک اسسٹنٹ سیکریٹری جگہ لے گا بدرالحسن فاروقی کی۔ ظاہر ہے وہ اپنے آدمی کو ڈپٹی سیکریٹری بنائیں گے جو ان کے لئے مشکلات پیدا نہ کرے۔ اس کے لئے جوڑ توڑ اور بھاگ دوڑ تو اسی وقت شروع ہو گئی ہو گی جب نقوی صاحب اسپتال میں داخل ہوئے ہوں گے۔ پہلی کامیابی تو اسی گروہ نے حاصل کی ہو گی جس نے نقوی صاحب کو گھر سے اسپتال اور پھر قبرستان پہنچانے کا پورا انتظام کر لیا تھا۔

”اس لئے تو چھ مہینے کے اندر اندر پوسٹنگ ہو گئی ورنہ سرکاری عہدے مہینوں خالی پڑے رہتے ہیں اور ایڈہاک انتظام کے تحت کوئی قائم مقام دہرا چارج اپنے پاس رکھتا ہے۔“

”خلاصہ یہ کہ ہمیں بدرالحسن سے نیک توقعات وابستہ کرنے کی غلطی نہیں کرنی چاہئے۔“ غالب نے کہا۔ ”اب ہم چلتے ہیں۔ ہم سے مراد ہے میں اور نازو۔ ہم جائیں گے اسپتال اور ڈاکٹر شیلی کے بارے میں پیش رفت کا جائزہ لیں گے۔ نازو کو وہاں چھوڑ کر میں شاہدہ کا پتا چلاؤں گا۔“

دوپہر تک میں اخبارات کی ورق گردانی کرتا رہا۔ منظر نے نوکروں کا ایک معتبر جوڑا ارسال کیا تھا۔ ایک دیہاتی قسم کی بدصورت عورت تھی جو سمع خراشی کرنے والی پکی آواز میں بات کرتی تھی۔ اسے دعویٰ تھا کہ وہ پاکستانی ہی نہیں چینی کھانے بھی پکا سکتی ہے۔

میں نے کہا۔ ”بی بی! پکانا تو مجھے بھی آتا ہے ہر قسم کا لیکن جو میں پکاتا ہوں اسے کھانا سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔“

اس نے خاصا برا مانا۔ ”سوئی! انگلیاں نہ کھا جاؤ تو میرا ذمہ۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں بی بی! انگلیوں کے بعد تم کو کچھ کھا جاؤ... بات ہو رہی ہے تمہارے چینی کھانے کی۔ ایسا نہ ہو چین سے ہمارے سفارتی تعلقات خراب ہو جائیں۔ وہ بڑا دوست ملک ہے۔ مان جائیں کہ ہم ایسا کھاتے ہیں۔“

اس کا بھولا سا شوہر بہت کم گو تھا۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ ”ہمارا اسم گرامی ہے عاشق علی تڑپ۔“

میں نے تڑپ کے کہا۔ ”یعنی واہ! عاشق کے ساتھ تڑپ!“

وہ بولا۔ ”یہ ہمارا تخلص ہے۔ تخلص سمجھتے ہو آپ؟“

مجھے ہنسی آ گئی۔ ”نہیں، تمہاری ذات ہے کیا؟“

اس کی بیوی نے وضاحت کی۔ ”اجی شعر بناوے ہے کینٹ۔ انگوٹھا لگاوے ہے لیکن باتیں بڑی مشکل مشکل کرے ہے۔“

رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”باتیں تم سمجھا دینا۔ یہ بتاؤ کام کیا کرے گا؟“

”ہم بطریق احسن سب کچھ کر سکتے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”اندرونی و بیرونی معاملات سرانجام دے سکتے ہیں جو دیانت داری کے متقاضی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”معاملات کی تشریح فرمائیے۔“

”ہم انتظام سبزہ و گل سے جاروب کشی تک اور خرید و فروخت سے آداب میزبانی تک سب پر مہارت کا دعویٰ رکھتے ہیں۔“

رابعہ نے کہا۔ ”مطلب یہ کہ جھاڑو دے سکتے ہو۔ مالی کا کام کر سکتے ہو۔ بازار سے سودا سلف لا سکتے ہو۔“

اس نے خاصا احتجاجی تاثر دیا لیکن خاموش رہا۔ اگلا مرحلہ معاوضے کا تھا۔ بیوی اپنے سرتاج پر غالب تھی اور خود پاؤں کی جوتی بن کے رہنے کے بجائے اسے جوتی کی نوک پر رکھتی تھی۔ وہ مولا قلندر قوت برداشت اور عفو و درگزر سے کام لینے میں بھی جواب نہیں رکھتا تھا۔ بعد میں اس نے اپنی خاندانی تاریخ اظہار سے واضح کیا کہ علوم شرقیہ اور شعر و سخن پر اس کی دسترس کا سبب والد ماجد تھے جو مدرسے میں عربی فارسی پڑھاتے تھے لیکن شاعری کے اور شاعروں کے دشمن تھے۔ ”انہیں وہ غیر شرعی اور افعال قبیح گردانتے تھے۔“ اس نے بتایا۔

ابھی تک میری ہمت نہیں پڑی تھی کہ وقار یوسف سے اور اس کی بیوی سے تعزیت کروں۔ خود رابعہ کو یقین نہیں تھا کہ اب ان کی جذباتی کیفیت کیا ہو گی۔ ان کے گھر پر تعزیت کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا چنانچہ وقار یوسف بھی مصروف تھا ورنہ وہ آ جاتا تو میں اس کے سامنے ساری صورت حال کی وضاحت کرتا۔ یہ بد اخلاقی بہرحال تھی چنانچہ میں نے رابعہ کے گھر سے ٹیلیفون کیا۔ ایک لائن انگیج مل رہی تھی۔ دوسرے نمبر پر وقار نے ریسیور اٹھا لیا۔

میں نے کہا۔ ”وقار... یار مجھے افسوس ہے۔“

اس نے چند سیکنڈ کے بعد کہا۔ ”سوری۔ رانگ نمبر۔“ اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے رابعہ سے کہا۔ ”وہ تو شاید بات بھی نہیں کرنا چاہتا مجھ سے۔ اس کی بیوی کے جذبات کا خود اندازہ کر لو۔“

رابعہ نے کہا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہاں کوئی ہو گا جس کی موجودگی میں اس نے تم سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نقوی صاحب کے دونوں فون ٹیپ ہو رہے ہوں۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو۔ وہ سمجھدار ہیں دونوں۔“

رابعہ کی بات ٹھیک تھی۔ آدھے گھنٹے بعد کار کا ہارن سنائی دیا تو رابعہ نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ ”وہ آ گئے۔“

میں نے گیٹ کھولا۔ وہ چمکتی دمکتی سیاہ کیڈلاک جو نقوی صاحب کے زیر استعمال تھی سرسراتی ہوئی اندر آ گئی۔ میں نے گیٹ بند کیا اور وقار یوسف کی بیوی کو گاڑی سے اتر کر اندر جاتے ہوئے دیکھا۔ وقار میرا انتظار کر رہا تھا۔

”سوری سکندر صاحب! لیکن تمہیں فون نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ہر کال ٹیپ ہو رہی ہے۔ نرے پراسرار قسم کے لوگ کوٹھی کے چاروں طرف منڈلاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں اور تعزیت کے لئے آنے والے بھی نہ جانے کون ہوتے ہیں، میں تو سب کو پہچانتا بھی نہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ انہوں نے گھر کے اندر بھی خفیہ مائکرو فون وغیرہ لگا دیئے ہوں گے۔ بہانہ ہے تفتیش کا۔“ وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ”ڈرامہ تو ضرور ہو گا بھائی۔ اور ڈرامہ کرنے والے وہی لوگ ہوں گے جو نقوی صاحب کے وجود کو حرف غلط کی طرح مٹانا چاہتے تھے۔ تمہاری بیوی تو مجھے ہی قصوروار سمجھتی ہو گی۔“

”تمہیں تو نہیں۔ لیکن شیلی کو سمجھتی ہے۔“

”شیلی کو میں ہی لے کر گیا تھا۔“

”وہ سمجھتی ہے کہ شیلی نے تمہیں دھوکا دیا تھا۔ یہ غلطی ضرور ہے تمہاری کہ تم نے اسے نہیں سمجھا اور اس پر اعتبار کر لیا۔“

”مجھے ڈر لگتا ہے۔ اس کے سامنے جاتے ہوئے۔“

وقار نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ آئیں میرے ساتھ۔“

میں اندر گیا تو رابعہ فون اٹھائے کھڑی تھی۔ ”کیا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ نہیں میں تم کو غلط نہیں کہہ رہی ہوں... لیکن غالب... اسپتال سے لاش کہاں جا سکتی ہے... اور اس لاش کا ابھی پوسٹ مارٹم تک نہیں ہوا تھا... اس کے لئے تو حفاظتی اقدامات کرنے بھی ضروری تھے۔ پولیس کا پہرا ہو گا۔ نہیں تھا... یہ تو بڑی بے قاعدگی ہے۔ خیر تم جیسا مناسب سمجھو کرو... دھاندلی ہے یا لاقانونیت مگر غیر متوقع کچھ بھی نہیں ہے۔“

رابعہ نے ریسیور رکھ کر میری طرف دیکھا۔ ”شیلی کی لاش

www.paksociety.com

اسپتال میں نہیں ہے۔"

"پھر کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

رابعہ کے جواب دینے سے پہلے ہی کال کٹ گئی۔ وقار یوسف اندر اپنی بیوی کے پاس چلا گیا تھا۔ وہ تعزیت کرنے والوں سے گھبرا کر ادھر آ گئے تھے۔ وقار یہ بھی چاہتا تھا کہ اپنی بیوی کو اس سوگوار ماحول سے نکال لے۔

رابعہ نے کہا "ایمبولنس آئی ہے۔ میرا خیال ہے چوکیدار کو لائی ہوگی۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں مگر اتنی جلدی اسے کیوں ڈسچارج کر دیا۔"

میں نے کہا "میں دیکھتا ہوں۔"

ایمبولنس اندر آئی تو ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا "مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ کا بنگلا یہی ہے۔"

میں نے کہا "ہاں، ان کے چوکیدار کو لائے ہو؟"

"اس نے پوچھا۔ "آپ سکندر بخت صاحب ہو!"

میں نے جواب دینے سے گریز کیا۔ "اندر آجانے کے بعد یہ سارے سوال کرنا ضروری ہیں؟"

ڈرائیور نے کہا "صاحب! لاش ہے ڈاکٹر شیلا خان کی۔ آپ وصول کر لیں۔"

میں نے ایمبولنس کا دروازہ کھولا۔ اصولاً مجھے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ گیٹ ابھی کھلا ہوا ہی تھا اور میں شیلا کی یخ بستہ لاش کو دیکھ رہا تھا جو چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور سوچ رہا تھا کہ اس خطرناک چال کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ اسی وقت وقار یوسف کی بیوی بھی پہنچ گئی تھی جو شیلا کو اپنے باپ کا قاتل سمجھتی تھی۔

رابعہ اور وقار ایک ساتھ باہر آئے۔ اسی وقت گیٹ سے پولیس کی ایک گاڑی اندر آ گئی۔ ایمبولنس کا پیچھے والا دروازہ کھلا ہوا تھا اور شیلا کی لاش سامنے تھی۔

صورتِ حال کی سنگینی ایک دم مجھ پر عیاں ہو گئی تھی مگر اس وقت رابعہ کی حاضر دماغی نے یا میری قسمت نے مجھے بچا لیا۔

رابعہ نے مجھے ڈانٹ کے کہا "جناب عاشق علی ترپ صاحب! یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ کیوں آئی ہے ایمبولنس؟"

میں نے اندازہ کر لیا کہ ایمبولنس کے ساتھ آنے والی پولیس کی گاڑی میں اس علاقے کے تھانے سے تعلق رکھنے والے لوگ نہیں ہیں اور وہ مجھے نہیں پہچانتے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ایمبولنس ڈرائیور کے سوال کے جواب میں میں نے خود کو سکندر بخت تسلیم نہیں کیا تھا۔

میں نے مضحکہ خیز آواز میں مظلوم لہجے میں کہا "بیگم صاحب۔ ہم تو بس حاضر ہونے ہی والے تھے" اور سر جھکا کے اندر چل پڑا۔

رابعہ آگے بڑھ گئی۔ "کیا بات ہے بھئی؟"

ایمبولنس ڈرائیور نے ایک نظر اسے دیکھا پھر پیچھے آنے والی پولیس کی گاڑی کو "میں نے بتایا تھا بیگم صاحب ان کے ــــــ"

"وہ تو ملازم تھا۔ مجھے بتاؤ۔"

اب وقار یوسف نے کہا "تم لوگ کیا لینے آئے ہو؟" وہ جیپ سے اترنے والے سب انسپکٹر سے مخاطب تھا۔

سب انسپکٹر نے کہا "تم ہو سکندر بخت؟"

وقار یوسف نے متانت سے انگریزی میں کہا "فرض کرو میں ہوں لیکن انکار کرتا ہوں پھر تم کیا کرو گے؟"

سب انسپکٹر تھوڑا سا پریشان ہوا۔

وقار نے ایک دم دہاڑ کے کہا "تم کس کی اجازت سے اندر آئے ہو؟ کیا یہ شارع عام ہے؟ تمہیں نظر نہیں آتا کیا لکھا ہے تمہارے پاس۔ منہ اٹھا کے اپنی فوج کے ساتھ کسی کے گھر چڑھائی کرنا تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ نہیں جانتے تم؟"

سب انسپکٹر نے کہا "زیادہ گرمی کھانے کی ضرورت نہیں، میں ڈیوٹی پر ہوں اور وردی میں ہوں۔"

"یہ سب مجھے مت بتاؤ۔ میں وقار یوسف ایڈووکیٹ ہوں، مجھے معلوم ہے کہ پولیس کے فرائض اور وردی کے اختیارات کی حد کیا ہے اور میرے ساتھ یہ ہیں رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ"

وقار یوسف بگڑ گیا۔ "تم نے ٹریس پاس کیا ہے۔"

رابعہ قادری نے کہا "وقار، میں بات کر لیتی ہوں۔"

سب انسپکٹر کی جان میں جان آئی "آپ کے شوہر تو..."

"شٹ اپ۔ زبان سنبھال کے بات کرو" رابعہ نے کہا۔ "میرا بھائی ہے۔"

سب انسپکٹر کی پوزیشن پھر خراب ہو گئی "سوری۔ میں نے سمجھا۔"

"تمہارے پاس کوئی خانہ تلاشی کا وارنٹ ہے؟" رابعہ نے پوچھا۔

"وارنٹ؟"

"وارنٹ نہیں سمجھتے۔ ملازمت کرتے کتنا عرصہ ہو گیا؟"

"وارنٹ تو نہیں ہے لیکن..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" وقار نے چٹکی بجا کے کہا "اپنی گاڑی باہر لے جاؤ۔ آؤٹ۔"

"اور اگر میں نہ لے جاؤں تو؟" سب انسپکٹر گرم ہو گیا۔

"تو میں فون کرتا ہوں ایس ایس پی کو۔ تمہارا نام اور گاڑی نمبر بتانا کافی ہوگا۔"

سب انسپکٹر نے لہجہ بدلا "جناب۔ ایک عرض سن لیں۔"

"سب سنوں گا لیکن باہر۔ تمہارے گھر میں داخل ہونے کا جواز کوئی نہیں۔ پہلے باہر جاؤ۔ تم شرافت سے گھنٹی بجا کے

مرضی سے اندر آتے تو میں بداخلاق نہیں ہوں۔ تمہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کے تم سے بات کرتا لیکن تم نے وردی کی رعونت دکھائی۔ مجھے بتاؤ ایسے ہی کوئی تمہارے گھر میں گھس جائے تو تم کیا کرو گے؟"

رابعہ نے کہا "چلو جانے دو وقار۔ یہ لوگ اپنی فرعونیت میں ایسی غلطی کر جاتے ہیں۔"

وقار بڑبڑانے لگا "وردی پہن کے قانون کے محافظ بن جاتے ہیں۔ قانون کا خاک پتا نہیں۔"

میں ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے لگ کے سن رہا تھا اور تماشا پردے کی اوٹ میں تھا۔

سب انسپکٹر نے کہا "بیگم صاحب۔ اس ایمبولنس میں لاش آئی ہے۔"

"لاش؟ کس کی لاش۔ کیا میرا چوکیدار مر گیا؟" رابعہ نے پریشان ہو کے کہا۔

"چوکیدار" سب انسپکٹر چکرا گیا "نہیں جی۔ کون چوکیدار؟"

"پھر کس کی لاش ہے؟ اسپتال میں تو میرا چوکیدار ہی داخل تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے زخمی ہو گیا تھا۔"

سب انسپکٹر نے کہا "جناب۔ اس میں کسی عورت کی لاش ہے۔"

ایمبولنس ڈرائیور ابھی تک احمقوں کی طرح خاموش کھڑا پریشان ہو رہا تھا۔ "ڈاکٹر شیلا خان کی لاش ہے بیگم صاحب۔ میں نے آپ کے اس نوکر کو بتایا تھا۔"

"شیلا خان کی لاش۔ یہاں کیوں لائے ہو؟" رابعہ نے کہا۔

"وہ جی۔ سکندر بخت صاحب ہیں نا یہاں... ان..."

"تم پاگل ہو یا نشے میں ہو۔ کس نے کہا تھا تم سے کہ سکندر بخت نام کا کوئی شخص یہاں رہتا ہے؟" وقار یوسف نے یہ ظاہر کیا کہ وہ غصے کا بہت تیز ہے۔

ڈرائیور گڑبڑا گیا "سر۔ آپ مجھ پر ایسے ہی غصہ ہو رہے ہیں۔ مجھے تو کہا گیا تھا کہ یہ لاش اس پتے پر پہنچا دو۔ دیکھ لیں پتا یہی ہے۔"

وقار یوسف نے سلپ لے لی "پتا تو ٹھیک ہے۔ کس نے دیا ہے تمہیں؟"

"اسپتال والوں نے سر۔ انہوں نے کہا تھا کہ سکندر بخت صاحب سے دستخط کرا لینا۔" ڈرائیور بولا۔

"یہ کیا چکر ہے؟" رابعہ نے وقار یوسف کی طرف دیکھا "انسپکٹر صاحب تمہیں معلوم ہے کچھ؟"

سب انسپکٹر نے ٹوپی اتار کے رومال سے سر صاف کیا۔ وہ عمر رسیدہ شخص تھا جس کا سر درمیان سے صاف ہو چکا تھا "آپ کو نہیں معلوم؟"

وقار یوسف نے کہا "تم کیا چیز ہو یار۔ معلوم ہوتا تو تم سے پوچھتے؟ اسی لیے تسلی نہیں کی تم نے۔ یہ عمر ہو گئی ابھی تک عقل آئی ہو۔"

"آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں میرے ماتحتوں کے سامنے۔ وکیل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے۔"

"میری بہن نے جو رعایت دی ہے وہ کافی ہے۔ شکریہ ادا کرو اور جاؤ۔ عزت اور بے عزتی کے چکر میں مت پڑو۔ مجھے جرم تم نے کیا ہے بلا اجازت اندر آ کے۔ میں نے نہیں۔"

"وقار۔ پلیز مجھے بات کرنے دو۔ تم اندر جاؤ۔" رابعہ نے اسے بڑی بہن کی طرح ڈانٹا۔

سب انسپکٹر نے ایک گہری سانس لی "بیگم صاحب۔ اسپتال میں کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ دو آدمی مُردہ خانے میں گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ڈاکٹر شیلا خان کی لاش لینے آیا ہوں۔ مُردہ خانے میں اس وقت صرف ایک ہی بندہ تھا۔ اس نے کہا کہ لاش لے جانے کی اجازت تو صرف انچارج صاحب ہی دے سکتے ہیں۔ وہ انچارج کو لے آیا۔ انچارج ایک ڈاکٹر ہے۔ اس نے لاش دینے سے انکار کیا اور کہا کہ اس کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔ ویسے بھی یہ پولیس کیس ہے اور ابھی تفتیش ہو رہی ہے۔ ان میں سے ایک نے ڈاکٹر کو ہاتھ مار کے لمبا لٹا دیا۔ اس نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں تھا۔ دوسرے بندے کو انہوں نے ریوالور سے ڈرا کے کہا کہ لاش کہاں ہے؟ سیدھی طرح ہمارے حوالے کر دو ورنہ تم بھی یہیں پڑے نظر آؤ گے۔ وہ بے چارا ڈر گیا۔ اس نے سرد خانے سے لاش نکلوائی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جیسا ہم چاہتے ہیں ایسا ہی کرتے جاؤ۔ لاش وارثوں کے حوالے کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ اسی کے مطابق چلو۔ کسی رجسٹر میں کچھ لکھنا ہے تو لکھو۔ کوئی فارم بھرنا ہے تو بھرو۔ ایمبولنس منگواؤ اور لاش رکھوا دو۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم ہے۔"

وقار نے کہا "وہ زبردستی لاش لے گئے۔ کوئی روکنے والا نہیں تھا انہیں؟"

"لے کہاں گئے۔ یہاں بھیج دی" رابعہ بولی۔

"سر وہاں جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ پوسٹ مارٹم تو ایک قانونی ضرورت ہے۔ آپ کو معلوم ہے" سب انسپکٹر نے پھر ماتھے سے پسینہ صاف کیا "بہت سے لوگ پوسٹ مارٹم نہیں کراتے۔ مخالفت کرتے ہیں اور شور مچاتے ہیں کہ لاش کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ ویسے ٹھیک بھی ہے۔ جو بندہ سڑک پر حادثے میں مر گیا۔ کسی گاڑی کے نیچے آ گیا یا کسی نے خودکشی کر لی، ٹرین کی پٹری پر لیٹ گیا تو پوسٹ مارٹم سے کیا فائدہ جی۔"

"کمال ہے۔ تم پولیس میں واقعی بھاڑ جھونکتے رہے۔ او میاں تمہاری دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔ بندے کو مار کے سڑک پر ڈال دیتے

www.paksociety.com

ہیں یا ریلوے لائن پر کہ رات کو بس، ٹرک یا ٹرین گزرے گی تو لگے گا حادثہ تھا یا خودکشی کا کیس بن جائے گا۔ پوسٹ مارٹم سے ہی پتا چلتا ہے کہ بندہ پہلے مرا تھا اور پھر اسے گاڑی کے آگے یا پٹری پر ڈالا گیا تھا۔"

"لعنت... ہم تو سمجھتے ہیں جی۔ میں لوگوں کی بات کر رہا تھا۔ اکثر جھگڑے ہوتے ہیں وہاں اور بعض اوقات زبردستی بھی لے جاتے ہیں لوگ لاش۔ جھگڑا بھی ہو جاتا ہے۔ وہ چار سو روپے کر خانہ پُری کراتے ہیں پھر چیر پھاڑ کے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا فارم بھروا کے ہیں اور لاش لے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کو معلوم تھا یہ کیا کیس ہے۔ دوسرا بندہ تو معمولی ملازم تھا۔ اس نے وہی کیا جو اسے کہا گیا تھا۔ جو لاش لے جانے آئے تھے ان میں سے ایک نے اسپتال کی ایمبولینس منگوائی کہ لاش گھر لے جانی ہے۔ اس ڈرائیور نے بھی دیکھا ہوگا اسے۔"

ڈرائیور چیخ اٹھا "بادشاہو۔ میرا کیا قصور ہے۔ اسپتال میں روز مرتے ہیں لوگ۔ ہم تو سارا دن یہی کام کرتے ہیں۔ مریض کو گھر سے لانا۔ کوئی فوت ہو جائے تو گھر پہنچانا۔"

"ہاں ہاں۔ معلوم ہے ہمیں لیکن شناخت کے لیے تو تمہیں بلا لیں گے ہم" سب انسپکٹر نے غرا کے کہا اور پھر رابعہ سے مخاطب ہو گیا "دوسرا بندہ مردہ خانے میں تھا۔ اس نے پرچی دی تھی۔"

ڈرائیور نے کہا "اس نے مجھے پرچی دی اور کہا کہ وہاں تمہیں سکندر بخت صاحب ملیں گے۔ ان سے دستخط کرا لینا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ کیا ڈراما چل رہا ہے۔ میں گاڑی لے کر روانہ ہو گیا۔"

"ان کے جاتے ہی مردہ خانے کا ملازم شور مچاتا بھاگا اور اس نے دوسرے لوگوں کو بلا لیا۔ جو ڈاکٹر بے ہوش پڑا تھا اسے تو وارڈ میں لے گئے تھے۔ ہم شعبۂ حادثات کے سامنے کھڑے تھے۔ ایک بلوہ ہو گیا تھا۔ اس میں دو بندے مرے تھے کچھ زخمی ہوئے تھے ان کو لے کر آئے تھے۔ ہم سے کہا گیا کہ اس ایمبولینس کے پیچھے جاؤ۔ وہ بھی ابھی نکلی ہے۔ ہمیں پتا بھی بتا دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ سکندر بخت جو بھی ہو اسے پکڑ لانا۔"

"تم ہر ایک کا حکم مان لیتے ہو؟" وقار نے طنز سے کہا۔

"نہیں جی۔ وہاں پہلے سے ایک ڈی ایس پی صاحب موجود تھے انہوں نے حکم دیا تھا۔" سب انسپکٹر بولا "اب ہماری تو مصیبت ہے نا جی۔ افسر کا حکم نہیں مانتے۔ یہاں آ گئے تو آپ نے بے عزت کر دیا۔"

رابعہ نے کہا "دیکھو۔ یہ تو جو کچھ بھی ہوا غلط ہوا۔ اب تم ایسا کرو کہ یہ لاش واپس لے جاؤ۔ بلکہ ایک منٹ ٹھہرو۔ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ ایسا نہ ہو راستے میں کوئی گڑبڑ ہو جائے۔"

وقار یوسف نے کہا "میں بھی چلوں گا ساتھ۔"

سب انسپکٹر نے کہا "بڑی مہربانی ہوگی جناب۔ میری جان چھوٹ جائے گی۔"

ڈرائیور نے بھی کہا "میں تو غریب آدمی ہوں جی۔"

رابعہ نے اسے تسلی دی "کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔ میں اسپتال والوں سے بھی بات کر لوں گی اور انہیں سمجھا دوں گی کہ کیا مذاق کیا ہے یا پھر غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہاں کوئی سکندر بخت نہیں رہتا جسے ڈاکٹر شیلا خان کی لاش کی ضرورت ہو۔"

میں نے دل ہی دل میں رابعہ کی فہم و فراست کی داد دی۔ اس نے بڑی صفائی سے مجھے بچا لیا تھا اور اب لاش لے کر آنے والی ایمبولینس اور پولیس کے ساتھ اسپتال جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس طرح واپسی کے سفر میں لاش کے غائب ہو جانے کا احتمال نہیں رہا تھا۔ جس نے بھی کوشش کی تھی کہ شیلا خان کے نام کے ساتھ میرا نام شریک جرم کے طور پر آئے اس نے مجھے مجرم ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ڈاکٹر شیلا خان میرے ساتھ تھی جس نے دل کے رفیق کا قتل کیا تھا اور اس کی لاش غائب کر دی تھی۔ یہ بھی فرض کیا جا سکتا تھا کہ میں نے ہی نقوی صاحب کو گھر میں زہر دینے کی کوشش کی اور میری ناکامی کے بعد یہ کام ڈاکٹر شیلا خان نے پورا کیا۔ اب میں نے اس کی لاش حاصل کرنے کے لیے مردہ خانے میں ہنگامہ کیا۔ اکثر مجرم اپنے ساتھی کی لاش نہیں چھوڑتے کہ کہیں لاش سے ان کا سراغ نہ مل جائے۔

کرنے والوں نے سب ٹھیک ہی کیا تھا۔ انہوں نے مردہ خانے کے ڈاکٹر کو ایک بار مار کے لٹایا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ آدمیوں میں سے ایک جوڈو کراٹے سے واقف تھا۔ اس طرح شک کا رخ فوراً میری جانب ہو جاتا تھا کیونکہ میں خالی ہاتھوں سے اپنا دفاع کرنے میں شہرت رکھتا تھا۔ غلطی ان سے صرف ایک ہوئی تھی جو بہت بڑی غلطی تھی۔ انہوں نے ڈرائیور کو سکندر بخت کا نام بتایا تھا کہ اس سے لاش کی وصولی کی دستاویز پر دستخط کرا لینا۔

اول تو کوئی اور میرے دستخط نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے مجھ سے اس حماقت کی توقع میرے دشمن بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر اسپتال کے مردہ خانے سے لاش لے جانے والا سکندر بخت تھا تو اس نے وہیں دستخط کیوں نہ کر دیے اور سکندر بخت کا آدمی تھا تو اسے سکندر بخت کا نام بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ سکندر بخت اتنا احمق بہرحال نہیں تھا کہ شیلا کی لاش اٹھا کر رابعہ کی کوٹھی پہ لے جاتا۔

یہ چالاکی کی غلطی تھی یا اس طرح ایک خبر بنانا مقصود تھا جس میں پھر ڈاکٹر شیلا خان کے نام کے ساتھ میرا نام آتا۔ رابعہ بدنام ہوتی اور یہ پتا چل جاتا کہ میں اسی کوٹھی میں ہوں۔ قسمت نے مجھے بچا لیا ورنہ یہ ثابت ہو جاتا کہ مجھے رابعہ نے چھپا رکھا ہے۔

رابعہ کی گاڑی کو وقار یوسف نے ڈرائیو کیا اور تینوں گاڑیاں

آگے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ شاید رابعہ نے تاکید کی تھی کہ پولیس اپنی گاڑی آگے رکھے اور ایمبولینس درمیان میں رہے۔ وہ خود سب سے پیچھے تھی۔ ایمبولینس کے لیے فرار ہونے یا راستہ بدلنے کا موقع نہیں رہا تھا اور یہ امکان بھی کم ہو گیا تھا کہ واپسی میں کوئی لاش چھین لے اور ایمبولینس ڈرائیور اپنی جان بچانے کے لیے مجبور ہو جائے کہ وہ تو لاش رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی کوٹھی پر سکندر بخت کے حوالے کر آیا تھا۔ نہ وہ سکندر بخت کو پہچانتا تھا اور نہ یہ تصدیق کر سکتا تھا کہ اس نے اپنے دستخط ٹھیک کیے یا غلط۔ وقار یوسف ریوالور بھی ساتھ لے گیا تھا۔

وقار یوسف کی بیوی تو پہلے ہی ڈپریشن کا شکار تھی۔ وہ یہاں سکون کی تلاش میں آئی تھی۔ وہ ہم سب کو اپنا سمجھتی تھی اور رسمی تسلی کے کھوکھلے الفاظ بولنے والوں کے سامنے دل کھول کے نہیں رکھ سکتی تھی۔ بعض اوقات آدمی ایک مخلص اور حقیقی غمگسار چاہتا ہے۔ لوگوں کی بھیڑ میں اسے سب ہی مصنوعی جذبات رکھنے والے لوگ نظر آتے ہیں جن کے سامنے درد دل بیان کرنا بھی وقت کا زیاں محسوس ہوتا ہے۔

لیکن یہاں تک کہ وقار کی بیوی کو نئی پریشانی سے واسطہ پڑ گیا۔ اب اس کی دلجوئی کے لیے نازو تھی یا میں تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ان حالات میں وہ مجھ پر اعتماد کرے گی لیکن میرا دل صاف تھا اور میرا ضمیر مطمئن تھا۔

وہ نازو کے سامنے چپکے چپکے رو رہی تھی کہ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ میں نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں؟"

وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "یہ سب میری وجہ سے ہوا بھائی۔"

میں نے اس کے سر پر محبت سے تھپکی دی "یہ تو مجھے کہنا چاہیے۔ اسی خیال نے مجھے تمہارے سامنے مجرم بنا دیا ہے۔"

اس نے میرا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا "ایسا مت کہیں خدا کے لیے۔"

میں نے کہا "کہنے کو کہا جا سکتا ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے لیکن میں خود کو قصوروار سمجھتا ہوں کہ تم سے تمہارا باپ چھین لیا۔"

"سکندر بھائی۔ مرنا تو ایک دن سب کو ہے" اس نے سسکیوں کے درمیان کہا "اور کس کے والدین ہمیشہ رہتے ہیں لیکن آپ خود کو مجرم سمجھتے ہیں تو آپ سے زیادہ میں مجرم ہوں۔ میں نے انہیں مجبور کیا تھا کہ آپ کے خلاف مقدمات کو ختم کریں۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کی سب سے بڑی کمزوری میں ہوں۔ وہ میری بات ٹال ہی نہیں سکتے تھے۔ شروع سے مجھے ان کے لاڈ نے بگاڑ دیا تھا۔ میں ناز نخرے کرتی تھی اور وہ اسے پورا کرتے تھے۔ میں روٹھ جاتی تو وہ اداس ہو جاتے تھے۔ میں روتی تھی تو وہ تڑپ اٹھتے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو وہ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ اب میں کتنا رو رہی ہوں مگر وہ چپ لیٹے ہیں اپنی قبر میں۔"

ایک دم اس کے آنسوؤں کا زبردست ریلا آیا۔ یہ خیال بھی اس کے لیے بڑا دکھ دینے والا تھا کہ جو باپ اس کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا وہ اس کو یوں روتا دیکھنے کے لیے موجود نہیں اور اس کے آنسو رائیگاں جا رہے ہیں جن کی وہ منہ مانگی قیمت وصول کر سکتی تھی۔

نازو نے اسے خاموش کرانے کی کوشش کی۔ وہ خود بھی اس کے ساتھ رو رہی تھی۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ ان آنسوؤں کو بہہ جانے دوں۔ بند باندھنے سے وقتی طور پر دریا کی روانی رک جاتی ہے مگر پیچھے جمع ہو جانے والا پانی اپنی قوت سے بند کو توڑ ڈالے تو پھر سب کچھ بہا لے جاتا ہے اور یہ آنسوؤں کا دریا تو موسمی ندی کی طرح ہوتا ہے۔ دکھ کا موسم گزر جائے تو خود ہی خشک ہو جاتا ہے۔

میرے سامنے اس کا احساسِ غم تازہ ہو گیا تھا۔ یہ ایک فطری بات تھی۔ غیروں کے مقابلے میں اپنا پہلی بار سامنے آئے تو زخم دل سے پھر لہو رسنے لگتا ہے۔ اس کا مشاہدہ روز مرہ کی زندگی میں ہوتا ہے۔ کسی مرنے والے کو رو دھو کے اور دفنا کے گھر والے خاموش ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں اچانک باہر سے کوئی بیٹا یا بھائی پہنچ جائے تو نئے سرے سے سب اس کے گلے لگ کر رونے لگتے ہیں۔

اس کا موڈ بدلنے کے لیے میں نے نازو سے کہا "کھانے کا تو ابھی کوئی موڈ نہیں ہے۔"

نازو نے وقار کی بیوی کو دیکھا "تم نے کچھ ناشتا وغیرہ کیا تھا؟"

"ہاں کیا تھا" وہ بولی "مگر کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

"اچھا تو میں کافی لے آتی ہوں" نازو نے کہا۔

وقار کی بیوی نے باتھ روم میں جا کے منہ دھویا اور پھر میرے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔ "سکندر بھائی۔ جتنا دکھ ہے وہ اپنی جگہ لیکن ایک عجیب سا سکون ملتا ہے یہ سوچ کر کہ انہوں نے ایک مقصد کے لیے جان دی۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ بیٹھے بیٹھے ان کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ لوگ حادثات کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ امی کو دیکھیں کتنے عرصے سے بستر پر مفلوج پڑی ہیں۔ انہیں ابھی تک کسی نے نہیں بتایا کہ ان کا رفیق سفر بچھڑ گیا ہے۔ کیا فائدہ انہیں مزید دکھ دینے کا۔ رفاقت کا احساس اگر ہے تو ان کے ذہن میں۔ اسے کیوں چھینا جائے۔ وہ خود کو سہاگن سمجھتی رہیں۔ جب تک زندہ ہیں۔ بیوہ ہو کے ہر عورت کی چمک ہو جاتی ہے۔ ان کی تو بات ہی الگ ہے۔ ڈیڈی نے بڑی ترقی کی تھی۔ وہ کلرک بھرتی ہوئے تھے۔ کچھ اور جیتے تو ہوم سیکریٹری بھی ہو جاتے مگر اس مقام تک پہنچنا بھی کیا کم تھا۔ ان کا بیک گراؤنڈ تو ایسا تھا کہ انہیں کوئی مدد نہیں ملی۔"

میں نے کہا "میں ان کے متعلق واقعی کچھ نہیں جانتا۔"

"ان کے والد موچی تھے۔ انڈیا میں جہاں ان کا گھر تھا اسی گلی کے نکڑ پر بیٹھتے تھے۔ ایک لکڑی کا باکس ان کا کل سرمایہ تھا۔ وہ جوتے بناتے نہیں تھے۔ مرمت کرتے تھے۔ کسی کا تلا لگایا کسی کی

www.paksociety.com

ایڑی ٹھونک دی۔ کہیں سے سلائی اُدھڑ گئی تو اسے ٹھیک کروا لیا۔ اس زمانے میں غریب لوگ چمڑے کا جوتا بار بار نہیں خرید سکتے تھے وہ اوپر والے حصے پر سوراخ ہو جانے کی صورت میں پیوند بھی لگوا لیتے تھے۔"

میں نے کہا "غریب آج بھی ایسا ہی کرتے ہیں اور اسی شہر کی نہ جانے کتنی گلیاں ہوں گی جن کے نکڑ پر ایسے ہی جوتے مرمت کرنے والے اسی طرح اپنا پیٹ پال رہے ہیں۔"

"سچ کہا آپ نے سکندر بھائی۔ بس اب ہماری نظر نہیں جاتی ان پر۔ ہم ان گلیوں اور بستیوں سے بہت دور آ گئے ہیں! لیکن آج میں سوچتی ہوں کہ وہ کیا کمائی کرتے ہوں گے آج تو مہنگائی ہے۔"

میں نے کہا "مہنگائی کب نہیں تھی۔ کبھی لوگوں نے کہا کہ بھئی بڑا سستا زمانہ آ گیا ہے۔ وہ تو جب چیزوں کی قیمت چڑھتی ہے تب پچھلے زمانے کو سستا کہنے لگتے ہیں ورنہ گزارا کرنے والے اس وقت بھی گزارا کر لیتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں۔ گلی کے نکڑ پر بیٹھا ہوا موچی زیادہ قوت برداشت رکھتا ہے۔ وہ مقدر سمجھ کے غربت سے سمجھوتا کر لیتا ہے اور صبر شکر سیکھ جاتا ہے۔ مہنگائی کا رونا وہ زیادہ روتا ہے جس کے پاس کوٹھی ہے اور کار ہے۔ گورنمنٹ نے ٹیکس بڑھا دیا۔ پیٹرول کی قیمت بڑھا دی۔"

"یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ نوکروں کے نخروں کی بات کرتے ہیں۔ شکایت کرتے ہیں کہ نوکروں کا دماغ خراب ہو گیا ہے اتنے منہ پھاڑ کے پیسے مانگتے ہیں۔ خود کو نہیں دیکھتے کہ خدا نے کتنا دیا ہے۔ ان کا گزارا نہیں ہوتا تو بے چارا نوکر کیسے گزارا کرتا ہو گا۔ ڈیڈی کے والد نے بڑی محنت سے کام لے کے انہیں پڑھایا۔ چاہتے تو اپنے ساتھ جوتے گانٹھنے کے لیے بٹھا لیتے مگر وہ کہتے تھے کہ ایسے تو ایک کے بعد دوسری نسل یہی کام کرتی رہے گی اور کبھی کسی کی حالت نہیں بدلے گی۔ ڈیڈی بتاتے تھے کہ جب انہوں نے بی اے کیا تھا تو بڑا بے روزگاری کا زمانہ تھا۔ گریجویٹ واقعی بوٹ پالش تک کرتے تھے۔"

میں نے کہا "بڑے ہمت والے اور قابل تعریف ہوتے ہیں وہ لوگ جو ڈگری بھی رکھتے ہیں اور عزت نفس بھی لیکن محنت کر سکتے ہیں۔"

"جب ڈیڈی کو کلرکی ملی تو گویا بادشاہت مل گئی تھی۔ وہ بتاتے تھے کہ محلے میں مٹھائی تقسیم کی گئی تھی۔ لوگ بڑے رشک و حسد کے ساتھ کہتے تھے کہ دیکھو جی موچی کا لونڈا تو بابو بن گیا۔ اس کے بعد تو سب کچھ بدل گیا۔ اب کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ڈیڈی یعنی نقوی ایڈیشنل ہوم سیکریٹری کے ڈیڈی جوتے گانٹھتے تھے۔ پاکستان آ جانے کے بعد وہ کچھ بھی کہہ سکتے تھے کہ والد کا بزنس تھا یا وہ زمیندار تھے لیکن یہ بات وہ بڑے فخر سے بتاتے تھے کہ ان کے والد نے کس طرح انہیں اس مقام تک پہنچایا۔ بابو بننے کے بعد انہوں نے والد کو کام کرنے سے روکا تھا۔ نوجوان تھے لوگوں کی باتیں بری لگتی تھیں۔ والد نے ان کی نہیں مانی اور اپنا کام کرتے رہے۔ سرکاری ملازمت میں تبدیلی تو ہوتی ہے۔ انہیں پہلی بار دوسرے شہر جانا پڑا تو والد کو ساتھ لے گئے اور یوں وہ کام ختم ہو گیا جو بچپن سے کرتے چلے آئے تھے۔ پھر ڈیڈی نے ایک انگریز افسر کی حوصلہ افزائی پر آئی سی ایس کا امتحان دیا۔ انگریز متعصب بھی ہوتے تھے اور فراخ دل بھی۔ سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اس نے صلاحیت دیکھی تو ڈیڈی سے کہا کہ رینگ رینگ کر آگے بڑھنے سے بہتر ہے ایک لمبی چھلانگ لگاؤ۔ ناکامی سے مت ڈرو۔ یہ جگہ تو رہے گی۔ ڈیڈی نے امتحان دیا اور کامیاب بھی ہو گئے۔ افسر بنے اور لائق افسر کہلائے۔ ان کے والد نے سب دیکھا۔ انیس سو ساٹھ میں جب ان کا انتقال ہوا تو وہ پشاور میں تھے۔ سرکلر روڈ پر کوٹھی سے ان کا جنازہ اٹھا۔ درجنوں کاریں پیچھے تھیں۔ فخر اور غرور تھا انہیں تو جائز تھا۔ کسی کی تقدیر ایسے بدلے۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں ان کی طرح؟ کوئی کہہ سکتا تھا یہ جنازہ اسی موچی کا ہے جو فلاں قصبے کی فلاں گلی کے نکڑ پر ایک پیسے میں جوتیاں گانٹھتا تھا۔"

میں نے اسے بولنے دیا۔ اس کے غم کا بار ہلکا ہوتا جا رہا تھا۔ نازو کافی لے آئی تھی۔ کافی پیتے ہوئے وہ پھر بولنے لگی۔

"سکندر بھائی۔ ڈیڈی کو سب معلوم تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ آپ کے بارے میں تو وہ کہنے لگے۔ پھر کبھی۔ وہ مجھے بلاتے تھے۔ کبھی کہتے تھے اے جھلّی، کبھی نوکرانی۔ لیکن مجھے اداس دیکھتے تھے تو پوچھتے تھے شہزادی کو کیا دکھ ہے۔ میری بلبل کیوں خاموش ہے؟"

میں نے جلدی سے اسے وہ بات یاد دلا دی جو پھر آنسوؤں کے ریلے میں بہنے والی تھی۔ "تم نے میرے بارے میں بتایا تو کیا کہا انہوں نے؟"

"کہنے لگے کہ تو کیا مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ ارے لڑکی! ہم تو پل پل کی خبر رکھتے ہیں۔ اس ملک میں کون کیا کر رہا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ ہمارا تو یہی کام ہے کہ معلوم کرتے رہیں۔ افواہوں کی تصدیق کریں کہ اس کی بنیاد کیا تھی۔ انہیں چوہدری دلاور کے بارے میں بھی معلوم تھا اور اس کی غیر قانونی سرگرمیوں کے بارے میں بھی۔"

"پھر انہوں نے کچھ کیا نہیں؟" میں نے بے اختیار کہا۔

"وہ کہتے تھے کہ میں مجبور ہوں۔ بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ ان لوگوں پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں۔ اُلٹے لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ وہ زمانہ اب نہیں رہا جب ایمانداری کی قدر تھی۔ قائد اعظم تھے۔ ان کے بعد لیاقت علی خان آئے تو انہیں راستے سے ہٹا دیا۔ پھر ناظم الدین جیسے گھر بٹھا دیے گئے۔ اب انہی لوگوں کا راج ہے۔ انہی کی چلتی ہے جنھوں نے پاکستان بنانے والوں سے ان کا پاکستان چھین لیا تھا۔"

"میرے بارے میں تم نے ان سے کہا تھا کہ مقدمات ختم کرا دیں؟"

"ہاں۔ میں نے کہا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ میرے بس کی بات نہیں لیکن میں ضد پر اڑ گئی تو انہوں نے کہا کہ اچھا میں کوشش کروں گا۔"

"کوشش یقیناً کی تھی انہوں نے۔"

"ہاں۔ اسی کا انجام ہے یہ۔" وہ رونے لگی "مگر سکندر بھائی۔ میں سمجھتی ہوں کوئی نیک مقصد کے لیے کوشش کرے اور برے لوگوں کے ہاتھوں مارا جائے تو وہ شہید کہلائے گا کیا یہ غلط ہے؟"

میں نے کہا "میں کوئی مفتی نہیں۔ دین کا علم بھی واجبی سا رکھتا ہوں۔ لیکن میری عقل اصولی طور پر تسلیم کرتی ہے کہ نقوی صاحب کو شہادت نصیب ہوئی۔ وہ جانتے تھے کہ ظلم اور ناانصافی کا شکار میں ہوا تھا اور میری حمایت کر کے وہ ایسے لوگوں کو دشمن بنا لیں گے جو کسی اصول، ضابطہ اخلاق یا قانون کی پروا نہیں کرتے۔ ان کی طاقت کیا ہے اور وسائل کیا ہیں؟ ان کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں اور ان کی مخالفت میں جان جانے کا خطرہ بھی ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے ہماری مدد جاری رکھی تو یہ کسی جہاد سے کم نہیں۔"

وقار کی بیوی کے چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ آ گئی "ڈیڈی نے یہ بھی بتایا تھا مجھے کہ آج میرے سامنے پھن اُٹھانے والے سانپ وہی ہیں جن کو میں نے ہی دودھ پلایا تھا۔ پتا نہیں اس بات کا کیا مطلب تھا!"

میں اس بات کا مطلب اسے سمجھا سکتا تھا لیکن ایک دل زدہ بیٹی کو اور آزار پہنچا کے زیادہ دکھی کرنے کا یہ کوئی موقع نہیں تھا۔ اختیار اور اقتدار نقوی صاحب کے پاس بھی تھا مگر انہوں نے اس کا استعمال کرتے ہوئے ذاتی مفاد کو اہمیت دی۔ شاید نقوی صاحب بھی ان پرانے لوگوں کی آخری کھیپ میں شامل تھے جو خوش آئند توقعات، بلند و بانگ دعوے اور سنہرے خواب لے کر پاکستان بنانے والوں کے ہراول دستے میں شامل ہوئے تھے۔ جب یہ توقعات غلط ثابت ہوئیں۔ دعوے پُر فریب نعرے بن گئے اور سنہرے خوابوں کو الٹا تعبیر ملی تو پاکستان بنانے والوں میں دو قسم کے رد عمل نے جنم لیا۔ ایک گروہ شرافت سے اپنی عزت و ناموس اور وضع داری کے ساتھ الگ ہو کے گوشہ نشین ہو گیا۔ دوسرے گروہ نے جیسا دیس ویسا بھیس کے فارمولے پر عمل کیا اور اصول فراموش کر دیے، مقاصد کو بالائے طاق رکھ دیا اور ہر عہد کو بھلا دیا جو انہوں نے قوم سے اپنے آپ سے اور خدا سے کیا تھا۔ ذاتی مفاد کی جنگ چھڑی تو لوٹ کی اس میں کود پڑے اور انہوں نے وقت سے فائدہ اٹھایا۔ وہ خسارے میں نہیں رہے۔ مقام اور مرتبے کے ساتھ انہوں نے دولت سمیٹی لیکن یہ دولت انہی کی عطا کردہ تھی جو نقوی صاحب سے مراعات حاصل کرتے تھے ان کے صوابدیدی اختیارات کا فائدہ اٹھاتے تھے اور انگریز حاکم کی ایجاد "معمولی قوانین میں نرمی" (IN RELAXATION OF NORMAL RULES) سے استفادہ کرتے تھے یہی وہ سانپ تھے جو اب اتنے قوی ہو گئے تھے کہ نقوی صاحب کے سامنے پھن پھیلائے کھڑے ہوئے تھے اور نقوی صاحب میں اتنی طاقت نہ تھی کہ ان کا سر کچل دیں۔ بالآخر انہوں نے ہی نقوی صاحب کو ڈس لیا۔

"یہاں آ کے مجھے بڑا سکون ملا۔ مجھے تو اب وہ سرکاری گھر بالکل "سب جیل" کی طرح لگتا ہے" وقار کی بیوی نے کہا۔

نازو نے کہا "تو مت رہو وہاں۔"

"ہاں۔ سوئم ہو جائے پھر ہم سامان اٹھا لیں گے۔ ایک صاحب بڑی ہمدردی سے فرما رہے تھے کہ ابھی آپ چھ مہینے رہ سکتی ہیں یہاں۔" وہ بولی "ایک اور نے کہا کہ مزید مہلت بھی مل سکتی ہے۔"

نازو نے کہا "ہو گا کوئی سرکاری چمچہ۔"

"ایک تو مجھے اس ماحول سے وحشت ہوتی ہے۔ وہاں ہر چیز سے ڈیڈی کی یاد آتی ہے۔" وقار کی بیوی نے کہا۔

"تمہارے پاس اپنا گھر بھی ہے پھر کوٹھی ہے۔"

"نئی کوٹھی میں جا کے ہم کیا کریں گے۔ اسے تو کرائے پر اٹھا دیں گے۔ ہمیں کیا کمی ہے گھر بہت ہے۔" وہ بولی "مجبوری یہ ہے کہ تعزیت کرنے والے سب سرکاری کوٹھی میں آ رہے ہیں۔ ہمیں سوئم تک وہیں رہنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "تمہیں کچھ اندازہ ہے۔ نقوی صاحب کس حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے تھے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ بہت مایوس تھے۔"

"انہوں نے فائلیں تو منگوائی تھیں؟"

"ہاں۔ وقار نے ذکر کیا تھا مجھ سے۔" وہ بولی۔

میں نے عمداً اپنی اور دلاور کی اپنے گھر میں ملاقات کا ذکر نہیں کیا "میں نے اور غالب نے کل صبح فائلیں تلاش کی تھیں۔"

"اچھا! کس وقت؟ کہاں کہاں دیکھا تھا؟"

"ہر جگہ۔ جب تم شیلی کے ساتھ اسپتال گئی تھیں" میں نے کہا۔

نازو اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم لوگ باتیں کرو۔ میں دیکھتی ہوں عاشق علی ترپ اور اس کی اہلیہ کیا کر رہے ہیں۔ انہیں کھانے پکانے میں لگا دوں یا بازار سے منگوا دوں کچھ۔"

وقار یوسف کی بیوی نے کہا "فائلیں مل جاتیں تو تم کیا کرتے؟"

"سوچا تو یہی تھا کہ انہیں غائب کر دیں گے پھر خیال آیا کہ کہیں نقوی صاحب کسی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔ فائلیں ملی ہی نہیں" میں نے کہا۔

"آخری بار جب میری ان سے بات ہوئی تھی تو انہوں نے کہا

www.paksociety.com

تھا کہ مجبوری ہے۔ مجھ سے میری جان مانگ لے مگر وہ چیز مت مانگ جو میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ڈیڈی۔ ایسی باتیں مت کریں۔ وہ بولے کہ میری جان آخر کس کے کام آئے گی۔ کسی کے کام آ جائے تو اچھا ہے۔ میں رونے لگی تو انہوں نے کہا کہ اچھا اس بے وقوف لڑکے سے کہنا کہ مجھ سے ملے۔"

میں نے کہا "میری اور ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے باہر بھجوا دیں گے۔ لندن میں نے بتایا کہ مجھے تو لندن سے نکالا گیا تھا۔ وہاں کون گھسنے دے گا تو انہوں نے کہا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم فی الحال پاکستان سے چلے جاؤ بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے تم گمنام ہو جاؤ اور گمنام ہی رہو۔ لوٹ کے پاکستان آؤ تو ایسے آؤ کہ کسی کو بھی معلوم نہ ہو۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"اس وقت فوری طور پر میں کیسے فیصلہ کر سکتا تھا۔ وہ ایک تجویز تھی۔" میں نے کہا "چلو اچھا ہوا تم نے یہاں آ کے میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔ مجھے چاروں طرف ڈر لگ رہا تھا تمہارے سامنے جاتے ہوئے۔"

"آپ نے ایسا کیوں سوچا سکندر بھائی۔ دھوکا خود آپ کے ساتھ ہوا تھا۔ آپ کو کیا معلوم تھا شیلی کے بارے میں؟"

میں نے کہا "اب تمہارا کیا خیال ہے؟"

"شیلی کے بارے میں؟"

"ہاں۔ تم اسے مجرم سمجھتی ہو؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی "وقار بھی کہتے ہیں کہ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔"

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہی ہے۔"

"پھر خودکشی کیوں کی تھی اس نے؟"

"خودکشی! اسے قتل کیا گیا تھا۔ غالب نے مجھے سب بتا دیا ہے۔" میں نے کہا "کل میں نے بھی لندن فون کر کے پوچھا۔"

وقار کی بیوی کی دلچسپی ایک دم بڑھ گئی "تمہیں معلوم ہے اس کی سب چیزیں میرے پاس ہیں؟"

میں چونکا "کون سی چیزیں؟"

"اس کے پاس ایک بیگ تھا۔"

"ہاں۔ بیگ وہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اس میں پاسپورٹ اور ضروری کاغذات ہوتے تھے۔ انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس تھا اور شاید امریکن ایکسپریس کے ٹریولر چیک۔"

"آپ تو معلوم ہوتا ہے بڑی تفصیل سے بیگ میں جھانک چکے تھے۔"

میں نے خفیف ہو کے کہا "وہ خود بتا چکی تھی لیکن بیگ تمہارے پاس کیسے پہنچا؟"

وہ ہمارے ساتھ ہی تو آئی تھی گاڑی میں۔ آئی سی یو میں بیگ لے کے جانا مجھے بھی ٹھیک نہیں لگا تھا۔ میں نے اپنا بیگ گاڑی میں چھوڑا تو اس نے بھی چھوڑ دیا تھا۔ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ کوئی حرج تو نہیں؟ میں نے کہا حرج کیا؟ بہت مال ہے تو ساتھ لے لو۔ کہنے لگی نہیں مال کی پروا نہیں اور مال میں اتنا رکھتی بھی نہیں۔ زیور اور چیک لے جا کے کوئی کیا کرے گا؟ گاڑی میں سے بیگ کی تو چوری ہو گا؟ میں نے کہا کہ ابھی آج تک تو سنا نہیں۔ ویسے لوگ ہاتھ سے چھین کر بھی لے جاتے ہیں۔ اس نے احتیاطاً بیگ کو سیٹ کے نیچے رکھ دیا۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کے نیچے۔ اتنی احتیاط میں بھی کرتی ہوں کہ بیگ کو نیچے رکھ کے دروازہ لاک کر دیتی ہوں۔ سیٹ پر صاف نظر آئے بیگ تو چور کی نظر متوجہ ہوتی ہے۔ ورنہ کیا پتا چلتا ہے۔"

میں نے کہا "اور وہ بیگ گاڑی میں ہی رہ گیا۔"

"ہاں۔ وہ ہمارے ساتھ واپس کہاں آئی تھی۔ بے چاری!" میرا دل کچھ اور ہلکا ہو گیا "تمہیں بھی ہمدردی ہے اس سے؟"

"دیکھو سکندر بھائی۔ وہ لڑکی تھی۔ تمام لڑکی نہیں تھی ... لندن سے یہاں آئی اپنی غلطی سے ماری گئی اور خودکشی کی افسوس کی بات تو ہے نا۔" وقار کی بیوی نے کہا "غالب تو کہتا ہے وہ جھوٹ بولتی ہے۔"

"اور وقار کیا کہتا تھا؟"

"وقار کہتے تھے کہ اتنا بڑا جھوٹ کوئی نہیں بول سکتا جانے۔"

"مجھے وقار کی سمجھ بوجھ کی داد دینی پڑے گی۔ مجھے بھی غالب نے قائل کر لیا تھا کہ نہ وہ ڈاکٹر ہے نہ اس کا نام شیلا خان ہے لیکن میں نے لندن فون کیا۔ اس اسپتال سے معلوم کیا تو سب درست نکلا۔"

اس نے حیرانی کا اظہار کیا "اچھا! یعنی وہ نیورو فزیشین تھی؟"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دو بج چکے تھے اور ابھی تک رابعہ اور وقار یوسف نہیں لوٹے تھے۔ نازو کچن میں دوپہر کا کھانا تیار کرانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ وقت گزاری کے لیے میں نے وقار کی بیوی کو تفصیل سے ڈاکٹر شیلی کے بارے میں بتایا۔

اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا "توبہ خدایا۔ واقعی دلاور نے اس کی ماں کو قتل کیا تھا۔ اور وہ سوتیلی بہن تھی اس کی!"

"مجھے تو یہی پتا چلا ہے۔"

"اور وہ ذلیل اس کی لاش خراب کر رہا ہے۔ بے غیرت۔"

میں نے کہا "وہ سمجھتا ہے کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ اس نے تو بہن کو چکر دیا تھا۔ مجھے چکر میں ڈالنے کے لیے۔ لیکن گڑبڑ ہوئی کہ بہن شاید خود میرے چکر میں پڑ گئی۔"

وہ مسکرانے لگی "کیسے نہ پڑتی۔ آپ تو خود۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "نہیں۔ پہلے ہی اس غلطی نے بڑی خرابی پیدا کر دی تھی۔ سب خفا تھے مجھ سے۔ حالانکہ کوئی بات نہیں تھی۔ رابعہ سے اور غالب سے مجھے ہرگز امید

نہیں تھی۔"

"آپ اب کے چکر میں نہیں پڑے تھے؟"

"ابھی کس کی قسم کھاؤں۔ تمہاری یا رابعہ کی۔ خدا کی۔"

"میں ناراض نہ ہوں۔ مجھے معلوم ہے آپ ایسے نہیں ہیں لیکن وہ آپ کے چکر میں کیسے پڑ گئی۔ کوئی بات تو کی ہو گی آپ نے ایسی۔ دانستہ نہیں مگر حوصلہ افزائی۔"

"وہ فطرتاً ایسی تھی۔ دیکھو زندگی کی مثال ہے۔ وہ محسن کے چکر میں ایسی پڑی تھی کہ پاگل ہو گئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ محسن کی شادی شہلا سے ہو چکی ہے۔ اس کا ایک بچہ بھی ہے۔ ہم سب سمجھاتے تھے مگر وہ ایک ہی بات کہتی تھی۔ میں محسن سے کچھ مانگ تو نہیں رہی ہوں۔ بات کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ تھی نا پاگل پن کی بات۔ محسن نے بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ الٹا وہ اس کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آتا تھا۔ بے عزت کرتا تھا اسے لیکن جتنا محسن اس کو دور رکھنے کی کوشش کرتا رہا اتنا ہی وہ محسن کے قریب ہوتی گئی۔ اب یہ قدرت کے کھیل ہیں۔ اسے جو چاہیے تھا بالآخر اس نے محسن کو پا لیا۔" میں نے کہا۔

وقار کی بیوی مسکرانے لگی "یعنی وہ بھی چاہتی آپ کو اگر زندہ رہتی؟"

"ممکن تو نہیں۔ تم الٹا مطلب نکال رہی ہو۔ میں وضاحت کر رہا تھا اس کے رویے کی۔ مجھے یقین نہیں، صرف شک ہے کہ وہ اپنے شعور کو فراموش کر بیٹھی تھی۔ جس کام کے لیے اسے بلایا گیا تھا اور میرے پیچھے لگایا گیا تھا وہ کام بھول گئی تھی۔ دلاور کے آدمی مسلسل اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے آگے خبر پہنچا دی کہ چوہدری صاحب، کام بگڑتا نظر آ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو وہ لڑکی بھانڈا پھوڑ دے۔ چوہدری صاحب نے کہا کہ یہ بات ہے تو اس کا قصہ پاک کرو۔ اس کا یوں کام تمام کیا گیا کہ ایک ساتھ دو کام ہو گئے۔ تمہارے ڈیڈی کو اپنے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ وہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ شیلی پر الزام عائد کر کے اور اس کے قتل کو خودکشی بنا کے انہوں نے تفتیش بھی روک دی۔ چوہدری دلاور کو یقین ہے کہ شیلی کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں۔ جب اس کی لاش کو لاوارث قرار دے کر دفنایا جائے گا تو چوہدری صاحب لندن جائیں گے اور اپنی ولدیت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اس کے مکان اور ترکے کے مالک بھی ہو جائیں گے۔"

"لیکن تم یہ سب جانتے ہوئے بھی...؟"

میں نے کہا "ابھی دیکھو۔ دلاور خود اپنے جال میں پھنس رہا ہے۔ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ ڈاکٹر شیلی کون تھی۔ شیلی نے خود ہی سب بتا دیا تھا۔ نقوی صاحب نے ایک کیسٹ چھوڑا تھا۔ ابھی تک دلاور یا کسی کے ہاتھ نہیں لگا ہے۔ اس نرس کے پاس ہے۔"

"وہ نرس کہاں ہے؟"

"نرس لاپتا ہے۔ وہ اسپتال نہیں پہنچی تھی۔ غالب اور نازو ایک ساتھ نکلے تھے انہیں شیلی کی لاش کے بارے میں معلوم کرنا تھا اور اس نرس کے گھر بھی جانا تھا۔ لاش تو خود یہاں آ گئی ہے۔ اب دیکھو نرس کے بارے میں وہ کیا خبر لاتے ہیں۔"

وقار کی بیوی نے مایوسی سے سر ہلایا "جب یہاں پہنچ گئے تھے وہ تو کیا نرس کے گھر نہیں گئے ہوں گے۔"

"یقیناً گئے ہوں گے مگر انہیں کیسٹ مل جاتا تو وہ یہاں نہ آتے۔ اس سے مجھے امید ہے کہ نرس ان کے ہاتھ نہیں آئی۔"

"اس نرس نے بھی پھر فون نہیں کیا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی کا وہ بیگ اب کہاں ہے؟"

"وہیں۔ اسی سیٹ کے نیچے" وقار کی بیوی نے کہا "بعد میں مجھے کہاں ہوش تھا کہ بیگ یاد آتا۔"

"دلاور کو یقیناً اس کی تلاش ہو گی۔" میں اٹھ کھڑا ہوا "ذرا چابی دو اپنی گاڑی کی۔ میں دیکھ لوں۔"

"چابی تو وقار کے پاس تھی۔ وہ ساتھ لے گئے ہوں گے۔"

"خیر۔ دیکھ لیں گے اس کے آنے کے بعد۔"

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی کال بیل بجی۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ اس میں سے مجھے پولیس کی گاڑی نظر آ گئی اور نہ جانے کیسے مجھے میری چھٹی حس نے خطرے سے خبردار کر دیا۔ شاید یہ مجھے عجیب سا لگا تھا کہ کچھ دیر پہلے ایک پولیس کی گاڑی آئی تھی۔ اب دوسری آ گئی۔ میں نے نازو کو باہر بھیجا اور خود غائب ہو گیا۔ غائب ہونا بہت آسان تھا۔ رابعہ کی وارڈروب سے گزر کے میں نیچے پہنچ گیا۔

نیچے میرا آدھا گھنٹا انتظار کرتے گزرا پھر نازو نے خطرہ ٹل جانے کا سگنل دیا اور میں اوپر لوٹ آیا۔ پہلی بار آنے والی پولیس کی گاڑی کو ایمرجنسی میں ایمبولینس کے پیچھے دوڑایا گیا تھا اور ان میں سے کوئی بھی مجھے نہیں پہچانتا تھا جو گاڑی میں آئے تھے۔ الٹا وارنٹ نہ ہونے کی وجہ سے انہیں خاصی خفت اٹھا کے واپس جانا پڑا تھا لیکن دوسری گاڑی میں علاقے کی پولیس نے ایک ڈی ایس پی اور مجسٹریٹ کے ساتھ چھاپا مارا تھا۔

وہ مجھے تلاش کرتے ہوئے آئے تھے۔ نازو نے واجبی سی مزاحمت کی تھی کہ اس وقت گھر کی مالکن موجود نہیں ہیں مگر انہوں نے ایک نہیں سنی اور دندناتے ہوئے کمروں میں پھیل گئے۔ نازو مطمئن ضرور تھی کہ انہیں میرا سراغ نہیں ملے گا لیکن اس نے مجسٹریٹ کو اور ڈی ایس پی کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ ایک کرائم رپورٹر ہے چنانچہ ان کی طرف سے کوئی زیادتی ہوئی یا انہوں نے اختیارات سے ذرہ برابر تجاوز کیا تو اس کے بارے میں پوری رپورٹ پریس کو جاری کر دی جائے گی۔

اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ محتاط ہو گئے اور انہوں نے صرف انہی مقامات پر مجھے تلاش کیا جہاں مجھے چھپایا جا سکتا تھا۔ انہوں نے انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک بھی کھول کے دیکھا اور تلاشی کی

www.paksociety.com

روشنی میں پائپ کے نیچے تک جھانکا پھر وہ اوپر چھت پر چڑھ گئے۔ اور وہیں واٹر ٹینک میں دیکھا اور آس پاس کے مکانوں کی چھت پر کود کے میرے فرار ہو جانے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ کوٹھی کی عقبی دیوار کو دیکھا کہ کہیں میں رسی لٹکا کے دیوار کے ساتھ تو نہیں پھسلا ہوا ہوں۔ جاتے وقت رسمی طور پر مجسٹریٹ نے کہا کہ ہم نے ایک قانونی ضرورت پوری کی ہے اور ہم زحمت کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ وہ نیا ایس ڈی ایم خاصا مہذب اور معقول آدمی تھا۔ اس نے نازو کے سوال کے جواب میں یہ بھی تسلیم کیا کہ اس کوٹھی میں سکندر بخت کی موجودگی کی اطلاع ایک مخبر نے دی تھی پھر اسپتال سے ایک ٹیلی فون آیا کہ ڈاکٹر شیلا خان کی لاش یہاں لائی گئی ہے۔ اس نے کہا کہ ہم مجبور ہیں۔ اطلاع غلط ہو تب بھی جانا تو پڑتا ہے یہاں تو لوگ فائر بریگیڈ کو بھی نہیں بخشتے۔ انہیں آگ لگنے کی جھوٹی اطلاع دے کر دوڑاتے ہیں اور لطف بھی لیتے ہیں اس غیر ذمے دارانہ مذاق سے۔ انہیں بھاگنا پڑتا ہے تصدیق کیے بغیر بھی۔"

میں نے نازو کی بات سن کے کہا "ان کی ٹائمنگ تھوڑی سی غلط ہو گئی۔ شاید وارنٹ وغیرہ ملنے میں دیر ہو گئی یا مجسٹریٹ مصروف تھا۔ پلان تو یہ ہوگا کہ ادھر اسپتال سے ایمبولینس میں لاش پہنچے ادھر چھاپا مار پارٹی پہنچ جائے۔"

"اسی لیے تم بچ گئے" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔" میں نے کہا "میں تو بالکل رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا۔ ڈاکٹر شیلی کی لاش کے ساتھ۔"

عاشق علی تڑپ نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا "ہم حاضر ہوئے تھے یہ استفسار فرمانے کہ ماحضر تناول کرنے میں تاخیر کیوں؟"

میں نے کہا "تڑپ صاحب! آپ حاضر نہیں ہوئے تشریف لائے ہیں۔ جیسے پوچھتے نہیں استفسار فرماتے ہیں۔"

وقار کی بیوی نے کہا "یہ کیا نمونہ ہے؟"

"یہ مظفر نے ارسال کیا ہے۔ عاشق علی نام ہے۔ تڑپ تخلص کرتے ہیں" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "تڑپ صاحب کچھ نمونہ کلام سے مستفید فرمائیے۔"

اس کی آنکھیں چڑھ گئیں اور وہ چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ استغراق کی کیفیت تھی۔ "عرض فرماتے ہیں۔"

عشق کا اب چل پڑا ہے سلسلہ
تو ہے بلبل میں ہوں تیرا بلبلہ

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی "واہ۔ بلبل کے ساتھ بلبلا۔"

اندر سے ان کی اہلیہ نے چیخ مار کے کہا "ارے نامراد۔ کھانے کو پوچھنے گیا تھا۔ شعر پڑھنے کھڑا ہو گیا۔"

وہ فوراً واپس ہو گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ چار بجنے والے تھے اور ابھی تک نہ غالب کا پتا تھا نہ رابعہ اور وقار کا۔ ان میں سے کوئی فون ہی کر دیتا تو ہم سب کی بے سکونی کچھ کم ہو جاتی۔ نازو کے اصرار پر میں نے بھی کچھ کھانا منظور کر لیا۔ اصل مقصد وقار کی بیوی کو کچھ کھلانے کا تھا۔ یہاں آ کے وہ ناشتہ [illegible] تھی لیکن میرا بھی یہی خیال تھا کہ اپنے گھر کی [illegible] ناشتا بھی ٹھیک سے نہیں کیا ہوگا۔ اس کی آنکھیں [illegible] سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید گزشتہ رات وہ سوئی بھی نہیں [illegible] سے آنکھوں کے گرد سوجن سی محسوس ہوتی تھی۔

ہم میز پر بیٹھے ہی تھے کہ ایک ساتھ سب وارد ہوئے۔ رابعہ کی فاکس ویگن کی آواز آئی۔

نازو نے عاشق علی کو بھیجا۔ "دیکھو دروازہ کھولو۔ اپنے گھر کے فرد ہیں۔ ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ یہاں سکندر نام کا کوئی شخص نہیں رہتا۔"

میں نے کہا "فرشتۂ اجل بھی پوچھے تو انکار کر دینا۔"

وہ سہما ہوا چلا گیا "خلاف ہدایات ہم حالت خواب میں کوتاہی فرمائیں تو آپ کی پاپوش مبارک اور ہمارا سر ہو۔"

اس کی بیوی نے سر پر ہاتھ مارا "اللہ مارا۔ پاگل ہے۔"

وقار کی بیوی نے کہا "تم بھی بلبل کی طرح چہکتی ہو [illegible] تھا اس کا۔"

غالب کو رابعہ کے ساتھ دیکھ کے میں نے حیرانی سے کہا "ان کے انتظار میں گیٹ پر کھڑے ہوئے تھے؟"

"حالت تو ایسی ہو رہی ہے جیسے گاڑی کے پیچھے دوڑتے آئے ہو" نازو نے کہا۔

غالب نے کہا "اس وقت پیٹ خالی ہے۔ [illegible] ورنہ وہ بھی خالی ہو جائے گا۔"

وقار اپنی بیوی کی طرف دیکھ کے مطمئن انداز میں [illegible] "ہم ٹھیک وقت پر پہنچ گئے نا!"

رابعہ نے کہا "نازو نے تو کمال کر دیا۔ میں سوچ رہی تھی نہیں دوپہر کے کھانے کا کیا ہوگا؟"

"جملہ تفکرات امور خانہ داری کے لیے ہم تشریف رکھتے ہیں بیگم صاحب۔" عاشق علی تڑپ نے سر جھکا کے کہا "ماحضر کا انتظام ہو انصرام۔"

میں نے ہنس کے کہا "میں بھائی۔ اتنی اردو کافی ہے۔ کھانا تو بغیر لغت کے کھانے دو۔"

عاشق علی کی سب سے مضحکہ خیز عادت اپنے لیے "ہم" [illegible] ہیں" اور "ہم تشریف لاتے ہیں" جیسے الفاظ کا استعمال تھا۔ [illegible] کرنا اور حاضر ہونا اس نے نہیں سیکھا تھا اور عوامی الفاظ سے کترا جاتا تھا۔ تاہم وہ بعد میں ایک وفادار، فرض شناس، قابل اعتماد ملازم ثابت ہوا۔ مستقبل میں وہ کچھ کم غالب [illegible] حرکات و سکنات سے کچھ سوا ہوا یا اچھی لگتا تھا۔ اس [illegible] باتوں میں کمی زبان کی ہی نہیں کام کاج میں بھی بہت تیز ثابت ہوا۔ [illegible] اس نے کھانے پکانے میں بھی اپنی مہارت کے دعوے کو بہت جلد تسلیم کرا لیا۔

کھانے کے بعد وقار نے بیوی سے پوچھا "کیا خیال ہے گھر چلیں؟"

اس نے صاف انکار کر دیا "تم جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

وہ سوئی تو رابعہ نے ایک بار پھر عاشق علی اور اس کی بیوی کو سمجھایا کہ جب تک چوکیدار نہیں آ جاتا انہیں ہر آنے والے کے لیے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھنا ہوگا کہ ان کا نام کیا ہے اور کام کیا ہے؟ کوئی زبردستی اندر نہیں آئے گا۔ فون آئے تو خود کسی کو کچھ نہیں بتانا ہے۔ رابعہ کے سوا کوئی بات نہیں کرے گا۔

ہم سب رابعہ کے بیڈ روم میں بیٹھ گئے۔ رابعہ کی پریشانی اس کی صورت سے عیاں تھی مگر کھانے کی میز پر اس نے مدعا بات نہیں کی تھی۔

میں نے کہا "وقار تم بتاؤ پہلے۔"

وقار نے کہا "کیا بتاؤں سکندر صاحب۔ عجب چکر ہیں۔ ہم یہاں سے ایمبولینس کے ساتھ ہی اسپتال پہنچے تھے۔ پولیس والے تو بھی گئے تھے۔ وہ جان چھڑا کے واپس شعبۂ حادثات کی طرف چلے گئے۔ ہم نے گاڑی مردہ خانے کے ساتھ روک دی۔ وہاں پارکنگ کی اجازت نہیں ہے۔ رابعہ باجی کو میں نے گاڑی کے ساتھ بھیج دیا اور خود مردہ خانے کے انچارج سے ملا۔ وہاں ابھی خاصی افراتفری تھی۔ پولیس پہلے سے موجود تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے تو ایمبولینس ڈرائیور کو گرفتار کر لیا۔"

"اس کا کیا قصور تھا؟"

"قصور کراچی دیکھا ہے غریب آدمی کا۔ اسے بھی نہ پکڑتے تو پھر کسے پکڑتے۔" وقار نے کہا "میری ایک انسپکٹر سے منہ ماری ہو گئی۔ میں نے کہا کہ یہ اسپتال ہے یا چنڈو خانہ۔ غالب وہاں موجود تھا اور اس کی سب سے جھڑپ ہو چکی تھی۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے مردہ خانے کے انچارج کو معطل کر دیا تھا اور اس نے ماتحت [illegible]۔"

غالب نے کہا "اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ کسی کے پاس غفلت اور کوتاہی کے الزام کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے اخبار کے رپورٹرز بھی بلا لیے تھے۔ سب کا ایک ہی سوال تھا کہ مردہ خانے میں حفاظتی انتظام کیوں نہیں ہے۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ پر جھلاہٹ سوار ہو گئی۔ کہنے لگا کہ آپ لوگ صحافی ہیں۔ کمانڈوز متعین کرا دیں یہاں۔ اسپتال کی اپنی کوئی فوج تو ہے نہیں جو مردوں کو چوری ہونے سے روکے۔ ویسے اس قسم کا کوئی واقعہ پہلے ہوا ہوتا تو سیکیورٹی کا انتظام بھی ہو جاتا۔"

وقار نے کہا "بات تو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا وہ لیکن میں نے تو [illegible] دے دی کہ اس کیس میں ابھی تک لاش کا پوسٹ مارٹم کیوں نہیں ہوا تھا۔ لاش کو اسپتال سے رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی کوٹھی پر کیوں بھیجا گیا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے پولیس بھی وارنٹ لے کے کیوں آئی تھی۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کی شامت آ گئی تھی۔ وہ کہنے لگا کہ وکیل صاحب۔ آپ جو چاہیں کریں۔ میں نے کچھ نہیں کیا تھا اور نہ میں یہ بتا سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ تحقیقات ہوں گی تو سب سامنے آ جائے گا۔"

غالب بولا "اخبار والوں نے پوچھا کہ آخر مردہ خانے کے انچارج اور اس کے ماتحتوں کو معطل کرنے سے کیا ہوگا۔ قصور ان کا تو نہیں تھا۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کہنے لگا کہ معطل تو میں بھی ہو سکتا ہوں۔ قصور میرا بھی کوئی نہیں۔ اوپر والے کچھ تو کرتے ہیں۔"

وقار نے کہا "خیر اس کے بعد میں نے کہا چلیے اب آپ اس لاش کو واپس سرد خانے میں رکھوا دیجیے۔ ابھی تک اس کو کسی نے کلیم تو نہیں کیا ہے؟ اس نے کہا کہ کلیم کرنے والے تو زبردستی لے گئے تھے۔ آپ واپس لے آئے۔ میں آج ہی پوسٹ مارٹم کرا کے کسی کے حوالے کرتا ہوں۔ لاش اندر لائی گئی تو اسی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ بس اچانک مجھے خیال آیا کہ شیلی کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ سرد خانے میں رکھی ہوئی لاش منجمد ہو کے اکڑ جاتی ہے مگر اس لاش کو سرد خانے سے نکلے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ ایمبولینس میں آتے جاتے دوپہر کی دھوپ سے گاڑی میں خاصی گرمی ہوگی۔ لاش ابھی تک ویسی کی ویسی ہے۔ گردن ٹوٹی ہوئی ہو تو سر ضرور ڈھلکا ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "بڑی باریک بینی سے کام لیا تم نے۔"

رابعہ نے بھی سراہا "واقعی۔ وقار نے کمال کر دیا۔"

"اب جو لاش کو کھولا گیا تو جناب وہ لاش تھی کسی اور کی۔"

میں اچھل پڑا "کسی اور کی؟"

"ہاں۔ لاش ڈاکٹر شیلی کی نہیں تھی۔"

"پھر کس کی تھی؟" نازو نے کہا۔

"کسی لاوارث بڑھیا کی لاش تھی اور وہ ٹھنڈی بھی نہیں تھی جیسی کہ سرد خانے کی لاش ہوتی ہے" وقار نے کہا۔

"پھر شیلی کی لاش کہاں گئی؟"

غالب نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ بھوت بن کے غائب ہو گئی۔ میرا سسر بھی بھوت ہے۔ وہ لے گیا اسے ورغلا کے۔ بڑا دل پھینک بھوت ہے۔"

نازو نے گھبرا کے کہا "شرم آنی چاہیے تمہیں۔"

"کیوں۔ یہ حرکت میری ہوتی تو مجھے ضرور شرم آتی۔ حد ہوتی ہے کوئی ہوس کی بھی۔" غالب نے کہا۔

"میرے ابا کی شرافت کی قسم کھاتے تھے لوگ۔"

"قسم کھانے والے تو ویسے بھی جھوٹے سمجھے جاتے ہیں اور میں اپنے سسر کو کچھ بھی کہوں۔ تم اپنے ابا کو کہاں سے بیچ میں لے آئی ہو۔ یا تم مان لو کہ وہ بھوت ہیں" غالب نے کہا۔

www.paksociety.com

نازو نے خفیف ہو کے کہا "بھوت ہو تم خود۔"

"معاف کرو۔ مائی ڈیئر بھتنی" غالب نے بیچ پہ ہاتھ رکھ کے کہا "میں پہلے بھوت تھا۔ اب پر موشن ہو گئی ہے میری جن کے عہدے پر اور تمہیں معلوم ہے جن بڑے حسن پرست اور عاشق مزاج ہوتے ہیں خصوصاً کسی جن پہ۔"

میں نے ایک ہاتھ غالب کے منہ پر رکھا اور دوسرا نازو کے منہ پر "ہمیں قبض کے لیے اتنی چیخ کافی ہے کھانا ہضم ہو جائے گا۔"

غالب ہنسنے لگا "ویسے اصل ماحول بے حد ڈراؤنا اور سنجیدہ ہو گیا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا حضرات و خواتین کے خوفزدہ چہرے۔"

وقار مسکرایا "بات ہی ایسی ہے یار۔ میں خود وہاں بہت ڈر گیا تھا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ شبلی راتوں رات اتنی بوڑھی کیسے ہو گئی۔ مرنے کے بعد۔ ہم نے ہنگامہ کیا تو وہاں موجود ڈاکٹروں کے بھی ہوش گم ہو گئے۔ پولیس الگ پریشان ہوئی۔ ایمبولینس کے ڈرائیور سے پوچھا کہ یہ کیا چکر ہے تو دہائی دینے لگا کہ مجھے کیا معلوم میں تو ان کے ساتھ ساتھ آیا ہوں۔ یہ تو لاش دینے والوں کو دیکھنا چاہیے کہ کس کی لاش دے رہے ہیں۔ اب سرد خانے میں دیکھا گیا تو شبلی کی لاش وہاں نہیں تھی۔"

یہ میرے لیے دوسرا شاک تھا "کیا؟ لاش وہاں نہیں تھی؟"

"نہیں۔ سرد خانے میں صرف تین ہی لاشیں تھیں۔ جو وہاں مرتے ہیں ان سب کی لاشیں تو وارث لے جاتے ہیں۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کا کوئی بھی نہ ہو۔ وہ چار دن انتظار کیا جاتا ہے کہ وارث آ جائے۔ عموماً حادثات میں سڑک پر مرنے والے وہاں پہنچتے ہیں جن کے پاس سے کوئی بھی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے ان کی شناخت ہو سکے۔"

میں نے کہا "یہ تو نیا ہی کیس ہو گیا۔"

"کیس تو بن گیا ہے مگر نامعلوم لوگوں کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ وہ ہمیشہ نامعلوم رہیں گے" غالب نے طنز سے کہا۔

نازو بولی "مجھے معلوم ہے یہ حرکت دلاور کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔"

"اچھا۔ ماشاء اللہ کتنی ذہین ہو تم" غالب بولا "صدقہ اتارنا چاہیے کہ کہیں تمہیں نظر نہ لگ جائے۔"

"کیا یہ غلط ہے؟" وہ خفا ہو کے بولی۔

"غلط نہیں ہے تو باہر جا کے ڈھول لے کر اور چوک پر اعلان کرو۔ کیونکہ پولیس تو مانے گی نہیں تمہاری بات۔"

رابعہ نے کہا "بیچ تو یہی ہے۔"

غالب نے کہا "حیرت کے بغیر بیچ کیسا۔ مجھے ایک جنگ کے کیشیئر کا لطیفہ یاد آ رہا ہے۔ اخباروں میں بھی چھپا تھا یہ واقعہ۔ مولانا صاحب غبن کے الزام میں گرفتار ہوئے تھے تو بھنو تھے کہ مجھے ورغلانے والا شیطان تھا۔ اس کے خلاف ایف آئی آر درج کی جائے۔ میرے بارے میں تو سب ہی جانتے ہیں کہ کتنا نیک، پرہیزگار اور نمازی قاری ہوں۔"

میں نے کہا "خیر اس میں شک کی تو بات نہیں کہ اس واردات میں دلاور اینڈ کمپنی کے سوا کسی کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ بلا روک ٹوک لاحق ہو گی کہ ڈاکٹر شیلا خان کے ساتھ اس کا رشتہ ثابت کرنے کے لیے اسے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

اب غالب نے میری تائید کی "یہ تو اس نے پہلے ہی سوچا ہوگا۔ جب اسے اطلاعات ملی ہوں گی تشویش ناک قسم کی جو ہمیں مل رہی تھیں۔"

نازو نے معصوم بن کے کہا "کیسی اطلاعات؟"

"یہی کہ رونا نک تیمن کچھ غیر طبعی ہونے کے بارے میں جن کا مطلب ہے حقیقت سے قریب تر۔"

میں نے کہا "شکوست..."

"میں تو عرض کر رہا تھا۔ دیکھئے وہ کیا چیز ہے جس کو بیان کی ہے کہ چھپائی نہیں جا سکتیں۔ اعصابی امراض کی باہر اعصاب پر انہی میں سے ایک سوار ہو گئی تھی۔ تیمن سے شروع ہوتی ہے۔ قاف پر ختم ہوتی ہے۔ بیچ میں تیمن بھی شامل غالباً۔"

"مار کھاؤ گے تم" میں نے خفت سے کہا کیونکہ سب ہنس رہے تھے۔

"جی نہیں۔ میں کھا کے آیا ہوں۔ آپ شوق فرمائیے۔ اپنا گھر ہے بھئی۔ مس رابعہ! یہ کچھ کھانا چاہتے ہیں" غالب نے پوزیشن بدل لی اور پھر دور جا بیٹھا۔

"پریشانی تو ہو گی دلاور کو" رابعہ نے کہا۔

"بھینچو۔ تم سے بھی زیادہ" غالب نے لقمہ دیا۔

"اب تم راضی سب سے پٹو گے" رابعہ نے خفت سے کہا۔

غالب نے ٹھنڈی آہ بھری "اف یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں۔ میں کہاں جا کے بیچ بولوں؟"

میں نے کہا "مغرب شمالی جاؤ یا ماؤنٹ ایورسٹ پر۔"

نازو بولی "زیبے باعث دوم بھی ہے وہ سرے کرے گا۔"

اب عاشق علی تڑپ نے رہنمائی کی "جناب عالی تحریر و معافت فرمانے آئے کہ نوش جاں فرمانے کے لیے وقت مناسب اور جملہ حاضرین کی خواہش و افزاوی ذبیح کے مطابق حاضر کیا جانا چاہیے؟"

غالب نے کہا "اس کا اردو میں ترجمہ کرو۔ ورنہ یہاں لا میں جواب دینے والے بھی ہیں۔"

میں نے کہا "بھئی شام کو ہم سب کافی پیتے ہیں۔"

رابعہ نے سہلایا "مجھے تو ہر وقت لغت ساتھ رکھنی پڑتی ہے۔ پتا نہیں اس کی بیوی کیسے سمجھتی ہے؟"

میں نے کہا "بیویاں سب کچھ سمجھتی ہیں۔"

غالب خوش ہو کے بولا "بڑی دردناک خوشخبری بیان فرما دی آپ نے۔ آخر غلط کیسے کہتی ہیں۔"

شام کے چھ بج رہے تھے جب رابعہ نے اسپتال فون کیا اور معلوم کیا کہ شبلی کی گمشدگی کی تحقیق کے بعد وقار نے نقوی صاحب کی کوٹھی کا نمبر ملایا جہاں ایک ملازم ہر فون کے جواب میں اور ہر آنے والے کو بتلا رہا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ وقار نے اسے کہا ٹھیک ہے۔ کوئی پوچھے تو مت بتانا کہ ہم کہاں ہیں۔ کال بند ہوتے ہی مجھے شبلی کے بیگ کا خیال آیا۔ "وقار تمہاری گاڑی باہر موجود ہے؟"

"ہاں ہے" اس نے باہر جھانک کے کہا۔

"اس میں شبلی کا بیگ ہوگا۔ مجھے تمہاری بیوی نے بتایا تھا۔"

"ہونا تو چاہیے۔ وہ ہمارے ساتھ اسپتال گئی تھی تو اس نے گاڑی میں ہی چھوڑ دیا تھا پھر کسی نے دیکھا ہی نہیں مگر سکندر صاحب یہ بھی ایک ثبوت سمجھا جا سکتا ہے شبلی کی بے گناہی کا۔ وہ والدہ کے ساتھ گئی تھی تو اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ اسے کوئی دوا یا انجکشن لے جانا ہوتا تو وہ بیگ ساتھ رکھتی۔"

غالب نے کہا "برخوردار ذرا پولیس کی عینک لگا کے دیکھو۔ وہ یہ نہیں سمجھیں گے کہ اس نے جانتے بوجھتے ایسا کیا تھا۔ تاکہ شک کی گنجائش نہ رہے۔"

میں نے کہا "خیر اب اسے نکال لاؤ۔ میرا خیال ہے یہ بیگ نہ ملنے سے والدہ کو زیادہ پریشانی لاحق ہوئی ہو گی۔ شبلی نے خلاف عادت اسے گاڑی میں چھوڑ دیا تھا ورنہ ہدایات تو واضح ہوں گی کہ اس کا بیگ مت چھوڑنا۔ اسی میں شناخت کے سارے ثبوت تھے۔"

"وہ بیگ نہیں ملا تو دلاور کو لاش اٹھوانی پڑی۔ سوال یہ ہے کہ لاش گئی کہاں؟" غالب نے کہا۔

"تمہارے پاس ایک ٹرمپ کارڈ تھا جو ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور بہت مطمئن ہو گا کہ اب مجھے کچھ معلوم ہوا ہے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ وہ صاف انکار کر دے گا۔"

"ڈاکٹر شیلا خان سے اور رشتے سے بھی۔"

"نہیں یہ رشتہ رہے گا۔ کوئی پوچھے گا تو کہے گا کہ ہاں شیلا خان لندن میں ہے۔ عرصے سے اس کی کوئی خبر نہیں اور ہمارے درمیان کوئی رابطہ رہا بھی نہیں۔ بفرض محال یہ ثبوت مل جائے کہ لاہور میں تھی تو وہ سب سے زیادہ حیران ہو گا کہ اچھا! بڑی عجیب لڑکی ہے۔ ہمیشہ سے سمجھتی ہے کہ اس لیے مجھے لاعلم رکھا۔ خیر جو بھی کیا۔"

غالب نے کہا "سارا کھیل بدمعاشی کا ہے اور بدمعاشی ہے لعنت کی۔ حق حلال کی کمائی سے پیسہ جوڑا جائے تو دولت خرچ کرتا ہے دیکھ بھال کے کرتا ہے۔ کالا دھن جو کالی ذہنیت کی لوٹ ہے۔ اس میں حصہ لیجیے۔ کالے دھندوں میں پھونک دیا جاتا ہے۔"

وقار نے سہلایا "ہم قانون اور انصاف کی لکیر پیٹتے رہ جاتے ہیں۔"

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب سوال ہے مستقبل کا" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "کس کے مستقبل کا؟"

"ظاہر ہے ہم سب کے مستقبل کا۔"

"میرا مستقبل میرے سامنے ہے" اس نے نازو پر نظر جما کے کہا "اور خاصا مایوس کن ہے۔ بلکہ پُرخطر ہے۔ صحافت کا مستقبل بھی مجھے تاریک نظر آ رہا ہے۔"

"تمہاری صحافت کا تو ماضی بھی تاریک ہے۔ جب صحافی تھے تو کون سا تیر مارا تھا؟"

اس نے پھر ٹھنڈی آہ بھری "ارے ہم کیا تیر مار تھے۔ تیر تو تم نے چلایا ہے ایسا کہ ہائے ہائے نشانہ تھا دل۔ چھوڑو بھی آنکھ۔ اب ساری دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ گدھے گھوڑے ایک جیسے نظر آتے ہیں۔"

"ایک جیسے ہوتے بھی ہیں۔ ایک لاٹھی سے ہانکے بھی جاتے ہیں" رابعہ ہنسی۔

میں نے کہا "میں اپنے مستقبل کی بات کر رہا تھا۔ محسن کی زندگی میں اب ٹھہراؤ آ جانا چاہیے۔ گل کے حق میں بھی بہتر ہے ورنہ مجھے کیبوں کے ساتھ محسن بھی جانتے ہیں۔ میرے ساتھ ان کے لیے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔ الٹا وہ عدم تحفظ کا شکار ہو جائیں گے۔ محسن ہر معاملے میں ملوث ہو گا۔ یہ الگ بات ہے گل کا ماضی اس کی سب سے بڑی کمزوری بن جائے گا۔ یہ بہت زیادہ پرانی بات نہیں ہے کہ وہ شبنم ناگ کی بیٹی تھی اور ناگ منی کہلاتی تھی۔ اس کے خلاف ادھر اُدھر کے گاؤں، دیہات اور قصبوں میں لوٹ مار، ڈکیتی، رہزنی اور قتل و غارت گری کے درجنوں مقدمات درج ہوں گے۔ شبنم ناگ تو مارا گیا مگر ناگ منی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے کینچلی بدلی ہے۔ اس کا ماضی خود اس کے خلاف سب سے بڑی فرد جرم ہے اور فائدہ اٹھانے والے اس کی کمزوری کو ہماری کمزوری بنا سکتے ہیں۔ جب تک ہم یہاں نہیں تھے وہ منظر عام پر نہیں تھی یا اس ملک کے قانون کی دسترس سے دور تھی۔ اب اس کے لیے گھر سب سے محفوظ جگہ ہے پھر محسن کا گھر ایک بار بس کے اُجڑ چکا ہے۔ ظاہر ہے یہ زخم آسانی سے بھرنے والا نہیں مگر گل کی چاہت اور رفاقت کا مرہم اسے مندمل کر سکتے ہیں۔ گل کو بھی کرنا چاہیے اور یہ کم نہیں۔"

"اور خود تمہیں محسن کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔ خدا تمہیں عقل دے اور اس کی توفیق۔ آمین۔" غالب نے ہاتھ اٹھا کے منہ پر پھیرے۔

"میں دعا میں تمہارے لیے مانگوں؟" وقار بولا۔

"اپنے لیے میں خود دعا مانگ سکتا ہوں۔ اللہ مجھے جن بھوتوں کے قبیلے سے بچا۔ جو بلا میرے گلے پڑی ہے اس سے مجھے محفوظ

www.paksociety.com

رکھے۔ ہائے مجھے بھوت بنا دیا اس بھوت نے میری جان چھڑا دو میرا سسر کہتا ہے خود کو۔ آمین۔ تم آمین۔" غالب نے بڑی دردمندی سے دعا مانگ کے منہ پر ہاتھ پھیرے۔

غصے سے نازو کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا کیونکہ باقی سب لوگ ہنس رہے تھے "تم نے مجھے بلا کہا ہے؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ اتنے گواہ بیٹھے ہیں۔ پوچھ لو کسی سے بھی کیا میں نے تمہارا نام لیا ہے؟" غالب نے کہا۔

"تمہارے گلے تو میں ہی پڑی ہوں نا؟" اس کی شکل رونے والی ہو گئی "تم نے مجھے بلا کہا ہے۔ مجھے معلوم ہے۔"

"بھئی نازو۔ بلا میں اور خوب صورت بلا میں بڑا فرق ہوتا ہے اور دیکھو" ایک شعر بھی تو ایسے ہی موقعے کے لیے کہا تھا میں نے۔

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لیے ہوتے

میں نے کہا "غالب کے بچے تم موقع محل نہیں دیکھتے۔ ابھی نازو جلال میں آ گئی نا تو دماغ درست کر دے گی۔"

"چلو معافی مانگو نازو سے۔" رابعہ بولی۔

"کیا میں معافی مانگوں؟" غالب نے کہا "بڑا افسوس ہے خاتون کہ آپ بھی جانبداری سے کام لے رہی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ میں اپنی دعا میں ترمیم کر سکتا ہوں کہ اللہ کوئی خوب صورت بلا نازل فرما مجھ پر۔ آمین۔"

نازو ہنس پڑی "تم جیسے واہیات بھی کم دیکھے ہیں میں نے۔"

"مطلب یہ کہ دیکھے ہیں پہلے" غالب نے مجھے دیکھ کے کہا "ہاں۔ انہی کی محبت نے مجھے نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔"

"ہم تو تجھے آدمی پر بھی رشک کرتے ہیں۔ شوہر جو ہو گئے۔" وقار یوسف ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"اچھا۔ یہ بات ہے۔ بیٹے! ابھی تمہاری بیوی اٹھتی ہے سو کے تو میں بتاتا ہوں۔ دوسرے الفاظ میں تم اعلان کر رہے ہو کہ اب تم آدمی نہیں رہے۔ تم گدھے ہو۔ الو ہو یا پاگل کتے ہو۔ بے عزتی تو تمہاری بیوی کی ہے۔" غالب نے کہا "جاؤ نازو۔ سوئے شیر کو جگا دو۔"

"یار اسے مت چھیڑو۔ کل سے اس کی حالت خراب تھی۔ یہاں آ کے ایک دم ٹھیک ہو گئی ہے وہ۔ میں تو یہ دیکھ کے حیران رہ گیا۔ دن تو خیر جیسا گزر رہا تھا گزر گیا تھا۔ رات کو بھی وہ ایک منٹ کے لیے نہیں سوئی۔ مسلسل روتی رہی۔ سکون آور گولیوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ جس میں وہ مسلسل بولتی رہی۔"

میں نے کہا "وقار تم نے رابعہ کا جتنا ساتھ دیا ــــــ"

"ایسی باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ بولا۔

"نہیں یہ حقیقت ہے۔" رابعہ نے کہا "یہ صرف تمہاری محبت اور تمہارے خلوص کا نتیجہ ہے کہ آج میں پھر بیٹھ [illegible] اب سیٹ ہونے بھی نہیں دیا تھا تم نے۔ تم مقدمات نمٹ [illegible] فرم کو چلاتے رہے اور میرے اکاؤنٹ میں برابر [illegible] رہے۔ اتنی ایمانداری کی توقع کوئی اپنوں سے بھی نہیں [illegible]"

غالب نے کھنکار کے کہا "سکندر۔ اشارہ سمجھو۔"

میں نے کہا "اب میں توقع رکھتا ہوں کہ تم پہلے کی طرح [illegible] کا خیال رکھو گے۔"

"منظر صاحب کا ذکر نہیں کیا آپ نے جو انہوں نے [illegible] میرے بس کا نہیں تھا۔"

"ہاں۔ وہ چراغ کا جن ہے۔ تم انگوٹھی کے جن ہو" [illegible] نے کہا "حوالہ ہے مسٹر الہ دین کی اسٹوری کا لیکن اپنے [illegible] اعظم صاحب۔ آپ کی تقریر سے بڑے دردناک الوداعی [illegible] ایسے ٹپک رہے تھے کہ میں ہاتھ روم میں جا کے [illegible] چاہتا تھا۔ کم سے کم چار جا۔ نصیب دشمناں کوچ کا ارادہ [illegible] ہے؟"

رابعہ نے کہا "جو منہ میں آتا ہے بکتے چلے جاتے ہو۔"

"تم تو ایسے بگڑ رہی ہو جیسے میں نے دنیا سے کوچ کی بات [illegible] تھی۔ بھئی کوچ کا مطلب تو ہے روانگی۔ خیر سے یہ منہ اٹھائے [illegible] بھی جا سکتے ہیں۔ آدمی ہو تو اس کا پتا ہوتا ہے۔ یہ ٹیپا سکندر اعظم [illegible] ابھی نمو لگائیں اور منہ ہو مشرق کی طرف تو ناک کی سیدھ [illegible] بھارت فتح کرنے چل پڑیں۔ دنیا تج دیں اور باقی زندگی دین کے [illegible] وقف کر دیں۔ سادھو بدھ کی طرح کسی پیڑ کے نیچے لنگوٹ باندھ [illegible] بیٹھ جائیں۔" اس نے آنکھیں بند کیں اور آلتی پالتی مار کے [illegible] "شم شوم۔ سندرم۔ جنم میں ذالم ور ستم [illegible]"

اس کی اداکاری پر ہنستے ہنستے سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے [illegible] جتنا میں اپنے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے بات کرنے [illegible] کوشش کرتا تھا اتنا ہی وہ ماحول کو غیر سنجیدہ بنا رہا تھا۔ مجھے [illegible] وقار کی بیوی کا۔ ظاہر ہے وہ ہوتی تو ہم سب ایسے نہیں ہنس [illegible] تھے لیکن وہ اٹھ جاتی تو یقیناً برا مانتی۔ دکھ ہمیں بھی تھا مگر وہ [illegible] صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے غم کی شدت کو ہم محسوس [illegible] کر سکتے تھے۔ خود وقار بھی ہمارے ساتھ سسر محترم کی موت [illegible] صدمے کو بھولا ہوا تھا۔ سسر اسے بھی زیادہ عزیز نہیں تھا [illegible] وہ سسر کی پسند تھا۔ ان حالات میں وہ بیوی کے رنج پر [illegible] نقوی صاحب کی وفات حسرت آیات پر نہیں۔ ہم سب [illegible] کے بنے ہوئے تھے ہم آلام و مصائب کی ہر آزمائش سے [illegible] مسکراتے گزرتا جانتے تھے۔ سکھ میں تو سب ہی ہنس سکتے [illegible] دکھ میں بھی روتے نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم زندگی کے [illegible] مسائل کا سامنا کرتے ہوئے نہ پریشان ہوتے تھے اور نہ [illegible] ہارتے تھے۔ آپس میں مشورہ کر کے بڑے سکون سے [illegible] بحران سے نمٹنا سیکھ لیا تھا۔ ہمارے ذہن اور اعصاب کو [illegible]

[illegible] کا خوف لاحق نہیں کرتا تھا۔

[illegible] علی ترپ یہ استفسار فرماتے تشریف [illegible] کے کھانے میں کیا ہو گا۔ اسی وقت وقار کی بیوی بھی [illegible] رابعہ نے نازو سے کہا "ذرا تم بتا دو" ترپ صاحب [illegible] نہیں۔ بازار سے منگوا کے دے دوا نہیں۔" [illegible] زیادہ بیزاری سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے وقار کی بیوی [illegible] سے کہا "آؤ تم بھی منہ دھو لو۔ بلکہ نہا لو۔ فریش ہو جاؤ تو چائے پی [illegible]"

[illegible] کے نام پر کچھ اور بھی" غالب نے ہانک لگائی۔

وقار کو اچانک ان کاغذات کا خیال آیا جو اس کی گاڑی میں [illegible] کے نیچے رکھے ہوئے تھے وہ شیلی کا بیگ لے کر لوٹا تو کچھ [illegible] نظر آ رہا تھا۔ "باہر مجھے کچھ مشکوک قسم کے لوگ نظر آئے [illegible]"

غالب نے کہا "مشکوک کی وضاحت کرو۔ میری نظر میں تم بھی مشکوک ہو۔"

"ایک شخص گیٹ کے اوپر سے جھانک رہا تھا۔ اس کا کالا سر مجھے گیٹ کے اوپر ابھرا ہوا دکھائی دیا۔ میں نکلا تو وہ غائب ہو گیا۔ میں نے لپک کے گیٹ پر سے جھانکا تو ایک شخص دوسری طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ میں نے اسے متوجہ کیا اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ وہ [illegible] "کیا بات ہے" میں نے کہا "یہاں کیوں کھڑے ہوئے ہو؟ گیٹ کے سامنے" وہ بد تمیزی سے بولا۔ گیٹ تمہارا ہے۔ فٹ پاتھ [illegible] نہیں ہے وکیل صاحب۔" ظاہر ہے وہ مجھے پہچانتا تھا مگر یہ بات کہہ کے وہ چل پڑا اور سڑک پار کر گیا۔ وہاں دو گاڑیاں کھڑی [illegible] ان کے ڈرائیور باہر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں مگر تم خود دیکھ سکتے ہو کہ وہ کوٹھی کی نگرانی کر رہے ہیں۔"

"کیا صورت سے پولیس والے لگتے ہیں؟"

"نہیں۔ پولیس والے نہیں ہیں۔" وقار نے کہا "ان کا [illegible] بدمعاشوں جیسا۔"

غالب نے کہا "میں جا کے ابھی قتل عام کرتا ہوں۔"

رابعہ نے کہا "ہم نیچے چلتے ہیں۔ وقار تم اوپر رہو۔ منظر آنے والا ہے۔"

وقار نے سمجھایا "ہاں۔ آٹھ بجے اٹھتے ہیں وہ اپنے چیمبر [illegible]"

میں نے کہا "آج تم سب نے چھٹی کی؟"

رابعہ بولی "ہاں۔ دوسرے لوگ ہیں کلائنٹس سے نمٹنے کے [illegible]"

غالب نے کہا "اپنی تو نوکری ایسی ہی ہے اور ابھی شروع ہوئی [illegible]"

[illegible] رابعہ اور غالب الماری سے گزر کے نیچے پہنچ گئے۔ بند

کمرے میں حبس تھا۔ رابعہ نے جاتے ہی اے سی چلا دیا۔ وہ بیگ رابعہ کے کندھے پر بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ جو بالکل اسی طرح شیلی لٹکائے پھرتی تھی۔ یہ نرم چمڑے کا شولڈر بیگ تھا جس کے تسمے لمبے تھے۔ اس کے دونوں جانب سنہرے نقوش تھے۔ ایک طرف اجین کے کلچر کی عکاسی تھی۔ ایک بل فائٹر جو "ماتا ڈور" کہلاتے ہیں اپنے مخصوص روایتی لباس میں بپھرے ہوئے سانڈ کو چیلنج کر رہا تھا۔ نوکیلے سینگوں والا سانڈ سر جھکا کے اس پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس کے نتھنوں سے دھواں سا نکل رہا تھا اور سموں سے گرد اڑ رہی تھی۔ دوسری طرف اہرام مصر تھے کھجور کا ایک درخت تھا اور ایک شخص اونٹ کی مہار تھامے ریت پر پیدل جا رہا تھا۔ پس منظر میں چاند سے رات کا وقت ظاہر ہوتا تھا۔

یہ ہینڈی کرافٹ کا خوب صورت نمونہ اس نے نہ جانے کہاں سے لیا تھا۔ اس کے اندر دو زپیں تھیں جن سے بیگ میں تین خانے بن گئے تھے۔ رابعہ نے میرے سامنے بیڈ پر اس کی ایک ایک چیز نکالی تو مجھے ایک مانوس خوشبو نے بے چین کر دیا۔ پرفیوم کی چھوٹی سی خوب صورت شیشی اس کے سامان میں سے برآمد ہوئی۔ غالب نے فوراً اسے اچک لیا۔

"بڑی قیمتی خوشبو ہے۔" وہ بولا اور فوراً اس کا اسپرے رابعہ پر کر دیا۔

رابعہ چلائی "یہ کیا بدتمیزی ہے!"

"کیوں۔ خوشبو بری لگی ہے؟ تمہیں یا ڈر لگتا ہے اس خوشبو سے؟" غالب بولا۔

رابعہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے شیشی چھین کے پیچھے رکھ دی مگر اب کمرے میں وہ خوشبو پھیل گئی تھی جو میرے احساس میں شیلی کے وجود سے منسوب ہو چکی تھی۔ رابعہ نے اس کے دونوں پاسپورٹس دیکھے اور پھر غالب کو تھما دیے۔ شاید غالب کو رابعہ کے اور میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس خوشبو نے ہمیں مضطرب کر دیا ہے اس نے پاسپورٹ پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بیگ میں پندرہ بیس ہزار نقد باقی تھے اور خاصی مالیت کے ٹریولر چیک الگ موجود تھے۔ ایک چھوٹی سی ڈائری میں بہت سے ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے تھے۔ پرانے نمبر لندن کے تھے۔ نیا اضافہ پاکستان کے نمبروں کا نظر آتا تھا۔ ان میں منظر کے گھر کا فون نمبر تھا۔ رابعہ کے آفس کا نمبر تھا۔ چار نمبر ان کے علاوہ تھے۔

میں نے رابعہ سے پوچھا "ان میں کوئی نمبر دلاور کا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم لیکن یہ ایک نمبر وزیر خان اسپتال کا ہے ظاہر ہے وہاں اس سے رابطہ ہو سکتا ہے۔"

"اور باقی تین نمبر کس کے ہیں؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم لیکن معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

غالب نے کہا "یہ نمبر کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"کارآمد تو یہ ساری دستاویزات ہیں۔ میرا خیال ہے دلاور

www.paksociety.com

ایجنڈ کمپنی کو ان کی ضرورت پڑے گی۔ کیا پتا آج صبح وہ انہی چیزوں کی تلاش میں یہاں آئے ہوں۔ ان کو اسی جگہ کہیں چھپا دو۔"

غالب نے کہا "میں حیران ہوں کہ اس بار نرس شاہدہ کے ساتھ کیا ہوا؟"

میں نے کہا "تم گئے تھے اس کے گھر؟"

"میں اور وقار ایک ساتھ گئے تھے اسپتال سے فارغ ہو کر لیکن وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ محلے میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئیں۔ ان کے شہر میں بہت سے رشتے دار تھے۔ چچا، تایا، ماموں اور خالائیں۔ وہ شہر کے مختلف حصوں میں رہتے ہیں اور اکثر ان کے گھر آتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے وہ بھی ان کے گھر جاتے ہوں گے۔"

ادھر سے انٹرکام کے بزر کی ہلکی سی میوزیکل ٹون آئی۔ رابعہ نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہاں۔ کیا ہے نازو۔ ٹھیک ہے بھیج دو۔ پوچھنے کی کون سی بات ہے؟" پھر وہ ہنسنے لگی۔

میں نے کہا "کون آیا ہے۔ منظر؟"

"بالکل صحیح اندازہ لگایا تم نے۔ کہہ رہا ہے کہ میں اس چوہے دان میں سے کیسے گزروں گا۔" رابعہ بولی اور سیڑھیاں چڑھ کے دروازہ کھولنے گئی۔

غالب بولا "ہاتھی۔ گینڈا کیسے گزر سکتا ہے چوہے دان سے۔"

منظر کا اپنی غیر معمولی جسامت اور قاعدے بڑھے ہوئے پیٹ کے ساتھ کچن کی الماری میں داخل ہونا اور پھر اس دروازے سے گزر کے تہ خانے تک پہنچنا یقیناً مشکل کام تھا۔ وہ اوپر سے لڑھکتا ہوا آیا۔

میں نے رابعہ کو خبردار کیا "اس کے پیچھے رہا کرو ورنہ یہ لڑھکا تو تم پر دو من کا بوجھ آ جائے گا۔"

اس نے بیٹھتے ہی مجھے نصف درجن گالیوں سے نوازا "سالے سکندر اعظم کے بچے۔ عاشقی کی سوجھی۔ تو یہاں چھپا ہوا ہے سالے۔"

"بے شک۔ کونے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔ لیکن تو میاں کے اس پروپیگنڈے پر مت جا۔ ایک بلبل کے نقطہ نظر سے دیکھ۔"

"یہ سالا مجھ جیسے بچوں کے باپ سے کہتا ہے کہ بلبل کی نظر سے دیکھ۔ میں تو باپ ہوں تیری اس بلبل کا۔" اس نے رابعہ کی طرف اشارہ کیا "پوچھنا تو مجھے اس سے چاہیے کہ میرے ساتھ یہ سلوک کیوں ہو رہا ہے؟"

"پھر کیا ہونا چاہیے؟" میں نے ہنس کے کہا۔

"پھڑول۔ تیری تو اب تک پھڑول ہونی چاہیے" وہ شور مچانے لگا "اور روز تجھے کھانے چاہئیں پہلے سو پیاز پھر سو جوتے جوتے پڑنے چاہئیں سر پر سر منڈوانے کے بعد۔ دماغ آ جائے راہ راست پر تمہارا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا پہلے؟"

"رابعہ۔ مجھے بڑا ناز ہوا ہے۔ اس سے کہو میرا کوئی سو بار اذان دے کر کے میری توبہ۔ آئندہ کسی کی طرف نظر اٹھا کے دیکھوں تو۔"

رابعہ مسکرائی "چلو اس بار معاف کیا۔"

"معاف تو خیر میں نے کر دیا تھا لیکن تم اس کے گلے بی بی رونے بیٹھ گیا ہے اور اب اسے باندھو کسی ضمنے سے اب مزار بھی نہیں بنے گا جیسے۔"

میں نے کہا "دیکھو منظر۔ میں ابھی سے صاف بتا رہا ہوں یہاں قید ہو کے نہیں رہ سکتا۔"

"تو پھر جیل چلا جا۔ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں تیرا" وہ بولا "پھانسی چڑھ جا۔ ایسے مر مر کے کیا جینا۔ تجھے تو ہم مرتے ہیں پریشانی میں۔ یہ کیا ہے؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "ایک شعر عرض ہے۔"

بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے
یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

"میں سمجھا" اس نے شبلی کے پاس پڑے ہوئے "مرحوم کی باقیات کو سامنے رکھے رو رہا تھا تو۔ تجھے پتا ہے ہے اس کی؟"

"میں بتاؤں میں کیسے بتاؤں؟"

"تیرا تو باپ بھی بتائے گا۔ بھوتنی کے۔ مجھے معلوم ہے سب تیرا حرامی پن ہے۔ لاش تو نے ہی غائب کرا دی کہیں اس کا مزار بنائے گا اور جب مجاور بن کے بیٹھے گا بحر ظلمات میں دوڑنے والے اندھے گھوڑے۔ رہنے دو تھی مس رابعہ۔ اس بے چارے کو معاف کر دو۔ میں بھی بھڑک جاتا۔"

رابعہ نے کہا "کیا جرم ہے ان کا جو میں معاف کروں؟"

"بس کسی زنجیل رہے رکھی ہے نا تم نے اس کا نچوڑ سب۔ میری بیوی کو دیکھو۔ کیسا باندھ رکھا ہے مجھے باندھے ہیں مال غنیمت۔ اس کے لیے تو مال غنیمت ہی جانتی ہے کہ دوسرا کاٹھ کا الو کہاں ملے گا۔ سب ذرا ہے۔ تم بھی پر کاٹ دو اس کے ورنہ میں بتا دیا ہوں۔ اولاد ہے یہ تمہاری۔"

"آپ بھی حد کرتے ہیں" رابعہ جھینپ کر بولی۔

میں نے کہا "منظر کیا تمہاری معلومات اب تو تجھے معلوم ہے آج کیا ہوا تھا؟"

منظر بولا "سچ بے خبر وار اور وقار یوسف نے خلاصہ سنایا فون پر۔ ہاں وہ میں نے ہی تو بھیجے تھے۔"

رابعہ ہنسی "یہ جن کے بھیجے تھے۔ کہاں سے ملے؟"

"وہ اپنا ایک جاننے والا تھا۔ اللہ کو پیارا ہوا۔ اس کے گھر تھے۔ بعد میں بیوی اپنے انڈے بچے سمیٹ کر ان کی چھٹی ہو گئی تھی۔ وہ جگہ انہیں مرغی کے مالک نہیں ملے۔"

"شعر نہیں سنتے ہوں گے۔"

"بس۔ ایک تو خود شاعر تھا۔ وزن ردیف قافیے پر اعتراض کرتا رہتا تھا اور ان کی فکر کو بھی عامیانہ قرار دیتا تھا۔ دوسرا گھر والی اور اس کی بیوی تو سونے میں بھی بولتی تھی۔ وہاں یہ کیا مجھے خیال آیا کہ رابعہ کی اچھی گزرتی رہے گی۔ پیسے کا مسئلہ نہیں ہے بے چاروں کو۔ ایک ٹھکانا چاہیے اور تھوڑی سی محبت جیسے بھی رہتے ہیں تو عزت کے ساتھ۔"

"میں نہیں جانے دوں گی یہاں سے" رابعہ نے کہا۔

منظر نے ٹھنڈی آہ بھری "کاش تم نے کہا ہوتا کہ ہم اور پھر ہماری اولاد بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ صرف میں۔"

میں نے کہا "منظر، بار بار ایک ہی بات مت کر۔ میں شادی ضرور کروں گا لیکن پہلے یہ معاملات نمٹ لوں۔"

منظر نے اپنے جوتے کی طرف ہاتھ بڑھایا "بھوتنی کے۔ تیرے ان معاملات کی اور تیری تو ایسی تیسی۔ خود پھیلاتا جاتا ہے۔ سمیٹے گا اب تیرا باپ۔ اس کا تو کوئی علاج ہے۔"

"نہیں منظر اب میں یہ واقعی سمیٹ دینا چاہتا ہوں۔ یہ جو کچھ ہوا یہاں آنے کے بعد۔ غلط تھا مگر زندگی کے حادثات فطری کا مقدر ہوں تو انہیں کون روک سکتا ہے۔"

"کیا فرمایا آپ نے۔ پتا نہیں کب میں نے بھی چاہا تھا کہ اب پیدا ہو کیا شعر ہے"

"بس بہت زرخیز ہے ساقی۔۔۔"

میں نے کہا "میرا پہلے ارادہ تھا کہ شبلی کے ساتھ لندن بھاگ جاؤں۔ تیری نینی کے ساتھ۔"

"تیری تجی کے ساتھ میرا دل بھی چاہتا ہے کہ نیلو کے ساتھ بھاگ جاؤں۔ نیت تو بعد میں خراب ہوتی ہے" منظر بولا۔

رابعہ ہنسنے لگی "میں بھابی کو بتا دوں گی۔"

"اسے معلوم ہے۔ میں خود بتا چکا ہوں کئی بار۔ سچ کسی سے تو بولنا چاہیے۔ وہ سمجھتی ہے کہ یہ بھوتنی کا اب کہاں جائے گا۔ اس کے بھی فرار نہ ہو۔" منظر نے کہا۔

"میرا پلان کچھ اور تھا۔ اس کی منظوری مرحوم نقوی صاحب کا کہ بیٹا مقدمات تو ختم ہونے سے رہے۔ یہاں تم تمہیں چھوڑے گا۔ یہ مقدمات کی کہ تم اس میں اترتے جا رہے ہو باہر نکلنے کی کوشش ہے۔"

"کہا تو ٹھیک ہی تھا انہوں نے۔"

"یہ شبلی کی تجویز تھی۔ خدا جانے اس میں وہ کس حد تک مخلص تھی۔"

"تجھے ورغلانے میں وہ ضرور مخلص ہو گی۔ اب میں کیا کہوں اسے۔ عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے بی بی رابعہ۔ یہ بڑی تلخ حقیقت ہے۔ اسے فرشتہ اجل نہ لے جاتا تو وہ لے گئی تھی اس بھوتنی والے کو۔"

میں نے کہا "یار اب تو کوئی میرے کہے کا اعتبار نہیں کرتا مگر خدا گواہ ہے۔ مجھے امید کی ایک صورت نظر آئی تھی۔ میں لندن جاتا فرضی نام سے۔ اصلی نام سے مجھے وہاں کوئی داخل نہیں ہونے دے گا۔ نقوی صاحب نے لائن کلیئر کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہاں سے دو چار ماہ بعد میں لوٹتا۔"

"یا دو چار سال بعد۔ دو چار بچوں کے ساتھ۔"

"منظر مجھے غصہ آیا تو تیرا پیٹ پھاڑ دوں گا۔"

"سب کچھ اور بھی پھاڑ دے۔ زمانے نے پہلے ہی پھاڑ دیا ہے سب کچھ۔ اب تو دل چاہتا ہے کپڑے پھاڑ کے نکل جاؤں کہیں۔ تو بتا کہاں جاؤں؟"

میں نے کہا "تو کل تماشے۔ اب بیچ میں مت بولنا۔ جب میں لندن سے واپس آتا تو میرا حلیہ بھی بدلا ہوا ہوتا اور نام بھی۔ میں اپنے ماضی کو بھلا کے ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا۔ دو چار افراد کے سوا۔ یعنی تم لوگوں کے سوا کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ میں وہی سکندر بخت ہوں۔"

"کیا بات ہے۔ نام تو۔ مولوی رحمت اللہ سالکوٹی یا مسٹر انگریز بخت۔"

"ظاہر ہے میک اپ سے حلیہ بدل کے زیادہ کتنے دن رہ سکتا ہے۔ ہاں مستقل داڑھی مونچھیں بڑھا کے اور وکٹوریہ جیسی اسٹائل کے بال رکھ کے میں کچھ عرصہ کراچی میں گزارتا۔ کوئی بزنس کرتا۔ اپنا ایک حلقہ بناتا جس میں مجھے جاننے والے کسی اور نام سے جانتے۔ میرا بیک گراؤنڈ بھی مختلف ہوتا۔ میں ہفتے میں ایک بار نائٹ کوچ سے لاہور آتا اور رات کو ہی چلا جاتا۔ تم سے رابطہ ایسے رکھتا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور سال دو سال بعد جب دنیا سکندر بخت کو ڈھونڈنے میں ناکامی کے بعد تھک ہار کے بیٹھ جاتی۔ تم سب دنیا کے سامنے اسے مرحوم کہہ کے صبر کر لیتے۔ یہ مشہور کر دیا جاتا کہ وہ مرحوم پرست تو اللہ کو پیارا ہوا۔ تو میں لاہور منتقل ہو سکتا تھا۔ فی الحال یہ پروگرام تو ختم ہوا لیکن اس منصوبے کے ملبے پر دوسرا منصوبہ زیر غور ہے۔"

"کس کے زیر غور ہے۔ تیرے زیر غور ہے تو ابھی سے نامنظور اور ہم غور فرما رہے ہیں تو منظور" منظر نے کہا۔

"منصوبہ یہ ہے کہ روپوشی کے پروگرام پر یہاں عمل کیا

www.paksociety.com

جائے لندن جانے کے بجائے میں اسی زیرِ زمین قید خانے میں رہوں اور کسی کے ساتھ نظر نہ آؤں۔ میرے مشیران یعنی تم سب میری تشنگی کی اتھاہ پہچان رکھو۔ رحمٰن آسانی سے چکر میں آنے والے نہیں ہیں۔ وہ اسے اغوا ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کریں گے مگر انتظام ایسا ہو کہ انہیں میرا سایہ تک نہ ملے۔"

"پھر آپ بھوت بن جائیں۔ وہ کسی کو نظر نہیں آتے اور ان کا سایہ بھی نہیں ہوتا۔" غالب نے کہا۔

"تجویز تو یہ بھی تھی کہ میں سلیمانی ٹوپی اوڑھ کے سب کی نظروں سے غائب ہو جاؤں مگر سب کے درمیان رہوں۔ مجھے سب تجاویز ایک سی ناقابلِ عمل لگتی ہیں۔ انڈر گراؤنڈ رہنے کی اسکیم مناسب" میں نے کہا۔

"کیوں۔ یہاں رہنے میں کیا ہے بھوتنی کے۔ مفت کی روٹیاں توڑو لمبی تان کے سو جاؤ۔ ناز نخرے اٹھانے والی ایک چھوڑ دو دو ہیں۔"

"میں چھ مہینے ساری دنیا سے کٹ کے اس قید خانے میں رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔"

غالب بولا "وہ تو خیر سے آپ ہیں۔ رہ گئی یہ رہتی چاہیے کہ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"دیکھو یار۔ اگر ہم نے فیصلہ کر لیا تو اس پر عمل بھی کریں گے۔ جنگل کی طرح تجھے باندھ دیں گے کسی کونے میں اور وہیں کھولا ماریں گے تیرے لیے۔ پاگل ہونا ہے تو شوق سے ہو جا۔ پہلے ایک مسئلے سے نمٹ لیں پھر دماغ کا علاج بھی کرا لیں گے۔"

غالب نے تائید کی "بالکل ٹھیک۔ پہلے جان بچائی جائے۔ ورنہ دماغ بھی نہیں ہوگا تو ٹھیک کیا کرائیں گے" غالب نے کہا "اور یہ ہو سکتا ہے کہ اس کارِ خیر میں چھ مہینے نہ لگیں۔ یہ تو زیادہ سے زیادہ وقت ہے۔"

"اور کم سے کم؟"

"پانچ مہینے انتیس دن۔" غالب نے کہا "ہم اس عرصے میں تمہارے لاپتا ہونے کا یقین دلا دیں گے۔ تمہاری رحلت کا بندوبست کریں گے اور سرکاری طور پر تمہاری دردناک موت کا پروانہ اس طرح پیش کیا جائے گا کہ خود تمہیں اپنی جواں مرگی پر رونا آنے لگے گا۔ یہ میری ڈائریکشن کا کمال ہوگا۔"

"یہ بہت مشکل۔ بلکہ ناممکن ہے۔ جھوٹ کا پتا چل جائے گا۔ ولاور اینڈ کمپنی ہی نہیں۔ پولیس والے بھی ہیں۔ اب تو وزارتِ داخلہ کا اوپر سے دباؤ بھی ہوگا کہ دیکھو یہ کوئی چال تو نہیں ہے۔ زندہ تری کو اتنی آسانی سے مرحومین میں نہیں شامل کیا جا سکتا" میں نے کہا۔

"ہم نے اس پر تفصیل سے غور کیا ہے اور بحث کی ہے۔ یہ آپ ہم پر چھوڑ دیں اور خاموشی سے صرف تماشا دیکھیں۔ ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔"

منظر نے بھی سہلایا "پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ سارے دھوکا دینے والوں کو دھوکا دینا ناممکن ہے مگر اب میں کچھ کچھ قائل ہو گیا ہوں کہ سوچ سمجھ کے ہر قدم اٹھایا جائے تو ہر طرح کا کام ہو سکتا ہے" منظر نے کہا "مگر شرط یہی ہے کہ دنیا چھ مہینے تو تمہاری منحوس شکل نہ دیکھے۔"

"شکل کو کچھ مت کہنا۔ بڑی بڑی یکتائے روزگار حسینائیں جمال اس پر فریفتہ ہوئی ہیں" میں نے کن انکھیوں سے رابعہ کو دیکھا۔

منظر نے عادت کے مطابق گلا پھاڑ کے قہقہہ لگایا "سارا غلط فہمی ہے تیری۔ اسے جہنم لاوارث سمجھ کے کسی نے ترس کھاتے ہوئے تجھے گود لے لیا...."

میں نے قہقہے کی آڑ میں لے لیا۔ گو رعرف اتولی مجہند رابعہ نے خفگی سے کہا "بکو مت۔"

منظر نے کہا "چھ مہینے کی جیل کاٹ لے۔ سارے کیس ختم ہو جائیں گے ورنہ میں بتادوں بچہ۔ اس بار تو پکڑا گیا تو تیری ضمانت تک نہیں کرا سکیں گے۔ پولیس بڑی سرگرمی سے تلاش میں ہے۔ ہر جگہ چھاپے مارے گی۔ ہم سب کے گھروں اور دفتروں کی نگرانی ہوگی۔ ہمارا پیچھا کیا جائے گا یہ دیکھنے کے لیے کہیں گاڑی کی ڈکی میں تو سکندر بخت نہیں ہے۔ یہ ضرور دیکھا جائے گا کہ تو کہیں نہیں بیٹھا ہوا ہے۔ آنا جانا کہیں نہیں ہے۔ نہ دن کے اجالے میں نہ رات کے اندھیرے میں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ سب میں نہیں کر سکوں گا۔"

"تیرا تو باپ بھی کرے گا بھوتنی کے۔ قسم خدا کی زنجیریں ڈال کے لٹا کے رکھیں گے تجھے۔"

غالب نے کہا "ہمارے لیے بھی یہاں بڑا رسک ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے تو پکڑا گیا تو ساتھ ہی ہم سب بھی اندر ہو جائیں گے دھوکا دہی کا اور قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا پتا نہیں کتنے سنگین الزامات کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ یہ سب مت کرو۔"

"اور کوئی طریقہ نہیں ہے سکندر۔"

میں نے کہا "فرض کرو میں کہیں چلا جاؤں۔ لندن نہ سہی کراچی۔"

غالب نے انکار میں سر ہلایا "پولیس ہی نہیں پبلک بھی تمہیں کہیں نہ کہیں پہچان جائے گی اور پکڑے گی۔ تمہارے خلاف پولیس کی زبردست مہم شروع ہونے والی ہے۔ اخباروں میں تصویریں چھپ چکی ہیں۔ جب پوسٹر لگ جائیں گے ہر شہری کی نظر میں تو تم لوگوں کی نظر سے کیسے بچو گے!"

"فرض کرو میں تمہاری بات مان لوں پھر بھی تو یہ کام... چھ مہینے بعد نئے نام اور بدلے ہوئے حلیے میں بھی کوئی مجھے... جائے میں اپنے فنگر پرنٹ تو نہیں بدل سکتا۔ میری صورت بدلنے والوں کو بھی پکڑا جا سکتا ہے اور تصدیق کے لیے فنگر پرنٹ ہیں۔ پولیس کے ذہن میں جو سکندر بخت نہیں ہوگا وہ نہیں پکڑا جائے گا۔ سکندر بخت پکڑا گیا تو حلیے یا نام کی تبدیلی سے بچ نہیں سکے گا۔"

غالب نے کہا "امید پر دنیا قائم ہے۔ سو فیصد یقین کے ساتھ کوئی کام آغاز نہیں ہوتا۔ ابتدائی اندازے تجزیے، سروے اور FEASIBILITY رپورٹس کی بنیاد پر بڑے بڑے پروجیکٹ شروع کیے جاتے ہیں تو کامیابی کے غالب امکانات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اسی نوے فیصد کامیابی کی امید ہو تو کم سے کم بیس فیصد تو تقدیر پر یا خدا کی مرضی پر بھی بھروسا کرنا چاہیے یار۔ ویسے تو سب کچھ خدا کی مرضی پر منحصر ہے مگر وہ بھی تو کہتا ہے کہ کوشش کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تم سب کو انکار نہیں کر سکتا۔ میں تعاون کروں گا لیکن مشروط طور پر۔ مجھے سب کچھ بتایا جائے گا اور ٹھیک دو مہینے بعد میں صورتحال دیکھ کے فیصلہ کروں گا کہ اس منصوبے کو جاری رکھا جائے یا ختم کر دیا جائے؟"

"ٹھیک ہے۔ لیکن تمہاری جان چھوٹ گئی تمام قانونی مسائل سے۔ بالفاظ دیگر تم کو تختہ دار تک پہنچنے سے بچا لیا گیا۔ جس کا موجودہ حالات میں ایک فیصد چانس نہیں ہے کیونکہ تمہارے خلاف ٹھوس شواہد ہیں اور کم سے کم ممکن میں تمہیں سزائے موت اول ہو سکتی ہے۔ تو پھر زندگی تم شرافت سے گزارو گے۔"

"بالکل میری طرح" منظر نے کہا "ہمیں ایک ہی کام ہوگا۔"

میں نے جلدی سے کہا "بس بس۔ میں سمجھ گیا لیکن میں بھی ایک بات کی لیپی رکھے بغیر بتا دینا چاہتا ہوں۔ میں اپنے مقصد سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔"

"یہ کون سا مقصد۔ رابی جیٹھانی کے ساتھ رخصتی؟" منظر نے کہا "پھر دن رات فیکٹری چلاؤ۔"

"کون سی فیکٹری؟" غالب نے کہا۔

"بابا فیکٹری اور کون سی فیکٹری۔" غالب نے گھورا۔

"یہی۔ دو دو منزلی اور دالبوں والی فیکٹری۔ کیا وہ خریدنے کا پروگرام بھی ہے؟"

منظر گلا پھاڑ کے ہو ہو کرنے لگا "ہوئے گا رے۔ شادی کے بعد بو فیکٹری میں نے چلا رہا ہوں۔ بچے پروڈکشن فیکٹری۔"

رابعہ کا رنگ لال پڑ گیا "تم بھی حد سے بڑھ جاتے ہو بے ہودہ کہیں کے۔"

میں نے فوراً سنجیدگی سے کہا "منظر ابھی تک میرے باپ کے قاتل آزاد گھوم رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ درمیان میں زیادہ اہم مسئلے نے مجھے ذاتی انتقام کے مقصد کو التوا میں رکھنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن میں اس خیال کو دل سے نکال نہیں سکا تھا۔ مجھے آج بھی خیال آتا ہے کہ میرے والد کے ساتھ ولاور نے کتنا انسانیت سوز ظلم کیا تھا اور ان کو کتنی بے رحمی سے تڑپا تڑپا کے مارا تھا اور وہ کتنی بے بسی سے سب برداشت کرنے اور خاموش رہنے پر مجبور کر دیے گئے تھے۔ تو میرا خون میری رگوں میں سنسنانے لگتا ہے۔ مجھے بعض اوقات شرم آتی ہے اپنے آپ سے کہ میں نے ابھی تک انہیں سزا دینے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ میری غیرت مر گئی ہے کیا؟"

"یار۔ یہ انتقام تو کس کس سے لے گا؟" غالب نے کہا۔

"سب سے۔ میں مسلمان ہوں اور پٹھان ہوں غالب" میں نے کہا "ہم قصاص کے اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ آنکھ کے بدلے آنکھ۔ جان کے بدلے جان۔ اور میرا پٹھان خون انتقام کو انصاف سمجھتا ہے۔ یہ میری بے حسی تھی کہ ولاور کے دل میں خوف نہیں رہا۔ وہ سمجھتا ہے بات پرانی ہو گئی اور میں بھول گیا۔ نہیں۔ میں اس کے جرم کو کیسے بھلا سکتا ہوں۔"

منظر نے مایوسی سے کہا "اچھا یار۔ جو تیری مرضی ہے وہ کر لیکن ہماری بھی کوئی حیثیت ہے یا نہیں۔"

غالب نے کہا "پہلے تم ہماری بات مانو۔ اپنی جان بچاؤ پھر جو چاہو کرو۔ ہم تمہارے ساتھ ہوں گے۔"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا "شاید تم اتفاق نہ کرو اس سے لیکن میں مجبور ہوں۔ نہ میں تم کو کھونا چاہتا ہوں اور نہ اپنے مقصد سے دور ہونا قبول کر سکتا ہوں۔ تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔"

اس نے بڑے سکون سے کہا "میں انتظار کر رہی ہوں اور کرتی رہوں گی۔"

"یہ انتظار غیر معینہ مدت تک طویل بھی ہو سکتا ہے" میں نے کہا۔

"مگر میرا وعدہ محدود ہے۔ زندگی کی آخری سانس تک" رابعہ نے سر جھکا کے آہستہ سے کہا۔

میں نے سکون کی گہری سانس لی "تم نے میرے دل کی سب سے بڑی خلش دور کر دی ہے۔ یہ وعدہ ہی میرا سب سے بڑا سہارا ہوگا۔ اس کی خاطر میں اپنی حفاظت بھی کروں گا کیونکہ میں بھی پابند ہوں تمہارے پاس لوٹ کر آنے کا۔"

منظر نے گھڑی دیکھی "یار اب میں تو چلتا ہوں۔ ورنہ بیوی مارے گی۔ بہت دیر ہو گئی۔"

"کیوں اس اللہ میاں کی گائے کو بدنام کرتا ہے منظر۔ وہ کچھ کہتی ہے تجھے۔ وہ مار سکتی ہے تجھے؟"

"اے وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کہتی رہتی ہے۔ یہی تو سب سے بڑی مار ہے اس کی۔" منظر اٹھ کھڑا ہوا "وہ اللہ میاں کی گائے نہیں۔ مرغی ہے جو ہر وقت کڑکڑاتی رہتی ہے مگر کڑک نہیں ہوتی۔"

وقار نے کہا "جب آپ آئے تھے تو کیا آپ کو محسوس ہوا تھا کہ باہر کچھ لوگ کھڑے ہیں۔ بڑے مشکوک انداز میں؟"

www.paksociety.com

"اب غور کروں گا۔ میری تو گاڑی ہی باہر کھڑی ہوئی ہے" مظہر نے کہا اور اوپر چڑھ گیا۔ الماری سے گزرا اور غائب ہو گیا۔
وقار نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم بھی چلیں۔ اپنے گھر۔"
رابعہ بولی "یہ پرایا گھر ہے؟"
"میرا مطلب تھا جو میرا گھر ہے۔ نقوی صاحب کی سرکاری کوٹھی نہیں۔ وہاں تو کل جائیں گے سو ختم ہو گا۔ بس اس کے بعد جائیں گے تو سامان اٹھانے کے لیے" وقار نے کہا۔
میں نے کہا "اپنی بیوی سے تو پوچھ لو۔ وہ جائے گی؟ آج کا دن یہاں گزار کے وہ خاصی پُرسکون ہو گئی ہے۔"
"وہ رہنا چاہے رات کو بھی تو رہے۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے اجنبی ماحول میں صحیح نیند نہیں آتی اور میں آج رات واقعی سونا چاہتا ہوں" وقار یوسف نے کہا "اپنے بیڈ روم میں۔"
"پھر تم ضرور جاؤ" رابعہ نے کہا۔
وقار کے جانے کے بعد میں نے کہا "میں ابھی سے خود کو ایک قیدی محسوس کرنے لگا ہوں۔ یہ احساس بڑا عجیب لگتا ہے مجھے کہ دنیا میرے لیے سمٹ کر اس کمرے کی چار دیواری اور چھت تک محدود ہو چکی ہے اور میں یہاں چھپ کر رہنے پر مجبور ہوں کیونکہ باہر خطرہ ہے۔ موت ہے۔"

"ایسی باتیں مت سوچو۔"
"یہ سوچنے کی بات نہیں۔ وہ حقیقت ہے جس سے سمجھوتا کرنا مشکل لگتا ہے۔ بالکل جیل میں نووارد قیدی کی طرح۔ تم سب آزاد ہو۔ باہر کی دنیا میں جو کچھ ہے سب تمہارے لیے ہے۔"
غالب نے کہا "باہر کی دنیا کو ہم یہاں لا سکتے ہیں۔ کیا چاہیے تمہیں؟"
"مجھے آزادی چاہیے۔ اس حد تک کہ میں چاہوں تو گوالمنڈی جا کے تکے کباب کھا سکوں۔ سرنگ چلا جاؤں مچھلی کھانے انارکلی مال۔۔۔ سب ہی میرے لیے ممنوعہ علاقے ہو چکے ہیں۔ جب تک میں اس وینڈ میں تھا یہ نہیں سوچا تھا کہ اس سے محرومی کیا چیز ہو گی۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ چھ مہینے تک لاہور میں رہ کے لاہور سے دور رہنا۔ لاہور کو نہ دیکھنا۔ لاہور کو محسوس نہ کرنا۔ کتنا مشکل ہو گا۔ نہر کے کنارے کی صبح، انارکلی کی دوپہر، باغ جناح کی شام اور مال روڈ کی رات۔"
"بس کر یار۔ ابھی سے رونا شروع کر دیا۔ کیسے ہو گا پھر یہ کام اور زندگی کیسے گزرے گی۔ زندہ رہنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور زندہ رہنے کے لیے بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کڑوی دوا بھی پیتا ہے آدمی اور اپنے جسم کی چیر پھاڑ اور کاٹ چھانٹ بھی قبول کرتا ہے۔"
"یہ وقتی مایوسی اور فرسٹریشن کا ردعمل ہے۔ جیل میں نووارد بھی بہت جلد مستقبل کی امید کے ساتھ آزمائش کے دن کاٹنے لگتا

ہے اور دن کتنے ہی مشکل ہوں کٹ جاتے ہیں۔ بالا خر وہ گھر میں اپنوں کے درمیان ہوتا ہے۔ جن کے لیے وہ جیتا ہے۔"
"یہی سوچ کے میں بھی مجبور ہو جاتا ہوں کہ میری زندگی صرف میری نہیں" میں نے کہا۔
"اگر صرف اپنی ہوتی تب بھی کیا اسے ضائع کیا جا سکتا ہے فضول اور بے وقعت سمجھ کے۔ نہیں۔ ایسا ہوتا تو وہ سب کیا کر لیتے جو فٹ پاتھ پر گوشت کے لوتھڑوں کی طرح پڑے ہوتے ہیں۔ اندھے اور اپاہج، مفلوج اور لاچار بھی زندگی سے چمٹے ہیں۔ اتنی بدصورت اور کریہہ نظر آنے والی زندگی بھی خوبصورت اور قابل قدر ہوتی ہے۔ تم تو لاکھوں کروڑوں سے خوش نصیب ہو۔ کیا میسر نہیں ہے تمہیں؟ مال و دولت، عزت، محبت، ہم سب کی رفاقت اور سب سے بڑھ کے رابعہ کی محبت۔"
میں نے شرمندگی سے کہا "میں کفران نعمت کا گناہ نہیں کر سکتا۔ خدا کا شکر ادا کرنا بھی مشکل نظر آتا ہے مجھے جس نے مجھے مواقع فراہم کیے مجھے۔ حادثات سے بچایا۔ دشمنوں سے محفوظ رکھا۔ ذلت و رسوائی سے بچایا۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ استاد شیدی کی طرح میں آج ایک ڈھانچا ہوتا۔ کسی ٹریفک حادثے میں ایک ہاتھ یا پیر یا آنکھ سے محروم ہوتا، کسی ذہنی صدمے سے ہو جاتا یا کال کوٹھڑی میں پھانسی چڑھنے کی تاریخ کا انتظار کر رہا ہوتا۔
یہ سب دست قدرت کی عنایت ہے کہ اس نے مجھے زندگی کی بدصورتی سے دور رکھا اور سارا حسن میری جھولی میں ڈال دیا۔ کوئی کافر اپنی خوش نصیبی کا اقرار نہیں کرے گا۔"
"عملی اقرار یہی ہے کہ تم زندہ رہو۔ زندگی کی جدوجہد کرتے رہو۔"

"وہ میں ضرور کروں گا۔ بس مجھے اس بزدلانہ طریقہ کار سے اختلاف تھا۔ چوہے کی طرح بل میں گھس جانا۔ اس خوف سے باہر نکلنے میں خطرہ ہے۔ بس اس خیال سے میرا ذہن باغی ہو جاتا ہے مجھے پھر ٹیپو سلطان شہید کا قول یاد آتا ہے کہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔"
"وہ زمانہ اور تھا۔ اب پاکستان میں شیر صرف چڑیا گھر میں ہیں اور ان کی زندگی سو سال کی ہو تب بھی قابل رشک نہیں۔ وہ گیدڑ ہی بہتر ہے جو آزاد ہے اور تماشائے عبرت نہیں بنا ہے۔"
بحث لاحاصل تھی۔ ایک میرا نقطہ نظر تھا جو سب کو غلط لگتا تھا۔ ایک عملی طریقہ تھا جس پر عمل کر کے میں جینے کی امید رکھ سکتا تھا۔ زندگی کی حفاظت تو خدا نے اپنے کسی خاص بندے کی بھی نہیں کی تھی جو اس کے محبوب تھے اور اس سے اتنے قریب کہ عرش پر عالم بالا کی سیر اور خدا سے شرف ملاقات کے لیے بلائے گئے تھے۔ دیگر انبیا اور اولیا تھے، قطب اور ابدال تھے۔

کے اعمال صالح اور اسوۂ حسنہ انہیں پہلے سے منظور شدہ زندگی کی ایک سانس کی اضافی مہلت نہ دلا سکے تھے۔ میں کس ساتھ میں تھا کہ اپنی حفاظت کا سارا عذاب جھیل کے دعویٰ کرتا کہ اب مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ کوئی نہیں مار سکتا۔ اگر نوشتۂ تقدیر یہ تھا تو اسے میری تدبیر کیسے بدلے گی؟ میرے مقدر میں دلاور کے ہاتھوں مارا جانا ہے تو ایسا ہی ہو گا۔ میری موت تختۂ دار پر لکھی ہے تو مجھے کوئی گولی نہیں لگے گی۔ اور مجھے جینا ہے۔ رابعہ سے شادی کر کے گھر بسانا ہے اور گھر میں چراغ جلانے ہیں تو پھر کیا دلاور اور کیا کوئی اور شکاری۔ نہ کسی کو وہ گولی ملے گی جس کا نشانہ وہ مجھے بنا سکے نہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے تختۂ دار تک لے جا سکے گی۔
میرے لیے بڑے اعتماد آفریں اور حوصلہ افزا خیالات تھے مگر انہی کی وجہ سے میں ذہنی انتشار میں مبتلا تھا۔ ایک طرف دوستوں کا اصرار تھا کہ میں زندہ رہنے کے لیے ان کی تدبیر کا ساتھ دوں، دوسری طرف مجھے تقدیر سے لڑنا بے سود لگتا تھا۔ میرے خیالات میں انتشار تھا اور میری قوت فیصلہ دو متضاد قوتوں کے درمیان بے عمل ہو رہی تھی۔ جیسے برابر کی ٹیموں کی رسہ کشی میں طاقت کا توازن رسے کو نہ ادھر ہونے دے نہ ادھر۔
اب ہم رات کا کھانا اپنی مرضی سے آزادی کے ساتھ کہیں بھی کھانے کے لیے نہیں جا سکتے تھے۔ غالب کا خیال تھا کہ اس سے فرق نہیں پڑتا۔ کھانا منگوایا جا سکتا ہے مگر اس دلیل کے پیچھے

میرا دل رکھنے کا خیال کارفرما تھا ورنہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ فرق پڑتا ہے۔ وہی کھانا، آئس کریم یا چاٹ جو گھومتے پھرتے کھائی جاتی ہے جب گھر منگوائی جائے تو اس سے تفریح کا لطف غائب ہو جاتا ہے۔ ہم میں نے اس سے اتفاق کیا۔ شاید اسی انتظام کے پیش نظر مظہر نے عاشق علی تڑپ اور ان کی اہلیہ کو ارسال کیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا۔ وہ عورت ہر قسم کے کھانے پکانے میں کمال رکھتی تھی اور اس کا مجہول نظر آنے والا شوہر نما اور شاعر نما تڑپ عاشق ساحر کا نیک تھا اور حق نمک ادا کرنے میں اس کی عقل پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔

رابعہ اور نادرہ اوپر ایک ہی بیڈ روم میں سو گئیں۔ تڑپ صاحب برآمدے میں لیٹ گئے اور کہا "ہم یہاں استراحت فرمائیں گے اور دوران خوابیدگی فرائض دربانی سے بھی غافل نہیں ہوں گے" یہ ایک مضحکہ خیز بات تھی کہ آپ سو گئے تو چوکیداری کیسے کریں گے بھائی لیکن کسی نے اس سے یہ سوال نہیں کیا تھا۔
میں اور غالب ڈرائنگ روم میں تھے۔ وہاں اعصاب شکن سکون اور سکوت تھا جس میں اے سی کی ہوا کی سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میں باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن جانتے بوجھتے غالب نے لائٹ آف کر کے نیند کا بہانہ کیا۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ میں آرام کروں اور اس ماحول سے آشنائی کا رشتہ خود استوار

ہو جائے جہاں مجھے آج کی رات کے بعد بھی نہ جانے کتنی راتیں گزارنی تھیں۔
میں اندھیرے اور سناٹے میں آنکھیں کھولے پڑا رہا اور چشم تصور سے بہت کچھ دیکھتا رہا۔ شیلی کی لاش جو اس وقت سرد خانے میں بھی نہیں تھی اور کسی گمنام مدفن میں یوم حشر تک کے لیے گم ہو چکی تھی۔ دلاور اس لاش سے بھی ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کے جرم کا راز فاش نہ کر دے۔ اپنے خون کے رشتے کو اس نے خود اپنے لیے طلسم اسم بنا لیا تھا۔ وہ بہت بڑا شکاری تھا۔ کمان کی طرح شیلی کو استعمال کر کے اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے چاہے تھے مگر پھر ایک تیر کا رخ اسی کی طرف ہو گیا تو دلاور نے کمان ہی توڑ دی۔
آسٹریلیا کے قدیم باشندے حرف "ر" کی شکل کا ایک ہتھیار استعمال کرتے ہیں جس کے دونوں طرف دھار ہوتی ہے مگر اصل کمال اس کے استعمال میں ہے۔ ماہر فن اسے پھینکتے ہیں تو یہ ہوا میں اُڑتا ہوا جاتا ہے اور شکار کا کام تمام کر کے لوٹ آتا ہے۔ گویا پھینکنے والے کے قدموں میں آگرتا ہے۔ اسے آسٹریلیا میں بوم رینگ BOOMRANG کہا جاتا ہے۔ پرانے فنون حرب اور قدیم ہتھیاروں کی طرح جو اب صرف میوزیم میں نظر آتے ہیں بوم رینگ اور اسے استعمال کرنے والے بھی ختم ہو رہے ہیں لیکن ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جنھیں ملکہ الزبتھ نے آسٹریلیا کا دورہ کیا تھا تو ان کے سامنے اس فن کا مظاہرہ ہوا تھا۔ بوم رینگ کے بارے میں جدید سائنسی تحقیق کہتی ہے کہ یہ ہوائی جہازوں کا بوٹا اور خلائی سیاروں کے ڈیزائن کی طرح AERODYNAMICS کا کمال ہے۔ قدیم غیر مہذب اور جاہل قبائل یہ کیسے جانتے تھے؟ یہ خدا ہی جانے!
کہنے کا مقصد یہ تھا کہ آج بھی کوئی چال پلٹ کے چلنے والے کے حق میں شکست کا سبب بن جائے تو کہا جاتا ہے کہ بوم رینگ ہو گئی کیونکہ بعض اوقات اناڑی ہاتھوں میں یا اندازے کی غلطی سے بوم رینگ اُڑتا ہوا جاتا ہے مگر دشمن کا سر نہیں جاتا ہے۔ وہ پلٹ کر پھینکنے والے کی گردن آ اتارتا ہے۔ ایسا ہی شیلی کے کیس میں دلاور کے ساتھ ہوا تھا۔ اب ہم دلاور کا اس سے رشتہ ثابت کر سکتے تھے۔ ہمارے پاس دستاویزی ثبوت بھی تھے اور گواہ بھی مگر اس کی لاہور میں موجودگی ثابت نہیں کر سکتے تھے۔
چوہدری دلاور معمولی ایکٹر نہیں تھا۔ اس کے لیے ایمان یا ضمیر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ حلف اُٹھا کے بھی کہہ سکتا تھا کہ اس نے شیلی کو آخری بار لندن میں ہی دیکھا تھا۔ وہ لاہور میں کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہے تو مجھے بتا دے وہ کہاں ہے؟
اچانک میں اٹھ بیٹھا۔ میرے لاشعور میں ایک گتھی تھی جسے میں نے سلجھانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی کیونکہ اور کسی نے بھی مسئلے پر اس پہلو سے غور بھی نہیں کیا تھا۔ مسئلہ جو لاشعور میں

www.paksociety.com

محسوس نہ ہونے والی نلکی کی طرح موجود رہے ایسے ہی حل ہوتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ وحی کی طرح یہ خیال نازل ہوا۔ غیب سے ایک کرشمہ ظہور پذیر ہوا۔ ہوتا یہ ہے کہ خود اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور لاشعور کا کمپیوٹر خاموشی سے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں مصروف رہتا ہے اور جیسے ہی حل ملتا ہے فوراً شعور کو پیغام موصول ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے سائنس دانوں اور فنکاروں نے انکشافات سے تخلیقی کام تک ایسے ہی وحی کی طرح نازل ہونے والے خیال کی صورت میں کیے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بیتھوون نے اپنی شہرۂ آفاق پانچویں سمفنی خواب میں سنی تھی جو در حقیقت لاشعور کا سپنا ہے۔

میں نے غالب کو ہلا کر کہا "غالب کیا سو رہا ہے؟"

"سبحان اللہ کیا سوال کیا ہے" وہ بولا "جگا کے پوچھ رہے ہو کہ سو رہا ہے۔ فرمایئے کیا مسئلہ ہے؟ شیلی کا بھوت آگیا ہے یہاں! میرے سسر نے غلطی سے تمہیں لات مار دی۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ جاگ رہا تھا ورنہ اتنی بکواس نہ کرتا۔ "یار اٹھو۔"

"اٹھ گیا بھائی۔ اب کیا دنیا سے اٹھ جاؤں۔"

میں نے کہا "مرزا جی۔ باہر چلو۔ خبردار جو اختلاف کیا یا حلق سے آواز نکالی۔ تمہیں نانی کی قسم۔"

غالب نے تکیے کو مکا مارا "یہ حرامی پن ہے۔ بلیک میلنگ ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ چلو۔"

"لیکن کہاں؟ دلاور کو قتل کرنا ہے تو صبح نو بجے کریں گے یار۔ ناشتے کے بعد۔"

میں نے کہا "تمہیں پھر نانی کی قسم جو سوال کرو۔"

غالب نے اپنے سر کے بال نوچ لیے "اب تمہیں رابعہ کی قسم جو پھر مجھے نانی کی قسم دی۔"

"اور کے مزید کوئی قسم نہیں" میں نے کہا "اب اٹھو۔ باہر چل کے میں بتاتا ہوں۔"

ہم چوروں کی طرح اپنے ہی گھر سے باہر آئے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ رابعہ اپنی گاڑی کی چابیاں کہاں رکھتی ہے مگر میں نے انہیں اٹھایا اور واپس رکھ دیا۔ رات کی خاموشی میں کسی فاکس ویگن کی آواز سن کے ہی وہ اٹھ بیٹھتی۔ اٹھنے نہ پاتے تھے کہ گرفتار ہم ہوتے والی بات ہو جاتی۔ برآمدے میں ٹرپ صاحب ویسے ہی سوتے رہے۔ غالب نے میرے ساتھ گیٹ عبور کیا۔

"باہر آگئے۔ اب بولو مجھے بھگا کے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"مرزا۔ تم نے کہا تھا کہ اس ایمبولینس ڈرائیور کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا؟" میں نے کہا "جو شیلی کی لاش لایا تھا۔"

غالب نے کہا "اس سوال کا جواب میں نیند میں بھی دے سکتا تھا۔ ہاں۔"

"اس کا قصور تو کوئی نہیں تھا؟"

"میرے خیال میں نہیں تھا" غالب نے کہا۔

"تمہارا خیال غلط ہے۔ فرض کرو ابھی اسی وقت تم اس ڈرائیور سے ملنا چاہیں تو وہ کہاں ملے گا؟"

"حوالات میں۔"

"کون سے تھانے کی حوالات میں؟"

"تھانہ انارکلی۔ ویسے پولیس کی مرضی اسے [illegible] سانده کلاں لے جائے۔"

میں نے کہا "شرط لگاتے ہو مجھ سے۔ وہ کسی تھانے میں نہیں ہوگا۔"

"کتنی شرط ہے۔ میں ہارتا ہوں۔"

میں اسے گھسیٹ کر آگے لے گیا "زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں ہم واپس آجائیں گے۔ صبح وہیں سوتے ہوئے پائے جائیں گے جہاں رات کو دیکھے گئے تھے۔"

غالب نے سر پہ ہاتھ مارا۔ "بھائی تم نے تہیہ کر لیا ہے [illegible] ہونے کا اور اپنے ساتھ ہم سب کو مروانے کا۔ تم تھانے جاؤ گے واپس کیسے آؤ گے؟"

"میں اندر نہیں جاؤں گا۔ تم دیکھ آنا" میں نے [illegible] ایک ٹیکسی میں داخل ہو کے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور اگلی سیٹ پر سو رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ "[illegible] ہے؟"

میں نے کہا "یہ بڑا حرامی صحافی ہے" غالب۔ اس کو تھانے [illegible] ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "مجھے کسی تھانے نہیں جانا۔ [illegible] اترو۔"

میں نے کہا "سو روپے میں چلو گے؟"

اس کی ہنسی نمودار ہو گئی "تالوٹے میں بھی چلوں گا۔"

راستے میں غالب نے کہا "اگر وہ وہاں ہوا؟"

میں نے کہا "اسے کہنا کہ بھائی صاحب اللہ آپ کو حوالات میں ہی خوش رکھے اور واپس آجانا۔ میں شرط ہار جاؤں گا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں" میں نے دانت نکال کے کہا "تم ہار گئے تو [illegible] ہوگا تمہارے ساتھ۔ تمہاری عزت لٹ جانے کی۔ میرے ہاتھوں۔"

"ایک صحافی کی عزت پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے" غالب [illegible]

"نہ نواب کالا باغ نہ فیلڈ مارشل ایوب خان [illegible]"

ٹیکسی کو میں نے تھانے سے کچھ دور ہی روک لیا۔ غالب [illegible] قدم پیدل چل کے تھانے میں داخل ہو گیا۔

"میرا بھی دل چاہتا ہے صحافی بن جاؤں۔ [illegible]" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

"[illegible] بن جاتا ہے اس طرح تھانے میں" ٹیکسی ڈرائیور نے حسرت سے کہا۔

"عجیب بات ہے۔ وہ کہتا ہے ٹیکسی ڈرائیور بن جاؤں۔ سارا [illegible] ہوتی ہے۔ میرا پیسے خرچ نہیں ہوتے۔ پیسے ملتے ہیں۔ چلو [illegible] کرا دیتا ہوں۔ یہ ٹیکسی اس کے نام کر دو۔ وہ تمہیں اپنی [illegible] لگوا دے گا۔"

[illegible] پڑا "وہ تو ٹیکسی چلائے گا۔ ہم [illegible] اخبار کا [illegible]"

کسی عظیم فلسفی کی طرح میں نے کہا "یاد رکھو۔ ہر شخص کے لیے ایک کام ہے اور ہر کام کے لیے ایک شخص۔"

اس نے فوراً ایک نوٹ بک نکالی اور لکھتے ہوئے بولا "کیا زبردست قول ہے جی۔ کس کا ہے؟"

میں نے سوچ کے کہا "ان کا جو یہ چیز دیکھ کے رو پڑتے تھے [illegible] کبیر داس۔ کچھ لوگ انہیں کبیر خان بھی کہتے تھے۔"

غالب نمودار ہوا تو اس کی چال سے ہی میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ شرط ہار گیا ہے۔ اس نے اندر بیٹھتے ہی سر کھجا کے کہا "پیر و مرشد۔ آپ کے پیر کہاں ہیں۔ میں چھونا چاہتا تھا۔"

میں نے کہا "اس وقت گندے ہو رہے ہیں۔ کل دھو کے پیش [illegible] لینا۔"

"یہ تو زیادتی نہیں ہے بھائی" غالب نے کہا "ایک پارٹ جیسا [illegible] تھا جہاں تھانے دار بیٹھا تھا۔ میں نے تعارف کرایا تو مخمل کی طرح نرم ہو گیا۔ کہنے لگا کہ جناب اس ڈرائیور کا کیا قصور تھا۔ میں نے کہا قصور وار کو تم کب پکڑتے ہو لیکن اپنی زبان سے اقرار کر رہے ہو تو اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ تم نے رشوت لے کر اسے بے قصور ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا اور چھوڑ دیا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"توبہ توبہ کرنے لگا۔ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا کہ رشوت؟ توبہ [illegible] کیا مجال ہے جو کبھی ایک پیسہ لیا ہو کسی سے۔"

"ٹھیک ہے۔ ایک پیسہ تو فقیر بھی نہیں لیتا۔"

"پھر میں پتا چلا کہ اس کی سفارش تو خود گرفتار کرانے والوں نے کی۔ فون آگیا اسپتال سے۔ کوئی پولیس افسر خود آیا اور اس نے کہا کہ اسے جانے دو۔ نیک آدمی ہے۔ ایمبولینس چلانا ہے بڑے ثواب کا کام ہے۔"

"تم نے پوچھا کہ وہ کہاں رہتا ہے؟"

"[illegible] بڑے سیدھے لوگ ہیں۔ فوراً گھر پہنچ جاتے ہیں۔ [illegible] بتا دیا کہ تمہارا بندہ ہمارے پاس ہے۔ آج رات [illegible] چھڑانا ہے تو نذرانہ لے کر حاضر ہو جاؤ۔ تھانے دار [illegible] مختلف انداز میں بتایا کہ بے چارا پریشان تھا کہ میرے بیوی بچوں کو پتا نہیں۔ ہم نے کہا کہ اچھا بلوا لیتے ہیں۔ گھر سے کھانا بھی آیا تھا۔ بڑی اچھی عورت ہے۔ کھانا اچھا پکاتی ہے۔ ہمارے لیے بھی لائی تھی۔"

"اس ٹیکسی والے کو بتاؤ اب کہاں جانا ہے؟"

"کہاں جانا ہے۔ واپس جانا ہے اور کہاں؟"

"نہیں۔ ایمبولینس ڈرائیور کے گھر۔" میں نے کہا۔

غالب سے پہلے ٹیکسی ڈرائیور نے غل کیا "بات تھانے جانے کی ہوئی تھی۔"

غالب نے کہا "اچھا۔ تھانے جاؤ گے؟ تمہاری مرضی۔ کتنے دن کے لیے جاؤ گے؟ یہ بھی بتا دو۔"

"یہ... یہ تو بڑا ظلم ہے جناب۔"

"ہاں یار ظلم تو ہے" غالب نے کہا "اب ذرا جلدی گھر چلو ورنہ ہم اور ظلم کریں گے۔ بڑے ظالم لوگ ہیں ہم۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے ہمارے تیور دیکھ لیے تھے اور لہجے سے اندازہ کر لیا تھا کہ ہم ٹیڑھے لوگ ہیں۔ اس نے بادل ناخواستہ گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور بولا "سو روپے میں یہاں تک کی بات ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "ستانوے روپے ہیں۔ سنت نگر تک ایک روپیہ ہے گا تو پورے سو ہو جائیں گے۔"

"یہ تو بدمعاشی ہے" اس نے گاڑی بند کر دی "آپ دوسری گاڑی لے لیں۔"

غالب نے ادھر ادھر دیکھا۔ "کہاں ہے دوسری گاڑی؟"

وہ اکڑ گیا "نہیں ہے تو میں کیا کروں۔ میں سنت نگر نہیں جا سکتا۔ بند کروا دیں آپ مجھے تھانے میں۔"

اب غالب کو پھر اٹھ کے تھانے جانا پڑا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو یقین نہیں تھا کہ اس دھمکی پر عمل بھی ممکن ہے۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے فرار ہونے کا سوچا ہی تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر چابی نکال لی۔ ادھر غالب دو سپاہیوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ ادھر ڈرائیور نے میری منت سماجت شروع کر دی اور ہاتھ جوڑنے لگا مگر میں نے سپاہیوں کو سمجھا کہ اسے ہم اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔ واپسی میں گاڑی اس کے سپرد کرتے ہوئے اسے مزید کچھ رقم بھی دی جا سکتی تھی۔ ورنہ سو روپے بھی کم نہ تھے۔

پولیس والوں نے اس کی ایک نہیں سنی اور اسے پکڑ کے اندر لے گئے۔ شاید غالب نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ ڈرائیور کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ ورنہ وہ صرف گھسیٹ کر لے جانے وہیں سے ہونا کاری بھی شروع کر دیتے۔

اب ڈرائیونگ غالب نے سنبھال لی "شرافت کا زمانہ ہی نہیں رہا یار۔"

میں نے کہا "جس کی لاٹھی اس کی ٹیکسی۔ زمانے کا یہی دستور

www.paksociety.com

ہو گیا ہے۔ تو ہم کیا کریں۔"

"میں نے کہہ دیا ہے کہ اسے صبح تک سونے دو۔ صبح سے پہلے ہی ہم واپس آجائیں گے۔" غالب نے کہا۔

"جرم کیا بتایا اس کا؟"

"کیا سواری اٹھانے سے انکار کرنا جرم نہیں ہے؟ میں دخل نہ دیتا تو وہ اور بھی جرم کر رہا ہے۔" غالب نے کہا۔

"کیا تم پوچھو گے نہیں کہ ہم ایمبولنس ڈرائیور کے گھر کیوں جا رہے ہیں؟"

غالب بولا "میری عقل شریف میں کچھ آ رہا ہے۔"

رات کے وقت پرانی آبادی میں کسی معمولی ڈرائیور کا گھر تلاش کرنا بظاہر آسان نہ ہوتا مگر اتفاق سے ہم غلط جگہ مڑ کے صحیح گلی میں داخل ہو گئے۔ گلی کے نکڑ پر حلوائی کی دکان پر لوگ بڑے بڑے پیالوں میں یخنی اور دودھ پی کے جان بنا رہے تھے اور خوش باشی سے گپ لگا رہے تھے۔ یہ ہماری طرح کالی پتے اور جھک مارنے سے بہت بہتر کام تھا۔ وہ جانتے تھے کہ گلی میں کون ایمبولنس چلاتا ہے اور کس کی بیوی زبان چلاتی ہے تو وہ جو آ چلا آیا ہے۔

ہم نے صحیح دروازے پر دستک دی۔ اندر کچھ بڑبونگ مچی کیونکہ گھر والے سوئے پڑے تھے اور ان کے لیے تو بھی رات کے وقت دستک بڑی غیر متوقع تھی۔ جس کے دل میں چور ہو وہ تو ہر آہٹ پر سمجھتا ہے کہ شامت آگئی۔ ڈرائیور نے بہ زبان زوجہ کہلوایا "کون ہے جی؟"

میں نے آواز بدل کے کہا "چوہدری صاحب نے بھیجا ہے۔"

کچھ دیر بعد زوجہ نے شوہر کے ڈائیلاگ بولے "کون چوہدری صاحب؟"

میں نے کہا "وہ جو تمہارے پیچھے بول رہا ہے نا۔ اسے معلوم ہے کہ چوہدری ایک ہی ہے۔ کیا ہم اندر آ کے سمجھائیں یا وہ خود اپنا دیدار کرانے کو باہر آئے گا۔"

ڈرائیور فوراً باہر آگیا۔ جلدی میں اس نے ہماری اشکال پر بھی غور نہیں کیا تھا اور اندر سے ہمیں اس لیے نہیں دیکھ سکا تھا کہ ہم عین دروازے کی جھری کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔

میری صورت پہچانتے ہی وہ پیلا پڑا اور واپس ہونے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "مقابلہ کرو گے یا شور کرو گے تو اپنی عزت خراب کرو گے سمجھے!"

غالب نے کہا "دروازے کے پیچھے سے بھی آواز نہ آئے۔"

لیکن آواز آئی "آخر کیا چاہتے ہو جی آپ؟"

غالب نے نرم لہجے میں "یہ بڑا دردناک سوال ہے اور اس کا جواب زیادہ دردناک ہے۔ اس لیے خاموش رہو۔"

میں نے کہا "ہم تفصیلات کریں گے۔"

وہ کانپنے لگا تھا "اچھا... اندر... اندر آجاؤ" وہ بولا اور پھر اپنی نصف بہتر سے مخاطب ہوا "چل پردہ کر لے۔"

ہم بات کا پردہ رکھنے کے ایک ذیلی کمرے میں داخل ہوئے اور رک گئے۔ کیں اس کا ڈرائنگ روم یا مہمان خانہ سب کچھ کہا جا سکتا تھا۔ اندر شاید چار گز کا دالان ہو گا۔ ایک پایہ ٹوٹی چارپائی اور فرش پر اس کی تمام اثاثہ حقوق زوجیت بکھرے پڑے تھے۔

میں نے کہا "ہم جھوٹ سچ کو پرکھنے کا آلہ بھی اپنے ساتھ لائے ہیں۔ تم اسپتال میں ہو۔ یہ آلہ دیکھا ہے کبھی؟"

"کیا... آلہ تو نہیں دیکھا..." وہ بولا۔

"اچھا آج دیکھ لو۔" میں نے تھیلی کے رنگ سے برآمد ہونے والا چھوٹا سا ریوالور نکال لیا "کوئی جھوٹ بولے تو اس سے ایک سارا کھاکا ہوتا ہے۔ یہاں سے ایک چیز نکلتی ہے اور جھوٹ بولنے والا ڈھیر ہو جاتا ہے۔"

غالب نے کہا "یہ سچا آدمی ہے۔ جھوٹے کا ماتھا کالا ہو جاتا ہے اس کا کتنا گورا رنگ ہے۔"

میں نے کہا "غور سے میری بات سنو۔ آج تم اسپتال سے ایک لاش لے کر گئے تھے۔ ایمبولنس والے قاری نے کہا"

"ہاں جی۔ آپ کے سامنے ہاں۔"

غالب نے سہلایا "یادداشت اچھی ہے بچے تمہاری۔"

میں نے کہا "اسپتال سے روانہ ہونے کے بعد تم کہاں گئے تھے؟"

"جہاں مجھے بتایا گیا تھا گڑھی شاہو۔"

میں نے ریوالور کو اچھالا اور پھر پکڑ لیا "بچ گئے تم بال بال۔ سوچ جھوٹ بتانے والا آلہ خود کار ہے۔ تم نے جھوٹ بولا تھا مگر میں نے بڑی مشکل سے بچایا ہے تمہیں۔"

"اب سوچ کے جواب دو۔ چاہو تو پہلے اندر جا کے بیوی کو رخصت کر دو۔" غالب نے کہا "دعا مانگ لو، پانی پی لو۔ کلمہ پڑھ لو۔"

وہ سخت دہشت زدہ ہوا "میں... میں بتاتا ہوں۔ گیا تو گڑھی شاہو جانے کے لیے تھا... لیکن باہر نکلتے ہی مجھے پیچھے سے دو گاڑیوں نے روک لیا۔ ایک آدمی اتر کے میرے ساتھ آ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی یہی تھا۔"

"یہ تو جھوٹ سچ پکڑنے والا آلہ ہے۔ وہ ریوالور ہو گا" غالب بولا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا "اس نے کہا کہ جدھر سے میں کہوں ادھر سے چلو۔ اس نے... کچھ نوٹ... دس ہزار روپے مجھے دیے اور کہنے لگا پانچ منٹ کی بات ہے۔ پانچ منٹ میں دس ہزار نہیں کمانے تم نے؟"

"اور تم بہت مجبور تھے پہلے ہی" میں نے کہا۔

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا "دو قریب تری تھی"

ہوتا ہے جس کی تین بیٹیاں شادی کے لائق ہوں اور وہ خدا پر آس لگائے بیٹھا ہو۔ ریوالور کے سامنے میں کیا بول سکتا تھا۔ جیسے وہ مجھے مارنے گاڑی لے جاتے۔ میں نے گاڑی کا رخ موڑ لیا۔ وہ مجھے ایک گھر میں لے گئے۔ وہاں میں تو گاڑی میں بیٹھا رہا۔ انہوں نے پیچھے سے لاش اتار دی۔ اندر لے گئے اور واپس لے آئے پانچ منٹ بعد۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اب جاؤ۔ سمجھ لو کچھ ہوا ہی نہیں۔"

غالب بولا "ابھی تمہیں معلوم تھا کہ راستے میں لاش بدل دی گئی ہے بچے تری؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "اللہ مجھے معاف کرے۔"

"اللہ کیوں معاف کرے ذخیرہ۔ دس ہزار میں لاش کا سودا کرنے والے کو کس اصول کے تحت معاف کیے جانے کا حق حاصل ہے؟" میں نے کہا۔

"تم خطا کرا کے بھاگنے کی فکر میں تھے۔ جھکنا ہمیں پڑتا ہی ہے تمہارے ایک جھانپڑ ضرور رسید کروں لیکن خیال آجاتا ہے تمہاری بیوی کا اور تین بچیوں کا۔ سوچ لو تو کل صبح دس بج کے دس منٹ پر یادوں گا... یا پھر۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "ہمارے ساتھ چلو اور بتاؤ وہ کون سا گھر تھا۔"

وہ ہاتھ جوڑنے لگا "وہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

"کمال ہے۔ ہم سے ڈر کیوں نہیں ہے تمہیں۔ ہم بھی مار ڈالیں گے تمہیں" غالب نے اسے یقین دلایا "اگر تم نے انکار کیا۔"

"تم نے جوا کھیلا تھا۔ جوئے میں رسک تو ہوتا ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ کیا پتا وہ تمہاری بات مان لیں۔ ترس کھا کے تمہیں چھوڑ دیں۔ ان کے پاؤں پڑ جانا۔ رونا دھونا" میں نے کہا۔

اس نے اندازہ کر لیا کہ ہم ٹلنے والے نہیں ہیں "میں دور ہی سے بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے مگر اس جھوٹ سچ کا پتا چلانے والے خود کار آلے کا خیال رکھنا۔ غلط گھر کی طرف انگلی اٹھائی تو یہاں سوراخ ہو جائے گا۔" غالب نے اس کی پیشانی کو انگلی سے چھوا۔

میں نے کہا "ہمیں کچھ اندازہ تو ہے کہ وہ گھر کہاں ہو گا۔ بس تصدیق کرنی ہے۔"

اس کے ذہن میں اگر کوئی غلط فہمی تھی تو میری بات سے رفع ہو گئی۔ اس کی صورت پر بے بسی کے آثار مزید واضح ہو گئے۔ اس نے اندر کی جانب منہ کر کے کہا "میں ابھی آتا ہوں۔"

اس کی زوجہ جو غالباً کان لگائے تمام گفتگو سن رہی تھی، چلانے لگی "نہ جاؤ جی ان کے ساتھ۔ پتا نہیں کون ہیں یہ۔"

اس نے ڈانٹ کے کہا "چپ کر کمبخت کی اولاد۔ ابھی جگائے گی سارے محلے کو۔ خبردار جو حلق سے آواز نکالی۔"

خالص شوہرانہ انداز میں بیوی کے احتجاجی مظاہرے پر قدغن لگا کے وہ ہمارے ساتھ چل دیا۔ اس وقت تک گلی کے نکڑ پر جان بنانے والے ڈکار لے کر جا چکے تھے۔ حلوائی صاحب کڑاہی کی کھرچن نوش فرما رہے تھے جو ان کے نزدیک ملائی تھی۔ اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھ کے خوش دلی سے کہا "ارے خیر ہو صوفی" اور صوفی نے جواب میں بے تکلفی سے اسے مشورہ دیا کہ وہ کھرچ کر کڑاہی کھائے ٹوٹے کھا جائے۔

"سچا نری اچھا حساب ہے" غالب نے کہا۔

ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد سچا فوری پریشان نظر آنے لگا "تر مجھ کی۔ میں دس ہزار واپس کر دوں گا۔ اگر تب کہو گے۔"

"ہم تو چاہتے ہیں تم مزید دس ہزار وصول کرو۔ دس ہزار بہت کم دیے تھے انہوں نے۔" غالب بولا۔

"اچھا جی۔ کم دیے تھے!"

"اور کیا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو ایک لاکھ مانگتا۔ پچیس ہزار مل جاتے مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔

وہ سوچتا رہا "کیا پتا وہ دے ہی دیں" یہ تو انہوں نے دیے اور میں نے رکھ لیے۔

تقریباً پندرہ منٹ تک ٹیکسی چلتی رہی۔ ایمبولنس ڈرائیور مسلسل "سیدھے سیدھے" کی ہدایات دیتا رہا۔ بالآخر ایک جگہ اس نے کہا "یہاں روک لو۔"

میں نے ریوالور کو فلمی اسٹائل میں اچھال کے دوبارہ پکڑنے کی کوشش کی مگر اس مرتبہ ناکام رہا۔ تاہم میں نے اپنی متانت میں فرق نہیں آنے دیا اور نیچے سے ریوالور اٹھا کے کہا "کون سا مکان ہے؟"

اس نے کہا "وہ تیسرا... جس کی باری کھلی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "اچھا اب تم جاؤ۔ گھر جا کے دعا کرو کہ ہم سے پھر ملاقات نہ ہو۔"

غالب نے کہا "یہ سچا آدمی ہے۔ اچھا آدمی ہے اور کیا پتا کوئی ہے۔ جو ایک جھانپڑ میں لوٹ سکتا ہے۔ صبح دس بج کر دس منٹ پر میں اس کو پیار سے چپت لگاؤں گا ایسے۔"

وہ سخت نروس تھا۔ کوئی سوال کیے بغیر اترا اور چل پڑا۔ اس کی خواہش تھی کہ ہمارے کھلی باری (کھڑکی) والے مکان تک پہنچنے سے پہلے وہ اس گلی سے نکل جائے۔

"یہاں بھی رہی بڑا اچھا چلے گا" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "اگر ضروری ہوا۔ کوئی ویسے ہی نکل آیا تو جھوٹ نہیں بولیں گے کہ ہمیں چوہدری صاحب نے بھیجا ہے۔"

"سچ کہہ دیں گے کہ ہمیں شامت اعمال نے بھیجا ہے۔"

غالب نے کھلی کھڑکی سے ہٹ کے دروازے پر دستک دی اور

www.paksociety.com

بچہ غیرارادی طور پر اندر جھانکنے لگا۔ میں نے اسے نبرستہ کہا تو اس نے رات تقال کے نفی میں سرہلایا جس کا مطلب تھا کہ اندر کوئی قابل دید منظر نہیں۔ دوبارہ کنڈی بجانے پر کوئی بولا "اچھا اچھا۔ ذرا تھمو تھمے سانس لو۔" یہ بات پنجابی میں کہی گئی تھی جس کا مطلب تھا کہ ذرا دم تو لو۔ لہجہ کسی قدر بیزار بوڑھے کا تھا اور حقیقت میں جو شخص برآمد ہوا وہ واقعی زندگی یا دنیا سے بیزار لگتا تھا۔ باقی زندگی دنیا اس سے بیزار رہی ہوگی۔

"ہمم... تم کون ہو؟ میں سمجھا وہ حرامی آگیا۔"

میں نے اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "ہم یقیناً اس تعریف کے مستحق نہیں تھے۔ اس کی مراد غالباً کسی زیادہ زبردست اور فرزند سے ہوگی۔ شخص مذکورہ اچانک آگیا اور اس نے ثابت بھی کردیا کہ وہ اسم بامسمیٰ ہے۔"

"ابا۔ یہ کون ہیں؟" اس نے ہمیں گھور کے دیکھا۔

ابا نے اپنی جان چھڑائی "تو خود ہی پوچھ لے۔ آجاتے ہیں نیند حرام کرنے پتا نہیں کہاں کہاں سے؟"

وہ دبلا پتلا مگر تیز طرار نوجوان تھا۔ اس کی گلے میں لال ریشمی رومال تھا اور اس کے ہونٹ بھی پان سے لال تھے۔ ریوڑ کے گھر لوٹنے والے نمائشی بیلوں کی طرح اس نے ایک کلائی پر موتیے کی کلیوں کا ہار بھی لپیٹ رکھا تھا۔

اس نے بلاوجہ اکڑ کے پوچھا "کیا بات ہے؟" حالانکہ یہی بات وہ شریفانہ لہجے میں بھی کرسکتا تھا مگر وہ تھا حرامی۔ بقول والد۔

میں نے کہا "دروازے پر شور کروگے تو محلہ اکٹھا ہوجائے گا۔"

غالب نے کہا "ہم بدمعاش ہیں۔ مار پیٹ گالی گلوچ سب کرسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "ریوالور بھی۔"

تیسری بار ریوالور کو گھما کے اچھالنے اور پکڑنے کا مظاہرہ کامیاب رہا اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ فوراً ہمیں اندر کے روبرو لے گیا۔ "حکم کرو موتیاں والیو۔" اس کا لہجہ اب ریشم کی طرح ملائم تھا۔

میں نے کہا "تمہارے گھر میں کوئی میت ہوئی تھی؟ آج کل میں؟"

وہ بھونچکا رہ گیا۔ میرا تیر نشانے پر لگا تھا "میری دادی فوت ہوئی تھی لیکن وہ تو بستر میں اور بیمار تھی۔"

غالب نے اسے ٹٹولا "تم نوجوان اور پٹھے کیسے ہو۔"

وہ ذرا گھبرایا "کیا مطلب؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ جوان اور صحت مند لوگ بھی فوت ہوجاتے ہیں۔"

"دادی کو کہاں گاڑا اور کب؟" غالب نے کہا "ہمیں ان کی قبر پہ لے چلو۔"

"اس وقت!" وہ چونکا کے بولا "مگر شہر کے پیچھے قبرستان ہے۔"

"ہم فاتحہ پڑھنے آئے تھے۔" میں نے کہا "فاتحہ پڑھ کے جائیں گے۔" غالب نے کہا "تمہاری دادی میری دادی۔"

میں نے کہا "میری تو دادی بھی نہیں تھی۔ صرف دادا تھا۔ بچپن میں اس کے نام سے سب اسی طرح تھرتھر کانپتے تھے جیسے تم کانپ رہے ہو۔ موتیاں والیے۔"

"آخر... کون ہو تم لوگ۔ کیا پوچھتے ہو؟"

میں نے اسے ٹیکسی کی طرف دھکیلا۔ "ہمارے ساتھ چل کے بتاؤ کہ دادی کی قبر کون سی ہے۔ خاموشی سے چلوگے یا شور مچاتے ہوئے۔"

"تم... مجھے قتل کردوگے... وہاں لے جاکے؟" وہ چلانے لگا تھا کہ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اسے ٹیکسی میں کھینچ لیا۔ غالب نے دروازہ پہلے ہی کھول رکھا تھا۔ موتیوں مزاج نوجوان نے واجبی سی مزاحمت کی اور زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑایا مگر میری گرفت سے اس نے اپنی کوشش کے رائیگاں جانے کا یقین کرلیا۔ اس نے ٹانگیں چلانی بند کردیں۔

ٹیکسی روانہ ہوئی تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اس نے سب سے پہلے لال ریشمی رومال کو گلے سے الگ کیا جس کی وجہ سے اس کا دم گھٹنے کی نوبت آگئی تھی۔ موتیے کی کلیاں تو پہلے ہی بکھر چکی تھیں۔

میں نے کہا "تمہاری دادی کا انتقال اسپتال میں ہوا تھا؟"

اس نے لمبے لمبے سانس لے کر کہا "ہاں... تم کون ہو؟"

میں نے کہا "نہیں۔ ہم وہ نہیں ہیں۔ آج کس کے کوٹھے گئے تھے؟"

"نگینہ بائی..." اس نے کہا "مرنے والی نہیں... [illegible]"

"روز جاتے ہو؟ مال کہاں سے لاتے ہو؟" میں نے کہا۔

وہ پریشان ہوگیا "کاروبار کرتا ہوں اپنا۔"

غالب نے کہا "کاروبار کی وضاحت کرو۔ شکل سے تم کفن فروش بھی نہیں لگتے۔ شوقین رنگینیوں والے ہیں۔ لاشیں تو نہیں بیچتے؟"

"لاشیں... کیسی بات کرتے ہو جی۔"

میں نے ایک دم اس کے اٹھے ہاتھ کا چوتھا مارا۔ "شرافت سے بتاؤ کہ تم نے اپنی دادی کی لاش کا سودا کتنے میں کیا تھا؟ اس کے بدلے کس کی لاش دفنائی گئی تھی اور کیسے؟"

وہ پھوں پھوں کرکے رونے لگا۔

غالب نے کہا "تمہاری دادی کی لاش شاید اس وقت بھی مردہ خانے میں ہے۔ سرد خانے میں محفوظ پڑی ہوگی۔ دیکھو گے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "آپ پولیس والے ہو؟ خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔ میں پاگل ہوگیا تھا۔ نگینہ بائی کے عشق میں۔"

"نگینہ بائی کے بچے۔ اپنی دادی کی لاش بیچ دی تو نے۔"

"ٹھیک کہا تھا تیرے باپ نے کہ تو حرامی ہے۔" میں نے بے قراری سے اس کے بال پکڑ کے سر کو کئی بار سامنے مارا "کتنے پیسے ملے تھے؟"

"وہ... دس ہزار۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون لوگ تھے انہوں نے کہا کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ تمہاری دادی کو مرنا ہی تھا۔ اتنی بوڑھی تھی وہ اور دن گننے سے اسپتال میں پڑی تھی۔ اب تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں اسے۔ مجھے تک نہیں جانا تھا۔ اس کی لاش ہمیں دے دو۔ ہم دوسری دفن کردیں گے۔ اسے رکھ لو۔ میں نے سب سے پہلے مجھے ہاں کردی۔ بعد میں بڑی مشکل پڑی مجھے۔ میں اسپتال سے لاش لایا اور اسے گھر میں پلنگ کے نیچے رکھ دیا۔"

"گھر میں کسی کو نہیں بتایا؟"

"نہیں۔ گھر میں کون ہے۔ سوائے ابا کے۔ اسے بھی ٹھیک نظر نہیں آتا۔ آنکھوں میں موتیا ہے۔ ماں پہلے ہی مرگئی تھی۔ ایک بہن کراچی میں ہے۔ وہ کبھی آتی نہیں۔ بس میں رہتا ہوں یہاں۔"

"اس انتظار میں کہ ابا بھی جائے تو مکان تمہارا ہو اور تم اسے بیچ کے نگینہ بائی پر نچھاور کردو۔ تمہارا باپ بھی کتنا بدنصیب ہے۔ جس ماں کے قدموں میں جنت تھی۔ اس کو وہ مرنے کے لیے اسپتال میں پھینک آیا تھا۔ بیٹے نے پلٹ کے خبر نہیں لی تو ہوا کیا ٹھیک۔ اب خود اس کی باری آنے والی ہے جب کوئی اسے پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ جیسے ماں کے مرنے پر اس نے سکون کا سانس لیا ہوگا ایسے ہی تم اس کو گاڑ کر لوگے۔"

وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ نسل کی کمینگی اور خودغرضی کا یہ نقشہ اتنا عبرت ناک تھا کہ میں تصور نہیں کرسکتا تھا۔

غالب نے کہا "باقی بات بھی ختم کرو۔ پھر کیا ہوا؟"

"جب لاش بدل گئی۔ کوئی امیر تفنس زرا تیور تو پایا تھا۔ سب وہ نے ابا کو... میں نے باپ سے کہا کہ دادی کی لاش آگئی ہے۔ اس نے کہا اچھا کفن دفن کا انتظام کر۔ اور محلے والوں کو بتادے۔"

"وہ رویا نہیں؟"

"بعد میں رو رہا تھا۔ اس وقت تو چپ بیٹھا رہا۔ میں نے فوراً کفن لا کے خود ہی پہنا دیا اور اس کے بعد محلے والوں کو اطلاع دی۔ عورتیں ہمارے گھر میں آتی جاتی نہیں تھیں مگر ڈر تھا کہ میت نہلانے نہ آجائیں۔"

"صورت شکل دیکھنے تو آسکتی تھیں!"

"ہاں۔ میں نے جنازہ گاڑی میں رکھ دیا تھا۔ جو لوگ آئے ان سے کہا کہ سب انتظام اسپتال میں ہی ہوگیا تھا۔ یہاں کون کرتا۔ خیال ابا ہے نے نہلا دھلا کے کفن دے دیا۔ محلے کے دو چار لوگ ساتھ ہوگئے۔ سب نامحرم تھے اس لیے قبرستان میں بھی کیا مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ فرق کسی کو کیسے ہوسکتا تھا۔ سب ہی جانتے تھے کہ دادی کئی مہینے سے اسپتال میں مر رہی ہے مگر مرنے کا نام نہیں لیتی۔ گھسیٹتے ہی مٹی ڈال کے لوٹ آئے۔"

باقی راستہ وہ خاموش رہا۔ رات کے دو بجے ہم قبرستان میں تھے۔ اس کا مین گیٹ آگے تھا۔ اندر جانے کے لیے راستے بہت تھے۔ جہاں سے بھی کسی نے چاہا دیوار گرا کے ایک شارٹ کٹ نکال لیا تھا۔ زمینی راستے کے بعد نہ قانونی طور پر مدفین کی اجازت ہوتی ہے اور نہ کوئی فاتحہ خوانی کے لیے آتا ہے۔ خود گورکن ابھی شہر خموشاں کے کسی حصے میں اپنے پکے مکان میں سو رہا ہوگا۔

لوگ کہتے ہیں کہ گورکن بہت کماتے ہیں اور قبروں کے کاروبار میں بھی بہت ہیرا پھیری ہے۔ ممکن ہے ہو مگر میں نے آج تک کسی گورکن کو خوشحال یا صاف ستھرا نہیں دیکھا تھا۔ ان کے چہروں پر طمانیت اور خوشی نہیں دیکھی تھی۔ ان کے گھر بھی ایسے تھے کہ شاید مرنے کے بعد انہیں بہت کم فرق کا احساس ہوتا ہوگا۔ پہلے زمین کے اوپر قدرے کشادہ کچی کوٹھری تھی۔ بعد میں زمین کے نیچے کچھ کم جگہ میں لیٹ گئے۔ زندگی تو اس مٹی کو کھودنے بھرنے برابر کرنے اور مٹی کو مٹی میں ملتا دیکھنے ہی گزرتی ہے۔

ہم بہت سی پختہ، نیم پختہ، شکستہ اور دھنسی ہوئی قبروں سے بچتے بچاتے انہیں پھلانگتے اور بعض اوقات ان پر آجانے میں جوتوں سمیت یوں قدم جماتے گزرے کہ شاید مردہ بول سکتا تو کہتا کہ بھائی صاحب، آپ تو سر پر چڑھ گئے یا مہذب شاعرانہ مزاج کا مالک ہوتا تو کہتا۔

اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی
آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے

قبرستان میں خوف اور دہشت کے بجائے اس قسم کے خیالات میرے لیے باعث ندامت تھے۔ قبرستان تو جائے عبرت سرائے فانی ہے۔

بالآخر وہ ایک قبر کے پاس رک گیا اور ادھر ادھر دیکھ کے بولا "یہی قبر ہے۔"

اندھیرے میں بھی قبر کے اوپر گلاب کے پھول نظر آرہے تھے اور میں نم آلود مٹی کی مہک کو محسوس کرسکتا تھا۔ میرے دل کی کیفیت بڑی عجیب ہوگئی تھی۔ یہ تصور کرنا ایک دل گداز تجربہ تھا کہ مٹی کے اس ڈھیر کے نیچے وہی خوش باش خوش ادا اور خوش شکل شبانہ سفید کپڑے کے کفن میں شکستہ گردن اور پاش پاش سر کے ساتھ یوم حشر کا انتظار کررہی ہے جب بالآخر وہ دنیا میں لمبے ہاتھ رکھنے والوں کے دامن پکڑے گی اور داور محشر سے انصاف طلب ہوگی۔ "ہاں یار۔ وہاں تو دھاندلی نہیں چلے گی نا..." میرے کانوں میں اس کی آواز گونجی۔ "دیکھو کیسے دلدار نے مجھے دھوکا دیا۔ یہاں بلا کے اپنے فریب کے جال میں گرفتار کرلیا اور پھر بلیک میل کیا۔ سوری یار میں تم کو سب نہ بتاسکی جو میں بتانا چاہتی تھی۔"

غالب میرے جذبات سے آگاہ تھا۔ اس نے کہا "چلو یار چلیں۔"

www.paksociety.com

"تمہارا گھر دوچند ہو گیا ہے یار۔ یہاں آ کے" میں نے کہا۔
غالب نے کہا "ہم صرف فاتحہ پڑھنے آئے تھے۔ چلو فاتحہ پڑھیں۔"

رات کے سوا دو بجے ہم نے اس عورت کے لیے فاتحہ پڑھی جسے لندن سے یہاں تک خدا کھینچ لائی تھی۔ اس نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔ وہ ایک خوبصورت خوش نصیب تھی۔ وطن لوٹ کے اپنے باپ کی خواہش کے مطابق ان کے دکھ دور کرنا چاہتی تھی جو بے استطاعت تھے۔ مگر تقدیر نے دیا اور اسے لالچ کے اندھے کنویں میں دھکیل دیا۔

ہم دل گرفتہ واپس ہوئے۔ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔ "کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ کیا ابھی رسوائی کا کچھ اور تماشا باقی ہے یار۔" تجلی کی صدا کسی بازگشت کی طرح آئی۔

مجیدہ بائی کے عاشق زار سے کچھ کہنا بے سود تھا۔ جب خونی رشتوں کے احترام سے اس حد تک بے گانہ ہو جاتے تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ آخر اس دنیا میں وہ بے غیرت بھی تو بستے ہیں جو خود اپنی ماں بہن یا بیٹی کی عزت کا سودا کرتے ہیں۔

یہ طے کرنا مشکل تھا کہ زیادہ بدنصیب کون تھا۔ وہ بوڑھی عورت جو تمام عمر خدمت کرتی رہی۔ پہلے باپ کی پھر شوہر کی پھر اپنے بچوں کی۔ سب کے ناز اٹھاتی رہی اور سب کے دکھ سہتی رہی۔ شوہر تو خیر مجازی خدا تھا۔ وہ پارس کی جرنی بنا کے بھی رکھے تو صابر عورت زبان پر شکوہ نہیں لاتی مگر تمام عمر ذیابیطس کے آزار اور ستم برداشت کر کے وہ ایک جنت کے خواب ضرور دیکھتی ہے جو صرف اس کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے لیکن اولاد اس جنت کو بھی جہنم بنا دے۔ اس عورت سے زیادہ بدقسمت کون ہے؟

اس بڑھیا کی لاش سے دس ہزار میں قبر تک چھین لی گئی تھی اور اب اس کی لاش بیٹا بیٹی اور پوتے نواسے ہونے کے باوجود لاوارث پڑی تھی۔ تجلی کو اپنوں کے ہاتھوں نہ سہی غیروں نے مٹی دے دی تھی مگر اسے کسی اور کی قبر میں جگہ ملی تھی۔

باہر نکلتے ہی میں نے مجیدہ بائی کے عاشق سے کہا "خدا کرے تمہیں اور تمہارے باپ کو بھی قبر نصیب نہ ہو۔ تمہارا کیا تمہارے آگے آئے۔"

غالب نے کہا "اگر تم نے کسی سے اس ملاقات کا ذکر کیا تو کسی روز ہم تمہاری موت بن کے نازل ہوں گے۔ تمہیں گاڑ جائیں گے یہاں۔"

میں نے کہا "اور مجیدہ بائی کا مجرا دیکھنے چلے جائیں گے۔ ذرا ادھر آؤ۔"

وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا "کیا بات ہے؟"

"آپ کتنا مال ہے جیب میں؟" میں نے اس کی تلاشی لی اور ہر جیب خالی کر دی۔ اس کے پاس اب بھی پانچ چھ ہزار روپے موجود تھے۔ غالب نے مجھے ٹیکسی کے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے ماچس نکال کے دی اور میں نے نوٹ ڈھیر کی صورت میں زمین پر رکھ دیے۔ وہ سمجھ نہ پایا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ وہ روتا ہوا میری طرف لپکا۔ میں نے اس کے ایک لات ماری۔ وہ دس گز دور جا کے گرا۔ میں نے نوٹوں کو آگ لگا دی۔ وہ پھر اٹھ کے آیا۔ میں نے ایک جھانپڑ کھینچ مارا اور وہ ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا۔

میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا "چلو مرزا جی۔ آج کا کام ختم ہے۔"

غالب نے ٹیکسی اسٹارٹ کی تو وہ پھر اٹھا۔ اس امید میں کہ اسے بھی ساتھ لے جائیں گے مگر ہم نے پلٹ کے نہیں دیکھا۔

غالب نے کہا "پہنچ جانے کا صبح تک حرامی۔"

میں نے کہا "مرزا جی۔ تم نے مجھ کو بھلی بھی کیا ساتھ رہنے دی؟"

"ہاں۔ وہ ابھی باسی کی قبروں پر تھے تھے۔ وہ بڑا ہی ہے۔"

میں نے کہا "یہ اپنے مصری لاشوں کو محفوظ کرتے تھے ہزاروں سال بعد بھی وہ اسی حالت میں ہیں۔ لیکن نہ فن بھی زندہ ہے۔ لینن کا جسم اصلی حالت میں موجود ہے۔ غالباً ماؤ کے بھی اسکواڈ میں۔"

"یہ فن TAXIDEEMI کہلاتا ہے۔ شہروں کے اور جنگلوں کے سر خود لے کے رہو آج بھی محفوظ کیے جاتے ہیں۔"

غالب میری بات کا مطلب سمجھ گیا "شاید تجلی کی لاش محفوظ نہ کیا جا سکے۔ محفوظ کرنے کا کچھ عرصہ محفوظ حالت میں ہونے والے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیتے ہوں گے۔ جسم کے ٹوٹ پھوٹ ہونے کا عمل تو سانس کی آمد و رفت رکتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ تجلی کو مرے کے چھ گھنٹے تو اسپتال میں ہی گزر گئے تھے۔ بے شک کولڈ اسٹوریج میں تھی مگر اب تو دفن ہوئے بھی کتنے گھنٹے ہو گئے۔ پھر اپنے چوہدری صاحب کو کیسے قائل کریں گے ہم؟" میں نے کہا۔

"مشورہ کرتے ہیں پھر کچھ سوچیں گے" غالب نے کہا۔

ٹیکسی زرا نیور تھانے کی حوالات میں رہ کر اسے نیک لگا بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کے آیا اور سلاخیں پکڑ کے کھڑا ہو گیا۔

"مرزا۔ میری توبہ۔ میرے باپ کی توبہ۔"

غالب نے کہا "تمہاری ٹیکسی اچھی ہے۔ بریک ٹھیک کرا لینا۔"

"مجھے باہر تو نکالیں۔ میں اپنا دماغ بھی ٹھیک کراؤں گا ان کی بریک بھی خراب ہے" وہ بولا۔

جب اسے رہائی مل گئی تو میں نے اسے سو کا نوٹ پیش کیا۔ "کرائے کی اصل رقم سے دگنی رقم ضرور ہے۔"

غالب نے کہا "ایک روپیہ واپس کرو اور جاؤ۔"

اس نے حیرانی سے ہمیں دیکھا۔ خاموشی سے ایک روپیہ نکال کے دیا اور بھاگ گیا۔ ذلیل رفتہ تک اسے یقین نہیں تھا کہ ہم اس کو بخوشی کرایہ نہیں لیں گے۔ ہم نے باپ بیٹے سخت غلام رکھا نہیں انہیں اکیلا جو عمل کی طرح ملازم ہو چکا تھا۔

اس نے مونچھیں ہلا کے کہا "آپ۔ آپ کو دیکھا ہے پہلے بھی؟"

میں نے کہا "آئندہ نہیں دیکھو گے۔ دیکھ لو آج ہم کو جی بھر کے۔"

مسکراتا ہوا اس کی مونچھیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی اور تھانے دار کی باردراشت بروقت کام نہیں آئی ورنہ وہ مجھے گلے لگا لیتا اور جانے نہ دیتا۔ بات پھر بیچ ہی بیان کے چند مردوں کے لیے گڑھا کھودنے والا خود ہی اس میں گرتا ہے۔ ہم نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو روٹس سے تھانے میں بند کرایا تھا اور اس کی ٹیکسی لے گئے تھے۔

رہائی کے لیے کوئی سواری دستیاب نہ تھی۔ ہم نے پیدل چلنا شروع کیا۔ رات بڑی پرسکون تھی مگر میرے دل میں سناٹا تھا۔ تجلی کا ہنستا مسکراتا چہرہ بار بار سامنے آ جاتا تھا۔ ایک مصرعہ بار بار آتا۔ تاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں۔ اسپتال کے سرد خانے میں ایک بڑھیا کی لاش رکھی ہوئی ہے جس کی تدفین کے لالہ پان کنگرہ ہیں۔ اس کا اپنا بیٹا مطمئن سو رہا ہے کہ چلو اماں بھی گئیں۔ ہے قبر میں جا کے سو گئی۔ بڑھیا کی خاموشی پکار رہی ہے۔ اے بیٹا! اے بیٹا! دیکھ تو ذرا بدمعاشی کیسی رہا عمل ہے۔ ارے میری قبر میں وہ بے حیا گھس گئی ہے۔ رہی جو لندن سے آئی تھی۔ ہر ایک کو باہر رکھتی تھی۔ ارے کوئی نکالو اسے۔ مجھے میری قبر چاہیے۔

غالب بھی خاموش تھا اور ہم ساتھ چلتے ہوئے اپنے اپنے خیالوں کے گرداب میں گم رہے تھے۔ ہماری خاموشی ہم کلام تھی کیونکہ خیالوں کا محور و مرکز ایک تھا اور سوال جواب ایک تھے۔

تقریباً چار بجے کے قریب پہلے میں دروازے کے اوپر سے کودا۔ پھر غالب ہم دبے پاؤں آگے بڑھے۔ ہمیں یقین تھا کہ دروازہ ویسے ہی کھلا ہوا تھا جیسا ہم چھوڑ گئے تھے چنانچہ واپس اپنے کمرے تک آنے میں ہونا کوئی مشکل نہیں تھا۔ خیر صاحب جو رہمان کے زانوں پر اٹھانے پر مصر تھے باقاعدہ خراٹے لے رہے تھے۔

ہم اندر پہنچے ہی تھے کہ ایک دم لائٹ جل گئی۔ ہم ایک دم رک گئے۔ ہمارے سامنے رابعہ اور نازو ایک عجب جارحانہ تیور اور انداز لیے کھڑی تھیں۔

"کہاں سے تشریف لا رہی ہے سواری؟" نازو نے کہا۔

غالب نے راتوں کی تنہائی کی "ذرا چوک تک پان کھانے گئے تھے۔"

نازو نے غرا کے کہا "زانت تو دودھ کی طرح چمک رہے ہیں۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک ہی لگا لیتے کہ لال نظر آتے۔"

غالب نے میری طرف دیکھا "کس قدر غیر منطقی انداز گفتگو ہے ان جاہل نظر آنے والی خاتون کا۔ بابا رے میں نے کب کہا ہے کہ ہم نے پان کھایا بھی ہے۔ پان کھانے گئے تھے۔"

میں نے کہا "نازو بیٹے جانس تو رہا ہے پابا۔ مجھے یہ غالب نے کہا تھا۔"

"جھوٹ۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور رزیں میرے دشمن۔" غالب نے کہا "ارے جنگل کی کون سی بات ہے اس میں۔ تمہیں پان کھانا ہے تو بتا دو۔ میں آگے سے لے آتا ہوں ورنہ کہ یہاں تو ختم ہو گئے تھے۔"

رابعہ بولی "غالب۔ سچ بتاؤ کہاں گئے تھے؟"

"حد ہو گئی۔ تم بھی مجھے ہی ذانٹ رہی ہو۔ اسے ڈانٹو جس نے مجھے بھی ورغلا کے لے گیا تھا۔"

میں نے کہا "غالب۔ وہ مجیدہ بائی والی بات مت بتانا۔"

"یار میں کوئی بے وقوف ہوں" غالب نے منہ پھاڑ کے جماہی لی اور پھر انگڑائی لی۔ "ہائے۔ بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا۔"

رابعہ اور نازو نے بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ "تم مجرا دیکھنے گئے تھے؟"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "مجرا؟ وہ کیا ہوتا ہے۔"

غالب نے کہا "یار مجرو کہہ رہی ہیں۔ جیسے سائیں پاپڑ والے کا اور گلکر سلہ کا مجرو تھا۔ اپنا مجرو ہے بیچ ہے چلو چلیں۔"

نازو نے چراغ پا ہو کے اس کا راستہ روک لیا "تم سیدھی طرح بتاؤ گے یا نہیں!"

"نہیں۔ میں ٹیڑھی طرح بتاؤں گا کیونکہ میں کتے کی دم ہوں۔ تم بے شک مجھے کسی نلکی میں ڈال کے چیک کر لو۔ میں سیدھا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے ناخدا میں سمجھایا "میں نے کوشش کی تھی۔ نلکی ٹیڑھی ہو گئی۔"

رابعہ نے مجھے گھورا "سکندر بہت بری بات ہے۔ تم گھٹیا ہو گئے۔"

میں نے کہا "تین گھنٹے دس منٹ میں سمجھئے۔"

غالب نے کہا "یار وہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تم تمہیں۔ چلو ذرا دعائیں سودا کر لو۔ رہی ہو رہی ہے سونے میں۔ جھگڑا مت کرو۔"

نازو نے کہا "اب سونے کا خیال آیا ہے۔ صبح ہو رہی ہے۔"

غالب نے ترمیم کی "صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔"

میں نے غلط مصرع جوڑا "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟"

اگر ہم شرافت سے کہہ دیتے کہ بھئی سچ بات کریں گے تو شاید وہ مان جاتیں مگر اب ہم نے انہیں چڑا دیا تھا اور اب انہیں بھی ضد

www.paksociety.com

ہو گئی تھی کہ ہمیں سونے نہیں دیں گی۔ بالآخر ہمیں ہی ہتھیار ڈالنے پڑے۔ تھکن اور نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں چنانچہ ہم کچن میں چلے گئے جہاں چار افراد کے لیے ٹیبل تھی اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے خدمت میں اولیت کا بار نازو کو اٹھانا پڑتا تھا۔ وہ کافی بناتی رہی اور میں نے مختصراً بتادیا کہ مجھے کیا شک ہوا تھا اور تصدیق سے کیا ثابت ہوا۔

رابعہ نے کہا "اگر تم اس قسم کے خطرات مول لیتے رہے اور ایڈونچر کی خاطر کسی کو بتائے بغیر جاتے رہے تو کسی دن واپس نہیں آؤ گے۔"

"یہ تو سچ فرمایا آپ نے۔ ہم ابن بطوطہ کی طرح دنیا دیکھنے نکل جائیں گے اور واپسی پر سفرنامہ لکھ کے پیش کریں گے" غالب نے کہا۔

"سفرنامے کے قابل اعتراض حصے سنسر کرنے کے بعد" میں نے کہا۔

"وہ ایک پاکیزہ سفرنامہ ہوگا" غالب نے کہا "ہم ابن بطوطہ کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھے گا' جو پچاس سے اوپر ہو۔"

"اس سے کم تو لڑکیوں میں شمار ہوتی ہیں' آپ لوگوں کی طرح۔"

غالب نے کہا "چلو' یہ ہر سال بائیسویں سالگرہ کرتی ہیں۔ پچھلے پچیس سال سے۔ یہ لڑکیاں ہی رہیں گی۔"

رابعہ اور نازو نے احتجاج کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ سنی ان سنی کرتی رہیں۔ ہم خفیف ہو کے خاموش ہو گئے۔

رابعہ نے پوچھا "اب کیا تم لاش نکلواؤ گے؟"

میں نے کہا "کیسے نکلوائیں۔ کس عذر پر۔ اس کے لیے تو کورٹ کے آرڈر ضروری ہیں اور کورٹ آرڈر کے چکر میں پڑیں گے تو دلاور اینڈ کمپنی کو خبر مل جائے گی۔ وہ لاش کہیں اور دفنا دیں گے۔"

غالب نے کہا "یہ کارروائی تو اچانک اور خاموشی سے ہونی چاہیے۔"

رابعہ نے "ہاں" میں سر ہلایا "یہ مشکل ہے۔ بلکہ ناممکن۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے کہا "قانون ہماری راہ میں حائل ہے اس لیے ہمارے پاس غیر قانونی طریقہ اختیار کرنے کے سوا چارہ نہیں۔"

نازو نے کہا "کیا کرو گے تم۔ لاش نکال کے اسپتال لے جاؤ گے؟"

"تم اپنی طرح ہمیں بے وقوف کیوں سمجھتی ہو؟" غالب نے کہا۔

"میں بے وقوف ہوں؟"

"نہیں۔ تم بے وقوفی کی چیمپئن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تم نے غنڈہ گردی اور مار دھاڑ سیکھی۔ لڑکیوں والے کوئی کام نہیں سیکھے۔ سینا پرونا' کاڑھنا۔ شرمانا لجانا' کچھ نہیں آتا" غالب نے اسے باقاعدہ ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"یہ سب تم سیکھ لینا۔" نازو نے کہا "اور تم سب کام کر رہی ہیں تو مرد آخر عورتوں کے کام کیوں نہیں کر سکتے؟"

"اس لیے کہ وہ کوئی احمقانہ کام نہیں کر سکتے۔ وہ ناقص العقل نہیں ہوتے۔"

میں نے انہیں ہاتھ اٹھا کے خاموش کیا "یار بحث کہاں ہو رہی ہے۔"

"میں بھی مذاق نہیں کر رہا تھا" غالب بولا "ختم تم کرو۔"

میں نے کہا "ہمیں کیا معلوم ہے۔ نمبر ون۔ چوہدری دلاور اور ڈاکٹر شیلا خان کا باپ ایک تھا۔ نمبر دو' وہ پشاور کے قریب کے کسی علاقے کا ایک کاروباری تھا جو پہلے بیوی کو یہاں چھوڑ کر لندن بھاگ گیا اور پھر کسی وجہ سے لندن والی بیوی کو چھوڑ کر پاکستان چلا گیا۔ یا مارا گیا لیکن ہمیں اس سے سروکار نہیں۔ نمبر تھری یہ ڈاکٹر شیلی کا دلاور سے رشتہ۔ نمبر فور لندن میں وہ لوگ ہیں جو شیلی کے خاندانی حالات کے گواہ ہیں۔ نمبر فائیو لندن کی جیل میں ایک بے گناہ دہرے قتل کی سزا کاٹ رہا ہے جو اس نے نہیں دلاور نے کیے تھے۔ ہم اس کا سراغ لگا سکتے ہیں اور وہ دلاور کو شناخت کر سکتا ہے۔ اس نے دلاور کو دیکھا تھا اور وہ جان بچا کے فرار ہونے میں کامیاب رہا تھا۔ شیلی کی ماں کو مارنے کے بعد دلاور نے اسی نیگرو کی گرل فرینڈ کو شیلی سمجھ کے ختم کیا تھا۔ نمبر پانچ وہی ڈاکٹر شیلا خان جو دلاور کی سوتیلی بہن تھی پاکستان آئی اور عین اسی روز جب نقوی صاحب کا انتقال ہوا وہ قتل کی گئی۔"

"سرکاری ریکارڈ پر یہ ہے کہ اس نے نقوی صاحب کو قتل کیا اور پھر خودکشی کر لی۔"

"اس کی موت خودکشی تھی یا قتل تھا۔ یہ الگ مسئلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قتل کو دلاور کے کھاتے میں ڈالنا اور اسے ثابت کرنا عملی طور پر ناممکن ہوگا اس لیے ہم اس چکر میں نہیں پڑیں گے۔" میں نے کہا "اگر یہ ثبوت مل جائے کہ وہ ڈاکٹر شیلا تھی جس کی لاش بدل دی گئی۔ اس کی جگہ اسپتال میں ایک اور کی لاش موجود ہے اور پوسٹ مارٹم سے یہ تصدیق ہو جائے کہ قبر میں سے نکالی جانے والی لاش ڈاکٹر شیلا خان کی ہے۔ اس کا پاسپورٹ وغیرہ ہمارے پاس ہیں۔"

"فنگر پرنٹ تو شاید نہ ملیں" غالب نے سوچ کے کہا "پوسٹ مارٹم کے لیے عدالتی احکامات حاصل کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔"

"تصدیق کے دیگر سائنٹیفک طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔ آج کل فنگر پرنٹ سے زیادہ دانتوں کی ساخت سے شناخت کی جاتی ہے۔ دانتوں کی ساخت کے اعتبار سے دنیا کے سب افراد ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ فنگر پرنٹ مٹ جاتے ہیں۔ میڈیکل DENTURE رپورٹ ہمیشہ دستیاب رہتی ہے۔ بعد میں زمانہ جانا جائے تب بھی۔"

"یہاں کسی نے پوسٹ مارٹم تک نہیں کیا۔ دانتوں کی ساخت کی رپورٹ کہاں سے ملے گی؟"

"یہ رپورٹ مل جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر شیلی خان کی پرسنل میڈیکل ہسٹری لندن میں محفوظ ہوگی۔ کراسویل اسپتال میں ہوگی۔ موازنے سے با آسانی ثبوت حاصل ہو جائے گا کہ وہ ڈاکٹر شیلا خان ہی تھی۔"

"ہو گئے۔ یہ ثابت ہو گیا' پھر؟"

"پھر اپنے چوہدری دلاور صاحب سے پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر انہوں نے ڈاکٹر شیلی کو شناخت نہیں کیا اور اس کے قانونی وارث کی حیثیت سے سامنے نہیں آئے۔"

"وہ کہے گا کہ مجھے کیا معلوم۔ وہ میری سوتیلی بہن تھی اور اس سے میرے مراسم نہیں تھے۔ اس نے مجھے پاکستان پہنچنے کی کوئی اطلاع نہیں دی تھی اور یہاں بھی وہ ہوٹل میں ٹھہری۔ میرے دشمنوں نے اسے ورغلایا تھا یا وہ خود ان سے مل گئی تھی۔ وہ ثابت کرنے کو کہ شیلی تو سکندر کے ساتھ فلاں فلاں جگہ دیکھی گئی اور ان کے ساتھ رہی تھی۔ مجھے میری بہن نے کچھ نہیں بتایا تو اور کون بتاتا؟ ظاہر ہے وہ خود ایسا نہیں چاہتی تھی ورنہ سیدھی میرے پاس آتی اور میرے گھر میں ٹھہرتی۔ تو یہ سب نہ ہوتا اس کے ساتھ۔"

"تمہارا اعتراض درست ہے" میں نے کہا "ہم مان لیں گے۔"

"وہ کہے گا کہ اسپتال میں کوئی لڑکی اوپر سے گر کے مر گئی تھی۔ یہ کسی اخبار کی شہ سرخی نہیں تھی کہ میں ضرور دیکھتا۔ پتا نہیں ہر روز ایسے ہی کتنے لوگ حادثات میں مر جاتے ہیں۔ ان کی خبریں کوئی بھی نہیں پڑھتا۔"

رابعہ نے کہا "الٹا وہ تم پر الزام عائد کر سکتا ہے کہ تم نے اس لڑکی کو ورغلایا۔ اسے اپنے ساتھ رکھا اور اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ وہ سوتیلی بہن کے جذبات میں دشمنوں کی آلہ کار بن گئی تھی کہ وہی لوگ اس کی موت کے ذمے دار ہیں۔"

میں نے کہا "ہمیں اس الزام سے فرق نہیں پڑتا۔"

غالب نے کہا "فرض کرو وہ سوال کرے کہ تمہیں تو سب معلوم تھا۔"

"مجھ سے؟"

"میری مراد تھی ہمارے وکیل سے۔ جو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرے گا۔ وہ رابعہ قادری ہوں یا بھائی منظر۔ وہ پوچھ سکتا ہے کہ تمہارے موکل کو تو سب معلوم تھا۔ اس نے اسپتال والوں کو یہ بات کیوں نہیں بتائی۔ پولیس کو حقائق سے آگاہ کیوں نہیں کیا۔ غالب نے اخبار والوں کو کیوں نہیں بتایا؟"

رابعہ نے کہا "ہاں۔ وہ تو ہے ایک نمبر کا مکار اداکار۔ روئے گا یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں بڑا بدنصیب ہوں۔ مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ میری سوتیلی بہن تھی جو اسپتال میں مری تھی۔ حادثے' خودکشی یا قتل کے اسباب سے مجھے کیا۔ جو شیلی نے کیا وہ اس کی مرضی۔ اللہ اسے معاف کرے۔ میں تو سب سے پہلے وارث بن کے پہنچتا اور عزت و آبرو سے دفناتا۔"

غالب نے بھی سر ہلایا۔ "ہاں۔ وہ کہے گا کہ مجھے تو علم ہوا نہیں پھر اس کی لاش لاوارث سمجھ کے غائب کر دی گئی یا دفنا دی گئی تو اس میں میرا کیا قصور؟"

"اور کچھ فرمانا ہے کسی کو؟" میں نے کہا۔

"ہم مخل اندازی فرمانے پر مجبور ہیں۔" عاشق علی ترپ نے اندر آ کے کہا "کیونکہ وقفہ برائے ناشتا دوران گفت و شنید لازم ہے اور ہم زحمت برائے انتظار دینے کے لیے تشریف لائے تھے۔"

میں نے کہا "اچھا یار ہم چلے جاتے ہیں یہاں سے۔ تم بناؤ ناشتا۔"

"صبح صبح اتنی مشکل اردو ڈال دی کان میں" غالب نے کان میں انگلی ڈال کے ہلائی "خالی پیٹ آدمی کو بدہضمی ہو جائے۔"

رابعہ کے بیڈروم میں پہنچ کے میں نے اپنی بات پوری کی "میں چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر شیلا خان کا چوہدری دلاور سے رشتہ ثابت ہو جائے اور وہ اسے تسلیم بھی کر لے۔ اس کے بعد سوال اٹھایا جائے گا کہ آخر اس کی سوتیلی بہن کے اور اس کے درمیان دشمنی کے اسباب کیا تھے؟ محض سوتیلے ہونے کا رشتہ یا کچھ اور۔ اور اصل اسباب ہم بتائیں گے۔ چوہدری دلاور نے ڈاکٹر شیلی کی ماں یعنی اپنے باپ کی دوسری بیوی کو قتل کیا تھا۔ اس کا چشم دید گواہ اس عورت کا تیسرا شوہر ہے۔ وہ چوہدری دلاور کا یقیناً مشکور ہوتا اگر اس نے صرف ایک قتل کیا ہوتا لیکن دلاور نے تو اس کی گرل فرینڈ کو بھی شوٹ کر دیا تھا۔ ناکردہ گناہ کی سزا وہ کاٹ رہا ہے۔ وہ دلاور کو شناخت کر لے گا۔ یہاں کی بات اور ہے۔ دلاور برطانیہ کی جیل میں ایک دہرے قتل کے چشم دید گواہ کو ختم نہیں کرا سکتا۔"

"بالکل ٹھیک۔ یہ چوہدری دلاور کا سب سے بڑا مسئلہ بن جائے گا کہ وہ خود کو کیسے بے گناہ ثابت کرے۔ یہاں تو بندہ لاہور

www.paksociety.com

میں نامو اور خود کو اسی وقت کراچی میں موجود ثابت کرو مگر دلاور لندن میں خواہ انکار نہیں کر سکے گا۔ سوال صرف یہ ہے کہ جرم ہوا لندن میں، مجرم ہے پاکستانی شہری۔ مقدمہ وہاں چلایا جا سکتا ہے یہاں نہیں۔ جیسے یہاں سے کوئی قتل کر کے باہر نکل جاتا ہے واپس نہیں آتا۔ دلاور بھی لندن نہیں جائے گا۔"

میں نے کہا "برطانیہ اور پاکستان کے درمیان مجرموں کے تبادلے کا معاہدہ ضرور ہو گا۔"

"یہ بہت لمبی کارروائی ہے۔ کون ہو گا مدعی؟"

میں نے کہا "حکومتِ برطانیہ۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر شیلا خان برطانوی شہری بھی تھی۔ پورا کیس ڈاکٹر شیلی کی تمام شناختی دستاویزات کے ساتھ ہائی کمشنر کو بھیجا جا سکتا ہے۔ برطانوی ہائی کمیشن خود باقی کارروائی کرے گا۔ ان کے ایک شہری کی پراسرار موت اتنی معمولی بات نہیں کہ وہ نظر انداز کر دیں۔ نہ انہیں دلاور خرید سکتا ہے نہ دبا سکتا ہے اور نہ وہ یہاں کی پولیس کو خاطر میں لائیں گے۔"

غالب نے مجھ سے ہاتھ ملایا "ویری گڈ۔ سب سے آسان تو پھر یہی کام ہے کہ ہم یہ پاسپورٹ وغیرہ تمام تفصیلات، خدشات، امکانات اور حقائق کے ساتھ اسے ارسال کر دیں۔"

"ہم یہی کریں گے۔ چوہدری دلاور کی پبلک لائف اس کیس میں تباہ ہو جانے کی لیکن سب سے پہلے ضروری ہے کہ ایک لاوارث لاش کے بارے میں ڈاکٹر شیلی ہونے کا تصدیق نامہ ملے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ لاش اس وقت تک محفوظ رہے جب تک عدالتی اجازت ملتی ہے اور سرکاری کارروائی ہوتی ہے۔"

"اسی لیے تم لاش محفوظ رکھنے کے سائنسی طریقوں پر غور فرما رہے تھے" غالب نے کہا۔

"ہاں، مگر مسئلہ ہے قانونی طریقِ کار کا۔ اس سے پہلے کہ عدالت قبر کھود کے لاش نکالنے کے احکامات صادر کرے اور ان پر عمل ہو۔ اصل مجرم لاش غائب کر دیں گے۔ ابھی کسی کو ہمارے عزائم کا علم نہیں چنانچہ پہل ہم کریں گے۔ آج ہی شیلی کی لاش کسی اور قبر میں منتقل کر دی جائے۔"

رابعہ اور نازو کی حالت غیر ہو گئی "سب... یہ کیسے ہو گا؟"

میں نے کہا "ہو جائے گا۔ تم فکر مت کرو۔"

"سکندر۔ اس چکر میں مت پڑو" رابعہ نے کہا۔

"میں دلاور کو چھوڑ دوں۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا۔" میں نے برہمی سے کہا "مجھے اس سے بدلہ لینا ہے۔ اسے ذلیل کر کے کتے کی موت مارنا ہے مگر خود نہیں۔ میں بتا چکا ہوں کہ میں اسی دنیا میں اسی عدالتی نظام سے انصاف حاصل کر کے رہوں گا۔ میں اسے مجرم ثابت کر کے تختۂ دار تک پہنچا کے رہوں گا۔ یہی میرا مقصدِ حیات ہے۔ ایسی صورت میں اس کے خلاف اتنی اہم شہادت کو میں کیسے ضائع کر دوں؟"

غالب نے کہا "رابعہ کی تشویش غلط نہیں۔ اسے تمہاری فکر ہے۔"

"میری فکر کا یہ مطلب نہیں کہ رابعہ یا تم میں سے کوئی میرے مقصد کی راہ میں حائل ہو" میں نے کہا۔

"آخر تم یہ کام کیسے کرو گے؟ تم پکڑے جاؤ گے۔"

"تم کر سکتے ہو تو تم کرو" میں نے کہا "کسی کو یہ کام بہرحال کرنا ہے۔"

غالب نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں کروں گا یہ کام۔"

اب نازو پریشان ہو گئی "یہ جرم ہے۔ کہیں گڑبڑ ہو گئی تو؟"

"گڑبڑ نہیں ہو گی" غالب نے اسے تسلی دی "یہ سب مال امتیاز اور دھاندلی کیوں ہوتی ہے آخر۔ صرف اس لیے کہ جس کے پاس طاقت ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ طاقت میں پاور ہے تو اثر و رسوخ کہ کرتا ہے یا پیسہ اور بدمعاشی۔ ہمارے قومی کردار کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ یہاں ہر شخص ذاتی مفاد کو مدِنظر رکھتا ہے۔ اس کے لیے پیسہ سب سے اہم ہے۔ کوئی اصول قاعدہ یا ضابطہ نہیں۔ ہم بھی مجبور ہیں کہ روم میں وہ کرو جیسا رومن کرتے ہیں۔ میں پیسے کی طاقت سے کام لوں گا۔ یہی گورکن کو یہ کام کرنے کی منہ مانگی قیمت ادا کروں گا۔ وہ پہلے سے قبر کھود کے رکھے گا اور میرے سامنے لاش منتقل کر دے گا۔ اصل قبر پھر اسی طرح نظر آئے گی۔"

"لیکن اسے کوئی اور زیادہ رقم کے لالچ میں نئی قبر کا راز بتانے پر مجبور کر سکتا ہے" نازو نے کہا۔

"کبھی تم غلطی سے عقل کی بات کرتی ہو تو میں سوچتا ہوں کہ اگر تمہارا منہ..."

"بکو مت" نازو کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"تمہارا منہ بھی اتنا ہی اچھا ہوتا" غالب نے اپنی بات مکمل کی۔

رابعہ ہنسنے لگی "یہ منہ خراب ہے کیا؟ تمہیں پسند نہیں؟"

"کیوں خوار خواہ لڑائی ہو تمہیں بی جمالو" غالب بولا "نازو کے منہ کو کوئی برا کہے تو میں اپنا منہ توڑ جواب دوں اسے کہ کمبخت الٹا اپنا سا منہ لے کر رہ جائے۔"

"فضول بولتے ہو تو سوچتے ہی نہیں" نازو نے کہا۔

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ سوچتا ہوں کہ آخر دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ فضول بولنے والے ہیں" غالب نے کہا اور میری طرف دیکھا "پھر میں کیوں خاموش رہوں۔"

"تم نے نازو کی بات کا جواب نہیں دیا" میں نے کہا۔

"وہ لاجواب بات تھی۔ جواب اس کا یہ ہے کہ ہر ذمے گورکن کی مرضی۔ ہم اسے منہ مانگا معاوضہ ادا کریں گے ایک غلط کام گناہ اور جرم کرانے کے لیے۔ تو یہ بھی اس پر واضح کر دیں گے کہ کچھ بولنے سے پہلے وہ اپنی قبر کھود لے۔ فضول لاعلمی کا مظاہرہ ہو

کر سکتا ہے۔ کوئی کچھ بھی پوچھے تو کہہ دے کیا معلوم رات کو کیا ہوا۔ میں رات کو گھر میں سوتا ہوں مردے بیچ کر۔"

میں نے کہا "ظاہر ہے گورکن سے بچ کر تو بار بار ٹریڈنگ کرنے رہائی ہو سکتا ہے۔"

"دوسری بات یہ کہ فوری طور پر کچھ نہیں ہو گا۔ جب برطانوی ہائی کمشنر یا قونصلیٹ کا کوئی نمائندہ عدالت سے یا حکومتِ پاکستان سے رجوع کرے گا اور قانون مجبوراً حرکت میں آئے گا تو دلاور اینڈ کمپنی کو احساس ہو گا کہ یہ کام تو خراب ہو گیا۔ پھر وہ لاش ہٹانے کا سوچیں گے۔"

"یہ مفروضہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ کیا پتا وہ اسی وقت کی پلاننگ کر رہے ہوں جیسے ہم کر رہے ہیں" میں نے کہا۔

"میں اولین فرصت میں یہ کام کرتا ہوں" غالب نے گھڑی دیکھی "اندھیرا ہونے کے بعد چلا جاتا ہوں۔"

میں نے کہا "گورکن کا ایمان اگر تم خرید سکتے ہو تو کوئی اور زیادہ قیمت دے کر خرید سکتا ہے۔ تم اسے ذرا دھمکا کے خاموش رہنے پر مجبور کر سکتے ہو تو کوئی اور اس کی زبان کھلوا سکتا ہے اور زبان بند رکھنا زیادہ مشکل کام ہے" میں نے کہا۔

"پھر تم بتاؤ کیا ہو سکتا ہے؟"

"ایک تو یہ کہ قبر خالی نہ چھوڑی جائے۔ اس قبر میں گورکن کسی اور کو ڈال دے۔ وہ تیار قبریں بھی رکھتے ہیں۔ شیلی کی موجودہ قبر کو کھلا رکھے اور آج بھی کوئی ضرورت مند آئے تو اس کو دے دے۔ اسے ڈبل فائدہ ہو گا۔ وہ قبر کھودنے کی محنت سے بچ جائے گا اور بعد میں کوئی اور پہنچا تو اسے قبر میں ایک لاش مل جائے گی۔"

"مجبوری بات۔ اگر وہ لاش کسی مرد کی ہوئی تو؟"

"گورکن کہہ سکتا ہے کہ آپ نے یہ قبر کھودنے کا کہا وہ میں نے کھود کے رکھ دی۔ اب سارا قبرستان تو نہیں کھود سکتا۔ آپ لوگ قبر بھول گئے ہوں گے۔ دوسرا کام یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں وہ کسی عورت کی میت رکھ دے۔ بعد میں جب پوسٹ مارٹم وغیرہ کی رپورٹ مل جائے گی تو انہیں احساس ہو گا کہ وہ دھوکا کھا گئے۔"

غالب کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا "ذرا سوچو یار، عدالت کوئی حکم جاری کرنے سے پہلے پوچھے گی نہیں کہ وہ کون سی قبر ہے اور حکم پر عمل درآمد میں کچھ وقت لگے گا۔ اس کے لیے پولیس کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک مجسٹریٹ موجود رہتا ہے اور میڈیکل آفیسر ہوتا وہ سب کچھ کرتا ہے۔ اس کے لیے قبرستان میں خیمہ بھی لگایا جاتا ہے اور گورکن یہ کام سب کی موجودگی میں کرتا ہے۔ جب قبر کی نشاندہی پہلے سے ہو جائے گی تو سب انتظامات مکمل ہونے تک کرنے والے اپنا کام نہیں کر جائیں گے۔ قبر پر گارڈ کون بٹھائے گا؟"

"گارڈ بھی بٹھائی جا سکتی ہے۔ ہم خود بھی حفاظت کر سکتے ہیں لیکن یہ نہ ہو تو عدالت میں اپنے اندیشے کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نشاندہی مجسٹریٹ کے پہنچنے کے بعد کی جائے گی۔"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا "ایسے نہیں ہو گا۔ عدالت پہلے دفن کرنے والوں کو یا گورکن کو طلب کرے گی۔ اس کا ریکارڈ رکھے گی۔ گورکن کے پاس ایک رجسٹر ہوتا ہے جس میں مرنے والے کے سارے کوائف اس کے لواحقین درج کرتے ہیں۔ گورکن قبر کا تعین کرتا ہے۔ اس سے ایک طرح کی ضمانت حاصل ہو جاتی ہے کہ پوسٹ مارٹم کے لیے غلط قبر تو نہیں کھودی جائے گی۔ اصل قبر میں سے برآمد ہوئی غلط لاش۔ اس کے بعد کوئی کیسے کہ یہ نہیں۔ وہ ہے تیری قبر۔ تو بڑا مسئلہ بن جائے گا۔ مجسٹریٹ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اچھا اب دوسری قبر کھود کے دیکھو۔"

نازو نے کہا "ہمیں تو پھر یہ سب کچھ برطانوی ہائی کمیشن یا قونصلیٹ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ انہیں بتا دیا جائے کہ قانونی پوزیشن کیا ہے اور اس میں کیا گھپلا ہو سکتا ہے۔ تمہیں کیا ضرورت ہے لاشوں کو ادھر سے ادھر کرنے کی۔ وہ خود شیلی کی قبر پر پہرا لگوا دیں گے اور ایک دو روز میں پوسٹ مارٹم کرانے کا تصدیق نامہ بھی حاصل کر لیں گے۔"

غالب نے کہا "ذرا اپنا منہ ادھر کرو۔ میرے سامنے۔"

نازو چلائی "غالب۔ ہوش میں رہو۔ سمجھے!"

"حد ہو گئی یار۔ میں نے کیا چومنے کی بات کی ہے؟ میں تو دیکھنا چاہتا تھا کہ جب تم عقلمندی کی بات کرتی ہو تو تمہارے چہرے پر کیسا نور ہوتا ہے۔"

رابعہ ہنسنے لگی "تمہیں فرق ہی۔ بلکہ ابھی برداشت کا مضمون بنا کے زرافت نرلی ہوں۔ ٹاسک کروائی ہوں۔ بار کونسل کا صدر اور سیکرٹری میرے ساتھ جانے پر تیار ہو جائیں گے۔ میں انہیں سب بتا دوں گی۔ ہم اسلام آباد جا کے ہائی کمیشن کو یہ سب ثبوت پیش کرتے ہیں اور اسے معاملے کی اونچ نیچ سے بھی آگاہ کر دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ یہ سب شناختی دستاویزات بھی انہی کی تحویل میں رہیں۔ زیور، چیک وغیرہ سمیت ان کے پاس محفوظ رہیں گے۔"

"ہم انہیں بتا دیں گے کہ کسی بھی مرحلے پر مجھے یا غالب کو عدالت گواہی کے لیے یا شناخت کے لیے طلب کر سکتی ہے۔ ہم بتا سکتے ہیں کہ وہ کب، کس ہوٹل میں اور کس کمرے میں تھی۔ اس کی موت کہاں اور کیسے ہوئی تھی۔ ہم تمام گواہوں کے نام بھی دے سکتے ہیں اور پتے بھی۔ ابھی ہم مختصراً حقائق بتا کے درخواست کریں گے کہ اس معاملے میں فوراً وزارتِ خارجہ کے ذریعے ایکشن لیا جائے اور حتی الامکان رازداری برتی جائے ورنہ کی صورت میں سارا معاملہ چوپٹ ہو سکتا ہے۔"

"تمہارے واپس آنے تک ہم قبرستان میں اپنے حفاظتی انتظامات رکھیں گے" غالب نے کہا۔

www.paksociety.com

"ہم بندوق لے کر پہرا دو گے؟"

"پہرے وار مل جاتے ہیں۔ ایک نہیں چار محافظ رکھے جا سکتے ہیں جو چھپ کر نگرانی کرتے رہیں۔ ایک فوٹو گرافر کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں جو ہر کاروائی کی تصویر کشی کرے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ مجرم کون تھے لاش کو کس نے نکالا اور کہاں دفنا دیا۔ بعد میں عدالت کے روبرو سب پیش کیا جا سکتا ہے۔"

ناشتے کے بعد رابعہ نے منظر کو فون کیا کہ عدالت جاتے ہوئے اس کو اپنے ساتھ لے جائے۔ وہ راستے میں اسے پورے پلان کی تفصیلات بتا کے اس سے مشورہ چاہتی تھی۔ وہ اپنی گاڑی بھی غالب کے لیے چھوڑنا چاہتی تھی جسے بہت سے کام نمٹانے تھے۔

رابعہ کے پاس اپنے اکاؤنٹ میں بھی خاصی رقم تھی۔ جو ہم کسی بھی ضرورت میں استعمال کر سکتے تھے۔ مالی مسائل کے حل میں وقار یوسف اور اس کی بیوی پر بھی بھروسا کیا جا سکتا تھا اور منظر بھی پیچھے رہنے والا نہیں تھا مگر ایک بیوی اور چند بچوں کی کفالت کرنے والے وکیل سے مالی معاونت کی توقع رکھنا غلط تھا۔ یہی کیا کم تھا کہ اس نے ہماری عدم موجودگی میں تمام معاملات کی نگرانی کی اور اب بھی وہی سارے قانونی مسائل سے نمٹتا تھا۔ وہ وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کے انتظامی امور میں بھی اپنی ذمے داریاں پوری کرتا تھا اور اسی کی وجہ سے وہ لوگ جیسے لوگ اسپتال کو ذاتی مفاد یا سیاسی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کر پاتے تھے۔ رابعہ کے پاس ایک ذاکر بھائی کا نذرانہ بھی تھا۔ اس نے اپنے چاولا کو مجھے پچاس کروڑ دیے تھے کہ ناگ منی کو دے دوں۔ اس میں سے ایک لاکھ محسن بڑے اصرار کے بعد لے گیا تھا اور باقی تین لاکھ ایک طرح سے "ایم فوالیس" کے فنڈ کے لیے ریزرو فنڈ میں تھے۔

غالب کا خیال یہ تھا کہ وہ چار مسلح محافظوں کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ کچھ لوگ لائسنس یافتہ اسلحے کے ساتھ بینکوں اور کمپنیوں میں پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈ کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ یہ عام طور پر ریٹائرڈ فوجی ہوتے تھے۔ جس طرح لوگ اپنے شوفرز کو وردی پہنا کے اپنی شان بڑھاتے تھے ایسے ہی بنگلوں کے باہر گارڈز کو بھی وردی دے دیتے تھے۔ غالب کو یقین تھا کہ کسی قسم کی وردی میں چار مسلح افراد قبر پر موجود رہیں تو ولا ور اینڈ کمپنی کے شکاری کتے قریب پھٹکنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ چار مسلح افراد کو قتل کرنا بھی آسان نہ تھا اور اس میں اپنے بندوں کے مارے جانے کا خطرہ الگ تھا۔ قبرستان میں گورکن یا کوئی بھی شخص ان گارڈز کی موجودگی میں معترض نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بھی سمجھتے کہ کسی وجہ سے سرکاری طور پر گارڈ لگائی گئی ہوگی۔

غالب کی اسکیم واقعی بہت محفوظ تھی اور بحث مباحثے کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ ایک مشکل مسئلے کا آسان حل نکل آیا تھا جو کم پُرخطر مگر زیادہ موثر تھا۔ غالب کے خیال میں اس پر مشکل سے بیس ہزار کا خرچ تھا۔ چار چار ہزار گارڈز کی تنخواہ۔ چار ہزار کی وردیاں۔ ہر قسم کی وردی مال روڈ پر بنگلن اینڈ کمپنی سے دستیاب تھی۔ گورکن کو رشوت دے کر قبر کھدوانے کا گناہ کرنے اور یہ جرم کرتے ہوئے پکڑے جانے اور بعد میں افشائے راز کے خوف میں مبتلا رہنے سے یہ کہیں بہتر تھا۔

فی الوقت ہمارے پاس ایک ہی ریوالور تھا اور وہ بھی شبلی کا زنانہ ماڈل کا پاکٹ ریوالور۔ رابعہ کا چوکیدار ابھی اسپتال میں تھا اور اس کا ایک ہفتے سے پہلے ڈیوٹی پر حاضر ہونا مشکل تھا۔ میں نے غالب سے کہا تھا کہ چار کے بجائے پانچ سیکیورٹی گارڈ مل جائیں تو ایک کو ساتھ لے آئے۔ اسے وقتی طور پر رابعہ کی کوٹھی کے گیٹ پر کھڑا کیا جا سکتا تھا اور بعد میں اپنے ساتھ رکھنے میں فائدہ تھا۔ کہیں بھی آتے جاتے جب رابعہ گاڑی چلا رہی ہو تو وہ آگے پیچھے نظر رکھ سکتا تھا اور پیچھا کرنے والے سے نمٹ سکتا تھا۔

میں نے غالب سے یہ بھی کہا تھا کہ ممکن ہو تو وہ کہیں سے ہم سب کے لیے ریوالور لے آئے۔ ریوالور حاصل کرنا عام آدمی کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا مگر کرائم رپورٹر یا کوئی غالب جیسا صحافی کسی بھی پولیس اسٹیشن سے اسلحہ خرید سکتا تھا۔ وہ ضبط شدہ اور تلاشی میں برآمد ہونے والا یا چوروں ڈاکوؤں کے پاس سے برآمد ہونے والا سب اسلحہ سرکار کے مال خانے میں جمع نہیں کراتے تھے۔ کچھ "ضرورت مند" منہ مانگی قیمت پر خرید لیتے تھے۔ کچھ وقتِ ضرورت کسی پر پکا کیس بنانے میں کام آتا تھا۔ حکومت کے کسی وزیر کے خلاف جو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتا ہو، ایک نظم لکھ دینے والے شاعر کے پاس سے بغیر اسلحے کا پستول برآمد ہو جائے تو وہ ساری عمر کے لیے شاعری سے توبہ کر لیتا تھا اور اس کے انجام سے دس دیگر شاعر یا کالم نویس عبرت پکڑتے تھے اور آزادیٔ صحافت یا آزادیٔ اظہار کے مطالبے کی جذباتی حماقت سے تائب ہو جاتے تھے۔

رابعہ کے اور غالب کے جانے ہی میں کچھ دیر اخبار دیکھتا رہا۔ تقریباً سب ہی اخباروں میں رابعہ کے گھر میں "نامعلوم" حملہ آوروں کی توڑ پھوڑ اور مجرمانہ کاروائی کی تصاویر چھپی تھیں۔ شاید مصلحت کے تحت غالب نے ڈاکٹر شبلی کی لاش کے بارے میں خبر کی اشاعت رکوادی تھی۔ نہ کسی اخبار میں لاش کے رابعہ کے گھر پہنچائے جانے کا ذکر تھا اور نہ لاش کے ساتھ پولیس کے کسی وارنٹ کے بغیر اندر داخل ہونے کا۔ تاہم اسپتال کے مُردہ خانے میں پیش آنے والے ایک واقعے کا ذکر یوں تھا کہ "نامعلوم" افراد پوسٹ مارٹم کرائے بغیر لاش لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔"

دوپہر سے کچھ دیر پہلے ہی میں پیچھے جا کے سو گیا اور تین گھنٹے تک سوتا رہا۔ نادرہ نے مجھے دوپہر کے کھانے کے لیے اٹھایا۔ اس وقت تک نہ غالب لوٹا تھا اور نہ رابعہ واپس آئی تھی۔ رابعہ شاید اپنے آفس میں یادداشت (MEMORENDUM) ٹائپ کرا رہی تھی جو اسے اسلام آباد جا کے برطانوی ہائی کمیشن کو پیش

کرنا تھی۔ وہ شبلی کے سب کاغذات بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ غالب کے متعلق بھی یہی فرض کیا جا سکتا تھا کہ وہ کہیں شہر میں بھٹک رہا ہوگا۔ اس کا کام بھی آسان نہیں تھا۔

کھانے کی میز پر میرا ساتھ نادرہ نے دیا۔ ہم کھانے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ وقار کا فون آ گیا "عصر اور مغرب کے درمیان سوئم ہے۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ تم کہاں سے بات کر رہے ہو، آفس سے؟"

"نہیں۔ نقوی صاحب کی سرکاری کوٹھی سے" وہ بولا "میں ذرا دیر پہلے آفس گیا تھا۔ سوئم کے انتظامات بھی کرنے تھے۔"

میں نے کہا "رابعہ وہاں گئی تھی؟"

"ہاں۔ وہ میمورنڈم ٹائپ کرا رہی تھیں۔ مجھ سے کہا تھا کہ میں سید عادل آ جاؤں۔ غالب کہاں ہے؟"

میں نے کہا "وہ رابعہ کی گاڑی لے کر نکلا تھا۔ بہت سے کام تھے۔ ہو سکتا ہے وہ بھی وہیں پہنچ جائے۔"

"میں نے تو فوری نہیں کیا تھا کہ رابعہ باجی گاڑی لے کر نہیں گئی ہیں۔ ورنہ میں اپنی گاڑی ان کے لیے چھوڑ دیتا۔ خود ٹیکسی سے گھر پہنچ جاتا۔ یہاں دو گاڑیاں ہیں ابھی تو۔"

میں نے کہا "ہم بھی آ جائیں گے۔"

وقار نے کہا "ہم نہیں۔ صرف نادرہ آ جائے اگر ضروری سمجھے۔"

"ضروری تو رسم ہو تو نبا ہے اسے نباہنا پڑتا ہے۔ میں بھی تو آؤں گا۔"

"نہیں۔ آپ مت نکلیں گھر سے۔"

"یار اب ایسا ظلم بھی مت کرو مجھ پر۔ شادی بیوی نے غیر معمولی فراخ دلی کا ثبوت دیا ورنہ عورتیں کہاں معاف کرتی ہیں۔"

وہ بولا "اگر آپ سوئم میں شریک نہیں ہوں گے تو وہ آپ کی مجبوری کو بھی معاف کر دے گی۔"

"ایسی کوئی مجبوری نہیں کہ میں گھر کے اندر سے گاڑی میں بیٹھ کے نقوی صاحب کی کوٹھی کے اندر بھی نہ پہنچ سکوں۔ بس تم گاڑی بھجوا دو۔ میں ٹیکسی سے نہیں آؤں گا۔"

اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ "آپ مصر ہیں تو ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا "وہ سرکاری گاڑی مت بھیجنا۔ سب سرکاری گاڑیاں ایک جیسی نظر آتی ہیں۔"

وہ کہنے لگا "نہیں۔ وہ تو ایسے ہی کھڑی ہوئی ہے۔ ایک دو روز میں واپس ہو جائے گی۔ میں ابا یا نقوی صاحب کی ذاتی گاڑی بھیج دوں گا۔"

نادرہ کچھ خاموش تھی "آپ کھانا کھائیں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔"

میں نے اسے چھیڑا "ان کے بغیر حلق سے لقمہ نہیں اُترتا؟"

وہ مسکرائی "فکر کی بات تو ہے۔ پتا نہیں کب سے گیا ہوا ہے وہ۔"

میں نے اسے تسلی دی "تم بھی دیکھو تاکہ اس کے سپرد جو کام کیا گیا ہے۔ وہ بازار سے آٹا دال لانے کا نہیں تھا۔ اسے سیکیورٹی گارڈ تلاش کرنے تھے۔ مجھے تو معلوم بھی نہیں کہ یہ مخلوق کہاں ملتی ہے۔ ظاہر ہے کسی دکان پر نہیں ملتی۔ وہ صحافی ہے اس لیے سارے ٹھکانے جانتا ہے۔"

"ہسپتال ٹرسٹ انکیں ایمپلائی سے ڈرائیور چوکیدار خانساماں سب مل جاتے ہیں۔"

"جس قسم کے کام کے لیے وہ چار آدمی تلاش کرے گا۔ بلکہ پانچ دیا ایسے ہی راہ چلتے نہیں پکڑے جا سکتے۔ وہ سب کچھ دیکھے گا۔ عمر صحت، تجربہ اور مہارت۔ مستعدی اور حاضر دماغی اور یہ کہ کون کس قسم کا اسلحہ استعمال کر سکتا ہے اور اس کے پاس لائسنس ہے یا نہیں۔ پھر بنگلن اینڈ کمپنی سے وردیاں پسند کرے گا سب کے لیے۔ آخری مرحلہ ہوگا انہیں یہ سمجھانے کا کہ انہیں کہاں ڈیوٹی دینی ہے اور کیسے؟"

نادرہ نے سوال کیا "پتا نہیں ان کے کھانے پینے اور سونے کا انتظام کیسے ہوگا؟ چار محافظ چوبیس گھنٹے کچھ کھائے پیے اور آرام کے بغیر تو وہاں کھڑے نہیں رہ سکتے۔"

"ظاہر ہے ایک وقت میں دو افراد ڈیوٹی دیں گے۔ اب وہ آٹھ آٹھ گھنٹے کی شفٹ کرتے ہیں یا بارہ گھنٹے کی۔ یہ وہ آپس میں طے کر سکتے ہیں ورنہ غالب انہیں بتا دے گا۔ کھانے پینے کا بندوبست اور سونے کی جگہ کا انتظام بھی کہیں قریب ہی کرنا ہوگا۔ مجھے غالب کی انتظامی صلاحیت پر پورا بھروسا ہے۔"

کھانے کے بعد میں نے سوچا کہ رابعہ سے بات کر لوں۔ اگر اس نے اپنا کام ختم کر لیا ہو تو ہم اسے بھی ساتھ لے جائیں۔ وقار یوسف کی گاڑی شاید آنے ہی والی تھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو ڈائل ٹون غائب تھی۔ فون ڈیڈ تھا۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ فون کی خرابی کی شکایت درج کرانے کے لیے بھی فون ضروری ہوتا ہے۔ شکایت درج کرنے والا پوچھتا ہے کہ آپ کس نمبر سے بول رہے ہیں۔

باہر سے وقار یوسف کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو میں نے ایک کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا۔ "نادرہ۔ گاڑی تو آ گئی۔ تم نے ابھی تیاری بھی نہیں کی۔"

"تیاری کیسی۔ چلیے۔"

میں نے کہا "غالباً نسوانیت کی تاریخ میں تم پہلی خاتون ہو جس نے واقعی کسی تیاری کے بغیر کپڑے کہہ دیا کہ چلیے۔ ورنہ خواتین کہتی یہی ہیں کہ مجھے کون سی تیاری کرنی ہے۔ بس میں ابھی تیار ہو رہی ہوں ایک منٹ میں۔ اس کے بعد پون گھنٹا تو صرف کپڑے بدل کے میک اپ میں لگ جاتی ہیں۔"

"آپ گاڑی میں بیٹھیں۔ میں زیب صاحب کو سمجھا دوں کہ

ہمارے جانے کے بعد کسی کے لیے بھی دروازہ نہ کھولیں۔ دروازے تک جا کے بات بھی نہ کریں کسی سے۔ فون آئے تو کہہ دیں کوئی نہیں ہے۔"

"فون تو خراب ہے۔"

"کبھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات لائن ہولڈ آپ کا مسئلہ چند منٹ میں ختم ہو جاتا ہے۔"

باہر نکلنے سے پہلے میں نے بٹن دبا کے الیکٹرانک لاک کھولا اور کنڈی کھول کے پھاٹک کھلا چھوڑ دیا۔ نازو باہر آ کے اسے بند کرتی تو وہ خود بخود پھر لاک ہو جاتا۔ اندر سے بٹن دبائے بغیر اسے نہیں کھولا جا سکتا تھا۔ یہ کوئی سو فیصد قابلِ اعتماد انتظام نہیں تھا۔ جیسا کہ مشہور ہے۔ دروازے صرف شرفا کے لیے ہوتے ہیں۔ چوروں یا جانوروں کے لیے نہیں۔

کار کا اگلا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میں نے ڈرائیور کی صورت پر غور کرنا اس لیے ضروری نہیں سمجھا کہ کار تو بہرحال وقار یوسف کی تھی۔ اس کا خمیازہ میں نے فوراً بھگتا۔ ابھی میں بیٹھا بھی نہ تھا کہ میرے سر پر پیچھے سے کسی نے ضرب لگائی۔ وہ کوئی ڈنڈا تھا یا سلاخ تھی جس پر کپڑا لپیٹ دیا گیا تھا تاکہ میرا سر نہ پھٹے مگر وار کرنے والے ہاتھوں میں بڑی جان تھی۔ ایک دم سارا منظر میری نظروں میں دھندلا پڑ گیا۔ میں نے اپنے دفاع کی ایک لاشعوری کوشش میں پیچھے پلٹ کے دیکھنا چاہا اور اپنا ایک ہاتھ گیٹ کی طرف بھی بڑھایا جسے ابھی میں نے بند نہیں کیا تھا۔ دوسری بار پھر سر کی ساتھ میں لگا اور میں حلق سے کراہ نکال کے سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ تاہم اس وقت تک میں اجنبی ڈرائیور کی شکل دیکھ چکا تھا۔

مجھے پولیس لاک اپ میں ہوش آیا۔ میں حوالات کے غلیظ اور کھردرے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ آنکھیں کھولنے کے بعد سب سے پہلے مجھے اپنی بے لباسی کا خیال آیا۔ میرے سب کپڑے اتار لیے گئے تھے۔ فرش گیلا تھا اور وہ مجھے اپنا ہی پیشاب لگتا تھا۔

میرے سر میں دھما دھم ہو رہی تھی اور وحشی درد جیسے اندر کا سر سے ٹکرا رہا تھا۔ درد کا ایک سمندر تھا جس کی طوفانی موجیں پیہم یلغار کر رہی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو سر دوبارہ فرش پر پڑا رہ جائے گا۔ اس کا بوجھ میرے شانوں پر کسی چٹان کی طرح تھا۔

ہمت کر کے میں دونوں ہاتھوں کے بل آہستہ آہستہ اٹھا۔ لباس ہر انسان کا اعتماد ہوتا ہے۔ اس کا عملی ثبوت عام زندگی میں ملتا ہے۔ پیوند لگے میلے اور پرانے کپڑوں والا جیب میں پیسے ہونے کے باوجود اپنے بچے کے لیے کھلونوں کی کسی بڑی دکان میں جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ سوٹ اور ٹائی میں خالی جیب تو بھی کسی فائیو اسٹار ہوٹل کی کسی تقریب میں بن بلائے مہمان کی حیثیت سے بھی شریک ہو سکتا ہے لیکن لباس نہ ہو تو وہ بزدل چوہے کی طرح چھپنے کے لیے کونے اور پناہ گاہیں تلاش کرتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے تو میں اس میں سما جاؤں۔

حوالات میں میرے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ یہ بھی بڑی عجیب بات تھی۔ اندرونِ تفتیش کے وقت کچھ بھی ہو لیکن کسی حوالاتی کو رات نے ننگ تک کپڑوں کے بغیر نہیں رکھا تھا۔ حوالات ویسی ہی تھی جیسی کسی بھی تھانے کی ہوتی ہے۔ گندی، ہر قسم کے داغوں سے اور خون کے بدنما دھبوں سے بھری ہوئی دیواریں۔ برسوں کی غلاظت کے تعفن میں بسی ہوئی۔ ناقابلِ شکست فولادی سلاخوں کے دروازے والی۔ نیچی چھت سے جالے لٹک رہے تھے۔ فرش پر چیونٹے اور کاکروچ گھوم رہے تھے اور دیواروں پر چھپکلیاں چپکی ہوئی تھیں۔

حوالات کے ماحول کو پُرآسیب نحوست زدہ اور ناقابلِ برداشت حد تک غلیظ دکھا جاتا ہے تاکہ وہاں پہلی بار آنے والوں کے اعصاب تفتیش کے عمل کے آغاز سے پہلے ہی جواب دے جائیں۔ جیسے عاشق خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔ ایسے کسی حوالات کو دیکھ کر تھانے کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ہر حوالات اور ہر تھانے اس حد تک ذہنوں میں ملتے ہیں جیسے سب قبرستان ایک جیسے نظر آتے ہیں۔

میرے لیے بھی یہ سمجھنا مشکل تھا کہ مجھے کس تھانے میں بند کیا گیا ہے۔ حوالات کے باہر جو علامتی قسم کا محافظ روایتی قسم کی بندوق لیے کھڑا رہتا ہے اور جس کا اصل کام حوالات میں بند ملزموں اور ان کے رشتے داروں کے درمیان رابطہ کرانا اور بھر وعامت کے ریٹ پر معاوضہ وصول کرنا ہوتا ہے۔ وہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تھانے کے اندر بھی خاموشی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ حوالات میں کسی کا نہ ہونا ایک اتفاق سمجھا جا سکتا تھا مگر تھانے کا عملہ تو ہونا چاہیے۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ بیک وقت سب غیر حاضر ہوں۔ گشت پر نکل گئے ہوں یا خاموشی سے کام میں مصروف ہوں۔

میں نے پہلے سوچا کہ کسی کو متوجہ کرنے کے لیے شور مچاؤں مگر مجھے اپنی حالت پر شرم آئی۔ میں ایک دیوار سے ٹیک لگا کے اکڑوں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ بالآخر میں پکڑا گیا تھا۔ سارے حفاظتی انتظامات اور مستقبل کی ساری منصوبہ بندی دھری رہ گئی تھی۔ صورتِ حال کی سنگینی کے باوجود مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ جنگل کے بادشاہ سخت خفا تھے کہ فلاں شکاری کی دیدہ دلیری ملاحظہ ہو۔ جب ہمارے سامنے آ کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ نشانہ اتنا خراب ہے کہ گولی پھر بھی نہیں لگتی۔ لومڑی نے جو مشیرِ خاص تھی عرض کی کہ "جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ وہ اس لیے بچ جاتا ہے کہ آپ چھوٹی چھلانگ نہیں لگا سکتے اور اس کا نشانہ اس لیے خطا ہوتا ہے کہ آپ چھلانگ مارتے ہیں تو اس کے اوپر سے گزر جاتے ہیں۔" جنگل کے بادشاہ نے غور فرما کے کہا کہ "ٹھیک ہے جوابی لومڑی۔ کل سے

ہم چھوٹی چھلانگ لگانے کی پریکٹس کریں گے۔"

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ حلیہ اور نام بدل کے ہر شکاری کی آنکھوں میں دھول جھونکتا چلوں گا مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ شکاری بھی اتنے ہی اعتماد کے ساتھ مجھے دھوکا دے کر پکڑ سکتے ہیں۔ انہوں نے آسانی سے وقار کی گاڑی چھین لی تھی۔ وہ نقوی صاحب کی سرکاری گاڑی بھی پہچان سکتے تھے اور سرکاری ڈرائیور کو کسی پوائنٹ پر روک کے گرا سکتے تھے۔ میرا دھیان ہی اس طرف نہیں گیا کہ وقار یوسف کی گاڑی بھی میرے لیے خطرے کی کوئی بات ہو سکتی ہے۔ خصوصاً اس صورتِ حال میں جب چند منٹ پہلے ہی ان نے مجھ سے گاڑی بھیجنے کی بات کی تھی۔

صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے رابعہ کے گھر کا فون ٹیپ کیا تھا۔ یا نقوی صاحب کے گھر کا۔ وقار یوسف نے گزشتہ روز ہی رابعہ کی ترقی کے کیس پر اور اس کے سامنے مشتبہ افراد کی موجودگی کا ذکر کیا تھا۔ کسی دشواری کے بغیر انہوں نے وقار یوسف کی گاڑی چھین لی جس میں مجھے نازو کے ساتھ نقوی صاحب کے گھر جانا تھا۔ ڈرائیور وہ بہروپیا تھا اور اس نے ٹوپی بھی لگا رکھی تھی۔ میں نے اس کی صورت پر اس وقت غور کیا تھا جب میں اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جسے میں سرکاری ملازم سمجھا تھا وہ اسی وردی میں کوئی شکاری تھا۔

حوالات میں اور باہر اندھیرے سے رات کا پتا چلتا تھا مگر وقت کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ میرے ہاتھ کی گھڑی بھی کپڑوں کے ساتھ اتار لی گئی تھی۔ حوالات سے میرا فرار ہونا محال ہی نہیں ناممکن تھا۔ میرے کپڑے چھین لینے کا مقصد تو یہی تھا کہ مجھے عدم تحفظ کے کسی امتحان میں ڈال دیا جائے۔ اس کا دوسرا مقصد میرے فرار کے امکانات کو کم کرنا تھا۔ اس حالت میں موقع حاصل کر لینے کے باوجود میرا باہر جانا مشکل ہو جاتا۔

میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ یہ وقفہ ایک گھنٹے کا بھی ہو سکتا تھا اور ایک دن کا بھی۔ یہ واردات ہوئی تھی اس سے اگلی۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے یا نو بجے کے بعد کا وقت تھا۔ اس کا اندازہ بھی گھڑی کے بغیر کیا جا سکتا تھا۔

صبر کے ساتھ انتظار کا وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ زخموں اور دشمنوں کے جانے سے اس اذیت کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آہستہ آہستہ میری بے سکونی بڑھتی گئی۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی اور سر کی چوٹ کا اثر تھا کہ میں متلی محسوس کر رہا تھا۔ خیال کی پرواز کسی سمت کی پابند نہیں ہوتی۔ دھیان بار بار وقفے وقفے سے آ رہا تھا۔ مجھے بھی خیال آ رہا تھا کہ کہیں سے اسپرین کی گولیاں بھی پانی کے ساتھ مل جائیں اور بلیک کافی کی آرزو تھی۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ این خیال است و محال است و جنوں۔

رفتہ رفتہ میری قوتِ برداشت ختم ہونے لگی۔ کچھ نہ کرنا اور صرف صبر و استقامت کے ساتھ امید کا دامن نہ چھوڑنا ایک لاحاصل کوشش بن گیا۔ امید کیسی اور انتظار کس کا؟ ابھی تو خود مجھے معلوم نہیں کہ میں کہاں ہوں تو یہاں اور کون آ سکتا ہے۔

میں نے چلا کے کہا "کوئی موجود ہے یہاں؟"

خلافِ توقع مختصر وقفے کے بعد نظر آنے والے چق پڑے دروازے سے کوئی باہر نکلا "کیا بات ہے۔ آرام سے بھونکو" میں نے ایک مانوس آواز سنی۔

"آرام کے بچے۔ یہ آرام کی جگہ ہے تو تم میری جگہ آ جاؤ۔"

وہ بھاری قدم اٹھاتا آگے آیا۔ دور سے وہ ایک خوش شکل سیاہ فام شخص لگتا تھا۔ پولیس کی وردی سے اس کے عہدے کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ نشانات اس کے کندھے پر ہوں گے اور میں کھڑا ہوئے بغیر انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

جب وہ بالکل میرے سامنے آیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں یا میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی ہیں۔ وہ استاد پیڈرو تھا۔

"پیڈرو" میں نے چیخ کے اسے ماں کی گالی دی "تم پولیس کی وردی میں؟"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "پیڈرو۔ میرا نام وحید عباسی ہے۔"

میں نے اسے مزید گالیاں دیں "میں تیری سات پشتوں کو پہچانتا ہوں ابلیس کی اولاد۔ سارے نام جانتا ہوں تیرے۔ یہ بتا مجھے یہاں اس حالت میں کیوں رکھا گیا ہے؟"

اس نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا "یہ سب ڈی ایس پی صاحب سے پوچھنا۔"

"کون ڈی ایس پی۔ میں پوچھتا ہوں یہ کون سا تھانہ ہے؟"

وہ واپس جاتے جاتے رکا "یہ جہنم کا تھانہ ہے۔ اور کچھ؟"

میں نے چلا کے کہا "مجھے منظر سے یا رابعہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ مسکرایا "کرو۔ ساری رات کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

میری گالیوں سے وہ ذرا بھی مشتعل نہیں ہوا تھا۔ شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ پولیس کی وردی میں استاد پیڈرو تھا۔ میں اس کے کسی ہم شکل بھائی کے وجود کی جھوٹی کہانی نہیں سن سکتا تھا۔

www.paksociety.com

www.paksociety.com

اپنے مدمقابلے سے وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔
وہ میری چیخ و پکار کی پروا کیے بغیر واپس کمرے میں چلا گیا۔ میں سلاخوں سے سر لگائے سوچتا رہا کہ یہ سب کیا ہے۔ کیا یہ تھانہ جعلی ہے؟ مجھے پولیس نے گرفتار نہیں کیا تھا۔ اغوا کرنے والے ولاور اینڈ کمپنی کے شکاری تھے اور میرے ساتھ کوئی نیا گیم کھیل رہے تھے۔ میں نے ذہن کو پُرسکون کرنے کی اور سوچنے کی کوشش کی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے؟ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے جب کہ میں کچھ کر ہی نہیں سکتا۔
ایک بار پھر میں خاموش ہو کے بیٹھ گیا۔ اندر سے میں کسی جوالا مکھی کی طرح کھول رہا تھا۔ میرا ذہن شکست خوردگی کے حوصلہ شکن احساس سے دوچار تھا اور مایوسی مکڑی کے جالے کی طرح میری سوچ کو گرفت میں لیتی جا رہی تھی۔
میں نے چلا کے کہا "پیڈرو۔ میری بات سنو۔"
وہ پھر چق ہٹا کے باہر نکلا "پیڈرو تمہاری ماں کا یار تھا کوئی کہ اسے یاد کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "آج کیا دن ہے۔ کیا تاریخ ہے؟"
اس نے کہا "آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔ کل تمہاری تاریخ وفات ہے۔"
میں غصے کو پی گیا "وقت کیا ہوا ہے؟"
اس نے کہا "تم پر بُرا وقت آیا ہوا ہے۔"

میں نے اسے پھر غصے و دو چار فحش گالیاں دیں۔ "تم لوگوں میں ہمت ہوتی تو مجھے بہت پہلے قتل کر چکے ہوتے۔ تم صرف ڈرامے کرتے ہو۔"

اس نے کہا "لو وہ ڈی ایس پی صاحب آ گئے۔"
مجھے ایک اور شاک لگا۔ ڈی ایس پی کی وردی میں آنے والا چوہدری دلاور تھا۔ وہ بڑے وقار اور متانت کے ساتھ چلتا ہوا میری طرف آیا۔

میں نے کہا "آیئے چوہدری دلاور صاحب۔ خوب بہروپ بھرا ہے تم نے بھی لیکن مجھے اس کا فائدہ بتا دو۔"
اس نے حیرانی سے پیڈرو کی طرف دیکھا "عباسی۔ یہ کیا کہہ رہا ہے؟"
پیڈرو نے نفی میں سر ہلایا "پتا نہیں سر۔ یہ مجھے بھی پتا نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ ہاں، استاد پیڈرو۔"

دلاور مسکرایا "نام تو اچھا رکھا ہے اس نے تمہارا لیکن یہ مجھے چوہدری دلاور کیوں سمجھ رہا ہے۔ کون ہے چوہدری دلاور؟"
آخری جملہ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا تھا "کیا تم مجھے پاگل ثابت کر سکتے ہو اس طرح...." میں نے دلاور کو ایک گندی گالی دی۔
"تم خود اپنے آپ کو پاگل ثابت کرنا چاہتے ہو۔ نہیں سکے کہ میرا نام احسان الحق ہے۔" اس نے اپنے سینے پر لگے ہوئے نام کی پٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"اچھا۔ ٹھیک ہے تم احسان الحق ہو۔ تم ڈی ایس پی ہو" میں نے اپنا سر سلاخوں پر مار کے کہا "لیکن مجھے اس طرح کیا ہے؟ میرے کپڑے کہاں ہیں؟"
دلاور نے سوالیہ نظروں سے پیڈرو کو دیکھا "یہ کب گرفتار کیا تھا؟"
"پولیس آئی قریشی نے سر۔ اس وقت بھی ملزم نے کپڑے نہیں پہن رکھے تھے۔"
مجھے یہ بے سروپا گفتگو پاگل کر سکتی تھی۔ میں نے خود پر قابو پا کے کہا "اچھا مجھے دوسرے کپڑے لا دو۔"
دلاور مسکرایا "عباسی۔ اپنی وردی دے دو اسے۔"
پیڈرو نے کہا "سر۔ میری بیوی کے کپڑے ہیں۔ میک کلینرز سے لیے تھے۔ وہ دے دوں؟"
میرا حوصلہ جواب دے چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ لوگ اور شاید یہی مجھے پاگل کرنا چاہتے ہیں۔ میرا گلا گھونٹ دینا بے کار تھی۔ میں آہنی سلاخوں سے سر ٹکرا کے اپنا سر توڑ سکتا تھا۔ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

میں نے کہا "مجھے پانی چاہیے۔"
"اور کچھ....؟" دلاور نے کہا۔
"اگر اسپرین مل جائے۔ میرے سر میں بہت درد ہے۔"
"کیوں نہیں۔ بھئی عباسی۔ یہ ملزم.... کیا نام ہے اس کا؟"
میں اسے گالی دیتے دیتے رک گیا۔ مجھے سوچنے کی صلاحیت بحال کرنے کی ضرورت تھی اور جسمانی قوت کو بحال کرنا ضروری تھی۔
"اس کا نام اکبر علی ہے سر۔" پیڈرو کا ڈراما جاری تھا۔
میں نے تلخی سے کہا "عباسی صاحب مجھے کافی ہے؟"
وہ سوچ میں پڑ گیا "اچھا میں دیکھتا ہوں۔ کافی بھی شاید مل جائے۔"
ڈی ایس پی بنا ہوا چوہدری دلاور واپس جا رہا تھا اور والے کمرے میں داخل ہوتے ہی دلاور تھا کہ باہر سے ایک اندر آ گئی۔

ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے پاگل ہونے کا یقین ہو گیا۔ عورت رابعہ تھی۔ اس نے میری طرف اجنبیت کی نظر ڈالی پھر دلاور نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے کمرے میں لے گیا۔

میری آنکھیں رابعہ کی شناخت میں غلطی نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کا ثانی نہ تھا نہ کوئی ہو سکتا تھا۔
اس کی کائنات میں حسن کے رنگ لامحدود تھے اور تخلیق کا ہر نمونہ خالق کی قدرت کاملہ کی گواہی دیتا تھا لیکن میری رابعہ وہ شاہکار تھی جو صرف ایک بار وجود پاتے ہیں۔
کہیں میں کوئی بھیانک خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ میں نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر کے سوچا۔ وہ خوف اور اندیشے جو آدمی کے لاشعور میں چوہوں کی طرح رینگتے رہتے ہیں جاگتے میں ڈرائیں نہیں جاتے ہیں اور نیند میں پریشان کریں تو ڈراؤنے خواب بن جاتے ہیں۔
اگر میں پاگل ہو جاتا تب بھی تصور میں یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ میرے سامنے دلاور نے رابعہ کی کمر میں ہاتھ ڈالا مگر اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور کوئی احتجاج کیے بغیر اس کے ساتھ یوں کمرے میں چلی گئی جیسے میں کوئی اجنبی حوالاتی تھا اور ایسا مجرم تھا جس پر اس کی نگاہ ڈالنا بھی ضروری نہ تھا اور دلاور اس کا اصلی پرستار تھا۔
یہ ناممکن تھا۔ میرے شعور میں ایسے خوف کا وجود بعید از امکان تھا۔ کسی مکمل ذہنی مریض کے ذہن سے بھی شاید ایسے خیال اُگ نہیں ہو سکتا جس کا احساس یا تجربہ اس نے ہوش و حواس کی کیفیت میں نہ کیا ہو۔
رابعہ مجسم وفا تھی اور پیکر محبت تھی۔ وہ جان دے سکتی تھی مگر کسی کے ہاتھوں کو اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ اس کے جسم کو اپنے لمس سے گناہ گار کریں۔
پھر یہ سب کیا تھا؟ میری نظر کا دھوکا یا میرے حواس کا فریب! میرے دماغ کا فتور یا عالم خواب؟ میں نے اپنی انگلی کو دانتوں سے کاٹا تو تکلیف کے احساس نے مجھے یقین دلایا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ یہ کسی ذہن کو متاثر کرنے والی دوا کا اثر ہو سکتا ہے جس میں آدمی کے حواس ہی نہیں عقل بھی دھوکا دیتی ہے اور وہ اپنے وہم کو حقیقت تسلیم کر لیتا ہے۔ دنیا کی (اس وقت کی) سب سے اونچی عمارت امپائر اسٹیٹ بلڈنگ پر سے ایک شخص اس یقین کے ساتھ کود گیا تھا کہ وہ اُڑ سکتا ہے چنانچہ بحفاظت کسی پرندے کی طرح نیچے اُتر جائے گا۔ ایسا ایک دوا ایل ایس ڈی (L.S.D) کے استعمال کا نتیجہ ہوا تھا جو نشے کی جدید ترین صورت تھی۔
تاہم مجھے ایل ایس ڈی کے زیر اثر ہونے کا امکان ایک فیصد ہزار بھی نہیں تھا۔ مجھ پر کوئی عام بے ہوش کرنے والی دوا آزمائی گئی تھی جس کا اثر اب ختم ہو رہا تھا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ جب میں وقار یوسف کی گاڑی میں بیٹھا تھا تو پیچھے سے میرے سر پر کوئی چیز ماری گئی تھی۔ اس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا اور کچھ دیر بعد ہوش میں آنے لگا تھا کہ کسی نے میرے منہ پر رومال رکھ دیا تھا۔ وہ شاید کلوروفارم کی بو تھی جو پہلے مجھے سنگی

کے ساتھ محسوس ہوئی تھی لیکن اب میں بالکل ٹھیک تھا۔
میری نظر اس دروازے پر جم کے رہ گئی تھی جس پر چق پڑی ہوئی تھی۔ نظر کے درمیان ایک پردہ تھا مگر تصور کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اگر رابعہ ہی پردے کے پیچھے دلاور کے ساتھ موجود تھی تو یہ فرض کرنا محال تھا کہ وہ شرافت سے آمنے سامنے بیٹھے قانونی مسائل پر تبادلۂ خیالات کر رہے ہوں گے۔ جس طرح دلاور اسے اندر لے کر گیا تھا اس کے بعد تصور میں قابل اعتراض مناظر کے سوا کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ میرے وجود میں آتش فشاں بھڑکنے لگا تھا لیکن میں اپنی بے بسی کی آگ میں جل کے خاکستر ہونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

رابعہ ایک وکیل کی حیثیت سے نہ جانے کتنی بار پولیس اسٹیشن جا چکی تھی اور قانونی مقدمات کے سلسلے میں اس کا پولیس کے ساتھ براہ راست واسطہ رہتا تھا مگر آج وہ جس طرح تھانے آئی

تھی یہ اس کا انداز نہ تھا۔ وہ ہمیشہ بڑے وقار، اعتماد اور عزم کے ساتھ آتی تھی۔ عام لوگوں کی نظر میں اس کا پیشہ زیادہ باعزت تھا۔

وہ کوئی عام وکیل نہ تھی اور اسے اپنی کامیابی پر فخر سے سربلند رکھنا آتا تھا مگر آج میرے سامنے سے گزر کے جانے والی رابعہ کے اطوار عامیانہ تھے اور وہ ایک بازاری عورت لگتی تھی۔

دلاور کا ایس پی کی وردی میں نظر آنا بھی ناقابلِ فہم تھا مگر دلاور کچھ بھی کرسکتا تھا۔ کوئی نیا چکر چلانے کے لیے وہ میرے سامنے جوکر بن کر بھی آسکتا تھا اور جنرل بن کے بھی لیکن رابعہ یہ سب کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ کسی جائز مقصد کے حصول کی خاطر بھی وہ اپنی عزت، عکس کو داؤ پر لگانے کا جھوٹا کھیل بھی نہیں کھیل سکتی تھی۔ اگر اس کے یہاں آنے کا مقصد میری رہائی کے لیے کوشش کرنا ہوتا تو پہلے وہ مجھ سے بات کرتی اور پھر بڑے افسر سے۔ بفرضِ محال دلاور نہ ہوتا کوئی اصلی ایس پی بھی رابعہ سے میری رہائی کا وعدہ کرتا اور پھر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالنے کی جسارت کرتا تو رابعہ اس کے منہ پر تھپڑ مارتی۔

اس یقین سے مجھے کچھ سکون ملا کہ وہ جعلی ایس پی تو دلاور ہوسکتا ہے مگر وہ عورت رابعہ نہیں ہے۔ ضرور دلاور کے ذہن نے کوئی نیا ڈراما تیار کیا ہے اور وہ اسی ڈرامے کا ایک کردار یہ عورت ہے جو رابعہ کی ہم شکل ہے یا اسے میک اپ سے رابعہ کے مشابہ بنا دیا گیا ہے۔ نصف صدی یا اس سے بھی پہلے کسی نے کہا تھا کہ

سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

چنانچہ وہ عورت رابعہ جیسی نظر تو آسکتی تھی مگر رابعہ نہیں بن سکتی تھی۔ میں نے بھی اسے دور سے دیکھا تو دھوکا کھا گیا۔ وہ میرے پاس آتی یا مجھ سے بات کرتی تو سارا پول کھل جاتا۔ میں یہ سوچنے لگا کہ یہ سب ڈراما ہے تو پھر پولیس اسٹیشن کیسے اصلی ہوسکتا ہے۔ یہ بھی تھانہ نہیں تھانے کا سیٹ ہے جو ایک سین شوٹ کرنے کے لیے لگایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حوالات خالی پڑی ہے اور پولیس کی وردی میں بھی وہی افراد نظر آرہے ہیں جو اس ڈرامے کے مرکزی کردار ہیں اور آج سے پہلے بھی چہرے، حلیے اور نام بدل بدل کے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کرچکے ہیں۔ تھانے میں تو تخت لگا بھی ہوتا ہے۔ ڈیوٹی افسر، محرر، حوالات کی گارڈ اور کانسٹیبل وغیرہ وہاں جھوٹی سچی رپورٹیں لکھوانے والے، چھوٹے چور کو پکڑوانے والے بڑے چور۔ ظلم کرنے والے، مظلوم اور بے گناہ مجرم سب ہر وقت نظر آتے رہتے ہیں۔ عزتوں کے سودے، پکڑ دھکڑ، تفتیش اور لین دین کے معاملات دن رات جاری رہتے ہیں۔

اچانک پیڈرو پھر نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر وہی مخصوص پُرخباثت مسکراہٹ تھی جس کی نقل شاید شیطان بھی نہ کرپاتا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سلور کا گلاس تھا اور دوسرے میں بظاہر کچھ نہیں تھا مگر میرے پاس آکے اس نے مٹھی کھول کے ہتھیلی سامنے کردی "یہ لو اسپرین کی گولیاں اور پانی۔"

میں نے ایک ہاتھ سے گلاس پکڑ لیا اور دوسرے میں گولیاں لے لیں پانی قدرے گرم تھا اور اس میں سے ایک ایسی کراہیت انگیز بو اٹھ رہی تھی جس نے میرے حواس مختل کردیے۔ یہ پیشاب کی بو تھی۔ اسپرین کی گولیاں بھی بھیڑ بکری کی مینگنیاں تھیں۔

احساسِ ذلت نے مجھے پاگل کردیا اور میں نے مٹھی کی گولیاں اور گلاس پیڈرو کو کھینچ مارا۔ "کمینے کی اولاد۔ یہ پانی ہے؟"

وہ اس ردِعمل کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا اور خود کو بچاتے ہوئے ہنسا "اور کیا ہے شہزادے!"

"یہ وہی ہوگا جو تیری ماں نے تجھے پلایا تھا۔"

میں نے دوسرے ہاتھ کو غلاظت کے احساس سے نجات کے لیے دیوار پر رگڑا۔

وہ افسوس سے سر ہلانے لگا "میں تو سمجھا تھا کہ تمہیں دشمنی میں بند کرادیا ہوگا مگر تم تو خطرناک قسم کے پاگل ہو۔"

"کس نے بند کرایا ہے مجھے؟"

"تمہارے ہی دوست رشتے دار ہیں" وہ مجھے گھورنے لگا۔ "نام تو میں نہیں جانتا سب کے۔ ان میں سے ایک عورت ایس پی صاحب کے پاس آئی بیٹھی ہے رابعہ نام ہے اس کا۔"

میں نے کہا "ذرا قریب آکے بات کرو۔"

"کیوں؟ تم بہرے بھی ہو؟"

میں نے کہا "میں اپنا اس عورت کا اور تمہارا نام بتا سکتا ہوں جو تم بھول گئے ہو پیڈرو۔"

وہ تھوڑا سا قریب آیا "مجھے ترس آتا ہے تم پر۔ اچھا پڑھے لکھے بندے لگتے ہو۔ کیوں پاگل لگتے ہو، ہر ایک سے نام تمہاری بڑی یاری تھی اس عورت رابعہ سے!"

میں نے سلاخوں سے ہاتھ نکال کے اس کی گردن پکڑنے کی ناکام کوشش کی "وہ رابعہ نہیں ہے..." میں نے اسے پوری ڈکشنری سے منتخب گالیاں دے کر کہا۔

وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا "پھر کیا اماں ہے تمہاری؟ بڑی جوان ہے۔"

ایک بار پھر میں نے خود پر کنٹرول حاصل کیا۔ میں نے خود کو یاد دلایا کہ ہر قسم کی اشتعال انگیزی کا مقصد میری ذہنی آسودگی ختم کرنا ہے۔ دشمن جانتے ہیں کہ طاقت کے مقابلے میں سب سے بڑا ہتھیار عقل ہوتی ہے اور وہ اب تک میرا یہ ہتھیار کند نہیں کرسکے۔ کمرے کی چق ہٹا کے دلاور نے سر نکالا "اوئے عباسی یہ کیا رولا ہے؟"

عباسی عجیب پیڈرو نے فریاد کی "آپ کا ہی بندہ ہے جی"

اندر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی تو دلاور کا چہرہ پھر غائب ہوگیا۔ میں نے اس کی آواز سنی۔

"ہیلو کون؟... اچھا اچھا... اپنے وکیل صاحب... کیسے یاد کیا جی اس وقت؟" لہجہ اور آواز بدل کے بات کرتے ہوئے دلاور دانستہ طور پر اپنے فطری انداز گفتگو پر آگیا "ہاں جی آپ کا بندہ ہمارے پاس بالکل ٹھیک ہے ابھی تک تو۔ جی ہے۔ باتیں بڑی الٹی سیدھی کررہا ہے۔ دماغ پر کچھ اثر ہے۔ جی ہاں ہم جانتے ہیں جی دماغ درست کرنا۔ کوئی پیچ ڈھیلا ہو۔ جی ٹھیک ہے، زبان بند ہو، سب ٹھیک ہوجاتا ہے اس کا۔ ہمارے پاس بڑے اچھے استاد قسم کے کاریگر ہیں اور ان کے ہاتھ بھی اچھے ہیں... وکیل صاحب تو یہ بھی وکیل صاحب ملاقات کرانی فون پر تو رہا ہے تو وہ بولا کہ اب آپ نے فون نمبر معلوم کرلو کہ جگہ کون سی ہے۔ ہاں جی، پھر آجاؤ اپنا بندہ کیا ہم مل ہی جائیں۔ یہ لیں تو ہمارا ماننا" اس نے فون بند کردیا۔

وہ پھر کمرے سے نکلا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا میری طرف آیا۔ اس کے لبوں کی فاتحانہ مسکراہٹ میں میرے لیے چیلنج تھا اور پانی کا خوف۔

"بابا جی۔ تم آرام سے نہیں بیٹھ سکتے؟"

"بس آرام سے ہوں میں تو" میں نے تلخی سے کہا۔

پیڈرو نے شکایت کے انداز میں کہا "اس نے پانی مانگا تھا جناب کے سامنے اور اسپرین کی گولیاں۔"

میں نے کہا "تھا کہ لاؤ۔"

"یہ پھینکیں سرجی۔ گلاس مار دیا میرے منہ پر کہ یہ پانی نہیں پیشاب ہے اور یہ دیکھیں اسپرین کی گولیاں ہیں۔ ان کو مینگنی کہتا ہے۔"

"پاگل ہے عباسی۔ تم دل پر مت لو۔"

میں نے کچھ نہیں کہا جناب عالی۔ ابھی کہہ رہا تھا کہ یہ عورت رابعہ نہیں ہے۔ اسی کی شکایت پر تو پولیس نے اسے پکڑا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اس نے گھر میں بہت توڑ پھوڑ کی تھی۔ رابعہ کو مارا تھا۔ اتنا عرصہ کوئی بھی پریشان رہے۔ بندے کا گھربار لٹ جائے اور وہ موت سے بچ نکلا ہو۔ اتنے صدمات میں گرفتاری کا ڈر ہو۔ تو کوئی بھی پاگل ہو سکتا ہے۔"

"سرجی! اب کیا اسے سزا ہوگی؟"

"اوئے بے وقوف۔ سزا دینا نہ دینا ہمارا کام نہیں ہے۔ عدالت جو چاہے کرے۔ ویسے کسی پاگل کو جیل خانے نہیں پاگل خانے بھیجا جاتا ہے۔ تم بلاوجہ بحث مت کرو۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس بار انہوں نے مجھے پاگل قرار دینے کی بات طے کی ہے اور میں نے اپنا ردِعمل جارحانہ رکھا۔ میں ان پر چیختا رہا، انہیں گالیاں دیتا رہا تو اس سے میرے دشمنوں کے منصوبے کی تکمیل میں مدد ملے گی۔ ان کے کسی سفید جھوٹ، بے بنیاد الزام اور بے سروپا دعوے کی تردید کرنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہاں میری سننے والا کون ہے اور کون ہے جسے میں وہ کل بتا کے قائل کرسکوں کہ میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔ ان لوگوں سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کسی خفیہ کمرے سے قلم بندی میں مصروف ہوں۔ ہر اشتعال انگیزی کا مقصد ہی میرے پاگل پن کا وہ ثبوت حاصل کرنا ہو جو دنیا کے سامنے پیش کیا جاسکے۔

دلاور نے جھک کے کچھ اٹھایا "اکبر علی۔ یہ کیا ہے؟"

میں نے غور سے اس کی ہتھیلی کو دیکھا جس پر سفید رنگ کی دو گولیاں رکھی ہوئی تھیں "یہ اسپرین کی گولیاں ہیں۔"

دلاور نے مسکرا کے پیڈرو کی طرف دیکھا "تم تو مار رہے تھے۔"

پیڈرو نے احتجاج کیا "سرجی۔ قسم خدا کی۔"

"عباسی۔ طریقہ ہوتا ہے بات کرنے کا۔ سمجھنے کی کوشش کرو یار کہ یہ نارمل نہیں ہے" دلاور نے کہا "اگر تم نارمل ہو۔ اس جیسا بننے کی کوشش کروگے تو پھر تم کو بھی اندر اسی کے ساتھ بند کرنا پڑے گا۔"

پیڈرو نے بے بسی سے اپنے افسر کو دیکھا پھر مجھے خون آشام نظروں سے گھورا۔

"جاؤ میرے کمرے سے پانی لاؤ" دلاور نے حکم دیا۔

"پہلے بھی وہیں سے لایا تھا سر۔"

"جاؤ پھر لاؤ۔ میں بتاتا ہوں تمہیں کہ پاگلوں کے ساتھ کیسا برتاؤ رکھنا چاہیے۔" دلاور نے کہا۔ پیڈرو کے جاتے ہی وہ مجھ سے مخاطب ہوگیا۔ "انسپکٹر عباسی جاہل ہے اور بے وقوف بھی..."

میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "پھر وہ انسپکٹر کیسے بن گیا۔ اپنے ڈی ایس پی احسان الحق صاحب؟"

وہ مسکرانے لگا "سفارشی ہے۔"

"آپ تو اہلیت کی بنیاد پر اس عہدے تک پہنچے ہوں گے!" میں نے طنزاً کہا۔

پیڈرو دوسرے گلاس میں پانی بھر کے لے آیا "آپ بھی تسلی کرلیں سر۔"

دلاور نے گلاس لے کر کہا "اکبر علی۔ کیا یہ پیشاب ہے؟"

میں نے کہا "چکھ کے دیکھ کے بتاتا ہوں۔"

اس نے ایک گھونٹ لیا "یہ پانی ہے۔ لو۔ اور یہ لو گولیاں۔"

میں نے اطمینان سے گولیاں حلق میں رکھ کے پانی کا گلاس خالی کردیا۔ اس سے پیڈرو کو مایوسی ہوئی "مجھے تو اس کی سمجھ نہیں آئی۔"

دلاور نے کہا "اب میرے سامنے اس سے جو پوچھنا ہے پوچھو۔"

پیڈرو نے کہا "اوئے کون پاگل ہے... میں کہ تم؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے میں... ورنہ میں باہر ہوتا اور تم اندر ہوتے۔"

"نام کیا ہے اپنا؟"

میں نے سہلایا "اکبر علی۔"

"میرا کیا نام لے رہے تھے تم ابھی۔" دلاور بولا۔

www.paksociety.com

"احسان الحق۔ جو آپ نے بتایا تھا۔"

"پھر یہ چوہدری دلاور کون ہے؟" پیڈرو نے کہا۔

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔"

پیڈرو جھلا گیا۔ "اوئے تم تو مجھے بھی کیا کہہ رہے تھے...... استاد پیڈرو؟"

"استاد پیڈرو؟" میں نے سوچ کے کہا "مجھے یاد نہیں۔"

دلاور نے پوچھا "اس عورت کو پہچانتے ہو جو مجھ سے ملنے آئی تھی۔ میرے کمرے میں ہے اس وقت بھی؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "وہ رابعہ تھی۔"

"ویری گڈ۔ تم نے دیکھا عباسی۔ اس وقت یہ کتنا نارمل ہے۔"

پیڈرو نے کہا "بندے کا دماغ خراب ہوتے دیر نہیں لگتی۔"

"اچھا چلو اب تم اسے چائے شائے دو... اور دیکھو پھر کوشش کرو۔ شاید یہ کپڑے پہن لے" دلاور نے جاتے جاتے کہا۔

"پہلے کتنے جوڑے خراب کر چکا ہے سب۔"

"چلو ایک اور سہی..."

میں خاموشی سے سب سنتا رہا۔ وہ مجھ پر ثابت کر چکے تھے کہ میں نے پاگل پن کے دورے میں رابعہ کو مارا۔ اس کے گھر میں توڑ پھوڑ کی اور رابعہ پولیس سے مدد لینے پر مجبور ہو گئی۔ میرے پاگل پن کی وجہ میرے حالات کا دباؤ تھا۔ میں نے مسلسل بے سکونی اور آلام و مصائب سے بھرپور خانہ بدوشی اور بے سروسامانی کی زندگی گزاری تھی اور میرے خلاف فوجداری نوعیت کے اتنے قانونی مقدمات درج تھے کہ سزا کا خوف میرے اعصاب پر سوتے جاگتے سوار رہتا تھا۔ اب وہ مجھے بتا گئے تھے کہ شغلِ دیوانگی میں کئی بار میں اپنے لباس کو بھی تار تار کر چکا تھا۔

مرد بدست زندہ۔ میں کس کس تہمت سے دامن بچاتا۔ کس کس الزام کی نفی کرتا اور نفی کرنے سے کیا ہوتا؟! ایک دیوانہ اگر سفید کو سفید کہے تو ہوش مند اسے سیاہ تسلیم کرا سکتا ہے۔ ابھی تک مجھے علم نہیں ہوا تھا کہ میرا ذہنی توازن کب بگڑا تھا۔ عزیزوں اور دوستوں نے مجھے پولیس کے حوالے کرنے سے پہلے میرا نفسیاتی اور ذہنی علاج معالجہ کرایا تھا یا نہیں اور انہوں نے پاگل خانے بھیجنے کے بجائے مجھے پولیس کے حوالے کیوں کیا تھا جہاں بڑے بڑے ذی ہوش رات بھر کی تفتیش کے بعد مجذوب کی بڑ ہانکنے لگتے ہیں۔ مجھے امید تھی کہ رفتہ رفتہ وہ مجھے میرے دورِ جنوں کی اور بھی کہانیاں سنائیں گے جن سے مجھ پر چودہ طبق روشن ہو جائیں گے اور جو باتیں مجھے یاد نہیں وہ سب میرے حافظے میں نقش ہو جائیں گی۔

دلاور دروازے تک گیا اور لوٹ آیا "وہ اپنے اکبر علی۔ ابھی فون کیا تھا تمہارے لیے کسی وکیل نے۔ کیا نام بتایا اس کا؟"

میں نے بے اختیار کہا "منظر۔"

مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ دلاور نے سوچا "منظر... منظور۔ کیا منظر؟ یہاں سے تو کوئی منظر دکھائی نہیں دیتا۔"

پیڈرو نے کہا "سر جی۔ پتا نہیں اس کے دماغ میں اس وقت کون سا منظر ہے۔ کاغان میں گھوم رہا ہے یا مری میں۔"

دلاور نے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا "کوئی وکیل تھا۔ نام بتایا بھی تھا اس نے۔ وہ آ رہا ہے تم سے ملنے۔ مس رابعہ کو بھی بہت فکر تھی تمہاری کہ کہیں ہم تشدد نہ کریں۔ میں نے ... ہے کہ جی ہمیں کون سا چوری کا مال برآمد کرنا تھا یا کوئی اقبال جرم کرانا تھا۔ کیس تو سارے پرانے ہیں عدالتوں میں۔ ہم تو بس پیش کریں گے۔ آگے عدالت جیسے چاہے کرے۔ میڈیکل ... خود پتا چل جائے گا کہ پاگل پن اصلی ہے یا چکر بازی ہے۔ یہاں روز واسطہ پڑتا ہے ٹھگوں سے۔ جب پھانسی کا پھندا نظر آتا ہے تو پاگل بن جاتے ہیں لیکن سائنس بڑی ترقی کر گئی ہے اب۔ فوٹو اتار لیتے ہیں دماغ کے اندر کا۔ سب معلوم ہو جاتا ہے کہ مشینری ٹھیک ہے یا واقعی خراب ہے۔ ویسے اس بے چارے ... اپنے پاس سے دس ہزار روپے ہیں مجھے۔ ورنہ میڈیکل سے پہلے ہم بتا دیتے" وہ معنی خیز انداز میں ہنسا۔

اس کی باتوں نے اور اس کے یقین نے مجھے الجھن میں ... دیا "اگر وہ رابعہ ہے تو وہ مجھ سے کیوں نہیں ملی!"

دلاور نے سر ہلایا "اوئے تم سے مل کے کیا کرے گی... تمہارا دماغ ٹھکانے ہے۔ تھوڑی دیر پہلے انسپکٹر عباسی سے ... سیدھی باتیں کر رہے تھے۔ دورہ پڑتے دیر لگتی ہے۔ وہ ... اور پھر اس حالت میں..."

"رابعہ مجھ سے ڈرتی ہے!" میں نے زیرِ لب کہا اور ... اس مذاق پر یا بے رحمی پر مجھے بیک وقت ہنسنا بھی چاہیے تھا اور رونا بھی۔ دیوانے سے یہ مت پوچھو دیوانے پر کیا گزری ہے؟

"اوئے تم سے کیا بولا تھا میں نے۔ جا کے اس کے لیے کپڑے لاؤ۔ ابھی یہ کچھ ٹھیک لگتا ہے مجھے۔"

"میں کدھر سے لاؤں جی کپڑے۔ اپنے پاس تو کوئی ... ہے۔ لیکن...؟"

"لیکن کیا؟"

"سر جی۔ آپ نے بیگم صاحب کے کپڑے منگوائے تھے دھلنے کے۔"

"دھلنے سے نہیں آئے ڈرائی کلینر سے مگر زنانہ کپڑے؟" دلاور نے ایک لمحہ غور کیا "خیر لے آؤ۔ جب کچھ نہیں ہے تو زنانہ ... سب چلے گا اور اسے کیا اچھے برے سے۔ آ جاتے ہیں ... ٹھیک ہے۔"

"اچھا جی! ہم بھی تھوڑا رونق میلہ دیکھ لیں" پیڈرو ہنسا اور چلا گیا۔

"دیکھو بھئی۔ اب مت پھاڑنا کپڑے۔ ورنہ میری گھر والی تو ... جانے کی کہ دوسرے لا کے دو۔" دلاور نے کہا "زنانہ کپڑے پہن لو گے؟"

میں نے کہا "بہت شوق سے پہنوں گا جی۔ آج تک نصیب ہی نہیں ہوئے تھے۔ ایک بات بتائیں اپنے ڈی ایس پی صاحب!" وہ جاتے جاتے رک گیا "بولو۔"

"میں کپڑے پہن لوں گا۔ اس کے بعد رابعہ سے مل سکتا ہوں؟"

"یہ مرضی ہے اس کی۔ ویسے میں سفارش کروں گا کہ ابھی خطرے کی بات نہیں۔" دلاور نے بڑی شانِ استغنا سے کہا "ابھی تو اسے تشویش تھی کہ تمہارے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ میں نے تسلی کرا دی ہے اس کی۔"

پیڈرو یا انسپکٹر عباسی کپڑے لے کر آیا تو زنانہ قمیص اور شلوار پہنتے ہوئے مجھے بہت عجیب لگا لیکن مکمل برہنگی کے احساس سے نجات پا کے مجھے بہت ذہنی سکون ملا۔ ابھی تک میں فرش پر گھٹنے سمیٹے بیٹھا تھا اور اسی حالت میں رہنے پر مجبور تھا۔ میری ٹانگیں اکڑ گئی تھیں اور کمر درد کرنے لگی تھی۔ اب میں نے اس حوالات جیسے پنجرے میں زخمی شیر کی طرح ٹہلنا شروع کیا جس کی انا سب سے زیادہ زخم خوردہ تھی۔ دیوانگی اور برہنگی کے بعد یہ حیثیت گدائی میرے احساسِ بے بسی اور رسوائی کے لیے تازیانۂ عبرت تھی۔ معلوم نہیں وہ فون کس وکیل کا تھا۔ دلاور نے جھوٹ بولا تھا یا واقعی فون منظر نے کیا تھا۔ اگر یہ عورت رابعہ ہوتی تو منظر بھی اس کے ساتھ آتا۔ اگر یہ تھانہ نہیں تھا تو پھر منظر یہاں کیسے فون کر سکتا تھا۔ پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ کہیں منظر کو خود کسی شکاری نے یہ تبصرہ دیا ہو کہ فون کر کے دیکھ لو۔ تمہارے سکندرِ اعظم کو ہم نے شکار کر کے پنجرے میں کسی جانور کی طرح بند کر رکھا ہے۔

اس خیال سے ہی مجھے پسینہ آ گیا کہ منظر یا غالب کو یہاں بلایا گیا اور ان کے ساتھ رابعہ یا نازو آ گئیں تو میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہو گا۔ کیا پتا یہاں میری اسیری کے مناظر کی تصویر کشی جاری ہو اور اس پاگل خانے میں میری شرمناک حالت کی عکاسی کا مقصد مجھے بلیک میل کرنا ہو۔ خیر مجھے نہ شرمندہ ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ڈرنے کی۔ دلاور جیسا کمینہ شخص اس سے کہیں زیادہ کر سکتا ہے اور جتنا وہ آج سے پہلے کر چکا ہے اس کے مقابلے میں تو یہ کچھ بھی نہیں۔

جو عورت جسے میں نے رابعہ سمجھا تھا اور تسلیم بھی کیا تھا ملاقات سے تقریباً بیس گز دور جس والے کمرے میں کسی بات پر کھلکھلا کے چونک کے ادھر دیکھا تھا۔ رابعہ کبھی ایسے نہیں ہنستی تھی۔ وہ بڑی نرمی سے اور نزاکت کے ساتھ ہنستی تھی اور بہت کم۔ عام طور پر وہ مسکرا کے رہ جاتی تھی۔ کھل کے بیتابی ہنستی تھی یا پھر نازو۔

ان سب کی یاد آئی تو میں دل مسوس کر رہ گیا۔ وہ سب میری گمشدگی سے کتنے پریشان ہوں گے۔ نازو نے انہیں بتا دیا ہو گا کہ ہمیں سوئم میں شرکت کے لیے جانا تھا اور وقار یوسف نے ہمیں لے جانے کے لیے اپنی گاڑی بھیجی تھی۔ شک کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ وقار یوسف نے فون کر کے کہا تھا کہ وہ نقوی صاحب مرحوم کی سرکاری گاڑی نہیں اپنی گاڑی بھیج رہا ہے اور جو گاڑی آئی تھی وہ واقعی اسی کی گاڑی تھی۔ اس جیسی دوسری نہیں تھی۔

ساری گڑبڑ ایک منٹ کے فرق سے ہو گئی تھی۔ نازو میرے ساتھ رہتی تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں پہلے اسے پیچھے بٹھانے کے لیے دروازہ کھولتا تو وہ ڈرائیور کی صورت دیکھ لیتی یا اس شخص سے نمٹ لیتی جو پچھلی سیٹ پر ایسے دبکا ہوا تھا کہ مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ شکاری نادان نہیں تھے۔ انہیں معلوم ہو گا کہ مقابلہ ایک سے نہیں دو سے ہو گا اور دونوں مل کے ایک اکیلا اور دو گیارہ ہونے کا ثبوت دیں گے مگر وہ اس کا بھی انتظام کر کے آئے ہوں گے۔

نازو نے گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھا ہو گا تو پہلے اسے یقین نہیں آیا ہو گا کہ میں اسے چھوڑ کے اکیلا جا رہا ہوں۔ ممکن ہے ایک لمحے کے لیے اسے یہ خیال بھی آیا ہو کہ میں مذاق کر رہا ہوں مگر ہم نقوی صاحب کے سوئم میں جا رہے تھے اور یہ مذاق کا موقع نہ تھا پھر وہ سمجھ گئی ہو گی کہ گڑبڑ ہو گئی ہے۔

کسی نے یقیناً ٹیلی فون ٹیپ کر کے ہماری گفتگو سنی تھی اور انہیں ہمارے پروگرام کا پتا چل گیا تھا۔ انہوں نے وقار یوسف کی گاڑی کو رابعہ کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی چھین لیا۔ اصل ڈرائیور کو مار کے پھینک دیا یا ریوالور دکھا کے نیچے اتار دیا اور شوفر کی وردی میں دوسرا شخص گاڑی چلا کے رابعہ کے گھر لے آیا۔ ایک روز مرہ کی لاشعوری عادت کے مطابق میں نے غور سے ڈرائیور کا چہرہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وردی میں آدمی کی شخصیت ایسے کیموفلاج ہو جاتی ہے کہ سب چہرے ایک سے نظر آنے لگتے ہیں۔ میں نے تو ڈرائیور کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک احمقانہ اطمینان کی بات یہ تھی کہ گاڑی وقار یوسف کی ہے تو ڈرائیور بھی وہی ہو گا لیکن ایسا نہیں تھا۔

مجھے اغوا کرنے کے لیے آنے والوں نے لڑنے جھگڑنے کا یا لڑائی کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ انہیں علم ہو گا کہ مجھے چند سیکنڈ کی مہلت بھی مل گئی تو میں ان کا بھرتا بنا دوں گا اور اتنی دیر میں نازو پہنچ گئی تو یک نہ شد دو شد والی بات ہو گی۔ جیسے آندھی طوفان کے ساتھ زلزلہ بھی آ جائے۔ انہوں نے بلا تاخیر میرے سر کا نشانہ

www.paksociety.com

لے کر دوڑ کیا اور مجھے گاڑی میں ڈال کے فرار ہو گئے۔ نادو ساتھ ہوتی تو شاید وہ ریوالور سے کام لیتے اور ہمیں مجبور کر دیتے کہ شرافت سے گاڑی میں بیٹھ جائیں۔

بہت سوچنے پر بھی مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ گاڑی میں کتنے لوگ تھے اور میں نے بے ہوشی سے پہلے کوئی آواز سنی تھی یا نہیں۔ مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ میں کتنا عرصہ ہوش سے بے گانہ رہا۔ ایک گھنٹا، ایک دن، ایک رات۔ یہ اسی شام کے بعد آنے والی رات تھی جب مجھے اغوا کیا گیا تھا یا اس سے اگلی۔ چوٹ شدید تھی مگر ایسی بھی نہیں کہ میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ بے ہوش رہتا۔ ایسی چوٹ سے تو اللہ ہی بچائے ورنہ دو چار گھنٹے گزر جانے کے بعد ڈاکٹر بھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہتے۔ آدمی مفلوج ہو سکتا ہے۔ اندھا ہو سکتا ہے یا مجنون زندہ لاش کی طرح گزار سکتا ہے۔

سونے جاگنے کے وقت کا حساب رکھنا کتنا آسان کام ہے لیکن بے ہوشی سے ہوش کی منزل تک وقت کی مسافت کا اندازہ کرنا عملاً ناممکن ہے۔ عام حالات میں گھڑی بھی اتنی اہم نہیں رہتی۔ فرد خود بھی گھٹتے بڑھتے سایوں سے وقت کا صحیح اندازہ کر لیتا ہے لیکن اس وقت مجھے دن، تاریخ اور وقت کی نشاندہی ظاہر کرنے والے اس فرد کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی اس کے بغیر میں مجبور تھا کہ سنی سنائی پر اعتبار کروں جو بتایا جائے اسے ہی سچ مانوں۔ سر پر ضرب لگا کے مجھے بے ہوش کرنے کے بعد جو لوگ مجھے یہاں لائے ہوں گے انہیں بھی معلوم ہوگا کہ بہت جلد مجھے ہوش آ جائے گا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ شام سے رات تک چند گھنٹے ہی گزرے ہوں گے مگر کسی کو لمبے عرصے کے لیے بے ہوش رکھنا کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مجھے مسلسل خواب آور دواؤں کے زیرِ اثر رکھا گیا ہو۔ ہر چھ آٹھ گھنٹے بعد انجکشن لگا دیا گیا ہو۔

مجھے امید تھی کہ یہ ڈراما زیادہ لمبا نہیں ہوگا۔ چوہدری دلاور کیا چاہتا ہے۔ یہ بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ ڈیڑھ فٹ دس فٹ کے اس پنجرے میں مسلسل چکر لگاتے ہوئے میں نے عجیب سی اعصابی بے چینی محسوس کی۔ بے سکونی کی یہ کیفیت اس شخص کی حالت سے مختلف نہ تھی جس کا نشہ ٹوٹ رہا ہو۔ مقررہ وقت پر طلب پوری نہ ہو تو اعصابی نظام احتجاج کی اذیت برداشت کرتا ہے۔ شاید مجھے بھی خواب آور ادویات سے ذہنی و جسمانی طور پر ناکارہ کر دیا گیا تھا لیکن اب ان دواؤں کا اثر ختم ہو رہا تھا۔

آخر مجھے یہاں کب تک کسی جنگلی جانور کی طرح قید میں رکھا جائے گا؟ میرے دوست اور ساتھی میری پُراسرار گمشدگی سے کتنے پریشان ہوں گے۔ اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے مجھے کہاں کہاں تلاش کیا ہوگا۔ انہوں نے سارے تھانوں سے اور تھانے داروں سے رابطہ کیا ہوگا۔ پولیس کے مخبروں سے پوچھا ہوگا۔ مظہر اور وقار یوسف وکیل تھے چنانچہ ان کا تعلق دو طرفہ تھا۔ ایک طرف وہ پولیس کے تمام قانونی اور غیر قانونی اعمال سے باخبر تھے تو دوسری طرف وہ مجرموں کے بھی راز دار اور مددگار تھے اور جرائم کی دنیا کے تمام راز ہائے سربستہ سے واقف تھے۔ انہوں نے اسپتالوں کے شعبۂ حادثات میں بھی دیکھا ہوگا اور مُردہ خانے تک جا کے لاوارث لاشوں میں بھی تلاش کیا ہوگا لیکن یہ کوئی گمنام جگہ تھی جہاں مجھے قید کیا گیا تھا۔ یہ جگہ اس شہر میں کہیں بھی ہو سکتی تھی۔ یہ دور افتادہ بستی بھی ہو سکتی تھی۔ جب تک مجھے اغوا کرنے والے ذرا سا بھی اشارہ نہ دیتے میرے دوست اور مددگار میرا سراغ نہیں لگا سکتے تھے۔

رابعہ بن کے یہاں آنے والی عورت خاموش تھی یا دبی آواز میں باتیں کر رہی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اور دو ایک کے سوا سب کچھ کر رہے ہوں۔ میں نے صرف ایک بار اس کی آواز سنی تھی لیکن اس سے آواز کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

پیڈرو تو کچھ ہی بعد باہر سے چائے کی ٹرے کے ساتھ نمودار ہوا اور سیدھا کمرے میں چلا آیا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ وہ خود تو پولیس کی وردی میں کسی ڈی ایس پی سے کم نہیں لگ رہا تھا اور اس نے نام بھی احسان الحق کر لیا تھا۔ پیڈرو تو بس انسپکٹر عباسی کا کردار ادا کر رہا تھا اور وہ بھی مصر تھے کہ میں خود کو اکبر علی سمجھوں لیکن میرا نام انہوں نے نہیں بدلا تھا۔ اپنی مصلحت وہ خود سمجھتے تھے۔ میرے خیال میں ان کا مقصد میرے ذہن میں الجھن اور انتشار پیدا کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اب مجھے صبر، حوصلے اور استقامت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا تھا اور یہ دیکھنا تھا کہ ان کا اگلا قدم کس سمت اٹھتا ہے۔

پیڈرو چائے کی پیالی اٹھائے بڑھا اور باہر تھا۔ اس نے پیالی میری طرف بڑھا کے کہا "نوش جان کرو مسٹر ڈار۔"

پیالی کے بجائے میں اس کی کلائی بھی پکڑ سکتا تھا اور ذرا جھٹکے سے سلاخوں کی طرف بھی کھینچ سکتا تھا۔ اس کا ایک بازو سلاخوں کے اندر ہوتا اور وہ خود باہر تو میرے لیے اس کا بازو جسم سے الگ کرنا بھی ممکن تھا اور اس کی گردن توڑنا بھی مگر اس سے مجھے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ الٹا نقصان یہ ہو سکتا تھا کہ وہ مشتعل ہو کے مجھے گولی مار دے۔

پیڈرو نے ایک تحسین آمیز اشارہ کرتے ہوئے کہا "یار تم کمال کے عورت ہوتے مانو۔"

اس کی باقی بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ دلاور کا قابل ماتحت تھا۔ انتہائی سفاک، انتہائی پُر فریب اور عیار اداکار۔ اس کی توقعات پر ہمیشہ پورا اترنے والا۔ بھروسے کے اور وفادار۔ فرق صرف خبث اور منفی سوچ کا تھا ورنہ دونوں بالغالب بھی ایک دوسرے کے ایسے ہی قابل اعتبار ساتھی تھے۔

اس وقت بھی پیڈرو اپنے مالک اور ان داتا چوہدری دلاور کی ہدایات کے عین مطابق اپنا یہ رول نبھا رہا تھا اور یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ جعل اور ہاتھ کی صفائی سے وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا وہ اپنا کام دل جمعی سے کر رہا تھا۔

چائے ان حالات میں ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ میں نے خود کو خاصا تازہ دم محسوس کیا اور دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ ابھی تک مجھ پر دلاور کے عزائم واضح نہیں ہوئے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا اور دلاور احمق بہرحال نہیں تھا کہ وہ بغیر سوچے سمجھے کوئی ایسا کام کرے جس میں وقت ضائع ہو لیکن حاصل کچھ نہ ہو۔ وہ مجھے اغوا کرانے کے بعد مجھے پولیس کے حوالے کر سکتا تھا۔ یہ سب سے آسان کام تھا۔ پولیس کو شاید درجن بھر مقدمات کے سلسلے میں میری تلاش تھی اور ان میں سے نصف مقدمات انتہائی سنگین نوعیت کے تھے۔ جن میں میری ضمانت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ دو مقدمات قتل کے تھے جن میں مفرور مجرم کی حیثیت سے مجھے زندہ یا مُردہ گرفتار کرنے یا میری گرفتاری کے کام میں معاون ثابت ہونے والے کے لیے نقد پچاس ہزار روپے کا انعام تھا۔ دلاور کے لیے نہ سہی پیڈرو جیسے لوگوں کے لیے یہ بڑی رقم تھی اور قانونی طریقے سے مجھے ٹھکانے لگا کے وہ بہت سے مسائل سے نجات حاصل کر سکتے تھے جو میں نے پیدا کر رکھے تھے۔

اگر دلاور اینڈ کمپنی نے ایسا نہیں کیا تو اس کا سبب صرف ایک خوف ہو سکتا تھا کہ بعد میں اہم فرائض کے مجاہد بھی جارحانہ نادیدہ اور راز نے آ کے ان کا جینا حرام ہو جائے گا۔ وہ ہر قیمت پر مفاہمت چاہتا تھا۔ مخالفت نہیں۔ اس کی اصل کمزوری وہ ماضی تھا جس کی داستان کے ہر ورق، ہر سطر اور ہر حرف کے پیچھے گواہ ہم تھے۔ دولت کے راستے سیاست کی منزل تک پہنچنا چاہتا تھا اور اپنے مستقبل کی نیک نامی کو ماضی کے کسی حوالے سے داغ دار کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ غالب اور نادر کے میدانِ کائنات میں آ نکلنے سے یہ رسک اور بڑھ گیا تھا اور مجھے اس کے مقابلے کے لیے پہلے سے زیادہ مؤثر طاقت حاصل ہو گئی تھی۔ اگر کبھی اس کے سیاہ کارناموں سے پردہ اٹھاتا تو وقار یوسف، مظہر یا وہاب جیسے وکیل اسے عدالت میں کھینچ لیتے پھر اس کے بچنے ابھرنے کی کوئی تدبیر نہ ہوتی۔ بدلے ہوئے حالات کا تقاضا تھا کہ دلاور ساری بدمعاشی چھوڑ دے۔ جا بجا ناراضوں سے تائب ہو اور قتل و خونریزی کا باب ہمیشہ کے لیے بند کر دے۔ یہ اسی وقت ممکن تھا جب اس کے اور میرے درمیان پُرامن بقائے باہمی کا معاہدہ طے پا جائے۔ اس کے نقطۂ نظر سے یہ ممکن تھا لیکن میرے یقین کے مطابق ناممکن۔

مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی جو کچھ عجیب سی بات تھی۔ بے ہوشی کی طویل نیند سے جاگنے کے بعد میں خود کو ذہنی طور پر بہت مستعد اور چوکس محسوس کر رہا تھا۔ میرا جسمانی اضطراب اور بے سکونی کی کیفیت بھی ختم ہو گئی تھی اور میرا جی چاہتا تھا کہ فرش پر دراز ہو جاؤں۔ شاید مجھے چائے میں پھر خواب آور دوا دی گئی ہوگی۔ میں نے بند ہوتی آنکھوں کو بڑی مشکل سے وا کیا اور سر گھما کے چند والے کمرے میں سے اس عورت کو برآمد ہوتے دیکھا جو رابعہ بن کے آئی تھی۔ برآمدے میں لگے ہوئے بلب کی روشنی میں وہ مجھے بالکل رابعہ لگی۔ اس کا لباس بھی بالکل رابعہ کے لباس جیسا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس قسم کا ایک سوٹ اسے پسند تھا جس میں سیاہ و سفید کا بڑا دلفریب امتزاج تھا۔ کیا اسے اتفاق ہی سمجھنا چاہیے کہ اس عورت نے رابعہ کا سوٹ پہن لیا ہے لیکن رابعہ کا یہ سوٹ اس نے کہاں سے حاصل کیا؟ بات کپڑے کے ڈیزائن کی نہیں تھی۔ اس قمیص کے گلے پر اور آستینوں پر نچلے بارڈر پر اور شلوار کے پائنچوں پر ایک جیسا کڑھائی کا کام تھا جو شاید کروشیا کی بنائی کا۔ پھر کیا یہ عورت سچ مچ رابعہ تھی؟ میں نے نیم خوابیدہ ذہن کے ساتھ سوچا۔

میری آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ جب میں نے رابعہ کی آواز سنی۔ وہ میرے بہت قریب تھی "سکندر۔ میری طرف دیکھو۔"

"حیران ہو... تم؟" میں نے آنکھیں کھولنے کی ناکام کوشش کی "میرا نام ہے اکبر علی ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ میں رابعہ ہوں۔"

"جھوٹ۔ تمہارا چہرہ اور یہ کپڑے رابعہ کے ہیں۔ باقی سب دھوکا ہے۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "تمہاری آواز... ہاں... آواز بھی وہی ہے... کیا تم واقعی..."

"سکندر۔ میں رابعہ ہی ہوں۔ میرے ساتھ چلو گے؟"

"مجھے سب اپنے ڈی ایس پی۔ اپنے چوہدری دلاور صاحب... سوری، احسان الحق صاحب... یہ نہیں جانے دیں گے۔ اور وہ... مسٹر... انسپکٹر عباسی۔ تمہیں معلوم ہے نا... پیڈرو ہے۔"

اپنی انتہائی کوشش کے باوجود میں خود فراموشی کے عالم

بدنام ترین مجرم چارلس سوبھراج کے جرائم کی مکمل تفصیل

چارلس سوبھراج کی سرگزشت

میں ملاحظہ فرمائیں

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کریں یا براہِ راست ہم سے منگوائیں

کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس ۲۳ کراچی 1

www.paksociety.com

ٹوٹتے ہوئے احساس سے نجات حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ میں چاہتا تھا کہ آنکھیں کھول کے رابعہ کو دیکھوں۔ وہ میرے اتنے قریب تھی۔ میں اس کی آواز سن رہا تھا۔ اس آواز کو پہچان بھی رہا تھا۔ وہ خوشبو جو رابعہ استعمال کرتی تھی جیسے اس فضا میں شامل تھی جس میں، میں سانس لے رہا تھا۔ انکار یا تذبذب کی کیفیت اب ختم ہو چکی تھی۔ مجھے اس کے رابعہ ہونے کا یقین ہو چکا تھا لیکن اس یقین نے میری کوئی مدد نہیں کی۔ میں سو گیا یا بے ہوش ہو گیا۔

جب ایک بار پھر میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو مجھے گھومتا ہوا آسمان نظر آیا۔ آسمان کسی نیلی چھتری کی طرح تھا جس میں جا بجا سفید پیوند لگے ہوئے تھے۔ یہ ضرور بادل ہوں گے۔ میں نے پھر آنکھیں کھولیں اور بند کرلیں۔ آسمان سمٹ کے ایک دائرے کے برابر رہ گیا تھا اور یہ دائرہ واقعی چھتری جتنا تھا۔ اس چھتری کے چاروں طرف سے نامانوس چہرے جھانک رہے تھے۔ گندے چہرے، بوڑھے اور بالوں بھرے چہرے۔ گنجے سر والے چہرے۔ مونچھوں والے اور غلیظ دانتوں والے چہرے۔ غالباً میں کسی کنوئیں کی تہ میں لیٹا ہوا تھا اور وہ سب اس کنوئیں کی گول منڈیر پر سے مجھ پر خندہ زن تھے۔ ان کی آنکھوں میں تمسخر تھا اور بے رحمی تھی۔ کسی کو مجھ سے ہمدردی نہیں تھی۔ کوئی مجھے اس کنوئیں سے نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھانے پر آمادہ نہ تھا۔ لیکن میں سب میں تو۔ اس کنوئیں کی تہ میں کیسے لیٹ گیا تھا۔ میں خود کنوئیں میں گرا تھا؟ کسی نے مجھے دھکیل دیا تھا؟ کیا عجیب بات ہے۔ کنوئیں کی سطح ہموار ہے اور اس میں پانی کیوں نہیں ہے۔ پانی ہوتا تو میں ڈوب نہ جاتا۔

اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ کنوئیں کی تہ نہیں ہے بلکہ میں سخت زمین پر لیٹا ہوا ہوں اور میرے اردگرد تماشائی حلقہ بنائے کھڑے ہیں۔ آوازوں کا جو شور پہلے واضح نہیں تھا اب صاف سنائی دینے لگا تھا۔

"ہوئے پاگل ہے کوئی۔"

"پاگل نے خیر بھگا جے پرا سے وڑی چا مگے کہ تیرا ماما ہے کہ ماسی" کوئی ہنسا۔

"ذرا ذرمی مونچھ سے ماما ہے۔ کپڑوں سے ماسی" جواب ملا "میرا ماما تیری ماسی۔"

"یہ کہو ماکہ اوپر سے ماما ہے نیچے سے ماسی۔ کہیں درمیان کی چیز نہ ہو یار" میرا دوسرا بھانجا بولا۔

کسی نے بزرگانہ تحمّل سے کہا "بابا یک بک لگا رکھی ہے۔ پتا نہیں کون ہے بے چارہ۔"

"بے چارہ کہ بے چاری۔ پہلے یہ تو دیکھو بزرگو۔ اچھی طرح ٹٹول کے۔"

میں اٹھ بیٹھا۔ وہ سب ایک دم سیدھے ہو گئے جو رکوع کی حالت میں تھے اور زیادہ تفصیل سے میرا مطالعہ کر رہے تھے جیسے میں خلائی مخلوق ہوں یا اہرام مصر کی کوئی تاریخی چیز۔ جو کھڑے ہوئے تھے وہ بھی ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے شرمندگی بھری نظروں سے تماشا دیکھنے والوں کو دیکھا۔ وہ سب عام لوگ تھے راہ گیر جو جلدی میں نہیں ہوتے اور ان کے پاس ہر تماشے سے سرسری گزرنے کے لیے وقت کی کمی کوئی مسئلہ نہیں ہوتی۔ خواہ ریچھ بندر ہو یا لڑتے مرغے ہوں یا کوئی ٹرک کسی بچے کو کچلتا ہوا گزر گیا ہو ان کی دلچسپی یکساں ہوتی ہے۔ فی الحال ان کی دلچسپی کا مرکز میں تھا۔ ایک صحت مند نظر آنے والا جوان آدمی۔ جس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور جس نے مشکوک انداز میں زنانہ ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔ کپڑے قیمتی اور صاف ستھرے تھے مگر میرے جسم پر [illegible] تھے۔

میں نے بوجھل سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کے کہا "میں کہاں ہوں؟"

کچھ لوگ میرے سوال پر ہنسے "کسی دوسری دنیا سے آیا ہے بندہ۔"

کھچڑی داڑھی اور صافے والا ایک شخص گھٹنوں کے بل میرے پاس بیٹھ گیا "کون ہے تو پتر۔ کیا نام ہے تیرا؟"

میں نے بے خیالی میں کہا "اکبر علی... نہیں سکندر..."

میرے ناخلف بھانجے پھر ہنسے "اس کی یادداشت گم ہو گئی ہے چاچا۔ جیسے تمہاری بھوری بھینس گم ہو گئی تھی۔"

"پھر تھانے سے ملی تھی۔"

ایک اور شخص میرا ہمدرد ثابت ہوا "چلو چھوڑو ادھر سے۔ فضول گلاں ہی گلاں۔ کرنا کرانا کچھ نہیں۔ سارا دن مستی..."

"ارے چل یار۔ ادھر تو بڑی گرما گرمی ہے" میری جنس کے بارے میں سوال جواب کرنے والے کھسک لیے۔

"کوئی ٹھکانا ہے تمہارا؟" دوسرا شخص بھی میرے پاس بیٹھ گیا۔ "تم کو ادھر پہلے کبھی دیکھا نہیں۔ ماں پیو بہن بھائی کہاں ہیں؟"

میں اب سنبھل گیا تھا "میں سب بتا دوں گا۔ پہلے مجھے یہاں سے نکالیں۔ میں بڑی مصیبت میں پڑ گیا تھا۔"

"چاچا ذرا خیال سے۔ ایسا نہ ہو ہمدردی گلے پڑ جائے" کسی نے مشورہ دیا۔

"ہاں جی۔ زمانہ خراب ہے۔ میری مانو تو اسے سیدھا تھانے لے جاؤ" یہ دوسرا مشورہ تھا "ادھر سب پتا چل جائے گا۔"

ایک دم ان سب کے درمیان مجھے تھانے لے جانے پر اتفاق رائے ہو گیا "یہ ٹھیک ہے" کئی آوازیں آئیں۔

"نہیں۔ مجھے گھر جانے دیں۔"

"اوئے تجھے تو اپنا نام بھی یاد نہیں۔ اکبر علی ہے کہ سکندر؟"

میں نے کہا "آپ یقین کریں۔ میری یادداشت متاثر نہیں ہوئی ہے اور نہ میں کچھ بھولا ہوں" میں نے کہا۔

"پھر یہ کیا ہے۔ یہ حلیہ...؟"

میں نے کہا "یہ بڑی لمبی اور عجیب کہانی ہے۔ آپ لوگ اس چکر میں مت پڑیں۔ میں خود ہی لاہور چلا جاؤں گا۔"

اب بڑے میاں بھی مسکرانے لگے "ارے پتر یہ لاہور نہیں تو کیا کراچی ہے؟"

"میرا مطلب ہے یہ جگہ کون سی ہے؟" میں نے بات بنانے کی ناکام کوشش کی "میں تو خود لاہور ہی میں رہتا ہوں۔"

اس سے میرا بیان مزید مشکوک ہو گیا "لاہور میں رہتا ہے بندہ اور کہتا ہے لاہور جانا ہے۔"

"مرے یار بھلا ہے کوئی۔"

"بھلا نہیں جی۔ گلاں ٹھیک ٹھاک کرتا ہے۔ یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔"

میں نے پوچھنا چاہا کہ آج دن کیا ہے۔ تاریخ کیا ہے۔ "ابھی پتا چل جائے گا کہ پاگل بن رہا ہے یا..."

اس بات نے مجھے نروس کر دیا "بھائی صاحب۔ آپ کیا سمجھے ہیں۔"

"پھر بتا اسے کہ میں کیا سمجھتا ہوں۔ بتا آج سوموار ہے کہ منگل۔"

میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب میں نہیں دے سکتا تھا۔ میں خود نہیں جانتا تھا کہ دلاور یوسف کے گھر سے اغوا ہونے کے بعد اس تماشہ گاہ تک میں نے ہوائی تابوت میں سفر کتنے عرصے میں طے کیا۔ اگر میں کہتا کہ مجھے معلوم نہیں تو خود ثبوت فراہم کر دیتا کہ میں دیوانہ ہوں۔ اس سے بہتر تھا کہ ایک چانس پر جوا کھیلوں اور اندھیرے میں تیر چلا دوں۔

میں نے کہا "سوموار۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔"

ایک دم سوالیہ چہرے قہقہہ بار ہو گئے۔ کسی نے کہا "ارے پاگل سے پتر۔ آج تو جمعرات ہے۔"

مجھ سے سوال پوچھنے والا بہت کائیاں تھا۔ اس نے مجھے غلطی کا چانس نہیں دیا تھا۔ میرا جواب سو فیصد غلط ہو گیا تھا۔

"دیکھیں۔ آپ لوگ غلط سمجھ رہے ہیں۔ وہ بات کچھ ایسی ہے" میں نے ہجوم کے جارحانہ تیور دیکھتے ہوئے دفاعی انداز اختیار کیا۔

"تاریخ پتا ہے؟"

میں نے بے بسی سے سوال کرنے والے کو دیکھا "[illegible] بارہ تاریخ تھی..."

"کس کا سوئم۔ کون مر گیا تھا تیرا؟"

"شاید اسی صدمے کا اثر ہے۔"

"اثر نہیں جی۔ مکر کر رہا ہے۔ پاگل نہیں تو پھر نشے باز ہے یا انڈیا کا جاسوس۔"

صورت حال ایک دم خطرناک ہو گئی تھی۔ میں دن اور تاریخ ٹھیک بتا کے اپنا اعتبار قائم کر لیتا اور شاید کوئی ہمدردی رکھنے والا میری وضاحت بھی قبول کر لیتا مگر اب رائے عامہ مجھے تھانے پہنچانے کے حق میں تھی اور میرے گرد ہجوم نے اپنا حلقہ تنگ کر لیا تھا۔ میں نے پہلے سوچا کہ ایک جست لگاؤں اور دو چار کو گرا کے نکل بھاگوں مگر اس میں خطرہ یہ تھا کہ ہجوم میرا تعاقب کرتا اور میرے پیچھے شور مچاتے ہوئے دوڑنے والے جب "پکڑو پکڑو" چلاتے تو آگے والے بھی میرا راستہ روک لیتے۔ یہ کوئی چھوٹا سا بازار تھا۔ ابھی تک میں اس علاقے کو پہچان نہیں پایا تھا حالانکہ مجھے یقین تھا کہ لاہور کا چپہ چپہ میرا دیکھا بھالا ہے۔ آج مجھے اندازہ ہوا کہ میرا یقین باطل تھا۔ پیدائش کے بعد ساری عمر لاہور کی گلیوں کی پچاس سال تک خاک چھاننے والا بھی ایک نظر دیکھ کے نہیں بتا سکتا کہ وہ کس محلے کی کس گلی میں ہے۔

دو چار ہاتھ میری طرف بڑھے اور انہوں نے مجھے کسی خطرناک مجرم کی طرح پکڑ لیا۔ ذلت و رسوائی کے اس تماشے میں جہاں میرے لیے ذہنی اذیت تھی وہاں اطمینان کا ایک پہلو بھی تھا کہ ابھی تک کسی نے مجھے پہچانا نہیں اور مجمع دیکھ کے کوئی پولیس والا ادھر نہیں آیا۔

میں نے نرمی سے کہا "بھائی صاحب۔ میں بھاگ نہیں رہا ہوں۔ آپ مجھے تھانے لے جانا چاہتے ہیں تو شوق سے چلیں میرے ساتھ لیکن ایسے مت پکڑیں مجھے۔"

کسی نے مجھے پیچھے سے دھکیلا "چل آگے ہو۔ باتیں مت کر زیادہ۔"

سب سے بڑا خطرہ انڈین جاسوس قرار دیے جانے کی صورت میں پیدا ہو سکتا تھا۔ جنگ ابھی ختم ہوئی تھی اور ہندوستان کے خلاف نفرت کے جذبات انتہا پر تھے۔ بھارتی جاسوس ہونے کے شبہے میں بہت سے بے گناہ پٹ چکے تھے۔ کوئی نیم دیوانہ یا حلیے سے عجیب نظر آنے والا شخص مشکوک حرکت کرتا نظر آتا تھا تو پبلک کی انٹیلی جنس تفتیش کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیتی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ اچانک کسی جیالے کا جذبہ حب الوطنی جوش میں آگیا اور اس نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے میرے بھارتی جاسوس ہونے کا اعلان کر دیا تو عوامی جذبات ایک دم بھڑک اٹھیں گے۔ ہجوم کے صرف جذبات ہوتے ہیں۔ عقل صرف ان کے پاس ہوتی ہے جو ان جذبات سے کھیلتے ہیں۔

میں نے سخت لہجے میں کہا "میرے حلیے پر مت جاؤ۔"

پیچھے سے کسی نے میرے ہاتھ مار دیا "اور کیا صورت پر جائیں تیری..."

میں نے دہاڑ کے کہا "پولیس اسٹیشن چلو پھر معلوم ہو جائے گا کہ میں کون ہوں۔"

لیکن اب لوگوں کا موڈ بدل چکا تھا۔ وہ وقت جب میں اسی شہر کے معتبر حوالوں سے رائے عامہ کو ہموار کر سکتا تھا بے مقصد باتوں میں ضائع ہو گیا تھا۔ اب کوئی دلیل یا حوالہ میرے کام نہیں آسکتا

www.paksociety.com

تھا۔ زیادہ خرابی میرے حلیے نے پیدا کی تھی۔ اگر میں پھٹے پرانے کپڑوں میں ہوتا لیکن وہ مردانہ کپڑے ہوتے تو تماشا نہ بنتا۔ یہ سمجھا جاتا کہ میں کوئی غریب آدمی ہوں جو بیماری یا فاقہ کشی کے باعث سڑک پر گر کے بے ہوش ہو گیا تھا لیکن ان لوگوں نے مجھے جس حالت میں دیکھا تھا وہ شک پیدا کرنے والی تھی۔

میرے دہاڑنے کا الٹا اثر ہوا "تو وہی۔ ہم پر گرمی کھاتا ہے۔"

"ہم بھی پاگل کتے کی طرح کاٹ لے گا۔"

"دو ہاتھ اور مارو ذرا کس کے" کسی نے مشورہ دیا۔

اب میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں مارنے والوں کی ایسی تیسی کر کے جائے واردات سے فرار ہو جاؤں۔ یہ میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ چند سیکنڈ میں دائیں بائیں والے اوپر نیچے ہو گئے۔ میں نے ہر طرف ہاتھ پیر چلائے اور یہ نہیں دیکھا کہ کس کو کہاں لگی۔ کچھ تو وہیں لمبے لیٹ گئے۔ دو پیٹ پکڑ کے ڈھیر ہو گئے۔ باقی چلاتے ہوئے بھاگے۔

میں نے میدان صاف دیکھا تو بے تحاشا بھاگا۔ نہ جانے کس نے چلا کے کہا "دیکھا۔ میں نے کہا تھا نا۔ بھارتی جاسوس ہے۔"

"ہیروئن کا مغز ہے" کوئی اور چلایا "خبردار۔ اس کے پاس پستول ہو گا۔"

"وہی بم پھینک دے گا۔"

دوسرے شور مچانے والے زیادہ تھے مگر کچھ واقعی بہادر لوگ تھے جو میرے تعاقب میں دوڑتے چلے آ رہے تھے اور پتھر بھی چلا رہے تھے۔

یہ ریس کب اور کہاں ختم ہو گی؟ اس کا انحصار میری کوشش سے زیادہ تقدیر پر تھا۔ مجھے راستہ صاف ملتا۔ میں کسی بند گلی میں داخل نہ ہوتا۔ ٹھوکر کھا کے نہ گرتا یا کسی سے ٹکرا کے نہ رکتا تو شاید ایک کلو میٹر دوڑ سکتا تھا لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تعاقب کرنے والوں میں کوئی میراتھن ریس (۲۶ میل کی دوڑ) میں حصہ لینے والا شامل ہو۔ اس سے میں کسی طرح بھی نہیں بچ سکتا تھا کیونکہ وہ بڑی مستقل مزاجی سے دوڑے گا اور اس کا اسٹمنا بھی میرے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گا۔ عام لوگوں کا حال تو چند منٹ بعد مجھ سے بھی برا ہو گا۔

میں خود آؤٹ آف پریکٹس تھا ورنہ تین چار کلو میٹر کی دوڑ ایک زمانے میں معمول کی بات تھی اور میں ہر صبح جاگنگ کرتا تھا۔ اس وقت سب سے زیادہ پریشانی لباس کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ جاگنگ سوٹ میں شاید میری کارکردگی بہت بہتر ہوتی لیکن تنگ اور چھوٹے زنانہ شلوار قمیص میں دوڑنا مشکل کام بھی تھا اور شرمناک بھی۔

میں پیچھے دیکھے بغیر بھاگتا رہا اور گلیوں سے گزرتے ہوئے راہ میں حائل ہونے والے ہر شخص کو دھکا دے کر گراتا گیا۔ میری

خواہش تھی کہ کوئی ٹیکسی آجائے تو میں سامنے جا کے اسے روک لوں اور زبردستی اس میں بیٹھ کے ڈرائیور کو چلنے پر مجبور کر دوں۔ جان بچا کے نکلنے کی خاطر میں کسی پرائیویٹ کار والے کو بھی کار کے باہر پھینک دیتا اور خود اس کی کار لے کر بھاگ جاتا مگر بدقسمتی کہ اس راستے پر میرے قریب سے نہ کوئی ٹیکسی گزری نہ کار۔

حیرت انگیز رفتار سے میں نے ایک کلو میٹر یا اس سے کچھ زیادہ فاصلہ طے کرنے میں پانچ چھ منٹ ہی لگائے ہوں گے۔ گلی کوچوں سے گزر کے میں پھر کسی سڑک پر پہنچ گیا تھا جو نسبتاً غیر آباد تھی۔ مجھے امید تھی کہ تعاقب کرنے والے پیچھے رہ گئے ہوں گے یا تھک ہار کے بیٹھ گئے ہوں گے یا اس فضول تعاقب سے اکتا کے واپس چلے گئے ہوں گے۔ ایک باریش نوجوان کو اپنے پیچھے دیکھ کے مجھے حیرت ہوئی۔ وہ شور مچائے بغیر خاموشی سے میرا پیچھا کر رہا تھا اور اس کی مستقل مزاجی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لمبی دوڑ میں بھی مجھ کو شکست دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ایک آدمی سے نمٹنا آسان تھا۔ میری سانس بھی اتنی پھولی ہوئی تھی کہ میں ہانپ زیادہ رہا تھا، دوڑ کم رہا تھا۔ رفتار کم کر کے میں سڑک کے ایک کنارے ٹھہر گیا۔ عزم و استقلال کا پیکر مولوی پہلے ہی مجھے پکڑنے کے لیے حملہ آور ہوا۔ میں نے اس کی ایک کلائی پکڑی اور اسے ایک جھٹکا دے کر پہلے اپنی طرف کھینچا پھر گھما کر گھوم گیا اور مولوی نے "اوئے، اوئے" کرتے ہوئے نصف دائرے میں رہی سہی بے بسی سے بندھے ہوئے پھرکی کی طرح چکر کاٹا پھر میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ خط مستقیم میں گیا اور ایک پرانے دروازے سے ٹکرایا جس کے سامنے ٹاٹ کا پردہ لہرا رہا تھا۔ کواڑ شاید پہلے ہی کھلے ہوئے تھے۔ ایک دھماکے کے ساتھ میں نے اسے اندر جاتے دیکھا لیکن پھر میری توجہ ایک گاڑی کی طرف ہو گئی جو بریک لگا کے عین پیچھے آ گئی تھی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کسی دیوانے کے خواب کا حصہ تھا یا کسی بے سروپا کامیڈی فلم کا سین۔ سڑک کے دوسری جانب سے دو پولیس والے میری طرف لپکے۔ ان میں سے ایک رنگیلا والا اور دوسرا عام وردی میں کوئی کانسٹیبل جو اس کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھا۔ مضحکہ خیز حلیے میں ایک عورت نما مرد کو دوڑتا دیکھ کر وہ پہلے ہی متوجہ ہو گئے تھے۔ مولوی کے ساتھ میری ہاتھا پائی انہوں نے دیکھی پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ قانون حرکت میں نہ آتا۔ قانون حرکت میں برکت ہے۔

میں اس خیال سے گاڑی کی طرف دوڑا تھا کہ اس میں جو بھی ہو گا اسے پہلے شرافت سے کہوں گا کہ مجھے یہاں سے لے جائے اور اس نے تذبذب کا مظاہرہ کیا یا اکڑفوں دکھائی تو اسے کھینچ کر باہر ڈال دوں گا اور خود گاڑی لے کر بھاگ جاؤں گا۔ اس سے پہلے کہ میں گاڑی تک پہنچتا وہ خود ہی اُتر کے بھاگ

... حیران ہونے کے لیے بھی وقت نہیں تھا۔ یہ شخص میرے پاس پہنچنے کے بجائے سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔ میں اس کی صورت تک نہیں دیکھ سکا۔

گاڑی کا انجن چل رہا تھا۔ میں نے اس میں بیٹھتے ہی گیئر ڈال کر دروازہ بعد میں بند کیا۔ گاڑی تھوڑا سا لہرائی اور پھر ایک جست لگا کے آگے بڑھی۔ قانون کے دونوں محافظ چھلانگ مار کے ایک طرف نہ ہوتے تو ایک ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاتے۔ اسی وقت میری نگاہ اسی ٹاٹ کے پردے والے دروازے کی طرف گئی جس سے گزر کے مولوی کسی اجنبی گھر میں داخل ہو گیا تھا۔ کوئی پہلوان نما شخص مولوی کو واپس باہر پھینک چکا تھا اور اب اس کے پیچھے پر سوار تھا۔

خطرے کی حدود سے باہر جاتے ہی مجھے زبردست شاک لگا۔ اس وقت تک میں نے گاڑی کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ مجھے ایک کار یا ٹیکسی کی ضرورت تھی جو میرے پاس آ گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میں کار چھین سکتا ہوں اور وہ کیوں بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ یہ سوچنے کی فرصت کسے تھی۔ اب میں نے گاڑی کو دیکھا تو بے اختیار میرے پاؤں بریک پر جم گئے۔

گاڑی رک گئی اور میں نے اسے اندر باہر سے دیکھا۔ مزید تصدیق کے لیے میں نیچے اُترا اور گاڑی کا نمبر چیک کیا۔ یہ وقار یوسف کی وہی گاڑی تھی جس میں مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ میری عقل جواب دے گئی۔ اسٹیئرنگ پر سر رکھ کے میں نے سوچا۔ یہ سب آخر کیا ہے؟ حقیقت میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ ضرور میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ مجھے میرے کپڑے، میرے جسم پر زنانہ کپڑے تھے لیکن جو کپڑے پہن کے میں روانہ ہوا تھا وہ بڑے سلیقے سے تہ کیے ہوئے ساتھ والی سیٹ پر رکھے ہوئے تھے۔

یا علی! یا عجائب! یہ کوئی طلسم ہوش ربا ہے یا قصہ سوتے جاگتے کا۔ کیا میں کسی جادو نگری میں آگیا ہوں یا کارخانۂ قدرت اور نظام کائنات میں کوئی چیز کسی نظم و ضبط کے قاعدے، اسباب و علل اور عقل یا دلیل کی تابع نہیں رہی۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا ہے کیا اور کیسے ہو رہا ہے؟ یہ واقعی ہو رہا ہے یا میں کسی ٹرانس کی حالت یا خواب کی کیفیت میں دیکھ رہا ہوں مگر حقیقت سمجھ کے قبول کر رہا ہوں اور اسی کیفیت میں واقعات کا منطقی تجزیہ کرنے کی کوشش میں بھی مصروف ہوں۔ یہ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں۔

حالات و واقعات کا ایک گورکھ دھندا تھا جس میں ہر لمحہ ایک نیا سوال، ایک نئی الجھن اور دماغ خراب کرنے والی نئی صورت حال سامنے آتا تھا۔ مجھے اب واقعات کے اس سلسلے کا تعلق کسی نئے خوف سے لگنے لگا تھا۔ پتا نہیں اس کے بعد کیا ہو جائے گا۔ ممکن ہے مجھے نظر آئے گا کہ ساتھ والی سیٹ پر رابعہ بیٹھی ہوئی ہے۔ میں نے خالی سیٹ کو دیکھا اور وہاں کسی کو نہ پا کے سکون کا سانس

لیا۔ کسے خبر کہ اگلے موڑ پر کیا ہونے والا ہے۔ آخر میں کیسے ان حالات سے نکل کے اس سڑک پر پہنچ گیا۔ کون تھا جو وقار یوسف کی کار میں میرا تعاقب کرتا رہا اور موقع پاتے ہی گاڑی میرے تصرف میں چھوڑ کے بھاگ گیا؟ اسے کسی نے ہدایات دی تھیں کہ اس وقت فلاں جگہ وقار یوسف کی گاڑی پہنچا دینا۔ سکندر کو ضرورت ہو گی۔ اس کے کپڑے لے جانا مت بھولنا مگر اپنی شکل اسے مت دکھانا۔ ظاہر ہے یہ "حسن انتظام" از خود چوہدری دلاور کے ذہن کی کارفرمائی کا ثبوت تھا مگر سوال وہی تھا کہ کیوں؟

ان پاگل کر دینے والے حالات کے باعث میرے خیالات، میری قوت فیصلہ اور میری کارکردگی بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ ذہن اور جسم کے افعال میں ہم آہنگی باقی نہ رہنے کے نتائج سامنے آ رہے تھے۔ میں کچھ سوچتا تھا تو بے یقینی اور انتشار کے گرداب میں پھنس جاتا تھا اور کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا تھا کہ کیا سچ ہے اور جھوٹ کیا۔ خواب کیا ہے سراب کیا اور حقیقت کیا۔ جسم ذہن کے انتشار میں اعصابی دباؤ کا شکار ہو جاتا تھا مگر کچھ کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی یا مجھے احساس ہونے لگتا تھا کہ میں نے جو بھی کیا غلط کیا۔

اس کی ایک مثال میرے سامنے تھی۔ میں نے یہ احساس ہوتے ہی کہ گاڑی وقار یوسف کی ہے بریک لگا دیے تھے اور اب اپنے مضحکہ خیز حلیے میں سڑک کے کنارے گاڑی میں بیٹھا آتے جاتے لوگوں کی نظروں کا نشانہ بن رہا تھا جو غور سے دیکھتے تھے تو کنفیوز ہو جاتے تھے کہ کار میں عورت تھی تو اس کی شیو اتنی کیوں بڑھی ہوئی تھی اور مرد تھا تو زنانہ بہروپ میں چہ معنی دارد۔

میرا دماغ ٹھکانے ہوتا تو میں ادھر ادھر کی سوچوں میں وقت گنوانے کے بجائے پہلا کام یہ کرتا کہ لباس بدل لیتا تاکہ میرا حلیہ تو مشکوک نہ رہے پھر یہ دیکھتا کہ گاڑی کے انجن یا بونٹ میں کسی جگہ نصب ٹائم بم میری زندگی کی آخری گھڑیوں کے آخری لمحے تو شمار نہیں کر رہا ہے اور کچھ نہ ہوتا تو سیدھا رابعہ یا غالب کے پاس پہنچ جاتا۔ باقی سوالات کے جوابات سب مل کے تلاش کر سکتے تھے کہ ان الجھے ہوئے واقعات کی گتھی کو سلجھانا موجودہ کیفیت میں میرے اکیلے کے بس کی بات نہیں تھی۔

یہ خیال آتے ہی میں نے گاڑی کو پھر گیئر میں ڈالا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ عین اسی وقت خوفناک مونچھوں اور خطرناک عزائم رکھنے والے ایک شخص نے اندر منہ ڈال کے اپنا تجسس رفع کرنا چاہا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ یہاں میں کس کا انتظار کر رہا ہوں یا کر رہی ہوں۔ گاڑی اچانک چل پڑی تو اس کا سر کھڑکی سے لگا، اس کی کنپٹی پر کار کی اگلی کھڑکی کے درمیانی حصے سے چوٹ آئی ہو گی۔ اس نے چلا کے کہا "اوئے تیری..." مگر اس کی گالی کا اصل حصہ میں نے نہیں سنا۔

بہت سی باتیں اب میری سمجھ میں آ گئی تھیں۔ ایک یہ کہ میں شام ِ شمال کے علاقے میں ہوں۔ دوسری یہ کہ وقت صبح کے دس

www.paksociety.com

گیا وہ پیچ کا ہے اور یہ کہ ذہنی و جسمانی طور پر میں بہت تیزی سے نارمل ہوتا جا رہا ہوں۔ موقع پاتے ہی میں نے کار کو ایک دیوار کے ساتھ پارک کیا۔ گاڑی کے آگے پیچھے درخت تھے۔ کار اور دیوار کے درمیانی خلا کو ڈریسنگ روم کی طرح استعمال کرتے ہوئے میں نے ایک منٹ میں زنانہ کپڑوں سے نجات حاصل کی اور اپنے اصلی کپڑے پہن کے پھر کار میں بیٹھ گیا۔ اگر کوئی دیکھتا بھی تو یہی سمجھتا کہ انتہائی مجبوری کے باعث میں جسم میں جمع ہو جانے والا فاضل پانی سرِ راہ خارج کر رہا ہوں۔ وہ مصنوعی زنانہ کپڑے میں نے وہیں چھوڑ دیے جن کے تصور سے بھی مجھے خجالت محسوس ہوتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی کوئی ضرورت مند غریب انہیں اٹھا کے بہت خوش ہوگا۔ غریب کی گھر والی انہیں پہن کے اس سے بھی زیادہ خوش ہوگی اور گھر والی کو خوش دیکھ کے وہ مزید خوش ہوگا۔ سب ضرورت مندوں کو ایسی خوشیاں راستے میں پڑی مل جایا کریں تو دنیا ہی جنت ہو جائے۔

اپنے پرانے حلیے کے ساتھ ہی میری خود اعتمادی لوٹ آئی تھی اور میں گاڑی یوں چلا رہا تھا جیسے میرے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا اور میں اپنے معمول کے مطابق واپس گھر جا رہا ہوں۔ میں نے ساری الجھنوں کو اور پریشان کن سوالوں کو ذہن سے خارج کر دیا تھا۔ ان کے بارے میں فرصت سے سوچا جا سکتا تھا۔ فوری طور پر مجھے ذہنی یکسوئی اور سکون کی ضرورت تھی۔

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد کہ مجھے لوٹ کر رابعہ کی طرف نہیں جانا چاہیے میں نے وقار یوسف کے گھر کا راستہ اختیار کر لیا تھا اور تقریباً پچاس میل کی رفتار سے رواں تھا کہ اچانک میرے کانوں نے دلاور کی آواز سنی۔

"کیا حال ہے جی اپنے سکندر اعظم صاحب! طبیعت کیسی ہے؟"

میں بری طرح اچھل پڑا۔ گاڑی تھوڑا سا لہرائی پھر میں نے اسٹیئرنگ کو سنبھال لیا اور رفتار کم کر دی۔ یہ انارکلی جیسی تنگ اور پُرہجوم جگہ ہوتی یا مال روڈ تو گاڑی کے لہرانے سے ضرور کوئی ناخوش گوار حادثہ پیش آ جاتا۔

بالکل غیر ارادی طور پر میں نے پیچھے دیکھا حالانکہ آواز میرے سامنے ڈیش بورڈ کے نیچے نصب ریڈیو کے اسپیکر سے آئی تھی۔

دلاور ہنسا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ میری گھبراہٹ دیکھ کے لطف اندوز ہو رہا ہے حالانکہ وہ خدا جانے کہاں بیٹھا تصور اور قیاس کی بنیاد پر بات کر رہا تھا "آپ تو ایسے ہی نروس ہو رہے ہو جی۔ ایسا نہ ہو گڈی سمیت۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ماشاء اللہ سے اپنے چودھری دلاور صاحب ریڈیو پر قوم سے خطاب فرما رہے ہیں۔ اس بدنصیب قوم کے ہونے والے لیڈر۔ ہیں جی!"

"ہاں جی۔ اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔ قوم کی بدنصیبی میں تو ہمیں بھی شک نہیں لیکن لیڈر تو وہی بنتے ہیں جو بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں۔"

"بدنصیبی تو سزا ہے بداعمالی کی۔ اپنا سب کچھ قربان کر دینے والے قائدِ ملت کو اسی قوم نے قربان کر دیا۔ جیسے مخلص آدمی کو قائدِ ملت کا خطاب دے کر سیاسی موت۔ اس کے بعد آ گئے تم جیسے قائدِ ذلت اور بابائے ذلالت سب۔ اور کوئی بھی ان کا راستہ نہ روک سکا" دلاور نے بات کاٹ دی "پھر تم کیوں اپنا وقت اور اپنی توانائی ضائع کرتے ہو؟"

"میں اپنا کام کرتا رہوں گا دلاور۔ برائی کے خلاف جہاد فرض ہے۔ کامیابی اور ناکامی خدا کے ہاتھوں میں ہے۔ ہتھکنڈوں سے خوف زدہ کر کے مجھے اپنا راستہ بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔"

"یار سکندر۔ دیکھو ذرا سوچو۔ عقل سے کام لو" وہ سمجھانے لگا "میں نے ایک موقع دیا ہے تمہیں۔ آخری موقع۔"

"تم بہادر بنے پھرتے ہو دلاور۔ اصل بات یہ ہے کہ تم نہیں سکتے۔ تم ڈرتے ہو۔"

وہ بدمعاشوں کی طرح ہنسا "کس سے ڈرتا ہوں! تم؟ تمہاری چنڈال چوکڑی سے؟ یار مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا تھا۔ قتل کرنا تو دور کی بات ہے۔ تمہیں پولیس کے حوالے کرنا یا پاگل خانے میں جمع کروا دینا تو بہت آسان تھا۔ کون تم کو بچانے والا۔۔۔ ہیں جی!"

"وہی خدا! جس نے آج تک بچایا ہے" میں نے کہا۔ "تم سے ایسے احمقانہ ڈرامے کی امید نہیں رکھتا تھا۔"

"ابھی اپنے سکندر صاحب۔ یہ تو بس ایک کھیل تھا۔ خیال تھا کہ تم سیانے بندے ہو۔ ہیں جی۔۔ اشارہ سمجھو گے۔ ایسے ڈرامے چلتے نہیں ہیں۔ تم نے بھی تو بڑے منصوبے بنائے تھے۔ لیکن تم لندن جاؤ چھ مہینے کے لیے یا سکو چھ سال کے لیے لوٹ کر تو آؤ گے نا۔ تم سے فلک تمہارا سکندر بخت۔ دلاور کے دشمن پھر بھی رہ گئے ہیں جی! اور جب آؤ گے تو ہم بھی تمہیں ایسے پہچان لیں گے جیسے تم نے وردی میں ہمیں شناخت کر لیا تھا۔ بڑی ہنسی آتی تھی تمہاری باتیں سن کے۔ جو تم اور تمہارے سب حمایتی کرتے تھے۔"

"تم سب سنتے تھے؟"

وہ پُرمسرت لہجے میں بولا "کیوں جی۔ کان تو دیواروں کے ہوتے ہیں۔ ہم کیسے نہ سنتے۔ اپنے کانوں میں روئی ڈال جائے کہ بڑی بات ہے۔"

میں سمجھ گیا۔ ان دیواروں میں خفیہ مائیکروفون نصب تھے۔

"اب سمجھے ہو!" وہ حیرانی سے بولا "کمال ہے! سکندر اعظم صاحب۔ بڑی دیر سے سمجھے۔ ہمارا تو خیال تھا اللہ نے تمہارے ساتھ ایک سے ایک ہوشیار بندہ

جاسوس اور سراغ رساں ہیں جی۔ ایسے چٹکی بجانے میں

میں نے ہنس کے کہا "چودھری دلاور۔ یہ سب جھوٹ ہے اور کوئی حیثیت نہیں تمہارے دعوے کی۔"

عقل کو آ رہی گیا۔ گاڑی کا وہ کھولو کیا کہتے ہیں گلوز کمپارٹمنٹ۔ اس میں ٹیپ پڑے ہیں۔ ابھی نہیں گھر جا کے سن لینا۔ وہی باتیں ہیں جو تم کرتے تھے۔"

میں نے بے اختیار گلوز کمپارٹمنٹ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ مجھے نہیں دیکھ رہا تھا مگر اسے اندازہ تھا کہ میرا فطری ردِعمل یہی ہوگا۔ اس کی بات سن کے میرا ہاتھ رک گیا تھا لیکن میں نے کہا "اب سمجھ میں آیا کہ رابعہ کو وہ کوٹھی تم نے کیوں دی تھی۔"

وہ ہنسا "چلو اچھا ہوا! سمجھ آ گئی۔ ہیں جی! چودھری دلاور کوئی پاگل نہیں ہے کہ لاکھوں خرچ کر کے کوٹھی بنائے مگر کسی اور کی۔ ادھر سے غیرے کی زمین تو پکڑ سکتا ہے۔ دشمن اور تمہاری رابعہ جیسی توپ وکیل۔ توبہ توبہ! یہ تو زہر کھا کے والی بات ہوئی۔ ایسے اناڑی شکاری بھی نہیں ہیں جی ہم کہ ایک تیر سے بس دو شکار کریں۔ یہ تو سب ہی کر لیتے ہیں۔ ہم نے کیے تین شکار۔ ایک تو چاندنی بیگم کو اور اس کے بے سُرا تھی جیسے یار کو خوش کر دیا۔ کام کے بدلے چودھری دلاور کو بلیک میل نہ کرتے تو جب تک جیتے خوش تھے۔"

"ابھی جہنم میں بڑے خوش ہوں گے۔ وہاں میں رہتے ہوں گے۔"

"ہم تو جس دنیا میں ہیں اسی کی بات کرتے ہیں۔ آگے کی جانے" دلاور بولا "کوٹھی میں جی ہم نے بہت کچھ لگایا تھا۔ عیاشی کے لیے خرچ زیادہ ہوا تھا مگر کچھ کام کی چیزیں بھی گئی۔ آہستہ آہستہ پتا چلے گا تمہیں کہ یہ سودا ہمیں مہنگا پڑا اپنے سکندر صاحب۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ تمہارے پروگرام کا پتا چل گیا۔ ہیں جی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ تم اور تمہارے سوا صحافی اور وکیل۔ سب مل کے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ تیسرا فائدہ یہ ہو گیا کہ ہم نے کوٹھی کو کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔ محبوبہ یا داشتہ ہونے والی" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

میں نے مشتعل ہوئے بغیر کہا "تم ہمیشہ کی طرح اپنی گھٹیا ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ اور کچھ نہیں۔"

کوٹھی کے اس کے سوا اپنے سکندر صاحب گھر یا دلا ہمارے اصول اور قانون بھول گئی وہ بھی۔ مفت میں۔ چوہا ایسے ہی چوہے دان میں پھنستا ہے۔"

"تم کوئی نئی دھمکی دے رہے ہو؟"

"ہاں۔ کھلی دھمکی ہے یہ" دلاور نے ایک دم لہجہ بدل لیا "جس بلی نے حج پر جانے سے پہلے نو سو چوہے کھائے ہوں۔ وہ نو چوہے اور بھی کھا سکتی ہے۔ اب یا تو تم شرافت سے باز آ جاؤ۔ میرے ساتھ پنگا لینا چھوڑ دو اور مجھ سے سودا کر لو۔ اگر تم میرے راستے میں آؤ گے تو یہ سمجھ لو کہ میں وہی پرانا چودھری دلاور ہوں۔ جیسے میں نے تمہارے باپ کی قبر کا نشان تک مٹا دیا تھا۔ ایسے ہی تمہاری قبر کا سراغ بھی نہیں ملے گا کسی کو۔ ایسی جگہ لے جا کے ماروں گا۔"

"لیکن میں ایسے نہیں کروں گا" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا "ہم تمہیں چوک میں پھانسی دیں گے۔"

"اپنی لیلیٰ کو بھی سمجھا دینا۔۔ کہ جو ایک بار ہو چکا ہے وہ پھر ہو سکتا ہے۔ کوٹھی کی جگہ ملبہ اور کھنڈر باقی رہ جائے گا۔ پہلے ماں گئی تھی اب بیٹی کی باری ہے۔ ایک عورت ہی ہے نا وہ۔ اس خوش فہمی میں نہ رہے کہ میں اس کی قانونی طاقت سے ڈر جاؤں گا۔ اسے شاہی محلے کے کوٹھے پر نہ بٹھا دیا تو۔۔۔ تو کتا دلاور اپنے باپ کا نہیں کسی گنجے کا تخم تھا۔"

"یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے سب جانتے ہیں۔"

"بہت شوخی ہو گئی اپنے سکندر صاحب" وہ دہاڑ کے بولا "اسی شہر میں رابعہ اگر کوٹھے سے قدم پیچھے رکھ دے تو مجھے بتانا۔ اپنے سارے وکیلوں کو اور سارے ایم آر ایس کے مجاہدوں کو لے جانا ساتھ۔"

"غالب اور نازو کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایئے" میں نے ہنس کے کہا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا تمہیں۔ انہیں تم سے پہلے معلوم ہو چکا ہے۔ تم گھر پہنچنے والے ہو۔ میں اب واپس جا رہا ہوں۔ ضرورت محسوس ہو تو رابطے کا یہی ذریعہ استعمال کر لینا۔" دلاور کی آواز بند ہو گئی۔

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ میرے تعاقب میں کوئی کار نہیں تھی یا تھی تو آخری موڑ پر ہی رک چکی تھی۔ اس سے پہلے میں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ میرے پیچھے آنے والی گاڑیوں میں سے کون سی مسلسل ساتھ چلتی رہی ہے۔ سڑک پر ٹریفک معمول کے مطابق رواں تھا اور میرے ذہن میں یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ کوئی میرا پیچھا بھی کر سکتا ہے حالانکہ موجودہ حالات میں مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ جو لوگ اب تک کھلونے کی طرح مجھ سے کھیل رہے تھے اور میری زندگی کے ہر لمحے کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں رکھتے ہوئے میری بے اختیاری کا تماشا کر رہے تھے وہ اچانک پیچھے کیسے ہٹ سکتے ہیں۔

اصل بات یہ تھی کہ میں نے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ سوچنے سے ذہنی انتشار کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو رہا تھا چنانچہ میں سوچ کے

www.paksociety.com

سب در دریچے بند کر کے سلامتی اور عافیت کی جانب بھاگ رہا تھا۔ جب میں نے گاڑی کو وقار یوسف کی کوٹھی کے کھلے گیٹ میں موڑا تو میرے ذہن میں دلاور کی دھمکی کے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔ "نہیں تو تم سے پہلے معلوم ہو گیا ہے۔ ابھی معلوم ہو جائے گا تمہیں بھی۔"

میں گاڑی بند کر کے اُترا ہی تھا کہ ایک کھڑکی کا پردہ ہٹا کے وقار یوسف کی بیوی نے باہر جھانکا۔ ایک لمحے میں اس کی صورت پر خوف، بے یقینی اور مسرت کے جذبات کا ہر رنگ نظر آیا۔ اس نے چیخ مار کے نازو کو آواز دی۔

"نازو۔۔۔ نازو۔۔۔ سکندر بھائی۔" پھر اس کا چہرہ غائب ہو گیا۔

نازو رسہ تڑا کے فرار ہونے والی گائے کی طرح دوڑتی ہوئی دروازے سے نکلی۔ وقار یوسف کی بیوی اس کے پیچھے تھی۔ ایک ساتھ ان دونوں نے مجھے دونوں طرف سے پکڑ لیا۔

"ارے بھئی۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ایسے کیوں گرفتار کیا جا رہا ہے مجھے۔ میں گھر آ رہا ہوں گھر سے بھاگ کے نہیں جا رہا ہوں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"اندر چلو پھر بتاتے ہیں تمہیں" نازو نے چراغ پا ہو کے مجھے دھکیلا "بھاگنے والے لوٹ کے گھر آتے ہیں تو جوتے پڑتے ہیں ان کو۔"

میں ہنستا ہوا اندر گیا اور صوفے پر بیٹھ گیا "آخر ہوا کیا ہے۔۔۔؟"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی" وقار یوسف کی بیوی نے بھی خفگی کا مظاہرہ کیا "ہم سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا ہوا ہے۔ کہاں تھے آپ، ایسے بتائے بغیر چلے گئے اچانک۔ کسی پروگرام کے بغیر۔"

"یعنی اب یہ نوبت آ گئی ہے۔ کہ ہم بھی اعتبار کے قابل نہیں رہے" نازو روہانسی ہو گئی "میری تو خیر اوقات کیا لیکن غالب یا رابعہ کو بھی اپنا نہیں سمجھا تم نے کہ ان سے ہی ذکر کر دیتے۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے سکندر۔"

"یہاں میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے کہا "اور مزید ثبوت کے طور پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

نازو نے کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سب غلط فہمی کی بنا پر مجھ سے کتنے بدگمان ہیں "معروف و مصروف رہا کرتا۔ تم جو چاہتے ہو کرتے ہو۔ بعد میں وضاحت تک کے ہم کیا کریں۔ یہ تمہاری زندگی ہے۔ تم اس پر کسی کو اختیار دینا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔"

"جب عورت کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگے اور کسی صورت بند نہ ہو تو بزرگوں کا آزمودہ نسخہ ہے۔"

"لگا ایک جھانپڑ رسید کرو اور خاموش کر دو اسے۔ سوری سکندر، اپنا سمجھ کے تم جو چاہو کہو۔ ایک نہیں دو تھپڑ مار لو۔ لیکن ایسے تم ہاتھ اُٹھا کے رکھو۔ نازو تمہاری عزت ضرور کرتی ہے۔ تم سے اونچی نہیں ہے۔"

میں نے خود کو بے عزت محسوس کیا۔ وہ واقعی بچوں جیسی بات کر رہی تھی۔ میں نے سر جھکا کے جوتے اُتارے اور سر لیٹ کے چھت کو دیکھنے لگا۔ مجھے یہ سچ تھا کہ نازو نے محبت کا اظہار کیا تھا۔ نشوونما کا نہیں۔ بچے دیر سے گھر لوٹیں تو ماں ان سے زیادہ سخت سست کہتی ہے جو سب سے زیادہ منتظر ہو اور بعد میں گلے لگا کے پوچھتی بھی ہے کہ تو کہاں تھا میرے لال… روتی بھی ہے۔

میرے معذرت نے نازو کو تھوڑا سا پشیمان کیا۔ وقار کی بیوی اس سے پہلے میرے پاس بیٹھ گئی "آپ بولتے کیوں نہیں سکندر بھائی۔"

"کیا کہوں گا بول کے۔ جب سننے والا ہی کوئی نہیں… سب کی سنتی ہے۔ تمہارے بعد غالب کی پھر رابعہ کی… یوسف کی۔ سب پہلے سے ایک بات طے کر چکے… خراب ہو گیا ہے۔ میں کسی کو اپنا نہیں سمجھتا اور اپنی… نے ایک مفروضے کو حقیقت سمجھ لیا ہے کہ میں جہاں بھی… مرضی سے گیا تھا اور جاتے ہوئے میں نے سب کو آخری… رکھ کے نہیں بتایا تھا۔"

نازو نے شرمندگی سے کہا "یہ غلط ہے تو تم تردید کر سکتے…"

"کیا فائدہ تردید کرنے سے بھی۔ اگر ملزم کو پہلے… دے دیا جائے تو وہ اپنی صفائی میں کیا کہے۔ اور یہاں کے… ذہن تو پھر بھی اپیل کا حق محفوظ رہتا ہے۔ میں تم سب کے… خلاف اپیل لے کر کہاں جا سکتا ہوں۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"آئی ایم سوری سکندر۔ میں غصے میں زیادہ ہی بول گئی…" نے کہا "تمہیں سمجھنا چاہیے ہمارے جذبات کو۔ بات… بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ آخر کہاں تھے تم؟"

"میں کیا بتاؤں کہ کہاں تھا" میں نے سوچ کے کہا… "کچھ معلوم نہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ آج دن کیا ہے؟"

نازو نے اور وقار یوسف کی بیوی نے ایک دوسرے کو… سوالیہ نظروں سے دیکھا "دن۔ جمعرات ہے۔" "تمہیں نہیں معلوم…"

میں نے نفی میں سر ہلایا! "اور تاریخ۔۔۔؟"

"کیا تمہاری گھڑی خراب ہے؟" نازو نے مجھے غور… دیکھا۔

"گھڑی۔۔۔ کہاں ہے گھڑی۔" میں نے کلائی اُٹھائی…

"اوہ۔۔۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا۔"

"کیا معلوم نہیں تھا؟" نازو نے کہا۔

"یہی۔۔۔ کہ گھڑی ہے میری کلائی پر۔ ورنہ میں تم سے… تاریخ کیوں پوچھتا اور جب انہوں نے مجھ سے پوچھا… کے انہیں بتاتا۔" میں نے جیسے خود سے باتیں کر… "معاملہ اتنا خراب نہ ہوتا۔ جتنا بعد میں ہوا۔ سب… پاگل سمجھ رہے تھے۔"

نازو نے کہا "تمہیں آرام کی ضرورت ہے لیکن پہلے نہا کے فریش ہو جاؤ۔"

"آپ نے ناشتا کیا ہے؟" وقار یوسف کی بیوی نے پوچھا "نہیں کیا ہوگا۔ میں بھی پاگل ہوں کہ ایسی بات پوچھ رہی ہوں۔ تب تک آپ تیار ہوں گے میں کافی بناتی ہوں آپ کے لیے اور سینڈوچ۔ کہاں گئے تھے سکندر بھائی۔ مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔"

"مجھے لگتا ہے کہ اب تم رونے لگو گی۔ بے وقوف میں بالکل ٹھیک ہوں" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "کہاں ہے تمہارا میاں اور بچے کہاں گیا ہے؟ سب نکلے ہوئے ہوں گے مجھے تلاش کرنے ہسپتالوں، مُردہ خانوں اور قبرستانوں میں۔۔۔"

وقار یوسف کی بیوی ایک دم رو پڑی "مت کریں ایسی منحوس باتیں۔ پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی ہے ہمیں۔ کیا ہو گیا ہے آخر دنیا کو۔"

میں نے کہا "نہ دنیا کو کچھ ہوا ہے نہ ہمیں۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ دکھ اور مسائل۔ تنگی اور پریشانی میں ہی نرمی کی آزمائش ہوتی ہے۔ تم ابھی سے گھبرا گئی ہو۔ حوصلہ رکھو، خدا سب ٹھیک کرے گا۔"

یہ تسلی کی رسمی باتیں تھیں۔ ہمارے اس گھر میں قدم رکھنے سے پہلے وقار یوسف اور اس کی بیوی ایک پُرسکون، محفوظ اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ ہم ایسے بد قدم تھے کہ اپنے ساتھ آلام و مصائب کا ایک سلسلہ ساتھ رکھتے تھے۔ نقوی صاحب پہلے اپنی سرکشی سے صرف اس لیے خفا تھے کہ اس نے اپنی مرضی سے زندگی کے شریک سفر کا انتخاب کر لیا تھا اور یہ کوئی غلط فیصلہ نہیں تھا جس کا نقوی صاحب کو بھی بالآخر احساس ہونے لگا تھا مگر اب تو وہ ہمیشہ کے لیے اس سے روٹھ کے چلے گئے تھے کسی حد تک ان افسوس ناک حالات کا ذمے دار خود میں تھا جو ان کی موت کا سبب بنا۔ اب یہ کہنا تو آسان تھا کہ موت کا ایک دن معین ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کس کے لیے موت کا بہانہ کیا ہوگا مگر میرے لیے اپنا احساس جرم اور پشیمانی سے چھٹکارا پانا مشکل کام تھا۔

دن اور تاریخ کا علم ہوتے ہی مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ دو چار دن کی نہیں صرف بیس گھنٹے کی واردات تھی۔ مجھے گزشتہ روز چار بجے اغوا کیا گیا تھا اور میں درمیانی شب اس جعلی حوالات میں گزار کے دوپہر بارہ بجے لوٹ آیا تھا۔ دلاور وڑائچ ایسا ہی تھا۔ وہ کوئی بات براہ راست نہیں کہتا تھا اور سیدھے سادے مسئلے کو جان بوجھ کے پیچیدہ طریقے سے حل کرنا اس کی عادت تھی۔ اس طرح وہ پُراسرار بنتا تھا۔ اپنی دہشت پھیلاتا تھا یا خود کو بہت چالاک اور عیار ثابت کرتا تھا لیکن یہ حقیقت تسلیم کیے بنا چارہ نہ تھا کہ اس کے شکاری ذہن نے ہمارے لیے مسائل کے جال بچھا دیے تھے۔ اس کی منفی ذہانت اور ہماری مثبت سوچ میں طاقت کا توازن وقتی طور پر کبھی ایک طرف ہو جاتا تھا تو کبھی دوسری طرف۔ کبھی دفاعی اور کبھی جارحانہ حکمت عملی اختیار کرنے کے باوجود ابھی تک نہ کسی کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تھی اور نہ کسی نے اپنی شکست تسلیم کی تھی۔ چنانچہ صورت حال کسی حد تک جوں کی توں تھی لیکن آج کل دلاور کا پلڑا کچھ بھاری تھا۔

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اہم اراکین ایک مقصد پر متحد تھے اور اس کی تمام قوت کا ارتکاز اسی مقصد کے حصول پر تھا۔ جب یہ مقصد نہ رہا تو وہ شیرازہ بندی نہ رہی اور اپنی اپنی زندگی کے مسائل زیادہ اہمیت اختیار کر گئے جن کا تعلق مستقبل سے تھا۔ غالب کو پھر صحافت کے روز و شب کی کشش بلانے لگی اور فطری طور پر اس نے نائلہ کی صلاحیت کا رخ بھی اسی پیشے کی طرف کر دیا جس میں دلچسپی کے ساتھ ایڈونچر بھی تھا۔ جدوجہد بھی تھی اور چیلنج کی سنسنی خیزی بھی۔ غالب اپنی شریک سفر کے ساتھ رفاقت کو گھر کی چار دیواری تک محدود رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ زندگی کے ہر لمحے میں وہ ایک دوسرے کے جذبات ہی نہیں تجربات کے بھی شریک ہوں اور اس فارمولے پر مکمل اتفاق رائے سے وہ اپنی منزل کی جانب بلا مبالغہ قدم اُٹھا چکے تھے۔

اسی طرح محسن اپنی ازدواجی زندگی کے پہلے دور پر احساس جرم کا شکار تھا۔ اسے شدت سے یہ احساس تھا کہ یکے بعد دیگرے اس نے دو غلطیاں کی تھیں۔ اس نے رفتہ کے تقاضوں کو سمجھے بغیر عجلت میں یا جذبات کی رو میں بہہ کر ہم سب سے پہلے شادی کر لی تھی اور دوسری غلطی یہ کی تھی کہ زیادہ بڑی خرابی کا انتخاب کر لیا تھا۔ اگر وہ ہم سے معذرت کر لیتا کہ میں بیوی بچوں کو چھوڑ کے تم سب کے ساتھ نہیں جا سکتا تو شاید ہمارے جذبات کو ٹھیس پہنچتی اور ہم کچھ مایوسی کا اظہار کرتے مگر اس کے انکار سے ہمارے عزائم متزلزل نہیں ہوتے اور ہماری جدوجہد یا ہمارے جذبے میں کمی نہ آتی لیکن اس نے بیوی بچوں کو چھوڑا تھا اور اس کی عدم موجودگی کا دراصل اس کی واپسی کے انتظار کا اور امید کا طویل عذاب جھیلنے والے بیوی بچے بالآخر اپنی مجبوری، محرومی اور صبر کے ساتھ محسن کے فیصلے پر قربان ہو گئے تھے۔ محسن کو ایک جہنم سے گزر کے گل کی محبت کسی گمشدہ جنت کی طرح پھر مل گئی تھی۔ وہ اتنا ڈر گیا تھا کہ دوسری بار اس نے سابقہ گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کو ترجیح دی اور باقی زندگی صرف محبت کی بارگاہ میں نذر کر دی اور گل کا ہاتھ تھام کے سکون، راحت اور مسرت کی تلاش میں نکل گیا۔ اکرام شیخ اور کاجل پہلے ہی کراچی میں سکھ چین کی زندگی گزار رہے تھے اب رابعہ بھی چاہتی تھی کہ میں ہر قیمت پر دلاور سے مفاہمت کر لوں۔ اس نے اپنی پریکٹس پھر شروع کر دی تھی اور اسے بھی اپنی گم گشتہ جنت پھر مل گئی تھی۔ اس کی تکمیل عہد رفاقت کے خواب کے بغیر

ممکن نہ تھی چنانچہ اس کا اصرار بھی بے جا نہ تھا۔

غسل سے فارغ ہوتے ہوتے میں نے مجموعی صورت حال کو سمجھ لیا تھا۔ اب مسئلہ صرف میرا تھا اور میں ایک دائرے میں گھوم کے نقطہ آغاز پر پہنچا تھا تو پھر بالکل اکیلا تھا۔ مجھے دلاور کے ساتھ اپنا حساب خود چکانا تھا اس سے خود انتقام لینا تھا اور اس معاملے میں کسی اور کے وہ جذبات نہیں ہو سکتے تھے جو میرے تھے۔ ظلم میرے والد پر ہوا تھا جو اکیلے اور بے بس تھے۔ رزق حلال کے فلسفے پر ایمان رکھتے ہوئے انہوں نے جو کچھ اپنی محنت اور صلاحیت کے بل پر جمع کیا تھا وہ انہی زور آور لٹیروں نے چھین لیا تھا جن کے دامن پر وزیر خان کے لہو کے داغ بھی تھے۔ وہ آج بھی آزاد تھے اور قانون کا خوف انہیں اتنا بھی نہیں تھا جتنا مالک کو اپنے پالتو کتے کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے انہیں کیفر کردار تک پہنچانا صرف میرا مسئلہ تھا اور یہ میرے لیے ایسا مسئلہ نہیں تھا جسے میں وقت گزشتہ کہہ کے نظرانداز کر سکوں۔ بات اپنی اپنی فطرت اور مزاج کی ہے۔ جو انسانیت سوز سلوک میرے والد وزیر خان کے ساتھ ہوا تھا اس نے میرے وجود میں دکھ کے زخم بھر دیے تھے اور میرے احساس میں اذیت کا زہر کسی سیال کی طرح شامل ہو گیا تھا۔ اس کی شدت اور حدت میں وقت گزرنے کے ساتھ کمی نہیں آئی تھی۔ نفرت اور اشتعال کا جو آتش فشاں ان کی مظلومیت کی موت اور ان کے المناک انجام کی خبر پاکے بھڑک اٹھا تھا وہ آج بھی اسی طرح روشن تھا۔ شاید کسی کی مجبوری تھی یا بے بسی تھی۔ اگر میں انتقام کے خیال سے تائب ہو سکتا یا عفو و درگزر کی اہمیت کو دل سے تسلیم کر سکتا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں ان کی مغفرت کی دعا کرتا اور صبر کرتا کہ ظالموں کے لیے بہرحال ایک میزان عدل اور ایک یوم حشر ہے لیکن میں دلاور اور پیڑو جیسے لوگوں کے سامنے قانون کی بے بسی اور سب کچھ جان کے انجان بن جانے والوں کی بے حسی دیکھتا تھا تو میری رگوں میں اُبلنے والا لہو پکارتا تھا کہ سکندر تم پر وزیر خان کا انتقام فرض ہے اور ظالموں سے اپنا حق چھیننا تم پر فرض ہے۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ یہ میرا کام ہے اور میں ہی کروں گا۔

لنچ کے وقت ناشتا کرتے ہوئے وقار یوسف کی بیوی نے اور نازو نے بہت چاہا کہ میں انہیں کچھ بتاؤں مگر میں نے ٹال دیا "پہلی بات تو یہ کہ تم مانو گی نہیں کیونکہ تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی نہ مانتا۔"

"ایسی بھی کیا بات ہے؟"

"یہ کچھ ایسی ہی بات ہے جو چپ ہوں" میں نے کہا "غالب کو اور باقی سب لوگوں کو آنے دو۔ ایک ہی بار پریس کانفرنس میں سارے حقائق بیان کروں گا۔ اس وقت جسے جو سوال کرنا ہو کرے۔ ابھی تو سونا چاہتا ہوں۔"

"رابعہ باجی تو پہنچ رہی ہیں" وقار یوسف کی بیوی نے کہا۔

"تمہارے پاس سکون آور گولیاں ضرور ہوں گی" میں نے کہا۔

"میں لاتی ہوں" وہ اٹھ کے اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔

میں نے نازو سے کہا "وقار یوسف کی گاڑی کے گلوو کمپارٹمنٹ میں شاید کچھ کیسٹ ہوں گے۔"

"کیسٹ!"

"ہاں۔ میں نے دیکھے نہیں۔ تم نکال لینا اور وقت ملے تو سن بھی لینا۔ سب کے ساتھ" میں نے کہا۔

نازو نے سر ہلایا "تم کچھ پُراسرار بننے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"میں بے حد پُراسرار ہوں خاتون اور میری طلسم ہوشربا کی کہانی سن کے تو تمہارے بھی ہوش اڑ جائیں گے۔ تم نے مرزا جی کے بارے میں کیوں خاموشی اختیار کی ہوئی ہے آخر۔ نصیب دشمناں وہ سدھار گئے تمہیں چھوڑ کے کسی اور کے ساتھ ..."

نازو نے میری بات کاٹ دی "اسے ابھی تک کوئی ڈاکٹر شبلی نہیں ملی.... فیصل آباد گیا ہے۔"

میں نے شرمندگی کے احساس میں دکھ کی ٹیس محسوس کی "بہت مدد ان شکن ملتا رہا ہے تم سے تو نہیں۔ ہم لاجواب ہو گئے۔ کیا اس کا خیال تھا کہ ہم فیصل آباد کے کھنڈا گھر دیکھیں گے؟"

"اسے محسن نے بلایا تھا" نازو بولی۔

"کیوں؟" میرے کانوں میں دلاور کی آخری بات پھر سنائی دینے لگی۔

"اس نے کچھ بتایا نہیں تھا۔ بڑی عجلت میں نکل گیا۔ فون رکھا اور روانہ ہو گیا۔ کہہ رہا تھا کہ محسن کا کوئی مسئلہ ہے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"آج صبح کی۔ سات بجے فون آیا تھا۔ سوا سات بجے غالب روانہ ہو گیا۔"

"تم نے محسن کو فون کر لیا ہوتا۔"

"کیا تھا۔ اس کے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ گھنٹی مسلسل بج رہی ہے۔ ریسیور کوئی نہیں اٹھاتا۔"

"محسن تو فوزیہ کے گھر میں تھا۔"

"ہاں۔ اب معلوم نہیں کیا بات ہے۔ فون کٹ جانے پر بھی ایسا ہی ہوتا ہے" نازو نے کہا۔

میں سکون آور گولیاں کھا کے اندر والے کمرے میں جا لیٹا اور بہت دیر تک غالب کے اچانک فیصل آباد جانے کے اسباب پر غور کرتا رہا۔ بات یقیناً ایسی تھی کہ چھپایا جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ واقعی کوئی بات ہو چکی ہے جس کا علم غالب کو ہے اور محسن کو بھی ہے۔ دلاور نے کہا تھا۔ تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا۔ کہیں محسن تو مشکل میں نہیں پڑ گیا۔ قتل کا سب سے بڑا دشمن اس کا ماضی تھا۔ وہ کہیں بھی گرفتاری کے خطرے سے محفوظ نہ تھی۔ پولیس کے پاس ناگ منی کا پورا ریکارڈ تھا۔ خدانخواستہ کسی کینہ پرور دشمن نے

نل پلازہ کے پیچھے میں ناگ منی کو دیکھ کر کوئی پرانا بدلہ تو نہیں چکایا؟ وہ ڈاکو فقط ناگ کی بہن تھی اور ڈاکو کا دوست کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بھی بھائی کے ساتھ مل کے ڈاکے ڈالتی تھی۔ اس گروہ کے خلاف گروہ بھی ہوں گے۔

گولیوں نے بالآخر اثر دکھایا اور میری آنکھ کھلی تو رات ہو رہی تھی۔ وقار یوسف کے ساتھ رابعہ بھی آ چکی تھی۔ وہ سب ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ وہی کیسٹ سن رہے تھے جن میں ہم سب کی آوازیں صاف پہچانی جا سکتی تھیں۔ کس نے کیا کہا تھا اور کب؟ اس کا ایک ایک لفظ ریکارڈ ہو گیا تھا۔ اس خانے کی دیواروں میں پوشیدہ ایف ایم مائیکروفون یقیناً بہت حساس اور طاقتور تھے کہ ہماری گفتگو سنتے رہے اور نشر کرتے رہے۔ عام قسم کے مائیکروفون سو میٹر کے دائرے میں ہی کام کرتے ہیں لیکن مصنوعی آلات کا دائرہ میلوں تک بھی ہو سکتا ہے۔ رازداری کے سارے انتظامات دھرے رہ گئے تھے اور دشمنوں نے ہمارے ارادوں اور منصوبوں کی سب تفصیلات جاری کر دی تھیں۔ معلوم نہیں دلاور نے یہ راز افشا کرنے میں کیا مصلحت دیکھی۔ اگر وہ چاہتا تو اسی طرح ہمارے تمام معاملات سے باخبر رہتا اور ہمارے سارے منصوبوں کو خاک میں ملاتا رہتا۔

غالب نے ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا۔ "یہ سب وہی باتیں ہیں جو ہم نے کی تھیں۔"

وقار یوسف نے اس کی تائید میں سر ہلایا "دوبارہ سننے کا فائدہ کچھ نہیں۔"

رابعہ اور وقار کی بیوی زیادہ متفکر نظر آ رہی تھیں۔ شاید نازو نے انہیں پہلے ہی میرے ردعمل سے آگاہ کر دیا تھا کہ اس وقت سب نے خاموشی اختیار کیا ورنہ غالب ضرور ہاتھ دھو کے میرے پیچھے پڑ جاتا۔ رابعہ کی نظر بار بار اٹھتی تھی اور میرے چہرے کا طواف کر کے لوٹ جاتی تھی۔ اس کے دل کی اضطرابی کیفیت اس کی آنکھوں سے عیاں تھی مگر وہ سب کے ساتھ نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں غالب کے ساتھ بیٹھ گیا "تم کب آئے؟ محسن کا کیا مسئلہ تھا؟"

"کوئی خاص نہیں" غالب نے ٹالنے کے انداز میں کہا "میں ابھی تو آدھا گھنٹا پہلے ہی واپس پہنچا تھا۔"

میں نے کہا "مجھے تم سب کے رویے میں اجنبیت سی محسوس ہوئی ہے۔ مجھ سے کچھ پوچھو۔ میری اچھی طرح خبر لو۔ جیسے نازو نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔"

"تم خود پریشان ہو جاؤ گے" غالب نے کہا "اجنبیت کے اس احساس کا ذمے دار کون ہے۔ ہمارے درمیان عدم اعتماد کی یہ فضا کیسے پیدا ہو گئی؟ یہ سب اچانک تو نہیں ہوا۔ تم نے پہلے ہمیں نظرانداز کیا۔ ڈاکٹر شبلی کے معاملے میں غلط فہمی کو ہوا دینے کے شق

ردعمل کا اظہار کیا اور اب اپنی پُراسرار خاموشی اور رازداری کے ساتھ اغوا ہونے کے لیے غائب ہو گئے۔ کسی کو ہوا تک نہیں لگنے دی اس بات کی کہ تم کیا سوچ رہے ہو اور کیا کرنے والے ہو۔"

میں نے مسکرا کے کہا "رابعہ۔ تم بھی بولو کیا تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ میں اتنا بدل گیا ہوں؟"

"یہ سوال تم اپنے آپ سے کرو گے تو جواب مل جائے گا۔"

"نہیں۔ تم بتاؤ کیا ایسا ممکن ہے کہ میں تم سے کوئی بات چھپاؤں۔ تمہیں یا غالب کو پتا نہ چلنے دوں کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ ایسا ہو سکتا ہے؟"

"ایسا ہو چکا ہے" نازو نے کہا۔

"غلط۔ تم نتائج سے اسباب کا تعین کر رہے ہو۔ یہ محض اندازے کی بات نہیں۔ تم سب کو یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ یعنی جو کچھ میں نے کیا اس کا واحد سبب یہ تھا کہ میں کسی کو بھی کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ آخری لمحے تک میرا خیال تھا فوزی صاحب کے سوئم میں شرکت کا مگر پھر ایک لمحے میں میرا دماغ الٹ گیا اور میں نازو کو چھوڑ کے ملک پرستان یا صحرائے گوبی کی طرف چل پڑا؟ سو فیصد اپنی مرضی سے اور خوشی سے؟ میرے بے وقوف دوستو! صرف ایسی صورت میں ہو سکتا تھا جب اچانک میرا دماغ چل جائے۔ پاگل پن کے آثار پہلے نہیں تھے پھر کیا دورہ پڑا تھا مجھ پر؟ اور دورے کا اثر ختم ہوا تو میں لوٹ آیا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ شبلی کی موت کا صدمہ تھا جسے میں نے بظاہر برداشت کر لیا تھا مگر صدمہ اتنا شدید تھا کہ میرے اعصاب کی کشیدگی انتہا تک پہنچی تو میرا فیوز بریک ڈاؤن ہو گیا اور جس آدمی پر ایک بار پاگل پن کا ایسا دورہ پڑے اس کا کیا بھروسا۔ کل کو پھر نکل جائے گا یا کپڑے پھاڑ کے۔"

رابعہ نے کہا "ایسی باتیں مت کرو۔ یہ کسی نے نہیں کہا۔"

"کہا نہیں مگر مجھے احساس دلایا کہ میں نے ناقابل معافی جرم کیا تھا۔ سب پر عدم اعتماد کا مظاہرہ صرف غلطی نہیں 'گناہ' ہے۔ جرم ہے لیکن میں جو کچھ اپنی صفائی میں کہنے والا ہوں۔ وہ اس سے بھی زیادہ ناقابل اعتبار ہے۔ میرے بیان کو ریکارڈ کر لو کسی ماہر نفسیات کی موجودگی میں۔ یا ذہنی امراض کے ڈاکٹر کے سامنے۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ اس کا فیصلہ کیا ہو گا۔ وہ مجھے پاگل قرار دے گا۔ کہے گا کہ میں وہم کو سچ خواب کو حقیقت اور غیر موجود کو موجود تسلیم کرنے لگا ہوں۔ میرے لاشعور کا خوف بے شمار تصورات (MELUCINATIONS) کو جنم دے رہا ہے۔"

وقار یوسف کی بیوی نے کہا "سکندر بھائی۔ چلیں آپ جانے دیں پہلے۔ کسی نے کچھ فرض نہیں کیا اور خدا نہ کرے کہ آپ کا ذہنی توازن خراب ہو۔"

غالب نے سوچ کے کہا "کیا تمہیں اغوا کیا گیا تھا؟"

"اغوا صرف عورتوں ہی کو نہیں کیا جاتا۔" میں نے چائے کی پیالی لے لی۔

"پہلے ہم بتائیں گے کہ تمہاری گمشدگی سے ہم پر کیا بنی۔ ہم کتنے پریشان ہوئے۔ ہم نے کیا سوچا اور کہاں کہاں تمہیں تلاش نہیں کیا۔ رابعہ اور نازو نے مل کے اس ایک رات میں کتنے لیٹر آنسو بہائے تھے اور کتنی دعائیں مانگی تھیں... اور ہم نے رات بھر میں کتنی جاسوسی کی تھی۔ کس کس سے پوچھا تھا" غالب بولا۔

میں نے کہا "چوہدری دلاور سے بھی پوچھا تھا؟"

"ہاں۔ مجبوری تھی۔"

"پھر اس نے کیا کہا؟"

"پہلے تو اس سے بات نہیں ہو سکی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے مگر بالآخر ہم اس کا ایک فون نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جہاں اس سے براہ راست گفتگو ہوئی" وقار یوسف بولا۔

"ہم نے... تبھی میں نے کہا کہ دلاور دشمنی اور عداوت کے رشتے اپنی جگہ۔ نہ ہم اتنے بے وقوف ہیں کہ تم سے رعایت کی امید رکھیں اور نہ اتنے بزدل کہ رحم کی بھیک مانگیں۔ تم ہمیں جانتے ہو اور ہم تم سے واقف ہیں اس لیے امید ہے کہ تم جھوٹ نہیں بولو گے۔ وہ کہنے لگا "جھوٹ بولتا ہے بزدل اور ڈرنے والا" میں نے اسے تھوڑا سا بانس پر چڑھایا "اسی لیے پوچھ رہا ہوں تم سے۔ تم کم ظرف دشمن نہیں ہو۔ کیا سکندر کو تم نے اغوا کیا ہے؟" وہ ہنسنے لگا "غالب صاحب۔ یار ہم اتنے گھٹیا کام نہیں کرتے اور اغوا کرنا ہی ہو گا تو پھر نازو کو یا رابعہ کو کرائیں گے۔ جی ہی" میں نے اس کی بات پر غور کر کے پوچھا "اچھا تمہیں کچھ معلوم ہے کہ سکندر کہاں ہے؟" اس نے کہا "کمال کی باتیں کرتے ہو آپ بھی۔ یہ فون پر پوچھ رہے ہو مجھ سے؟ دوسری طرف ٹیپ کرتے جا رہے ہو ساری باتیں۔ میں کیا بتاؤں سکندر اعظم نمبر دو کے بارے میں۔ ویسے وہ بھی دنیا کو فتح کرنے نکلا تھا۔ اب کیا پتا پولیس اٹھا کے لے گئی ہو۔"

"یہ ٹھیک ہے" میں نے کہا۔

"کیا ٹھیک ہے؟" رابعہ چونکی "تم کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا؟"

"گرفتار تو نہیں کیا تھا۔"

"بس... تم خود پیش ہو گئے تھے گرفتاری دینے کے لیے" نازو نے کہا۔

"لیکن پولیس کو شرم آئی کہ یہ تو بڑی بے عزتی کی بات ہو گئی۔ مفرور مجرم خود آ گیا ہے تھانے... نہ اسے پولیس پکڑ سکی اور نہ پبلک۔ حالانکہ انعام کی رقم بھی کم نہ تھی۔ انہوں نے کہا ہو گا کہ چلو پھر بھاگ جاؤ۔ ہم خود پکڑ لیں گے تمہیں اور ثابت کر دیں گے کہ ہم نااہل نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "یہ بات دلاور کو معلوم تھی کہ میں پولیس کی تحویل میں ہوں۔"

وقار یوسف، رابعہ اور نازو نے ایک ساتھ کہا "کیا؟"

پھر غالب نے کہا "اس نے چھڑوا دیا تھا تمہیں؟"

"نہیں۔ میں تو دلاور کے ساتھ تھا۔"

غالب نے سر پکڑ لیا "ارے کمبخت۔ تم خود پاگل ہو چکے ہو تو ہمیں پاگل مت کرو۔"

میں نے انہیں ساری بات بتا دی جو ان کے لیے ناقابل یقین بھی تھی اور انتہائی پرتجسس اور حیرت انگیز بھی۔ انہوں نے بیچ بیچ میں سوال بھی بہت کیے لیکن میں نے سب کا جواب تحمل سے دیا۔ ہر کسی شہر طلسمات کے مسافر کو ناممکن محسوس ہونے والے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے اسی دشواری کا سامنا ہو گا۔ اسے ثابت کرنا پڑے گا کہ جو کچھ اس نے دیکھا وہ خواب، وہم و گمان کی بات نہیں تھی۔ وہ ہوش و حواس کے تجربات کا بیان کرتے ہوئے بھی ہوش و حواس میں ہے۔ اس کی بے سروپا داستان میں جو انہونی باتیں ہیں وہ محض فریب خیال یا نظر نہیں اور جو دوسروں کو بعید از قیاس لگتا ہے وہ بھی سچ ہے۔ راوی اگر عادی دروغ گو نہ ہو تو بالآخر لوگ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

میں نے عقل کی دلیل اور منطقی جواز کے ساتھ سب بتایا تو مگر میں دیکھ رہا تھا کہ بے یقینی اب بھی سننے والوں کے چہروں سے عیاں ہے۔ وہ ابھی تذبذب اور گومگو کی کیفیت میں تھے کہ پوچھیں تو کیا پوچھیں؟

سب سے پہلے غالب نے کہا "تمہیں معلوم ہے ظہور نے کیا دیکھا تھا؟"

"کیا دیکھا تھا؟ میرے سر پر ڈنڈا پڑتے ہوئے؟"

"نہیں۔ اس نے دیکھا تھا کہ تم گاڑی میں بیٹھ کے نکل گئے تھے۔"

"اور گاڑی میں کوئی نہیں تھا" نازو بولی۔

"ڈرائیور بھی نہیں تھا" میں نے کہا "پھر وہ گاڑی تنہا خود چل کے آئی تھی؟"

"ممکن ہے اسے بھوت سسر چلا رہا ہو" غالب نے کہا۔

رابعہ نے فوراً مداخلت کی "لیکن یہ کیسٹ تو واضح ثبوت ہے کہ سکندر جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔"

وقار یوسف نے کہا "ہاں جی۔ ان کو جھوٹا کس نے کہا ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے۔"

غالب نے بھی سر ہلایا "سکندر کو کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی مگر جو سوالات ہمارے ذہن میں ہیں۔"

میں نے کہا "تو پوچھو۔ پوچھتے کیوں نہیں؟"

غالب نے سوچ کے کہا "تم بتا سکتے ہو... وہ جگہ کون سی تھی جہاں تم کو قید میں رکھا گیا تھا... اور جہاں تمہیں چھوڑا گیا تھا؟"

میں نے کہا "سوری۔ نہ میں اس وقت ہوش میں تھا جب مجھے لے جایا گیا تھا اور پھر بے ہوشی کی حالت میں سڑک پر ڈال دیا گیا تھا۔"

"تم انہیں وہاں لے جا سکتے ہو نا!" نازو نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "اس کا فائدہ بھی کوئی نہیں۔"

"وہ جادو کے کپڑے کہاں ہیں؟" غالب نے سوال کیا۔

"یہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے جلدی میں انہیں جہاں اتارا وہیں چھوڑ دیا ورنہ ایک اور ثبوت ہوتا میرے پاس" میں نے بڑی ادا سے کہا "جو کچھ یاد ہے مجھے لیکن کپڑے اب وہاں نہیں ملیں گے تمہیں لے جانا اور دکھانا۔ اچھے خاصے قیمتی کپڑے تھے وہ بھی کسی نے چھوڑے ہوں گے۔"

رابعہ نے پھر میری مدد کی۔ اس نے بات کا رخ موڑ دیا "یہ سب سننے کے بعد مجھے تو خوف محسوس ہو رہا ہے اس گھر سے۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ وہ جگہ خطرناک ہے۔"

میں نے کہا "جہاں ایسے خفیہ مائیکرو فون نصب کیے جا سکتے ہیں وہاں سب کچھ نصب ہو سکتا ہے... دلاور کی دھمکی سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ محل کی جگہ کھنڈر باقی رہ جائے گا۔ پہلے ماں گئی تھی اب بیٹی کی باری ہے۔ کیا پتا اس نے تہ خانے کی دیواروں میں یا بنیادوں میں آتش گیر اور دھماکا خیز مادہ بھر دیا ہو۔ پتا نہیں کب سے فٹ کر رکھے ہوں۔ ایک چنگاری دکھانے یا ایک بٹن دبانے کی دیر ہے سب اڑ جائے گا۔"

وقار یوسف نے سر ہلایا "یہ تو اس نے ایک طرح سے صاف بتا دیا ہے کہ چوہا ایسے ہی چوہے دان میں پھنستا ہے اور مارا جاتا ہے۔"

وقار یوسف کی بیوی نے جھرجھری لی "میں تو کہتی ہوں کہ لعنت بھیجو اس محل پر۔ اس سے تو جھونپڑی اچھی جہاں آدمی چین کی نیند سو سکتا ہے۔"

وقار ہنسنے لگا "اچھا ڈائیلاگ ہے۔ جیسے تم نے کبھی جھونپڑی میں قدم رنجہ فرما کے اندر سے دیکھا ہے؟"

وہ بولی "جس گھر سے میں آئی تھی اس کے مقابلے میں جھونپڑی تھا تمہارا یہ گھر۔"

"چلو ایک سچ تو تسلیم کیا تم نے... کہ تمہاری نظر میں ہماری اوقات کیا تھی۔ ہم جھونپڑی میں رہنے والے تھے اور تم محلوں کی شہزادی۔ کبھی سوچا کہ جسے جھونپڑی کہتی ہے اس میں میرے مرحوم سسر کا بچپن گزرا تھا۔ جہاں وہ پیدا ہوئے تھے وہ جھونپڑی تھی... راستہ لگا۔"

وقار کی بیوی برا مان چکی تھی چنانچہ میں نے فوراً بات کا رخ جابر کی طرف کر دیا "تیرا یہ خاتون بھی مانیں گی اگر میں کہوں گا کہ اپنا اپنا نصیب ہے۔"

"میں نے کوئی لالچ نہیں کیا تھا" رابعہ بولی "وہ زمین میری تھی۔"

"لیکن جس شخص نے اس زمین پر تمہیں ایک محل کھڑا کر کے دیا تھا وہ تمہارا بھی جانی دشمن تھا۔ دشمن کی مہربانی بھی بے سبب تو نہیں ہوتی۔"

"اس نے جان بخش دی تھی اپنی۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہی تو اس کی چالاکی تھی۔ اس نے کہا کہ سوری وکیل صاحب۔ غلطی ہو گئی۔ معاف کریں اور یہ لیں اپنی کوٹھی۔ اسے میں نے ہی تباہ کیا تھا میں ہی بنا کے دے رہا ہوں۔ تم نے اس کی معافی بھی قبول کی اور کوٹھی کے بدلے کوٹھی کو حق سمجھ کے قبول کر لیا۔ جبکہ تم اس کی عیاری سے مار کھا گئیں۔ اس نے جان بوجھ کے یہ "غلطی" کی تھی۔ بعد میں جو کچھ ہوا وہ اس کی منصوبہ بندی اور مرضی کے مطابق ہوا۔"

رابعہ نے خفگی سے کہا "میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟"

میں نے دانت نکال کے کہا "وہی کرتا جو تم نے کیا۔"

"پھر میں نے کون سی غلطی کی۔"

"غلطی بھی محبت کی طرح کی نہیں جاتی۔ ہو جاتی ہے مس رابعہ۔ ظاہر ہے کوئی عقلمند بھی دلاور سے مطالبہ نہ کرتا کہ کوٹھی گرا دو اور اپنا ملبہ اٹھا کے لے جاؤ۔"

رابعہ مطمئن ہو گئی "میں نے تو اپنا بھی بہت کچھ لگا دیا ہے اس میں۔"

میں نے کہا "چاہو تو نکال لو۔"

"کیسے نکال لوں۔ جان کی بازی لگ گئی۔ نہ بابا مجھے تو ڈر لگتا ہے اب اس کے بارے میں سوچ کے بھی۔"

"آئیڈیا... غضب کا آئیڈیا۔ میرے عظیم دماغ کا کمال" غالب نے چٹکی بجا کے کہا "مس رابعہ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو میرے جیسے ذہین مشیر کی خدمات حاصل ہیں۔"

"آگے بھی کچھ بولو" رابعہ مسکرانے لگی۔

"دیکھیے۔ مالی معاملات میں مشورہ مفت نہیں دیا جاتا۔ آخر آپ بھی تو قانونی مشورے کی فیس لیتی ہیں" وہ ہاتھ مل کے بولا "آپ کو لاکھوں کا فائدہ ہو گا۔ مجھے کیا ملے گا؟"

"وہی جو تمہارے نصیب میں ہے" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "موقعے کی مناسبت سے اپنے عاشق علی زیب کا ایک شعر یاد آ گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہاتھی یا گھوڑے کے لیے دوڑتا ہی پھرے گا
قسمت میں جو گدھا ہے تو گدھا ہی ملے گا

"دولہا گھوڑے پر سوار ہو پھر بھی دولہا ہی ہوتا ہے" کیوں نازو؟" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ اب تو گدھے بھی سہرا باندھ کے آ جاتے ہیں" نازو بولی۔

غالب نے تو بجری "گدھے اور دولہا میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کے نصیب میں ساری عمر بوجھ اٹھانا ہوتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "اب تم ٹرنے لگو گے۔ وہ غضب کا آئیڈیا کہاں

www.paksociety.com

کیا؟"
"نہیں رابعہ قاری۔ آپ ہم کو غلط سمجھ رہی ہیں۔" غالب بولا۔
"تو کیا سمجھ رہی ہوں؟"
"میں نے قاری میں یہ تو نہیں کہا تھا کہ سکندر کو بیچ دو گے کاروں کے ہاتھ۔"
رابعہ سوچ میں پڑ گئی "کیسے بیچ رہی ہوں؟"
"کسی بھی خریدار کو سازو سامان سمیت۔ اپنے جذبات سمیت۔"
رابعہ نے کہا "بات جذبات کی نہیں۔ خطرات کی ہے۔"
وقار یوسف کی بیوی نے کہا "بہت فائدہ ہے اس میں رابعہ باجی۔"
میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ مالی فائدہ بہت ہوگا مگر جانتے بوجھتے کسی کو موت کے منہ میں دھکیلنا......."
غالب نے کہا "رکھو ہم اس کا اشتہار دیں گے۔ یہ اشتہار چوہدری رلادر کی نظر سے بھی گزرے گا اور وہ سمجھ جائے گا کہ ہم جان بچا کے بھاگ گئے۔ کسی ایسے شخص کو جس سے اس کا تعلق ہی نہ ہو۔ وہ کیوں مروائے گا۔ اگر وہاں کوئی ہلاکت خیزی کا سامان ہوگا۔ تو وہ رلادر کے کام نہیں آئے گا۔ اگر غباروں میں بڑا تماشا ہے تو رہے۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا "پہلی بات تو یہ کہ خریدار کو لاعلمی میں رکھتے ہوئے ہم اس کا سودا کریں گے تو یہ بہت غلط بات ہوگی۔ یہ بڑا جان لیوا دھوکا ہوگا۔ حادثات کے امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ خدانخواستہ کبھی گھر میں آگ لگ گئی۔ یا بعد میں کسی مالک نے سوچا کہ نقشے میں تبدیلی کی جائے یا اس محل کی جگہ سینما اور شاپنگ سینٹر بنا دیا جائے تو ظاہر ہے عمارت گرائی جائے گی۔ ایسا دس بیس سال میں بھی ہو سکتا ہے اور پچاس سال بعد اس گھر میں رہنے والی اگلی نسل کے ساتھ بھی۔ لاعلمی میں جتنے لوگ مارے جائیں گے سب کے خون کا الزام ہم پر آئے گا۔ اس دنیا میں نہ سہی۔ میدان حشر میں جواب دہ ہم ہوں گے۔"
غالب نے کہا "چلو ہم خریدار کو بتادیں گے۔"
نازو نے طنز سے کہا "اشتہار میں یہ بھی لکھ دینا کہ اجتماعی خودکشی کے خواہش مندوں کے لیے سنہری موقع۔ آپ کے بعد لواحقین بھی صبر جمیل کی ضرورت سے بے نیاز ہوں گے۔ وہ آپ کے ساتھ ہی کوچ کریں گے۔"
وقار یوسف نے کہا "اس کے علاوہ چوہدری رلادر یہ سودا نہیں ہونے دے گا۔ اسے معلوم ہوگا کہ کوئی دلچسپی لے رہا ہے تو وہ خود اسے مطلع کردے گا کہ اس سودے میں وہ مارا جائے گا۔"
نازو نے کہا "یہی تھا تمہارا عظیم آئیڈیا؟"
غالب کھسیانا ہو گیا "ایڈیسن جیسا عظیم موجد بھی جب ابتدا میں بیٹھا تھا تو اس کا ایسے ہی مذاق اُڑایا گیا تھا۔"

نازو بولی "عظیم آئیڈیا تمہارے دماغ سے بھی کبھی نہیں۔"
"کاش میں تمہیں اپنا دل چیر کے دکھا سکتا۔" غالب نے...
"اور تمہارا سر توڑ کے رکھ سکتا۔ تم کو میرے جذبات کا اور تمہاری عقل کا صحیح اندازہ ہو جاتا۔"
وقار یوسف کسی گہری سوچ میں تھا۔ "سوال یہ ہے خرم صاحب کہ اگر رلادر نے یہاں ایسا ہولناک انتقام کیا تو... تک...."
میں نے اس کی بات کاٹ دی "وقار۔ رلادر کی مرضی یہ نہیں تھی کہ ہم سب کو ختم کرادے۔ ایسے مواقع تو اسے بہت ملے جب وہ چاہتا تو باری باری سب کو قتل کروا دیتا لیکن وہ جانتا ہے کہ اس طرح مسائل میں اضافہ ہو جائے گا۔ وہ... ہے کیونکہ اس کا بھی ایک خاندان ہے۔ بیوی بچے ہیں... محفوظ ہیں۔ آپس میں ہم سب بھی ایک خاندان کے فرد ہیں۔ قوت کے اعتبار سے ہمارا جذباتی رشتہ شاید زیادہ مضبوط ہے۔ چوہدری رلادر نے کسی ایک کی جان لی تو باقی سب اس کی جان کے دشمن ہو جائیں گے۔ ہمارا خاندان نہ رہا تو اس کا بھی نہیں رہے گا۔"
"پھر یہ سب وہ کیوں کر رہا ہے؟" وقار یوسف نے کہا۔
"یہ بجھ پر دباؤ ڈالنے کے حربے ہیں۔" میں نے کہا "ہم... کے ساتھ اس کی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ ایم آر ایس کے... آنے سے پہلے وہ شاید تم میں سے کسی کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔"
"اس کی بات کیوں کرتے ہو۔ تم کب جانتے تھے انہیں۔"
"یہ بھی سچ ہے۔" میں نے اعتراف کیا "سب سے ساتھ... محسن تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے محسن کا نام سنا ہو۔ ابھی سب... میرے ساتھی بنے جب اس کی اور میری ذاتی جنگ کا معاملہ منظر میں چلا گیا۔ ہم نے رلادر کے خلاف وہ جنگ لڑی جو... اس قوم کے ہر فرد نے لڑی تھی۔ اب پھر میرا اور اس کا... ہے۔ اسے میری وجہ سے اپنا سیاسی مستقبل خطرے میں نظر... ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اپنی خواہش انتقام سے دستبردار ہو جاؤں۔"
"جو تمہارے لیے ناممکن ہے۔" غالب نے طنز سے کہا۔
"ظاہر ہے۔ رزبر خان میرا باپ تھا۔ اس کے وارث کی حیثیت سے یہ صرف میرا فرض بنتا ہے کہ اس کے قاتلوں کو دار تک پہنچاؤں۔ کسی اور کا نہیں۔ تم کہہ سکتے ہو کہ انتقام جہالت کی بات ہے۔ کینہ پروری ہے۔ ضرور... ہوگی۔ میں اصولی طور پر اس سے اختلاف نہیں... میری فطرت کے تقاضے میری مجبوری بن گئے ہیں۔ شاید یہ پٹھان خون کی صفت ہے کہ ہم دشمن کے ساتھ اپنا حساب...

میں برابر کرنے کے قائل ہیں۔ چوہدری رلادر نے میرے والد کے ... کا خون کیا۔ ان کا سب کچھ چھین کے انہیں بیچ بیچ کا محتاج ... کے ساتھ ہوگا۔ اس نے میرا حق غصب کیا۔ ابتدائی ... اپنی ... اپنے باپ کے ترکے سے محروم ہوگی۔ میرے حصے میں ... اس کی اولاد ... آئی۔ چوہدری رلادر کی اولاد بھی ذلیل و خوار ہوگی۔ ... حاصل کرکے رہوں گا اور آخری بات یہ کہ رزبر خان کا ... بھی ہے۔ اگر اسے قانون سزا نہ دے سکا تو میں دوں گا۔ ... میرے باپ کی قبر کا سراغ نہیں ایسے ہی رلادر کی قبر کا نام ... نہیں رہے گا۔ یہ میرا عہد تھا اور میں آج بھی اس پر قائم ... گزرنے سے میرے جذبات نہیں بدلے۔ اس لیے کہ ... نہیں بدلے۔ جو کل سچ تھا وہ آج بھی سچ ہے۔"
... جذبات میں میرا لہجہ بہت تلخ ہو گیا تھا۔ میرا چہرہ گرم ہو گیا ... آخری بات کہتے ہوئے میں نے صوفے کی پشت پر مکا مارا تو ... دیکھا کہ باقی سب لوگ مجھے کیسی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
پھر خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں اور کیا کہنا چاہتے ہیں مگر کہہ نہیں سکتے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج ان سب کی مشکل آسان کردوں گا۔ ان کی دوستی نے خلوص کی بہت آزمائش ہو چکی تھی۔ ان کے مجھ پر اتنے احسانات تھے کہ میں خود بھی اس سے زیادہ بار احسان کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ میں خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ذاتی مقاصد اور اپنی زندگی کے خطرات کی خاطر انہیں اپنا ساتھ دینے پر مجبور کروں۔
جب وقار یوسف کی بیوی اٹھی کہ ہمیں کچھ کھانے کا بندوبست کروں "تو میں نے کہا "رکھو۔ برا ماننے یا ناراض ہونے کی بات نہیں۔ تم لوگوں نے میرا بہت ساتھ دیا۔ اب میں نہیں چاہتا کہ تم میرا ساتھ دو۔ ... کا رشتہ جو قائم ہے وہ باقی رہے گا۔ زندگی کی آخری سانس تک لیکن ہر ایک کی اپنی زندگی ہے اور اپنا مستقبل ہے۔ کوئی بھی اپنے حالات کے تقاضوں کو تمام عمر نظرانداز کرکے سب کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔"
مالو نے غصے سے کہا "یہ قدر رہ گئی ہے اب ہماری۔"
کمال نے ہنس کے کہا "قدر نہ کرتا تو کہتا کہ لعنت بھیجو اپنی زندگی پر۔ چلو میرے ساتھ۔ میں جس آگ میں کود رہا ہوں اس میں تم بھی کود جاؤ۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے تم جیسے دوستوں کی اور ... کی خلوص اور محبت کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ شاید کل ... محسوس ہوگی کون سہارا دے گا مجھے اگر تم سب نہ رہے۔"
مالو نے کہا "میں ابھی تک کبھی نہیں سمجھی کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو اور کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"بہت آسان اور صاف بات ہے۔" غالب نے کہا "سکندر کا

زندگی کے نشیب و فراز
گناہ و ثواب
اندھیروں اور اجالوں
وقت اور حالات کے بطن سے جنم لینے والی ایک
بصیرت افروز کہانی.

غلام روحیں

میاں شاہد علی کی داستانِ حیات سب رنگ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی مسلسل داستان جو پہلی بار کتابی شکل میں منظر عام پر آ رہی ہے۔
ایک مجبور اور بے بس شخص کی الم انگیز کہانی۔ اس نے جرم و گناہ کے راستوں کو اپنانے سے انکار کیا تو مجرم بنا کر اسے جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پھینک دیا گیا۔ قسمت نے اسے گھر بار اور والدین کے سائے سے محروم کر دیا ہے!!
وہ جیل سے رہا ہو کر باہر آیا تو انتقام کا سینہ فگار رضا نامی شعلے دل کے زنجیروں کو جھلسا رہے تھے۔ لیکن ایک دوست نے اس کی رہنمائی ایک مرد کامل کے آستانے تک کردی۔!!
وہ عشق حقیقی میں ڈوب گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں تو قلب روشن ہو گیا۔ لیکن ایک اچانک حادثے نے ماضی کے زخموں کو کرید کر پھر ہرا کر دیا تو اس نے تڑپ کر آنکھیں کھول لیں۔!!
تاریک راہوں کی گھٹن سے ابھرنے والی ایک خوبصورت اور عبرت انگیز داستان۔

قیمت:- ۲۰۰ روپے

ملنے کا پتہ

کتابیات پبلیکیشنز

www.paksociety.com

کہنا یہ ہے کہ مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں۔ جاؤ شادی کرو۔ گھر بساؤ اور خوش رہو۔"

"بالکل ٹھیک۔" میں نے بُرا مانے بغیر کہا "جیسے اکرام شیخ اور کابل نے کیا جو محسن نے اور گل نے کیا۔"

"تم طنز کر رہے ہو؟" غالب بولا۔

"نہیں یار۔ میں حقیقت بتا رہا ہوں۔ دیکھو آج تک ہم سب پریشانی میں اور ضرورت پڑنے پر کہاں جاتے تھے؟ مظہر کے گھر۔ وقار یوسف کے گھر۔ نقوی صاحب کے گھر اور ہماری پہلی پناہ گاہ تھی انکل رضوی مرحوم کا گھر۔ اب محسن کہاں گیا آخر ...؟ فوزیہ کے گھر۔ یہ گھر ہمارے لیے تحفظ کے حصار تھے۔ کیونکہ ہم سب کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ اب میرے لیے دو گھر اور ہو گئے ہیں۔ ایک گھر ہے اکرام شیخ اور کابل کا۔ دوسرا محسن اور گل کا۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک گھر تمہارا بھی ہو۔ ظاہر ہے وہ بھی میرا گھر ہو گا۔"

"نہیں۔ وہ تمہارا گھر نہیں ہو گا۔ یہ حقیقت پسندی نہیں ہے۔ محض تجاہل ہے۔" غالب نے کہا۔

میں نے ہنس کے کہا "جو گھر میرے والد نے چھوڑا تھا وہ میرا ہے۔"

"زیادہ چالاک مت بنو۔ سب کے ساتھ اچھی بات کیوں نہیں کرتے کہ رابعہ کا اور تمہارا گھر بھی ہے۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں رابعہ کو دھوکے میں نہیں رکھ سکتا۔ ابھی میں خود نہیں جانتا کہ انتہائے عہد کی منزل کہاں ہے۔ عہد کرنا واقعی آسان ہے۔ نبھانا مشکل اور کبھی ناممکن ہو جاتا ہے کیونکہ حالات پر کسی کا اختیار نہیں۔"

"یہ حالات تم خود پیدا کرتے ہو" نازو نے کہا۔

"میں اپنی مجبوری کی وضاحت کر چکا ہوں" میں نے کہا "میری وجہ سے تم سب نے بہت قربانی دی۔ بہت تکلیف جھیلی۔ نقصان اٹھایا لیکن اب انتہا ہو چکی ہے۔ شیلی کی موت اور نقوی صاحب کے قتل نے مجھے جھنجوڑ کے رکھ دیا ہے۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ مجھ سے تعلق کی وجہ سے خرابی کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے۔ کل کو خدانخواستہ وقار یوسف اور اس کی اتنی محبت کرنے والی بیوی کے پُرسکون گھر کو بھی میرے حالات نے تباہ کر دیا تو میں خود کو بھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ مجھے تو چاہیے کہ ان سب سے دور رہوں جو میرے اپنے کہلاتے ہیں۔ جو مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ انہیں سزا تو نہیں ملنی چاہیے اس محبت کی۔ یہ میری دوستی نہیں دشمنی بن جائے گی ان کے حق میں۔"

"پھر تم کیا کرو گے؟ سب کو چھوڑ دو گے؟" غالب نے غصے سے کہا۔

"ہاں۔ اسی میں بہتری ہے سب کی۔"

"لعنت سب پر۔ تمہاری بہتری کس میں ہے؟ یہ بھی سوچو۔"

"بہت سوچا ہے میں نے اور مزید سوچنا نہیں چاہتا۔ میں بتا چکا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے لیکن یہ سب کچھ میں اکیلا ہی کروں گا۔ بُرا مانتے ہو تو مانو مگر تم تیک یو ویری مچ۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ یہ احساس جرم میرے لیے سوہانِ روح ہوتا جا رہا ہے کہ میری دوستی نے تم سب کو آباد نہیں برباد کیا" میں نے اچانک رخ رابعہ کی طرف کر لیا "ان سب کو گواہ بنا کر... سامنے میں تم سے صاف کہنا چاہتا ہوں کہ مجھ سے توقعات مت رکھو۔ میرا کچھ پتا نہیں۔ میں کب لوٹ کے آؤں۔"

رابعہ ایک دم اُٹھی تھی مگر میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ اس نے خود کو چھڑانے کی واجبی سی کوشش کی "جہنم میں جاؤ۔"

"پوری بات سُن کے جاؤ۔"

"میں کچھ سُننا نہیں چاہتی۔ تم پاگل ہو۔"

"ہاں۔ میں پاگل ہوں۔ تم پاگل مت بنو ایک پاگل کے لیے" میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا "اپنی پریکٹس کرو۔ نام کماؤ۔ کسی سکندر کے آسرے پر مت رہو۔ اپنی زندگی برباد مت کرو۔" نازو نے ...!"

لیکن رابعہ کچھ سُنے بغیر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اب شاید کسی بیڈ پر گر کے رو رہی تھی۔

نازو آگ بگولا ہو کے اُٹھی "سکندر۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔"

"شرم کی کیا بات ہے؟ مجھے دکھ ضرور ہے کہ میں نے سب کو یہ کڑوی گولی نگلنے پر مجبور کیا لیکن میں مطمئن ہوں کہ اب مجھ پر کوئی بار نہیں۔"

غالب نے صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر ہم بعد میں بات کریں گے۔"

"او کے۔ جیسی تمہاری مرضی" میں نے کہا "چلو تم مجھے بتاؤ کہ فیصل آباد کیوں گئے تھے اتنی افراتفری میں؟ کوئی بات ضرور تھی جو تم نے چھپائی تھی۔"

غالب نے سپاٹ لہجے میں کہا "ہاں۔ محسن بہت پریشان تھا۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتا تھا مگر میں نے کہا کہ سکندر کا کچھ پتا نہیں کہاں گیا ہے پھر اس نے مجھے بتایا کہ کسی نے فوزیہ کے شوہر کو اغوا کر لیا ہے۔"

"اس کی دشمنی تھی کسی سے؟"

"اغوا کرنے والے محسن کے دشمن تھے" غالب نے کہا "انہوں نے فون کر کے اسے دھمکی دی کہ تمہارا بہنوئی ہمارے قبضے میں ہے۔"

"او مائی گاڈ۔ پھر...؟"

"محسن پریشان ہو گیا۔ اس نے پوچھا کہ تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔ اس نے جواب میں ایک قہقہہ لگایا اور کہا "اپنے محسن خان شیروانی صاحب۔ ہم وہ ہیں" کیا کہتے ہیں انہیں... صاف جی! ابتدائی ہو۔ تم خود سمجھ لو کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔" محسن نے کہا کہ میری بہن کو بیچ میں کیوں گھسیٹتے ہو۔ اس کا تو کسی معاملے سے تعلق نہیں۔ "تو اس نے کہا کہ فوزیہ کا تعلق تم سے تو ہے نا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ وہ بیوہ ہو جائے؟" بس اس کے بعد لائن کٹ گئی اور محسن نے پریشانی کی کیفیت میں مجھے فون کر دیا۔"

"یہ بات فوزیہ کو معلوم تھی؟"

"نہیں۔ محسن نے فون ریسیو کیا تو فوزیہ کچن میں تھی۔ اس نے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ اس نے بعد میں پوچھا کہ کس کا فون تھا تو محسن نے کہہ دیا کہ اسے بتا چکا تھا کہ فوزیہ گرم ہونے لگی کہ مجھے کیوں نہیں بلایا۔ میں پوچھتی کہ کہاں سے بول رہے ہو۔ محسن نے کہا کہ وہ معذرت کر رہا تھا کہ مجھے اچانک سیالکوٹ جانا پڑ گیا۔ کسی ساتھی پروفیسر کا انتقال ہو گیا تھا۔ فوزیہ نے کہا کہ گھر پر فون کر کے اطلاع بھی نہیں دے سکتے تھے؟ محسن نے کہا کہ وہ کہتے ہیں میں فون کرتا رہا۔ کوئی اٹھا ہی نہیں تھا۔ فون خراب تھا شاید۔ اس وقت تو محسن نے ٹال دیا مگر بعد میں اسے اور کچھ نہ سوجھا۔ اس نے فوراً مجھے بلایا کہ سکندر نہیں ہے تو تم آ جاؤ۔ اس وقت تک محسن نے پولیس کو بھی رپورٹ نہیں دی تھی۔"

"محسن تو سب کی آواز پہچانتا ہے۔ کون تھا فون کرنے والا؟"

"فون پر آواز بدل جاتی ہے اور شاید وہ اصل آواز میں بول بھی نہیں رہا تھا مگر محسن کو یقین تھا کہ یہ حرکت ولاور اینڈ کمپنی کی ہے۔ اس نے گل کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا مگر محسن کی حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے سے فوزیہ کو بھی شک ہو رہا تھا کہ کوئی بات ضرور ہے۔ جب میں پہنچا تو ان کے شک کی تصدیق ہو گئی۔"

"پھر؟" میرے اندر غصے کا آتشِ فشاں اُبلنے لگا۔

"پھر یوں سمجھ لو کہ میرے ساتھ ساتھ ہی فوزیہ کا شوہر بھی پہنچ گیا اور فوزیہ سے پہلے محسن نے اسے ڈانٹا کہ سیالکوٹ جانا تھا تو فون کر دیتے اور فون نہیں ملا تھا تو کسی سے پیغام بھجوا دیتے۔ دیکھو فوزیہ کتنی پریشان ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ محسن نے معاملے پر پردہ ڈالا ہوا ہو گا۔ معصوم صورت بنا کے کہنے لگا "کیا کروں یار۔ بات ہی ایسی تھی" محسن نے کہا کہ "کیا ہوا تھا تمہارے اس ساتھی کو۔ اچانک انتقال ہوا یا پہلے سے بیمار تھے؟" وہ ذہین آدمی ہے۔ اس نے فوراً ایک کہانی گھڑ کے سنا دی اور بات اس وقت تو ختم ہو گئی ابھی اسے اور مجھے گھر پہنچے آدھا گھنٹا ہوا تھا کہ پھر فون آ گیا۔ فون کرنے والا وہی تھا۔ اس نے کہا کہ محسن صاحب! خیر سے آپ کے بہنوئی گھر پہنچ گئے کیا کہتے ہیں انہیں۔ دوبارہ بھائی۔ ہیں جی؟ ہم نے کہا چلو ایک موقع دیتے ہیں تمہیں۔ بہن کا سہاگ عزیز ہے تو ہماری بات سمجھ لو اور اپنے اس سکندرِ اعظم کو بھی سمجھا دو۔"

"آخر کیا سمجھانا چاہتے تھے مجھے وہ..." میں نے بے اختیار ایک گالی دے کے کہا۔

"محسن نے بعد میں مجھے بتایا کہ ولاور کے لہجے کی نقل کرنے والا ولاور بہرحال نہیں تھا" غالب بولا "لیکن وہ ولاور اینڈ کمپنی کا آدمی یقیناً تھا۔ اسے سب کچھ معلوم تھا۔ اس نے محسن سے یہ بھی کہا کہ دیکھو تم تو پہلے ہی بہت نقصان اُٹھا چکے ہو اپنی دوستی کے چکر میں۔ سکندر کا کیا گیا؟ تمہارے بیوی بچے مارے گئے اور ایسا نہ ہو کہ پولیس تمہاری گل بانو کو تاک سمجھ کے پکڑ لے۔ اگر وہ گرفتار ہو گئی تو اسے پھانسی ہو گی اور بچ گئی تب بھی عمر قید تو لازمی ہے۔ تم پھر کھاتے پھرو۔"

"محسن نے کیا جواب دیا اسے؟"

"کچھ نہیں۔ وہ سنتا رہا کیونکہ اس وقت وہاں گل بھی موجود تھی۔ دھمکی دینے والے نے یہ بھی کہہ دیا کہ خبردار اپنے ٹیلی فون کو آبزرویشن پر مت لگوانا۔ ویسے ہم کہیں سے بھی فون کر سکتے ہیں جیسے کہ تم کرتے تھے۔ کسی ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھ کے۔ ہمیں کون پکڑے گا۔"

"یہ بھی معلوم تھا اسے؟"

"ہاں یار۔ اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے فوزیہ پاس بیٹھی ہے یا گل۔ اس لیے تم چپ ہو۔ خیر میں ہدایات کروں گا۔ پولیس کے پاس جانے کی حماقت مت کرنا۔ اس سے پہلے ہم پہنچ جائیں گے تمہارے پاس۔ محسن کا ڈرنا جائز تھا۔ وہ تو شاید دروازے پر نظر رکھے بیٹھے تھے کہ ادھر میں پہنچا اُدھر انہوں نے فوزیہ کے شوہر کو چھوڑ دیا۔ دوسری بار فون کیا تو انہوں نے میرا نام لے کر کہا تھا کہ تم نے اچھا کیا غالب کو بلا لیا۔ اب اسے سمجھا دینا کہ آج ہی واپس جائے اور سکندرِ اعظم سے کہے کہ وہ بھی سمجھ جائے۔"

میں نے کچھ دیر بعد کہا "غالب۔ کیا اس کے بعد بھی کسی دلیل کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ دیکھو یہ حرام زادے کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ ان کا ٹارگٹ صرف میں ہوں مگر براہِ راست وار کو میں نے قبول نہیں کیا تو انہوں نے دوسروں کو نشانہ بنا لیا۔ ان کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ یہی ثابت کرنے کے لیے انہوں نے محسن کی بہن کا گھر تاکا۔ یہ وارننگ میرے لیے تھی کہ اس بار تو فوزیہ کے شوہر کو زندہ سلامت واپس کر دیا گیا ہے۔ وہ اگلی بار اس کی لاش بھی بھیج سکتے ہیں۔ ان کا اگلا نشانہ اکرام شیخ کا گھر بھی ہو سکتا ہے۔ وقار یوسف کا بھی ہو سکتا ہے۔"

"اس مشکل کا حل تمہارے نزدیک یہ ہے کہ ہم سب کو چھوڑ دو۔"

"اور کیا کر سکتا ہوں میں۔ اب تک جو ہوا سو ہوا۔ آئندہ کے لیے میں کوئی خطرہ مول لوں گا تو صرف اپنی خاطر۔ تم بس اپنی حفاظت خود کرو۔ ویسے اللہ تمہاری حفاظت کرنے والا ہے۔ میرے کسی معاملے میں تمہیں ملوث ہونا ہی نہیں چاہیے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا یار" غالب نے جھنجلا کے کہا۔

"یہ ہونا چاہیے اور ہو گا" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "ایک طرف میرے قانونی مسائل ہیں جن کا کوئی حل نہیں۔ پولیس سے

www.paksociety.com

میں کب تک چھپ کے رہ سکتا ہوں۔ کیسے کیسے ٹھکانے ہیں میرے۔ وہ بھی اب غیر محفوظ ہو گئے ہیں۔ یہ بات بھی معلوم ہو جائے گی دلاور کو۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ میں تم سب کا ساتھ چھوڑ گیا ہوں یا تم سب نے بالآخر میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ میں خود بھی بتا دوں گا دلاور کو کہ اب میری اور تمہاری جنگ ہے۔ ون ٹو ون۔ لیکن اس نے میرے جذباتی رشتوں کو خراب کیا تو اس کے رشتے بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ آخر اس کے عزیز دوست اور رشتے دار بھی ہوں گے۔ اس کی بیوی کے بہن بھائی اور ماں باپ ہو سکتے ہیں۔ دلاور کے اپنے بچے ہیں۔ میں معلوم کر سکتا ہوں کہ وہ کہاں رہتے ہیں اور کہاں پڑھتے ہیں۔"

غالب نے مجھے نفرت سے دیکھا "یعنی اب اتنا گر جاؤ گے تم۔"

"اگر مجھے دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا۔ کوئی راستہ نہ چھوڑا گیا میرے لیے۔ فوزیہ کا آنچل کا یا وقار کا گھر برباد کیا کسی نے تو میں دلاور کے لواحقین کو نہیں بخشوں گا۔ یہ مجبوری ہے یار۔ جنگ میں یکطرفہ اصول پرستی اور شرافت نہیں چلتی۔ تاہم میں پہل نہیں کروں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ میری طرف سے بھی ایک دھمکی ہی کافی ہو گی پھر وہ سنبھل جائے گا۔ اگر اس نے فوزیہ کے شوہر کو اٹھایا تو یہ ہو سکتا ہے کہ میں اس کی بہن۔ مگر اس کی بہن ہے کہاں۔ ایک بیٹی تھی۔ مگر اس کی بیوی کی بہن تو ہو گی۔ یا اس کا بھائی ہو گا۔ میں اسکور ایک مرتبہ برابر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو دلاور کی پیش قدمی رک جائے گی۔ اس کو بریک لگانا ضروری ہو گا غالب۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر تم اکیلے سب کچھ نہیں کر سکو گے" غالب گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"اکیلا تو صرف خدا رہ سکتا ہے یا شیطان۔ یہ اگر جیوں کا قول ہے۔" میں نے کہا "میں کہاں اکیلا ہوں۔ تم سب میرا ساتھ دو گے مگر سامنے آئے بغیر۔"

"صرف مورل سپورٹ (MORAL SUPPORT) کافی نہیں ہوتی" غالب نے کہا۔

"نہیں۔ تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ تم اخبار میں ہو۔ تمہارے ساتھ نادرہ ہے۔ یہ کتنا بڑا سہارا ہے" میں نے کہا "تمہارے، وقار اور منظر کے سارے وسائل میری دسترس میں ہوں گے۔ میرا تم سے رابطہ تو ختم نہیں ہو گا۔ دلاور کی جارحانہ کارروائی کے خوف سے بے نیاز ہو کے تم میری زیادہ مدد کر سکو گے۔ کیا غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"پتا نہیں یار۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔ رابعہ قائل ہو جائے گی تو میں بھی قائل ہو جاؤں گا۔"

میں نے کہا "وہ مان جائے گی۔ یہ جذبات کا سیلاب گزر جائے پھر میں اسے سمجھا دوں گا۔"

رات کے کھانے کا وقت ہو گیا مگر بھوک کسی کو نہیں تھی۔ وقار یوسف کی بیوی نے سب کو کھینچ کر میز پر لا بٹھایا۔ وقار یوسف نے بیوی کی مدد کی۔ اس نے نادرہ کو سمجھایا تو بیوی نے رابعہ کو ڈانٹا کہ تم عجیب بے وقوف ہو۔ رونے کی کیا ضرورت ہے۔ دماغ درست کرو خود کو سکندرِ اعظم سمجھنے والے کا۔"

اس کے باوجود کہ کھانے کی میز پر سب کی دل پسند چیزیں تھیں اور وقار یوسف کے ساتھ اس کی بیوی حقِ میزبانی ادا کرنے میں سب سے مستعد تھی سب نے جبراً تھوڑا بہت کھایا۔ میری بات کرنے کی اور غالب کی ہنسانے کی کوشش ناکام ہوئی۔ کھانے کے بعد انہوں نے سب کو باہر لے جا کے آئس کریم کھلانے کی پیشکش کی۔ ابھی سب تیاری کر رہے تھے کہ منظر کا فون آ گیا۔ میں نے وقار سے کہا کہ وہ مجھے اور غالب کو چھوڑ جائے کیونکہ منظر آ رہا ہے۔ وقار یوسف کی بیوی نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ ان حالات میں کہ اس کے باپ کا سوئم صرف ایک دن پہلے ہوا تھا وہ اپنا غم چھپا کے سب کی دلجوئی میں مصروف تھی۔ رابعہ نے سب سے زیادہ مزاحمت کی تھی مگر اسے نادرہ نے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا۔

میں اور غالب چھت پر جا بیٹھے۔ نیچے کے مقابلے میں اوپر حبس اور گھٹن کم تھی۔ چھت پر ایک طرف دو تخت بھی بچھے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے ان پر وقار اور اس کی بیوی سوتے تھے۔ کچھ فاصلے پر بہت سی فولڈنگ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کشنوں کی سوا ایسی چیزیں بہت آرام دہ تھیں اور دھوپ یا بارش سے خراب ہونے والی بھی نہیں تھیں۔

"کافی پیو گے؟" غالب نے کہا۔

"منظر آ جائے۔ پہلے اس کی گالیاں کھا لوں پھر کافی بھی پی لیں گے۔"

"تم نے شبلی کی بات تو کی تھی۔ اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا" غالب نے کہا۔

"میں سوال جواب کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ایک داستان تھی وہ بھی۔۔۔ ختم ہو گئی۔"

"میں نے اس کی لاش اصل قبر سے نکلوا کے دوسری جگہ دفن کرا دی تھی" غالب نے کہا۔

"کیسے؟ اجازت لے کے؟"

"اجازت کون دیتا اور اس سے پہلے ہی چودھری رنا اپنی بہن کی لاش کا سراغ بھی نہ پاتا" غالب نے کہا "بس یہ کام تو ایسے ہی ہو گیا۔ جیسے ہو سکتا تھا۔"

"اب اس کا مدفن کہاں ہے؟"

"یہ میرے سوا کسی کو معلوم نہیں اور میں بتاؤں گا نہیں۔"

"مجھے بھی نہیں؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "خدانخواستہ کل تم سے کسی نے زبردستی معلوم کرنے کی کوشش کی تو ہو سکتا ہے کہ تم بتا دو۔ تو کوئی

مجبور ہو جاتا ہے۔ چودھری دلاور اس معاملے میں بُری طرح پھنس گیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"رابعہ نے سب کچھ برٹش کونسلیٹ کو بھیج دیا تھا۔ شبلی کے تمام کاغذات' پاسپورٹ' کریڈٹ کارڈز' ٹریولرز چیک جو غیر استعمال شدہ رہ گئے تھے اور اس کی موت کے بارے میں تمام واقعات کی رپورٹ جس سے یہ خودکشی نہیں بلکہ قتل ثابت ہوتا ہے۔ اس نے شبلی کا سارا بیک گراؤنڈ بھی بتا دیا ہے کہ وہ کون تھی اور کہاں سے آئی تھی؟ دلاور سے اس کا کیا رشتہ تھا۔ اس کی ماں کون تھی اور اس کا قتل کن حالات میں ہوا تھا۔ قاتل کون تھا اور کس نے دیکھا تھا۔ وہ شخص جو چشم دید گواہ ہے۔ لندن کے شیخ صاحب اور شبلی کا سابقہ شوہر۔ یہ کیس زور پکڑ گیا ہے۔ اس کی نقل ڈی جی، پاکستان کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر کو دی گئی ہے۔"

میں فکر مند ہو گیا۔ "رابعہ نے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔"

"وہ بے وقوف نہیں ہے۔ اس پر پانچ وکیلوں کے دستخط ہیں اور وہ سب سینئر وکیل ہیں۔ رابعہ اور منظر کے علاوہ وہ بھی ایسے لوگ ہیں جن پر دلاور کا باپ بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔"

"اب لاش کا پوسٹ مارٹم کیسے ہو گا؟ میرا مطلب ہے اصل قبر کی نشاندہی کیسے ہو گی؟"

"یہ بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے قانون کا پہیہ تو حرکت میں آئے۔ عدالت سے احکامات مل جائیں کہ لاش کو نکال کے پوسٹ مارٹم کیا جائے۔ برطانوی سفیر کا نمائندہ، میڈیکل بورڈ اور پولیس کے افسران کی تفتیشی ٹیم کے ساتھ مجسٹریٹ قبرستان پہنچ جائیں گے تو کسی نہ کسی طرح یہ اطلاع بھی فراہم کر دی جائے گی۔"

"مگر اس وقت وہ پابند ہوں گے کہ وہی قبر کھودیں۔"

"ہاں۔ قبر یا تو خالی ملے گی یا اس میں سے کسی اور کی لاش نکلے گی پھر خصوصی اختیارات کے تحت مجسٹریٹ کارروائی کر سکے گا۔ وہاں صحافی بھی ہوں گے اور وہ سب وکیل بھی جن کی درخواست پر ساری کارروائی ہو گی۔ وہ اپنی ذمہ داری پر دوسری قبر کی نشاندہی کریں گے۔"

"کیا دلاور کو معلوم نہیں ہو گا کہ لاش کو غائب کر دیا گیا ہے اور یہ کام کس نے کیا ہے؟"

"ہم ۔۔۔ یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس میں صرف میرا ہاتھ تھا۔ میں نے کرائے کے مزدور حاصل کیے تھے۔ بڑی دور سے لایا تھا اور بہت بھاری معاوضے کے لالچ میں۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ خطرناک کام ہے مگر پکڑے جانے کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ سو، کو دس دس ہزار روپے کے لالچ نے مجبور کر دیا اور وہ میرے ساتھ میری شرائط پر چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ میں انہیں آنکھوں پر پٹی باندھ کے لایا تھا۔ پہلے تو انہوں نے گورکن کو باندھ کے ڈال دیا پھر وہ شبلی کی قبر کھودی اور وہ نے ایک نئی قبر تیار کی۔ صبح چار بجے تک سارا کام ختم ہو گیا۔ شبلی کی پرانی قبر اصل حالت میں نظر آنے لگی اور نئی قبر کا سراغ باقی نہ رہا تو میں انہیں پھر گاڑی میں بٹھا کے لے گیا اور وہیں چھوڑ آیا جہاں سے وہ آئے تھے۔ یہ خالص فلمی قسم کا سین تھا۔ میرے چہرے پر نقاب تھا اور گاڑی کی نمبر پلیٹ بدل دی گئی تھی۔ بزل رضیہ کو مزدور کہاں پہچان سکتے تھے۔"

"گاڑی کس کی تھی؟"

"کرائے کی۔ منظر نے اپنے نام سے حاصل کی تھی" غالب نے کہا۔

"مگر یہ تم کچھ اور پروگرام بتا کے گئے تھے؟"

"ہاں لیکن بعد میں مجھے یہ خیال آیا کہ قبرستان میں کسی ایک قبر پر وردی والے محافظوں کی موجودگی سب کو متوجہ کرے گی۔ اخبار والے دوڑیں گے پھر پولیس آ جائے گی یہ پوچھنے کے لیے کہ معاملہ کیا ہے؟ میں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔"

میں نے گھڑی دیکھ کر کہا "منظر کیوں نہیں پہنچا ابھی تک؟"

"اس کے پاس کوئی موکل بیٹھا ہوا تھا۔ منظر نے کہا تھا کہ اس سے فارغ ہو کے آتا ہوں۔"

اسی وقت سڑک پر ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ اس میں دونوں طرف ڈبل ہیڈ لائٹس تھیں اور چار ہیڈ لائٹس والی گاڑی مرسڈیز ہی کی ہو سکتی تھی۔ چھت پر سے سڑک دور تک نظر آتی تھی۔ وہ گاڑی سیدھی وقار کے گھر کی طرف آ رہی تھی۔

میں نے کہا "شیطان کا نام لیا اور وہ نازل ہو گیا۔"

غالب اٹھ کر منڈیر تک گیا تھا کہ منظر کو اوپر بلا لے۔ میں نے بھی گاڑی کو خاموش ہوتے سنا اور اس کی ہیڈ لائٹس کے آف ہونے کو محسوس کیا مگر اس کے بعد مجھے غالب کا جھک کر نیچے دیکھنا اور خاموش رہنا کچھ عجیب سا لگا۔ یہ صرف چند سیکنڈ کی بات تھی۔ منظر گاڑی بند کر کے باہر نکلتا تو غالب اسے اوپر بلانے کے لیے آواز دیتا۔

میں اٹھا ہی تھا کہ غالب نے پلٹ کے خاموشی سے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا اور میں نے اس کے ساتھ جھک کر منڈیر کی جالی سے جھانکا تو مجھے کار میں سے یکے بعد دیگرے چار افراد برآمد ہوتے دکھائی دیے۔

"منظر کہاں ہے؟ یہ کار تو اسی کی ہے" میں نے غالب کے کان میں سرگوشی کی۔

غالب نے سر ہلایا "ابھی معلوم ہو جائے گا جب یہ اوپر آئیں گے۔ نیچے تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"رات اے چانس بابی لوگ۔ آئس کریم کھانے کے لیے نہ جاتے تو ہم بھی نیچے ہی ملتے" میں نے کہا "ان چاروں سے تو ہم نمٹ لیں گے۔"

"انہوں نے منظر سے گاڑی چھینی ہو گی۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وقار کا اور منظر کا خون بھی شپ ہو رہا ہے" میں نے کہا "خدا کرے منظر محفوظ ہو۔"

گاڑی سے نکلنے والے چاروں افراد نے خود کو رات کی سیاہی میں گم کرنے کے لیے کالے کپڑے پہن رکھے تھے اور شاید باہر آنے سے پہلے انہوں نے منہ پر کالے نقاب بھی ڈالے تھے۔ اس نقاب میں جہاں آنکھوں کے لیے سوراخ تھے وہاں سے دھوپ کے چشموں کی چمک نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے آہٹ کیے بغیر گیٹ کھولا اور پھر کمانڈوز اسٹائل میں دوڑ کے اندر گھس گئے۔ انہوں نے بند دروازوں کو ٹکر ماری تھی لیکن دروازے مقفل نہیں تھے ہم نے تو اندر سے کنڈی بھی نہیں لگائی تھی۔ نتیجہ یہ کہ دروازے ایک دم کھل گئے اور پچھلی دیوار سے ٹکرائے۔ میں اور غالب زینے کے دونوں جانب دبکے ہوئے نچلی منزل کے شور کو سنتے رہے۔ وہ دروازوں کو لاتیں مار مار کے کھول رہے تھے۔ ساتھ ہی وہ مدہم اور دبی ہوئی بلند آواز میں ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ یہاں بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ غصے میں گالیاں بک رہے تھے اور توڑ پھوڑ کر رہے تھے۔

"...... بھاگ گئے" کسی نے ایک فحش گالی ہم سب کے لیے استعمال کی۔

"کیسے بھاگ گئے....." دوسرے نے دوسری گالی دی "کیا انہیں پتا چل گیا تھا؟"

"منظر ضرور کھلا پڑا ہے!"

چوتھے نے کہا "دیکھو ہوشیار رہو۔ وہ بھاگے نہیں ہوں گے آس پاس ہی چھپے ہوئے ہوں گے۔"

"اوئے کالیے۔ اوپر چھت پر جا کے دیکھ۔"

کالیے نے کہا "گورے کی اولاد۔ میں اکیلا جاؤں؟ تو چل میرے ساتھ۔"

"ساتھ نہیں، آگے پیچھے۔"

میں اور غالب سنبھل گئے۔ غالباً وہ کالیا ہی تھا جو دبے پاؤں اوپر آ رہا تھا۔ اسے کور فراہم کرنے والا پیچھے تھا۔ حسب توقع وہ اپنے سامنے اندھیرے میں دیکھتے ہوئے سیدھے چلتے گئے۔ کالیے کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ چند قدم پیچھے آنے والا مشین گن سے مسلح تھا۔ میں نے اشاروں کی زبان میں غالب کو سمجھایا کہ میں پیچھے والے کو دبوچتا ہوں۔ کالیا پلٹ کے فائر کرنے کی کوشش کرے گا مگر اسے کچھ وقت لگے گا۔ غالب کے ذہن میں شاید اس سے بہتر منصوبہ تھا کہ اس نے گونگے بہروں کی زبان میں ہی مجھ سے کہا کہ تم اپنا کام کرو۔ میرا کام مجھ پر چھوڑ دو۔"

میں نے کالیے کے محافظ مشین گن والے کو ایک جست میں جا لیا اور اسے ساتھ لیتا ہوا زمین پر گر گیا۔ اس کا سر پکے فرش والی چھت پر یوں لگا جیسے کوئی ناریل کو پوری قوت سے دیوار پر دے مارے۔ اس کا گلا میں نے پیچھے سے دبوچ لیا تھا۔ وہ آواز نکالے بغیر تھوڑا سا تڑپ کے ساکت ہو گیا مگر اس کے اور میرے گرنے سے چھت ہل گئی تھی۔

کالیے کی آواز میں نے اس وقت سنی جب میں مشین گن قبضے میں لے چکا تھا اور میدان جنگ میں لڑنے والے سپاہی کی طرح الٹا لیٹ کر اس کا نشانہ لے چکا تھا۔ کالیے نے چیخ مارنے کے انداز میں "ہائے" کہا اور اس کا بایاں ہاتھ بے اختیار سر کی طرف اٹھا پھر لڑکھڑا کے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ غالب کی نشانے بازی میں مہارت پہلے سے ثابت تھی۔ ایک اور ثبوت اس نے ابھی ابھی کالیے کے سر کا نشانہ لے کر فراہم کیا تھا۔ جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا وہیں اس کو آدھی اینٹ مل گئی تھی۔ ہر چھت پر تھوڑا بہت کاٹھ کباڑ ہوتا ہی ہے۔ اس نے وہ آدھی اینٹ توپ کے گولے کی طرح داغ دی تھی اور اسے اپنے نشانے پر اتنا بھروسا تھا کہ وہ اٹھ کے آگے نہیں آیا تھا۔

کالیے کی آواز نیچے سنی گئی تو کسی نے چلا کے کہا "ارے کیا ہو گیا کالیے؟"

غالب نے ناک پکڑ کے حلق سے عجیب سی آواز نکالی اور پتا نہیں کون سی ناقابل فہم زبان میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا تو نیچے کون سمجھ سکتا تھا۔ ایک اور شخص جو نسبتاً جلد باز اور احمق تھا دوڑتا ہوا اوپر آ گیا۔ اس وقت تک میں واپس اپنے مورچے میں آ چکا تھا۔ میں نے پیچھے سے اس کے سر پر مشین گن کا دستہ مارا اور وہ منہ کے بل گر گیا۔ اس کے ہاتھ میں جو ریوالور تھا وہ فرش پر پھسلتا ہوا سیدھا گیا اور کالیے سے ٹکرا کے ٹھہر گیا۔

اب میں نے اوپر سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ زینہ دو حصوں میں تھا اور عام زینوں کی طرح گھوم کے چھت تک پہنچتا تھا۔ اوپر والے کمرے سے میں نے پوزیشن میں چوتھے شخص کو دیکھا جو ریوالور تھامے اوپر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اٹین شن ہو جاؤ بیٹے یہ گولی مار آلہ نیچے گرا دو" میں نے آواز بدل کے کہا "ورنہ میں اوپر سے تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر کے تمہیں گرا دوں گا۔"

شاید وہ چند سیکنڈ سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہتھیار ڈالنا بہتر ہے یا ادائے فرض کے لیے جان دینا۔ ظاہر ہے فرض پر زندگی کی محبت غالب آ گئی اور اس نے ہاتھ نیچے رکھتے ہوئے ریوالور چھوڑ دیا۔

غالب وہ آدھی اینٹ اٹھا لایا تھا جس سے اس نے کالیے کو شکار کیا تھا۔ جیسے ہی آخری شخص نے ریوالور چھوڑا، غالب نے اوپر سے اینٹ چھوڑ دی۔ اینٹ اس پر قہر خداوندی بن کے نازل ہوئی۔ اس کے کاسہ سر میں شگاف پڑنے سے خون کا فوارہ ابلا اور وہ پورچ میں لیٹ کر تڑپنے لگا۔

میں نے کہا "مرزا جی۔ مصیبت پیدا کر دی تم نے بلاوجہ۔ اتنا خون پھیلا دیا۔ اب اسے صاف کون کرے گا؟"

"اس کا سر کیا تھا" غالب نے اپنا دفاع کیا۔

"جلدی کرو۔ وہ لوگ واپس آ رہے ہوں گے" میں نے کہا۔

"جلدی کیا کروں؟"

"ہم ان کی ڈگی کھولو" میں نے کہا "میں دیکھتا ہوں آگے کیا ہے۔"

لاشیں تین تھیں۔ صرف کالیا پیشانی پر اینٹ لگنے سے بے ہوش ہوا تھا۔ اس کی حفاظت کرنے والے کی گردن ٹوٹ گئی تھی اور چوتھا جو اوپر آنے والا تھا شاید سر کی اندرونی چوٹ سے مر گیا تھا۔ وہ بے حس و ساکت نظر آ رہا تھا۔ میں نے کالیے کو نیچے منتقل کیا اور اس کو کندھے پر ڈال کے باہر گیا تو غالب نے ڈگی کھول دی تھی۔ منظر کو نکالا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔

"میں... زندہ ہوں!" منظر نے ہانپتے اور کانپتے ہوئے کہا "شکر ہے... ورنہ ابھی جہنم رسید ہو جاتے۔"

میں نے کہا "چلیں آپ اندر تشریف لے جائیں۔"

"کیا ہے؟" منظر نے بے یقینی کی طرح... کیا، غالب اسے کھینچ کے لے گیا۔

تیسری لاش نے بڑی خرابی پھیلائی تھی۔ میں نے ... مٹی سے بھرے ہوئے دو تین گملے گرائے۔ مٹی نے خون جذب کر لیا تو میں نے اندر سے برش لا کے مٹی کو اور گملے کے ٹکڑوں کو اکٹھا کیا اور اس ڈھیر کو ایک بوری میں بھر کے واپس چھت پر لے گیا۔ خون آلود مٹی بڑی زرخیز ثابت ہوگی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ مٹی چند خالی گملوں میں بھر دی جو بالکل بے کار پڑے تھے اور ٹوٹے گملے کے ٹکڑوں کو میں نے پچھلے حصے میں ڈال دیا جہاں خالی میدان تھا۔

یہ سب کام میں نے دوڑ دوڑ کے بڑی تیزی سے کر ڈالے۔ غالب نے پورچ کو صاف کر دیا۔ میں نے اوپر سے ایک ... نیچے گرا دیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" غالب نے خفگی سے کہا۔

"میرا نشانہ خطا ہو گیا" میں نے نیچے آتے ہوئے کہا ... اس میں سے تھوڑی سی مٹی کالیے کے سر میں ... غالب مٹی لے کر اندر گیا تو میں نے ... لرزتے ہوئے منظر ... "وکیل صاحب۔ تم ہوش میں ہو نا؟"

"چودہ طبق روشن ہو چکے ہیں بھوتنی کے۔ چودہ اور ہوں گے۔"

"یہ بات غور سے سن۔ تیرے ساتھ راستے میں جو بھی ہوا ... نہیں گے" میں نے کہا "گھر والے باہر گئے ہوئے ہیں۔ وہ واپس آئیں تو انہیں یہ سب نہیں بتانا ہے۔ ہم چلتے ہیں۔"

غالب نے کہا "تم کہاں جا رہے ہو یار؟ مجھے اکیلا چھوڑ کے"

"تمہارے ساتھ کالیا ہے" میں نے ہنس کے کہا "ابھی باقی سب لوگ بھی آ گئے ہوں گے۔"

"میں کیا بتاؤں یار؟ ... بھی کیا بتا سکا۔"

"کہنا یہ شخص چوروں کی طرح گھر میں گھسا تھا۔ میں نے اوپر سے گولا مار دیا۔" میں نے کہا "میں ان لاشوں کو ٹھکانے لگا کے بھائی منظر کو گھر چھوڑ دوں گا اور آ جاؤں گا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں۔"

غالب کو میری حکمت عملی سے اختلاف ہو گا مگر اسے سوچنے سمجھنے یا جرح کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں نے حملہ آوروں کا اسلحہ اسٹور میں چھپایا اور منظر کو ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ وقار یوسف شاید کسی ... کے چکر میں وہ چلا گیا تھا یا وہ لوگ آئس کریم کھانے کے بعد باتوں میں مصروف ہو گئے تھے چنانچہ مجھے اتنی مہلت مل گئی تھی۔

ذرا تیز ... میں کر رہا تھا "منظر۔ یہ حملہ آور کون تھے؟"

"میرے سالے تھے سب ... سے آئے تھے؟" منظر جھلا کے بولا۔

"تجھے کہاں ملے تھے؟"

"راستے میں یار۔ سامنے آ گئے گاڑی کے۔ ایک ہوتا تو میں سالے کے اوپر سے گزر جاتا مگر وہاں تو چار تھے اور سب مسلح تھے۔ مجھ سے کہنے لگے "وکیل صاحب! ہم ساتھ چلیں گے تمہارے۔ جہاں بھی تم جا رہے ہو" میں نے کہا "میں تو جہنم میں جا رہا ہوں" وہ خبیث تو سب تھے مگر یہ کالیا بڑا حرامی ہے۔ کہنے لگا کہ "ہم جہنم رسید بھی کر سکتے ہیں تمہیں لیکن تم شرافت سے چلو گے تو ابھی دنیا میں اور کچھ دن گزار لو گے" میں نے کہا "تم سب خاندانی شرافت کا ثبوت دے رہے ہو" تو سالے نے کھٹ سے ریوالور مار دیا میرے سر پہ اور ٹھونس دیا ڈگی میں۔"

منظر کی بات سنتے ہوئے میں راستے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ایک ویران اور تاریک موڑ پر میں نے گاڑی روکی اور ڈگی کھول کے ایک لاش باہر گرا دی۔ ایک میل بعد میں نے دائیں جانب موڑ کاٹ کے دوسری لاش چھوڑ دی اور پھر ایک میل بعد سیدھے ہاتھ پر آخری لاش پھینکی تو ... یوسف کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔

"اب تم بھی اتر جاؤ" میں نے منظر سے کہا۔

"اس بھوتنی کے کو بھی اپنے سالوں جیسا سلوک کرنا ہے۔"

میں نے کہا "وکیل صاحب۔ کون سا پولیس اسٹیشن یہاں سے قریب ہے؟"

"قریب کوئی نہیں۔ ایک ڈیڑھ میل دور ہے۔"

"گاڑی میں یہاں چھوڑ رہا ہوں۔ میں خود بھی پیدل واپس جاؤں گا۔ تم رپورٹ لکھوا دو کہ تم سے چار مسلح افراد نے گاڑی چھین لی تھی۔ تم اپنے سر کی چوٹ کو بطور شہادت پیش کر سکتے ہو۔ معلوم نہیں وہ کون لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے۔ تم تو صرف وقار

www.paksociety.com

یوسف ایڈووکیٹ کے گھر جانے کے لیے نکلے تھے۔ تمہارا بیان بھی اتنا ہی ہوگا۔"

"اور رہ گیا وقار یوسف۔ کیا گھر میں ہوا تھا؟"

"وہاں تم نہیں پہنچے رنگیلی صاحب۔ وہاں کی بات کیوں کرتے ہو۔ وہاں کے معاملات ہم سنبھال لیں گے۔"

"دیکھو یار سکندر۔ میری پہلی غلطی معاف کر۔ بیوی تو اپنا حق مہر معاف کرتی۔ حق زوجیت تک معاف کرنے کو تیار ہے۔"

میں نے کہا "مگر میری کیا غلطی ہے؟"

"یہ غلطی تیری نہیں، میری تھی۔ دو سزا کا پنگا لیا تیرے ساتھ۔ خواہ مخواہ۔"

میں نے ہنس کے کہا "تیری پہلی غلطی تھی تیرا پیدا ہونا۔"

"نہیں یار۔ تو چھوڑ یہ سارے دھندے۔ میں اپنی جان بچا کے بھاگ جاتا ہوں اور اپنے ساتھ رابعہ کو بھی ورغلا کے لے جاتا ہوں۔ تو میرے سارے بچے لے جا اور جیم خانہ کھول لے۔ قسم خدا کی بڑے فائدے میں رہے گا۔ بڑی کمائی ہوگی۔ رابعہ یوں بھی تجھے عاق کرنے والی ہے۔"

میں نے گاڑی روک کے انجن بند کیا، چابی نکالی اور کہا "خدا حافظ۔"

"ابے سکندر۔ بھوتنی کے۔ اللہ کرے تیرے بھی سولہ بچے ہوں ایک بیوی سے اور تیری چار بیویاں ہوں۔ ایسی کی تیسی وکالت کی۔ میں ابھی تھانے جاکے تیرے سب جرائم کا اقرار کرلیتا ہوں کہ سب تو میں نے کیا تھا سکندر نہیں کے۔ مجھے پھانسی چڑھا دو۔"

وہ بکتا جھکتا چلا گیا اور میں کالا اللہ سمت میں چلتا ہوا آدھے گھنٹے بعد وقار یوسف کے گھر پہنچا تو حسب توقع وہاں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ مجرم یعنی مسٹر کالیا کو ایک کرسی سے باندھ دیا گیا تھا اور سب لوگ اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ کالیا ویسے تو ہوش میں تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ غالب نے جو اسے ماری تھی اس نے دماغ کے اندر نٹ پرزے ڈھیلے کردیے تھے۔ وہ گول گول آنکھیں گھما رہا تھا اور جھومنے کے انداز میں سہلاتے ہوئے بلاوجہ مسکرا رہا تھا۔

غالب نے مجھے دیکھتے ہی کہا "آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟"

میں نے کہا "حرام خوری... معاف کرنا ہوا خوری کے لیے۔ یہ کون ہے؟"

وقار نے مجھے غور سے دیکھا "غالب کا کہنا ہے کہ یہ چور ہے مگر کمال کی بات یہ ہے کہ یہ کچھ لے کر نہیں گیا۔"

"میں نے آہٹ سنی اور اوپر سے دیکھا تو حضرت تھے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ ایک پھول پھینکا تھا ان پہ۔ گملے سمیت۔" غالب بولا۔

وقار نے کہا "چور اندر پھرتا رہا۔ اس نے الماریاں کھول کر دیکھیں۔ سب کچھ سامنے ہی رکھا تھا۔ چاہتا تو سب سمیٹ کر نکل جاتا۔"

"بے وقوف یا ناتجربہ کار لگتا ہے۔" ثمینہ نے [illegible] مار کے کہا۔

وقار کی بیوی نے کہا "چلو شکر ہے کچھ گیا نہیں۔ بلاؤ پولیس کو اور ان کے حوالے کردو۔"

"خواہ مخواہ مصیبت کو بلاتی ہو۔" وقار نے کہا "نقصان تو نہیں ہوا تو رپورٹ لکھوانے سے فائدہ۔ یہ مجھے دیکھنے میں لگتا ہے یا پھر مخبوط ہے۔"

"یہ خود کیا بتاتا ہے اپنے بارے میں؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے کہہ رہا تھا میں قطب مینار ہوں۔ پھر کہنے لگا [illegible] قطب الدین ہے اور میں ہرن مینار پہ ہرن پکڑنے [illegible] سے کہہ رہا تھا کہ تم میری پھوپی ہو۔ رابعہ سے پوچھا کہ فلم بجلے رانی میں جو ٹوپی لگائی تھی وہ کہاں ہے۔ سانو [illegible] بات پر" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "یہ پاگل ہے تو پھر اسے باندھ کے کیوں رکھا ہے؟"

رابعہ نے کہا "شاید یہ پاگل بن گیا ہے۔ اصل [illegible] ہے۔"

شک تو اور کو بھی تھا مگر میرے اور غالب کے پاس [illegible] نفاذ تھا اور نہ شک پیدا کرنے والی کوئی بات تھی۔ [illegible] تماشے کی پوزیشن میں نہیں تھا یا بتانا نہیں چاہتا تھا۔

موقع ملتے ہی میں نے وقار یوسف سے کہا "اس کو پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے باہر لے جاؤ ورنہ پچھلی گاڑی [illegible] دو۔ اچھی طرح باندھ کے اور منہ بند کرکے پھر گاڑی [illegible] جاؤ۔"

"یہ چکر کیا ہے آخر؟"

"تمہیں معلوم ہوجائے گا لیکن خواتین کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔" میں نے کہا "ذرا بھی [illegible] کے بعد چابیاں گاڑی [illegible] دینا اور کہہ دینا کہ چور کو پولیس کے حوالے کردیا ہے۔ وہ چلا لیں گے کہ پاگل پن اصلی تھا یا نہیں۔ رپورٹ نہیں لکھوائی۔"

سخت کشمکش ہونے کے باوجود وقار یوسف نے [illegible] لی۔ اس نے رات بارہ بجے گاڑی پورچ میں کھڑی کرکے اشارے سے بتادیا کہ سب میری مرضی کے مطابق ہو گیا۔ رابعہ اور سانو خاصی پریشان اور متفکر نظر آتی تھیں۔ شک ہو رہا تھا کہ اندر ہی اندر ہم کوئی کھچڑی پکا رہے ہیں۔ [illegible] بالکل نارمل نظر آنے کی کوشش کررہے تھے۔ وقار یوسف بیوی کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں جا کے سو گیا۔ [illegible] بھی نہیں آرہی تھی مگر وہ اپنی بیوی کو تنہائی سے بچا [illegible] رابعہ اور سانو دوسرے بیڈ روم میں چلی گئیں اور بہت دیر تک چپکے باتیں کرتی رہیں۔ غالب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا کہاں چھوڑا تھا اور لاشوں کا کیا [illegible] تھا۔ میں [illegible] کے جانے کا انتظار کرتا رہا۔

[illegible] بیڈ روم کے کلاک نے دو گھنٹے بجائے۔ میں اس وقت [illegible] ڈرائنگ روم [illegible] تھا۔ میں باتھ روم جانے کے بہانے اٹھا اور میں [illegible] دروازے سے لگ کے رابعہ اور سانو کی گفتگو سننے کی کوشش [illegible] کھسر پھسر کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ غالباً وہ لائٹ آف کرکے [illegible] کے خلاف [illegible] پر اظہار خیالات فرما رہی تھیں۔ غالب نے [illegible] باہر جاتے دیکھا تھا اور خود بھی میرے پیچھے آیا تھا۔ اس نے مجھے باتھ روم سے برآمد ہوتے اور پھر دوسرے بیڈ روم [illegible] کیا تو پھر اپنی جگہ جاکے لیٹ گیا۔

"[illegible] رہی ہیں وہ دونوں؟" غالب نے کہا۔

[illegible] نے جھوٹ بول دیا "نہیں۔ تمہیں کیوں نیند نہیں آرہی [illegible]" میں نے جمائی لے کر کہا اور بستر پر ایسے گر گیا جیسے میں گہری [illegible]

[illegible] بجے کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ غالب سچ مچ سو گیا ہے [illegible] کے خراٹے مصنوعی نہیں ہیں۔ میں کروٹ بدل کے اٹھ بیٹھا۔ اچانک فیصلے کا لمحہ آگیا تھا تو میرے عزم اور یقین کی چٹان میں جیسے دراڑ پڑنے لگی تھی۔ شاید غالب یا رابعہ کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر آج ہی رات عمل درآمد بھی کرگزروں گا۔ لیکن تذبذب اور دو پہلو [illegible] عمل کی گھڑی گزر جائے تو بعض اوقات دامن میں تمام عمر کے پچھتاوے رہ جاتے ہیں بقول علامہ کے:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی!

مجھے ان سب کے جذبات کا خون کرتے ہوئے اور ان کے [illegible] کی زنجیر توڑ کے جاتے ہوئے دکھ بھی ہو رہا تھا اور خوف اندر سے میرے دل میں [illegible] کھٹک رہا تھا کہ [illegible] تعلق ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہوجائے۔ ایسا نہ ہو کہ ان سے بچھڑنے کے بعد دوبارہ ملنا میرے اختیار کی بات نہ رہے۔ میں سچ مچ [illegible] اور یوسف بے کارواں نہ ہو جاؤں۔

میں نے ڈر کو اور وسوسوں کو شیطان کی رخنہ اندازی سمجھتے ہوئے [illegible] کے دل سے نکال دیا اور آہستہ سے کھڑا ہو گیا۔ [illegible] زخم ہے۔ ملنا ہو تو برسوں وقت کی بھول بھلیوں میں بچھڑنے والے بھی اچانک کسی موڑ پر مل جاتے ہیں اور تقدیر میں [illegible] زندگی کے بے خطر راستوں پر ساتھ ساتھ سفر کرنے [illegible] ایک دوست اجل اچانک یوں اچک لیتا ہے کہ [illegible] بات بھی پوری نہیں ہوپاتی۔ امید کے ساتھ یقین کا [illegible] تو آدمی کبھی حوصلہ نہیں ہارتا۔

میں نے خاموشی سے باہر آکے اسٹور کا دروازہ کھولا اور اس [illegible] نکال لیا جو ہم نے حملہ آوروں سے چھینا تھا۔ ایک [illegible] کے ساتھ اضافی راؤنڈ تھے۔ [illegible] اعتبار پہ بجلی پور کے ریوالور تھے جو پوری طرح لوڈڈ تھے۔ میں نے ان چیزوں کو وقار یوسف کی گاڑی میں پیچھے کی سیٹ پر رکھ دیا۔ گاڑی کا ڈرائیونگ سائڈ والا دروازہ لاک نہیں تھا۔ اندر سے چابیاں نکال کے میں نے ڈکی کھولی تو ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ میں نے فوراً پورچ کی لائٹ آف کردی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے ڈکی میں جھانک کر دیکھا۔ کالیا بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ کہیں وہ مر نہ گیا ہو۔ میں جھک کر اس کی سانس کو محسوس کرنا چاہتا تھا کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

وقار جب اسے تھانے لے گیا تھا تو کالیا کو مضبوطی سے باندھ کر اچھی طرح چیک کرنے میں غالب نے بھی مدد کی تھی۔ اکیلا وقار یوسف یہ کام اتنی خوبی سے نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی جس کا مطلب یہ تھا کہ حوصلہ رکھو۔ ابھی سب ٹھیک ہوجائے گا۔

میں نے ڈکی بند کی اور گیٹ کی طرف گیا۔ فولادی گیٹ کی کنڈی کو آواز کیے بغیر کھولنا آسان کام نہیں تھا۔ گھر کے اندر جو لوگ سو رہے تھے ان کے لاشعور میں خوف جاگ رہا تھا۔ وہ معمولی سی آہٹ پر اٹھ کر بیٹھ جاتے یا تصدیق کے لیے آجاتے کہ کہیں چور کے بعد ڈاکو تو نہیں آگئے۔ وہ سب ایک سے حالات سے دوچار تھے اور سوتے جاگتے انہیں ہر سمت سے خطرات کی یلغار کا نفسیاتی خوف لاحق رہتا تھا۔ نقوی صاحب کے بعد شبلی کے قتل نے اور بعد کے واقعات نے سب سے تحفظ کا احساس چھین لیا تھا۔ اگر میری موجودگی میں وہ خود کو زیادہ غیر محفوظ سمجھتے تھے تو حق بجانب تھے۔ بعد میں مجھے امید تھی کہ وقت گزرتا جائے گا اور زندگی معمول پر آجائے گی تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔

میں نے پھاٹک کھولا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ اس وقت کوئی بھی جاگ اٹھتا تو وہ سب کو اٹھا دیتا اور میرے فرار کی پہلی کوشش ہی ناکام ہوجاتی تو دوسری کی کامیابی زیادہ مشکل ہوجاتی۔ اب مرحلہ تھا گاڑی کو باہر نکالنے کا۔ میرا خیال تھا کہ گاڑی کو خود ہی دھکیل کر باہر لے جاؤں پھر گیٹ بند کروں اور گھر سے کچھ دور لے جاکے گاڑی اسٹارٹ کروں تاکہ کسی کو پتا نہ چلے اور سکندر کی دغابازی کا علم صبح سے پہلے کسی کو نہ ہو۔

میں گیٹ کھول کر پلٹا تو میرے قدم ایک جھٹکے سے یوں رک گئے جیسے غلطی سے میرا پاؤں بجلی کے ننگے تار پر پڑ گیا تھا۔ گاڑی کی اگلی سیٹ پر ایک سایہ سا نظر آیا تھا۔ تاریکی میں ونڈ اسکرین کے شیشے کے پیچھے رابعہ کا چہرہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اندھیرے کمرے میں گھڑی کا روشن ڈائل نظر آتا ہے۔ نہ جانے کب وہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر آ بیٹھی تھی۔

میں تھکے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا۔ "رابعہ۔"

اس نے مسکرا کے ہونٹوں پر انگلی رکھی "چلو۔"

www.paksociety.com

میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "کہاں جانا ہے تمہیں؟" میں نے بدمزگی سے کہا۔

"جہاں تم جا رہے ہو۔" وہ بولی۔

مجھے اپنی کوشش ناکام ہونے پر صدمہ بھی تھا اور پکڑے جانے کی خفت الگ تھی۔ "میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔" میں نے غصے کو ضبط کیا۔

"پھر تم بھی نہیں جا سکتے۔" اس نے پرسکون اور مضبوط لہجے میں کہا۔

"رابعہ! دیکھو میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"پہلے یہاں سے نکلو، پھر بات بھی سمجھ لوں گی تمہاری۔ کوئی آ گیا تو..." وہ گھر سے بھاگنے والی کسی کالج گرل کی طرح شوخی سے مسکرائی۔

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند۔ رابعہ نے میرے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا اور اب مجھے کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ آج رات میرے لیے اپنے منصوبے پر عمل کرنا ممکن ہو۔ میں زبردستی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ورنہ میری پوزیشن زیادہ خراب ہوتی۔ ایک آخری امید یہ تھی کہ میں رابعہ کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں اور اسے قائل کرنے کی کوشش کروں کہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس میں سب کی بہتری ہے لیکن میرا ساتھ کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ مجھے کسی قیمت پر منظور نہیں ہوگا۔ اگر میں رابعہ کو قائل کر سکا تو شاید وہ صبر اور تدبر سے کام لیتے ہوئے مجھے جانے دے ورنہ خیریت سے گھر کو آ سکے یہ تو طے ہے۔

"اچھا پیچھے اترو۔ دھکا لگاؤ گاڑی کو۔" میں نے کہا۔

"پہلے تم اترو۔" اسے ڈر تھا کہ شاید میں اسے دھوکا دے کر نکل جاؤں گا۔

میں نے گاڑی کو دھکیلا۔ پورچ کی ڈھلوان سے گاڑی خود ہی چلتی سڑک پر پہنچ گئی۔ میں نے احتیاط سے گیٹ برابر کیا اور پھر گاڑی کو دھکا لگانے لگا۔ خود میں شاید اتنی دور تک گاڑی کو نہ دھکیلتا مگر غصے میں اور ایک انتقامی جذبے کے تحت میں نے رابعہ کو بھی ایک ایسا کام کرنے پر مجبور کیا جو ہرگز زنانہ کام نہیں تھا۔ میں اسے سزا دینا چاہتا تھا۔

جب خود میرا سانس پھولنے لگا تو میں دروازہ کھول کے اندر بیٹھ گیا۔ رابعہ فوراً دوسری سیٹ پر گر گئی۔ "مروا دیا..." اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"مروا دیا... میں نے؟ تم نے مروا دیا مجھے۔" میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اور ہانپتے ہوئے کہا "کس الو کے پٹھے نے کہا تھا..."

"خود کو... گالی مت دو۔" وہ بولی۔

"میں نے... میں نے کہا ہو تو لعنت مجھ پر۔" میں نے جل بھن کے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ تم اس طرح جا سکتے تھے مجھے چھوڑ کے؟" رابعہ نے خفگی سے کہا "مجھے معلوم تھا... کتنے کمینے ہو تم۔"

"اب تو معلوم ہو گیا نا؟" میں نے کہا "جتنا تم سمجھتی ہو کہیں زیادہ کمینہ ہوں میں۔"

"پھر میں بھی کم نہیں ہوں۔ کمینوں کے ساتھ کمینہ بننا پڑتا ہے۔"

"تم دیکھنا میں چلا جاؤں گا۔ اور ضرور جاؤں گا" میں نے اسٹیئرنگ پر مکا مار کے کہا "آج نہ سہی کل۔ تم مجھے روک نہ سکو گی۔"

"میں آج کب روک رہی ہوں تمہیں!"

میں نے دانت پیس کے کہا "میرا واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی جا رہی ہوں۔"

میں بھونچکا رہ گیا "تم... پاگل ہو گئی ہو۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے یہی بات میں نے تم سے کہی تو جواب دیا تھا تم نے 'یار سب' پاگل کا ساتھ پاگل ہی دے تو پھر... خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

میں نے کہا "کہاں بیٹھیں گے۔ تمہارے ماموں کے مہمان خانے میں۔ جنگل میں یا کسی درگاہ کے مجاور بن کے۔ یہی ہوتا تو میں نہ بیٹھا رہتا آرام سے؟"

"گاڑی چلاؤ آرام سے۔ ابھی کھمبے سے ٹکرا جاتے۔"

"تم مجھے غصہ دلا رہی ہو۔ اگلے کھمبے سے میں خود ہی ٹکرا دوں گا۔"

"اگلا کھمبا تو گزر گیا۔ آگے تمہاری مرضی۔ ساتھ جئیں گے اور ساتھ مریں گے۔"

میں نے گاڑی روک لی "ڈیئر رابعہ۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہماری یہ زندگی لیلیٰ مجنوں کی کہانی نہیں ہے۔ یہ تو ایسی کہانی ہے اس پر فلم بن ہی نہیں سکتی۔ اب صحرا نوردی اور جوگی ہونے کے زمانے گئے۔ اصل مجنوں بھی جنگل میں اکیلا ہوتا تو اسے محکمۂ جنگلات والے پکڑ لیں گے۔ سانپ کاٹ لے گا یا ہو جائے گا بچھو ڈنک مار کے کاٹ لے۔ فلموں والے ڈائیلاگ بول کر ساتھ جئیں گے اور ساتھ مریں گے۔ مریں ہمارے دشمن، ہم ساتھ جئیں گے لیکن..."

"لیکن ساتھ رہیں گے نہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

میں نے کہا "پلیز! عقل سے کام لو۔"

"صرف میں عقل سے کام لوں پھر جذبات کا کیا کروں؟ تجوری یا لونڈ اسٹور روم میں رکھوانے کی چیز ہوتی تو رکھوا دیتی۔ ویسے بھی میں عورت ذات ناقص العقل۔ میرا سارا اختیار تو تمہیں دے دیا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ رابعہ کو بحث سے قائل کرنا مشکل ہوگا "رابعہ! ذرا سوچو تم میرا ساتھ کیسے دے سکتی ہو۔ میری اور تمہاری پوزیشن میں بہت فرق ہے۔ میں ایک مفرور اشتہاری مجرم ہوں۔ تم ایک باعزت اور عزت دار وکیل ہو۔"

"میں تو بس ایک بات جانتی ہوں وہ یہ کہ تم سکندر ہو اور میں رابعہ۔ باقی سب باتوں سے مجھے کیا لینا دینا۔ ہاں تم انکار کر دو کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ یقین دلا دو مجھے کہ تمہیں کل بھی میری ضرورت نہیں ہوگی۔ کبھی نہیں ہوگی۔ تو میں تمہارا ساتھ کیا یہ دنیا چھوڑ دوں گی۔"

"بس اب تم اپنا آخری ہتھیار آزماؤ گی۔ رونا شروع کر دو گی" میں نے تنبیہ کے کہا "لیکن میں اس ڈرامے سے متاثر ہونے والا نہیں۔"

وہ جھک کے بولی "لیکن کرو نہ بے ذرا... تم مجھے رلانا چاہتے ہو۔"

میں نے فخر سے کہا "یہ تو خالص زنانہ ادا ہے کہ تم تو مجھے چھوڑو گے۔ مجھے معلوم ہے تم مجھے چھوڑو گے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تم ہنستی رہو۔"

"تو پھر چلو۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"تم جذباتی ہو رہی ہو۔ بعد میں پچھتاؤ گی۔"

رابعہ نے چبا چبا کے لہجے میں کہا "بہت پچھتا چکی میں۔ پچھتائی میں تم سے مل کے بھی۔ زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی۔ پھر تم سے محبت کر کے پچھتائی تھی میں مگر یہ میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔ ہونی کو انہونی کون کر سکتا تھا۔ پھر میں تمہارا ساتھ چھوڑ کے اور واپس آ کے پچھتائی تھی۔ مجھے بتاؤ کیا تمہیں دکھ نہیں ہوا تھا۔ کیا تم نے نفرت نہیں کی مجھ سے یہ سوچ کر کہ رابعہ کم ہمت ثابت ہوئی تھی۔"

"بس... اور بات تھی۔" مجھے کوئی جواب نہ سوجھا۔

"پھر میں پچھتائی تھی اپنی پریکٹس دوبارہ شروع کر کے۔ میں پچھتائی تھی تمہارے ساتھ بے نیازی کا اور غیریت کا انداز اختیار کر کے حالانکہ اس میں بھی میرے جذبات کی خیر خواہی شامل تھی لیکن اس کی بہت سخت سزا دی تم نے مجھے۔ تم نے یہ ظاہر کیا کہ تمہیں میری پروا نہیں اور تم شیلی کے ساتھ ہو گئے۔"

"اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے کہو۔ کیا تمہیں واقعی یقین تھا کہ میں شیلی کی خاطر تمہیں چھوڑ دوں گا؟"

"نہیں... یہ تو خیر ناممکن تھا۔ مگر میں تمہارا جھوٹا تعلق بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ تم کسی عورت میں مجھے جلانے کے لیے دلچسپی لو یہ بھی گوارا نہیں مجھے۔ پتا نہیں کیسے میں نے ضبط سے کام لیا۔ غالب اور نازنین روٹھے رہتے تو کسی دن... خیر چھوڑو۔"

"مجھے شیلی کی موت کا کتنا دکھ ہے!"

"تم سے زیادہ مجھے دکھ ہے۔" رابعہ نے کہا "اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"میں اور کوئی غلطی نہیں کروں گی۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم کتنے ضدی ہو۔ تم کسی کی نہیں مانو گے اور جب تک انتقام نہیں لو گے چین سے نہیں بیٹھو گے۔ میں نے بہت سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ بن کے رہنا چاہیے اپنے شاندار سجے گھر میں؟ اور جدائی کے بعد انتظار کے عذاب کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کے صبر کرنا چاہیے؟ وقت ہر زخم کا درماں بن جاتا ہے تو کیا مجھے وقت گزارنے کے لیے خود کو شب و روز کی مصروفیات میں خود کو بھی بھلا دینا چاہیے؟ کیا مجھے تمہارے بغیر زندگی کو جینے کی سزا بناتے ہوئے خود کو تنہائی کی اذیت، محبت سے محرومی اور احساسِ پشیمانی کے جہنم میں جھونک دینا چاہیے؟ یا کوئی اور سہارا تلاش کر لینا چاہیے۔ جینے والے یوں بھی تو جیتے ہیں آخر کہ تم نہیں اور سہی۔ اور نہیں اور سہی... ایک سکندر میں کیا ہے جو کسی اور میں نہیں لیکن افسوس کہ ہر سوال کا واضح جواب نفی میں تھا۔ وہ سب ناممکن تھا جو میرے دیوانہ وار بھٹکتے ہوئے ذہن نے سوچا تھا۔ میرے سامنے تو صرف ایک ہی درِ امکاں کھلا ہوا تھا۔ باقی سب در بند تھے۔ اگر تم میرا ساتھ نہیں دے سکتے تو پھر میں تمہارا ساتھ دوں۔ سایہ تو وجود کے ساتھ ہی رہے گا۔ آگے رہے یا پیچھے۔"

میں نے اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو۔ اس کے لب و رخسار کو چومتے ہوئے میں نے کہا "رابعہ۔ پلیز میری بات مان لو۔ واپس چلی جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ لوٹ کر ضرور آؤں گا تمہارے پاس۔"

اس نے میرے شانے پر سر کو نفی میں ہلایا "نہیں سکندر۔ میں نے سب کو چھوڑ دیا ہے۔ میں صرف تمہارے ساتھ ہوں۔ نہیں کرنی مجھے وکالت۔ کیا ملے گا مجھے دنیا کے مقدمات لڑ کے اگر میں اپنی محبت کا کیس ہی ہار گئی۔ پیسے کی کسے ضرورت ہے۔ بہت ہے ہمارے پاس ہماری زندگی کے لیے۔ اب نہ میں تمہاری وکیل ہوں اور نہ تم میرے موکل۔ تم میری زندگی ہو۔ میرا مستقبل ہو۔ تم میرے ہو۔ میرے مالک اور میری ملکیت ہو۔ جب ہم اپنا گھر آباد کریں گے تو تم میرے مجازی خدا، اس گھر کے سربراہ، میرے بچوں کے باپ ہو گے۔"

میں دم بخود اسے دیکھتا رہا "اور تب تک۔"

"تب تک تم میرے محافظ ہو اور میں تمہاری محافظ ہوں۔ ٹھیک ہے کہ میں مرد کی طرح لڑ بھڑ نہیں سکتی۔ بہت سی خامیاں ہیں مجھ میں مگر میں مر تو سکتی ہوں، تمہارے ساتھ۔ واپسی تمہارے لیے نہیں ہے تو میرے لیے بھی نہیں۔ جیسے میں نے بھی سب کشتیاں جلا دی ہیں۔"

میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کیے۔ "او کے او کے جانم۔ معاف کر دو اپنے سکندر کو جو تمہیں چھوڑ کے جا رہا

www.paksociety.com

تھا۔ کون کہتا ہے کہ تم میں خامیاں ہیں۔ تمہاری سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ تم رابعہ ہو۔ اور معاف کرنا میں سکھاؤں گا تمہیں۔ قتل کرنا تو آتا ہے تمہیں۔ عشوہ و غمزہ و ادا سے؟"

وہ مسکرانے لگی۔ میں نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی۔ اب صبح کے ساڑھے چار بجنے والے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اجالا پھیلنے سے پہلے آبادی سے نکل جاؤں۔ وقار کی گاڑی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس کی چوری یا گمشدگی کی رپورٹ نہیں لکھوائے گا۔ اسے یہ بھروسا بھی رہے گا کہ میں اس کی گاڑی کسی واردات میں استعمال نہیں کروں گا۔ اس کے پاس اپنے سسر نقوی صاحب، مرحوم کی چھوڑی ہوئی دو کاریں تھیں۔ نقوی صاحب کی واحد وارث کی حیثیت سے ان کی بیٹی کو سب کچھ مل گیا تھا۔ قانونی کارروائی محض رسمی ضرورت تھی۔ نقوی صاحب کی بڑی عالی شان کوٹھی اور ان کا سارا اثاثہ بالآخر وقار کے تصرف میں آ گیا تھا۔ غریب کنگلا بندہ۔ مقدر نے زند تلندر۔ نقوی صاحب نے تو سوچا ہوگا کہ میری بیٹی کسی نوب بیوروکریٹ یا صنعت کار کے گھر جائے گی۔ دولت کا یہ دریا کسی دوسرے دولت کے دریا میں گرے گا تو دولت کا سمندر بن جائے گا اور ان کے بعد ان کی آنے والی نسلیں اس سمندر پر حکمرانی کریں گی۔ ہوس کو یہ تماشا کار کیا گیا۔ شاید زیادہ عبرت ناک ایک دوسرا معمہ ہے کہ سارا وسو برس کا بے پل کی خبر نہیں۔ آدمی قصے زیادہ سے زیادہ سو برس بعد قبر میں جا لیٹتا ہے کیوں پریشان رہتا ہے کہ اس کے بعد اگلے سو سال یا دو سو سال میں اس کی دولت کا درخت کتنا پھلے گا۔ کیا کر سکتا ہے کسی کی دولت یا اب بچی کا ڈھانچا جس نے عمر بھر بیسہ جوڑنے کے گزاری ہو۔ اگر اس کی اولاد سب ہوتے میں ہار دے یا فقیروں میں بانٹ دے۔

وقار یوسف کی گاڑی فی الحال میری ضرورت تھی۔ ایک تو اس لیے کہ میرے پاس ولاور کے رابطے کا واحد ذریعہ اس گاڑی میں نصب ریڈیو رابطے کا سسٹم تھا پھر اس کی ڈکی میں ایک شخص بند تھا جو مجھے مفید معلومات فراہم کر سکتا تھا۔ یہ گاڑی محفوظ بھی تھی کیونکہ ایک وکیل کے نام پر رجسٹرڈ تھی اور اس کے بارے میں چوری کی رپورٹ ہونے کا امکان نہیں تھا۔

میں سیدھا قصور کی طرف نکل آیا تھا اور اب کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا جہاں میں اپنی گاڑی کے ساتھ حفاظت سے ایک دن گزار سکوں۔

اچانک رابعہ نے کہا "ٹھہرو۔"

میں نے کہا "ہاں۔ حیرانی کی کیا بات ہے۔ پہلے شہر نہیں دیکھی؟"

"شہر ریسٹ ہاؤس ہے" رابعہ نے کہا۔

"ریسٹ ہاؤس۔ یعنی آرام کرنے کی جگہ؟" میں نے اسے ڈانٹا "ابھی سے آرام کی سوجھ گئی" اور گاڑی کا رخ ریسٹ ہاؤس کی طرف کر دیا۔

"تم نے اسلحہ سیٹ پر ڈال رکھا ہے۔"

"ارے۔ یہ تو میں بھولا ہوا تھا" میں نے گاڑی روک لی۔

"اسے سیٹ کے نیچے کر دو۔ اور یہ لو۔"

میں نے کہا "یہ کیا ہے؟ گھر سے سفر کے لیے آلو قیمہ اور پراٹھے پکا کے لائی ہو؟"

وہ ہنسی "اس میں باقی رقم ہے۔ سنبھال کے رکھو۔"

"یہ رقم کہاں سے آئی؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"بھول گئے کل کو اس کے منہ بولے بھائی نے چار لاکھ دیے تھے۔ ایک لاکھ تو محسن لے گیا تھا۔ باقی غالب نے۔"

"اچھا اچھا۔ حساب بعد میں دیتا۔ یہ بتاؤ کہ تم کیوں اٹھا لائی ہو یہ رقم؟"

"اس لیے کہ ضرورت پڑے گی تو ہم کس بینک سے چیک کیش کرائیں گے۔ ضرورت کہیں بھی پڑ سکتی ہے۔"

میں نے پچھلے والی سیٹ نکالی۔ "تم نے اپنی افادیت ثابت کرنی شروع کر دی ہے ابھی سے۔"

پچھلے والی سیٹ کے نیچے ایک سب مشین گن کے لیے جگہ تھی۔ میں نے نقد رقم بیگ سے کچھ اپنے پاس رکھ کے باقی وہیں چھپا دی اور سیٹ کو پھر فکس کر دیا۔ ایک ریوالور چیک کر کے میں نے رابعہ کو تھما دیا اور دوسرا اپنے پاس رکھ لیا۔

شہر کے کنارے والی سڑک پر دو فرلانگ ڈرائیونگ کے بعد میں نے محکمۂ انہار کا ریسٹ ہاؤس دیکھا۔ سرکاری عمارات کے طرز کا ریسٹ ہاؤس خاصی محفوظ جگہ تھی۔ اس کے احاطے میں ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے طویل برآمدے کے دوسرے کنارے پر گاڑی روکی تو دائیں جانب کی گلی سے ایک بوڑھا نمودار ہوا۔ اس کے سر کے بال تقریباً سفید تھے اور خاکی وردی برسوں پرانی لگتی تھی۔

کوئی سوال کیے بغیر اس نے مجھے ہاتھ اٹھا کے سلام کیا۔ ان غریب چوکیدار قسم کے ملازموں میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں ہوتی کہ وہ کسی کار میں آنے والے سے آمد کی غرض و غایت پوچھ سکیں یا ریسٹ ہاؤس میں قیام کی اجازت دینے سے پہلے شناخت کرانے کی درخواست کریں۔ کمرے دستیاب ہوں تو ہر افسر اور صاحب ثروت ان کمروں کو استعمال کر لیتا ہے اور خود چوکیدار کو بخشش کی توقع میں انہیں خوش آمدید کہتا ہے۔ اس وقت سورج طلوع ہو چکا تھا۔

ریسٹ ہاؤس انگریزی حرف ایچ کی شکل میں بنا ہوا تھا۔ دو کمرے بالکل سامنے تھے اور دو ڈرائنگ روم تھے۔ ان کے پیچھے کچن تھا۔ دائیں بائیں محدود سرخ بجری دار چار کمروں کی قطار تھی۔ کار پارکنگ سامنے والے حصے میں تھی۔ جیپ ڈھلتی سے پتہ چلتا تھا لان خاصی کی حالت بتاتی تھی کہ اس کی دیکھ بھال کوئی احسن طریقے سے کرتا ہے۔ کسی دشواری کے بغیر ہمیں دائیں طرف کی قطار کا پہلا کمرا مل

گیا۔ جہاں گاڑی کو ہم سامنے تک لا سکتا تھا۔ چوکیدار نے کمرا کھولنے کے بعد کہا کہ وہ ابھی دو بیڈ منٹ میں صفائی کرا دے گا اور بستروں کی چادر بھی بدل دے گا۔ میں نے افسروں کی طرح شہلایا اور اسے سو کا ایک نوٹ دے دیا "بابا یہ اخراجات کے لیے ہے۔"

"دوپہر کے کھانے میں کیا ہوگا؟" رابعہ نے سوال کیا "ہم جو بھی ہو گا بنے گا۔ ابھی تم چائے بنا لاؤ پھر انڈا پراٹھا۔"

"جی بیگم صاحبہ۔"

"اور کون ٹھہرا ہوا ہے یہاں؟" میں نے کہا۔

"دو ڈاکٹر کے کوئی صاحب ہیں جی" وہ بولا۔

جب وہ چادریں بدلنے آیا تو اس کی بغل میں ایک رجسٹر بھی تھا۔ اس میں نام لکھ دیں اپنا سر۔"

میں نے رجسٹر لے کر اس کے ورقوں صفحات کا مطالعہ کیا اور پھر ایک نام کا انتخاب کیا۔ یہ پبلک ہیلتھ کے ایک زیادہ کمشنر کا کوئی ایکس ای این شیخ رشید تھا۔ ایک تو اس کے دستخط کرنا آسان تھا دوسرے اس کا ہینڈ رائٹنگ بھی کاپی کیا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے چوکیدار نے اندراج پر نظر نہیں ڈالی اور رجسٹر کو اسی طرح بغل میں دبا کے واپس لے گیا۔ وہ رکھ کر پھر جا۔ جب لے کر آیا اور برتن درمیان کی میز پر سجا کے رخصت ہو گیا۔

رابعہ باتھ روم میں جا کے منہ دھو چکی تھی اور ایک بیڈ پر جب لیٹی تھی۔ اسے میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ کار میں ہمارے ساتھ تیسرا مسافر بھی تھا جو ابھی تک ڈکی میں بند ہے۔ مجھے اس کی طرف سے تشویش ہونے لگی تھی کہ کہیں وہ مر نہ چکا ہو۔ ایسے بے حس و حرکت اور بند پڑے رہنے کے علاوہ پچھلے حصے کے جھٹکوں سے سخت مند دی کی قوت برداشت بھی جواب دے جاتی ہے۔

چائے پیتے ہوئے میں نے کہا "رابعہ۔ ایک قیدی کو اندر لانا ہے۔"

وہ چونکی "کون ہے وہ قیدی؟"

"کالیا۔ جو کل رات وقار کے گھر میں پکڑا گیا تھا۔ گاڑی کی ڈکی میں بند پڑا ہے۔"

"گاڑی میں۔ تم ساتھ لائے ہو اسے؟ ... وہ تو..."

میں نے کہا "وقار میرے کہنے پر اسے باہر گھمانے لے گیا تھا اور ڈکی میں بند کر کے واپس لے آیا تھا۔"

"اس نے تو کہا تھا کہ میں تھانے چھوڑ آیا ہوں۔"

"وہ ایک سیاسی بیان تھا جو اس نے میرے کہنے پر دیا تھا" میں نے کہا۔

"یعنی وقار بھی۔" رابعہ خفگی سے بولی "مجھے نہیں بتایا اس نے۔"

"وقتی طور پر تمہارا ماتحت ضرور تھا لیکن اپنے گھر میں وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ میری بات ماننے کے لیے اس نے تم سے اجازت لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تو کوئی قصور نہیں کیا تھا۔"

رابعہ نے پریشانی سے کہا "اندر کیسے لاؤ گے اسے اور لا کے کیا کرو گے؟"

میں نے کہا "پہلے طریقہ بتاؤ اسے اندر لانے کا۔"

رابعہ نے باہر جھانکا۔ وہ جیپ نواب نہیں ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ ذرا بنگلے کا ایک چکر لگاتی ہوں۔ دیکھتی ہوں بابا کیا کر رہا ہے۔ میں اس سے بات کروں گی۔ تم آگے پیچھے دیکھ کے اسے اٹھا لاؤ۔"

"مجھے بس دو منٹ لگیں گے" میں نے زنجیر بجا کے کہا۔

"اس کے بعد گاڑی کو پچھلی طرف لے جانا تاکہ سڑک پر سے نظر بھی نہ آئے" رابعہ نے کہا "کل رات کیا ہوا تھا؟"

"خاصی گڑبڑ ہو گئی تھی پھر بتاؤں گا" میں نے چائے کی پیالی خالی کر کے رکھی۔

رابعہ کے جانے کے پانچ منٹ بعد ہی میں گاڑی کی چابی لے کر گیا۔ تین منٹ بعد واپس آ گیا کہ میں نے کار کی ڈکی کھولی۔ کالیا ہوش میں تھا۔ وہ ہوش میں ہو تو مجھے آنکھیں کھول کے دیکھتا۔ میں نے فوراً نمبر دبا کر نکالا اور اسے بنڈل کی طرح کھینچ کے اٹھا لیا۔

رابعہ کمرے میں پہنچ میں مجھے آدھا منٹ ہی لگا ہوگا لیکن عین اس وقت جب میں دروازے پر تھا ایک لمبی چوڑی اسٹیشن ویگن اندر آ گئی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ اس کی نمبر پلیٹ سے ہی مجھے پتا چل گیا کہ گاڑی پولیس کی ہے۔ پولیس والوں نے تمام کو باادب باملاحظہ ہوشیار کرنے کے لیے اس پر ستاروں کے مونوگرام سے واضح کر دیا تھا کہ یہ سواری خاص ایس پی صاحب کی ہے۔ ونڈ اسکرین کے پیچھے مجھے جو ڈرائیور نظر آیا وہ بھی پولیس کی وردی میں تھا۔

وہ صرف ایک لمحہ تھا جب میں گاڑی کی آواز پر ٹھٹک گیا تھا۔ پولیس کے نام سے ہی مجھے الرجی تھی اور اس کو شدید عاقبت میں ہمارے ساتھ ہی پولیس کا پہنچنا کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔ کالیا کو بیڈ پر ڈالتے ہی میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ پولیس مجھے پکڑنے کے لیے نہیں آئی تھی۔ اس گاڑی میں ایس پی صاحب کی فیملی تھی جو شاید گھومنے پھرنے پکنک منانے یا شکار کے موڈ میں تھی۔ فیملی صرف چار افراد پر مشتمل تھی۔ خود ایس پی صاحب ان کی نصف بہتر اور دو بچے۔

اب تشویش کی بات یہ رہ گئی تھی کہ کیا ڈرائیور نے یا اگلی سیٹ پر تشریف فرما ایس پی صاحب نے میرے کندھوں پر بنڈل کی صورت میں سوار کالیا کو دیکھا ہوگا؟ یہ نہ ہو کہ ایس پی صاحب تفتیش شروع کر دیں۔ شک کرنا پولیس کی عادت ہے نظر ثانی اور اس کے بعد جلد بازی میں یہ ایک جھلک میں بے والا عام آدمی شاید یہ سمجھے گا کہ میرے کندھے پر لپٹا ہوا بستر تھا یا

کوئی بوری نظی گر نہیں میں کیونکہ جو انہیں معلوم ہوتا ہے اس میں ذرا مختلف قسم کے عکس محفوظ ہوتے ہیں۔ میں چور تھا اور میری داڑھی میں تنکا بھی تھا چنانچہ میرا خوف زدہ ہونا ایک فطری سی بات تھی۔

میں نے کالیا کو بیڈ کے نیچے ڈالا اور پھر دروازہ کھول کے بھاگا۔ ایس پی صاحب کے بچے پچھلے صحن کے لان میں دوڑ لگانے چلے گئے تھے اور ادھر سے ان کے چیخنے چلانے کی آواز آ رہی تھی۔ دوسری آواز ایس پی کی بیگم صاحبہ کی تھی جو اردلی کو عادتاً چیخ چلا کے سامان احتیاط سے اندر لانے کا حکم دے رہی تھیں۔ ظاہر ہے وہ بھی حکم چلانے اور حاکمیت کا اعلان کرنے کی عادی تھی۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ اس نے رابعہ کو دیکھ لیا جو شاید کچن سے برآمد ہوئی تھی۔ رابعہ اپنے لباس، رفتار، حسن اور رکھ رکھاؤ سے بڑی چیز لگتی تھی۔ ایس پی کی بیوی ابھی زیادہ پرانی نہیں ہوئی تھی کہ روایتی تھانیدارنی کی طرح پھول کے ڈھول بن جاتی۔ قبول صورت وہ بھی تھی۔ ایک اور اپنی ہمسر ہم مرتبہ بیگم صاحبہ کو دیکھ کر وہ خود ہی آگے بڑھی اور انہوں نے مصافحہ کیا تو میں نے سوچ لیا۔ بھلا چودھری کی بیوی اور کوتوال کی بیوی سہیلی ہو سکتی ہیں؟ سماجی تعلقات استوار کرنے کا یہ کوئی موقع نہ تھا۔ رابعہ بے رخی سے اس کی طرف دیکھے بغیر نکل آتی تو ٹھیک تھا۔ وہ دل ہی دل میں اسے خود دماغ اور بداخلاق کہتی مگر اس کے بعد سلام دعا کو بھی کسر شان سمجھتی۔

رابعہ نے معلوم نہیں کیا کہا اور کیا نہیں کہا۔ جب تعارف طویل ہونے لگا تو میں نے کالیا کو پھر نیچے سے گھسیٹ کر نکالا اور بیڈ پر ڈال کے اس کے ہاتھوں پیروں کو جکڑنے والی رسیاں کھولنے لگا۔ غالب اور دلدار یوسف نے کوئی چانس نہیں لیا تھا اور اسے اتنی مضبوطی سے باندھا تھا کہ میرے لیے کھولنا مشکل ہو رہا تھا۔

رسی کے سارے بل کھل جانے کے بعد بھی کالیا اسی طرح پڑا رہا۔ میں نے کھینچ کر اس کے ہاتھوں کو سیدھا کیا اور پھر پیروں کو تو وہ کراہنے لگا۔ یہ ایک اچھی علامت تھی۔ اس کی کلائیوں پر گہرے نشان پڑ گئے تھے اور دوران خون رک جانے کے باعث وہ تقریباً مفلوج ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے مالش کر کے خون کی گردش کو رواں کیا پھر جگ سے پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔ اوپر چھت سے معلق پنکھا مجبوراً چل رہا تھا۔ سرکاری دفاتر کے اہلکاروں کی طرح سرکاری ریسٹ ہاؤس کے پنکھے کا مزاج بھی بگڑ گیا تھا۔

دروازے پر دستک دی گئی تو میں نے پردہ ہٹایا اور شیشے کے پیچھے رابعہ کے ملبوس کی جھلک دیکھ کے کنڈی کھول دی۔ "مل گئیں سہیلی کو اور ان کے میاں کو بھی ساتھ لے آتیں" میں نے کہا۔

"میں کیا کرتی؟ وہ خود ہی گلے پڑ گئی۔"

"تم کسی جاہل وزیر کی بدتمیز بیگم کا رول ادا کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر نکل جاتیں۔ بڑا اچھا ہوتا اگر وہ برا مان کے شوہر سمیت آ دھمکتی کہ ہمارے ساتھ چائے پینے کے لیے اور پھر پتا چلتا کہ اس کا ایس پی۔ واپسی میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کیے لوٹ جاتا۔"

"خواہ مخواہ بولتے جا رہے ہو۔ ایس پی گیا۔ کسی واردات کی تفتیش کے لیے آ گیا ہوگا۔ شام کو واپسی میں بیوی بچے ساتھ لے کر واپس چلا جائے گا۔" رابعہ نے کہا "نیلوفر میری کلاس فیلو تھی بی اے میں۔"

"کون نیلوفر؟"

"کیا۔ ایس پی کی بیوی۔ اس نے پہچان لیا مجھ کو ورنہ میں کسی جاہل وزیر کی بدتمیز بیوی بن جاتی۔"

"اسے معلوم ہے کہ تم کیا کر رہی ہو؟"

"نہیں۔ یہ کراچی چلی گئی تھی۔ شادی حیدر آباد میں ہوئی اور یہ لوگ وہیں رہتے ہیں" رابعہ نے کہا "کل واپس چلے جائیں گے۔"

"پھر ٹھیک ہے" میں نے کہا "ابھی اسے دعوت کرنا۔ بلائے تو بے شک چلی جانا اور شام تک اسی کے ساتھ رہنا۔ کہہ دینا میرا میاں فلسفی اور پاگل ہے۔ کسی سے نہیں ملتا۔ اس وقت بھی سلطنت ہسپانیہ کے زوال کے اسباب پر غور کر رہا ہے۔ ڈسٹرب کیا جائے تو باؤلے کتے کی طرح کاٹنے دوڑتا ہے۔"

"کون کرتا ہے ایسی باتیں؟"

"شادی کے بعد بیویاں صرف نقائص بتاتی ہیں شوہروں کے خوبیاں شادی سے پہلے دیکھ کر فارغ ہو جاتی ہیں۔ اس لیے۔"

رابعہ ہنسی "واقعی۔ اس نے بھی رونا شروع کر دیا تھا کہ اس کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی تفریح ہے کہ بلاوا آ جائے اور دوڑے چلے گئے ہر وقت تو کیسی نوکری۔"

میں نے کہا "کالیا تمہاری نظر کرم کا طلب گار ہے۔"

"اس پاگل نے ہوش میں آتے ہی شور مچا دیا... پھر نیلوفر فوراً آ جائے گی۔"

"کہہ دینا سکندر اعظم کے زمانے کا مُردہ ہے۔ میرے میاں تحقیق کر رہے ہیں اس لیے شور مچا رہا ہے۔ تمہارے میاں تفتیش کرتے ہیں تو کیا ملزم شور نہیں کرتے؟" میں نے کہا "تمہارا ریوالور کہاں ہے؟"

"کسے شوٹ کرنا ہے ابھی؟" اس نے ریوالور نکال لیا۔

"کسے۔ اگر یہ حلق سے آواز نکالے ویسے تو آنکھیں کھول کے تمہیں دیکھے گا تو پھر بے ہوش ہو جائے گا۔"

"وہ کیوں؟" رابعہ نے برا مان کے کہا "اتنی بری ہے میری صورت؟"

"میرے جیسے ناقل دماغ اور ذہین و ذکی شخص کے ہوش گم ہو گئے تھے تمہیں پہلی بار دیکھ کے تو یہ کالیا کیا چیز ہے۔ باقی یہ کہ ہوش میں آ کر ہوا تو اثر ہوگا۔ وہ غنڈہ جیسا بھی شرارت پر آمادہ ہو گا تو اسے یقین دلانا کہ تمہارے حلق سے آواز نکلی تو ریوالور سے نکلا ہوا گولی کا حلق میں اتر جائے گی۔"

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں ذرا گاڑی لے کر جا رہا ہوں۔"

"اسے لے کر؟" وہ پریشان ہو گئی۔

"نہیں۔ گاڑی کو پیچھے کھڑا کرنے کا مشورہ تم نے تو دیا تھا" میں نے کہا۔

"اچھا۔ جلدی آ جانا" اس نے ہدایت کی "زیادہ دیر نہیں۔"

"نیلوفر آ جائے" میں نے جاتے جاتے پلٹ کے کہا "مصیبت نیلوفر کہہ دینا میرے اصول ہیں۔ ذاتی مہمان ہیں۔ صرف دوستوں سے ملنے ہیں۔ خدا کے علاوہ۔"

گاڑی کو پیچھے لے جانے کا مصرف بڑا اہم تھا۔ میں نے کار کو بیچ ہاتھ کی گلی میں روک کے ریڈیو آن کیا۔ اس کے اسپیکر میں سے خالی دینے لگی۔ میں نے باہر ہاتھ نکال کے ایریل کو ٹھیک کیا اور کہا "ہیلو۔" جواب میں کسی نے ہیلو نہیں کہا۔ میں نے دوسرے نمبر پر کہا "ہیلو چودھری دلاور ہیلو۔"

ایک آواز ابھری "کون بکواس کر رہا ہے؟"

"تمہارا باپ" میں نے کہا "کتے کے بچے دلاور کہاں ہے؟"

"کون دلاور؟" بات کرنے والا سنبھل گیا۔

"عزرائیل سے پوچھو۔ وہ اپنے یادداشت کی فہرست میں سے نام اڑانے جا رہے ہیں۔ ورنہ میں خود آ کے بتاؤں گا تمہیں۔"

"کیا نام ہے دلاور سے؟" وہ ڈر گیا۔

"دلاور کیا تمہارا غلام ہے کہ اس کا نام ایسے لے رہے ہو۔ چودھری صاحب کیا تم ہو؟" میں نے غرّا کے کہا۔

"غلطی ہو گئی۔ آپ چودھری صاحب سے شکایت نہ لگائیں" وہ ایک دم منت سماجت پر اتر آیا "حکم کریں جناب۔"

"چودھری دلاور کو پیغام دو میرا۔ آج رات تک کسی وقت بھی اس سے بات کروں گا۔ خود نہیں بیٹھ سکتا فون کے پاس تو کسی کو بٹھا دے جو ٹیپ کر لے میری بات۔"

"جیسا حکم جناب۔"

"ایک بات اسے پہلے بتا دینا۔ کالیا پہنچ گیا ہے ہمارے پاس خیریت کے ساتھ۔ باقی مال ہم نے واپس کر دیا تھا" میں نے ریڈیو بند کر دیا۔

ریسٹ ہاؤس میں پہنچا تو کالیا ہوش میں آ چکا تھا۔ آنکھیں کھول رہا تھا اور رابعہ سے کہہ رہا تھا کہ وہ کچن تک جا کے ایک کپ گرم دودھ لے آئے۔ ملازمہ نے بتایا کہ پانی کی نہر سامنے بہہ رہی تھی۔ دودھ کی یہاں محاورے کے مطابق بہتی تھیں لوگ دونوں کو الگ الگ رکھتے تھے اور استعمال کرتے تھے۔ شہر والے رفتہ رفتہ پانی میں دودھ ملانے لگے تھے۔ دودھ میں پانی ملانا چھوڑ چکے تھے۔

رابعہ خالص بھینس کے خالص دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے کر لوٹی اور فوراً واپس جانے لگی۔ "دہ۔ نیلوفر بضد تھی ناشتا ساتھ کریں گے۔ میں وہیں جا کے کر لیتی ہوں۔ تمہارے بارے میں وہی کہہ دیا میں نے جو تم چاہتے تھے۔"

"کیا کہہ دیا کہ پاگل فلسفی ہوں؟"

"نہیں یہ میں نے کہا کہ اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کرنے آئے ہیں اور اسی میں لگے ہوئے ہیں۔"

میں نے سوچا کہ اسے جانے کی اجازت دی اور کنڈی لگا کے اپنے تحقیقی مقالے کو دیکھا۔ اب میں اس پر زیادہ یکسوئی کے ساتھ کام کر سکتا تھا۔

میں نے کہا "مسٹر کالیا۔ یہ ٹانک پی لو۔ اگر اس سے تمہارا دماغ درست نہ ہوا تو پھر کھانسی کی دوا دیں گے۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ "تم کون ہو؟"

"بھول گئے مجھے؟" میں نے پیار سے اس کے چپت لگائی "میں کیا ہوں تمہارا پتر کالیا۔ بھالے میں چھالیہ بیچتا تھا۔ یاد آیا میرا نام!"

اس نے نفی میں سر ہلایا مگر میرے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لے کر غٹ غٹ پینے لگا۔ اسے نقاہت بھی تھی اور وہ بھوکا بھی تھا۔

"بابا جی۔ یہ کون سی جگہ ہے؟" اس نے ہونٹ صاف کر کے کہا۔

میں نے ریوالور نکال لیا "یہ جانوروں کا دماغی اسپتال ہے۔ چودھری دلاور کے کتوں کو یہاں اس کے کتوں کو بھی ٹھیک کر سکتا ہوں میں جو بھونکنے کے ساتھ کاٹتے بھی ہیں۔"

وہ بے وقوفوں کی طرح مسکرانے لگا "یہ پٹاخے والا پستول ہے نا۔ میں شبرات پر لایا تھا۔"

میں نے اس پر نظریں جما کے کہا "رات کو تمہارے پاگل پن کا دورہ اس لیے چل گیا تھا کہ اس وقت علاج نہیں ہو سکتا تھا۔"

اس نے ایک دم رونی صورت بنائی "میں گھر جاؤں گا۔"

میں شک میں پڑ گیا۔ سر کی چوٹ سے یادداشت کے متاثر ہونے پر بہت سی فلمی کہانیاں لکھی گئی تھیں اور یہ کوئی بے بنیاد بات بھی نہیں تھی۔ دماغ کے کمپیوٹر کو قدرت نے کاسۂ سر میں بہت محفوظ کر دیا ہے لیکن شدید چوٹ سے کسی ایک حصے کا متاثر ہو جانا ناممکن نہیں ہے۔ میں نے سنا تھا کہ لوگ اندھے یا مفلوج بھی ہو جاتے ہیں مگر میرے ذاتی مشاہدے میں کوئی ایسا کیس نہیں تھا۔ وقتی صدمے یا (CONCUSSION) سے دماغ ہل جاتا ہے تو عارضی بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات آدمی کو پوری طرح ہوش و حواس میں آنے میں وقت لگتا ہے لیکن اس سے پہلے اندرونی چوٹ کی علامات بہت واضح ہوتی ہیں جو کالیا میں نظر نہیں

www.paksociety.com

آرہی تھیں۔

اس کے پیشہ ور بدمعاش ہونے میں کلام نہیں تھا۔ بدمعاش بننا بھی آسان کام بہرحال نہیں ہے۔ ذلت و رسوائی کے احساس سے عاری ہونے کے علاوہ بدمعاشی میں اچھی خاصی قوتِ برداشت کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ بندہ پولیس کی چھترول اور جیل کی سختی بھی جھیل جائے۔ چھترول سے پہلے پولیس کے سامنے معصوم اور بے گناہ بننے کے لیے اچھی اداکاری بھی ضروری ہوتی ہے اور مجرم ذہین بھی ہوتے ہیں کہ پکڑنے والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک دیں۔ سب دیکھتے رہ جائیں اور وہ مالِ غنیمت سمیت کے غائب ہو جائیں۔ چالاک چوروں کے بارے میں تو مشہور ہے کہ وہ آنکھوں سے کاجل چرا لیں اور آنکھوں والے کو پتا نہ چلے۔

کالیا اگر ایکٹنگ کر رہا تھا تو اس کا پتا چلانے کے لیے مجھے یہاں سائنٹیفک طریقے دستیاب نہ تھے مثلاً سوڈیم پینتھنال یعنی (SODIUM PANTHENOL) کے انجکشن جس کو سچ کا ٹیکہ یعنی (TRUTH SERUM) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے اثر سے پاگل بن جانے والا بیچارہ سو جاتا ہے مگر ذہنی طور پر بیدار رہتا ہے اور واقعی پاگل نہ ہو تو پھر ہر سوال کا سچ جواب دیتا ہے۔ ہپناٹزم کے بھی ایسے ہی موثر طریقے ہیں مگر میں نہ ڈاکٹر تھا اور نہ ہپناٹزم کا ماہر۔

میں نے کہا "تو تم شرافت کی زبان سمجھنا نہیں چاہتے اور یار تمہارا پاگل پن ابھی دور ہو جائے گا۔ آسان کام مجھے مشکل طریقے سے کرنا بھی آتا ہے۔"

جانتے بوجھتے میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں اس کی طرف سے غافل اور بے پروا ہو گیا ہوں۔ میں نے گھڑی دیکھی اور ایک جماہی لے کے ریوالور بیڈ کے ساتھ والی ٹیبل پر رکھ دیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا میری توقع کے مطابق تھا اور میں اس کے لیے تیار بھی تھا۔ کالیا بجلی کی طرح اٹھا اور اس نے ریوالور پر قبضہ کرنے کے لیے جست لگائی۔ اس کا ہاتھ ریوالور سے چند انچ ہی دور تھا جب میرے بوٹ کی ٹھوکر اس کی کلائی پر پڑی۔ وہ تھوڑا سا آگے جھکا ہوا تھا۔ میں نے پیچھے سے اس کی گدی پر ہاتھ مارا تو وہ بیڈ سے قلابازی کھا کے لڑھک گیا۔

نیچے گرتے ہی وہ تڑپنے اور مچلنے لگا۔ "میں پستول لوں گا۔ پستول میرا ہے۔"

اس کی عیاری نے مجھے حیران کر دیا۔ ریوالور پر جھپٹنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے وقت اس کی ساری دیوانگی ختم ہو چکی تھی۔ وہ پوری طرح ہوش میں تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ کوشش میں ناکامی کے ساتھ ہی اس نے پھر دیوانگی کی ڈرامے بازی شروع کر دی لیکن اب میں سمجھ چکا تھا کہ یہ ڈراما ہے اور میرا شک دور ہو گیا تھا۔

میں نے اسے اٹھا کے بیڈ پر ڈال دیا "آرام سے لیٹ جاؤ اور شور مت کرو پھر پستول ملے گا تمہیں۔"

وہ کسی فرمانبردار بچے کی طرح خاموش ہو گیا۔

"کھولو" تو اس نے منہ کھول دیا۔ یہ اس کی سمجھ و... اندازہ بھی نہ تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور اس کے سینے پر... حلق سے غوں غوں کی بے معنی آوازیں نکالیں... مجھے ہٹانے کی کوشش بھی کی مگر اس کی گردن... اس کی ٹانگیں چلانے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا... میرے گھٹنوں سے دبے ہوئے تھے۔

اس کی گردن کو جھٹکے دے کر میں نے... "میرا خیال ہے تمہارا پاگل پن ٹھیک ہوا یا نہیں؟"

اس کی سانس رکنے لگی اور آنکھیں حلقوں سے... لگیں۔ اس نے مزاحمت چھوڑ دی تو میں نے اس خیال سے کہ وہ مر ہی نہ جائے اپنے ہاتھ اس کی گردن پر سے ہٹا لیے... سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں...

"میں تمہیں جان سے مارنا نہیں چاہتا۔ میں... مجھے معلوم ہے تم نے صرف حکم کی تعمیل کی تھی... مجبوری کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں۔ یا تمہیں خوف... تھا۔ تمہاری ناکامی کے بعد تمام میرے ہاتھ میں آ گئی... سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ جو تم مجھے مناسب... ہو یا پھر جان دے کر۔"

رقم رابعہ نے ذاتی استعمال کے کپڑوں کے ساتھ... تھی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پچھلا ہے۔ ایک گانٹھ لگا کے رسی کو بیڈ کے نیچے سے گزارا اور دوسری کلائی... اس کے پاؤں کے ساتھ رسی بیڈ کے گرد... اب وہ بیڈ سمیت اٹھ کے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا... سرکاری بیڈ بہت بھدے، بڑے اور بھاری تھے۔

"مجھے تم سے چند سوالات کرنے ہیں" میں نے... واسطہ پولیس سے تو رہا ہو گا۔ ان سے بہتر طریقے... کسی کی زبان کھلوانے کے اور صحیح معلومات حاصل... عام طور پر بلکہ تقاضے قیمت مجرم شرافت سے کچھ نہیں... بھی ولاور کے پیچھے ہو۔ آسانی سے کچھ نہیں بکو گے... کہ ولاور نمک حرامی کے جرم کی سزا دے گا۔ لیکن... اس کے دشمنوں نے پکڑ لیا تو وہ کیا سزا دیں گے؟"

وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا...

"یہ جگہ کچھ محفوظ نہیں ہے" میں نے کہا "... نہیں ہو سکتا پھر یہاں نہ جانے کدھر سے ایک ٹولی آ... ٹوٹی ہے۔ اب ان کے جانے کے بعد تمہاری حمایت... گھومیں گے یا پھر رات کو تمہیں اپنی جگہ لے جائیں... شیطان کے سوا کوئی دخل نہیں دیتا۔ اس وقت تک چپ... رہو، آرام کرو اور سوچو۔ ویسے تھوڑی دیر سے...

...مدتیں بھی گزار سکتے ہو۔ فکر مت کرنا۔ ہم... بنا دیں گے ابھی۔"

اس نے پھر سر کو ہلا کے رضامندی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"...بچہ ہو؟" میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"...باغ لگانے آیا ہے نا؟" میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ایک بات اور سمجھ لو کہ چلانے سے تم کوئی فائدہ نہیں حاصل... الٹا نقصان یہ ہوگا کہ تم اعتبار کھو دو گے۔ کیا ولاور نے بتایا تھا کہ میں جوڑو کرانے بھی جانتا ہوں؟ نہیں بتایا۔ خیر... کے تذکرے کو اپنی دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے سمجھے؟"

...نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھ کے ایک آرام کرسی کا... بھی بیڈ کی طرح بھدے موٹے اور بھاری سال... لکڑیوں کی بنی ہوئی تھی۔ پرانے وقتوں کی عمارتوں کی... فرنیچر بھی اتنا مضبوط ہوتا تھا کہ انگریزوں کے عہد کی میز... آج بھی ریلوے کے ویٹنگ روم، پرانے ڈاک بنگلوں اور... میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جو ٹھیکیدار پچاس روپے میں چار... قیمت کرتے تھے وہ اب سو روپے میں بارہ فٹ کما کے چار... والوں کو نذرانہ دیتے ہیں، چالو کام منظور کرا لیتے ہیں اور... الگ ہو جاتے ہیں۔ آج پوچھنے والا کوئی نہیں تو... کل ہوگا۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میں نے کرسی کو اس کے قریب... کالیا سے کہا "اس لکڑی کے بازو زیادہ مضبوط ہیں یا... تمہارے؟ میرا خیال ہے کہ تم اس کرسی کے بازو پر چڑھ کے کود... کو کچھ نہیں ہوگا۔ اب دیکھو۔"

میں نے ہتھیلی سے ایک وار کیا اور کرسی کا بازو درمیان سے... "تم کو شک ہوگا کہ یہ لکڑی ہی کمزور تھی" میں نے کہا "...دوسرے کی مضبوطی چیک کر لیتے ہیں۔"

...دوسرے بازو پر خود چڑھ گیا اور میرے ایک سو اسی پونڈ... نہیں ٹوٹا پھر میں۔ پھر تھوڑی ہتھیلی مار کے اسے بھی توڑ دیا۔

...اندازہ کر سکتے ہو کہ اس کے مقابلے میں تمہاری ہڈیاں تو... کچھ بھی نہیں... تمہارے بازو "کلائی سے اوپر یا نیچے" اسی طرح... کیسے لگو گے؟ اور ایسے ہی تمہاری ٹانگیں چار... پھر کیا ہو پسلیوں کو توڑا جائے باری باری" اس کے... انگلیاں ہیں۔ ٹخنے ہیں اور گھٹنوں پر چپنی کی ہڈی ہے... کرنے سے تم مرو گے نہیں کالیا لیکن جیلی نشہ جیسی چیز... سب سے نازک اور اہم ہے گردن۔ پھانسی دینے میں... توڑتے ہیں۔" میں نے ٹوٹے بازوؤں والی سرکاری کرسی

کو ایک کونے میں فٹ کیا اور اس کے بازوؤں کو یوں آپس میں ملا دیا کہ ایک نظر دیکھنے میں وہ جڑے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ "میں تمہیں بولنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ اگر تم نے چالاکی دکھائی اور مدد کے لیے ایک چیخ مار دی تو کیا ہو گا؟ وہ بابا دوڑا ہوا آئے گا اور پوچھے گا کہ صاحب کیا ہوا؟ اس نے میرے اور رابعہ کے سوا کسی کو نہ گاؤں... یہ برآمد ہوتا دیکھا تھا نہ کمرے میں آتے۔ میں اسے ٹال دوں گا کہ میں ہی چلایا تھا۔ پاؤں میں کیل چبھ گئی تھی۔ ویسے میں کہوں گا کہ پاؤں کے نیچے شیر آگیا تھا۔ بھی وہ مانے گا لیکن کالیا اس وقت تک تمہاری گردن تمہارے جسم کے ساتھ ایل کی شکل میں پڑی ہو گی۔ اپنے حلق سے نکلنے والی آخری آواز کے بعد تم قبر میں صورِ اسرافیل ہی سنو گے۔ اس لیے شور مچانے سے تو بہتر ہو گا کہ تم کلمہ پڑھ کے مرو۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کتنا ڈر گیا ہے۔ میں نے اس کے منہ میں سے کپڑا نکالا تو وہ بڑی مشکل سے بولا "مجھے... چھوڑ دو... میں سب... بتا دوں گا۔"

"تمہیں ولاور کا کوئی ڈر نہیں؟"

"ولاور..." اس نے نفرت کے زہر سے بجھے ہوئے لہجے میں کہا "اس نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ اب جو اسے کرنا ہے وہ کرے گا... پھر جو مجھے کرنا ہو گا میں کروں گا۔"

"کوئی کہانی گھڑنا ہے تم نے اتنی دیر میں...؟"

"تم نہ یقین کرو۔ تمہاری مرضی... اب میں نہیں ڈرتا اس سے۔"

"کیوں... اب کیا ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

"جب تک کوئی دھمکی دیتا رہے کہ تمہارے گھر کو آگ لگا دی جائے گی۔ گھر والا ڈرتا ہے لیکن گھر جل کے خاک ہو جائے تو پھر کیسا ڈر؟ میری بھی بس کی ایک قربانی ہے کہ آگ لگانے والے اور اس کے گھر کو آگ لگا دوں۔"

میں نے کہا "کس نے آگ لگا دی تھی تمہارے گھر کو؟... کون ہے وہ؟"

"رذیل... چوہدری ولاور" اس نے نام سے پہلے ایک غلیظ گالی دی۔

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "مگر تم تو اسی کے نمک خوار اور وفادار ہو۔"

"وہ میری مجبوری تھی۔ وفاداری نہیں۔"

"اور اب مجبوری باقی نہیں رہی؟"

"بس یہی سمجھ لو" اس نے سانپ کی طرح پھنکار کے کہا۔

میں نے سوچا کہ اس آدمی کی بات سن لینی چاہیے۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا ایکٹنگ کر کے مجھے بے وقوف بنانا چاہتا ہے یہ معلوم ہو جائے گا اور اس کی نیت کا بھی پتا چل جائے گا۔ مجھے وہ کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ خالی ہاتھ بے یار و مددگار اور میرے

www.paksociety.com

مقابلے میں بہت کمزور ہے۔

میں نے اسے آزاد کر دیا۔ وہ پاؤں سمیٹ کے بیٹھ گیا اور اپنی کلائیاں رگڑنے لگا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ کریا بابا نے کہا "ناشتا سر۔"

کالیا پر نظر رکھتے ہوئے میں دروازے تک گیا اور کنڈی کھول دی۔ کالیا کچھ کرنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ میں نے بابا سے ٹرے لے لی۔ اسے شاید علم نہیں تھا کہ رابو اپنی سہیلی کے ساتھ ناشتا کرنے چلی گئی تھی۔ وہ دو افراد کے لیے ناشتا لایا تھا۔

دروازہ بند کر کے میں نے کہا "چلو پہلے کچھ کھا پی لو پھر بتانا کہ وہ کیا مجبوری تھی جس کی وجہ سے تم ایک خنجر کے ساتھ حملہ آور ہوئے تھے۔"

صبح کے نو بجنے والے تھے اور میرا بھوک سے حال خراب ہونے لگا تھا۔ چائے تو جیسی تھی سو تھی۔ پراٹھے بہت عمدہ تھے اور ان میں سوائے ہاتھوں کی سختی یا کھردرا پن نہیں تھا۔ یہ ضرور کسی عورت نے بنائے تھے۔ میں نے ایک فلمی اشتیاق پر غور کیا۔ ڈاک بنگلے کے چوکیدار کی ایک چندے آفتاب چندے ماہتاب بیٹی کا تصور کیا۔ اگر میں اکیلا اور ہیرو ٹائپ شہری بابو ہوتا تو میرا اس کا رومانس لازمی تھا۔ وہ کمرے کی صفائی کرنے آتی تو مجھ سے ٹکرا جاتی یا میں ٹہلتا ہوا نہر کی طرف جاتا تو اسے نہر میں نہاتا دیکھ لیتا۔ اس کے بعد دوگانے کے لیے فضا خاصی سازگار تھی۔ درختوں کے گرد گھوم گھوم کے گانا اور رومانس کی ساری بیہودگی ہیروئن کا حتمی تجزیہ تھیں۔ میں ہنس پڑا۔

کالیا نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ ایک وحشی خونخوار جانور سے وہ اچانک ایک پریشان حال اور دکھی انسان بن گیا تھا۔

"تم مجھے بیس ہزار روپے دے سکتے ہو" اس نے اچانک کہا۔

میں نے کہا "بیس ہزار! میں تمہیں ہزار روپے دے سکتا ہوں مگر بیس نہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "صرف بیس ہزار کی ضرورت ہے مجھے۔"

میں نے کہا "فرض کرو میں تمہاری خواہش پوری کر دوں، پھر کیا ہوگا؟"

"میں بیس ہزار دلاور کے منہ پر ماروں گا۔ میری مجبوری ختم ہو جائے گی۔ میری جنت مجھے مل جائے گی۔"

میں نے کہا "بیس ہزار میں جنت!"

اس نے کہا "جنت میری چھوٹی بہن کا نام ہے۔ مجھ سے دس سال چھوٹی ہے وہ۔ میں نے اسے باپ بن کے پالا تھا۔"

اس نے مجھے ایک افسوس ناک کہانی سنائی۔

کالیا کا باپ ایک خوش حال کسان تھا۔ گاؤں میں اس کا بجلی والا پکا مکان تھا۔ وہ ایک محنتی اور ایماندار آدمی تھا جو سب کے کام آتا تھا چنانچہ سب اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ ایک عزت دار شوہر اور باپ بھی تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے بیٹے اور بیٹی کا رشتہ شہر کے کسی پڑھے لکھے آدمی سے [illegible] کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جوان ہوا ہی تھا کہ اس کی [illegible] اور شہر کے ڈاکٹروں نے بہت علاج کے بعد فیصلہ [illegible] کوئی نہیں بچا سکتا۔ اسے کینسر ہو گیا تھا۔ کالیا کے باپ نے سب کچھ بیچ دیا لیکن جس مرض کا علاج دنیا میں کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں تھا اس سے شفا کہاں تھی۔ [illegible] مر گئی۔ اس کی موت سے پہلے ہی کالیا کا باپ چوہدری [illegible] کارخانے میں ملازم ہو گیا تھا۔ یہ کارخانہ [illegible] میں زرعی مشینری کے پرزے اور آلات بنتے تھے۔

کالیا کی بات نے مجھے چونکا دیا "تمہارا باپ چوہدری دلاور [illegible] میں کام کرتا تھا؟"

اب کالیا کے چونکنے کی باری تھی "کیسے، آپ کو پتا ہوا؟"

میں نے کہا "جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔"

"یہی نام تھا کمپنی کا۔ چوہدری دلاور نے مجھے بھی نوکر [illegible] لیکن میری ماں کے مرتے ہی میرا باپ بھی مر گیا تھا۔ [illegible] مجبوری میں۔ ماں کی بیماری نے ہمیں مقروض بھی کر دیا [illegible]"

"دلاور نے دیا تھا یہ قرض...؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ایک اور مالک تھے۔"

میں نے بے اختیار کہا "وزیر خان؟"

"وزیر خان!" وہ سوچ میں پڑ گیا "نہیں۔ ان کا نام [illegible] علی تھا اور وہ واقعی شرافت کی تصویر تھا۔ اس نے بلا کر میرے باپ کو۔ ہم تو معمولی اجرت پر کام کرتے تھے مگر اس نے پہلے دس ہزار دلوائے۔ دوسری بار پھر دس ہزار دیے۔ وہ میری ماں کو دیکھنے کے لیے اسپتال بھی آیا تھا اور اس کے جنازے میں بھی شریک تھا۔"

میں نے کہا "یاد کرو۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص ہوگا۔ درمیانے قد کا سانولا سا۔ خشخشی داڑھی والا۔ [illegible] میں رہتا تھا۔"

"تم وزیر خان کی بات کر رہے ہو پھر؟"

میں نے مضطرب ہو کے کہا "تم نے دیکھا تھا وزیر خان کو؟"

"ہاں۔ دیکھا تو تھا۔ ایک بار۔"

"میں وزیر خان کا بیٹا ہوں۔" میں نے جوش سے کہا۔

"تم میر شرافت علی کے قاتل ہو" کالیا نے [illegible] کہا۔

"کیا یہ بات تمہیں چوہدری دلاور نے بتائی تھی؟" [illegible] جوش و خروش سرد پڑ گیا "خیر، تم آگے کہو۔"

"ماں کی موت کے پانچ سال بعد ابا بھی مر گیا۔ اس وقت ہم قرض کا ایک پیسا نہیں ادا کر سکے تھے۔ آمدنی بہت کم [illegible] پڑنے لگا تھا۔ اسے ڈھیرے قرض کے غم نے مار دیا۔ ایک تو [illegible] کا قرض تھا۔ دوسرا بیٹی کا۔ میری بہن اس کی موت کے [illegible] سال کی ہو گئی تھی۔ ہم گاؤں میں ہوتے تو اس کی شادی [illegible] کی عمر میں ہو جاتی۔ شہر آنے سے پرانے رشتے بھی ٹوٹ [illegible] کے لوگ اسے بھول گئے تھے اور وہ گاؤں والوں کو [illegible] خود اٹھا نہیں کا ہو گیا تھا مگر مسئلہ تو بیٹی کا ہوتا [illegible] اس کے لیے پیغام بھی آئے مگر شادی کے لیے جہیز نہیں [illegible] اخراجات کے لیے رقم نہیں تھی اور کس منہ سے [illegible] شرافت علی کی یہ شرافت کیا کم تھی کہ وہ قرضہ ہماری [illegible] سے صرف پچاس روپے مہینے کے حساب سے کاٹ رہا [illegible] کم ہو جاتے تھے مگر گزارا بڑی مشکل سے ہوتا [illegible] مر گیا تو چوہدری دلاور نے مجھے بلایا اور کہا کہ کالیا..."

"[illegible] تمہارا اصل نام تو نہیں ہو سکتا" میں نے اس کی بات [illegible]

"نہیں۔ اصل نام تو جمال شاہ تھا مگر رنگ ایسا ہی کالا تھا۔ [illegible] کالو کہتے تھے۔ اب کالیا کہتے ہیں۔ چوہدری دلاور [illegible] تمہیں تو معلوم ہے کہ تمہارے باپ نے بیوی کی [illegible] کے زمانے میں بیس ہزار روپے کا قرض لیا تھا؟" میں نے کہا [illegible] ہے جناب" وہ کہنے لگا۔ "اس وقت کوئی رسید نہیں لی گئی [illegible] حساب کتاب گڑبڑ ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ [illegible] کہاں خرچ ہوئے تھے۔"

"پانچ سال بعد حساب میں گڑبڑ ہونے لگی تھی؟"

میں نے کہا کہ جناب رسید اب لے لیں" اس نے کہا "ابا بڑا سادہ [illegible] مانتا۔ لین دین کے بارے میں حدیث شریف میں [illegible] کہ لکھ لیا کرو۔ یہ تو کمپنی کا حساب ہے" اس نے میرے سامنے رسید رکھ دی۔ میں نے اس پر دستخط بھی کر دیے اور انگوٹھا بھی لگا دیا۔"

"دستخط کے ساتھ انگوٹھا!"

"دلاور نے کہا تھا کہ بعض لوگ مکر بھی جاتے ہیں کہ دستخط [illegible] خواہ مخواہ کا لمبا چکر چلتا ہے۔ انگوٹھے کا نشان [illegible] ہے" میں نے کہا "جناب کیا آپ ایسا سمجھتے ہیں [illegible] اس وقت تو میں غصے میں چلا آیا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ [illegible] قرض اتار بھی چکے تھے۔ میں نے اگلے دن چوہدری صاحب [illegible] لگے "بے وقوف۔ بیس ہزار پر یہ تو بہت کم سود [illegible] ہوتی یہ رقم یا کاروبار میں لگاتے ہم تو ہزار روپیہ [illegible] کے میں کیا ہوتا۔ خود چوہدری دلاور ہی بولتا رہا کہ "معلوم [illegible] روپے مہینہ سود پر بیس ہزار دیتا ہے۔ سود خور افغان تو [illegible] روپے مہینہ لیتے ہیں۔ ہم نے تو کسی ضمانت کے بغیر ہی [illegible] ورنہ بینک والے تو مکان کے کاغذات رکھوا لیتے [illegible]"

"اس وقت تک تم کتنا سود دے چکے تھے؟"

"چوہدری دلاور کے حساب سے نو ہزار" وہ بولا "رسید لکھوانے کے بعد ہر مہینے مجھے تنگ کرنے لگا۔ اب وہ مجھ سے دو سو رکھوا لیتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ تو بینک کے ریٹ پر لے رہا ہوں۔ اصل کب لوٹاؤ گے؟ بیس ہزار بہت بڑی رقم تھی۔ میں نے ایک دن صاف کہہ دیا کہ ایسے تو میں ساری زندگی یہ رقم نہیں لوٹا سکتا اور میرے باپ کو بھی معلوم ہوتا کہ یہ قرض حسنہ نہیں بلکہ سود والا قرض ہے تو شاید وہ نہ لیتا۔ پکی رسید دے کے میں پھنس گیا تھا۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا تھا کہ قرض میں نے لیا تھا۔ اس نے نئی تاریخ جو ڈال دی تھی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ بہن کو ساتھ لے کر بھاگ جاؤں مگر مجھے معلوم ہو گیا کہ چوہدری دلاور سے بچ کے میں کہیں بھی نہیں جا سکتا۔ اس کے آدمی میری نگرانی کرتے تھے۔ شاید اسے بھی اندازہ تھا کہ مجبوری کی حالت میں میں اور کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے پاس زمین مکان زیور کچھ بھی تو نہیں تھا جو بیچ کے میں بیس ہزار پورے کر سکتا۔ اس کے علاوہ چوہدری کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ میں کہیں بھی جاتا پکڑا جاتا۔ دلاور کی رپورٹ پر پولیس بھی مجھے پریشان کرنے لگی۔ تھانے والے آئے دن مجھے اٹھوا لیتے تھے اور رات بھر تھانے میں ٹھکائی کرتے تھے اور پھر دلاور یہ صفائی کرتا تھا کہ مجھے مزید مہلت کے وعدے پر رہائی دلوا دیتا تھا۔ بالآخر ایک دن اس نے میرے سامنے دو باتیں رکھیں۔ ایک یہ کہ میں اس کی خدمت کر کے قرضہ معاف کرا سکتا ہوں۔ دوسری یہ کہ قرض کے بدلے میں اسے کوئی چیز دے سکتا ہوں۔ اس وقت میں مطلب نہیں سمجھا تھا۔ مطلب اس نے بعد میں سمجھا دیا۔ اس نے کہا کہ تمہاری ماں کی بیماری میں تمہارا اصل ہمدرد میر شرافت علی تھا جس نے تمہارے باپ کو قرض بھی دلوایا تھا اور اسی کی وجہ سے تم باپ بیٹا یہاں ملازم بھی رکھ لیے گئے تھے۔ ایک شخص نے بعد میں اسی میر شرافت علی کو قتل کر دیا تھا۔ وہ تمہارا محسن تھا اور اس کے قتل کا بدلہ لینا تم پر قرض ہے۔ تم یہ قرض ادا کرو تو قرض معاف کیونکہ میر شرافت علی میرا بھی دوست تھا۔"

"دوسری شرط اس حرام زادے نے یہ رکھی ہوگی کہ اگر ڈرتے ہو تو اپنی بہن کی شادی مجھ سے کر دو" میں نے طیش میں دانت پیس کے کہا۔

کالیا کا چہرہ دکھ سے مزید تاریک ہو گیا "بالکل ٹھیک اندازہ کیا آپ نے۔ اس کی نظر میری بہن پر تھی جو چوبیس سال کی ہو گئی تھی اور ابھی تک بھائی کے گھر میں بیٹھی تھی۔ اب میں کیا کہوں۔ ہر بھائی کو اپنی بہن اچھی لگتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی بہن جسے اس نے ماں اور باپ کی محبت بھی دی ہو لیکن وہ واقعی بہت خوب صورت اور معصوم ہے۔ اگر وہ پڑھی لکھی ہوتی تو بڑے بڑے لوگ اس کو اپنے گھر کی بہو بنانے پر فخر کرتے۔"

میں نے کہا "پھر کیا جواب دیا تھا تم نے؟"

www.paksociety.com

"ظاہر ہے وہی جو ایک عزت دار بھائی کرے گا۔ غریب ہونا اور بات ہے' بے غیرت تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ جنت کی شادی۔ یہ میری بہن کا نام ہے۔ میں خوشی سے زیادہ مروا لے دلاور جیسے شخص کے ساتھ کیسے کر دیتا۔ جنت سے بڑی تو شاید اس کی اپنی بیٹیاں ہوں گی۔ اور وہ کیسا آدمی ہے' یہ بھی جانتا ہوں میں۔ جانتے بوجھتے اپنی معصوم بہن کو اس ہوس ناک بھوکے بھیڑیے کے آگے ڈال دیتا۔ وہ بھی صرف بیس ہزار کی خاطر۔ بیس ہزار تو میں کسی کا گلا کاٹ کے کہیں ڈاکا ڈال کے لے آتا اور جیل جاتا یا پھانسی چڑھ جاتا مگر جنت پر دلاور کی پرچھائیں بھی نہ پڑنے دیتا۔ میں نے پہلی شرط مان لی۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا اور کہا کہ تم اس کی بیوی کو اغوا کر لاؤ۔ وہ خود ہی آجائے گا۔ اس کے بعد قرض کی پکی رسید تمہیں مل جائے گی۔"

"مگر میری تو کوئی بیوی نہیں ہے۔ شادی کہاں ہوئی ہے میری؟"

کالیا چکرا گیا "پھر یہ..... آپ کے ساتھ۔"

میں نے کہا "یہ رابعہ ہے۔ بہت مشہور وکیل۔ میری شادی اسی سے ہوگی اگر قسمت کو منظور ہوا لیکن ابھی میری بیوی نہیں ہے وہ۔"

"اچھا؟ دلاور نے تو یہی کہا تھا۔"

"جو تم رابعہ کو اغوا کرنے کے لیے آئے تھے باقی لوگ کون تھے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ دلاور نے کہا تھا کہ وہ دو تھیں۔ تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ تمہارے ساتھ تین آدمی اور بھی ہوں گے۔"

"ذرا سوچ کے جواب دو" میں نے کہا "کیا ان تینوں کو تم نے کبھی فیکٹری میں دیکھا تھا؟"

"نہیں۔"

"دلاور کے ساتھ؟" میں نے کہا۔

کالیا نے پھر نفی میں سر ہلایا "وہ بھی مجھے نہیں جانتے تھے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ کرائے کے بدمعاش تھے۔ خیر اب بتاؤ تم کیا کرو گے۔ تم دلاور کی پہلی شرط پوری کرنے میں ناکام رہے۔"

"اب..... ظاہر ہے جنت کا نکاح ہوگا چوہدری دلاور سے" وہ ایک دم اداس ہو گیا "وہ اس کی قید میں ہے۔"

"قید میں؟"

"وہ دلاور کے سالے کے گھر میں ہے۔ اس کا سالا جواری شرابی ہے۔ دلاور نے اسے خرید رکھا ہے۔ وہ اس کو پیسہ دیتا رہتا ہے۔ وہ پولیس کا مخبر بھی ہے اور نشے کی لت نے اسے اتنا بے غیرت بنا دیا ہے کہ وہ خود اپنی بہن کے گھر میں لڑکیاں لاتا ہے۔ اب بہن پر سوکن لانے کی سازش میں وہ دلاور کے ساتھ ہے۔ بہن کا گھر تباہ کرنے کی کوئی فکر نہیں۔ نکاح اسی کے گھر میں ہوگا۔"

"فرض کرو۔ فرض کرو تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ تم رابعہ کو اغوا کر کے لے جاتے" میں نے کہا "پھر وہ دلاور تمہاری بہن کو اپنے گھر میں ڈال لیتا۔ تو کیا کرتے؟"

"اس کا بندوبست کر لیا تھا میں نے۔ میں نکاح کے وقت سب کے سامنے دلاور کی گردن اڑا دیتا۔"

"اگر میں بیس ہزار تمہیں دے دوں تو تمہیں قرض کی دلاور کی رسید تمہارے حوالے کر دے گا اور ... حوالے کر کے کہے گا کہ جاؤ کالیا خوش رہو" میں نے کہا۔

"بے وقوف ہو تم اگر ایسا سمجھتے ہو۔ وہ تم سے بیس ہزار لے کر قرض معاف نہیں کرے گا اور تم سے رشتہ ضرور طے کرا ...

"میں اس کی....."

میں نے کہا "بکری کھانے سے دماغ ... ہو جاتا ہے ... کام لو۔ جب اسے بیس ہزار دیتے ہیں تو اپنا بندوبست ... کا یہ مطلب نہیں کہ دلاور کی گردن اڑانے کے لیے ... کر لو۔ نہیں" ایسے لوگوں کی موجودگی میں قرضہ ادا کرنا گوارا ہوں۔ ضرورت پڑنے پر تمہارے حق میں گواہی دے ... بہن کے ساتھ دلاور کے عقد ثانی کو رکنے کی ترکیب ... قرض ادا ہو گیا تو شادی کیسی! یہ بات تمہیں سب کے سامنے پڑے گی لیکن یہ کام آسان نہیں ہوگا۔ تم دلاور کو بھی جانتے ... اس کا سالا بھی کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بھائی ہی نہ رہے۔"

وہ طیش میں آ گیا "کالیا بھی کم نہیں ہے۔ میں اپنے حق ... جاؤں گا ایسے بندے....."

میں نے کہا "نہیں کالیا۔ سوری... جمال" ... تمہیں جمال ہی کہوں گا اور بھی کوئی تمہیں کالیا کے نام ... پر مخبر مارتا۔ کالا رنگ اللہ نے بلال حبشی کو بھی دیا تھا۔ تحقیر کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔"

"آپ..... بڑی عجیب باتیں کرتے ہو۔"

میں نے کہا "جمال۔ تمہارے ساتھ ہم جائیں گے۔"

"آپ؟"

"ہاں ہم" میں نے کہا "سب نہیں۔ ... کچھ اخبار والے بھی پہنچ جائیں گے۔ تم فکر مت کرو ... نہیں۔ یہ چوہدری دلاور تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ایک ... بتا دوں تمہیں۔ میں نے میر شرافت علی کو قتل نہیں کیا تھا۔ چوہدری دلاور نے قتل کروایا تھا۔ شاید بذر ... کے ہاتھ ...

... باپ میرے والد بڑے خان ہی تھے۔ انہیں بھی ایسے ہی ... کر دیا گیا تھا اور بعد میں مروا دیا گیا تھا۔ چوہدری ... کے تمہیں پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ اس ... کا ساتھ دیا تھا۔ پکڑے جانے یا مارے جانے تو تم ... سکتا تھا شادی سے۔ اب تم غصے میں مت ... شنو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ شادی کہاں ہو رہی ... اس کے سالے کا نام کیا ہے اور وہ رہتا کہاں ...

"... نام ہے بابا گنڈی۔ رفیق اصل نام ہے۔ نشہ کرتا ہے ... ایک دم لگاتے ہیں اور گنڈی کی طرح اڑ جاتے ... ہے" (گنڈی پتنگ کو کہتے ہیں) سائنس ... کے اندر ہے مگر نکاح ہوگا کالا شاہ کاکو کے ... یہ کوٹھی دلاور نے کرائے پر لی ہے۔ بنگلہ ... ہے۔"

"... اکیلی ہے اس کے ساتھ؟"

"... دلاور کے بیوی بچے سب رہتے ہیں لیکن بنگلہ ... اس کی بہن کو بھی نہیں معلوم کہ کیا ڈرامہ ہونے والا ہے ... ہی کر رہی ہے۔ نکاح کے وقت دلاور اپنی بیوی کو ... یہاں کچھ خطرہ ہے۔"

... "ابھی ٹھیک ہے۔ اب تم دلاور سے ملو۔ معافی مانگو ... کام نہ ہوا نہیں۔ اب آپ کی دوسری شرط مجھے منظور ... مجھے نکاح کی اور وقت۔ میں اپنے دو گواہ لاؤں ... کی رسید لے آئیں۔ امید ہے دلاور بھاگنے میں ... اسے کوئی شک نہیں ہوگا۔ ہر کام اس کی مرضی کے ... عین وقت پر وہاں کچھ لوگ پہنچ جائیں گے۔ اس ... کے سامنے رکھ دیتا۔"

... نظر آنے لگا "اگر..... اگر جنت کی..."

"... ہوگا جنت کو۔ دلاور سے چھٹکارا ملے بہت ہول ... میں نے ریوالور رکھا کے کہا "ابھی ... اور اخبار والوں کے سامنے دلاور جواب نہیں ...

"... مت کرو۔ وہ بھی سنبھال لیں گے ہم....."

... کہا "ویری گڈ۔ پلان بہترین اور مکمل ہے ... ڈی ایس پی نے ایک دم اندر آ کے کہا۔

... ریوالور تھا۔ رابعہ اس کے پیچھے تھی۔

... کی شکست اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ ... میرا برا حال ہو گیا۔ رابعہ کو دیکھ کر کچھ کہنا بے سود ... جا سکتا تھا جو حالت کا کنجوس بھائی ہے

اور پھر اس پر زندگی کے ہر رنگ میں واقعات و حادثات کی تصویر۔ شاید دس سال پہلے نیلوفر نام کی ایک لڑکی کے ساتھ رابعہ نے ایک ہی کالج سے ایک ساتھ بی اے پاس کرنے کی غلطی کی تھی۔ اس وقت یہ غلطی بہرحال نہیں تھی۔ آج میری بدقسمتی نے اس پرانے تعلق کو دوبارہ جوڑ دیا تھا۔ قسمت کا ہاتھ شامل نہ ہوتا تو میں ایک مفرور و مطلوب اشتہاری مجرم کیوں ہوتا! نیلوفر کا شوہر ڈی ایس پی کیوں ہوتا۔ میں ایک دن بعد یہاں آتا یا ڈی ایس پی صاحب ہمارے جانے کے بعد تفتیش کے لیے آجاتے۔

لیکن بقول فلسفی دوراں جب جو ہوتا ہے تب تب سو سو ہوتا ہے۔

رابعہ کے چہرے پر رنگ' خجالت اور بے بسی کے جذبات کی تصویر بہت واضح تھی۔ میں اس تصویر کو دیکھتا یا توپ کے دہانے کی طرح نظر آنے والے ریوالور کی نال کی طرف۔

کالیا اس صورت حال سے فائدہ اٹھا سکتا تھا مگر اب وہ میرا دشمن نہیں رہا تھا۔ وہ میرا محتاج ہو گیا تھا۔ البتہ اس کو اپنی مجبوری کی تاریک سرنگ کے دوسرے کنارے پر امید کی جھلملاتی روشنی نظر آنے لگی تھی۔ شاید وہ یہی سوچتا رہ گیا کہ اسے قانون کی مدد نہیں چاہیے! قانون کے مقابلے میں ایک مجرم کی مدد کے وعدے پر بھروسا کرنا چاہیے۔

میں نے ہتھکارانہ طور پر ہاتھ اٹھا لیے "آپ نیلوفر کے شوہر ہیں نا؟"

"میں صرف نیلوفر کا شوہر نہیں ہوں۔"

"سوری! مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کی کتنی بیویاں ہیں۔"

"شٹ اپ۔ میرا مطلب تھا کہ میں ایک پولیس افسر بھی ہوں بلکہ پولیس افسر پہلے ہوں۔ شوہر اس کے بعد" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "کوئی بیوی یہ بات سن کے خوش نہیں ہو سکتی۔"

"میں بیوی کو خوش کرنے کے لیے فرض شناسی کا سودا نہیں کرتا۔" اس نے کہا "ویسے بھی کون خوش رکھ سکتا ہے بیوی کو۔ نہ ڈاکٹر' نہ وکیل' نہ صحافی' نہ تاجر کسی کے پاس وقت ہوتا ہے اتنا جتنا بیویاں مانگتی ہیں؟"

"تم عام پولیس والوں سے مختلف باتیں کرتے ہو۔"

"اور تم؟ کیا تم عام مجرموں جیسی باتیں کرتے ہو" اس نے کہا "میرا نام عمر قریشی ہے۔"

میں نے کہا "کیا مجھے اپنا نام بتا کے مصافحہ کرنا چاہیے اور کہنا چاہیے کہ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کے۔"

اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا "اس نام سے تمہیں کچھ یاد نہیں آیا؟"

میں نے کہا "مجھے بہت سے منتشر کرکٹ کھلاڑی یاد آتے ہیں جن پر ریڈیو کمنٹری میں نے عمر قریشی سے سنی تھی اور مجھے جمشید مارکر

www.paksociety.com

کا نام یاد آتا ہے جو ان کا ساتھ دیتے تھے۔"

وہ ریوالور کا رخ میری طرف رکھتے ہوئے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا "میں ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب کے زمانے میں اے ایس آئی تھا۔ ان کے ساتھ بھی رہا تھا۔ جب تم ان کی کوٹھی میں رہتے تھے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا "گویا ہم پرانے شناسا ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "ویسے تو پولیس میں تمہارے شناسا بہت ہیں' میں تمہیں ذرا پہلے سے جانتا تھا۔"

میں نے متکلم لہجے میں کہا "پھر تو تمہیں معلوم ہوگا کہ میں بے گناہ ہوں۔"

"میرے جاننے یا نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا فیصلہ عدالت کرتی ہے۔" عمر نے کہا "تمہارا ایک اور ساتھی بھی تھا۔"

میں نے ایک آہ بھری "تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ...

سہرا باندھے ہوئے چلنے کو یہاں سب تیار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

وہ مسکرایا اور میں نے رابعہ کی طرف دیکھا جو میرے پیچھے کھڑی اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ اس نے میری بات سنی نہیں یا واقعی پریشان تھی کہ اسے شرمانے اور پیار بھرا غصہ دکھانے کا خیال نہیں آیا۔

"یعنی تمہاری شادی نہیں ہوئی ابھی تک؟" عمر نے طنز سے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "مس رابعہ کے جھوٹ کا اعتراف بھی کرتا ہوں۔"

"جھوٹ کا اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا۔ مس رابعہ کو دیکھ کر۔"

"تم نے انہیں بھی پہچان لیا ہوگا۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"یہ بھی اچھی خاصی مشہور ہیں۔ مگر تم سے کچھ کم۔ جب نیلو نے مجھے بتایا۔"

میں نے کہا "تم جانتے ہو نیلو کو۔ کیا غضب کیا تھا اس نے ظلم زہر عشق میں۔"

"نیلوفر کو میں نیلو کہتا ہوں۔ فلمستار نیلو کی اجازت کے بغیر۔"

میں نے کہا "ایک جیسے نام رکھنا کاپی رائٹ ایکٹ کی خلاف ورزی نہیں ہے۔ کیا وہ [illegible] تمہیں [illegible] ہے۔"

اس نے میرے مذاق کو نظرانداز کر دیا "مجھے حیرانی ہوئی تھی کہ خاتون نے وکالت چھوڑ کے کسی خبطی پروفیسر سے کیوں شادی کر لی؟ اور وہ خبطی آخر کسی ریسٹ ہاؤس میں چھپ کے کیوں ریسرچ کر رہا ہے۔"

"اس کے بعد تمہاری پولیس مین کی رگ پھڑکی [illegible] آئے تفتیش [illegible]۔"

"میری بیوی سخت ناراض ہے مجھ سے مگر میں۔"

"فرض سے مجبور ہوں۔" میں نے اس کی بات [illegible]

"انعام کی بات بتا دیجیے اپنی نیلو کو اور اس سے وعدہ [illegible] ساری رقم اسے زیور کپڑے بنانے کے لیے دے ہوئے [illegible]"

اب اس نے میری بات کاٹ دی "وہ اسی لیے [illegible] میرا انعام کی رقم لینے کا بھی کوئی خیال نہیں۔ میں نے تو [illegible] بتا دیا تھا کہ تمہاری یہ سہیلی جو تمہاری کلاس فیلو تھی [illegible] اس نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔ میں نے اسے تمہارے [illegible] بتا دیا تھا کہ تمہاری گرفتاری پر کتنا انعام ہے۔ اور وہ خوش ہوئی تھی کہ خدا نے ہمیں یہ موقع دیا ہے۔"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھ سے نظر نہ ملائی۔

"دراصل ہم کچھ مقروض ہیں۔ مکان بنایا تھا قرض [illegible] زیور کا تو اسے اتنا شوق نہیں۔ وہ خوش تھی کہ اب یہ قرض [illegible] ہو جائے گا۔ وہ تو میری مدد بھی کرنا چاہتی تھی مس رابعہ [illegible] تھی کہ اتنا خطرناک مجرم ہے تو رسک مت لو۔ میں رابعہ [illegible] جا کے اسے باتوں میں لگائی ہوں تم اچانک آجانا۔"

رابعہ نے زخم خوردہ لہجے میں کہا "مجھے نیلوفر سے اس کی توقع نہیں تھی۔"

"محترم خاتون۔ وکیل ہو کے بھی آپ ایسی بات کرتی [illegible] ہر روز عدالت میں آپ کو یہ تجربہ نہیں ہوتا کہ پیسہ قانون کو [illegible] مار دیتا ہے اور دولت کی طاقت کے مقابلے میں خون کے رشتے سوت کے دھاگے ثابت ہوتے ہیں۔ نیلوفر تمہارا بڑا [illegible] تھی۔ اپنے گھر کی بھلائی کے لیے خود غرض ہو گئی تھی۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "اس معاملے میں شاید [illegible] ہی خود غرض ہوتی ہے۔"

"جب میں نے اسے بتایا کہ انعام کی رقم کو بھول جاؤ [illegible] صرف اپنا فرض ادا کروں گا۔ فرض کی خاطر۔"

"آئی سی۔ تم ایمانداری کے مرض میں مبتلا ہو۔"

"ہاں۔ یہ بیماری مجھے رضوی صاحب سے لگی تھی [illegible] مزاج تھا۔ وہ میرے آئیڈیل تھے اور میں انہی جیسا بننا [illegible] لیکن اس خوش فہمی سے دور رہنا کہ ان سے تعلق کی [illegible] تمہیں کوئی رعایت دوں گا۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا [illegible] تم نے فرار ہونے یا مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو [illegible] تمہیں شوٹ کر دوں گا۔ یہ جذباتی رعایت میں نے [illegible] دی تو تمہیں کیسے دے سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "انکل رضوی مرحوم کے حقیقی جانشین [illegible]

اب بھی نہیں رکھ سکتا۔"

"مرحوم کے ساتھ تم نے جو سلوک کیا تھا اس کے بعد تم کسی رعایت کے مستحق ثابت نہیں ہوتے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "میں نے کیا سلوک کیا تھا؟"

"تم نے انہیں آزمائش میں ڈال رہا تھا۔ فرض اور محبت کی کشمکش کے عذاب میں مبتلا کر دیا تھا اور جو شخص کبھی ہارا نہیں تھا وہ اس جنگ میں ہار گیا تھا۔ انہوں نے تم کو پناہ دی تھی اور تحفظ فراہم کیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ قانون کی نظر میں تم مجرم ہو۔ وہ تمہارے طرفدار ہو گئے تھے۔"

"شاید اس لیے مسٹر عمر تھیکی کہ وہ حقیقت کو جانتے تھے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"حقیقت تو میں بھی جانتا ہوں۔ مگر حقیقت کو تسلیم کرانا میرا کام نہیں ہے۔ یہ اعلان عدالت کرتی ہے۔ رضوی صاحب بھی یہ بات سمجھتے تھے لیکن تم نے ان کا جذباتی استحصال کیا تھا۔ ان کا سارا کیریئر ایک کھلی کتاب تھا۔ ان کے ضمیر کی اجلی چاندنی بے داغ تھی مگر آخری وقت میں تم نے اسے میلا کر دیا۔ مرتے وقت ان کے ضمیر پر یہ بوجھ تھا کہ ان کا ریکارڈ خراب ہو گیا۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ ان کی بہت عزت تھی لیکن انہیں قبل از وقت ریٹائرمنٹ دی گئی تو اس ذلت کو انہوں نے اپنی سزا سمجھ کے قبول کیا تھا۔ دنیا کی بات نہیں' وہ خود اپنی نظر میں بے عزت ہو گئے تھے۔"

"میں اپنی صفائی میں کچھ کہوں گا تو عذر گناہ بدتر از گناہ والی بات ہوگی۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ میری وجہ سے وہ آزمائش میں پڑے تھے لیکن یہ احساس آج تم نے دلایا ہے کہ وہ میری وجہ سے ذلت کے عذاب سے دوچار ہوئے تھے۔ میں اپنے جرم کی تلافی بھی نہیں کر سکتا۔ اس پر شرمندہ ہونے سے بھی کیا ہوگا۔"

"اس ایماندار پولیس افسر کے پاس رہنے کے لیے ذاتی مکان تک نہیں تھا۔ ان کی موت کے بعد کیا بیتی اس فیملی پر!"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیا "انکل رضوی کی وائف ایک اسکول چلا تو رہی تھیں۔ پھر وہ بھی تباہ ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں اب وہ کہاں ہیں۔"

"وہ لندن میں ہیں۔" عمر نے کہا "کچھ خیر خواہ بھی تھے ان کے مگر تم جیسے نہیں۔ انہوں نے سب بندوبست کر دیا تھا کہ وہ بحفاظت اس ملک سے نکل جائیں۔ جہاں تمہارے دشمن ان کی جان لینا چاہتے تھے۔ مسز رضوی نے اب ایسٹ اینڈ میں ایک بوتیک کھول لیا ہے اور ان کے بچے وہیں پڑھ رہے ہیں۔ تم نے کیا کیا ان کے لیے؟"

"بہت کچھ کیا تھا۔ لیکن وہ کسی کا احسان لینے کی روادار نہیں تھیں" میں نے احتجاج کیا۔

"تمہیں حیرت ہوگی کہ وہ ایک بہت بدنام شخص تھا۔ ایک ہسٹری شیٹر مجرم اور کئی بار کا سزا یافتہ۔ پولیس اس کو قتل کے ایک کیس میں ملوث کرکے پھانسی لٹکانا چاہتی تھی تاکہ مصیبت ختم ہو۔ اصل گواہ اس کے خلاف سامنے نہیں آتے تھے اور ناکافی شہادت کی بنا پر وہ دو بار قتل کے الزام سے صاف بچ گیا تھا۔ تیسری بار پولیس نے پکا بندوبست کر لیا تھا۔ گواہ بھی پولیس کے اپنے تھے اور پولیس نے واقعاتی شہادت بھی جمع کر لی تھی۔ آلۂ قتل وغیرہ سب دستیاب تھا مگر تمہارے انکل ایس ایس پی رضوی مرحوم نے جھوٹا کیس بنانے پر پولیس والوں کو معطل کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ملزم کو سزا ضرور ہونی چاہیے مگر انصاف کے تقاضے بھی پورے کرنا لازمی ہے۔ اگر مجرم رہا ہو جاتا ہے تو یہ پولیس کی نااہلی ہے اور نااہلی کو جعلسازی سے چھپانا زیادہ بڑا جرم ہے۔ اس ہسٹری شیٹر بدمعاش نے رضوی صاحب کے احسان کا بدلہ یوں چکایا کہ ان کی فیملی کو لندن پہنچا دیا۔"

"مگر مسز رضوی نے اس کی مدد کیسے قبول کر لی تھی؟"

"انہیں آج بھی علم نہیں کہ یہ سب انتظام کس نے کیا تھا۔ انہیں تو اچانک پتا چلا کہ ان کے شوہر کے ایک اکاؤنٹ میں خاصی بڑی رقم موجود ہے۔ جس کا مرحوم نے کبھی بیوی سے بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ اکاؤنٹ نیا کھولا گیا تھا مگر یہ مسز رضوی کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ خود بینک منیجر نے انہیں بتایا کہ یہ رقم تو کئی سالوں میں جمع ہوئی تھی۔"

"بینک منیجر نے جھوٹ بولا تھا؟"

"وہ جھوٹ کیسے نہ بولتا۔ اسے اپنی جان عزیز تھی۔ یہاں سے لندن چلے جانے کا مشورہ مخلص دوستوں نے دیا۔ پاسپورٹ وغیرہ کا انتظام مشکل نہیں تھا۔ وہ اپنا سب کچھ سمیٹ کر چلی گئیں۔ ان کا جہاز ٹیک آف کرنے تک میں خود ائرپورٹ پر موجود تھا۔ اس نامی گرامی بدمعاش کے علاوہ۔"

"مجھے شرم آ رہی ہے اپنے شریف آدمی ہونے پر۔ اور اس خیال سے کہ میں انہیں انکل کہتا تھا۔ تم مجھے بیچارے سمجھتے ہو ان کا۔"

"ہرگز نہیں۔ میرا ان سے رابطہ ہے اور میں انہیں سمجھاتا رہتا ہوں کہ وہ کسی پرانے تعلق کا کہیں حوالہ نہ دیں۔ گمنام رہیں اور اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ بنائیں۔"

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے کہا "تھینک یو مسٹر عمر تم نے مجھ پر احسان کیا۔"

"میں نے کسی پر احسان نہیں کیا۔" وہ برہمی سے بولا۔

"وہ بدمعاش کون تھا؟"

"اب کیا کرو گے اس کا نام جان کے۔ وہ اس دنیا میں ہی نہیں۔"

www.paksociety.com

"وہ مر چکا ہے؟"
"اسے ایک طوائف نے قتل کردیا تھا۔ ایک لاوارث کمزور سی عورت نے خنجر اس کے سینے میں اُتار دیا تھا۔ یہ تو ہونا ہے سکندر صاحب۔ مکافاتِ عمل اسی کو کہتے ہیں شاید۔ ایسی کہانیاں تو بہت ملیں گی تمہیں۔ یہ بتاؤ تم یہاں کیا کررہے ہو۔ اور یہ کون ہے؟"
"یہ کالیا ہے۔ پہلے میرا دشمن تھا۔"
"اب دوست کیسے بن گیا؟"
"ایک مظلوم دوسرے مظلوم کا ساتھی ہوجاتا ہے۔"
"اوہ! تو یہ بھی مظلوم صاحب ہیں۔" عمر نے طنزیہ لہجے میں کہا "مگر مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس پر ہونے والے ظلم کی داستان سے۔"
"بڑے افسوس کی بات ہے۔"
"ہاں مگر ظلم کہاں نہیں ہورہا ہے اور کیا خود اس نے کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا ہوگا۔ اس کی تو صورت بتاتی ہے کہ یہ جرائم پیشہ ہے۔"
میں نے تلخی سے کہا "عجلت میں فیصلہ کیا تم نے۔ اگر چہرے دیکھ کے معلوم ہوسکتا کہ کون ظالم ہے اور کون مظلوم' کون مجرم ہے اور کون بے گناہ تو پھر پولیس' قانون اور عدالت کی کیا ضرورت تھی۔"
"میں یہاں کسی اور کام سے آیا تھا۔" عمر قریشی نے کہا "ایک قاتل کی تلاش میں حیدر آباد سے خصوصی ٹیم کے ساتھ۔ وہ ایک صنعت کار کا ڈرائیور تھا۔ اسے لوٹ کے قتل کرنے کے بعد فرار ہوگیا تھا۔ اس کا آبائی گاؤں قریب ہی ہے جہاں اس کے بیوی بچے رہتے تھے۔ وہیں سے پکڑا گیا آج۔"
"تمہاری کامیابی میں خوش قسمتی کا بھی بہت دخل ہے۔ چھوٹے مجرم کو پکڑنے آئے تھے بڑا مجرم ہاتھ آگیا۔ میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں مگر مجھے ہفتے تک مہلت چاہیے۔" میں نے کہا۔
"سوری' میں تو کل ہی واپس جارہا ہوں۔ جانے سے پہلے میں تم کو مقامی پولیس کی تحویل میں دوں گا۔"
میں نے کہا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہفتے کے بعد....."
"سکندر' میں مہلت دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔"
"اور اگر میں گرفتار ہونے سے انکار کردوں؟"
"میں کب یہ اُمید رکھتا ہوں کہ تم رضاکارانہ گرفتاری دو گے۔ یہ میرا کام ہے اور میں قانونی طور پر اتنا بے اختیار بھی نہیں ہوں۔ ایک گھنٹے میں میری پولیس پارٹی مجرم کے ساتھ پہنچنے والی ہے۔ وہ تمہیں بھی ساتھ لے جاسکتے ہیں' اس وقت تک میں تمہیں......"

رابعہ میرے پیچھے صوفے کے ساتھ لگی کھڑی تھی اگر وہ چاہتی تو میرے ساتھ ہی بیٹھ بھی سکتی تھی مگر ذہنی کشیدگی نے یہ بات مجھے بھی خیال نہیں دیا کہ اس سے بیٹھنے کے لیے کہوں۔ میرے دائیں ہاتھ پر وہ بیٹھا تھا جس پر کالیا بظاہر تمام معاملات سے لاتعلق بیٹھا اپنے مستقبل کی خانہ خرابی پر مقدر کو کوس رہا تھا۔ وہ رابعہ کو اغوا کرکے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر خود اغوا ہوگیا تھا۔ پھر اس کو اُمید کی روشنی سراب کی طرح نظر آئی تھی۔ مجھے اس وقت سب سے یقین آچکا تھا کہ تاحیات ابدی سے میں اس کی بدبختی کے ناسور کا علاج کرسکتا ہوں میں بھی اپنی بدبختی کے تیر کا نشانہ بن گیا تھا۔
معلوم نہیں کیا سوچ کے اس نے جان کی بازی لگائی اور اس میں اتنی ہمت کیسے آگئی کہ وہ گھات میں بیٹھے ہوئے چیتے کی طرح جست لگا کے سیدھا اپنے شکار پر گرا اور ڈی ایس پی عمر قریشی کو ساتھ لیتا ہوا کرسی سمیت فرش پر اُلٹ گیا۔
عمر قریشی کو فائر کی مہلت ہی نہیں ملی۔ اس کی تمام توجہ میری طرف تھی اور وہ غالباً سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کالیا اس پر یوں حملہ کردے گا۔ اس کوشش میں کالیا کی جان جاسکتی تھی اور عمر قریشی گولی چلا رہا تو یہ گولی مجھے یا رابعہ کو بھی نشانہ بنا سکتی تھی مگر عمر قریشی ٹھنڈے دماغ کا اور اعصاب پر قابو رکھنے والا شخص تھا۔ اس نے بلا ارادہ اور بے سبب گولی نہیں چلائی۔
کالیا کو خطرہ ڈی ایس پی کی وردی سے نہیں اس کے ریوالور سے تھا۔ اس نے دیوانہ وار جدوجہد کی اور عمر قریشی سے ریوالور چھیننے میں کامیاب ہوگیا۔ عمر قریشی نے زبردست مزاحمت کی مگر پہل کرنے کا فائدہ کالیا نے اُٹھالیا تھا۔ اس نے ریوالور ہاتھ میں آتے ہی دور پھینک دیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ڈی ایس پی کے مقابلے میں وہ کمزور حریف ہے اور یہ ہتھیار اس کے قبضے میں رہا تو پھر چھن جائے گا۔
یہ صرف چند سیکنڈ کی بات تھی۔ اُدھر کالیا نے ریوالور پھینک کے اُٹھنا چاہا اُدھر عمر قریشی نے اسے ٹانگ پکڑ کر پھر کھینچ لیا۔ اب کالیا نیچے تھا اور عمر قریشی اوپر۔ وہ دونوں خون کے پیاسے درندوں کی طرح لڑ رہے تھے۔ اپنی ناکامی نے ڈی ایس پی کو مشتعل کردیا تھا تو کالیا نے بھی آخری وقت تک موت سے لڑنے کا عزم کررکھا تھا۔
ریوالور صوفے کے نیچے سے گزرا اور اس سے پہلے کہ میں اسے پکڑتا رابعہ کے پیروں سے ٹکرا گیا۔ وہ میرے پیچھے ہی موجود تھی۔ اس نے جھک کے ڈی ایس پی کا ریوالور اُٹھالیا۔
"بس کرو۔" اس نے دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھام لیا اور چیخ کے کہا۔
میں نے کہا "رابعہ گولی مت چلانا۔"
رابعہ پر جنون سوار تھا "میں کہتی ہوں چھوڑ دو اسے ورنہ میں گولی ماردوں گی عمر۔"

عمر نے رابعہ کے لہجے کی وحشت اور دیوانگی کو محسوس کرلیا۔ وہ تجربہ کار پولیس افسر تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ کب کس کی بات دھمکی ہوتی ہے اور کب لہجے میں خون کی پیاس بولتی ہے۔ اس نے کالیا کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے فرش سے کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑ دیے تھے۔ بال نوچے تھے اور چہروں پر خونی خراشیں ڈال دی تھیں۔
میں نے کہا "رابعہ یہ ریوالور مجھے دو۔"
"نہیں۔ مجھے معلوم ہے تم ریوالور اسے واپس کردو گے۔"
"سکندر" عمر قریشی نے کہا "فرض کرو میں تمہیں ہفتے تک کی مہلت دے دوں۔"
میں نے تلخی سے کہا "کیا اچانک تمہیں اس کا اختیار مل گیا ہے؟"
"نہیں۔ میں مجبور ہوگیا ہوں۔ تم سے سودا کرنے پر۔"
"سودا کیسا" رابعہ نے کہا "تم سکندر کو گرفتار نہیں کرسکتے۔"
"مگر سکندر نے تو خود گرفتاری دینے کا وعدہ کیا تھا۔"
"سکندر کون ہوتا ہے یہ وعدہ کرنے والا۔" رابعہ نے چلا کے کہا "اس کی زندگی صرف اسی کی نہیں۔ میری بھی ہے۔"
اسی وقت دروازے میں نیلوفر نمودار ہوئی۔ اس نے ایک چیخ ماری "رابعہ! یہ کیا ہورہا ہے۔ تم مارنا چاہتی ہو عمر کو....."
رابعہ نے کہا "مگر اس نے سکندر کو ہاتھ بھی لگایا تو تمہارے بچے یتیم ہوجائیں گے۔ نیلوفر پہلے اپنے فرض شناس شوہر سے اس کی مرضی پوچھ لو۔ وہ اپنے فرض کی خاطر جان دینا چاہتا ہے تو اس کی مرضی۔ میں بھی کوئی رعایت نہیں کروں گی۔"
"مگر اس پاگل عورت سے کہو..... پلیز۔" نیلوفر بولی۔
عمر نے اس کی بات کاٹ دی "نیلو' بچے کہاں ہیں؟" وہ نرمی سے بولا۔
"بچی اور بیٹا سو رہے ہیں۔" نیلوفر رونے لگی۔
"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ ان کے پاس۔" عمر نے پرسکون لہجے میں کہا۔
"اور تم؟"
"میں آتا ہوں۔ چلو تم۔" عمر نے ڈانٹ کے کہا "ایسا نہ ہو بچے بھی آجائیں یہاں۔"
رابعہ نے کہا "خبردار نیلوفر' اگر تم نے کسی کو کچھ بتایا یا کہیں فون کیا تو اپنا نقصان کرو گی۔"
"میں کسی کو کچھ نہیں کہوں گی۔ تم جیسا کہو گی ویسا ہی ہوگا۔"
نیلوفر نے روتے روتے کہا "خدا کے لیے عمر کو معاف کردو۔ اسے مت مارو۔"
میں نے کہا "تمہارے شوہر کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ ہم ابھی آدھے گھنٹے میں یہاں سے چلے جائیں گے مگر تم بچوں کے ساتھ اپنے کمرے میں رہو گی۔ ہماری روانگی تک ریسٹ ہاؤس میں صرف ملازم ہے' اسے بھی کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔"
"تم جس کی چاہو قسم لے لو۔ میں اپنے بچوں کی زندگی کی قسم کھاتی ہوں کہ کسی کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔ نہ آج نہ بعد میں کبھی۔ عمر بھی نہیں بتائے گا۔"
"نیلو!" عمر نے سختی سے کہا "فضول باتیں مت کرو' جاؤ۔"
لیکن نیلوفر نے اس کی سنی ان سنی کردی۔ نہ اس کے لیے عمر ڈی ایس پی تھا اور نہ وہ اس کا حکم ماننے کی پابند تھی۔ وہ صرف ایک بیوی اور ایک ماں کی حیثیت سے بات کررہی تھی اور مجھ سے اپنے پیار کی سلامتی کی ضمانت چاہتی تھی۔ وہ پیار جو سہاگ کا سیندور بھی ہوتا ہے اور ممتا کا سرچشمہ بھی۔ اسے اپنے شوہر پر بھروسا نہیں تھا۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں وہ محبت کو فرض پر قربان نہ کردے۔ وہ ایسا کرسکتا تھا۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا۔
میں نے کہا "نیلوفر! اس قسم کے بعد بھی... تم پر اعتبار نہ کرنے والا شیطان ہی ہوسکتا ہے۔ انسان نہیں۔ تمہارے عمر کو خدا عمرِ خضر دے' اسے میں حفاظت اور سلامتی کے ساتھ تمہارے حوالے کرکے جاؤں گا۔"
"تمہاری بیوی..... رابعہ اسے ماردے گی۔" وہ اب بھی نروس تھی۔ میں نے ایک ہاتھ بڑھا کے رابعہ سے ریوالور لے لیا۔ رابعہ کی وحشت کا دور ختم ہوچکا تھا۔ اس نے انکار نہیں کیا۔ عمر کو اپنی بیوی پر طیش آرہا تھا جس نے اپنے جذبات کے پاگل پن میں براہِ راست مجھ سے ایک وعدہ کرلیا تھا اور بدلے میں ایک وعدہ مجھ سے بھی لے لیا تھا۔
نیلوفر کے جاتے ہی میں نے کہا "ڈی ایس پی صاحب یہ جو کچھ بھی ہوا۔ ہم سب کی مجبوری تھی۔ کالیا کی اور میری۔ نیلوفر کی یا رابعہ کی مجبوری کی نوعیت کچھ بھی سہی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم سب جینا چاہتے ہیں' ہم سب زندگی سے اور اس کے سارے رشتوں سے پیار کرتے ہیں۔"
رابعہ نے کہا "سکندر' باتیں کرنے کے لیے وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔"
میں نے ایک قدم آگے بڑھایا "مسٹر عمر قریشی' تم مجھے جانتے ہو تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ ایس ایس پی سراج جیسے سفاک اور چوہدری ولاور جیسے عیار شکاری ابھی تک مجھے زیرِ دام نہیں لاسکے۔ میں تمہاری اصول پرستی اور فرض شناسی کی قدر کرتا ہوں اور میری دعا ہے کہ خدا تمہیں انکل رضوی مرحوم کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ تمہیں دوستوں کی دشمنی اور دشمنوں کی دوستی سے بچائے۔ لاؤ دوسرا ریوالور مجھے دو۔"

www.paksociety.com

"کون سا دوسرا ریوالور؟"

میں نے کہا "جو ریوالور کالیا نے تم سے چھینا تھا وہ تم نے رابعہ سے لیا تھا۔ تمہارا اپنا ریوالور کہاں ہے؟"

اس نے تذبذب کے ساتھ کہا "وہ کمرے میں ہے۔"

"میں نے تمہاری بیوی سے ایک وعدہ کر لیا ہے اس لیے میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" میں نے ریوالور کو جیب میں ڈال لیا "میں تلاشی لوں گا تمہاری۔"

اس کا ہاتھ تیزی سے پتلون کی جیب کی طرف گیا ہی تھا کہ میں نے ٹھوکر ماری جو اس کی کلائی پر لگی۔ اس نے مشتعل ہو کے میرے پیٹ میں مکا مارا۔ یہ کسی پیشہ ور اور مشاق باکسر کا مکا تھا جس نے مجھے دوہرا کر دیا۔ اس کا دوسرا مکا میرے منہ پر پڑا۔ میں نے پیچھے ہٹتے ہٹتے لات گھمائی جو اس کی پسلیوں پر پڑی۔ وہ سنبھل نہ سکا اور لڑکھڑا کے بائیں جانب گرنے لگا۔ وہ باہمت اور سخت جان تو تھا۔ جب کالیا نے اسے ٹکر ماری تو وہ ریوالور نکال چکا تھا۔

کالیا اس کے بازو سے لٹک گیا اور اپنے دانت اس کی کلائی میں گاڑ دیے۔ ایک بار پھر وہ ڈی ایس پی سے ریوالور چھیننے میں کامیاب رہا۔ تکلیف کی شدت میں عمر نے اسے ایک گالی دی اور اس کی پسلی میں اپنے دوسرے ہاتھ سے گھونسا مارا مگر کالیا کسی پاگل کتے کی طرح اس سے چمٹ گیا تھا اور اس کی بوٹی اتارے بغیر اسے چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ عمر غصے میں اسے مار ہی نہ ڈالے۔ وہ اب کالیا کے سر پر مکے مار رہا تھا اور یہ ایک ماہر باکسر کے مکے تھے۔ کالیا کے دماغ کی کوئی شریان بھی پھٹ سکتی تھی جس سے وہ ہمیشہ کے لیے مفلوج یا اپاہج بھی ہو سکتا تھا اور بے ہوشی میں ہلاک بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے ناپ تول کے عمر کی گردن پر کان سے ذرا نیچے کنپٹی پر ہتھیلی کا وار کیا اور وہ ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے جھٹکے یوں رک گئے جیسے بجلی بند ہونے سے گھومتا ہوا پنکھا رک جاتا ہے۔ میں نے ایک جھٹکا دے کر کالیا کو الگ کیا اور عمر کو سنبھال کے فرش پر لٹا دیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

"تم پاگل ہو گئے ہو کالیا۔" میں نے اسے جھنجوڑ کے کہا "ہوش میں آؤ۔"

کالیا نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا اور ایک آستین سے اپنے ہونٹ صاف کیے جن پر خون لگا ہوا تھا۔ یہ عمر قریشی کا خون تھا "کیا اسے میں نے مار دیا ہے؟"

میں نے کہا "یہ زندہ ہے۔ تم جا کے اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔ منہ دھو کے یہ کپڑے بدل ڈالو ورنہ یہ خون تمہاری آستین پر ہے یہی تمہیں پکڑوا دے گا۔"

"کپڑے تو یہی ہیں میرے پاس۔"

میں نے کہا "بیگ میں سے میرا کوئی جوڑا نکالو اور جلدی کرو۔ اس کے بعد تمہیں اور مجھے بہت سے کام کرنے ہیں اور وقت کم ہے۔ اور تم رابعہ، تم اس کے بچے یا دادو، باتھ روم میں ڈیٹول کی ایک شیشی ہے۔"

"وہ تو خالی ہے۔" رابعہ بولی۔

"چند قطرے ہیں اس میں۔ کلائی کا زخم صاف ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

رابعہ میرے بیگ میں سے کپڑوں کا ایک جوڑا نکال چکی تھی۔ اس نے باتھ روم سے ڈیٹول کی شیشی لا کے بھیگے ہوئے رومال سے عمر کے زخم کو صاف کیا اور اس پر ڈیٹول کی شیشی انڈیل دی۔ یہ شیشی نہ جانے کب سے باتھ روم کے ریک میں پڑی تھی۔ اس پر مٹی کی تہ جمی تھی کہ خالی سمجھ کے اسے عرصہ دراز سے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ شاید یہ چند قطرے ہمارے لیے ہی تھے جو اس وقت کام آ گئے۔

کالیا باتھ روم سے برآمد ہوا تو خاصا بدلا ہوا لگ رہا تھا "پرانے کپڑوں کا کیا کروں؟"

میں نے کہا "ابھی ساتھ رکھو راستے میں کہیں پھینک دینا۔ اب یہ سامان اٹھا کے گاڑی میں لے جاؤ۔"

رابعہ بھی پیکنگ میں مصروف تھی "ایک منٹ رکو۔"

میں نے کہا "چلو تم اتنی دیر میں فون وہیں کنکشن کر آؤ۔ اس کا تار کاٹ دینا اس طرح کہ جوڑا بھی نہ جا سکے۔"

"میں تار کاٹ کے پول پر سے کھینچ لوں گا۔" کالیا باہر نکل گیا۔

"رابعہ، اب تم جا کے نیلوفر کو بلا لاؤ۔" میں نے کہا "جانے سے پہلے مجھے بھی بیگ میں سے پینٹ شرٹ نکال دو۔"

"یہ فرمائش آپ ایک منٹ پہلے نہیں کر سکتے تھے۔" رابعہ نے دوبارہ بیگ کھولتے ہوئے کہا۔

رابعہ کے جاتے ہی میں نے عمر قریشی کی وردی اتاری اور اپنے جسم کے کپڑے اسے پہنا دیے۔ خود رابعہ کی دی ہوئی پینٹ شرٹ پہن کے میں نے عمر کی سرکاری وردی کو ایک اخبار میں لپیٹ لیا۔ اس وقت تک کالیا نے تینوں بیگ گاڑی میں رکھ دیے تھے۔

"اب میری بات غور سے سنو کالیا۔" میں نے کہا "رابعہ کے آتے ہی تم اسے اپنے ساتھ لے کر نکل جاؤ۔"

"اور تم......"

"میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔ تم دائیں طرف سیدھے ایک فرلانگ تک نہر کے کنارے چلو گے پھر بائیں طرف ایک فرلانگ کچے راستے پر۔ گاڑی کے سلو میٹر پر نظر رکھنا۔ تمہیں ایک فرلانگ کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔ جہاں یہ فاصلہ پورا ہو وہاں رک کے میرا انتظار کرنا۔ کوشش کرنا کہ گاڑی درختوں یا جھاڑیوں کی اوٹ میں

بھی سورج کی چمک پڑے تو سڑک پر کسی کو محسوس ہو سکتا ہے کہ مجھے دیر ہو جائے۔ رابعہ کو پریشان مت ہونے دینا۔ اسے سمجھا دینا کہ میں نے کیا کہا تھا۔ خواہ شام ہو جائے نہر سے کوئی پلٹ کے ادھر نہیں آئے گا۔"

رابعہ کے ساتھ نیلوفر اندر آئی۔ اس نے ایک دل دوز چیخ ماری اور دوڑ کے عمر پر گر گئی۔ "عمر... تم نے مار دیا اسے؟" وہ پاگلوں کی طرح عمر کو ٹٹولنے لگی۔

"عمر زندہ ہے۔" میں نے کہا۔

"خون ہے... ایسے کیوں پڑا ہوا ہے۔ کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ؟" وہ چیخ کے بولی۔

میں نے کہا "اسے آدھے گھنٹے میں ہوش آ جائے گا۔"

"میں ابھی ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔ بابا کو معلوم ہو گا۔"

میں نے اسے روک دیا "بابا کچھ نہیں کر سکتا۔ ٹیلی فون خراب ہے۔ کیا تمہیں اعتبار نہیں ہے میری بات پر۔"

"اگر اسے ہوش نہ آیا۔ او میرے خدا! میں کیا کروں گی اس کے بغیر... یہ اس کی کلائی پر پٹی کیوں ہے؟"

میں نے کہا "معمولی زخم ہے۔ رابعہ نے ڈیٹول سے صاف کر دیا تھا لیکن میرا مشورہ ہے کہ بعد میں اسے انجکشن ضرور لگوا لینا۔"

"اے ٹی ایس کا؟"

"نہیں، ANTI-RABIES کا۔ جسے غلطی سے کتے کے کاٹے کا انجکشن کہا جاتا ہے۔"

"بابا، کسی کتے نے کاٹ لیا ہے عمر کو۔ کتا کہاں ہے یہاں؟" وہ دہشت زدہ ہو کے بولی۔

میں نے کالیا سے کہا "تم کیوں کھڑے ہو۔ جاتے کیوں نہیں۔ رابعہ تم بھی جاؤ۔ میں نے کالیا کو سب سمجھا دیا ہے۔"

رابعہ نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے اور پھر میری نظر کا اشارہ سمجھ کے خاموشی سے کالیا کے ساتھ نکل گئی۔

"کس کتے نے کاٹا تھا عمر کو۔ بتاتے کیوں نہیں۔" نیلوفر نے کہا۔

میں نے کہا "اسے کالیا نے کاٹ لیا تھا۔ یہ دونوں آپس میں الجھ گئے تھے۔ وہ انجکشن اس لیے ضروری ہے کہ ہر گوشت خور جانور کے دانتوں میں ایک خاص قسم کا زہر ہوتا ہے۔ کتے کی طرح بلی بھی گوشت کھاتا ہے۔ بلی چوہا بھی کاٹ لیں تو وہی چودہ انجکشن لگوانے چاہئیں۔"

"خدا کرے اسے پاگل کتا کاٹے۔ وہ پاگل ہو کے بھونکتا ہوا مر جائے۔" نیلوفر رونے لگی۔

میں نے کہا "کیا میں عمر کو تمہارے کمرے میں پہنچا دوں۔ تم کہاں تک اسے کیا کہو گی؟"

"عمر دیکھا ڈیڈی کی طبیعت ذرا خراب ہے۔"

نیلوفر سخت مضطرب تھی "تم جھوٹ بول رہے ہو۔ عمر ایسے ہی پڑا رہے گا۔ یہاں فون بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر بھی نہیں آ سکتا۔"

"بابا ہے یہاں اور وہ پولیس پارٹی بھی آئی ہوئی ہو مجرم کو گرفتار کر کے لا رہی ہے۔" میں نے کہا "میں اب چلتا ہوں۔ عمر جیسے پولیس افسر کی بیوی کو بہادر ہونا چاہیے۔ یہ نوکری ہی ایسی ہے۔"

"بھاڑ میں جائے ایسی نوکری۔ ہزار بار کہا ہے میں نے کہ لعنت بھیجو نوکری پر۔ اپنا کاروبار چلاؤ۔ کس چیز کی کمی ہے ہمیں۔ ایک فلور مل فیکٹری ہے۔ جو ڈیڈی کی ہے۔ مگر میری کون سنتا ہے۔ کہتا ہے یہ بات صرف پیسے کی یا پیسہ کمانے کی نہیں۔ دنیا میں اور بھی بہت سے کام زیادہ اہم ہیں میرے لیے۔"

میں نے کہا "کچھ لوگ ایسے ہی دیوانے ہوتے ہیں نیلوفر۔ وہ کسی مقصد کے بغیر نہیں جیتے اور ان کے لیے مقصد حیات پیسہ نہیں ہوتا۔ موجد، فلسفی، تخلیق کار ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں اور تمہیں فخر ہونا چاہیے اپنے شوہر پر کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ وہ زندگی کو بیوپار سمجھتا ہے نہ دکانداری سمجھتا ہے۔"

میری بات نے اسے کچھ نفسیاتی تسلی دی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے نیلوفر کو خدا حافظ کہا اور پچھلی طرف کے لان پر سے گزر کے دیوار پھاند گیا۔ اب میرے سامنے کھیت تھے اور تاحد نگاہ پھیلا ہوا جنگل تھا جس میں کہیں کہیں درخت جھنڈ کی صورت میں نظر آتے تھے۔ مشرق کی طرف بھارتی سرحد یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔

ریسٹ ہاؤس کے ملازم نے مجھے دیوار پھاند کے فرار ہوتے نہیں دیکھا تھا اور آس پاس مجھے گائے بھینس چرانے والے لڑکوں کے سوا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہت دور نہر کے کنارے پر عورتیں کپڑے دھونے اور نہانے میں مصروف تھیں اور دوسری طرف چند بچے گھروندے بناتے نظر آ رہے تھے۔

میں نے ایک گڑھے میں اتر کے پھر کپڑے بدلے۔ اب میرے جسم پر ڈی ایس پی کی وردی تھی اور میرے کپڑے اخبار میں لپٹے ہوئے پیکٹ کی صورت میں میری بغل میں تھے۔

گڑھے سے باہر نکل کے میں پھر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ریسٹ ہاؤس کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ میں نے خود کو نیلوفر یا بابا کی نظروں سے محفوظ رکھا اور ایک سائڈ پر کھڑا نہر کے کنارے دونوں طرف دیکھتا رہا۔ اپنے انداز و اطوار سے میں ڈی ایس پی نظر آنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ ایک ٹریکٹر میرے سامنے سے گزرا جس کے پیچھے ٹرالی میں گھاس کے انبار کے مزدور لدے ہوئے تھے۔ ڈرائیور نے اور مزدوروں نے مجھے سر تک ہاتھ اٹھا کے عاجزی سے سلام کیا اور میں نے دستور کے مطابق اپنی اکڑی ہوئی گردن کو افسرانہ

www.paksociety.com

رعونت سے ہلانے پر اکتفا کیا۔
ہم جس مذہب کے پیروکار تھے اس میں سلام میں سبقت لے جانے کی فضیلت تھی لیکن محمود و ایاز کے ایک ہی صف میں کھڑے ہونے کا زمانہ گزر گیا تھا۔ اب محکوم ہی حاکم کو سلام کرتا تھا۔ حاکم کی مرضی جواب دے نہ دے۔
مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ آدھے گھنٹے بعد بائیں طرف سے ایک جیپ آتی دکھائی دی۔ میں گیٹ سے کچھ آگے جا کے رک گیا۔ یہ وہی پولیس پارٹی تھی جو کسی مفرور قاتل کی گرفتاری کے لیے عمر قریشی کی نگرانی میں حیدر آباد سے آئی تھی۔
ڈرائیور نے میرے قریب لا کے جیپ روک لی اور نیچے اتر کے مجھے سیلوٹ کیا۔ جیپ کی پچھلی سیٹ پر چار پولیس والے ایک شخص کو ہتھکڑی پہنے درمیان میں گھیرے بیٹھے ہوئے تھے۔
میں نے کہا "مل گیا بندہ؟"
"یس سر۔" ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے اے ایس آئی نے بھی سیلوٹ مار کے کہا "ملتا کیسے نہیں؟"
میں نے پیچھے جا کے ملزم کا معائنہ کیا۔ اس کو گرفتار کرتے ہوئے پولیس نے خاصی بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ بہادری کے آثار ملزم کی حالت سے عیاں تھے۔ اس کی آنکھوں کے گرد سوجن اور نیل تھے۔ ہونٹ بھی سوجے ہوئے تھے اور اوپر والے ہونٹ کا ایک کنارا پھٹ گیا تھا۔ اس سے خون رس رہا تھا۔ ملزم کی پیشانی پر ایک گومڑ تھا اور وہ کراہ رہا تھا۔
"کیوں اوئے نمک حرام۔" میں نے اس کے بال پکڑ کے چند جھٹکے دیتے ہوئے کہا "حیدر آباد سے بہت دور سمجھا تھا تُو نے اس جگہ کو؟ ارے ہم تو تجھے سات سمندر پار سے پکڑ لاتے۔ ڈرائیوری کرتے کرتے خود گاڑی کا مالک بننا چاہتا تھا؟ کوٹھی میں رہنا چاہتا تھا۔ بول، جیسی لگژری حویلی کی تھی ویسی ہی تو بھی بنانا چاہتا تھا؟"
اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے میں نے اس مظلوم شخص کو بھی پولیس کی روایات کے مطابق بے رحمی سے مارا اور گالیاں بھی دیں۔ وہ چلاتا رہا "ہائے میں مر گیا۔ ہائے ربا میری توبہ۔ سرجی معاف کر دیں مجھے۔ غلطی ہو گئی مجھ سے۔"
صاف ظاہر تھا کہ ملزم پہلے ہی اپنے جرم کا اقرار کر چکا ہے۔ اسے مارنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ جو ملزم اعتراف جرم نہ کر رہا ہو یا جس سے کچھ اگلوانا ہو اس کے ساتھ تشدد آمیز سلوک کی بات سمجھ میں آتی ہے مگر جو خود سب بتا چکا ہو اسے پولیس کیوں مارتی ہے؟ پریکٹس کے لیے؟ اپنی اذیت پسند فطرت کی تسکین کی خاطر۔ عدالت اسے قانون کے مطابق سزا دیتی ہے پھر یہ اضافی سزا کس لیے؟
تاہم اس ظلم کے بغیر میں خود کو پولیس افسر ثابت نہیں کر سکتا تھا "پکڑ کے رکھو اسے اچھی طرح۔ ٹکڑے کر کے رکھو یہ تک۔۔۔"
سب انسپکٹر نے کہا "سرجی وہ عمر قریشی صاحب۔۔۔"
میں نے کہا "ہاں وہ گئے ہیں ارکاڑے۔"
"ارکاڑہ؟ وہ کس لیے سر؟"
"وہاں ان کی بہو بیٹا ہے نا۔ نیلوفر۔ عمر صاحب کی بیاز..." میں نے رک کر مسخرانہ انداز میں کہا "اس کا کوئی ماں فرشتہ ہو۔۔۔ ڈی ایس پی صاحب نے کہا کہ چلو ادھر بھی تعزیت کر لیں پھر آئے گا حیدر آباد سے۔"
"پھر ہمارے لیے کیا حکم ہے سر؟"
"تم ملزم کو ٹرین سے لے جاؤ حیدر آباد۔"
اے ایس آئی پریشان ہو گیا "وہ سر۔ ٹرین سے تو۔۔۔"
"خرچہ دے گئے ہیں عمر صاحب۔ یہ لو۔" میں نے اسے ... کے پانچ نوٹ تھمائے۔ "جیپ تمہیں اسٹیشن چھوڑ کے ادھر آئے گی۔ وہ میری گاڑی لے گئے ہیں۔"
"ٹھیک ہے سر۔" اے ایس آئی نے کہا۔
میں نے کہا "ڈرائیور کو جلدی فارغ کر دینا۔ عمر صاحب کے بچے ادھر ہی ہیں۔"
اے ایس آئی جاتے جاتے رک گیا "بچے؟"
"ہاں مُنی اور جنا۔" میں نے کہا "وہ ساتھ جا کے کیا کرتے۔ عمر صاحب نے جانا ہے اور رہ جانا ہے شام تک۔ میں رکا ہوا ہوں ادھر۔ بچوں کے لیے کچھ ڈبل روٹیاں ... ڈرائیور کے ساتھ۔"
جب چلی گئی تو میں نے اپنی کامیاب اداکاری پر ... خود کو خراج تحسین پیش کیا۔ عمر قریشی، اس کی بیوی ... نام بڑے مشہور حوالے تھے جن سے ثابت ہو گیا تھا کہ میں سب ... مل چکا ہوں اور انہیں اچھی طرح جانتا ہوں ورنہ عمر قریشی ... کو ارکاڑہ جانے کے لیے اپنی گاڑی کیوں دیتا۔
وردی پر جیب کے اوپر جہاں عمر قریشی کے نام کی پلیٹ لگی تھی وہ میں نے کاغذ میں لپیٹے ہوئے پیکٹ کے نیچے چھپا رکھی ... جتا تو اے ایس آئی یا کوئی دوسرا سپاہی بھی میرا نام ... جیپ کے نگاہ سے اوجھل ہوتے ہی میں لوٹ کر ... طرف گیا جہاں میں نے اپنا لباس بدل کے پولیس کی ... تھی۔ ایک بار پھر میں نے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور ... وردی کو پیکٹ بنا کے بغل میں دبا لیا۔ اب پولیس پارٹی کے ... آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ان کی دوبارہ عمر قریشی ... ملاقات حیدر آباد میں ہوگی۔ ڈرائیور جیپ کے ساتھ ایک ... گھنٹے میں واپس آئے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ کسی ... ایس پی نے انہیں بے وقوف بنایا تھا۔ اس وقت تک ... ہوش میں آ چکا ہوگا۔ وہ سمجھ جائے گا کہ یہ سارا چکر میرا ...

... بچوں کے ساتھ واپس لاہور پہنچ کے وہ پولیس کو ... محمود بخت نے ریسٹ ہاؤس میں کیا واردات کی ... نام کی ایک ایڈورٹ کے ساتھ پولیس کی وردی ... ممکن ہے ملزم نے بعد میں وردی اتار دی ہو ... بدل لیے ہوں۔ اس کے ساتھ کالیا نام کا ایک ... رنگ کی شلوار قمیص میں۔"
... سب غلط ہوگا۔ میں اب براؤن شرٹ اور کالی پتلون میں ... رابعہ نے بھی سفید قمیص اور شلوار پہن لی تھی۔ صرف رابعہ ... نہیں بدلا تھا جو اب بدلا جا سکتا تھا مگر اصل چیز تھی ہمارا ... نہ جانے کب سے مشتہر ہو رہا تھا۔ کالیا کے بارے ... معلومات فراہم کر سکتا تھا مگر فوری طور پر نہیں۔ رابعہ ... تھی۔ وہ کسی جرم میں مطلوب نہیں تھی اور اسے گرفتار ... آسانی سے کور کر سکتے تھے کہ اس وقت تو وہ ہمارے ... نہر کے کنارے کسی ریسٹ ہاؤس میں وہ سکندر کے ... ممکن ہے۔ ضرور مسٹر عمر قریشی کو غلط فہمی ہوئی۔
ریسٹ ہاؤس سے میں نے اپنی سمت کا تعین کیا۔ میں ایک ... فرلانگ بائیں طرف چلتا تو غالباً اس جگہ ... کالیا کے ساتھ رابعہ میرے انتظار میں تھی مگر میں نے ... کے لیے ایک فرلانگ مزید کے وزنی فرضی لکیر پر ...
کوئی صاف میدانی راستہ نہیں تھا۔ دور سے رکھوں پر پہلے ... رکھی تھی۔ میں کھیتوں کی منڈیر پر چلتا رہا اور ... مڑ کر پیچھے دیکھا کہ ریسٹ ہاؤس جب تک نظر آیا ... مطمئن تھا کہ میں صحیح سمت میں جا رہا ہوں۔ پھر نشیبی علاقہ ... ریسٹ ہاؤس کو چھپا لیا۔
... گزرنے کے بعد میں نے رک کے چاروں طرف نظر ... اپنے اندازے کے مطابق میں اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں ... ہونا چاہیے تھا۔ یہاں یا سو گز دائیں بائیں ہونے ... میں پڑا تھا۔ اگر کالیا کی آنکھیں ایک طرف دیکھ ... دوسری طرف رابعہ کی نظریں مجھے آسانی سے دیکھ سکتی ... درخت کی اوٹ میں یا جھاڑی کے پیچھے تھے تو میری ... تلاش کر سکتی تھیں مگر کھلی جگہ میں میرا وجود بہت ...
... چند قدم چل کے پھر دائیں بائیں دیکھا۔ اسی وقت ... سر کھجانے لگا۔ میں بے اختیار رکا۔
... درخت کے پیچھے سے نمودار ہو کے رابعہ نے قہقہہ لگایا ...
... کالیا ایک پتھر اٹھا کے کہا "آپ کی نظر میں یہ ... گیا ہو گا ہے؟ کوہ قراقرم۔"
قراقرم بھی کے تو۔ وہ تو ختم ہو۔" رابعہ نے کہا "کبیر خان عرف چیف کے تو۔"
"اس نام سے ذہن میں امریکی ریڈ انڈین قبیلے کا کوئی سردار آتا ہے۔ تنگ و عزنگ۔ منہ پر اور بدن پر رنگ سے لکیریں اور سر پر شتر مرغ کے پروں کا تاج۔ چیف گیرونیمو۔"
"تمہاری وردی کہاں ہے؟"
میں نے پیکٹ اسے تھما دیا "اسے سنبھال کے رکھو ابھی۔ کیا پتا کب حلیہ بدلنے کے لیے اس کی ضرورت پڑ جائے۔ کالیا کہاں ہے اور گاڑی کہاں ہے؟"
"کالیا گاڑی کی ٹیوننگ کر رہا ہے۔ ادھر ہے۔"
"وہ موٹر مکینک بھی ہے؟" میں نے کہا۔
"راستے میں دو جگہ گاڑی بند ہوئی تھی۔ میں تو سمجھی پٹرول ختم ہو گیا۔"
"پٹرول کتنا ہے؟"
"ہاف سے زیادہ۔" وہ میرے ساتھ چل پڑی۔
کالیا ٹیوننگ سے فارغ ہو کے انجن کی آواز بڑے دھیان سے سُن رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کے اس نے بڑے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور بونٹ بند کر دیا۔
"ابھی کدھر چلنا ہے؟" اس نے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔
میں نے کہا "تم ہمیں جی ٹی روڈ تک لے چلو۔"
"گاڑی پکڑی نہ جائے مین روڈ پر۔ ناکا بندی ہوگی ضرور۔"
میں نے کہا "اس گاڑی کا نمبر پولیس کے پاس نہیں ہوگا۔ نہ یہ چوری کی گاڑی ہے اور نہ کہیں بھی ہوئی۔"
"اس بڈی ایس پی نے تو نمبر دیکھا ہوگا۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا "گاڑی سائڈ میں نہ ہوتی تو وہ ضرور دیکھ لیتا۔ اس وقت قدرت نے ہمارا ساتھ دیا۔ عمر قریشی نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ اسے تمہاری ظلم کی داستان سے کوئی دلچسپی نہیں ورنہ شاید میں اسے تمہارے بارے میں بتا دیتا۔"
"بڑی خرابی ہو جاتی پھر تو۔" رابعہ نے کہا۔
مین روڈ پر پہنچ کے میں نے ڈرائیونگ خود سنبھال لی اور کالیا نیچے اتر گیا "میں اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟"
"تم جاؤ سیدھے چوہدری صاحب کے پاس۔" میں نے کہا "ان کے پاؤں پکڑ کے معافی مانگو کہ جو کام تمہیں سونپا گیا تھا وہ تم نہیں کر سکے اور بڑی مشکل سے جان بچا کے واپس پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہو۔ تمہاری حالت تمہاری بات کے سچ ہونے کا ثبوت ہوگی۔ سالار کو یقین دلا دینا کہ کسی نے مخبری کر دی تھی اور وہاں سب پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ تین بندے مارے گئے اور تم خود بال بال بچے۔ ویسے سالار کو پوری رپورٹ تو مل گئی ہوگی۔ اب تک

www.paksociety.com

تین لاشیں اٹھائی گئی ہوں گی اور منظر نے اپنی گاڑی کے چھینے جانے کی رپورٹ بھی لکھوائی ہوگی۔"

"منظر کون؟"

"وہی جس کی کار تم نے چھینی تھی۔ بہت بڑا رئیس ہے وہ۔"

میں نے کہا "دلاور کے سامنے ہاتھ جوڑنا کہ جناب ایک موقع اور دیں۔ وہ تمہیں دوسرا موقع نہیں دے گا کیونکہ اسے تو بہانہ چاہیے دوسری شادی کا۔ جب وہ نہ مانے تو تم مجبوراً مان جانا۔ جیسی خوشی نہیں۔ روتے دھوتے کہنا کہ اچھا جی رب کی یہی مرضی ہے تو...."

"یہ تو میں کروں گا لیکن... اس کے بعد...."

"فکر مت کرو پھر ہم پہنچ جائیں گے۔ تم ایک کام تو یہ کرو کہ ہمیں پورا پتا سمجھا دو۔ اور اگر تمہارے رشتے دار ہیں تو ان کے نام...."

"رشتے دار!" اس نے تلخی سے کہا "غریب آدمی کو اپنا رشتے دار کون مانتا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا تو دو چار نام رکھ لو۔ دور کے چاچے مامے مانو ہم جمعہ کی نماز کے بعد پہنچ جائیں گے۔ تمہارے چاچے مامے بن کے۔"

"دلاور شک میں پڑ جائے گا۔"

"کیوں؟ تم نکاح کر رہے ہو اپنی بہن کا تو کیا اس میں تمہاری طرف سے کوئی شریک نہیں ہوگا۔ تمہارے گواہ کون ہوں گے؟"

میں نے کہا "یہ حق ہے تمہارا۔"

رابعہ نے کہا "ویسے کالیا کیا تمہیں یقین ہے کہ دلاور جنت ہی کے ساتھ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"اس نے یہی کہا تھا۔"

"اس کے کہنے پر مت جاؤ۔ فرض کرو بعد میں اس نے انکار کر دیا کہ کوئی شادی نہیں ہوئی تھی۔ یہ لڑکی اور اس کا بھائی مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔"

"نکاح نامہ تو ہوگا۔"

"وہ کہہ سکتا ہے کہ نکاح نامہ جعلی ہے۔ پولیس تمہیں ہی پکڑے گی کیونکہ تم ہی پکڑے جا سکتے ہو۔ دلاور جھوٹا ہو کے بھی سچا بن جائے گا اور پولیس تمہارا اور جنت کا وہ حشر کرے گی کہ تم خود نکاح نامے کو جعلی مانو گے۔ اتنی پٹائی کے بعد تم شاید زندہ بھی رہنا پسند نہ کرو۔"

"ایسا ہوگا تو میں اسے مار کے مروں گا۔ لیکن یہ شک کیوں ہے تمہیں؟" کالیا نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ تمہاری بہن جنت سے اچھی نہ جانے کتنی لڑکیاں ہیں جو خوشی خوشی اس کی دوسری تیسری یا چوتھی بیوی بننا قبول کریں گی۔ یہاں ایسی پڑھی لکھی اور ماڈرن لڑکیاں بھی مل جائیں گی جو چوتھائی شوہر کو کافی سمجھیں گی کیونکہ اس کی دولت بھی ان کے سارے خوابوں کو حقیقت میں بدل... دلاور کو کیا ضرورت ہے کہ جنت جیسی معمولی لڑکی کو... اپنے گلے کا ہار بنائے۔ ایسے ہار تو وہ ہر رات... ہوگا۔"

کالیا کی آنکھوں میں خون کی سرخی اتر آئی "جنت... کوئی چوہدری دلاور ایسا کرے گا تو...."

میں نے کہا "آرام سے، آرام سے، غصے میں مت... بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں تمہارے لیے اور تمہاری... لیے۔ دلاور کی نیت کچھ بھی ہو۔ وہ تمہاری بہن کے ساتھ... زنا نہیں کر سکے گا۔ یا تو شادی ہوگی باقاعدہ حق مہر کے ساتھ..."

رابعہ نے کہا "وہ چالاک آدمی شرعی حق مہر پر اصرار... گا۔"

"تم خاموش ہو جانا مگر عین وقت پر جب میں اشارہ... کے اپنی شرائط پیش کر دینا۔ حق مہر ایک لاکھ۔ جنت کے... اور کاروبار میں حصہ۔"

"وہ گولی مار دے گا مجھے۔"

"کیسے گولی مار دے گا۔ ہم ہی نہیں اور بھی بہت سے... ہوں گے۔ ان میں اخبار والے بھی ہوں گے۔"

"اخبار والوں کو اندر کون جانے دے گا؟"

"دو چار آدمی ہمارے ساتھ ہی آئیں گے... آگے پیچھے ساری باتیں ریکارڈ کرتے رہیں گے اور اچانک تصویریں بھی... گے۔"

کالیا پریشان نظر آنے لگا "وہ بہت خطرناک آدمی ہے... اس کے بندے ہوں گے سب۔ ایسا نہ ہو...."

میں نے ہنس کے کہا "کالیا! تم کیا سمجھتے ہو اخبار والوں... انگلی نہیں اٹھا سکتا دلاور کا باپ بھی۔ یا تو تمہاری بہن... باعزت طور پر قانونی بیوی بنے گی یا تم ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاؤ گے۔ نکاح کا وقت چار بجے رکھنا۔ اس سے پہلے... نکاح مت پڑھانے دینا۔ ہم ساڑھے تین بجے یا پونے... آئیں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم بھی ہمیں نہ پہچان سکو۔... ابھی سن لو کہ ہم نیلی پگڑیاں باندھ کے آئیں گے۔ تم بھی... باندھنا۔ وہ ہو سکی تو کرتا اور جالی مار کہ... میں لال گلاب کے ہار... یہ ہوگی ہماری پہچان۔ رابعہ اسے ایک... دے دو ابھی۔ تیاری کے لیے۔"

رابعہ نے اسے پانچ ہزار روپے دیے "ایک ہزار تمہارا... تمہاری بہن کے لیے۔ آخر اسے بھی تو دلہن بننا ہوگا۔"

کالیا رونے کے قریب ہو گیا "کتنی بدقسمت ہے... بھی مجبوری میں بنے گی۔ پھر پتا چلے گا کہ مجبوری بھی...

ریشمی جوڑا اور سنگھار سب تماشا تھا۔"

"اللہ نے چاہا تو بہت جلد سچ مچ دلہن بنے گی۔ تم اپنا دل میلا مت کرو۔" رابعہ نے کہا۔

"کیا... میں جنت کو بھی بتا دوں۔ پہلے سے...."

"ہرگز نہیں۔ بات جب ایک سے دوسرے تک پہنچتی ہے تو پرائی ہو جاتی ہے۔ تم شاید مجبوری کی اداکاری کر لو۔ جنت ایکٹنگ نہ کر سکی تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ اسے رونے دو اپنی قسمت پر۔"

کالیا رخصت ہو گیا تو میں نے گاڑی کے پیٹرول ٹینک کو فل کرایا اور پھر گاڑی کو پنڈی جانے والی شاہراہ پر ڈال دیا۔ موسم اچانک خوشگوار ہو گیا تھا۔ میرا موڈ اس سے زیادہ خوشگوار تھا۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا اور آزاد محسوس کر رہا تھا۔ لاہور میں میرے گرد مخالف حالات کا حصار تنگ سے تنگ تر ہونے لگا تھا۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ شکاری جال پھیلاتے جا رہے تھے اور حلقہ در حلقہ آفات و حادثات کی زنجیر مجھ سے لپٹتی جا رہی تھی۔ میں اتنا بے بس اور مجبور ہو گیا تھا کہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے دوسروں کے بارے میں زیادہ سوچنا پڑتا تھا اور میرے دل پر دوستوں کے بوجھ کی چٹان بڑھ کے پہاڑ بن گئی تھی۔ وہ میرے دوست تھے جو میرا بھلا چاہتے تھے مگر بدلے میں ان کو میری طرف سے کیا مل رہا تھا؟ مصیبت اور پریشانی۔ دکھ اور ذلت۔ تباہی اور بربادی۔ رابعہ نے اگر فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ میری خاطر سب کچھ چھوڑ دے گی۔ اپنا کیریئر اور مستقبل بھی۔ اپنے رشتے بھی اور تعلقات بھی۔ تو یہ مجبوری ہے اسی عشق کی جس میں انتہا کے بغیر ابتدا کچھ نہیں۔ اور ابتدا نہیں تو انتہا بھی نہیں۔ رابعہ نہیں تو میں نہیں اور میں نہیں تو رابعہ نہیں۔

رابعہ نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا کہ میں اسے کہاں لے جا رہا ہوں۔ اب ایسا ہر سوال بے معنی اور بے مقصد ہو چکا تھا۔ وہ بڑی مطمئن تھی۔ باہر خلا میں دیکھ رہی تھی اور نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

گوجرانوالہ شہر سے گزرتے ہوئے میں نے گھڑی دیکھی تو دو بج چکے تھے۔ شاہراہوں پر تانگے ریڑھے سائیکلوں والے اور پیدل حضرات کی اکثریت تھی چنانچہ جمہوری اصولوں کے مطابق وہی حکمران تھے اور انہی کا قانون تھا۔ رکشا اور موٹر سائیکلوں والے کسی قانون کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اپنا راستہ خود نکال لیتے تھے۔ ٹرک اور بسوں والے پریشر ہارن سے خلقِ خدا کو دہشت زدہ کر کے نکل جاتے تھے۔ مشکل ہم جیسے کار والوں کی تھی جو ٹریفک کے قوانین کا پابند رہنے کی کوشش میں پھنسنے پر مجبور تھے۔ بیشتر لوگ کار کے سامنے سے چیلنج کے انداز میں گزرتے تھے کہ ہمت ہے تو گزار کے دیکھو۔ وہ رابعہ کو گھورتے تھے اور میں انہیں گھورتا تھا۔ یہ پہلوانوں کا شہر تھا۔ اس سے زیادہ میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ شہر سے باہر آ کے میں نے سکون کا سانس لیا۔

"اف! یہاں تو ایسا لگتا تھا کہ سب ہی مرنا چاہتے تھے۔"

رابعہ مسکرائی "وہ کیسے؟"

"آدھے تم پہ مر چکے تھے، آدھے میری گاڑی کے نیچے آنا چاہتے تھے۔ تھکن سے میرا برا حال ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"چلو تھوڑی دیر کہیں رک جاتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے گاڑی روک لی "لو رک گئے اب بولو۔"

"بھئی میرا مطلب تھا کہ کچھ کھا لینا چاہیے۔"

میں نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی "سب کچھ حاضر ہے۔ گنے، ریڑھیاں۔ پیڑے والی لسی۔ گرد دھواں اور مکھیوں والے... بھٹے۔"

"کھانے کا وقت ہے لیکن میرا موڈ چائے کا ہے۔" رابعہ بولی۔

"چائے کے ساتھ ہی کچھ کھا لیتے ہیں۔" میں نے گاڑی ایک روڈ سائیڈ ریسٹورنٹ کے سامنے روک لی۔ وہاں پڑے تھے

رہے تھے۔ بجھتے چیتے کے مسالے میں دھواں دھار مرچیں تھیں۔ ہم سوں سوں کرتے کھا گئے۔ اس کے بعد ٹھنڈی بوتل پی تھی۔

رابعہ نے دوپٹے سے آنسو پونچھ کے کہا "کیسا لگ رہا ہے؟"

میں نے بوتل حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا "اِک آگ سی ہے پیٹ کے اندر لگی ہوئی۔"

رابعہ بولی "یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے۔"

بعد میں ہم نے ایک جگہ چائے پی جو بقول خاص و عام ... کا ایسا مشروب تھا جسے چائے کی چند پتیوں کو گھنٹوں کے حساب سے ابالا جاتا تھا۔ وہ گھنٹے بعد میں نے کار کو جہلم کے بائیں اُلٹے ہاتھ پر نہ جانے والی سڑک پر موڑ لیا۔

اب رابعہ خاموش نہ رہ سکی "اِدھر کیا ہے؟"

میں نے کہا "منگلا ڈیم۔ اس کے آگے آزاد کشمیر۔ باقی تم دیکھ رہی ہو۔ کھیت درخت اور پوٹھوہار کی سرزمین کے نشیب و فراز۔ نیلا آسمان اور سورج، پکھی پرندے۔ کیا یہ سب کافی نہیں؟"

"اُف۔ آخر کہاں جا رہے ہیں ہم!"

"شمال کی طرف۔ کسی جائے پناہ کی تلاش میں۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کوشش کا انجام کیا ہوگا۔ ہم شامتِ اعمال سے بچ کے جا رہے ہیں یا شامتِ اعمال ہمیں بلا رہی ہے؟" میں نے گاڑی کو ایک بہت چکی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ڈال دیا۔

سورج اب مغرب میں تقریباً ہمارے سامنے غروب کی جانب مائل تھا اور اس کی ترچھی کرنیں اکا دکا درختوں سے چھن کر بار بار میری آنکھوں پر پڑ رہی تھیں۔ دھوپ چھاؤں کے اس کھیل سے بچنے کے لیے میں نے سن وائزر کو سامنے کر لیا۔ تقریباً ایک سو گز فرلانگ آگے ایک جیپ جا رہی تھی۔ پہلے اس نے ٹریکٹر کو دور تک کیا پھر ہم نے۔ اچانک ایک پل آیا جو اتنا ہی چوڑا تھا کہ ایک وقت میں ایک گاڑی گزر سکے۔ یہ دریائے جہلم کی کوئی شاخ تھی یا برساتی نالا۔ اس کا پاٹ بہت تھا۔ بارش کے موسم میں شاید یہ بھی چھوٹے موٹے دریا کی طرح نظر آتی ہوگی۔ ابھی اس میں پانی بہت کم تھا۔ ایک جگہ ندی عبور کرنے کے لیے پانی میں بڑے بڑے پتھر بھی پڑے ہوئے تھے۔

عین وقت پر میں نے گاڑی روک لی۔ کیونکہ مخالف سمت سے ایک جہازی سائز کی شیورلیٹ امپالا نمودار ہو گئی تھی جس کے پہیے پل کے کناروں سے شاید ایک فٹ ہی اندر ہوں گے۔ کار ہمارے قریب سے گزری تو مجھے اس کی کھڑکیوں پر سیاہ پردے نظر آئے۔ غالباً اس میں کسی بڑے زمیندار گھرانے کی معزز اور پردہ دار خواتین جا رہی تھیں۔ ڈرائیور نے مجھے اور رابعہ کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔ دیہی علاقوں میں اجنبی ہم سفر مشکوک رہتا ہے اور گاڑی والا تو دس کوس دور ہوتا ہے کہ اس کے آنے کی خبر باعثِ تشویش بن جاتی ہے۔

یہی ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ چھوٹے سے گاؤں کی آبادی شاید سو ڈیڑھ سو گھروں پر مشتمل تھی۔ ان میں چند پکے گھر بھی تھے۔ ایک مسجد کے میناروں کی سفیدی سرسبز درختوں اور نیلے آسمان کے پس منظر میں نمایاں تھی۔ ایک ٹیوب ویل کے قریب جو اس وقت بند تھا دو نوجوان لنگوٹ باندھے کشتی لڑ رہے تھے۔ وہیں ایک قطعۂ زمین پر مٹی دھول میں کچھ لوگ والی بال کھیل رہے تھے۔ انہوں نے شلواریں اوپر چڑھا لی تھیں اور وہ ننگے پیر تھے۔ گاڑی کو دیکھتے ہی وہ اپنا کھیل بھول گئے۔

میں نے گاڑی روکی اور دوستانہ ماحول پیدا کرنے کے لیے کشتی لڑنے والے نوجوانوں کو السلام علیکم کہنے کے بعد مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

وہ مٹی دھول میں بھرے ہوئے تھے۔ چند سیکنڈ انہوں نے اپنے گندے ہاتھوں کو دیکھا اور پھر یہ محسوس کرتے ہوئے کہ میں نے اپنا ہاتھ پیچھے نہیں کیا ہے پہلے ایک نے اور پھر دوسرے نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

اگر ہاتھ ملانے کے بعد میں اپنے ہاتھ جھاڑتا تو یہ بد دماغی کا مظاہرہ ہوتا۔ میں نے پنجابی میں کہا "یہ کون سا گاؤں ہے؟"

ان میں سے ایک نے چک نمبر بتایا "کس سے ملنا ہے جناب عالی؟"

میں نے کہا "میں یہاں منگلا ڈیم پر انجینئر ہوں۔ رہنے والا لاہور کا ہوں۔ میری ابھی شادی ہوئی ہے لیکن میری بیوی نے کبھی گاؤں نہیں دیکھا تھا۔"

اب والی بال ٹیم کے ارکان بھی ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے۔ میرے بیان کے بعد انہوں نے دانت نکالتے ہوئے رابعہ کو قابلِ رحم نظروں سے دیکھا۔

"دراصل یہ ولایت میں تھی۔" میں نے رابعہ کی پوزیشن واضح کی "پھر کراچی میں رہی۔ اسے بہت شوق تھا گاؤں دیکھنے کا۔ میں نے کہا کہ چلو آج تمہیں گاؤں دکھاتے ہیں۔ اس لیے اِدھر چلا آیا۔"

اب ایک پختہ عمر کا آدمی شلوار نیچے کرتا آگے آیا "جم جم تو جناب۔ شوق سے دیکھو گاؤں۔ میں پوسٹ مین ہوں اس علاقے کا۔ سب کی چٹھیاں لکھتا بھی ہوں۔ پڑھتا بھی ہوں اور بانٹتا بھی ہوں۔ لفافے ٹکٹ بھی رکھتا ہوں۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "میرا نام ابراہیم بیگ۔"

"خادم کو جانن دین کہتے ہیں۔" اس نے میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"کریلے" پیچھے سے کسی نے "لے" کو کھینچ کے کہا۔

وہ تڑپ کے پلٹا "کون ہے؟ کس نے بکواس کی ہے مہمانوں کے سامنے۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ اس کی چڑ ہوگی۔ اسے چڑانے والا منہ بند

کیے معصوم صورت بنائے کھڑا تھا اور باقی لوگوں کے ہنسنے سے نمایاں ہو گیا تھا۔

میں نے فوراً کہا "ماسٹر جانن دین۔ یہ بتاؤ کہ ہم ایک دن رہنا چاہیں اس گاؤں میں تو کہاں رہیں۔"

"ایک دن نہیں جناب سو دن رہو۔ جم جم رہو۔ ویسے تو خادم کا گھر بھی ہے لیکن اپنے ملک صاحب کا ڈیرا ہے۔ شہر سے ڈی ایس پی صاحب آتے ہیں۔ انسپکٹر اسکول اور جناب سرکاری افسران بھی سب ان کے مہمان ہوتے ہیں۔"

ایک نوجوان نے کہا "آپ نے راستے میں گاڑی دیکھی ہوگی ان کی۔"

دوسرے نے سر ہلایا "اس سے بہت بڑی ہے۔"

میں نے کہا "اچھا وہ شیورلیٹ امپالا۔ کیا کرتے ہیں ملک صاحب؟"

پوسٹ مین نے میری گاڑی کو چھوٹا قرار دینے والے کو گھورا ہوگی کرنا گیا ہے۔ خیر سے زمیندار ہیں۔ یہ جو ممبر اسمبلی ہیں ملک انور ان کے سگے چچا ہیں۔"

نہ میں کسی ملک انور کو جانتا تھا اور نہ مجھے یہ سمجھ آئی تھی کہ کون کس کا چچا ہے لیکن یہ مجھے معلوم تھا کہ اس گاؤں میں ہم کسی نمبردار، تحصیل دار یا زمیندار وغیرہ کے ہی مہمان ہوں گے۔ باقی رعایا کی کیا مجال کہ کسی معزز کو اپنے غریب خانے میں قیام کی دعوت بھی دے سکے اور خود مہمان کسی زمیندار کے مقابلے میں غریب مزارع کو ترجیح دے تو گھاٹے میں رہتا ہے۔

میں نے پوسٹ مین صاحب کو گاڑی میں بیٹھنے کی دعوت دی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ مٹی گرد سے گاڑی کی سیٹ خراب کرنا اس کے نزدیک گناہِ کبیرہ سے کم نہ تھا۔ دیگر حضرات پر بھی دھول کم نہ تھی۔ اس سے خاصی مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہوئی۔

"آپ چلو جناب عالی، ہم پیچھے آئیں گے۔"

میں نے چشمِ تصور سے یہ منظر دیکھا کہ میں رابعہ کے ساتھ کار کو پیدل کی رفتار سے چلاتا جا رہا ہوں اور ہمارے پیچھے پندرہ بیس افراد جلوس کی شکل میں آ رہے ہیں جو حلیے سے بھوت لگتے ہیں۔ راستے میں مزید افراد کا اس جلوس میں شامل ہونا یقینی تھا۔

میں نے کہا "جانن دین یہ تو بارات بن جائے گی۔"

اس نے میری بات سمجھ لی "اچھا جی پھر میں سب کو منع کر دیتا ہوں۔ آپ آگے چلیں۔ میں پیچھے آتا ہوں۔"

میں نے اس تجویز سے بھی اتفاق نہیں کیا "اگر تم گاڑی میں نہیں بیٹھو گے تو پھر ہم سب پیدل چلیں گے فاصلہ ہی کتنا ہے۔"

"اور گاڑی؟"

"وہ بعد میں آ جائے گی۔ تم کسی سے کہہ دو کہ اس کا خیال رکھے۔"

جانن دین نے ایک نوجوان کو محافظ مقرر کیا اور میرے ساتھ چل پڑا۔ حاسد لوگ اس کی عزت افزائی سے خوش نہیں تھے چنانچہ ہمارے روانہ ہوتے ہی پھر کسی نے "کریلے" کا نعرہ لگایا اور جانن دین نے غضب ناک ہو کے پیچھے دیکھا۔ کریلے کا لفظ بڑے ترنم اور لے میں ایسے ادا کیا جاتا تھا جیسے کوئی ریڑھی پر سبزی بیچنے والا صدا لگاتا ہے۔

"بڑے کنجرے چیز ہیں جی۔" جانن دین نے مجھے مطلع کیا "وہ جس نے آپ کی گاڑی کو چھوٹا کہا تھا۔ حکیم صاحب کی پہلی بیوی کا لڑکا ہے۔ باپ کی دکان پر سے کوئی معجون کھا گیا تھا حلوہ سمجھ کے۔ آدھا مرتبان خالی کر دیا تھا اور جناب وہ تھی بڑی خاص دوائی۔ حکیم صاحب ان عورتوں کو دیتے تھے جن کے لڑکیاں پیدا ہوتی ہوں۔"

میں نے تعجب سے کہا "اور اس معجون کے کھانے سے لڑکا پیدا ہوتا ہے؟"

"ہاں جی، یہ حرامی خود ایسے ہی پیدا ہوا تھا۔" جانن دین نے کہا "دوا کھا کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔ آپ نے سنا کیسی واہیات آوازیں نکال رہا تھا۔"

رابعہ نے دبے لہجے میں پوچھا "یہ جو کریلا کریلا کر رہا تھا؟"

"نام نہ لیں بیگم صاحب ایسی واہیات چیز کا۔" جانن دین نے بیزاری سے کہا۔ "میں نے جس لڑکے کو رکھوالی کے لیے کھڑا کیا ہے جناب وہ فرزند ہے خادم کا۔ کسی نے گاڑی کو ہاتھ بھی لگایا تو وہ ہاتھ اس کی..." اچانک اسے خیال آیا کہ رابعہ جیسی ایک خاتون کی موجودگی میں جملہ مکمل نہیں کیا جا سکتا۔

جانن دین نے ملک انور کے ڈیرے تک پہنچتے ہوئے کم سے کم نصف درجن مخبتس افراد کو، ایک بکری کو اور دو کتوں کو دھتکار کے دور بھگایا۔ ٹریفک جام کرنے والی ایک بھینس کو ڈانٹ کے ہٹایا۔ بھینس سے دور رہنے کی کوشش میں رابعہ نے اچھلتے ہوئے ایک دیوار کو گلے لگایا۔ میں دیوار سے بچا تو اب بھینس سے بچ سکا اور اس نے میرے ہاتھ چومے۔

ملک انور ہمیں اپنی حویلی کے دروازے پر چشم براہ ملا۔ کسی نے برق رفتاری سے اس کو معزز مہمانوں کے آنے کی خبر پہنچا دی تھی۔ وہ پینتالیس سالہ وسیع و عریض شخص تھا جس نے زیادہ معزز اور باوقار نظر آنے کے لیے اپنے سر پر پگڑی بھی سجالی تھی۔ اس کی بل کھاتی ہوئی مونچھیں، بیش قیمت کپڑے کی کھیر دار شلوار اور اکڑی ہوئی گردن اس کے صاحبِ اقتدار ہونے کی دلیل تھیں لیکن وہ خوش اخلاق اور نرم خو ثابت ہوا۔

جانن دین نے تعارف کا فریضہ ادا کیا "ملک صاحب یہ منگلا ڈیم کے چیف انجینئر ہیں۔ ولایت سے شادی کر کے آئے ہیں۔ آپ سے ملنے کے بڑے مشتاق تھے۔"

جانن دین نے نیک نیتی سے حقائق میں مبالغہ شامل کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں تصحیح کرتا ملک نے اسے ٹوک دیا "اچھا اب تو

جاؤ۔ تیرا کام ختم۔"

"جی ملک صاحب" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مہمانوں کی گاڑی اُدھر ہی چھوڑ دی کر لے۔"

جانن دین نے زخم خوردہ لہجے میں کہا "میرا چھکڑا کھڑا ہے جی اُدھر۔"

"اس نے خاک حفاظت کرنی ہے۔ وہ چڑھ گیا ہوگا اس کی چھت پر۔ جا اسے دھکا لگا کے اپنے ساتھ لا۔ خبردار جو اندر کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔ احاطے میں کھڑی کر کے اس پر تنبو لگانا ہے۔"

"جی ملک صاحب۔"

ملک صاحب نے مجھ سے کہا "جناب اسے چابی دے دیں۔"

میں نے کہا "میں خود چلا کے لے آتا ہوں۔"

"چھوڑیں جی۔ آپ آرام کریں۔" ملک نے کہا اور مجھ سے چابی لے کر جانن دین کی طرف اُچھال دی۔

جانن دین نے چابی پکڑی اور واپس ہونے لگا۔

"اوئے جانن دین ذرا بوتھا ادھر کر۔"

"جی ملک صاحب۔" وہ گھوم گیا۔

"اوئے میں نے سُنا ہے منی آرڈر آیا تھا شہر سے۔"

"جی ملک صاحب' دو ہزار۔ میں نے مجھلی بیگم صاحب کو دے دیے تھے۔"

"پکا ای نہ ہو تو۔۔۔"

"قسم رب کی ملک صاحب۔ انہوں نے بقلم خود انگوٹھا لگایا تھا۔"

"اوئے انگوٹھے کے گھوڑے۔ وہ تیری بے تُکی ہے۔ میں نے کیا کہا تھا؟"

"غلطی ہو گئی ملک صاحب! آئندہ آپ کو ہی دوں گا" جانن دین نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"چل دفع ہو" ملک صاحب نے فراخ دلی سے اسے معاف کر دیا۔

یہ ملک صاحب کی حاکمیت کا مظاہرہ تھا جو مہمانوں پر یہ واضح کرنے کے لیے ضروری تھا کہ باقی سب یعنی ان کی رعایا..... یعنی اس گاؤں میں بسنے والی خدا کی مخلوق کی اوقات کیا ہے؟ ہم نے جانن دین کے ساتھ جو عزت کا برتاؤ کیا تھا وہ ملک صاحب کے رویے کے بعد ہمارے لیے باعثِ ندامت بن گیا تھا۔ لیکن خود جانن دین اور اس جیسے لاکھوں کروڑوں تھے جو اس سلوک کے عادی تھے اور اپنی ذلت کو نوشتۂ تقدیر سمجھتے تھے جسے بدلا نہیں جا سکتا۔

ملک صاحب کی حویلی بہت بڑی تو نہیں تھی پھر بھی اس کا رقبہ چار پانچ کنال تھا جبکہ گاؤں کے دوسرے گھر پانچ سات مرلے سے زیادہ نہیں تھے۔ حویلی کے دو حصے تھے۔ پچھلے حصے میں زنان خانہ تھا۔ جانن دین کی بات سے میں نے اندازہ کیا تھا کہ ملک صاحب کی کم سے کم تین عدد بیویاں اس حویلی میں موجود ہوں گی۔ بڑی، مجھلی اور چھوٹی۔ ان کی اولادیں بھی اپنی اپنی ماؤں کے ساتھ رہتی تھیں اور جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' دستور کے مطابق حکم بڑی کا چلتا تھا جس کے دو جوان بیٹے تھے اور ایک بیٹی بیاہی جا چکی تھی۔ مجھلی نے غالباً سوکن کو جلانے کے لیے پیداوار کا یہی تناسب رکھا تھا مگر اس کے بچے ابھی چھوٹے تھے۔ چھوٹی بہرحال چھوٹی تھی اور ملک صاحب کی منظورِ نظر تھی۔ شہری ہونے کے ساتھ ساتھ رواجی تعلیم یافتہ یعنی میٹرک پاس تھی۔ ملک صاحب نے اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جب وہ فلم بنائیں گے تو ہیروئن وہی بنے گی چنانچہ اسے ماں بننے کا شوق نہیں تھا۔

سامنے والے حصے میں مہمان خانہ تھا۔ ایک بڑے کمرے میں دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ یہ دربارِ عام تھا۔ اس کے آگے قالین تھا اور سامنے صوفہ سیٹ۔ قالین کے دونوں طرف کرسیاں تھیں۔ یہاں آنے والے کی حیثیت دیکھتے ہوئے خود ملک صاحب فیصلہ کرتے تھے کہ وہ دری پر بیٹھے گا' قالین پر' کرسی پر یا ان کے ساتھ صوفے پر۔ ہم نے خود اپنے لیے صوفے کا انتخاب کیا۔

دوسرے کمرے میں چارپائیوں پر بستر بچھے ہوئے تھے اور اسے مہمانوں کی خوابگاہ کا درجہ حاصل تھا۔ اس کے بعد اصطبل' گیراج اور ملازموں کی رہائش گاہ تھی۔ دونوں حصوں کے درمیان ہاکی کے گراؤنڈ جتنا صحن تھا مگر اس کو بھی ایک دیوار نے تقسیم کر رکھا تھا۔ آٹھ فٹ اونچی دیوار کے آخری حصے میں جو چھوٹا سا دروازہ تھا اس کو صرف وہی عبور کر سکتے تھے جو نامحرم نہیں تھے۔

ایک بار پھر میں نے ملک صاحب سے اپنا تعارف کرایا اور جانن دین کے نہ ہونے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہہ دیا کہ میری ولایت پلٹ بیوی اردو بھی نہیں جانتی۔ میں خود پنجابی میں بات کر رہا تھا۔ اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں' میں نے بتایا کہ میرے دادا کی نارووال میں بہت زمین تھی لیکن والد صاحب نے زراعت پر کاروبار کو ترجیح دی اور لاہور میں خراد مشینوں کی فیکٹری لگائی۔ خیر سے اب ہم ٹرانسپورٹر بھی ہیں۔

ملک انور متاثر نظر آنے لگا۔ "بڑا اچھا کیا جی آپ کے والد صاحب نے۔ بڑی مصیبت ہے اب تو زمینداری میں۔ مزارعے آنکھیں دکھاتے ہیں۔ پانی کے لیے نہر والوں کے پیچھے پھرنا پڑتا ہے۔ بیچ میں آڑھتی آ گئے ہیں۔ خیر جی یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ آپ کا خیر سے کتنے دن کا پروگرام ہے؟"

میں نے کہا "بس ایک دو دن۔"

"لو جی۔ ہم تو آپ کو ایک ہفتے سے پہلے جانے نہیں دیں گے۔ ادھر تو ہماری مرضی چلتی ہے جناب۔ ہم آپ کو شکار پر لے چلیں گے۔"

میں نے کہا "ملک صاحب۔ اب آپ سے ملاقات ہو گئی ہے ہم آتے رہیں گے۔ ابھی ایک ہفتے کی چھٹی مشکل ہے۔ ہم نے اتنا کام ہے۔"

اب ہماری خاطر تواضع کا عمل شروع ہوا۔ ملک چاہتا تھا کہ ہم کپڑے بدل کے آرام سے بیٹھ جائیں اور چاہیں تو نہا دھو لیں۔ عام دستور یہی تھا کہ خواتین مہمانوں کو اندر زنان خانے میں ٹھہرایا جاتا تھا جہاں ملک صاحب کی بیویاں خاطر مدارات کی ذمے دار تھیں مگر ہمارے ساتھ مسئلہ ذرا مختلف ہو گیا تھا۔ رابعہ کی جان بچ گئی تھی کہ وہ صرف انگریزی بول سکتی تھی۔ اندر اس کا تماشا بن جاتا۔ خود رابعہ نے بھی صاف کہہ دیا کہ وہ اسی کمرے میں رہنا پسند کرے گی۔ یہ بات میں نے ملک صاحب کو سمجھا دی۔

ملک انور نے کہا "جیسی آپ کی خوشی جناب۔ ویسے میری بی بی انگریزی جانتی ہے۔"

میں نے رابعہ سے کہا "تم اندر جا کے ان سے مل لو۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ ورنہ بداخلاقی ہوگی۔"

"حرج یہ ہے کہ وہ میرے بارے میں جتنی اُلٹی سیدھی باتیں کریں گی وہ سب میں سنوں گی لیکن کسی کو جواب نہیں دے سکوں گی۔"

"پھر تو مزہ آئے گا۔ مجھے بتانا ان کی کیا رائے تھی" میں نے کہا "وہ کھل کے بات کریں گی کیونکہ ان کے خیال میں تم تو پنجابی' اردو جانتی ہی نہیں ہو۔"

ملک صاحب کے طلب کرنے پر سترہ اٹھارہ سال کی ایک چوہدری چٹاخی مخلوق نمودار ہوئی۔ دیہات کی یہ الھڑ مٹیار قبل از وقت جوان ہو چلی تھی یا کر دی گئی تھی۔ اس کا رنگین جوڑا' آنکھوں میں بھرا ہوا سُرمے اور کاجل کا ذخیرہ اور ہونٹوں پر بھونڈی نارنجی لپ اسٹک اور اس کی بے باک مسکراہٹ سب بتاتے تھے کہ وہ محض خادمہ نہیں' غالباً شاہزادوں کی دلبستگی کا سامان فراہم کرنے والی کنیزِ خاص ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ اس انارکلی پر شہزادہ سلیم ہی نہیں خود مغلِ اعظم بھی عنایت کی نظر رکھتے ہوں۔ کسی غریب مزارع کی بیٹی کو بدقسمتی سے خوب صورتی مل جائے یا اس کی جوانی خود چوروں کو بلانے لگے تو اسے ڈاکو لے جاتے ہیں۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھنے کے خواب دیکھنے لگتی ہے۔ کیا پتا بھولے ملک صاحب ہی اسے ملکانی بنا دیں۔ وہ نہیں جانتی کہ شاہزادے تخت نشین ہو جاتے ہیں۔ انارکلی دیوار میں چُن دی جاتی ہے۔

میزبانی کے پہلے راؤنڈ میں ملک صاحب کے صاحب زادوں نے بھی شرفِ ملاقات بخشا۔ بڑے یعنی ولی عہد نمبر ایک اور دوئم نیم چڑھے کریلے کی مثال تھے اور کیوں نہ ہوتے۔ باپ کی جاگیر اور حاکمیت کا زعم الگ۔ جوانی کی بے لگام شہ زوری الگ۔ باپ کے برعکس انہوں نے اپنے رویے سے یہ ظاہر کیا کہ انجینئر' بیرسٹر' وکیل' کچھ نہیں ہوتے۔ ایسے ہی نام بڑے اور درشن چھوٹے۔ بڑی چیز ہوتی ہے ڈپٹی کمشنری یا محکمۂ جنگلات کا افسر اور ایس پی لگنا۔ میں نے ان سے اتفاق کیا۔ مجھلی کے نمونے ماشاء اللہ سے بڑے ذہین ہوشیار تھے۔ ملک صاحب نے ہنستے ہوئے بتایا کہ بڑا آٹھ سال کی عمر میں تھانے دار پر بگڑ گیا تھا تو اسے ایسی سُنائی تھیں کہ تھانے دار کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔ ابھی سے آنکھ مارتا ہے۔۔۔ اس لڑکی کو۔ یہ جو خادمہ بیگم صاحبہ کے ساتھ گئی ہے۔"

"اللہ جہنم سے بچائے" میں نے طنز سے کہا مگر ملک صاحب طنز سے ناواقف تھے "اور یہ چھوٹا برخوردار۔"

"یہ بھی بڑا۔۔۔ ہے" ملک صاحب نے اسے تعریفی سند کے طور پر ایک شاندار گالی سے نوازا۔

ظاہر ہے قصور بچوں کا نہیں تھا۔ وہ جو کچھ دیکھ رہے تھے اور سُن رہے تھے وہی دہرا رہے تھے۔ بڑوں کے نزدیک یہ معیوب بات نہیں تھی وہ اسے اپنی موروثی تہذیب کے عین مطابق سمجھتے تھے۔

میزبانی کے دوسرے راؤنڈ میں مجھے چائے سے نوازا گیا جس کے ساتھ کپڑے دھونے والے صابن کی شکل والی برفی تھی اور لڈو تھے جو اخروٹ کی طرح توڑ کے کھائے بھی جا سکتے تھے مگر میرا خیال ہے انہیں غلیل میں زیادہ موثر طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب برفی کا ایک سالم پیس کھا لینے کے بعد بھی میرے حواس برقرار رہے۔ چائے کا دوسرا کپ مجھے زبردستی پلایا گیا تھا مگر میں جانبر ہو گیا۔ دیہات میں یہ سب کچھ متوقع تھا۔

رابعہ کی بھی اندر اچھی خاصی درگت بنی۔ خواتین نے آپس میں اسے بہت برا بھلا' بے شرم' ولایتی مرغی' نقلی میم وغیرہ قرار دیا۔ یہ بھی سُنا کبھی کہ بندہ اپنی زبان بھول جائے۔ ولایت میں رہ کے دماغ خراب ہو گیا ہے اور کچھ نہیں۔ اپنا کتا بھی دس برس ولایت میں رہے تو بھونکنا نہیں بھولتا۔ یہ شبہ ظاہر کیا گیا کہ اس نے مجھے پھانس لیا ہے اور وہ میری بیوی نہیں ہے۔ چائے کیسے نخرے سے پی رہی ہے جیسے کڑوی دوا ہو۔ مٹھائی کو چھوا تک نہیں۔ ڈرتی ہے موٹی نہ ہو جائے۔ ہڈیوں پر سوکھی چمڑی اچھی لگتی ہے۔

ملک صاحب کی تازہ ترین دلہن نے میٹرک کی انگلش گرامر اینڈ کمپوزیشن کا ایسا آملیٹ بنایا جو کوئی پھوہڑ بیوی اپنے شوہر سے لڑنے کے لیے ہی بنا سکتی ہے۔ بعد میں وہ بھی رابعہ کی انگریزی سے زیادہ اس کی صورت سے حسد کرنے والوں میں شامل ہو گئی۔ رابعہ نے بتایا کہ ایک دفعہ تو اس کی قوتِ برداشت جواب دینے کے قریب ہو گئی تھی۔ وہ ان سب کی صرف ایک جملے میں ایسی تیسی کر دیتی کہ بند کرو یہ بکواس۔ میں اردو پنجابی سب سمجھتی اور بولتی ہوں۔ مگر پھر میری وجہ سے اس نے ولایت پلٹ بیوی کا مشکل کردار نبھایا۔ رات کو وہ مجھ پر برس پڑی کہ یہ تم نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا۔ خود تو مزے سے گپ لگا رہے ہو۔ مصیبت میری کہ غلطی سے بھی اردو کا جملہ زبان سے نہ نکل جائے۔

اس رات میری اصل آزمائش ڈنر کے وقت ہوئی جس میں معززین کو میری خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ ایک ڈاکٹر تھا جو بیک وقت دو اور چار پیروں پر چلنے والی خدا کی سب مخلوق کا مسیحا تھا اور

www.paksociety.com

تھا۔ مساوات کے اصول پر عمل کرتے ہوئے سب کو ایک ہی دوا بھی دیتا تھا جو قطعی بے ضرر ہوتی تھی۔ اس سے نہ مریض کو فائدہ ہوتا تھا اور نہ مریض کو نقصان۔ شفا کا کریڈٹ اسے ملتا تھا۔ قضا تقدیر کے کھاتے میں جاتی تھی۔ موقع پاتے ہی اس نے میرے کان میں اعتراف جرم کرلیا کہ وہ کسی ڈاکٹر کا کمپاؤنڈر تھا۔ سوال اس کی روزی کا ہے اور آج تک اس کی غفلت یا نااہلی سے کوئی نہیں مرا۔ ویسے موت برحق ہے اور جب وقت آجائے تو حکیم بقراط اور حکیم جالینوس بھی کیا کرسکتے ہیں۔ میں نے اسے تسلی دی کہ میرا ارادہ ہرگز اس کی ڈگریوں کے بارے میں کوئی سوال کرنے کا نہیں ہے۔

دوسرا مہمان اسکول ٹیچر تھا۔ اس نے حیرت انگیز انکشافات اور علم وفضل کے دریا بہا کے جملہ حاضرین کو بے حد متاثر کیا۔ ان میں راقم بھی شامل تھا جو اس کے کسی دعوے کو غلط نہیں کہہ سکتا تھا مثلاً امام مسجد صاحب کے ساتھ مل کے اس نے آدمی کے چاند پر اترنے کے دعوے کو فریب قرار دیا۔ "یہ عالم اسلام کے خلاف یہودی سازش ہے۔ امت مسلمہ کو گمراہ کرکے بے وقوف بنایا گیا ہے۔"

دسترخوان پر بکرے، خرگوش، مرغی، مرغابی اور تیتر بٹیر سب ہی صف بستہ تھے جو دیسی گھی میں بھونے گئے تھے۔ چاول دو قسم کے تھے نمکین اور میٹھے۔ انہیں پلاؤ زردہ کہا جارہا تھا۔ کھانے میں حساب غلط ہوگیا۔ میں نے اس سے دگنا کھالیا تھا جتنا مجھے کھانا چاہیے تھا مگر اکثریت متفق تھی کہ میں نے اس کا دسواں حصہ بھی نہیں کھایا۔ جب باقی لوگوں نے دسترخوان صاف کردیا تو مجھے خاصی شرمندگی کے ساتھ تسلیم کرنا پڑا کہ شہری لوگ کھاتے نہیں، چکھتے ہیں۔

رات نے نو بجے یہ پرتکلف تقریب اختتام پذیر ہوئی تو آٹھ دس افراد مجھ سے گلے مل کے اور مجھے نچوڑ کے یوں رخصت ہوئے جیسے ان سے میری یہ آخری ملاقات ہے۔ صبح تو مجھے پھانسی ہوجانی ہے۔ بے شک وہ خلوص نیت سے سب کچھ کررہے تھے مگر ہم پر جو بیت رہی تھی، ہم ہی جانتے تھے۔ رابعہ اندر سے آئی تو دھڑام سے چارپائی پر گر پڑی۔

"مروادیا تم نے مجھے۔"

میں نے کہا "انگریزی میں۔ پلیز، تم کو اردو نہیں آتی۔ یا پھر میرے کان میں کہو جو بھی ارشاد فرمانا ہے۔"

جب وہ اپنی کمر تھپکی تو میں نے کہا "شب بخیر۔"

"ابھی سے۔ کہاں شب بخیر۔ تم چاہتے ہو میں ساڑھے نو بجے سو جاؤں۔"

میں نے کہا "پھر کیا کریں، باہر شاید چاندنی رات ہو۔ کھیت میں چل کے دوگانا گائیں؟"

"باہر کتے بھونک رہے ہیں۔ توبہ۔"

میں نے سوچ کے کہا "سترہ لگتے ہیں۔ بے شک گن لو باہر جاکے۔"

"سکندر۔ کیا مقصد ہے آخر اس کا۔ کہاں پھنسے ہیں ہم یہاں آکے؟" رابعہ نے بیزاری سے کہا۔

"خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے تمہیں کہ یہاں دشمن کوئی نہیں ہے۔ سب تمہیں سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں۔ وی آئی پی جیسا سلوک ہورہا ہے ہمارے ساتھ۔ یہ ان کی محبت کا انداز ہے جو تمہیں ناگوار گزر رہا ہے۔ دو دن چھپ کے رہنے کی اس سے بہتر جگہ تمہیں کہاں ملتی؟"

"پنڈی، مری، ایبٹ آباد کہیں چلے جاتے۔ ہوٹل بہت تھے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ میں کسی بھی ہوٹل کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ دوسری یہ کہ مجھ جیسے کو ایک شادی میں شریک ہونے کی تیاری کرنی ہے۔ چوہدری وفادار کے گھر میں داخل ہونا۔ اس کی تقریب نکاح میں ایسے شامل ہونا کہ اسے شک بھی نہ ہو۔ پھر عین وقت پہ مولوی کی طرح اعلان کرنا کہ ٹھہرو، یہ شادی نہیں ہوسکتی۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔"

"کیا یہاں رہ کے آسان ہوجائے گا۔"

"میرا یہی خیال ہے۔ آگے تم دیکھتی جاؤ۔ انشاءاللہ برات یہیں سے جائے گی ڈھول باجے کے ساتھ۔"

"تمہیں۔ ان کی بالکل فکر نہیں۔"

"کالیا کی اور جنت گڈی کی۔"

"ہو مت۔" رابعہ نے خفگی سے کہا "تم جانتے ہو میں کس کی بات کررہی تھی۔ غالب اور نازو، وقار... سب بہت پریشان ہوں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ خوش ہوں گے" میں نے کہا "پریشان ہوتے ہیں ماں باپ اگر لڑکا لڑکی گھر سے بھاگ جائیں۔ ان کی تو عین خواہش تھی کہ ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے نکل جائیں۔ سب نے یہی کہا ہوگا کہ بالآخر رابعہ ورغلا کے لے گئی سکندر کو۔ خیر وہ جہاں رہیں خوش رہیں۔"

"سکندر، مجھے غصہ آرہا ہے۔"

"میں وہ شعر پڑھوں، مجھ کو غصے پہ پیار آتا ہے۔"

"دیکھو کہیں سے فون کرکے انہیں یہ تو بتادو کہ ہم خیریت سے ہیں" رابعہ نے کہا "پتا نہیں وہ کیا سوچ رہے ہوں گے۔"

میں نے رابعہ کو مطمئن کرنے کے لیے جھوٹ بول دیا "خاتون۔ میں اتنا بے وقوف بہرحال نہیں ہوں جتنا نظر آتا ہوں۔ اس سے زیادہ ہی ہوں۔ میں نے ایک دردناک نوٹ چھوڑا تھا کہ میں وہاں جارہا ہوں جہاں سے کوئی لوٹ کے نہیں آتا۔ تمہارا نہیں لکھا تھا۔ مفہوم یہ تھا کہ میں لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ چنانچہ تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اللہ آپ سب کو صبر جمیل دے۔"

جب اولاد عطا کرے۔ جو ہم میں سے کسی کے نقش قدم پر نہ چلے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کھاؤ میری قسم۔"

میں لاجواب ہوگیا "میں نے غالب کو بتایا تھا۔"

رابعہ کے مزید کچھ کہنے سے پہلے کنیز خاص ایک ٹرے میں دودھ سے بھرے گلاس رکھ کے حاضر ہوئی۔

میں نے دہشت زدہ ہوکے کہا "کمال ہے۔ یہ کیا ہے؟"

وہ اٹھلا کے ہنسی "دودھ ہے سرکار۔ اصلی اور خالص بھینس والا۔ ملائی پر بادام پستے۔ پی کے دیکھو۔ رات کو دل خوش کرنے والی چیز ہے۔"

اس کی بات اتنی فحش تھی کہ رابعہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا مگر وہ اپنی ذومعنی بات پر ہنس رہی تھی "صاحب جی۔ یہ گلاس خاص آپ کے لیے ہے۔"

اس سے پہلے کہ رابعہ پھٹ پڑتی میں نے اس کا ہاتھ پکڑلیا "تم بھی کیا چیز ہو۔ لال پری، ذہین چھری۔"

"ہائے میں مرگئی" اس نے گھبرا کے اپنا ہاتھ چھڑایا "اپنی بیوی کے سامنے تو بڑے ملک صاحب بھی میرا ہاتھ نہیں پکڑتے" وہ بھاگی مگر جاتے جاتے مجھے آنکھ مار گئی۔ اس کی بات کا مطلب بہت واضح تھا کہ جب بیوی سامنے نہ ہو تب دست درازی کرتا۔

رابعہ غصے میں آتش فشاں بن گئی "بے شرمی کی کوئی حد ہوتی ہے۔ اس نے بتادیا سب کو تو کیا عزت رہ جائے گی تمہاری۔ وہ تو ہے۔ بس اب کیا کہوں میں۔"

میں ہنس پڑا "پاگل ہو تم بھی۔ ارے جتنے یہاں جو مہمان آتے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ یقیناً سب کو بہت خوش ہو کے بتائے گی کہ صاحب نے مجھے دوبار لال پری کہا اور ایسے لٹو ہوئے مجھ پر کہ بیوی کے سامنے ہی میرا ہاتھ پکڑلیا۔"

"دیکھو۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوگا۔ مذاق میں بھی۔"

میں نے کہا "رابعہ، ہم جو کررہے ہیں سب ڈراما ہے۔ جھوٹ ہے۔ اسے ایک کھیل سمجھ کے انجوائے کرو۔ جلنے کڑھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ لو دودھ پیو اور جوان ہوجاؤ۔"

"کیا!" رابعہ نے آنکھیں نکالیں "میں یہ دودھ پیوں؟"

"اور کیا دونوں گلاس میں پیوں؟ نہ پیئے تو میزبانوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔" میں نے کہا "بہت صدمہ ہوگا انہیں۔"

"جذبات مجروح ہوں یا خود میزبان صدمے سے ہلاک ہوجائیں۔ میں اپنی جان کو ہلاکت میں نہیں ڈال سکتی۔ انہوں نے پہلے ہی زبردستی میرے حلق تک بھر دیا ہے۔"

"ان کے بس میں ہو تو ٹھونس ٹھونس کر بھردیں۔ لیکن اب اس دودھ کا کیا کریں۔ آخر" میں نے کھڑکی کے پیچھے گاڑھے دودھ کو دیکھا "ابھی ایک ترکیب آئی ہے میرے ذہن میں۔ تم ذرا اندر والے دروازے کی کنڈی لگاؤ۔"

میں نے کھڑکی کھول کے باہر جھانکا۔ ایک ویران اور تاریک گلی میں بے خوابی کے مرض میں مبتلا دو کتے بے مقصد پھر رہے تھے۔ گاؤں میں ہُو کا عالم تھا اور عشا کی نماز پڑھ کے سوجانے والے خوابوں میں گم تھے۔ کتے بھی بالآخر روانہ ہوگئے اور موقع پاتے ہی میں نے دودھ کو گندی نالی میں انڈیل دیا۔

رزق کو ایسے ضائع کرتے ہوئے مجھے احساس گناہ بھی ہوا اور میں نے خود کو مجرم بھی محسوس کیا۔ اس دنیا کی ایک تہائی آبادی فاقہ کشی کا شکار تھی۔ وہ دودھ جن معصوم بچوں کی زندگی تھا ان کی ماؤں کی چھاتیاں سوکھی تھیں اور شیرخوار نوزائیدہ بچے اس وقت بھی بھوک سے دم توڑ رہے تھے۔ دوسری طرف میں ملائی پستے اور بادام والا دودھ نالی میں بہا رہا تھا کیونکہ میرا پیٹ تو انواع واقسام کے لذیذ اور مرغن کھانوں سے بھرا ہوا تھا۔

"اللہ مجھے معاف کرے" میں نے کھڑکی بند کرکے کہا "میں نے کفران نعمت کیا ہے مجبوری میں۔"

رابعہ بولی "کیا مجبوری تھی۔ مستحق کم تو نہیں ہیں دنیا میں۔"

میں نے کہا "اس وقت میں کہاں جاکے تلاش کرتا مستحق کو۔ گاؤں کے لوگوں کو جگاتا؟ اتنی اخلاقی جرأت ہوتی تو میں کہہ دیتا کہ واپس لے جاؤ۔ مگر ہماری معاشرتی مجبوریاں بھی بعض اوقات عذاب جاں ہوجاتی ہیں۔"

وہ ساری رات نیند لینے کی کوشش کرتے گزری۔ اجنبی جگہ اور آسیب زدہ محسوس ہونے والے ماحول میں اپنی تنہائی کا خیال کچوکے دینے لگا۔ جو خیال دن کے اجالے میں اور ظاہری مصروفیت میں دور دور تھے وہ ایک دم یلغار کرکے ذہن پر قابض ہوگئے۔ میں نے رات کے مختلف حصوں میں بھی ان کے بارے میں سوچا جن کو میں سوتا چھوڑ کے فرار ہوگیا تھا۔ معلوم نہیں وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ میں نے انہیں قابل اعتبار نہیں سمجھا۔ ان پر بھروسا نہیں کیا۔ میں بزدل تھا۔ خودغرض تھا یا پریشانیوں میں گھر کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوگیا تھا۔ پھر خیال آتا تھا کہ نہیں، وہ سب جانتے تھے۔ میں انہیں بتاچکا تھا کہ اپنی وجہ سے میں ان کی زندگی اور ان کا مستقبل خراب نہیں کرسکتا۔

مجھے محسن کا اور گل کا خیال بھی آیا۔ فوزیہ اور اس کے شوہر کو ملنے والی دھمکی بھی پریشان کن تھی۔ واجد اگر اس حد تک آگے بڑھ گیا تھا تو مجھے بھی ایک قدم آگے جاکے اس کا یہ چیلنج قبول کرنا ہوگا۔ اگر میں نے جوابی کارروائی نہ کی تو وہ سمجھے گا کہ اس نے میری کمزوری پکڑلی ہے اور وہ اپنا دباؤ بڑھائے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ میں بھی اس کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دوں اور اس کی زبان میں اسے دوٹوک جواب دوں کہ بولو اب کیا مرضی ہے تمہاری؟ میرے رشتے محفوظ نہیں ہوں گے تو تمہارے رشتوں کی

www.paksociety.com

سلامتی بھی خطرے میں پڑے گی۔ تم میرے گھر کی دیواروں پر پتھر مارو گے تو وہی پتھر لوٹ کے تمہارے گھر کی طرف آئیں گے۔

میں فوزیہ اور اس کے شوہر کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا تھا کہ جان بچا کے کہیں بھاگ جاؤ۔ فوزیہ کا شوہر لیکچرار تھا اور یہ اس کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن تھا لیکن محسن یا گل سے ضرور کہہ سکتا تھا کہ روپوش ہو جاؤ۔ اگر شادی نہیں کی ہے ابھی تو کرلو اور بھاگ جاؤ کہیں۔ کراچی چلے جاؤ اکرام شیخ کے پاس یا کسی اور جگہ جہاں رلادور کے خیال کی رسائی بھی نہ ہو۔ جہاں کوئی شکاری ان تک پہنچ نہ پائے۔

رات کے آخری پہر میں غنودگی کچھ گہری ہو گئی تھی کہ خیال نے خواب کی صورت اختیار کرلی اور مجھے یوں لگا جیسے اندھیرا کمرا اچانک روشن ہو گیا ہے۔ تاریکی میں دھندلی روشنی کا ایک ہیولا تھا جو میرے سامنے آ کے ٹھہر گیا تھا۔ یہ شیلی تھی، اس کے جسم پر چاندی کے چمکیلے تاروں کا کفن تھا جس سے یہ اُجالا پھوٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں مدھم انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ "سکندر! آخر کون تھے وہ سب لوگ۔ اجنبی اور بے رحم، جو مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے رہے۔ کیا بگاڑا تھا ان کا میں نے کہ انہوں نے میرے وجود کو روح سے جدا کر کے بھی قرار نہ لینے دیا۔ ایک مدفن میں خاک ہونے سے پہلے دوسری قبر کے زنداں میں ڈال دیا؟ مگر شکوہ ان سے کیسا۔ وہ تو دشمن ہی تھے نا؟ تم میرے ساتھ کیوں نہیں رہے۔ ایک بار بھی اگر میرے بے جان جسم کو تمہارے مہرباں ہاتھوں کا لمس میسر آجاتا تو... خیر، تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔ دیکھو تو خود مجھے ہی آنا پڑا۔ تم سے تو ایک بار بھی آیا نہ گیا۔ جو پھول تم لاتے ان کی خوشبو اندر تک میری مٹی کو معطر کر آتی...."

میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ موسم اچھا خاصا خنک تھا لیکن میرا اپنا جسم پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ میری طرح شاید رابعہ نے بھی رات سوتے جاگتے گزاری تھی۔ اس نے تاریکی میں بھی مجھے ہڑبڑا کر اُٹھتے دیکھ لیا۔

"کیا ہوا؟ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے کیا؟"

مجھے اپنی چوری پکڑے جانے پر خفت ہوئی لیکن اندھیرے میں رابعہ میرے چہرے کے تاثرات کو نہیں پڑھ سکتی تھی "نہیں۔ سونے کی کوشش کرتے کرتے تھک گیا تھا" میں پھر لیٹ گیا۔

"پھر تمہاری آواز میں خوف اور پریشانی کیوں ہے؟"

میں نے چڑ کے کہا "اس لیے کہ یہ جگہ مجھے بھوتوں کا ڈیرا لگتی ہے۔ اس ماحول میں نیند آسکتی ہے؟"

"کتنی دیر ہے صبح ہونے میں؟"

میں نے روشن ڈائل والی گھڑی دیکھی "ساڑھے چار بجے ہیں۔ اب معلوم نہیں یہاں سورج نکلنے پر صبح ہوتی ہے یا مرغوں کے اذان دینے پر۔"

"مرغے تو ساری رات اذان دیتے رہے ہیں۔"

"وہ نفسیاتی مریض ہوں گے۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نیند میں تمہیں کتوں کے بھونکنے پر ایسا لگا ہو کہ مرغے بول رہے ہیں۔"

"پھر تو جاگتے میں مجھے مرغوں کی آواز ایسے سنائی دینا چاہیے جیسے کتے بھونک رہے ہیں؟" رابعہ نے خفگی سے کہا "کیا میں پاگل ہوں۔"

"تم لڑنا چاہتی ہو مجھ سے؟ ویری گڈ۔ اس طرح وقت اچھا گزرے گا۔ تو تمہارے سوال کا جواب یہ ہے مس رابعہ کہ تم پاگل ہی نہیں ہو۔ دیوانے تو ہوشیار بھی ہوتے ہیں۔ تم احمق بھی ہو... ورنہ اس طرح منہ اٹھا کے میرے ساتھ نہ چل پڑتیں۔ اب تم بولو "کیا میں پاگل ہوں؟"

"پتا نہیں۔ مگر تم ایسے بولتے رہو گے تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ پاگل کون ہے؟"

گاؤں کی کسی مسجد سے آوازِ اذان آئی تو مجھے صبح ہونے کی اتنی خوشی ہوئی کہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ حویلی کے اندر والے حصے میں بھی کچھ ہلچل شروع ہوئی تھی۔ غالباً ملازمین نماز کے عادی اٹھ گئے تھے۔

میں نے کہا "مس رابعہ... آپ کو زحمت تو ہوگی..."

"کیا بات ہے؟"

"مجھے بیڈ ٹی چاہیے۔ کافی ہو تو بہتر ہے۔"

"چپ کر کے لیٹے رہو۔ یہ خالہ جی کا گھر نہیں ہے کہ جب جو چاہا مانگ لیا۔"

میں نے آہ بھری "سچ کہتی ہو۔ مُردہ بدست زندہ۔ اور مہمان بدست میزبان۔ یہاں تو وہی ہوگا جو ملک صاحب چاہیں گے۔ دیکھو وہ ناشتے میں چائے پلاتے ہیں کہ پانی بھر کے لسی۔ مجھے یقین ہے کہ پاؤ بھر مکھن اور چار پراٹھے بھی لازمی ہوں گے۔ تم لکھ لو کہ یہاں میری وفات حسرت آیات کا سبب کثرت خوراک ہوگی۔"

"زبردستی کون ٹھونستا ہے تمہارے منہ میں؟ مت کھانا۔"

"ابھی تمہیں اندازہ نہیں نیک بخت کہ ملک صاحب حکم عدولی کی کیا سزا دے سکتے ہیں۔" میں نے کہا "تمہارا شہری قانون کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ کہیں گے کہ کھاؤ تو مجھے کھانا پڑے گا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پتا چلے گا کہ جب معدے میں گنجائش نہ رہی تو لسی پھیپھڑوں میں بھر گئی۔ مکھن سے دل بھر گیا۔ پراٹھوں کے ٹکڑے جگر میں چلے گئے۔"

"تم جاؤ نماز پڑھ آؤ۔ فاسد خیالات دماغ سے نکل جائیں گے" رابعہ بولی۔

مجھے یہ تجویز پسند آئی۔ شرمندگی تو بہت ہوتی تھی کبھی کبھی اللہ میاں کے سامنے جا کے سجدہ ریز ہونے سے مگر میں ڈھیٹ بن کے حاضر ہو جاتا تھا کہ۔

رحمت پہ تیری میرے گناہوں کو ناز ہے
بندہ ہوں جانتا ہوں تو بندہ نواز ہے

اندھیرے بہت سے گھروں کے دروازوں سے نمازی نکل رہے تھے۔ یہاں شہر والی بات تو تھی نہیں کہ میں کسی سے راستہ پوچھتا۔ آواز کی سمت کا اندازہ کرتے ہوئے میں اسی گلی میں گیا تھا جو درحقیقت گاؤں کی مال روڈ کہی جا سکتی تھی۔ ملک صاحب کا دولت کدہ واقع تھا۔ آگے مطب اور اسکول مشتمل بازار تھا۔

نمازیوں کی صف میں شاید مجھے کوئی نہ پہچانتا اور نظر انداز کر دیتا مگر پوسٹ مین جان دین نے مجھے دیکھ لیا۔ نماز کے بعد وہ سیدھا میری طرف لپکا۔

"میر ابراہیم صاحب۔ بڑی خوشی کی بات ہے جی آپ سے اللہ کے گھر میں بھی ملاقات ہو گئی" اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

جان دین نے وہیں اعلان عام کر دیا کہ میں وہی کاروالا مہمان ایڈیٹر ملک ابراہیم ہوں جس نے ملک صاحب کو میزبانی کا شرف بخشا ہے۔ مزید یہ کہ میں اردو پنجابی سے نابلد ولایت کی میم کا شوہر ہوں جو اپنے حسن و جمال سے میموں کو کرے... لوگوں کی خودی زیادہ بلند تھی۔ وہ محض مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ تقریباً ایک تہائی مجھ سے گلے ملے اور باقی مجھے چومنے پر آمادہ تھے۔ اردو میں وہ "کھسک" ہو گئے تھے اور پنجابی بولنے لگے تھے۔ ان میں وہ ایسے خوش نصیب بھی شامل تھے جنہوں نے جان دین کے ساتھ مل کے میری گاڑی کو دھکا لگایا تھا تاکہ اس کے انجن کو تکلیف دیے بغیر گاڑی کو ملک صاحب کے احاطے تک لائے تھے۔

بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑا کے میں مسجد سے باہر آیا تو صرف ایک شخص ساتھ تھا اور یہ پیش امام صاحب تھے۔ وہ بضد تھے کہ میں ان کے ساتھ ایک پیالی چائے ضرور پی کر جاؤں۔ چائے کی طلب نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں مسجد سے ملحق ان کے غریب خانے پر قدم رنجہ فرماؤں۔ بعد میں مجھے اپنے اس فیصلے پر پچھتانا پڑا۔ پیش امام صاحب سے تعارف تو گزشتہ رات ہی ہو گیا تھا۔ انہوں نے علم کے جو دریا بہائے تھے ان میں ڈوب کے میں نے ان کا فضل تسلیم کر لیا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے وہاں اچھی چائے ملی۔

ایک چھوٹے سے کمرے میں صاف ستھری دری پر بٹھایا گیا جس پر دیوار کے ساتھ ساتھ گاؤ تکیے تھے جن پر ہاتھ سے گل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ دوسرے کمرے کو ملانے والے دروازے پر ایک سوتی چادر کو پردے کے طور پر لٹکا دیا گیا تھا۔

اچانک اس کے پیچھے سے آواز آئی "چینی کتنی ابا جی؟"

میں نے بے اختیار کہہ دیا "ایک چمچ" حالانکہ ابا جی میں نہیں تھا۔ مجھے مولوی صاحب کے سامنے سخت شرمندہ ہونا پڑا۔ پردے کے پیچھے سے دوسرا سوال کیا گیا کہ "دودھ کتنا؟" تو میں نے مولوی صاحب سے کہا "کہہ دیجئے دودھ نہ ڈالیں۔"

پھر پردے کی اوٹ سے ایک بے حد اُجلا گلابی، نازک اور شفاف جلد والا ہاتھ باہر آیا۔ مولوی صاحب نے ٹرے لے لی اور وہ ہاتھ اپنی چکا چوند دکھا کے ہمیشہ کے لیے یوں غائب ہوا کہ میرے تصور میں صرف روشنی رہ گئی۔ مولوی صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کی بیٹی ایف اے سی ٹی ہے۔ اس کا رشتہ اپنوں میں ہی طے ہوا تھا مگر لڑکا جاہل ہونے کے علاوہ لالچی تھا۔ وہ دوبئی گیا اور وہیں اس نے کسی مال دار پاکستانی فیملی میں شادی کرلی۔ ان کی بیٹی اب شہر کے اسکول میں پڑھاتی ہے اور شادی کے نام سے بدکتی ہے۔

آخر میں انہوں نے وہی کہا جو ہر لڑکی کا باپ کہتا ہے "آپ تو ماشاء اللہ صاحب حیثیت ہیں۔ خیال رکھئے گا۔ بیٹی کا بڑا بوجھ ہے مجھ پر۔ یہاں تعلیم ہی اس کا عیب بن گئی ہے۔ قصور وار اس کا منگیتر تھا مگر سزا اسے مل رہی ہے۔ اللہ سب جاہلوں کو معاف کرے... جو سمجھتے ہیں کہ علم صرف مردوں کے لیے ہے...."

مجھے ایک تعلیم یافتہ اور فراخ دل شخص سمجھتے ہوئے اس چھوٹے سے گاؤں کے مولوی نے بہت بڑی بات کی تھی۔ اس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے میرے ساتھ وہ دکھ بانٹ لیا تھا جس کا بار کوئی اور نہیں اٹھا سکتا تھا۔ میں باہر آیا تو میرا دل بھی اتنا ہی بوجھل تھا کیونکہ میں نے اسے جھوٹ بول کے ٹال دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ نہ آج نہ کل اور اس کے بعد کبھی۔ شاید میں کبھی زندگی میں پھر ادھر نہیں آؤں گا۔ مگر میں نے عیاری اور ہوشیاری سے خود کو ہر قسم کے رد عمل سے بچا لیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ "انشاء اللہ۔ میں کچھ ضرور کروں گا" یعنی اگر اللہ نے چاہا تو۔ میں یہ جھوٹ نہ بولتا تو کیا کرتا؟ میں سچ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ میں اسے نہیں کہہ سکتا تھا کہ مولوی صاحب! آپ کو کس عقل مند نے مشورہ دیا تھا کہ اس منافق، متعصب اور بے رحم مردوں کے معاشرے میں رہتے ہوئے اپنی بیٹی کو زیور تعلیم سے آراستہ کریں۔ آپ نے اسے جاہل ہی رہنے دیا ہوتا تو وہ کب کی ٹھکانے لگ جاتی اور کسی جاہل عم زاد کے دو چار بچوں کی ماں ہوتی۔

اس افسوسناک تضاد سے ہمارے شہر بھی محفوظ نہ تھے۔ لوگ قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم ضرور دہراتے تھے کہ علم حاصل کرنے کے لیے چین جاؤ اور دین کی یہ بات مانتے تھے کہ ہر مرد عورت پر علم فرض ہے مگر احساس کمتری کا مارا ہوا مرد اگر میٹرک پاس ہو تو بی اے پاس لڑکی کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ توبہ توبہ۔ وہ بے لگام اور منہ زور عورت مجھے شوہر کہاں تسلیم کرے گی۔ یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ ظلم برداشت نہیں کرے گی اور غلام بن کے نہیں رہے گی۔

میں نے گاؤں کے باہر کا ایک چکر لگایا۔ اس وقت تک سورج طلوع ہو چکا تھا اور دیہی زندگی کے عام منظر دیکھے جا سکتے تھے۔ کسان ہل بیل کے ساتھ کھیتوں میں ایک زرخیز دن کا آغاز کر رہے

www.paksociety.com

تھے۔ عورتیں ایک کنوئیں کے ڈول سے مٹی کے گھڑے بھر رہی تھیں۔ ننگ دھڑنگ بچے کیچڑ سے پانی میں بھینسوں کے ساتھ نہا رہے تھے۔

واپسی پر رابعہ مجھے ایک ایس ایچ او کی طرح پریشان لگی جس کی حوالات سے قیدی فرار ہو گیا ہو "نماز پڑھنے گئے تھے کہ حج کرنے؟"

میں نے سعادت مندی سے کہا "کیا دشمنوں کا مزاج برہم ہے؟"

"دشمنوں کا نہیں۔ ملک صاحب نے ہر طرف ہرکارے دوڑائے تھے۔ خبر ملی کہ بندہ گیا تو مسجد تھا مگر صراط مستقیم سے بھٹک گیا۔ کہیں اور گئے تھے تم؟"

"گویا مخبروں نے اطلاع پہنچا دی۔" میں آہ بھر کے بیٹھ گیا "آج صرف تمہاری وجہ سے ایک گولڈن چانس نکل گیا۔"

"کیسا گولڈن چانس؟"

"بہت فلمی انداز میں شہری بابو اور گاؤں کی حسین البیلی مٹیار کے رومانس کا جس کا انجام بھی ناظرین کی خواہشات کے مطابق ہوتا ہے۔ آہ کیا جلوہ تھا۔ وہ برقی طور پر کی کہ دیدۂ عجب کا شعلہ اور کیا آواز تھی۔ جی چینی کتنی ڈالوں؟ دودھ کتنا پئیں گے آپ اور وہ چائے کا کپ کیا سرور تھا اس میں۔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔"

رابعہ نے برا مان کے کہا "جاؤ جاؤ۔ آنے کی بھی کیا ضرورت تھی؟"

"کیسے جاؤں؟ تمہیں پناہ دینے والا ترس کھا کے چاہنے والا یا مجبوراً شریک حیات بنانے والا بھی تو نہیں ہے ساری دنیا میں۔"

"اچھا ہوا تمہیں تو کوئی مل گیا۔ میری فکر مت کرو۔"

رابعہ کے مزاج کا درجۂ حرارت زیادہ بلند ہونے سے قبل ہی ملک صاحب کی طرف سے ناشتے کی دھمکی آ گئی۔ میں نے رابعہ کو سمجھایا کہ یہاں عورتیں مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کر سکتی ہیں مگر وہ کمیں یعنی نچلے طبقے کے لوگ ہیں۔ ہم خواص میں شامل ہیں۔ یہاں بیوی بھی شوہر کے ساتھ نہیں پھرتی اور اس کے ساتھ بیٹھ کے کھانا نہیں کھاتی۔ لیکن رابعہ نے زنان خانے میں جا کے ناشتا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

"ان کا جو دل چاہے سمجھیں۔ میں بے شرم ہوں، بے حیا ہوں۔ تم نے میری زبان بند کر دی ہے اور ان عورتوں کی باتیں، توبہ میرا کھانا زہر ہو جائے گا۔"

اب میں نے ملک صاحب کو قائل کرنے کے لیے رابعہ کو مورد الزام ٹھہرایا کہ ولایت میں رہ کے یہاں کے آداب سے واقف نہیں اور یہاں کے رسم و رواج کو نہیں مانتی۔ کچھ وقت لگے گا پاکستانی معاشرے کے طور طریقے اپنانے میں۔ ملک صاحب برا ماننے یا انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ میں شرافت سے بات نہ کرتا اور صاحب لوگوں کی طرح حکم دیتا کہ ناشتا … تو بھی وہ مانتے۔

ناشتا نمٹنے کے بعد دن کا باقی وقت ہم نے گاؤں دیکھنے اور آس پاس کے علاقے کی سیر میں گزارا۔ ملک صاحب کو … پھر مایوسی ہوئی جب ہم نے ان کی شاہانہ شہسواری … سواری پر پیدل گھومنے کو ترجیح دی۔

ہم گاؤں کی گلیوں سے گزرے تو راہ چلتے لوگ راستہ چھوڑ کر دیوار سے لگ گئے۔ بچوں کو بھی کتوں کی طرح دھتکار کے بھگا دیا گیا۔ عورتیں بند دروازوں کے پیچھے سے صاحب اور میم کا نظارہ کرتی رہیں۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ ان کی آنکھوں میں تجسس اور دلچسپی سے زیادہ نفرت اور ملامت ہو گی۔ جہاں عورت آزادی کی خواہش پر بھی احساس جرم میں مبتلا ہو وہاں وہ اس کے سوا کیا کر سکتی ہے کہ آزادی کو برا سمجھے اور کہے خواہ آزادی مذہب اور اخلاق و شرافت کے دائرے میں ہی کیوں نہ ہو۔

ملک صاحب نے چلتے چلتے کہا "آپ آج صبح مولوی صاحب کے گھر چلے گئے تھے۔"

میں نے کہا "جی۔ بہت عمدہ چائے پلائی انہوں نے … اچھے آدمی ہیں۔"

"ان کی بیٹی.... منگیتر نے چھوڑ دیا تھا اسے۔"

میں نے کہا "جاہل اور لالچی تھا، نہیں بدبخت تھا وہ اور میں سمجھتا ہوں خدا نے بچا لیا اس لڑکی کو ایسے شخص سے۔ ان شاء اللہ اس کی شادی اب ہم کرائیں گے کسی بہت اچھے خاندان میں۔"

ملک صاحب کو چپ لگ گئی "اچھا ہے جی۔ نیکی کا کام ہے۔"

میں نے کہا "ملک صاحب! یہ نیکی آپ کیوں نہیں کرتے۔ ایک تعلیم یافتہ مذہبی ماحول کی پروردہ سلیقہ مند لڑکی کو اپنی بہو کیوں نہیں بنا لیتے۔ صورت بھی اچھی ہی ہو گی اس کی۔ ویسے بھی اصل چیز تو سیرت ہے۔"

ملک کا موڈ خراب ہو گیا "ویرا جیم صاحب! آپ ان معاملات کو نہیں سمجھتے۔ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ وہ ہمارا … ٹکڑوں پر پلنے والا۔ دو ٹکے کا آدمی۔"

میں نے کہا "آپ نماز پڑھتے ہیں اس کے پیچھے۔ وہ … نہیں ہے تو اسے نکال کیوں نہیں دیتے گاؤں سے۔"

"بس وقت بدل گیا ہے جناب۔ ورنہ اس کی مجال نہ تھی … لڑکی کو شہر میں پڑھاتا اور وہیں نوکری کراتا مگر اس … اب کرتل اور لڑکی اپنے ماموں کے ساتھ رہتی ہے … کریں جی اس بات کو۔ بیگم صاحبہ سے پوچھیں گاؤں کیسا لگا؟"

میں نے رابعہ سے انگریزی میں کہا "اس ابو جہل کی … کو کھولنے کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے تم پر غصہ آ رہا ہے۔"

"میں سیاست سے کام لے رہا ہوں اور ہماری سیاست کی تو بنیاد ہی منافقت پر ہے" میں نے کہا "میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے … بات کا برا مت ماننا۔"

اب میں نے ملک سے کہا "بیگم صاحبہ گاؤں والوں کی سادگی اور خلوص سے بے حد متاثر ہیں۔ لیکن ان کی خواہش ہے کہ یہ گاؤں کی کوئی شادی دیکھیں۔ کیا آج کل میں کوئی شادی ہے؟"

"شادی۔ ہے تو سہی.... مگر"

"مگر کیا۔ کوئی کام ہے آپ کو تو ہم چلے جائیں گے۔"

"نہیں جی۔ وہ ایک مراثی ہے اپنا۔ ذات کا نائی ہے اور اس کا ہماری برادری سے بہت نیچ ہے۔"

رابعہ نے مجھ سے کہا "کیا وہ شودر ہے۔ اس کمینے سے پوچھو کہ کیا اسلام میں ذات پات ہے۔ یہ دولت مند ہے اس لیے اشراف کہلاتا ہے۔"

میں نے کہا "بیگم صاحبہ فرماتی ہیں کہ کیا ہم جانے بغیر اس کی شادی میں نہیں جا سکتے۔"

ملک نے کہا "ہمیں کوئی روک سکتا ہے؟ یہ تو ہماری شان کے خلاف بات ہے مگر ہم آپ کی وجہ سے اس کو یہ عزت دیں گے۔"

"بیگم صاحبہ کا مطلب یہ تھا کہ بتانے سے وہ دور جائیں گے، خلل کے تقریب میں حصہ نہیں لیں گے۔ ہم وحشی جیسے بن کے پاس گئے تو زیادہ مزہ آئے گا۔"

رابعہ نے کہا "کیا خواہ مخواہ کہتے جا رہے ہو میری طرف سے۔"

میں نے کہا "شہری شادیاں تو دیکھی ہوں گی تم نے۔ گاؤں کی شادیاں بھی دیکھ لو۔ پھر بتانا کہ ہماری شادی کیسے ہونی چاہیے شہری یا دیہاتی؟"

"مجھے کوئی شوق نہیں۔"

"مجھے تو بہت شوق ہے اور کیا پتا گاؤں کی شادی میں عبداللہ دیوانہ ہو جائے۔ میں مولوی صاحب سے کہوں کہ چلو جی اپنا بھی نکاح پڑھوا دو ہاتھوں ہاتھ۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ تم تو پہلے ہی کہہ چکے ہو۔"

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "اوہ۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ ہماری شادی ہو چکی ہے۔"

تیسرے پہر ہم نے شکار کھیلا۔ اس کے لیے ملک صاحب کے اصطبل سے گھوڑے منگوائے گئے تھے۔ ملک کا خیال تھا کہ … شاید ناک شہسوار ہوں گے۔ میں نے مدت ہوئی گھوڑے پر سواری نہیں کی تھی مگر لندن میں چار سالہ قیام کے دوران … کے علاوہ میرا ایک شوق ہارس رائیڈنگ تھا۔ جوڈو … سیکھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا مگر وہاں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ … نے ایک جاپانی کلاس فیلو کے ساتھ شام کی کلاس میں … کر دیا۔ وہاں متعصب قسم کے بدمعاش انگریز لڑکے جو سر پر استرا پھرا کے (SKIN HEADS) کہلاتے تھے ایشیائی باشندوں کو اکیلا پا کے گھیر لیتے تھے اور خوب مارتے تھے۔ ایک مرتبہ شامت اعمال کے باعث انھوں نے مجھے گھیر لیا کیونکہ میں اور محسن انگریز لڑکیوں سے معاشقے لڑانے میں حد سے زیادہ بدنام ہو چکے تھے اور گوروں کی عزت نفس اس سے سخت مجروح ہوتی تھی کہ کالے لوگ گوری لڑکیوں سے اتنا عشق لڑائیں۔ میں نے اپنے دفاع میں کچھ ہاتھ پیر چلائے مگر وہ چار تھے اور پٹائی کے فن میں مہارت رکھتے تھے۔ اچانک ایک ہندوستانی لڑکا آ گیا۔ اس نے چاروں کو دھنک کے رکھ دیا۔ اس پر مجھے مزید غیرت آئی کہ میرے ایک دشمن نے مجھے چار دشمنوں سے بچایا ورنہ وہ میری ہڈی پسلی ایک کر دیتے۔ مجھے اپنا دفاع خود کرنا آنا چاہیے۔

گھوڑے بہت اچھی نسل کے تھے۔ ملک نے سیاہ رنگ کی ایک گھوڑی پر تھپکی دے کے کہا "ہوتی یہ اپنی لاڈو ہے۔ کسی کو پیٹھ پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی۔ اپنے سوا۔"

میں نے کسی عظیم فلسفی کی طرح ایک نکتہ بیان کیا "ہر لاڈو ایسا ہی کرتی ہے" اور پھر رابعہ سے انگریزی میں کہا "مثلاً تم۔"

ملک بولا "آپ یہ گھوڑی لے لو۔ اس کے مزاج میں بھی بڑی مسکینی ہے اور ہے بھی خوب صورت۔ راضی خوشی سب کے پاس چلی جاتی ہے لالی کی طرح۔"

"لالی۔ کون لالی؟"

"وہی جسے آپ نے رات لال پری کا خطاب دیا تھا" ملک نے مجھے آنکھ ماری "ہانسہ جب چھتی تھی تو اسے چھوڑتا نہیں تھا جناب۔ مرد تو ایسا ہی کرتے ہیں۔"

مجھے پسینہ آ گیا۔ ملک سمجھ رہا تھا کہ رابعہ کچھ نہیں سمجھ رہی ہے۔ اس الو کی پٹھی نے واقعی سب کو بتا دیا تھا اور ملک نے بھی برا نہیں منایا تھا۔ گھر میں تفریح کے لیے ایک چیز تھی سب کی دولت مشترک تھی۔ مہمانوں کے لیے گھوڑی بھی حاضر اور لالی بھی۔

میں نے رابعہ سے نظریں نہیں ملائیں "آپ برا تو نہیں مانیں گے اگر میں آپ کی لاڈو کو لے لوں۔"

رابعہ نے غرا کے کہا "بلاوجہ شیخی میں مت آؤ۔ پھر شرمندگی ہو گی۔"

میں نے کہا "اب ہم بہت بے شرم ہو گئے ہیں جی۔"

لاڈو اتنی سرکش ہرگز نہیں تھی جتنا ملک مجھے اس سے ڈرا رہا تھا اور خود میں پریکٹس نہ ہونے کے باوجود شہسواری بھولا نہیں تھا۔ ویسے تو سب ہی جانوروں کو پیار سے سدھایا جا سکتا ہے مگر گھوڑوں کے رسیا گھوڑوں کی نفسیات پر خاصی ریسرچ کر چکے ہیں۔ اس کا مطالعہ میں نے بھی کیا تھا چنانچہ لاڈو نے واجبی سی مزاحمت کے بعد تابعداری اختیار کر لی۔ ملک نے اپنے لیے دوسری گھوڑی منتخب کی اور پنکھیری کو رابعہ کے حوالے کر دیا گیا۔

غریب مزارعین کا ایک جم غفیر دائیں بائیں ایک میل تک

www.paksociety.com

قطار میں پھیل گیا اور انہوں نے ڈانگ سوٹوں سے جھاڑیوں کو کھنگالنا شروع کیا۔ کچھ لوگ گھی کے خالی کنستر بھی بجا رہے تھے اور حلق سے ہر قسم کی آوازیں برآمد کر رہے تھے۔ ہمارے پیچھے شکاری کتوں کے ٹرینر چل رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں زنجیروں سے بندھے ہوئے اونچے قد اور پتلی کمر والے شکاری کتے تھے۔

اچانک دونوں طرف کی جھاڑیوں سے کوئی خرگوش نکلتا اور جان بچا کے بھاگتا تھا تو کتوں کو آزاد کر دیا جاتا تھا۔ پھر کتے اور خرگوش کی دوڑ شروع ہوتی تھی جو در حقیقت موت و حیات کی جدوجہد ہوتی تھی۔ خرگوش کی تیز رفتاری مشہور ہے اور وہ بڑی پھرتی سے راستہ کاٹ کے رخ بدل لیتا ہے مگر کتوں کو بھی شکار کی خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ وہ خرگوش کی چستی، چالاکی اور تیز رفتاری کو مات دیتے تھے اور اسے بالآخر زندہ پکڑ کر اور دانتوں میں دبا کے مالک کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔ زندگی کے لیے خرگوش کی دیوانہ وار جدوجہد کے بعد اس کی ناکامی اور پکڑے جانے کے بعد موت کے منہ میں اس کی معلوم بے بسی میں ملک جیسے لوگوں کے لیے بڑی سنسنی خیزی تھی۔ فتح کا نشہ تھا اور کمزور پر غالب آجانے کا غرور تھا۔ لیکن رابعہ جیسی خواتین کے لیے شدید جذباتی توہین اور عبرت کا سامان تھا۔ اس کے نزدیک یہ شکار نہیں آدمی کی حیوانی جبلت کا شفاف مظاہرہ تھا۔ اس نے مجھ سے سوال بھی کیا کہ فرض کرو خرگوش کی جگہ تم ہوتے۔

میں نے کہا "ایسا صرف اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ تم خرگوشنی ہوتیں اور ایک جنرل فارمولے کے تحت میں کوئی بھی چوپایہ بننا قبول کر لیتا بشرطیکہ مادہ تم ہوتیں۔"

رابعہ نے بھنے ہوئے خرگوش پر نظر ڈالنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ اس کی طبیعت اتنی متعفن ہوئی کہ اس نے کچھ بھی نہیں کھایا۔

"مجھے عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا "معاف کرنا۔ تم اس سے بڑی چیزیں ہضم کر چکی ہو مثلاً بکرے، اللہ میاں کی گائے اور وہ جانور جس کے سامنے لوگ بین بجانا سیکھتے ہیں۔ سیکڑوں مرغیاں تم چرغے، چکن تکے اور بریانی کی صورت میں نوش فرما چکی ہو۔ آخر خرگوشوں سے کیوں خفا ہو؟"

"میں نے تمہیں منع تو نہیں کیا۔ تم کھاؤ، بس میرا سر مت کھاؤ۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "بکری کا سر میں بڑے شوق سے کھاتا ہوں کیونکہ اس میں مغز ہوتا ہے۔ اللہ تمہارے سر پہ تمہارے سر کے تاج کا سایہ سلامت رکھے۔"

خرگوش جنگل میں ہی خیمہ لگا کے بھونے گئے تھے اور غالباً اس کے لیے کیمپ سے اسپیشل باورچی درآمد کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے کمال سے خرگوش کو چرغہ بنا دیا تھا۔ بھاگ دوڑ میں تھکن اور پسینے سے برا حال ہو گیا تھا۔ طعام سے پہلے ملک نے مجھے عجیب دیل کے شاور میں غسل کی پیش کش کی جو میں نے رابعہ کی وارننگ والی نظروں کو نظرانداز کرتے ہوئے قبول کی۔ میں شاور کے طوفانی آبشار جیسے دھارے میں نہاتے ہوئے رابعہ کو بھی اشارہ کرتا رہا کہ آجاؤ تم بھی۔ وہ بہت خفا تھی مگر کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ وہ کافی فاصلے پر خیمے کے پیچھے جا کے بیٹھ گئی۔

خرگوش مسلم نوش فرماتے ہوئے بھی میں نے اسے [illegible] اور اسے دکھا دکھا کے بوٹیاں کھاتا رہا۔ ملک نے اس کے لیے [illegible] منگوائی مگر وہ بھی رابعہ نے چکھ کے واپس کر دی۔ [illegible] وہ چکھنا کہتے تھے۔ ملک نے اپنے زریں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رابعہ کی عادت کو ولایت کے ماحول کی خرابی کا نتیجہ قرار دیا جہاں لوگ آم بھی چمچوں سے کھاتے ہیں اور پائے چھری کانٹے سے۔ میں نے کہا کہ رابعہ تو عید کی سویاں بھی اسٹرا STRAW سے کھاتی ہے۔

"ہم تو جناب شکاری ہیں خاندانی۔ باپ دادا بھی شکاری تھے تو یہ نہیں دیکھتے تھے کہ جانور کے چار پاؤں ہیں یا دو۔ اور نر ہے یا مادہ۔ مادہ ہے تو کس کی۔ بس جو دل کو بھا جائے۔" اس نے مجھے آنکھ مار کے کہا۔

"آنکھ بھی اچھی مارتے ہیں آپ" میں نے کہا "بلکہ [illegible] ہیں یا نہیں؟ میرا مطلب ہے مچھلی کا شکار۔"

ملک نے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا "بیگم صاحبہ کی طبیعت تو خیریت سے ناساز نہیں ہے۔ کوئی کھٹی چیز اچار، املی وغیرہ منگواؤں؟"

اسے جھاڑ رسید کرنے کے بجائے میں نے [illegible] سے کام لیتے ہوئے کہا "بڑی تاڑنے والی نظر ہے آپ کی ملک صاحب۔"

شام کو ہم واپس لوٹے تو حسب توقع تخلیہ میسر آتے ہی شامت آگئی "یہ سب کیوں کر رہے ہو تم آخر...."

میں نے کہا "میں آرام یعنی RELAX کر رہا ہوں۔ بلاوجہ ٹینشن TENSION مت لو۔ روم میں ویسے ہی بن جاؤ جیسے رومن ہیں۔ شہر میں شہری۔ دیہات میں دیہاتی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر دو مردوں کے سامنے بدتمیزی کیوں کر رہے ہو؟"

"اس لیے خاتون کہ میں بدتمیز ہوں۔" میں نے سرگوشی میں کہا "اب میں سو رہا ہوں۔ آپ اپنا وعظ جاری رکھیں۔ میں آنکھیں ہی نہیں کان بھی بند کر کے سو رہا ہوں۔"

میں دو گھنٹے بعد اٹھا تو حالت ابتر تھی۔ بہت عرصے بعد گھوڑے کی سواری نے جسم کا جوڑ جوڑ ہلا دیا تھا۔ رابعہ نے گھوڑے کو ایڑ ہی نہیں لگائی تھی۔ وہ خراماں خراماں چلتی رہی تھی اور جب خرگوش ذبح کر کے ہوتے تھے تو پھر آگے بڑھتے سے پہلے پہنچنے کا انتظار کرتے تھے۔

میں ہائے ہائے کرتا ہوا اٹھا تو اس نے طنز سے کہا "تمہاری [illegible] ایسے کراہتا ہوا دیکھ لیا۔"

"[illegible]؟" میں نے کہا "کون سی لاؤں۔ اس کا نام لالی ہے۔ کراہتا دیکھے گی تو تمہاری طرح چہرے کے نقش نہیں بھینچتی رہے گی۔ ہاتھ پاؤں دبائے گی۔ تم تو بڑی سنگدل ہو، دل کا درد بھی نہیں [illegible]"

رابعہ مسکرائی "لالی کو بلا دوں؟ یا مولوی صاحب کی دختر نیک اختر کو؟"

"ارے تم ہی سر دبا دو۔ ظالم حسینہ" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چھوڑو۔ تم تو کچھ زیادہ ہی رومانٹک ہو رہے ہو یہاں۔" رابعہ نے ہاتھ چھڑا کے کہا "رات کو شادی میں بے ہودگی مت کرنا۔"

"میں صرف ہودگی کروں گا۔ وعدہ۔" میں نے کہا "یعنی وہ سب جو اپنی منکوحہ کے ساتھ سرعام کیا جا سکتا ہے۔"

رابعہ ہنسی "منہ دھو کے رکھو اپنا۔ میں منکوحہ نہیں ہوں کسی کی۔"

ملک صاحب نے سرشام نوٹس دیا کہ شادی میں چلنا ہے تو تیار ہو جائیں۔ فرمائش پر مجھے ریشمی لنگی، بوسکی کا ڈھیلا کرتا اور ایک پگڑی بھی فراہم کر دی گئی۔ ملک بطور خاص نیلی پگڑی کے لیے پریشان تھا لیکن اس کے لیے ناممکن کچھ نہیں تھا۔ صرف آدھے گھنٹے میں ایک سفید پگڑی کو نیلا رنگ دے کر سکھا دیا گیا۔ کلف اور استری کے بعد ملک کے ایک ملازم نے پگڑی باندھی اور میرے سر پر رکھ دی۔ ملتانی کھسے پہن کے میں نے آئینہ دیکھا۔

"واہ جی ملک صاحب۔ نور بن گئی ایک۔ بس آپ جیسی مونچھوں کی کسر رہ گئی" میں نے ہونٹوں پر فرضی مونچھوں کو تاؤ دیا "بڑا رعب ہوتا ہے مونچھوں کا۔"

ملک بہت خوش ہوا "مونچھ تو مرد کا زیور ہے جی۔"

میں نے کہا "کیا بیگم صاحبہ بھی تیار ہیں؟"

ملک نے قہقہہ مارا "لو جی۔ کمال کرتے ہو آپ بھی۔ عورتوں کا تیار ہونا اتنی جلدی ختم ہو سکتا ہے۔ جو ٹائم پر تیار ہو جائے وہ زنانی نا ہوا۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "شہر اور گاؤں میں کم سے کم ایک قدر مشترک ہے۔ کیا آپ کی بیویاں بھی ساتھ جائیں گی؟"

ملک کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے میں نے نادانستگی میں اسے گالی دے دی ہو "ہم ابراہیم صاحب! ہم تو مرد ہیں اور حاکم ہیں۔ عورت ہوتی ہے گھر کی عزت۔ ان کو اس بے حیثیت شخص کی شادی میں لے کے جاؤں اور وہ بھی بن بلائے۔ ناک کٹ جائے گی ہماری۔"

"اگر وہ دعوت دیتا آپ کو۔"

"اس کے سر پہ جوتی نہ توڑ دیتا میں۔ آج تک کسی کمینے نے ایسی گستاخی کی جرات نہیں کی۔ میں تو آپ کا دل رکھنے کے لیے ساتھ جا رہا ہوں۔"

رابعہ تیار ہو کے آئی تو میں اسے دیکھ کے ہونقا رہ گیا۔ خالص دیہاتی اسٹائل کے زرق برق کپڑوں میں وہ پہچانی نہیں جاتی تھی۔ کپڑے قیمتی تھے اور شاید اس کی کسی بیوی کے زیر استعمال تھے۔ اسے سونے کے بھاری بھرکم زیورات سے بھی لاد دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ سب خصوصی انتظام ملک کے حکم پر ہوا تھا۔ رابعہ کی بے بسی اور جھنجلاہٹ جائز تھی۔ اس کی کسی نے نہیں سنی تھی اور جیسا کہ اس نے مجھے بعد میں بتایا اسے "لالی" بناتے ہوئے بڑی، مجھلی اور چھوٹی بیگمات کے علاوہ حویلی کی ہر ملازمہ اور خود لالی پری نے رابعہ کا خوب تمسخر اڑایا تھا اور اسے سخت اشتعال انگیز باتیں سننی پڑی تھیں۔

وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی کہ دیکھا اپنے مذاق کا انجام۔ اسے میرا دیہاتی ایڈیشن بھی پسند نہیں آیا تھا۔ وہ بہرحال حسین لگ رہی تھی۔

میں نے کہا "ملک صاحب یہ کیا؟ اتنا زیور؟"

"لگتا ہے تو ضروری ہے شادی بیاہ میں۔ آخر ہمارے مہمان ہیں آپ۔"

میں نے کہا "ملک صاحب، ہم عام دیہاتی بن کے شادی میں شریک ہونا چاہتے تھے۔"

"آپ خاص آدمی ہیں" ملک نے گویا فیصلہ کر دیا۔ "اور سارے گاؤں کو معلوم ہے کہ آپ کتنے بڑے سرکاری افسر ہیں۔ یہ تو بس شغل ہے۔"

شغل کا سارا لطف تو وہیں غارت ہو گیا تھا۔ شادی والے گھر میں ہمارا پہنچنا ایک تاریخی واقعہ بن گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ملک کا صدر اطلاع دیے کے اپنے چپراسی کے گھر پہنچ جائے۔ اس گلی میں ہمارا پیدل جانا خود کو تماشا بنانے کے مترادف ہوتا۔ میں نے اپنی گاڑی کو احاطے میں خاص طور پر لگائے گئے خیمے کے نیچے پارک کرا دیکھا تھا۔ شادی کے لیے ہم اس جہازی کار میں بیٹھے جس کی چوڑائی گلی سے کچھ ہی کم تھی چنانچہ دونوں طرف سے ٹریفک رک گئی تھی یا روک دی گئی تھی۔

ہمارے پہنچتے ہی جیسے افراتفری پھیل گئی۔ جملہ حاضرین احتراماً صف بستہ ہو گئے اور خوش نصیب خاندان کے چیدہ چیدہ افراد پر مشتمل چند رہنما افراد نے تعریفی قصیدے پڑھتے ہوئے ہمارے گلوں میں ہار ڈال دیے۔ کسی نے ہم سے مصافحہ کرنے کی گستاخانہ جرات نہیں کی۔ پروٹوکول کے تحت یہ ممنوع ہو گا۔ ان کے لیے اور آنے والی نسلوں کے لیے یہی کم فخر اور غرور کی بات نہ تھی کہ ملک صاحب بنفس نفیس اپنی ذاتی گاڑی میں ایک بہت بڑے سرکاری افسر اور اس کی ولایتی بیوی کے ساتھ شادی میں شریک ہوئے تھے۔ ہمیں ایک تخت کے اوپر لگے ہوئے صوفے پر بیٹھنا پڑا۔

www.paksociety.com

معلوم نہیں اس گاؤں میں ملک صاحب کے علاوہ صوفہ کس کے گھر میں تھا اور کہاں سے منگوایا گیا تھا۔ شادی کی تقریب قانونی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ سب لوگ دبے دبے اور کچھ خائف سے تھے۔ ان کی شوخی اور خوشی، بے تکلفی اور ہلڑ بازی جو ہر شادی کو جشن طرب بناتی ہے یکسر مفقود تھی۔ نکاح خاموشی سے ہوا اور اس کے بعد چند لوگوں نے آپس میں گلے مل کے ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ چھوارے جو ایسی تقریب میں لٹائے جاتے ہیں اور شرکا بڑے جوش و خروش سے لوٹتے ہیں خصوصاً بچے، سب کے ہاتھوں پر رکھ دیے گئے اور ہمارے سامنے ایک شیشے کی پلیٹ میں لائے گئے۔ لانے والا خود دلہن کا باپ تھا۔

میں نے اسے گلے لگا کے مبارک باد دی تو وہ خوشی سے رونے کے قریب ہو گیا "کیا بات ہے۔ کچھ پتا نہیں ہے۔ بابا شابا کدھر ہے؟"

ملک صاحب نے ناگواری سے مسکراتے ہوئے کہا "کیا ادھر کوئی میت ہوئی ہے جو سب کو چپ لگی ہوئی ہے؟"

مجھے بہت افسوس ہوا۔ ملک کو ایسے موقعے پر یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ میں نے بڈھے کی دل آزاری کا تدارک یوں کیا کہ اپنی جیب سے ایک ہزار روپے نکالے اور کہا "یہ ہماری طرف سے منہ دکھائی۔"

بڈھا ڈر گیا "نہیں جناب...."

میں نے کہا "بیگم صاحب خود اندر جا کے دلہن کو منہ دکھائی کے بعد دیں گی۔"

بڈھے کی زبان گنگ ہو گئی۔ وہ کبھی میری طرف دیکھتا تھا کبھی ملک کی طرف۔ میں نے نوٹ رابعہ کو دے دیے "بیگم صاحبہ کو اردو پنجابی نہیں آتی مگر دعا اور مبارک باد کے لیے الفاظ نہیں جذبات ہوتے ہیں۔ جاؤ۔"

اتنی دیر میں غالباً ملک نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بڈھے کو اجازت دے دی تھی جو اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ رابعہ اندر کیا گئی ایک قیامت آ گئی۔ یہ بھی گرد و نواح کے دیہات کی صدیوں کی تاریخ میں پیش آنے والا پہلا واقعہ تھا جس پر سب کی عقل دنگ تھی۔

رابعہ ایک کچے کمرے کی کوٹھری میں گئی اور جیسا کہ اس نے بعد میں مجھے بتایا۔ اس کوٹھری میں سے دیگر خواتین کو بڑی عجلت میں نکالا گیا۔ چند قریبی سہیلیاں جو زیادہ بہادر تھیں اور ولایتی میم کو دیسی لباس میں دیکھنے کی بہت شوقین تھیں، دروازے تک کھڑی ہو گئی تھیں۔ جب رابعہ نے دلہن کا گھونگھٹ اٹھا کے اسے پیار کیا اور گلے لگا کے ایک ہزار روپے دیے تو سناٹا چھا گیا۔ خواتین کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ دلہن کی ماں نے زار و قطار روتے ہوئے رابعہ کے پاؤں چھونے کی کوشش کی اور اتنی دعائیں دیں کہ رابعہ گھبرا کے فوراً واپس نکل آئی۔

میرے اصرار پر گانا بجانا شروع ہوا۔ ایک ڈھول والا، نفیری والا جو برات کے ساتھ آئے تھے مگر احتراماً خاموش بیٹھے تھے میدان میں اتر آئے۔ رنگین ڈھول پر خوب رنگین پھندنے، چمکیلے تارے لگے ہوئے تھے اور اسے بجانے والا بھی رنگ میں آ گیا تھا۔ بہت بڑے سرکاری افسر کی فیاضی اور دریا دلی کی دھوم مچ گئی تھی چنانچہ ڈھول والا بھی بہت بڑے انعام کی توقع کر رہا تھا۔ ڈھول کے ساتھ ہی چار نوجوانوں کی ٹولی میدان میں آ گئی جو دولہا کے ساتھی تھے۔ ہم نہ آتے تو وہ بہت دھما چوکڑی کرتے۔ اب انہیں موقع ملا تو انہوں نے دل کی بھڑاس نکالی اور ایسا رنگ محفل شباب پر آ گیا۔

جیسا کہ مجھے توقع تھی ملک تھوڑی ہی دیر میں اس تماشے سے اکتا گیا تھا۔ وہ طوعاً و کرہاً برداشت کر رہا تھا۔ اس کے ذہن پر احساس مسلط تھا کہ وہ اپنی حیثیت اور مرتبے اور آبائی روایات کو پامال کرتے ہوئے اپنے سے کمتر اور کمین لوگوں کی اس شادی میں شریک ہوا۔ شرکت کی حد تک وہ عذر پیش کر سکتا تھا کہ مجھے مہمانوں نے مجبور کر دیا تھا لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ اس کے سامنے باادب باملاحظہ ہوشیار رہنے والے اسے نظرانداز کرتے ہوئے بےخودی میں مگن تھے۔ اس کی حیثیت عام تماشائی کی ہو گئی تھی۔

اس نے اشارے سے دلہن کے باپ کو بلایا "اوئے کیا ڈھول نے ہی ہونا ہے کہ بیٹی کو رخصت بھی کرنا ہے۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا "جو حکم سرکار۔"

"حکم دے چھڑے۔ ظاہر ہے تم یہ کر رہے ہو جیسے میرے حکم کے بغیر سانس بھی نہیں لیتے۔ کیا ان مہمانوں کا پیٹ شور شرابے سے بھر جائے گا۔"

"غلطی ہو گئی عالی جاہ...."

اب میں نے مداخلت کی "ملک صاحب مزہ آ رہا ہے۔ ابھی اتنی بھوک بھی نہیں ہے۔"

ملک کو جیسے میری بات پر یقین نہیں آیا "کیا آپ کھانا بھی یہاں کھائیں گے۔ کھیل تماشا دیکھ لیا۔ اب حویلی چلیں۔"

میں نے کہا "ملک صاحب یہ تو بڑی خلاف اخلاق بات ہو گی کہ ہم شادی میں شریک ہوں اور کھانا کھائے بغیر چلے جائیں۔"

"اچھا تو آپ تشریف رکھیں۔ مجھے معاف کریں" وہ اٹھ کھڑا ہوا "مجھے کچھ ضروری کام بھی تھا۔ میں گاڑی بھیج دوں گا آپ کے لیے۔"

میں نے کہا "اگر آپ کو ضرورت ہو گاڑی کی تو میری گاڑی بھیج دیں۔"

"نہیں مجھے گاڑی نہیں چاہیے" وہ اٹھا اور سب کے سلام کے جواب سے واک آؤٹ کے انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا نکل گیا۔

ایک لمحے کے لیے سب کچھ رک گیا۔ ڈھول بجانے والے کے ہاتھ، رقص کرنے والوں کے قدم، ساتھ دینے والوں کی تالیاں اور تماشا کرنے والوں کا انہماک۔ سب ایسے سکتے میں آ گئے جیسے کوئی بہت ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا ہو۔ ملک نہیں برات کا دولہا اٹھ کے چلا گیا ہے۔

میں نے آواز دے کے کہا "چلو بھئی جوانو۔ شروع ہو جاؤ پھر۔ ملک صاحب کو ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا۔"

اجازت نامہ گویا تجدید شادمانی کا لائسنس تھا۔ ایک دم ڈھول والے نے ڈم ڈم کر کے دلوں کی دھڑکن اور خون کی گردش کو گرما دیا۔ لڈی ڈالنے والے پھر جوش میں آئے اور تماشا پہلے سے زیادہ ہنگامہ خیز ہو گیا۔ وہ ملک کی موجودگی سے خائف تھے۔ میرے رویے نے انہیں احساس دلا دیا کہ میں خود بڑا افسر نہیں ہوں اور ان کی خوشی میں دل سے شریک ہوں۔

رابعہ نے مجھ سے پوچھا "ملک کیوں چلا گیا؟"

میں نے کہا "وہ اپنے نمک خواروں کا نمک کیسے کھاتا۔ کل کو وہ نمک خواری کا طعنہ دیتے پھرتے؟"

"تم واقعی یہاں کھانا ضرور کھاؤ گے؟"

"مجھے بتاؤ کہ تمہارے شہر میں مہمان کسی شادی میں شریک ہوں مگر کھانا کھائے بغیر چلے جائیں تو کیا میزبان اسے اپنی توہین نہیں سمجھیں گے؟ آخر ان غریبوں کی بھی عزت ہے اور دیکھو یہ کتنے خوش ہیں ہماری موجودگی سے۔ اور ابھی تم دیکھنا میں لڈی میں کیسے زبردستی شامل ہو کے ثابت کرتا ہوں کہ مغرب اور مشرق مل سکتے ہیں۔"

"دیکھو میرے ساتھ بدتمیزی مت کرنا۔ مجھے مت گھسیٹنا۔"

"نصیب اپنا تو تم کیا کرو گی؟"

"میں مار ڈالوں گی۔ بے عزتی ہو جائے گی سب کے سامنے۔ دیکھو تمہیں میری قسم مجھے مجبور مت کرنا۔"

جب اس نے قسم دے دی تو میں مجبور ہو گیا۔ "یہ قابل تحمل کیا ہو تم بھی۔"

مجھے یاد ہے کہ میں پہلی بار لڈی ڈالنے والی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ لڈی نہایت دلچسپ اور مشکل رقص نہیں ہے۔ بس جسم کو مخصوص لے اور تال کے ساتھ ہم آہنگ رکھتے ہوئے دوسروں کی نقل کرنے لگا۔ وہاں ایک ہم شور مچ گیا۔ منظر ان سب کے لیے ناقابل یقین تھا۔ بعد میں میری حرکات "شاندار" ہو گئیں لیکن RHYTHM میں نہیں رہا تھا۔ لوگ ہنس ہنس کے بے حال ہو گئے مگر وہ میرا تمسخر نہیں اڑا رہے تھے۔ خوش تھے اس لیے ہنس رہے تھے۔

چند منٹ میں مجھے پسینہ آ گیا اور میں ہانپنے لگا۔ خود رابعہ کہتی ہے کہ وہ اس سے بے حد محظوظ ہو رہی تھی۔ میں نے عزت کے ساتھ الگ ہو جانا بہتر سمجھا اور صوفے پر جا بیٹھا۔ اس کے ساتھ ناچ گانا ختم ہو گیا کیونکہ مہمان اب کھانے کے لیے بےچین تھے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے وہ مجھے اور رابعہ کو الگ بٹھا کے کھانا کھلانے کا اہتمام کر چکے تھے لیکن ہم نے عام مہمانوں میں شامل ہو کے کھانا کھایا۔ اس سے لوگ بہت خوش ہوئے۔ حویلی کے اندر تو رابعہ کا بڑا تحقیر آمیز انداز میں مذاق اڑایا جاتا تھا اور اسے بہت اشتعال انگیز قسم کی باتیں سننا پڑی تھیں مگر یہاں رابعہ نے جسے سنا تعریف کرتے سنا۔ سب کے لبوں پر ایک ہی بات تھی۔ کتنے بڑے لوگ ہیں اور کتنے سادہ، کیسے ملنسار اور نیک دل۔

میرا مقصد بھی لوگوں میں گھل مل کے اپنا کام نکالنا تھا۔ میں نے دولہا سے کہا جو بڑا کھرا جوان تھا کہ کیا مجھے ایسے دو چار جوڑے مل سکتے ہیں جیسے میں نے پہن رکھے ہیں۔ پیسوں کی فکر نہیں۔ بس کل تک بندوبست ہو جائے تو میں اپنے ساتھ لے جاؤں۔ دوستوں کو تحفہ دوں گا۔ اس نے اپنے ایک دوست کو بلا کے میرا مسئلہ بیان کیا۔ اس نے کہا "سوہنیو یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔"

میں نے کہا "کل کس وقت تک مل جائیں گے ایسے کپڑے۔"

اس نے سوچ کے کہا "دوپہر تک۔ ویسے یہ کپڑے خاصے مہنگے ہیں۔"

میں نے اسے ایک ہزار روپے دیے "اس میں کام ہو جائے گا؟"

"بالکل ہو جائے گا جناب۔ ملک صاحب کے ڈیرے پر حاضر کروں؟"

میں نے کہا "مزاری صاحب کے گھر رکھوا دینا میں وہاں سے لے لوں گا۔"

پھر میں نے ڈھول والے سے بات کی "استاد بڑا غضب کا ڈھول ہے۔ بجاتے بھی خوب ہو تم۔ واہ واہ۔"

وہ ہاتھ جوڑ کے بانچھیں چھٹنے لگا۔ کسی میراثی کی اتنی تعریف یہاں کون کرتا تھا "جی رب کی مہربانی ہے۔"

میں نے کہا "یہ ڈھول بیچو گے؟"

وہ ہونقا رہ گیا "جی!"

میں نے ہنس کے کہا "یار یہ ڈھول چاہیے مجھے۔ کتنے میں دو گے؟"

"سرکار یہ تو روزی ہے ہماری۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"ڈرو نہیں۔ میں زبردستی نہیں لوں گا۔ مجھے کہیں سے لا دو۔"

"مجبوری کیا تو... مشکل ہے۔ یہ تو میں نے سنگھار کیا ہے اس کا۔ ڈھول بنوانا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "جو ڈھول کسی سے مل جائے تو میں اچھی قیمت دوں گا۔ دو سو چار سو۔ مجھے تو اندازہ نہیں۔ سو اوپر ہو جائیں بے شک۔"

اب دولہا نے اسے ڈانٹ لگائی "اوئے نخرے مت کر...."

www.paksociety.com

بول کتنے پیسے لے گا ڈھول کے۔ چپ کر کے صاحب کو دے دے ورنہ تیرا یہ ڈھول پھاڑ دوں گا۔ اور دیکھوں گا پھر تجھے کون بلاتا ہے یہاں۔"

میں نے کہا "نہیں بھئی۔ زبردستی مت کرو۔ چلو بابا تم بھی ہزار لے لو۔ جب تک تمہارا اپنا ڈھول نہ بن جائے گزارا کرنا۔"

"اوئی مہینے کے سو کمالے یہ تو اس کا دماغ خراب ہونے لگتا ہے۔ آپ نے بہت دے دیے۔ ڈھول کا کیا ہے۔ سو دو سو میں بن جائے گا۔ بہت لگا تو مہینہ لگ جائے گا" دولہا نے مجھے سمجھایا۔

مگر میں اسے ایک ہزار دے چکا تھا "یہ صبح ملک صاحب کے ڈیرے پر پہنچا دینا۔"

جب ہم واپس ملک کے ڈیرے پر پہنچے تو ہم سے پہلے ہماری بداعمالیوں کی داستانیں حویلی کے اندر تک پہنچ چکی تھیں۔ ملک سخت مضطرب تھا۔ خاص و عام کا فرق مٹا کے میں نے اس کے لیے جذباتی مسائل پیدا کر دیے تھے۔ ظاہر ہے میرے مقابلے میں اس کا رویہ پہلے سے زیادہ ناپسندیدہ ہو گیا تھا۔

اس نے مجھے لیکچر دینے کی کوشش کی "سوری ان کمی کمینوں کو منہ لگاؤ تو جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ حاکم اور افسر لوگ اس لیے نیچے والوں سے دور رہتے ہیں۔ ان سے یاری لگائیں گے تو ان پر حکم کیسے چلائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک مقام رکھا ہے۔ زمین نیچے ہے سورج اوپر۔ ایسے ہی۔"

میں نے کہا "ملک صاحب۔ اگر تم نے خلفائے راشدین کی تاریخ پڑھی ہوتی تو تمہیں اندازہ ہوتا کہ اسلامی مساوات کیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ اور ان کا غلام ایک اونٹ پر باری باری سفر کرتے تھے۔ تمہارے رواج اور طور طریقے اپنی جگہ لیکن مجھ پر یہ ثابت مت کرو کہ اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے۔"

اگلے دن مزید بدمزگی ہوئی جب ملک کو معلوم ہوا کہ میں نے جیسے کپڑے گزشتہ رات پہنے تھے ویسے ہی منگوائے بھی ہیں اور میراثی کا ڈھول بھی خرید لیا ہے۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ تھا ورنہ یہ سمجھتا کہ میں نے بہت پی لی ہے اور یہ سب کچھ میں نے نشے کی حالت میں کیا ہوگا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ میں دوسری قسم کا افسر ہوں جو "مولوی ٹائپ" ہوتے ہیں۔ رابعہ نے اندر کی رپورٹ دی۔ خواتین یقین کرنے پر تیار نہیں تھیں کہ میں نے لڈی ڈالی۔ سب کے ساتھ نمکین اور میٹھے چاول کھائے اور میراثی سے دوستوں کی طرح بات کرتا رہا۔ ان سب کے خیال میں میرے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا تھا۔ چھوٹی بیگم نے تو یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ بوتل میری جیب میں ہوگی اور میں چھپ چھپ کے پیتا رہا یہاں تک کہ نشے میں آؤٹ ہو گیا۔

ملک کو یہ معلوم ہوتا تو نہ وہ ہمیں شادی میں لے جاتا اور نہ خود جاتا۔ شاید وہ شادی ہی ملتوی کرا دیتا۔ اس کی پوزیشن بڑی خراب ہوئی تھی۔ اس کا حکم سننے والی رعایا کے سامنے سرکاری حاکم کا ایک نمونہ آیا تھا جو فرعون صفت نہیں تھا بلکہ ان کا ہمدرد اور عالی ظرف تھا۔ ملک نے بعد میں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ یہ ہمیں کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ شاید وہ ان پر گرجا برسا ہو گا کہ مجھ سے پوچھے بغیر اور میری اجازت کے بغیر تم نے اس کی بات کیوں مانی؟ میراثی کو جوتے مارے ہوں کہ تو نے ڈھول بیچ دیا تو تیری کھال کا ڈھول بنوا کے دیتا ہوں۔ تو انکار نہیں کر سکتا تھا تو ملک صاحب سے پوچھو۔ اور قلفی کرنا گھڑی اٹھانے والے سے کہا ہو گا کہ نمک حرام! تو نے ہمارے مہمان سے پیسے لیے؟ کیا ہم اتنے سو جوڑے نہیں دے سکتے تھے؟ اور یہ مولوی تیرا کیا لگتا ہے کہ تو نے اس افسر کے کہنے پر جوڑے وہاں رکھوائے؟

جھلایا ہوا حاکم کسی بھی بہانے رعایا کو ناکردہ گناہوں کی سزا دے سکتا ہے۔ قصور سارا میرا تھا مگر غصہ شاید اس نے کچھ دوسرے بے بس لوگوں پر اُتارا ہو گا۔ اگلے دن ہماری روانگی سے قبل اس نے تحائف کا ایک انبار پیش کر کے اپنی حیثیت سے ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

اس نے وہ لباس مجھے پیش کیا جو میں شادی میں پہن کے گیا تھا۔ میں نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔ رابعہ کے جوڑے تک بھی سب ٹھیک تھا مگر اس نے کہا کہ لباس کے ساتھ سارے گہنے بھی جائیں گے تو میں نے انکار کر دیا۔

"یہ ہماری ریت ہے جناب عالی۔"

"ہوگی۔ مگر تحفہ حد سے بڑھ جائے تو رشوت کہلاتا ہے۔ پندرہ بیس ہزار کا سونا دینے کا مقصد؟"

"پندرہ بیس کہاں جی۔ دو چار ہزار کی چیز کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔" اس نے جانتے بوجھتے زیور کی قیمت کم بتائی۔ "ہمارا تو کوئی کام نہیں ایسا کہ ہم رشوت دیں۔ آپ تحفہ ہمارے منہ پر مار کے ہمیں بے عزت کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی۔ آپ بڑے افسر ہیں جوتے بھی مار سکتے ہیں ہمیں۔ ہم بھی کوئی فقیر نہیں ہیں اپنی حیثیت کے مطابق تحفہ دیتے ہیں۔"

میں مجبور ہو گیا۔ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو میں اسے تحفے میں پیش کر کے حساب برابر کر سکتا پھر رابعہ نے مجھے ایک ترکیب سمجھائی۔

رخصت ہونے سے پہلے میں نے کہا "ملک صاحب اپنے سب بچوں کو بلوائیں میں تو ان سے ملا ہی نہیں۔"

ملک نے سب کو حاضر کر دیا۔ جب وہ سب کا تعارف کرا کے انہیں سلام کروا چکا تو میں نے ہر بچے کو دو دو ہزار روپے دیے۔

"یہ... یہ آپ کیا کر رہے ہیں جناب عالی" ملک نے احتجاج کیا۔

"یہ ہماری ریت ہے" میں نے کہا "جب ہمارے گھر مہمان آتے تھے تو اپنی اپنی استطاعت کے مطابق دے جاتے تھے۔

کر جاتے تھے اب تم نہیں بولو گے۔"

ملک جھلایا مگر میں نے حساب برابر کر دیا تھا۔ شام ہوتے ہی ہم نکلے تو سارا گاؤں ہمیں الوداع کہنے کے لیے موجود تھا۔ ان میں جانن دین بھی تھا، پیش امام بھی۔ ایک نوبیاہتا دلہن دولہا کے ساتھ کھڑی رو رہی تھی۔ شاید ہم جیسا دیوانہ پھر کبھی ادھر نہ آیا ہوگا۔ ہمارے چرچے رہتے ہوں گے۔ یہ حقیقت کھلی ہوگی کہ ابراہیم نام کا نوجوان ڈیم پر کوئی انجینئر تھا تو لوگوں نے کہا ہوگا کہ "وہ تو فرشتے تھے فرشتے۔ غریب پرور تھے۔ میراثی سے ملک صاحب تک سب کا دل لے گئے۔" اس گاؤں میں دو دن کا قیام ایسا دلچسپ اور یادگار تھا جس کی یاد نے مجھے ہمیشہ بے چین کیا۔ میں نے چاہا ایک بار پھر وہاں جا کے دیکھوں۔ جانن دین زندہ ہے یا نہیں، مولوی صاحب کی بیٹی کی رخصتی ہوئی یا نہیں۔ اس کے کتنے بچے ہیں جس کی شادی ہماری شرکت سے تاریخی بن گئی تھی۔ لیکن میں کبھی وہاں نہ جا سکا۔

واپسی میں رابعہ بھی اداس تھی "کیسے خواب کی طرح لگتا ہے۔ کل شام کتنی رونق تھی۔"

میں نے کہا "یہ ہماری دنیا نہیں تھی رابعہ۔ عالم آزاد گاں ہے سب سے الگ۔ سندباد نے کتنے سفر کیے تھے۔ ہر سفر ایسا ہی کسی نئی حیرت انگیز دنیا کا تجربہ۔"

"سندباد کا اب کیا ارادہ ہے؟" رابعہ بولی۔

"ابھی تو کچھ نہیں کرنا۔ کل جمعہ ہے۔ چوہدری صاحب کے عقد میں شرکت پہلے سے طے ہے۔"

اس رات ہم نے لاہور کے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ میرا ذہن آنے والے دن کی منصوبہ بندی میں الجھا ہوا تھا۔ رابعہ جاننا چاہتی تھی کہ آخر میں کیا سوچ رہا ہوں مگر کسی نتیجے پر پہنچے بغیر میں کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

رات کے بارہ بجے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کیس میں مجھے مدد لینے کے سوا چارہ نہیں۔ میں نے آپریٹر کو وقار کے گھر کا نمبر دیا۔

"پرسنل کال ہوگی۔ صرف مسٹر غالب کے لیے" میں نے کہا۔

"پرسنل کال ہے سر" آپریٹر نے کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ مسٹر غالب نہ ہوں تو کال ملانے کی ضرورت نہیں۔"

"کون بات کریں گے؟"

"مسٹر کامل شیخ بات کریں گے۔"

میں نے ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا نام اکرام شیخ لکھوایا تھا۔ چند منٹ بعد فون رابعہ نے اٹھا کے کہا "ہیلو۔" اور ریسیور مجھے دے دیا۔ غالب نے رابعہ کی آواز پہچان لی تھی۔

"السلام علیکم رابعہ..."

میں نے کہا "رابعہ کے بچے۔ شور مت کرو۔ ابھی سب کو اٹھا دے گا۔ تیرے کان خراب ہیں کہ دماغ۔ مردانہ اور زنانہ آوازوں میں فرق نہیں کر سکتا۔"

"سکندر۔ کاش کوئی ایسا فون ایجاد ہو جائے کہ ادھر سے جوتا مارا جائے تو دوسری طرف بات کرنے والے کے منہ پر لگے۔"

میں نے کہا "جیسے راکٹ نشانے پر مارے جاتے ہیں ایسے ہی راکٹ والے جوتے میں ایجاد کر رہا ہوں۔ مگر ابھی جو میں کہہ رہا ہوں وہ غور سے سن۔ تیرے علاوہ یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہونی چاہیے ورنہ..."

"ورنہ کیا۔ ابے بھگوڑے ہمیں دھمکی دیتا ہے۔ ہماری بہن کو بھگا کے لے گیا۔ تیری تو..."

میں نے کہا "خواہ مخواہ ملامت بن میرا۔ میں نے دوست سمجھتے ہوئے تجھ پر اعتبار کیا ہے۔"

"کوئی کام ہوگا ضرور۔"

"ظاہر ہے۔ دوست اور کب کام آتے ہیں۔"

"تجھے معلوم ہے سب کو کتنا دکھ ہے اور کتنا غصہ ہے؟ رابعہ سے ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ وہ بھی تیرے ساتھ فرار ہو جائے گی۔ وہ تو خود بڑی مخالفت کر رہی تھی۔ کون سا جادو کر دیا اس پر؟"

"اسے محبت کا جادو کہتے ہیں" میں نے ہنس کے کہا۔

"اچھا اب تم لیلیٰ مجنوں یقیناً صحرا میں مارے مارے پھرو گے۔ میں بتا دیتا ہوں۔ ایک تو اپنا تھر کا ریگستان ہے۔ دوسرا چولستان کا علاقہ بھی موزوں ہے۔ اونٹ وغیرہ کرائے پر مل جاتے ہیں۔ چڑھنے کے لیے سیڑھی..."

"اپنی بکواس بند کریں آپ تو میں کچھ فرماؤں۔ جو خبر میں پریس کے ایک معزز رکن اور سینئر صحافی کو سنانے والا ہوں۔ وہ خصوصی ہے یعنی آپ کی زبان میں اسکوپ SCOOP اور وہ بھی EXCLUSIVE۔ یہ خبر سن کے آپ اچھل پڑیں گے تو اچھلتے ہوئے خیال رکھیں کہ زیادہ اوپر جا کے چھت سے نہ ٹکرائیں اور گریں تو فرش پر۔ عرش پر نہ جائیں۔"

"کیا ہوا آخر؟ رابعہ سے شادی کر لی تو نے؟ یا تو نے رابعہ کے چاند سے بیٹے کو جنم دیا ہے؟"

میں نے کہا "اپنے چوہدری داور صاحب کل عقد ثانی فرما رہے ہیں۔"

"میں نہیں مانتا۔ اس کا عقد ثانی بہت پہلے ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی نمبر دو کراچی میں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کسی کو معلوم نہیں۔ مجھے پتا بھی معلوم ہے۔"

"او کے۔ اب میں اُچھلتا ہوں حیرت سے" میں نے کہا "ایسی صورت میں آپ کل عقد کا سوئم سمجھ لیں۔"

"کہاں ہو رہی ہے یہ سوئم کی تقریب؟"

"کالا شاہ کاکو میں۔ کالیا کی بہن سے" میں نے کہا "اس کی

www.paksociety.com

بھی ایک اسٹوری ہے۔ مختصراً یہ کہ کالیا مقروض تھا۔ دلاور نے کہا کہ یا تو رابعہ کو اغوا کر دو یا اپنی بہن دے دو۔ پہلی کوشش رائیگاں گئی۔ اب وہ دوسری شرط پوری کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ شادی نہیں، محض شادی کا ڈراما ہوگا۔ کچھ عرصے بعد کالیا کی بہن منہ کالا کرا کے روتی پھرے گی اور دلاور اسے پہچاننے سے بھی انکار کر دے گا۔ یہ بھی ممکن ہے بعد میں وہ اسے بلیک میلنگ کے الزام میں لڑکی کو اندر کرا دے۔ وہ بس اس کی عزت سے کھیلنا چاہتا ہے۔"

"پھر ہم اور آپ کیا روک سکتے ہیں دلاور کو؟"

میں نے کہا "ہم تو براتی ہوں گے۔ عین وقت پر کالیا قرض کی رقم دلاور کے منہ پر مارے گا اور کہے گا کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ اب وہ تین جیالے صحافی ہوں جو براتی کے بھیس میں اندر پہنچ جائیں۔"

"دلاور کہاں گھسنے دے گا انہیں۔"

"وہ سب طے ہے۔ جب لڑکی کے چاچے ماسے ہوں گے سب۔ تو بھی تمہارے ساتھ ہو وہ پہلے تو کیمرا چھپا کے لائے۔ پھر عین وقت پر تصویریں اتارے۔ جب اپنے چوہدری دلاور سہرا باندھے نمودار ہوں۔ وہ چونکے کہ وہ دوڑے بغیر اس سے کھٹا کھٹ سوال کریں اور ہر حالات کے لیے تیار رہیں۔ ہم تو خیر شیر کی ماند میں جا رہے ہیں۔ اگر نازو بھی ثواب دارین کے لیے اس کار خیر میں شریک ہونا چاہے تو اس کی مرضی۔"

"تم ہو کہاں۔ اس مسئلے پر مزید تفصیلی گفتگو ضروری ہے۔"

میں نے کہا "میں بتا دیتا ہوں لیکن غالب۔ بات اخبار کی ہے۔ اگر رازداری میں فرق آیا تو آئندہ میں رابطہ نہیں کروں گا خواہ کچھ بھی ہو جائے۔"

"یار خوامخواہ مت۔ مشکل دور میں اکیلا آؤں گا۔"

"کوئی سن تو نہیں رہا ہے؟"

"میں سن رہا ہوں۔ ممکن ہے آپ کا فون بھی سن رہا ہو۔ یہ سن رہی ہو۔"

میں نے اسے بتا سمجھایا اور وہ صبح ہونے جاگنے سے پہلے ہی پہنچ گیا۔ میں نے دوپہر ہی [illegible] اسے جاننے [illegible] پر [illegible] اور کالیا سے پہلے ہی اتفاق ہو چکا تھا۔

"براتیوں نے [illegible] کا [illegible] ہیں" میں نے کہا۔

"وصول ہے کیا [illegible] اس لیے مسلح محافظوں سے کیسے تمہیں گے وہ سب کو اندر ہی مارنے کا ارادہ کر لیں گے۔"

"ہم جو زیادہ خون کے نہیں جا رہے ہیں۔ سب مسلح ہوں گے۔ سب کا مطلب ہے میں اور تم، رابعہ اور نازو۔ اور یہ تمہارے صحافی برادری کے جیالے آئیں گے کیا وہ اپنی حفاظت کا بندوبست کر کے نہیں آئیں گے۔ کسی کو بتا دیں کہ ہم فلاں جگہ جا رہے ہیں۔ رات تک واپس نہ آئیں تو پولیس کے ساتھ پہنچ جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ سب تو میں کرلوں گا۔ دلاور [illegible] کیسے ہے؟"

"ایک ہی تانگے میں" میں نے کہا۔

"وقار کی گاڑی کیا بیچ کھائی؟"

"ضرورت پڑے گی تو بیچ بھی دیں گے۔ ابھی تو [illegible] ہے۔"

"کیا دلاور تمہیں پہچانے گا نہیں؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" میں نے کہا "میں [illegible] تیار ہوں۔"

"بیٹے سو جائیں مرے ہوں گے تو دلاور [illegible] کی ذکر ایکس رے کر لیتی ہے۔ تم شرط ہار جاؤ گے۔"

"اگر اس نے مجھے پہچان لیا تو میں تین بار [illegible] قوال کے کپڑوں کا گدھا ہوں" میں نے کہا "وقار [illegible]"

"یہ کیا شرط ہوئی۔"

"بیچنے والا یہ مطالبہ کہیں بھی کر سکتا ہے۔ [illegible] شادی کی تقریب میں جہاں سیکڑوں معزز مہمان ہوں۔ [illegible] کسی فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ میں ڈنر کرتے ہوئے اور [illegible] کسی مجمع عام میں مثلاً محفل موسیقی میں یا سینما میں۔"

غالب نے ہنس کے ہاتھ ملایا "پھر منظور ہے۔ ہر موقع پر [illegible] والا یہ اعلان تین بار کرے گا۔"

"اب آپ تشریف لے جائیں" میں نے کہا "وقار [illegible] اس کی دولہن کو شک نہ ہو۔ نہ منظر کو پتا چلے اور نہ محسن یا [illegible]"

غالب نے سر ہلایا "فوزیہ کو کچھ مشکل ہی ہے۔"

میں نے کہا "کل ہم دلاور کے سامنے تو [illegible] کے۔"

"تمہی مسٹر [illegible] کو" غالب نے کہا "اگر [illegible] سے بہت محبت ہے؟"

"سوال محبت کا نہیں۔ اہمیت کا ہے۔ ساری [illegible] طرف آ جو ہو کا بھائی ایک طرف۔ دلاور کی مسلح [illegible] قیامت ڈھا دے گی۔ باقی معاملات میں سنبھال لوں گا۔ [illegible] ممکن ہے کہ وہ کچھ دن کے لیے روپوش ہو جائیں [illegible] جائیں اکرام شیخ کے پاس۔ فوزیہ کو اور اس کے شوہر کو [illegible] لے جائیں تو اور اچھا ہے۔"

"اگر اپنی کیوں؟"

"اس لیے کہ شاید میں بھی [illegible] جاؤں۔" [illegible]

"اچانک مجھے اپنے چوہدری دلاور صاحب کی [illegible] کا [illegible] مجبور کر رہا ہے۔"

وہ [illegible] اور [illegible] میں نے اسے کاؤں میں [illegible] [illegible] سنایا۔ وہ بہت ہنسا۔ اس نے ناشتا [illegible] اور پھر رخصت ہو گیا۔ وہ صبح صبح گھر سے نکل [illegible]

بھی گھر سے بھاگ گیا۔ تم نے ریت جو ڈال دی ہے۔"

[illegible] "یار وہ جیلی کے کیس کا کیا بنا؟"

[illegible] چلا گیا۔ اب معاملہ برٹش کونصلیٹ اور وزارت [illegible] درمیان ہے۔ دلاور کے ہاتھوں کے توڑ الو اڑتے ہوئے [illegible] اس کے فرشتے بھی کوچ کر گئے۔ اس نے اپنے [illegible] رکھے ہیں کہ قبر کا پتا چلا دے۔ میں نے اپنا جاسوسی نظام [illegible] ہے جو مجھے اس کی ناکامی اور پریشانی کی خبریں دیتا رہتا [illegible]

[illegible] "اس کالے کی حفاظت ضروری ہے جو دلاور کے [illegible] قتل کے الزام کا عینی گواہ ہے اور اس کے جرم کی سزا کاٹ [illegible]

[illegible] کیس کی ایک نقل برطانیہ میں کاؤنٹی جیل کے حکام کو [illegible] ہے کہ اس قیدی کی حفاظت کی جائے۔ وہ دوہرے قتل کے [illegible] الزام میں سزا کاٹ رہا ہے۔ اب اصل قاتل کے بے نقاب [illegible] مطلوب ہے تو ممکن ہے کوئی عینی گواہ کو ختم کرنے کی کوشش [illegible]

[illegible] کیا کام کیا ہے تم لوگوں نے۔ دلاور اس بار پھنس [illegible] نے کہا "یہاں بھی دو افراد کی حفاظت ہونی چاہیے۔ [illegible] دائم رکی [illegible] کی لاش لایا تھا اور جس نے لاش [illegible] دوسرے اس خبیث پوتے کی جس نے دادی کی لاش دے [illegible] قن [illegible] تھی۔ دلاور کے لیے ان کو مروانا مشکل [illegible]"

[illegible] آئی جی کو مطلع تو کر دیا ہے مگر ہمارے ملک میں [illegible] خطرے کی صورت میں کچھ نہیں کرتی۔ ان کا تو اصول [illegible] قتل ہو جائے تو پھر کریں گے تفتیش۔ ایسے کسی کے خطرہ [illegible] بے کچھ نہیں ہوتا۔ ہر بندے کے ساتھ گارڈ تو لگائی [illegible]"

"اس کا مطلب ہے وہ مارے جائیں گے" میں نے مایوسی [illegible] کہا۔

[illegible] دلاور کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اور قانون بہت کمزور [illegible] ہیں" غالب نے ہاتھ پھیلا کے کہا۔

[illegible] چلا گیا اور پھر ایک بجے نازو کے ساتھ آیا۔ مجھے فکر سے [illegible] دھونے کا راز ختم ہوا تو میں نے کہا کہ وقت کم ہے۔ [illegible] جات روانہ کہاں سے ہوئی۔ غالب نے اپنے ایک صحافی [illegible] سارا انتظام کیا تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کے وہاں [illegible] اس کے گھر پہنچ گئے۔ وہ غیر شادی شدہ تھا اور اکیلا ہی [illegible]

[illegible] نازی ہے فی الحال۔ بہت جلد شہید ملائے گا۔" غالب [illegible] ہوئے کہا "اس کے کرتوت ایسے ہی ہیں۔"

[illegible] راقم ناڑی تھا۔ میں نے کہا" غالب نے سب بتایا

ہے آپ کو۔۔ کہ معاملہ کیا ہے؟"

وہ چھ فٹ چار انچ قد کا کیم شحیم آدمی تھا "ہاں ہم تو آپ کے بارے میں بھی سب جانتے ہیں۔ آپ فکر ہی نہ کرو۔ آج ونکا بجا دیں گے۔"

ونکا بجا دیں گے اس کا تکیہ کلام تھا۔ وہ ایک مشہور انگریزی اخبار کا چیف رپورٹر تھا اور سنسنی خیز انکشافات کے چکر میں کئی بار پٹ چکا تھا۔ اغوا ہو چکا تھا مگر وہ صحافت کو جہاد سمجھتا تھا۔ وہ بلیک میلنگ کرتا تو اسی سے لاکھوں وصول کر لیتا جن کے چہرے وہ بے نقاب کر چکا تھا مگر وہ انتہائی فضول قسم کے کباڑ خانے میں اکیلا رہتا تھا اور اس کا سو روپے ماہانہ کرایہ دیتا تھا۔

"صرف سو روپے" میں نے حیرانی سے کہا۔

"دراصل یہ رعایت صرف مجھے حاصل ہے" وہ بولا "ایک تو میں نے وعدہ کر رکھا ہے کہ مالک مکان کو کبھی پریشان نہیں کروں گا۔ خصوصاً کرائے کے معاملے میں۔ دوسرے میں اس کے کسی کرائے دار کو تھانہ کچہری نہیں کرنے دوں گا۔ اس کے بہت سے مکان ہیں جو کرائے پر اٹھے ہوئے ہیں۔ سب وقت پر کرایہ دیتے ہیں اور نوٹس ملتے ہی خالی کر جاتے ہیں۔ راتوں رات پولیس میرے کہنے پر انہیں دور چھوڑ آتی ہے۔ اس مشورے کے ساتھ کہ اب کیس کر کے اپنا خانہ خراب مت کرنا۔"

"یعنی تم بدمعاشی سے مکان خالی کراتے ہو۔"

"شرافت کا زمانہ کہاں ہے بھائی۔ لوگ مالک مکان کو سالوں کھینچتے ہیں عدالتوں میں۔ قانون کس کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ ہمیشہ شریف اور غریب آدمی مارا جاتا ہے۔" ناڑی نے کہا۔

ناڑی نے ایک میک اپ مین کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ جب ہم سب دیہاتی شعبدہ ناخدا بن چکے تو اس نے اپنا کام شروع کیا۔ رابعہ اور نازو نے تو گھونگھٹ نکال لیے۔ خود ناڑی اور غالب نے عام قسم کی ڈاڑھی مونچھ کو کافی سمجھا مگر میری باری آئی تو میک اپ مین کو خاصی محنت کرنی پڑی۔ میں ساٹھ ستر سال کا سفید ڈاڑھی، سفید بالوں اور بھنووں والا بابا نظر آنا چاہتا تھا۔ یہ کام اس کے لیے چیلنج بن گیا تھا تو میرے لیے بھی۔ غالب نے متعدد بار اصرار کیا کہ بھئی اب بس کرو۔ دیر ہو رہی ہے مگر میں اطمینان سے خامیاں دور کراتا رہا۔ اگر دلاور مجھے پہچان جاتا تو فوری طور پر وہاں جو بھی ہوتا اس سے نمٹنے والے ہم سب تھے مگر بعد میں شرط ہارنے کی پاداش میں مجھے نہ جانے کہاں اور کس کس موقعے پر تین بار کھڑے ہو کے اعلان عام کرنا پڑتا کہ حضرات و خواتین۔

گو میں تمہیں بیٹا دو پیروں پر کھڑا ہوں
انسان نظر آتا ہوں لیکن میں گدھا ہوں

جب میں مطمئن ہو گیا تو ناڑی نے میرا یوں معائنہ کیا جیسے خریدار قربانی کے بکرے کو دیکھتے ہیں "ویسے تو سب ٹھیک ہے [illegible]

www.paksociety.com

جوانی تمہاری آنکھوں سے جھانکتی ہے بلکہ پکارتی ہے۔"

میں نے کہا "کیا کروں آخر میں اس جوانی دیوانی کا۔"

"تم کول شیشوں والا سیکنڈ ہینڈ چشمہ پہن لو۔ راستے میں کہیں سے خرید لیں گے۔"

"غازی! تم ہم پیشہ ہو کے مجھ سے دغا کر رہے ہو" غالب نے آہ بھری "اگر میں شرط ہار گیا تو سوچو تمہاری کتنی بے عزتی ہو گی۔"

"میری کیوں بھائی....؟"

"اس لیے کہ تم بھی صحافی ہو۔ جب ایک صحافی چلا چلا کے کالم میں لکھتا ہوں تو سننے والے کیا نتیجہ اخذ کریں گے۔"

"سننے والوں میں نو بے وقوف ہوں گے۔ ان کی مجھے یا تمہیں پروا نہیں کرنی چاہیے۔ دسواں عقل مند ہو گا۔ وہ تمہاری بات سے متاثر نہیں ہو گا۔"

"یہی تو تم نہیں سمجھتے۔ وہ دسواں آدمی میں خود ہوں تو باقی نو میں تم جیسے شامل ہوں گے۔" غالب نے آہ بھری۔

ہم ایک بجے دو گاڑیوں میں لد کے روانہ ہوئے۔ پہلی گاڑی میں پیچھے خواتین یعنی رابعہ اور نازو تھیں۔ آگے ان کا دولہا نظر آنے والا خاکسار ڈھول سمیت تشریف فرما تھا۔ ہمارے دیہاتی لباس کے اندر ریوالور تھے اور یہ بارات "ٹروجن ہارس" (TROJEN HORSE) کی طرح تھی۔

تاریخ میں ٹروجن ہارس بہت مشہور ہے۔ یونان کی دو ریاستوں کے درمیان جنگ میں محاصرہ طول کھینچ گیا تو ایک عقل مند نے یہ مشورہ دیا تھا کہ لکڑی کا ایک دیو ہیکل گھوڑا بنایا جائے جس کے پیٹ میں پچاس سپاہی بیٹھ جائیں اور اس کی ٹانگوں میں چھپے ہوں۔ جب گھوڑا تیار ہو گیا تو فوج نے محاصرہ اٹھا لیا۔ شہر والے بہت خوش ہوئے کہ راتوں رات دشمن بھاگ گیا۔ وہ فتح کا جشن مناتے ہوئے گھوڑے کو شہر میں کھینچ لائے اور جلوس کی شکل میں لیے پھرے۔ رات ہوئی تو گھوڑے کے اندر سے پچاس سپاہی نکل آئے۔ انہوں نے پہرے داروں کو قتل کیا اور شہر پناہ کے دروازے کھول دیے۔ ان کی اپنی فوج رات کو لوٹ آئی اور سیدھی شہر میں داخل ہو گئی۔

ہم بھی اسی طرح دلاور کے قلعے میں داخل ہوئے جہاں حفاظتی انتظام اتنا سخت تھا کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ وہ خود ہمیں بڑی عزت احترام کے ساتھ اندر لے گیا۔ حسب توقع ساڑھے تین بجے کالیا منہ لٹکائے رونی صورت بنائے گیٹ پر موجود تھا۔ نیلی پگڑی دیکھتے ہی اس نے دلاور کے ساتھ آگے بڑھ کے ہمارا استقبال کیا۔

میں نے کالیا کو گلے لگا لیا۔ "یہ کیا ہے چڑے۔ ایسے ٹھاٹ شادی..."

اس نے مؤدب ہو کے کہا "دادا جی۔ مجبوری تھی۔ اور پھر اچھا رشتہ روز کہاں ملتا ہے۔ یہ اپنے چوہدری صاحب بڑے چنگے آدمی ہیں۔"

دلاور نے کہا "سلام بابا جی۔"

میں نے کہا "کیا کرتا ہے اچھا دلاور..."

کالیا نے میرے کان میں چلا کے کہا "بہت بڑا آدمی [illegible] گا۔"

میں نے آواز بدلنے کے ساتھ ہاتھوں میں تھوڑا سا رعشہ پیدا کر لیا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے دلاور کو ٹٹول کے اپنا اطمینان کر لیا کہ اس کے پاس کوئی ریوالور نہیں [illegible] دولہا بنا ہوا تھا۔ گورے لٹھے کی شلوار کے ساتھ [illegible] شیروانی پہنی تھی اور قراقلی ٹوپی۔ اس کے گلے میں ہار بھی تھے۔

کالیا نے حاضر دماغی سے کام لیا "یہ میرے بابا جی [illegible]" نے غالب کو چوہدری دلاور سے ملوایا اور غالب نے بھی اس کے ساتھ ماسے جیسا سلوک کیا اور اسے جپھی ڈال کے خوب [illegible] بھی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ اندر کوئی ریوالور جیسی چیز تو نہیں۔ غازی کو چاچا قرار دیا گیا۔ وہ یتیم تھا اور اس [illegible] محبت میں دلاور کو اپنا چھوڑا کہ برداشت کرنے کے [illegible] نکل گئی۔ رابعہ اور نازو نے ماسی اور چاچی کا منصب [illegible] ہوئے دولہا کو دعائیں دیں۔

"چلیں جی اندر چلیں" دلاور نے گھڑی دیکھ کے کہا۔

میں نے کہا "اوئے ابھی ٹھہر چڑے۔ یہ [illegible] ہے کہ خاموشی سے سب ہو جائے۔"

چاچا یعنی غازی نے کہا "ابا جی خود ڈھول بجائیں گے [illegible] بہت عرصے بعد..."

غالب بولا "ہاں جی۔ ہمارا تو یہ پیشہ ہے۔"

"تم... تم لوگ میراثی ہو..." دلاور کا موڈ خراب ہو گیا۔

"آہو چڑے" میں نے ڈھول گلے میں لٹکا کے کہا "اپنے [illegible] دادا بھی بینڈ بجاتے تھے گوروں کی پلٹن میں۔ چلو بھی [illegible] شادیانے۔"

ایک سیدھی پتلی چھڑی اور دوسری قدرے خم دار [illegible] جیسی لکڑی سے میں نے ڈھول کی پنجابی شہرت کی [illegible] ہوئی مگر غازی نے بات بنائی کہ ابا جی کے ہاتھ [illegible] پھر میں نے اکھاڑوں کی مخصوص تال پہ ڈھول بجانا [illegible] تک تک دھن نا۔ غالب اور غازی نے منہ پر ہاتھ [illegible] "بلے... بلے... بابا" کی آوازیں نکالیں اور پھر ہاتھ اٹھائے [illegible] ہوئے اندر چل پڑے۔

دلاور اس ہنگامہ آرائی سے بہت پریشان نظر آ [illegible] ادھر ادھر کے بہت سے لوگ تماشا دیکھنے کے لیے رک گئے [illegible] ڈھول کی آواز سن کے عورتیں اور بچے چھت پر [illegible] اس کا خیال تھا کہ سارا کام خاموشی سے ہو جائے [illegible] نہیں چلے گا اور نکاح کا ڈراما ختم ہو جائے گا۔

اس نے کالیا سے کہا "تم نے پہلے نہیں بتایا تھا کہ [illegible]

[illegible] ساتھ ہو گا۔"

[illegible] چوہدری صاحب! آخر جنج ہے" وہ بولا "اور اپنے دارا [illegible] کی حالت ہے۔"

[illegible] تعمیر شدہ تھی اور اس کی آٹھ فٹ بلند دیواروں پر [illegible] کے نوکیلے ٹکڑے جڑ دیے گئے تھے۔ گیٹ پر کوئی [illegible] نہیں تھا مگر اندر مجھے استاد پیڈرو کے علاوہ تین افراد [illegible] صورت سے ہی شکاری کتے لگتے تھے اور تھوتھنی [illegible] دیکھ رہے تھے جیسے خطرے کی بو سونگھنے کی کوشش [illegible]

[illegible] کو ایک وسیع ہال جیسے ڈرائنگ روم میں لے جایا گیا۔ [illegible] کی تزئین و آرائش کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ نئی کوٹھی [illegible] کے پرانے گھر کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع، خوب [illegible] شکوہ تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس نے اپنی نئی بیوی کو بھی [illegible] رکھنے کے لیے یہ کوٹھی بنوائی ہو۔ ابھی کھڑکیوں پر پردے [illegible] اور فرش پر صرف قالین نظر آ رہا تھا۔ ایک دیوار کے [illegible] تخت جیسا تخت لگوا دیا گیا تھا جس پر ایک دبلا پتلا چھنگی داڑھی [illegible] مریل نظر آنے والا مولوی رکھا ہوا تھا۔

[illegible] کے دلاور اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں بڑے زور [illegible] ڈھول کوٹتا رہا۔ ہال میں اس کی گونج کان کے پردے پھاڑ [illegible] تھی مگر میں کسی خبطی بڈھے کی طرح اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ [illegible] اپنی خوشی کو چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔ دلاور نے مجھے نہیں [illegible] اور غالب کی صورت پر شرط ہار جانے کے خیال سے بارہ [illegible] تھے۔

[illegible] غازی نے چلا کے کہا "بس کرو ابا جی۔"

میں نے کہا "کیوں بس کروں۔ تو کون ہوتا ہے مجھے بس کرانے [illegible]"

[illegible] نے کہا "اب نکاح کے وقت تو ڈھول نہیں بجتا نا۔"

میں نے ہاتھ روک لیا "نکاح ہو رہا ہے... اچھا اچھا... کون [illegible] گا۔"

"یہ مولوی صاحب بیٹھے ہیں" غالب نے کہا۔

[illegible] نے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے غور سے دیکھا "یہ... یہ تو منڈا [illegible] داڑھی کا۔"

غازی نے کہا "ابا جی۔ داڑھی ہے ذرا چھوٹی ہے۔"

بنگالی مولوی نے بڑبڑ ہو کے کہا "ہم مدرسہ خوشنما العلوم [illegible] سے فارغ التحصیل ہیں۔"

"[illegible] کی تحصیل کا ہے۔ اور گنجا کس کو کہا ہے تو نے کاکا۔"

غازی نے مجھے پکڑ کے بٹھا دیا "ابا جی۔ آپ نہ سمجھے ہو [illegible]"

[illegible] اور نازو کو اندر دلہن کے پاس پہنچا دیا گیا تھا۔ استاد پیڈرو [illegible] کو نکاح کا گواہ مقرر کیا گیا۔ غالب اور غازی بحیثیت ماما اور چاچا دلہن کے وکیل بنے اور دلاور نے مولوی کو اشارہ کیا کہ وہ نکاح پڑھائے۔ نکاح کے دونوں گواہ چوہدری دلاور کے ساتھ کھڑے تھے۔ میں ان کے قریب ہی ڈھول اپنے سامنے رکھ کے بیٹھ گیا۔ کالیا میرے ساتھ تھا اور اس کے بعد غالب اور غازی۔

میں نے دلاور کی نظر بچا کے بیس ہزار کے نوٹوں کی گڈی کالیا کو پکڑا دی تھی۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا "ٹھہرو مولوی صاحب۔"

دلاور نے اسے گھور کے دیکھا "اب کیا ہے؟"

"میری کچھ شرائط ہیں" کالیا نے بڑے اعتماد لہجے میں کہا۔

"شرائط۔ تیرا دماغ تو ٹھیک ہے کالیا" پیڈرو نے غرا کے کہا۔

غازی نے کہا "اوئے جوان گری مت دکھا۔ بیٹی دے رہے ہیں ہم کوئی مخول نہیں کر رہے ہیں۔"

غالب نے بھی سمجھایا "یہ بات تو بڑوں کے سامنے ہی ہوتی ہے۔ بول پتر۔"

کالیا نے کہا "حق مہر ہو گا ایک لاکھ۔"

دلاور نے مشتعل ہو کے کہا "ایک لاکھ..... تیری تو..."

کالیا نرم رہا "گالی مت دیں چوہدری صاحب۔ شادی کے بعد ہم اور آپ برابر ہو جائیں گے۔"

غازی نے سمجھایا "سالا تے جنوئی۔"

کالیا بولا "یہ کوٹھی میری بہن کے نام لکھی جائے گی۔"

اب پیڈرو نے اسے ماں کی گالی دی "..... میراثی کی اولاد۔"

غازی کھڑا ہو گیا "اوئے اتنی بے عزتی ہم برداشت نہیں کرتے۔ کون ہے تو۔ ادھر آ تو ذرا۔"

دلاور نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی "ٹھہرو۔ یہ کیسا تماشا ہے کالیا۔ پیڈرو تم اپنی بکواس بند کرو۔"

"میری تیسری شرط ہے..... پکی رسید کہ اب مجھ پر کوئی قرضہ باقی نہیں رہا۔ پرانی رسید کی واپسی۔"

دلاور نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا "تیری صرف ایک شرط منظور کی جا سکتی ہے۔ یہ لے اپنی پرانی رسید" اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کے پھینکا۔

غازی نے یہ کاغذ اچک لیا "اس پر لکھ دیں کہ بقایا کچھ نہیں۔ ابھی..."

دلاور نے غصے میں قلم نکالا اور رسید پر لکھ دیا کہ قرض کی ساری رقم وصول پائی "تیری باقی دو شرطیں فضول ہیں۔ تو جانتا ہے کوٹھی کرائے کی ہے..."

کالیا نے کہا "پھر جناب یہ لیں اپنے بیس ہزار۔ مجھے یہ نکاح منظور نہیں۔"

ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے دلاور کو ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔ وہ کبھی بیس ہزار کے نوٹوں کو دیکھتا تھا تو کبھی کالیا کو۔ یہی حالت اس کے حواریوں کی تھی۔

"تو یہ بات تھی۔ اس لیے کتے کی طرح بھونک رہا تھا تو..."

www.paksociety.com

ایک دم طیش میں آگیا "شرم نہیں آتا رہا تھا... کس سے بھیک مانگی ہے تو نے؟"

اسی وقت ایک عجیب وغریب کردار اندر آگیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ ٹیکا گنڈی کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہ جوان آدمی تھا مگر اسے نشے کی لت نے تباہ کردیا تھا۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے تھے اور آنکھوں کے گرد گہرے حلقے تھے۔ اس کے کپڑے بھی میلے تھے۔

اس نے کہا "او بھائیا جی۔ یہ کیا شور شرابا ہے؟"

"مجھے تو تُو نے کہا تھا کہ سب ٹھیک ہوگیا ہے" دلاور نے اپنے سالے کو مخاطب کیا "پھر یہ کیا ہے؟"

"کیا ہے بھائیا جی۔ کچھ بھی تو نہیں ہے۔ میں نے تو پکی بات کرلی تھی کالیا سے۔ اور اندر اس کی بہن بھی راضی خوشی بیٹھی ہے۔"

"مگر یہ... تو شرم میں لگا رہا ہے۔ یہ دیکھ... اس نے بیس ہزار میرے منہ پر ماردیے ہیں۔" دلاور بگڑ گیا "رسید بھی لے لی ہے مجھ سے۔"

"رسید دے دی ہے آپ نے بھائیا جی یہ تو بڑی غلطی کی آپ نے" ٹیکا گنڈی بولا۔ "ضرور یہ کہیں سے چرا کے لایا ہوگا۔"

"اب یہ نکاح سے انکار کررہا ہے۔"

اب غازی نے اپنی اصلی آواز میں کہا "چوہدری دلاور صاحب۔ آپ جیسی حیثیت کے شخص کو یہ شرائط ماننی چاہئیں۔ ایک لاکھ نقد اور یہ کوٹھی نہ سہی کوئی مکان تو۔"

دلاور اُچھل پڑا "تم... کون ہو تم؟"

"میں جناب غازی بن شہید۔ آپ نے میرا نام تو ضرور سُنا ہوگا" غازی نے اپنے انگریزی اخبار کا نام بتا کے کہا۔

"تم کیسے اندر آئے" دلاور چیخ کے بولا۔

"ہم لوگ ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں چوہدری صاحب" اب غالب نے بھی اصلی آواز میں کہا "ہمیں پتا چلا تھا کہ آپ عقدِ ثانی فرمارہے ہیں۔ اپنی پہلی بیوی سے اجازت لیے بغیر۔"

صدمے سے دلاور کی حالت غیر ہوگئی "تم... تم نے چلایا ہے یہ چکر۔"

"چکر تو آپ نے چلایا تھا چوہدری صاحب۔ بہت پہلے" غازی نے بے خوفی سے کہا "اس کا ثبوت میری جیب میں ہے۔ مجھے کالیا نے سب بتادیا ہے۔"

پیڈرو نے اسے ایک سانس میں بہت سی غلیظ گالیاں دیں۔ "اس سے تو میں بعد میں نمٹ لوں گا۔ پہلے تیری صحافت کی..."

"پیڈرو۔ یہاں ہونے والی گفتگو کا ہر لفظ ریکارڈ ہوا ہے لیکن میرے پاس ایک مائیکروفون کے سوا کچھ نہیں ملے گا تمہیں" غازی نے پیچھے ہٹ کے کہا "ہم کچا کام نہیں کرتے۔"

دلاور نے پیڈرو کو روک دیا "تم دھوکے سے اندر آئے ہو۔"

"جی نہیں۔ آپ خود میرے استقبال کے لیے موجود تھے۔"

"مگر تم نے جعلسازی کی۔ براتی کا بھیس بدلا۔"

غازی مسکرایا "بھیس تو پولیس بھی بدلتی ہے۔ براتی بھی بدلتے ہیں۔ یہ جعلسازی نہیں ہوشیاری کہلاتی ہے۔"

غالب نے کہا "ہم اپنے اخبار کے لوگوں کو بتاکے تھے اور پولیس کو اطلاع دے کر آئے تھے کہ ہم کہاں جارہے ہیں۔"

دلاور کی حالت غیر ہورہی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ سب غالب کا چلایا ہوا ہے اور کالیا نے اسے دھوکا دے کر اس میں خنجر گھونپا ہے۔ وہ اخبار والوں کے پاس پہنچ گیا تو اخبار والوں میں اس کا ایک دشمن بھی تھا جس نے سازش کا جال پھیلاکے اسے شکار کرلیا۔ وہ کالیا کو قرض کی اصل رسید بھی واپس کرچکا تھا اور یہ تحریر بھی دے چکا تھا کہ اس پر کچھ بھی واجب نہیں۔ تاہم ابھی تک اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "اوئے یہ کیا ڈراما ہے۔ مجھ غریب آدمی کو کیوں مروادیا۔"

غازی نے کہا "بابا" ڈرو نہیں۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

غالب بولا "تمہیں پیسے بھی مل جائیں گے۔"

میں نے کانپتے ہوئے کہا "اوئے مجھے جانے دو رب کے لیے۔ مجھے کیا معلوم تھا... ہائے او ربا۔"

دلاور نے اپنے سالے سے مخاطب ہوکے کہا "اندر جاکے دیکھ وہ عورتیں کون ہیں۔ اُلو کے پٹھے۔"

ٹیکے کی حالت اپنے بھائیا جی سے بھی زیادہ خراب تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ دلاور تو مجھے مار ڈالے گی۔ میں نے اسے بڑے بہانے سے بھیجا تھا۔

"ہم جیسے بے غیرت بھائیوں کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔" غازی نے کہا "اب تو یہ کہانی اخبار میں چھپے گی۔ تصویروں کے ساتھ" غالب نے کہا۔

دلاور نے محسوس کیا کہ اس کا سیاسی مستقبل ہی نہیں ازدواجی مستقبل بھی داؤ پر لگا ہوا ہے۔ اس گفتگو کے ریکارڈ ہونے والی بات غلط بھی ہو مگر اس تقریب سعید کی تصویریں اتاری جاچکی تھیں۔

رابعہ اور نازو سید ھی اس کمرے میں چلی گئی تھیں جو ڈرائنگ روم سے متصل تھا۔ یہ دلہن کا کمرا تھا جو لال کپڑوں میں سمٹی بیٹھی تھی۔ وہاں ان تینوں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ خصوصی کیمرا غازی نے فراہم کیا تھا اور غالب نے اس کے استعمال کا طریقہ سمجھنے کے بعد نازو کو سمجھادیا تھا۔ پہلے ایک کھڑکی کے شفاف شیشے کے پیچھے سے اور پھر ایک دروازے کی جھری سے دلاور کو اس وقت فوکس کیا گیا تھا جب وہ باندھے نکاح خواں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے اور ٹیکا گنڈی بھی موجود تھے۔ کھڑکی کے سامنے قادر جھری کے پیچھے سے نازو کو نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ یہ خصوصی کیمرے میں رات کے وقت نظر نہ آنے والی (INFRA-RED) شعاعوں سے بھی تصویر اتاری جاسکتی تھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔ غازی نے اس میں بہت زیادہ حساس یعنی ہائی اسپیڈ فلم ڈال رکھی تھی اور یہ بتادیا تھا کہ عام دن کی طرح صاف آئے گی۔ روشنی کم ہو تو شٹر کی رفتار بھی کم کردی جائے۔ نازو نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے کیمرے کا صحیح استعمال کیا تھا اور بہت کارآمد تصویریں بنائی تھیں۔

دلاور کے سالے رفیق عرف ٹیکا گنڈی نے اندر جاتے ہی چلانا شروع کردیا "او بھائیا جی۔ او نے نس گئی۔ کوئی بھی نہیں ہے اندر۔"

انتہائی بدحواسی میں اندر گیا "کیا بکواس کرتا ہے۔"

"بکواس نہیں جی۔ دیکھ لو سارا کھیل ختم" ٹیکا بولا پھر اس کے رونے کی آواز آئی "مجھے کیوں مارتے ہو۔"

پیڈرو نے اسے گالی دی "باہر جاکے دیکھ... وہ دور نہیں گئی ہوں گی وہ ضرور اس... صحافی کی ماں نازو ہوگی۔ اور اس کے ساتھ بولی اور کلی کی اولاد ہے۔"

دلاور ایک دم چونکا اور مجھے گھورنے لگا "بابا جی۔ تجھ سے ذرا توجہ ہٹی تو... ہم بھی دیکھیں صرف فکر آیا ہے کہ یہ سالار بھی..."

میں نے اپنی اداکاری جاری رکھی اور ہاتھ جوڑتا رہا "میری بچے بانے دو۔ مجھے کیا معلوم تھا سوہنے کی خاطر۔"

غازی نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا "چوہدری دلاور صاحب یہ آپ کی دوسری شادی ہوتی۔"

"کون... کررہا تھا شادی" دلاور نے سہرا اُتار کے پھینک دیا "یہ تو لڑکے نے خود اپنی بہن پیش کی تھی مجھے کہ میں بیس ہزار نہیں دے سکتا۔ شادی کرلو میری بہن سے۔"

"بیس ہزار میں لڑکی بُری نہیں تھی" غازی نے کہا "کیا آپ نے اپنی بیوی کو اور اہلِ خانہ کو اس شادی کی اطلاع نہیں دی تھی۔ یہ شادی کہاں ہورہی تھی؟"

"بکواس بند کرو۔ میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ یہ پریس کانفرنس نہیں ہے" دلاور نے چیخ کے کہا۔

پیڈرو غصے میں بگولے کی طرح اندر آیا "چوہدری صاحب! لڑکی کو لے گئیں۔ رابعہ اور نازو۔"

دلاور نے کہا "وہ رابعہ کا یار..."

پیڈرو نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا "یہ بڈھا ہے؟"

دلاور نے غصے میں سرہلایا "اسے یہ لوگ سو روپے میں پکڑلائے تھے وہ باہر ہوگا۔ وہی لے گیا ہوگا انہیں۔"

"میں دیکھتا ہوں چوہدری صاحب" پیڈرو باہر بھاگا۔

"ان صحافیوں سے تو میں نمٹ لوں گا" چوہدری دلاور نے کہا "چلو اوئے تم دونوں۔ دروازے بند کردو سارے۔"

میں نے زاروقطار رونا شروع کیا "اوجی مجھے تو جانے دو۔"

میری بوڑھوں کی طرح کانپتی آواز اور لرزتے بدن نے دلاور کو شک نہیں ہونے دیا۔ اس نے میرا ڈھول اُٹھاکے باہر پھینکا۔ پھر مجھے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ میں ایسے لڑکھڑاتا ہوا گیا جیسے کوئی بھی ضعیف شخص جاسکتا تھا۔ اس نے مجھے ایک لات ماری۔ میں فرش پر گرا اور ہائے ہائے کرنے لگا۔ "ہائے میں مرگیا یا رب جی۔"

دلاور نے کہا "دفع ہوجا او مرے... ویسے ہی مرنے کے قریب ہے۔ میرے حصے لگے گا۔"

کمرے کے اندر سے میں نے غالب اور غازی کی آواز سنی "خبردار۔"

دلاور پھر اندر چلا گیا "تم اسلحہ لے کر آئے تھے میرے گھر میں؟"

غالب بولا "ہاں" اپنی حفاظت کے لیے یہ ضروری تھا۔ اب ہم جارہے ہیں۔"

غازی نے کہا "کسی نے راستہ روکا ہمارا تو مارا جائے گا۔"

دلاور نے ایک دم پینترا بدل لیا "آپ غازی شہید صاحب۔"

"غازی بن شہید" اس نے تصحیح کی۔

"چلو بھئی غازی بن شہید صاحب۔ اپنے غالب صاحب کی طرح آپ بھی بہت مشہور صحافی ہو" دلاور نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "کالیا جیسے دو ٹکے کے لوگوں کا تو کام یہی ہے ہم جیسے عزت داروں کو بلیک میل کرنا۔"

"آپ کالیا کی بہن سے شادی کرنے والے تھے" غازی نے اسے ٹوکا۔

غالب نے کہا "اس دو ٹکے کے آدمی کو اتنی عزت دے رہے تھے آپ۔"

"چلو چھوڑو جی۔ مٹی پاؤ" دلاور نے کہا "بات ختم ہوئی اور نہیں ہوئی تو آپس کی بات ہے۔ ختم ہوجانی چاہیے۔ میں یہ بیس ہزار بھی کالیا کو واپس کرتا ہوں۔ رسید بے شک آپ پھاڑ دیں۔"

میں برآمدے میں جہاں گرا تھا وہیں بیٹھا تھا اور میرے قریب ایک کھڑکی تھی جس میں سے اندر ہونے والی ساری گفتگو صاف سنائی دیتی تھی۔

"کالیا کی جان کی کیا ضمانت ہے؟" غالب نے کہا۔

www.paksociety.com

"آپ بتاؤ کیا ضمانت چاہیے۔ دیکھیں نا اب تو سارا قصہ ہی ختم ہو گیا۔ آپ اخبار والوں سے تو ہمیں بہت ڈر لگتا ہے جی۔"

"ہم سے صرف مجرم اور چور ڈرتے ہیں" غازی نے کہا "میں ان کی بات نہیں کر رہا ہوں جو پولیس سے ڈرتے ہیں۔ میں معزز اور بااختیار چوروں کی بات کر رہا تھا۔ آپ جیسے معاشرے کے مجرموں۔۔۔"

"آپ بیٹھو جناب۔ تسلی سے بات کرتے ہیں ہم۔ وہ جی کیا کہتے ہیں اسے۔ آف دی ریکارڈ۔ (OFF THE RECORD)

"چلیں ٹھیک ہے" غازی نے کہا "آف دی ریکارڈ بات کریں۔"

"پہلے آپ بتاؤ کہ یہ سب ریکارڈ تو نہیں ہو رہا ہے؟"

غالب ہنسا "اپنے چوہدری دلاور صاحب' ریکارڈ تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہمارے پاس کوئی مائکروفون نہیں تھا۔ آپ تلاشی لے سکتے ہیں ہماری" غازی نے کہا۔

"تم پھر بلف کر رہے ہو گے" دلاور نے بے یقینی سے کہا۔

"ہم قسم کھانے۔۔۔ کے لیے تیار ہیں" غالب نے کہا "کوئی مسلمان جھوٹی قسم نہیں کھاتا۔"

غازی بولا "ہم تو ایسے ہی دل لگی کے لیے آئے تھے۔ ہاں رقم ہم نے کالیا کو فراہم کی تھی۔ اس نے پریس کلب آ کے ساری بات سب کے سامنے بتا دی تھی۔"

"اس کی تو" دلاور کا حوصلہ ایک دم بڑھ گیا "مگر تم لوگ بھی کم حرامی نہیں ہو۔ تم صحافی نہیں بلیک میلر ہو۔ شوق سے چھاپو یہ خبر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تم۔ تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ میں تردید کر دوں گا۔"

غالب نے کہا "تردید کا مطلب پبلک آئیڈنٹی ہے۔ لیکن خبر کو ہم دبا بھی سکتے ہیں۔ ورنہ ہمارے پاس کالیا کے بیان کی تائید میں یہ رسید ہو گی۔ پھر اس کی بہن کا بیان بھی ہو گا۔ تصویریں ہوں گی۔ تم کس کس ثبوت کو جھٹلاؤ گے دلاور۔ بہتر ہے سودا کر لو۔ کالیا اور اس کی بہن ہمارے پاس ہیں۔"

"سودا؟" وہ چونکا "بولو کتنی رقم چاہیے۔ ایک لاکھ' دو لاکھ۔ پانچ لاکھ۔"

"بس؟" غازی نے کچھ دیر بعد کہا "تم تو خاصے امیر ہو چکے ہو دلاور۔ وطن فروشی کے کاروبار میں بہت مال اکٹھا کیا ہے تم نے۔"

"اب اپنے چوہدری صاحب محب وطن ہیں۔ اس قوم کے لیڈر بننا چاہتے ہیں" غالب نے طنز سے کہا۔

"ہاں۔ پیسہ بہت ہے میرے پاس اور تم جانتے ہو پیسے کی طاقت سے کیا ہو سکتا ہے۔ لیڈر بننا تو معمولی بات ہے۔ شیطان چاہے تو خود کو فرشتہ تسلیم کروا لے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم روک سکو گے۔ کوئی یقین نہیں کرے گا تم پر غالب صاحب۔ مجھے سچا کہنے والے ہوں گے' تم دیکھ لینا۔"

غالب نے کہا "تم سودا کر لیتے تو فائدے میں رہتے۔"

دلاور بھڑک اٹھا "کیسا سودا۔ بولو تم کیا کرو۔"

"اگر تم تیار ہو تو تمہیں سکندر سے بات کرنی ہو گی۔"

"سکندر سے؟" دلاور نے سوچ کے کہا "اس سے بات کر سکتا ہوں اپنے غالب صاحب۔ میں تو شروع سے کوشش کر رہا ہوں کہ وہ سمجھ جائے اور ضد چھوڑ دے۔ لیکن بات نہیں مانتا۔ میں نے اسے ہر پیشکش کی۔ اس نے ٹھکرا دیا۔ خیر۔ اب بھی میں تیار ہوں مگر وہ ہے کہاں؟"

"ہم اسے بلا لیں گے۔ جب ہمیں آپ کی ایک بات کا جواب مل جائے گا۔"

غازی نے کہا "اب وہ باتیں جو آف دی ریکارڈ ہیں۔"

"آف دی ریکارڈ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ شیلی کو لوگوں نے کہاں دفن کیا ہے؟" دلاور بولا۔

"یہ تو صرف سکندر جانتا ہے" غالب انجان بن گیا۔

"اگر وہ مجھے بتا دے کہ اس لاش۔۔۔"

"چوہدری صاحب۔ وہ غالباً آپ کی بہن تھی۔" غازی نے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے" دلاور نے کہا "اسے میرے خلاف کیا گیا ہے۔"

"پھر اس کی لاش کے لیے تم کیوں پریشان ہو؟"

دلاور نے غالب کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا "اگر شیلی کی قبر دکھا دے تو۔ میں بتا سکتا ہوں کہ اس کے باپ کو کہاں دفن کیا گیا تھا۔"

"یعنی تم اعتراف کرتے ہو۔۔۔؟"

"نہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا تھا" دلاور نے فوراً بات کاٹ دی۔

"پھر تمہیں کیسے معلوم ہے؟"

"یہ کام پیڈرو نے کیا تھا" چوہدری دلاور نے کہا "قاتل بھی وہی ہے۔ میر شرافت علی کو بھی اسی نے قتل کیا۔ اسی نے وزیر خان کی لاش پوسٹ مارٹم سے پہلے قبر سے نکالی تھی۔"

"کیا تم یہ پولیس کے سامنے کہہ سکتے ہو؟" غازی نے کہا۔

دلاور ہنسا "یہ باتیں آف دی ریکارڈ ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم پیڈرو کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم اس سے پوچھ لیں گے" غالب نے کہا۔

اسی وقت میں نے پیڈرو کو سخت پریشانی میں دیکھا۔ وہ رابعہ' نازو اور کالیا کی بہن کے پیچھے گیا تھا اور وہیں سے ہماری طرف آیا۔ میں کھڑکی سے کان لگائے اندر کی باتیں سن رہا تھا اور اس سے میری پوزیشن بہت مشکوک ہو گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب میرے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ پیڈرو کو پہلے ہی مجھ پر شک تھا۔ وہ ضرور مجھے پہچان جائے گا اور میں ابھی پہلی جیتی ہوئی شرط ہار جاؤں گا۔

اس سے پہلے کہ پیڈرو اپنے حلق سے کوئی آواز نکالتا میں نے پھرتی سے اٹھ کے اس کے ایک ہاتھ مارا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ خود کو بچا نہ سکا اور میرا وار اتنا موثر ثابت ہوا کہ پیڈرو کٹے ہوئے درخت کی طرح گرنے لگا۔

میں نے اسے سنبھال لیا اور آہستہ آہستہ کھینچ کے برآمدے کی اس کھڑکی سے دور لے گیا۔ میں نے پہلا کھلا دروازہ دیکھا تو پیڈرو کو اس میں ایک بیڈ پر ڈال دیا۔ یہ غالباً چوہدری دلاور کا بیڈ روم تھا۔ بہلوانے بتایا تھا کہ آج کل اس نے بیوی بچوں کو کرائے کی ایک کوٹھی میں رکھا ہے مگر عارضی طور پر کہیں بھیج دیا ہے۔

بیڈ کے سرہانے شیلف پر فریم میں کسی نئے شادی شدہ جوڑے کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تو دلاور کی صورت پہچاننے میں کامیاب ہو گیا۔ یقیناً یہ اس کی شادی کی تصویر تھی اور وہ دلہن اس کی پہلی بیوی ہی ہو سکتی تھی کیونکہ وہ دلاور کی ہم عمر تھی۔ یہ دسمبر ۱۹۷۸ء کی تصویر تھی۔ اس حساب سے دلاور کی شادی کو چوبیس سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اس وقت وہ پچیس چھبیس سال کا تھا تو اب یقیناً پچاس کا ہو چکا تھا۔ دوسری اس نے جانے کب کی تھی مگر جس لڑکی سے وہ تیسری شادی کرنے والا تھا وہ تو اس کی بیٹی سے بھی چھوٹی تھی۔ میں نے کالیا کی بہن کو دیکھا تو یہی خاطر جیسا کہ اس نے بتایا تھا وہ کالیا سے بہت چھوٹی تھی۔ ممکن ہے وہ اٹھارہ کی ہو یا بیس کی۔

چوہدری دلاور کی بیوی بے انتہا حسین تھی۔ دلہن کے سنگھار اور لباس عروسی میں تو چڑیل بھی پری لگتی ہے مگر میک اپ کے بغیر بھی اس کی صورت کے نقوش میں بڑی دلکشی تھی۔ اس کا رنگ دب اتنا اجلا تھا کہ تضاد میں اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں زیادہ ہی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ بھی اتنی ہی تھی۔ اٹھارہ یا بیس سال کی لڑکی مگر گداز بدن معصوم سی لڑکی۔ شاید اب وہ پھیل گئی ہو اور چالیس پینتالیس سال کی ادھیڑ عمر عورت بن کے اپنی وہ کشش کھو بیٹھی ہو جس نے اب تک دلاور کو پابند کر رکھا تھا۔ اس کے جوان بچے بچیاں ہوں گے چنانچہ دولت کی طاقت سے خود کو شباب سمجھنے والے چوہدری دلاور نے دوسری بیوی خرید لی تھی۔ یہ کوئی انوکھی اور نرالی بات نہیں تھی۔ ایک مسئلہ نفسیاتی تھا۔ مرد کا بے وفا اور آوارہ مزاج ہے۔ بیس پچیس سال میں اس کا جی ایک عورت سے بھر جاتا ہے تو وہ دوسری کرنے کے بہانے تلاش کرتا ہے۔ بے حساب دولت فراہم کر دے تو پھر اسے کون روک سکتا ہے۔

بیڈ کے دوسری جانب ایک اور دلہن کی تصویر تھی جو اپنے دولہا کے ساتھ بڑی شرمیلی اور پر تفاخر مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ یہ دلاور کی بیٹی تھی کیونکہ وہ ماں کے آغاز شباب کا عکس ثانی تھی۔ اس کا شوہر فوجی یا مرچنٹ نیوی کا کوئی افسر تھا اور بلاشبہ ایک ہینڈسم جوان تھا۔ تصویر پر شادی کی تاریخ صرف ایک سال پہلے کی تھی۔ دوسرے فریم میں تین بچے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے دو لڑکے صوفے کے بازو پر بیٹھے ہوئے تھے اور درمیان میں ان کی چھوٹی بہن اپنی گود میں گڑیا رکھے بیٹھی تھی۔ بڑا لڑکا بارہ چودہ سال کا تھا۔ چھوٹا شاید آٹھ دس سال کا ہو گا۔ سب سے چھوٹی لڑکی پانچ سال کی بھی نہیں تھی۔

اس کمرے میں بڑی گھریلو فضا تھی۔ یہاں دلاور صرف ایک شوہر تھا یا ان بچوں کا باپ تھا۔ وہ کوئی دہشت گرد' سمگلر' غدار وطن یا بین الاقوامی مجرم نہیں تھا۔ عام انسانوں کی طرح وہ بھی اس گھر میں رہنے والوں کے لیے محبت اور شفقت' سکون' فلاح اور نیکی کا سائبان تھا جس کے نیچے ایک خاندان پل رہا تھا اور اچھے مستقبل کی جانب گامزن تھا۔ دلاور باہر جو بھی تھا جیسا بھی تھا' اپنے گھر پر باہر کی زندگی کا سایہ تک نہیں پڑنے دیتا ہو گا۔ وہ ہرگز دل سے نہیں چاہتا ہو گا کہ اس کے بیٹے بھی وہی زندگی اختیار کریں جو اس نے گزاری اور اس کے نقش قدم پر چلیں۔ صرف پیسہ کمائیں۔ ناجائز اور جائز کی پروا نہ کریں۔ نہیں' صورت حال اس کے برعکس ہو گی۔ شاید دل سے وہ چاہتا ہو گا کہ اس کا بیٹا سکندر بخت جیسا ہو تو بیٹی رابعہ جیسی۔ انسان کی فطرت کا یہ تضاد ہر جگہ نظر آتا ہے۔ چور یا ڈاکو بھی چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا پڑھ لکھ کے ڈاکٹر' پروفیسر' وکیل یا انجینئر بنے۔ کوئی بھی ناجائز اور غیر قانونی ذرائع سے پیسہ جمع کرنے والا ہمیشہ ضمیر کی خلش اور بے اطمینانی میں مبتلا رہتا ہے کہ اسے عزت نہیں ملی۔ پھر وہ اولاد کے لیے دولت کی نہیں عزت کی خواہش کرتا ہے۔

میں نے اس کمرے میں بلاوجہ اتنا وقت ضائع کر دیا تھا۔ چند منٹ میں دوسری طرف نہ جانے کیا ہوا ہو گا۔ یہ خیال آتے ہی میں وہاں سے نکلا اور پھر برآمدے میں آ گیا۔ دلہن کے ساتھ فرار ہونا ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ معلوم نہیں کیا مجبوری تھی کہ رابعہ اور نازو ہمارا ساتھ چھوڑ کے کالیا کی بہن کے ساتھ چلی گئیں اور وہ بھی اپنا پتا نشان چھوڑے بغیر۔ اندازہ یہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ لوٹ کے غازی کے گھر ہی گئی ہوں گی۔

کمرے میں سے فائر کی آواز سن کے میں اچھل پڑا۔ پھر کسی نے بڑی دل خراش چیخ ماری۔ غالب نے چلا کے کہا "اس حرام زادے کو جانے مت دینا غازی" اس کے بعد دوسرا فائر ہوا اور کوئی دروازہ دھڑ سے بند ہوا۔

میں دوڑ کے کمرے میں گیا تو مجھے دلاور کے دو ساتھیوں میں

www.paksociety.com

سے ایک فرش پر دم توڑتا دکھائی دیا۔ نکاح خواں مولوی صاحب وحشت سے بے ہوش ہو چکے تھے یا انھوں نے بہتر یہی سمجھا تھا کہ بے ہوشی اختیار کر کے بالکل غیر جانب دار فریق بن جائیں۔ ویسے بھی بے ہوش پڑے ہوئے شخص کو گولی کون مارتا ہے۔

غالب اندر کھلنے والے دروازے کے قریب غازی پر جھکا ہوا تھا۔ دوسرے فائر کا نشانہ غازی بنا تھا۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔

میں نے کہا "یہ کیا ہوا۔ دلاور کہاں ہے؟"

"وہ سور کا بچہ بھاگ گیا" غالب نے کہا "ذرا غازی کو اٹھاؤ۔"

میں نے ایک طرف سے غازی کو سہارا دیا۔ گولی لگنے کے باوجود اس کی صورت پر اذیت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ یہ اس کے حوصلے اور برداشت کی صلاحیت تھی ورنہ اپنا خون بہتا دیکھ کے اچھا بھلا آدمی بھی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہم نے غازی کو قالین پر سیدھا لٹا دیا۔ میں باتھ روم میں سے پانی کی بالٹی اٹھا لایا۔ وہاں دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ ڈیٹول بھی تھی۔

غالب نے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد کہا "تمھاری تو ہڈی بھی ٹوٹی ہے یار۔"

غازی نے کہا "یار۔ ہڈی نہ ٹوٹتی تو میں اپنے پیروں پر چل کے اسپتال جاتا۔ اب تم مجھے میو اسپتال لے چلو۔"

"کسی پرائیویٹ آرتھوپیڈک سرجن کے پاس کیوں نہیں؟"

"یار۔ یہ پولیس کیس ہوگا۔" غازی نے کہا "میو اسپتال میں مجھ سے کوئی کچھ نہیں پوچھے گا اور رسمی قانونی کارروائی پوری کرنے کے لیے میں کوئی کہانی سنا دوں گا کہ مجرموں کے ایک ٹولے نے فائر کیا تھا۔ میں ان کا پیچھا کر رہا تھا۔"

"کسی ٹولے کا نام تو لینا ہی پڑے گا۔"

"ہاں۔ سوچ رہا ہوں کس کا لوں؟" غازی مسکرایا "ایک تو رنگ محل میں جعلی دوائیں بنانے والے ہیں جن کے بارے میں کچھ چھاپا تھا میں نے۔ انھوں نے بھی دھمکی دی تھی مجھے۔ میرے گھر تک آدمی کو پکڑوا دیتا ہوں۔"

غالب نے کہا "یار۔ آئی ایم سوری۔"

"پھر وہی فضول بات۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میری گولی کا نشانہ تم بن جاتے یا تمھاری گولی میرے سر میں لگتی۔ خدا کا شکر ادا کرو یار کہ صرف ٹانگ ٹوٹی۔ دو چار ہفتے گزر جائیں گے پلاسٹر میں اور بیساکھی کے سہارے۔ کم آن۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

میں نے حیرانی سے کہا "تم نے گولی چلائی تھی غازی پر۔"

غازی ہنسا "ہاں۔ یہ مجھے غازی سے شہید کرنا چاہتا تھا مگر میں بچ گیا۔"

غالب نے شرمندگی سے کہا "گولی تو میں نے دلاور پر چلائی تھی مگر وہ نکل گیا۔ غازی اس کے پیچھے تھا، یہ نشانہ بن گیا۔"

ہم نے قالین کے خراب ہونے کی پروا کیے بغیر زخم کو ڈیٹول سے دھو کے صاف کیا۔ فرسٹ ایڈ کے اصولوں کے مطابق پٹی باندھنے سے پہلے پنڈلی کے اوپر نیچے لکڑیاں رکھنا ضروری تھا۔ غالب اندر گیا تو تلاش کرنے پر مجھے اسٹور سے اپنے مطلب کی ہموار اور صاف لکڑیاں مل گئیں۔ کوٹھی کی تعمیر کے بعد کھڑکیاں اور دروازے بنے ہوں گے۔ یہ اسی کا بچا ہوا مال تھا۔

پٹی باندھتے ہوئے غالب نے مجھے ساری بات بتائی۔ دلاور کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کالیا نے ہمارے ساتھ مل کے اس کے خلاف سازش کی تھی اور وہ بری طرح پھنس گیا ہے۔ اس کا ساتھی عرف نیلا گنڈی پکڑا جا چکا تھا۔ دلاور کو اب بھی یقین نہیں تھا کہ ہم نے ساری گفتگو ریکارڈ نہیں کی ہے۔ اس نے اطمینان کی خاطر غالب اور غازی نے نیلا گنڈی کو اجازت دی کہ وہ ان کی تلاشی لے سکتا ہے۔ دلاور اسے ہدایات دیتا رہا کہ اندر کی جیب میں، بیلٹ کو دیکھو۔ بٹن کھول کے دیکھو۔ قمیص کے بٹن دیکھو، بالوں میں دیکھو۔ نیلا گنڈی میں اتنی عقل نہیں تھی کہ وہ کسی خفیہ مائیکروفون کا سراغ لگا سکتا۔

جب دلاور کو یقین آ گیا کہ اس کی گفتگو ریکارڈ نہیں ہوئی تو اسے شک ہوا کہ ہم اسے اغوا کرنے آئے ہیں۔ ایک وجہ تو اس کے دل کا چور تھا۔ وہ محسن کے جنونی کو اغوا کر چکا تھا اور جوابی کارروائی ہو سکتی تھی۔ پھر رابعہ اور نازو کے فرار ہونے کا مطلب اس نے یہ نکالا کہ وہ کالیا کی بہن کو اغوا کر کے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئی تھیں اور ہمارا پروگرام اسے اور پنڈو کو پکڑنے کا تھا۔ پنڈو کو اس نے رابعہ اور نازو کے تعاقب میں بھیج دیا تھا۔ جب وہ واپس نہیں آیا تو دلاور کو یقین آنے لگا کہ پنڈو اپنی جان بچا کے نکل گیا ہے اور وہ اکیلا پھنس گیا ہے۔

اس نے اچانک اپنے ایک محافظ کو مروانے کا فیصلہ کر لیا جو اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ دلاور نے اسے غالب پر حملے کا اشارہ کیا۔ غالب کے ریوالور سے جو گولی نکلی وہ دلاور کے محافظ کے سینے میں اتر گئی۔ دلاور دروازے کی طرف دوڑا۔ غالب نے چلا کے غازی سے کہا کہ اس حرام زادے کو جانے مت دینا۔ اس کی آواز میں نے بھی برآمدے میں سنی تھی۔ تاہم غازی کو دلاور کے دوسرے محافظ نے ٹانگ اڑا کے گرا دیا۔ اس صورت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دلاور بھی نکل گیا اور اس کا محافظ بھی۔ غالب نے گولی دلاور پر چلائی تھی جو بعد میں نکلا تھا مگر بدقسمتی سے غازی عین دروازے میں منہ کے بل گرا تو گولی اس کی ٹانگ میں لگ گئی۔

ظاہر ہے قصور غالب کا نہیں تھا اور اس نے غازی کو نشانہ نہیں لیا تھا مگر اس کی ٹانگ کے زخمی ہونے پر وہ شرمندہ تھا۔

"میں غازی کو اسپتال لے جاتا ہوں" غالب نے کہا "دلاور اور پنڈو بہت ہوشیار ثابت ہوا۔ جان بچا کے نکل گیا اور واپس نہیں آیا۔"

میں نے مسکرا کے کہا "مرزا جی۔ آپ اس ناچیز کے بارے میں والے بول دیں۔ میں زیادہ ہوشیار ہوں۔ پنڈو اسی کوٹھی کے ایک بیڈ روم میں بے ہوش لیٹا ہوا ہے۔ شامت اعمال اسے میرے پاس لے آئی تھی۔"

"اس کو پنڈو کی بے وقوفی کہا جا سکتا ہے۔ تمھاری ذہانت نہیں۔"

"بیٹے اب تم شرط بھی ہار چکے ہو۔ اس لیے مان لو کہ میں تم سے زیادہ عقل مند بھی ہوں اور ذہین بھی۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"ابھی یہ فیصلہ ہونا باقی ہے" غالب نے کہا۔

"فیصلہ تو ہو گیا۔ پنڈو کے توجہ دلانے کے باوجود دلاور نے مجھے علاوہ تسلیم نہیں کیا تھا۔ غازی گواہ ہے۔"

غازی نے سر ہلایا "یہ تو ٹھیک ہے۔ تمھاری اداکاری نے بچایا نہیں۔"

"ابھی اب کوئی گنجائش نہیں رہی" میں نے بے حد مسرت سے چیخ کر کہا "اب زندگی میں تین مواقع ایسے آئیں گے مرزا جی کہ تم اپنے گدھا ہونے کا اعلان عام کرو گے۔ پہلا موقع میرے ذہن میں ہے۔"

غالب نے مکروہ لہجے میں کہا "میں جانتا ہوں۔ اس وقت جب تم سر باندھ کے ویسے ہی اُلّو نظر آتا ہے تم مطالبہ کرو گے کہ خود کو گدھا کہو سب کے سامنے۔"

"بالکل ٹھیک سمجھا تم نے۔ حاضرین میں تمھارے دوستوں کے علاوہ معززین شہر بھی ہوں گے۔ وہ بہت خوش ہوں گے تمھارا اعتراف سن کے۔ نہ جانے کتنے تم کو گدھا اور بہت کچھ کہنے کے خواہش مند ہوں گے۔ خیر اب کل کی بات کل کریں گے۔ یہ بتاؤ وہ نیلا گنڈی بھی اُڑ گیا؟"

"وہ کیسے سکتا ہے۔ وہ زور بچے کے پر سے کاٹ دیے سالے کے۔ اندر روم میں لیٹا ہوا ہے" غالب نے کہا "کالیا پہرا دے رہا ہے۔"

اس وقت ایک غیر متوقع اور مضحکہ خیز بات ہوئی۔ نکاح خواں مولوی صاحب جن کو ہم اپنی پریشانی میں بھولے ہوئے تھے ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ وہ بنگالی لب و لہجے میں اردو بولتے تھے تو ویسے ہی ہنسی آتی تھی۔

"ابی صاحب۔ ہم کو معاف کرو۔ ہمارے والد صاحب کو معاف کرو۔ والدہ صاحب کو معاف کرو۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں کیا ہوگا ورنہ ہم تو جنازہ پڑھانے بھی نہ آتے اس مردود کا۔ ہم بہت ڈرا ہوا ہے۔ ابھی ہم اللہ کو پیارے ہو جاتے۔ آپ کی گولی ہمارے قریب گری ہے" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

میں نے کہا "مولوی صاحب، آپ جائیں۔ آپ سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں لیکن ایک بات کا خیال رکھیں۔ آپ سمجھ لیں کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔ آپ کسی کو بھی کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"ابی ہم اپنی اہلیہ کو بھی نہیں بتائیں گے۔ منکر نکیر کو بھی نہیں بتائیں گے۔ میدان حشر میں بھی نہیں بتائیں گے" اس نے جلدی جلدی اپنا بستہ بغل میں دبایا اور دروازے کی طرف لپکا "السلام علیکم۔ خدا حافظ" یہ الفاظ اس نے باہر جا کے کہے تھے۔ "او خنز علیکم کہا ہو گا بھی" مگر مطلب ہم نے سمجھ لیا تھا۔

"کیا میں ٹیکسی لے آؤں" میں نے کہا۔

"کیا یہ پوچھنا ضروری ہے۔ ہم میو اسپتال تک پیدل تو نہیں جا سکتے۔"

غازی نے کہا "کوئی ضرورت نہیں۔ ہم باہر تک ایسے ہی جا سکتے ہیں۔"

"ایک ٹانگ پر۔"

"ہاں۔ ایک طرف سے تم سہارا دو گے۔ چند قدم کا تو فاصلہ ہے۔" غازی نے کہا "سکندر کو یہاں رہنے دو۔ نیلا اور پنڈو سے ہم نہیں نمٹ سکتے۔"

میں نے کہا "میں غازی کے گھر ہی آ جاؤں گا۔ رابعہ اور نازو وہیں ہوں گی۔"

غالب نے کہا "امید ہے وہ کالیا کی بہن کو وہیں لے گئی ہوں گی۔ مگر یار انھیں بتا کے جانا چاہیے تھا۔"

غازی بہادر آدمی تھا۔ وہ ایک ہاتھ غالب کے شانے پر رکھے ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا دروازے تک گیا اور پھر مین گیٹ تک۔ لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ سخت اذیت میں ہے۔ سڑک جہاں سے کوئی سواری مل سکتی تھی اس جگہ سے ہو کر دور تھی اور غازی کا ایک ٹانگ پر یہ فاصلہ طے کرنا محض ارادے کی بات نہیں تھی۔ میں نے کالیا سے کہا کہ وہ ہوشیار رہے۔ میں ابھی دس منٹ میں واپس آتا ہوں۔

ایک بار پھر ابتدائی طبی امداد کی تربیت کام آئی۔ میں نے اور غالب نے آپس میں ہاتھ پکڑ کر جھولا سا بنایا اور غازی کو اٹھا لیا۔ غازی کا وزن ڈھائی سو پونڈ سے زیادہ ہی ہوگا۔ چند قدم چل کے ہم ہانپنے لگے مگر قدرت نے مدد کی۔ ایک پرائیویٹ کار والے نے ہمارے پاس گاڑی روکی اور وہ شریف آدمی انھیں میو اسپتال تک لے جانے پر تیار ہو گیا۔

میرا خیال ہے کہ مجھے واپس پہنچنے میں دس منٹ بھی نہیں لگے تھے۔ گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ میں جس دروازے کو کھلا ہوا چھوڑ گیا تھا وہ اب بند تھا۔ میں نے ریوالور نکال لیا اور آہستہ آہستہ برآمدے کے دروازے کو قریب جا کے لات ماری۔ دروازے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

میں پیچھے کی طرف سے گیا۔ پوری کوٹھی کھلی پڑی تھی۔ اس میں ایک نامعلوم شخص کی لاش موجود تھی اور اگرچہ پنڈو بے ہوش پڑا ہوا تھا مگر چودھری دلاور کے فرار ہو جانے سے صورت حالات میرے لیے خاصی غیر محفوظ ہو گئی تھی۔ وہ اپنے مددگاروں

www.paksociety.com

کے یا پولیس کے ساتھ کسی بھی وقت یہاں پہنچ جاتا تو میں اور کالیا ہی پکڑے جاتے۔ کالیا کا انجام تو بُرا ہی ہوتا مگر تفتیش کے نتیجے میں میرا اصلی چہرہ برآمد کیا جاتا تو دلاور خوشی سے پاگل ہو جاتا۔ مجھے شکار کرنے آئے تھے اپنے سکندر اعظم۔ تقدیر سے بڑے شکاری سمجھنے لگے تھے خود کو؟ ہیں جی، بڑے بڑے غازی سورما ساتھ لائے تھے۔

میں کوٹھی کے نقشے سے تو واقف نہیں تھا مگر اندازے سے میں نے پچھلے حصے کی طرف سے کمرے میں پہنچنے کی کوشش کی اور اس دروازے سے اندر داخل ہوا جس سے دلاور فرار ہوا تھا۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور کالیا غسے میں چوکیداری پر مامور کر گیا تھا غائب تھا۔ میں چند قدم آگے بڑھا اور رک گیا۔

باتھ روم کے کھلے دروازے سے میں نے پہلے دو جھولتے ہوئے پیر دیکھے۔ پھر کالیا کی لاش نظر آگئی۔ اسے مارنے کے بعد گلے میں پھندا ڈال کے لٹکایا گیا تھا اور رسی کا دوسرا سرا باتھ روم کے روشندان کی سلاخ سے باندھا گیا تھا جو روشن دان کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ کالیا کے سر سے خون بہہ کر اس کے جسم پر آ گیا تھا اور قطرہ قطرہ باتھ روم کے سفید ٹائلوں والے فرش پر جمع ہو رہا تھا۔

میں نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ خطرے سے خبردار کرنے والی چھٹی حس نے مجھے آہوئے صیاد دیدہ سے زیادہ چوکنا کر دیا تھا۔ کالیا کا قتل اس بات کا ثبوت تھا کہ شکاری گھات میں ہیں۔ چوہدری دلاور کمرے سے نکل کے فرار نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی کوٹھی میں چھپ گیا تھا اور موقع پاتے ہی اس نے سب سے پہلے اس کو ٹھکانے لگایا تھا جو ساری خرابی کا ذمے دار تھا۔

میں نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ اندر سے کھولا۔ غالباً دلاور نے کالیا کو مارنے سے پہلے اندر سے کنڈی لگا دی ہوگی۔ اسے معلوم تھا کہ میں اسی راستے سے واپس آ سکتا ہوں۔ دوسری طرف سے راستہ تلاش کرنے میں مجھے چند منٹ اور لگے۔ دلاور کو بھی چند منٹ کی مہلت ہی درکار تھی۔ اس تصور سے میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی کہ شاید اس وقت جب میں نے دروازے پر لات ماری تھی شکاری اپنے شکار کا کام تمام کر رہا تھا۔ لات مارنے میں نے اسے اپنے آنے کی خبر دے دی اور میرے کمرے میں پہنچنے سے پہلے وہ باہر نکل گیا۔ اب وہ یقیناً اسی کوٹھی میں کہیں موجود تھا اور منتظر تھا کہ میں خود اپنے پیروں سے چل کے اس کے ریوالور کی زد میں آ جاؤں۔

میرے لیے شجاعت مندی نہ پائے رفتن والی بات تھی۔ میرا اس کمرے میں محصور ہو جانا بھی خطرناک تھا اور باہر نکلنے کی کوشش کرنا بھی۔ پھر مجھے پیڈرو کا خیال آیا۔ اسے یرغمال بنا کے میں بچ سکتا تھا۔ میں پیڈرو کو ڈھال کی طرح استعمال کرتے ہوئے نکلنے کی کوشش بھی کر سکتا تھا۔ دلاور گولی چلاتا تو پہلے پیڈرو کو لگتی۔

یہ خیال آتے ہی میں نے دوڑ لگائی اور ایک زقند میں اس بیڈ روم میں جا پہنچا جہاں میں نے پیڈرو کو ناک آؤٹ کر کے چھوڑا تھا۔ وہاں ہر چیز ویسی ہی تھی اور وہیں تھی سوائے پیڈرو کے، وہ کہیں نہیں تھا۔ میں نے بے یقینی سے اس جگہ کو دیکھا جہاں وہ پڑا ہوا تھا۔ بستر کی ہر شکن اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے تک وہاں کوئی تھا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ پیڈرو ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا مگر بعض اوقات آدمی اپنے یقین ہی سے مات کھا جاتا ہے۔ شاید میرا یہ خیال بھی غلط ہو گیا تھا کہ کالیا کو قتل کرنے والا دلاور تھا۔ اسے خود استاد پیڈرو نے قتل کیا ہوگا۔

سوال یہ تھا کہ وہ اب کہاں ہے؟ شاید اسی کوٹھی میں۔ میری نظر وال کلاک کی طرف گئی۔ کلاک کی ٹک ٹک مجھے خبردار کر رہی تھی کہ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ سب بچے گئے ہیں۔ کچھ بھاگ گئے ہیں۔ کچھ اس دنیا سے ہی رخصت ہو چکے ہیں۔ صرف تم ہو جو قضا کے نشانے پر کھڑے رہ گئے ہو۔ اور دستِ اجل نے اپنی کمان کھینچ لی ہے۔

میں بھاگنے کے خیال سے پلٹا ہی تھا کہ میرے قدم زمین میں گڑ گئے۔ دروازے میں ایک عورت چپ چاپ کھڑی تھی جس کے ہاتھ میں بہت خطرناک قسم کا سا خوبصورت ریوالور تھا جس کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔ اسے پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ دلاور کی بیوی تھی۔ وہ بیوی جو اس کے ساتھ زندگی کے اٹھائیس سال گزار چکی تھی۔

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ بڈھے“ اس نے مجھ پر سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

میں نے ہاتھ اوپر اٹھائے ”دیکھئے۔“

”میں سب دیکھ رہی ہوں“ اس نے تیز لہجے میں کہا ”تم کون ہو اور میرے کمرے میں کیا کر رہے ہو؟“

میں نے کہا ”آپ مسز دلاور ہیں.....؟“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“

”خاتون، میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گا۔ میں چور ڈاکو نہیں ہوں۔ ایک شریف آدمی ہوں۔“

”شریف آدمی کیا لوگوں کے بیڈ روم میں اس طرح گھستے ہیں؟“ اس نے طنز سے کہا ”مجھے تو تمہاری یہ داڑھی بھی نقلی لگ رہی ہے۔ آواز سے تم جوان آدمی ہو۔ حلیہ بوڑھوں کا بنا رکھا ہے۔ کیا چکر ہے یہ؟“

میں نے آہ بھری ”مسز دلاور۔ یہ تقدیر کے چکر ہیں۔ بہت پرانے لیکن آپ ان چکروں میں مت پڑیے۔“

”مجھے باتوں میں مت الجھاؤ۔ اگر تم نے ذرا سی بھی چالاکی دکھائی تو میں تم کو گولی مار دوں گی اور قانون کی نظر میں جرم نہیں ہوگا۔“

میں نے طنز سے کہا ”آپ بھی قانون کو سمجھتی ہیں۔ کمال ہے۔ آپ کے شوہر تو قانون کو کچھ نہیں سمجھتے۔“

”تم نے بتایا نہیں کہ تمہارا نام کیا ہے اور کیا کام ہے تمہارا میرے بیڈ روم میں؟“

میں نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا ”آپ کسی بدبخت سکندر کو جانتی ہیں؟“

”بہت اچھی طرح۔“

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”میں وہی خانہ خراب ہوں۔“

اس کی آنکھیں بے یقینی سے مجھ پر جمی رہیں ”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

میں نے محسوس کیا کہ شاید اس جوئے میں بازی جیتنے کے امکانات پیدا ہونے لگے ہیں ”اس حلیے پر نہ جائیں خاتون۔ یہ میک اپ کا کمال ہے۔“

”پھر میں تمہارا اصل چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا ”اس وقت..... یہاں تو بہت مشکل ہے۔ خود کو چھپانے کے لیے ہی تو میں نے یہ بھیس بدلا ہے۔“

”تم مجھے کیسے جانتے ہو؟“

”جیسے آپ مجھے جانتی ہیں۔ اس کے علاوہ....“ میں نے پرانی تصویر کو دیکھ کر کہا ”حسن و جمال کی یہ آب و تاب ابھی ماند نہیں پڑی ہے۔ میں نے آج ہی یہ تصویر دیکھی اور میری خوش قسمتی کہ آج ہی آپ کو بھی دیکھ لیا۔ مجھے رشک آتا ہے دلاور پر۔“

خوشامد اور حسن کی تعریف عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس کے لہجے کی زہرناکی کم ہو گئی ”فضول باتیں مت بناؤ، چالاک آدمی۔“

میں نے کہا ”کیا واقعی آپ بھی مجھے اتنا ہی برا سمجھتی ہیں جتنا آپ کے شوہر نامدار نے مجھے دنیا کے سامنے بنا دیا ہے؟“

”میں دنیا کی ذمے دار نہیں ہوں لیکن دلاور کے دوست بہت اچھے ہیں۔“

”کیا اس کا مطلب ہیں یہ لوں کہ دشمن اچھے ہیں۔“

”نادان دوستوں سے تو دانا دشمن اچھے ہی ہوتے ہیں۔ یہ بڑی کمال بات ہے، دلاور کو اس کے دشمنوں نے نہیں..... دوستوں نے خراب کیا۔ وہ ایسا نہیں تھا۔“ اس کی آنکھیں جیسے ماضی کے کسی خواب کا منظر دیکھ رہی تھیں۔

”آپ کی بات کر رہی ہیں آپ۔ چوبیس سال پہلے کی جب آپ کی اس سے شادی ہوئی تھی۔“

”شاید“ اس نے کہا ”مسٹر بدبخت، دلاور کسی بھی وقت یہاں آ سکتا ہے۔ تم آخر یہاں کیا کر رہے تھے؟“

”اگر میں کہوں کہ میں آپ کے شوہر کی برات میں ڈھول بجا رہا تھا تو آپ مانیں گی؟ اگر میں یہ کہوں کہ دلہن تو خیر بھاگ گئی مگر دلاور کے ہونے والے برادرِ نسبتی کی خون آلود لاش اسی کوٹھی کے باتھ روم میں موجود ہے تو.....!“

”میں سمجھوں گی کہ تم مجھے بے وقوف بنا کے کوئی حرکت کرنا چاہتے ہو۔ جھوٹ وہ بولتا ہے جس کے پاؤں ہوں۔“

میں نے کہا ”مجھے قسم کھانے کی عادت نہیں ہے مسز دلاور۔ قسم جھوٹے لوگ کھاتے ہیں لیکن آپ کو یقین دلانے کے لیے میں یہ بھی کر سکتا ہوں۔ کیا آپ نے اندر آتے ہوئے ایک رنگین ڈھول نہیں دیکھا تھا؟“

”ایک رنگین..... بہت بڑا ڈھول باہر پڑا ہوا تو تھا“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”دیکھئے، آپ کے ساتھ میرا کوئی اختلاف نہیں۔ آپ اپنے انداز و اطوار اور رویّے سے شائستہ خاتون لگتی ہیں اور آپ کی شخصیت میں حسن کے ساتھ جو وقار ہے وہ آپ کے خاندانی ہونے کی دلیل ہے۔“

یہ تعریف اور خوشامد کی ایسی گولی تھی جس نے فوراً اثر دکھایا۔ ”تم بھی باتوں سے تو معقول آدمی لگتے ہو۔ پھر یہ کیا کھیل شروع کر رکھا ہے تم نے۔ کیوں اپنی جان کے دشمن ہوئے ہو؟“ اس کا لہجہ اب بالکل بدل گیا تھا۔

میں نے کہا ”اس کھیل سے اپنا دامن بچائیں محترم خاتون۔ یہ آگ کا کھیل ہے۔ مجھے جانے دیجیے۔ میں دلاور کا دشمن ضرور ہوں مگر اس عورت کو جو کسی کی بیوی ہو، بہن ہو یا ماں ہو، میں دشمن کی نظر سے دیکھنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ میرے لیے آپ اتنی ہی قابلِ تعظیم ہیں جتنی کوئی بھی شریف اور گھریلو عورت ہو سکتی ہے۔ بس کے ایسے بیارے بیارے بچے ہوں۔“

اس نے بیڈ سائیڈ پر رکھی ہوئی تصویروں کو دیکھا۔ وہ موقع تھا جب میں آسانی سے جست لگا کے اس پر قابو پا سکتا تھا اور اس کے ہاتھ سے وہ خطرناک ہتھیار بھی لے سکتا تھا جو یقیناً اسے دلاور نے اپنی حفاظت کے لیے دیا ہوگا لیکن وہ بازی ہار چکی تھی ”ان بچوں کو ماں کی ضرورت ہے۔ ماں کی محبت کا بدل دلاور کی ساری دولت بھی نہیں ہو سکتی۔“ میں نے نیا ترم کے کسی ماہر کی طرح اپنی آواز کو پُرتاثیر بنایا تھا کیونکہ میں اسے متاثر کر چکا تھا۔ یہ حربہ غلط سہی میری نیت غلط نہیں تھی۔ میں اپنی جان بچانے کے لیے اسے نقصان پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔

”جاؤ۔ بھاگ جاؤ یہاں سے“ اس نے تھکے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں کہا ”اس سے پہلے کہ دلاور آ جائے۔“

میں نے کہا ”خاتون، اگر دلاور آ گیا تو مشکل میں آپ بھی ہوں گی۔ آپ کو بھی میرا یہی مشورہ ہے۔“

اس نے مجھے حیران اور سوالیہ نظروں سے دیکھا ”کیا مطلب ہے

www.paksociety.com

ذرا اس بات کا؟"

"آپ کو اس وقت یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ دلاور نے تو آپ کو اور بچوں کو..."

اس نے میری بات کاٹ دی "میں بہن کے ہاں رہتی ہوں۔ اپنے بچوں کے ساتھ۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن دلاور نے آپ کو یہاں سے رخصت کر دیا تھا۔ کہیں بھیج دیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہاں؟"

"میں اپنی بہن کے گھر گئی تھی۔ یہ ٹھیک ہے اور مجھے دو چار دن وہیں رہنا تھا پھر ہم نے ایک ساتھ مری جانے کا پروگرام بنا لیا تو میں نے سوچا کہ دلاور کو بھی بتا دوں۔ میں فون کرتی رہی" اس نے ایک ریسیور اٹھا کے کان سے لگایا "یہ تو ڈیڈ ہے۔ مگر دوسرے فون۔"

"ہو سکتا ہے سارے فون ایک ساتھ مر گئے ہوں" میں نے کہا۔

"کہیں سے کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔ اس لیے مجھے آنا پڑا۔"

"اگر آپ تھوڑی دیر پہلے آتیں تو بہت برا ہوتا۔ دلاور واقعی تیسری شادی کرنے والا تھا۔"

وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے گھورنے لگی "تیسری شادی... یہ کیسا مذاق ہے کیا بے ہودگی ہے۔"

"حقیقت آپ کو معلوم ہو جائے گی۔ وہ کالیا کی بہن تھی۔"

"کون کالیا؟"

میں نے اوبھری "اب میں کیا بتاؤں جب آپ کو کچھ معلوم ہی نہیں۔ کالیا کی لاش دیکھنے کی ہمت ہے تو کچن میں دکھاتا ہوں۔ وہاں ایک اور شخص بھی مرا پڑا ہے۔ ڈرائنگ روم میں۔"

"نہیں... میں نہیں... مگر یہ سب..."

میں نے کہا "خدا کے لیے آپ جائیں۔ تاکہ میں بھی جاؤں۔ دلاور آ گیا تو قیامت آ جائے گی۔"

"میں کسی قیامت سے نہیں ڈرتی۔ کیا کرے گا؟ آخر وہ مجھے مار ڈالے گا؟ اس لیے کہ چوبیس سال بعد اسے نئی مل گئی ہے" وہ تلخی سے بولی۔

میں نے نرمی سے کہا "آپ کے بچوں کو نئی ماں تو نہیں مل سکی۔ ان کے لیے آپ کو جینا چاہیے۔"

اسی وقت باہر ایک گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔

"دیکھا... وہ آ گیا نا... دلاور آ گیا..." اس کا رنگ فق ہو گیا تھا اور وہ ہکلا رہی تھی۔

یہ غلطی میری تھی یا اس کی بے وقوفی کہ ہم نے قدرت کی طرف سے عطا ہونے والی مہلت کو ضائع کر دیا تھا۔ "اب میں کیا کروں؟"

"چھپ جاؤ۔ خدا کے لیے کہیں چھپ جاؤ۔ بے وقوف لڑکی۔ اس بیڈ کے نیچے گھس جاؤ۔ جلدی..." وہ وحشت زدہ تھی۔

صورت حال اچانک ڈرامائی طور پر سنگین اور مضحکہ خیز [illegible] تھی۔ میرے ذہن نے چند ہی سیکنڈ میں سوچ سمجھ [illegible] نیچے چلا گیا۔ کسی حد تک مجھے یہ اعتماد حاصل ہو چکا تھا [illegible] بیوی ہی مجھے بچا لے گی۔ اپنی کوشش اور ہمت سے [illegible] وقت گزر گیا تھا اور میں فرار ہونے کی یا مقابلہ کرنے کی [illegible] نہ کیا جاتا۔

دلاور کی بیوی بڑی پھرتی سے ہوتے ہوئے [illegible] لیٹ گئی تھی۔ زیبا جلتر کے تجربے میں نے ہمت سے مجھے [illegible] کے تجربے سے میں اس روز آشنا ہوا اور اسی زیبا جلتر نے [illegible] بچا بھی لیا۔

بیڈ کے نیچے میرے لیٹنے کے لیے وافر جگہ تھی۔ [illegible] کے دونوں جانب لمبائی کے رخ بیڈ کور قالین تک لٹکا ہوا تھا۔ [illegible] طرف دیوار تھی اور دوسری طرف بیڈ کا وہ حصہ [illegible] طرف رہتا ہے۔ دیوار کے ہر کونے تک پھیلے ہوئے [illegible] لینا مشکل کام نہیں تھا اور دم سادھے خاموش پڑے [illegible] گھنٹوں گزار سکتا تھا بشرطیکہ اس دوران میں ناک [illegible] یا کھانسی نہ آئے۔

دلاور نے اندر آتے ہی کہا "تم نوشی... تم...!"

ظاہر ہے نوشی اس کی بیوی کا نام تھا جو نوشابہ [illegible] وغیرہ کا مخفف ہوگا "کیا بات ہے تم تو ایسے پریشان ہو جیسے کسی اور کے بیڈ روم میں دیکھ لیا ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ تم کیوں آئی ہو یہاں؟" دلاور نے جھنجھلا کے کہا۔

"فضول باتیں تم کر رہے ہو۔ مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میں اپنے گھر میں کیوں آئی ہوں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں!"

"وہ... میرا مطلب تھا کہ تم تو ہفتے بھر کے لیے گئی تھیں جلدی کیوں آ گئیں؟ جواب دو میری بات کا۔ چھوڑو یہ رسالہ"

"اوف۔ رسالہ کیوں پھینک دیا اٹھا کے"

"حد ہے۔ میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ تم رسالہ پڑھ رہی ہو۔"

"وہ ذرا ایک ڈیزائن دیکھ رہی تھی گلے کا۔"

"بھاڑ میں گیا ڈیزائن۔ میں نے کچھ پوچھا تھا" دلاور نے [illegible] کے کہا۔

نوشی نے مصنوعی بے اعتنائی سے کہا "[illegible] پوچھا تھا؟"

"یہی کہ تم اتنی جلدی کیوں آ گئیں اور بچے کہاں ہیں؟"

"بچے خالہ کے گھر میں ہیں اور میں آئی تھی [illegible] کر کرنے تھک گئی تھی۔"

دلاور نے فون اٹھا کے دیکھا "فون ڈیڈ ہے۔"

"تمہارے فون ڈیڈ ہیں۔ ابتدائی تو میں نے چیک کر لی ہے سب نے..."

"تم ادھر بھی گئی تھیں؟" دلاور نے کہا۔

"نہیں۔ ابھی تمہارے آنے سے پانچ منٹ پہلے تو آئی ہوں۔ [illegible] ڈرائیو کی۔ اتنی تھک گئی تھی کہ سیدھی یہاں آ کر لیٹ [illegible] ذرا اسے ہی چلا دو۔"

دلاور نے اسے ہی چلایا تو میں نے اس کے اشارت بدلنے کی [illegible] جانب تک۔ بیڈ کے نیچے لیٹ کر میں خود کو [illegible] سا محفوظ سمجھ رہا [illegible] میرے لیے اب فکر کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ دلاور کی [illegible] مجھے بچا رہی تھی۔

"ہمارا اچانک مری جانے کا پروگرام بن گیا تھا۔ ذرا یہ رسالہ [illegible] اٹھا دو۔ اس پر کیا غصہ... ٹھیک ہو۔"

"آج تو تمہارا لہجہ ہی بدلا ہوا ہے۔ زہر کی جگہ شہد ٹپک رہا [illegible]" دلاور نے کہا۔

"ہاں ایک ہاتھ سے تو نہیں بجتی دلاور۔ ادھر تو میرے [illegible] کب سے تم نے بھی مجھے نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ میں اتنی [illegible] نہیں ہوں۔"

بالفاظ دیگر۔ میں نے بیڈ کے نیچے لیٹ کے سوچا۔ خدا نخواستہ [illegible] نے سابقہ طرز تغافل کا کفارہ ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا اور [illegible] میں اس کا موڈ رومانٹک ہو گیا تو......

مگر دلاور نے کہا "اس وقت ان چونچلوں کا وقت نہیں ہے۔ [illegible] ہی چلا ہے تو تم بھی جاؤ گی۔"

"میں نے سوچا تمہیں بتا دوں۔"

"اچھا بتا دیا نا؟ بڑی مہربانی۔ اب جاؤ۔ یہاں پولیس آنے والی ہے۔"

"پولیس... ہائے میں مر گئی۔" اس نے بڑی ادا سے چیخ ماری۔ "پولیس کیوں آئی ہے میرے گھر میں؟"

"خدا کے لیے عقل سے کام لو۔ پولیس مجھے یا تمہیں پکڑنے نہیں آ رہی" دلاور نے برہمی سے کہا "ہوئی ہے کوئی ایسی بات [illegible] کہ مجھے پولیس کو بلانا پڑا۔"

"آخر مجھے بھی تو پتا چلے۔"

"اف یہ عورتوں کے معاملات نہیں ہیں۔"

"یعنی کسی عورت کا معاملہ نہیں ہے" نوشی نے یوں کہا کہ مجھے [illegible] مسکرانے لگا۔

"وہ حرام زادہ سکندر بخت یہاں آ گھسا تھا بھیس بدل کے۔"

"اچھا۔ کس بھیس میں؟" نوشی نے حیرت سے کہا۔

"نئے فقیر کا بھیس بنا کے آیا تھا" دلاور نے کہا۔

"تم بھی نہیں پہچان سکے اسے۔ کیا وہ اب بھی کوٹھی میں ہے"

"نہیں... وہ ٹھہرتا یہاں تو میں خود اسے گولی نہ مار دیتا۔ میں تو ذرا سی دیر کے لیے باہر گیا تھا۔ وہ پاگل کا بچہ پڑا ہوا تھا یہاں۔ مجھے کیسے دھوکا دے سکتا تھا سکندر۔"

"پھر کیا کیا سکندر نے یہاں...؟"

"وہی جو اس کا کام ہے۔ کالیا کو قتل کر دیا۔"

"قتل!" نوشی نے پھر چیخ ماری "۔ کالیا کون ہے؟"

"جب تم نہیں جانتیں تو منہ بند رکھو۔ پاگلوں کی طرح مت چلاؤ۔ ادھر پولیس والے تفتیش کر رہے ہیں۔" دلاور نے برہمی سے کہا "ابھی تک نہیں وہ قتل کر دے گا اس نے"

"اور پھر..." نوشی نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"کہاں ہے وہ؟" دلاور نے اس کی بات کاٹ دی۔

"مجھے کیا معلوم؟" نوشی نے بڑی نزاکت سے کہا۔

"وہ یہیں پڑا تھا۔ کہاں گیا؟"

"یہاں... میرے بیڈ روم میں؟ تمہارا دماغ خراب ہے۔"

"دیکھو میرا دماغ بالکل ٹھکانے ہے۔ تم جاؤ یہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔"

"میں تھوڑی دیر بعد جاؤں گی۔ پولیس چلی جائے۔ تھوڑی دیر آرام بھی کر لوں۔ ڈرائیونگ سے تھک گئی ہوں۔"

"خود ڈرائیونگ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ شوفر بچوں کو لے گیا تھا۔ ان کی خالہ کی گاڑی میں۔"

"اچھا اب کمرے سے مت نکلنا۔ وہ لاشیں لے جائیں گے تم دیکھ لو گی تو رات کو ڈرو گی" دلاور نے باہر جاتے ہوئے کہا۔

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد نوشی نے کہا "سنو۔ میں دروازہ بند کر لوں اندر سے؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کر لو۔" دلاور کی آواز باہر سے آئی۔

نوشی نے بیڈ پر سے اٹھ کر کنڈی لگائی تو میں نے اس کی آواز بھی سنی۔ پھر نوشی نے بیڈ کور کو ایک سائیڈ سے اٹھا کے کہا "تم چاہو تو باہر نکل سکتے ہو بابا جی۔"

میں نے کہا "مسز دلاور۔ خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکال دو۔ دلاور کو پتا چل گیا تو وہ نہ جانے کیا سمجھے گا۔"

"کیا سمجھے گا۔ یہ کہ تم میرے عاشق ہو۔ نان سینس۔"

"دیکھو۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن تم سے اس کا بدگمان ہونا ٹھیک نہیں" میں نے سائیڈ سے سر نکال کے کہا۔

"بدگمانی تو اس کی فطرت میں ہے۔ وہ ہمیشہ شک کرتا رہا ہے مجھ پر" وہ تلخی سے بولی "مرد خود کو بہت عقل مند سمجھتے ہیں نا اور عورت کو ناقص العقل۔ اسی خوش فہمی میں مارے بھی جاتے ہیں..." وہ ہنسی۔

"کیا مطلب...؟"

"مطلب کیا سمجھاؤں میں تمہیں۔ یہ بال تم نے دھوپ میں سفید کیے ہوتے تو سمجھ جاتے۔ دیکھو کسی کو بلاوجہ چور سمجھا جائے اور کہا جائے تو اس کا رد عمل کیا ہوگا۔ وہ کہے گا کہ بھاڑ میں جائے

www.paksociety.com

شرافت۔ اب چوروں کے ہی وکھاؤں کا سب کو۔"

بات واضح ہو گئی تھی۔ شکی مزاج دلاور ہمیشہ ایک باوفا بیوی کے خلاف بے اعتباری کے وہم کا شکار رہا۔ شاید یہ اس کا احساس کمتری تھا۔ بیوی صورت ہی میں نہیں سیرت اور خاندانی نجابت میں بھی اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ تھی۔ اس نے ایک حد تک برداشت کیا۔ اب وہ کھلے دل سے میرے سامنے اعتراف کر رہی تھی کہ بالآخر اس نے وہی کیا جس کا اس پر الزام تھا۔ پہلے بے سبب تھا پھر اس نے انتقاماً سبب پیدا کر دیا۔

میں پریشان ہو گیا۔ دلاور کی بیوی نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ کوئی فرشتہ سیرت شوہر پرست اور وفا شعار بیوی نہیں ہے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ ایسے کو تیسا ملتا ہے۔ دلاور کو یا پھر تو عزت کی نہیں اس کے اعمال نے گھر کی عزت کا بھرم بھی نہ رہنے دیا۔

اس وقت دلاور کی بیوی نے اس کے بدترین دشمن کو پناہ دے رکھی تھی اور اگر میں اس کی عنایت کو بے سبب سمجھتا تو بڑا بے وقوف کہلاتا۔ عورت کی محبت میں انتہاپسندی ہوتی ہے تو نفرت میں بھی۔ یہ ایک منطقی نفسیاتی ردعمل تھا۔ چوبیس سال ساتھ گزارنے کے بعد دلاور کی بیوی اس سے اتنی نفرت کر رہی تھی کہ وہ مشرقی عورت کی مثالی اور روایتی وفا پرستی کی راہ بھی ترک کر چکی تھی اور اس کے دشمن کے سامنے اس کا اعتراف بھی کر رہی تھی۔ اس کے اشتراک کی پیش کش سے مجھے خوف آیا۔ یہ دریا میں ڈوبنے سے بچنے کے لیے دلدل میں اتر جانے کے مترادف تھا۔

"مسز دلاور..."

"میرا نام نوشابہ ہے" اس نے کہا۔

میں نے بادلِ ناخواستہ کہا "نوشابہ۔ میں کب تک یہاں قید رہوں گا آخر!"

وہ مسکرائی "جب تک میں چاہوں گی۔"

"کیا تم وہ ظالم جادوگرنی ہو جس نے طوطا بنا کے ایک شہزادے کو پنجرے میں بند کر دیا تھا۔"

وہ ہنسی "تم خود کو شہزادہ کہہ رہے ہو یا یہ کہ میں نے تم پر جادو کر دیا ہے؟"

میرا دل چاہتا تھا کہ اپنا سر پیٹ لوں "خدا کے لیے آہستہ بولو۔ کہیں اس نے باہر سے سن لیا تو پوچھے گا کہ کس سے باتیں کر رہی تھیں؟"

"میں کہہ سکتی ہوں کہ فون پر بات کر رہی تھی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ فون ڈیڈ ہے۔"

"اوہ۔ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔" وہ بڑی ادا سے بولی "اچھا دیکھو یہ میری گاڑی کی چابیاں ہیں۔"

میں نے کہا "کیا میں تمہاری گاڑی لے کر بھاگ جاؤں؟"

"نہیں۔ ایسا مت کرنا۔" وہ بولی "گاڑی تو اندر کھڑی ہوئی ہے۔ ابھی جب پولیس چلی جائے گی تو تمہیں موقع مل جائے گا۔ گاڑی کی ڈکی میں چھپ کر لیٹ جانا۔"

"یہ تم کیسی فلمی چویشن پیدا کر رہی ہو۔ بھول رہی ہو کہ تمہارے بیڈ روم میں تمہارے بیڈ کے نیچے لیٹا ہوا ہوں۔ میری جگہ کوئی بھی شوہر ہو تو رقابت کے جنون میں سوال کئے بغیر مار دے پھر میں ڈکی میں پایا گیا تو... یا اس سے پہلے ہی دلاور نے دیکھ لیا تو۔"

"وہ نہیں۔ دلاور اس وقت میرے پاس ہو گا۔ تم انتظار کرنا پھر میں تمہیں لے جاؤں گی۔ دلاور ساتھ نہیں ہو گا۔"

"چند منٹ کا مطلب چند گھنٹے ہوا تو میں ڈکی سے اندر فوت ہو جاؤں گا جیسے قفس میں بہار کا انتظار کرتے کرتے کوئی بیمار ہو جائے۔ یہاں بھی میں خوف سے تھر تھر کانپ رہا ہوں۔ چابی اپنے پاس ہی رکھو۔"

"میں نے تو سنا تھا کہ تم بڑے جی دار آدمی ہو؟"

"کس سے سنا تھا؟"

"خود دلاور تسلیم کرتا ہے۔"

مجھے تھوڑی سی خوشی ہوئی "پتا نہیں میں تمھی دیر یہاں زندہ رہوں گا۔"

"اوپر آ جاؤ۔ میرے ساتھ... آرام سے لیٹ جاؤ۔"

مجھے پھر پسینہ آنے لگا "ٹھیک ہے۔ آگ اور پٹرول ایک ساتھ نہیں رہ سکتے اور تم وہ آگ ہو جس کی تپش مجھے یہاں بھی محسوس ہو رہی ہے۔"

اس خراجِ تحسین پر جیسے زیادہ خوشی سے اس کا چہرہ دمک اٹھا "آگ سے کھیلتے ہو اور جلنے سے ڈرتے ہو؟"

میں نے کیسے بولتا کہ تم آگ تو کیا انگارہ بھی نہیں۔ بس ایک چنگاری ہو جو راکھ ہونے کو ہے اور یوں بھی پرائی آگ میں جلنا میری عادت نہیں تاہم جان بچانے کے لیے حرام کو حلال کیا جائے ہے تو پھر جھوٹ بولنا بھی گناہ نہیں۔ "وقت نے مجھے برف بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس وقت آگ مجھ پر اثر نہیں کر سکتی۔"

"یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ دن کی تپش میں برف پگھل جائے گی تو رات کی تاریکی میں آگ زیادہ روشن محسوس ہو گی۔"

میں اس کی بے شرمی پر شرمندہ ہوا۔ وہ ایک شوہر کی بیوی تھی۔ جوان بچوں کی ماں تھی۔ شاید نانی بننے والی تھی۔ اس کے وجود میں انتقام کا جذبہ ہوس بن گیا تھا۔ جیسے شمع بجھنے سے پہلے بھڑکتی ہے ایسے ہی وہ حسن و شباب کی باقی ماندہ پونجی لٹانے پر آمادہ تھی۔ حالانکہ یہ اس کی اپنی نسوانیت کی توہین تھی۔ دلاور کا رویہ کتنا ہی غلط کیوں نہ رہا ہو انتقام کے نام پر اس کا عمل سے عورت کے نام کی تقدیس رسوا ہو رہی تھی۔ اگر انتقام کے لیے وہ دلاور کو قتل کر دیتی تو یہ ایک فطری ردِ عمل ہوتا۔ انگریزی میں کہتے ہیں کہ دوسری غلطی پہلی غلطی کا جواز نہیں ہوتی۔

معلوم نہیں حسد، دکھ اور پچھتاوے، بے بسی اور اشتعال کے کتنے طویل اور صبر آزما دور سے گزر کے اس نے بے راہروی اختیار کی اور وہ کون تھا جس نے ایک عورت کی جذباتی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے غلط راستے پر ڈال دیا۔ یقیناً وہ کوئی خود غرض اور بے ضمیر مرد ہی ہو گا جو اسے شجرِ ممنوعہ کی لذت سے آشنا کر کے خود کسی اور کے باغ سے چوری کے پھل کا مزہ لینے نکل گیا۔ یہ بھی انگریزی مثل ہے کہ چوری کے پھل زیادہ میٹھے لگتے ہیں۔

(STOLEN FRUITS TASTE SWEETER)

اب یہ عورت اپنی عزتِ نفس کے احساس سے محروم ہو کے کسی بھکاری کی طرح جھوٹی محبت کے لیے دامن پھیلاتی تھی۔ مجھے شرم آئی کہ میں نے جھوٹ کو ڈھال بنایا مگر اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھے یہ جھوٹ کتنا مہنگا پڑے گا۔ گو میرے ہاتھ میں دلاور کی بہت بڑی کمزوری آ گئی تھی لیکن میں ذلت کی اس انتہا میں گرنے سے بچا رہا۔ میں ہی بہتر سمجھتا تھا۔

اس بیڈ کے نیچے لیٹ کر مجھے دلاور کی بیوی پر یقیناً ترس بھی آیا۔ یوں تو ہر عورت کمزور ہوتی ہے مگر وہ حد سے زیادہ کمزور ثابت ہوئی کہ نفس کے خلاف کوئی مزاحمت نہ کر سکی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ اس کی اولاد کو ماں کے کردار کا یہ تاریک پہلو نظر آ گیا تو ان پر کیا بیتے گی۔ ماں کے قدموں کے نیچے تو جنت ہوتی ہے۔ گناہ کے انگارے دیکھ کے وہ خود اپنی نظروں میں گر جائیں گے۔ ماں کی ممتا بے آبرو ہو جائے گی۔

برائی سے برائی پیدا ہوتی ہے اور برائی کا انجام بھی برائی پر ہوتا ہے۔ شاید یہ مکافاتِ عمل کی بات تھی کہ جس دلاور نے اپنے مال و زر کے خزانوں کو جرم و گناہ کے کاروبار کی کمائی سے بھر لیا اسے پتا بھی نہیں چل سکا کہ گھر کے اندر اس کی عزت و غیرت کا خزانہ لٹ چکا ہے۔ کاش یہ بات میں اسے بتا سکتا۔ میں اس کا دشمن ضرور تھا لیکن اس کے گھر کی عزت میری نظر میں اپنے گھر کی عزت کے برابر تھی۔ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ بیٹی یا بہن تو سب کی ایک سی ہوتی ہے۔

دلاور تقریباً دو گھنٹے بعد آیا "ہنی۔ تم سو رہی ہو!"

"نہیں... بس ایسے ہی۔" اس نے اداکاری کی "کیا وہ لوگ چلے گئے؟"

"ہاں۔ بیٹا بھی آ گیا ہے" دلاور نے کہا "وہ مجھے تلاش کرنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ بے وقوف..."

"گھر میں اب کوئی لاش تو نہیں ہے؟"

"نہیں ہے۔ ڈرو مت۔ چلو میں تم کو چھوڑ آؤں پھر مجھے کام ہے۔"

"میں چلی جاؤں گی۔ تم جاؤ۔ شوفر کو بھیج دینا۔"

دلاور نے کہا "کہاں سے بھیج دوں۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ وہ بچوں کو گھمانے لے گیا ہے۔"

"اب آ گیا ہو گا۔ کہیں سے فون کر دینا۔ شام کو ہم سب مری جا رہے ہیں۔"

"جاؤ بابا جاؤ" جان چھوڑو میری۔ یہ بتانے کے لیے تمہارا یہاں آنا بھی ضروری نہیں تھا" دلاور نے باہر جاتے ہوئے کہا۔

میں خاموش لیٹا نوشابہ کی ریاکاری دیکھتا رہا۔ دلاور کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ ایک ہی زنجیر میں جکڑے ہوئے دو قیدیوں کی طرح ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے پر مجبور تھے اور یہ زنجیر معاشرتی قدروں کی نہیں تھی۔ بچوں کی تھی جو ان کی مجبوری بن چکے تھے۔

دلاور کے جاتے ہی نوشابہ اٹھ کے باہر گئی اور کچھ دیر بعد لوٹ آئی "اب تم آزاد ہو۔"

میں نے باہر آتے ہوئے سوچا کہ کیوں نہ میں مکمل آزادی حاصل کر لوں۔ میں ایک ہاتھ مار کے نوشابہ کو بھی لٹا دوں اور اس کی گرفت سے نکل جاؤں مگر وہ میری توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوئی۔ میں بیڈ کے نیچے سے نکلا تو وہ اسی طرح ہاتھ میں ریوالور لیے کھڑی ہوئی تھی جیسے مجھے پہلی بار نظر آئی تھی۔

میں نے مسکرا کے کہا "اب یہ قتل کا سامان کس لیے۔ قتل تو تم پہلے ہی کر چکی ہو۔"

"مجھے بے وقوف مت سمجھو سکندر۔ میں مردوں کو سمجھتی ہوں۔ کسی حد تک میں تمہیں بھی جانتی ہوں" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "میرے جیسی عورت اگر یقین کر لے کہ تم واقعی اس کے حسن و شباب سے متاثر ہو گئے ہو تو وہ انتہائی بے وقوف عورت ہو گی۔ مجھے معلوم ہے اب کوئی مجھ سے لیلیٰ مجنوں والی محبت نہیں کر سکتا۔ ہاں جن کی ہوس کی پیاس گھر کے پانی سے نہیں بجھتی وہ میرے جسم کو بالکل کوکا کولا کی طرح قبول کر لیتے ہیں۔"

میں نے بے بسی سے کہا "پھر کیا حکم ہے میرے لیے۔ بس کوکا کولا۔"

"آگے چلو اور ڈکی میں لیٹ جاؤ۔ ڈکی میں نے کھول دی ہے راستے میں ڈکی کھول کے چھلانگ لگانے کی کوشش بھی مت کرنا۔ ڈکی اندر سے نہیں کھل سکتی۔"

میں نے کہا "اگر میں اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دوں تو؟"

"تو مجھے تمہیں گولی مارتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہو گی اور میرا شوہر میری دلیری کی داد دے گا۔ میں اسے بتا دوں گی کہ سکندر بجنت بد معاش تو بیڈ کے نیچے چھپا ہوا تھا اور میں باہر نکلی تو وہ میرے تعاقب میں آیا۔ اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ میرے پاس ریوالور ہے۔ بیڈ کے نیچے تمہاری موجودگی کے آثار پولیس خود تلاش کر لے گی۔ شاید تمہارے کچھ بال ہوں یا کھال کے ذرات۔"

میں نے ہتھیار ڈال دینا ہی بہتر سمجھا۔ وہ عورت بے حد خطرناک تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ ایک تو وہ دلاور کی بیوی تھی دوسرے زخم خوردہ عورت ناگن سے کم نہیں ہوتی۔ اس کا داؤ کچھ نہیں لگا ہوا تھا۔ وہ سب کچھ ہار کے بھی جیتنے کی پوزیشن میں

تھی۔

اس امید میں کہ تقدیر سے بہتری کی امید رکھنی چاہیے اور عورت سے حماقت کی۔ میں ڈکی میں جالیٹا۔ ڈکی کھٹ سے بند ہوگئی۔ میں نے گھپ اندھیرے میں ہاتھوں سے اس کا لاک کھولنے کی ناکام کوشش کی اور پھر تسلیم کرلیا کہ وہ ٹھیک کہتی تھی۔ ڈکی کا لاک یا چابی سے کھولا جاسکتا تھا یا ڈیش بورڈ پر بٹن دبا کے۔ اس گاڑی کا لاکنگ سسٹم الیکٹرونک بھی تھا اور سنٹرل بھی۔ بس ایک بٹن دبانے سے سارے دروازے اور ڈکی بند بھی ہوتے تھے اور کھلتے بھی تھے۔

صورت حال واقعی مضحکہ خیز اور ڈرامائی تھی۔ رابعہ یا غالب میں سے کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اس وقت میں کہاں ہوں۔ اگر میں انہیں بتاتا کہ مجھے دلاور کی بیوی نے اغوا کرلیا تھا اور اپنے ساتھ لے گئی تھی کیونکہ بے وقوفی یا بدقسمتی سے میں اس کے حسن وشباب کے لیے جھوٹے خوشامدانہ الفاظ استعمال کر بیٹھا تھا۔ تو میری بات کو پہلے مذاق ہی سمجھا جاتا۔

لیکن یہ مذاق نہیں بڑی سنگین حقیقت تھی کہ معاملات کچھ اور الجھ گئے تھے۔ کالیا کی بہن کی عزت ضرور بچ گئی تھی مگر کالیا مارا گیا تھا اور اس کی بہن ہماری ذمے داری بن گئی تھی۔ دلاور کے خلاف کچھ رسوا کن ثبوت ہمارے ہاتھ لگ گئے تھے، جن سے اسے بلیک میل کیا جاسکتا تھا مگر باقی سب جان بچا کے نکل گئے تھے اور میں دشمن کے قلعے میں اتنا اندر تک چلا گیا تھا کہ واپسی کا راستہ بھی مجھ پر بند ہوگیا تھا۔

ڈکی میں ہاتھ کے اوپر کارپٹ تھا مگر اس کے باوجود میں ہر جھٹکے پر اچھل رہا تھا۔ اپنے سر کو چوٹ سے بچانے کے لیے میں نے دونوں ہاتھ نیچے رکھ لیے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ نوشابہ مجھے کہاں لے جائے گی۔ اپنے گھر یا کسی خلوت گاہ میں۔ اس عورت کی تو جتنی عزت تھی وہ لٹا چکی تھی مگر میری عزت خطرے میں تھی۔ میں سوچتا رہا کہ اس آگ سے اپنا دامن بچانے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے... ابھی تک وہ میری طرف سے بدگمان نہیں ہوئی تھی۔ کوکا کولا کی بچی۔ اسے یہ بتانا بھی مشکل تھا کہ مجھے صرف گھر کا سادہ پانی پسند ہے۔ میں اسے استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے شرط یہ تھی کہ پہلے میں خود استعمال ہونا قبول کروں۔ میں نے اس فلسفے پر غور کیا کہ مقصد براری کے لیے جنگ کی حکمت عملی میں کچھ بھی غیر اخلاقی نہیں ہوتا مگر خود کو اس فلسفے پر عمل کرنے کے لیے قائل نہ کرسکا۔

سوچنا بے کار تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "بھئی اپنے سکندر اعظم صاحب۔ اب یا تو تدبیر کام آئے گی یا تقدیر۔ بہادری اور تدبیر اس لیے کام آئے گی کہ تمہارے مقابل ہے ایک عورت جو وہ ہوتی ہے کیا کہتے ہیں اسے 'ناقص العقل'۔ بہادری اس کی عقل تو ہوتی ہے ٹخنوں میں... کے سمجھتے ہو آپ... تمہاری عقل خیر سے بالکل صحیح جگہ پر ہے چنانچہ تم اس ناگن کو بھی ڈسنے سے پہلے قابو کرلو گے اور لاٹھی سلامت تمہارے ہاتھ میں رہے گی۔ انشاءاللہ۔"

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ میں نے خود کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ سب مطمئن ہوں گے کہ سارے کام ٹھیک ہوگئے۔ کالیا کی بہن خوش ہوگی کہ عین وقت پر ہم فرشتۂ غیب کی طرح امداد لے کر پہنچے اور کالیا نے بیس ہزار ایک ہوسناک بھیڑیے کے سامنے ڈال کے اس کے دامن عزت کو تار تار ہونے سے بچالیا۔ اب وہ بھائی بھی آتا ہی ہوگا۔ وہ اپنے محسنوں کا شکریہ ادا کریں گے اور جان بچانے پر زار ہو جائیں گے۔ افسوس لڑکی! کالیا سے زیادہ کوئی تیری تقدیر بھی ہے جس نے تجھے رسوائی کے عذاب سے بچالیا تو تنہائی کے عذاب میں گرفتار کردیا۔

گاڑی رک گئی اور میرے خیالات کا بے ہودہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ میں نے ہلکا سا کھٹکا سنا اور ایک ہاتھ سے ڈکی کو دھکیلا تو اس کا ڈھکن پورا اوپر اٹھ گیا۔ میں کود کے باہر آیا۔ نوشابہ اسی طرح میری جان کی دشمن بنی کھڑی تھی۔

میں نے مسکرانے کی فضول کوشش کرتے ہوئے کہا "یہ تو تمہارا پرانا گھر ہے۔ یہاں کیوں لائی ہو مجھے؟"

"معلوم ہوجائے گا" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "اندر چلو۔"

"قلوپطرہ ہر شب ایک غلام کو اپنی خواب گاہ میں طلب کرتی تھی اور صبح محل کی فصیل سے اس کی لاش دریا میں پھنکوا دیتی تھی۔" میں نے کہا۔

"نہ میں قلوپطرہ ہوں اور نہ تم غلام ہو۔ نہ یہاں محل ہے اور نہ دریا۔ پھر اس بات کا مقصد؟" اس نے مسکرا کے کہا "چلو شرافت سے اندر۔"

میں نے اندر کی جانب روانہ ہوتے ہوئے کہا "یہ ایک لطیفہ تھا۔ تمہیں ہنسی نہیں آئی تو سوری۔ میں اس بند دروازے سے نہیں گزر سکتا۔ میں بھوت نہیں ہوں۔ غالب کا سر بھوت ہے۔"

وہ میری بات پر مسکرائی بھی نہیں۔ اس نے چابیوں کا ایک گچھا میری طرف پھینک دیا "سات نمبر چابی لگاؤ۔"

"کیا کھل جا سم سم کہنے سے کام نہیں چلے گا۔" میں نے سات نمبر چابی لگاتے ہوئے کہا "سات میرے لیے مبارک عدد ہے۔ ایک طوطے کی معرفت مجھے معلوم ہوا تھا کہ ساتویں مہینے کی سات تاریخ کو میری شادی ہوگی۔ اس وقت میری عمر ستر سال ہوگی اور میری بیوی کی سات سال کم یعنی ستر۔ ہمارے سات بچے ہوں گے جن کی سات آنکھیں ہوں گی یعنی وہ کانے ہوں گے۔"

نوشابہ ہنس پڑی "دلاور یہ بھی کہتا تھا کہ تم کوئی ایسے ہی جوکر ہو۔ یہاں بیٹھ جاؤ اور فون کا ریسیور اٹھاؤ۔"

میں ڈرائنگ روم میں قدم رنجہ فرما چکا تھا۔ یہ نسبتاً قدیم طرز کا مکان تھا۔ اس کا فرنیچر بھی پرانا تھا۔ اس گھر سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں مگر آج میں یہاں ایک مجبور مہمان کی حیثیت سے لایا گیا تھا اور یہ بیک وقت تلخ و شیریں تجربہ تھا۔

نوشابہ نے مجھے ایک نمبر ملانے کو کہا اور ریسیور میرے ہاتھ سے لے کر ریوالور درمیانی میز پر عین میرے سامنے رکھ دیا پھر وہ اپنی بیٹی سے بات کرنے لگی اور اسے بتانے لگی کہ اسے کچھ دیر ہوجائے گی۔ وہ ایک ضروری کام نمٹا کے آئے گی۔ شام کو مری روانگی کا پروگرام طے ہے۔

میں نے اتنی دیر میں ریوالور اٹھالیا تھا۔ یہ اٹلی کا بنا ہوا بہت قیمتی کولٹ آٹومیٹک تھا۔ دلاور کی بیوی ایک پراسرار عورت تھی اور بلاوجہ مجھے حیران کررہی تھی۔ اس نے مجھے ریوالور اٹھانے سے بالکل نہیں روکا تھا۔

ریسیور رکھ کے وہ میرے سامنے بیٹھ گئی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیا سمجھوں۔ انتہائی احمق یا چالاک۔ تم مجھے گن پوائنٹ پر یہاں لائیں اور پھر گن میرے حوالے کردی" میں نے کہا۔

"یہاں مجھے تم سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔"

"وہاں کیا خطرہ تھا؟ ایک شریف اور نہتے آدمی سے؟"

"اگر دلاور یا اس کا کوئی جاسوس مجھے دیکھ لیتا تو میری پوزیشن محفوظ رہتی۔ مجھ پر یہ الزام نہ آتا کہ میں تمہیں ورغلا کے یہاں لائی ہوں۔"

"اور اگر اب کوئی آجائے؟"

"یہاں کوئی نہیں آئے گا" وہ بولی "ذرا میں گاڑی کو گیراج میں بند کر آؤں پھر بات کریں گے۔"

"تم مجھے... صرف باتیں کرنے کے لیے یہاں لائی ہو؟"

اس نے جاتے جاتے پلٹ کے مجھے دیکھا "ہاں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اس قسم کے مرد نہیں ہو جو بات کرنے سے پہلے ہاتھ پکڑتے ہیں۔"

اس کی واپسی تک میں سوچتا رہا کہ مجھے بھاگ جانا چاہیے یا اس کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے۔ کمرے کے نیم تاریک ماحول میں صرف ایک لائٹ تھی جس سے خاموشی بھی پراسرار لگتی تھی۔ اندر کئی ہفتے یا کئی مہینے کی حبس ہوا کی بو تھی۔ شاید ایک مدت سے ادھر کوئی نہیں آیا تھا۔ دلاور نے خطرات کے پیش نظر اپنی پرانی رہائش گاہ کو چھوڑ دیا تھا۔

وہ واپس آکے پھر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اب وہ ایک بالکل بدلی ہوئی عورت تھی۔ سنجیدہ اور باوقار "مجھے اس شادی کے بارے میں بتاؤ۔ کون ہے یہ کالیا کی بہن؟"

میں نے کہا "سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اسے دیکھا تک نہیں اور نہ میں اس کا نام جانتا ہوں لیکن آج دلاور اس سے نکاح کرنے والا تھا۔ غالباً یہ نکاح اس لڑکی کے ساتھ ایک دھوکا ہوتا۔"

پھر میں نے اسے مختصراً کالیا کے بارے میں بتادیا۔ نوشابہ کے چہرے کی کیفیت بتارہی تھی کہ میری بات سے اسے کتنا صدمہ ہوا ہے۔ وہ سخت مشتعل ہوگئی۔ "مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس نے کراچی میں بھی ایک شادی کررکھی ہے۔"

"سنا میں نے بھی ہے۔ تم نے اپنی سوکن کو دیکھا نہیں؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "تمہیں کس نے بتایا تھا؟"

"میرے دوست اخبار والے ہیں۔ وہ سب پتا چلا لیتے ہیں۔"

وہ سوچتی رہی۔ "میری ایک بیٹی ہے۔"

"وہی جس کی تصویر میں نے دیکھی تھی، اپنے شوہر کے ساتھ؟"

"ہاں۔ ابھی سال بھر پہلے اس کی شادی مرچنٹ نیوی کے ایک ریڈیو آفیسر سے ہوئی تھی" وہ ایک دم اداس ہوگئی "ندیم شادی سے پہلے بڑا اچھا لڑکا تھا۔"

"ندیم اسی کا نام ہے؟"

اس نے سرہلایا "سوہنی کے شوہر کا۔ میری بیٹی کا اصل نام تو ریحانہ تھا مگر وہ شروع سے اتنی خوب صورت تھی کہ ہم اسے سوہنی کہنے لگے اور پھر یہی اس کا نام ہوگیا۔ سوہنی لندن میں پڑھتی تھی۔ ندیم وہاں ریڈیو آفیسر کا کورس کررہا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے ملے تو بس..."

"یہ لو میرج تھی؟"

"ہاں۔ ندیم کو ایک یونانی شپنگ کمپنی نے بہت اچھی آفر دی اور اس نے وہ ملازمت قبول کرلی۔ ایک سال میں اس نے تین بار ملازمت چھوڑی۔ آج کل وہ لیبنن امریکن کمپنی میں ہے اور اس کی تنخواہ ایک سال میں تین گنا ہوچکی ہے۔ دوسرے فوائد الگ ہیں جو سب حاصل کرتے ہیں۔"

"جو ادھر کا مال ادھر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ غالباً یہی دیکھتے ہوئے دلاور نے اس کا رشتہ منظور کرلیا۔ اب مجھے شک ہے کہ ندیم کو دلاور کسی ناجائز مقصد کی خاطر استعمال کررہا ہے۔ سوہنی نے مجھے بتایا تھا کہ ندیم کے بارے میں عجیب وغریب خبریں مل رہی ہیں۔ ایک شخص نے گمنام فون کرکے سوہنی کو بہت کچھ بتایا تھا مگر اس بے وقوف لڑکی نے یقین نہیں کیا۔ اسے اپنے شوہر پر بہت اعتماد ہے۔ یہ نہیں سمجھتی کہ وہ داماد کس کا ہے۔"

میں نے کہا "کیا وہ اسمگلر ہے؟"

"اسمگلنگ تو کوئی خاص بات نہیں۔ تقریباً سب ہی کرتے ہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

www.paksociety.com

"وہ جب جہاز پر جاتا ہے تو اپنی بیوی کے ساتھ جاتا ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے مجھے افسردگی سے دیکھا "مگر سوہنی کبھی اس کے ساتھ نہیں گئی اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ہر بار اس کے ساتھ نئی بیوی جاتی ہے۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا "کیا... وہ بردہ فروشی کرتا ہے؟"

"اس کی بیوی قانونی ہوتی ہے۔ نکاح نامے اور پاسپورٹ کے مطابق۔ مگر وہ اس کے ساتھ واپس نہیں آتی۔ اسے وہ طلاق دے کر کہیں چھوڑ آتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی قانونی پوزیشن ہمیشہ بہت محفوظ رہتی ہے۔ وہ چاہے تو تین بھی ساتھ لے جا سکتا ہے۔ باہر کے ملکوں میں تو یہ تاثر عام ہے کہ مسلمان چار شادیاں کرتے ہیں اگر ایک پاکستان میں ہے تو کیا ہوا؟"

میں دم بخود بیٹھا رہا۔ بدبختی نوشابہ کے بعد اس کی سوتیلی بیٹی کا نصیب ہو گئی تھی۔ "نوشابہ، کیا وہ بنگالی لڑکیاں ہوتی ہیں؟"

"بنگالی... یہ خیال کیسے آیا تمہیں؟"

"اس لیے کہ وہ مشرقی پاکستان جاتا تھا تو موت کا سامان لے کر۔ مگر وہاں سے خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تھا۔ وہ کسی کی زندگی خرید لیتا تھا جس کے پاس جوان جسم ہو۔ لاوارث اور برائے فروخت۔"

شاید یہ اس کے لیے نئی پُرآزار اطلاع تھی۔ وہ اپنے آنسو پیتی رہی اور ہونٹ کاٹتی رہی۔ "سکندر۔ تمہیں دولت اچھی نہیں لگتی؟"

"دولت سے زیادہ اچھی چیزیں ہیں میرے پاس۔ خوشی ہے اپنے انسان ہونے پر۔ خدا مجھے کتا یا اس سے بھی گھٹیا جانور بنا سکتا تھا۔ اس نے مجھے اپاہج یا معذور نہیں بنایا۔ مجھے سب کچھ دیا جس کی خواہش کی جا سکتی ہے۔ ایک خوب صورت زندگی، صحت اور تعلیم، عزت اور محبت، مخلص دوست اور... پیار کرنے کی صلاحیت۔ لوگوں سے، اپنے وطن سے۔ کیا اس کے بعد دولت کی ضرورت باقی رہتی ہے؟"

"تم نے ٹھیک کہا۔ جن کے پاس یہ سب نہ ہو وہ دولت اکٹھی کرتے ہیں اور پھر دولت سے سب کچھ خریدنا چاہتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ خوشی اور محبت بھی خریدی جا سکتی ہے۔ مانا کہ دولت کماتے کماتے اس نے سب کچھ گنوا دیا ہے۔ میری محبت مر گئی ہے۔ اس کا قاتل خود دلاور ہے۔ وہ اپنی بیٹی سے بہت پیار کرتا تھا۔ سوہنی اب اس سے نفرت کرتی ہے لیکن اس کا مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ سوہنی اپنے باپ کی بیٹی کہلانا پسند نہیں کرتی۔ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ وہ ندیم سے نفرت کرنے لگی ہے۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ میں نے سوچا کہ مجھے یہ سب سننے کی کیا ضرورت ہے؟ نہ میرا اس عورت کی زندگی کے معاملات سے کوئی تعلق ہے اور نہ سوہنی سے۔ میں چاہوں بھی تو ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

نوشابہ نے آنسو پونچھ کے کہا "تمہیں معلوم ہے وہ کیا کرتا ہے، سوہنی کا شوہر۔ وہ بہت چنٹ، کم عمر نوجوان ہے اور بہت چرب زبان۔ غالباً اس میں سیکس اپیل بھی بہت ہے۔ سوہنی جیسی بے وقوف لڑکیاں آسانی سے اس کے جال میں پھنس جاتی ہیں۔ وہ ان سے لو میرج کر لیتا ہے اور انہیں ہنی مون کے لیے باہر لے جاتا ہے۔ سوہنی کو تو یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ کس شپ پر تھا، کب کراچی آیا اور کب گیا۔ مہینے میں ایک دوبار وہ گھر کا چکر بھی لگا لیتا ہے اور ڈھیروں سامان چھوڑ جاتا ہے۔ سوہنی کو سامان کی نہیں، شوہر کی ضرورت ہے مگر شوہر تو وہ نہ جانے کتنی لڑکیوں کا ہے اور وہ لڑکیاں بھی نہ جانے کون تھیں اور اب کہاں ہیں؟"

"تم یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہی ہو آخر؟"

"میں... میں چاہتی ہوں کہ تم کچھ کرو۔ تمہارے اخباری دوست..."

"مسز دلاور... نوشابہ۔ فرض کرو میں نے سب کچھ معلوم کر لیا۔ معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا؟ ندیم کی ملازمت ختم ہو جائے گی۔ وہ اندر ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے وہ جیل سے کبھی باہر نہ آئے۔ کیا پتا باہر لے جانے کے بعد اس نے اپنی بیویوں کو صرف طلاق دی یا انہیں کسی کے ہاتھ بیچ دیا اور جنہوں نے اس کی منکوحہ بیویوں کو خریدا انہوں نے بعد میں ان لڑکیوں کو کیسے رکھا۔ کنیز یا داشتہ بنا کے زبردستی۔ سرکش قسم کی لڑکیوں کو قید میں رکھا یا موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس دنیا میں جہاں چیف حکمران ہے شیطان کا قانون چلتا ہے جس کے سامنے انسان کا قانون بہت بے بس ہے۔ تم اپنے ساتھ سوہنی کی زندگی کو بھی داؤ پر لگاؤ گی۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔ تم میری مدد کرو۔ اس کے بدلے میں تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں دلاور کے خلاف تمہارا ساتھ دوں گی۔"

"وہ کیسے۔ تم بیوی ہو اس کی اور ہر بیوی بہت مجبور ہوتی ہے۔"

"لیکن ہر بیوی بہت کچھ جانتی ہے جو باہر کا آدمی جان ہی نہیں سکتا۔"

میں نے کہا "او کے۔ فرض کرو میں ندیم کے متعلق سب کچھ معلوم کر کے تمہیں بتا رہا ہوں پھر تم کیا کرو گی؟ اسے [illegible] سمجھنے والا آدمی نہیں ہوگا۔ اگر تم نے اسے بلیک میل کیا تو بیک وقت دو خطرناک دشمنوں سے کیسے مقابلہ کرو گی۔ دلاور اور اس کا داماد تمہاری اور تمہاری سوتیلی بیٹی کی زندگی کو جہنم بنا دیں گے۔ یا تم دونوں کو جہنم رسید کر دیں گے۔"

"تم ہماری فکر مت کرو۔ میں سنی سنائی پر اعتبار نہیں کرتی۔ مجھے ثبوت مل جائے پھر میں خود نمٹ لوں گی دلاور سے بھی اور اس سے بھی۔ جس نے میری سوتیلی بیٹی کی زندگی برباد کی۔ کیا تمہیں معلوم ہے دلاور نے مجھ سے کس طرح شادی کی تھی؟"

"وہ ضرور آپ پر مرتا ہوگا اور آپ کے چاہنے والوں کے مقابلے میں جیت گیا ہوگا۔ خوش قسمت تو وہ ہے ورنہ دلاور بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہو آیا..." میں کہنا چاہتا تھا کہ نوشابہ! مگر ایک بیوی کے سامنے اتنی بھیانک بات کہنا مناسب نہ تھا۔

"اس نے مجھے زبردستی حاصل کیا تھا۔ یوں سمجھ لو کہ کالیا کی بہو کو تم نے بچا لیا۔ مجھے بچانے کے لیے غیب سے کوئی فرشتہ نہیں آیا تھا۔ میرا بھائی نہیں، باپ تھا جو مجھے بیچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔"

"تمہیں یہ شادی منظور نہیں تھی... آخر کیوں؟"

"اس کی وجہ بہت معمولی ہے۔ میں کسی اور کو پسند کرتی تھی۔ دلاور کے مقابلے میں تو غریب تھا لیکن وہ انسان تھا۔ دلاور نہیں تھا۔"

"تم انکار کر سکتی تھیں۔ کیا تم میں بغاوت کی ہمت نہیں تھی؟"

اس نے کہا "ہمت تو بہت تھی۔ میں بے وقوفی کی حد تک بہادر تھی لیکن وہ شریف آدمی تھا اس لیے بزدل تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا کہ نوشابہ عام حالات میں سول میرج میں کوئی حرج نہ تھا مگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا باپ خودکشی کر لے گا۔ اس کے پاس دوسرا کوئی راستہ ہی نہیں رہے گا۔ میں تمام عمر احساسِ جرم کی اس خلش کے ساتھ نہیں گزار سکتا۔ میں اپنی محبت کو قربان کر سکتا ہوں مگر کسی بے بس آدمی کے خون کا الزام قبول نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا کہ الزام تم پر کیسے آ سکتا ہے تو اس نے کہا کہ نوشابہ! میں اس عدالت کی بات نہیں کر رہا تھا جہاں جھوٹی گواہی پر قاتل بھی بری ہو جاتے ہیں۔ میں تو اپنے اندر کی عدالت میں مجرم ثابت ہو جاؤں گا اور اپنے آپ سے بچ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے؟"

"وہ واقعی انسان تھا" میں نے کہا۔

"بس اس کے بعد میں نے نوشتۂ تقدیر جان کے خود کو دلاور کے حوالے کر دیا تھا۔ چوبیس سال کی جیل کاٹ چکی ہوں میں صرف ان بچوں کی خاطر جن کو میں پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی مگر انہیں پیدا ہونا تھا۔ مجھے بعد میں یہ بھی پتا چلا کہ میرے باپ پر مجبوری کا قرض ہماری رخصتی کے بعد بھی باقی رہا تھا۔ اس کو دلاور کے چنگل سے موت کے بعد رہائی ملی۔"

"کیا یہ موت طبعی تھی؟" میں نے کہا۔

"تم بہت ذہین آدمی ہو۔ کاش ندیم سے پہلے تم سوہنی سے ملے ہوتے۔ وہ ضرور تمہیں پسند کرتی اور یہ ناممکن تھا کہ تم اس کی محبت میں گرفتار نہ ہوتے۔ میں نے سنا ہے کہ جسے تم چاہتے ہو..."

"سوہنی وہی ہوتی ہے جسے مہینوال چاہے۔ اس ندیم کا پورا نام کیا ہے؟"

"ندیم ناصر۔"

"آج کل وہ کس جہاز پر ہے اور کہاں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ تو تمہیں معلوم کرنا پڑے گا۔"

"ابھی تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس سے مجھے کیا حاصل ہوگا۔ تم کیا مدد کر سکتی ہو میری؟"

"تم اپنے باپ کے قاتل کو تلاش کر رہے ہو نا؟ میں تمہیں اس کے بارے میں وہ سب بتا سکتی ہوں جو تمہیں معلوم نہیں ہے۔"

میں اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا "اگر ایسی ہی بات تھی تو تم نے مجھ سے پہلے رابطہ کیوں نہیں کیا تھا؟ آج کی ملاقات تو اتفاقیہ تھی۔"

"ہر کام کے لیے ایک وقت بہرحال مقرر ہے۔"

"یہ سب کچھ تم دلاور کے کہنے پر کہہ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا "تمہیں... جھوٹ بول رہی ہوں؟ یہی مطلب ہے نا تمہارا...؟"

"ہاں۔ جھوٹ سب بولتے ہیں اور دلاور وہ شاطر ہے جس کے پاس سارے مہرے ہیں۔ وہ اچانک کوئی مہرا ایسے آگے بڑھا رہا ہے کہ تقدیر ساتھ نہ دے تو حریف کو مات ہو جائے۔ سانپ کا ڈسا ہوا رسی سے ڈرتا ہے۔ ایک بار اکبر خان مجھے یقین کا فریب دینے میں کامیاب رہا تھا۔ وہ دلاور کا بھائی تھا اور اس یقین نے مجھے عذابوں کے بدترین جہنم میں جھونک دیا تھا۔ پھر اس کی بہن آگئی اور ابھی تک میں اس پر اعتبار کی سزا بھگت رہا ہوں۔ ان حالات میں یہ ناممکن نہیں ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو آگے بڑھا دیا ہو۔ وہ بڑا زبردست ایکٹر اور ڈائریکٹر ہے۔ جب وہ کوئی سچویشن پیدا کرتا ہے تو وہ حقیقت سے زیادہ حقیقی لگتی ہے۔ اکبر خان کی کہانی، شبلی کی کہانی اور تمہاری کہانی۔ ہر کہانی میں سچ کا وہ زہر تھا جسے میں نے سقراط بن کے قبول کر لیا مگر اب مجھے عقل آ گئی ہے مسز دلاور۔ میں کسی اور کے لیے نہیں مر سکتا۔ میں مروں گا تو صرف اپنے لیے یا رابعہ کے لیے۔ میں اظہارِ ہمدردی کر سکتا ہوں مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر یہ سب سچ تھا تو خدا تمہاری مشکل آسان کرے۔ جھوٹ تھا تو دلاور کو بتا دینا کہ اس کا شکار زیرِ دام آ کے نکل گیا۔"

اس نے ایک دم مجھ پر دیوانہ وار حملہ کیا "تم... تم بھی ذلیل اور کمینے مرد ہو۔ میں سمجھی تھی تم انسان ہو۔"

اس کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی حالت مجھ سے پوشیدہ نہ تھی۔ اس کے جذبات کا تغیر اس کی صورت سے عیاں تھا اور میں اس ردِعمل کے لیے ذہنی و جسمانی طور پر تیار تھا۔ اگر میں بے خبر ہوتا تو وہ اپنے ناخنوں سے میرا منہ نوچنے میں کامیاب ہو جاتی۔ میرے چہرے کو لہولہان کر دیتی اور میرے کپڑے پھاڑ دیتی۔

میں نے اس کے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ وہ پلٹ کے پیچھے گری اور پھر اٹھ کے آئی۔ میں نے دوسرا ہاتھ مارا اور اسے نیچے گرا دیا۔ وہ بے حس و حرکت ہو کے قالین پر لیٹ گئی۔ میں نے جھک کے اس کی نبض دیکھی تو اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ اس کا سانس بھی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میں نے اس کے دوپٹے سے اس کے ہاتھوں اور پیروں کو باندھا اور پھر فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

www.paksociety.com

نمبر ملتے ہی میں نے کہا "غالب۔"
غالب نے کہا "تم ابھی تک وہیں ہو، خدا کے بندے؟"
"نہیں۔ میں خدا کی ایک بندی کے ساتھ ہوں۔ وہ مجھے ورغلا کے یہاں لے آئی۔ تم تو جانتے ہو میں کتنا بھولا بھالا اور معصوم نوجوان ہوں۔"
"سیدھی طرح بات کرو، تم کہاں ہو؟"
"تم نے دلاور کا پرانا گھر دیکھا ہوگا۔ جہاں وہ شروع میں رہتا تھا۔"

غالب نے کہا "دیکھا ہے۔"
"وقار یوسف کی گاڑی میں وہاں آجاؤ۔ فوراً۔۔۔" میں نے ریسیور رکھ دیا اور نوشابہ کو دیکھنے لگا۔
وہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے ہاتھ پاؤں آزاد کرانے کے لیے زور لگا رہی تھی اور بل کھا رہی تھی۔ اس کی شعلہ بار آنکھیں مجھ پر نفرت کے زہریلے تیر برسا رہی تھیں۔ "کیوں باندھا ہے تم نے مجھے؟" وہ چیخ کے بولی۔
میں نے کہا "شور مچانے سے گلا بھی بیٹھ جائے گا۔ تم خود جانچ چکی ہو کہ ادھر کوئی نہیں آسکتا۔"
"تم کیا۔۔۔ کیا چاہتے ہو ذلیل انسان؟"
"کچھ نہیں۔ بس تم کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں کچھ دن۔"
"تم۔۔۔ تم پچھتاؤ گے۔"

"میں پچھتانے کا قائل نہیں۔ غلطی سب کرتے ہیں۔ میں بھی غلطی کرتا ہوں تو نقصان اٹھاتا ہوں مگر پچھتاتا نہیں۔"
"میں چلاؤں گی تو کوئی ضرور آجائے گا۔"
میں نے کہا "مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہارا منہ بند کردوں۔ یا تمہیں باتھ روم میں بند کردوں۔"
اس نے مجھے اپنی شکست مان لی۔ اس نے عورت کا آخری حربہ بھی آزما لیا۔ وہ رونے لگی "خدا کے لیے یہ مت کرو۔ تم آزاد ہو۔ مجھے چھوڑ دو۔ میری گاڑی میں چلے جاؤ لیکن مجھے ساتھ مت لے جاؤ۔ دلاور مجھے مار ڈالے گا۔۔۔ وہ بہت شکی آدمی ہے۔"
"وہ مجھ پر شک نہیں کرسکتا۔ کم سے کم تمہارے معاملے میں۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں خطرناک دشمن ضرور ہوں مگر ذلیل آدمی نہیں ہوں۔"

دس منٹ بعد غالب نے باہر سے ہارن بجایا تو میں نے دروازہ کھولا "آیئے، تشریف لایئے اسے اپنا ہی گھر سمجھئے۔"
غالب نے حیرانی سے نوشابہ کو دیکھا "یہ ہے وہ خدا کی بندی جو تمہیں ورغلا کے یہاں لے آئی تھی؟"

"یہ مسز دلاور ہیں۔ اصل نام نوشابہ ہے۔"
غالب اچھل پڑا "مسز دلاور۔ دلاور کی بیوی۔۔۔ اصلی؟"
"بالکل اصلی۔۔۔ اور پہلی" میں نے کہا "یہ ہمارے ساتھ جائیں گی۔"

نوشابہ کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے میں نے اسے غالب کے سپرد کیا "چاندی ہی تو اب تیرے حوالے۔"
"یار اس پینڈورا کے باکس کو میں کہاں لے جاؤں؟"
"اس سے پوچھو تو یہ کہے گی۔ ما بدولت کی میں قسمت کے بچی جائے جہاں لے چلے۔" میں نے دروازے کو پھر سات نمبر چابی سے لاک کیا اور اس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے "تم چلو میں تمہارے پیچھے آتا ہوں۔"
"کیسے آؤ گے۔۔۔ وہ رلگاؤ گے گاڑی کے ساتھ؟"
"اسے، یہ گاڑی ہے؟" میں نے گاڑی کو ایک لات ماری۔ "اس کھٹارے سے تو گدھا گاڑی اچھی ہوگی۔ ہم آئیں گے ایک بیش قیمت کیڈیلاک میں۔"
غالب نے ایک آہ بھری "کسی کیڈیلاک والی نے کبھی ہمیں نہیں ورغلایا۔ ملی بھی تو وہ بھوت کی بچی۔ قاتل حسینہ۔"
"میں مسز دلاور کو بتا چکا ہوں کہ تمہارا سسر بھوت ہے۔" میں نے گیراج کی طرف جاتے ہوئے کہا "ٹھیک ایک کلومیٹر کے بعد گاڑی روک لینا۔ خاتون کو ذرا سنبھال کے لے جانا۔ دلاور کی میں یہ دلاور کی مونث ہیں بالکل۔"
اس پرانے بنگلے سے دونوں گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہوئیں۔ میں نے غور کیا تو مجھے کار میں سیل فون بھی نظر آگیا۔ ایک فرلانگ کے بعد میں گاڑی روک کے آگے گیا۔ میں نے نوشابہ سے دلاور کا

نمبر پوچھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور خطرہ یہ تھا کہ کپڑا نکالا گیا تو وہ شور مچا کے راہ گیروں کو متوجہ کرلے گی۔
غالب نے ڈیش بورڈ میں دیکھا تو اسے ایک نوٹ بک اور پنسل مل گئی۔ "تم یہ نمبر لکھ سکتی ہو۔"
میں نے غالب کی تائید کی "اس کے لیے تمہارے ہاتھ کھولے جاسکتے ہیں۔ تمہیں منہ کھولنے کی اجازت بھی دی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ تم اپنی آواز کم رکھو اور حلق سے لاؤڈ اسپیکر کا کام نہ لو۔"
اس نے اقرار میں سر ہلایا اور میں نے گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس کے حلق سے کپڑا نکال لیا۔ میں پوری طرح چوکس تھا کہ اگر وہ چلانے کی ہمت بھی کرے تو اس کا منہ دبا لوں مگر وہ خاموش رہی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔
"تم میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کررہے ہو۔"
"اگر یہ ہمارا گھر ہوتا تو ہم دست بستہ خدمت کے لیے کھڑے نظر آتے اور تمہارے ہر حکم کی تعمیل کرتے مگر یہ سڑک ہے" میں نے کہا۔

"تم نے تو کہا تھا کہ تمہاری نظر میں ہر عورت ماں بہن یا بیٹی ہے۔"
"میں نے جو کچھ کہا تھا غلط نہیں تھا۔ میں اس بات پر قائم ہوں۔"
"دلاور کا موبائل نمبر تو مجھے معلوم نہیں" اس نے کہا۔

"اب یہ ایسی بات ہے جس پر اصولاً تمہارے جوتے پڑنے چاہئیں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ کیا یہ بات قابلِ یقین ہے کہ بیوی کو شوہر کا فون نمبر معلوم نہ ہو۔ تم سے کیسے بات کرتا تھا وہ؟"
"مجھ سے۔۔۔؟"
"میں گاڑی میں لگے ہوئے فون کا نمبر نہیں پوچھ رہا تھا۔ وہ شاید عجیب قسم کے ایف ایم بینڈ پر کام کرتا ہوگا اور کال کسی عام فون کے ذریعہ ملتی ہوگی۔ یہ بتاؤ کہ گاڑی سے دلاور کا تم سے رابطہ کس نمبر پر ہوتا تھا؟"
وہ تذبذب میں پڑ گئی "معلوم نہیں' اس وقت کہاں ہوگا وہ۔ ایسے تو بہت سے نمبر ہیں۔"
میں نے کہا "خاتون۔ زیادہ چالاک مت بنو۔ میں اس فون کے بغیر بھی اس کو پیغام دے سکتا ہوں لیکن اس کو پیغام دینے کے لیے تو پریشانی تمہیں ہوگی۔ ڈائریکٹ بات ہوجائے تو تمہارے حق میں اچھا ہے۔"
اس نے مجھے ایک نمبر دیا "اس پر کوشش کرلو۔"
"وہ خود ہوگا اس نمبر پر؟"
"نہیں ہوگا تو کوئی اور ملے گا۔ تم کہہ دینا کہ پیغام ہے ایکس وائی زیڈ ہے۔ اس کا مطلب ہے انتہائی اہم اور فوری پھر وہ خود بات کرلے گا تم سے مگر تم کیا کہو گے اس سے؟"
"یہی کہ آئے اور تمہیں لے جائے" میں نے کہا۔
"وہ نہیں آئے گا۔"
"تو کسی کو بھیج دے گا۔ تم خود بات کرلینا اس سے کہ یہ بدمعاش مجھے بے ہوش کرکے اغوا کرلایا ہے۔"
وہ جگہ ایسی تھی کہ دونوں گاڑیاں سڑک سے کافی فاصلے پر کھڑی ہوئی تھیں۔ غالب نے وقار کی گاڑی کا بونٹ اٹھا دیا تھا جس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ ایک گاڑی خراب ہوگئی ہے اور دوسری گاڑی اس کی مدد کے لیے رکی ہوئی ہے۔
کار فون لندن میں عام تھے۔ خصوصاً ٹیکسیوں میں لیکن دلاور کی شاہانہ کیڈیلاک میں وائرلیس فون کا سسٹم کچھ اور تھا۔ اسے سمجھنے اور آپریٹ کرنے میں مجھے تھوڑا سا وقت لگا۔ پہلا مسئلہ ایریل کا تھا جو ایک بٹن دبانے سے خود بخود باہر نکل کے اوپر اٹھ گیا۔ دوسرا سیل فون کی پاور لائن کا تھا۔ یہ سگریٹ لائٹر سے جوڑی گئی تھی۔
ریسیور میں لائٹ آتے ہی میں نے نوشابہ کا دیا ہوا نمبر ملایا۔ فوراً ہی دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ تین گھنٹیوں کے بعد کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔
"ہیلو ہیلو۔۔۔ کون بول رہا ہے؟"
دلاور نے آواز بدلی تھی مگر میں نے اسے لہجے سے پہچان لیا۔
"اسے چوہدری دلاور صاحب۔ کیا حال ہے خیر سے آپ کا؟"
"تم۔۔۔ سکندر رحمت۔ کیا بات ہے؟" اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ شاید اسے امید تھی کہ میرے خود فون کرنے کا مقصد

مصالحت کے سلسلے کا آغاز بھی ہوسکتا ہے۔ "اچھا سونگھ لیا تھا تم نے۔"
"تم کب پہچانے جیجے مجھے۔ بڑا افسوس ہے اپنے چوہدری صاحب' آپ اب بڑے ہوگئے ہو۔ نظر دھوکا دے جاتی ہے۔"
وہ ہنسا "شکر ہے عقل دھوکا نہیں دیتی۔ جو تم جیسے نوجوانوں کو اکثر دھوکا دیتی ہے۔ یہ بتاؤ فون کیوں کیا ہے؟"
"پوچھنا یہ تھا جناب عالی۔" میں نے اسی کے لہجے میں کہا "تیرا اس وقت حاضر اسٹاک میں خیر سے آپ کی کتنی بیویاں ہیں۔۔۔؟ یہی جی' ایک دو کہ تین؟"
وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا "تیری بھی ہوگی سکندر۔۔۔ تم پھول پہنے رہ جاؤ گے ساری دنیا میں۔"
میں نے کہا "میں تو حاضر اسٹاک کی بات کررہا تھا۔ اس وقت کتنی ہیں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں' خیر میں بتا رہا ہوں کہ جواب ہے ایک۔"
"اب بھی تم نے اصل بات نہیں کی۔ ایک بیوی ہے میری ٹھیک" دلاور نے کہا "آگے بولو۔"
"ایک کون سی۔ لاہور والی یا کراچی والی؟"
غالباً اسے میرے انکشاف سے الیکٹرک شاک لگا "کراچی والی!"
میں نے کہا "ہم سے مت چھپاؤ اپنے چوہدری صاحب۔ ہم تو یہاں بیٹھ کے اس کا ناک نقشہ بھی بتا دیں گے۔ پتا ٹھکانا بھی اور یہ بھی کہ خیر سے وہ کتنے دن بعد ماں بنے گی۔"
"اس طرح تم مجھے بلیک میل کرنے کی سوچ رہے ہو تو احمق ہو' بے شک یہ بات میری بیوی کو۔۔۔ میری پہلی بیوی کو معلوم نہیں مگر معلوم ہوجائے گی تو کیا ہوگا؟ تھوڑا سا شور کرے گی' روئے گی' پیٹے گی گھر جائے گی کہاں؟ اس کا کون سا میکہ ہے۔ ہیں جی' ایک وہ پاگل سا چرسی۔۔۔ اس کا بھائی۔"
میں نے کہا "چوہدری صاحب۔ میں بلیک میلر نہیں ہوں۔ کم سے کم ایسی فضول دھمکی سے آپ جیسے بڑے شکاری کو بلیک میل کرنے کی کوشش ایسی ہے جیسے کوئی چھرے والی بندوق سے شیر کو مارنا چاہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری بیویاں اس وقت کہاں ہیں۔ کس جگہ اور کس کے ساتھ؟"
"تو اس ختم کرو اپنی۔ کیا تم نے فردوس کو اغوا کرلیا ہے؟"
"فردوس یعنی جنت۔ جنت کو تو ہم واقعی اغوا کرکے لے گئے تھے لیکن وہ تمہاری بیوی کب بنی تھی" میں نے کہا "وہ تو انشاء اللہ تمہاری قاتل بنے گی کیونکہ تم نے اس کے بھائی کو مار دیا ہے۔"
"وہ جو چاہے کرے۔ تم جیسے الو کے پٹھے نہ جانے کب سے یہ حسرت لیے پھر رہے ہیں۔ میں اس کی بات نہیں کررہا تھا۔"
"اوہ۔ میں سمجھ گیا۔ یہ کراچی والی زوجہ ثانی ہوں گی۔ نہیں جناب عالی' ہم نے تو آپ کی پہلی بیوی کو اغوا کیا ہے۔ جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ۔"

"تو شاہ کو؟ بکواس کرتے ہو تم؟"

"میں تو بہت کچھ کرتا ہوں دلاور۔ جو تم اچھی طرح جانتے ہو۔ مثلاً اس وقت میں تمہاری شاندار کیڈیلاک چلا رہا ہوں اور تم سے تمہارے ہی کار فون پر بات کر رہا ہوں۔ یہ بھی بکواس ہے تو مجھے کال کر کے دیکھ لو۔" میں نے ریسیور بند کر دیا۔

میری توقع کے عین مطابق آدھا منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ کار فون "بیپ بیپ" کرنے لگا اس کی ننھی سی سرخ روشنی جلنے بجھنے لگی۔

"چوہدری دلاور اسپیکنگ" میں نے اسی کی آواز بنا کے کہا۔

"سکندر۔ یہ تم نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے" دلاور اب غرا رہا تھا۔

میں نے ہنس کے کہا "کلہاڑیاں اب میرے پیروں پر اثر نہیں کرتیں۔ اتنی بار ماری ہیں کہ یاد بھی نہیں۔"

"تم پکڑے جاؤ گے۔ گاڑی خود اپنا پتا دے گی۔"

"گاڑی پکڑی جائے گی۔ یہ تو ہو سکتا ہے مگر اس کے ساتھ میں بھی پکڑا جاؤں یا تمہارے بچوں کی اور جعلی ماں تمہیں مل جائے یہ ذرا مشکل ہو گا۔"

"میں بات کرنا چاہتا ہوں نوشابہ سے۔"

"بسم اللہ۔" میں نے کہا "تمہیں شرعی حق حاصل ہے اپنی منکوحہ کی آواز سننے کا۔"

میں گاڑی کو اسٹارٹ کر کے تھوڑا سا آگے لے گیا اور اسے وقار کی گاڑی سے ملا کے کھڑا کر دیا۔ وقار کی گاڑی سڑک کی جانب رہی۔ کھڑکی کھول کے میں نے ریسیور ساتھ والی کھڑکی سے پاس کر دیا۔

"دلاور۔ انہوں نے مجھے اغوا کر لیا ہے۔ میرے گھر سے اور کہاں سے.... میرا وہاں آنا غلطی نہیں تھا۔ جو کچھ وہاں ہو رہا تھا وہ غلط تھا.... اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں ادھر تھوکنے بھی نہ آتی۔ کیا سنوں میں.... تم نے کبھی سنی میری۔ میں کہتی تھی کہ بہت ہو گئی اب بس کرو ورنہ باہر کی آگ تمہارے گھر کے اندر پہنچ جائے گی۔ اس کو گالیاں دینے سے کچھ نہیں ہو گا۔ اندھے ہو تم اور تمہارے سارے۔"

میں نے کہا "مختصر بات کرو۔ دلاور لمبی بات کر کے وقت لینا چاہتا ہے مسز دلاور۔"

"اچھا سنو۔ میں.... دماغ خراب ہے تمہارا۔ وہ اسی کوٹھی میں چھپا بیٹھا تھا۔ تمہارے شکاری کتے اس کی بو بھی نہ پا سکے اور نہ وہ قانون کے رکھوالے جو تمہارے جرائم پر پردہ ڈالتے آئے تھے۔ تمہارے جاتے ہی وہ آ گیا۔ میں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر کار تو اندر ہی تھی۔ ریوالور نکالنے کا موقع کہاں ملا مجھے۔ ڈرائیور ساتھ ہوتا تو کیا کر لیتا.... وہ بھی مارا جاتا۔ میرے ساتھ کوئی برا سلوک تو نہیں ہوا.... ہاں بے ہوش نہ ہوتی تو میں شور مچاتی.... چلتی گاڑی سے کود جاتی۔ اب بھی ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں میرے۔ دلاور۔ انہوں نے صرف تم سے بات کرانے کے لیے منہ سے کپڑا نکالا تھا۔"

میں نے ریسیور لے لیا "اچھا جی! اپنے چوہدری صاحب۔ خیر سے آپ نے اپنی گھر والی کی زبانی سب سن لیا۔ اب ہم چلتے ہیں۔"

"سنو۔ کہاں جا رہے ہو؟"

"سوئزرلینڈ براستہ ہانگ کانگ" میں نے کہا۔

"آخر کیا چاہتے ہو تم۔ بات کرو۔"

میں نے کہا "بات کرنے کے لیے ایک عمر پڑی ہے اپنے چوہدری صاحب جی۔ یار زندہ صحبت باقی۔"

میں نے ریسیور بند کیا۔ گاڑی کی چابیاں نکالیں اور گلوز کمپارٹمنٹ کو خالی کر دیا۔ اس میں گاڑی کے کاغذات کے علاوہ ایک چیک بک تھی اور ایک لفافے میں تقریباً دس ہزار روپے پھر میں نے ڈکی کھولی۔ اس میں مجھے ایک سب مشین گن نظر آئی۔ میں نے اسے خالی کر کے بے مصرف کر دیا۔ گاڑی کو لاک کرنے سے پہلے میں نے بونٹ کھولا اور وہ سب تار نکال لیے جو نکالے جا سکتے تھے۔ ایک رومال سے میں نے ہر اس جگہ کو پہلے ہی رگڑ کے صاف کر دیا تھا جہاں میرے فنگر پرنٹ ہو سکتے تھے۔ تار میں نے وقار کی گاڑی میں ڈال دیے اور چابی غالب کے حوالے کر دی پھر میں نے کار فون کا ریسیور بھی کھینچ لیا۔

"اب تم جاؤ۔ مسز دلاور کو وی آئی پی مہمان بنا کے رکھو۔"

"تم.... تم مجھے کہاں لے جاؤ گے؟" وہ چلانے لگی "دلاور مجھے لینے آ رہا ہے۔"

"اس میں شور کرنے کی کون سی بات ہے۔ وہ پھر آ جائے گا۔ ایک بار نہیں دس بار آئے گا اگر اسے تمہاری ضرورت ہے۔ ظاہر ہے اب محبت کا مسئلہ تو ہے نہیں" میں نے کہا اور اسے دبوچ کے پھر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔

"دلاور اب تمہیں ضرور پہچان لے گا۔" غالب نے کہا۔

"اب کی بات مت کرو بیٹے۔ تم شرط ہار چکے ہو۔ جاؤ اپنے یار غازی کے گھر۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔"

گاڑی کے جاتے ہی میں نے ادھر ادھر دیکھا اور سڑک عبور کر کے ایک پیڑ پر چڑھ گیا جہاں سے میں دلاور کی کار پر نظر رکھ سکتا تھا۔ مشکل سے پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک ساتھ دو گاڑیاں آئیں اور کیڈیلاک کے آگے پیچھے رک گئیں۔ ایک گاڑی میں سے دلاور برآمد ہوا اور دوسری میں سے استاد پیڈرو۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔

تقریباً سو گز کے فاصلے سے میں ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا لیکن ان کی حرکات و سکنات سے ان کی ہیجانی کیفیت عیاں تھی۔ گاڑی کو لاک دیکھ کے پیڈرو نے اس پر لات ماری۔ دلاور نے اسے غصے سے دیکھا اور پھر جیب میں سے ڈپلی کیٹ چابی نکال کے دروازہ کھول لیا۔ وہ غصے کے باوجود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹیلی فون ریسیور جیسا ایک آلہ بھی تھا۔ شاید اس کی کار میں حفاظتی اقدام کے طور پر کوئی ایسا الیکٹرک سسٹم بھی نصب تھا جو مسلسل سگنل نشر کرتا تھا اور اس سے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ گاڑی کس سمت میں ہے۔ سمت کا تعین ہونے کے بعد سگنل کی قوت دیکھتے ہوئے عین اس جگہ پہنچنا مشکل نہ تھا جہاں گاڑی موجود ہے۔ یہ عام قسم کے "سگنل ڈی ٹیکٹر" (SIGNAL DETECTOR) یا ریڈار کے اصول پر کام کرنے والے آلات تھے۔ اگر ملک کے اندر کہیں سے خفیہ نشریات جاری ہوں تو ان کا سراغ بھی انہی کی مدد سے لگایا جاتا ہے۔

دلاور کو یہ ڈر ضرور تھا کہ کسی دن وہ گاڑی سمیت اغوا ہو جائے گا یا اس کے بیوی بچے۔ گاڑی کو چوری سے بچانے کا یہ نظام تھا جو ضرورت پڑنے پر اس کے کام نہیں آیا تھا۔ تار الگ ہو جانے کے بعد گاڑی کا الیکٹرانک نظام بے کار ہو گیا تھا جس میں الیکٹرانک لاک، پاور ونڈو اور اگنیشن وغیرہ شامل تھے۔ اب گاڑی اسٹارٹ بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسی پرتعیش اور پرتکلف گاڑیوں میں یہی خرابی ہوتی ہے۔ جب ان کا خودکار نظام جواب دے جائے تو وہ عام گاڑیوں کی طرح چلنا اپنی توہین سمجھتی ہیں۔

دلاور نے یقیناً مجھے بہت گالیاں دی ہوں گی مگر میں درختوں کی شاخوں میں چھپا ہوا اس کی جھنجلاہٹ اور بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں دلاور کی بیوی کا سائلنسر والا ریوالور تھا۔ اگر میں چاہتا تو یہیں سے نشانہ لے کر دلاور کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیتا اور اسے پتا بھی نہ چلتا کہ گولی کہاں سے آئی تھی مگر اسے ختم کر دینا میرا مقصد نہیں تھا۔

دلاور اور پیڈرو کے ساتھ دو دو محافظ بھی آئے تھے جو منتظر تھے کہ کہاں ملے تو وہ دشمن کو بھون کے رکھ دیں مگر دشمن چھلاوہ بن کے غائب ہو چکا تھا۔ دلاور بڑے غور سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کچھ آتے جاتے لوگوں سے بھی پوچھا اور اس کے حکم پر اس کے غلام دونوں طرف کے گھروں میں بھی گئے۔ یہ سب نئی کوٹھیاں تھیں جہاں عام لوگ نہیں رہتے تھے کہ وہ منہ اٹھا کے اندر چلے جاتے۔ ایک حکم کا غلام عین اس درخت کے نیچے سے گزرا جس پر میں بڑی فراغت سے بیٹھا ہوا تھا۔

انہیں ہر طرف سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر کسی کوٹھی کے اندر سے کوئی ملازم یا مالی مجھے پیڑ پر چڑھتا دیکھ لیتا تو یہ ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے گھیر لیتے مگر ایسی صورت میں قریب آنے سے پہلے ہی چاروں کے چاروں غلام مارے جاتے اور دلاور کے ساتھ پیڈرو جان بچا کے بھاگنے کی سوچتے ہی میں خود بھی نو دو گیارہ ہو جاتا۔

دلاور سمجھ گیا تھا کہ میں نے گاڑی کو چلنے کے قابل نہیں چھوڑا ہے اس نے میری ساری تخریبی کارروائی کا پہلی نظر میں ہی اندازہ کر لیا ہو گا۔ اس کے پاس چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی اعلیٰ نسل کی سواری کو گھٹیا گاڑی کے پیچھے باندھے اور کھینچ کر لے جائے۔ یہ خدمت استاد پیڈرو کے سپرد ہوئی۔ میں گاڑی کو آہستہ آہستہ دور جاتا دیکھتا رہا۔

دلاور اب بھی وہیں موجود تھا اور اس کے ساتھ حکم کے دو غلام رہ گئے تھے۔ اس نے انہیں بھی غیر مسلح کر دیا تھا۔ ان کی سب مشین گنیں پیڈرو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ دلاور نے اپنی جیب میں سے بھی ریوالور نکال کے گاڑی میں ڈال دیا تھا۔ اس نے یہ سب کارروائی بڑے واضح انداز میں کی تھی۔ وہ چالاک آدمی یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ میرا کہیں آس پاس موجود ہونا بعید از امکان نہیں۔ وہ مجھے یہ دکھانا چاہتا تھا کہ اب اسلحہ کسی کے پاس نہیں اور میں چاہوں تو مذاکرات کے لیے تشریف لے آؤں مگر میں دلاور کی رگ رگ سے واقف تھا اور اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ ان سب کے پاس دوسرے ریوالور بھی ہوں گے۔

دلاور کی تشویش سے مجھے خوشی ہوئی۔ اگر وہ بیوی کو اہمیت نہ دیتا تو کبھی یہاں نہ آتا۔ بات صرف بیوی کی ہوتی تو وہ کہتا کہ سکندر اعظم صاحب شوق سے رکھو اس سیکنڈ ہینڈ عورت کو اپنے پاس۔ بازار میں نئی بہت ہیں میرے لیے مگر معاملہ تھا اس کے بچوں کا۔ اگر ان کو ماں واپس نہ ملتی تو وہ دلاور کو عاق کر دیتے۔ دلاور بیوی کو چھوڑ سکتا تھا بچوں کو نہیں اور بچوں کی وجہ سے وہ بیوی کو ہر قیمت پر واپس حاصل کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے اس بار جو گیم کھیلا تھا اس میں تقدیر نے میرا ساتھ دیا تھا۔ میں نے کالیا کی بہن کو شکار ہونے سے بچا لیا تھا اور تقدیر نے دلاور کی بیوی کو خود شکار ہونے بھیج دیا تھا۔ کالیا کی موت کے باوجود یہ بڑی کامیابی تھی۔

دلاور نے آدھے گھنٹے بعد ہمت ہار دی۔ اس نے سمجھ لیا ہو گا کہ بیوی کو بہ زور بازو واپس لے جانا ممکن نہیں اور جیسا کہ اغوا کر کے تاوان وصول کرنے والوں کا مروجہ طریقہ کار ہے میں نے بھی پہلی بار اسے صرف یہی دیکھنے کے لیے بلایا تھا کہ وہ اکیلا آتا ہے یا اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ؟

آدھے گھنٹے بعد اس نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہاں اکیلا ٹھہرتا۔ جیب میں ریوالور ہوتا تب بھی اسے یہ خدشہ لاحق ہوتا کہ میں اچانک کہیں سے ٹپک پڑوں گا اور بیوی کی طرح شوہر کا اغوا حماقت کے ایک ڈرامے کا حرف آخر بن جائے گا۔ وہ نامور کار دلاور تھا اور اس کی بہادری آتشیں اسلحے اور حکم کے غلاموں کی طاقت پر منحصر تھی۔ شاید وہ خود کو ہر صورت آزاد رکھنا بہتر سمجھتا تھا۔ اگر وہ بھی شکار ہو جاتا تو پھر سوتنی کے اماں ابا کو چھڑانے والا کوئی نہ رہتا۔

دلاور دوسری گاڑی میں بیٹھ کے نکل گیا تو میں نے اترنے کا ارادہ کیا اور ملتوی کر دیا۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ میں دس منٹ انتظار کر لوں۔ اس احتیاط نے مجھے محفوظ رکھا۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ کار واپس آ گئی۔ میں ایک سمت سے آنے والی سب ہری گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ دلاور ہرے رنگ کی ایک فورڈ اسکورٹ میں گیا تھا۔ دور سے میں اس کا نمبر نہیں لوٹ کر سکتا تھا مگر وہ لوٹ کر آئی تو عام رفتار سے نہیں بہت آہستہ آہستہ گزری۔ ظاہر

www.paksociety.com

ہے ولاور اطمینان سے جائزہ لے رہا تھا کہ میں اپنی کمین گاہ سے نکل آنے کی حماقت کروں تو غیر متوقع طور پر پکڑا جاؤں۔

ولاور کو دوسری بار مایوسی ہوئی تو میں نے پیڑ کے اوپر سے کہا۔ "فکر مت کرو اپنے چوہدری صاحب۔ اب ہماری ملاقات ضرور ہوگی۔ یہیں جی اور ہمارے گراؤنڈ پر ہوگی۔ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ ہم تمہیں وہاں بلائیں گے جہاں تم دم دبائے آؤ گے۔ اتنا تو پتا چل ہی گیا ہے کہ تمہیں نوشابہ نہیں اپنے بچوں کی ماں کی ضرورت ہے۔"

مزید دس منٹ کے بعد میں نے اترنے کا فیصلہ کیا۔ میں جس شاخ پر بیٹھا بلکہ لیٹا ہوا تھا وہ درخت کے تنے کا حصہ تھی۔ تنا اوپر سے انگریزی حرف وائی کی طرح دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور یہ حصہ نسبتاً چوڑا اور سیدھا تھا۔ تالی یعنی شیشم کے اتنے بڑے درخت میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔

پریکٹس نہ ہونے کی وجہ سے درخت پر چڑھتے ہوئے میری کہنیاں چھل گئی تھیں۔ اترتے ہوئے میں توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ نیچے والی کمزور شاخیں میرے وزن سے جھکنے لگیں تو مجھے چھلانگ مارنی پڑی۔ بلندی اب بھی کافی تھی۔ عقلمندی مجھ سے یہ سرزد ہوئی کہ میں شاخ پکڑ کے جھول گیا چنانچہ لچک کے ساتھ کافی نیچے پہنچ کے گرا۔ اس سے میری ٹڈی پسلی بچ گئی۔

دو بچے جو وہاں گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ ایک مولانا صاحب جو سائیکل پر ہانپتے ہوئے محو سفر تھے (حالانکہ وہ منن کے مولوی کو دھوتے ہوئے سائیکل کو ہانپنا چاہیے تھا) اور بس کے انتظار میں کھڑی ہوئی ایک عورت سب دم بخود رہ گئے۔ میں نے سب کو مسکرا کے دیکھا اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔ جس کا جو دل چاہے سمجھے، مجھے کیا؟

ولاور کی کار سے ملنے والی رقم میری جیب میں تھی۔ میں نے ایک ٹیکسی کو روکا اور اسے غازی کے گھر کا پتا بتایا تو اس کی گردن دائیں بائیں ہلنے لگی۔ میں زبردستی بیٹھ گیا۔

"یار انکار سے دل مت توڑو۔ پیسے بے شک دگنے لے لو۔ مال حرام بہت ہے میرے پاس۔"

"بات پیسوں کی نہیں یار۔ میری مرضی نہیں تو بس۔"

میں نے کہا "چلو پھر میں یہ ٹیکسی خرید لیتا ہوں۔ بولو کتنے میں دو گے جیسی تم کو گھر چھوڑ دوں گا۔"

وہ سمجھ گیا کہ میں پاگل نہیں تو ضرور خود دماغ ہوں اور عام ٹیکسی ڈرائیوروں والا رویہ میرے ساتھ نہیں چلے گا۔ وہ چل پڑا۔ "بڑی زیادتی ہے۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ٹیکسی میری ہے۔"

میں نے کہا "یہی تو غلط فہمی ہے تمہاری۔ یہ ٹیکسی ہے کار ہوتی تو تمہاری ہوتی۔ ٹیکسی پبلک پراپرٹی ہوتی ہے۔ کیسی بھی ہو۔" میں نے اسے آنکھ ماری جس کا مطلب اس نے سمجھ لیا۔ ٹیکسی کا لفظ اس زمانے میں طوائف یا کال گرل کے لیے بھی مستعمل تھا۔

"میں نہ جاتا تو تم کیا کر لیتے" کیا بگاڑ لیتے میرا؟"

"میں بار بار کے تمہارا حلیہ بگاڑ دیتا" میں نے اطمینان سے کہا۔ "آج رات تم اسپتال میں گزارتے۔ گھر نہ جاتے۔"

اس نے سخت مشتعل ہو کے پیچھے دیکھا اور شاید اپنی صحت کا موازنہ میری صحت سے کرتے ہوئے خاموش ہو جانا بہتر سمجھا۔ غازی کے گھر سے کچھ فاصلے پر میں نے اسے سو کا نوٹ دیا۔ وہ دیر باقی رقم واپس کرنے کے لیے جیب ٹٹولتا رہا۔ پھر ایک دم گاڑی گیئر میں ڈال کے بھاگ گیا۔ دراصل گاڑی پہلے سے گیئر میں تھی۔ کلچ چھوڑ کے اس نے پوری ریس دی اور گویا مجھ سے بدلہ لے لیا۔ میں چاہتا تو اسے دوڑ کے بھی پکڑ لیتا مگر میں نے مسکرا کے کہا "جاعیش کر پتر۔ ہمارا کون سا باپ کا مال تھا" اور غازی کے گھر والی گلی میں داخل ہو گیا۔

غازی ٹانگ پر پٹی باندھے لیٹا ہوا تھا اور غالب روٹھا کر رہا تھا۔ "اس کی تو خیر عقل میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔ جب اسے کسی لڑکی کے ساتھ بھاگ جانا چاہیے تھا تب تو وہ ڈٹا رہا اور عاشقانہ عمر نے یونہی ایسے ہی گزار دی۔ کسی چاہنے والی کے ساتھ فرار ہوئے بغیر۔ اب اس عمر میں جب تمہارے اللہ اللہ کرنے کے دن تھے۔"

میں نے اندر داخل ہو کے بہ آواز بلند کہا "اللہ اللہ۔ کیا اور بیان ہے۔ مرزا غالب میں شرم سے ڈوب مرنے کے لیے کہاں جاؤں؟"

غازی اٹھ بیٹھا "وہ آیا تھا... ولاور...؟"

میں نے کہا "کیسے نہ آتا وہ ایسے آیا جیسے..."

"شمع پر پروانہ آتا ہے" غازی نے کہا۔

"پرانی گھسی پٹی تشبیہ ہے مگر خیر۔ وہ شمع کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"شمع یعنی پانچ بچوں کی اماں اندر ہے۔ اسے یہاں لا کے تم نے میری عزت داؤ پر لگا دی ہے۔ محلے والے جانتے ہیں کہ میں اکیلا ہوں۔ یہاں کبھی کسی عورت نے قدم نہیں رکھا۔"

"وہ تمہیں بتا رہا تھا کہ تمہارے ہونے والے سسرال سے لوگ آئے تھے محلے والوں کو دیکھنے" غالب نے کہا "مخدوش خراب ہو تو آدمی مکان نہیں لیتا۔ رشتہ کیسے کر سکتا ہے... رشتہ نہیں ہوا۔"

میں اندر گیا تو نوشابہ ایک پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ابھی اسی طرح بندھے ہوئے تھے اور اس کا منہ بھی بند تھا۔ ظاہر ہے وہ سخت تکلیف میں تھی۔

میں نے کہا "میں معافی چاہتا ہوں اس سلوک کی لیکن یہ رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ تمہارا شوہر آیا تھا مگر جب خانہ لے کر۔ بندوق اور گولی کی زبان میں بات کیسے ہو سکتی تھی وہ واپس چلا گیا۔ میں اسے پھر بلاتا ہوں۔ اس میں کچھ وقت تو لگے گا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور التجا تھی۔

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ شام کو تمہارا پروگرام اپنے بچوں کے ساتھ سرکس جانے کا تھا۔ وہ یقیناً پریشان ہوں گے۔ باپ کے اعمال کی سزا اولاد کو بھگتنی پڑتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ولاور اس بات کو چیلنج نہیں دے گا کیونکہ اس میں سب کی بدنامی ہے۔ بچوں کو سمجھا سکتا ہے کہ تمہاری امی بہت جلد خیریت سے لوٹ آئیں گی۔ ولاور اتنا ضرور جانتا ہے کہ میں کمینہ شخص نہیں ہوں۔ آپ تمہیں اس وقت تک ہماری قید میں رہنا ہوگا جب تک ہمارے اور ولاور کے درمیان کوئی معاہدہ نہ ہو جائے۔ یہ تم پر منحصر ہے کہ تم یہاں قیدی بن کے رہنا چاہتی ہو یا مہمان بن کے؟"

رابعہ میرے پیچھے آ کے کھڑی ہوئی تھی "مسز ولاور۔ آپ تعاون کریں تو مشکلات کم ہوں گی۔ ہمارے لیے بھی اور آپ کے لیے بھی۔"

"ورنہ ہم آپ کو ایسے بھی رکھ سکتے ہیں۔ انجکشن دے کر سلا بھی سکتے ہیں" میں نے کہا "مہمان بن کے تم دیکھو گی کہ ہم آپ میزبانی میں نہ پٹھانوں سے پیچھے ہیں اور نہ تکلف میں اہالیان لکھنؤ سے۔"

اس نے سر ہلا کے اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو میں نے اسے کھول دیا۔ دوپٹہ کوئی سخت رسی نہیں تھی مگر خود نوشابہ نازک سی عادی نہ تھی۔ اس کی کلائیوں پر دوپٹے سے بھی نشانات پڑ گئے تھے۔ جب میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا تو کچھ دیر وہ چپ بیٹھی رہی اور آنسو پونچھتی رہی۔ رابعہ نے زیادہ رقیق القلب ہونے کا ثبوت دیا اور بڑے دوستانہ انداز میں اس کے پاس بیٹھ کے اسے تسلی دینے لگی۔ نوشابہ کو اپنی نہیں بچوں کی فکر تھی۔

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ میں نے ولاور سے کہہ دیا تھا کہ انہیں سمجھا دے۔"

"آخر مجھے قید کر کے تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "مسز ولاور۔ تمہارے شوہر نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ میرے عزیز ترین دوست کی بہن کو بیوہ کرنے کی دھمکی دے چکا ہے۔ ان کا ہمارے معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا مگر اس نے ان کے جنرل کو اٹھوا لیا تھا۔ ہم اسے احساس دلانا چاہتے ہیں کہ یہ بازی نہیں کھیلنی ہے لیکن ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔ ہمارے تو بیوی بچے ہی نہیں ہیں۔ وہ بیوی کے لیے اتنا پریشان تھا۔"

"تم غلط کہتے ہو۔"

"وہ پریشان نہ ہوتا تو آتا ہی کیوں۔ یقین کریں اسے سخت پچھتاوا تھا۔ ابھی آدھے گھنٹے میں اس سے پھر بات ہوگی۔"

"میں بات کروں گی اس سے۔"

"سوری خاتون۔ اب یہ ممکن نہیں" میں نے کہا "رابعہ۔ ان کے نہانے کا بندوبست کرو۔"

رابعہ نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے غالب کو اندر نکالا اور خود باہر آ گیا "اسے ہم یہاں نہیں رکھ سکتے۔ غازی نے کہا ہے۔"

"پھر کہاں لے جائیں؟"

"میں نے نازو کو کالیا کی بہن کے ساتھ اپنے گھر بھیج دیا تھا۔ وہ ٹیکسی میں گئے ہیں۔ گاڑی گلی کے باہر کھڑی ہے۔"

"اوکے۔ قدرت کو اگر یہی منظور ہے کہ لوٹ کے بدھو گھر کو جائیں یعنی بدھن کے تو پھر چلو۔"

ہم غازی کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر اس نے انکار کر دیا "میں ٹھیک ہوں۔ معمولی زخم ہے۔ اس سے بڑے زخم کھائے ہیں زندگی میں۔"

"لیکن تم اکیلے ہو۔"

"یہ سارا محلہ میرا خاندان ہے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ تم جاؤ" وہ بولا۔

آدھے گھنٹے بعد ہم پھر رابعہ کی اسی عالی شان کوٹھی میں تھے۔ جہاں میں ایک منٹ کے لیے بھی قید میں رہنے پر تیار نہ تھا۔ نازو ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی۔ میں نے پہلی بار کالیا کی بہن کو دیکھا تو مجھے حیرانی ہوئی۔ وہ معمولی شکل و صورت کی عام سی لڑکی تھی۔ ایسی پری جمال نہیں تھی کہ ولاور اس پر جان و دل سے فریفتہ ہو کے شادی کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ یقیناً اسے کچھ دن کھلونا جان کے کھیلتا اور پھر توڑ دیتا یا چھوڑ دیتا۔ بھائی کا بیس ہزار کا قرض اپنی آمد سے اتار کے اور شاید رسید کے طور پر گناہ کی نشانی اپنے ساتھ لے کر واپس آ جاتی۔ ابھی تک اسے علم نہیں تھا کہ اس کے بھائی نے اب اپنا قرض جان دے کے ادا کر دیا ہے۔ وہ ہم سب کی اتنی ممنون تھی کہ بار بار کہہ رہی تھی کہ "آپ نے خرید لیا ہے مجھے بیگم صاحب۔ میں ساری عمر غلامی کروں گی آپ کی۔ بس مجھے اپنے قدموں سے دور نہ کریں۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں۔"

یہ الگ مسئلہ تھا۔ اسے آج نہیں تو کل یہ بتانا ضروری ہوگا کہ اب اس کا بھائی نہیں رہا۔ وہ بتا چکی تھی کہ دنیا میں اس کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں۔ اس صورت میں اسے گھر سے بھی نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ رابعہ اور نازو نے مل کے طے کیا کہ فی الحال اسے وقار یوسف کے پاس چھوڑا جائے جہاں یہ گھر کا کام کاج کرے اور خوش رہے۔ اسے سمجھا دیا جائے کہ کالیا ابھی ولاور کے خوف سے روپوش ہو گیا ہے۔ اور موقع ملتے ہی آئے گا۔

اب رات ہو چکی تھی۔ ولاور کی بیوی نے رابعہ کی محل نما کوٹھی کو حیرانی سے دیکھا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اتنی دولت مند و کیل عورت اس طرح میرے ساتھ خوار ہو رہی ہے۔ پھر وہ مطمئن ہو گئی تھی کیونکہ رابعہ کے ساتھ نازو بھی اس کی خدمت میں مصروف ہو گئی تھی۔ کالیا کی بہن کی نوشابہ کی نظر میں کیا اوقات تھی۔ اس کے جذبات پھر بھی سوکنوں والے ہو گئے تھے کہ یہ عورت میرے شوہر کو مجھ سے چھین رہی تھی۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس کا شوہر اس عورت کی عزت لوٹ رہا تھا۔ شوہر کو تو ایک عورت پہلے ہی چھین چکی تھی جسے نوشابہ نے دیکھا تک

www.paksociety.com

نہیں تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ انتظار کے اس وقفے میں دلاور پر کیا بیت رہی ہوگی۔ درمیان میں دو بار ٹیلی فون کی گھنٹی بجی مگر کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا تو دلاور کی بیوی نے کہا "کیا پتا یہ دلاور ہی ہو۔"

میں نے کہا "زیادہ امکان اسی بات کا ہے۔"

"پھر بات کیوں نہیں کرتے؟"

غالب نے مسکرا کے کہا "وہ دلاور ہے ہر ٹھکانے پر فون گھما رہا ہوگا۔ ہم نہیں چاہتے کہ دلاور اندھیرے میں تیر چلائے اور وہ نشانے پر جا لگے۔"

"ہم نے اسی لیے یہ اندھیرا کر دیا ہے۔ اگر اس نے یہاں آنے کی حماقت کی تو بلاوجہ خون خرابہ ہوگا مسز دلاور۔ جو بات مذاکرات سے حل ہو جائے اس میں طاقت استعمال کرنے سے نقصان ہو جاتا ہے۔"

دو گھنٹے بعد میں نے باہر آ کے رفیق یوسف کی کار کے ریڈیو ٹرانسمیٹر کو استعمال کیا "کون بول رہا ہے؟" کسی نے کہا۔

"کیا تمہیں یہ چوہنی کی آواز لگتی ہے؟" میں نے کہا "دلاور کہاں ہے؟"

"کون دلاور؟" اس نے [illegible] پوچھ لیا۔

"وہ تمہارا باپ اور کون۔ اس سے کہو کہ فوراً لائن پر آ جائے ورنہ میں اس کی بیوی کو تنہا کر دوں گا۔"

"بکواس مت کرو۔" اس نے مجھے مشتعل ہو کے گالی دی۔

"جو میں نے کہا ہے وہی کہنا اس سے۔" میں نے جواب میں رنگے رزان کی گالی لڑھکائی "ورنہ خود دلاور تمہاری کھال کا ڈھول بنا کے تمہارے سو تم پر بجائے گا۔"

کسی بدمعاش کی طرح بات کیے بنا بات نہیں بنی تھی۔ وہ چپ ہو گیا اور میں نے سوئچ آف کر دیا۔ رابعہ آئی اور میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

"ہم تو وقت گزارنے کے لیے گئے تھے۔"

میں نے سنجیدگی سے کہا "عزیزہ۔ ہر چیز اپنے مرکز سے بھاگنا چاہتی ہے لیکن کشش ثقل اسے کھینچ لیتی ہے۔ انشاء اللہ ہم پھر فرار ہوں گے۔"

"اور پھر آئیں گے یہیں۔ ٹھنڈی کھوئی..."

"یہ کھوئی کے بارے میں کہا گیا ہے۔ گھوڑے پر یہ تہمت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ... میرا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم کسی کے ساتھ نہیں ہوں گے تاکہ ہماری وجہ سے کسی پر وقت نہ آئے۔"

اسی وقت ریڈیو کی لائٹ آن ہو گئی۔ میں نے اس کا والیوم کھولا اور دلاور کی آواز آئی "تم نے ثابت کر دیا کہ تم ذلیل ہو۔"

میں نے کہا "میں نے تمہاری شرافت دیکھ لی تھی جو تم درگاروں میں اپنے ساتھ لائے تھے۔"

"سیدھی طرح بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے مگر تم انجان بن رہے ہو۔ ایک تو یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ جو معاملات میرے اور تمہارے درمیان ہیں ان میں تیسرا فریق نقصان نہیں اٹھائے گا۔"

"تیسرا فریق کون ہے... تم سب ایک ہو۔"

"میری مراد غیر متعلق لوگوں سے تھی۔ محسن اور گل شادی کر کے الگ ہو گئے ہیں۔ فوزیہ کے شوہر کی طرح بھی کل تک شوہر پہ ہاتھ مت ڈالنا۔"

"پولیس نائک منی کو پکڑ لے تو الزام مجھے مت دینا۔"

"نائک منی کا منہ بولا بھائی ہے محسن موتی۔ وہ طمنچی ناک سے کم نہیں ہے دلاور۔ اگر وہ تمہارے بچوں کو بھی بازار اٹھا لے تو تم بھی مجھے الزام مت دینا۔"

مجھے دلاور کی صورت کا تصور کر کے خوشی ہو رہی تھی۔ وہ غصے میں زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا ہوگا۔ دل میں نہ جانے کیا ارادے باندھ رہا ہوگا کہ ایک بار یہ مٹھی میں آ جائے تو کہاں کا رعب اور کیسی وارننگ۔ وہ ایک ایک کا بینڈ بجائے گا۔ وہ دل ہی دل میں مجھے ایسی گالیاں دے رہا ہوگا جو پولیس والے ملزموں کو دیتے ہیں اور بدترین عذاب کے ساتھ مجھے اور میرے لواحقین کو ہلاک کرنے کا عہد کر رہا ہوگا لیکن یہ سب کل کی باتیں تھیں۔ کوٹ آج بھی ہوئی تھی۔

میں نے کہا "میں تم سے وعدہ نہیں لوں گا اس لیے کہ تمہارے وعدے کی حیثیت جعلی نوٹ کے برابر بھی نہیں ہو سکتی۔ میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔"

"چلو جی، ہم ہو گئے خبردار۔ اپنے سکندر اعظم صاحب نے فرمایا۔"

"مجھے بیڈروم چاہیے۔" میں نے کہا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے کہا "چاہیے کا مطلب؟"

"مطلب اردو میں بالکل صاف اور واضح ہے۔ بیڈروم میرے حوالے کرو۔ اپنے بچوں کی ماں لے جاؤ۔"

"یہ... ناممکن ہے۔"

"میں تمہیں کل تک سوچنے کی مہلت دوں گا۔" میں نے کہا۔ "تم بچوں کو بہلا سکتے ہو کہ آج وہ ماں کے ساتھ مری کیوں نہیں جا سکے۔ کل شام کو وہ براہ راست ماں کی آواز سنیں گے اور یہ آزمائش کے وہ خوش نہیں ہوں گے اپنے چوہدری صاحب۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔ مجھے معلوم ہے۔"

"وقت نے تم کو بہت کچھ سکھایا ہے۔ پہلے جو بچہ اپنے پیروں پہ کھڑا نہیں ہو سکتا وہ سو میٹر کی دوڑ جیت لیتا ہے بعد میں۔ سکندر کل نہیں کر سکتا تھا آج کرنے پر مجبور ہوگا۔ تمہاری چالوں نے اسے ماہر شکاری بنا دیا ہے دلاور۔ ورنہ وہ تو شریف آدمی تھا۔ شرافت کی ٹریفک آخر کب تک یک طرفہ چل سکتی تھی۔"

"اچھا۔ بیڈروم تمہیں مل جائے گا۔" دلاور نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "لیکن آج نہیں۔"

"کل۔ پرسوں۔ جب تمہارے پاس مال ہو۔ اس ہاتھ دینا اس ہاتھ لے جانا۔ تمہاری امانت محفوظ ہے۔"

"سنو۔ میں اس سے بات کروں گا۔"

"سوری۔ تمہارا پیغام دیا جا سکتا ہے۔ ریسیور وہ سب سن رہی ہے۔"

"جھوٹ مت بولو۔ وہ سن رہی ہے تو بولتی کیوں نہیں؟"

میں نے کہا "مہربانی ہے شاید۔ یا پھر تم سے خفا ہے۔ ایک بات اور سنو اپنے چوہدری صاحب۔ تمہیں دوسرا بیڈروم مل سکتا ہے مگر بچوں کو تم اصل ماں کہاں سے لا کے دو گے۔ وہ تمہیں بھی معاف نہیں کریں گے اگر تم نے ان کو ماں جیسی نعمت سے محروم کیا۔ بیڈروم تو تمہیں مل ہی جائے گا۔ آج نہ سہی کل۔"

"تم نے نوشی کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی؟" وہ سخت پریشان تھا۔

"وہ مہمان ہے ہماری۔ ہم اس کو سیر کرا رہے ہیں شہر کی۔ وہ بہت مطمئن ہے۔ ابھی ہم باہر کہیں کھانا بھی کھائیں گے اور پھر کہیں رات بھی گزاریں گے۔ ایم آر اقبال کے کیمپ میں اس کی پہلی رات انتہائی مشکل سے گزرے گی۔ شاید اسے نیند نہیں آئے۔ ہم باتیں کریں گے اس سے۔ بہت سی باتیں وہ بتا چکی ہے تمہارے بارے میں۔ اس کی نوکری اور دیگر مشاغل کے بارے میں۔"

"تم نے ضرور مارپیٹ کیا ہے اسے۔" دلاور نے چیخ کر مجھے ایک گالی دی۔

میں نے فلمی ولن کی طرح ایک قہقہہ لگایا اور ریسیور رکھ دیا۔

"تم بھی بڑے مسخرے باز ہو گئے ہو۔"

"میں ہادر تو تھا۔ کیا خیال ہے ایک رومانٹک سین ہو جائے" میں نے رابعہ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"بدتمیزی مت کرو" وہ گھبرا گئی "ابھی کوئی آ جائے گا اندر سے۔"

"دیکھو چاند نکلا ہوا ہے ایک اوپر... ایک میرے سامنے۔ ایک مجھے کباب کی طرح لگ رہا ہے دوسرا پراٹھے کی طرح۔ پراٹھا ہے کیوں نہ میں کباب ہی کھا لوں۔ بھوک میں تم مجھے شامی کباب لگ رہی ہو۔"

اس نے خود کو چھڑا لیا "اپنی شکل دیکھی ہے۔ جلے ہوئے پراٹھے جیسی ہو رہی ہے۔" اس نے مجھے انگوٹھا دکھایا اور اٹھ گئی۔

میں نے ایک آہ بھری اور گاڑی بند کر دی "میں نے سنا ہے تم بھی پکا ہوا پراٹھا لگ رہی ہو۔ ویسی ہی شکل بنائی ہے میں نے اس بات پر۔ کیوں نہ ہم رات کو کہیں جا کے پراٹھا کباب کھائیں۔"

"شامت اعمال آواز دے رہی ہے تمہیں۔"

"دیکھو جو ہونا ہے وہ یہاں بھی ہو سکتا ہے۔ ایک گاڑی میں سب جا سکتے ہیں۔"

"مسز دلاور نمبر ایک" اور نہ ہونے والی مسز دلاور نمبر تین کا کیا ہوگا۔ وہ ہمارے ساتھ کیسے جا سکتی ہیں؟"

"انہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ کالیا کی بہن اور نوشابہ کے لیے کھانا لے آئیں گے" میں نے کہا "چلو غالب سے بات کرتے ہیں۔ وہ کیا کہتا ہے؟"

غالب نے تھوڑا سا تامل کیا "تم پھر اپنے ذہن پر آنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"اس وقت ہمیں جو برتری حاصل ہے......"

غالب نے میری بات کاٹ دی "اگر دلاور نے ہم میں سے ایک دو کو اٹھا لیا تو حساب برابر ہو جائے گا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھا ہوگا۔"

نازو نے بھی کہا "کیا پتا وہ باہر نگرانی کر رہے ہوں۔ ہم نے یہاں آ کے عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ ایک تجربہ ہمیں پہلے ہو چکا ہے۔ اس نے ہماری ساری گفتگو سن لی تھی اور ریکارڈ کر لی تھی۔"

"وہ تہ خانے کی بات تھی" میں نے کہا۔

"تم کیسے یقین سے کہہ سکتے ہو۔ تہ خانے میں کسی کو کچھ نظر نہیں آیا تھا اور نہ محسوس ہوا تھا" غالب نے کہا "یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس نے پورے گھر میں جاسوسی کے آلات نصب کر رکھے ہوں؟"

نازو بولی "پھر تو ہم سب کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

میں نے کہا "میں تمہاری رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ جب تک دلاور کی بیوی یہاں ہے وہ کوئی کارروائی نہیں کر سکتا۔ اس کی بیوی کے ساتھ ہم جہاں بھی ہوں گے محفوظ ہوں گے۔ وہ گاڑی میں ہمارے ساتھ ہوگی تو کوئی بھی گاڑی پر فائرنگ نہیں کرے گا۔"

رابعہ نے اندر سے آ کے کہا "نوشابہ اپنے بچوں سے بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ بہت رو رہی ہے۔"

نازو نے غالب کی طرف دیکھا "بات کرا دو۔ اس کی بھی تسلی ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "ابھی تک اس کے بچوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ان کی ماں کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ دلاور ان کو بہلا چکا ہوگا۔ ذرا سوچو، بچوں کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں اور خود نوشابہ نے ہمارے خلاف کچھ کہہ دیا تو کیا ہوگا۔ یا ٹیلی فون ایکسچینج کی معرفت دلاور نے پتا چلا لیا کہ کال یہاں سے ہوئی تھی پھر؟"

بہت بحث مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ ہم دلاور کی بیوی کو کالیا کی بہن کی نگرانی میں چھوڑ کر جائیں گے۔ کالیا کی بہن ریوالور نہیں چلا سکتی تھی اور اکیلے رہ جانے سے ڈرتی تھی لیکن ہمارے سمجھانے سے مان گئی۔ دلاور کی بیوی کو ایک بیڈروم میں بند کر دیا گیا جس سے باہر آنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ یہ دروازہ مقفل کر کے چابی کالیا کی بہن کو دے دی گئی۔ خود کالیا کی بہن نے اپنے کمرے کو اندر سے کنڈی لگا کے لاک کر لیا اور لائٹس آف کر کے سو گئی۔ ان دونوں میں سے کسی کا موڈ بھی کھانے کا نہیں تھا۔

www.paksociety.com

ہم تاریکی میں باہر آئے مگر سڑک کی روشنی اتنی تھی کہ باہر سے ہماری نگرانی کرنے والا کوئی بھی شخص گاڑی کو باہر نکلتا دیکھ سکتا تھا۔ جتنی دیر ہم اندر رہے تھے ٹیلی فون کی گھنٹی وقفے وقفے سے بجتی رہی تھی۔ یہ منظر یا وقار یوسف بھی ہو سکتے تھے۔ رابعہ کا کوئی موکل یا غالب کا دوست بھی ہو سکتا تھا اور خود دلاور بھی جو تصدیق کرنا چاہتا ہو کہ ہم یہاں ہیں یا نہیں۔ دلاور بے وقوف نہیں تھا۔ وہ سمجھتا ہو گا کہ ہم اپنی غیر موجودگی اسی طرح ثابت کر سکتے ہیں کہ ریسیور نہ اٹھائیں مگر وہ بار بار نمبر ملا رہا تھا شاید اس امید میں کہ تنگ آ کے یا غلطی سے کوئی ریسیور اٹھا لے۔ یقین نہ سہی اسے شک ضرور ہو گا کہ ہم یہاں بھی پناہ گزین ہو سکتے ہیں۔

احتیاطاً میں نے غالب کو ٹیکسی لانے کے لیے باہر بھیجا۔ وہ ٹیکسی کو کمپاؤنڈ کے اندر لے آیا۔ ٹیکسی وقار کی گاڑی کے پیچھے رک گئی۔ غالب نے گیٹ بند کر دیا "باہر کوئی ہے۔"

"کون ہے؟" میں نے کہا "تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟"

"دوسری طرف دو افراد خاصے مشتبہ انداز میں کھڑے ہوئے تھے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھا تو وہ ایک کار میں بیٹھ چکے تھے جو خاصے فاصلے پر کھڑی تھی۔"

میں نے دیوار کے اوپر سے دیکھنے کی کوشش کی "کون سی گاڑی ہے؟"

غالب نے کہا "دائیں جانب پچاس ساٹھ گز دور نیلی کار ہے۔"

میں نے کہا "دائیں جانب کوئی کار ہی نہیں ہے۔ ایک فرلانگ تک۔"

اب غالب نے دروازے سے جھانکا۔ "ابھی تو تھی۔"

"شک ہوگا تمہارا لیکن شک کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے" میں نے کہا "تم نازو کے ساتھ نکلو اور بہتر ہے کہ کالیا کی بہن کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ اگر کوئی تمہارا تعاقب کرے تو گھوم کے واپس آ جانا۔ ورنہ پانچ منٹ بعد دوسری گاڑی میں ہم روانہ ہو جائیں گے۔ تم کالیا کی بہن کو چھپا کے رکھنا۔ اسے کہنا کہ پچھلی سیٹ پر سر نیچے رکھے۔ میں یہی احتیاط رابعہ کے ساتھ کروں گا۔ کوئی تعاقب کرے تو یہی سمجھے کہ گاڑی میں دو افراد ہیں۔"

ٹیکسی والا شور کر رہا تھا کہ دیر کیوں ہو رہی ہے۔ اسے ہماری حرکات و سکنات بھی شک میں مبتلا کر رہی تھیں۔ غالب نے اسے تھوڑا سا دم دلاسا دیا اور چند منٹ بعد وہ نازو کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ کالیا کی بہن پچھلی سیٹ پر بیمار بن کے لیٹ گئی تھی۔ میں گیٹ بند کر کے باہر جھانکتا رہا۔ میں نے غالب کو سمجھایا تھا کہ وہ خطرہ محسوس کرے تو پیچھے آنے والوں پر فائر کھول دے۔ ٹیکسی والا خود ہی ڈر کے گاڑی کو بھگائے گا۔ بازار میں یقیناً بھگدڑ مچے گی اسی سے فرار میں مدد ملے گی۔ غالب نے مجھے بتا دیا تھا کہ گڑبڑ ہوئی تو وہ سیدھے اپنے اخبار کے دفتر چلے جائیں گے۔ ہم پرانا کباب کھائیں یا دھکے کھائیں ہماری مرضی۔

غالب کے خدشات غلط نہیں تھے۔ ابھی ٹیکسی باہر نکلی ہی تھی کہ سائیڈ کی کسی گلی سے ایک نیلے رنگ کی کار برآمد ہوئی اور میرے سامنے سے گولی کی طرح گزر گئی۔ میں نے اندر بیٹھے ہوئے افراد کی صورت کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ میری زیادہ توجہ نمبر پلیٹ پر تھی لیکن نمبر جان بوجھ کے خراب کر دیے گئے تھے۔ چند سیکنڈ بعد میں نے ایک فائر کی آواز سنی پھر دوسرا فائر ہوا۔ اس کے بعد شور مچ گیا۔ چوک سے پہلے ہی گاڑیوں کے بریک لگانے، ہارن دیے اور آپس میں ٹکرانے کی آوازوں کے ساتھ بہت سے لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں تو میں اندر بھاگا۔

دو منٹ بعد میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ گاڑی اسٹارٹ کرے۔ یہ وقار یوسف کی کار تھی جسے دلاور اینڈ کمپنی کے شکاری پہچانتے تھے۔ بظاہر اس میں صرف ایک عورت تھی اور وہ رابعہ قاری ایڈووکیٹ تھی جو کار چلا رہی تھی۔ پچھلی نشست پر میں دلاور کی بیوی کو دبوچے لیٹا ہوا تھا۔

رابعہ نے گاڑی کو مخالف سمت میں دوڑاتے ہوئے اپنی نظر عقب نما آئینے پر رکھی اور ہر لمحے رننگ کمنٹری سے آگاہ کرتی رہی کہ پیچھے کون ہے۔ پہلے ایک میل میں رابعہ نے کئی گاڑیوں کو اوورٹیک کیا مگر کسی گاڑی نے ہم تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔ رابعہ نے دو موڑ کاٹے۔ میں اپنے پیروں کے قریب سب مشین گن لیے بالکل تیار تھا کہ کوئی راستہ کاٹے تو اسے اڑا دوں۔

دلاور کی بیوی اتنی دہشت زدہ تھی کہ دبکی پڑی تھی۔ شاید میرے بارے میں اس کا ابتدائی تاثر غلط ہو گیا تھا۔ اب میں اس کے نزدیک کسی بھی عام دہشت گرد سے مختلف نہیں تھا چنانچہ مجھ سے شرافت یا رعایت کی توقع عبث تھی۔ شاید اس کا شوہر میرے بارے میں ٹھیک ہی کہتا تھا کہ وہ کتے کی دم ہے۔ اور خود کتا ہے جو بھونکتا بھی ہے اور کاٹتا بھی ہے۔

ایک جگہ رابعہ نے کار کو بریک لگا کے روک دیا۔ وہاں رات کا اندھیرا تھا اور خاموشی تھی "سکندر۔ غالب اور نازو کا پتا کرو۔"

"کیسے پتا کروں؟"

"ان کے آفس چلتے ہیں" وہ بولی۔

"ابھی وہ آفس نہیں پہنچے ہوں گے" میں نے کہا اور کار کے ریڈیو کو آن کر دیا۔ اس کی سرخ لائٹ چمکنے لگی۔

ہمیشہ کی طرح وہی بلڈاگ کی غراہٹ سنائی دی "کون بول رہا ہے؟"

میں نے بھی وہی جواب دیا "تمہارا نام نہاد باپ۔"

اس نے قہقہہ لگا کے کہا "چوہدری صاحب۔۔۔" پھر پیچھے کسی نے اس سے ریسیور چھین لیا اور میں نے چیختی ہوئی آواز سنی "سکندر اعظم کی ناجائز اولاد۔ مجھ سے بات کرو۔ میرے بدلے میں دلاور کی بیوی واپس کرنا چاہتے تھے تم؟"

میں نے کہا "ٹھیک ہے تم نے۔ تمہارا دھڑ میرے کسی کام کا نہیں صرف سر مل جائے تو بھی غنیمت ہے۔"

"نہیں۔۔۔ یہ بھی تمہیں ملے گا" اس نے ایک ناقابل اشاعت لفظ استعمال کیا۔

میں نے کہا "ظاہر ہے جو چیز تمہارے باپ کے پاس نہیں تھی وہ تمہارے پاس کہاں ہو گی؟"

اس نے مجھے لگاتار گالیاں دیں "تم سے سودا کر لیا ہے دلاور نے اس لیے تم بول رہے ہو مگر تمہاری بولتی بند ہو جائے گی سکندر۔ میں کوئی کتا نہیں ہوں اس کا کہ میری زنجیر تمہیں پکڑا دے۔"

میں نے کہا "اس کا کتا ہے خاصا وفادار، معتبر اور خوددار جانور ہے اپنا موازنہ اس سے مت کرو۔ وہ برا مانے گا۔"

"سنو۔ ایک آفر میری بھی ہے۔"

"میں سن رہا ہوں۔"

"تم شکیلی کی لاش کا پتا بتا دو۔ میں بتاؤں گا کہ تمہارے باپ کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں۔"

میں نے پھر کسی ولن کی طرح قہقہہ مارا "چوہدری۔ جب تمہارا آقا تمہیں میرے حوالے کر دے گا تو پھر میں خود سب کچھ معلوم کر لوں گا۔ اور تم بتا دو گے۔ ایسی کی تیسی تمہاری آفر کی اور تمہاری۔ دلاور سے کہہ دینا کہ اسے ایک موقع اور ملے گا۔ پھر میں سمجھوں گا کہ وہ جنگ کو محدود رکھنا نہیں چاہتا۔ خاندانوں اور رشتوں کو بھی داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہے۔ اگر ایسا ہے تو سکندر اس کے چیلنج کو قبول کرتا ہے۔"

میں نے پھر ریڈیو آف کر دیا اور ایریل کو دبا دیا۔ ابھی رات کے دس بجے تھے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ رابعہ کے گھر سے نکل کے ہم نے اچھا ہی کیا تھا۔ دلاور فارغ نہیں بیٹھا تھا۔ اس نے ہمارے تمام ٹھکانوں پر پہرے بٹھا دیے تھے اور وہ راتوں رات کاؤنٹر ایکشن سے اپنی بیوی کی بازیابی کا پروگرام بنا رہا تھا۔

رابعہ نے کہا "تم کہو تو میں یہاں سے فون کر لوں۔"

"یہاں کون سے ماموں رہتے ہیں تمہارے" میں نے اس کوٹھی کی طرف دیکھا جس کی طرف رابعہ نے اشارہ کیا تھا۔

"کوئی شریف آدمی کسی خاتون کو مدد کے لیے ایک فون کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "بشرطیکہ وہ آدمی واقعی شریف ہو اور خاتون تم جیسی حسین نہ ہو۔ وقت رات کا نہ ہو اور وہ اکیلا نہ ہو۔"

"تم تو بس بولنا جانتے ہو" وہ کار سے اتر کے کسی پرائی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ گئی اور کال بیل بجانے لگی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔

نوشابہ نے کہا "خدا کے لیے میری بات دلاور سے کرا دو۔ بہت زیادہ خرابی ہو گئی۔ وہ پاگل ہو رہا ہو گا۔"

"ہم اس کے پاگل پن کا علاج کر رہے ہیں" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "جب کمزور دب جاتا ہے تو شہ زور کو پہلے سے زیادہ طاقت دیتا ہے۔ اس کا دماغ جب درست ہو گا جب اس کا یہ گھمنڈ ٹوٹے گا کہ سب سے بڑی طاقت نہ وہ ہے نہ اس کی دولت۔ طاقت اوپر والا دیتا ہے تو چوہے کے مقابلے میں بلی بھی دم دبا کے بھاگنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔"

"تم باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہو۔"

"تم اپنے آنسو ضائع کر رہی ہو۔ دلاور کی بیوی کو تو مجسم دلیری ہونی چاہیے۔"

رابعہ اندر غائب ہو گئی تھی۔ میں دیکھ نہیں سکا تھا کہ اسے اندر لے جانے والا کون ہے۔ وہ پانچ منٹ کے بعد باہر آ گئی۔

"میں نے اخبار کے دفتر فون کیا تھا غالب نہیں ملا۔"

"میں نے اور کیا فرمایا تھا۔"

"پھر میں نے وقار کو بتا دیا کہ وہ کسی کی طرف سے فکر مند نہ ہو۔ سب ٹھیک ہیں۔ یہ نہیں بتایا کہ میں کہاں سے بات کر رہی ہوں۔"

"اس نے اپنی گاڑی کی خیریت تو دریافت نہیں کی تھی؟"

"نہیں۔ پوچھ رہا تھا کہ غالب اور نازو پھر پہنچ گئے تمہارے ساتھ۔ میں نے کہا کہ نہ ان کے بغیر ہمارا گزارا ہے نہ ہمارے بغیر ان کا۔ وقار تو اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن میں نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ بے چارا شریف آدمی سوتے سے اٹھ کے آیا تھا اور تکلف میں دوسرے کمرے میں بیٹھا رہا تھا" رابعہ نے کہا۔

"جو رات کے دس بجے سو جائے وہ واقعی شریف آدمی ہے۔"

"بوڑھا اور بیمار تھا۔ غالباً اکیلا بھی۔"

میں نے ایک آہ بھری "یہ بڑھاپا، بیماری اور تنہائی ایک ساتھ کیوں آتے ہیں آخر۔"

جو بات پرانے کباب سے شروع ہوئی تھی وہ کہاں آ کے ختم ہوئی تھی۔ اب کھانے کا خیال کسی کو بھی نہیں تھا مگر اتفاق سے راستے میں ایک ریسٹورنٹ آ گیا تو رابعہ اتر کے گئی اور پرانا کباب لے آئی۔ دلاور کی بیوی کا صدمے، غصے اور احساس ذلت سے برا حال تھا۔ اس نے کچھ کھانے سے صاف انکار کر دیا۔ ہم نے بھی غالب کے آفس پہنچنے تک کچھ نہیں کھایا۔

غالب ہمیں باہر ہی مل گیا "مجھے معلوم تھا تم یہاں آؤ گے۔"

نازو نے کہا "آج تو تم نے مروا دیا تھا سکندر۔ وہ تو گھات لگا کے بیٹھے تھے۔ ایک دم فائرنگ شروع کر دی۔"

غالب نے کہا "بس میری ایک گولی نے کام دکھایا جو ان کے ونڈ اسکرین پر لگی تو ڈرائیور اندھا ہو گیا۔ اس نے گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھا دی اور پھر ایک کھمبے سے ٹکرا دی۔ کھمبا ٹیڑھا ہونے سے تار ٹوٹے اور ان کی گاڑی پر گرے۔ بڑے زبردست اسپارک ہوئے تھے۔ ایک افراتفری مچ گئی تھی۔ PANIC پھیل گئی تھی۔ کاریں بجلی کے تاروں سے بچنے کی کوشش میں ادھر ادھر ہو گئیں تو آپس میں ٹکرائیں۔ اور پتا نہیں کیا کیا ہوا۔ صبح پتا چلے گا کہ کتنے مرے۔"

www.paksociety.com

"وہ مرے یا نہیں جو تمہارے پیچھے تھے؟"

"وہ کہاں بچے ہوں گے۔ فٹ پاتھ پر کھمبے سے تصادم ہی کافی تھا پھر بجلی کے تار ہائی ٹینشن کیبل (HIGH TENSION CABLE) تھے۔ جل کے کوئلہ ہو گئی ہوں گی لاشیں بھی۔"

"قدرت بھی کیسے اشارے دیتی ہے" میں نے رابعہ کی طرف دیکھ کے کہا "ان کو دیکھ کے اور جلا کر دیکھ کے مجھے پرانے کباب کا خیال آیا اور بس میرا موڈ بن گیا۔"

رابعہ کا چہرہ سرخ ہوا تھا مگر اسے نوٹ صرف میں نے کیا تھا۔

"سوچو اگر ہم وہاں سے نہ نکلتے تو اندر ہی مارے جاتے۔ دلاور کو شاید اطلاع مل چکی تھی کہ ہم اندر ہیں۔ وہ اپنی فورس جمع کر رہا تھا اور حملے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہوگا۔" میں نے کہا۔

اچانک اخبار کے دفتر کی کھڑکی سے سر نکال کے کسی نے کہا۔

"گلاب شیپ۔ گلاب شیپ۔"

میں نے رابعہ سے کہا "تمہیں بلا رہا ہے کوئی۔ گلاب صورت تم ہی ہو۔"

غالب نے دانت نکالے "بنگالی چپڑاسی ہے۔ غالب کہہ رہا ہے۔ ویسے نازو کو تم کیا سمجھتے ہو۔ کریلے کا پھول۔"

"اور تم خود کیا ہو... کریلے۔"

"خاتون۔ پھول سے پھل اٹھتا ہے" غالب نے ایک فلسفیانہ نکتہ اٹھایا "کریلے وہ ہوں گے جو کریلے کے پھول سے نکلیں گے۔ ماشاءاللہ سے آپ کے بچے۔"

رابعہ ہنس پڑی۔ نازو غصے کے باوجود مسکراتی رہی "تمہارا ٹیکسی والا پہلے تو سمجھا ہی نہیں تھا کہ فائرنگ ہم پر ہو رہی ہے یا ہم کر رہے ہیں۔ جب سمجھا تو ایسے بھاگا "یا رب ستی" یا میرے مولا" ایسی کی جب بے کیا ہے" وہ اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ مجھے بعد میں بہت ہنسی آئی۔ اچھا ہوا اس کی گاڑی پر گولی کا نشان بھی نہیں آیا۔ ورنہ تو اسے ہارٹ اٹیک ہو جاتا۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کے اور پانچ سو روپے دے کر رخصت کیا کہ اب وہ چار دن گاڑی لے کر مت نکلنا۔"

اوپر سے بنگالی پھر چلانے لگا "گلاب شیپ۔ اوپ کی پھون" تو غالب "ابھی آتا ہوں" کہہ کے چلا گیا۔ دلاور کی بیوی نے خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا اور وہ خلا میں گھور رہی تھی۔ ہماری گاڑی آفس کی دیوار کے عین نیچے نسبتاً تاریک جگہ پر کھڑی ہوئی تھی۔ یہ جگہ بھی محفوظ نہیں تھی۔ دلاور کی بیوی اچانک شور مچا دیتی تو مجھے اس کو لے کر فرار اختیار کرنا پڑتا ورنہ اخبار والے تو خود کسی سنسنی خیز کہانی کے پیچھے دوڑے چلے آتے۔ اس لیے میں بہت چوکس تھا۔

غالب کی غیر حاضری میں مجھے پیڈرو کا خیال آیا۔ اسے ریڈیو فون پر بٹھانے والا دلاور ہی ہوگا۔ دلاور کے لیے یہ سکون کی رات نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں مایوس ہو کے اس سے ابلہ ہی ختم کر دوں۔ اس نے میری شرائط قبول کر لی تھیں مگر

دوسری طرف وہ ہار ماننے پر تیار نہیں تھا اور اس نے اپنے سارے وسائل بروئے کار لاتے ہوئے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بیوی کی بازیابی کے لیے کوشش تیز کر دی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ بچوں کو ایک دو دن سے زیادہ بہلایا نہیں جا سکتا۔ بچے اتنے چھوٹے بھی نہیں تھے اور نوشابہ کی بہن بھی شک میں پڑ سکتی تھی کہ مری جانے کا پروگرام طے کرنے کے بعد اس کی بہن اچانک روپوش کیسے ہو گئی۔ اسے کتنے بھی ضروری کام سے جانا پڑتا وہ فون ضرور کرتی۔ میرے اور دلاور کے درمیان ہونے والی گفتگو کا علم پیڈرو کو بھی ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں نے نوشابہ کے بدلے اس کو مانگا تھا۔ اگر یہ بات اسے خود چوہدری دلاور نے بتائی تھی تو اس سے دلاور کی بدنیتی ثابت ہوتی تھی۔ وہ حسب توقع اپنے وعدے پر عمل کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتا تھا لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ استاد پیڈرو نے خود یہ بات سن لی ہو۔ بہرصورت اس نے مجھے تبادلے کی پیش کش کی تھی۔ اس سے اندازہ ہوا تھا کہ اسے اپنی سلامتی کی فکر لاحق ہو گئی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ چوہدری دلاور پر سو فیصد بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی استاد پیڈرو اس کے بچوں کی ماں کے برابر تو کیا اس کا پاسنگ بھی نہیں ہو سکتا۔

غالب جلدی ہی آ گیا۔ وہ کچھ متفکر اور سنجیدہ تھا "یار ایک بری خبر ہے۔"

سب سے زیادہ نوشابہ چونکی "کیا بری خبر ہے؟"

غالب نے اسے سپاٹ نظروں سے دیکھا "خبر آپ کے لیے نہیں ہے خاتون۔ آپ کے لیے تو خوش خبری ہے۔ دلاور نے رابعہ کی کوٹھی کو دھماکے سے اڑا دیا ہے۔"

رابعہ کا رنگ فق ہو گیا "یہ... کس نے بتایا؟"

"ایک گمنام فون تھا" غالب گاڑی میں بیٹھ گیا "اس نے کہا کہ اوئے مرزا غالب صاحب 'بڑی رونق لگی ہوئی ہے یہاں۔ ہی ہی کیا خوب آتش بازی ہو رہی ہے۔ ایسا نظارہ تو ہم نے بھی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ آپ بھی آ جاؤ۔ تصویریں بناؤ' میں نے کہا 'الو کے پٹھے، یہ کیا بکواس ہے؟'"

"وہ دلاور نہیں تھا؟"

"نہیں۔ مگر اس کے لہجے کی نقل کر رہا تھا۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اطلاع چوہدری صاحب کی طرف سے دی گئی ہے۔"

"یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟"

"ابھی تو آدھا گھنٹا بھی نہیں ہوا" رابعہ نے کہا۔

غالب نے کہا "میرا خیال ہے کہ چوہدری دلاور نے غلط فہمی میں ایسا کیا۔ پہلے میں نکلا تھا نازو کے ساتھ اور ہم ٹیکسی میں تھے۔ ممکن ہے کالیا کی بہن بھی ان کو نظر آ گئی ہو۔ میں نے اسے کہا تھا کہ سر نیچے رکھنا۔ وہ تو بے چارہ ان کے لیے کچھ تھی مگر کیا ہوا۔ کسی نے دلاور کو اطلاع دے دی کہ وہ گاڑی میں بیٹھے تھے اور ٹیکسی میں تمہاری بیوی کو کہیں لے گئے ہیں۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ پیچھا کرنا۔

کئی بار دو انہیں اور ناکامی کے بعد غصے میں پاگل ہو کے کہا اچھا باقی سب کو فنا کر دو۔ اس کے خیال میں تم رابعہ اور ... اندر ہی تھے۔"

"ہو سکتا ہے۔ بالکل ہو سکتا ہے" میں نے کہا۔

"کیا کسی نے بم پھینکا تھا؟" نازو نے پوچھا۔

"نہیں۔ ایک عینی گواہ کا کہنا ہے کہ اندر کوئی دھماکا ہوا... اچانک ہی سے آگ لگی" غالب نے کہا۔

"مجھے تم الٹے جواب کیوں دیتے ہو؟" نازو بگڑ گئی۔

"اس لیے کہ تمہاری کھوپڑی الٹی ہے" غالب نے کہا۔ "بم نہیں پھینکا تو آگ کیسے لگی؟"

"جیسے میرے دل میں لگی ہوئی ہے اس وقت۔ جیسے شاعر اپنے ... اور مقرر اپنی تقریر سے جذبات میں لگاتے ہیں۔ اس ... کے بھی جذبات ہیں، کسی نے سامنے کھڑے ہو کے اسے ... کر دیا ہوگا۔ بیچ من کے آگ لگ گئی اسے۔ جیسے تمہیں ..."

"تم کب بولتے کب ہو کر مجھے آگ لگے" نازو نے طنز سے ...

"نہیں؟ جب میں بھوت کی بچی کہتا ہوں تو تم چراغ پا کیوں ...؟"

اس مرحلے پر مجھے دخل دینا پڑا "دیکھو لڑنے کے بجائے ہمیں ... خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس کوٹھی میں جل کے ... نہیں مرے۔"

رابعہ نے کہا "چل کے دیکھ تو لیں۔ کیا پتا یہ جھوٹ ہو۔"

... نے کہا "دیکھو گی تو زیادہ صدمہ ہوگا۔ یہ سچ ہی لگتا ہے ... دلاور نے صرف جاسوسی کے آلات ہی نہیں لگوائے ہوں ... ایسے آتش گیر بم بھی نصب کرا دیے ہوں گے کہ جب ... پڑے اور موقع ملے تو ایک بٹن دبانے سے یا سوئچ آن ... سب کچھ اڑ جائے۔ یاد ہے اس نے دھمکی بھی دی تھی۔"

غالب بولا "اس کی یہ حماقت بے سبب نہیں تھی۔ وہ ... تھا۔"

... نے کہا "اس حرام زادے کو یہ حرکت بہت مہنگی پڑے ... بتا دوں گا اسے کہ کیسے پن میں بھی سکندر اس کا باپ ..."

دلاور کی بیوی نے خوف زدہ ہو کے کہا "دیکھو۔ اگر غلط فہمی کی بنا پر ... اس کا کیا قصور۔"

"کیسے قصور تو ہمارا ہے" رابعہ نے تلخی سے کہا۔

"مجھے بات کرنے دو اس سے۔ پلیز" اسے یقین آ جائے گا کہ ... نہیں ہوا۔" وہ منت کرنے لگی۔

"... ہم پر کیوں یقین نہیں کیا تھا اس نے۔ اپنی طرف ... سے ہمارا قصہ پاک کر دیا۔ اب کس امید پر وہ سمجھتا ہے

اس نے میری بات کاٹ دی "تمہارا سب نقصان میں پورا کروں گی۔ میں اسے سمجھاؤں گی کہ تم شریف لوگ ہو۔ تم نے مجھے آرام سے رکھا ہے۔ میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ میں اسے مجبور کروں گی کہ جو عہد کیا ہے اس پر قائم رہے۔"

"او شٹ۔ خوش فہمی ہے تمہاری کہ وہ تمہاری مان لے گا۔"

"اچھا مجھے اپنے بچوں سے بات کرنے دو۔ میں انہیں سب سچ بتا دوں گی کہ مجھے تمہارے باپ کے دشمنوں نے اغوا کر لیا ہے اور تمہارا باپ بدعہدی کر رہا ہے۔ اس سے میری زندگی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ وہ باپ کو مجبور کر دیں گے پھر دلاور جو بات کرے گا اس میں دھوکا نہیں ہوگا۔"

نوشابہ کی بات قابل غور تھی لیکن فوری طور پر میں اس سے کوئی وعدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ "کالیا کی بہن کہاں ہے؟"

"اوپر۔ چوکیدار کے کمرے میں۔ وہ بڈھا آدمی ہے اور اکیلا رہتا ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جائے گا" غالب نے کہا۔

"یہ اچھا کیا تم نے۔"

رابعہ نے پھر کہا "سکندر! واپس چلو۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ صدمے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو اطمینان ہے کہ ہم سب بچ گئے۔ اس کوٹھی میں میرا کیا تھا۔"

"خرچ تو تم نے بھی کیا تھا" میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"برائے نام۔ باقی سب دلاور کا پیسہ تھا جو حرام تھا۔ اس نے جس مقصد کے لیے خرچ کیا تھا وہ پورا نہیں ہو سکا۔ زمین کی قانونی وارث میں ہوں وہ تباہ نہیں ہو سکتی" رابعہ نے کہا۔

رابعہ کی کوٹھی کے چاروں طرف ایک ہجوم حلقہ بنائے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ پولیس کوشش کر رہی تھی کہ لوگ آگ بجھانے والی گاڑیوں کے لیے راستہ چھوڑ دیں۔ مشکل یہ تھی کہ اسی وقت سامنے سینما میں بھی فلم کا انٹرول ہوا تھا۔ چنانچہ تماشا دیکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب ٹریفک رک گئی تھی۔ کوٹھی سے اٹھنے والے شعلے محاورے کے مطابق آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ شعلوں کے عکس نے واقعی آسمان کا رنگ آتشیں کر دیا تھا۔ آس پاس کا علاقہ آگ سے روشن تھا اور دھوئیں کے بادل آسمان کی طرف اڑ رہے تھے۔ شعلوں کی تپش سے گرد و پیش کا درجہ حرارت بڑھ گیا تھا۔ فائر بریگیڈ والے ہر سمت سے پانی کی دھار ڈال رہے تھے لیکن آگ قابو میں آتی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ رابعہ کے گھر سے ملحق گھروں کے مکین خوف و ہراس کی کیفیت میں اپنا اپنا سامان نکال کے لے جا رہے تھے۔ سارا سامان لے جانا تو ان کے لیے ناممکن تھا۔ وہ قیمتی اشیا دوسرے گھروں میں منتقل کر رہے تھے۔ جو کچھ دور سڑک کے پار تھے۔ اس کار خیر میں کچھ لوگ نیک نیتی سے ان کی مدد کر رہے تھے مگر میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ریڈیو اٹھائے نکلا اور مخالف سمت میں چل پڑا۔ ایک تو کسی کا گھر جل رہا ہو اور اس کی زندگی کا اثاثہ خاک ہونے کا ڈر ہو تو اسے لوٹنے کا کون سوچ سکتا ہے۔ میں

www.paksociety.com

نے اس بے ضمیر شخص کو پکڑ لیا۔
"کہاں لے جا رہے ہو یہ ریڈیو۔ چور کی اولاد۔"
"یہ... میرا ہے۔" اس نے اکڑ کے کہا۔

میں نے اسے مارا تو وہ ریڈیو چھوڑ کے بھاگ گیا۔ میں نے ریڈیو اصل مالک کے حوالے کر دیا جو اتنی بدحواسی میں سامان ڈھو رہا تھا کہ اسے میری طرف دیکھنے یا میرا شکریہ ادا کرنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ اچانک وہاں اندھیرا ہو گیا۔ شعلوں سے بجلی کے تار پگھل گئے تھے۔ مین لائن میں رابعہ کے گھر کے سامنے سے گزرتی تھی۔ تاریکی میں آگ اور بھی بھیانک منظر پیش کرنے لگی۔ میں نے رابعہ سے کہا "چلو۔ دیکھ لیا اپنی آنکھوں سے۔ اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

مجمع میں ہم بہت پیچھے تھے۔ چنانچہ کسی نے بھی رابعہ کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ میں لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ عام خیال یہی تھا کہ جانی نقصان کوئی نہیں ہوا۔ وکیل صاحب یہاں رہتی نہیں ہیں۔ کچھ لوگ اس کی تردید بھی کر رہے تھے جنہوں نے گاڑی کو وہاں آتے دیکھا تھا۔

دلاور کی بیوی اچانک ہم سب کی نظروں میں مجرم بن گئی تھی اور روتی ہوئی تھی۔ یہ سب اس کے شوہر کا کیا دھرا تھا۔ شاید پہلی بار اس نے کسی کے گھر کو آگ میں جل کے خاکستر ہوتے دیکھا تھا۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے وہ اس گھر کو اندر سے دیکھ کر آئی تھی۔ یہ کسی بھی طرح اس کے رئیسانہ گھر سے کمتر نہ تھا۔ شاید اس کی شان و شوکت دیکھ کے اس نے حسد محسوس کیا ہو کہ یہ محل اس کے شوہر نے ہی رابعہ کو ہتھیا کے دیا تھا۔ ممکن ہے اسے علم نہ ہو کہ دلاور نے یہ محل چاندنی بیگم کی نذر کیا تھا اور پھر چاندنی بیگم دولت کی اسی قربان گاہ پر قتل ہوئی تھی۔ تاہم وہ رابعہ کا دکھ اس کے چہرے پر پڑھ سکتی تھی۔ اس نے پیشکش بھی کی تھی کہ وہ نقصانات کی تلافی کرے گی مگر جیسے راکھ سے پھر دیواریں کھڑی نہیں ہوتیں ایسے ہی جذبات مر جائیں تو انہیں صرف دولت سے زندگی نہیں ملتی۔

جب ہم واپس جا رہے تھے تو خاموشی تھی۔ گاڑی اب غالب چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ نازو چپ بیٹھی تھی۔ پچھلی سیٹ پر میرے اور رابعہ کے درمیان نوشابہ تھی۔
"اب ہم کہاں جائیں گے؟" رابعہ نے اچانک پوچھا۔
غالب نے کہا "دنیا بہت بڑی ہے۔"
"مگر اس میں ہمارے لیے جگہ کہاں ہے؟"
غالب نے کہا "جگہ دل میں ہونی چاہیے۔ نازو کا تو مسئلہ نہیں۔"
میں نے مسکرا کے کہا "پھر تو رابعہ کو بھی یہ سوال نہیں کرنا چاہیے۔ مگر رابعہ اداس ہے۔"
"میں ایک بار پھر بے گھر ہو گئی ہوں" وہ اداسی سے بولی۔
"اینٹ پتھروں سے بنے ہوئے چھت والے حصار کو مکان کہتے ہیں۔ گھر نہیں۔ پہلا گھر تمہاری والدہ کا تھا۔ دوسرا ایک دام

اجل۔ ڈیتھ ٹریپ میں (DEATH TRAP) کا ... کر سکتا۔ ویسے تو ایک گھر کو میں بھی اپنا کہہ سکتا ہوں مگر ... طرح میں اس میں رہ نہیں سکتا۔"

نازو نے کہا "فی الحال ایک جگہ ہے میرے ذہن میں ... ابھی خالی مل جائے۔"

غالب نے کہا "بہت سی مسجدیں خالی ہیں۔ مگر اللہ کے گھر پر بھی اس کے بندوں کی اجارہ داری ہے۔ یار سکندر ... ہے جہاں بھوت رہتے ہوں۔"

"میں کیا بتاؤں۔ نازو سے پوچھو" میں نے اسے چھیڑا۔ خلاف توقع وہ خفا نہیں ہوئی "ذرا تیاری ہو۔ تم ..."

غالب نے کہا "میں گھر داماد نہیں بنوں گا۔"

نازو نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ غالب نے ایک ...
"وہاں؟ آخر ہوتا بھوت کی بچی۔ کیا جگہ سوچی ہے۔"
"کیا کوئی قبرستان یا مرگھٹ ہے۔ کوئی آسیب زدہ گھر۔"
"ایک بھوت بنگلا ہے" غالب نے کہا "اس سے زیادہ ... نہیں بتا سکتا۔"

جب تک گاڑی اس گلی میں نہیں پہنچ گئی میں بھی ... سمجھا تھا پھر گاڑی اچانک رک گئی۔ اس وقت تک سب ... ہو گیا تھا کہ وہ کیا جگہ ہے۔ سوائے دلاور کی بیوی کے ... نے اپنے منہ سے مرحوم نقوی صاحب کا نام نہیں لیا تھا۔ ... یہ کوٹھی کسی کو الاٹ نہیں ہوئی تھی۔ نازو سے مجھے بعد میں ... ہوا کہ ابھی اسے حکومت کو واپس کرنے کے لیے خالی بھی نہیں ... گیا تھا چنانچہ سرکاری طور پر یہ ابھی تک نقوی صاحب مرحوم ... نام پر تھی۔

غالب خود نیچے اترا اور ادھر ادھر دیکھ کے بند گیٹ پر ... بس یہی ایک خطرے کا لمحہ تھا جب کسی دوسری کوٹھی کا ... اسے دیکھ لیتا تو پولیس بلا لیتا مگر رات کے ساڑھے گیارہ بجے ... ویران تھیں۔ کوٹھیوں میں روشنی تھی مگر کہیں ... محسوس نہیں ... تھے اور چوکیدار اپنے اپنے کیبن میں اسٹولوں پر بیٹھے ہوئے ... گیٹ کے اندر کرسیوں پر۔

غالب نے مین گیٹ کا چھوٹا دروازہ اندر سے کھول ... سب کار سے اتر کے اندر چلے گئے۔ میرے ذہن میں اس ... سے بہت سی یادیں منسوب تھیں۔ یہ سیکریٹری حضرات کی ... رہائش گاہیں تھیں جہاں پر کوئی نہیں مار سکتا تھا مگر ... شب خون مارنے سے کون روک سکتا ہے۔ ہوم سیکریٹری ... آرزو دل میں لیے نقوی صاحب دنیا سے رخصت ہوئے ... انہیں طویل رخصت سے پہلے ہی ہمیشہ کے لیے رخصت ... تھا۔

کوٹھی کی سب لائٹس آف تھیں۔ غالب نے پچھلے ... روشنی جلائی پھر گیٹ کی لائٹس روشن کر دیں تاکہ کسی کو شک ...

وقار یوسف کی گاڑی باہر کھڑی تھی اور یہاں کے رہنے والے نے اس کار کو اکثر آتے جاتے دیکھا ہوگا۔ انہیں معلوم ہوگا وقار یوسف مرنے والے کا رازدار تھا اور وکیل تھا۔

غالب بولا "اب مسئلہ ہے اندر داخل ہونے کا۔"

میں نے کہا "میں نازو کے دماغ کی داد دیتا ہوں۔ اس جگہ کا کسے خیال آ سکتا تھا۔"

"مجھے آنے ہی والا تھا۔ بس اس کی زبان تیز ہے۔ یہ ایک پہیلی بوجھ لی" غالب نے کہا "میں سوچ رہا تھا۔"

"بہت خوب۔ آپ بھی دماغ سے سوچتے ہیں" نازو طنزاً بولی۔

"تمہارے لیے دل سے سوچتا ہوں۔ تم دماغ کی فکر مت کرو" غالب نے ایک ہاتھ سینے پر رکھا "اجازت ہو تو میں لیے دل کو۔ سوری اس گھر کا دروازہ کھولوں۔"

وہ پیچھے غائب ہو گیا۔ میں دلاور کی بیوی کو دیکھ رہا تھا جو بہت سہمی ہوئی تھی۔ اس عورت کے لیے جس کی زندگی کا محور اس کا گھر اور بچے ہوں، عیش و عشرت کی زندگی، سیر و تفریح اور شاپنگ ہو اور مجرمانہ نوعیت کی تخریبی سرگرمیوں میں شریک رہنا بھیانک تجربہ تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ برداشت کرتے کرتے کہیں اس کے اعصاب ہی جواب نہ دے جائیں اور وہ پاگلوں کی طرح چیخنا شروع کر دے۔ اسے پہلے جو امید تھی کہ دلاور سے ملتے ہوتے ہی وہ رہا ہو جائے گی اب وہ دم توڑ چکی تھی۔ وہ بے بسی اور تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اسے جتنا غصہ ہم پر تھا اس سے زیادہ شاید دلاور پر تھا۔ آج رات وہ اپنے بچوں کے ساتھ جبار آفریدی کے ولیمے کی تقریب میں شامل ہوتی مگر قسمت اسے کہاں لیے پھر رہی تھی۔

میں بالکل تیار تھا کہ اگر وہ دیوانگی میں اچانک مجھ پر حملہ کرے یا چیخنے کے لیے منہ کھولے تو اس کو دبوچ کے اس کا گلا گھونٹ دوں۔ اس کی خاطر میں سب کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ بے شک مجرم وہ نہیں تھی اور جنگ میں بے گناہ عورتوں یا بچوں کو اور بیمار بوڑھوں کو گھسیٹ لینا جنیوا کنونشن کے تحت غیر اخلاقی قرار دیا گیا تھا مگر جنگی جرائم میں نازی جرمنی کو سزا دینے والے بھی کم مجرم نہ تھے۔

انہوں نے بھی جنیوا کنونشن کی قراردادوں کی دھجیاں بکھیری تھیں لیکن وہ فاتح تھے اور قصوروار صرف مفتوح ہوتا ہے پھر فاتح یہ کہہ کر دل بہلا لیتا ہے کہ محبت اور جنگ میں تو سب جائز ہے۔ کچھ ایسے ہی نا جذبات اس وقت میرے بھی تھے۔ میں اخلاقیات سے بالاتر ہو کر دلاور کی شکست کے بارے میں سوچ رہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ اسے ایسی وہ سزا دوں جو تمام عمر کا عذاب ہو۔ میں نوشابہ کو قتل کر سکتا تھا کہ بعد میں دلاور ساری زندگی پچھتاوے کا دکھ جھیلے۔ اس کی اولاد اس پر تھوکے اسے ماں کا قاتل کہے اور اس سے نفرت کرے۔ آخر دلاور نے بھی تو میرے باپ کو ایسی انسانیت سوز

موت سے ہمکنار کیا کہ اس کا خیال آج بھی میرے خون میں آگ بھر دیتا تھا۔

فرق صرف یہ تھا کہ وہ دلاور تھا اور میں سکندر۔ جو وہ کر سکتا تھا میں نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا تو ضمیر مر چکا تھا مگر ابھی تک میرا راہنما میرا ضمیر تھا۔

غالب منہ لٹکائے واپس آیا "بھیا۔ چوروں کے لیے کوئی آسان راستہ نہیں چھوڑا کوٹھی بنانے والوں نے۔"

"بہت قیمتی لوگ رہتے ہیں یہاں۔ ان کی حفاظت ایسے ہی کی جاتی ہے" میں نے کہا۔

"ہر طرف گرل ہے اور دروازے کسی قلعے کے دروازے سے کم نہیں۔" غالب نے کہا "خیر ہم بھی چور نہیں شریف آدمی ہیں۔ فرض کرو ہم سے چابیاں کھو گئی ہیں۔ ہم اندر کیسے جائیں گے؟"

میں نے کہا "گاڑی میں پلاس اور پیچ کس ہوں گے۔"

غالب نے کہا "پچھلی طرف سے گیراج میں داخل ہو کے دیکھا جا سکتا ہے کہ وہاں کیا کچھ ہے؟"

ہم نے دلاور کی بیوی کو نازو کے سپرد کیا اور اسے سمجھا دیا کہ اس کی حیثیت جنگی قیدی کی ہو گئی ہے۔ غلط حرکت کی صورت میں اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے۔ نازو اسے پچھلی طرف لے گئی۔ دلاور کی بیوی روتے ہوئے اپنے وجود کا بوجھ گھسیٹنے پر مجبور تھی۔ قسمت نے اسے جو ذلت دی تھی وہ اس کے تصور میں بھی نہ تھی۔

میں نے اور غالب نے آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد پچھلی طرف سے ہی ایک باتھ روم کے روشندان کی جالی نکال دی۔ غالب کو میں نے اوپر اٹھایا اور وہ اندر اتر گیا۔ اس کے ساتھ ہی سب بند دروازے کھل گئے۔ غالب نے بے خوفی سے پھر لائٹ جلائی اور ایک بیڈ روم سے گزرتا ہوا دوسرے بیڈ روم میں پہنچا۔ پھر اس نے پورچ کا ایک دروازہ کھول دیا۔

خود کو اس ڈرائنگ روم میں پا کے میری ذہنی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ ایک وقت تھا کہ یہاں بیٹھ کے میں نے نقوی صاحب سے اور دلاور سے بات کی تھی۔ ان مقدمات کی فائلوں کو دیکھا تھا جو میرے خلاف زیر سماعت تھے۔

اچانک مجھے کچھ یاد آیا "غالب، نقوی صاحب کی مفلوج اور معذور بیوی کا کیا بنا؟"

"وہ اسپتال میں ہیں" غالب نے کہا "اور شاید زندگی کی آخری سانس تک رہیں گی۔ اگر آئیں گی تو سفر آخرت کے لیے۔"

"اگر وقار یوسف کی بیوی کو معلوم ہو جائے کہ ہم یہاں کس طرح داخل ہوئے ہیں۔ کیا کہے گی وہ؟"

غالب نے کہا "وہ بے چاری کیا کہے گی۔ اسے تو شکوہ ہوگا کہ ہم نے اسے کیوں نہیں بتایا۔ وہ چابیاں لے کر آ جاتی۔"

نازو اب دلاور کی بیوی کو تسلی دے رہی تھی کہ وہ رونا دھونا بند

www.paksociety.com

کرے۔ خدا نے اور پھر دلاور نے چاہا تو بہت جلد اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ اپنی جان ہلکان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دلاور مجبور ہے۔ وہ بالآخر مان جائے گا۔ دلاور کی بیوی کی یہ خواہش بہرحال پوری نہیں کی جاسکتی کہ اسے اپنے شوہر یا بچوں سے بات کرنے کا موقع دیا جائے۔

رابعہ نے سیدھا کچن کا رخ کیا۔ وہاں سب کچھ تھا۔ احساس تحفظ ملتے ہی سب پر تھکن اور بھوک غالب آگئی تھی اور اب وہ پرانا کباب سب کے لیے من و سلویٰ بن گیا تھا۔ ٹھنڈے پہلے کوئی چکھنے پر راضی نہ تھا۔ رابعہ نے انہیں اوون میں گرم کیا اور الیکٹرک کیتل لگا کے کافی تیار کرلی۔

میں نے اور غالب نے اتنی دیر میں نقوی صاحب کی بیوی کے کمرے کو کھولا اور وہاں پڑی ہوئی ڈھیروں دواؤں میں سے سکون آور گولیاں اٹھائیں۔ بہت سی دوائیں ایسی تھیں کہ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور ان کا استعمال خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ میں خود بھی ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ تھا اور ایک رات سکون سے سونا چاہتا تھا۔

دلاور کی بیوی نے سب کے اصرار پر تھوڑا سا کھانا کھایا۔ کافی وہ پی نہیں سکی۔ نازو نے اسے سکون آور گولیاں دیں تو اس نے کسی تذبذب کے بغیر قبول کرلیں۔ "یہ تو میں نے بہت کھائی ہیں۔ کسی دن اتنی کھالوں گی کہ دائمی سکون مل جائے گا۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "مسز دلاور۔ یاد رکھیں آپ کو اپنے لیے نہیں، بچوں کے لیے جینا ہے۔ کیا آپ اتنی خودغرض ماں ہیں کہ اپنے سکون کے لیے انہیں ساری عمر ماں سے محرومی کے عذاب کی سزا دیں گی۔"

وہ خاموش ہوگئی اور کچھ دیر بعد سوگئی۔ یہ پہلے نقوی صاحب کا بیڈ روم تھا۔ اس میں اب بھی ان کا ڈبل بیڈ اسی طرح موجود تھا جیسے ان کی زندگی میں تھا۔ ہر چیز ویسی ہی تھی اور وہیں تھی۔ نازو نے بالآخر رابعہ کی بات مان لی اور دلاور کی بیوی کے ساتھ بیڈ پر سوگئی۔ رابعہ نے وہیں قالین پر تکیہ لگالیا اور دروازے کو اندر سے لاک کرکے چابی سرہانے رکھ لی۔

بیچ کا دروازہ نقوی صاحب کی بیگم کے کمرے میں کھلتا تھا۔ وہاں دواؤں کی بو بسی ہوئی تھی اور ایک منحوس قسم کی آسیب زدہ فضا تھی لیکن غالب اتنا تھکا ہوا تھا کہ کرسی کھا کے لیٹا اور سوگیا۔ خود میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہورہی تھیں لیکن مجھے دلاور کو یہ بتانا تھا کہ ہم ابھی تک زندہ ہیں۔ میں نے باہر جاکے کار کے ریڈیو فون پر بات کرنے کا سوچا مگر یہ طریقہ غیر محفوظ تھا۔ سڑکوں پر رات کے چوکیدار گشت کررہے تھے اور یہ ویسے بھی خواص کا علاقہ تھا۔ یہاں سب ہی نقوی صاحب جیسے ٹاپ قسم کے افسر رہتے تھے چنانچہ پولیس بھی یہاں رعایت نہیں کرتی تھی۔

میں نے ذہن پر زور دیا تو مجھے وہ نمبر یاد آگیا جس پر میں نے دلاور کی کار کے فون سے بات کی تھی۔ مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ نمبر کے اعداد صحیح ترتیب میں ہیں۔ خصوصاً آخری [illegible] کوشش کرکے صحیح نمبر ملا سکتا تھا۔ پہلی رانگ کال کے بعد میں کامیاب ہوگیا۔

میں نے ذرا اونچی آواز بنا کے کسی روبوٹ کی طرح آہستہ آہستہ کہا "چوہدری دلاور کو بلاؤ۔"

"میں، دلاور ہوں۔ کون ہو تم؟"

میں نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا "میں سکندر کی روح ہوں [illegible] عالم بالا کی کال ہے۔"

"سکندر۔" چوہدری دلاور کو شاک لگا "تم ابھی کہاں ہو؟"

"جہنم میں" میں نے اسی لہجے میں کہا جیسے فلموں میں [illegible] مُردے کو بات کرتا دکھایا جاتا ہے۔ "تمہارے لیے جو آنچل [illegible] بنایا گیا ہے۔ اس کے سوا وہ کہاں جاسکتی تھی۔"

"مذاق مت کرو۔"

"اس کی لاش کوئلہ ہوگئی تھی۔ کاش تم دیکھ سکتے اور [illegible] بچوں کو دکھا سکتے۔ اچھے چوہدری صاحب" میں نے صداکاری [illegible] کے کہا "تم نے دنیا پر اس محاورے کی صداقت بھی ثابت کردی کہ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود اسی میں گرتا ہے۔"

"تم۔ جھوٹ بکتے ہو۔"

"ہاں۔ میں واقعی اسی دنیا سے بول رہا ہوں۔ میں تمہیں [illegible] کی آواز بھی سنوا سکتا ہوں۔" میں نے کہا "غالب اور نازو [illegible] ہیں چوہدری دلاور۔ اس گھر میں دو ہی بدنصیب عورتیں [illegible] تھیں۔ ایک تمہاری پہلی بیوی۔ ایک وہ جو تیسری بیوی نہ بن سکی۔"

زندگی میں پہلی بار میں نے اسے روتے سنا "سکندر! خدا کے لیے کہہ دو یہ جھوٹ ہے۔ تم مذاق کررہے ہو۔"

میں نے کہا "دلاور، یہ تو مکافات عمل ہے۔ مذاق تمہارے ساتھ تقدیر نے کیا ہے۔ بڑا بے رحم مذاق ہے یہ۔ کتنی محنت سے تم نے وہ محل بنوایا تھا۔ کیسے کیسے سراغ رسانی کے آلات نصب کرائے تھے وہاں۔ تم واقعی بہت چالاک ہو۔ بہت ہوشیار ہو۔ بڑا زبردست جال بچھایا تھا تم نے ہماری موت کے لیے۔ تم ایک بٹن دباتے اور اس کوٹھی میں ہر طرف نصب ڈائنامائٹ کسی آتش فشاں کی طرح تباہی پھیلا دیتے۔ تمہیں اطلاع دینے والوں نے بھی غلط نہیں بتایا تھا کہ ہم وہاں پہنچ گئے ہیں۔ بس وہ اندازہ نہ کرسکے کہ وہاں کی [illegible] لوگ گئے ہیں اور جو گئے ہیں وہ کون تھے؟"

"سکندر، میں اپنے بچوں کے سامنے ان کی ماں کے قاتل کی حیثیت سے نہیں جانا چاہتا۔"

"تو مت جاؤ۔ بن باس لے لو۔ دفع ہوجاؤ کہیں بھی۔ [illegible] جیسے تمہارے پاس۔ دوسری بیوی بھی ہے۔"

"دیکھو۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔۔۔۔ بدعہدی کی میں نے" [illegible]

رابعہ کے بچوں کو مت دو۔"

"تت۔۔۔۔ تت۔۔۔۔ تت" میں نے افسوس سے کہا "بڑا [illegible] آدمی ایسے گڑگڑا رہا ہے۔ غلطی تم کیسے کرسکتے ہو اپنے [illegible] دلاور صاحب۔ ہیں جی غلطی تو کرتے ہیں ہم جیسے انسان [illegible] کیا کہتے ہیں اسے۔ انجمن یعنی تمہارا غرور ٹوٹا نہیں [illegible] ایک نہیں نوشابہ جیسی دس مرجائیں۔ اور اولاد کا کیا ہے [illegible] اور پیدا ہوجائیں گے ابھی تو تم جوان ہو۔"

دلاور پھر سنبھل گیا "دیکھو سکندر۔۔۔۔ نوشابہ۔۔۔۔"

میں نے کہا "پھر بات کریں گے اچھے چوہدری صاحب۔ نیند [illegible] ابھی تو۔"

"سنو۔ ایک منٹ۔۔۔۔ تم جہاں کہو جیسے کہو۔۔۔۔ میں پیڈرو کو [illegible]"

"لیکن پیڈرو نے تو کچھ اور ہی پیشکش کی تھی" میں نے کہا اور [illegible] کردیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ رات بھر بے یقینی کے عذاب میں تڑپے گا۔ میں نے اسے شک میں ڈال دیا تھا کہ اس کی بیوی کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا تھا محض اسے اذیت دینے کے لیے [illegible]۔ شاید خود اسے بھی یقین کرنا مشکل ہوگیا تھا کہ چوبیس سال [illegible] والی نوشابہ جل کے مرچکی ہے۔ اس کے آدمی غلط رپورٹ کیسے دے سکتے ہیں۔

صبح تک میں گہری نیند سویا۔ ایک عرصے کے بعد مجھے مکمل ذہنی احساس تحفظ ملا تھا اور تقدیر کی بساط پر بازی میرے حق میں پلٹ گئی تھی۔ شاید میں نو بجے کے بعد بھی سویا پڑا رہتا لیکن غالب نے بقلم خود بیڈ ٹی تیار کی اور انتہائی مہذب طریقے سے مجھے لات مار کے جگایا۔

"اف تمہیں بڑا اے خیر ہو۔ اتنی محبت سے تو شاید بیوی بھی نہ اٹھائے گی" میں نے چائے کا کپ تھام کے کہا۔

"پرانی باتیں بھول جاؤ۔ مستقبل کے شوہروں کی طرح ہم بھی نازو کو بیڈ ٹی پیش کریں گے۔"

"باقی سب لوگ سو رہے ہیں؟"

غالب نے اقرار میں سر ہلایا "سوائے مسز دلاور کے۔۔۔۔ وہ جاگتی ہے۔ اب تو مجھے بھی اس پر ترس آنے لگا ہے۔"

"آج اسے گھر بھیج دیں گے یار" میں نے کہا۔

"آخر کس کی چلے گی۔ دلاور کی یا پیڈرو کی؟"

میں نے اسے گزشتہ رات دلاور سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا "ہم اپنی بات پر قائم ہیں۔ ہمیں پیڈرو چاہیے۔ یقینی ہے کہ پیڈرو نے اپنی طرف سے کوئی پیشکش نہیں کی تھی۔ نادر شاہ کی قبر کا نشان بتادو تو تمہیں وزیر خان کا مدفن دکھادیا جائے گا۔ نادر شاہ کی قبر سے پیڈرو کا کیا واسطہ۔ الزام تو دلاور پر ہے۔"

"کہیں پیڈرو فرار نہ ہوجائے۔"

"پولیس پیچھے تو مجھے بھی ہے۔ دلاور بہت زیادہ دباؤ میں ہے اور کوئی راستہ نہ رہا تو وہ پیڈرو کو قربان کرکے بیوی کو بچالے گا۔ خطرہ تو پیڈرو بھی محسوس کررہا ہوگا۔"

"رابعہ کے گھر کی آتش زدگی کے بارے میں اخباروں کی کیا رپورٹ ہے؟"

"یہاں کوئی اخبار نہیں ڈالتا۔ میں معلوم کرتا ہوں مگر اس وقت کون ہوگا اخبار کے دفتر میں؟" غالب نے کہا "تم دلاور سے آخری بات کرلو۔"

میں نے فون اٹھایا "وہ رات بھر تڑپا اور پھڑکتا رہا ہوگا۔"

غالب نے مجھے روک دیا "دوبارہ یہ فون استعمال مت کرو۔ کیا معلوم دلاور نے اپنے فون کو آبزرویشن پر لگوادیا ہو۔ اسے پتا چل جائے گا کہ کال کہاں سے کی گئی تھی۔"

"چلو پھر باہر گاڑی میں چلتے ہیں۔ بات بھی کرلیں گے اور اخبار بھی لے آئیں گے" میں نے کہا۔

ہم بغلی دروازے سے برآمد ہوئے اور گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہوگئے۔ بنگلے کے قریب ہم نے اس میں پیٹرول بھروایا پھر ہم نے اخبار لیا اور پوری چھولے کا ناشتا۔ تو مے گھنٹے میں ہم واپس بھی آگئے۔ اس وقت تک بلو، نازو بھی جاگ گئی تھیں۔ ناشتا رابعہ کے حوالے کرکے میں نے اخبار دیکھا۔ اس میں آگ لگنے کی واردات کو شارٹ سرکٹ کا نتیجہ بتایا گیا تھا۔ مجھے بھی یہی امید تھی بم کے دھماکے یا تخریبی کارروائی کی خبر دبادی گئی تھی۔ میں اخبار میں ایسا گم ہوا کہ دلاور سے بات کرنا بھول گیا۔

چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ آگ بجھانے والے عملے نے جل کے کوئلہ ہوجانے والی دو لاشیں نکالی تھیں۔ ان میں ایک کسی عورت کی لاش تھی اور دوسری مرد کی۔ عورت کی لاش کو ہاتھ کی کلائی میں رہ جانے والی چوڑیوں سے شناخت کیا گیا تھا۔ میں نے غالب کو متوجہ کیا۔

غالب نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "یار یہ عاشق علی ترپ اور ان کی اہلیہ ہوں گے۔"

صدمے سے میرا دل ڈوبنے لگا "وہ اندر کیسے پہنچ گئے آخر!"

"وہ اور کہاں جاسکتے تھے" غالب نے کہا "رابعہ انہیں وہیں چھوڑ گئی تھی۔"

"مگر ہم نے انہیں کیوں نہیں دیکھا تھا؟"

"میرا خیال ہے کہ نہ انہیں ہمارے آنے کی خبر ہوئی نہ جانے کی۔ ہم تو خاموشی سے گئے تھے اور ہم نے باہر کی لائٹس بھی آف رکھی تھیں۔ اندر بھی ہم دو کمروں تک محدود رہے تھے اور ہماری کوشش تھی کہ کسی کو اندر ہماری موجودگی کا پتا نہ چلے۔ یہی غلطی یا احتیاط اُن بے چاروں کی موت کا سبب بن گئی۔"

"آخر وہ تھے کہاں؟"

"یار بوڑھے لوگ تھے۔ کیا پتا پچھلے حصے میں کہیں سو رہے ہوں۔ ان کی کیا مصروفیات تھیں۔ نہ کہیں آنا جانا، نہ ٹی وی دیکھنا یا پڑھنا۔ گھر کا بھی کوئی کام نہیں رہا تھا۔"

www.paksociety.com

"شاید ایسا ہی ہوا ہوگا" میں نے کہا "ممکن ہے ان میں سے کوئی بیمار ہو۔ دوسرا تاداری کے خیال سے وہیں رہتا ہو۔ ہم ٹھہرے بھی کتنی دیر تھے۔ کچن کی طرف کوئی جاتا تو شاید وہ جاگ اٹھتے لیکن وہاں کسی نے چائے بھی نہیں پی تھی۔ ہم کھانا بھی باہر کھانے چلے گئے تھے۔ کیسی بھیانک غلطی ہوگئی ہم سے۔ کسی کو بھی ان کا خیال نہیں آیا۔"

"ہم سے بڑی مجرمانہ کوتاہی سرزد ہوگئی۔"

"کوتاہی بہت معمولی لفظ ہے۔ ہم نے گناہ کیا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔" میں نے کہا۔

ناشتے کے دوران بھی مجھے بار بار عاشق علی تڑپ کا خیال آتا رہا اور ان کی صورت آنکھوں کے سامنے پھرتی رہی۔ ان کا چلنا پھرنا' بات کرنے کا انداز' ان کا ذوق شعری۔ سب ایک لطیفہ تھے مگر ان کی موت بہت بڑا المیہ۔ رابعہ نے مجھے خاموش دیکھا تو سمجھی کہ شاید میں رات کو سو نہیں سکا اور اپنے ہی معاملات پر سوچ رہا ہوں۔ میں نے اور غالب نے اتفاق رائے سے اخبارات غائب کروا دیے تھے تاکہ انہیں اس حادثے کی خبر نہ ہو۔ بے شک یہ خبر ہمیشہ چھپی نہیں رہ سکتی تھی لیکن ابھی ان کو دلاور کی بیوی سے زیادہ ڈیپریشن ہو جاتا۔ خصوصاً رابعہ کو جس پر اپنے گھر کو آگ میں جلتا دیکھنے کا اثر زیادہ ہوا تھا۔

دلاور کی بیوی ہاتھ منہ دھونے کے بعد کچھ بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اس کا ڈیپریشن جو پہلے مایوسی کا آئینہ دار تھا اب جارحانہ انداز اختیار کرنے لگا تھا۔ اس نے پھر اصرار کیا کہ اسے دلاور سے بات کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔

"کس بات کا ڈر ہے آخر تم لوگوں کو اور میں کیسے یقین دلاؤں تمہیں کہ میں تمہاری سفارش کروں گی۔ دلاور کو مجبور کروں گی کہ تمہاری بات مانے۔ میں تمہارے خلاف کوئی بات کیسے کہہ سکتی ہوں۔ ایک مجبور عورت جسے یہ بھی علم نہیں کہ یہاں سے وہ کہاں جائے گی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے مسز دلاور۔ آپ کو موقع دیا جائے گا۔"

"کب؟" وہ بے چین ہوگئی "میں بچوں سے بھی بات کروں گی۔"

"میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔ سب کچھ حالات پر منحصر ہے۔"

"کیسے حالات؟ حالات تو یہی رہیں گے" وہ غصے میں بولی۔ "بہانے بازی مت کرو۔"

میں نے اسے گھور کے کہا "اپنی آواز کم رکھو۔ ورنہ تمہیں جو رعایت حاصل ہے آزادانہ اٹھنے بیٹھنے کی اور باتیں کرنے کی' یہ واپس بھی لی جا سکتی ہے۔"

وہ خاموش ہوگئی مگر اس کی یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ وہ اپنے گھر اور اپنے بچوں سے ایک حد تک دوری برداشت کر سکتی تھی اس کے بعد جذبات کے دباؤ سے وہ اسی طرح پھٹ سکتی تھی جیسے بھاپ زیادہ ہونے سے پریشر ککر دھماکے سے پھٹ جاتا ہے۔

میں نے ناشتے کے فوراً بعد گاڑی کے ریڈیو فون پر دلاور سے رابطہ کیا "گڈ مارننگ" میں نے کہا "رات کیسی گزری ہے چودھری صاحب؟"

"مشکور ہوں تم سے۔ پیڈرو نے کیا کہا تھا؟ وہ تو جیسے رات بھر فون سے لگا بیٹھا رہا تھا اور کسی تمہید کے بغیر اصل بات پر آ گیا تھا۔ اس کا غرور اور اس کی اکڑفوں غائب ہوگئی تھی۔

میں نے کہا "کیا وہ تمہیں کچھ بتانے پر تیار نہیں ہے یا راز ہو گیا ہے' چھترول کر دی اس کی پھر بتائے گا۔ آپ تو ماہر ہیں زبان کھلوانے کے۔"

"میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔"

"کوئی۔ وقت بھی کوئی شے ہے۔ ضائع ہوتی ہے دولت عزت بھی آنی جانی چیز ہے۔ رشتے دار غریب کے نہیں ہوتے۔ دولت مند کو رشتوں کی یا دوستوں کی کیا کمی۔"

"پیڈرو نے کہا تھا کہ شیلی کی قبر کا نشان بتا دو؟"

میں نے ہنس کے کہا "تم جانتے نہیں آؤ کے حرامی پن سے واقف جب تمہیں معلوم تھا تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے تھے؟ یہ پٹی ڈاکٹر نے ہی پڑھائی ہوگی اسے' میں نے اسے تو صاف جواب دے دیا تھا مگر تم بھی سن لو مجھے پیڈرو چاہیے' زندہ سلامت پھر تمہیں بیوی بھی مل جائے گی۔ زندہ سلامت۔"

"کب..... کہاں..... اور کیسے.....؟"

میں نے کہا "تم نے ایک سانس میں تین سوال کر ڈالے۔ پہلے سوال کا جواب تم دو گے۔ تم پیڈرو کو ایک گھنٹے میں پیش کر سکتے ہو یا ایک دن میں۔ تمہاری بیوی تو ہمارے پاس بالکل محفوظ رکھی ہوئی ہے۔ بالکل اسی حالت میں جیسے ہم لائے تھے۔ رہ گیا سوال کہاں اور کیسے کا تو اس کا انحصار ہے پہلے سوال کے جواب پر۔ جگہ ہم بتائیں گے اور طریق کار بھی ہمارا ہوگا لیکن نقصان کسی طرح کا ہمارا نہیں ہوگا۔ اپنی کھوپڑی میں یہ بات اچھی طرح بٹھا لو اور کوئی خناس ہے تو نکال دو۔"

"فرض کرو۔ میں ایک گھنٹے بعد تم سے ملنا چاہوں۔"

"مقصد صرف ملاقات ہو تو مجھے [illegible] سے زیادہ خوشی ہوگی۔ یقین کرو' بندہ کوئی اچھی شکل دیکھے۔ تمہاری منحوس صورت سے تو مجھے ویسے بھی الرجی ہے۔ ہاں پیڈرو کو ساتھ لاؤ گے تو میں وصول کرنے آجاؤں گا۔"

"آخر کہاں؟ مجھے بھی تو انتظام کرنا ہوگا۔"

"انتظام کیسا دلاور۔ بس گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہو جاؤ۔ اگر تم سوچ رہے ہو کہ کوئی جال پھیلاؤ۔ ادھر ادھر اپنی [illegible] چھپانے کے لیے جگہ دیکھو۔ بم بندوق اور توپ خانے کا بندوبست کرو تو بہتر ہے کہ اپنی دوسری بیوی پر اکتفا کرو اور بچوں سے کہو کہ اسے ہی ماں تسلیم کر لیں۔ اس ماں کے لیے دعائے مغفرت

"ایسی کوئی بات نہیں" اس نے گم صم لہجے میں کہا۔

"پھر میں اپنی کابینہ سے مشورہ کر کے بتاتا ہوں" میں نے فون بند [illegible]

میں نے غالب سے اور رابعہ سے ہنگامی میٹنگ کی۔ "دلاور [illegible] اب دو غور طلب مسائل ہیں۔ بلکہ تین۔ پہلا پیڈرو کو [illegible] لینے کے لیے کسی محفوظ اور مناسب جگہ کا انتخاب' دوسرا [illegible] دلاور اور تیسرا اسے اپنی تحویل میں رکھنے کا مسئلہ۔"

[illegible] غور و خوض کے بعد ہم نے پہلے دو مسائل کو ترجیح دی اور [illegible] پر سب کا اتفاق ہوگیا۔ جب میں نے دوبارہ دلاور کو [illegible] ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ میں اس گاڑی کو وکٹوریہ پارک کے [illegible] لے گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اس نے سگنل کی ڈائریکشن معلوم کر لی ہو۔

رابطہ ہوتے ہی میں نے کہا "سنو دلاور۔ یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔ رحم رعایت کی کوئی گنجائش نہیں اور [illegible] سے اب ہم بھی دستبردار ہوگئے ہیں کیونکہ مقابلہ کسی [illegible] سے نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ ایسے معاملات [illegible] کے نقصانات کیا ہوتے ہیں؟ اغوا کرنے والوں کے [illegible] ہو تو وہ بڑے سفاک ہو جاتے ہیں۔ ہم بھی مجبور [illegible] کہ روایتی طریقے پر عمل کرتے ہوئے تمہیں قسطوں [illegible] ارسال کریں۔"

"نہیں۔ ایسا ظلم مت کرنا۔"

میں نے کہا "دلاور۔ کیا ظالم بھی سمجھتا ہے کہ ظلم کسے کہتے [illegible] کو تم نے کس کس پر کیسے کیسے مظالم توڑے تھے۔"

"یہ وقت پرانی باتوں کا نہیں ہے۔"

"آج تمہارے لیے وہ پرانی باتیں ہوگئی ہیں۔ کل ہم بھی کہیں گے کہ ہم بھی ڈیل نہیں کرتے دلاور۔ ہم صرف جواب دیتے [illegible] تمہاری وجہ سے ہیں۔ تم نے محسن کے [illegible] ہوتا تو ہم بھی نوشابہ کو نہ اٹھاتے۔ اب تم نے یہ [illegible] کی کوشش کی کہ تم بڑے شکاری ہو تو شکار ہوگی تمہاری [illegible]"

"مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟" دلاور نے بے چینی سے کہا۔

"غور سے سنو۔ اگر ریکارڈ کر رہے ہو تو ٹیپ کو پھر سن لینا۔ تم [illegible] بجے اپنی اسی کیڈیلاک میں نکلو گے جو کل تمہاری بیوی [illegible] تھی۔ عین شالامار باغ کے دروازے کے مقابل تم گاڑی سے باہر آؤ گے۔ ہم دیکھ لیں گے کہ تمہارے ساتھ گاڑی [illegible] چودھری ہے یا کوئی اور بھی بیٹھا ہوا ہے۔ تم اس کے [illegible] کھول کے بند کرو گے۔ اس کے بعد ڈکی کھولو گے۔ بات [illegible] ہے نا؟"

"ٹھیک ہے۔ آگے بولو۔"

"[illegible] اپنے ٹرپ میٹر کو زیرو پر کر لینا۔ ٹھیک چار کلو میٹر کے بعد تم گاڑی روک لو گے اور وہاں سے بائیں ہاتھ پر جانے والے کچے راستے پر جانے سے پہلے دس منٹ انتظار کرو گے۔ جب تمہارے قریب سے ایک ٹیکسی گزر جائے تو تم بھی روانہ ہو جانا۔ دس منٹ بعد۔ یہ بات مت بھولنا ورنہ بہت خون خرابہ ہوگا۔"

"ٹیکسی میں کتنے آدمی ہوں گے؟"

"ایک تمہاری بیوی اور ایک ڈرائیور۔"

دلاور نے کہا "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ چار نہیں ہوں گے' ڈکی میں دو آدمی ہوئے تو مجھے کیسے پتا چلے گا۔ وہ نوشابہ کو میرے حوالے کرنے کے بجائے مجھے بھی ساتھ لے جا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "تمہاری تشویش بجا ہے۔ تم بھی خالی ہاتھ تو نہیں آؤ گے۔ ہم یہ مطالبہ کریں کہ اسلحہ لے کر کوئی نہیں آئے گا تو یہ احمقانہ بات ہوگی۔ نہ تمہارے وعدے کی ضمانت ہے نہ ہمارے وعدے کی۔ ہاں ٹیکسی ڈرائیور تمہیں ڈکی چیک کرا سکتا ہے۔ وہ سڑک پر تم سے آگے نکل کے رک جائے گا اور ڈکی میں لیٹ کر دکھائے گا۔ ظاہر ہے اس میں پہلے سے دو آدمی ہوں یا ایک بھی ہو تو دوسرا آسانی سے نہ اندر لیٹ سکتا ہے اور نہ نکل سکتا ہے۔ خیانت کا استعمال کرنے کی سوچنا بھی نہیں ورنہ نتائج کے ذمے دار تم خود ہو۔ تم اور تمہاری بیوی مارے جائیں۔ پیڈرو مارا جائے اور کوئی بھی نہ بچے رہے نام اللہ کا۔ پولیس دونوں گاڑیوں پر اور لاشوں پر قبضہ کر لے گی۔"

"جب تم خود نہیں آرہے ہو تو مجھ سے کیوں توقع رکھتے ہو۔"

"اے چودھری صاحب۔ آخر بیوی تمہاری ہے وہ۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ تم ضرورت سے زیادہ ہی چالاک بن رہے ہو۔ میں نہیں آؤں گا۔ پیڈرو کے ساتھ بھی میرا ڈرائیور آئے گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔" میں نے کہا اور فون بند کر کے لوٹ آیا۔

اب افراتفری میں پلان کے دوسرے حصے پر عمل درآمد شروع ہوا۔ میں نے دلاور کی بیوی سے کہا "چلیں جی اللہ نے آپ کے بچوں کی سن لی۔ چودھری دلاور کا دماغ راہ راست پر آگیا۔"

"اب میں بات کرلوں؟" اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"کر لینا ابھی چند منٹ میں" میں نے کہا۔

پروگرام کے مطابق غالب اور نازو نے وقار کی گاڑی میں سے سب مشین گن نکال کے اندر پورچ میں چوکیدار کے کیبن کے پیچھے رکھ دی پھر وہ رابعہ کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ اسے رابعہ کو اخبار کے آفس میں چھوڑنا تھا اور نازو کے ساتھ وقار کے گھر جانا تھا۔ نقوی صاحب کی ذاتی کار بہت کم استعمال ہوتی تھی کیونکہ مال مفت کے مصداق سرکاری خرچ پر چلنے والی کار زیادہ بے دردی سے استعمال کی جاتی تھی۔ ذاتی کار ان کی نئی زیر تکمیل کوٹھی میں کھڑی ہوئی تھی۔ ان کے شوفر کو جو ابھی واپس نہیں بلایا گیا تھا یہ کار لے کر یہاں پہنچنا تھا۔

www.paksociety.com

"بہت بدتمیز آدمی ہو تم"

"تم بڑے تمیزدار ہو۔ میرے گھوڑے کو گولی مار دی خدا کے لیے۔"

میں نے کہا "میری نظر اتنی کمزور نہیں ہے اور نہ نشانہ اتنا خراب ہے کہ میں گھوڑے پر گولی چلاتا اور اسے نہ لگتی۔ وہ تو بس ایسے ہی غلطی سے فائر ہو گیا تھا۔"

غالب نے کہا "چلو چار سو روپے لے لو۔ اور سو لے لو جرمانہ۔"

"اب دو لاکھ روپے بھی دو تو میں نہیں جانے والا۔ جب گاڑی میں پٹرول ڈلوانے کے لیے پیسے نہیں تھے تو گاڑی کیوں لی تھی۔ ایسا ہی رہزن بننا ہے" اس نے گھوڑے کو مخاطب کیا "چل ارے دلاور شیر۔ تجھے کون سی پٹرول کی ضرورت ہے۔"

رہزن اچانک جیب سے نیچے راستے پر اترا اور روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر کے لیے میں غصے سے اتنا مغلوب ہو گیا تھا کہ میں نے پھر ریوالور نکالا اور اس مرتبہ رہزن کے بائیں کان چھیدنے کا سوچا۔ بوڑھے کے دو ہاتھ مار کے اس کی خودی کو عرش سے فرش پر لانے کا سوچا اور گھوڑے کو اغوا کرنے کا بھی سوچا مگر غالب کی طرح مجھ پر بھی شرمندگی غالب تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ایک مفلس کی قوت فیصلہ کو دولت شکست نہ دے سکی تھی۔ پانچ سو روپے اس کے لیے بہت تھے مگر اپنے پیارے گھوڑے پر تاکا نہ حملے سے ہونے والے جذباتی صدمے کا ملال کہیں زیادہ تھا۔

"کچھ لوگ واقعی خریدے نہیں جا سکتے۔ آج ثابت ہو گیا" غالب بولا۔

"مرعوب اور خوف زدہ بھی نہیں کیے جا سکتے" میں نے تسلیم کیا۔

ہم سخت پریشانی کا شکار تھے۔ دوپہر کے دو بجے سورج کی تمازت عروج پر تھی۔ گرم تنور کھیتوں سے بخارات اٹھ رہے تھے۔ گرمی سے ہمارا پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور ہم گرد و غبار سے اٹی ہوئی ویران راہ گزر پر دو گاڑیاں ہونے کے باوجود بے بس و لاچار کھڑے ہوئے تھے۔ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس جگہ سے قریب ترین سڑک یا آبادی کتنے فاصلے پر ہو گی۔ گاڑیوں کو یوں چھوڑ کے جانا بھی مسئلہ تھا۔ اس سے دونوں طرف کی ٹریفک بلاک ہو گئی تھی۔ اگر سامنے سے کوئی رہزن آ جاتا یا بیل گاڑی آ جاتی تو وہ سیدھی نہیں گزر سکتی تھی اور الٹا چلتے ہوئے اتنی بڑی گاڑی کو کھینچ کر لے جانا ناممکن تھا۔ یہی صورت حال پیچھے کی طرف تھی میرے لیے ریورس میں جانا مشکل ضرور تھا ناممکن نہیں تھا۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا درست" میں نے آہ بھر کے کہا "چلو مجبوراً جس راہ پر خطرے بچ کے آگے جا رہے تھے اب الٹے اس پر واپس جاتے ہیں۔ کسی پٹرول پمپ سے پٹرول لا کے اس گاڑی میں ڈالیں گے تو یہ خود اپنی جگہ سے ہلے گا۔"

"اور تب تک راستہ بلاک رہے گا؟"

"تو رہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں" میں نے کہا "جس میں ہمت ہو وہ گاڑی کو راستے سے ہٹا دے یا اوپر سے گزر جائے۔ ہم پہلے ہی بہت لیٹ ہو گئے ہیں۔ دو گھنٹے اور لگ جائیں گے۔ رابعہ پریشان ہو گی۔"

"اچھا؟ اب بھی پریشان ہوتی ہیں خاتون؟" غالب نے میرے ساتھ بیٹھ کے کہا "میرا خیال تھا کہ اتنا عرصہ ساتھ رہ کے عادی ہو چکی ہیں۔ پریشانی نہ ہونے سے پریشان ہونا چاہیے۔"

میں نے آہستہ آہستہ گاڑی کو الٹا چلانا شروع کیا۔ مجھے امید تھی کہ کچھ دور جا کے کوئی ہموار جگہ ضرور مل جائے گی جہاں گاڑی کو موڑ کے سیدھا چلانا ممکن ہو گا۔ ابھی ہم نے مشکل سے پچاس ساٹھ گز کا فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ میرے کانوں میں ایک فائر کی آواز آئی۔

غالب نے بھی بے اختیار پلٹ کے دیکھا "یہ... گولی کس نے چلائی ہے؟"

میں نے گاڑی روک دی "ادھر شکار کے شوقین تو نہیں۔"

"یار یہ ریوالور کے فائر کی آواز تھی۔" غالب نے کہا۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور گاڑی بند کر کے دو جیب اتر گئے۔ میں نے دائیں جانب اور غالب نے بائیں جانب گندم کے کھیتوں میں پناہ لی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ جن سوزوکی پر ہماری واپسی کا انتظار کرنے والے ہی ہمارے تعاقب میں آئے ہوں۔ دلاور کی سبز گاڑی میں اس کی بیوی اور بیٹا خیر و عافیت کے ساتھ گزر گئے تو ان کو گویا مشکل حل کیا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔ شاید دلاور نے انہیں یہی کہا کہ جب تک میرا بے وقوف بیٹا اور اس کی بیوی اپنا سکندر کی تحویل میں ہوں ایسی کوئی کارروائی مت کرنا جس سے ان کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ ایسی صورت میں یہ مسئلہ طاقت سے نہیں سیاست سے حل ہو گا لیکن ایسا کوئی معجزہ رونما ہو جائے کہ وہ جذباتی نوعمر لڑکا اپنی ماں کو ساتھ لانے میں کامیاب ہو جائے تو پھر اس سکندر اعظم کو زندہ یا مردہ میری خدمت میں پیش کرنے کے لیے تم جس حد تک جا سکتے ہو اس میں کوئی کمی مت کرنا۔ شاید دلاور خود اپنے لشکر کی کمان کر رہا ہو۔ اسے امید ضرور ہو گی کہ ہم وضع داری اور شرافت کے جذباتی جھانسے میں ایک عورت کے ساتھ غیر انسانی سلوک ہرگز نہیں کریں گے اور ماں کے لیے بیٹے کی درد بھری فریاد اور ممتا کی تڑپ سے متاثر ہو جائیں گے تو کہیں گے کہ جاؤ۔ دلاور زندہ یا مردہ تو ہم اس سے برابری کی سطح پر بات کرتے مگر اس بچے کی بات کا کیا جواب دیں جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے ماں کو مانگنے آیا ہے۔

ہم دلاور کی توقعات کے عین مطابق شرافت اور حماقت سے ہار گئے تھے اور اب میدان صاف پا کے اس نے اپنے شکاری کتوں کے ذریعے حملے کروائے تھے کہ وہ ہمارے پیچھے لگ جائیں۔ میں

www.paksociety.com

دلاور کے اشتعال کی کیفیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ اس کی بیوی نے پہلے اپنی حماقت سے یہ موقع فراہم کیا تھا کہ دشمن اس کی عزت کو رسوائی بنالیں۔ رہی سہی کسر صاحب زادے نے پوری کردی تھی۔ فیصلے نے اسے پاگل کر دیا ہوگا لیکن شاید پہلی بار اسے احساس ہوا ہوگا کہ طاقتور سے طاقتور انسان بھی اس وقت خود کو کتنا بے بس اور مجبور محسوس کرتا ہے جب اپنے گھر کی دیوار میں رخنے نمودار ہونے لگیں اور اسے سہارا فراہم کرنے والے اپنے ہاتھ بھی اپنے نہ رہیں۔ باہر کے محاذ پر اس نے پایا... شکست کی ذلت برداشت کی تھی مگر یہ جذباتی شکست کا پہلا تجربہ اس کے لیے بہت تلخ ثابت ہوا ہوگا۔ اسے احساس ہوا ہوگا کہ رفیق بھی اس کا نہیں رہا۔ اب وہ اپنی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا اور اسے رسوائی کا تماشا بنانے پر عبرت ناک سزا نہیں دے سکتا۔ جو اس کی مجبور بیوی تھی اب ایک جوان بیٹے کی ماں ہے اور وہ بیٹا بغاوت کر چکا ہے لیکن وہ بغاوت کے جرم میں اسے موت کی سزا نہیں دے سکتا۔ جو وہ دوسروں کو دیتا آیا تھا۔

میں کھیت میں تقریباً بیس گز اندر پکی ہوئی فصل کے درمیان اس وقت تک بالکل محفوظ تھا جب تک میں خود دشمن کو اپنی موجودگی کا سراغ نہ دوں۔ میرے سامنے ہزاروں سرکنڈوں جیسی شاخوں، نوکیلی دھار والی پتیوں اور گندم کے خوشوں کی سرسبز دیوار تھی جس میں سے صرف میری نظر کچی سڑک کا ایک حصہ دیکھ سکتی تھی۔ اس سڑک پر سے گزرنے والا کوئی شکاری مجھے تلاش نہیں کر سکتا تھا۔

اب میں واضح طور پر ان کی آوازیں سن رہا تھا۔ معلوم نہیں کیوں وہ گاڑی یا موٹر سائیکل لے کر نہیں آئے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کم سے کم چار آدمی تھے جو ادھر دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ بالکل مخالف سمت میں اس راستے کی دوسری جانب کہیں غالب بھی میری طرح مورچہ بند تھا اور اپنی کمین گاہ سے اس راستے کو دیکھ رہا تھا جس پر دلاور کے چھوڑے ہوئے پیشہ ور قاتل ہمارا سراغ تلاش کرنے آگئے تھے۔ ہم اس وقت تک گولی چلانے کے قائل نہ تھے جب تک ہم پر گولی نہ چلائی جائے ورنہ اس دفاعی پوزیشن میں چار چھ افراد کو نشانہ لے کر گولی مارنا بہت آسان ہوتا۔

گرمی سے میرا برا حال تھا۔ سب پودے خالص آکسیجن فراہم کر رہے تھے مگر حبس سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ جڑوں کے قریب حشرات الارض آزادانہ گھوم رہے تھے اور انہیں جھٹکنے کے لیے مجھے بار بار اپنا پاؤں زمین پر مارنا پڑتا تھا۔ ذرا اوپر اُڑنے والے ننھے منے مچھر جیسے جانور صرف گردن یا چہرے پر کاٹ کے مطمئن نہیں تھے۔ وہ قمیص کے گلے سے اندر پہنچ گئے تھے اور میرے جسم کا سروے کر رہے تھے۔ انہیں بے دخل کرنا مشکل تھا۔ بیشتر کو میں نے قمیص کے اندر ہی مسل دیا مگر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میرے لیے ساکت بیٹھنا مشکل تر ہونے لگا تھا۔ میرے ہلنے سے پودے اور اوپر گندم کے خوشے ہلتے تھے اور یہ حرکت دشمن کو ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلانے کے مترادف تھی۔

میری نظر نے اچانک دو افراد کو دیکھا جو ہاتھوں میں ریوالور تھامے ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ وہ انداز و اطوار سے خطرناک بدمعاش نظر آنے کی پوری کوشش کر رہے تھے اور ان کے عزائم بہرحال قاتلانہ تھے۔ جو زبان وہ آپس میں بول رہے تھے اس میں شریفانہ الفاظ کم تھے گالیاں زیادہ تھیں۔ نچلے والی گالیاں ہمارے لیے تھیں۔ بے تکلفی کی گالیوں سے وہ ایک دوسرے کو مخاطب کر رہے تھے۔ وہ سب بیس سے پچیس سال کی درمیانی عمر کے نوجوان تھے۔ جسمانی طور پر صحت مند بھی تھے لیکن ان کی صورتیں ان کے اعمال کی کہانی کہتی تھیں اور ان کے نفرت انگیز ماضی کی تصویر تھیں۔ احساسِ محرومی، غلط صحبت، حادثاتِ زمانہ یا مختصراً قسمت نے انہیں غلط راستوں پر ڈال دیا تھا اور غلط وقت پر ان کے ہاتھوں میں غلط چیز تھما دی تھی۔ کتاب یا قلم کی جگہ ان کے ہاتھوں نے ریوالور کو کامیابی کا شارٹ کورس کرنے کے لیے منتخب کرلیا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس شارٹ کورس سے ان کی زندگی کا سفر شارٹ ہو کے اچانک تختۂ دار پر ختم ہو سکتا ہے۔ انہوں نے مختصر جوا کھیلنے کو ترجیح دی تھی اور داؤ پر اپنی زندگی لگادی تھی۔

وہ سب گاڑی کے قریب آکے ٹھہر گئے تھے۔ اب وہ ہر طرف گھوم کے ہمارا سراغ لگانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

"ابے او چیکے۔ دونوں گاڑیاں یہاں کیوں کھڑی ہیں آخر؟"

چیکے نے پُرتمسخر جواب دیا "میں نے پوچھا تھا گاڑیوں سے۔ ایک کہتی ہے میری مرضی۔ دوسری سے تم خود پوچھ لو۔"

ظاہر ہے چیکے نے گالیاں کھائیں کیونکہ ان کے باقی ساتھی ہنس پڑے تھے پھر کسی نے کہا "او یار گاڑی خراب بھی ہو جاتی ہے۔"

"مغز خراب ہے تیرا۔ ایک ساتھ دونوں گاڑیاں کیسے ہو گئیں؟ اور یہ نویں نکور گاڑی خراب ہو سکتی ہے؟" یہ چوتھے شخص کی آواز تھی۔

"بات کچھ اور ہے۔ پتا کرو" نمبر ون زیادہ سنجیدہ تھا اور اس کا دماغ صحیح خطوط پر سوچ رہا تھا۔

جسے نیکا کہہ کے مخاطب کیا گیا تھا وہ اچانک ہی مسکرایا "کیا؟ انہیں شیر اٹھا کے لے گئے ہوں اور کھا گئے ہوں۔ میں کس سے کہوں؟"

"جنگلی سور اٹھا کے لے گئے ہوں گے تا تیری بے بے کو۔ سؤر وے پھرتا کچھ نہیں تھا کیونکہ اس کے سوا تو ہمارے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی۔" نمبر ون کا پارہ چڑھ گیا۔

نمبر تین بولا "یار وہ ادھر اُدھر ہو گئے۔"

"ہاں۔ یہی خیال ہے میرا بھی۔ ان کو پتا چل گیا کہ ہم پہنچا

کر رہے ہیں اور وہ دوڑ کے جان نہیں بچا سکتے۔"

"دوڑنا تو گاڑی کو تھا۔ گاڑی چھوڑنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ گاڑی سے زیادہ تیز دوڑ سکتے تھے۔" نیکا بدستور غیر سنجیدہ رہا۔

"تو باز نہیں آئے گا۔"

"نہیں یار۔ سوچنے کی بات ہے۔ انہیں تو پتا نہیں ہوگا کہ ہماری جیپ خراب ہو گئی ہے۔ ہم اب ایک جیپ پر نہیں، دو گاڑیوں پر آرہے ہیں۔"

"کچھ ٹھیک ہے نیکا۔ بھاگنے کے لیے گاڑی زیادہ کام کی چیز تھی۔ گاڑی ضرور خراب ہوگی" نمبر تین بولا۔

پھر نمبر چار نے کہا "میں بتاؤں؟ آگے والی گاڑی خراب ہو گئی۔ پیچھے والی پھنس گئی۔"

نمبر ون نے دوبارہ اس مفروضے کو مسترد کر دیا "اوئے تم سب پاگل ہو؟ یہ خراب ہونے والی گاڑی نہیں ہے۔"

نیکا بولا "نئی گاڑی میں بھی پیٹرول ختم ہو جائے تو نہیں چلتی۔"

گاڑیوں کے بیچ سڑک میں رک جانے کی وجہ معلوم کرنے کے لیے ہر ایک کی تجویز الگ تھی۔ ایک نے کہا کہ شیشہ توڑ دو سائڈ کا اور بونٹ کھول کے دیکھو۔ دوسرے نے کہا کہ بونٹ ویسے بھی کھولا جا سکتا ہے لیکن اسے موقع فراہم کیا گیا تو وہ نیچے لیٹ کر بھی بونٹ کھولنے میں ناکام رہا۔ تیسرے نے مختلف چابیاں آزمانے کا مشورہ دیا۔ اس سے وقار یوسف کی گاڑی کا دروازہ کھل گیا کیونکہ اس کے لاک پرانے ہو چکے تھے۔ ان کے دندانے اور گراریاں گھس چکی تھیں۔ نئی کار کے کسی لاک میں کوئی چابی کام نہیں آئی لیکن مسخرا نیکا ایک تار کی مدد سے ایک لاک کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد بونٹ کھول کے دیکھا گیا اور چیکے نے اس پائپ سے منہ لگا کے پیٹرول کھینچا جو کاربوریٹر سے ملا ہوا تھا۔

"تھو، پیٹرول تو بہت ہے" اس نے ہوا خارج کر کے کہا۔

"پیٹرول ہے نا۔" نمبر ون بولا "میں نہ کہتا تھا۔"

"پیٹرول گاڑی میں نہیں۔ پیٹرول پمپ پر بہت ہے۔ اپنے گاؤں میں بہت ہے۔" نیکا ہنس پڑا "گاڑی میں پائپ سے صرف ہوا آرہی ہے۔ گاڑی اسی لیے ادھر کھڑی ہو گئی ہے۔"

تیسرے نے کہا "پھر تو پکی بات ہے وہ ادھر اُدھر ہو گئے۔"

نمبر ون بولا "ٹھیک ہے۔ تم ادھر دیکھو۔ تم دونوں، میں اُدھر جاتا ہوں۔ وہ زیادہ دور نہیں جا سکتے۔ چیکے، چپ کر کے چلنا ہے میرے ساتھ۔"

"میں تو بالکل چپ ہوں پہلے ہی" وہ بولا۔

میں نے پودوں کی سرسراہٹ سے اندازہ کیا کہ وہ کھیت میں داخل ہو گئے ہیں۔ انہوں نے بہت جلد سمجھ لیا تھا کہ ہم گاڑیاں چھوڑنے پر کیوں مجبور ہوئے تھے اور وہ صحیح سمت میں ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ میں ان کے قدموں کی آواز پر کان لگائے بیٹھا رہا۔

ان کے بوٹوں سے پودوں کے تنے ٹوٹ رہے تھے اور کپڑوں سے رگڑ کھا کے خوشے بکھر رہے تھے۔

"اللہ معاف کرے۔ ہم رزق پر چل رہے ہیں" چیکے کی آواز آئی۔

"رزق کے گھوڑے۔ وہ تیرا باپ ادھر اُدھر ہوگا تو تیری آواز سن لے گا" اس کے ساتھی نے دبی دبی آواز میں ڈانٹا۔

وہ مجھ سے دس گز دور اپنا راستہ بناتے آگے جا رہے تھے اور میرا ان کی راہ میں حائل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر میں بالکل تیار تھا کہ وہ رخ بدل کے میری طرف آنے لگیں تو انہیں حلق سے آواز نکالنے کا موقع بھی نہ ملے۔ پھر وہ بات ہوگئی جس کا مجھے ڈر تھا۔ کوئی مچھر سے بھی چھوٹا اُڑنے والا کیڑا سیدھا میری ناک میں داخل ہوگیا۔ اسے آگے راستہ بند ملا تو وہ زیادہ حساس حصوں کی طرف چلا گیا اور انتہائی ضبط کے باوجود میں چھینک کو نہ روک سکا۔ اسے تقدیر یا ستم ظریفی کہا جاتا ہے۔ ہر احتیاط اور حفاظتی تدبیر رائیگاں گئی۔ ایک حقیر کیڑے نے اشرف المخلوقات کی عقل کے فیصلوں کی ساری افادیت ختم کردی۔

وہاں چھینک کسی بم کے دھماکے سے کم نہ تھی "اوئے چیکے ہوشیار۔"

چیکے نے جواب دیا "ہوشیار، خبردار۔ بندہ اِدھر ہی موجود ہے۔"

انہوں نے اندازے سے سمت کا تعین کرتے ہوئے فائر جھونک دیے مگر میں اس سے پہلے ہی وہ جگہ چھوڑ چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری موجودگی کا راز فاش ہوتے ہی ان کا ردِعمل کیا ہوگا۔ اب میں نے جوابی کارروائی کی اور ان کی طرف یکے بعد دیگرے دو فائر کئے پھر میں جگہ چھوڑ کے پیچھے دوڑا۔ مشکل یہ تھی کہ پودوں کی حرکت سے ہم سب ایک دوسرے کی نقل و حرکت کا بالکل صحیح اندازہ کر سکتے تھے۔ اب تک کسی کے زخمی یا ہلاک ہونے کا سبب صرف یہ تھا کہ کسی نے بھی دیکھ کے نشانہ نہیں لیا اور گولیاں دائیں بائیں سے گزر گئی تھیں۔ جب دوبارہ مجھ پر فائر ہوئے اور میں محفوظ رہا تو میرے لیے جگہ بدلنا پھر ضروری ہوگیا۔ مجھے بھی ہلتے ہوئے پودے بتا رہے تھے کہ وہ دونوں کہاں ہیں۔ میں نے ایک کا نشانہ درست رکھتے ہوئے گولی چلائی اور جب کوئی چیخ مار کے بلبلایا تو مجھے عجیب سی وحشیانہ خوشی ہوئی۔ چلانے والا نیکا تھا جو شاید سخت زخمی ہو کے گرا تھا اور تڑپ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں چلانے سے طوفان سا آگیا تھا اور ایک طرف کے پودے ایسے گر رہے تھے جیسے آندھی چل رہی ہو۔

دوسرے شخص نے اشتعال اور انتقام کے جنون میں دو ہوائی فائر کئے۔ اب اس کے ریوالور کی گولیاں ختم ہوگئی تھیں اور میرے پاس ابھی تین گولیاں بچی ہوئی تھیں۔ میرے حریف نے چھ گولیاں ضائع کر دی تھیں جب کہ میں نے تین میں سے ایک کا صحیح استعمال

www.paksociety.com

کیا تھا۔

اپنے ذہن کے حساب کتاب کی مدد سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جب تک دشمن دوسرا ریوالور استعمال نہ کرے وہ مجھ پر مزید فائر نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایک ہی ریوالور لے کر آیا تھا تو وہ لازماً خود کو مسلح کرنے کے لیے فیکے کا ریوالور حاصل کرے گا جس میں دو گولیاں باقی تھیں۔ اس کے لیے وہ ٹھیک اسی جگہ جانے پر مجبور ہوگا جہاں فیکا دم توڑ رہا تھا۔ اس کی بھیانک آواز اب ہلکی خراش خراتوں جیسی آواز میں بدل گئی تھی جو اس کے حلق سے نکل رہی تھی۔ پورے بھی اب کم ہل رہے تھے جس سے یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ زیادہ خون بہہ جانے کے بعد فیکے کا جسم تڑپنے کے قابل بھی نہیں رہا۔

یہ خاموشی کا ایک بھیانک وقفہ تھا جس میں ہر جانی دشمنوں کے بہت قریب فرشتۂ اجل بھی موجود تھا یا پہنچنے والا تھا۔ فیکے کی روح قبض کرنے کے بعد اسے ہم دونوں میں کسی ایک کی جان لینی تھی۔ میں دو گولیوں کو بچا کے رکھنا چاہتا تھا اور اس وقت کے انتظار میں تھا جب میرا حریف طاقت کا توازن حاصل کرنے کے لیے حرکت کرے اور وہ ریوالور اٹھائے جو مرجانے والے کے لیے بے مصرف ہو گیا تھا۔

سڑک کے دوسری طرف سے ایکدم فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں نے پہلے تین آوازوں سے اندازہ کیا کہ وہ سب ایک ساتھ گولیاں چلا رہے ہیں پھر کسی نے بھیانک چیخ مار کے گالی دی اور چند سیکنڈ تک دو ریوالور استعمال ہوئے۔ ان میں ایک یقیناً غالب کا ریوالور تھا۔

میرے سامنے ایک دم حرکت ہوئی اور یہ حرکت اسی سمت میں تھی جدھر فیکے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ میری قیاس آرائی درست ثابت ہونے لگی تھی۔ کسی تذبذب کے بغیر میں نے نشانہ لیا اور ریوالور خالی کر دیا۔ آخری فائر کے بعد بھی میں نے کوئی چیخ نہیں سنی تو مجھے مایوسی نے گھیر لیا۔ میرا نشانہ خطا ہو گیا تھا اور اب میں خالی ہاتھ رہ گیا تھا۔ میرے دشمن کے پاس دو گولیاں تھیں اور وہ بے خوف و خطر میرے سامنے آ کے صرف ایک گولی سے میرا کام تمام کر سکتا تھا۔

خرچ ہونے والی گولیوں کا حساب میں نے رکھا تھا تو میرے دشمن نے بھی رکھا ہوگا لیکن اس نے عجلت سے کام لیا اور ایک فائر فوراً داغ دیا۔ اس وقت میری ساری قوت میری زبان ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے بھی ایک کربناک چیخ بلند کی اور ذبح کیے جانے والے بکرے جیسی آوازیں نکالنے لگا۔ میں نے ادھر ادھر ٹانگیں چلائے اور ہاتھ مارے کے پودوں کو اسی طرح ہلایا جیسے فیکے نے نزع کے کرب میں ہلایا تھا۔ یقیناً میرے دشمن نے بھی یہ نظارہ بڑی خوشی اور فتح کے غرور سے دیکھا ہوگا لیکن اس نے دوسری گولی کو محفوظ کر لیا تھا اور ابھی رہیں موجود تھا۔ ایک منٹ سے بھی کم مدت میں مرجانے کی اداکاری کرتے ہوئے میں ہاتھ پیر جھٹکا کے ساکت ہو گیا۔

آہستہ آہستہ میں نے اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کی صدا سنی۔ وہ بہت محتاط طریقے سے میرے قریب آ رہا تھا اور مجھے خوف یہ تھا کہ کہیں میری موت کا یقین حاصل کرنے کے لیے وہ آخری گولی بھی نہ چلا دے۔ لیکن یہ رسک لیے بنا چارہ نہ تھا۔ بے دم سادھے لاش کی طرح پڑے پڑے میں نے دل ہی دل میں خدا سے دعا کی کہ مجھے مقابلہ کرنے کی مہلت ضرور دے۔ میں ایسے بے جان لاش کی طرح لیٹے ہوئے گولی کا نشانہ نہ بنوں۔

دوسری طرف کے محاذ کی خاموشی کو پھر ایک فائر اور ایک چیخ کی آواز نے منتشر کیا۔ یہ چیخ غالب کی نہیں تھی۔ غالب کا نشانہ شروع سے ہی قابلِ رشک رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں حریفوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے یہ یقین نہ رہا کہ مقدر مجھے مزید مہلت عطا کرے گی۔ یہ خوف میرے اعصاب پر سوار تھا کہ میرے نزدیک پہنچنے کے بعد دشمن میرے سر میں آخری گولی ضرور مارے گا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا کیونکہ پھر خطرہ کوئی نہ رہتا۔

وہ اب بہت قریب آ گیا تھا۔ میں جان کی بازی لگا کے اس پر جست لگانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ایسے لیٹے لیٹے گولی کا نشانہ بن جانا خودکشی کے مترادف تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی قوت کو مجتمع کر کے اٹھتا میں نے غالب کی آواز سنی۔ وہ مجھے بھی پکار رہا تھا اور دشمن کو بھی للکار رہا تھا۔

"تو ٹھیک ہے نا؟ وہ تینوں مارے گئے ہیں میں نے اب ایک باقی ہے نا۔ آنے دے ادھر سالے کو" وہ سڑک کی جانب سے بول رہا تھا۔

میرے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا اور میں آج کہہ سکتا ہوں کہ وہ موت کا پسینہ تھا۔ اچانک جیسے میرے ہاتھ پاؤں میں طاقت نہیں رہی تھی اور میں مفلوج ہو گیا تھا۔ مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں نے دیر کر دی ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کی نظریں میری لاش پر جمی ہوئی تھیں۔ چشمِ تصور سے میں اس کے لبوں کی مسکراہٹ بھی دیکھ رہا تھا اور یہ بھی کہ اس نے اپنا ریوالور والا ہاتھ اوپر اٹھا لیا ہے۔

پھر اچانک مجھے اپنی دعا کے مستجاب ہونے کی نوید ملی۔ خدا نے میری سن لی تھی اور مجھے مقابلے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ غالب کی آواز نے میرے غنیم کو بدحواس کر دیا۔ وہ ایک دفاعی پوزیشن پر چلا گیا۔ اس نے اپنی آخری گولی ضائع نہیں کی کیونکہ وہ نہتا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کسی لاش کے مقابلے میں ایک زندہ اور مسلح دشمن پر ور گولی چلانے سے تحفظ کی ضمانت حاصل ہو سکتی تھی۔ لاش پر تو گولی ضائع ہی جاتی۔ اگر اس کا ارادہ قریب آ کے مجھے پھر شوٹ کرنے کا تھا تو اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ مجھ

رفت پر یہ ارادہ بدل گیا ورنہ وہ بھی دست مارا جاتا۔

میں نے آہستہ آہستہ گردن کو حرکت دی اور آنکھیں کھول کے دیکھا۔ وہ مجھ سے چند قدم دور موجود تھا مگر میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ سڑک کی طرف تھی۔ اب میری زندگی کی ضمانت بے حس و حرکت پڑے رہنے میں تھی۔ مقابلہ غالب کے اور میرے دشمن کے درمیان تھا۔ کسی آہٹ کے بغیر میں نے رومال نکالا اور اپنی ناک پر رکھ لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پھر کوئی کیڑا مجھے بیچ بچ میں ورا دے۔ چیونٹے میری گردن پر رینگ رہے تھے اور میرے بازوؤں کے راستے قمیص میں داخل ہو چکے تھے لیکن میں سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ میں جانتا تھا کہ حشرات الارض بھی اتنے بے وقوف نہیں ہوتے کہ زندہ اور مردہ میں فرق کو نہ سمجھتے ہوں۔ وہ جانور کی لاش بے خوفی سے کھاتے ہیں مگر زندہ جانور سو رہا ہو تو یہ جسارت نہیں کرتے۔

مجھے ضبط اور قوتِ برداشت کے مظاہرے کا یہ وقفہ گھنٹوں طویل لگا ہر چند منٹ کی بات تھی۔ غالب اپنی محفوظ دفاعی پوزیشن میں رہتے ہوئے کوئی حکمتِ عملی وضع کر رہا تھا جس سے وہ آخری دشمن کو اچانک مار گرائے۔ میری طرح اس نے بھی ہر فائر کے بعد بلند ہونے والی چیخ سنی ہوگی۔ چیخ تو میری بھی بہت دلخراش تھی اور میں نے بہت شور کیا تھا۔ غالب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً دھوکا کھا جاتا مگر وہ مجھے جانتا تھا اور میری آواز کے فطری اور غیر فطری لہجے کے فرق کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میرا ہلبلانا اور واویلا "ایکٹنگ" ہے۔ سچ مچ مرتے ہوئے میں اتنا ہنگامہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے گولی لگے یا گولا۔ مجھے اس کی ذہانت اور اعتماد نے پھر زندگی کی طرف کھینچ لیا تھا ورنہ اپنی طرف سے تو میں کلمہ بھی پڑھ چکا تھا اور موت کو گلے لگا چکا تھا۔

اچانک سڑک کی طرف سے ایک خاصا بڑا پتھر آیا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر گرا۔ میں احتیاط بھول گیا اور میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو میرا دشمن چھلانگ مار کے کچھ آگے چلا گیا تھا۔ میری طرف اس کی توجہ ہی نہیں تھی ورنہ ایک مردے کو پٹ پٹ آنکھیں جھپکا تا دیکھ کے وہ میرے چکر کو سمجھ جاتا۔ یہ میری خودکشی کی دوسری احمقانہ کوشش تھی جو خوش قسمتی سے ناکام رہی۔

غالب نے چلا کے کہا "ارے کچھ بول منہ سے۔ کہاں لگا؟ کیا منہ ہی ٹوٹ گیا ہے؟"

اس نے غالب کو زیر لب گالی ضرور دی ہوگی۔ مجھے اس بات پر ہنسی آئی تھی لیکن میں صرف مسکرایا۔ اب میں زیادہ بے فکری سے دشمن کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا پوز نہیں بدلا تھا مگر اب وہ میری طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا تو میں آنکھیں کھلی رکھ سکتا تھا۔

سڑک پر سے غالب نے دوسرا پتھر پھینکا جو اس کے سر کے قریب سے گزر کے کھیت کی نرم مٹی میں دھپ سے گرا۔ اس نے بدحواس ہو کے پھر جگہ بدلی۔

"ارے نیری تو..." غالب کا اعلان خاصا اشتعال انگیز تھا۔ غالب پودوں کے پیچھے سے دشمن کی نقل و حرکت کا اندازہ کر رہا تھا۔ نشانہ لینے سے پہلے وہ اس کو دائیں بائیں دوڑانا چاہتا تھا۔ یہ بڑی مؤثر حکمتِ عملی تھی کیونکہ خود غالب اپنے دشمن کی نظر سے اوجھل تھا۔ شاید وہ کسی گاڑی کے پیچھے تھا اور اسے پتھر بھی دستیاب تھے۔ پرانے درختوں میں محصور ہو جانے والے دشمن کو باہر نکالنے کے لیے بھی گلیل سے ایسے ہی پتھر پھینکے جاتے تھے۔

"تیرا سر نظر آ رہا ہے مجھے" غالب نے بہ آوازِ بلند اسے ایک گالی دے کے کہا "لے بچ"

وہ بے اختیار جھکا اور اسی وقت غالب نے فائر کیا۔ دشمن کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ وہ غالب کو نہیں دیکھ سکتا مگر غالب واقعی اسے دیکھ رہا ہے۔ بلف کرنے کی یہ چال کامیاب رہی۔ اس نے ایکدم ریوالور اٹھایا اور غالب کی آواز کی سمت کا تعین کرتے ہوئے آخری گولی چلا دی۔ غالب کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اس وقت تک وہ اپنی جگہ سے کئی گز دور چلا گیا ہوگا۔

فائر کی آواز کے ساتھ ہی میں نے غالب کا قہقہہ بلند ہوتے سنا تو میرے جسم میں بجلی بھر گئی۔ میں تڑپ کے اٹھا اور کسی نرم خو چیتے کی طرح اس پر حملہ آور ہوا۔ سڑک کی طرف سے غالب نے کہا "پھر نشانہ لے نیری تو..."

وہ دیوانہ وار بھاگا مگر وہی کھیت جو اس کے لیے بھی پناہ گاہ تھے اب اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ میں نے چلا کے کہا "بھاگ کے کہاں جائے گا بھاگ کے..." میں نے اس جملے میں دو مرصع گالیاں استعمال کرتے ہوئے اسے گھیرا۔ جب اس نے دیکھ لیا کہ اب میرے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچنے ہی والے ہیں تو اس نے خالی ریوالور مجھ پر کھینچ مارا جس کی چھ گولیاں ضائع ہو چکی تھیں۔ اتنے قریب سے نشانہ خطا نہیں ہو سکتا تھا۔ ریوالور میرے ماتھے پر لگا اور مجھے دن میں تارے نظر آ گئے۔ اندھیرے میں جگنو سے اڑنے لگے اور میں لڑکھڑا کے منہ کے بل گرنے لگا۔ اس نے پلٹ کر مجھے دبوچنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے ساتھ ہی گرا۔ اس کی گردن میرے ہاتھ میں آ گئی اور خود بخود ٹوٹ گئی۔ کم سے کم اس وقت میرا خیال یہی تھا۔

چند منٹ میں مجھے ہوش بھی آ گیا۔ غالب مجھے سہارا دے کر اٹھا رہا تھا۔ میرے قریب ہی آخری دشمن مرا پڑا تھا اسے لیٹا ہوا تھا کہ اس کی کھلی آنکھیں مجھے ریجھتی رہ گئی تھیں۔ میرے ہاتھوں نے ہوش کے آخری لمحات میں اس کی گردن مروڑ دی تھی۔ یہ ایک فطری اور غیر ارادی ردِعمل تھا جس میں صرف میرے ہاتھ شریک تھے۔ میرے ذہن کو فیصلہ صادر کرنے کی مہلت ہی کہاں ملی تھی۔

"چل بھائی۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جا" غالب نے میرے

کپڑے جھاڑے۔
میں نے ڈگمگتے ہوئے سر پہ ہاتھ رکھا "بڑے زور سے مارا تھا ریوالور حرامی نے۔"

"تو نے کہا نہیں کہ بھائی صاحب مروت اور شرافت بھی کوئی چیز ہے۔ ذرا نرمی سے اور نزاکت سے وار کیجیے" غالب مسکرانے لگا۔

"ادھر کی کیا پوزیشن ہے؟"

"پانی پت کے گراؤنڈ نمبر دو میں بھی فتح ہماری ہوئی۔"

"یہ تو ہمیں سچ مچ قتل کرنے کی نیت سے آئے تھے" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ حالانکہ جھوٹ موٹ مار دینا کافی تھا۔"

"میرا مطلب تھا پہلے دلاور نے ہمیں قتل کرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ورنہ مواقع تو بہت آئے تھے۔"

غالب نے کہا "یہ موقع زیادہ اشتعال انگیز تھا۔ اس کے ساتھ بگا لینا تو معمول تھا۔ اس کی گھروالی اور ولی عہد کا پنگا بہت بڑا تھا۔"

"ہمیں فوراً نکل جانا چاہیے۔ دلاور بے چینی سے منتظر ہو گا کہ اس کے بھیجے ہوئے کرائے کے قاتل اپنی کامیابی کی رپورٹ دیں۔"

"سکندر اعظم کی کھوپڑی اور غالب کا سر عزرائیل سے پیش کریں اور انعام پائیں" غالب نے لاش کو الٹ پلٹ کے اس کے کپڑوں کی تلاشی لی مگر اس کی کسی جیب میں کچھ بھی نہیں تھا۔

دوسری لاش کی میں نے تلاشی لی مگر وہ اپنی شناخت کی کوئی نشانی ساتھ نہیں لائے تھے۔ کسی کی انگلی میں انگوٹھی یا کلائی میں گھڑی تک نہ تھی۔ باقی دو لاشیں کچی سڑک کے دوسری جانب تھیں مگر غالب ان کی جامہ تلاشی سے پہلے ہی فارغ ہو چکا تھا۔

"ان کے پاس کوئی جیپ تھی" میں نے کہا "جو خراب ہو گئی تھی۔"

"چل کے دیکھ لیتے ہیں" غالب نے کہا "شاید ٹھیک ہو جائے۔"

"یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ اتنی دیر میں اس طرف سے کسی کا گزر نہیں ہوا" میں غالب کے ساتھ چلنے لگا۔

"فرشتہ اجل چار مرتبہ گزرا تھا۔ دنیاوی ٹریفک کے لیے راستہ بلاک تھا" غالب بولا "اس راستے پر مجھے آسیب کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ ان کی جیپ کو بھی یہاں آ کے خراب ہونا تھا۔"

"میرے سر کے بیچ میں گومڑ نکل رہا ہے" میں نے کہا۔

"دونوں طرف نکلتا تو کہا جا سکتا تھا کہ گدھے کے سر پہ سینگ۔"

"تیری حس مزاح مر چکی ہے" میں نے کہا "تھکن اور بھوک سے میں خود مرنے والا ہوں۔ تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اپنے کشت و خون کے باوجود۔"

"میں کچی گندم کھا رہا تھا۔ بڑے مزے کی ہوتی ہے" غالب نے کہا۔

"بڑی فراغت حاصل تھی تمہیں!"

"ہاں۔ میں نے کہا کہ پریشان ہو کے ادھر ادھر دوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ خود ہی آ جائیں گے سامنے۔"

"تم تو کھیت چر رہے تھے۔ وہ سامنے آئے بغیر ہی تمہیں مار دیتے پھر؟"

"کیسے مار دیتے یار۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور کان کھلے ہوئے تھے۔ اندازہ تھا کہ وہ کہاں ہیں۔"

"مرزا جی۔" میں نے چلا کے کہا۔

غالب اچھل پڑا "کیا ہوا۔ کیا کوئی مردہ آ رہا ہے تعاقب میں دوڑتا ہوا۔"

"جیپ" میں نے ہاتھ سے دائیں طرف اشارہ کیا۔

جیپ کو انہوں نے ایک کھنڈر کے پیچھے کھڑا کر دیا تھا۔ یہ شاید کبھی کسی کا کچا گھر رہا ہو گا جو بارش یا سیلاب میں گر گیا تھا۔ اس کی ایک دیوار باقی رہ گئی تھی۔ ہمارے پیچھے آنے والوں نے عقلمندی یہ کی تھی کہ جیپ کو راستے میں نہیں چھوڑا تھا۔ وہ چار تھے اور دھکیل کر جیپ کو دھکا لگا کے سڑک سے دور لے جا سکتے تھے۔ وہاں کھیت کی منڈیر بھی نہیں تھی۔ ایک مٹی دھول کا میدان سا تھا۔

میں نے جیپ کا معائنہ کیا مگر اس کی خرابی کو سمجھنا مشکل تھا۔ چابی لگانے کے باوجود انجن ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں نے بیٹری کے پول چیک کیے اور کوائل کے تار دیکھے۔ کنڈنسر کا کنکشن دیکھا۔

غالب نے کہا "مستری صاحب لعنت بھیجو اس پر۔ یہ دیکھو۔"

ہر جیپ کی طرح اس کے پیچھے بھی دس لیٹر پٹرول کا جیری کین موجود تھا۔ غالب نے اسے کھول کے نکال لیا تھا۔ "اپنا کام اس سے چل جائے گا۔"

"یہ تو ایسا لگتا ہے کہ سب دست غیب کا انتظام ہے" میں نے کہا۔

"ان بے چاروں کے لیے تو کہا جائے گا کہ موت انہیں یہاں کھینچ لائی تھی۔ ہمارے لیے جیپ کی خرابی تائید ایزدی بن گئی۔ اس کی جگہ کار ہوتی تو مسئلہ پھر وہی ہوتا کہ اس میں سے پٹرول کیسے نکالیں اور کس چیز میں نکالیں۔ بھرا ہوا جیری کین پورے دس لیٹر کا۔ ہمیں جیپ بنانے والے کی مغفرت کی دعا تو کرنی چاہیے۔"

"نہیں۔ ہم جیری کین بنانے والے کے ممنون ہیں" میں نے واپسی میں کہا۔

"نہیں۔ ہم اس میں پٹرول بھرنے والے کا شکریہ ادا کر سکتے ہیں۔"

"نہیں۔ جس نے پٹرول ایجاد کیا یا نکالا۔"

"نہیں۔ جس نے پٹرول انجن بنایا۔"

"لاتعداد تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا۔"

ہم بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ میرے سر میں درد تھا لیکن میں دلاور کو نیچا دکھانے اور اس کا حساب برابر کرنے کے خوش تھا۔ غالب ایسے ہی سدا خوش رہنے والا قلندر تھا۔ وقت آدمی کو اندر سے اور باہر سے کیسے تبدیل کرتا ہے اس کا اندازہ نہیں ہوتا مگر کبھی آدمی اپنے بہت پرانے وقت کے ساتھ اپنا موازنہ کرے تو حیران رہ جاتا کہ اچھا! وہ بھی میں تھا اور وہ میری ہی زندگی تھی؟

حالات کی ایک حوصلہ شکن راہ گزر پہ چلتے چلتے میرا اور محسن کا ساتھ چھوٹ گیا تھا اور اب محسن کی جگہ غالب نے لے لی تھی۔ ہمجولی کے حادثات نے سب سے زیادہ محسن کو تباہ کیا تھا۔ پہلے اس کی ماں کینسر سے مر گئی تھی پھر باپ جو وزارت خارجہ میں اپنی سچی بڑی خدا رسیدہ بیٹا ریٹائرمنٹ لیتے ہی زندگی سے بھی ریٹائر ہو گیا تھا۔ فوزیہ کی رخصتی بڑے المناک حالات میں ہوئی تھی یہ سوچ کے مجھے آج بھی شرم آتی تھی کہ میں نے جوانی کے جذبات کی بلغار میں اس سے ساتھ جتنے عہد و پیمان کیے تھے وہ میں نے لندن میں قیام کے دوران نہیں بھلائے تھے مگر دراصل بعد سے ملتے ہی میں فوزیہ کو اپنے بھول گیا تھا جیسے اس نام کی کسی لڑکی سے میرا کبھی جذباتی تعلق نہ تھا حالانکہ یہ تعلق کئی سالوں پہ محیط تھا اور غیر سرکاری طور پر یہ طے شدہ بات تھی کہ مجھے اس کا جیون ساتھی بننا ہے۔ فوزیہ کے والدین نے بھی یہ صدمہ اتنی ہی خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا جتنی عالی ظرفی کے ساتھ محسن نے مجھے معاف کر دیا تھا۔ فوزیہ اس کی بہن تھی اور میں اس کا دوست تھا۔ اس نے دوستی کی لاج رکھی۔ فوزیہ کو یہ دکھ اٹھانا ہی تھا۔ وہ خاموشی سے اپنا غم اپنے دل میں چھپائے شوہر کے گھر چلی گئی تھی اور اس نے مجھے بھلا بھی دیا تھا مگر میں آج بھی احساس جرم سے دامن نہیں چھڑا سکا تھا۔ محسن کی زندگی میرے ساتھ دوستی کی ہر آزمائش سے گزری تھی۔ یہاں تک کہ اس نے شملا سے محبت اور پھر شادی کی تب بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا یہاں تک کہ انتظار کرتے کرتے اس کی بیوی اور اس کا بیٹا بھی میرے دشمنوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ محسن نے اپنے بیٹے کے دنیا میں آنے کی خوشخبری ضرور سنی تھی مگر اس کے واپس دوسرے جہان میں جانے کے وقت تک باپ بیٹا آمنے سامنے نہ ہوئے تھے۔

ان سب حالات نے محسن کو اندر سے توڑ پھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ درمیان میں ذہنی مریض بھی بن گیا تھا لیکن قسمت اچھی تھی کہ اسے گل نے سنبھال لیا۔ ڈاکٹر شیخ آغا کی ڈاکو بہن نائکہ تو نسا نے گل بانو بنتے ہی محسن کی محبت کو دل میں بسا لیا تھا۔ اس وقت شملا زندہ تھی مگر وہ سب سے اور انجام سے بے نیاز اپنی محبت کی پوجا کرتی رہی اور یہی محبت اب محسن کی رفاقت اور محافظت بن گئی۔ سہارے کی ضرورت گل بانو کو بھی تھی۔ موقع ملتے ہی اس نے محسن کو ہم سب سے چھین کے لے گئی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم ہو گا کہ محسن ہمارے ساتھ رہے گا تو کبھی پوری طرح اس کا نہیں ہو گا اور عورت اپنے شوہر میں کسی کی شراکت منظور نہیں کر سکتی۔ نہ اس کے ماں باپ کی، نہ بچپن کے دوستوں کی، کسی دوسری عورت کا تو سوال ہی کیا۔ وہ ان سب سے جلتی ہے جو اس کے شوہر کے وقت یا اس کے خیالات اور جذبات کے کچھ حصے پر قابض ہونے کی کوشش کریں۔ پرانا شوخ، ملنسار، پیارا محسن حادثات کی مار سے مر گیا تھا۔ اب اس کی جگہ صرف گل کا شوہر رہ گیا تھا۔

محسن کے خلا کو غالب نے پُر کیا تھا۔ کبھی جو محسن تھا وہ آج غالب کا ہی روپ محسوس ہوتا تھا۔ خود میں کتنا بدل گیا تھا اس کا اندازہ میرے رویے اور معمولات کے فرق کو دیکھ کے ہوتا تھا۔ خوش رہنے کی کوشش میں آج بھی کرتا تھا مگر بے فکری کی زندگی خواب فردا ہو گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ میں اور محسن گورے لڑکوں کے خلاف اعلان جہاد کرتے تھے تو نوبت زیادہ سے زیادہ ہاتھا پائی تک آتی تھی اور ہم ٹوٹی ہوئی ناک یا آنکھ کے ساتھ مار دھاڑ کر کے آتے تھے تو اگلے دن بھول جاتے تھے۔ کسی سے دشمنی کا مسئلہ نہیں تھا لیکن اب میں اشتہاری مجرم اور قاتل تھا۔ قطع نظر اس سے کہ جتنے مقدمات میرے خلاف درج تھے سب ذاتی عناد کا نتیجہ تھے اور جھوٹ پر مبنی تھے میں ایک طویل جنگ کے دوران ان گنت لوگوں کو خود اپنے ہاتھوں سے مار چکا تھا اور بہت سے لوگ میری وجہ سے یا میری خاطر مارے گئے تھے۔ ان میں استاد بیڈی جیسے پیارے دوست بھی شامل تھے اور شملا جیسی معصوم لڑکی بھی۔ ابھی ابھی میں نے دو افراد کو مار دیا تھا۔ جو میری جان کے درپے تھے۔ ان کی لاشوں کو اٹھتے چلتے مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور میری یہ بے حسی تلخی حالات کا نتیجہ تھی۔

میں کتنا بدل گیا تھا۔ اس کا اندازہ صرف میں کر سکتا تھا جس کی یادوں کے البم میں پرانی معصوم تصویریں بھی تھیں اور آج کی سفاک خونی تصویریں بھی۔ کبھی میرے خوابوں خیالوں کی دھند سے پرانا سکندر جھٹ نکل آتا تھا تو وہ مجھے حیرت سے دیکھتا تھا اور میں اسے۔ ہم ایک دوسرے سے اتنے دور اور اجنبی ہوتے جا رہے تھے جیسے بچپن اور عہد طفولیت کی تصویر جوانی میں بالکل نامانوس لگتی ہے اور بڑھاپے میں جوانی کسی اور کی لگتی ہے۔

خیالات کی یہ فلم کسی بھی وقت میرے دماغ میں چند منٹ چلتی تھی تو یادوں کے سیکڑوں عکس گزر جاتے تھے۔ جیسے فلم کے پروجیکٹر میں سے ایک منٹ میں گزرنے والے سیکڑوں فریم جو الگ الگ ساکت محسوس ہوں مگر مل کے جیتی جاگتی زندگی نظر آئیں۔

غالب نے کہا "سوچ کا دورہ پڑا ہے بھائی؟"

میں نے مسکرا کے کہا "جس کے پاس دماغ ہو گا وہی تو سوچے گا۔ بقول شاعر۔ وہ عقل کیا کرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے۔"

غالب نے کہا "برائے مہربانی مکالمات لایعنی سے احتراز اور

www.paksociety.com

تضیع اوقات سے گریز فرماتے ہوئے قُلفی دانہ ذخیرہ توانائی برائے حرکت مشینی مواصلات دلائیے۔"

میں بھونچکا رہ گیا اور پھر قہقہہ مار کے ہنس دیا "یہ بے وابہ کیا روانی ہے۔ بے اختیار استاد عاشق علی ذب مرحوم و مغفور یاد آ گئے۔ وہ بتاتے تھے اس کا مطلب بھی اور یہ بھی کہ گرامر غلط تھی۔"

"گرامر کا تو مجھے پتا نہیں ہے۔ اردو صحیح تھی اور مطلب صرف یہ تھا کہ پیٹرول ٹینک کا ڈھکنا کھولیے۔"

مجھے پھر ہنسی آ گئی "راہ موز کا ترجمہ۔ مشینی مواصلات اور پیٹرول کا ذخیرہ توانائی۔" میں نے چابی سے ڈھکنا کھولا۔

"کیا غلط ہے اس میں؟ یہ ایندھن ہے اور ایندھن ہوتا ہے ذخیرہ توانائی۔ مواصلات کہتے ہیں ٹرانسپورٹ کو۔ موٹر مواصلات کی طرح مشینی مواصلات بھی ٹھیک ہے۔"

اس وقت تین بجے تھے جب ہم اپنے پیچھے کھیتوں میں چار لاوارث لاشیں چھوڑ کے پھر روانہ ہوئے۔ معلوم نہیں گرد و نواح کے لوگوں نے فائرنگ کی آوازیں سُن کے کیا سمجھا تھا۔ پولیس اور چوروں کا مقابلہ ہے یا شکاری پرندوں کا شکار کر رہے ہیں۔ قریب آ کے صورتِ حال کا جائزہ لینے کی ہمت کسی نے نہیں کی تھی۔ شاید عمداً وہ دور رہے تھے اور ادھر سے کوئی گزرا بھی نہیں تھا۔ بعد میں جب انہیں گندم کے کھیتوں میں لاشیں ملیں گی تو وہ کیا کریں گے؟ میں نے اوپر آسمان کی بلندی پر چکر لگانے والے گدھوں اور چیلوں کو دیکھ کے سوچا۔ کیا واقعی یہ گدھ لاشوں پر منڈلا رہے ہیں اور کوئی نہ آیا تو وہ اپنے شکاری پنجے اور مُردار خور منحوس چونچ کے ساتھ لاشوں کا گوشت اُدھیڑنے آ جائیں گے؟ موت سے کسی کو رستگاری ہے مگر یہ بھی کیا موت ہے؟ زندگی کی طرح موت بھی انداز جدا رکھتی ہے۔ جو شہید ہیں وہ کبھی نہیں مرتے۔ کچھ اس شان سے مرتے ہیں کہ انسانیت کو اشکبار چھوڑ جاتے ہیں یا پوری قوم کو۔ انہیں بھی زمانہ روتا ہے کبھی ایک ملک سُریا خاندان۔ کچھ گمنام مر جاتے ہیں۔ یوں کہ اُمید رکھنے والے بھی ان کی واپسی کا انتظار کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور کچھ ایسے مرتے ہیں جیسے یہ چار مرے۔ کہ مارنے آئے تھے اور اپنی زندگی کی قیمت وصول کرنے سے پہلے ہی اس انجام کو پہنچے جو منطقی تھا اور متوقع تھا۔ رزقِ خاک تو سب ہوتے ہیں۔ اشرف المخلوقات جب حشرات الارض اور مُردار خوروں کا رزق بنتے ہیں تو ان کی لاش پر شیطان رقص کرتا ہے کہ اسے بنی نوع آدم کو میں نے بہکا کرکے کس انجام کو پہنچایا۔

مزید نو گھنٹے کی مسافت کے بعد جب میری جسمانی توانائی تقریباً تمام ہو چکی تھی ہم ایک سڑک پر پہنچ گئے اور مجھے سڑک کے آغاز میں ہی ایک کیفے ڈی پھونس دیکھ کے وہی مسرت حاصل ہوئی جو صحرا کے پیاسے مسافر کو پانی کا کنواں دیکھ کے ملتی ہوگی۔

میری اور غالب کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے ہم دو سری جنگِ عظیم کے اپنی نالین سے بچھڑے ہوئے سپاہی ہوں۔ ہم نے پہلے دو دو گلاس پانی کے پیے۔ پھر دو دو کپ چائے کے انڈیلے اور یہ بالکل نہیں دیکھا کہ وہ چائے کیسی ہے۔ اس میں دودھ شکر کے آمیزے میں مشروبات کی لذت تھی۔ وہاں موجود چند لوگوں نے اور خود کیفے ڈی پھونس کے بد ہیئت بیرا نے ہماری ابتر حالت پر خاصی حیرانی کا اظہار کیا مگر ہماری کاربین دیکھتے ہوئے ہمیں مشکوک نہیں سمجھا۔

میرا دل تو کھانا کھانے پر بھی مائل تھا اور تنور کی گرم روٹی کی سوندھی خوشبو کے ساتھ تڑکے والی دال کھانے والوں کو دیکھ کے میرے منہ میں پانی آ رہا تھا مگر غالب نے مجھے رابعہ کی یاد دلا کے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

"پتا نہیں وہ کتنی فکرمند ہو گی۔ تمہیں کھانے کی پڑی ہے!"

میں نے کہا "برادر۔ بڑا معقول پسندانہ خیال ہے۔ جو ہوں پیٹ نہ پاں روٹیاں۔ خیر مجھے گلاں کھوٹیاں۔ (جب پیٹ میں روٹی نہ ہو تو ساری باتیں جھوٹی) اور بہت پہلے فارسی میں بھی اعتراف کیا گیا تھا کہ اس سال دمشق میں ایسا قحط پڑا کہ لوگ عشق تک بھول گئے۔"

"اچھا اب میں جاتا ہوں اپنے اصطبل کی جانب۔ شام کو کہیں ملو گے؟"

میں نے سوچ کے کہا "مل سکتا ہوں۔ بشرطیکہ آج کے بارے میں تم کسی کو کچھ نہ بتاؤ۔"

"تاؤ ور کسی میں شامل نہیں ہے۔"

"ظاہر ہے مرزا جی۔ مجھ میں تو اور تجھ میں 'میں'۔ تمہارا اور تاؤ ور کا معاملہ الگ نہیں ہے۔" میں نے کہا "مجھے بہت سے مسائل درپیش ہیں۔ میں رابعہ کو فون کر کے کہتا ہوں کہ وہ تمہارے آفس میں بے نوٹس آ جائے اور جیسے ہی وہ تاؤ ور کی گاڑی دیکھے 'سوال کیے بغیر بیٹھ جائے۔ اس کے بعد مجھے اپنا حلیہ درست کرنا ہوگا۔"

"کسی ہوٹل میں مت جانا۔ دلاور کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس کی فرم کا کوئی سپاہی نہیں لوٹ کے آیا۔ وہ تو پاگل ہو جائے گا۔"

"تمہارے منہ میں گھی شکر۔ کاش ایسا ہی ہو۔ میں سارے شہر کو اطلاع دوں گا۔" میں نے کہا۔

"رسوا کن شکست کے دُہرے عذاب نے اس کے انتقام کی آگ پر تیل چھڑک دیا ہوگا۔"

"یہ صحیح علاج ہے اس کا۔ تیل کیا پیٹرول اور اسپرٹ چھڑکنی چاہیے اس آگ پر۔ ایک دن اپنی ہی آگ میں جل کے راکھ ہو جائے گا حرام زادہ۔ اگر میرے ہاتھوں مارا نہ گیا۔"

ہم کچھ دور آگے پیچھے چلتے گئے پھر لاہور کی معروف ترین سڑکوں پر ہمارے راستے جدا ہو گئے۔ میں نے ایک اسپتال کے شعبہ حادثات کا فون استعمال کرتے ہوئے رابعہ سے رابطہ قائم کیا۔"

حق غصے میں تھی۔ میری آواز سنتے ہی اس نے گرجنا برسنا شروع کیا۔

"شور مت کرو" میں نے کہا "فوراً پہنچو تاجپوری۔ اسی وقت" اور فون بند کر دیا۔ یقیناً اس نے بعد میں بھی بہت کچھ کہا ہوگا اور میری نازیبا گفتار پر مزید مشتعل ہوئی ہوگی لیکن شعبۂ حادثات سے روانگی گفتگو نہیں ہو سکتی تھی اور اسے منانے کے لیے اس کی تلخ نوائی سُن کے اپنی صفائی پیش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ موقع محل کے اعتبار سے بھی یہ حرکت احمقانہ ہوتی۔ میں نے فون کی اجازت دینے والے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بھی افسردہ نظر آنے کی کوشش کی۔

دس منٹ بعد میں نے رابعہ کو دور سے ہی دیکھ لیا۔ وہ ایک دس والے کی ریڑھی سے فالسے کے سیاہ جامنی مشروب کا گلاس پی رہی تھی۔ میں نے گاڑی اس کے قریب روکی تو جوس لگانے والے نے باری باری مجھے اور پھر رابعہ کو دیکھا اور غالباً اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسے پُراسرار طور پر نمودار ہونے والی گاڑی میں ایک مشتبہ نظر آنے والے نوجوان کے ساتھ بن بُلائے بیٹھ جانے والی شریف لڑکی نہیں ہو سکتی۔

میں نے کہا "تم کیا افسوسناک مائع پی رہی تھیں؟"

"جی تو چاہتا ہے تمہارا خون پی جاؤں۔ سارا دن کیسے لوگ جاتے آتے رہے۔ کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ کھانے کو پوچھ لیتا۔"

میں نے کہا "کیا تم نے دیکھا کہ کسی نے اپنے لیے کھانا منگوایا تھا؟"

"نہیں۔ چائے چائے اور بس چائے۔ سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ۔ سارا دن۔۔۔ کھانا کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "اور پھر ساری رات۔ پاکستان کا غریب صحافی صرف قوم کا غم کھا سکتا ہے۔ ویسے بھی سگریٹ اور چائے پینا دانشور ہونے کی دلیل ہے۔ خبریں تو تازہ ترین مل رہی ہوں گی۔"

"ہاں۔ نہیں ملی تو ایک تمہاری خبر نہیں ملی۔"

"میں تو ڈر رہا تھا کہ تم اچھی طرح خبر لو گی لیکن تم غصے میں نکھر گئیں۔ تمہاری فطرت میں یہ انقلاب۔۔۔"

"جب تم نے فون کیا تھا تو میں غصے کا بم بنی ہوئی تھی۔ نکل گیا [illegible] سارا غصہ۔۔۔"

میں نے دانت نکالتے ہوئے کہا "ستر فیصد ضائع ہو گیا۔"

"تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

میں نے دل پر ہاتھ رکھ کے آہ بھری "کاش تم نے اصلی مجنوں کو دیکھا ہوتا۔ میں تو اس کا چربہ ہوں۔ سو فیصد۔ تم بہ غور دیکھ رہی ہو۔ مجنوں سمجھ کے پتھر مارے تھے لوگوں نے اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا۔"

"کسی طرح بتاؤ سارا دن کیسے لگ گیا۔ میں بہت پریشان تھی۔"

میں نے کہا "یہ بڑی درد بھری آنسو بھری کہانی ہے میری رس بھری۔" میں نے آواز میں رقت پیدا کی "ابھی تھانے لگا تو ساون کی جھڑی لگ جانے کی اور میرے وائپر خراب ہیں۔ پہلے یہ سوچ لوں کہ جاؤں کدھر کو میں۔ سیدھی راہ چلتا ہوں تو گھوم کے پھر یہیں نہ آ جاؤں گا۔ دنیا گول ہے" اور کیسی عجیب بات ہے رابعہ کہ اس شہر میں جو ہمارا شہر تھا اور جہاں ہمارا گھر تھا۔ اب ہم سر چھپانے کا ٹھکانا تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اتنے دوست ہیں سب کے گھروں کے دروازے ہمارے لیے کھلے ہوئے ہیں لیکن ہم ان سے دشمنی نہیں کر سکتے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ ہم جہاں جائیں گے تباہی ساتھ لے جائیں گے۔ چلو ایک دن کسی ہوٹل میں گزاریں' پھر سوچیں گے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "آج حالات نے نیا رُخ اختیار کر لیا ہے۔ اگلے دو تین دن میں وہ سارے چھوٹے بڑے ہوٹل چھان ماریں گے۔"

"ایک طریقہ اور ہے" اس نے اخبار اپنے سامنے پھیلا لیا۔

"یہ آج کا نہیں' آنے والے کل کا اخبار ہے۔"

"تم وقت سے آگے جا رہی ہو۔"

"میگزین اور چھوٹے اشتہارات کا صفحہ ایک دن پہلے چھپ کے آ جاتا ہے۔ میں نے ایسے ہی اُٹھا لیا تھا" رابعہ بولی "اس میں کرائے کے لیے خالی مکانوں کے بہت سے اشتہار ہیں۔"

"ویری گڈ۔ غور سے دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ ہمارے شایانِ شان کوئی محل ہے؟"

"یہ سارے مکان ابھی اُٹھے نہیں ہوں گے۔ کل اخبار آئے گا تو ضرورت مند جائیں گے۔ ہم آج ہی بات کر سکتے ہیں۔"

"مالک مکان پوچھے گا نہیں کہ غیب کا علم کہاں سے حاصل کیا آپ نے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ اخبار جہاں چھپتا ہے وہاں سب پہلے دیکھتے ہیں۔ اپنے کسی عزیز دوست کو ضرورت ہو تو بتا دیتے ہیں۔ ایک مکان ہے راوی پارک میں۔"

"لوگ تمہیں بھی فلم اسٹار سمجھیں گے اور مجھے ہیرو۔"

"وہاں سب شریف لوگ رہتے ہیں۔ یہ مکان ہے مختصر فیملی کے لیے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "پھر تو ہمارے لیے نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے؟"

"اس لیے کہ ہم تو فیملی میں نہیں ہیں۔ اس کے لیے کم سے کم ایک شوہر اور اس کی زیادہ سے زیادہ چار بیویوں کا ہونا ضروری ہے۔ میری تو ایک بھی نہیں۔" میں نے روتے لہجے میں کہا "آہ قسمت۔"

رابعہ مسکرائی "ہم کہہ سکتے ہیں کہ۔۔۔ ایک فیملی ہیں ہم۔"

www.paksociety.com

"مجھے تو بہت شرم آئے گی جھوٹ بولتے ہوئے۔ تم بے شرم ہو۔ کہہ دینا یہ میرا میاں ہے" میں نے شرما کے کہا "میں اس کی بیوی ہوں' جھوٹ کا سارا عذاب مجھے کیوں ہو۔"

"یہ بھی کہہ دوں گی بابا؟" رابعہ ہنسی۔

"بابا۔ اتنا فرق تو نہیں ہے میری تمہاری عمر میں۔ اور خبطی ہوا کوئی پھر اور کہے گا نکاح نامہ نکالو اور ضمانت مانگے گا کہ فیملی آئندہ بھی مختصر رہے گی۔"

رابعہ نے اخبار میرے منہ پر مار دیا "خبطی اور جھکی تم ہو۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "ابھی یہ تو بنیادی شرط ہے مکان حاصل کرنے والوں کے لیے۔ خیر میں وعدہ کر سکتا ہوں کہ فیملی مختصر رہے گی۔ دیکھو نا مستقبل کے نقش قدم پر چلنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔"

"میں کچھ نہیں سن رہی ہوں" رابعہ باہر دیکھنے لگی۔

میں نے اسے پریشان کرنا جاری رکھا "دیکھو نا۔ بلاوجہ خفا ہو تم مجھ سے۔ یہ سب تو تم پر منحصر ہے۔ تمہیں مختصر فیملی پسند نہیں تو....."

"مت تنگ کرو مجھے۔ میں رونے لگوں گی تو دماغ درست ہو جائے گا۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ مالک مکان کا مطلب یہ ہو گا کہ کرائے دار پہلوان اور پہلوانی نہ ہوں۔ ابھی تو ہم دونوں ہی مختصر ہیں۔ وعدہ کر سکتے ہیں کہ آئندہ وزن اور نہ بڑھائیں گے کیا پتا اس کی چھت کمزور ہو یا دروازے چھوٹے ہوں۔ یا اس نے سوچا ہو کہ مختصر لوگ ہوں گے تو مکان خالی کرانا آسان ہو گا۔ لوٹے کی طرح اٹھا کے باہر پھینک دوں گا۔ کرائے دار اڑ جاتے ہیں بعض اوقات۔ ساڑھے تین سن کا کرائے دار ہو اور ساڑھے چار کی کرائے داری تو۔"

رابعہ ہنس پڑی "سیدھی طرح چلو رائل پارک۔"

میں بھی ذرا ایکٹنگ سے تھک گیا تھا اور فوری طور پر مجھے غسل کے بعد کپڑے بدلنے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ وعدہ خلافی کرتے ہوئے میں رابعہ کے ساتھ اخبار کے دفتر سے غائب ہو گیا تھا اور اب غالب اس وقت تک مجھے تلاش نہیں کر سکتا تھا جب تک میں اس کو اپنا نیا ٹھکانا نہ بتاؤں۔ مجھے دلاور سے بھی بات کرنی تھی مگر اس کی مجھے جلدی نہیں تھی۔ زیادہ مناسب یہ تھا کہ اسے پریشان اور مشتعل رہنے دیا جائے اور دیوانہ وار جھنجلنے دیا جائے۔ وہ اپنے شکاری کتوں اور اپنے حکم کے غلاموں پر بھنّا جائے کہ تم سب ناکارہ اور حرام خور ہو۔ ابھی تک اس کا پتا نہیں چلا سکے۔ اس نے چار بھروسے کے آدمی مار دیے۔ کیا پتا وہ پیزہ شک حرام اس کے ساتھ مل گیا ہو۔ جاؤ' دیکھو' اسے تلاش کرو۔ اس کے سارے ٹھکانے اور تمام ہوٹل دیکھو۔

رائل پارک کا وہ مکان ہماری ضروریات کے عین مطابق بڑی گمنام اور عام سی بلڈنگ کا ایک حصہ تھا۔ تیسری منزل پر دو کمرے اور دیگر خانے۔ خود مالک مکان سب سے نیچے مقیم اپنی دو بیویوں کے ساتھ بھی خوش و خرم زندگی نہیں گزار رہے تھے۔ کثرت ازدواج ان کے دل میں مزید دو کی خواہش اور ہوس تھی۔ وہ خاصا ٹھرکی بڈھا تھا۔ اس نے رابعہ کو بھی ایسی للچائی نظروں سے دیکھا کہ میرا خون حقیقی غیرت مند شوہر کی طرح شوں شوں کرکے اُبلنے لگا لیکن ذاکرات خود رابعہ کر رہی تھی چنانچہ میں اس خون کے گھونٹ پی گیا۔ اوپر کی دو منزلوں کے متعلق مالک مکان نے یقین دلایا کہ بڑے ہی شریف لوگ رہتے ہیں۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک نمبر کا جھوٹا تھا۔ اوپر بھی اس نے مختصر فیملی کے نام پر بڑے غلط قسم کے لوگ آباد کر رکھے تھے۔ کچھ گھروں سے بھاگ کر فلموں میں کام کرنے کی خواہش مند لڑکیاں تھیں جو دلالوں کے ہتھے چڑھ جاتی تھیں۔ ایک کرسچن لڑکا تھا جس نے کسی ہندو لڑکی سے شادی کی پھر دونوں مسلمان ہو گئے تھے محض اپنی جان بچانے کے لیے اور چھپ کے رہ رہے تھے۔

ان سب باتوں کا پتا فوراً نہیں چل سکتا تھا۔ مالک مکان نے کرایہ وصول کیا اور چابی مجھے تھماتے ہوئے آنکھ ماری "جاؤ عیش کرو۔"

میرا چہرہ گرم ہو گیا "تمہاری یہ آنکھ خراب ہے کیا؟ ادھر ہو ذرا روشنی کی طرف کرو۔ میں آنکھوں کا ڈاکٹر ہوں۔"

وہ گھبرا گیا "نہ۔ میں نے چشمہ والا ہوں۔ اصلی میرے کا۔"

میں نے کہا "اس سے کام نہیں چلے گا۔ میں آئی ڈراپس دوں گا۔ تمہاری اس آنکھ میں تو کالا پانی اُترنے والا تھا۔ دوسری آنکھ کا پانی مر گیا ہے۔"

وہ بیچ بیچ تشویش میں مبتلا ہو گیا "اچھا جی۔ دوائی ضرور دینا مجھے' سامان کدھر ہے آپ کا؟"

میں نے کہا "آ جائے گا کل تک۔ گاڑی تمہارے دروازے پر کھڑی ہوئی ہے خیال رکھنا۔"

اوپر پہنچ کے رابعہ ہنسنے لگی "آنکھوں کا ڈاکٹر بننے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے کہا "اس کی آنکھوں کا ایسا علاج کروں گا کہ دماغ درست ہو جائے گا۔ کیسے دیکھ رہا تھا تمہیں ہوسناک نظروں سے خبیث نے آنکھ بھی ماری تھی مجھے۔"

"آنکھ تو مجھے بھی ماری تھی" رابعہ نے کہا۔

"اچھا! کل کے بعد آنکھیں جھپکانا بھول جائے گا" میں نے کہا۔

کمرے پرانی وضع کے تھے۔ اونچی چھت اور لکڑی کے شہتیروں والے۔ سال خوردہ دیواروں پر جو سفیدی باقی تھی اس پر ہم سے پہلے رہنے والوں نے مصوری کے وہ شہکار تخلیق کرنے کی کوشش کی تھی جو کبھی پنڈت کوکا رام کے ممنوعہ لٹریچر کا نظر آجاتے تھے۔ رابعہ کی تو حالت غیر ہو گئی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ اب تک میں دیواروں پر نیا وال پیپر لا کے نہ لگا دوں وہ صرف میری طرف دیکھے۔ پاکیزہ محبت کی نظر سے۔

کپڑوں کے سوٹ کیس میں اٹھا لایا تھا۔ اسلحہ ابھی گاڑی میں پڑا تھا۔ سب سے خطرناک چیز مشین گن تھی۔ اسے اخبارات میں لپیٹ کر ڈکی میں ڈالنے کا فیصلہ میں نے رات تک مؤخر کر دیا اور خود غسل کرنے چلا گیا۔ کپڑے بدلنے کے بعد میں نے واحد غسل خانہ رابعہ کے حوالے کیا اور خود نیچے اُتر گیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں بستر اور چارپائیاں خرید لایا۔ ایک مزدور نے چارپائیاں اوپر پہنچا دیں۔ ضرورت کا کچھ سامان خریدنا باقی تھا لیکن یہ کام اتنا ضروری نہیں تھا جتنا شب بسری کے بنیادی لوازمات کا حصول۔

میں اب بہت پُرسکون تھا اور ذہنی طور پر تمام ترجیحات کا تعین بھی کر چکا تھا۔ رابعہ نے بھی کپڑے بدل لیے تو میں نے اسے کھانے کی دعوت دی۔

"نیچے اُتر کے 'انگلش سرکل' تک چلتے ہیں' انگلش چوک...."

"انگلش چوک..... ہرگز نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا کیری ہوم چلیں۔ بیڈن روڈ تک۔"

"کیوں بلاوجہ ایسی جگہ جانے کا رسک لیتے ہو۔ ایک طرف پیٹ کا مسئلہ ہے تو دوسری طرف شوق ہے رونمائی کا۔"

"پھر کیا کروں۔ فاقہ تو مجھ سے ہو گا نہیں۔ اور کچن میں کھانے کے لیے صرف وصول ہے یا لکڑی کے جالے ہیں" میں نے چڑ کے کہا۔

"کل سب انتظام کرلیں گے۔ ابھی پیٹ بھرنے کے لیے قریب سے دو تکے لے آؤ۔ آرام سے بیٹھ کے باتیں کریں گے ہم" اس نے مجھے پیار سے سمجھایا۔

میں سمجھ گیا۔ جو بات عورت ضد کرکے دوران میں منوا لیتی ہے لاچار ہو کے دوستی میں منوا سکتی ہے۔ جو عورتیں ازلی تلوں کی طرح نوکیا نفسیات کے اس نکتے کو سمجھتی ہیں وہ فائدے میں رہتی ہیں اور انگریزوں کا یہ قول اس کی صداقت کا ثبوت ہے کہ جو عورت غلام بنا کے رہے وہی مرد پر حکومت کرتی ہے۔ اس کے برعکس عورت کی کمزوری ہے تعریف اور خوشامد۔ ازدواجی جھگڑے وہاں زیادہ ہوتے ہیں جہاں میاں بیوی ایک دوسرے کی فطرت کے بنیادی تقاضوں کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔

میں پھر نیچے گیا تو کھانے پینے کا بہت سا سامان خرید لایا۔ رابعہ خفا ہونے لگی "ہم اس کا چوتھائی بھی نہیں کھا سکتے۔ باقی کا کیا کریں گے؟"

میں نے بڑی شان سے کہا "فالتو ہے کچھ فریج میں رکھ دینا خراب نہیں ہو گا۔"

"فریج ہوتا تو میں تمہیں رکھ دیتی اس میں۔ تم خراب ہوتے جا رہے ہو" رابعہ مسکرانے لگی۔

"پھر نکاح کے وقت مجھے مجرد حالات میں نکال جاتا اور قاضی کے سامنے رکھ دیا جاتا۔ شب عروسی مجھے اُبالا جاتا کاٹلی استعمال بنانے کے لیے۔"

رابعہ نے کھانا چارپائی پر پھیلا دیا "تمہارے جانے کے بعد ایک لڑکی آئی تھی۔"

"کیسی تھی؟ میرا مطلب ہے کیوں؟"

"مجھ سے پوچھ رہی تھی آپ نئے ہیں" رابعہ نے کچھ شرما کے کہا۔

"اس کی نظر اتنی کمزور تھی۔" میں نے تشویش سے کہا "تم نے بتا دیا اسے کہ میں تو پاکستان بننے سے پہلے کانن بالا کے نام سے کام کرتی تھی۔ ایک لڑکی مجھے بھی دو بار ملی "اوپر آتے جاتے۔"

"اچھا؟ کیسی تھی؟"

"بڑی بے شرم تھی" میں نے آنکھ مار کے کہا "ایسے آنکھ ماری تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ اس عمارت میں آنکھ مارنے کی بیماری پھیلی ہوئی ہے۔"

"ہاں۔ تمہیں بھی لگ گئی ہے یہ بیماری۔" رابعہ نے مجھے آنکھ ماری اور پھر ہنس پڑی۔ میں بھی ہنسنے لگا۔ ایک انوکھی انمول اور بے پایاں مسرت میرے رگ و پے میں سکون اور راحت کا نشہ بن کے اُترنے لگی۔ میرے ساتھ سب کچھ اچانک ہو رہا تھا۔ دو گھنٹے پہلے میں اس خلوت اور ایسے گوشۂ عافیت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ ہو۔ یہ خیال رابعہ کو آیا تھا اور اچانک وہ خوب صورت خواب ایک حقیقت بن گیا تھا جس کی تعبیر کے پیچھے ہم دیوانہ وار دوڑ رہے تھے لیکن خواب ہم سے گریزاں تھے۔ رنج و فکر و غم' اندیشہ ہائے دور و دراز۔ خوف اور وسوسے' فرشتۂ اجل کے روپ میں تعاقب کرنے والے خونی شکاری۔ ہماری زندگی کے دشمن اور ناکردہ گناہوں کی سزا دینے والے۔ سب اس بند دروازے سے بے خبر تھے جس کے پیچھے ہم دونوں' صرف میں اور رابعہ۔ باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے اور کاغذی دسترخوان پر سے چیزیں اٹھا اٹھا کے ایک دوسرے کو کھلا رہے تھے۔

کاش میں رابعہ کو ہمیشہ اتنا ہی خوش رکھ سکتا۔ وہ ایسے ہی ہنستی رہتی اور ہم کسی احساسِ جرم و گناہ کے بغیر ایک دوسرے کے ہو جاتے۔ بھول جاتے کہ وہ بہت بڑی وکیل ہے اور میں سکندر بخت۔۔۔۔ جسے وزیر خان کے قاتلوں سے بدلہ لینا ہے اور اپنا حق حاصل کرنا ہے مگر یہ ناممکن تھا۔ کوئی ایسی غیبی قوت ہوتی جو راتوں رات یا پلک جھپکتے میں سب کچھ بدل سکتی تو یہ ہو سکتا تھا کہ میرے خلاف تمام قانونی مقدمات ختم ہو جائیں۔ دلاور اپنے سب جرائم کا اعتراف کرلے اور مجھے میرا حق دے کر خود جیل جانا قبول کرلے۔ رابعہ کو اس کا گھر مل جائے اور مجھے میرا حق۔

کمرے میں صرف ساٹھ واٹ کے ایک بلب کی روشنی تھی۔

www.paksociety.com

دیوار پر نصب ٹیوب لائٹ پرانی ہونے کی وجہ سے یا کم وولٹیج کے باعث وقفے وقفے سے بھڑک رہی تھی۔ اسے میں نے بند کر دیا تھا۔ روشنی رابعہ کے چہرے پر ایک رُخ سے پڑ رہی تھی اور اس کے بالوں کی ایک لٹ کا سایہ چہرے پر لرزاں تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تمہیں۔ اپنے ارمانوں کو۔ خوابوں کو" میں نے آہ بھر کے کہا "یہ سب تو ایک خواب ہے جو بکھر جائے گا۔"

"اگر یہ حقیقت ہو تو پھر؟"

"پھر میں خدا سے کچھ نہ مانگتا۔ اس دنیا کو اپنی جنت سمجھ کے دوبارہ بے دخل نہ ہوتا۔" میں نے کہا "دنیا میں ہر شخص اپنی جنت کا تصور الگ رکھتا ہے رابعہ۔ کسی کے لیے کار کوٹھی بنگلہ اور لامحدود دولت سے دنیا جنت ہے تو کوئی کہتا ہے۔ فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے۔"

"اور تمہارے لیے...؟" وہ میری آنکھوں میں جھانک کے بولی۔

"میرے لیے؟ بس میں اور تم۔ اور سب کچھ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ملے یا نہ ملے فرق نہیں پڑتا۔"

"جھوٹ، بالکل جھوٹ۔ اگر اتنا ہی محدود ہوتا تمہارے لیے زندگی کی خوشی کا مطلب تو تم سب کچھ پالیتے۔ کیا اس وقت میں تمہارے پاس نہیں ہوں؟ مگر تمہاری خواہشات کی ایک دنیا بیچ میں ہے جسے تم چھوڑ نہیں سکتے۔"

"تم نہیں سمجھو گی۔ میں آج کی نہیں، آنے والے دن کی بات کر رہا تھا۔ آج کا دن میرا نہیں ہے۔"

"کہتے ہیں کل کبھی نہیں آتی" رابعہ اُداس ہونے لگی۔

میں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا "ایسا نہیں ہے جانم۔ کل کے یقین پر ہی تو دنیا قائم ہے۔ اسی کے لیے ساری جدوجہد ہے جو تم میرے ساتھ کر رہی ہو۔ یہی یقین ہمارا اثاثہ ہے۔ یقین جو غم سے کریم ہے۔ یہ یقین گنوا دیا ہم نے تو پھر کیا رہ جائے گا ہمارے پاس۔"

اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا "میرا یقین تم ہو۔ میں خود تو بہت کمزور اور بے بس ہوں۔"

"یہ ہو سکتا ہے کل میں نہ رہوں۔"

اس نے میرے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا "تم میرے ساتھ رہو گے ہمیشہ... وعدہ کرو۔"

"یہ وعدہ تو میں بہت پہلے کر چکا تھا۔"

"آج پھر کرو" اس نے اپنا سر میرے کندھے پر مارا۔

اس کے بال ابھی گیلے تھے۔ چھینٹے میرے منہ پر پڑے۔ اچانک مجھے ہوش آگیا۔ اس کے قرب کی خوشبو اور اس کے وجود کی نرم آنچ مجھے پگھلانے لگی تھی۔ میں ڈرا کہ کہیں خود اپنی عدالت میں مجھ پر خیانت مجرمانہ کی فرد جرم نہ عائد ہو جائے۔

شیطان پھر آدم و حوا کی جنت میں سانپ بن کے پہنچ گیا تھا اور انہیں شجر ممنوعہ کا ذائقہ چکھنے پر اکسانا چاہتا تھا۔ ابلیس لعین کیا دوبارہ پھر مجھے میری جنت سے بے دخل کرا سکتا ہے۔ نہیں، کبھی نہیں۔ میں کسی جہنم سے گزر کے جنت میں جانا بھی منظور نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا "رابعہ یہ کھانا سمیٹ لو پھر میں بتاتا ہوں آج میں نے اور غالب نے دلاور کی ایسی تیسی کر دی۔"

رابعہ نے چونک کے آنکھیں کھولیں "مجھے نیند آنے لگی تھی۔"

"اچھا پھر سو جاؤ۔ صبح باتیں کریں گے۔" میں نے کہا "میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں۔ سوچ رہا تھا نیچے جاکے چائے پئیں گے۔"

"چائے نہیں پیو گے تو نیند اچھی آئے گی۔" رابعہ اٹھی اور اپنے بستر پر گر کے سو گئی۔ میں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ میری جنت محفوظ تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے بچ جانے والے کھانے کو اخبار میں لپیٹا اور دروازہ بند کر کے دبے پاؤں نیچے اتر گیا۔ میں نچلی منزل کے ایک دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا جب دروازہ ایک دم کھلا۔ میری نظر بے اختیار اُدھر گئی۔ تیسری بار اس لڑکی کو دیکھ کے مجھے پسینہ آگیا۔

"کیا ہے جی۔ بار بار آتے ہو دروازے تک اور چلے جاتے ہو۔ اندر آجاؤ نا!" اس نے بے شرمی سے انگڑائی لے کے کہا۔

میں نے ہمت کر کے کہہ دیا "لعنت اس پر جو ایک بار بھی تمہارے در پر آئے۔ مجبور ہوں اس لیے آتے جاتے تھوک کے گزر جاتا ہوں۔"

اس نے بڑے جھٹکے سے دروازہ بند کیا۔ دھماکے سے پوری بلڈنگ ہل گئی ہوگی مگر مجھے خاصی خوشی ہوئی۔ پھر یہ خوشی فکرمندی میں بدل گئی۔ رابعہ نے بھی کسی لڑکی کا ذکر کیا تھا جو اسے نیلو کی بیٹی لگی تھی۔ رابعہ کی صورت میں نیلو کی مشابہت بہت زیادہ تھی مگر رابعہ نسبتاً دراز قد تھی۔ اس فاحشہ کے رویے نے مجھے احساس دلایا کہ شاید ہم غلط جگہ آگئے ہیں۔ مالک مکان کا رویہ میرے خیال کو تقویت دیتا تھا۔ وہ مجھے بھی ایسا ہی سمجھا ہوگا جیسے فلمی دنیا میں قدم جمانے کے لیے ایک حسین سہارا ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ یہاں رہنے والے برے تھے مگر یہ جگہ اس لحاظ سے یقیناً اچھی تھی کہ ادھر وہ شکاری نہیں آسکتے تھے جو ہمیں شریفانہ ٹھکانوں پر تلاش کر رہے ہوں گے۔

میں نے سارا کھانا دو گدڑی پوش فقیروں کے سامنے رکھ دیا اور پھر کار میں جا بیٹھا۔ تھڑی کا مالک مکان نے فوراً دروازہ کھولا "اوہو۔ آپ ہو، میں سمجھا کوئی چور لے گیا گاڑی۔ ڈاکٹر صاحب میری دوائی..."

میں نے کہا "صبح دوں گا۔ یہ تمہارے کرائے دار کیسے ہیں؟"

"کیا ہوا جی؟" وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

"ابھی تک تو نہیں ہوا۔ مگر کچھ ہوا تو۔" میں نے جھک کے گاڑی کے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے ریوالور نکالا اور دامن سے صاف کر کے جیب میں رکھ لیا "اور یہ میری بیوی سوری ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔"

اس نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... میرا مطلب ہے کسی ایسی ویسی بات کا۔ یہ ریوالور اصلی تھا؟"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی "کبھی چلا کے دکھاؤں۔ تم اپنے سر پر جیب رکھو۔ میں اس میں سوراخ کرتا ہوں۔ تمہارے سر میں نہیں، جیب میں۔"

وہ زبردستی مسکرایا "لائسنس تو ہوگا۔"

میں نے رازدارانہ انداز میں کہا "اس کا تو ہے جو میری بیوی کے پاس ہے نا اس کا نہیں ہے۔ عقلمند لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ لائسنس والا دکھا کے بچ جاتے ہیں۔ کام ہمیشہ دوسرے سے لیتے ہیں۔"

جب میں نے کار کو بیک کیا تو وہ بونقوں کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ وہ میری باتوں کو مذاق سمجھے یا حقیقت۔ آنکھوں کے ایک ڈاکٹر کا اتنی خوب صورت بیوی کے ساتھ ایسے گھر میں آنا ہی شکوک پیدا کرتا تھا لیکن میری باتیں سن کے اس میں شک کا اظہار کرنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ معاملہ سخت گڑبڑ ہے اور دال میں کالا ہی کالا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کسی کو بھگا لائے ہیں اور شاید خاندان غیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب ان سے پنگا لینے کا مطلب ہے بغیر لائسنس والے ہتھیار سے قتل۔ یارب العالمین! ابھی تو میں جوان ہوں۔

مجھے اس کی حالت کا تصور کر کے بہت ہنسی آئی مگر یہ گفتگو ضروری تھی۔ اب رابعہ کو یا مجھے کسی سے وہاں در معقولات کا خطرہ کم تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مالک مکان دیگر کرایہ داروں کو ہوشیار کرائے گا کہ یہ جو صاحب کے سر پر آکے بیٹھے ہیں ان سے ہوشیار، بڑا خونخوار اور غیرت مند خالص پٹھان قسم کا ماہر امراض چشم ہے جو شک کا علاج آنکھ میں گولی مار کے کرتا ہوگا۔ اسے اپنے جیسا سمجھنے کی غلطی مت کرنا۔ مجھے دعوت گناہ دینے والی لڑکی بھی سمجھ جائے گی کہ گزشتہ رات اس نے کیا فاش غلطی کی تھی۔

میں نے لبرٹی روڈ پر ایک کشمیری چائے والے کی دُکان کے سامنے گاڑی روک لی۔ موسم جاڑوں کا نہیں تھا مگر رات کچھ خنک تھی اور میرا موڈ کافی یا بلیک چائے کا نہیں بن رہا تھا۔ خوشبودار نمک والے اور دودھ میں سبز چائے کے ساتھ یخنی کی طرح اُبالی ہوئی بالائی جو شیشے کے گلاس میں پیش کی جاتی تھی 'رشید بٹ پہلوان کی سوغات' تھی۔ اس علاقے میں ایک بٹ برادران بازی بلند رکھا تھا خالص ہونے اور لسی کے لیے بھی شہرت رکھتے تھے اور پرانے لاہور کی دم توڑتی ہوئی روایات کو زندہ رکھنے والوں میں شامل تھے۔ ان میں ایک پہلوان پان والا تھا جو پان بنا کے کسی کے ہاتھ میں نہیں پکڑاتا تھا۔ گلوری خود منہ میں رکھتا تھا۔ جسے یہ انداز نہ بھائے وہ جائے بھاڑ میں۔ 'اندرون لوہاری دروازہ اور گوال منڈی کے علاوہ بھی بہت سے وضع داری کے ٹھکانے تھے جن کو مغربی تہذیب کا عفریت نگلا جا رہا تھا۔ پھر بھی زندہ دلوں کا یہ شہر آباد تھا۔ دلی کی طرح جو سات بار اُجڑ کے بھی دلی رہی تھی۔

کشمیری چائے کا ایک پُر سرور گھونٹ لے کے میں نے گلاس کو ڈیش بورڈ پر رکھا اور گھڑی دیکھی۔ ابھی صرف ساڑھے دس بجے تھے۔ فلموں کے آخری شو کا ہاف ٹائم ابھی ہوا تھا چنانچہ شو تینوں نے دودھ سوڈے سے کوکا کولا تک سب پر یلغار کر دی تھی۔ اتنی جلدی سونے کی مجھے بھی عادت نہیں تھی مگر کمرے کے اندر ماحول اتنا پُر سکون اور خواب آور تھا کہ میں باہر نہ آتا تو سو جاتا لیکن مجھے دلاور کی خیر خبر ضرور لینی تھی۔

میں نے ریڈیو آن کیا اور کار کا ایریل کھینچ دیا۔ باہر اتنا شور تھا کہ مجھے شیشے چڑھانے پڑے۔ والیوم بڑھا کے میں نے مائک میں کہا "ہیلو... ہیلو کوئی ہے یا سب مر گئے؟"

ایک منٹ پورا ہونے سے پہلے کوئی بولا "کون ہے؟" اس نے درمیان میں ماں کی گالی دے کے کہا۔

میں نے اسے بہت موزوں جواب دیا "تمہارا باپ۔ یہ مت پوچھنا کون سا باپ!"

وہ شاید میری آواز پہچان گیا "کیا بات ہے؟"

"وہ خرزادہ کدھر ہے؟" میں نے کہا۔

"ہوش میں رہ کے بات کیا کرو۔"

میں بھی غرا کے کہا "میں خود آگیا نا تو تمہارے ہوش ٹھکانے آجائیں گے کتے۔ میں بھونکنے والوں کی زبان کھینچ لیتا ہوں۔"

"نہیں... دیکھتا ہوں... ایک منٹ" وہ گھبرا گیا۔

میں اطمینان سے چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔ وہ شاید دلاور سے رابطہ کر کے اسے بتا رہا تھا کہ ریڈیو فون پر کوئی خاص بات کرنا چاہتا ہے۔ اس کی حیثیت ٹیلی فون کی طرح تھی مگر کام ٹیلی فون کے بجائے وائرلیس کے نظام پر پیغام دینے اور وصول کرنے کا تھا۔

کچھ دیر بعد دلاور نے کہا "تم زندہ ہو آج بھی اپنے سکندر صاحب۔"

میں نے کہا "ایک آدمی کو مارنے کے لیے تم نے چار بھیجے تھے۔ اگلی بار آٹھ روانہ کرنا۔"

"تمہیں مارنا مقصد ہوتا تو میں تم سے بات کیوں کرتا۔ اس وقت بھی میں بہت مصروف تھا۔"

"کس کے ساتھ؟ خیر چھوڑو، میں تمہیں تمغہ جرأت پر مبارک باد دینا چاہتا تھا۔"

"جرأت کدھر کی ہم میں۔"

"مگر تمغہ پھر بھی مل گیا۔ اور دینے والا بھی اپنا ہی بہادر

www.paksociety.com

سچوت۔"

وہ سمجھ گیا "ایسے ہی کھلونوں سے کھیلتا ہے وہ۔ کیا کریں جی! ہوتا کسی گھسیارے کی اولاد تو باپ کا ہاتھ درانتی سے کاٹ دیتا۔"

میں نے کہا "پہلے اپنی بیوی سے تو پوچھو۔"

"کیا پوچھ لوں؟"

"کہیں سچ مچ اس کا باپ گھسیارا نہ ہو۔"

"میں ایسی باتوں سے مشتعل نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "پیڈرو کہاں ہے؟ ایک ساتھ تم نے دو دھوکے دیے مجھے۔ بہت گھٹیا اور چھوٹے بدمعاش ایسی حرکت کرتے ہیں۔"

"کرتے ہوں گے اپنے سکندر صاحب۔ ہمیں کیا معلوم جی۔ ہم نے کب دعویٰ کیا ہے بڑی بدمعاشی کا۔ بڑے بدمعاش تو آپ ہو۔ عورتوں کو اٹھا لے جاتے ہو۔ یہ ہوئی نا بہادری۔"

میں نے کہا "تم سے زیادہ دلاور تو تمہارا بیٹا ثابت ہوا۔ وہ آگیا سیدھا ان کے دشمنوں کے سامنے۔"

"بچے بے وقوف اور جذباتی ہوتے ہیں۔ میں نے اس کی اور اس کی ماں کی کھال ادھیڑ دی۔"

"آفریں۔ صد آفریں۔ گولی کیوں نہیں ماری؟"

"اس نے گولی چلائی مجھ پر۔ کوئی بات نہیں، وہ کون سا قتل کرنا چاہتا تھا مجھے۔ میں نے ہی ٹانگ اڑا دی تھی بیچ میں۔ ہیں جی؟ اس کی ماں بے وقوفی سے اغوا ہوئی تھی۔ اتنی بے وقوف تو سب عورتیں ہوتی ہیں اپنے سکندر صاحب۔ سزا میں نے انہیں اس لیے دی کہ وہ تمہاری تعریف کر رہی تھی۔"

"اس شریف عورت پر بہتان مت لگاؤ۔"

"وہ تمہاری اس کی تعریف کر رہی تھی کیا کہتے ہیں اسے... ہاں شرافت کی۔ بالا اور وہ حرام زادہ۔ وہ بھی ہاتھ ملا کے آیا تھا تم سے۔ اور اپنے سکندر صاحب، وہ بھی کہنے لگا کہ... خیر چھوڑو۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب کوئی اپنے دشمن کی تعریف کرے تو سمجھو وہ ہار گیا۔ اور اپنا تھا تو اپنا نہیں رہا۔ میں نے یہی سمجھایا ہے انہیں کہ دشمن صرف دشمن ہوتا ہے اور برا ہوتا ہے۔ اس میں اچھائی مت دیکھو۔ اس سے نفرت کرو۔ ہیں جی... ورنہ تم کمزور پڑ جاؤ گے۔"

"انکار کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تم کمزور پڑ گئے ہو۔ دیکھو اب کون ہے تمہارے ساتھ۔ پیڈرو بھی چلا گیا یا نا آخر۔"

دلاور قہقہہ مار کے بولا "کہاں چلا گیا؟ اپنے سکندر صاحب! جب تک کوئی اس دنیا سے نہ چلا جائے دلاور سے بچ کے کہاں جا سکتا ہے۔ سوا ہم کہا کرتے ہیں جی، جو بات ہو گئی اس پہ قائم ہیں۔ پیڈرو تمہیں ملے گا اور تم وعدے کے مطابق شیلی کی قبر کا نشان بتاؤ گے۔ تم نے برطانوی افسروں کو میرے پیچھے لگا دیا ہے۔ کوئی بات نہیں، دلاور ولایتی کتوں سے بھی نمٹ لے گا۔ میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دوں گا اپنے سکندر صاحب، میں کچھ ثابت نہیں ہونے دوں گا۔"

میں نے قہقہہ لگایا "تم کہاں کہاں سے ثبوت مٹاؤ گے دلاور۔"

"کس جرم کے ثبوت، کیسے ثبوت؟"

میں نے کہا "تم خود سب جانتے ہو۔ اس لیے تم بات بھی کر رہے ہو ورنہ اپنی مصروفیت چھوڑ کے بھاگے نہ چلے آتے۔ تمہارا مستقبل تباہ ہو جانے کا دلاور۔ تمہارے خلاف دوہرے قتل کا چشم دید گواہ لندن میں موجود ہے جسے تم ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ تم سمجھ رہے ہو شیلی کی ماں کا تیسرا شوہر۔ تم نے ایک لڑکی کو شیلی سمجھ کے قتل کرا دیا تھا کیونکہ تم اپنی اس سوتیلی بہن کو پہچانتے نہیں تھے۔ اپنی سوتیلی ماں کو مارنے والے بھی تم تھے مگر شیلی کی زندگی باقی تھی۔ اس کی ماں کے تیسرے شوہر نے تمہیں قتل کرتے دیکھا تھا مگر وہ اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکا اور لندن میں جیل کاٹ رہا ہے۔ اسے یقین ہے کہ وہ اصل قاتل کو پہچان سکتا ہے۔ تم نے شیلی کو بھی اسی لیے بھائی بن کے بلایا تھا کہ یہاں اسے قتل کرنا آسان تھا لیکن افسوس دلاور۔ یہاں بھی ایک چشم دید گواہ ہے۔"

"میں ٹیلی فون پر یہ باتیں نہیں کر سکتا۔"

"مت کرو، میں تو کر سکتا ہوں۔ اچھی طرح سمجھ لو دلاور۔ میں جانتا ہوں مقتول صاحب کو تم نے کیسے مروایا تھا۔ اور پھر شیلی کو لوٹ کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کے کیسے قتل کروا دیا تھا۔ تمہارے ہاتھ لمبے ہیں تو میرے وسائل بہت ہیں۔ شیلی کا کیس ہی تمہیں تختۂ دار تک پہنچا دے گا ایک دن۔ تم نہیں جانتے کہ تمہارے خلاف کتنے خفیہ ہاتھ میری مدد کر رہے ہیں۔ اسی اسپتال کے اندر... باہر پولیس میں اور... ہر جگہ۔"

میرا خیال ہے کہ یہ سب اسے بتانا غیر ضروری تھا۔ رابعہ نے کیس کی تفصیلات برٹش کونسلیٹ کو ارسال کر دی تھیں اور اس کیس کی تمام دستاویزات کی نقول ہر متعلقہ محکمے کے سربراہ کو بابا سیٹھ کا کی طرف سے ایک یادداشت کی صورت میں پیش کر دی گئی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس کیس کی تفتیش بہت اعلیٰ سطح پر ہو گی اور ثبوت ملتے ہی دلاور کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو جائیں گے۔ ایک بین الاقوامی مجرم کی حیثیت سے اس کی ضمانت بھی نہیں ہو گی۔

جب اچانک میں نے گاڑی کے شیشے پر ایک اجنبی چہرہ دیکھا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دلاور نے اتنی لمبی بات مجھے الجھانے کے لیے کی تھی۔ میری کال ملتے ہی اس نے اپنے کتوں کو چھوڑ دیا تھا جو میری بو سونگھتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔ سگنل ڈی ٹیکٹر (SIGNAL DETECTOR) عام چیز تو نہیں ہے۔ یہ غیر قانونی نشریات کا پتا چلانے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ریڈیو ویوز کی نشاندہی کرتا ہے۔ اسی لیے خفیہ ریڈیو اسٹیشن چلانا ممکن نہیں ہے۔

چند ہی منٹ میں ان لوگوں نے میرا سراغ لگا لیا تھا۔ اس سے بھی ثابت ہوتا تھا کہ وہ اسی علاقے میں ایک میل کے دائرے میں کہیں موجود تھے ورنہ وہ اتنی جلدی مجھ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

میں نے دروازے اندر سے لاک کر لیے تھے ورنہ وہ براہ راست میری پسلیوں پر ریوالور رکھ کے کہتے کہ چلو... اور مجھے جانا پڑتا۔ اتنی مصروف جگہ تھی کہ وہ حملہ کر کے شیشے توڑتے تو بہت سے لوگ متوجہ ہو جاتے۔

میں نے دائیں جانب شیشے سے ناک لگا کے گھورنے والے کو دیکھا اور اشارے سے کہا "معاف کرو بابا۔"

اس نے مجھے ریوالور دکھا کے کہا "شرافت سے دروازہ کھولو۔" سامنے ایک چھوٹا تھا جو میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ انجن کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔

شیشے بند ہونے کی وجہ سے ان کی آواز بہت کم آ رہی تھی اور وہ بلند آواز سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ "ٹھیک ہے۔" میں نے مسکرا کے کہا اور گاڑی کو اسٹارٹ کیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ [illegible] میں بھی گاڑی موجود ہے۔ بیک کیے بغیر میں گاڑی نہیں نکال سکتا تھا۔ میرے پیچھے والی گاڑی میں ڈرائیور کی سیٹ پر تیسرا شخص موجود تھا۔ جو تھا میری کار کی ڈکی کا سہارا لیے ایسے کھڑا ہوا تھا جیسے عام طور پر لوگ کسی بھی گاڑی کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں بائیں طرف سے گھرا ہوا تھا مگر جب تک کار کے اندر تھا محفوظ تھا۔

گاڑی کے انجن کی آواز پر سامنے والے نے مڑ کے دیکھا اور گھبرایا۔ پیچھے والا بھی سیدھا ہو گیا۔ بدقسمتی یا غلطی سے میں نے [illegible] ترچھا کھڑا نہیں کیا تھا۔ اب میرے سامنے مشکل سے دو انچ کے فاصلے پر بھی گاڑی تھی اور وہ مجھے ایک انچ ہلنے کا موقع [...] مجھے راستہ نہ آگے تھا نہ پیچھے۔

"اوکے بوائز، تمہاری مرضی۔" میں نے کہا اور گاڑی کو ایک دم پیچھے ہٹایا۔ اس میں سامنے والی گاڑی سے ٹکرانے کا رسک [illegible] تھا۔ دھماکا ہوتا تو مجمع لگ جاتا اور خود گاڑی والا ہنگامہ [illegible] کہ میرا نقصان پورا کرو۔ نقصان پورا کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا [illegible] مجھے معلوم تھا کہ میرے باہر نکلتے ہی ان تینوں میں سے کوئی ریوالور کی نال میری کمر یا میری پسلیوں سے لگا دے گا اور مجھ سے [illegible] کہ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ میں نے ذرا بھی [illegible] تو گولی میرے دل کو چیرتی پھاڑتی ہوئی جسم سے گزر جائے گی۔ [illegible] کی آواز پر مجمع بھی جوتیاں چھوڑ کے غائب ہو جائے گا۔ بعد میں پولیس میری لاش اٹھانے آئے گی تو چشم دید گواہ تک نہ ملے گا۔

یہ بھی ہو سکتا تھا کہ لوگ مجھے تھانے لے جائیں۔ تباہ ہونے والی گاڑی کا مالک یا اتفاقیہ نمودار ہو جانے والی پولیس الزام عائد کر دے کہ میں نشے میں ہوں اور یہ قابل دست اندازی پولیس جرم ہے جس میں تھانے جانا ضروری ہے۔ تھانے جانے سے کہیں بہتر تو یہ ہوتا کہ میں خاموشی سے ان لوگوں کے ساتھ دلاور کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔

میں نے گاڑی ایک دم بڑھائی تو سامنے کھڑا ہوا شخص زبردست دھکے سے الٹ کر آگے گیا اور اس کا دھڑ گاڑی پر منطبق ہو گیا۔ جھٹکے سے اس کی کمر ٹوٹی نہیں ہو گی تو ریڑھ کی ہڈی کے مہرے ضرور ہل گئے ہوں گے۔ شاید اس بے وقوف کو مجھ سے یہ امید نہیں تھی کہ میں اتنے لوگوں کی موجودگی میں اس پر گاڑی چڑھا سکتا ہوں۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھ گئے تھے اور وہ آگے والی کار پر الٹا پڑا ہوا تھا کہ کار کے بمپر نے اس کی ٹانگوں کو چھو لیا۔ میں نے بریک لگا کے گاڑی کو تصادم سے بچا لیا تھا۔ ایک دشمن اب میری راہ میں حائل نہیں رہا تھا۔ پھر ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں میں نے گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈالا اور ریس دے کے کلچ سے پیر ہٹایا۔

گاڑی ایک دم پیچھے گئی۔ پیچھے والے کو مہلت ہی نہ ملی کہ وہ بیچ میں سے نکل جائے۔ میں نے پیچھے والی گاڑی کو پوری قوت سے ٹکر ماری۔ دراصل میں اپنے ذہن کے کمپیوٹر کی مدد سے چند نتائج اخذ کر چکا تھا جو میرے حق میں تھے۔ تصادم سے میری گاڑی کی ٹیل لائٹس کو نقصان ہوتا اور ڈکی پچک جاتی مگر پیچھے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس اور گرل کے ساتھ ریڈی ایٹر کی جالی بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ اس کے بعد وہ گاڑی میرا تعاقب کرنے کے قابل نہ رہتی۔ اس ٹکر سے وہ گاڑی مزید اتنا پیچھے چلی جاتی کہ مجھے سامنے سے گاڑی موڑنے کے لیے چھ آٹھ فٹ جگہ مل سکتی تھی۔

جب دھماکا ہوا تو میں نے ایک چیخ بھی سنی۔ جو شخص پیچھے کھڑا ہوا تھا وہ دونوں گاڑیوں کے درمیان ایسے دب گیا تھا کہ اس کی ٹانگوں کی ہڈیوں کا چورا ہو گیا ہو گا۔ دنیا کا کوئی ڈاکٹر اسے دوبارہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ہیڈ لائٹس کے شیشے ٹوٹنے کی مخصوص آواز اور ایک زیادہ بڑا دھماکا سنا۔ یہ پچھلی گاڑی کے ونڈ اسکرین کے شیشے ٹوٹنے کی آواز تھی۔ ونڈ اسکرین کا شیشہ جسے میکانک گیس والا شیشہ کہتے ہیں ٹوٹتا ہے تو بکھر جاتا ہے۔ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ ان کے درمیان ویکیوم ہوتا ہے جو دھماکے کا سبب بنتا ہے اور شیشے کے یہ ننھے ننھے ٹکڑے ایسے ہی اڑتے ہیں جیسے بلب پھٹنے سے کانچ اور دور تک جاتا ہے۔ عام طور پر ان سے ڈرائیور کا چہرہ لہولہان ہو جاتا ہے اور بعض اوقات آنکھیں بھی ضائع ہو جاتی ہیں۔

اب ہر طرف سے لوگ متوجہ ہو گئے تھے۔ کشمیری چائے پلانے والے کا لڑکا میری طرف دوڑا چلا آ رہا تھا۔ جو شخص گاڑی کے ساتھ چپکا ہوا تھا وہ بدحواس ہو گیا تھا اور احمقوں کی طرح آگے پیچھے دیکھ رہا تھا جہاں اس کے دو ساتھی الٹے پڑے چیخ رہے تھے۔

www.paksociety.com

میں نے کھڑکی کو ایک انچ نیچے کیا اور اس میں سے دس کا نوٹ چائے والے کی طرف پھینک دیا پھر میں نے دیوانہ وار گاڑی کو موڑا۔ قریب کے لوگ اچھل کے ایک طرف ہو گئے اور میں گاڑی کو سڑک پر لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس وقت تک پکڑو پکڑو کا شور مچ گیا تھا۔ میرے جرم کے ایک نہیں دسیوں گواہ تھے جنھوں نے مجھے گاڑی آگے پیچھے کر کے دو بندوں کو لتاڑتے اور ایک کار کو تباہ کرتے دیکھا تھا۔ وہ سب یقیناً یہ سمجھے ہوں گے کہ میں نشے میں ہوں۔

سب سے پہلے رونمائی کرنے والا احمقانہ حد تک دلیری کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ تھا۔ شاید اسے ڈر ہو گا کہ غلط منصوبہ بندی اور ناکامی پر بھی اس کے لیے دلاور کو جواب دینا مشکل ہو گا اور جو سزا دلاور دے گا اس سے بچنے کے لیے رسک لینا بہرحال بہتر ہے۔

وہ چھلانگ مار کے بونٹ پر میرے سامنے آ گیا۔ اسے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا، میں نے گاڑی کو تیز رفتاری سے دائیں بائیں لہرایا تو اس کے قدم دو مرتبہ اکھڑ گئے۔ سامنے سے آنے والی ایک گاڑی اور ایک تانگا بال بال بچے ورنہ ٹکر سامنے سے ہوتی تو کوئی نہ بچتا۔ سڑک پر رات گیارہ بجنے کے بعد بھی ٹریفک تھی اور ایمپریس روڈ پر جہاں تک سمجھا تھا، مجھے خالی سڑک ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔ میں بونٹ پر چڑھے ہوئے شخص کو ذرا بھی موقع دیتا تو وہ پلٹ کے فائر کر دیتا اور ونڈ اسکرین میں سوراخ کرتی ہوئی گولی سیدھی میرے سر میں گھس جاتی۔ یہ بھی سائنس کا کمال ہے کہ پتھر لگنے سے کار کا شیشہ بکھر جاتا ہے لیکن گولی سے صرف اس میں سوراخ ہوتا ہے، شیشہ نہیں ٹوٹتا۔ تشریح اس کی غالباً یہ ہے کہ گولی کی تیز رفتاری کا ساتھ شیشہ نہیں دے سکتا چنانچہ راستہ دے دیتا ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔ میرا مسئلہ تو ابھی اس بدقسمت سے نجات حاصل کرنا تھا جسے یہ ہوش بھی نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ بالکل پاگل ہو چکا تھا۔ اس وقت موت سے کوئی نہیں ڈرتا جب مرنے یا مارنے کا مرحلہ آ جائے۔

وہ عین میرے سامنے تھا اور کافی حد تک میری نگاہ سامنے دیکھنے سے قاصر تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ میں کسی گاڑی سے نہ ٹکرا جاؤں یا میں نے کسی سائیکل سوار کو نہ روندا تو فٹ پاتھ پر گاڑی ضرور چڑھا دوں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کتنے لوگ اس رات مرتے مرتے بچے۔ دن کا وقت ہوتا تو یہ خونی ریس ثابت ہوتی اور سو گز کے فاصلے میں... جانے کتنے حادثات ہوتے۔

وہ پھر سنبھل کے پلٹنا چاہتا تھا کہ میں نے ایک دم بریک لگائے اور پھر بچ بچا کے رفتار بڑھائی۔ وہ شیشے کے اوپر گرا اور میں نے ایک فائر کی آواز بھی سنی۔ اب مجھے ایک سیکنڈ کی مہلت ملی۔ میں نے بڑی تیزی سے اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا۔ اسٹیئرنگ کو مجھے الٹے ہاتھ سے سنبھالنا پڑا۔ وہ عین میرے سامنے شیشے سے چپکا ہوا تھا۔ میں نے سیدھا ہاتھ باہر نکالا اور اس کی پتلون کا پائنچہ میری گرفت میں آ گیا۔ میں نے ایک آخری خطرناک ٹرن لیا اور گاڑی الٹے ہاتھ پر ایک کوٹھی کے کھلے گیٹ سے گزر گئی۔ وہ دائیں جانب تھا تو میں نے اسے جھٹکے سے کھینچا اور وہ وہیں گر گیا۔ اب میں نے گاڑی کو سنبھالا ورنہ میں پورچ میں گھس جاتا جہاں ایک ویگن موجود تھی۔ بریک لگا کے میں نے گاڑی کو پوری اسپیڈ سے واپس کیا۔ وہ سخت زخمی ہونے کے باوجود کھڑا ہو گیا تھا اور گولی چلانے کے لیے تیار تھا۔ اس کا نشانہ خطا ہوتا تو گولی پچھلی کھڑکی میں لگتی یا پیچھے والے شیشے سے گزر کے میری نشست میں پیوست ہو جاتی۔ شاید اس کے ہاتھوں کی توانائی نے ساتھ نہیں دیا یا وہ لرزتے ہاتھوں سے ریوالور کا رخ سیدھا نہ رکھ سکا۔ اس نے گولی ضرور چلائی مگر وہ نہ جانے کدھر گئی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ وحشت زدہ تھا۔ وہ زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔

"نہیں..." وہ چلایا "رک جاؤ۔"

اس میں ہمت ہوتی تو وہ جست لگا کے ہٹ جاتا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ وہیں کھڑا رہے گا۔ جب گاڑی نے ٹکر ماری تو وہ اوپر اچھلا اور اس نے ایک بھیانک چیخ بلند کی۔ میں نے اپنی نگاہ گیٹ پر رکھی اور پھر سڑک پر پہنچ گیا۔ اس وقت کوٹھی کے اندر لائٹس جل اٹھی تھیں اور کوئی باہر آ کے چیخنے لگا تھا۔ وہ انگریزی میں پوچھ رہا تھا "آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے آخری بار ڈرائیو وے پر پڑے ہوئے شخص کو دیکھا جس کے جسم پر سے گزرتے ہوئے کار کے پہیے دو بار اسے اچھال چکے تھے۔ وہ انسان نہیں اسپیڈ بریکر تھا۔ اس کے زندہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور کار کو سیدھا لے گیا۔

"یو باسٹرڈ!" میں نے دلاور کو بلند آواز میں گالی دی۔ "اس کی جگہ میں نے تمہیں کچلا ہوتا۔" میں ذہنی طور پر انتشار کا شکار تھا۔ ایک طرف مجھے ان لوگوں کا تصور پریشان کر رہا تھا جن کو میں نے اپنا دفاع کرتے ہوئے کرش کر دیا تھا۔ کسی گاڑی نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ گاڑی میں بیٹھا ہوا ڈرائیور بھی ونڈ اسکرین کے شیشوں سے زخمی ہوا تھا۔ دوسری طرف مجھے یہ فکر تھی کہ نہ جانے کتنے لوگوں نے گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا ہو گا۔ ابھی تک مجھے موقع نہیں ملا تھا کہ میں گاڑی کے پچھلے حصے کو دیکھتا اور اندازہ کرتا کہ اس کو کس حد تک نقصان پہنچا ہے۔

اسمبلی کے پیچھے سے اور چیئرنگ کراس کا چکر لگا کے ہوٹل کی طرف سے رائل پارک آتے ہوئے میری ایک کیمسٹ سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ مجھے بغیر نسخے کے دو ٹیبلٹ دینے پر رضامند نہیں تھا۔ اصولاً اس کا انکار جائز تھا مگر مجھے اس وقت کون ڈاکٹر ملتا جو میری فرمائش پر دو ٹیبلٹ کو نسخے میں شامل کر دیتا۔

"آپ جانتے ہیں دو ٹیبلٹ خطرناک ڈوز ہے۔"

"مگر میں تو صرف دو گولیاں مانگ رہا ہوں۔ میں ذرا اپ سیٹ ہوں۔"

"آخر کیوں؟ اور سکون کے لیے لوگ خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔"

"صرف دو گولیوں سے خودکشی نہیں ہو سکتی۔"

"مجھے کیا معلوم آپ کہاں کہاں سے ایسی ہی گولیاں جمع کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر کا نسخہ لے آیئے..."

"میں خود ڈاکٹر ہوں" میں نے چڑ کے کہا "پیڈ گاڑی میں پڑے ہیں، بتاؤ کتنے نسخے لکھ کے لا دوں۔ کس کس نام سے؟"

اس نے غور سے مجھے دیکھا "آپ... ڈاکٹر نسیم حسن ہیں!"

میں نے سکون کا سانس لیا "شکر ہے کہ آپ نے پہچان لیا۔"

اس نے مجھے پوری شیشی دے دی۔ دو گولیاں میں نے وہیں اس کے سامنے کھا لیں اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ جب میں واپس رائل پارک پہنچا تو آدھی رات ہو چکی تھی۔ گلی کے اس حصے میں سناٹا تھا اور بیشتر گھروں کی لائٹس آف تھیں۔ میں نے کار کو خاموشی سے اپنی جگہ پارک کیا اور سیڑھیاں چڑھ گیا۔ کار کا پچھلا بمپر ٹوٹ گیا تھا، ڈکی اندر دب گئی تھی اور ٹیل لائٹس کا تو وجود ہی نہیں رہا تھا۔

دروازہ اسی طرح بند تھا۔ رابعہ خاموش لیٹی ہوئی تھی اور کچھ دیر بعد مجھے یقین آ گیا کہ وہ واقعی سو رہی ہے۔ بستر پر لیٹنے کے بعد میں بہت دیر کھلی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ صبح رابعہ کے سامنے جھوٹ بولنا چاہیے یا اسے سب بتا دینا چاہیے۔ وہ میری خاطر قربانی دینے کا فیصلہ کر چکی تھی اور عملاً دنیا کو چھوڑ آئی تھی۔ ایسے جھوٹ بولنا مناسب نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ وہ ناراض ہو گی کہ میں رات کو باہر کیوں گیا تھا اور مجھے خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو اسے معلوم بھی نہ ہوتا۔

دلاور کا رویہ ایک دم جارحانہ ہو گیا تھا جو ایک خطرناک بات تھی۔ خود میں اس خیال سے بے چینی محسوس کر رہا تھا کہ ذہنی طور پر بتدریج میں کسی پیشہ ور قاتل جیسا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دن میں پانچ افراد کی جان لے کر اور کم سے کم دو کو عمر بھر کے لیے معذور بنا کے میں اس خیال سے مطمئن تھا کہ برا نہیں کیا۔ دفاع میرا حق تھا مگر اس حق کو میں احتیاط سے استعمال نہیں کر رہا تھا۔ دوسری طرف دلاور تھا جس کے پاس ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی اتنی دولت تھی کہ وہ ہر روز نئے لوگ بھرتی کر لیتا تھا جو اس کے احکامات کی تعمیل کے لیے پیسہ لے کر جان دینے پر تیار ہو جاتے تھے۔ چھوٹے موٹے جرائم پیشہ افراد ہزاروں تھے مگر ان سے کہیں زیادہ وہ مجبور لوگ تھے جن کا معاشی استحصال ممکن تھا۔ کچھ اپنی پریشانیوں کی اس انتہا کو پہنچ چکے تھے کہ اب خودکشی کا سوچتے یا ڈاکا ڈالنے پر بھی تیار تھے اور دلاور کی پیشکش قبول کرتے ہوئے وہ یقیناً خوش ہوں گے کہ یہ کام خودکشی یا ڈاکا ڈالنے سے بہرحال بہتر ہے۔ کچھ کم ہمت اور ناکارہ لوگ تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں ان کے کرنے کے لیے کوئی کام نہیں رہا اور جو کام ہے وہ دنیا انھیں کرنے نہیں دیتی۔ نشے کے یا جوئے کے عادی۔ جھگڑا کرنے والے اور مقروض، پیسہ لے کر دلاور کا کوئی بھی کام کرنے پر تیار ہو سکتے تھے۔ ان کے مسائل کا حل پیسہ تھا جو دلاور کے پاس بہت تھا اور وہ ہر آدمی کو اس کی ضرورت سے اتنا زیادہ دے سکتا تھا کہ وہ انکار ہی نہ کر سکے۔

ایسے لوگ بلاوجہ مارے جا رہے تھے اس میں قصور میرا نہیں تھا۔ قانونی اور اخلاقی اعتبار سے مجھے حق حاصل تھا کہ میں اپنا دفاع کروں اور کوئی میری جان لینے کی کوشش کرے تو اسے مار ڈالوں۔ قانونِ قدرت بھی یہی تھا جس پر انسان ہی نہیں حیوان بھی عمل کرتے تھے۔ جنگ کے میدان میں توپوں اور ٹینکوں کی گھن گرج سے آگے رہنے والے پیادے اسی طرح مرتے تھے جیسے حشرات الارض۔ طاقتور کے لیے بقا تھی اور کمزور کے لیے فنا لیکن اس کے باوجود مجھے افسوس ہوتا تھا کہ پیسہ انسانی جانوں کا مول کیوں بن گیا ہے۔ لوگ اتنے مجبور کیوں تھے کہ پیسہ انھیں خرید لیتا تھا۔ وہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ نہ مرنے سے اور نہ مارنے سے۔ مرنے والے سب ایسے لوگ تھے جو نہ مجھے جانتے تھے اور نہ میرے اور ان کے درمیان کوئی تنازعہ تھا کہ وہ میرے دشمن ہوتے۔ یہ مالِ حرام اور بیسویں صدی کا رجحان تھا کہ دولت جرم کے فروغ اور مجرموں کی حوصلہ افزائی کے لیے استعمال ہو رہی تھی۔ وہ اچھے دن پچھلی صدی میں رہ گئے تھے جب دولت فلاح کے کاموں میں صرف ہوتی تھی اور مشورہ دینے والے کہتے تھے۔

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پُل بنا... چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

مجھے غالب کا خیال بھی آیا جس سے میں نے شام کو ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ یقیناً پریشان ہو گا اور یہ سمجھ رہا ہو گا کہ میں پھر اسے چکمہ دے کے غائب ہو گیا اور میں نے اس کی طرف سے تعاون کی پیشکش کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا۔ ایک مسئلہ مالکِ مکان کا بھی تھا۔ وہ صبح پریشان ہو گا کہ رات کو گاڑی ٹھیک ٹھاک اور صحیح سالم کھڑی تھی۔ صبح تک یہ حشر کیسے ہو گیا؟ اگر کسی نے وہیں اسے ٹکر ماری ہوتی تو دھماکے سے سارا محلہ جاگتا اور ٹکر مارنے والا بھاگ جاتا تب بھی تصادم کی باقیات وہیں مل جاتیں۔ ٹوٹنے والے شیشے اور پلاسٹک کی کرچیاں وہیں پڑی ہوتیں۔ ظاہر ہے اسے بھی کوئی کہانی سنانی پڑے گی کہ میں رات کو بیوی کے لیے دوا لینے گیا تھا اور واپسی میں یہ حادثہ ہو گیا۔ کوئی کھڑی گاڑی میں پیچھے سے ٹکر مار کے فرار ہو گیا۔

سکون آور گولیوں نے بالآخر کچھ اثر دکھایا اور میں ایک بجے کے بعد سو گیا۔ صبح رابعہ مجھ سے بہت پہلے اٹھ گئی۔ اس نے باتھ

www.paksociety.com

روم کا دروازہ کھولا تو میں نے سنا تھا لیکن اندھیرا دیکھ کے میں نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور کروٹ لے کے سو گیا۔ تاہم نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ چند منٹ بعد ہی میں پھر جاگا تو رابعہ فرش پر چادر بچھائے نماز پڑھ کے دعا مانگ رہی تھی۔ میں اس کی محویت کو بڑے احترام آمیز خوشی کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر اتنا سکون' ایسا ملکوتی حسن اور پاکیزگی کا نور تھا کہ وہ کوئی تصوراتی آسمانی مخلوق نظر آئی تھی۔ ایک غیر مرئی پیکر جس نے صبح صادق کی خاموشی کے طلسم' شبنم کے ابر گہربار کی لطافت اور غنچۂ نودمیدہ کی مہک کے ساتھ وجود کا سفر کیا ہو اور اسے سورج کی پہلی کرن کے ساتھ عدم کی جانب لوٹ جانا ہو۔

جب اس نے سلام پھیر کے میری طرف دیکھا اور مسکرائی تو صبح ہو گئی۔ آسمان روشن ہو گیا اور میرے دل میں گزشتہ رات سے چمنی میں جمے ہوئے کالے دھوئیں کی طرح جم جانے والا مایوسی کا اندھیرا چھٹ گیا۔

میں نے مسکرا کے کہا "صبح بخیر۔"

"السلام علیکم۔ مسلمانوں کا یہی طریقہ ہے۔ تم پر خدا کی سلامتی ہو۔"

میں نے کہا "تم مجھے شرمندہ کر رہی ہو۔"

وہ ہنسی "صرف کوشش کر رہی ہوں۔ شرم آئی ہے تمہیں؟"

"آج آرہی ہے۔ آج نماز کے بعد کیا دعا مانگی؟"

"بس خدا سے سلامتی اور اپنے امان میں رکھنے کی۔ اس وقت میں بہت پُرسکون ہوں اور اب میں نے طے کیا ہے کہ ہر دن کا آغاز ایسے ہی کروں گی۔ دل کو بڑی تقویت ملتی ہے اور سارا ذہنی انتشار ختم ہو جاتا ہے نماز کے بعد۔"

"میرے لیے بھی دعا کرنا کہ خدا مجھے توفیق دے۔"

وہ ہنسی "دعا تم خود بھی مانگ سکتے ہو۔ خدا سب کی سنتا ہے۔ تم رات کو کہاں گئے تھے؟"

میں نے کہا "تمہیں معلوم ہے' تم تو سو رہی تھیں؟"

"ہاں۔ لیکن تم باہر گئے تو مجھے نیند میں ہی ایسا لگا جیسے تنہائی بوجھل ہو گئی ہے اور میں اکیلی ہوں۔"

"میں کشمیری چائے پینے گیا تھا" میں نے کہا۔

"مجھے جب خیال آیا کہ تم چائے پینے کے موڈ میں تھے تو میں مطمئن ہو کے پھر سو گئی تھی۔ تم کب واپس آئے تھے؟"

"ایک بجے کے قریب۔"

"دو گھنٹے چائے پیتے رہے؟" اس نے چادر پھر بستر پر پھیلا دی۔

"نہیں۔ ایک حادثہ ہو گیا تھا" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

اس نے پلٹ کے دیکھا "کیسا حادثہ؟"

"میں گاڑی پیچھے کرنے لگا تو دوسری گاڑی سے ٹکر ہو گئی۔"

"زیادہ نقصان تو نہیں ہوا؟"

"اس گاڑی کی ہیڈ لائٹس بکھر گئیں اور ونڈ اسکرین ٹوٹ گئے

تھے' اپنی گاڑی کی پچھلی سائڈ کا ملبہ ہو گیا۔"

اس نے پریشانی سے کہا "کیا گاڑی بے قابو ہو گئی تھی؟"

"نہیں۔ جان بوجھ کے ایسا کیا تھا میں نے۔ ایک آدمی آگے تھا' ایک پیچھے۔ دونوں کو راستے سے ہٹانے کا اور کوئی طریقہ ہی نہیں تھا۔"

وہ بستر پر بیٹھ گئی "کون تھے وہ؟ پوری بات کیوں نہیں بتاتے تم؟ توڑ توڑ کے کہہ رہے ہو۔"

میں نے کہا "یہ نفسیاتی طریقہ ہے۔"

"بھاڑ میں گئی نفسیات۔ کیا انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ ہم یہاں ہیں۔"

میں نے اسے ساری بات سُنا دی "میرا خیال ہے کہ اب یہ کار وقار یوسف کو واپس کر دی جائے۔ وہ ڈینٹ پینٹ کرا لے گا اور ضرورت پڑنے پر حادثے کی کوئی فرضی کہانی بھی سُنا دے گا۔ اسے کون جھٹلا سکتا ہے۔ اس کے گواہ بھی بکے ہوں گے۔ فیر فون کرنے والے جھوٹے پڑ جائیں گے۔"

"دیر کیوں کرتے ہو۔ فون کر دو اسے۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا "آج چھٹی ہے نا۔ دیر ہی گئی۔ ابھی تو وہ سوا پڑا ہو گا۔ میں واپسی میں ناشتا بھی لے آؤں گا۔"

"سکندر۔ دیکھو فون کرنے کے علاوہ کچھ مت کرنا۔"

میں ہنس پڑا "مثلاً..؟"

"کسی چکر میں مت پڑنا۔"

"جانم۔ جو تمہارے چکر میں پڑ گیا وہ کسی اور کے چکر میں کیسے پڑ سکتا ہے۔ میں یوں گیا اور یوں آیا۔" میں نے چٹکی بجائی۔

مالک مکان اور ان کے "شریف" کرائے دار سب دیر سے سونے اور جاگنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ ابھی تک کسی نے پیچھے سے تباہ حال گاڑی کو نہیں دیکھا تھا۔ میں اسے گھما کے پچھلی طرف سے باغ جناح تک لے گیا پھر پلازہ سینما کی طرف مڑنے والی سڑک کے انتہائی بائیں جانب روک دیا۔ گاڑی میں ہی "ٹول کٹ" یعنی پلاس' پیچ کس موجود تھے۔ میں نے غور سے ڈیش بورڈ کا معائنہ کیا اور خفیہ ریڈیو فون کا ٹرانسمیٹر دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ڈیش بورڈ کے نیچے ریڈیو کے ساتھ منسلک تھا اور اس کو پاور سپلائی کار بیٹری سے دی گئی تھی جس کا مطلب تھا کہ یہ ایک دولت کی کسی بھی بیٹری پر کام کر سکتا تھا۔

پیچ کھول کے اسے ریڈیو کے ساتھ نکالنا خاصا محنت طلب کام تھا۔ مجھے اگلی دونوں سیٹوں کے سامنے والی جگہ میں بیچ لیٹ کے کام کرنا پڑا۔ ڈیش بورڈ کے نیچے اندھیرا تھا اور مجھے ہاتھ اوپر کر کے ایک ساتھ پلاس اور پیچ کس استعمال کرنے پڑے تو میرے بازو شل ہو گئے مگر آدھے گھنٹے بعد مجھے اس محنت کا صلہ مل گیا۔ میں ڈیش بورڈ سے رابطے کے پورے سسٹم کو کار سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ مسئلہ مشین گن نے پیدا کیا۔ اسے ہاتھ میں لے کے چلنا

ناان عام کے مترادف تھا کہ حضرات و خواتین! ناچیز کی طرف توجہ ہو۔ میں ایک دہشت گرد ہوں۔ (قارئین ذہن میں رکھیں کہ اس وقت کلاشنکوف کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا) اسے لپیٹنے کے لیے میرے پاس اخبار نہیں تھا۔ سڑک پر سے گزرنے والے اکّا دکّا لوگ مجھے مصروف دیکھ کے فرض کر لیتے تھے کہ گاڑی میں کوئی خرابی ٹھیک کر رہا ہوں۔ مشین گن کے ساتھ راؤنڈ بھی تھے اور اس وزن کو اٹھا کے چلنا بھی مشکل کام تھا۔ اس کا حل میں نے نکالا کر آگے والی سیٹوں کے بیک کور اتار لیے جو تھیلوں کی طرح تھے۔ تمام اسلحہ ایک ہی تھیلے میں سما گیا۔ احتیاطاً میں نے ریڈیو فون وغیرہ کو دوسرے تھیلے میں لپیٹ لیا کیونکہ یہ نازک سامان تھا۔

چابی اندر لگا کے میں نے گاڑی کو لاک کر دیا۔ چند منٹ بعد ہی میں نے اس وفادار گاڑی کو الوداع کہا جس نے متعدد مواقع پر میری جان بچائی تھی۔ رکشے والے کو میں نے امرتسری حلوائی کی طرف سے چلنے کو کہا تاکہ میں راستے میں ناشتے کے لیے حلوا پوری لے لوں۔ اسٹالوں پر اخبار بھی آ گئے تھے۔ میں نے ایک انگریزی کا اور ایک اردو کا اخبار خرید لیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا کسی نے کھیتوں میں ملنے والی لاشوں کو دریافت کر لیا ہے یا گزشتہ شب ایبٹ روڈ پر ہونے والے ہنگامہ آرائی کا کوئی تذکرہ ہے۔ روزنامہ "مشرق" کا دفتر تو اس جگہ سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا۔

واپس رائل پارک پہنچ کے میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے نو بجنے والے تھے۔ میں نے نیچے ایک چائے والے سے کہا کہ وہ میری منزل پر چائے کا چار دے تو اس کی بڑی مہربانی۔ ہم نئے آئے ہیں اور ابھی ہمارے پاس سامان نہیں ہے۔ میری لجاجت سے وہ مان گیا اور پھر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ گھر بار رکھنے والے کہیں جاتے ہیں تو گھر کا اسباب بھی ساتھ لے جاتے ہیں مگر ہماری بدقسمتی کہ وہ بلڈنگ ہی بدنام تھی اور وہاں جو آتے تھے خالی ہاتھ آتے تھے اور اپنے ساتھ امید یا عزائم کے سوا کچھ لاتے تھے تو گھر سے چوری کی ہوئی رقم یا ماں کا زیور۔ لڑکیاں جن کی جوانی بے لگام ہو جاتی تھی یا جو فلمی کہانیوں اور رومانی ناولوں سے متاثر ہو کے کسی ہیرو کے ساتھ محبت کا سرمایہ لے کر گھر سے نکل آتی تھیں اور پھر ان کے ساتھ جو ہوتا تھا وہ سب ہی جانتے تھے۔

مالک مکان دروازے کے سامنے گملوں میں سرد پے او گھ رہے تھے "او ہو ڈاکٹر صاحب' صبح صبح گاڑی بیچ آئے کیا؟"

میں نے کہا "یہ خیال کیسے آیا آپ کو؟"

"نوٹوں سے بھری ہوئی بوریاں تو اٹھا رکھی ہیں اور گاڑی غائب ہے۔"

میں نے کہا "گاڑی ایک دوست کی تھی۔ اسے واپس کر دی۔ اگر بوریوں میں نوٹ ہوتے تو میں یہ بلڈنگ آپ سے خرید لیتا اور باقی کرائے داروں کے ساتھ آپ کو بھی بے دخل کر دیتا۔"

"مجھے کیوں جی؟" وہ ہنسنے لگا۔

"یہ ایسے کرائے دار رکھنے کی سزا ہوتی" میں نے کہا۔

"ٹھیک جی۔ ہمیں تو غرض ہے کرائے سے اور ماتھے پر کسی کے نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کون ہے۔ جیسے آپ نے کہا ڈاکٹر ہیں اور ہم نے مان لیا۔ بعد میں پتا چلے کہ آپ کے پیچھے تو پولیس لگی ہوئی ہے۔ تو ہمارا کیا قصور جناب عالی۔ پولیس تو چار چھتر ہمیں بھی مارے گی خواہ مخواہ۔"

میں نے محسوس کیا جیسے وہ عام بات نہیں کر رہا ہے بلکہ خاص میرا حوالہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ وہ سب جانتا ہے۔ اس کی بات کی صداقت کو مجھ سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا۔ میں نے ہنس کے اس سے اتفاق کیا اور اوپر چل پڑا۔ اس نے مجھے پیچھے سے یاد دلایا کہ "وہ جی... میری دوائی...؟" اور میں نے پلٹ کے کہہ دیا "ہاں ہاں یاد ہے مجھے۔ آج مل جائے گی۔"

"خدا کا شکر ہے" رابعہ نے مجھے دیکھ کے کہا "جیسے گئے تھے ویسے آئے' کچھ ہوا تو نہیں؟"

میں نے سخت حیرانی سے کہا "تمہیں نہیں معلوم ابھی تک؟"

رابعہ کا رنگ اُڑ گیا "کیا ہوا۔ جلدی سے بتاؤ!"

"بھئی' مجھے بڑا خطرناک قسم کا عشق ہو گیا ہے تم سے۔ پرانی بات ہے۔"

"بدتمیز۔ ڈرا دیا تھا مجھے۔ اُف... میرا دل کیسے دھڑک رہا ہے۔" اس نے بڑی بے ساختگی سے میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔

میں نے غور فرما کے کہا "مجھے تو عجیب سی آواز آرہی ہے۔"

اس نے ہنس کے اور کچھ شرما کے ہاتھ چھوڑ دیا "کان بج رہے ہوں گے تمہارے۔"

"نہیں۔ آواز بالکل واضح ہے۔ حلوہ... پوری... حلوہ... پوری۔ تم میرے دل پر ہاتھ رکھ کے دیکھو۔ بالکل یہی آواز آرہی ہے نا۔"

چائے والا کسی نوٹس کے بغیر اندر آ گیا اور اس رومانی منظر سے خاصا محظوظ ہوا۔ رابعہ کا ہاتھ میں نے پکڑ کے اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ رابعہ نے جلدی سے ہاتھ چھڑا لیا۔ چائے والا مسکراتا ہوا چلا گیا۔

"عجیب بدتمیز آدمی ہے۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ یہاں سب دل والے رہتے ہیں جن کا ایک ہی فلسفہ حیات ہے۔ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ تو دل کی پکار سُنیں۔ میں حلوا پوری لے آیا ہوں۔"

"اور ان بوریوں میں کیا ہے۔ موت کا سامان؟"

"یہ بھی زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے" میں نے آہ بھری۔

جب رابعہ ناشتے کو فرش پر چادر اور اخبار بچھا کے لگا رہی تھی تو میں نے تازہ اردو اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ صفحہ اوّل پر بین الاقوامی خبروں میں میری دلچسپی واجبی سی تھی۔ جتنی کسی بھی تعلیم یافتہ کہلانے والے شخص کو ہونی چاہیے۔ ناشتے کے بعد لمنڈی

www.paksociety.com

چائے پیتے ہوئے میں نے ایک گرماگرم خبر پڑھی جس نے میرے لہو کو گرما دیا۔

میں نے چلا کے کہا "وہ مارا پاپڑ والے کو۔"

رابعہ دم بخود رہ گئی "کسے مارا؟ پاپڑ والے کو۔۔۔ کیوں؟"

میں نے رابعہ کو گلے لگا کے کہا "بیگم مبارک ہو تمہیں۔ بہت مبارک۔"

اس نے خود کو چھڑا کے کہا "کس بات کی مبارکباد دی جارہی ہے اتنے جوش و خروش سے؟"

"تم نے کارنامہ ہی ایسا سرانجام دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمہارا جلوس نکالوں۔ تمہیں کندھے پر بٹھا کے اور ہاروں سے لاد کے آگے آگے میں ڈھول بجاتا چلوں جو میں نے دلاور کی تیسری شادی کے نہ ہونے سے پہلے بجایا تھا۔ ساری دنیا کو بتادوں کہ کم سے کم ابابیلان شہر کو کہ یہ ہے وہ "عظیم خاتون" جو کام کیا اس نے وہ رستم سے بھی نہ ہوگا۔"

رابعہ ہنسنے لگی "کیوں پاگل ہو رہے ہو دتے؟"

"بات ہی ایسی ہے جانم۔ دلاور کے خلاف پرچا کٹ گیا۔ ایف آئی آر درج ہوگئی۔ آج کی تازہ خبر" میں نے ہاکر کی طرح چلاتے ہوئے اخبار لہرایا۔

چائے والا دبے پاؤں اندر آگیا۔ "برتن لے جاؤں جی؟"

میں نے جھنجھلا کے کہا "آخر تم چوروں کی طرح کیوں آتے ہو؟"

"آپ کی کون سی چیز چرالی ہے جی؟" وہ برا مان کے بولا۔

میں نے کہا "ناراض کیوں ہوتے ہو یار' یہ لو پیسے' باقی رکھو۔ نیچے سے اوپر آنے میں تمہاری توانائی بھی تو خرچ ہوتی ہے۔ چائے ٹھنڈی تھی۔"

"پھر نہیں ہوگی جی" وہ خوش ہوگیا۔

"پھر تمہیں وہ سین بھی دیکھنے کو نہیں ملے گا جو تم نے پہلی بار دیکھ لیا تھا۔"

"کون سا سین جی؟" وہ انجان بن گیا۔

میں نے کہا "آئندہ دستک دے کر آنا اب جاؤ۔"

رابعہ نے مجھے ڈانٹا "یہ کیا بے ہودگی ہے۔ وہ کیا سمجھتا ہوگا؟"

"وہ سمجھ گیا ہے۔ دراصل یہاں ایسے ہی لوگ رہتے ہیں کہ اچانک پہنچ کے وہ بہت سے ایسے مناظر دیکھ لیتا ہوگا جو فلموں میں سنسر کردیے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ سیدھا اندر آتا ہے۔"

"تمہیں بھی تو شرافت سے رہنا چاہیے۔"

"صرف مجھے۔۔۔ سارا قصور تمہارا ہے۔ تم ایک بدصورت کالی کلوٹی اور بے ڈھنگی چیز ہوتیں تو میں خود تم سے چار ہاتھ دور رہتا۔"

رابعہ ہنسنے لگی "اچھا وہ خبر کیا تھی۔ واقعی دلاور گرفتار ہوگیا؟"

"گرفتار بھی ہوجائے گا انشاء اللہ۔ اس کے خلاف تحقیقات کا حکم تو دے دیا گیا ہے۔ آئی جی کی طرف سے اور وزارت داخلہ کے ترجمان کی خبر ہے کہ شیلی کے قتل کی تحقیق میں برطانوی کونسلیٹ کے حکام سے پورا تعاون کیا جائے گا۔" میں نے اخبار اس کے سامنے کردیا۔

"اس قسم کے بیانات کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ تو بس ایک سیاسی بیان ہے جو شاید وزارت خارجہ کے ایما پر دیا گیا ہوگا کہ ہمارے اور برطانیہ کے سفارتی تعلقات خوشگوار رہیں۔"

میں نے کہا "اس میں یقیناً کونسلیٹ کے دباؤ کو دخل ہوگا اور ممکن ہے اس نے رپورٹ اپنے ملک کے حکام کو بھیجی ہو۔ ہدایات وہاں سے آئی ہوں۔ یہ معاملہ دلاور کا باپ بھی نہیں دبا سکتا۔"

"تم پولیس اور عدالتی نظام سے پوری طرح واقف نہیں ہو۔ اس لیے بہت خوش ہو۔" رابعہ نے خبر پڑھ کے کہا "کونسلیٹ یہ خود تحقیق کرے گا نہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغ رساں طلب کیے جائیں گے۔ یہ تالا پولیس ہی کرے گی۔ آئی جی صاحب ایک انکوائری ٹیم بنائیں گے جس میں شاید کوئی ایس پی یا ڈی آئی جی کے عہدے کا افسر ہوگا۔ اس کے ساتھ ایک ڈی ایس پی ہوگا اور ایک انسپکٹر۔ وہ کافی وقت گزارنے کے بعد یعنی دلاور سے معاملے کو دبانے کے تمام اخراجات پر بات چیت کے بعد کیس ایف آئی اے کو بھیج دیں گے۔ وہ نئے سرے سے تحقیق شروع کریں گے۔ درمیان میں ہماری وزارت خارجہ کا کوئی سیکشن افسر یا ڈپٹی سیکرٹری کونسلیٹ کو یقین دلاتا رہے گا کہ حکومت پاکستان اس معاملے کو خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ یہ ایک صنعت کار کا معاملہ ہے اور کیس بھی اس کے کسی زرخرید غلام یا لاوارث کے قتل کا نہیں ہے۔ سب تفتیشی ادارے اپنا اپنا حصہ وصول کریں گے اور وقت گزاریں گے۔ دلاور کو سودا یقیناً مہنگا پڑے گا لیکن وہ کنگال نہیں ہوگا نہ اس کی عزت و حیثیت متاثر ہوگی۔ بالآخر جو رپورٹ کسی ایس ایس پی یا انکوائری کمیشن کو پیش کی جائے گی اس میں تمام الزامات کی نفی ہوگی۔ اسے سیاسی سازش' دشمنی کا نتیجہ اور کردار کشی کی مہم وغیرہ قرار دیا جائے گا۔ کونسلیٹ مجبور ہوگا کہ اس رپورٹ کو تسلیم کرے۔ محض ایک مسلمان پاکستانی لیڈی ڈاکٹر کی خاطر جس کے پاس اتفاق سے برطانوی شہریت تھی۔ پاکستان اور برطانیہ کے سفارتی تعلقات متاثر نہیں ہوں گے۔ لکھ لو میری بات۔"

میں نے مایوسی سے کہا "تم نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ آخر تم اور تمہارے ساتھی وکیل۔ جنھوں نے یہ کیس بنایا تھا۔"

"ہم گواہی دے سکتے ہیں۔ بیان دے سکتے ہیں۔ شک کا اظہار کرسکتے ہیں مگر تفتیش اپنے ہاتھ میں تو نہیں لے سکتے۔"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ۔۔۔"

"کیسے ہوگا پوسٹ مارٹم۔۔۔ شیلی کی قبر میں تو ایک ڈھانچا ہوگا ہے۔"

"فرض کرو صحیح قبر کی نشاندہی کردی جائے!"

"تو پوسٹ مارٹم سے ثابت ہوگا کہ اس کی موت بلندی سے گرنے کا نتیجہ تھی جس میں اس کا سر پھٹ گیا تھا اور گردن ٹوٹ گئی۔ یہ ایک حادثے کو قتل کون کہے گا اور کیسے ثابت کرے گا؟"

"چشم دید گواہ۔"

"اول تو ہیں نہیں۔ جو کوئی سامنے آنا چاہے گا اسے بٹھا دیا جائے گا یا خرید لیا جائے گا۔"

"اور تم خاموش رہو گی۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی؟"

"میں نہ سہی۔ میرے ساتھی شور مچائیں گے۔ پولیس کی دھاندلی پر احتجاج کریں گے۔ غالب اور اس کے صحافی ساتھی اس آواز کو پبلک تک اور حکومت تک پہنچائیں گے لیکن عدالت نہ رائے عامہ سے متاثر ہوتی ہے اور نہ اخبارات سے۔ وہ قانونی ثبوت اور گواہ دیکھ کے فیصلہ صادر کرتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے یہ سب بے کار تھا جو کچھ تم نے کیا تھا؟"

اس نے برہمی سے کہا "تمہیں اندازہ تھا کہ کچھ نہیں ہوگا تو جھک مارنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"انصاف کے لیے لڑنا ہمارا فرض ہے۔ انصاف کا نہ ملنا ہماری بدنصیبی۔ دنیا کو معلوم ہوجائے گا کہ سچ کیا تھا اور جھوٹ کیا۔ لوگ بہت سیانے ہوگئے ہیں۔ بس وہ مجبوری اور بے بسی سے ظلم دیکھنے اور ظلم برداشت کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ اپنے انفرادی مسائل میں ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ اجتماعی مسائل سے لاتعلقی کرتے ہیں۔ یہ بڑی مجرمانہ بے حسی ہے۔ لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ آج جو زید یا بکر کے ساتھ ہوا کل خود ان کے ساتھ ہوگا تب بھی کوئی نہیں بولے گا۔ لوگوں کو ایک آواز ہوکے بولنا چاہیے۔ ایک ملک کے عوام کی آواز کو کوئی دبا سکتا ہے؟ مگر یہ احساس اور یہ شعور رفتہ رفتہ بیدار ہوگا۔ آہستہ آہستہ پھیلے گا۔ ظاہر ہے کچھ لوگوں کی آواز پہلے کوئی نہیں سنتا لیکن بالآخر وہی خلق کی آواز بن جاتی ہے۔"

"مطلب یہ کہ اس وقت تک ہم انتظار کریں؟ کیا ہماری زندگی میں وہ وقت آئے گا؟" میں نے کہا۔

"آ بھی سکتا ہے۔ جدوجہد شرط ہے اور مایوسی سے اجتناب۔"

میں نے کہا "میں اپنی زندگی میں دلاور کو آہنی سلاخوں کے پیچھے اور ہتھکڑی لگے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اسے پھانسی کے تختے پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایسے کہ اس کی رحم کی آخری اپیل بھی مسترد ہوچکی ہو۔ وہ میرے باپ کا قاتل ہے لیکن اس کے دامن پر تو اور بھی ان گنت بے گناہ انسانوں کے لہو کے داغ ہیں اگر قانون اسے سزا نہ دے سکا۔۔۔"

"تو تم دو گے۔۔۔ یہی ہے نا تمہارا مقصد حیات؟"

"بالکل۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ اسے قتل کرنا تو بہت آسان تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ میرے ساتھ انصاف ہو۔ اس ملک کا قانون اتنا بااختیار ثابت ہو کہ محض دولت اور اثر و رسوخ کی بنا پر کوئی نہ بچ سکے۔"

"کاش ایسا ہو۔"

"دلاور کے خلاف تو برطانیہ میں بھی دہرے قتل کا مقدمہ بنتا ہے۔"

"مگر دلاور پاکستان میں ہے۔"

"اسے برطانیہ لے جایا جاسکتا ہے" میں نے کہا۔

"کون لے جائے گا۔ پہلے اس کے خلاف وہاں مقدمہ درج ہو پھر برطانوی حکومت یا انٹرپول کے ذریعے حکومت پاکستان سے درخواست کی جائے کہ اس مجرم کو برطانیہ کے حوالے کیا جائے اور یہ سارے مرحلے طے ہوجانے کے بعد مجرم پکڑا جائے۔ پھر برطانیہ میں اس پر جرم ثابت ہو۔ سزائے موت تو وہاں ہے نہیں۔ اس کے علاوہ۔۔۔ وکیل وہاں بھی ہوتے ہیں۔ ہر قسم کے مقدمات کے لیے وکیلوں کی مشہور فرم ہوتی ہے جو فیس بہت زیادہ لیتے ہیں مگر ان کی شہرت کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے مؤکل کو قانونی موشگافیوں سے بچانے کا ہنر جانتے ہیں۔ ظاہر ہے کوئی قانون اتنا مکمل نہیں ہوتا کہ اس میں چور دروازہ ہی نہیں ہو۔ دلاور کے پاس پیسے کی کیا کمی۔ وہ بڑی سے بڑی لیگل فرم کی خدمات حاصل کرلے گا۔"

میں نے کہا "ایک شخص وہاں اس کے جرم کی سزا کاٹ رہا ہے۔ وہ دلاور کے خلاف جرم کا چشم دید گواہ ہوگا۔"

رابعہ نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا "میں قنوطی ہوکے سوچنا نہیں چاہتی مگر مجھے تمہارا کسی خوش فہمی میں مبتلا رہنا بھی منظور نہیں۔ یہ کیس بہت کمزور ہوگا۔ اسے دوبارہ شروع کرانا بھی مشکل ہوگا مگر فرض کرو اسے پھر ٹرائل کے لیے بھیج دیا گیا۔ سب سے پہلے شناخت پریڈ ہوگی۔ کیا وہ سیاہ فام اتنے عرصے بعد دلاور کو بہت سے دوسرے لوگوں کے درمیان پہچان سکے گا؟ دلاور کے پرانے چہرے کے خدوخال بہت بدل گئے ہوں گے۔ اس سیاہ فام نے دلاور کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ کسی حد تک اس کی یادداشت میں محفوظ ہوگی۔ اب اس نے شناخت میں غلطی کی تو کیس وہیں ختم۔ امکانات لامحدود ہیں۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ وہ جانتے بوجھتے دلاور کو نہ پہچانے۔"

"اور خود جیل میں سڑتا رہے؟"

"وہاں کی جیلوں میں سڑتا کوئی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ قید تنہائی ہوتی ہے جس میں آپ کو دنیا سے دور رکھا جاتا ہے اور آپ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتے۔ باقی سہولتیں وہاں ایسی ہیں کہ ہمارے پسماندہ علاقوں کے رہنے والے اور انتہائی غریب کہلانے والے ان کی زندگی کو قابل رشک سمجھیں۔ وہ جم کھیلتے ہیں۔ کھانا بھی ٹھیک ملتا ہے۔ اخبار' ریڈیو' ٹیلی وژن بھی انہیں میسر ہوتے ہیں۔ وہ ملاقاتیں بھی کرتے ہیں اور ان پر وہ انتہائی سوز ظلم بھی

www.paksociety.com

نہیں ہوتا جن کی وجہ سے ہماری جیلیں بھری پڑی ہیں۔ بے گناہ قیدی کے حق میں آواز اُٹھانے والے بھی اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور برسوں بعد بھی نا اُمید نہیں ہوتے۔ ایسے قیدیوں کی عزت یا سماجی حیثیت ختم نہیں ہوتی۔ اُلٹا انہیں مظلوم سمجھا جاتا ہے اور ہمدردی کا مستحق۔ اس کالے کو اگر اتنی دولت دے دی جائے جو اس کے نقصانات کی تلافی کر دے اور اس کے مستقبل کی خوشحالی کی ضامن ہو تو شاید وہ جیسی تیسی اسیری کے باقی دن کاٹنا قبول کر لے اور ڈالر کو پہچاننے سے بھی انکار کر دے۔"

"تم نے تصویر کا انتہائی تاریک رُخ پیش کر کے میرا حوصلہ بہت پست کر دیا ہے۔"

"حوصلہ پست نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کالا کسی قیمت پر ڈالر کو معاف نہ کرے اور اڑ جائے کہ اب تم آجاؤ میری جگہ اندر۔ پھر وہ جو چاہے گا کیس کرے۔ اس کی حمایت میں کالوں کی ہر تنظیم اُٹھ کھڑی ہو۔"

"مطلب یہ کہ مجھے بہت زیادہ پُرامید نہیں رہنا چاہیے۔"

"جب بھی آدمی کوئی کام شروع کرتا ہے تو اس میں کامیابی اور ناکامی کے امکانات کا ایک خاص تناسب ہوتا ہے۔ میں بھی رسک لینا چاہتا ہوں جو تم چاہتے ہو اور میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"مگر کس حد تک؟"

"حد کیا ہوتی ہے۔ محبت کی انتہا کیا ہے؟"

"فرض کرو میں کہوں کہ رابعہ ڈالر کو قتل کر دو۔۔۔ میری خاطر۔"

"نہیں کروں گی۔" رابعہ نے پورے یقین سے کہا "میں مجبور ہوں۔ مجبور تم نے نہیں کیا ہے۔ میں نے خود اپنے آپ کو کیا ہے۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ نہ جانے کتنی بار میں نے رابعہ کے جذبات کو مجروح کیا تھا۔ اس کی بات نہیں مانی تھی۔ صاف انکار کر دیا تھا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا اور میرے مقابلے میں وہ مسلسل سپر ڈالتی جا رہی تھی۔ اپنی ہار مانتی جا رہی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورت کی ہار ہی اس کی جیت ہوتی ہے تو یہ رابعہ نے ثابت کر دیا تھا۔

میں نے اسے چوم کے کہا "تمہاری محبت بہت عظیم ہے۔ مجھے شرمندگی ہے۔"

اس نے مجھے دھکیل کر کہا "جھوٹ۔ تم زیادہ ہی بے شرم ہوتے جا رہے ہو۔ بالکل شرمندگی نہیں تمہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "اب ایسا بھی نہیں۔ تمہارے مقابلے میں کم آتی ہے تو یہ فرق ہے مرد اور عورت کا۔ عورتوں کو رونا بھی بہت آتا ہے۔ مگر کرنا بھی بہت آتا ہے۔ محبت اور نفرت کے ساتھ شرم کے جذبات کا بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔"

رابعہ نے انگریزی اخبار اُٹھا لیا تھا۔ میں کار سے نکالے ہوئے ریڈیو فون کو استعمال کرنے کے مضمرات پر غور کر رہا تھا کہ رابعہ نے کہا "اس میں کچھ اور بھی ہے۔"

میں نے سر اُٹھایا "کیا ہے اور؟"

"کونسلیٹ نے ہوم آفس کو لکھا ہے کہ اس کیس میں سزا کاٹنے والے مجرم کا پھر بیان لیا جائے اور تصدیق کے ساتھ اسے ریکارڈ کر دیا جائے۔ اس نے پرانے کیس کا ریکارڈ نکالنے اور اہم دستاویزات کی نقول فراہم کرنے کو بھی کہا ہے۔"

"ویری گڈ۔ تم بلاوجہ مجھے ڈی مورالائز کر رہی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اب کچھ ضرور ہوگا۔ لڑکی! آؤ نا۔"

"کیا بک رہے ہو؟"

"سوری۔ وہ ذرا دماغ اور زبان... دونوں بھٹک گئے تھے۔ کیا تم نیچے جا کے اپنے مرزا غالب کو خیریت سے مطلع کر سکتی ہو۔ بذریعہ فون۔"

"میرا فون کہاں ہے؟"

"ہمارے پیارے مالک مکان کے پاس۔ اس کی آنکھوں کے لیے دوا بھی لیتی جاؤ۔"

"آنکھوں کی دوا؟"

میں نے ویلیم کی شیشی خالی کر کے گولیاں کاغذ کی ایک پڑیا میں باندھ لیں۔ حلوا پوری کے ساتھ چھولے بھی تھے جو ہم نے صرف چکھے تھے کیونکہ ان میں مرچیں بہت تیز تھیں۔ میں نے ان سے روغن کو بڑی احتیاط سے شیشی میں بھرا۔

"سر پھر گئے تم اُسے؟" رابعہ نے بگڑ کے کہا "اندھا ہو جائے گا وہ۔"

"مرچوں سے کوئی اندھا نہیں ہوتا" میں نے کہا "پانی زیادہ بہتا ہے جس سے آنکھیں دُھل کے صاف ہو جاتی ہیں۔"

"سنگدل۔ کیا بچگانہ حرکت ہے۔ بہت تکلیف ہوگی اسے۔"

میں نے کہا "جب اس نے تمہیں میلی نظر سے دیکھا تھا تو مجھے بھی بہت تکلیف ہوئی تھی۔"

رابعہ نے شیشی مجھ سے چھیننے کی کوشش کی "میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

"ٹھیک ہے میں خود ہی دے دوں گا اُسے" میں نے کہا اور روڈ کے باہر چلا گیا۔ رابعہ میرے پیچھے تھی مگر دروازے تک آ کے رُک گئی۔

مالک مکان ایک صحت مند مبارد حبشی کو اوپر آنے سے ہی نہیں اندر سے بھی روکنے کی کوشش کر رہے تھے اور اسے یقین دلا رہے تھے کہ ان کے دن پھرنے ہی والے ہیں۔ راتوں کا اصل مسئلہ ہے۔"

مجھے دیکھتے ہی وہ کچھ جھینپ کر مسکرائے "آؤ جی ڈاکٹر صاحب!"

www.paksociety.com

میں نے کہا "ایک فون کرنا تھا مجھے۔"

"فون۔ فون کا مت پوچھیں جی۔ یہ بھی اسی لیے آئی تھی مس غنچہ۔" مالکِ مکان بولا "کسی فلساز کی کال آنے والی تھی۔"

میں نے جیب سے لال روغن کی شیشی نکالی "فون خراب ہے گویا۔"

اس نے مجھے آنکھ ماری اور مس غنچہ کو بھی آنکھ مار کے رخصت کر دیا "کال آئے گی تو میں بُلوالوں گا آپ کو۔ خدا کرے فون ٹھیک ہو جائے۔"

مس غنچہ کے جاتے ہی اس نے فون میرے سامنے رکھ دیا "آپ کیا جانیں جی اتنا کرایہ نہیں دے سکتی جتنی کالیں کرنا چاہتی ہے مفت میں" انھوں نے مفت پر زور دیا "آپ سو فون کرلیں۔ یہ دوائی مجھے دے دیں۔"

غالب اپنے آفس میں نہیں تھا لیکن نازو مل گئی "اچھا آپ ہیں!"

"ابھی تو ہوں" میں نے کہا "کوئی اعتراض؟"

"کہاں سے بول رہے ہو؟"

"اس نامعقول سوال کا جواب میں ہمیشہ یہی دیتا ہوں کہ اپنے منہ سے۔ پتا نہیں بھلا بار بار کیوں پوچھتے ہیں۔"

"بڑے موڈ میں ہو۔ اخبار دیکھ لیا ہے شاید۔"

"میں اخبار پڑھتا ہوں۔ صرف دیکھتا نہیں۔ جو دیکھنے کی چیز ہے اسے بار بار دیکھتا ہوں۔ دن میں پنج وقتہ۔"

"سکندر کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"زکامِ محبت، سرسامِ عشق۔ دل میں درد ہے بیٹھا بیٹھا۔ پہلے کیفیت اختلاجی تھی۔ اب عالمِ وحشت ہے۔"

وہ ہنسی "رات کو تارے بھی گنتے ہوگے۔"

"نہیں۔ وہ کل دن میں ہی نظر آگئے تھے" میں نے کہا۔

"فون کیوں کیا تھا؟"

"فون کرنے کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ دیگر احوال یہ ہے کہ جملہ لواحقین ابھی تک بالکل زندہ سلامت ہیں اور یہ سو فیصد سچ ہے۔ میں پھر فون کروں گا۔ فقط والسلام۔"

نازو شور کرتی رہ گئی اور میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اصل مقصد اسے اپنی خیریت سے آگاہ کرنا تھا۔ باقی باتیں مالکِ مکان کی موجودگی میں نہیں ہو سکتی تھیں جو مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میں نے اس کے فون پر مریخ کی مخلوق سے رابطہ کر لیا تھا اور انھی کی زبان میں بات کر رہا تھا۔ اس کے نقطۂ نظر سے تو میں نے کوئی کام کی بات ہی نہیں کی تھی اور محض ایک کال ضائع کی تھی۔

میں نے اخلاقاً پوچھ لیا "کتنے پیسے؟"

"صرف آٹھ آنے۔ میں تو ضرورت پوری کرتا ہوں سب کی۔ منافع تھوڑی کماتا ہوں۔ نہ لوں تو بل دیتے دیتے یہ جائداد قرقی ہو جائے..... ہاں وہ دوائی....."

مجھے آٹھ آنے دیتے ہوئے بہت غصہ آیا۔ خبیث منافع کما کے بھی شکر رہا تھا اور ایک ہاتھ سے کال کے پیسے مانگ رہا تھا تو دوسرے سے دوا۔ ابھی لے بیٹا۔ تو بھی کیا یاد کرے گا۔

میں نے شیشی جیب سے نکالی اور اسے تھمادی "دن میں تین بار دونوں آنکھوں میں دو دو قطرے۔ صبح اٹھتے ہی۔ دوپہر کو کھانے کے بعد اور رات کو سوتے وقت۔"

وہ بہت خوش ہوا "اور پرہیز جناب؟"

"پرہیز بہت ضروری ہے بلکہ پرہیز نہ کیا تو دوا بے کار ہے۔ صبح ناشتے میں اُبلے ہوئے ٹنڈے صرف نمک کے ساتھ۔ دوپہر کے کھانے میں ایک تندوری روٹی سادہ۔ صرف پانی کے ساتھ۔ رات کو اونٹ کے گوشت کے پارچے....."

وہ متفکر ہو گیا "اور سب تو..... ٹھیک ہے مگر رات کا معاملہ....."

میں نے کہا "کالے بکرے کے کانوں کی یخنی بھی چل سکتی ہے۔"

"تو جی دو قطرے ابھی ڈال دو اپنے مبارک ہاتھوں سے۔"

میں اس کے لیے تیار نہیں تھا "ایسے نہیں۔ ذرا پرہوا چاہیے۔"

"ذرا پر بھی لو" اس نے میز پر رکھی ہوئی بہت سی شیشیوں میں سے ایک ذراپر برآمد کر لیا۔

حسبِ توقع اس نے ایسی دلخراش چیخ ماری جیسے میں نے اس کے دل میں خنجر گھونپ دیا ہو یا پیٹ پر انگارا رکھ دیا ہو۔ اس نے اتنا واویلا کیا کہ اندر سے اس کے لواحقین دوڑے چلے آئے۔

"پتا نہیں کیا الا بلا کھاتے رہتے ہو۔ مارو اٹھیں گے تمہیں یہ خیالی حکیم جوان بنانے کے چکر میں" ایک لانبی اچکی قسم کی عورت نے سر پر ہاتھ مار کے چلاتے ہوئے کہا "سٹھیا گئے ہو تم۔"

"دفع ہو جا الو کی پٹھی" وہ بلبلایا "ہر وقت ساٹھ کا طعنہ دیتی ہے۔ تیرے باپ نے باسٹھ سال کی عمر میں....."

میں فوراً کھسک گیا کیونکہ اب ان کے درمیان پرانی خاندانی تاریخ کے شرمناک واقعات پر جنگ چھڑ چکی تھی۔ جاتے وقت وہ شیشی میں نے جیب میں رکھ لی۔ اتنی سزا کافی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تکلیف زیادہ ہو تو وہ کسی سچ مچ کے ڈاکٹر کو آنکھیں اور دوا دکھادے۔ گلی کے آخر تک میں اس کی "ہائے اوئے میں مر گیا۔ ہائے اوئے مرگیا" سن سکتا تھا اور اس کی گھروالی کا ہنگامہ جو شوہر کا ہنگامہ فرو کرنے کے لیے کر رہی تھی۔

بازار سے میں نے نکل کا دس گز تار اور ایک بارہ وولٹ کا ڈاپیٹر خریدا اور دوبارہ غالب کو فون کیا۔ کاروباری ذہن کے مالک ایک شخص نے باہر لکھ دیا تھا "ضرورت پڑنے پر آپ یہاں سے فون کر سکتے ہیں۔" بظاہر یہ خدمتِ خلق کے جذبے کا اظہار لگتا تھا مگر اس طرح وہ غیر قانونی طور پر پبلک کال آفس چلا رہا تھا اور "ضرورت" کی قیمت لے رہا تھا۔ کال کی نہیں۔

"یہ کیا تماشا ہے۔ میں ذرا سی دیر کے لیے پہنچ گیا تھا۔"

"نازو نے تو بڑے المناک طریقے پر بتایا تھا کہ تم اوپر چلے گئے یعنی اوپر والے کے پاس۔"

"رات کیا لفڑا ہو گیا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ میں کشمیری چائے پینے گیا تھا۔ بادام پستے والی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مشرق کے ایک رپورٹر نے مجھے فون کر دیا تھا۔"

"کیا اس نے پہچان لیا تھا مجھے؟"

"دیکھ لیتا تو پہچان جاتا۔ وہ اس وقت پہنچا جب تم نکل گئے تھے۔ اسٹوری اسے پوری مل گئی تھی لیکن اخبار کی آخری کاپی تیار تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم جانتے ہو تو لگا دو۔ مجھے شک ہوا گاڑی کے بارے میں جو کچھ لوگوں نے دیکھا تھا بتایا گیا تھا۔"

میں نے کہا "وقار سے کہنا اس کی گاڑی پلازا سینما کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ چابی اندر ہے اس لیے ڈپلی کیٹ لے کر جائے۔ ان کا کیا حال ہے؟"

"تمہارے محسن کا؟"

"ہاں۔ جو مجھے کشمیری چائے پینے سے روکنے کے لیے آئے تھے؟"

"وہ سب اسپتال میں ہیں" غالب نے کہا "دو بڑوں کے اسپتال میں۔ ان کی ٹانگیں ناکارہ ہو گئی ہیں۔ تیسرے کا چہرہ زخمی تھا۔ ابھی تک کسی نے کوئی بیان نہیں دیا ہے۔ پولیس پہنچ گئی تھی تھوڑی دیر بعد۔ انھیں پتا چلا تو سب نے ایک ہی بات کی "پتا نہیں کوئی شراب کے نشے میں دھت معلوم ہوتا تھا۔ پہلے آگے گرا، پھر پیچھے اور گاڑی لہراتا ہوا نکل گیا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"معلوم کرنے سے۔ مجھے رات کو ہی شک ہو گیا تھا کہ تم نکلے ہو گے اپنی بلبل کے ساتھ سیرِ چمن کو۔ کہتے ہیں کہ بہاراں ہے۔"

"نہیں یار۔ بلبل خوابِ ناز میں تھی۔ میں دلاور سے بات کرنے نکلا تھا۔ اس نے باتوں میں الجھایا اور اس کے الیکٹرانک کے تنتی گئے ریڈیو کی لہریں سونگھتے ہوئے۔ اللہ نے بچایا۔ مگر انھوں نے جھوٹ کیوں بولا؟"

"کتے اپنے مالک کے اشارے پر چلتے ہیں۔ آج صبح مالک کی رنگ سے پولیس بھی واپس چلی گئی تھی۔ کوئی کیس درج کیے بغیر۔"

"وہ کیوں؟"

"جیسے شکاری ناکارہ گھوڑوں کو اور کتوں کو گولی مار دیتے ہیں۔ دلاور اب انھیں تسلی دیتے جائے گا کہ فکر مت کرو۔ تمہارا علاج میں کراؤں گا۔ خواہ تمہیں لندن، امریکا بھیجنا پڑے۔ تمہارے خاندان کو مالی پریشانی سے بچانا میرا فرض۔ اتنی بڑی قربانی کا انعام بھی بہت بڑا ہو گا۔ اس دنیائے فانی کے بدلے عالمِ جاودانی۔ دلاور جیسے لوگ کوئی روگ نہیں پالتے۔"

"میں پھر اس سے بات کرنے والا ہوں۔ دیکھنا ہے وہ دور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔"

"تم ہو کہاں؟ میرے پاس ایک خبر ہے تمہیں سُنانے کے لیے۔"

"کل کا اخبار دیکھو۔ رابعہ ساتھ لائی تھی۔ سوری، اخبار وہ آج کا ہے۔ اس میں ایک کرائے کا مکان ہے۔ رائل پارک میں۔ وہاں آنکھوں کے ایک نامور معالج رہتے ہیں۔ مکان مالک بتا رہے گا۔ وہ ڈاکٹر سے آنکھوں میں ٹرنکا لگوا چکا ہے۔ خبر کیا ہے؟"

"خصوصی۔ میں آکے سناؤں گا۔"

میں نے ریسیور رکھا، دس منٹ بات کرنے کے دس روپے بن گئے تھے "میں نے ٹرنک کال تو نہیں کی تھی۔"

"یہاں ایک میل کے علاقے میں دوسرا فون نہیں تھا۔ بس میں جانے میں تو آدھا گھنٹا لگتا۔ ٹیکسی کرتے تو دس روپے خرچ ہوتے۔ تم نے وقت اور پیسہ دونوں بچائے" اس نے ثابت کر دیا کہ فائدے میں تو میں رہا تھا۔

میں گھر کے دروازے سے گزر کے سیڑھیاں چڑھنے لگا تو مجھے مالکِ مکان صاحب کے کراہنے کی آواز آئی۔ ان کا شور و غوغا تھم گیا تھا لیکن اب وہ آنکھیں بند کیے پڑے تھے۔ میں نے اپنی حرکت کو ایک مختلف زاویے سے جواز فراہم کیا۔ اگر حکومت کسی کو نظر بند کرتی ہے تو مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ تو امن و امان رہے۔ اس قہری مکان مالک کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ جب تک اس کی ہر ایک کو بدبختی سے دیکھنے والی آنکھوں کی نظر بندی رہے خود اس کے حق میں بہتر۔ کچھ تو بارِ گناہ کم ہو گا۔

میں نے رابعہ کو مژدہ سنایا "بس آنے والے ہیں وہ دونوں ہنگامہ خیز اور آتش فشاں محبت کے علمبردار۔"

رابعہ نے خوش ہو کے کہا "غالب اور نازو۔ تم نے پتا سمجھا دیا تھا نا اچھی طرح!"

"میں نے کہا تھا آنکھوں کے ڈاکٹر کو پوچھ لینا۔ مریض مالکِ مکان نیچے ہی روتا ہوا مل جائے گا" میں نے قہقہہ مار کے کہا اور پھر اسے مکان مالک کی آنکھوں میں خصوصی زود و قطار ذرا ایس ڈالے جانے کی روداد سنائی۔ ہنستے ہنستے خود رابعہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"یہ خطرناک کام ہے سکندر۔ زیادہ خرابی ہوئی اور وہ چلا گیا تمہاری دوا سمیت کسی اچھے آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس پھر؟"

میں نے اسے جیب سے شیشی نکال کے دکھائی "ابھی سے تم بھی دنیا کی سب بیویوں کی طرح عقل سے بالکل پیدل سمجھنے لگی ہو۔ بس ایک ڈوز کافی تھی میں نے۔ دوسری کے لیے وہ شیشی تلاش بھی نہیں کرے گا۔ چودہ پندرہ طبق روشن ہو گئے تھے اس پر۔"

سائٹ میں اڈاپٹر کا پلگ لگا کے میں تار کو اوپر چھت پر لے گیا۔ بارہ وولٹ کا کشتی ریڈیو فون کو فراہم کرتے ہی اس کی لائٹ آن ہو گئی۔ میں نے دلاور سے رابطے کا نمبر ملایا تو ہمیشہ کی طرح وہی

www.paksociety.com

آواز سنائی دی مگر اس کا لہجہ پہلے جیسا پھاڑ کھانے والا نہیں تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"بات تم سے کرنے کی نہیں ہے۔ دلاور کو بلاؤ۔"

"اچھا۔ تم وہی ہو!" اس نے مختاط لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ تمہارا اسپیشل باپ۔"

"چوہدری دلاور اسپتال میں ہے" اس نے کہا۔

"جھوٹ مت بول۔ وہ بات نہیں کرے گا تو اسی کا نقصان ہوگا۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

میں نے کہا "وہ کون سے اسپتال میں ہے؟"

"یہ بتانے کی اجازت نہیں ہے مجھے۔"

"گولی لگی تھی دلاور کو۔ اس لیے جانا پڑا اسپتال۔ کیا زخم کاری ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم"

"اگر وہ مر گیا تو میں تمہیں مٹھائی کھلاؤں گا۔ دعا کرو۔" میں نے ریسیور بند کر دیا۔ لمبی بات کرنے کا ویسے بھی میرا پروگرام نہیں تھا لیکن دلاور کے بارے میں اس اطلاع نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو غالب کو یہ بات کیوں معلوم نہیں تھی اور اس آپریٹر کو یہ بات مجھے بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ صرف یہ کہہ سکتا تھا کہ چوہدری صاحب نہیں ہیں۔ یہ گمراہ کن اطلاع یعنی "ڈس انفارمیشن" تو نہیں۔

میں اپنے ساز و سامان کے ساتھ نیچے پہنچا تو غالب اور نازو براجمان تھے "بلا کمیں نازل ہو گئیں یہاں پر؟" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "رابعہ بتا رہی تھی کہ یہ نام جگہ ہے؟"

میں نے اس کا براہ راست جواب دینے سے گریز کیا "نیک نام لوگ آئیں گے تو نیک نام کہلانے لگے گی۔"

غالب بولا "بھوت تم نے لگے تو بھوتوں کا ڈیرا مشہور ہو جائے گی۔ میرے سسر کا داخلہ ممنوع کر دینا۔ بڑا بدمعاش بھوت ہے۔"

"غالب۔ ہوش میں رہنا۔ میرے ابا بہت شریف آدمی تھے۔"

"مجھے کیا معلوم۔ دیکھنے میں تو ہم بھی شریف لگتے ہیں۔"

"اپنا مقابلہ ان سے مت کرو۔ وہ واقعی شریف تھے۔"

"ان کا نام شریف الدین تھا۔ یا شاید محمد شریف۔ میں نے ایک ڈاکٹر قاتل اور جواری کا نام پاکباز خان دیکھا ہے۔" غالب بولا۔

"میں ان کی شرافت کی بات کر رہی تھی۔"

"شرافت کا کوئی سرٹیفکیٹ ہے تمہارے پاس۔ سرٹیفکیٹ کے بغیر کوئی نہیں مانتا کہ آپ میٹرک پاس بھی ہیں۔ برتھ سرٹیفکیٹ نہ ہو تو آدمی پیدا نہیں ہوتا۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ ہو تو مر جاتا ہے۔ سرٹیفکیٹ لاؤ بی بی۔"

نازو نے چلا کے کہا "کیا مطلب ہے تمہارا۔ وہ بدمعاش تھے؟"

"جوانی میں سب ہوتے ہیں۔ ان کا بڑھاپا تم نے دیکھا اور تمہارا دل رکھنے کے لیے میں مان لیتا ہوں کہ وہ شریف تھے اور تم شریف زادی ہو بلکہ شریف الدین زادی۔"

"پھر تم نے بدمعاش کیوں کہا تھا انہیں؟"

"میں نے ایک بھوت کو کہا تھا جو خود کو میرا سسر بتاتا ہے۔ اس کے پاس بھی میرا سسر ہونے کا سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔ تم کہاں باسی کڑھی کی طرح ابال آ رہا ہے۔"

"میں باسی کڑھی ہوں؟" نازو نے آستین چڑھائی "اور تم خود کیا ہو؟"

غالب نے دوزانو ہو کے سینے پر ہاتھ رکھا اور سر جھکایا "میں تمہارا اکلوتا، پہلا اور آخری پرستار۔ جاں نثار، دلدار، بے حد پائیدار اور وفادار۔ تمہارے نابکار۔"

نازو ہنس پڑی "بس کرو، کا نیچے باز۔"

میں نے کہا "یہ اچھی بات ہے کہ اب تم لڑتے ہو تو ابھی میں ہی صلح کر لیتے ہو۔ بیرونی مداخلت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خیر نازو پیار مجھے۔"

"تم نے اخبار دیکھا آج کا؟"

"پھر وہی احمقانہ بات۔ دیکھا نہیں پڑھا ہے اول تا آخر پہلے انگریزی میں اور پھر اسی کا ترجمہ اردو میں۔"

"اس میں ایک خبر دلاور کے بارے میں تھی۔"

"مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ فرماتی ہیں کہ وہ کوئی خبر ہی نہیں، انہوں نے مجھے اتنے تاریک پہلو دکھائے کہ مجھے مستقبل میں اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ تاریک الدنیا ہو جاتا اگر مسلمان نہ ہوتا۔"

رابعہ نے احتجاج کیا "میں شیخ چلی کے خیالوں کی حمایت نہیں کر سکتی۔ کہ بالکل ٹھیک سوچا تم نے ایسا ہی ہوگا۔"

"خبر تازہ ترین جو اخبارات میں نہیں پہنچی یہ ہے کہ دلاور اسپتال میں ہے۔"

"خود بیٹے نے اس کار دار کی سے کوچ کرا دیا تھا، دو چیخ کیا۔"

"یہ جھوٹی اسٹوری ہے۔ بیٹے کو تم کیا سمجھتے ہو۔ وہ اپنے باپ کا بھی باپ ہے ابھی سے۔ دیکھو لو کتنی صفائی سے ماں کو نکال کے لے گیا۔ تمہارے جذبات سے کھیل کے اس نے وہ کام کیا جو دلاور بم دھونس سے نہیں کر سکتا تھا۔ کمانی اور مکالمے بے شک دلاور کے تھے لیکن اداکاری تو خود بیٹے نے کی۔ اداکاری تو اس کی اپنی تھی۔"

میں نے خود کو سخت احمق محسوس کیا "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"جیسے میں عقل اور دور اندیشی کی بیشتر باتیں کہتا ہوں۔ اور ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ خود دلاور کو دیکھ لو۔"

میں نے بڑے اشتیاق سے کہا "نکالو یار۔ آتی ورسے جیب میں چھپا رکھا ہے۔"

غالب ہنسا "تم مذاق سمجھ رہے ہو۔ میری سی آئی ڈی نے بتایا ہے کہ وہ چھتا کتنا اُلو کا پٹھا ہے۔ اس کا مقصد چند دن غائب رہنا تھا۔ وہ ایک اسپتال کے وی آئی پی روم میں جا کے لیٹ گیا ہے۔ اس کے جسم پر خراش بھی نہ جائے گی تو میرا نام بھی سکندر بدونہاں سکندر۔"

"کافر وہ جو شک کرے آپ پر بھی نازو۔ پیرو مرشد یہ بھی فرما دیجئے کہ ایسا دلاور نے کیوں کیا اور اس وقت وہ کہاں ہے؟"

"اسپتال میں اسے گزشتہ ہفتے سے داخل دکھایا گیا ہے تاکہ کل کی کارروائی کو کسی طرح اس کے کھاتے میں نہ ڈالا جا سکے۔"

"مرزا۔ تمہاری سی آئی ڈی کے مخبر کون ہیں؟"

"سوری۔ مخبروں کے نام نہیں بتائے جا سکتے۔ ایک مخبر دلاور کے اندر کے لوگوں میں شامل ہے۔ معتمدین خاص میں۔ اس کی اطلاع ہے کہ دلاور نے اسپتال کے ریکارڈ میں اپنا نام استاد پیڈرو لکھوایا ہے۔"

"اور اسپتال والوں نے لکھ لیا!"

"وہ نام پر معترض نہیں ہوتے۔ خصوصاً اس وقت جب مالکان کسی کی مدد کرنا چاہیں اور انہیں مطلوب معاوضہ مل جائے۔ کل نہیں، اسپتال میں استاد پیڈرو کا ایک..... آپریشن دکھایا گیا ہے کل کی تاریخ میں۔ آپریشن تھیٹر کے ریکارڈ میں بھی ضروری اندراجات کر لیے گئے ہوں گے۔"

"میرا تو دماغ چکرا گیا ہے۔ آخر کیا مقصد ہے اس کا؟"

"ظاہر ہے پیڈرو کو حفاظتی چھتری فراہم کرنا۔ دلاور بھی غائب ہو گیا اور پیڈرو کے بارے میں اسپتال کا عملہ اور ریکارڈ یہ شو کرتا ہے کہ وہ وہاں داخل تھا جب کہ وہ کہیں اور کسی خاص کارروائی میں مصروف ہے۔ آئی بات سمجھ میں؟"

دلاور کی عیاری اور مکاری پر میں دم بخود رہ گیا "یار یہ تو بہت ہی ڈرامائی چیز ہے۔"

"دریں چہ شک۔ اپنے جانشین کو کیسی عملی تربیت دے رہا ہے وہ۔ وہ باپ سے بڑا ایکٹر ہے اور بہت آگے جائے گا۔ دلاور نے اسے ساری اسکیم سمجھائی ہوگی کہ بیٹا یہ سکندر اعظم اور اس کے حواری جو اپنے آپ کو ایم آر ایس کہتے ہیں۔ بڑے جیالے اور افلاطون بنتے ہیں۔ جذباتی احمقوں کا ایک ٹولہ ہیں۔ پیڈرو تو کسی اور مشن پر جا رہا تھا۔ دلاور نے بیٹے کو سمجھا دیا کہ یہ ڈراما تمہاری کوشش سے کامیاب ہو سکتا ہے۔ طاقت استعمال تو کی جا سکتی ہے مگر اس میں خطرہ ہے تمہاری ماں کی جان جانے کا۔ پہلے اسے نکال لاؤ۔ پھر میں باقی سب سے نمٹ لوں گا اور بیٹے نے باپ کی توقعات پر پورا اتر کے ثابت کر دیا کہ دلاور کے بعد اس سے بڑا دلاور ہوگا۔ اور ہم اس سے بہت پیچھے ہیں" غالب نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"ہم پیچھے نہیں ہیں" نازو نے کہا۔

"بس چند روز سال پیچھے ہیں" غالب اپنی بات پر قائم رہا۔

میں نے کہا "وہ کیسے؟"

"بھائی آنے والے دلاور کی تو عملی تربیت بھی شروع ہو چکی ہے۔ کل کے سکندر اور غالب ابھی کہاں ہیں۔ جو اس کا مقابلہ کریں۔"

رابعہ تو مسکرا کے چپ ہو گئی مگر نازو نے تنتنا کے کہا "تو کر لیجئے نا پہلے سے اس کا بندوبست۔"

"تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی" غالب بولا۔

"تو دوسرا ہاتھ تلاش کر لیجئے۔ اب کیا ہو سکتا ہے" نازو بولی۔

"ہو تو سکتا ہے" غالب نے سوچ کے کہا مگر شرارت اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔

میں نے کہا "بتائیے تا حضور۔ کیا ہو سکتا ہے؟"

"بھئی آپ نے وہ قصہ تو سنا ہوگا۔ کسی نے شادی کے لیے اٹھارہ سال دوشیزہ کی شرط رکھی تھی اور یہ کہا تھا کہ ایک نہ ملے تو نو نو سال کی دو لے آنا۔ تو ہم بھی ڈبل سے اسٹارٹ کریں اگر۔"

نازو نے آنکھیں نکال کے کہا "باز آجاؤ غالب۔"

غالب میرے پیچھے آ گیا "یار یہ حساب کی بات ہے۔ سات سات سال کے دو ہوں تو چودہ کے برابر ہوں گے یا نہیں؟ یہ تو دلاور زادہ ہے نا۔ مزید سات سال بعد یہ ہوگا اکیس کا۔ اور ہمارے دو اسی طرح ان دونی ترقی کرتے رہے تو مزید سات سال بعد دونوں مل کے اٹھائیس کے اور دلاور کی اولاد بھی اٹھائیس کی۔ ہو گیا نا برابر۔ پھر وہ ایک اور یہ دو۔ یار بس نیت کر لو تین کی۔ دو تو ہوں گے۔"

نازو نے خلاف توقع مجھے ایک طرف دھکیل کے غالب کو پکڑ لیا "ابھی دو اور تین کا پہاڑا یاد کراتی ہوں میں۔"

"ارے نازو۔ یہ کیا بھئی۔ تم سے کچھ کہا ہے میں نے؟"

غالب ادھر اُدھر بھاگا مگر نازو نے اسے پکڑ کے اٹھایا اور چارپائی پر پھینک دیا۔ غالب کی ہنسی نہیں رک رہی تھی "نازو آخر رابعہ کو بھی دیکھو۔ کتنی شرافت سے اس نے اتفاق کیا کہ میں غلط نہیں کہتا۔"

نازو نے پھر اسے ایک ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور سر کے اوپر سے گزار کے دوسری چارپائی پر پھینک دیا "کتنے ہوں گے دو کے چار...؟"

چارپائی زیادہ مضبوط نہیں تھی۔ اس کی ایک پٹی ٹوٹ گئی اور غالب اندر دھنس گیا۔ "تم تو ڈی میری کمر۔ سُنا سکندر، کیسی صاف آواز آئی ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ہے نا یہ بھوت کی بچی۔"

رابعہ نے نازو کو روک لیا "بس کرو نازو۔ نیچے لوگ کیا سمجھیں گے۔ اوپر کیا دھاچوکڑی ہو رہی ہے؟"

غالب نے اٹھتے ہوئے کہا "ہر نئے نظریئے کی مخالفت جاہل لوگ ایسے ہی کرتے ہیں۔ بعد میں مان لیتے ہیں۔"

امن و امان بحال ہوتے ہی میں نے کہا "مرزا۔ تمہاری سی آئی ڈی کی رپورٹ غلط بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"ہرگز نہیں۔"

"کیوں۔ اس میں سب فرشتے ہیں کیا؟"

غالب نے کہا "میں تصدیق کر چکا ہوں۔"

"یعنی تمہیں معلوم ہے کہ دلاور کسی اسپتال میں لیٹا ہوا

www.paksociety.com

ہے؟"

اس نے افرار میں سر ہلایا "یہ الگ بات ہے کہ اس تک پہنچنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا میرے بھوت سسر تک پہنچنا۔ وہ رابطہ قائم کر سکتا ہے اگر چاہے۔"

"بہت سخت سیکیورٹی ہے؟"

"ہاں۔ اور اسپتال میں ہم مشین گن سے گولیاں برسانے اور دستی بم پھینکنے ہوئے نہیں جاسکتے۔ اب اس معاملے کے تین پہلو تھے۔ ہمیں بے وقوف بنانا۔ الحمدللہ ہم بن چکے۔ بڈھو کو کسی ایسے مشن پر بھیجنا جو بہت خطرناک ہے لیکن دلاور کی طرف سے اس کو پورا تحفظ حاصل ہے۔ اس پر الزام نہیں آسکتا۔ جس مریض کا اسپتال میں کوئی...... آپریشن ہوا ہو وہ کسی دوسری جگہ یا دوسرے شہر میں قتل کیسے کر سکتا ہے۔"

میں چونکا "دوسرے شہر میں قتل؟"

"ہاں۔ قتل کر کے نکل جانا اس کے لیے مشکل نہیں۔ سو چشم دید گواہ ہوں تب بھی اس کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ شہادت زیادہ مضبوط ہے۔"

"یار غالب۔ مجھے سخت پریشانی لاحق ہو رہی ہے۔ دوسرے شہر میں قتل کے خیال سے۔"

"قتل ضروری نہیں۔ اغوا بھی ہو سکتا ہے۔"

"گل اور محسن کا" یا فوزیہ کا۔" میں نے کہا "تم ٹھیک سوچ رہے ہو یار۔ مگر تم نے سوچنے کے علاوہ بھی کچھ کیا؟"

"ہاں۔ میں نے فیصل آباد والوں کو روپوش ہو جانے کے لیے کہہ دیا۔ گل اور محسن تو کراچی چلے گئے ہیں۔ سالے اکرام کے پاس۔"

مازو نے بگڑ کے کہا "گالی دینا ضروری ہے۔"

"یہ پیار کا ایک رشتہ بھی تو ہوتا ہے۔ اور یہ" غالب نے کہا۔

"ابھی نہیں ہے۔"

"ہو جائے گا پھر میں اسے ایسے ہی بلاؤں گا۔ چل سالے ادھر آ۔ سالے کیا کر رہا ہے۔ چل سالے میرے ساتھ۔"

"بڑے اچھے لگو گے" مازو نے جل بھن کے کہا۔

"ابھی کیا لگتا ہوں تمہیں۔ وہی کہتا جو اس روز کہہ رہی تھیں۔ تم پیار کے سمندر کو ہلانے والا چودھویں کا چاند ہو۔ تم گلشن عشق کی بہار ہو اور میں خوشبو۔"

مازو ٹھٹک رہ گئی "میں.... میں کہہ رہی تھی.... غالب کے بچے!"

"اور کیا میرا سسر کہہ رہا تھا۔ میں جاگ رہا تھا اس وقت۔ اور بتاؤں....؟"

"چپ کر کے بے شرم" مازو پھر اس کی طرف لپکی لیکن میں نے اسے روک لیا کیونکہ اس سے سنجیدہ گفتگو میں مداخلت ہو رہی تھی۔

"آخر یہ عورتوں سے کشتی کیوں نہیں لڑتی۔ اسے مردوں سے

ہاتھا پائی کا شوق کیوں ہے۔" غالب نے شکایتی انداز میں کہا "شعور اس کی نفسیات میں گڑبڑ ہے۔ ہمارا دل تو نہیں چاہتا کسی عورت سے گتھم گتھا ہونے کو۔"

میں نے کہا "تو فوزیہ اور اس کا شوہر وہیں ہیں؟"

غالب نے کہا "ابھی تو وہیں ہیں۔ کیا نام ہے فوزیہ کے شوہر کا؟ ایاز۔ ایاز صاحب ٹرانسفر کرانے کے چکر میں تھے۔ اس میں وقت لگتا ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ مری کا راؤنڈ لگاؤ۔"

میں نے کہا "غالب کہیں دلاور اپنی ناکامی کا بدلہ اب ان سے نہ لے۔ ایاز کو تو پہلے بھی اغوا کر لیا گیا تھا۔ ہم نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ اب کہیں وہ پتھر کا جواب ہتھوڑے سے نہ دے۔"

"فکر کرنے سے کیا ہو سکتا ہے۔ ایاز کوئی بچہ تو نہیں ہے اور فوزیہ چاہے تو اسے مجبور کر سکتی ہے۔"

"وہ تو سمجھتی ہوگی کہ اس کی زندگی کے سارے مصائب کا ذمے دار میں ہوں۔ غالب تم جا کے انہیں دیکھو۔ رو دلاور کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں۔ انہیں بچاؤ۔"

"اچھا کچھ کرتے ہیں۔ ابھی تو یہاں دلاور کا معاملہ بھی عجیب ہو گیا ہے۔ میں نے آج ہی ایک خبر سنی ہے کہ اس کو بک کر لیا گیا ہے یعنی تیلی مرڈر کیس میں اس کا نام شامل ہو گیا ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اس سے یہ ہوا ہے کہ دلاور کے بیرون ملک جانے پر پابندی لگ گئی ہے۔ اس کا پاسپورٹ سرکاری تحویل میں لے لیا گیا ہے۔"

"وہ دوسرے پاسپورٹ پر نکل جائے گا۔ اگر اسے جانا ہوا۔"

"مگر وہ جائے گا نہیں۔ ابھی اس کے خلاف ثبوت کوئی نہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ محض شک کی بنا پر کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ایک اور غیر مصدقہ خبر یہ ہے کہ گزشتہ رات ایف آئی اے کے ایک بہت سینئر افسر نے اس سے اسپتال میں ملاقات کی۔ ہو سکتا ہے کہ اسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دینے والا بھی وہی ہو لیکن دلاور سے پوچھ گچھ ضرور ہوئی ہے کیونکہ سٹیٹ نے اسلام آباد میں رزاق سومرو کے قتل سے رپورٹ مانگی ہے۔ اسے کچھ تو بتانا ہوگا۔"

"یہ تو خوش خبری ہے۔ بس کسی طرح وہ چکر میں آجائے اور گرفتار ہو کے ایک بار حوالات پہنچ جائے۔ میری بڑی حسرت ہے اسے حوالات کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنے کی۔"

اب رابعہ نے مداخلت کی "ممکن ہے وہ ضمانت قبل از گرفتاری کے لیے خاموشی سے کوشش کر رہا ہو لیکن ضمانت مشکل ہے قتل کے کیس میں۔"

میں نے مسرت سے کہا "کیا واقعی وہ گرفتار ہو جائے گا؟"

"اگر ایک بار تفتیش میں اس کا نام آگیا تو پھر پوچھ گچھ تو ہوگی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ پولیس اسے ہاتھ تک نہ لگائے۔ بڑا عزت احترام کے ساتھ گھر میں آئی رہے اور تفتیش مکمل ہو جائے جس میں اس پر کوئی الزام نہ رہے۔ مگر یہ بات ہے مشکل۔ معاملہ

ایک برٹش ڈاکٹر کا ہے۔"

"مظہر اور وقار سے کہو کہ اس کیس کے پیچھے لگ جائیں۔ معلوم کرتے رہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟"

غالب نے کہا "ایک مظہر ہی کیا۔ دس وکیل اور بھی ہیں۔ دلاور کے خلاف کیس میں بارہ سینئر وکیل تھے جن کی طرف سے کیس کی تفصیلات ارسال کی گئی تھیں۔ وہ سب بڑے مضبوط لوگ ہیں اور دلاور کی چالوں کو ناکام کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا اصل مقابلہ ہے پولیس سے جو دلاور کے ساتھ ہے۔ تم کو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ جگہ چھپ کے رہنے کے لیے بہترین ہے۔"

"بہتر تھا کہ یہ اندر ہی رہیں" رابعہ نے طنز سے کہا۔

"کیا مطلب؟ میں قید ہو جاؤں ان دو کمروں میں؟"

"چند دن گزارلو۔ اب دلاور بھی دباؤ میں آرہا ہے۔ شاید بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔"

"بہتری کی امید دلاور سے؟" میں نے کہا "وہ ایسی ٹیڑھی ہے جو ٹوٹ تو سکتی ہے مگر سیدھی نہیں ہو سکتی۔"

"کتے کی دم کے بارے میں بھی یہی مشہور ہے کہ بارہ برس نلکی میں ڈال کے رکھو تو نلکی ٹیڑھی ہو جائے گی۔ دم سیدھی نہیں ہوگی۔"

"یہ غلط ہے کیا؟"

"میں کہتا ہوں بارہ برس بعد تو کتا بھی نلکی کا عادی ہو جائے گا۔ رہنے دو اسے نلکی کے ساتھ۔ بائی دا وے کتے کی طبعی عمر کتنی ہوتی ہے۔ کیا بارہ سال زندہ رہتا ہے وہ؟" غالب نے کہا۔

"مذاق یہ خیال تو ذہن سے نکال دو کہ میں یہاں صبح سے رات تک اور پھر رات سے صبح تک چارپائی پر لیٹا رہوں گا۔ ہوائی قلعے بناتا رہوں گا اور خوابوں کے محل ڈھاتا رہوں گا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ تم لوگ مل کے مجھے پاگل خانے میں داخل کرا دو۔ زیادہ محفوظ جگہ ہے جہاں دلاور کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔ سارا دن جو چاہو کرو۔ چیخو چلاؤ۔ چھلانگیں مارو یا قہقہے۔"

"بہت اچھی تجویز ہے۔ رابعہ کیا خیال ہے؟"

"یہ وہاں سے بھی نکل جائیں گے اپنی جگہ پاگل خانے کے ڈاکٹر کو بند کر کے" رابعہ نے کہا "ذرا بیمار ہو کے بھی تو ڈری لیٹنا ہے آرام سے۔"

میں نے کہا "میں بیمار نہیں ہوں۔ لیٹا رہا تو بیمار ہو جاؤں گا۔"

"تمہیں اجازت ہے چھت پر چڑھ کے پتنگ اڑاؤ۔ میں کبوتر لادوں گا۔ اسلاف کا مشغلہ رہا ہے کبوتر بازی۔ بہت خوش ہوں گے عالم ارواح میں کہ اس گراں نسل میں کوئی تو ہے جو ان کے فنون لطیفہ کی سرپرستی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بازیاں ہیں مثلاً چالبازی، ندسریازی، عشق بازی۔ رابعہ کے ساتھ۔"

"غالب۔ حد سے مت بڑھو۔"

"جملہ مکمل تو ہونے دو۔ رابعہ کے ساتھ تم تاش کھیلو اور

لنگڑی پالا کھیل سکتے ہو۔ بالکل بے ضرر کھیل ہیں۔" غالب ہنسا "اونچ نیچ کھیلو۔ ایک دوسرے کو پکڑنے کا کھیل کھیلو۔ میں گڑیا گڈا لادیتا ہوں۔ ان کا بیاہ رچاؤ۔ فی الحال۔"

میں نے ہونٹ کاٹ لیا۔ "میں سوچ رہا ہوں۔"

غالب احتیاطاً پیچھے ہٹ گیا "ہونٹ کاٹنے کی۔ یہ بھی اچھا کام ہے۔ دن گزر جانے کا مصروفیت میں۔ شام تک ایک جوڑی چباؤ گے تو آدمی لگو گے۔"

"تمہاری کھال اچھی ہے اس کام کے لیے۔"

"اپنے ایمان سے کہو۔ مازو کی یا رابعہ کی کھال کتنی نفیس ہے۔ بڑی ملائم اور کورے قیمے کی طرح صاف۔"

"جوتے کے لیے ذرا موٹی کھال چاہیے۔ مضبوط قسم کی" میں نے ذرا نگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"ارے رکے۔ تم چلو میرے ساتھ۔ مت بیٹھو گھر میں" غالب نے کہا "رابعہ کو بٹھا دو پردے میں۔ یہ جو ناہاتھ میں نہیں پاؤں میں اچھا لگتا ہے۔"

میں نے جوتا پھر پہن لیا "وہ اسپتال کہاں ہے۔ جہاں استاد بڈھو کے نام سے چوہدری صاحب محو استراحت ہیں۔ مالک کون ہے اس کا؟"

"مالک ایک اور چوہدری ہیں۔ ان کا سینما بھی ہے" غالب بولا۔

"تم جانتے ہو انہیں؟"

غالب نے کہا "اتنا ہی جتنا وزیراعظم کو جانتا ہوں۔ نام معلوم ہے۔ صورت دیکھی ہے۔ گھر بھی دیکھا ہے۔"

"کیوں نہ ہم ان سے ملیں اور ان کے کندھوں پر سوار ہو کے جائیں دلاور سے ملنے کے لیے۔"

"وہ بوڑھا آدمی ہے۔ دو مشٹنڈوں کے وزن سے بیٹھ جائے گا لیکن تجویز اچھی ہے۔ اس میں ہمارے اسٹریچر پر واپس آنے "پڑیوں کے راستے یا مردہ خانے پہنچنے کے امکانات بھی روشن ہیں۔"

"فضول باتیں مت کرو" مازو نے خفگی سے کہا "کس کی مجال ہے کہ تم پر انگلی بھی اٹھائے۔"

"بچے بچہ راہ چلتے مجھ پر انگلی اٹھاتا ہے۔ کہتا ہے وہ دیکھو جا رہا ہے ایک بھوت کا داماد۔"

میں نے بات بڑھنے نہیں دی "تم آج فون کرو اسپتال کے مالک کو۔ اخباری نمائندے کی حیثیت سے۔ اور اس سے کہو کہ انٹرویو لینا ہے۔"

"کیوں نہ یہ کام میں کروں؟" مازو نے جوش سے کہا۔

"اللہ تمہیں جزائے خیر اور اولاد صالح دے" غالب نے دعائیہ انداز میں کہا "میری بلائیں لیتی ہو۔ اچھے سے۔"

میں نے کہا "تم اسے گھر لاؤ۔ اسپتال کے دروازے تک تو وہاں ہم استقبال کے لیے موجود ہوں گے تمہارے ساتھ ہی چلے جائیں گے۔"

www.paksociety.com

"آج شام کے لیے وقت لے لوں؟" نازو نے کہا۔
غالب نے کہا "ہوشیار رہنا۔ سُنا ہے وہ کوئی منتر جانتا ہے۔ ساتویں یا آٹھویں بیوی ہے اس کی۔ چھ کو چھوڑ چکا ہے۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ بری تم بھی نہیں ہو۔"
"اس نے پروپوز کیا تو میں آٹھویں بننا قبول کر لوں گی" نازو نے ہنس کے کہا۔
وہ نکل رہے تھے کہ مالک مکان سرخ آنکھیں لیے نمودار ہوا "ڈاکٹر صاحب! وہ دوائی کی شیشی پتا نہیں کہاں رکھ دی میں نے۔"
رابعہ نے مجھے گھورا "چچا! آپ چلے جائیں کسی اچھے سے ڈاکٹر کے پاس۔"
وہ بُرا مان گیا "للو۔ چچا کیسے کہہ دیا آپ نے؟ میری کیا اتنی عمر ہے اور اچھے ڈاکٹر کیا یہ نہیں ہیں؟"
رابعہ نے کہا "یہ بھی اچھے ہیں مگر انہوں نے شاید بتایا نہیں آپ کو۔ یہ جانوروں کی آنکھوں کے اسپیشلسٹ ہیں۔"
وہ اُچھلا "جانوروں کی آنکھوں کے۔ میں... میں کیا گدھا ہوں۔ میری آنکھوں میں کیا دوائی ڈال دی تھی؟"
میں نے اسے تسلی دی "وہ بندر کی آنکھوں میں ڈالتے ہیں اور انسان پہلے بندر ہی تھے۔ یقین نہیں تو ڈارون کی جو کتاب نظریۂ ارتقا پر ہے... وہ پڑھ لو۔"
وہ ایسے گیا جیسے سیدھا میری بات کی تصدیق بندروں سے کرے گا۔ کچھ دیر بعد اس کے چلا سنے پر میں نے دروازہ کھول کے دیکھا۔ آخری سیڑھی شاید اسے نظر نہیں آئی تھی۔ اب وہ لنگڑاتا ہوا اور گالیاں بکتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔ ظاہر ہے گالیاں میری شان میں تھیں اور مجھے برا ماننے کا کوئی حق نہیں تھا۔
غالب اور نازو چلے گئے تو میں نے رابعہ سے کہا "اب بتاؤ کیا کریں۔ کون سی بازی کھیلیں؟"
"آؤ چھت پر چلیں۔ پتنگ اُڑائیں" رابعہ نے کہا "بڑا مزہ آئے گا۔"
"پتنگ کہاں سے آئے گی؟"
"ہم دوڑ کے لے آؤں۔ نسبت روڈ سے۔ ماجھا ذرا اچھا دیکھ کے لانا۔"
پتنگ بازی میں واقعی بہت مزہ آیا۔ رابعہ انتہائی باکمال قسم کی پتنگ باز ثابت ہوئی۔ معلوم نہیں یہ اطلاع نیچے کیسے پہنچی۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی نمودار ہوئی جس سے میرے تعلقات سخت کشیدہ ہو گئے تھے۔ وہ رابعہ کی بھی استاد ثابت ہوئی۔ رابعہ مجھے بھول گئی اور وہ پرانی سہیلیوں کی طرح ایسے پیچ لڑانے لگیں جیسے پتنگ بازی کے ٹورنامنٹ کا فائنل ہے۔ آخری پتنگ کٹوا کے اس نے مجھے پھر آنکھ ماری اور نیچے اُتر گئی۔ فلمی دنیا کے لیے اس نے اپنا نام نائلہ رکھا تھا حالانکہ وہ کالی تھی۔
"لڑکی تھی۔ یہ کیوں آئی تھی۔ رنگ میں بھنگ ڈالنے۔"
"چھت پر کسی کو آنے سے روکا نہیں جا سکتا۔"

"مگر تم کیوں بے تکلف ہو رہی تھیں۔ اس لیے کہ خیال کیا اس نے تمہیں؟"
اب رابعہ نے گرمی دکھائی "ہم اتنا تاقص انتخاب ہے تھے۔ "اناڑی کارِیگر اپنے اوزاروں کو الزام دیتا ہے۔ ڈور میرے ہاتھ میں ہوتی تو میں تماشا دکھاتی۔ آخر چلو کوئی اور بازی کھیلتے ہیں۔"
"کون سی بازی؟" رابعہ نے سمجھنے کے باوجود انجان بن کے کہا۔
"وہی جس کے بارے میں شاعر نے کہا۔ جو چاہو لگا دو ڈر کیسا؟"
مالی پھر نمودار ہوئی اور اس نے مجھے چھیڑنے کے لیے آنکھ ماری "کون ہے تمہارا ڈاکٹر صاحب۔ نیچے جانا پڑے گا۔"
"مالی تم اپنا نام ہریالی رکھ لو آج... " میں نے اسے جوابی آنکھ ماری "شاید کوئی ہریالا بنا تمہیں لے جائے۔"
وہ سبز سوٹ میں تھی۔ میری بات سے خوش ہوئی "تمہارے منہ میں بتاشے گھی اور دیسی شکر۔"
میں نیچے گیا تو مالک مکان نے منہ پھیر کے ریسیور کی طرف اشارہ کیا۔ جو تن سے جدا ہو جانے والے سر کی طرح ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ حسبِ توقع فون غالب نے کیا تھا۔ نازو نے شام چھ بجے اسپتال کے مالک چوہدری بشارت سے انٹرویو کا ٹائم لے لیا تھا۔ غالب نے مجھے وقت کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی "دیر ہوئی تو نازو کے لیے پرابلم ہو گی۔"
"نازو خود ایک پرابلم ہے" میں نے فلسفیانہ بیان دیا۔
"وہ میری پرابلم ہے" غالب بولا "ہم اس کے ساتھ ہی اندر جا سکتے ہیں۔"
"اندر تو کسی وقت بھی جا سکتے ہیں۔ اس صحیح سالم واپس نہیں آ سکتے نازو کی مدد کے بغیر" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔
مالک مکان سے تعلقات بحال کرنا ضروری تھا "آپ تو ایسے ہی بُرا مان گئے مذاق کی بات کا" میں نے کہا۔
"کیا مطلب؟ تم ڈاکٹر نہیں ہو؟"
"نہیں گھوڑوں گدھوں کے بھی آئی اسپیشلسٹ ہوتے ہیں؟ انہیں کیا چشمہ لگانا ہوتا ہے۔"
وہ قائل ہو گیا "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا مگر معلوم ہے یہ بات سُن کے میری بیوی نے کیا کہا؟ اس نے کہا تمہاری آنکھیں گھوڑے جیسی لگ رہی ہیں۔"
میں نے کہا "گھوڑے کو ہر چیز چار گنا بڑی نظر آتی ہے۔ کہہ دینا کہ تم اب مجھے چار گنا پھیلی ہوئی لگ رہی ہو۔ دوبارہ یہ بات نہیں کہے گی اور ہاں" میں یہ دوا لکھ کے دیتا ہوں۔ بازار سے منگوا لینا۔"
میں نے اسے سلفا سیٹا مائیڈ کا دس پرسنٹ سلوشن لکھ دیا اور تاکید کی تھی کہ شیر تک جرمنی کا ہو۔ وہ بالکل مطمئن ہو گیا۔ دو تین دن تک اس کی آنکھوں کی لالی ختم ہو گئی اور اس نے یہ اعتراف

بھی کیا کہ اب اسے پہلے سے کہیں بہتر دکھائی دے رہا ہے جو محض نفسیاتی اثر تھا۔
شام کو میرے ساتھ رابعہ بھی نقلی تمرہ جیسی پہ لے کر آفس چلی گئی۔ اسے ڈاکٹر شبلی کے کیس کی رپورٹ لینی تھی اور دوسرے وکیلوں سے بات کرنی تھی جنہوں نے اس کے ساتھ مل کے یہ کیس ناکام بنانے کو ارسال کیا تھا۔ چوہدری داور کے خلاف ایف آئی آر کٹ گئی تھی اور اب اسے ختم کرنا بھی ناممکن تھا۔ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے بارہ سینئر وکلا کو نہ پولیس ڈرا دھمکا سکتی تھی اور نہ چوہدری داور کی دولت خرید سکتی تھی۔
میں دوسری ٹیکسی میں "بشارت آئی کلینک" پہنچا جو مضافات کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے بیچ میں تنہا تھا اور نئے دولت مند اس کی جدید سہولیات، خوب صورت عمارت اور چلتی سے حاضر ہو چکے تھے۔ سرسبز لان پر رنگین پھولوں کے تختوں کے درمیان منتخب مرمر کی بینچوں پر موتیا کا آپریشن کرانے والے بوڑھے افسردہ بیٹھے تھے اور چونکہ ملاقات کے اوقات بھی یہی تھے اس لیے بیٹے پوتے بھی بکثرت موجود تھے۔
غالب کو میں نے ایک مالی کے ساتھ بحث میں مصروف دیکھا وہ مالی کو قائل کرنے کی بے سود کوشش کر رہا تھا کہ اتنی محنت کر کے موسمی پھول کھلانے کی کیا ضرورت ہے۔ پلاسٹک کے پھول اصلی سے بہتر ہوتے ہیں کہ سارا سال ویسے ہی رہتے ہیں۔ بہتر یہ کہ ان پر بھی خوشبو کا اسپرے چھڑک کر دو۔
مالی بہت خفا تھا۔ "صاحب! نقلی پھولوں کا کیا مقابلہ اصلی پھولوں سے۔"
"تم نے عورتوں کے نقلی بال نہیں دیکھے؟ اصلی سے زیادہ خوب صورت ہوتے ہیں اور نقلی دانت، موتیوں جیسے دانت ہو سکتے ہیں تمہارے بھی۔ جب چاہو مسکراؤ۔ بلاوجہ مسکراؤ۔ نقلی روشنی نہ ہو تو دنیا اندھیری ہو جائے۔ کہیں سورج چاند کی روشنی سے دنیا کا کام چل سکتا ہے۔ نیون سائن جل سکتے ہیں۔ اچھا میں چلا۔"
وہ تیر کی طرح ایک نرس کی طرف گیا۔ "مسز! مسٹر! مجھے آپ نظر آ رہی ہیں۔ بالکل صاف، بھولی قل۔"
نرس بوکھلا گئی "کیا پہلے آپ نہیں دیکھ سکتے تھے؟"
"دیکھتا کیسے۔ تم ابھی تو آئی ہو۔" غالب بولا اور بازو پھلانگ کے میری طرف آیا۔
"تمہاری جیب میں کیا ہے؟" میں نے کہا۔
غالب نے خالی جیب اُلٹ دی "دیکھ لو رابعہ تمہیں میرے پاس۔"
"ہم تو کے پیچھے خالی ہاتھ جائیں گے اندر۔ اسلحے کے بغیر۔"
"اسلحہ" اس نے احمقوں کی طرح کہا "ہم بھی کچھ نہیں لائے؟ اگر مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔ لو وہ نازو آ گئی۔"
میں نے پلٹ کے دیکھا تو نازو ایک دو پہیہ مرسیڈیز سے اُتر رہی تھی۔

"بڑی کمائی ہے آنکھوں کے اسپتال کی۔ سارے عقل کے اندھے اب شاید یہاں آتے ہوں گے" غالب بولا۔
کار میں سے ایک دُبلا پتلا شخص سوٹ میں برآمد ہوا۔ وہ شوفر کے اُترنے اور دروازہ کھول کے کھڑے ہونے تک بیٹھا رہا تھا۔ کلینک کے دروازے پر کھڑا ہوا سنتری اٹین شن ہو گیا۔ مالی نے فوارہ چھوڑ کے اسے سلام کے لیے ہاتھ اُٹھا دیا۔ وہ اس قسم کے استقبال کا عادی معلوم ہوتا تھا۔
"کاش اس کی مونچھیں ہوتیں" غالب نے تو بھر کے کہا "کلف والی۔"
میں نے کہا "پھر کیا ہوتا؟"
غالب نے افسوس سے مجھے دیکھا "کیا ہوتا۔ کچھ نہیں ہوتا مونچھوں سے۔"
"کاش اس کی داڑھی ہوتی۔ فرنچ کٹ یا جھاڑ جھنکاڑ ٹائپ۔"
"پھر کیا ہوتا؟"
اب میں نے مسکرا کے کہا "کچھ نہیں۔ داڑھی سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ کم آن۔"
ہم ایک چھلانگ مار کے ان کے عین پیچھے پہنچ گئے۔ نازو اور چوہدری بشارت خراماں خراماں ایک روش پر چلتے ہوئے سیدھے مین گیٹ کی طرف جا رہے تھے اور سنتری سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔
بشارت نے گھوم کے کہا "کون ہو تم لوگ؟"
میں نے کہا "میں سیٹھ انار خان لنگوروالا۔ یہ اپنا ریوالور اصلی والا۔"
غالب بولا "میں سیٹھ شیر خان لنگوروالا۔ اپن تمہارے ساتھ جانے کو مانگتا۔ چوں چرا نہیں مانگتا۔"
بشارت کا رنگ ریوالور دیکھتے ہی اُڑ گیا تھا۔ جو میں نے اس کی کمر سے لگا دیا تھا مگر اس طرح کہ اسے صرف وہ محسوس کر سکتا تھا۔ کوئی اور نہیں دیکھ سکتا تھا۔
"کیا۔ کیا چاہتے ہو تم؟"
نازو نے کہا "بشارت صاحب۔ ان لوگوں کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔"
"تم جانتی ہو انہیں؟"
نازو نے سر ہلایا "ان کا تعلق پیشہ ور قاتلوں کے ایک گروہ سے ہے۔"
اس نے بشارت کے کان کے قریب سرگوشی میں یوں کہا کہ ہم بھی سُن لیں۔
"میں کیا کروں میں؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔
"وہی جو یہ لوگ کہیں۔ ابھی اور کیا کر سکتے ہیں آپ۔ اتنے مریض بیٹھے ہیں اور ان کے ساتھ آنے والے۔ خواہ مخواہ دو چار بے گناہ بھی مارے جائیں گے اور آپ کا اسپتال بدنام ہو گا۔"

www.paksociety.com

اس نے نازو کا "مشورہ" مان لیا۔ ہم دوستانہ طریقے سے مسکراتے ہوئے اور پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اسپتال کے مین گیٹ سے گزرے اور اس لفٹ کے سامنے رُک گئے جس پر لکھا ہوا تھا "صرف مریضوں کے لیے" یہ لمبی سی لفٹ تھی جس میں بیڈ یا اسٹریچر پر لیٹے ہوئے مریض اوپر نیچے منتقل کیے جاتے تھے۔ لفٹ کا دروازہ کھلا اور آپریشن کا ایک مریض بیڈ پر باہر لایا گیا۔ ہم اندر چلے گئے تو میں نے پاؤں دروازے کے بیچ میں... رکھ دیا۔ لفٹ کا دروازہ پورا بند نہیں ہوا۔ لفٹ وہیں رُکی رہی۔

"شرافت سے چوہدری دلاور کے کمرے تک چلو گے تو اسٹریچر پر نہیں لائے جاؤ گے" میں نے کہا۔

"چوہدری دلاور۔ کون چوہدری دلاور؟"

غالب نے کہا "کاش تمہاری مونچھیں ہوتیں۔"

وہ حیران ہو کے بولا "پھر کیا ہوتا؟"

"پھر میں انہیں اکھاڑ کے تمہارے ہاتھ پر رکھ دیتا اور بتاتا کہ چوہدری دلاور کی بھی مونچھیں نہیں ہیں اور وہ بھی حرامی ہے۔"

میں نے ٹخنے میں سہلایا اور پیر اندر کھینچ لیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی لفٹ اوپر چڑھنے لگی۔ میں نے فورتھ فلور کا بٹن دبا دیا۔

"میں کسی چوہدری دلاور کو نہیں جانتا۔ کیا وہ داخل ہے یہاں؟"

لفٹ اوپر پہنچ گئی تھی۔ غالب نے گراؤنڈ فلور کے "جی" پر انگلی رکھ دی۔ لفٹ نیچے چل پڑی۔ "وہ یہاں استاد پیڑیدہ کے نام سے پڑا ہے۔"

"استاد پیڑیدہ۔ نام رجسٹریشن پر لکھے جاتے ہیں۔ تم کو انکوائری سے معلوم ہو سکتا تھا۔"

"انکوائری تم کرو۔" میں نے نیچے پہنچتے ہی پھر نمبر چار دبا دیا۔ "جب تک تمہیں یاد نہیں آئے گا کہ استاد پیڑیدہ کس کمرے میں کس نام سے لیٹا ہوا ہے۔ ہم لفٹ میں اوپر نیچے ہوتے رہیں گے بڑا مزہ آ رہا ہے" غالب نے کہا "یہ لڑکی کون ہے؟"

"بہن ہے اس کی۔ اسے بعد میں اغوا کریں گے" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ شیر خان لنگوروالا اس لومڑی سے شادی کرے گا۔"

میں نے پھر "تین" کا بٹن دبا دیا۔ "شرم کرو۔ شیر ہو کے لومڑی سے شادی کرو گے؟"

"ہم اپنا نام لومڑ خان لنگوروالا کرے گا" غالب بولا "تمہارا ریوالور میں کتنا گولی ہے ایک چلا کے دکھاؤ۔"

میں نے بشارت کے سر کا نشانہ لیا "ابھی گولی ادھر سے جائیں گا۔ پیچھے سے نکلے گا۔"

"ہم کچھ کرے گا" غالب نے اس کی گودی پر ہاتھ رکھ دیا۔

بشارت کا حوصلہ جواب دے گیا "میں تمہیں لے کر چلتا ہوں لیکن مجھے بتاؤ کیا تم اسے قتل کرو گے؟"

میں نے غالب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا "یہ تو ارادہ نہیں تھا ہمارا۔ مگر تم کہتے ہو تو۔"

"نہیں نہیں۔ ایسا مت کرنا۔"

"عجیب فریبی ہو تم بھی۔ جب استاد پیڑیدہ کو جانتے ہی نہیں اور جہاں وہ ہے یہ بھی نہیں تو پھر قتل کے نام پر تڑپنے کیوں ہو۔"

غالب ہنسا "ارے بیچے یہ استاد پیڑیدہ تو ہے کیا چیز؟"

میں نے کہا "اس کی عرفیت تو ہم جانتے ہیں۔ نام کیا ہے اس کا؟"

"ایاز احمد۔" اس کے منہ سے نکل گیا۔

"ذرّیں گڈ۔ تم تو پرانے شناسا معلوم ہوتے ہو اور کسی سے یہ نام ہم نے نہیں سنا۔ اس ایاز کے محمود۔ چوہدری دلاور سے بھی نہیں" میں نے لفٹ کے کنٹرول کی طرف ہاتھ بڑھایا "کون سے فلور پر ملا کون؟"

"سیکنڈ......" بشارت نے سخت مجبوری کے عالم میں کہا۔

میں نے دو نمبر کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ نیچے گئی۔ دو کا روشن بٹن بند سے بجھ گیا تو میں اور نازو آگے ہو گئے۔ غالب نے ریوالور کے پیچھے بشارت کو اپنے ساتھ رکھا۔ اگرچہ اسے کسی سے بھی رابطے کا موقع نہیں ملا تھا ورنہ کسی کو یہ اندازہ ہوا تھا کہ مالک کے ساتھ کیا ڈراما ہو گیا ہے لیکن مجھے اندیشہ یہ لاحق تھا کہ لفٹ کے اوپر نیچے ہونے سے کسی کو شک نہ ہو گیا ہو جن لوگوں نے بشارت کو لفٹ میں جاتے دیکھا تھا شاید ان میں سے کسی کی نظر فلور پینل پر ہو اور اس نے تاڑ لیا ہو کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ لفٹ فورتھ فلور تک جاتی ہے پھر گراؤنڈ پر پہنچتی ہے مگر دروازہ کھلنے سے پہلے ہی اوپر چل پڑتی ہے۔

اندیشے بعض اوقات صرف وہم ثابت نہیں ہوتے خطرات کی پیش بندی کا موقع بھی فراہم کرتے ہیں۔ میرے اور نازو کے آگے رہنے سے فائدہ ہوا ورنہ اسی لفٹ میں ہم ہینڈز اپ کرا کے نیچے لے جائے جاتے۔

دروازہ کھلتے ہی دو سیکیورٹی گارڈ سامنے آ گئے۔ ان کی خودکار رائفلیں بڑے جارحانہ انداز میں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ سوچنے کا موقع اس لیے مل گیا کہ لفٹ کا گیٹ آہستہ آہستہ کھلتا ہے۔ میں نے نازو کو اشارہ کیا اور پلک جھپکنے میں ایک پر میں نے ہاتھ ڈال دیا اور دوسرے پر نازو نے۔ ایک جھٹکے میں وہ اندر آئے اور تیزی سے گزر کے سامنے والی دیوار سے ٹکرا گئے۔ میں نے پھر چار نمبر کا بٹن دبا دیا تھا چنانچہ دروازہ بند ہو رہا تھا۔

میں اور نازو ایک ساتھ پلٹے اور گارڈ ابھی سنبھلے بھی نہ تھے کہ ہم نے انہیں محاورے کے مطابق آڑے ہاتھوں لیا۔ الٹی ہتھیلی کے ایک کاری وار نے جو ان کی کنپٹی پر پڑا تھا انہیں سارے فرائض کے احساس سے بے نیاز کر دیا۔

صورت حال کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے غالب نے چلا کے کہا تھا "خبردار ہلنا مت کوئی۔ سانس بھی مت لینا ورنہ ہوا نکل

www.paksociety.com

"احمق ہو تم گدھے ہو۔"

غالب نے گھوڑے جیسا سر ہلایا "اور آپ دونوں کے بچاؤ۔ تم لفٹ کو اوپر ہی روکو خاتون۔"

نازو نے گیٹ کو تھوڑا سا کھلا رکھا۔ لفٹ وہیں رہی۔ میں نے باہر جھانک کے دیکھا۔ چوتھی منزل پر ابھی کچھ بھی نہیں تھا۔ تعمیرات کا تھوڑا بہت کام جاری تھا اور سریا سیمنٹ بکھرا پڑا تھا۔ غالباً چوتھی منزل کسی توسیعی منصوبے کا حصہ تھی جس پر عمل ہونے والا تھا۔ ادھر اور کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے نازو کو اشارہ کیا "تم ذرا باہر آؤ اور اپنا منہ دوسری طرف رکھو۔ یہ مت پوچھنا کہ کیوں؟"

"ہاں۔ شرم آنے کی باتیں بتانے ہو رہے۔"

لفٹ تقریباً دس فٹ لمبی تھی اور عام لفٹس کی طرح پانچ فٹ چوڑی۔ ہمیں گارڈز کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے خاصی جگہ میسر آگئی تھی۔ اب وہ دونوں منہ کے بل پڑے تھے۔ ان کی رائفلیں کسی کام نہ آسکی تھیں۔ چند منٹ میں ساری کارروائی مکمل ہو گئی تو میں نے بشارت کو بھی باہر آنے کا اشارہ کیا۔ کسی گارڈ کے ہوش میں آنے کا امکان نہیں تھا۔ میں نے دروازے کو اچانک لفٹ کے بند ہونے سے روکا اور ہم زینے کے راستے نیچے اُترے۔ اب میں بھی سیکیورٹی گارڈ کے یونیفارم میں تھا اور غالب بھی۔ ہمارے ہاتھ میں انہی کی خودکار رائفلیں تھیں اور بشارت کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"اگر تم چوہدری دلاور کے ساتھی ہو تو تم نے ہمارے بارے میں ضرور سنا ہوگا۔ نہیں سُنا تو اب سُن لو کہ ہم میدانِ جنگ میں لحاظ مروت سب بھول جاتے ہیں" میں نے کہا "یہ اسپتال ہے۔ یہاں کشت و خون نہیں ہونا چاہیے مگر اس کا دارومدار تمہارے اپنے رویے پر ہوگا۔"

اس نے صرف سر ہلایا "میں نے ابھی تک تمہاری مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔"

"تم نے سیکیورٹی کو کیسے اطلاع دے دی تھی؟"

غالب نے مجھے ایک چھوٹا سا آلہ دکھایا "یہ دیکھو۔"

"یہ کیا ہے؟"

غالب نے اس چھوٹی سی ڈبیا جیسے آلے پر ایک بٹن دبایا "یہ کوڈ سگنل دیتا ہے۔ اس کی جیب میں تھا۔"

کمرے میں ڈاکٹر کے سوا کوئی بھی نہیں تھا جو بے وقوفوں کی طرح ہکا بکا کھڑا ہوا تھا۔ بالکل اس دولہا کی طرح جو حجلۂ عروسی میں قدم رنجہ فرمائے تو دیکھے کہ سیج خالی ہے، دلہن غائب اور کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ سخت بے یقینی کی کیفیت میں وہ صورتِ حال کی وضاحت کرنے کی کوشش ناکام میں مصروف تھا۔

نازو سب سے پہلے دوڑ کے کھڑکی تک گئی تھی اور جھک کے نیچے دیکھ رہی تھی "وہ بھاگ گیا اس طرف۔" اس نے چھلانگ مار

"تم جیب میں ہاتھ ڈالے پیغامات بھیجتے رہے۔" میں نے غرّا کے کہا۔

بشارت کی بے بسی دیکھنے کے قابل تھی۔ اسے بھروسا تھا وہ سیکیورٹی اسٹاف پر جو مسلح تھے پھر شاید اسے یقین تھا کہ مختل بیچ کی مدد پہنچ جائے گی اور یہ غنڈے پکڑے جائیں گے مگر اب اس کو سہارا دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

ہم دوسری منزل پر پہنچے تو ایک ڈاکٹر تیزی سے ہماری طرف آیا "سر۔ کہاں تھے آپ...؟"

میں نے کہا "سر اوپر گئے تھے۔ کچھ ہدایات دینے کے لیے۔"

ڈاکٹر نے میری صورت پر غور نہیں کیا "سر۔ وہ روم نمبر دو سو دو۔"

"کیا ہوا ہے دو سو دو میں؟" بشارت پریشان نظر آنے لگا۔

"وہ کوما میں ہے۔ کچھ دیر پہلے ٹھیک تھا وہ۔"

"کیا کہہ رہے ہو" بشارت بولا "ہم سوتیا کے آپریشن کرتے ہیں۔ جب مریض بالکل صحت مند ہوں تب داخل کرتے ہیں۔"

میں نے نرمی سے کہا "خود چل کے دیکھ لیں سر۔"

ڈاکٹر آگے چلنے لگا۔ میں اور غالب ایک قدم پیچھے رہے۔

"کسی نے کوئی غلط دوا تو نہیں دے دی تھی؟"

"یہاں تو آپ جانتے ہیں سر۔ سسٹم میں ایسی غلطی کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

دائیں طرف مڑتے ہی اس نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ بشارت نے میری طرف دیکھا "تم ٹھہر جاؤ یہاں۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "آپ کی حفاظت کے لئے...."

"یہ ڈسپلن نہیں ہے یہاں کا۔ سیکیورٹی والے کسی مریض کے کمرے میں نہیں جاتے۔"

"یہ خاتون تو جا سکتی ہیں۔ ہم باہر انتظار کریں گے" غالب نے کہا اور اپنا ریوالور نازو کو تھما دیا۔

"اس ریوالور کے بغیر بھی یہ قتل کر سکتی ہے۔ ویل مزڈر۔ نگاہ ناز سے اور خالی ہاتھ سے۔"

بشارت اندر چلا گیا۔ نازو اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی پھر میں نے اس کے چلانے کی آواز سُنی۔

میں اور غالب ایک ساتھ اندر گھسنے کی کوشش میں آپس میں ٹکرا گئے پھر غالب نے پہل کی اور میں اس کے پیچھے کمرے میں پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں چوہدری دلاور نے کوئی غیر متوقع اور حیران کر دینے والی چال چلی ہوگی۔ وہ استاد پیڑ روح بن کے یہاں روپوش تھا اور اس نے اپنا نام بھی ایاز لکھوایا تھا مگر اندر قدم رکھتے ہی مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔

دول گا۔"

ایک گہری سانس لے کر بشارت نے بیٹھے پر رکی ہوئی ہوا نکالی "ہم کیا سمجھتے ہو بچ کے نکل جاؤ گے۔"

میں نے بے بسی کی نمائش کی "پہلے ایسا ہی سمجھتے ہیں ہم۔"

خوف و ہراس کے جراثیم جتنی تیزی سے پبلک پر حملہ کرتے ہیں اتنی تیزی سے کوئی وبا یا جنگل کی آگ بھی نہیں پھیلتی۔ چند منٹ میں بھگدڑ مچ گئی اور بھیڑ چال میں لوگوں نے وجہ جانے بغیر اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ کچھ گاڑیوں کو بھی بھول گئے اور اسپتال سے نکل بھاگے۔ کاریں نکالنے والوں نے عجلت میں ایک دوسرے سے گاڑیاں ٹکرا کے اپنا بھی نقصان کیا۔

لیکن سب سے زیادہ نقصان مجھے ہوا۔ میں نے باہر آتے ہی چوہدری دلاور کو دیکھ لیا تھا۔ وہ پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ اس نے اپنی راہ میں حائل ہونے والی ایک نرس کو بھی دھکا دے کر گرا دیا۔ صرف ایک بار اس نے پلٹ کے میری طرف بھی دیکھا۔ اس کی نگاہ ایک بدحواس ہجوم میں مجھے تلاش نہ کر سکی لیکن میں نے صاف پہچان لیا۔

میری مجبوری یہ تھی کہ میں فائر نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چوہدری دلاور کو گزند پہنچتی۔ درمیان میں حائل بہت سے بے گناہ کوئی کا نشانہ بن جاتے۔ یہ بات صرف میں جانتا تھا کہ دلاور کیوں بھاگ رہا ہے اور کس سے بھاگ رہا ہے۔ باقی بھاگنے والے سب کے ساتھ بھاگ رہے تھے اور خود کو خطرے میں محسوس کر کے بھاگ رہے تھے حالانکہ خطرے کا وجود بھی نہیں تھا۔

دلاور کو میں نے پہلی بار یوں فرار ہوتے دیکھا تھا۔ اتنی عمر کے لڑکے اس کی رفتار قابلِ تعریف تھی مگر مسئلہ اس کے لئے صرف عزت کا ہی نہیں تھا، بقا کا تھا۔ میری نظروں کے سامنے اس نے پارکنگ عبور کی اور ایک سیاہ رنگ کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

میں نے چلا کے کہا "روکو۔ اسے روکو۔"

لیکن میری آواز پر وہاں دھیان دینے والا کون تھا۔ اس کا الٹا اثر ہوا۔ چیخ پکار کا شور.... فریاد و فغاں میں بدل گیا۔ نہ جانے کس منچلے نے اندیشے کا اظہار اعلانیہ کر دیا "جلدی کرو بم پھٹنے ہی والا ہے بھاگو۔"

ایک ساتھ کئی خواتین نے ہسٹریائی انداز میں کورس شروع کیا اور بے وقت کی راگنی کی طرح بے سُری آوازوں میں رونے لگیں۔ ان کے سرتاج انہیں ڈانٹنے لگے "رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جلدی چلو۔"

"جب چلو۔ یہ ساری مصیبت ہے۔"

"کیا ساری باندھ کے آنا ضروری تھا۔ فیشن شو ہو رہا تھا جہاں تم گئی ہو ساری کو۔"

"اپنی پوتو کہاں ہے۔ تمہارے ساتھ تھا۔ گڈی کدھر ہے؟"

"کام ہم کی اطلاع ملی ہے فون پر۔" کسی پیدائشی شرپسند اور مزاحم واز نے کہا۔

مگر یہ سب سننا رائیگاں اور کچھ کرنے کو تھا بھی نہیں۔ سیاہ کار چوہدری دلاور کے بیٹھتے ہی چل پڑی تھی۔ میں نے اس کا نمبر سمجھنے کی کوشش کی مگر ایک تو درمیان میں دوسری گاڑیاں اور لوگ تھے دوسرے کار کا نمبر بہت غیر نمایاں تھا اور ایک

دی۔

"ہاں چھلانگ ماری۔ ایک دم۔" ڈاکٹر کو جیسے زبان مل گئی اور اس نے نازو کے بیان کی تائید میں اپنا کدو جیسا شفاف سر ہلایا۔

میں نے غالب کو دروازے پر رہنے کا اشارہ کیا اور کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ بشارت عین کھڑکی کے نیچے سیمنٹ ٹائل سے بنے ہوئے تین فٹ چوڑے راستے پر الٹا پڑا ہوا تھا۔ ٹائلوں کے بیچ میں کچی زمین کی ایک انچ چوڑی پٹی گھاس کے لئے چھوڑی گئی تھی۔ اوپر سے یہ ٹائل سبز کناروں والے چوکور خانے لگتے تھے۔ بشارت سر کے بل گرا تھا۔ اس کا سر ایسے پچکا تھا کہ خون کے چھینٹے ٹائلوں پر اور دور دور تک گئے تھے۔

میں نے نازو کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا "یہ کیسے ہو گیا۔"

"بس اچانک ہی ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے کھڑکی کی طرف دوڑ لگائی۔ ریوالور ہوتا میرے پاس تو میں پیچھے سے شوٹ کر دیتی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ ایسی احمقانہ حرکت کر سکتا ہے۔ میں نے چلا کے اسے روکا لیکن اتنی دیر میں وہ کھڑکی پر چڑھ کے کود چکا تھا۔"

میں نے کہا "یہ سب ابھی تمہارے ذہن میں تازہ ہے۔ وہ کھڑکی پر چڑھا اور پھر اس نے چھلانگ ماری یا وہ سر کے بل لڑھک گیا؟"

"اس نے چھلانگ لگائی تھی۔"

"بالکل سیدھی؟"

"ہاں۔ جیسے کوئی جان بچانے کے لئے کودتا ہے۔"

"پھر یہ سر کے بل کیسے گرا۔" میں نے شرلاک ہومز کی طرح سوال کئے "دو منزلوں کا فاصلہ اتنا تو نہیں تھا کہ وہ قلابازی کھاتا۔"

"یہ تفتیش آپ کریں۔ اس کا تعلق شعبۂ سراغرسانی سے ہے۔ میں تو صرف چشم دید گواہ ہوں۔"

ایک خیال کے ذہن میں آتے ہی میں پلٹ کے بھاگا اور غالب کو دھکیل کے باہر نکل گیا۔ سیکیورٹی کی وردی میں ایک شخص کو دوڑتا دیکھ کے کچھ خوف و ہراس کی فضا پیدا ہوئی۔ ہر شخص میرے راستے سے خود ہٹ گیا اور دوسرے سے پوچھنے لگا کہ کیا بات ہوئی ہے۔ ظاہر ہے دوسرا یا تیسرا بھی کچھ جانتے تو بتاتے۔

میں بڑی تیزی سے ریلنگ کے ساتھ ساتھ گھومنے والے زینے پر اترا اور لڑھکتا ہوا نیچے پہنچتے ہی بال بال بچا۔ اسپتال میں ایک دم افراتفری پھیل گئی تھی۔ کچھ لوگ پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ باقی میرے بھاگنے سے یہ سمجھ رہے تھے کہ سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ شاید کہیں آگ لگی ہے یا کسی نے بم رکھ دیا ہے۔ خود ساختہ خدشات کے باعث لوگ بھی دروازے کی جانب چل پڑے تھے اور اس "خطرناک" جگہ سے جلد از جلد بھاگنے کی فکر میں تھے۔

www.paksociety.com

وقت میں جماعتی میں کیا۔ یہ ٹیفنٹ ہینڈ ڈرائیو فورڈ اسکورٹ تھی۔ ڈرائیو دوسری طرف بیٹھا ہوا تھا۔ دلاور کے چہرے نے اس کا چہرہ چھپا لیا تھا۔

میں مایوس لوٹا۔ مجھے غصہ خود پر زیادہ تھا کہ میں نے دیر کی۔ اگر میں خود کھڑکی سے باہر کا منظر ملاحظہ فرما لیتا تو کیا فرق پڑتا۔ نازو نے دیکھ ہی لیا تھا اور مجھے بتا بھی دیا تھا کہ بشارت نے اسے موقع دیے بغیر کھڑکی سے چھلانگ مار دی۔ مجھے اسی وقت سمجھ لینا چاہئے تھا کہ اصل بات کچھ اور ہے۔

ڈاکٹر سب سے پہلے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ شاید اس نے دلاور کو کھڑکی کے راستے نکلتے دیکھا ہوگا۔ اسے دلاور کی صرف ایک جھلک نظر آئی ہوگی جو چند سیکنڈ کے وقفے سے اندر پہنچنے والی نازو نے نہیں دیکھی۔ ڈاکٹر یقیناً دلاور کو روکنے یا بچانے کے لئے بھاگا ہوگا لیکن اپنی اسی کوشش کے نتیجے میں وہ کھڑکی تک پہنچ کے توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ایک دم توڑتے جھکا تو باہر گر گیا۔ اس کے سر کے بل گرنے کی دوسری توضیح نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے دو منٹ صورت حال کو سمجھنے اور نازو سے سوال کرنے میں نہ ضائع کئے ہوتے تو میں دلاور کو ضرور پکڑ لیتا۔ اب تو خود ہمارا اپنی جان بچا کے یہاں سے نکل جانا ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ اسپتال کی انتظامیہ حرکت میں آگئی تھی اور انہوں نے لوگوں کو چلا چلا کر سمجھانا شروع کر دیا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اندر مختلف مقامات پر لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے لاؤڈ اسپیکرز پر بھی یہی اعلان دہرایا جا رہا تھا "حضرات و خواتین خطرے اور پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ بے بنیاد افواہوں پر توجہ نہ دیں۔ نظم و ضبط برقرار رکھیں۔"

سیکیورٹی کے دیگر ارکان ایک جگہ جمع ہو چکے تھے۔ ایڈمنسٹریٹر ناپ ایک شخص انہیں ڈانٹ رہا تھا "کیسے شروع ہو گیا یہ ہنگامہ۔"

کسی نے میری طرف انگلی اٹھائی "یہ دوڑا ہوا گیٹ تک گیا تھا۔"

"اور تم کیوں دوڑ رہے تھے؟ اسے دیکھ کر؟ ایڈیٹ۔ اے سڑا دھر آؤ ذرا۔"

اب اُس کے حکم کی تعمیل کے سوا چارہ نہ تھا "یس سر۔"

"تم جیسی نے تمہیں پہلے نہیں دیکھا۔"

"میں نے بھی آپ کو پہلے نہیں دیکھا تھا سر۔ بشارت صاحب نے آج ہی ہم دونوں کو بھرتی کیا تھا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

دوسرے گارڈز مسکرانے لگے۔ انہیں میری نامعقول بات بھی معقول لگی تھی۔

"ہم دونوں؟ دوسرا کون ہے؟"

"پتہ نہیں ہوگا کہیں۔ میرے ساتھ ہی انٹرویو لیا تھا۔ اس لئے مجھے معلوم ہے۔"

"کیوں دوڑے تھے تم کیا ہوا تھا؟"

"پتی ہوا تو کچھ نہیں تھا؟" میں نے سر کھجا کے کہا "ہم ہو جاتا۔"

"کیا مطلب؟ ہاتھ نیچے رکھو۔" ایڈمنسٹریٹر الجھ گیا۔

"یس سر۔ وہ ایک گاڑی کا تالا کھولنے میں مصروف تھا۔ میں نے روکا تو وہ بھاگ کے دوسری گاڑی کی طرف گیا اور اس میں بیٹھ کر فرار ہو گیا۔ کیا میں نے غلطی کی تھی اس کا پیچھا کر کے۔"

"جاؤ پتا کرو وہ کس کی گاڑی چرا کے لے گیا ہے۔"

میرا جھوٹ چل گیا تھا۔ اگر اس وقت کوئی بیک ویو کر لیتا تو مجھے اوپر سے سیڑھیاں اترتے دیکھا تھا تو کار چور والی کہانی ختم ہو جاتی۔ ایک خطرہ یہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ وہ سیکیورٹی گارڈ ایک بار قدرت میں نمودار ہو جاتیں جن کی وردی ہم نے اپنے تن زیب تن کر لی تھی۔ انہیں ہوش سے بیگانہ ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ ہو چکا تھا مگر ہوش میں آنے کے لئے آدھا گھنٹہ مقرر نہیں تھا۔ کوئی ایک منٹ میں اٹھ بیٹھتا یا گھنٹہ بھر لیٹا رہتا تو اس کی مرضی۔

جب ایڈمنسٹریٹر اندر چلا گیا اور دوسرے گارڈز مجھے اپنی نظروں سے گھورتے ہوئے اپنی اپنی ڈیوٹی کرنے چلے گئے تو میں بڑا مستعدی سے اوپر جانے کے ارادے سے زینے کی طرف بڑھا۔ آدھے راستے میں میری ملاقات غالب اور نازو سے ہوئی۔ غالب نے اپنی وردی اتار پھینکی تھی اور وہ عام ملاقاتیوں کی طرح واپس جا رہے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر پر ملاقات کا وقت ختم ہونے کا اعلان بے مقصد ہو گیا تھا۔ ملاقاتی ہی نہیں بہت سے مریض بھی بھاگ گئے تھے۔ خود میں نے ایک شخص کو ماتھے پر پٹی باندھے اسپتال کے لباس میں فرار ہوتے دیکھا تھا۔

"تم چلو سیدھے باہر۔" میں نے رکے بغیر کہا "ٹیکسی میں بیٹھو۔"

غالب نے کہا "تم کیا چوتھی منزل سے براہ راست چھلانگ لگاؤ گے؟"

پورے اعتماد سے میں چوتھی منزل تک گیا۔ کسی بھی سیکیورٹی گارڈ کو کہیں بھی جانے سے کون روک سکتا تھا۔ میں نے اوپر پہنچ کر ہوئی لفٹ میں جھانکا۔ اس کے دونوں دروازوں کو ایک اینٹ نے ذرا سی درز میں کھلنے سے روک رکھا تھا۔ اس درز میں سے مجھے گارڈ تو لیٹے پڑے نظر نہیں آئے کیونکہ اندر اندھیرا ہو گیا تھا مگر میں نے ایک کے کراہنے کی آواز سنی "اوہ میں کہاں ہوں۔" ظاہر ہے وہ ہوش میں آ رہا تھا اور بہت جلد اسے احساس ہونے والا تھا کہ سب سے پہلے ماں نے اسے اسی حالت میں جنم ضرور دیا تھا مگر اس وقت وہ خوش بہادرے بہت دور تھا۔

میں زینے کے راستے اطمینان سے واپس آیا اور گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس وقت تک لان خالی ہو چکا تھا۔ پارکنگ ایریا میں صرف ڈاکٹروں کی گاڑیاں رہ گئی تھیں مگر ڈاکٹرز اور انتظامیہ کے ذمے دار ارکان اسپتال کے مالک کی وفات حسرت آیات پر اظہار تشویش کرنے کے لئے پچھلے حصے میں جمع تھے۔ غالباً اب تک لاش

میں نے کہا "پہلے جنگل کا بادشاہ تھا۔ اب چڑیا گھر کا بادشاہ ہے۔ اسے کیا عام گھوڑوں گدھوں کے ساتھ رکھا جاتا۔ وی آئی پی بانڈ میں تھا وہ۔ وہ جنت کا حال دیکھنے باہر نکل آیا۔ اس سے بھگدڑ پیدا ہو گئی حالانکہ وہ بلی سے زیادہ ڈرپوک تھا اور فوراً ہی اندر لوٹ گیا تھا۔" میں نے کہا "مگر لوگ بھی تو ڈرپوک ہیں۔"

باقی راستے ہماری ڈرائیور سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ پتا نہیں وہ میری بات سے مطمئن ہو گیا تھا یا بُرا مان کے خاموش تھا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر اتر کے میں نے کہا "مرزا جی۔ اب ان دو بانکوں کا کیا کریں؟"

غالب نے کہا "ایک دائیں کندھے پر اٹھا لو۔ دوسری بائیں پہ۔"

"یار مجھے یہ وردی بھی اتارنی ہے فوراً۔"

"یہاں سب کے سامنے۔" نازو گھبرا گئی۔

"اور کیا مینار پاکستان پر چڑھ کے اتاروں۔" میں نے کہا "اس لباس میں جاؤں گا تو مالک مکان کیا سمجھے گا۔"

"کہہ دینا وہ نوکری چھوڑ دی۔ محکمہ حیوانات کے محکمے میں ملازم ہو گیا ہوں۔ اب تم اور یہاں رہنے والے سب محفوظ ہو۔" غالب بولا۔

میں نے کہا "اچھا تم چلو۔ راستہ ہے گھر میں۔"

"اور تم کیا کشمیر فتح کرنے جا رہے ہو؟" غالب نے کہا۔

"بالکل۔ میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔" میں نے کہا "مجھے بس خیال نہیں آیا ورنہ کشمیر تو کب کا فتح ہو جاتا۔"

غالب اور نازو کے چلے جانے کے بعد میں نے ایک گرینڈ خلوت میں جناب بے تاب کرنے والوں کے خلاف خاصی اشتعال انگیز باتیں لکھی ہوتی تھیں۔ ایک رائفل کا میگزین خالی کیا اور رائفل کو گٹر کے ڈھکن میں ڈال کے چھپا دیا۔ ایک رائفل کے ساتھ میں جارحانہ انداز میں بیٹھا ہوا اپنے گھر پہنچا تو حسب توقع نیچے ہی مالک مکان سے ملاقات ہو گئی۔

اُس نے مجھے روکا "کدھر منہ اٹھائے جا رہے ہو خیر سے۔ ہم کیا کانٹے ہیں راہوں میں۔"

میں نے ڈانٹ کے کہا "تم مالک ہو اس بلڈنگ کے۔"

"ابھی تک تو ہوں۔"

"میں ویسے ہی آئی کا نمائندہ ہوں۔ سمجھے؟"

"آئی ایس آئی کہتے تو سمجھ جاتا۔"

"مشتبہ افراد کی تفتیش کا ادارہ SUSPICIOUS CHARACTERS INVESTIGATION اب سمجھے!"

"کون ہیں مشتبہ افراد یہاں۔ سب شرفا رہتے ہیں۔"

"سب معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا "تمہاری بہت قریبی بالکنی میں ایک مفرور لڑکی ہے لالی۔ اور تمہاری آنکھوں کا ایک ڈاکٹر رہتا ہے۔ وہ بھی کسی کو بھگا کے لایا ہے۔"

پیچھے پر بھی پہنچ گئے ہوں گے کہ مالک نے خودکشی نہیں کی۔ اسے اوپر کی کھڑکی سے اچھالا گیا تھا۔ ایسے کہ وہ سر کے بل نیچے آئے۔ یہ قتل تھا اور قاتل فرار ہو گیا تھا۔ کمرا نمبر دو سو دو میں ایاز نام کا جو شخص داخل تھا وہ اب کمرے میں موجود نہیں تھا۔

ایک گارڈ نے اچانک کہا "تم کہاں جا رہے ہو۔"

"نوکری چھوڑ کے۔" میں نے پیچھے دیکھے بغیر کہا "بشارت صاحب نے آج ہی بھرتی کیا تھا۔"

"یہ وردی اور بندوق تو چھوڑ جاؤ تمہارے باپ کا مال ہے کیا۔"

"بھونکنے کی ضرورت نہیں کتے۔" میں نے غرا کے کہا "مال تمہارے باپ کا بھی نہیں ہے۔"

لیکن اس فرض شناس شخص نے بندوق اٹھالی تھی۔ بادل ناخواستہ میں نے شکست تسلیم کرنے کا ڈراما کیا "اچھا اچھا۔ اب گولی مت چلانا ورنہ پھانسی ہو جائے گی تمہیں۔"

یہ بات فوراً اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے بندوق نیچے کر لی اور میں نے اسے گھما مار کے لٹا دیا "سوری دوست۔ اس کی فرمائش تو نے کی تھی۔"

میں نے بھاگتے ہوئے چور کی لنگوٹی والا کیس یاد کرتے ہوئے گارڈ کی رائفل بھی لے لی اور ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا کیونکہ میرے پاس دو رائفلیں تھیں۔

"بے وقوف قوم۔ جہاں وردی اتاری تھی وہیں اپنی رائفل چھوڑ آئے تھے۔" میں نے غالب سے کہا۔

غالب نے کہا "بھول گیا تھا یار۔"

"تم پیدا ہوتا کیوں نہیں بھولے تھے۔" میں نے کہا "یہ سب پرانے چکر ہیں چھوڑو۔"

"کون سے چکر۔ نمبر خان۔"

"جن میں پڑ کے اپنے بابا آدم جنت سے نکلے تھے۔ ڈرائیور بادشاہ تم کیا سن رہے ہو چلو۔"

"کہاں چلوں؟" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔

"میری سسرال۔" غالب نے کہا "بھوتوں کے ڈیرے پر۔"

"اس کا مطلب ہے گلشن چورنگی" میں نے ڈرائیور کو ٹھنڈا کر دیا۔

ڈرائیور کے لئے اب شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ ہم دونوں ہی گارڈز تھے۔ ایک غالباً ڈیوٹی چھوڑ کے کسی نرس کے ساتھ نکلا تھا اور دوسرا ڈیوٹی ختم کر کے گھر جا رہا تھا۔ اس نے راستے میں ہم سے ہنگامے کا سبب پوچھا "سنا ہے کسی نے بم رکھ دیا تھا۔"

"غلط سنا ہے تم نے۔ دراصل شیر باہر آ گیا تھا۔"

ڈرائیور نے پلٹ کے مجھے دیکھا "شیر؟ یہاں شیر بھی ہے؟"

میں نے کہا "سونیا کے آپریشن کے لئے داخل ہوا تھا۔"

"کیوں مذاق کرتے ہو۔"

www.paksociety.com

"کیسی باتیں کرتے ہو جناب۔ مجھو ذرا آرام سے۔" مالک مکان جو اس بات سے ہو گیا "دراصل دشمن بہت ہیں میرے۔"

"مجھے بھی انہی میں شامل سمجھو۔" میں نے کہا اور اوپر چل پڑا "دیکھو خبردار کوئی باہر نہ جانے پائے۔"

مالک مکان نے بڑی مشکل سے سر ہلایا "یا میرے مولا۔ کیا سے کیا ہو رہا ہے۔"

اپنے کمرے میں پہنچ کے میں نے یہ بات بتائی تو رابعہ خفا ہوئی۔ باقی سب ہنسے "کیوں خواہ مخواہ پیچھے پڑ گئے ہو اس شریف زدی کے۔"

"شریف زدی۔ اس کا تو باپ بھی شریف نہیں ہوگا۔" میں نے ریوالور اتارتے ہوئے کہا "یہ لو۔ سنبھال کے رکھو۔ راشدہ آباد بکا ہے۔"

"جیسی راشدہ کار میں آتی ہے۔" غالب نے زمزمہ کیا۔

اب دلاور کے مسئلے پر بحث شروع ہوئی۔ میں نے بتایا کہ وہ کس طرح فرار ہوا تھا۔

"یار میں نے کبھی اسے یوں بھاگتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل چوہوں کی طرح بھاگا تھا۔ سوچو ذرا دلاور جیسا بندہ اور ایسے فرار ہو۔"

"سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ تم کیا سوچتے رہے۔"

"اور میں کیا کرتا۔ دوڑ کے اسے پکڑ نہیں سکتا تھا۔ قریب بھی جاتا تو وہ فائر کر دیتا۔ میں گولی چلاتا تو مارا جاتا کوئی اور۔ ہر شخص ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا۔"

نازو بولی "وہ کمرے سے کیسے نکل بھاگا۔ کھڑکی کے راستے۔"

"یہ تم سے کس نے کہا کہ وہ کھڑکی کے راستے نکلا تھا۔"

میں نے کہا "میری عقل نے۔ بشارت اس کے پیچھے لگا ہوگا۔"

نازو نے میری بات کاٹ دی "اس نے دلاور کو نکلتے دیکھا ہوگا ورنہ کے تھا۔"

غالب نے کہا "اگر یہ بات تھی تو پھر یہ بتاؤ کہ دلاور کیسے آرام سے اتر گیا۔ بشارت کیسے سر کے بل جا گرا۔"

"بشارت تو کھڑکی میں جھکا ہوگا۔ شاید زیادہ جھک گیا اور اس کے قدم اکھڑ گئے۔ ہاں دلاور کیسے اترا۔ یہ ہے غور طلب سوال۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ رسی سے اترا۔" نازو نے کہا۔

"ہاں نظر آ گئی تم نے وہ رسی کے ذریعے۔ جبھی مان گئے تمہاری عقل کو ناقص العقل لڑکی۔" غالب نے اس کی جبیں پر ہاتھ مارا۔ "یہ یا صرف میرا بھوت سر کر سکتا تھا۔"

"اپنے ہاتھ کو قابو میں رکھو۔ اور زبان بھی۔"

"سب پر قابو ہے مجھے سوائے دل کے۔" غالب نے آہ بھری "دل ہے پرائے بس میں۔"

"میرا دل بس۔ اور بس جاری ہے مسلسل پسپائی۔" رابعہ نے کہا۔

نازو نے کہا "جب میں نے جھانک کر دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے کوئی رسی کا ٹکڑا تھا۔ جو سانپ کی طرح بل کھا کے غائب ہو گیا۔"

غالب نے کہا "جب ہوتا تو صاف نظر آتا کہ وہ سانپ تھا۔"

"وہ رسی تھی۔" نازو نے بگڑ کے کہا "دلاور نے استعمال کی ہوگی۔"

"جبھی وہ رسی کے ساتھ ہی خود بھی اڑ گیا۔ رسی کیا ہوا میں کھڑی کی تھی اس نے۔" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "نازو کی بات میں وزن ہے۔"

"اس کے دماغ جتنا؟" غالب نے کہا۔

"تمہیں جینئس کے دماغ جتنا۔ تم جانتے ہو کہ عقل سے جینئس بنی ہوئی ہے۔ اگر کوئی ماہر ہو تو رسی باندھ کے اوپر سے نیچے جاتا ہے اور نیچے سے ایک جھٹکا دے کے رسی بھی کھول سکتا ہے۔ پرانے چور اس فن کے ماہر تھے۔ وہ تو گوہ کو بھی استعمال کرتے تھے۔"

"گوہ کیا؟" نازو نے پوچھا۔

میں نے کہا "چھپکلی کے قبیلے کا ایک جانور ہوتا ہے۔ قدرے چھوٹا۔ سنا ہے وہ دیوار پر اپنے پنجے گاڑ دیتا تھا اور اس کی دم سے رسی باندھ کے چور نیچے اترتے تھے۔ جاتے وقت گوہ کو ساتھ لے جاتے تھے۔"

"رسی مضبوط نہ شاید ہاتھی کی دم بھی نہیں ہوتی۔" غالب نے سر کھجایا۔

رابعہ نے کہا "رسی باندھنے اور کھولنے والی بات اپنی سمجھ میں آتی ہے۔ کیا پتا دلاور اس میں مہارت رکھتا ہو۔ وہ ہر فن مولا ہے۔"

غالب نے کہا "چلو تمہاری نازو کا دل رکھنے کے لئے مان لیتے ہیں۔"

"تمہاری نازو؟" رابعہ ہنسنے لگی۔

"چلو تمہارا دل رکھنے کے لئے کہتا ہوں 'میری نازو'۔" غالب نے کہا۔

نازو نے برہمی سے کہا "کسی کی نہیں ہے نازو۔ فضول باتوں میں الجھ گئے ہیں سب۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ آخر دلاور کو عین وقت پر فرار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ پہلے بھی نکل سکتا تھا اور اگر اسے پتا چلا تھا کہ حفاظتی انتظامات کے باوجود ہم اندر پہنچ گئے ہیں تو یہ اطلاع اس کو کیسے ملی۔"

"خوب۔" غالب نے پھر شاباشی کے انداز میں اس کی کمر پر دھپ ماری "تم پر ہزار بار آفرین۔ بھوت کا بچہ۔"

"غالب کے بچے۔" نازو نے چلا کے کہا "کمر توڑ دی۔"

"صنم سنتے ہیں تیری بھی کمر ہے۔ کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے۔" غالب نے سر کو ادھر ادھر گھما کے شعر پڑھا۔

میں نے کہا "مرزا تمہارے جاسوسوں نے تو یہ بتایا تھا کہ چوہدری دلاور زخمی ہو کے یہاں آیا ہے۔ پیٹ کی گولی لگ گئی تھی اسے۔ یہ تو بالکل غلط ہے۔ تم دلاور کو دوڑتا ہوا دیکھتے تو خود مان لیتے۔ تمہارے جاسوسوں کی یہ اطلاع بھی ٹھیک نہیں کہ یہاں احمد چیمہ کا اپنڈکس کا آپریشن کیا گیا ہے۔ یہ آنکھوں کا اسپتال ہے۔"

"یہی سچائی ہے ان کے جاسوسوں کی۔" نازو نے کہا۔

"جاسوس غلط نہیں کہتے۔ یہ آنکھوں کا اسپتال تھا۔ اب توسیع کے بعد اس کو آئی کلینک اینڈ جنرل ہاسپٹل کر دیا گیا ہے۔ بس بورڈ ابھی نہیں لگا ہے۔ پیٹ میں گولی لگنے کی بات دلاور نے خود ہی پھیلائی ہوگی۔ جاسوس کیا کریں۔"

"وہ جاسوسی چھوڑ دیں۔ کوئلے بیچا کریں۔" نازو نے پھر اسے چھیڑا۔

"صرف کرتے ہیں کیوں۔ بھوت نہ بنا کریں۔ مجھے بہت پریشان کرتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"سب اعمال کی سزا ہے کہ خواب میں بھی بھوت نظر آتے ہیں۔" نازو بولی۔

"خواب میں تو بھوتنی آتی ہے۔ باپ نے بے لگام چھوڑ دیا ہے۔"

رابعہ نے نازو کو ڈانٹا "تمہیں بھی چین نہیں آتا چھیڑ خانی کے بغیر۔"

"اچھا آپ پوچھیں اس نے بھوتنی کسے کہا ہے۔" نازو بولی۔

"تمہیں کہا ہے اور کسے۔ کرلو جو کرنا ہے۔" غالب نے چلا کے کہا "بھوت کی بچی۔"

میں نے غالب کو روکا اور نازو جنگلی بلی ہوتے ہوتے رہ گئی۔

رابعہ نے اپنی دن بھر کی کارگزاری پیش کی "ہم آٹھ وکیلوں نے چیف جسٹس کو درخواست دی ہے کہ ایف آئی آر کاٹنے کے باوجود پولیس نے ابھی تک کسی ملزم کو گرفتار نہیں کیا ہے۔ عدالتی احکامات اور وارنٹ کو نظرانداز کیا جا رہا ہے۔"

میں نے خوش ہو کے کہا "پھر؟"

"ہم نے ایس ایچ او کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ دائر کروا دیا ہے۔ اب اسے دلاور کو گرفتار کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا پڑے گا۔ قتل کا سنگین مقدمہ ہے اور مین سوال یہ کہ اس میں سیشن کورٹ سے نیچے کوئی ضمانت منظور نہیں کر سکتا۔ دلاور نے وکیل تو بہت بڑا کیا ہے۔"

"کسے وکیل کیا ہے اس نے تمہیں؟" غالب نے کہا۔

"ہمارا ہی ایک ساتھی تھا۔ پہلے درخواست [illegible] دستخط کرنے والوں میں شامل تھا۔ مجھے نہیں پتا وہ دلاور [illegible] ہو گیا۔ ہم نے اس کے خلاف بار میں ریفرنس [illegible] وقت مدعی اور وکیل صفائی کیسے ہو سکتا ہے۔ پہلے الزام عائد کرنے والوں میں تھا اب ثابت کرے گا کہ الزامات غلط ہیں؟ یہ [illegible]

"ابھی بتاتی ہوں۔ کمر کیا تمہیں کمر بھی نظر نہیں آئے گی۔" نازو نے گردن سے پکڑنے کی کوشش کی مگر رابعہ نے اسے روک لیا۔

"کیا بچوں کی طرح لڑ رہے ہو۔ آرام سے بیٹھو۔"

"میں تعریف کرتا ہوں اس کی اور بھی رلاتی ہے۔" غالب نے شکایت کی "پاگل۔"

"اس کے ہاتھ تو ذرا دیکھو۔ میں اب ہاتھ مارا اس نے تو۔" نازو بولی۔

میں نے کہا "سیشن کو مچھلی بازار مت بناؤ۔ یہ اسمبلی نہیں ہے۔ ہم اس نکتے پر غور کر رہے تھے کہ دلاور کو اطلاع کیسے ملی۔ تو اس کا جواب ہے۔ یہ چیز جو غالب نے بشارت کے تکیے سے برآمد کی تھی۔"

رابعہ نے اسے غور سے دیکھا "یہ تو اس الیکٹرانک کاؤنٹر کی طرح ہے جو مولوی اب تسبیح کی جگہ استعمال کرنے لگے ہیں۔"

"ہاں اس میں بھی بٹن دبانے رہتے ہیں۔ دل اللہ اللہ کرتا رہتا ہے اور کاؤنٹر شمار کرتا جاتا ہے۔" میں نے کہا "یہ اس قسم کا سگنل دینے والا آلہ ہے۔ مورس کوڈ کی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جس کے پاس ایسا ہی ریسیور ہو گا وہ سگنل سن سکے گا۔"

"تو یہ بشارت کے پاس کیوں تھا؟"

"سیکیورٹی سے رابطے کے لئے۔" میں نے کہا "خطرے کی صورت میں اگر چلا کے مدد نہ مانگی جا سکے تو خاموشی سے ایس او ایس دے دیا جائے۔"

"ایک ریسیور دلاور کے پاس بھی ہوگا۔" نازو نے کہا۔

"بشارت نے ہمارے ساتھ جاتے ہوئے اس کو خبردار کیا اور وہ کھڑکی کے راستے نکلنے پر مجبور ہو گیا۔"

میں نے کہا "بالکل ایسی ہی بات ہوئی۔ بشارت کو آخری وقت تک امید تھی کہ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے مگر جب ہم نے سیکیورٹی والوں کو گن پوائنٹ پکڑ لیا تو اس نے خطرہ محسوس کیا۔ ظاہر ہے دلاور کو یہ سگنل مل گیا۔"

"پھر بھی اس کے پاس کافی وقت تھا۔"

"اس نے رسک نہیں لیا سامنے سے نکلنے کا۔ کہ کہیں ہم سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔" میں نے کہا "نازو کہتی ہے اس نے رسی دیکھی تھی۔"

"میری نازو وہ سانپ ہوگا۔" غالب نے پھر چٹکی لینے کی کوشش کی۔

میں نے کہا "سوال یہ ہے کہ دلاور کو بروقت رسی کس نے فراہم کی۔"

رابعہ نے کہا "یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ رسی ساتھ لایا تھا۔ عقلمند اور دور اندیش مجرم ہے۔ تمام امکانات کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ یہاں غلط نام سے رکھا ہوا ہے۔ نام تھا احمد چیمہ کا اور لیٹا ہوا تھا چوہدری دلاور۔"

روانہ بدعنوانی کے زمرے میں آتا ہے۔"
"دلاور کو دکیلوں کی کمی نہیں۔"
نازو نے کہا "اگر اس نے ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کرلی تو؟"

رابعہ مسکرائی "اس کے لئے بھی عدالت میں خود حاضر ہونا پڑتا ہے اور ایسے کیس میں ضمانت قبل از گرفتاری نہیں ہوتی۔ دلاور کو روپوش ہونے کا مشورہ خود ایس ایچ او نے ہی دیا ہوگا۔ روپوش کب تک رہے گا۔ سیشن کورٹ نے ڈاکٹر تجلی کی قبر کھودنے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کے لئے میڈیکل بورڈ کے احکامات جاری کر دیے ہیں۔ تین دن بعد قبر کھودی جائے گی۔"
میں نے بے خیالی میں کہا "کون سی قبر؟"
"جس کی نشاندہی استاد کی جانب سے کی جائے گی۔" رابعہ بولی۔
"اگر قتل ثابت ہو گیا اور دلاور پکڑا نہ جا سکا۔ پھر؟"
"پھر وہ مفرور قرار دے دیا جائے گا۔ اشتہاری مجرم ہو جائے گا۔"

"آمین۔ صد آمین۔ خدا ہم سب کو وہ مبارک دن دکھائے۔" غالب نے کہا۔
"ہاں بار۔ ایک بار نزاسے بھی اندر دیکھ لیں۔ بڑی حسرت ہے۔" میں نے کہا "اب تم جاؤ۔"
"بڑی بے مروتی کی بات ہے یہ تو۔ ٹھیک ہے ہم تمہارے گھر میں ہیں اور تمہارے مہمان ہیں۔ جانے کے لئے تو مت کہو۔"
"مکان میرا نہیں ہے۔ وہ نیچے بیٹھا ہے چند کی آنکھوں والا۔ مکان اس کا ہے اور میں تمہیں مہمان ہی نہیں تسلیم کرتا۔ تم بلائے جان ہو۔"
"میں کمنی ہوں۔" رابعہ نے فوراً اعلان کر دیا "چائے میں ابھی بناتی ہوں۔ اپنے دوست مبارک سے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "بیبی کچن کا افتتاح بھی ہو گیا۔"
"میں آفس سے الیکٹرک کیتلی اٹھا لائی تھی۔ چینی پتی پاؤڈر ملک منگوائے تھے۔ کپ واپس آتے ہوئے خرید لئے۔"
میں نے سر پہ ہاتھ مارا "اب کل سے میری شامت۔ نون مرچ مسالہ لاؤ۔ بھنڈی توری ٹنڈے لاؤ۔ شادی کا سب سے افسوسناک پہلو یہی ہے۔"
"حق ہے پیرو مرشد" غالب نے میرے ہاتھ چوم کے آہ بھری۔ "اچھا بھلا آدمی شوہر ہو جاتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کسپانوی زبان میں شوہر کسے کہتے ہیں۔"
میں نے کہا "نہیں تم بتاؤ۔"
"لغت میں اس کے معنی ہیں۔ خاموشی سے ٹھڈے کھا کے خدا کا شکر بجا لانے والا جانور۔" غالب نے کہا "جو اپنی مادہ سے ڈرتا ہے۔"

"کسپانوی زبان کہاں بولی جاتی ہے؟" نازو نے تنک کے کہا۔
"جغرافیہ پڑھا ہوتا تو معلوم ہوتا۔ کسپا بدے اور پیٹا پوز کے بیچ میں۔" غالب نے کہا "اب پوچھو گی یہ کہاں ہیں۔ جاہل۔"
رابعہ نے ہنس کے کہا "چھوڑو بولنے دو انہیں۔ ایسی زبانیں یہی بولتے ہوں گے۔"
میں نے کہا "مرزا جی۔ تم دروازے کے پیچھے سے وہ تو پکڑ لاؤ۔"
"کسے پکڑ لاؤں؟" غالب بولا۔
"ٹمبک۔ اس پہ لکھوانا۔ دلاور کی اسیری مبارک۔"
"ٹھیک ہے زبان تو یہ" DILAWAR(HAPPY PRISON TO
غالب ہنسا۔ "میں ابھی لاتا ہوں۔"
چائے بن کر آئی تو رابعہ نے کہا "غالب کو کہاں بھیج دیا۔"
"میں نے کہیں نہیں بھیجا۔ وہ خود چلا گیا غصے میں۔"
"تم نے کچھ کہا تھا۔"
"نہیں۔ نازو سے روٹھ کے گیا ہے۔"
نازو ہنسی "ایسی چیز نہیں ہے وہ۔ میں تو کہتی ہوں خدا کرے واپس ہی نہ آئے۔"
"کیسی بات کرتی ہو تم بھی نازو۔" رابعہ نے اسے ٹوکا۔
اسی وقت غالب کیک سمیت اندر آ گیا "یار یہ کیا جگہ ہے۔ کیسی کیسی چیزیں نہاں ہیں اس چڑیا گھر میں۔ ایک تو مالک مکان ہے۔"
"اور کون مل گیا۔"
"مل گئی۔ نیچے رہتی ہے۔ بے شرم۔" غالب نے کیک درمیان میں رکھ دیا "اسے بھی آنکھوں کی بیماری ہے ڈاکٹر صاحب۔ ایسی آنکھ مارتی ہے ظالم۔"
"تمہیں کی تو نہیں۔ چوٹ تو نہیں آئی۔" نازو بولی۔
کیک ہم نے یوں کاٹا جیسے سچ مچ دلاور جیل جا چکا ہے۔ یہ ابھی آرزو کی بات تھی مگر خوشی کی خبر تھی کہ شکاری نے دام نیا تو سہی۔ نازو اور غالب بضد تھے کہ رات کا کھانا بھی ہم ساتھ ہی کھائیں گے مگر رابعہ نے انہیں روانہ کر دیا۔
"سمندر کو بہانہ چاہئے باہر جانے کا۔"
"کیا واقعی کھانا بھی تم بناؤ گی۔ بقلم خود۔" غالب نے کہا۔
"فرض کرو اس مظلوم شخص نے کھانے سے انکار کر دیا تو ضابطہ فوجداری کی کون سی دفعہ کا اطلاق ہو گا۔"
"اس پر ضابطہ داری کی دفعہ نو دو گیارہ لگتی ہے چلو۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا "ہم فون سے رابطہ رکھیں گے بلاوجہ آنے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ترسا رہے ہیں یہاں۔ یہ اپنی ہونی ہے ہماری۔"
"ایک شریف تو نیچے بیٹھا آنکھیں مل رہا ہے اور ہر ایک سے پوچھ رہا ہے کہ جمعدار اور وردی میں ایس پی آئی کا جو نمائندہ آیا تھا وہ واپس کیوں نہیں آیا۔ کس نے چھپا رکھا ہے اسے؟"
غالب اور نازو کے جاتے ہی مالک مکان آ گیا۔ وہ خاصا

"اچھا اچھا۔ حکم کریں ابا جی۔ چوہدری صاحب تو ہیں نہیں۔"
میں نے کہا "گھبراؤ مت۔ ہم اسے بشارت کے اسپتال میں ملنے گئے تھے..... وہ بھاگ گیا۔"
جو نا قابل اشاعت لفظ میں نے استعمال کیا اس کا مفہوم بزدل ہی تھا۔
"اسپتال میں؟ اچھا جی مجھے تو معلوم نہیں۔"
"بشارت کو تو ہم نے فارغ کر دیا۔"
"کیسے جی۔ فریج میں رکھ کے۔ قلفی جمادی اس کی؟"
"مذاق کرتے ہو میرے ساتھ۔ تمہیں ٹھنڈا کر کے دکھاؤں۔" میں نے دہاڑ کے کہا "اس کنجر سے کہہ دینا کہ چل بھاگ۔ کہاں تک بھاگے گا۔ بڑا شکاری بنا پھرتا تھا۔ کل بات کروں گا میں۔"
میں نے وائرلیس آف کر دیا۔ غیر جانبدار کی گفتگو میں کوئی شک نہیں تھا کہ دلاور کے کئے پھر آوازوں کی لہروں کا سراغ لگاتے ہوئے آ جائیں۔ اب مجھے ایک فون کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ منظر کو اپنی خیریت سے ضرور آگاہ کر دوں پھر مجھے خیال آیا کہ وہ دن میں رابعہ سے ملا ہو گا اور شاید رابعہ نے اسے سب بتا دیا ہو گا۔ پھر بھی اس سے گپ شپ کرنے اور اس کی گالیاں کھانے کو جی چاہتا تھا۔ سب سے الگ ہو کے مجھے بھری دنیا میں تنہائی کا احساس ہوتا تھا۔ اپنے دوستوں سے اور اپنے گھروں سے کٹ کے آدمی خود اپنی شناخت بھی کھو دے تو ایک بھٹکی ہوئی روح بن جاتا ہے۔ مجھے قتل اور محسن کی یاد آئی۔ شاید وہ کراچی میں تھے اور اکرام شیخ کے گھر میں بیٹھے ہماری ہی باتیں کر رہے تھے۔ اکرام شیخ کی بیوی کا جل ان کی خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھی۔

ممکن ہے وہ کلفٹن کے ساحل پہ ہوں یا شہر کی رونق کا حصہ ہوں۔ کسی چینی ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہے ہوں۔ اکرام شیخ کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ اب اس کے پاس دو ٹیکسیاں ہیں اور کاجل نے اپنا اسکول کھول رکھا ہے۔ وقت کتنا بدل گیا ہے۔ ایس آئی سعد اکرام شیخ جسے ہم مذاق میں ڈبل ایس ٹی ٹی شیخ کہتے تھے کہاں پولیس کی نوکری اور کہاں ٹیکسی چلانا۔ مگر وہ خوش تھا اور مطمئن تھا۔ ہزاروں میل دور سے چل کے کاجل خود اس کا گھر بسانے آئی تھی کیونکہ اس کا اپنا گھر کوئی نہیں رہا تھا۔ یہی تقدیر کا کرشمہ ہے لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ رشتے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔
رابعہ اوپر آئی تو میں چپ بیٹھا تھا "کیا ہوا؟ اندھیرے میں ایسے کیوں بیٹھے ہو؟"
میں نے مسکرا کے کہا "اب تو اکیلا بھی نہیں ہوں۔ اور اندھیرا بھی دور ہو گیا تمہارے آتے ہی۔ بیٹھو۔"
وہ میرے قریب بیٹھ گئی "دلاور سے بات ہوئی۔"
"نہیں۔ وہ ابھی تک لاپتا ہے۔"

بدحواس تھا۔
"شکریہ ڈاکٹر صاحب اللہ بھلا کرے آپ کا۔ مجھے تو کچھ زیادہ ہی نظر آنے لگا ہے۔" وہ بولا "کوئی بھی نہیں مانتا کہ وہ اوپر آیا تھا۔"
"کون۔ کس کی بات ہے؟"
"کیا نہیں جی۔ وہ وارنٹ لے کر آیا تھا۔ مشتبہ افراد کا بندہ تھا۔ وردی میں اور بندوق۔ ایسے افسار کی تھی اس نے۔" مالک مکان نے کچھ بتا کے واضح کیا۔
"ابا جو کوئی ارادہ ہو نا نہیں۔ خواب دیکھا ہو گا آپ نے۔"
اس نے سر پہ ہاتھ مارا "کوئی کمال ہو گیا۔ آپ بھی یہی کہتے ہیں۔ گھر والی تو مجھے بالکل ہی پاگل سمجھتی ہے۔ وہ لالی کہاں والی بھی یہی کہہ رہی تھی۔ کیا میں اندر دیکھ لوں؟"
"ضرور۔ پولیس ہوتی تو ہم کہتے کہ وارنٹ دکھاؤ۔ آپ سے کیا پردہ۔" میں نے کہا "کونا کونا دیکھ لیں۔"
اس نے ہر کونے میں جھانک کے دیکھا اور پھر میرے ساتھ چھت پر گیا۔ اندھیرے میں اسے نظر نہیں آیا ورنہ وہ ضرور پوچھتا کہ یہ ایریل کس نے لگایا ہے جب ریڈیو نہیں ہے۔ اس نے یقین کامل کا اظہار کیا کہ وہ خبیث چھت پر سے ساتھ والے مکان میں اتر گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ دو طرف گلی ہے اور دو طرف ایک منزلہ مکان "مگر وہ قاتل نہیں ہوا۔"
"سنا ہے آج تم گندی بھی اڑا رہے ہو۔ تم اور وہ لالی کہاں والی۔" مالک مکان نے جاتے جاتے کہا "لگتے تو تم شریف ہو لیکن۔"
"میں اکیلا نہیں تھا۔ بیوی ساتھ تھی۔" میں نے احتجاج کیا۔ "یہ کرایہ نامہ میں نہیں تھا کہ تم چھت بھی استعمال کرو گے۔"
میں نے کہا "کرایہ نامہ میں یہ کہاں تھا کہ میں تمہاری آنکھوں کا علاج کروں گا۔ اور تمہیں اعتراض ہے تو اپنی چھت نیچے لے جاؤ۔ ہمیں نہیں چاہئے۔"
وہ ڈر کیا "وہ جی آپ ناراض ہو گئے۔ گندی کیا جی آپ بے شک جہاز اڑاؤ چھت پر سے۔ ویسے وہ کل والی دوائی زیادہ اچھی تھی۔"
میں نے کہا "میں اور دوں گا۔ وہ بازار میں نہیں ملتی۔"
جب وہ تجلی چلا گیا تو مجھے دلاور سے رابطے کا خیال آیا۔ انگریزی محاورے کے مطابق لوہا گرم تھا اور اس پر چوٹ لگانے کا وقت تھا۔ میں نے وائرلیس کو جوڑا اور کانوں پہ ہیڈ فون چڑھا کے پاور آن کر دی۔
کچھ دیر سرسراہٹ جاری رہی پھر وہی آواز سنائی دی "ہیلو کون ہے؟"
میں نے پرانا جواب دیا تھا کہ وہ مجھے پہچان لے "تمہارا باپ۔"

"وہ کہیں نہیں جا سکتا۔" رابعہ بولی "استار پیڈ رو کا غائب ہونا زیادہ خطرناک ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ فوزیہ اور اس کے شوہر کی خیریت معلوم کرنی چاہیے مگر فون نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"کل میں پوچھ لوں گی۔ اپنے آفس سے فون کر کے۔"

"اور کل سارا دن میں کیا کروں گا۔ چارپائی پر لیٹ کے تمہاری واپسی کا انتظار۔ آئندہ چند دن اہم ہیں۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ تفتیش میں شامل رہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا "میں اپنی فریق سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ اگر میک اپ سے مجھے غیر ملکی بنا دیا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ میں اس کا وکیل ہوں۔ جو وہاں ورکی جگہ سزا کاٹ رہا ہے۔ دوہرے قتل کے الزام میں اور میں ڈاکٹر شکیل کیس کی تفتیش کے نتائج کا جائزہ لوں گا اور پھر اپنی لیگل فرم کو کیس دوبارہ کھولنے کے امکانات کی رپورٹ دوں گا۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے مگر۔"

"مگر کیا۔ میک اپ میں کا انتظام غالب کا دوست غازی کر سکتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تم قانون نہیں جانتے۔ کسی نے بحث شروع کر دی یا تم سے شناخت مانگ لی پھر۔"

"میں ہر ایک سے بات نہیں کروں گا۔" میں نے کہا "پولیس کی تو مجال نہیں کہ سوال کرے۔ گوری چمڑی دیکھ کے یہاں سب ہی مرعوب ہو جاتے ہیں۔ فرنچ بولوں گا تو کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا مگر میں سب کی سنتا رہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر بھی ایک غیر ملکی قانونی نمائندے کی موجودگی پر اعتراض نہیں کریں گے۔ میں کسی کے کام میں مداخلت نہیں کروں گا۔ بس مجسٹریٹ سے اجازت لینی ہوگی۔ وہ میں لے لوں گا۔"

"مجسٹریٹ سے اجازت میں بھی دلوا سکتی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔ "لیکن اچھی طرح سوچ لو۔ کسی مرحلے پر تمہاری کسی بات سے یا کسی حرکت سے شکوک پیدا ہوئے تو پھر تم بھاگ نہیں سکو گے قانون کی مشینری فوراً حرکت میں آجائے گی۔"

"وہ اس وقت بھی حرکت میں ہے۔"

"اچھا پیچھے چلو۔ باتوں سے پیٹ تو نہیں بھرے گا۔"

"دیکھو رابعہ۔ جانے کی حد تک کچن کی ایکٹیوٹی ٹھیک ہے۔ کھانا پکانے کے چکر میں مت پڑنا۔ مجھے پہلے ہی احساس ہے کہ میری وجہ سے تم بھی یہاں رہنے پر مجبور ہو۔"

"یہاں نہ رہتی کسی اور کرائے کے گھر میں رہتی۔"

"وہ اور بات ہوتی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے وہ عزیز رشتے دار نہیں ہیں جو صرف تہمت اور الزام تراشی یا طعنہ زنی کر سکتے ہیں اور اسی کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ وہ بزرگی کے ٹھیکے دار نہیں ہیں جو اخلاقیات کے خود ساختہ معیار پر کسی کو بھی برادری سے خارج کرا دیتے ہیں۔ سنگسار کرا سکتے ہیں اور عاق نامے شائع کرا سکتے ہیں۔"

"حالانکہ ان کی قانونی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔" رابعہ ہنسی۔

"ہم پر انگشت نمائی کرنے والے وہی ہیں جو دشمن ہیں۔ ہم پروا نہیں کرتے لیکن سوچو اس معاشرے میں میری وجہ سے تمہاری عزت داغدار ہو سکتی ہے۔ اگر یہ بات عام ہو جائے کہ تم شادی کی رسمی کارروائی کے بغیر میرے ساتھ رہتی ہو۔ کون مانے گا کہ ہم ایک دوسرے کا انسانی سطح پر احترام کر سکتے ہیں۔ محبت کو خود اپنی نظر میں بے آبرو کرنے سے ڈرتے ہیں۔"

"میں کسی منافق معاشرے میں دوہرے چہرے رکھنے والے کی کسی بات کو اہمیت نہیں دے سکتی۔"

"ایسا نہیں ہے رابعہ۔ آدمی معاشرتی حیوان ہے۔ معاشرے کی قید میں رہتا ہے اور مجبور ہے کہ اس قید خانے کے نظام کو قبول کرے۔ جیل کے اندر جیل مینول چلتا ہے۔"

"خاک چلتا ہے۔"

"میرا مطلب ہے کہنے کی حد تک۔ کیا ہیومن رائٹس یعنی عالمی انسانی حقوق کے منشور کا ڈھول پیٹنے والے اور آئینی حقوق کی بات کرنے والے آج تک ہماری پولیس اور ہمارے نظام انصاف کی خرابیوں کو دور کر سکتے ہیں۔ پتا نہیں کتنے لوگوں کو دنیا میں ضمیر کا قیدی قرار دیا جاتا ہے۔ کیا ہوتا ہے اس سے؟ کوئی ڈکٹیٹر اپنے فولادی ہاتھوں کو نرم کرتا ہے۔ کہیں انسانی یا اخلاقی قدروں کی پامالی رک جاتی ہے؟"

"مگر ہم تو آزاد ہیں۔"

"نہیں۔ زنجیروں کا نظر نہ آنا آزادی نہیں ہے۔ کیا ہم سچ بول سکتے ہیں یا لکھ سکتے ہیں؟ قطعی نہیں۔ یا ہم کافر ہو جائیں گے یا باغی اور غدار۔ حد تو یہ ہے کہ ہم سچ تک رسائی بھی نہیں رکھتے۔ اس کی اجازت نہیں ملتی کہ ہم کسی اور کے سچ سے گمراہ ہوں۔ باہر سے آنے والی کتاب ممنوعہ قرار پاتی ہے۔ کبھی کوئی رسالہ۔ نوجوانوں کا اخلاق۔ اسلام یا ملک کی سالمیت خطرے میں پڑنے لگتی ہے۔ ہمارے بعض برادر اسلامی ممالک تو ہم سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ وہاں غیر ملکی نشریات تک جام کر دی جاتی ہیں۔ یہاں سنسر شپ تو ہے مگر آپ اپنے گھر میں بی بی سی یا آل انڈیا ریڈیو سنیں تو جرم نہیں۔"

"رابعہ نے کہا "انڈیا میں ریڈیو پاکستان سننا منع تھا۔"

"ہاں' ہمارے حکمراں بھی خوش ہوں تو بی بی سی ٹھیک کہتا ہے ورنہ جھوٹ بولتا ہے۔ یہودی لابی کا ترجمان ہے۔ ویسٹرن بلاک کا میڈیا ہے۔ ایسے ہی ہم اسی دوغلے معاشرے میں جی رہے ہیں۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تو بناتے ہیں لوگ۔ ڈیڑھ اینٹ کا معاشرہ بنا کے الگ رہنا ناممکن ہے۔"

وہ نوکرانی ہو یا ملکہ۔ حسین ہو یا بدصورت' جاہل ہو یا اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ اس کے اندر ایک فطری خواہش ایک کمزوری یا طلب ہوتی ہے اچھے کپڑوں کی اور اچھے زیورات کی کیونکہ خوب صورت نظر آنا اس کا حق ہے۔"

"رابعہ" میں نے کہا "ایک بات مانو گی۔"

"نہیں" اس نے صاف کہا "ماننے والی بات ہوتی تو تم پوچھتے کیوں؟"

"تم اپنے آفس میں بھی رہ سکتی ہو۔"

"میں جہنم میں بھی رہ سکتی ہوں۔ مگر تمہارے ساتھ۔" اس نے رسالہ رکھ دیا "پھر کوئی دورہ پڑا ہے تمہیں؟"

"تمہاری پریکٹس......"

"چھوڑ دی میں نے پریکٹس۔ آج بھی میں صرف ڈاکٹر شکیل کیس کی وجہ سے آفس اور کورٹ گئی تھی۔ میرے معاملات وقار یوسف سنبھال رہا ہے۔ منظر بھی ہے۔ اس کی مدد کرنے والا۔ لیکن وقار اکیلا سب کرنا چاہتا ہے۔ وہ راضی نہیں تھا مگر میں نے اسے مجبور کر دیا بے پار ٹنر بننے پر۔ ایک ماتحت وکیل پہلے رکھ لیا تھا اس نے دو اور بلائے ہیں۔ عجیب بے غرض نوجوان ہے یہ وقار بھی۔ بغیر کچھ کیے مجھے میرے حصے کی آدھی آمدنی دے گا۔ میری ایک نہیں سنا کہ سارا کام وہ کر رہا ہے تو منافع بھی رکھے۔ مگر وہ بضد ہے کہ نصف میرے اکاؤنٹ میں ڈالے گا۔ جیسے پہلے میری عدم موجودگی میں ڈالتا رہا ہے۔"

"تم بھی کپڑے سستی تھیں خریدتی تھیں۔"

"یہ برے ہیں کیا؟" وہ مسکرائی۔

"بورن بچ وغیرہ کے ساتھ تم کیا نظر آتی تھیں۔ مجھے معلوم ہے لوگ مبہوت ہو جاتے تھے۔ جہاں بھی تم جاتی تھیں۔"

"اب کسی کو میں اچھی نہیں لگتی تو نہ سہی۔"

"میں چاہتا ہوں۔ تم میک اپ کرو۔ جیولری اور......"

"ان کے بغیر تمہیں بری لگتی ہوں میں؟" اس نے خفگی سے کہا۔

"یار لڑکی کیوں ہو۔ یہ حق ہے تمہارا......"

"اپنا حق میں خود حاصل کر سکتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے میرے حقوق کیا ہیں۔ تم خود کو دیکھو ذرا۔"

"مجھے کیا ہوا ہے۔"

"میرے پاس تمہاری پرانی تصویریں ہیں۔ دکھاؤں؟ تمہاری صحت پہلے جیسی نہیں رہی۔"

"میں سوکھ کے کانٹا ہو گیا ہوں یا توند نکل آئی ہے میری۔"

"تمہارا رنگ سانولا ہو گیا ہے۔"

"پہلے کالا تھا۔ بہت جلد گورا ہو جاؤں گا۔"

"تمہاری آنکھوں کے گرد حلقے ہیں۔ بے آرامی کے۔ شیو دیکھو کتنی بڑھی ہوئی ہے اور اپنے کپڑے دیکھو۔"

"مردوں کی صورت نہیں سیرت دیکھی جاتی ہے اور کپڑے"

"چھوڑو یہ فکریں۔ ہم خوش ہیں نا۔ خدا خوش نصیبوں کا حال بھی جانتا ہے اور اعمال کا بھی۔ بے علم اور بے خبر لوگوں یا شیطان کے چیلوں سے کیا ڈرنا۔"

"ڈرنا انہی سے چاہیے رابعہ۔ اچھے انسان کسی کا گھر نہیں اجاڑتے اور کسی کی دنیا ویران نہیں کرتے۔ کسی کو جنت سے بے دخل کرانے کی سازش میں شریک نہیں ہوتے۔ سوچو اگر ہمارے اس لینڈ لارڈ کو پتا چل جائے۔"

"کیا کرے گا۔ نکال دے گا یہاں سے؟ نکال دے۔ ہم بھی جلوس نکال دیں گے اس کی شرافت کا۔" رابعہ نے مجھے ہاتھ پکڑ کے اٹھا لیا۔

میں نے کہا "پہلے ہم کھمبوں پر چڑھ کے فون کر لیتے تھے۔ کسی بھی بکس سے تار جوڑ کے۔"

"اب پھر موڈ ہو رہا ہے؟"

"یہ دیکھو۔ یہ ٹیلی فون کے تار ہیں۔" میں نے ایک تار کو پکڑ لیا "کتنا آسان ہے۔"

"پتا نہیں کس کی لائن ہے۔ رقم اس کے بل میں لگے گی تو روئے گا۔"

"ٹیلی فون کے بل کو لوگ پہلے ہی رو رہے ہیں۔ ہماری ایک کال سے کیا فرق پڑے گا۔" میں نے کہا "ابھی تو غیر ملکی فون سیٹ بھی نہیں ہے اپنے پاس۔"

"ورنہ کسے فون کرتے؟"

"منظر کی گالیاں سنتے۔ فوزیہ کی خیریت معلوم کرتے۔"

نیچے آ کے میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ ابھی میرا سونے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ رابعہ بہت سی کتابیں اور رسالے لائی تھی۔ ظاہر ہے یہ سب میری دل بستگی کا سامان تھا۔ قید تنہائی میں اپنے خیالوں سے بڑا اذیت دینے والا دشمن کوئی نہیں ہوتا اور خیالوں کے شر سے بچنے کی بہترین پناہ گاہ کتاب ہی ہے۔ آدمی ساری عمر تصور کی کائنات میں ایک مسافر کی طرح پھرتا رہے پھر بھی اس کے سارے طلسمات کا نظارہ نہیں کر سکتا۔ خود رابعہ بھی ایک فیشن میگزین دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کی حالت پر افسوس ہوا۔ مجھے خود سے شرم آئی۔ میں اپنے لیے ہر تلخی جھیل رہا تھا مگر وہ میرے لیے دکھ پریشانی اور کسمپرسی کو بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کر رہی تھی۔ اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتی تو اس وقت اپنے چیمبر میں کسی کیس کی اسٹڈی کرتی۔ پی ایل ڈی کے ضخیم مجموعے اور قانونی حوالوں کی ورق گردانی میں مصروف ہوتی۔ وہ اگلے دن کسی کیس میں دلائل دینے کے لیے نوٹ لیتی اور پھر عدالت میں اپنے منطقی انداز خطابت سے استغاثہ کے جھوٹ کی مٹی پلید کر دیتی۔ اس کا وہ پرشکوہ گھر ہوتا جس میں وہ پوری شان و شوکت کے ساتھ تمام آسائشوں کے ساتھ اور وقار کے ساتھ رہتی۔ بہترین لباس پہنتی اور زیورات خریدتی۔ سامان آرائش اور خوشبو لاتی۔ اب وہ صرف فیشن میگزین دیکھ کے گزارا کر رہی ہے۔ آرائش و زیبائش کی خواہش عورت کی جبلت ہے۔

www.paksociety.com

بھی زنانہ شوق میں شامل ہیں۔"

"خواہ مخواہ کی باتیں ہیں۔ تم بھی بڑے شوقین مزاج تھے۔ مجھے معلوم ہے پہلے سلیقے سے کپڑوں کا انتخاب کرتے تھے۔ پرفیوم، کرکٹ، میوزک۔ سب شوق تھے تمہارے۔"

"عشق نے سب بھلا دیا۔ خیر ایک فلمی گانا برمحل ہے۔ گا کے سناؤں۔" میں نے کہا اور میز پر طبلہ بجانے لگا۔

اِک دن یہ آنسو بنیں گے ستارے
کبھی نہ کبھی دن آئیں گے ہمارے

رابعہ ہنسی "اچھا گا لیتے ہو تم۔ تو گاتے کیوں نہیں۔"

میں نے آہ بھری "گاتا بھی تھا میں۔ کیا میں نے پہلے نہیں بتایا۔ برطانیہ میں ایک لوکل ریڈیو اسٹیشن تھا جو ایشیائی باشندے چلاتے تھے۔ اس پر انڈین غالب تھے۔ بھارت سے ان کے سنگر اور میوزک ڈائریکٹرز بھی آتے تھے۔ پروگرام پیش کرنے کے لیے۔ ان کا سفارت خانہ بھی بہت سرگرم رہتا تھا۔ ہماری پوزیشن خراب ہی رہتی تھی۔ میرے جیسے سر پھرے مقابلے پر کچھ نہ کچھ کرتے تھے۔ وہ شوق وہیں تک محدود رہا۔ ملی نغمے لکھتا تھا ایک پاکستانی ڈاکٹر۔ دھن بناتا تھا ایک بنگالی انجینئر اور گاتا تھا آپ کا یہ خادم۔"

"ہم اپنا گھر بسائیں گے تو اس میں موسیقی کی محفل بھی کریں گے کبھی مہینے میں ایک بار۔" رابعہ نے کہا "امانت علی خان اور مہدی حسن صاحب کو بلائیں گے ساری رات سنیں گے ریکارڈ کریں گے۔"

"اچھا اب تم خواب دیکھو۔ میں سوتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے بھوک میں نیند نہیں آتی۔"

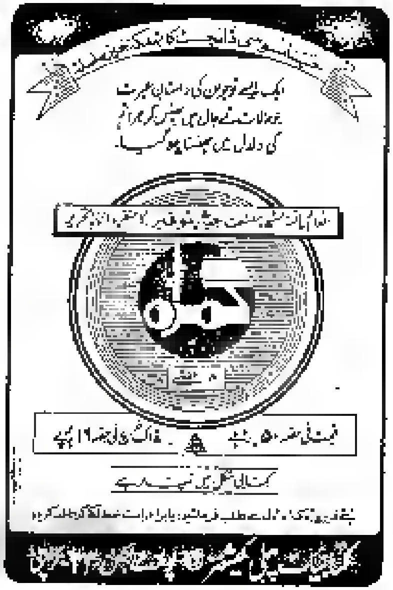

"اب تو رات کافی ہو گئی ہے۔ بچے جیتے ہیں اللہ مالک ہے۔"

نیچے مالک مکان کی محفل جمی ہوئی تھی۔ وہ سب پہلوان تھے اور سب کا تعلق ایک ہی اکھاڑے سے تھا۔ اس نے مجھے ایک ایک سے ملوایا۔

"بڑا کانٹے کا دنگل ہونے والا ہے جی۔ گوجرانوالہ سے۔" اس نے مجھے بتایا۔ "آپ سے بھی کام تھا ایک چھوٹا سا۔"

"ہم میں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں پہلوانی سے۔" میں نے معذرت کی۔

وہ میرے ساتھ آگے آ گیا جہاں رابعہ منتظر تھی کہ میں اپنی جان چھڑا کے آؤں۔ "ڈاکٹر صاحب کوئی ایسی چیز دے دیں۔" مالک مکان نے رازداری سے کہا "کہ پچھے ہاتھوں پر مل لیں اور ہاتھ پھیریں ان پر تو کھجلی ہو جائے انہیں۔ داؤ بھول جائیں اور بیٹھ جائیں۔ لیکن بچانے بچے ہوا کیا تھا۔ یا آنکھوں میں مرچیں لگ جائیں۔"

میں نے کہا "شرم کرو کچھ۔ ایسے جیتنے سے تو بہتر ہے کہ ہار جاؤ۔"

"ہوگی انہوں نے پچھلی بار ایسا ہی کیا تھا ہمارے ساتھ۔ اب تو جناب الیکشن بھی ایمانداری سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ دیکھ لاشک۔ سب جگہ بے ایمانی ہے۔"

"مگر یہ کھیل ہے۔"

"ہوگی اتنی بڑی بڑی شرطیں لگی ہوئی ہیں۔ ایک دو کا سٹہ چل رہا ہے ہمارے خلاف۔ ہم ایک چار سے جیت جائیں تو آپ کا بھی....."

میں نے سختی سے کہا "میں ایسے دھندے نہیں کرتا۔ اور ایسی کمائی پر میں لعنت بھیجتا ہوں۔ آپ بھی چھوڑیں پہلوانی۔ جوئے کا اڈا چلا لیں۔"

وہ خاصا مایوس لوٹا۔ دنگل کی انتظامی کمیٹی میں اس نے کہا بتا رکھی ہوگی کہ آنکھوں کے ڈاکٹر سے شرطیہ نسخہ کامیابی مل جائے گا۔ ایسے لوگوں نے ہی ملک سے فنِ پہلوانی کا جنازہ نکالا تھا۔ بھلا خود مالک مکان بھی پہلے پہلوان ہوگا اور وہ گوشت کے بے ہنگم پہاڑ جن کو بٹھا رکھا تھا اس کے سامنے بیٹھے ہوں گے جب استاد شاگردوں کو سنے پر زور آزمائی سکھائیں گے تو ظاہر ہے فن کا خدا حافظ۔

مگر ہمیں کب وہم بھی تھا کہ کارِ طفلاں تمام خواہد شد۔"

رابعہ اور میں ایک ریڑھی پر لگی ہوئی کڑاہی گرما گرم جنگلی والے کباب بنے کھا کے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے بوتل پی کے لوٹے تب بھی دھواں ہمارے کانوں سے نکل رہا تھا۔ دنگل انتظامیہ کمیٹی مجھ سے مایوس ہو چکی تھی۔ انہوں نے میری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ غالباً وہ متبادل انتظامات پر غور کر رہے تھے۔ چلو تم سو جاؤ ہم بیٹھے ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

ناامید۔" رابعہ نے کہا "پتا چل جائے گا صبح۔"

لیکن صبح بہت دور تھی اور اس پُراسرار مہمان کے غائب ہو جانے سے میری نیند بھی غائب ہو گئی تھی۔ رابعہ نے میری فرمائش پر چائے بنانے کے لیے بجلی کی کیتلی کا پلگ لگایا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور میں اچھل پڑا۔ میں ریوالور ہاتھ میں لے کر دیوار سے لگ گیا۔ دروازہ رابعہ نے کھولا اور غازی کی شکل نظر آئی۔ وہ اندر آ گیا۔

"بھئی سلام علیکم بھائی بہنوں کو۔" اس نے کہا۔

میں نے سکون کا سانس لیا "غازی صاحب۔ آپ شہید ہو جاتے ابھی۔"

وہ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کے مسکرایا "میری بڑی لمبی عمر ہے۔"

"دیر کیا چہ شک۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے تمہیں یاد کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"سو منہ دیکھے کے لوگ ایسا کہتے ہیں۔"

"میں لوگوں میں شامل نہیں ہوں۔ لوگ منافق بھی ہوتے ہیں۔ رابعہ سے پوچھ لو۔"

"اچھا پھر تو وہ بات ہو گئی۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے لیکن یہ بہت مشکل تھی۔"

میں نے کہا "تم جو تانگے کے ساتھ چار منزلیں چڑھ کے تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ہم تو چھت پر بھی دیکھ آئے تھے۔"

"میں نیچے چلا گیا تھا۔ ایک بڑی خوش اخلاق اور خوش مزاج خاتون رہتی ہیں نیچے۔" اس نے رابعہ کی طرف دیکھ کے آنکھ ماری۔

رابعہ چائے بنا رہی تھی اس لیے اس نے کچھ نہیں سنا اور کچھ نہیں دیکھا۔ میں نے کہا "اس بلڈنگ میں آنکھ مارنے کا مرض وبائی صورت اختیار کر چکا ہے۔ تمہیں بھی ہو گیا۔"

اس نے قہقہہ مارا تو رابعہ نے نظر اٹھا کے دیکھا "بڑے خوش ہیں۔"

میں نے کہا "غازی۔ وہ لڑکی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

اس نے آہستہ سے کہا "بڑا خرابی ہے یار۔ مجھے تو ٹھیک لگی۔ کیا لے بیٹھے۔ ہر طرف سے اور خود ہم کون سے اچھے ہیں یار کہ کسی کو بُرا کہیں۔ آج تو دل کو اچھا لگے وہی اچھا۔ کل کس نے دیکھی ہے۔"

میں نے کہا "سچ کہتے ہو تم بھی۔ عیش کرو۔ جانے دو گے۔"

"ابھی پھر پالوں گا۔" اس نے کہا "چائے جیسا ٹھیک ہو تو اس سے بھی بالا تھا۔ کیا نام ہے اس کا۔"

"گلابی کہاں ہے لانی۔" میں نے کہا "بڑی مختصر ملاقات رہی۔"

"کب پھر ہوگی ملاقات۔" اس نے دوسری بار مجھے آنکھ ماری۔ "جس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں تو میں نے کہا کہ میں ابھی

اچانک مالک مکان نے کہا "ارے ڈاکٹر صاحب۔ مہمان نیا تھا آپ کا۔"

میں یوں چونک کے پلٹا جیسے اس نے میرے پیچھے سانپ چھوڑ دیا ہو "میرا مہمان؟"

"آہو جی۔ مہمان ہی کہا ہے میں نے۔ قاری تو نہیں بولے۔"

"پھر کہاں گیا۔ کون تھا؟"

"تمہارا چوہدری تانگے والا۔ اوپر گیا ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی گھر والی کے ساتھ سیر پہ جانے کے لیے نکلے ہیں۔ پر وہ بندہ بھی ڈھیٹ ہے۔ کہنے لگا میں دروازے پر بیٹھ کے انتظار کروں گا۔ ادھر ہی کھڑا تھا جب میں نے دیکھا۔"

میں نے تشویش سے رابعہ کی طرف دیکھا "یہ کون آ گیا ہمیں تلاش کرتا۔"

رابعہ نے کہا "وہ ہوگا غازی بن شہید۔"

"اوہ۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔" میں نے اطمینان کی سانس لی۔

پریشانی مجھے اوپر اپنے مکان کے دروازے پر کسی کو نہ پا کے ہوئی۔ مالک مکان کا کہنا تھا کہ وہ خود دیکھ چکا ہے۔ مہمان واقعی دروازے پر کھڑا تھا۔ پھر وہ کہاں گیا۔ میں نے سوچا اور فطری طور پر مجھے اوپر کا خیال آیا۔ وہ غائب تو ہو نہیں سکتا تھا۔ زینہ دیکھ کے شاید اسے چھت پر جانے کی سوجھی ہو۔ اس کا یہاں آنا ہی خالی از علت نہ تھا۔ زخمی ٹانگ کے ساتھ اس کا چوتھی منزل تک پہنچنا اس کے غازی ہونے کی دلیل تھی۔

وہ چھت پر بھی نہیں تھا "کہاں گیا آخر وہ۔ کہاں ہے۔"

رابعہ نے کہا "وہ واپس چلا گیا ہوگا۔"

"دنگل کمیٹی کو نظر نہیں آیا۔ اتنے مکین تھے وہ پھر ہمیں کیسے دیکھ لیا تھا جانے وقت بھی اور آتے ہوئے بھی۔"

"وہ غالب کا بھوت سر تو ہے نہیں۔"

میں نے کہا "اس سے زیادہ غور طلب یہ سوال ہے کہ وہ کیوں آیا ہے۔"

"کیا تم جانتے تھے۔"

"مگر اسے کیا پتہ۔ مجھی سے علم ہو گیا میری خواہش کا۔ میں نے غالب سے بات کی ہوتی تو سمجھتا کہ اس نے بھیجا ہوگا۔ تم سے میں نے بعد میں کہا تھا کہ غازی میری مدد کر سکتا ہے۔ وہ رسمی ملاقات یا تفریح کے لیے نہیں آ سکتا۔ مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے اس نے۔ اور یہ کیا ضروری ہے کہ وہ غازی ہو۔"

"اور کون ہو سکتا ہے۔ وہ چوہدری تانگے والا۔"

"چوہدری رہا ہو۔ لیکن وہ بات تو غلط ثابت ہو گئی تھی۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی ہوتی تو وہ اتنا تیز کیسے دوڑتا۔ مگر خطرے سے دور بھاگنے کے لیے تو بغیر ٹانگوں والا بھی دوڑتا ہے۔"

"چلو نیچے چلیں۔ ایسے سوچ سوچ کے پریشان ہونے سے کیا

www.paksociety.com

آتا ہوں آنکھیں دکھا کے۔"

"آنکھیں نہیں۔ تمہارا اخلاق خراب ہو گیا ہے۔ تمہارا کوئی علاج نہیں سوائے شادی کے۔ وہ تمہارے بڑے کریں گے۔"

"بڑے" وہ اپنی شادیاں کرنے میں مصروف ہیں۔" غازی ہنسا "تمہیں معلوم ہے میں کیوں آیا ہوں؟"

"ہاں مجھے اس میک اپ آرٹسٹ کی خدمات فراہم کرنے جس نے مجھے جوان سے بوڑھا کر دیا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ کالے کو گورا بنا دے۔"

"مجھے پیغام ملا تھا استاد پیڈرو کا۔ تمہارے لیے۔" اس نے میری بات ان سنی کر دی "غالب سے بات ہوئی تو اس نے کہا کہ جا کے مل لو۔"

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے پیڈرو کی آواز فون پر سن کے اسے کیسے پہچان لیا اور پوچھے بغیر کیوں مان لیا کہ وہ استاد پیڈرو تھا؟"

"میں نے کب کہا ہے کہ وہ یقیناً پیڈرو تھا اور میں اسے پہچان گیا تھا۔" غازی نے رابعہ سے چائے کا مگ لے لیا۔

"پھر یہ کہ کسی بھی معاملے میں بات کرنے کے لیے اس نے براہ راست غالب سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ وہ جانتا ہے کہ تم ان معاملات میں براہ راست کم لوث ہو صرف ایک بار...."

"دراصل" غازی نے چائے کا گھونٹ لے کر ادا کی۔ "اس وقت غالب نہیں تھا جب فون آیا تھا۔ اور میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ آپریٹر نے جو فون ملایا ہے۔ سننے میں غلطی کی۔ غالب اور غازی کے فون غلط ملط ہو جاتے ہیں پھر جب میں نے پیغام غالب کو دیا تو یہ اعتراض اس نے بھی اٹھایا تھا۔ میں نے کہا کہ بھائی یہ تو تم اسی سے پوچھنا کہ اس نے تم سے بات کیوں نہیں کی۔ مجھ سے تو ایک آدمی نے کہا کہ میں استاد پیڈرو ہوں اور میں جانتا تھا کہ وہ کس قسم کا استاد ہے۔ میں نے کہا کہ اچھا ہو تو پھر؟ کیا حکم ہے میرے لیے۔ اس نے کہا کہ ایک پیغام دینا تھا۔ سکندر سے کہو مجھ سے مل لے۔"

میں نے مگ رکھ دیا "ایک منٹ۔ فون کب آیا تھا؟"

"ابھی کوئی دو ڈھائی گھنٹے پہلے۔"

میں نے کہا "ایک گھنٹے پہلے غالب یہاں سے گیا تھا۔ تم سے اس کی کہاں ملاقات ہوئی؟"

"ملاقات نہیں ہوئی۔ میں نے اس کے گھر فون کیا تھا۔"

"کون سے گھر؟"

"ایک نمبر دے رکھا ہے اس نے مجھے۔ وہیں وہ موجود تھا۔ اس نے کہا مجھ سے تو میں آ گیا ورنہ میرا کیا تعلق تمہارے معاملات سے۔" میری جرح نے اس کا موڈ آف کر دیا۔

"شرافت مانو۔ ہم پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ اعتبار کے دھوکے میں کئی بار نقصان اٹھا چکے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے تم پر بھی اعتبار نہیں۔ اندیشہ یہ ہے کہ دھوکہ تمہارے ساتھ نہ ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"اصل بات تم نے ابھی تک نہیں پوچھی۔"

"یہ کہ پیڈرو نے کب اور کہاں ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے؟"

"آدمی تم ذہین ہو۔ میں نے پوچھا تھا کہ استاد محترم اگر سکندر ملنا چاہے تو ملاقات کب اور کہاں ہو گی؟ اس نے کہا کہ یہ میں پھر بتاؤں گا اور فون بند کر دیا۔"

"اچھا اب کبھی اتفاق ہو کہ غالب نہ ملے اور تمہاری بات ہو پیڈرو سے تو اس سے کہنا کہ سکندر تیار ہے بشرطیکہ تم ایسی جگہ کا انتخاب کرو جہاں کسی کی مداخلت کا امکان نہ ہو مثلاً جنگل میں۔ کوئی مضبوط تنے والا درخت ہو۔ ہر قتل کے اعتراف کی تحریر کے علاوہ تم رسی بھی اپنے ساتھ لاؤ۔ سکندر تمہیں پھانسی دینے کے لیے پہنچ جائے گا۔"

غازی کا رنگ ایک لمحے کے لیے پھیکا پڑا "کہہ دوں گا۔ میرا کیا ہے۔"

میں نے نظر جما کے دیکھا "ویسے تمہارا مشورہ کیا ہے۔"

اس نے سوچ کے کہا "اگر تم ڈرتے نہیں تو مل لو اس سے۔"

"فائدہ ہو گا؟"

"نقصان کیا ہو گا؟" وہ بولا۔

"زیادہ سے زیادہ جان کا۔ لیکن دوست ہمارے پاس لے دے کے یہی ایک جان ہی تو ہے جس کی حفاظت کے لیے ہم در بدر یہ سب بہروپ اختیار کرتے ہیں اور راستے بار بدلتے ہیں۔ خیر پیڈرو کی خواہش کابینہ کے سامنے رکھی جائے گی اور عام بحث کے بعد رائے سب کی۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا "بہت دیر ہو گئی باتوں میں۔ میں نے تو ڈگی بجا کے کہا تھا کہ یوں گیا اور یوں آیا۔"

میں نے طنز سے کہا "ناک کیے بغیر اندر مت گھس جانا۔ کیا پتہ اتنی دیر میں اس کا شوہر آ گیا ہو۔"

"شوہر! کیا وہ شادی شدہ ہے؟"

"کہنے کو تو ہے۔ ویسے بھی احتیاط اچھی چیز ہے۔"

وہ کچھ کہا لیکن آدمی ڈھیٹ قہقہہ مارتے رخصت ہو گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور سامنے سے ہٹ گیا۔ دس سیکنڈ کے بعد میں نے اس امید میں ایک دم دروازہ کھولا کہ غازی چابی کے سوراخ میں سے اندر جھانک رہا ہو گا یا کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو گا لیکن مجھے مایوسی اور شرمندگی ہوئی۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں غازی کے طرز عمل نے مجھے شک میں ڈال دیا تھا۔ آخر وہ میری اور پیڈرو کی ملاقات میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا تھا۔ اصولاً تو غالب کو پیغام دینے کے بعد اس کا کام ختم ہو گیا تھا ورنہ وہ غالب سے کہہ سکتا تھا کہ مجھے تو معاف ہی رکھو۔ پچھلی بار تمہارے پھڈے میں پڑا تھا تو ایک ٹانگ ضائع ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ فون

ہموار ہوئی اس نے مجھے نروس کر دیا۔

"وہ میں معافی چاہتا ہوں۔ غازی سے کچھ کام تھا مجھے۔"

"غازی؟ کون غازی۔" اس نے جمائی اور پھر ایک قاتل انگڑائی لی۔

"غازی بن شمید۔ وہ صحافی ہے ویسے تو۔"

"سوری۔ میں تو اکیلی ہوں اس وقت۔ اس بہانے آپ اندر آنا چاہیں تو آ سکتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ تلاشی لے لیں۔" اس نے آنکھ ماری۔

میں نے کہا "نہیں میں اندر نہیں آ سکتا۔ بیوی نے دیکھ لیا تو... وہ لنگڑا کہہ رہا تھا۔"

"کون لنگڑا۔ آپ کو نیند میں بولنے اور چلنے کی عادت تو نہیں ہے؟" وہ مسکرانے لگی۔

"وہ صحافی لنگڑا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ جب ہم آئے تو وہ...."

"اچھا وہ آپ کا مہمان؟" لالی نے تلخ لہجے میں کہا "فراڈ ہو گے یار۔ میں نے اس لیے بٹھا لیا تھا کہ آپ گھر پر نہیں تھے۔ وہ میری ڈائری اٹھا کے لے گیا اور واپس بھی نہیں آیا۔"

"کیا تھا ڈائری میں؟"

"ڈائری میں کیا ہوتا ہے۔ آپ کیا لکھتے ہیں ڈائری میں؟"

"روز کا خرچ۔ دھوبی کا حساب۔ لیکن آپ کی ڈائری یقیناً آپ کے لیے اہم ہو گی۔ کیا آپ کو یقین ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ممکن ہے آپ نے کہیں اور رکھ کے بھول گئی ہوں۔"

"جب وہ گیا تھا تو ڈائری یہاں رکھی ہوئی تھی۔ میرے تکیے کے نیچے بالکل سامنے۔ بعد میں مجھے پتہ لگا۔ اس کے سوا یہاں کوئی نہیں آیا اور ڈائری کو میں تکیے کے نیچے رکھتی ہوں یا دراز میں۔ کسی اور جگہ میں نے بھول کے بھی نہیں رکھی۔ آپ کہہ رہے ہیں وہ لنگڑا تھا؟" وہ پریشان نظر آنے لگی "وہ ضرور بلیک میل کرے گا مجھے۔"

"اگر اس میں ایسا مواد تھا تو شاید۔"

"ایسے دوست ہیں آپ کے؟ آپ اسے منع نہیں کر سکتے؟"

میں نے کہا "وہ میرا دوست ہرگز نہیں ہے۔ اپنی آنکھیں دکھانے آیا تھا۔ میں اسے کیسے منع کر سکتا ہوں۔ مجھ سے تو اس نے بتایا کہ وہ آپ کا مہمان ہے اور آپ نے ہی اسے بھیجا تھا میرے پاس۔"

"میں نے؟" لالی نے برہمی سے کہا۔

"ہاں۔ آپ نے کہا تھا کہ آنکھیں خراب ہیں تو اوپر ایک ڈاکٹر رہتے ہیں۔ جا کے دکھاؤ۔ میں نے آپ کی وجہ سے فیس بھی نہیں لی تھی۔" میرے لیے اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اپنا پول چھپانے کے لیے سفید جھوٹ سے کام لوں۔

"مرد سب ایسے ہی ہیں آپ بھی۔"

ہوتا تو میں غالب سے بھی معلوم کر لیتا کہ اس نے غازی کو اس وقت میرے پاس پیغام بر بنا کے بھیجنے کی اشد ضرورت کیوں محسوس کی تھی۔ یہ پیغام تو صبح بھی دیا جا سکتا تھا۔

رابعہ نے کہا "غازی پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"شک سے فائدہ ہو سکتا ہے نقصان نہیں۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے پورا اطمینان کر لینا حالات کا تقاضا ہے۔"

رابعہ خاموش ہو گئی اور کچھ دیر بعد سو گئی۔ میں دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ میرے دل میں ایک خلش سی تھی کیونکہ غالب بھی سوچے سمجھے بغیر کام نہیں کرتا تھا۔ جب تک کوئی مجبوری لاحق نہ ہوتی وہ ایک معمولی سے کام کے لیے غازی پر انحصار نہ کرتا۔ ایک گھنٹا پہلے اسے کوئی مجبوری درپیش نہ تھی لیکن یہ بھی بعید از امکان تو نہیں کہ وہ گھر پہنچا ہو (بی اماں اور یوسف کا گھر ہی سب کا گھر تھا) تو کوئی نئی بات ایسی معلوم ہوئی ہو۔ لاحول ولا قوة۔ میں نے غازی سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ غالب نے اسے رابطے کے لیے کس کا فون نمبر دیا تھا؟

نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ میں نیچے جا کے دیکھوں۔ کیا واقعی وہ آج رات لالی کرایہ دار کا مہمان تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے قطعی تعجب نہ ہوتا مگر وہ نہ ملتا تو اس جھوٹ کے پس پردہ غازی کے عزائم کا کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا۔ سوال یہ ہے کہ میں کس بہانے اس وقت لالی کا دروازہ بجا کے یہ پوچھوں کہ کیا مسٹر غازی بن شمید یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ یہ سخت بداخلاقی اور بدتمیزی کی بات ہوتی۔ غازی کیا کہے گا اور لالی کیا سمجھے گی۔ بھاڑ میں جائیں دونوں۔ جو سمجھتے ہیں سمجھا کریں۔ مجھے کوئی تو مارنے سے رہا۔

میں اٹھ کے دبے پاؤں دروازے تک گیا اور آواز کیے بغیر کنڈی کھولی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری اس معیوب حرکت کا علم رابعہ کو بھی ہو۔ وہ مجھے رنگ میں بھنگ ڈالنے کی غیر شریفانہ حرکت کی ہرگز اجازت نہ دیتی۔ ایک سیڑھی میں ننگے پاؤں ہی اتر گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اسی وقت لال چیونٹے بھی سیر سپاٹے کے لیے نکلتے ہیں۔ تین بار لال چیونٹوں نے مجھے کاٹا۔ شاید اس افسوس ناک بلکہ شرمناک حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

میں نے گھنٹی بجانے سے پہلے نیچے جھانکا اور پھر دروازے سے کان لگا دیے۔ اگر مالک مکان "لالی" یا رابعہ مجھے اس پوز میں دیکھ لیتے تو وضاحت مشکل ہو جاتی اور مجھے خاصا شرمندہ کیا جاتا کہ چوری چوری خلوت کی آوازیں سن رہے تھے؟ شیم آن یو مسٹر سکندر بخت۔

اندر خاموشی تھی اور اندھیرا تھا۔ اس میں کوئی غلط بات نہیں تھی۔ میں نے دل کڑا کے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ اندر روشنی ہونے تک میں نے خود کو پرسکون اور پراعتماد کر لیا اور اپنے لبوں پر ایک معذرت خواہانہ مسکراہٹ طاری کر لی۔ لالی پریشان بال، کھنچی خواب ناک آنکھوں کے ساتھ جس شب خوابی کے لباس میں

www.paksociety.com

"میرا خیال ہے ہم دونوں کے ساتھ فراڈ کیا اس نے۔ معلوم نہیں اس کا نام غازی بن شہید تھا یا نہیں۔ ایسا نام ہونا تو نہیں کچھ عجیب لگا تھا مجھے۔"

"پھر وہ صحافی بھی نہیں ہوگا۔" لالی نے کہا۔

"مجھے یہی بتایا تھا اس بدمعاش نے۔ لیکن وہ لنگڑا تو تھا۔"

"بالکل بھی نہیں۔ کم از کم میرے سامنے وہ ٹھیک چلتا رہا۔"

"مجھے مالک مکان نے اسے لنگڑا ہی بتایا تھا۔" میرے منہ سے نکل گیا۔

"مالک مکان نے! آپ کو آخر کیوں بتایا تھا؟"

"شاید اس نے میرا نام لیا ہوگا۔ اوپر آیا تو آپ کا مہمان جو کب یہاں سے ڈاڑی لے گیا۔ پتا نہیں میرے گھر سے کیا لے گیا ہوگا۔ میں ابھی جاکے دیکھتا ہوں؟" میں اب فرا اٹھنا چاہتا تھا۔

ایک منٹ ڈاکٹر صاحب" لالی نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "فرض کریں وہ یہاں ہوتا تو آپ کیا بات کرتے اس سے؟"

میں نے ایک گہری سانس لی "جو آپ نے بتایا ہے تو میں بھی بتا دیتا ہوں۔ ایک خاص قیمتی گھڑی تھی میری۔ خالص سونے کی چین والی۔"

"گھڑی تو آپ کے ہاتھ پر ہے۔"

"نہیں وہ تکیے کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ لوگوں کو عادت ہوتی ہے تکیے کے نیچے ایسی چیزیں رکھنے کی۔ اس سے فائدہ اٹھایا اس بدمعاش نے۔ خیر آپ بھی صبر کریں، میں نے بھی بلا وجہ ہی جگایا آپ کو۔"

"آپ اس کی رپورٹ کیوں نہیں کرتے۔ چوری آپ کی ہوئی ہے۔"

"کیا فائدہ۔ پولیس آپ کو بھی پریشان کرے گی۔ ڈائری تو آپ کی بھی گئی ہے۔ پولیس پوچھے گی کہ آخر ایسی کیا بات تھی اس میں۔"

"میں ڈائری کا نام نہیں لوں گی لیکن وہ پکڑا گیا تو شاید۔"

"اگر پکڑا گیا تو آپ کا نام لینا ہی پڑے گا۔ کہ آپ کا مہمان تھا وہ۔ مجھ سے یہی جھوٹ بولا تھا اس نے۔ خدا حافظ اور شب بخیر۔"

میں اوپر گیا تو رابعہ دروازے میں کھڑی تھی۔ اس نے پہلے مجھے اور پھر میرے ننگے پیروں کو دیکھا "یہ کیا آوارہ گردی ہو رہی ہے اس وقت؟"

میں نے خفت سے سر کھجایا "تم نے اگر ساری باتیں سنی ہیں۔۔۔"

اس نے دروازہ بند کیا "باتیں تو سنی ہیں مگر اتنا جھوٹ سکندر۔"

"بابا جھوٹ نہ بولتا تو خود پھنس جاتا۔ یہ غازی تو بڑا ہی چکرباز ثابت ہوا۔ میری ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ خطرہ ہے یا خیر خواہ۔"

"تم صبح تک انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ غالب سے پوچھ لیتے۔"

اب مجھے رابعہ کو سب بتانا پڑا "دراصل وہ مجھ سے کہہ گیا تھا کہ آج رات لالی کا مہمان ہوگا۔ یہیں بیٹھا ہوا تھا اور گھر واپس جانے کا کہہ کے لوٹ کے لالی کرماں والی کے پاس نہیں گیا۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ وہ لالی کے ساتھ نہیں ہوگا۔ اس کی تصدیق صبح نہیں ہوسکتی تھی۔"

رابعہ مطمئن نہیں ہوئی "کیوں نہیں ہو سکتی تھی۔ لالی ہی بتا دیتی۔"

"یار مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔" میں نے جھلا کے کہا "خلش سی تھی میرے ذہن میں جو مجھے پریشان کر رہی تھی۔ میں نہیں رہا اور معلوم کرنے چلا گیا تو کوئی گناہ کیا؟"

"گناہ کی بات نہیں۔ مالک مکان دیکھ لیتا تو کیا سمجھتا؟"

"ابھی جس کا دل چاہے سمجھے۔" میں نے کہا اور منہ تک چادر لپیٹ کے پڑ گیا "ڈر کیا کہا ہے کسی نے ڈرتے نہیں وفا میں مسلمان کسی سے۔ سوائے اللہ کے اور بیوی کے۔ ہاں۔"

کچھ دیر بعد رابعہ کی آواز آئی "یہ غازی بلیک میلر تو نہیں ہے؟"

میں نے چادر سے منہ نکالے بغیر کہا "میں سوچ رہا ہوں۔ وجہ اس کا جواب ہے کہ واللہ اعلم بالصواب۔"

رابعہ ہنسی "چوروں کی طرح منہ چھپا کے کیا سوچ رہے ہو؟"

"لالی کرماں والی کے بارے میں۔ کوئی اعتراض! خواب میں بھی اسے رکھوں گا۔ سونے دو مجھے۔"

"رابعہ بولی "ایک شعر سنو۔

تمہارا جو ذرا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس حال میں دیکھا

"وہ ایسی ہی ہے۔ تم جلتی ہو۔" میں اٹھ بیٹھا "دیکھا اس نے کہا تھا کہ فون ضروری ہے۔ ابھی غالب سے بات کر لیتے ہیں غازی سے۔"

"یہ بھی کوئی ایسا کام نہیں جو صبح پر نہ ٹالا جاسکے۔" وہ منہ پھیر کے سو گئی "تم سو جاؤ۔"

بالآخر میں بھی سو گیا۔ رات کو میں نے الٹ پلٹ خواب دیکھے۔ میں نے دو لنگڑوں کو دیکھا جو تیز بھی تیکھا لگتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ ایک میرا پیچھا کر رہا تھا دوسرا لالی کا۔ وہ اسی کا باپ تھا بالی میں تھی۔ ایک لنگڑا وکار تھا۔ دوسرا غازی۔ اور وہ دوسرے ہی اس ریس میں حصہ لے رہے تھے۔ دوسرے خواب میں مجھے اور ڈاکٹر حوالات کے اندر نظر آیا۔ حوالات کے اندر ایک لاش بھی پڑی تھی۔ یہ ڈاکٹر شبلی کی لاش تھی اور وکار رقص کے مجھے بتا رہا تھا کہ اس نے خودکشی کی تھی۔ ایسے سکندر صاحب۔

صبح رات کا خواب ابھر آیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نہانے ہوئے ٹھنڈا پانی کھولنا بھول گیا ہوں اور خالص گرم پانی نہا رہا ہوں۔

میں یہ سب نہیں ہوگا تو میری سزا زیادہ سخت ہوجائے گی۔ وہ جو خاقہ کشی ہیں اور اجلی بات بات پر رہتے ہیں ان کو جیل کی سختی سے اتنا فرق نہیں پڑتا۔ وہ عادی ہوتے ہیں۔"

اس نے متاثر ہوئے بغیر کہا "چپ چاپ ناشتا کرو۔ ابھی آپ جیل نہیں جا رہے ہیں۔ اور نہ میں جانے دوں گی۔"

"ہاں۔ تم خود جیلر سے کم ہو کیا۔ اس وقت بھی حکم چلا رہی ہو۔ مگر سرکاری جیل میں جانا پڑا تو تمہارے دلائل کوئی جھوٹ نہیں بیا کہ تم مجھے کبھی بتا کے اناڑی یا غائب کردو اور پولیس کے ہاتھ میں خالی ہتھکڑیاں رہ جائیں۔ وہ منہ دیکھتے رہ جائیں کہ ملزم کدھر گیا؟"

"لالی آئی تھی۔"

"اچھا۔ تمہارے خواب میں بھی آئی تھی؟" میں نے رابعہ کی بات کے بیچ میں کہا۔

"وہ بہت پریشان ہے۔ ڈائری کے نہ ملنے سے۔ غازی سے پوچھنا ہے کہ اس نے یہ گھٹیا حرکت کیوں کی آخر؟"

میں نے کہا "خاتون۔ وہ غالب جیسا صحافی نہیں ہے۔ دیکھیں بابا گلگروں کی طرح اس پیشے میں بھی بدنام بدمعاش اور بد کردار لوگ ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک کوئی حرکت گھٹیا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی کو بھی بلیک میل کرسکتا ہے اور شاید اسی طرح عیاشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ وہ نہ صحافت کا غازی ہے نہ کبھی شہید ہوگا۔ یہ مختار کا غازی ہے کردار کا نہیں۔ اپنی صحافی برادری کے ساتھ تو لا تعلق جتنا ہوگا قربانی دینا کے ساتھ نہیں۔ پھر بھی میں غالب کی معرفت اسے تمہاری تشویش سے آگاہ کردوں گا۔ لالی کے لیے تمہاری ہمدردی تمہاری عالی ظرفی اور میری کمینگی کی دلیل ہے۔"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔"

"چلو میں اعتراف کر رہا ہوں۔ تمہارا دل بہت چوڑا ہے۔ میرا مطلب ہے وسیع القلب بھی ہو تم۔ رقیق القلب ہونے کے علاوہ۔ اور اب مجھے اجازت دو خاتون کہ میں اس کمینی دنیا سے دو دو ہاتھ کرنے جاؤں۔ اور فتح مند واپس لوٹوں۔ آئینہ دیا دو مجھے۔"

رابعہ ہنسنے لگی "وہ تو غالباً بزرگ دیتے ہیں۔ ہندوؤں میں۔"

"اچھا تم اجازت دو دعا کے ساتھ۔"

"کمینہ! ہر جانے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔"

"کیا مطلب۔ میں اور تم آخر کب تک یہاں چھپے رہیں گے۔ استخارہ بنتل نہ ہم بھی نہ تھے اور پھر یہی وقت ہے کچھ کرنے کا۔ بلاوہ بہت عرصے بعد خود کو غیر محفوظ سمجھ کے بھاگ رہا ہے۔ ہمیں کام مکمل کرنا ہوگا جہاں تک کہ دلاور پر فرار کے سب راستے بند ہوجائیں گے اور اس کی کمر دیوار سے لگ جائے تو وہ خود ہاتھ اٹھا دے۔ وہ ست دیار میں ہے اور ہمیں دباؤ بڑھانا چاہیے۔"

"کسی ذاتی خوشی میں مست رہتا۔ وہ ذہنی سانپ ہے۔ پلٹ کے ڈنک ضرور کرے گا۔"

میرے اوپر گرا ہے۔ آنکھ کھلی تو رابعہ کو دیکھا۔ وہ چائے کی پیالی لیے کھڑی تھی اور اس میں چمچ ڈبو کے ایک ایک قطرہ میری ناک پر ٹپکا رہی تھی۔

میں ناک ملتا اٹھا "یہ کیا ہے بی بی! یہ تو بڑا ظالمانہ طریقہ ہے کسی مظلوم کو جگانے کا۔"

"مظلوم صاحب نو بج رہے ہیں۔"

"پھر وہ نو بجے کیا مجھے ایسے ہی کھولتا پانی ڈال کے جرائم سے پاک کیا جائے گا؟"

"یہ چائے ہے گرم پانی نہیں۔"

"گرم چائے کیا ناک پر ڈالی جاتی ہے۔ یا تم ناک کے راستے چائے حلق میں اتارنے کی کوشش کر رہی تھیں۔" میں نے پیالی لے لی "ویسے کتنا اچھا ہوتا اگر تم ایمن کلیان کے سروں میں گنگناتیں "جاگو۔۔۔ جاگو۔۔۔ موہن پیارے۔" اور میں آنکھیں کھولتا تو تمہاری زلف عنبریں مجھ پر ابر سیاہ کی طرح سایہ فگن ہوتی۔"

وہ ہنسی "یہ کس رومانی زمانے ناول کا سین تھا؟"

"لکھا جائے گا۔۔۔ بلکہ لکھا جا رہا ہے" میں نے چائے پیتے ہوئے اسے غور سے دیکھا "ہر لمحہ۔۔۔ ہر گھڑی۔۔۔ صبح و شام۔ تمہاری رفاقت کی ہر ادا کے عنوان سے اس کا ایک ایک باب مکمل ہو رہا ہے۔"

"ہاتھ منہ دھو کے آجاؤ تو ناشتا کریں۔" اس نے شرما کے واپس جاتے ہوئے کہا۔

میں چائے کی خالی پیالی لیے بیٹھا رہا۔ محبت، خدمت اور رفاقت کے جذبات کی بھرپور توانائی کے ساتھ عورت کسی بھی مرد کی ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے اور پھر اسے عادات کا غلام بنا کے اپنے تابع کر سکتی ہے۔ وہ اس پر اتنا انحصار کرنے لگتا ہے کہ ذہنی اور جسمانی طور پر اپاہج ہو جاتا ہے۔ صبح بیڈ ٹی سے دن بھر اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا اور بن مانگے ہی اس کو ہر آسائش فراہم کر دینا بھی مامتا کا ایک انداز ہے۔ وہ بچہ اسی طرح شوہروں کی دیکھ بھال کرتی ہیں جیسے بچوں کی۔ پھر شوہر بھی بچے بن جاتے ہیں اور خود کچھ نہیں کرتے۔

ناشتے پر میں نے احتجاج کیا "تم میرا جذباتی استحصال کر رہی ہو۔"

رابعہ نے حیرانی سے کہا "وہ کیسے؟"

"یہ سب کیوں کر رہی ہو تم۔ یہ تو میں شادی کے بعد بھی نہیں چاہتا۔ ایسی ناز برداریاں کسی نشے کی لت سے کم تباہ کن نہیں ہوتیں۔ جب نشہ نہ ملے تو زندگی کی کیا حالت ہوتی ہے۔"

اس نے مسکرا کے کہا "تم نے سگریٹ چھوڑ کے ثابت کر دیا ہے کہ تم نشے کے عادی نہیں ہو سکتے۔"

"رابعہ۔ تم میں اور سگریٹ میں بڑا فرق ہے۔ ابھی مجھے سخت زندگی گزارنے کی عادت ڈالنا چاہیے۔ مجھے اگلی کا کیا پتا شاید

www.paksociety.com

جنہیں اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہونا۔ تمہیں بھی ڈاکٹر شکیل کے کیس کو آگے بڑھاتا ہے یہاں تک کہ پولیس بھی عدالت کے حکم سے مجبور ہو جائے۔ دلاور کی گرفتاری کے لیے۔ اگر اس کے خلاف ایف آئی آر درج ہے اور اس کا پاسپورٹ بھی ضبط ہو گیا ہے تو واقعی اس کے برے دن آ گئے ہیں۔ صلح صفائی کی پیش کش وہ پہلے بھی کر چکا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان حالات میں اس کا سر کتنا جھکتا ہے۔ وہ قدموں میں سر رکھتا ہے یا...."

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا "تمہارے سامنے وہ کبھی سر جھکانے نہیں آئے گا۔"

"اس کا باپ بھی آئے گا مس رابعہ۔ وہ ہماری طرح نہیں ہے جو سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں۔ عزت غیرت اور حمیت کے جذبات کسی پُرفریب اور مکار آدمی کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے.... وہ ضرور مجھ سے رابطہ کرنا چاہے گا اور میری شرائط پر معاملات کا تصفیہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ تم نے کبھی شطرنج کھیلی ہے؟"

"جی نہیں۔ میں افیون نہیں کھاتی۔"

"خیر اس میں شاہ کو مات ہونے لگے تو ہر مہرہ قربان کیا جا سکتا ہے۔ وزیر تک مارا جاتا ہے" میں نے کہا "شاہ دلاور کا وزیر ہے استاد پیڈرو۔ ابھی تک وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اب شاید مجبور ہو کے اسے ہمارے حوالے کر دے۔ کسی چکر بازی کے بغیر۔"

"اور اس کے بعد....؟"

"شاہ کی بادشاہت کس کے دم سے ہوتی ہے۔ سپاہ کے دم سے۔ سارے مہرے پٹ جائیں گے۔ وزیر تک نہیں ہو گا تو شاہ کب تک مات سے بچے گا اور بچ کے جائے گا کہاں۔ بساط کی طرح یہ دنیا بھی بڑی محدود ہے۔ شطرنج کی چالوں کے بارے میں یہ سچ ہے کہ لا محدود ہیں مگر پھر بھی آخر میں شاہ کے لیے ایک گھر بھی نہیں رہتا۔"

"یعنی تم ابھی پیڈرو پر قناعت کرو گے؟"

"فی الحال۔ یہ ایک عبوری اور عارضی سمجھوتا ہو سکتا ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔ دلاور کا حساب بعد میں چکائیں گے پہلے پیڈرو کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔"

"وہ خود بھی اتنی آسانی سے ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔ آخر دلاور جیسے استاد کا شاگرد ہے۔"

"استاد کے آگے کیا استادی چلے گی اس کی۔ دلاور اسے بوری میں بند کر کے یا پنجرے میں ڈال کے ہمارے حوالے کر سکتا ہے اگر وہ واقعی چاہے۔"

تھوڑی سی بحث کے بعد رابعہ مان گئی اور میں چھت پر چڑھ گیا۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ مالک مکان صاحب تشریف لے آئیں تو انہیں باتوں میں لگا کے رکھے اور چھت پر نہ آنے دے ورنہ میری خفیہ سرگرمیوں کو دیکھ کے وہ نہ جانے کیا نتیجہ اخذ کریں گے۔"

"وہ تو ایک بے وقوف اور بے ضرر سا آدمی ہے۔"

میں نے کہا "بے وقوف آدمی ہی مسائل پیدا کرتا ہے۔ وہ مجھ سے تو کچھ پوچھے گا نہیں۔ باہر اعلان کر دے گا کہ ایک انڈین ایجنٹ چھت پر موجود ہے جس نے جعلی ڈاکٹرین کے مکان کرائے پر لے لیا تھا مگر اس وقت وہ وائرلیس پر سرحد پار بھارتی انٹیلی جنس سے رابطہ کر کے انہیں اہم معلومات فراہم کر رہا ہے تاکہ شام تک کوئی حملہ نہ ہو جائے۔"

"کون مانے گا ایسی بے سروپا بات۔"

"دس میں سے آٹھ ضرور مانیں گے۔ ابھی حالات بھی ایسے ہیں اور بھارت کے خلاف جذبات نے ایسا ماحول بنا رکھا ہے کہ حقائق کی تصدیق بعد میں ہوتی ہے پہلے لوگ مار مار کے دنبہ بنا دیتے ہیں اور پھر تھانے پہنچا دیتے ہیں۔ تھانے میں کسی کو کچھ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ سیاہ کو سفید' فرشتے کو شیطان۔"

میں نے ریسیور آن کیا تو حسب توقع وہی شخص بولا جو غالباً اسی کام پر مامور تھا کہ فون ریسیو کرے یا ریڈیو کال اور چوہدری صاحب کو' وہ جہاں بھی ہوں۔ پیغام پہنچائے کہ کوئی ان سے ملاقات یا مذاکرات کا متمنی ہے۔ پھر صاحب جیسے چاہیں۔ آج ایسے لوگ افسر یا بطور پی آر او کہلاتے ہیں۔ ذرا نچلی سطح کے افسران کے لیے ان کے پی اے یہ کام بڑی سیاسی خوش خلقی' ذہانت اور مہارت سے کرتے ہیں۔ کوئی پی اے یا پی آر او اتنا ہی کامیاب ہے جتنا باس کا مزاج شناس ہو۔ یہ جانتا ہو کہ باس کے لیے کون اہم ہے اور کون غیر اہم۔ کسے دیکھ کے ان کی آنکھوں کو سرور ملتا ہے کس سے دل کو قرار آتا ہے اور کس سے ملنا مجبوری ہے۔ کسے دھتکارا جاتا ہے۔ کسے رکھائی سے ٹالا جاتا ہے اور کسے خوب صورتی سے۔ کس سے کہا جاتا ہے کہ صاحب میٹنگ میں ہیں اور کسے بتایا جاتا ہے کہ وہ چشم براہ ہیں' صرف آپ کے لیے۔"

دلاور کے اس پی اے نے بھی اب یہ جان لیا تھا کہ میں تیسری قسم کا ملاقاتی ہوں جس سے نہ چاہنے کے باوجود ملنا پڑتا ہے۔ میں کون ہوں کیا ہوں؟ یہ جاننا اس کے لیے ضروری نہیں تھا۔

"آپ میرے باپ بول رہے ہو نا زی؟" اس نے غالباً دانت نکالتے ہوئے کہا "آواز پہچان لی ہے میں نے۔"

"تمہارا دوسرا باپ کہاں ہے؟" میں نے غرا کے کہا۔

"ابھی بات کراتا ہوں زی" وہ شاید نئی کو زی اور شین کو سین بولتا تھا۔ شاید اس کے سامنے والے ایک دو دانت نہیں تھے چنانچہ خلا میں سے ہوا نکل جاتی تھی۔

کچھ دیر بعد دلاور نے کہا "یار سکندر۔ آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے فلمی ولن اسٹائل کا قہقہہ مارا "آج پوچھ رہے ہو اپنے چوہدری صاحب؟ اتنے ایکشن اور ایڈونچر کے بعد پہلی

"رکھو جی۔ وہ ڈائری مجھے ہر قیمت پر واپس چاہیے۔"

"یہ بات ہے" میں نے متفکر چہرہ بنایا "کچھ پتا تو چلے کہ ڈائری کیا بات تھی اس میں۔"

"وہ ضرور مجھے بلیک میل کرے گا۔ آپ تو جانتے ہو۔ میں کوئی۔ شریف لڑکی نہیں ہوں" وہ نظریں چرا کے بولی "اس میں کچھ لوگوں کے نام اور پتے ہیں جو انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیے تھے۔ کچھ خفیہ پتے ہیں اور خفیہ فون نمبر جن کا پتا ان کی بیویوں کو نہیں ہے۔"

"رنگین گُڈ۔ اور کیا ہے.... وہ نے کی ضرورت نہیں' جب اتنا بتا دیا ہے تو سب بتا دو" میں نے کہا۔

"وہ.... اور بھی بہت کچھ ہے۔"

"مثلاً.... ایسے ثبوت جو مٹائے نہیں جا سکتے اور جن سے کسی بھی عزت دار کہلانے والے کا اس دنیا میں منہ کالا ہو سکتا ہے۔ تم تو شاید کرائی رہتی ہو محروب" سوائی میں میرے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی جو معیوب تھی۔

رابعہ نے مجھے گھورا "لالی بہت پریشان ہے۔"

"پریشانی کی بات تو ہے۔ اس کے ذریعہ آمدنی پر کسی اور نے قبضہ کر لیا ہے۔ اب یہ بے چاری کیا کرے گی۔ جتنا یہ وصول کرتی تھی اس سے دگنا نازی وصول کرے گا مگر لالی کو کچھ نہیں دے گا۔ لالی سے یہ خود وصول کرنے آ رہا ہے گا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "میں بہت ذلیل ہوں۔ کیا کروں.... مقدر میں ذلت تھی۔"

رابعہ نے اسے تسلی دی "ڈائری مل جائے گی لیکن اسے ضائع کرنا لالی۔ یہ خطرناک کام تمہارے بس کا نہیں۔ اگر تو بلیک میل ہوتے ہیں تو دسواں بلیک میل کرنے والے کو ہر ثبوت کے ساتھ اُڑا دیتا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ صرف نام پتا لکھ لینے سے کسی عزت دار کی عزت کو کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ بہت لوگ نہ جانے کس کس کو پتا لکھ دیتے ہیں۔ کارڈ بانٹتے پھرتے ہیں۔"

"ہوتا تم بھی وہی.... وکیل ہونے کے باوجود ناقص العقل۔ مانی ڈیئر رابعہ' کسی کو پتا لکھ کے دینا واقعی کوئی غیر اخلاقی بات نہیں مگر سوچو کہ لالی جیسی لڑکی کے پاس ایک ہی ڈائری میں سب کے پتے ٹیلی فون نمبر تک کہ خفیہ نمبر ہوں۔ تو صاف پتا چلتا ہے کہ یہ سب ایک حمام میں ننگے ہونے والے لوگ ہیں۔"

"اس میں اور بھی بہت کچھ تھا" لالی نے اعتراف جرم کر لیا۔

"تم نے کہا' تصویریں؟"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا "ڈائری کے بیک کور میں۔ چمڑے کی جلد کے اندر' سامنے والے کور کے پیچھے چپک تھے۔"

"ایسے احمق بھی تمہارے مہمانوں میں تھے؟"

پوچھ لیتے تو میں مطالبات کی فہرست پیش کر دیتا اور تم دستخط کر دیتے.... بتا بھی۔"

"دیکھو میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تو آ جاؤ میری کوٹھی پر۔ کراؤن سنیما کے سامنے ہے۔ تم نے تو دیکھی ہو گی۔"

"میں سیریس ہوں۔"

"مگر میں زندگی میں کبھی سیریس نہیں ہوا۔ تم تو جانتے ہو میں جوکر ہوں۔"

"مجھے تو پتا ہے.... میری بیوی نے سب بتا دیا ہے.... اور میرے بیٹے فیصل نے بھی کہ تم نے ان کے ساتھ بڑی شرافت سے کام لیا۔"

"سیاست سے کام لیا" میں نے دلاور کی تصحیح کی "میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں شریف جتنی بے وقوف ہوں۔ تم سب ایک خاندان نہیں ایک ڈراما گروپ ہو۔ سب پیدائشی ایکٹر ہیں جن کو تمہاری تربیت اور ڈائریکشن نے کامل کر دیا ہے۔ تمہارا ایک بھائی تھا اکبر خان۔ پھر تمہاری بہن بن کے شیلی آئی لیکن وہ اپنا رول بھول گئی۔ تم نے اسے دنیا کے اسٹیج سے بھی رخصت کر دیا۔ تمہاری بیوی اور بیٹا اپنا رول نبھا گئے۔"

"میں نے تمہیں ہمیشہ ایک بہادر دشمن تسلیم کیا ہے۔"

"چھوڑو یہ فضول باتیں۔ پیڈرو کہاں ہے؟"

"پیڈرو۔ مجھے نہیں معلوم۔"

"تمہیں معلوم ہے دلاور۔ نہیں معلوم تو معلوم کر لو شام تک" میں نے اس کا جواب سنے بغیر ریسیور بند کر دیا۔

میں لمبی بات کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ نیچے آتے ہوئے میں نے وائرلیس کے ایریل کا تار کھول لیا۔ یاد دولت کے اڈاپٹر کے ساتھ ریسیور بہترین کام کر رہا تھا۔ ایریل کی بلندی سے اس کی رینج بہت بڑھ گئی تھی اور آواز کی کوالٹی بہتر ہو گئی تھی۔

میں نیچے آیا تو لالی موجود تھی "اس کمینے کا کچھ پتا چلا؟"

میں نے کہا "چھت پر تو نہیں ہے۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا۔"

وہ مسکرائی "آپ مذاق کرتے ہو بھائی جان۔"

"بھائی جان! اناحول ولا قوۃ۔" میں نے احتجاج کیا "یہ راتوں رات تم نے رشتہ کیسے بدل لیا۔ میں کسی کا بھائی نہیں ہوں بی بی۔ ذوالفقار جب یہ شہر گرنے جانے کی ہمیں دیکھیں گے تو میں کو دیکھ کے سرخ رنگ پکڑتی ہے۔"

"آپ نے تو محاورہ ہی بدل دیا" لالی ہنسنے لگی۔

"تمہیں خربوزہ تو نہیں کہہ سکتا میں۔ خواہ مخواہ اس نے بھی مجھے بھائی جان کہنا شروع کر دیا پھر؟" میں نے رابعہ کی طرف اشارہ کیا۔

"لالی کچھ کہنے آئی تھی۔ اس کی بھی سن لو" رابعہ نے کہا۔

www.paksociety.com

"ہم تنہا تو سب ہی تھے۔ کچھ زیادہ تھے ان کے ہر چیک کی فوٹو کاپی میرے پاس تھی یا چیک نمبر تھے۔"

"تم زیادہ دن نہیں چلو گی لالی۔ غلط راستہ تو پہلے ہی اختیار کر لیا تھا تم نے۔ یہ دوسرا راستہ موت کا راستہ ہے۔ تمہیں تو معلوم ہوگا کہ وہ کس قماش کے لوگ ہیں۔ شوقین مزاج رئیس یا بدمعاش اپنی زندگی پر کسی کو اختیار نہیں رہنے دیتے۔ وہ تھوڑا تھوڑا تم کو دینے کے بجائے یکمشت بڑی رقم خرچ کر دیں گے۔"

"نہیں جی۔ میرے پاس تو معمولی حیثیت کے لوگ آتے ہیں۔ ایک معمولی عورت ہوں میں۔ دفتروں کے بابو، چھوٹے موٹے دکان دار، بے حیثیت افسر۔ وہ بڑے بزدل لوگ ہیں سب۔ بیوی بچوں سے، خاندان سے، معاشرے سے، سب سے ڈرنے والے۔ میں ذہن سے اتنی ہی رقم وصول کرتی ہوں جتنا وہ آسانی سے دے سکتے ہیں۔"

رابعہ نے افسوس سے سر ہلایا "اللہ ہی رحم کرے تمہارے حال پر۔ زندگی تمہاری اپنی ہے۔ جیسے چاہو گزارو۔"

"اگر وہ ڈائری کسی بڑے بلیک میلر کے ہاتھ آئی ہوتی لالی تو وہ اسے تباہ کر دیتے مگر اس حرام زادے نے تمہارے ساتھ میرے اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچائی ہے اس لیے میں غازی کو سبق ضرور سکھاؤں گا۔ وہ ذری اس لیے خطرناک ہے کہ اس کا کوئی کردار نہیں۔ کل وہ میرا دوست بنا ہوا تھا تو کل میرے دشمنوں سے بھی مل جائے گا۔ وہ ڈائری اس کے پاس نہیں رہے گی۔ تمہارے پاس بھی نہیں۔"

"پھر کیا خود کرو گے یہ کام؟" لالی نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اس سوال کا جواب ایک طمانچہ ہو سکتا تھا مگر ایک تو تم عورت ہو اور پھر زمانے کے ہاتھوں ستم رسیدہ۔ ڈائری میں رکھوں گا۔ اس وقت تک جب تک کہ میں فرداً فرداً سب کو خط لکھ کے یا فون کر کے مطلع نہیں کر دیتا کہ اب وہ آزاد ہیں اور ان کی عزت محفوظ ہے۔ دوبارہ کسی دلدل میں قدم نہ رکھیں۔ ایک بار تو شیطان کے بہکاوے میں غلطی کر بیٹھے تھے۔"

لالی کا چہرہ اتر گیا "تم نہیں جانتے کہ مجھے کتنا نقصان ہوگا۔"

"اور جو نقصان تمہارے ہاتھوں بلیک میل ہونے والے اٹھا رہے ہیں۔۔۔؟"

"وہ عارضی ہے۔ میں بیزار ہو رہی ہے جمع ہو چکے ہیں میرے پاس۔ میں نے طے کیا تھا کہ پچاس ہزار ہوتے ہی میں یہ سب چھوڑ دوں گی۔ اپنے شوہر کے ساتھ کراچی چلی جاؤں گی اور ایک بوتیک کھول لوں گی۔"

"تمہارا شوہر بھی ہے۔ کس شوہر کی بات کر رہی ہو تم؟"

"وہ جو میرے ساتھ رہتا ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ وہ بے غیرت ہے مگر یہ محبت ہے اس کی جسے تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ کسی مرد میں اتنا حوصلہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایسے عذاب کو برداشت کر سکے۔"

"تمہارا۔۔۔ نکاح ہو چکا ہے اس سے؟" رابعہ نے بے یقینی سے کہا۔

"نکاح؟ ہاں ایجاب و قبول کا نام نکاح ہے تو ہو گیا۔ کرایا جائے گا رسم دنیا کے سامنے وہ سب سے نکاح کا ڈرامہ بھی کریں گے۔"

"تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"شرم آتی تو میں یہ سب کیوں کرتی۔ اور تمہیں کیوں بتاتی۔ ابھی میں بے شرم ہوں اور میرا شوہر بے غیرت۔ کل یہ سب ماضی ہوگا جسے ہم ہمیشہ کے لیے دفن کر دیں گے۔ جیسے شریف زادیاں اپنی محبت کی ناجائز نشانیوں کو دفن کر دیتی ہیں۔ شادی کے بعد ان کے احمق شوہر تمام عمر اپنی باکباز بیوی کی عزت و عصمت پر فخر کرتے رہتے ہیں۔"

"دولا علمی کی بات اور ہے۔"

"میں نے دھوکا نہیں دیا۔ صاف بتا دیا کہ میں کیا کرتی ہوں اور کیوں کرتی ہوں۔ اس نے کہا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم کوٹھے پر بیٹھنے والی ہو تمہیں تب بھی میری محبت ایسی ہوتی اور محبت کا جذبہ تو ایک ہی ہوتا ہے۔ جیسے پانی ایک ہوتا ہے خواہ وہ گٹر سے بہے، آسمان سے برسے، دریا میں بہے یا جھیل میں ساکت کھڑا ہو۔ لالی کی اور ملکہ الزبتھ کی، میری یا رابعہ کی محبت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کل جب میں عزت دار ہو جاؤں گی، میرا اپنا گھر، شوہر اور بچے ہوں گے تب۔۔۔ خیر چھوڑو۔۔۔ اب تم کیا سمجھو گے اس بات کو۔"

میں نے کہا "تم نے ٹھیک کہا۔ میں تمہاری محبت کے اس فلسفے سے نہ متفق ہوں اور نہ اپنے گناہ کے کسی جواز کو تسلیم کر سکتا ہوں۔"

وہ تلخی سے ہنسی "خود ہی گناہ کرنے کے باوجود۔"

میں نے برہمی سے کہا "زبان سنبھال کے بات کرو۔ ہم کوئی گناہ نہیں کر رہے ہیں۔"

"اچھا؟ خدا کو حاضر و ناظر جان کے کہو کیا یہ بیوی ہے تمہاری؟" لالی نے میرا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا "بولو۔ چپ کیوں ہو گئے؟ تم مجھ سے نکاح کی بات کر رہی تھیں۔ اپنی کہو تمہارا نکاح ہوا ہے سکندر سے؟ نہیں تو پھر تم اس کے ساتھ کیسے رہتی ہو؟ اور یہ بات میں رنگیلا کو بتا دوں۔۔۔؟"

رابعہ کا رنگ فق ہو گیا "تم۔۔۔ کیسے جانتی ہو؟"

"میں نے پہچان لیا تھا تمہیں سکندر بخت۔ تم آنکھوں والے ڈاکٹر نہیں ہو۔ فکر نہ کرو میں نے تمہارا راز فاش نہیں ہونے دیا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے پاس غالب اور تازہ آئے ہیں۔ تم رابعہ قادری اغوا کیس ہو۔ میں بھی لاہور میں رہتی ہوں اور تمہارے قصے بہت سنے ہیں میں نے۔"

میں ابتدائی صدمے سے سنبھل گیا تھا "لیکن یہ غلط ہے جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹا الزام ہے کہ ہم گناہ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ میں حلف اٹھا سکتا ہوں۔"

"اس کی فکر مت کرو۔ خدا کی یہ دنیا بہت بڑی ہے اور ابھی تک ہم اس کی امان میں ہیں ورنہ زمین ہم پر تنگ ہو جاتی۔ تم سامان سمیٹو۔ میں ٹیکسی لے کے آتا ہوں۔"

رابعہ میرے اچانک فیصلے سے کچھ پریشان ہو گئی تھی۔ یہ دربدری میرا اور اس کا نصیب ہو گئی تھی۔ ابھی یہاں چین سے بیٹھے چند ہی دن ہوئے تھے کہ پھر بے سکونی کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے والے بھی ہم سے بہتر تھے جن کا گھر نہیں ہوتا تھا تو وہ کہیں گھر بسانے کی تمنا بھی نہیں رکھتے تھے اور نقل مکانی ان کے لیے زندگی کا ایسا معمول تھا جس میں نہ کوئی احساس محرومی شامل تھا نہ کوئی دکھ اور نہ خوف۔ یہ ان کی ضرورت تھی یا عادت مگر ہم فرار اختیار کرنے پر مجبور ہونے تھے۔ بھی اسیری کا خوف ہمارا تعاقب کرتا تھا تو کبھی مرگ ناگہاں کا۔ نہ جانے کتنے جان کے طلب گار شکاری تھے جو ہمارے نقش قدم دیکھتے ہوئے ہر پناہ گاہ تک پہنچ جاتے تھے۔

میرے ذہن میں اچانک ایک ایسی بات آ گئی تھی جس نے میرے لیے فوری فیصلے کو آسان کر دیا تھا مگر مالک دکان کو سخت صدمہ ہوا۔

"جا رہے ہو جی؟ ہم سے کوئی ناراضی ہے ڈاکٹر صاحب؟"

میں نے کہا "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ ناراضی کیسی؟"

"پھر کیا بات ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟ مجھے بتائیں میں ابھی ذلیل کرتا ہوں۔ ویسے بھی اب میں نے سوچا تھا کہ ان مشکوک قسم کے کرائے داروں کی چھٹی کر دوں۔ آپ جیسے شریف اور معزز لوگوں کو جگہ دوں۔"

میں نے کہا "مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ بس یہ جگہ کچھ مناسب نہیں تھی میرے لیے۔ تیسری منزل تک چڑھنا اترنا۔۔۔"

"ٹھیک۔ آپ تو خیر سے جوان آدمی ہو۔ امریکا میں تو لوگ سو منزل اوپر رہتے ہیں اور خیر سے اپنے لہور میں بھی چھ منزلہ۔۔۔"

میں نے کہا "آپ نے ٹھیک کہا۔ لیکن مشکل میری وائف کے لیے تھی۔"

اس نے کچھ سوچ کے سر ہلایا اور مسکرانے لگا "اچھا اچھا۔۔۔ سمجھ گیا میں۔ پھر ٹھیک ہے جی۔ عورت کو احتیاط کرنی چاہیے پہلی بار۔"

غصے کے باوجود میں مسکرا دیا "ویسے تو نوٹس دینا چاہیے تھا مجھے ایک مہینے کا لیکن ایک جگہ مل گئی ہے۔ اب ایک مہینے کا ادا کر دیں۔"

مالک مکان نے کہا "حد کرتے ہو ڈاکٹر صاحب۔ قدر بندے کی ہوتی ہے پیسے کی نہیں۔ بندے سے زیادہ پیسے کو اچھا سمجھنے والے ہوتے ہیں گھٹیا بندے۔ کرایہ دو دن رہے آپ۔ تین دن کا کرایہ ہم سے لو۔ مکان خالی کر کے تمہارا نام لے لو۔"

"چھوڑو۔۔۔ حلف تو زیادہ جھوٹے لوگ اٹھاتے ہیں۔ میں ویسے ہی مان لیتی ہوں کہ تم سچ بول رہے ہو مگر اصل مسئلہ ہے رنیا کا۔ کیا دنیا کی نظر میں تم اور میں ایک سے گناہ گار نہیں ہوں گے؟ بدکاری کے مجرم تو بدکار ہی کہلاتے ہیں۔ کم زیادہ کی بات نہیں۔ تم بھی دنیا کی پروا نہیں کرتے، میں بھی نہیں کرتی۔ کل تمہارے لیے بھی خواب ہے اور میرے لیے بھی۔ تم نہ مانو مگر ہم ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔ فرق صرف راستے کا ہے۔"

"بند کرو یہ بکواس۔ میں وہ ڈائری تمہیں نہیں دوں گا۔"

"سوچ لو سکندر بخت۔ تم ایک ساتھی سے محروم ہو جاؤ گے۔ ہزاروں لوگوں کی طرح میں بھی تمہاری مداح ہوں۔ تمہاری کامیابی چاہتی ہوں۔ تمہاری عزت بھی کرتی ہوں۔ تم سے ہمدردی بھی رکھتی ہوں۔ اس لیے کہ جس دھرتی کی خاطر تم نے جہاد کیا تھا وہ میرا بھی وطن تھا۔ وطن تو یہ اس کتے کا بھی ہے جو یہاں پیدا ہوا اور یہیں مر گیا۔ چور، ڈاکو، طوائف اور رنڈی تھے۔ بدکار اور بدمعاش، ہندو، سکھ، عیسائی۔ حرامی اور حلالی، جنگلی اور کم ذات پاکستانی تو سب ہیں۔ یہاں کے درخت، پہاڑ اور دریا۔ مٹی پتھر سب پاکستانی ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"بالکل نہیں۔ پاکستان اتنا ہی تمہارا بھی ہے جتنا میرا۔ پھر تم یہ دھمکی کیوں دے رہی ہو مجھے۔"

"مجبوری میں اور زندہ رہنے کے لیے تو ہی سب کچھ کرنا ہے۔ میرے اور اپنے آنے والے کل کو بچانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ زیادتی مت کرو اور مجھے زیادتی کرنے پر مجبور مت کرو۔ میں تمہارا جرم برداشت کر رہی ہوں۔ تم میرے گناہ پر پردہ رہنے دو۔ کم سے کم دنیا کے سامنے۔ تم جو کر رہے ہو کرتے رہو لیکن مجھے مت روکو۔"

"یہ تو ایسا ہی ہے جیسے چور کے کہ تھانے دار صاحب، آپ تھانے میں بیٹھ کے حرام کھائیے اور مجھے چوری سے مت روکیے۔"

"کیا ایسا نہیں ہو رہا ہے؟"

"لیکن میں چور نہیں ہوں۔ میں کوئی جرم یا گناہ نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے بگڑ کے کہا "اپنا مقابلہ مجھ سے مت کرو۔"

"قانون کی نظر میں تم بہرحال مجرم ہو۔ ورنہ ایسے چھپ چھپ کے نہ رہتے جیسے میں رہتی ہوں۔" اس نے جاتے جاتے کہا۔

میں نے اسے بہت گالیاں دیں۔ فاحشہ اور طوائف تو وہ تھی اوروں کے ساتھ وہ مجھے بھی بلیک میل کرنا چاہتی تھی۔

میں نے کہا "رابعہ۔ اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ یہ جگہ غیر محفوظ ہو گئی ہے ہمارے لیے۔"

خلاف توقع رابعہ نے مجھ سے اتفاق کیا۔ "سوچا تو میں نے بھی تھا۔ غازی کے دوغلے کردار پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ جو دوسروں کو بلیک میل کرتا ہو۔ وہ کسی موقعے پر ہمیں بھی لالی کی طرح دھمکی دے سکتا ہے۔ مگر ہم جائیں گے کہاں؟"

www.paksociety.com

میں نے شرمندہ ہو کے کہا "ضرور دوں گا۔"

مالک مکان میں بہت سی خرابیاں اور خامیاں ہوں گی جو ہم سب میں ہوتی ہیں لیکن کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ قصوروار آدمی کی نظر بے... اپنی ذات کی خوبیوں تک محدود رہتی ہے اور دوسروں میں صرف خرابیاں دیکھتی ہے۔

ہمارا اسباب خانہ بہت محدود تھا اور سمٹ کر دو سوٹ کیس اور ایک بیگ میں سما گیا تھا۔ جو تھوڑا سا فرنیچر ہم نے عارضی ضرورت پوری کرنے کے لیے لیا تھا وہ چھوڑا جا سکتا تھا۔ لالی کا دروازہ مقفل دیکھ کے مجھے خوشی ہوئی۔ وہ موجود ہوتی تو زینے میں قدموں کی آہٹ سن کے دروازہ کھولتی اور باہر ضرور جھانکتی۔ شاید ہم سے اچانک روانگی کا سبب پوچھتی اور اصرار کرتی کہ ہم اسے اپنا پتا دے کر جائیں تاکہ وہ بعد میں ہم سے ڈائری حاصل کر سکے۔

جب ٹیکسی روانہ ہو گئی تو مجھے لالی نظر آئی۔ وہ بازار سے کچھ لانے گئی ہوگی۔ کسی کو فون کرنے یا کوئی خط ڈالنے بس اتنی دیر میں ہم نکل گئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اس کی اور میری نظریں ملیں تو وہ ٹھٹک کے رک گئی۔ اس نے ٹیکسی کی چھت پر سوٹ کیس دیکھ کے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ہم لوٹ کر نہیں آئیں گے اور شاید اسے افسوس بھی ہوا ہوگا کہ وہ دھمکی نہ دیتی تو ہم یہ انتہائی قدم نہ اٹھاتے۔ حیرت سے زیادہ ندامت اس کے چہرے پر عیاں تھی۔

رابعہ نے کہا "کچھ پتا تو چلے! مجھے بھی کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے مسکرا کے کہا "تمہارے پاس اپنے آفس کی چابی تو ہوگی؟"

"ہاں۔ ایک چابی ہمیشہ میرے پاس رہتی ہے۔"

"اس وقت تو آفس میں کوئی بھی نہیں ہوگا۔ پوری بلڈنگ خالی پڑی ہوگی شاید۔" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے! میری طرح وہاں بہت سے وکیل سہ پہر کے بعد آفس میں آتے ہیں۔ کورٹ سے فارغ ہو کے عموماً گھر جاتے ہیں۔ لنچ کے بعد گھنٹا بھر آرام کرتے ہیں اور پھر رات تک کیس میں سر کھپاتے ہیں یا موکلوں سے نمٹتے ہیں۔ ایک انکم ٹیکس کے مشیر ہیں۔ وہ بھی بارہ ایک بجے آتے ہیں۔ ایک انجینئرنگ کمپنی' ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی فرم اور ایک امپورٹ ایکسپورٹ والے ہیں۔ دس گیارہ بجے تک کسی نے کی دکانیں بھی کھلتی ہیں۔"

"ویری گڈ۔ اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے لیکن افسوس سے کہنا ہے مجھے خاتون کہ آپ کی عقل پر پتھر پڑے ہوئے تھے ابھی تک۔ خاصے بڑے بہاڑ جتنے۔"

"کے نوٹ!" رابعہ نے میری طرف دیکھ کے کہا۔

اپنے پرانے نام کبیر خان کی مناسبت سے میں کے ٹو بھی کہلاتا تھا اور ایم آر ایس کے دوستوں میں مجھے چیف کے ٹو کا لقب بھی دیا گیا تھا۔ "احمقانہ لڑکی' تم کو ہنسنا نہیں رونا چاہیے اور غور کرنا چاہیے کہ آخر پڑا ہوا اب بات مجھے ہی کیوں سوجھتی جب کہ زید ہے...؟"

"وجہ کچھ نہیں۔ بس میں موقع دیتی ہوں تمہیں بولنے کا۔ ...کیا بات ہے؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لی "مجھے خیال یہ آیا تھا کہ کیوں نہ ہم تمہارے آفس کو بطور رہائش گاہ کے استعمال کریں۔"

"یہ... یہ خیال تو مجھے بہت پہلے آیا تھا" رابعہ نے کہا۔

"پھر آپ نے اس کا اظہار کیوں نہیں فرمایا تھا؟" میں نے لفو سے کہا۔

"اس لیے کہ آدمی کو پہلے تولنا اور پھر بولنا چاہیے۔ ہر خیال دماغ میں آتا ہے مگر قابل عمل نہ ہو تو بے کار ہے۔ آفس میں ہم کیسے رہ سکتے ہیں؟ ہم' یہ بات لاجواب نہیں' بے جواز ہے۔"

"آخر لوگ فٹ پاتھ پر بھی تو رہتے ہیں۔"

"وہ ایک کمرشل بلڈنگ ہے۔ رات نو دس بجے سب چلے جاتے ہیں تو باہر تالا پڑ جاتا ہے۔"

"کوئی چوکیدار بھی نہیں رہتا؟"

"ایک چوکیدار ہے پوری بلڈنگ کا۔ وہ اندر رہتا ہے۔ لوہے کی جالی کو کھینچ کر زینے کے سامنے والا راستہ بند کر دیتا ہے اور خود وہیں دری ڈال کے سو جاتا ہے۔ زینے کے نیچے اس کا کیبن ہے۔ صبح نو بجے اس کی ڈیوٹی ختم ہوتی ہے مگر وہ بہت پہلے اٹھ جاتا ہے پھر صفائی کرنے والے آ جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "کسی نے اپنے آفس کے لیے اپنا چوکیدار نہیں رکھا ہے؟"

"ابھی کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"تم محسوس کر سکتی ہو۔ تمہارے پاس مقدمات کی جو فائلیں ہیں ان کو چرانے کے لیے کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ لاکھوں کی جائداد ہتھیانے کے لیے یا سزائے موت سے بچنے کے لیے کسی بے گناہ کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈلوانے والے ثبوت شہادت ضائع کرنا چاہیں تو...؟"

"ایسا بہت کم ہوتا ہے۔"

"لیکن ہوتا ہے..." میں نے کہا "ناممکن نہیں ہے۔ تمہیں اپنے آفس میں حفاظت کے لیے کوئی چوکیدار ایسا رکھنا چاہیے۔"

"جو باکسنگ' جوڈو اور کشتی کے فن سے واقف ہو۔ پستول سے توپ تک چلا سکتا ہو۔ بدمعاشوں کی ہڈیوں کا سرمہ کر دے اور کشتوں کے پشتے لگا دے... فلمی ہیرو کی طرح اور خود بھی فلمی ہی نظر آتا ہو تمہاری طرح۔ تابعدار اتنا ہو کہ ایک اشارے پر آسمان سے تارے توڑ لائے اور وفادار ایسا کہ ساری عمر مالک کا غلام رہے" رابعہ ہنسی۔

میں نے انکساری سے کہا "غلام نہیں' زرخرید غلام کہو اور مالک نہیں۔ مالکن بھی بادشاہ ہو..." ٹیکسی ادھر سائیڈ میں لگا کر

بلڈنگ میں تو چوکیدار بھی دوڑا۔ مجذوب اور اس کے ہمزاد نے زمین اور سینڈ فلور کے کاریڈور میں خوب دوڑ لگائی اور پکڑنے کی کوشش کرنے والوں کو خاصا پریشان کیا۔ ایک پاگل آدمی اور کتا دونوں ایک سے چار خانہ سوٹ میں تھے اور خاصی بھاگ دوڑ کے بعد اس وقت پکڑے گئے تھے جب تعاقب کرنے والے بھی تھکن سے ہانپ رہے تھے۔ بیشتر دفاتر میں کرسیاں میزیں اور فائلیں الٹ چکی تھیں۔ ڈرپوک حضرات اور سہمی ہوئی اسٹینو لڑکیاں باتھ روم میں بند ہو چکی تھیں اور مجھونا کا دیتے والوں میں سے تین کو کتے نے کاٹ لیا تھا' چار کو مجذوب نے۔ کتا پاگل نہیں تھا مگر RABIES کے ڈر سے سب نے چودہ چودہ انجکشن پیٹ میں لگوائے تھے اور اس کے باوجود خوف میں مبتلا رہے تھے کہ کہیں وہ پاگل ہو کے کتے کی طرح بھونکتے ہوئے HYDROPHOEBIA میں مبتلا ہو کے نہ مریں۔ کتے کو بعد میں کارپوریشن والے پکڑ کر لے گئے تھے اور مجذوب کو پاگل خانے پہنچایا گیا تھا۔ چوکیدار پر سخت غفلت اور نمک حرامی کی فرد جرم عائد کرتے ہوئے اسے برخواست کیا جاتا مگر وہ رابعہ کے پاؤں نہ پکڑتا اور یہ وعدہ نہ کرتا کہ پھر آئینے میں اپنی داڑھی اور مونچھیں کبھی نہیں دیکھے گا۔ رابعہ کی سفارش کے باوجود اس کے سامنے بطور سزا یہ شرط رکھی گئی تھی کہ وہ ایک چیز کو بچا لے۔ نوکری کو یا گیسوئے تابدار کو۔ اسے بہت اچھی تنخواہ ملتی تھی' خدمت کا انعام الگ تھا اور وہاں سب اثر و رسوخ والے لوگ تھے۔ ان کے ساتھ رہتا کسی کے گھر میں چوکیدار یا ڈرائیور اور چپڑاسی بننے سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ اس نے مونچھوں اور زلفوں سے دستبردار ہونا قبول کر لیا تھا اور ملازمت بچالی تھی۔ ظاہر ہے جب دیکھنے کو ہی کچھ نہ رہا تو اس نے وہ آئینہ بھی توڑ دیا تھا۔

اب وہ سامان اٹھانے آیا تو بہت بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دوبارہ مونچھوں کی بہار تھی اور کانوں تک آنے والے پٹے پہلے کی طرح تیل سے چمکا رہے تھے۔ رابعہ نے مجھے بعد میں بتایا کہ وہ سخت ڈپریشن میں مبتلا ہو گیا تھا چنانچہ وقار یوسف نے اسے پھر چہرے اور سر پر بال اگانے کی اجازت دلوا دی تھی مگر آئینہ دیکھنے سے خود اس نے توبہ کر لی تھی۔

جب وہ ایک سوٹ کیس اور ایک بیگ لے کر چلا تو میں اس کے پیچھے رہا اور زینے کے ایک موڑ کا فاصلہ رکھ کے چڑھا گیا۔ وہ دائیں طرف مڑ کے رابعہ کے کمرے میں داخل ہوا تو میں دائیں طرف آگے نکل گیا اور گیلری میں سڑک کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ جب چوکیدار دوسرا سوٹ کیس اور دوسرا بیگ لانے کے لیے نکلا تو اس نے میری طرف دیکھا ہی نہیں۔ وہ بائیں طرف مڑ کے زینہ اتر گیا تو میں نے رابعہ کے آفس کا رخ کیا۔ اس وقت کاریڈور کے آخر میں ایک شخص فرش کو گیلا کپڑا رگڑ کے چمکانے میں مصروف تھا اور میری طرف اس کی پشت تھی۔ اس کی نصف بہتر اوپر سے زینے کی صفائی کرتی آ رہی تھی اور آخری قدم اتر کے

ٹیکسی رک گئی اور ڈرائیور نے سامان اتار کے رکھ دیا تو میں نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ کونے پر چشمے بنانے والے کی دو چھوٹی دکان باہر سے بند تھی مگر اندر ملازمین شوکیس اور شو ونڈوز کے شیشے چمکا رہے تھے اور معمول کے مطابق صفائی میں مصروف تھے۔ باقی دکانیں ابھی بند پڑی تھیں۔ عمارت کے وسط میں لوہے کی گرل سمیٹ کر ایک طرف کر دی گئی تھی اور گیٹ پر اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے رابعہ کے ساتھ کوئی بھی دیکھے اور پہچاننے کی کوشش کرے۔ بہت پہلے جب میں ایک وکیل کی حیثیت سے رابعہ کے پاس آتا تھا تو بہت کم لوگ مجھے جانتے تھے بعد میں میری بدنامی اور نیک نامی کی داستانیں سنسنی خیز خبریں بنیں۔ رابعہ کے ساتھ میرے تعلق کے چرچے عام ہوئے اور مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کے دوران مجھے بیک وقت محب وطن اور مفرور مجرم قرار دیا گیا۔ میری تصویریں خبروں کے ساتھ اور اشتہاری مجرم کی حیثیت سے شائع ہوئی ہوں گی تو اس بلڈنگ میں بھی بہت سے لوگ چونکے ہوں گے کہ "اچھا۔ یہ بندہ تھا۔ اسے تو یہاں آتے جاتے دیکھا تھا۔ صورت سے تو ایسا نہیں لگتا تھا۔"

صورت سے کون کیسا لگتا ہے یہ عمل از وقت کسی کو خیال نہیں آتا مگر بعد میں جتنے منہ اتنی باتیں۔ سب قیافہ شناس ہونے کے دعوے کرنے لگتے ہیں۔ عمارت میں بیشتر لوگ آج بھی وہی ہوں گے۔ شاید چوکیدار بھی وہی ہو اور صفائی کرنے والا عملہ بھی پرانا ہو۔ شام کا وقت ہوتا تو بہت سے لوگوں میں میرے چہرے کو غور سے کوئی نہ دیکھتا مگر اس وقت خود رابعہ کا آفس پہنچنا ہی غیر معمولی بات تھی۔ ہاتھ اٹھا کے سلام کرنے والے اور خیریت دریافت کرنے والے بھی حیران تو ہوں گے کہ وکیل صاحب صبح صبح سامان سمیت کہیں جا رہی ہیں یا کہیں سے آئی ہیں۔ میں ساتھ ہوتا تو سنسنی خیز نظریں اور چہ میگوئیاں بہت سی بے بنیاد افواہوں کا سبب بن جاتیں جن کا مرکزی کردار میں ہوتا۔ شام تک سب کو معلوم ہو جاتا کہ رابعہ کے ساتھ کون تھا۔

ان سب عوامل کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے رابعہ کو آگے روانہ کیا اور اسے تاکید کی کہ وہ چوکیدار کو سامان لانے کے لیے بھیجے۔ چوکیدار وہی تھا۔ میانوالی کا سوا چھ فٹ سے نکلتا ہوا جوان جس کو تنگی سے چپکتے ہوئے بالوں میں کنگھی پھیرنے اور پھولی ہوئی مونچھوں کو آئینے میں دیکھ کے سنوارنے کا شوق تھا۔ وہ گیٹ کے پاس اسٹول پر بیٹھا ہاتھ میں چھوٹا سا شیشہ لیے اتنے انہماک سے مونچھوں اور زلفوں کا جائزہ لیتا رہتا تھا کہ اسے کسی کے آنے جانے کی خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ کوئی غیر متعلق شخص کسی غلط ارادے سے بھی بلڈنگ میں نہیں گھسا تھا مگر ایک بار یہ ضرور ہوا تھا کہ ایک دیوانہ اوپر پہنچ گیا تھا جو عام طور پر جی پی او کے سامنے ننگ دھڑنگ ایک کتے کے ساتھ نظر آتا تھا۔ جاہل اور کمزور عقیدے کے لوگ اسے مجذوب اور کتے کو اس کا ہمزاد سمجھتے تھے۔ جب اوپر

www.paksociety.com

ہوئے اپنی بے تمیزی آواز میں گا بھی رہی تھی۔

رابعہ کے آفس کا نقشہ کچھ بدل گیا تھا۔ اس کا رقبہ پہلے کے مقابلے میں دگنا ہو گیا تھا۔ رفاہ یوسف نے ساتھ والا کمرا بھی حاصل کر لیا تھا اور درمیان کی دیوار نکال کے ہال کی پارٹیشن اس طرح کی تھی کہ وسط میں ویٹنگ لاؤنج بن گیا تھا۔ دائیں بائیں تین تین کیبن تھے جن میں میز اور دو کرسیوں کے علاوہ دو سٹول بیٹھنے کو تھے۔ سامنے کے حصے میں تین بڑے کمرے تھے۔ درمیان والے کمرے کے باہر کمپنی کے نام کی چمکتی ہوئی تختی لگی ہوئی تھی۔ یہ رابعہ کا آفس تھا۔ اس کے ساتھ والا کمرا عبدالودود منظر اور وقار یوسف مل کے استعمال کرتے تھے۔ تیسرا کمرا سب کا مشترکہ ڈرائنگ روم تھا جسے میٹنگ روم کہنا بہتر ہو گا۔ وہاں ایک صوفہ سیٹ تھا اور ایک بیڈ۔ ایک مختصر حصے میں ٹائلٹ اور اس کے ساتھ چھوٹا سا کچن جسے KITCHENET کہا جاتا ہے۔ یہاں کوئی موکل نہیں آسکتا اور اسٹاف کو بھی اجازت کے بغیر داخل ہونے کی ممانعت تھی۔ یہاں پرائیویسی میں اکثر جانے پیچے تھے "آرام کرتے تھے اور گپ شپ کرتے تھے یا مشورہ۔ یہ سب باتیں مجھے اندر قدم رکھتے ہی معلوم نہیں ہوئیں۔ میں تو ایک دروازہ کھول کے غائب ہو گیا تھا اور یہ دروازہ اتفاق سے میٹنگ روم کا تھا۔ بعد میں رابعہ کے ساتھ میں نے تفصیل سے آفس کا معائنہ کیا۔ یعنی اس وقت جب چوکیدار دوسرا سوٹ کیس اور بیگ رکھ کے رخصت ہو گیا تھا۔

رابعہ نے اندر سے دروازہ لاک کر کے کہا "آپ باہر تشریف لا سکتے ہیں۔"

میں اس وقت جوتوں سمیت بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ "بہتر ہو گا کہ آپ ہماری خدمت اقدس میں حاضر ہو جائیں۔"

رابعہ اندر آ گئی۔ "آتے ہی لیٹ گئے سامان اٹھاؤ باہر سے۔"

"یہاں تو نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ تمہیں یقین ہے کہ تم کسی اور کے آفس میں نہیں گھس گئی ہو غلطی سے؟" میں مستعدی سے اٹھ بیٹھا۔

"وقار نے بتایا تو تھا کہ توسیع کی ہے۔"

"تمہیں بتایا ہو گا" میں تو یہ شان و شوکت دیکھ رہا ہوں۔ بہت خوش قسمت ہو تم کہ تمہیں رفاہ جیسے معاون اور منظر جیسے دوست ملے۔"

"ہم سب پارٹنر ہیں۔ اب کوئی کسی کا معاون نہیں رہا۔"

"برا مت ماننا۔ اتنی ترقی شاید تمہاری کوشش سے نہ ہوتی جتنی تمہاری عدم موجودگی میں ہوئی۔"

"کیا مطلب؟ مجھے وکالت چھوڑ کے گھر بیٹھ جانا چاہیے۔"

"ان گنیں نا گرا۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ تم میں صلاحیت نہیں تھی یا تم میں اتنی اہلیت نہیں تھی۔ اس حقیقت کو تم نے پہلے ہی نے تسلیم کر لیا تھا کہ تم کتنی ذہین "قابل اور بے باک وکیل ہو۔ میں تمہاری خوش قسمتی کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔ کیا ہوتا ہے جب اصل مالک کسی کاروبار سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ کاروبار پر پوری توجہ نہ دیں یا اسے دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ ہر کاروبار چوپٹ ہو جاتا ہے۔ یار لوگ سب کچھ کھا پی کے بانٹنے میں بانٹ کے نو دو گیارہ ہو جاتے ہیں اور مالک ہوجاتا ہے دیوالیہ۔ تمہارے ساتھ اس کے برعکس ہوا۔ یہ کتنا بڑا احسان ہے اللہ کا۔ تمہاری ایمانداری نہ ہوتی تو تمہیں بھی نااہل "خود غرض اور لالچی معاون مل جاتے۔ تمہاری سب آمدنی اپنی جیب میں ڈالتے اور تمہارے کھاتے میں نقصان ہی نقصان ہوتا۔ تم راتوں رات انھیں تو یہاں فرنیچر کے نوٹس اور ناصلے۔ گرد آلود ٹائلیں "ٹوٹا پھوٹا فرنیچر اور کھڑکی کے جالے ملتے۔ تمہاری بنجل فرم ایک بھولا بسرا نام ہوتی۔ مگر دیکھو اور ناز کرو اپنی تقدیر پر۔ تم جہاں تھیں اب اس سے آگے ہو۔"

مجھے یوں لگا جیسے وہ رو پڑے گی۔ یہ خوشی "طمانیت اور فخر رغرور کے جذبات کا سیلاب تھا جو اسے بہائے جاتا۔ "تو یہ سب ٹھیک نہیں؟۔ بس یہی سب کچھ ہے۔ تم اور تمہاری محبت... اتنی بے پناہ چاہت... یہ بھی تو مجھے حاصل ہے۔"

میں اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا اور اپنے ایک ہاتھ سے اس کو قریب کر لیا "وکیل صاحب یہ کیا ہو رہا ہے۔ بے چارے موکل کا کچھ خیال کریں۔"

اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا "وکالت چھوڑ دوں گی میں۔"

"بڑا نیک خیال ہے۔ پھر تم گھر میں ہانڈی چولہا کرنا اور بچے پالنا۔ میں کسی دفتر میں بابو گیری کروں گا۔ دفتر سے سائیکل پر گھر واپس آؤں گا۔"

"خدا نہ کرے" رابعہ نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ بالآخر تمہیں سب کچھ مل جائے گا جو تمہارا ہے۔ تمہارا کاروبار۔ تمہاری جائیداد۔"

میں نے ایک آہ بھری "ابھی تو تم بھی ہماری نہیں ہو جاتیں۔" "اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم یہاں کیسے رہیں گے؟"

"آ جائے گا سب کچھ سمجھ میں۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم مت کہو یہاں رہنا صرف مجھے ہے۔ تمہارے چوکیدار کی حیثیت سے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔"

"کیا تمہیں تحفظ فراہم کرنا میرے فرائض میں شامل نہیں ہے؟ محافظ اور چوکیدار ایک ہی بات ہے" میں نے کہا "اس کے علاوہ خاتون "غالباً شکسپیئر صاحب فرما گئے تھے کہ گلاب کو کسی بھی نام سے پکارو وہ گلاب ہی رہے گا۔ میرا نام چوکیدار شیر خان ہو یا جمعدار رحمو راما ہو گا تو بہ نا چیز وہی تمہارا بندۂ بے دام "محبت کا غلام" پیار کے گھوڑے کی لگام "رکھتا ہاتھ میں تھام۔"

رابعہ ہنس پڑی "جمعدار رحمو رام بڑا اچھا ہے یہ نام۔"

"اچھا اب غور سے سنو کہ یہاں میں کیسے تمہارے ساتھ اور سب کے سامنے رہتے ہوئے بھی کسی کو نظر نہیں آسکتا۔ چالاک چور ہو تو اندھیرے میں روپوش نہیں ہوتا اور تاریک گوشوں میں نہیں چھپتا۔ وہ چور کو تلاش کرنے والوں کے ساتھ ٹارچ ہاتھ میں پکڑے چور چور چلانے لگتا ہے۔ میرے پاس ابھی ایک وردی ہے جو ہم نے اسپتال میں ایک محافظ کے جسم پر سے اتاری تھی۔ وہ عام سی خاکی وردی ہے اور اسے پہن کے میں رات کو یہاں کا چوکیدار بن جاؤں گا۔ رات کو آرام سے سو کے گزاروں گا اور صبح غائب ہو جاؤں گا۔"

"کیسے غائب ہو جاؤ گے" سلیمانی ٹوپی اوڑھ کے۔"

"یہ میں وقت آنے پر تمہیں کر کے دکھا دوں گا۔ فی الحال تم عمارت کے چوکیداروں کو بتا سکتی ہو کہ ہم نے اپنے آفس کے لیے بھی ایک چوکیدار رکھ لیا ہے جو صرف رات کے وقت اندر ہو گا اور صرف آفس کے اندر کی حفاظت کا ذمے دار ہو گا۔ باہر کی رکھوالی پہلے کی طرح پرانے چوکیدار اپنی اپنی شفٹ میں کریں گے۔"

"چلو یہ تو میں کہہ دوں گی مگر کیا رات نو بجے سے صبح تک ہم آفس کے اندر بند رہیں گے۔"

"ہم نہیں۔ صرف میں۔"

"اور میرے بارے میں کیا حکم ہے۔"

"حکم یہ ہے کہ آپ معمول کے مطابق اپنے پیشہ ورانہ فرائض کے معمولات میں مصروف ہو جائیں۔ صبح کورٹ جائیں" شام کو موکلوں سے ملیں اور ایسا محسوس ہو جیسے یہ وقت آج کا نہیں۔ پونے دو سال پہلے کا ہے جب تم صرف رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ تھیں اور تم سے ایک سکندر بخت سے پرانا شناسائی کا رشتہ ضرور تھا مگر کسی تجدید وفا کی نہ صورت تھی نہ امکان تھا۔"

"جب کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔ چلو ایک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ دنیا کے سامنے تم سب بھول جاؤ۔ ہونٹوں پہ کبھی میرا نام نہ آئے اور کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے" تو بس ایک خاموشی تری سب کے جواب میں۔"

"یہ شاعری نہیں باتیں ہیں یا باتوں میں شاعری۔ مجھے تو تمہارا یہ خیال بھی ایسے ہی لگتا ہے۔ جیسے شاعری کی پرواز تخیل۔"

"تجربہ کر کے دیکھو پہلے پھر کہنا کہ یہ خیال آرائی تھی یا حقیقت۔ سکندر ہر وقت تمہارے ساتھ ہو گا۔ رگ جاں سے بھی قریب تر۔ ہر جگہ ہو گا مگر اسے پہچاننے والے صرف چار افراد ہوں گے۔ تمہارے علاوہ غالب اور رفاہ۔ منظر اور وقار یوسف۔ رات جب تم آفس سے فارغ ہو کے جاؤ گی۔"

"میں کہاں جاؤں گی؟ یہ بھی بتا دو۔"

"تم کہاں جاؤ گی؟ کچھ اپنا ٹھکانا کر لے" میں نے لہجے سے مصرعہ کا مفہوم بدل دیا "ویسے ٹھکانوں کی کیا کمی۔ تمہارے لیے کسی خطرہ نہیں اور پابندی نہیں۔ منظر کے چچا کے گھر میں وہ وقار یوسف کے ساتھ۔ لیکن میں وہاں بھی نہیں آؤں گا۔ رات کو ہم باہر کہیں بھی مل لیں گے پہلے سے طے شدہ کسی مقام پر۔ خفیہ بیٹھک کی جگہ صیغہ راز میں رہے گی اور ہر بار بدلتی رہے گی۔ تم بات سمجھ رہی ہو؟"

"آ گئی۔ ابھی تو یہ بڑی ذہانت کی بات لگتی ہے۔ بعد میں وقت ثابت ہو۔ اس کا فیصلہ حالات کر سکتے ہیں۔"

"اچھا اب وہ پہرے سے پہلے میں رخصت ہو جاؤں گا۔ کسی نے بھی مجھے یہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔"

"جاؤ گے کیسے پانچ بجے تک؟"

"نہیں وہ کیسے گا۔ غالب کو فون کرو اور اسے کہو کہ ایک چھوٹا ساتھ چاہیے۔ یعنی میک اپ کرنے والا جو ماہر فن ہو اور میری خواہش اور اطمینان کے مطابق ہر صبح میری صورت بدل سکے۔"

"ہر صبح؟"

"ہاں۔ مجھے دن میں دوسرا چہرہ چاہیے۔ جو ہر روز نیا ہو۔ اگر اس کی کوئی آسان ترکیب ہو تو بہت اچھا ہے ورنہ میں خود اس کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے تیار ہوں۔ معاوضہ وہ جتنا چاہے لے۔ یہ مسئلہ ہے میرے ایک خاص مشن کی کامیابی کا جس پر میرے مستقبل کا انحصار ہے۔"

"میرے یا ہمارے مستقبل کا۔"

"تم تو زبان پکڑتی ہو۔ الگ اب کیا ہے میرے اور تمہارے لیے۔ غالب کو فون کرنے کے بعد اپنا سامان اور سوٹ کیس یہاں سے لے جاؤ۔ اتنے سامان کی جگہ یہاں نہیں ہے۔ میں اپنا سوٹ کیس اس بیڈ کے نیچے رکھوں گا۔ ہمارا اسلحہ اور نقد رقم بھی یہیں رہے گی۔ میرے کپڑے یہاں ہوں گے اور بس۔"

"مجھے تو ٹھیک نہیں لگتا ہے کہ تم رات بھر آفس میں بند رہو۔ باہر کا گیٹ بھی لاک ہو جاتا ہے" رابعہ متفکر ہو گئی۔

میں نے ہنس کے کہا "اس کی مت فکر کرو۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے چوکیدار دو۔ میں اس سے دوستی کر لوں گا۔ وہ گیٹ پر ہی تو سوتا ہے۔ جب ضرورت پڑے گی خود میرے لیے تالا کھول دے گا یا مجھے گیٹ کی چابی بنوا دے گا۔ آپس کے اعتماد کی بات ہو گی۔ میں بھی اسے موقع فراہم کروں گا کہ کبھی رات کو میرے جاننے کے لیے جانا چاہے تو چلا جائے۔ اب بھی وہ غائب تو ہو جاتا ہو گا۔ رات کو بھی گھر میں کوئی بیمار ہو۔ مہمان آئے ہوئے ہوں یا کوئی تقریب ہو خاندان میں تو وہ گیٹ بند کر کے ہی تالا ڈال کے جاتا ہو گا۔ کسی کو معلوم کیسے ہو سکتا ہے۔ صبح وہ پھر موجود ہوتا

www.paksociety.com

ہے۔"

رابعہ نے کہا "بھئی تم نے سب سوچ لیا ہے۔ چلو تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔"

غالب کی تلاش میں رابعہ نے پہلے وقار یوسف کے گھر فون کیا پھر اس کے نفیس اخبار کے دفتر سے بتایا گیا کہ وہ بلوائی باغ کے مضافاتی علاقے میں کسی کرائم رپورٹ کے چکر میں نکلا ہے۔ رابعہ نے ماتو کے اخبار والوں سے پوچھا تو پتا چلا وہ دونوں میو اسپتال کے میڈیکو لیگل افسر کے پاس بیٹھے ہیں۔ بالآخر ایک ڈاکٹر نے اسے تلاش کر کے فون تھمادیا۔

"رابعہ۔ بھئی ہم تو پہنچے تھے تمہارے غریب خانے پر۔ لیکن بڑا افسوس ہوا۔ یہ دیکھ کے کہ تم دونوں انتقال کر چکے ہو" میں نے غالب کی آواز دوسرے فون کے ریسیور میں سنی۔ "خیر۔ اللہ تمہیں اس دنیا میں پھر کسی کے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ہمیں تو صبر جمیل کی ضرورت نہیں۔"

"عقل سلیم کی ضرورت تو ہے۔" میں نے کہا۔

"کون سلیم، میری اپنی عقل کافی ہے مجھے۔ اور یہ کون نامعقول بول رہا ہے بیچ میں۔ کوئی بھوت لگتا ہے۔ آواز میرے سسر سے ملتی ہے۔ کیا یہ بھوت اب لوگوں کی ٹیلی فون کالیں بھی سننے لگے ہیں۔"

"تم حکایت کرو بھوتوں کے وزیر مواصلات سے۔ کسی بدمعاش کی معرفت۔"

"وہ تم میرے سسر کو بدمعاش نہیں کہہ سکتے۔ وہ بے تمیز ہے جاہل ہے احمق ہے لیکن" اس کے بعد ایک دو تا ساپ سنائی دیا۔

میں نے کہا "کیا ہوا؟ کیا بازو سے خون بہا اور ہا؟"

"ادای سے انگلی نکل رہی۔ بڑی ہے کہ جھٹکو والے ڈاکٹر صاحب بھی دیکھ رہے ہیں اور گواہ ہیں اس قاتلانہ حملے کے۔"

بڑی مشکل سے رابعہ نے اسے اپنی بات سمجھائی پھر وہ اپنا سامان الگ کرنے لگی اور ایک سوٹ کیس میں میرے کپڑوں کے نیچے اسلحہ رکھ دیا جس میں اب چار ریوالور باقی تھے اور کچھ فاضل راؤنڈ۔ ایک پرانا ریوالور سائلنسر کے ساتھ بھی تھا۔ لائسنس کے بغیر اسلحہ رکھنا ہی ایک خطرناک جرم تھا مگر کئی وکیلوں کی فرم میں یہ شاید تحفظ بھی تھا۔ اپنا ساز و پی کی طرح سجے ہوئے رکھنے میں تین شیلف تھے سب سے اوپر والے شیلف میں چائے کے برتن تھے اور کچھ کراکری۔ اس کے علاوہ چائے، کافی اور دودھ کے ڈبے تھے۔ اس کے نیچے والے حصے میں الیکٹرک اسٹوو تھا اور کیتلی تھی۔ سب سے نیچے کے خانے میں برتن دھونے کے لیے سنک لگایا گیا تھا۔ رابعہ نے وہ سب سامان بھی یہاں بھر دیا جو ہم نے چند دن وائلڈ پارک کی تیسری منزل والے گھر میں استعمال کیا تھا۔

ابھی تک عمارت میں چہل پہل نہیں تھی حالانکہ دوسرے گیارہ بج رہے تھے۔ سوا گیارہ بجے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ یہ غالب کا ارسال کردہ میک اپ مین تھا۔ اس کا اپنا حلیہ ایسا تھا کہ لگتا تھا وہ بھیس بدل کے آیا ہے۔ اس کے بچوں جیسے گول چہرے پر نوکیلی مونچھیں بالکل نقلی نظر آتی تھیں اور اسی طرح آنکھوں کا سبز رنگ بھی۔

اس نے خود کو متعارف کراتے ہوئے اپنا چھوٹا سا ملائم ہاتھ آگے بڑھا کے میرے ہاتھ کو چھوا اور فوراً پیچھے کر لیا۔ "میں زاہد ڈمال زیدی ہوں۔ چارلی نے کہا کہ فی الوقت میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہے۔ اب میں زیدی ہوں۔"

میں نے مسکرا کے کہا "اور یہ چارلی کون ہے؟"

اسے میری جہالت پر سخت صدمہ ہوا۔ "آپ چارلی کو نہیں جانتے۔ کمال ہے۔"

"ایک تو مشہور کامیڈین تھے۔"

"یہ استاد ہیں میرے میک اپ مین بلکہ سرجن۔ یہ فن ان پر ختم ہے۔"

رابعہ نے حوصلہ افزائی کے لیے کہا "نہیں بھئی۔ آپ ضرور استاد کا نام روشن کریں گے۔ فن کیسے ختم ہو سکتا ہے۔"

"اچھا؟" اس نے بڑی معصومیت اور بے یقینی سے کہا "آپ رابعہ قادری ایڈووکیٹ کو اطلاع کر دیں۔"

"مجھے اطلاع ہو گئی۔ میں ہی رابعہ ہوں۔"

وہ حیرت سے پلکیں جھپکاتا رہا "کمال ہے۔" یہ اس کا تکیہ کلام تھا۔

"کیا کمال ہے۔" رابعہ بولی۔

"آپ وکیل" اس نے افسوس سے سر ہلایا "شکلوں میں آپ شکلیں بدلنی ہیں۔ سب کا پتا نکل ہو جائے گا۔"

"سب کے چراغ بجھے دو زیدی۔" رابعہ نے خوش ہو کے کہا۔

"میں بات کر سکتا ہوں شباب کیرانوی صاحب سے۔ کتنے چہرے متعارف کرائے ہیں انھوں نے۔ وہ مانتے ہیں میری بات اور آپ کو ضرورت بھی نہیں ہے سفارش کی" اس نے دونوں ہاتھوں کے فریم میں رابعہ کو فوکس کر کے کہا۔

"میں بہت خوش اور مطمئن ہوں اپنے کام سے۔ مجھے فلموں سے دلچسپی بھی نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا۔

وہ قبیلی اور جبلی تھوڑی تھا "دیکھئے اس میں عزت، دولت اور شہرت ہے۔"

"سب ہے میرے پاس زیدی۔"

اس نے شانے اچکا کے "کمال ہے" کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

"پھر آپ میک اپ کیوں کرانا چاہتی ہیں۔"

میں نے کھنکار کے کہا "مگر آپ کی نظر کرم اس ناچیز کی جانب ہو تو میں کچھ عرض کروں۔ میک اپ مجھے کرانا ہے میرا نام اسد مراد اور ہو محمد علی۔ ان سب کے چہرے وہی بناتے ہیں دوست......"

"سوری مسٹر زیدی۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ مجھے غرض ہے تمہارے کام سے۔ وہ بکتا ہو تو ہزار دو ہزار زیادہ بھی اہمیت نہیں رکھتے۔"

"استاد کے ہوتے خود کو استاد کہنا اچھا نہیں لگتا ورنہ زیدی کسی سے کم نہیں۔" وہ جوش میں آگیا۔ "صبح ہزار روپیہ میں صبح شام نوری کو گدھا اور گدھے کو نوری بنا کے نہ دکھلا دوں تو کہنا۔"

جب رابعہ چلی گئی تو میں نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا اور زیدی سے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

"میں غلط کام کرتا نہیں مگر کیا کروں۔ مقروض ہوں غالب صاحب کا۔"

"یہ کوئی غلط کام نہیں ہے۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"کمال ہے۔ کیا صبح و شام چہرہ بدلنا دھوکے بازی نہیں ہے آخر کیا مقصد ہے اس کا۔ خود کو چھپانا؟"

"بالکل ٹھیک۔ میرے لیے خود کو اپنی جان کے دشمنوں سے چھپانا بہت ضروری ہے۔ جان بچانا کوئی غلط کام کیسے ہو گیا؟"

زیدی قائل نہیں ہوا "اس کے لیے ایک بار حلیہ بدلنا کافی تھا۔ یہ صبح و شام کا چکر میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"تم اپنی سمجھ کو زیادہ تکلیف مت دو۔ چھ سات ہزار کم نہیں ہوتے تو کوئی اور آ جائے گا" میں نے بے رخی سے کہا "جرح اور سوال جواب کیے بغیر کام کرنا ہے تو کرو ورنہ جاؤ۔ غالب کا قرض میں نے معاف کیا۔"

"کمال ہے۔ قرض تو رہتا ہے۔ خود غالب صاحب کے یہ کہنے سے قرض نہیں بڑھتا کہ انھوں نے ایک انسانی فرض پورا کیا تھا لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ مدت کرنے تو کسی اور کے جرم میں مجھے ضرور پھانسی کے تختے تک پہنچا دیا جاتا۔ انھوں نے سب کا بھانڈا پھوڑ دیا اور اصل قاتلوں کے چہرے بے نقاب ہو گئے تو میری جان بچی تھی۔ خیر آپ بتائیں مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"ایک بات بہت اچھی طرح سمجھ لو۔ یہ کام غلط نہیں ہے۔ اس کا اندازہ بھی تمہیں بہت جلد ہو جائے گا مگر بعد میں بھی تمہاری زبان سے اس بارے میں کوئی بات کسی نے بھی سنی تو ہم بھی سن لیں گے۔ اخبار والوں کے کان بھی ہزار ہوتے ہیں اور آنکھیں بھی۔"

"آپ بھی اخبار والے ہو؟"

"اور کیا میں تمہیں جیل سے بھاگا ہوا لگتا ہوں؟" میں نے اس کی لاعلمی سے فائدہ اٹھایا "یہ بھی فلمی کے لیے بتا رہا ہوں کہ یہ بھی تقریباً ویسا ہی معاملہ ہے۔ جیسا تمہارا تھا۔ ایک لیڈی ڈاکٹر لندن سے آئی تھی۔ کچھ لوگوں نے جو بڑے بااثر، قاتل اور بدمعاش ہیں اسے اوپر بہت بلندی سے نیچے دھکیل دیا اور قتل کو خودکشی بنا دیا۔"

ہے۔"

"اسے؟ صرف اسے؟ کمال ہے۔"

"احمد علی عرشی۔ میں اسے بہت زیادہ ہیں، ایک کافی ہے" میں نے کہا۔

زیدی نے سر ہلایا "مسٹر اسد۔ تمہارا بھی اچھا بھلا چہرہ ہے۔ زخمی مجھے کیا۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "ہاں تمہیں کیا۔ میں اسے بگاڑنا چاہتا ہوں۔ صبح شام بدلنا چاہتا ہوں۔ کمال ہے مت کہنا اور اس کی وجہ مت پوچھنا۔ جس نے بھی تمہیں بھیجا ہے یہ ضرور سمجھایا ہوگا کہ اچھا کام ہوگا تو معاوضہ بھی اچھا ہوگا۔"

"معاوضے کی تو بات نہیں ہوئی تھی" وہ بے جو بے لفظوں میں بولا۔

"خیر۔ معاوضہ تمہاری مرضی کا ہوگا بلکہ دگنا۔"

"دگنا کیوں۔" وہ ہر بات پر حیران ہونے والا شخص تھا۔

"نزدیک معاوضہ کام کا ہوگا۔ دوسرا رازداری کا۔ یہ بتا تمہاری ماہانہ آمدنی کا اوسط کیا ہے؟"

اس نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کچھ دیر سوچا "اوسط کوئی خاص نہیں ہے ابھی۔ جو استاد نے دیا کافی ہے۔"

"یہ کافی کتنا ہوتا ہے۔ آخر اس آمدنی سے تمہارے گھر کا خرچ چلتا ہوگا۔ گزارا ہو جاتا ہے۔"

"ہاں۔ گزارا تو سب کا ہو جاتا ہے۔ سو دو ہزار ملنے لگے ہیں مجھے بھی" اس نے کہا "پہلے کم تھے۔"

"میں پانچ ہزار ماہانہ پیش کروں گا۔"

"ماہانہ! کمال ہے" اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ماہانہ اس لیے کہ کام روز کا ہے۔ تم چاہو تو یہاں آ جاؤ ورنہ میں بھی آ سکتا ہوں تمہارے گھر۔ یا اسٹوڈیو میں۔ میرا خیال ہے مسٹر زیدی کہ تم ابھی زیر تربیت ہو یعنی اپرنٹس ہو۔ کام سیکھ رہے ہو۔"

"میں کام سیکھ چکا ہوں۔ اب تو مکمل میرا شاگرد ہے۔" اس نے بُرا مان کے کہا۔

"مکمل کون؟" میرے منہ سے نکل گیا۔

"آپ اکمل کو نہیں جانتے۔ کمال ہے" میری فلمی جہالت اس کے نزدیک افسوس ناک تھی۔ "یہ جو اپنے ہیرو ہیں اجمل صاحب، ان کا چھوٹا بھائی ہے اکمل۔ کم میں نے سنا ہے کہ اسے بھی چانس مل گیا ہے۔ میک اپ مین بننا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "معلوم نہیں تمہارے استاد چارلی کیا کرتے ہیں اور تم کتنے دنوں میں ہو۔ شام تک مجھے اندازہ ہو گا۔ مجھے ایک نمبر کام چاہیے۔"

"مسٹر اسد۔ مجھے آپ گدھا، الو یا کچھ بھی کہہ سکتے ہیں مگر استاد چارلی کو نااہل نہیں کہہ سکتے" وہ ایک دم بگڑ گیا "یہ عدیم و حید

"کیپٹن ڈاکٹر کا جرم کیا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ اصل مجرموں نے ایک بہت بڑے آدمی کو زہر دے کر ہلاک کرایا تھا۔ وہ آدمی اسپتال میں داخل تھا۔ جب یہ لیڈی ڈاکٹر اس سے ملنے گئی تو زہر دینے والوں نے الزام لیڈی ڈاکٹر پر عائد کر دیا اور یہ کہا کہ اس نے خود کو گرفتاری سے بچانے کے لیے دوڑ کے اوپر سے چھلانگ لگا دی تھی۔ حالانکہ اسے اٹھا کے پھینکا گیا تھا۔ اس طرح انہوں نے ایک نہیں دو قتل کیے تھے۔ میں ان کے پیچھے لگا ہوا ہوں مگر کچھ معاملات ایسے ہیں کہ میں بھیس بدلے بغیر یہ کام کروں گا تو ڈاکٹر شیلی کی طرح مارا جاؤں گا۔" روانی میں نام میری زبان پر آ گیا۔

"ڈاکٹر شیلی انگریز ہو گی؟"

میں نے فوراً اپنی غلطی کی تلافی کی "ہاں۔ ظاہر ہے ایسے نام ہماری لڑکیوں کے نہیں ہوتے۔ تفتیش کے لیے میرا دن میں صورت بدل کے پھرنا ضروری ہے۔ رات کو بھی مجھے چھپ کے رہنا ہو گا۔ اصل چہرہ کسی نے غلطی سے بھی دیکھ لیا تو میرے پیچھے لگ جائے گا۔ تم نہیں سمجھو گے۔"

اس نے سر ہلایا "دن میں کیا حلیہ ہو گا؟"

"ایک غیر ملکی وکیل کا۔ میں ظاہر کروں گا کہ لندن سے آیا ہوں اور ڈاکٹر شیلی کے لواحقین نے مجھے اس کیس میں وکیل نامزد کر کے بھیجا ہے۔ میرے کاغذات تیار ہیں۔ میں پولیس کو بھی تفتیش کا رخ نہیں بدلنے دوں گا اور خود بھی حقائق کی کھوج میں رہوں گا۔ قاتل اتنے طاقتور نہیں ہیں کہ کسی برطانوی وکیل پر ہاتھ ڈال سکیں۔ ایک برطانوی ڈاکٹر کو مارنے کے الزام میں ان کے خلاف پہلے ہی تحقیقات ہو رہی ہیں اور برطانوی کونسلیٹ نے بہت اعلیٰ سطح پر حکومت پر دباؤ ڈالا ہے۔ میری حفاظت خود حکومت کرے گی۔"

"اچھا کیا آپ نے سب بتا دیا۔ اب میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔ اگر اصلی قاتلوں کو پھانسی ہو گی تو مجھے بھی خوشی ہو گی کہ میں نے اس کام میں ہاتھ بٹایا تھا۔"

"اب مسئلہ یہ ہے۔ زیدی کہ ہر صبح مجھے ایک برطانوی وکیل کا حلیہ اختیار کرنا ہے۔ شام کو یہ چہرہ بدل کے پھرنا ہے۔ اصل چہرہ بہر حال کسی کو نظر نہیں آئے گا۔ مشکل کام صبح کا ہے۔ رات کو معمولی سی تبدیلی سے کام چل جائے گا۔ کیا اس کے لیے مجھے روز میک اپ اتارنا پڑے گا۔"

"اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"کوئی ترکیب نکالو۔ کوئی ماسک ہو نقاب قسم کی چیز۔"

"کمال ہے" اس نے نفی میں سر ہلایا "فلمی ترکیب ہے۔ حقیقی نہیں ہو تا کہ اصلی چہرہ نظر آنے لگے اور دن کے اجالے میں کسی کو شک نہ ہو۔ اسٹیج پر تو چل جاتا ہے کیونکہ دیکھنے والے دور سے دیکھتے ہیں اور پھر روشنی بھی ہو سورج کے اجالے کی طرح نہیں ہو سکتی۔ ہاں ایک حل ہے اس مشکل کا۔"

"وہ کیا؟"

"کچھ دن میں خود میک اپ کروں گا۔ ساتھ ساتھ آپ کو بتاؤں گا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ آپ آئینے میں دیکھتے رہیں۔ چند دن میں آپ خود سیکھ لیں گے اور اپنا میک اپ خود کر لیں گے۔ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں۔ جو چیزیں رنگ روپ اور حلیہ بدلنے میں کام آتی ہیں وہ خود میں فراہم کر دوں گا۔ میں اور آپ آنے جانے کے چکر سے بچ جائیں گے۔"

"ویری گڈ۔ کیا یہ میک اپ ہر جا ہو گا؟ میرا مطلب ہے دن میں پانی سے یا دھوپ سے خراب تو نہیں ہو گا؟ اور کتنے دن چلے گا؟"

"تین دن تو چلے گا۔"

"اس کے بعد؟"

"سوکھ کے خراب ہو گا تو جھریوں جیسی لائنیں پڑ جائیں گی پھر خشک مٹی کی طرح بھربھرا ہو کے جھڑنے لگے گا۔ لیکن دن میں آپ نہ دھوئیں تو اچھا ہے۔ شیو مت کریں۔ دھوپ کا اثر ہو گا اگر آپ مسلسل دو دن دھوپ میں ہی پھرتے رہے۔ میک اپ اتارنے کا طریقہ بھی میں آپ کو بتا دوں گا۔ اس میں مخصوص چیزیں استعمال ہوتی ہیں۔"

"سب کیمیکل ہوں گے۔ میری جلد کا کیا بنے گا؟"

"جلد پر اثر ضرور پڑے گا۔ فلم والے تو کام ختم کر کے میک اپ اتار دیتے ہیں اور جلد کو ٹھیک رکھنے والے لوشن کریم استعمال کرتے ہیں۔ غیر ملکی اور بہت اچھے قسم کے اسکن ٹانک اور کنڈیشنر۔"

"رات کو میں بھی کر لوں گا۔" میں نے کہا "ختم لکھ دینا سب کے نام۔"

"مگر رات کو میک اپ دوسرا ہو گا۔"

"رات کو میک اپ کے بغیر چہرہ کچھ بدل جائے تو کام چل جائے گا۔" میں نے سوچ کے کہا "جب میں میک اپ کا ماہر ہو جاؤں گا تو فلموں میں کوشش کروں گا۔ اچانک مجھے شوق ہو گیا ہے کہ نیلو، نیّا اور دیبا کا میک اپ کروں۔ بڑا مزہ آتا ہو گا۔"

وہ ہنسنے لگا "ان کے اپنے میک اپ مین ہوتے ہیں۔ کسی ارے غیرے کو وہ ہاتھ کہاں لگانے دیتی ہیں۔ ماہر بننے میں تو کئی سال لگ جاتے ہیں مسٹر اے۔"

میں نے مایوسی سے کہا "اچھا ٹھیک ہے مسٹر زیدی۔ جب میں یہ کام خود کرنے لگا تو پھر تم کیا کرو گے۔ تمہاری ضرورت ہے کہاں تک؟"

"کمال ہے" اس کا چہرہ اتر گیا۔ "میں نے تو آپ کی مشکل آسان کی تھی۔"

میں نے ہنس کے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "میں مذاق کر رہا تھا یار۔ پانچ ہزار ماہانہ تمہیں ملتے رہیں گے۔ کیا پتا درمیان میں کبھی پھر تمہارے ماہرانہ مشورے کی ضرورت پڑ جائے۔ رازداری کی شرط سب سے اہم ہے۔"

"اور یہ کام کب تک چلے گا۔"

"ابھی ہم تین مہینے کا معاہدہ کرتے ہیں۔ کام اس سے پہلے ختم ہو گیا تب بھی رقم تمہیں ملتی رہے گی۔ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ تم کس حد تک کارآمد ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم ہزار دو ہزار ماہانہ ایسے ہی دیتے رہیں۔ تمہیں اپنا مشیر رکھ لیں۔ جب ضرورت ہو بلا لیں۔ اچھا اور بھروسے کا آدمی ہو تو ہم قدر کرتے ہیں مسٹر زیدی۔"

"مجھے منظور ہے" اس نے خوش ہو کے ہاتھ ملایا۔ "آج تو میں کچھ بھی نہیں لایا تھا۔ کل آپ میرا کمال دیکھنا۔"

"آج مجھے بھی فرصت نہیں۔ ویسے بھی آدھا دن گزر گیا ہے۔ کل صبح میں خود تمہارے پاس آؤں گا۔ بتاؤ تمہیں کہاں آؤں؟"

اس نے مجھے ایک فلم اسٹوڈیو کا پتا بتا دیا جہاں اسے رات بھر شوٹنگ میں حصہ لینا تھا جس میں اسٹوڈیو کے گیٹ پر ملوں گا ورنہ آپ کو اندر کوئی نہیں جانے دے گا۔"

جانے سے پہلے اس نے مجھے کچھ ٹپ دیے کہ چہرے اور حلیے کو ناقابلِ شناخت بنانے کے لیے میں خود کیا کر سکتا ہوں۔ کچھ عام سی باتیں تھیں جو میں بھی سمجھتا تھا۔ زیدی خود کو فنکار کہتا تھا۔ جس ملک میں بڑے فنکار بھی خوش حال نہ ہوں وہاں زیدی جیسے چھوٹے فنکار کی تنگ دستی سمجھ میں آتی تھی۔ وہ انانے پہلے اسے تذبذب میں مبتلا رکھا مگر بالآخر اس نے ہمت کر کے کچھ ایڈوانس مانگ لیا۔

"پیمانے کے بغیر تو معاہدہ پکا نہیں ہوتا" اس نے کہا۔

میں نے اس کی ضرورت کو سمجھ لیا "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ یہ تو اصولی بات ہے۔"

وہ نصف رقم لے کر خوش بلکہ ممنون نظر آنے لگا۔ میری فرمائش پر اس نے انارکلی بازار سے کچھ حلیہ بدلنے کا سامان بھی دلا دیا اور رخصت ہو گیا۔ میں نے دروازے کو اندر سے لاک کر کے چائے بنائی اور ایک ڈبل بسکٹ کھا کے لنچ کی ضرورت سے بے نیاز ہو گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ دو بجے کے بعد وقار یوسف آ جائے گا پھر شاید رابعہ واپس آئے گی اور وہ آخر میں شام کو منظر پہنچے گا۔ اس درمیان میں غالب یا ناز کا آ جانا بھی بعید از امکان نہ تھا۔

میں نے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور جو کبھی ادرکی ایرجنتا ام پچن لی۔ ٹھیک پاؤڈر اور کاجل کے ایک مرکب کی ڈبیا مجھے زیدی فراہم کر گیا تھا۔ اس کو اپنے ہاتھوں اور چہرے پر ملنے سے میری جلد کا سفیدی مائل گندمی رنگ خاصا سانولا ہو گیا۔ زیدی کی ہدایات کے مطابق میں نے ٹشو پیپر سے رنگ کو پھیلایا اور اس میں قدرتی یکسانیت پیدا کی۔ وہ انارکلی کے کسی ہیئر ڈریسر سے بالوں کی وگ اور ایک پرانی عینک بھی لایا تھا۔ سادہ گول شیشوں والی عینک میرے چہرے کے سائز کی مناسبت سے بہت چھوٹی تھی۔ فریم پرانا ہو کے ڈھیلا ہو گیا تھا۔ اسے ناک پر جما کے میں نے سر پر جناح کیپ CAP) رکھی اور آئینہ دیکھا تو تبدیلی کے مجموعی تاثر کو دیکھ کے ہنس پڑا۔ میں نے بیڈ کے نیچے سے مشین گن نکالی اور کندھے پر لٹکائی۔ اس کا مجموعہ آدمی پٹھان کی شکل میں جنچنے پر آ گیا تو میں سو فیصد سکیورٹی گارڈ نظر آنے لگا۔

پہلا شکار وقار یوسف کو ہونا تھا۔ سوا دو بجے اس نے چابی لگا کے باہر سے دروازہ کھولنا چاہا۔ میں نے سوراخ سے جھانک کے دیکھا تو وہ مجھے حیران نظر آ رہا تھا کہ آج اس سے بھی پہلے کوئی آفس پہنچ گیا۔ پھر اس نے دستک دی اور میں نے دروازہ کھولا تو میرا ہاتھ پیشہ ورانہ مستعدی کے ساتھ مشین گن سنبھال چکا تھا۔

وقار بوکھلا کے رک گیا "تم… کون ہو تم؟"

میں نے آواز بدل کے کہا "پہلے تم بتاؤ اپنا نام۔ کیا کام ہے؟"

"میں کام کرتا ہوں یہاں۔ یہ میرا آفس ہے۔"

"کیا ثبوت ہے؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "بی بی صاحب نے بولا ہے کہ اندر کسی کو مت آنے دو۔ پہلے پوچھو کون ہے۔"

"لاحول ولا قوة۔ میں مالک ہوں اس کمپنی کا۔ اور تم کس بی بی کی بات کر رہے ہو؟ رابعہ تو میری ایڈووکیٹ میری پارٹنر ہیں۔"

"نام بولو اپنا۔"

"وقار یوسف۔ بی بی صاحب نے بتایا نہیں تمہیں؟"

"بتایا تھا۔" میں نے گن کو نیچے کر لیا "ایک وقار یوسف صاحب آئے گا۔ ایک منظر صاحب آئے گا۔ معاف کرنا آپ نام ادھر سے بتایا۔"

وقار کرسی پر بیٹھ کے مجھے گھورنے لگا "تمہیں چوکیدار رکھا گیا ہے؟ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

میں نے اسے مشین گن دکھائی "یہ ثبوت ہے۔ ہم ڈاکو ہوتا تو یہ ادھر بی بی جی کے ادھر چھپا کے رہتا۔"

اس نے مزید جرح کی۔ بی بی صاحب سے میری ملاقات کہاں ہوئی تھی۔ وہ خود کہاں ہیں۔ مجھے کیوں رکھا گیا ہے؟ کتنی تنخواہ ہے۔ ڈیوٹی کب سے کب تک ہو گی؟ آخر میں اس کو خیال آیا کہ اس نے میرا نام تو پوچھا ہی نہیں ہے۔

"شیر خان ولد محبت خان تحصیل چارسدہ ضلع مردان۔"

اچانک وقار یوسف نے پشتو بولنی شروع کر دی۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی روانی سے پشتو بول لیتا ہے۔ کبھی اسے کسی سے بھی پشتو میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا اور نہ اس کی نوبت آئی تھی۔ اب معلوم نہیں وہ کیا پوچھ رہا تھا اور میرا یہ حال تھا کہ نزع کا عالم تھا۔

"صاحب۔ ہم پشتو نہیں جانتا۔"

"مردان کے پٹھان ہو اور پشتو نہیں جانتے؟ تم ضرور کوئی جعلساز ہو۔ شرافت سے بتا دو کہ کیا چاہتے ہو ورنہ میں پولیس کو

www.paksociety.com

فون کرتا ہوں۔ یہاں کوئی بدمعاشی نہیں چلے گی۔ یہ وکیلوں کا دفتر ہے۔"

اسی وقت رابعہ آگئی لیکن وہ میرا بدلا ہوا حلیہ دیکھ کے بدحواس نہیں ہوئی۔ وقار یوسف نے اسے مسکراتے دیکھا تو چکرا گیا۔ پھر میں ہنسنے لگا اور وقار یوسف کو اپنے بے وقوف بننے پر ہنسی آئی۔

"کمال کردیا ہے آپ نے تو۔ بڑے اچھے ایکٹر بھی ہیں آپ" اس نے خفت سے کہا "مگر یہ اچانک آپ دونوں کہاں سے ٹپک پڑے۔"

رابعہ نے کہا "ہمیں آنے جھک مار کے۔ میں اپنا سامان تمہارے گھر چھوڑ کے آئی ہوں۔ آج سے میں بھی ہر روز آفس میں بیٹھوں گی۔"

"واقعی!" وقار یوسف نے خوش ہو کے کہا "کتنے دن؟"

"کتنے دن کیا۔ مستقل بیٹھوں گی۔ جیسے تم بیٹھتے ہو۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔ ضرور اس میں بھی کوئی اسرار ہے۔"

ریٹائرنگ روم میں بیٹھ کے ہم نے اسے مختصراً اپنا پروگرام بتایا "سمجھو سکندر بخت غائب ہو گیا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟"

رابعہ نے کہا "میں بات میں تمہاری بیوی کو سمجھا کے آئی ہوں کہ حضرت رات کو اچھے بھلے سوئے تھے۔ صبح غائب۔ بس ایک پرچا چھوڑ گئے تھے کہ تم کہیں جاؤ۔"

وقار یوسف تابعدار قسم کا سب کی خوشی میں خوش رہنے والا انسان تھا۔ رابعہ کو وہ باس بھی سمجھتا تھا' استاد بھی اور باجی بھی لیکن میری بھی اتنی ہی عزت کرتا تھا اور اختلاف کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کا خلوص اور اس کی خدمت گزاری سب کے لیے بالکل بے غرض تھی۔ اس نے مجھ سے یہ شکایت بھی نہیں کی کہ میں نے اس کی گاڑی کا کباڑا کردیا تھا۔

رابعہ نے مجھے ڈاکٹر شبلی کے قتل کی فائل دے دی اور میں نے اندر والے کمرے میں لیٹ کے اس درخواست کا مطالعہ کیا جو رابعہ کے ساتھ دوسرے سینئر وکیلوں نے صدر' چیف جسٹس آف پاکستان' آئی جی وغیرہ کے علاوہ برطانوی کونسلیٹ کو ارسال کی تھی اور یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو سرکاری مشینری حرکت میں آنے پر مجبور ہوئی اور دلاور کے خلاف ایف آئی آر درج ہوگئی تھی۔ اصل درخواست کے حقائق اتنے ناقابلِ تردید تھے کہ اس معاملے کو دبانا ممکن ہی نہیں رہا تھا اور اعلیٰ سطح پر تفتیش کے احکامات موصول ہو جانے کے بعد مقامی پولیس بھی بے اختیار اور بے بس ہوگئی تھی۔ ایف آئی آر بھی چیف جسٹس کے حکم پر درج کی گئی تھی اور مدعی صرف وکلا ہی نہیں تھے۔ خود برٹش کونسلیٹ نے وزارتِ داخلہ کے توسط سے ایک فریق بننے کی درخواست کی تھی۔ ہوم سیکریٹری نے آئی جی سے تین اعلیٰ افسران کے نام مانگے تھے جو اب کیس کی تفتیش کر کے رپورٹ عدالتِ عالیہ کو پیش کرنے کے ذمے دار تھے۔ اسلام آباد سے ایس پی ظفر حیات کو نامزد کردیا گیا تھا۔ اس کے معاون سی آئی اے کا ایک ڈی ایس پی شاہد علی اور ایس ایچ او انسپکٹر خدا بخش تھے۔ ایف آئی آر کو پڑھنا تو ممکن تھا لیکن میں نے دوسری سب دستاویزات کا مطالعہ کیا جن کی نقول رابعہ کو بھی ارسال کی گئی تھیں۔ ان میں برطانوی کونسلیٹ کا وہ خط بھی شامل تھا جس میں حصولِ انصاف کی خاطر تمام وکیلوں کی کوشش کو سراہا گیا تھا اور یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ ڈاکٹر شبلی کے قتل کے سلسلے میں ان سے ہر ممکنہ تعاون کیا جائے گا۔

فائل پڑھنے کے بعد میرا حوصلہ دوچند ہو گیا اور میں فائل کو سرہانے رکھ کے اپنے تصور میں گم ہو گیا۔ میں نے دلاور کو ہتھکڑی پہنے حوالات سے باہر نکلتا دیکھا' عدالت میں اسے مجرموں کے کٹہرے میں دیکھا۔ اسے جیل کے لباس میں کالی کوٹھری کے اندر دیکھا' اخبار میں اس کو پھانسی دیے جانے کی خبر دیکھی اور اس کی لاش دیکھی جو صبح صبح جیل کے دروازے سے باہر اس کے ورثا کے حوالے کی گئی تھی۔ دلاور کی گردن ایک ہاتھ لمبی ہو گئی تھی اور چہرہ جانکنی کی اذیت سے مسخ ہو گیا تھا۔

یہ سب میری خواہشات کے عکس تھے۔ حقیقت کی منزل ابھی بہت دور تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ تقدیر کے ترکش کے پہلے تیر کا نشانہ کون ہو گا؟ میں یا دلاور؟ جو میں اس کے لیے سوچ رہا تھا اس سے زیادہ بُرا وہ میرے لیے سوچتا تھا مگر کسی کے چاہنے سے کچھ ہوتا تو دنیا کب کی نیست و نابود ہو جاتی۔ ایسا کوئی نہ تھا جس کا دشمن نہ ہو اور وہ خود کسی کے وجود کو دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا نہ چاہتا ہو۔

باہر کے آفس میں اب مؤکل آنے لگے تھے۔ رابعہ اور وقار یوسف مصروف تھے۔ میں نے سو جانا بہتر سمجھا اور سوچتے سوچتے سو گیا۔ پھر اچانک جیسے بھونچال آ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی میری ٹانگ پکڑ کے مجھے گھسیٹتا ہوا لے جا رہا ہے۔ میں گھبرا کے اٹھا اور بڑی مشکل سے اپنی ٹانگ چھڑانے میں کامیاب ہوا۔ گرچہ تھا مظہر جس نے مجھے ٹانگ کھینچ کے بیڈ سے نیچے گرانے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس کشمکش کے نتیجے میں میری کوشش کسی حد تک کامیاب رہی۔ میں نیچے تو نہیں گرا لیکن میرا جوتا اتر کے مظہر کے ہاتھ میں چلا گیا۔

"یار' حد ہو گئی۔ وکیلوں کے آفس میں ایک وکیل ایسی لاقانونیت کا مظاہرہ کرے" میں نے خود کو سنبھالا۔

"یہ مظاہرہ تو ابھی ہو گا بھوتنی کے" مظہر نے جوتے کو گنڈاسے کی طرح لہرایا "تیرا جوتا اور تیرا سر۔ ایک بال نہیں چھوڑوں گا۔"

میں نے کہا "یار پہلے اپنے بال بچوں کی خبر لے۔ سنا ہے کتنے ہیں۔ بال زیادہ ہیں سر پہ کم۔ اور مشین وہی پرانی چلا رہی ہے۔"

"مشین! اب کون سی مشین؟" مظہر کنفیوز ہو گیا۔

تھا اور شاہد علی کا ماتحت۔ ان دونوں کو دلاور نے اپنی کوشش سے تفتیشی ٹیم میں شامل کرایا تھا۔ اس نے اوپر متعلقہ ایس پی اور ڈی آئی جی تک رسائی حاصل کرلی تھی۔ رسائی کا مطلب عام فہم الفاظ میں یہی ہو سکتا تھا کہ اس نے قانون کے لمبے ہاتھوں کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی تھی اور خود اس کے پیچھے پناہ لے لی تھی۔

اوپر والے افسران کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے شاندار بنگلوں سے اپنی شاندار کاروں میں اپنے شاندار آفس پہنچ کے صرف افسری کریں' احکامات صادر فرمائیں اور رپورٹیں طلب کریں۔ کسی بھی معاملے میں ذاتی دلچسپی لینا اور خود ہر جگہ پہنچ کے تصدیق یا تفتیش کرنا ان کے فرائض میں شامل نہیں ہوتا۔ چنانچہ جو کیس ماتحت بنا دیں اس پر دستخط ثبت کر کے وہ بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شبلی کے کیس میں بھی اوپر والوں کو بتایا گیا ہو گا کہ اس معاملے میں سابق ایس ایچ او اور موجودہ ڈی ایس پی صاحب کے ساتھ نئے ایس ایچ او کی شمولیت یقیناً اسلام آباد سے آنے والے ایس پی صاحب کی بھی خواہش ہو گی کیونکہ یہی دو افسران کیس کے بنیادی حقائق اور ضروری تفصیلات کا صحیح علم رکھتے ہیں۔ دیکھنا اب یہ تھا کہ اسلام آباد سے آنے والا کون ہے' کیسا ہے اور کیا کرتا ہے؟

رات کو میری ملاقات عمارت کے چوکیدار سے ہوئی۔ وہ چھوٹی دروازے کی گرل کو کھینچ کر لاک کر چکا تھا اور اطمینان سے ہٹ پہ چارپائی بچھائے لیٹا ہوا تھا۔ ریڈیو اس کے سرہانے رکھا تھا اور نہ جانے کس اسٹیشن سے فرمائشی پروگرام کے فلمی نغمے نشر ہو رہے تھے۔ چوکیدار کا سر پنجابی گانے کے بولوں پر بے اختیار ہل رہا تھا۔

میرے قدموں کی آہٹ پر وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ میں زینے سے اتر کے اس کے پاس پہنچا تو مجھے حیرت سے زیادہ اس کی آنکھوں میں خوف کے آثار نظر آئے۔ اس نے ریڈیو کی آواز کم کردی اور تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال لیا۔

"کون ہو تم۔ وہیں رک کے بتاؤ" اس نے سراسیمگی میں کہا۔

میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ اٹھائے "خبردار ابھی گولی مت چلاؤ۔ ہم چور نہیں ہیں۔ اے چوکیدار بادشاہ تمہاری طرف۔"

"چوکیدار! چوکیدار تو میں ہوں۔"

میں نے کہا "ہم وکیل صیب کا آفس میں اے۔ اندر دام باہر تم۔"

اس نے ریوالور نیچے کرلیا "کیا نام ہے تمہارا۔ مجھے تو کسی نے نہیں بتایا کہ اندر کے لیے بھی چوکیدار رکھا گیا ہے۔"

"ہم شیر خان ہے۔ خوامخواہ" اس میں ناراضگی کا کیا بات ہے۔ تم باہر کا چوکیدار ہے۔ پورا بلڈنگ کا۔ ہم چھوٹا چوکیدار ہے۔ ایک آفس کا۔ تم ہمارا افسر ہے۔"

یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی "اچھا۔ آؤ بیٹھو' میرا نام بسرام

"دفع یار۔ جس میں تو پہچانا جاتا ہے" میں نے کہا۔

"سامنے وہ بیوی ہے میری۔"

"خاک بیوی ہے۔ گھر میں جوتے کھاتا ہے اس سے اور باہر آکے لوگوں کی جوتیاں اٹھاتا ہے۔ سولہ بچوں کے اکلوتے ابا۔"

مظہر نے جوتا میری طرف پھینکا "تو باز نہیں آئے گا ذرا اے بازیوں سے۔ یہ کیا سوانگ بھرا ہے۔ ویسے ٹھیک ہو رہا ہے تیرے ساتھ جو بھی ہو رہا ہے۔ رابعہ نے چوکیدار کی وردی پہنادی۔ ابھی سے یہ اوقات ہے تیری۔ بعد میں کیا ہو گا تیرے گھر میں۔"

میں نے جوتا پہن کرلیا "جو بھی ہو گا اچھا ہو گا۔ کوئی گھر کو چڑیا گھر تو نہیں بنے گا۔"

مظہر بیٹھ گیا "دیکھ یار' تو مجھے سولہ بچوں کا طعنہ مت دیا کر۔ اس سے میری حوصلہ شکنی نہیں ہو سکتی بھوتنی کے۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔ میں تو کہتا ہوں کچھ اور بھی رونق ہونی چاہیے۔ تم سب اپنے اپنے بچے بھیج دینا میرے پاس۔ اس ریوڑ میں شامل ہو کے پل جائیں گے ورنہ تمہیں تو فرصت ملے گی نہیں ان کو پالنے کی۔"

میں نے کہا "کیا سب چلے گئے؟"

"رابعہ کو وقار یوسف اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ میں بھی جا رہا تھا۔ رابعہ نے کہا کہ چوکیدار کو جگادو۔ اندر سو رہا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "تجھے معلوم نہیں تھا پھر تو نے کیسے پہچانا مجھے؟"

"وہ کیا ہے۔۔۔ وہی راولی کی شناسد۔ ایسے ہی سمجھ لے کہ خرائی کو خرائی پہچانتا ہے۔ ویسے تو رابعہ نے بتایا تھا سب کچھ لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ ڈرامہ شروع ہو چکا ہے۔ میں نے سوچا کہ آج تو مل ہی لوں۔ ابھی کسی کو پتا نہیں۔"

"بالکل۔ آج کے بعد یہاں آفس میں کوئی بات نہیں ہو گی۔ تم لوگ۔۔۔ وقت تم میں آجاؤں گا۔"

"آنا جانا ہے لیکن احتیاط بہت ضروری ہے۔"

"غالب نے بھروسے کا آدمی بھیجا تھا۔ صبح و شام چہرہ بدلے گا۔"

"کسی نے پہچان لیا تو الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں گے بیٹا۔"

میں نے کہا "تو کیا تو پہچان سکتا تھا مجھے اس حلیے میں۔ اگر معلوم نہ ہوتا؟"

مظہر نے تنی میں سر ہلایا "تیرا واسطہ پڑے گا پولیس کے انتہائی ہوشیار افسروں سے۔ اور چوہدری دلاور سے۔ اصل خطرہ تو ان سے ہو گا۔ انہیں کوئی شک نہ ہوا تو پھر کوئی خطرہ نہیں۔"

مظہر نے جانے سے پہلے مجھے بتایا کہ انسپکٹر خدا بخش اور ڈی ایس پی شاہد علی تفتیش [illegible] موڑنے کی پوری کوشش کریں گے۔ ڈی ایس پی شاہد [illegible] عرصہ پہلے انسپکٹر تھا اور اسی تھانے میں ایس ایچ او بھی جب اب خدا بخش آیا ہے۔ خدا بخش پہلے سب انسپکٹر

www.paksociety.com

میں نے ہنس کے کہا "پہلے بہرام ڈاکو تھا اب بہرام چوکیدار ہے۔"

"کون ڈاکو۔ بہرام خان کا نیازی قبیلے سے تعلق ہے۔"

مجھے یہ بات بھی اسے سمجھانا پڑی کہ پرانے وقتوں میں بہرام نام کا ایک مشہور ڈاکو تھا جس کے نام کی اتنی شہرت تھی کہ اس پر فلمیں بنی تھیں۔ اب یہ خدا جانے کہ لیلیٰ مجنوں کی داستان کی طرح اس بہرام ڈاکو کے قصوں میں کتنی حقیقت تھی اور کتنی رنگ آمیزی۔

کچھ دیر بعد ہم دوست بن چکے تھے۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ میانوالی کے کسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس کے والدین، بیوی بچے، بہن بھائی وہیں تھے۔ تلاشِ معاش نے اسے بے گھر کردیا تھا اور اب وہ عید بقرعید کے علاوہ گھر جا ہی نہیں سکتا۔ مہینے دو مہینے بعد بیوی بچے خود اس سے ملنے آجاتے تھے لیکن وہ انہیں مستقل یہاں نہیں رکھ سکتا۔ اس تنخواہ میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کرائے کا مکان لے کر ایک گھر بسائے۔ اس کی بیوی تو یہی چاہتی تھی مگر وہ مجبور تھا۔ ابھی وہ اپنی آمدنی میں سے ایک چوتھائی اپنے گزارے کے لیے رکھتا تھا اور باقی گھر بھیج دیتا تھا جہاں سب کا مل جل کے گزارا ہو جاتا تھا۔ یہاں گھر کرایہ پر رکھتا تو ماں باپ اور بہن بھائیوں کو کیا دیتا۔ وہ بڑا بیٹا تھا اور اس پر سب کی ذمے داری تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ اپنوں سے جدائی کی مجبوری کے احساس کو یہاں تنہائی کے عذاب نے دوگنا کردیا تھا اور اسے کوئی ہمدرد ہم زبان اور ہمراز نہ ملا تھا جس سے باتیں کرکے وہ اپنے بارِ غم کو ہلکا کرسکتا۔ جب وہ باتیں کرنے لگا تو پھر مسلسل بولتا رہا اور میں نے بھی اسے دل کا غبار نکالنے کا پورا موقع فراہم کیا۔ درمیان میں اس نے ایک بار میرے لیے اپنے کیبن میں چائے بھی بنائی۔

میں نے کہا "یار یہ تمہارا بی بی لوگ آتا ہے تو کدھر رہتا ہے؟"

اس نے کہا "یار شیر خان۔ اب تم سے کیا پردہ۔ رات کو انہیں چوری چھپے یہاں رکھتا ہوں۔ صبح رخصت کردیتا ہوں کہ جاؤ لاہور کی سیر کرو۔ وہ چڑیا گھر، شالامار یا جہانگیر کے مقبرے کی سیر نہیں کرتے، وہاں پہنچ کر گھاس کے تختوں پر بیٹھ کے اور سو کے وقت گزارتے ہیں۔"

میں نے افسوس سے کہا "اب فکر مت کرو بہرام خان۔ ابھی تمہارا بی بی لوگ آنے کا تو ہم ادھر ڈیوٹی دے گا۔ تم ہمارا دفتر میں آرام کرو۔ ادھر سونے کا واسطے کمرا بھی ہے، غسل خانہ بھی ہے۔ بہت جگہ ہے۔"

وہ بے حد جذباتی ہوگیا "اچھا۔ یہ تو بڑی مہربانی ہے تمہاری۔ وہ تو وہ یہاں پڑے رہتے تھے۔ ہم میاں بیوی اندر برآمدے میں چلے جاتے تھے۔"

"کسی کی فکر بھی مت کرو۔" میں نے اسے ایک اور فراغ

"آپ کہاں گیا ہے وہ۔ فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔ آئندہ مجھ سے فون نمبر مت پوچھنا۔ اور یہ کہنا ہے بیچے والے تم سے رابطہ نہیں کرسکتے۔ یہاں تک کوئی ٹیلی فون لائن نہیں آتی۔ سمجھے؟"

"ہاں جی۔ نہیں۔ میرا مطلب تھا بالکل سمجھ گیا" اس نے میری بات کا غلط مطلب نکالتے ہوئے سکندر سے کہا۔

مجھے چند منٹ انتظار کرنا پڑا۔ پھر ولاور اپنے گھر یا کسی ٹھکانے پر پہنچ گیا اور رابطہ مل گیا "سکندر۔ یار تم پریشان کررہے ہو مجھے۔"

"یار میں لعنت بھیجتا ہوں تمہاری یاری پر۔ اور پریشانی تو ابھی تم نے دیکھی بھی نہیں ہے بیٹا" میں نے کہا "تمہیں دن میں تارے نظر آئیں گے اب۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ میری ایک معمولی سی غلطی نے کھیل تھوڑا سا بگاڑ دیا ہے مگر میں بازی نہیں ہارا ہوں سکندر" ولاور نے برہمی سے کہا "تم یہ سمجھنے لگے ہو کہ میرے ہاتھ میں کوئی پتا نہیں رہا تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ ہر پتا ہے میرے پاس۔"

"پھر چال چلنا کیوں بھول گئے ہو۔ سامنے میدان میں آکے مقابلہ کیوں نہیں کرتے؟" میں نے طنز سے کہا۔

"یہ تمہارا چیلنج ہے تو مجھے منظور ہے۔ تم بھی آجاؤ کھل کے سامنے۔ ابھی کس منہ سے تم میدان میں لڑنے کی بات کرتے ہو جبکہ خود تم ہی سب سے بڑے بھگوڑے ہو اپنے سکندر صاحب۔ ہمت تم میں نہیں ہے کسی کو منہ دکھانے کی۔ ہیں جی؟ سنا ہے اپنے دوستوں سے بھی ڈرتے ہو۔ دشمنوں کے خوف نے تو پہلے ہی زندگی حرام کردی تھی۔ اکیلے منہ چھپائے پھر رہے ہو سب سے۔"

میں نے کسی دلہن کی طرح نقاب لگا کے اپنی شکست کو چھپایا "میرا چہرہ اتنا برا نہیں ہے چوہدری صاحب۔ تمہاری سی آئی ڈی نے میرے بارے میں ہمیشہ غلط خبریں فراہم کی ہیں۔ دوست تو آج بھی میرے ساتھ ہیں۔ دوست تو نہ چھوڑتے ہیں اور نہ چھوڑے جاتے ہیں۔ دوستی کا رشتہ تو زندگی کے ساتھ رہتا ہے اور آزمائش کے وقت ہی خلوص کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے مگر تم یہ باتیں نہیں سمجھو گے کیونکہ تم ضرورت اور غرض کے رشتوں کو جانتے ہو۔"

ولاور نے کہا "ان باتوں کو چھوڑو اپنے سکندر صاحب۔ اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟ ہیں جی۔ ہماری بات پر غور تو کیا ہوگا تم نے۔"

"بہت غور فرمایا ہم نے اور اس نتیجے پر پہنچے بالآخر کہ ویسے تو معاملات بہت ہیں مگر ایک مسئلے پر سودا ہوسکتا ہے۔ تم بیٹو کو میرے حوالے کردو اور میں تم کو ڈاکٹر شبلی کی قبر کا نشان بتادوں۔"

"یہ بھی ہوسکتا ہے" ولاور نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "ابھی تو بیٹو شہر سے باہر ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وزیر خان مرحوم کی لاش اب کہاں دفن ہے۔ وہ جگہ میں تم کو دکھا سکتا ہوں۔"

"ولاور۔ میرے والد کو ایسے پیسے کی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم سب

مٹی خاک ہیں اور خاک میں بھی ہو خاک ہے۔ ہمارا تو عقیدہ ہے کہ یومِ حشر ہر شخص اپنی قبر سے مکمل کے ساتھ اپنے بدن سے اٹھے گا۔ اللہ وزیر خان کی مغفرت کرے۔ میری ہرگز یہ خواہش نہیں ہے کہ میں ان کے مدفن پر کوئی مزار تعمیر کروں یا اسے پھر وہیں لے جاؤں جہاں اسے پہلی بار دفن کیا گیا تھا۔ ان کی روح کے لیے ایصالِ ثواب اور مغفرت کی دعائیں کہیں بھی رہ کے کرسکتا ہوں۔ اصل مقصد ہے اس قاتل کی گردن پکڑنا جس کو قانون پھانسی کا پھندا ڈال سکتا۔ میرے یقین کے مطابق وہ اسلم پیڈو تھا جس نے میرے شریف النفس اور بے گناہ باپ کو ہر طرح کی اذیت اور بہیمانہ تشدد سے مارا تھا۔ اگر قاتل کوئی اور تھا تو یہ بات بھی مجھے پیڈو ہی بتا سکتا ہے۔ میں اس کے شہر واپس آنے کا انتظار کرسکتا ہوں۔ تمہیں تو معلوم ہوگا کہ وہ کہاں گیا تھا اور کس کام سے؟"

"اپنے سکندر صاحب۔ ہمارے درمیان بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ ہم ایک بار مل کے بہت سے معاملات ختم کرسکتے ہیں، ہیں جی۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ملنے کے بہانے تم میرے خلاف کوئی نئی سازش نہیں کرو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ قسم کھا سکتا ہوں۔"

"تمہارے وعدے اور تمہاری قسمیں۔" میں نے ہنسی سے کہا "چوہدری صاحب۔ سکندر بخت کو الو کا پٹھا سمجھنا چھوڑ دو۔"

"مجھے ایک چانس دو۔ پلیز آخری بار اعتبار کرکے دیکھو۔"

اس کا لجاجت آمیز لہجہ بھی مجھے قائل نہ کرسکا۔ "مجھے تو شک ہے کہ اتنی لمبی بات بھی تم صرف اس لیے کررہے ہو کہ تمہارے شکاری کتے مجھ تک پہنچ جائیں۔"

"نہیں۔ پہلی بار وہ میری غلطی تھی۔"

"بہت خوب۔ تم سے بھی غلطی ہوتی ہے اپنے چوہدری صاحب۔"

"یہ بتاؤ صبح تم سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں نہ میرے وعدے پر اعتبار ہے نہ میری قسم پر لیکن تم خود سمجھتے ہو میری پوزیشن کو۔ جیسا تم کہو گے ویسا ہی ہوگا۔ مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔"

یہ شاید پہلا موقع تھا جب میرے کان ولاور کے منہ سے اس قسم کے الفاظ سن رہے تھے۔ گردشِ حالات اسے مجبوری کے اس موڑ پر لے آئی تھی کہ اسے بچاؤ کے سب راستے بند نظر آرہے تھے اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اس وقت میرے سوا کوئی بھی اس کی مدد کرنے والا نہیں ہے۔ مجھ سے بھی اسے کیا توقع ہوسکتی تھی مگر وہ چالاک لومڑی کوشش کررہا تھا کہ مجھے اس پر اعتبار آجائے اور میں باہمی مفاد میں سودے بازی پر راضی ہو جاؤں۔ میں ولاور کی رگ رگ کو پہچانتا تھا۔ خود کو اپنی دولت اور غنڈہ فورس کی طاقت کے بل پر ناقابلِ شکست سمجھنے والا قانون کو اپنی زرخرید کا

دلا نہ پیش کش کی ہم، اور عمرہ بوٹی دے گا۔ سود چاروں کا کوئی بانڈ نہیں ہے۔ کسی کو معلوم نہیں ہوگا۔ رات کو ایک فون کافی ہے۔ ولی کرنا اسے تو سیر کو جائے۔"

ظاہر ہے اس کے بعد خود میرے لیے رات کو کسی بھی وقت کہیں آنے جانے کا مسئلہ پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگیا۔ بہرام کے ساتھ باہمی تعاون اور پیشہ ورانہ رفاقت کا یہ سلسلہ بہت عرصے کامیابی سے چلتا رہا۔ بہرام جلد ہی سو جانے کا عادی تھا مگر اس رات وہ بارہ بجے تک مجھ سے باتوں میں مصروف رہا۔ ظاہر ہے میں نے اسے اپنے بارے میں جو تھوڑا بہت بتایا وہ غلط تھا اور میرے اپنے ذہن کی اختراع تھا مگر اس نے یقین کیا۔

رات بارہ بجے میں نے نیند کے بہانے گلوخلاصی حاصل کی ورنہ شاید وہ برسوں کے اکیلے پن کی کسر رات بھر جاگ کے اور مجھے جگا کے پوری کرتا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ بہرام بھی سو چکا ہے تو میں نے ولاور سے رابطے کا مواصلاتی نظام برقرار کیا۔ سیکنڈ فلور کے سب دفاتر بند تھے لیکن چھت پر جانے کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ نصف شب کے سکوت میں ڈوبی ہوئی رات کا نظارہ ایک ایسا جذباتی تجربہ تھا جو اس شہر میں گزارے ہوئے خوب صورت وقت کی ان گنت تصویروں سے سجا ہوا نگار خانہ لگتا تھا۔ تاحدِ نظر پھیلی ہوئی روشنیاں تاریک آسمان کے ستاروں سے سرگوشیاں کررہی تھیں اور گھروں کے چراغ رفتہ رفتہ گل ہوتے جارہے تھے۔ نیند کا سہانا سایہ دن بھر کے تھکے ہاروں کو راحت و سکون کا پیغام دے رہا تھا اور محبتوں کے سمندروں کے شناور بھی بالآخر تھک کے آسودگی کے ساحل پر محوِ خواب ہونے لگے تھے۔

میں نے چھت پر بنے ہوئے اسٹور میں ایک پلگ تلاش کرلیا۔ اڈاپٹر لگا کے میں نے ریسیور کو چیک کیا۔ اس کی سرخ روشنی سے ظاہر ہوتا تھا کہ ٹرانسمیٹر کے تمام کل پرزے اپنی اپنی کارکردگی کے مطابق رابطے کے فرائض سرانجام دینے کے لیے تیار ہیں۔ اتنی بلندی پر ایریل کو مزید اونچا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے ایک کھلی جگہ پر ریڈیو ایریل سے منسلک کردیا۔

بٹن دبانے کے بعد کچھ دیر سکوت رہا۔ میں نے مسلسل "ہیلو ہیلو" کہا تو کسی نے سوتے سوتے جواب دیا "حکم کرو۔"

"حکم کے غلام کہاں مرگئے تھے۔"

"وہ جی ذرا آنکھ لگ گئی تھی" وہ اب میری آواز پہچاننے لگا تھا "چوہدری صاحب بہت دیر سے یہاں موجود تھے۔ ابھی ابھی گئے ہیں۔"

"لڈو کھیل رہے تھے تمہارے ساتھ یا تاش؟"

"آپ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ اپنا فون نمبر تو دو جناب عالی۔ میری شامت آجاتی ہے۔ چوہدری صاحب کہتے ہیں کہ سکندر سے بات کراؤ۔ لیکن میں کیسے بات کراؤں آپ سے۔ مجھے کیا معلوم؟"

www.paksociety.com

غلام بخش رالا اور مجھے اہم آدالیں نسبت ... کے دعوے رکھتے رالا اچانک خود کو بے بس اور لاچار اور مجبور تسلیم کر رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کی فطرت کسی انقلاب سے دوچار ہو چکی تھی اور کسی معجزے کے نتیجے میں وہ شیطان کے راستے کی پیروی چھوڑ کے صراطِ مستقیم اپنا چکا تھا یا اسے ہدایت مل گئی تھی۔ نہیں! وہ مجھے الو بنا کے اس جال سے نکلنا چاہتا تھا جس میں تقدیر ہر شکاری کو کبھی نہ کبھی گرفتار کر لیتی ہے۔

رالاور نے کہا "کس سوچ میں پڑ گئے آپ سکندر صاحب"

میں نے سوچ کے کہا "میں بھی اب تھک گیا ہوں چوہدری صاحب۔ مجھے بھی احساس ہو رہا ہے کہ میں نے بہت وقت ضائع کیا۔ کچھ نہیں ملا مجھے اس جذباتی پاگل پن سے۔ اگر میں عقل سے کام لیتا تو آج تمہارے ساتھ میں بھی ایک مطمئن اور خوش حال زندگی گزارتا نظر آتا۔ تم نے معافی تلافی سے بہت پہلے ہی مجھے شراکت کی پیش کش بھی کی تھی۔"

وہ شک میں پڑ گیا "شراکت۔ میرے کاروبار میں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ تو تجربہ کی بات تھی۔ ہاں میں تم پر اور تمہارے کاروبار پر لعنت بھیج کے الگ ہو سکتا تھا۔ رابعہ کے ساتھ لندن جا کے آباد ہو سکتا تھا۔ بلکہ اس سے بھی پہلے... چھوڑو۔ یہ تجربہ تو عمر اور وقت کے ساتھ ہی آتا ہے ... کچھ گنوا کے ہی تو پا سکتا ہے۔"

"اگر تم سیریس ہو تو آپ سکندر صاحب۔ مٹی پاؤ گزری باتوں پر اور سمجھو کہ بس آج سے پیچھے دیکھنا ہی نہیں۔ سب کی اور نظر رکھنی ہے اسی پر۔ کیا کہتے ہیں آپ؟ مستقبل پر۔ دل صاف اور ہر فیصلہ صاف۔ پارٹنرشپ نہ سہی۔ ہم اپنا اپنا کام کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے معاملے میں ٹانگ اڑائے بغیر۔ سب کی بھلائی ہے اسی میں۔"

میں نے اسے بولنے دیا۔ وہ اس خیال سے خوش تھا کہ بالآخر میں نے اس سے مفاہمت کا فیصلہ کر لیا اور موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ یہ موقع مجھ سے زیادہ اس کے لیے سازگار تھا اور میرے فیصلے سے اس کے آج کی ہر مشکل آسان ہوتی نظر آ رہی تھی۔ نفی کی بات صرف مجھے خوش فہمی کا فریب دینے کے لیے تھی ورنہ میں بھی سمجھتا تھا کہ کل رالاور پھر وہی ہو گا جو کل تھا۔

"اچھا۔ اب دھیان سے میری بات سنو۔ میں تم سے ملاقات کے لیے تیار ہوں لیکن یہ نہ کسی کی فتح کی تقریب ہے نہ شکست کا جشن۔ نہ کوئی کسی کے سامنے ہتھیار ڈالنے آئے گا اور نہ ہی اپنی مونچھ نیچی کرنے۔"

"فکر مت کرو جی۔ مونچھ تمہاری ہی اونچی رہے گی آپ سکندر صاحب۔"

"میں پھر تمہیں خبردار کرتا ہوں رالاور کہ تم نے چالبازی کی تو تمہاری خیر نہیں۔ اس بار کوئی تمہیں نہیں بچا سکے گا۔ تم زندگی کو ملاقاتوں کے پیچھے رکھنا نہیں چاہتے تو اس آخری موقعے سے فائدہ"

"میں ٹھیک بارہ بجے وہاں اکیلا آؤں گا۔ اس کے بعد؟"

"ہم کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ وہیں معاملات کو طے کر سکتے ہیں یا دوران ملاقات کے لیے شرائط طے کر سکتے ہیں۔ یہ سب کل کے بعد دیکھا جائے گا۔ مستقبل کا انحصار تمہارے رویے پر ہے۔" میں نے ریسیور آف کر دیا۔

مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ اس بار رالاور خود کو چوہے دان میں پھنس جانے والے چوہے سے زیادہ بے بس محسوس کر رہا ہے اور گرفتاری کے خوف نے اس کی ساری اکڑفوں نکال دی ہے۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اتنی ہوشیاری سے بنایا جانے والا منصوبہ یوں ناکام ہو گا کہ اسے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس نے تو ڈاکٹر شیلی کو لندن سے اس لیے بلوایا تھا کہ ایک تیر سے دو شکار کرے۔ پہلے مجھے شیلی کے جال میں گرفتار کرا دے اور پھر میرے ہاتھوں ہی شیلی کا کام تمام ہو۔ رابعہ مجھ سے بدظن ہو جائے اور رالاور کے راستے کا کانٹا نکل جائے۔ اس کی یہ چال الٹی ہو گئی تھی۔ صورت حال یہ تھی کہ خود رالاور قتل کے الزام میں مطلوب تھا۔ اگر اس کا جرم ثابت ہو جاتا تو اسے تختہ دار سے کوئی وکیل معافی نہ بچا سکتا۔ یہ پولیس اس کی زر خرید اور حلیف تھی وہ اس کی حریف ہو گئی تھی کیونکہ معاملہ اب کسی لاوارث کا نہیں تھا۔ ایک غیر ملکی شہری کا تھا جو لیڈی ڈاکٹر تھی اور یہاں بھی ... آئی ہوئی تھی۔ رالاور اسے تسلیم کرنے تو چند روز کا مکس ملتا ... اور پھر لندن میں اس کے خلاف زہر کے قتل کی پرانی فائل کھل جاتی اور اسے قاتل کی حیثیت سے شناخت کرنے والا ایک گواہ بھی سامنے آ جاتا جو اس کے جرم کی سزا کاٹ رہا تھا۔ رابعہ کے ساتھی سینیٹرز، وکیلوں نے اور برطانوی کونسلیٹ نے ان سب حربوں کو بے اثر بنا دیا تھا جو اس ملک کا ہر دولت مند ذی اثر اور بااثر یا رسوخ شخص قانون کی عملداری کو بے اثر بنانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

اس رات مجھے عجیب سی بے چینی رہی۔ میں سونے کی کوشش کرتا تھا تو تصور میں نور جہاں کا زبانِ شکستہ حال مقبرہ آ جاتا تھا جہاں لوحِ مزار پر خود اس کی پیش کوئی ایک درد عبرت کی تحریر تھی۔

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

(ہم غریبوں کے مزار پر نہ کوئی چراغ جلتا ہے نہ پھول چڑھتا ہے چنانچہ کوئی پروانہ جلنے کو نہیں آتا اور کوئی بلبل یہاں نغمہ زن نہیں ہوتی)

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات اٹھارھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد و مقبول سلسلہ
شکاری
اٹھارواں حصہ

پسندیدہ رسائل و ڈائجسٹ کی اپنی حاصل کریں
خریدنے کے لیے ... تشریف لائیں

شکاری

معاشرے کے ناسوروں کی نشاندہی جو بستی میں
پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اتر جاتے ہیں
کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے
روز و شب موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن
سلگتی راتیں، آس و یاس، خوف و ہراس
تلخ حقیقتیں، شہر بے خواب

میری پہنچ تصور مجھے کبھی ایک منظر کہانی تھی تو کبھی دوسرا۔ شکاری دلاور بھی تھا اور شکاری میں بھی تھا۔ ہم ایک ہی شکار گاہ میں آمنے سامنے ہوں گے تو فضا کے تیر کا نشانہ کون ہوگا؟ کون کس کے پھیلائے ہوئے دام ہم رنگ زمیں میں گرفتار ہوگا؟ تدبیر کس کی کارگر ہوگی اور تقدیر کس کا ساتھ دے گی؟ یہ سب سوچ کے مجھے اٹھانے ہو رہے رابعہ ہی نہیں، اس کے ساتھی رکیل تمہارے خلاف درج ہونے والی ایف آئی آر کر تمہارے گلے کا پھندا بنا کے رکھ لیں گے۔ تمہارا پیسہ، اثر و رسوخ اور بد معاشی کا زور برطانوی کونسلیٹ کے لیے بے معنی ہے... خود حکومت بے بس ہے۔"

"میں سب جانتا ہوں۔ مانتا ہوں اپنے سکندر صاحب کہ اس چال میں تم نے مجھے شہ مات دی ہے جی تی، اور وہ السندی ہے۔ کیا کہنے تمہارے... بہرحال۔ میں بالکل سمجھ رہا ہوں کہ ڈاکٹر شبلی کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوا تو کیا ہوگا۔ میری عزت میرا مستقبل میری زندگی سب داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ اس لیے تم پر اعتبار کرنا ہی ہے مجھے، کہ میں مجبور ہوں۔ تمہارے ساتھ چالبازی کرنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں نقصان ہوگا۔ تمہارے بابی کی اور چاہنے والے مجھے چھوڑیں گے نہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ کل تم کہاں ملو گے؟"

"جہاں تم کہو۔"

میں نے کہا "دوپہر ٹھیک بارہ بجے نور جہاں کے مقبرے میں۔"

"اتنی دور ویرانے میں؟"

میں نے کہا "جگہ کا انتخاب میرا ہوگا۔ کسی آبادی میں مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ تم اکیلے آئے ہو یا اپنے ساتھ تم نے تمام شکاری کتے بھی لا سکتے ہو۔ تمہارے نزدیک ان مخلوق۔ جان کی کوئی اہمیت نہیں۔ تم انہیں مروانے ہی رہتے ہو۔"

"میں نے کہا تاکہ کوئی نہیں آئے گا۔"

"کیا بجے کے لیے میں نور جہاں کے مزار پر موجود رہوں گا۔ اس سڑک پر جو مقبرہ جہانگیر کی طرف جاتی ہے پام کے یا کھجوروں کے کسی جھنڈ سے میں آنے جانے والوں پر نگاہ رکھوں گا۔ سیر و تفریح کے لیے آنے والے تانگوں میں گزرتے ہیں یا سائیکلوں پہ آتے ہیں۔ وہ سب مقبرے کی بیرونی دیوار کے عین گیٹ پر اترتے ہیں۔ کسی نے ادھر اُدھر مورچہ بندی کی تو مجھے اندازہ ہو جائے گا۔ حقیقت تو یہ ہے دلاور کہ میں نے اس راستے پر نگرانی کا پکا انتظام

کیا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم مجھ سے بات ختم کرنے ہی اپنی غنڈہ فورس کو آس پاس پوزیشن سنبھالنے کے لیے روانہ کرو۔ وہ رات بھر چھپے رہیں اور کل دوپہر تک سامنے نہ آئیں۔"

"بڑا افسوس ہے اپنے سکندر اعظم صاحب..."

"یہ افسوس کی بات نہیں۔ احتیاط کا تقاضا ہے کہ دشمن کی ہر چال کا پہلے سے اندازہ..." میں نے اس کی بات کاٹ دی "تم سے کچھ بعید نہیں ہے۔ ممکن ہے تمہارے بندے مقبرہ جہانگیر میں سیر کرنے نظر آ سکتے ہیں مگر تمہارا اشارہ ملتے ہی باہر آ کے نور جہاں کے مزار کو گھیر لیں۔ اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ اگر مجھے کوئی گڑبڑ نظر آئی تو ملاقات ہو جائے گی۔ اس وقت میری یا تمہاری قانونی پوزیشن تقریباً ایک جیسی ہے۔ اگر پولیس نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تو تم بھی پکڑے جاؤ گے۔"

www.paksociety.com

کیا۔
"آپ کو سرکاری طور پر اس کی اجازت ہے؟" سوال ڈی ایس پی نے کیا تھا جو کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔
"کس بات کی اجازت؟" میں نے ہاتھ ہلا کے کہا "میں صرف ایک قبلی امانی ہوں۔ سراغ رساں بھی نہیں ہوں۔ تعطیل طلب تو نہیں ہوگی۔ جیسے سب رہیں گے ایسے ہی میں بھی رہوں گا۔ یہاں کے صحافی اپنی اپنی رپورٹ اخبار کو دیں گے۔ میں یہ رپورٹ مسز شیلی کے انکل کو دوں گا۔ انہیں آپ ضرور جانتے ہوں گے۔"
"وہ جو انگلینڈ میں ہیں" ظفر حیات نے کہا۔
"نہیں۔ خود ڈاکٹر شیلی کا تعلق انگلینڈ سے تھا۔"
"پھر انہوں نے ایک فرنچ وکیل کا انتخاب کیوں کیا؟ کیا برطانیہ میں انگریزی بولنے والے وکیل نہیں تھے۔ وہاں تو پرائیویٹ سراغ رساں بھی ہوتے ہیں۔"
"بالکل ہوتے ہیں" میں نے کہا "لیکن ہر شخص کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ میں ڈاکٹر شیلی کا دوست تھا۔ شاید اس لیے۔"
ظفر حیات چالاک تری تھا اور کچھ عرصہ پیرس میں گزار چکا تھا۔ اس نے مجھ سے پیرس کے بارے میں بہت سے سوالات کیے جن کا جواب وہی دے سکتا تھا جو پیرس میں رہا ہو۔ آپ فلاں کیفے میں گئے ہیں کبھی۔ فلاں آرٹ گیلری کے باہر جو فوارہ ہے وہ دیکھا ہے آپ نے۔ فلاں تھیٹر اور آپیرا بہت شاندار ہے۔ رہائش کہاں ہے آپ کی؟ آفس کہاں ہے؟"
میں اور محسن جب لندن میں تھے تو ہر ویک اینڈ پر پیرس جاتے رہتے تھے۔ ہم جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کی سیاحت بھی خوب کر چکے تھے۔ ان ممالک کے درمیان ویزا کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ اگر آپ کے پاس پاسپورٹ ہے تو آپ اپنی گاڑی میں بلا روک ٹوک برطانیہ سے جرمنی، فرانس، سوئٹزرلینڈ یا آسٹریا جا سکتے ہیں۔ ویزا ملک کی سرحد پر لگا دیا جاتا ہے اور بعض اوقات اس کا تکلف بھی نہیں کیا جاتا۔ سرحدی محافظ عام سیاح کو اس کے حلیے سے پہچان لیتے ہیں اور اس سے کوئی تعرض نہیں کرتے۔
میں ظفر حیات کو پوری طرح مطمئن کرنے میں کامیاب رہا۔ اس دوران چائے بھی آئی اور فضا خاصی دوستانہ رہی مگر ڈی ایس پی شاہد علی اور انسپکٹر خدا بخش کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات واضح طور پر تشویش میں بدل گئے۔
"کیا آپ انگریزی تھوڑی بہت بھی نہیں جانتے؟" ظفر حیات نے کہا۔
"وہری لٹل" میں نے مسکرا کے کہا "یہ مترجم مجھے یہاں ایمبیسی کے کچھ عہدے داروں کی طرف سے فراہم کیا گیا ہے۔ غالباً وہ لوگ اس سے ہر ایسے کیس میں مدد لیتے ہیں۔"
ظفر حیات ایک دم چونکتا ہوا بولا "آپ مل چکے ہیں ان سے؟"
"نہیں۔ ان سے اور کچھ مقامی صحافیوں سے کل ملاقات ہوئی تھی" میں نے کہا۔
کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا "موسیو آندرے اس وقت میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"
"خدمت کچھ نہیں" میں نے کہا "مجھے ایک اطلاع ملی تھی۔ کسی نے کل رات مجھے کال کیا۔ ہوٹل ٹیلیفون پر۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر شیلی کا قاتل کسی مقبرے میں چھپا ہوا ہے۔"
مولوی غلام حسین نے اس کا ترجمہ کیا تو ڈی ایس پی شاہد علی نے بے اختیار کہا "یہ کیا بکواس ہے۔"
انسپکٹر خدا بخش بولا "کس نے چکر دیا ہے اسے؟"
"کس مقبرے میں؟" ظفر حیات لطف اندوز ہو کے بولا۔
میں نے مولوی سے مشورہ کیا۔ یوں جیسے میں اس سے کچھ پوچھ رہا ہوں پھر غلام حسین بولا "مقبرہ ہے نور جہاں کا۔"
"وہ کوئی ملکہ تھی" میں نے مسکرا کے کہا۔
ظفر حیات مسکرایا "موسیو آندرے۔ ایسی بے بنیاد اطلاعات پر آپ کو توجہ نہیں دینی چاہیے اور نہ یہ توقع رکھنی چاہیے کہ ہم کوئی ایکشن لے سکتے ہیں۔"
"چیک تو کر سکتے ہیں آپ۔ اس میں کیا حرج ہے۔"
"اس میں بھی وقت ضائع ہوگا" ظفر حیات نے مایوسی سے سمجھایا۔
"تفتیش تو امکانات پر ہی کی جاتی ہے۔ اس میں وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔ آپ اس امکان کو نظر انداز کیسے کر سکتے ہیں کہ یہ اطلاع صحیح بھی ہو سکتی ہے" میں نے کہا "آخر کسی کو کیا ضرورت تھی مجھے فون پر یہ اطلاع دینے کی؟ بہت کم لوگ مجھے جانتے ہیں۔"
"سر یہ کسی کی شرارت ہوگی۔ بوگس کال" خدا بخش بولا۔
"میں اب تک جتنے لوگوں سے ملا ہوں وہ سب سنجیدہ مزاج اور معقول لوگ تھے۔ بے حد ذمے دار۔" میں نے ترجمہ سن کے کہا۔
"سر کیا ہم اس کی باتوں کو اتنی اہمیت دیں گے۔ اسے کیا پتا یہاں کیا ہو رہا ہے؟" شاہد علی بولا۔
"ہم اس کی باتوں کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتے" ظفر حیات سوچ میں پڑ گیا "اس کا کیا جائے؟ جب یہ کہہ دے گا کہ میں نے بتا دیا تھا مگر پولیس نے میری اطلاع پر ایکشن ہی نہیں لیا۔ کل خبر آ جائے گی۔"
"تو کیا آپ چھاپا ماریں گے سچ مچ؟" خدا بخش بولا۔
"کیا چھاپا؟ جھوٹ موٹ بھی مارا جاتا ہے" ظفر حیات نے اسے گھورا "حکم ان" اپنی نفری سے کہو کہ تیار ہو جائے۔ ایک منٹ بعد ہم ساتھ چلیں گے۔ اس کو ابھی تک سیکرٹ رکھو۔ چھاپا مار پارٹی کو بتایا جائے کہ ہم جا رہے ہیں شاہی قلعے کے نزدیک۔ صرف چار مسلح سپاہی ساتھ لو اور چلو۔"
شاہد علی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "سر اب یہ دربار میں

پولیس نے ... فون سے اعلان کیا "اندر کون ہے۔ تمہیں تین منٹ کی مہلت دی جاتی ہے باہر آ جاؤ۔"
ظفر حیات نے کہا "کیا وہ مسلح ہوگا؟"
بالکل بے خیالی میں خدا بخش کے منہ سے نکل گیا "کون چوہدری دلاور؟"
ظفر حیات کی نظر اس پر جم گئی "چوہدری دلاور!"
خدا بخش سے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔ اب وہ اپنے افسر اعلیٰ کو کسی طرح بھی مطمئن نہیں کر سکتا تھا کہ یہ نام اس کی زبان پر کیوں آ گیا تھا۔
"تم یہ سمجھتے ہو کہ وہی قاتل ہے؟" ظفر حیات نے سخت لہجے میں کہا۔
"نہیں... نہیں سر... وہ تو لوگ بکواس کرتے ہیں۔"
"کون لوگ؟ اور لوگوں کی بات چھوڑو۔ تم نے یہ نام کیوں لیا تھا؟" ظفر حیات نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ تم بھی ایسا ہی سمجھتے ہو؟"
شاہد علی نے پھر میگا فون پر اعلان کیا "اب دس تک گنتی ہوگی۔ ایک... دو... تین..."
میں نے غلام حسین سے کہا "کیا یہ لوگ پاگل ہیں؟ انہیں پہلے اندر جا کے دیکھنا چاہیے۔ انہوں نے کیوں فرض کر لیا ہے کہ اندر کوئی آتشیں اسلحہ لیے بیٹھا ہے اور مزاحمت کرے گا یا بم پھینک دے گا۔"
غلام نے کہا "کیا پتا اندر کوئی بھی نہ ہو۔"
لیکن اسی وقت اندر سے ایک فائر ہوا اور ایک پولیس مین زمین پر گر کے تڑپنے لگا۔ باقی پولیس والے فوراً لیٹ گئے اور اندھا دھند گولیاں چلانے لگے۔ ان کی رائفلوں کا رخ مقبرے کی طرف تھا۔ انسپکٹر خدا بخش ایک درخت کے پیچھے ہو گیا اور ریوالور سے فائر کرنے لگا۔
ظفر حیات نے جیپ کو گیئر میں ڈالا اور آگے لے گیا۔ اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لیا اور ہم جیپ کے پیچھے سے پولیس مقابلہ دیکھنے لگے۔ میرے ساتھ ٹائر کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا مولوی غلام حسین زیر لب درود شریف پڑھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے دعا کے انداز میں اٹھے ہوئے ہاتھ کانپ رہے تھے۔
ظفر حیات نے کہا "بے وقوف۔ ان کو پہلے خیال نہیں آیا۔ خواہ مخواہ ایک نفری مارا گیا۔ اس باسٹرڈ انسپکٹر کو ضرور معلوم تھا کہ بہادر علی یہاں ہو سکتا ہے۔ وہ ایک خطرناک تری ہے۔"
میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں نے اس کی بات نہیں سمجھی مگر اس کی رائے سن کے مجھے خوشی ہوئی۔
شاہد علی نے پھر وارننگ دی "مقابلہ بند کرو ورنہ ہم اندر بم پھینک دیں گے۔"
مت آئیں۔ اس طرح خواہ وکیل اور صحافی آپ کو بہت پریشان کریں گے۔"
"مجھے کوئی پریشان نہیں کر سکتا۔ اور رسک میں زیادہ قبول کرتا ہوں۔ شاہد علی!" ظفر حیات نے برہمی سے کہا "مجھے اپنی ساکھ بہت عزیز ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے خلاف نااہلی کی جھوٹی خبر بھی کسی اخبار میں شائع ہو۔ فرض کرو ایک فیصد امکان ہے اس اطلاع کے سچ ہونے کا۔ میں یہ ایک پرسنٹ رسک نہیں لینا چاہتا۔ پھر تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اس طرح مجھے کیا فائدہ حاصل ہوگا۔ میں اس فرنچ وکیل پر ثابت کروں گا کہ ہم گمنام اطلاعات پر ایکشن نہیں لیتے تو ٹھیک ہی کرتے ہیں۔ یہ برطانیہ، فرانس نہیں ہے جہاں کوئی شہری پولیس یا فائر بریگیڈ اور ایمبولینس والوں کو جھوٹا فون نہیں کرتا۔ یہاں پڑھے لکھے بھی ایسا بے ہودہ مذاق کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔"
"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر" شاہد علی قائل ہو گیا "اس کا منہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔"
ظفر حیات مولوی سے مخاطب ہوا "اس اُلو کے پٹھے سے کہو کہ ہم اس کی اطلاع پر کارروائی کر رہے ہیں مگر یہ غلط ہوئی تو آئندہ میں اسے اپنے آفس میں قدم نہیں رکھنے دوں گا۔ جوتے مار کے نکال دوں گا۔ میں گوری چمڑی سے متاثر نہیں ہوتا اور نہ کسی صحافی سے ڈرتا ہوں۔ بس اپنا کام کرتا ہوں۔"
مولوی نے کہا "آپ سمجھ تو گئے ہوں گے موسیو آندرے۔ کیا میں ترجمہ کروں اُلو کے پٹھے کا۔"
میں نے مسکرا کے کہا "تم ترجمہ کر کے اسے بتا دو کہ گدھے کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔"
ظفر حیات فوراً کھڑا ہو گیا تھا۔ شاہد علی اور خدا بخش نے بھی بڑی مستعدی کا ثبوت دیا مگر وہ خوش بہرحال نہیں تھے۔
"یار خواہ مخواہ کی پڈ لگ گئی" شاہد علی نے زیر لب خدا بخش سے کہا۔ اس طرح کہ ظفر حیات نہ سنے۔
میں نے کہا "آپ نے مجھ سے کچھ کہا، غلام؟"
غلام نے کہا "جواب میں کیا عرض کروں؟ یہ بتا دیں؟"
ایک گھنٹے بعد پولیس نے نور جہاں کے مقبرے کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ میں ظفر حیات کی جیپ میں بیٹھا ہوا ظاہری بے نیازی سے تمام کارروائی دیکھ رہا تھا۔ سڑک پر کچھ راہ گیر بھی رک گئے تھے مگر پولیس نے کسی کو قریب نہیں آنے دیا۔ پولیس ہیڈ آفس سے یہاں تک سارا راستہ میں سخت تشویش میں مبتلا رہا تھا۔ مجھے پریشانی یہ تھی کہ دلاور اندر موجود ہوا تو کیا ہوگا؟ کیا پتا اس کے مخبر دور دور تک موجود ہوں اور انہوں نے محاصرے سے قبل ہی دلاور کو خبردار کر دیا ہو۔ وہ عین وقت پر نکل گیا ہو۔ لیکن یہاں اس کا فرار ہونا آسان کام نہ تھا۔ یہ غیر آباد علاقہ تھا جس کے آس پاس پرانے باغ کے آثار باقی رہ گئے تھے یا چند درخت تھے۔

www.paksociety.com

خوف بھی محسوس ہوتا تھا اگر میری نیت صاف نہ ہوتی … میں وزیر جیسے شخص کو اپنی باتوں سے اپنے ڈھب کی بتاتی ہوں — اور اداکاری سے الو بنا رہا ہوں تو یہ فرض کرنا غلط ہوگا کہ … وقت … بن رہا ہے۔

مجھے کچھ دیر نیند ضرور آئی ہوگی کیونکہ پھر میری آنکھ کھلی تو صبح صادق کا دھندلا اجالا کھڑکیوں کے شیشوں پر پھیل چکا تھا۔ میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی تو ساڑھے چھ بجے تھے۔ زیدی کی ہدایات کے مطابق میک اپ اتارنے اور نہانے میں نے کچھ دیر کے لیے ملتوی کر دیا۔ نیچے جا کے میں نے بہرام سے ملاقات کی جو نماز سے فارغ ہو کے چائے پی رہا تھا۔ اس نے بڑے خلوص سے مجھے چائے پیش کی مگر میں نے معذرت کر لی کہ نہائے دھوئے بغیر میں کچھ نہیں کھاتا پیتا۔ اصل بات یہ تھی کہ دن کا آغاز میں اس بے کیف ذائقے سے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ چائے بھی پیوں اور لطف کے بجائے کوفت حاصل ہو۔ بہرام سے ملنے کا اصل مقصد رونمائی تھا۔

واپس اوپر آ کے میں نے اپنے لیے چائے بنائی، چند بسکٹ کھاتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں پہنچ گیا۔ وقار … میں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا "مجھے غالب سے بات کرنی ہے۔"

"ابھی تو وہ … رہے ہیں" وقار نے … کہا "کوئی پیغام ہو تو وہیں آ کر چھوڑ دیں۔"

وقار خود بھی نیند میں تھا … میں نے کہا "پیغام یہ ہے کہ انہیں فوراً جگا دیں۔ بہت اہم خبر ہے۔ میں جوہر ٹاؤن … بول رہا ہوں۔"

اس کے بعد وقار یوسف کی نیند یقیناً اڑ گئی ہوگی۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ اخبار والوں پر خبر کے نزول کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ عام حالات میں تو یہ ہے کہ … کا کوئی بھروسا نہیں مگر اس میں خبر کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اچانک مارشل لا لگ جاتا ہے، کینیڈی کا قتل ہو جاتا ہے یا آدمی چاند پر اتر جاتا ہے اور ساری دنیا کو خبر دینے کے ذمے دار اخباری کارکن سوتے سے اٹھ کے یوں دوڑتے ہیں جیسے صور اسرافیل سن کے سب میدان حشر کی جانب دوڑیں گے۔

غالب نے شاید پوچھا ہوگا کہ … کون؟ کیونکہ وقار نے مجھ سے نام نہیں پوچھا تھا۔ ایک … منٹ بعد لائن پر غالب آ گیا۔

"شش … مت کرنا صحافی کے گھوڑے" میں نے کہا "مجھے مجبوراً وقار سے جھوٹ بولنا پڑا۔"

"کیوں؟ کیا تکلیف تھی؟" غالب نے بیزاری سے کہا۔

"تم کوئی بے ہودہ خواب دیکھ رہے ہو گے … ہوتے ہو" میں نے کہا "شرم آنی چاہیے تمہیں۔ نازو کو پتا چلا تو وہ کیا کرے گی۔"

"وہی جو اس وقت میں تمہیں … کام کی بات کرو"

"بس یار، میری آنکھ کھل گئی تھی تو میں نے سوچا … دوسرے کیوں خواب غفلت میں پڑے رہیں۔ اٹھو، خدا کو یاد کرو۔ کیا خبر

کل صبح تک کس طرف سے … آتا ہے۔"

"تم نے مجھے … بتایا ہے … کچھ بتانے کے لیے … اصل فون … کتاب … کے بعد بھی … تھے۔"

یار میں ایک شریف آدمی کے بیڈ روم سے بات کر رہا ہوں۔"

"او … سوری" میں نے کہا "مرزا غالب! تمہیں ایک بندہ چاہیے جو فرنچ بول سکتا ہو یا سمجھ سکتا ہو … میں رہائش کر سکتا ہو … ہیں کئی … ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں … سمیت … نازو کے بیڈ روم میں ہو۔"

"خدا یوں … بڑے صحافی ہو … سارے زمانے کی خبر رکھتے ہو … یہ تو بہت چھوٹا سا کام ہے۔"

"اتنی … کہا … کے دروازے پر اخبار … ورنہ تو بتا سکتا ہوں … گلی میں … کل تک … ہوں گی۔"

"اگر … ہے … مجھے دس بجے تک ایسا بندہ مل جانا چاہیے سمجھے؟" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا۔

"سمجھ گیا … بات مجھے منہ اندھیرے جگا کے بتانا ضروری تھی۔"

"بے حد ضروری تھی۔ اب نازو کو بھی … سلام دعا کرنے … تم چاہو تو دوسرا … ورنہ … نازو سو رہی ہوں ابھی تو۔"

"شکر ہے، وہ بہت خوش ہوگی تم سے باتیں کر کے" غالب نے بھنا کے کہا "ابھی اٹھانے لگا ہوں اسے۔"

ریسیور پر وقار کی آواز آئی "کمال ہے سکندر صاحب، آپ بھی۔"

میں نے … کہا "معاف کرنا یار، مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں تھا … فون رکھنا ہی نہیں چاہیے۔ ورنہ سوتے وقت اس کی گھنٹی … بند کر دینی چاہیے۔ اب تم ایسا کرو کہ ریسیور رکھ کے سو جاؤ … نازو کے اٹھنے سے پہلے۔ اور نازو پوچھے تو کہنا کہ فون تو کسی کا بھی نہیں آیا۔ ورنہ گھنٹی بجی ہے۔"

جب نازو نے کہا "ہیلو" تو میں خاموش رہا … دو تین بار ہیلو کر کے اس نے ریسیور رکھ دیا۔ میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ اب غالب کی شامت آئی … نہ جانے نازو کیا کرے گی۔ بتایا ہوگا کہ فون پر کون بات کر رہا ہے۔ نازو سمجھے گی کہ غالب نے اسے پریشان کرنے کے لیے جھوٹ بولا۔

آٹھ بجے بہرام رخصت ہونے سے پہلے میرے پاس آیا۔ اس نے فوری طور پر میری پیش کش سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ "… ہے … میں سوموار کی شام کو آؤں گا" اس نے عمارت کے بیرونی گیٹ کی چابیاں میرے حوالے کر دیں "تم سنبھال لو گے؟"

میں نے کہا "تو تم کدھر جا رہے ہو … میانوالی؟"

"ہاں۔ واپسی پر بیوی بچوں کو ساتھ لے آؤں گا۔ دو چار دن …

بہت ہیں اور یتیم خانے۔"

"… توقع ہم کو غالب نے بھیجا ہے۔ ہم مترجم ہو سکتے … آپ تو فر فر اردو بول لیتے ہیں۔ انگریزی بھی جانتے ہوں گے … مترجم کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے … فوراً سنبھالا لیا "میری ضرورت کو چھوڑیے۔ آپ کو حق خدمت کے طور پر پانچ ہزار ماہانہ کی ضرورت ہے یا نہیں؟"

اس نے تھوک نگل کے کہا "پانچ … پانچ سو … یا ہزار؟"

"پانچ ہزار۔ مگر شرط یہ ہے کہ آپ کوئی سوال نہیں کریں گے۔ جو بات میں فرنچ میں کہوں گا آپ اس کا ترجمہ اردو یا انگریزی میں کریں گے۔ اور … کو یہ بھی نہیں بتائیں گے کہ میں اردو یا انگریزی سمجھتا ہوں۔"

"بہت بہتر، بہت بہتر۔ لیکن آپ یہ بتا دیجئے کہ معاملہ کیا ہے؟"

"سوال شروع کر دیے آپ نے۔ خیر پہلی غلطی ہے اس لیے معاف کرتا ہوں۔ میں ایک سراغ رساں ہوں۔ قتل کے ایک مقدمے کی سراغ رسی کے لیے برطانیہ سے آیا ہوں۔ ویسے میں پاکستانی ہوں مگر یہاں کی پولیس کا رویہ تفتیش میں معاون نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے میں اپنی شناخت ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ خود میں سب کی باتیں سنتا رہوں گا … کیا خیال ہے اب چلیں؟"

"چلئے جناب۔ ہم تو آپ کی خدمت کے لیے ہیں۔ نام بھی خادم حسین رضوی ہے" وہ بولا۔

"یہ فرنچ آپ نے کیسے سیکھ لی؟"

"بس۔ سوچا تھا کوئی غیر ملکی زبان سیکھنے سے معاش کا مسئلہ حل ہو جائے گا بہتر طور پر" اس نے آہ بھر کے کہا "اللہ مالک ہے۔"

اسلام آباد سے آنے والے ایس ایس پی ظفر حیات کو تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں مجھے بتایا گیا کہ ان کا کمرا دوسری منزل پر ہے۔ جب میں نے اس کمرے میں قدم رکھا تو ڈی ایس پی شاہد علی اور انسپکٹر خدا بخش وہاں پہلے سے موجود تھے۔

میں نے فرنچ میں اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے ڈاکٹر شیلی کیس میں ان کے ایک دوست کی طرف سے اتھارٹی مقرر کیا گیا ہے۔ میں یہاں تفتیش میں بطور مبصر شریک رہوں گا۔ میرا نام ہے موسیو آندرے ژاں سوبارتے … مختصراً آپ مجھے آندرے کہہ سکتے ہیں۔"

ظفر حیات محظوظ ہوا "تفتیش ہم خود بھی کر سکتے ہیں۔"

"آپ غلط سمجھے۔ میں صرف دیکھوں گا اور اپنی رپورٹ دوں گا کہ میں اس سے مطمئن ہوں یا نہیں۔ میرا ارادہ ہرگز دخل اندازی کا نہیں ہے" میں نے وضاحت کی اور مولوی نے فر فر ترجمہ

یہاں رہ لیں گے" … بہرام … کے بعد تم چاہو تو کچھ دن کے لیے پشاور چلے جانا۔"

"او یار! آرام حرام ہے … تم جاؤ" میں نے مجبوراً ذمے داری قبول کی۔ خود کردہ را علاج نیست۔ اب یہ مصیبت بھی بھگتنی ہی پڑے گی۔

زیدی ٹھیک وقت پر نمودار ہوا "میں نے آپ کے مسئلے کا حل تلاش کر لیا ہے بلکہ ایجاد کر لیا ہے۔"

"دیکھیے، کسی کا سر کاٹ کے تو نہیں لے آئے ہو کہ میں اپنا سر اتار کے لگا لوں؟ روز شام کو بدل لوں۔"

"کمال ہے" اس نے ملال سے کہا "آپ ہی نے کہا تھا کہ کوئی طریقہ ایسا ہو جس سے صبح و شام میک اپ آسان ہو جائے۔"

"بالکل کہا تھا اور مجھے تم جیسے ذہین آدمی سے یہی امید تھی۔"

وہ خوش ہو گیا "یہ دیکھیں، یہ فرنچ کٹ داڑھی ہے، اسے آپ ہر روز ایسے چپکا سکتے ہیں۔ یہ خاص قسم کا گلیو ہے۔ ایسا گوند سمجھ لیں جو آپ کی جلد کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور ہے بھی اتنا مضبوط …"

"کہ داڑھی کے ساتھ کھال بھی اتر جائے گی۔"

"نہیں جی، یہ صرف گرم پانی سے نرم پڑ جائے گا۔ اور یہ دیکھیں، ہٹلر جیسی موچھیں" اس نے دونوں چیزیں اپنے چہرے پر سجا کے دکھائیں۔

اس کی صورت میں نمایاں ہونے والی تبدیلی نے مجھے حیران کر دیا "واہ بھئی، تم تو زیدی لگتے ہی نہیں۔ ایکس وائی لگتے ہو۔"

وہ مسکرایا "اور دیکھئے یہ عینک۔ اس کے ساتھ یہ سنہری زنجیر ہے۔ اس کے شیشوں میں سے آپ کی آنکھیں بڑی نظر آئیں گی۔"

"اور مجھے دنیا چھوٹی لگے گی۔"

"نہیں۔ آپ کو فرق نہیں پڑے گا۔ عینک کے نیچے آنکھوں میں آپ یہ لینز خود پہن سکتے ہیں۔ نیلا رنگ آپ کی رنگت کے لیے زیادہ موزوں ہے اور سنہرے بال ہوں تو اچھا لگتا ہے۔ یہ ہے آپ کی وگ۔ گولڈن براؤن۔ اس کے ساتھ فلیٹ ہیٹ پہن کے آپ سو فیصد فرنچ یا برطانوی نظر آئیں گے۔ سوٹ اور ٹائی تو آپ ظاہر ہے استعمال کریں گے۔"

زیدی ایک گھنٹے بعد گیا تو میرا حلیہ اتنا بدل چکا تھا کہ اب میری شناخت ناممکن تھی۔ غالب کا بھیجا ہوا فرنچ سمجھنے والا مولوی ٹائپ شخص اس کے جاتے ہی آ گیا۔ اس نے عربی قرأت کے ساتھ سلام کر کے تپاک سے مصافحہ کیا۔

"فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟" میں نے کہا۔

"جی خدمت کے لیے تو ہم حاضر ہوئے ہیں۔"

"تشریف رکھئے۔ میں … دینے کا قائل نہیں۔ مسجدیں پہلے ہی

www.paksociety.com

"اور ہاں! یہ بھی میں نے سوچا" کہ یہ لوگ واقعی اتنے بڑے کہ تاریخ کے ورثے کو محض اپنے مجرمانہ مقاصد کی خاطر تباہ کر دیں گے۔ پھر بھی مجھے سخت ملال تھا کہ رائفلوں کی گولیاں نور جہاں کے مقبرے کی خستہ حال دیواروں کو مزید زخمی کر رہی ہیں۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ نور جہاں کا مجھ پر جائز حق تھا۔ خود میں آج تک نہ جانے کتنی بار مقبرہ جہانگیر گیا تھا مگر تفریح کی خاطر۔ ایک بار بھی مجھے نور جہاں کی قبر پر پھول رکھنے یا اس کے سرہانے چراغ روشن کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ الٹا میں پولیس کو یہاں لانے کا ذمے دار تھا اور خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا کہ میری وجہ سے آج اس مزار کی دیواروں پر گولیاں چلائی گئیں۔

اس سے پہلے کہ پولیس والے چھپے ہوئے مجرموں کو باہر نکالنے کے لیے واقعی دستی بم پھینک دیتے، میں نے خادم حسین سے کہا "یار ان لوگوں کو سمجھاؤ۔ یہ ایک یادگار ہے۔ اس پر گولیاں نہ چلائیں۔"

"پھر کیا کریں جی؟ اندر سے بھی تو پھول نہیں مارے جا رہے ہیں۔ یا میرے مولا! جل تو جلال تو...."

میں نے کہا "ان سے کہو انتظار کریں۔ محاصرہ قائم رکھیں۔ مجرم آخر کب تک اندر رہیں گے۔ کچھ کھائے پیے بغیر ایک دو دن۔"

"پولیس والے تو کھائے پیے بغیر ایک گھنٹا نہیں گزارتے۔"

"وہ ملزموں کو خبردار کریں کہ اندر گیس چھوڑی جائے گی۔ دستی بم سے تو عمارت بھی تباہ ہو جائے گی" میں نے برہمی سے کہا۔

اب خادم حسین نے میری بات ظفر حیات تک پہنچائی اور شاید خود اسے بھی خیال آیا کہ اس کو محکمۂ آثار قدیمہ والوں کے سخت ردعمل کا سامنا بھی کرنا ہوگا اور پریس تو اس کا ناطقہ بند کر دے گا لیکن اس کے احکامات جاری کرنے سے پہلے ہی شاہد علی کی دھمکی کام کر گئی۔

اندر سے ایک شخص ہاتھ اٹھائے باہر آ گیا۔ ظفر حیات ریوالور سمیت آگے چلا گیا۔

"وہ مارا پاپڑ والے کو" میں نے خادم کے کندھے پر دھپ مار کے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔

خادم اچھل پڑا "جی.... کسے مار دیا.... کون پاپڑ والا۔"

انسپکٹر خدا بخش نے ایک ناخوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ یوں جیسے وہ کہہ رہا ہو اس معرکے میں کامیابی کا تو وہ دار ہے لیکن اس کی مسکراہٹ کا مفہوم کچھ اور تھا۔

نہ جانے کس سمت سے ایک فائر ہوا۔ اندر سے "ہینڈز اپ" کرکے آنے والا لڑکھڑایا اور وہیں گر گیا۔

گولی اس شخص کے سر میں لگی تھی۔ اس سے گولی چلانے والے کی نشانہ بازی میں مہارت ثابت ہوتی تھی۔ گولی کافی فاصلے سے چلائی گئی تھی لیکن نشانہ خطا نہیں ہوا تھا۔ آواز سے میں نے بھی محض سمت کا اندازہ کیا لیکن اس سمت میں جہانگیر کا مقبرہ تھا جہاں ہر روز کی طرح سیاح اور میر سپاٹے کے شوقین آ رہے تھے، بچوں اور سائیکلوں، رکشاؤں اور اسکوٹروں پر۔

مقبرہ جہانگیر کافی فاصلے پر تھا اور قاتل کہیں درمیان میں کسی بلند جگہ پر موجود تھا جہاں سے وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور شاید میگا فون کی آواز بھی سن رہا تھا۔ میں نے دائیں جانب کے ہر درخت کو غور سے دیکھا کہ کہیں کوئی حرکت محسوس ہو مگر میری نظر کسی کا سراغ لگانے میں ناکام رہی۔ خود ایس پی صاحب حواس باختہ تھے۔ اس کے خیال میں تو میری اطلاع ہی بے بنیاد تھی۔ وہ یہاں محض خانہ پُری کی کارروائی کے لیے چند سپاہی ساتھ لایا تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ یہ نفری بہت کم ہے۔ مقابلہ اگر کسی منظم گروہ کی طاقت سے ہوگا تو باقی تین سپاہی، انسپکٹر اور ڈی ایس پی خود اپنی حفاظت کے لیے بھی ناکافی ہوں گے۔ مشکل یہ تھی کہ اب وہ پسپائی اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ اس پر بہت سے سنگین الزامات عائد ہو جاتے۔ پریس اور پبلک سوال کرتی کہ اس نے ایک غیر مصدقہ اطلاع پر یقین کر لیا تھا تو پھر یہ قدم اتنی بے دلی اور ناقص منصوبہ بندی کے ساتھ کیوں اٹھایا تھا۔ مقابلے کے لیے اتنی کم فورس کیوں ساتھ لی تھی اور ایک پولیس مین کو مروانے کے بعد فرار اختیار کرنے میں کیا عقلمندی تھی۔ کیا وہ مجرموں کی طاقت کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا؟ کیا پولیس کا یہی کام ہے کہ جب اصل مقابلہ ہو تو جان بچا کے بھاگ جائے اور فرضی مقابلوں میں جسے چاہے ہلاک کرکے بہادری کی سند حاصل کر لے۔ اس پر نااہلی، کوتاہی اور مجرمانہ غفلت کا الزام آتا۔

اس سب کا ذمے دار میں تھا۔ پہلے میری حیثیت مخبر کی تھی تو اب معتبر گواہ کی۔ نہ مجھے جھٹلایا جا سکتا تھا اور نہ پولیس کی مرضی کے مطابق بیان دینے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ .... شدید ذہنی اضطراب سے دوچار تھا مگر بظاہر پرسکون .... صورت حال سے واجبی طور پر متاثر نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایس پی نے اپنی فورس کو حکم دیا کہ وہ مسلسل فائر کریں اور آہستہ آہستہ فائر کرتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں۔ خود اس نے بھی یہی حکمت عملی اختیار کی تھی اور مجھے جیپ کے پیچھے رہنے کی تاکید کرکے آگے بڑھ گیا تھا۔

خادم حسین پر رعشہ طاری تھا "سر.... آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ مجھ سے تو آپ نے کچھ اور کہا تھا۔"

میں نے کہا "کیا کہا تھا؟ مجھے یاد نہیں۔"

"حد ہو گئی جی۔ آپ نے کہا تھا کہ مجھے جان کے دشمنوں سے خطرہ ہے۔ یہ تو کچھ اور ہی معاملہ نظر آتا ہے۔"

میں نے فلسفیانہ انداز اختیار کر لیا "خادم حسین۔ وہ کیا کہا ہے اپنے مرزا غالب نے...."

"جی انہوں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ میک اپ کرتا ہے...."

"ابھی میں اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کی بات کر رہا تھا۔

تمہارے اس نام نہاد صحافی کی نہیں۔ شاعر نے فرمایا ہے۔ ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی۔ کیا سمجھے.... پھر پانچ ....کہ میں کو اب کچھ نظر آتے ہیں کچھ کیا سمجھے؟"

"جی کچھ نہیں" اس نے سرہلا کے روتی آواز میں کہا۔

"اب بھی کچھ نہیں سمجھے؟ خیر پھر انتظار کرو۔ دیکھو اور غور کرو۔ سب سمجھ میں آ جائے گا بالآخر۔"

"میں کچھ سمجھنا نہیں چاہتا۔ مجھے تو آپ اجازت دیں ورنہ ابھی فضا سے کوئی مجھے بھی لگ جائے گی۔"

"دلدل میں قدم رکھنے سے پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ بعد میں اپنی مرضی سے باہر آنا ممکن نہیں ہوتا پیارے۔ باہر تم اسی صورت میں نکل سکتے ہو جب کوئی تمہارا ہاتھ تھامے اور تمہاری مدد کرے۔ میری مدد کے بغیر تم کوئی حماقت کرو گے تو مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔"

"میں نے.... میں نے کیا کیا ہے؟"

"یہی تو ہوتا ہے دنیا میں۔ جو کچھ نہیں کرتے، وہی پکڑے جاتے ہیں۔ اور ان پولیس والوں سے تو خدا بچائے۔ ابھی دعوے کر دیں گے تم کو گرفتار کر سکتے ہیں کہ گولی تم نے چلائی تھی۔"

خادم حسین اچھل پڑا "میں نے.... آپ تو گواہ ہیں۔"

"دیکھو یار یہ گواہی وغیرہ تو ہوگی بعد میں۔ اس سے پہلے کیا ہوگا؟ یہ تم نہیں جانتے" میں نے کہا "تم نے میرا راز افشا کیا تو یہ غالب کے ساتھ احسان فراموشی ہوگی۔ اور غالب تمہیں اس پر کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اس کے ہاتھ بھی بہت لمبے ہیں اور پولیس تو اس کی مٹھی میں ہے۔ وہ تمہیں دس دیگر مقدمات میں ملوث کرا دے گا۔ کیا سمجھے؟ اب تمہیں میں اور صرف میں ہی بچا سکتا ہوں۔ میرے ساتھ رہو گے تو عیش کرو گے۔"

"خاک عیش کروں گا۔ میری تو شلوار بھی ناپاک ہو گئی ہے۔ شیطان کے بہکاوے میں آ گیا تھا میں۔ لالچ بڑی بلا ہے۔"

"حوصلے اور صبر سے کام لو خادم حسین اور خدا پر بھروسا رکھو کہ تمہاری نیت صاف تھی تو تمہیں کسی سے نقصان نہیں ہوگا۔"

نور جہاں کے مزار کی اینٹوں کا رنگ سرخ ہو گیا تھا اور فرش پر دم توڑنے والا اب ساکت پڑا ہوا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا اور اس نے جانتے بوجھتے اپنی زندگی کو داؤ پر لگایا تھا یا اسے تقدیر نے دھوکا دیا تھا۔ قریب سے دیکھے بغیر اس کی شناخت ناممکن تھی مگر میرا یقین کہتا تھا کہ وہ دلاور کا مہرا تھا۔ بالآخر وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ میں نے دلاور کو فریب دے کر گرفتار کرانا چاہا تھا تو اس نے بھی

خلوص نیت کا فریب دے کر مجھے مروانے کا پورا اہتمام کیا تھا۔ اگر میں اعتماد کے دھوکے میں اکیلا اندر چلا جاتا تو ملکہ نور جہاں کی آخری آرام گاہ سے سیدھا عالم بالا کے سفر پر روانہ کر دیا جاتا۔ نیم تاریکی میں چھپا ہوا کسی قاتل کا ہاتھ نظر آنے سے پہلے ہی میرا قصہ

تمام کر دیتا یا شاید دلاور کے بجائے پولیس مجھ کو گرفتار کرکے ....ضرور ہوتی۔

تینوں کانسٹیبل پرانی ساخت کی رائفل سے فائر کرتے جا رہے تھے۔ ایک گولی چلانے کے بعد وہ تھوڑا سا آگے کھسک جاتے تھے اور اپنی کہنی اور پیٹ کے بل وہ مزار تک کا فاصلہ رینگتے ہوئے طے کر رہے تھے۔ رائفل کے فائر کا دھماکا اتنا خوف ناک تھا کہ اس کی گونج سے فضا مرتعش محسوس ہوتی تھی۔ میرے کانوں میں سیٹی سی بجنے لگتی تھی اور خادم حسین ہر بار اچھل کے یا اللہ کہتا تھا۔ درختوں کے علاوہ اس شور محشر سے گھبرا کے فضا میں چکر کاٹتے ہوئے اپنے اضطراب کا اظہار کر رہے تھے اور مقبرہ جہانگیر میں بھی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ باہر نان چھولے بیچنے والے خوان اٹھا کے اندر چلے گئے تھے اور سیر کے لیے آنے والے بھی غائب ہو چکے تھے۔ بہت کم ایسے بہادر تھے جو دور سے تماشا کر رہے تھے اور اس بات سے خائف نہیں تھے کہ کوئی گولی حادثاتی طور پر انہیں بھی مرحومین میں شامل کر سکتی ہے۔

لاہور شاہدرہ .... طرف سے آنے والے تانگے بھی دور ہی تھم گئے تھے اور میدان .... سے ایک فرلانگ دور جمع ہونے والے اس سارے منظر کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے یہ کسی فلم کی شوٹنگ کا منظر ہو۔ یہاں فلم یونٹ اکثر دکھائی دیتے تھے چنانچہ وہ سینما کے فنکاروں کو جیتا جاگتا دیکھنے کے شائقین حسب توفیق دخل در معقولات کرتے تھے اور عموماً پولیس کے لاٹھی چارج سے فیض یاب ہو کے منتشر ہوتے تھے .... مسرت طلب حالت میں گھر پہنچتے تھے کہ مضروب شانے یا ٹوٹے ہوئے ٹخنے پر مرہم تھوپتے ہوئے آہیں بھرتے تھے۔ ہائے نیلو کو دیکھنے گئے تھے، نیل ہی نیل پڑ گئے۔

ایک ایسا ہی باہمت جیالوں کا گروہ بہت آگے تک آ گیا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ پولیس والے نقلی ہیں اور وردی میں ایکسٹرا ہیں۔ ایس پی ظفر حیات نے ان کو چلا کے خبردار کیا مگر وہ ایک دوسرے کو بتاتے رہے۔ اوئے یہ وہی ہے چمن والا! اوئے.... اصل ہے نا.... جب ایس پی ظفر حیات نے انہیں بھگانے کے لیے ایک کی ٹانگ کا نشانہ لے کر فائر کیا اور وہ چیخ مار کے گرا تو اس کا اصل خون دیکھ کے سب سرپٹ دوڑے۔ زخمی کی کسی نے مدد نہیں کی۔ وہ خود اٹھا اور ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا چلانے لگا "اوئے میتوں مروا کے نس چلے ہو" (مجھے مروا کے بھاگ رہے ہو)

پولیس بالآخر نور جہاں کے مزار میں داخل ہو گئی۔ ظفر حیات اور اس کے دو ماتحت افسروں نے تینوں سپاہیوں کو ڈھال بنایا تھا مگر انہیں یقین دلا رہے تھے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہم پیچھے ہیں۔ تمہارے اور تمہاری حفاظت کر رہے ہیں۔ ماتحت مجبوراً خودکشی کی نیت کرکے اندر داخل ہوئے۔ اس نوکری میں یہی ایک خرابی ہے کہ افسر کے حکم پر آگے جانا پڑتا ہے مرنے کے لیے۔

خلاف توقع اندر سے کسی نے بھی قانون کے محافظوں کا

www.paksociety.com
www.paksociety.com

استعمال گولیاں چلا کے نہیں کیا۔ مجھے خاصی حیرانی ہوئی۔ کیا اندر صرف ایک ہی شخص تھا۔ وہ اکیلا تھا تو اس نے فائرنگ کیوں کی تھی اور مقابلے کا آغاز کرنے کا چیلنج کیوں لیا تھا؟ اس سوال کا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ اسے بھی دھوکے سے مروا دیا گیا تھا۔ شاید اسے کہا گیا ہوگا کہ مزار کے اندر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہاں اکیلا سکندر بخت آئے گا۔ اگر اس کے ساتھ وہ سرکش گئے جو کر نئے ہو خود کو ایم آر ایس کے مجاہد کہتے ہیں تو باہر ہم ان سے نمٹ لیں گے۔ ان میں سے کسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیں گے۔

ہوا اس کے برعکس یہ تھا کہ ایک نوری کو وہاں اسی طرح رکھا گیا تھا جیسے شیر کے شکار کے لیے بکرا باندھا جاتا ہے۔ اور مچان پر بیٹھے ہوئے شکاری اس کے محافظ نہیں ہوتے۔ یہ شخص مجھے نہ مار سکتا تو خود میرے ہاتھوں مارا جاتا۔ اسے باہر نکلنا پڑتا تو خود چوہدری رلاور اینڈ کمپنی نے اس قربانی کے بکرے کو مار دیا ہوتا۔ وہ پولیس کی تحویل میں بکرے کی طرح چلانے لگتا تو زیادہ خرابی ہوتی۔

ایس پی ظفر حیات اب لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ میری موجودگی اس کے لیے غیر اہم ہو چکی تھی اور اس کا ارادہ ہرگز مجھے شامل تفتیش کرنے کا نہیں تھا مگر میں خود ہی غلام حسین کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ غلام حسین کی پوری کوشش تھی کہ مزار کے گیٹ جیسے پر کسی کی نظر نہ جائے۔ اس نے جیب میں رکھے ہوئے پانی کے کین کو منہ لگا کے حلق تر کیا تھا اور اسی بہانے تھوڑا سا پانی چبوترے پر گرا لیا تھا تاکہ سب صرف پانی نظر آئے۔ اندر کا یا باہر کا فرق پتا نہ چلے۔

ظفر حیات نے خاصی ناگواری سے کہا "یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی ہے یا پکیا ہر جگہ یہ ہمارے سر پر سوار رہے گا۔"

اس کے تجربے کا معاشرت ڈی ایس پی شاہد علی نے چند مخصوص گالیوں سے نواز کے مجھ سے جان چھڑانے کا ایک طریقہ بتایا "سر جی یہ نیا ہے ولایت سے۔ اس کو تھوڑا سا نمونہ دکھائیں اگر حکم ہو۔"

"کیسا نمونہ؟" ایس پی نے کہا۔

"یہی سر کہ پاکستان میں پولیس کیسے کام کرتی ہے اور کوئی پنگا لے پولیس کے ساتھ تو کیا ہوتا ہے؟"

"زر نجیو۔ کوئی بے وقوفی مت کر بیٹھنا" ایس پی نے سخت لہجے میں کہا "پہلے ہی بڑی مصیبت میں ہیں ہم لوگ۔ سارے وکیل مدعی ہو گئے ہیں اور یہ ان سب سے بڑھ کر ہے۔ کڑوا کریلا نیم چڑھا۔ سفیر آ جائے گا اس کی ایک شکایت پر اور تمہارے ساتھ میری نوکری بھی جائے گی۔"

ڈی ایس پی نے کھنکار کے کہا "وہ آپ بجا فرماتے ہیں سر۔ لیکن یہ جو مولوی ہے اس کے ساتھ۔"

ایس پی نے غلام حسین کو غور سے دیکھا "ہاں۔ اسے ذرا طریقے سے سمجھا جا۔"

ڈی ایس پی مسکرانے لگا "اپنے طریقے سے سر؟"

"شرافت سے۔ بھول جاؤ کہ یہ رنگیل پاکستان میں ہے۔ یہ سمجھو کہ تم فرانس یا برطانیہ میں ہو۔ جانتے ہو نا وہاں کیا رویہ ہوتا ہے پولیس کا عوام کے ساتھ۔"

"جی سر" ڈی ایس پی مردہ آواز میں بولا "مگر یہاں ایسے کون کہتا ہے۔ عوام بھی تو ویسے نہیں ہیں۔"

مشکل غلام حسین کی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ میں ہر لفظ سمجھ رہا ہوں لیکن پولیس کو یہ بات معلوم نہیں۔ جو کچھ وہ مجھ سے کہیں گے اسے لفظ بہ لفظ صحیح ترجمہ کر کے بتانا ہوگا۔ شاید پولیس اسے مجبور کرے گی کہ اس کو وہ "ترکیل" کو وہی بتاؤ جو ہم کہیں مگر غلام کے لیے یہ ناممکن ہوگا۔ اسے مقامی پولیس کے بارے میں بھی معلوم ہوگا کہ جو ان کی مرضی اور منشا کے مطابق نہ چلے وہ زیادہ دن نہیں چلتا۔

غلام حسین نے فرنچ میں کہا "مشکل رہے ہیں آپ موسیو۔"

میں نے کہا "غلام۔ تم ڈر گئے تو سمجھو مر گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کرو۔ یہ مجھ سے ڈرتے ہیں اور تم میرے ساتھ ہو۔"

"مگر کب تک بعد میں۔"

"میں انہیں سمجھا دوں گا کہ تمہارا میرا ساتھ عارضی نہیں ہے۔ بہت لوگ ہیں یار جو تمہاری حفاظت کر سکتے ہیں۔ خدا پر بھروسا ہونا چاہیے تمہیں۔"

"خدا نے یہ تو نہیں کہا کہ پاگل کتے کی دم کھینچو اور اللہ پر بھروسا رکھو کہ وہ کاٹے گا نہیں۔"

ایس پی نے ہیڈ آفس سے مزید فورس طلب کی تھی۔ ایک ایمبولینس کے ساتھ جو سائرن بجاتی آگے آ رہی تھی پولیس کے مسلح جوانوں کی پوری پلٹن میدان جنگ میں اس وقت پہنچی جب معرکہ ختم ہو چکا تھا۔ ایک پولیس مین اور ایک چور کی میت لے کر ایمبولینس واپس چلی گئی۔ ایس پی کے حکم پر نامعلوم فورس نے اس پاس کے علاقے میں کسی مشتبہ افراد کو تلاش کرنے کی رسمی کوشش کی اور ایک مجذوب صفت فقیر کو پکڑنے میں کامیاب رہے۔ مقبرہ جہانگیر کے اندر ابھی تک خوف و ہراس کی فضا تھی۔ ایس پی نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے اعلان کرا دیا کہ لوگ پریشان نہ ہوں۔ پولیس کو ایک مفرور مجرم کی تلاش تھی اور وہ مارا جا چکا ہے۔ شہر کی طرف سے آنے والے بیشتر لوگ پولیس کی اتنی نفری دیکھ کے واپس چلے گئے تھے بعد میں آنے والوں کو کچھ معلوم نہ تھا۔ رفتہ رفتہ سڑک پر بھی ٹریفک بحال ہو گیا اور پولیس بھی رخصت ہو گئی۔

ایس پی ظفر حیات میرے پاس آیا "غلام۔ اس الو کے پٹھے کا کیا خیال ہے؟"

غلام نے گڑبڑا کے کہا "کس معاملے میں سر؟"

"یہاں جو کچھ ہوا اس نے بھی دیکھا تھا۔ کچھ بولا؟"

"میری طرف سے تم دونوں جہنم میں جاؤ" ظفر حیات نے جیپ اسٹارٹ کی اور مجھ پر ایک قہر آلود نگاہ ڈال کے روانہ ہو گیا۔

"مروا دیا نا آپ نے جناب۔" غلام بولا۔

"مجھے تمہارا جواب پسند آیا۔ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی۔ اب تم میرے ساتھ چکر چھوڑو اور جان کا تحفظ کرنا چاہو تو مجھے کسی ٹورسٹ گائیڈ کی طرح مقبرہ جہانگیر لے چلو۔ اور جانا چاہو تو فی امان اللہ۔ غالب سے رابطہ کر کے اسے وہ سب بتا دینا جو تم نے دیکھا تھا۔ باقی کام غالب خود کر لے گا۔"

غلام تذبذب میں پڑ گیا۔ اسے میرا ساتھ دینا بھی اتنا ہی پر خطر لگتا تھا اور اکیلے واپس جانا بھی۔ مشن کی ناکامی نے مجھے بھی مایوس اور بددل کر دیا تھا لیکن دلاور کو آسان شکار سمجھنا میری غلطی تھی۔ چال چلنے سے پہلے میں نے اپنا دفاع مضبوط کر لیا تھا اور مقابلہ دلاور کے یہاں آیا تھا۔ ظاہر ہے میں دلاور پر اعتماد کرتا تو اس حماقت کا خمیازہ بھی مجھے ہی بھگتنا پڑتا۔ کچھ یہی کیفیت دلاور کی تھی۔ وہ بھی چالاک تھا اور جوابی چال چلنے سے پہلے اس نے اپنے تحفظ کا پورا بندوبست کیا تھا۔ بظاہر اب یہ ناممکن سی بات لگتی تھی کہ ہم ایک دوسرے کی زبان کی ضمانت پر اعتبار کرتے ہوئے پھر کسی جگہ ملاقات پر رضامند ہوں اور اکیلے پہنچ بھی جائیں۔

مقبرہ جہانگیر کی سیر سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میرا ذہن اپنے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ دلاور کا ہی آدمی تھا جسے خود اس نے یا کسی محافظ نے ہتھیار ڈالنے کے بعد زبان کھولنے کی مہلت نہ دی اور نور جہاں کے مزار سے باہر آتے ہی گولی مار دی۔ شاید یہ بات پولیس انسپکٹر اور ڈی ایس پی نے بھی سمجھ لی تھی۔ ایس پی باہر کا فوری تھا مگر باقی دو اس کھیل میں شریک سمجھے جا سکتے تھے۔ خاموش تماشائی بھی غیر جانبدار بہرحال نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ مصلحت کے باعث وہ جذبات کا اظہار نہ کرے۔ پولیس پھر کیسے جانبداری کے ساتھ تفتیش اور حصول انصاف کے عمل کو آگے بڑھانے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو۔ خلقت فریاد کناں ہے کہ ظالم اور طاقتور بااثر اور بدمعاش کا پلڑا صرف انہی کے دم سے بھاری ہے۔

ایس پی ظفر حیات کی کہانی میں بڑا جھول تھا۔ پولیس کی گولی کا نشانہ بن جانے والا کوئی چور نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ وہاں سے مال غنیمت برآمد ہوا تھا اور نہ وہ چوروں کے مال کی حفاظت کر رہا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو پولیس والے کب وہاں سے ٹلتے۔ وہ رات تک اور پھر اگلی صبح تک انتظار کرتے کہ باقی چور بھی آئیں تو وہ اپنا حصہ وصول کریں۔ لیکن وہ ایک لاش لے کر خاموشی سے چلے گئے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ظفر حیات نے اس کہانی پر اعتبار کیا اور یہ سمجھ لیا کہ میں بھی اس کہانی کو من و عن تسلیم کر لوں گا۔ نہیں۔ اس میں کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ شاید انسپکٹر کو یا ڈی ایس پی کو پہلے سے معلوم تھا یا پھر وہ میری بات سے اندازہ کر چکے تھے کہ دلاور کا یہاں

"نہیں سر۔ مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔"

ایس پی نے کہا "یہ دلاور کی ٹپ اسے کس نے دی تھی؟"

"ٹپ؟ کرنے والوں کو دی جاتی ہے۔"

"بے وقوف۔ اس کو کسی نے بتایا تھا کہ دلاور یہاں ہوگا؟"

میں نے کہا "اس سور کے بچے سے کہو کہ مجھے فرشتے بتا گئے تھے۔"

غلام حسین نے بے بسی سے کہا "ایسی بات میں کہہ سکتا ہوں؟"

"اچھا اسے کہہ دو کہ ہم اپنے ذرائع رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں کچھ بتانے کے پابند نہیں" میں نے کہا۔

ایس پی نے سر ہلایا "مگر دلاور تو یہاں نہیں ملا۔"

میں نے کہا "پھر یہ کون تھا؟ دلاور کا ماموں؟"

غلام کی معرفت ایس پی نے جواب دیا "یہ شاید کوئی چور تھا۔ اندر سے مال غنیمت بھی ملا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گروہ تھا جو اپنا مال یہاں چھوڑ گیا تھا۔ ایک شخص چوکیداری کر رہا تھا۔ شاید وہ رات کو کسی وقت آ کے حصے تقسیم کرتے۔"

میں نے کہا "غلام۔ یہ تو بہت ہی چغد قسم کا ایس پی ہے۔ اگر یہ بات تھی تو پھر اسے یہاں پولیس کو چھوڑنا چاہیے جو چھپ کے نگرانی کرتی رہے اور جب رات کو گروہ کے باقی ارکان آئیں تو انہیں پکڑے۔ اس کے علاوہ مال غنیمت کہاں ہے؟"

غلام نے میری بات آگے پہنچائی تو ایس پی کا پارا چڑھ گیا "اس وکیل سے کہو کہ ہر معاملے میں دخل نہ دے۔ ہم اپنا کام جانتے ہیں۔ یہ اپنا کام کرے۔ یہ واپس جائے گا ہمارے ساتھ یا یہیں جھک مارے گا؟"

میں نے مقبرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "غلام۔ اس سے کہو کہ دفع ہو جائے اپنی شکل گم کرے۔ ہم سیر سپاٹا کریں گے نان چھولے کھائیں گے اور واقعی جھک ماریں گے۔"

"پولیس کے جانے کے بعد کیا ہم محفوظ ہوں گے؟"

"پولیس کی وجہ سے ہی ہم غیر محفوظ تھے۔ اس سے پوچھو کہ یہ کیا جگہ ہے؟ کیا یہ کوئی مسجد ہے؟"

"یہ تو میں بھی بتا سکتا ہوں۔"

"یار غلام۔ خود کو احمق ثابت مت کرو۔ معلوم تو مجھے بھی ہے مگر اس سے پوچھنے کا مقصد کچھ اور ہے" میں نے کہا۔

غلام نے مجبوراً پوچھا "سر پوچھ رہے ہیں کہ یہ کیا جگہ ہے۔ کیا یہ کوئی مسجد ہے؟"

"اور تم مجھ سے پوچھ رہے ہو" ایس پی ظفر حیات نے گرج کے کہا "تم خود نہیں بتا سکتے تھے۔ تم تو یہیں پیدا نہیں ہوئے تھے گورے کی اولاد۔"

غلام نے ہمت سے کام لیا "گالی مت دیں ایس پی صاحب۔ گورے خنزیر کھاتے ہیں اور میں الحمدللہ ایک دیندار مومن گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔"

www.paksociety.com

ملنا بعید از امکان نہیں۔ وہ ہلاک ہونے والے کو بھی جانتے تھے چنانچہ وہ لاش لے کر جلد از جلد رخصت ہو گئے۔ انہوں نے دلاور کو نکل جانے کا موقع فراہم کیا۔ آج تک وہ دلاور کی غیر قانونی سرگرمیوں میں اس کے معاون اور مددگار تھے اور اس اعانت بجانب کا جتنا معاوضہ انہیں دلاور جیسے مجرموں سے ملتا تھا اس کا ہزارواں حصہ بھی سرکار بطور تنخواہ نہیں دیتی تھی۔ حکومت سے زیادہ وہ دلاور اینڈ کمپنی کے ملازم و نمک خوار تھے چنانچہ آزمائش کی گھڑی میں وہ فرض شناسی سے زیادہ ذاتی وفاداری کو اہم سمجھتے تھے۔ آج کل دلاور کی تقدیر بھی گردش میں تھی۔ اس پر برا وقت آیا ہوا تھا اور وہ روپوشی پر مجبور تھا ورنہ پولیس کے لیے گرفتاری کی رسمی کارروائی لازمی ہو جاتی۔ دلاور گرفتاری سے یا سزا سے نہیں ڈرتا تھا۔ وہ بدنامی سے اور بدنامی کی تشہیر سے ڈرتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم کب سے اسی انتظار میں ہیں کہ پولیس اسے ہتھکڑیاں پہنانے پر مجبور ہو اور پولیس فوٹوگرافر اس کی زندگی کے ایک ناقابل فراموش لمحے کا عکس اپنے کیمروں میں محفوظ کر لیں۔ اس کی تصاویر نمایاں طور پر شائع کرائیں اور با تصویر یہ خبر شہر کی گلیوں میں پھیلا دیں۔ اس کی سطح عام مجرموں سے بہت بلند تھی جو ہر روز حوالات میں جوتے کھاتے نظر آتے ہیں۔ دلاور کی سطح کے مجرم تو ہمارے معاشرے میں معزز ہو جاتے ہیں اور اتنے طاقتور کہ کسی کو ان کی طرف انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی۔

میں نے اچانک کہا "خادم، ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟" خادم اچھل پڑا۔ اس کے اعصاب خاصے کمزور تھے یا وہ پولیس ایکشن سے بہت ڈرا ہوا تھا۔

"اتنی دیر سے آپ مقبرہ نور جہاں کو گھور رہے تھے میں تو سمجھا کوئی عمل کر رہے ہیں۔"

"عمل کی کھوپڑی اتنی خادم حسین۔ آؤ ہم نور جہاں سے معافی مانگتے ہیں۔"

خادم حسین بھونچکا رہ گیا "نور جہاں سے! آپ کا مطلب ہے وہ جو ملکہ ترنم ہیں... ادام...؟"

"نہیں، وہ ملکہ نور جہاں کی روح سے۔ میں سخت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے مزار پر گولیاں چلیں۔ پھول نہیں بکھیرے گئے۔"

"آپ... معافی مانگ کے آجائیں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"کیا تم نے کبھی نور جہاں کے مزار کو اندر سے دیکھا ہے؟ نہیں دیکھا ہو گا کوئی بھی نہیں جاتا اس کھنڈر میں۔ آہ... جہانگیر کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ وہ ہندوستان پر حکومت کرتا تھا اور نور جہاں اس پر حاکم تھی۔ [illegible]..."

"جی نہیں۔ مجھے تو آپ معاف ہی رکھیں۔ میں چلتا ہوں۔"

اس نے قریب آنے والے ایک رکشا کو روکا اور اس میں بیٹھ کے فرار ہو گیا۔

میں نے دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کے سیٹی بجاتے ہوئے مقبرے کی طرف چلنا شروع کیا۔ میرا دایاں ہاتھ اس ریوالور کی سختی اور ابھار کو محسوس کر سکتا تھا جو پتلون کی بیلٹ نے [illegible] کر کوٹ نے اسے چھپا رکھا تھا۔ اپنے انداز و اطوار سے اور [illegible] سے میں پاکستانی کم اور غیر ملکی سیاح زیادہ نظر آتا تھا۔ پولیس ایکشن کے دوران میں نے خود کو بالکل الگ اور بہت دور رکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کسی نے مجھے ظفر حیات سے باتیں کرتے دیکھا ہو گا تو یہی سمجھا ہو گا کہ میں محض تجسس سے مجبور ہو کے اس ہنگامے کا سبب دریافت کر رہا ہوں۔ میں ایس پی ظفر حیات کے ساتھ اس کی جیپ میں یہاں آیا ضرور تھا مگر واپس اس کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ میرے لیے یہ کتنا آسان تھا کہ میں نے اس سے نقشہ لیا تھا یا یہ کہ میں اسلام آباد سے اس کے ساتھ آیا تھا۔ میں یہاں کے آثار قدیمہ دیکھ رہا تھا اور وہ اپنا کام کر رہا تھا۔

مقبرے کے باہر مارے جانے والے ایک مجرم کے خون کی لالی اب مدھم پڑ رہی تھی اور اس کا رنگ سیاہ ہونے لگا تھا۔ مجھے پھر حیرت ہوئی کہ پولیس نے اس کیس میں کتنی کم دلچسپی لی تھی بلکہ اسے کوئی واردات ہی نہیں سمجھا تھا۔ جیسے وہ حادثے میں مرنے والے کی لاش اٹھا کے لے جاتے ہیں ایسے ہی ایک مجرم کی لاش لے کر چلے گئے تھے حالانکہ اس مجرم کا قاتل بھی کہیں آس پاس ہی موجود تھا۔ اگر وہ پولیس کی گولی سے مارا جاتا تو اور بات تھی مگر مجرم نے تو خود ایک پولیس والے کی جان لی تھی۔ ایک پولیس مین کے قاتل کو کس نے مارا تھا اور کیوں؟ اس سوال کو نہ ڈی ایس پی نے اہمیت دی تھی اور نہ ایس پی نے۔ کیا اس کا مطلب یہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ ایسا ہی چاہتے تھے یا سمجھتے تھے کہ ایسا ہی ہو گا۔

یہ بڑا چکرا دینے والا سوال تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا تھا کہ پولیس کو چوہدری دلاور کی اور سکندر کی ملاقات کے وقت اور مقام کا علم تھا۔ دلاور کی حفاظت اس کے اپنے آدمی کر رہے تھے یا خود پولیس والے یا پھر اس کا مقصد سکندر کی گرفتاری ہو گا۔ جب ایک غیر ملکی وکیل کی دخل اندازی کے باعث یہ سازش طشت از بام ہوئی تو افشائے راز سے قبل ہی معاملے کو دبا دیا گیا۔ انسپکٹر خدا بخش اور ڈی ایس پی شاہد علی کی حد تک پولیس کی ملی بھگت سمجھ میں آتی تھی مگر کیا ایس پی ظفر حیات بھی...؟

میں نے پلٹ کے مقبرے کی پُر آسیب نیم تاریک فضا میں قدم رکھا تو مجھے گرد و غبار، وقت کی یلغار کی شکستگی کا نشانہ بنے والی بھدی دیواروں اور بلند گنبد کی وسعت میں پھڑپھڑاتے پرندوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میرا ذہن یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ وہاں چور راستہ ہو۔ [illegible] حال چھوڑ گئے تھے اور ایک معاہدہ بن گئے تھے۔ وہ مال کیا تھا، کتنا تھا، کہاں تھا؟ یہ سارے سوال بے معنی ہو گئے تھے۔

اچانک میری نظر کاغذ کے ایک پرزے پر گئی۔ سفید اجلے رنگ کا یہ ٹکڑا اس فرسودگی اور کہنگی کی فضا میں یوں لگ رہا تھا جیسے کوئلوں کے ڈھیر پر سنگ مرمر کا ٹکڑا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ اس پر

دریافت لوں اور اپنی گرفت میں بے بس کر دوں اور پھر اسے ڈھال بنا کے خود بھی نکل جاؤں مگر دوسرے لمحے میں نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اکیلا ہے یا اس کے محافظ ہر طرف سے خفیہ طور پر اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ میرے پاس تو اپنی گاڑی بھی نہیں تھی کہ میں اسے اٹھا کے گاڑی میں ڈالتا اور بھاگ جاتا۔ یہ عام گزرگاہ تھی اور یہاں کوئی تماشا ہوتا تو خود تماشائی مجھے گھیر لیتے۔

دلاور ٹہلتا ہوا میرے قریب آیا۔ وہ سے بڑھتا ہوا انداز تھا کہ ہی اسے شک میں مبتلا کرتا۔ میں نے اسے مسکرا کے دیکھا۔ یہ رسمی خوش اخلاقی کا مظاہرہ تھا۔ کسی اجنبی مقام پر دو ہی افراد ہوں تو وہ ایک دوسرے کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ شلوار قمیص کے بجائے دلاور نے سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور سنہرے فریم والے "رے بین" کے سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ اس کا ہیر اسٹائل بھی بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ سر پر ٹوپی رکھتا تھا مگر آج اس نے گریو کٹ بالوں میں مانگ نکال کے انہیں سلیقے سے جما لیا تھا۔ اس کی بغل میں بیٹن تھی یعنی وہ چھڑی جو سینیئر فوجی افسران اور پولیس افسران اپنی اتھارٹی کی سند کے طور پر بغل میں یا ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ اس کے جوتے بیٹنٹ لیدر کے تھے۔ اس حلیے میں اگر وہ اپنا تعارف چوہدری دلاور حسین کے بجائے ڈی ڈی حسین کے نام سے کراتا تو مجھے قطعی تعجب نہ ہوتا۔

"گڈ مارننگ!" دلاور نے لہجہ بدلا تو مجھے وہ کوا ورد یاد آیا کہ کوا چلا ہنس کی چال تو اپنی چال بھی بھول گیا۔

میں نے مسکرا کے اس سے مصافحہ کیا "گڈ مارننگ۔"

"تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" دلاور نے حیرت انگیز طور پر انگریزی کا پورا جملہ ٹھیک بولا جس میں گرامر بھی غلط نہیں تھی۔

میں نے اپنی صورت پر بار بار بجائے "پاردن؟" جس کا مطلب تھا کہ میں معذرت چاہتا ہوں۔ فرنچ، ڈچ اور ٹی کے تلفظ سے نا آشنا ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے فارسی اور عربی بولنے والے۔

اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی "تم انگریزی نہیں سمجھتے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "نو انگلش۔ فرنچ... [illegible] انگلش۔ ای اے تو دست (میں فرانسیسی ہوں بہت کم انگریزی جانتا ہوں)"

"تم نے یہاں کسی کو دیکھا؟" دلاور مطمئن ہو گیا کہ اب اس کی ٹوٹی پھوٹی انگلش کی غلطیاں بھی چل جائیں گی۔

میں نے مسکرا کے کہا "آئی سی یو۔" (میں تمہیں دیکھ رہا ہوں)

دلاور نے مجھے گھور کے دیکھا "میں ڈی ڈی حسین ہوں، ایس ایس پی۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی مگر میں نے ضبط سے کام لیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے پورا فرنچ نام لیا۔

پنسل سے صرف ایک ہی جملہ تحریر تھا "مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔"

میں دلاور کی ہینڈ رائٹنگ کو پہچانتا تھا اور خاصے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ یہ اسی کی تحریر تھی۔ عام آدمی کے لیے یہ کسی محبت کرنے والے کا بے وفا محبوب کے نام آخری پیغام بھی ہو سکتا تھا اور اعتماد کو دھوکا دینے والی محبوبہ پر کسی عاشق کا الزام بھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ پیغام میرے لیے تھا اور خود دلاور نے بھیجا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ پولیس کے ساتھ میں نہیں آیا مگر وہاں پولیس کو میں نے ہی بھیجا ہو گا۔

سوال یہ تھا کہ پیغام کون لایا۔ دلاور کی یہ تحریر وہاں کس نے چھوڑی تھی۔ میں نے کسی کو بھی آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ کیا مارا جانے والا ہی دلاور کا نامہ بر تھا یا پولیس کا کوئی اہلکار اس کا ایجنٹ تھا؟ دلاور کو کیسے معلوم ہوا کہ میں ہی پولیس کو لانے کا ذمے دار تھا؟

میں نے کاغذ کے اس پرزے کو جیب میں ڈال لیا اور باہر نکل آیا۔ اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میرے ذہن میں ایک نیا سوال پیدا ہو گئی تھی کہ کیا میرے اس ہیئت کی تبدیلی کے باوجود دلاور نے مجھے شناخت کر لیا تھا؟ یہ تو ناممکن تھا کہ اسے کسی نے خبردار کر دیا ہو۔ اس راز سے ہم چھ افراد کے سوا کوئی واقف نہ تھا۔ میں اور منظر، غالب اور نازو، وقار یوسف اور رابعہ۔ خادم حسین نے شاید دلاور یا سکندر کا نام بھی نہ سنا ہو۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہاں میرے سوا بھی کوئی ہے اور میں نے پلٹ کے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے بے خبری میں میرے ہاتھ نے بجلی کے ننگے تار کو پکڑ لیا ہو۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر دلاور موجود تھا۔

اگر میرے پیچھے افریقہ کا آدم خور ببر شیر آ جاتا تب بھی میں اتنا حیران و پریشان نہ ہوتا جتنا دلاور کو دیکھ کے ہوا۔ ابھی چند منٹ پہلے میں اندر تھا اور میں نے ہر طرف سے گھوم پھر کے دیکھا تھا۔ میرے سوا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی روح کی طرح وہ میری نظروں سے اوجھل رہا اور اچانک مجسم ہو کے سامنے آ گیا۔ وہ بہت بڑا ایکٹر، شعبدہ باز، شاطر شکاری سب کچھ تھا اور اس کا شیطانی ذہن ڈرامائی صورت حال پیدا کر کے اپنے حریف پر نفسیاتی غلبہ حاصل کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا تھا لیکن اس وقت تو دلاور نے جیسے سچ مچ خود کو مافوق الفطرت قوتوں کا مظہر ثابت کر دیا تھا۔

میرا حیرت سے دم بخود رہ جانا ایک فطری سی بات تھی مگر خود دلاور اپنے دائیں بائیں دیکھتا ہوا بڑی بے فکری سے ٹہلتا ہوا آ رہا تھا۔ مجھے سنبھلنے کا موقع مل گیا اور میں نے چند سیکنڈ میں سخت جدوجہد کے بعد چہرے سے حیرانی کے جذبات کو مٹا کے پھر اجنبیت اور بے نیازی طاری کر لی۔

صرف ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا تھا کہ میں [illegible]

www.paksociety.com

دلاور نے پھر انگریزی کا فقرہ دہراتے ہوئے پوچھا کہ کیا میں نے اس جگہ کسی اور کو بھی دیکھا ہے۔ اشاروں کنایوں سے اس نے میرا فقرہ حلیہ اور ناک نقشہ واضح کیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ ایک خطرناک مجرم ہے۔

میں اسے احمقوں کی طرح دیکھتا رہا اور ایسے مسکراتا رہا جیسے وہ مجھے کوئی لطیفہ سنا رہا ہے۔ دلاور پر اب جھنجلاہٹ سوار ہو گئی تھی۔

"کیا مصیبت ہے" اس نے زیرِ لب بڑبڑا کے کہا۔

"یار ون؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"کچھ نہیں۔" دلاور غرایا اور پلٹ کے دوسری طرف چلا گیا۔

میں اسے کن انکھیوں سے دیکھتا رہا اور نورجہاں کے مزار کی بوسیدہ دیوار کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ میں نے اس کے پلاستر کا ایک ٹکڑا اٹھا کے دیکھا اور اینٹوں کی چنائی پر انگلی پھیر کے سہلایا۔ میں چاہتا تھا کہ دلاور مجھے ذخائرِ قدیمہ پر تحقیق کرنے والا کوئی خبطی اسکالر سمجھ لے جو گھر بار اور روزگار کے عیش و آرام چھوڑ کے اسی طرح ہزاروں سال پرانی تہذیب کا سراغ لگانے کے لیے دنیا کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔

دلاور نے بھی روپوشی کے لیے بہروپ اختیار کیا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ پولیس کے خوف سے چھپتا پھر رہا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ گھر یا دفتر میں پولیس اسے ضرور گرفتار کر لے گی۔ ڈاکٹر نبیلی کے قتل کا کیس رابعہ کی اور اس کے ساتھی وکیلوں کی کوشش سے اتنا اوپر چلا گیا تھا کہ اب نہ دلاور کی دولت اسے بچا سکتی تھی نہ پولیس کی حمایت۔ واقعاتی شہادت سے ثابت ہو تا تھا کہ ڈاکٹر نبیلی اس کی سوتیلی بہن تھی جسے خود اس نے پاکستان بلایا تھا۔ ایک سیاہ فام مجرم جیدی گواہ برطانیہ کی جیل میں طویل قید کاٹ رہا تھا جس نے دلاور کو دوہرے قتل کا ارتکاب کرتے دیکھا تھا لیکن بدقسمتی اور حالات کی شہادت نے اسے مجرم بنا دیا تھا۔ یہ دوہرا قتل نبیلی کی ماں کا تھا اور ایک لڑکی کا جسے دلاور نے غلطی سے نبیلی سمجھ لیا تھا کہ وہ اس سیاہ فام کی گرل فرینڈ تھی۔ وہ سیاہ فام نبیلی کی ماں کا تیسرا شوہر تھا۔ ان سب شہادتوں کو مٹانا ناممکن تھا۔ ڈاکٹر نبیلی کا قتل دلاور کی سب سے بڑی غلطی تھی جس کی وجہ سے پرانے گڑے مردے بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اب یہ دلاور کے لیے صرف غیرت کا نہیں زندگی اور موت کا معاملہ بن گیا تھا کہ وہ ڈاکٹر نبیلی کے قتل کا سراغ ملنے سے پہلے مٹا دے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب اسے ڈاکٹر نبیلی کی قبر کا سراغ ملے اور وہ قبر میں سے لاش غائب کروا دے پھر کوئی کیسے ثابت کرے گا کہ اس نام کی کوئی لڑکی پاکستان آئی تھی اگر آئی تھی تو پُراسرار حالات میں ہلاک ہو گئی تھی اور ان پُراسرار حالات کے پیچھے دلاور کا ہاتھ تھا۔ ڈاکٹر نبیلی برطانوی شہریت رکھتی تھی۔ اس لیے تفتیش بھی اہم ہو گئی تھی ورنہ دلاور کے لیے پولیس کی مدد سے رسمی کارروائی کے بعد تفتیش کے لاحاصل نتائج کی رپورٹ حاصل کرنا مشکل نہ ہوتا۔

اگر وہ چاہتا تو اس کیس میں ضمانت قبل از گرفتاری بھی حاصل کر سکتا تھا مگر اسے ڈر تھا کہ کہیں ہم اعلیٰ عدالتی سطح پر دباؤ سے اس کی کوشش کو ناکام نہ کر دیں۔ وہ گرفتاری کا رسک نہیں لے سکتا تھا، حالانکہ عدالتِ عالیہ سے اس کی ضمانت منظور ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔ قتل خود اس نے نہیں کیا تھا۔ شک یہ تھا کہ جرم اس کے ایما پر اور اس کی اعانت سے ہوا تھا اور اس قتل سے اس کے مخصوص مفادات وابستہ تھے۔ اس کے جرم میں ملوث ہونے سے دنیا کی کوئی عدالت انکار نہیں کر سکتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اب وہ اسی طرح ایک مفرور مجرم کی زندگی گزار رہا تھا جیسے میں۔ میں نواب وبیدری کی زندگی کا عادی ہو گیا تھا اور میرے ہر کیس میں دلاور نے دھن دولت اور دھاندلی سے حالات اور واقعات کی شہادت کو اس حد تک مسخ کر دیا تھا کہ اب مجھے دنیا کی کسی عدالت سے انصاف کی امید نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنا معاملہ اس کے سپرد کر دیا تھا جو سب سے اوپر ہے اور جس سے نہ ظاہر پوشیدہ ہے نہ باطن۔ دلاور کے لیے خوف اور روپوشی، ذلت اور بے بسی کا یہ دور بڑا صبر آزما ثابت ہو رہا تھا جس نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ دولت کی طاقت کا غرور۔ گھر کی راحت اور خون کے رشتوں کی قربت۔ وہ مجبور ہو گیا تھا کہ سر جھکا کے مجھ سے میری شرائط پر مفاہمت کی بات کرے مگر میں اتنی جلدی اسے کیسے بخش دیتا۔ ابھی تو اس کے لیے آزمائش کا عذاب شروع ہوا تھا۔

میری نظر رہ رہ کے وقفے وقفے سے دلاور کی کیفیت کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے وہاں میری موجودگی سخت ناگوار گزر رہی تھی مگر وہ مجھے حکم نہیں دے سکتا تھا کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ اسے یقیناً کسی کا انتظار تھا۔ وہ اوھر سے کھڑا تھا۔ جدھر شاہدرہ کا ریلوے اسٹیشن تھا اور بار بار گھڑی دیکھتا تھا۔ خوشی مجھے اس بات پر تھی کہ دلاور کی نگاہ میرے میک اپ سے دھوکا کھا گئی اور وہ میرے انداز و اطوار میں بھی سکندر بخت کی جھلک نہ دیکھ سکا۔

زیرِ لب باتیں کرنے اور دیواروں کا بنظرِ غائر مطالعہ فرماتے ہوئے میں گھوم کے دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں سے میں بھی شاہدرہ ریلوے اسٹیشن کی جانب دیکھ سکتا تھا۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک جھنڈ کے پیچھے گرد سی اڑی اور کچے راستے پر چلتی ہوئی ایک جیپ نمودار ہوئی۔ اس میں صرف دو ہی افراد تھے۔ ایک ڈرائیونگ کر رہا تھا اور دوسرا اس کے ساتھ بگل مارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی بغل کے نیچے کسی خود کار مشین گن کو چھپانے کی ادھوری سی کوشش ادھوری تھی۔ ڈرائیور پولیس کی وردی میں تھا مگر پولیس والا نہیں تھا۔

میں اتنے کم فاصلے پر تھا کہ ان کی گفتگو صاف سن سکتا تھا۔

"بہت دیر سے آتے ہو تم لوگ۔" دلاور نے غصے سے کہا "کوئی کام وقت پر بھی کر لیا کرو۔"

وہ میرا مطلب سمجھ گیا کہ مجھے ٹیکسی چاہیے اور میں ان کے ساتھ میں روڈ تک جانا چاہتا ہوں۔ اس نے سہلا کے مجھے ساتھ آنے کی اجازت دی۔ میں بگل والے کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔

"رات کو کتنے آدمی تھے یہاں؟" دلاور نے پوچھا۔

"نو جناب عالی۔"

"کس وقت آئے تھے؟"

"میں یہی نو بجے۔ ساڑھے نو بجے میں نے خود ان کو اپنی اپنی جگہ پر بٹھایا تھا اور وہ بندے بھی ہوشیار تھے جناب عالی۔"

"مزار سے کتنی دور تھے؟"

"سب نے چالیس پچاس گز ہوا تھا۔ سڑک کے پیچھے اور مزار کے پیچھے ایک چوکی سے دوسری چوکی سو گز دور ہو گی۔"

"تمہیں یقین ہے کہ رات یہاں کوئی نہیں آیا؟" دلاور بولا۔

"مگر چوہے کا بچہ بھی نزدیک نہ آتا تو پتا چل جاتا۔ ان کے پاس اندھیرے میں دیکھنے والی دوربینیں تھیں ہر بندے کے پاس۔"

دلاور نے سہلایا "اور وہ جاگتے رہے رات بھر؟"

"سونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میں نے سب کو جگانے والی دوائی کی دو دو گولیاں خود کھلاوی تھیں۔" بگل والا بولا "اور جناب عالی میں خود چوکیداری کرتا رہا۔ چکر لگاتا رہا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اسے معلوم ہو گیا" دلاور مایوسی سے بولا۔

"..... یہ ہو سکتا تھا جی۔"

"تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہے وہ۔ جو بات ہماری عقل میں رات کو آتی ہے وہ دن میں سوچ لیتا ہے اور دن کی بات اسے رات کو پتا چل جاتی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ رات ہوتے ہی پہنچ جانا۔ تم تو آئے تھے نو ساڑھے نو بجے" دلاور گرم ہو گیا "مغرب کے بعد نہیں نکلتے تھے؟ اس کے بندے تم سے پہلے موجود ہوں گے۔ اس نے جب مجھ سے بات کی تھی تو اپنے بندے وہاں پہلے ہی بٹھا دیے ہوں گے۔ انہوں نے سب کو دیکھا ہو گا اور جا کے بتایا ہو گا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔"

میں سپاٹ چہرے کے ساتھ احمقوں کی طرح بیٹھا رہا۔ مین روڈ تک مشکل سے پانچ منٹ کا راستہ تھا مگر پیلی ٹیکسی لاہور جانے والے راستے پر کچھ آگے نظر آئی۔ میں نے گاڑی رکوائی اور خالص فرانسیسی انداز میں مسکراتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ میں نے انہیں کیسی شاندار گالیوں سے نوازا ہے۔

جیپ مجھے چھوڑ کے آگے بڑھ گئی تو میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور پیچھے بیٹھ گیا۔ اس کا میٹر ڈاؤن تھا۔

"گاڑی خالی نہیں ہے جی میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں" ڈرائیور نے احتجاج کیا "بندہ سامنے گھر میں گیا ہے۔"

میں نے کہا "چلو اس بندے کو۔ وہ دوسری ٹیکسی لے لے گا۔"

"سب کا انتظار تھا باس" بگل والا بولا۔

"میری گھڑی کے حساب سے تو۔" دوسرے نے کہا۔

"تف کر دو اپنی گھڑی کو۔ حرام زادہ نہیں دیا ہے۔"

"رپورٹ تو کی ہے" بگل والے نے کہا۔

"پھر پولیس کیسے ٹپکی تھی یہاں؟"

ڈرائیور نے کہا "یہ اسی کی کارستانی ہے استاد۔ وہ آپ کو چکر دے گیا۔"

"میری اطلاع کے مطابق تو وہ غائب ہے۔ اس کے ہر ٹھکانے پر میری نظر ہے۔ اس اس نے کہیں باہر سے پولیس کو فون کیا ہو گا۔ مجھے بے وقوف سمجھتا ہے نا۔ ایک بندہ خود تو مروانا پڑا مجھے۔ ساری بات مجھے انسپکٹر خدا بخش سے معلوم ہو گی۔"

"یہ ساری مصیبت ایس پی کی ہے باس۔ وہ بڑا فرض شناس بن رہا ہے۔ کیوں نہ اسے۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ وہ مجبور ہے۔ اسے ڈراما تو کرنا ہی پڑے گا" دلاور بولا "اس سے کوئی خطرہ نہیں۔"

"فرانسیسی بولو۔ کوئی ہے یہاں۔"

دلاور نے کہا "کوئی نہیں ہے۔ یہ ہے کوئی پاگل۔ اردو انگریزی کچھ نہیں جانتا۔"

بگل والے کی آواز مجھے جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ غور کرنے پر مجھے یاد آیا کہ وہ ریڈیو آپریٹر تھا جو وائرلیس پر مجھ سے بات کرتا تھا اور پھر دلاور کو پیغام دیتا تھا۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ ان پاس دلاور کے بہت سے تجربہ کار موجود تھے جو میری راہ دیکھ رہے تھے۔ دلاور نے ان سب کے پیچھے بھی اپنے آدمی لگا رکھے تھے جو میرے دوست اور ساتھی تھے۔

جس پرچے پر دلاور نے مجھے ایک سطر کا پیغام دیا تھا وہ میری جیب میں تھا۔ اسے جیب میں رکھنا میری غلطی تھی۔ کسی اجنبی کو جو اردو کا ایک لفظ سمجھتا بھی نہ ہو ایسے کسی رقعے کو اٹھانے اور سنبھال کر رکھنے کی کیا ضرورت ہو گی۔ اس طرح تو میں خود اپنا راز فاش کرنے کے درپے تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے وہ رقعہ وہیں ڈال دیا جہاں مجھے نظر آیا تھا۔ ایک طرح سے یہ بروقت ہوا۔

دلاور جیب میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ اسے اپنا چھوڑا ہوا پیغام یاد آ گیا۔ وہ پلٹ کے اندر آیا۔ رقعہ وہیں موجود پا کے اسے کچھ مایوسی ہوئی۔ اس نے کاغذ کو اٹھا کے مروڑ کیا اور گولہ سا بنا کے پھینک دیا۔ یہ گولہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر گرا۔ جب دلاور پلٹا تو میں نے اسے پھر اٹھا کے جیب میں ڈال لیا اور تیزی سے آگے بڑھا۔

"موسیو!" میں نے دلاور کو مخاطب کیا۔

وہ رک گیا اور ماتھے پر تیوری ڈال کے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ "کیا بات ہے؟"

میں نے عاجزی اور لجاجت سے کام لیا "ٹیکسی موسیو۔ سی وانت۔" میں نے انگلی سے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

www.paksociety.com

"اور واپس کا کرایہ؟"

"کرایہ میں دوں گا۔ یہ لو۔" میں نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کے اسے تھماتے ہوئے کہا "اور چاہیے؟ یہ لو۔"

دوسرا نوٹ پکڑتے ہی اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کر دی "کدھر جانا ہے؟"

"آگے ایک جیپ جا رہی ہے۔ اس کا پیچھا کرنا ہے۔ اس طرح کہ انہیں پتا نہ چلے" میں نے کہا۔

اس نے مڑ کے مجھے دیکھا "باؤ جی مروا مت دینا۔"

میں نے کہا "خطرے کی بالکل کوئی بات نہیں۔ جیپ دور نہیں گئی ہو گی۔ ان کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ تھوڑی سی کوشش کرو گے تو انہیں پکڑ لو گے۔ پھر آرام آرام سے پیچھے چلتے جانا۔"

وہ کچھ پریشان تھا۔ "کوئی گڑبڑ تو نہیں کر جائیں گے نا۔ آپ تو پیچھے ہو یہلے مجھے لگے گی۔"

"یار تم پیچھے آ جاؤ۔ میں چلاتا ہوں ٹیکسی۔"

اس نے یہ بھی قبول نہیں کیا "کچھ بتاؤ تو سہی معاملہ کیا ہے؟"

"معاملہ بس یہ ہے کہ وہ جیل سے بھاگے ہوئے ہیں اور حلیہ بدل کے پھر رہے تھے کہ میں نے دیکھ لیا۔ وہ مجھے نہیں پہچانتے۔ میں خفیہ پولیس کا آدمی ہوں۔ شاباش ذرا اسپیڈ بڑھاؤ گاڑی کی۔"

ڈرائیور کے لیے اب انکار کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ خفیہ پولیس کے نام پر اس نے مجھے پلٹ کے دیکھا ضرور تھا لیکن بے یقینی سے نہیں۔ شاید وہ حیران تھا کہ آخر خفیہ پولیس کا افسر نظر آنے والا بندہ اتنی شرافت سے بات کیوں کر رہا ہے۔ دھمکی یا دھونس سے ٹیکسی لے جانے کے بجائے وہ سو سو دے رہا ہے؟ اللہ خیر کرے۔

جیپ مجھے دور سے ہی نظر آ گئی۔ ٹیکسی نے راوی کا پل پار کیا تو ولاور کی جیپ موڑ کاٹ رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور کو اشارے سے بتا دیا۔ "آگے ایک ٹرک ہے۔ اس کے آگے بس کچھ جب۔"

"میں نے دیکھ لیا ہے جناب۔ نمبر صاف نہیں ہے لیکن ابھی نظر آ جائے گا۔ آپ فکر ہی نہ کرو" اس نے ٹرک کو پیچھے چھوڑ دیا۔

"ہاں.... نمبر ہے....؟"

میں نے کہا "نمبر سے کچھ نہیں ہوتا۔ جیپ نقلی ہے اور جعلی نمبر ہے۔ آگے رش زیادہ ہو گی۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ کوئی پیچھا کر رہا ہے تو وہ تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔"

"یہ کیسے پتا چل سکتا ہے جناب۔ اتنی گاڑیاں ہیں سڑک پر۔ کیا وہ آپ کو پہچانتے ہیں۔"

"ہاں۔ یہی تو اصل مسئلہ ہے۔"

"بس تو آپ لیٹ جاؤ سیٹ پر اور باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔ میں آپ کو بتاتا رہوں گا۔"

اس کی بات معقول تھی۔ میں نے خود کو سیٹ پر لیٹ کر چھپا لیا۔ اب جیپ کا ڈرائیور عقب نما شیشے میں دیکھتا تو اسے پیچھے ایک خالی ٹیکسی نظر آتی۔ ڈرائیور نے رنجیت نگر کراس کرتے ہوئے مجھے صورت حال سے باخبر رکھا۔ "سوہنی وال صاحب سے جیپ آگے نکل گئی۔ اب یہ اردو بازار کے قریب ہے۔ اور تھوڑا سا ٹریفک میں پھنس گئے۔ بریڑھا بیچ میں آ گیا۔ اس کو دیکھو اوئے پہلوان موڑ سائیکل والا رہو رہی ہے۔ پیچھے بٹھائی ہے ڈھائی من کی بے بے۔ خود ڈھائی چھٹانک ہے اور چل رہا ہے بیچ میں۔ مرنے کی صلاح ہے کھوتے۔ یہ لو جی جیپ تو رک گئی ہے میں نفت کرے ہے۔"

میں نے کہا "تم بھی رک جاؤ۔ اگر یہ لوگ کھانے پینے بیٹھ جائیں تو تم بھی لسی کا ایک جگ پکڑ لاؤ۔ ہم دونوں کیوں بھوکے رہیں۔"

جیپ آدھے گھنٹے بعد پھر روانہ ہوئی اور شاہ عالمی کی طرف سے رام گلی پہنچ کے رک گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو اب اس تعاقب میں مزہ آنے لگا تھا۔

"اب کیا کروں جی۔ گلی میں تو ٹیکسی نہیں جا سکتی۔"

میں نے فوراً باہر چھلانگ لگائی "کون سی گلی میں گئے ہیں وہ لوگ؟"

ڈرائیور نے اشارے سے بتایا "جہاں جیپ کھڑی ہوئی ہے۔ اس سے اگلی والی۔"

میں نے کہا "تم انتظار کر سکتے ہو.... اسی جگہ؟"

"کب تک جناب؟"

"زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ سو بچے تم ایک پورے دن کا کرایہ مجھ سے وصول کر چکے ہو۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی۔"

"کرائے کی بات نہیں جناب" وہ کھسیانا ہو گیا "خالی ٹیکسی دیکھ کے لوگ پریشان کرتے ہیں۔ انکار کرنا بھی مشکل ہوتا ہے اور آپ جیسا کوئی آ جائے تو...."

جاتے جاتے میں نے کہا "بتا دینا ڈی ایس پی شاہد علی کو لایا ہوں اور انہیں واپس لے جانا ہے۔"

جس گلی کی طرف ڈرائیور نے اشارہ کیا تھا وہ مشکل سے چھ فٹ چوڑی تھی اور اس میں بھی جگہ جگہ دروازوں کے سامنے چبوترے سے بنے ہوئے تھے۔ ولاور اور اس کے ساتھی غائب ہو گئے تھے اور یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کس گھر میں داخل ہوئے ہوں گے۔ میں گلی کے آخر تک گیا تو وہ تینوں مجھے دائیں طرف نظر آئے ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے رک کے بکلی والے نے گھنٹی بجائی یا شاید دستک دی۔ میں نے عمارت کے محل وقوع کو نوٹ کیا۔ اس کا دروازہ پرانے لاہور کی عمارتوں جیسا تھا یعنی بڑے محرابی اور خاصی بلند چوکھٹ والا۔ اس کے دونوں پٹ سال خوردہ ساگوان کی لکڑی کے اور انتہائی مضبوط تھے۔ اکھڑے ہوئے نیلے رنگ میں ابھرے ہوئے ڈیزائن کے سفید چوکور ٹکڑے بھی میلے نظر آتے تھے۔ اس کے دائیں جانب والے مکان کا چوبی حصہ ٹوٹا ہوا تھا اور دوسرے بند بھی

"میں گلی کے موڑ سے تمہیں بھی دیکھوں گا اور ان پر بھی نظر رکھوں گا۔ ویسے وہ اتنی جلدی شاید نہ آئیں۔ جب یہ کام کر لو تو پھر ٹیکسی لے کر جاؤ" میں نے غالب کے نام اور فون نمبر والی چٹ اسے تھمادی "اخبار کے دفتر۔"

"اس اخبار کا دفتر میں نے دیکھا ہے۔"

"وہاں غالب صاحب ہوں گے۔ انہیں بتانا۔ ان کو خاموشی سے بتانا کہ میں یہاں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"سب بتادوں انہیں؟"

"سب بتادو.... مگر لمبی کہانی مت سنانا۔ وقت ضائع کیے بغیر انہیں یہاں.... لے آنا۔" میں واپس چل پڑا۔

"اچھا جی۔ بس آپ ان کا دھیان رکھنا۔ ایسا نہ ہو وہ آ جائیں ایک دم اور مار مار کے میری ہڈیاں توڑ دیں۔"

میں گلی کے نکڑ سے دیکھتا رہا۔ ڈرائیور نے بونٹ کھولا اور چند منٹ بعد تار نکال کے بند کر دیا۔ اس نے ہاتھ ہلایا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو میں پھر اندر کی طرف لپکا۔ مجھے ڈر یہ بھی تھا کہ اتنی دیر میں ولاور گلی کی دوسری طرف سے نہ نکل گیا ہو یا اچانک مجھے سامنے سے آتا نہ دیکھ لے۔ وہ فوراً تاڑ جائے گا کہ میں نے نور جہاں کے مقبرے سے یہاں تک اس کا پیچھا کیا ہے۔

گلی میں خود کو چھپا کے اس دروازے پر نظر رکھنے کے لیے کوئی بھی جگہ نہیں تھی اور بلاوجہ گلی میں کھڑے ہونا یا چہل قدمی کرنا بھی محلے والوں کی نظر میں شک پیدا کرتا۔ ایک گلی میں رہنے والے ایک دوسرے کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ گھر میں کتنے افراد ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں کرتے۔ ان کی عادات و اطوار سے رشتے داریوں تک کا حال پرانے لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہوتا۔ کس کے گھر میں کون لوگ اکثر آتے ہیں وہ خود کہاں جاتے ہیں۔ ان کے چچا ماما شہر میں کہاں رہتے ہیں اور بیٹی داماد کا گھر کہاں ہے۔ ایسی صورت میں کوئی اجنبی ویسے ہی سب کی نظروں میں کھٹک جاتا ہے اور وہ محلے والوں کے بارے میں سوال کرے کہ اس گھر میں کون رہتا ہے تو سو فیصد مشکوک ہو جاتا ہے۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ یہ کام میں نے اس ٹیکسی ڈرائیور سے کیوں نہیں لیا۔

مشکل کا حل قدرت کے اختیار میں ہے۔ میں گلی کے آخر تک جا کر واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک دروازہ کھلا اور کسی عورت نے آٹھ دس سال کے ایک بچے کو باہر نکال دیا۔ لڑکا یقیناً حرام خور تھا یا والدہ کے احکامات کی تعمیل اسی طرح مشروط طور پر کرتا تھا۔ خراب لاؤڈ اسپیکر جیسی آواز والی ماں نے بچے کے اعلان عام کیا "جائے گا کیسے نہیں تو سو دو سے پیسے۔ سات دس پیسے ایک تک کام سے جاتا پیسے تو بہانے کرتا ہے ویسے سارا دن کھوتے کی طرح گلی میں دوڑتا پھرتا ہے۔ چل جھاڑو لے کر آ نہیں تو آج تیری ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

لڑکا باہر بیٹھ گیا "لے آؤں گا۔ ابھی نہیں جا رہا میں۔"

نئی طرز کا بنایا گیا تھا۔ اس کی کھڑکیوں کے شیشے بڑے تھے اور باہر گرل تھی۔ دوسری طرف پرچون کی چھوٹی سی دکان تھی۔ ایسی دکانیں گلی محلوں میں عام نظر آتی ہیں۔ جہاں پرانے وقتوں کے بڈھے سستی ٹافیاں ریوڑیاں لڈو اور پتنگ، چورن اور تھوڑا بہت دال چاول یا صابن رکھ کے دکان داری سے زیادہ وقت گزاری کا سامان کرتے ہیں۔

سہ منزلہ عمارت میں مجھے ایک ہی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اوپر کی منزل پر دو دو کھڑکیاں تھیں اور یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ پہلے حصے میں مکان کی دیواریں کسی دوسرے مکان کی دیواروں سے لگی ہوئی ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ولاور یا اس کے ساتھی صرف سامنے والے حصے کے واحد دروازے سے ہی آ جا سکتے تھے۔

تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میں پھر سڑک تک آیا جہاں ٹیکسی ڈرائیور گاڑی سے کچھ فاصلے پر یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اس کا ٹیکسی سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

مجھے دیکھ کے وہ مستعد ہو گیا "کام ہو گیا جناب؟"

میں نے ایک کاغذ کے پرزے پر غالب کا نام اور اخبار کے علاوہ وقار کے گھر کا فون نمبر لکھا "ایک کام کرو گے؟"

"بس جی غلط کام نہ کرائیں مجھ سے۔ میں غریب آدمی ہوں۔"

"غلط کام نہیں ہے" میں نے اسے تسلی دی "انعام بھی ملے گا۔ میں گلی کے اندر موڑ سے ان پر نظر رکھوں گا۔ تم مجھے دیکھتے رہنا۔"

"یہ تو کوئی کام نہ ہوا جی۔"

"پوری بات سن لو" میں نے کہا "پہلے تو ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے جیپ کو خراب کر دو۔"

"ہوا نکال دوں ٹائروں کی؟"

"ایسا کام مت کرو کہ پکڑے جاؤ۔ لوگ پوچھیں گے کہ یہ کیا کر رہے ہو پھر؟" میں نے کہا "جیپ کھلی ہوئی ہے۔ تم بونٹ اٹھاؤ اور اندر اس کے کنڈنسر کا تار نکال دو۔ کھینچ کے توڑ دو۔"

"کنڈنسر کہاں ہوتا ہے جناب عالی؟"

"کمال ہے۔ ٹیکسی چلاتے ہو اور یہ بھی نہیں جانتے۔ خیر ڈسٹری بیوٹر کیپ تو دیکھی ہے نا۔ اس میں سے جو تار نکلتے ہیں وہ پلگ میں لگ جاتے ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "درمیان والا تار نکال دوں؟"

"نہیں۔ وہ نظر آنے گا اکھڑا ہوا تو انہیں شک ہو گا کہ کسی نے پنگا لیا ہے۔ پھر وہ ہوشیار ہو جائیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں شک بھی ہو۔ اگر تم غور سے دیکھو گے تو ڈسٹری بیوٹر کیپ پر ہی ایک چھوٹی سی ڈبیا نظر آئے گی۔ ٹیوب لائٹ کے اسٹارٹر جیسی۔ اس کو کہتے ہیں کنڈنسر۔ جو تار اس پر لگا ہوا نظر آئے اسے توڑ کے الگ کر دو۔ پتلا سا تار ہو گا۔"

"اگر کسی نے دیکھ لیا تو...."

www.paksociety.com

"ابھی کہاں نہیں۔ آج آنے دے تیرے ابے کو" ماں مجبور تھی اور گلی میں آ کے نا خلف بیٹے کی اصلاح نہیں کر سکتی تھی۔

"کٹے والی پتنگ بھی لوں گا میں" لڑکے نے بالآخر شرط پیش کر دی۔

"اسی طرح بکواس کرتا۔ گر دیکھ... اس زینب کی ماں سے پھر کہتا کہ ہماری پیالی ان کے گھر میں ہے کب سے... خود تو کسی کو خیال نہیں آتا کہ برتن واپس کر دے۔"

"ہاں... اوپر جانا پڑے گا" لڑکا بسورنے لگا۔

"تو چلا جا۔ تیری ٹانگیں گھس جائیں گی کیا فرید" ماں نے چلا کے کہا۔

"کھوکھر صاحب کی کھنٹی کرنٹ مارتی ہے۔ دروازہ بجاؤ تو اس کی پاگل ماں کاٹنے کو دوڑتی ہے" لڑکا آخر آنے کے تجربے کر کے اس کرنے کے انداز میں اُچھلتا ہوا چل پڑا۔

یہ ساری گفتگو لاہور کی مخصوص پنجابی زبان کے چٹخارے والی تھی جس کا یہاں صرف ترجمہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہر جگہ زبانہ لغت کے الفاظ میں لہجہ اپنا الگ مفہوم رکھتا ہے۔ میں سر جھکا کے زیر لب مسکراتا ہوا گزر گیا لیکن اس گفتگو سے مجھے مفید معلومات اخذ کرنے میں مدد ملی۔ وہ چھوٹی سی دکان "ماسے دی ہٹی" تھی جو غالباً سب سے زیادہ آسان حوالہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ ایسی دکانوں پر سائن بورڈ نہیں ہوتے۔ جب جھاڑو خرید کے لڑکا اسی گھر کے دروازے تک گیا جس میں دلاور اپنے ساتھیوں سمیت داخل ہوا تھا تو مجھے یہ پتا چل گیا کہ وہاں کوئی کھوکھر صاحب رہتے ہیں جن کی بیٹی زینب ہے اور غالباً ایک چڑچڑی بد مزاج ماں۔ مزید یہ کہ ان کی کال بیل میں کرنٹ آتا ہے۔

لڑکے نے غالباً پتنگ مل جانے کی خوشی میں ماں کا دوسرا کام کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس نے گھنٹی کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ جھاڑو سے دبا دیا۔ وہ سائنس کے اس بنیادی اصول سے واقف تھا کہ لکڑی میں کرنٹ نہیں آتا۔ دو منٹ بعد کسی نے دروازے کا تھوڑا سا پٹ کھول کے لڑکے سے بات کی۔ لڑکا واپس ہوا ہی تھا کہ میں نے اسے انگلی کے اشارے سے بلا لیا۔ وہ جھاڑو کو تلوار کی طرح لہراتا آ گیا۔

"تمہارا نام فرید ہے نا" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "یہ کھوکھر صاحب ہیں نا۔ جن کی لڑکی ہے زینب۔ یہ آج گھر پر کیوں ہیں؟"

"رات کی ڈیوٹی تھی ان کی" لڑکے نے کہا "پھر رات کو جائیں گے۔"

میں نے ایک روپے کا نوٹ نکالا "یہ تمہیں مل سکتا ہے زور پتنگ کے لیے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ کھوکھر صاحب کے گھر میں کتنے لوگ رہتے ہیں۔"

لڑکے نے پہلے مجھے اور پھر نوٹ کو دیکھا "بیچ وہ خود۔ ان کی گھر والی اور بیٹی۔ سب پاگل ماں۔"

"کیا وہ سچ مچ پاگل ہے؟" میں ذرا گیا۔

"اور کیا۔ اسے تو وہ پاگل خانے میں داخل کرا دے۔ ان کی بیوی۔ لیکن کھوکھر صاحب کہتے ہیں کہ تم بھی ساتھ رہو ماں سے۔ پھر خیف ہے ورنہ ادھر باہر روز لگا دیتے ہیں پاگل خانے کا۔"

"اوپر کون رہتا ہے؟" میں نے ہنسی ضبط کی۔

"کرائے دار۔ دوسری منزل پر آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ زیادہ دن کوئی نہیں رہ سکتا۔"

"کیوں؟ کیا کھوکھر صاحب تنگ کرتے ہیں؟"

لڑکے نے نفی میں سر ہلایا "اوپر جنات رہتے ہیں۔ جو ان کی نہ مانے اسے اوپر سے گلی میں پھینک دیتے ہیں۔ ایک عورت کو پھینک دیا تھا۔ ماں کہتی ہے وہ مغرب کے وقت بال کھول کے کوٹھے پر گئی تھی۔ اس سے پہلے ایک ترکھان کو پھینک دیا تھا۔ وہ ادھر الماری بنا رہا تھا جہاں ایک جن نماز پڑھتا تھا۔"

میں نے اسے روپیہ دے دیا۔ "بیٹا یہ سب فضول باتیں ہیں۔"

"ٹھیک۔ آپ فضل دین سے پوچھ لو ماسے دی ہٹی کے ساتھ والا مکان اس کا ہے۔ کیا آپ کرائے پر مکان لینے آئے ہو؟"

"ارادہ تو تھا..."

"ابھی تو مشکل ہے۔ یہ نئے کرائے دار ہیں۔ یہ خالی کریں تو آپ بے شک آ کے دیکھ لینا۔ جن کسی کو نہیں چھوڑتے۔ جب تمہیں اوپر سے نیچے گلی میں پھینک دیں گے تو تمہیں بھی پتا چل جائے گا" اس نے طنز اور تمسخر کے ساتھ کہا۔

میں فوراً واپس ہو گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں لڑکا میرے بارے میں اپنی والدہ سے ذکر نہ کر دے۔ ایک روپے کی رشوت اس کا منہ بند رکھنے کے لیے تھی۔ کسی اجنبی سے ایک روپیہ لینے پر ماں ضرور اس کو چھیتی لگاتی مگر وہ روپے کا حوالہ دیے بغیر بھی بات کر سکتا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ غالب کا آدھے گھنٹے سے پہلے آنا قطعی ناممکن تھا۔ اگر وہ نازو کے ساتھ آفس میں مل جاتا اور وہ فوراً روانہ ہو جاتے تب بھی ٹیکسی کے جانے آنے میں چالیس پچاس منٹ سے کم نہیں لگتے۔ ایک گھنٹے میں وہ پہنچ سکتے تھے مگر یہ ایک گھنٹا گزارنا میرے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ میں اس گھر کے دروازے پر نظر رکھنا چاہتا تھا جہاں جن مالک مکان کو کچھ نہیں کہتے تھے مگر کرائے داروں کو بے دخل کرنے کے شوقین تھے۔ عدالت سے بے دخلی کا حکم مل جائے تب بھی پولیس کسی کرائے دار کو کھڑکی کے راستے گلی میں نہیں پھینکتی۔

مجھے کھوکھر صاحب کی شخصیت سے کچھ دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ وہ کوئی پُراسرار تو ولی تھا۔ رات کی ڈیوٹی تو بہت سے لوگ دیتے ہیں۔ کارخانوں میں رات کی شفٹ ہوتی ہے۔ رات کو ٹرین چلتی ہے اور ہوائی جہاز اُڑتے ہیں۔ مگر کھوکھر کا کردار مشکوک اور تجسس کو بیدار کرتا تھا۔ اس کا گھر آسیب زدہ مشہور تھا اور مجرموں

ایک اور نوٹ دیا "ٹھیک ہے" میں نے اس کے کندھے پر شاباش دی "تم نے آج قانون کی مدد کی۔ سب شہری تمہاری طرح تعاون کرنے لگیں تو اس شہر سے لاقانونیت ختم ہو جائے۔"

اس نے بے حد خوش ہو کے کہا "نہیں جی یہ تو میرا فرض تھا۔" اصل خوشی اسے دو گھنٹے میں تین سو کمانے کی ہوگی۔ یہ اس کی دو دن کی کمائی سے زیادہ رقم تھی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ پولیس نے اسے بیگار میں نہیں پکڑا ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ اُلٹا ہم اس سے کچھ وصول کر لیتے تو اپنی تقدیر کے سوا وہ کس سے شکایت کرتا۔

ٹیکسی ڈرائیور چلا گیا تو میں نے غالب سے کہا "وہ جیپ دلاور کی ہے۔ دلاور اس گلی کے ایک گھر میں چھپا ہوا ہے اور میرا خیال ہے کہ سو رہا ہے۔ وہ رات بھر جاگتا رہا ہو گا۔ اس کے ساتھ اور آدمی بھی ہیں۔ ایک کو میں نے آواز سے شناخت کیا تھا۔ دوسرا بھی کوئی جانا پہچانا ہو گا۔"

غالب نے حیرانی سے کہا "دلاور کہاں مل گیا تھا؟"

میں نے مختصراً نورجہاں کے مزار پر پیش آنے والے واقعات کا خلاصہ پیش کر دیا "وہاں رات بھر دلاور کے شکاری گھومتے رہے۔ اس تاک میں رہے کہ میری بو بھی پا لیں تو مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ دلاور ان کی ناکامی پر تپا بیٹھا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میں نے پہلے سے اپنے جاسوس وہاں بٹھا دیے تھے۔ انہوں نے مجھے فرار کرا دیا اور میں ادھر گیا بھی نہیں۔ حالانکہ میں تو پوری بارات لے کر گیا تھا۔ دلاور ذرا دیر سے پہنچا ورنہ آج حوالات میں اس کی سرابندی ہوتی۔"

"کیا واقعی اس نے تمہیں نہیں پہچانا؟" نازو بولی۔

"واقعی سے آپ کی مراد کیا ہے؟"

"ممکن ہے وہ نہ پہچاننے کی اداکاری کر رہا ہو۔ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ آپ اس کے پیچھے تشریف لا رہے ہیں۔" غالب بولا۔

"یار آخر وہ آدمی ہے۔ نعوذ باللہ۔ خدا تو نہیں ہے۔ اب یہاں باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔ ایسا نہ ہو وہ نکل جائے۔"

"ہم تو ابھی آئے ہیں۔ اتنی دیر میں تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ دلاور کو پکڑنے کا اس سے اچھا موقع نہ پہلے کبھی آیا تھا اور نہ پھر کبھی ملے گا۔ وہ مطمئن ہے کہ اس کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ میں نے

کے بہت سے ٹھکانے ایسے ہی ہوتے ہیں جہاں عام آدمی قدم رکھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ وہ خود اپنے ٹھکانوں کو جن بھوتوں کا ڈیرا مشہور کرتے ہیں اور اس طرح مداخلت کے ڈر سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ چوہدری دلاور کا اس گھر میں قدم رنجہ فرمانا بھی کھوکھر کے خلاف میرے شکوک کو تقویت پہنچاتا تھا۔

گلی میں بے وجہ ٹھہرنا میرے لیے مسائل پیدا کر دیتا۔ مجبوراً میں سڑک پر آ گیا جہاں دلاور کی جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ کسی وجہ کے بغیر دلاور کا جیپ کو یہاں چھوڑ جانا مشکل ضرور تھا مگر ممکن نہیں تھا۔ یہ جیپ میں نے اس کے پاس کبھی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ حفاظت کے خیال سے جیپ کو دوبارہ استعمال نہ کرے۔ گلی کی دوسری طرف سے پیدل نکل جائے یا آگے کہیں جا کے اپنی گاڑی میں بیٹھ جائے۔ روپوشی میں آدمی چھوا اور مقام بھی نہیں گاڑیاں بھی بدلتا رہتا ہے۔

میں جیپ سے اتنے فاصلے پر تھا کہ دلاور اچانک آ جاتا تو مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن میں دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ ایسی صورت میں میرے لیے تعاقب جاری رکھنا میرے اختیار کی بات نہیں رہے گی۔ فوراً کوئی ٹیکسی مل گئی اور ڈرائیور نے بھی تعاون کیا تو شاید میں اپنے مقصد میں کامیاب رہوں ورنہ جیپ چلی جائے گی اور جب غالب آئے گا تو میں ٹھنڈی سانس بھر کے ایک شعر پڑھنے کے سوا کچھ نہ کر سکوں گا... بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔

چالیس منٹ بعد بھی جیپ وہیں موجود تھی۔ جب ٹیکسی غالب اور نازو کے ساتھ واپس آئی۔ سڑک کے دوسرے کنارے سے میں نے انہیں اشارہ کیا اور خود سڑک عبور کر گیا۔ نازو نے پیچھے والا دروازہ پہلے ہی کھول دیا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے مسکرا کے کہا "دیکھا میرا کمال آپ نے سر! اتنی جلدی آ گیا۔"

غالب نے کہا "کیا چکر ہے؟"

نازو نے بھی کہا "تم کیا کر رہے ہو یہاں؟"

میں نے کہا "میں نے ایک ایسا گھر دریافت کیا ہے جس میں بھوت رہتے ہیں۔"

غالب مسکرایا "میرے سسرال کی بات کر رہے ہو؟"

نازو نے مجھے گھورا "یہ بے ہودہ مذاق کرنے کے لیے ہمیں بلوایا تھا یہاں؟"

میں نے ٹیکسی والے کی طرف دیکھا "تم نے کچھ نہیں بتایا انہیں؟"

"اس نے تو بتایا تھا اب تم بتاؤ۔"

"تم خالی ہاتھ تو نہیں ہو نا؟" میں نے غالب اور نازو کی طرف دیکھا۔

وہ میرا مطلب سمجھ گئے "نہیں گزارا ہو جائے گا۔" غالب نے یوں کہا کہ ٹیکسی ڈرائیور سمجھے ذکر پیسے کا ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور کا اب کوئی کام نہیں رہا تھا۔ میں نے اسے سو کا

www.paksociety.com

خود کو محصور کرلیا ہے ایک ایسی جگہ جہاں سے اس کا نکلنا بھی آسان نہیں اور اس کے حفاظتی انتظامات بھی ہنگامی صورت حال میں ناکافی ثابت ہوں گے۔"

"تمہیں کیا معلوم اندر کتنے لوگ ہیں اور ان کے پاس کتنا اسلحہ ہے؟" غالب نے کہا۔

نازو نے تائید میں سر ہلایا "وہ قلعے کے اندر ہیں۔ ہم کھلی جگہ میں براہ راست نشانہ بن جائیں گے۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ نعرۂ تکبیر لگا کے حملہ کردو۔ تم آگے جاؤ۔ بائیں طرف سب سے پہلے چھوٹی سی پرچون کی دکان نظر آئے گی جو سامنے والی گلی کہلاتی ہے اس کے ساتھ والا گھر فضل دین کا ہے۔"

"کون فضل دین؟"

"جانتا تو میں بھی نہیں اسے مگر وہ غالباً پہلے اسی گھر میں رہتا تھا جس میں اب وڈاور موجود ہے" میں نے کہا "تم دستک دے کر اندر داخل ہو جاؤ۔ کسی عورت کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ چند منٹ میں تم گھر والوں کو مجبور کرسکتی ہو کہ وہ خاموش رہیں اور ہم سے تعاون کریں۔ تمہارا کوئی سگنل ملتے ہی میں پہنچ جاؤں گا۔"

نازو نے کہا "میں انگلی منہ میں ڈال کے سیٹی بجاؤں گی۔"

غالب نے افسوس کے ساتھ سر ہلایا "تمہارے سب اطوار حد درجہ غیر شریفانہ بلکہ لوفرانہ ہیں۔"

"جب واسطہ تم جیسے بدمعاشوں سے ہو تو شرافت نہیں چلتی۔"

"یہ سب قرب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ گز بھر کی زبان ہوگئی ہے لڑکیوں کی۔" غالب نے توبہ کے انداز میں کانوں کو ہاتھ لگایا۔

میں نے کہا "حد کرتے ہو تم بھی۔ مجھے فکر ہے کہ بنا بنایا کھیل نہ بگڑ جائے تم آپس میں لڑ رہے ہو۔"

نازو نے کہا "سوری۔ میرے سگنل پر تم اندر آگئے..... پھر؟"

"پھر اس گھر کے مکینوں سے میں نمٹ لوں گا۔" میں نے کہا "تم پہنچ جاؤ دو منٹ فرق سے۔ جس گھر میں وڈاور ہے اس میں کوئی کھوکھر صاحب رہتے ہیں۔ کھوکھر صاحب کے دوسرے پڑوسی کون ہیں۔ یہ مجھے معلوم نہیں مگر کسی بھی بہانے اندر پہنچ سکتی ہو۔ پوری کوشش کرنا کہ ہنگامہ آرائی نہ ہو۔ عورتیں اور بچے خوف زدہ ہوکے چلانے نہ لگیں۔ انہیں سمجھا دینا کہ تمہارا ارادہ کسی کو نقصان پہنچانے کا یا لوٹ مار کرنے کا نہیں ہے۔ اس کے باوجود کوئی مردانہ وار سامنے آئے تو اسے خاموش رکھنے کے لئے تم ہاتھ کی صفائی دکھادو یا ریوالور۔ یہ تمہاری مرضی۔ کام مکمل ہو جائے تو یہ گھر غالب کے حوالے کردینا اور خود باہر آکے سامنے سے ناکا بندی کرنا۔ میں اور غالب دو طرف سے کھوکھر کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ عین ممکن ہے وڈاور مقابلہ نہ کرے اور فرار ہونے کی کوشش کرے۔ فرار کے لئے صرف سامنے کا راستہ ہے۔ تمہارے لئے گلی میں یا دروازے پر کھڑا رہنا مشکل ہوگا۔ تمہارے لئے ایک محفوظ مقام تو سامنے والی ہٹی ہے لیکن وہ بڑھا.... یہ نہ مانے گا کہ تم اس کی دکان میں سودا خریدنے کے بہانے سے وہاں اتنی دیر تک آمدورفت رہتی ہے۔ اس نے کسی سے بھی کچھ کہہ دیا تو بات پھیل جائے گی اور وہاں مجمع لگ جائے گا۔ بہتر ہے کہ تم کھوکھر کے گھر کے بالکل سامنے والے گھر میں اپنی جگہ بناؤ جہاں سے تم دروازے پر نظر رکھ سکو اور ضرورت پڑنے پر وڈاور کا راستہ بھی روک سکو۔"

نازو کچھ پریشان نظر آئی "یہ کہنا آسان ہے مگر تین گھروں میں گھس کے سارے گھر والوں کو قابو کرنا مشکل ہوگا۔ کیا پتا کتنا کنبہ ہو۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کسی گھر میں عورتوں بچوں اور مردوں کی تعداد کیا ہے۔ کوئی شکاری بندوق ہی لے کے آگیا تو....؟"

میں نے کہا "میں تمہیں سائلنسر والا ریوالور دیتا ہوں۔ ویسے تو تم خالی ہاتھوں سے بھی کسی پہلوان کو لٹا سکتی ہو مگر مقابلے پر کوئی آتشیں اسلحہ اٹھائے تو اسے بلا تکلف گولی مار دینا۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ گولی چلانے کا مقصد اس کی جان لینا نہ ہو۔ یہ ایک فیصلہ کن معرکہ ہے نازو اور اس میں سب سے اہم کردار تمہارا ہے۔ اگر تم نے کامیابی سے پہلا مرحلہ طے کرلیا تو دوسرا مرحلہ بہت آسان ہو جائے گا۔"

"ہاں دوسرے مرحلے میں ہم سب اللہ کو پیارے ہو جائیں گے یا پولیس کو....."

میں نے کہا "دوسرے مرحلے میں ہم کوشش کریں گے کہ دونوں طرف سے کھوکھر کے گھر میں داخل ہو جائیں۔ چھت پر پہنچ جائیں اور زینے کے راستے نیچے جاکے بے خبری میں وڈاور کو گرفتار کرلیں۔ اسے مہلت ہی نہ دیں مقابلے کی لیکن وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو تو پھر رعایت ہماری طرف سے بھی نہیں ہوگی۔"

"فائرنگ ہوئی تو محلے میں کھلبلی مچ جائے گی۔"

"مرزا جی اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ بندوق کی نال کے سامنے کوئی نہیں ٹھہرتا۔ ہم وڈاور کے ساتھ نکلیں گے اور اپنا راستہ خود بنائیں گے۔ صرف سڑک تک پہنچنے کی بات ہے۔ اس کے بعد جو پہلی گاڑی نظر آئے گی وہی ہمارے کام آئے گی۔ یہ ایک کمانڈو ایکشن ہے۔ خاموشی سے ہم نے مقصد میں کامیابی حاصل کرلی تو ٹھیک ہے ورنہ جتنی خرابی ہو منظور۔ نیت یہ ہے کہ ایک کو بھی نہ مارنا پڑے مگر ناکامی سے بچنے کے لئے جو بھی راہ میں حائل ہو اسے اڑا دو۔ اس سے پہلے کہ وہ تمہیں مارے۔ جنگ کا اصول یہی ہے۔ تذبذب اور سوچ بچار کی کوئی گنجائش نہیں۔ راستہ صاف....."

نازو نے مسکرا کے سر ہلایا "میں جاتی ہوں۔"

"جاؤ اگلے جہاں میں ملاقات کی امید مت رکھنا۔" غالب بولا "اس جہاں میں کافی بھگت لیا ہے تمہیں۔"

"ابھی تو ساری عمر بھگتو گے۔" نازو نے ہنس کے کہا "آتی

آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہوں۔"

"آخر ہو نا بھوت کی بچی۔"

نازو سڑک عبور کرگئی تو میں نے کہا "مرزا جی۔ ہم پلاننگ کوئی نہیں کرسکتے۔ نہ مجھے معلوم ہے نہ تمہیں کہ پڑوسی کے گھروں کا نقشہ کیا ہے اور وہاں سے ہم درمیان والے گھر کی چھت تک کیسے جائیں گے۔"

"اللہ مالک ہے۔" غالب بولا۔

"ہاں اپنی اپنی عقل سے وسائل اور ذرائع پیدا کرنا ہی اصل آزمائش ہے اگر تم دشمن کے علاقے میں پہلے اتر جاؤ تو میرا انتظار کرنا۔ اور اپنے پیچھے ایسا انتظام کرکے آنا کہ بعد میں بھی گڑبڑ نہ ہو۔"

پانچ منٹ بعد میں بھی سڑک پار کرکے گلی میں داخل ہوگیا۔ میرے اندازے کے مطابق نازو کو پانچ سے دس منٹ کا وقت درکار ہوسکتا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے وہ فاصلہ طے کیا جو مشکل سے سو گز تھا۔ میرے کان نازو کی سیٹی کی آواز پر تھے۔ سامنے وہی ہٹی کے سامنے میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ آگے جاؤں یا چند منٹ انتظار کروں۔ اس چھوٹی سی نیم تاریک اور اجڑی ہوئی دکان پر ایک گم صم بڈھا مسلسل کھانستے ہوئے حقے کے کش لے رہا تھا۔ اس نے مجھے تیسری بار زیادہ غور سے دیکھا۔

"ہاں جی کس کو دیکھ رہے ہو؟" اس نے کھانستے ہوئے سوال کر دیا۔

میں اس کے قریب چلا گیا "بابا جی کئی سال پہلے میں آیا تھا یہاں اب مکان بھول گیا ہوں۔"

"نام بتاؤ مجھے۔ میں تو یہیں پیدا ہوا تھا اور یہیں مروں گا۔ مجھے سب کا پتا ہے۔ ان کا بھی جو مر گئے میرے سامنے۔"

میں نے کہا "فضل دین۔"

"کون فضل دین؟ ایک تو یہ اپنے ساتھ ہے۔ بڑ حرام چرسی۔ اس کا باپ لوگو شاپ تھا....؟"

اسی وقت نازو کی سیٹی سنائی دی۔

میں نے کہا "اس کا یہ گھر تو نہیں تھا اس کا۔"

بابے نے کہا "ٹھیک کہتے ہو تم بھی۔ پہلے یہ کھوکھر کے گھر میں تھے۔"

"اچھا جی بڑی مہربانی۔" میں نے سلام کے انداز میں ہاتھ اٹھایا اور ساتھ والے گھر کا دروازہ کھول کے اندر چلا گیا۔

وہ میرے اندازے کے مطابق پانچ چھ مرلے کا گھر تھا۔ مختصر صحن کے دائیں جانب ایک کمرا تھا اور سامنے دو کمروں کے دروازے نظر آرہے تھے۔ بائیں طرف شاید باورچی خانہ اور غسل خانہ وغیرہ تھے۔ نازو کی آواز پر میں سیدھا گزر گیا۔ سامنے والے ایک کمرے کے پیچھے مجھے تیسرے کمرے کا دروازہ نظر آیا۔ یہ کمرا اتنا تاریک تھا کہ وہاں دن میں بھی بلب جل رہا تھا۔ اندھیرے کے

علاوہ اس میں سیلن تھی اور گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ فرش پر ایک نوجوان اوندھا پڑا ہوا تھا۔ ایک حد سے زیادہ صحت مند عورت چارپائی پر چت لیٹی چھت کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ نیچے لٹکا ہوا تھا اور وہ بے ہوش ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ تیسری عورت عمر رسیدہ تھی جو دیوار سے ٹیک لگائے خاموش کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے دائیں بائیں دو بچے تھے۔ لڑکا شاید دس بارہ سال کا تھا۔ لڑکی عمر میں اس سے کچھ کم لگتی تھی۔

نازو نے میری سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا "میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ لڑکا فضل دین ہے۔ اس نے شور مچانے کی کوشش کی تھی۔ یہ بیوی ہے اس کی۔"

دبلے پتلے اور بیمار نظر آنے والے فضل دین کی بیوی کا وزن کسی طرح بھی دو سو پاؤنڈ سے کم نہ تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ خود فضل دین نوجوان تھا۔ اس کے بارے میں مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ بڑ حرامی نہیں چرسی بھی ہے۔ شاید چرس کے نشے نے ہی اس کی صحت کو گھن کی طرح چاٹ لیا تھا۔

"آپ فضل دین کی ماں ہیں؟" میں نے احترام آمیز لہجے میں کہا "یہ دونوں آپ ہی کے بچے ہیں؟"

اس عورت نے اقرار میں سر ہلایا "ہمارے پاس کچھ نہیں رہا اب تو۔"

میں نے نرمی سے کہا "آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم چور ڈاکو نہیں ہیں۔ نہ ہم کسی کے ساتھ کوئی زیادتی کرنا چاہتے ہیں۔"

"پھر اس طرح میرے گھر میں داخل ہونے کا کیا مقصد۔ اور فضل دین نے قرض لیا ہے تم سے تو میری چوڑیاں لے لو۔ میں کیا کروں آخر۔ میری تو زندگی عذاب بن گئی ہے۔ روز کوئی آجاتا ہے۔"

میں نے اسے روک دیا "خدا فضل دین کو نیک ہدایت دے۔ مجھے قرض وصول کرنا ہوتا تب بھی کسی ماں کے ہاتھوں سے چوڑیاں میں نہیں اتروا سکتا تھا۔ آپ بہو سے کہیں کہ مکر چھوڑے اور سیدھی بیٹھ جائے ورنہ یہ لال بیگ چھوڑتا ہوں میں اس کی شلوار میں۔"

لال بیگ کہیں نہیں تھا مگر میری دھمکی کام کرگئی۔ وہ ایک چیخ مار کے اٹھ بیٹھی "ہائے میں مرجاؤں گی۔ اف ارے کوئی مجھے پانی پلاؤ۔"

میں نے غرا کے کہا "لگتا ہے لال بیگ تمہارے حلق میں ڈالنا پڑے گا۔ خبردار جو اب آواز نکالی۔"

وہ چپ ہوگئی۔ اس کا گوشت کے پہاڑ جیسا جسم یوں لرز رہا تھا جیسے زلزلے سے چارپائی ہل رہی ہو۔

میں نے کہا "ہم خفیہ پولیس کے لوگ ہیں۔ تمہارے ساتھ والے گھر کی نگرانی کر رہے تھے۔ اس میں کچھ جرائم پیشہ لوگ رہتے ہیں۔ تمہیں کچھ معلوم ہے؟"

عمر رسیدہ عورت نے سر ہلایا "لوگ کہتے ہیں کہ....."

www.paksociety.com

"کیا کہتے ہیں؟" میں نے کہا۔
"یہی کہ اس گھر میں جنات ہیں۔ تم آ رہی ہو آئی ہو عجیب و غریب۔"
"یہ سب کھوکھر کا ڈرامہ ہے۔ اصل کام کچھ اور ہوتا ہے یہاں۔"
"یہ جعلی نوٹ بناتے ہیں یہاں۔" موٹی عورت نے کہا۔
ساس نے اسے گھورا "ایسے ہی نہیں بولا کرتے۔ تو نے دیکھا ہے؟"
"تو دیکھا نہیں تو کیا۔ فضل دین کہہ نہیں رہا تھا۔" بہو بولی۔
"میرے بیٹے کا نام مت لے خوار خوار۔"
میں نے ساس بہو کی لڑائی ختم کرائی "ہم خود چیک کریں گے نا۔ ہم نے ہر طرف سے انہیں گھیر لیا ہے۔ سب گرفتار ہو جائیں گے تھوڑی دیر میں لیکن آپ لوگ صرف اتنا کرو کہ خاموش رہو۔ گھر سے باہر کوئی نہیں جائے گا۔ گھر کے اندر آرام سے جو چاہو کرو۔ ہم اوپر جا کے ساتھ والے گھر کی چھت پر اترنا چاہتے ہیں۔"
"یہ تو بڑا مشکل ہے۔" موٹی پھر بولی "ہمارا مکان دو منزلہ ہے۔ کھوکھر کا تین منزلہ۔ ویسے چھت پر سیڑھی رکھی ہے۔"
"ہم سیڑھی کے بغیر بھی چڑھ جائیں گے۔ تم چلو مجھے راستہ دکھاؤ۔"
"ہائے میں مر گئی۔" اس نے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ لیے "میں کیسے جا سکتی ہوں تمہارے ساتھ۔ اماں کو لے جاؤ۔"
میں نے آنکھیں نکال کے کہا "سیدھی طرح چلو ورنہ گلے میں رسی باندھ کے گھسیٹتا ہوا لے جاؤں۔"
وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ اوپر جانے والا زینہ قدرے تنگ تھا۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے میں ڈرتا رہا کہ کہیں اس کا پیر پھسل گیا تو واپس نیچے جاتے ہوئے وہ مجھ پر سے گزرے گی اور مجھے روڈ رولر کی طرح چپٹا کر جائے گی۔ وہ ہانپ رہی تھی اور خوف سے بھی اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے۔
دوسری منزل برآمدے اور ایک ہال جیسے طویل کمرے پر مشتمل تھی۔ ہال کی چھت تک پہنچنے کے لئے لکڑی کا زینہ استعمال ہوتا تھا۔
"اسے تم اوپر کھینچ سکتے ہو۔" موٹی عورت نے مجھے بتایا لیکن یہ بات میرے ذہن میں پہلے سے موجود تھی۔
اچانک میں نے کہا "بھئی موٹی تم خود ہو اتنی موٹی عقل نہیں ہے تمہاری۔ تم نے کہا تھا کہ یہاں جعلی نوٹ چھاپے جاتے ہیں اور کیا ہوتا ہے؟"
اس نے سوچ کے کہا "ہر دو عورتیں آتی ہیں یہاں۔"
"عورتیں ہر گھر میں آتی ہیں۔"
"وہ میرا مطلب تھا، شریف عورتیں نہیں ہوتیں۔"
"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"
"فضل دین بتاتا ہے مجھ کو۔ اس کی ایک بہن بھی تھی اس پر جن عاشق ہو گئے تھے۔ جنات نے اسے شام ڈھلے کھلے بالوں کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ شام کے وقت ننگے سر نہیں جانا چاہئے۔ خاص طور پر منگل کو۔ وہ منگل کی رات تھی جب اسے جنات نے تیسری منزل کی کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔" اس نے توبہ توبہ کرتے ہوئے دونوں پھولے ہوئے گالوں کو ہاتھ لگایا "بڑی بری حالت تھی اس کی۔ تن پر ایک لیر بھی نہیں تھی۔ تڑپ تڑپ کے مر گئی سب کے سامنے۔"
اس کے عقائد اور نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا تھا جو مبنی برجہالت تھے مگر اس واقعے کی ایک اور شہادت مل گئی تھی جس کا حوالہ سب سے پہلے آٹھ دس سال کے ایک بچے نے دیا تھا۔
"یہ کتنی پرانی بات ہے؟" میں نے کہا۔
"میری شادی سے پہلے کی۔ میری ساس کو مت بتانا کہ میں نے تم کو کچھ بتایا ہے۔" وہ بولی "سنا ہے اس نے بیٹی کی شادی کھوکھر سے کی تھی اور بدلے میں یہ مکان اپنے نام لکھوا لیا تھا۔ اس کا شوہر یہ محلہ ہی چھوڑ کے چلا گیا تھا اور لوٹ کے نہیں آیا مگر یہ بے حیا رہتی ہے اسی گھر میں۔ اچھا اب میں جاؤں؟"
"ہاں مگر دیکھو۔ خیال رکھنا کہ شور شرابا نہ ہو۔" میں نے لکڑی کا زینہ اوپر کھینچ لیا۔
زینے کے تختے چھ انچ چوڑے تھے۔ یہ تقریباً نیم دائرے کے زاویے پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے تقریباً سیدھا اور عمودی رکھا۔ اس طرح سب سے اوپر والے تختے پر قدم جما کے میں کھوکھر کے مکان کی منڈیر تک پہنچ گیا۔ منڈیر پر چار فٹ اونچی دیوار تھی۔ اندیشہ یہ تھا کہ میں نے اس کا سہارا لیا تو اینٹ اکھڑ کے ہاتھ میں آ جائے گی اور میں اینٹ سمیت واپس نیچے پہنچ جاؤں گا۔ میں نے احتیاط سے دو انچ باہر نکلے ہوئے کنگورے پر پنجے جمائے اور بازوؤں کے بل خود کو اٹھا کے دوسری طرف اتار دیا۔
مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آس پاس کی کسی چھت سے کوئی مجھے دیکھ رہا ہو گا تو کیا سمجھے گا۔ چھت پر ریڈیو اور ٹی وی کے ایریل لگے ہوئے تھے۔ ایک جہازی سائز کا انٹینا امریکی ٹی وی کی نشریات وصول کرنے کے لئے تھا اور اس میں اٹکی ہوئی پتنگ ہوا سے پھڑپھڑا رہی تھی۔ چھت کے درمیان میں چار تخت بچھے ہوئے تھے جو گرمیوں کے موسم میں سونے والوں کے کام آتے ہوں گے۔ ایک کونے میں خالی ڈبے، پرانے گاڑ اور ٹوٹا پھوٹا فرنیچر ڈھیر کی صورت میں پڑا ہوا تھا۔
دس منٹ تک میں تخت پر لیٹا رہا اور زینے کے اس راستے کو دیکھتا رہا جو اوپر کھلتا تھا۔ غالب کے آنے تک مجھے بہرحال انتظار کرنا تھا۔ اس کا انحصار نازو کی پیش قدمی پر تھا۔ پہلے گھر میں اسے عملاً کوئی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہاں کوئی لڑنے بھڑنے والا مرد ہی نہیں تھا۔ راحد جوان آدمی چرس کا نشہ کرتا تھا اور رنگ

خراب کیا۔ دار بچانے کے بجائے گردن پر پڑ گیا اس کے دو بچے بھی تھے انہیں ابو کے حوالے کر رہا ہے کرتے میں۔"
"سارے پہلوان رہتے ہیں اس گھر میں؟"
"ہاں عورتیں بچے نہیں تھے محلے میں پچاس سال ہو گئے سب عزت کرتے ہیں ان کی اور وہ ایک طرح سے گلی والوں کے محافظ تھے۔ نازو جاتے وقت باہر سے تالا لگا گئی ہو گی ورنہ کیا پتا بعد میں کوئی آ جاتا۔ پہلوانوں کا اڈا ہے۔"
"یہ اچھا کیا۔ اب کوئی آیا بھی تو تالا دیکھ کے لوٹ جائے گا۔" میں نے کہا "اب چلیں نیچے؟"
"چلو اوپر جانے کی یہ ضرورت نہیں مگر ہمارے کروٹ ٹھیک نہیں۔" غالب نے آہ بھری "مجھے بتائے آپ۔"
"مرزا جی۔ آج تخت یا تختہ۔ صرف رلاور کو زندہ ساتھ لے جانا ہے۔ یہ کھوکھر بھی بڑی نامی گرامی چیز ہے۔ سنا ہے یہاں جعلی نوٹ چھاپے جاتے ہیں اور خفیہ طور پر کچھ بردہ فروشی کا سلسلہ بھی ہے۔ جنات رنجبو کا چکر بھی کچھ ایسی سرگرمیوں کا پردہ ہے۔ ممکن ہے رلاور بھی اس کا شریک کار ہو۔ دونوں پکڑے جائیں تو کیا بات ہے۔"
"یہ لوگ آسانی سے ہاتھ نہیں آئیں گے۔ مقابلہ ہو گا۔"
"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ رلاور سے میں نمٹ لوں گا۔ تم باقی لوگوں کو موقع مت دینا۔ فائرنگ کے بعد بھی ہمیں اتنا وقت ضرور مل جائے گا کہ یہاں سے نکل جائیں۔ بعد میں جو ہوتا ہے ہوتا رہے۔ مجھے امید ہے کہ کوئی بھی ہمارا راستہ روکنے کی غلطی نہیں کرے گا۔"
میں پھونک پھونک کے قدم رکھتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ اپنا ریوالور میں نے نازو کو دے دیا تھا۔ اس کا ریوالور میرے پاس ضرور تھا مگر میں اسے استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ میرے ہاتھ زیادہ کارآمد تھے۔ گولی چلانے کی نوبت آتی تو میں غالب کے بے خطا نشانے پر زیادہ اعتماد کر سکتا تھا۔
نچلی منزل پر خاموشی تھی۔ میں نے اور غالب نے خاموشی سے ہر کمرے کا دروازہ کھول کے دیکھا۔ مکان کی اس منزل کے بارے میں مشہور کر دیا گیا تھا کہ یہاں جنات رہتے ہیں۔ ایک کمرے میں ہر قسم کی پرنٹنگ انک کے چھوٹے بڑے ڈبے بکھرے ہوئے تھے۔ مختلف سائز کے ڈرافٹنگ بورڈ تھے اور یہ کسی آرٹ ڈیزائنر کا اسٹوڈیو نظر آتا تھا۔ دوسرے کمرے میں مختلف قسم کے کیمرے، انلارجر اور فوٹوگرافک میٹریل کے علاوہ کرنسی کی چھپائی میں استعمال ہونے والے کاغذ کے ڈھیر رکھے ہوئے تھے۔ تیسرے کمرے میں چھپائی کی مشینیں تھیں اور ایک سرسری جائزہ لے کر میں اور غالب اس نتیجے پر پہنچے کہ یہاں واقعی جعلی کرنسی چھاپی جاتی تھی۔ انگریز کہتے ہیں کہ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ بغیر وجہ کے افواہ بھی نہیں پھیلتی۔ غالب نے تو یہ بھی معلوم کر لیا کہ

آؤٹ ہو گیا تھا۔ اب نازو کو تیسرے گھر میں سے غالب کے لئے راستہ بنانا تھا۔
نازو پر مجھے پورا اعتماد تھا۔ عورتوں کا اصل مسئلہ تھا جو دہشت زدہ ہو کے چیخنے چلانے لگتی تھیں۔ مرد اگر چار بھی ہوتے تو نازو کے فریب میں آ جاتے۔ مردانگی اور سخت کوشی کے زعم میں انہیں خیال بھی نہ آتا کہ یہ نرم و نازک لڑکی جو حسن و لطافت کا مجموعہ ہے، صنف نازک ہی نہیں ہے اور شعلہ جوالہ ہے۔ ہر آتا جاتا سب کو حسن کی ... لڑکی سمجھتا تھا۔ نازو شاہان کا شب مردوں کو ... سمجھ رہا ... زندگی میں بار بار آ جاتا تھا اور نازو اپنی معصومیت آمیز ادائے حسن سے دھوکا دے کر پورا فائدہ اٹھاتی تھی۔
اس کے باوجود مجھے پریشانی ہو رہی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی چھپ کے وار کرے۔ دور سے کوئی چیخ مارے یا ریوالور نکال لے۔ نازو کی جگہ میں جاتا تب بھی پیچھے سے سر پر ڈنڈا یا سریا مارنے والے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ مقابلہ صرف اس سے کیا جا سکتا ہے جو سامنے ہو۔ سامنے سے کوئی نازو پر گولی بھی نہیں چلا سکتا تھا۔ اگر چلاتا تو نازو کے جوابی فائر سے مارا جاتا لیکن فائرنگ سے گریز ضروری تھا ورنہ باہر مجمع لگ جاتا اور ہمارے لئے فرار کے راستے زیرو پولیس بند کر دیتی۔
میں ٹہلتا ہوا دوسری طرف کے مکان تک گیا جس کی چھت کی بلندی تقریباً اتنی ہی تھی۔ چھت پر کوئی بھی نہیں تھا۔ آگے کے سارے مکانوں کی چھتوں پر کہیں دھلے ہوئے کپڑے سوکھ رہے تھے۔ ایک عورت کنگھی سے بال سلجھا رہی تھی مگر اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ دوسری طرف غور کرنے پر مجھے ایک کبوتر باز نظر آیا جو زلف بردوش حسینہ کی کافر ادائی پر ایمان لٹانے کے لئے تیار تھا اور ظاہر ہے دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔
غالب خاصی بدحواسی میں نمودار ہوا "تم کب سے کھڑے ہو؟"
میں نے اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا "تم نے بہت دیر کی۔ خیریت رہی نا؟"
"خیریت کہاں رہی یار۔ ایک بے وقوف خواہ مخواہ جان سے گیا۔ دھوبی پچھاڑ بنے آیا تھا۔ کہتا تھا رستم پور والا ہوں۔ مردوں کی طرح لڑو مجھ سے۔"
"یہ نازو سے کہہ رہا تھا؟" میں مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔
"نہیں یار۔ پہلے تو سب نے شرافت سے ہاتھ اوپر اٹھائے تھے۔ جب میں اندر گیا تو پہلوان جوش میں آ گیا۔ کہنے لگا کہ اب آ نامرد میدان میں۔ وہ مجھے دھوبی پچھاڑ دینے ہی والا تھا۔ سالے نے ایک رم ویری لیا تھا۔ نازو ہاتھ نہ مارتی اس کے تو میں گیا تھا۔ ہاتھ رکھ سخت ڈنکیا اس کا اور پہلوان کی گردن ڈھلک گئی۔ نازو کو بھی افسوس ہوا۔ اس نے احتیاط کی تھی مگر پہلوان کی پھرتی نے کام

www.paksociety.com

وہاں صرف پاکستانی کرنسی ہی نہیں ڈالر اور پاؤنڈ بھی چھاپے جاتے تھے۔

ایک ذریعہ دولت ہو جانے سے دوسری رقم، شہرت بھی کھینچ لیتی ہے۔ جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے ایسے ہی ناجائز ذرائع سے ... دولت ... آدمی کو ہوس اور گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور ایک برائی سے دوسری کا راستہ کھلنے لگتا ہے اور پھر اس برائی کے دائرے VISCIOUS CIRCLE سے نکلنے کی نہ کوئی خواہش کرتا ہے نہ کوشش۔ شراب، عورت، نشہ اور جوا۔ عیش و عشرت کے لوازمات سب کی طلب بڑھتی جاتی ہے اور جب احساس ندامت ہی نہ رہے تو برائی بھی نہیں رہتی۔ حد فاصل کو عبور کر لینے کے بعد انسان ہی شیطان بن جاتا ہے۔

پچھلی منزل پر دلاور کے ساتھ دو افراد تو میرے سامنے داخل ہوئے تھے۔ وہاں اور کتنے لوگ تھے اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ کھوکھر اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک بیوی کے علاوہ اس کی کم سے کم ایک بیٹی تھی۔ شاید دلاور اپنے کمپنی کو باہر والے کمرے میں جگہ دی ہوگی تو ... بیٹھک کہا جا سکتا تھا۔ کھوکھر کا کوئی بھائی، بہنوئی یا ذرا ملازم بھی اندر ہو سکتا تھا۔

ابھی میں نے آخری زینے سے نیچے جھانکا ہی تھا کہ ایک عورت کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھی اور غالباً کچن میں داخل ہو رہی تھی۔ ابھی اس نے چیخ مارنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے جست لگائی اور اس کے منہ کو ایک ہاتھ سے دبا لیا۔ وہ پچھلا کچن میں تھے اسے اندر کھینچ لیا۔ اس کشمکش میں عورت کی لات ... دروازے پر لگی لیکن اندر سے کسی نے چلا کے پوچھا "صغراں کیا بات ہے!"

غالب اس وقت تک نیچے آ گیا تھا اور کمرے کے دروازے سے لگ کے کھڑا ہو گیا تھا۔ صغراں کی خیریت دریافت کرنے والا جیسے ہی باہر آیا اس نے مجھے اپنی بیوی کے ساتھ زبردستی کرتے دیکھا اور ہیرو کی طرح ... اپنی عزت کو انتقام کے فہرست میں آ گیا۔ وہ مجھے ... غالب نے پیچھے سے اس کی ... سے مارا ... چیخ مار کے سید صاحب کے بل صحن میں گرا۔

میں نے بھی اس کی بیوی کو سمجھا بجھا کے خاموش کرنے کی کوشش میں وقت ضائع نہیں کیا اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ مار کر اسے ریلیف دے دیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا غالب نے کھوکھر کو ناک آؤٹ کیا تھا۔ بس کا وار بھرپور تھا کہ کھوکھر جیسا لمبا تڑنگا اور قابل رشک صحت کا مالک جوان بھی برداشت نہ کر سکا ورنہ دولت کے حملہ کرتا تو غالب کو گولی چلانی پڑتی۔

کھوکھر کی ہائے نے اندر خطرے کا الارم بجا دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ دلاور مقابلہ کرنے کے بجائے گلی میں کھلنے والے دروازے سے نکلنے کی کوشش کرے گا۔ اندر سے اس نے مجھے یا غالب کو دیکھ لیا ہوگا اور یہ سمجھ لیا ہوگا کہ ہم کس طرف اور کس ... سے نازل ہوئے تھے۔ اس کا دماغ بڑی تیزی سے صورت حال کو سمجھنے کی اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

اندر سے یکے بعد دیگرے تین فائر ہوئے۔ نشانہ میں تھا مگر پہلی گولی نارکول کے ڈرم میں لگی جسے اینٹوں کی چوکی پر رکھ کے اور چٹکی کی ٹونٹی لگا کے حمام بنا لیا گیا تھا۔ اس کے سوراخ میں سے جو ٹپکا کار دھارا نکلا تو سید صاحب صغراں کے چہرے پر آیا۔ میں نے سر جھکا کے غوطہ مارا اور تیر کی طرح اس کمرے میں چلا گیا جہاں سے فائر کیا گیا تھا۔ دوسری اور تیسری گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

اچانک میں نے دلاور کے بغل والے ساتھی کو مقابل دیکھا۔ وہ پھر میرا نشانہ لے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں پھر غوطہ مار کے بچنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے اس کو فلائنگ کک ماری۔ گولی اس بار میرے قدموں کے نیچے فرش اور دیوار کے سنگم پر لگی۔ وہ الٹ کے گرا تو اپنے ساتھ استری کے اسٹینڈ کو بھی لے گیا اور پیچھے دیوار سے لگی ہوئی تختے کے پٹوں والی الماری میں گھس گیا۔ بہت سے چینی برتن اس کے اوپر گرے۔ اس کا دوسرا ساتھی ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا اور نہ میں نے دلاور کی آواز سنی تھی۔

ساتھ والے کمرے میں دو فائر ہوئے تھے اور میں نے کسی کے چیخنے کی آواز بھی سنی تھی مگر وہ غالب کی آواز نہیں تھی۔ میں نے برتنوں کی الماری میں ... والے کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ بے ہوش تھا۔ میں نے ... وہیں رہنے دیا اور باہر نکلا تو غالب دوسرے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا ... دلاور ملا؟" میں نے آواز بدل کے کہا۔

"نہیں" غالب نے تیسرے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو کچن کے مقابل اسٹور جیسا لگتا تھا۔

اچانک اس کی کھڑکی سے ایک ہاتھ باہر آیا۔ یہ دلاور کا ہاتھ تھا... اور اس میں مجھے ایک دستی بم نظر آ رہا تھا۔

"میرا راستہ چھوڑ دو غالب"

"ورنہ تم کیا کرو گے؟ یہ دستی بم پھینک دو گے؟" غالب نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"میں مجبور ہو جاؤں گا۔"

"نیک کام میں دیر کیسی دلاور۔ اچھا ہے یہ جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔"

"سکندر میں ہمت ہوتی تو وہ ذرا تمہارے ساتھ آتا۔ وہ بزدل تو بھاگ گیا۔ تم کو مرنے ... بھیج دیا۔"

"وہ تمہارے استقبال کے لئے باہر موجود ہے اور تمہارا جنازہ اٹھانے والوں میں بھی شامل ہوگا۔" غالب نے کہا۔

"تم مارے جاؤ گے۔ دلاور جب...."

"اور تم بچ جاؤ گے؟ ہم کو سمجھا دیا کہ دوست کون ہے اور دشمن کون۔" غالب نے مجھے ہاتھ سے پیچھے رہنے کا اشارہ کیا۔

دیتا ہے۔ ایسے میں پولیس کی آمد کسی بھی لمحے متوقع تھی۔

میں کمرے کے دروازے کے پیچھے رہتے ہوئے دلاور کی بے بسی اور مجبوری کا تماشا کر رہا تھا۔ یہ میرے لئے زندگی کا سب سے زیادہ مسرت بخش اور کامیابی کا سب سے بڑا موقع تھا جو اچانک مل گیا تھا۔ سوچا تو میں نے پہلے بھی کئی بار تھا۔ منصوبہ بندی بھی بہت کی تھی۔ اپنی عقل ... برداشت پر ... جال بھی کئی پھیلائے تھے۔ بعض بھی بہت کئے تھے اور ... اندازے لگا کے اس کے ٹھکانوں پر چھاپے بھی لیکن مقدر کی نارسائی سے ہر تدبیر الٹی ہوتی چلی آئی تھی۔

دلاور نے جب دروازہ کھولا تو غالب ایک ستون کے پیچھے فائر کرنے کی پوزیشن میں بالکل تیار تھا۔ دلاور کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے اور اس کی صورت سے میں دلاور کی ذہنی اذیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ مقدر کا اسے تقدیر نے دیا تھا کہ جب وہ خود کو بالکل محفوظ سمجھ رہا تھا اسے یقین تھا کہ بھیس بدلنے کے بعد اسے شناخت کرنے والا کوئی بھی نہیں اور اس کا یہ ٹھکانا ایسا ہے کہ کسی دشمن کے وہم و گمان کی رسائی بھی یہاں ممکن نہیں۔ تو بدبختی نے چور دروازے سے اس کی شکست اور ذلت کے اسباب فراہم کر دیے تھے۔ غالب کے ساتھ تو وہی ہوا تھا کہ آنکھ لگنے کو جائیں تو چوری مل جائے۔ وہ آیا تھا ایک جعلی نوٹ چھاپنے والے کی گرفتاری کے لئے اور گرفتار ہو گیا چوہدری دلاور جس کے سائے کو بھی پولیس سلام کرتی تھی اور جو خوار آج تک نہ پکڑ پائے تھے۔ ضرور دلاور نے یقیناً اس وقت کو کوسا ہوگا جب اس نے کھوکھر کے گھر کو محفوظ سمجھ کے یہاں اپنی بدلی ہوئی صورت کے ساتھ رہنا قبول کیا تھا۔ اپنے سکندر اعظم تو شاید یہی حسرت دل میں لئے رہ جاتے مگر ایک معمولی صحافی نے کہاں تک ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ خرگوش کے شکار کرنے والے کی گولی شیر کو جا لگی۔ بد قسمتی اور کیا ہوتی ہے۔

مجھے پوری امید تھی کہ دلاور اپنی ہار کو جیت میں بدلنے کے لئے کوئی چال ضرور چلے گا۔ میں اس کے سامنے آئے بغیر غالب کو موقع فراہم کر رہا تھا کہ وہ دلاور کی ایک نہ چلنے دے۔

غالب نے ستون کی آڑ سے ریوالور نکالا "تمہیں یقیناً معلوم ہوگا کہ اہم آدمیوں میں سب سے بڑھ کر بے خطا میرا ہی نشانہ تھا۔"

"اگر تم مجھے شوٹ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو...."

"تمہاری جیب میں جو رکھا ہے باہر ڈال دو۔" غالب نے حکم دیا۔ "مجھے ذرا بھی شک ہوا تمہاری نیت ... تمہاری ناک کے اوپر پیشانی کے وسط میں ہوگا۔"

دلاور کا چہرہ احساس ذلت سے مسخ ہو رہا تھا "کچھ نہیں ہے میری جیب میں۔"

"وہ دستی بم کیا تم نے سکون آور گولی کے طور پر نگل لیا ہے؟"

"وہ... اندر ہی رکھا ہوا ہے۔"

... دلاور کے نتیجے میں اعتماد نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دستی بم کچن میں گرے گا۔ کھوکھر اور اس کی بیوی کے بہت قریب تھا۔ ظاہر ہے ان کے ... بچ ... جاتے ... مگر دھماکے سے اس کمرے کی ... چھت ... تھی جس میں خود دلاور نے پناہ لے رکھی تھی۔ غالب اس کے مقابلے میں بہتر قابل پوزیشن سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ وہ دھماکے سے پہلے کمرے میں جا کے لیٹ جاتا یا کسی تخت کے نیچے گھس جاتا تو بم کی ہلاکت خیزی سے محفوظ بھی رہ سکتا تھا۔ شاید ابھی تک دلاور نے میری صورت نہیں دیکھی تھی اور وہ آواز سے دھوکا کھا گیا تھا۔ یہ میرے حق میں بہتر تھا ورنہ میرا فریق کو کیل کا کردار یہیں ختم ہو جاتا۔

"مقابلہ بے کار ہے دلاور۔" غالب نے کہا "باہر پولیس موجود ہے۔ وہ تمہیں نہیں کھوکھر کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ جعلی کرنسی چھاپنے کے جرم میں۔ تم بونس میں پکڑے جاؤ گے اور شریک جرم کہلاؤ گے۔"

"میں خود کو تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔" دلاور نے گھبراہٹ اور پریشانی سے کہا "بشرطیکہ تم مجھے نکلنے کا موقع دو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کچھ نہیں کہوں گا تمہیں لیکن تم جاؤ گے کدھر سے؟"

"جدھر سے تم آئے تھے۔" چالاک دلاور نے کہا۔

غالب نے پلٹ کے اجازت طلب نظروں سے مجھے دیکھا اور میں نے سر ہلا کے غالب کو رضامندی کا اظہار کرنے کے لئے کہا۔

"تم کوشش کر سکتے ہو۔ ویسے باہر گلی کے ہر کونے پر پولیس ہے۔ تم نکلو گے کیسے؟"

"تم مجھے نہیں روک سکتے؟" دلاور نے بے بسی سے کہا۔

"نہیں۔ میں تو خود ہی پولیس کو یہاں لانے کا ذمہ دار ہوں۔ اس جعلی نوٹوں کے کیس کا سراغ لگانے میں پولیس ناکام ہو گئی تھی۔ کھوکھر کے ایک ساتھی نے مخبری کی تھی۔ باقی سب پکڑے جا چکے ہیں۔"

"غالب۔ میں نے سکندر سے کہا تھا کہ مجھے اس کی ہر شرط منظور ہے۔ وہ مجھ سے مل لے لیکن وہ نہیں آیا۔ تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔" دلاور اب منت سماجت پر اتر آیا تھا "یہ میری عزت کا سوال ہے۔"

غالب ہنسا "آج معلوم ہوا کہ تمہاری بھی عزت ہے۔"

"پلیز۔ مجھے ایک موقع دو۔ میں رابطہ ہے سکندر سے اور تم سب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ سب کے نقصانات کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ تم سب کا جتنا بھی نقصان ہوا میری وجہ سے...."

"اس کے باہر آ جاؤ۔" غالب نے میری ہدایت پر کہا "لیکن ہاتھ اوپر اٹھا کے۔ چالاکی نہیں چلے گی۔" باہر سے میں لوگوں کی آوازوں کا شور سن رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ فائرنگ نے اس پرسکون رہائشی علاقے میں ... بھگدڑ مچا دی ہے اور بازار میں ... لگ

www.paksociety.com

"ویری گڈ جس کے پاس رکھا ہوا ہے اسے بھی باہر نکالو۔"
"اندر تو کوئی نہیں تھا۔ میرے سوا۔"
"تم یہ موقع گنوا دو گے دلاور۔ باہر کیا ہنگامہ ہو رہا ہے۔ آواز تم بھی سن رہے ہو۔ میرے ساتھ پریس فوٹو گرافر بھی آیا ہے۔ میں اسے کہہ دیتا ہوں کہ دروازے کھول دے۔ نازو باہر پولیس کے ساتھ ہے۔"

دلاور نے اپنے پیچھے زینے کو دیکھا "تم اس طرف سے آئے تھے؟"
"ہاں ساتھ والے گھر کی چھت سے کود کے۔"
"تم مجھے اس طرف سے نکال دو گے؟" دلاور اب سخت بدحواس تھا۔
"یقیناً مجھے کون روکے گا۔ اس گھر سے تو میں نگرانی کر رہا تھا تمہارے غیر قانونی کاروبار کی۔ اور کوئی صورت نہیں ہے تمہارے بچنے کی دلاور۔ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔ تمہارا کوئی محافظ پولیس کی مسلح فورس کا مقابلہ کرے گا تو کتے کی موت مارا جائے گا۔ تم خود سوچو کہ کل کے اخبار کیا کہیں گے۔ چوہدری دلاور جعلی نوٹ چھاپتا تھا۔ بردہ فروش تھا۔ تمہارا تو سیاسی مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ یہاں سے اسلحہ برآمد ہو گا۔ اس میں دستی بم بھی ہے۔ تم پر بیک وقت کتنے خطرناک مقدمات بن جائیں گے۔ ابھی تو صرف ڈاکٹر تجلی کے قتل کا معاملہ ہے جو تم سکندر سے مل کے ختم بھی کرا سکتے ہو۔ جلدی فیصلہ کرو۔"

غالب کی نفری کام کر گئی۔ دلاور نے پیچھے پلٹ کے کہا "باہر آ جاؤ تم بھی چیمہ۔"
چیمہ دبے قدموں نکلا جو دلاور کی جیپ چلا کے لایا تھا۔ اس کی شکل پر بارہ بجے ہوئے تھے اور لگتا تھا وہ بے ہوش ہو کے گرنے ہی والا ہے۔
"چیمہ صاحب۔ جیب میں اور نیفے میں جو مال مسالا ہے سب نکال کے باہر ڈال دو۔" غالب نے حکم دیا۔
"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں ہے میرے پاس۔" اس نے ہکلاتے ہوئے ساری جیبیں الٹ کے دکھا دیں "میں جاؤں؟"
دلاور نے کہا "اگر یہ اوپر جا کے راستہ دیکھ لے۔"
"کیوں نہ میں خود اسے اوپر کا راستہ دکھا دوں۔" غالب نے کہا اور چیمہ کے سر میں گولی مار دی۔ سوراخ بالکل پیشانی کے وسط میں ہوا تھا۔ خون اس سوراخ سے ایسے نکلا جیسے ٹونٹی سے پانی کی دھار نکلتی ہے۔ اس خون نے دلاور کے کپڑوں کو رنگ دیا۔
"یہ... یہ کیوں کیا تم نے؟"
"میں ایسا نہ کرتا تو میرے ساتھ کیا ہوتا۔ چیمہ اوپر جا کے مجھے گولی مار دیتا۔ کیا یہ پلان اسے تم نے سمجھایا تھا؟"
"چیمہ کے پاس اسلحہ کہاں تھا؟"
"اس نے جھوٹ بولا تھا۔ بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی مجھے۔ اس کی دائیں ٹانگ پر بندھا ہوا ریوالور مجھے صاف نظر آ رہا ہے۔"

غالب کی بات کے سچ ثابت ہونے میں دیر نہیں لگی۔ نزع کے کرب میں تڑپنے والے اور لاش میں بدلنے والے چیمہ کا ریوالور ایک ٹھوکر سے غالب کے قریب آ گرا۔ اسے شاید چیمہ نے موزے میں اڑا رکھا تھا۔
"تم خود کو بہت چالاک سمجھتے ہو دلاور۔ باقی احمق ہیں تمہاری نظر میں۔" غالب مشتعل ہو گیا "انسانوں کی جان کی تمہاری نظر میں بھی کوئی قیمت نہیں رہی۔ اس وقت تم کیسا محسوس کر رہے ہو جب تمہارے ساتھ کوئی نہیں۔ تم بالکل اکیلے ہو اور ایک گولی اسی طرح تمہارا ہر نشہ ختم کر سکتی ہے۔ طاقت، دولت اور عزت کا، عیاری اور بدمعاشی کا سارا جھوٹا غرور تمہارے سر کے ایک سوراخ سے اسی طرح بہہ جائے گا۔"
دلاور کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور وہ کانپ رہا تھا "دیکھو خدا کے لئے مجھے موقع دو۔ آخری موقع۔"
"ہر موقع تمہارے لئے آخری ہوتا ہے دلاور۔ مگر میں خود تمہارا کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں تمہیں سکندر کے سامنے پیش کروں گا۔ اس کے بعد جو سب کا فیصلہ۔ چلو منہ دوسری طرف کرو۔"
دلاور نے تعمیل میں دیر نہیں لگائی۔ وہ باہر کے شور سے سخت بدحواس تھا اور اسے خطرہ تھا کہ دروازہ بجانے والے کسی بھی وقت اندر داخل ہو جائیں گے تو وہ جائے واردات پر رنگے ہاتھوں پکڑا جائے گا۔ ظاہر ہے غالب کے لئے خطرے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ وہ تو چشم دید گواہ کی حیثیت سے چیمہ کے قتل کا الزام بھی دلاور پر عائد کر سکتا تھا۔
غالب آگے بڑھا۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تیار تھا۔ میں اس کی حکمت عملی کو کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ مگر نتیجے سے پریشان تھا۔
"چلو آگے" غالب نے دلاور کو حکم دیا مگر اس نے جیسے ہی ایک قدم آگے بڑھایا، غالب نے پوری قوت سے اس کے سر پر ریوالور مارا۔ دلاور لڑکھڑایا اور دہرا ہو کر گر گیا۔
اب میرے لئے چھپے رہنا ضروری نہیں تھا "ویری گڈ تم نے کمال کر دیا آج تو تم چیمپ۔"
غالب نے ریوالور کو ایک کپڑے سے صاف کیا "دیکھو اوپر کیمرے ہیں۔ اچھا چھوڑو میں خود ہی جاتا ہوں۔"
اس نے ریوالور کو دلاور کے ہاتھ کی گرفت میں دیا اور خود اوپر بھاگا۔ اوپر والی منزل پر جہاں جعلی نوٹ چھاپے جاتے تھے مختلف قسم کے کیمرے موجود تھے مگر صحیح کیمرے کا انتخاب اور استعمال غالب ہی کر سکتا تھا۔ لوگ اب دھڑا دھڑ دروازہ پیٹ رہے تھے اور امید یہ تھی کہ آخر کار وہ دروازہ توڑ دیں گے۔ میں نے اندر ایک

"اچھا۔ سوری۔ سوری سوری جناب۔"
نازو کو کسی کی پروا نہیں تھی "تو کیا وہ واقعی پکڑا گیا؟ واقعی گرفتار ہو گیا؟ میرا تو دل خوف سے دہل رہا تھا فائرنگ کی آوازیں سن سن کے۔ غالب تو ٹھیک ہے نا؟ ویسے تو دیکھا تھا میں نے اسے۔ کیمرا کہاں سے ملا؟"
میں نے کہا "صرف سوال کرو گی یا کسی سوال کے جواب کی مہلت بھی دو گی؟" وہ پوچھنے لگی "غالب نے کیسی تصویریں بنائی ہیں؟"
"یہ تو غالب ہی بتا سکتا ہے۔"
"بتایا تو نہیں کہ وہ خبیث بعد میں نکل جاتے۔ ہمیں انتظار کرنا چاہئے تھا۔"
"زیادہ فکر مت کرو۔ تمہاری صحت پہلے ہی قابل رشک نہیں ہے۔"
وہ یہ بات پوچھنے کے موڈ میں تھی "اسی سے تو دھوکا کھا جاتے ہیں تم جیسے سورما۔ رستم پور والے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسی "کیا عقل نقل کرتا ہوا بے ہنگم گوشت کا ڈھیر تھا۔ میں نے ٹانگ کک ماری ہو گی کہ وہ پورے فوم میں رقص کر گئے ہیں۔"
میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "غالب تو کہہ رہا تھا کہ تم نے اسے کرنچ کر دیا۔" میں نے ہاتھ کی حرکت سے گردن توڑنے کا ایکشن دکھایا۔
"کرنچ کر دیا؟ ارے نہیں میرا ہاتھ دیکھ رہے ہو۔ اس سے میں بھینسے کی گردن توڑ سکتی ہوں؟ اسے لگا ہو گا ایسا ہی مگر وہ رستم پور والے کے پیٹ کی ملک دیکھی تھی میں نے .... اس کی نبض سانس اور دل کی رفتار سب بالکل ٹھیک تھے۔ بس اس کے لئے کھڑا ہونا مشکل ہو گیا تھا۔ اور دو لاتوں کے بیچ ...."
ڈرائیور نے اسے پر ملامت نظروں سے دیکھا۔ اس کی نظروں کا مطلب بہت واضح تھا کہ بڑی نیک اور مہذب نظر آتی ہو مگر بات چیت اور اطوار سے خود کو بدمعاش اور دادا گیر ثابت کرتی ہو۔
"تم اس کے چیلوں کی بات کر رہی ہو۔ رستم پور والے کے۔"
"ہاں استاد کے تم نہیں تھے وہ بھی۔ ہکا بکا کھڑے کانپ رہے تھے۔ ہاتھ جوڑنے لگے ایک تو رونے پر آ گیا تھا کہ میری بہن۔ میری ماں میری پھوپھی۔ میرا دل بہت کمزور ہے تم جیسا کوئی دبا ہی ہو گا۔" وہ پھر زور سے ہنسی اور ڈرائیور کو ڈانٹنے لگی "تم کیا بار بار مڑ کے پیچھے دیکھ رہے ہو۔ آگے دیکھ کے گاڑی چلاؤ یا آنکھیں پیچھے لگوا لو۔"
وہ بوکھلا گیا "آپ نے دل خوش کر دیا جی۔ یہ جو رستم پور والا ہے نا آپ کو پتا ہے اس نے میرے ابا کے ساتھ کیا بدمعاشی کی تھی۔ اس کا جوڑ پڑ گیا تھا میرے ابا سے۔ اس نے دنگل سے پہلے انھیں بد دعا دے دی۔"
"دھوکا کیسے دے دی؟"

ٹیلی فون دیکھا تھا۔ جتنی دیر میں غالب نے کیمرے سے قاتل اور مقتول یعنی دلاور اور چیمہ کی تصاویر بنائیں، میں نے پولیس کا ایمرجنسی نمبر گھما دیا۔
ابھی میں بات کر ہی رہا تھا کہ دروازہ ٹوٹ گیا اور ایک ساتھ آٹھ دس افراد اندر آ گئے۔ ان سب نے ایک ساتھ چلانا شروع کر دیا "کیا ہو رہا ہے اندر اتنی دیر سے؟"
"فائرنگ کون کر رہا تھا؟"
غالب نے گرج کے کہا "خبردار جو کوئی آگے آیا۔ اگر کسی نے کوئی سراغ مٹانے کی کوشش کی تو وہ بھی مجرم سمجھا جائے گا۔"
لوگ رک گئے اور خاموش بھی ہو گئے۔ دروازے کے باہر میں نے تقریباً تیس چالیس افراد کو دیکھا جو خوف اور تجسس میں گردن اٹھا اٹھا کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔
میں نے فون رکھ کے کہا "آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ یہ کارروائی اسپیشل پولیس نے کی ہے۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ یہاں جعلی کرنسی چھاپی جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ اخباری نمائندے بھی ہیں اور پریس فوٹو گرافر بھی۔ ایک مجرم ہلاک ہوا ہے۔ باقی صرف بے ہوش ہیں۔ چھت پر بھی ہماری فورس موجود ہے اور علاقہ پولیس آ رہی ہے۔ میں آپریشن کمانڈر کی حیثیت سے درخواست کروں گا کہ آپ قانون کو اس کا فرض ادا کرنے دیں اور کسی کام میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔ پلیز منتشر ہو جائیں۔"
میری بات کا بہت اچھا رد عمل ہوا۔ لوگ باہر چلے گئے اور کچھ تو چلے گئے۔ کچھ گھبرا کے کھڑے ہو گئے۔ سامنے والے گھر سے نازو نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ خاموشی سے نکلی اور سڑک کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد غالب باہر آیا اور لوگوں کو اس گھر میں رہنے والوں کی مجرمانہ سرگرمیوں کی رپورٹ دینے لگا۔ جب پولیس پہنچی تو مجھے بھی نکلنے کا موقع مل گیا۔ میرا کام اب ختم ہو گیا تھا۔ باقی کام غالب کا تھا۔
نازو سڑک پر ٹیکسی روک چکی تھی۔ اس کا چہرہ مسرت سے کھلا ہوا تھا۔ اگر ہم سڑک پر نہ ہوتے تو فرط جذبات سے وہ مجھ سے لپٹ جاتی اور مجھے سیاہ کر دیتی۔ یہ حرکت اس نے میرے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی کی۔
"تم نے تو کمال کر دیا آج۔" اس نے دو بار میرا منہ چوم کے کہا۔
"ارے پاگل ہوئی ہو۔" میں نے ہنستے ہوئے اسے دور کیا "ایسی بھی کیا خوشی۔ بھئی اللہ کی مدد سے سب ہوا۔ تمام کام کے لئے اس نے وقت مقرر کیا ہے۔"
ٹیکسی ڈرائیور نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا "اگر کوئی لاٹری نکل آئی ہے صاحب تو بیگم صاحبہ کو خوش ہونے دیں۔"
"بکومت۔ یہ بیگم صاحبہ نہیں۔ میری بہن ہے۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"ایس پی نے ملنگ کو بھیج دیا۔ وہ اپنا تمغہ پہلوان والا ہاتھ لے کر اندر چلا گیا جہاں تایا جی جوڑ کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ اس نے پتا نہیں کیا پڑھتے ہوئے آگ میں کچھ ڈالا اور تایا کے ساتھ سب کو دھونی دے دی۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ تایا کو رستم پورووالہ بننے کی دعا دے رہا ہے۔ وہ حرامی اپنا کام کر گیا۔ دھوئیں سے اس وقت تو کچھ نہیں ہوا بعد میں سب کو چکر چڑھ گئے۔ تایا جی جوڑ شروع ہونے کے پانچ منٹ بعد چت ہو گئے اور یہ ان کے بیٹے پر چڑھ کے رستم پورووالہ ہو گیا۔"

میں نے ہنس کے کہا "تایا جی نے دوبارہ اسے چیلنج نہیں کیا؟"

"نہیں جی۔ شرط یہی تھی کہ جو ہار جائے گا وہ پھر پورووالہ میں اس کے سامنے نہیں آئے گا۔" ڈرائیور نے بڑے دکھ سے کہا "اسی طرح وہ پہلے بھی چار پانچ نامی گرامی پہلوانوں کو ہرا چکا تھا۔"

"دھونی دے کر؟" نازو بولی "تم اس ملنگ کو پکڑتے۔"

"پکڑا تھا جی۔ تب بھی تیار تھی اس کی مگر وہ بڑی اونچی چیز نکلا۔ پتا نہیں اس نے زیب میں سے کیا نکال کے سنگھا دیا۔ وہ بندے اسے اٹھا کے لا رہے تھے انہیں اسٹریچر پر اٹھا کے لانا پڑا۔ وہ ایسا غائب ہوا کہ پھر پورووالہ میں نظر نہیں آیا۔"

میں نے ٹیکسی رابعہ کے آفس سے کچھ فاصلے پر رکوائی۔ ہم نے تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کیا اور اوپر چلے گئے تو آفس میں بڑا سنجیدہ ماحول تھا۔ وقار یوسف اور منظر کے سامنے [illegible] بیٹھے ہوئے تھے۔ دو حضرات اور ایک خاتون اپنی باری کے انتظار میں تھے۔ ہم سیدھے اس کمرے میں چلے گئے جس کے باہر پرائیویٹ لکھا ہوا تھا۔ جاتے جاتے میں نے رابعہ کو اندر بلا لیا۔ اس نے سر ہلایا اور کچھ دیر بعد مؤکل کو وقار کے سپرد کر کے آ گئی۔

رابعہ بولی "کیا ہو گیا تمہارے چہروں پر لڈو پھوٹ رہے ہیں۔"

"یہ تمہارا آفس نہ ہوتا تو میں کہتا کہ وہ مارا پاپڑ والے کو۔ اب تم منہ میٹھا کراؤ۔ خیر سے تمہارا دلاور پولیس کی تحویل میں پہنچ گیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" رابعہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

"یہ لمبی کہانی ہے۔ ابھی تم کو میرے ساتھ چلنا ہے۔ فوراً۔"

"مگر یہاں... اچھا چلو کہاں جانا ہے؟"

"ایس پی ظفر حیات کے پاس۔ ممکن ہے اسے تلاش بھی کرنا پڑے۔ اس کے ساتھ میں اور تم پولیس اسٹیشن چلیں گے۔"

"میرا نام کیوں خارج کر دیا؟" نازو بولی۔

"بابا تم صحافی لوگ ہو۔ ہم وکیل ہیں۔" میں نے کہا "تم آ جانا بعد میں اپنے ساتھ دو چار بندے لے کر۔ اپنی برادری کے۔"

نازو نے ادھر ادھر فون ملا کے ایس پی ظفر حیات کا سراغ لگا لیا۔ وہ سخت جز بز ہوا۔ اس کی شام غارت ہو گئی تھی لیکن وہ رابعہ کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنی خصوصی ٹیم کے ساتھ پہنچنے کی ہامی بھری۔ منظر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ رابعہ نے فون کیا تو وہ گھر سے روانہ ہونے ہی والا تھا۔ رابعہ نے اسے بھی براہ راست تھانے پہنچنے کی تاکید کی۔ آخری فون نازو نے اپنے آفس کیا اور ایک فوٹوگرافر کو رابعہ کے آفس میں طلب کیا تھا۔

رابعہ اور میں فوراً روانہ ہو گئے۔ نازو کو کچھ دیر بعد اپنے فوٹو گرافر کے ساتھ آنا تھا۔ راستے میں رابعہ نے مجھ سے اس کارنامے کی روداد سنی۔

"نہ جانے کیوں مجھے یقین نہیں آتا۔" رابعہ نے ساری بات سن کے کہا۔

"بات ہی ایسی ہے کہ کوئی آسانی سے یقین نہیں کرے گا مگر دیکھ کر تو مانو گی۔" میں نے کہا "آج میرے ساتھ غالب اور نازو نہ ہوتے تو میں اکیلا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نازو تو واقعی قیامت ہے۔ انجام کی پروا کئے بغیر خطرے میں کود پڑتی ہے۔"

"مجھے حسد محسوس ہو رہا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

میں ہنس پڑا "تم اس سے بڑی پاگل ہو۔ دیکھو اب خیال رکھنا ایک بات کا مجھے اردو یا انگریزی نہیں آتی۔ صرف فرنچ جانتا ہوں میں۔ تمہیں کچھ معلوم ہے کہ کہاں جانا ہے۔ رام گلی کا علاقہ کس تھانے میں آتا ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔ مجھے سب معلوم ہے۔" رابعہ ہنسی "چلو"

رابعہ خود گاڑی چلاتی رہی اور میں اسے بتاتا رہا کہ کیسے نور جہاں کے مزار سے دلاور کی شامت اعمال اسے کھوکھر کے گھر لے گئی تھی اور کیسے میں نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کی مدد سے یہ ناقابل یقین کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ جعلی نوٹوں کا ریکٹ اس کے لئے بھی حیرت کا سبب بنا۔

"غالب کو کیا دھانسو اسٹوری ملی ہے۔ لاٹری میں۔"

رابعہ نے کہا "پولیس کو خاصی مایوسی ہو گی کہ اخبار والے پہلے پہنچ گئے۔"

"انہیں معلوم ہو جاتا تو رفع دفع کر لیتے؟"

"ایسے کیس کو دبانا تو مشکل ہوتا ہے مگر اس کا کریڈٹ پولیس کو ملتا۔ اب تو الٹی جواب طلبی ہو جائے گی کہ علاقے میں یہ سب ہو رہا تھا تو پولیس کیسے بے خبر رہی۔ اس وقت ضمانت تو ہو نہیں سکتی۔ غالب صبح کے اخبارات میں یہ ساری خبریں لکھوا سکتا ہے کہ چوہدری دلاور کو چھاپا مار کے جعلی کرنسی چھاپنے کے علاوہ قتل اور خطرناک آتشیں اسلحہ رکھنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ اس کی تصویریں بھی شائع ہوں گی تو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں رہے گی کہ وہ ڈاکٹر شیلی کے قتل کے کیس میں گرفتاری کے ڈر سے روپوش تھا۔ عدالت شاید اس کی ضمانت بھی منظور نہ کرے۔"

رابعہ نے پولیس اسٹیشن جانے سے پہلے ہیڈ کوارٹر کا رخ کیا۔ وہاں صرف ایمرجنسی ڈیوٹی والے موجود تھے مگر وائرلیس کنٹرول روم نے آخر کار ایس پی ظفر حیات سے رابطہ کر لیا اور ہمارا پیغام

سے کہا جاؤ چوہدری صاحب کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ قانون سے ہم نمٹ لیں گے۔"

"تم تو ابھی سے مایوس ہو۔" میں نے کہا "اور مجھے بھی مایوس کر رہی ہو۔"

"میں دیکھ رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تفتیشی ٹیم میں اچھی شہرت کے حامل افراد کو جان بوجھ کے نہیں شامل کیا گیا۔ پولیس میں بڑے ذہین اور باصلاحیت افسر ہیں جن کی ایمانداری اور فرض شناسی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ مگر انہیں انتظامی اور دفتری امور میں الجھا دیا جاتا ہے۔ جرائم سے نمٹنے کے لئے رہ جاتے ہیں پولیس کے نام کو بدنام کرنے والے۔ خیر اس کیس میں غفلت اور نااہلی کی سزا صرف معطلی یا برطرفی نہیں ہو گی۔ ہم انہیں مجرموں کا ساتھی بنا کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچائیں گے۔ میں اکیلی تو نہیں ہوں بہتیرے سینئر وکیل ہیں میرے ساتھ اور پریس۔"

"ایم آر پریس کو بھول گئی ہو؟" میں نے کہا۔

رابعہ مسکرائی "وہ تو میں خود ہوں۔"

پولیس اسٹیشن کے باہر سڑک کے دوسرے کنارے پر وہ جیپ بھی موجود تھی جسے میں نے عارضی طور پر ناکارہ بنا دیا تھا۔ اس کے علاوہ دو گاڑیاں تھیں ان میں سے ایک وہی سبز رنگ کی ڈاٹسن تھی جس میں دلاور کا بیٹا اپنی ماں کو واپس لے گیا تھا۔ اس گاڑی کی یہاں موجودگی یہ ثابت کرتی تھی کہ دلاور کے گرفتار ہونے کی خبر اس کے گھر والوں کو بھی دی جا چکی ہے۔ دوسری گاڑی کے قریب چار خونخوار قسم کے شکاری تھے جو دلاور کی فیملی کے باڈی گارڈ بن کے آئے تھے مگر ان کے تیور بڑے جارحانہ تھے۔ وہ دلاور کی خصوصی فورس کے ایسے ارکان ہو سکتے تھے جو موقع پاتے ہی دلاور کو قانون کی گرفت سے نکال کر لے جائیں۔ ابھی وہ مجبور تھے لیکن انہیں یقین تھا کہ چوہدری دلاور کبھی مجبور نہیں ہوتا۔

نہ جانے کہاں سے غلام حسین اچانک نمودار ہو گیا "یہ آپ نے مجھے کہاں طلب کر لیا جناب۔ خدا دشمن کو تھانے نہ لے جائے۔"

میں سمجھ گیا کہ اسے غالب نے بلایا ہو گا "دشمن تھانے پہنچ گیا ہے غلام حسین مگر تم کسی مجرم کے ساتھ نہیں۔ ایک عالی شہرت یافتہ وکیل کے معاون ہو۔ کوئی تمہیں ٹیڑھی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔"

"وہ اندر غالب صاحب کا جھگڑا ہو رہا ہے۔ اچھا ہوا آپ آ گئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔"

"جھگڑا کس بات پر ہے؟"

"تصویریں اتاری تھیں تو انہوں نے۔ پولیس کیمرا چھین رہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ایس پی کے حوالے کروں گا۔ پولیس والے بگڑ گئے۔ غالب صاحب نے یہاں آتے ہوئے کیمرا کسی کو دے دیا راہ چلتے۔"

دے دیا۔ وہ کسی پارٹی میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا۔

"[illegible] مجھے ابھی تک پولیس کی رپورٹ نہیں ملی۔"

"یہ تو پولیس کی نااہلی ہے۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"صبح بھی میرا کافی وقت ضائع ہوا۔ اس غیر ملکی وکیل نے بلاوجہ مجبور کیا۔ ورنہ وہاں میں کیوں جاتا۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کچھ نہیں ہوا۔"

ظفر حیات نے کہا "جو کچھ ہوا اس کا تعلق ان معاملات سے نہیں تھا جن کی تفتیش کے لئے مجھے بطور خاص بھیجا گیا ہے۔" وہ گرم ہو گیا۔

"اور اب میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ اسی کیس میں جو شخص اصل ملزم ہے جس کے خلاف ایف آئی آر ہے وہ گرفتار ہو گیا ہے تو آپ ماننے کے لئے تیار نہیں۔" رابعہ نے بھی تیز لہجے میں کہا "وہ بھیس بدل کے پھر رہا تھا۔ جعلی نوٹوں کے کیس کو چھوڑیں مگر چوہدری دلاور کو اپنی تحویل میں لینا کیا میری ذمے داری ہے؟"

"او کے او کے۔ میں آتا ہوں۔" ظفر حیات نرم پڑ گیا "میں ایس ایچ او سے کنفرم کرتا ہوں۔ آپ پولیس اسٹیشن جائیے۔"

"ایس پی صاحب۔ مجھے آپ کے ڈی ایس پی شاہد علی اور انسپکٹر خدا بخش پر بالکل بھروسا نہیں۔"

"اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے ان پر بھروسا ہے۔"

"فرق اس وقت پڑے گا جب میں اور میرے ساتھی [illegible] کی حیثیت سے ان کی نااہلی اور جانبداری ثابت کریں گے۔ آپ اپنی پوزیشن خراب مت کریں۔ اخبار والے وہاں پہلے سے موجود ہیں اور تمام تفصیلات جمع کر چکے ہیں۔ حقائق کو مسخ کرنے اور شہادتوں میں رد و بدل کرنے کی کوشش کی گئی تو......"

لیکن ایس پی ظفر حیات اس سے پہلے ہی فون رکھ چکا تھا۔ رابعہ سخت غصے میں تھی اور [illegible] دھمکی نے ظفر حیات کو مشتعل کر دیا تھا۔

میں نے کہا "[illegible] کی ضرورت تھی۔"

"تم نہیں سمجھتے۔ انہیں پہلے سے خبردار نہ کیا جاتا تو انہیں خوش فہمی رہتی ہے کہ قانون موم کی ناک ہے جسے اپنی مرضی سے موڑا مروڑا جا سکتا ہے۔ ابھی دیکھو یہ دلاور سے کیا سودا کرتے ہیں اسے کیسے بچاتے ہیں۔"

"اپنی نوکری کو داؤ پر لگا کے؟"

"نوکری!" رابعہ نے تلخی سے کہا "اب تک یہ اتنا کما چکے ہیں کہ باقی عمر صرف خرچ کریں تب بھی بہت ہے۔ پھر دلاور انہیں اپنی عزت آبرو اور اپنا مستقبل بچانے کی اتنی بڑی قیمت دے سکتا ہے کہ یہ خود نوکری کو لات مار دیں۔ وہ ایس پی ظفر حیات کو بزنس پارٹنر بنانے کی پیشکش کر دے تو کیا ظفر حیات اسے جیل بھجوا دے

www.paksociety.com

"راہ چلتے... روک دیا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"پتا نہیں جی مگر پولیس کو پتا نہیں چلا۔" غلام حسین نے مسرت سے کہا۔

میں رابعہ کے ساتھ اندر گیا تو ایس ایچ او اور غالب کے درمیان سخت زبانی جنگ چل رہی تھی۔

"میری فکر مت کرو۔ صحافی جیل جاتے ہیں تو ان کی عزت کم نہیں پہلے سے زیادہ ہوتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر سے فیض تک سب جیل گئے تو بے روزگار نہیں ہوئے تھے۔ تم اپنی فکر کرو۔ ایک بار یہ پیٹی اتر گئی تو تمہیں چپراسی کی نوکری بھی کوئی نہیں دے گا۔"

"بار بار دھمکی مت دو مجھے۔ میں سچ مچ اندر کروں گا تمہیں۔"

"کس جرم میں۔ چلو وکیل بھی آ گئے میرے۔" غالب نے کہا۔

رابعہ نے فوراً صورت حال کو سنبھالا "یہ کیا چیخ پکار ہے غالب؟"

غالب نے فریاد کی "بلاوجہ میرے پیچھے پڑ گیا ہے یہ تھانیدار کہ کیمرا دو۔ بابا کیسا کیمرا۔ کیمرا ہے کہاں؟"

تھانیدار دہاڑا "کیمرا تمہارے پاس تھا۔ تصویریں اتاری ہیں تم نے۔"

"پھر کیا میں نے اسے نگل لیا۔ جادو منتر سے غائب کر دیا؟"

"میں چاہتا تو تم سے کیمرہ چھین لیتا تو ٹھیک تھا۔ میں نے شرافت کا ثبوت دیا اور اعتبار کیا تم پر۔ تم نے کہا تھا۔ تم ایس پی صاحب کو دو گے لیکن تم نے راستے میں کسی کو دے دیا۔"

"کس کو دے دیا؟ کسی نے دیکھا مجھے کیمرا دیتے ہوئے۔ میں تو اسی گاڑی میں بیٹھا رہا تھا جس میں تم آئے ہو۔" غالب نے کہا۔

"تم پیچھے تھے۔ تم نے کسی سگنل پر رکھ دیا ہوگا کسی جاننے والے کو۔ بس میری نظر چوک گئی۔"

رابعہ نے کہا "فرض کرو ایسا ہی ہوا۔ ضابطۂ فوجداری کی کون سی دفعہ کے تحت اپنا کیمرا کسی کو دینا جرم ہے اور اس میں کون سی ایسی تصویریں تھیں کیا غالب نے کسی ممنوعہ علاقے کی تصویر اتاری تھی؟"

ایس ایچ او کرسی پر بیٹھ گیا "اچھا آپ سب لوگ یہاں سے تشریف لے جائیں فی الحال۔ تم بھی صحافی صاحب۔"

رابعہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور مجھے دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا "ہمیں ایس پی ظفر حیات نے یہاں ملنے کو کہا ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔"

"ایس پی صاحب۔ انہیں کس نے بتایا؟" ایس ایچ او پریشان ہو گیا۔

"میں نے انہیں مطلع کیا تھا کہ ڈاکٹر نبیلہ مرزا کیس کا اصل ملزم بھی گرفتار ہونے والوں میں شامل ہے۔" رابعہ نے کہا "اس کا نام چوہدری دلاور ہے۔"

"آپ کو ملزمان کے نام کیسے معلوم ہو گئے؟"

"ایس پی صاحب صرف چوہدری دلاور کو اپنی تحویل میں لینا چاہتے ہیں۔ یہ ان کا کیس ہے اور اس کیس میں استغاثے کے ایک وکیل یہ بھی ہیں۔ یہ برطانیہ سے آئے ہیں اور برٹش کونسلیٹ کے نمائندے ہیں۔ ان کی ملاقات ایس پی ظفر حیات سے بھی ہو چکی ہے۔"

"دیکھیے وکیل کا یہاں کوئی کام نہیں۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"یہ انگلش اردو نہیں جانتے۔ فرنچ میں بات کرو یا ان کے مترجم کے ذریعے۔" رابعہ نے کہا "رہا یہ سوال کہ وکیل کا یہاں کیا کام تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں مدعی بھی ہوں۔ یہ اور وکیل آنے والے ہیں جو سب مدعی ہیں۔ ملزم کی شناخت تم نہیں کر سکتے ہم کریں گے۔ ہم نے چند اور اخبار والے بلائے ہیں۔ ایس پی صاحب پریس کانفرنس میں سب بتائیں گے۔"

ایس ایچ او پھر اٹھ کھڑا ہوا "پریس کانفرنس۔ اچھا تو ساری تیاری کر کے آئے ہیں آپ لوگ۔"

وہ ایک دم ایکٹو ہو گیا۔ اس نے ماتحت عملے کو حکم دیا کہ تھانے کے اندر... باہر سے سارا "گند" صاف کر دے۔ گند میں اس نے ہمیں بھی شامل کیا تھا مگر ظاہر ہے ہمیں وہاں سے نکالنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

"غیر متعلقہ لوگ نظر نہ آئیں مجھے۔ کوئی اخبار والا بھی میری اجازت کے بغیر داخل نہ ہونے پائے ورنہ سب کو لاک اپ میں حاضر کر دوں گا۔ یہ ساری گاڑیاں گیٹ کے سامنے کیوں کھڑی ہیں۔ وکیل صاحب اپنی گاڑی ہٹا لیں۔"

رابعہ نے قانونی سوال کیا "کیوں؟ یہ نو پارکنگ زون نہیں ہے اور میں نے گاڑی گیٹ کے سامنے بھی کھڑی نہیں کی ہے۔"

"تمام ملزمان ہوں حوالات میں۔" ایس ایچ او نے عمداً رابعہ کی بات نہیں سنی اور ایس پی صاحب کے استقبال کے لئے تیار ہو گیا۔

غالب نے کہا "ملزمان کے علاوہ جتنے لوگ ہیں حوالات میں انہیں آگے پیچھے کرو۔"

"تم نے مجھ سے کچھ کہا؟" ایس ایچ او غرایا۔

"نہیں میں کسی فضول فری سے فضول بات نہیں کرتا۔" غالب نے کہا۔

رابعہ نے آہستہ سے پوچھا "کیمرا کسے دیا تھا؟"

غالب مسکرایا "اپنے دفتر کا ایک چپراسی ڈاک لے کر جا رہا تھا۔ میں نے اسے آنکھ ماری اور کیمرا تھما دیا۔ وہ مجھے پولیس کی گاڑی میں دیکھ کے سمجھ گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔"

"تھانیدار دیکھ لیتا پھر؟"

"وہ موٹر سائیکل پر تھا۔ وہیں سے لوٹ گیا۔ اس کا تو باپ بھی اسے نہیں پکڑ سکتا تھا۔" غالب بولا۔

... ایس پی کی جیپ اندر آئی تو کھٹاکھٹ سلیوٹ ہونے لگے۔ اس

"آپ تو کرو گے؟" غالب نے کہا۔

"یہ مرزا غالب کے گھوڑے۔ صحافت میں خالی نام سے کچھ نہیں ہوتا۔ دام وصول کرو بنا دام" اس نے انگلی اور انگوٹھے سے مال شمار کیا۔

"اپنی بے احتکار کو دھوکا دینا صحافت نہیں ہے۔ اگر تم نے دوسری [illegible] کی تو میں کسی دن تمہاری دوسری ٹانگ بھی توڑ دوں گا۔"

"بات سمجھا کرو۔ میرے چاند بلیک میل ہم انہی کو کرتے ہیں جو دو نمبر کالے دھندے کرتے ہیں۔ جن کے پاس کالا دھن ہے۔ جن کے کرتوت کالے ہیں۔ کسی شریف آدمی کی عزت سے نہیں کھیلتے۔ لالی کے پاس آنے والے آخر کون تھے۔ انہیں تو سزا ملنی چاہیے۔"

"سزا دینے کے لیے قانون ہے عدالتیں ہیں۔"

غازی کا زبردست قہقہہ تھانے میں گونجا "یار یہاں بیٹھ کے بھی تم ایسی باتیں کرتے ہو۔ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ سرمال حرام تو حرام میں ہی جاتا ہے۔ میں کون سا اس کمائی سے حج کرنے جا رہا ہوں۔ یہ سارے بدمعاش چور ڈاکو، انکم ٹیکس کھانے والے اور رشوت لینے والے عیش کر رہے ہیں تو ہم کیوں نہ کریں۔ انہی کے مال سے۔ صحافت اپنی جگہ، عیاشی اپنی جگہ۔ صحافی ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ دنیا تیاگ دو۔ جوگی ہو جاؤ۔"

"یہ تو وہی فلسفہ ہو گیا کہ نماز میرا فرض ہے، چوری میرا پیشہ۔"

"واہ۔ کیا بات ہے تمہاری مرزا غالب ثانی۔ دریا کو بلکہ سمندر کو کوزے میں بند کر دیا۔ اپنا بھی فلسفۂ حیات ہے اور رہے گا۔ تم کرو اپنی مقدس پیشہ ورانہ صحافت۔ ہم تو چور کو بھی پکڑیں گے اور کوتوال کو بھی اور دونوں سے جتنا بھی لیں گے۔ دونوں کو زندگی بھی دیں گے۔ یہ ساری دنیا اسی طرح قائم رہتی ہے۔ شرافت کا زمانہ کہاں ہے۔"

"غازی۔ وہ ڈائری واپس کر دے مجھے ورنہ میں اسے تباہ کر دوں گا۔"

"ہرگز نہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں اس کا حصہ دیتا رہوں۔ اسے تو پہلے سے زیادہ ہی مل جائے گا۔ اور وہ محفوظ بھی رہے گی۔ وہ اناڑی ہے ابھی۔"

غازی کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ایس پی ظفر حیات مسکراتا ہوا آ گیا۔ ایس ایچ او کی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے اس نے چند کرسیاں اور منگوائیں جو میز کے گرد لگا دی گئیں۔ خود ایس ایچ او اپنے افسر اعلیٰ کے بالکل پیچھے بیٹھا۔

"آئی ایم سوری کہ آپ لوگوں کو کچھ انتظار کرنا پڑا۔" ظفر حیات نے سگریٹ سلگا کے اطمینان سے بات شروع کی "جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں مجھے خصوصی تفتیش کے لیے یہاں بھیجا گیا تھا۔ ایک برٹش لیڈی ڈاکٹر مس نبیلہ کے بارے میں اس شبے کا اظہار کیا گیا تھا کہ اس کی موت حادثاتی نہیں تھی بلکہ اسے قتل کیا گیا

وقت وہ وردی میں نہیں تھا۔ سوٹ پہنے آیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس کے پیچھے پیچھے آنے والوں میں نازو کے علاوہ دو چار اخباری نمائندے تھے جن میں غازی بھی شامل تھا۔ وہ بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا آیا تھا مگر بڑے کرّوفر کے ساتھ۔

"واٹ از دس؟" ظفر حیات نے حیرانی سے کہا "یہ سب لوگ آخر کیا کر رہے ہیں یہاں؟"

"سر آپ نے ہی کہا تھا کہ اخبار والوں کو تفصیلات پریس کانفرنس میں بتائی جائیں گی۔" ایس ایچ او بولا۔

"میں نے؟" ظفر حیات حیرانی اور برہمی سے بولا۔

اب غالب نے کہا "ہم سے بھی یہی کہا تھا تم نے ایس ایچ او صاحب۔"

نازو نے فوراً بات اچک لی "ابھی تم نے ہی تو تمام اخبار والوں کو فون پر بتایا ہے۔ یہ سب لوگ ایسے ہی تو نہیں آ گئے ہیں۔"

رابعہ نے بھی تائید میں سر ہلایا۔

"یہ غلط ہے۔ جھوٹ ہے سر۔"

اب غازی نے بیساکھی زمین پر مار کے کہا "اچھا ہم جھوٹے تم سچے خود بتا دو۔ یہ کیا قصہ ہے جعلی نوٹوں کا۔ یا اس معاملے کو بھی نوٹوں کے ساتھ دبانے کی فکر میں ہو۔"

غالب ہنسا "اس کیس کی اطلاع تو میں نے دی تھی۔ میں چشم دید گواہ ہوں۔ سارا محلہ جانتا ہے تصویریں بھی لی ہیں۔"

ظفر حیات نے فوراً صورت حال کی نزاکت کو سمجھ لیا "آل رائٹ لیڈیز اینڈ جنٹلمین مجھے کچھ مہلت دیں۔ میں ابھی آپ سب کے سامنے آتا ہوں۔ مجھے اپنے ایس ایچ او سے کیس کی تفصیلات حاصل ہو جائیں۔ پھر میں آپ لوگوں کو بریف کر سکوں گا۔ آپ لوگ تشریف رکھیں۔ چائے وغیرہ پئیں۔ میں اندر دس منٹ بات کروں گا۔ صرف دس منٹ۔"

ایس ایچ او نے طوعاً کرہاً سب کے لئے پرتکلف چائے کا انتظام کرنے کے احکامات جاری کئے اور خود ظفر حیات کے ساتھ اندر چلا گیا۔

"یہ ملزمان کو غائب تو نہیں کر سکتے نا؟" میں نے کہا۔

غالب ہنسنے لگا "ٹکر اور چوہدری دلاور کو میرے سامنے حوالات میں بند کیا گیا تھا۔"

رابعہ نے فکر مندی سے کہا "مجھے ان کی ملی بھگت کے پیچھے گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔"

غازی نے کہا "ایسی کی تیسی گڑبڑ کرنے والوں کی۔ یہ حرامی ہیں تو ہم ان کے باپ ہیں۔"

غالب نے کہا "اپنے بارے میں تم نے سچ بولا غازی۔"

"تمہیں شکایت ہے مجھ سے۔ مجھے معلوم ہے۔"

"تم اس لڑکی لالی کی ڈائری چرا لائے تھے؟" غالب نے کہا۔

"تمہیں کیوں اعتراض ہے اس پہ یار۔ وہ سالی سب کو بلیک میل کرتی تھی۔"

www.paksociety.com

تھا۔ عدالت عالیہ میں ایک مدعی مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ بھی ہیں۔ مسز نیلی کے قبلی فرزند نے لندن سے بھی ایک وکیل نامزد کیا ہے جو تفتیش اور عدالتی کارروائی میں بحیثیت مبصر شریک ہوگا۔"

میں نے ہاتھ اٹھا کے خادم سے کہا "ایس پی کو بتا دو کہ میں اس نیگرو کا بھی وکیل ہوں جو چوہدری دلاور کو مجرم سمجھتا ہے مگر دوسرے قتل کے الزام میں اس کی جگہ جیل میں بند ہے۔ وہ دوسرے قتل کی واردات کا چشم دید گواہ تھا۔ جس میں دلاور نے اپنی سوتیلی ماں کو اور نیلی کے دھوکے میں اس نیگرو کی گرل فرینڈ کو قتل کیا تھا۔ وہ نیگرو چوہدری دلاور کی دوسری ماں کا نمبر دو شوہر تھا۔"

خادم حسین نے میری بات دہرا دی "جس سے چہروں پر آخری جملے کے بعد مسکراہٹ نظر آنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔ اب پلیز اپنے وکیل صاحب سے کہیں کہ دخل اندازی نہ کریں اور مجھے بات کرنے دیں۔ اگر تم ان کے کان میں میری بات کا فوری ترجمہ ساتھ ساتھ کر سکتے ہو تو اجازت ہے۔"

میں نے خادم کا ہاتھ دبایا "کہو ٹھیک ہے۔"

ایس پی نے اپنی بات پھر شروع کی "آج صبح مجھے خبر دی گئی کہ ڈاکٹر نیلی کا مبینہ قاتل چوہدری دلاور شاہدرہ میں نورجہاں کے مزار پر موجود ہے۔ یہ گمنام اطلاع تھی لیکن میں نے اسے نظرانداز نہیں کیا اور پولیس فورس کے ساتھ وہاں پہنچا لیکن میرے محترم دوست کی اطلاع غلط فہمی پر مبنی تھی۔ میرا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"کیونکہ آپ خصوصی تفتیش کر رہے ہیں۔" کسی نے طنز کیا۔

"اور اب آپ کے سامنے قتل بھی ہو جائے تو آپ ایکشن نہیں لیں گے" غالب نے کہا "دوسری طرف دیکھتے رہیں گے کہ یہ میرا کام نہیں ہے۔"

قاضی بولا "وہاں ایک نہیں دو قتل ہو گئے۔ پولیس فورس کے ایک آدمی کی موت کا ذمے دار کون ہے آخر؟"

ایس پی نے تحمل سے کام لیا "وہاں چوروں کے ایک گروہ نے ٹھکانا بنایا تھا۔ اس وقت ایک ہی چور موجود تھا۔"

"کیا اس نے خود کو چور تسلیم کر لیا تھا؟"

"کیا اس کے ماتھے پر چور کا لیبل لگا ہوا تھا؟" غالب بولا "اسے تو کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔"

ایس پی نے کہا "پولیس نے اسے ہلاک نہیں کیا تھا۔"

"پھر کس نے ہلاک کیا تھا؟ یہ تفتیش کون کر رہا ہے؟" ایک صحافی بولا۔

"اگر وہ جگہ چوروں کا ٹھکانا تھی تو اس کی نگرانی کیوں ضروری نہیں سمجھی گئی؟" نازو نے سوال کیا "گروہ کے دیگر ارکان۔"

ایس پی نے کہا "آپ لوگ غیر متعلقہ سوالات کر رہے ہیں۔ یہ میرے دائرہ اختیار میں نہیں آتے۔ آپ علاقہ ایس پی سے پوچھیں۔ میرے پاس وقت کم ہے۔"

"کیا آپ دوا میں اسلام آباد جا رہے ہیں؟" غالب نے کہا "۔۔۔ کی ملاقات سے۔"

"مجھے رپورٹ دینا ہے۔" ایس پی نے ضبط سے کام لیا۔

"یہ کام زیادہ اہم نہیں ہے جس کے لیے آپ نے رپورٹ تیار کی تھی۔ مگر مصروفیات کو آپ ملتوی کر سکتے ہیں" قاضی نے کہا۔

"او کے۔ میں آپ کے ڈسپوزل پر ہوں اور جب تک آپ چاہیں گے یہاں موجود رہوں گا۔ ہر سوال کا جواب بھی دوں گا لیکن پلیز پہلے مجھے اپنی بات تو مکمل کرنے دیں۔" ایس پی نے برہمی سے کہا "پولیس کا فرض کیسے ادا کیا جائے، یہ آپ لوگ تو ہمیں نہیں سکھائیں گے نا؟"

رفتہ رفتہ طور پر اس کی بات کا اثر ہوا۔ ظفر حیات نے دوسرا سگریٹ جلا کے ایک گہرا کش لیا۔ "ایس ایچ او نے مجھے بتایا ہے کہ اس علاقے میں جعلی نوٹ کافی مقدار میں پکڑے گئے تھے دوسرے علاقوں میں بھی ملے تھے لیکن یہاں کچھ زیادہ تھے جس پر شک کیا تھا کہ کوئی گروہ اس علاقے میں سرگرم ہے۔ پولیس نے چھاپا مارنے کی تیاری مکمل کر لی تھی لیکن خبر لیک آؤٹ ہو گئی۔ ہماری طرح اخبار والوں کے بھی مخبر ہوتے ہیں۔ کسی نے ایک سینئر صحافی مرزا غالب کو خبر دی اور یہ پولیس سے پہلے پہنچ گئے۔ پولیس کے کام میں مداخلت اندازی کو جرم سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر اس طرح عام شہری معاملات کو خود ڈیل کرنے لگیں تو پھر پولیس کی کیا ضرورت ہے۔ مرزا غالب نے بہت بڑا رسک بھی لیا تھا۔ پولیس وہاں دس منٹ بعد پہنچی تھی۔ اگر مجرم ہمارے صحافی دوست کو مار کے نکل جاتے تو پولیس کی ساری پلاننگ فیل ہو جاتی۔ خیر اب مجرم پکڑے جا چکے ہیں اور تفتیش کے نتائج سامنے آ جائیں گے۔"

خاموشی کا وقفہ توڑتے ہوئے قاضی نے سوال کیا "اگر پولیس کا دعویٰ ہے کہ جعلی نوٹ پہلے ہی پکڑے گئے تھے تو یہ بتایا جائے کہ کب اور کہاں یہ نوٹ چلانے والے گرفتار ہوئے تھے؟"

ایس ایچ او نے کہا "کچھ لوگوں نے خود یہ نوٹ دیے تھے۔"

"وہ کون لوگ تھے؟ کیا ان کے بارے میں تفتیش ہوئی تھی؟"

"آخر پولیس ریکارڈ پر کیا ہے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ان جعلی نوٹ چھاپنے والوں کے گروہ کا پہلے سے علم تھا اور وہ چھاپا مارنے ہی والے تھے؟" قاضی نے اونچی آواز میں کہا۔

"یہ بھی جھوٹ ہے کہ وہ دس منٹ بعد پہنچ گئے تھے" غالب نے کہا۔

ایس پی نے ہاتھ اٹھایا "میں متنازعہ سوالات کے جواب نہیں دوں گا۔"

رابعہ نے کہا "ٹھیک ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ کیا چوہدری دلاور کو بھی وہیں سے گرفتار کیا گیا ہے؟"

"اسے سامنے لایا جائے" غالب نے مطالبہ کیا۔

سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں اتنے لوگ موجود ہیں۔ سب ذمے دار صحافی ہیں۔ میں انہیں حقیقت سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ حیدر بخش عرف مٹھو فیصل آباد کا رہنے والا ہے۔"

اب رابعہ نے احتجاج کیا "یہ غلط ہے۔ یہ چوہدری دلاور ہے۔ اس کا اصلی چہرہ میک اپ سے بدلا گیا ہے۔"

"خاتون۔ آپ جذباتی ہو رہی ہیں" ظفر حیات بولا "میں پوری ذمے داری اور یقین کے ساتھ بتا رہا ہوں کہ یہ ملزم کا اصلی چہرہ ہے۔ میک اپ کے بغیر۔ یہ رب نواز کھوکھر کا ایک ساتھی ہے اس کا دوسرا ساتھی زاہد علی عرف بادل مارا جا چکا ہے۔ غالباً اس کا قتل انتقامی راز کے ڈر سے خود مٹھو نے کیا۔"

"یہ ہم سب کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا رہی ہے" غالب نے غصے سے میز پر مکا مارا "میں مطالبہ کرتا ہوں کہ اس میک اپ۔۔۔"

"شٹ اپ" ظفر حیات نے گرج کے کہا "بی ہیو یور سیلف مسٹر غالب ورنہ میں تمہیں باہر نکلوا دوں گا۔"

"تم ایک مجرم کو بچا رہے ہو۔" نازو۔۔۔ نے چلا کے کہا "ہم بچے ہو تو ہمیں چیک کرنے دو۔"

قاضی نے جیسا بھی زمین پر ماری "بالکل ٹھیک۔ میک اپ ہوگا تو ابھی معلوم ہو جائے گا۔ میرے پاس ثبوت ہے۔"

"سوری جنٹلمین۔ تفتیش آپ لوگوں کا کام نہیں ہے۔ ہم نے بھی زندگی مجرموں سے نمٹنے گزاری ہے۔ ہم اتنے اندھے نہیں ہیں کہ کوئی مجرم میک اپ کر کے ہمیں دھوکا دے سکے۔ آپ لوگ خود اس سے کچھ پوچھنا چاہیں تو میری طرف سے اجازت ہے۔"

قاضی نے کہا "مٹھو بیٹے۔ اپنا نام بتاؤ۔"

کچھ لوگ مسکرانے لگے "مٹھو بیٹا نہیں۔ میں حیدر بخش ہوں۔ فیصل آباد میں رہتا ہوں۔ باپ کا نام غلام قادر۔" غالب نے طوطے کی نقل اتاری۔

ایس ایچ او نے دونوں ملزموں کو واپس بھجوا دیا۔ ظفر حیات اٹھ کھڑا ہوا "خادم حسین، تمہارا انگریزی چھوڑی والا وکیل مطمئن ہے یا نہیں؟"

خادم نے مجھ سے کہا "بھئی تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے جی۔"

میں نے کہا "اسے کہو کہ ملزم کو پھر یہاں لایا جائے۔ میں مطمئن نہیں ہوں۔"

ظفر حیات نے مجبوراً میری خواہش پوری کی۔ اب ساری نظریں مجھ پر تھیں کہ ایک ماہر غیر ملکی وکیل کے پاس پولیس کے جھوٹ کا کیا توڑ ہے۔

میں نے ملزم کی معرفت کہا "حیدر بخش۔ اپنے بارے میں سب کو تفصیل سے بتاؤ۔ اونچی آواز میں تاکہ سب سن لیں۔"

چوہدری دلاور نے قطعی بدلی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا

"میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ بے بنیاد افواہ کس نے پھیلائی تھی اور کیوں؟" ایس پی ظفر حیات نے کہا۔

"بے بنیاد افواہ!" غالب نے چلا کے کہا "پولیس پارٹی سے سامنے میں آیا تھا۔ میں نے اطلاع دی تھی پولیس کو۔"

ظفر حیات بولا "کیا اطلاع دی تھی آپ نے مرزا غالب صاحب؟"

"چوہدری دلاور نے میرے سامنے ایک قتل بھی کیا تھا۔ کھوکھر کے گھر میں۔ اس نے دلاور کا راستہ روکا تھا۔"

"کون تھا وہ آدمی؟" ایس ایچ او بولا۔

"میں اسے نہیں جانتا۔ مگر اس کی لاش پولیس نے اٹھائی تھی۔ کیا پولیس کو وہاں چوہدری دلاور بے ہوش پڑا نہیں ملا تھا؟ آلۂ قتل اس کے ہاتھ میں تھا۔"

"وہ ریوالور بھی پولیس کے قبضے میں ہے۔"

"اس پر دلاور کے فنگر پرنٹس ہوں گے" غالب نے کہا۔

"مرزا غالب صاحب۔ کیا آپ چوہدری دلاور کو پہچانتے ہیں؟" ظفر حیات نے سکون سے کہا۔

"میں اس سوال کا کیا جواب دوں؟ کیا آپ نہیں پہچانتے۔ یہاں جتنے لوگ موجود ہیں سب پہچانتے ہیں اسے" غالب نے کہا۔

ایس پی نے رابعہ، نازو اور دیگر صحافیوں کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے پیچھے پلٹ کے ایس ایچ او سے کچھ کہا۔ ایس ایچ او نے سر ہلایا اور اندر چلا گیا۔

"میں جائے واردات سے پکڑے جانے والوں کو ابھی پیش کرتا ہوں" ایس پی ظفر حیات بولا "چوہدری دلاور کو آپ سب یقیناً پہچان لیں گے۔ یہ ہے نا اس کی تصویر؟" اس نے جیب میں سے ایک تصویر نکال کے دکھائی۔

"لیکن اس نے بھیس بدل رکھا ہے" غالب سمجھ گیا کہ پولیس اب کیا چال چلنے والی ہے۔

ایس ایچ او دو افراد کے ساتھ واپس آیا۔ ان دونوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"یہ ہے چوہدری دلاور" غالب نے کہا۔

ظفر حیات مسکرانے لگا "اور دوسرا کون ہے؟"

"اسے میں نہیں جانتا۔ یہ کھوکھر ہوگا۔"

"آپ اسے بھی نہیں جانتے" ظفر حیات نے کہا "یہ چوہدری دلاور نہیں ہے۔ حیدر بخش عرف مٹھو ہے۔ باپ کا نام غلام قادر ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے" غالب اور نازو ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔

ظفر حیات نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا "آپ کا خیال کیا ہے؟"

"یہ میک اپ میں ہے" غالب نے چلا کے کہا۔

"ڈونٹ شاؤٹ۔ چیخنے چلانے سے جھوٹ بھی سچ نہیں بن

www.paksociety.com

"میرا نام حیدر بخش ولد غلام قادر ہے۔ میں فیصل آباد میں بلاک میکر تھا۔ مجھے رب نواز کھوکھر نے یہاں بلایا اور کہا کہ کرنسی چھاپنے کے کام میں ایک ماہر کاریگر کی مدد چاہیے۔"

میں نے اس کی آواز نازو کے چھوٹے سے ٹیپ پر ریکارڈ کی تھی جو مجھے نازو نے میز کے نیچے سے تھمایا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ اتنا کافی ہے" میں نے کہا "حیدر بخش۔ تم بلاک میکنگ کا کام کب سے کر رہے ہو؟"

"کئی سال سے جی" چوہدری دلاور بولا۔

"ہر قسم کا بلاک بنا سکتے ہو اگر میں کہوں؟"

"ہاں جی" دلاور ذرا بھی نہ گھبرایا۔

میں نے میز پر سے ایک پیپر ویٹ پہلے ہی اٹھالیا تھا اور اسے پتلون پر رگڑ کے صاف بھی کرلیا تھا "یہ دیکھو۔ اس پیپر ویٹ کے اندر کتنے رنگ کے پھول ہیں؟"

دلاور نے پیپر ویٹ لے لیا اور غور سے دیکھ کے بولا "تین رنگ کے۔"

میں نے خادم کی زبانی کہا "ٹھیک ہے۔ اب تم جاسکتے ہو۔ ایس پی صاحب۔ آپ کی اجازت سے میں یہ پیپر ویٹ اپنے پاس رکھوں گا۔"

"وہ کس لیے؟" ایس ایچ او چونکا۔

"میں نے اس پر ملزم کے فنگر پرنٹ حاصل کیے ہیں۔ ان کا موازنہ بعد میں چوہدری دلاور کے فنگر پرنٹس سے کیا جاسکتا ہے" میں نے کہا۔

غالب اور نازو کا چہرہ کھل اٹھا۔ غازی نے بے ساختہ کہا "ابے واہ" اور دوسرے صحافی بھی متاثر ہوئے مگر ایس ایچ او کا رنگ اڑ گیا۔ خود ظفر حیات کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوگئے مگر وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

میں نے کہا "ابھی جو کچھ میں نے ملزم سے پوچھا تھا۔ وہ بھی میرے پاس ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ اس کا اصل مقصد ملزم کی آواز کا نمونہ حاصل کرنا تھا۔ آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ آواز کا ایک اسپیکٹرم SPECTRUM ہوتا ہے۔ ایک شخص کی آواز کا گراف مشین پر بنایا جائے تو کبھی دوسرے شخص کی آواز سے نہیں ملتا اور کوئی آواز بدل کے بات کرے تب بھی گراف نہیں بدلتا۔ میں سونوگرافی سے چوہدری دلاور کی آواز کے گراف اور اس ملزم کے گراف کا موازنہ کرسکتا ہوں۔ لیبارٹری سے رپورٹ بھی لے سکتا ہوں کہ دونوں میں کیا فرق ہے۔"

پلک جھپکنے میں ظفر حیات اور ایس ایچ او کے جھوٹ کی عمارت زمیں بوس ہوگئی۔ "آئی ایم سوری۔ میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

میں نے کہا "میں بلا اجازت کچھ نہیں کروں گا۔ یہ ملزم آپ کی تحویل میں ہے۔ آپ خود اس کے فنگر پرنٹس لے کر عدالت میں پیش کردیں اور سونوگراف کے لیے ملزم کی آواز اور دلاور کی آواز کے نمونے بھی لے آئیں۔"

اب رابعہ نے اور غازی نے محاذ سنبھال لیا "ایس پی صاحب۔ ملزم کے فنگر پرنٹ دینے میں پولیس کا کیا نقصان ہے؟ اور آواز تو سب نے ریکارڈ کی ہے۔ پوری پریس کانفرنس کی ریکارڈنگ ہے۔"

غازی نے سہلایا "ہم تو وی ریکارڈ بات پر ٹیپ نہیں چلاتے ورنہ ہر لفظ کو بطور ثبوت محفوظ رکھتے ہیں۔"

ظفر حیات کے لیے ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ "او کے۔ میں اسے انا کا مسئلہ نہیں بناؤں گا۔"

میں نے مسکرا کے خادم کی معرفت کہا "ٹھیک ہے" اور پیپر ویٹ کو رومال میں لپیٹ لیا "کیا مجھے چوہدری دلاور کے فنگر پرنٹ کا نمونہ مل سکتا ہے؟ اور کسی فنگر پرنٹ ایکسپرٹ کا نام پتا۔"

میں نے باہر آکے دیکھا تو چوہدری دلاور کی جیپ موجود تھی لیکن سبز رنگ کی ڈاٹسن کار غائب ہوچکی تھی۔ وہ چار خونخوار قسم کے شکاری بھی نظر نہیں آرہے تھے جن کی صورت سے ہی ان کے قاتلانہ عزائم کا اظہار ہوتا تھا۔

غازی نے بڑے جوش کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا "بھئی مان گئے۔ لاجواب ولایتی مال ہی ہوتا ہے۔"

میں نے خادم حسین کے ذریعے سے جواب دیا "اچھے حسین وکیل یورپ میں نہیں ہوتے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کیس میں مدعی اور وکیل کی حیثیت سے یہ خاتون پیش ہوں گی تو جج دل کے ہاتھوں مجبور ہوجائے گا۔ وکیل گئے گا ہی نہیں اور آپ کے حق میں فیصلہ صادر ہوجائے گا۔"

خادم حسین نے اس کا ترجمہ کیا تو رابعہ کا رنگ لال ہوگیا "خادم حسین ان سے کہو کہ یوں فیصلہ ہوا تو اپیل منظور ہوجائے گی۔ ہاں ملزم دل کے ہاتھوں مجبور ہوکے خود پھانسی پر لٹک جائے تو بات ہے۔"

میں نے جواب دیا "اگر میں ملزم ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔"

رابعہ نے دوسروں کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے موضوع بدل دیا "آج تو آپ کی ایک چال نے بساط الٹ دی۔ پولیس کو چاروں شانے چت کردیا۔"

مولوی خادم حسین سر کھجانے لگا "سمجھ تو آپ گئے ہوں گے۔ ایسی با محاورہ اردو کا میں کیا ترجمہ کروں۔ ویسے خاتون سے مجھے بھی اتفاق ہے۔"

غازی نے بڑی بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا "ابھی پاکستان کی پولیس سے پہلا سابقہ پڑا ہے بیٹے۔ آگے دیکھتے ہوتا ہے کیا۔"

میں نے کہا "خادم۔ اس لنگڑے صحافی سے کہو کہ پھر اس نے مجھے بیٹا کہا یا ہاتھ مارا تو میں اس کی بیساکھی سے اس کا سر توڑ دوں

گا۔" میں نے کہا "اور تم تک پہنچا ہو تو قطب شمالی بھی آجاؤں گا۔ میرے لیے دور نہیں۔"

غالب مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ کار بھی گئی تو میں بے فکری سے دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کے سڑک پر چلنے لگا۔ کسی اجنبی کی طرح میں ہزار بار کے طے کیے ہوئے راستوں پر ہر چیز کو ایسے دیکھتا رہا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں لیکن اس طرح میں گردو پیش پر نظر رکھ سکتا تھا۔

ابھی میں زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ پیچھے سے دلاور کی سبز رنگ کی ڈاٹسن کار بڑی تیزی سے آئی۔ اگر میں پہلے سے محتاط نہ ہوتا اور چھلانگ مار کے فٹ پاتھ پر نہ چڑھتا تو شاید کار مجھے کچل دیتی۔ ایک ساتھ وہ سب وحشیانہ انداز میں ہنسے جو کار میں تھے۔ پھر کار رک گئی۔ میں نے ان چار بدمعاش قسم کے افراد کو تھانے کے باہر دیکھا تھا ان میں سے دو پچھلا دروازہ کھول کے باہر آگئے۔ ان دونوں نے میرا راستہ روک لیا۔

ایک نے بڑک مار کے کہا "کھلو جا تھاں اتے وکیل دیا سو دیا" (رک جائیں وکیل کے سسر) اس نے بڑی آواز کے ساتھ کمانی دار چاقو کھولا۔

دوسرے نے بھی چمکیلے پھل والا خنجر میری پسلی سے لگا دیا "کنڈ دیاں آندراں ایتھے ای نہ کالے تیری فرنگی؟" (آنتوں کے ساتھ تیری فرنگی بھی نکال دوں؟)

میں نے خوف زدہ ہوکے ہاتھ اوپر اٹھائے اور فرنچ میں کہا "میرا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔"

وہ سمجھے کہ میں ان سے تشریف آوری کا مقصد پوچھ رہا ہوں۔ گاڑی میں سے سر نکال کے ڈرائیور نے کہا "اوئے پاگل دے پتر۔ جلدی کام کروا اپنا۔ خبردار جو اسے خراش بھی آئی۔"

ایک خنجر والے نے اشارے سے کہا "ٹیپ ریکارڈر؟"

میں نے سر ہلایا اور چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر اسے دے دیا۔ کسی مزاحمت کے بغیر یہ ان کے لیے بڑی غیر متوقع کامیابی تھی۔ اب دوسرے نے اشارے سے پیپر ویٹ مانگا۔ "پیپر ویٹ۔ فنگر پرنٹ؟"

میں نے کچھ دیر سوچا اور دوسری جیب میں سے دلاور کے فنگر پرنٹ والا پیپر ویٹ بھی دے دیا مگر اس کے ساتھ ہی میں فرنچ میں احتجاج بھی کرتا رہا۔ میں نے پولیس اور رپورٹ کے الفاظ بھی استعمال کیے تھے کہ وہ اندازہ کرلیں کہ میں ان کے خلاف پولیس کو رپورٹ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

"او جا اوے۔ سو واری جا پولیس کول۔"

دوسرے نے ناقابل اشاعت الفاظ میں یہ واضح کیا کہ پولیس کے پاس جاکے میں واپس کیسے آؤں گا۔ وہ قہقہہ مار کے ہنسے اور پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی چند منٹ میں غائب ہوگئی۔ یہ ساری کارروائی فٹ پاتھ سے ذرا ہٹ کے اندھیرے میں ہوئی تھی۔

گا۔"

خادم حسین نے ترجمہ کیا "وکیل صاحب فرماتے ہیں کہ میں اب اجازت چاہتا ہوں۔ آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔"

رابعہ نے کہا "اگر وکیل صاحب چاہیں تو میں انہیں ہوٹل چھوڑ سکتی ہوں۔"

میں نے جواب دیا "چاہتے تو ہم یہ ہیں کہ خاتون ہوٹل چلیں مگر چھوڑ کر نہ جائیں۔"

اب دوسرے لوگ رخصت ہوچکے تھے چنانچہ خادم حسین کی ضرورت بھی نہ رہی تھی۔ سورج غروب ہوچکا تھا اور سڑک پر بیشتر گاڑیاں ہیڈ لائٹس کے ساتھ چل رہی تھیں۔ خادم بھی چلا گیا تو میں نے کہا "فی الحال آپ لوگ بھی جائیں۔ جیسے سب گئے ہیں۔"

"کیا مطلب۔ تم ساتھ نہیں چلو گے؟" رابعہ بولی۔

"نہیں۔ میری چھٹی حس کہتی ہے کہ پوشیدہ آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں اور خفیہ ہاتھ میری گوشمالی کے لیے تیار ہیں" میں نے رابعہ سے اور پھر نازو سے رخصت ہونے کے انداز میں ہاتھ ملایا "میں پیدل جاؤں گا۔"

رابعہ متفکر ہوگئی۔ "یعنی انہیں موقع فراہم کروگے کہ پکڑلیں۔"

غالب نے کہا "اتفاق سے میری چھٹی حس کا تعلق بھی کچھ ہے لیڈیز میرا خیال ہے کہ آپ لوگ اپنی صورت گم کریں۔"

"بدتمیزی مت کرو۔" نازو بولی "اتنی بری تھی ہے ہماری صورت۔"

"فرق صرف الفاظ کا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تشریف لے جائیں۔ رہی صورت کی بات تو اس میں کیا شک ہے کہ بدصورتی ہے ہماری۔ ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔"

"خاک ہوتا۔ جھک مارتے پھرتے۔ کوئی منہ نہ لگاتا" نازو بولی۔

"منہ تم کب لگاتی ہو۔ کبھی منہ کے قریب نہیں آنے دیا۔" غالب نے تو بھری۔

میں نے کہا "دیکھو فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ تم دونوں گاڑی میں جاؤ۔ میں اور غالب بھی آفس پہنچ جائیں گے۔"

"لیکن۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ دلاور نے پولیس کے ساتھ مل کے جو چال چلی ہے اس کے جواب میں ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ نہیں سکتے۔ تم جاؤ۔ غالب تم بھی مخالف سمت میں پیدل روانہ ہوجاؤ اور سو قدم کا فاصلہ رکھ کے واپس میرے پیچھے آؤ۔"

"تم پیدل جاؤ گے؟" رابعہ مجبوراً نازو کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی "ٹیکسی لے لو۔ آفس تو بہت دور ہے۔"

"مشورے کا شکریہ۔ ضرورت پڑنے پر میں بحری جہاز لے کر

www.paksociety.com

سڑک پر سے گزرنے والی ہر گاڑی تانگے اور رکشا میں بیٹھا ہوا مسافر یا زرا نیم دیکھیے اندازہ کر سکتا تھا کہ اپنی خاموشی سے دائیں بائیں کوئی مجرمانہ فعل کا ارتکاب کر رہا ہے۔ بفرض محال میں چلا تا تب بھی کسی کے مدد کے لیے آنے سے پہلے ہی وہ اپنا کام کر کے نکل جاتے۔ میں رضاکارانہ طور پر دونوں چیزیں انہیں نہ دیتا تو وہ زبردستی میری تلاشی لیتے۔ اس میں یہ خطرہ تھا کہ وہ مجھ سے ریوالور بھی چھین کر لے جاتے۔

غالب چند منٹ بعد ہی پہنچ گیا "یہ دو ہی تھے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔"

"تم نے چاروں کی صورت دیکھی ہے نا؟"

"پہلی بار دور سے دیکھی تھی۔ اب اتنے قریب سے دیکھی ہے کہ بھول نہیں سکتا۔ تم کہاں تھے؟"

"جب انہوں نے خنجر نکالے تھے تو میں مشکل سے پچاس قدم کے فاصلے پر تھا اور فائر کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔"

"اب تیار ہو جاؤ اس کھیل کے آخری خطرناک سین کے لیے" میں نے کہا "تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ پولیس کیا گیم کھیل رہی ہے؟"

غالب نے اقرار میں سر ہلایا "میرے اور تمہارے خیالات کی حد بالکل متوازی چل رہی ہے۔ آخری راؤنڈ میں مقابلہ بس ہم دو کریں گے؟"

"رابعہ تو نازو کا ساتھ ہونا اشد ضروری ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ پھر رابعہ کہاں چھپے رہے گی۔" میں نے کہا "مجھے آج شدت سے نگل اور محسن کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ اکرام شیخ اور کاجل بھی ہوتے تو جانیں تھیں۔"

"اللہ ان سب کی مغفرت کرے۔" غالب نے ہاتھ اٹھا کے کہا "اب انہیں یاد کرنے سے کیا فائدہ جو گزر گئے۔ بارہیں چھوڑ کے بیویوں کو پیارے ہو گئے۔"

"مرزا جی۔ آج تم نے جس کیمرے سے تصویریں اتاری تھیں۔ کیا وہ مل سکتا ہے؟"

"بالکل مل سکتا ہے۔"

"اس میں فلم بھی ہوگی اس میں۔ کسی نے نکالی تو نہیں ہوگی؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "کیمرا میری الماری میں بحفاظت رکھ دیا گیا ہوگا۔ میری مرضی اور اجازت کے بغیر فلم کو کوئی نہیں چھوئے گا۔"

"وری گڈ۔ اب یا تو تم بقلم خود جا کے وہ کیمرا لاؤ۔ فلیش کے ساتھ ہو تو بہتر ہے۔"

"فلیش اسی کے ساتھ ہے۔"

"ایک اور کیمرا چاہیے جو اندھیرے میں تصویریں اتارے۔ اس حد تک صاف کہ صورت میں شناخت ہو جائے۔"

"بہتر تھا اگر اسی کیمرا ہو گر خود جا کے لانا پڑے گا۔ خدا کرے قلم ہو اس میں" غالب نے کہا۔

"اچھا تم جاؤ۔ میں بھی ذرا حلیہ بدل کے۔ پھر اسی جگہ ملیں گے" میں نے کہا۔

غالب نے گھڑی دیکھی "آدھ گھنٹے بعد۔"

"ایک گھنٹا زیادہ ہے۔ بس جا کے آنے میں جتنا وقت لگے" میں نے کہا اور قریب سے گزرنے والے ایک رکشا میں گھس گیا۔

رابعہ اور نازو بڑے جوش و خروش سے فتح کی روداد منظر کو سنانے میں لگی تھیں۔ . . رقار یوسف بڑی سعادت مندی سے ان کے لیے چائے بنا رہا تھا۔

"ہوں۔ تو کیا وہ جعلی رکیل جس کا ذکر ہو رہا تھا۔" منظر بولا "سالا فرنچ کٹ تھا۔"

میں نے کہا "خوب چل رہا ہے میری تعریف کرنے کے۔"

منظر نے قہقہہ مارا "ابے جوتی کے۔ یہ تعریف ہے؟! بے لیلیٰ اگر مجنوں کو اچھا نہیں کہے گی تو کیا اس کے گدھے کو اچھا کہے گی۔"

"تمہاری بیوی گدھے کو اچھا کہتی ہوگی تیرے مقابلے میں۔ شرط لگا لے۔"

منظر نے آہ بھری "سچ کہتا ہے سالا بد تو۔ سوال یہ ہے کس گدھے کے ہونے ہیں۔"

"فرنچ گدھے کے" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

منظر گلا پھاڑ کے ہنسنے لگا "ہو ہو ہو۔ بعض بڑے نیک ارادے ہیں تیرے۔ اللہ سہاب کرے۔ آمین ثم آمین۔"

رابعہ نے کہا "یہ تم نجانا آپ شاب بولتے رہتے ہیں انگریزی میں اور ہر وقت ہنستے رہتے ہیں۔"

"ہاں۔ تمہیں تو رونا ہی آ رہا ہوگا۔" منظر نے ذرا رو ٹھا رہتے ہوئے کہا "بات ہی ایسی ہے۔۔۔"

نازو اور رقار یوسف بھی مسکرانے لگے تو رابعہ کو بھی ہنسی آ گئی اور میں فوراً حلیہ بدلنے کے لیے اندر گھس گیا۔ زلفی نے میرا مسئلہ آسان کر دیا تھا۔ مجھے رکیل سے دوبارہ جو کیدار بننے میں دس منٹ بھی نہیں لگے۔ میں دروازے کے باہر نکلا تو منظر رخصت ہو رہا تھا۔

"یار میں بھی جا رہا ہوں واپس" میں نے کہا۔

"واپس کہاں۔ تھانے؟" منظر رک گیا "اب کیا سوجھی ہے؟"

میں نے کہا "رلاور کو ولاور ثابت کرنا ہے اور اس کا ثبوت حاصل کرنا ہے۔"

منظر نے ٹھنڈی سانس لی "میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیسے کیونکہ تیری بات میری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میری بات تو مانتا نہیں۔ ورنہ میں آ کے کر جوتی کے۔ جھگڑنے کے لیے ہم رہ جاتا۔"

"میرے ساتھ غالب بھی ہوگا یار۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

کی نوبت نہیں آئے گی مگر کوئی بات خلاف توقع ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں تب تو نہ بھی نہیں کریں گی کوئی صاحب۔"

"کیوں؟" رابعہ نے برا مان کے کہا "میں رہی کاؤنٹی جو میرا دل چاہے گا۔"

"نہیں کہ تمہارا کوئی کرداری نہیں ہے۔ تمہارا دل بہت اہم ہے" میں نے کہا اور پھر انہیں مختصراً اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔

غالب مجھ سے پہلے ملے منٹ جائے ملاقات پر موجود تھا "یہ بلائیں بھی ساتھ ہیں؟" اس نے نازو کی طرف دیکھ کے کہا۔

میں نے کہا "دیکھا؟ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اب خود سن لیا نا۔"

"تمہاری بلائیں تو میں دور رکھوں گی بعد میں۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "کیمرے لائے ہو؟"

غالب نے شولڈر بیگ آگے بڑھا دیا "دونوں کیمرے اس میں ہیں۔"

میں نے فلیش والا کیمرا رابعہ کو پکڑا دیا۔ "اس سے تم کو شاید ایک ہی تصویر کھینچنے کا موقع ملے گا۔ دوبارہ فلیش کے چارج ہونے میں ایک منٹ تو لگتا ہے اور اتنی مہلت تمہیں کوئی نہیں دے گا۔ تمہیں اپنی حفاظت بھی کرنا ہوگی اور کیمرے کی بھی۔ اگر اور کچھ نہ سوجھے تو تصویر اتارتے ہی بھاگ لینا۔ گاڑی لے کر بھاگ جانا۔"

رابعہ نے کہا "یہ ایک تصویر کب کھینچی جائے گی؟"

"تم پولیس اسٹیشن کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر گاڑی میں بیٹھ کے دیکھتی رہو گی۔ مجھے امید ہے کہ چوہدری دلاور اپنے اصل حلیے میں برآمد ہوگا۔ شاید اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا۔ ظاہری ایس پی عابد علی یا انسپکٹر خدا بخش۔ تمہیں ان کو فوکس کرنا ہے۔ اس طرح کہ وہ تھانے کے اندر نظر آئیں۔ فلیش ٹائٹ پر دو چار ٹیکیں گے۔ بہر حال یہ تصویر ہی اصل کام کرے گی۔ اس میں باقی تصویریں آج دن میں اتاری گئی تھیں اور جس واردات کا یہ ریکارڈ ہے اس کی رپورٹ کل کے اخبارات ضرور دیں گے۔ وقت اور تاریخ کے ساتھ۔ جو تصویر تم اتارو گی وہی ثبوت ہوگی کہ بعد میں اتاری گئی تھی۔ ہو سکے تو بالکل فکر مت کرنا۔ تصویر کو بچا کر کیمرے سمیت بھاگ جانا۔ کسی کو پیچھا کرنے کا موقع بھی نہ ملے۔"

"تصویر تھانے میں دلاور کی موجودگی کا ثبوت ہوگی۔ رات کا وقت اور آج کی تاریخ" رابعہ نے فوراً لہجے میں کہا۔

"اب تم جاؤ۔ موقع محل دیکھ کے پوزیشن لے لو" میں نے کہا۔

رابعہ نے سر ہلایا اور گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہو گئی۔ میں نے دوسرا کیمرا نازو کو دیا "تمہیں اندر کی عکاسی کرنی ہے۔"

"کیمرا لے کے مجھے اندر کون جانے دے گا؟!"

میں نے کہا "ابھی چل کے دیکھتے ہیں۔ راستہ بتاتے ہیں

"میری نظریں تو آج دن تمام ہوں گی جس رات یہ دونوں تم کو شرع کے مطابق قبول کر لیں گی۔ اور تمہارے وجود میں یہ جو فالتو پکا انرجی بھری ہوئی ہے تا یہ صرف ہوگی پیداواری مقاصد میں تو دنیا میں بڑا سکون ہو جائے گا۔ ابھی تو نافرمان اولاد کی طرح تم عاق کر دیے کے قابل ہو مگر کیا کریں۔ مجھ میں بھی شفقت پدری اتنی بھری ہوئی ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "جتنی ہماری پکا انرجی ہے۔"

منظر چلا گیا۔ تو نازو نے ماتھے پر تیوری ڈال کے کہا "میں تو سمجھی تھی کہ غالب اپنے آفس چلا گیا۔"

"آج افغان نے تم نے ٹھیک سمجھا تھا۔ لیکن وہ بھی آفس کو ہاتھ لگانے گیا ہے۔ خدا حافظ۔"

نازو اٹھ کھڑی ہوئی "تم ایسے نہیں جا سکتے۔ پہلے بتاؤ ہمیں بھی کہ کیا کرنا چاہتے ہو تم دونوں؟"

"کیا تو بہت رکھ چاہتے ہیں مگر جانے ہوئے شرم آتی ہے۔"

رابعہ نے کہا "میں بھی ساتھ چلوں گی تمہارے۔"

"ایسے نہیں۔ گا کے سناؤ۔ تمہارے سنگ میں بھی چلوں گی پیا جیسے پتنگ سنگ ڈور" میں نے زنانہ آواز بنا کے گایا۔

"یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ ہم تمہیں بے سہارا نہیں چھوڑ سکتے۔"

"چلو بابا چلو۔ غالب ٹھیک ہی کہتا تھا۔ بلائیں چمٹ گئی ہیں ہماری جان کو" میں نے کہا۔

"غالب ایسا نہیں کہہ سکتا" نازو بولی۔

"تمہیں کیا معلوم۔ تم اسی میں خوش ہو۔ مدد تمہارے منہ پر کہتا ہے مگر وہ ایک نمبر کا جھوٹا اور ریا کار ہے۔"

"بالکل تمہاری طرح؟" رابعہ نے دروازے کو مقفل کر دیا۔

"میری بات اور ہے۔ میں تو اتنا بھولا بھالا شرمیلا اور نیک ہوں کہ بس دل سے دعا نکلتی ہے۔"

"کس کے لیے؟"

"تمہارے لیے اور کس کے لیے۔ کہ اللہ تمہیں ایسی ہی اولاد دے۔"

"اب تم حد سے بڑھ رہے ہو" رابعہ نے خفگی سے کہا "بے ہودگی پر اتر آئے ہو۔"

"کیا کسی کو دعا دینا بے ہودگی ہے؟" میں نے نازو سے پوچھا "ہم تو یہی کہتے ہیں اللہ تمہیں اسد جیسی اولاد دے۔ فقیر کی جھولی میں تو سب کے لیے ہر قسم کی دعا ہے۔"

"فقیر صاحب۔ گاڑی چلاؤ چپ چاپ" رابعہ نے پیچھے بیٹھ کے کہا۔

"اچھا اب سنجیدگی سے سنو کہ میں تم دونوں کو ساتھ لے جانے پر کیوں تیار ہو گیا۔ کسی رشوت کے بغیر۔ تمہیں ایک ایڈونچر میں حصہ لینا ہے ہمارے ساتھ۔ اللہ سے امید تو یہی ہے کہ مار دھاڑ

www.paksociety.com

تمہارے لیے بھی۔ تم پولیس اسٹیشن کے پیچھے چلو۔ اس کی بیک سائڈ پر حوالات کی دیوار ہے۔ اس میں اوپر روشن دان ہیں جن میں سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔ بہت بدبودار جگہ ہے۔ تم وہاں انتظار کرو ہمارا۔"

پولیس اسٹیشن کی عمارت مستطیل تھی۔ صدر دروازہ سڑک کی جانب تھا لیکن پیچھے بھی گلی تھی۔ انتہائی بائیں طرف حوالات بنائی گئی تھی اور ایس ایچ او صاحب دائیں جانب بیٹھتے تھے۔ درمیان کے بیرک جیسے حصے میں ہیڈ محرر کا، ڈیوٹی افسر کا اور غالباً تفتیش کا کمرا تھا۔ ایک کمرا ہر تھانے میں ڈیوٹی دینے والوں کے آرام کا کمرا ہوتا ہے جس میں چارپائیاں نظر آتی ہیں اور جو فارغ ہوتے ہیں وہ وہاں سوتے رہتے ہیں۔

سامنے والے گیٹ سے گزر کے ایس ایچ او کے کمرے تک پہنچنا مشکل کام تھا۔ برآمدے میں کھلنے والے تین کمروں کے دروازے سے کوئی نہ کوئی اندر آنے والے کو ضرور دیکھ لیتا تھا۔ ایک سنتری مین گیٹ پر ہوتا تھا تو دوسرا حوالات کے فولادی گیٹ کے باہر۔ عموماً تیسرا ایس ایچ او کے کمرے کے باہر گھنٹی کے انتظار میں رہتا تھا اور گھنٹی بجتے ہی لپک کے اندر چلا جاتا تھا۔ اس کا یہ کام بھی تھا کہ فالتو لوگوں کو انچارج صاحب کے پاس نہ جانے دے اور ڈیوٹی افسر کے پاس بھیج دے۔

میں دائیں طرف سے گھوم کے گیا تو مجھے کھلی کھڑکی کے نیچے سے جھک کے جانا پڑا۔ کمرے کے اندر سے تھانہ انچارج کے علاوہ چوہدری دلاور کی آواز صاف سنی جا سکتی تھی۔ تیسری آواز کو بھی میں نے کسی دشواری کے بغیر پہچان لیا۔ وہ ڈی ایس پی شاہد علی تھا اگر میرے پاس چھوٹا ٹیپ ریکارڈر ہوتا تو میں ان سب کی گفتگو آسانی سے ریکارڈ کر سکتا تھا لیکن گلی میں لوگوں کی آمدورفت تھی۔ ایس ایچ او کی کھڑکی کے نیچے رُک کر باتیں سننے کی کوشش کرنے والا فوراً پکڑا جاتا۔

میں سیدھا آگے نکل گیا اور پھر گھوم کے اُلٹے ہاتھ پر عمارت کی لمبائی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ادھر چار کھڑکیاں نظر آ رہی تھیں لیکن دروازہ صرف ایک تھا جو عمارت کے وسط میں تھا اور غالباً بعد میں نکالا گیا تھا تاکہ پیچھے والی گلی میں پہنچنے کے لیے پوری عمارت کا چکر نہ لگانا پڑے۔ اشیائے ضرورت کی چند دکانیں پچھلی طرف ہی تھیں۔

غالب مخالف سمت سے میرے سامنے آ گیا "اندر جانا پڑے گا؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا! "اور اسی ایک دروازے سے۔"

دروازہ اچانک کھلا اور ایک شخص دھوتی بنیان میں باہر نکلا۔ غالب فوراً پیچھے ہٹ گیا مگر میں نے آگے بڑھ کے کہا "ملک صاحب ہیں ڈیوٹی پر؟"

"ملک؟ کون ملک؟ ہیڈ کانسٹیبل ملک احسان؟" اس نے میری وردی کو غور سے دیکھا "سیدھے ہاتھ پر دیکھ لو۔ سو رہا ہے۔"

"مہربانی۔" میں نے ایسے کہا جیسے میں اکثر وہاں آتا رہتا ہوں اور ملک احسان میرا لنگوٹیا ہے یا سالا۔ ملک یا شاہ تو کسی کے بھی نام کا حصہ ہو سکتا تھا۔ دھوتی بنیان والا کوئی چھوٹی موٹی چیز لینے گیا تھا۔ اس نے پلٹ کے بھی نہیں دیکھا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ غالب میرے پیچھے تھا۔ یہ تفتیش کا کمرا تھا جہاں ہر رات بربریت اور سفاکی، ظلم و تشدد کے نت نئے تجربات سے جرائم کا سراغ لگایا جاتا تھا۔ یہاں بھیانک آلاتِ تشدد میں ایسی چیزیں بھی نظر آتی تھیں جو عام گھروں کے کچن یا باتھ روم میں استعمال ہوتی ہیں۔ کپڑے دھونے والا ڈنڈا، لوٹا اور بالٹی یا کونڈی اور ... پولیس کے اذیت پسند ذہن کا کمال ہی تھا کہ وہ ان کو ... سے تشدد کے لیے استعمال کرتے تھے۔

میں نے بائیں طرف ملک احسان کو بھی نیند میں ملاحظہ کر لیا۔ غالب دائیں طرف گیا۔ مجھے اس کمرے میں ایک شخص کھڑا ہوا نظر آیا۔ وہ سرا اپنی وردی تبدیل کر رہا تھا۔ اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے قریب جا کے کہا "ابے ملک احسان صاحب ابھی سوئے ہیں؟"

"ہاں ابھی سوئے ہیں۔" اس نے دونوں ہاتھ اُٹھا کے لمبی انگڑائی لی اور اسی وقت مجھے موقع ملا کہ میں اسے بھی سلا دوں۔ اس کے ہاتھ انگڑائی کے انداز میں تھے کہ میں نے پیچھے سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کے کھینچ لیا۔ میرا ہاتھ اس کے منہ پر آ گیا۔ ایک خفا سر کے پیچھے کہنی سے میں نے اس کی کنپٹی پر ضرب لگائی تو وہ تڑپ کے ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے اسے فوراً چارپائی کے نیچے کے آگے کھسکا دیا۔ ملک احسان کے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ سوتا رہے۔ فوری طور پر اس کے جاگ اُٹھنے کا امکان نہیں تھا۔

میں واپس ہوا اور دائیں طرف والے کمرے میں جانے ہی والا تھا کہ باہر سے دھوتی بنیان والا ہاتھ میں صابن کی ٹکیا لیے نمودار ہوا "کیا ہوا؟"

میں نے کہا "ملک احسان تو ابھی سویا ہے، میں پھر آ جاؤں گا۔"

وہ سرہانے گزرنے لگا تو میں نے اسے دبوچ لیا اور دو منٹ بعد وہ ملک احسان کے ساتھ والی چارپائی پر سو رہا تھا۔ اس کی وردی غالب کے سائز کی تھی اور اس کے کام آ سکتی تھی۔ دائیں جانب غالب نے ایک شخص کے سر پر پیچھے سے ریوالور مار کے اسے ناک آؤٹ تو کر دیا تھا مگر اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ میں نے وردی اسے تھمادی "تم جاؤ نازو کو لے آؤ" غالب نے کہا "میں ابھی آیا ہوں۔"

میں نے زخمی اور بے ہوش پڑے ہوئے شخص کو دوسری چارپائی کے نیچے کر دیا جس پر ملک احسان دراز تھا۔

ہونے تک جاچی کو ہٹا کے اس کی جگہ لے لینا۔"

"اس کی جگہ میں کیسے لوں گا یار۔"

"اچھا پھر تم کٹ آؤٹ لے کے تھانے سے باہر جاؤ۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ رابعہ کہاں کھڑی ہوئی ہے۔ اس کی کار نظر آ جائے گی۔ رابعہ سے کہنا کہ کیمرا فوکس کرے اور فٹ پاتھ پر کہیں چھپ کے کھڑی ہو جائے۔ اس کی گاڑی لے کر تھانے کے مین گیٹ سے اندر آؤ اور احاطے میں دائیں طرف سے پیچھے پہنچ جاؤ۔ انچارج صاحب کے کمرے کی کھڑکی کے قریب۔"

"ٹھیک ہے۔ گیٹ پر کوئی روکے گا نہیں مجھے؟"

"گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں کسی کو پتا نہیں چلتا کہ اندر کون بیٹھا ہوا ہے۔" میں نے کہا "رابعہ سے کہنا کہ پریشان نہ ہو۔ ہم جاتے ہوئے اسے پک کر لیں گے۔ نازو تم گھوم کے پیچھے جاؤ۔ انچارج صاحب کے کمرے کی کھڑکی کے پاس انتظار کرو۔"

"تم ساتھ نہیں آؤ گے؟"

"نہیں۔ میں اندھیرا ہوتے ہی برآمدے کی طرف سے آؤں گا۔ انچارج کے کمرے کے باہر جو سپاہی کھڑا ہوا ہے اسے ناک آؤٹ کر کے دروازے سے اندر پہنچ جاؤں گا۔ اور اندر سے کنڈی لگا دوں گا۔ اتنی دیر میں تم تصویریں اُتار لینا۔ پھر تم کھڑکی سے اندر کود کے آ جانا۔ چار افراد سے نمٹنا ہو گا وہ آرام سے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر تو انہیں صورتِ حال کو سمجھنے میں اور سنبھلنے میں لگے گی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اسلحہ نکالیں ہم انہیں لمبا لٹا دیں گے۔ دلاور کو ہم کھڑکی کے راستے باہر لے جائیں گے۔ غالب وہاں پہلے سے گاڑی کے ساتھ موجود ہو گا۔"

"پھر رابعہ کا کیا بنے گا؟ وہ تصویر کیسے اُتارے گی؟"

"ظاہر ہے اسے کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں اس کو تمہارے ساتھ روانہ کر دوں اور خود وہاں انتظار کروں۔ جب افسران ہوش میں آئیں گے اور لائٹ بحال ہوگی تو بھاگ دوڑ شروع ہوگی۔ تم مجھے دونوں کیمرے دے جاؤ۔ میں اندھیرے میں ان کی تصویریں اُتارتا رہوں گا۔"

"اتنی دور سے کچھ پتا نہیں چلے گا۔"

"میں اس دوران میں قریب بھی جا سکتا ہوں۔" میں نے کہا "فلیش کیمرے کی تصویر آخری ہو گی۔ اس کے بعد ظاہر ہے میں فرار ہو جاؤں گا۔"

"ابھی وقت ہے۔ سوچ لو" نازو بولی۔

"سوچنے کا وقت نہیں ہے نازو۔ تم جاؤ۔ غالب تم بھی جاؤ۔"

اگلے پانچ منٹ میں بہت کچھ ہو گیا۔ غالب پولیس کی وردی میں تھا۔ کسی نے اس کی صورت پر غور نہیں کیا اور وہ اطمینان سے پچھلے دروازے تک پہنچ گیا۔ میں اسی کمرے میں تھا جہاں ملک احسان واقعی سو رہا تھا مگر اس کے ساتھ تین افراد بے ہوشی کی نیند میں

میں نے عمارت کے آخری حصے تک دوڑ لگائی جہاں نازو تاریکی میں بہت سی گاڑیوں کے ڈھانچوں کا معائنہ کر رہی تھی۔ یہ سب وہ گاڑیاں تھیں جو پولیس نے چوروں سے برآمد کی تھیں یا ضبط کی تھیں۔ ایسی گاڑیوں کے انجر پنجر عموماً ہر تھانے کے احاطے میں انصاف کی بھیک مانگتے نظر آ جاتے ہیں۔ انہیں قانونی الجھنوں سے گھبرا جانے والے مالک چھوڑ دیتے ہیں یا مقدمات کی طوالت سے تنگ آنے والے۔ پھر ان لاوارث گاڑیوں کو کسی کی "سپردگی" میں دے دیا جاتا ہے جو اچھی حالت میں ہوں۔ سپردگی کا مطلب یہ ہے کہ اصل مالکان کا پتا چلنے تک کوئی ان کی حفاظت کرے گا۔ یہ "کوئی" ہمیشہ انہی کے بھانجے بھتیجے ہوتے ہیں جو اس ملک کے کروڑوں عوام کی تقدیر کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ ناکارہ گاڑیوں کے پرزے ٹائر ٹیوب غائب ہوتے رہتے ہیں اور کباڑی بازار پہنچ جاتے ہیں۔

"یہاں تو واقعی سخت بدبو ہے۔"

میں نے کہا "ادھر گندا نالا ہے اور حوالات کے قیدیوں کی ساری غلاظت بھی بہہ کے آتی ہے۔ اس سوراخ کے راستے جو تمہیں نظر آ رہا ہے۔"

"وہ حوالات کے اندر ہی سب کچھ کرتے ہیں؟"

"اور کیا حوالات میں اٹیچ باتھ ہوتا ہے؟" میں نے کہا "حوالات ایسی انسانیت سوز جگہ ہے جہاں شاید کتے کو باندھ دیا جائے تو وہ عفونت سے مر جائے۔"

غالب وردی پہنے باہر کھڑا تھا۔ "ابھی ابھی ایس پی پہنچا ہے۔"

"اچھا! انچارج کے کمرے میں ہیں سب لوگ؟"

"اور کہاں ہو سکتے ہیں مگر وہاں پہنچنا مشکل کام ہے۔ ساتھ والا کمرا ہیڈ محرر کا ہے۔"

"وہاں کتنے لوگ ہیں؟"

"ایک تو وہ خود ہیڈ محرر ہے۔ فریادی اور ملزمان زیادہ ہیں۔ پہلے دو پارٹیاں تھیں جو ایک دوسرے کے خلاف مارپیٹ کا پرچہ کٹوانے آئے تھے۔ اب آرام سے حوالات میں بیٹھے ہیں سب۔ تین آدمی رہ گئے ہیں مگر اور آ جائیں گے باہر سے۔"

"پھر کیا کریں؟"

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔"

"وہ کیا... جلدی بولو۔"

"میں لائٹ بند کر رہا ہوں۔ میں نے مین سوئچ دیکھ لیا ہے۔ نازو گھوم کے باہر جائے اور اندھیرا ہوتے ہی کھڑکی سے تصویریں اُتار لے۔ ایک دم اندھیرا ہو گا تو اسے کوئی بھی نہیں دیکھ سکے گا۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ مین سوئچ آف کرنے کے ساتھ ہی کٹ آؤٹ بھی نکال لینا۔ پھر تم سیدھے نکل جانا برآمدے میں انچارج صاحب کے کمرے کی طرف اور کسی طرح وہاں کھڑے

www.paksociety.com

پڑے ہوئے تھے۔ ایک ساتھ والی چارپائی پر اور وہ ان کے نیچے۔
اندھیرا ہوتے ہی مختلف لوگ چلائے "اوئے کیا مصیبت ہے۔"

کسی نے کہا "پھر لائٹ چلی گئی۔ موم بتی جلاؤ بھئی۔"

"یہ جمعرات عمر لوڈ شیڈنگ ہے۔ سو گھوما پتا ہی لوٹ زائد ہو گا۔"

میں اندھیرے میں سیدھا چلتا ہوا برآمدے سے گزر گیا۔ انچارج کے کمرے کے باہر کھڑا ہوا سپاہی وہاں موجود نہیں تھا۔ اسے اندر بلا لیا گیا تھا۔

میں نے انچارج کی آواز سنی "اوئے بے وقوف۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ لائٹ چلی گئی ہے۔ جا کے موم بتی لا کہیں سے۔"

سپاہی سرپٹ دوڑتا ہوا تیزی سے باہر نکلا اور میرے قریب سے گزر گیا۔ میرا کام کچھ آسان ہو گیا تھا۔ میں دروازے سے بالکل سامنے والی کھڑکی کو دیکھ سکتا تھا جو پوری کھلی ہوئی تھی۔ اسی میں مجھے نازو کا سایہ نظر آیا۔ وہ سر اٹھا کے ایک تصویر اتارتی تھی اور پھر نیچے ہو جاتی تھی۔ فلم کو ری وائنڈ کرنے میں شاید پانچ سیکنڈ لگتے تھے تو تصویر اتارنے میں اس سے بھی کم۔

ایک منٹ بعد میں اندر داخل ہو گیا۔ میرے دروازہ بند کرتے ہی اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کو گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اس سے پہلے شاید وہ سمجھے تھے کہ میں موم بتی لے کر آیا ہوں۔

"خبردار۔ کوئی اپنی جگہ سے ہلا" میں نے کہا "میرے پاس ریوالور میں سائلنسر لگا ہوا ہے۔"

اس دھمکی کا اثر ہوا اور وہ ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ پر منجمد ہو گئے۔ اسی لمحے میں نازو کھڑکی سے اندر آئی۔ اس کا پہلا نشانہ انچارج ہی تھا جو زیادہ قریب تھا۔ اس کی پشت کھڑکی کی طرف تھی لیکن گردن کرسی کے اوپر بھی نظر آ رہی تھی۔ نازو نے اسی کو نشانہ بنایا ہو گا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔

میرا پہلا شکار ڈی ایس پی تھا۔ اگر وہ کھڑا نہ ہوتا تو زندہ رہتا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو کنپٹی پر لگنے والی کھڑی ہتھیلی کا بھرپور وار اس کی گردن پر پڑا۔ اس کی گردن خاصی موٹی تھی۔ مگر ضرب اتنی شدید تھی کہ ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ میری نظر نے اس وقت دلاور کو اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھاتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اس کے بازو پر لات ماری اور پھر اس کی ٹھوڑی کے نیچے گردن کے سامنے والے حصے پر ضرب لگائی تو اس کی آواز حلق میں گھٹ کے رہ گئی اور وہ کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

نازو نے بھی انسپکٹر ظفر حیات کو ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ اب ہمارا راستہ صاف تھا۔ باہر سے سپاہی نے دروازہ بجانا شروع کیا "سر جی موم بتی لایا ہوں میں۔"

کسی اور نے چلا کے کہا "دروازہ اندر سے کیوں بند ہے؟"

"اوئے۔ شور مچایا کیسا ہے؟" کوئی اور بولا۔

میں نے نازو سے کہا "چلو تم باہر نکلو۔ دیکھو غالب آیا یا نہیں۔"

نازو پھر کھڑکی سے نکل گئی۔ میں نے دلاور کو بغلوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا تو ساتھ ہی کرسی بھی لڑھک گئی۔ دلاور کو میں نے کھڑکی کی دہلیز پر رکھا اور خود اس کے اوپر سے گزر گیا۔ نازو نے کسی حد تک دلاور کو سنبھال لیا تھا۔ غالب کو گاڑی کے ساتھ دیکھ کے میری جان میں جان آئی۔ اس نے دلاور کو اٹھانے میں مدد دی۔ ہم دونوں نے اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔

نازو نے بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیا اور ڈرائیونگ سیٹ کی جگہ بیٹھ کے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ میں دلاور کے اوپر گرا اور گیٹ بند کر دیا۔ غالب نے آگے بیٹھ کے ریوالور نکال لیا۔

"جو راستہ روکے اسے شوٹ کر دو" میں نے کہا۔

"گاڑی اوپر سے گزار دینا اگر کوئی سامنے آ جائے" غالب نے نازو سے کہا۔

اندر اب خاصا ہنگامہ برپا تھا۔ لوگ انچارج صاحب کے کمرے کا دروازہ توڑ رہے تھے۔ نازو نے ایک دم کار کو ریورس کیا اور گاڑی کسی زخم خوردہ وحشی جانور کی طرح فراٹے بھرتی آگے بڑھی۔ گیٹ پر کھڑا ہوا سنتری چھلانگ مار کے ایک طرف گر گیا تو اس کی جان بچ گئی۔ کار تیزی سے سڑک پر آئی اور دائیں جانب مڑی۔ مخالف سمت سے آنے والی ایک کار نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بچایا ورنہ دونوں کاروں میں خوفناک تصادم ہوتا۔

"تم پھر رابعہ کا خیال رکھنا۔" میں نے کہا۔

نازو نے بریک لگائے اور کار سڑک کی رگڑ سے چیخنے لگی۔ اب دلاور کے اوپر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ساتھ والا دروازہ کھول کر قریب آتے ہی رابعہ کو اندر کھینچ لیا۔ اس نے دروازہ بند بھی نہیں کیا تھا کہ نازو نے پھر گاڑی کا ایکسیلیٹر دبا دیا۔ میرے ساتھ رابعہ بھی چوہدری دلاور پر سوار تھی۔

"ابھی مجھے یقین نہیں آتا" رابعہ نے کہا۔

میں نے کسی کا خیال کیے بغیر اسے چوم لیا "جانم شکار بالآخر شکار ہو گیا۔"

"تم اسے اغوا کر لائے کسی پروگرام کے بغیر۔"

"کسی پروگرام کے بغیر میں تم پر بھی عاشق ہو گیا تھا" میں نے قہقہہ مار کے کہا "پروگرام سے زندگی میں مشکلیں ہیں ہم بیٹھ نہیں سکتے۔"

غالب نے پلٹ کے دیکھا "ایک تصویر بنا لو۔ شکاری شکار کے بعد اس کی لاش پر پاؤں رکھ کے بنواتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "نازو گاڑی روکو۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے اس کے اوپر بیٹھے۔ اسے سیدھا بٹھاؤ۔"

نازو نے گاڑی روکی۔ اس وقت تک ہم تھانے سے بہت دور نکل گئے تھے اور خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ دلاور بدستور

بے ہوش تھا۔ میں نے اسے درمیان میں سیٹ کا سہارا دے کر بٹھا لیا۔ اس کے ایک طرف رابعہ اور دوسری طرف میں بیٹھ گیا تو گاڑی پھر روانہ ہوئی۔

رابعہ بولی "اب یہ بھی تو سوچو کہ اسے لے کر کہاں جائیں گے؟"

"ابھی تو چلتے ہیں تمہارے آفس۔ وہاں چوکیدار بھی نہیں ہے اور کل دوپہر تک کسی کی مداخلت کا اندیشہ بھی نہیں ہو گا۔"

"پھر اسے وہاں سے کیسے لے جائیں گے؟"

"ہم اسٹریچر پر بھی لے جا سکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اس وقت تک چوہدری صاحب خود تعاون پر آمادہ ہوں گے" میں نے کہا۔

غالب بولا "لیکن چوہدری دلاور کے اغوا اور تھانے پر حملے کی خبر پھیل چکی ہو گی۔ شک ہم پر کیا جائے گا۔"

"ہم کون...؟" میں نے کہا "صبح ہوتے ہی میں پھر فرنچ وکیل بن جاؤں گا۔ تمہاری اور نازو کی پوزیشن ویسے ہی محفوظ ہے۔ کیا تمہارے اخبار کے ساتھی اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ تمہارے حق میں گواہی دیں۔"

"ہم رات بھر اخبار کے دفتر میں تھے" غالب ہنسا "واہ بہت۔"

"اب رہی رابعہ۔ تو یہ تھی منظر کے گھر میں۔ دونوں جینئیر وکیل ہیں ان کا نام کون لے سکتا ہے" نازو بولی "منظر کو ہم فون کر کے بتا دیں گے کہ ہم کیا چیز اٹھا لائے ہیں۔ اور کہاں سے۔"

رابعہ کے آفس کی سیڑھیوں کے قریب گاڑی رک گئی۔ میں نے غالب کی مدد سے چوہدری دلاور کو اوپر پہنچایا۔ عمارت کا چوکیدار پہلے ہی مجھ سے غیر سرکاری چھٹی لے کر جا چکا تھا۔ اس وقت میں ہی چوکیدار بھی تھا۔

میں نے نازو سے کہا "اپنے چوہدری صاحب کی تلاشی لے کے انہیں بحفاظت رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔"

"کیوں؟ تم جا رہے ہو کہیں؟"

"ہاں۔ مجھے فلیٹ کے کمرے سے ایک تصویر اتارنی ہے" میں نے کہا۔

غالب بولا "تم یہاں چوکیداری کرو۔ تاکہ کسی کو خلاف معمول کچھ نہ لگے۔ میں جاتا ہوں۔"

میں غالب کے ساتھ نیچے تک گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ غالب کے جاتے ہی میں گرل بند کر کے گیٹ کو پھر لاک کر دوں گا۔ گیٹ کے بالکل سامنے نازو کی گاڑی تھی۔ اچانک ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی ہم پر آئی۔ پھر تیزی سے آنے والی ایک جیپ گاڑی کے پیچھے رک گئی۔ اس میں سے چار پولیس والے کود کے اترے۔ وہ سب مسلح تھے۔

"خبردار۔ ہلنا نہیں۔ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کے کھڑے ہو جاؤ۔"

کسی نے غرا کے حکم دیا۔

میں نے غالب کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے ہاتھ اٹھا دیے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تعاقب کرنے والے اتنی مستعدی کا ثبوت دیں گے اور ہماری کامیابی کی خوشی اتنی جلدی خاک میں مل جائے گی۔

پولیس کو دیکھتے ہی غالب یوں زینے کے پیچھے روپوش ہو گیا تھا کہ کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

ایک سب انسپکٹر نے پولیس کے روایتی خونخوار لہجے میں سوال کیا "یہ گاڑی ابھی یہاں آئی ہے؟"

میں نے سر ہلایا "ہاں جی۔ ابھی کوئی دس منٹ پہلے۔"

"جھوٹ کیوں بولتا ہے" اس نے ایک گالی دے کر گویا مجھے اپنے بیان میں تصحیح کا موقع فراہم کیا۔

"آٹھ نو منٹ ہوئے ہوں گے جناب عالی" میں نے لہجے میں انکساری یا خوف بھر کے چوکیدار کے احساس ذمہ داری کو غالب نہیں آنے دیا "میں نے تو اندازے سے بتایا تھا۔"

"گاڑی کس کی ہے؟"

"وکیل صاحب کی" میں نے کہا۔

"کون سے وکیل صاحب؟"

"وکیل صاحب۔۔۔ مس رابعہ قادری جناب۔ کسی اور کی مجال تھی کہ یہاں گاڑی کھڑی کرتا۔ اور بتائے بغیر میں بھی دروازہ نہیں کھولتا۔"

"فالتو بات مت کرو۔ جتنا پوچھا جائے اتنا بتاؤ" سب انسپکٹر بگڑ گیا۔ "اور کون تھا گاڑی میں؟"

"اور کون ہو گا جی۔ میں نے تو کسی کو دیکھا نہیں۔ ویسے گاڑی آپ کے سامنے ہے۔ آپ تلاشی لے لو" میں نے کہا۔

"اس وقت وکیل صاحبہ کو اکیلے آنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟" وہ غصے سے بولا "کیا کوئی آنے والا ہے یا پہلے سے موجود ہے؟"

"یہ تو وکیل کی مرضی ہے جناب عالی" میں نے کہا "اس کے دفتر میں کون آتا ہے کون جاتا ہے۔ خود اسے کون روک سکتا ہے کسی بھی وقت آفس آنے سے۔"

"اچھا چلو۔ انہیں بلا کے لاؤ" سب انسپکٹر نے مجھے حکم دیا۔

میں نے گیٹ کو پھر لاک کر دیا "میں بتاتا ہوں انہیں۔ آپ ٹھہریں۔"

سب انسپکٹر نے مجھے پھر گالی دی "۔۔۔ یہ گیٹ کیوں بند کیا ہے؟"

میں نے کہا "مجھے حکم ہے جناب عالی کہ اجازت کے بغیر کسی کو بھی اندر نہ آنے دوں۔ خاص طور پر رات کے وقت۔ مجھے اسی لیے چوکیدار رکھا گیا ہے۔"

پولیس کے ایک زیادہ حساس یا زیادہ گہری سوجھ بوجھ کے ماہر کانسٹیبل نے

www.paksociety.com

آگ بگولا ہو کے کہا "پولیس کا راستہ کون روک سکتا ہے۔ کھول دروازہ نہیں تو..."

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "مجھے آپ جتنی گالیاں مرضی دیں۔ میں غریب چوکیدار ہوں مگر یہاں سارے دفتر وکیلوں کے ہیں۔ انہوں نے مجھے خاص ہدایت دی ہے کہ وارنٹ نہ ہو تو ڈی آئی جی کے لیے بھی دروازہ نہ کھولوں۔ میں وکیل صاحب کو بلانے جا رہا ہوں۔ آپ دروازہ توڑ کے اندر داخل ہو سکتے ہو تو آ جاؤ۔"

سب انسپکٹر کا چہرہ غصے سے لال پڑ گیا مگر وہ طیش میں اپنے ہونٹ کاٹنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ اس کو اپنے اختیار کی حدود کا علم تھا اگر وہ نشے میں ہوتا تب بھی اپنے ماتحتوں کو یہ حکم نہیں دے سکتا تھا کہ اس بدتمیز چوکیدار کو گولی مارو اور دروازہ توڑ کے اندر چلے جاؤ۔ اس نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ میری عاجزی میں بھی مسخرا اڑانے کا انداز شامل ہے اور بے رتبہ ہونے کے باوجود میں اس کے اختیار و اقتدار کو چیلنج کر چکا ہوں لیکن وہ مجبور تھا کہ اپنے ماتحتوں کے سامنے اس بے عزتی کو برداشت کرے۔

ابھی تک غالب سیڑھیوں کی اوٹ سے میرے اور پولیس کے مذاکرات کے نتیجہ خیز ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اب اس نے رونمائی کا فیصلہ کیا اور یوں سامنے آیا جیسے ابھی ابھی اوپر سے اترا ہو۔

"ہاں بھئی چوکیدار۔ کیا بات ہے کیا ہنگامہ ہے یہ؟"

سب انسپکٹر معنی خیز انداز میں مسکرایا "دیکھا۔ ہم نے ٹھیک ہی سمجھا تھا۔"

اس کے فرمانبرداروں نے سو فیصد تائید کا اظہار گھڑے جیسا سر ہلا کے کیا۔

"جو تم نے سمجھا تھا وہ مجھے بھی سمجھاؤ تھانے دار صاحب" غالب نے کہا "ایک ان پڑھ چوکیدار کیا سمجھے گا تمہیں۔"

اس نے گھور کے غالب کو دیکھا "تم کون ہو اوئے۔"

"میں خدائی فوجدار ہوں جو تھانے دار، صوبے دار اور نمبر دار وغیرہ سے ذرا اونچی چیز ہوتا ہے" غالب نے کہا۔

"اوپر تم تھے۔ اور کون ہے اوپر؟"

"مجھ سے اوپر تو بہت ہیں اور بالآخر تم کو بھی اوپر ہی جانا ہے مگر اپنی باری پر۔ اس وقت تشریف آوری کا مقصد بیان کرو" غالب نے چٹکی بجائی۔

"بڑی اکڑ فوں میں ہے بندہ" سب انسپکٹر نے اپنے ماتحتوں کی طرف دیکھا "ذرا باہر آ کے بات کرو نا۔"

غالب نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے گیٹ کھول دیا "شاید اندر سے آواز صاف نہیں پہنچ رہی تھی تمہارے کانوں میں۔ اب بولو؟"

غالب کے اعتماد نے سب انسپکٹر کو محتاط کر دیا "وکیل ہو تم بھی۔ کیا نام ہے اس عورت کا جس کی یہ گاڑی ہے؟"

"رابعہ قاری" ایک کانسٹیبل نے سعادت مندی سے کہا۔

"ہاں۔ رابعہ قاری۔ ابھی ابھی بڑے ضروری کام سے اس گاڑی میں یہاں پہنچی ہے جہاں پہلے سے تم اس کے لیے چشم براہ تھے۔ ضروری کام تو شاید ابھی شروع بھی نہیں ہوا تھا۔"

سب انسپکٹر نے بیک وقت مجھے رابعہ کو اور غالب کو گالی دی تھی مگر حالات متقاضی تھے کہ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیں۔

غالب نے اپنا کارڈ اس کی ناک کے سامنے کر دیا۔ "اگر تم نے لی ہوئی ہے تو نصیحت اسی میں ہے کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کر فضول بولنے کے نتیجے میں صبح تمہاری وردی بھی اتر جائے۔ ایک ساتھ وکیلوں سے اور صحافیوں سے پنگا لینے کا انجام زیادہ برا بھی ہو سکتا ہے؟"

سب انسپکٹر نے کارڈ کو غور سے پڑھا۔ وہ نیا اور نا تجربہ کار سب انسپکٹر تھا جو اختیار کے نشے میں زیادہ ہی آؤٹ ہو گیا تھا۔

"ابھی اخبار شائع نہیں ہوا۔ کیا میں تمہارے غیر قانونی چھاپے کی خبر دے دوں؟ یہاں بہت بڑے بڑے وکیلوں کے دفتر ہیں۔ ڈی آئی جی صاحب تمہاری کارکردگی کی خبر پڑھ کے خود تمہیں تمغۂ حماقت دینے آ جائیں گے۔ انہیں کیا معلوم پولیس میں تم جیسے بھی بھرتی ہو گئے ہیں۔"

سب انسپکٹر کی حالت غیر ہو گئی "آپ تو ناراض ہو گئے سر۔ یہ چھاپے کی بات تو ہم نے کی ہی نہیں۔ ہم تو بس رات کی ڈیوٹی پر گشت کر رہے ہیں۔ ادھر گاڑی آ کے رکی تو ہم نے پوچھ لیا۔ کہیں غلط قسم کے لوگ نہ ہوں۔ آپ لوگوں کی حفاظت کرتے ہیں ہم تو۔"

غالب نے اپنا کارڈ چھین لیا۔ "مجھے معلوم ہے سب کہ تم کیا کرتے ہو جو تمہیں نہیں کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرتے ہو جو کرنا چاہیے۔"

"اچھا جناب عالی غلطی معاف۔ غلط فہمی ہو جاتی ہے۔"

"یہ غلط فہمی نہیں۔ تم نے تعاقب کیا تھا اس گاڑی کا... آخر کیوں؟ ایک شریف عورت کو جو بہت معزز وکیل بھی ہے اس طرح ہراساں کرنے کا کیا مقصد تھا؟" غالب نے دہاڑ کے کہا۔

"ہم اتنی جرأت کر سکتے ہیں جی۔"

"مجھے خود میڈم نے بتایا ہے کہ تم ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ آخر کیوں؟ انہیں اغوا کرنا چاہتے تھے یا تمہیں شک تھا کہ وہ اپنی گاڑی میں کسی کو اغوا کر لائی ہیں؟"

"سر۔ اجازت ہو تو اندر آ کے ایک منٹ اکیلے میں کچھ عرض کروں؟" سب انسپکٹر نے لجاجت سے کہا۔

غالب نے راستہ چھوڑ دیا "اپنے بندوں سے کہو دور جا کے کھڑے ہوں۔"

سب انسپکٹر کے اشارے پر وہ تیتیوں کی طرح دور جا کھڑے ہوئے۔

تو میں اس کے گھر لے جاتا سب کو۔ بھوتوں کے ڈیرے پر پولیس چھاپا کیسے مار سکتی تھی۔" غالب نے کہا۔

میں نے اسے ٹوک دیا "مذاق نہیں۔ صورت حال کچھ دیر میں سنگین ہو جائے گی۔ ایس پی ظفر حیات صبح سے پہلے بھی تلاشی کے خصوصی وارنٹ حاصل کر سکتا ہے۔ اسے دلاور کا شک بھی ہوا کرتا ہے اور اپنی فرض شناسی ثابت کر کے نوکری بھی بچانی ہے۔"

"میرا تو دماغ کام نہیں کرتا" نازو بولی۔

"جو نہیں چیز کا کیا تو نقصان ہے۔ عین ضرورت کے وقت دغا دے جاتی ہے" غالب نے کہا۔

نازو نے اسے گھورا "تم باز نہیں آؤ گے؟ کیا میرا دماغ خراب ہے؟"

"خراب یا اچھی وہ چیز ہوتی ہے جو اپنا وجود رکھتی ہو۔ اس دنیا میں نہیں پائی جاتی ہو" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "رابعہ۔ انہیں لڑنے دو۔ تم فوراً دلاور کو ساتھ لے کر یہاں سے چلی جاؤ۔ آفس کو لاک کر جاؤ۔"

"مگر دلاور کے ساتھ۔ میں کہاں جاؤں؟" رابعہ گھبرا گئی۔

"فی الحال سیدھی منظر کے گھر چلی جاؤ۔"

"منظر کے گھر میں کیسے رکھا جا سکتا ہے دلاور کو؟"

"ایک رات ہی کی بات ہے" میں نے کہا۔

"صبح کیا ہوگا؟"

میں چڑ گیا "سب اسی وقت بتا دوں؟ کل کیا ہوگا' پر سوال کیا ہوگا؟ پولیس کا دھیان ادھر نہیں جا سکتا۔ دلاور کو ڈکی میں بند رکھو یا بے ہوش کر کے گیراج میں۔ صبح ہونے میں دیر ہی کتنی ہے۔ چھ آٹھ گھنٹے۔"

"اس کے بعد ہم کوئی جگہ دیکھ لیں گے" غالب نے کہا "میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہاں چھاپا پڑے گا۔"

رابعہ نے بے بسی سے کہا "منظر مشکل میں نہ پڑ جائے۔"

"وہ مشکل میں کب نہیں تھا۔ جب سے ہمارا اس کا ساتھ ہے وہ مشکل میں ہے" غالب بولا۔

"اسے بتا دوں سب۔؟"

"بتانا۔ چھپانے کی ضرورت بھی نہیں اور چھپانا ناممکن ہوگا۔ اسے بتانا کہ صبح دلاور کو کہیں شفٹ کر دیا جائے گا۔ پھر وہ سارے معاملات سنبھال لے گا۔ وہ گواہ بن جائے گا کہ تم اس کے گھر تھیں اور تم اکثر وہاں رات کو رک جاتی ہو چونکہ اس کے بچے پھوپی کو بہت چاہتے ہیں" غالب بولا۔

میں نے کہا "ویسے وہاں پولیس کے آنے کا ایک فیصد امکان بھی نہیں۔"

غالب نے کہا "میں اور نازو جاتے ہیں اپنے آفس۔ یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ خبروں میں کیا ہے؟"

"اور کیا نہیں ہے" نازو نے کہا۔

"دیکھیں جناب۔ ہم تو بہت معمولی حیثیت کے نوکر ہیں۔ ہماری وردی بھی اتروا کے آپ کو کیا ملے گا" سب انسپکٹر نے گیٹ کے اندر آ کے کہا "اوپر سے حکم آیا تھا کہ ایسی ایک گاڑی سڑک پر جہاں بھی نظر آئے اسے روک لو۔"

"ایس پی ظفر حیات کا حکم تھا؟"

سب انسپکٹر تقریباً اچھل پڑا "جی۔ نہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کہتے ہیں تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں سر۔ وائرلیس پہ سب کو پیغام دیا گیا تھا۔"

"کیا پیغام تھا؟"

وہ تذبذب میں پڑ گیا "آپ خبر بنا دو گے۔ میری نوکری۔"

"نہیں جائے گی تمہاری نوکری" غالب نے اسے تسلی دی۔

"آپ کسی کو بتاؤ گے تو نہیں؟"

"یار کیا اسٹامپ لکھ دوں۔؟"

اس نے میری طرف دیکھا "یہ بندہ کچھ مشکوک لگتا ہے۔"

"اگر تم کچھ بتانا نہیں چاہتے تو جاؤ میں خبر فون پر لکھواتا ہوں" غالب نے کہا۔

"نہیں سر۔ دراصل۔ یہ ایس پی صاحب آئے ہیں اسلام آباد سے کسی قتل کی تفتیش کے لیے۔ انہوں نے مجرم گرفتار کر لیے تھے۔ مجرموں کے کچھ ساتھیوں نے تھانے پر حملہ کیا اور انہیں چھڑا کے لے گئے۔ بس اس گاڑی کا......... نمبر تو نہیں بتایا تھا بس کہا تھا کہ اس قسم کی گاڑی ہے لیکن ایسی تو سو سو جانے کتنی گاڑیاں ہوں گی اور آپ معزز لوگ ہو۔ آپ کا اس واردات سے کیا تعلق۔ آپ کام کریں اپنا اور مجھے اجازت دیں" اس نے صورت حال کی وضاحت کے بعد بڑی عقیدت کے ساتھ غالب سے مصافحہ کیا اور پھر خیرسگالی کے جذبات کو فروغ دینے کے لیے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔

اس کے جاتے ہی غالب نے کہا "یہ جگہ اب قطعی محفوظ نہیں رہی۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "پولیس کو شک ہو گیا ہے کہ یہ کارروائی ہماری ہے۔ وہ یقیناً ایم آر ایس کے بارے میں جانتا ہوگا۔ چلو رابعہ سے بات کرتے ہیں۔"

اس صورت حال نے رابعہ کو بھی پریشان کر دیا "اگر بات شک تک محدود ہے تب بھی ٹھیک نہیں۔ یہ سب انسپکٹر رپورٹ ضرور دے گا کہ اس قسم کی ایک گاڑی میں رابعہ قاری ایڈووکیٹ آدھی رات کے وقت آفس پہنچی تھیں اور وہاں مرزا غالب نام کے صحافی بھی پائے گئے پھر شک کی بات نہیں رہے گی۔ اس عمارت کی نگرانی ہوگی۔"

نازو نے کہا "یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ اب اس وقت ہم کہاں جا سکتے ہیں اور وہ بھی دلاور کے ساتھ۔"

"اگر اپنے بھوت سسر کے ساتھ میرے اچھے تعلقات ہوتے

www.paksociety.com

"سو گیا میں غریب چوکیدار۔ پولیس وارنٹ لے کر آئے تو میں کیا کروں؟" میں نے کہا۔

"تم منظر کے گھر فون کر کے رابعہ کو اطلاع دینا۔ پھر اخبار کے دفتر فون کر کے مجھے بتانا۔"

میں نے کہا "یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے فون نہ کرنے دیں۔ ان کی نظر میں ایک چوکیدار کی کیا وقعت ہے۔ میں نے مزاحمت کی تو وہ ٹھڈوں پر اتر آئیں گے۔"

"تم انہیں مت روکنا۔ کریں جو ان کا دل چاہے۔ اگر وارنٹ ہوگا ان کے پاس تب بھی وہ ناکام رہیں گے۔ یہ کوئی جوئے کا اڈا یا کسی کا عقوبت خانہ نہیں ہے۔ ایک بلڈنگ فرم کا آفس ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"یہاں کوئی غضب کیوں نہیں کیا جا سکتا؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "اس کے لیے وقت نہیں ہے اور پھر فائدہ بھی کیا ہوگا اس سے۔ ان کی کارروائی عین قانون کے مطابق ہوگی۔ مجسٹریٹ یقیناً ان کے ساتھ ہوگا۔"

دس منٹ بعد چوہدری دلاور کو گٹھری بنا کے پھر رابعہ کی گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ وہ ہوش میں آنے لگا تھا۔ ماجد نے ایک ہاتھ مار کے اسے پھر بے ہوشی کی دنیا میں پہنچا دیا۔ جب تک ان کی گاڑی روانہ نہیں ہو گئی میں سخت تشویش میں مبتلا رہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اچانک ادھر اُدھر سے پولیس کی گاڑیاں نمودار نہ ہو جائیں۔

پروگرام کے مطابق رابعہ کو اخبار کے آفس میں سب ایڈیٹر ماجد کو ڈراپ کرنا تھا اور پھر منظر کے گھر جانا تھا۔ میں نے لائٹ بجھا کے اپنا بستر گیٹ کے قریب بچھایا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے لیٹ گیا۔ نیند آنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ دلاور کی گرفتاری کے خیال سے میرے جسم کے رونگٹوں میں سنسنی بھر گئی تھی اور شدید اضطرابی کیفیت میں میرے اعصاب پر سخت دباؤ تھا۔ شاید میری ایک خواہش پوری ہو گئی تھی۔ بالآخر ہم سب نے قانون کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ دلاور پر مجرم کی حیثیت سے ہاتھ ڈالے۔ اس پر جرم ثابت کرنا اور اسے تختہ دار تک پہنچانے کے مرحلے ابھی باقی تھے۔

پولیس نے دو گھنٹے بعد دھاوا بولا۔ میں ایک کروٹ پر لیٹا ہر سمت سے یلغار کرنے والے مچھروں کو بھگانے میں مصروف تھا۔ میرے جسم کے کھلے حصوں سے میرا لہو چوسنے کے ساتھ میرے کانوں میں خوشی کے شادیانے بھی بجا رہے تھے۔ ظاہر ہے میں اکیلا ان کی افواج کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

تیز روشنی اور گھن گرج کے ساتھ پولیس کی تین گاڑیوں پر مشتمل پولیس فورس نے بڑی مستعدی سے عمارت کا محاصرہ کر لیا۔ یہ افسران بالا کی خوشنودی حاصل کرنے، انہیں بدنامی سے بچانے اور ان کے مفادات کے تحفظ کا مسئلہ تھا۔ عام دنوں کے لیے وہ قلم اٹھا کے رپورٹ لکھنے کی زحمت بھی بڑی مشکل سے کرتے ہیں۔

گاڑی سے اترنے والا ڈی ایس پی شاہد علی تھا۔

ڈی ایس پی شاہد علی کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا وہ یہ کہ شاہد علی تھانے میں میری کنپٹی کی ضرب سے ہلاک ہو چکا تھا لیکن وہ زندہ تھا۔ گویا مرنے والا کوئی اور تھا جسے میں نے اندھیرے کی وجہ سے شاہد علی سمجھا تھا۔

ڈی ایس پی شاہد علی نے مجھے حکم دیا "دروازہ کھولو۔"

پولیس کی گالی کا اب کوئی اس لیے برا نہیں مانتا کہ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہوتے ہیں۔ کرخت آواز میں بھونکنے والے کتے سے یہ توقع کون رکھتا ہے کہ وہ شرافت اور نرمی سے بلی کی طرح ایک بار "میاؤں" کرے اور خاموش ہو جائے۔ میں تالا کھول کے انہیں خوش آمدید کہنے کے انداز میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

شاہد علی کے ساتھ ہی دو درجن بھر باوردی اندر آ گئے۔ ان میں سے تین دائیں طرف چلے گئے اور تین بائیں جانب۔ باقی نے اوپر کا رخ کیا۔

میں نے تھر تھر کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑ کے پوچھا "مائی باپ آخر معاملہ کیا ہے؟"

شاہد علی کے بعد آنے والے سویلین نے جو خود کو زیادہ مہذب، سنجیدہ اور بارعب ثابت کرنا چاہتا تھا میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا "ہم عمارت کی تلاشی لیں گے۔ میں ایس ڈی ایم ہوں اور میرے پاس تلاشی کا وارنٹ ہے۔"

شاہد علی نے کاغذ کا ایک پرزہ مجھے تھما دیا "ہم کوئی بھی غیر قانونی کام نہیں کرتے۔"

میں نے زیر لب کہا "[illegible]۔"

"کیا کہا ہے تم نے؟"

"یہی جناب کہ آپ سچ فرماتے ہیں۔ آپ قانون کے رکھوالے ہیں۔ یہاں قانون داں اپنا کام کرتے ہیں۔"

"اوپر چل کے رابعہ قاری ایڈووکیٹ کے آفس کا تالا کھولو۔" مجسٹریٹ نے مجھے حکم دیا۔

"میں تو جناب باہر کے گیٹ کا چوکیدار ہوں۔" میں نے اردو، سرائیکی اور پنجابی کا ملغوبہ بنایا "باقی سب کے اپنے اپنے آفس ہیں اور ان کی چابیاں وہ ساتھ لے جاتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں" مجسٹریٹ نے شاہد علی کو مخاطب کیا "تالا توڑ دو۔"

"آپ انہیں فون کر کے گھر سے بلا لیں سر۔"

"بکو مت۔ ہمیں تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں" شاہد علی بولا۔

"تم تلاشی کے دوران ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو اجازت ہے۔" مجسٹریٹ بولا "تم گواہی دو گے کہ پولیس نے کوئی توڑ پھوڑ نہیں کی، ریکارڈ کو نہیں چھیڑا اور کوئی چیز ساتھ نہیں لے گئے۔"

"مائی باپ۔ پھر تلاشی لینے کا مقصد کیا ہے؟" میں نے کہا۔

لیے ایک بانڈی ہے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "بندے بے ایمان تو نہیں ہیں نا؟ آج کل میں جن کے ساتھ ہوں وہ بڑے مکار ہیں۔ حصہ رسد بے وقت زندگی میں مادہ پڑتے ہیں۔"

شاہد علی نے دہاڑ کے کہا "ارے تم دونوں کیا راز و نیاز کر رہے ہو؟"

مخلص کانسٹیبل نے بڑی بے خوفی سے کہا "سر جی میں اس نتیجے کے کھوج سے پوچھ رہا تھا کہ بندے اس عمارت میں کہیں چھپے ہوئے ہیں تو بتا دے ورنہ بعد میں پولیس برآمد کرے گی تو سب کے ساتھ میرے عدم تعاون کی سزا کیا ہوگی اسے ناقابل اشاعت سمجھا جائے۔"

ڈی ایس پی شاہد علی نے تعریفی نظروں سے اپنے ذہین ماتحت کو دیکھا "ٹھیک ہے ذرا اچھی طرح پوچھ اس سے۔" پھر وہ دوسروں کی طرف متوجہ ہو گیا جو مجسٹریٹ کی واضح ہدایات کے باوجود ایسے مقامات پر انسان کو تلاش کر رہے تھے جہاں سے انسان تو کیا چوہا بھی برآمد نہیں ہو سکتا تھا۔

"چوکیداروں سے اپنا بڑا یارانہ ہے۔ وہی کچھ مخبری کرتے ہیں۔ ابھی دو ہفتے پہلے پتا چلا تھا کہ پلاٹ کا سودا ہوا ہے اور ادائیگی شام کو ہوئی۔ پیسہ رات بھر گھر میں ہوگا۔ چار لاکھ ہاتھ لگے تھے مگر میرے ساتھ دھوکا ہوا۔ بیس ہزار دیے کہ تجوری میں کچھ نہیں تھا۔ رقم تو الماری میں سے ملی تھی اور الماری پہلے سے کھلی ہوئی تھی۔ یہ تو بڑی غلط بات ہے۔ میں تجوری کھولتے ہوئے پکڑا جاتا تو سب بھاگ جاتے۔ کوئی میرے ساتھ مارا جاتا؟ پھر میرا حصہ کم کیوں؟"

میں نے آہ بھری "دنیا میں انصاف کہاں ہے بابو۔ مگر خیر یہ بانڈی ایسی نہیں ہے۔ میں بتاؤں گا تمہیں۔"

تلاشی لینے والے اپنی ناکامی کا اعلان کر چکے تھے۔ "یہاں کوئی نہیں ہے سر جی۔"

"چھت پر جا کے دیکھو" شاہد علی نے کہا۔

"ہاں۔ کہیں وہ چھت پر سے کود کے فرار نہ ہو گئے ہوں" میں نے کہا۔

شاہد علی نے مجھے خونی نظروں سے دیکھا "ہم سے مذاق کرتا ہے۔"

مجسٹریٹ نے اسے روک لیا ورنہ اس کا ہاتھ مجھ پر اٹھ جاتا "تمہیں صرف تلاشی لینے کا اختیار ہے۔ مار پیٹ کا نہیں۔ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ یہ کل مجھے گواہ بنائے گا کہ پولیس نے اس پر تشدد کیا تھا۔"

میں نے کہا "میں بیگم صاحبہ کو اطلاع دینا چاہتا ہوں۔"

"کس بات کی؟"

"جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اس کی" میں نے کہا "اچھا ہے اگر وہ

"ہمیں اطلاع ملی ہے کہ کچھ دہشت گرد ایک شخص کو اغوا کر کے یہاں لائے ہیں۔ ہمیں صرف ان مجرموں کو گرفتار کرنا ہے۔" مجسٹریٹ نے گول مول جواب دیا۔

شاہد علی نے مجھے آگے دھکیلا "زیادہ جرح مت کر۔ آگے چل۔"

میں لڑکھڑا کے سنبھلا اور اوپر چلا گیا۔ پولیس ہر ممکن احتیاط سے کام لے رہی تھی کیونکہ معاملہ قانون کی جنگ لڑنے والوں کا تھا جو معمولی غلطی کو بھی بہت بڑا جرم بنا سکتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ تالے کھولنے کا سامان اور ایک ماہر فن کو بھی لائے تھے۔ ماہر فن بھی پولیس کی وردی میں تھا۔ غالباً اس نے تالے کھولنے کی تربیت سند یافتہ چوروں سے حاصل کی تھی اور پھر محنت، ہاتھ اور صلاحیت سے اس کام میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ چٹکی بجاتے میں اس نے رابعہ کے آفس کا دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہو کے لائٹ جلا دی۔

پولیس کے نصف درجن جوان یوں اندر داخل ہوئے جیسے اندر سے انہیں خوفناک مزاحمت کا اندیشہ ہو اور مجرم جواب میں توپ اور ٹینک خانے سے مشین گنوں اور دستی بموں سے حملہ کر دیں گے۔ اندر کسی کو نہ پا کے وہ خاصے مایوس ہوئے۔

شاہد علی نے کہا "تم بھی اچھی طرح دیکھو ہر جگہ۔"

مجسٹریٹ نے انہیں خبردار کیا "کسی فائل کو ہاتھ مت لگانا۔ دراز بھی مت کھولنا اور کوئی چیز گرانا نہیں۔"

شاہد علی نے برا سا منہ بنایا "اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے مجسٹریٹ صاحب۔ چھاپا تو چھاپا ہی ہوتا ہے۔"

"ہاں مگر جواریوں کے اڈے پر اور وکیلوں کے آفس میں چھاپا مارنا ایک بات نہیں ہوتی۔ آدمی درازوں میں یا فائلوں میں نہیں مل سکتے۔ بس الماریوں میں، باتھ روم میں اور ایسی جگہ دیکھ لو جہاں کوئی چھپ سکتا ہے۔"

تالا کھولنے والا اس کارروائی میں عملی حصہ نہیں لے رہا تھا اور ایک طرف کھڑا جمائیاں لے رہا تھا۔ غالباً اسے سوتے سے اٹھا کے لایا گیا تھا۔

میں نے اس سے سرگوشی میں کہا "تم کہاں پولیس میں پھنس گئے؟"

"کیا مطلب ہے آخر اس فضول بات کا؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "یہی کام تم دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کے کرنے، جو پولیس کی طرح وقت ضائع نہیں کرتے، تالے کھولتے ہیں، تجوریوں کے اور مال سے بھری ہوئی الماریوں کے نقد زیورات، پرائز بانڈ سمیت کے ساتھ لے جاتے ہیں۔ خالی ہاتھ نہیں لوٹتے۔"

اس پر رقت طاری ہو گئی "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔"

میں نے رازداری سے کہا "تم کہو تو میں بات کروں تمہارے

www.paksociety.com

خود دیکھ لیں اپنی آنکھوں سے۔"

مجسٹریٹ اجازت دینے پر آمادہ نظر آتا تھا اور شاہد علی کی صورت پر ناخوشی کے آثار تھے مگر کسی کے انکار یا اقرار سے پہلے دھماکا ہو گیا' مرزا غالب نے یوں قدم رنجہ فرمایا کہ خود میں بھونچکا رہ گیا۔

"چوکیدار۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" غالب نے سخت برہمی کا اظہار کیا۔ "کیا کوئی قتل ہو گیا ہے؟ پولیس کیا کر رہی ہے یہاں؟"

"اپنا وقت ضائع کر رہی ہے جناب' میری نیند تو خراب۔۔۔"

"تم کو کے بچے۔ سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے کہ ہم خانہ تلاشی کے وارنٹ لے کر آئے ہیں" ڈی ایس پی شاہد علی نے دانت پیس کے کہا "تم کو بھی دکھا چکے ہیں۔"

"لیکن کیوں۔۔۔ ایک بگل فرم میں ایسی کیا بات ہے؟"

اب مجسٹریٹ نے کہا "تم کون ہو؟ یہ تمہارا آفس ہے؟"

"اگر یہی سوال میں تم سے کروں پھر؟" غالب نے کہا "باقی سب تو پولیس والے لگتے ہیں۔"

"میں مجسٹریٹ ہوں۔"

"میں چیف رپورٹر ہوں۔" غالب نے اپنا کارڈ اس کے سامنے کیا "اس کمپنی کے تینوں پارٹنر میرے قریبی دوست ہیں۔ مس رابعہ قاری' عبدالرؤف منظر اور وقار یوسف۔ کیا انہیں اس کارروائی کا علم ہے؟"

میں نے کہا "میرے منع کرنے کے باوجود انہوں نے تالا خود کھول لیا اور مجھے فون بھی نہیں کرنے دیا۔"

"تالا کیسے کھول لیا؟" غالب نے حیرانی سے کہا۔

"یہ ایک چور کو بھی وردی پہنا کے ساتھ لائے تھے" میں نے تالا کھولنے والے کی طرف اشارہ کیا "تالے کھولنے کا سب سامان ہے اس کے پاس۔"

"یہ بکواس کرتا ہے" ڈی ایس پی شاہد علی نے کہا۔

"اچھا پھر تم بتاؤ کہ اس آفس میں تالا کھولے بغیر آپ لوگ کیسے داخل ہو گئے؟" غالب نے کہا "سارے دروازے مقفل تھے اور چابی صرف انہی کے پاس رہتی ہے جو مالک ہیں۔ یہاں جتنے آفس ہیں سب اس وقت بند ہیں اور کسی کی چابی چوکیدار کے پاس نہیں۔ ڈی ایس پی صاحب بولتے کیوں نہیں آپ؟ اور آپ مجسٹریٹ صاحب۔ ان قفل شکن چوروں کے اس غیر قانونی فعل کی نگرانی آپ کر رہے ہیں؟"

"اتنا وقت نہیں تھا ہمارے پاس۔" ڈی ایس پی نے جھلّی جھانکتے ہوئے اپنا دفاع کیا "سلطان کی گرفتاری ضروری تھی۔"

"کیوں۔ کیا قیامت آنے والی تھی؟ آسمان گرنے والا تھا۔ اور ایسے مجرم تھے جو ایٹم بم کا دھماکا کرنے والے تھے؟" غالب نے دہاڑ کے کہا "اور یہ سلطان کون ہیں آخر' جن کی تلاش میں تم اتنا بڑا لشکر لے کر یہاں آ گئے۔ اتنی تیاری سے تم رات کو حملہ

کرتے تو کشمیر فتح کر لیتے۔ میں ابھی بات کرتا ہوں ڈی آئی جی صاحب سے اور سب اخبار والوں کو بتاتا ہوں۔"

ڈی ایس پی نے ٹیلی فون پر ہاتھ رکھ دیا "اتنی گرمی مت دکھاؤ صحافی صاحب۔ کوئی فائدہ نہیں ہوگا تمہیں اس سے۔ ہم نے سب کچھ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے کیا ہے۔ ایک چوکیدار کی گواہی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ خود مجسٹریٹ صاحب جانتے ہیں کہ تالا اسی نے کھولا تھا۔ چابی تھی اس کے پاس۔"

اب مجسٹریٹ کے تیور بھی بدل گئے "ہاں۔ اور ہم نے اندر داخل ہونے سے پہلے انہیں اطلاع کر دی تھی۔ کیا نام ہے خاتون کا؟"

"مس رابعہ قاری۔ انہوں نے فون پر چوکیدار سے بات کی تھی اور اسے اجازت دی تھی کہ دفتر کھول دے۔"

میں نے احتجاج کیا "یہ جھوٹ ہے۔"

"سچ وہ ہوتا ہے۔۔۔ جس کے گواہ ہوں۔" شاہد علی نے مجھے ایک اور گالی دی "تیرے بھونکنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو میں نے کہا ہے وہی سچ ہے۔"

غالب بولا "کہاں فون کیا تھا تم نے؟"

ڈی ایس پی بڑی عیاری سے جواب کو گول کر گیا۔ "مجھے کیا معلوم' چوکیدار نے کیا نمبر ملایا تھا۔ ایک اور بات بتا دوں تمہیں۔ جب ہم یہاں سے چلے جائیں گے تو تم کیسے ثابت کرو گے کہ ہم یہاں آئے تھے؟ خیر تم ہی نہیں اپنے جرم کا صاحب۔"

غالب نے یہ ظاہر کیا جیسے اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہو "اچھا سر' اگر مقابلہ جھوٹ بولنے کا تھا تو تم جیت گئے۔ اب میں بات کر لوں مس رابعہ سے؟"

ڈی ایس پی نے مسکرا کے فون پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور اپنی فورس کو حکم دیا کہ وہ کام ختم کر کے نیچے پہنچ جائیں۔ انہوں نے کسی بھی چیز کو چھیڑا نہیں تھا۔ جانے سے پہلے انہوں نے ہر چیز کو کپڑے سے صاف کروایا جہاں ان کے ہاتھ لگے تھے۔

مجسٹریٹ نے کہا "میں خود بھی بات کرنا چاہتا ہوں ان صاحب سے۔"

غالب نے ریسیور اسے پکڑا دیا "پہلے آپ فرما لیں ہو گیا ہے۔"

دوسری طرف سے غالباً منظر نے ریسیور اٹھایا تھا۔ وہ وضاحت سننے سے پہلے ہی مجسٹریٹ کے گلے پڑ گیا۔ مجسٹریٹ پریشان نظر آ رہا تھا۔ منظر کی زبان کا مقابلہ وہ کیسے کرتا؟ وہ سنیں تو سہی' آپ بھی حد کرتے ہیں۔ یہ کیسے بات کرتے ہیں آپ؟ شرافت بھی کوئی چیز ہوتی ہے" اور اسی قسم کے ادھورے جملے سنا۔ پھر ان کی باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی اور مجسٹریٹ نے غصے سے ریسیور ڈی ایس پی کو تھما دیا۔ منظر نے جس طرح اس کی ایسی تیسی کی اس کا عکس شاہد علی کی صورت پر نظر آ رہا تھا۔ اس نے دانت

غالب نے دانت نکالتے ہوئے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا "دماغ خراب ہے ان لوگوں کا۔ بھلا ملزم اتنی رات گئے کسی وکیل کے آفس میں پوچھنے کے لیے کیسے آ سکتے ہیں۔ سارے شہر میں کیا یہی ایک جگہ تھی؟"

ہم پولیس کی لاقانونیت اور غیر انسانی طرز عمل پر انہیں برا بھلا کہتے رہے اور خاموشی سے ان تمام مقامات کا جائزہ لیتے رہے جہاں وہ خفیہ مائکرو فون لگا سکتے تھے۔ ایک عام قسم کا ایف ایم مائکرو فون ہماری گفتگو کا ہر لفظ نشر کر سکتا تھا اور سو دو سو میٹر یا ایک کلو میٹر دور بیٹھے پولیس والے سب کچھ سن بھی سکتے تھے اور ریکارڈ بھی کر سکتے تھے۔ ہم محتاط ہوتے تو آزادانہ گفتگو میں دلاور کی گرفتاری کا حوالہ بھی دیتے اور یہ ذکر بھی کرتے کہ رابعہ نے اسے منظر کے گھر پہنچا کے اچھا کیا جہاں پولیس کے فرشتے نہیں پہنچ سکتے۔ فرشتوں سے پہلے وہ خود وہاں سے دلاور کو برآمد کر لیتے۔ وہ مجسٹریٹ واقعی لیے ساتھ لیے پھر رہے تھے کہ جب اور جہاں ضرورت پڑے وارنٹ کے قانونی تقاضے پورے ہو جائیں۔ دلاور اگر منظر کے گھر سے برآمد ہوتا تو صورت حال بہت خراب ہو جاتی۔ وکیل ہو یا جج۔ قانون کی گرفت سے تو کوئی بھی بالاتر نہیں ہے۔

میں نے میزوں اور کرسیوں کی سطح کے نیچے ہاتھ پھیر کے دیکھا۔ صوفوں اور الماریوں کے پیچھے ہر کرسی کی پشت پر اور کچن کے ہر شیلف میں برتن ہٹا کے دیکھا۔ پیڈ کے نیچے جھانکا اور دروازوں کے پٹ اور چوکھٹوں پر ٹارچ کی روشنی ڈالی کہ کہیں کوئی دھبا یا ایسا داغ نظر آئے جو پہلے وہاں نہیں تھا۔ مقناطیسی قسم کے ایف ایم مائکرو فون کسی بھی لوہے کی چیز پر خود چپک جاتے ہیں ورنہ انہیں ایک خاص قسم کی چپکنے والی شفاف گوند سے لگایا جا سکتا ہے۔

غالب نے فرنیچر کو نہیں دیکھا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی بہت سی چیزوں کی تلاشی لی۔ ان میں ٹیبل لیمپ' پگل دان اور ایش ٹرے وغیرہ شامل تھے۔ اس نے ٹیوب لائٹس کی پٹی پر ہاتھ پھیرا۔ وال لائٹس کے شیڈ' سوئچ بورڈ' پنکھوں اور ریگولیٹرز پر مائکرو فون تلاش کیا اور بالآخر کامیابی اسی کے حصے میں آئی۔

مائکرو فون ایک پینٹنگ کے فریم کی پشت پر دریافت ہوا۔ یہ ایک مشہور برطانوی مصور کانسٹیبل کی بنائی ہوئی تصویر تھی جو مناظر فطرت کو پینٹ کرنے میں لافانی شہرت کا حامل ہے۔ ظاہر ہے یہ اصل تصویر نہیں' اس کا پرنٹ تھی۔ اس کی وسعت کے اعتبار سے فریم بھی تین انچ چوڑی اور آدھا انچ موٹی لکڑی کا تھا جس کے نقش و نگار پر سنہرا رنگ پھیرا گیا تھا۔ اس کے پیچھے دو انچ چوڑا اور چار انچ لمبا مائکرو فون کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا کیونکہ اس کا رنگ سیاہ تھا اور فریم کے پیچھے اندھیرا رہتا تھا۔ فریم کا وہ کنارا جس پر مائکرو فون چھپایا تھا رابعہ کی ٹیبل کے قریب دائیں ہاتھ والی دیوار پر مشکل سے چھ فٹ دور ہو گا۔

ہم نے پولیس والوں کی ہوشیاری کو سراہا۔ انہوں نے ہماری

پیچ کے منظر کو وہ گالیاں دیں جو فون پر نہیں دے سکا تھا اور وہ دھمکیاں دیں جو احمقانہ تھیں۔

غالب مسکراتا رہا "شوق پورا ہو گیا آپ کا۔ اب آپ عزت سے تشریف لے جائیں۔"

"تم سے بھی نمٹ لوں گا میں بیٹا" ڈی ایس پی جاتے ہوئے بولا۔

غالب نے کہا "ہم صحافی تو تمہارے باپ ہوتے ہیں۔ تمہاری رگ رگ کو پہچانتے ہیں۔ تمہیں بھی پتا چل جائے گا کل کہ یہاں کتنے خفیہ مائکرو فون تھے' کتنے ٹیپ ریکارڈر اور کیمرے۔ تم نے یہ نہیں سوچا ڈی ایس پی کہ میں اچانک کیسے پہنچ گیا تھا؟ وحی نازل نہیں ہوتی تھی مجھ پر۔ مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ اب تم کیا کرو گے۔ پکا بندوبست کیا تھا میں نے بھی۔"

ڈی ایس پی کا رنگ اڑ گیا۔ "میں نے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا۔"

"جتنی گالیاں تم نے دی ہیں اور جو دھمکیاں دی ہیں ان کی قانونی حیثیت کیا ہو گی؟ اب گھر جا کے صبح تک سوچتے رہنا کہ پولیس کی نوکری چھوڑ کے تم کیا کرو گے؟ انارکلی میں دہی بھلے بیچو گے یا گنڈیریاں؟"

مجسٹریٹ پڑھا لکھا اور سمجھ دار آدمی تھا۔ اس نے فوراً صورت حال کو سنبھال لیا۔ "چلو تم جاؤ شاہد علی۔ کارروائی پوری ہو گئی نا۔ رپورٹ میں دے دوں گا اور غالب صاحب' آپ اس چوکیدار سے کہیں کہ نیچے جائے' مجھے کچھ بات کرنی ہے۔"

"مجھے کوئی بات نہیں کرنی آپ سے۔۔۔ جب تک ڈی ایس پی اس چوکیدار سے معافی نہیں مانگتا۔"

"آپ تو جانتے ہیں ان لوگوں کو۔" مجسٹریٹ نے بے بسی سے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ڈی ایس پی معافی مانگے اور وہ بھی ایک چوکیدار سے۔۔۔ ناممکن۔"

"یہ فرعون بنے پھرتے ہیں۔ کیا کسی غریب چوکیدار کی عزت نہیں ہوتی؟ میں اسے اچھی طرح سمجھا دوں گا" غالب نے کہا۔

لیکن مجسٹریٹ نے بالآخر اسے منا لیا۔ غالب بھی ایکٹنگ ہی کر رہا تھا۔ اس نے درگزر کر کے گویا بڑا احسان کیا اور ایس ڈی ایم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہونے والے صحافی سے جان چھوٹی۔ میں نیچے تک گیا اور دروازے کو مقفل کر آیا۔

میں واپس گیا تو غالب نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ایک کاغذ پر لکھا "مجھے شک ہے کہ پولیس یہاں کوئی خفیہ مائکرو فون نصب کر گئی ہے۔ محتاط رہ کے بات کرنا۔"

میں نے کہا "سر' بہت اچھا ہوا کہ آپ آ گئے ورنہ میں تو مارا جاتا۔"

www.paksociety.com

آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے بڑی صفائی سے مائکروفون لگایا تھا اور اس کے لیے جگہ بھی خوب منتخب کی تھی۔ کمرے کی ہر دیوار پر آرائشی تصاویر آویزاں تھیں۔ برطانوی مصوروں کی طرح پاکستان کے قدرتی مناظر کی عکاسی کرنے والے استاد اللہ بخش کے علاوہ زین العابدین اور...... حنیف رامے کی مصوری کے نمونے بھی دیواروں پر موجود تھے۔ یہ نقل نہیں بلکہ اصل شاہکار تھے جو رابعہ نے کسی نمائش سے خریدے ہوں گے۔ ان کے فریم بھی مائکروفون چھپانے کے لیے موزوں تھے مگر نہ بنا دور تھے۔

میں حیران تھا کہ یہ کام کس نے کیا اور کب کیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ تو وہی جگہ ہے جہاں میں قفل کھولنے کے ماہر کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے باتوں میں لگا کے میں نے بڑی ہوشیاری دکھائی ہے۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ مجھے باتوں میں الجھا کے وہ اپنا کام کر گیا تھا۔

میں نے اور غالب نے سراغ رسی کے اس کارنامے پر ہاتھ ملا کے ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کی اور پھر وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے چائے بناتے ہوئے سرائیکی میں بات کی اور غالب پنجابی میں اظہار خیال کرتا رہا۔

کچھ دیر بعد منظر آگیا۔ حسب عادت اس نے ہنگامہ برپا کر دیا "میں کہتا ہوں نام بتاؤ مجھے اس بھوتنی والے مجسٹریٹ کا۔ ڈی ایس پی شاہد علی کی ٹوپی اچھالیے۔"

میں نے چوکیدارانہ جہالت سے کہا "وہ کیا ہوتا ہے جی۔"

"اسے جی پی کو کہتے ہیں۔ مگر تو کیا سمجھے گا۔" منظر نے مجھے ٹکو ماری اور میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی کیونکہ میں ان تمام انگریزی حروف تہجی کے مطلب سے بخوبی واقف تھا۔ نام یہ جن الفاظ کا مخفف ہیں وہ پولیس کی آزادی کے دور میں بھی شائع نہیں کیے جا سکتے۔

"رابعہ نہیں آئی تمہارے ساتھ..." غالب نے بہ آواز بلند کہا۔

منظر نے مائکروفون کی طرف رخ کر کے جواب دیا "اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کل سے۔ بخار تھا شام کو۔ ڈاکٹر نے گھر آ کے دیکھا تھا اور دوا دے دی تھی۔ بس اس کے بعد سے گدھے بیچ کے سو رہی ہے۔"

"اسے عشق کا میعادی بخار ہے" غالب نے کہا "اور اس کا علاج کسی چارہ گر کے پاس نہیں۔ سوائے اس کے۔"

"جو سالا غائب ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اسے خرکار پکڑ کر لے گئے۔"

"بڑوں کو خرکار ہی لے جا سکتے ہیں۔ خیر اچھا ہوا" غالب نے کہا "تمہاری جان بھی چھوٹ گئی اور عذاب ختم ہوا رابعہ کا بھی۔"

انہوں نے میرے گھورنے کی پروا نہیں کی۔ اصل مقصد تو پولیس کو بتانا تھا کہ رابعہ دونوں سے منظر کے گھر میں ہے اور بخار کی حالت میں اس کے کسی اغوا کی واردات میں ملوث ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"اس خبیث الدہر کا بھی کچھ پتا ہے؟" منظر نے کہا۔

"وضاحت فرمائیے آپ کس کو پوچھ رہے ہیں؟" غالب بولا۔

"ابے وہی رابعہ کے عشق کا وائرس۔ سکندر اعظم کی اولاد۔ ایسے غائب ہے جیسے تمہارے سر سے سینگ۔"

غالب ہنسا "میرا خیال ہے کہ وہ اور چوہدری دلاور دونوں سارے جھگڑے خود نمٹانے کے لیے کہیں چلے گئے تھے۔ لڑنے کے لیے۔ تلواریں سونت کے آمنے سامنے مقابلہ ہو۔ کہیں عدالت، کہاں کا قانون؟ جو جیتا وہی سکندر، جو ہارا وہ دارا۔"

"یہ سب حرامی پن اسی کا ہے مرزا۔ اس نطفۂ ناتحقیق کا۔ میں سکندر کو بتلوں گا کہ اس کے بارے میں۔"

"ابے صحافی کے گھوڑے۔ میں چوہدری دلاور کی بات کر رہا تھا۔ اسی نے بھیجا ہوگا پولیس کو۔"

"وہ تو خود مفرور ہے پولیس کے ڈر سے۔"

"یار سب ڈراما ہے۔ شرط لگا لو تم مجھ سے۔ وہ اسی ایس پی کے ساتھ بیٹھا ہوگا جو اسلام آباد سے تفتیش کا ناٹک رچانے آیا ہے۔" منظر بولا۔

"سنا تو یہ ہے کہ وہ بڑا ایماندار اور فرض شناس ہے۔"

منظر نے قہقہہ بلند کیا "ان کا یہی طریق کار ہے بیٹے۔ جو واقعی ایماندار ہوں ان کے بارے میں جھوٹے قصے پھیلائے جاتے ہیں کہ بڑا راشی ہے اور منہ کو حرام لگا ہوا ہے لیکن جتنا بے ایمان اور حرام کھاتے ہیں ان کے بارے میں باقاعدہ تشہیری مہم چلائی جاتی ہے کہ بڑے ولی اللہ ہیں۔"

"یہ ایسی ہی چیز ہے بھائی" غالب نے آہ بھری۔

"مجھے ابھی تک یہ پتا نہیں چلا کہ آخر غیبی سواری کہاں سے آگئی؟"

غالب بولا "جس بارہ میں آخری کال جانے سے پہلے تیار کھڑا ہوا تھا۔ کچھ پروگرام تھا۔"

"اسی کے ساتھ جو مجھے زہر ہی مار رہی ہے؟ ایک عشق کیا ... دوسری نازک ہاتھوں کی" منظر نے ملامت سے کہا "نام ہی ذرا ہے نا۔ نہ نازک نہ نزاکت۔ اس کا نام تو کچھ قند یا نور ہونا چاہیے تھا۔"

"ایسے تو تمہاری منکوحہ کا نام بھی زرخیز خانم یا مس ... ہونا چاہیے۔" غالب بولا۔

منظر نے زبردست قہقہہ مارا "ابے مان گئے تجھے۔ کیا نام تجویز کیا ہے۔ مس زود افزا۔ مس تو خیر وہ نہیں ہے مگر ... زرخیز ہے۔ اس نے مجھے سولہ بچوں کا باپ بنا دیا ہے۔ اس کی زرخیزی کا نام جچتا ہے اس پر۔ آئندہ زود افزا ہی کہوں گا اسے اور بتاؤں گا کہ نام تو نے دیا ہے۔"

اطلاع مجھے دیر سے ملی کہ اغوا کی اس واردات میں استعمال ہونے والی گاڑی کہاں دیکھی گئی ہے۔ ہم نے چھاپا مارنے والی بجلی پانی کے واپس جاتے ہی رابعہ کو دلاور سمیت وہاں سے رخصت نہ کیا ہوتا تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔

ڈی ایس پی شاہد علی کو تلاشی کے وارنٹ حاصل کرتے ہوئے پورا یقین ہوگا کہ وہ بہت بڑا دھماکا کرے گا۔ دلاور کو برآمد کرنے کے علاوہ سکندر بخت کی گرفتاری اور اعانت مجرمانہ میں رابعہ کو حراست میں لے کر وہ شاید اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ سرانجام دیتا لیکن مقدر نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ رابعہ اور دلاور کا وہاں کوئی سراغ نہیں ملا اور سکندر بخت کو اس کی نگرانی پر چوکیدار کے روپ میں شناخت کرنے سے قاصر رہیں۔ الٹا غالب نے بروقت لیوا ہو کے اس کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا کر دیے تھے مگر اس کے باوجود شاہد علی اپنا کام کر گیا تھا۔ خفیہ مائکروفون کی تنصیب سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا شک دور نہیں ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہم چالاک لوگ ہیں جادوگر نہیں کہ رابعہ اور دلاور کو چھو منتر سے غائب کر دیا ہوگا۔ انہیں ہم نے ادھر ادھر کر دیا تھا اور ڈی ایس پی شاہد علی کو پوری امید تھی کہ وہ اس جگہ کا سراغ لگا لے گا۔

صبح میں نے اطمینان سے ناشتا کیا اور پھر اپنا حلیہ تبدیل کر کے باہر نکلا تو صبح کا سورج بہت اوپر آچکا تھا۔ میری آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ اگر عمارت میں صفائی کے لیے آنے والا عملہ گیٹ نہ بجاتا تو میں نہ جانے کب تک سوتا رہتا۔ آفس میں آ کے میں پھر سو گیا تھا اور دو بجے اٹھا تھا۔

دس بجے تک عمارت میں چہل پہل کے آثار مفقود تھے چنانچہ میں نے باہر نکلنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اگر سادہ کپڑوں والے پولیس کے جاسوس عمارت کے آس پاس منڈلا رہے ہوں گے اور آنے جانے والوں پر نظر رکھے بیٹھے ہوں گے تو یہ رپورٹ ضرور دیں گے کہ صبح سے اندر کوئی نہیں گیا تھا لیکن وہ فرنیچر والا باہر آیا ہے۔ کیا وہ رات بھر اندر رہا تھا؟

آفس کے سیل فون کو استعمال کرتے ہوئے میں نے منظر کے گھر کا نمبر ملانا چاہا تو مجھے اندازہ ہوا کہ فون ڈیڈ ہے یا لائن کٹی ہوئی ہے۔ شاید اسی لیے صبح سے اب تک غالب یا رابعہ میں سے کسی نے بھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا اور فون کی گھنٹی ایک بار بھی نہیں بجی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے اسی فون پر اکرم ٹیکس ایڈوائزر کے آفس سے غالب کو فون کیا۔ وقار یوسف کی بیوی میری بدلی ہوئی آواز نہ پہچان سکی۔

"غالب صاحب تو صبح ہی چلے گئے تھے" وہ بولی۔

"آپ ان کی واقف ہوں گی۔"

"واقف!" وہ ہنسی "ابھی زیادہ سے زیادہ آپ انہیں منگیتر کہہ سکتے ہیں۔ وہ بھی نصف۔ آپ کون ہیں؟"

"ابے کیوں پڑتا ہے مجھے اس سے۔ بہت ماریں گے اس کے بچے مجھے۔"

"وہ سمجھے گی کہاں۔ خوش ہوگی کہ میں اسے روح افزا جیسی ٹھنڈی اور میٹھی چیز کہہ رہا ہوں۔" منظر بولا "اب نکل یہاں سے ناک میں دم لا دیا ہے۔"

نیچے آ کے منظر نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا "ابے چوکیدار کے گھوڑے۔ فرنیچر کیل کے کھوتے۔ یہ کیا مصیبت بھیج دی ہے تو نے میرے گھر۔ قسم خدا کی مجھے تو یقین نہیں آیا دلاور کو دیکھ کے۔ اتنے بڑے بدمعاش ہو گئے ہو تم لوگ۔ خاتون پر حملہ کرنے لگے ہو۔ سوچو بیٹا کہ پکڑے جاتے تو کیا ہوتا؟"

"اس کے بارے میں کیا سوچنا جو ہوا ہی نہیں۔ مگر دلاور کو اغوا کر کے نہ لاتے تو کیا کرتے؟ پولیس نے تو اسے صاف بچا لیا تھا۔ قانون کی ایسی تیسی کرنے والوں کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔ اب تم جاؤ اپنے گھر۔ صبح ملاقات ہوگی۔"

"اور وہ قوم خور میرے۔ چوہدری دلاور میرے گھر میں کب تک رہے گا؟"

"زیادہ سے زیادہ کل تک۔"

"اور کل کے بعد۔" منظر سخت پریشان تھا۔

"جہنم میں۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"جہنمی تمہارے ساتھ؟ ٹھیک ہے۔ بس واپس مت آنا جہنم سے۔ قسم خدا کی سولہ بچوں کی شکل کا خیال نہ ہوتا تو میں خودکشی کر لیتا۔ اب نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ تم تو عذاب الٰہی بن گئے ہو میرے لیے۔"

"تیرے اعمال ایسے ہوں گے نور چشم۔ اب جا، اپنے سترھویں فرزند کے بارے میں سوچ۔"

"اب کیا خاک سوچنا ہے۔ سنگ بنیاد تو رکھ دیا" منظر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "ابے بھائی، نیچے اترو گاڑی سے۔"

غالب اس کی گاڑی سے اتر گیا۔ "کیوں دھکا لگانا ہے کیا؟"

"میں جا رہا ہوں اپنے گھر" منظر نے دروازہ بند کر لیا۔

غالب نے شور مچایا "یار تو مجھے بھی وہیں جانا ہے۔"

"تمہاری وہ میری حویلی میں نہیں ہے۔ وقار کے پاس ہے۔ پیدل جاؤ بیٹا۔" وہ گاڑی نکال کے گیا "تمہاری سزا یہی ہے۔"

"الو کا پٹھا۔ مجھے ادھر چھوڑ جاتا تو کیا اس کی گاڑی کے ٹائر گھس جاتے" غالب نے خفگی سے کہا اور پیر پٹختا ہوا چل پڑا۔

رات کا باقی حصہ میں نے بڑے سکون سے سو کے گزارا۔

مجھے یقین تھا کہ گزشتہ شب کی ناکامی پر شرمندہ ہونے کے بجائے دلاور کے نمک خوار زیادہ چراغ پا ہوں گے۔ تھانے میں بجلی نہ ہونے سے گھپ اندھیرا تھا۔ اس کے باوجود ہم دلاور کو نکال کر لے گئے تھے۔ منصوبہ بندی، ٹیم ورک اور کمانڈو ایکشن کی طرح ہونے والی واردات سے انہوں نے بالکل صحیح اندازہ کیا تھا کہ یہ کام صرف ایم آر ایس کے سرکٹ دبانے ہی کر سکتے تھے۔ بس

www.paksociety.com

"میں اخبار کے دفتر سے ہی بول رہا تھا۔"

"یہ تو خیر غلط ہے۔" وہ بولی "آپ ان کے ساتھی ہوتے تو یہ ضرور معلوم ہوتا آپ کو کہ غالب نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔"

اس نے ذہانت کا ثبوت دیا تھا اور مزید بات کیے بغیر فون رکھ دیا تھا۔ اب میں نے منظر کا نمبر ملایا۔ انکم ٹیکس ایڈوائزر کے آفس میں ابھی تک ایک کلرک کے سوا کوئی نہیں پہنچا تھا اور وہ اپنی میز پر کاغذات کو ادھر سے ادھر رکھنے میں مصروف تھا۔ یہاں فون سب کی اشد ضرورت تھی اور ایک آفس کا فون خراب ہو تو دوسرے آفس کے فون کو استعمال کرنا پڑتا تھا۔ کلرک کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ میں کس کس سے بات کر رہا ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں؟

غالب نے منظر کے گھر سے "ہیلو" کہا تو میں نے سلام عرض کیا۔

"کہاں سے بول رہے ہو۔ جواب یہ مت دینا کہ اپنے منہ سے۔"

میں نے کہا "رابعہ کے آفس کا فون فوت ہو گیا ہے یا اس کی لائن قتل کروا دی گئی ہے۔"

"ہمیں معلوم ہے۔ ہم صبح سے کوشش کر رہے تھے۔ صبح کا مطلب ہے آٹھ بجے سے۔ تمہاری صبح اب ہوئی ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ میری صبح منہ اندھیرے ہوئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی اس بت طناز کو دیکھا جس کے سر پر ٹوکری اور ہاتھ میں جھاڑو دیکھ کے کسی شاعر نے کہا تھا۔

وہ دیکھو چلا آتا ہے معشوق ہمارا
ہے سر پہ فلک ہاتھ میں دُم دار ستارہ

غالب ہنسا "اور تب سے اب تک گویا اس کے ساتھ..."

میں نے کہا "میں آفس میں جا کے پھر سو گیا تھا۔ ساتھ والا آفس بند تھا۔ فون کہاں سے کرتا۔ باہر نکلوں گا جب لوگوں کی آمدورفت شروع ہو جائے گی۔"

"اس سے ثابت ہوا کہ سوچنے سمجھنے کی تھوڑی بہت صلاحیت اب بھی ہے تم میں" غالب بولا "باہر کی صورت حال مخدوش ہے۔"

"تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟"

"نگرانی والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ایک دودھ فراہم کرنے والا ریڑھا دائیں طرف بہت دیر سے موجود ہے۔ اس پر جو لوگ دودھ کے مٹکوں کے ساتھ تشریف فرما ہیں وہ حلیے سے گوالے لگتے ہیں نہ صورت سے۔ مزید یہ کہ وہ ٹکٹکی باندھ کے اس راستے کو دیکھ رہے ہیں جہاں سے ہم نے آنا ہے... ہم کا مطلب ہے لقمان اور اپنے چوہدری صاحب جو رات لوٹے نہیں تھے۔"

"اور کون ہے دوسری طرف؟"

"دوسری طرف ایک شخص پوری چھولے بنا رہا ہے اور اس نے فٹ پاتھ کے پیچھے ایک میز کے گرد کچھ بنچیں ڈال دی ہیں۔ ایک بنچ پر گدھ جیسا ایک گنجا اور منحوس شکل والا بیٹھا ہے۔ وقفے وقفے سے پوریاں نگل رہا ہے۔ شام تک اس کا یہی حال رہا تو ہیضہ ہو جائے گا۔"

"تمہیں کون رپورٹ دے رہا ہے؟"

"اپنا ایک شاگرد ہے۔ دفتر میں چپراسی کا کام کرتا ہے۔ اسے تو کہیں سراغ رساں ہونا چاہیے تھا۔"

"اپنے چوہدری صاحب کا کیا حال احوال ہے؟"

"رات بھر مزے سے گیراج میں سوتے یا روتے رہے۔ ناشتا زہر مار فرمایا۔ اور بھی بہت کچھ فرمایا جو فون پر نہیں بتایا جا سکتا۔"

"منظر کی بیوی کو بھی معلوم ہے؟"

"ہاں۔ مجھ سے بعد اصرار کہہ رہی تھی کہ یہ سارا قصہ ختم کرا دیں۔ میں ڈال دیتی ہوں پراٹھے میں چوہے مار سفوف۔ پتا نہیں اس کے خاندان میں کون کس کا پیر ہے۔ پیر صاحب کے حکم پر گورکھ ایسا کانٹے کا کہ پولیس کیا منکر نکیر کو پتا نہیں چلے گا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کے اسے منع کیا کہ وہ اس موضوع پر اظہار خیال نہ فرمائے۔ تم آؤ تو چوہدری صاحب کو اور وہاں کر دیں۔ نازو بہت بڑبڑ کرتا ہے اور گوشمالی کا تہیہ کیا جاتی ہے۔ رابعہ البتہ فکرمند ہے۔"

میں نے کہا "تم کہیں سے کرائے کی گاڑی لے کر آؤ تو گیٹ کے سامنے لا کے روکو۔ میں اوپر سے دیکھ لوں گا اور ایسے بیٹھ جاؤں گا کہ کوئی دیکھ ہی نہ سکے۔"

کلرک میری گفتگو کی طوالت سے کچھ پریشان ہو رہا تھا۔ شاید خود اسے بھی کسی سے بات کرنی ہوگی۔ وہ بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ریسیور رکھ کے اس سے معذرت کی "کہا رابعہ قاری کا فون خراب تھا۔"

"وہ تو کوئی بات نہیں" وہ بولا "آپ بھی وکیل ہیں؟"

"میں انہی کے ساتھ ایک کیس میں شریک ہوں۔"

"غالباً آپ کو علم نہیں کہ وہ شام کے وقت ملتی ہیں۔ اس وقت تو ان کا آفس بند ہوتا ہے۔" وہ بولا۔

مجھ سے غلطی ہو گئی تھی اور اسے بتانا ضروری تھا "دراصل رات ہم بہت دیر تک کام کرتے رہے تھے۔ پھر وہ چلی گئیں منظر صاحب کے ساتھ اور میں یہیں لیٹ گیا۔"

وہ مطمئن ہو گیا لیکن میرے دل میں خلش باقی رہی۔ اگر کوئی ایسا موقع آیا کہ میں نے خود کو فرنچ وکیل ظاہر کیا اور شناخت اس کلرک نے سن لیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ یہ بتا سکتا ہے کہ وکیل صاحب تو میرے آفس میں فر فر اردو بول رہے تھے۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ ایسا موقع شاید کبھی نہ آئے مگر یہ فیصلہ بھی کیا کہ

ایک شخص کو روک لیا جو پڑھا لکھا نظر آتا تھا۔ میری فرنچ سن کے وہ بوکھلا گیا۔

"سوری۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔ کیا آپ انگریزی نہیں جانتے؟"

"فرنچ" میں نے افسوس سے سر ہلایا "سی۔ نو انگلش۔ یو سپیک" اس نے انگریزی میں کہا "وات ہیپ؟"

میں نے کہا "وانٹ ٹیکسی۔ نو ٹیکسی ہیئر"

اس نے سر ہلایا اور اشارے سے کہا "کم ود می" اور پھر میرے ساتھ چل پڑا "کم آن۔ آئی ول گیٹ یو اے ٹیکسی۔"

شاید اس کا خیال تھا کہ اول تو ٹیکسی والا میری بات ہی نہیں سمجھے گا اور سمجھا تو اجنبی جان کے مجھے بلاوجہ شہر کی سیر کرائے گا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کہاں جانا ہے اور میں نے اسے بتایا کہ پہلے میں پولیس ہیڈ آفس جاؤں گا۔ وہ مجھے ٹیکسی میں بٹھا کے اور شکریہ وصول کر کے چلا گیا تو میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ پہلے مجھے اخبار کے دفتر جانا ہے۔ اس نے کسی حیرانی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ اس اجنبی نے مجھ سے انگریزی بولی تھی اور میں نے صرف "تھینکس" کہا تھا۔ پولیس ہیڈ آفس جانا اسے ویسے بھی پسند نہ تھا اور میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ نگرانی کرنے والوں نے رپورٹ دے دی ہوگی کہ مرزا غالب ایک غیر ملکی وکیل کے ساتھ آیا تھا۔ غیر ملکی کچھ دیر بعد ٹیکسی میں بیٹھ کے کہیں چلا گیا۔

غالب میرے انتظار میں آفس کے باہر ہی موجود تھا۔ وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا اور ہم ٹیکسی کو گرینڈ ہوٹل لے گئے۔ راستے میں ہم نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس کا تعلق براہ راست دلاور کے معاملے سے ہوتا۔ جب غالب کرائے کی کار لے کر آیا تو میں نے ڈرائیونگ سنبھالی۔

"اف۔ رات تو بال بال بچے" میں نے سکون کا سانس لے کر کہا۔

"سوال یہ ہے کہ اب کیا ہوگا؟" غالب نے کہا "ہمارا نہیں، دلاور کا۔"

"کچھ نہیں۔ بس ہم دلاور کو پولیس کے حوالے کریں گے۔ اصل حلیے میں۔ اس حالت میں کہ نہ وہ فرار ہو سکے نہ کوئی فرار کرا سکے۔ وہ پکڑا جائے۔"

"اگر پولیس پھر اسے چھوڑ دے بعد میں۔"

"پکی گرفتاری کے لیے اسٹیج سیٹ کرنا تمہارا کام ہے یا رابعہ کا۔ بعد میں جو ہوگا وہ مجھے معلوم ہے۔ ایک بار اس کو ہتھکڑیاں لگوا کے حوالات میں پہنچانا اور اس تقریب کی اخبارات میں رپورٹ شائع کرانا اصل کام ہے۔ وہ ایس پی ظفر حیات ایک بار تو دلاور کے بدلتے ہوئے حلیے سے فائدہ اٹھا گیا۔ اس بار کیا کرے گا؟"

غالب نے سوچ کے کہا "اس کا تو باپ بھی دلاور کو گرفتار کرے گا سب کے سامنے۔ ہم ایک نہیں چلنے دیں گے اس کی۔"

آئندہ صبح کے وقت یہاں کسی کو بھی نظر نہ آؤں۔ آج کا معاملہ مختلف تھا۔ پولیس روز تو نگرانی نہیں کرے گی۔

سفید رنگ کی ایک شیورلٹ گیارہ بجے کے بعد نمودار ہوئی تو میں نے ونڈ اسکرین کے پیچھے غالب کا چہرہ دیکھ لیا اور فوراً نیچے اتر آیا۔ گاڑی گیٹ کے سامنے رکی ہی تھی کہ میں پچھلا دروازہ کھول کے اندر بیٹھ گیا۔ شاید کسی بھی دور سے دیکھنے والے کو کچھ نظر ہی نہیں آیا ہوگا۔ چند سیکنڈ بعد میں اور غالب ایک ساتھ گاڑی سے باہر آئے اور کچھ دیر گیٹ کے سامنے رک کے اوپر چلے گئے۔ گاڑی وہیں کھڑی رہی۔ نگرانی کرنے والوں نے تو یہی دیکھا ہوگا کہ گیارہ بجے ایک سفید لمبی سی کار آئی تھی جس میں ایک تو وہی جرنلسٹ تھا۔ وہ گاڑی چلا کے لایا تھا۔ اس کے ساتھ فرنچ وکیل آیا تھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر تھا۔ دونوں اتر کے اوپر چلے گئے تھے۔

"تم نے میری مشکل آسان کر دی" میں نے کہا "اب تم جاؤ۔" "تم ساتھ نہیں چلو گے؟"

"نہیں۔ میں چند منٹ بعد نکلوں گا۔ پولیس والوں نے دیکھ لیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ آیا تھا۔ مجھے یہاں چھوڑ کے تم اکیلے واپس چلے گئے۔ اب مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ میں ٹیکسی لے کر کہیں بھی جا سکتا ہوں۔ بہتر ہے کہ تم اخبار کے دفتر جاؤ۔ میں بھی وہیں آتا ہوں۔ کسی نے تمہارا پیچھا کیا تو مایوس ہو کے لوٹ جائے گا۔ ممکن ہو تو یہ کار بھی واپس کر دینا اور دوسری لے لینا۔ یا ہم منظر کے گھر جاتے ہوئے پکڑ لیں گے۔"

غالب میرے ساتھ اوپر تک گیا اور پانچ منٹ بعد اکیلا اتر کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے اوپر گیلری سے ہاتھ ہلا کے خدا حافظ کہا اور دونوں جانب نگرانی کرنے والوں پر بھی نظر رکھی۔ حسب توقع وہ بڑے غور سے غالب کو دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے بھی کار کا پیچھا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شاید وہ صرف رپورٹ دینے پر مامور تھے اور اپنی جگہ چھوڑ کے کہیں جانا ان کے اختیار کی بات نہیں تھی۔

پانچ منٹ بعد میں بڑے اطمینان سے ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے اترا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا مال روڈ تک گیا...... خالی گاگر جیسے دودھ کے مٹکوں کا پیتل دھوپ میں چمک رہا تھا۔ نہ جانے ریڑھے کا اصل مالک کون تھا اور کہاں تھا۔ شاید وہ کسی حوالات میں بند اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔ ریڑھے پر قابض سادہ کپڑوں میں پولیس والوں کی نظر مجھ پر تھی لیکن میں نے انہیں کوئی اہمیت نہیں دی۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر رک کے میں آتی جاتی گاڑیوں میں خالی ٹیکسی کو تلاش کرتا رہا مگر یہ وقت ہی ایسا تھا کہ سب گاڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر میں سڑک عبور کر کے ہائی کورٹ کی طرف چلا جاؤں تو مجھے ٹیکسی مل جائے گی۔ وہاں وکیل بھی آتے تھے اور موکل بھی۔ گواہ بھی اور پولیس والے بھی۔ لیکن انجان آدمی کی طرح میں نے قریب سے گزرنے والے

www.paksociety.com

میں رابعہ سے کہوں گا کہ سارے مدعی موجود ہوں۔ ہر اخبار کے رپورٹرز اور پریس فوٹوگرافرز کو حاضر کرنا میرا کام۔"

میں نے گاڑی منظر کی کوٹھی کے باہر ہی روک دی۔ غالب کے ساتھ میں گیٹ سے اندر داخل ہوا تو میری نظر نے نازو کو دیکھا۔ وہ گیراج کے سامنے آرام کرسی پر نیم دراز اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی۔

مگر صاف ظاہر تھا کہ وہ گیراج کے دروازے پر چوکیدار بنی بیٹھی ہے۔ دلاور کا وہاں سے نکلنا بعید از امکان تھا مگر نازو کوئی چانس لینے کے موڈ میں نہیں تھی۔ ناممکن کو ممکن بنا کے دلاور نکل جاتا تو نازو سے بچ کے کہاں جاتا۔ اس نے تو گود میں ریوالور بھی رکھ لیا تھا حالانکہ اپنے خالی ہاتھوں سے وہ دلاور جیسے چار کو چت کر سکتی تھی۔

غالب نے کہا "سب ٹھیک ہے نا حوالات میں؟"

نازو کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا "بیس باس۔ مہمان بالکل خیریت سے ہے۔"

"آج مجھے باس کہہ کے تم نے دل خوش کر دیا۔ تمہارا چہرہ بھی سرخ گلاب کی طرح نظر آ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے تمہارا قتل قند بنا کے کھا لوں۔" غالب نے کہا۔ "رابعہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ تو منظر کے ساتھ کورٹ چلی گئیں۔"

مجھے کچھ مایوسی ہوئی "کورٹ چلی گئی۔"

"ہاں۔ سب کچھ معمول کے مطابق نظر آنا چاہیے" غالب نے کہا "کورٹ سے وہ آفس جائے گی اور ہماری اس سے ملاقات رات کو ہوگی۔ اگر ضروری ہوا تو وہ آفس سے وہ منظر کے ساتھ ہی لوٹ کر آئے گی۔ نگرانی کرنے والوں کا مطمئن ہونا بے حد ضروری ہے۔ دلاور سے ہم دونوں نمٹ لیں گے۔ شام کو میں اور نازو پھر اخبار کے دفتر میں ہوں گے۔ دن میں تم بھی اپنا کام کرو یعنی جس کیس کی تفتیش کے لیے آئے ہو اسی میں مصروف رہو۔ دل چاہے تو ایس پی ظفر حیات کا سر کھاؤ یا پولیس سرجن سے ملو اور پوچھو کر ڈاکٹر شبلی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ دکھائے۔ جائے واردات کا معائنہ فرماؤ اور ان ڈاکٹروں نرسوں سے بات کرو جو قتل کے وقت موجود تھے۔ تمہارے پاس وقت گزاری کے لیے مصروفیت بہت ہے۔"

غالب مجھے منظر کی بیوی سے بچا کے پچھلی طرف سے گیراج میں بھی لے گیا۔ سامنے سے گیراج مقفل تھا۔ پیچھے سے اس کا راستہ اسٹور روم سے ہو کے جاتا تھا۔ وہاں اندھیرا تھا اور کاٹھ کباڑ کے ڈھیر میں میرا پاؤں نہ جانے کس کس چیز پر پڑا۔ ان چیزوں میں ایک بچہ بھی تھا جو وہاں اپنے مطلب کی کوئی چیز تلاش کر رہا تھا یا چھپا ہوا تھا۔ اس نے ایک دل خراش چیخ ماری۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ منظر کا دسواں لخت جگر تھا یا شاید نواں۔

دلاور کی حالت دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ ایک رات کی اسیری نے اسے بے حال کر دیا تھا۔ وہ بیمار اور پژمردہ نظر آ رہا تھا اور اس کی بے خواب آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کی شیو خاصی بڑھ گئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے اور وہی رسی اس کے ٹخنوں سے ذرا اوپر بھی دونوں پیروں پر کے لپیٹ دی گئی تھی۔ یہ نائلون کی رسی تھی جسے نازوں کھینچ لگا کے نہیں توڑ سکتا تھا۔ رسی کا آخری حصہ گیراج کی دیوار میں ٹھکی ہوئی کھونٹی سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس طرح کہ دلاور کے لیے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا عملاً ناممکن تھا۔ وہ پاؤں پھیلا کے آرام سے بیٹھ سکتا تھا مگر دیوار کا سہارا نہیں لے سکتا تھا۔ پیچھے سے کھونٹی اس کی کمر میں گڑ رہی تھی۔ یہ ٹونٹی گیراج میں کار کو دھونے کے لیے لگی تھی اور کچھ خراب تھی چنانچہ پانی قطرہ قطرہ بہہ رہا تھا اور اس کے کپڑوں میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ گیلے فرش سے دور بھی نہیں سرک سکتا تھا۔

میں نے دروازے کی اوٹ سے ہی دلاور کو دیکھا اور لوٹ آیا۔ فی الحال میں اس کے سامنے جا کے اپنی شناخت کا راز افشا نہیں چاہتا تھا حالانکہ دلاور کو اس حال میں دیکھ کے میرے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی تھی کہ میں پرانے حساب کو تھوڑا سا بے باق کر دوں۔

"تم نے کیا سوچا ہے آخر۔ پولیس اسے کہاں سے گرفتار کرے گی؟" میں نے باہر آ کے پوچھا۔

"یہ ہم سب مل کے طے کریں گے۔ جلدی کیا ہے؟"

میں نے کہا "منظر اسے کتنے دن رکھ سکتا ہے یہاں؟"

"وہ تو کہتا ہے کہ اسے ساری عمر یہاں قید رکھو یا مار کے گاڑ دو۔ اسے کوئی اعتراض نہیں" غالب نے کہا "نازو یہاں اس کی حفاظت کے لیے موجود ہے اور ضرورت پڑنے پر تفتیش بھی کر سکتی ہے۔"

"تفتیش بے کار ہے۔ تم جانتے ہو دلاور کو۔ وہ جو کچھ بتائے گا اور ہم جان کے کیا کریں گے۔ سب کچھ ہمیں پہلے ہی معلوم ہے۔ یہ دیکھو کہیں اس کے شکاری کتے یہاں تک نہ پہنچ جائیں۔ وہ سارے شہر میں اس کی بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ ذرا ظفر حیات کی حالت زخمی سانپ سے کم خطرناک نہیں ہوگی۔ اس کی افسری کے منہ پر زبردست طمانچہ پڑا ہے۔ مجھے اس کا اندازہ ڈی ایس پی شاہد علی کی حالت سے ہو گیا تھا۔"

غالب نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ دلاور کے اغوا سے ہلچل ہوگی۔ اس کے حکم کے غلام الگ بوکھلائے پھر رہے ہوں گے اور اس کے ٹکڑوں پر پلنے والے سرکاری اہلکار لوگ پریشان ہوں گے مگر وہ اتنی جلدی یہاں دھاوا نہیں بول سکتے۔ گزشتہ رات تصدیق ہو گئی تھی کہ رابعہ اور منظر جائے واردات سے بہت دور اپنے گھروں میں سو رہے تھے بلکہ منظر نے تو رابعہ کی بیماری کی تصدیق کر دی تھی۔ میں اور نازو رات کو وہاں نہیں ٹھہرے تھے۔ منظر صاحب اور وکیل صاحب اپنی اپنی گاڑیوں میں کورٹ گئے ہیں روز کی طرح۔ دن میں وہ معمول کے مطابق مقدمات کی پیروی کریں گے شام کو آفس جائیں گے اور رات کو پھر گھر۔ ان پر کسی کو شک

"شاہد علی! تم اسی لیے ترقی نہیں کر سکے کہ عقل نام کی کوئی چیز تمہارے سر میں نہیں تھی" ظفر حیات نے خفگی سے کہا "بابا یہ کوئی عام آدمی ہے؟ کسی کی ضمانت نہیں ہوگی اگر اسے کچھ ہوا۔ برطانوی حکومت جان نہیں چھوڑے گی۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ سے آ جائیں گے سراغ رساں۔"

شاہد علی نے مجھے گھور کے کہا "اس وقت ہم میٹنگ میں ہیں۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے دانتوں کی نمائش کی "میں آ گیا میٹنگ میں۔"

ظفر حیات نے سر پر ہاتھ مارا "اب اس پاگل کے بچے کو سمجھاؤ کہ ہم اس سے میٹنگ کرنا نہیں چاہتے' یہ میٹنگ کا مطلب ملاقات لے رہا ہے۔"

شاہد علی نے پھر کوشش کی "آفیشل میٹنگ۔"

میں نے سوچ کے سر ہلایا "میں خادم حسین کرمانی۔ کم بخت۔"

شاہد علی نے مجھے گالی دی "دفع ہو جاؤ۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "آئی کم شبلی کیس۔"

شاہد علی واضح کرنا چاہتا تھا کہ مجھے سرکاری میٹنگ سے چلا جانا چاہیے۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں شبلی مرڈر کیس کے لیے آیا ہوں اور تفتیش مکمل ہونے سے پہلے نہیں جا سکتا۔

"چھوڑو اسے۔ بیٹھا رہے یہاں" ظفر حیات بولا "وہ مولوی آ جائے پھر اسے سمجھا دیں گے کہ آئندہ بلا اجازت نہ آئے۔ مجھے فکر ہے اپنی رپورٹ کی۔ ابھی تک میں نے پروگریس صفر ہے بلکہ کیس میری موجودگی میں زیادہ خراب ہو گیا ہے۔ کل کے واقعے کی پوری رپورٹ اخبار میں آ جائے گی۔"

"وہ رپورٹ تو آ گئی ہے سر۔"

"یار شاہد علی۔ پتا نہیں کیوں مجھے تم جیسے احمق دیے گئے ہیں۔ وہاں نور جہاں کے مزار پر جو کچھ ہوا اس سے میرا کیا تعلق۔ اور اس کیس کو میں سنبھال سکتا ہوں مگر رات تھانے میں جو کچھ ہوا۔"

"آپ کا اس سے بھی کوئی تعلق نہیں سر۔"

ایس پی نے نفی میں سر ہلایا "یہ زبردست پلاننگ کرنے والے معمولی لوگ نہیں تھے۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے تصویریں بھی اتاری ہوں گی۔"

"تصویر اتارتے تو پتا چل جاتا۔"

"بکو تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ تصویر اندھیرے میں خاموشی سے بھی اتاری جا سکتی ہے۔ یہاں ہم سب کے ساتھ دلاور بھی تھا اور وہ میک اپ میں نہیں تھا۔ جب ہم نے اسے صحافیوں کے سامنے پیش کیا تھا تو اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا اور اسی لیے ہم نے صاف انکار کر دیا تھا کہ یہ دلاور نہیں ہے۔ جعلی نوٹ چھاپنے والوں کا ساتھی ہے۔"

"اس حرامی نے تو لنگر پہ نشے لے لیے تھے۔ تمہارا فوٹوگراف

ہوگی تو وہ یہی رپورٹ دے گا کہ اس واردات میں رابعہ بہرحال شریک نہیں تھی۔"

"نازو کو باہر بیٹھنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ اگر وہ سارا دن باہر اسی طرح موجود رہی تو کیا پتا کسی کو شک ہو جائے؟"

"یہ بات اسے سمجھائی جا سکتی ہے" غالب نے کہا۔

"دلاور کو تلاش کرنے والے ہر جگہ دیکھیں گے اور وہیں جہاں کوئی بات خلاف معمول لگی' دندناتے پہنچ جائیں گے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ تارا یوسف کا اور منظر کا گھر بھی محفوظ جگہ نہیں ہے۔"

"پھر اسے کہاں لے جائیں۔ ویسے تو ہر جگہ غیر محفوظ ہے۔ ہاں ایک جگہ ہے میری نظر میں۔" وہ کچھ سوچ کے بولا۔

"کون سی جگہ؟"

"رابعہ کا پرانا گھر۔" غالب بولا۔

"وہ کھنڈر۔ آگ لگنے کے بعد وہاں کیا رہا ہوگا؟"

"تہ خانہ محفوظ ہوگا۔ تم نے اچھا وقت گزارا تھا وہاں۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بہت خوب صورت کوٹھی تھی اور تہ خانہ واقعی بڑی پرسکون اور محفوظ جگہ تھی۔ رابعہ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اسے آرام دہ بنانے میں لیکن اب وہاں کیسے جا سکتے ہیں ہم۔ اس پر ملبے کا ڈھیر ہے۔ نیچے پہنچنے کا راستہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔"

"میرا خیال ہے اگر میں چند مزدور لگا دوں کھدائی کے لیے۔ اور ملبہ صاف کرانے کا ٹھیکا دے دوں۔ تو ہو سکتا ہے وہ راستہ نکال لیں۔ میں اس جگہ کی نشاندہی کر سکتا ہوں جہاں زینہ تھا۔"

"ایسا ہو جائے تو کیا بات ہے۔ وہ جگہ آئندہ بھی ہمارے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوگی۔" میں نے کہا "چلو آج یہی کام کرتے ہیں پہلے۔"

"یہ کام میں اکیلا کر لوں گا۔ تم جاؤ ظفر حیات سے مل کے اس کے جذبات کی آتش فشانی دیکھو۔ خادم حسین کو گھر سے ساتھ لے جانا۔" "وہ کہاں رہتا ہے۔ میں تو کبھی اس کے گھر نہیں گیا۔"

"گھر تو پرانے شہر کی گلیوں میں ہے لیکن فون ہے اس کے پڑوس میں۔ پیغام دے دینا کہ وکیل صاحب نے بلایا ہے۔ تم جہاں کہو گے وہ خود پہنچ جائے گا۔ تم یہ گاڑی اپنے پاس رکھو اور ممکن ہو تو فلیٹیز میں اپنے نام سے کمرا بھی بک کرا لو" غالب نے کہا۔

اس کی تجویز معقول تھی۔ میں گاڑی لے کر نکلا تو راستے میں ایک پبلک کال آفس سے خادم حسین کو پیغام دیتا ہوا سیدھا پولیس ہیڈ آفس پہنچ گیا۔ حسب توقع وہاں ہنگامی میٹنگ جاری تھی جس میں ڈی ایس پی شاہد علی بھی شریک تھا۔

مجھے دیکھتے ہی ایس پی ظفر حیات کا موڈ بگڑ گیا "یہ مصیبت کیوں آ گئی۔ اسے کہو پھر کبھی آئے۔ ابھی ہم مصروف ہیں۔"

"آپ ہی نے اس کوری کھوپڑی والے کو سر چڑھا رکھا ہے۔ میں تو اپنا بندوبست کر سکتا ہوں کہ پھر اس کی صورت نظر نہ آئے۔"

www.paksociety.com

جوانا چاہتا تھا۔" شاہد علی نے مجھے خونی نظروں سے گھور کے ایک اور گالی دی۔

"چلو وہ معاملہ تو ختم ہوا۔ اب جعلی نوٹوں والا کیس ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ خبر جاری کردو کہ وہ بلاک میکر پولیس حوالات سے فرار ہوگیا تھا۔ متعلقہ لوگوں کو معطل کرادو جو اس کی حفاظت پر مامور تھے۔"

"یہ سب کرچکا ہوں میں۔ اصل مسئلہ دلاور کا ہے۔ اسے وہی ایم آر ایس والے لے گئے ہیں۔ میں شرط لگا سکتا ہوں۔"

"شرط مت لگاؤ۔ ثابت کرو۔ وہ سب تو تمہارے سامنے معصوم بنے پھر رہے ہیں۔ سوائے سکندر بخت کے سب کے بارے میں معلوم ہوچکا ہے کہ کون کہاں تھا اور کیا کررہا تھا۔"

"ان کا سرغنہ تو وہی ہے، سکندر بخت۔ چھلاوہ ہے وہ سر بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ گرگٹ اتنی تیزی سے رنگ نہیں بدلتا جیسے وہ چہرے بدلتا ہے اور ایسے غائب ہوتا ہے سامنے سے۔"

"شاہد علی! اتنے مرعوب ہو تم اس سے جیسے وہ عام آدمی نہیں سپرمین ہے۔ مافوق الفطرت قوتوں کا مالک ہے۔ تم کو احساس کمتری ہے پہلے سے تو پھر تم کچھ نہیں کرسکتے۔"

شاہد علی نے اِدھر اُدھر دیکھا "ویسے ایسی بات نہیں سر میں نے بڑے بڑے نوسرباز اور بدمعاش دیکھے ہیں اور۔"

"زبانی دعووں سے کام نہیں چلے گا۔ پتا چلاؤ کہ دلاور کہاں ہے؟ اگر انہوں نے دلاور سے کچھ اگلوالیا تو سمجھو ہم سب گئے کام سے۔"

"دلاور کو آپ کیا سمجھتے ہیں سر۔ وہ فولاد کا بنا ہوا ہے۔ خالص فولاد کا۔ سکندر کا باپ بھی اس سے کچھ معلوم نہیں کرسکتا۔"

سکندر کا باپ تو خیر واقعی کچھ نہیں کرسکتا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا لیکن بیٹا یہ کام ضرور کرے گا۔ اس فولاد کو پگھلا کے گندے پانی کی طرح گٹر میں نہ بہایا تو میں بھی وزیر خان کا بیٹا نہیں۔

"آدمی تو آدمی ہی ہوتا ہے شاہد علی۔ اور وہ کوئی جوان آدمی بھی نہیں ہے۔ آج کل تو تشدد کے حربے بھی بہت عام اور موثر ہوگئے ہیں۔ میری اور تمہاری نوکری اور زندگی دونوں کی سلامتی چاہتے ہو تو دلاور کا سراغ لگاؤ۔"

"صرف! پھر آپ مجھے آزادی سے کام کرنے دیں۔ ولایتی طریقوں سے ولی مجرم کچھ نہیں بتاتا۔ میں ابھی پکڑتا ہوں دو چار بندے اور آپ کے سامنے وہ سب نہ بک دیں تو میرا نام شاہد علی نہیں۔ ہم تو بندے کو گنے کی طرح مشین میں سے گزار سکتے ہیں۔ جیسے گنے کا رس نکلتا ہے ویسے ہی اس کے دل کی بات زبان سے نکلتی ہے۔"

"کس کو پکڑنا چاہتے ہو تم؟"

"وہی جو خاص بندے ہیں، ایم آر ایس کے پیچھے۔"

"یا یہ ایم آر ایس کیا بلا ہے۔ بلاوجہ اتنا ہوّا کھڑا کردیا ہے تم لوگوں نے مجھے تو اس کا مطلب بھی معلوم نہیں۔"

شاہد علی کو اب اپنے افسر اعلیٰ کی لاعلمی اور جہالت پر خوش ہو کر مسکرانے کا موقع مل گیا "ایم آر ایس کا مطلب ہے مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔"

"مائٹ از رائٹ۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس؟"

"جی سر۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ زمانہ خراب ہے۔ قانون کوئی چیز نہیں، نہ قانون کسی کا محافظ ہے، نہ مددگار۔ بس جس کے پاس طاقت ہے اس کا ہر کام ہوجاتا ہے اور وہ مجرم کو مجرم یا بے گناہ کو بے گناہ ثابت کرسکتا ہے ورنہ تھانے کچہری میں انصاف نہیں ملتا۔"

"نظریات تو کسی حد تک ٹھیک ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں نا جو گئے تھے مشرقی پاکستان میں بھارتی فوج سے لڑنے؟"

"نہیں سر۔ ان کی لڑائی تو بس دلاور سے تھی جو یہاں سے باغیوں اور علیحدگی پسندوں کو اسلحہ فراہم کرتا تھا۔ ان میں سکندر کی دلاور سے خاندانی دشمنی ہے۔ کچھ وراثت کا جھگڑا ہے۔ سکندر سمجھتا ہے کہ اس کے باپ کو دلاور نے مروادیا تھا۔ اس کا ایک دوست تھا محسن شیرازی۔ کسی ڈپٹی سیکریٹری کا بیٹا تھا۔ پھر یہ رابعہ جو سکندر کی یار ہے۔"

"تم اس مشہور وکیل کی بات کررہے ہو؟"

"ہاں جی۔ مشہور تھا۔ اس نے سکندر کی خاطر پہلے مقدمہ لڑنا چھوڑ دیا تھا حالانکہ وہ آج کل سیکریٹری ہے سر۔"

"سیکریٹری۔ کس محکمے کا؟" ایس پی چونکا "یہ اچھا پوائنٹ ہے۔ ہم اسے رابعہ کے خلاف استعمال کرسکتے ہیں۔"

"محکمے کا پتا بھی چل جائے گا سر۔ لیکن۔"

"لیکن کیا۔؟"

"اس کا نام مجھے معلوم نہیں" شاہد علی خفت سے بولا۔

"کوئی بات نہیں" ظفر حیات نے طنز کیا "ہم ہر محکمے کے ہر سیکریٹری سے پوچھ لیں گے۔ بلکہ تم فون اُٹھا کے یہ کام شروع کردو۔ کوئی نہ کوئی ضرور مان جائے گا کہ وہ رابعہ کا خصم ہے اور اس کا یار تھا سکندر۔"

"میں پتا کرلوں گا سر" شاہد علی کو پسینہ آگیا۔ "میں آپ کو کچھ اور بتانے والا تھا۔ محسن، رابعہ اور سکندر۔ ان کے نام سے ایم آر ایس بنی تھی۔ بعد میں دوسرے لوگ بھی شامل ہوگئے۔ سارے آپس میں دوست تھے اور جذباتی نوجوان تھے۔ بس مرزا غالب صحافی، اس کی یار نادو۔ بڑی ماہر ہے جوڑ توڑ کرانے کی۔ ایک لڑکی تھی جس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ ناگ منی ہے۔"

"ناگ منی! کون ناگ منی؟"

"ڈاکو شیش ناگ کی بہن۔ بڑا نامی گرامی ڈاکو تھا۔ پولیس مقابلے میں ہلاک ہوا تھا مگر جاتے جاتے وہ بہن کو سکندر کے حوالے کرگیا۔ خود ناگ منی کم نہیں تھی مگر وہ گل بانو بن کے بالکل بدل گئی۔ ہمارے محکمے کا ایک اے ایس آئی تھا۔ اکرام شیخ نوکری چھوڑ گیا۔ وہ نازو کا بھائی تھا۔ یہ سارے اکٹھے ہوگئے تھے چوہدری دلاور کو غدار اور ملک دشمن سمجھتے ہیں اور اس کو تباہ کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ معزز اور امن پسند شہری ہے، محب وطن ہے۔"

ظفر حیات عجب طرح سے مسکرایا "یہ بات میرے سامنے تو مت کہو۔ جھوٹ کی بھی حد ہوتی ہے شاہد علی۔"

شاہد علی پھر بغلیں جھانکنے لگا "ویسے تو سر یہاں الزام کس پر نہیں ہے۔ لوگوں نے قائداعظم اور قائد ملت کو معاف نہیں کیا تھا۔۔۔"

"دوبارہ میرے سامنے یہ موازنہ مت کرنا شاہد علی۔ میں بہت بُرا آدمی ہوں مگر پاکستانی ہوں اور نہ اس ملک کے خلاف کچھ سن سکتا ہوں، نہ قائد اعظم کے خلاف۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ دلاور کیا ہے لیکن میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا تھا۔ افسوس کہ یہ میرے دائرہ اختیار میں نہیں۔ میں صرف ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس کی تفتیش کے لیے آیا ہوں ورنہ۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

شاہد علی کا رنگ فق ہوگیا "آئی ایم سوری سر۔"

"دلاور کی بازیابی کے لیے کیا کررہے ہو تم؟"

"ہر جگہ نگرانی ہورہی ہے۔ جہاں بھی یہ ایم آر ایس والے آتے جاتے ہیں، ہمارے بندے وہاں موجود ہیں۔ ابھی تک رپورٹ وہی ہے۔"

"کہ کوئی رپورٹ نہیں۔ تمہارے یہ بندے کون ہیں۔ تم جیسے ہیں تو پھر رپورٹ خاک دیں گے۔ ان کو نظر آتا ہے؟ سنائی دیتا ہے ٹھیک سے اور وہ بیٹھے بیٹھے سو تو نہیں جاتے؟"

"نہیں سر۔ بڑے خاص بندے لگائے ہیں۔ ابھی تک رابعہ کے آفس اور وقار یوسف کے گھر کی نگرانی ہورہی تھی۔ دونوں جگہ خفیہ مائکروفون لگادیے تھے۔ جو بات ہوتی صاف سُنی جاتی تھی۔ اب تیسری جگہ بھی ایک پارٹی روانہ کی ہے۔ جو منظر وکیل کی کوٹھی کا فون ٹیپ کرے گی۔ اندر جاکے مائکروفون لگانا تو مشکل تھا، رابعہ اور منظر کی گاڑی کے نیچے مائکروفون لگائے ہیں۔ مقناطیسی مائکروفون ہیں۔ گر نہیں سکتے اور نظر بھی نہیں آسکتے۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ یہ بات نہ رابعہ کے علم میں تھی اور نہ منظر کے۔ اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ وہ ایک ہی گاڑی میں نہیں گئے تھے ورنہ آپس میں ضرور باتیں کرتے اور باتوں باتوں میں بھانڈا پھوٹ جاتا۔ خود وقار یوسف کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے گھر کی باتیں کوئی باہر سُن رہا ہے۔ ان سب کو یہ بتانا ضروری تھا مگر سوال یہ تھا کہ کیسے بتایا جائے۔

"دلاور کے گھر والوں کی حفاظت کے لیے کیا کیا ہے تم نے؟"

"یہ میرا کام تو نہیں تھا سر۔ خود دلاور نے بندوبست کرلیا اور انہیں غائب کردیا۔ ان پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔"

"تمہاری اپنی عقل کیا کہتی ہے۔ تم شروع سے اس کیس کو ڈیل کررہے ہو اور تمہارے ساتھ وہ انسپکٹر بھی ہے۔ وہ کہاں ہے اس وقت۔"

"وہ موبائل میں گھوم رہا ہے سر" شاہد علی مسکرایا "اس کے پاس ایک خاص ریسیور ہے۔ ہم نے دلاور کو ایک سگنل ٹرانسمیٹر دے دیا تھا جو پولیس کی فریکوئنسی پر کام کرتا ہے۔"

"کس کی اجازت سے۔ تم جانتے ہو یہ کتنا سنگین جرم ہے۔"

"اوپر والوں کا حکم تھا سر۔ اور ٹرانسمیٹر ویسے تو پولیس کا ہے مگر ہمیں بھی حکومت نے فراہم نہیں کیا تھا۔"

"پھر؟"

"ہمارے پاس تو پرانے وقتوں کے آلات ہیں سر۔ جو گورے ہندوستان چھوڑتے وقت کباڑ سمجھ کے چھوڑ گئے تھے۔"

"پورا نظام وہی ہے۔ کالے قانون تک۔"

"یہ ٹرانسمیٹر دراصل چھوٹا سا وی ایچ ایف مائکروفون ہے۔ دلاور نے خود ہی باہر سے اسمگل کیا تھا۔ ایک ایس ایس پی ہوتے تھے مرحوم ضامن رضوی۔"

"نام سنا ہے ان کا۔"

"کوئی کچھ بھی کہے جناب عالی۔ ماننا پڑتا ہے کہ ویسا افسر نہیں دیکھا۔ محب ہندہ تھا جی اور اتنا قابل۔ پہلے ترقی کی پھر تو نئی وقت بدل گیا اور اس کا گزارا نہیں ہوا۔ پُرانے لوگ لحاظ کرتے تھے۔ نئے دشمن ہوگئے اس کے۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ اچھا افسر تھا ماتحتوں کے لیے بھی۔"

مجھے اس وقت ایک دشمن کے منہ سے مرحوم انکل ضامن رضوی کے لیے تعریف کے الفاظ سُن کے دلی سکون اور مسرت حاصل ہوئی۔ گزرے ہوئے وقت کی بہت سی یادوں کے نقش تازہ ہوگئے۔ ہم نہ ہوں گے تو بہت یاد کرے گی دنیا۔ ان کی صورت نے میرے تصور میں سرگوشی کی۔

"ضامن رضوی کا کیا ذکر تھا یہاں؟" ظفر حیات بولا۔

"انہوں نے یہ سگنل دینے والا آلہ ضبط کرلیا تھا۔ پھر ہم نے بھی خاص خاص لوگوں سے یہ آلات منگوائے۔ خاص استعمال کی چیز ہے۔ ہر جگہ استعمال نہیں کرسکتے اور خفیہ رپورٹ تو اس کے بغیر نہیں بنتی۔ مگر سرکاری طور پر کچھ نہیں ہے۔ لکھا یہ جاتا ہے کہ رپورٹ مخبروں نے دی تھی۔ ایسا ہی ایک سگنل دینے والا آلہ چوہدری دلاور کے پاس ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اس سے پتا چل جاتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ سگنل مسلسل نشر ہوتا ہے اور طاقتور ریسیور ہو تو سراغ لگایا جاسکتا ہے۔"

"مگر یہ تو اس کی گاڑی میں ہوگا۔"

"ہاں جی۔ ٹرانسمیٹر گاڑی میں ہے۔ مائکروفون تعویذ کی طرح گلے میں پڑا رہتا ہے۔ لگتا ہے چاندی کے کیس میں کوئی نقش ہوگا یا کلام پاک کا خوبصورتی نسخہ۔ سونے کی زنجیر ہے۔ مگر اندر وہ آلہ ہے اور ذخیرہ اس کا ریلیا ہے۔ اس کا سگنل گاڑی میں وصول ہوتا ہے

www.paksociety.com

اور اس کے ٹرانسمیٹر سے نشر ہوتا ہے تو گھر کے فون پر بھی سنا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت گاڑی نہیں ہے اس کے پاس۔ تعویذ جیسے آلے کا سگنل اتنا کمزور ہوتا ہے کہ مشکل سے سو گز تک جاتا ہے۔ انسپکٹر کے پاس ریسیور بہت طاقتور ہے۔ اس نے پکڑ لیا تو معلوم ہو جائے گا کہ دلاور سو گز کے اندر کہیں موجود ہے۔"

ظفر حیات متفکر ہو گیا "آئیڈیا یقیناً اچھا ہے مگر بہت سے سوالات ہیں جو انسپکٹر کی تلاش کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ فرض کرو اغوا کرنے والوں نے اسے تعویذ نہ سمجھا یا تعویذ کو کھول کے دیکھا۔ اس کے گلے سے اتار لیا۔"

"ویسے تو تعویذ گنڈے پر یقین نہ رکھنے والے بھی تعویذ کو نہیں چھیڑتے۔ گلے میں چھوڑ دیتے ہیں لیکن خطرہ ضرور ہے کیونکہ یہ تعویذ زیادہ بڑا نظر آتا ہے۔"

"اس کی بیٹری کتنی پاور فل ہے؟"

"بیٹری کا مجھے پتا نہیں سر۔"

"کمزور ہوئی تو سگنل بھی کمزور ہوگا۔ سو گز کے بجائے پچاس گز جائے گا۔ اس کو کسی کوٹھی میں رکھا گیا جو کنال دو کنال کی ہو یا تہ خانے میں۔ تو سڑک پر سے گزرتے ہوئے تمہارے انسپکٹر صاحب کو کچھ بھی سنائی نہیں دے گا۔ خواہ ریسیور رائفل سے اچھا ہو۔"

"یہ چانس تو ہے سر لیکن کوشش کرنا ضروری ہے۔"

ان کی گفتگو نے مجھے خاصا نروس کر دیا تھا۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ سڑک سے وہ جگہ کتنی دور ہے جہاں دلاور اس وقت موجود تھا۔ میرے اندازے کے مطابق سڑک سے گیٹ اور پھر گیراج تک کا فاصلہ کسی طرح بھی پچاس گز سے زیادہ نہیں تھا۔ دلاور کے گلے میں تعویذ کس نے دیکھا ہوگا۔ تلاشی میں اسلحہ وغیرہ تو نہیں چھوڑا جاتا مگر چاندی کی نقشین ڈبیا پر کسی کا شک نہیں جاتا کہ اس میں چھپا ہوا کوئی آلہ سگنل نشر کر رہا ہوگا۔ وہ بدستور دلاور کے گلے میں لٹکا ہوا ہوگا۔ منظر کا گھر بھی سب کی نظر میں ایک مشکوک جگہ تھی۔ انسپکٹر وہاں ضرور چیک کرے گا۔ کیا پتا اب تک اسے کوٹھی میں دلاور کی موجودگی کا سراغ مل گیا ہو۔ وہ چھاپا مار چکا ہو یا اس کے لیے قانونی مرحلے پورے کر چکا ہو۔ وہ کسی دشواری کے بغیر دلاور کو برآمد کر لیں گے اور نازو اسے حبس بے جا میں رکھنے کے الزام میں گرفتار ہو جائے گی۔ منظر بھی چکر میں آ جائے گا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں یہ معلومات کیسے آگے پہنچاؤں۔ میرے لیے پُرسکون رہنا بھی مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ ان کی گفتگو ابھی جاری تھی مگر میں وہاں سے اٹھنے کی سوچ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ غالب نے اتنی جلدی دلاور کو منظر کے گھر سے شفٹ نہیں کیا ہوگا۔ میں رابعہ کو خبردار کر سکتا تھا کہ وہ دلاور کے لاکٹ جیسے تعویذ کو گلے سے اتار کے توڑ دے۔

اچانک خادم کے چلانے کی آواز آئی "مدد کرتے ہو تم لوگ بھی۔ اندر وکیل صاحب فرنچ بول رہے ہوں گے اور ان کا صاحب انگریزی۔"

ایس پی نے گھنٹی بجائی "اندر آنے دو مولوی کو۔"

خادم حسین اندر آیا تو خاصا خفا تھا۔ "مجھے کوئی اسپیشل پاس ہوا ہی سرونٹ ہے یہ بک بک ہوگی روز۔"

"تمہاری بک بک تو ہم ایک منٹ میں بند کر سکتے ہیں اسپیشل پاس کے بچے" شاہد علی نے کہا "کتا بھونکنے سے باز نہ آئے تو زبان کاٹ دینی چاہیے۔"

خادم نے مجھ سے فرنچ میں کہا "یہ لوگ مجھے دھمکی دے رہے ہیں کہ میری زبان کاٹ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "ان سے کہو کہ تم صرف زبان ہی نہیں ناک کان شوز سب کچھ کٹا سکتے ہو۔"

مولوی نے جواب میں کہا "وکیل صاحب فرماتے ہیں کہ مولوی خادم حسین کو لاوارث نہ سمجھا جائے۔ یہ بات اعلیٰ افسران کے گوش گزار کی جائے گی۔ تحریری طور پر۔"

میں نے اتنی دیر میں بہت کچھ لکھ لیا تھا "خادم حسین۔ باہر جا کے کہیں سے فون پر یہ باتیں سب کو بتا دو۔ میں نے نام اور نمبر لکھ دیے ہیں۔ یہ کام فوراً کرو اور فوراً مجھے واپس آ کے بتاؤ۔"

میں نے اسے جیب میں سے دس کا نوٹ نکال کے دیا۔ "جب واپس آؤ تو کوئی دوا لیتے آنا۔ کھانسی کا شربت ہی لے آنا۔"

مولوی سمجھ گیا "میں ابھی دوائی لے کر حاضر ہوتا ہوں۔"

ایس پی نے کہا "تم بیمار ہو تو یہاں کیوں بیٹھے ہو۔"

خادم رک گیا۔ اس نے مجھ سے کہا "آپ کچھ بیمار نظر آئیں۔ میں کیا جواب دوں انہیں آخر؟"

"ان سے کہو کہ وکیل صاحب خدا نخواستہ نزع کے عالم میں نہیں ہیں معمولی گلے کی خرابی ہے۔"

خادم حسین کے جانے کے بعد بھی میرا اضطراب کم نہیں ہوا۔ ڈی ایس پی شاہد علی کے پاس کاغذات کا ایک نیا پلندہ آیا تھا۔ یہ نگرانی کرنے والوں کی تازہ ترین رپورٹس تھیں جو اس نے ایس پی کی طرف بڑھا دیں۔

"کچھ نہیں شاہد علی۔ سب گھر کے لوگ ہیں۔"

"آپ فکر مت کریں سر۔ شام تک امید ہے۔"

"رات کو تم کہہ رہے تھے کہ صبح تک امید ہے۔ ادھر مجھے اپنے کیس کی پریشانی ہے۔ یہ جو تمہارا باپ سامنے آ کے بیٹھا ہے یہ مجھے آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہے۔ ابھی تک تو اس کی قبر کا بھی پتا نہیں۔ میں اس کا نام نہیں لینا چاہتا۔ گورکن مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔"

"کیا کریں جی۔ بڈھا نوری تھا بھول گیا۔"

"اور تم نے فرض کر لیا کہ وہ بتانا نہیں چاہتا۔ معلوم کرنے کی کوشش میں اسے ہی ختم کر دیا۔ اب کیا اس کی روح سے معلوم کرو گے؟ یہ تو دیکھنا تھا کہ بڈھے کی قوت برداشت کتنی ہے" ظفر حیات نے برہمی سے کہا۔

"زیادہ سختی نہیں کی تھی سر۔ وہ بھی مجبوری تھی۔ بڈھا بکا ہوا تھا۔"

"بکا ہوا تھا۔ کیا مطلب ہے؟"

ڈی ایس پی شاہد علی نے عیاری سے کہا "اسے خاموش رہنے کی قیمت دی جا چکی تھی۔"

"کس نے دی تھی قیمت؟"

"انہی لوگوں نے سر۔ جو یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ڈاکٹر شبلی کو قتل کیا گیا تھا حالانکہ حادثہ ساری دنیا کے سامنے پیش آیا تھا۔"

ظفر حیات کا غصہ اور بڑھ گیا "شاہد علی۔ قتل کیا گیا تھا یا نہیں، یہ معلوم کرنے کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ تم میری مشکلات میں اضافہ کر رہے ہو۔ ایک طرف مدعی ہیں سینئر بیگ۔ یہ ان کی کھلی شکایت رہنے نہ دینے پائے۔ ان کا ساتھ رہنے والے ہیں چوہدری دلاور کے پرانے رشتہ۔ ان کو حمایت حاصل ہے پریس کی، تنظیمات کی اور مجھ پر دباؤ ہے حکومت کا۔ میں کیسے بچا سکتا ہوں دلاور کو جب تم خود استغاثہ کے کیس کو مضبوط بنانے پر آمادہ ہو۔ [illegible] کوئی معمولی غلطی نہیں ہے۔ وہ ہمارے حق میں گواہی دے سکتا تھا۔ جسے پتا ہو سکتا تھا [illegible] کہ اب تمہارے اور دلاور کے دشمن اس قتل کو بھی دلاور کے کھاتے میں ڈالیں گے۔ یہ ثابت کریں گے کہ دلاور کے کہنے پر پولیس نے اسے اٹھایا۔ اس سے شبلی کی قبر کا پتا پوچھا تاکہ وہاں سے لاش غائب کی جا سکے اور اس نے انکار کیا تو تشدد سے اسے مار ڈالا۔ کیا کہو گے تم جواب میں؟ بولو" اس نے میز پر مکا مارا۔

"[illegible] نہیں سر" شاہد علی کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی "کون الزام لگا سکتا ہے پولیس پر قتل کا؟"

"کیوں؟ وہ گورکن کیا طبعی موت مرا تھا؟"

"یہ آپ سے کس نے کہا کہ وہ مر گیا ہے اور اس کی موت پولیس تشدد سے ہوئی تھی" شاہد علی مسکراتا رہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ سر کہ ہم تو اسے رات کے وقت اٹھا لائے تھے اور صبح واپس چھوڑ آئے تھے۔ آپ کو یہ بات میں نے اس لیے بتا دی کہ آپ سے کیا پردہ۔ لیکن اور کسی کو کچھ بھی نہیں معلوم۔ نہ بڈھے کا بیٹا آیا تھا فریاد لے کر، نہ اس نے کسی کے خلاف رپورٹ لکھوائی اور نہ کوئی بیان دیا۔ کھا گیا ہوگا باپ کو خود ہی اور قبرستان کا مالک خود بن گیا ہوگا۔"

ظفر حیات نے اطمینان کا سانس لیا اور سگریٹ جلانے لگا۔ "اس کے لڑکے کو کچھ معلوم ہے؟"

"نہیں سر۔ ابھی تک تو اس نے بیان نہیں بدلا مگر میرا خیال ہے وہ جھوٹ بولتا ہے۔ گورکن بڈھا نوری تھا۔ ستر سال کا ضرور ہوگا۔ خود تو قبریں نہیں کھودتا ہوگا۔ بیٹا اس کے کام میں مدد کرتا ہوگا۔ قبر کھودنا بڑی جسمانی مشقت کا کام ہے۔ جوان آدمی ہی کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر شبلی کی قبر بھی گورکن کے بیٹے نے ہی کھودی ہوگی۔"

"کتنے بچے ہیں اس کے؟"

"دو تھے سر لیکن اب ایک رہ گیا ہے۔ ایک بھاگ گیا باپ کی موت کے بعد۔ شاید وہ جانتا تھا۔"

"اب تم دوسرے کو بلا کے وہ سب مت کرنا جو بڈھے کے ساتھ کیا تھا۔ ان لوگوں کے لیے مارنے سے بڑی چیز پیسہ ہے۔ جیب کی خوب مالیت۔ کون سا تمہاری جیب سے جائے گا۔ دس ہزار میں نہیں۔ پچاس ہزار۔ نقد ایک لاکھ رکھوا اس کے سامنے۔"

"اتنا نقد میں کہاں سے لاؤں گا سر؟"

"شاہد علی!" ظفر حیات نے اسے سرزنش کی "کیا تم یہ بھی چاہتے ہو کہ میں تمہارا بینک بیلنس معلوم کرواؤں۔ اور پھر تمہیں بتاؤں کہ تم ایک لاکھ کس بینک کی کس برانچ سے اور کون سے اکاؤنٹ سے لا سکتے ہو۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ سب۔"

"[illegible] سر" شاہد علی نے جلدی سے کہا "یہ شبلی ڈاکٹر ہوتا یا کوئی پاکستانی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا سر۔ ہم کسی بھی لاش کو، میرا مطلب ہے کسی بھی عورت کی پرانی لاش کو پوسٹ مارٹم کرنے والوں کے حوالے کر دیتے۔ لیکن اس ڈاکٹر کا تو پورا ریکارڈ ہے برطانیہ میں۔ فنگر پرنٹس سے لے کر دانتوں کے ایکسرے تک۔"

"فنگر پرنٹ تو مٹی میں مل گئے۔ ہاں دانتوں کی ساخت کا ریکارڈ ہوگا۔ آج کل DENTAL STRUCTURE ہی شناخت کا سب سے موثر اور صحیح طریقہ سمجھا جاتا ہے۔"

خادم حسین نے اندر آ کے کھانسی کا ایک شربت میرے سامنے رکھ دیا اور بولا "آپ کے منظر صاحب اور مس رابعہ سے بات تو نہیں ہو سکی لیکن میں نے بار روم میں پیغام دے دیا تھا۔"

"بے وقوف۔ کیا پیغام دے دیا تھا اور کسے؟" میں نے کہا۔

"وہ مل گئے تھے وقار یوسف صاحب" خادم حسین نے کہا "لیکن میں نے ان کے گھر فون نہیں کیا۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "اور منظر صاحب کے گھر کون ملا تھا؟"

"کوئی جناب۔ جتنی تیز ان کی زبان چلتی ہے" اس نے توبہ کے انداز میں کانوں کو ہاتھ لگایا "قینچی کیا چیز ہے جناب۔ الیکٹرک زبان ہے اللہ۔"

"منظر کی بیوی؟" میں نے کہا "اسے نہیں بتانا تھا کچھ بھی خادم۔"

"نہیں بتایا جی۔ میں کوئی بے وقوف ہوں۔ بس جیسے ہی وقفہ آیا میں نے جھٹ سے کہہ دیا کہ مجھے تو مس نازو سے بات کرنی تھی۔ آپ کہاں بیچ میں کود کے میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ میں وہ خادم

www.paksociety.com

نہیں ہوں جسے آپ نے مرغی خریدنے کے لیے ایک سال پہلے بازار بھیجا تھا اور وہ سو کا نوٹ لے کر بھاگ گیا تھا۔ اگر اس کا نام بھی خادم تھا تو یہ میرا قصور نہیں۔ وہ خفا ہو گئیں کہ سو روپے بھی لے گئے تھے اور جھوٹ بھی بولتے ہو۔ تمہاری آواز وہی ہے۔ میں نے کہا کہ جناب میں وہی خادم ہوتا تو آپ کو فون کیوں کرتا سال بھر بعد۔ اگر آواز ملتی ہے میری تو یہ بھی میرا قصور نہیں۔ بڑی قسمیں کھائیں تب انہیں یقین آیا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "چلو خدا کا شکر ہے یقین آگیا ورنہ وہ آسانی سے ماننے والی خاتون نہیں ہیں۔ پھر بات ہوئی تاڑو سے۔"

"بات ہوئی مگر انہوں نے کہا کہ وہ تعویذ تو دلاور کے گلے میں نہیں ہے۔"

میں فکرمند ہو گیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"سب کچھ ہو سکتا ہے جی دنیا میں۔ انہوں نے تصدیق کرلی تھی۔"

ظفر حیات نے میز پر چھڑی ماری "مولوی خادم حسین' زیادہ فرنچ مت بولو۔ کیا رپورٹ لائے ہو تم باہر سے؟ تم مجھے مترجم سے زیادہ جاسوس لگتے ہو۔ کیا چکر چلا رکھا ہے تم نے؟"

"چکر کیسا سر۔ یہ دو نالائق ہوں جی آپ کے سامنے۔"

"تمہارے اس وکیل کو ایک گھنٹے میں چھینک تک نہیں آئی۔ تم کھانسی کا شربت اٹھا لائے ہو۔ سچ بتاؤ باہر کیوں گئے تھے؟"

میں نے اطمینان سے کھانسی کے شربت کی بوتل اٹھائی اور ڈھکن کی مدد سے تقریباً دو چمچ پی گیا۔ اس کا ذائقہ برا نہیں تھا۔

ظفر حیات ایک دم اتنی پی بن گیا تھا "خادم' تمہاری کھال کھینچ کے اس کی جوتے بنا سکتا ہوں میں اور اس جوتے سے تمہارے اس ولایتی وکیل کا سر گنجا کر سکتا ہوں۔ سیدھی طرح بتاؤ کہ تمہیں اس نے کس مشن پر بھیجا تھا؟ تم نے منظر' رابعہ' وقار یوسف اور تاڑو سب کے نام لیے تھے۔"

مولوی نے فریادی نظروں سے مجھے دیکھا "آپ سن رہے ہیں جناب۔ میری کھال کی کوئی بات نہیں مگر آپ کو جوتے پڑیں گے۔"

میں نے غصے میں بولنا شروع کیا "اس سے کہو کہ میں ابھی اور اسی وقت آئی جی صاحب سے بات کروں گا۔ پھر برٹش کونسلیٹ سے۔ اور میں ایک ایف آئی آر بھی درج کرانا چاہتا ہوں کہ میرے معاون کو دھمکی دی جا رہی ہے۔"

خادم حسین نے یہ بات آگے پہنچائی تو ظفر حیات اور شاہد علی دونوں کا جوش و خروش سمندر کے جھاگ کی طرح ختم ہو گیا۔ خادم حسین کو یقین آگیا کہ میں کوئی معمولی چیز نہیں ہوں۔ مجھ سے تو آئی جی بھی ڈرتا ہے۔ وہ زیادہ اعتماد کے ساتھ مسکراتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

اب خادم حسین کی مدد سے میں نے ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس کے بارے میں کچھ تفصیلات حاصل کرنے کے لیے دستاویزات کی نقول مانگیں۔

"پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں ہے" ظفر حیات کے بجائے شاہد علی بولا۔

میں نے سخت حیرانی کا اظہار کیا "کمال ہے۔ یہ مانا کہ قتل۔ یہ تو بعد میں طے ہوگا مگر پوسٹ مارٹم ہر صورت میں ضروری ہے۔"

"پوسٹ مارٹم اب ہوگا۔ عدالت کے حکم سے قبر کھودی جائے گی۔ اگر قبر کا سراغ مل گیا۔"

"کیا مطلب؟ قبر بھی نہیں ہے۔ میں تو اپنے ساتھ میڈیکل ریکارڈ لے کر آیا تھا۔ سوشل سیکیورٹی والوں نے مجھے فراہم کیا تھا۔ اس میں شیلی کے ڈینٹل اسٹرکچر کی رپورٹ بھی شامل ہے۔"

مجھے شاہد علی اور ظفر حیات کے چہروں پر تردد کے آثار دیکھ کے خوشی ہوئی۔

"ہم قبر کا پتا چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "اور کے مجھے چوہدری دلاور کے فنگر پرنٹ چاہئیں۔"

"چوہدری دلاور کوئی مجرم نہیں ہے۔ ریکارڈ ہوتا ہے پیشہ ور افراد کا۔ سزا یافتہ لوگوں کا۔" شاہد علی بولا "وہ معزز آدمی ہے۔"

میں نے کہا "فنگر پرنٹ کسی معزز آدمی کے بھی لیے جا سکتے ہیں۔"

"کہاں سے لائیں ہم اس کے فنگر پرنٹ آخر؟ وہ خود کہاں ہے؟"

میں نے کہا "اس کے گھر سے' دفتر سے' اس کی گاڑی سے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں اس کے خلاف قتل کی ایف آئی آر ہے۔ وہ مجرم نہ سہی ملزم ضرور ہے۔ پولیس کو اس کی تلاش میں ہونا چاہیے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ابھی تک پولیس نے کچھ نہیں کیا ہے۔ کوشش شروع ہی نہیں کی ہے۔"

شاہد علی گرم ہو گیا۔ اس نے غصے میں بتایا کہ ایک انسپکٹر گاڑی لے کر شہر کی خاک چھانتا پھر رہا ہے اور اس کے ذمے چوہدری دلاور کا سراغ لگانا ہے۔ سارے شہر کی پولیس فورس ایک آدمی کے لیے وقف نہیں کی جا سکتی۔

میں جانتا تھا کہ انسپکٹر شہر میں کیوں پھر رہا ہے۔ اس کا مقصد دلاور کی گرفتاری نہیں تھا۔ وہ اسے بازیاب کر کے قانون کے ہاتھوں کی دسترس سے دور پہنچانا تھا۔

میں نے کہا "چوہدری دلاور کا ایک بھائی تھا اکبر خان۔"

"ہم اس کے متعلق نہیں جانتے۔"

میں نے کہا "چوہدری دلاور کا باپ پشاور کے قریب کسی گاؤں میں کارپینٹر تھا۔ بڑا اچھا کاریگر تھا۔ اچانک وہ اپنے بیوی بچے چھوڑ کے لندن چلا گیا تھا۔ آخر کیوں؟"

"اس سوال کے جواب پر آپ روشنی ڈالیں۔"

"لیکن وہ یہاں کا رہنے والا تھا۔ کیا وہ کوئی جرم کر کے فرار ہوا تھا۔ یہ اس کے آبائی گاؤں اور متعلقہ تھانے کے ریکارڈ سے معلوم ہو جائے گا۔"

"ہم اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔"

میں نے ایک نوٹ بک میں یہ لکھ لیا اور کہا "دلاور کے باپ نے لندن میں شادی کر لی تھی۔ ایک انگریز عورت سے جو پہلے سے طلاق یافتہ تھی۔"

ظفر حیات نے اقرار میں سر ہلایا "وہ شیلی کی ماں تھی۔"

"جی۔ دلاور کے باپ نے فرنیچر کا اچھا کاروبار کیا مگر ایک روز وہاں سے بھی اچانک غائب ہو گیا۔ بیٹی اور بیوی کو چھوڑ کے۔"

ظفر حیات نے کہا "آخر کیوں۔ تم نے وہاں معلوم کیا۔ کیا وہ کوئی جرم کر کے فرار ہوا تھا؟"

میں نے کہا "اس بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا مگر شیلی کی ماں نے تیسرے مرد سے شادی کی تھی۔ جو ایک نیگرو تھا اور آج کل جیل میں ہے۔ کیا تم جانتے ہو وہ کس کے جرم کی سزا کاٹ رہا ہے؟"

"تم بہتر بتا سکتے ہو" ظفر حیات بولا۔

"ویل۔ میں نے اس سے ملاقات کی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ قتل کے جرم میں عمر قید کاٹ رہا ہے۔ اس پر ڈاکٹر شیلی کی ماں کے قتل کا الزام ثابت ہو گیا تھا۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔"

"پھر ہم کیا کریں' وہ اپیل کرتا۔"

"اپیل سے کام نہیں بنا۔ حالات کی گواہی بھی اس کے خلاف تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ قتل کرنے والا چوہدری دلاور تھا۔"

"کیا وہ چوہدری دلاور کو جانتا تھا؟" شاہد علی بولا۔

"نہیں۔ مگر میں نے اسے تصویر دکھائی تو اس نے پہچان لیا اور شور کرنے لگا کہ یہی ہے قاتل۔ یہ کون ہے؟ اسے میرے سامنے لاؤ۔"

"وہ کسی بھی تصویر کو دیکھ کر شور مچا سکتا تھا" ظفر حیات مسکرانے لگا۔ "کیا اسے کہا گیا تھا کہ وہ دلاور کو ملزم ٹھہرائے؟"

"کیا مطلب؟"

"جو لوگ چوہدری دلاور کے دشمن ہیں۔ سکندر بخت کا نام سرفہرست ہے۔ اس کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ وہ لندن میں زیر تعلیم تھا۔ وہاں اس کے بہت دوست ہیں۔ کسی نے قاتل کو دلاور کی تصویر پہلے ہی دکھا دی ہوگی اور یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ اس کا ڈاکٹر شیلی سے کیا رشتہ تھا۔ اسے موقع مل گیا ایک جھوٹی کہانی سنانے کا۔ یا شاید یہ کہانی اسے بنا کے دے دی گئی۔"

"میں امکانات کو مسترد نہیں کر سکتا۔ حقائق جو بھی ہوں گے سامنے آجائیں گے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ گھر میں موجود تھا کہ اس کی بیوی آگئی اور شور کرنے لگی۔ اس کا جھگڑا چل رہا تھا کہ چوہدری دلاور آگیا۔ وہ نام نہیں جانتا تھا۔ بیوی نے کہا کہ ایک انڈین یا پاکستانی آگیا۔ جو حلیہ اس نے بتایا تھا۔ اس سے چوہدری دلاور کا ہے۔ اس پاکستانی نے ڈاکٹر شیلی کی ماں کو مار دیا۔ پھر اس نیگرو کی گرل فرینڈ کو مار دیا' ڈاکٹر شیلی سمجھ کے۔ نیگرو جان بچانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا تھا۔ اسے پولیس نے ڈبل مرڈر کے الزام میں پکڑ لیا۔ ساری گواہیاں اس کے خلاف تھیں۔ اسے سزا ہو گئی۔ عدالت کے ریکارڈ پر بیان ہے۔ اس کا دفاع کرنے والے وکیل نے اس بیان کی روشنی میں ایک اسکیچ بنوایا تھا۔ ایک خاکہ۔ اس شخص کا جسے نیگرو اصل قاتل قرار دیتا تھا۔ نیگرو نے تسلیم کیا کہ وہ خاکہ بالکل اصل تصویر جیسا تھا۔ عدالت نے یہ بات نہیں مانی مگر فائل میں خاکہ موجود ہے اور اب چوہدری دلاور کی تصویر سے ملا کے دیکھا جائے گا۔ تو ثابت ہو جائے گا کہ نیگرو جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ وہ کسی فرضی شخص کا حلیہ نہیں بیان کر رہا تھا۔"

"وقت آنے پر جو ہوگا اس کا فیصلہ ہم کریں گے نہ تم" ظفر حیات اٹھ کھڑا ہوا "اب مجھے کام سے جانا ہے۔ آئندہ جب آؤ پہلے اپائنٹمنٹ لو ورنہ میں نہیں ملوں گا۔"

اس کے آفس سے باہر آتے ہوئے میں خاصا مطمئن تھا۔ مجھے مفید معلومات حاصل ہوئی تھیں اور میں نے بروقت خطرات کا سدباب کر لیا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ پولیس کس طرح چوہدری دلاور سے مل کر قانون کے عمل کو سبوتاژ کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے اور اس کا پیسہ کیسے انصاف کے راستے میں دیوار بن رہا ہے۔ مجھے نور دین کی موت کا بھی پتا چل گیا تھا اور میں ظفر حیات کو اپنی معلومات سے ہراساں کرنے میں بھی کامیاب رہا تھا۔

اب مجھے منظر کے گھر جانے کی جلدی تھی۔ پولیس اس یقین کے ساتھ دلاور کو تلاش کر رہی تھی کہ شہر میں کہیں نہ کہیں ہمارے خصوصی ٹھکانوں کے آس پاس چوہدری دلاور کے لاکٹ کا سگنل سنائی دے گا مگر تاڑو کا کہنا تھا کہ دلاور کے گلے میں ایسا کوئی لاکٹ نہیں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دلاور نے وہ لاکٹ گلے سے اتار کے کہیں ڈال دیا ہو۔ رابعہ کے آفس میں۔ اس کی گاڑی میں۔ منظر کے گھر میں یا گیراج کے کباڑ خانے میں جہاں اسے کوئی دیکھ نہ سکے مگر اس کا سگنل نشر ہوتا رہے۔

میں نے خادم کو گاڑی میں بٹھایا اور اسے پیچھے نظر رکھنے کی ہدایت کی "اگر کوئی ہمارا پیچھا کرے تو بتانا۔"

"جی؟ میں سمجھا... میرا مطلب ہے مجھے کیسے معلوم ہوگا۔ پیچھے تو جناب کافی ساری گاڑیاں ہیں۔ سب ہمارا پیچھا کرنے والے نہیں ہیں۔ شریف لوگ ہیں اپنے اپنے کام سے جا رہے ہیں۔"

"یار احتیاط کہاں ہے تمہاری ڈکشنری میں؟" میں نے کہا "میں بھی گاڑی کو موڑتا ہوں۔ دیکھنا کون سی کار ہر موڑ پر ساتھ رہتی

www.paksociety.com

ہے؟"

"آہستہ آہستہ جناب۔ میں تو تربوز کی طرح لڑھک رہا ہوں دائیں بائیں، پیچھے کیسے دیکھوں؟" خادم حسین نے واویلا کیا "لاحول ولا قوۃ۔ بڑی بے حیا عورت ہے۔ یہ لگ جانے کی پیچھے نہیں، وہ تو دوسری طرف چلی گئی۔ اس کا لباس۔"

میں نے کہا "بہت بے ہودہ تھا، مجھے معلوم ہے۔"

"بے ہودہ! لباس تھا ہی کہاں جناب۔ بالشت بھر کے بلاؤز میں سے۔"

"خادم حسین۔ تم نے جو دیکھا اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ اب کون پیچھے ہے ہمارے؟"

"اب تو یہ دیکھا آپ نے موٹر سائیکل پر۔ کیا بے شرمی سے کمر میں ہاتھ ڈالے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ یہ سواری۔"

میں نے ہنس کے کہا "اونٹ پر بھی ایسے ہی بیٹھتی وہ۔۔۔"

منظر کے گھر جاتے جاتے میں نے گاڑی کراؤن سینما کی طرف موڑ لی۔ رابعہ کی پرانی کوٹھی کے ملبے پر چار مزدور کام کررہے تھے۔ ایک محل نما خوب صورت عمارت کا بیشتر حصہ گر گیا تھا مگر کچھ آثار باقی تھے۔ جلی ہوئی کھڑکیوں اور دروازوں کے خلا میں ویرانی نوحہ خواں تھی اور دھوئیں سے کالی دیواروں پر وقت کے آنسو جم گئے تھے۔ میری نظروں میں سارے منظر آج بھی زندہ تھے۔ ایک کوٹھی وہ تھی جہاں میں پہلی بار رابعہ کے گھر آیا تھا۔ پرانی کوٹھی کے لان اور مختصر سے باغ میں بارہا میں نے اس کے ساتھ چاندنی کے سائے گھٹتے بڑھتے دیکھے تھے۔ اس کی ماں کا جنازہ اُٹھتے ہی یہ کوٹھی زمیں بوس ہوگئی تھی۔ اسے تباہ کرنے والا بھی چوہدری دلاور تھا۔ اس نے دوبارہ اس گھر کا ملبہ صاف کرکے یہاں جدید طرز کی خوب صورت کوٹھی بنوائی تھی۔ اس کوٹھی میں چاندنی بیگم اور گولو پہلوان سے بھی میں ملا تھا۔ پھر کس عیاری سے دلاور نے یہ کوٹھی رابعہ کی نذر کردی تھی۔ نقصان کی تلافی کے طور پر لیکن یہ دام اجل تھا۔ اس کی بنیادوں اور دیواروں میں آتش گیر اور تباہ کن مادہ رکھا گیا تھا۔ یہ دلاور کے اختیار میں نہ تھا کہ ہمیں خدا کی طرف سے ملنے والی زندگی کی مہلت کی ایک ساعت بھی کم کرسکے چنانچہ جس دن اس نے اپنی دانست میں ہم سب کو اس محل کے ملبے میں دفن کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس دن ہم تائید ایزدی سے بچ گئے تھے۔

کیا اب اس ملبے پر تیسری بار تعمیر ہوگی؟ میں نے سوچا اور گاڑی سے اتر کے ایک مزدور کے پاس چلا گیا۔ وہ ایک ٹرک میں ملبہ ڈال رہا تھا۔

"سیٹھ کدھر ہے تمہارا؟" میں نے کہا۔

وہ حیران ہوکے مجھے دیکھنے لگا "کون سیٹھ؟"

"جس نے تمہیں یہاں کام پر لگایا ہے" میں نے کہا۔

"ٹھیکے دار سے پوچھو جناب۔ وہ اُدھر بیٹھا ہے" مزدور نے سڑک کے پار چائے کی ایک ریڑھی کی جانب اشارہ کیا۔

ٹھیکے دار بنچ پر پاؤں سمیٹے بیٹھا تھا۔ سیٹھ۔ میں نے کہا کہ یہ سب ملبہ لے جاؤ۔ ایک دم مفت دے رہا ہوں۔ لیے۔ بولا تھا شام کو آئے گا۔ تم کون ہے؟"

میں نے کہا "میں۔ میرا مکان بننے کا یہاں۔ پھر سیٹھ۔"

"تمہارا منشی عجب ہے۔ ہم ایک طرف سے ملبہ صاف کر نہیں چلے اودھر سے ہٹاؤ۔ بیچ میں سے" ٹھیکے دار بولا "ہم نہیں سنتا۔ بولا کہ جیسا بولے گا ویسے کرے گا ورنہ ہوگا اپن کو کیا۔ تھوڑا مشکل ہوا مگر ہم بیچ والا حصہ پہلے صاف، دوسرا رُک جاتا ہے۔"

میں نے واپس جاکے صاف شدہ حصے کا معائنہ کیا اور ہوگیا۔ غالب نے فرش کا وہ حصہ صاف کرالیا تھا جس میں تہ خانے کا زینہ تھا۔ اس فرش میں بھی دراڑیں پڑی ہوئی تھیں جگہ سے فرش بیٹھ گیا تھا۔ سیمنٹ ٹوٹنے سے شگاف پڑ گئے تھے سریے کا جال سلامت تھا۔ یہاں سے نیچے جانے کا راستہ آسان ہوگیا تھا۔

خادم حسین کی حالت بھوک سے غیر ہورہی تھی۔ جب میں نے اسے طلب کیا تھا تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہوچکا تھا۔ اب شام ہوگئی تھی۔ جب میں نے چائے کے لیے پوچھا تو وہ بچوں کی طرح بچنے لگا۔

"گستاخی معاف۔ آپ نے تو مروت بھی چھوڑ دی۔ چائے سے پیٹ بھر سکتا ہے۔ حسین میں بھی کچھ ڈالنا پڑ جاتا ہے چڑیل۔ انسان کے ساتھ بھی پیٹ لگا ہوا ہے اور آدمی کو بے چارا پیٹ کی خاطر کرتا ہے۔ پیٹ میں تو جناب قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ اب صاف انا اللہ کی آواز آرہی ہے۔ کوکہاں سنائی دے گی کسی غریب کے پیٹ کی فریاد۔"

میرے لیے کھانے کا وقت نکل گیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی کافی کے ساتھ سینڈوچ کھائے اور خادم حسین کو بہر حال مصروف چھوڑ کے نکل گیا۔ "میں بل دے جاؤں گا۔ تم آرام سے کھا پی کے گھر چلے جانا۔ اب تمہاری ضرورت کل ہی پڑے گی نا؟"

"آپ بتادیں۔ میں کہاں آجاؤں؟" وہ بولا "فارغ ہو کے وقت، کیونکہ گھروالی بھی میکے چلی گئی ہے۔"

میں نے کہا "صبح منظر صاحب کے گھر فون کرلینا۔"

ابھی میں اپنی کار تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ میں نے ریسٹورنٹ کے باہر پولیس کی گاڑی دیکھی۔ ڈی ایس پی شاہد علی اگلی سیٹ پر تھا۔ وہ بڑی تیزی سے باہر نکلا اور اندر چلا گیا۔ اس کے پیچھے جانے والا دوسرا شخص انسپکٹر تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ مولوی خادم حسین کو اُٹھانا چاہتے تھے اور نہ جانے کیسے انہیں پتا چل گئی تھی کہ وہ میرے ساتھ ہے۔ اس سوال کا جواب بجلی کی

ریوالور اڑ کے چھت تک گیا اور پھر نہ جانے کہاں گرا۔ میں نے شاہد علی کو کھینچ کے پلٹ دیا۔ وہ تیسری مرتبہ اٹھا تو میں نے اس کی کلائی پکڑی اور فوراً گھوم گیا۔ اسے کندھے کے اوپر سے گزار کے میں نے زمین پر لٹا دیا تو اس کا سر فرش پر لگا اور وہ بے سدھ ہوگیا۔

انسپکٹر کا دھیان دروازے کی طرف تھا۔ اسے اپنے افسر کی مدد کا خیال ہی نہیں آیا۔ وہ گرنے کے بعد پھر اٹھا اور دروازے کی طرف لپکا۔ اس وقت تک ایک دروازے سے ایک ساتھ گزرنے کی کوشش کرنے والے راستہ بلاک کرچکے تھے۔ انسپکٹر نے چیخ چیخ کے انہیں اپنی اتھارٹی سے متاثر کرنے اور اوائے فرض کی سزا سے ڈرانے کی بے سود کوشش کی۔ وہ لوگوں کو دھکیلتا گالیاں بکتا سب کے بیچ میں سے باہر پہنچا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔ مولوی خادم حسین سر پر پاؤں رکھ کے بھاگا تھا۔ یا دار تک سے وہ سمجھ گیا تھا کہ دجل اس کے تعاقب میں ہے۔ وہ پولیس کے ہاتھ نہیں لگا۔

شاہد علی کے ناک آؤٹ ہوتے ہی نہ جانے کہاں سے منیجر نکل آیا "یہ کیا بدمعاشی ہے۔ کون ہو تم؟ پولیس کہاں آگئی یہاں اور یہ اسٹیٹ توڑ پھوڑ کیوں ہوئی ہے یہاں؟" اس نے چلانا شروع کیا۔

میں نے جواب فرنچ میں دیا اور تیس سیکنڈ تک مسلسل بولتا رہا "یہ سب تم پولیس سے پوچھنا۔ میں تو ایک وکیل ہوں اور قتل کے ایک مقدمے کی پیروی کے لیے لندن سے آیا ہوں۔"

کبھی اچانک آدمی کو ایسی غیر متوقع صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ مفروضات پر قائم یقین کی دیوار خود اسی پر آگرتی ہے۔ ایسا ہی کچھ میرے ساتھ ہوا۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ میری فرنچ کے جواب میں ایک ریسٹورنٹ کا منیجر فرنچ بولنے لگے گا۔

"اگر تم فرنچ وکیل ہو تو کیا تمہیں پاکستان میں قتل کرنے کا لائسنس حاصل ہے۔ تم قتل کے کس مقدمے کی پیروی کررہے ہو۔ تم تو خود قاتل ہو۔ تم نے ایک ڈی ایس پی کو مار ڈالا ہے۔ تمہیں معلوم ہے یہ کتنا سنگین جرم ہے۔ اگر پولیس کسی وکیل کو بلاوجہ سب کے سامنے مارے تو یہ کوئی جرم نہیں ہوتا مگر وہ جواب میں اپنے دفاع میں کسی کو تھپڑ بھی ماردے تو اس کی بخشش نہیں ہوتی۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ فرانسیسی بولتے ہوئے میں نے کوئی بے ہودہ یا فضول بات نہیں کی تھی۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ یہاں فرنچ کون سمجھے گا، میں فرنچ کی کوئی نظم پڑھ دیتا یا کوئی لطیفہ سنا دیتا تو مزید خرابی ہوتی۔ میرا ردعمل فطری تھا چنانچہ جو بات میرے لبوں تک آئی وہ بھی غلط نہیں تھی۔

میں نے کہا "تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ پولیس افسر مرا نہیں ہے، بے ہوش ہے۔"

"پریشانی تو میرے لیے ہے۔ تمہارا کیا ہے؟ تم صاف بچ

طرح میرے ذہن میں آگیا۔ پولیس نے میری گاڑی کے پیچھے بھی ٹریکر یا بگ چپکا دیا تھا۔ اس وقت جب میں ایس پی ظفر حیات سے باتیں کررہا تھا، پولیس کو اپنی کارروائی کے لیے کافی وقت ملا تھا۔ یقیناً انہوں نے میری اور خادم حسین کی ساری گفتگو سنی ہوگی اور ان پر یہ راز فاش ہوگیا تھا کہ فرنچ بولنے والا وکیل اردو بھی جانتا ہے۔

اگر وہ خادم حسین کو گرفتار کرلیتے تو اس سے سب کچھ اگلوا لیتے۔

میں نے واپس دوڑ لگائی اور پولیس کے ساتھ ہی اس ہال میں پہنچ گیا جہاں خادم حسین بڑے مزے سے دونوں وقت کا کھانا ایک ساتھ کھانے میں مگن تھا۔ پولیس کو دیکھتے ہی اس کا نوالہ حلق میں اٹک گیا اور اس کی نظروں میں خوف سمٹ آیا۔ میں بڑی تیزی سے آگے بڑھا اور درمیان کی میزوں سے ٹکراتا ہوا شارٹ کٹ سے خادم حسین کی میز تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

میں نے اس سے فرنچ میں کہا "خادم حسین بھاگ جاؤ۔ ان کو میں روک لوں گا۔ روپوش ہوجاؤ فی الحال۔"

اس سے زیادہ کہنے کی مجھے مہلت ہی نہ ملی۔ شاہد علی نے مجھے گالی دی "تیری فرنچ تو میں ابھی نکالتا ہوں۔"

خادم حسین اچھل کے کھڑا ہوا اور میرے پیچھے سے دروازے کی طرف دوڑا۔ انسپکٹر نے اس کو چلا کے آواز دی "رک جاؤ ورنہ گولی ماردوں گا۔"

ریسٹورنٹ میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ بڑی گھبراہٹ میں اٹھ کے دروازے کی طرف بھاگ رہے تھے اور خادم حسین انہی میں شامل تھا۔ انسپکٹر گولی چلاتا تو وہ کسی اور کو بھی لگ سکتی تھی۔ کئی کرسیاں اور میزیں الٹنے سے بھی انسپکٹر کی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ وہ دروازے کی طرف گیا مگر پہلے اس سے ایک ویٹر ٹکرا گیا۔ اس نے ویٹر کو دھکا دے کر گرایا تو خود ایک کرسی کی ٹانگوں میں الجھ گیا۔ خادم حسین کے لیے اتنی مہلت بہت تھی۔ وہ بڑی پھرتی سے لوگوں کے بیچ میں گھس چکا تھا اور زیادہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اصل خطرہ اسی کی جان کو ہے۔

شاہد علی اپنی کوشش میں ناکامی پر سخت مشتعل تھا۔ اس نے پہلے انسپکٹر کو ہدایات دیں کہ وہ بالکل لحاظ نہ کرے اور مولوی کو گولی ماردے مگر انسپکٹر خود فرنیچر کے ساتھ فرش پر پڑا نظر آیا تو اس کی مایوسی میرے خلاف غیظ و غضب کے طوفان میں ڈھل گئی۔ وہ گالیاں بکتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں اس کے لیے تیار تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا اور ایک منٹ میں اسے تین بار اٹھا کے ادھر سے اُدھر پھینکا۔ پہلی بار وہ ایک میز پر گرا اور میز پر سے پھسل کے فرش پر گیا تو میز اس کے اوپر آئی مگر وہ فوراً ہی کھڑا ہوگیا۔ اس نے ریوالور نکالا ہی تھا کہ میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ میری ایک کک نے اس کے ہاتھ سے ریوالور کو غائب کردیا۔

www.paksociety.com

جاؤ گے۔"

میں نے کہا "بلاوجہ شور مت کرو۔ تم نے کچھ نہیں کیا ہے۔ قصوروار ہیں یہ پولیس والے جو اسکاٹ لینڈ کے ایک گواہ کو اٹھانے آئے تھے۔ یہ اس کو لے جاتے تو تھانے میں تشدد سے ہلاک کر دیتے۔ میں نے اس گواہ کو بچایا۔ باقی جو کچھ تم نے دیکھا تم بتا سکتے ہو۔ پولیس کسی قانونی اختیار کے بغیر اندر آ گئی اور انہوں نے سامان توڑ پھوڑ دی۔"

"قانونی اختیار" وہ تلخی سے بولا "کون پوچھتا ہے یہاں قانونی اختیار کو۔ میں نے ان کے حق میں گواہی نہ دی تو یہ پہلے مجھے بند کر دیں گے پھر میرا ریسٹورنٹ بند کرا دیں گے۔ تم کس کے قتل کی تفتیش کر رہے تھے؟"

"تفتیش نہیں، مقدمے کی پیروی۔ ایک برطانوی لیڈی ڈاکٹر شیلی کو یہاں قتل کر دیا گیا تھا۔"

"پھر تم بھاگ جاؤ۔ ورنہ مجھے تمہارے خلاف بھی گواہی دینی پڑے گی۔ میں وہیں چھپ جاتا ہوں جہاں سے ابھی نکلا تھا۔"

"تم فرنچ کیسے جانتے ہو؟"

"میں پیرس میں رہا تھا نو سال تک۔ اب جاؤ' میں کہہ دوں گا کہ مجھے کچھ پتا نہیں تمہارے بارے میں" وہ کاؤنٹر کے پیچھے غائب ہو گیا۔

میں دروازے کی طرف بڑھا۔ اس وقت تک سب لوگ فرار ہو گئے تھے۔ اندر کا منظر ایسا تھا جیسے وہاں بیٹھے ہوئے لوگ اندر بم ہونے کی اطلاع پر بھاگے ہوں۔ کرسیاں' میزیں' کراکری اور بوتلیں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ دروازے کا شیشہ جو چھ فٹ لمبا اور ڈھائی فٹ چوڑا ہو گا کسی نے راستہ بنانے کے لیے توڑا ہو گا۔ اس کے ٹکڑے راستے میں بکھرے ہوئے تھے اور کچھ فریم میں لگے رہ گئے تھے۔

میں باہر نکلا تو مجھے دروازے کے سامنے تماشا دیکھنے والوں کا ہجوم نظر آیا۔ راہ چلتے لوگ ریسٹورنٹ کے سامنے ٹھہر گئے تھے۔ بہت سی کاریں کھڑی ہو گئی تھیں۔ اس سے ٹریفک جام ہو گیا تھا اور راستہ مانگنے والے اب مسلسل ہارن بجا رہے تھے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو انسپکٹر مجھے خاصے فاصلے پر لوگوں سے کچھ پوچھتا نظر آیا۔ غالباً وہ یہ معلوم کر رہا ہو گا کہ مولوی خادم حسین کو کس طرف فرار ہوتا دیکھا گیا ہے۔

میں نے موقع غنیمت جانا اور خاموشی سے لوگوں کے درمیان سے گزر کے اپنی کار تک پہنچ گیا۔ وہاں سے کار نکالنے میں مجھے دس منٹ لگ گئے مگر بالآخر میں چوک تک پہنچ گیا۔ آگے راستہ صاف تھا۔ منظر کے گھر پہنچنے کا خیال میں نے بدل دیا تھا۔ شاید پولیس کی نظر میں میری گاڑی تھی اور یہ گاڑی غالب نے اپنے نام سے کرائے پر حاصل کی تھی۔ اس کو غالب کے اخبار کے دفتر کے سامنے چھوڑ دینا ہی بہتر تھا۔

گاڑی کو وہاں کھڑا کرنے سے پہلے میں نے رومال سے اندر کی ہر وہ جگہ صاف کر دی جہاں میرے فنگر پرنٹ پائے جانے کا احتمال تھا۔ میں نے دفتر کے استقبالیہ پر بیٹھے ہوئے سیکیورٹی گارڈ سے کہا کہ وہ مرزا غالب کو بلائے حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ غالب ابھی آفس نہیں پہنچا ہو گا۔ نفی میں جواب پا کے میں نے گاڑی کی چابیاں گارڈ کو دے دیں۔

"مرزا غالب کو فون کر دو کہ ان کی گاڑی یہاں پہنچ گئی ہے۔"

گارڈ نے چابیاں لے لیں "وہ آتے ہی ہوں گے۔"

"پھر یہ چابیاں انہیں دے دینا" میں نے کہا "گاڑی باہر کھڑی ہوئی ہے دیکھ لو۔"

"ٹھیک ہے" اس نے گاڑی پر نظر ڈال کے کہا "آپ کا نام؟"

میں نے کہا "چودھری دلاور۔" اور باہر نکل گیا۔

منظر کے گھر میں ٹیکسی میں پہنچا۔ منظر اور رابعہ کے گھر پر ملنے کا امکان نہیں تھا۔ یہ ان کے آفس میں بیٹھنے کا وقت تھا مگر مجھے نازو کو منہ پا کے مایوسی ہوئی۔ نازو مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔

"کیا بات ہے۔ تم بہت بدحواس نظر آ رہے ہو؟"

"پہلے یہ بتاؤ کہ دلاور کہاں ہے؟"

"اسے تو غالب اپنے ساتھ لے گیا ہے۔"

"کیا؟" میں نے کہا "اسے میرا انتظار کرنا چاہیے تھا۔"

"اس نے بہت انتظار کیا۔ اور معاف کرنا۔ بہت گالیاں دیں تمہیں" نازو بولی "تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"میں ایس پی ظفر حیات کے ساتھ تھا۔"

"سارا دن؟"

"ہاں سارا دن۔" میں نے جھلا کے کہا "مجھے یہ بتاؤ کہ وہ بے وقوف دلاور کو کہاں لے گیا ہے۔"

"وہیں۔ جہاں اسے رکھنے کا خیال تھا۔ تہ خانے میں۔ اس نے راستہ بنا لیا تھا۔"

"میں نے دیکھا تھا۔ وہاں مزدور ملبہ صاف کر رہے تھے لیکن غالب اکیلا اسے تہ خانے میں کیسے لے جانے لگا۔"

"ابھی تو دلاور اس کی گاڑی میں ہے۔ ڈگی میں سو رہا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ سکندر کو ادھر بھیج دینا۔ وہ جب بھی آئے گا اسے رات آٹھ بجے لوں گا۔"

"گاڑی کس کی ہے؟"

"کرائے کی۔" نازو بولی "یہ مولوی خادم حسین کیا کہہ رہا تھا؟"

میں نے کہا "نازو۔ دلاور کے گلے میں ایک لاکٹ تھا۔ دیکھنے میں تعویذ لگتا تھا مگر اس کے اندر چھوٹا سا سگنل نشر کرنے والا آلہ تھا۔ پولیس اسے سگنل کی مدد سے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔"

"مجھے تو ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی۔"

"چلو گیراج میں دیکھتے ہیں" میں نے کہا "ایسا نہ ہو کہ پولیس کو سگنل سنائی دے تو وہ یہاں پہنچ جائے۔"

نازو متفکر ہو گئی "وہاں تو بہت کاٹھ کباڑ ہے۔ کیسے تلاش کریں گے ہم ایک لاکٹ کو۔"

"میں نے رابعہ اور منظر کے لیے بھی پیغام دیا تھا" میں نے کہا۔

"تمہارا پیغام مجھے مل گیا تھا تو انہیں بھی مل گیا ہو گا۔"

"تمہاری سارا دن کوئی بات نہیں ہوئی ان سے۔ یا وقار سے۔"

نازو نے نفی میں سر ہلایا "مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ عدالت میں تھے اور ظاہر ہے میں اپنا کام [illegible] تھی۔ تم بھی تو بتاؤ کہ سارا دن کیا مصروفیت رہی۔"

"بتاؤں گا۔ ذرا پہلے رابعہ کے آفس کا نمبر ملاؤ۔"

"یہاں سے بات کرو گے؟ فون ٹیپ نہ کر رہے ہوں شکاری۔"

میں نے کہا "کہتی ٹھیک ہو تم۔ لیکن خطرہ تو باہر سے بات کرنے میں بھی ہے۔ آفس کا فون بھی ٹیپ ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں چلتا ہوں۔"

"ایسے نہیں۔ پہلے مجھے بتاؤ کہ بات کیا ہے؟ اتنے پریشان نظر آ رہے ہو تم کہ مجھے وحشت ہو رہی ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور آرام سے بیٹھ گیا۔ "بات یہ ہے مس نازو کہ پولیس نے دلاور کا سراغ لگانے کے لیے اور ہمیں اغوا کا مجرم ٹھہرانے کے لیے بڑے وسیع پیمانے پر کارروائی کی ہے۔ رابعہ کی کار اور منظر کی کار کے نیچے خفیہ مائکروفون نصب کرا دیے گئے تھے۔ اگر ساتھ جاتے تو ضرور آپس میں کوئی بات دلاور کے متعلق کرتے اور پولیس کو سب معلوم ہو جاتا کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے۔ وقار یوسف کے گھر میں بھی کہیں ایسا ہی مائکروفون لگایا گیا ہے۔ معلوم نہیں کہاں؟ رابعہ کے دفتر میں مائکروفون آسانی سے لگ گیا تھا مگر وقار کا گھر بہت بڑا ہے۔"

"یہ کارروائی تو پولیس یہاں بھی کر سکتی ہے۔"

"ہاں۔ مگر اس کے لیے انہیں اندر آنا پڑے گا۔ معلوم نہیں وقار یوسف کے گھر میں یہ کیسے ممکن ہوا۔ یہ مائکروفون حساس بہت ہوتے ہیں لیکن ان کی رینج کم ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وقار یوسف کے بیڈ روم یا ڈرائنگ روم کا انتخاب کیا ہو گا انہوں نے۔ تم ذرا وقار کی بیوی سے پوچھو کہ آج کل میں کوئی اجنبی تو گھر میں نہیں آیا تھا؟"

نازو نے فون کیا تو حقیقت کھل گئی۔ ایک شخص ٹیلی فون کے محکمے کا لائن مین بن کے پہنچا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ آپ کا فون خراب ہے۔ وقار کی بیوی نے حیرانی سے کہا کہ فون تو ٹھیک ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ آپ چیک کر لیں کیونکہ ہمارے پاس خرابی کی شکایت ہے اور مجھے فون ٹھیک کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جب میں واپس چلا جاؤں تب آپ کو خرابی کا پتا چلے۔ وقار کی بیوی نے دیکھا تو فون واقعی ڈیڈ تھا۔ اس نے لائن مین کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ لائن مین نے بیڈ روم کے سیٹ کو بھی چیک کیا اور ڈرائنگ روم کی ایکسٹینشن کو بھی۔ وقار کی بیوی اپنے کام میں مصروف رہی۔ وہ لائن چیک کرنے کے لیے پول پر چڑھا اور کچھ دیر بعد اس نے کہا کہ فون ٹھیک ہے اب چیک کر لیں۔

نازو فکرمند نظر آنے لگی "اس کا مطلب ہے وہ فون بھی ٹیپ کر گیا اور مائکروفون بھی لگا گیا۔"

"اب ایسا نہ ہو کہ یہاں بھی کوئی فون ٹھیک کرنے والا آ جائے یا میٹر ریڈر ہی پہنچ جائے۔ منظر کی بیوی کو سمجھا دو کہ گھر میں باہر کا کوئی آدمی نہ آئے۔ بجلی کی استری' ٹی وی' غسل خانے کا نل جس کا جو کچھ بھی خراب ہو ابھی خراب رہنے دو۔"

"میں کہہ دوں گی اس کو۔ لیکن یہ تو بڑی تشویش ناک بات ہے" نازو نے کہا "کوئی رات کے وقت چوروں کی طرح اندر آ کے بھی یہ کام کر سکتا ہے۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے میں بال بال بچ گیا۔ میں پولیس ہیڈ آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے میری گاڑی کے نیچے مائکروفون لگا دیا۔ یہ بہت عام اور سستی سی چیز ہے۔ کیا پتا دلاور نے درجن کے حساب سے منگوا کے انہیں فراہم کر دی ہو۔ میں اور مولوی خادم حسین واپسی میں باتیں کرتے گئے اور پولیس ہمارے تعاقب میں رہی۔"

"تمہاری باتیں سن لیں انہوں نے؟"

"باتیں کوئی خاص نہیں تھیں مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ میرا راز کھل گیا ہو گا۔ میں مولوی سے اردو میں باتیں کرتا رہا تھا۔ پولیس کے سامنے میں ظاہر کرتا تھا کہ میں تو پیدائشی فرنچ وکیل ہوں اور انگلش تک نہیں جانتا۔"

"کیا خادم کو پکڑ لیا انہوں نے؟"

"خادم کو میں نے فرار کرا دیا اور پولیس کو بھی روکے رکھا لیکن خادم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب تک روپوش رہ سکے گا۔ وہ پکڑا گیا تو پولیس اس سے ایک ایک بات پوچھ لے گی۔ میرا یہ فرنچ وکیل کا کردار اب نہیں چلے گا۔ میں نے خاصی مارپیٹ کی تھی پولیس کے ساتھ۔ وہ تو مجھے گرفتار کر لیں گے دیکھتے ہی۔ ان کے فرض میں مداخلت کا الزام تو کچھ بھی نہیں۔ میں ان کے ہتھے چڑھ گیا تو میری اصلیت ان پر ظاہر ہو جائے گی کہ میں تو سکندر بخت تھا۔ فرنچ وکیل کو غائب ہو جانا چاہیے اب۔"

"تمہارے غائب ہونے سے رابعہ اور منظر بھی مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔"

"ممکن ہے۔ فرنچ وکیل کوئی دھوکے باز تھا۔ پولیس دھوکا کھا گئی تو رابعہ اور منظر کا کیا قصور۔ نہ مجھے رابعہ نے پناہ دے رکھی تھی اور

www.paksociety.com

نہ میں منظر کے گھر میں رہتا تھا۔"

نادر بولی "انھوں نے تمھیں رابعہ کے آفس میں دیکھا تھا۔ تمھیں تو ایس پی ظفر حیات کے آفس میں بھی نظر آیا تھا۔ اس سے ظفر حیات پر کیا الزام آسکتا ہے؟" میں نے کہا "اور یہ پولیس کا کام ہے کہ وہ اس جعلی ٹریفک وکیل کو تلاش کرے۔ انھوں نے ضمانت طلب کیے بغیر کیسے مان لیا تھا کہ وہ واقعی وکیل ہے اور ڈاکٹر شکیل مراد کیس میں اسے بے ٹھکانے سے بھیجا گیا ہے۔ پرنٹ کو نطیشہ اس کے ساتھ آیا تھا اور ڈاکو نطیشہ سے اس کو کسی قسم کی اخلاقی لیبر جاری ہوا۔ اس کا پاسپورٹ ہو پڑا دیکھنا پولیس کا فرض تھا۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم اب کہاں جاؤ گے؟"

"غالب میرے انتظار میں ہوگا" میں نے کہا "میں باہر کہیں سے رابعہ کو بھی فون کروں گا۔ تم ذرا احتیاط رکھو۔"

"میں گیراج میں وہ لاکٹ تلاش کرتی ہوں۔"

"نہیں۔ ایک اور خیال آیا ہے مجھے" میں نے کہا "فرض کرو ولاور نے لاکٹ گلے سے اتار کے گیراج میں پھینک دیا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ ہمارے قبضے میں نہ آجائے۔ اسے یہ اندازہ نہیں ہوگا کہ اتنی جلدی وہ شفٹ کرلیا جائے گا۔ وہ سمجھ رہا ہوگا کہ مقتول ملنے ہی تلاش کرنے والے اس تک پہنچ جائیں گے۔ اب وہ بے بس ہے اور غالب کو بالکل خطرہ نہیں مگر خطرہ یہاں موجود ہے۔ ممکن ہے پولیس یہاں دھاوا بولے۔ تم ایک گھبرانے کی ایکٹنگ کرنا۔ اگر وہ آئے تو بڑی تیاری کے ساتھ آئیں گے اور اس یقین کے ساتھ گیراج کا گیٹ توڑیں گے کہ ولاور اندر موجود ہے کیونکہ اندر سے مقتول وصول ہو رہا ہے۔ وہ کچھ بھی کریں۔ تم اپنا کام کرتی رہنا۔ تصویریں اتارتی جانا۔ منظر کی بیوی سے کچھ نہیں ہوگا۔ کسی بچے کو باہر بھیج دینا۔ کسی طرف سے بھی نکال دینا۔ وہ پڑوس کے کسی گھر سے اخبار کے دفتر فون کر دے اور اخبار والے فوٹوگرافر کے آجائیں۔ انھیں پتا بھی نہ چلنے پائے۔ وہ ٹیلی فون کی لائن کاٹ دیں گے اور کسی کو باہر نہیں جانے دیں گے۔ ایک بچہ شاید نکل جائے۔"

"تم مجھے ڈرا رہے ہو۔"

"ڈرنے کی تو کچھ نہیں ہوگا۔ پولیس والے بھی ڈر رہے ہوتے ہیں۔ کل جو کچھ ہوا اس کے بعد وہ اخبار والوں سے پنگا نہیں لیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ جب ولاور گیراج میں نہ ملے تو وہ اندر گھس جائیں۔ خانہ تلاشی کا وارنٹ ضرور لائیں گے وہ اور مجسٹریٹ بھی ساتھ ہوگا۔ تمہاری حفاظت کا ذمے دار خود وہ ہوگا تاہم رسک اپنی جگہ ہے کہ وہ خود تم سے گھبرا جائیں کیونکہ وہاں اگر اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کریں گے اور پانچ منٹ میں اپنا کام کر کے چلے جائیں گے" میں نے کہا۔

"پانچ منٹ میں اخبار والے کیسے پہنچ سکتے ہیں۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا "انھیں اطلاع مل جائے میں نے کہہ سکتے ہیں کہ پولیس نے ایک بہت بڑے وکیل کے گھر میں کیا کارروائی کی ہے۔ منظر کی بیوی ان کے سامنے دہائی دے سکتی ہے۔ ہنگامہ کرسکتی ہے کہ وہ سب لٹیرے تھے۔ سارا زیور اور نقد لے گئے۔ ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ آیندہ ایسی کارروائی کرنے سے پہلے سوچیں گے سو بار۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ میں دیکھ لیتی ہوں۔" نادرہ نے کہا۔

میں باہر نکلا تو سورج غروب ہوچکا تھا اور اندھیرے کی چادر بھی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ تھوڑا سا پیدل چلنے کے بعد میں نے ایک ٹیکسی روک لی۔ اس وقت سوا سات بجے تھے۔ ساڑھے سات بجے میں پھر رابعہ کے پرانے گھر کے سامنے تھا۔ دن میں بلا اٹھانے والے مزدور اس وقت نہیں تھے ورنہ وہ مجھے یاد رکھ لیتے۔ میری بات ہوئی تھی۔ اردگرد کی عمارتوں کے بیچ میں ایک راہ کے گھر کی خالی جگہ یوں لگتی تھی جیسے روشنیوں کے جزیروں میں کوئی تاریک خلا۔

خود میں نے مرا روشنی میں نمایاں نظر آنے سے گریز کیا۔ میرے دل میں یہ خوف بیٹھا ہوا تھا کہ اب تک میرے ہاتھوں ہلاک ہوتے ہوتے رہ جانے والا ڈی ایس پی شاہد علی بھی ہوش میں آگیا ہوگا اور شاید اپنے پاگل پن میں وہ میرے قتل کے درپے ہوگا۔ انسپکٹر اسے مولوی خادم حسین کی گرفتاری میں ناکامی کے بعد اپنے افسر اعلیٰ کو بتائی کا منظر دیکھا ہوگا اور اسے پتا چلا ہوگا کہ رلائی وکیل بھی نظر گیا تو وہ بھی کم مشتعل نہیں ہوگا۔ راولپنڈی پولیس والوں نے سب کو مطلع کر دیا ہوگا کہ وہ وکیل جہاں نظر آئے اسے گرفتار کرلیا جائے۔ کسی غیر ملکی پر ملکی قوانین کے تحت مقدمہ چلایا جاسکتا ہے بلکہ سفارت خانے کی تحویل میں دینا ضروری ہے۔ یہ سب بعد میں دیکھا جائے گا۔ ایک رات اسے اپنا مہمان رکھ کے یہ تو سمجھا ہی کر یہاں پولیس پر ہاتھ اٹھانے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔

میں غالب کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ ایک بچہ میرے قریب آیا۔ اسے پہچان کے میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ منظر کا دوسرا یا پانچواں لخت جگر تھا۔ مجھے زینب کے ساتھ ان سب کے نام عمریں یاد رکھنا مشکل کام تھا۔

اس نے قریب آکے مجھ سے کہا "انکل! آپ کو انکل بلا رہے ہیں۔"

میں نے سوچا کہ اس سے نام پوچھوں کہ وہ رشید ہے یا سعید۔ اس طرح یہ ظاہر ہوتا کہ میں اسے پہچانتا ہوں۔

"کون انکل؟" میں نے پوچھا۔

"انکل غالب" اس نے کہا "میرے ساتھ آئیے۔"

مجھے خوشی سی ہوئی اس کی جرأت اور ذہانت پر مگر افسوس بھی ہوا کہ غالب نے اس خطرناک کام میں ایک بچے کو بلاوجہ شریک کرلیا۔ وہ آگے آگے چلتا ہوا مجھے پچھلی طرف ایک گلی میں لے

گیا۔ وہاں غالب ایک عجیب سی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا جو مسافروں سے زیادہ باربرداری کے کام آتی ہوگی۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے کہا "اس بچے کو بھیجنا ضروری تھا؟"

"بھئی ہم خود سامنے آنا نہیں چاہتے تھے۔"

"کیا منظر کی بیوی کو معلوم ہے کہ اس کا ایک بچہ گھر میں نہیں ہے۔"

"منظر کا بچہ۔ تمہارا دماغ تو ٹھکانے ہے دوست۔ میں پاگل نہیں ہوں کہ منظر کے بچوں کو ساتھ لے کر پھروں۔"

"پھر یہ کون تھا۔ رشید یا سعید نہیں تھا؟"

غالب ہنس پڑا "یار اسے تو میں نے پانچ روپے دیے تھے۔ یہیں کھیل رہا تھا۔"

میں نے خفت سے کہا "کمال ہے۔ منظر کے ایک بچے سے کتنا ملتا تھا۔"

"اس کے سولہ بچے ہیں۔ کسی نہ کسی سے ہر بچہ مل جائے گا۔" غالب نے کہا "تم نے سارا رن کہاں جھک ماری آج؟"

"جھک نہیں ماری۔ ایک ڈی ایس پی کو مارا ورنہ مولوی خادم حسین مارا جاتا۔ اسے بچایا تو خود مارا گیا۔ باقی سب بھی مارے جاتے آج بچا۔ قسمت نے بچا لیا۔ یہ صرف شرخیاں ہیں۔ پوری خبر بعد میں۔ یہ بتاؤ ولاور کہاں ہے؟"

غالب نے پیچھے اشارہ کیا "میرے ساتھ۔"

"اس باکس میں؟ زندہ بھی ہے کہ مرگیا؟" میں نے اس گاڑی کے پچھلے حصے میں رکھے ہوئے باکس کو دیکھا "کہاں سے لیا یہ باکس اور یہ گاڑی کس کی ہے؟"

"ایک کباڑیے کی۔ اس نے کار کی باڈی پر بنائی تھی۔ سامان ڈھونے کے لیے" غالب بولا "بڑی مشکل سے مجھے دینے پر راضی ہوا۔ یہ باکس اسی سے خریدا تھا۔ میں نے کہا کہ آخر اسے میں کیسے لے جاؤں؟ ریسے تو وہ خود ہی چلاتا ہے اس عجوبہ روزگار گاڑی کو۔ آج وہ کچھ علیل تھا بلکہ بدہضمی کے باعث صاحب فراش تھا۔ ڈرائیو تک نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے کہا کہ تم چلو میرے ساتھ۔ میں باکس گھر پر چھوڑ کے تمھیں واپس کباڑخانے چھوڑ دوں گا۔ وہ مان گیا مگر غصے راستے میں اسے اترنا پڑا۔ بہت مجبور ہوگیا تھا۔ کہنے لگا کہ میں ابھی آیا ایک منٹ میں۔ تم بھیں ٹھہرنا۔ میں نے وعدہ کیا اور اس کے غائب ہوتے ہی بھاگ آیا۔"

مجھے ہنسی آگئی "تو کہاں غائب ہوگیا تھا۔"

"ہے ایک جگہ۔ کارپوریشن کے زیر انتظام" غالب بولا "اسی لیے تو میں سڑک پر نہیں تھا۔ وہ اپنی گاڑی کو تلاش کر رہا ہوگا اور گاڑی ایسی ہے کہ شاید سارے شہر میں ایک ہی ہوگی۔ لوگ دیکھ چکے ہوں گے۔"

"میں نے تو کبھی نہیں دیکھی پہلے۔"

مگر بہت سے لوگوں نے دیکھی ہوگی۔ اب تم یہ باکس اٹھاؤ میرے ساتھ مل کے۔ ولاور کو اس کے مدفن میں لے چلیں۔ چار چھ مزدور پکڑ لاؤ۔"

میں نے کہا "یار اتنا بڑا بکس یہ نیچے کیسے جائے گا۔"

غالب بولا "تہ خانے کا زینہ میں نے دریافت کرلیا تھا۔ مزدوروں نے واسے بھی ہٹا دیا ہے مگر یہ ٹھیک ہے کہ بکس اس میں سے نہیں اتر سکتا۔ بکس کو ہم جس اس جگہ تک لے جائیں گے بار تک کسی کو نہ ہو۔ وہاں بھی ولاور کو باکس میں سے نکالیں گے تو کوئی ضرور دیکھے گا۔ ہم میں سے ایک نیچے اتر جائے گا اور دوسرا ولاور کو اوپر سے لٹکائے گا۔ رات کو یہ باکس شگاف کے اوپر رہے گا تاکہ کتے بلیاں اندر نہ آئیں۔"

"ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ولاور کو صندوق سے نکالے بغیر شگاف میں سے نیچے کیسے لٹکایا جائے گا۔" میں نے کہا۔

"سمجھ میں آجائے گا۔ باکس کے پیندے میں دو فٹ بائی دو فٹ کا ایک تختہ ہے جو پیچ لگا کے فٹ کیا گیا تھا اور دو منٹ میں پیچ کھول کے ہٹایا جاسکتا ہے۔ یہ حصہ عین فرش کے شگاف پر آئے گا۔ تم باکس کے اندر رہتے ہوئے ولاور کو نیچے لٹکا سکتے ہو۔ اوپر سے باکس بند رہے گا۔ خود تم باہر نکلیں گے تو تختہ پھر فٹ کردیں گے اور صندوق کا ڈھکن کھول کے باہر نہ جائیں گے۔ یہ باکس کوئی اٹھا کے نہیں لے جاسکتا۔ دن میں وہیں پڑا رہے گا۔ کوئی کھول کے دیکھتا ہے تو دیکھے۔ اسے خالی صندوق کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔"

میں نے کہا "آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن آپ کے دماغ میں آیا کیسے؟"

"ویسے تو اچھوتے خیالات قابل رشک نظریات اور عظیم منصوبوں نے ہمیشہ اس ناچیز کے دماغ میں جنم لیا ہے لیکن یہ خیال باکس دیکھ کے آیا تھا۔ مسئلہ تھا ولاور کو کہیں رکھنے کا۔ یہ باکس اتنا بڑا تھا کہ اسے ہم سائی صاحب کے قبرستان کی دیوار کے ساتھ رکھ دیتے تو ولاور اس میں دو چار دن گزار لیتا۔ ہم رات کو اس سے ملاقات کرسکتے تھے۔ اسے سارا دن سلائے رکھنا اور باندھ کے اندر لٹائے رکھنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ میں نے وہ سوچ میں باکس لے لیا۔ اس باکس کو یہاں رکھنے کا خیال مجھے اندر جھانکنے کے بعد آیا جب میں نے پیچھے دو فٹ چوڑا دو فٹ لمبا چوکور تختہ الگ دیکھا۔ معلوم نہیں اسے کس مقصد کے لیے بنایا گیا تھا؟"

میں نے کہا "اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ ممکن ہے پہلے بھی کسی چودھری ولاور کو اس میں ایسے ہی لایا گیا ہو لیکن مذاق کیا تم یہ باکس منظر کے گھر لے گئے تھے؟"

"نہیں یار۔ وہاں سے تو ولاور کو ٹیکسی میں لایا تھا۔ اس وقت وہ بالکل ہوش میں نہیں تھا۔ ایک گودام کے احاطے کے باہر۔

www.paksociety.com

گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ جب ٹیکسی چلی گئی تو میں نے دلاور کو اس میں ڈالا اور یہاں آگیا اور انتظار تھا تمہارا۔"

"اتنا تردد بے سبب کیا تم نے۔ ہم دلاور کو قید میں نہیں رکھنا چاہتے۔" میں نے کہا "اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔"

"کل یہی ہوگا۔ مگر ایسے کہ صورت حال ڈرامائی ہوگی اور پولیس دلاور کو یہاں سے برآمد کرے گی تو تماشائی بھی بہت ہوں گے اور گواہ بھی۔ تم جاکے مزدور لاؤ۔"

چھ مزدوروں نے ہانپتے ہوئے اس باکس کو رابعہ کے گھر کے کھنڈر میں بس اسی جگہ پہنچا دیا جہاں فرش کے ایک شگاف میں صرف تاریکی نظر آتی تھی۔ جتنی دیر میں غالب اس مشتبہ گاڑی کو ریلوے اسٹیشن کے گودام پر چھوڑ کے آیا میں نے دیگر انتظامات کئے اور اس جگہ کی نگرانی کی۔ لوگ دن میں وہاں مزدوروں کو کام کرتا دیکھ چکے تھے۔ اب مزدوروں کو ایک باکس وہاں رکھتے دیکھ کر کسی نے غیر معمولی تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ شاید دیکھنے والوں نے یہی سمجھا کہ اس میں تعمیراتی سامان ہوگا یا مشینری۔ سڑک کے پار سے اندھیرے میں ساری کارروائی کسی کے لیے اتنی دلچسپی کا باعث نہیں تھی کہ وہ قریب آکے مجھ سے کچھ پوچھتا۔

غالب آدھے گھنٹے میں لوٹ آیا۔ اس کے پاس رسی، کانچ، موم بتی اور پیچ کس سب تھے۔ اس نے باکس کا ڈھکنا اُٹھایا اور اندر غائب ہوگیا۔ دس منٹ بعد اس نے باکس کا سائڈ بجا کے مجھے اندر تشریف لانے کا سگنل دیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں نے ڈھکنا اُٹھایا اور باکس میں اُتر گیا۔ یہ تقریباً چھ فٹ لمبا چار فٹ چوڑا اور پانچ فٹ اونچا باکس تھا۔ اس میں بیک وقت دو افراد کا سمانا آسان نہ تھا مگر غالب تختہ ہٹا کے شگاف میں اُتر چکا تھا۔ باکس میں دلاور کسی لاش کی طرح بندھا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں جسم کے ساتھ ملا کے ایک ہی رسی سے باندھ دیے گئے تھے۔ میں نے خاصی دشواری سے اپنے سر کو نیچا رکھتے ہوئے دلاور کو شگاف سے گزارا۔ اس طرح کہ پہلے اس کے پاؤں نیچے گئے۔ پھر وہ پھانسی کے پھندے سے لٹکنے والی لاش کی طرح جھولنے لگا۔ غالب نے اسے نیچے سے تھام لیا تو میں نے رسی چھوڑ دی اور ایک گہرا سانس لیا۔ میرے ہاتھ اس بوجھ کو بڑی مشکل سے سنبھال پائے تھے۔ رسی میری ہتھیلی میں گڑ گئی تھی اور بازو شل ہونے لگے تھے۔

خود نیچے اُترنے کے بعد میں نے باکس کے تختے کو برابر کیا اور موم بتی کی روشنی میں تہ خانے کو دیکھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا اور وہی تھا۔ آرام و آسائش کے سب اسباب اپنی جگہ تھے۔ بیڈ قالین اور پردے دھول میں اَٹے ہوئے تھے۔ ریڈیو گرام پر ریکارڈوں پر اور کتابوں پر بھی گرد و غبار تھا۔ یہ سب سامان [illegible] میرے لیے فراہم کیا گیا تھا مگر آج یہ آسیب زدہ جگہ مجھے کسی فرعون کے مدفن کی طرح لگ رہی تھی۔ اہرام مصر جب کھودے گئے تھے تو حنوط شدہ لاشوں کے ساتھ دنیاوی مال و متاع کے انبار نکلے تھے۔ اپنی زندگی عیش و عشرت سے گزارنے والے مرنے کے بعد یہ سب ساتھ لے گئے تھے تاکہ دوسری دنیا کی زندگی بھی پُرآسائش رہے مگر لوگوں نے اہرام کھود کے سب نکال لیا اور خود فرعون کی ممی کو میوزیم میں تماشائے عبرت بنا کے رکھ دیا۔ پہلے یہ تہ خانہ ائرکنڈیشنڈ تھا اور یہاں خوابناک روشنیاں جھلملاتی تھیں۔ اب یہاں حبس تھا اور تعفن تھا۔ اندھیرا تھا اور ایک وحشت ناک خاموشی تھی۔ موم بتی کی مدھم روشنی نے ماحول کو زیادہ ڈراؤنا بنا دیا تھا۔ غالب نے دلاور کی رسیاں کھول دیں۔ "چلو اب ہم چلیں۔ آج رات دلاور کو یہاں آرام کرنے دو۔" غالب نے کھانے پینے کی چیزوں کا ایک لفافہ اور پانی کی ایک بوتل اس کے پاس رکھ دی۔ "اس پر جو مدہوشی ہے انجکشن کا اثر ہے۔ صبح تک یہ اثر ختم ہو جائے گا۔"

"رات کو یہ ہنگامہ نہیں کرے گا؟"

"کرنے دو ہنگامہ چوہدری صاحب کو۔ ان کی سننے والا کون ہوگا۔ یہ جتنی زور سے چاہے چلائے۔ اس کی آواز باہر نہیں جاسکتی۔"

"یہ خود تو باہر جاسکتا ہے۔"

"کیسے؟ اسے کیا معلوم کہ اوپر شگاف پر کوئی باکس رکھا ہوا ہے۔ ہم جاتے وقت تختہ کس جائیں گے۔" غالب نے کہا "یہ نیچے سے اس کو توڑ بھی نہیں سکتا۔ یہاں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ آدھی رات گزر جانے کے بعد اسے ہوش آنے لگے گا۔ آہستہ آہستہ صبح تک یہ اُٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو جائے گا۔ شاید کھڑا بھی ہو سکے مگر اس میں اتنی طاقت نہیں ہوگی کہ اس زندان کی دیواریں توڑ کے نکل جائے۔ کچھ کھا پی کے اس کی حالت یقیناً بہتر ہو جائے گی۔ یہ سوچنے کے قابل بھی ہوگا مگر کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوگا۔ موم بتی تھوڑی دیر میں گل ہو جائے گی۔ پھر یہ ٹارچ جلتی رہے گی۔ آہستہ آہستہ اس کے سیل ختم ہوں گے مگر صبح تک تھوڑی بہت روشنی رہے گی۔ شاید اسے اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کہاں ہے۔ پھر یہ تنہائی اور بے بسی کی پُراذیت موت کا تصور کرے گا۔ بھوکے پیاسے ایک تہ خانے میں تڑپ تڑپ کر جان دینے کا خیال اسے پاگل کردے گا۔ یہ چیخے گا، مدد کے لیے چلائے گا مگر اس کی آواز صرف یہ دیواریں سنیں گی۔"

مجھے غالب کی باتیں سن کے دلی طمانیت حاصل ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کاش یہ ممکن ہوتا کہ دلاور اسی تہ خانے میں اسی عذاب کے ساتھ مرجاتا۔ مگر یہ میرے انتقامی جذبات کا ردِعمل تھا۔ عقل صرف اندیشوں کا شکار تھی۔

"اگر یہ کسی طرح نکل گیا۔ کوئی اس کی آواز پر پہنچ گیا، پھر؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا "آج رات کو اس کا امکان ایک فیصد بھی نہیں۔ صبح میں خود یہاں آجاؤں گا۔ اس باکس پر بیٹھ کے ملبہ ہٹانے کے کام کی نگرانی کروں گا۔ کوئی آواز سُنوں گا تو سب سے پہلے میں۔ تیسرے پہر چوہدری دلاور کو پولیس اس تہ خانے سے نکالے گی۔"

میں اور غالب باہر آئے تو رات کا آخری شو بھی شروع ہو چکا تھا اور کراؤن سینما کے آس پاس رونق خاصی کم تھی۔

غالب نے کہا "میری گاڑی۔ میرا مطلب ہے وہ گاڑی کہاں ہے جو تمہارے پاس تھی؟"

میں نے اسے بتایا "تمہارے آفس کے باہر موجود ہے۔ چابیاں میں نیچے گارڈ کو دے آیا تھا۔ تم آفس جاؤ گے؟"

"ہاں۔ دیکھنا ہے کہ پولیس نے گزشتہ روز کی واردات کے بارے میں کیا پریس نوٹ جاری کیا ہے؟"

"تم کیا خبر لگا رہے ہو۔ اسٹاف رپورٹر کے حوالے سے؟"

"ظاہر ہے پولیس تو تھانے سے دلاور کے اغوا کی خبر چھپائے گی۔ دلاور فی الحال ایک مفرور اور مطلوب مجرم ہے۔ وہ تھانے میں کیسے آیا اور آیا تو فرار کیسے ہو گیا؟ اغوا ہوا تو کس نے کیا اور سارے تھانے والے اغوا کرنے والوں کو نہیں روک سکے؟ ایسی خبر سے تو پورا تھانہ معطل ہو سکتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہیں گے کہ گزشتہ رات نامعلوم شرپسندوں نے تھانے پر فائرنگ کی اور ایک زیرِ حراست مجرم کو چھڑانے کی کوشش کی جسے تھانے والوں نے ناکام بنادیا۔ ہم تصویریں شائع کر رہے ہیں جن میں چوہدری دلاور اپنے اصل حُلیے میں ایس پی ظفر حیات، ڈی ایس پی شاہد علی اور ایس ایچ او کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے اور ان کی یہ میٹنگ بڑے دوستانہ ماحول میں ہو رہی ہے۔ تھانے کی میز پر چائے کے برتن بھی رکھے ہوئے ہیں۔"

"کیا تم نے پرنٹ دیکھے ہیں؟"

"میں نے تو نہیں دیکھے مگر کرائم رپورٹر نے مجھے بتایا تھا۔ اسے تو مفت میں اتنی زبردست اسٹوری مل گئی ہے۔"

"کرائم رپورٹر تو تم بھی ہو۔"

"میں کورٹ رپورٹنگ کرتا ہوں۔ میرا اور کرائم رپورٹرز کا کام تقریباً ایک ہے۔ ہم مل جل کے کرتے ہیں۔ عام خبریں تو سب اخبار والے پول POOL کر لیتے ہیں یعنی شہر میں دس تقریبات ہیں تو ہر جگہ ایک رپورٹر پہنچ جاتا ہے۔ پھر تمام تقریبات کی رپورٹ اور خبریں آپس میں تبادلہ کر لیتے ہیں مگر کچھ خصوصی یعنی EXCLUSIVE اسٹوری ہوتی ہیں جو کوئی رپورٹر خود تلاش کر کے لاتا ہے۔ ہر اخبار کی ساکھ ایسی ہی خصوصی خبروں سے قائم ہوتی ہے۔ تم دیکھنا ہماری رپورٹ کے شائع ہوتے ہی یہ ٹیم بدل جائے گی جو اس وقت ڈاکٹر شبلی کے قتل کی تفتیش کر رہی ہے۔"

"یہ تو کوئی سزا نہ ہوئی۔"

"سزا دینا محکمہ جاتی کارروائی ہے۔ اوپر والے جو چاہیں کریں۔ وہ پوچھیں گے ضرور کہ دلاور تھانے میں کیسے آیا تھا۔ تم نے گرفتار کیا تھا تو اس کا اندراج روزنامچے میں کیوں نہیں ہے اور گرفتار نہیں کیا تھا تو اس کی کیا وجہ ہے؟ ایس پی ظفر حیات اور شاہد علی ڈی ایس پی کا پہلا کام تو یہی تھا کہ ڈبل مرڈر کیس میں نامزد ملزم کو گرفتار کریں۔"

"کیا انہیں معلوم ہے کہ ان کی تصویریں اُتاری گئی ہیں؟"

"نہیں۔ ابھی تک وہ دلاور کے اغوا کو راز رکھے ہوئے ہیں۔ اس کی تلاش خاموشی سے جاری ہے۔ وہ خاصے مطمئن ہیں اپنی کارکردگی سے۔"

میں نے کہا "میرا بھی یہی خیال ہے۔ آج ایس پی ظفر حیات سے باتوں کے دوران بہت سے انکشافات ہوئے۔ رابعہ اور مظفر کی گاڑیوں کو بگ BUG کیا گیا تھا اور وقار یوسف کے گھر کو بھی۔ میں نے سب کو خبردار کردیا تھا۔"

"رابعہ کے آفس میں تو مائیکروفون مل گیا تھا" غالب نے کہا "چھوٹی جگہ تھی۔ وقار یوسف کے گھر میں ذرا مشکل سے ملے۔"

میں نے کہا "یہ کام انہوں نے خود آسان کر دیا ہے۔ خفیہ مائیکروفون ٹیلی فون سیٹ میں ہوگا۔ ایک جعلی لائن مین گھر پہنچا تھا یہ پوچھنے کے لیے کہ کیا فون ڈیڈ ہے۔ فون ٹھیک تھا مگر وقار کی بیوی نے چیک کیا تو خراب نکلا۔ اسے وہ ٹھیک کر گیا مگر اس بہانے اپنا کام بھی کر گیا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"شام کو نادر نے پہلے وقار کی بیوی سے بات کی تھی۔ پھر مجھے بتایا تھا" میں نے کہا "تم دفتر میں اپنی گاڑی کو بھی نیچے سے چیک کرلینا۔ مجھے شک ہے کہ اس میں بھی خفیہ مائیکروفون ہے۔"

"کیا تمہارا پیچھا کیا تھا کسی نے؟"

میں نے اسے خادم حسین کے اغوا کی ناکام کوشش کے بارے میں بتایا "ڈی ایس پی شاہد علی تو میری جان کا دشمن ہو رہا ہوگا۔ تم معلوم کرو کہ ریسٹورنٹ کے واقعے کی رپورٹ کیا ہے۔ کسی طرح یہ بھی پوچھو کہ وہاں پولیس کیسے پہنچی تھی۔ کسی نے مخبری کی تھی۔ انہوں نے گاڑی کا پیچھا کیا تھا یا گاڑی سے نشر ہونے والے سگنل کے ذریعے؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

میں نے کہا "اگر پولیس والوں نے میری باتیں سُنی ہیں پھر تو مجھے فریق وکیل والا کردار ختم کرنا پڑے گا اور ایسا نہیں ہے تو پھر مجھے ضمانت قبل از گرفتاری کی فکر کرنی چاہیے۔"

"رات کو تم رابعہ کے دفتر میں ہی ہو گے؟"

"اور کہاں جاسکتا ہوں میں" میں نے کہا "تم رابعہ سے بھی بات کر کے مجھے بتانا۔"

میں اور غالب اپنے اپنے راستے پر روانہ ہوگئے۔ رات بھر کے لیے آفس بلڈنگ میں بند ہونے سے پہلے میں نے بیڈن روڈ پر کھانا کھایا اور دس بجے ٹہلتا ہوا رابعہ کے آفس پہنچا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اصل چوکیدار مجھے اپنی جگہ چھوڑ کے غیر سرکاری چھٹی پر

www.paksociety.com

کیا ہوا تھا اور رضا چوکیدار ڈیوٹی میں نائب تھا۔ آفس سے رخصت ہوتے وقت کسی نے بھی گیٹ کو لاک نہیں کیا تھا۔ ہر شخص نے فرض کرلیا ہوگا کہ چوکیدار یہ کام خود کرے گا۔ وہ سامنے نہیں تو کہاں آس پاس ہی کہیں ہوگا۔ میں نے گیٹ کو مقفل کیا اور اوپر جاکے اپنا لباس اور میک اپ بدلا۔ چوکیدار بن جانے کے بعد یہ ضروری تھا کہ میں گیٹ پر جاکے بستر بچھاؤں۔ تھکن سے میرا اتنا برا حال تھا کہ میں آفس میں آرام سے سونا چاہتا تھا۔ مسئلہ صبح آنے والوں کا تھا۔ صفائی کرنے والا عملہ طلوع آفتاب سے قبل ہی آجاتا تھا۔ میں اوپر سوجاتا تو وہ نیچے جگاتے رہتے اور مجھے پتا نہ چلتا۔

مجھے غالب کے فون کا بھی انتظار تھا اور میں رابعہ کی خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے چائے بنا کے پی اور ایک چکر نیچے کا لگایا۔ میں لوٹ کے آیا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

غالب نے کہا "کیا سوگئے تھے؟"

"نہیں۔ میں چوکیدار ہوں بھائی 'گشت پر تھا۔"

"میں نے گاڑی کو چیک کرلیا ہے۔ اس میں مجھے کوئی ایسا آلہ نظر نہیں آیا جسے خفیہ مائکروفون سمجھا جاسکے۔"

میں نے کہا "کہاں کہاں دیکھا تھا؟"

"ڈیش بورڈ پر 'گاڑی کے نیچے' انجن میں۔"

میں نے کہا "اتنی جلدی کیسے دیکھ لیا۔ خفیہ مائکروفون تو بہت چھوٹی سی چیز ہوتی ہے۔ پولیس ہیڈ آفس کے باہر گاڑی دو گھنٹے کھڑی رہی تھی۔ انہیں اطمینان سے کام کرنے کے لیے کافی وقت مل گیا تھا۔"

"ہاں میں نے الیکٹرانک چیک بھی کرالیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"ہمارا ریڈیو مانیٹر ایک پاگل ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کوئی [illegible]" میں نے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔ اسے دنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں کی نشریات سننے کے علاوہ پورے نشریاتی نظام سے دلچسپی ہے۔ پتا نہیں کیا کرتا رہتا ہے ان چیزوں کے ساتھ۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتی۔ اس کی HOBBY ہے۔ اس نے کسی آلے سے چیکنگ کی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ کہیں سے بھی سگنل نشر ہوگا تو گرین لائٹ آن ہوجائے گی۔ ایک عجیب کام ریڈیو ہے۔ اس میں کچھ اختراع کی ہے۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تم وہ چیز لے لو اس سے۔"

غالب بولا "تمہارے کہنے سے پہلے لے لی ہے۔"

میں نے کہا "ڈی ایس پی شاہ علی سے بات ہوئی؟"

"ہاں۔ وہ خود مجھے دوبار فون کرچکا تھا۔ رابعہ سے بھی بات کی تھی اس نے مگر رابعہ نے ٹال دیا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں 'وہ فرنچ وکیل کہاں ہے اور کیا کررہا ہے؟"

"ہم سے کیا چاہتا تھا؟"

"پریشان تھا کہ آج ہم ایک مجرم کو گرفتار کرنے گئے تھے وہاں وہ فرنچ وکیل اور اس کا مولوی غلام حسین جو مجھے نہ ہم انہیں پکڑنے نکلے ہیں۔ وہ بلاوجہ وہاں سے فرار ہوئے اور اس کی وجہ سے ریسٹورنٹ میں لوگوں کو کچھ غلط فہمی ہوگئی۔"

"اس نے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا؟"

"نہیں۔ غالباً ظفر حیات کا دباؤ ہے کہ جیسے بھی ہو اس فرنچ وکیل سے معذرت کرے۔ آخر یہ غلط فہمی کیوں ہوئی اسے۔ تم نے ضرور ایسی کوئی حرکت کی ہوگی۔ ایس ایس پی نے کہا ہے کہ اس معاملے میں کوئی شکایت ملی تو میں تم کو معطل کرنے پر مجبور ہوجاؤں گا۔"

میں نے ہنس کے کہا "چلو اب تم میری طرف سے اس کو بتادو کہ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ یہ تو اچھی خبر ہے میرے لیے کہ ابھی میرا فرنچ وکیل کا کردار چل سکتا ہے۔"

"کل کے اخبار کے لیے تصویریں میں نے دیکھ لی ہیں۔ تم صبح کے اخبار میں ملاحظہ کرنا۔ دل خوش ہوجائے گا۔"

"ایسی کیا بات ہے آخر؟"

غالب نے کہا "کھڑکی کے عین سامنے کیلنڈر تھا۔ نازر نے تصویریں اتاری ہیں تو جیسی کیلنڈر کی تاریخ آگئی اور اس سال کا کیلنڈر تو بالکل صاف ہے۔"

میں نے کہا "رابعہ اور منظر سے بات ہوئی؟"

"ہاں۔ تمہارا پیغام جو مولوی غلام حسین نے رفتار یوسف کو دیا تھا پڑھ دینے والا تھا۔ وہ دونوں پریشان ہوگئے تھے۔"

"مولوی غلام حسین نے ایسی کیا بات کہہ دی تھی؟"

"اس نے کہا تھا کہ آج آپ لوگ گاڑی استعمال نہ کریں۔ خطرہ ہے۔ وہ سمجھے کہ شاید کسی نے گاڑی میں بم فٹ کرادیا ہوگا۔ انہوں نے پولیس کو اطلاع دی۔ بم ڈسپوزل والے آگئے۔ انہوں نے گاڑی اپنی تحویل میں لے کر چیک کی مگر ملا کچھ نہیں۔ میرا مطلب ہے بم تو نہیں ملا مگر دو خفیہ مائکروفون برآمد ہوگئے جو گاڑی کے فرش پر نیچے چپکے ہوئے تھے۔ کورٹ کے احاطے میں خاصی سنسنی پھیلی تھی لیکن اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی۔"

"یہ حرکت دوبارہ بھی کی جاسکتی ہے۔ ہم سب کو محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی" میں نے کہا۔

"منظر نے مجھے بتایا ہے کہ پولیس دلاور کو تلاش کرتی ہوئی اس کے گھر پہنچی تھی۔ انہوں نے دلاور کا نام تو نہیں لیا۔ یہ کہا کہ ہم سکندر بخت کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہ یہاں روپوش ہے۔ ان کے پاس وارنٹ تھا۔ مجسٹریٹ اور لیڈی سرچ سب آئے تھے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ صرف گیراج میں دیکھ کے چلے گئے۔"

"اس کا مطلب ہے بلاشبہ... دلاور کی موجودگی کی خبر سہا تھا۔ خاصے مایوس ہوئے ہوں گے پولیس والے کہ صرف نانٹ ملا۔ دلاور نہیں۔ بے وقوف لوگ ذرا اوپر بھی جھانک لیتے۔"

اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہی سب کچھ اس کے ساتھ ہو۔ وہ دنیا میں رسوا ہو۔ جیسے میں دنیا میں امان تلاش کرتا پھرتا تھا اور مجھے امان کہیں نہ ملتی تھی ایسے ہی اس کی اولاد پر یہ زمین تنگ ہوجائے اور دلاور اسی طرح ذلت اور عذاب کے ساتھ رخصت ہو جیسے وزیر خان گیا تھا۔ میں یہ تماشا نے عبرت دیکھوں اور میرے ساتھ وہ سب بھی چوہدری دلاور کا انجام دیکھیں جنہوں نے میرے باپ کی اور میری بے بسی کا نظارہ کیا تھا اور جب گلزار سے دلاور کی لاش نامعلوم قبر کی گہرائی میں دفن کرنے کے لیے لائی جائے تو میں پھر اس سلطنت کے وارث کی حیثیت سے نظم و نسق سنبھالوں جس کا بانی وزیر خان تھا۔

مجھے یقین تھا کہ چوہدری دلاور مجھ سے ہر قیمت پر سودا کرنے پر آمادہ ہوجائے گا۔ وہ اپنی ذلت و رسوائی کی تشہیر سے بچنے کے لیے میرا ہر مطالبہ تسلیم کرے گا۔ وہ اسٹار پیلس کو میرے حوالے کردے گا۔ وزیر خان ٹرسٹ اسپتال سے دستبردار ہوجائے گا۔ تمام نقصانات کی تلافی کے لیے تیار ہوگا لیکن صرف مادی نقصان پورا کرنے سے جذبات کے گھاؤ نہیں بھر سکتے۔ مجھے صرف میرا حق ہی نہیں انصاف بھی چاہیے۔

تھکن کے باوجود اس رات میں پرسکون نیند سے محروم رہا۔ میرے دل میں خوف کی ایک خلش بھی موجود تھی کہ کہیں یہ سب میری تمام خیالی نہ ہو۔ صبح پتا چلے کہ دلاور تو رات کے وقت نکل گیا۔ مرزا غالب کا یقین بے بنیاد ثابت ہوجائے اور معلوم ہو کہ دلاور کے تعاقب میں نے ہم سب کو پھر شکست دے دی ہے۔ مجھے چوہدری دلاور کی شکاری فوج کی طرف سے کسی جوابی کارروائی کا بھی ڈر تھا۔ وہ دلاور کی بازیابی کے لیے کچھ بھی کرسکتے تھے۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ آج کل اسٹار پیلس کہاں ہے اور کیا کررہا ہے؟ دلاور کے نئے ساتھی کون ہیں؟ پبلک لائف میں آنے کے بعد اس نے بہت سے نئے دوست بنالیے تھے اور یہ سیاسی رفیق اس کے مستقبل سے اپنا مستقبل وابستہ سمجھتے تھے۔

مگر صبح معمول کے جمعدار اور اس کی چھوٹی نصف بہتر نے مجھے بیدار کیا۔ دراصل چوکیدار سے زیادہ بے تکلف تھی جو اسے علی الصباح جاتے بھی چھیڑ کرتا تھا اور اس کی سرمے کاجل سے چمکتی آنکھوں کے علاوہ کپڑوں سے جھلکتے سبار جوبن کے نظارے سے آنکھیں بھی سینکتا ہوگا مگر نصیب وصل تو حسرت ہی سہی۔ ظاہر ہے میں اتنا بے مروت اور بے نیاز شخص تھا کہ مجھے تو وہ پورا مرد بھی تسلیم نہیں کرتی ہوگی ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی اس کی طرف ایک نظر بھی نہ دیکھے۔

اس کے بعد میں نے چہل قدمی کا ایک راؤنڈ پورا کیا اور پھر بلیک کافی پی کے حواس بحال کیے۔ غسل کرکے لباس اور حلیہ بدلتے ہوئے مجھے ایک گھنٹا لگ گیا۔ نو بجے میں نے آفس کو مقفل کیا اور پھر فرنچ وکیل کے روپ میں باہر نکل گیا۔ فوری طور پر مجھے ناشتے

"وہ منظر اور رابعہ کی وجہ سے بہت محتاط بلکہ ڈرے ہوئے تھے۔"

جب میں نیچے بستر بچھا کے لیٹا تو مجھے دلاور کا خیال آیا۔ اس زیر زمین ویران اور آسیب زدہ کمرے کے فرش پر وہ خود کو اکیلا پاکے کیا محسوس کرے گا؟ ابھی سب کچھ اس کے پاس ہے۔ اس کی دولت کا غرور، بدمعاشی کی طاقت' حکم کے غلاموں کی فوج' کرائے کے قاتلوں اور زر خرید شکاری کتوں کے غول۔ ایک بدعنوان' راشی اور بے ضمیر بدکرسی کے بااثر ارکان کی حمایت اور کرپٹ انتظامیہ سے گٹھ جوڑ' اثر و رسوخ۔ مگر اس کے باوجود وہ چوہے دان میں پکڑے جانے والے چوہے سے زیادہ بے بس ہے۔ یہ زندان خود اس نے تعمیر کیا تھا جو اسے اپنا مدفن لگے گا۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے یہ کہاوت ضرور یاد آئے گی کہ دشمنوں کے لیے گڑھا کھودنے والا خود اس میں گرتا ہے۔ لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔ ایک ہی بات ہے وہ گرفتار وحشت زدہ ہوگا اس احساس سے کہ اس شہر میں جہاں اسے کسی چیز کی کمی نہیں' جہاں وہ زمین پر اکڑ کے چلتا تھا۔ جہاں اس کی ہیبت قائم تھی۔ اسے اَن داتا جان کے سلام کرنے والے سینکڑوں تھے۔ اس کی دسترس میں تمام وسائل تھے۔ وہ ہر چیز کو' ہر انسان کو اور ہر نظام کو خریدنے کی سکت رکھتا تھا۔ وہاں آج وہ اتنا اکیلا ہوگیا ہے کہ کوئی اس کی سننے والا نہیں رہا۔ صرف چند فٹ اوپر وہ شہر آباد ہے جس میں چوہدری دلاور ایک طاقت کا نام تھا۔ اس کی ماتحتی میں سب شامل تھے۔ قانون کی دھجیاں بکھیرنے کا حوصلہ رکھنے والے بھی' قانون کے علمبردار بھی۔ قانون کے رکھوالے بھی۔ قانون سے کھیلنے والے بھی اور قانون کو تماشا بنانے والے بھی۔ مگر کوئی اس کی مدد کے لیے نہیں آئے گا۔ کسی کو پتا ہی نہیں چلے گا کہ اسی زمین پر جہاں وہ ہر طرف چوہدری دلاور کی تلاش میں دن رات ایک کررہے ہیں' ایک کھنڈر کے نیچے دلاور موجود ہے اور ابھی زندہ ہے۔ وہ ہر سمت میں دیکھ رہے ہوں گے مگر اس چھٹی سمت کو بھولے ہوئے ہوں گے۔ وہ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک چوہدری دلاور کو ڈھونڈیں گے۔ پانچویں سمت افق کی انتہا ہے مگر عالم ارواح کی جانب کوئی اس امید میں نہیں دیکھتا کہ وہاں جانے والا لوٹ کے بھی آسکتا ہے۔ ہاں نیچے زمین کی گہرائی میں پاتال تک چھٹی سمت ہے ادھر تو کوئی دیکھے' کسی کو تو خیال آئے اس مدفن کا بھی۔ مگر یہ ناممکن ہے۔

چوہدری دلاور اگر وہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مرجاتا تو مجھے کیا حاصل ہوتا؟ اسے مارنا تو ہر وقت ممکن تھا مگر میرا مقصد تو کچھ اور تھا۔ میں اس سے اپنا حق وصول کرنا چاہتا تھا اور اس کو انصاف کے تقاضوں کے مطابق ان تمام جرائم کی سزا دلوانا چاہتا تھا جو اس کے نامۂ اعمال میں درج تھے۔ اس نے پہلے میرے باپ کو ذلت و رسوائی دی اور پھر بڑا عذاب دے کر مارا تھا۔ اس نے ایک محسن اور ایک شریف آدمی کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا تھا اور

www.paksociety.com

سے زیادہ اخبار کی طلب تھی۔ اخبار مجھے چوک سے ہی مل گیا۔

صفحۂ اول پر ڈاکٹر نبیلہ کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کے میرے دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا۔ اس سے دل لگانے کی قسمت تو نہیں مل گئی تھی۔ افسوس اس کا تھا کہ وہ اچھی لڑکی تھی جو ہمارا ساتھ دے رہی تھی اور زندہ رہتی تو شاید نادر اور گل کی طرح اہم آرائیں کا مضبوط ستون ثابت ہوتی۔ پتا نہیں ایسی لڑکی چوہدری دلاور کی سوتیلی بہن بھی کیوں ہوئی؟

اس تصویر کے ساتھ ہی ڈاکٹر نبیلہ مرڈر کیس میں تفتیش کے لیے خصوصی طور پر بنائی جانے والی ٹیم کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات تھے کہ وہ قاتلوں سے مل گئے ہیں اور چوہدری دلاور نے منہ مانگی قیمت پر ان کے ایمان کو خرید لیا ہے چنانچہ وہ دلاور کو گرفتار کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ چوہدری دلاور مفرور نہیں ہے، پولیس جانتی ہے کہ وہ کہاں ہے کیونکہ ہر رات ان کی ملاقات ہوتی ہے اور وہ بھی تھانے میں۔ ثبوت کے طور پر وہ تصویریں شائع کی گئی تھیں جو نادر نے اندھیرے میں انفرارڈ کیمرے سے بنائی تھیں۔

اس رپورٹ میں جو کرائم رپورٹر سے منسوب تھی سارا زور بیان مرزا غالب کا تھا۔ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ خود پولیس ہی چوہدری دلاور کو تحفظ فراہم کر رہی ہے اور خصوصی تفتیشی ٹیم کی تشکیل ایک پُرفریب ڈراما ہے۔ اس میں اچھی شہرت کے حامل افراد کو عمداً شامل نہیں کیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اف... کسی اخبار میں نہ چوہدری دلاور کے اغوا کی خبر شائع ہوئی تھی اور نہ اس کی گرفتاری کی چنانچہ اس رپورٹ کی اشاعت سے طوفان کھڑا ہونا یقینی بات تھی۔ اس کیس میں مدعی بھی کوئی ایک نہیں تھا۔ ہائی کورٹ بار کے کیارہ ارکان اس کیس میں استغاثہ دائر کرنے والوں میں شامل تھے۔ غالب نے ٹھیک کہا تھا۔ اب تفتیشی ٹیم کو عتاب سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اس خبر کے ردعمل میں پہلی اور پبلک کے ساتھ وکیلوں کی ہر تنظیم احتجاج کرے گی اور پھر حکومت کے مخالف سیاسی لیڈر بھی پیچھے نہیں رہیں گے۔

ریسٹورنٹ میں ہنگامے کی کوئی خبر سرے سے نہیں تھی۔ ڈی ایس پی شاہد علی کو معلوم ہو گا کہ اگلے دن اس کے خلاف کیا رہا تھا کا خیر سو اور شائع ہونے والا ہے تو وہ ایک رپورٹ فریق وکیل کے خلاف لکھوا دیتا جس نے اسے سب کے سامنے مارا تھا۔ اسے گرار بھی مہر تھے مگر اسے ایس ایس پی ظفر حیات نے معاملہ رفع دفع کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گزشتہ رات ایک مفرور ملازم سکندر بخت کے لیے مظفر کے گھر کی تلاشی کا بھی کسی خبر میں ذکر نہیں تھا۔

اب میں خود کو خاصا محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ میری شناخت کا راز فاش نہیں ہوا تھا اور میرے خلاف کوئی کیس نہیں بنا تھا۔ ظاہر ہے مولوی غلام حسین کی جان بھی فی الحال بچ گئی تھی۔ میں نے ناشتے کے بعد مظفر کے گھر فون کیا تو وہاں صرف نادر تھی۔

اس نے میری آواز سنتے ہی کہا "مبارک ہو۔"

"کیا ہوا؟ لڑکا یا لڑکی؟" میں نے کہا۔

"لڑکا اور لڑکی دونوں کو مبارک ہو" نادرہ ہنسی۔

"یہ سب کمال ہے ایک اور لڑکے کا جس کا سہرا..." میں نے کہا "وہ بھوت کی طرح چھٹ گیا پولیس والوں سے۔"

"تم خود کم بھوت ہو۔ سب کی چھٹی کرا دی۔"

"چھٹی ہو جائے گی۔ انشاء اللہ" میں نے کہا۔

نادرہ بہت خوش تھی۔ "جی حضرت کس دنیا میں ہیں! چھٹی تو ہو گئی۔ صبح صبح آئی جی کے حکم سے سب معطل بھی اور گرفتار بھی۔"

"زندہ باد اخبار والے کی۔۔۔ اخبار والی" میں نے کہا "یہ خبر کہاں سے مل سکتی تھی؟"

وہ ہنسی "غالب کو کسی نے فون کر کے اطلاع دی تھی۔"

"وہ خود کہاں ہے۔ خیر مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا "رابعہ کہاں ہے؟ مگر یہ بھی معلوم ہے مجھے۔ وہ مظفر کے ساتھ چلی گئی ہو گی۔ آج کورٹ روم میں جا کے اس سے ملوں گا۔ ہو سکتا ہے اسے دیکھے ہو گئے۔"

"مولوی غلام حسین نے فون کیا تھا۔"

"اب اس کا فون آئے تو اسے یقین دلانا کہ خطرے کی بات نہیں۔ وہ فوراً مجھ سے غالب کے پاس پہنچ جائے۔"

"اگر کچھ دیر میں پھر فون آیا تو کہہ دوں گی۔ ورنہ میں جا رہی ہوں۔"

"کہاں؟ آج آفس؟"

"آج چوہدری دلاور کو گرفتار کیا جائے گا۔ عصر اور مغرب کے درمیان۔ اس تقریب سعید میں شرکت فرما کے ثواب دارین حاصل کریں۔ یہ دعوت نامہ دیا ہے کچھ خاص لوگوں کو۔"

"اگر سب پہنچ گئے اور تماشا نہ ہوا پھر؟"

"اخبار والے پہنچ جائیں گے۔ پولیس کو لانا مجبوری تھی اور مظفر کی ذمے داری ہے۔ دیکھے تو یہ بھی غالب کی بڑی اسٹوری ہوتی مگر کور یج زیادہ چاہیے۔ بہت سے گواہ... کے لیے بڑی رازداری سے خاص خاص لوگوں کو بلایا جائے گا... انکار کیا جا سکتا ہے۔"

ذرا گھنٹے بعد میں مرزا غالب سے ملا۔ وہ ملبہ اٹھانے والے مزدوروں کو ہدایات دے رہا تھا کہ وہ بجے تک کام ختم کر لیں۔ تھکا ہوا ٹھیکے دار مزید ایک دن کی مہلت چاہتا تھا مگر غالب صاف کہا کہ مفت کا مال جتنا اٹھا لیا وہ اٹھا لیا سب نہیں اٹھا سکتا۔ دو بجے تک تو صبر کرو۔ لکڑی کا بدصورت اور بھاری باکس... ہوا تھا جہاں ہم اسے چھوڑ گئے تھے۔ میں نے ... میں دلاور کے بارے میں پوچھا تو غالب نے سر کے اشارے سے جواب دیا کہ سب ٹھیک ہے۔

بارے میں سوچنے تک نہیں تھے۔

میں نے تختے کے پیچ کھولے اور تختے کو تھوڑا سا پیچھے ہٹا کے جھانکا مگر مجھے تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں نے تختے میں صرف ایک پیچ باقی رہنے دیا اور تختے کو تھوڑا سا گھما کے ایک کونے میں چھوٹے سے کھوکھلے خلا کے سوا باقی حصے کو بند رکھا۔ میں خود تختے کے اوپر بیٹھ گیا۔

گھٹنوں کے بل جھک کے میں نے آواز لگائی "کیا حال احوال ہے پیارے چوہدری دلاور صاحب؟"

اس کا میں صرف اندازہ کر سکتا تھا۔ موت کے مہیب سناٹے میں یہ آواز اس کے لیے کیا تھا ثابت ہوئی ہو گی مگر اس کے ساتھ ہی دلاور کی امید کا بجھتا ہوا چراغ پھر روشن ہو گیا ہو گا۔

"بکواس" وہ چلایا "خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالو۔"

میں نے کہا "خدا ہی نکالے گا تمہیں اس مدفن سے دلاور۔ اس کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ قرب قیامت کی پیش گوئی سب کر رہے ہیں لوگ۔ جیسے ہی صور اسرافیل سنو باہر آجانا۔ میدان حشر میں۔"

"بکواس۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔"

"مرنا کون چاہتا ہے اپنے چوہدری صاحب" میں نے تمسخر کے ساتھ کہا "وہ سب بھی مرنا نہیں چاہتے تھے جن کو تم نے بے دریغ قتل کیا تھا۔ تم کہتے ہو کہ موت کا ایک دن معین ہے اور انہیں اسی طرح مرنا تھا۔ یہی میں تمہارے بارے میں کہوں گا۔ تم کو بھی یہاں مرنے کے لیے آنا تھا۔ اب موت کب آتی ہے یہ شاید تمہیں پتا چلے مگر چند دن اور۔۔۔"

وہ اندھیرے میں میری آواز کی سمت تڑپا اور ٹھوکریں کھاتا ہوا اوپر چڑھتا "مجھے باہر آنے دو۔ خدا کے لیے۔"

"خدا کا نام ایسے ہی وقت میں زبان پر آتا ہے۔ زندگی بھر شیطان سوار رہتا ہے۔۔۔"

اس کا چہرہ مجھ سے چند فٹ قریب تھا "میری بات سنو۔ میں اپنے ہر جرم کا اقرار کرتا ہوں۔ ہر غلطی کو مانتا ہوں۔ تمہارے ساتھ میں نے جو زیادتی کی سب میرا قصور تھا۔ میں بہت برا آدمی ہوں۔ بہت کمینہ ہوں۔"

میں نے قہقہہ لگایا "دلاور۔ تم اس وقت ہوش میں نہیں ہو۔ موت کے خوف نے تمہارے حواس گم کر دیے ہیں۔ تمہیں نہیں معلوم تم کیا کہہ رہے ہو۔ تخت دار پر آدمی کچھ بھی کہہ سکتا ہے اگر اسے یقین ہو کہ وہ بچ جائے گا۔ ایسا تم نے کئی بار کیا ہے۔ تم نے وعدہ خلافی کی۔ تلافی کا ذکر کیا مگر تلافی نہیں کی۔ تم خود کو بہت ہوشیار اور چالاک سمجھ کے اپنے ہر وعدے سے منحرف ہوتے رہے۔"

"اب ایسا نہیں ہو گا۔ یہ آخری بار ہے۔ بالکل آخری

صاف شدہ جگہ پر مجھے ایک خیمہ بھی نظر آ رہا تھا جو شاید صبح ہی نصب کیا گیا تھا۔ یہ جھونپڑی جیسا خستہ حال خیمہ تھا جیسا کہ عام طور پر کھلے آسمان کے نیچے رہنے والے خانہ بدوش یا چوکیدار استعمال کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا مقصد سڑک کی طرف رکاوٹ کھڑی کرنا ہو گا۔ رات میں ہم باکس کھول کے اندر اتریں تو نہ جانے کتنے لوگ شک میں مبتلا ہو جاتے۔ خیمے کے اندر عام ضروریات کا سامان دیکھ کے مجھے حیرانی ہوئی۔

"یہ کیا اسباب ہے اور کس کا ہے؟"

"یہ اپنے چوہدری دلاور صاحب کی ضرورت کا سامان ہے۔"

میں نے ادھر ادھر دیکھا "ان سے شرف نیاز حاصل کر لوں میں۔"

"ضرور۔۔۔ وہ بے چینی سے منتظر ہو گا۔ ذرا خیال رکھنا اپنا۔ کہیں وہ تمہارے استقبال کے لیے زیادہ جذباتی نہ ہو۔"

"میں بھی کم جذباتی نہیں ہوں۔" میں نے کہا اور باکس کا ڈھکنا اٹھا کے اندر اتر گیا۔ لکڑی کا دہ باکس کسی جھونپڑے یا کیبن کی طرح تھا۔ پہلے مجھے اندر گھپ اندھیرا محسوس ہوا۔ پھر میری آنکھیں عادی ہو گئیں تو ہر طرف درزوں سے چھنے والی روشنی میں مجھے وہ چوکٹا صاف نظر آنے لگا جس کو ہٹا کے میں نیچے اتر سکتا تھا۔

اچانک میرے کانوں میں دلاور کی آواز آئی۔ وہ مدد کے لیے چلا رہا تھا۔ شاید چلاتے چلاتے اس کی آواز بیٹھ گئی تھی اور کوئی جواب نہ پا کے وہ خوف اور مایوسی سے پاگل ہو رہا تھا۔ وہ گالیاں بک رہا تھا۔ کسی کو مخاطب کیے بغیر۔ "کوئی۔۔۔ نہیں سنتا۔ سب بہرے ہو گئے ہیں۔۔۔ کے بچے۔۔۔ ارے کوئی ہے۔ میری آواز نہیں پہنچ رہی ہے کسی۔۔۔ کے کانوں تک؟ کیا ہو گیا ہے سب کو۔ کہاں مر گئے ہو سب۔۔۔ تم سب کی۔۔۔ ایک ایک کا دماغ درست کروں گا میں۔۔۔ کے بچو۔ میں دلاور ہوں۔۔۔ چوہدری دلاور۔۔۔ میں سب کی۔۔۔"

مجھے اس کی دیوانگی میں کوئی شبہ نہ رہا۔ انتہائی مضبوط اعصاب کا مالک نظر آنے والا عیار اور مکار، ذہین اور فطین شکاری۔ پُرفریب اداکاری کا ماہر۔ اپنی عقل سے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کے پیش کرنے والا چوہدری دلاور موت کو روبرو دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے پُرعذاب انجام کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ تصور میں اپنی لاش کو اس تہ خانے میں سرد ہوتے اکڑتے، ڈی کمپوز ہوتے گلتے سڑتے اور کیڑے مکوڑوں کی خوراک بنتے اور بالآخر ہڈیوں کے بدوضع پنجر میں ڈھلتے دیکھ رہا تھا اور ہر منظر اس کے اعصاب کی شکست کا سامان فراہم کر رہا تھا۔ آس ٹوٹ رہی تھی۔ نا امیدی بڑھ رہی تھی۔ ایسے وقت میں شدید کرب اس کا ماضی بھی ڈراتا ہے۔ ہر جرم اور ہر گناہ کا احساس اس کی اذیت میں اضافہ کرتا ہے۔ اسے ڈرکوکے لگتا ہے۔ تم تو موت کو بھولے ہوئے تھے۔ اپنے انجام کے

www.paksociety.com

سوچ لیں۔"

"سوچو دلاور کہ پہلے تم نے آخری موقع کب مانگا تھا۔ آج اگر میں تم کو یہاں سے نکال لوں، تمہیں زندگی کا یقین حاصل ہو جائے، تمہاری سب دولت اور طاقت پھر تمہارے ساتھ ہو تو تمہارے جذبات اس کے برعکس ہوں گے۔ تم کہو گے کہ میں نے کیسا بے وقوف بنایا سکندر کو۔ کتنی اچھی اداکاری کی اور کیسے اسے اپنی نیک نیتی کا یقین دلایا۔"

"یقین کرو میں......"

"یقین ایک بار ٹوٹتا ہے پھر قائم ہو تو اس میں بال آ جاتا ہے۔ دوسری بار یہ ریزہ ریزہ ہو جائے تو خدا کے سوا کوئی ٹکڑے جوڑ کے بے داغ آئینہ نہیں بنا سکتا۔ تمہاری آخری اپیل مسترد کی جاتی ہے۔"

"سنو سکندر۔ تم اتنے بے رحم نہیں ہو سکتے۔" وہ چلایا۔

میں نے کہا "دلاور۔ کیا تم مجھے اعتراف جرم کی تحریر دے سکتے ہو؟"

"ہاں... ہاں... میں تیار ہوں۔"

"اس میں اپنے ہر جرم کا اعتراف کرو گے، سب بتاؤ گے کہ تم نے میرے والد کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ کیسے ان سے سب کچھ چھینا تھا اور کس طرح ان کی زندگی کو بھی ایک سزا بنا دیا تھا۔ خود ان کے لیے اور پھر میرے لیے۔ تم نے اس ملک کے ساتھ جو کیا۔"

"میں سب لکھ دوں گا۔"

"یہ بھی بتاؤ گے کہ تم نے ناجائز دولت کہاں سے اور کیسے کمائی تھی؟"

"ہاں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "کتنے لوگوں کو اذیت دے کر ہلاک کیا اور کروایا؟"

"تم مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کرتے؟"

"تم واقعی پاگل ہو گئے ہو دلاور۔" میں نے افسوس سے کہا "تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہارے جھوٹ پر یقین کر رہا ہوں؟ ایسی تحریر تم دے سکتے ہو مجھے، جو تمہیں سیدھا تختۂ دار پر لے جائے۔ جو تمہیں دنیا میں رسوا کر دے۔ تمہارا مستقبل تباہ کر دے۔ تمہاری عزت کا جنازہ نکال دے اور جو تم سے محبت کرتے ہیں وہ بھی تم سے نفرت کرنے لگیں۔ شیطان سے زیادہ تم پر لعنت ہو۔ ہوش و حواس میں رہتے ہوئے کوئی اس قسم کا اعتراف جرم کر ہی نہیں سکتا۔ میں جانتا ہوں تمہیں اچھی طرح۔ تم بعد میں کہو گے کہ یہ تحریر جبر سے لی گئی تھی۔ جو سکندر بول رہا تھا میں لکھ رہا تھا، جان بچانے کے لیے مجھے سب لکھنا پڑا۔ قانون کی نظر میں اس اعتراف جرم کی حیثیت صفر ہو جائے گی۔ البتہ میرا جرم بن جائے گا۔ بہتر ہے کہ تم مر جاؤ۔"

"دیکھو سکندر، میں اس ملک سے چلا جاؤں گا۔ اپنے بچوں کے ساتھ۔ مجھے زندہ چھوڑ دو۔" وہ دعائیں مانگنے لگا۔

"یہ باعزت موت ہے دلاور۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ تم غائب ہو جاؤ گے۔ یہ سمجھا جائے گا کہ راز فاش ہونے پر دشمنوں نے مار دیا۔ تمہارا خاندان ذلت و رسوائی سے بچ جائے گا۔"

"نہیں... نہیں۔" اس نے چیخ چیخ کے کہا "مجھے چھوڑ دو۔ مجھے معاف کر دو سکندر۔" پھر وہ منت سماجت پر آ گیا "خدا اور رسول کا واسطہ۔"

"اس کے بعد تم مجھے رزاب خان مرحوم کے نام کا واسطہ دو گے، پھر رابعہ کی محبت کا۔" میں نے طنز سے کہا۔ "یہ سب بے کار ہے دلاور۔ اور ہاں ایک بات تو میں نے بتائی نہیں تھی، جو کچھ تم بول رہے ہو اب یہ سب میں نے ریکارڈ کر لیا ہے۔"

وہ نیچے سے چیزیں اٹھا اٹھا کے اوپر پھینکنے لگا۔ اس کے شافٹ تک پہنچنا مشکل تھا کیونکہ تو ٹوٹا زینہ ملبے سے اٹا ہوا تھا۔ ٹوٹے زینے سے اس کے ہاتھ اوپر تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

"جھوٹے، لعنتی شیطان، کتے کی اولاد۔" وہ دیوانہ وار مجھے گالیاں دینے لگا۔ ایک سے ایک فحش اور گندی گالی۔ جو کچھ پھینکتا تھا وہ شافٹ تک پہنچنے سے قبل ہی چھت سے ٹکرا کے گر جاتی تھیں۔ لالٹین کے برتن ٹکرا کر ریکارڈ ہو رہے تھے۔ نظر آ رہا تھا مجھ پر مارنا چاہتا تھا شاید اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں ورنہ موم بتی رات کو ہی ختم ہو چکی تھی اور اس کے سیل بھی اتنی دیر تک نہیں چل سکتے تھے اور اوپر سے آنے والی روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔

دلاور کسی جنگلی جانور کی طرح اپنے پنجرے میں اچھل کود کر کے اپنے غصے کا اظہار کر رہا تھا۔ مجھے اندیشہ یہ تھا کہ کہیں پاگل نہ ہو جائے۔ دیوار سے سر پھوڑ کے خودکشی نہ کر لے۔ موت کے خوف سے اس کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔

میں نے کہا "دلاور۔ اب جو میں کہہ رہا ہوں وہ غور سے سنو۔ میرا ارادہ ہرگز تمہیں قتل کرنے کا نہیں تھا ورنہ تم تب ہی مر گئے ہوتے۔ میں ایک زخمی جانور کو تڑپتے ہوئے میں تمہیں مارنے کا شوقین نہیں۔"

"کیا؟ تم مجھے نہیں مارو گے؟" وہ رک گیا۔

"ہاں۔ تم زندہ رہو گے۔ اگر تم اس تہ خانے میں مر گئے تو افسوس ہوگا کہ دنیا نے تمہارا عبرت ناک انجام نہیں دیکھا۔ تمہیں موقع دوں گا۔"

"تم مجھے معاف کر دو گے؟" وہ خوشی سے چلایا۔

"ہاں۔ لیکن تمہیں پولیس گرفتار کرے گی۔ تمہارے خلاف فرد جرم پہلے سے موجود ہے۔ تم نے اپنی موٹر میں ڈاکٹر شبلی کو قتل کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی تم نے ان گنت قتل کیے تھے۔

رابعہ آج چیف جسٹس کے سامنے درخواست پیش کرے گی کہ ملزم کے بارے میں کچھ اطلاعات ملی ہیں۔ اندیشہ یہ ہے کہ پولیس نے اسے پناہ دے رکھی ہے۔ انہیں پابند کیا جائے کہ وہ ملزم کو گرفتار کریں۔"

"کہاں سے گرفتار کریں۔ عدالت پوچھے گی نہیں۔"

"اس جگہ کی نشاندہی پولیس کو کر دی جائے گی مگر اندیشہ یہ ہے کہ بدعنوان اہلکار ملزم کے فرار میں معاون ثابت نہ ہوں اس لیے صرف ڈی آئی جی کی براہ راست نگرانی میں کارروائی کی جائے۔"

"یار ہم کس بنیاد پر نشاندہی کریں گے۔"

"ہم بتائیں گے کہ کچھ لوگوں کو جو چوہدری دلاور کے ساتھی ہیں اس جگہ مشتبہ انداز میں آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔ یہ جگہ رابعہ قادری ایڈووکیٹ کی ملکیت تھی مگر اس پر چوہدری دلاور نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے یہاں ایک کوٹھی تعمیر کی تھی جو اس نے غیر قانونی طور پر ایک طوائف کو دے رکھی تھی۔ بعد میں اس کا قبضہ رابعہ قادری ایڈووکیٹ کو مل گیا تھا مگر اس کو پراسرار طور پر آتش زنی سے تباہ کر دیا گیا۔ اس کوٹھی میں ایک تہ خانہ تھا اور شبہ ہے کہ دلاور اسی تہ خانے میں چھپا ہوا ہے۔ ہم نے رات کو یہاں نگرانی کی تو ہمیں چوہدری دلاور کے خاص آدمی یہاں آتے جاتے دکھائی دیے۔ ہم ان کو پہچانتے ہیں مگر نام نہیں جانتے۔"

"کم سے کم میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔"

"میں، رابعہ اور وقار یوسف یہ بات کہیں گے۔ تم تو محض دلاور کا ایک ذریعہ ہو۔ ڈاکٹر شبلی کے وکیل جس کے مطالبے کو پولیس آسانی سے مسترد نہیں کر سکتی۔ خصوصاً آج کے اخبار میں شائع ہونے والی خبر اور تصویروں کے بعد جو کارروائی ہوئی ہے اس سے کافی حوصلہ شکنی ہوئی ہے دلاور کا ساتھ دینے والوں کی۔ امید ہے نئی تفتیشی ٹیم کا چند روز میں اعلان ہوگا۔ اس میں سب باہر کے لوگ ہوں گے۔ وکلاء استغاثہ مطالبہ کریں گے کہ تحقیقاتی کمیشن بنایا جائے جس کا سربراہ ہائی کورٹ کا جج ہو۔ ان حالات میں آج دلاور کا گرفتار ہو جانا یقینی ہے۔ ابھی تک کسی کو ہمارے عزائم کی خبر نہیں ورنہ اچانک دلاور کی غنڈا فورس اسے نکال کر لے جاتی اور ساتھ ہی ہمیں بھی۔"

اچانک میں نے مولوی خادم حسین کو دیکھا۔ وہ تیر کی طرح ہماری طرف آ رہا تھا۔ "السلام علیکم جناب۔ میں تو بہت ڈرا ہوا تھا۔ تمام رات سو بھی نہیں سکا تھا کیا واقعی اب خطرہ نہیں رہا؟"

میں نے کہا "خادم حسین، خطرہ ہر شخص کے لیے ہر جگہ موجود رہتا ہے۔"

"جی یہ کیا فرما رہے ہیں آپ۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ کیا یہ ناممکن تھا کہ یہاں آتے ہوئے تم کسی گاڑی کے نیچے آ جاتے۔"

میرے والد کا قتل بھی شامل ہے مگر سزائے موت تو قدرتی کو ایک بار ہی ہوتی ہے۔ تمہیں ساری دنیا کے سامنے گرفتار کیا جائے گا۔ تم پر مقدمہ چلے گا اور ایک دن تم پھانسی پر لٹکائے جاؤ گے۔ تمہاری ہر اپیل مسترد ہوتی جائے گی۔ بالآخر مجھے میرا حق ملے گا اور انصاف ہوگا۔ صرف اس لیے تم زندہ تھے اور زندہ رہو گے۔ تم بہت بڑے شکاری تھے مگر تقدیر سے بڑے شکاری نہیں تھے۔ تم قدرت کے نظام انصاف سے نہیں لڑ سکتے۔ اجل کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ یہ ثابت ہونے تک تم زندہ رہو گے۔"

میں نے تختے برابر کر دیے اور پیچ لگا کے کس دیے۔ پھر میں باکس سے باہر آ گیا۔ ملبے سے گزرا اور غالب کے سامنے پہنچ گیا "میرا دل بہت مسرور ہے۔ دلاور کو موت کی دہشت نے دیوانہ کر دیا ہے۔ جا کے اس کی حالت دیکھو۔"

"میں دیکھ چکا ہوں۔" غالب نے کہا "میرا دل تو چاہتا ہے کہ اسے یہیں قید تنہائی میں مر جانے دو۔ یہ بڑی پرعذاب موت ہوگی۔ بے بسی اور بے چارگی کے ساتھ دکھ اور پچھتاوے۔ خوف عاقبت اور ہر لمحہ قریب آتی موت کا تصور۔ تڑپ تڑپ کے بھوک پیاس سے مرنے کا اور اسی زنداں میں لاش کے سڑنے گلنے کا خیال۔ دلاور کے انجام کی فلم بنائی جا سکتی تو دنیا کی سب سے زیادہ ہٹ فلم بنتی۔ اس فلم کا ہر منظر دیکھنے والوں پر کپکپی طاری کر دیتا۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔"

"نہیں یار۔ ہم انسان ہیں۔ شیطان نہیں ورنہ کیا کرتے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ مجرم کو قانون کے مطابق سزا ملے اور سزا کا انسانی تصور یہ ہے کہ قاتل کتنا ہی سفاک اور درندہ صفت کیوں نہ ہو۔ اسے کم سے کم اذیت کے ساتھ سزائے موت دی جائے۔ پھانسی کے بعد الیکٹرک چیئر، پھر گیس چیمبر اور اب زہریلے انجکشن سے بھی سزائے موت دی جاتی ہے۔"

"کیا واقعی تمہیں یقین ہے کہ اسے سزائے موت ہوگی؟ یعنی اس پر عمل درآمد بھی ہوگا؟" غالب نے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ ایسا ضرور ہوگا۔ انصاف کا عمل طویل اور پیچیدہ ضرور ہے مگر قانون کی مدد ہم کریں گے۔"

"قانون کی مدد وکیل کرتے ہیں۔"

"وکیل اپنا کام کریں گے۔ جہاں قانونی سقم ہوگا وہاں ہم وکیلوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ ثبوت اور شہادت کو مکمل اور حتمی بنا سکتے ہیں۔ ہم گواہ لا سکتے ہیں اگر اصل گواہ سامنے نہ آتے ہوں، قتل کر دیے جاتے ہیں یا منحرف ہو جاتے ہوں۔ انصاف تو ثبوت اور شہادت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ پولیس یہاں آ کے دلاور کو گرفتار کرے گی؟ کون قائل کرے گا پولیس کو کہ دلاور یہاں چھپا ہوا ہے۔"

"میں، رابعہ اور تم۔ ہم قائل کریں گے۔"

"کیسے قائل کریں گے عدالت ایسی اپیل کو؟"

www.paksociety.com

خادم حسین نے جھرجھری لے کے کہا "توبہ توبہ۔"
"یا ابھی جہاں تم کھڑے ہو یہ زمین پھٹ جائے اچانک زلزلہ آجائے۔"
خادم حسین فوراً دو قدم دور ہو گیا پھر اپنی حرکت پر خود ہی جھینپ کر مسکرانے لگا۔ "اس مردود کو بروقت روک لیا آپ نے ورنہ جناب رات بھر مجھے الٹا لٹکائے رکھتے وہ لوگ۔ خود گرفتار ہو گئے اللہ کے حکم سے۔"
میں نے کہا "چلو ان سے مل کے آتے ہیں۔"
"ہرگز نہیں۔ یعنی آپ مجھے دعوت دے رہے ہیں زخمی شیر سے ملاقات کی۔ میں تو اس کے پنجرے کے قریب نہ جاؤں۔"
"فکر مت کرو۔ وہ پنجرے سے باہر نہیں آسکتا" میں نے کہا "تمہیں نہیں مجھے ان سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"
غالب ٹھیکے دار کو نوٹس دے چکا تھا "بس ایک گھنٹے میں یہاں سے سب غائب ہو جائیں ورنہ حوالات میں نظر آئیں گے بھرتہ کرنا۔"
ٹھیکے دار رو کھلا گیا "اجی ایسا ظلم مت کریں۔ ابھی آدھے گھنٹے میں جاتے ہیں ہم۔"
میں نے کہا "مرزا جی۔ ایک اطلاع کل نہیں دے سکا تھا میں۔ مجھے ایس پی سے گفتگو کے دوران پتا چلا تھا کہ پولیس نے اس گورکن کو اٹھا لیا تھا۔ اس سے ڈیڈ کی قبر کا پتا معلوم کرنے کے لیے مگر وہ کچھ بتانے سے پہلے ہی ہلاک ہو گیا۔ پولیس نے تشدد کیا تھا اس پر۔ مگر اس کے بیٹے نے خاموشی سے باپ کو دفنا دیا۔ کیا کرتا بے چارا۔"
"اچھا۔ یہ کل کی اسٹوری ہو گی۔ خصوصی رپورٹ مس نازو کی۔ میں اسے کہتا ہوں کہ آج ہی گورکن کے بیٹے سے مل کے اس کا بیان ریکارڈ کرے اسے بتائے بغیر" غالب نے کہا "اگر اسے پتا چل گیا کہ نازو صحافی ہے اور اس کا بیان اخبار میں شائع ہو گا تو شاید وہ کچھ بھی نہ بتائے۔"
خادم حسین کے ساتھ میں نے پولیس ہیڈ آفس میں قدم رکھا تو میں نے یہ ظاہر کیا جیسے مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں رابعہ کی گاڑی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔
"ایس پی ظفر حیات۔ وہ تو نہیں ہیں" ایک سب انسپکٹر نے بتایا جو ملحقہ کمرے میں پہلے بھی بیٹھتا تھا۔
"کل تو تھے اچھا ڈی ایس پی شاہد علی۔" میں نے خاصی حیرانی سے کہا۔
"وہ۔ وہ بھی نہیں ہیں" سب انسپکٹر نے کہا۔
"ایک ساتھ کہاں چلے گئے سب لوگ۔"
"کل پرسوں تک نئی ٹیم کے ارکان کا اعلان ہو گا۔ آپ معلوم کر لیں اور پھر تشریف لائیں۔"
میں نے کہا "مجھے کسی ٹیم سے نہیں۔ وہ ہی لوگوں سے ملنا تھا۔

میرے کچھ کاغذات ان کے پاس تھے۔ یہ ایک ذاتی مسئلہ ہے۔"
سب انسپکٹر نے بادل ناخواستہ مجھے اوپر بھیجا۔ معطلی اور بحالی تو ایک ایسا معمول ہے کہ رائے عامہ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا اس سے بہتر نسخہ کوئی نہیں۔ پولیس سے کوئی جرم سرزد ہو جائے اور بیک وقت پریس اور پبلک شور مچانے لگیں تو ملزم کے معطل ہونے کی یا لائن حاضر کیے جانے کی خبر فوراً جاری ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کسی کو پتا نہیں چلتا کہ وہ کتنے گھنٹے یا کتنے دن معطل رہا۔ اور بحال ہو کے کہاں گیا۔ اس کیس میں مسئلہ زیادہ سنگین تھا۔ ان کی گرفتاری بھی ظاہر کی گئی تھی چنانچہ وہ زیر حراست تھے یعنی ایک پرتکلف کمرے میں اپنے اپنے بیڈ پر لیٹے اخبارات و رسائل کا مطالعہ فرما رہے تھے۔ صحافیوں اور وکیلوں کی شان میں ایک سے قصیدے پڑھ رہے تھے اور بے حد مطمئن ہشاش بشاش اور فارغ نظر آتے تھے۔ ان کے لیے ریڈیو ٹی وی بھی فراہم کیا گیا تھا اور چائے پانی کا خصوصی انتظام تھا۔
مجھے دیکھتے ہی ان کا موڈ خراب ہو گیا "یہ کیوں آیا ہے یہاں؟" عادت کے مطابق ڈی ایس پی شاہد علی نے گالی دے کے کہا۔
خادم حسین نے میرا جواب پہنچایا "محترم وکیل آپ سے اظہار ہمدردی کرنے کے لیے آئے تھے لیکن یہاں پہنچ کے معلوم ہوا کہ خبر غلط تھی۔ آپ لوگ گرفتار تو نہیں ہوئے ہیں۔ کیا معطل ہونے کی خبر درست ہے؟"
"مولوی۔ اس کو لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ کل تو میرے ہاتھ آجا تو رات کو میں۔"
"میں ڈی آئی جی صاحب سے معلوم کروں گا کہ حقیقت کیا ہے؟" میں نے چلتے چلتے کہا "اگر یہ حوالات ہے تو میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ زیر حراست مجرموں کو دنیا میں کہیں اتنے آرام سے نہیں رکھا جاتا۔"
ظفر حیات نے تشویش سے کہا "یہ بامشرو ہمیں سچ مچ حوالات میں دیکھنا چاہتا ہے۔"
میں نے کہا "مقامی صحافی اور وکیل کہتے پھر رہے ہیں کہ تم نے اصل ملزم کو گرفتار نہ کرنے کا معاوضہ ایک کروڑ روپے لیا تھا۔"
ڈی ایس پی شاہد علی نے پھر ایک ناقابل اشاعت بات کی۔
"یہ بھی سنا ہے کہ خود تم نے چودھری دلاور کو کہیں چھپا رکھا تھا۔ اور اسے آج وہاں سے گرفتار کر لیا جائے گا۔"
"یہ کون... کہتا ہے؟"
"میری اطلاع کے مطابق رابعہ قادری ایڈووکیٹ۔ مرزا غالب جرنلسٹ اور میں ابھی ڈی آئی جی صاحب سے ملیں گے۔"
ایس پی ظفر حیات اٹھ کے آگے آیا "کس سلسلے میں؟"
"اس جگہ کا پتا چل گیا ہے جہاں تم نے ملزم کو بحفاظت رکھا تھا۔ میں تو خیر نہیں جانتا۔ مگر ڈی آئی جی صاحب خود گھر ادا کریں

الزام ہے وہ تو واردات کے وقت تمہارے ساتھ تھا۔ اس جھوٹ سے ایک بے گناہ کی جان بچتی ہے۔"
"یہ۔ یہ تو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے مجھے آپ نے۔"
"یا فرض کرو تم چشم دید گواہ بن جاؤ۔"
"بھی کیا کرتے ہیں آپ۔ جب اصل گواہ زندہ ہیں تو مجھے کیوں آگے دھکیل رہے ہیں آپ مرنے کے لیے۔"
میرا مطلب تھا کہ بعض اوقات پتا زہر بن جاتا ہے اور جھوٹ تریاق۔ ویسے بھی جان بچانے کا مسئلہ ہو تو حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔"
"آپ کھل کے بات کریں جناب۔"
میں اسے بھی چشم دید گواہوں میں شامل کرانا چاہتا تھا جو کہیں کہ انہوں نے رابعہ کے پلاٹ پر چودھری دلاور کو دیکھا تھا مگر وہ نظر آنے کے بعد غائب ہو گیا۔ اس کی گواہی کیس کو زیادہ مضبوط بناتی تھی۔ مولوی خادم حسین کے بارے میں میرا خیال یہ تھا کہ وہ بس نام کا مولوی ہے اور در حقیقت اس کا ایمان بھی ہم جیسے گناہ گاروں کی طرح کمزور ہے۔
ابھی میں وضاحت کا سوچ ہی رہا تھا کہ سڑک کے پار میری گاڑی کے بالکل پیچھے ایک اور گاڑی آکے رک گئی۔ رابعہ کی یہ سرخ واکس ویگن خاصی جانی پہچانی چیز تھی۔ میں نے پیچھے والی گاڑی میں دیکھا تو سب سے پہلے مجھے نازو نظر آئی۔ میں حیران ہو کے اٹھا ہی تھا کہ دوسری طرف سے اترنے والے کی صورت دیکھ کے مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہوا۔ لیکن یہ دھوکا نہیں تھا گاڑی سے اترنے والا استاد پیڈ مددی تھا۔
نازو اب بھی اگلی سیٹ پر بیٹھی سامنے خلا میں گھور رہی تھی اور پچھلی سیٹ پر مجھے دو افراد کے سر نظر آ رہے تھے۔ اس دوسری ہلکے نیلے رنگ کی واکس ویگن کے پچھلے شیشے ڈارک تھے۔ پلک جھپکتے میں میں نے خادم حسین کے ساتھ جگہ بدل لی تاکہ پیڈ مددی کی نظر مجھے نہ دیکھ پائے۔
خادم حسین کے لیے میری بدحواسی باعث حیرت بن گئی "کیا ہوا اچانک آپ کو؟ صورت سے تو یہ لگتا ہے جیسے آپ نے کوئی ایسی ویسی چیز دیکھ لی ہے۔ بھوت پریت وغیرہ۔"
میں نے آگے جھک کر کہا "بالکل ٹھیک سمجھے تم مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ بھوت پریت بھی مجھے دیکھ لیں۔"
"یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہے جناب کہ خود کو بچانے کے لئے آپ نے مجھے ان کے سامنے کر دیا۔ اور ایسے بھوت پریت کو دھوکا کون دے سکتا ہے۔ میری اور آپ کی تو صورت ذرا بھی نہیں ملتی جگہ بدلنے سے کچھ نہیں ہو گا۔" وہ بڑے جوش و خروش سے کھانے میں لگا رہا۔
میں نے کہا "خادم حسین۔ تم اپنے معدے پر ظلم کر رہے ہو۔"

سے گرفتاری کی کارروائی عدالت کے حکم پر ہو گی۔"
ظفر حیات کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اس نے شاہد علی کی طرف دیکھا "یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟ کیا واقعی تم نے دلاور کو چھپا رکھا تھا؟ پیسے لے کے۔"
"یہ کتا جھوٹ بکتا ہے" شاہد علی نے غرا کے کہا "بھونکنے دیں اسے بھی اور دوسرے کتوں کو بھی۔ مجھ پر شک نہ کریں۔"
"شک کیوں نہ کروں؟ تمہارا اور انسپکٹر کا رویہ میرے لیے شروع سے مشکوک رہا ہے۔ تم مجھے بھی ڈبل کراس کر رہے تھے۔"
"سر غلط فہمی ہے آپ کی۔ رفع ہو جائے گی۔ اگر دلاور گرفتار ہو گا تو آپ کو بھی پتا چل جائے گا" شاہد علی نے بگڑ کے کہا۔
"کوئی بات ضرور ہے ورنہ عدالت کا حکم کیسے ہوا" ظفر حیات بولا۔
"عدالت ایسا حکم نہیں جاری کر سکتی۔ یہ بھی جھوٹ ہے۔"
میں بھس میں چنگاری ڈال کے نیچے آ گیا۔ اب وہ آپس میں دست و گریباں تھے۔ ظفر حیات کو شک ہو گیا تھا کہ شاہد علی نے ساری رقم خود ہضم کر لی اور اسے دلاور کی مدد کرنے پر آنے میں نفع کے برابر حصہ بھی نہیں ملا۔ شاہد علی ایک کروڑ کے جھوٹ پر چراغ پا تھا۔ دشمن کے نزدیک یہ جھوٹا پروپیگنڈا تھا۔ وہ کیسے جان سکتا تھا کہ کچھ دیر میں یہ جھوٹ اس کے خلاف سب سے سنگین سچ ثابت ہو جائے گا۔
میں اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ رابعہ اور غالب کو وقار یوسف کی گاڑی میں آنا تھا۔ میں نے مین پولیس ہیڈ آفس کے سامنے ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور گاڑی کو اگلے چوک تک لے گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ تینوں ادھر ہی سے گزریں گے۔ انتظار کی یہ مہلت غنیمت تھی۔ میں نے اور خادم حسین نے قریب ہی ایک ہوٹل میں بیٹھ کے کھانا کھایا۔ مجھے بالکل بھوک نہیں تھی اور جو تھی وہ کھانا دیکھ کے مر گئی لیکن خادم حسین کی حالت غیر ہونے لگی تھی "بھوک برداشت نہیں ہوتی مجھ سے جناب۔ میں خود مر سکتا ہوں، بھوک نہیں مر سکتی، استغفراللہ۔"
میں نے کہا "خادم حسین۔ تم جھوٹی گواہی دو گے؟"
وہ اچھل پڑا "نہیں۔۔۔ جھوٹی گواہی۔ لاحول ولا قوۃ۔"
میں نے کہا "فرض کرو ایک شخص کو قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا ہونے والی ہو۔ تمہیں علم ہو کہ اصل قاتل یہ شخص نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ تم قاتل کو بھی جانتے ہو اور تمہارے یقین کی بنیاد مفروضات پر نہیں، حالات اور واقعاتی شہادت پر ہے۔ اصل گواہ تمہارے سامنے اعتراف کر چکے ہیں کہ انہوں نے سب دیکھا تھا مگر وہ ڈر کی وجہ سے گواہی دینا نہیں چاہتے۔"
"میں کہہ سکتا ہوں اپنے بیان میں کہ فلاں فلاں چشم دید گواہ ہیں۔"
"وہ صاف مکر جائیں گے۔ جھوٹا حلف بھی اٹھائیں گے۔ یہ بھی طے ہے۔ ایسی صورت میں کیا تم کہہ سکتے ہو کہ جس پر قتل کا

"ظلم کی بات مت کریں جی۔ خادم حسین پر کم ظلم ہو رہا ہے؟ آپ بھی ظلم کرنے والوں میں شامل ہیں اور پولیس بھی۔ غریب آدمی پر دنیا میں ہر جگہ ظلم ہو رہا ہے۔ میں تو پورا انصاف کرتا ہوں اپنے پیٹ کے ساتھ۔ اسے بھوکا کبھی نہیں رکھتا۔ جن بھوت آ جائیں یا حضرت عزرائیل۔ ہم کھانا ختم کیے بغیر اٹھنے والے نہیں ہیں۔ صاف بات ہے۔"

"خادم حسین! ذرا سامنے دیکھو۔"

"سامنے کیا ہے جی۔ سامنے رزق ہے یا آپ کی ذات بے برکات وپُر آفات ہے۔۔۔" وہ خاصے خوشگوار موڈ میں تھا۔

"سامنے ہماری گاڑی کے ساتھ ہی دوسری گاڑی ہے۔"

اس نے چونک کے سر اٹھایا "ہے بالکل ہے جناب' بادامی رنگ کی۔"

میں نے کہا "کہاں دیکھ رہے ہو تم؟ نیلے رنگ کی ویسی ہی گاڑی ہے جیسی ہماری لال گاڑی ہے۔"

"یہ بھی سچ کہا آپ نے۔ بادامی رنگ کی گاڑی آگے ہے۔ نیلے رنگ کی پیچھے۔" اس نے ایک ڈکار لی اور زور سے الحمد للہ کہا۔

"کون ہے اس گاڑی میں۔ غور کرو۔"

پانی کا گلاس اس کے ہونٹ تک پہنچ کے رک گیا۔ "واللہ یہ تو۔۔۔ یہ تو وہی ہیں جناب۔ اپنی مس نازو۔ غور کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ایک شخص گاڑی سے اترا ہے۔ کرائی کا ٹپ۔"

اس نے پانی پیتے ہوئے سر ہلایا اور پھر گلاس میز پر رکھ دیا "پیچھے کھڑا ہے۔ رنگ ایسا کہ کچھ نہ پتے تو اندھیرے میں دکھائی بھی نہ دے۔ موٹے موٹے گھونگریالے بال۔ پکوڑا ناک۔ کانوں میں سونے کی مندریاں۔"

"میں نے حلیہ نہیں پوچھا تھا۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں میں اسے۔"

"مگر یہ تو مجھے شریف آدمی نہیں لگتا۔ آپ کیسے جانتے ہیں اسے۔"

میں نے جھنجلا کے کہا "یار جانتا میں تمہیں بھی ہوں اور دلاور کو بھی۔ میرا مطلب ہے کہ میرے جاننے والوں میں ہر قسم کے لوگ ہیں۔ بدمعاش بھی شریف بھی۔"

"کتنے افسوس کا مقام ہے۔ پہلے آپ نے میرا نام لیا تھا۔ یعنی میں بدمعاش ہوں۔ مؤخر الذکر دلاور شریف ہے!"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو اور اپنا سر نیچے رکھو۔ یہ بتاؤ وہ کالا بھوت کیا کر رہا ہے؟"

"کچھ نہیں جی۔ بس ادھر ادھر نظریں اٹھا رہا ہے۔ حیرانی تو مجھے مس نازو پر ہے۔ وہ کیسی انجان بنی بیٹھی ہیں۔ دو بار نظریں چار ہو چکی ہیں مگر انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ ضرور ان کی نظر کمزور ہے۔ وہ خود بھی کمزور ہیں ویسے تو۔"

"اس کی آنکھیں اور تمہارا دماغ دونوں بعد میں چیک کرائیں گے۔ ابھی یہ بتاؤ کہ وہ کلو یا ادھر تو نہیں دیکھ رہا ہے۔"

"دیکھتا ہے کبھی کبھی۔ کیا بلاؤں اسے؟"

"خبردار جو یہ غلطی کی۔ شانزے قتل کر چکا ہے یہ شخص تمہیں مار کے بنجری بنا دے گا۔ تم یہ چابیاں پکڑو۔ گاڑی چلا لیتے ہو نا۔"

"کیوں نہیں جناب۔ زندگی کی گاڑی آخر چل ہی رہی ہے۔ ابھی سال بھر پہلے میں راکٹ چلاتا تھا۔ خلائی راکٹ۔"

"خلائی راکٹ؟"

"ہاں جی۔ وہ بیڈ فورڈ ٹرک تھا۔ اس کا نام تھا۔"

"اچھا اچھا۔ تم یہ گاڑی لے کر جاؤ۔ کالا جن تم سے میرے بارے میں ضرور پوچھے گا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ رابعہ کی کار ہے اور میرے پاس تھی' تم صاف مکر جانا کہ ولایتی وکیل صاحب تو پولیس ہیڈ آفس میں تشریف رکھتے ہیں۔ مجھے بھوک لگی تھی' میں اکیلا یہاں کھانا کھانے آیا تھا اور اب واپس جا رہا ہوں۔"

"اگر اس نے شرافت سے میری بات نہ مانی جناب۔ خدانخواستہ دست درازی پر اتر آیا زبان درازی کے بعد۔ شکم سیر ہونے کے بعد مجھ پر کچھ غنودگی طاری ہوتی ہے" میں ایڈی سے بھی نہیں ہو سکتا۔"

"لڑنے کی ضرورت نہیں۔ زور بیان سے اسے قائل کر لینا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو سچ کہہ رہے ہو۔"

"نازو بی بی سے ڈر لگتا ہے۔ وہ پہچان لیں گی۔"

"نہیں۔ وہ تمہیں نہیں پہچانیں گی۔" میں نے خادم حسین کو یقین دلایا "مگر وہ میرے بارے میں کوئی سوال کرے تو اسے بھی یہی جواب دینا۔"

خادم نے چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا "اللہ مالک ہے جی۔"

میں نے کہا "بزدل مت بنو خادم حسین۔ مسکراتے ہوئے باہر جاؤ اور گاڑی لے کر چلے جاؤ پولیس ہیڈ آفس۔ میں بعد میں نکلوں گا۔"

"یعنی ان لوگوں کے میرے تعاقب میں روانہ ہونے کے بعد۔"

"ٹھیک سمجھے تم۔ کالا جن تمہارا پیچھا کرے گا۔"

"اُف۔ میرا تو کھانا برابر ہو گیا۔ آپ نے تو کہا تھا کہ اب کوئی خطرے کی بات نہیں رہی۔ پھر یہ کالا جن کہاں سے آ گیا۔ یہ میرا پیچھا ایسے تو نہیں کرے گا جیسے میں سائیکل پر تانگے کا پیچھا کرتا تھا۔" اس نے آہ بھری۔

میں نے حیرانی سے کہا "تم۔۔۔ کب مولوی خادم حسین۔"

"وہ سر! ایسے ہی بات نکل گئی منہ سے۔ خیر سے شادی بھی ہو چکی ہے اب تو۔ یہ قصہ ہے تب کا جب خادم جوان تھا۔"

"یعنی کامیاب عاشق ہو تم۔ ایسے پیچھے لگے تھے کہ شادی کر کے ہی دم لیا۔" میں نے کہا۔

"ایسی ہماری قسمت کہاں جناب۔ شادی تو میری ہو گئی اس

تانگے والے کی بیٹی سے۔ اس نے پسند کرایا تھا مجھے اور وہ تانگے والی تو کالج جانے لگی تھی کار میں۔ پہلے ہی دن اس نے میرے اوپر سے کار گزارنے کی کوشش بھی کی تو سائیکل کا چورا ہو گیا۔ میں گرا سائیڈ میں اس لئے بچ گیا۔ وہ تو صاف نکل گئی جناب۔ پھر تانگے والا ہی مجھے اٹھا کے اپنے گھر لے گیا۔"

میں نے کہا "اچھا اچھا۔ یہ کہانی پھر کبھی سنیں گے۔ ابھی تم جاؤ۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

"اچھا جی۔ وہاں دن گولیاں تو نہیں چلیں گی پیچھے!" وہ اٹھا۔

میں نے اسے یقین دلایا "کالے جن کی تم سے کوئی دشمنی نہیں۔"

"لیکن آپ سے تو ہے۔" اس نے سر ہلایا اور تو بھر کے نکل گیا "پھر ہم کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں جناب۔"

بدقسمتی سے اس کے اندیشے کی فوراً ہی تصدیق بھی ہو گئی۔ میں پلٹ کر دیکھے بغیر تصور کر رہا تھا کہ اب وہ سڑک پار کر چکا ہو گا۔ شاید اب گاڑی کی طرف بڑھا ہو گا اور اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی ہو گی۔ تھوڑے بہت فرق کی گنجائش میں نے ٹریفک کے لئے رکھی اور پھر آہستہ آہستہ سر گھما کے دیکھا۔ استاد پیڈرو اور مولوی خادم حسین کے درمیان مکالمہ جاری تھا مگر یہاں تک ان کے لبوں سے ادا ہونے والے کسی لفظ کی شنوائی نہ تھی۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ویٹر کو بلا کے رقم پوچھی۔ اس قسم کے کسی بھی ریستوران میں بل لانے کا تصور نہیں پایا جاتا۔

بل کی رقم میری توقع سے بہت کم تھی مگر میں نے ویٹر کو سامنے روکے رکھنے کے لئے کہا "اتنے پیسے بن گئے؟ حد کرتے ہو تم لوگ بھی۔ لوٹتے ہو۔"

ویٹر نے بے زاری سے کہا "ادھر کی ریٹ ہے کھانے سے پہلے پاکٹ۔ یعنی چاہئے معلوم کرنا چاہئے۔"

ویٹر عین میرے مقابل تھا اور اس کا ایک ہاتھ کمر پر تھا۔ بازو کی خالی تکون میں سے مجھے پیڈرو اور خادم حسین نظر آ رہے تھے۔ میں نے صرف بات لمبی کرنے کے لئے پوچھا کہ کھانے کے دام کیا ہیں۔ چائے کے کیا ہیں۔ کھانے میں سالن کی پلیٹ کتنے کی تھی اور خادم نے کتنی روٹیاں کھائی تھیں۔ اس گفتگو سے خاصے لوگ محظوظ ہو رہے تھے مگر میں کسی کنجوس کی طرح حساب کی پائی پائی جوڑ رہا تھا۔ جیب سے ایک کاغذ نکال کے میں نے ہر رقم لکھی اور پھر ٹوٹل کیا تو دو روپے کم نکلا۔ ویٹر اکثر ایسا کرتے ہیں کیونکہ زیادہ تر گاہک جمع تفریق کے بغیر نوٹ پکڑا دیتے ہیں اور اپنی راہ لیتے ہیں۔ دن بھر میں دو دو چار چار روپے اضافی لے کر ویٹر کافی کما لیتے ہیں مگر کسی گاہک کو دو چار روپے کی خاطر حساب کتاب کے چکر میں پڑنا اچھا نہیں لگتا یا انہیں اس کی فرصت اور عادت نہیں ہوتی۔ جھلایا ہوا ویٹر اب کچھ خفیف کھڑا تھا۔

میں نے کہا "برا مت ماننا دوست۔ اپنی عادت ہی کچھ ایسی ہے۔ یہ لو بل کے سولہ روپے۔ باقی چار تم رکھو۔"

چار روپے کی ٹپ ایسے ہی کی تھی جیسے چار سو کے بل پر سو روپے چھوڑ دیے جائیں۔ میری کنجوسی کا تاثر ختم ہو گیا اور ویٹر کے ساتھ دوسرے لوگوں نے بھی مجھے فیاض سمجھ کے معاف کر دیا۔ میرا مقصد پورا ہوتا تھا۔ ویٹر نے مجھے تحفظ فراہم کر دیا تھا ورنہ پیڈرو کی نظر ضرور مجھ پر پڑ جاتی۔ وہ مجھے پہچان نہیں سکتا تھا مگر اس معمولی ریسٹورنٹ میں سے جہاں سب ہی شلوار قمیص یا دھوتی والے تھے کوئی شخص سوٹ میں برآمد ہوتا تو پیڈرو فوراً سمجھ جاتا کہ یہی وہ غیر ملکی وکیل ہو سکتا ہے۔ ابھی مجھے یہ علم نہیں تھا کہ آخر وہ نازو کے ساتھ یہاں کیوں آیا تھا اور نازو اس کے ساتھ آنے پر کیسے آمادہ ہوئی تھی۔ نازو کی صورت اور اس کا موڈ بتاتے تھے کہ وہ اپنی مرضی سے نہیں آئی تھی۔

جب میں ریسٹورنٹ سے باہر آیا تو پیڈرو اور خادم کے مکالمے نے تلخ کلامی اور پھر شور ہنگامے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جان بچانے کے لئے یہ موثر حکمت عملی تھی کہ مجمع لگا لیا جائے اور خادم اس میں کامیاب رہا تھا۔ جب میں نے سڑک عبور کی تو میرے کانوں میں خادم کی آواز آئی۔

"ہوتی ان سے پوچھو کہ یہ کون ہوتے ہیں مجھ سے سوال جواب کرنے والے۔ بے شک گاڑی مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی ہے مگر اس وقت وہ ساتھ نہیں ہیں۔ میں ڈرائیور رہوں ان کا۔ گاڑی چرا کے نہیں لایا ہوں اور اگر چوری کا شبہ ہے تو چلو پولیس آفس۔ میں بھی تو وہیں جا رہا ہوں۔"

پیڈرو کچھ پریشان ہوا "تم غلط سمجھ رہے ہو یار۔ مجھے تو کام ہے تمہارے وکیل صاحب سے۔"

"اس وکیل صاحب سے۔ مظہر صاحب' وقار یوسف اور مس رابعہ سب آفس میں ملیں گے۔" خادم حسین کار میں بیٹھ گیا "اور پھر مجھے یار مت کہنا۔ میں ہر ایک سے یاری نہیں لگاتا پھرتا اور ویسے بھی یہ بڑا غیر شریفانہ لفظ ہے۔"

پیڈرو کے ساتھ کچھ لوگ اور بھی مسکرانے لگے "میری مراد اس وکیل سے تھی جو باہر سے آیا ہوا ہے۔ بڑا مشکل نام ہے اس کا۔"

"ان سے ملنا بھی بہت مشکل ہو گا۔ وہ ہر ایرے غیرے سے نہیں ملتے۔"

پیڈرو گرم ہو گیا "کیا سمجھتا ہے آخر وہ خود کو۔ ایک معمولی وکیل ہی ہے وہ۔ کسی ملک کا سربراہ نہیں ہے۔"

مولوی خادم حسین مسکرانے لگا "پہلی بات تو یہ کہ وہ معمولی وکیل نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ کہ وہ ہر ایرے غیرے کی زبان نہیں سمجھتے۔ صرف فرنچ بولتے ہیں۔ تمہیں فرنچ آتی ہے؟"

"تمہیں تو آتی ہے ایرے غیرے کے بچے۔"

میں نے اتنی دیر میں حلقہ بنائے کھڑے ہوئے آٹھ دس افراد کے پیچھے سے صورت حال کا جائزہ لیا تو نازو کی خاموشی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ نازو کی پچھلی سیٹ پر ایک مرد اور عورت بیٹھا ہر

www.paksociety.com

سارے معاملے سے بے نیاز اور چپ بیٹھے ہوئے تھے مگر ان کی خاموشی ہی ان کے جارحانہ عزائم کا راز فاش کر رہی تھی۔ ایک ہی کار میں سوار افراد ایک دوسرے سے اتنے اجنبی، نا آشنا اور لاتعلق نہیں ہو سکتے۔ ان سب کے درمیان کشیدگی اور بے زاری کے جذبات کا جو تجلی پن تھا جو ان کے چہروں پہ صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے وجود کو جبر کے ساتھ برداشت کر رہے تھے۔ نازو کی بے بسی بھی اس مجبوری کا اعتراف کرتی محسوس ہوتی تھی کہ خالی ہاتھوں سے اپنا دفاع اور دشمن کا خاتمہ خراب کرنے کی بے مثل صلاحیت، ذہانت اور ہمت رکھنے کے باوجود وہ کچھ نہیں کر پا رہی ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ مقابلے پر آتشیں ہتھیاروں سے لیس خطرناک دشمن ہیں جو خون بہانا جانتے ہیں۔ وہ نازو کے عین پیچھے موجود تھے، ان کے ہاتھوں میں ریوالور بھی ہوں گے اور ان کی انگلیاں ٹریگر پہ ہوں گی۔ مستعد اور مضطرب اور ایک اشارے کی منتظر......

میں اس صورت حال میں سوچے سمجھے بغیر مداخلت کی حماقت کرتا تو خمیازہ نازو کو بھگتنا پڑتا۔ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ عام تماشائی کی حیثیت سے کچھ بول سکوں۔ میں صرف فرنچ سمجھ اور بول سکتا تھا۔ میں نہ اردو سمجھ رہا تھا اور نہ انگریزی اور میرے ترجمان کے فرائض ادا کرنے والا خود اس معاملے میں فریق تھا مگر میرے کہنے سے انجان بن گیا تھا۔ استاد پیڈرو سے براہ راست الجھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ ابھی مجھے اپنی شناخت پر پڑے ہوئے پردے کی ضرورت تھی۔ میرا غیر ملکی وکیل کا کردار خاصا فائدہ مند ثابت ہو رہا تھا۔ جب تک بدقسمتی سے جنم لینے والے کسی حادثے کے باعث انکشاف راز نہیں ہوتا سکندر بخت کو روپوشی سے تحفظ حاصل رہنا چاہئے۔ سوسیو آندرے کی ذات ابھی تک شک شبے سے بالاتر ہے اور جیسے جیسے وقت گزرے گا اس کی صورت میں کسی اور کی مشابہت تلاش کرنے والی نظریں از خود مایوسی کا شکار ہو جائیں گی۔

تاہم نازو کی مدد کرنا بھی لازم تھا اور ایسے حالات پیدا کرنے کے لئے میں کسی موثر بہانے کی تلاش میں تھا جس سے افرا تفری مچلے یا ہنگامہ ہو تو نازو کے محافظوں کی توجہ پل بھر کے لئے دوسری طرف ہو جائے اور نازو کو اپنے نازک ہاتھوں کی ہلاکت آفرینی کا مظاہرہ کرنے کا موقع مل جائے لیکن خادم حسین کے روانہ ہونے تک مجھے کچھ بھی نہیں سوجھا۔ نازو آسانی سے قابو میں آ جانے والی چیز نہیں تھی چنانچہ میری فکرمندی جائز تھی۔ آخر استاد پیڈرو نے ایسا کیا داؤ آزمایا کہ جنگلی بلی سے زیادہ خونخوار نازو پالتو بلی کی طرح دبک گئی۔

لوگ منتشر ہو گئے اور پیڈرو اپنی گاڑی میں خادم حسین کے پیچھے روانہ ہو گیا تو میں نے بھی پولیس ہیڈ آفس کا رخ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک رابعہ اور منظر کے ساتھ دوسرے سینئر وکلا کے استغاثہ عدالتی احکامات کے ساتھ پولیس ہیڈ آفس پہنچ گئے ہوں

تھے۔ ڈاکٹر شبلی کے قتل کی ایف آئی آر درج کرانے کے لئے میں بارہ وکیل مدعی تھے پھر ان میں سے ایک نے ... مقابلہ جیتا منظور کیا تو اس کا نام مدعی وکیلوں میں شامل ... اس کا کیس بد عنوانی کے الزام میں بار کونسل کو بھیجا ... کی بنیادی رکنیت معطل کی جائے۔ جو وکیل ایک وقت میں قاتل نامزد کرے وہ دوسرے وقت میں اسی کی سب ... کرے تو پھر مل جائے تو اس کی بے کرداری میں کون شک ... عدالت سے ولاور کی گرفتاری کے لئے احکامات حاصل ... والے گیارہ وکیل تھے پولیس آفس میں ... سب کا ... لازمی نہیں تھا۔ ڈی آئی جی صاحب کو عدالت کا حکم ... بھی پہنچا سکتا تھا اور یہ فرض داری منظر کے ساتھ رابعہ رضاکارانہ طور پر قبول کی تھی۔

پولیس ہیڈ آفس زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے ... پہنچنے میں دس منٹ بھی نہیں لگے تھے۔ پیڈرو کی کار ... دروازے سے خاصے فاصلے پر دیکھا۔ خادم حسین کی ... رابعہ کی سرخ کار اس وقت اندر کے پارکنگ ایریا میں ... خادم حسین برآمدے میں بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔

"اللہ نے بچا لیا جی اس وقت تو۔ آپ نے بالکل ... خاموش تماشا دیکھتے رہے اور نازو بی بی۔"

میں نے کہا "یہ حالات کا تقاضا تھا۔"

"ٹھیک ہے جی۔ حالات کے تقاضے میں اپنی جان ... تو...؟" میں نے اسے تسلی دی "ہم تمہاری مغفرت کی دعا ... چہلم تک مانگتے۔ سو تم تک تو پہنچا کرتے۔ اب جو ہوا نہیں اس ذکر کی بحث کی کیا ضرورت ہے۔"

"وہاں آپ انجان بن گئے۔ کیا اب وہ لوگ جان نہیں ... کہ میں آپ کا مترجم ہوں۔ ایک نمبر کا دھوکے باز اور ... سمجھیں گے وہ مجھے۔"

"مجھے وہ خادم حسین نہ سمجھتا ہے۔ آخر اتنا ڈرنے کی ... تم مسلمان تو موت سے نہیں ڈرتے۔"

"موت سے کون کافر ڈرتا ہے جناب۔ مار ... ہڈیاں توڑ کے مجھے تمام زندگی کے لئے اپاہج بنا دیا ... کا کا کیا کر لو گے جی؟"

"یار ... بزدل ہو تم۔ خدا پر بھروسا رکھو۔ ہم بھی ... اور پھر تم بھی مرو گے۔"

"اچھا جی......" اس نے یوں کہا جیسے میں نے کوئی ... تھا "آپ تو اور تسلی میں دے دیا۔ سر فرنچ نہ سمجھیں ... ہوتی تو اس عذاب میں کیوں گرفتار ہوتا۔ اب تو ... وار فانی سے آپ کے ساتھ ہی کوچ ہوگا۔ ساتھ ... کے دشمن مجھے آپ سے پہلے چلتا کر دیں گے۔" اس نے ... میاں کی طرف دیکھ کے ایک فریادی آہ بھری "مجھے ... آپ ...

... نمبر کے جوتے ... تصویریں بنائیں اس ... چیف ... کر رہا مساوی ورنہ تجھے بھی نیچے بھیجتا ہوں۔ "سب انسپکٹر ... کر کے کہا "ایک بار تو بھی چھ نمبر کی چھترول کا مزہ ..." خادم حسین نے جھٹ ترکی بہ ترکی کہا "یہ تو تمہارے ڈی آئی جی کا باپ بھی نہیں کر سکتا میرے ساتھ۔" اور پھر ایک دم آگے ہو کے بچے گا۔

سب انسپکٹر اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا چنانچہ اس نے ایک زبردست گالی ارسال کی "تیرا... بھی... کی طرح اکڑ رہا ہے نا۔ جب تیرا ولایتی باپ نہیں ہوگا پھر دیکھیں گے تیری اکڑفوں...... مردہ چوہے کی طرح لٹکا ہوا نظر آئے گا۔"

میں نے خادم کو خبردار کیا "مولوی... سانپ بچھو اور پاگل کتے کے ساتھ مذاق میں بھی پنگا نہیں لینا چاہئے۔"

ڈی آئی جی کے وسیع اور شاندار طریقے پر آراستہ کمرے میں پاکستانی دربار کا سماں تھا۔ وہ خود بڑے کروفر سے گھومنے والی کرسی پہ یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے یہ تخت شاہی ہے۔ ان کے سامنے بہت رعب کرنے والی سیاہ مہاگنی کی لکڑی کی ٹاپ ٹیبل تھی جس کی وسعت ان کے عہدے اور کمرے کے شایان تھی۔ اس کے گرد ایک درجن کرسیاں نیم دائرے میں لگی ہوئی تھیں۔ ... بائیں طرف قطار میں چار فون رکھے ہوئے تھے۔ سرخ، سفید، سیاہ اور ... باقی سب سامان آرائش تھا جو وہ شاید ہی استعمال کرتے ہوں گے۔ ... کی مٹھ والی چھڑی عصائے اختیار کے طور پر ان کی دسترس میں تھی۔

بارہ کرسیوں میں سے دائیں جانب کی چار کرسیوں پر پولیس کی ... چار افسران با ادب با ملاحظہ ہوشیار بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کے چہرے میرے لئے اجنبی تھے۔ اتنا عرصہ پولیس سے واسطہ رکھنے کے بعد میں نیچے اور اوپر والے افسران کے عہدے محض صورت دیکھ کر بتا سکتا تھا۔ جتنا بڑا افسر ہوتا تھا اس کی صورت پر اقتدار کے غرور کا، بے اعتنائی کا اور اپنی برتری کے اظہار کا انداز اتنا ہی زیادہ نمایاں نظر آتا تھا۔ ان میں ایک ایس ایس پی تھا۔ ایک نوجوان اے ایس پی۔ یہ دونوں پولیس سروس کے براہ راست افسر بنائے جانے والے افسر تھے۔ باقی دو میں سے ایک انسپکٹر تھا اور دوسرا اس کا ماتحت سب انسپکٹر۔ غالباً وہ بھی ڈائریکٹ اے ایس آئی بھرتی ہوا تھا چنانچہ ان میں سفید بالوں والا عمر رسیدہ انسپکٹر سب سے الگ نظر آتا تھا۔

ڈی آئی جی صاحب کے عین مقابل چار وکلا میں سے ایک تو رابعہ تھی۔ دوسرا عبدالودود منظر۔ باقی دو بھی متانت اور چند سالی کے باعث بار کے سینئر ارکان لگتے تھے۔ ان کی سوالیہ نظریں ایک ساتھ مجھ پر مرتکز تھیں۔

ڈی آئی جی نے کہا "یہ کون ہے۔ میں نے کہا تھا کہ صحافی کوئی اندر نہ آنے پائے۔"

اور یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ سب لوگ آ چکے ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ" میں نے تیزی سے اوپر کا رخ کیا "جو بات سب سے پہلے بتانے والی تھی وہ آخر میں بتا رہے ہو۔ تم بھی آ جاتا ساتھ ورنہ میری فرنچ کون سمجھے گا۔"

کوتوال شہر عرف ڈی آئی جی صاحب اوپر سب سے الگ ایسی جگہ بیٹھے تھے جہاں واقعی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ وہاں برآمدے میں چند صحافی جمع اور رہے تھے اور محافظ خاص کو مرعوب کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔ محافظ ایک سب انسپکٹر تھا۔

"جو دل چاہے لکھو جی۔ ہمیں کیا ہم تو حکم کے بندے ہیں اور ڈی آئی جی صاحب نے کہا ہے کہ کسی صحافی کے باپ کو آگے مت آنے دو۔"

"میں ... نہیں بیٹا ہوں ایک صحافی کا۔" کسی دل جلے نے کہا۔ "بیٹے کے لئے تو منع نہیں کیا ہے۔" تالیاں نے اس کی حمایت کی "اسے جانے دو ورنہ ناراض ہوں گے ڈی آئی جی صاحب۔"

سب انسپکٹر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے مجھے بھی روک لیا "مسٹر آپ کیا چیز ہو؟"

میں نے فوراً فرنچ بگھاری "کیا یہ غلام ابن غلام نہیں جانتا کہ ہم سابق حکمران قوم کے نمائندے ہیں۔"

خادم نے ترجمہ یوں کیا "یہ لندن سے آئے ہوئے بڑے وکیل ہیں ان کو تو ڈی آئی جی صاحب روک ہی نہیں سکتے۔"

سب انسپکٹر تذبذب میں پڑ گیا "اچھا چلو لندنی ولایتی اندر ہیں تو ولایتی وکیل بھی جائے مگر تم کدھر چلے مولوی۔"

"میں ولایتی وکیل کی دیسی زبان ہوں۔" خادم نے کہا "میری مدد کے بغیر ان کی بات کون سمجھے گا؟"

خادم حسین کو کلیرنس مل گئی۔ آگے جانے سے پہلے میں نے ایک پریس کانفرنس کر ڈالی "خادم حسین ان کو بتاؤ کہ خصوصی تفتیشی ٹیم کے جو ارکان معطل کئے گئے تھے ان کو گرفتار کرنے کے بعد عام قیدیوں کی طرح نہیں بلکہ سرکاری مہمانوں کی طرح رکھا گیا ہے۔ وہ پولیس میں ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اسی عمارت کے ایک کمرے میں یوں فروکش ہیں جیسے یہ کوئی فور اسٹار ہوٹل ہے۔ یہ لوگ خود دیکھ سکتے ہیں اور ساری دنیا کو دکھا سکتے ہیں کہ انہیں آرام دہ بستر، ریڈیو، ٹی وی، اخبار، بہترین کھانا اور نوکر چاکر سب فراہم کئے گئے ہیں۔ کیا وہ مجرم نہیں ہیں جو مجرموں کو غیر قانونی مراعات دیتے ہیں۔"

خادم نے خاصی جذباتی تقریر کی جس میں میری بات کو زیادہ موثر طریقے پر پیش کیا گیا تھا اور انصاف کی دھجیاں اڑانے اور قانون کو تماشا بنانے پر پولیس کے خوب لتے لئے گئے تھے۔ اس نے سب انسپکٹر کے گھورنے کی پروا نہیں کی۔

"یہاں کھڑے رہنے سے کیا فائدہ۔ آپ لوگ جائیں اور دیکھیں کہ قانون میں جس مساوات کا ذکر ہے وہ کہاں ہے۔ نیچے حوالات میں بھی قیدی ہیں" اوپر والے قیدی پلاؤ قورمے کھا رہے

www.paksociety.com

مظہر نے اتنے سنجیدہ ماحول میں بھی اپنی عادت نہیں چھوڑی "کمال ہے ڈی آئی جی صاحب۔ آپ کو ولایتی مال کی پہچان نہیں۔ سنا ہے آپ کے گھر میں ہر چیز باہر کی ہے۔ ذاتی استعمال کی......"

مجھے بعد میں پتا چلا کہ ڈی آئی جی کی بیوی غیر ملکی تھی۔ اس نے گھور کے مظہر کو دیکھا "ڈونٹ ٹرائی ٹو بی پرسنل ان یور جوکس۔" (مذاق میں بھی کسی کی ذات کو نشانہ مت بناؤ)

"سوری سر..... میں آپ کی بیوی کے حوالے سے بات نہیں کر رہا تھا۔" مظہر نے انگریزی میں کہا۔

ڈی آئی جی معذرت کے اس انداز پر مزید بڑبڑایا۔ مظہر کہہ دیتا کہ "چور کی داڑھی میں تنکا" تب بھی مطلب یہی ہوتا۔

رابعہ نے فوراً مداخلت کی "سر یہ موسیو آندرے ہیں۔"

"آئی سی۔ وہ برٹش وکیل جو انگریزی نہیں جانتا۔" ڈی آئی جی نے طنز اور تمسخر آمیز لہجے میں کہا اور مجھ سے مصافحہ کیا "یہ کون ہے محترم؟"

خادم نے سر جھکا کے کہا "ماشاء اللہ بالکل ٹھیک سمجھے آپ" اب ڈی آئی جی نے چھڑی سے دوسروں کی نشاندہی کرتے ہوئے تعارف کی رسم نبھائی "یہ نئی تفتیشی ٹیم ہے۔ وزارت داخلہ نے محکمے کے بہترین دماغ ہمارے حوالے کر دیے ہیں۔"

مظہر نے کہا "پہلی ٹیم کا انتخاب کرتے ہوئے بھی یہی معیار مدنظر رکھا جاتا تو اچھا تھا۔"

ڈی آئی جی نے بُرا مان کے کہا "وہ بھی کم نہیں تھے مگر خدا بچائے ان اخبار والوں سے..... یہ سب بلیک میلر ہیں....."

ایک وکیل نے احتجاج کیا "آپ سب کا لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں۔"

"میرا مطلب تھا کہ کچھ بلیک میلرز نے ان کے بارے میں حقائق کو ایسے مسخ کیا کہ ان کا کیریئر خراب ہوا۔"

"حقائق کو کیسے مسخ کیا؟ کیا وہ تصاویر جعلی تھیں جن میں وہ لوگ ایک مفرور مجرم کے ساتھ ہیں۔"

"وہ بھی پولیس اسٹیشن کے اندر....."

"خیر چھوڑیں یہ بحث۔" ڈی آئی جی نے ناگواری سے کہا۔

اب میں نے دخل دیا "خادم اس سے پوچھو کہ کیا اسی لئے صحافیوں کو یہاں نہیں آنے دیا گیا ہے کہ حقائق چھپانے مقصود ہیں؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہم اخبار والوں کو سب بتاتے رہیں گے۔ ہم نے انہیں بتا دیا ہے کہ یہاں زیر حراست پولیس والوں کے ساتھ معزز مہمانوں جیسا سلوک ہو رہا ہے۔"

خادم حسین نے پھر ایک جذباتی تقریر کر ڈالی جس میں حقائق بہرحال وہی تھے مگر الفاظ اس کے اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے۔

"ڈی آئی جی آپ کو کیا ہو گیا؟ بکواس کرتا ہے تمہارا یہ وکیل۔"

میں نے جواب دیا "جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ ڈی آئی جی صاحب اگر سچ بولتے ہیں تو پھر صحافیوں سے کیوں ڈرتے ہیں۔ میں اس دوہرے معیار انصاف سے اچھی توقعات وابستہ نہیں کر سکتا اور یہ سمجھتا ہوں شیلی مرڈر کیس میں پولیس ایک فریق کا کردار ادا کر رہی ہے جسے ایف آئی آر میں نامزد قتل کا مجرم پولیس اسٹیشن میں تفتیش والوں کے ساتھ چائے پیتا ہے اور پھر روپوش ہو جاتا ہے، اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی کہ پولیس کا محکمہ قاتل کو بچانے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ تفتیش میں اسی لئے پیش رفت نہیں ہوئی۔"

ڈی آئی جی صاحب مجبور تھے ورنہ میری جگہ عام آدمی ہوتا تو ان کا جلال آتش فشانی اس کو ہی نہیں اس کے سارے خاندان کو بھسم کر دیتا۔ ان کے سامنے قانون کے رکھوالے بیٹھے ہوئے تھے جن کو وہ اپنا سمجھتے تھے ورنہ درحقیقت یہی لوگ قانون کی روح کو مسخ ہونے سے بچانے کا مقدس فریضہ نبھا رہے تھے۔ ڈی آئی جی ایک حد تک اپنے غصے کا اظہار کر سکتا تھا اور اس نے ہی کر دیا تھا۔ اس حد سے بڑھ کے کسی کو گالیاں دینا یا ہاتھ اٹھانے کی دھمکی دینا بھی اس کے لئے عزت و وقار کا مسئلہ بن جاتا۔

اس نے سیاسی مصلحت کوشی سے کام لیا اور اپنا غصہ پی گیا۔

اس نے مسکرا کے اپنے ماتحتوں کی طرف دیکھا اور پھر وکیلوں کی طرف "اب اس شخص کی رائے کو میں کیسے بدل سکتا ہوں۔"

مظہر نے پھر پٹا لیا "آپ کوشش تو کر سکتے ہیں۔ مثلاً صحافی حضرات کو بلا کے اس کے ایک خیال کو فوراً غلط ثابت کر دیں۔"

ڈی آئی جی نے اب رفاہی گیم کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کسی بڑے سیاستدان کی طرح اس نے ہر منفی الزام اور تنقید کا جواب تحمل اور بردباری کا پیکر بن کے دیا تھا کہ اس کے ماتحت سیکھ لیں اور ان کے سامنے یہ ظاہر ہو کہ اتنی بے عزتی ہونے کے باوجود ڈی آئی جی صاحب چیخنے چلانے کے بجائے [illegible] کر سکے۔ اس نے گھنٹی بجائی اور حاضر ہو کے سلیوٹ بجانے والے کانسٹیبل سے کہا کہ وہ تمام صحافیوں کو بلا لے۔ کانسٹیبل مشینی انداز میں حرکت کرتا تھا۔ وہ پھر سلیوٹ مار کے گھوڑے کے کھلونے کی طرح باہر نکل گیا۔

دوسرے وکیلوں نے ڈی آئی جی صاحب کے اقدام کو [illegible] لیکن نظروں ہی نظروں میں مجھے اور مظہر کو خراج تحسین پیش [illegible] چار مقامی صحافی بھی وکیلوں کے ساتھ فٹ ہو گئے۔ دو فوٹو [illegible] مخالف سمتوں سے اپنے کیمروں کے فلیش چمکانے لگے۔

اب ڈی آئی جی نے کھلے انداز میں اپنی پوزیشن کا [illegible] کیا "لیڈیز اینڈ جنٹلمین" اس نے بالوں پر ہاتھ پھیر کے [illegible] سے کہا "آپ سب تو ایک دوسرے سے واقف ہوں گے [illegible] وقت میں آپ کا تعارف ان افسران سے کراتا ہوں جن کو [illegible]

داخلہ نے فوری طور پر شیلی مرڈر کیس کی خصوصی تفتیش کے لئے نامزد کیا ہے۔ پرانی ٹیم کے معطل کئے جانے کے بعد۔"

"غالباً آپ ان کی گرفتاری کے احکامات جاری کر چکے ہیں۔" کسی رپورٹر نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"غالباً کیوں یقیناً۔" غالب بولا۔

"صرف احکامات جاری کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عمل درآمد کی نیت ہی نہ ہو تو۔" مظہر نے طنزیہ لہجے میں تبصرہ کیا۔

"پلیز۔ آپ لوگ مجھے بات ختم کرنے دیں۔" ڈی آئی جی بولا "میں آپ کو ہر طرح سے مطمئن کر سکتا ہوں۔"

"اجی آپ کیا نہیں کر سکتے۔" مظہر نے زیر لب کہا۔

ڈی آئی جی نے اس اشتعال انگیزی کو نظرانداز کر دیا "یہ نئی ٹیم کے نگران ہیں ایس ایس پی جاوید صدیقی۔ ان کی بہت گڈ ول ہے۔"

غالب نے سر جھکائے جھکائے کہا "خدا کرے ان کی واپسی بھی عزت کے ساتھ ہو۔"

"بس آپ لوگوں کے ہاتھوں محفوظ رہے۔" ڈی آئی جی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "ان کا ریکارڈ بہت اچھا ہے لیکن موجودہ حالات میں ان کا کام بھی زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ میں آپ لوگوں سے تعاون کی درخواست کروں گا۔"

ایک وکیل نے کہا "تعاون کا جذبہ دو طرفہ ہوتا ہے۔"

ایک رپورٹر نے کہا "رائٹ۔ ابھی جو سلوک ہمارے ساتھ روا رکھا گیا تھا اس کے بعد آپ یہ توقع رکھیں کہ ہم آپ کی خوش اخلاقی کے گن گائیں تو یہ ناممکن ہے۔"

غالب نے کہا "چلو یار دیر آید درست آید۔ ہم پچھلی بات نہیں کرتے۔ آئندہ کے لئے تعاون کا یقین دلا سکتے ہیں بشرطیکہ ہمیں حقائق سے باخبر رکھا جائے۔ جب آپ یہ اختیار کی چھڑی گھماتے ہیں تو ماتحت عملہ لاٹھی چارج کر دیتا ہے۔ گدھے گھوڑے ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیے جاتے ہیں۔"

اب ایس ایس پی جاوید نے کھنکار کر کہا "آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہو تو پہلے مجھے بتائیں۔ لیڈ لگانے سے پہلے۔"

"ہم زرد صحافت کے قائل نہیں۔ آپ بھی سچ کی کڑواہٹ کو قبول کرنا سیکھ لیں۔ ہر سُرخی کو سنسنی خیزی کا شاہکار مت کہیں۔"

ڈی آئی جی نے سراہا "آئی ہوپ کہ تعاون سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ غلط فہمی تو ہوتی رہتی ہے۔"

"غلط بیانی کے باعث۔" غالب نے کہا "غلط فہمی کوئی خود رو چیز نہیں ہے۔"

"یہ اے ایس پی آفتاب عالم ہیں۔ نئے نئے پولیس سروس میں آئے ہیں مگر یہ ہمارے محکمے کے ایک آئی جی صاحب کے ہونہار سپوت ہیں اور اپنے والد کے نقش قدم پر چلنے کا عزم لے کر آئے ہیں۔" ڈی آئی جی نے انگریزی میں کہا۔

"یہ عالم خورشید آفریدی کے بیٹے تو نہیں۔" ایک رپورٹر بولا۔

اے ایس پی نے خوش ہو کے اسے دیکھا "یو آر ویری وائز۔"

اس رپورٹر نے عجیب انداز میں آنکھیں گھما کے اوپر دیکھا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس یوں لی کہ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پیچھے کے اس نے اضافہ کر دیا تھا۔ اے ایس پی کا چہرہ بے عزتی کے احساس سے سرخ ہوا مگر وہ خون کا گھونٹ پینے پر مجبور تھا۔ اس کو اعلیٰ افسران کی موجودگی کا بھی خیال آیا ہوگا اور یہ بھی کہ کیریئر کا آغاز ان لوگوں سے بگاڑ کے نہیں کرنا چاہئے جن کی اوقات تو کچھ نہیں ہوتی مگر ان کے منہ لگنے سے بڑے بڑے بادشاہ ان سے بھی ڈرتے ہیں۔

دیگر دو ارکان میں انسپکٹر ساجد تھا اور ضیا اے ایس آئی انقلاب۔ یہ سب لوگ مختلف شہروں سے بڑی عجلت میں پہنچے تھے انہیں حکم ملا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں رپورٹ کریں۔ ابھی انہیں پوری طرح علم بھی نہیں تھا کہ اس کیس کی نوعیت کیا ہے جس کی خصوصی تفتیش کے لئے یہ ٹیم بنائی گئی تھی۔

"انہیں کچھ وقت دیں۔ یہ ریکارڈ دیکھ لیں اور تفتیش کے لئے لائحہ عمل بنائیں۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

رابعہ نے احتجاج کیا "کتنا وقت چاہئے۔ ہم تو فوری طور پر ایکشن چاہتے ہیں۔ عدالتی احکامات کے مطابق۔"

"عدالتی احکامات کے سامنے میں بے بس ہوں۔ میں پولیس فوری فراہم کر سکتا ہوں۔ مگر ذمے داری آپ کی ہے۔"

"ہمارے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں۔"

"کیا ذرائع ہیں آخر آپ کی اطلاعات کے۔ آپ لوگ وکیل ہیں جاسوس نہیں۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

"کیا ہم نے جعلی نوٹ چھاپنے والے گروہ کی نشاندہی نہیں کی تھی اور کیا ہماری فراہم کردہ معلومات غلط تھیں۔ پولیس کو اس وقت تک کچھ پتا نہیں تھا۔" غالب نے کہا۔

"یہ کہنا غلط ہے۔ پولیس چھاپا مارنے کی پلاننگ کر رہی تھی۔ آپ نے بلاوجہ دخل اندازی کی۔ اس سے کام خراب ہو سکتا تھا۔"

"پولیس کے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ انہیں کچھ معلوم تھا۔ پھر وہ پلاننگ کیسے کر رہے تھے؟ اور کب تک پلاننگ کرتے رہتے؟ جب تک کہ مجرم ملک کا بدل کے فرار نہ ہو جاتے!" غالب نے کہا "کیا پولیس کے مجرموں سے مذاکرات ہو رہے تھے۔"

"کچھ بھی ممکن ہے۔" دوسرے رپورٹر نے لقمہ دیا۔

"جنٹلمین آپ لوگ فضول باتوں میں الجھ رہے ہیں۔" ڈی آئی جی نے برہمی سے کہا۔

رابعہ نے کہا "اچھا آپ کریں کام کی بات۔ کہاں ہے وہ پولیس فورس جس کی آپ نے بات کی تھی۔"

"مجھے کسی شہادت چاہئے کہ پولیس کا وقت ضائع نہیں

www.paksociety.com

ہوگا۔ مطلوبہ مجرم وہاں موجود ہے۔ یہ ثابت کریں پہلے۔۔۔"

"یہ ثابت کیسے ہوگا۔ آپ خود بتائیں کے دیکھ سکتے ہیں ڈی آئی جی صاحب۔ ٹھوس شہادت کا کیا مطلب ہے آخر؟ کیا آپ لوگ اپنے مخبروں کی اطلاع پر چھاپے نہیں مارتے۔ شک اور شبہے کی بنیاد پر کوئی کارروائی نہیں کرتے۔"

منظر نے کہا "مخبر تو ان کے اپنے آدمی ہوتے ہیں۔ خود مجرم اور مشتبہ لوگ۔ ہماری بات پر یہ کیوں اعتبار کریں۔"

وقفے وقفے سے خادم مجھ سے بات کرتا تھا اور میں سرہلا کے ظاہر کرتا تھا کہ میں سب سمجھ رہا ہوں۔ حالانکہ ہمارے درمیان ساری گفتگو نازو کے بارے میں ہوئی تھی جسے پولیس آفس کے سامنے دلاور کے ایک ساتھی نے یرغمال بنا رکھا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے سخت تشویش لاحق تھی۔ ابھی تک میں نے غالب یا رابعہ کو کچھ نہیں بتایا تھا اور ان کے رویے سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تازہ ترین صورت حال سے بے خبر ہیں۔

"او کے۔ جاوید صدیقی۔ تم اپنی ٹیم کے ساتھ جاؤ۔ ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس میں نامزد ملزم گرفتار ہو جاتا ہے تو یہ تمہارے کریڈٹ پر جائے گا کہ تم نے چارج لیتے ہی اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔ حالانکہ مجھے اس کی امید بہت کم ہے۔ ہم عدالت کے حکم کو نظر انداز کر سکتے تھے مگر یہ مدعی خود بہت بڑے وکیل ہیں اور خود کو بہت بڑا سرافرماں بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ صحافی بھی موجود ہیں یہاں۔ ہمیں بُرائی مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

رابعہ نے کہا "رازداری بہت اہم ہے اس کیس میں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا مس رابعہ۔ میں ان سب کو سلیمانی ٹوپی پہنا کر روانہ کروں کہ یہ کسی کو بھی نظر نہ آئیں۔ چھاپا رازداری سے کیسے مارا جا سکتا ہے۔" ڈی آئی جی نے کہا "جو کچھ ہوگا سب کے سامنے اور سرعام ہوگا۔"

میں نے غالب کی طرف جھک کے اس کے کان میں کہا "نازو باہر پیڈرو کی گاڑی میں بیٹھی ہوئی ہے۔"

غالب نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے اردو نہیں فرنچ بولی ہو۔ میں نے سرہلا کے اسے یقین دلانا چاہا کہ اس کے کانوں کو دھوکا نہیں ہوا اور میں نے وہی کہا تھا جو اس نے سمجھا ہے۔

ڈی آئی جی نے ازراہ تمسخر دوسروں سے اردو میں کہا "ابھی اس ولایتی رئیس کو معلوم ہونا چاہئے کہ محفل میں کانا پھوسی بدتہذیبی کہلاتی ہے۔ ہم دیسی لوگ تو انہی سے اپنی ایٹی کیٹ سیکھتے ہیں۔"

مجھ سے ایک خطرناک غلطی ہو گئی تھی مگر غالب نے ڈی آئی جی کے پکڑنے سے پہلے ہی بات بنا لی "سوری۔ میں سمجھا نہیں۔ مترجم صاحب آپ پوچھیں یہ کیا کہہ رہے ہیں۔"

میں نے خادم سے کہا "تم وہی بات دہراؤ جو باہر صحافیوں کے سامنے کہی تھی۔"

خادم شروع ہو گیا "موسیو آندرے جذباتی ہو کے بھول گئے تھے کہ یہاں ان کی زبان کوئی نہیں سمجھتا۔ اب تو انہیں سمجھ کر بات سمجھنے والے بھی ان کی بات کو ایک کان سے سن کے دوسرے سے اڑا دیتے ہیں۔ انہوں نے زیر حراست پولیس افسران کے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک کی بات کی تھی۔ آپ نے کچھ دیکھا؟"

یہ آخری سوال صحافی حضرات سے کیا گیا تھا۔ انکشاف انہی کو اس تذلیل کا بدلہ لینے کا موقع مل گیا جو ڈی آئی جی نے انہیں اپنے دربار خاص سے دور رکھ کے کی تھی۔ وہ سب ایک ساتھ بولنے لگے۔ وہ لوگ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ آئے تھے طوفان کو تشویش کر رہے ہیں۔

ڈی آئی جی نے بڑی مشکل سے انہیں خاموش کیا "مسٹر... غلط فہمی ہوئی ہے آپ لوگوں کو۔"

"غلط فہمی؟" ایک چیف رپورٹر بھڑک اٹھا "یہی تو ... آپ لوگوں کا۔ جھوٹ خود بولتے ہیں۔ غلط فہمی ہماری ... آخر یہ غلط فہمی یکطرفہ کیوں ہوئی ہے؟ آپ لوگوں کو کبھی غلط فہمی ہوئی؟"

دوسرے نے کہا "یہ لوگ تو صرف خوش فہمی کا شکار رہتے ہیں۔"

تیسرا بولا "اس بات کا مطلب تو یہ ہوا کہ جو ہم کہہ رہے ہیں وہ غلط ہے۔ جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے ہیں وہ بھی غلط ہے۔ کچھ خدا کا خوف کیجئے۔ جہاں آپ بیٹھے ہوئے ہیں اس عمارت کے ایک کمرے میں یہ کھلی دھاندلی ہو رہی ہے۔ آپ اتنا ... اور بے خبر تو نہیں ہو سکتے۔"

غالب نے اٹھتے ہوئے کہا "میں معذرت چاہتا ہوں لیکن موسیو آندرے نے شام کی چائے پر مدعو کیا ہے۔ انہیں کچھ خاص بات کرنی ہے اسی سلسلے میں۔"

خادم نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا "جی ہاں، بہت خاص بات ہے۔"

ڈی آئی جی نے اسے غور سے دیکھا "کس بارے میں؟"

خادم کچھ گھبرایا "ظاہر ہے سر سات سمندر پار سے صاحب جس کام کے لئے تشریف لائے ہیں اسی بارے میں ہوگی۔"

"ہوگی کیا؟ تمہیں نہیں معلوم؟" ڈی آئی جی نے تحکم سے کہا۔

"مجھے... مجھے کیسے معلوم ہو سکتی ہے سر۔ ابھی تو بات ہوئی نہیں۔ ہوگی ضرور میری معرفت مگر۔ میں پہلے ہی ضمانت دیتا ہوں کہ معلوم ہونے کے بعد بھی میں کچھ بتاؤں گا نہیں۔ میں رازداری کا پابند ہوں۔ اخلاقاً... شرعاً اور قانوناً... کیا میں نے غلط کہا؟"

آخری سوال اس نے پھر رپورٹرز اور صحافیوں سے کیا۔ ان سب نے تقریباً ایک زبان ہو کے اس کی تائید کی۔ مولانا حسین نے بالواسطہ طور پر قانون اور صحافت کے پیشوں سے تعلق رکھنے والوں کی حمایت حاصل کر لی تھی۔ ڈی آئی جی صاحب

ہیڈ آفس میں ہوں گے۔ وہ یہاں آئے ہوں گے تو کسی نے ہم پولیس ... بتایا ہوگا کہ لال رنگ کی گاڑی یہاں کھڑی ہوئی تھی مگر اب پھر اس سمت میں چلی گئی۔ میں اور خادم چائے پینے گئے تھے۔ کار سڑک پر کھڑی ہوئی تھی۔ پیڈرو نے بالکل اس کے پیچھے اپنی گاڑی لگائی تو مجھے اسے دیکھ لیا۔ نے بھی اور نازو نے بھی۔"

"پھر تم چھپ گئے؟" غالب نے خفگی سے کہا۔

"نہیں یار۔ میں نے خادم سے کہا کہ گاڑی لے جائے۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ اس سے ضرور پوچھیں گے ہمارے بارے میں اور خادم نے میری ہدایات کے مطابق کہہ دیا کہ وہ تو اکیلا آیا تھا چائے پینے۔"

"بالکل ٹھیک۔ خادم نے بتا دی۔" غالب کچھ کچھ پریشان ہو گیا۔ "پھر اب کیا کریں۔ کہاں لے گئے ہوں گے وہ نازو کو؟"

"گھبرانے کی بات نہیں۔ پیڈرو زیادہ بے تاب ہے ہم سے رابطے کے لئے۔"

"نازو تو منظر کے گھر میں تھی۔"

"پیڈرو نے پتا لگا لیا ہوگا یا دھوکے سے؟"

"تصدیق بات قائم کرنے سے بہتر تھا کہ تم منظر کے گھر فون کر کے پوچھ لیتے۔" غالب نے کہا "نازو کو دھوکا کون دے سکتا ہے۔ تمہارا مطلب ہے انہوں نے منظر کے گھر میں گھس کے نازو کو گن پوائنٹ پر اٹھا لیا ہوگا۔" میں نے کہا "اگر ایسا ہوتا تو خوردار منظر کو پتا چل جاتا۔"

"بے پتا چل جاتا۔ فرشتے بتاتے اسے؟ فون کرنے کی اجازت دیتے اسے اغوا کرنے والے۔" غالب مجھ پر برس پڑا۔

"ایسی سنگین واردات کا ارتکاب کرنے والے پہلے فون چھوڑتے کہاں ہیں۔ لائن پہلے کاٹتے ہیں مگر پیڈرو سے اتنی بڑی حماقت کی امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ منظر کے گھر میں گھس جائے۔"

"یہ حماقت ہے تمہارے نزدیک۔ اس نے تو بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔" غالب خلا میں گھورنے لگا "حساب برابر کر دیا۔ اب سودا کرو اس سے دلاور کے بدلے نازو کا۔"

میں نے کہا "شاید ایسا ہی کرنا پڑے۔ تم فون کر کے دیکھو منظر کے گھر یا وقار یوسف کی بیوی کو۔ اگر کچھ پتا نہیں چلتا تو ہم یہ آپشن ہولڈ رکھتے ہیں۔ ویسے مجھے سو فیصد یقین ہے کہ ان سے تمہارا آئندہ رابطہ ہوگا شاید ابھی۔"

"تم رابعہ کو سمجھاؤ کہ دلاور کی گرفتاری کا معاملہ فی الحال ملتوی کر دیں کوئی بھی بہانہ کر دے۔ پولیس کو پہلے ہی بہانے کی تلاش ہے۔"

میں اوپر واپس گیا اور غالب نیچے کسی کے آفس میں گھس گیا۔ فون تو یقیناً ہر کمرے میں تھا اور غالب کو ایک کال کرنے سے کون روک سکتا تھا۔ خادم کو غالب کی بدحواسی پر سخت تشویش تھی۔

"یہ تو نیا معاملہ بہت الجھ گیا۔ اغوا کرنے والے کیا ان سے واقف نہیں تھے۔ میں تو حیران ہوں مس نازو اغوا کیسے ہو گئیں۔"

کچھ بعید نہ تھا کہ بعد میں کسی وقت بھی اسے طلب کر لیں اور جتنی باتیں اسے معلوم ہیں وہ سب یوں سن لیں جیسے لوگ ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ لگا کے وہ سب سن لیتے ہیں جو اس میں محفوظ ہو۔ آدمی کو کیسٹ کی طرح بجانے کے لئے پولیس کے پاس خصوصی آلات ہوتے ہیں۔

میں اور غالب باہر آئے تو میں نے واضح طور پر رابعہ اور منظر کو پریشان دیکھا۔ اور اب خاصی گرما گرمی پیدا ہو چکی تھی۔ ڈی آئی جی کو خبر نہ تھی کہ صحافی اتنی دیر میں کیا گل کھلا چکے ہیں۔ انہیں باہر روک کر اسے منگا چکا تھا۔ وہ شاید مہمانوں کی خاطر داری کے سارے ثبوت جمع کرلائے تھے اور اب ڈی آئی جی صاحب کی تردید خود انہی کے لئے باعث خفت ہو رہی تھی۔ دوسری طرف رابعہ اور منظر کو جلدی تھی کہ دلاور کی گرفتاری کے لئے عدالتی احکامات پر عمل درآمد میں تاخیر نہ کی جائے۔

غالب نے باہر آتے ہی مجھ سے کہا "یہ کیا فرما رہے تھے آپ"

"ٹھیک فرما رہے تھے ہم۔" میں نے کہا "نیچے چلو اور خود ہی دیکھ لو اپنی آنکھوں سے۔ ایک ہلکے نیلے رنگ کی ٹاکس ویگن تمہیں گیٹ کے سامنے نظر آ جائے گی۔ تھوڑا سا دائیں جانب۔ پیڈرو کو تم پہچانتے ہو؟"

"یار یہ کیا مذاق ہے۔ نازو کیوں ہے ان کے ساتھ؟"

"تم نروس ہو رہے ہو؟ یہ سوال میں نازو سے نہیں کر سکا۔ کرتا بھی کیسے۔ وہ فرنچ نہیں جانتی۔" میں نے سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔

"بھاڑ میں گئی تمہاری فرنچ۔ اور لعنت تمہاری وکالت پر۔ تم کو زیادہ فکر تھی اپنی۔" غالب اب مشتعل تھا۔

"چلاؤ مت مرزا جی۔ مجھے نازو کی فکر کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ یہ سب اچانک پیش آیا تھا میرے سامنے اور وہاں کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔" میں نے کہا "دیکھو ہم گیٹ سے باہر نہیں جائیں گے۔ پہلے یہاں رک کے میری بات سن لو۔"

"بولو جلدی۔" غالب نے گیٹ سے باہر جھانک کے کہا "گاڑی تو مجھے کوئی بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا اور گیٹ سے باہر آ گیا۔ "کہاں ہے وہ نیلی ٹاکس ویگن؟"

"یار خدا کی قسم۔ وہ یہاں موجود تھی۔ جب میں اوپر گیا تھا۔ تم خادم سے پوچھ لو۔"

خادم نے سر ہلایا "اجی وہ تو سائے کی طرح لگ گیا تھا میرے پیچھے خبیث کہیں کا۔"

"تم نے اوپر آتے ہی کیوں نہیں بتایا تھا؟"

"میرا خیال تھا کہ وہ انتظار کریں گے۔ وہ کسی سے بات کرنا چاہتے تھے اور اسی لئے نازو کو ساتھ لائے تھے۔ ورنہ وہاں کیوں پہنچتے جہاں رابعہ کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ نازو نے انہیں بتایا ہوگا کہ

www.paksociety.com

بڑے گھانے کا سودا کیا ہے جی ان کو لے جانے والوں نے۔ وہ پٹخا دیں گی سب کو ڈیوں کے دام میں.....“

میں نے کہا ”مولوی خاموش ہو جاؤ۔ تم ابھی کچھ نہیں جانتے نہ ہمیں نہ ہمارے دشمنوں کو۔“

”آپ کے کہاں جی۔ اب تو برابر کی دشمنی ہے مجھ سے ان کی۔ مارا گیا ڈنڈو (سینڈک) ہاتھیوں کی لڑائی میں۔“

میرے واپس پہنچنے تک صورت حال میں کوئی ڈرامائی تبدیلی آچکی تھی۔ میں نے رابعہ کا اُڑا ہوا رنگ دیکھا اور منظر کی صورت پر بارہ بجے ہوئے نظر آئے تو میرے خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ انہیں نازو کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔

رابعہ نے اپنے لہجے پر قابو پانے کی کوشش کی ”آئی ایم سوری سر لیکن فی الحال یہ نہیں ہو سکتا۔“

”لیکن کیوں؟ ابھی تو آپ بچوں کی طرح ضد کر رہی تھیں کہ ابھی چلو۔“ ڈی آئی جی نے کہا اور دوسروں کی طرف دیکھ کے مسکرایا۔

منظر بولا ”اب یہ بچوں کی طرح آپ کو کچھ سمجھا رہی ہیں تو آپ نہیں سمجھ رہے ہیں۔ آپ بچے بن گئے ہیں۔“

دوسرے وکیل اور صحافی سب تجسس میں مبتلا ہو گئے تھے

”آخر یہ کس نے فون کیا تھا آپ کو؟“

”یہ میں نہیں بتا سکتی۔“ رابعہ نے اُٹھتے ہوئے کہا ”اسے میرا مصدقہ ذریعہ سمجھ لیں۔ اس نے سابقہ اطلاع کے بارے میں کچھ شک کا اظہار کیا ہے۔ ایسی صورت میں چھاپا مارنے میں وقت ضائع ہوگا سب کا۔“

”ہمارے وقت کی فکر مت کریں۔ ضائع کرتے ہی رہتے ہیں اور پھر بھی یہ بچ جاتا ہے؟“ ایس ایس پی جاوید بولا ”عام تاثر ہے کہ ہم مکھیاں مارتے رہتے ہیں۔ مفت کی روٹیاں توڑتے ہیں۔ کرتے کچھ نہیں۔“ یہ بات انسپکٹر نے کی تھی ”بس ٹائم ضائع کرتے ہیں۔“

اب منظر اُٹھا ”خیر جھوٹ یہ بھی نہیں ہے۔ مگر اس وقت ہم اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارا وقت بہرحال قیمتی ہے۔“

ڈی آئی جی بولا ”آپ کی مرضی۔ ہم تو بالکل تیار تھے۔ جاوید صدیقی کیا خیال ہے؟“

”چھاپا مارنا چاہئے سر۔ شک پر بھی۔“

منظر سمجھ گیا کہ در جواب آں غزل پولیس وہی کہہ رہی ہے جو پہلے رابعہ کہہ رہی تھی ”مجھے بات کرنے کی اجازت دیں مس رابعہ سے۔ پھر میں بتاتا ہوں۔“

اس نے چند قدم دور جا کے ایک منٹ بات کی اور پھر لوٹ آیا ”پوزیشن کلیر ہو گئی ہے سر۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ملزم اب وہاں نہیں ہے جہاں پہلے تھا۔ اسے کسی نے خبردار کر دیا ہے کہ چھاپا پڑنے والا ہے۔ اسے فرار کرا دیا گیا ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم بھی نہیں جانتے کہ چھاپا کہاں مارنا ہے۔“ ڈی آئی جی نے کہا۔

”چالاک مجرم ہوا کا رُخ دیکھتا ہے۔ یہاں سے اس کے کسی مخبر نے پوری رپورٹ دی ہوگی کہ کیا کارروائی ہو رہی ہے۔“ ”یہ کیوں نہیں مانتے کہ تمہارے پاس کچھ نہیں تھا۔ تم سنی سنائی پر ایکٹو ہو رہے تھے۔ بلکہ اوور ایکٹو ہو گئے تھے۔“

”حقیقت سامنے آجائے گی آپ کے۔“ رابعہ نے کہا ”نہ صرف کل۔ اس ملزم کو ہم ہی گرفتار کرائیں گے۔“

”ویری گڈ۔ کہاں سے؟“ ڈی آئی جی نے طنزیہ پوچھا۔

”آپ کے گھر میں سے۔“ منظر بولا ”مصدقہ ذریعے سے اطلاع ملی ہے کہ وہ آپ کے گھر میں شفٹ ہو گیا ہے۔“

”واٹ نان سنس۔“ ڈی آئی جی نے برہمی سے کہا۔

”ظاہر ہے سنی سنائی پر ہم بھی یقین نہیں کرتے۔“ منظر بولا ”مگر دنیا میں ناممکن کچھ نہیں ہے۔ ہم بھی تصدیق کر لیں گے۔ آپ بھی۔ اس کے بعد دیکھیں گے۔“

”یہ مجھے بدنام کرنے کی سازش ہے۔ اگر اس بارے میں ایک لفظ بھی شائع ہوا تو میں.....“ ڈی آئی جی لال پیلا ہونے لگا۔

”آپ قانون کے مطابق کارروائی ضرور کریں۔“ ایک صحافی نے اس کا چیلنج قبول کر لیا ”اندر کرا دیں جھوٹ چھاپنے والے ایڈیٹر اور پبلشر کو۔ پریس بند کرا دیں اس کا۔ اختیار آپ کو بھی ہے اور کمشنر صاحب کے پاس بھی۔ پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس کا ہتھیار ہے آپ کے پاس۔“

”توقع کریں جی قانونی کارروائی کی۔ آپ حاکم ہیں جو بھی اسی وقت ڈک دیں۔ کون پوچھنے والا ہے۔“ ایک وکیل نے ڈی آئی جی کو چیلنج کر دیا۔

جو صحافی ایک سنسنی خیز سرخی کے چکر میں آئے تھے خاصے مایوس تھے اور غالب کو پوچھ رہے تھے کہ سب سے پہلے کہاں غائب ہو گیا۔ وکیل برادری کو رابعہ سے زیادہ دلچسپی تھی اور وہ جاننا چاہتے تھے کہ اچانک وارداور کی گرفتاری کا التوا کیوں ڈال دیا گیا ہے؟ کیا اسے فون پر کسی نے دھمکی دی تھی یا چھاپا فرار ہو گیا ہے۔ رابعہ نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی انہیں یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔

ان کے جاتے ہی منظر نے پوچھا ”بھوتنی کے کیا ڈرامہ چلایا ہے۔ تو نے فون کیا تھا تجھے جا کے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا ”چکر کچھ اور ہے۔ رابعہ جانتی ہے“ رابعہ سخت خوف زدہ تھی ”گاڑی میں بیٹھ کے بات کریں گے۔“

میں نے کہا ”نہیں۔ گاڑی کا کیا بھروسا۔ اتنی دیر میں کہیں مائیک وغیرہ چھپا دیا ہو۔“

رابعہ اپنی گاڑی سے کچھ فاصلے پر رک گئی ”یہ کس کا فون تھا۔ کہہ رہا تھا کہ نازو ہمارے پاس ہے۔ یقین نہیں تو ذرا گھر والے سے پوچھ لو۔ مولوی خادم حسین سے۔“

”ارے بھائی تمہیں کیا ہوا ہے۔ تم کیوں رو رہے ہو۔ بھوتوں چڑیلوں کے نیلی کے پیچھے کیا ہے یہ کون سی انوکھی بات ہے۔ اگر نہ جاتا تو عجیب بات ہوتی۔ چلو ہم بھی چلیں۔ رابعہ تم جاؤ گاڑی لاؤ باہر۔“ رابعہ نے کہا ”منظر بھائی۔ نازو اور غالب کسی مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے۔“

”تمہارا دل کو۔ تمہارا دل تو پہلے ہی پاگل ہے۔ یار انہیں کیا ہو سکتا ہے۔ کیا بگاڑ سکتا ہے کوئی ایک بھوت کا اور بھوتنی کا۔ وہ تو جائیں گے سب کا خانہ خراب کر کے۔ تم تو اچھی طرح جانتی ہو ان دونوں کو۔“

میں نے برہمی سے کہا ”مگر یہ بہت غلط حرکت کی اس نے۔ وہ کیا سمجھتا ہے ایک اسی کو نازو کی فکر ہے۔ ہم کچھ نہیں۔ واسطہ پڑے گا اصلی پیڈرو سے تو یاد آئے گی ہماری۔ اب بتاؤ ہم کیا کریں۔ کدھر جائیں۔“

”یار ہم چلتے ہیں اپنے آفس۔“ منظر نے اپنی گاڑی کا دروازہ میرے لئے کھول دیا ”اور انتظار کرتے ہیں ان کا۔ یا کسی خبر کا۔“

”صرف انتظار؟“ میں نے تلخی سے کہا۔

”اے بھوتنی کے اور کیا کریں۔ پریشانی میں سڑکوں پر دھوئیں ایک دوسرے کے گلے لگ کے؟ چیخیں چلائیں۔ بال نوچیں یا کپڑے پھاڑیں۔ کیا ہوگا اس سے اور یہی سب کرنا ہے تو ٹھیک ہے اپنے آفس میں بیٹھ کے کریں گے۔ یہاں پولیس آفس کے گیٹ پر کب تک کھڑے رہیں گے۔“

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا جو اپنی گاڑی میں میری منتظر تھی ”مولوی خادم حسین۔ تم کہاں جاؤ گے؟“

اس نے صورت حال سمجھ کے کہا ”کون سی جگہ رہ گئی ہے اب میرے لئے اپنے گھر سے بیوی بچوں کو بھگایا اور خود بھی بے گھر ہو گیا۔“

میں نے کہا ”تم ہمارے ساتھ چلو۔“

”کیا اور فرنچ بولنی ہے آپ کو؟ نہ جانے کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے فرانسیسی سیکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ عربی شریف پڑھی ہوتی تو اس عذاب کے بجائے کچھ زیادہ ثواب ہی ملتا۔“

میں نے کہا ”اگر تمہیں یہاں لاوارث چھوڑ دیا تو تم بھی غائب کر دیے جاؤ گے۔ پولیس والے تمہاری میزبانی کے لئے خاصے مشتاق ہیں۔ تم بیٹھ جاؤ منظر صاحب کی گاڑی میں۔“

منظر نے ٹھنڈی سانس لی ”اپنے نصیب میں ایسی ہی چیزیں رہ گئی ہیں بیچارے مولوی خادم حسین کاش کہ تم ایک لڑکی ہوتے۔ حسینہ نہ سہی جوان تو ہو۔“

”لاحول ولا قوۃ پھر کیا ہوتا جی۔“ خادم بُرا مان کے بولا۔

”کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا۔ لڑکا یا لڑکی۔“ منظر بولا ”اچھا اب یہ دروازہ بند کرو ورنہ گاڑی چلی تو لڑھک جاؤ گے باہر۔“ تاریلی کی طرح میں رابعہ کے ساتھ بیٹھنے ہی والا تھا کہ نہ جانے اندھیرے میں

”وہ پیڈرو تھا؟“ میں نے کہا۔

”نہیں پیڈرو کی آواز پہچانتی ہوں میں۔“

میں نے کہا ”میں اس کی صورت پہچانتا ہوں۔ نازو کو اس کے ساتھ دیکھ چکا ہوں۔ وہ آواز بدل کے بات کر رہا ہوگا یا بات کرنے والا اس کے دو ساتھیوں میں سے کوئی ہوگا۔ وہ گاڑی میں پیچھے اسلحہ لئے بیٹھے تھے نازو آگے تھی۔“

رابعہ نے کہا ”تو کیا.....؟“

”ہاں نازو کو اغوا کیا گیا ہے۔ اور کیا کہا تھا اس نے؟ یہی کہا ہوگا کہ وارداور کو چھوڑ دو۔ ورنہ.....“

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا ”کہاں لے گئے ہیں وہ نازو کو۔“

”مجھے معلوم ہوتا تو میں یہاں نہ آتا۔ وہ میرے ساتھ آئے تھے لیکن اب نہ جانے کدھر غائب ہو گئے ہیں۔ غالب کو انہی کی تلاش تھی۔ وہ کسی سے بات کرنا چاہتے تھے۔ مجھے تو پہچانتے نہیں تھے۔ میں بھی ظاہر نہیں کر سکتا کہ میں کسی کو جانتا ہوں۔“

”پھر غالب کہاں گیا؟“ منظر نے پوچھا۔

”غالب فون کر رہا تھا۔ تمہارے گھر۔“ میں نے کہا ”میں دیکھ رہا ہوں لیکن غالب پولیس ہیڈ آفس میں کہیں بھی نہیں تھا۔“

ڈرائیونگ لائسنس برانچ سے متصل کمرے میں فارغ بیٹھے ہوئے ایک سارجنٹ نے تصدیق کی کہ غالب نے کچھ دیر پہلے وہاں سے فون کیا تھا۔

منظر نے کہا ”تم اس وقت بھی یہاں موجود تھے؟“

سارجنٹ نے اقرار میں سر ہلایا ”خیر تو ہے وکیل صاحب۔“

”تم نے اس کی گفتگو سنی تھی؟“

”اپنے کان تو میں بند نہیں رکھ سکتا تھا۔ ویسے کوئی خاص بات نہیں کی تھی اس نے۔ بس پوچھا تھا کہ سب خیریت ہے نا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ جواب اسے کیا ملا تھا۔ ہاں یا نہیں۔ لیکن صحافی صاحب کی صورت دیکھ کے میں نے تو یہی اندازہ کیا کہ خیریت ہی ہوگی۔ یہ اندازہ کیسے ہوا تمہیں؟“

”جی صورت دیکھ کے ہم تو بندے کا سارا حال احوال پتا کر لیتے ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔ شریف آدمی ہے یا چور۔ جب وہ آئے تھے مرزا غالب صاحب تو شکل پر بارہ بج رہے تھے۔ بات کرنے کے بعد گیارہ ہو گئے۔ پھر دس۔ اس نے اطمینان کا سانس لے کر مجھے ٹھیک ہے کہا اور سر ہلا کے چلا گیا۔ بری خبر سنتا تو فون اتنے آرام سے نہ رکھتا اور بھاگتا ایسے کہ ٹھیک ہے کہنا بھول جاتا۔“ میں نے اور رابعہ نے دروازے کے باہر سے ساری گفتگو سنی تھی مگر اس سے اُلجھن بڑھ گئی تھی۔ پریشانی کی بات نہیں تھی تو اسے ہمیں بھی بتانا چاہئے تھا۔ کسی سے کچھ کہے بغیر غائب ہو جانا سب کی پریشانی میں اضافہ کرنے کے مترادف تھا۔ پُرسکون اور بے فکر نظر آنے والا منظر بھی متفکر تھا مگر خوف اور اندیشوں کے طوفان میں بھی مسکراتے رہنا اس کی عادت تھی اور مشکل وقت کی آزمائش میں خود ہنسنا اور دوسروں کو ہنسانا اس کے مزاج میں شامل

www.paksociety.com

سے کسیے ایک ہیولا نمودار ہو گیا "ٹھہر جا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کے جلالی لہجے میں کہا۔

ایک لنگوٹ کے سوا اس کے جسم پر کچھ نہیں تھا۔ اس کی عمر پچاس ساٹھ سال ضرور ہوگی مگر وہ لمبا تڑنگا اور صحت مند تھا۔ اس کے گرد غبار دھاری بال بے ہنگم طریقے پر پھیلے ہوئے تھے اور جھاڑ جھنکار کھچڑی داڑھی نے اس کے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے گلے میں لال نیلے پیلے منکوں کی مالا تھی۔

رابعہ نے خوف زدہ ہو کے کہا "یہ تو کوئی پاگل ہے۔ تم بیٹھو۔"

میں نے کہا "ایک منٹ ٹھہرو۔ یہ ہم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

"بھیک مانگے گا۔ جھک مارے گا۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ یہ سوچنے کا منتظر تھا۔ اکیلے میں ہم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

فقیر میری طرف آنے کے بجائے رابعہ کی طرف بڑھا اور کھڑکی پر جھک گیا "تو رابعہ ہے؟"

رابعہ نے بے اختیار اپنا چہرہ پیچھے کر لیا "ہاں۔۔۔ کیا بات ہے؟"

"تو سکندر کو جانتی ہے؟" فقیر نے اسے خوف زدہ دیکھ کے لہجے میں ڈرامائی گھن گرج پیدا کی "جانتی ہے نا؟"

رابعہ نے امداد طلب اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر ہلا کے اسے ہاں کہنے کو کہا اور فقیر کے بالکل پیچھے مستعد اور چوکس کھڑا رہا کہ وہ حد سے بڑھے تو اسے پیچھے کھینچ لوں۔ فقیر کے بدن سے کوڑے کے ڈھیر سے اٹھنے والی بو محسوس ہوتی تھی۔

رابعہ نے رومال ناک پر رکھ کے اقرار میں سر ہلا دیا۔

فقیر کا ایک ہاتھ آگے بڑھا "لا سو روپے دے۔"

"کس بات کے؟" رابعہ اور دور ہو گئی "ہاتھ ہٹاؤ پیچھے۔"

"سکندر کے نام پہ سو روپے نکال دے ہم فقیروں کے لئے۔"

فقیر کا ہاتھ گاڑی کے اندر پہنچ گیا۔

اب میں نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور اسے پیچھے کھینچ لیا۔ فقیر نے گردن چھڑا کے مجھے غصے سے گھورا۔ میرے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ میں اس بد تمیز فقیر کے سامنے بھی گونگا بنا رہوں اور یہ ظاہر کروں کہ میں اس کی بات نہیں سمجھتا مگر ایک خاتون کے ساتھ اس کا جارحانہ رویہ مجھے سخت ناپسند ہے یا اس کی زبان میں پوچھوں کہ یہ کیا ڈراما ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے رابعہ اور سکندر کے نام کسی اور نے بتائے تھے۔ وہ خود رابعہ کو کیسے جان سکتا تھا مگر اس نے چہرے اور حلیے سے گاڑی کے رنگ سے یا نمبر سے رابعہ کو پہچانا تھا اور اسے یہ معلومات فراہم کرنے والا پیڈرو کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ اسی جگہ گاڑی میں موجود تھا اور غالباً عین پولیس آفس کے سامنے موجود رہنے کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے اس نے ایک فقیر کو پیغام رسانی کا ذریعہ بنانا بہتر سمجھا تھا۔ یہ فقیر بھی آس پاس کہیں اسی فٹ پاتھ پر براجمان ہوگا یا خیرات مانگنے پہنچ گیا ہوگا۔ پیڈرو نے اسے سو پچاس دے کر نام بتا دیا اور سمجھا دیا کہ اسے کس سے کیا کہنا ہوگا۔

فقیر ذرا سے باز بھی تھا اور اس نے تاڑ لیا تھا کہ پیغام دینے والا سو پچاس اس وجہ سے دے گیا ہے تو سو پچاس اس سے بھی وصول کئے جا سکتے ہیں جس کے لئے پیغام [illegible] اندازہ [illegible] اتنی خوب صورت لڑکی اور کسی سکندر کے معاملے میں [illegible] قلابی چکر کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

رابعہ نے ہمت سے کام لیا "دیکھو سو روپے کی کوئی بات ہوئی تو سو روپے ضرور ملیں گے ورنہ جو جوتے پڑیں گے ملنگ بابا اچھی طرح سمجھ لو۔"

"ہم کیا جانیں سو روپے کی بات ہے کہ لاکھ روپے کی۔ چھوڑو ہم جاتے ہیں۔" فقیر نے کہا۔

"اب ویسے نہیں جا سکتے تم" رابعہ کا حوصلہ بحال ہو گیا "یہ لو سو کا نوٹ۔ پہلے بتاؤ کہ تمہیں میرا نام کس نے بتایا تھا اور سکندر کا۔"

"تھا ایک جی۔" فقیر نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"ملنگ بابا' یہ جو تمہارے پیچھے کھڑے ہیں' یہ پولیس کے بڑے افسر ہیں۔ یہ خود بھی تمہاری ہڈیاں اچھلی کر سکتے ہیں اور انہوں نے اندر پہنچوا دیا تمہیں تو رات بڑی مشکل سے گزرے گی تمہاری۔"

فقیر کی حالت غیر ہو گئی "ارے بیگم صاحب۔ وہ تھا ایک بھجنگ بدمعاش قسم کا آدمی۔"

رابعہ نے پیڈرو کا حلیہ بیان کیا "ایسی ہی گاڑی تھی جو ادھر کھڑی ہوئی تھی؟"

اس نے اقرار میں گردن ہلائی "ہاں ایسی شکل کی ضرور تھی پر اللہ قسم اس کے مقابلے میں کھٹارا تھی بالکل کھٹارا۔"

رابعہ نے سو کا نوٹ اسے دے دیا "اب جلدی سے بولو اس نے کیا کہا تھا؟"

فقیر نے میری طرف دیکھا "اس نے اس نے کہا تھا کہ رابعہ کو ایک بات بتا دینا۔ لیکن کسی کے سامنے نہیں بتانا۔"

رابعہ نے کہا "ان کی فکر مت کرو۔ یہ صرف فرنچ جانتے ہیں۔ میرا مطلب ہے اردو پنجابی نہیں سمجھتے۔ ولایت سے آئے ہیں۔ بیچارے ہی آدمی ہیں۔"

"اچھا جی۔ بیگم صاحب فقیر کی سفارش کر دو۔ ہم بھی ایک بار ولایت پہنچ جائیں۔ میرا چاچا لندن میں ہے۔ خوب کما رہا ہے۔ گورے خیرات میں پاؤنڈ دیتے ہیں۔"

"فضول بک بک مت کرو۔ ورنہ یہ سو روپے واپس لے لوں گی اور دماغ درست کرا دوں گی۔" رابعہ نے بگڑ کے کہا "کیا کہا تھا اس نے؟"

"اس نے کہا تھا کہ سکندر کے ساتھ اسپتال پہنچ جاؤ۔ قسم اللہ کی بس اتنا ہی کہا تھا۔" فقیر پیچھے ہٹنے لگا۔

میں نے اسے روک لیا اور آگے دھکیل دیا۔ وہ دوڑ کے چلانے لگا۔

"اچھی طرح سوچ لو اور کچھ تو نہیں کہا تھا۔" رابعہ بولی "ایسا نہ ہو تمہیں بعد میں یاد آئے۔"

"قسم اللہ کی یہی کہا تھا۔ اب فقیر کو جانے دو۔"

"جاؤ مگر یہ مت بھولنا کہ تمہاری بات جھوٹ نکلی یا ہمیں معلوم ہوا کہ تم نے نشے میں سنا کچھ تھا کہا کچھ۔۔۔"

"توبہ کی بیگم صاحب توبہ۔ ہم نشے کو ہاتھ لگائیں تو ہمارے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ ایک ایک لفظ بتا دیا ہے جو سنا تھا۔"

میں جانتا تھا کہ رابعہ اس سے نادر کے بارے میں اور دوسرے لوگوں کے رویے سے عیاں شکوک و شبہات کی بات کرے اور اس واحد چشم دید گواہ سے کارآمد تفصیلات حاصل کرے۔ میں خود کو گونگا بہرا بنا ہوا تھا اور یہ ظاہر کرنے پر مجبور تھا کہ میں ایک لفظ بھی سننے یا بولنے کے قابل نہیں ہوں ورنہ میں سو روپے کے بدلے سو سوال کرتا۔

رابعہ نے شاید میرے جذبات کو میرے چہرے پر پڑھ لیا "ملنگ بابا۔ ایک تو وہ کالا کلوٹا بدمعاش تھا۔ اس کے ساتھ گاڑی میں اور کون تھا؟"

فقیر نے مکاری سے کہا "اور تو کوئی بھی نہیں تھا بیگم صاحب۔"

رابعہ نے اسے ڈانٹا "جھوٹ بولتے ہو تم۔"

"وہ۔۔۔ ہاں جی۔ ایک لڑکی تھی۔" فقیر میرے تیور دیکھ کے پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ "وہ کار سے اتری نہیں تھی۔ میں نے غور سے نہیں دیکھا تھا اسے مگر تھی آپ جیسی۔۔۔ میرا مطلب ہے بہت خوب صورت۔۔۔ ہوگی بائیس چوبیس سال کی۔ اجلی چٹی' رنگ گورا' سرخ اور سیاہ دھاری والی قمیص تھی۔ کانوں میں سفید ٹاپس' انگوٹھی تھی دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں۔"

"بدمعاش' بکتے ہو غور سے نہیں دیکھا تھا۔"

فقیر کھسیانا ہو کے سر کھجانے لگا "بس جی اب میں جاؤں؟"

"قصور۔ جب تم نے اتنے قریب سے لڑکی کو دیکھا تھا کہ سیدھے ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں انگوٹھی بھی نظر آ رہی تھی تو تم نے پچھلی سیٹ پر بھی نظر تو ضرور ڈالی ہوگی۔"

فقیر پھنس گیا "آپ تو جرح کرتی ہو جی۔"

"آخر سو روپے لئے ہیں تم نے۔ پوری بات بتانی پڑے گی۔ کون تھا پچھلی سیٹ پر۔ خبردار جھوٹ مت بولنا۔"

"دو بندے تھے۔ ان کی شکل میں نے نہیں دیکھی۔ میرا مطلب ہے اتنے غور سے نہیں دیکھی۔"

"کسی اور سے تمہاری کوئی بات نہیں ہوئی تھی؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا "باقی سب چپ بیٹھے تھے۔"

"اب ایک آخری سوال۔ جس نے تم سے بات کی تھی وہ گاڑی چلا رہا تھا یا کوئی ڈرائیور کی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اتر کے تمہارے پاس آیا تھا یا تم خود اس کے پاس گئے تھے۔ اس نے بلایا تھا یا تم خیرات مانگنے گئے تھے؟"

"یہ ایک سوال ہے جی؟ اس میں تو دس سوال ہیں۔" فقیر نے فریادی لہجے میں کہا "ہم تو سوال کرنے گئے تھے۔ اس نے کہا کہ ایک کام کرو تو سو روپے ملیں گے۔ میں نے کہا کہ معاف کرو بابا۔ ہم کام کرنے والے ہوتے تو بھیک کیوں مانگتے۔ وہ بولا کہ بہت آسان کام ہے۔ ابھی اندر سے ایک لال گاڑی آئے گی۔ بالکل ایسی ہی مگر چمکتی دمکتی۔ اس میں ایک لڑکی بیٹھی ہوگی۔ رابعہ نام ہے اس کا۔ اسے ایک پیغام دینا ہوگا۔ ممکن ہے وہ بھی خوش ہو کے تمہیں سو روپے بخش دے۔ جب میں [illegible] بیگم صاحب تو اپنے سو روپے لے لئے۔ سب بتا دیا میں نے اب جاؤں؟"

رابعہ نے کہا "ایک آخری سوال۔"

وہ چلانے لگا "یہ تو پہلے بھی کہا تھا آپ نے۔ آخری سوال کتنے ہیں آخر۔"

"اس گاڑی کا نمبر دیکھا ہوگا تم نے۔"

"نہیں جی۔ قسم لے لو۔"

"قسم مت کھاؤ خبیث آدمی۔ میں جانتی ہوں کہ تم پولیس ہیڈ آفس کے سامنے کیوں بیٹھے ہو۔ تمہیں بٹھایا گیا ہے یہاں۔ تم پولیس کے مخبر ہو بلکہ مجھے تو شک ہے کہ تم فقیر نہیں ہو پولیس کے آدمی ہو۔ بھیس بدل کے یہاں بیٹھے رہتے ہو اور آنے جانے والوں پر نظر رکھتے ہو۔ تمہاری زبان بہت صاف ہے۔ تم پڑھے لکھے ہو۔"

فقیر بد حواسی میں پلٹا تو مجھے راہ میں حائل پایا "یا میرے مولا۔"

رابعہ نے کہا "گاڑی کا نمبر بتاؤ اور جاؤ۔"

خلاف توقع فقیر نے ہتھیار ڈال دیے اور گاڑی کا نمبر بتا دیا۔ میں رابعہ کی ذہانت اور معاملہ فہمی کا قائل ہو گیا۔

"اپنی زبان بند رکھنا' سمجھے؟" رابعہ نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "اگر میرے بارے میں یا ان سوالات کے بارے میں جو میں نے تم سے پوچھے تھے کسی کو بتایا تو میں اخبار والوں کو تمہارے پیچھے لگا دوں گی۔ وہ تمہاری تصویر چھاپ دیں گے کہ یہ شخص فقیر نہیں ہے پولیس کا آدمی ہے۔ دھندا چوپٹ ہو جائے گا تمہارا۔"

سو کا نوٹ ابھی تک فقیر کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا "توبہ میری بیگم صاحب۔ غریب کے پیٹ پر لات مار کے آپ کو کیا ملے گا۔"

"غریب!!" رابعہ نے طنز سے کہا "ہوتا تو میں مار دیتی تمہیں اوباش کہیں کے۔ تمہارے یہ بال اور داڑھی سب جعلی ہیں۔ اچھے خاصے جوان اور ہٹے کٹے آدمی ہو تم۔ چلو دفع ہو جاؤ۔"

احساس ذلت و خفت سے وہ سخت برافروختہ نظر آتا تھا مگر کسی وجہ سے رابعہ کو پلٹ کے جواب نہ دے سکا اور زیر لب کچھ کہتا ہوا اسی اندھیرے میں گم ہو گیا جس میں سے وہ سامنے

www.paksociety.com

کی طرح لگا تھا۔
"یہ سب بلاوجہ کیا تم نے۔ ایسے لوگوں کے منہ نہیں لگنا چاہئے۔" میں نے رابعہ کے ساتھ بیٹھ کے کہا۔
رابعہ نے گاڑی آگے بڑھا دی "ایسے لوگوں کو ان کی اوقات تو دکھانی چاہئے۔ چالاک بنتے ہیں۔ میں رگ رگ سے واقف ہوں ان کی۔"
"غصہ تو مجھے بھی آرہا تھا لیکن کیا فائدہ۔ جو معلوم کرنا تھا معلوم ہو گیا۔" میں نے گھڑی دیکھی "بہت پیچھے رہ گئے ہم۔"
رابعہ نے رفتار بڑھا دی "منظر کو اب ہماری فکر لاحق ہوگی کہ غالب کیا سو گیا۔ ہم کہاں چلے گئے۔"
میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہم کہاں جا سکتے ہیں اپنی مرضی سے۔ یا تو کوئی لے جاتا ہے یا تقدیر کہیں پہنچا دیتی ہے۔ خود جاتے ہیں تو بس اپنی شامت اعمال کے پیچھے۔ بیچارہ سکندر بخت تو کہیں بھی نہیں ہے۔ دن میں ملتا ہے ایک فرنچ وکیل جس کی زبان ہے مولوی خادم حسین۔ رات کو نظر آتا ہے ایک چوکیدار۔"
رابعہ مسکرائی "تم فلسفی ہو رہے ہو مگر یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔"
"وقت، رفت، وقت۔" میں نے جھلا کے کہا "کہاں گیا میرا وقت آخر۔ وہ وقت جو میں تم سے ایسی باتوں کے لئے نکال لیتا تھا۔ خود تمہارے پاس وقت نہیں ہے اب سکندر کے لئے ایک نگاہ التفات کا۔ ہم سب اجنبی ہو گئے ہیں۔ کوئی صحافی ہے کوئی وکیل ہے۔ تم اور منظر اور وقار یوسف سب وکیل ہو۔ غالب اور غالبا رپورٹر ہیں۔"
رابعہ ہنسی "اور تم؟"
"میں... میں سب کچھ ہوں اور کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں رلا رر کا دشمن ہوں۔ ایم آر ایس کا چیف ہوں۔ مفرور مجرم ہوں۔ چوکیدار ہوں اور فرنچ وکیل ہوں۔ بس وہ سکندر نہیں ہوں جو رابعہ کے عشق کو زندگی کی معراج مانتا تھا اور اپنے بخت پر ناز کرتا تھا۔"
"سکندر بخت تم رہے ہو۔ اگر رابعہ کی نظر سے دیکھو۔ کیوں دیکھتے ہو خود کو کسی اور کی نظر سے۔" رابعہ نے بائیں ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام لیا "تم نے مجھے حوصلہ دیئے تھے کہ اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں۔ اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔"
"تم نے ہمیں شرمندہ کیا اور لاجواب کیا مرزا۔" میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا "ایک فلمی شعر سنو۔ ذرا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے۔"
"چراغ نہیں یہ کارپوریشن کی اسٹریٹ لائٹس ہیں۔ ہاتھ چھوڑو میرا۔"
میں نے فلمی ہیرو کی طرح کہا "ایک بار یہ ہاتھ تھاما ہے تو۔"
"اُف۔ ابھی مجھے گیئر بدلنا ہے۔"
میں نے اس کا ہاتھ جھٹکے سے لگایا "زندگی کی گاڑی کو عشق کے ہائی وے پر ٹاپ گیئر میں چلتے رہو۔"
"کیا کرتے ہو۔ گاڑی بند ہو جائے گی۔ مشکل ہے اُٹے۔" اس نے جھنجلا کے کہا۔
"میرے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی اگر تم نے میرے پیارا مشغل توڑا۔" میں نے کہا۔
رابعہ نے بریک لگائے تو گاڑی بند ہو گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ رابعہ نے اپنا ہاتھ دبا کے دیکھا۔ مسکرائی اور گاڑی پھر اسٹارٹ کرلی "پاگل۔"
"دیوانہ، مجنوں، عاشق کہہ دو۔" میں نے سر جھکا کے کہا۔
منظر اپنے آفس میں مشتعل بیٹھا تھا "کہاں رہ گئے تھے تم دونوں۔ اُدھر مجھ سے نکیریا کے بات کرو۔ تمہاری تنظیمیں تباہ ہوئی دن کہ تمہیں شیطان نے بہکا دیا تھا۔ نوابی گروی ہو رہی تھی۔"
میں نے معصومیت سے کہا "بابا جی۔ جو کہنا ہے شیطان کو کہیں۔ ہمارا کیا قصور ہے۔ ویسے بھی آپ کی تو اب عمر نہیں رہی بہکنے کی۔"
رابعہ نے فوراً بات بدل دی "منظر بھائی، پیڈرو نے اسپتال بلایا ہے۔"
منظر نے اسے غور سے دیکھا "اسپتال بلایا ہے؟ پیڈرو نے؟"
"آپ بڑا ہی سمجھ رہے ہیں..... ہمیں اسی لئے دیر ہوئی۔"
"چلئے تو ہم ایک ساتھ تھے۔ پھر یہ پیڈرو کا پیغام تمہیں کس نے دیا اور کب دیا؟"
میں نے کہا "رابعہ سچ کہہ رہی ہے۔"
"بھوتنی کا کوا بھوت... اب پیڈرو کو کیا ہوا کہ وہ اسپتال پہنچ گیا۔ دل کا دورہ پڑا تھا یا آ گیا تھا تمہاری گاڑی کے نیچے۔ اب اسپتال میں لیٹا ہوا ہے عالم نزع میں اور مجھے یاد کر رہا ہے۔ ذخیری وصیت میں اقبال جرم کرنا چاہتا ہے یا مجھے مار کے مرنا چاہتا ہے۔"
میں نے جھنجھلا کے کہا "کسی اُلو کے پٹھے کی ٹٹے گا یا اپنی تن کے جائے گا۔"
"اچھا بول۔ تیری بھی سن لوں پہلے مولوی۔ یار تم فرنچ کا ترجمہ کرنے کے علاوہ بھی کچھ کر سکتے ہو یا نہیں۔ چائے بناتے ہو۔ بیٹھے کیوں ہو، چلو تو اب کا اور تھوڑا سا۔ تم بتا رہے تھے ناکہ یہ بھی سارا کام تم سے کرائی ہے۔"
خادم حسین نے بُرا سا منہ بنایا مگر بولا نہیں اور خاموشی سے چائے بنانے لگا۔ میں نے منظر کو فقیرے سے حاصل ہونے والی معلومات سے آگاہ کیا۔ رابعہ نے اتنی دیر میں غالب کی تلاش میں ادھر اُدھر فون گھمائے مگر وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ نہ منظر کے گھر میں نہ وقار یوسف کے گھر اور نہ اپنے اخبار کے آفس میں۔
منظر نے کہا "یہ نمبر کس گاڑی کا ہے جو فقیرے نے بتایا تھا۔"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ پیڈرو کیا چاہتا ہے؟"

منظر ہو ہو کر کے ہنسنے لگا "میں چلا جاتا ہوں یار۔ مگر کباب میں زن مولوی خادم حسین بھی ہے۔ یار تمہیں یہی پیار سے کیا ملتی ہے۔"
خادم حسین نے چائے کی ٹرے درمیان میں رکھ دی "منظر صاحب یہ بڑی زیادتی کی بات ہے۔"
"ہو بھی ہم نے تمہارے ساتھ زیادتی کہاں کی ہے بھئی۔" منظر نے بے تکلفی سے اس کے شانے پر ہاتھ مارا "ہم خود جورو کے غلام بنا بار اور یہ سالے سب ہم سے بڑھ کر زن مرید ہوں گے۔ تمہارا تو خیر نام ہی ایسا ہے۔ ان کو بھی خادم کہہ کر ہی بلانا پڑے گا۔ یہاں شروع کرو۔"
خادم حسین مسکرانے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ ہمیں سمجھنے لگا تھا۔
رابعہ نے کہا "مگر نو بجے تک غالب کا فون نہ آیا۔"
بس... فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ منظر نے رابعہ کو اشارہ کیا "اس وقت میری کال تو نہیں ہو سکتی۔ میں تو گھر جا رہا ہوں اٹھو بچے۔"
رابعہ نے کہا "میں بھی اُٹھ جاتی ہوں تمہارے ساتھ۔"
گھنٹی پانچویں بار بجی تو ریسیور میں نے اٹھا لیا "ہیلو!" میں نے لہجہ اور آواز بدل کے کہا۔
جواب میں پیڈرو نے کہا "کون بول رہا ہے؟"
میں نے ایک جاہل چوکیدار کی عاجزی کے ساتھ سراسیمگی لہجے میں جواب دیا "اس دفتر کا چوکیدار۔"
"اور کوئی نہیں ہے یہاں۔" پیڈرو نے تحکمانہ بلکہ جارحانہ لہجے میں پوچھا "رابعہ یا سکندر؟"
میں نے فدویانہ انداز سے کہا "یہاں ایک تو بڑے وکیل صاحب ہوتے ہیں منظر صاحب۔ رقار صاحب ہوتے ہیں۔ سکندر صاحب تو کوئی نہیں۔ باقی سب چلے گئے۔ رابعہ بی بی جا رہی ہیں ابھی۔"
"اُلو کے بچے۔ فضول بولنے کی عادت ہے تجھے۔ رابعہ سے تو میری بات کرا دے۔"
میں نے کہا "چوکیدار کی بھی عزت ہوتی ہے۔ مگر جو خود بے عزت ہوتے ہیں وہ کسی کی عزت نہیں کرتے۔"
"بکواس مت کر۔" اس نے مجھے ایک اور گالی دی۔
"گالی کا جواب دیتا میں اگر تم میرے سامنے ہوتے۔ ٹیلی فون پر کسی کو گالی دینا کوئی مردانگی نہیں ہے۔"
"ایک معمولی چوکیدار مجھ سے زبان چلاتا ہے۔ سامنے ہو تو کیا حال کرتا تیرا....." وہ چیخنے لگا۔
میں نے کہا "تمہاری نوکری کرنے سے پہلے ہی بتا دیا تھا میں نے کہ سب کچھ کر سکتا ہوں میں مگر گالی اور بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔ سات سال جیل کاٹی ہے میں نے۔ گالی دینے والے افسر کو دفتر میں ہی جان سے مار دیا تھا۔ اگلی بار پھانسی بھی چڑھ سکتا

"اس نے رابعہ اور سکندر کو بلایا ہے۔ ظاہر ہے وہ بات کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس نے وقت کوئی نہیں دیا اور اسپتال کا نام تک نہیں بتایا۔" منظر بولا۔
میں نے کہا "یار تمہاری ساری عقل سولہ جنتوں میں بٹ گئی۔ تمہارے پاس کچھ نہیں رہا۔ پیڈرو کی مراد ہوگی وزیر خان ٹرسٹ اسپتال سے جہاں ہم جب چاہیں چلے جائیں۔ وہ منتظر ہوں گے۔ نادرہ بھی وہیں ہوگی اور ممکن ہے اس کے پیچھے مرزا غالب بھی اندر چلے گئے ہوں۔ یہ سوچے بغیر کہ اندر جانا تو آسان ہے۔ واپس باہر آنا مشکل ہوگا۔"
منظر اُچھل پڑا "بے ایمان ہے بھوتنی کے۔ اس وقت رابعہ نہ ہوتی تو میں تمہارا منہ چوم لیتا۔"
میں نے رابعہ کی طرف دیکھا "تھینک یو۔ اس وقت تمہاری وجہ سے میرا منہ ناپاک ہونے سے بچ گیا۔ اس منہ کو چومنے کے جملہ حقوق محفوظ ہیں منظر صاحب۔"
"یہ تو بڑا مسئلہ ہو گیا۔" منظر نے سوچتے ہوئے کہا۔
"مسئلہ کیسے ہو گیا۔ تیری بیوی کا منہ ہے۔"
"اب میں کچھ اور کہہ رہا تھا۔ اکیلی رابعہ کیسے جائے گی وزیر خان ٹرسٹ اسپتال۔ سکندر تو ہے نہیں۔ جوان جہان اکیلی لڑکی۔ بھولی بھالی۔"
میں نے کہا "سب غلط۔ اول تو وہ لڑکی نہیں... رابعہ ہے ایک سینئر اِنویسٹی گیٹر۔ اتنا عرصہ ہمارے ساتھ رہ کے بھولی بھالی بھی نہیں رہی۔ اور اسپتال میں وہ اکیلی کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ سکندر نہ سہی تم جا سکتے ہو۔ غالب جا سکتا ہے۔"
"غالب؟ غالب تو پہلے ہی اندر ہو گیا ہے سالا۔"
"یہ بھی یہ ایک مفروضہ ہے۔"
"لاج بہرحال ہے میرا ساتھ جانا بے کار ہے۔ میں اپنی حفاظت خود نہیں کر سکتا تو رابعہ کی خاک حفاظت کروں گا۔"
رابعہ نے اچانک کہا "سکندر جا سکتا ہے میرے ساتھ۔"
میں نے اور منظر نے اسے یوں دیکھا جیسے رابعہ کا دماغ چل گیا ہو "ارے بھولی بی بی اگر تم اس فرنچ وکیل کے ساتھ جاؤ گی تو تمہیں کوئی نہیں ملے گا سوائے ڈاکٹروں اور نرسوں کے اور ان سے تم نے پوچھا استاد پیڈرو کے متعلق تو وہ رجسٹر دیکھ کر کہیں گے کہ اس نام کا تو کوئی بھی مریض داخل نہیں ہے۔ خود میں یا وقار ساتھ ہوں تب بھی بات نہیں بنے گی۔"
"سکندر اس عمارت کا محافظ بھی ہے۔ وہ میری حفاظت کے لئے میرے ساتھ جا سکتا ہے۔ اگر ایک عورت باڈی گارڈ کے طور پر کسی کو ساتھ رکھے تو جائز ہے۔ پیڈرو کو شک نہیں ہوگا۔"
میں نے منظر کی طرف دیکھا "بھوتنی کے اس وقت تو نہ ہوتا تو..."
رابعہ نے جھینپ کے کہا "بکواس۔"

www.paksociety.com

ہوں۔ تم جو بھی ہو سامنے آ کے آزما لو مجھے۔"
حسب توقع وہ سنبھل گیا "چل بات کرا اپنی رابعہ بی بی سے۔"
"پہلے نام بتاؤ اپنا۔ آج تک یہاں کسی جاہل اور بدتمیز آدمی نے فون پر ایسے بات نہیں کی۔ رابعہ بی بی کی مرضی ہوگی تو میں بلاؤں گا۔"
"ان سے کہو پیڈرو بات کرنا چاہتا ہے۔ استاد پیڈرو۔"
"استاد جی ذرا زبان سنبھال کے بات کرنا ان سے۔ تیرے جیسے مال بھٹوں سے کی جاتی ہے۔"
"اچھا میرے باپ۔ تو چوکیدار ہے یا خدائی فوجدار ہے یہاں۔"
"چوکیدار ہر بات کا ذمے دار ہوتا ہے۔ کوئی غلط آدمی یہاں نہ آئے نہ کوئی کسی سے غلط بات کرے۔ بھونکنے اور کاٹنے والے کتے کو گولی مار دوں۔ یہ بھی میرے فرائض میں شامل ہے۔ لو بات کرو۔"
رابعہ میری بات پر مسکرا رہی تھی اور منظر اشاروں میں مجھے شہ دے رہا تھا کہ میں پیڈرو کو اس سے زیادہ سناؤں مگر میں رابعہ کی موجودگی میں اس کے شجرہ نسب میں آباؤ اجداد کی جگہ ناپاک جانوروں کو شامل نہیں کر سکتا تھا۔ آزادانہ مقابلہ ہوتا تو اسے اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر مجھے خوشی ہوتی۔
رابعہ نے کہا "تمہارا پیغام مل گیا تھا مجھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے نازو کو قید کر رکھا ہے۔"
دوسرے چند ثانیے فون کے اسپیکر میں پیڈرو کی آواز آئی "اور کیا معلوم ہے جی آپ کو وکیل صاحب۔"
"تم وزیر خان ٹرسٹ اسپتال میں ہو نا۔"
"واہ جی۔ مان گئے آپ کو۔" پیڈرو ہنسا۔
"کیا غالب بھی پہنچ گیا ہے وہاں؟"
پیڈرو کے تامل سے ہم نے اندازہ کیا کہ یہ سوال غیر متوقع تھا اور جواب دینے سے پہلے اسے سوچنا پڑا "بلایا تو ہم نے آپ کو تھا اور اپنے سکندر اعظم صاحب کو۔ خیر جی وہ آ گئے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے تو ہم نے کہا آ جی بسم اللہ۔"
"پیڈرو انہیں کچھ ہوا تو...."
"وکیل صاحب! فون پر دھمکی مت دو۔ آپ کا چوکیدار تو گالی بھی نہیں سنتا۔ ہم بھی غلط بات نہیں سنیں گے۔ شرافت سے بات کرنی ہے تو آ جاؤ۔ بس دو باتوں کا خیال رکھنا۔ ایک تو چوہدری صاحب کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ اسپتال میں پولیس نہیں آنی چاہیے ورنہ بات نہیں ہوگی۔ کوئی نہیں ملے گا تمہیں۔"
"تمہارے چوہدری صاحب بالکل خیریت سے اور آرام سے ہیں۔ پولیس نہیں آئے گی مگر میں بھی اکیلی نہیں آ سکتی۔"
"اکیلی کیوں۔ اپنے سکندر اعظم کو ساتھ لاؤ۔"
"کہاں سے لاؤں سکندر کو۔ کیا تمہیں معلوم [illegible] روپوش ہے۔"
"بے وقوف مت بناؤ مجھے۔ تمہیں ضرور معلوم [illegible]"
"تم نہیں مانتے تو تمہاری مرضی۔"
"صاف کہو کہ وہ بزدل آنا نہیں چاہتا۔ ڈرتا [illegible] ہے۔"
رابعہ نے کہا "گرفتاری سے ضرور ڈرتا ہے وہ مگر تم سے ڈرنا اور موت سے بھی نہیں ڈرتا۔ میرا اس سے رابطہ [illegible] تمہارا پیغام پہنچا دیتی اور وہ آ جاتا۔ تم اسے مار سکتے تھے [illegible] نہیں کرا سکتے تھے۔ اب بولو کیا مجھ سے بات کرو گے؟"
"تم اکیلی آؤ گی؟"
"اکیلی تو نہیں۔ میرا چوکیدار میرے ساتھ آئے گا [illegible] وہی جو ابھی بکواس کر رہا تھا۔"
"ہاں وہ ڈرائیور بھی ہے اور جاں نثار بھی۔ وہ کوئی [illegible] دخل نہیں دے گا اور ایک طرف خاموش کھڑا رہے گا [illegible] بہت خطرناک آدمی ہے۔ کسی نے میرے ساتھ بدتمیزی کا [illegible] مظاہرہ کیا تو وہ سب کو مار دے گا۔ آخر میں مجھے بھی اور [illegible] کو بھی۔"
"کیا وہ مسلح ہوگا؟"
"ہاں تم اپنے ساتھ مسلح آدمی رکھ سکتے ہو۔ میں [illegible] بازی لگا کے آ رہی ہوں لیکن اپنی حفاظت کے خیال سے [illegible] نہ سکی۔ میں منظر کو بتا کے آؤں گی اور تمہارے [illegible] کے مہمان خانے کی نگرانی بھی اسے سونپ کر آؤں گی۔"
"ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں دروازے پر ملیں گے۔" پیڈرو [illegible] اور فون بند کر دیا۔
میں اور منظر یہ گفتگو خاموشی سے سن رہے تھے۔ [illegible] ریسیور رکھا تو منظر نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا "اوئے [illegible] ڈوب کے مر جا شرم سے۔ بڑا مجنوں کا ماما بنا پھرتا ہے [illegible] اور چوکیدار بنا دیا سالے۔"
میں نے کندھا سہلا کے کہا "جاں نثار بھی تو کہا تھا [illegible]"
"قربانی کا بکرا اور کسے کہتے ہیں۔ تیرے جیسے اُلّو [illegible]"
"اور کولہو کا بیل کہتے ہیں عبدالودود منظر کو۔" [illegible]
"ذرا سوچ کہ تیری زندگی کا اب کوئی مقصد ہے؟ سوائے [illegible] ان کی ماں کی پرورش کا بار اٹھانے کے علاوہ [illegible] ہے اور دھرتی پر بوجھ بڑھتا جا رہا ہے۔"
"یہ آج دوسری بار بوڑھا کہا ہے تو نے مجھے۔ زیادہ [illegible] تو ایک ساتھ تین شادیاں اور کر کے دکھا دوں گا۔ تم جیسے [illegible] جوانی پر لعنت جو ٹھنڈی آہیں بھرنے، دکھ بھرے [illegible] تنہائی میں بیٹھے بیٹھے جلانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے [illegible]"
رابعہ نے بیگ سے ریوالور نکالا "یہ بندوبست پہلے ہی کر لیا تھا میں نے۔ اب آپ ہماری حفاظت کے لئے کوئی فول پروف بندوبست [illegible] وقت کرتے تو کیسا ہو؟...."
[illegible] کو مطلع کر دوں تاکہ سوچ [illegible] اندر کہاں ہوگا یہ [illegible] تم حسین جانی بیٹھے ہیں یہ [illegible] کرتے ہیں۔
[illegible] کیا نہیں ہے؟
"میں [illegible] کر سکتا ہوں کہ فلطقہ میں نے فون کر کے تمہارے [illegible] لکھوا دوں۔ آدھ گھنٹے میں کام کھلوا دو میں چوہدری دلاور [illegible] باپ استاد پیڈرو ملے گا۔ یہ جو نیا ایس پی آیا ہے ڈاکٹر شبلی [illegible] تفتیش کے لئے جاوید صدیقی ہوا ہے بتاؤں کہ آج شام [illegible] ماحب کی میٹنگ کے بعد سے رابعہ قادری ایڈووکیٹ اور [illegible] بیرسٹر دونوں غائب ہیں اور اندیشہ ہے کہ ڈاکٹر [illegible] کے قاتلوں کی پشت پناہی کرنے والے افراد نے انہیں [illegible] یرغمال بنا لیا ہے اور ممکن ہے اغوا کرنے والے انہیں قتل کر دیں۔"
میں نے حیرانی سے منظر کو دیکھا "آئیڈیا تو برا نہیں ہے۔"
"اچھا کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ نیا ایس پی پریشان ہوگا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔ تفتیش ابھی شروع نہیں ہوئی اور مدعی نمبر ایک کے ساتھ ایک چیف رپورٹر غائب ہو گیا۔ جس کی وجہ سے پہلی خصوصی ٹیم پر حکام بالا کا عتاب نازل ہوا تھا۔ معطل ہونے والے رسمی طور پر گرفتار کر لئے گئے تھے مگر اخبار والوں نے ملی بھگت کا راز فاش کر دیا۔ اب انہیں بھی حوالات میں بند کرنا پڑے گا اور ہتھکڑی ڈال کے عدالت میں ضمانت کے لئے پیش کرنا ہوگا جو کل تک اتنے بااختیار تھے کہ جسے چاہیں کسی بھی الزام میں اندر کرا دیں۔ جاوید صدیقی کو اپنی فکر لاحق ہوگی تو وہ خود آئے گا میرے پاس اور میں اسے بتاؤں گا کہ غالباً یہ کارروائی انہی کی ہے جو چوہدری دلاور کو بچانا چاہتے تھے مگر وکیل اور صحافی برادری کے اتحاد نے ان کی کوشش کو ناکام بنا دیا اور انہیں اندر کرا دیا۔ میں اسے ایک انتقامی کارروائی قرار دے سکتا ہوں اور باتوں باتوں میں کہہ سکتا ہوں کہ پولیس ہیڈ آفس کے باہر نیلے رنگ کی ایک فاکس ویگن دکھائی تھی مجھے چوہدری دلاور کے خاص آدمی نظر آئے تھے ان میں سے استاد پیڈرو کو میں پہچانتا ہوں۔ میں گاڑی کا نمبر بھی بتا سکتا ہوں اور اس شبہے کا اظہار بھی کر سکتا ہوں کہ انہی لوگوں نے رابعہ اور غالب کو اغوا کیا ہوگا۔"
"وونڈر فل منظر۔"
"کمال تو یہ ہو سکتا ہے کہ جاوید صدیقی کی موجودگی میں مولوی صاحب مجھے باہر کہیں سے فون کریں اور کوئی فرضی لطیفہ سنا کے سب ہوں ختم کر دیں گا۔"
غلام محمد ہو کے بولا "میں شریف آدمی ہوں جی۔"
کے لئے بھی چیلنج ہے میرا۔ کوئی میرا ریکارڈ توڑ کے دکھائے۔"
میں سینے پر ہاتھ مار کے یہ چیلنج قبول کرنے والا تھا مگر رابعہ نے میری نیت کو تاڑتے ہوئے ایک کشن مجھ پر کھینچ مارا "چلو اُٹھو بدلو یہ لباس فاخرہ اور آ جاؤ اپنی اصلی پوشاک پہن کے جاں نثار صاحب۔"
"اچھا ہوا یہ کشن تھا اینٹ نہیں تھی۔ اتنا غصہ آخر کس لئے۔ میں اس چیلنج کو قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔" میں اُٹھ کے اندر لپکا۔
منظر نے قہقہہ مارا "تیرا تو باپ بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا مقابلے پہ۔ اے بے یہ مردوں کے کام ہیں۔"
"منظر بھائی! آپ بھی موقع محل دیکھے بغیر شروع ہو جاتے ہیں۔" رابعہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔
"ارے بابا تم سے کر لیتے ہیں تھوڑا سا ہنسی مذاق دل بہلانے کو ورنہ گھر میں ایک اژدھام ہے۔ اور وہاں موقع کہاں ملتا ہے ہمیں اپنی کہنے کا۔ تمہاری زوار افزا بھابی کی الیکٹرک زبان تو فل اسٹاپ کاما لگائے بغیر چلتی ہے۔"
رابعہ ہنسنے لگی۔ میں چوکیدار کی وردی میں باہر آیا تو اس کی نظر مجھ پر تھی "کیا میں سرکس کا جوکر لگ رہا ہوں۔ ہنسی مت کرو ورنہ میں بوقت نکاح بھی یہی کپڑے پہن کے آ جاؤں گا۔"
"اے نکاح تو بغیر کپڑوں کے بھی ہو جاتا ہے۔" منظر ہنسا "بس پانچ چیزیں ضروری ہیں۔ قاضی، میاں بیوی اور دو گواہ۔"
میں نے رابعہ کو سات گلشر والا وہ پستول نکال کے دکھایا جو بہت عرصے سے بحفاظت رکھا ہوا تھا "یہ کافی ہے یا اسٹین گن لے لوں۔"
"اسٹین گن لے کر جاؤ گے اسپتال میں۔ اس کا تو لائسنس بھی نہیں ملتا۔" رابعہ نے کہا "وہ لوگ اسپتال میں گڑبڑ نہیں کریں گے۔"
منظر نے اقرار میں سر ہلایا "ان کا اصل مسئلہ ہے چوہدری دلاور کی رہائی۔ ان کی رگ دبی ہوئی ہے۔ وہ جھگڑا نہیں سودا چاہتے ہیں۔"
"کیا خیال ہے سودا کر لیا جائے؟"
"مجھ سے کیا پوچھتے ہو بھائی۔ خود تول کے دیکھ لو کون سا پلڑا بھاری ہے۔ نازو اور غالب ایک طرف ہیں دوسری طرف چوہدری صاحب۔"
میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ پلڑا تو ہمارا ہی بھاری رہے گا۔ وہ نازو یا غالب کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کوئی رسک نہیں لیں گے۔" میں نے کہا "چلو مس رابعہ۔ ڈرائیور اور باڈی گارڈ ڈیوٹی کے لئے حاضر ہے۔"
"میری مانو تو تم بھی اپنے بیگ میں کوئی آلہ قتل لے جاؤ لیکن تمہارا دل چاہے دو چار خون کرنے کا...."

"مجھے تو تمہارے آدمی ہونے میں بھی شک ہے۔ اور شریف تو میں بھی ہوں مگر احمق نہیں ہوں۔ ابھی یہ مرتفع ہو جائیں پھر تمہیں ایسے لطیفے سناؤں گا کہ تم ساری فرنچ بھول جاؤ گے۔"

"مجھے تو معاف رکھیں جناب۔"

"تمہاری یہ مولوی شکل دیکھ کے تو مجھے بھی رونا آتا ہے۔ مولوی ہنسنے ہنسانے والے زیادہ جچتے ہیں۔ غم زدہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں۔ خیر اصل مقصد کچھ اور ہو گا فون کا۔ تم السلام علیکم کہہ کے ریسیور رکھ دینا اور پھر چلے جانا اپنے کمرے میں۔ ایس پی جاوید صدیقی کے سامنے ریسیور پکڑے اکیلا بولتا رہوں گا۔ صورت سے تشویش اور بدحواسی کا اظہار کروں گا اور پھر اسے بتاؤں گا کہ کسی نے وزیر خان ٹرسٹ اسپتال سے فون کیا تھا مگر اپنا نام نہیں بتایا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مرحوم وزیر خان کے ایک سابق نمک خوار کا بیٹا ہے اور اس نے ابھی ابھی دیکھا ہے کہ دلاور کا دست راست استاد بیڈرو یہاں پہنچا ہے۔ وہ ایک مرد اور عورت کو اغوا کر کے لائے ہیں۔ مرد کو میں پہچانتا ہوں۔ وہ مشہور صحافی مرزا غالب ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کے دوست ہیں اس لئے آپ کو بتا رہا ہوں۔ جاوید صدیقی اس ڈرامے کو خاک سمجھے گا۔ وہ تو پولیس فورس لے کے میرے ساتھ دوڑے گا وزیر خان اسپتال کی طرف۔ اُمید ہے اس وقت تک تمہارے مذاکرات ختم ہو جائیں گے۔ کوشش کرنا کہ گیارہ بجے تک تم وہاں سے نکل جاؤ کیونکہ گیارہ بجے کے بعد میں اسپتال کا مکمل محاصرہ اور چھاپا مارنے کی بھرپور کارروائی چاہتا ہوں۔"

"یار منظر۔ اسپتال میں یہ سب کیسے ہو گا۔" میں نے سوچ کے کہا۔

رابعہ بولی "وہ ایک خیراتی اسپتال ہے۔"

"ہوا کرے۔ مجرم تو مسجدوں سے بھی پکڑے جاتے ہیں۔ ایس پی جاوید صدیقی کے پاس خصوصی اختیارات ہیں۔ وہ خود اجازت بھی حاصل کرے گا اور مجسٹریٹ کو بھی بلوائے گا۔ مجھ پر یا تم پر کوئی الزام نہیں آ سکتا لیکن اس آپریشن کے نتیجے میں بیڈرو گرفتار ہو گیا اور اس کے قبضے سے نازو اور غالب برآمد کر لئے گئے تو چوہدری دلاور کی پلاؤ ڈبلیو ایل۔"

رابعہ نے کہا "پلاؤ ڈبلیو ایل؟"

"فضول سوالات مت کیا کرو بی بی۔ یہ شرافت بات ہے جی بی سمجھی ہو؟"

"جنرل پریکٹشنر ڈاکٹر کو کہتے ہیں۔"

منظر ہو ہو کر کے ہنسنے لگا۔ اس کے ہلکے جیسے پیٹ میں زلزلہ سا آ گیا۔ رابعہ جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کہا "یار منظر اتنا لمبا چوڑا منصوبہ اچانک کیسے آ گیا تیرے دماغ میں؟"

"اب اچانک کے گھوڑے سے یہ تو کمال ہے اپنے دماغ کا۔ جب زبان سے ہم اول فول بک رہے ہوتے ہیں تب بھی دماغ کا کارخانہ بند نہیں ہوتا۔ ایک بازی کھیلنے تم جا رہے ہو اور کا تمہیں بھی پتا نہیں، دوسری بازی میں کھیلوں گا۔ ورنہ کیا کہتا اور ہار کی صورت میں کسی کی صحت پر کیا اثر ہو۔ رات کی خاموشی میں ایک آپریشن ہو گا جس کی کسی کو خبر نہیں ہو گی۔ بیڈرو پکڑا گیا۔ غالب اور نازو برآمد ہو گئے تو ورنہ کچھ نہیں۔ میں جاوید صدیقی کو سمجھا دوں گا کہ وہ جائے اسپتال پر چھاپا کس نے مارا؟ کب مارا اور کب پولیس نے محاصرہ کیا تھا؟ کون کہتا ہے۔" منظر نے قہقہہ لگا کے مجھے آنکھ ماری۔

"ٹھیک ہے پھر ہم چلتے ہیں۔" رابعہ نے کہا "خدا حافظ خیریت رہے۔"

منظر نے خادم حسین کو بلایا "بھئی تم سے کچھ کہنا ہے کہاں کس کے خیال میں گم ہو۔"

وہ جھینپ کر مسکرانے لگا "جی ابھی اپنا کھانا ایک یار کی خدمت سوری ہو کی سکتے ہیں۔"

منظر نے کہا "ہاں تمہارے ساتھ اور تمہارے گھر بہت دکھی ہو گی۔ مولوی کیا تم نے لو میرج کی تھی۔"

"اجی لاحول ولا قوۃ۔" خادم حسین نے یوں کہا کہ جیسے آ گئی۔

"ہنسنے والا نہیں۔ فائدے میں تم رہے۔" منظر نے کہا "لو میرج سے پہلے ہی غلامی ہو جاتی ہے۔ تم نے شوہر کی میرج کے بعد۔ میری طرح۔ کبھی آؤ میرے گھر اور دیکھو پیار کی نشانیاں نظر آئیں گی تھوک کے بھاؤ۔"

رابعہ نے میرے مشورے پر پیچھے بیٹھنا قبول کیا "خواتین صرف اپنے شوہر کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھتی ہیں شوہر نہیں۔"

رابعہ اپنے خیال میں کھوئی ہوئی تھی "غالب تو پاگل ہے ایسے منہ اٹھا کے نکل گیا۔"

میں نے کہا "کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔"

"اونہہ۔ ہمارا عشق تو پھر عشق نہ ہوا کیونکہ ہمارا دماغ خلل نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا "قتل کے ٹکر کرنے کا حق لانے کی۔ اب خود بھی گرفتار ہیں یک نہ شد دو شد۔"

"میرے ایک دوست نے اولاد کی خواہش میں دوسری شادی کی۔ مجھے سال بعد پتا چلا تو میں نے فون پر تعریت کی کہ کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے یک نہ شد دو شد۔ جو ہنسنے سے کہنے لگا کہ کمال ہے یار۔ پہلی بیوی اسپتال میں ہے فون آیا تو وہ بھی یہی کہہ رہا تھا۔ دو بچے ہوئے ہیں۔"

رابعہ ہنسنے لگی "خوب گھڑتے ہیں۔"

"اور پھر کیا کروں۔ تم اپنے ساتھ مجھے بھی ڈبو دینا۔"

پھر وہ دور آیا جب خدا نے وہ امانت مجھ سے واپس لے لی۔ جس کی حفاظت سے میں غافل ہو گیا تھا۔ بڑے ہونے کے بعد میں نے اپنے والد اور ان کے کاروبار کی وہی فکرمندی سے حفاظت نہیں کی تھی جیسے بچپن میں دس کے ایک نوٹ کی کی تھی۔ شاید میں اس بار امانت کا مستحق ثابت نہ ہوا تھا کہ خدا نے مجھ سے سب کچھ واپس لے لیا۔ باپ کی شفقت کا سایہ، دولت جائیداد اور کاروبار جس کا میں خود کو مالک سمجھتا تھا۔ لندن میں تعلیم کے نام پر عیش کرتے ہوئے میں نے اپنے والد کا دیا ہوا سبق بھلا دیا تھا کہ سب کا مالک خدا ہے۔ جو میرا تھا مجھ سے چھن گیا تھا یہاں تک کہ وطن کی زمین مجھ پر تنگ ہو گئی تھی اور اپنے پرائے ہو گئے تھے۔ آزمائش کا یہ دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا مگر میں راضی برضا تھا اور پُر امید تھا کہ خدا معاف کرنے والا اور منصف ہے۔ وہ غاصبوں سے میرا حق ضرور مجھے واپس دلوائے گا جو میری کوتاہی کے سبب مالک بنے بیٹھے تھے۔

جہاں اب اسپتال تھا وہاں کبھی زراعت میں کام آنے والی مشینری کے پرانے پرزے بنتے تھے پھر یہاں اسلحہ بننے لگا اور صرف میرے ہی نہیں وطن کے دشمنوں نے ضمیر فروشی سے اپنے خزانے بھر لئے۔ مجھے اس جدوجہد کا ہر دن اور ہر عذاب یاد تھا۔ دربدری اور جلاوطنی کے اس دور مصائب کا ہر زخم ہنوز تازہ تھا۔ وقت نے مجھے تجربے کی ایک کسوٹی عطا کی تھی جس پر میں اچھے برے غلط اور صحیح اپنے اور پرائے کی پہچان کر سکتا تھا۔

وقت بدلا تھا تو ایک آزمائش میرے ایمان کی ہوئی تھی جب میرے دشمنوں نے مجھ سے میرا اعتبار اور میرا یقین خریدنے کی پوری کوشش کی تھی مگر یہ رابعہ کی محبت تھی اور کچھ مخلص دوستوں کی رفاقت کی طاقت تھی کہ مجھے دولت کے پہاڑ کی کشش بھی نہ کھینچ سکی۔ آج میں فخر سے سر اٹھا کے اپنے رب کے حضور بھی جا سکتا تھا اور میدان حشر میں بھی اپنے والد سے کہہ سکتا تھا کہ آپ کا دیا ہوا کوئی سبق میں نے کبھی نہیں بھلایا۔ آج خود کو فاتح سمجھ کے غرور سے زمین پر اکڑ کر چلنے والے اسی زمین میں چند فٹ نیچے مُردوں سے بدتر حالت میں اور میری قید میں تھے اور طاقت کے نشے میں خود کو نمرود کی خدائی کا دعویدار سمجھنے والے جھک کر مجھ سے ملنے پر مجبور تھے اور صلح کے طلب گار تھے۔

مرحوم وزیر خان کے قاتل اور اس کی حق حلال کی کمائی کو لوٹنے والے اژدھے اب بھی یہ اُمید رکھتے تھے کہ وہ دنیا کے قانون کو دھوکا دے کر بچ جائیں گے۔ انہوں نے یہ اسپتال وزیر خان کے نام سے اسی جگہ کھڑا کیا تھا جہاں اس نے کھیتوں کو ہریالی دینے والی مشینوں اور زمین کی زرخیزی بڑھانے والے آلات کی فیکٹری لگائی کہ خدا نے وزیر خان کو وسیلہ بنایا تھا کہ کچھ لوگوں کو روزگار ملے۔ ان کی کوشش سے پیداوار بڑھے تو ان گنت بھوکے پیٹ بھر جائیں اور غربت کے دکھ خوشحالی کے سکھ میں بدل جائیں مگر کر رہی ہو۔ تمہارے چہرے پر ہنسی دیکھ کے مجھے بھی حوصلہ ملا ہے۔"

"پتا نہیں دلاور میں کتنی دلاوری رہ گئی ہو گی۔ کہیں مر ہی نہ جائے۔ ہم نے اس کی خبر ہی نہیں لی۔"

"عام آدمی بھی کچھ کھائے پئے بغیر دو دن گزار لیتا ہے تھوڑا سا سخت جان ہو تو ہفتہ۔ دلاور جیسے آسانی سے نہیں مرتے۔ دنیا کی ہوس کا رشتہ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ سانس کی ڈور کو ٹوٹنے نہیں دیتا۔ یا شاید موت کے بعد شروع ہونے والے عذاب کا خوف جان اٹکائے رکھتا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ رابعہ اپنے خیالات کے انتشار کا شکار ہے اور میری بات دھیان سے نہیں سن رہی ہے۔ خود میرے جذبات کی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ برسوں پہلے یہ جگہ میری تھی۔ کبھی میں اپنے باپ وزیر خان کے ساتھ یہاں آتا تھا تو کارخانے کے مالک کی حیثیت سے مجھے وہی عزت و تکریم ملتی تھی جو کسی بادشاہ کے جلو میں چلنے والے ولی عہد سلطنت کو حاصل ہوتی تھی "چھوٹے مالک سلام" جب پہلی بار گیٹ کھولنے والے چوکیدار نے مجھے کار میں دیکھ کے یہ الفاظ کہے تھے تو وزیر خان نے گاڑی روک لی تھی اور کہا تھا "دیکھو چوکیدار۔ سلام کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے مگر یہ چھوٹے بڑے مالک والی بات غلط ہے۔ سب کا مالک اور سب سے بڑا مالک ایک ہے۔ ہم سب تو فقط امانت دار ہیں۔ کیا سمجھے؟" ظاہر ہے چوکیدار کچھ نہیں سمجھا تو میں کہاں سمجھتا۔ میں نے آفس میں پہنچ کے ان کی گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کے جھولتے ہوئے سوال کیا تھا کہ امانت دار کیا ہوتا ہے اور اس دن جو بات انہوں نے مجھے سمجھائی تھی وہ آج بھی مجھے یاد تھی۔ انہوں نے مجھے دس کا نوٹ دیتے ہوئے کہا تھا کہ بیٹا اسے شام تک سنبھال کے رکھنا۔ امانت دار کا مطلب میں رات کو سمجھاؤں گا۔ اس زمانے میں دس کے نوٹ کی حیثیت اور وقعت سو کے نوٹ سے بھی زیادہ تھی اور کسی بچے کے لئے جو اسکول میں جیب خرچ کے چار آنے خرچ کرتا تھا یہ بہت بڑی دولت تھی۔ شام تک میں نے دس کے نوٹ کو پتلون کی جیب میں دبائے رکھا اور سارا دن بار بار اس کی موجودگی کو محسوس کرتا رہا کہ کہیں وہ پھسل کے گر تو نہیں گیا! کسی نے نکال تو نہیں لیا۔ شام کو گھر پہنچ کے ابا نے دس کا نوٹ واپس مانگا تو میں نے محسوس کیا جیسے میرے سر سے کوئی بوجھ اُتر گیا۔ پھر انہوں نے کہا کہ "بیٹا یہ دس کا نوٹ میری امانت تھی اور تم اس کے امانت دار تھے تم نے اس کی حفاظت کی تو اپنا فرض ادا کیا۔ اپنی امانت میں نے واپس لے لی۔ ایسے ہی یہ زندگی اور جو کچھ ہمارے پاس ہے سب خدا کی امانت ہے اور ہم صرف امانت دار ہیں۔" یہ بات میرے ذہن میں ایسی بیٹھی تھی کہ دنیا کے فلسفی اور مبلغ اپنی کتابی تعلیم سے اتنی بڑی سچائی کو اتنی آسانی سے کبھی نہیں سمجھا سکتے تھے۔

www.paksociety.com

ملک کے معماروں کے سب خواب غاصبوں نے چھین لیے۔ اسی فیکٹری میں موت کا سامان ہوا۔ نفرتوں کا زہر گولیوں کی صورت میں برسانے کے اسباب ہوئے اور اپنوں کا لہو بہا کے ہوسِ زر کی تسکین و تکمیل کا سلسلہ دراز ہوا۔ جب دشمنوں اور غداروں کے لئے مکافاتِ عمل کا وقت آیا تو انہوں نے چہرے بدل لئے۔ وہ قوم کے مصلح اور لیڈر بننے لگے۔ انہوں نے اسلحہ ساز فیکٹری کی جگہ خیراتی شفاخانہ قائم کر دیا۔ مجھے معافی تلافی کی فراخدلانہ پیشکش کی تاکہ ان کے ماضی کا مکروہ چہرہ چھپا رہے۔

آج پہلی بار میں اس اسپتال میں جا رہا تھا جہاں میرے والد نے دس کا ایک نوٹ دے کے مجھے امانت دار کا مطلب سمجھایا تھا۔ آج یہ جگہ کروڑوں کی نہ سہی لاکھوں کی تھی مگر میری نہیں تھی۔ قانونی طور پر میں اس کا وارث تھا مگر میں یہاں بھیس بدل کے آیا تھا۔ میں مالک تھا مگر میری حیثیت کیا تھی؟

رابعہ نے اچانک کہا "کیا ہم گوجرانوالہ کے راستے شاہدرہ جائیں گے؟"

وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کا راستہ بھی جی ٹی روڈ پر بائیں جانب وہیں تھا جہاں کسی زمانے میں وزیر خان انڈسٹریز تھی۔ ایک چھوٹی سی عام فاؤنڈری جس کا مالک صرف میرا باپ تھا۔ پھر اس میں میر شرافت علی اور دلاور کا سرمایہ شامل ہوا تو یہ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس بن گیا تھا۔ وزیر خان اور میر شرافت علی پہلے اس کارخانے کے حقِ ملکیت سے محروم ہوئے تھے اور آخرکار زندگی پر اپنے اختیار سے۔ اب عملاً چوہدری دلاور ہی یہاں سب کچھ تھا لیکن خود کو قانونی گرفت سے بچانے کے لئے اس نے اپنی بدباطنی پر خیرخواہی کا پردہ ڈال دیا تھا اور اسلحہ سازی کے وطن دشمن کاروبار سے اپنی تجوریاں بھر کے یہاں وزیر خان کے نام سے خیراتی شفاخانہ قائم کر دیا تھا۔

یہاں میں نہ جانے کتنی بار آیا تھا۔ بچپن سے اب تک ہر دور میں میرے آنے کا مقصد یا انداز بدلتا رہا مگر راستہ بہرحال کبھی نہیں بدلا تھا۔ آج میں جی ٹی روڈ کے آگے نکل گیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ فیکٹری کی جگہ اسپتال کی سہ منزلہ عمارت بن جانے سے جگہ اور گرد و پیش کا سارا ماحول اجنبی سا ہو گیا تھا۔ کچھ تبدیلیاں ساتھ والی عمارت کے خدوخال میں بھی رونما ہو چکی تھیں۔ ہوزری کا کارخانہ پہلے صرف ایک ہال پر مشتمل تھا اب اس کی جگہ نئی دو منزلہ عمارت کھڑی ہوئی تھی۔ آگے واشنگ مشین اور گیزر بنانے والی فیکٹری نئی تھی۔ وہاں پہلے خالی پلاٹ پر پانی بھرا نظر آتا تھا جس کو بھینسوں کا سوئمنگ پول کہا جاتا تھا۔ پچھلی طرف چھوٹی سی مسجد تھی مگر اب اس کا ایک مینار آس پاس کی تمام عمارتوں سے اونچا دکھائی دینے لگا تھا۔

میں نے گاڑی کو ریورس کیا "جگہ اتنی بدل گئی ہے۔"

"ہاں میں نے بھی بورڈ دیکھ لیا تھا۔ میری نظر اسی طرف تھی۔" رابعہ بولی "ذرا یو ٹرن کرتے ہوئے نگاہ سڑک پر رہتی تو تم بھی اس موڑ کو مس کر دیتے۔"

تقریباً سو گز پیچھے جا کے میں نے بائیں طرف تنگ سی سڑک پر موڑ کاٹا جو پہلے سیدھی ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کے گیٹ تک جاتی تھی۔ اس پتلی سی سڑک کے دونوں جانب سیمنٹ کے گملوں میں جو پودے لگائے گئے تھے اگر ان کی دیکھ بھال کی جاتی تو وہ بڑے ہو کر اچھے ضرور ہو جاتے کہ درخت بنتے مگر جیسا کہ ہمارے ملک میں ہوتا ہے شجرکاری کا ہر تجربہ ناکام ہو جاتا ہے۔ ان کی حفاظت کوئی بھی اپنی ذمے داری نہیں سمجھتا۔ ننھے پودوں کو بکریاں جڑ سمیت اکھاڑ کے کھا جاتی ہیں اور بچے ہوئے گملے بکھر جاتے ہیں یا چوری ہو جاتے ہیں۔ اب راستے کے دونوں طرف جھاڑ جھنکاڑ تھا تو اگ گئے تھے اور فقیروں کے اڈے تھے۔ کسی اسپتال کے ایمرجنسی کا ٹھکانا عام گزرگاہ کے مقابلے میں زیادہ منافع بخش ثابت ہوتا ہے۔ بیمار یا ان کے ساتھ آنے والے تیماردار روحانی مدد کے بھی طلب گار ہوتے ہیں اور یہ فقیر جیسا وہ ظرف دیکھ کر جو صورت سے زیادہ پریشان اور مایوس نظر آتا ہے وہی زیادہ خیرات دیتا ہے اور دعائیں بھی زیادہ سمیٹتا ہے۔

"یار یہ تو اسپتال کسمپرسی کا شکار نظر آتا ہے۔" رابعہ بولی "پہلے کے مقابلے میں یہ جگہ زیادہ صاف اور خوب صورت ہونا چاہئے۔ ایک فیکٹری سے اسپتال کے ماحول تک....."

میں نے کہا "مت سوچو کہ کیا ہونا چاہئے اور کیا نہیں ہونا چاہئے۔ یہ سب دھوکا فراڈ اور ڈراما ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ اسپتال بھی یہاں کیوں ہے۔ آس پاس جو کارخانے ہیں وہ سب پہلے بھی تھے۔ یہاں ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کیوں نہیں ہے۔"

رابعہ سمجھتی تھی کہ میرے لہجے میں یہ تلخی میرے جذبات کے ردعمل کی آئینہ دار ہے۔ اس نے نرمی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا "ٹیک اٹ ایزی۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کے سر ہلایا اور گاڑی روک لی۔ مین گیٹ پر بھدے سیاہ رنگ کا بورڈ نیم دائرے میں لگا ہوا تھا اور اس پر بدخطی کے نمونے میں اسپتال کا نام انگریزی میں لکھا تھا مگر لکھنے والا حد درجہ عالم فاضل تھا۔ ہوسپٹل کو HOSEPETAL لکھا گیا تھا اور چیریٹیبل کو CHERRY-TABLE بنا دیا گیا تھا۔ بورڈ پہ آگے تک تھا اور اس کے پیچھے جا کے خیال ضرور آتا تھا کہ کبھی وہ اوپر تھا۔ بورڈ کو رات کے وقت نمایاں کرنے کے لئے ریفلیکٹ لائٹ لگائی گئی تھی اس کا بلب شاید پہلے فیوز ہوا ہو گا تو لائٹ بھی ٹوٹ کے جھول رہی تھی۔ نچلی منزل کے اندر سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ اوپر کی دونوں منزلیں مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

رابعہ نے کہا "کیا یہاں صرف او پی ڈی ہے۔ مریض داخل نہیں کیے جاتے؟"

میں نے کہا "پھر اتنی بڑی عمارت کس لئے؟ گیٹ بھی بند ہے۔ مجھے تو اسپتال سے زیادہ یہ جیل خانہ یا پاگل خانہ لگتا ہے۔"

"عام طور پر اسپتالوں میں چوبیس گھنٹے ایمرجنسی کا شعبہ ہوتا ہے جو یہاں بے حد ضروری ہے۔ آس پاس کسی بھی کارخانے میں کوئی حادثہ پیش آ جائے پھر؟"

"پھر کیا۔ یہ خیراتی اسپتال ہے مس رابعہ۔ کوئی سرکاری اسپتال نہیں ہے۔" میں نے تلخی سے کہا "شاید وزیر خان بھی یہ نام پسند نہ کرتا۔ وہ اسپتال کے ساتھ اپنا نام بھی نہ لکھتا۔ وہ خیرات کے لفظ سے چڑتے تھے۔ کہتے تھے کہ ہم حسب توفیق امداد کرتے ہیں حسب استطاعت نہیں۔"

"میں سمجھی نہیں؟"

"بعض استطاعت والے تو بہت ہیں مگر اتنی توفیق کسے کہ سب راہِ خدا میں دے دے۔ کیا مصیبت ہے۔ یہاں تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں۔"

رابعہ نے اِدھر اُدھر گھنٹی کی تلاش میں نظر دوڑائی اور پھر پھاٹک کی کنڈی بجائی۔ میں ایک قدم پیچھے جیب میں ریوالور کو گرفت میں لئے کھڑا رہا۔ ایک منٹ بعد پہلے کوئی کھانسا پھر اس نے آدم بے زار لہجے میں اندر ہی سے سوال کیا "کون ہے؟ کیا بات ہے؟"

رابعہ نے کہا "دروازہ کھول کے دیکھو گے تو پتا چل جائے گا کہ کون ہے پھر بات بھی بتا دیں گے۔"

گیٹ کھولنے والا کسی نیند سے بیدار ہوا تھا یا شاید یہی اس کے بولنے کا انداز تھا۔ وہ پھولے ہوئے گالوں اور گھنی مونچھوں والا پہلوان ٹائپ شخص تھا جس نے گھنی سیاہ داڑھی کو صفائی سے ترشوایا تھا مگر سر پر استرا پھروا دیا تھا۔ اس نے بھینس کی لنگی مار رکھی تھی۔ رابعہ سے زیادہ وہ مجھے دیکھ کے چونکا۔

"کس سے ملنا ہے جی؟ یہ ملاقات کا وقت نہیں ہے۔"

رابعہ نے کہا "میں کسی سے ملنے نہیں آئی ہوں۔"

وہ حیران نظر آنے لگا "پھر کیا۔ آپ بیمار ہو....."

میں نے کہا "میں تم کو بیمار لگتا ہوں؟"

اس نے میرے لہجے کا برا مانا "اسپتال کا ٹائم صبح نو بجے کا ہوتا ہے۔ اس وقت....."

رابعہ نے اسے ڈانٹا "تمہارے علاوہ بھی کوئی ہے یہاں؟ جب ایک بار بتا دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے جی۔ کچھ پتا نہیں مجھے۔ کون داخل ہے آپ کا یہاں۔ میں دیکھتا ہوں اگر شاہ صاحب سو رہے ہوں گے تو پیچھے گیٹ سے آپ کو اندر لے جاؤں۔ لیکن....." وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"لیکن کیا؟" رابعہ نے بیگ کھول کے دیکھا اور سو کا ایک نوٹ نکال لیا "شاہ صاحب کون ہیں؟"

اس کا آگے بڑھنے والا ہاتھ پیچھے ہٹ گیا "آپ نہیں جانتی ہو شاہ صاحب کو۔ ڈاکٹر شاہ۔"

رابعہ نے فوراً بات بنائی "اچھا وہ ڈاکٹر شاہ۔ میں سمجھی کوئی اور شاہ صاحب آ گئے نئے۔"

وہ سو کا نوٹ اچک کے گیٹ کے پیچھے غائب ہو گیا اور ہمیں چکر میں ڈال گیا۔

"اب کیا کریں؟ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے؟"

"یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم کسی مریض سے بے وقت ملنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مریض داخل بھی کئے جاتے ہیں یہاں۔" میں نے کہا۔

"مگر ہم کس سے ملیں گے اور کیوں؟ ہم تو استاد پیڈرو سے ملنے آئے تھے۔"

میں نے کہا "کہیں وہی ڈاکٹر شاہ نہ ہو۔ دیکھتے ہیں اندر جا کے۔"

"پچھلی طرف کون سا گیٹ ہے اور اس کا راستہ....."

میں نے کہا "آؤ دیکھتے ہیں۔ یہ گلی سی نظر آ رہی ہے مجھے۔"

پتلی سی گلی اسپتال کی قد آدم دیوار اور ساتھ والے واشنگ مشین کے کارخانے کی بارہ فٹ اونچی دیوار کے بیچ میں تھی۔ یہ مشکل سے تین فٹ چوڑی جگہ بھی سیوریج لائن کے لئے چھوڑی گئی تھی جس میں شاید پیچھے کی طرف واقع فیکٹریوں کی لائن بھی ملتی ہو گی۔ سیمنٹ کے اس پختہ نالے پر سیمنٹ کے سلیب تھے جو اوپر ایسے ہی رکھ دیے گئے تھے تاکہ صفائی کے لئے نالے کو کہیں سے بھی کھولا جا سکے۔ اس پر چلتے ہوئے رابعہ کا برا حال تھا۔ بدبو سے بچنے کے لئے اس نے رومال کا گولا سا بنا کے ناک پر رکھ لیا تھا۔ اندھیرے میں بو کے ساتھ ہی مچھر اور دوسرے کیڑے مکوڑے بھی تھے جو میرے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔

رابعہ نے کہا "اُف۔ میرا تو دماغ خراب ہو گیا۔"

میں نے کہا "یہ بات نہیں۔ تمہیں پتا آج چلا۔"

"کیسی جان لیوا بدبو ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کارخانوں کے ویسٹ WASTE اور کیمیائی اخراج سے پیدا ہو رہی ہے۔"

"بالکل ٹھیک خیال ہے آپ کا۔ اس سے زہریلی گیس بھی پیدا ہوتی ہے کوئی تو اس کا پتا تمہیں اس وقت چلے گا جب تم چکرا کے دھڑ سے گر جاؤ گی۔ دیکھو سیمنٹ کے سلیب بھی بہت ناقص اور پرانے ہیں۔ سنبھل کے چلو کوئی ٹوٹ گیا تو گٹر آپ سے اندر....."

رابعہ نے کہا "سمندر میں کشتی ہوں واپس چلو۔ ایسا نہ ہو چوہے کی طرح ہم سیدھے چوہے دان میں پھنس جائیں۔"

"ہم سے کم میں خود کو چوہا تسلیم نہیں کر سکتا۔ دیکھو بائیں طرف مڑ جاؤ ورنہ دیوار سے ٹکرا جاؤ گی۔"

"آ جاؤ کیا۔ آ جائیں جی۔" کسی نے سرگوشی میں کہا اور میں

www.paksociety.com

نے سر کٹے سے موچھوں والے چوکیدار کی نشے میں ڈوبی ہوئی آواز پہچان لی۔ وہ موڑ پر ہمارے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ بائیں طرف چند فٹ کے فاصلے پر وہ چور دروازہ تھا جو تاریکی میں کسی مجرمانہ سرگرمیوں کے اڈے کا خفیہ راستہ لگتا تھا۔

"بس جی قسمت ہے آپ کی۔ شاہ صاحب سو رہے تھے۔ میں نے میز کی دراز میں سے چابی نکال لی۔" وہ آگے چلتے ہوئے بولا۔

رابعہ نے پلٹ کر پھر مجھے دیکھا مگر میں نے اسے آگے دھکیل دیا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے ڈر رہی تھی مگر میں اب حقیقت حال جانے بغیر واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ اچانک میرا یہ شک یقین میں بدل گیا تھا کہ ایک بار پھر وزیر خان کے نیک نام کو مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اور خیراتی اسپتال کا بورڈ بھی فریب کا پردہ ہے جس کے پیچھے پرانے شکاری بدلے ہوئے حالات میں کوئی نیا جال پھیلائے بیٹھے ہیں۔

میں حیران بھی تھا اور بعد میں مجھے افسوس بھی ہوا کہ آخر یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا تھا۔ اتنا عرصہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے ظاہر و باطن کو ہر پہلو سے پرکھنے کے بعد مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ ان کی نیکی بھی خالی از بدی نہیں ہو سکتی۔ وہ جسے کھرا سونا بتاتے ہیں وہ ملمع بھی نہیں ہوگا۔ صرف جعلی ہوگا۔

اس خوف ناک انکشاف کے ساتھ ہی میرے ذہن میں سے شبہات کے سنپولیے کلبلانے لگے تھے اور سوالیہ نشانوں کی طرح پھن اٹھا رہے تھے۔

رابعہ نے رُک کے مجھے آگے نکلنے کو کہا۔ وہ خود دیوار سے لگ گئی تھی۔ میں بیچ کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر چلا گیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے کہا "اتنا اندھیرا کیوں ہے یہاں؟"

"تم کیا پہلی بار آئے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔ تم کون ہو؟"

"میں۔ سیکیورٹی کا آدمی ہوں۔ نذیر باؤلا۔ نادی کہتے ہیں سب مجھے۔ تم سے پہلے بیگم صاحب کے ساتھ کون آتا تھا؟" وہ کنفیوز ہو گیا۔

"وہ میرا آدمی تھا۔" میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

"اچھا آپ ادھر انتظار کریں۔ میں ابھی آتا ہوں اسے ساتھ لے کر۔" وہ اندر کے دوسرے دروازے میں غائب ہو گیا۔

اب میری آنکھیں برائے نام اجالے میں دیکھنے لگی تھیں۔ اندر کا دروازہ کھلا تو تھوڑی سی روشنی میں کمرے کے خدوخال واضح ہو گئے۔ بہ مشکل سے آٹھ فٹ چوڑا اور دس فٹ لمبا کمرا تھا۔ جس میں ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کی بینچ لگی ہوئی تھی۔ اس قسم کی بینچ ریلوے پلیٹ فارم کے علاوہ پارک وغیرہ میں ہی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بھدی سی کرسی تھی۔ کمرے کی دیواریں بھی خالی اور سپاٹ تھیں اور ان کا میلا پن تاریکی میں بھی محسوس ہوتا تھا۔ کمرے کے اندر عجیب سی پُر آسیب گھٹن تھی اور کسی اسپتال سے زیادہ یہ تھانے کی لاک اپ جیسا کمرا لگتا تھا۔

رابعہ کو میں نے زبردستی بینچ پر بٹھا دیا ورنہ وہ کمرے کے وسط میں بت بنی کھڑی ہوئی تھی "ٹینس (TENSE) ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے سکندر۔" اس کی آواز میں کپکپی تھی "ہم تو پیڈمد سے ملنے آئے تھے۔"

"پیڈمد آ رہا ہو گا۔"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا "وہ باؤلا تو کسی اور کو بلانے گیا ہے معلوم نہیں وہ کیا سمجھ رہا ہے ہمیں۔"

"یہ سب ڈراما ہے۔ پیڈمد شاگرد کس کا ہے۔ چوہدری دلاور نے اسے سب سکھا دیا ہے۔"

"نہیں سکندر۔ معاملہ کچھ اور ہے۔"

ذہنی طور پر اس سے ہم خیالی کے احساس کو دباتے ہوئے میں نے یوں محسوس کیا۔ جیسے میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں "ہاں کیا معاملہ ہو سکتا ہے۔ اس اسپتال میں نازو اور غالب ہوں گے کیس یہ پیڈمد کے کا کہ تم دلاور کو چھوڑ دو ہم انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔"

"یہاں مریض داخل کیے جاتے ہیں؟"

میں نے بے نیازی سے شانے اچکا کے کہا "ممکن ہے۔"

"پھر یہاں اتنا سناٹا کیوں ہے۔ جہاں مریض داخل ہوں وہاں ڈاکٹر بھی ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔ نرسیں اور اسپتال کا عملہ۔"

"ڈاکٹر شاہ تو ہیں۔"

"کسی مریض کے ساتھ کوئی اور نہیں۔ اندر نہ کسی باہر برآمدے اور کاریڈور میں یا گیٹ کے سامنے بھی کوئی نہیں ہے۔ اسپتال میں تو ہر طرف لواحقین تیمار دار اور پریشان حال عزیز نظر آتے ہیں۔"

"یہ اتنا بڑا اسپتال تو نہیں ہے۔"

"پھر بھی۔ ادھر بالکل اندھیرا ہے۔ وارڈ اوپر ہی ہوں گے۔"

میں نے جھوٹ سے رابعہ کو بہلانے کا شغل جاری رکھا "مریض سو رہے ہوں گے۔ لائٹس آف کر دی گئی ہوں گی۔"

"لائٹس بالکل کہاں بند ہوتی ہیں۔"

"اچھا ابھی جو ہو گا معلوم ہو جائے گا۔ میں بھی تو آج پہلی بار ہی آیا ہوں۔" میں نے چڑ کے کہا "میرا سر مت کھاؤ بلاوجہ۔"

رابعہ چپ ہو گئی۔ مجھے اپنی درشتی پر ندامت ہوئی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"آرام سے کرسی پر بیٹھو اور ہاتھ ریوالور پر رکھو۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور اس کے گالوں پر جھکا ہی تھا کہ دروازے کے پیچھے آہٹ کے ساتھ چوں چوں کی آواز سنائی دی۔ میں چوکس ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور نادی ایک دبلے

"تم ہمارے ساتھ استادی کرتے ہو۔ ہم ایسا سبق دیں گے تمہیں کہ ساری استادی بھول جاؤ گے۔"

"بچپن میں تم استاد تھے۔ پڑھاتے تھے کہیں۔ کسی کالج میں یا یونیورسٹی میں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تم شاگرد ہونا میرے۔ خبیث۔ تم ان سے ملے ہوئے تھے۔ تم ہی ساری باتیں ان تک پہنچاتے تھے ورنہ وہ کیسے جان سکتے تھے۔"

"وہ کون؟"

"شش!" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی "آہستہ بولو۔ وہ سب سن رہے ہیں میرے بیٹے۔"

"تمہارے بیٹے۔ کتنے بیٹے ہیں تمہارے؟"

وہ مسکرانے لگا "میں نہیں۔ تھے۔ سب مر گئے۔ نہیں دنیا کے لیے میں مر گیا۔ ایک ہی بات ہوئی نا۔ پروفیسر غیاث الدین دوسری دنیا میں اکیلا گیا اور باقی سب وہیں رہے۔ تم کیسے آئے یہاں۔"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "ہم آپ سے ملنے آئے تھے۔" صورت حال کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اگر مجھے وقت ملتا تو میں پروفیسر غیاث الدین سے سب پوچھ لیتا کہ آخر اس کے ناخلف بیٹوں نے اسے پاگل بنا کے یا پاگل کرنے کے لیے اس اسپتال میں اکیلا کیوں چھوڑ دیا تھا لیکن مجھے نادی کی واپسی کا بھی خیال تھا۔

رابعہ بہت خوف زدہ تھی "سکندر اگر نادی کو پتا چل گیا کہ ہم ان کے کچھ نہیں۔ یا وہ ڈاکٹر شاہ آ گیا۔"

میں نے کہا "پروفیسر صاحب چلیں میں آپ کو اندر چھوڑ آؤں۔"

"اندر؟" اس نے دروازے کی طرف دیکھا "کیا اس وقت میں باہر ہوں۔ تم بھی تو اندر ہو۔"

"میرا مطلب تھا آپ کے بیڈ پر۔ آپ کے سونے کا وقت ہے۔"

اس نے سر ہلایا اور ایک بازو پر سے آستین کھینچ کر اوپر کر لی۔ میں نے دیکھا کہ بازو پر ان گنت سرخ نشانات تھے جو اب سیاہ پڑ چکے تھے۔ اس بازو میں ان گنت انجکشن لگائے گئے تھے۔ سونے کے نام پر اس کا رد عمل کسی معصوم بچے کی طرح تھا جو ایک معمول کا عادی ہو۔ یہ جانتا ہو کہ اس نے دانت برش نہ کیے یا کپڑے نہ بدلے یا دودھ نہ پیا یا ممی پاپا کو گڈ نائٹ نہ کہا تو وہ خفا ہوں گے۔

میں نے اس کی کرسی کو موڑ لیا "انجکشن کون لگاتا ہے تمہیں؟"

"ڈاکٹر شاہ۔ اس سے نیند اچھی آتی ہے۔ اچھی نیند اچھی صحت کی ضامن ہوتی ہے۔ میں جب یہاں آیا تو بیمار تھا۔ اب کتنا صحت مند ہوں دیکھ لو لیکن دیکھو۔ یہ بات انہیں مت بتانا۔ ڈاکٹر

دھکیل کر اندر لے آیا۔ اس پر ایک اجنبی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اسپتال کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ گہری سرخ یا سیاہ دھاریوں والی ڈھیلی قمیص اور ایسا ہی پاجامہ۔ اس کے سر پر مشین پھیری گئی تھی مگر اس بات کو کچھ عرصہ گزر چکا تھا۔ اب اس کے سر پر آدھا انچ سے کچھ کم لمبے بال تھے۔

نادی نے ایک سوئچ دبانے سے پہلے اندر والا دروازہ اچھی طرح بند کر دیا۔ کمرے میں زیرو واٹ کے بلب کی بیمار اور زرد روشنی پھیل گئی۔ یہ بلب بھی خاصی بلندی پر چھت میں نصب تھا اور سرخ رنگ کا تھا "تو جی آپ منٹ بات کرو آپ۔ میں باہر بیٹھتا ہوں۔" نادی نے کہا "سگریٹ ہوگی آپ کے پاس۔ کے ٹو پیتا ہوں میں۔"

میں نے کہا "نہیں ختم ہو گئی ہے۔ یہاں کہیں ملتی ہو گی؟"

اس نے قدرے تہذیب کے ساتھ کہا "باہر ملتی ہے۔ ساتھ والی فیکٹری میں کینٹین ہے رات کی شفٹ والوں کے لیے۔"

"پھر تو چائے بھی ہو گی وہاں۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے میری نیت کو بھانپتے ہوئے نادی کو پچاس کا نوٹ پکڑا دیا "یہ لو۔ اپنے لیے بھی سگریٹ لے لو اور ان کے لیے بھی۔ میرے لیے بلکہ ہم سب کے لیے چائے ہنگت لے آؤ تو بڑی مہربانی۔ باقی رقم تمہاری۔"

وہ لالچی آدمی خوش ہو گیا "سگریٹ کون سی؟"

میں نے کہا "کے ٹو اور کون سی۔ اپنا بھی یہی برانڈ ہے بابا۔"

بے وقوف ہونے کے باوجود اس میں اتنی عقل ضرور تھی کہ اس نے جاتے ہوئے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ رابعہ ٹکٹکی لگائے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو سپاٹ چہرے خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جیسے دیواروں کی بے حسی اور ہماری اجنبیت میں اپنی پہچان تلاش کر رہا ہے۔ وہ صحرا میں سمت گم کر دینے والے مسافر کی طرح ہکا بکا اور پریشان تھا یا کسی اجنبی شہر کی سڑک پر یادداشت کھو دینے والے کی طرح بالکل بے بس و لاوارث لگتا تھا۔ وہ نہ میری طرف متوجہ تھا اور نہ رابعہ کی طرف۔ اس کے لیے ہمارا وجود بھی اتنا ہی بے معنی تھا جتنا اس کمرے کا، کمرے میں رکھی ہوئی بینچ کا۔

میں نے اس سے دوستانہ لہجے میں کہا "ہیلو۔"

وہ مسکرانے لگا "ہیلو۔"

میں نے کہا "استاد پیڈمد نے بھیجا ہے تمہیں۔ کہاں ہے وہ؟"

رابعہ نے مجھے پُر ملامت نظروں سے دیکھا۔ اس کی نظریں صاف کہتی تھیں کہ اس دیوانے سے کیا پوچھتے ہو جسے شاید اپنا بھی معلوم نہیں۔

"وہ۔ وہ تو میں ہوں۔" اس نے سوچ کے جواب دیا۔

"کیا تم استاد پیڈمد ہو؟"

"نہیں بس استاد۔" وہ بولا "وہ کہتے تھے کہ بڑے استاد بنے

www.paksociety.com

شاہ نے بھی منع کیا ہے۔"
میں نے کہا "رابعہ دروازہ کھولو۔"
رابعہ نے میرا بازو پکڑ لیا "سکندر پلیز...... چلو ہم واپس چلیں۔ ورنہ کسی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔"
میں نے اپنا بازو چھڑا لیا "نئی مصیبت میں پڑنے سے پہلے میں ایک ایک کو شوٹ کروں گا۔ میں دیکھوں گا یہاں کیا ہو رہا ہے۔"
"تم پاگل ہو گئے ہو۔"
"ہاں جو بھی پاگل خانے میں آتا ہے پاگل ہو جاتا ہے لیکن ہر بات کی حد ہوتی ہے۔"
"تمہیں غالب اور نازو کی فکر نہیں۔"
"انہیں کچھ نہیں ہو سکتا۔ دروازہ کھولو۔" میں نے سختی سے کہا۔
رابعہ نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک کاریڈور سا تھا جس کے دونوں طرف کمروں کے بند دروازے تھے۔ آخری حصے میں آمنے سامنے کے دو کمروں میں روشنی تھی جو ہم نے سڑک کی طرف سے بھی دیکھی تھی۔ میں نے وہیل چیئر کو آہستہ آہستہ دھکیلا اور بے آواز قدموں سے چلنے لگا۔
پہلا کھلا دروازہ لفٹ کا تھا جس میں شاید پروفیسر کو نیچے لایا گیا تھا۔ میں کرسی سمیت اندر داخل ہو گیا۔ رابعہ نے اچانک کہا "ناجی باؤلا"۔ مگر اندر قدم رکھتے ہی بٹن دبا دیا۔ دروازہ بند ہوا اور لفٹ اوپر جانے لگی۔ یہ لفٹ اتنی لمبی تھی کہ اس میں مریض کو بیڈ پر یا اسٹریچر پر بھی اوپر نیچے منتقل کیا جا سکتا تھا۔
"وہ آ گیا۔ ناجی۔" رابعہ نے کہا "اس نے ہمیں دیکھ بھی لیا ہے۔"
میں نے مجرمانہ فرار کا ارادہ بدل دیا اور لفٹ کو واپس نیچے لانے والا بٹن دبا دیا۔ گراؤنڈ کو چھوتے ہی لفٹ کا دروازہ کھل گیا اور میں نے ناجی کا بد مزاج چہرہ اپنے مقابل پایا۔
"یہ کیا ہے بی بی۔" اس نے خفگی سے کہا "آپ اندر کیوں جا رہے تھے؟"
میں نے سکون سے کہا "مریض کو بیڈ پر پہنچانے کے لئے۔ ان کو نیند آ رہی تھی۔"
رابعہ نے میری تائید کی "پروفیسر غیاث الدین سے پوچھ لو۔"
ناجی کے ایک ہاتھ میں سگریٹ کے دو پیکٹ تھے اور دوسرے میں چائے کی ٹرے جس میں نیلے اسٹیل والی چائے کی کیتلی رکھی ہوئی تھی۔
"آ جاؤ تم بھی اندر۔" میں نے کہا۔
"نہیں آپ باہر نکلو۔ آپ تو بڑے غلط آدمی ہو جی۔ میری نوکری کا بھی خیال نہیں۔ اندر کوئی نہیں جا سکتا۔"
"اچھا مجھے معلوم نہیں تھا۔" میں نے کہا اور کرسی کو پھر دھکیل کر باہر لے آیا۔

ناجی خوفزدہ نظروں سے کاریڈور کے آخری حصے کو دیکھ رہا تھا جہاں روشنی تھی "اگر ڈاکٹر شاہ نکل آئے تو۔"
"تو کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا "فکر مت کرو۔ ہم ان کے سامنے اپنی غلطی مان لیں گے۔ تمہاری نوکری نہیں جا سکتی۔"
اس نے کہا "سنئے۔ آہستہ بات کرو۔ اور چلو یہاں سے واپس۔"
خفیہ ملاقات کے کمرے میں پہنچ کے دروازہ بند کرتے ہی ناجی کے چہرے پر سکون کے آثار نمودار ہوئے "شاہ جی بڑے نوری ہیں۔ آپ نہیں جانتے۔"
"کیا ظلم کرتے ہیں؟" رابعہ بولی۔
"اگر ان کو پتہ چل جائے کہ میں نے اس طرح آپ کو پروفیسر صاحب سے ملوایا تھا تو مجھے جیل ہو جائے گی۔ کم سے کم [illegible] کی۔"
میں نے رابعہ کو والد کے لفظ پر چونکتے دیکھا تھا۔ معلوم ہوا ہم میں سے کسے پروفیسر غیاث الدین کا بیٹا یا بیٹی کہہ کر پروفیسر نے یہ نہ جانا ہی بتا تھا کہ اسے ذہنی ہوش اور دنیا سے الگ کر کے اس جگہ پہنچانے کے ذمے دار تھے جو شاید یہ مشہور کر چکے تھے کہ ان کا باپ مر گیا یا ایسا محسوس کرتا تھا کہ اس کی یہ زندگی موت سے بدتر ہے۔ جینا کوئی جینا نہیں۔ ان حالات میں اس کے کسی بیٹے کا رفتہ رفتہ باپ سے ملنے کے لئے آنا مشکل لگتا تھا۔ اس کی کوئی بیٹی چوری چھپے پروفیسر سے ملنے آئی ہو اور کی صورت میں اس کی مشابہت دیکھ لی ہو یا اسے غلط فہمی ہو کہ میں اس کا بیٹا ہوں۔
میں نے کہا "یہاں جیل بھی ہے؟"
"ہاں جی۔ بڑی سخت جیل ہے۔" ناجی نے چائے پیالیوں میں ڈالی اور مجھے پکڑا دی "کھانے کو کچھ نہیں ملتا اور مار پڑتی ہے۔"
"مگر یہ تو ہسپتال ہے۔" رابعہ نے کہا۔
"ہسپتال بھی ہے۔" ناجی نے اس سے اتفاق کیا اور کر کے چائے پینے لگا۔
میں نے کہا "پروفیسر صاحب سے بھی پوچھو۔ چائے پئیں گے؟"
پروفیسر نے سر ہلایا "صائمہ کے ہاتھ سے پیوں گا۔"
رابعہ کی طرف دیکھ کے کہا "آپ بھی کھاؤں گا۔"
میں نے رابعہ کو اشارہ کیا "صائمہ تم پلاؤ۔"
رابعہ نے ندامت سے کہا "سوری۔ وہ تو میں بھول گئی۔ اگلی بار ضرور پلاؤں گی۔ ابھی آپ چائے پی لیں۔"
پروفیسر کا خیال تھا کہ اس کی صحت یہاں آنے کے بعد بہتر ہو گئی ہے۔ نشے کی حالت میں یا دواؤں کے زیر اثر اس کے لاشعور میں بٹھا دی گئی تھی۔ ورنہ حقیقت اس کے

کمرے سے جب اس نے پروفیسر کو چھوڑ کے ہماری طرف رخ کیا "تم جانتے کیوں نہیں۔"
میں نے کہا "اگر ہم جانے سے انکار کر دیں تو کیا کرو گے تم؟"
رابعہ نے سر ہلایا "ہاں تو ہم یہ سب تھے۔ آخر تم نے اور تم نے ایک بھی بات نہیں کرنے دی۔ چالیس روپے اس کے علاوہ بھی رکھ لئے تم نے پھر بھی دھمکی دیتے ہو اور ڈراتے ہو پروفیسر صاحب کو۔"
"اچھا جی میں کچھ نہیں کہوں گا کسی سے۔" وہ ڈر گیا۔
"آپ بھی نہیں کہ ہم یہاں کسی سے ملنے کے لئے آئے تھے۔"
"ہم کل رات پھر آئیں گے لیکن ذرا دیر سے گیارہ بارہ بجے۔"
وہ انکار میں سر ہلانے لگا "دس بجے سب سو جاتے ہیں اور پھر موقع نہیں ملتا۔ آج تو شادی تھی۔"
"آج کیا ہوا تھا شاہ جی کو؟"
"کچھ نہیں۔ آج زیادہ پی گئے ہیں وہ۔ اور اکیلے بھی نہیں ہیں۔ کوئی عورت ہے اندر۔" ناجی نے خود ہی اگل دیا "بہت خوب صورت عورت ہے۔ وہی لائی تھی شراب کی بوتل بھی۔"
"اگر کل تم نے ہمارے لئے دروازہ نہ کھولا تو ہم آج کی ہر بات رانا صاحب کو بھی بتا دیں گے اور شاہ جی کو بھی۔"
اس نے سو اور پچاس کا نوٹ نکالا "یہ لیں جی اپنے پیسے۔ مجھے معاف کریں۔ غلطی ہو گئی تھی مجھ سے۔"
میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "کل رات گیارہ بجے کے بعد۔ چلو صائمہ۔"
میں آگے بڑھا ہی تھا کہ پیچھے کا دروازہ کھلا۔ ایک عورت تیزی سے اندر آئی۔ ہمیں دیکھ کے رکی اور پھر باہر کے دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ اندازاً تیس سال کی بھرپور عورت تھی۔ میک اپ اور ہیئر اسٹائل سے حسین بھی لگتی تھی مگر اس کی اصل خوب صورتی بے تاب جوانی کے مدوجزر میں تھی جسے لباس نے زیادہ نظر نواز کر دیا تھا۔ وہ کچھ نروس اور پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس نے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر مجھے اور پھر رابعہ کو دیکھا۔ ایک نظر ناجی پر ڈالی اور دوسری پروفیسر پر۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اس وقت کوئی بھی یہاں نہیں ہوگا اور وہ خاموشی سے نکل جائے گی۔ ایک اجنبی جوڑے کی موجودگی اس کے لئے ایک غیر متوقع صدمہ بن گئی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی تاثرات تھے جو گھر سے فرار کی کوشش کرتے ہوئے ماں باپ اور بھائی بہن کے ہاتھوں پکڑے جانے والی لڑکی کے ہو سکتے ہیں۔
خاموشی کا ایک لمحہ ہم سب پر کسی بوجھل چٹان کی طرح آ گرا تھا۔ آخر کار عورت نے کہا "میں جا رہی ہوں۔ کیا نام ہے تمہارا؟ ناجی۔ ادھر آؤ۔ کون ہے یہ تمہاری باجی؟" "وہ جی۔"
ناجی بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا "نہیں جی۔"
"اچھا ٹھیک ہے۔ اپنی کوئی باجی۔ چلو باجی کی باجی سہی۔" اس نے

تھی کہ دو برسوں کا بیمار اور فاقہ زدہ نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں اور زرد گال اتنے پچک گئے تھے کہ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی لگتی تھیں۔ اس کی عمر اگر پچاس سال تھی تو وہ ساٹھ کا نظر آتا تھا۔
جب رابعہ اسے چائے پلا رہی تھی تو اس نے اچانک رابعہ کا ہاتھ پکڑ لیا "صائمہ مجھے اپنے گھر لے چلو۔"
رابعہ نروس ہو گئی "اپنے گھر؟"
"ہاں اپنے گھر۔ مجھے اسٹور میں چھپا دینا۔" وہ رازدارانہ انداز میں بولا "یا باہر جو مرغیوں کا ڈربا ہے اس میں بند کر دینا تاکہ انہیں پتہ نہ چلے۔"
میں نے کہا "ہم آپ کو گھر میں رکھیں گے۔ الگ بیڈ روم دیں گے۔"
وہ کانپنے لگا "نہیں نہیں۔ وہاں تو وہ آ جائیں گے اور لے جائیں گے۔ گھر میں اندر سے کنڈی لگا سکتا ہوں۔ دروازے کو لاک کر سکتا ہوں اور تم کھڑکیوں کو بند کرا سکتے ہو۔ حفاظت کے لئے میں سرہانے خنجر رکھ کے سویا کروں گا۔ جیسے ہی وہ میرے قریب آئے میں یوں خنجر کھینچ کے سر میں ماروں گا۔"
اس نے ایک دم رابعہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے کر ناجی پر کھینچ ماری تھی۔ ناجی بازو سے بچتے ہوئے سر پر پیالی لگی تو وہ طیش میں آ گیا "میں تمہاری شکایت کروں گا رانا صاحب سے۔"
پروفیسر کا رنگ پیلا پڑ گیا "رانا صاحب سے نہیں وہ ماریں گے مجھے کوڑے سے۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے ان سے۔"
"پھر یہ تیزی مت کرنا میرے ساتھ۔" ناجی نے کہا "اب چلو واپس۔"
"نہیں۔ میں صائمہ بی بی کے ساتھ جاؤں گا۔"
"ڈاکٹر شاہ کی اجازت کے بغیر تم باہر نہیں جا سکتے۔" ناجی نے اسے ڈانٹا "چلو اب اپنے کمرے میں ورنہ میں رانا صاحب کو بتا دوں گا۔"
"پھر وہ مجھے بجلی لگائیں گے۔" وہ سہم گیا۔
"ہاں۔ کہنا نہیں مانو گے تو بجلی لگانی پڑے گی۔"
"میں کہنا مانوں گا۔" پروفیسر نے کہا۔
"اچھا جی آپ جائیں۔ بہت دیر ہو گئی۔" ناجی نے کہا "دس بجے شاہ جی راؤنڈ کرتے ہیں۔"
میں نے گھڑی دیکھی تو پونے دس ہو رہے تھے "ٹھیک ہے ہم جا رہے ہیں۔ ناجی۔ یہاں اور کتنے مریض ہیں؟"
وہ ایک دم چوکنا ہو گیا "کیا آپ اخبار والے ہو؟"
میں نے کہا "نہیں ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ بہت بڑا ہسپتال ہے اور تم اکیلے ہو۔ سب کو کیسے سنبھالتے ہو۔"
اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور ویل چیئر کو گھما کے دروازے کی طرف چل پڑا پھر اسے خیال آیا کہ ہم ابھی تک وہیں

www.paksociety.com
www.paksociety.com

اپنے کندھے پر جھولتا ہوا بیگ اُتارا اور اس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

واضح طور پر وہ نشے میں تھی اور اسے نہ اپنی حرکات و سکنات پر کنٹرول تھا اور نہ اپنے خیال و اظہار پہ۔ اس نے آخر کار بیگ میں سے سو سو کے نوٹ نکال لیے۔ شاید خود اسے علم نہیں تھا کہ بیگ میں کتنی رقم ہے اور اس کی مٹھی میں کتنے نوٹ آئے ہیں۔

"یہ لو۔ آپس میں بانٹ لینا۔" اس نے مٹھی بھر نوٹ ناجی کے سامنے پھینک دیے "کسی کو کچھ مت بتانا میرے بارے میں۔"

ناجی نوٹ اُٹھانے لگا "کیا نہ بتاؤں بی بی جی؟"

"یہی کہ میرا نام صوفیہ ہے۔" وہ ہنسی "اور میں تمھارے شاہ جی کے پاس آئی تھی۔ ناجی کی باجی کے ساتھ کون ہے۔ باجی کا باجا باجا یا راجا۔ راجا کے ساتھ رانی تکّی ہے بالکل۔ کھٹکے راجا۔ تو تم بھی عیش کرو۔" اس نے دو مٹھیاں بھر بھر کے نوٹ اُچھال دیے۔

مجھے اس عورت پر ترس بھی آرہا تھا اور حیرانی بھی ہو رہی تھی۔ اگر وہ کوئی آبرو باختہ عورت نہیں تھی تو کسی نام نہاد ڈاکٹر شاہ کے ساتھ خلوت میں کیوں شریک تھی اور اگر اس نے اپنے شباب کو ڈبو کے یہ دولت کمائی تھی تو پھر اسے مالِ مفت کی طرح کیوں لٹا رہی تھی۔ وہ شریف عورت تو ہو نہیں سکتی تھی کہ بدنامی سے ڈرتی۔ پھر وہ کیوں چاہتی تھی کہ کسی کو اس کے یہاں آنے کا علم نہ ہو اور وہ اتنی خوف زدہ ہو کے کیوں فرار ہو رہی تھی۔ نشے میں ہونے کے باوجود اسے اتنا ہوش یقیناً تھا کہ وہ افشائے راز کرنے والی زبانوں کو مہرِ خاموشی کی قیمت چکانا نہیں بھولی تھی۔ کسی دولت مند کے عشرت کدے سے رخصت ہونے والی جسم فروش عورت دیکھنے والوں کو رشوت دینے پر مجبور نہیں کرتی کہ وہ اس کے آنے جانے کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ اس نے رشوت کسی اور زیادہ سنگین جرم کو چھپانے کے لیے دی تھی۔

مجھے یا رابعہ کو کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور میں نے اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ میں خاموشی سے تماشا دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وزیر خان خیراتی اسپتال میں اور کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا۔ ابھی میں نے صرف ٹریلر دیکھا تھا مگر میں پوری فلم کا اندازہ کر سکتا تھا۔

صوفیہ کسی بگولے کی طرح باہر نکل گئی تو ناجی نے دانت نکالتے ہوئے کہا "نشے میں تھی۔"

"ہم کب پاگل کہہ رہے ہیں۔" میں نے کہا "نشہ تو تمھیں بھی ہو رہا ہے اتنے ڈھیر نوٹ دیکھ کر۔ اُٹھا لو یہ سب۔"

"سب اُٹھا لوں؟" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

میں نے نیچے جھک کے ایک کارڈ اُٹھا لیا "ہاں سب۔ مگر دیکھو۔ جو وعدہ تم نے صوفیہ سے کیا ہے اور ہم سے کیا ہے اس پر قائم رہنا۔ کسی کو بھی کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔"

اس نے سر ہلایا "اب نکل جائیں آپ بھی۔ ڈاکٹر شاہ نہ آجائیں۔ وقت ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "وقت پورا ہو گیا ہے شاید۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر شاہ نہ آئیں۔"

رابعہ نے کہا "پھر انجکشن کون لگائے گا آج؟"

ناجی نوٹ سیدھے کرتا رہا "اس کی فکر نہیں۔ ایک رات نہ سہی اور ضرورت پڑنے پر میں بھی یہ کام کر لیتا ہوں۔ انجکشن لگانا کیا مشکل ہے۔"

"اچھا؟ کس چیز کا انجکشن لگاتے ہو تم؟"

"کوئی دوا ہوتی ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

رابعہ اور میں باہر آگئے۔ روانہ ہونے سے پہلے رابعہ نے پروفیسر کو مسکرا کے ہاتھ ہلایا۔ ہم تنگ بدبودار تاریک سرنگ جیسی گلی سے گزرے اور جب اسپتال کے سامنے والے حصے میں ظاہر ہوئے تو میں نے گہری سانس لی۔

"اُف یہ اسپتال تو واقعی پاگل خانہ ہے۔ میرا تو دماغ گھوم گیا ہے۔ یہ سب کیا تھا سکندر؟" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "پاگل ہو جاؤ گی اگر سوچنے لگیں۔"

"سوچنے کی بات تو ہے۔"

"ہونہہ۔ آج کا اندازہ ہو گیا۔ کل دیکھ لیں گے کہ یہ سب کیا تھا۔" رابعہ نے گاڑی کا دروازہ کھولنا چاہا تو حیران ہوئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ "شاید میں ہی لاک کرنا بھول گئی تھی۔"

میرا ذہن اب اسپتال سے زیادہ ان مسائل میں اُلجھا ہوا تھا جن کا حل تلاش کرنے ہم یہاں آئے تھے مگر یہاں تو پیچیدہ اور نت نئی غرقابیں سے کوئی اسپتال کے معاملات نے پیدا کر دی تھیں۔ ان سے بعد میں بھی نمٹا جا سکتا تھا۔ صورتِ حال کسی حد تک بھی عیاں ہوتی تھی اور اچھی بات یہ تھی کہ حادثاتی طور پر پیڈرو کی غلطی کے باعث ایسا ہوا تھا۔ تاہم اس بارے میں ابھی سے کچھ کہنا بھی مشکل تھا۔ خود داور اس فن میں کمال رکھتا تھا کہ حقیقت کو فریبِ نظر بنا دے اور جھوٹ کو سچ کے پیرائے میں ایسا پیش کرے کہ ہم جیسے بال کی کھال نکالنے والے اور خود کو بہت ہوشیار سمجھنے والے بھی ٹامک ٹوئیاں مارتے نظر آئیں۔

پیڈرو کا طے شدہ وقت اور مقام پر نہ آنا احتیاط کا تقاضا بھی ہو سکتا تھا۔ اسے خوف بہرحال ہوگا کہ کہیں ہم اپنی طاقت کے ساتھ اس کی سازش کے تنکے کو مسمار نہ کر دیں اور داور کو چھڑانے کے چکر میں وہ خود بھی جنگی قیدی نہ ہو جائے۔ عدم اعتماد کی یہ فضا دونوں طرف تھی مگر داور جیسے سپہ سالار کی عدم موجودگی میں اس کے لشکر کا حوصلہ زیادہ پست ہو گیا تھا۔ اپنی سرتوڑ کوشش کے باوجود وہ دن رات ایک کرکے بھی یہ سراغ لگانے میں ناکام رہے تھے کہ داور کو ہم نے زمین آسمان کے درمیان کس زنداں میں ڈال رکھا ہے۔

اس بات کا قوی امکان تھا کہ پیڈرو نے چھپ کے دیکھا ہو اور اسے یقین آچکا ہو کہ رابعہ کے ساتھ واقعی صرف ایک ڈرائیور اور باڈی گارڈ آیا تھا۔ اب وہ ملاقات کے لیے نئی جگہ تجویز کرے گا اور مطمئن ہو جائے گا کہ دھوکے یا تصادم کا امکان نہیں تو سامنے بھی آجائے گا۔

ہم تقریباً آدھا گھنٹا اندر گزار کے آئے تھے اور آدھا گھنٹا رابعہ کی بیر بہوٹی جیسی لال فاکس ویگن اسپتال کے سامنے موجود رہی تھی۔ یہ گاڑی خود رابعہ کی شناخت تھی۔ شہر میں بلاشبہ ایک نہیں سیکڑوں ایسی گاڑیاں تھیں مگر اتنا بھڑکتا ہوا شوخ لال رنگ میں نے کسی کا نہیں دیکھا تھا۔ اس عرصے میں پیڈرو کہیں دور بیٹھا جائزہ لیتا رہا ہوگا کہ فاکس ویگن میں سے بعد میں کتنے شکاری برآمد ہوتے ہیں یا اس گاڑی کے پہنچنے کے کتنی دیر بعد ایم آر ایس کے کمانڈوز آتے ہیں مگر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

جب رابعہ نے کہا "یہ دیکھو۔ تم کدھر دیکھ رہے ہو۔"

میں نے اسے دیکھا "یہ کیا ہے؟"

"یہ سیٹ پر رکھا ہوا تھا۔" رابعہ نے ایک لفافہ مجھے تھما دیا "مخاطب مجھے کیا گیا ہے۔ ڈیئر مس رابعہ۔ رابعہ کی جگہ صرف آر۔"

"تم نے پڑھ لیا؟ کیا لکھا ہے؟"

"یہی کہ ویری سوری۔ میں آج رات نہ آسکا۔ خیر بہت جلد ملاقات ہوگی۔ میں فون کروں گا۔ تمھارا۔ پی۔"

الو کا پٹھا۔ ڈیئر مس آر کی اولاد۔ میرے سامنے آئے تو تمھارا پپ۔" میں نے کہا۔

"ابھی جل گئے۔"

میں نے کہا "تمھارے لیے اس قسم کے خطاب اور الفاظ ادا کرنے کے جملہ حقوق میرے نام محفوظ ہیں۔ تحریر کس کی ہے؟"

"کسی کی نہیں۔" رابعہ نے خط میرے سامنے کر دیا۔

روایتی مجرمانہ انداز میں اخبار یا رسالے میں سے طبع شدہ الفاظ اور جملے کاٹ کر سادہ کاغذ پر چپکائے گئے تھے تاکہ کسی کی تحریر کو شناخت نہ کیا جا سکے اور مضمون بھی ایسا تھا کہ لگتا تھا ظالم سماج کی نظروں سے چھپ کر محبت کرنے والوں کی کہانی ہے۔

"میں نے دروازہ یقیناً لاک کیا تھا۔ مجھے عادت ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے اترنے کے بعد دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہو۔"

"غیر شعوری طور پر سب گاڑی والے یہی کرتے ہیں۔ بعد میں کسی نے لاک کھولا ہوگا۔" میں نے کہا "تمھیں اب ڈور لاک بدل دینا چاہیے۔ پرانا ہو گیا ہے۔"

رابعہ نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی "اس کا مطلب ہے کہ یہاں تک تو وہ بھی پہنچے تھے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم نے کس حد تک وعدے کی پابندی کی ہے۔"

میں نے کہا "کیا پتا وہ اس وقت بھی چھپ کر ہمیں دیکھ رہے ہوں۔"

رابعہ نے خط کو ڈیش بورڈ پر ڈال دیا "مگر ہم انھیں کہاں دیکھیں؟" میں نے کہا "ایک منٹ ٹھہرو۔ میں گاڑی کو چیک کر لوں۔"

"ہم کیا دیکھ سکیں گے یہاں اندھیرے میں۔"

میں نے جائزہ لے کے پیچھے انجن پر نظر ڈالی مگر ظاہر ہے یہ سرسری نگاہ کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔ کوئی بہت چھوٹی چیز تو انجن کے جانے پہچانے پرزوں میں الگ نظر آ سکتی ہے مگر وہ خالی سو گرام کا تباہ کن مادہ جو گاڑی کے پرخچے اُڑا دے۔ چھوٹا سا ڈائنامائٹ جو الیکٹرک اسپارک سے متحرک ہو جائے یا ٹائم بم جتنا بم تو کہیں بھی لگایا جا سکتا ہے اور لگانے والا فنکار ہو تو اسے دن کے اجالے میں بھی تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ میں نے بونٹ بند کیا اور اندر بھی دیکھا لیکن آگے اسٹیئرنگ کے نیچے اور ڈیک وغیرہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے رابعہ کو اشارے سے واضح کیا کہ شاید وہ مائیکرو فون لگا گئے ہوں گے۔

"چلیں بس اللہ مالک ہے۔" میں نے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ کے کہا۔

رابعہ نے کہا "ہاں۔ ہماری نیت تو صاف تھی۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ آج ہی بات ہو جائے مگر وہ بزدل ہیں۔ ڈرتے ہیں خواہ مخواہ۔"

"جھوٹا اور مکار آدمی کسی پر آسانی سے اعتبار نہیں کرتا۔" میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی اپنا لہجہ بدل لیا "اب کدھر جانا ہے؟"

"واپس" رابعہ نے کہا "تمھیں ہوٹل میں ڈراپ کرکے میں گاڑی لے جاؤں گی۔"

ہم نے راستے میں ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ ہم نے اسپتال کے اندر جا کے بہت کچھ دیکھ لیا ہے اور سمجھ لیا ہے جس کے سبب ہم پر اسپتال کی آڑ میں ہونے والے لرزہ خیز جرائم راز افشا ہو گئے ہیں اور اب ہم اصولی طور پر فیصلہ کر چکے ہیں کہ پس پردہ ہونے والی پُراسرار سرگرمیوں کو بے نقاب کرنا ہمارا اخلاقی قانونی اور معاشرتی فریضہ ہے۔ کم سے کم مجھے اس انکشاف نے سخت جذباتی صدمہ پہنچایا تھا کہ وزیر خان کے نام پر قائم ہونے والے رفاہی اسپتال میں بیماروں کو شفا نہیں ملتی۔ وہاں تو ایک عقوبت خانہ قائم ہے۔ وہ جگہ جیل خانے سے بدتر ہے۔ جیل خانے میں مجرم پہنچتے ہیں اور انھیں کسی قانون اور ضابطے کے مطابق نظامِ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے بعد اپنے جرم کی سزا کاٹنے کے لیے وہاں بھیجا جاتا ہے۔ یہاں بظاہر بے خبر اور معصوم لوگ ایک بھی جرم نہ ہونے والی قید کاٹ رہے تھے۔ پتا نہیں ان کا کیا جرم تھا۔ شاید کوئی جرم نہ ہونا ہی ان کا جرم تھا۔ میری طرح وہ بھی عداوت کی سازش کا شکار ہوئے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ کمزور تھے اور شکاری ان کے مقابلے میں زیادہ طاقتور۔ یا وہ سادہ لوح تھے اور شکاری زیادہ عیار۔ دنیا میں سب شکاری ہیں۔ ڈاروِن کے نظریے

www.paksociety.com

ارشاد کے مطابق جو حالات کا مقابلہ نہ کر سکے وہ معدوم ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے تو یہ بات یوں کہی تھی "ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات۔"

مجھے نہیں معلوم کہ راستے بھر رابعہ نے مجھ سے کیا باتیں کی تھیں اور میں نے کیا جواب دیا تھا۔ میرا ذہن بیک وقت دو طرفہ آزمائش کے عذاب سے دوچار تھا۔ مجھے بازو کی فکر تھی تو غالب پر غصہ تھا کہ اس نے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرنے کی جذباتی حماقت کا ارتکاب کیوں کیا۔ بازو تو خیر مجبور تھی مگر غالب کو رضاکارانہ طور پر مجبوری کی قید میں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ہمارے ساتھ ہوتا تو ہماری طاقت کم نہ ہوتی اور ہم بہرحال بازو کو چھڑا لیتے۔ اب ایک کے بجائے دو کی رہائی کا مسئلہ درپیش تھا۔

میرے اشتعال کے جذبات کا ایک ہدف استاد پیڈرو تھا تو دوسرا چوہدری دلاور۔ میں چاہتا تھا کہ دلاور کو اسی تہ خانے میں تڑپ تڑپ کے مر جانے دوں اور پیڈرو کو اس اذیت گاہ میں اسی طرح ذہنی و جسمانی طور پر معذور کر کے دھکیلتا ہوا موت کے اندھے غار تک لے جاؤں مگر یہ ابھی ناممکن تھا۔ میں مجبور تھا کہ دلاور کو زندہ رکھوں اور پیڈرو سے برابری کی سطح پر بات کروں۔

میں نے آفس بلاک کے نیچے گاڑی روکی اور بند کر دی۔ اسی وقت نیلے رنگ کی دو ٹاٹا سن ویگن گولی کی طرح ہمارے قریب سے گزر گئی۔ اس کی [illegible] تھیں مگر عقبی شیشے میں سے مجھے دو سر نظر آئے۔ ان میں سے ایک یقیناً استاد پیڈرو کا تھا۔ انہوں نے شاید دور سے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ اس خیال نے مجھے پریشان کر دیا کیونکہ سارا راستہ میں نے ایک بار بھی اس امکان پر غور نہیں کیا تھا اور پیچھے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یہ ایک فاش غلطی تھی جس کا خمیازہ کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر مجبوری نے دونوں طرف کے حریفوں کو جارحیت کے ارتکاب سے باز رکھا تھا اور احتیاط کی ضرورت نے دفاعی حکمت عملی کو ناگزیر کر دیا تھا۔

"یہ وہی تھے۔" رابعہ نے کہا۔

"ہاں اور یہ ہمارے تعاقب میں تھے۔ تم نے ایک بار بھی نہیں دیکھا؟"

رابعہ نے کہا "بیک ویو مرر تمہارے سامنے تھا مگر تم تو ذہنی طور پر نہ جانے کہاں تھے۔ خدا کا شکر ہے کوئی حادثہ نہیں ہوا۔"

"سوری۔ میں واقعی بہت اپ سیٹ ہوں۔" میں نے کہا۔

اوپر منظر کو سوتا پا کے مجھے حیرانی ہوئی۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ اس کا سر پشت سے لگا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں مگر منہ کھلا ہوا تھا اور وہ خراٹے لے رہا تھا۔ مولوی خادم حسین البتہ دوسری کرسی پر دونوں بازو اوپر اٹھا کے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اسی حالت میں منجمد ہو چکا ہے۔ اس کی حالت میں ہمیں دیکھ کے بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بس وہ پلکیں جھپکاتا رہا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کے میں نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور دبے پاؤں اندر جا کے چٹکی بھر نمک لے آیا۔ یہ نمک میں نے منظر کے حلق میں ڈال دیا۔

رابعہ زور سے ہنسی اور منظر ہڑبڑا کے اٹھا "بے غیرتی ہوا کی کی بھی بھوتنی کے۔ آخ۔ ارے مولوی صاحب پانی دو۔ مجھے مار کے۔ زہر دے دیا۔ دشمنوں نے مجھے۔ آف۔"

رابعہ نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا "کوئی بہت برا خواب دیکھ رہے تھے۔ سویٹ ہارٹ۔"

منظر نے دو بار غرارے کئے اور پانی نگل لیا پھر ایک سانس میں گلاس خالی کر کے میز پر رکھ دیا "اسی لئے نمک زیادہ کڑوا لگا کہ میں مٹھائی کھا رہا تھا۔"

"تقریب کیا تھی؟" میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"منگنی تھی میرے باپ کی۔ کوئی اعتراض ہے۔ تم تو مجھے بیہوش کر کے چلے گئے تھے اس حجلۂ عروسی میں۔" منظر نے مولوی خادم حسین کی طرف اشارہ کیا "اس منحوس دلہن کے ساتھ۔"

خادم حسین کے جسم میں حرکت ہوئی لیکن وہ بولا نہیں۔ پھر میں نے غور کیا تو وہ زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا "خادم کوئی وظیفہ پڑھ رہا ہے۔ دافع بلیات ختم کا۔"

خادم حسین نے اقرار میں سر کو خفیف سی جنبش دی۔

میں نے کہا "تم تو گھر جانے والے تھے؟"

"اب مقدر میں نہ ہو تو آدمی اپنے گھر کیا بڑے گھر بھی نہیں جا سکتا۔ ادھر تم نکلے ادھر فون آ گیا۔"

"کس کا فون آ گیا؟ پیڈرو کا؟"

"اس فرعونوں کا۔ مرزا غالب کے گھوڑے کا۔" منظر بولا۔

رابعہ نے اور میں نے ایک ساتھ کہا "غالب نے فون کیا تھا؟"

"اب تو کیا میں کرتا اسے فون۔"

"کہاں سے بول رہا تھا۔ تم نے اچھی طرح خیریت اس کی پوچھی نہیں؟"

"خیریت خوب لی میں نے سالے کی دو سنائیں۔ رابعہ تم ذرا باہر جاؤ تو میں بتاؤں۔" منظر بولا "اصل گالیاں جو میں نے دیں۔"

رابعہ ہنسنے لگی "گالیوں کو سنسر کر کے سنا دو۔"

"وہ ہے کہاں آخر؟" میں نے کہا۔

"وہیں جہاں اسے ہونا چاہئے۔ قید میں جہاں دونوں مل بیٹھے اور فون صبا کی مرضی سے کیا تھا۔"

مجھے سخت مایوسی ہوئی "اچھا؟ کیا بازو نے بھی بات کی تھی؟"

"نہیں خود اس بھوتنی والے کے حلق سے بات یوں نکل رہی تھی جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ کنپٹی پر ہو گی ریوالور کی نال لیکن کہہ رہا تھا کہ ہماری بالکل فکر مت کرنا ہم خیریت سے ہیں۔ خیریت کا بچہ۔"

رابعہ کا چہرہ اتر گیا "اور کیا کہا اس نے۔"

"اور یہی کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ بازو بھی آرام سے ہے۔"

رابعہ نے کہا "سچ تو کہہ رہا ہے بیچارہ۔ بلایا تھا صرف مترجم کے طور پر اور ساتھ دے رہا ہے ہر مصیبت میں۔ میرا خیال ہے خادم حسین کہ تھکن سے تمہارے اعصاب متاثر ہو رہے ہیں۔ تم اندر جا کے سو جاؤ۔"

مولوی افسوس سے سر ہلانے لگا "آپ بھی کم عقل نہیں ہیں جی۔ معاملہ اعصاب کا نہیں پیٹ کا ہے۔ خالی پیٹ تو کسی کو بھلا نیند آ سکتی ہے۔ قسم لے لیں جو دوپہر سے اب تک ٹھنڈی سانسوں کے سوا کچھ گیا ہو پیٹ میں۔ پیٹ میں بھوک سے دوڑنے والے چوہے تک نڈھال پڑے ہیں اور آپ کہہ رہی ہیں سو جاؤ۔ کتنا اچھا ہوتا اگر آدمی کا گزارا صرف نیند پر ہی ہو جاتا۔"

ہم سب کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ مولوی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ ہمیں تو ایک عادت سی ہو گئی تھی کہ کھانا جب ملا کھا لیا نہ ملا تو نہ سہی۔ جب وقت ملا نیند پوری کر لی ورنہ جاگ رہے ہیں مسلسل اور تھکن ہے تب بھی آرام کی فرصت نہیں۔ زندگی کسی معمول کی پابند نہیں رہی تھی مگر خادم حسین کی قوت برداشت اس امتحان میں فیل ہو جاتی تھی۔

منظر نے گھڑی دیکھی "اُف آدھی رات ہو گئی گھر پہنچتے پہنچتے اگلا دن شروع ہو جائے گا۔"

"کھانا کھا لو ہمارے ساتھ۔"

"مجھے جوتے کھانے ہیں گھر جا کے اور گالیاں کھانی ہیں سوئٹ ڈش کے طور پر۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا "اپنے ساتھ مجھے بھی نہ گھر کا رکھا نہ گھاٹ کا۔ اب یہ جو کرنا ہے کر ڈالے۔ آر یا پار۔ ہماری بھی جان چھوٹے اس روز روز کے عذاب سے۔"

"سچ بتاؤ جی۔ یہ گئے تھے کہیں کھانا کھانے۔ مجھے چھوڑ گئے تھے اکیلا یہاں اور خود سالم مرغ کھا کے آ گئے تھے۔"

"مولوی۔ ایک ٹانگ سالم جو تم نے نگلی تھی۔ وہ بھول گئے۔"

خادم حسین نے ایک آہ بھری "صرف ایک ٹانگ۔ معدے تک کہاں پہنچی۔ دانتوں میں ہی رہ گئی تھی۔"

میں نے کہا "منظر تم لے جاؤ نا رابعہ کو اپنے ساتھ۔ تمہارے ساتھ یہ بھی کھا لے گی جو تمہیں ملا۔"

"اللہ بھلا کرے تمہارا۔ تم ساتھ چلو گی تو خانہ جنگی کو روک لو گی ورنہ اس کی زبان جو ہے تو الیکٹرک قینچی کی طرح چلتی ہے مگر غصے میں بن جاتی ہے مشین گن۔ تمہارا بہت لحاظ کرتی ہے۔ یہ تو ہو گیا [illegible] کا خرچہ۔"

دو بجے گئے تو میں نے خادم حسین کو ساتھ لیا اور ہم دونوں نے ساتھ مین گیٹ کو مقفل کر کے نکل کھڑے ہوئے۔ مجھے خیال تھا کہ اس عمارت کے چوکیدار کو ان آفیشل چھٹی پر گئے ایک ہفتے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ مجھ سے وہ دو چار دن کی رعایت لے کر گیا تھا۔ دو اور چار کو جمع کرنے سے بھی چھ دن ہی بنتے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ

تب میں نے کہا کہ اچھا بیٹے جہاں رہو خوش رہو۔ دونوں پھولو پھلو۔ ہمارے ساتھ تو یہ ممکن نہیں تھا۔ ہم دشمن تھے تمہاری زنجیروں کے اور اصل دوست تو تمہارے دشمن ہیں۔ اب واپس مت آنا۔ لیکن لائن پتا نہیں کب کٹ گئی تھی۔ پتا نہیں اس نے کتنا سنا۔"

میں نے کہا "یہ بات غالب سے اس لئے کہلوائی گئی ہوگی کہ ہم بھی دلاور کو آرام سے رکھیں۔"

"میں بھی سمجھ گیا تھا۔ بس جذباتی ہو کے زیادہ بول گیا۔ ساری باتیں انہوں نے سنی ہوں گی۔ جو بھی وہاں ہوں گے۔ میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ پھر گھنٹی بجی اور کسی نے تمہارا پوچھا کہ سکندر بخت سے بات کرنی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کی والدہ ماجدہ نے بلایا تھا اسے اپنی خلوت خاص میں وہیں ملاقات کر لو بھوتنی کے۔ بے غیرت ہنسنے لگا اور بولا کہ وکیل صاحب اسے کہاں غائب کیا ہے ڈیئر۔ مدت سے درشن نہیں ہوئے۔ میں نے کہا کہ یہاں آؤ تو تمہیں ایک اور چیز دکھاؤں۔ تمہاری تسلی ہو جائے گی۔ وہ کہنے لگا کہ رابعہ کا گزارا آج کل کیسے ہو رہا ہے۔"

رابعہ کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔

"میں نے کچھ اور سنائیں تو بہت ہنسا کہنے لگا کہ اس کو بتانا آج شاید ملاقات نہ ہو۔ کل ملیں گے اگر خدا لایا۔ وقت اور جگہ وہی۔ پھر اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے اس حرام زادے کی آواز پہچان لی تھی حالانکہ وہ آواز بنا کے بول رہا تھا۔"

"استاد پیڈرو؟"

"ہاں تم ملے تو نہیں ہو گے اس سے؟"

میں نے کہا "نہیں یہ پیغام ملا ہے البتہ۔"

منظر نے رابعہ سے خط لے لیا "اچھا پھر تم اتنی دیر کہاں رہے؟ میں تو مجبور تھا یہاں بیٹھے رہنے پر۔ یہ مولوی خادم حسین تو بالکل شتر مرغ ہے جو خطرہ دیکھ کے ریت میں منہ چھپا لے۔ خطرہ ٹل جائے تو سر اٹھا کے چلنے لگے۔"

اب خادم حسین نے کہا "منظر صاحب سراسر زیادتی کر رہے ہیں آپ میرے ساتھ۔ کیسے خطرناک حالات میں آپ کا ساتھ دے رہا ہوں میں۔ اغوا، قتل، مار دھاڑ، بلیک میلنگ، لڑائی، لاش کا پوسٹ مارٹم۔ تب تب ادھر پولیس کی دشمنی اور خانہ خرابی۔ سب کچھ تو برداشت کر رہا ہوں میں۔ اچھا بھلا اپنے گھر میں بیوی کے ساتھ سو رہا ہوتا۔ الّو کی طرح نہ جاگ رہا ہوتا اس ویرانے میں۔"

جب منظر نے ہو ہو کر کے ہنسنا شروع کیا تو خادم حسین کو احساس ہوا کہ وہ انجانے میں کیا کہہ گیا ہے۔

خادم حسین نے سر کھجا کے کہا "اب تو بخش جاؤ گے جی۔ مجھے معلوم ہے مارا جاتا ہے غریب آدمی میرے جیسا۔ زبان پر غلبہ ضعف۔ ابھی قدر نہیں ہے تو بعد میں کون پوچھے گا۔"

www.paksociety.com

اب تک اپنی جیلی سے دوری کی ساری کسر پوری کرے گا۔ اگر میں نے ڈھیل دی اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے نہ ہونے سے بھی فرق نہیں پڑا تو وہ مہینے میں ایک دو بار چکر لگ جانے گا لیکن تنخواہ پوری لے گا۔ خیر جب تک کچھ نہیں ہوتا عیش کرے۔ کوئی بات ہوئی تو خود ہی پکڑا جائے گا۔

ہڈیان روڈ پر کھانا کسی پا نہیں تھا۔ لسی اور دودھ سے میرا گزارا ہو جاتا مگر خادم حسین کی تسلی مکمل ڈنر کے بغیر مشکل تھی۔ مجھے لکشمی چوک سے گزر کے ریلوے اسٹیشن تک جانا پڑا جہاں دن رات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ خادم کے ساتھ میں نے بھی کھانے میں مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر بہت جلد ہار گیا۔ واپسی پر ڈرائیونگ میں خادم حسین کو سونپنا چاہتا تھا۔

"مجھے راستے میں اتار دینا۔ تم کرشن نگر شاہو کے راستے آفس چلے جانا میں آجاؤں گا صبح ہونے سے پہلے۔"

اس نے سر موڑ کر چائے پیتے ہوئے سر ہلایا "اب اکیلا تو میں فرشتہ اجل کے ساتھ نہ جاؤں۔ آپ کا اور میرا ساتھ رہے گا ہر جگہ جی۔"

"میں بڑی خطرناک جگہ جا رہا ہوں۔"

"ہر جگہ خطرناک ہے جی میرے لئے جہاں آپ ہیں۔ یہاں بھی ہو سکتا ہے کوئی استاد پیدا ہو یا چوہدری دلاور اور خادم حسین کے سر پہ ایٹم بم مار سکتا ہے یا گولیوں کے ایک سو ایک سوراخ کر سکتا ہے۔"

"دفتر محفوظ جگہ ہے۔"

"قطعی نہیں جی کیا پتا میں وہاں پہنچتا ہوں یا راستے میں ہی کوئی اچک لیتا ہے۔ آفس جاؤں اور دروازہ کھولتے ہی بم پھٹے یا گولی لگے سر کے بیچ میں۔ کلمہ تک پڑھنے کا موقع نہ ملے۔۔۔؟"

"حد ہے یار۔ جب یہ جانتے ہو کہ موت سے تمہیں مفر نہیں تو پھر یہاں وہاں سب ایک ہی بات ہے۔"

"جی آپ کے ساتھ دل کو تھوڑی سی تسلی رہتی ہے جی۔"

مجبوراً میں نے خادم حسین کو بھی ساتھ ہی لیا۔ ہوٹل میں بل ادا کرتے ہوئے میں نے ایک جلی ہوئی خشک روٹی بھی لے لی۔ ایسی روٹی گاہک کے سامنے نہیں رکھی جا سکتی چنانچہ تنور والا خود ہی ایک ٹین کے کنستر میں ڈال دیتا تھا۔ ہوٹل کے مالک نے عنایت خسروانہ سے کام لیتے ہوئے مجھے وہ روٹی بلا معاوضہ پیش کر دی اور میں نے اسے کاغذ میں لپیٹ لیا۔

خادم حسین کا تجسس بیدار ہو گیا تھا "یہ کس لئے جی؟"

میں نے کہا "تمہیں بار بار بھوک لگتی ہے نا۔ بعض اوقات فرصت نہیں یا وقت نہیں ہوتا۔ کچھ موجود ہونا چاہئے آڑے وقت کے لئے۔"

خادم حسین نے برا سا منہ بنایا "آڑے وقت میں یہ کھاؤں گا تو خود بھی آڑا لیٹ جاؤں گا۔"

میں نے وہ روٹی کو پیچھے بونٹ اٹھا کے انجن پر ایسی جگہ رکھ دیا جہاں سے وہ گر نہیں سکتی تھی اور بونٹ بند کر کے چابی خادم کو دے دی۔

"تم او بھینے لگے ہو گاڑی چلا لو گے؟"

"مجبوری ہے جی۔ نام بھی خادم ہے اور نوکر تو نوکر ہوتا ہے انکار کیسے کر سکتا ہے۔ حادثہ ہو جائے تو برا مت مانئے گا۔" وہ مذاق کے موڈ میں آ گیا تھا۔

میں پچھلی سیٹ پر لیٹ کے اسے ہدایات دیتا رہا اور راستہ بتاتا رہا کہ اب ہم کہاں ہیں۔ رابعہ کے گھر کے پیچھے ایک گلی پر گاڑی روک کے میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ اسی جگہ میرا انتظار کرے لیکن گاڑی میں بیٹھ کے نہیں۔ گاڑی اندھیرے میں دو بلڈنگوں کے درمیان ایسے کھڑی تھی کہ دور سے نظر بھی نہیں آتی تھی۔ خادم ٹہلتا ہوا گلی کے آخر تک گیا اور ایک کوٹھی کے باہر بنے ہوئے چوکیدار کے کیبن میں بیٹھ گیا۔ وہ کوٹھی خالی تھی۔ اب وہاں کوئی چوکیدار نہیں تھا۔

"اب یہاں سو مت جانا۔ نظر رکھنا دونوں طرف۔ گاڑی پر بھی اور مجھ پر بھی۔"

اس نے ٹھنڈی سانس لی "چار آنکھیں ہوتیں تو آپ کہتے کہ چاروں طرف نظر رکھنا۔"

میں کسی دشواری کے بغیر تہہ خانے کے اندر پہنچ گیا جو رابعہ کی کوٹھی کے خالی پلاٹ پر تھا۔ اس میں سے گزر کے بیسمنٹ تک پہنچنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے کیبن جیسے صندوق کا ڈھکنا آہستہ سے اٹھایا اور اندر اتر گیا۔ وہ روٹی میرے ہاتھ میں تھی جو انجن کی گرمی سے سوکھ کے سخت بھی ہو گئی تھی۔ اندر تختہ اسکریو ڈرائیو سے حفاظت رکے ہوئے تھے۔ کوئی تو تحت کے بغیر نے اسکریو ڈھیلے کئے اور وہ تختہ الگ کر دیا جو عین فرش کے شگاف پر تھا۔

نیچے گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی ڈالی تو دلاور مجھے فرش پر پڑا ہوا نظر آیا۔ اس نے ایک دم اٹھنے کی کوشش کی مگر نقاہت کے باعث پھر گر گیا۔ میں تہہ خانے میں اترا تو دلاور مجھ پر حملہ کرتا تو میری ایک لات سے دور جا کر گرتا۔ اس میں جسمانی ہمت تھی اور وہ ذہنی طور پر بھی مجھ سے مقابلہ نہیں سوچ سکتا تھا۔ اس کی اصل طاقت دولت تھی جو اسلحہ کے غلام جاں نثار اور کرائے کے قاتل سب فراہم کرتی تھی۔

دلاور کی حالت عبرت آموز ہو گئی تھی۔ اس کی شیو بڑھی تھی اور بکھرے ہوئے بال گرد آلود ہو رہے تھے۔ فرش پر لیٹنے سے اس کے کپڑے بھی مٹی میں بھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بے خوابی اور وحشت تھی اور دیوانگی کے آثار تھے۔

اس سے پہلے کہ میں دلاور سے خیریت پوچھتا وہ عجیب ہوئی اور متفکر تیز حد تک بے تحری آواز میں بھوں بھوں کر

"تم۔ مذاق مت سمجھو میری بات کو۔"

میں نے اسے ایک ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلا کے دور جا گرا "موت کو مذاق تم سمجھ رہے ہو۔ زندگی کا ایک دن لیا ایک سیکنڈ نہیں خرید سکے اپنی ساری دولت سے دلاور۔ موت کا فرشتہ مقررہ وقت پر آتا ہے اور جان لئے بغیر ٹلتا نہیں۔"

وہ فرش پر سر رکھ کے رونے لگا "مجھے مت مارو۔"

میں نے کہا "ابھی نہیں ماروں گا میں تمہیں۔ تمہاری زندگی ویرانی ہے تو کیسے مار سکتا ہوں تمہیں۔"

"مجھے زندہ رکھنے دیا مجھے اس قید خانے میں۔ سکندر کہاں ہے اس سے کہو ایک بار میری بات سن لے۔"

"کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ۔ میں اس کو تمہارا پیغام پہنچا دوں گا۔ پیسہ چاہئے؟ کتنا چاہئے بولو۔" میں نے جیب میں سے کچھ نوٹ نکالے اور اس کی طرف اچھال دیے "یہ لو۔ کافی ہے یہ رقم یا۔۔۔"

"مجھے۔ مجھے کھانے کے لئے کچھ چاہئے۔ تھوڑا سا پانی لا دو مجھے۔" وہ رونے لگا۔

"خرید کیوں نہیں لیتے سب کچھ۔ فون کرو شیزان یا فلیٹیز کو۔ اتنے دولت مند ہو تم کہ ہوٹل خرید سکتے ہو۔ میرے پاس تو یہی روٹی ہے۔" میں نے اسے جلی ہوئی اور سوکھی ہوئی روٹی کی جھلک دکھائی۔

اس نے گرسنہ نظروں سے روٹی کو دیکھا اور آگے آیا "لاؤ یہی دے دو۔"

"یہ بالکل خشک اور جلی ہوئی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں گزارا کر لوں گا۔ لاؤ۔" اس نے قریب آ کے ہاتھ بڑھایا۔

میں نے اس کی تھوڑی کے نیچے بوٹ سے زبردست کک ماری۔ دلاور چیخ مار کے فرش پر لوٹنے لگا۔ اس کے ہونٹوں سے خون جاری ہو گیا تھا۔ میں نے دو ٹھوکریں اس کی پسلی میں ماریں "یہ کھانا کیسا ہے؟ جوتے لاتیں اور گالیاں سب کھاتے تھے تمہارے زر خرید۔ آج تم بھی مزہ چکھو۔"

وہ ذبح کئے ہوئے بکرے کی طرح آوازیں نکالنے لگا اور تڑپنے لگا "نہیں۔ میں مر جاؤں گا خدا رسول کے لئے۔ مجھ پر رحم کرو۔ میرے بچے۔ میرے گھر۔ میرے بیوی بچے انہیں بلا دو۔"

"وہ آ جائیں گے تمہارے مرنے کے بعد۔" میں نے کہا "ان کے سامنے تمہاری لاش کے ٹکڑے کتوں کے آگے ڈالے جائیں گے۔ وہ تمہاری ہڈیاں تک چبا جائیں گے۔ کئی دن کے بھوکے کتے باہر سامنے بھی ہیں۔"

وہ کراہنے لگا "پانی۔ پانی۔"

میں نے ایک پر نفرت قہقہہ بلند کیا "پانی ہو گے۔ تھوڑا سا پانی میرے جسم کے اندر جمع ہے۔ وہی پلا سکتا ہوں میں۔ منہ کھولو اپنا۔"

رونے لگا۔

میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ ٹارچ کی روشنی اس کی آنکھوں کو چندھیا رہی تھی۔ میں اسے دیکھ سکتا تھا مگر وہ میری صورت دیکھنے سے قاصر تھا۔

آہستہ آہستہ اس نے اپنے وجود کو کسی کوڑھی یا مفلوج بھکاری کی طرح ہاتھوں کے بل فرش پر گھسیٹنا شروع کیا "تم کون ہو خدا کے لئے رحم کرو مجھ پر۔"

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اپنی آواز بدل کے میں نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا جو اس آسیب زدہ تہہ خانے کی ویرانی میں موت کی سفاک ہنسی بن کے گونجا "تم نہیں پہچانتے مجھے؟ پہچانو گے بھی کیسے؟ کبھی پہلے مجھے دیکھا جو نہیں۔ تم نے سنا ضرور ہو گا میرے بارے میں لیکن سوچا نہیں ہو گا کہ اتنی جلدی مجھ سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ پہچانو مجھے دلاور۔ میں موت کا فرشتہ ہوں۔ ہا ہا ہا۔۔۔"

دلاور کا جسم یوں کانپنے لگا جیسے ناقابل برداشت تیز بخار میں کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا "موت۔۔۔ موت کا فرشتہ۔ نہیں جھوٹ بول رہے ہو تم۔ یہ وردی۔ تم چوکیدار ہو۔ میری حفاظت پر مامور ہو۔ چوکیدار۔ میری بات سنو۔ دیکھو وہ تمہیں کیا دیتا ہے۔ دو چار سو۔ میں تم کو سو گنا ہزار گنا زیادہ دے سکتا ہوں دو لاکھ چار لاکھ۔ بس مجھے یہاں سے نکال دو۔"

میں نے سوچ کے کہا "یہ۔ یہ تو کم ہیں۔"

اس نے محسوس کیا کہ بولی بڑھا کے وہ مجھے خرید سکتا ہے "اچھا تم بولو کتنا چاہئے۔ خود بتا دو۔ پانچ لاکھ لے لو۔ اچھا دس لاکھ۔"

میں نے کہا "مجھے منظور ہے۔ لاؤ نکالو دس لاکھ۔"

"تم۔ تم میرے ساتھ چلو۔" وہ تھوڑا سا آگے آیا "میرے گھر۔"

"ضرور چلوں گا۔ پہلے دس لاکھ تو دو۔"

"یہاں۔ یہاں دس لاکھ۔ چوکیدار۔ میں تو قیدی ہوں۔ کچھ نہیں ہے میرے پاس یہاں مگر میں بہت دولت مند آدمی ہوں۔ چوہدری دلاور نام ہے میرا۔ بڑے بڑے دولت مند لوگ جانتے ہیں مجھے۔"

"جانتے ہوں گے۔ میں تو سیدھی بات جانتا ہوں۔ دس لاکھ دو اور چلو میں تمہیں خود باہر نکال کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔"

وہ اور آگے آیا "مجھ پر اعتبار کرو۔ میں پورے دس لاکھ نقد دوں گا۔ بعد میں۔"

"بعد کی بات مت کرو۔ ادھار سودا نہیں ہو سکتا۔ دس لاکھ نہیں۔ صرف دس روپے نکالو دلاور سیٹھ۔ آزادی صرف دس روپے میں خرید لو۔ فرشتہ اجل سے زندگی صرف دس روپے میں لے لو۔"

www.paksociety.com
www.paksociety.com

دلاور مجھے گندی گالیاں بکنے لگا۔ اس کا ذہنی توازن بگڑ رہا تھا۔

میں نے اس کے قریب بیٹھ کے روٹی کو اس کے سامنے کیا "دیکھو یہ روٹی۔ تمہارے کتے بھی شاید نہ کھاتے۔ اس وقت یہ روٹی جان بچا سکتی ہے تمہاری۔"

اس نے ایک دم روٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ وہ آگے آیا تو میں پیچھے کھسک گیا "ہوں۔ لے لو یہ روٹی۔ آگے بڑھو۔ پانی بھی ملے گا۔ پہلے یہ روٹی کھا لو۔ ایسے نہیں چاروں ہاتھوں پیروں پر چل کے آؤ۔"

وہ پاگل کتے کی طرح میرے پیچھے چلنے لگا۔ اس کی نظر روٹی پر تھی۔ میں نے اسے بھونکنے کے لئے کہا تو وہ سچ مچ بھونکنے لگا۔ کمزوری اور تھکن کے باوجود اس جلی ہوئی سوکھی روٹی کے لئے اس نے اتنے بڑے کمرے کا پورا چکر لگایا اور پھر تھک کے گر گیا۔

میں نے روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کے اس کے سامنے ڈال دیا۔ اس نے لپک کر وہ ٹکڑا اٹھایا اور منہ میں ڈال کے چبانے لگا۔ وہ اس وقت انسان نہیں ایک جانور تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں دیوانگی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے پاس فلم بندی کرنے والا کیمرا نہیں ہے ورنہ میں اس منظر کو محفوظ کر لیتا۔

تھوڑا سا پیچھے ہٹ کے میں نے دوسرا ٹکڑا پھینکا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کے اسے بھی اٹھا لیا حالانکہ اس پر مٹی بھی لگ گئی تھی۔ اسے خشک روٹی کو چبانے اور نگلنے میں سخت دشواری ہو رہی تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا اور روٹی کو حلق سے اتارنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہا تھا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ خشک حلق سے وہ روٹی ایسے اتر رہی ہوگی جیسے سوکھے اور موٹے گتے کے ٹکڑے، خشک گھاس یا درختوں کی چھال۔ لیکن وہ کھا رہا تھا اور چبائے بغیر اسے نگلنے کی کوشش میں بار بار اگل رہا تھا پھر اٹھا رہا تھا اور مٹی کی پروا کئے بغیر منہ میں ڈال کے دانتوں سے پیس رہا تھا۔

آدھی روٹی کھانے کے بعد اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس کی آواز بند ہو گئی کیونکہ روٹی نے اس کے حلق کا راستہ روک دیا تھا۔ وہ اب عجیب سی آوازیں نکال کے ابکائیاں لے رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مر جائے چنانچہ اوپر جا کے میں ایک گلاس میں پانی لایا۔ یہ اشیائے خورونوش خیمے میں پہلے سے موجود تھیں۔

اس نے پانی یوں پیا کہ اسے کئی بار پھندا لگا اور کھانسی کے ساتھ حلق سے روٹی کے ٹکڑے واپس گلاس میں آئے مگر وہ سب پی گیا۔ پھر میں نے اسے باقی روٹی دے دی۔ وہ روٹی کو دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھانے لگا۔ پانی پیتے ہی اس کی جسمانی توانائی کچھ بحال ہو گئی تھی۔

"ابھی رات ہے دلاور۔" میں نے کہا "صبح تمہیں ہر چیز مل سکتی ہے۔ ناشتے میں حلوہ پوری۔ گرما گرم چائے۔ لسی یا دودھ۔"

وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا اور مجھے ایسے دیکھنے لگا جیسے پالتو کتا اپنے مہربان مالک کو دیکھتا ہے۔

"میرا کہنا مانو گے؟ جو میں کہوں گا کرو گے؟" میں نے ...

اس نے اقرار میں سر ہلایا "کروں گا۔"

میں نے کہا "اچھا یہ کپڑے اتار دو۔ اور دونوں ... سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"

میرا خیال تھا کہ وہ انکار کرے گا یا تذبذب کا مظاہرہ کرے گا لیکن مجھے بڑی حیرت ہوئی جب ایک لمحے کا توقف ... اس نے میرے حکم کی تعمیل کی اور الف ننگا کھڑا ہو گیا۔ اس کی مزاحمت بالکل ختم ہو چکی تھی۔

میں نے کہا "چلو سر کے بل کھڑے ہو جاؤ۔ وہاں دیوار ... کے سامنے۔"

اس نے کوشش ضرور کی لیکن یہ جسمانی طور پر اس کے لئے ناممکن تھا۔

میں نے کہا "اچھا چھوڑو۔ چوہدری دلاور۔ ذرا اپنا حال دیکھو آئینے میں۔ اس وقت کیا ہو تم۔ تمہاری دولت اور طاقت کہاں ہے جس پر تمہیں اتنا غرور تھا۔ اگر تم کو وہ سب اس حالت میں دیکھ لیں۔ بڑے بڑے دولت مند جو تمہاری عزت کرتے تھے۔ تمہارے نوکر چاکر حکم کے غلام۔ بیوی بچے ..."

وہ زمین پر گر گیا اور دھاڑیں مار مار کے رونے لگا "یہ میرے اعمال کی سزا ہے۔"

"آج پہلی بار سچی بات کی ہے تم نے۔ کیا تم چاہو گے کہ ساری دنیا کو تمہارا تماشا دکھاؤں؟"

"نہیں اس سے تو بہتر ہے کہ تم مجھے مار ڈالو۔" وہ چیخا۔

"ابھی سے موت کی آرزو کرنے لگے ہو۔ موت اتنی آسانی سے نہیں ملے گی دلاور۔" میں نے ریوالور نکال کے اسے دکھایا "اس کی ایک گولی کی قیمت کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ مگر لاکھوں، شاید کروڑوں اسلحے کی تجارت میں ہی کما لئے تھے ... نہیں بچا تھا تم نے لوٹ کے تاجروں کو۔ مگر اس وقت تم کتنے بے بس اور مجبور ہو۔ تم واقعی مرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ میں ایسے جینے سے مرنا بہتر سمجھتا ہوں۔"

میں نے قریب جا کے ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا "تمہاری مرضی۔ اپنی آخری خواہش بتا دو۔ کیا ہوگا اس دولت کا؟ تم نے وزیر خان کو قتل کر کے میر شرافت علی کو مروا کے ... لاکھوں بے گناہوں کی جان لے کے جمع کی تھی ... جائیداد ..."

وہ لرزنے لگا "میں سب واپس کر دوں گا۔ ... ایک بار رانا کو بلا کے لے آؤ۔ یہی آخری خواہش ہے میری۔"

میں نے ریوالور ہٹا لیا "رانا صاحب کون ہیں دلاور؟"

وہ اس سوال کے لئے بالکل تیار نہ تھا "رانا صاحب ..."

میں نے ریوالور کا دستہ اس کے جبڑے پر مارا "... اسپتال میں کیا ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر شاہ کون ہے، رانا کون ہے؟"

"محسن کی بہن فوزیہ کو اور اس کے شوہر کو اغوا کرنے کے لئے۔"

جواب بم کے دھماکے کی طرح تھا "فوزیہ کو؟" میں نے چیخ کے کہا "اس نے کیا بگاڑا تھا تمہارا۔ اب کہاں ہیں وہ؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

میں اس پر ٹوٹ پڑا "تجھے یقیناً معلوم ہے بتا مجھے نہیں تو میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔"

اس میں اتنا دم ہی کہاں تھا کہ میرے وحشیانہ حملے کا مقابلہ کر سکتا۔ نازو کی بے بسی کی وجہ اب میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ معاملہ اس کے اپنے سگے بھائی اکرام شیخ کا ہوتا تو شاید وہ ڈٹ جاتی۔ خون کے اس آخری رشتے کو بھی داؤ پر لگا دیتی مگر فوزیہ کی وجہ سے وہ مجبور ہو گئی تھی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ دلاور بے حس ہو گیا ہے۔ اب میرے گھونسے لاتیں اس پر کوئی اثر نہیں کر رہی ہیں۔ میں نے اپنے اشتعال پر قابو پا کے اسے غور سے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے اس کی سانس رک گئی ہے۔

میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا اور پھر کان لگا کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مر جائے اور پھر میرے ہاتھوں ہونے والے اس قتل کے جرم کی سزا غالب اور نازو کو ملے۔ ان کی رہائی کے لئے دلاور کا زندہ رہنا ضروری تھا۔ دوسرے مجرموں تک پہنچنے اور دلاور سے اس کے ماضی کے ہر جرم کا اعتراف کرانے کے لئے بھی یہ لازمی تھا کہ دلاور ہماری قید میں رہے مگر زندہ رہے۔

لیکن اس کے دل کی دھڑکن خاموش تھی۔

تنفس اور حرکت قلب کی بحالی کے طریقے میں نے سیکھے بھی تھے مگر آزمائے کبھی نہیں تھے۔ فرسٹ ایڈ کے اصول اس وقت زندگی بچا لیتے ہیں جب ڈاکٹر دستیاب نہ ہو اور مریض کو اسپتال پہنچانا فوری طور پر ممکن نہ ہو۔

باہر کے ملکوں میں طبی امداد فراہم کرنا ہر شہری کی تعلیم اور معاشرتی ذمے داری کا لازمی حصہ سمجھا جاتا ہے اور ناگہانی حادثے کی صورت میں ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ڈاکٹر یا ایمبولینس کے آنے تک اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں اول تو قانونی ایجنسیوں کے خوف سے کوئی بھی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے کر دخل در معقولات کا الزام نہیں لیتا۔ زیادہ سے زیادہ کوئی ایمبولینس والوں کو فون کر دیتا ہے۔ باقی رہے نام اللہ کا۔ زندگی ہوئی تو وقت پر ایمبولینس بھی آ جائے گی، ڈاکٹر بھی فوراً توجہ دیں گے اور دوا بھی دستیاب ہو جائے گی ورنہ انا للہ۔

میرے لئے دلاور کا مر جانا جیتی ہوئی بازی میں بساط الٹ جانے کے مترادف ہوتا۔ جس شکاری کو زیر دام لانے کے لئے میں نے اپنی زندگی کے روز و شب، ساری توانائی، تمام وسائل صرف

"تم یہ سب کیسے جانتے ہو۔ کون ہو تم؟" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کی گردن دبوچ لی اور اسے دیوار پر دے مارا "یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔"

وہ دیوار سے ٹکراتے ہی نیچے گرا تو بے سدھ ہو گیا۔ میرے ہلانے جلانے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو میں نے اس کے چٹکی لی مگر وہ مکر نہیں کر رہا تھا۔ وہ واقعی بے ہوش ہو گیا تھا۔

ایک بار پھر مجھے اس کے لئے پانی لینے اوپر جانا پڑا۔ اس بار میں خیمے سے موم بتی بھی لے آیا۔ اسے جلا کے میں نے پگھلے موم کا ایک قطرہ دلاور کی پیشانی پر ٹپکایا مگر اس پر اثر نہیں ہوا۔ میں نے قریب بیٹھ کے اس پر پانی کے چھینٹے ڈالے تو وہ کراہنے لگا۔ اس کے ہوش میں آنے سے پہلے میں بسکٹوں کا ایک پیکٹ بھی اٹھا لایا اور پانی کے بھرے ہوئے گلاس کے قریب رکھ دیا پھر میں کرسی پر جا بیٹھا۔

دس منٹ بعد اسے ہوش آ گیا لیکن اٹھ کر بیٹھنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ آنکھیں کھولے چھت کو تکتا رہا۔

میں نے کہا "دلاور دیکھو تمہارے قریب ہی پانی ہے اور بسکٹ بھی ہیں۔"

اس نے بے یقینی سے سر گھمایا اور ایک دم اٹھ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ بڑھانے سے پہلے میں نے دونوں چیزیں اٹھا لیں۔ "تم سے کچھ پوچھا تھا میں نے۔ یاد ہے رانا کون ہے؟"

"رانا... میرا ساتھی ہے۔" دلاور نے آہستہ سے کہا "بزنس پارٹنر۔"

"ویری گڈ۔" میں نے ایک بسکٹ اس کی طرف پھینکا پھر دوسرا۔ وہ اٹھا اٹھا کے کھاتا گیا۔

"رانا کا پورا نام کیا ہے۔ کہاں رہتا ہے وہ؟"

"رانا شوکت علی۔ گلبرگ میں کوٹھی ہے اس کی۔ گلبرگ تھری میں۔" اس نے سمجھ لیا تھا کہ اب اسے ہر سوال کا جواب دینا ہی پڑے گا۔

"اچھا رانا کے علاوہ اور کون ہے تمہارے ساتھ؟"

اس نے دو نام اور بتائے۔ ان کے پتے اور ٹیلی فون نمبر سب اسے یاد تھے۔ اس نے اپنے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں بتایا اور اسپتال کے بارے میں بھی ہر سوال کا صحیح جواب دیا۔ سارے بسکٹ کھانے اور پانی پینے کے بعد اس کی ذہنی، جسمانی صلاحیتیں اس حد تک بحال ہو گئی تھیں کہ اس نے مجھ سے کپڑے پہننے کی اجازت مانگی۔ وہ جانور سے پھر انسان بن گیا تھا۔

میں نے اسے اجازت دے دی "چوہدری دلاور۔ استاد ریڈ ... کو تم نے کہاں بھیجا تھا؟"

"کراچی" دلاور نے مٹی دھول کی پروا کئے بغیر کپڑے پہن لئے۔

"کس کام سے؟"

www.paksociety.com

کرنے تھے۔ اُمیدوں کا سرمایہ جھونک دیا تھا، ارمانوں کا خون رنگ اور خوابوں کا اُبال قربان کردیا تھا وہ ایک حادثاتی غلطی سے مجھے احساسِ شکست دے کر مرجائے اور میری کامیابی میں احساسِ جرم کی ندامت شامل ہوجائے، یہ مجھے منظور نہیں تھا۔

میں نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر دلاور کو سیدھا چت لٹا کے اس کے سینے پر دل کے مقام کو دبانا شروع کیا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس پر پورا دباؤ ڈال کے دل کو متحرک کرنے کی کوشش کی اور اس کے منہ سے منہ لگا کے پوری قوت سے اپنا سانس اس کے پھیپھڑوں میں بھردیا۔

میری چند سیکنڈ کی کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ دلاور کا رکنے والا دل پھر دھڑکنے لگا اور اس نے ایک جھٹکے سے سانس لیا پھر سانس خود چلنے لگا اور میں نے دل کو معمول کے مطابق اپنی توانائی سے چلنے کا موقع فراہم کیا۔ آکسیجن کی فراہمی بحال ہوتے ہی جسم کے ایندھن نے زندگی کی حرارت پیدا کردی اور دلاور موت کی سرحد کو چھو کے لوٹ آیا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ زندگی اور موت کے درمیان یہ وقفہ نہایت مختصر ہوتا ہے جب کوشش کی جاسکتی ہے کہ جسم کے سارے طبعی افعال پھر معمول پر آجائیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک منٹ۔ اس کے بعد سب سے پہلے دماغ کے خلئے آکسیجن کی کمی سے مرنے لگتے ہیں اور دماغ کو پہنچنے والا نقصان ناقابلِ تلافی ہوتا ہے۔ جسم کی موت کے بعد جب دماغ بھی مرجائے تو موت قطعی کہلاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے CLINICAL DEATH قرار دیتے ہیں۔

دلاور کے جسم پر پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور شاید وہ کمزوری بھی محسوس کررہا ہوگا۔ یہ ایک قدرتی بات تھی۔ اس کی وقتی کیفیت تھی جو دل کے دورے سے جانبر ہونے والے کی ہوسکتی ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اسے کچھ آرام ملے اور مناسب خوراک کے ساتھ طبی امداد بھی ورنہ اس کی حالت پھر بگڑنے کا امکان تھا لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں اسے اسپتال نہیں لے جاسکتا تھا اور نہ ہی ڈاکٹر کو اس تہ خانے میں نہیں لاسکتا تھا۔

میں نے اپنی طبی معلومات پر انحصار کیا۔ دل کے مرض اتنے عام تھے کہ ان کے بارے میں معلومات بھی عام ہوتی تھیں اور دوا علاج کے ساتھ احتیاط کے مسائل پر اخبارات و رسائل میں مضامین بھی میں پڑھتا ہی رہتا تھا۔ صحت کے بارے میں آگاہی کو ترقی یافتہ معاشرے میں بنیادی اہمیت حاصل تھی اور میں نے لندن میں رہتے ہوئے اچھی خاصی میڈیکل انفارمیشن حاصل کرلی تھی۔

باہر آکے میں نے خادم حسین کو تلاش کیا۔ وہ اس خالی کیبن میں بے بسی اور مظلومیت کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ وہ عجیب شخص تھا۔ شاید خبطی یا قنوطیت پسند تھا۔ وہ خوش ہونا جانتا ہی نہیں تھا اور رضاکارانہ طور پر ناخوشی اور پریشانی کے اسباب تلاش کرنا اسے پسند تھا ورنہ وہ میرا ساتھ چھوڑ کے بھی جاسکتا تھا۔ اسے کوئی مجبوری لاحق نہیں تھی کہ میرے ساتھ رہ کے خطرات مول لے

اور مصائب کا شکار ہو تو مجھ سے یا تقدیر سے شکایت کرے۔ دکھ اور پریشان حالی میں بھی اس کے لیے تسکین کا کوئی پہلو تھا کہ وہ خود اپنے ساتھ خوار ہورہا تھا اور دن رات رونے کو تیار تھا۔

میں نے اسے بلا کے کہا "کیا سوگئے خادم حسین؟"

وہ بڑبڑا کے اُٹھا تو کہنے لگا "سو تو اب کہاں ہمارے نصیب میں" اس نے ایک آہ بھری "جب ہر طرف زندگی منڈلا رہا ہو تو کون کافر سوسکتا ہے۔"

میں نے کہا "کہتے ہیں نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔"

"ہاں جی۔ پھانسی کی نیند سویا تاہے بندہ" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ اس نے منہ بگاڑ کے جماہی لی "اب کیا حکم ہے؟"

"حکم کیا خادم۔ درخواست کرسکتے ہیں تم سے۔ چلو ذرا اسپتال تک۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "خیریت تو ہے نا جی۔ طبیعت ٹھیک نہیں لگتی آپ کی۔ نہیں اللہ نہ کرے کہ اگر ایسا ہے تو پھر کیا آپ کو؟ دو انجکشن لگیں گے تو چل جائیں گے جناب مگر آپ ویٹنگ میں لوگ ہوں گے۔"

"یار ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ بس ذرا دلاور کی حالت خراب ہے۔" خادم نے گاڑی اسٹارٹ کی "دل کا دورہ" کا نام ہے اس کو دو اسے کچھ نہیں ہوگا مجھے یہ تجربہ ہے۔

"تم کیا کروگے؟"

"سورہ یٰسین پڑھوں گا اس کے سرہانے۔ تب تو ثواب ہی ہوجائے گا بس۔"

میں نے ایک اسپتال کی ساری رات کھلی رہنے والی ڈسپنسری سے گلوکوز وغیرہ اور ہیپارین کا انجکشن لیا اور جو دوا میں نے مانگی تھی کیسٹ نے کہا "وہ علیم ہی کے لیے چاہیے؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے مریض کے لیے۔"

"مریض کہاں ہے کون ہے؟" وہ شکی مزاج آدمی تھا۔

میں نے کہا "گھر پر ہے۔ میرا بڑا بھائی ہے۔"

"انجکشن کس نے لکھا ہے۔ نسخہ دکھاؤ" اس کے لہجے کی رکھائی اور ہٹ دھرمی کے باعث یہ کیا اور مجھے یہ اعتبار کیا جاسکتا تھا۔

میں نے وضاحت کرنے کی کوشش کی "دراصل وہ دل کے مریض ہیں۔ اس وقت ان کا علاج کرنے والا ڈاکٹر تو ہے مگر انہوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ یہ دوا میں لادوں۔"

"اندر جاکے ڈاکٹر سے کہو۔ الو دل کا دورہ ہے تو اسے لانا چاہیے تھا۔ دیکھو شاید ڈاکٹر تمہارے ساتھ چلا جائے۔"

اسی وقت اندر سے ڈاکٹر نمودار ہوگیا اور کیسٹ نے ساری بات بتادی "یہ دوائیں ایسے نہیں دی جاتیں۔ میں ساتھ چل کے دیکھ لیتا ہوں مریض کو۔"

انکار کی صورت میں میری پوزیشن زیادہ مشکوک ہوجاتی۔ پہلے ہی یہ سمجھ رہے تھے کہ میں یا خادم نشے کے عادی ہیں

"کیا کرتے ہو۔ میں خود بھی دیوار پھاند سکتا ہوں" وہ بوکھلا گیا "یہ کیا فرش کھلنے کا ہے"

گھاس کیا۔ اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ تم مجھے یہاں مار کے تو نہیں ڈال دوگے۔ بولتے کیوں نہیں" میں اندر جاتا ہوں کہ

میں نے کہا "ہم نیکی کا صلہ بدی سے نہیں دیتے۔ تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تمہیں واپس اسپتال پہنچانا ہماری ذمے داری ہے۔ اب ذرا سنبھل جاؤ۔ ہم نیچے جارہے ہیں ایک تہ خانہ ہے مگر اس کا زینہ نہیں ہے۔ میں تمہیں نیچے اتاروں گا بلکہ لٹکاؤں گا تم فرش پر کود جانا۔"

"کتنی بلندی ہے؟ میری ہڈیاں۔۔۔"

"ہڈیاں نہیں ٹوٹیں گی۔ آٹھ دس فٹ کی بلندی ہے۔ چلو ادھر۔۔۔ پاؤں نیچے لٹکاؤ اور اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دو۔"

وہ تہ خانے کے فرش پر سنبھل سے اُترگیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی نیچے پہنچا اور میں نے اس کی آنکھوں پر سے پٹی اتاردی۔ اس نے حیرانی اور خوف سے آسیب زدہ نظر آنے والے ویران کمرے کے ماحول کو اور پھر چوہدری دلاور کو دیکھا جو اب فرش پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔

"یہ کون ہے؟" ڈاکٹر بولا۔

میں نے کہا "کمال ہے۔ تم نے پہچانا نہیں۔ یہ تمہارے علم شدہ لوگ کا چہرہ ہے۔ اب تم کوئی سوال مت کرنا ورنہ میں تمہاری زبان اور تمہارے انگوٹھے کو حلق سے اکھاڑ دوں گا۔ تمہاری طبیعت خراب ہوگئی تھی اس لیے میں ڈاکٹر کو تمہارے علاج کے لیے بلایا ہوں۔"

دلاور چلّانے لگا "بہت چالاک ہو تم۔ یہ ڈاکٹر نہیں ہے۔"

"میں ڈاکٹر ہوں۔ بھروسا کرو۔"

"ڈاکٹر۔ خاموشی سے مریض کا معائنہ کرو۔ نہ کچھ اسے بتانے کی ضرورت ہے اور نہ اس سے کچھ پوچھنے کی" میں نے خطرناک انداز میں کہا اور دلاور سے کہا "یہ شور ہو کہ میں تم کو بھی دوسرے کمرے میں بند کرنے پر مجبور ہوجاؤں۔"

دلاور نے کہا "تم مجھے زہر کا انجکشن لگادوگے، جلاد۔"

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا "آپ مطمئن رہیں۔ آرام سے لیٹ جائیں۔ مارنا ہمارا کام نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اور تمہیں مارنا میرے لیے کیا مشکل تھا۔ میں تم کو چھوڑ جاتا اور پلٹ کے نہ آتا تو کیا ہوتا۔"

دلاور کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ اس نے خاموشی سے خود کو ڈاکٹر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر نے اسے دو انجکشن لگائے اس کے لیے نسخہ لکھا اور میرے حوالے کردیا۔ میں نے اسے باہر پہنچایا اور ہم دلاور کو اس کے زندان میں چھوڑ کے روانہ ہوگئے۔ ڈاکٹر کو میں نے پہلی سے کچھ فاصلے پر اتر کے اس کی آنکھوں پر سے پٹی کھول دی۔

انجکشن لیتے ہیں۔ قیافہ شناسی کوئی سائنس نہیں اور صورت دیکھ کے میں ڈاکٹر کی لالچی طبیعت کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا مگر میں نے اسے اپنے ساتھ بٹھانے کے بعد قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔

میں نے آدھے راستے میں جیب سے پانچ سو روپے نکالے اور خادم سے کہا کہ گاڑی روک دے۔

"ڈاکٹر صاحب میں صاف بات کروں گا۔ اب یا تو آپ اُتر کے واپس چلے جائیں پیدل۔۔۔"

"کیا؟ پیدل واپس جاؤں۔۔۔ اس وقت۔۔۔؟" ڈاکٹر نے بوکھلا کے کہا۔

"یا آپ یہ فیس رکھ لیں" میں نے کہا "آپ رازداری کے ساتھ مریض کو دیکھنے کے بعد اسے دوا دیں گے اس کے علاج کے لیے نسخہ لکھ کردیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "زبانی وعدے پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ہم تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جائیں گے۔"

ڈاکٹر ہنسنے لگا "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔"

میں نے اسے پکڑلیا اور ریوالور نکال لیا "اب سوال پیدا ہوگیا ہے۔"

ڈاکٹر کی حالت ایسی ہوگئی جیسے خود اسے دل کا دورہ پڑ گیا ہو۔ میرے اشارے پر خادم نے گاڑی آگے بڑھادی۔ میں نے بکا بکا اور دم بخود بیٹھے ہوئے ڈاکٹر کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ میں نے رومال کو پٹی کی جگہ استعمال کیا۔ ڈاکٹر نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ میری ہدایات کے مطابق خادم نے گاڑی کو بلاوجہ مختلف گلیوں میں گھما پھرا کے گزارا تاکہ ڈاکٹر کو راستے کا اندازہ نہ ہوسکے۔ چالاک لوگ یاد رکھتے ہیں کہ گاڑی دائیں یا بائیں کتنی بار گھومی تھی اور کتنے وقفے کے بعد پھر اندازے سے پولیس کو بھی جائے واردات تک لے آتے ہیں۔

خادم نے گاڑی عین اسی جگہ روکی جہاں نیمہ نصب تھا۔ میں ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کے اسے ساتھ لے گیا۔ اس نے کئی بار ناہموار زمین پر ٹھوکر کھائی اور ملبے کے ڈھیر پر اس کے قدم لڑکھڑائے۔

"یہ تو جنگل ہے کوئی" اس نے کہا "آخر تم کہاں لے آئے ہو مجھے۔ کون ہو تم؟"

میں نے کہا "عقلمند لوگ صحیح اندازہ کرلیں تب بھی زیادہ سوالات نہیں کرتے۔"

"تم ڈاکو ہو۔ مجھے اپنے اڈے پر لائے ہو" وہ بولتا رہا۔ "فرض کرو ایسا ہی ہے۔"

"کیا تمہارے کسی ساتھی کو گولی لگی ہے پولیس مقابلے میں؟"

"ابھی تم خود دیکھ لوگے۔ اب ایک دیوار ہے سامنے۔"

"کتنی اونچی دیوار ہے۔ وہ دروازہ کوئی نہیں ہے؟"

"دروازہ تو ہے مگر ہم ادھر سے جا نہیں سکتے" میں نے کہا اور ڈاکٹر کو اٹھا کے پاس میں اُتاردیا۔

www.paksociety.com

"باقی تھوڑا سا فاصلہ ہے۔ تم پیدل جا سکتے ہو۔"

اس نے شاید دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ وہ زندہ سلامت لوٹ آیا ہے "میں چلا جاؤں گا۔"

میں نے اسے سو کا نوٹ دیا "یہ تمہاری فیس ہے۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"شاید آئندہ بھی ہمیں تمہاری ضرورت پڑے گی۔ تعاون کرو گے تو فائدے میں رہو گے۔ جو ہمارے کام آئے ہم اسے دوست سمجھتے ہیں اور جسے ایک بار دوست کہہ دیں اس کے لیے جان بھی دے سکتے ہیں۔"

اس نے ہاتھ جوڑ دیے "تمہاری جان لے کے میں کیا کروں گا۔ بس میری جان بخش دو۔ کسی اور کو دوست بنالو۔"

"ٹھیک ہے مگر اپنی زبان بند رکھنا۔ ورنہ معلوم تو ہو جائے گا ہمیں اور ہم پھر آ جائیں گے۔ اسپتال میں یا تمہارے گھر۔"

"میں سمجھوں گا کہ آج رات میں کسی کے ساتھ کہیں نہیں گیا تھا۔ رات بھر اسپتال میں ہی رہا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم بھی مجبور تھے۔" میں نے کہا "ایک بات بتاؤ۔ یہ مریض زندہ تو رہے گا؟"

"بظاہر اس کے مرنے کا امکان نہیں۔ ویسے موت کا وقت کوئی نہیں بتا سکتا۔"

"میرا مطلب تھا دل کا یہ دورہ کس حد تک سیریس تھا؟"

"حتمی رائے تو ای سی جی دیکھے بغیر نہیں دی جا سکتی مگر میرا خیال ہے کہ دل کا مسئلہ کوئی نہیں۔"

"یعنی انجائنا یا تھرامبا سس کی پرابلم نہیں؟"

"غالباً نہیں۔ یہ ایک شاک کی کیفیت کا اثر تھا جس کے نتیجے میں دل بند ہو سکتا تھا لیکن CARDIAC ARREST کا وقفہ بہت مختصر تھا۔ اگر اس سے خفیف سا نقصان ہوا ہوگا تو اس کا پتا بھی ای سی جی سے ہی چلے گا۔ دل دنیا کی سب سے حیرت انگیز اور مضبوط مشین ہے۔ یہ ایک سیلف ریپئرنگ یونٹ ہے۔ میں نے صرف سپورٹنگ ٹریٹمنٹ دیا ہے۔"

"کتنا عرصہ ضرورت رہے گی اس کی؟"

"یہ دوائیں استعمال کرنے کے بعد کسی ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہو۔ ویسے تم نے یہ جھوٹ بلاوجہ بولا تھا۔"

"کون سا جھوٹ؟"

"یہی کہ تم ڈاکٹر ہو۔ تمہارے پاس ریوالور تھا۔ وہ کافی تھا۔"

میں نے مسکرا کے کہا "ٹھیک ہے۔ آئی ایم سوری۔"

"تم پڑھے لکھے آدمی ہو......"

"... ... ...ت انگریزی تو جاہل بھی جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ انجائنا اور تھرامبا سس جیسے الفاظ نہیں بولتے۔ تم نے ای سی جی کا مطلب بھی نہیں پوچھا تھا۔ یہ لو اپنے سو روپے۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ بس تمہاری ضرورت پوری ہو گئی۔ مجھے اس

سے کیا کہ تم جیسا پڑھا لکھا اور شریف صورت آدمی یہ سب کر رہا ہے اور کس کے لیے؟" اس نے نوٹ گاڑی میں ڈالا اور نکل پڑا۔

خادم نے نوٹ اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا "دیکھا جی آپ نے... کا بڑا انجام کیسے ہمارے منہ پر سو کا نوٹ مار گیا..."

"اور اس جوتے کو جیب میں رکھ لیا..."

اور وہ کام کیا ہے تم نے... اسے حق محنت سمجھ لو... کے لیے۔ یہ جوتے تو اب اس قابل بھی نہیں رہے کہ کسی کو بھی مارے جائیں۔"

"جس دن یہی خیال میرے دل میں بھی آیا تھا... بہت پرانے ہو گئے ہیں" اس نے گاڑی آگے بڑھائی "پہلے میرے سسرال سے آئے تھے۔ میرا سسر خود تو... دل اس کا ہے گاؤں کے ... کے دل جیتا۔ بہت ... ہونے کے باوجود۔"

میں نے ہنس کے کہا "خادم ... دیکھو ... آواز کیسے بنتا۔"

"اور جناب یہ جوتے بھی اس کی اولاد ... ایک ہی تو سالی ہے میری۔ پانچ سو ماتھ ... تھی کہ یہ تو ہو گا۔ ایک تالا توڑ لایا تھا۔ میرے ... بغل میں تھا اس نے فوراً نکال کے مجھے دے دیا اور ... چاؤ بابا معاف کرو۔ پچاس روپے کے جوتے کے ... پاؤں لگ گئے کا تا ہو گئے تب بھی میں اسے ... اپنے پاس۔ کہنا تو میں یہ چاہتا تھا کہ ... اپنے باپ کے ... کے علاوہ میری زندگی خطرے میں پڑ جاتی جناب۔ ... میرے جیسے دو کو بغل میں دبا کے ... سکتا ہے۔ جیسے ... قلعے کی فصیل پر۔ بتیل مرتا بھی تو نہیں۔"

میں نے کہا "تم دعا تو مانگتے ہو گے اس کے مرنے کی۔"

"اب تو اسے کیا پڑی ہو گی... وہ مرے گا تو ... کے۔ یہ دولت بیر میں تو لے جانے سے رہا۔ ..."

اس نے پھر آہ بھری۔

رابعہ کے آفس پہنچ کے میں نے وقت دیکھا تو رات ... بجے تھے۔ میں نے خادم سے کہا کہ وہ اندر سو جائے مگر ... صوفے کو ترجیح دی۔ میں اتنا تھک گیا تھا کہ ... صبح ... پیٹ سے میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ خادم ... بنانے میں مصروف ہے اور زیر لب ... بڑبڑا رہا ہے۔ ... میری جسمانی توانائی کو پوری طرح بحال کر دیا تھا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے خادم حسین۔ وظیفہ ... کر رہے ہو۔ بیوی یاد آ رہی ہے؟"

اس نے چونک کے مجھے دیکھا اور خفت سے مسکرایا "... بخیر تو بڑا اچھا لگ رہا ہے جی۔ بڑا ہلکا پھلکا اور آزاد محسوس ہوں میں۔" "پھر کس پر خفا ہو رہے تھے؟"

تھوڑا ... ذر تھا تو اب باقی نہیں رہا تھا۔ اس سے میرا ... ہو گیا تھا اور میں اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ... پہنچتے ہی مجھے ایک غیر متوقع صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ آفس میں خادم حسین کے علاوہ ایک اور شخص بھی موجود تھا جس کی پشت میری طرف تھی۔ جب اس نے سر گھما کے دیکھا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہ جوان نظر آنے والا لڑکا چوہدری دلاور کا بیٹا فیصل تھا جو ایک بار اپنی ماں کو ہماری تحویل سے چھڑانے کے لیے ... مذاکرات کرنے آیا تھا۔ اس نے بڑے اعتماد ... کا ثبوت دیا تھا اور ... کے ساتھ ایک جھوٹ بولا تھا اور ایک ایسی کہانی سنائی تھی جس پر ... بھی یقین کر لیا تھا۔ فیصل نے خود کو چوہدری دلاور کا ... جانشین ثابت کیا تھا، عمر اور تجربے کے فرق کے باوجود بازی اس نے جیت لی تھی۔

میں نے حیرت کے رد عمل کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور خادم حسین سے سرائیکی لہجے میں پوچھا "یہ سوہنا منڈا کون ہے؟"

خادم حسین اسٹول پر ہمیشہ کی طرح پاؤں سمیٹے ... اور گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھا تھا "کہتا ہے میں چوہدری دلاور کا بیٹا ہوں۔"

"اچھا جی۔ پھر کیا کریں؟"

"پھر یہ کہ سوہنا منڈا بیٹھا ہے رابعہ بی بی کے انتظار میں۔ ان سے بات کرنا چاہتا ہے اپنے دلاور کے بارے میں۔"

"ضرور کرے مگر رابعہ بی بی تو آئیں گی شام کو۔ یہ ابھی سے یہاں کیوں آ کے بیٹھ گیا۔ چلو پھر چار بجے آنا۔"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "تم ان کی گاڑی لے کر کہاں گئے تھے۔ تم چوکیدار ہو یا ڈرائیور۔"

میں نے کہا "دونوں کام آتے ہیں مجھے اور بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں میں۔ اب تمہیں کیا بتاؤں۔"

"تم یہیں کہیں رہتے ہو؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "دن میں سوتا ہوں، رات کو جاگتا ہوں۔"

"تم نے کبھی سکندر بخت کو آتے جاتے دیکھا؟"

میں نے خادم حسین کی طرف حیرانی سے دیکھا "سکندر بخت کون؟"

"بکواس مت کرو میرے سامنے۔ تم پرانے آدمی ہو۔ رابعہ ... ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سکندر بخت ... نہ جانتے ...۔ اس کے تیور دیکھ کے مجھے حیرت ہوئی "دیکھو ہمارے ساتھ ... کی بات مت کرو۔ تم جو کرتے ہو ابھی۔ لاٹ صاحب کی اولاد ... ہم کیا ہم کس کو جانتے ہیں اور کس کو نہیں۔ تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟" میں نے چوکیدار کے انداز ... بالکل متاثر نہیں ہوا "سکندر بخت کو جانتے ہو یا نہیں؟"

"ہاں ہاں جانتے ہیں۔" میں نے کہا "یہاں آتے تھے وہ بھی۔ ... لوگ ان کے پیچھے لگ گئے۔ ابھی وہ کہیں چلے گئے ہیں۔"

"کہاں چلے گئے ہیں؟" وہ مسکرایا۔

"یہ جو حرافہ یہاں آتی ہے صفائی کرنے۔ توبہ توبہ! ایسی بے حیا اور زبان دراز عورت ہے۔ بولی بولی پھرتی ہے اس کی تو اور آنکھیں تو ایسے مٹکاتی ہے، میں نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ اندر سے بھی صاف کرتا ہے۔ میرے گلے پڑ گئی کہ صوفی بہانے بہانے سے اندر بلاتا ہے۔ اپنی صورت دیکھی ہے بھانڈو پھرے۔ میرے منہ لگا تو سو سنا دوں گی۔ کیا مطلب ہے جی ایسی واہیات بات کا آخر؟"

جتنے جتنے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے "چھوڑو، مطلب سمجھ کے کیا کرو گے خادم حسین۔ اندر کی صفائی وہ نہیں کرتی۔ ہم خود کرتے ہیں۔ چائے تو بہت اچھی بناتے ہو تم۔"

اس نے بادِ نا ٹھنڈی سانس لی "امور خانہ داری کے سوا میں نے کیا کیا ہے شادی کے بعد۔ برتن کپڑے دھونے اور کھانا پکانے کی تو کوئی بات نہیں مگر وہ تو شاید چاہتی تھی کہ بچے بھی میں پیدا کروں، جی۔ اللہ نے سبب بنا دیا کہ میری جان چھوٹ گئی۔ میں تو اب اسے لینے جاؤں تو اُلو کا پٹھا۔"

میں نے مناسب سمجھا کہ صبح صبح ایک بار دلاور کو دیکھ آؤں۔ وہ جاگ رہا تھا اور اندھیرے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے اپنی قید تنہائی کو ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا اور یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اب اس کی رہائی صرف ہماری صوابدید پر منحصر ہے مگر بے بسی اس کے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ اس کا وہ پُرسکون انداز باقی نہیں رہا تھا جس میں مصنوعی بے حسی اور رعونت آمیز بے نیازی نظر آتی تھی۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا، بے چین اور مضطرب، خوف زدہ اور مایوس تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے گہرے ہو گئے تھے اور اس کی شیو بڑھ کے باقاعدہ داڑھی نظر آنے لگی تھی۔

"کیا حال ہے اپنے چوہدری دلاور کا؟" میں نے کہا۔

"فکر مت کرو۔ میں مروں گا نہیں اور خودکشی بھی نہیں کروں گا اپنے سکندر اعظم صاحب۔ میں تم سے رحم کی بھیک بھی نہیں مانگوں گا۔"

"وہ چیز مانگنے سے کیا فائدہ جو ملنے کی امید ہی نہ ہو۔ دوائیں سب موجود ہیں۔ کھانے پینے کو بھی ہے۔ ابھی پتا نہیں کتنے دن اس قید خانے میں گزریں تمہارے۔"

"میں حوصلہ ہارنے والا آدمی نہیں ہوں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ گردن میں پھانسی کا پھندا پڑنے تک تم زندہ رہو۔"

"پھانسی تم سب جا ہو دے سکتے ہو۔"

"ہاں مگر یہ کام میرا نہیں۔ سزا تمہیں قانون دے گا۔ جب انصاف ہو گا تو ساری دنیا دیکھے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے وزیر خان کے ساتھ ناانصافی ہوئی تھی تو ساری دنیا دیکھتی رہی تھی۔"

میں واپس پہنچا تو نو بج رہے تھے۔ اب مجھے اپنا چوکیدار کا حلیہ بدل کے پھر فرنگی وکیل کا روپ دھارنا تھا۔ یہ کام اب میرے لیے اتنا آسان ہو گیا تھا جیسے کپڑے بدلنا۔ ابھی تک کسی نے غیر ملکی وکیل کے بھیس میں سکندر بخت کو نہیں پہچانا تھا۔ ابتدا میں ... اگر

www.paksociety.com

"اگر ہمیں پتا ہوتا تب بھی تمہارے باپ کو بھی نہ بتاتے۔ چلو اب اٹھو اور باہر جاؤ۔ یہ آفس کا ٹائم نہیں اور پارک نہیں ہے کہ بچے ادھر آ کے بیٹھ جائیں۔"

"ہاں میاں شہزادے۔ تمہارے تو اسکول جانے کا وقت ہے یہ" خادم حسین بولا "تم کہاں بھٹک رہے ہو۔"

"تم چپ رہو مُلا دوپیازہ کی بدروح" فیصل نے اسے بُری طرح جھڑک دیا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچ کے باہر لے گیا "ابھی اس کو مُلا دوپیازہ بولا۔ ہم کو بیربل کہہ دو گے۔ ہم تو ہاتھ مار کے تمہارا منہ کر دیں گے پیاز جیسا۔"

اس نے مزاحمت کی مگر میری گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ بلبلا کے رہ گیا اور آفس کے باہر برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے خونی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا "میں چودھری کا بڑا بیٹا ہوں فیصل!"

"ارے بہت دیکھے ہیں ہم نے چودھری۔ ادھر جو بیٹھے ہیں وہ بھی کم نہیں ہیں۔ بڑے بڑے وکیل لوگ ہیں۔ چلو نیچے ورنہ ہم اوپر سے پھینک دیں گے سڑک پر" میں آگے بڑھا۔

وہ زینے کی طرف چل پڑا "تم بہت بدتمیز آدمی ہو۔ میں تو تمہاری رابعہ باجی کے لیے ایک پیغام لایا تھا۔ انہی کا فائدہ تھا..."

"بولو۔ ہم بتا دیں گے" میں نے کہا۔

وہ رُک گیا "ان سے کہہ دینا کہ شیر کا بچہ بھی شیر ہی ہوتا ہے۔ وہ گھاس نہیں کھاتا۔ خون پیتا ہے اور گوشت کھاتا ہے خواہ وہ آدمی کا ہو۔"

"یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔ کون سی نئی بات ہے۔ رابعہ باجی کو بھی پتا ہو گی۔" "یہ بھی بتا دینا اسے کہ میرا ایک ہی باپ ہے۔"

"ہاں یہ نئی بات ہے۔ بتا دیں گے۔"

"اگر اسے کچھ ہوا تو بہت کچھ ہو گا۔ جس کا ابھی اسے اندازہ نہیں ہے۔ میری ماں کا ساگ اُجاڑنے والے کا میں گھر اُجاڑ دوں گا۔ اور پھر بھی سمجھ میں نہ آئے اس کی" وہ ایک لمحے کے لیے رُکا اور پھر اس نے ایک لفافہ مجھے تھما دیا "تو یہ دے دینا اسے۔"

میں اس لڑکے کی بے خوفی اور ہمت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ لفافہ لیتے ہوئے اچانک میرا ارادہ بدل گیا اور میں نے اسے روکنے کا فیصلہ کر لیا "اس میں کیا ہے؟"

"تمہارے مطلب کی چیز نہیں ہے" اس نے کہا اور تیزی سے زینے کی طرف بڑھا "الٹی میٹم ہے اس میں مگر تم کیا سمجھو گے۔"

میں نے ایک دم اس کا راستہ روک لیا "ایٹم بم ہے اس میں۔ پھر تو ہم نہیں جانے دیں گے تمہیں۔ ہم تم کو پولیس کے حوالے کریں گے۔"

"پولیس۔" اس نے حقارت سے کہا "راستہ چھوڑو میرا۔"

"تو ٹھیک ہے ہم رابعہ باجی کو فون کر کے بلا لیتے ہیں..."

"نہیں۔ مجھے جانا ہے۔ تم یہ ان کو دے دینا" ... کی فکر میں تھا۔

"اچھا تم خود ان سے بات کرو۔ وہ کہیں گی تو ہم جانے دیں گے تمہیں۔"

"ورنہ؟ ورنہ کیا کرو گے؟ مجھے باندھ کے [illegible]" ... لڑکا بہت تیز مزاج تھا۔

"ہاں۔ ہم یہی کریں گے۔ تم کو بوری میں ڈال کے رکھیں گے۔ ہم تو چوکیدار ہیں۔ ایسا دیا تو کوئی آدمی آفس میں گھس ... یا کوئی کتے کا بچہ ادھر آ کے بھونکنے لگے تو ہم ..."

... نے اسے ایک جھٹکے سے پیچھے کھینچ لیا اور اسے ... موقع دیے بغیر دھکیل کر آفس میں کر دیا۔ وہ ... پھر کھڑا ہو گیا۔ اب اس کا ... جواب دے گیا تھا اور ... نظر آنے لگا تھا۔

"بیٹھ جاؤ ادھر" میں نے اسے اندر والے کمرے میں پہنچا دیا۔

"میری ماں کو بھی معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں" اس نے مجھے مرعوب کرنے کی آخری کوشش کی "اور وہ ... یہاں سے۔"

"ہمیں بتاؤ کہاں ہے وہ۔ ہم اسے بھی لے آتے ہیں۔"

"وہ خود آ جائے گی اگر مجھے دیر ہوئی۔"

"وہ کیا توپ لے کر آ جائے گی۔ ہم کیا ... جائیں گے چھوڑ کے" میں نے کہا۔

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ آ گئی۔ میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا اور مجھے اس پر ترس آیا تھا۔ وہ ایک باوقار عورت تھی جس نے حالات کی مجبوری کے سامنے ... ہوئے دلاور سے عہد وفا استوار رکھا تھا۔ وہ ... عورت ... قسمت نے دھوکا دیا ورنہ وہ کسی بہت بڑے آدمی کی ... ہوتی۔ آدمی دلاور بھی بڑا تھا مگر ... اور ... وہ بہت بڑا لیڈر بھی بن سکتا تھا مگر وہ بہت بڑا بدمعاش بن گیا۔

"تم کیوں بیٹھے ہو یہاں فیصل" اس نے مجھے نظر انداز کر ...

"اس خبیث نے بٹھا رکھا ہے" فیصل پھر شیر ہو گیا۔

"گالی دو گے تو ہاتھ مار کے تمہارا ... توڑ دیں گے۔ تمہارے باپ نہیں ہیں کہ لاڈ میں بدتمیزی برداشت کریں۔"

دلاور کی بیوی نے صورت حال کی ... دو چوکیدار۔ بے وقوف بچہ ہے ... "میرا ..."

"کاٹنے کو دوڑتا ہے اس لیے پوچھا ہم نے۔ ... رکھو بیگم صاحب" میں نے کہا "آپ کی وجہ سے چھوڑ دیا ... ہم تو پولیس کے حوالے کر دیتے۔"

"ہمت ہے تو بلاؤ پولیس کو۔"

ماں نے اسے ڈانٹا "چپ کرو فیصل۔ خوامخواہ بات ...

... یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔"

کوئی بھی ... نہیں ہے برآمد ہونے والے خط کی تحریر ... اصل خط نہیں تھا۔ اس کی فوٹو کاپی تھی لیکن اس تحریر ... بھی حوالہ نہیں تھا۔ اس کا ہر لفظ فوزیہ کے لبوں سے ادا ... محسوس ہوتا تھا۔

"تم ... معلوم ہو خدا کرے تمہاری عظیم فتوحات کا یہ سلسلہ ... مجھے نہیں معلوم کہ مجھ سے پہلے اور میرے بعد ... جاری ... فتح کے جھنڈے گاڑے اور کتنے مفتوحہ دلوں کو ... کہاں کہاں ... کر کے چھوڑ دیا۔ ہلاکو اور چنگیز خان نے بھی کیا ... ہے وہ ... گھروں کو اور بستیوں کو تاخت و تاراج کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ ... کر نہیں دیکھتے کہ لٹ جانے اور مٹ جانے ... کیا بیتی۔ ویران بستیاں بھی آباد ہو جاتی ہیں۔ اپنی پہلی ... نے ... شکوے کے بغیر قبول کر لیا تھا۔ اپنے اجڑے گھر کو پھر بسانے کے لیے میں نے خود پر بڑا جبر کیا تھا۔ بڑی مشکل سے اور محنت سے میں نے ماضی کے ہر زخم کا نشان تک مٹا دیا تھا اور اب میں خوش تھی کہ میں نے اپنی شکست کو فتح میں بدل دیا ہے لیکن ... ہے کہ میرے گلشن کی یہ بہار بھی تمہیں گوارا نہیں اور تم پھر میری دنیا اجاڑ کے مجھے احساس شکست کے اسی زنداں میں قید کرنا چاہتے ہو جس سے رہائی آسان نہ تھی۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ میرے گھر کو اپنے انتقام کی آگ سے ... مت کرو۔ پہلی بار کا سارا عذاب صرف میں نے جھیلا تھا مگر اب فوزیہ ایک بیوی ہے اور ایک ماں بھی ہے۔ ... اپنے تعلق کے عہد ماضی کو میرے شوہر اور میرے بچوں کے مستقبل کا آسیب مت بناؤ۔ غلطی اگر کی تھی تو میں نے۔ سزا ... وہ تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ انہیں ... ہراساں کیا جا رہا ہے۔ دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ آخر ہم کیا کریں؟ کہاں جائیں جہاں یہ خوف کے سائے ہمارا تعاقب نہ کریں۔ میرے شوہر نے ٹرانسفر کرا لیا پھر نوکری چھوڑ دی۔ وہ شہر چھوڑ دیا۔ ہم خانہ بدوشوں کی طرح روپوش رہنے پر مجبور ہیں۔ میرے شوہر کو بڑی مشکل سے ایک ... کالج میں لیکچرر کی نوکری ملی ہے۔ وہ رات کے وقت گھر آتے ہوئے ڈرتا ہے۔ راستے میں ... اجنبی لوگوں نے روک کے مارا اور اس کے کپڑے پھاڑ دیے۔ اسے دھمکی دی کہ اگر تمہارے سالے نے حرامی پن نہ چھوڑا تو ہم اس کی بہن ... آگے کیا لکھوں۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ انہوں نے کیا کہا ہو گا۔ میرا شوہر کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ کس کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھوائے۔ وہ نہ کسی کو جانتا ہے نہ پہچانتا ہے اور نہ اس کے پاس کوئی ثبوت ہے نہ گواہ۔ وہ قصور وار محسن کو سمجھتا ہے اور مجھے الزام دیتا ہے کہ تمہارے بھائی اور اس کے ... دوست کی وجہ سے ہماری زندگی عذاب ہو رہی ہے۔ میرا محسن سے کوئی رابطہ نہیں ... کسی نے فون پر مجھے بتایا تھا کہ وہ بھی کراچی ... ہے اور اس نے کسی نامی گرامی ڈاکو کی بہن سے شادی کر لی ہے

کی کیا ضرورت ہے۔ معاف کرنا چوکیدار۔ جب سے اس کا باپ غائب ہوا ہے اس کا مزاج بگڑا ہوا ہے۔ کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔ چڑچڑا ہو گیا ہے۔ مجھ سے بھی لڑتا ہے۔ تم اس کی بات کا بُرا مت مانو۔"

"اچھا جی۔ آپ لے جائیں اسے۔ ہم آپ کے کہنے سے چھوڑ رہے ہیں۔ آپ بھلی مانس ہیں۔"

معلوم نہیں ماں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کیا اشارہ کیا تھا کہ فیصل کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ "سوری چوکیدار۔ میرا دماغ آج کل ٹھکانے نہیں ہے ڈیڈی کی وجہ سے۔ وہ پتا نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "تھانے میں رپورٹ لکھواؤ۔ شاید پتا چل جائے۔ پتا نہیں کیسے لوگ ہوتے ہیں جو گھربار، بیوی بچوں کو چھوڑ جاتے ہیں۔"

"وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں گئے ہیں۔ انہیں اغوا کیا ہے دشمنوں نے۔" "دشمن [illegible] ہوں گے تو پھر ڈرنا چاہیے۔ ہم نہیں ڈرتے کیونکہ ہم صرف دوست بناتے ہیں۔"

"دشمن ہوتے ہیں بڑے لوگوں کے۔ حسد کرنے والے اور جلنے والے۔ تم جیسے لوگوں کا دوست بھی کون ہوتا ہے۔ خوش فہمی رہتی ہے تمہیں کہ جس نے مسکرا کے سلام کا جواب دے دیا وہ تمہارا دوست ہے۔"

"مسکرا کے سلام کا جواب دینے والا بھی دشمن تو نہیں ہوتا نا بیٹا۔ جاؤ اپنی ماں کے ساتھ۔ ہم کیا سمجھائیں تمہیں۔ وقت خود تمہیں دوست اور دشمن کا فرق بتا دے گا۔"

جب دلاور کی بیوی اپنے بیٹے کے ساتھ نیچے اُتر گئی تو میں نے خادم کو اشارہ کیا "ان کے پیچھے جاؤ۔"

"ہرگز نہیں۔ یہ لڑکا ہے یا بم کا گولا" خادم حسین نے کانوں کو ہاتھ لگایا "یہ مُلا تو خیر ٹھیک ہے مگر دوپیازہ کیوں کہا اس نے۔ دوپیازہ ہم پکا لیتے ہیں۔ گوشت کا سالن ہوتا ہے۔"

"خادم حسین۔ اوپر سے ہی جھانک کے دیکھ لو وہ کس گاڑی میں آئے تھے اور کون تھا ان کے ساتھ؟" میں نے جھنجھلا کے کہا "وہ نیچے نہ کھڑے رہیں میرا پیچھا کرنے کے لیے..."

خادم دوڑا اور گیلری سے نیچے جھانکنے لگا۔ میں ابھی تک وہ لفافہ ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا جو فیصل دے گیا تھا۔ اس پر نام رابعہ کا ہی لکھا ہوا تھا مگر کھولنے سے پہلے میں نے اس کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ پیکٹ میں بم رکھ دیا جائے یا زہریلی گیس بھری جائے لیکن ایک لفافے میں الٹی میٹم کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے اس کے اندر صرف ایک کاغذ ہی نظر آ رہا تھا۔

خادم نے کہا "گاڑی وہی تھی جناب کل والی اور اس کو وہ کالے منہ والا ہی چلا کے لایا تھا۔"

"استاد چپ رہو" میں نے لفافہ کھولتے ہوئے کہا۔

"دوپیازہ والی بات رہ گئی جی۔ ہم تو قورمہ بھی پکا سکتے ہیں مگر

www.paksociety.com

جو خود بھی قتل اور ڈکیتی کی متعدد وارداتوں میں مطلوب ہے؟ کیا یہ سچ ہے سکندر؟ میرے بچے اسکول جاتے ہیں تو میں ان کی واپسی تک دروازے اندر سے بند کرکے ان کی خیریت کے ساتھ واپسی کے لیے دعا مانگتی رہتی ہوں۔ رات کو جب تک میرا شوہر لوٹ کے نہیں آجاتا میرا دل خوف سے کانپتا رہتا ہے۔ تمہیں یہ ضرور معلوم ہوگا کہ محسن کہاں ہے؟ اس سے کہو کہ مجھ سے ملے میرے ساتھ آکے رہے تاکہ میں خود کو اتنا اکیلا اور کمزور محسوس نہ کروں۔ اگر اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے تو وہ بلاوجہ ہماری زندگی کے دشمن ہوجانے والوں کو اس بات کا یقین دلا سکتا ہے۔ انہیں یہ کون کرسکتا ہے کہ ہمارا تم سے کوئی تعلق کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں تمہیں خدا رسول کا' رابعہ کی محبت کا اور چچا وزیر خان کے نام کا واسطہ دے کر کہتی ہوں سکندر کہ اپنی جنگ میں میرا گھر تباہ مت کرو۔ اگر میرے شوہر کو کچھ ہوا یا میرے بچوں پر آنچ بھی آئی تو میں مرجاؤں گی مگر میرے مرنے سے تمہیں کیا فرق پڑے گا۔ تمہاری فتوحات جاری رہیں گی۔ فوزیہ اب تمہارا راستہ کیسے روک سکتی ہے جب پہلے بھی وہ تمہارے لیے گرد راہ تھی۔ تم تو چٹانوں سے ٹکرا کے انہیں ریزہ ریزہ کرسکتے ہو۔ اگر تم مجھے جینے کا حق بھی دینا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ وہ ہمیں ماردیں گے۔ قسمت میں اگر یہی ہے تو ٹھیک ہے مگر یاد رکھنا سکندر کہ اس دنیا کی ساری فتوحات کے بعد تمہارے لیے بھی یوم حساب آئے گا جب تمہارا دامن تھام کے میں داور محشر سے سوال کروں گی کہ اس پر لہو کے جتنے داغ ہیں وہ جرم کس پر ثابت کرتے ہیں۔ تم تو انصاف انصاف پکارتے پھرتے ہو۔ کبھی سوچا کہ خود تم نے میرے ساتھ انصاف کیا تھا؟ اور میں کیا لکھوں؟ بات تو تمہارے سمجھنے کی ہے۔ میں یہ خط چوری چھپے لکھ رہی ہوں۔ کسی کے کہنے پر۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا پیغام تمہیں پہنچادیا جائے گا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو اور یہ خط میرے خلاف اعتراف جرم کی تحریر نہ بنے۔ میں کہاں تک ڈروں اور کس کس سے ڈروں؟ میرا خدا جانتا ہے کہ نہ میرا کوئی گناہ ہے نہ جرم پھر بھی وہ میرے صبر کا امتحان لیتا ہے تو میں ہر امتحان کے لیے تیار ہوں۔

نقش فریادی۔ ایک بھولا بسرا شجر ممنوعہ۔ فوزیہ' ایک نام جو تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو!

خط پڑھ کے میرے دماغ میں سائیں سائیں سی ہونے لگی۔ ایک ہولناک مہیب سناٹے میں فوزیہ کی آوازیں پکارنے لگی جیسے ویران قبروں کے درمیان اندھیری رات میں کوئی بین کرتا ہو۔ ملامتوں کی باد سموم ماضی کے ہر کھنڈر سے سر ٹکرا رہی تھی۔ تم انصاف انصاف پکارتے پھرتے ہو۔ کبھی سوچا کہ کیا میرے ساتھ تم نے انصاف کیا تھا؟ کیا میرے گلشن کی یہ بہار بھی تمہیں گوارا نہیں؟ ہلاکو اور چنگیز خان نے بھی یہی کیا تھا۔ سکندر اعظم' فاتح اعظم۔

میں نے خط دو ایک بار' دوبارہ پڑھا یہاں تک کہ اس کا ہر لفظ مجھے ازبر ہوگیا اور فوزیہ کے زخم خوردہ ٹوٹے ہوئے دل نے زہر میں بجھے ہوئے نشتر کی طرح میرے دل کو زخمی کردیا۔

فوزیہ نے اپنا نام ضرور لکھا تھا مگر پتا نہیں لکھا تھا اور فون نمبر بھی نہیں دیا تھا ورنہ میں اس سے بات کرلیتا مگر کیا کرتا؟ کہتا کہ سوری فوزیہ' میرا کوئی قصور نہیں۔ نہ کبھی سوچا تھا اور نہ ہی میں ایسا چاہتا ہوں۔ میں بھی مجبور ہوں۔ حالات کے آگے کس کا بس چلتا ہے۔ تمہارے لیے میں سب ... ہوں مگر میں کیا کروں۔ شٹ اپ سکندر' تمہارے لیے یہ سب تماشا تھا۔ یہاں تم فوزیہ سے محبت کرتے رہے ... لڑکیوں سے دل بہلاتے رہے اور آج رابعہ کے عشق کا دم بھرتے ہو۔ کیا بات ہے؟ اپنی ڈائری دیکھو اور بتاؤ تم نے کتنی لڑکیوں کو پھانسا۔ ہر لڑکی ایک شجر ممنوعہ سے زیادہ نہیں تھی تمہارے لیے سکندر اعظم۔ پلٹ کے کون دیکھتا ہے کہ اس نے کتنے گھر اجاڑے اور کتنے دل توڑے۔ مردوں کے یہی کام ہیں!

خادم حسین میری دہشت سے خوف زدہ نظر آرہا تھا۔ اس نے دوبار پوچھا تھا کہ خیر تو ہے جی؟ کیا ہے آخر یہ الٹی میٹم؟ سیدھی بات لکھ دی ہے کسی نے تو منع کردیں۔

بالآخر میں نے میز پر مکا مار کے کہا "میں ان سب کو ماردوں گا خادم۔ چڑھادیں یہ لوگ مجھے پھانسی۔ میں ان کا ..."

آگے ادھر میں نے کہا وہ منظر کی زبان میں "..." ولچی ایل" کی تفسیر تھا چنانچہ یہاں نقل نہیں کیا جاسکتا۔ عقلمندی یہ کی کہ رابعہ کو فون کردیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ وقت پر ... ہوگی مگر منظر کی گاڑی میں کچھ خرابی ہوگئی تھی جسے وہ ٹھیک کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"آپ تو فوراً آجائیں جی۔ بہت برا حال ہے ان کا۔ ... پر کیا بتاؤں کیا کہہ رہے ہیں۔ بہت افسوس ناک قسم کے الفاظ نکل رہے ہیں جی ان کی زبان سے خود بخود۔ وہ اپنی مرضی سے تو باتیں نہیں کرسکتے۔ اثر ہوگیا ہے ان کے دماغ پر۔ ... بہت کا نہیں۔ الٹی میٹم کا۔ اچھا جی میں تو سمجھا تھا کہ یہ بھی کوئی چیز ہوگی الٹی میٹم کی طرح۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں تو نہیں پیتا۔ وائرس کمپاؤنڈ۔ سو فیصد الکحل ہوتی ہے نا ان میں ... سو فیصد ایمان ہوگیا۔"

میں نے ریسیور اس سے چھین لیا "یہ کیا فضول بکواس ... ہو اور فضول سوال کررہی ہو۔"

"بھوتنی کے۔ یہ سن رہی ہو اور کررہی ہو کہ ... میں تیری وہ تمہیں 'تیرا وہ ہوں۔ باپ کا باپ سالے۔ یہ ... ہے۔ آکے سر پہ سو جوتے ماروں گا اور سو پیاز کھلاؤں گا تو ٹھکانے آجائے گا۔"

میں نے کہا "منظر' یہ ڈرامہ نہیں۔ سخت سنگین معاملہ ہے۔ فوراً آجاؤ۔ لعنت بھیجو کورٹ پر۔"

دونوں پڑھ کے کہا "ہول نہ تو یہ ... جسے کون لایا"

"میں نے بتایا تھا کہ دلاور کا بیٹا آیا تھا۔"

"... پہلے بھی ایک بار مجھے آزما چکا تھا۔ سالے کو پکڑ کے ..."

"... اس کی ماں نہ آتی تو کچھ نہ کرتا۔ میں نے یہاں ..."

"... لیکن ماں کو دیکھ کے سب بھول گیا۔ اب اتنی حسین تو نہیں ..."

"... مت کر۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ لفافے میں کیا ہوگا۔ میں تو سمجھا تھا کہ اس کی ماں نے رد عمل ... فریاد کی ہوگی! دھمکی دی ہوگی کہ ہم جالب اور دانو کے ساتھ یہ کردیں گے وہ کردیں گے۔"

"مطلب ... ان کی تو ... ایل۔"

رابعہ نے کہا "کیسی عجیب بات ہے کہ کراچی میں محسن اپنی بہن سے چھپ کے رہتا ہے۔ اتنا ڈرتا ہے وہ؟"

"یہ ڈر کی بات نہیں۔ وہ خود بہن کو محفوظ رکھنے کے لیے اس سے لاتعلق رہتا ہوگا۔"

"یار وہ تو الٹی میٹم کا ذرا سا ہوا گھر سے نکلا ہی نہیں ہوگا۔ پڑا رہتا ہوگا عشق کے نشے میں چور۔ حالانکہ ویسے بھی زن مرید تو ہے تیری طرح۔ دور اندیشی لگائی ہوگی تو رابعہ کے پیچھے بیٹھ جاتا ہوگا۔"

"بات کچھ بھی ہو۔ سوال یہ ہے کہ اب میں کیا کروں؟"

"تم عیش کرو بیٹے۔ عشق کرو' قتل و غارت گری کرو۔ بدمعاشی اور درازی ... کرو۔ یہ سب کام کرتے رہتے ہو تم۔"

میں نے کہا "یار منظر' کبھی تو سیریس ہوجانا چاہیے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ فوزیہ پر کوئی مصیبت آئی تو...؟"

"ابے تم ... واویلا کیا۔ ابھی مصیبت آئی تو نہیں۔ ... کہتے ہیں کہ بھاگ جائیں اس ملک سے۔ یہ صرف دھمکی ... کسی کو موقع ہی کیوں دیا جائے کہ وہ کمزوری سے فائدہ اٹھائے۔"

رابعہ بولی "باہر جانا کوئی آسان کام ہے۔"

"اس کا بندوبست ہوجائے گا عزیزہ۔ تم خود کو ہلکان مت کرو۔ افسوس کہ تمہارا دل سوکن کے جذبات سے خالی ہے۔ بھئی آخر فوزیہ سے یہ لڑکا پکا محبت کرتا تھا اور پہلی محبت وہی ہے اس کی۔ تم نمبر دو یا شاید محبوبہ نمبر چار سو ہو۔ پہلی محبت کون بھولتا ہے۔"

رابعہ مسکرائی "میں ایسی باتوں سے متاثر نہیں ہوتی۔ مگر منظر یہ کیسے پتا چلے گا ان کا کہ وہ کہاں ہیں۔ خط میں تو کچھ بھی نہیں۔"

"... پولیس کے دلاور سے۔ باقی سب خاموشی ہے"

"اللہ! یہ توہین عدالت ہے۔" منظر نے کہا "عدالت کیسے چھوڑ سکتا ہوں میں میرے کیس...؟"

"بھاڑ میں گئے کیس۔ اگر آج تو فوت ہوجاتا تو کیا ہوتا؟ تجھے ہیضہ ہوجاتا یا نمونیہ تو کیا ایمبولینس میں اور اسٹریچر پر عدالت میں پیشی کے لیے جاتا۔" میں نے چلا کے کہا۔

"اچھا اچھا۔ اتنا چلاتا ہے تو فون رکھ دے۔ آواز ویسے ہی آجائے گی یہاں تک۔ بنے ہوئے ہو آتی سولہ بھتیجوں کی پھوپھی۔"

"کیا بات ہے؟ یہ خادم کیا کہہ رہا تھا؟"

میں نے کہا "منظر کے ساتھ فوراً آجاؤ۔"

"گاڑی ابھی ٹھیک ہورہی ہے۔"

"بھاڑ میں گاڑی کو۔ ٹیکسی لے کر آجاؤ۔ یہاں آتے ہوئے دیکھنا کہ پیچھے استاد چندو تو موجود نہیں ہے اسی گاڑی میں۔ ہاں وہ آیا تھا۔ چوہدری دلاور کے حرام زادے کے ساتھ۔ اس فیصل کے ساتھ اور ایک خط دے گیا ہے۔ اسی کو الٹی میٹم کہہ رہا تھا خادم۔ اب کیا فون پر سب بتاؤں میں۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے۔" میں نے زور سے ریسیور پٹخ مارا۔

خادم نے مجھے فوراً پانی کا گلاس پیش کیا "پہلے جناب سو تک گنتی کریں۔ پھر اللہ کا نام لے کر یہ پانی پی لیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"آگ بجھ جائے گی جی۔ جو آپ کے دل اور دماغ میں لگی ہوئی ہے۔ بڑا مجرب نسخہ ہے۔"

میں صوفے پر بیٹھ گیا اور خاصی کوشش سے سو تک گننے میں کامیاب ہوا۔ پانی پیتے ہی میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنے آپ پر کنٹرول حاصل ہوچکا ہے۔ میں خاصا پُرسکون تھا اور میرا ذہنی انتشار کم ہوگیا تھا۔ میں نے اندر جاکے اپنی وردی بدلی اور سوٹ پہن کے فرنٹ وکیل بن گیا۔

میری تیاری آخری مراحل میں تھی کہ باہر سے رابعہ کی اور پھر منظر کی آواز آئی۔

"اندر کپڑے بدل رہے ہیں جی وہ۔" خادم نے بتایا۔

"مولوی۔ تمہاری صورت سے تو لگتا ہے کہ رات کو تم نے کوئی قابل اعتراض خواب دیکھا تھا۔"

"رات تو میں نے اپنی گھر والی کو دیکھا تھا جی۔"

"اچھا! کس کے ساتھ؟" منظر نے خاصے دکھ سے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔" وہ بات کاٹ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ "خیر جی آپ یہ الٹی میٹم دیکھیں۔ مجھے تو یہ خط ہی لگتا ہے۔"

جب میں باہر آیا تو رابعہ خط پڑھ رہی تھی۔ میں اس کی میز پر پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔ رابعہ نے پورا خط پڑھنے کے بعد منظر کے حوالے کردیا۔ اچانک رابعہ کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار نمودار ہوگئے تھے۔

www.paksociety.com

ہو جائے گا۔ جب وہ نکل جائیں گے تب پتا چلے گا دشمنوں کو۔ اب رہی محسن اور اپنی گل بانو کی بازیابی کے مستقبل کی بات تو ایسا کرتے ہیں کہ انہیں ساری صورت حال بتا دیتے ہیں۔ ہمیں تو معلوم ہے کہ وہ اکرام شیخ اور کاجل کے ساتھ ہیں کاجل کوئی اسکول چلا رہی ہے اور سابق اے ایس آئی اکرام شیخ ٹیکسی چلاتے ہیں۔"

"مجھے ان کا گھر اور فون نمبر معلوم ہے۔" میں نے کہا "کیوں نہ انہیں یہاں بلا لیں۔"

منظر نے نفی میں سر ہلایا "بے وقوفی ہے۔ کیوں اپنے ساتھ انہیں خراب کرتے ہو۔ کاجل اور اکرام شیخ سے تو بالکل امید نہیں کہ وہ گھربار اور کاروبار چھوڑ کے چل پڑیں ہاں محسن کا دماغ بے پاؤں بجلی کی طرح۔ جدھر چل پڑا اچل پڑا۔ اچانک عشق کا دورہ ختم ہو جائے اور دوستی کا دورہ پڑ جائے۔ تو گل بانو بھی ٹانگ میں بن جائے تو خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ ہم سوئی تو تھا سا لیا۔ وہ پھر کود سکتے ہیں میدان عمل میں۔ حل نہ ہو تو۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا "یہ ٹھیک ہی فرمایا آپ نے۔"

رابعہ بدستور گم صم رہی "سوال یہ ہے کہ اس خط کا جواب کیا دیا جائے۔"

"نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جواب کسے دیا جائے اور کیسے دیا جائے" منظر بولا "یہ اندازہ تو ہو گیا کہ دلاور کے غائب ہو جانے سے دشمن کے کیمپ میں کتنی کھلبلی مچ گئی ہے۔ پہلے انہیں یقین ہو گا کہ وہ دلاور کو ڈھونڈ نکالیں گے اور اسے بزور بازو چھڑا کے لے جائیں گے لیکن اب ان پر مایوسی اور جھنجلاہٹ سوار ہے۔ انہوں نے افراتفری میں ادھر تو غالب اور نازو کو پکڑ لیا ہے اور دوسری طرف کراچی میں بھی کارروائی کی دھمکی دے رہے ہیں مگر میں اس دھمکی کو قطعی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر کسی کا بال بھی بیکا ہوا تو نقصان دلاور کا ہو گا۔ وہ کر ہی کچھ بھی نہیں۔ ابھی وہ اپنی پوزیشن کو مستحکم کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب ان کا پلڑا بھاری ہو جائے گا تو ہم سودا کرنے پر مجبور ہوں گے۔ وہ اپنے قبضے میں غالب اور نازو کو پہلے ہی ڈال چکے تھے۔ اب فوزیہ کو پکڑنے کی بات کر رہے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں کیونکہ فوزیہ کے ذریعے دباؤ دو طرفہ ہو گا۔ بیک وقت تم پر اور محسن پر لیکن اگلا قدم اٹھانے سے پہلے وہ ذرا ردعمل دیکھیں گے۔ پوچھیں گے کہ اب کیا سوچا ہے؟ تمہارے پاس ایک ترپ کا پتا ہے تو ہمارے پاس دو ہیں۔ دلاور کی سلامتی اور رہائی کے بدلے غالب اور نازو۔ اور فوزیہ کے گھربار کے تحفظ کی ضمانت۔"

میں نے منظر کی بات غور سے سنی تھی۔ اس کی دلیل میں وزن تھا۔ "کون کرے گا ہم سے سودا؟"

"دلاور کے بیٹے کا بیان تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ زیادہ پریشانی اس کے گھر والوں کو ہے۔ پیڈرو جیسے لوگوں کا کیا [illegible] ہو گا تو وہ بدمعاشی کی سلطنت کا تاج اپنے سر پر رکھ [illegible] دوسرے نمبر ان ہو جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ دلاور کی شوہری اور فیصل نے باپ کی رہائی کا معاملہ اپنے ہاتھ [illegible] ہے۔ پیڈرو دل سے تو چاہتا ہو گا کہ دلاور کا پتا نہ [illegible] بدبختی کا اظہار نہیں کر سکتا۔ وہ زندہ ہے کہ اس کی [illegible] برعکس دلاور اچانک آ گیا تو بس پر بھی بد خواہی کا [illegible] ہو گیا کہ اس نے جانتے بوجھتے اس کی رہائی کے لیے [illegible] کی تھی۔ اس کی خبر نہیں۔ دلاور کا ولی عہد یا اس کی [illegible] کسی ذریعے سے رابطہ کریں گے۔"

رابعہ نے سر ہلایا "منظر بھائی کی بات میں وزن ہے۔"

"منظر بھائی کا اپنا وزن ہر بات میں شامل ہے۔" میں [illegible]

"سوال ایک یہ بھی ہے کہ فوزیہ کو یہ خط لکھنے پر [illegible] کیا تھا؟ فوزیہ نے کوئی اشارہ بھی نہیں دیا" رابعہ بولی۔

"میرے ذہن میں صاف پیڈرو کا نام آتا ہے۔ دلاور نے بتایا تھا کہ وہ کراچی گیا تھا۔ یہی مقصد تھا اس کے [illegible] محسن اور گل کو تلاش نہیں کر سکا۔"

"پھر فوزیہ کو کیسے تلاش کیا اس نے؟"

"ابھی فوزیہ کا شوہر پروفیسر ہے۔ بتایا تھا پچھلے [illegible] معلوم ہے۔ فیصل آباد سے فرار ہو کے کراچی جانے والے [illegible] وہاں جا کے پرچون کی دکان تو کھولنے سے رہا۔ [illegible] سے رہا۔ وہاں بھی وہ کسی کالج میں ہی پڑھائے گا۔ پیڈرو [illegible] کے ہر کالج سے معلوم کیا ہو گا کہ حال ہی میں یہاں اس [illegible] لیکچرر آیا ہے یا کسی نے ملازمت کے لیے درخواست دی ہے [illegible] کے کسی کلرک نے سو پچاس روپے لے کر بتا دیا ہو گا [illegible] میں نیا پتا درج تھا۔ فوزیہ نے لکھا ہے نا کہ اس نے [illegible] کی تھی مگر اب کسی اور کالج میں پڑھا رہا ہے۔ [illegible] معلوم ہو جانے کے بعد پیڈرو کے لیے فوزیہ کو پریشان کرنا [illegible] تھا۔ اس کے شوہر اور بچوں کے لیے خطرہ پیدا کرنے کے [illegible] نے کسی کو ہمدرد بنا کے بھیج دیا ہو گا اور فوزیہ کے دل میں [illegible] بٹھا دی ہو گی کہ ساری خرابی کا ذمے دار میں ہوں۔ اگر وہ [illegible] مجھے مجبور کرے اور میں راہ راست پر آ جاؤں تو سب [illegible] ہو جائے گا۔ کسی کے لیے کوئی خطرہ نہیں رہے گا اور سب [illegible] سے رہ سکیں گے۔ عین ممکن ہے اس خط کا مضمون بھی [illegible] نے تجویز کیا ہو اور فوزیہ جذباتی استحصال کا شکار ہو گئی [illegible] شکاری ایسے ہی جال بچھاتے ہیں۔ فوزیہ بے چاری کیا جانے [illegible]"

رابعہ نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھا "تمہارا اندازہ [illegible] ٹھیک کام کر رہا ہے۔ خادم حسین بلاوجہ پریشان تھا۔"

اب خادم کو بولنے کا موقع ملا "آپ یقین کریں [illegible] ڈر گیا تھا کہ کہیں میری کسی بات سے مشتعل ہو کے [illegible]

میں نے ہنسی سے کہا "خوش فہمی کا شکار مت ہو بھوتنی کے۔ پہلے بھی ایک بار آئے تھے اسکاٹ لینڈ یارڈ والے جب اس ملک کے پہلے اور سب سے مقبول وزیراعظم کو قتل کیا گیا تھا اور سب کچھ بھی نکالا تھا انہوں نے کہ قتل کرنے والے اور کرانے والے کون تھے مگر خود ان کا انجام کیا ہوا تھا۔ کہاں ہے ان کی تفتیش کی رپورٹ؟ ایک ایکسیڈنٹ میں سب ختم کر دیا گیا تھا پھر آج تک۔"

"یہ کوئی سیاسی قتل نہیں ہے" منظر نے میری بات کاٹ دی "یہ ایک عام قتل کا معاملہ ہے اور دلاور جیسے قاتلوں کے سرپرستوں کا ہاتھ نہیں ہے۔ جاوید صدیقی نے غالب اور نازو کے اغوا کی رپورٹ درج کرا دی ہے۔ ایف آئی آر میں دلاور کے ساتھ اشارۃً پیڈرو کا نام بھی آ گیا ہے۔ وہ تم سے بھی ملنا چاہتا ہے۔"

"گویا معاملات اب پر آہستہ ہیں۔" میں نے کہا۔

"ظفر حیات اپنے گھر پر حراست میں ہے۔" رابعہ بولی "جاوید صدیقی کا اصرار تھا کہ ہم خود بھی دیکھ لیں اور کل کے اخبار میں یہ خبر تصویر کے ساتھ آ جائے۔ کسی نامزد ڈی آئی جی نے اس نوازش کا اظہار کیا ہے۔ یہ کیس غالباً سی آئی اے کے سپرد کیا جائے گا۔"

"کون ہے نامزد ڈی آئی جی؟"

"مجھے نہیں معلوم لیکن میرا اندازہ ہے کہ سی آئی اے کے ایس ایس پی کو اس کی جگہ لایا جائے گا۔ یہ محکمہ جاتی چپقلش کا سلسلہ ہے جو توڑ جوڑ ہوتے ہیں۔ دھڑے بندی ہوتی ہے۔ ڈی آئی جی کو "قتل کرانے والے" جب برسر اقتدار آئیں گے تو زیادہ بخشنے والوں میں ظفر حیات اور شاہد علی بھی ہوں گے تو ترقی تو خیر ان کی گئی۔ انہیں تو اب فکر ہو گی کہ جیل جانے سے اور تفتیش سے بچ جائیں۔ حوالات سے نکل کر گھر چلے جائیں تو یہی بہت ہے۔ عمر بھر کمانے کے لیے بہت ہے۔ بس کھایا پیا اگلنا پڑے۔"

"اچانک میں بہت پرامید ہو گیا ہوں۔ شاید ظالموں کے لیے یوم حساب قریب آ گیا ہے۔" میں نے کہا "کل رات رابعہ اور میں وزیر خان کے نام پر چلنے والے اسپتال گئے تھے۔"

"مجھے سب بتا چکی ہے رابعہ۔"

"کیا ہو رہا ہے وہاں منظر" میں نے کہا "تمہیں کیوں اندازہ نہیں تھا؟ آخر تم بھی تو اس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل تھے۔"

"پہلے اجلاس میں ضرور شریک ہوتا تھا میں۔"

"کبھی اندر جا کے نہیں دیکھا تھا؟"

"دیکھا تھا ایک بار مگر وہی جو مجھے دکھایا گیا تھا۔ جیسے وزیر کسی اسپتال کے دورے پر جاتا ہے تو کیا دیکھتا ہے۔ اس کے ساتھ اخبار والے بھی ہوتے ہیں۔ سب کو مثالی ماحول نظر آتا ہے۔ علاج معالجہ سہولتیں غذا اور دوا، توجہ اور انتظام سب بہترین۔"

کر دیں۔ مشکل وقت کے لیے ایک وظیفہ ہے میرے پاس۔ میں نے وہی پڑھ کے پانی پر پھونکا اور انہیں پلا دیا۔ یہ سب اسی کا کرشمہ ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "تو وظیفہ اور دم درود بھی کر لیتے ہو تم جادو ٹونا اور کالے علم میں بھی دسترس ہے تمہیں...؟"

"مذاق کی بات نہیں جی۔ کئی بار آزمایا ہوا نسخہ ہے میری گھر والی... اللہ اسے جلد جنت نصیب کرے۔ غصے میں زبان درازی کے بعد دست درازی پر اتر آتی تھی۔ اور خیریت وہ ہے بھی خاصی صحت مند۔ چمٹا چھری جھاڑو اور کپڑے دھونے کا ڈنڈا تو بڑے مہلک ہتھیار ہوتے ہیں۔ باورچی خانے کے برتن بھی توپ کے گولوں کی طرح داغ دیتی ہے۔ اس وقت یہی وظیفہ اسے یوں ٹھنڈا کر دیتا ہے جیسے ابھی آپ چولہے کی طرح بھڑک رہے تھے پانی پیتے ہی ٹھیک ہو گئے۔"

منظر نے زور سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا "مولوی۔ تم تو بڑے کام کے آدمی ہو۔ یار ہمیں بھی بتا دو یہ وظیفہ مگر ابھی نہیں ابھی تو چائے بنا کے لاؤ تم۔"

خادم حسین ہانپنے کانپنے لگا۔ "دیکھیں جی منظر صاحب یہ دوطرفہ مذاق بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ میرا آپ کا کیا مقابلہ جناب۔ اپنے برابر کا دیکھ کے بے تکلف ہونا چاہیے۔"

"ٹھیک تو کہہ رہا ہے خادم حسین" رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ابھی زبان کی طرح ہاتھ بھی قابو میں نہیں رہتے میرے ورنہ تم بھی جادوئی ہو جاؤ گے مولوی صاحب۔"

"جادوئی ہونے سے پہلے تو میں فوت ہو جاؤں گا جی۔" وہ بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔

"جاوید صدیقی نے فون کیا تھا مجھے" منظر بولا۔

"کب؟ کیا کہہ رہا تھا؟"

"وہ سب تو بچ اندر ہو گئے ہیں۔ ظفر حیات ایس ایس پی اور اس کے ماتحت۔ آج کے اخبارات میں خبریں اور تصویریں دیکھ کے ہوم سیکرٹری نے فوری آئی جی کو بھی معطل کر دیا ہے۔ کل میرا رویہ بھی زیادہ جارحانہ تھا۔ جاوید صدیقی بڑی نیاز مندی دکھا رہا تھا کہ آپ کا تعاون چاہیے اور مس رابعہ کو یقین دلائیں کہ جیسا وہ چاہتی ہیں ویسا ہی ہو گا۔ آخر میں غالب کا پتا پوچھنے لگا کہ میں خاص خاص صحافیوں کو مدعو کرنا چاہتا ہوں۔ سب کی مدد چاہیے مجھے اس کیس میں۔ انشاءاللہ ڈاکٹر شکیل کے قاتل کو بہت جلد بے نقاب کر کے تختہ دار تک پہنچا دیا جائے گا۔" منظر نے قہقہہ مارا "بڑا خراب تھی سالے کی۔"

"وہ بھی تو ہو گی۔ جب اوپر سے دباؤ پڑے گا اگر برطانوی حکومت نے سچ مچ اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کو بھیج دیا تو حکومت بھی بے بس ہو جائے گی۔ وہ گڑے مردے اکھاڑ کے سب کا کام تمام کر دیں گے۔" رابعہ بھی بولی۔

www.paksociety.com

"تم نے کبھی چھاپا نہیں مارا؟"

"چھاپے کے بچے۔ کون مارنے دیتا مجھے چھاپا۔ اگر میں کوشش بھی کرتا تو خود اندر ہوتا۔ اسی کے ساتھ جس کو تم نے اتفاق سے دیکھ لیا۔ مجھے تو شک تھا نہ فرصت تھی۔ ایک دن میں چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں بھوتنی کے اور ہفتے میں سات دن۔ بکھیڑے ہوتے ہیں ہزاروں۔ ادھر تمہارے مسئلے۔ تمہاری رابعہ بی بی کے دفتر اور ان کے کیس۔ اپنے قانونی معاملات۔ گھر بار۔ اتنا وقت کہاں سے نکالا میں کہ اسپتال کے انتظام کی پوری نگرانی کرتا۔"

میں نے کہا "سوری یار، تو ناراض ہو گیا۔"

"یہ ناراض ہوتی ہے محبوبہ۔ بیوی بھی روٹھتی ہے تو آدمی کہتا ہے کہ چلو تم روٹھے ہم چھوٹے۔ ہم تو ہیں دوست۔ بُرا مانیں گے تو گالی دیں گے یا لات ماریں گے تمہارے ایسی کہ پھر کبھی بیٹھ ہماری طرف نہیں کرو گے۔ تشریف رکھو گے تو دل سے ہائے نکلے گی۔ مولوی خادم حسین تم بھی سن لو۔"

خادم حسین نے چائے کا مگ منظر کے سامنے رکھ دیا۔ ان کے تعلقات مزید کشیدہ ہو گئے تھے۔ "آپ واہیات باتیں کرتے ہیں بھی اور خود بھی واہیات آدمی ہیں۔"

"بالکل ٹھیک۔ سمجھے تم۔ اب ہماری اور تمہاری دوستی پکی۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

خادم حسین وار بچا گیا ورنہ اس کا دوسرا شانہ منظر کے بھاری بھرکم ہاتھ کا نشانہ بنتا۔ "خدا نہ کرے کہ میں آپ جیسا یا دیوانہ کہلاؤں۔"

میں نے کہا "میں اور خادم حسین رات کو دلاور سے ملنے گئے تھے۔ تم خادم حسین کو محض مولوی مت سمجھو۔ اس کے گُن تو آہستہ آہستہ سامنے آ رہے ہیں۔ ہیرا بندہ ہے ہیرا۔"

"دیکھنے میں تو کھیرا لگتا ہے" منظر بولا۔

"آپ خود بھی تو بے ہنگم کدو لگتے ہیں" خادم حسین جل کے بولا۔

میں نے کہا "رات کو دلاور مارا گیا میرے ہاتھوں۔"

رابعہ اور منظر نے مجھے بے یقینی سے دیکھا اور پھر انتظار کرنے لگے کہ یہ مذاق ہے تو میں حقیقت بتا دوں۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ اس کی حالت پہلے ہی تباہ تھی۔ بھوک پیاس قید کی سختی اور اعصابی دباؤ سے۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اسپتال میں کیا ہوتا ہے۔ رانا کون ہے اور ڈاکٹر شاہ کا وہاں کیا کام ہے۔ اب ظاہر ہے وہ شرافت سے کچھ بتانے والا تو تھا نہیں۔ مجھ سے کچھ زیادتی ہو گئی۔"

"اور وہ مر گیا؟" منظر نے چلا کے کہا "اُلو کے پٹھے۔"

رابعہ نے افسوس سے سر ہلایا "یہ تم نے کیا کر دیا سکندر۔"

میں نے کہا "پہلے میری بات تو سن لو۔"

"اب بات اب کیا رہ گئی ہے سننے کو بھوتنی کے۔ اس کی لاش کہاں پڑی ہے؟"

"کس کی لاش؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"رابعہ۔ میرا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا ہے۔ میں ابھی کسی کا گلا دبا دوں گا۔ تمہارا لحاظ کر رہا ہوں ورنہ اسے۔ سمجھا دو۔"

"یار لاش کوئی نہیں ہے دلاور۔"

"دلاور کی لاش بھی ٹھکانے لگا دی تم نے؟" رابعہ نے طنز سے کہا۔

"حد کرتی ہو تم بھی۔ دلاور زندہ ہے تو لاش ٹھکانے لگانے کا سوال؟"

"ابھی تم نے کہا تھا۔"

"میں نے کہا تھا کہ وہ مارا گیا میرے ہاتھوں سے مگر بڑی کوشش کی تو وہ زندہ ہو گیا۔ کیوں خادم حسین؟"

خادم حسین نے سر ہلایا "ہم ایک ڈاکٹر کو بھی اٹھا لائے تھے آنکھوں پر پٹی باندھ کے۔"

اب میں نے انہیں ساری بات بتائی۔ "آج صبح میں نے جا کے دیکھا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک تھا۔"

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے رابعہ کو اشارہ کیا اور اس نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو۔ جی میں رابعہ قادری بول رہی ہوں۔ کون؟ دیکھئے میں نے پہچانا نہیں۔ اچھا اچھا۔۔۔ مسز دلاور۔"

میں نے رابعہ کو اشارہ کیا اور اس نے [illegible] کا بٹن دبا دیا۔

"جی میں نے پڑھ لیا وہ خط۔"

"وہ تمہارے نام تو نہیں تھا۔"

"اس کے باوجود میں نے پڑھ لیا تو کوئی قانونی جرم نہیں کیا۔ یہ معاملہ ہے میرے اور سکندر کے درمیان۔ مجبوری یہ ہے کہ خط سکندر کو پہنچایا بھی نہیں جا سکتا۔ معلوم نہیں وہ کہاں ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"مسز دلاور بات یہاں ختم ہو جانی چاہیے لیکن میں ایک موقع دے رہی ہوں تمہیں کہ جو کہنا ہے اور جس بات کے لیے تم نے فون کیا ہے کہہ دو۔"

"اس خط کے بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ مجھے معلوم اس میں کیا لکھا ہوا تھا۔"

"مسز دلاور۔ خط پہنچانے والا تمہارا اپنا بیٹا تھا۔ تم نے بروقت پہنچ کے بچا لیا ورنہ اب تک وہ سب بتا چکا ہوتا کہ خط اس کے پاس کہاں سے آیا تھا اور اسے کس نے یہ خط ڈیلیور کرنے کو دیا تھا۔ اس خط کی اصل کہاں ہے؟"

"میری سمجھ میں تمہاری کوئی بات نہیں آ رہی ہے۔ تم کس بیٹے کا ذکر کر رہی ہو؟"

"میں فیصل کی بات کر رہی تھی جو آج صبح فوزیہ کے ذریعے خط دے گیا تھا۔"

"کون فوزیہ؟"

"چھوڑو یہ بات مسز دلاور۔ فیصل تو بچے کے بعد آیا تھا اور میرے آفس میں چوکیدار کے سامنے بہت اکڑ فوں دکھا رہا تھا۔ بچہ سمجھ کے اسے چھوڑ دیا۔"

"لیکن فیصل تو اسکول میں تھا نو بجے۔ اسکول آٹھ بجے لگتا ہے اس کا۔ تم معلوم کر سکتی ہو۔"

رابعہ نے تلخی سے کہا "اب میں کہوں گی کہ تم نیلے رنگ کی ایک فاکس ویگن میں آئی تھیں جسے استاد پیڈرو چلا رہا تھا تو تم کہو گی کون استاد پیڈرو۔ فیصل کی اسکول میں اور تمہارے گھر میں یا کسی اور کے ساتھ موجودگی ثابت ہو جائے گی مگر یہاں جو کچھ ہوا اس کا گواہ کوئی نہیں۔ سوائے ایک غریب چوکیدار کے جس کی گواہی بھی معتبر نہیں سمجھی جائے گی۔ خیر یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"دیکھو میری طرح تم بھی ایک عورت ہو مگر ابھی ایک فرق ہے تمہاری اور میری حیثیت میں۔ تم ابھی بیوی اور ماں نہیں بنی ہو۔ میں اپنے شوہر کے لیے اور بچے اپنے باپ کے لیے بہت پریشان ہیں۔ خدا کے لیے ہم پر رحم کرو۔"

"میں کیا مدد کر سکتی ہوں تمہاری؟"

"اگر تمہیں معلوم ہے کہ چوہدری دلاور کہاں ہے۔۔"

"مجھے معلوم نہیں اور معلوم ہوتا تب بھی تمہیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ میں تم کو بتاؤں گی۔ اگر تم اتنا احمق سمجھتی ہو مجھے تو یقیناً افسوس کی بات ہے میرے لیے۔"

"دلاور کے خلاف قتل کا مقدمہ تم نے درج کرایا تھا......؟"

"مدعی صرف میں نہیں تھی۔ میرے ساتھ دس وکیل اور بھی ہیں۔"

"مگر ابتدا تم نے کی تھی۔ آج ایک اور مقدمہ بنا دیا گیا ہے اس پر کہ وہ غالب اور نازو کے اغوا کا ذمے دار ہے۔ جس آدمی کا کسی کو علم ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے، زندہ بھی ہے یا نہیں، وہ اغوا کے جرم میں کیسے ملوث ہو سکتا ہے۔"

"دلاور خود کچھ نہیں کرتا خاتون۔ دوسروں سے سب کچھ کرواتا ہے۔ تم اتنی بھولی نہیں ہو کہ تمہیں یہ سب بتانا ضروری ہو۔ مجھے تو یقین ہے کہ یہ فون بھی تم نے دلاور کے کہنے پر کیا ہے۔ شاید وہ تمہارے قریب ہی موجود ہے یا تم وہاں ہو جہاں وہ روپوش ہے۔ تم بھی جانتی ہو اور ہم بھی جانتے ہیں کہ وہ کتنا بڑا ڈرامے باز ہے لیکن اس کے سب ڈرامے فلاپ ہو گئے ہیں اور اب کوئی ڈراما چلنے والا نہیں ہے۔ پولیس اسے برآمد کر لے گی وہ جہاں بھی ہو گا۔ ممکن ہے خود تم سے، دلاور کے ولی عہد بہادر سے تفتیش کی جائے۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تفتیش کیسے ہوتی ہے؟"

وہ رونے لگی "یقین کرو مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ اگر تمہیں معلوم نہیں تو پھر پولیس نے اسے غائب کیا ہے۔"

"یہ بات تم عدالت میں کہہ سکتی ہو؟"

"عدالت میں۔ وہاں تو ثبوت کے بغیر کوئی بات اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ محض میرا شک ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہو۔"

"حادثہ یا سازش۔ دشمنی اور رقابت۔ انتقام یا شامت اعمال۔ دلاور جیسے لوگوں کی موت کے بہانے کم نہیں ہوتے۔"

"یا شاید کہ وہ زندہ ہے۔"

"مجھے بھی یقین ہے کہ وہ زندہ ہے لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ زیادہ عرصہ روپوش نہیں رہ سکے گا۔ بہت جلد اسے اپنے ہر جرم کی سزا بھگتنے کے لیے عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ اس لیے کہ دلاور کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہوگی اور وہ مجرموں کے کٹہرے میں۔"

"یہ غلط فہمی ہے تمہاری۔ مجرم اگر دلاور ہے تو اس سے بڑا مجرم سکندر ہے۔ دلاور مفرور ہے تو سکندر بھی روپوش ہے۔ جتنے الزام دلاور پر لگائے گئے ہیں اس سے دس گنا جرم سکندر کے ہیں۔ پھر سزا ایک کو کیسے ہو سکتی ہے۔ جیل جائیں گے تو دونوں۔ پھانسی چڑھے گا سکندر کو بھی۔"

"بکواس بند کرو اپنی۔" رابعہ نے برہمی سے کہا۔

"یہ بکواس نہیں ہے رابعہ بیگم۔ اگر میں بیوہ ہوئی تو تم سہاگن بھی نہیں بنو گی۔ دولت کی بات چھوڑو۔ وہ بھی تم سے کہیں زیادہ ہے میرے پاس۔ میرا اصل سہارا ہوں گی دلاور کی نشانیاں۔ میرے بچے۔ تمہارے پاس کیا ہو گا وکیل صاحبہ۔ بدنامی کے سوا۔"

"تم ذاتیات پر اتر آئی ہو.... مجھے رشتوں کی کمی نہیں۔"

"ہاں۔ ایک خصم کر کے چھوڑ دیا۔ دوسرے کو یار بنا کے رکھا۔ اس کے بعد تو ہر رات نیا رشتہ ملے گا تجھے فاحشہ۔"

"شٹ اپ ذلیل عورت" رابعہ نے چیخ کے کہا اور ریسیور پٹخ دیا مگر اندر والے فون پر دلاور کی بیوی کی آواز آتی رہی۔

"یہ راتوں کے یار وفادار نہیں ہوتے۔ ان پر بھروسا مت کرنا۔ تیرا مقابلہ اب مجھ سے ہے۔ دلاور کی بیوی سے۔ تو نے دیکھا ہے میرے فیصل کو۔ وہ دوسرا دلاور ہے۔ وہ دلاور کا وارث ہے۔ تجھے اپنی داشتہ بنا لے گا۔"

میں نے بٹن دبا کے لائن کاٹی اور باہر لپکا۔ رابعہ صوفے پر گر کے لیٹی اور رو رہی تھی۔ ذلت سے کانپ رہی تھی۔

"میں چھوڑوں گی نہیں اس کو....."

منظر نے کہا "پاگل مت بنو۔ وہ ایک جاہل عورت ہے۔ بکنے دو اسے۔"

میں نے کہا "اس کا تو مقصد ہی تمہیں گالیاں دینا تھا۔ تمہیں اپنے جذبات پر کنٹرول رکھنا چاہیے۔"

خادم حسین نے فوراً پانی کا گلاس پیش کیا "یہ لیں جی۔ پہلے سو تک گنیں۔ پھر تین بار لا حول کا ورد کر کے پانی پئیں۔ بڑا مجرب نسخہ ہے۔"

رابعہ نے اسے گھور کے دیکھا لیکن گلاس لے لیا۔ وہ پانی پئے

www.paksociety.com

علی والی تھی کہ خادم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "ایسے نہیں جی۔"

میں نے کہا "ہاں ایسے نہیں۔"

منظر نے مجھے حیرانی سے دیکھا "ارے تو بھی باؤلا ہو گیا ہے۔"

"نہیں۔ خادم ٹھیک کہتا ہے۔ میں تجربہ کر چکا ہوں۔ تم آن' دل ہی دل میں سو تک گنو۔"

رابعہ نے ایک گہری سانس لی اور ایک منٹ بعد پانی پی کے مسکرانے لگی کیونکہ میں اور منظر دونوں ہی اسے غور سے دیکھ رہے تھے جیسے خادم حسین کے تجربے کی کامیابی یا ناکامی کا حتمی فیصلہ اب ہوگا۔

خادم حسین کا چہرہ چمک اٹھا۔ "دیکھا جی آپ نے کیسی تاثیر ہے میرے وظیفے میں۔ ایک دم مسکرانے لگی ہیں دریا کی طرح۔"

"دریا کے بچے" منظر بولا "چکر دیتے ہو ہمیں۔ قسم کھا کے کہو تم وظیفہ پڑھتے ہو۔"

خادم سر کھجانے لگا "وہ جی۔ قسم کھانا کیا ضروری ہے؟"

میں نے کہا "ہمیں معلوم ہے خادم حسین کہ سو تک گنتی گننے سے دھیان بٹ جاتا ہے آدمی کا۔"

"دلاور کی بیوی خطرناک عورت ہے۔" رابعہ بولی۔

"سانپ کے بارے میں کیا مشہور ہے۔ جوڑے میں سے ایک کو مار دو تو دوسرا پیچھا نہیں چھوڑتا اور سانپ کا بچہ سپولیا ہی ہوتا ہے۔ وہ بھی بدلہ ضرور لیتا ہے" میں نے کہا۔

"یہ سب جہالت کی بات ہے۔ نہ آدمی سے زیادہ کینہ پرور کوئی جانور ہے اور نہ خطرناک چیز۔ دلاور کی بیوی چالاک بنتی ہے مگر ہے احمق۔ اس نے ظاہر کیا کہ اسے خط کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ غرض توقع اسے یہ تھی کہ ہم نوزیہ کے مسئلے پر تشویش کا اظہار کریں گے اور اسے ذریعہ بنا کے دھمکیاں دینے والوں سے تحفظ حاصل کرنے کی درخواست کریں گے مگر ہم نے بڑی سمجھ بوجھ کا ثبوت دیا اور اسے لفٹ ہی نہیں ڈالی۔"

"بے وقوف عورت خط کے بارے میں سوال کر رہی تھی کہ تم نے پڑھا اور یہ بھی ظاہر کر رہی تھی کہ اسے خط کے بارے میں کچھ پتا نہیں پھر یہ کیسے جان لیا اس نے کہ وہ میرے نام تھا" میں نے کہا۔

"بس یار۔ اس وقت ہم یہ گفتگو ریکارڈ نہیں کر سکے ورنہ اپنے چوہدری دلاور کو سنواتے کہ لو سنو اپنی بلبل کی آواز۔" منظر بولا "اچھا اب ہم تو جاتے ہیں کورٹ۔ تم جاوید صدیقی سے مل لو۔"

"ابھی تم اپنی گاڑی سے جاؤ" میں نے رابعہ سے کہا "ہر جگہ پہچانی جاتی ہے۔ اس کا رنگ ہی ایسا ہے۔"

"کیسا ہے؟" رابعہ نے برا مان کے کہا "اتنا اچھا رنگ تو ہے۔"

"میں خراب کب کہہ رہا ہوں۔ بالکل لال۔ سانپ کے عروسی جوڑے میں لپٹی ہوئی دلہن لگتی ہے مگر لال جوڑا پہن کے دلہن انارکلی میں گھوم رہی ہو تو ہر نظر اٹھتی ہے۔"

منظر بولا "جیسے شب عروسی کے بعد تم اپنے لال [illegible] کورٹ پہنچ جاؤ تو مدعی مجرم جج سب پر سکتہ طاری ہو جائے [illegible]"

رابعہ نے غصے سے کہا "آپ واقعی واہیات [illegible] ٹھیک کہتا ہے۔"

منظر ہو ہو کر کے ہنسنے لگا۔ "مولوی کو غلط کون کہہ سکتا ہے بھائی۔ فوراً کافر ہونے کا فتویٰ لگا دے گا۔ مولوی تمہیں کس بات [illegible] لگتی ہے؟"

خادم چونکا "لاحول ولا قوۃ۔"

"پھر اس کی مسکراہٹ کی مثال کیوں دی تھی؟" منظر نے اسے ڈانٹا۔

جب وہ چلے گئے تو میں نے آفس کو لاک کیا اور خادم کے ساتھ نیچے اتر گیا۔

خادم نے ایک دم مجھے کہنی ماری "وہ جی۔ اُدھر۔"

میں نے کہا "کیا بات ہے۔ یہ کوئی غیر ملکی ٹورسٹ ہیں یہ تو ہوتی ہی بے حیا ہیں۔ تم مت دیکھو اُدھر۔ سب کچھ نظر آتا ہے اس عالم کم لباسی میں۔"

"آپ بھی ایسی باتیں کرنے لگے ہیں جی۔" مولوی نے کہا "میں تو اس گاڑی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔"

سڑک کے دوسرے کنارے پر بہت سی گاڑیوں کے درمیان وہی ٹاکس ویگن موجود تھی جس کو کل سے اب تک میں دیکھ چکا تھا۔ پہلی بار اس میں نادرہ نظر آئی تھی تو جب ہم اور خادم [illegible] جگہ کھانا کھا رہے تھے پھر ہم نے اسے پولیس ہیڈ آفس کے پاس [illegible] تھا۔ اس کے بعد رات کو اسی کار نے ہمارا تعاقب کیا تھا اور صبح اس میں دلاور کی بیوی اپنے بیٹے کے ساتھ آئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ہر بار مجھے استاد پیڑو ہی نظر آیا تھا۔

اتنی دور سے خادم کی دوربین نگاہوں نے کار کو پہچان لیا [illegible]

میں نے کہا "ظاہر یہ کرو کہ ہم نے کچھ نہیں دیکھا۔"

خادم حسین کی نظر اس میم کو دیکھ رہی تھی جس نے لباس کے نام پر چار گرہ کپڑے کو بدنام کیا تھا اور اس کے گورے بدن کی [illegible] تاب نے ہر نگاہ کو خیرہ کر دیا تھا۔ ایک موٹر سائیکل والا لڑکھڑا [illegible] گیا۔ ایک تانگے والے نے نعرہ لگایا "اوئے صدقے [illegible]" خادم حسین اپنے ہی محلے کے ایک [illegible] سے ٹکرا گیا۔ ظاہر ہے وہ بھی سامنے نہیں دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا "خادم حسین کیا [illegible] ہے تمہارا دوسری شادی ایسی ہی کسی فرنگن سے کرا دی جانے والی ہیں۔"

وہ جز بز ہو کے بولا "لاحول ولا قوۃ جی۔"

"لاحول پڑھتے جاتے ہو مگر خود بھٹکنا چاہتے ہو۔ اس کار کو دیکھ سکتے ہو؟ ڈرائیور نظر آ رہا ہے تو بتاؤ۔"

شاہد علی نے کہا "مولوی۔ ایک بار میں باہر آ جاؤں پھر۔"

"پھر کیا ہوگا۔ بڑے بول مت بولو۔ کیا پتا تم باہر ہی نہ آؤ۔ یا آ تو جاؤ مگر عبرت بن جاؤ۔" خادم حسین نے کہا۔

ظفر حیات کچھ نہیں بولا۔ وہ غالباً روتا بھی رہا تھا۔ یہ فرق عہدے کا نہیں احساس کی شدت کا تھا اور تعلیم کے فرق کا تھا۔ شاہد علی نیچے سے اوپر تک رشتے اور رگڑے کھاتا ذلیل کرتا اور ذلیل ہوتا تیس برس میں اس عہدے تک پہنچا تھا۔ ظفر حیات اچھے خاندان اور اعلیٰ تعلیم کے ساتھ براہ راست افسری کے منصب پر فائز ہوا تھا۔ اس نے صرف عزت دیکھی تھی اور یہ سزا اس کے لیے شرمناک تھی جب کہ شاہد علی اس طبقے سے تھا جس کے نزدیک پیسہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔ عزت اور شرم آنی جانی چیز ہے۔

جاوید صدیقی اپنے آفس میں تھا اور خصوصی ٹیم کے دیگر ارکان کانفرنس میں شریک تھے۔ وہ سب آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے مجھے دیکھتے ہی جاوید صدیقی مستعد ہو گیا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو خبردار کرنے کے انداز میں کہا "دیکھو ذرا سنبھل کے" اور پھر مسکراتا ہوا مجھ سے ہاتھ ملانے کے لیے آگے آیا۔

"میں آپ ہی کا منتظر تھا۔" اس نے بڑی شائستگی سے کہا "میری آج صبح منظر صاحب سے بھی بات ہوئی تھی اور مس رابعہ قادری سے بھی۔"

مولوی نے میری طرف سے جواب دیا "وکیل صاحب فرماتے ہیں کہ آج سب کا رویہ بدلا ہوا دیکھ کے انہیں لگتا ہے وہ راتوں رات کسی اور ملک میں پہنچ گئے ہیں۔"

جاوید صدیقی مسکراتا رہا "انشاء اللہ اب کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ ہم نے ڈاکٹر شکیل کی پوسٹ مارٹم رپورٹ مانگی تھی مگر مجھے یہ جان کے تعجب ہوا کہ اس کیس میں واقعی پوسٹ مارٹم نہیں ہوا۔ یہ بہت بڑی بے قاعدگی ہے اور ہم یہ یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ ایسا کسی گھپلے کو چھپانے کے لیے کیا گیا تھا۔"

میں نے خادم کو سمجھایا "یہ جانو کہ کس طرح اسپتال سے لاش چوری ہوئی تھی اور ڈاکٹر شکیل کو ایک بڑھیا کی جگہ دفن کر دیا گیا تھا۔ بڑھیا کا شوقین مزاج پوتا اس سازش میں شریک ہو گیا تھا چنانچہ کسی کو پتا نہیں چل سکا تھا کہ جنازہ بڑھیا کا نہیں دفنانے والے ڈاکٹر شکیل کو دفنا آئے تھے۔ کسی نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر شکیل کہیں اور دفن ہے مگر یہ بات صرف گورکن جانتا تھا جسے قتل کر دیا گیا ہے۔"

"او مائی گاڈ!" جاوید صدیقی نے سر جھٹک کے کہا "یہ بڑی عجیب کہانی ہے مگر کیا ثبوت ہے اس کی صداقت کا۔"

"یہ سب عدالت سے دوبارہ پوسٹ مارٹم کی اجازت کی درخواست میں بتایا گیا ہے۔ کیا ایس پی صاحب نے یہ درخواست

خادم نے نظر جما کے دیکھا اور ایک ایک کر کے نمبر پلیٹ کے سارے حروف اور اعداد دہرا دیے۔ اس کی نظر واقعی عقابی تھی۔

"ڈرائیور آس پاس تو نظر نہیں آ رہا ہے۔ ہاں وہ رہا... پان سگریٹ کی دکان پر کھڑا ہوا ہے؟ ہماری طرف پیٹھ کیے۔ وہی کالے منہ والا ہے۔"

"اس نے پہلے دیکھ لیا ہوگا ہمیں۔ خیر تم کوئی ٹیکسی روکو پولیس ہیڈ آفس جانے کے لیے۔" میں نے کہا۔

حسب توقع نیلے رنگ کی ٹاکس ویگن نے ہمارا پیچھا کیا۔ اتفاق سے ٹیکسی کا بیک ویو مرر کا رخ ایسے تھا کہ میں بھی پیچھے کا ٹریفک دیکھ سکتا تھا حالانکہ میں پچھلی سیٹ پر تھا۔ ڈرائیور کے لیے اس کا رخ یقیناً غلط ہوگا مگر اسے پروا نہیں تھی۔ وہ سڑک پر دوسروں کی پروا کیے بغیر اپنی مرضی سے چلتا تھا اور قاعدے قانون سے بھی بے نیاز تھا۔

ایک بار میں نے اسے ٹوکا "یہ تم کیا کر رہے ہو۔ سگنل توڑا ہے تم نے۔"

"پھر کیا ہوا بادشاہو۔ توڑنے والوں نے تو سب کچھ توڑ دیا" وہ سرد آہ بھر کے بولا "ظالموں نے میرا دل توڑ دیا۔ میں تو ابا کو ساتھ لے کر گیا تھا شادی کا پیغام دینے پھر اس کے چوکیدار نے ابا کا چشمہ توڑ دیا اور میرا بازو۔ مہینہ بھر بستر میں رہا۔ اور جی اس بات پر میری بہن کا رشتہ توڑ دیا میرے ماما نے۔ چور تالے توڑتے ہیں۔ مجرم جیل توڑتے ہیں اور توڑنے والوں نے تو یہ ملک توڑ دیا۔ ہم نے سگنل توڑ دیا تو آپ گرم ہو رہے ہیں۔"

مجھے ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی آیا کیونکہ وہ باتوں باتوں میں انتہائی خطرناک طریقے پر گاڑی چلا رہا تھا۔ یہ دوسرے لوگوں کا کمال تھا کہ وہ بچ گئے اور حادثہ نہیں ہو سکا۔ پولیس ہیڈ آفس کے دروازے پر اتر کے میں نے اسے کرایہ ادا کیا "اگر اس وقت میں تم کو اندر لے جاؤں تو توڑنے والے تمہاری ہڈیاں توڑ دیں گے اور تم کو حوالات میں ڈال دیا تو تم زنجیریں اور سلاخیں نہیں توڑ سکو گے۔ تمہارے ساتھ ہم بھی مارے جاتے۔"

"صحیح۔ بندہ کبھی تو مارا جاتا ہے۔ ٹرین الٹ جاتی ہے۔ جہاز گر جاتا ہے۔ مرنے سے کیا ڈرنا۔" اس نے سلیوٹ کے انداز میں سلام کیا نوٹ جیب میں رکھا اور باقی رقم دیے بغیر بھاگ گیا۔

جاوید صدیقی کے پاس جانے سے پہلے میں نے حوالات کو ملاحظہ فرمایا۔ وہاں ٹوٹے پھوٹے خستہ تن مجرموں کے درمیان سابق ایس ایس پی ظفر حیات اور ڈی ایس پی شاہد علی بھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔

خادم کے ساتھ مجھے دیکھتے ہی شاہد علی گالیاں بکنے لگا "دفع ہو جاؤ۔"

خادم نے کہا "عقل نہیں آئی ابھی تمہیں۔ سوچ کیا رہے کر رہے تھے تم مجھے بند کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔"

www.paksociety.com

ملاحظہ نہیں کی۔"

"اتفاق سے مجھے ابھی تک موقع نہیں ملا۔"

"عدالت سے اس کی اجازت مل چکی ہے اور شیلی کی قبر کا سراغ بھی لگا لیا گیا ہے مگر فی الوقت اس کا انکشاف نہیں کیا جا سکتا ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ با اثر ملزم وہاں سے لاش کھود کے لے جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے غائب کر دیں گے۔"

"ہم وہاں مسلح پہرا بٹھا سکتے ہیں۔"

"مسلح گارڈز کی زندگی داؤ پر لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر ہے کہ دیگر انتظامات مکمل ہوتے ہی میڈیکل بورڈ کے ارکان، مجسٹریٹ اور مسلح گارڈز قبرستان کا رخ کریں۔ قبر کی نشاندہی کر دی جائے گی۔"

"کیا وکیل صاحب بھی جانتے ہیں کہ قبر کہاں ہے؟"

"وکیل صاحب نے سنا ہے کہ قبر کے بارے میں ملا ور گیس کے مدعی جانتے ہیں۔"

"گیس میں اب کیا مدعی ہیں۔"

"انہی میں سے کسی کو معلوم ہوگا۔ یا شاید کسی صحافی کو بھی علم ہو۔"

"کل یہاں ایک صحافی موجود تھا۔ مرزا غالب۔ مجھے پتا چلا ہے کہ باہر نکلتے ہی اسے اٹھا لیا گیا۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ اغوا کرنے والوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ گاڑی کا نمبر اور دیگر تفصیلات بھی فراہم کی جا سکتی ہیں۔"

"ایف آئی آر میں سب ہے۔"

"پھر کیا وہ گاڑی پولیس کی تحویل میں لے لی گئی ہے؟"

"معلوم کیا جا رہا ہے کہ وہ گاڑی کس کی ہے۔"

"وہ گاڑی غالباً باہر موجود ہے۔ ایک ملزم نے اسی میں ہمارا تعاقب کیا تھا۔ ممکن ہے پولیس ہیڈ آفس تک آ کے وہ سیدھا نکل گیا ہو۔"

جاوید صدیقی نے بڑی پھرتی دکھائی اور انسپکٹر کو حکم دیا کہ وہ فوراً دیکھے اور گاڑی موجود ہو تو اسے قبضے میں لینے کی بھرپور کارروائی کرے۔ "ملزم کو زندہ پکڑنا ضروری ہے مگر وہ مزاحمت کرے یا فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے بے دریغ گولی مار دی جائے۔"

"مارنے کے لیے گولی نہ ماری جائے۔ پکڑنے کے لیے ماری جائے۔" خادم نے کہا اور میں حیران رہ گیا کیونکہ یہی بات میں کہنا چاہتا تھا مگر اچھے طور پر کہتا تو یہ ظاہر ہو جاتا کہ میں جاوید صدیقی کی بات سمجھ رہا تھا۔

جاوید صدیقی نے غور سے خادم حسین کو دیکھا "اب تک سنا تھا کہ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ آج دیکھ لیا، تم تو اس وکیل سے بھی زیادہ ہوشیار ہو۔"

"وکیل باہر سے آیا ہے جی۔ ہم اسی ملک میں رہتے ہیں۔ یہ اکثر سنا ہے کہ جب کوئی مجرم جو پولیس سے ملا ہوا ہو خطرناک ہو جائے اور یہ اندیشہ ہو کہ گرفتاری کی صورت میں وہ پول کھول دے گا تو اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کروا دیا جاتا ہے۔ عذر یہ پیش کیے جاتے ہیں۔ ملزم نے حوالات میں اپنی شلوار کے ازار بند سے خودکشی کر لی۔ اس نے پولیس پر فائرنگ کی اور گرفتاری میں مزاحمت کی۔ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی۔"

"تمہارا نام کس نے تجویز کیا تھا۔ بطور مترجم؟"

"مظفر اور غالب صاحب نے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں فرنچ جانتا ہوں۔"

"تم اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتے ہو۔ اس غیر ملکی وکیل کو انہی باتوں سے ہمارے خلاف مت کرنا ورنہ۔۔۔"

"دیکھیں جی ایسی دھمکیاں مجھے ظفر حیات اور شاہد علی بھی بہت دیتے تھے۔ ورنہ کا لفظ بہت استعمال کرتے تھے مگر میں صاف بتا دوں کہ میں اپنا کام دیانت داری سے کرتا ہوں۔ نہ کسی کو ڈراتا ہوں، نہ کچھ چھپاتا ہوں اور نہ کسی کی دھمکی سے ڈر کے وہ بات چھپاتا ہوں جو میرے وکیل کو دوران تفتیش معلوم ہو۔ اسے میرے ذریعے بتائی جائے اور جس کا اخفا کرنا استغاثہ کے مفاد میں نہ ہو۔"

میں نے فرنچ میں کہا "خود بولے جا رہے ہو۔ کچھ مجھ سے بھی کہو۔ تاکہ میں تمہیں سپورٹ کر سکوں۔"

خادم حسین نے ایک جذباتی تقریر کی اور کہا کہ راز داری بعض اوقات وفاداری کی شرط ہوتی ہے اور وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے۔ میں نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی۔

"اب ان کو سمجھا دو کہ وکیل صاحب کیا فرماتے ہیں۔ اگر تمہیں کسی نے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھا تو ہم اسے ہمیشہ کے لیے بھینگا کر دیں گے۔ وہ ساری عمر سب کو ٹیڑھی نظر سے دیکھے گا۔"

انسپکٹر نے بڑی مستعدی دکھائی تھی مگر وہ تھوڑی دیر بعد آتی منہ لٹکائے واپس آیا "باہر تو ایسی کوئی گاڑی موجود نہیں سر۔"

"کہاں تک دیکھا تم نے؟ کسی سے پوچھا؟"

"میں نے دونوں طرف پولیس کی نفری کھڑی کر دی ہے۔ سادہ لباس میں کہ پھر گاڑی نظر آئے تو روک لیں۔"

"اب وہ ہر شریف آدمی کو پریشان کریں گے جو نیلے رنگ کی فاکس ویگن میں گزرے گا۔ ابھی تک پتا نہیں چلا کہ گاڑی کس کی ہے۔ ملزم اسی میں دندناتا پھر رہا ہے۔"

ڈی ایس پی آفتاب نے وضاحت کی "یہ نمبر غالباً بوگس ہوگا۔"

"پھر بھی پتا تو چلے کہ کسے دیا گیا تھا۔"

ایک کانسٹیبل نے اوپر آ کے سلیوٹ کیا اور صاحب کے سامنے ایک سلپ رکھ دی۔

"اسے اندر بلاؤ۔"

ایک شخص سخت برہمی کی کیفیت میں اندر آیا "واٹ از گی

نہیں اتفاق سے آج ایم ایس صاحب بھی باہر اور ایک کے درمیان دستیاب ہیں۔ میں نے قبرستان کے گورکن کو طلب کیا تھا۔"

"وہ تو کب کا باہر بیٹھا ہے سر۔" انسپکٹر نے کہا۔

"کیا کہتا ہے وہ۔ قبر کی نشاندہی کر سکتا ہے؟"

"وہ تو پھر انکار کر رہا ہے کل سے۔" ڈی ایس پی نے کہا۔

"کل سے؟" میں نے فرنچ میں خادم سے کہا "کیا یہ لوگ رات بھر اس سے یہی معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔"

"اسے لاؤ میرے سامنے۔" جاوید صدیقی نے حکم دیا۔

ایک دبلے پتلے سوکھے اور بیمار نظر آنے والے لڑکے کو اندر لایا گیا جو اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کر دیا۔ پولیس نے واقعی اسے رات بھر "بڑی احتیاط" سے مارا تھا۔ بے احتیاطی سے تفتیش کے نتیجے میں اس کا باپ ضائع ہو گیا تھا اور یہ کیس بڑی مشکل سے دبایا گیا تھا۔

"چپ کر کے سیدھا کھڑا ہو۔۔۔" انسپکٹر نے گرج کے کہا "کیا سکھایا تھا تجھے کو۔ افسروں کے سامنے تمیز سے بات کرتے ہیں۔"

"تم نے میرے باپ کو ایسے ہی مار ڈالا تھا۔ مجھے بھی مار ڈالو۔ میں کیسے بتا دوں وہ بات جو مجھے معلوم ہی نہیں۔"

خادم نے کہا "ذرا تمیز سے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ وکیل صاحب بیٹھے ہیں یہاں اور لوگ بھی آنے والے ہیں۔ انہیں سب بتانا۔"

"اسے لے جاؤ اور چھوڑ دو۔ یہ واقعی کچھ نہیں جانتا۔" جاوید صدیقی نے صورت حال کو سمجھتے ہوئے کہا۔

میں نے خادم سے کہا "ان سے کہو کہ گورکن کو روک لیں۔ یہ ہمارے ساتھ ہی جائے گا۔"

"جانے دیں جی غریب کو۔"

"تم نہیں سمجھتے خادم۔ یہ چھوڑا گیا ہے۔ یہاں سے نکل کے یہ گھر نہیں پہنچے گا۔ شرطیہ کہتا ہوں یہ غائب ہو جائے گا اور کہا جائے گا کہ وہ ڈر کے بھاگ گیا یا اسے حادثہ پیش آ جائے گا اور بعد میں پتا چلے گا کہ یہ شراب کے نشے میں وسط سڑک کے بیچ میں چل رہا تھا۔ اس کی چال بتاتی تھی کہ یہ ہوش میں نہیں تھا۔ اصل وجہ جاننے والا کون ہوگا پھر۔۔۔؟"

خادم نے میری بات آگے پہنچا دی "وکیل صاحب چاہتے ہیں کہ اس گورکن کو پولیس اپنی تحویل میں بحفاظت رکھے۔ جب تک پوسٹ مارٹم ختم نہیں ہوتا۔ اندیشہ یہ ہے کہ اسے بھی مار دیا جائے گا۔"

جاوید صدیقی نے کہا "تمہارے وکیل صاحب کس حیثیت میں یہ درخواست کر رہے ہیں؟"

"یہ فرانس سے خاص طور پر تفتیش میں شامل رہنے کے لیے

دیں۔ مجھے آفس میں اتنی اہم میٹنگ سے کیوں تھانے لایا گیا ہے؟"

"یہ تمہاری گاڑی کا نمبر ہے؟" جاوید صدیقی نے کہا۔

"ہاں مگر کل سے اب تک میں پاپا کو اسپتال میں تنہا چھوڑ کے۔"

"اس کار کا نمبر ایک ایف آئی آر میں لکھوایا گیا ہے۔"

اچانک خادم بولا "ڈاکٹر صاحب۔ کیا نیلی فاکس ویگن ہے آپ کی؟"

"نیلی فاکس ویگن۔ باہر جا کے دیکھ لو۔ اس سے چار گنا لمبی شیورلٹ بلیزر ہے۔"

"نہیں دکھا رہی جی۔ اصل کار تو نیلی فاکس ویگن ہے۔" جاوید صدیقی نے کہا "مگر نمبر تو یہی ہے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کل کسی قتل یا ڈکیتی میں کوئی بھی گاڑی استعمال ہوتی ہے۔ مجرم اس پر کوئی بھی بوگس نمبر پلیٹ لگا لیتے ہیں۔ پکڑا وہ جائے گا جس کی نمبر پلیٹ اصلی ہوگی۔"

"آئی ایم سوری۔ یہ کنفیوژن دور ہو جائے پھر گاڑی آپ کو واپس مل جائے گی۔"

"کیا مطلب۔ میں گاڑی چھوڑ جاؤں؟"

"آپ ٹھیک سمجھے۔ گاڑی پولیس کی تحویل میں رہے گی فی الحال۔ آپ آزاد ہیں۔"

"نہیں، آپ مجھے بھی بند کر دیں کہ گاڑی میں چلا رہا تھا۔" ڈاکٹر سخت مشتعل تھا "مجھے طوفان کا ساتھی بنا دیں۔"

"بوگس نمبر پلیٹ والی گاڑی ملتے ہی۔۔۔"

"مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ وہ گاڑی کیسے مل سکتی ہے۔ اب تک وہ پھر نمبر پلیٹ بدل چکے ہوں گے اور آج میں یہ گاڑی تھانے میں چھوڑ گیا تو کل مجھے اس کی جگہ صرف اس کا ڈھانچا ملے گا۔"

"میں شک کی بنا پر اسے روک رہا ہوں۔"

"میں کیس کروں گا۔۔۔ تم نے کیا سمجھ رکھا ہے مجھے۔"

"جاؤ کر دو۔ دھمکیاں دو گے تو تمہیں بھی بند کرا دوں گا۔" جاوید صدیقی نے دہاڑ کے کہا۔

ڈاکٹر پیر پٹختا باہر چلا گیا۔ سب کچھ کہنے کے بعد میں نے ساری بات خادم حسین سے سنی اور جاوید صدیقی سے واجبی سا احتجاج بھی کیا کہ یہ ایک شریف شہری کے ساتھ زیادتی ہے مگر یہاں شہری کے حقوق کون مانتا ہے اور پولیس تو شریف شہری صرف اسے سمجھتی ہے جو شرافت کی سند قیمت دے کر حاصل کر سکتا ہو یا اوپر سے شرافت کی گواہی دلوا دے۔

"تمام انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔ آج بارہ بجے لاش کو قبر سے نکال کر قبرستان میں ہی پوسٹ مارٹم ہوگا۔" جاوید صدیقی نے کہا۔

میں نے کہا "کیا میڈیکل بورڈ تشکیل دے دیا گیا ہے؟"

"لیں۔ عدالت نے پولیس سرجن کے علاوہ میو اسپتال کے ایم ایس کو سربراہ مقرر کیا ہے۔ ابھی میری مجسٹریٹ سے بات ہوئی

www.paksociety.com

آئے ہیں پی اور مقتولہ کے وکیل بھی ہیں۔ یہ تحریری درخواست بھی دے سکتے ہیں ریکارڈ پر رکھنے کے لیے گورکن کی حفاظت کے ذمے دار اب آپ لوگ ہیں کیونکہ آپ ہی اسے اٹھا کر لائے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ بن جانے کے بعد آپ کی ذمے داری ختم۔"

اب جاوید صدیقی کے لیے چارہ نہ رہا کہ گورکن کی حفاظت کے لیے رکے "یہ اس نے نیا جھگڑا کھڑا کر دیا ہے۔ تم لوگ بھی بالکل احمق ہو۔ کسی پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اسے خاموش رکھنا کوئی مشکل کام تھا۔ ابھی سب وکیل اور صحافی آجائیں گے تو ایک مقدمہ اور پولیس کے خلاف۔ میں پہلے سے خبردار کر رہا ہوں سب کو۔ یہ نہ ہو کہ تمہارا سب کا انجام بھی وہی ہو۔۔۔"

اچانک اسے خیال آیا کہ خادم حسین سب سن رہا ہے اور وہ یقیناً یہ بات بھی لرزتے ہوئے سمجھا دے گا۔ باقی سب کے چہرے تنک گئے تھے۔ وکیلوں اور صحافیوں نے ان کے اختیارات کو قانون کی زنجیروں میں جکڑ کے انہیں بے اقتدار کر دیا تھا۔ وہ من مانی کرنے کے مجاز نہیں رہے تھے اور خود کو بہت بے عزت محسوس کر رہے تھے۔

خادم حسین نے خاموش رہنے میں عافیت جانی۔ اس وقت گیارہ بجنے والے تھے اور اگر پوسٹ مارٹم کے عدالتی احکامات واقعی موصول ہو گئے تھے تو رابعہ اور منظر کے علاوہ کسی نہ کسی اخبار نویس کو بھی یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔

"یہ عجیب بے ہودگی کیسی ہے؟" جاوید صدیقی بولا "کل جب ہم اس کیس کے اہم ملزم چودھری دلاور کی گرفتاری کے لیے تیار تھے تو وہ خاتون پہنچ گئیں جو عدالتی احکامات لائی تھیں۔ انہوں نے اعتراف کرلیا کہ انہیں پوری اتھارٹی نہیں تھی اور آج جب قبر کھود کے پوسٹ مارٹم کرنے کے احکامات جاری کر دیے گئے ہیں تو ابھی تک کسی کو معلوم نہیں کہ قبر کہاں ہے؟"

خادم نے مجھ سے بات کی اور میں نے کہا "پولیس کو سب معلوم ہو جائے گا۔ ساری بات وقت کی ہے۔ وکیل ذمے دار لوگ ہوتے ہیں اور کسی شنوائی پر عدالت سے احکامات حاصل کرنا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ ان کی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ وہ چودھری دلاور کی گرفتاری کو یقینی بنائیں گے اور قبر کی صحیح نشاندہی کریں گے لیکن وہ رسک نہیں لیں گے اور قبل از وقت کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں۔"

اسی وقت رابعہ کے ساتھ دو وکیل اندر آگئے پھر منظر داخل ہوا اس کے پیچھے ایک وحشی ریچھ ٹائپ شخص اندر آیا جس کی شخصیت کا سب سے نمایاں حصہ اس کے بال ہی تھے۔ سر کے بال شانوں تک آرہے تھے اور انہیں شاید عید کے عید ہی دھویا جاتا تھا یا ممکن ہے جب نیا چاند نکلتا ہو تو وہ نہا بھی لیتا ہو اور بال بھی سلجھا لیتا ہو۔ یہ گرد آلود الجھے ہوئے بال اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ چہرے کے باقی حصے پر جھاڑ جھنکاڑ داڑھی مونچھوں کا قبضہ تھا اور جیسے خودرو جنگل کے پودے اپنی بیلیں اور شاخیں [illegible] میں مل جاتی ہیں ایسے ہی سر داڑھی اور مونچھوں کے بال [illegible] ہو گئے تھے چنانچہ دو آنکھوں اور ایک ناک کے سوا [illegible] تھا۔ اس نے ایک رنگین قمیص اور ملگجی تہبند [illegible] تھی جس کا گریبان اس حد تک چاک تھا کہ اس کے سینے کے بالوں کا کھیت بھی صاف نظر آتا تھا۔ خاکی زمین کی چادر [illegible] بعد اتارنا بھول گیا تھا اور جوتوں کا یہ حال تھا کہ [illegible] نوادری کے لیے مفت دیے جاتے تو وہ معذرت [illegible] پاؤں ہی بھلا۔

سب سے ہاتھ ملانے کے بعد جاوید صدیقی نے تفریح کے ساتھ سوال کیا "یہ بالکل نئی چیز دیکھ رہا ہوں میں۔"

اس نے اسی کے انداز میں کہا "ابھی تو [illegible] دیکھا ہی کیا ہو گا تم نے ایس پی بہادر۔ اور بھی [illegible] کرسی پر بیٹھنے والا کیا دیکھ سکتا ہے ویسے ہی [illegible] ادا وحشت کی سیاہی میں سے دیکھ سکتے ہیں۔"

منظر نے کہا "یہ البرٹ پنڈورا عاصی ہیں۔"

"واٹ؟" ایس ایس پی کی حیرانی کا رد عمل [illegible] "چندر عاصی!"

منظر نے بتایا "یہ ایک جینئس ہیں۔"

"وہ تو ان کے حلیے سے ظاہر ہے" ایس ایس پی نے [illegible] "ویسے کرتے کیا ہیں؟"

"یہ پوچھو کہ کیا نہیں کرتے۔ رپورٹر، فوٹو گرافر [illegible] کچھ جیسے جرنلزم میں ایم اے کر چکے ہیں۔ شاید آپ کو [illegible] واقعے کی اخبار میں بڑی تشہیر ہوئی تھی ایک شخص نے [illegible] میں ایک وی وی آئی پی سے ڈگری وصول کرنے کے بعد مائک سنبھال لیا تھا اور کہا تھا کہ آپ سب گواہ ہیں [illegible] ڈگری وصول کی لیکن ڈگری یہ نہیں یہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے۔ ڈگری میں ہوں اور ڈگری میرے سر میں محفوظ ہے۔ میں [illegible] جرنلزم نہیں کبھی نہ کوئی ہوا نہ ہوگا۔ میں ہمیشہ طالب علم رہوں گا پھر اس نے ڈگری سب کے سامنے پرزہ پرزہ کر کے اچھال دی تھی اور اسٹیج سے اتر گیا تھا۔ یہی ہے وہ جینئس۔"

ایس ایس پی کے علاوہ خود میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ [illegible] اس شہر میں رہنے کے باوجود میں نے اس کا ذکر سنا تھا نہ کبھی [illegible] سے ملا تھا۔

جاوید صدیقی نے نسبتاً احترام آمیز لہجے میں کہا "کس ادارے سے منسلک ہیں آپ؟"

"زندگی کے اخبار سے" عاصی نے ذرا اونچے لہجے میں کہا۔

منظر نے وضاحت کی "مستقل یہ کہیں نہیں رہتے۔ سال چھ مہینے تو جیل میں گزارتے ہیں کیونکہ خطرناک [illegible] جو کوئی حکومت نہیں سن سکتی۔ باقی عرصہ کبھی رپورٹنگ کرتے [illegible]

بچے اس نے اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے تو سب کو ذرا گڑ تو کھانا چاہیے۔ اتنی دیر میں دو وکیل اور تین اخبار کے نمائندے پہنچ چکے تھے۔ جاوید صدیقی نے پھر گھڑی دیکھی۔

"تو صاحب ابھی سے۔ ایک کپ چائے کافی کے ہم چلتے ہیں۔ اتنی دیر میں پولیس محاصرہ کرلے گی اور قبرستان میں پرندہ پر نہیں مار سکے گا۔"

عاصی بولا "پرندہ معصوم ہوتا ہے۔ اس کے پر مارنے سے ہوا میں خفیف سا ارتعاش ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ اسے پر مارنے دو ایس پی بہادر۔ پرندے کو پابند مت کرو۔ چاند صاحب 'پکھو' پاگل ہیں اور بے ضمیر تو ہیں ہی۔"

سب مسکرانے لگے لیکن عاصی کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس نے ایک سچی بات کہہ دی تھی اور مطمئن تھا۔ "چائے کا ایک کپ" سارے لوازمات کا نام تھا۔ سرکاری خرچ پر نظر آنے والا تواضع کا یہ بندوبست بھی پولیس نے بزور بازو کیا ہوگا۔ وہ بھتا صرف نقدی وصول نہیں کرتے "اللہ" کے بدلے کچھ بھی طلب کر سکتے ہیں۔

منظر نے میری طرف دیکھے بغیر میرے کان میں کہا "ڈٹ کے حرام کھا بھوتنی کے۔"

میری مجبوری تھی کہ میں غیر ملکی ایجنٹ تھا اور پاکستانی اطوار کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا جو عوام الناس کی ذہنیت میں نظر آتے ہیں۔ میں نے بڑے تکلف سے چائے کے ساتھ صرف ایک [illegible] لیا۔ کسر خادم حسین نے پوری کر دی۔ اسے معلوم نظر آتا تھا کہ آج کا وقت تو قبرستان کی منحوس فضا میں گزرے گا اور نحوست زدہ روٹی کھاتے گزرے گا۔ اس نے مرنے والوں کو مزید بدنام کیا اور پیٹ بھر کے ہاتھ مارے کہ مجھے خفت ہوئی۔

"اس بھوتنی والے کو بھی گالو کے آنا پڑے گا۔ اسے شریف بنا ہو گا" منظر نے رابعہ سے کہا۔

خادم نے سن لیا "منظر صاحب میرا تو اصول ہے کہ جب مرنا ہی ہے تو آدمی خالی پیٹ کیوں مرے۔ فاقے سے مرنے والا صور اسرافیل پر خود کیسے کھڑا ہوگا؟"

خادم کا اصل مقابلہ ہوا عاصی کے ساتھ۔ باقی سب اپنی کرسی کے چکر میں تکلف سے کام لیتے رہے۔ ان دونوں نے میدان صاف کر دیا پھر خادم نے بہ آواز بلند الحمدللہ کہا اور عاصی نے زبردست ڈکار لی۔ یہ بھی اعلان تھا کہ کھایا پیا ہضم ہو گیا۔ اب چلنا چاہیے۔

وکیل اور صحافی حضرات اپنی اپنی کاروں میں بیٹھے۔ ایس ایس پی نے اپنی جگہ سنبھالی اور اپنی جیپ کو آگے رکھا۔ اس جیپ پر ایک گھومنے والی لائٹ تھی اور ایک سائرن نصب تھا۔ پولیس کی بڑی گاڑی میں کم و بیش بارہ مسلح جوان بے زار صورتوں اور خشک

کبھی فوٹو گرافر بن جاتے ہیں۔ ان کے کچھ چھاپے ہوئے یہاں کے اخبار والے ڈرتے ہیں اس لیے باہر بہت قدر ہے ان کی۔ فوٹو گرافی کے ایوارڈ لے چکے ہیں۔"

"گریٹ اٹھرانی کا نام ہے۔۔۔؟"

"ہاہے۔ نام میں کیا رکھا ہے" عاصی نے پھر اعلان کیا "میرا باپ عیسائی تھا۔ ماں ہندو تھی لیکن میں مسلمان ہوں۔ میرا وجود تمام مذاہب کا سنگم ہے۔"

"عاصی تو آپ کا تخلص ہوا۔ شاعر بھی ہوں گے آپ؟"

"شاعر کون نہیں ہے لیکن میں عاصی ہوں۔ عاصی یعنی گنہگار۔ ہر قدم پر گناہ کرتا ہوں۔ سانس لیتا ہوں تو گناہ، جینا بھی گناہ، مرنا بھی گناہ مگر میں ہر قدم پر توبہ بھی کرتا ہوں اور اس خدا سے پوری امید رکھتا ہوں کہ وہ معاف کرنے والا ہے" اس نے اوپر انگلی اٹھا کے جھومتے ہوئے کہا "جو سب کا خدا ہے، ہر مذہب کا، ہر انسان کا۔"

جاوید صدیقی نے گھڑی دیکھی "میرا خیال ہے ہمیں پہلے ہی دیر ہو گئی ہے چلنا چاہیے۔"

منظر کے ساتھ آنے والا ایک وکیل بولا "آپ کی پولیس فورس تیار ہے؟"

دوسرے نے کہا "قبرستان کے چاروں طرف پہرا سخت ہونا چاہیے۔"

"کیوں؟ کیا خطرہ ہے؟" جاوید صدیقی مسکرایا۔

"یہ آپ کو تو پہلے سے اندازہ ہونا چاہیے۔" منظر نے کہا "آپ جیل سے سبق نہیں لیا آپ نے۔ وہ بھی چلے گئے تھے نوجوان کے مقبرے چار سپاہی لے کے اور ان میں سے تین مارے گئے تھے۔"

جاوید صدیقی متفکر ہو گیا "آئی فورس۔۔۔ خیر میں کرتا ہوں۔ آفتاب تمام تھانوں سے ایمرجنسی کی بنیاد پر فورس طلب کرو۔ میں خود بات کرتا ہوں آئی جی سے۔"

"اپنی پولیس فورس پہلے روانہ کر دیں۔ وہ اندر باہر مورچے سنبھال لیں۔ مسلح حملے کی صورت میں انہیں جوابی کارروائی کے لیے تیار ہونا چاہیے" رابعہ نے کہا "ہم سب کی حفاظت کے ذمے دار آپ ہیں۔"

"آف کورس" ایس ایس پی نے فون اٹھا کے ڈی آئی جی سے بات کی اور اسے اجازت حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے کہا "اس کیس میں ملزمان کی طرف سے مسلح مداخلت کا اندیشہ ہے۔ ممکن ہے وہ لاش چھین کر لے جانے کی کوشش کریں۔ وہ انتہائی بااثر اور خطرناک قسم کے لوگ ہیں۔ اس کے علاوہ میڈیا، وکلا اور سینئر صحافی مناسب حفاظتی انتظامات کے بغیر وہاں جانے کے لیے تیار نہیں۔ یس سر۔ تھینک یو سر۔"

اس نے مسکرا کے ریسیور رکھا اور سب کی طرف یوں دیکھا

www.paksociety.com

جھنڈیوں کے ساتھ یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے واقعی میدان جنگ جا رہے ہوں۔ منظر کی کار میں آگے رابعہ تھی اور پیچھے میرے ساتھ خادم۔ میں نے ایک کاغذ کے پرزے پر پہلے ہی لکھ لیا تھا "کوئی مجھ سے بات کرے گا تو خادم کی معرفت۔ احتیاط ضروری ہے۔" یہ پرزہ باری باری سب نے دیکھا۔ رابعہ نے صرف سر ہلایا۔ منظر نے البتہ مجھے مخاطب کیے بغیر کہا "اب ہم کیا خالی کھوپڑی لیے پھر رہے ہیں دنیا میں۔ مولوی خادم حسین سمجھ رکھا ہے مجھے۔"

"دیکھئے آپ پھر زیادتی کر رہے ہیں" خادم نے احتجاج کیا۔

"زیادتی تو اپنے پیٹ کے ساتھ کی تم نے۔ اتنا بھر لیا کہ اب تمہیں ہوگا ہیضہ ورنہ کم سے کم ڈائریا۔ قبرستان میں جھاڑیاں ڈھونڈتے پھرو گے۔ خیال رکھنا مولوی، خالی نظر آنے والے گڑھے کہیں پرانی قبریں نہ ہوں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ منظر صاحب آپ کو شرم آنی چاہیے۔"

منظر نے آہ بھری "ہاں نور چشم۔ آنی تو چاہیے مگر کیا کریں اگر نہیں آتی۔ خواتین کو تو باقاعدگی سے آتی ہے۔ تمہیں کب آتی ہے؟"

یہ ذو معنی بات تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی اور رابعہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ خادم حسین مزید جزبز ہوا "آپ کو کم سے کم خواتین کی موجودگی کا خیال رکھنا چاہیے۔"

"خوا... تین... تین کہاں؟ ایک رابعہ ہی تو ہے۔ یہ سب زیادہ کھانے کا نتیجہ ہے کہ تمہیں ایک کے تین نظر آ رہے ہیں۔ وہاں تین مجسٹریٹ تم ایک سمجھ کے کھا رہے تھے۔ آخر وہ سب کیا کھاں۔ پیٹ تو تمہارا میری عظیم توند کے مقابلے میں ایسا ہی ہے جیسے نئی دلہن کے مقابلے میں سال بھر سینئر بڑی ہو گا۔"

اب رابعہ نے کہا "منظر بھائی۔ بس بھی کریں۔ کیوں تنگ کرتے ہیں اس شریف آدمی کو۔"

"تنگ اور چوڑا میں کیا کروں گا۔ میں تو دل بہلا رہا ہوں تم لوگوں کا ورنہ ابھی سے تم سب کے چہرے آسیب زدہ ہو جاتے۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی دور ہی رہنا۔ اور اس بھوتنی والے کو بھی دور رکھنا۔ زیادہ اچھا ہوتا اگر تم شملہ پہاڑی پر بیٹھ کے کوئی پیار بھرا گیت چیٹ کرتے۔ وہاں کیا ہے تمہارے دیکھنے کے لیے اور تم نے وہ نہ دیکھنا بہتر۔ اب بھی وقت ہے 'اُتر جاؤ' کہیں۔ ورنہ کل جغرافیائی مناظر دیکھنے سے سوئی خراب ہو گا۔"

خادم حسین نے کہا "اگر سر مجھے اجازت ہو تو میں اُتر جاؤں۔"

منظر نے اسے ڈانٹا "میں تم سے بات نہیں کر رہا تھا۔ تمہیں عبرت پکڑنی ہے۔ میں خود چھڑاؤں گا تمہیں مولوی۔"

قبرستان کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ پولیس والے پوزیشن سنبھال رہے تھے۔ انہیں مختلف تھانوں سے یہاں تک لانے والی سرکاری گاڑیاں کچھ فاصلے پر لائن میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ہر تھانے سے ایک سب انسپکٹر رینک کا ایک افسر بھی آیا تھا جو انچارج تھا کہ قبرستان میں آنے والوں کو [illegible] جس کے لیے اتنی فوری طلب [illegible] فوراً ان کی کمان سنبھال لی اور جا کر [illegible] متعلق احکامات جاری کیے [illegible]

جاوید صدیقی نے فوراً آ کے [illegible] ابھی تک نہ مجسٹریٹ صاحب آئے ہیں اور [illegible]

ایک سب انسپکٹر نے کہا "مجسٹریٹ صاحب اندر ہیں۔"

"اندر کہاں؟"

"اندر خیمہ لگا دیا گیا ہے سر۔ ایک اور صاحب بھی ساتھ ہیں۔ ان کو میں نہیں جانتا۔"

کیا یہ افراد پر مشتمل قافلہ جاوید صدیقی کے پیچھے [illegible] (کلاشن) اور نالی (مشین) کے [illegible] دو درختوں کے درمیان [illegible] جگہ پر نصب خیمہ اور سائڈ میں کھڑی ہوئی [illegible] گاڑی لے جانا منع تو نہیں تھا مگر لوگ احتراماً ایسا نہیں کرتے [illegible] کچے راستے کے دونوں جانب قبریں تھیں اور مٹی سے [illegible] کے پیوند سے چند قبروں کی سائیڈ پر نشان آ گئے تھے۔ مجسٹریٹ صاحب کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ [illegible] انسانوں کے گھر مسمار کروا دیتے تھے تو مُردوں کے مدفن [illegible] تھوڑا سا فاصلہ بھی دوپہر کی گرمی میں پیدل طے کرنا ان کی حاکمیت کے خلاف تھا۔

مجسٹریٹ کے ساتھ ایک دبلا پتلا عینک والا ادھیڑ عمر آدمی بھی تھا۔ یہ ایم ایس تھا جسے مجسٹریٹ صاحب اپنی کار میں لائے تھے۔

مجسٹریٹ خود ماتحت آدمی تھا اور قبر کھودنے کے [illegible] نکالنے کی یہ ڈیوٹی اس نے طوعاً و کرہاً قبول کی تھی۔ اس کی [illegible] وکیل صحافی برادری کے اکٹھے ہونے کی [illegible] کر رہے تھے اور بقول منظر سب کو "وخت" ڈال رہا تھا [illegible] والے اندر کرا رہے تھے اور باقی کی نوکری خطرے میں [illegible]

مجسٹریٹ نے ایک نظر سب پر ڈالتے ہوئے ماتھے پر بل [illegible]

"یہ پورا جلوس کیوں آیا ہے یہاں؟"

منظر بولا "غنیمت ہے آپ نے جلوس کو برات نہیں کہا۔ قاضی خود آپ ہیں۔ دولہا دلہن لانے پڑتے۔"

"میں فضول بات پسند نہیں کرتا۔"

"میں صرف فضول باتیں کرتا ہوں۔ جسے پسند نہ ہوں [illegible]" منظر نے آتے ہی مجسٹریٹ سے پنگا لے لیا۔

اب عاصی بولا "فضول تو تمہارا سوال تھا۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہاں کیا ہونے والا ہے۔"

جاوید صدیقی نے فوراً صورت حال کو سنبھال لیا [illegible]

[illegible] قبر کی نشاندہی کر سکتا ہو وہ ساتھ رہے۔ ایک اخباری نمائندہ اور ایک [illegible] صرف دو شاہی وکیل۔"

رابعہ نے کہا "نشاندہی میں کروں گی۔ منظر بھی میرے ساتھ ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم چلو میرے ساتھ۔ جب گورکن کھدائی کرے [illegible] اُس وقت ایک تصویر بنانے کی اجازت ہے۔ اس کے بعد سب واپس یہاں آ جائیں گے۔ اس خیمے میں پوسٹ مارٹم [illegible] ہوگا اور اس کی رپورٹ عدالت کو دے دی جائے گی۔"

یہ بات صرف غالب کو معلوم تھی کہ ڈاکٹر شیلی کی لاش کس قبر میں ہے۔ شاید اس نے رابعہ کو شریک راز کر لیا تھا۔ میرے لیے یہ انکشاف باعث حیرت تھا کہ رابعہ بھی یہ بات جانتی تھی مگر اس نے کبھی بھولے سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس نے بڑی عقلمندی کی [illegible] کیونکہ اگر یہ بات عام ہو جاتی تو رابعہ کی زندگی بھی خطرے میں [illegible] شاید غالب نے بھی بعد میں طے کیا ہوگا کہ کم سے کم ایک شخص اور ایسا ہونا چاہیے جسے یہ معلوم ہو۔ آج غالب نہیں تھا تو رابعہ سامنے آ گئی تھی ورنہ شاید وہ قبرستان آنا بھی گوارا نہ کرتی۔

"یہ تو کسی اور کی قبر ہے" مجسٹریٹ نے کہا۔

جاوید صدیقی بولا "اس پر تو کتبہ [illegible] کے نام کا ہے۔"

رابعہ نے کہا "آپ کتبے پر نہ جائیں۔ ڈاکٹر شیلی کی یہی قبر ہے۔"

مجسٹریٹ نے نفی میں سر ہلایا "میں کیسے مان لوں؟"

"میں عدالت میں حلف نامہ دے چکی ہوں۔ [illegible] ہوں آپ نہیں" رابعہ نے کہا۔

"ایک AFFIDAVIT میں نے بھی داخل کیا تھا" منظر بولا "اب بھی آپ عدالتی احکامات کو نظر انداز کرتے ہیں تو سوچ لیں۔ یہ توہین عدالت کا کیس ہوگا۔ گواہ یہ سب ہیں۔"

"ٹھیک ہے مجھے کیا۔ گورکن سے کہو کھدائی کرے۔"

گورکن کی جسمانی حالت ایسی کہاں تھی کہ وہ دوپہر کی دھوپ میں قبر کھود سکتا۔ اس کے ایک معاون نے کدال چلائی اور مٹی ایک طرف پھینکنے لگا۔ اس وقت میرے دل کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ مجھے وہ شوخ اور انتہائی پُر اعتماد، تیز طرار حسین و جمیل لڑکی یاد آ رہی تھی جس کی رفاقت کے سارے لمحات میری یادوں میں زندہ تھے۔ وہ چوہدری دلاور کی سوتیلی بہن تھی جسے اپنی دانست میں دلاور قتل کر چکا تھا۔ اب اسے دھوکے سے بلا کے دلاور نے ایک تیر سے شکار کرنے چاہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ شیلی مجھے اپنے دام محبت میں گرفتار کر لے گی۔ وہ میرے خلاف شیلی کے ذہن میں نفرت کا اتنا زہر بھر چکا تھا کہ شیلی میری دشمن تھی مگر وہ مجھ سے ملی تو حقیقت آشکار ہو گئی۔ وہ ایک باضمیر لڑکی تھی۔ دلاور کی [illegible] مجھے مروا کے اس جرم میں شیلی کو تختہ دار تک

صحافی ہیں یا مدعی وکلا۔"

"میں کسی کو تصویر اتارنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"ہم بلا اجازت بنائیں گے پھر تم لاٹھی چارج کا حکم دو گے۔ کیمرے توڑو گے اور ہم سب کو بند کرا دو گے۔" عاصی نے اعلان کیا "ہمیشہ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس بار شاید یہ ڈراما نہ چلے قاضی صاحب۔ ہم تو بڑے گھر جاتے ہی رہتے ہیں۔ تمہیں گھر نہ بھیج دیا جائے۔"

"وہ بھی بڑا گھر ہی ہوگا۔ قاضی صاحب چھوٹے گھر میں تو نہیں رہتے ہوں گے" منظر بولا۔

"واٹ نان سنس۔ یہ کیا قاضی قاضی لگا رکھی ہے تم سب نے" مجسٹریٹ چراغ پا ہو گیا۔

"مجسٹریٹ پہلے قاضی کہلاتے تھے۔ چیف جسٹس کو قاضی القضاۃ کہا جاتا تھا اور تھانے دار کو کوتوال" خادم حسین بولا۔

"تم کون ہو؟"

"یہ ڈاکٹر شیلی کے وکیل ہیں جو لندن سے آئے ہیں۔ برٹش کونسلیٹ اور کامن ویلتھ افیئرز کی طرف سے یہ تفتیش کے آفیشل مبصر ہیں۔" جاوید صدیقی نے کہا "یہ برطانوی حکومت کو رپورٹ دیں گے کیونکہ ڈاکٹر شیلی برٹش نیشنل تھی۔ خادم حسین ان کا مترجم ہے کیونکہ یہ صرف فرنچ بولتے اور سمجھتے ہیں۔"

"تم فرنچ جانتے ہو؟" مجسٹریٹ نے کہا۔

"آپ بول کے دیکھ لیں" خادم حسین نے کہا۔

"آپ لوگ وقت ضائع کر رہے ہیں" ایم ایس نے کہا "میں ڈاکٹر قاسم ہوں۔ آخر وہ پولیس سرجن ابھی تک کیوں نہیں آیا۔ میرے پاس ایک پورے اسپتال کے انتظامی مسائل بھی ہیں۔"

مجسٹریٹ نے کہا "قبر کی نشاندہی کون کرے گا؟ گورکن کہاں ہے؟"

"گورکن تو تھانے میں تھا" منظر بولا "وہیں مر گیا شاید۔"

"گورکن تھانے میں کیا کر رہا تھا؟"

"انصاف کی قبر کھود رہا تھا شاید" عاصی بولا۔

ایس ایس پی جاوید نے اسے گھور کے دیکھا "وہ ہمارے ساتھ ہی آیا ہے۔ اسے حفاظت کے خیال سے پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔"

"میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ اس قسم کے حفاظتی انتظامات کی کیا ضرورت ہے۔ قانون کے مطابق یہ کارروائی پہلی بار تو نہیں ہو رہی ہے۔" مجسٹریٹ نے کہا "کیا مُردوں سے خطرہ تھا کہ وہ حملہ کر دیں گے؟"

"مُردوں سے نہیں... زندوں سے ڈرنا چاہیے آپ کو بھی مجسٹریٹ صاحب۔ ایک گولی کے مقابلے میں آپ کی جان یقیناً بہت قیمتی ہے اور گولی کسی بھی سمت سے آ سکتی ہے" منظر بولا۔

"کیا فضول بات ہے" مجسٹریٹ نے ناگواری سے کہا "آپ

www.paksociety.com

پہنچانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور جب وہ بے وقوف لڑکی اتھانے میں میری جانب جذباتی پیش قدمی کرنے لگی تو واہدہ نے اسے دوسرے طریقے سے ٹھکانے لگا دیا۔ اس کا قتل بھی خودکشی کا کیس بن گیا تھا مگر پھر خوش قسمتی کے پتے واہدہ کا ساتھ چھوڑنے لگے اور وہ ہر بازی ہارنے لگا۔ اب وہ میری قید میں تھا اور اس کے خلاف قتل کے جرم کی شہادت مکمل ہو گئی تھی۔

رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا "چلو۔ اب یہاں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دل خراب ہو گا گلی سڑی لاش کا ڈھانچا دیکھ کے۔"

میں نے سر ہلایا اور گیٹ کی طرف چل پڑا "میری نظر میں تو اس کا وہی سراپا ہے ابھی تک۔"

"بڑی اچھی لڑکی تھی بے چاری۔ موت اسے کہاں لے گئی۔"

آہستہ آہستہ دوسرے وکیل بھی ہمارے پیچھے آ گئے۔ خادم حسین ہمارے درمیان چل رہا تھا جس سے ظاہر یہی ہوتا تھا کہ ہم اس کی معرفت مجو منتظر ہیں۔ کھدی ہوئی قبر کے پاس اب صرف عاصی رہ گیا تھا۔ مجسٹریٹ اور ڈاکٹر قاسم ناک پر رومال رکھے دور کھڑے تھے۔

باقی لوگ درمیان میں حلقہ بنائے کھڑے تھے اور بڑے اندوہناک تجسس کے ساتھ قبر کی مٹی کے ڈھیر کو بلند ہوتا دیکھ رہے تھے۔ شیلی کا لندن سے اپنے وطن لوٹ کر آنا اور پھر اپنے ہی بھائی کے مذموم عزائم کا شکار ہونا اس کم الیہ نہ تھا کہ مرکے بھی اس کو اپنی ابدی آرام گاہ میں سکون سے سونا نصیب نہ ہوا تھا۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ اس کا وہ جوان جسم جو گلاب اور مرمر کی آب و تاب رکھتا تھا اور پیراہن کے بہار آفریں رنگ جس کے نشیب و فراز میں وہی نظر نواز کشش پیدا کرتے تھے جو سبزہ و گل وادیوں اور کوہساروں میں کرتے ہیں۔ اب وہ گل سڑ کے حشرات الارض کا رزق بنے اور خاک میں ملنے کے بعد کتنا بھیانک اور کریہہ المنظر بن چکا ہو گا۔ زندگی اور موت کے درمیان یہ فرق ایسے کون دیکھ سکتا ہے۔ قبر کی مٹی کے ڈھیر کے نیچے کیا ہوتا ہے۔ کیسے...... ایک شناسا چہرے کے مانوس خدوخال اور ایک آشنا شخصیت رکھنے والے کا جسم ڈی کمپوز ہوتا ہے۔ یہ آدمی دیکھ لے تو موت کا مفہوم پوری ہولناکی کے ساتھ عیاں ہو جائے۔

میلے کفن میں لپٹی ہوئی لاش نکالی جا چکی تھی اور بدبو کے بھبکوں سے بچنے کے لیے سب نے ناک پر رومال رکھ لیے تھے۔ ہڈیوں کے پنجر اور بچے کھچے گوشت کے اس ڈھیر کو مٹی پر رکھ دیا گیا تھا جو کبھی ڈاکٹر شیلی تھی۔ نہ جانے کون خوش نصیب ہو گا جس نے اس کے بدن کے گلشن کی بہار کا نخیرہ کن حسن دیکھا ہو گا۔ اب کفن کھولنے والے کیا دیکھیں گے۔ محض بدصورتی اور زندگی کے عناصر کی بے ترتیبی۔

جاوید صدیقی اور مجسٹریٹ پریشان تھے کہ ابھی تک پولیس سرجن نہیں پہنچا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں پوسٹ مارٹم کے قانونی تقاضے پورے نہیں ہوتے تھے۔ ایم ایس خود بھی بہت بڑا پروفیسر تھا اور اس کے لیے پوسٹ مارٹم روز مرہ کے معمول کی طرح تھا۔ ایک ایسا کام جس میں اس کی عمر کا تجربہ بھی کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے کافی تھا۔ شاید وہ سیکڑوں پوسٹ مارٹم کر چکا تھا مگر ضابطے کی کارروائی کے لیے پولیس سرجن کا ہونا ضروری تھا۔ ایس پی نے اس کی تلاش میں گاڑیاں روانہ کر دی تھیں اور فون کرنے بھی بھیجا تھا مگر ہنوز پولیس سرجن لاپتا تھا اور جانے والے بھی کوئی خبر لے کر نہیں لوٹے تھے۔

ڈاکٹر شیلی کی لاش مٹی کے ڈھیر پر گھڑی کی طرح پڑی تھی۔ مجسٹریٹ کی جاوید صدیقی کے ساتھ کانفرنس جاری تھی پھر وہ ہماری طرف آیا۔

"آخر ہم اور کتنی دیر انتظار کر سکتے ہیں۔ پولیس سرجن نے انتہائی غیر ذمے دار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔"

عاصی بولا "اس کے خلاف محکمہ جاتی شرح نتیجے کی کارروائی شروع کی جانے اور بطور سزا اسے دوسرے اسپتال ٹرانسفر کیا جائے۔"

اس کے طنز سے جاوید صدیقی متاثر نہیں ہوا "یہ سب بعد کی بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ ابھی ہم کیا کریں؟"

"انتظار" مظفر نے مختصراً کہا۔

"ہم میں سے کوئی بھی اتنا فارغ نہیں ہے کہ شام تک یہاں پولیس سرجن صاحب کے انتظار میں سارے کام چھوڑ کے کھڑا رہے۔"

"پولیس سرجن نہ پہنچا تو کیا ہو گا؟" ایک صحافی نے کہا۔

"کچھ نہیں ہو گا" ایک وکیل نے کہا۔

"ہاں۔ لاش پھر دفن کر دی جائے گی۔ پوسٹ مارٹم کے لیے کوئی تاریخ مقرر ہو گی۔"

عاصی نے کہا "ایم ایس لاش کے اجزا اور کچھ باقی ماندہ اجزا محفوظ کر سکتا ہے۔ لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے اور وہ چاہے تو رپورٹ بھی مرتب کر سکتا ہے۔ ہم اس کو مستند سمجھتے ہوئے تسلیم کر لیں گے۔"

رابعہ نے کہا "پولیس سرجن کو اس پر صرف دستخط کرنا ہے جو وہ بعد میں بھی کر سکتا ہے۔"

"یہ بات خلاف ضابطہ ہو گی۔ فرض کریں اس نے انکار کر دیا کہ جب میں موجود ہی نہیں تھا اور نہ میں نے پوسٹ مارٹم کی کارروائی میں حصہ لیا تو میں دستخط کیسے کر دوں؟"

اب میں نے خادم سے کہا "ان سے کہو کہ پولیس سرجن کا نہ پہنچنا اس قانونی عمل کو سبوتاژ کرنے کی سازش کا حصہ ہے۔ وہ خود نہیں آیا ہے یا اسے آنے نہیں دیا گیا ہے۔"

اندازہ میں ہے عورت TWENTIES میں تھی۔"

"میرا بھی یہی ہے۔ تیس سال کے درمیان" ایک صحافی نے نوٹ بک میں لکھتے ہوئے کہا۔

قد درمیانہ۔ پانچ فٹ چار انچ کے قریب۔ وزن ایک سو دس پاؤنڈ سے کچھ کم یا زیادہ۔ سر کے بالوں کا رنگ آپ نے بھی دیکھا ہے۔ ناخنوں کے معائنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ غالباً آرسینک جسے سنکھیا بھی کہا جاتا ہے۔"

مجسٹریٹ نے احتجاج کیا "یہ سب آفیشل نہیں ہے۔"

جاوید صدیقی نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ آپ پولیس کو یہ انفارمیشن کس اتھارٹی پر دے رہے ہیں؟"

ایم ایس نے ڈھٹائی سے کہا "تمہاری جتنی عمر ہے آفیسر اتنا تجربہ ہے میرا میڈیکل پروفیشن میں۔ آفیشل یا ان آفیشل۔ یہ میری رائے ہے جو غلط نہیں ہو سکتی۔ میں وہی بتا رہا ہوں جو میں دیکھ چکا ہوں" مجسٹریٹ نے کہا "لاش کو پھر دفنا دیا جائے۔"

رابعہ نے مطالبہ کر دیا "میں سب کی طرف سے درخواست کروں گی کہ قبر پر مسلح پہرا رکھا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ لاش غائب کر دی جائے گی۔"

"مجھے اس کا اختیار نہیں ہے۔ عدالتی احکامات لے آئیں یا میرے افسران حکم دیں تو۔"

مظفر نے کہا "مجسٹریٹ تمہیں حکم دے سکتا ہے۔ خصوصی حالات میں اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے۔"

"میں یہ ضروری نہیں سمجھتا" جاوید صدیقی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تمام مدعی کل عدالت میں تمہارا بیان آن ریکارڈ ہوئے آئیں گے۔ ایم ایس کی رائے بھی اس میں شامل ہو گی۔ کل کے اخبارات پوری رپورٹ دیں گے۔ اس کے بعد لاش غائب ہوئی تو جواب دہی تم کرو گے۔ ساری ذمے داری تمہاری ہو گی۔ یہ سمجھا جائے گا کہ تم نے قانون کی نہیں مجرموں کی مدد کی۔ بالواسطہ طور پر۔"

"یہ بے بنیاد بات ہے" وہ گرم ہو گیا۔

رابعہ اس سے الجھ گئی "تم من مانی کر رہے ہو۔ کسی کی سننے کو تیار نہیں۔ مجھے تو شک ہے کہ پولیس سرجن کو یہاں نہ آنے کا مشورہ دینے والوں میں تم بھی اتنے ہی شامل ہو جتنے اسے منہ مانگی قیمت پر روکنے والے۔ میں اپنی ذمے داری پر تمہارے خلاف یہ بیان دے سکتی ہوں۔"

"قانوناً۔ آپ کچھ ثابت نہیں کر سکیں گی۔ آپ جذباتی ہو رہی ہیں۔"

"تم کیس کو دبا رہے ہو" وہ اخبار پر اس کے پبلشر پر۔ انھیں بتا دیجیے وہ تو بند کر رہا ہے۔ تمہارے اختیارات لامحدود نہیں ہیں۔ تم کس کس کی زبان پکڑو گے۔ کس کس کو غلط کہو گے۔

خادم نے میری بات آگے پہنچا دی "وکیل صاحب فرماتے ہیں کہ پولیس سرجن کو یہاں نہ پہنچنے کی قیمت چکا دی گئی ہے یا اسے روک دیا گیا ہے۔ اغوا کر لیا گیا ہے۔ ممکن ہے قتل کر دیا گیا ہو۔"

میں نے اسے سرزنش کی "خادم۔ جو میں کہوں وہی آگے بتاؤ۔ ترشے میں اپنی طرف سے نمک مرچ مت ڈالو۔"

"میں ذرا کھل کے بات کر رہا ہوں۔ وضاحت کے ساتھ۔ یہ لوگ اسی قابل ہیں کہ انھیں کھری کھری سنائی جائے کوئی لحاظ کیے بغیر۔"

شاید جو بات میرے دل میں تھی وہی اندیشہ ان کے ہر شخص کے خیال میں تھی مگر لبوں تک نہیں پہنچی تھی۔ رابعہ کا چہرہ فکر و تردد سے دھواں دھواں ہو گیا اور مظفر کی صورت پر جھنجلاہٹ نظر آنے لگی۔ ایک معمولی سی فروگزاشت سے ہماری تمام محنت رائیگاں جا رہی تھی۔ شکاری اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ اس عمل میں کیسے رخنہ اندازی کی جا سکتی ہے اور عین وقت پر ہماری ناکامی پر کیسے اپنی کامیابی کا لیبل لگایا جا سکتا ہے۔

آج تک ہم نے ڈاکٹر شیلی کی قبر کو بے نام و نشان اور محفوظ رکھنے کی جتنی جدوجہد کی تھی وہ ضائع ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اب لاش کو پھر دفن کر دیا جاتا تو اگلی تاریخ مقرر ہونے تک لاش کی حفاظت کون کر سکتا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ دوسری بار لاش نکالی جائے گی تو وہ کسی اور کی ہو گی۔

جاوید صدیقی نے گھڑی دیکھی "سوا دو۔ ہم پندرہ منٹ اور انتظار کریں گے۔"

ایم ایس نے برہمی سے کہا "میں ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ سے سفارش کروں گا کہ پولیس سرجن کو معطل کر دیا جائے۔ یہ مجرمانہ غفلت ہے۔"

مجسٹریٹ نے اس سے اتفاق کیا "میرے اختیار میں ہوتا تو میں اسے اندر کر دیتا۔ میں جوڈیشل رپورٹ میں اس کا ذکر ضرور کروں گا۔"

یہ ساری باتیں بے کار تھیں۔ ہم اپنے مقصد میں ناکام رہے تھے اور اب ہمارے سامنے زیادہ مشکل مرحلہ دوسری بار قبر کھدوانے کے پوسٹ مارٹم کی تاریخ حاصل کرنے تک قبر کی حفاظت کا تھا۔

اچانک مظفر نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ پوسٹ مارٹم تو خیر نہیں ہوا لیکن آپ بتا سکتے ہیں کہ لاش مرد کی ہے یا عورت کی؟"

ایک دم سب وکیل اور صحافی متوجہ ہو گئے۔ جاوید صدیقی نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھا مگر وہ ایم ایس کو اس سوال کا جواب دینے سے منع نہیں کر سکتے تھے۔

"لاش بلاشبہ عورت کی ہے۔"

عاصی نے پوچھا "عمر، قد اور وزن کے بارے میں کوئی

www.paksociety.com

اگر تمہارے خلاف بھی شیطان کی بے جا طرف داری کا الزام آگیا تو تمہیں وضاحت مشکل ہو جائے گی۔ میں تو اسمبلی تک لے جا سکتی ہوں یہ معاملہ۔" رابعہ لال پیلی ہو گئی۔

جاوید صدیقی کا جوش و خروش سمندر کے جھاگ کی طرح ختم ہو گیا "یہ تو سراسر زیادتی ہے۔"

"تم اسے بلیک میلنگ کہنا چاہو تو مجھے اعتراض نہیں" منظر بولا۔ یہ مسئلہ طے ہو رہا تھا کہ باہر سے ایک کانسٹیبل دوڑتا ہوا آیا

"وہ سر سیکی۔۔۔ سر اُدھر۔"

"آگے بھی بولو۔ کیا پاگل کتا کاٹ گیا ہے تمہارے پیچھے۔"

"نہیں سر۔ اُدھر والی دیوار کے ساتھ ایک لاش پڑی ہوئی ہے قبرستان کے اندر۔"

"یہ بات تم ڈی ایس پی کو بھی بتا سکتے تھے۔"

"بتائی تھی سر۔ وہ وہیں موجود ہیں۔ انہوں نے کہا تھا سر کہ آپ کو اطلاع دی جائے۔"

"چلو اطلاع دے دی تم نے۔ اب جاؤ' علاقہ تھانے دار کو ضابطے کے مطابق کارروائی کرنے دو۔ ہم خصوصی تفتیش میں مصروف ہیں۔"

"وہ سر۔ انہوں نے آپ کو بلانے کا حکم دیا تھا۔ میرا مطلب ہے مجھے حکم دیا تھا کہ آپ سے درخواست کروں۔" کانسٹیبل بدحواس ہو گیا۔

لاش کو ایم ایس ڈاکٹر قاسم نے پہچانا "یہ تو غلام رسول ہے۔"

جاوید صدیقی اسلام آباد سے آیا تھا اس نے پولیس سرجن کو نہیں پہچانا تھا۔ اس کے سوال کا جواب ایک وکیل نے اور حاسی نے دیا۔

"اب تو سازش ثابت ہو گئی" رابعہ نے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔ اس قتل کا مقصد ہی پوسٹ مارٹم کی کارروائی کو التوا میں ڈالنا تھا" ڈاکٹر قاسم نے تاسف سے سر ہلایا۔

"اب نیا بورڈ تشکیل دیا جائے گا۔ ظاہر ہے اس میں دیر لگے گی۔ جب تک کوئی اور پولیس سرجن کا چارج لیتے نہیں آتا۔ کارروائی رکی رہے گی۔" رابعہ نے کہا "اور اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جرم کا سراغ مٹانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔"

جاوید صدیقی نے تعلّی بدلے ہوئے لہجے میں کہا "آپ مطمئن رہیں۔ اب یہ ناممکن ہے۔"

مجسٹریٹ نے بھی احکامات صادر کر دیے "قبر کی دن رات حفاظت کی جائے جب تک ضابطے کے مطابق۔۔۔"

"تو ٹھیک ہے بورڈ ضابطہ" ڈاکٹر قاسم نے برہمی سے کہا "میں اکیلا بھی پوسٹ مارٹم کر سکتا ہوں اور میری سینکڑوں رپورٹیں عدالتوں نے تسلیم کی ہیں۔ میں اکیلا یہ کام کروں گا۔"

"آپ اپنے رسک پر جو چاہیں کر لیں۔"

"رسک۔۔۔ مائی فٹ۔ میرے لیے کیا رسک ہے اس میں جب لاش قبر سے نکالی جا چکی ہے تو میں دیکھ سکتا ہوں۔ میں اپنی رائے بتا دوں گا۔ آگے عدالت کی مرضی اسے قبول کرے یا مسترد کر دے۔ رپورٹ کو کاؤنٹر سائن بھی مجھے کرنا تھا۔ غلام رسول میرا ماتحت تھا۔ میں اس کی FINDINGS سے اختلاف بھی کر سکتا اور اس کی رپورٹ کو مسترد کر کے اپنی رائے دے سکتا تھا۔"

رابعہ نے خوش ہو کے کہا "پھر آپ ختم کریں یہ کام آج ہی۔ کل کا کیا بھروسا۔"

"ہاں۔ کل میرے ساتھ بھی یہی ہو سکتا ہے جو غلام رسول کے ساتھ ہوا ہے۔ میں اس سے پہلے ہی تمام FACTS سب کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے مار کے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہو گا پھر کوئی لاش لے جانا چاہے تو لے جائے۔ میں ریٹائرڈ آدمی ہوں۔ چالیس سال سے زیادہ ہو گئے موت سے دن رات واسطہ رہا۔ میں موت سے کیا ڈروں گا۔"

ڈاکٹر قاسم کو ایک دم وکیلوں اور صحافیوں کی مکمل حمایت حاصل ہو گئی تھی۔ اسے ایک ہم پیشہ ڈاکٹر کی موت نے مشتعل کر دیا تھا۔ وہ جس معاشرے کا فرد تھا وہاں قانون کی دھجیاں بکھیرنے والے مجرم اتنے طاقتور تھے کہ انصاف مانگنا تک جرم ہو گیا تھا۔ پرانے وقتوں کا ڈاکٹر ان لوگوں میں سے تھا جو پرانی نسل کی اصول پرستی اور وضع داری کو مادہ پرستی کے عہدِ حاضر میں بھی زیادہ اہم سمجھتے تھے۔

ایس ایس پی جاوید صدیقی یا مجسٹریٹ اسے کیسے منع کر سکتے تھے کہ وہ پوسٹ مارٹم نہ کرے۔ ایک بار پھر قبرستان کی سوگوار اور مایوس فضا میں کھلبلی پیدا ہو گئی۔ ڈاکٹر شبلی کی لاش ابھی پوری طرح پھر سپردِ خاک نہیں ہوئی کہ دوسری مرتبہ نکالی گئی اور ایم ایس ڈاکٹر قاسم نے سب کے سامنے ضروری ٹیسٹ لیے جن کے لیے کیمیائی مرکبات اور ضروری سامان وہ ساتھ لایا تھا۔ تمام صحافی اور وکلا اس کے گرد جمع رہے۔ اب سب کے ساتھ رابعہ اور میں بھی وہیں موجود رہے۔ ڈاکٹر شبلی کے ساتھ ہونے والے ظلم پر عبرت کا ابتدائی جذباتی ردِعمل باقی نہیں رہا تھا اور ہم دکھی دل کے ساتھ وہ سب دیکھ رہے تھے جو شیطان کے ہاتھوں انسانیت کی توہین اور تذلیل کے مترادف تھا مگر زندگی کے ساتھ یہ سب آزمائشوں کا سلسلہ یونہی چلتا ہے اور اُجالوں کے متلاشی مسافر تاریکی میں بھی تھک کر بیٹھ نہیں جاتے۔

ڈاکٹر قاسم نے اپنی رپورٹ ایک انتہائی قسم کے ردِعمل کے تحت سب کو براہِ راست دے دی۔ کاغذی کارروائی میں بعد میں سب کچھ لکھا جاتا لیکن ضابطے کی کارروائی میں سقم پیدا کرنے والے اس حد تک کامیاب رہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ پر پولیس سرجن کے دستخط نہیں ہوئے اور اسی بنا پر مجسٹریٹ نے اسے سندِ اعتبار AUTHENTICITY عطا نہیں کی۔ تاہم ہمارا مقصد پورا ہو گیا تھا اور اب لاش کو غائب کرنے سے دلاور کے جرم کی تکذیب ممکن ہو سکتی تھی۔ لاش کو بدلنا بھی آسان نہ رہا تھا۔ اس کی عمر تعداد چیچک

میں نے کہا "میں اپنے خیالوں میں کھو گیا تھا۔"

"خیالوں میں یوں کھوتے رہے تو کھوتے بن جاؤ گے" منظر بولا "ہم علمی کھوتے تو ہم ہیں ہی" خادم آہ بھر کے بولا "انسان تو ہمیں کوئی سمجھتا ہی نہیں۔ گھر والی بس شوہر سمجھتی تھی۔ آپ لوگ تو پتا نہیں کس مٹی کے بنے ہوئے ہو۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے۔ خون دل پینے کو اور زخم جگر کھانے کو۔ اس پر گزارا کر لیتے ہو۔"

"تمہیں خریات کیا ہے' کیوں خفا ہو' کچھ بتاؤ تو سہی؟"

"بھلا بتانا ضروری ہے جی۔ خود آپ کو دکھائی نہیں دیتی ناچیز کی فاقہ زدہ صورت۔ بھی دو لقمے زیادہ کھالوں تو سب کو نظر آتا ہے۔ کسی کو نظر نہیں آ رہا ہے بھوک سے خادم حسین کا دم واپسی پر مر رہا ہے" اور سرِ راہ کیسے کیسے اشتہا انگیز مناظر تھے۔ کہیں پلاؤ' کہیں تکے کباب' کہیں قورمہ' خوشبو سے ہی دم نکل رہا تھا جی مگر آپ تو چلا تھے مُردوں کی فکر میں۔ زندوں کا خیال ہی نہیں۔"

رابعہ نے مسکرا کے کہا "اُف۔ سید ھی طرح بھی تو کہہ سکتے ہو کہ بھوک لگی ہے۔ روزے رکھتے ہو رمضان میں کہ نہیں۔"

"نہیں کا کیا سوال جی۔ مجال ہے جو ایک بھی چھوٹا ہو کبھی۔"

"اس کے باوجود اتنی بھی برداشت نہیں حالانکہ روزہ نام ہی صبر اور قوتِ برداشت کا ہے" رابعہ نے کہا۔

"رمضان کی اور بات ہے جی۔ اللہ توفیق دیتا ہے۔ سارا سال تو رمضان نہیں ہو سکتا۔"

منظر اوپر جا چکا تھا۔ میں نے خادم کو سو کا نوٹ دے دیا "دیکھو آس پاس قریب سے ہم سب کے کھانے کے لیے کچھ لے آؤ۔"

میں رابعہ کے ساتھ آفس میں پہنچا تو منظر ایک لفافہ کھول رہا تھا "یہ کسی نے نیچے سے ڈالا ہے۔"

رابعہ نے کہا "کیا ہے؟"

"ایک اور خط آیا ہے سکندر کے نام۔ کوئی بھوتنی کا ماننے کو تیار نہیں کہ سکندر غائب ہے۔"

"اب کیا پیغام ہے؟"

منظر نے پڑھتے ہوئے کہا "ایک ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ کس کا نمبر ہے یہ؟"

میں نے اور رابعہ نے باری باری اس کاغذ کے ٹکڑے کو دیکھا جس پر سوائے ایک فون نمبر کے کچھ بھی نہیں تھا۔ اعداد کی ترتیب یہ ظاہر کرتی تھی کہ فون سمن آباد یا ماڈل ٹاؤن ایکس چینج کے علاقے کا ہو گا۔ قصور میری یادداشت کا نہیں ذہنی انتشار کا تھا کہ اس نمبر نے میرے ماضی کی کتاب کے اوراق نہیں پلٹے اور میں کچھ دیر ان اعداد کو یوں گھورتا رہا جیسے مجھے حساب کا کوئی مشکل سوال حل کرنے کو دے دیا گیا ہو۔

پھر اچانک مجھے یاد آ گیا "یہ۔۔۔ یہ تو میرا۔۔۔ میرے گھر کا پرانا نمبر ہے۔"

"پرانا نمبر ہے؟"

اور وزن کی اتنی ہی پرانی لاش حاصل کرنا عملاً ناممکن تھا۔ لندن سے موصول ہونے والے ڈاکٹر شبلی کے فنگر پرنٹس اور ڈینٹل اسٹرکچر سے موازنہ کیے بغیر قانونی طور پر عدالت اسے ڈاکٹر شبلی کی لاش تسلیم نہ کرتی مگر واقعاتی شہادت اور ڈاکٹر قاسم کی رپورٹ بہت حد تک ہمارے مؤقف کی تائید میں تھی۔

ایک ایک کر کے پولیس کی وہ سب گاڑیاں روانہ ہو گئیں جو دوسرے تھانوں سے نفری لے کر آئی تھیں۔ قبل از وقت کیے جانے والے حفاظتی انتظامات بھی بے مصرف ثابت ہوئے تھے اور کرنے والے اپنا کام کر گئے تھے۔ پولیس سرجن کا قتل بھی ڈاکٹر شبلی کے قتل کے سلسلے کی ایک کڑی تھا مگر اس کی تفتیش معمول کے مطابق ہو رہی تھی۔ کسی نے بھی پولیس سرجن کو آتے نہیں دیکھا تھا ورنہ کہیں اس کی گاڑی نظر آئی تھی۔ یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ مقررہ وقت سے بھی پہلے اس وقت پہنچا تھا جب پولیس بھی نہیں تھی اور قاتلوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

یہ ساری کارروائی پہلے ہی کم دل آزار نہ تھی کہ ایک قتل نے فضا کے ماتمی بوجھل پن کو اور بڑھا دیا۔ مرنے والا بھی کوئی جرائم پیشہ نہیں تھا ایک معزز ڈاکٹر تھا۔ بھرپور زندگی گزارنے والے اپنے مرجائیں تو کوئی غیر متوقع اور افسوسناک بات نہیں ہوتی۔ برے کام کا برا انجام اگر آج دشمنوں یا قانون کے رکھوالوں کی گولی کا نشانہ نہ بنے تو کل اپنوں کے ہاتھوں بھی مارے جا سکتے ہیں لیکن ڈاکٹر کو کسی سے خطرہ نہیں ہوتا کیوں کہ وہ زندگیاں بچاتا ہے۔ بیماری اور معذوری سے نجات دیتا ہے۔ امید اور خوشیاں بانٹتا ہے۔ مجرم بننا بہت آسان ہے لیکن ڈاکٹر بننے کے لیے برسوں تک رات دن کتابوں میں سر کھپانا پڑتا ہے "اعلیٰ ترین نمبر لینے والوں کو ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ کم سے کم پانچ سال حصولِ علم اور تجربات میں صرف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر بننے کے بعد بھی کامیابی کی منزل فوراً ہی نہیں مل جاتی۔ پولیس سرجن کی پوسٹ تک پہنچنے والے نے چند بیس سال تو اس پیشے میں ضرور گزارے ہوں گے نہ جانے کتنے سرد و گرم دیکھے ہوں گے۔ سینکڑوں ہزاروں آپریشن کیے ہوں گے اور لاکھوں مریض دیکھے ہوں گے۔ ایک منٹ میں کسی نامعلوم قاتل کی گولی نے جسے شاید وہ پہچانتا تک نہیں تھا کامیابی کے اس سفر کا اختتام کر دیا۔ مرنے والے کی کسی سے دشمنی نہیں ہوتی مگر مارنے والے کو بھی اس سے صرف یہ شکایت ہوگی کہ وہ اپنا ایمان بیچنے پر تیار نہیں تھا اور دولت سے خریدا نہیں گیا ہو گا۔ اس نے غلط پوسٹ مارٹم رپورٹ دینے سے انکار کیا ہو گا۔

"حضور تشریف لائیں گے خود یا ہم یہاں ڈال کے لے جائیں" منظر نے دروازہ کھول کے کہا۔

میں چونکا۔ آفس آ گیا تھا۔ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی رابعہ بھی اتر گئی تھی۔ غالب کی گاڑی اپنی مخصوص جگہ پر پارک تھی اور خادم نیچے کھڑا تھا۔

www.paksociety.com

"ہاں۔ جب میں لندن گیا تھا تو ہمارے گھر کا فون نمبر یہی تھا۔ اسی نمبر پر میں والد صاحب سے بات کرتا تھا مگر بعد میں جب وہ گھر کسی اور کی ملکیت ہوا تو نمبر بدل گیا تھا۔ پہلے والا نمبر کٹ گیا تھا اور نئے مالک نے اپنے نام سے کنکشن لیا تھا۔ اس کے بعد رابعہ نے وہ گھر پھر میرے لیے خریدا تو نئے سرے سے فون کے لیے درخواست دی تھی۔"

"ہاں۔ فون جو ایک شخص کے نام پر ہو کسی اور کے نام نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کہ وہ قانونی وارث نہ ہو۔ اور عدالت یہ تسلیم کر چکی ہو۔" منظر نے کہا۔

"مجھے یاد ہے وہ تیرا نمبر تھا" رابعہ بولی۔

"میں حیران ہوں کہ مجھے اتنی دیر سے کیوں یاد آیا؟!"

"حیران و پریشان ہونے سے بہتر ہے تم سوچو کہ کسی نے تم کو یہ نمبر کیوں بھیجا ہے؟" منظر نے کہا۔

رابعہ بولی "ممکن ہے یہ نمبر کسی اور کو ملا ہو گا؟!"

"وہ بھی معلوم کر لیتے ہیں۔ نمبروار یعنی NUMERICAL ڈائریکٹری تو ہو گی یہاں" منظر نے کہا۔

رابعہ نے اسے ڈائریکٹری نکال کے دی مگر اس میں یہ نمبر ابھی تک بدلا نہیں تھا۔ اس میں بہ دستور وزیر خان کے نام اور پتے کا اندراج تھا۔ اسے ٹیلی فون کے محکمے والوں کی نااہلی سمجھا جا سکتا تھا اور فون نمبر کے موجودہ مالک کی عدم دلچسپی بھی کہ اس نے تصحیح کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

رابعہ نے مشورہ دیا "بات کر کے دیکھو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "مجھے کیا ضرورت ہے۔"

"تجسس مٹانے پر تمہارا نام تھا۔"

میں نے کہا "یہ چال ہے کسی کی۔ جال پھیلایا گیا ہے میرے لیے۔ کہ میں اس فون نمبر کو دیکھتے ہی جذباتی ہو کے ڈائل گھما دوں۔ بعض اوقات تجسس ہی آدمی کو مروا دیتا ہے۔ دلاور اچانک کسی طرح یہ فون نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اگر میں نے بات کی تو میری آواز ٹیپ ہو جائے گی۔ یہ ثابت ہو جائے گا کہ میری روپوشی ایک فریب ہے۔ درحقیقت میرا سب سے رابطہ ہے اور میں اسی جگہ موجود ہوں۔ یہ نمبر ایکسچینج پر ہو گا۔ وہ معلوم کر لیں گے کہ سکندر نے کہاں سے کال کی تھی۔"

"اس کی بات سمجھ میں آتی ہے۔" منظر بولا "اب اللہ کا نام لے کے تم یہ نمبر ملا ڈالو اور دیکھو پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔" "میں نمبر ملاؤں؟!"

"یار! اس میں ڈرنے کی کون سی بات ہے۔ یہ تمہارا آفس ہے اور یہ رقعہ تمہیں اپنے آفس میں ملا ہے۔ ابھی تک ایسا کوئی سائنسی طریقہ ایجاد نہیں ہوا تخریب کاری کا کہ آپ کسی کا فون نمبر ملائیں اور خود دھماکے سے اڑ جائیں۔"

میں نے سوچ کے کہا "یہ بھی ہو سکتا ہے منظر صاحب۔ ذرا عقل کے گھوڑے دوڑائیے۔ امکانات کتنے بھی کم ہوں مگر ناممکن کچھ نہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ آج صبح دلاور کی بیوی اور اس کا بیٹا آئے تھے۔ جب بیٹا آیا تو یہاں کوئی بھی نہیں تھا سوائے مولوی خادم حسین کے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اس لونڈے نے مولوی کو چکر دے کر ادھر ادھر بھیجا اور نظر بچا کے فون میں بم نصب کر گیا۔ ایک فون کال۔ خط دینے کا بہانہ تھا۔ ادھر یہ نمبر تھمایا کسی نے اور۔۔۔ بوم۔"

"کیا ایسا ہو نہیں سکتا؟"

"بھوتنی کے یہ وہی فون ہے جو ہم روز استعمال کرتے ہیں۔"

"گاڑیاں بھی وہی تھیں جو ہم روز استعمال کرتے تھے کراچی میں جاسوسی کے آلات نصب کر دیے گئے تھے اور یہاں اس بنگلے میں ہم نے کتنے خفیہ مائکرو فون دریافت کیے تھے۔"

"مائکرو فون اور بم میں بہت فرق ہوتا ہے نور چشم" منظر نے کمزور سا دفاع کیا۔

"نور چشم۔ نمبر والے قفل ہوتے ہیں یا نہیں؟ ادھر ادھر ہزار نمبر ملا ڈالو نہیں کھلتا۔ ایک مخصوص نمبر پر لیور حرکت میں آ جاتے ہیں۔ یہ سسٹم کیا تخریب کاری میں استعمال نہیں ہو سکتا۔ جتنی DEVICES ہیں جو نام پر مخصوص فریکوئنسی پر کام کرتی ہیں۔ ریموٹ کنٹرول۔ انفراریڈ یا الٹرا وائلٹ شعاعوں سے چلنے والے الیکٹرانک آلات۔ خود کار دروازے۔ کیا یہ سب سائنس فکشن ہیں؟" "یہ سب آج کے حقائق ہیں' یہ سائنس ہے۔"

"بے سائنس کے گھوڑے۔ میں مانتا ہوں سب مگر تمہارا تو کہاں تھا اس لونڈے کے پاس۔ تم نے خواہ مخواہ وہم ڈال دیا ہے میرے دل میں" منظر نے ٹیلی فون کو گھورتے ہوئے کہا۔

رابعہ نے کہا "احتیاط کرنے میں کیا حرج ہے۔"

میں نے کہا "اگر اس نمبر پر بات کرنی ہے تو باہر کہیں جا کے کر لیتے ہیں۔ یہ تمہارے ساتھ والے آفس میں بھی فون ہے۔"

منظر بولا "اس فون کو میں معائنے کے لیے بھیج دوں؟"

رابعہ نے کہا "ابھی سیٹ بدل دیتے ہیں۔" ورنہ ہم دور ہو جاتے گا۔ مولوی خادم حسین کی آمد نے سہ پہر چار بجے لنچ کا موقع فراہم کر دیا ورنہ ہم تو شاید چائے کافی پی کے وقت گزار دیتے۔ ان حالات میں نہ بھوک محسوس ہوئی تھی اور نہ کسی کے نزدیک کھانے کی اتنی اہمیت تھی مگر کھانا سامنے آیا تو سب اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس وقت تک متوکل آنے لگے تھے۔ وقار یوسف اور اس کے ساتھی وکیل ٹائپسٹ اور عملے کے دیگر ارکان ہر روز کی طرح اپنے کام میں لگ گئے پھر منظر کو بھی چند معاملات میں راہنمائی اور ہدایات دینے کے لیے جانا پڑا اور وہ وہیں الجھ کے رہ گیا۔

میں نے رابعہ سے کہا "تم کہیں سے اس نمبر پر بات کر کے دیکھو۔ مجھے شک ہے کہ چودھری دلاور کا کوئی والی وارث مجھ سے رابطہ کرنا چاہتا ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں کسی سے بات کرنے کی۔"

لیں گے۔ بعد میں کچھ نہیں ہو سکے گا۔ ہم زیادہ سے زیادہ دلاور کو لٹکا دیں گے۔ تم بھی غالب اور نازو تو نہیں ملیں گے۔"

"تم کیا چاہتے ہو آخر؟"

"یہی کہ انہیں امید کے جال سے نکلنے نہ دیا جائے۔ مایوسی کی انتہا کو نہ پہنچنے دیا جائے جہاں وہ صدمے یا اشتعال سے پاگل ہو کے مرنے مارنے پر تل جائیں۔ سب کو ماردیں اور خود بھی مر جائیں۔ وہ صرف اسی امید پر جی رہے ہیں کہ دلاور کا بیٹا جذباتی اور اہم ہے اور اس کی بیوی زخم خوردہ ناگن۔ ان دونوں سے ڈرنا چاہیے۔ آج رات ہم وزیر خان اسپتال میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ باہر کے حفاظتی انتظامات منظر یا وقار یوسف کے سپرد کر دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ غالب اور نازو کو وہیں رکھا گیا ہو گا۔"

رابعہ "ابھی میں فون کر کے آتی ہوں۔"

مجھے بہت کم امید تھی کہ رابعہ کی کوشش کے نتائج امید افزا ہوں گے مگر وہ واپس آئی تو اس کی صورت کے تاثرات سے میں نے اندازہ کیا کہ کوئی نئی بات ضرور ہوئی ہے۔

"یہ نمبر کسی ڈاکٹر علی حیدر کا ہے۔"

"میں کسی ڈاکٹر علی حیدر کو نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔

"منظر اور وقار یوسف بھی نہیں جانتے۔ میں نے پوچھ لیا ہے۔ ٹیلی فون پر صرف ملازم تھا اس لیے زیادہ بات نہیں ہوئی۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا "خود ڈاکٹر سے کب بات ہو گی؟"

"وہ پانچ سے چھ بجے کے درمیان گھر پر ملتے ہیں۔ چھ بجے کلینک جاتے ہیں تو پھر رات کو دس بجے لوٹتے ہیں۔ بیوی بچے انہیں بہت پہلے چھوڑ گئے تھے۔ تب سے وہ اکیلے رہتے ہیں۔"

"نمبر کہاں کا ہے' میرا مطلب ہے پتا؟"

"ادھر۔ ہمارے گھر کے قریب ہی کوٹھی ہے ڈاکٹر علی حیدر کی۔"

رابعہ کا میرے گھر کو ہمارا گھر کہنا مجھے اچھا لگا "جب تک ڈاکٹر صاحب سے بات نہ ہو کچھ پتا نہیں چل سکتا۔"

"ایک اور بات بتائی وقار یوسف نے۔ اس کی عدم موجودگی میں کسی علی حیدر نے فون کیا تھا۔ اس کی بیوی کو علی اصغر یاد رہا کیونکہ وہ بھی ڈاکٹر تھا۔ اس نے تمہارا پوچھا تھا کہ سکندر بخت صاحب تھا!" "پھر اس نے کیا کہا کہ ہیں۔۔۔؟"

رابعہ مسکرائی "ہاں۔ اس نے کہا کہ ہیں تو سہی ایک صاحب اس نام کے مگر پتا نہیں کہ دنیا میں کہاں ہیں۔ غالباً میرے شوہر کے کلائنٹ ہیں۔ کبھی کبھار آتے تھے ان کے پاس مگر اب مدت سے نظر نہیں آئے۔"

"ویری گڈ۔ بہت سمجھداری کا جواب ہے۔"

"اس کے بعد اور کچھ نہیں پوچھا گیا۔ وقار یوسف کسی علی اصغر نام کے ڈاکٹر کو بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے ابھی مجھ سے پوچھا کہ تمہارا یا سکندر کا کسی ایسے شخص سے کوئی واسطہ رہا ہے جس کا

میں نے کہا "جو حکم سرکار کا۔ میں خود بھی بات کر کے اپنی روپوشی [illegible] توڑنا نہیں چاہتا۔"

"ڈیئر! ویسے بھی اب بات کرنے کا وقت گزر گیا ہے۔ دلاور ہمارے پاس ہے۔ اس کی فرد جرم تیار ہے۔ ثبوت شہادت' سب ہے ہمارے پاس۔۔۔"

"لیکن ہم اس کے باوجود چودھری دلاور کو ابھی تک قانون کے حوالے نہیں کر پائے" میں نے کہا۔

"مگر اس بار وہ ہمارے چنگل میں ایسا پھنسا ہے کہ نکل نہیں سکتا۔" میں نے کہا "مجھے ایک بات بتاؤ۔ دلاور خود تو اب کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے لیکن اس کے والی وارث تو ہیں۔ انہوں نے ہتھیار نہیں ڈالے ہیں۔ وہ دلاور کو واپس حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرنے پر کمربستہ ہیں۔ غالب اور نازو ان کے قبضے میں ہیں۔ فوزیہ کو دھمکی ملی ہے۔ محسن اور گل کی طرف سے خبردار کر دیا گیا ہے۔ وہ مایوس بالکل نہیں ہیں۔ انہیں پوری امید ہے کہ ہم بلیک میل ہو جائیں گے۔ جس دن یہ امید ختم ہو گئی' یہ سمجھو کہ سب ختم ہو جائے گا۔"

"پھر ہم کیا کریں' دلاور کو چھوڑ دیں؟"

"ایسے نہیں۔ بازی کو لمبا کرو۔ اپنے پتے سنبھال کے رکھو اور دشمن کو اپنے پتے شو کرنے پر مجبور کرو۔ اگر کوئی بات کرنا چاہتا ہے ہم سے تو اس کی بات سنو اور سمجھو۔ یہ عقل کا کھیل ہے۔ اس کھیل میں ہمارے مقابل دلاور تھا اور اس کا ذہن شیطانی چالیں چلنے میں ماہر تھا۔ وہ بلاشبہ بہت بڑا شکاری تھا۔ کچھ شکاری اسپورٹس مین ہوتے ہیں جو ایڈونچر یا شوق کی خاطر شکار کرتے ہیں اور شکار کے اصولوں کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ گیم ہوتا ہے۔ دلاور جیسے شکاری KILLERS ہوتے ہیں جن کے نزدیک شکار نہ تفریح ہے نہ ایڈونچر بلکہ صرف اپنی وحشی طاقت کا مظاہرہ ہے جس میں شکار کو مارنا ہی اہم ہے۔ کوئی طریقہ یا اصول اہم نہیں۔ اب میدان میں دوسرے درجے کے شکاری ہیں جو عیاری' مکاری اور سفاکی میں دلاور کے ہمسر نہیں۔ انہیں ہم شکست دے سکتے ہیں مگر اس کے لیے وقت چاہیے۔ عقل چاہیے اور صبر و سکون چاہیے۔ ورنہ یہ بات لکھ لو کہ اناڑی شکاری جلد بازی میں اپنا بھی نقصان کریں گے اور ہمارا بھی۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو!" رابعہ نے مایوسی سے کہا۔

"دیکھو رابعہ۔ اگر آج ہمارے سامنے سیدھا سوال ہو۔ ایک ڈیڈ لائن آ جائے فیصلے کی۔ اچانک دلاور کی بیوی یا اس کا گرم خون رکھنے والا جوان بیٹا اعصابی دباؤ سے نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو جائیں۔ وہ ذہنی طور پر دلاور کی موت کو قبول کر لیں۔ ہر طرف سے مایوس ہو کے اور ہر کوشش کا انجام ناکامی دیکھتے ہوئے نوٹس دے دیں کہ آج رات بارہ بجے تک دلاور کو چھوڑ دو ورنہ ہم نازو اور غالب کو نہیں چھوڑیں گے پھر کیا رد عمل ہو گا ہمارا۔ اگر ہم نے سمجھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے' یہ محض دھمکی ہے تو ہم بہت بڑا رسک

www.paksociety.com

نام ڈاکٹر علی اصغر یا علی حیدر ہو۔ میں چونکی تو اس نے بتائی بات بتائی۔ عجیب!"
پھر کہا "اب جیسا تم مناسب سمجھو۔ علی حیدر کا کوئی تعلق ضرور ہے اس کیس سے۔"
"کیوں نہ اس سے مل لیں اس کے گھر جا کر، ساری بات صاف ہو جائے گی۔"
"میرا بھی یہی خیال ہے۔" رابعہ بولی۔
چونکہ اندر ہمارے سوا کوئی نہیں تھا اس لیے میں نے رابعہ کا منہ چومنے میں دیر نہیں لگائی۔ اسی وقت آواز آئی "لاحول ولا قوة۔"
"یہ کیا بدتمیزی ہے" وہ گھبرا کے اور بگڑ کے بولی۔
میں نے کہا "ہر بار کہنے سے کیا فائدہ کہ اس بات پر تمہارا منہ چوم لینا۔ فوری کو ریکنگیشن ہونا چاہیے مگر یہ لاحول کس نے پڑھی تھی۔" "ہوگی تمہارا مولوی غلام حسین تھا اور کون۔ تمہیں ذرا خیال نہیں کہ یہ دفتر ہے۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔
"بات جگہ کی نہیں سوچنے کی ہوتی ہے۔ اس اُلّو کے پٹھے کو اندر جھانکنے کی کیا ضرورت تھی۔ عین اسی وقت۔"
"وہ شریف آدمی ہے۔"
"تو ہم کیا بدمعاش ہیں اور میں تمہاری یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں کہ محض مولوی غلام حسین کہلانے سے وہ شریف آدمی ہونے کی سند حاصل کر چکا ہے۔ وہ مجھ سے بڑا بدمعاش ہے۔"
رابعہ کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی "ابھی پوچھ رہے تھے مجھ سے کہ کیا ہم بدمعاش ہیں۔ اب خود تسلیم کر رہے ہو۔"
میں نے دروازہ کھول کے جھانکا تو مولوی غلام حسین دوسری طرف منہ کیے سر کھجا رہا تھا۔
میری نظر پڑتے ہی وہ چونکا اور جھینپ کر مسکرانے لگا۔ "وہ جی۔ غلطی ہو گئی۔"
میں نے کہا "ہاں۔ ہم سے غلطی ہو گئی لیکن کیا کریں۔ انسان خطا کا پتلا ہے اور حوا کی بیٹی خطا کی پتلی۔ اللہ ہم سب کو معاف کرے۔"
وہ مزید شرمندہ ہوا۔ رابعہ باہر آئی تو اس کا چہرہ بھی گلابی ہو رہا تھا۔ ہم خاموشی سے آفس سے گزرے۔ رابعہ نے منظر کے کان میں کچھ کہا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اسے علی حیدر ملک کے گھر کا پتا ثابت ہوگی اور یہ کہ ہم اس سے ملنے کے لیے جا رہے ہیں۔
میں نے ڈرائیونگ غلام حسین کو سونپی اور خود رابعہ کی کار میں اس کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔ جب سے کانوں میں لگائے ہوئے خفیہ مائیکروفون دریافت ہوئے تھے ہم دوران سفر ایسی کوئی بات نہیں کرتے تھے جو افشائے راز کا سبب بنے یا دشواریاں پیدا کرے۔ ہر بار آتے جاتے گاڑی کو چیک کرنا کہ اس میں کسی نے کہیں ایف ایم مائیکروفون تو نہیں چھپا دیا ہے عملاً ناممکن تھا۔ ناخن کی ڈبیا جتنا مائیکروفون کوئی راہ چلتے ایک منٹ میں لگا سکتا تھا

ٹکرانے سے پوری کار کی باڈی میں تلاش کرتا ہو تو ایک گھنٹا چاہیے۔
رابعہ نے غلام حسین کو سمجھا دیا تھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ پیچھے خاموشی سے رابعہ کے ساتھ بیٹھ کے میں نے یہ فکر رکھی کہ ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا ہے اور رابعہ نے بھی۔ میں نے رابعہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تب بھی مزاحمت نہیں کی۔
میں نے غلام حسین سے فرنچ میں کہا "ہر وقت کرتا ہوں ارض پر آپ سے زیادہ حسین خاتون... کسی ایونیورسٹی یا پھر رہی ہیں تا، یہ سب صحبوتی سازش کا نا پُرسکون کاروائی ہے۔"
"یہ میں نہیں کہہ سکتا جناب!"
"کیوں نہیں کہہ سکتے۔ آخر تم مترجم ہو۔ ہمارے جذبات کی ترجمانی بھی تمہارے فرائض میں شامل ہے۔"
"آرام ماریں گی مجھے۔"
"نہیں ماریں گی۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔"
نہ جانے کس موڈ میں غلام حسین نے میری بات کا ترجمہ رابعہ کو سنا دیا۔ رابعہ نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اس کا چہرہ غصے اور حیا سے لال ہو گیا۔ وہ غلام پر برس پڑی۔
"غلام۔ کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ بدتمیزی کرتے ہوئے ساتھ۔"
"جی میں نے تو انکار کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ماروں گی نا۔ بے ایمانہ کہا۔ ترجمہ کرنا تمہارا کام ہے۔"
میں نے کہا "غلام ان سے کہو کہ سچ بولنا کوئی جرم نہیں۔"
"اجی لعنت سچ بولنے والے پر۔ آپ مجھے پٹوائیں گے۔ خود کیوں ڈرتے ہیں اتنا۔"
میں نے کہا "کون کہتا ہے کہ ہم ڈرتے ہیں۔" رابعہ ہنس رہی تھی۔ میں پھر بولا "میں نے کہا ہے کہ سچ بولنا کوئی جرم نہیں۔ کیا یہ غلط ہے؟ مگر مولوی تم انتہائی بزدل ہو۔ حق بات کہتے ہوئے ڈرتے ہو۔"
"مجھے نہیں معلوم تھی آپ کے جھوٹ سچ کا۔"
رابعہ کی خفگی دور ہو گئی تھی اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ دوسری طرف کرکے باہر دیکھ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مسکرا رہی ہوگی۔ ڈاکٹر علی حیدر کی کوٹھی تلاش کرنا میرے لیے بہت آسان تھا۔ کیونکہ میں اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ جہاں میرے والد وزیر خان کی اور اب ہماری کوٹھی تھی۔ اس کے پیچھے والی گلی میں ڈاکٹر علی حیدر کی چھوٹی کوٹھی تھی۔ غلام حسین کی شاندار گاڑی کو ایک ڈرائیور مزید چمکانے میں مصروف تھا۔
"ڈاکٹر صاحب سے کہو کہ ہم ملنا چاہتے ہیں۔" رابعہ بولی۔
"کیا نام بتاؤں جناب عالی؟" ڈرائیور نے مؤدبانہ کہا۔
رابعہ نے سوچ کے کہا "کہنا مسٹر اور مسز سکندر بخت۔"
ڈرائیور اندر چلا گیا تو میں نے مسکرا کے غلام حسین کو...

میں رابعہ قادری ہوں۔ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔ اور یہ مسٹر سکندر بخت، برطانیہ کے مشہور وکیل ہیں۔ یہ انگلش بھی نہیں سمجھتے۔ صرف فرنچ بولتے ہیں اس لیے یہ مترجم ہے۔"
علی حیدر بیٹھ گیا۔ "میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کو جھوٹ بول کے اندر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کون ہے یہ سکندر بخت جس کی وجہ سے میری زندگی خوار اور عذاب میں ہے۔ سکندر بخت ہمارا ایک دوست تھا... بلکہ ہے۔"
"خیال ہے۔ ایک بات کرو سوچ کے خاتون۔"
رابعہ نے کہا "دراصل وہ لاپتا ہے۔ ہم اس کو تلاش کر رہے ہیں۔"
"میرا نام کس نے بتایا تمہیں۔ کیا میں نے چھپا رکھا ہے تمہارے دوست کو؟"
"ہمیں کسی نے آپ کا فون نمبر دیا تھا اور کہا تھا کہ اس نمبر پر رابطہ قائم کریں۔ اتفاق سے یہ نمبر پہلے سکندر بخت کے والد کا تھا۔ کافی پرانی بات ہے۔ وہ پیچھے والی سڑک پر رہتے تھے وزیر خان۔"
"وزیر خان" اس نے زور دے کر دہرایا "لیکن وہ تو مر چکا ہے۔"
"آپ جانتے تھے انہیں؟"
"تھوڑا سا۔ کبھی کبھی ہم شطرنج کھیلتے تھے اور مچھلی کا شکار کرنے بھی جاتے تھے۔ وہ بھی اکیلا تھا اور میں بھی۔ اسی کا فون نمبر تھا۔" رابعہ نے کہا "ان کا ایک لڑکا تھا۔"
"ہاں۔ شاید لندن میں زیر تعلیم تھا وہ۔"
"بالکل ٹھیک۔ اسی کا نام سکندر بخت تھا۔ اس کا نام کبیر خان بھی تھا۔" رابعہ نے خوش ہو کے کہا۔
"اگر تم دوسرا نام نہ بتاتیں تو مجھے یقین کرنا مشکل ہوتا۔ یہ تفصیل بہت ہی کم لوگ جانتے تھے۔ خیر تم اسے کیسے جانتی ہو؟"
"وہ میرا کلاس فیلو تھا اور لندن سے آیا تھا تو ہماری نسبت طے ہو گئی تھی پھر حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ شادی سے پہلے وزیر خان کا انتقال ہو گیا اور سکندر بخت ایسی مشکلات میں گرفتار ہو گیا کہ وہ غائب ہو گیا۔ مجبوراً روپوشی اختیار کی اس نے۔"
"تمہیں بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟" علی حیدر نے افسوس سے کہا۔
"مجھے بھی بہت رنج ہے" رابعہ دکھی لہجے میں بولی "کہ اس نے مجھے بھی اعتماد کے قابل نہیں سمجھا۔ میرا خیال ہے وہ لندن میں ہے۔ وہاں ایک جگہ تھی جہاں اس کے دوست ہیں اور وہ محفوظ رہ سکتا ہے۔"
"آئی فیل سو سوری فار یو گرل" ڈاکٹر نے شفقت سے کہا "مجھے تو کسی نے فون پر کہا تھا کہ سکندر بخت کے نام سے تمہیں ایک نقدی ملے گا اسے رکھ لینا۔ میں نے کہا کہ میں تو کسی سکندر بخت کو نہیں جانتا تو مجھے ایک اور فون نمبر بتایا کہ یہاں سے پوچھ لینا۔ یہ کسی وکیل کے گھر کا نمبر تھا۔ تم دونوں بھی وکیل ہو۔ اسے ضرور جانتے ہوگے۔"

"تمہارے کچھ لوگ خواہ مخواہ گلے کا ہار ہو جاتے ہیں۔ بلاوجہ رشتہ جوڑتے ہیں۔"
رابعہ نے مجھے گھورا "یہاں شرافت سے رہو سمجھے۔"
میں نے غلام حسین سے کہا "تمہاری شرافت کی رگ نہیں پھڑکی؟ کسی عذر شرعی کے بغیر انہوں نے ایک نامحرم کو کیا کہہ دیا۔ تمہارے منہ سے لاحول ولا قوۃ نہیں نکلا۔"
ڈرائیور دوسرے دروازے سے نمودار ہوا۔ "اندر آجائیں جناب عالی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ مہمانوں کو بٹھاؤ۔ وہ باتھ روم میں ہیں۔"
میں نے جیب میں ریوالور کی موجودگی کو محسوس کیا اور ڈرائنگ روم کا جائزہ لے کر ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں میرے پیچھے سے بے خبری میں کوئی نہیں آسکتا تھا اور میں ہر آنے والے کو پہلے دیکھ سکتا تھا۔ صورت حال ابھی تک واضح نہیں تھی کہ علی حیدر ملک کی حیثیت کیا ہے۔ وہ ملارو اینڈ کمپنی میں شامل ہے یا اسے رابطے کا وسیلہ بنایا گیا ہے۔ بظاہر کسی ڈاکٹر کا ملارو کے مذموم کاروبار میں شریک ہونا مشکل لگتا تھا لیکن اس کا ملارو سے کوئی تعلق نہ ہو تا تو اس معاملے میں وہ کیوں ملوث ہوتا۔ یہ تعلق دور کا بھی ہو سکتا تھا مثلاً یہ کہ وہ ملارو کا فیملی ڈاکٹر ہو اور اب ملارو کی بیوی نے اسے سکندر کو بلوانے کے لیے استعمال کیا ہو۔ زبردستی یا اس کی مرضی سے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔
ڈرائنگ روم کی شان و شوکت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کوئی عام ڈاکٹر نہیں ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر اکیلا تھا۔ اس کی کوئی فیملی نہیں تھی۔ بیوی بچے آخر اسے کیوں چھوڑ گئے تھے؟ میں نے سوچا۔ اگر ڈاکٹر نے دوسری شادی کی ہوتی تو پہلی بیوی طلاق لے کر جا سکتی تھی یا احتجاجاً واک آؤٹ کر سکتی تھی لیکن گھر میں دوسری عورت بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ جس گھر میں وجود زن نہ ہو وہ ایک بے رنگ تصویر کی طرح نظر آتا ہے۔ کیا پتا ڈاکٹر نے دوسری شادی ہی نہ کی ہو۔ وہ شوقین مزاج ہو اور بیوی کے جانے سے اسے عیاشی کی مکمل آزادی مل گئی ہو۔ ایسا شخص ملارو کا ساتھی ہو سکتا تھا۔
ڈاکٹر اچانک اندر آ گیا۔ وہ صورت سے ذرا بھی ڈاکٹر نہیں لگتا تھا۔ اگر میں ڈاکٹر ہوتا تو کباڑیا بھی اچھی صورت کا رکھتا۔ خدا نے اسے جیسی بھی صورت دی تھی اس میں ڈاکٹر کا قصور نہیں تھا اور صورت کا مضحکہ اڑانا یقیناً گناہ تھا مگر نہ جانے کیوں جو میرے ذہن میں موجود ڈاکٹر کے تصور پر پورا نہیں اُترتا تھا۔ وہ پستہ قد، سیاہ فام اور کسی حد تک فربہ تھا۔ اس کے بائیں رخسار پر جھلسی ہوئی جلد کا ایک بدنما داغ اسے مزید بدصورت بناتا تھا۔
"تم میں سے سکندر بخت کون ہے؟" اس نے اندر آتے ہی کسی تمہید کے بغیر کہا۔
رابعہ نے تحمل سے کہا "سکندر بخت تو کوئی بھی نہیں۔"
"تو اب! پھر تم لوگ کون ہو؟" اس نے غصے سے کہا۔

www.paksociety.com

"وقار یوسف کو بالکل جانتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے تعجب سے سر ہلایا "عجیب بات ہے۔ وہ تحفہ آخر براہ راست تمہیں کیوں نہیں ارسال کیا گیا۔ بہت سی باتیں تمہاری صداقت ثابت کرتی ہیں۔ ایک تو تمہیں سکندر بخت کا اصل نام معلوم ہے۔ تم جانتی ہو کہ یہ فون نمبر پہلے کس کے نام پر تھا اور یہ کہ وقار یوسف کے گھر سے بھی مجھے بس اتنا ہی پتا چلا تھا کہ سکندر بخت کا کسی کو علم نہیں۔"

میں نے بے چینی سے خادم کے ذریعے کہا "وہ تحفہ کیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ کوئی میرے کلینک میں چھوڑ گیا تھا۔ آئی جسٹ ڈونٹ نو کہ مجھے اس ڈبل گیم میں کیوں گھسیٹا گیا ہے۔ نام ضرور جانتا ہوں میں اس کا مگر سکندر بخت میرے سامنے آجائے تو میں اسے پہچان نہیں سکتا۔"

"وہ تحفہ آپ کے کلینک میں ہے؟"

"نہیں۔ میں گھر لے آیا تھا مگر یہ حرکت بھی عجیب تھی کہ پیغام میرے گھر پر دیا گیا اور تحفہ کلینک پہنچا دیا گیا۔ میں لے کر آتا ہوں۔"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی نظر میں ایک ہی سوال تھا جس کا جواب آنے والا وقت ہی دے سکتا تھا۔

خادم حسین نے آہستہ سے کہا "اس میں بم ہوگا جی۔ شرط لگالیں۔"

رابعہ نے آہستہ سے ڈانٹا "تم چپ نہیں بیٹھ سکتے۔ ہم بھی اتنے نا سمجھ نہیں کہ اس فضول بات پر شرط لگا لیں تم سے۔"

علی حیدر دوبارہ اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں چھ انچ لمبا چوڑا پارسل تھا جس پر مضبوط کپڑا سی کر سلائی پر لاکھ سے مہر لگادی گئی تھی۔ "کیا یہ ڈاک سے آیا تھا؟"

"نہیں۔ انشورڈ پارسل تھا۔" اس نے پارسل رابعہ کی طرف بڑھا دیا۔

"سکندر بخت معرفت ڈاکٹر علی حیدر۔" رابعہ نے مجھے سنانے کے لیے اس پر لکھا ہوا پورا پتا پڑھا۔

"اس میں کوئی گڑبڑ ہے۔ دیکھو بھیجنے والے نے اپنا نام کبیر خان لکھا ہے اور پتا میرے گھر کا۔ کیا مقصد ہے آخر اس کا سوائے اس کے کہ بعد میں اس کا سراغ نہ لگایا جاسکے۔ خیر ہاؤ ایور، بے بی۔ میں صرف دعا کرسکتا ہوں کہ پھر کوئی مجھے اس معاملے میں ملوث نہ کرے ورنہ مجبور ہو کے میں پولیس سے رجوع کروں گا۔ ابھی تو میں نے خود ہی گریز کیا۔"

"یہ آپ نے اچھا کیا۔ تھینک یو ویری مچ۔ آپ کو جو ذہنی کوفت ہوئی اس کے لیے ہماری معذرت قبول کریں۔"

ڈاکٹر نے رابعہ کے شانے پر تھپکی دی "اٹ از او کے۔ تمہاری تو کوئی غلطی نہیں اس میں۔ خدا کرے تمہیں تمہارا سکندر بخت مل جائے۔"

"آمین" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں ایک بات اور۔ میں اس پارسل کو براہ راست گھر لایا تھا۔ میرا ایک مریض بم ڈسپوزل یونٹ میں ہے۔ اسے اسکرین پر چیک کرنے میں بھی پریشانی تھی کہ کہیں اس میں ٹائم بم یا کوئی ایسی بات نہیں ہے۔"

"یہ تو آپ نے ہمارا کام آسان کردیا" رابعہ نے کہا "ہم بہت شکرگزار ہیں۔" "ایسے کہاں چلتے ہیں۔ میں چائے پینے والا تھا۔ اس کے بعد میں کلینک چلا جاؤں گا۔ میرے ساتھ ایک کپ چائے پی کر جاؤ۔" اس نے یہ بات درخواست سے زیادہ حکم کے انداز میں کہی تھی۔

خود میرا موڈ چائے پینے کا تھا اور ڈاکٹر کے گھر میں مجھے اچھی کی چائے بھی مل گئی۔ ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ گاڑی کوٹھی سے باہر آئی تو رابعہ نے پارسل کھولنے کے لیے کہا۔ "ایسی کیا جلدی ہے۔ آفس چل کے دیکھ لیں گے۔"

رابعہ نے کہا "یہاں کیا حرج ہے۔"

خادم نے سر کھجا کے کہا "حرج تو بہت ہے جی۔ چند سیکنڈ میں ہیں اس دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچنے میں۔"

"سنا نہیں تھا ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا۔" رابعہ بولی۔

"پھر بھی جناب کل ضرور پڑھیں کھولنے سے پہلے۔"

میں نے سلائی کی طرف سے کپڑے کو پھاڑا تو اندر سے گتے کا ایک ڈبا نکل آیا۔ اس پر ایک سلپ لگی ہوئی تھی اور اس پر لکھا ہوا تھا "یہ پہلی قسط ہے۔"

نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ میں پارسل کو رابعہ کے سامنے نہ کھولوں۔ کوئی نامعلوم خوف میرے دل میں ایک خلش پیدا کررہا تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہونے والی ہے اور یہ تحریر وارننگ ہے لیکن رابعہ کا اصرار تھا کہ میں پیکٹ کھولوں۔

مجبوراً میں نے گتے کے ڈبے پر سے کاغذ اتارا اور اس کا ڈھکنا کھولا۔ اس کے اندر سفید روئی کا گولا سا رکھا ہوا تھا۔ کار کے اندر کی فضا نسبتاً تاریک تھی مگر میں نے کاٹن کی سفیدی پر لہو کی سرخی کا رنگ دیکھ لیا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے روئی کے گولے کو ڈبے سے نکالنے کے لیے کھولا تو اس کے عین وسط میں دو ڈھائی انچ کی کوئی سخت چیز محسوس ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ رابعہ سے پہلے خود اسے دیکھ لوں مگر رابعہ نے ڈبا اچانک مجھ سے لے لیا۔

دوسرے لمحے اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور ڈبے کو ایک طرف پھینک کر سیٹ پر گر گئی۔ میں نے ڈبے کو فرش پر گرنے دیا اور رابعہ کو سنبھالا مگر وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

خادم حسین با آواز بلند آیت الکرسی پڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے کار ایک طرف روکنے کے لیے کہا۔ اس نے گاڑی روک دی تھی کہ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

"وقار یوسف کے گھر چلو۔" میں نے کہا۔

خادم نے ہکلاتے ہوئے کہا "کیا۔۔۔ کیا ہوا جی۔ کیا تھا اس میں؟"

کہیں بیٹی ابھی چار انگلیاں تو نہیں رہ گئی ہیں۔ مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ اندر کے درد کی اذیت سے میرے آنسو نکل آئے ہیں اور میری آنکھوں سے بہنے لگے ہیں۔

اچانک میری نظر ایک کاغذ پر گئی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ یہ وہی سلپ ہے جو ڈبے پر لگی ہوئی تھی لیکن میں نے اسے اٹھایا تو مجھے نازک ہاتھ کی تحریر نظر آئی۔ اس پر لکھا تھا۔

"مجھے پوری امید ہے کہ آپ لوگ حوصلہ نہیں ہاریں گے اگر آپ نے ڈر کے ان کی کوئی بھی شرط مانی تو میں خودکشی کرلوں گی۔ میں نے غالب کو اپنی قسم دی تھی اور آپ کو اپنی قسم دیتی ہوں۔ اندر زمانے والی نہیں ہے۔"

مجھے تحریر پڑھ کے بے اختیار رونا آیا۔ میری چشم تصور نے اندر سے اس ہاتھ کو دیکھا جس کے حسن و رعنائی کی مثال نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ کی انگلی اس سے جدا ہوگئی تھی مگر وہ ہاتھ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہوگیا تھا۔ کیا یہ سفاک منظر غالب نے بھی دیکھا ہوگا۔ اس کے دل پر تو قیامت گزری ہوگی مگر اندر بیٹھی مسکرا رہی ہوگی۔ میں اس بات پر کسی سے بھی شرط لگاسکتا تھا کہ اندر کے حلق سے آہ بھی نہیں نکلی ہوگی۔

ایک گاڑی طوفانی رفتار سے اندر آئی۔ ڈرائیور اتنی جلدی میں تھا کہ بریک لگاتے لگاتے اس نے کار کو رابعہ کی گاڑی سے ٹکرا دیا۔ ٹکر بہت معمولی تھی اور اس سے کسی کا نقصان بھی نہیں ہوا۔ "کہاں ہے میرا مطلب ہے وقار کی بیوی۔ سوری کیا ہے اس کا۔ میں ڈاکٹر رشید ہوں۔ اس کا کزن۔"

"تم جو بھی ہو اندر جاؤ۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"معاف کیجئے میں تھوڑا۔ وہ خدا خیر کرے۔" وہ بیگ اٹھا کے اندر چلا گیا۔

میں ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوا۔ وہ رابعہ کا معائنہ کررہا تھا اور وقار یوسف کی بیوی کی ڈانٹ ڈپٹ مسکراتے ہوئے سن رہا تھا۔ میں نے خادم کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔

"ڈاکٹر کو بتایا کہ کیا ہوا تھا؟"

"نہیں بتاؤں گا جی۔" اس نے سر ہلایا۔

"بے وقوف۔ کسی کو کچھ نہیں بتانا ہے ابھی۔" میں نے کہا "کسی کار کی گاڑی میں طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ کسی کو بھی اس ڈبے کے بارے میں معلوم نہیں ہونا چاہیے۔"

"کیا ڈبے کے بارے میں جی۔ مجھے تو خود کچھ پتا نہیں کہ وہ کیا تھا جی۔" "میں نے تو خبردار کیا تھا۔ بم سے زیادہ خطرناک نکلی نا۔"

میں نے دوسرے کمرے میں جاکے مظفر کا نمبر ملایا "اسی وقت وقار یوسف کے گھر پہنچ جاؤ سارے کام چھوڑ کے۔"

"وقار یوسف کے گھر۔ ان کی بیوی کو کچھ ہوا ہے؟"

"ان کی بیوی ٹھیک ہے۔ بہت بھیانک واردات ہوگئی۔

"گاڑی چلاؤ۔" میں نے دہاڑ کے کہا۔

میں نے رابعہ کو سیٹ پر سیدھا لٹا دیا۔ اس طرح کہ رابعہ کا سر میری گود میں آگیا اور اس کا جسم سیٹ پر رہا۔ اس کے پیر میں نے اوپر اٹھا کے سیٹ پر رکھ دیے تھے۔ رابعہ کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا اور اس کی نبض کی رفتار بھی مدھم تھی مگر خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ شدید ذہنی صدمے کا اثر تھا اور بے ہوشی کی کیفیت میں جسم کا یہ ردعمل ہی ہوسکتا تھا۔

وقار یوسف کی بیوی نے ڈاکٹر کو فون کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ رابعہ کو بیڈ پر آرام سے لٹا کے میں باہر گیا۔ کسی حد تک اندازہ تو میں نے کرلیا تھا مگر میں تصدیق چاہتا تھا۔ میں نے کار کی پچھلی سیٹ کے سامنے فرش پر پڑے ہوئے ڈبے کو اٹھایا اور دل کو مضبوط کرکے روئی کی تہ میں رکھی ہوئی اس چیز کو دیکھا۔

یہ ایک کٹی ہوئی انگلی تھی۔ دائیں یا بائیں ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی۔ اس کا رنگ خون نکل جانے سے سفید ہوگیا تھا مگر اس کی جلد کی رنگت اجلی تھی۔ یہ نازک زنانہ انگلی کس کی ہوسکتی تھی۔ میں اس کا اندازہ کرسکتا تھا۔

اچانک مجھے متلی سی محسوس ہوئی اور مجھے چکر آگیا۔ میں نے سخت کمزوری محسوس کی اور میں جہاں کھڑا ہوا تھا وہیں گر گیا۔

دوبارہ میری آنکھ وقار یوسف کے گھر میں کھلی۔ بے ہوشی کا یہ وقفہ مشکل سے دس منٹ کا ہوگا۔ خادم حسین نے مجھے اندر پہنچایا تھا اور وہی اب میرے جوتے اتار کے ہاتھوں سے میرے تلوے مل رہا تھا اور مجھ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ وہیں ساتھ والے بیڈ پر رابعہ بے سدھ پڑی تھی اور وقار یوسف کی بیوی ٹیلی فون پر چلا رہی تھی "کیا بات ہے کب آؤ گے تم آخر؟ میں نے کہا تھا ایمرجنسی ہے۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آئی یا نخرے بڑھ گئے ہیں تمہارے۔ میں اسپتال لے جاؤں ہاں۔ پانچ منٹ میں نہ آئے تم تو میں بھی کہوں گی۔"

میں اٹھ بیٹھا "تھینک یو خادم میں ٹھیک ہوں۔"

خادم حسین زیر لب کوئی وظیفہ پڑھتا رہا اور مجھ پر پھونکیں مارتا رہا "سب ٹھیک کہاں ہے جی۔"

میں نے کہا "بس مجھے چکر آگیا تھا۔"

وقار یوسف کی بیوی چلائی "اب کہاں جارہے ہیں آپ؟"

میں نے کہا "کہیں نہیں۔ مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں جس کیفیت سے دوچار تھا اسے نروس شاک کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اس کے عادی ہو جاتے ہیں مگر عام آدمی انسانی خون یا جسم کے کسی کٹے ہوئے حصے کو دیکھ کے نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوجاتا ہے۔ رابعہ پر صدمے کا اثر زیادہ شدید تھا۔ میں نے فریج میں سے بوتل نکال کے پانی پیا اور پھر باہر آکے اس ڈبے کو اٹھایا۔ کٹی ہوئی انگلی کو میں نے روئی میں دفن کردیا۔ اب مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے دائیں ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی درد کی شدت سے سن ہوگئی ہے۔ میں نے غور سے اپنے ہاتھ کو دیکھا

www.paksociety.com

ہے۔"

"کس کے ساتھ۔ رابعہ کے ساتھ؟"

"رابعہ بھی ٹھیک ہے تم وقت ضائع مت کرو۔"

"یار ایک کال موصول ہوئی تھی تمہارے لیے۔ میرا خیال ہے کہ دلاور کی بیوی بول رہی تھی اس نے کہا کہ رابطے کا جو طریقہ پہلے استعمال کیا جاتا تھا وہی استعمال کیا جائے۔ وہ بات کرنا چاہتی ہے۔" "کیا تم ساری باتیں فون پر ہی کرو گے۔" میں نے ریسیور روم سے نیچے رکھا اور لوٹ کر اس کمرے میں گیا جہاں ڈاکٹر نے رابعہ کا معائنہ ختم کر لیا تھا اور اب صرف اپنی کزن کی جھاڑ کھا رہا تھا۔

"یار رنگی۔ اب خدا کے لیے معاف کرو۔ میں کیا کرتا۔ تمہاری کال ملتے ہی جوتے پہنے بغیر دوڑ لگا آ۔ مریض کچھ نہ ڈاکٹر پاگل ہو گیا۔" پھر اس نے مجھے دیکھا تو مجھ سے مخاطب ہو گیا "خاتون ٹھیک ہیں انہیں سونے دیں۔ صبح اُٹھیں گی تو ٹھیک ہوں گی۔"

"ٹھیک نہ ہوئیں تو ٹھیک نہیں ہوگا ڈاکٹر صاحب۔"

"رنگی تم ذرا نہیں بدلی ہو۔" وہ باہر جاتے ہوئے بولا "ویسی ہی پٹاخہ ہو ابھی تک۔"

میں نے اسے باہر تک چھوڑا اور اس کے سوالات کے جواب گول کر گیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ رابعہ کی یہ حالت اچانک کیسے ہوئی تھی۔

میں نے کہا "وہ بیوی ہے میری۔ مجھے غصہ آ گیا تھا۔ میں نے اس کے جھانپڑ مار دیا تھا۔"

وہ اپنی کار میں بیٹھ گیا "نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ۔ جھوٹ کیوں بولتے ہو بلاوجہ۔"

اس کی کار ابھی باہر گئی ہی تھی کہ ایک اور گاڑی خاموشی سے اندر آئی مگر فاکس ویگن کی خاموشی خود اپنی آمد کا اعلان کرتی ہے۔ یہ وہی نیلی فاکس ویگن تھی اور اس میں دو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔

گاڑی میں سے دلاور کی بیوی کو اُترتا دیکھ کے ایک لمحے کے لیے تو میری عقل کا فیوز بھک سے اُڑ گیا اور میرا ذہن جذبات کی تاریکی میں ڈوب گیا۔

وہ بڑے غلط وقت پر آئی تھی۔ میرے دل میں دلاور سے انتقام کی خواہش کا الاؤ یوں بھڑک اُٹھا تھا جیسے کوئی پٹرول کے لاکھوں گیلن والے ٹینک میں جلتی ہوئی دیا سلائی پھینک دے اور ایک دھماکے سے شعلے آسمان تک بلند ہو جائیں۔ جب آتش فشاں پھٹتا ہے تو سیال آگ کی بے پناہ ہلاکت خیز قوت رکھنے والی سوج اپنی راہ میں آنے والی ہر چیز کو تہس نہس کرتی جاتی ہے۔ ویرانوں کے ساتھ آبادیاں راکھ ہو جاتی ہیں۔ خارزاروں کے ساتھ گلشن جل جاتے ہیں۔ سانپ بچھو اور زہریلے گرگٹ ہی نہیں خوش رنگ معصوم تتلیاں اور سُریلے نغمے الاپنے والے پرندے بھی آشیانوں میں خاکستر ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسا ہی وقت تھا جب دلاور سے نفرت کے جذبات کا لاوا پھٹ پڑا تھا اور ایسے میں اچانک دلاور کی بیوی میرے سامنے آ گئی تھی۔

دلاور نے ابھی ابھی میرے احساس پر سفاکی کی انتہا ہوئے اذیت کے خنجر سے ایسا وار کیا تھا کہ میرے دل سے لہو اُبل رہا تھا۔ اگرچہ نازو پر یہ انسانیت سوز ظلم کرنے والا خود نہیں تھا۔ وہ دلداری قید میں تھا اور اس مجرم سے زیادہ سب کسی نامعلوم اور دور افتادہ جیل خانے کی کال کوٹھری میں سے بند جا پڑا ہو۔ نازو کے ہاتھ کی ایک انگلی کاٹنے والا خود نہیں تھا مگر میں اس کے وجود کو نازو پر ہونے والے ظلم کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ ایسی وحشیانہ بربریت کا ارتکاب دلاور کی بیوی نے کیا تھا۔ یہ جلادی صرف استاد چیدو ہی کر سکتا تھا۔ شیطانی فعل کی تجویز یا تائید میں دلاور کی بیوی کا قرین بعید از امکان نہیں تھا۔

معلوم نہیں بے اختیاری کا وہ ایک لمحہ کیسے ... جب میں پاگل ہو کے دلاور کی بیوی کو دبوچ سکتا تھا اور نازو کے بدلے یرغمال بنا کے اپنے انتقامی جذبات کی تسکین ... بنا سکتا تھا۔ شیطان نے مجھے بھڑکایا تھا مگر خدا نے مجھے ... بروقت عقلِ سلیم سے کام لینے کی توفیق عطا کی۔

مجھے خیال آ گیا کہ اس وقت میں سکندر بخت نہیں ... ہوں جسے وہ سب معلوم نہیں جو غالب یا نازو پر بیت رہی ... میرا سکندر بخت کے ذاتی معاملات سے بھی کوئی تعلق نہیں ... میں ضبط سے کام نہ لیتا تو ظاہر کا یہ پردہ باقی نہ رہتا اور اس سے ... وقت دو نقصانات ہوتے۔ سکندر کی روپوشی کا ڈراما ختم ہو جاتا ... میں فریقِ وکیل کی حیثیت سے حاصل ہونے والی مراعات اور ... سے محروم ہو جاتا۔

میرے اشتعال کے فرو ہونے کی ایک وجہ وہ اجنبی ... تھا جو دلاور کی بیوی کے ساتھ گاڑی ڈرائیو کر کے لایا تھا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ڈرائیور بھی نہیں تھا کیونکہ ... سے اُترنے کے بعد وہ دلاور کی بیوی کے ساتھ ہی آگے آیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں خادم حسین کو بلاتا یا وہ تاریوسف کو ... کو مہمانوں کی آمد سے مطلع کرتا۔ دلاور کی بیوی نے مجھ سے ... قدم کے فاصلے پر آ کے کہا "بات کرو نا۔ گونگے کیوں ہو گئے ..."

اس کے ساتھ آنے والا چوبیس پچیس سال کا نوجوان ... لاابالی سا لڑکا چونکا اور مسکرانے لگا پھر اس نے مجھ سے فرینچ ... "مادام آپ سے کچھ بات کرنے کے لیے آئی ہیں۔"

میرا حیران ہونا فطری تھا "مجھ سے؟"

"ہاں۔ مادام کہتی ہیں کہ آپ اس وقت مصروف ہوں ... اور وقت رکھ لیں۔ اور مادام کہتی ہیں کہ وہ ..."

"مجھے تو مادام کچھ کہتی نظر نہیں آ تیں۔ وہ چپ کھڑی ... تم بول رہے ہو" میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑا "یہ سب تو مادام نے مجھ سے راستے میں کہا ... تھا۔"

"کہاں لے گئی؟" میں اس کے انداز بیان سے محظوظ ہوا۔

"پتا نہیں" "آخر کہاں لے جاتی ہیں اس قسم کی لڑکیاں ایسے اللہ کے الو کا پٹھہ والیں کو؟"

"تمہاری گرل فرینڈ تمہیں کہاں لے جاتی ہے؟" میں نے کہا۔

"گرل فرینڈ" وہ بسورنے لگا "جناب یہ فرانس نہیں ہے۔ پاکستان ہے یہاں زیادہ سے زیادہ منگیتر ہوتی ہے مگر وہ بھی ممنوعہ ہوتی ہے ... کوئی چوڑیاں پہنانے والا اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے ... ہمارا جسم ٹول کے دیکھ سکتا ہے۔ وہ گلی میں سبزی بیچنے والے ... بے حجاب بات کر سکتی ہے مگر جہاں نظر آیا کہ گلی میں وہ جو اس کا منگیتر ہے اور مستقبل کا ہونے والا مجازی خدا ہے تو ایک دم غائب۔ سات پردوں میں سے اس کی جھلک نہیں دیکھی جا سکتی جناب۔"

میں نے ہنسی کو ضبط کیا "تمہاری باتیں میرے لیے ناقابلِ فہم ہیں۔"

اس نے ایک آہ بھری "مادام کی تھیوری یہ ہے کہ جب ڈاکٹر شبلی درمیان میں آ گئی تھی تو محبت میں رقابت کا عنصر شامل ہوا۔ اس نے سکندر بخت کو اپنی طرف کھینچا اور محبوبہ نسرین چھینی۔ وکیل رابعہ جو سمجھتی تھی کہ سکندر تو اس کے مقدر میں لکھا جا چکا اور اس کے جملہ حقوق اسی کے نام محفوظ ہیں۔ کاپی رائٹ ایکٹ کی اس خلاف ورزی پر تخت چراغ پا ہوئی اور اس نے جوشِ رقابت میں ڈاکٹر شبلی کا پتا صاف کر دیا یا کروا دیا۔"

"یہ غلط ہے" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کیوں؟ آپ جانتے ہی نہیں سکندر بخت کو تو پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"تم دراصل میں ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس کے حقائق و شواہد دیکھ چکا ہوں۔ اس کے قتل کی وجہ کچھ اور تھی اور اسے قتل کرانے والے لوگ بھی دوسرے تھے۔ سکندر بخت کا چکر مجھے نہیں معلوم مگر رابعہ کا نام یقیناً اس کیس کی ایف آئی آر میں نہیں ہے۔ وہ تو مدعی ہے اس کیس میں۔"

"کیا تو ہوتا ہے یہاں جناب۔ جو قتل کرتا ہے وہی مدعی بن جاتا ہے اگر با اختیار ہو مگر اسے آپ میرے ذاتی جذبات سمجھ لیں۔ مادام ایک عورت ہونے کے ناتے جس قسم کے خیالات کا اظہار فرماتی ہیں وہ ایک منطقی بات ہے۔ کیونکہ ایسا تو دنیا میں ہر جگہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔"

اب دلاور کی بیوی کے لیے چپ رہنا مشکل ہو گیا "تم آئی دیر سے کیا لاپ رہے ہو فرنچ میں۔ مجھے بھی تو پتا چلے۔"

"کچھ زیادہ چیچی اور کمبن چکر کی وضاحت کر رہا تھا" لڑکے نے اللہ کی بات سے کہا "وکیل صاحب کی ناقص عقل میں یہ بھی نہیں آتا کہ لڑائی کے گلے کا ہار کیسے ہو سکتی ہے۔ اب آپ ذرا سلیس اور سادہ زبان میں بات کریں تو مہربانی۔ ویسے یہ صاف منکر ہیں کہ کسی سکندر

دلاور کی بیوی کی تیوری چڑھ گئی "دانت کیوں نکال رہے ہو؟"

لڑکا مسکرا رہا تھا "دانت نکالنا میرا پیشہ ہے۔ بی ڈی ایس آخر کس لیے کیا ہے میں نے؟"

میں انجان بنا کھڑا رہا "مادام کون ہیں اور تم کون ہو۔ کسی تعارف کے بغیر میں کیا سمجھوں کہ وہ مسئلہ کیا ہے جس پر گفتگو ضروری ہے؟"

وہ لڑکا اپنے بارے میں یہ انکشاف کر چکا تھا کہ وہ دندان سازی میں ڈگری لے چکا ہے۔ اس کا ارادہ ڈینٹسٹ کا پیشہ اختیار کرنے کا ہوگا اگر اس کا کلینک ہوتا تو وہ اس وقت مسز دلاور کے ساتھ بطور مترجم اور ڈرائیور نہ آتا۔ شام کے وقت سب ڈاکٹر مصروف ہوتے ہیں خواہ دن میں وہ کسی سرکاری اسپتال میں ہوں لیکن شام کو پرائیویٹ پریکٹس ضرور کرتے ہیں۔ ڈینٹسٹ کو فی الحال ہمارے ملک میں اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی ملنی چاہیے یا عام ڈاکٹر کو حاصل ہوتی ہے۔ شاید یہ لڑکا ابھی سیٹ ہو رہا تھا اور موقعے کی یا وسائل کی تلاش میں تھا۔

"مادام کہتی ہیں کہ وہ آپ سے سکندر بخت کے بارے میں بات کریں گی" اس نے مسز دلاور سے مشورہ کر کے کہا۔

میں نے کہا "سکندر بخت! لیکن میرا اس کے معاملات سے کیا تعلق۔ میں اسے نہیں جانتا۔ میں نے اس کا نام ضرور سنا ہے لیکن اسے ابھی تک دیکھا نہیں ہے۔"

میری بات سننے کے بعد دلاور کی بیوی بولی "جھوٹ ہے سراسر۔ سب جانتا ہے یہ۔ دن رات اس کی چھتی رابعہ کے ساتھ اس کی گاڑی میں گھومتا ہے۔ ہر جگہ اس کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ حرافہ بتا سکتی ہے۔"

لڑکا سر کھجانے لگا۔ "کیا یہ سب اس سے کہوں؟ چھتی کا ترجمہ مشکل ہے۔ محبوبہ کہہ سکتا ہوں۔ اور حرافہ......"

"اس سے پوچھو کہ جب یہ ڈاکٹر شبلی کے قتل کی تفتیش کے لیے آیا ہے تو کیا اسے نہیں معلوم کہ وہ بھی سکندر بخت کے گلے کا ہار ہوئی تھی۔ بالکل بھول گیا تھا وہ رابعہ کو اور اس بے حیا کی دلالی اداؤں نے گھن چکر بنا دیا تھا سکندر کو۔ طوطا چشم۔"

"طوطا چشم۔ گھن چکر؟ اتنے مشکل الفاظ مت بولیں۔ میری فرنچ ایسی ہی ہے جیسی یہاں کے بی اے پاس کی انگلش ہوتی ہے اور جو دل باغ باغ ہو گیا کا ترجمہ ہارٹ گارڈن گارڈن بی کیم کرتا ہے۔"

میں ڈاکٹر شبلی کے حوالے پر چونکا تھا "ڈاکٹر شبلی کا کیا حوالہ تھا؟"

اس نے کہا "مادام کے خیال میں وہ محبت اور رقابت کی ازلی تکون کا وہ ضلع تھی جس کے بغیر کوئی فلمی کہانی آگے نہیں بڑھتی۔ سکندر بخت چاہتا تھا رابعہ کو اور جواب میں وہ بھی چاہتی ہوگی۔ وہ ریل کی متوازی پٹڑیوں کی طرح زندگی کے سفر میں آگے بڑھ رہے تھے کہ ڈاکٹر شبلی بیچ میں کودی اور سکندر بخت کو چھین کر لے گئی۔"

www.paksociety.com

www.paksociety.com

بجنت کو نہیں جانتے۔"
"چلو تم اس سے وقت لو۔ یہاں کھڑے کھڑے تو ساری بات نہیں ہو سکتی۔ یہ اتنا بد لحاظ ہے کہ اندر بیٹھنے کو بھی نہیں کہتا۔ میں خود یہاں کب بیٹھنا چاہتی ہوں۔"
لڑکے نے ترنت کہا "مادام آپ سے اکیلے میں کہیں ملنا چاہتی ہیں۔"
میں نے حیرانی سے کہا "آخر کیوں؟"
"جب اکیلے میں ملاقات ہو تو یہ خود پوچھ لیں مگر اکیلے میں آپ کیسے مل سکتے ہیں۔ کوئی حرجم درمیان میں ضرور ہوگا۔ تنہائی میں ہی آپ دونوں کے جذبات کی ترجمانی کروں گا۔"
"یہ کیا بکواس ہے۔ مجھے کوئی شوق نہیں اس بڑھیا سے تنہائی میں ملنے کا جو مجھے قطبی ریچھ کی طرح بے ہنگم اور خطرناک لگتی ہے۔ ایسی عورت کے بارے میں کیا جذبات ہو سکتے ہیں میرے جیسے حسین اور جوان مرد کے۔"
حرجم پریشان ہو گیا لیکن اس نے ترجمہ یوں کیا "وکیل صاحب فرماتے ہیں کہ وہ بے حد مصروف ہیں۔"
دلاور کی بیوی نے غصے میں اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔ میں تھوڑا سا نروس ہوا پھر مجھے خیال آیا کہ یہاں وہ ریوالور نکال کے مجھے گولی نہیں مار سکتی۔ اس نے بیگ میں سے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کے حرجم کو تھمادی "یہ وکیل اور ڈاکٹر ایسے ہی کہتے ہیں۔ انہیں جب تک فیس نہ ملے یہ بات نہیں کرتے۔ پتا نہیں بیوی کے ساتھ کیا کرتے ہوں گے؟"
حرجم نے کہا "بیوی کے ساتھ تو سب شوہر وہی کرتے ہیں۔"
"بکواس مت۔ اسے کہو کہ یہ فیس ہے اس کے وقت کی۔"
حرجم مجھ سے مخاطب ہوا "یہ فیس مشورہ ہے۔"
میں نے کہا "مگر میں یہاں پریکٹس نہیں کرتا۔ خاتون سے کہو کسی پاکستانی وکیل سے بات کر لیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جن سے میرا واسطہ ہے سب اچھے وکیل ہیں۔ مس رابعہ، مسٹر منظر۔"
"یہ دس ہزار کیوں ٹھکراتے ہیں وکیل صاحب۔ مفت میں مل رہی ہے اتنی رقم تو ملاقات کرنے میں کیا حرج ہے۔ ان کے لیے تو دس ہزار کچھ بھی نہیں۔ آپ ایک لاکھ مانگ سکتے ہیں اور یقین کریں میں سودا کرا دوں گا ایک لاکھ میں۔ آپ صرف ایک گھنٹا دے دیں۔ پچیس ہزار میرے۔ باقی آپ کے۔ یقین کریں میں سخت ضرورت مند ہوں۔ ٹکٹ بنوانے کے لیے مجھے پیسہ چاہیے۔ خالی پی ایچ ڈی کی ڈگری سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس عورت کے پاس بہت دولت ہے۔ اس کے شوہر کا مال حرام۔"
میں نے اسے ٹوکا "کون ہے اس کا شوہر؟"
"آپ نہیں جانتے" یہ مسز دلاور ہے۔ چوہدری دلاور کی بیوی جسے خطرہ ہے کہ یہ چوہدری دلاور کی بیوہ نہ ہو جائے۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو بڑی خوشی سے ہوتا۔ اتنا عرصہ استعمال کر لیا۔ پرانے شوہر اور پرانے کمبل سے جان چھڑا لینی چاہیے۔ دلاور … آنے لگتی ہے۔"
"شٹ اپ۔ تم میاں بیوی کے مقدس رشتے کو … اس کے بارے میں رائے کیوں دیتے ہو۔"
"مقدس رشتہ!" اس نے حقارت سے اور … کو
"یہ کون چوہدری دلاور ہے۔ وہی تو نہیں جس کا نام … کے قتل کی ایف آئی آر میں ہے؟"
"یہ سو فیصد وہی ہے جناب!"
میں نے برہمی سے کہا "ایسی صورت میں یہ … جا سکتے ہیں۔ مجھے رشوت دی جا رہی ہے اور تم … کہ میں ایک لاکھ لوں؟ آخر کس لیے۔ یہ اس … دستبرداری کا معاوضہ ہے۔ کیا میں اتنا بے …"
میں نے بات کو ایک خاص مقصد کے تحت طول … صرف وقار یوسف کی بیوی تھی جو میری کوئی مدد نہیں … رابعہ بے ہوش پڑی تھی اور ہوش کی طرف آتی تو … مسافت طے کر کے صبح سے پہلے ہرگز بے دار نہ ہوتی۔ … خود کو بہت تنہا محسوس کر رہا تھا۔ محسن اور مجتبیٰ کے جانے … غالب اور نازو نے رفاقت کا حق ادا کرنے میں کوئی کمی … تھی۔ اس کے باوجود کبھی کبھی احساس ہوتا تھا کہ ہماری … جیسی نہیں رہی۔ اب غالب اور نازو کے نہ ہونے سے … احساس شدید تر ہو گیا تھا۔ وقار یوسف یا منظر … جنگ میں مددگار تھے۔ ایم آر ایس کے ساتھ وہ … بشانہ نہیں لڑتے تھے۔ میں اکیلا اس لیے مقابلہ کر رہا تھا … پکڑا جا چکا تھا اور ہماری قید میں تھا۔ اس سے خاتمہ … نہیں تھا۔ دشمنوں کے حوصلے اس لیے پست تھے کہ ان … سپہ سالار نہیں رہا تھا۔ اس کا نائب اختیار … کہ دلاور کے ساتھ ہی خود سکندر بخت بھی غائب ہو گیا … پوری کرنے کے لیے اس نے غالب اور نازو کو اغوا … دی تھی کہ فوزیہ کے گھر کو تباہ کر دیا جائے گا۔ محسن اور … جاتا تو شاید انہیں بھی نہ چھوڑا جاتا۔ آخری حربے کے … رابعہ کو اغوا کرا سکتے تھے مگر ایک تو رابعہ کی حیثیت بہت … اور اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ ہوتا۔ دوسرے دشمنوں … رابعہ ہی سکندر تک رسائی کا واحد ذریعہ تھی۔ دلاور کی … لیے رابعہ ہی کو وسیلہ بنایا جا سکتا تھا۔ دباؤ بڑھانے کے … ہاتھ کی ایک انگلی کاٹ کر بھیجنا انتہائی بزدلانہ اور ذلیل … مگر دشمن بہرحال دشمن ہوتا ہے۔ اس سے شرافت کی … حماقت ہے۔ اب دلاور کی بیوی انتہائی مجبور ہو کے میرے … تھی۔ اس امید میں کہ یہ فرنچ وکیل سکندر سے بات کر کے … کو سلجھانے میں مدد کر سکتا ہے۔ اسے صرف اپنے شوہر … مطلوب تھی۔ میرے انکار نے اسے مایوس کیا۔

… رہے ہوتے کسی ہوٹل میں۔"
"بیٹا تم یہاں برتن … نہیں دھوتا۔ تم تو آج بھی اس گھر میں یہی کام کرتے … شراب … بھی بدتر کام۔"
… دلاور کی بیوی چلانے لگی "یہ کیا ہو رہا ہے آخر۔ کیا میں … اپنے ساتھ لائی تھی۔ میری بات کرتے کرتے تم …"
"مادام … لڑائی میں بلا معاوضہ کر رہا ہوں۔ اپنی مرضی سے۔ … ادا کرنے کے لیے" وہ بولا۔
… مظہر اور وقار یوسف کا منتظر تھا۔ میں نے انہیں آدھا گھنٹا … دیا تھا اور اتنی دیر میں ان کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میری … اور دل اندر رابعہ میں اٹکا ہوا تھا۔
… دلاور کی بیوی نے پلٹ کے کہا "اچھا چلو واپس۔ جانے سے … کہ ایک لاکھ بہت ہوتے ہیں۔ سوچ لے پھر۔"
خادم حسین … "یہ ایک لاکھ میں کیا خریدنے آئی تھی جناب؟"
میں نے کہا "اس سے پوچھو کہ وکیل صاحب تم سے بات کرنا … تو کیسے رابطہ ہو سکتا ہے۔ کوئی فون نمبر ہے؟"
… حرجم نے جواب دیا "مادام کہتی ہیں کہ وہ خود فون کر لیں گی۔"
"مگر میں ہر جگہ ہر وقت دستیاب نہیں ہوتا" میں نے کہا "اور … بات کسی آفس کے فون پر نہیں ہو سکتی۔ شاید میں باہر … سے فون کروں۔"
دلاور کی بیوی نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بیگ میں سے ایک کارڈ نکالا "یہ وکیل صاحب کو دے دو۔ رات کے آٹھ بجے سے … کے آٹھ بجے تک میں اس فون پر بات کر سکتی ہوں۔"
میں نے کارڈ پر ایک نظر ڈالی۔ یہ کسی کمپنی کا بزنس کارڈ تھا مگر اس کا نام "سی ڈی انٹرپرائز" تھا۔ سی ڈی اور اس کے حروف بہت … ابھرے ہوئے اور سرخ رنگ میں نمایاں تھے۔ باقی عبارت … ٹائپ رائٹر سائز کے حروف کا رنگ سیاہ تھا۔ کسی دشواری … میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ سی ڈی کا مطلب چوہدری دلاور کے … نہیں ہو سکتا مگر میرا یہ ظاہر کرنا ضروری تھا کہ میرے لیے … اس وقت تک کوئی مفہوم نہیں رکھتی جب تک … مجھے اس کا مطلب فرنچ میں نہ سمجھاوے۔ کمپنی کا پتا … اور پیچھے ہی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔
… کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں دلاور کی بیوی کو وہاں کیسے … اس کے ساتھ میرے جارحانہ رویے کا کوئی جواز نہیں بنتا … رنگ لے کر وہاں آئی تھی اور اب جلد از جلد بھاگ … خادم حسین سے کوئی توقع رکھنا عبث تھا۔ میں اسے … سمجھانے سے قاصر تھا۔ دلاور کی بیوی کے ساتھ … سمجھنے والا موجود تھا ورنہ میں خادم حسین سے کہتا کہ … کا ترجمہ کرے اور جتنی دیر میں ترجمہ کیا جاتا میں

"کیا بکتا ہے یہ گورا وکیل؟ کس بات پر برہم ہے؟"
حرجم نے تو بھری "کہتا ہے کہ ساری دنیا کے خزانے بھی اس کا ضمیر نہیں خرید سکتے۔ ہاں آپ دس سال کم کی ہوتیں تو بس ایک مسکراہٹ کافی تھی۔"
وہ مسکرائی "اچھا اس سے کہو کہ میں ایک لاکھ بھی دے سکتی ہوں۔ اگر یہ مجھے سکندر سے ملوا دے یا اس سے بات کرا دے۔ سکندر کو مکمل تحفظ کی ضمانت حاصل ہوگی۔ میں خود ملاقات کے لیے آ جاؤں گی۔ جہاں بھی یہ چاہے۔"
اندر سے مولوی خادم حسین برآمد ہوا۔ اس نے ہماری وہ باتیں کرنے کی آواز سن لی تھی اور غالباً فرنچ سن کے حیران ہوا تھا۔ دلاور کی بیوی کے ساتھ اس نوجوان حرجم کو دیکھ کے وہ چونکا۔
"کیوں جی یہ خطرناک عورت یہاں بھی آ گئی؟ آپ دور ہٹ کے بات کریں جی۔ اس کا بھروسا کوئی نہیں۔ مجھے اس کے تیور کچھ اچھے نہیں لگتے۔ کہیں آپ پر کچھ پڑھ کے نہ پھونک دے۔ کالے علم کے منتر..." وہ فوراً بیچ میں ہی بولا۔
میں نے کہا "خادم حسین۔ فضول باتیں مت کیا کرو۔"
"باتیں تو میں کم ہی کرتا ہوں جناب لیکن یہ فضول بات نہیں ہے۔ خود مجھ پر کالا جادو کرا دیا تھا میری چچی نے۔ وہ اپنی بیٹی کو میرے سر منڈھنا چاہتی تھیں۔ میں گدھا ہو گیا تھا جی۔ گھاس کھانے لگا تھا۔ دولتیاں چلاتا تھا اور گدھے جیسی آوازیں نکالتا تھا۔"
اب مسز دلاور کے حرجم سے برداشت نہ ہوا "تم اب بھی ویسی ہی آوازیں نکال رہے ہو۔"
خادم حسین کو جیسے کرنٹ لگ گیا "کیا؟ تم نے مجھے گدھا کہا؟"
"نہیں۔ انسان اپنی باتوں سے بھی خود کو گدھا ثابت کر دیتا ہے۔ تمہاری بات بالکل ناقابل یقین اور بے سروپا ہے بلکہ احمقانہ اور جھوٹ ہے۔"
خادم حسین جیسے آگ بگولا ہو گیا۔ "جو مجھے جھوٹا کہے میں اس کے دانت توڑ کے ہتھیلی پر رکھ دیتا ہوں۔"
"پھر تو ہمارے درمیان کاروباری اشتراک ہو سکتا ہے کیونکہ میں ہوں ڈینٹسٹ۔ ایک دن میں تم جتنے کیس بھیجو گے ہتھیلی پر دانت لانے والے، سب میں تمہارا کمیشن... ففٹی پرسنٹ۔"
"تمہارا دماغ خراب ہے مسخرے دندان ساز۔"
"خراب ہے تو ٹھیک ہو جائے گا مگر تم اپنی شکل کا کیا کرو گے، پہاڑی بکرے۔"
خادم حسین اچھلا "سر۔ آپ اسے روک لیں ورنہ مجھے غصہ آ گیا تو پہلا خون اسی کا ہوگا میرے ہاتھوں۔ آخر کون ہے یہ؟ اس کی فرنچ کتنی غلط ہے۔ بہت گھٹیا اور بازاری۔ جیسا یہ خود ہے۔"
"تمہاری گرامر غلط ہے۔ شاید فحش کتابوں سے سیکھی ہوگی۔ میں تو فرانس میں رہا ہوں۔" مسز دلاور کا حرجم بولا۔

www.paksociety.com

اندر جا کے حلیہ بدل کے پچھلی طرف سے نکل جاتا اور پھر جیسے ہی گاڑی باہر آتی میں مترجم دندان ساز کو ناک آؤٹ کر کے دلاور کی بیوی کو بھی دلاور کے پاس پہنچا دیتا۔ موجودہ فریج وکیل کے حلیے میں میرے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔

مولوی خادم حسین میں یہ صلاحیت بھی نہیں تھی کہ وہ دلاور کی بیوی کو باتوں میں الجھا کے مجھے نکلنے کا موقع فراہم کر دے۔ زیادہ سے زیادہ وہ اپنے حریف مترجم سے لڑ سکتا تھا مگر دلاور کی بیوی اس کی باتوں میں وقت ضائع کرنے والی نہیں تھی۔

یہ گھر وقار یوسف کا نہ ہوتا تو میں کسی بات کی پروا نہ کرتا اور دلاور کی بیوی کو احمقانہ جرأت کا یہ مظاہرہ مہنگا پڑتا۔ نہ جانے کیسے وہ یہاں تک پہنچی تھی۔ اگر خود اس نے ہمارا تعاقب نہیں کیا تھا تو پھر اس کے جاسوس ہماری نقل و حرکت کی نگرانی پر مامور تھے اور انہوں نے بھی اطلاع دی ہوگی کہ اس وقت فریج وکیل سے رابطہ کرنے میں کوئی خطرے کی بات نہیں۔ اس کے ساتھ رابعہ ہے اور وہ مولوی۔

دلاور کی بیوی کے پُراعتماد بے خوف انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے تازہ ترین واردات کا علم نہیں ہے ورنہ وہ میرے سامنے آتے ہوئے گھبراتی کہ نہ جانے میرا جوابی ردعمل کس قسم کا ہوگا۔ وہ عورت میرے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ کبھی تو وہ بہت مظلوم بن جاتی تھی۔ کبھی انتہائی عیار اور چالاک نظر آتی تھی۔ کبھی یوں لگتا تھا جیسے دلاور کی عدم موجودگی میں وہ اس کی جگہ دشمنی کے رشتے کو پوری دلاوری اور "دلاورات" روایات کے ساتھ نبھائے گی۔ دوسرے لمحے وہ عام سی کمزور اور جذباتی عورت رہ جاتی تھی جو سوچے سمجھے بغیر نادان بیٹے کی نادانی میں شریک ہو جاتی تھی اور اپنے شوہر کی خیروعافیت سے واپسی کے لیے جان و مال کے تمام خطرات قبول کرنے پر تیار تھی۔ شاید وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر رہی تھی۔ دلاور کے ہوتے اسے نہ کسی کا ڈر تھا اور نہ کوئی فکر تھی مگر اب دلاور کی سلامتی سے اس کے مستقبل کا تحفظ وابستہ تھا اور اس کی اولاد کی خوشیاں۔ وہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ کس کی مانے اور کس کی نہ مانے۔ اپنے جذبات کی یا عقل کی۔ سرکش اور جوان اولاد کی یا دلاور کے نام نہاد دوستوں کی اور زرخرید جاں نثاروں کی۔ وہ کہاں جائے کیا کرے؟

میں نے دلاور کی بیوی کو گاڑی میں بیٹھ کے جاتے دیکھا۔ نوجوان جس نے مترجم کے فرائض سرانجام دیے تھے۔ ڈرائیور بن گیا تھا اور گاڑی کو ریورس گیئر میں ایسے لے جا رہا تھا جیسے پیچھے کھلا میدان ہو۔ اس نے "بائی بائی" کہنے کے انداز میں ہاتھ بھی ہلایا تھا مگر درحقیقت اس نے خادم حسین کو انتہائی فحش اشارہ کیا تھا۔

خادم حسین نے سخت دُکھی لہجے میں کہا "دیکھا جی آپ نے۔ ہمت تھی تو سامنے کچھ کرتا۔ خبیث الزماں ناخلف نامحقق۔"

میں نے کہا "خادم۔ یہ گاڑی تو وہی تھی مگر نمبر بدلا ہوا تھا۔"

میری بے اعتنائی نے خادم کو مزید دُکھی کر دیا۔ "ای بدلا ہوا تھا

تو میں کیا کروں۔ ایسے لوگ گاڑی کا نمبر کیا باپ کا نمبر [illegible] ہیں۔"

اسی وقت ایک دھماکا ہوا اور خادم گیٹ کی طرف [illegible] "اندر گھسے مودودی اولاد۔ مار دی گیٹ کو ٹکر۔"

فاکس ویگن کا باہر نکلا ہوا مڈگارڈ عموماً [illegible] ڈرائیور کے لیے مسئلہ بن جاتا ہے جو اس کی باڈی [illegible] نہیں کرواتے۔ گاڑی کا پیچھے والا مڈگارڈ بہت نزدیک تھا۔ رگڑ سے گیٹ کے ستون کا ایک کونا بھی گر گیا تو [illegible] والا مڈگارڈ لگا تو پلر میں دراڑ پڑ گئی اور وہ گیٹ کے ساتھ [illegible] گیا۔

میں گیٹ کی طرف بڑھا اور رُک گیا۔ شاید [illegible] نوجوان ڈرائیور کی پُرجوش عجلت سے آسان ہو گیا تھا [illegible] گئی تھی اور یہ بات اب یقینی تھی کہ مولوی خادم [illegible] کارروائی کے ملزم کو نقصان کی تلافی کیے بغیر نہ جانے [illegible] گا۔ ایک گیٹ لائٹ بھی بجھ گئی تھی اور وہ نوجوان ڈرائیور باہر نکل کے اپنی کارکردگی کا جائزہ لے رہا تھا۔

خادم حسین کے علاوہ میں نے دلاور کی بیوی کو [illegible] وہ جائے واردات سے فرار ہونا چاہتی تھی "بے وقوف چلو یہاں سے۔ گاڑی کا تو بیڑا غرق ہو گیا۔"

خادم چلا رہا تھا "اسی جہنم میں گئی گاڑی۔ یہ بتاؤ [illegible] بنائے گا۔"

"ہاں۔ میرا باپ یہی کام کرتا ہے۔ شور مچانے [illegible] نہیں مولوی۔"

دلاور کی بیوی نے گھبراہٹ میں پھر کہا "چھوڑو [illegible] کرو۔ اس سے پوچھو کتنا نقصان ہوا ہے۔ جان چھڑاؤ [illegible] میں بجے گا کتنا بیڑہ؟"

"ہزار دو ہزار تو خرچ ہوں گے..."

دلاور کی بیوی نے کچھ نوٹ اپنے ساتھ آئے [illegible] تھمائے "چلو دے دو اسے۔"

معلوم نہیں خادم حسین میں ایسی کیا بات تھی کہ [illegible] سے بھی بنتی نہیں تھی اور لوگ اس سے چھیڑ خانی [illegible] تھے۔

دلاور کی بیوی کے مترجم نے نوٹ آگے بڑھا کے [illegible] دیا "پہلے رسید لکھو۔"

خادم نے چڑ کے کہا "ابھی آ جاتے ہیں منظر [illegible] تمہیں پکی رسید دیں گے بیٹے۔"

"اچھا چھوڑو۔ یہ لو پورے دو ہزار" اس نے [illegible] تھمائے "اب چاہو تو دونوں پلر نئے بنوا لینا [illegible] چار سو بچ جائیں گے اور ہاں یہ پرانے پلر سنبھال [illegible] ان کی قیمت مل چکی ہے۔ کسی دن میں لے جاؤں گا۔"

"ہاں لے جانا۔ اپنے ابا کو بھی ساتھ لے آنا۔"

[illegible] تھا کہ مجھے کسی نے ٹائم بم پر بٹھا دیا ہے اور بم پھٹنے والا ہے۔"

"منظر۔ صورت حال اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔"

"بابا صورت حال کو بھی سنگین بنانا تو تمہارا شوق ہے بیٹے۔"

میں نے کہا "ابھی ابھی دلاور کی بیوی یہاں سے گئی ہے۔"

"[illegible] خاطر مدارات کی اس کی؟ مجھے تو لگتا ہے وہ فریفتہ ہو گئی [illegible]"

"[illegible] بکواس بند کریں آپ تو میں کچھ فرماؤں" میں نے کہا "وہ [illegible] وکیل سے تنہائی میں ملنا چاہتی تھی۔"

منظر نے میرے شانے پر ہاتھ مارا "دیکھا۔ ٹھیک کہا تھا میں نے [illegible] وہ تنہائی میں تم پر دست درازی کرے گی۔"

"منظر، نازو کی جان خطرے میں ہے۔ تمہیں مذاق سوجھ رہا [illegible] معلوم ہے نا ہم گئے تھے ڈاکٹر علی حیدر کے گھر۔ وہاں [illegible] کسی نے ایک تحفہ بھیجا تھا۔ چھوٹا سا پیکٹ تھا جو ڈاکٹر [illegible] کے حوالے کر دیا۔ معلوم ہے کیا تھا اس میں؟"

منظر نے دانتوں کی نمائش کی "برتھ کنٹرول کی دوائیں۔ کسی [illegible] میں شرمندہ کیا ہوگا تجھے کہ شادی نہیں کرتے تو برتھ کنٹرول ہی کرو۔"

میں نے کہا "اس میں ایک انگلی تھی۔ نازو کے ہاتھ کی انگلی۔"

منظر پلک جھپکائے بغیر مجھے یوں دیکھتا رہا جیسے اچانک میں نے ایک جل فریج کا بول دیا ہے۔ اندر خادم حسین، وقار اور اس کی [illegible] آواز میں بات کر رہے تھے۔ پھر وقار بدحواسی میں آیا اور [illegible] ساتھ بیٹھ گیا۔

میں نے باہر گیٹ کا پلر ٹوٹا ہوا دیکھا تھا لیکن یہ خادم حسین کیا کہہ رہا ہے "دلاور کی بیوی نے گاڑی کی ٹکر ..."

میں نے کہا "تم دونوں میرے ساتھ باہر چلو۔ میں کچھ دکھانا چاہتا ہوں تمہیں۔"

منظر نے شاید میری صورت سے اندازہ کر لیا کہ معاملہ واقعی [illegible] ہے۔ وہ میرے ساتھ باہر نکل آئے۔ میں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا گتے کا باکس اٹھا کے منظر کو تھما دیا۔ منظر اور وقار [illegible] نے ڈبے کو روشنی کے رخ کھولا۔

وقار کا ردعمل زیادہ شدید تھا۔ وہ دہشت زدہ ہو کے ایک قدم پیچھے ہٹا۔ منظر نے ایک دم سر گھما کے مجھے دیکھا۔ اس کے ماتھے پر [illegible] کی شکن آ گئی تھی اور اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔

"یہ [illegible] نہیں ہو سکتا۔" منظر نے گھٹے لہجے میں کہا۔

"خدا کرے ایسا نہ ہو مگر کمینے دشمن سے کچھ بھی بعید نہیں۔"

وقار نے بے جان لہجے میں کہا "لیکن... یہ رابعہ باجی نے بھی دیکھی تھی؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "مجھ سے غلطی ہو گئی تھی لیکن مجھے کیا معلوم ہو سکتا تھا کہ اس میں کیا ہوگا؟"

منظر نے ڈبے کو گاڑی کے فرنٹ کمپارٹمنٹ میں رکھ دیا اور [illegible] کے گاڑی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں خلا [illegible]

سر پر بھی رکھوا دوں گا۔" خادم بولا۔

شور سن کے وقار یوسف کی بیوی باہر آ گئی "سکندر بھائی..."

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھی "شش... کیوں جھگڑا چھوڑ دی ہے۔"

اس نے آہستہ سے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے۔ کون ہے یہ عورت؟"

میں نے اندر جاتے ہوئے کہا "یہاں فریج میں بتاؤں گا تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ رابعہ ٹھیک ہے؟"

"ہاں مگر اٹھے گی اب صبح۔ آخر ہوا کیا تھا اسے؟"

"کچھ نہیں۔ بس نروس بریک ڈاؤن ہے۔"

میں چاہتا تھا کہ میک اپ اتار کے وقار کے کپڑے پہنوں اور باہر جا کے گاڑی سے دلاور کی بیوی کو اتار لوں مگر عین وقت بہت سی مشکلات نے میرے ارادوں کو ناکام کر دیا۔ میں میک اپ اتارنے میں ناکام رہا۔ اس کے لیے جو سامان درکار تھا وہ رابعہ کے آفس میں رکھا ہوا تھا پھر وہ گاڑی روانہ ہو گئی جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ چلنے کے قابل نہیں رہی۔ اس نوجوان نے ہیرو کی طرح دونوں ہاتھوں کا زور لگا کے مڈگارڈ باہر کھینچ لیا تھا جو اس حد تک اندر گھس گیا تھا کہ ٹائروں سے رگڑ کھا رہا تھا۔ میں نے کھڑکی سے گاڑی کو جاتے دیکھا اور خاصا مایوس ہوا پھر میں نے سوچا کہ اگر اس وقت میں ساتھ آنے والے کو ناک آؤٹ کر کے دلاور کی بیوی کو مجبور کر دیتا کہ میرے ساتھ چلے تو میں اسے کیسے لے جاتا؟ ظاہر ہے وہ شور مچاتی اور مجھے اس کو بھی خاموش کرنا پڑتا۔

اس کی ٹوٹی پھوٹی گاڑی کو چلا کے لے جانا بھی آسان نہ تھا۔ اگر میں مجبوری میں ایسا کرتا تو بہت بڑا خطرہ مول لیتا۔ شاید باہر کچھ اور لوگ بھی ہوں گے جو دلاور کی بیوی کے ساتھ بطور محافظ آئے ہوں گے مگر باہر ہی رک گئے ہوں۔ وہ فرشتہ اجل کی طرح میرا تعاقب کرتے اور مجھے آدھے راستے میں روک کے اپنے ساتھ لے جاتے۔ اگر باہر کوئی نہیں تھا تب بھی اس گاڑی میں وہاں جانا خطرناک تھا جہاں اپنے چوہدری دلاور صاحب کا تشدد قید خانہ تھا۔ مجھے گاڑی سڑک پر روکنی پڑتی۔ بہت سے لوگ اس کی حالت پر غور کرتے اور اسے یوں گھور گھور کے دیکھتے جیسے یہ گاڑی نہیں چاند گاڑی ہے۔ ان کے سامنے اس میں سے وہ نیم مردہ لاش نظر آنے والے افراد کو نکال کے تہ خانے میں پہنچانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا۔

جب منظر آیا تو میں اس شیر کی طرح ٹہل رہا تھا جس کو ایک لومڑی اور ایک گیدڑ بے وقوف بنا کے نکل گئے ہوں اور جنگل کا بادشاہ غصے میں تھر تھر کانپتا رہ گیا ہو۔ وقار یوسف اس کے ساتھ ہی داخل ہوا تھا مگر غالباً اسے کسی دروازے کی اوٹ سے بیوی نے وہ مقناطیسی اشارہ کر دیا جس پر نئے شوہر کھنچے چلے جاتے ہیں۔

منظر دھم سے یوں صوفے پر گرا کہ صوفے کی چولیں ہل گئیں۔ "کیا قیامت آ گئی تھی بھوتنی کے۔ فون پر تیری بات سن کے

www.paksociety.com

میں دیکھ رہی تھیں۔ وقار یوسف بھی ساکت و صامت تھا۔ ہم سب ایک ہی بات سوچ رہے تھے اور ہم سب کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔ یہ بے ضمیر اور سفاک شکاری اس لرزہ خیز تحفے کی دوسری قسط کب ارسال کریں گے اور اس میں کیا ہوگا؟ نازو کی دوسری انگلی یا اس کا چار انگلیوں والا پورا ہاتھ؟ اپنی دھمکی کو زیادہ موثر اور یقینی بنانے کے لیے وہ کسی بھی انتہا تک جا سکتے تھے۔

بالآخر منظر بولا "تم نے رابعہ سے کیا کہا تھا؟"

"میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ چیخ مار کے بے ہوش ہو گئی تھی" وقار نے کہا "میں نے اپنے ایک کزن کو بلا لیا تھا۔ وہ ڈاکٹر ہے مگر میں اسے کیا بتاتا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ابھی تمہاری بیوی کو بھی پتا نہیں ہے۔"

"رابعہ ہوش میں آئے گی تو معلوم ہوگا کہ اس نے کتنا اثر لیا ہے۔" منظر خلا میں دیکھتا رہا۔ "وقار! اگر ہم سب نے مل کے جھوٹ نہ بولا تو وہ پاگل ہو جائے گی۔ ہم اسے یقین دلا سکتے ہیں کہ اس نے غلط سمجھا تھا۔ وہ سب جھوٹ تھا۔ دھوکا تھا۔ وہ انگلی نازو کی نہیں تھی۔"

"وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے کہ آسانی سے مان جائے۔"

"یار! جھوٹ کو سچ بنانا پڑے گا۔ رابعہ کو قائل کیا جا سکتا ہے کہ اس نے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ وہ عقل سے کام لیتی اور تھوڑا سا غور کرتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ نازو کی انگلی اتنی بڑی اور بے ہنگم نہیں ہو سکتی۔ اس نے گاڑی میں دیکھا تھا۔ سرسری نظر ڈالی تھی اور گاڑی کے اندر اندھیرا تھا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "منظر۔ وہ انگلی نازو کے ہاتھ کی ہے۔"

منظر نے برہمی سے کہا "بھوتنی کے۔ کیا اس پر نام لکھا ہوا ہے نازو کا؟ اور کیا میڈیکل رپورٹ سے تصدیق ہو گئی ہے۔ ایسی انگلی کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ ٹھیک ہے یہ انگلی بھی کسی عورت کے ہاتھ کی ہے اور ہاتھ بھی نازک سا ہے مگر اس امکان کو مسترد تو نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے مردہ خانے سے کسی لڑکی کے ہاتھ کی انگلی کاٹ کے بھیج دی ہو؟"

مایوسی کے اندھیرے میں امید کی ایک کرن روشن ہو گئی۔ "واقعی۔ یہ خیال تو مجھے نہیں آیا تھا۔ ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے وہ ایسا کر سکتے ہیں مگر نہ ہمارے پاس نازو کے فنگر پرنٹس ہیں اور نہ ہی کوئی ایسی چیز جس سے موازنہ کر کے ہم یقین کے ساتھ کچھ کہہ سکیں۔"

"یار! اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کے ڈرامے ہم بھی کر سکتے ہیں۔"

میرا عزم بحال ہونے لگا "تو ٹھیک کہتا ہے منظر۔ دشمن اگر بندوق سے گولی چلائے تو جواب میں کوئی توپ چلانے تو جواب میں توپ، راستہ ضروری ہے۔ وہ بم پھینکے تو ہم اس پر بجلی گرائیں۔ ہم آج ہی جوابی تحفہ ارسال کر دیتے ہیں۔"

میرے بھتیجے سے غلام حسین نے کہا "آنکھ کے بدلے آنکھ، جان کے بدلے جان۔ یہ تو ہمارا اصولی بات ہے جی۔ چوہدری دلاور کی ایک انگلی بھیج دیں جی۔ دوسری قسط نہیں آئے گی جی۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا "تم بھی چپ رہو۔ بچے ہو۔"

منظر نے ایکدم مولوی غلام حسین کا ہاتھ پکڑ لیا "یہ ہاتھ تو بالکل دلاور کے ہاتھ کی طرح ہے... ہے نا۔"

غلام حسین زور لگانے لگا "چھوڑیں جی، میرا ہاتھ۔"

منظر نے کہا "ایک انگلی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چھوٹی انگلی کے جواب میں یہ چھوٹی انگلی بھیج دیں۔"

غلام شور کرنے لگا۔ "منظر صاحب۔ آپ کا مذاق ہے۔ اپنا ہاتھ دیکھیں، یہ بھی ویسا ہی ہے۔"

"بالکل غلط۔ میرا ہاتھ بہت بھاری ہے" منظر نے ہاتھ نہیں چھوڑا "یار سکندر! ایک انگلی کم ہو جانے سے غلام کو کیا فرق پڑے گا۔ اس کی پانچوں گھی میں ہیں اور سر کڑاہی میں۔ سر بعد میں کاٹیں گے۔"

غلام نے اپنے ہاتھ کو یوں دیکھا جیسے اس میں جان نہ رہ گئی ہو۔ "آپ کے دماغ میں فتنہ انگیز خیالات ہی کیوں ہیں منظر صاحب؟ اور مجھ سے کیا دشمنی ہے جی آپ کو؟"

"مولوی صاحب۔ جاں نثاری اور نمک خواری کا تقاضا ہے کہ تم اپنا سب کچھ قربان کر دو۔" منظر نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

مولوی غلام حسین نے کراہ کے کندھا سہلایا "میں آپ کو اپنا سب سمجھتا ہوں جی۔ بے شک قربان کر دیں آپ، صاحب۔"

وقار یوسف نے کہا "آپ لوگ باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ فیصلہ کر لیں جلدی سے کیا کرنا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔"

"فیصلہ کر لیا برخوردار۔ تم جا کے گھر سنبھالو۔ دونوں کو سنبھالو۔" منظر کی مراد اس کی بیوی اور رابعہ سے تھی۔ "میں غلام حسین اور سکندر کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

غلام حسین نے سہلایا "حکم سے کم تو آپ کے ساتھ... خطرہ میں مول نہیں لے سکتا جی۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو..."

منظر نے پھر اسے رعب مارنے کی ناکام کوشش کی... "صاحب کچھ ثواب کمائیں گے آپ کی خاطر... فرائی چھینا۔ لمبے دوست ہم بھی کچھ کریں گے۔"

غلام نے ہونٹوں پر زبان پھیری "اچھا جی۔ ٹھیک ہے۔ کر رہے ہیں آپ تو پھر چلیں۔ تک کام میں..."

میں سمجھ گیا تھا کہ منظر کے ذہن میں کچھ ہے جو وہ نہیں بتانا چاہتا۔ اس نے تحفے میں موصول ہونے والا...

بالکل مختلف مزاج رکھتی تھی۔ وہ دولت سے زیادہ خلوص اور محبت کو اہمیت دیتی تھی۔ اس نے باپ کی دولت کو ٹھکرا کے وقار یوسف سے شادی کی تھی۔ دولت آج بھی اس کے لیے سب کچھ نہیں تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ اور ہمارے ساتھ جذبات کے... دولت کو پھر قربان کر سکتی تھی۔

...نے غلام حسین کو قائل نہیں کیا اور اس نے اس کے بارے میں اپنا فیصلہ برقرار رکھا کہ اس میں سے ایک... بھی اجازت خرچ نہیں ہوگا۔ اب یہ وقار یوسف کی مرضی ہے... یا ساری رقم غلام حسین کو بخش دے کہ... اپنے سارے سسرال کو ظلم کے بجائے دکھائے اور پھر قالودہ کھلائے۔

منظر نے مایوسی سے کہا "مولوی کا ایمان واقعی پکا ہے۔"

میں نے کہا "منظر۔ نازو کی تحریر تو اصلی ہے۔"

"بھائی میں نے کب کہا کہ نقلی ہے۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ اس میں جو کچھ نازو نے لکھا ہے، تحریر اس سے پہلے لی گئی ہوگی۔ ممکن ہے اسے بھی دہشت زدہ کیا گیا ہو۔ دلاور کی بیوی نے جو کارڈ دیا تھا، اس پر پتا بھی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ سی ویو اپارٹمنٹس۔ زیرو روڈ ہے۔ فون نمبر بھی ہے۔ تم گاڑی چلاؤ۔ میں دیکھ رہا ہوں۔"

"مگر اس وقت تو آفس بند ہوتے ہیں۔ وہ رات کے وقت اس فون نمبر پر کیسے ملے گی؟"

"کال ٹرانسفر کا چکر ہوگا۔ جو فون ریسیو کرے گا وہ پیغام موصول کر کے آگے پہنچا دے گا۔ جواب ہمیں مل جائے گا۔"

ہم زیرو روڈ سے دو بار گزرے مگر مجھے کہیں بھی سی ویو اپارٹمنٹ کا بورڈ نظر نہیں آیا۔ مختلف مقامات پر گاڑی روک کے لوگوں سے معلوم کرنے کی کوشش بھی ناکام رہی۔

"اگر کسی کو پتا نہیں ہے تو کل دن میں تلاش کریں گے" منظر بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ فون نمبر نہیں" میں نے کہا۔

"تم نے بڑا اچھا کیا کہ... نہیں ہوا۔ دلاور کی بیوی نے اضطراب میں رابطے کا نمبر دے دیا۔ غلطی کر گئی ناقص العقل عورت ذات۔"

شکست خوردہ نکل گئی۔ میں اکیلا رہ گیا تو...

"بے وقوف کے۔ نکل کے کہاں جائے گی وہ۔ اب قدرت اس کو اپنے جال میں پھانس لے گی۔ وہ خود آئے گی تجھ سے ملنے اور... لاکھ روپیہ نقد بھی لائے گی۔ رقم جیب میں ڈال کے اس سے... کرنا کہ سکندر سے بات ہو جائے گی پھر ایک بار اس کی بات... سکندر سے۔ شوہر کی جدائی اس سے برداشت نہیں... دو دن بعد اسے بھی پہنچا دیں گے شوہر کے پاس۔ جو کام ٹھنڈے دماغ کے ساتھ کیا جاتا ہے اس میں خرابی کا امکان نہیں ہوتا۔ جلدی کی کیا ضرورت ہے۔"

اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں اگلی سیٹ پر اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ذرا پیچھے مولوی غلام حسین کو بٹھا دیا۔ "ذرا سنبھال کے رکھنا اسے۔"

غلام حسین نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "لاحول ولا قوۃ۔ آپ ہی رکھیں اسے اپنے پاس۔ توبہ توبہ۔"

میں نے ڈبے کو ڈیش بورڈ پر رکھا تو وحشت انگیز خیالات کا آسیب مجھے بھی پریشان کرنے لگا۔ اگرچہ اب میرے ذہن میں بھی شکوک پیدا ہو گئے تھے اور مجھے منظر کی بات قابل اعتبار محسوس ہوتی تھی کہ یہ انگلی نازو کی نہیں مگر خوف کے عفریت نے یوں دل میں پنجے گاڑ دیے تھے کہ میرے تصور میں بار بار نازو کا ہاتھ آ جاتا تھا۔ گلابی مرمریں اور نازک جس کی ایک انگلی کی جڑ سے لہو پھوٹ رہا تھا۔ گھبرا کے میں نے اس ڈبے کو گلوز کمپارٹمنٹ میں بند کر دیا۔

گیٹ سے گاڑی نکالتے ہوئے منظر نے گیٹ کیپر کو دیکھا "اس لڑکے نے اپنا نام نہیں بتایا تھا؟ کہاں سے پکڑا تھا دلاور کی بیوی نے ورکر؟"

"میں نے نام پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ کوئی ڈیشنگ تھا جس نے ابھی پریکٹس شروع نہیں کی۔ فرانس میں رہا تھا اس لیے فرنچ جانتا تھا۔"

"مسز دلاور کا کوئی ملازم یا رشتے دار تھا؟"

"نہیں۔ وہ تو ضرورت مند تھا کوئی۔" میں نے اسے تفصیل سے ساری بات بتا دی۔

"یار! تم سے اچھا تو مولوی غلام حسین رہا۔ دو ہزار وصول کر لیے۔ اب دعوت اس کی طرف سے۔"

"ہرگز نہیں۔ وقار صاحب کے گیٹ کی عزت کے اخراجات ہیں۔"

"یار سکندر! یہ مولوی واقعی دلچسپ بے رال کا بورم ہے۔"

"بے رال کا بورم؟" غلام نے غور کیا "جینئس بوم بوم تو الو کو کہتے ہیں؟"

"پہلے کہتے تھے۔ اب غلام کہتے ہیں۔ یار تم کیا سمجھے ہو وقار کو۔ اس کی بیوی کا نام ضرور لی ہے مگر وہ بے بڑی توپ چیز کی اولاد ہے۔"

مجھے وقار یوسف کا سسر یاد آیا جو واقعی بڑی توپ چیز کہلاتا تھا اور ایک مثالی ہیوی ویٹ تھا۔ فرعون صفت سازشی لالچی ہوس زر کا مارا ہوا لیکن نجی زندگی میں دیکھنے والوں کے لیے درس عبرت۔ اس کا انجام بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کی واحد وارث وقار یوسف کی بیوی کے لیے ایک گریٹ پدر کا فوت ہو جانا کوئی قابل ذکر نقصان نہیں تھا۔ وہ کئی کوٹھیوں اور کاروں کی مالک ہو گئی تھی اور بلا مبالغہ اس کی ذاتی آمدنی اتنی تھی کہ وقار یوسف کو سامنے عمر بھر کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی مگر ایک تو وہ احساس کمتری کی حد تک خوددار آدمی تھا اور نگی اس کے مزاج کو سمجھتی تھی۔ اس کے علاوہ وقار یوسف میں شرافت کی وضع داری تھی تو نگی بھی اپنے باپ سے

www.paksociety.com

مجھے منظر کی بات پسند آئی۔ "میں آج رات ہی بات کرکے دیکھتا ہوں۔ اگر اس فون نمبر پر اس سے رابطہ ہو گیا تو سمجھو پھنس گئی۔"

جب منظر نے گاڑی کو سول اسپتال کے گیٹ سے اندر موڑا تو خادم حسین نے کہا "یہ تو اسپتال ہے۔ یہاں کیا کام ہے جی؟"

"مُردہ خانے میں رکھوانا ہے تم کو" منظر بولا "تم چلتی پھرتی لاش ہو۔"

خادم نے گھبرا کے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ آپ جب بات کرتے ہیں ایسی ہی واہیات بات کرتے ہیں منظر صاحب۔"

"مولوی۔ کیا تم مُردوں سے ڈرتے ہو" منظر نے افسوس سے کہا "ڈرنا چاہیے زندہ انسانوں سے۔ یا شیطان سے۔"

"اسی لیے تو میں آپ سے ڈرتا ہوں جی۔"

"اچھا تم نے کبھی مُردہ خانہ دیکھا ہے؟ آج دیکھو۔ آدمی کو عبرت پکڑنے کے لیے قبرستان جانا چاہیے۔ زیادہ عبرت پکڑنی ہو تو مُردہ خانے جانا چاہیے کوئی پتا نہیں کل کیا ہو۔ تم بھی پڑے ہو یہیں اور دوسرے عبرت پکڑ رہے ہوں۔ بس گزر جائے تم پر سے ٹرک ڈمپر۔ یا کوئی تمہیں رقابت میں خنجر گھونپ دے مثلاً مجھے غلط فہمی ہو جائے کہ تم میری بیوی پر ڈورے ڈال رہے ہو تو میں تمہیں گولی مار دوں۔ یا آج ہی زیادہ کھانے سے تمہیں ہیضہ ہو جائے۔"

خادم حسین نے بگڑ کے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ آپ کی تو زبان ہی اتنی خراب ہے اور پتا نہیں ایسی باتیں صرف آپ کے دماغ میں کیوں آتی ہیں جی۔ آپ تو اچھے خاصے ذہنی مریض ہیں۔ بلکہ پاگل ہیں۔"

منظر نے گاڑی مُردہ خانے کے سامنے روک دی "بالکل ٹھیک کہا تم نے مولوی۔ میں واقعی پاگل ہوں۔ پتا ہے میں تم کو یہاں کیوں لایا ہوں؟ ہم اور تم یہاں ڈانس کریں گے۔ مُردہ خانے میں' کیسا اچھوتا خیال ہے۔ مُردے اکیلے پڑے بور ہو رہے ہوں گے ان کا بھی دل بہل جائے گا۔"

خادم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا موڈ سخت خراب تھا اور خوف سے رنگ اُڑا ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ وہ فش فرائی' چرغا اور لمب روسٹ کھانے آیا تھا۔ مُردہ خانے کے دروازے پر اس کی روح فنا ہو رہی تھی اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ زیرِ لب جل تو جلال تو کا ورد کر رہا تھا۔

اس نے مجھ سے کہا "سکندر صاحب۔ آپ ہی بتائیں یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "ہر سال آج ہی کے دن منظر کو دورہ پڑتا ہے۔ اس کے ماموں سسر آج ہی کے دن مُردہ خانے سے فرار ہوئے تھے۔ جب ان کی برسی آتی ہے تو یہ سیدھا یہاں آتا ہے اور مُردوں کو ماموں ماموں کہہ کر گلے لگاتا ہے۔"

ظاہر ہے میرے اس جواب کے بعد خادم حسین کے لیے خاموشی سے ہمارا ساتھ دینے کے سوا چارہ نہ رہا۔ ویسے بھی منظر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ورنہ شاید وہ بھاگ جاتا۔

مُردہ خانے کے اندر کا منظر میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ [illegible] ہے منظر نے بھی دیکھا ہو۔ اس کے پیشہ ورانہ فرائض میں قاتل سے مقتول تک اور قتل سے [illegible] معائنے کے سارے مراحل شامل تھے۔ منظر نے [illegible] بات کی تھی مگر حقیقت یہی ہے کہ مُردہ خانے سے [illegible] عبرت کوئی نہیں اور میت کی حرمت کے مسائل [illegible] والے کبھی خود مُردہ خانے جائیں تو اشرف المخلوقات [illegible] انسان کی بے توقیری دیکھ کے صدمے سے پاگل ہو جائیں۔

مُردہ خانے کا نگراں کلرک ہمیشہ کی طرح غائب تھا [illegible] سے متعلق جملہ امور کا نگراں ایک جلاد صفت کم ذات [illegible]

"آؤ جی سرکاراں۔ کوئی بندہ ہے آپ کا [illegible]" [illegible] سوئی اسامی سمجھ کے خوش خلقی سے ہمارا استقبال کیا [illegible] کمرے کے اندر لے گیا۔ "پہچان لو اگر ان میں ہے۔"

وہاں مُردے اسی طرح پڑے ہوئے تھے۔ [illegible] ترچھے سلیب پر' تختوں پر اور میزوں پر۔ ہر عمر کے چھوٹے [illegible] لوگ۔ کچھ قتل ہوئے کچھ حادثات کا شکار ہو کے وہاں پہنچے کچھ سڑکوں پر اور فٹ پاتھوں سے اُٹھائے گئے تھے [illegible] اکثریت لاوارث اور غریب غربا کی تھی جن کی کوئی شناخت نہ ہوتی۔ جن کو شناخت کرنے والا ہی نہیں ملتا۔

خادم حسین کی حالت غیر تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے گور و کفن لاشوں کو دیکھ رہا تھا جو غلیظ متعفن ماحول میں پڑی ہوئی تھیں جیسے وہ انسان نہیں کارپوریشن کی مہم [illegible] ہلاک ہونے والے کتوں کے آوارہ لاشے ہیں۔

"توبہ توبہ۔ کیسی بے حسی ہے جی۔ آخر یہ بھی کسی کے [illegible] بھائی یا شوہر ہوں گے کیا بیتے گی ان کے دل پر [illegible] گے یہ سب جو خدمتِ خلق کی باتیں کرتے ہیں۔ [illegible] درس دینے والے اور آدمی کی عظمت کے ترانے [illegible] لمبے چوڑے وعظ کرنے والے اور لیکچر دینے والے کیا یہاں نہیں آتے؟"

میں نے کہا "خادم حسین۔ کاش ہم باتیں نہ کرتے [illegible] عمل سے خود کو انسان ثابت کرسکتے تو یہ سب نہ ہوتا۔"

"ایک انٹرکانٹی نینٹل میں نے پالتو کتوں کے لیے دیکھا [illegible] کوٹھیوں میں اور ہوٹلوں میں بھرا رہا ہے انٹرکانٹی نینٹل کی [illegible] تک نہیں۔"

میں نے تلخی سے کہا "صفائی نصف ایمان ہے [illegible] حدیث یاد رکھنا کافی سمجھ لیا ہے ہم نے۔ ہم نصف ایمان بھی نہیں رکھتے۔"

منظر نے اتنی دیر میں مطلب کی بات کرلی تھی اور [illegible]

[illegible] حسین نے زور سے لاحول ولا قوۃ کہا اور اُبکائیاں لیتا ہوا [illegible] اس کے پیچھے لپکا۔ دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی [illegible] اس سے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل گر کے [illegible] نے ایک لاش سے [illegible] ہو گیا۔ میں اسے اُٹھا کے باہر کھلی ہوا میں لے گیا اور [illegible] لٹا دیا۔ خود میری طبیعت بھی بُری طرح مالش کر رہی [illegible] ضبط سے کام لے رہا تھا۔ قریب لگے ہوئے ایک نلکے [illegible] منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور دو گھونٹ پانی پیا تو [illegible] سنبھل گئی۔ خادم حسین کو ہوش میں لانے کے لیے [illegible] ایک خالی بوتل کو استعمال کیا جو وہیں کچھ فاصلے پر پڑی [illegible] اسے دھو کے میں نے پانی سے بھرلیا اور کچھ پانی خادم [illegible] تھوڑا سا اس کے حلق میں بھی گیا تو وہ ہوش میں آگیا [illegible] بلند آواز سے سورہ یٰسین پڑھنے لگا۔

میں نے کہا "خادم حسین۔ زندگی کی قدر ایسے ہی ہوتی ہے [illegible] کب سوچا تھا تم نے؟"

منظر نے قریب آ کے کہا "مولوی خادم حسین۔ تم میں حوصلہ [illegible] سب کچھ دیکھنے کا۔ زندگی کا خوب صورت اور روشن [illegible] والے ذرا سی آزمائش سے گھبرا جاتے ہیں۔ معمولی سی [illegible] شکوہ کرنے لگتے ہیں تقدیر سے۔ اب اندازہ ہوا کہ ہم ان [illegible] کے مقابلے میں کتنے اچھے ہیں اور خوش نصیب ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ جی۔ بندہ بڑا ناشکرا ہے۔ ڈرنا چاہیے [illegible] اس انجام سے۔" وہ کانوں کو توبہ کے انداز میں پکڑے بیٹھا رہا۔

میں نے کہا "تمہارا کام ہو گیا؟"

"ہو جائے گا۔ سو روپے میں بات ہوئی ہے" منظر بولا۔

"اللہ ہمیں معاف کرے" میں نے کہا۔

مُردہ خانے کے عقبی حصے میں ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں گدلا پانی بھرا ہوا تھا۔ یہ حصہ نسبتاً تاریک اور ویران نظر آتا تھا۔ [illegible] کے آخر میں مجھے آتش دان جیسی بھٹی بھی نظر آئی تھی۔ خادم حسین اب قدرے پُرسکون تھا اور بڑے غور سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

مُردہ خانے کے ملازم نے آستین چڑھا کے تالاب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک انسانی ٹانگ تھی۔ ٹانگ [illegible] کافی گل چکی تھی۔ اس نے ٹانگ کو واپس اسی محلول میں [illegible] اور پھر ہاتھ ڈالا تو کسی کا بازو نکال لیا۔

"یہ کسی زنانی کا بازو ہے" اس نے خود سے کہا اور بازو کو [illegible] دیا۔

[illegible] تالاب میں نہ جانے کتنے مختلف انسانوں کے جسمانی [illegible] تھے۔ صرف خادم حسین کو ڈرانے کے لیے [illegible] باقیات پکڑ کر ایک سر بھی نکالا اور چھوڑ دیا۔ اس

لاشوں میں سے ایک کا رنگ روپ اور جسامت والا ور جیسا تھا مگر مُردہ خانے کا ٹھیکے دار سر کھجانے لگا۔

"سرکاراں' یہ لاش ذرا جھگڑے والی ہے۔ ابھی پوسٹ مارٹم نہیں ہوا اور سنا ہے ذہنی مریض تھا مگر ہے کوئی بڑا آدمی۔"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ اس کی دو انگلیاں کاٹ دو۔ مجھے اس قسم کے ہاتھ کی دو انگلیاں لا دو۔ تمہارے پاس تو اسپیئر پارٹس کا اسٹور ہے۔ میں جانتا ہوں۔"

وہ کچھ حیران ہوا "وہاں تو باسی مال ہے۔ یہ تازہ چیز ہے۔ آپ پانچ سو دو سرکاراں تو میں اس کی انگلیاں نکال دوں۔ پوسٹ مارٹم کے وقت انگلیاں کون گنتا ہے جی؟" اس نے آنکھ دبا کے کہا۔

منظر نے نفی میں سر ہلایا "فضول بات مت کرو۔"

"چلو جی چار سو۔ اچھا تین سو۔"

"ملعون شخص!" خادم حسین نے نفرت اور حقارت سے کہا "خدا کو کیا منہ دکھائے گا میدانِ حشر میں؟"

وہ ڈھیٹ آدمی متاثر ہونے والا نہیں تھا "مولوی صاحب' جو منہ دیا ہے خدا نے وہی دکھائیں گے۔ تم کیا کسی اور کا منہ

سسپنس ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

عصرِ حاضر کی الف لیلہ

دیوتا

36 واں حصہ شائع ہو گیا ہے

قیمت ● 50 روپے ڈاک خرچ ● 16 روپے

ایک ایسی داستان جو ایک بار شروع کرکے چھوڑی نہیں جاتی

ایک کتاب کا ڈاک خرچ 16 روپے' دو کتابوں کا 18 روپے' تین یا چار کتابوں کا ڈاک خرچ 24 روپے ہوگا۔

پانچ کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف

پورے 36 حصوں کی رعایتی قیمت صرف 1100 روپے مع ڈاک خرچ۔ یہ رعایت صرف منی آرڈر بھیجنے پر ہی مل سکے گی۔

کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس 23

رمضان چیمبرز۔ ملبوریا اسٹریٹ۔ آئی آئی چندریگر روڈ

کراچی-74200 فون: 2628517

www.paksociety.com

تالاب میں نامکمل لاشیں بھی تھیں اور یہ سب لاوارث لوگ تھے یا لاشوں کا دھندا کرنے والے ٹھیکے دار نے ان کو لاوارث قرار دے کر فروخت کردیا تھا۔ یہ لاشیں میڈیکل کے طلبا کے لیے بڑی اہم تھیں۔ وہ انسانی جسم کی ساخت اور نظام کو سمجھنے کے لیے انھی کی چیر پھاڑ کرتے تھے۔ مستقبل کے مسیحا اور سرجن بننے والوں کے لیے یہ عملی تربیت کا ایک حصہ تھا۔ بے حسی کا قطعی غیر جذباتی رویہ اختیار کیے بغیر وہ انسانی جسم کی مشینری کو سمجھ سکتے تھے اور نہ ان کے افعال کو۔

خادم نے کانپتے ہوئے کہا "بعد میں ان کا کیا کرتے ہیں جی۔ یہ جو مختلف انسانوں کے ٹکڑے اس تالاب میں پڑے ہیں؟"

میں نے کہا "جب یہ استعمال کے قابل نہ رہیں تو دفنا دیے جاتے ہوں گے۔"

منظر نے کہا "دفنانے کی نوبت کم آتی ہے۔ جلا دیتے ہیں یہاں اس بھٹی میں۔"

مردہ خانے کے ملازم نے اس کی تائید کی اور تالاب میں اپنے ہاتھ ڈالتا رہا جیسے وہ مچھلیاں پکڑ رہا ہو۔ میں نے ہمت کرکے بھٹی کو قریب سے دیکھا۔ خوف کے باوجود خادم حسین کا تجسس اسے بھی کھینچ لایا۔ وہاں بہت سے جلے ہوئے اعضا کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ بہت سے اعضا پوری طرح جلنے سے رہ گئے تھے۔ یہ مردہ خانے کے نظارے سے بھی زیادہ بھیانک منظر تھا۔ یہ تصور کرنا مشکل تھا کہ وہ کون لوگ ہوں گے جن کے اعضا اس طرح بکھرے پڑے تھے۔ ان کی صورت کیسی ہوگی۔ وہ کیسا لباس پہنتے ہوں گے۔ کیسے بات کرتے ہوں گے۔ کیسے ہنستے ہوں گے۔ کیسے محبت کرتے ہوں گے اور کیسے دکھ سہتے ہوں گے۔ ان کے گھر کیسے ہوں گے اور وہ کون ہوں گے جو انھیں چاہتے ہوں گے۔ جن کو وہ چاہتے ہوں گے۔

یہ سب فرضی باتیں نہیں۔ تلخ حقائق ہیں۔ عام آدمی کی نظر یہ سب نہیں دیکھ پاتی اور جو جانتے ہیں وہ خاموش رہنا بہتر سمجھتے ہیں۔ اخبار والوں نے بہت کچھ لکھا اور دکھایا۔ اصل تصاویر شائع کردیں اور ساری تفصیل بیان کردی مگر وائے بے حسی۔ نہ ان نام نہاد علما پر اثر ہوا جو فروعی باتوں پر کفر کے فتوے صادر کردیتے ہیں اور معاشرے میں صرف بے حیائی اور برائی کے پیچھے لٹھ لے کر پڑے رہتے ہیں۔ کسی نے اس مسئلے پر مذمت کا ایک لفظ تک نہیں کہا۔ کسی فلاحی یا دینی، سیاسی یا معاشرتی تنظیم نے اس موضوع پر اظہار خیال تک نہیں کیا۔

ہم جب واپس ہوئے تو خود بھی شرمندہ تھے کہ ہم نے سو روپے دے کر اس خرابی کے اسباب کی حوصلہ افزائی کی مگر ہمارے پاس مجبوری کا عذر تھا۔ نازو اور غالب دو زندہ انسان تھے اور ان کی زندگی بچانے کے لیے کسی نامعلوم شخص کے ہاتھوں کی دو انگلیاں وہ کام کرسکتی تھیں جو قانون کی طاقت بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اسے ہم اپنی خود غرضی سمجھ سکتے تھے مگر اس میں بدنیتی کو دخل نہ تھا۔ ہمارا مقصد غلط نہیں تھا۔ وہ ایک لاوارث ہاتھ تھا اور جسم سے جدا ہوگیا تھا۔ ہاتھ بازو سے اور بازو جسم سے جدا ہوچکا تھا۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ دو انگلیاں ہاتھ سے جدا ہوجاتیں۔ ہو کے خاک ہوجاتے اور حشرات الارض کا رزق بنتے۔ اس ہاتھ کی مدد سے اگر دو زندگیوں کو بچالیں تو وہ ہاتھ [illegible] ہاتھ سے زیادہ محترم تھا جو کسی بے کس عورت کی [illegible] تار تار کرتا ہے یا بھوکے نادار سے سوکھی روٹی کا [illegible] ہے۔ وہ ہاتھ چوہدری دلاور کے ہاتھ سے زیادہ نیکوکار تھا۔

منظر نے اس نازک زنانہ انگلی کو الگ ایک کاغذ میں لپیٹ کر محفوظ کرلیا اور پاکٹ میں اس کی جگہ [illegible] انگلی رکھ دی "جب رابعہ ہوش میں آجائے تو [illegible] تمہارا کام ہے کہ تحریر ضرور نازو کی ہے مگر انگلی نازو کی [illegible] غور سے دیکھو اس پر چھوٹے چھوٹے بال [illegible] سرسری نگاہ ڈالی تھی اور وہ بھی چلتی گاڑی میں [illegible] سے اس کو فرق خود نظر آجائے گا۔"

میں نے کہا "اسے میں تو کل کرلوں گا۔"

منظر نے کہا "اس زنانہ انگلی کو میں میڈیکل [illegible] ایک پرائیویٹ لیبارٹری کے حوالے کردوں گا۔"

"یار، وہ کیا بتائیں گے۔ موازنے کے لیے [illegible] بھی نہیں۔"

"یہ معلوم ہوجائے گا کہ انگلی کب سے بے جان ہے [illegible] انگلی ہے اس کی عمر کیا تھی۔ قد و قامت اور وزن کے بارے میں بھی پتا چل جاتا ہے۔ اگر رپورٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ [illegible] عمر تیس سے اوپر تھی یا اس کا وزن [illegible] ہوجائے گا کہ وہ نازو نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ بھی پتا چل جائے [illegible] سات آٹھ دن پرانی تھی تو کچھ اطمینان ہوگا مگر یہ [illegible] ہیں۔ نتائج سو فیصد حتمی بھی نہیں ہوتے۔ نازو کو اللہ اپنا [illegible] رکھے۔ اس وقت تمہارے ساتھ آنے کا اصل مقصد [illegible] طرح ہم رابعہ کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی اس کے [illegible] کے لیے یہ ثبوت حاصل کرلیں۔ دوسرا مقصد تھا [illegible] کو روکنے کے لیے بروقت جوابی کارروائی۔ اب [illegible] ایک خط کے ساتھ چوہدری دلاور کی طرف سے اس کی [illegible] محبت بھرا تحفہ پہنچادوں گا۔"

میں نے کہا "اس کی بیوی کو۔ ذہین مرد کے پیچھے [illegible]"

"ہاں۔ اور تو کوئی ذریعہ نہیں۔" منظر بولا۔

میں نے کہا "یار، میرا خیال ہے کہ یہ حرکت اس [illegible] ہوگی۔ یہ بیگم استاد پیڈرو کا تحفہ۔"

"اب نہیں اس سے کیا۔ یہ حرکت جس [illegible] اسے پتا چل جائے گا اور دلاور کی بیوی کو پہلے معلوم [illegible]

مجھے نازو کے ہاتھ کی ایک انگلی ارسال کی گئی تھی۔ نازو [illegible] اللہ ان کا رکھوالا ہے۔ ان کے ہاتھوں پیروں [illegible] کی انگلیوں کی تعداد چالیس تھی۔ ہے۔ دلاور کے پاس ہاتھوں پیروں [illegible] انگلیاں صرف بیس ہیں۔ اکیسویں قسط میں شاید اس کا بازو یا [illegible] ٹانگ بھیجنی پڑے گی۔ یا ممکن ہے پہلے کان اور ناک کاٹے [illegible] آپ خود بھی تصور کرسکتی ہیں کہ دلاور کا سر کاٹنے سے پہلے [illegible] کیا جائے گا۔ نازو اور غالب مرکے بھی شہید ہوں گے [illegible] نہیں مریں گے۔ اللہ ہمیں بھی صبر دے گا مگر آپ کو دوسرا [illegible] آپ کے بچوں کا دوسرا باپ کہاں سے ملے گا۔ ابھی تو وہ [illegible] سلامت ہے اور ایک انگلی کے کم ہوجانے کے باوجود چوہدری [illegible] نازو بچے بھی ہوں [illegible]

سکندر بخت"

منظر مجھے گیٹ پر ڈراپ کرکے چلا گیا۔ وقار یوسف کے گھر [illegible] داخل ہوتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ کٹی ہوئی انگلی والا ڈبا [illegible] گاڑی میں رکھ دیا جس میں ہم یہاں پہنچے تھے۔ پھر میں اور خادم [illegible] ایسے داخل ہوئے جیسے ہم باہر ٹہلنے گئے تھے۔ رابعہ سکون سے سو رہی تھی۔ وقار کی بیوی نے لائٹس آف کرکے دروازہ بھی بند کردیا تھا اور اسے کی چابی [illegible]

"آپ لوگ بغیر بتائے کدھر نکل جاتے ہیں؟" وہ خفا ہوئے [illegible]

میں نے کہا "مکمل آزادی مرد کی شان ہے اور ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہ صنفی [illegible] ہے اور ہم وہاں [illegible] ہیں۔ یہ دنیا ہمیں روک نہیں سکتی۔"

"دنیا کی زندگی خود روک لے گی۔ ابھی تو بے سہارا ہیں نا۔"

خادم نے متانت سے کہا "خاتون کو بتادیں کہ میں الحمدللہ شادی شدہ ہوں لیکن میں کوئی اونٹ نہیں جسے وہ مہار ڈال دے۔"

"تم خود [illegible] یار کہ میں اونٹ نہیں گدھا ہوں۔ گھر کا الو [illegible] اور کولہو کا بیل ہوں۔ مختصراً یہ کہ شوہر ہوں۔"

وقار ہنسنے لگا "سچ کہا آپ نے۔ یہ تمام صفات تو مجھ میں بھی [illegible]"

"[illegible] کی خوش قسمتی ہے کہ اسے مثالی شوہر ملا۔"

"یہ آپ نے کب سے کہنا شروع کردیا ہے۔ مجھے کس نے [illegible] ہے میرا یہ نام آپ کو؟"

میں نے کہا "کسی نے نہیں۔ بس تم گلی ہو یعنی چھوٹی۔ میرے [illegible] دیکھ کے وزن کرلو اپنا اور میرا۔ عمر اور عقل کا [illegible]"

تصور وہ ڈاکٹر صاحب بتا کے گئے ہوں گے وہ بولے رہا [illegible] سمجھانے اس کی بیوی کو بتادیا تھا کہ بچپن میں تمہارے [illegible] کیونکہ اس کی آنکھیں ہری کانچ کی گولیاں [illegible] بچوں کی طرح [illegible] بیوی کا اب اسے سب کے سامنے [illegible]

معلوم ہوجائے گا۔ ظاہر ہے وہ شوہر کی سلامتی چاہے گی تو نازو کی سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے خود بھی کچھ کرے گی۔ چیز مدد کا یا کسی اور کا کیا جاتا ہے اگر وہ اور لنگڑا لولا ہوجائے۔ کوئی اس کا ہاتھ کاٹ لے یا سر کاٹ لے۔ نازو یا غالب کے ساتھ زیادتی کرنے والا مشکل میں پڑجائے گا کہ ایک انگلی کے بدلے میں دلاور کی ایک انگلی موصول ہوگئی۔ دوسری قسط بھی دلاور کی بیوی کو بھیجی گئی تو کیا ہوگا۔ وہ سب کی رگ رگ سے واقف ہے۔ یہ معاملہ اس کے شوہر اور بچوں کے باپ کا ہے۔"

میں نے کہا "میری بھی ایک تجویز ہے۔"

"جلدی سے فرماؤ" منظر نے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔

"اس پارسل کے ساتھ تحریر نازو کے ہاتھ کی تھی۔ اس کا جواب میں دوں گا۔"

"وہ کس لیے؟"

"خط میرے نام تھا۔ انھیں پتا چل جائے کہ مکتوب الیہ تک پہنچ گیا۔ میری تحریر سے تصدیق ہوجائے گی کہ سکندر بخت بے جا ہونے کے باوجود بے جا نہیں ہے اور اس شہر میں کہیں موجود ہے۔ اس سے ان کا حوصلہ بھی پست ہوگا اور دلاور کی بیوی تو زیادہ پُر امید ہوجائے گی کہ دلاور کی بازیابی کے لیے سکندر سے اس کی ملاقات ناممکن نہیں۔ ظاہر ہے وہ رابعہ کے ذریعے یا فریج وکیل کی معرفت سکندر بخت سے براہ راست مذاکرات کی پوری کوشش کرے گی۔"

منظر کو میری تجویز پسند آئی "تیرا دماغ ابھی کام کررہا ہے بھوتنی کے۔ چل لکھ جو لکھنا ہے۔"

میں نے کہا "کیسے لکھوں۔ خون دل میں انگلیاں ڈبو کے۔"

اس نے مجھے بریف کیس میں سے ایک پیڈ اور پین نکال کے دیے "ذرا اختصار سے کام لینا۔ مجھے گھر بھی پہنچنا ہے۔ نو بج رہے ہیں۔ بیوی مارے گی۔"

"تو گھر کیسے جاسکتا ہے۔ فرائی فش، چرغا اور کباب روسٹ کھلائے بغیر" میں نے پیچھے دیکھا جہاں خادم گم صم بیٹھا ہوا تھا "کیوں خادم!"

"میری تو آج بھوک مرگئی ہے جی۔"

"یہ تو غالباً پہلی بار ہوا ہے۔ تاریخی واقعہ شمار ہوگا۔"

"ہاں جی" اس نے آہ بھری "میں نے اس روز بھی خوب ڈٹ کے کھایا تھا جس دن میرا نکاح ہوا تھا اور اس دن بھی جب ابا جی اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔"

میں نے کمپنی کے لیٹر پیڈ پر لکھا۔

"اپنے چوہدری دلاور صاحب کی نصف بہتر کے نام جو تحفہ مجھے ڈاکٹر علی حیدر کی معرفت بھیجا گیا تھا وہ مجھے موصول ہوگیا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تحفہ ارسال کرنے والی آپ نہ ہوں۔ آپ کے شوہر نامدار کے وہ یار غار ہوں جو بالآخر اسے موت کے اندھے غار میں دھکیل دیں گے۔ تاہم آپ کے علم میں ہونا چاہیے کہ "پہلی قسط"

www.paksociety.com

چند منٹ میں وقار کی بیوی نے کھانا لگا دیا اور بھوک نہ ہونے کے باوجود مولوی خادم حسین نے ایسی ہاتھ کی صفائی دکھائی کہ سب صاف کر دیا۔ کھانے کے بعد مجھے مشکل سے چند منٹ ملے اور میں نے وقار کو اپنی کارگزاری سے آگاہ کر دیا۔

"معلوم نہیں کون بار بار فون کر رہا ہے" وقار نے کہا "پہلی بار کسی عورت نے تمہارے بارے میں پوچھا تھا تو میں نے رانگ نمبر کہہ کے رکھ دیا تھا۔ اس نے پھر فون کیا اور بولی کہ مجھے معلوم ہے آپ وقار یوسف ایڈووکیٹ ہیں لیکن مجھے سکندر بخت کا پتا چاہیے۔ میں نے کہا کہ خاتون! میں کسی سکندر بخت کو نہیں جانتا تو کہنے لگی کہ اتنا جھوٹ مت بولیں۔ میں نے ریسیور رکھ دیا اور دس منٹ تک نہیں اٹھایا۔ تیسری بار کسی مرد نے رابعہ کو پوچھا تھا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ منظر صاحب کے گھر پر ہوں گی۔"

"یہ ضرور دلاور کی بیوی ہوگی۔ خیر! میں آج رات اس سے رابطہ کرلوں گا۔"

"فون کرو گے اسے؟"

"آفس سے فون نہیں کرسکتا۔ وائرلیس ریڈیو فون پر پیغام دوں گا۔ پہلے دلاور سے بات ہوتی تھی۔ شاید اس کی بیوی کو بھی پیغام مل جائے۔"

"آپ یہاں رک جائیے۔ رات کو رابعہ باجی نے پوچھا تو..."

"بتا دینا کہ چوکیدار تو رات کے وقت آفس میں ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ چاہے گی تو بات کرلے گی ویسے مجھے امید کم ہے کہ صبح سے پہلے اس کی آنکھ کھلے" میں نے کہا۔

"اگر انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا نازو کے بارے میں؟"

"تو بتا دینا کہ نازو کو کچھ نہیں ہوا۔ جو بات میں سمجھا سکتا ہوں تم بھی کہہ سکتے ہو۔"

مولوی خادم حسین پر مردہ خانے کی فضا کا اثر بہت شدید تھا مگر آہستہ آہستہ احساس کی شدت میں کمی آرہی تھی۔ پہلے زیر لب اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا تھا جو دراصل خیالات کا بلند آواز میں غیر ارادی اظہار تھا۔ اس کے بعد وہ گم صم اور خاموش ہوگیا تھا اور سخت افسردہ تھا۔ صدمے کے ردعمل سے اس کی بھوک تک اڑ گئی تھی۔ انتہائی نامساعد اور پُرخطر حالات میں بھی اس کا معدہ متاثر نہیں ہوتا تھا اور وہ چوہے جو عام آدمی کے پیٹ میں خطرے کے وقت دوڑنا بھول جاتے ہیں کھانے کا وقت ہوتے ہی خادم حسین کے پیٹ میں اچھل پھاند مچانے لگتے تھے۔ اس کا اصول ہی یہ تھا کہ آدمی کھانے کے لیے جیتا ہے۔ جینے کے لیے نہیں کھاتا اور ساری جدوجہد پیٹ کی خاطر ہی تو کرتا ہے۔

اس وقت مولوی خادم حسین کا ساتھ بھی مجھے غنیمت محسوس ہو رہا تھا جب میرے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔ آج مجھے یہ خیال بھی آرہا تھا کہ عملاً ٹیم آر ایس تو وجود ختم ہوگیا ہے اور ایک بار پھر میں اکیلا ہی اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہوں۔ آغاز میں یہ صرف میری جنگ تھی جو میں اپنے باپ کے قاتلوں سے لڑ رہا تھا۔ اس کے بے گناہ لہو کی پکار پر انصاف مانگنے کے لیے "اپنا حق حاصل کرنے" کے لیے۔ اس وقت محسن کے بعد میرا ساتھ رابعہ نے دیا تھا۔ محسن نے بھی گل کے ساتھ اپنا گھر آباد کرلیا تھا۔ وائرلیس بہن ناگ منی اب گل بانو بھی نہیں رہی تھی۔ وہ ہوگئی تھی۔ نازو کا بھائی سابق سب انسپکٹر اکرام شیخ بھی ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا اور وہ ایک خوش حال کی طرف گامزن تھے۔ منظر بھی بے گھر نہیں رہا تھا۔ وقار نے تو عشق کی پہلی جست میں شادی کی منزل پالی تھی اور کو بلند رکھتے ہوئے ایک توپ قسم کے سسر کی دولت بازی تھی مگر سسر صاحب بھی سکندر کی طرح دنیا سے اور دولت بالآخر وقار یوسف کو ملی۔ وہ پہ قید دوست کے مقابلے میں وہ انتہائی خوش قسمت تھا۔

میرا ساتھ دینے والوں میں اب صرف غالب اور نازو رہ گئے تھے لیکن انہوں نے بھی کسی حد تک اپنے مستقبل کو تحفظ فراہم کرلیا تھا۔ غالب پھر کوچۂ صحافت میں قسمت آزمانے لے لوٹ آیا تھا اور اس بار وہ اکیلا نہیں تھا۔ مجنوں کے ساتھ بھی دشت نوردی میں ہم رکاب تھی۔ اگر وہ کسی بھی ناکامی سے گھبرا کے کسی حوصلہ شکن لمحے کی سازش کا شکار غیر جذباتی انداز میں صرف اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کے سے مغلوب ہو کے فیصلہ کرلیتے کہ اب انہیں بھی گھر جانا چاہیے تو مجھے دکھ ہوتا نہ تعجب۔ آخر کیا ملا کسی کو اس ایک ایسی جدوجہد سے جس میں مسلسل فرار تھا یا تعاقب تھا۔ اگر پیش قدمی تھی تو اپنے دفاع میں اور پسپائی تھی تو سے بچنے کے لیے۔ شکاری بھی ہم تھے تو کبھی دلاور اور کے اُجرتی قاتل اور پالتو کتے مگر اصل شکاری تو جب چاہا بھی بساط پر سے ایک طرف کا مہرا غائب کر دوسری طرف کا۔ بازی ابھی تمام نہیں ہوئی تھی اور کوئی کا دعویٰ کرسکتا تھا اور نہ شکست کا اعلان۔ میں اب یہ تھا کہ جنگ پھر ذاتی ہوگئی ہے لیکن کل جو بازی میرے والد خان نے ہاری تھی وہ آج میری جیت بن سکتی ہے۔ جمال دلاور سے پرانا حساب بے باق کرنے کا سوال تھا تو صرف میرے ارادوں کو بدل سکتی تھی۔ نہ میرے حوصلے میں کمی اور نہ یقین میں۔ میرے جذبات آج بھی وہی تھے جو روز اول

مایوسی اور قنوطیت کے موڈ کو بدلنے کے لیے میں مولوی خادم حسین کو مزنگ چونگی لے گیا جہاں کباب اور تلی ہوئی مچھلی نے ہم دونوں پر ایک ساتھ خوشگوار اثر کیا۔

میں نے کہا "مولوی خادم حسین۔ آج رابعہ بھی نہیں ہے صرف تم میرے ساتھ ہو۔"

اس نے سالم مچھلی میں سے کانٹے جدا کرتے ہوئے کہا "گھر والی بھی وہیں لوٹ گئی جہاں سے آئی تھی۔"

"اللہ مغفرت کرے اس کی۔ کب انتقال ہوا اس کا؟"

آفس میں پہنچ کے میں نے وکیل سے چوکیدار بننے کے بعد پہلی بار کا لاک کیا تو مجھے چودھری دلاور کا خیال آیا۔ اس کا قید میں گزارا ہونا تقریباً ناممکن تھا مگر وہ قید و بند کی اذیت سے نکل چکا تھا۔ ایک ہفتے سے اس نے دن کا اجالا نہیں دیکھا تھا اور اس کی نقل و حرکت اس تہ خانے تک محدود تھی جہاں وہ اتنا ہی آزاد تھا جتنا کوئی مُردہ اپنے مدفن میں۔ وہ سختی جھیلنے کا عادی نہیں تھا اور بیمار بھی تھا۔ کچھ تو عمر کے روگ ہوتے ہیں لیکن دلاور ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا تھا کہ اس کی بیماری کو عمر کا تقاضا سمجھا جاتا۔ یہ سب جوانی کی بے اعتدالی' کثرت مے نوشی' عیاشی اور خوف' خطرات اور اعصابی دباؤ کی زیادتی کا نتیجہ تھا۔

خادم حسین کو مطلع کیے بغیر میں نے قفل کھولا اور باہر سے تالا لگا کے پیدل ہی روانہ ہوگیا پھر ایک موٹر سائیکل سوار نے مجھے ریلوے اسٹیشن تک لفٹ دی اور وہاں سے میں نے نئی سواری کے رفتار چلنے والے تانگے میں سفر کیا تو دس منٹ بعد کراؤن سنیما کے پاس پہنچا تھا۔

سنیما کا انٹرول ختم ہو چکا تھا۔ دکان دار اور گیٹ کے سامنے والے اسٹاپ یعنی ریڑھی لگانے والے کاروبار سمیٹ چکے تھے۔ صرف وہ پان سگریٹ والا مصروف تھا جس کے کھوکھے کی رونق آخری شو کے آخری تماشائی کے رخصت ہونے تک باقی رہتی تھی۔

رابعہ کی کوٹھی کے پلاٹ پر خیمہ جوں کا توں نصب تھا اور نکوی اور پھولے ہوئے گھرے جتنا باکس بھی اپنی جگہ پر موجود تھا۔ میں اسکا کھول کے اندر غائب ہونے ہی والا تھا کہ کسی نے خیمے کے اندر سے فریاد کے انداز میں کہا "یا اللہ۔"

میں چونک پڑا اور میں نے خیمے کے اندر غور سے دیکھا تو مجھے زمین پر کوئی گدڑی میں لپٹا ہوا نظر آیا۔ وہ کوئی فقیر تھا جو خیمے کو خالی پاکر اس پر قابض ہوگیا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اسے سونے دیا جائے۔ اللہ کیا فرق ہے اگر کسی بے گھر کو رات بھر کے لیے پناہ کی جگہ مل جائے لیکن پھر مجھے خیمے کے اسباب میں اضافے کا احساس ہوا۔ شاید فقیر صاحب اپنا سامان بھی اٹھا لائے تھے اور یہاں مستقل آباد ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں نہ آتا تو شاید وہ چار دن میں بجلی بھی لے آتے۔

میں نے فقیر کی بے دخلی پر عمل درآمد کے پروگرام کو واپسی تک موخر کر دیا اور تہ خانے میں اتر گیا۔ اپنے ساتھ میں موم بتی اور ماچس بھی لے گیا تھا جو باکس کے اندر ہی رکھی ہوئی تھی۔

دلاور کی نظریں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوگئی تھیں۔ سماعت بھی قدموں کی آہٹ بھی سن لی ہوگی۔ مکمل خاموشی اور تاریکی ڈھکن اٹھانے کے ساتھ دیکھنے بھی لگتے ہیں۔ ابھی میں نیچے ہی رہا تھا کہ اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ معلوم نہیں وہ کیا چیز تھی اس نے دیوانگی کے جوش میں میری ٹانگوں پر ماری۔ اگر وہ

"میرا مطلب تھا جی اپنے میکے۔"

میں نے چرغے کی آخری رسوم ادا کرکے ڈکار لی "آج رات تم ہی میرے رفیق اور غم خوار ہو۔ ایسا نہ ہو تم بھی ساتھ چھوڑ جاؤ صبح ہونے تک۔"

"بری بات منہ سے کیوں نکالتے ہیں جی۔"

"میں تمہاری خوش خوراکی کا مظاہرہ دیکھ کے ایسا سوچنے پر مجبور ہوں۔ ایک چرغا اور ایک سیر مچھلی کھا چکے ہو تم۔ کسی کی نظر نہ لگ جائے تمہیں۔ سب دیکھ رہے ہیں۔"

"اچھا جی۔ چلیں پھر یہاں سے۔ اب کہیں اور جا کے کھیر کھائیں گے اور پھر ایک گلاس لسی کا پی کے خدا کا شکر ادا کریں گے۔"

"یعنی خدا کا شکر بھی اس سے پہلے ادا نہیں کرو گے؟ خیر بل ادا کرو۔"

وہ چونکا "میں۔ کہاں سے ادا کروں گا۔ غریب آدمی۔"

میں نے کہا "خادم حسین۔ اتفاق سے آج میری جیب خالی ہے۔ گھر سے پیسے لانا یاد نہیں رہا۔ تمہاری جیب میں تو دو ہزار ہیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "مگر یہ تو امانت میں خیانت ہوگی جناب۔"

"اور یہ حماقت میں نجاست ہوگی اگر جیب میں رقم ہونے کے باوجود تم نے بل ادا کیے بغیر فرار ہونے کی کوشش کی۔ اس پہلوان کو دیکھ رہے ہو جو راستے میں کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ہے۔ تمہیں بھی مچھلی کے ساتھ فرائی کردے گا۔"

خادم حسین مسکرانے لگا "آپ بھی تو ساتھ ہیں آخر۔"

میں نے کہا "میں تو ہوں پردیسی خادم حسین۔ فوراً بول کے انجان بن جاؤں گا اور اشاروں میں واضح کردوں گا کہ مجھے تم لائے تھے۔ تم نہیں بچ سکتے۔"

"آپ بعد میں مجھے لوٹا دیجیے" خادم حسین بولا "سارا گناہ آپ کے سر۔"

"یار گناہ تو پہلے ہی پہاڑ جتنا ہے خادم حسین۔ اس پر ایک کنکری اور رکھنے سے کیا فرق پڑے گا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

رابعہ کی آفس بلڈنگ کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ یہ میری یعنی قائم مقام چوکیدار کی نااہلی تھی مگر مجھ سے زیادہ اصل چوکیدار کی بدمعاشی تھی جو چھٹی لے کر گیا تھا تو لوٹ کے آنا ہی بھول گیا تھا۔ غنیمت ہے کہ ابھی تک کسی کو اس بے پرواہی سے نقصان نہیں ہوا تھا۔ سب لوگ اپنے آفس بند کرکے جاتے ہوئے فرض کرلیتے تھے کہ بلڈنگ کو بعد میں چوکیدار مقفل کردے گا اور وہ سامنے نہیں تو کوئی بات نہیں۔ ہوگا آس پاس ہی۔ صبح سب کو بلڈنگ کا مین گیٹ کھلا ہوا ملتا تھا تو بھی فرض کرلیا جاتا ہوگا کہ چوکیدار اپنا کام کر رہا ہے۔

www.paksociety.com

چند لمحے انتظار کرنا تو اسے میرے سر پر وار کرنے کا موقع مل جاتا۔ میں لٹک کر نیچے اُترا تھا۔ اس نے جلدی میں سوچا نہیں اور میں بال بال بچ گیا۔

میری ایک ٹانگ پر ضرب خاصی شدید پڑی تھی اور نیچے گرنے کے بعد میں اس قابل نہیں رہا تھا کہ فوراً کھڑا ہو سکوں لیکن دلاور نے دوبارہ حملہ کیا تو میں نے دوسری لات ماری اور وہ بلبلا کے دور جا گرا۔ میں نے اندھیرے میں ایک سایہ سا دیکھ کے لات چلائی تھی جو اس کے سینے پر پڑی تھی۔ اُٹھنے کے لیے مجھے اتنی مہلت بہت تھی لیکن میں سیدھا کھڑا ہوتا تو شاید دلاور پھر وار کرتا۔ میں نے

پہلے ماچس کی ایک تیلی روشن کی اور دلاور کی پوزیشن دیکھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا اور وہ دیوانہ وار مجھ پر حملہ کرنے آ رہا تھا۔ وہ کسی کرسی کا پایہ تھا جو دلاور کے ہاتھ میں ایک خطرناک ہتھیار بن گیا تھا۔

میں نے اسے قریب آنے کا موقع دیا اور آخری لمحے میں جلتی سلائی پھینک کر پہلو کے بل پلٹ کے ایک طرف ہو گیا مگر اپنی ٹانگ دلاور کی راہ میں اَڑا دی۔ وہ منہ کے بل گرا تو میں کھڑا ہو گیا۔ دوسری ماچس جلا کے میں نے دلاور کو جا لیا۔ اس کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ گیا تھا۔ اس نے میری طرف اور پھر اپنے ہتھیار کی طرف دیکھا مگر اسے آگے بڑھنے کا موقع بھی نہ ملا۔

میں نے اس کی ٹانگ پکڑی اور وہ پھر گرا۔ اس نے لاتیں چلا کے خود کو چھڑانے کی پوری کوشش کی۔ اس کے ہاتھ آگے پھیلے ہوئے تھے مگر ڈنڈا بہت دور تھا۔ میں نے اسے گھسیٹ لیا اور کمرے کی آخری دیوار تک کھینچ کرلے گیا۔

وہ مجھے گالیاں بک رہا تھا اور پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ خوف، احساس بے بسی اور تنہائی نے اس کے ذہن پر بُرا اثر ڈالا تھا۔

موم بتی روشن کر کے میں نے اسے خیردار کیا "دلاور۔ مجھ سے دور رہو ورنہ۔"

"ورنہ کیا۔ ورنہ تو مار ڈالے گا مجھے سور کے بچے۔ مار دے مار دے مجھے۔ میں ایسے زندہ رہنا نہیں چاہتا" وہ چلانے لگا۔

میں نے موم بتی کو ایک طرف رکھ دیا۔ "موت تو کسی کو بھی وقت سے پہلے نہیں آتی۔ تم تو ابھی بہت دن زندہ رہو گے۔ ایک وقت آئے گا جب تم منت سماجت کرو گے۔ ہاتھ جوڑو گے اور موت کی خواہش کرو گے مگر میں تمہارے قتل کا الزام اپنے سر کیوں لوں۔ مارنا ہوتا تو میں نے تمہیں بہت پہلے مار دیا ہوتا۔"

وہ فرش پر بیٹھ گیا "پھر کیا چاہتے ہو تم مجھے بتاؤ۔"

"تم یہ سوال کر رہے ہو؟ حیرت ہے" میں نے کہا "تم واقعی پاگل ہو گئے ہو۔ تم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے یہ بات کہ میں کیا چاہتا ہوں؟"

"مجھ سے سب کچھ لے لو سکندر۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ لے لو" وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔

میں نے کہا "تمہارے پاس اپنا کچھ نہیں۔ سب کچھ میرا ہے جس پر تم قابض تھے۔ میرا حق تو مجھے مل جائے گا مگر تمہاری سزا کا قرض پھر بھی باقی رہے گا۔ تم قاتل ہو۔"

"ہاں ہاں۔ میں قاتل ہوں۔ میں نے قتل کیا تھا۔" میں نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ اب مجھے جو سزا دینی ہے دے دو۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ پھانسی دینا تو جلاد کا کام ہے۔ میں تو بتا رہا ہوں تمہیں۔ قتل تم نے ایک رزم خان کا ہی نہیں تمہارے دامن پر تو ہزاروں بے گناہوں کے خون کے دھبے ہیں۔ فرصت میں حساب کر کے دیکھنا کہ جتنا اسلحہ تم نے بیچا تھا اس سے کتنے لوگ مارے گئے ہوں گے۔ ان کا تم ہی کر سکتے ہو کیونکہ اسلحے کا اس کی فروخت سے ملنے والی رقم کا حساب بھی تمہارے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تم نے اندازے قائم کرنے تھے۔ تم نے ایک ایک کوڑی کا اور ایک پائی کا حساب رکھا ہوگا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ پورے پاکستان میں تم نے کتنے لوگوں کے لیے موت کے فرمان جاری کیے تھے۔ اس کے لیے کرانے کے کتنے قاتل حاصل کیے تھے اور کیا معاوضہ ادا کیا تھا۔"

وہ گھٹنوں پر سر رکھ کے روتا رہا۔ اس کی حالت بگڑ چکی تھی جیسی ہو رہی تھی۔ اب تک اس کے تن پر وہی کپڑے تھے جو اس نے گرفتاری کے وقت زیب تن کیے تھے۔ یہ کپڑے مٹی اور غلاظت میں اٹ گئے تھے اور جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے۔ شیو اتنی بڑھ گئی تھی کہ داڑھی نظر آنے لگی تھی اور اس کا چہرہ بدلا لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں اور ان کے گرد حلقے نمودار ہو چکے تھے۔ اس کے سر کے بال اچانک سفید ہو گئے تھے اور وہ اپنی اصلی عمر سے بیس پچیس سال زیادہ کا نظر آتا تھا۔ غالباً ذہنی فکر اور اذیت کا نتیجہ تھا کہ اس کے بال بالکل سفید ہو گئے تھے۔ وہ بہت صحت مند جوان نوبی نظر آتا تھا۔

اس کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ بسکٹ کے ڈبے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ بوتل میں پانی بھی نہیں تھا۔ مجبور تھا کہ اسی جگہ کو حوائج ضروریہ سے فراغت کے لیے استعمال کرے۔ کمرے میں پیشاب پاخانے کی بدبو بھر گئی تھی۔ ہوا کے اخراج کا انتظام نہ ہونے سے یہ تعفن زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ میں یہاں رہتا تھا تو یہ ایک صاف ستھرا اور بڑی خوب صورتی سے آراستہ بیڈ روم تھا جس میں ائرکنڈیشنر کام کرتا تھا اور روشنیاں جگمگاتی تھیں۔

جب میں واپس آنے لگا تو دلاور میرے پیچھے دوڑا "خدا کے لیے مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔"

اچانک میں نے کہا "تمہیں معلوم ہے وہ سب کھانے پینے کا سامان کہاں ہے جو یہاں رکھا ہوا تھا؟ بولو نہیں تو تیرا پیٹ پھاڑ کے سب نکال لوں گا۔"

وہ گھگھیانے لگا "کیا ہوا اگر وہ چار روز بے ہنگم کے ہم فقیروں نے کھا لیے۔ رزق کی ضرورت ہو گئی تھی۔ مجبور اور محتاج۔"

میں نے کہا "میں جانتا ہوں تم جیسے بنے ٹھنے محتاجوں کی بے حد مجبوری کو۔ سارا دن گھر گھر سے ملنے والا نوالہ بھی تم پیٹ بھرنے کے بعد سو کھی روٹیاں بیچ کے رقم رکھتے ہو یا نشہ کرتے ہو۔ اُدھر دکھاؤ مجھے اس جھولے میں کیا ہے؟"

"کچھ نہیں بابا! فقیر کی جھولی میں کیا ہوگا۔ خیرات کے ٹکڑے اور پھٹے پرانے کپڑے" اس نے بیگ پیچھے کر لیا۔

میں نے بیگ چھین کے اُلٹ دیا۔ اس میں وہ سب بسکٹوں کے ڈبے اور کھانے پینے کی چیزیں اور جو بھری ہوئی تھیں جو ہم نے ضرورت کے لیے خیمے میں رکھ دی تھیں۔ ان سب کے ساتھ نقد مال بھی فرش پر بکھر گیا۔ یہ بلا مبالغہ ہزاروں روپے تھے۔

فقیر دیوانہ وار نوٹ پھر جھولے میں بھرنے لگا۔ "ارے ظالم دیکھو تیرے فقیروں کے مال پر بُری نیت رکھتا ہے۔ اللہ تجھے غارت کرے۔"

میں نے کہا "یہ سب سمیٹو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ شور مچانے فقیر ورنہ پولیس آ گئی تو اندر ہو جاؤ گے اور یہ سارا مال بھی ہاتھ سے جائے گا۔ اتنی دولت جمع کر رکھی ہے اور پھر بھی ہاتھ پھیلاتے ہو۔"

"ہاتھ کون نہیں پھیلاتا بابا۔ کیا تم کسی کے محتاج نہیں ہو۔" وہ بڑبڑاتا ہوا ایک بغل میں گدڑی اور سر پر ٹین کا بڑا سا صندوق رکھ کے روانہ ہو گیا۔ اصل خزانہ یعنی وہ بیگ جس میں اس کی ساری رقم محفوظ تھی اس نے بازو والے اسٹریپ کی مدد سے کندھے پر لٹکایا تھا۔

خالی ڈبوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ فقیر نے خوب پیٹ بھر کے سب کچھ کھایا تھا پھر بھی جو بچ گیا تھا دلاور کو وہ چار دن کے لیے کافی تھا اگر میں بروقت نہ دیکھتا تو وہ فقیر مجھے باکس کے راستے آتا جاتا دیکھ لیتا اور شک میں پڑ جاتا۔ خالی پلاٹ پر ناجائز قابضین اسی طرح نمودار ہوتے ہیں۔ جب جگہ خالی دیکھ کے فقیر نے ڈیرا جما لیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ یہاں کسی کو چوکیدار مقرر کرنا چاہیے بلکہ جب تک دلاور یہاں ہے مجھے خود رات یہاں گزارنی پڑے تو کوئی حرج نہیں۔

میں نے دلاور کو خوراک اور پانی فراہم کرنے کے بعد ٹوٹی ہوئی کرسی کو دیکھا۔ کرسی مضبوط تھی مگر دلاور نے اس کی ٹانگ توڑ کے اسے ہتھیار بنا لیا تھا۔ اس میں اتنی طاقت تھی تو وہ اگلی مرتبہ دار کے کمرے کا دروازہ بھی پھاڑ سکتا تھا لیکن اس وقت میں اکیلا فرنیچر نکال

"پھر کیا تمہارے ساتھ باقی زندگی اسی زنداں میں گزاروں۔ یہ زنداں تو خود تم نے اپنے لیے بنایا تھا۔ ورنہ یہ ایک محل نما کوٹھی کا سب سے زیادہ پُر تکلف اور آرام دہ کمرا تھا۔ اس کوٹھی کو بنایا بھی تم نے تھا اور کھنڈر میں بھی تم نے تبدیل کیا تھا۔"

"میں مر جاؤں گا۔ مجھ پر رحم کرو۔"

"بالآخر ہم سب مر جائیں گے۔ ابھی میں تمہیں زندہ رکھنا چاہتا ہوں لیکن تم خود کشی کرنا چاہو تو دیوار سے سر ٹکرا کے مر سکتے ہو۔ کم سے کم اس کی کوشش ضرور کر سکتے ہو اور کچھ تو ہے نہیں نہ خنجر نہ ریوالور۔ نہ زہر اور نہ پھانسی کا پھندا بنانے کے لیے رسی۔ نہ بجلی ہے کہ تم خود کو ELECTRICUTE کر سکو اور نہ خود کو آگ لگا سکتے ہو۔ ویسے بھی تم مایوس ہو کے ہمت ہارنے والے نہیں ہو۔ تم اس لیے میرے دشمن ہو کہ اس کے اہل ہو۔ کوئی کم ہمت بزدل اور احمق نری مجھ سے دشمنی نبھا ہی نہیں سکتا۔ دوستی تو ناممکن تھی مگر تم کو دشمن کہتے یا سمجھتے سے میری توہین نہیں ہوتی۔"

میں دلاور کے سامنے جتنا مطمئن نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا اندر سے اتنا ہی متفکر ہو رہا تھا۔ اس کی دیوانگی میں جنون کے آثار ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کی حیثیت کیا ہے۔ وہ کس حد تک مجبور ہے اور میں کتنا اختیار رکھتا ہوں۔ اسے اپنی فرد جرم کا علم تھا اور یہ معلوم تھا کہ میں سزا کی بات کیوں کر رہا ہوں۔ اس کا دماغ ابھی کام کر رہا تھا۔ صرف قید اور چوبیس گھنٹے کی پُر عذاب تنہائی بھوک پیاس اور جسمانی تکلیف اس کے اعصاب کو شکست دینے لگی تھی اور کبھی کبھی وہ بے اختیار ہو کے اشتعال میں ہوش کھو بیٹھتا تھا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ بالآخر اس کی قوت برداشت بالکل جواب دے جائے گی تو پاگل پن کے مختصر اور عارضی دورے مستقل دیوانگی میں ڈھل جائیں گے۔ مجھے اس انتہا تک جانے سے گریز کرنا تھا اور دلاور کو اسی طرح زندہ اور صحت مند رکھنا تھا جیسے جیل والے سزائے موت پانے والے قیدی کو رکھتے ہیں۔

اور آتے میں میں نے فقیر بادشاہ کی گدڑی کھینچ لی۔ وہ ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ "کون۔ کون ہے کھوتا۔"

میں نے کہا "جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔"

"فقیروں کو تنگ کرتا ہے۔ چل پھوٹ ادھر سے۔ سونے دے ہمیں۔" اس نے مجھے خمار غنودگی میں ڈانٹا "ہم ملنگ لوگ ہیں۔"

میں نے اس پر پانی کا جگ اُنڈیل دیا۔ "یہ کیا تمہیں جہیز میں ملنے والے محل کا بیڈ روم ہے۔ تم جہاں تھے کیسے ملنگ کی اولاد۔ چلو اٹھاؤ اپنا بوریا بستر۔ ورنہ میں تمہیں بھی اسی میں لپیٹ کر سڑک پر پھینک دوں گا۔"

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا "اچھا اچھا۔ خفا کیوں ہوتے ہو شہزادی بادشاہ۔ ہم تو خالی جگہ دیکھ کے آ گئے تھے کہیں اور لے جاتے ہیں اپنا ڈیرا۔ فقیروں کا کیا ہے۔ خدا کی ساری زمین اپنی ہے۔ آسمان

www.paksociety.com

دلاور کی بیوی نے مجھے جو کارڈ دیا تھا اس پر بھی ڈیوس روڈ والے آفس کا نمبر تھا چنانچہ مجھے امید تھی کہ یہ لڑکی ابھی مسٹر دلاور کو فون کرکے ساری بات بتا دے گی۔ پہلے اس کی جگہ ایک بے وقوف جیسی ٹائپ شخص ہوتا تھا جو شاید اس لیے رخصت کردیا گیا ہوگا کہ وہ رات کو سوتا ہوا ملتا تھا۔ رات کے وقت کسی کو وائرلیس فون پر اس لیے تو نہیں بٹھایا جاتا کہ جب اچانک ارجنٹ کال آئے تو ریسیو کرنے والا خواب خرگوش میں ہو۔

چوہدری دلاور کے سب دھندے خفیہ اور پراسرار تھے۔ ابھی مجھے معلوم نہیں تھا کہ سی ڈی انٹرپرائز کہاں ہے اور اس آفس میں رات کے وقت کیا کام ہوتا ہے مگر ٹیلی فون ریسیو کرنے کے لیے ایک ہوشیار لڑکی کا موجود ہونا یہی ثابت کرتا تھا کہ وہاں دنیا کے کسی بھی حصے سے کسی بھی وقت کال آجاتی ہوگی۔ اگر آدھی دنیا میں رات ہو تو باقی آدھی دنیا میں دن رہتا ہے اور آدھی دنیا اس حصے میں سو جاتی ہے تو دوسرے حصے میں لوگ جاگ رہے ہوتے ہیں اور کاروبار حیات جاری رہتا ہے۔

حسب توقع دس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی اور میں نے ریسیور اٹھا کے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے دلاور کی بیوی کی آواز سنائی دی۔

"کون بول رہا ہے؟"

"میں چوکیدار ہوں جی۔ حکم؟"

"دیکھو چوکیدار۔ یہ رابعہ کا آفس ہے نا؟"

"یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آدھی رات کو آپ نے کدھر فون کیا ہے" میں نے احمقانہ لہجے میں کہا "اور حکم؟"

"مجھے رابعہ سے بات کرنی ہے۔ ابھی۔"

"تو کریں؟ مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے اور کوئی حکم؟"

"بدتمیز آدمی۔ مجھے فون نمبر چاہیے ان کے گھر کا۔"

"گھر کا فون تو نہیں ہے بی بی اور ہوتا بھی تو میں آپ کو نہ بتاتا۔"

وہ برہمی سے بولی "وہ جو باہر سے ایک وکیل آیا ہوا ہے۔ وہ کہاں ملے گا اس وقت؟"

"مجھے کیا پتا جی۔ کوٹھی میں ملے گا یا کوٹھے پر۔ آپ کو آدھی رات کے وقت اس کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ گھر میں اور محلے میں کوئی مرد نہیں آپ کے کام کا؟"

"کیا بکواس ہے۔ کیسا کام؟" وہ گرم ہوگئی۔

"برا کام ہے تو نہیں کیا جی اور برا ہے تو کیا...." میں نے کہا مگر مجھے زنانہ لغت کی چند فحش گالیوں سے نواز کے اور نکلوانے کی دھمکی دے کے اس نے فون رکھ دیا۔

صرف تصدیق کے لیے میں نے سی ڈی انٹرپرائز کے کارڈ پر چھپا ہوا فون نمبر ملایا تو وہی آواز سنائی دی۔

"جی سر؟"

میں نے کہا "ہیلو کیا حال ہے؟"

وہ چکرا گئی "جی۔ آپ کو کس سے بات کرنی ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو ناراض مت ہونا۔ ایک رات مجھے نیند نہیں آرہی تھی تو میں نے تمہیں فون کیا تھا اور تمہاری آواز کا رس میرے کانوں میں ٹپکا تو میں سکون سے سو گیا تھا۔"

وہ ہنسی "ایسی کیا بات ہے میری آواز میں؟"

"یہ پوچھو کیا نہیں ہے اس نغمہ ساز میں۔ آبشار کا ترنم پہاڑی ندی کا سنگیت۔ برسات کی رم جھم۔"

"آپ کوئی شاعر ہیں جو راتوں کو جاگتے ہیں یا آوارہ گرد... سمجھا کے کسی لڑکی سے بات کرنا آپ کی ہابی ہے۔"

"کچھ بھی سمجھ لو۔ بات تو تمہاری آواز کی ہے اس میں نرمی اور مٹھاس ہے۔ جو نشہ ہے اور خمار ہے وہ شہد میں کہاں... نہ افیون میں اور نہ شراب میں۔"

"سب آزما چکے ہوں گے آپ۔ تجربے کی بات کررہے ہیں... صرف بکواس۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "اور جب آواز کا یہ انداز ہے تو حسن کا جلوہ کتنا قاتل ہوگا۔ تھری ناٹ تھری کی گولی سے بچ کر۔ گیارہ ہزار وولٹ کے کرنٹ سے زیادہ۔ سائنائیڈ سے زیادہ مہلک۔ میں نے تمہیں دیکھا نہیں مگر تم حسن کا ایٹم بم ہو۔"

"سو جائیں مسٹر۔ فالتو وقت نہیں ہے میرے پاس۔" اس نے فون بند نہیں کیا۔ ایسی باتیں کسے اچھی نہیں لگتیں۔

"ہاں۔ اب مجھے نشہ ہورہا ہے۔ نیند آرہی ہے۔ آج خواب میں تم کو دیکھوں گا مس ایٹم بم۔ میں وعدہ کرتا ہوں کوئی بدتمیزی نہیں کروں گا... آؤ گی نا خواب میں مس ایٹم بم؟"

وہ ہنسی "تم تو پاگل ہو۔ میرا نام مس ایٹم بم نہیں حسینہ ہے۔"

فون بند ہوگیا تو میں ہنسا۔ میری باتیں اسے پسند آئی تھیں۔ انداز تغافل ظاہری عدم دلچسپی اور خفگی کے باوجود اس نے اپنا نام بتا کے مجھے سلسلہ جاری رکھنے کا اجازت نامہ عطا کردیا تھا۔ کسی حد تک سب کی کمزوری ہے اور اپنی تعریف سن کے... نہیں ہوتا۔ عورت اگر واقعی حسین ہو تو اسے بطور خراج تحسین وصول کرتی ہے اور بدصورت ہو تو سچ سمجھ کے خوش ہوتی ہے۔ بے وقوف لڑکی ایسے ہی لفظوں کے جال پھینکنے والے شکاری کے دام میں گرفتار ہوجاتی ہے اور جب کھوکھلے لفظوں کا بھرم ٹوٹتا ہے تو روتی ہے۔

میرا ذہن اب زیادہ مستعد ہوگیا تھا۔ نیند کا کوسوں پتا نہیں تھا چنانچہ میں نے منظر کو فون کیا۔ کچھ دیر تک دوسری طرف گھنٹی مسلسل بجتی رہی۔ بالآخر خود منظر نے خواب آلود آواز میں "ہیلو" کہا۔

"معاف کرنا اپنے منظر صاحب نیند نہیں آرہی تھی مجھے..."

ریسیور میں سرسراہٹ کی جگہ شور سنائی دیتا اور ٹیوننگ کے ٹھیک ہونے کا پتا نہ چلتا۔

میں منتظر تھا کہ ایک جانی پہچانی آواز پوچھے کہ "تم کون ہو؟" میں حسب سابق جواب دوں کہ "تمہارا باپ" اور کسی ردعمل کے بعد ایک دوسرے کو پہچان کے ہم کام کی بات کریں مگر ایک شائستہ اور شیریں لہجے والی نسوانی آواز نے کہا "جی سر؟"

میں نے آواز بدل کے انگریزی میں کہا "کیا میں مسٹر چوہدری سے بات کرسکتا ہوں؟"

"مسٹر چوہدری تو موجود نہیں ہیں سر۔"

"مجھے معلوم ہے وہ اس وقت کہاں ہوگا۔"

اس نے تھوڑے توقف کے بعد کہا "اچھا؟ پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں مسز دلاور سے بات کرنا چاہتا تھا۔"

"مسز دلاور سے.... سوری سر۔"

"کیا تم مجھے ان کا فون نمبر دے سکتی ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں سر۔ مجھے معلوم نہیں۔ ویسے بھی پرائیویٹ فون نمبر ایسے تو نہیں بتائے جاسکتے" اس نے معذرت کی۔

"اچھا تم ان کو پیغام تو دے سکتی ہو؟"

"آپ کون ہیں سر۔ اپنا نام بتائیے۔ میں صبح کوشش کروں گی۔"

میں نے کہا "نام سے شاید ان کو یاد نہ آئے میں ڈاکٹر شبلی کا نمائندہ ہوں۔ لندن سے بات کررہا ہوں۔ میں نے یہاں سے موسیو نورے کو بھیجا تھا۔ وہ ایک مشہور وکیل ہیں۔"

"میں مسز دلاور سے کیا کہوں سر؟"

"ان سے کہو کہ وکیل نے مجھ سے پوچھا تھا اور میں نے اسے اجازت دے دی ہے۔ وہ معاملات طے کرا سکتا ہے۔ بس یہی پیغام ہے۔"

"آپ اپنا فون نمبر یا پتا لکھوائیں گے؟"

"نہیں۔ مسز دلاور جانتی ہیں کہ موسیو نورے کہاں مل سکتے ہیں" میں نے کہا اور پھر اچانک ایک خیال کے تحت اندھیرے میں تیر چلایا۔ "یہ چوہدری دلاور کا ڈیوس روڈ والا آفس ہے نا۔ سی ڈی انٹرپرائز؟"

لڑکی نے غالباً بوکھلا کے پہلے کہا "جی سر..." پھر بولی "میرا مطلب ہے آپ کو علم ہونا چاہیے کہ آپ نے کہاں فون کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں کنفرم کررہا ہوں۔"

ریسیور رکھ کے میں نے اپنے آپ سے کہا "وہ مارا پاپڑ والے کو" یہ بات میں اور محسن یا غالب کسی بڑی کامیابی پر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کے کہتے تھے۔ اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا تھا اور مجھے دلاور کے خفیہ ریڈیو فون کا سراغ مل گیا تھا۔

بھوت یا مُردوں کا مجھے کوئی ڈر نہیں۔ ایک بار آیت الکرسی پڑھ کے اور چاروں طرف پھونک مار کے دم کردوں گا تو کوئی خواب میں نہیں آسکتا" وہ ایک دم اداس ہوگیا "ہاں وہ نیک بخت آسکتی ہے۔ میری گھر والی۔ بہت دن ہوگئے۔"

میں نے اسے ڈانٹا "گویا اب تم قابل اعتراض خواب دیکھو گے مولوی خادم حسین۔ خیر مجھے کیا' میں تمہارے اخلاق و کردار کا ذمے دار نہیں ہوں۔"

انتہائی مضطرب اور بدحواس نظر آنے والا خادم حسین چند منٹ میں گھوڑے بیچ کے سو گیا۔ مجھے اس کے خراٹے سنائی دیے تو حیرانی ہوئی۔ ذہنی انتشار کی ایسی کیفیت میں اتنی جلدی سکون کی نیند سو جانا میرے لیے ناممکن نہ سہی انتہائی مشکل کام تھا۔

میں نے بیڈ کے نیچے سے پرانا وائرلیس ریڈیو فون نکالا جو عرصے تک میرے اور دلاور کے درمیان رابطے کا مؤثر اور محفوظ وسیلہ بنا ہوا تھا مگر اب بے کار پڑا تھا۔ اس کی بیٹری کمزور پڑ چکی تھی۔ میں نے اسے پلگ میں لگایا تو بیٹری کی پاور بتانے والی روشنی سرخ رہی۔ اس کے سبز ہونے میں کچھ وقت درکار تھا۔ میں چھت پر گیا اور ایک ریڈیو ایریل سے ٹرانس میٹر ریسیور کا تار منسلک کردیا۔ تار کا دوسرا سرا میں نے نیچے لٹکا دیا اور پھر کھڑکی سے ہاتھ بڑھا کے پکڑ لیا۔ اونچے اور لمبے ایریل کے استعمال سے آواز صاف بھی ہوجاتی تھی اور اس کی RANGE بھی بڑھتی تھی۔

خادم کے کمرے میں لائٹ جل رہی تھی لیکن اسے فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ میں نے کچن میں اپنے لیے ایک کپ کافی بنائی اور باہر آتے ہوئے لائٹ بجھا کے دروازہ بند کردیا۔ بیٹری کی لائٹ ابھی تک ریڈ تھی۔ میں نے رابعہ کے کیبن میں میز کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کے کافی پی۔ آج میرا پروگرام پھر رابعہ کے ساتھ وزیر خان اسپتال کے اندر جانے کا تھا۔ اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہوجاتے تو ہمیں پتا چل جاتا کہ وہاں کتنے قیدی ہیں اور علاج کے نام پر ان کے ساتھ کیا ظلم ہورہا ہے۔ ان مریضوں کو رہا کرانا تو ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ شاید پولیس بھی قانونی طور پر ایسا نہیں کرسکتی تھی لیکن بعد میں اپنے طور پر ہم معاملات سے بخوبی نمٹ سکتے تھے۔ ابھی تو اصل مقصد یہ دیکھنا تھا کہ کیا غالب اور نازو کو بھی اسی اسپتال میں قیدی بنا کے رکھا گیا ہے۔ ان کی رہائی اور بازیابی دوسرے تمام مسائل پر فوقیت رکھتی تھی لیکن ابھی تک ہم نے ان کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ معلوم نہیں اس وقت وہ کہاں ہوں گے اور کیا سوچ رہے ہوں گے۔

اچانک بیٹری کی لائٹ گرین ہوگئی اور میں نے ریڈیو کو آن کرکے ہیڈ فون کانوں پر چڑھا لیے۔ ہیڈ فون سے منسلک مائیکرو فون خود میرے سامنے آگیا۔ اس کی ٹیوننگ کو کسی نے بھی نہیں چھیڑا تھا۔ میرے کانوں میں ہلکی ہلکی سرسراہٹ آرہی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ دوسری طرف کے ریسیور کی فریکوئنسی یہی ہے اور میرا مواصلاتی رابطہ قائم ہوچکا ہے۔ ایریل اونچا نہ ہوتا تو

www.paksociety.com

کے اوپر نہیں لے جاسکتا تھا اور نہ میرے لیے یہ ممکن تھا کہ میں دلاور کی نقل و حرکت کو محدود کر دوں۔ میں اسے باندھ کے ڈالتا تو وہ یقیناً مر جاتا۔ دن کا وقت ہوتا اور بازار کھلے ہوتے تو میں کہیں سے زنجیر اور قفل لے آتا اور دلاور کے ایک پاؤں میں بیڑی ڈال کے دوسرا سرا دیوار میں نصب ہک سے یا روشن دان کی سلاخ سے جوڑ دیتا پھر دلاور دو تین گز کے دائرے میں رہتا اور اس کا ہاتھ ان چیزوں تک نہ پہنچ پاتا جو میں اس کے قریب رکھ جاتا۔ باقی سامان اس کی دسترس سے بھی دور رہتا۔

دلاور اب نسبتاً پرسکون تھا "آخر تم نے کیا سوچا ہے۔ کیا کرنا چاہتے ہو تم۔ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی کی لاش قبر سے نکال کے اس کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا ہے کہ اسے قتل کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر شیلی کے دوستوں نے برطانیہ سے ایک وکیل بھیجا ہے۔ اس کے پاس زیادہ تفصیلات ہیں۔ وہ D.N.A ٹیسٹ سے ثابت کر دے گا کہ ڈاکٹر شیلی تمہاری سوتیلی بہن تھی۔ اس کا اور تمہارا باپ ایک ہی تھا۔"

"یہ کوئی قیامت تک ثابت نہیں کر سکتا۔"

"قیامت تو بہت دور کی بات ہے۔ تختۂ دار پر تم اس حقیقت کو تسلیم کر لو گے۔ تم ایک جاہل آدمی ہو۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ آج کل D.N.A ٹیسٹ سے سات پشتوں کا سراغ لگایا جاسکتا ہے اور یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ کون کس کی اولاد تھا۔ یہ ثبوت اتنا ہی ناقابلِ تردید ہوتا ہے جتنا ریاضی کا فارمولا۔ اس کے بعد لندن سے اس عینی شاہد کو لایا جائے گا جس نے تمہیں دہرا قتل کرتے دیکھا تھا۔ تم نے اپنے باپ کی دوسری بیوی اور اس کے تیسرے شوہر کی گرل فرینڈ کو شیلی سمجھ کے قتل کیا تھا۔ وہ عینی شاہد ایک نکمو ہے۔ شیلی کی ماں کا تیسرا شوہر جو بے گناہ اس جرم میں جیل کاٹ رہا ہے جو تم نے کیا تھا۔"

"مجھے پھانسی ہو جائے گی تو تمہیں کیا حاصل ہوگا؟ تمہیں کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ وزیر خان کا قاتل کون تھا اور اس کی لاش اب کہاں ہے؟"

میں نے کہا "دلاور۔ تمہاری چالاکی اب نہیں چلے گی۔ پہلے میں تم کو ٹھکانے لگا دوں پھر پیڈرو سے بھی نمٹ لوں گا۔ وہ سب بتا دے گا۔"

"قانون کی نظر میں تم مجرم ہی رہو گے۔"

"مجھے سامنے آنے کی ضرورت بھی نہیں۔ تمہیں پولیس گرفتار کرے گی اور تم پر عام عدالت میں مقدمہ چلے گا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مدعی میں نہیں، رابعہ ہے۔ اس کے ساتھ وکیل اور بھی ہیں۔ یہ قید خانہ ہی ایک کال کوٹھری ہے دلاور۔ تم یہاں سے نکلو گے تو جیل کی سلاخوں کے پیچھے جاؤ گے اور وہاں سے اس دن نکلو گے جس دن صبح دم تمہیں پھانسی دی جائے گی۔

تمہارے خلاف میر شرافت علی کے قتل کی ایف آئی آر [illegible] چاندنی بیگم اور گوگو پہلوان کے قتل کی بہت جلد [illegible] وقار یوسف کے سسر کو اسپتال میں قتل کروایا تھا۔ ایسے [illegible] درجن مقدمات کے گواہ اب سامنے آگئے ہیں [illegible] کے ساتھ۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے نوے دیا تھا [illegible] گواہ ہے نہ ثبوت مگر باقی [illegible] تمہیں دس بار موت کی [illegible] کے لیے کافی ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ میرے خلاف بھی مقدمات بہت ہیں اور میں ایک مفرور مجرم [illegible] پکڑا نہیں گیا اور نہ میں پکڑا جاؤں گا۔ میں [illegible] ہو جاؤں گا۔ کیا ضرورت ہے مجھے سکندر بخت کے نام سے [illegible] رابعہ کے ساتھ میں کہیں بھی رہ سکتا ہوں۔ یہاں یا باہر کے ملک میں۔ میرے دوست بہت ہیں اور میرا محافظ خدا ہے۔ تمہارے سب دشمن ہیں اور تمہارا ساتھی شیطان تھا جو اب ساتھ چھوڑ چکا ہے۔"

دلاور کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ وہ خدا رسول کے واسطے [illegible] میرے پیچھے دوڑا مگر میں نے اسے لات مار کے پیچھے گرا دیا اور باہر نکل گیا۔ دلاور آسانی سے شکست تسلیم کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ آخری وقت تک مقابلہ کرے گا۔ دولت لٹا کے جان بچانے کی پوری کوشش جاری رکھے گا۔ عدالت میں پیشی سے تمام امیدیں وابستہ کیے بیٹھا ہے گا۔ بڑے سے بڑے وکیل کی خدمت حاصل کرے گا۔ رشوت [illegible] گواہوں کو خریدنے اور ثبوت مٹانے کے لیے تجوریوں کے منہ کھول دے گا۔ نیچے سے اوپر تک سب کو خریدنے کے لیے ساری دولت لٹا دے گا اور آخری وقت تک اس یقین سے دستبردار نہیں ہوگا کہ نظامِ انصاف اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر سپریم کورٹ نے بھی اس کی سزائے موت بحال رکھی تو وہ صدر سے رحم کی اپیل منظور کرا لے گا۔

چنانچہ میرا یہ یقین غلط نہیں تھا کہ دلاور خودکشی نہیں کرے گا خواہ میری قید میں اس پر کتنی ہی سختی کیوں نہ ہو۔

رات کے ایک بجے میں واپس آفس پہنچا تو مولوی قاسم بھی سخت پریشانی کا شکار تھا۔

"کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ ایسے غائب ہو گئے جیسے [illegible] جاتے؟" اس نے خفگی سے کہا۔

"تمہارا لہجہ اور تمہاری باتیں کسی شوہر پرست وفا شعار [illegible] کرنے والی بیوی کی طرح ہیں" میں نے کہا۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ اکیلے جی۔"

"کیوں۔ یہاں جن بھوت نظر آ رہے تھے؟" میں نے کہا۔

"دراصل آج تم نے اتنے مُردے دیکھے ہیں کہ خواب میں [illegible]"

"بس بس۔ مجھے اور مت ڈرائیے۔ میں سونا چاہتا تھا جناب۔ آپ کے انتظار میں مجبوراً جاگ رہا تھا اور جناب [illegible]

[illegible] میں چاہتا ہوں وہ کام اسی وقت ہو جائے۔ میں چابیاں نکال لی ہے [illegible] ابھی ڈلیور کر دوں۔ صبح ہونے سے پہلے اسے [illegible]

"پھر کیا ہوگا؟"

"یار وقت بچے گا۔ وقت ہی اہم ہے۔ غالب اور نازو پر ایک ایک پل بھاری ہو گا۔ میں مسٹر دلاور سے بھی بات کر چکا ہوں۔ وہ [illegible] سے ملنے کے لیے مثل ماہی بے آب تڑپ رہی ہے اور آپ کا ارشاد گرامی ہے کہ وہ مجھ پر فریفتہ ہو چکی ہے۔ میں اس پر لٹو [illegible] شارٹ [illegible] ملاقات ہو سکتی ہے۔ مجھے ایک لاکھ روپے مل جائیں تو میں اپنا گھر اکیلا بسا [illegible] خیالوں کے بقول شاعر [illegible] وہی ذات ہو [illegible] کے قریب اور کل ہی رابعہ کے ساتھ۔"

"یار میری طرف سے تو جہنم میں جاؤ لیکن رابعہ کے ساتھ۔"

"سی ڈی انٹرپرائز تو مجھے اکیلا ہی جانا پڑے گا۔ رابعہ تو اٹھ کر نہیں اسے اٹھانا پڑے گا۔ اچھی خاصی وزن دار چیز ہے وہ۔ یہ بھی پتا نہیں کیسے اٹھاتے پھرتے ہیں زیرو واٹ ہیروئنوں کو۔ وہ بیچ کہاں ہے؟"

"میری گاڑی میں۔" منظر کی آواز رونے والی ہو گئی "خدا کے لیے مجھے بہت اٹھانا۔ مجھے صبح کورٹ بھی جانا ہے۔ ڈپٹی بھی جنتی اور وکیل بھی دیتے ہیں۔ سو آدھا لیا تو ہو جائے گی میرے موکل کو پھانسی۔ چابی ہو گی گاڑی میں۔ خاموشی سے چوروں کی طرح گاڑی لے جانا اور واپس بھی چھوڑ جانا۔ اگر زندہ سلامت لوٹنے کا ارادہ ہو تو۔"

اس نے تکو کے کہا "بھوتنی کے یہ کیا مذاق ہے۔ سالے اب شادی کر لے پھر دیکھ کیسی نیند آتی ہے۔"

"یار منظر شادی تو صبح سے پہلے نہیں ہو سکتی نا۔"

"تمہیں ابھی کر لے جیسے مجھے جگا کے گناہ کیا ہے ایسے ہی جا کے اسے اٹھا اور کھالے نیند کی گولی ڈاکٹری نسخے کے بغیر۔ تجھے معلوم ہے میں کیا کر رہا تھا؟"

"معلوم ہے سب معلوم ہے" میں نے کہا "مگر میں نے خلل اس لیے ڈالا کہ ایک کام کی بات معلوم ہوئی ہے۔"

"جو اسی وقت بتانی ضروری تھی۔ ایک منٹ۔"

ایک منٹ بعد منظر کی بیوی نے جو مشین گن چلائی تو میں گھبرا گیا۔ اس کی زبان چلتی تھی تو قینچی شرماتی تھی اور اس وقت وہ غصے میں تھی۔ اس نے مجھے شارٹ ہینڈ کی رفتار سے وہ گالیاں دیں جو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

میں نے کہا "ارے بھابی۔ میں سکندر ہوں۔"

اسے شاید یہ جان کے شاک لگا "اوہ... سکندر! تم [illegible] نے تو کہا تھا۔"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے منظر نے شاید ریسیور چھین لیا اور میں نے اس کے چیخنے کی آواز سنی "کیوں بے کچھ مزہ آیا؟"

"یار تو نے کیا نام بتایا تھا میرا؟"

"سالے نام تو بھول۔ یہ حقیقی جذبات تھے ایک بیوی کے۔ یہ ہوتا ہے جب غلط وقت پر کوئی ڈسٹرب کرتا ہے۔ تیرا نام بتاتا تو وہ جھوٹ اور منافقت سے کام لیتی۔"

میں نے کہا "یار! میں نے ہی ڈی انٹرپرائز میں ایک جان

بدنام ترین مُجرم چارلس سوبھراج کے جرائم کی مکمل تفصیل

قیمت ۳۰ روپے

چارلس سوبھراج کی سرگزشت

میں ملاحظہ فرمائیں

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہ راست ہم سے حاصل کریں

کتابیات پبلی کیشنز ◎ پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

www.paksociety.com

میں نے کہا "ٹھیک ہے منظر صاحب، یور آنر گرینٹ۔ اب آپ اپنی اننگ پھر شروع کرسکتے ہیں۔ آپ بیٹنگ کررہے تھے یا باؤلنگ۔ آپ کے والد ماجد بھی ویسے تو سیدھا کھڑا نہیں جانتے تھے۔ نہ بیٹ کو، نہ بال کو۔"

اس کی ہوائی گالیوں سے میں بہت محظوظ ہوا اور فون ریسیور پر رکھ کے کھڑا ہوگیا۔ آفس کو لاک کرکے میں نیچے گیا اور مین گیٹ کھول کے باہر آگیا۔ رات کے دو بجے ماں پر بڑا سکون اور سکوت تھا۔ ہوا میں بڑی فرحت بخش خنکی اور تازگی تھی۔ میں فٹ پاتھ پر چلتا گیا اور پیچھے دیکھتا گیا۔ اکا دکا کاریں اس وقت بھی آجا رہی تھیں۔ نیت نیک ہو تو وسائل بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ ایک شریف آدمی نے مجھے لفٹ دی اور میری جھوٹ پر مبنی دردناک کہانی سے اتنا جذباتی ہوا کہ مجھے منظر کے گیٹ پر ڈراپ کرکے واپس گیا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ میرے ہونے والے سسر فوت ہونے والے ہیں اور انہوں نے فرشتۂ اجل سے بس اتنی مہلت لی ہے کہ آخری سانس آنے سے پہلے اپنی چاند سی بچی کو شرع کے مطابق میرے حوالے کرجائیں۔"

میں گیٹ پھاند کے اندر گیا اور منظر کی گاڑی کا دروازہ کھول کے دیکھا تو چابیاں واقعی موجود تھیں۔ میں نے خاموشی سے گیٹ کھولا اور گاڑی کو دھکیل کر پورچ سے باہر لے گیا۔ ڈھلوان سڑک پر یہ کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز پر منظر کی بیوی اُٹھ بیٹھے اور میں چوروں کی طرح پکڑا جاؤں تو سزا کے طور پر اس کا لیکچر سانحہ الفاظ فی منٹ کی رفتار سے سنوں۔

میری تحریر کے ساتھ مسز ولاور کے نام تحفہ ڈیش بورڈ پر ہی رکھا ہوا تھا۔ منظر نے اسے ٹشو پیپر میں پیک کرکے اوپر وہ کاغذ لپیٹ دیا تھا جس پر میں نے پیغام لکھا تھا اور اوپر ربر کا چھلا چڑھا دیا تھا۔

ڈیوس روڈ تک میں نے منظر کی نئی کرولا کی کارکردگی کو آزمایا۔ اس وقت ہر سڑک خالی تھی۔ سو میل کی رفتار پر گاڑی قابو سے باہر ہونے لگی۔ قصور نہ گاڑی کا تھا اور نہ ڈرائیور کی نااہلی کا۔ لندن اور پیرس کی سڑکوں پر میں نے اس سے زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ فاسٹ لین میں وہاں کم سے کم رفتار کی حد نوے میل تھی اور دو بار میرا چالان ایک سو بیس میل کی رفتار سے گاڑی چلانے پر ہوا تھا میرا خیال تھا کہ میں حد میں ہوں مگر میری نگاہ اسپیڈو میٹر پر نہیں تھی اور لندن میں پولیس مین کو غلط کوئی نہیں کہتا۔ وہ خود بھی غلط نہیں کہتے۔ سڑکوں کے کنارے نصب راڈار سب بتادیتے ہیں۔

لاہور کی سڑک پر اتنی سکت بھی بہت تھی۔ گاڑی کا حوصلہ اس سے کہیں زیادہ تھا مگر میں کسی گڑھے یا اسپیڈ بریکر پر اس کے شاک ابزوربر توڑنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا اور نہ اپنی ہڈیاں تڑوانے کا۔ میری برق رفتاری کو ایک پولیس پارٹی نے رتا سیٹی بجا کے چیک کیا لیکن اپنی قدیم اور ازکار رفتہ گاڑی میں میرے پیچھے دوڑنے اور پیس ہارنے کی شرمندگی اُٹھانے سے گریز کیا۔

ڈیوس روڈ پر پہنچ کے میں نے گاڑی کو گھوڑے کی طرح تھپکا دے کے کہا "شاباش" اور گاڑی رینگی چلنے لگی۔ آہستہ آہستہ ایک طرف کی سب عمارتوں کو غور سے دیکھتے ہوئے میں نے پوری سڑک عبور کی۔ میری نظر نے ہر سائن بورڈ کو پڑھا ہو گی۔ کان یا ملحقہ تھا۔ یہاں تھا یا سڑک کے کنارے دو کھمبوں پر نصب تھا جو میں نے گاڑی کو یوٹرن دیا اور دوسری طرف دیکھتا گیا۔ سی ڈی ای کے حروف پر نظر پڑتے ہی میرے پاؤں خود بخود حرکت میں آگئے ایک نے کلچ دبایا اور دوسرے نے بریک۔

بورڈ ایک سائڈ روڈ کی دیوار پر لگا ہوا تھا اور تیر کا نشان یہ ظاہر کرتا تھا کہ آفس اندر کسی عمارت میں ہے۔ میں نے گاڑی وہیں روک دی اور پیکٹ ہاتھ میں اُٹھا کے باقی راستہ پیدل طے کیا۔ اس بغلی گلی میں ہونے کی وجہ سے منظر کے ساتھ مجھے یہ بورڈ نظر نہیں آیا تھا۔ گلی میں رہائشی کوٹھیاں تھیں جن کے باہر گیٹ لائٹس بھی روشن تھیں اور ہر گیٹ پر کوٹھی کا نمبر نہیں تھا لیکن نام کی تختی موجود تھی۔

چوتھی کوٹھی کے باہر مجھے سی ڈی انٹرپرائز تحفہ ہوا نظر آیا جو بھی عام سائز کی نیم پلیٹ ہی تھی جسے دور سے کوئی بھی آفس کا بورڈ نہیں سمجھ سکتا تھا مگر جاننے والے جانتے ہوں گے کہ انہیں کہاں جانا ہے اور وہ کسی سے کچھ پوچھے بغیر پہنچ جاتے ہوں گے۔

گیٹ پر کوئی بھی نہیں تھا لیکن کال بیل بجانے پر ایک ادھیڑ عمر کا نیم خوابیدہ شخص نمودار ہوا اور اس نے گیٹ کے اوپر سے مجھے دیکھنے کے بعد باہر آنے کے لیے چھوٹا گیٹ استعمال کیا جو بڑے گیٹ ہی کا حصہ تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے بالکل اسی لہجے میں پوچھا جیسے وہ سوال کرتا تھا کہ "تم کون ہو؟" اور جواب میں "تمہارا باپ" سننے کا بُرا نہیں مانتا تھا۔ میں نے آواز کے چہرے ہی سے اسے پہچان لیا۔

"اچھا تو اب تم چوکیداری کررہے ہو؟" میں نے پرانے بے تکلف دوستوں کی طرح پوچھا۔

وہ چونکا "کیا مطلب ہے اس بات کا؟"

میں نے کہا "پہلے تم فون ریسیو کرتے تھے۔ خیر، یہ لو"

"یہ کیا ہے؟" اس نے غور سے پیکٹ کو دیکھا۔

"کوئی حسینہ ہے یہاں۔ یہ اسی کے لیے ہے" میں نے کہا۔

"مگر کیا ہے اور کس نے بھیجا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ رانا صاحب کی بات ہوئی تھی ابھی جس سے۔ وہی جو ٹیلی فون آپریٹر ہے۔ اسے معلوم ہوگا۔"

اس نے کچھ تذبذب کا مظاہرہ کیا مگر شاید اس نتیجے پر پہنچا کہ اتنے حوالوں کے بعد میری بات پر یقین کیا جاسکتا ہے۔ اس نے پیکٹ لے کر کہا "میں دے کر آتا ہوں، تم یہیں ٹھہرو۔"

"فکر مت کرو۔ میں اندر نہیں آؤں گا۔" میں نے کہا۔

اس نے گیٹ کو احتیاط سے بند کیا اور مجھے گھورتا ہوا اندر

باہر آیا۔ میں نے سرچ روڈ لگائی اور سڑک پر کھڑی ہوئی کار میں بیٹھ گیا۔ میں آدھا گھنٹہ کے روانہ ہونے تک کوئی بھی گیٹ سے باہر نہیں آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ حسینہ نے تحفہ کھول کے ضرور دیکھا ہوگا اور شاید تھوڑا سا بے ہوش ہوتی ہوگی۔ میں کچھ قریب ہوتا تو شاید رات کی خاموشی میں اس کی چیخ بھی سن لیتا۔

حسینہ کی بے ہوشی کے بعد یقیناً سابق ٹیلی فون آپریٹر اور چوکیدار نے بھی تحفہ ملاحظہ کیا ہوگا اور میری تحریر پڑھنے کے بعد انہوں نے مطلع کیا ہوگا کہ بیگم صاحب "مالک کی پہلی قسط آگئی ہے۔ اب ان شاء اللہ تھوڑا تھوڑا کرکے آپ کا باقی سہاگ بھی وصول ہوجائے گا۔"

ابھی صرف تین بجے تھے۔ ایک گھنٹے میں سارا کام اطمینان بخش طریقے پر ہوگیا تھا اور اب میں بجا طور پر مسز ولاور کے ہسٹریائی ردعمل کی توقع کرسکتا تھا۔ شام کو نازو کی تحریر کے ساتھ ہم نے ایک تحفہ وصول کرنے کا صدمہ برداشت کیا تھا۔ چند گھنٹے ہی گزرے تھے کہ ہماری طرف سے مؤثر طریقے پر جواب ارسال ہوگیا۔ ولاور کی بیوی کو معلوم ہوجائے گا کہ کسی نے لندن سے بات کی تھی اور کہا تھا کہ اب فرنچ وکیل کو معاملات طے کرنے کے اختیارات دیے گئے ہیں۔ یہ بات صرف وہ جانتی تھی یا اس کے ساتھ آنے والے حرم کو معلوم تھی کہ اس نے فرنچ وکیل کے ذریعے سکندر سے مذاکرات کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ فرنچ وکیل نے کا نمائندہ تھا۔ پہلے تو اس نے صاف انکار کردیا تھا اور کسی قیمت پر اپنا ضمیر بیچنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر گھر آئی لکشمی کو بھلا کون ٹھکراتا ہے۔ اس نے بھی لندن فون کرکے اپنے مؤکل سے پوچھا کہ معاملہ ایک لاکھ کا ہے اور اجازت حاصل کرلی۔ مؤکل نے کہا ہوگا کہ اچھا کراسکتے ہو تو بات کرادو۔ بات کرانے میں ہمارا کیا نقصان ہے۔

ٹیلی فون آپریٹر حسینہ اسے پہلے ہی مطلع کرچکی تھی کہ لندن سے کسی کا فون آیا تھا۔ فون وصول کرنے والے کو کہاں پتا چلتا تھا کہ کال کوئی ساتھ والے گھر سے کررہا ہے یا لندن سے۔ اب میری کمزوری کے اس کے لیے شک کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ رابعہ اور وہ فرنچ وکیل یقیناً جانتے ہیں کہ سکندر کہاں روپوش ہے۔ ان کا سکندر سے مسلسل رابطہ ہے اور سکندر آرام سے نہیں بیٹھا ہوا ہے۔ تازہ ترین کارروائی یہ ثابت کرتی ہے کہ چوہدری ولاور کو اس نے کہیں قید کررکھا ہے اور خود وہیں دن رات پہرے داری کررہا ہے۔ رابعہ یا اس فرنچ وکیل سے زبردستی کچھ معلوم نہیں کیا جاسکتا۔ سارے معاملات تو سکندر کے ہاتھ میں ہیں اور اس تک رسائی ہی اصل کام ہے۔

منظر کی گاڑی واپس چھوڑنے سے پہلے میں نے رابعہ کا حال معلوم کرلینا بہتر سمجھا اور کار کو اسی طوفانی رفتار سے دوڑاتا ہوا وقار یوسف کے گھر جا پہنچا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کیونکہ رابعہ پر خلاف

توقع انجکشن کا اثر صبح تک نہیں رہا تھا۔ وہ جاگ گئی تھی اور اب خاموشی سے آنسو بہارہی تھی۔ وقار یوسف اور گلی اس کو سمجھانے تسلی دینے میں ناکام ہوچکے تھے اور دوبارہ ڈاکٹر کو بلانے کا سوچ رہے تھے کہ وہ ایک اور انجکشن لگا جائے۔

مجھے دیکھ کے وقار یوسف حیران بھی ہوا "آپ اس وقت۔ مگر شاید اسی کو جذبۂ دل کی تاثیر اور عشق کی بے اختیاری کہتے ہیں۔"

"مبجا ارشاد! اس تجربے سے آپ بھی گزرے تو ہوں گے پھر حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں صرف یہ پوچھنے آیا تھا کہ۔"

"یہاں مت پوچھیں۔ خود جا کے دیکھ لیں اور سنبھالیں اپنے مریض کو" وقار یوسف مسکرایا۔

میں نیچے اُتر آیا "تم جاگ رہے تھے؟"

"ہم باری باری جاگ رہے تھے۔ میرے سونے کی باری آئی تو رابعہ باجی جاگ گئیں اور اب وہ روئے چلی جارہی ہیں۔"

مجھے دیکھتے ہی رابعہ اُٹھ کے بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ "سکندر۔ وہ قتل کردیں گے نازو کو۔ ان سے بات کرلو۔ چھوڑ دو ولاور کو۔"

میں نے اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ "انہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

اس نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھایا "اور ہونے کو کیا باقی رہ گیا ہے۔ تم اتنے سنگ دل اور خود غرض ہو۔ کیا تم چاہتے ہو۔۔۔"

میں نے کہا "پاگل مت بنو۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔"

"کیا غلط سمجھ رہی ہوں۔ جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

"تم نے غلط دیکھا تھا۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتا تم سے۔ نازو بالکل ٹھیک ہے اور دھمکی دینے والے اس کا بال بیکا نہیں کرسکتے۔ نہ وہ ہمیں بے وقوف بنا سکتے ہیں۔"

"سکندر۔ خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔ میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں جسے تم باتوں سے بہلا دو۔"

میں نے کہا "جذبات کی پٹی ہو آنکھوں پر۔ عقل پر جذبات حاوی ہوں اور اعصاب جواب دے چکے ہوں تو یہی ہوتا ہے۔ اب تمہیں مجھ پر بھی اعتبار نہیں۔ ہمت ہے تو آؤ میرے ساتھ چلو۔"

"مگر کہاں؟"

"میں تمہیں بتاتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔ اُٹھو۔"

وقار یوسف نے پریشانی سے مجھے دیکھا "میرے خیال میں ان کا اُٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔"

میں نے کہا "رابعہ سے پوچھ لو۔ یہ چل سکتی ہیں۔"

"میں ٹھیک ہوں" رابعہ کھڑی ہوگئی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے باہر لے آیا۔ وہ بار بار پوچھتی رہی "سکندر۔ مجھے بتاؤ، ہم کہاں جارہے ہیں؟"

میں نے پورچ میں کھڑی ہوئی گاڑی کا دروازہ کھولا اور خود بیٹھ

www.paksociety.com

کے ساتھ والا دروازہ رابعہ کے لیے کھول دیا۔ وقار یوسف اور تگی برآمدے میں پریشان کھڑے تھے۔ میں نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے اندر جانے کو کہا مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔

رابعہ نے وحشت زدہ نظروں سے گلوز کمپارٹمنٹ کو دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ اس کے ارتعاش سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خوف سے کانپ رہی ہے۔ اس کا جسم ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔

میں نے کہا "رابعہ۔ انھوں نے بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔ وہ تحریر یقیناً نازو کی تھی مگر انگلی نازو کی نہیں تھی۔"

"جھوٹ۔ بالکل جھوٹ ہے یہ۔ میں نے دیکھا تھا۔"

"اچھا پھر دیکھو" میں نے وہ پیکٹ کھول کے اسے تھمایا "ذرا نہیں۔ ڈیش بورڈ کے اوپر والی لائٹ جلاؤ اور غور سے دیکھ کے بتاؤ یہ انگلی زنانہ ہے کہ مردانہ۔ کیا نازو کی انگلیوں پر اتنے سیاہ موٹے بال ہو سکتے ہیں؟"

رابعہ کی آنکھوں میں ذرا سی دیر کے لیے بے یقینی کے سائے ابھرے پھر اسے میری سنجیدگی نے قائل کر لیا اور اس نے ہاتھ بڑھا کے ونڈ اسکرین کے اوپر والے حصے میں بیک ویو مرر کے ساتھ لگی ہوئی لائٹ جلا دی۔

"سکندر۔ تم مجھے مطمئن کرنے کے لیے حقیقت پر کوئی پردہ تو نہیں ڈال رہے ہو؟"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ کیا ہو گیا ہے آخر تمہاری عقل کو۔ حقیقت جو تمہاری نظر کے سامنے ہے۔ پردہ ڈالنے سے بدل سکتی ہے؟ یہ جو چاند نکلا ہوا ہے آسمان میں۔ کیا میں اسے سورج ثابت کر سکتا ہوں؟ یہ کہوں کہ برآمدے میں وقار یوسف نہیں غالب کھڑا ہوا ہے تو کیا تم مان لو گی؟ لاؤ مجھے دو یہ ڈبا۔ میں دکھاتا ہوں تمھیں۔"

بڑی بے خوفی سے میں نے وہ انگلی یوں اٹھائی جیسے وہ کسی انسان کے ہاتھ کا حصہ نہیں مرغی کی ٹانگ ہے جسے کاٹنے، بھونتے اور کھاتے وقت کوئی نہ جذباتی ہوتا ہے نہ دکھی "یہ کیا ہے۔ دیکھو، روشنی میں دیکھو۔ لو خود پکڑو اسے اپنے ہاتھ میں۔ کچھ نہیں ہو گا تمھیں۔ پتا نہیں کس بدبخت کے ہاتھ کی انگلی ہے یہ۔ بے جان انگلی تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔"

رابعہ نے نگاہ انگلی پر رکھی مگر خود اسے چھونے کی ہمت نہیں کی "نہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ دور ہٹاؤ اسے۔ دیکھ تو رہی ہوں میں۔"

"کیا دیکھ رہی ہو۔؟ مجھے بتاؤ یہ انگلی نازو کی ہو سکتی ہے؟"

رابعہ کی آنکھوں میں الجھن کے آثار تھے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تمھیں بہت جلدی تھی چیخ مار کے بے ہوش ہونے کی۔"

رابعہ نے کہا "مجھے یقین نہیں آ رہا۔ یہ وہی انگلی ہے؟"

"نہیں" میں نے اپنی انگلی کاٹ کے رکھ دی ہے اس کی جگہ۔" میں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کے کہا "گن لو پوری انگلیاں ہیں۔ وقار یوسف کی انگلیاں بھی گن لینا۔ تمہارے ذہن پر اتنا اثر تھا نازو کی تحریر کا کہ تم نے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں۔ گاڑی میں نظر بھی کیا آتا۔ وہ تو میں نے بعد میں روشنی میں جانچا تو صاف پتا چل گیا کہ یہ ہمیں دہشت زدہ کرنے کی احمقانہ کوشش تھی۔ انھوں نے نازو کو بھی ڈرایا ہو گا اور ممکن ہے پورا ڈرامہ ہو مگر ان میں ہمت نہیں تھی اتنی کہ اپنی دھمکی پر عمل کرتے۔ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ دلاور ہمارے قبضے میں ہے۔ ان اور غالب سے یہی معلوم کرنا چاہتے ہوں گے وہ کہ دلاور کو کہاں پر رکھا گیا ہے۔ یا پوچھا ہو گا کہ سکندر کہاں چھپا ہوا ہے۔ پر اور نازو بھی اتنے بچے نہیں ہیں کہ جیتے جی کوئی ان سے کچھ معلوم کر سکے۔ وہ انھیں کوئی نقصان اس لیے نہیں پہنچا سکتے کہ انھیں دلاور کی اتنی ہی فکر ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی حماقت کا خمیازہ دلاور بھگتے گا۔ انھوں نے ہمیں چکر دیا تھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ تم نے سوچنے سمجھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔"

رابعہ پر آہستہ آہستہ میری بات کا خوش گوار اثر ہوا تو وہ قائل ہونے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی، دکھ اور خوف کی جگہ کچھ اطمینان کے اثرات نظر آ رہے تھے۔

میں نے اتنی تقریر کو کافی جانا "آؤ۔ اب اندر چلیں۔ تمہیں مجھ پر اعتبار آگیا ہو گا اب تو۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہو۔"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ رابعہ کا ذہن ابھی کیسے جا سکتا تھا کہ وہ میری اور منظر کی سازش کو سمجھ سکتی اور اندازہ کر لیتی کہ ہم نے کیا چکر چلایا ہے۔ اس کے خیال میں ابھی کہیں گیا ہی نہیں تھا سوائے اپنے آفس کے جہاں ہر رات میں چوکیدار بن کے گزارتا تھا۔

"آئی ایم سوری سکندر۔" رابعہ نے بے خیالی میں میرے سینے پر سر رکھ دیا "میں پتا نہیں کیا ہو گیا ہے مجھے۔"

وقار یوسف اور اس کی بیوی فوراً اندر غائب ہو گئے تھے۔ میں نے اس کے گرد بازوؤں کا حصار قائم کر کے اس کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ "حکما کے نزدیک یہ وہی مرض ہے جو چھپائے نہ چھپتا۔ یہ عشق کا عارضہ بہت پرانا ہے اور اس سے دل و دماغ کے اعصاب متاثر ہوتے ہیں۔"

وہ مسکرائی "میں تو اکتا گئی ہوں اب اس لیلیٰ مجنوں کے فضول کھیل سے۔"

"پھر اب کیا کریں۔ شیریں فرہاد، ہیر رانجھا بن جائیں؟ اور تم محبت کو فضول کھیل کہتی ہو؟ محبت تو وہ عظیم جذبہ ہے۔"

"کیا محبت محبت۔ سب نے اپنے گھر بسا لیے ہیں۔ ہم ہی بے گھر ہیں۔ گھر ہوتے کے باوجود۔"

"غالب اور نازو کا گھر کہاں ہے۔ پتا لکھوا دو مجھے۔"

پتہ بتا دیا ہے۔ مگر دیکھو تم ضرور سو جانا ورنہ میں بھی جاگتا رہوں گا۔

"ذرا آرام کرو۔"

تجلی چیختی ہے۔ اس کا تعلق جذبات سے ہے اور دل کی بازگشت تیلی فون لائن سے ہے" میں نے اسے چوما۔ وہ اندر چلی گئی۔

میں نے منظر کے گھر میں گاڑی کھڑی کی تو صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ ایک بار پھر کے میں باہر کو دوڑا اور واپس چل پڑا۔ رات بھر میں نے بہت سے جھوٹ بولے تھے۔ رابعہ پر ایک جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے میں نے اور منظر نے بڑا لمبا چکر چلایا تھا جس کا علم ہمارے علاوہ صرف مولوی خادم حسین کو تھا۔ اس جھوٹ کو نبھانے کے لیے مجھے مردہ خانے میں بہت سے جھوٹ بولنے پڑے تھے۔ پھر میں نے دلاور کی بیوی سے جھوٹ بولا تھا۔ حسینہ نام کی ایک نیلی فون آپریٹر سے جھوٹ بولا تھا۔ بی ڈی انٹر پرائز کے چوکیدار سے جھوٹ بولا تھا۔ جھوٹ بولے بغیر منظر کی بیوی سے جھوٹ بولا تھا۔ اسے غائب جانا نہیں پڑے گا کہ رات کو میں نے کیوں فون کیا تھا اور کس طرح چور دروازے کی طرح منظر میں گھس کے گاڑی لے گیا تھا اور پھر واپس اپنی گاڑی لے کر گیا تھا۔

حساب کرنا مشکل تھا کہ ہر روز میں کتنے جھوٹ بولتا تھا۔ میں اپنی جگہ دہری زندگی گزار رہا تھا۔ فرضی وکیل، چوکیدار اور سکندر بخت کے تین کردار نبھا رہا تھا مگر میں مجبور تھا۔ دنیا نے مجھے روشنی کہا تھی کہ "حق کا بول بالا اور جھوٹ کا منہ کالا" اس محاورے کو غلط ثابت کر دے۔ کالا منہ استاد پیڈرو کا تھا مگر وہ قانون کی نظر میں نہ مجرم تھا نہ قصوروار اور آزادانہ گھوم رہا تھا۔ میں تو کوئی ڈبے والی کے جرم کی سزا پا رہا تھا۔ خیر ایسا ہمیشہ نہیں ہوگا۔ خدا ظالم کی رسی کچھ دراز کرے تو اسے فرعونیت کا خمار چڑھ جاتا ہے۔ اس کے نیک بندوں کی آزمائش ہوتی ہے۔ بالآخر صراط مستقیم پر استقامت سے چلنے والے کامران نہ ہوتے تو اس دنیا میں رحمان کی نہیں شیطان کی پرستش کرنے والے حکمران ہوتے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ دنیا میں آج بھی نیکی اور نیکی کرنے والے اور نیکی کو برحق سمجھنے والوں کا غلبہ ہے۔ ہمیشہ رہا ہے اور رہے گا۔ وہ ایٹم بم پھینک کے پچاس سال سے امریکا مردود رعونت ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک حسین کو شہید کر کے چودہ سو سال سے یزید ملعون ہے۔ خاقی تو سقراط کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کرنے والا بھی تو گروہ حق پر نہیں تھا۔ تاریخ میں یہی لکھا گیا۔

بڑے حوصلہ افزا خیالات تھے اور شاید یہ ایک رات کی محنت کا ثمر تھا کہ میں کامیابی کی منزل کے اور قریب ہو گیا تھا۔ زیادہ خوش تھا اور آنے والے دن سے بہتری کی توقعات رکھتا تھا۔

میں ابھی بیدار ہو کے خدا کے حضور ادائے فرض کے لیے مسجد کا رخ کرنے والے مسجدوں کا رخ کر رہے تھے۔ ایک بار پھر دل نے تجدید کا وعدہ کیا میرے قدم بھی بے اختیار ادھر اٹھ گئے۔ اس نماز کا حساب شاید اور تھا جس میں ارادے سے زیادہ جذبے کو دخل تھا۔

"وہ بھی ہماری وجہ سے خوار ہیں۔ ختم کرو اسے سکندر۔ دلاور کو پولیس کے حوالے کرو۔ قانون خود نمٹ لے گا اس سے۔"

"نادان لڑکی! کیا اس سے سارے مسائل حل ہو جائیں گے؟ وہ اکیلا نہیں ہے۔ آج بھی سب کچھ اس کے پاس ہے۔ قانون کو وہ کیا سمجھتا ہے۔ قانون اگر اتنا بااختیار ہوتا تو خرابی کا ایک خودرو پودا تباہی کا اتنا بڑا درخت کبھی نہ بن پاتا مگر تم فکر مت کرو۔ میں اس درخت کو جڑ سے اکھاڑ کے چھوڑوں گا۔ اس کے بعد ہی ہم محفوظ ہوں گے ورنہ تم سے بہتر کون جانتا ہے کہ قانون نے تو ہمیں کوئی تحفظ فراہم نہیں کیا تھا۔ الٹا ہمیں مجرم بنا دیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ آج بھی ہم مجرم ہیں۔ میں روپوش رہنے پر کیوں مجبور ہوں۔ کیا مجھے انصاف مل جائے گا اگر میں روپوشی ختم کر کے خود کو قانون کے حوالے کر دوں؟ نہیں رابعہ، دلاور کل سپولیا تھا، آج سانپ ہے تو کل اژدہا بن جائے گا اگر ہم نے اس کا سر کچلنے سے پہلے سمجھ لیا کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ آج وہ بے بس ہے مگر کل وہ قانون سے ہر ضمانت حاصل کرے گا اور پھر اتنی طاقت حاصل کرے گا کہ خود قانون اس کے سامنے بے بس ہو جائے گا۔"

"یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ میں روز تماشا دیکھتی ہوں انصاف کرنے والوں کی بے بسی کا۔"

"اچھا اب سکون سے سو جاؤ۔ اپنے اس نازک سے دماغ پر اتنا بوجھ مت ڈالو نئی نویلی۔ خدا نے چاہا تو کل نازو اور غالب ہمارے ساتھ ہوں گے۔"

وہ خوش ہو گئی "اچھا۔ وہ کیسے؟"

میں نے کہا "دلاور کی بیوی نے خود رابطہ کیا تھا مجھ سے۔ یعنی فرضی وکیل سے۔ کہ سکندر سے بات کرا دو۔ ایک لاکھ رشوت بھی دے رہی تھی۔"

وہ ہنسی "اسے رشوت کیوں کہتے ہو۔ بات کرا دو۔"

"ہاں ہاں۔ بات کرا دیں گے۔ پہلے ایک لاکھ تو وصول ہوں اور کوئی امید افزا بات ہو۔ یہ پتا چل جائے کہ وہ غالب اور نازو کو رہا کرا سکتی ہے یا اس معاملے میں بے اختیار ہے۔ اسے کچھ معلوم ہی نہیں۔ یہ بدمعاش ہے پیڈرو کی اور وہ دلاور کی بیوی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پیڈرو کی بات ہے۔ پیڈرو ہمیشہ ڈبل گیم کھیلتا ہے۔ ایک طرف دلاور کے جاں نثاروں میں شامل ہے اور اسے دلاور کا پورا اعتماد حاصل ہے مگر وہ دلاور کی جڑیں کاٹنے کی سازشوں میں بھی بالواسطہ طور پر شریک رہتا ہے تاکہ خود نمبر ون ہو جائے۔ کبھی وہ دلاور سے مل کے ہمیں بے وقوف بناتا ہے تو کبھی بیچ میں ہم سے مل کے دلاور کو بے وقوف ثابت کرتا ہے جو ایسے شخص پر اتنا اعتبار کرتا ہے۔"

"تم رات بھر سوئے نہیں نا؟"

"سونے کی کوشش ضرور کرتا رہا۔ نیند نہیں آئی تو منظر سے گاڑی لے کے ادھر آ گیا۔ خادم حسین سو رہا ہے آفس میں۔ اب مجھے بھی اطمینان ہو گیا ہے تمہاری طرف سے تو جا کے دو چار گھنٹے کی

www.paksociety.com

خشوع و خضوع کی کیفیت از خود طاری ہوتی تھی۔ بے خوف اظہار بندگی اور اپنی عبودیت کا اقرار کرتے ہوئے مجھے کوئی شرمندگی محسوس ہوتی تھی تو وہ ایسی ہی تھی جیسے گھر میں کوئی نالائق بچہ یہ جانتا ہو کہ وہ نالائق ہے مگر پھر بھی سمجھتا ہو کہ سب کی طرح ماں باپ اس سے کم پیار نہیں کرتے۔

اخبار والے اور دودھ والے اب سڑکوں پر نکل آئے تھے مگر مجھے ایک رکشا مل گیا جس نے ڈگنا کرایہ وصول کر کے مجھے رابعہ کے آفس پہنچا دیا۔

"تم سے کم بولیں تو ٹھیک کیا کہو" میں نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی "صبح کرایہ تو دوگنا بھی نہیں ہوتا۔"

"بولتی غلط کرتا تو سارا دن ایسے ہی گزر جاتی" اس نے خود کو صحیح ثابت کرتے ہوئے مجھے شرمندہ کر دیا "سب آدھا کرایہ دیتے۔"

مولوی خادم حسین سویا پڑا تھا مگر آہٹ پر اٹھ بیٹھا "کیا بات ہے جی۔ کہاں سے آ رہے ہیں آپ؟"

میں نے لائٹ جلاتے کہا "کیا بتاؤں خادم حسین۔ رات بھر میں قدموں کی چاپ سنتا رہا۔ دروازے کھل رہے تھے اور بند ہو رہے تھے۔ پتا نہیں کون لوگ آ جا رہے تھے۔ کبھی یوں لگتا تھا جیسے کوئی کرسی کھینچ کے بیٹھا ہے۔ فائل کیبنٹ کھلی ہے کسی نے۔ کوئی فون کر رہا ہے۔ ڈائل گھومنے کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ باہر جا کر دیکھو تو کچھ نہیں۔ میرا خیال ہے یہ انہی کی روحیں تھیں جن کے اعضا کو ہم نے دیکھا تھا۔ جیسے لوگ قصائی کی دکان پر بکرے کی ران... اور گردن یا سینہ دیکھتے ہیں۔"

خادم حسین بلند آواز میں آیت الکرسی پڑھنے لگا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ صبح صبح ایک اور جھوٹ بلا وجہ۔ میں نے شرمندگی سے سوچا۔

"معاف کرنا خادم حسین۔ یہ سب مذاق کی بات تھی۔ میں ذرا باہر گیا تھا۔ مظہر صاحب کے گھر اور پھر وہاں سے رابعہ کے پاس۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔"

وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا "یہ آثار ٹھیک نہیں ہیں جی۔ میرے ایک چچا تھے وہ بھی رات بھر بھٹکتے پھرتے تھے۔ پاگل خانے میں فوت ہوئے۔"

"مگر میں تمہارا چچا نہیں ہوں۔ اب میں سونا چاہتا ہوں۔ صبح دس بجے سے پہلے کوئی بھی آئے، کوئی بھی فون کرے۔ اگر تم نے مجھے جگایا تو تمہارا انجام وہی ہوگا جو سوتے شیر سے پنگا لینے کا ہوتا ہے۔"

"ایک وظیفہ ہے جی آپ کے لیے میرے پاس۔"

"اچھا میرے سرہانے بیٹھ کے کرو" میں نے آنکھیں بند کر لیں "مگر دیکھو وظیفہ الٹا نہ ہو جائے۔ تم بھی چلے جاؤ پاگل خانے اپنے چچا کی طرح۔ کیا چچی نے عقد ثانی کر لیا تھا بعد میں۔ چچا کو پاگل خانے پہنچا کے۔"

اس نے مزید لہجے میں کہا "ہاں جی مگر"

"اگر مگر کیا۔ تمہاری گھروالی بھی کرے گی۔ اس ... رکھنا۔"

کتنا آسان تھا مگر سونا مشکل ثابت ہوا۔ ایک تو خادم نے ... میرے سرہانے بیٹھ کے نہ جانے کیا پڑھنا ... شروع کر دیا تھا۔ اور پھونک بھی وہ براہ راست میرے منہ پر مارتا تھا کہ اسے پھٹکار کہا جا سکتا تھا۔ پھر وہ اپنے لیے ناشتہ لے آیا اور چائے کی خوشبو نے ناک کے راستے ... کے آثار بھی مٹا دیے۔ اس کے بعد فون کی گھنٹی بجنے ... چھلانگ مار کے اٹھا کہ مولوی خادم حسین کے ہاتھ سے چائے کا کپ گرتے گرتے بچا۔ میں نے کپ اس سے چھینا اور ... ریسیور اٹھا لیا۔

فون دلاور کی بیوی کا ہی تھا "... کیا ہے"

میں نے کہا "تم وہی ہو۔ رات والی؟"

اس نے کہا "دیکھو میں بہت پریشان ہوں۔ کسی سے ... بات کراؤ۔ اس گورے وکیل سے یا رابعہ سے... مظہر صاحب سے..."

"اچھا جی۔ ایسی کیا پریشانی ہے آخر۔ اس وقت تو ... بھی نہ کھلا۔"

"میں تمہیں بہت انعام دوں گی۔ مجھے کسی کا فون نمبر ... دو۔"

"اچھا جی لکھ لیں پھر" میں نے کہا "یہ میرے ماموں کا نمبر ہے۔ آپ کی سب پریشانی دور کر دیں گے۔ بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔"

اس نے مجھے گالیاں دیں اور فون بند کر دیا۔ اس کی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کتنی نروس اور پریشان ہے۔ اسے پہلی ... کی قسط موصول ہو چکی تھی۔ وہ شاید مولوی ... کی بات ... لے رہی تھی۔ اگر رات بھر میں اور رابعہ جاگتے رہے تھے تو نیند اس کی بھی حرام ہوئی تھی اور اب ہم پرسکون تھے تو اس کے لیے بے سکونی کا آغاز ہو گیا تھا۔

فون رکھ کے میں نے کہا "مولوی خادم حسین۔ ایسی ... جیل میں قیدیوں کو ملتی ہے۔ چائے تک نہیں بنانی آتی ... بیوی بھی چلی گئی ہوگی۔ امور خانہ داری کا ذرا سلیقہ نہیں ہے ... میں۔"

"مگر کل تو آپ تعریف کر رہے تھے جی" وہ جل کے بولا۔

"اب ہر روز تعریف کی تو تمہارا دماغ خراب ہو جائے گا۔ پہلے ہی بہت اچھا نہیں ہے۔ بس گزارے لائق ہے۔ رات ... میں آئی تھی گھروالی؟"

"نہیں جی۔" اس نے دل گرفتہ لہجے میں کہا "عورت کی ذات بھی بڑی بے وفا ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ تم فریج جانتے ہو۔ کسی ترچھا ...

شادی کرلو۔ وہ روز خواب میں آئے گی اور خواب بھی ایسے کہ تم خواہش کرو گے ہمیشہ کی نیند آ جائے۔ دوبارہ اٹھنے کو دل نہیں چاہے گا۔ ویسے تمہاری گھروالی خواب میں آتی تو کیا پہنے ہوتا؟ وہ سوئمنگ کاسٹیوم میں ہوتی یا لباس فطرت میں؟"

"لباس فطرت کیا ہوتا ہے جی؟"

"وہی۔ جس میں کائنات نظر آتی ہے۔ درخت اور پہاڑ۔ خوشنما پرندے اور جنگل کے درندے۔ جس میں اشرف المخلوقات پیدا ہوتا ہے۔"

"یہ سب مظہر صاحب کی صحبت بد کا نتیجہ ہے" وہ بگڑ گیا "ایسی بے شرمی کی باتیں۔ توبہ توبہ وہ بھی ایک پردہ نشین کے لیے جو کسی اور کی شریک حیات ہو۔"

مجھے قطعی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وحشت کی کیفیت میں دلاور کی بیوی صبح صبح یہاں نہ آ دھمکے۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ نازو کی ایک انگلی پہلی قسط کے طور پر ارسال کرنے والا کون تھا تو وہ اب تک احکامات صادر کر چکی ہوگی کہ نازو اور غالب کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو جیل میں اے کلاس سیاسی قیدیوں کے ساتھ ہوتا ہے اور انہیں تیار رکھا جائے تاکہ ایک منٹ کے نوٹس پر ان کا تبادلہ اپنے چوہدری دلاور سے کیا جا سکے۔ اگر یہ بات اسے معلوم نہیں ہوگی اور کرنے والے اپنی مرضی کے معاملے میں سرکشی کی حد تک خود مختار ہو چکے تھے تو وہ انہیں خبردار کر چکی ہوگی کہ دلاور کو کچھ ہوا تو ذمہ دار وہ ہوں گے اور دلاور واپس آتے ہی سب سے نمٹ لے گا۔

میں نے خلاف معمول صبح سات بجے ہی چوکیدار کی وردی اتار کے فرنچ وکیل کا لباس پہن لیا اور خادم حسین کو باہر گیلری میں کھڑا کر دیا کہ وہ آنے جانے والوں پر نظر رکھے۔

اس نے رننگ کمنٹری شروع کر دی "ہائی کورٹ کی طرف سے رکشا آیا ہے۔ کوئی نہیں ہے اس میں۔ نہیں رکشا ڈرائیور کا سر تو دکھتا ہے۔ ادھر سے ایک کار گئی ہے۔ اس میں دو موٹے موٹے ایک جیسے بندے بیٹھے ہوئے تھے جڑواں بھائی تھے غالباً۔ ایک ہزار پونڈ کے ہوں گے۔"

میں نے چڑ کے کہا "کیا۔ پیدائش کے وقت ایک ہزار پاؤنڈ؟"

"نہیں جی۔ آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ پانچ سو پاؤنڈ کا بچہ ہو سکتا ہے؟"

"برطانوی بچہ پانچ سو پاؤنڈ کا ہو سکتا ہے۔ اگر تم جیسے بچے کی قیمت ماں کی نظر میں کوہ نور ہیرے سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ مولوی خادم حسین زبان کو ناحق تکلیف مت دو۔ اگر تجھے دلاور کی بیوی نظر آئے یا استاد پیدرو کی منحوس صورت دکھائی دے تو بتانا۔"

"میری تو جناب نظر کمزور ہو رہی ہے۔ ناشتا کرنے سے پہلے اس سخت محنت کی عادت نہیں ہے۔"

"مگر آنکھیں کھلی رکھنا بھی مشقت ہے تمہارے لیے؟"

"کیا آنکھیں کام نہیں کرتیں۔ کمزور کیوں ہو جاتی ہیں آخر۔ وہ کیا کہا ہے جی کسی نے کہ بھوکا ہو تو انسان کو چاند آنکھیں نظر آتی ہیں پوریاں۔ اور حساب کے سوال کا جواب اس نے بتایا تھا کہ دو اور دو چار پوریاں۔ چھولے تو مفت ملتے ہیں ساتھ" خادم حسین دانت نکالنے لگا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ہم بیڈن روڈ تک پیدل گئے۔ امرتسری حلوائی کی دکان پر گھمسان کا رن پڑ رہا تھا مگر مولوی خادم حسین کی مہارت اور جدوجہد کے طفیل مجھے بھی ناشتہ میسر آیا۔ ہم واپس آئے تو مجھے دلاور کی بیوی آفس کے باہر کھڑی نظر آئی۔ اس کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور رات بھر جاگنے سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

اب خادم حسین نے دو طرفہ مترجم کے فرائض ادا کیے۔ وہ اندر پہنچتے ہی پھٹ پڑی۔

"اپنے وکیل صاحب کو بتاؤ کہ وہ دلاور کو قتل کر رہے ہیں۔"

میں نے حیران ہو کے کہا "وہ کون؟ خاتون سے پوچھو۔"

"ان سے کہو کہ اتنے بھولے نہ بنیں۔ وہی سکندر بخت اور اس کا شیطانی ٹولہ۔"

"اگر خاتون کو یہ بات معلوم ہے تو انہیں پولیس کے پاس جا کے رپورٹ لکھوانی چاہیے۔"

"ان سے کہو کہ فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کریں" اس نے میرے سامنے ایک لاکھ روپے پھینک دیے "بس میری بات کرا دیں سکندر بخت سے۔"

"مولوی خادم حسین۔ خاتون سے کہو کہ اس کے لیے کوشش کی جا سکتی ہے مگر ایسے نہیں۔ خاتون شرافت اور عاجزی سے درخواست کریں اور یہ رقم اپنے پھینکنے سے کام نہیں ہوگا۔ وہ کسی کے گلے میں نہیں ڈال رہی ہیں اور نہ وہ وکیل صاحب کو خرید رہی ہیں۔ وکیل صاحب کا بہت بڑا احسان ہوگا ان پر اگر انہوں نے ایک لاکھ قبول کر لیے اور سکندر کو بات کرنے پر آمادہ کر لیا۔ سکندر انکار بھی کر سکتا ہے مگر ایسی صورت میں رقم واپس نہیں ہوگی۔"

وہ غور سے سنتی رہی اور اپنے ہونٹوں کو دانت سے کاٹتی رہی۔ پھر اس نے زہرخند لہجے میں کہا "مولوی۔ تم نہیں کر سکتے شرافت سے بات۔"

"میں تو جی وہی کہوں گا جو آپ کہیں گی۔"

"اچھا اچھا۔ اپنی فرنچ میں کہہ دو وہی... جو یہ وکیل کہتا ہے۔"

"کیا کہہ دوں... آپ بھی تو بولیں کچھ۔ میں صرف ترجمہ کرتا ہوں" خادم حسین نے معصوم بن کے کہا۔

اب دلاور کی بیوی مجبور ہو گئی۔ اس نے بڑی شرافت اور لجاجت سے میرا ہاتھ پکڑ کے رقم مجھے دی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بہت ذلت بھی برداشت کر رہی تھی اور اذیت بھی۔ اس نے بتایا کہ کس طرح رات کو ان ظالموں نے

www.paksociety.com

چوہدری صاحب کی ایک انگلی کاٹ کے بھیجی تھی اور وہ دھمکی دے رہے ہیں کہ ان کے ٹوٹے ٹوٹے کر کے قسطوں میں مار ڈالیں گے اور سارے ٹکڑے مجھے ارسال کریں گے۔ ان کو سمجھاؤ کہ یہ ظلم نہ کریں۔ وہ مجھے بتائیں کہ انھیں کیا چاہیے۔ میں چوہدری صاحب سے ہر بات منوالوں گی۔ جیسے بھی وہ چاہیں گے۔ وہ اسٹامپ لکھوالیں۔ کسی کی ضمانت لے لیں۔"

میں نے بیزار رہنے کے باوجود ظاہر یہ کر رہا تھا کہ اس کی آہ و زاری سے میرے دل پر اثر ہو رہا ہے۔

میں نے کہا "خاتون سے کہو کہ اس معاملے میں احتیاط بہت ضروری ہے۔ اگر انھوں نے کسی سے ذکر کیا تو کام نہیں ہوگا۔"

اس نے کہا "وکیل صاحب سے کہو کہ مجھے ان پر پورا بھروسا ہے۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔"

"اس معاملے میں پولیس کے یا کسی اور کے بیچ میں آنے سے ان کا نقصان ہو سکتا ہے۔ اگر سکندر بخت کے ساتھ دھوکا ہوا تو تباہی کی ذمے دار یہ خود ہوں گی۔ اگر اس نے ملنے پر آمادگی ظاہر کی تو یہ اکیلی ان سے ملنے جائیں گی۔ جہاں بھی وہ بلائے گا۔ اگر وہ فون پر بات کرنا پسند کرتا ہے تو انھیں یہاں آنا ہوگا جہاں سکندر کے ... اسے ڈر ہوگا کہ فون ٹیپ کیا جائے گا اور کال ٹریس کرنے کی کوشش ہوگی۔ اس کا مکمل اطمینان ضروری ہے۔"

"وکیل صاحب سے کہو کہ ایسا ہی ہوگا۔ اس وقت بھی میں اکیلی ہی آئی تھی۔ اگر وکیل صاحب کی کوشش سے چوہدری صاحب لوٹ آئے تو میں ان کو منہ مانگا انعام دوں گی۔"

دوران گفتگو اس کا ہاتھ بار بار اپنے بالوں کی طرف جاتا تھا اور وہ ایک ہیئر کلپ کو ٹھیک کرتی تھی حالانکہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ مجھے شک ہوا کہ ہیئر کلپ میں خفیہ مائکروفون نہ ہو۔ مردوں کے لیے ویسے مائکروفون کو چھپانا کچھ مشکل ہوتا ہے۔ انھیں قمیص کے بٹن یا ٹائی پن استعمال کرنے پڑتے ہیں جس کے ساتھ تار منسلک ہو تو چھپانا آسان نہیں ہوتا مگر عورتیں لمبے کالے بالوں میں جتنے تار چاہیں چھپالیں۔ چوٹی کے ساتھ گوندھ لیں یا جوڑے میں باندھ لیں۔ جوڑے میں کار بیٹری ٹرانس میٹر کیا پورا ریڈیو اسٹیشن قائم ہو سکتا ہے۔

میں نے خادم حسین کو اس طرف متوجہ کیا "یہ عورت جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ اکیلی نہیں آئی۔ اس کے ساتھ جو بھی آیا ہے وہ کہیں قریب میں موجود ہے اور ساری گفتگو سن رہا ہے۔ شاید ریکارڈ بھی کر رہا ہو۔"

"میں دوڑ کے جاؤں اور پکڑلوں رنگے ہاتھوں؟"

میں نے حیرانی سے کہا "دوڑ کے کہاں جاؤ گے اور کس کو پکڑو گے۔"

"جو بھی مجھے یہ گفتگو سنتا اور ٹیپ کرتا نظر آئے گا۔ ہوگا تو کہیں آس پاس ہی۔"

"ہاں۔ زیادہ دور تو وہ نہیں ہو سکتا۔ اور وہ بیٹھا ہوگا کسی کار میں جس کا ایریل نکلا ہوا ہوگا۔"

خادم نے دلاور کی بیوی سے کہا "وکیل صاحب فرماتے ہیں اب آپ مطمئن ہو جائیں۔ جیسے ہی سکندر بخت سے بات ہوگی وہ آپ کی سفارش کریں گے اور آپ کو اس نمبر پر فون کریں گے جو آپ نے کل دیا تھا۔"

میں نے کہا "اس سے پوچھو کہ دن میں بات کرنی ہو تو کیا کیا جائے اور وہ فون صرف رات کو کیوں دستیاب ہوتا ہے۔"

دلاور کی بیوی نے کہا "دراصل دن میں وہ آفس ہوتا ہے لیکن مجھے پیغام مل جائے گا۔"

نادانستگی میں اس نے ایک ایسی بات بتا دی تھی جو پوچھنے پر وہ کبھی نہ بتاتی۔ اس کی بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سی ڈی ایکسچینج کا آفس ہے وہیں آج کل دلاور کی رہائش بھی ہے اور باہر لگا ہوا سائن بورڈ صرف ظاہرداری ہے۔ یہ جگہ بیک وقت آفس اور رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ سامنے والے حصے میں ایک دو کمرے آفس کے لیے رکھے گئے ہوں گے اور فون اسی حصے میں لگا ہوا تھا۔ رات کو آفس بند ہوتا تھا تو دلاور کی بیوی اس فون کو استعمال کر سکتی تھی۔

یہ ایک اور اہم انکشاف تھا۔ اب یہ معلوم کرنا باقی تھا کہ حسینہ نام کی کوئی لڑکی وہاں رات کو صرف فون کال وصول کرنے پر مامور ہے یا دلاور کی اپنی فیملی میں سے کوئی کال وصول کرتا ہے۔ اس نمبر کو صرف کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہوگا۔ پرائیویٹ نمبر کچھ اور ہوگا جو انتہائی محدود حلقے میں بہت قریب کے لوگ جانتے ہوں گے۔

میں نے کہا "تم جاکے بیگم صاحبہ کو ٹیکسی یا گاڑی تک چھوڑ دو۔ اس کے انکار کی پروا مت کرنا۔ خوش اخلاقی اور ادب آداب کے مظاہرے سے تمھیں کون روک سکتا ہے۔"

دلاور کی بیوی جانے کے لیے اٹھی تو مولوی خادم حسین ساتھ ہو گیا اور پھر یہ صورت حال پیدا ہوئی کہ وہ کہیں بھی اسے نہیں چھوڑتا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے خادم حسین کو سڑک تک ساتھ دینے کی اجازت دی۔ ان کے نیچے اترتے ہی میں نے گیلری میں پوزیشن سنبھال لی۔

خادم حسین سڑک تک گیا۔ پھر دلاور کی بیوی نے اس سے یوں جان چھڑائی کہ وہ ایک رکشا میں بیٹھ گئی۔ یہ مجھے کچھ عجیب سا لگا لیکن ادھر خادم حسین اس شکل بنا کے واپس ہوا ادھر وہ رکشا سڑک کے آخری موڑ پر رکی اور وہ ایک نئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ یہ گاڑی اس سے پہلے مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ یہ تو یعنی دو رنگ کی مرسیڈیز تھی۔ اس کا نچلا آدھا حصہ گرے تھا اور اوپر سے اس کا رنگ نیلا تھا۔ اس گاڑی کے ریڈیو کا ایریل بھی بہت لمبا تھا اور ہوا میں جھول رہا تھا۔ پھر اندر سے کوئی بٹن دبا کے اس الیکٹرانک ایریل کو سمیٹ لیا گیا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ اس کا رخ مخالف سمت تھا چنانچہ میں ڈرائیور کو نہیں دیکھ سکا مگر اس کے سر کی ایک جھلک

بتا رہی تھی کہ میں نے وعدہ خلافی کی تھی۔"

"کیسی وعدہ خلافی کی تھی؟"

"اچھا وعدہ خلافی کی تھی؟" اس نے آہ بھری "سب ہی کرتے ہیں۔ ہوتی ایک ہو تو بتاؤں بھی۔ جو باغ دکھاتے ہیں بیویاں کو کہ تمھیں سونے میں لاد دوں گا اور تم کہو تو چاند تارے بھی توڑ لاؤں گا تمھارے لیے۔ عید پر ایک ریشمی جوڑا تو لا نہیں سکا اس کے لیے۔ ایک سیٹ سنت کر کمائی میں رکھا تھا وہ بھی بک گیا تھا..."

میں نے کہا "پھر آج چلے شاپنگ کریں۔ ایک تو گاڑی نہیں ہو سکتی۔ اچھا نہیں لگتا ہر وقت کسی سے گاڑی مانگنا۔ آج کل میں پھر اپنی بیوی کے لیے پورا انار کلی بازار خرید لو۔ آج ہم بہت خوش ہیں۔"

خادم حسین کو یقین نہیں تھا کہ میں نے جو کہا ہے اس پر عمل کی نوبت بھی آئے گی۔ اب ہم بیٹنے والے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر ادا اور مظفر لوٹ جا چکے ہوں گے۔ راحیلہ کو زبردستی روک رکھا تھا حالانکہ وہ کہہ رہی تھی کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہے اور اسے آرام سے زیادہ ضروری کام ہیں۔ مگر گل نے وزن کی ایک نہیں سنی تاہم اس نے راحیلہ کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔

باہر آکے راحیلہ نے چابی مجھے تھمانے کی کوشش کی "تم چلاؤ گاڑی۔"

میں نے چابی واپس کر کے گاڑی کو ایک لات ماری "اس واہیات چیز کو تم گاڑی سمجھتی ہو۔ ہم بیٹھیں گے اس میں؟ اس سے بہتر ہے ہم کسی گدھے پر بیٹھ جائیں۔ کم سے کم عزت ہوگی۔"

راحیلہ چیخی "دماغ کیوں خراب ہو رہا ہے؟ لات کیوں ماری گاڑی کو؟"

"ہم تو اس کو بھی لات مار سکتے ہیں جو اس کمارے پر بیٹھے اور گاڑی چلانے کی بات کرے۔ معلوم نہیں یہ جانور کس طرف چلتا ہے آگے یا پیچھے۔ اس کا منہ کدھر ہے خادم حسین۔"

خادم حسین بولا "عام طور پر جدھر انجن ہو گاڑی ادھر ہی جاتی ہے۔ اس کا پتا نہیں... غالباً الٹی چلتی ہے۔"

راحیلہ جھنجلا ہوتی "مولوی۔ تم بھی بولنے لگے ہو۔ چیونٹی کے پر نکل آئے ہیں۔ بھاڑ میں جاؤ تم دونوں۔"

"ضرور جائیں گے مگر اس مشین میں نہیں جس کا انجن پیچھے ہے اور پہیے آگے ہے۔ یہ لال رنگ کا چار پہیوں والا اونٹ ہے۔ گاڑی آج ہم خریدیں گے تو تمھیں یہ فرق پتا چلے گا۔"

"پھر یہاں کیوں آئے ہو؟" راحیلہ منہ پھلا کے اندر جانے لگی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "وہ دراصل۔ مولوی خادم حسین کو اپنی بیگم کے لیے کچھ خریداری کرنی تھی۔ ہم نے سوچا کہ اپنی بیگم کو ساتھ لے لیں۔"

راحیلہ نے ہاتھ چھڑا لیا "بدتمیزی مت کرو۔"

"بیگم کا میرا مطلب تھا ہونے والی بیگم۔ دیکھو تمھیں ہماری

سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دلاور کا ولی عہد لگتا تھا۔

"کوئی بات نہیں بیٹے" میں نے دل ہی دل میں کہا "ایک لاکھ تو میں نے وصول کر لیے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم باپ کی جگہ کیا وصول کرتے ہو؟ تمھارا باپ تو برابر کا حریف تھا۔ تم جیسے بچے جو کل تک غلیل بندوق سے کھیلتے تھے آج ہمارے سامنے شکاری ثابت کرنا چاہتے ہیں خود کو۔ کیا زمانہ آگیا ہے۔" دور سے میں گاڑی کا نمبر نہیں نوٹ کر سکتا تھا مگر یہ عام گاڑی نہیں تھی۔ اسے تلاش کرنا بھی آسان تھا۔

صبح کے اخبارات میں غالب کے اور ماضی کے اخبارات نے ڈاکٹر شکیل کے قتل کے کیس کو بہت نمایاں جگہ دی تھی۔ یہ شہ سرخی تو نہیں بن سکتی تھی لیکن ایک نے درمیان میں چار کالمی سرخی یا کسی ہالے کے ساتھ لگائی تھی "برطانوی لیڈی ڈاکٹر کے قتل کا معما پولیس سرجن کے قتل سے زیادہ پراسرار ہو گیا۔" دوسرے نے تین کالمی سرخی یوں لگائی تھی "برطانوی نژاد پاکستانی لیڈی ڈاکٹر کو قتل کیا گیا تھا۔ عدالت کے حکم پر لاش کو قبر سے نکال کے پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر کا بیان۔" اسی اخبار نے پولیس سرجن کے قتل کی خبر کو الگ جگہ دی تھی اور اس کے ساتھ تفتیش کرنے والی پولیس ٹیم کے ارکان کی گرفتاری کی خبر تصویروں کے ساتھ لگائی تھی۔

میں نے کہا "خادم حسین آج دن کی اچھی ہوئی ہے۔ اچانک ہم لکھ پتی ہو گئے ہیں۔"

اس نے ایک آہ بھری "پھر ہمیں کیا ملے گا؟"

"چلو یار تم لے لو۔ ہم کیسے مال حرام بود بجائے حرام رفت۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں جی مال حرام پر۔ اور یہ آپ نے کیسے کہہ دیا کہ بجائے حرام رفت۔"

میں نے کہا "مولوی صاحب کیا واقعی یہ حرام ہے۔ ہم نے ایک کام کا معاوضہ طے کیا تھا۔ نہ شرط لگائی تھی اور نہ لاٹری میں جیتے ہیں نہ جوا کھیلا ہے اور نہ ڈاکا ڈالا ہے۔ اس عورت نے برضا و رغبت بلکہ خوشی سے یہ سودا کیا ہے۔ اب ہم کام نہ کریں اس کا تو واقعی حرام ہوگا ورنہ یہ حق محنت ہے۔ کیا فرماتے ہیں آپ بیچ اس مسئلے کے؟"

خادم حسین نے سوچ کے کہا "آپ کی بات دل کو لگتی ہے جی۔ سکندر بخت سے بات کرانے کے بعد آپ کی ذمے داری ختم۔ وہ مانے نہ مانے اس کی مرضی۔ مسز دلاور کے اور اس کے درمیان معاملات طے نہ ہوں تو آپ بری الذمہ۔"

"گویا مال غنیمت حلال ہے؟"

"اگر واقعی آپ اپنا حق محنت ہی سمجھتے ہیں تو حلال ہے مجھ پر۔ مگر میں کیا کروں گا جی ایک لاکھ کا؟"

"یار دو تین شادیاں کر لینا۔"

"نہیں جناب۔ ایک ہی کافی ہے۔ چار ہوں گی تو بہت ماریں گی مجھے۔" اس نے خوش دلی سے کہا "یہ ایک بھی اس ملے ...

www.paksociety.com

قسم۔ غصے میں تم بالکل اپنی فاکس ویگن جیسی لال ہو چکی ہو۔ اب مسکرا کے بجلی گرا دو ذرا۔"

رابعہ ہنس پڑی "اپنی صحبت میں تم مولوی خادم حسین کو بھی ڈھیٹ بنا دو گے۔"

جیب میں مال ہو تو خریداری ایک دلچسپ شغل بن جاتا ہے لیکن میرا اصل مقصد ایک تو رابعہ کو گزشتہ رات کی کہانی سنانا تھا۔ اس میں واقعات کا تھوڑا سا ردوبدل ضرور تھا۔ میں نے یہ نہیں بتایا کہ ہم مزدہ خانے بھی گئے تھے۔ میں نے کہا کہ دلاور کی بیوی کے لیے یہ دھمکی بھی کافی ہوئی تھی کہ آج اسے تھوڑا سا دلاور مل جائے گا۔ اس کے ناک یا کان۔ بال یا کھال۔ وہ صبح دوڑی ہوئی آئی تھی اور فریچ وکیل کو ایک لاکھ دے گئی تھی کہ وہ سکندر بخت سے بات کرا دو۔

جب میں نے ایک شوروم میں اتفاق سے بالکل ویسی ہی سرخ رنگ کی فاکس ویگن دیکھی جیسی رابعہ کے پاس تھی تو میں نے اسے خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔ دل ہی دل میں خوش ہونے کے باوجود رابعہ نے خفگی کا اظہار کیا۔

"تم تو گاڑی خریدنے آئے تھے۔ اس نامعقول چیز کو گاڑی سمجھتے ہو۔ جب اس سے تو بہتر ہے تم اور خادم حسین منہ کالا کرا کے گدھے پر بیٹھ جاتے۔ ایک کا منہ ادھر دوسرے کا ادھر۔"

میں نے ہنس کے کہا "ارے جانِ جاں جب تم ہمیں پسند ہو تو پھر تمہاری ہر ادا ہمیں پسند ہے۔ ہر چیز پسند ہے جو تمہیں پسند ہے۔ اگر تم لال رنگ کی فاکس ویگن چلاؤ گی تو میں بھی چلاؤں گا۔ تم لال جوڑا پہنو گی تو میں بھی پہنوں گا۔ تم لپ اسٹک سے ہونٹ لال کرو گی تو میں بھی کروں گا۔"

اب میری اور رابعہ کی گاڑیاں حد درجہ مشابہ ہو گئی تھیں اور میں نے عمداً یہ مشابہت پیدا کرنا بہتر سمجھا تھا۔ جو تھوڑا بہت فرق تھا وہ میں نے ایک چھپے سیٹ کور چڑھا کے اور ویسے ہی ڈوگل کیپ لگا کے مٹا دیا تھا۔ اب یہ ہو سکتا تھا کہ ہم دشمنوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہیں تو دونوں کی نمبر پلیٹ ادھر سے ادھر کر دیں۔ یا دونوں پر ایک ہی نمبر کی پلیٹ لگا کے کنفیوژن پھیلا دیں۔ ایک ہی وقت میں دو گاڑیاں حرکت میں آئیں۔ ایک کہے کہ میں نے گاڑی کو مشرق میں دیکھا تھا تو دوسرا کہے مغرب میں۔ اس کے علاوہ فی الحال اس نئی گاڑی میں دشمن کی طرف سے گڑبڑ کا امکان نہیں تھا۔

دوپہر کے وقت میں نے مولوی خادم حسین کو رخصت کر دیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں نے مذاق کیا تھا مگر میں نے رابعہ سے کہا کہ اب خادم حسین کی بیوی کے لیے کچھ تحائف خریدنے ہیں تو وہ پریشان ہو گیا اور انکار کرنے لگا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ بالآخر رابعہ نے اسے دس ہزار روپے قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ بھی اس کے لیے اتنی بڑی رقم تھی کہ وہ بدحواس ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک ہزار کافی ہوں گے مگر رابعہ کے اصرار کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ اس کے ساتھ جا کے ایک ایک چیز دلانا اور ادائیگی کرتے جانا زیادہ مشکل تھا۔ اکیلا وہ گزارہ طور پر خود خریداری کر لیتا تو کہیں زیادہ خوش ہوتا۔ پھر اس کے ساتھ خود ہم بھی UNEASY محسوس کر رہے تھے۔ کباب میں ہڈی کون بنتا ہے۔

وہ شام کو رابعہ کے آفس پہنچنے کا وعدہ کر کے چلا گیا تو ہم ... کے لیے ایک چینی ریستوران میں چلے گئے۔ فرصت اور ... یہ لمحات بہت عرصے بعد میسر آئے تھے مگر تفکرات ہمارے سوار تھے۔ غالب اور نانو کی طرف سے مجھے وقتی طور پر اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ ان پر حویلی کی سو بہت ... ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔ ہم نے دشمنوں کا چیلنج قبول کیا ... اور انہیں جواب میں چیلنج دے کر واضح کر دیا تھا کہ دلاور ... میں ہے۔ اس بارے میں شکوک کی گنجائش نہیں کہ جہاں ... وہیں سکندر بھی ہے اور دلاور کی رہائی کی واحد صورت ... سکندر بخت سے غیر مشروط بات کی جائے۔ ترپ کے سارے پتے ہمارے ہاتھ میں تھے۔ دلاور کی دولت ... شکاری کتوں کی فوج، پولیس اور خصوصی تفتیشی ... بھی دلاور کا سراغ نہیں لگا سکتے تھے اور نہ سکندر بخت پر ... سکے تھے۔

رابعہ نے کہا "تم کب بات کرو گے دلاور کی بیوی سے؟"

میں نے کہا "میرے ذہن میں کچھ اور تھا۔ کراچی جا کے کال کروں۔"

"کراچی جاؤ گے؟ صرف کال کرنے کے لیے؟"

"کراچی کیا ہے۔ دو گھنٹے کی مسافت۔" میں نے کہا "ابھی چلا جاؤں تو کل صبح پھر تمہارے ساتھ ناشتا کر سکتا ہوں۔ ابھی ساڑھے تین بجے ہیں۔"

"مگر اس کا فائدہ؟"

میں نے کہا "ایک تو مجھے یہ ڈر ہے کہ کال ٹریس کی جائے گی۔ یہاں خطرہ زیادہ ہے۔ کراچی میں ... جا سکتی ہے۔ کراچی کا نمبر معلوم کرنا اور پھر ... رابطہ کر کے انہیں کسی نمبر کے پتے پر پہنچنے کے لیے کہنا ... ہے۔ زیادہ دیر بات کرنی ہوئی تو میں دوسری کال دوسرے نمبر سے کر لوں گا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ سکندر ... ہے۔ یہاں شکاری خاصے مایوس ہوں گے کہ ان کی معلومات ناقص اور نامکمل ہیں۔ اچھا ہے سکندر بخت کو تلاش کرنے والے کراچی میں ٹاک ٹوئیاں مارتے پھریں۔ میں کل ہی واپس آ جاؤں گا۔ میرا ارادہ یہ بھی ہے کہ محسن اور گل سے ملوں۔"

"فوزیہ سے نہیں ملو گے؟" رابعہ نے کہا۔

"نہیں۔ محسن سے کہوں گا وہ مل لے۔"

"شرم آنی چاہیے تمہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ تم ... تھے۔ آج اس کی ذرا بھی پروا نہیں۔ یہ کیسی محبت ... کی بیوی بن گئی تو تمہارے جذبات بھی بدل گئے ...

... نہیں؟ مگر خیر میں اس کے گھر جاؤں گا۔ آخر وہ بہن تھی محسن کی اور بچپن سے ہم کزن ہی تھے۔ میری ایک بات سنو۔ تم بھی چپ ...

"... اب تم جاؤ۔ یہاں کے معاملات..."

"... معاملات ہوں گے تو رہتے رہیں... دلاور کی بیوی اب خود کوئی ایسی بات نہیں ہونے دے گی جس سے اس کی بات خراب ہو اور دلاور کو نقصان پہنچے۔ وہ تلاش کراتی پھرے گی فریچ وکیل کو۔"

"وہ سمجھے گی کہ بدمعاش ایک لاکھ لے کر بھاگ گیا۔"

"ایک دو دن میں کچھ نہیں ہو گا۔ منظر اور وقار یوسف اسے سمجھاتے رہیں گے کہ وکیل صاحب کا پتا ٹھکانا کسی کو معلوم نہیں مگر وہ نہیں جا سکتے۔ وہ لندن سے خاص طور پر اس کیس کی تفتیش میں شامل ہونے آئے تھے اور اب تفتیش آگے بڑھ گئی ہے تو ان کے واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ خادم حسین کے پیچھے پڑے گی۔ میں خادم حسین سے کہہ دوں گا کہ وہ بھی غائب ہو جائے۔"

"دو دن کے لیے چلا جائے بیوی کے میکے۔ اسے واپس لانے کے لیے۔ اب تو وہ خوشی خوشی آ جائے گی۔" رابعہ ہنسی۔

"رائٹ۔ سمجھا دیں جائے گا کہ میں اپنے مترجم کے ساتھ کسی کام سے اسلام آباد چلا گیا یا کہیں اور۔ دو دن میں ہم پھر واپس آ جائیں گے۔"

"منظر کو بتانا ضروری ہے۔"

میں نے کہا "ائیرپورٹ سے فون کر دیں گے۔"

رابعہ نے سر ہلا کے اور مسکرا کے تائید کر دی "ٹھیک ہے۔ چلو۔"

ہم ریسٹورنٹ سے نکلے تو ائیرپورٹ پہنچ گئے۔ ہم نے کوئی تیاری نہیں کی تھی اور کوئی پروگرام نہیں بنایا تھا چنانچہ ہمیں تو فلائٹ کا بھی علم نہیں تھا اور نہ یہ یقین تھا کہ فلائٹ پر ٹکٹ دستیاب ہوں گے یا نہیں۔ کار کو پارکنگ ایریا میں چھوڑتے ہوئے گیٹ پر ٹکٹ چیک کرنے والے ملازم کو بتایا کہ شاید میں دو تین دن بعد آؤں گا اور وہ میری کار کا خیال رکھے۔ اسے لاوارث سمجھ کے پولیس کے حوالے نہ کرے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ آخر وہ لوگ جو کاروباری دوروں پر آتے جاتے رہتے تھے گھروں سے گاڑی لاتے تھے اور پھر واپسی میں ساتھ لے جاتے تھے۔ اس طرح وہ ٹیکسی کے چکر سے بچ جاتے تھے۔ ٹیکسی والے منہ پھاڑ کے معاوضہ ... مانگنے کے عادی تھے۔ ان کا موقف ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ ہم کیا کریں۔ ٹھیکیدار الگ حصہ لیتا ہے اور پولیس الگ لیتی ہے۔

کراچی کی فلائٹ اسلام آباد سے آ رہی تھی اور اس میں ابھی گنجائش تھی۔ ویسے بکنگ پوری تھی مگر دو سیٹیں چانس پر تھیں ... کے لیے انتظار کرنے کا فائدہ ہوا۔ ڈھائی گھنٹے بعد ہم پرواز

اس کے سامنے جانے سے؟"

"نہیں۔ ڈرنے کی اب کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"پھر اور یہ کیا ہے۔ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ عشق صرف طلب کا نام ہے اور طلب پوری نہ ہو تو کچھ نہیں۔ قصور فوزیہ کا ہوتا۔ بے وفائی اس نے کی ہوتی تو تمہارا اس سے نفرت کرنا بھی ایک فطری ردعمل سمجھا جاتا۔"

میں نے خفت سے کہا "سچ تو یہ ہے کہ میں خود کو قصوروار سمجھتا ہوں مگر بعد میں جو کچھ ہوا تقدیر کا کھیل تھا۔ میں وہ نہیں چاہتا تھا جو ہوا مگر ہونے والی بات تھی، ہو گئی۔ اس کا گلہ بھی جائز ہے۔"

"لڑکیاں بڑی صابر و شاکر ہوتی ہیں۔ نوشتۂ تقدیر کو قبول کر لیتی ہیں۔ رو دھو کے چپ ہو جاتی ہیں۔ مردوں کی طرح انتقام کے جذبات کی پرورش نہیں کرتیں۔ میں سمجھتی ہوں فوزیہ تم سے نفرت نہیں کرتی۔"

"کرنی تو چاہیے۔" میں نے نظریں چرا کے کہا۔

"اس کے خط سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اب بھی تم سے توقعات رکھتی ہے کہ تم اس کی خوشی کو مقدم سمجھو گے۔ اس کے لیے کچھ کرو گے جس سے اس کا گھر برباد ہونے سے بچ جائے۔ اس کو یقین دلاؤ کہ آج بھی تم اس کی خوشی کے لیے سب کچھ کر سکتے ہو۔ کیا اس کے شوہر کو معلوم ہے کہ پہلے تم منسوب تھے؟"

"پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے معلوم ہو۔ فوزیہ نے خود بتا دیا ہو۔ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔ پڑھے لکھے روشن خیال اور مہذب لوگ ہیں ہم دونوں۔" میں نے کہا "کیا پتا پہلے خود وہ کسی اور کو چاہتا ہو۔ شادی ہو گئی فوزیہ سے۔ ماضی پیچھے رہ گیا۔ آج وہ خوش ہیں اور اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے کوشاں ہیں۔ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ۔"

"ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کیا تم نے کبھی رقابت اور حسد کے جذبات محسوس کیے تھے؟"

"کس کے لیے؟ فوزیہ کے شوہر کے لیے!"

"نہیں، اس شخص کے لیے جو پہلے میرا شوہر تھا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "نہیں۔ اس کا تو خیال ہی نہیں آیا میرے ذہن میں۔ وہ ایک حادثہ تھا۔"

"مجھے بھی معلوم نہیں اب وہ کہاں ہے۔ اگر وہ شادی کے لائق نہیں تھا تو یہ ایک جسمانی معذوری تھی۔ ذاتی طور پر وہ کمزور تھا کہ شادی سے انکار نہ کر سکا مگر وہ تھا شریف آدمی۔ اس نے میری زندگی کو جہنم نہیں بنایا۔ کیا تم حسد محسوس کرتے ہو جب میں ایسا کہتی ہوں؟"

"ہرگز نہیں۔ اگر وہ کبھی ملا تو میں اس سے دوستوں کی طرح ہاتھ ملاؤں گا۔ اسے مدعو کروں گا کہ ہمارے گھر آئے۔"

"اتنا بڑا دل رکھنے کے باوجود تم فوزیہ کا سامنا کرتے ہوئے ڈرتے ہو۔ جاؤ اس سے ملو۔ موقع ملے تو اس سے معافی مانگ لینا۔"

"معافی تو بہت پہلے مانگ چکا تھا میں۔ پتا نہیں اس نے معاف

www.paksociety.com

کر چکے تھے۔ زندگی کے بیزار کن اور اعصاب شکن ماحول سے فرار ہو کے ہم دونوں خوش تھے۔

رابعہ نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا "ایک دن آئے گا جب ہم بلا خوف و خطر کراچی اور لاہور کے درمیان سفر کریں گے۔"

"صرف کراچی ہی کیوں۔ ہم لندن، پیرس اور دنیا بھر میں ہر جگہ جائیں گے۔"

رابعہ نے اداسی سے کہا "آخر کب۔ یہ روز و شب کا سلسلہ ایسے ہی کب تک رہے گا۔"

میں نے فوراً موضوع بدل دیا "کتنا حیران ہوگا محسن ہمیں اچانک سامنے دیکھ کر۔"

رابعہ ہنسی "گل تو بے ہوش ہو جائے گی خوشی کے مارے۔ اکرام شیخ اور کاجل کو یقین نہیں آئے گا اپنی آنکھوں پر۔"

میں نے کہا "مزہ تو آئے گا اس وقت جب میں منظر کو کراچی سے فون کروں گا۔ وہ سمجھے گا مذاق کر رہا ہوں میں۔ یقین آئے گا اسے محسن سے بات کر کے۔"

"اور جب یقین آئے گا تو ایسی سنائے گا تمہیں...؟"

میں ہنس پڑا "میں تو کہہ دوں گا کہ مجھے رابعہ ورغلا کے لے گئی..."

"ہاں۔ ایسے بھولے بھالے معصوم بچے ہو نا تم۔"

"سب سے زیادہ لطف آئے گا مولوی خادم حسین کی بات کا۔ وہ بھونچکاں رہ جائے گا۔ 'ہیں جی۔ کراچی چلے گئے آپ؟ یہیں ایسے ہی جہاز میں بیٹھ گئے؟ جب قدرتی ارادے کے بغیر کام کرنے لگے اور ارادے پر اختیار نہ ہو تو یہ بڑی خطرناک بات ہوتی ہے جی۔ میرے ایک چچا تھے... یااللہ تو پاگل خانے پہنچے...'"

ہم بچوں کی طرح باتیں کرتے رہے اور ہنستے رہے یہاں تک کہ جہاز کے کراچی لینڈ کرنے کا اعلان ہو گیا۔ فلائٹ کے دوران میں نے صرف کافی پی تھی اور رابعہ نے چائے۔ ہم ائرپورٹ سے باہر آئے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ میرے ہاتھ میں صرف ایک بریف کیس تھا جسے میں فریج وکیل کے حلقے میں ہر جگہ اٹھائے پھرنے کا عادی ہو گیا تھا۔

پہلا مسئلہ اکرام شیخ کے گھر پہنچنے کا تھا۔ اس کا پتا جس ڈائری میں لکھا ہوا تھا وہ رابعہ کے آفس میں تھی لیکن میرا خیال تھا کہ اسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ وہ گولیمار کے علاقے میں رہتا تھا اور اس کی ایک ٹیکسی کا نمبر بھی مجھے یاد تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ کاجل اسی علاقے میں کوئی پرائمری اسکول چلا رہی تھی۔ اتنے عرصے میں اسکول یقیناً ترقی کر گیا ہوگا اور گمنام نہیں رہا ہوگا۔ کم سے کم گولیمار کے رہنے والے اس سے ضرور واقف ہوں گے۔

باہر آ کے میں نے قطار میں کھڑی ہوئی ہر ٹیکسی کے ڈرائیور سے پوچھا مگر اکرام شیخ کی ٹیکسی کا مالک اب کوئی اور تھا۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ اس نمبر کی ایک ٹیکسی ہے مگر وہ ٹیکسی جس شخص کی تھی اس کا حلیہ اکرام شیخ سے ذرا بھی نہیں ملتا تھا۔ وہ ایک پٹھان تھا... کسی کو اس کا پتا ٹھکانا معلوم نہیں تھا اور یہ کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہوگا۔ وہ اتنے بڑے شہر میں کسی بھی کونے میں ہو سکتا تھا۔

اب گولیمار جانے کا چارہ تھا۔ میں نے ... بھروسہ کیا اور اندازے سے ایک جگہ اتر گیا جو مجھے ... لگتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ پہلے اکرام اسی گلی میں رہتا تھا۔ خیال کچھ اتنا زیادہ غلط بھی نہیں تھا۔ ایک شخص نے مجھے ... دروازے پر پہنچا دیا جہاں پہلے ٹیکسی ڈرائیور اکرام رہتا تھا۔ ... سے ایک بزرگوار برآمد ہوئے۔ مشکل یہ تھی کہ ... اور ان کے آلۂ سماعت کی بیٹری ختم ہو چکی ... بیٹھنے لگے تو انہوں نے بتا دیا کہ میں اسکول کے ... کروں۔ اس کی بیوی اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھی اور اسکول ... ہی تھا۔ "کیا زمانہ آ گیا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور ... پرنسپل... توبہ۔"

میں اسے کیا بتاتا کہ کاجل پہلے کیا تھی۔ کس کی بیٹی تھی ... کتنی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ وقت بدل گیا تھا اور حالات بدل گئے تھے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے سانحے پر صرف اخبارات میں لکھا جا رہا تھا۔ ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانے والے بیانات دے رہے تھے اور کالم لکھنے والے سیاسی تجزیے کر رہے تھے۔ عام آدمی کے لیے یہ سب لاحاصل تھا ... صبح سے شام تک نون تیل لکڑی کے چکر میں پڑا رہتا تھا اور اب بھی اس کے معمولات میں فرق نہیں پڑا تھا۔

اسکول کا گیٹ بند تھا۔ اندر ایک لائٹ بھی جل رہی تھی مگر چوکیدار غائب تھا۔ آس پاس کے ایک دو لوگوں نے یہ ضرور ... کہ شاید وہ نماز پڑھنے یا روٹی کھانے گیا ہوگا۔ اسکول کے ... کسی کو پتا نہیں تھا مگر وہ اتنا جانتے تھے کہ پرنسپل روز ایک ٹیکسی ... آتی تھیں۔ پرنسپل کا ناک نقشہ وہی تھا جو کاجل کا۔ ایک ... سگریٹ والے نے کہا "ارے ہم سے پوچھو۔ بہاری ہے۔ ... آباد چلی گئی ہے اب تو۔ جس ٹیکسی میں وہ آتی ہے اس کی ... ایک ... کی ہے۔ کہتے ہیں اس کا گھر والا ہے۔ اللہ ہی جانے۔"

بہاری، بنگالی۔ مجھے یہ سب سن کے افسوس ہوا ... پاکستان سے آنے والے کیا پاکستانی نہیں تھے؟ ... پاکستان کی خاطر گھر بار لٹانے والے لوگ تھے ... پر "بہاری" کی چھاپ لگا دی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ... سے پاکستان آنے والوں پر مہاجر کا ٹھپا لگا دیا گیا تھا ... بات ہو گئی تھی۔ نئی تقسیم نے دلوں کو تقسیم کر دیا تھا۔ کاجل ... ہو گئی تھی اور اکرام شیخ پنجابی تھا۔

چوکیدار نو بجے نمودار ہوا۔ وہ اپنی ڈیوٹی چھوڑ کے ... ہو جانے پر ذرا شرمندہ نہیں تھا "اب کیا آدمی ... نوکری کی خاطر کھانا پینا چھوڑ دے۔"

میں نے کہا "نماز یہاں بھی پڑھ سکتے ہو تم اور کھانا..."

رابعہ نے میری بات کاٹ دی "تم کو معلوم ہے پرنسپل کہاں رہتی ہیں؟"

"معلوم ہے جی۔ بچے کو داخل کرانا ہے تو صبح آفس میں ملو۔ گھر پر جاؤ گے تو بے عزتی کراؤ گے اپنی بھی اور میری بھی۔"

میں نے غصے کو ضبط کر کے کہا "ہمیں کسی کو داخل نہیں کرانا ہے۔ تم ہمیں ان کے گھر پہنچا دو۔ گھر معلوم ہے نا؟"

"گھر تو معلوم ہے مگر میں کیسے جا سکتا ہوں ڈیوٹی چھوڑ کے؟"

اس نے طنز سے کہا "نمبر لے لو۔ پوچھ لینا لوگوں سے۔"

"ان کے گھر پر فون تو ہوگا۔ تم فون کر کے انہیں بتاؤ کہ لاہور سے رابعہ اور سکندر آئے ہیں۔"

"میں کہاں سے فون کروں۔ فون اندر بند ہے اور ان کے گھر کا فون نمبر دینے کا آرڈر نہیں ہے۔ ہر ایرے غیرے کو۔"

"ہم ایرے غیرے نہیں ہیں" رابعہ نے خفگی سے کہا "اپنے لوگ ہیں۔"

"اسی لیے تو گھر کا پتا ہے نہ فون نمبر معلوم ہے" اس نے طنز جاری رکھا۔

اس کے دیئے ہوئے پتے کو تلاش کرتے کرتے ہمارا تھکن سے برا حال ہو گیا۔ رابعہ خفا تھی کہ میں نے چوکیدار کو فرض شناسی پر لیکچر دے کر ناراض نہ کیا ہوتا تو وہ ہمارے ساتھ آ جاتا۔ میرا خیال تھا کہ سارا قصور نمبر لگانے والوں کا ہے۔ خواہ مخواہ بلاک نمبر سیکٹر نمبر اور اے بی سی ڈی لگا کے آسان پتے کو مشکل بنا دیا ہے۔ مکان نمبر اور گلی نمبر کافی ہوتا۔ خود وہ ہماری رہنمائی نہ کر سکے جن سے ہم نے پتا پوچھا۔ یا تو وہ بھی ہماری طرح اجنبی تھے یا پھر واقعی انہیں گرد و پیش کی خبر نہیں تھی۔

رات کے دس بجنے والے تھے جب اچانک گھر مل گیا۔ ہم نے دیکھا تو نمبر بھی وہی تھا۔ رابعہ نے فوراً کال بیل دبا دی۔ ایک منٹ بعد خود کاجل دروازے پر آئی اور کچھ دیر ہمیں یوں دیکھتی رہی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

رابعہ نے کہا "ارے کاجل۔ میں رابعہ ہوں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

اس نے سر ہلایا اور دروازہ کھول دیا "آئیے، اندر آ جائیے۔"

اس کا بجھا بجھا چہرہ اور سرد مہری کا رویہ دیکھ کے مجھے حیرانی ہونے لگی "کیا بات ہے؟ تم خوش نہیں ہوئیں ہمیں دیکھ کے؟"

وہ زبردستی مسکرائی "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

رابعہ نے کہا "اکرام کہاں ہے؟"

"وہ... اندر ہیں۔"

اندر سے اکرام کی آواز آئی "کون ہے کاجل؟" پھر وہ خود تولیے سے ہاتھ صاف کرتا نمودار ہوا اور ہمیں دیکھ کے ٹھٹک گیا۔

"تم...!"

"میرا خیال تھا کہ ہمارے اچانک پہنچنے سے تم لوگ خوشی کے ... ہو جاؤ گے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم تو ظاہری اخلاق ... بھی نہیں کر رہے ہو۔ کیا بات ہے؟"

... کاجل اور اکرام نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "تم دونوں ... آ گئے؟"

میں نے ہنسنے سے کہا "کیا مطلب۔ پوری برات کے ساتھ...؟"

"... نہیں آئی۔ اور غالب...؟"

"... کاجل والا تو۔ ہم سے یہ بن بلائے مہمانوں کا سلوک ہو رہا ... بھی آ جاتے تو کیا ہوتا۔ اتنی مشکل سے تمہارا گھر تلاش ... گولیمار میں جھک مارتے رہے۔ گھنٹا بھر سے یہاں پھر رہے ہیں۔"

"پہلے ٹیکسی والوں سے پوچھتے رہے۔ پھر چوکیدار سے تمہارے گھر کا نمبر لیا۔ فون نمبر اس نے دیا نہیں ورنہ تمہیں بلا لیتے ... اپنے ساتھ لے جاتے مگر تم تو واقعی پریشان ہو گئے ہو ہمیں دیکھ ..."

... رابعہ نے دل زدہ لہجے میں کہا "ایسی ہی بات ہے تو ہم چلے جاتے ہیں۔"

"ہاں۔ تم بتا دو گل اور محسن کا" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

اکرام نے آگے بڑھ کے میرا بریف کیس پکڑ لیا "سوری یار۔ ... غلط سمجھے۔ اور ہم بھی۔ اب جانے کا کیا سوال؟"

کاجل نے رابعہ کے گلے لگ کے کہا "ایسا لگتا ہے کہ آپ کو ... پتا نہیں۔ آپ لوگ ایسے ہی آ گئے ہو۔"

میں نے پریشانی سے کہا "یار کس بات کا پتا نہیں؟"

اکرام نے اسے گھورا "کاجل۔ آرام سے تو بیٹھنے دو انہیں ... تم جاؤ کھانے کا انتظام کرو۔"

... نے کہا "نہیں۔ پہلے بتاؤ بات کیا ہے؟"

ہم ان کے مختصر سے ڈرائنگ روم میں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ... کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ ان میاں بیوی کے ... سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہے ہیں۔

... اکرام نے کہا "تمہیں واقعی پتا نہیں۔"

"... بات کا یار۔ ہم تو ایسے ہی اچانک جہاز میں بیٹھے اور پہنچ گئے ... کسی کو بتائے بغیر۔"

اکرام نے کہا "یار میں ابھی واپس آیا ہوں۔ قبرستان سے۔"

... "قبرستان...!"

رابعہ چلائی "اکرام کیا ہوا ہے؟ بتاتے کیوں نہیں؟"

"ایک حادثے میں... ان دونوں کا انتقال ہو گیا۔"

"... محسن اور گل۔"

"... فوزیہ اور اس کا شوہر۔" اکرام شیخ بولا "فوزیہ کو ... بتا تھا۔ وہ پھر اسپتال سے تھی۔ اس کے شوہر کا ... کالج ... ساتھ ... دونوں ..."

www.paksociety.com

پر ایک ٹرک نے پیچھے سے ٹکر ماری۔ فوزیہ تو وہیں مر گئی تھی۔ اس کا شوہر اسپتال پہنچ کے مرا۔"

"او مائی گاڈ۔ کس وقت ہوا یہ۔۔؟"

"ساڑھے تین بجے۔ ٹرک ڈرائیور پکڑا نہیں گیا" وہ بولتا گیا۔ مگر میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس وقت بھی ساڑھے تین ہی بجے تھے جب مجھے اچانک کراچی جانے کا خیال آیا تھا۔ کیا یہ محض اتفاق تھا یا دنیا سے رخصت ہوتے وقت فوزیہ کی آواز نے میرے دل کو آخری بار پکارا تھا۔ یہ زندگی تم سے چاہت کے جرم کی سزا تھی جو میں نے اسی خوشی کاٹ دی۔ وہ جو قرض رکھتے تھے جان کا وہی قرض آج چکا دیا۔ اب نہ تم سے گلہ ہے نہ فریاد۔ مجھے اس کا آخری خط یاد آ رہا تھا۔

روتے روتے رابعہ نے کہا "یہ حادثہ نہیں ہو سکتا۔"

اکرام شیخ نے سرہلایا "بھئی شاہدین کا یہی کہنا ہے۔ ٹرک نے انہیں جان بوجھ کے ٹکر ماری تھی۔ رکشا بالکل بائیں کنارے پر تھا اور سڑک خالی تھی۔ ٹرک بہت دور تک رکشا کو گھسیٹتا ہوا لے گیا تھا۔ دوبارہ پیچھے سے ٹکر ماری تھی مگر اس کے بریک فیل نہیں ہوئے تھے۔ اپنا کام ختم کرنے کے بعد ٹرک آگے گیا اور درمیان کے ایک کٹ سے گھوم کے واپس چلا گیا۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ کیا محسن نے فون کیا تھا؟" کاجل بولی۔

میں نے نفی میں سرہلایا "مجھے کسی نے فون نہیں کیا تھا؟"

"اب محسن کہاں ہے اور گل؟" رابعہ نے کہا۔

"وہ دونوں وہیں ہیں۔ گل اور محسن دونوں فوزیہ کے گھر میں ہیں۔ ہم بھی واپس جانے والے تھے۔ آئے تھے کہ کچھ کھانے کے لے جائیں۔"

"آخر ان سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟" کاجل نے کہا۔

"دشمن تو وہ ہمارے تھے" میں نے کہا "ہمیں مار دیتے اگر ان کا بس چلتا مگر انہوں نے فوزیہ کا گھر آ ڈالیا۔ افسوس کہ فوزیہ نے بھی بہت دیر سے بتایا۔ ورنہ شاید ہم کچھ کرتے۔"

کاجل نے آنسو پونچھ کے کہا "دو سال کا ایک بچہ بھی ساتھ تھا مگر خدا نے اسے محفوظ رکھا۔ وہ پہلی ٹکر میں اچھل کے باہر جا گرا تھا۔ یہ بھی معجزہ ہے قدرت کا۔"

"مر جاتا وہ بھی ماں باپ کے ساتھ ہی تو اچھا تھا" میں نے تلخی سے کہا۔

"وہ محسن کے پاس ہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔ گل اور محسن چند دن پہلے ہی تو کسی بچے کو گود لینے کی بات کر رہے تھے۔۔۔"

"وہ کیوں؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اکرام کو دیکھا "ابھی تو شادی ہوئی ہے ان کی۔"

"ہاں۔ مگر گل ماں نہیں بن سکتی تھی۔ محسن کو پہلے سے معلوم تھا۔"

میں دم بخود رہ گیا "محسن کو کیسے معلوم تھا؟"

"اسے گل نے بتا دیا تھا۔ شادی سے پہلے [illegible] بھائی ڈاکٹر شیخ نائک کے ساتھ تھی تو ایک بار حادثہ پیش [illegible] نائک سٹی۔ میرا مطلب ہے گل بانو کو [illegible] آپریشن ہوا تھا کسی اسپتال میں۔ جان تو بچ گئی [illegible] ڈاکٹروں نے اسی وقت بتا دیا تھا کہ اب یہ ساری عمر [illegible] گی۔ ڈاکٹر رحم نکالنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ دونوں [illegible] لینا چاہتے تھے اور دیکھو قسمت کی ستم ظریفی۔ انہیں ایک [illegible] مل گیا جس سے ان کا خون کا رشتہ بھی ہے۔"

یہ محسن کی بدقسمتی کی انتہا تھی تو اس کی [illegible] اور کردار کی مضبوطی کا قابل رشک پہلو کہ وہ دوستی اور [illegible] ہمیشہ اپنے آپ کو قربان کرتا آیا تھا۔ وہ مانگنا جانتا ہی نہیں تھا صرف دینا جانتا تھا۔ اس نے پہلے شملا جیسی لڑکی کو سہارا [illegible] جس کے گناہ گار ماضی کی دلدل میں کوئی جو [illegible] بچا کے نکل جاتا۔ محسن نے اسے شریک حیات بنانے کی عزت [illegible] اور محبت بھی۔ پھر جب دوستی کے تقاضے پورے کرنے کا وقت [illegible] اس نے اپنی بیوی اور بچے کو ایک عظیم تر مقصد پر قربان کر [illegible] اب مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ اس نے ڈاکٹر شیخ کی [illegible] سٹی کو اپنی زندگی دے دی تھی۔ محبت اور صرف محبت کی [illegible] میں سمجھتا تھا کہ وہ اپنا گھر آباد کرنے بیٹھ گیا مگر اس فریب [illegible] سوائے حسرت تعمیر کے اس نے وہ بیٹھ کر قبول کیا تھا جو [illegible] بھی بے ثمر تھی اور خزاں سے محفوظ۔ اب اس نے اپنا [illegible] بھی گنوا دی تھی اور میں جانتا تھا کہ محسن کا مجرم میں [illegible] محسن کو مجھ سے کوئی گلہ نہیں تھا۔

جب رات گیارہ بجے ہم نے کاجل اور اکرام کے [illegible] گھر میں قدم رکھا جہاں سوگوار فضا میں موت [illegible] یہ سب ایک بھیانک خواب کی طرح لگا۔ یہ گھر فوزیہ کا [illegible] فوزیہ کا جس کے بغیر میں سمجھتا تھا کہ زندہ رہنا ہی ناممکن ہے۔ اس گھر میں فوزیہ نہیں تھی۔ صرف اس کی یادوں کا عکس [illegible] اپنے وجود اور عدم کا احساس دلا رہا تھا۔ اس [illegible] جہاں میں دھڑکتے دل اور حسرت دید کے ارمان لے کر [illegible] گھر سے رخصت ہو جانے کے بعد میں نے فوزیہ کو نہیں [illegible] اور اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کی [illegible] زندگی پر بھی میرے حالات کا منحوس سایہ پڑنے لگا [illegible] تک پہنچی کہ وہ براہ راست مجھ سے اپنے گھر کی سلامتی [illegible] مانگنے پر مجبور ہو گئی۔

یہاں آتے ہوئے ہم کتنے خوش تھے مگر کسے معلوم [illegible] ہم پر ہنس رہی ہے۔ اب اس اجنبی گھر میں قدم رکھتے ہوئے [illegible] احساس جرم و ندامت سے جھکا ہوا تھا لیکن محسن وہی محسن [illegible] مجھ سے گلے مل کے بہت رویا "یار تو نے اچھا کیا کہ آ گیا [illegible] سب بہت یاد آ رہے تھے جو یہاں نہیں تھے۔ نازو اور طالب [illegible] آ گئے۔"

منظر کو معلوم تھا؟"

"ہاں۔ اس سے میری بات ہو جاتی تھی۔ تمہاری خیر خبر بھی [illegible] رہتا تھا۔"

"اس نے کبھی مجھ سے تذکرہ نہیں کیا۔"

"ہاں۔ وہ چاہتا تھا کہ اب ان معاملات سے میں دور رہوں [illegible] نہیں کچھ پتا نہ چلے۔ تیرے لیے ویسے ہی کم پریشانیاں [illegible]"

"[illegible] پریشانیاں میری وجہ سے دوسروں کے لیے ہیں۔ اتنا [illegible] تم سب نے میرا کہ میں احسان کے بوجھ تلے دب کر [illegible] جا رہا ہوں۔ [illegible] قربانیاں کا قرض ہے مجھ پر۔"

"[illegible] باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ رشتے اور کس لیے [illegible] دعوتوں اور تقریبات میں بلانے سے تو سب ہی آ جاتے [illegible] خلوص اور محبت کی کسوٹی ہوتا ہے برا وقت۔ برا وقت کسی پر [illegible] آتا ہے۔ آج تجھ پر ہے۔ کل مجھ پر آ جائے تو کیا میرا ساتھ [illegible] نہیں دے گا؟"

میں نے کہا "محسن۔ اس میں تو شک کی گنجائش ہی نہیں کہ وہ [illegible] مجھے مارنا چاہتے تھے اور وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ میں تمام عمر اپنے آپ سے شرمسار رہوں گا کہ فوزیہ کا بستا گھر میری وجہ سے اجڑا۔ شکاری اس کے پیچھے لگ گئے تھے اور بالآخر انہوں نے اسے شکار کر لیا۔ انہیں دو دو ڈاکے مار دیا۔"

"[illegible] تو یہ ہے کہ جب تک ثبوت نہ ہو۔۔۔"

"کیا تو نے خود معلوم کیا تھا؟ کسی نے تو ڈرائیور کو دیکھا ہو گا۔ [illegible] کا نمبر نوٹ کیا ہو گا۔ وہ ٹرک کیسا تھا؟"

میں نے تو نہیں مگر اکرام نے پوچھا تھا۔ ٹیکسی چلانے والوں کی بات انچیانی کی تھی کہ حادثے کے وقت کوئی ٹیکسی وہاں سے [illegible] تھی تو کسی ڈرائیور نے کچھ دیکھا تھا۔ ٹیکسی والوں نے [illegible] چلانے والوں کی یونین سے رابطہ کیا۔ وہاں ایک سا تھی کی [illegible] بیلی تی مشتعل تھے۔ سنا ہے پولیس کو کسی نے گمنام اطلاع [illegible] مگر انہوں نے اہمیت نہیں دی۔ لالو کھیت کے تھانے میں [illegible] نے فون پر حادثے کی اطلاع دی تو وہاں ایک رکشا والا [illegible] موجود تھا اور ایک کو تھانے دار نے مرغا بنا کے کان [illegible] رکھے تھے۔ اس نے تھانے دار کی ٹوپی سے بچے ہاتھ لیے [illegible] کے۔ اس نے کچھ سنا تھا۔ تھانے دار بہت گرمی دکھا رہا [illegible] دیکھ لیا اور ڈرائیور کا ٹرک نمبر نہیں دیکھا۔ یہ بھی نہیں [illegible] کس کمپنی کا ٹرک ہے۔ کالا رنگ، گھنگریالے بال، موٹے [illegible] کسی بھی مکرانی کے ہو سکتے ہیں۔ اور دو کانوں میں سونے کی [illegible] بھی پہنتے ہیں۔"

[illegible] نے چونک کے کہا "یہ بھی بات ہوئی تھی؟"

[illegible] اور اس سے مجھے شک پڑتا ہے کہ وہ استاد پیڈ مونہ [illegible]

[illegible] اکرام زادہ ہو گا محسن۔ وہ پچھلے دنوں کراچی آیا ہوا تھا۔

[illegible] نے نظر ملائے بغیر کہا "انہیں معلوم ہی نہیں۔ ہم بھی کسی وجہ کے بغیر اچانک ہی ٹکٹ لے کر جہاز میں بیٹھ گئے۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد میں نے رابعہ سے کہا کہ چلو کراچی چلتے ہیں۔ اس نے کہا چلو۔ ٹکٹ بھی مل گئے۔ پتا نہیں یہ سب کیسے ہوا؟"

"مجھے بھی یقین تھا۔ ایسے میں دل چاہتا تھا کہ تو بھی ہوتا تو ہم فوزیہ کی باتیں کرتے۔ تجھ سے اور مجھ سے زیادہ اسے کون جانتا تھا۔ ہم تو جب پیدا ہوئے تب سے ساتھ تھے۔۔۔" وہ روتے روتے پرانے وقتوں کی یادوں میں کھو گیا۔ "ہم کہاں کہاں ایک ساتھ تھے۔ کس شہر میں ہمارا گھر کہاں تھا؟ ہم کیسے اکٹھے کھیلتے تھے۔ کیسے لڑتے تھے کیسے روٹھ جاتے تھے۔ انکل شیروانی، وزیر خان کیسے دوست تھے۔ یادیں، باتیں، پچھتاوے، مایوسیاں۔ ٹھیک ساڑھے تین بجے فون پیش آیا اور فوزیہ نے کہا خدا حافظ۔ میں نے ٹھیک ساڑھے تین بجے کہا کیوں نہ میں کراچی ہو آؤں۔ یہ کیا تھا؟ اتفاق۔ ٹیلی پیتھی۔۔۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کہتے ہیں جواب دا کہ تجسم کیا ہے؟"

فوزیہ کا بیٹا ہو بہو اس کی شکل کا تھا۔ اس کے شوہر سے میں کبھی نہیں ملا تھا۔ میں نے اس کی تصویر پہلی بار دیکھی۔ پھر رات کو ہم پرانے البم دیکھتے رہے۔ کاجل اور گل رو رو کے سو گئی تھیں۔

"تو نے مجھے اطلاع تک نہیں دی" میں نے کہا۔

"مجھے گل نے روک دیا تھا۔ پھر اکرام نے بھی کہا کہ کیا فائدہ۔ چند گھنٹے میں تو سب کچھ ختم ہو گیا۔۔۔"

"مجھے کچھ روز پہلے فوزیہ کا ایک خط ملا تھا" میں نے کہا۔

"اچھا۔ کیا لکھا تھا اس نے؟"

میں نے جیب میں سے خط نکال کے اسے دے دیا۔ اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اس کی نظریں خط کے الفاظ پر جم سی گئی تھیں۔ شاید کئی بار پڑھنے کے بعد اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خط مجھے واپس کر دیا۔ میں نے اسے اکرام شیخ کی طرف بڑھا دیا۔

میں نے کہا "محسن۔ میرے دل پر بڑا بوجھ ہے۔ میں کیا کروں؟ یہ سب میری وجہ سے ہوا؟"

"چھوڑ یار۔ تقدیر سے لڑ سکتا ہے کوئی۔ چچا وزیر خان کا قتل کیوں ہوا تھا؟ میری ماں کو کینسر کیوں ہوا تھا۔ انکل خاصا رضوی، استاد نیلی، شملا، یہ سب ہی اچھے لوگ تھے۔ انہیں کس کے جرم کی سزا ملی۔ اصل سزا تو زندہ بچ جانے والوں کے لیے ہوتی ہے۔ جو احساس کے عذاب سے گزرتے ہیں۔۔۔"

میں نے کہا "تو فوزیہ سے کیوں نہیں ملتا تھا۔ ایک ہی شہر میں تھے تم اور اسے تمہاری خبر نہیں تھی؟"

"میں جان بوجھ کے اس سے دور رہا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے میری بہن ہونے کی سزا نہ ملے لیکن میں اس سے بے خبر نہیں تھا۔ میں اس کے شوہر سے کلب میں مل لیتا تھا۔ وہ بھی پریشان تھا لیکن وہ حوصلہ مند آدمی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ باہر چلے جائیں۔ منظر نے کچھ بندوبست کرایا تھا۔ میں پوری حفاظت کر رہا تھا فوزیہ کی۔"

www.paksociety.com

اور اُس کا اصل مقصد تجھے اغوا کرنا یا نقصان پہنچانا تھا۔ وہ گل کو بھی پکڑوانا چاہتے تھے کہ یہ ناگن ہی ہے جو دربدری کی زندگی گزار رہی ہے۔"

محسن سوچ میں پڑ گیا "ایک بات اور بھی ہے۔ یہاں زیادہ تر ٹرک ڈرائیور پٹھان ہیں۔ سرحد، بلوچستان کے رہنے والے۔ پنجابی کم ہیں۔ کراچی تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کم سے کم میں نے اس علاقے کا کوئی ٹرک ڈرائیور آج تک نہیں دیکھا۔"

"یہ بات جس رکشا والے نے سنی تھی۔ وہ کون ہے؟"

"ابھی کچھ معلوم نہیں لیکن پتا چل جائے گا کل پرسوں میں۔"

"جس تھانے دار نے فون ریسیو کیا تھا کیا وہ خود جائے واردات پر گیا تھا؟"

"نہیں۔ اس نے تو فون کرنے والے کو ڈانٹ کے فون بند کردیا تھا کہ جب پتا نہیں ساری بات کا تو وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔ ایسے فون پر رپورٹ نہیں لکھی جاتی۔"

"اس تھانے دار اور اس رکشے والے کا پتا چلانا ضروری ہے جو وہاں مرغا بنا ہوا تھا۔"

"کچھ نہیں ہوگا اس سے سکندر۔ فرض کرو وہ استاد پیڑو ہی تھا پھر؟ کیا ہوگا اگر یہ معلوم ہوگیا۔ اول تو پولیس بہانے تلاش کرتی ہے کوئی کارروائی نہ کرنے کے۔ معلوم ہے رپورٹ کیا لکھی گئی ہے حادثے کے بارے میں؟ تفتیشی افسر صاحب کا کہنا ہے کہ رکشا غلط سائیڈ پر تھا۔ اس کا اگلا ٹائر بہت پرانا ہونے کی وجہ سے پھٹ گیا تھا اور غالباً اسی وجہ سے رکشا بے قابو ہو کے ٹرک کے سامنے آگیا۔ ٹرک ڈرائیور جان بچانے کے لیے فرار ہوا ورنہ مجمع اسے آگ لگا دیتا۔ اس کے علاوہ اگر یہ کام استاد پیڑو کا تھا تو وہ اسی وقت لاہور چلا گیا ہوگا۔ پکّی فلائٹ سے۔ اور دو گھنٹے بعد لاہور میں ہوگا۔ وہاں ایک نہیں دس گواہ ہوں گے یہ ثابت کرنے والے کہ وہ تو لاہور سے کہیں گیا ہی نہیں تھا۔"

میں نے کہا "خیر۔ ہم خود پیڑو سے پوچھ لیں گے۔ لیکن اب تیرا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ ان کا ٹارگٹ تو تھا۔ تیرا سراغ نہیں لگا سکے وہ۔ اگر تو نے سامنے آ کے تفتیش شروع کی تو انہیں آسانی ہو جائے گی۔"

اکرام شیخ زیادہ قریب ہی رہا تھا۔ اس نے میری تائید کی۔

"محسن کو تو جنازے میں ہی دیکھ لیا گیا ہوگا۔ وہاں کم لوگ تھے۔ ابھی ہمارے زیادہ جاننے والے نہیں ہیں یہاں۔"

میں نے کہا "تم ہمارے ساتھ چلو۔"

اکرام نے کہا "ہاں۔ ان حالات میں ان دونوں کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ ایک ذمے داری بھی قبول کرلی ہے تم نے۔ کہیں ایسا نہ ہو..."

"نہیں یار۔ ایسا مت کہو۔ گل مر جائے گی اگر اس بچے کو کچھ ہوا۔"

"پھر تم کو یہاں ایک دن بھی نہیں رکنا چاہیے..."

"تو ہاں ہم سب تیار ہیں۔"

"تم سب کل کے بھی نیا کرسکتے ہو۔ ہونے والی بات بھی ہو سکتی ہے۔" محسن بولا "خیر صحیح بات کر رہے ہو۔"

میں نے کہا "تم سو جاؤ۔ مجھے ایک فون کرنا ہے لاہور۔"

"یہاں تو فون نہیں ہے۔" محسن بولا۔

"فون اسکول میں ہے۔" اکرام نے کہا "ابھی [illegible] چلو۔"

جب ہم باہر نکلے تو گلی میں [illegible] سناٹا تھا۔ ہمیں اسکول پہنچنے میں دس منٹ بھی نہیں لگے [illegible] سویا پڑا تھا۔ اکرام شیخ نے اسے جگا دیا تو [illegible] بولا نہیں۔ اس نے پرنسپل کے کمرے کا تالا کھول [illegible] کا نمبر ملانے لگا۔ رات کے وقت لائنیں بھی خالی [illegible] کال دس منٹ میں لگ گئی۔ [illegible] خادم حسین بول رہا تھا۔

میں نے کہا "مولوی خادم حسین۔ کیا حال ہے تمہارا؟"

"اب حال پوچھتے ہو جی" وہ ایک دم پھٹ پڑا "مجھے [illegible] میں ڈال کے خود غائب ہوگئے۔"

میں نے تشویش سے کہا "آخر کیا ہوا؟ [illegible] بتاؤ تو سہی۔"

وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگا "وہ آئی تھی جناب [illegible] گھر والی۔ اپنی حرام کی اولاد کے ساتھ۔ ماں بیٹا دونوں [illegible] خطرناک اسلحہ تھا۔ زبردستی مجھے لے گئے۔"

"کہاں لے گئے؟" میں نے چلا کے کہا "خادم... ہیلو ہیلو" لیکن لائن کٹ گئی تھی یا کاٹ دی گئی تھی۔

عصرِ حاضر کی الف لیلیٰ۔ دنیا کی دلچسپ ترین کہانی
ٹیلی پیتھی کے فن کار فرہاد علی تیمور کی سرگزشت
سسپنس ڈائجسٹ کی مسلسل وار کہانی
دیوتا
دیوتا پچھلے [illegible] برسوں سے مسلسل سسپنس ڈائجسٹ میں چھپ رہی ہے اور
اس نے طوالت اور مقبولیت میں دنیا کے تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں

[illegible] کے دیکھ رہا تھا کہ وہ دلہن جوڑے میں کیسی لگے گی اور [illegible] دور ہو کرنے والا پڑا تھا... سوچ رہا تھا کہ [illegible] جاؤں... بس جی اسی میں ہوا آگیا اور آگئی اندر [illegible] غیر منکوحہ بیوی... ہاتھ میں اس کے تھا اتنا بڑا [illegible]

[illegible] نے کہا "تو یہ کہو کہ توپ لے کر آئی تھی۔"

[illegible] توپ کی گولی اور ریوالور کی گولی... تھوڑا سا چھوٹے بڑے کا [illegible] کام ایک ہی ہے دونوں کا۔ بس جی اس نے سر پہ میری [illegible] کا اور کہنے لگی کہ مولوی اٹھو اور شرافت سے [illegible] ساتھ چلو... میں نے کہا کہ دیکھو میں شادی شدہ اور بڑا [illegible] گناہ نہیں کرسکتا میں... پیچھے سے آگیا وہ خطرناک [illegible] جس کی ولدیت کے خانے میں بالا وجہ چوہدری دلاور کا نام [illegible] ہے۔ اس نے ہاتھ مار دیا جی میرے منہ میں سامنے [illegible] مجھے لوٹا نظر آتا ہے مگر بڑا گراورا جوان ہے [illegible] نے کہا کہ روٹی لائی بھی اور مجھے باہر گھسیٹ لیا کہ چلو [illegible] ساتھ اور بتاؤ کہ ڈیڈی کہاں ہیں... میں نے کہا کہ... کون [illegible] تو اس نے پھر دھکا دیا مجھے کہ چوہدری دلاور صاحب... [illegible] ماں۔ وہ بیٹے کو روکنے کے بجائے کہہ رہی تھی کہ ایک [illegible] مار اس کے فیل پھر اسے یاد آجائے گا سب۔ ورنہ یہ [illegible] پوچھے کہ کون سے چوہدری دلاور صاحب؟ میں نے... میں [illegible] کیا وہ ہیں اس کے ڈیڈی... پتا ہے تمہیں؟ یہ کون [illegible] باتیں پوچھ رہا ہوں میں نے جی؟ وہ تو ٹوٹ پڑی مجھ پہ جناب۔ وہ [illegible] اس کا بیٹا۔ دونوں نے آہ... تھپڑ مارا میرا [illegible] خالی تھی۔ میری سننے والا کوئی بھی نہیں تھا۔" وہ پھر رونے لگا۔

میں نے کہا "خادم حسین۔ یہ کیا بات ہوئی تم مرد ہو کے [illegible] خرم آئی ہا ہے تمہیں۔ تم نے مقابلہ نہیں کیا ان کا [illegible] مار کھاتے رہے۔"

"خود کرتے جی آپ تو۔ سالا ایسا... اور چھ چھوالوں... پھر کالا [illegible] کا میں نے مارا تھا۔ وہ دو تھے جناب۔ انہوں نے مل کے [illegible] ضربات خفیفہ و شدیدہ لگائی تھیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "یعنی تم گنتے بھی جا رہے تھے؟"

"[illegible] ایک ایک کا بدلہ لوں گا میں آپ کو۔ ورنہ یوم حشر [illegible] ہوگا۔ میں نے بھی کمی نہیں رکھی۔ جن جن کے [illegible] کر بیٹھے نہیں سنی ہوں گی... آہ۔"

[illegible] نے کہا "وہ مجھے تو نہیں ہوں گی تمہاری فارسی۔ اردو [illegible] گالیاں ہوتی ہیں خادم حسین۔"

"[illegible] میں اپنی زبان ناپاک کرتا... اور پھر عورت کے [illegible] جھک جاتی ہے میری۔ وہ بک رہی تھی اول فول۔ [illegible] کا زیور ہے۔"

تھوڑی سی کوشش کے بعد لائن پھر مل گئی اور خادم حسین نے بھیں بھیں روتے ہوئے کہا "ہیلو! ہائے۔"

میں نے کہا "خادم حسین۔ یہ کیا تم عورتوں کی طرح ہائے وائے کر رہے ہو۔ مجھے سخت تشویش ہو رہی ہے۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"کمال ہے جی... میں کوئی ایکٹنگ تو نہیں کر رہا ہوں... بے شک خوشی میں بھی بندہ روتا ہے مگر یہ نہیں... آہ، دماغ ٹھیک کیا ہے اس نے میرا۔ اونہہ... مگر باقی سب کچھ ختم تو نہیں چھوڑا۔"

"کس نے... اور تم اتنا چلا کیوں رہے ہو؟"

"مولوی اب کیا چلانے پر بھی پابندی ہے۔ یہ تو وہی بات ہوگئی... جو کسی شاعر نے کہا ہے۔ نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی... آہ! گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے... ہائے۔"

مجھے غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی۔ شعر کے آخر میں آہ اور ہائے کا اضافہ مولوی خادم حسین نے کیا تھا "دیکھو، ہوش رکھو۔ کیا تم خدا نخواستہ بہت زخمی ہو۔ دلاور کی بیوی تمہیں کہاں لے گئی تھی اور کیوں، پوری بات بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں جی... مجھے وہ نہیں، قضا لے گئی تھی... اور سچی بات تو یہ ہے کہ قضا پہلے مجھے آپ کے پاس لے آئی تھی۔ گھر والی کی بددعا لگی ہے مجھے۔ ظالم نے بڑی جلدی کی بددعا میں بھی۔ کل تک انتظار کرلیتی۔ سارے گلے شکوے دور کر جاتا اس کے... آہ... کتنے ارمانوں سے یہ ریشمی سوٹ... سونے کے زیورات، جوتیاں، پراندے، ہائے کیا کچھ نہیں لیا تھا اس کے لیے گرو جی... توبہ رب کی۔ میری دعا بڑی دیر میں سنی۔ اس کی بددعا فوراً سن لی۔"

میں نے جھنجلاہٹ اور کوفت پر بڑی مشکل سے قابو پایا "کوئی بات نہیں خادم حسین۔ یہ سب دو گے اسے تو وہ خوش ہو جائے گی۔ اب ذرا آرام سے مجھے بتاؤ۔"

"آرام سے۔ تو آرام اب کہاں مقدر میں جی۔ سیدھا بیٹھ نہیں سکتا۔ نہ لیٹ سکتا ہوں۔ نہ کھڑا ہو سکتا ہوں۔ ہر طرف سے... ساری ہڈیاں ہل گئی ہیں... دو سو بیالیس ہڈیاں ہوتی ہیں جناب انسان کے جسم میں... میری شاید ڈھائی سو ٹوٹ گئی ہیں۔"

"کیا ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں... کیسے...؟"

"آپ سامنے ہوتے جی۔ پھر بتاتا کوئی ہڈی توڑ کے... کہ ایسے... ہڈی کیسے ٹوٹتی ہے جناب۔ سینے کی سب پسلیاں توڑ گئے۔ ریڑھ کی ہڈی، گردن کا منکا... سب توڑے ہیں ظالم نے۔"

"کیا کیا فضول بکواس ہے یہ۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ سیدھی طرح بتاؤ۔"

"اسے سیدھا ہوا نہیں جاتا۔ سیدھی طرح کیا بتاؤں۔ وہ آئی تھی۔ فلاں فلاں کی غیر منکوحہ بیوی۔ ناپاک جانوروں کا نام کیسے لوں جی۔ وہی دلاور کی منکوحہ۔ میں بیٹھا تھا اس کے تصور میں گم

www.paksociety.com

"اچھا بات مختصر کرو۔ پھر وہ کہاں لے گئے تمہیں؟"

"وہ تو مار رہے تھے اوپر لیکن میں جان بچانے کے لیے خود ہی نیچے چلا گیا۔ اب دیکھتے ہیں جی، یہ سب آپ کی غفلت اور نااہلی کے باعث ہوا۔ گیٹ اگر مقفل ہوتا تو وہ خاموشی سے اوپر کیسے آتے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ وہ مجھ سے پوچھ کے اوپر آئے۔ تم بھی احمق ہو خادم حسین۔ تم آفس کا دروازہ کیوں کھولے بیٹھے تھے؟"

"میں کچھ استغراق کی کیفیت میں تھا جی۔ نیچے گاڑی موجود تھی ان کی... وہ آگے بیٹھ گئی اور مجھے اس کی اولاد نے بچھے گدے کی طرح بچھا دیا جناب اور میرے اوپر بیٹھ گیا۔ اسی سے ریڑھ کی ہڈی کے جنگلے ٹوٹے۔"

"ڈراما مت کرو مولوی خادم حسین۔ تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے مجھے معلوم ہے ورنہ تم اسپتال میں ہوتے یا قبرستان میں۔"

"افسوس صد افسوس۔ کوئی قدر نہیں آپ کی نظر میں خادم کی وفا ... کی۔ میں نے بہت پوچھا کہ ایسے غیر قانونی اور غیر اخلاقی طریقے پر مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔ میں رپورٹ لکھوا دوں گا پولیس کو۔ اس خبیث الدھر کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا۔ وہ لہرانے لگا میری ناک کے سامنے اور بولا کہ تمہیں آپریشن کے لیے لے جا رہے ہیں۔ تمہارے اعضائے رئیسہ کاٹ کے دیکھیں گے کہ آخر تم چیز کیا ہو۔ سر کاٹیں گے اور مغز چیک کرائیں گے کہ اس میں گوبر کتنے فیصد ہے اور بھوسا کتنا۔ عقل کون سی ہے مردانہ زنانہ یا درمیانہ۔ اس کی ماں تو نہال ہو رہی تھی بیٹے کی باتوں پر۔ توبہ توبہ کیا اور شرافت تو اٹھ گئی ہے زمانے سے۔"

"تمہیں بالکل اندازہ نہیں کہ وہ تمہیں کہاں لے گئے تھے؟"

"اندازہ تو مجھے صرف اس کے وزن کا ہو رہا تھا اور سانس رکنے سے نزع کا عالم تھا۔ یہی لگتا تھا جی کہ سفر آخرت ہے۔ بس کلمہ پڑھتا رہا میں۔ ان کا گھر ہی ہوگا وہ جہاں مجھے گھسیٹ کے نیچے ڈال دیا گیا تھا پھر منکر نکیر جیسے دو جلاد صفت ملازم مجھے اٹھا کے اندر لے گئے اور جناب وہاں مجھ پر بہت تشدد ہوا۔"

"کیا پوچھ رہے تھے وہ تم سے؟"

"پہلے تو چودھری دلاور کے بارے میں پوچھتے رہے۔ ایک تالا خانساماں تھا جی۔ کبھی میری آنکھوں میں مرچیں ڈالتا تھا۔ کبھی ناک میں گرم مسالہ۔ ایک چمچ بھر کے نمک بھی کھلا دیا اس نے زبردستی۔ اس کا ارادہ کان میں خوب گرم سرسوں کا تیل بھر کے جی جلانے کا بھی تھا۔ کہتا تھا کہ کان میں دیا جلاؤں گا تو مولوی کے دماغ میں روشنی ہوگی۔ دوسرا زیادہ بے رحم تھا جناب۔ اس نے مجھے الٹا لٹکا دیا پنکھے سے۔"

"واقعی۔ آئی ایم ویری سوری خادم حسین۔"

"ابھی کیا ہے۔ آگے سنیں گے تو کلیجا منہ کو آنے لگے گا۔" مولوی خادم حسین پر رقت طاری ہو گئی "رسی اس کے ہاتھ میں تھی۔ بار بار ڈھیلی چھوڑتا تھا اور پھر کھینچ لیتا تھا۔ وہ اولاد ابلیس۔ فیل

کہتا تھا کہ مولوی کا سر فرش پر لگے گا اور پاش پاش ہو ... میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا اس نے جب میں بے ہوش ہو گیا تو انھوں نے مجھے اتار لیا نیچے اور فرش پر ڈال دیا۔"

"تم واقعی بے ہوش ہو گئے تھے؟"

"نہیں جی۔ کچھ ڈراما تو کرنا ہی تھا جان بچانے کے لیے ... ان کو پتا چل گیا۔ ایک بدمعاش سائیکل میں ہوا بھرنے والا ... لے آیا اور کہنے لگا کہ مولوی کو اوپر سے ایڈجسٹ کر دو ... بھرتے ہیں۔ غبارے کی طرح پھولے گا اور پھر پھٹ جائے گا ... نے بھی جناب اللہ پر بھروسا کیا۔ میں نے کہا کہ تم ... ہو مگر جو بات مجھے نہیں معلوم وہ کیسے پوچھ سکتے ہو ... ماں بار بار کہتی رہی کہ دیکھو مار پیٹ اور تشدد ایسے ... الزام ثابت ہو جائے مگر اس کا نافرمان بیٹا ماں کی کہاں ... پھر وہ تنخواہ دار جلاد۔ اس کے ملازم، دونوں مجھے قتل کرنے ... حد شوقین نظر آتے تھے۔ انھیں یہ ڈر بھی تھا کہ زیادہ ... وکیلوں کے ٹولے کو پتا چل جائے گا۔ وہ گشت کی ... والوں کو بلا لیں گے اور کہیں گے کہ ابھی تلاشی کرو ... حسین کو۔"

میں نے کہا "مجھے یہ بتاؤ کہ نتیجہ کیا نکلا؟"

"آپ کو ابھی تک یہ پتا نہیں چلا جی؟ افسوس صد افسوس ... میرا وہ حال ہو گیا ہے جناب جو رکشے کا ڈبل ڈیکر بس ... سے ہوتا ہے یا شیرے ٹول چلانے کے بجائے توپ کا گولا ... ہو سکتا ہے۔ آپ پوچھتے ہیں نتیجہ کیا نکلا۔ میں خود نکل آیا ... میرا جنازہ نہیں نکلا اور بدن سے جان نہیں نکلی ورنہ ان ... کون سی کسر چھوڑی تھی؟"

"مجھے بہت افسوس ہے خادم حسین۔ واقعی بہت دکھ ہوا ... لیکن کیا تم نے کچھ بتایا؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ اتنا بودا سمجھتے ہیں جی آپ مجھے۔ تم ... یہ تو کوئی آزمائش ہی نہیں تھی۔ اگر وہ مجھے ذبح کرتے ... کھال اتارتے۔ میری بوٹیاں بناتے قیمہ کرنے والی مشین ... گزارتے پھر اس قیمے کو مرچ مسالے کے ساتھ ... کباب بنا دیتے اور کباب تیز آنچ پر ڈیل آئل میں تل کے ... کھلا دیتے تب بھی خادم کی زبان خاموش رہتی۔ مجھ سے ... اگلوانے کے لیے ان جیسے دس ہوتے اور دس دن تک ... روز مشقت کرتے تو آخر میں خود ہی تھک کے ہار جاتے ..."

"آفرین ہے تم پر خادم حسین۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا ... تم اندر سے اتنے سخت جان ہو اور اتنے بہادر ہو۔ اور کیا ... انھوں نے؟"

"بس جی پہلے تو وہ اپنے بیٹے والد کا پوچھتا رہا پھر ... بارے میں تو خود اس کی ماں فلاں فلاں کی غیر معلوم ... غصہ آتا ہے جی۔ کہیں ہلاک جاؤں ...

www.paksociety.com

زبان پر۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ آپ کہاں روپوش ہیں اور آپ کے بارے میں راجہ بی بی کو اور ان کے دوستوں کو علم ہے یا نہیں؟ انہیں وہ وکیلوں کا ٹولہ کہتے ہیں۔ وکیلوں کے ٹولے کی باتوں سے کیا پتا چلتا ہے۔ کیا وہ آپ سے کہیں ملتے ہیں؟ کبھی بات کرتے ہیں آپ سے فون پر؟ میں نے کچھ نہیں بتایا جی۔ یہی کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ میرے سامنے کوئی بات نہیں ہوتی اور نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا ہے آتے جاتے۔ وہ آسانی سے ماننے والے لوگ نہیں تھے۔ اپنی کارروائی بھی کرتے رہے۔ ایک بار مجھ سے کہا کہ اچھا اب کلمہ پڑھو پھر وہ خانساماں جو کھانا کھا کے بلڈوزر ہو گیا ہے۔ میرے منہ پر تکیہ دبا کے بیٹھ گیا۔ میری سانس رک گئی تھی۔ غالباً آخری سانس تھی وہ جناب کہ اس نے تکیہ ہٹا لیا۔ اچانک فیصل کی ماں نے شور مچا دیا کہ مولوی مر جائے گا پھر مجھے ایک اسٹول پر کھڑا کیا گیا۔ میرے منہ پر تکیے کا غلاف چڑھا دیا۔ میرے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا اور رسی کو چھت کے ہک سے باندھ دیا۔ ایک بار پھر ولاور کی بیوی آگئی اور بہت گرم ہوئی کہ جلاد یہ کیا کرتے ہو' یہ گھر ہے' پھانسی گھر نہیں ہے۔"

"یعنی سب مل کے ڈراما کر رہے تھے؟"

"ہاں جی۔ اب تو ڈراما ہی لگتا ہے مگر اس وقت مجھے کیا معلوم تھا۔ وہ بیچ کی لات مار کے اسٹول گرا دیتا' میں دہشت سے بھی فوت ہو سکتا تھا۔ یا میرا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ آفت ہے۔"

میں نے کہا "خادم حسین۔ کتنی دیر مشق ستم کی انہوں نے تم پر؟"

"دو دن جناب۔۔۔ تو۔۔۔"

میں نے کہا "بہت دیر بعد آہ کی تم نے۔ کیا بھول گئے تھے کہ تم ایک دردناک بیان دے رہے ہو۔"

"لو جی۔ کوئی مکا مار کے آپ کی ناک توڑ دے یا منہ میں ایک چمچہ نمک ڈال دے۔ نسوار کی طرح گرم مسالا سنگھائے اور سرمے کی طرح لال مرچیں آنکھوں میں ڈالے۔ تو کیا آپ بھول سکتے ہو۔ بس میں ضبط سے کام لے رہا تھا۔"

"خادم حسین۔ دو دن کہا تھا تم نے یا دو گھنٹے؟"

"کمال ہے جی۔ وہ مجھے منگل کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ بدھ کو رہائی ملی۔"

میں اس کی چالاکی سمجھ گیا "وقت بتاؤ۔"

"وقت۔۔۔ گیارہ بجے اغوا ہوا تھا میرا۔ رات ڈیڑھ بجے میں واپس پہنچا۔۔۔ اگلی تاریخ تو آ گئی تھی جناب۔"

میں نے ہنس کے کہا "میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا' دو گھنٹے۔"

"آپ کے ساتھ دو گھنٹے ایسا ہو۔ تو آپ کو لگے گا کہ دو دن آپ کی جان سولی پر اٹکی رہی۔ وہ تو بس اللہ کو منظور نہیں تھا کہ میری گھر والی عدت بیٹھی کرے۔"

"یہ کیا بے تکی بات ہے؟"

"بے تکی بات مت کہیں جی۔ یہی ہوتا ہے اس کی [illegible] شرح۔ عین عالم شباب میں بیوہ ہونے والی تو عدت کا زمانہ بھی [illegible] سے گزار لیتی ہے اور یہ وقت بھی بر تلاش کرنے میں ہی گزار لیتی ہے۔ عورت کی ذات ہی بے وفا ہوتی ہے جناب۔ اگلی ششماہی میں کسی اور کی زوجہ ہوتی۔"

"مولوی خادم حسین۔ سب کو تو مت کہو اور کیا ہوا ایسا تم کرتے مگر خیر۔۔۔ یہ وقت اس بحث کا نہیں ہے۔ تم بتاؤ کہ پھر رہائی کیسے ہوئی تمہاری؟"

"بس جی۔ وہ مایوس ہو گئے تھے کہ میں کچھ جانتا نہیں یا بتاؤں گا نہیں۔ فیصل کہنے لگا کہ میں تھک گیا ہوں اور نیند بھی آ رہی ہے مجھے۔ مولوی کو فریزر میں ڈال کے رکھو ورنہ صبح تک خراب ہو جائے گا اور جناب اس کے بدمعاش ملازموں نے مجھے ڈال دیا تھا فریزر میں مگر پھر نکال لیا۔ ایک کہنے لگا کہ چھوٹے چوہدری صاحب' کل تک رکھ کے کیا کریں گے اس حرام گوشت کو۔ دوسرا بولا کہ ہاں جی' ختم کریں اور گاڑ دیں کہیں۔ پھر وہ آپس میں بات کرنے لگے کہ کہاں گاڑا جائے مجھے۔ ایک کہتا تھا کہ گاڑنے کے لیے گڑھا کھودنا پڑے گا۔ خواہ مخواہ محنت کرنے سے کیا فائدہ' راوی میں ڈال آتے ہیں۔ دوسرا بولا کہ اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے' کسی بھی سڑک پر ڈال دو [illegible] لے آئے' ایک بدمعاش نے کہا کہ کپڑے تو اتار لو اس کے' کسی کے کام آ جائیں گے۔ دوسرے نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے اور جناب ایسی ذلت اٹھائی میں نے کہ اب بھی سوچ کے شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ میں نے بہت شور کیا مگر انہوں نے مجھے لباس فطرت میں کر دیا۔ یہی کہا تھا نا آپ نے اور اسی وقت پھر وہ آ گئی۔"

میں نے ہنسی کو ضبط کر کے کہا "فلاں فلاں کی غیر منکوحہ زوجہ؟"

"ہاں جی۔ اس کے سامنے مولوی خادم حسین کی کیا حالت ہوئی۔ میں تو واقعی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں سما جاؤں اس میں مگر وہ بے حیا' وہ ہنس ہنس کے دہری ہو گئی۔ کہنے لگی کہ کیا بے ہودگی ہے۔ مولوی خادم حسین کی حالت دیکھو' کنواری لڑکی سے زیادہ شرما رہا ہے۔ ایسی شرارت ٹھیک نہیں۔ ذرا تم غور [illegible] دیکھیں جی۔ یہ شرارت تھی!"

"یہ سب ملی بھگت تھی ان کی خادم حسین۔ ڈراما تھا۔"

"ہاں جی۔ میں سمجھ گیا تھا۔ ماں نے سب کو شاباش کہا [illegible] کہ بیٹا اتنا کافی ہے۔ اب تم جاؤ' باقی کام میرا اور اس نے [illegible] افسوس کا اظہار کیا اور مجھے برا بھلا بھی کہا فیصل کو۔ کہ تو جانتا ہے کچھ سرکشی ہے مزاج میں اور کچھ باپ کی وجہ سے غصے [illegible] ہے۔ اب تمہارا کیا قصور ہے بھلا۔ تم تو بس ایک ملازم ہو اور غلطی سے یا مجبوری کے باعث پھنس گئے ہو۔ پیسے کی ضرورت [illegible] اس لیے یہ کام قبول کر لیا ہوگا؟ میں نے کہا کہ پیسے کی

آپ کو بھی ہے جی۔ دنیا کا سب سے دولت مند آدمی بھی نہیں کہتا کہ مجھے پیسے کی ضرورت نہیں۔ میں تو ویسے ہی غریب آدمی ہوں۔ وہ کہنے لگی کہ تمہارا وہ گورا وکیل اب کیا کر رہا ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے کیا معلوم جی اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ آدمی خود کچھ نہیں کرتا' جو کچھ کراتی ہے تقدیر کراتی ہے۔ وہ کہنے لگی کہ خادم حسین تم تو ٹھیک اور شریف آدمی ہو۔ تم اس چکر میں مت پڑو۔ بعض اوقات تم جذباتی ہو جاتے ہو۔ یہ گورا وکیل تو چلا جائے گا واپس۔ تم اس کی حمایت میں کسی سے دشمنی مول مت لو۔ راجہ یا مظفر اور وقار یوسف تمہارے کام نہیں آئیں گے۔ پولیس مخالف ہو گئی تو تمہارا جینا عذاب کر دے گی۔ میں نے کہا کہ اس وقت تو میں آپ کی وجہ سے عذاب میں ہوں۔ وہ بولی کہ میں تمہیں ایک آفر کرنا چاہتی تھی۔ تم کو کام کرنا ہے تو میرے لیے کرو کوئی غلط کام نہیں ہوگا لیکن پیسہ بہت ملے گا۔ اتنا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں نے کہا کہ میں غلط آدمی کے لیے صحیح کام بھی نہیں کر سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے صحیح آدمی کے لیے غلط کام نہیں کر سکتا۔"

"مولوی خادم حسین۔ تم گفتگو میں اختصار سے کام نہیں لے سکتے۔ ہم ٹیلی فون پر بات کر رہے ہیں یار۔ ٹرنک کال کے چارجز معلوم ہیں؟"

"ٹرنک کال!" وہ شاید اچھل پڑا ہوگا "کہاں سے بات کر رہے ہیں آپ؟"

"کراچی سے۔"

"شاید غلط سنا میں نے۔ کیا کراچی کہا تھا آپ نے؟"

"ہاں۔ کراچی میں بیٹھا ہوں میں اس وقت۔ اکرام شیخ کے ساتھ۔"

"کون اکرام شیخ؟"

"تم نہیں جانتے۔ نازو کا بھائی ہے۔ میں اسی کے گھر سے بات کر رہا ہوں۔"

مولوی نے بے یقینی سے کہا "میں اس مذاق کا مقصد نہیں سمجھا جی؟"

"مذاق' یہ مذاق نہیں ہے یار۔"

"آپ۔۔۔ آپ واقعی کراچی فرار ہو گئے ہیں' یا میرے مولا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اچانک کراچی کیسے چلے گئے آپ۔ خدانخواستہ یہ حرکت نشے میں تو سرزد نہیں ہو گئی کہیں آپ سے؟"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ میرے ساتھ راجہ بھی ہے۔"

وہ دم بخود رہ گیا۔ "یعنی۔۔۔ گویا کہ۔۔۔ آپ دونوں گھر سے بھاگ گئے ہیں۔ مرض کی شدت اچانک بڑھ گئی ہوگی۔ واقعی مرض عشق بری بلا ہے۔ غنیمت ہے کہ آپ نے ایک ساتھ مرنے کا فیصلہ نہیں کیا۔۔۔ یہ سب ڈپریشن کی وجہ سے ہوا۔۔۔ مگر اب میرا کیا بنے گا؟"

میں نے کہا "خادم حسین۔ ہم کام سے آئے ہیں' صرف ایک دن کے لیے اچانک آنا پڑا۔ یہاں ہو گئی تھی کچھ ایسی بات کہ ہمیں کسی کو بھی بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ تم جلدی جلدی باقی بات بتاؤ۔"

"بس جی ولاور کی بیوی نے پہلے مجھے ایک لاکھ کا لالچ دیا۔"

"کس کام کے لیے؟"

"اس نے کہا کہ تم اس فرنگی وکیل کے ساتھ رہو اور غور سے ان سب کی باتیں سنتے رہو۔ ان کی نقل و حرکت دیکھتے رہو۔ اگر کہیں چوہدری ولاور صاحب یا سکندر بخت کا حوالہ آئے' کوئی ایسی بات پتا چلے جس سے ان کی روپوشی کا معما حل ہونے میں مدد ملتی ہو تو فوراً مجھے فون پر بتاؤ۔ ان کی پلاننگ کیا ہے۔ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ انہیں کیا معلوم ہے جو مجھے نہیں معلوم۔ یہ سب بتانے کو۔ میں نے کہا کہ صاف بات کریں بی بی کہ مجھے مخبری کرنی ہے اور نمک حرامی کرنی ہے۔ آپ مجھ سے میرا فرض' ایمان اور ضمیر خریدنا چاہتی ہیں صرف ایک لاکھ میں۔ اس نے کہا کہ تم پھر جذباتی ہو رہے ہو بیٹے۔ تمہاری ضرورت ہے اور میں تمہاری ضرورت سے بہت زیادہ دے رہی ہوں۔ میں تم کو مستقل آمدنی کی گارنٹی بھی دے سکتی ہوں۔ جس سے تمہاری زندگی عیش کے ساتھ گزر جائے۔ مجھے اپنا شوہر چاہیے۔ زندہ سلامت اور اس کا دشمن چاہیے۔ زندہ یا مردہ۔ تم صرف اطلاع دو گے۔ باقی کام میرا ہے۔ اس میں کون سی غلط بات ہے؟ اتنی آسانی سے اتنی دولت کمانے کا موقع ہر ایک کو نہیں ملتا۔ ایک لاکھ کم ہیں تو بڑھائے بھی جا سکتے ہیں۔ اس نے بہت لالچ دیا اور بالآخر مجھے بلینک چیک دے دیا دستخط کر کے۔ کیا خیال ہے جی' اس پر ایک کروڑ لکھ لوں؟"

میں نے حیرانی سے کہا "ایک کروڑ۔ تمہارے ضمیر اور ایمان کی بس اتنی ہی قیمت ہے۔ ایک بات اور سمجھ لو۔ خالی چیک دینے والا بے وقوف نہیں ہوتا' ولاور کی بیوی نے بینک والوں سے کہہ دیا ہوگا کہ میری چیک بک چوری ہو گئی ہے۔ ذرا ایک کروڑ کا چیک لکھ کے پیش کرو۔ سب پتا چل جائے گا۔ کسی کے اکاؤنٹ سے اتنی بڑی رقم نکلوانا تقریباً ناممکن ہے۔"

"میں مذاق کر رہا تھا جی۔ ایک کروڑ نہ ایک ارب۔ میں نے چیک تو جان چھڑانے کے لیے لے لیا تھا۔ وہ سمجھی کہ میں بک گیا۔ اس کی باتوں سے قائل ہو کے میں نے چیک لے لیا ہے۔ ایک دو لاکھ لکھ لوں گا۔ اس سے زیادہ کسی غریب آدمی کا حوصلہ کہاں ہوتا ہے۔ دو لاکھ کے تصور سے بھی اسے پسینہ آ جاتا ہے۔ خفقان ہونے لگتا ہے۔ سچ مچ مل جائیں تو خوشی سے پاگل ہو جائے یا سر بھی پھٹ جائے تو حیرت کی بات نہیں۔ میں ایسا ظاہر نہ کرتا تو شاید رہائی مشکل ہو جاتی۔ دس ہزار اس نے مجھے وہیں دے دیے۔ اس تکلیف کے عوض جو میں نے اٹھائی۔ علاج معالجے کے لیے اور کچھ بطور ہرجانہ۔"

www.paksociety.com

"افسوس مولوی۔ یہ رقم لے کر تم نے دشمن کا نمک کھا لیا۔"

"حد کرتے ہو جی آپ بھی۔ یہ مال غنیمت ہے جو حلال ہوتا ہے۔ اتنی سخت ایمان کی آزمائش اور اتنے جبر و تشدد کا مقابلہ کرنا کیا کسی جہاد سے کم تھا۔ ذہنی اور جسمانی اذیت کا معاوضہ تو قانونی طور پر بھی ملتا ہے... آخر آپ نے بھی تو ایک لاکھ وصول کیے تھے اس سے پھر میرے دس ہزار پر اعتراض کیوں جی؟"

میں نے کہا "میں چھیڑ رہا تھا تمہیں خادم حسین۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم ایک لاکھ ہی وصول کر لیتے اور اسے غلط اطلاعات فراہم کرتے رہتے۔ ابھی کہہ دیتے کہ سنا ہے سکندر بخت قطب شمالی پر چلہ کاٹ رہا ہے یا یہ کہ وہ چوہدری صاحب کو افریقہ لے گیا اور وہاں کے آدم خوروں کو ان کے چربی والے گوشت کی بریانی پکا کے کھلائے گا۔ خیر ابھی تم محفوظ ہو۔ کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ جب تک میں نہ آؤں صبح شام بلڈنگ کو لاک کرنا اور کھول دیا کرو۔ رات کو آفس بند کر کے سو جاؤ ورنہ کوئی اور اٹھا لے گا۔"

"کیا مظفر صاحب کو معلوم ہے جی... اور وقار صاحب کو؟"

"نہیں۔ انہیں میں بتا دوں گا۔ تم فکر مت کرو۔ بہتر ہو گا کہ تم صبح ہوتے ہی اپنی گھر والی کے آستانے پر حاضر ہو جاؤ۔ ریشمی چادر، میرا مطلب ہے کہ ریشمی جوڑے اور زیورات چڑھانے کے لیے۔ رات تک لوٹ آنا۔ کل بھی یہی کرنا۔"

"مطلب یہ کہ دن سسرال میں گزاروں ظالم ساس کی قید میں۔" مولوی خادم حسین نے آہ بھری "رات دفتر کے ویرانے میں قید رہوں اکیلا۔"

میں نے ہنس کے کہا "تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔ اسے بھی آفس میں لے آؤ فی الحال اندر والا کمرا تو خالی ہے۔ رابعہ کی طرف سے میں اجازت دیتا ہوں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات کہی جی آپ نے" خادم حسین خوش ہو گیا۔

"اور ہاں۔ سب سے ضروری بات تو رہ گئی۔ اپنے چوہدری صاحب کی گھر والی کا فون آئے یا وہ خود آئے تو اسے بتا دینا کہ سکندر بخت اس سے "سی ڈی انٹرپرائز" کے فون پر بات کرے گا کراچی سے۔"

"آپ واقعی کراچی میں ہو جی؟ مجھے تو لگتا ہے بے وقوف بنا رہے ہو۔ بیٹھے ہو گے یہیں کسی ہوٹل میں۔ یقین نہیں آتا..."

میں نے کہا "اچھا نہیں یقین آتا تو نہ سہی۔ بہت لمبی بات ہو گئی ہے بل دینے والے کا خانہ خراب ہو جائے گا۔"

"رات گیارہ بجے سے صبح پانچ بجے تک چوتھائی ریٹ ہوتے ہیں ٹرنک کال کے۔ پانچ بجنے والے ہیں" آپ۔"

"پھر یاد آیا تمہیں کہ تم زخمی ہو۔ اچھا خدا حافظ۔"

کچھ اکرام نے اندازہ کر لیا تھا کچھ میں نے اسے مختصراً بتا دیا کہ دلاور کی بیوی اور چھوٹے چوہدری صاحب نے خادم سے بزور اور بزور زر میرے بارے میں اور چوہدری دلاور کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی تھی مگر خادم حسین نے کمال کر دیا۔ تشدد پھر لالچ کے باوجود کچھ نہیں بتایا۔ وہ بزدل اور کمزور نظر آنے کے باوجود انتہائی بہادر ثابت ہوا۔

اکرام متفکر ہو گیا "فون پر یہ سب باتیں کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اور تو کوئی ذریعہ نہیں تھا" میں نے کہا۔

اکرام بولا "یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارے آفس کا نمبر ٹیپ کیا جا رہا ہو۔ سننے والوں نے ساری گفتگو سن لی ہو گی۔ اتنی دیر میں یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کراچی کے کس فون سے بات ہو رہی تھی؟"

"تمہیں ڈر ہے کہ کہیں...؟"

"یار مجھے اپنی نہیں تمہاری فکر ہے۔" اکرام نے خفگی سے کہا "کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ یہاں پہنچ جائیں۔ تمہاری آواز پہچان کے۔"

میں نے سوچ کے کہا "اپنے چوکیدار کو سمجھا دو کہ کوئی پوچھے کچھ نہ بتائے نہ میرے بارے میں اور نہ یہ کہ ہم نے یہاں سے فون کیا تھا۔ وہ یہی کہے گا کہ یہاں کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ وہ سمجھیں گے کہ میں نے اسکول کے باہر ہی سے ٹیلی فون لائن استعمال کی ہو گی۔ جیسے ہم پہلے کرتے تھے۔ کسی بھی کھمبے پر چڑھ کے فون جوڑ لیتے تھے۔"

"فکر مت کرو۔ چوکیدار بھروسے کے قابل ہے۔"

"مجھے تو مت سیدھی انگلی..."

اکرام ہنسنے لگا "جو سیدھے اور معصوم بنتے ہیں نا وہ اندر سے بڑے عیار اور فریبی ہوتے ہیں۔ چوکیدار کا ظاہر اور باطن ایک ہے لیکن اس کے بات کرنے کا انداز واقعی کچھ ایسا ہے کہ بندا بھی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس سے سختی ہے کا جل۔"

"چلو پھر کاجل کو تیار رہنا ہے۔ ایک دو دن کی بات ہے۔ شاید آج کل میں کوئی کچھ معلوم کرنے آئے گا۔ چالاکی سے باتوں باتوں میں پوچھنے کی کوشش کرے گا کہ اسکول کس کا ہے۔ مالک کون ہے اور ان کے ساتھ کون رہتا ہے۔ ممکن ہے چوکیدار کو رشوت بھی دے۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے دوست اور غریب آدمی کی قوت مزاحمت بہت کم۔"

ہم اسکول کے گیٹ سے باہر آئے تو آمد صبح کا تب ا... اجالا پھیلنے لگا تھا۔ ویسے تو ہر ساحلی شہر کی طرح کراچی میں رات اندھیرا اتنا کالا نہیں ہوتا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے اور اگر دیکھا جائے تو شاید کراچی میں رات نہیں ہوتی۔ بیشتر علاقوں میں ہوٹل اور ریسٹورنٹ ساری رات کھلے نظر آتے تھے اور وہاں بیٹھے ہوئے گپ شپ میں مصروف لوگوں کو دیکھ کے اندازہ ہی ہوتا کہ یہاں کے رہنے والے رات کو بھی نہیں سوتے۔ سڑک پر ٹریفک میں کمی آ جاتی تھی مگر بہت سے علاقے ایسے تھے جہاں دن رات زندگی کے ہنگامے ایک ہی انداز میں جاری رہتے تھے۔

واپس گھر پہنچ کے میں سویا تو چار پانچ گھنٹے بعد اٹھا۔ اکرام اور رابعہ ناشتے کی میز پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ رابعہ کی توجہ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اکرام سے میری اور خادم حسین کی گفتگو سن رہی ہے۔ کاجل اسکول جا چکی تھی۔

میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "دس بج گئے۔"

"صرف دس۔ گھڑی ٹھیک کر لو یا نظر ٹیسٹ کراؤ" رابعہ بولی۔

"کیا تم لوگ ناشتے سے فارغ ہو گئے؟"

"ہم گل اور محسن کے انتظار میں بھوکے بیٹھے ہیں۔ تمہاری وجہ سے نہیں" رابعہ نے کہا "وہ آتے ہی ہوں گے اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ ناشتا لے کر آئیں گے۔"

میں غسل سے فارغ ہو کے نکلا تو گھنٹی بجی۔ محسن ایک ناشتے دان اٹھائے اندر آیا پھر گل دو سال کے ایک بچے کو گود میں اٹھائے نمودار ہوئی۔ مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی۔ وہ فوزیہ کا بچہ تھا۔ جو ہوا ہی جیسا۔ میں نے اسے گل سے لے لیا۔ وہ مجھے اپنی معصوم حیرانی سے دیکھتا رہا۔ میرے ذہن میں ایک عجیب سا بے چینی اور شرمسار کرنے والا خیال آیا۔ اگر تقدیر کی لاٹری میں کی طرح پڑی نہ بدلتی تو زندگی کے سفر میں فوزیہ ہی میری ہم سفر ہوتی اور یہ بچہ میرا ہوتا۔ آدمی یہی سوچتا رہتا ہے جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا اور نہ ہوا یوں تو کیا ہوتا؟ میں اگر رابعہ سے نہ ملا ہوتا تو آج رابعہ کہاں ہوتی پھر میں کہاں ہوتا۔ اس کی مدد نے ہی مجھے جیل سے باہر نکالا تھا ورنہ شاید مجھے پھانسی ہو جاتی اور میں اگر نہ ہوتا تو فوزیہ کہاں ہوتی۔ قسمت اسی کا نام ہے کہ آدمی اگر شاید اور کاش جیسے الفاظ کے کھیل میں الجھ کے اپنی مجبوری اور بے اختیاری کے احساس کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر حقیقت اتنی ہی اٹل رہتی ہے۔

رابعہ نے کہا "کیا نام ہے اس کا؟"

گل نے چونک کے کہا "ہاں بھئی۔ رات کو تو بیٹا سو رہا تھا۔ ہم سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ اب بتاؤ نہیں اپنا نام؟" میں نے اسے میز پر بٹھا دیا۔

محسن نے آنکھوں میں آ جانے والے آنسو رومال سے صاف کیے اور کرسی پر بیٹھ کے اپنی بہن کے بچپن کی تصویر کو دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کی اداسی میں پل بھر کے لیے ممتا کے جذبات نمایاں ہوئے "ابھی یہ بولتا کہاں ہے۔"

"ایسے ہی دو چار الفاظ بول لیتا ہے" محسن بولا "فوزیہ کی کتاب۔ بابا کہتا ہے۔ کبھی ابو پاپا نہیں کہہ سکتا تھا۔"

گل نے مجھے مزید بتایا "بھوک لگتی تھی تو چلانے لگتا تھا۔ وہ اور اس کا مطلب تھا دودھ کی بوتل۔ کبھی پھر چیونٹی سب کے لیے ایک ہی لفظ تھا 'چیا' کے لیے ہو۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "یہ سب تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ تم اور محسن تو فوزیہ کے گھر نہیں جاتے تھے۔"

محسن نے کہا "میں نے بتایا تھا نا۔ میں فوزیہ کے شوہر سے ملتا رہتا تھا۔ کبھی وہ بچے کو بھی لے آتا تھا اپنے ساتھ۔ وہی بتاتا تھا اس کے بارے میں۔"

گل نے کہا "فوزیہ اسے بوبی کہتی تھی۔ نام تو بابر سلطان تھا۔ ہم بھی بوبی ہی کہیں گے نا محسن؟"

"ظاہر ہے" محسن نے کہا "چلو تم بوبی کو لے لو یا پھر ناشتا لگاؤ۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

رابعہ نے کہا "لاؤ بوبی کو مجھے دے دو۔"

میں نے کہا "جی نہیں۔ بوبی ہمارا بیٹا ہے۔ کسی کے پاس نہیں جائے گا کیوں بوبی؟"

بوبی نے اس سوال کا جواب یوں دیا کہ پہلے میری ناک پکڑی۔ ایک ہاتھ مار کے کپ نیچے گرایا اور پھر میز کو گیلا کر دیا۔ وہ بہت خوب صورت اور پیارا بچہ تھا۔ کسی تکلف کے بغیر وہ رابعہ کی گود میں چلا گیا اور وہ اسے دھلانے کے لیے باتھ روم میں لے گئی۔

"یار کتنے محبت کرنے والے ہیں بوبی سے مگر ماں باپ کا پیار کون دے سکتا ہے" محسن نے کہا "یتیم تو ہو گیا اتنی سی عمر میں۔"

گل ایک دم بگڑ گئی "خبردار جو کسی نے اسے یتیم کہا۔ یہ لفظ میں سننا بھی نہیں چاہتی۔ جب پیار میں فرق ہوتا ہے تو بچہ بھی محسوس کرتا ہے۔ ہم اس کے ماں باپ ہیں تو پھر ہمارا پیار وہی ہونا چاہیے بوبی کے لیے۔ جو اس کو ماں باپ سے ملا تھا۔ کیوں نہیں ہو گی آخر اس میں؟ میرا دل تو ممتا کے جذبات سے خالی نہیں ہے۔"

محسن نے اسے بڑی مشکل سے چپ کرایا "سوری گل۔ مجھے معاف کر دو۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ وہ ہمارا بیٹا ہے اسے کبھی احساس نہیں ہو گا کہ اس کو ماں باپ کا پیار نہیں ملا۔ ہم اس سے بھی زیادہ پیار دیں گے اسے۔ تم سے اچھی ماں کون ہو گی اس کے لیے اور میرے لیے تو یہ سب کچھ ہے میرا تو ایک ہی گھر تھا۔ نہ ماں باپ رہے نہ بہن کا گھر بچا۔"

گل بڑی مشکل سے خاموش ہوئی۔ ساری بات خیال اور احساس کے رشتوں کی ہے۔ گھاؤ جتنے گہرے ہوں درد اتنا ہی آزار دیتا ہے۔ کبھی ہوا کا جھونکا نمی کو بیدار کرتا ہے تو کبھی قطرہ شبنم بھی تڑپاتا ہے۔ ایک حادثے نے گل سے وہ صلاحیت چھین لی تھی جو شاید خالق کائنات کے نزدیک اس کی وجہ تخلیق تھی۔ جو عورت ماں نہ بن سکے وہ خود کو ہرے بھرے شاداب اور برگ و بار سے لدے ہوئے زندگی کے گلشن میں کسی ٹنڈ منڈ بے ثمر سوکھی شاخوں والے درخت کی طرح محسوس کرتی ہے اور جسے خندۂ گل میں بھی تحقیر و تذلیل کا انداز نظر آتا ہے۔

گل نے بلا وجہ یہ محسوس کیا کہ محسن نے اس کو طعنہ دیا ہے۔

www.paksociety.com

وہ ماں بننے کی جسمانی صلاحیت سے محروم ہوگئی تھی۔ اس کے جذبات کا سرچشمہ خشک نہیں ہوا تھا۔ محسن نے یہ کہا تھا کہ تم ماں نہیں بن سکیں تو تمہیں کیا معلوم کہ ماں کا پیار کیا ہوتا ہے اور نہ اس کی بات کا یہ مطلب تھا کہ اصلی اور نقلی ماں کے فرق کے باعث بچے کو بھی کمی کا احساس ہوگا مگر گل کچھ زیادہ ہی حساس ہو رہی تھی۔ شاید یہ ایک لاشعوری خوف کا نتیجہ تھا کہ دنیا کو اس کے پیار میں ہمیشہ کھوٹ نظر آئے گا اور اس کی محبت میں مصنوعی پن تلاش کرنے والے یہی کہیں گے کہ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ اس کا نعم البدل کون ہوسکتا ہے۔ ماں دس بار مارے تو دنیا کہے گی کہ بچے کی اصلاح کے لیے ایسا کرتی ہے۔ کوئی دوسری عورت غلطی سے بھی جھڑک بیٹھے تو سو الزام ٹھہرتے ہیں کہ اپنا بچہ نہیں ہے نا۔ بے شک عموماً ایسا ہی ہوتا ہے مگر مستثنیات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی مثالوں کی کمی نہیں جہاں سوتیلے کہلانے والے سگوں سے زیادہ رشتوں کا حق ادا کرتے ہیں۔

رابعہ اور گل کو بہت سی باتیں کرنی تھیں اور رونی کی شکل میں ان کو ایک کھلونا مل گیا تھا۔ اکرام شیخ کی ٹیکسی میں محسن کو ساتھ لے کر میں دوپہر سے کچھ پہلے باہر نکلا۔ ہم نوید کے گھر گئے۔ کرائے کے اس گھر میں آئے نوید کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے پھر بھی محلے کے دو چار گھرانوں سے لوگ رسمی تعزیت کے لیے آگئے۔ انہیں شکایت تھی کہ ہم نے روایت کے مطابق کسی ہمسائے کو ایک وقت کا کھانا لانے کا موقع بھی نہیں دیا۔

"صبح سے پہلے ہی گھر بند کر گئے آپ تو بھائی صاحب۔" ایک بولا۔

"ہاں بی بی قتل ہوجائیں تو بے شک تالا ڈال دیں۔"

"ہم تو رات بھی کھانا لائے تھے اور صبح کا ناشتا۔"

محسن نے کہا "میں آپ سب کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ مجبوری یہ تھی کہ میرا بھانجا دو سال کا ہے۔ وہ ماں کو یاد کر رہا تھا اور یہاں رہتا تو زیادہ پریشان ہوتا۔ گھر میں اور کوئی عورت نہیں تھی اس لیے بھی ہم چلے گئے تھے۔"

پہلے والے نے کہا "قل تو ہونے چاہئیں یہاں۔"

دوسرے نے اتفاق کیا "بچے تو وہیں پڑھے جاتے ہیں جہاں سے جنازہ اٹھے۔"

میں نے محسن کو اشارے سے منع کیا کہ وہ اس "شرعی بحث" میں نہ پڑے۔ "بالکل صحیح فرماتے ہیں آپ مگر ہمیں تو آج جانا ہے لاہور۔" محسن بولا "ہم آج ہی گھر خالی کر دیں گے۔"

دوسرے نے افسوس سے زیادہ ملامت بھری نظریں گھمائیں۔ "اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہوتی بھائی صاحب۔ دیکھیے تو زمانہ ایسا آگیا ہے کہ اب لوگ قل اور چہلم کو بھی فضول رسم کہنے لگے ہیں۔"

"مغفرت کی دعا لاہور میں بھی کی جاسکتی ہے اور ایک دن کیا ساری عمر مانگی جاسکتی ہے۔" محسن باز نہ رہ سکا "پلاؤ زردے اور قورمے کے بغیر بھی قرآن خوانی ہوجاتی ہے۔"

وہ لوگ بد دل ہو کے چلے گئے۔ خود انہیں بہانے کی تلاش تھی جو محسن کے رویے نے فراہم کردیا۔ ورنہ فرصت کسے تھی [illegible] خواری کرے۔ ان کے جاتے ہی میں نے [illegible] ملانے کی کوشش کی۔ محسن اور اکرام گھر کے سامان کا جائزہ لینے لگے کہ اس میں سے کتنا چھوڑا جاسکتا ہے۔ کتنا غیر ضروری ہے، بیچ دینا چاہیے اور کیا ساتھ لے جانا ضروری ہوگا۔ کچھ اکرام شیخ اپنے گھر میں رکھنا چاہتا تھا۔ بعد میں انتخاب اور [illegible] کے مسائل کا حتمی فیصلہ خواتین پر چھوڑ دیا گیا۔

دوپہر کے وقت کراچی سے لاہور کی لائنیں خالی نہیں تھیں۔ محسن اور ایس پی ذکی کو ملاتے ہی [illegible] کی ٹون آجاتی [illegible] نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر کسی نے کال بیل بجائی۔

آنے والا ایک سب انسپکٹر تھا اور اس کے ساتھ تھا کوئی سپاہی۔ اس نے سوالیہ اور مشتبہ نظروں سے ہم تینوں کو [illegible] لیا۔

میں نے محسن سے فرنچ میں کہا "اسے واضح الفاظ میں سمجھا دینا کہ میں بہت بڑا وکیل ہوں بلکہ فرانس میں مجھ سے بڑا کوئی بھی نہیں ہے اور میں جو کیس ہاتھ میں لیتا ہوں اس میں [illegible] اور مدعی دونوں صاف بچ جاتے ہیں لیکن تفتیشی افسر ضرور [illegible] ہوجاتا ہے۔"

سب انسپکٹر نے کہا "یہ کیا باتیں کر رہے ہو تم لوگ؟"

محسن نے کہا "آپ حکم کریں کیسے تکلیف کی؟"

"پہلے میری بات کا جواب دو" وہ سخت لہجے میں بولا اور [illegible] صوفے پر بیٹھ گیا "جب تم اردو میں بات کرسکتے ہو تو یہ [illegible]؟"

محسن نے مسکرا کے کہا "میں تو اردو جانتا ہوں مگر یہ [illegible] صاحب لندن سے ایک قتل کی خصوصی تفتیش کے لیے [illegible] آئے ہیں۔ انہیں برطانوی حکومت نے خاص طور پر [illegible] سے درخواست کرکے طلب کیا تھا اور یہ برطانوی [illegible] ساتھ ہی لندن سے لاہور پہنچے تھے۔ برطانیہ کے وزیر [illegible] مشترکہ بھی اسی فلائٹ سے آئے تھے اور وہ وفاقی وزیر [illegible] میٹنگ کرنے چلے گئے تھے۔ یہ وکیل صاحب نہ انگلش [illegible] اور نہ اردو جانتے ہیں۔"

سب انسپکٹر مرعوب نظر آنے لگا تھا پھر اسے یاد آیا کہ وہ تھانے دار ہے اور اسے کسی غیر ملکی لاٹ صاحب سے [illegible] کی کیا ضرورت ہے "تمہارا یہ گورا وکیل یہاں کیا کر رہا ہے؟"

یہ ذاتی جہالت ہے یا ہم کالوں کا کمپلیکس ہے کہ [illegible] یورپ امریکا سے تعلق رکھنے والا ہر شخص گورا ہے [illegible] میم [illegible]

محسن نے کہا "میں کہہ چکا ہوں کہ یہ قتل کی خصوصی [illegible] کر رہے ہیں۔"

"مگر یہاں اس گھر میں تو کوئی قتل نہیں ہوا ہے" سب انسپکٹر چونکا۔

اب میں نے مسکرا کے ہاتھ آگے بڑھایا "یہ تو ابھی پتا چل جائے گا۔ تمہیں پتا کہ وہ حادثہ تھا یا قتل؟"

محسن نے اس کا ترجمہ کیا "وکیل صاحب تعارف چاہتے ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ آپ کو غصہ کیوں آرہا ہے؟"

"میں سب انسپکٹر رشید پراچہ ہوں۔ نالو کھیت تھانے سے کل کے مارے گئے کی تفتیش کے لیے آیا ہوں۔"

اکرام نے کہا "سب انسپکٹر صاحب! نالو کھیت کو لیاقت آباد کہا جاتا ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو مجھ سے ورنہ..." وہ بھڑک اٹھا۔

"ورنہ کیا دھکے دو گے مجھے؟" اکرام نے سکون سے کہا "ایک اطلاع دوں تمہیں پراچہ صاحب۔ میں بھی سب انسپکٹر تھا پولیس میں اور میں [illegible] بھرتی ہوا تھا۔ ایس ایچ او بننے کے بعد ایس پی [illegible] رضوی مرحوم کے ساتھ تھا۔ تم جانتے ہو انہیں؟"

پراچہ ٹھنڈا پڑ گیا "نہیں۔ کبھی ادھر رہے تھے ایس ایس پی صاحب؟"

اکرام نے نفی میں سر ہلایا "اب تو وہ دنیا میں ہی نہیں رہے۔" محسن نے [illegible] پوچھا۔ "کسی ڈی آئی جی یا آئی جی سے کہ وہ کیسے آدمی تھے۔"

"آخر آپ نے کیا غلطی کی تھی کہ پولیس کی نوکری گئی۔"

اکرام مسکرانے لگا "شاید یہ پولیس کی نوکری کرنا ہی میری غلطی تھی۔ میرا مزاج اس نوکری کا نہیں تھا اور پولیس میں میرا جی نہیں لگا۔ میں حرام نہیں کھاتا تھا اور بہت زیادہ فرض شناسی دکھاتا تھا۔ ملزم پکڑا جاتا تو اس پر کوئی غیر قانونی تشدد استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے نکالا نہیں گیا تھا۔ میں نے استعفیٰ دے دیا تھا ورنہ انجام [illegible] ہوتا۔"

پراچہ کا موڈ پھر بدلنے لگا "اب کیا کرتے ہو؟ ٹیکسی چلاتے ہو۔"

"کیا ہاں مگر یہ سب تمہیں بتانے کا مقصد کچھ اور تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں اپنی تھانے داری کی اکڑفوں مت دکھاؤ۔ شرافت سے بات کرو اور خیال رکھو یہاں ایک سابق تھانے دار ہے۔ ایک بہت بڑا وکیل اور تیسرا مشہور صحافی... غالب۔"

محسن نے مسکرا کے اکرام کی طرف دیکھا مگر یہ جھوٹ چل گیا تھا۔ اس نے پراچہ سے مصافحہ کیا "مجھے ارباب ہدایت اللہ نے [illegible] کیا تھا۔"

"ڈی آئی جی صاحب نے؟" پراچہ بولا۔

"الحمد، میں وکیل صاحب کے ساتھ آیا ہوں۔ کسی مترجم کی ضرورت بھی پوری کرسکتا ہوں اور اس کیس کی رپورٹنگ بھی۔ ویسے ارباب ہدایت اللہ صاحب سے پرانے مراسم ہیں۔"

ایک سب انسپکٹر کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ محسن کی بات کو غلط سمجھے یا ڈی آئی جی صاحب سے تصدیق کرسکے "پھر تو جناب بڑی ہی خوشی ہوئی آپ سے مل کے۔" اس نے اٹھ کے بڑے ادب سے مصافحہ کیا اور محمود کے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ کانسٹیبل فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سب کے ہاتھ تھام کے بطور عقیدت سینے پر رکھے۔

"تغیرے مرحوم کا آپ سے کیا رشتہ تھا؟" پراچہ نے گویا تفتیش کا آغاز کیا۔

محسن یعنی غالب نے کہا "مرنے والی میری بہن تھی۔ حقیقی بہن اور دوسرا اس کا شوہر تھا۔"

"اوہو ہو۔ بڑا افسوس ہوا جی" پراچہ نے کہا "بڑے حرامی ہیں یہ ٹرک والے جی۔ سب سے زیادہ بندے یہی مارتے ہیں سڑکوں پر اور پھر ذرا شرافت انسانیت نہیں ان میں۔ بھاگ جاتے ہیں واردات کرکے۔"

"اچھا؟ کہاں چلے جاتے ہیں؟" محسن نے طنز سے کہا "ٹرک چھوڑ کے تیتر نکل جاتے ہیں یا اندرونی چھوڑ کے حلیہ بدل لیتے ہیں اور روپوشی کے لیے کسی گاؤں کی مسجد میں پیش امام بن جاتے ہیں کہ سراغ ہی نہیں ملتا۔"

وہ ڈھٹائی سے مسکرانے لگا "آپ تو جانتے ہیں جناب سب کچھ۔ مالکان انہیں بچاتے ہیں۔ بیوپاریوں تک پہنچ جاتے ہیں پھر کوئی کچھ نہیں رہتا۔ کچھ لیں تو ضمانت ہوجاتی ہے اور کیس بنتا ہے زیادہ سے زیادہ قتل سو چار سو کا..."

"غیر ارادی قتل" اکرام نے سمجھایا "مگر پراچہ صاحب اس کیس میں تو قتل عمد کے شواہد ملتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے دیکھا تھا کہ ٹرک نے کیسے پیچھا کرکے رکشے کو ٹکر ماری تھی دو مرتبہ اور کتنی دور تک اسے گھسیٹتا ہوا لے گیا تھا۔"

"اچھا جی!" پراچہ نے سخت حیرانی کا اظہار کیا "آپ بتائیں مجھے کس نے دیکھا تھا۔ دو گواہ مل جائیں تو ہم قتل عمد کا پرچہ کاٹ دیں گے۔"

"کس کے خلاف؟" محسن نے کہا "کیا ڈرائیور کا پتا چل گیا ہے؟ کوئی سراغ ملا ہے؟"

"نہیں جی۔ یہی تو ساری مصیبت ہے۔ خیر انشاء اللہ کوئی سراغ ضرور ملے گا۔" اس نے نامعلوم قاتل کو ایک گالی سے نوازا۔

محسن نے کہا "میں آج ارباب صاحب سے کہوں گا کہ وہ اس کیس کی تفتیش کے لیے خصوصی ٹیم بنادیں۔ کم سے کم کوئی ڈی ایس پی ہو۔"

پراچہ کا چہرہ اتر گیا "ہاں جی۔ وہ سب کچھ کرسکتے ہیں۔ بادشاہ

www.paksociety.com

لوگ ہیں وہ اور آپ کی اپروچ ہے۔ اپروچ سے ہوتا ہے سب کچھ جناب عالی۔ ہم تو خانہ پری کر سکتے ہیں۔ زیادہ اختیارات نہیں ہے ہمارا۔ کیا آپ صرف اس کام کے لیے آئے ہو؟"

"نہیں پراچہ صاحب۔ میں تو موسیو آندرے کے ساتھ لاہور میں سخت مصروف تھا۔ وہ بہت اہم کیس ہے۔ لیکن بہن کے ساتھ حادثہ پیش آنے کی خبر سن کے میں کیسے نہ آتا۔ یہ وکیل صاحب ہمدردی میں ساتھ آ گئے۔ ہم کل تک واپس چلے جائیں گے۔ یہاں اکرام شیخ اس کیس کی تفتیش میں ساتھ رہے گا۔"

پراچہ نے اطمینان کا سانس لیا "آپ فکر ہی مت کریں جی۔"

اب محسن نے براہ راست اور میں نے اس کی معرفت سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا تو صورت حال ایسی ہو گئی جیسے تفتیش سب انسپکٹر پراچہ نہیں کر رہا ہے ہم کر رہے ہیں۔ اس نے سوچا ہو گا کہ تھانے داری کا رعب جھاڑ کے تفتیش کے بہانے لواحقین کو ڈرائے گا دھمکائے گا کہ وہ حادثے کو قتل قرار دینے کی کوشش چھوڑ دیں ورنہ.... ہر تھانے دار کا جملہ اگر ورنہ پر ختم ہو تو آگے سمجھنے والے کی سمجھ پر منحصر ہے کہ وہ ظلم اور ناانصافی کو نوشتہ تقدیر سمجھ کے قبول کرتا ہے یا سو ہزار اور سو بوتے کمانا چاہتا ہے۔

میں نے کہا "کیا پولیس نے جائے واردات کا معائنہ کر لیا؟"

محسن بولا "اور وقوعہ کا نقشہ تیار کر لیا؟"

اس نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا "وہ.... ہاں جی یہ تو کرنا ہی پڑتا ہے لیکن اس کا فائدہ کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "کیا وہاں عینی گواہ نہیں ملا؟"

محسن بولا "ٹرنک بازار کے دکان دار تو وہیں باہر بیٹھے رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کے بیان سے کوئی سراغ ملا؟"

"نہیں جی۔ دکان دار تو سب عام طور پر موجود رہتے ہیں مگر اتفاق سے اس وقت...."

"سب نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے" محسن بولا۔

"ہاں جی۔ بالکل یہی بات کی سب نے۔"

"اور تم نے مان لی۔ ساڑھے تین بجے کون سی نماز پڑھ رہے تھے با جماعت؟" محسن نے کہا۔

"ایسے ہی جی۔ بکواس کرتے ہیں سارے۔ ایسے کدھر کے نمازی ہیں؟" پراچہ نے فوراً پینترا بدل لیا۔ "سالے شوگی کھا رہے ہوں گے۔"

"سب اتنی دیر سے کھانا کھاتے ہیں۔ پراچہ یہ تو ہم ابھی جا کے دیکھ سکتے ہیں کہ کون کتنے بجے نماز کے لیے جاتا ہے اور کتنے بجے کھانا کھاتا ہے۔ سیدھی صاف بات کہو کہ تم نے کسی کا بیان لینے کی زحمت ہی نہیں کی۔"

"ادھر بیان اچھے ہیں جی یہ لوگ۔ سارے بے ایمان ہیں۔ بہانے بازی کرتے ہیں۔ کسی کے دل میں خدا کا خوف نہیں ہے۔"

میں نے کہا "تمہارا خوف تو ہو گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم چاہو اور کوئی بیان نہ دے۔"

پراچہ نے مردہ لہجے میں کہا "اچھا جی بلا لیتے ہیں کوئی [illegible] کو۔"

میں نے کہا "سب کو نہیں۔ صرف انہی کو جن کی دکان کے سامنے یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ ان سے پوچھو کہ اس وقت گاہک تھے؟ انہوں نے کسی کو پانی کی ٹنکی فروخت کی تھی تو کیش میمو تھا؟ ٹنکی کون لے کر گیا تھا؟ سوزوکی والا گیا تھا تو اس نے ٹنکی کہاں پہنچائی تھی۔ کوئی ٹنکی فٹ کرنے گیا تھا تو اس نے بھی گاہک کا مکان یا بلڈنگ دیکھا ہو گا۔ اس گاہک کو طلب کرو۔"

"وہ کس لیے جی؟ اتنا فالتو ٹائم نہیں ہے ہمارے پاس۔"

محسن نے اسے غور سے دیکھا "اچھا ٹھیک ہے۔ تمہاری بات میں آج ہی آئی جی صاحب کو بتا دوں گا کہ تم حد سے زیادہ مصروف ہو۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں فارغ کر دیں۔ لائن حاضر ہو جاؤ گے تو بہت ٹائم ملے گا۔"

پراچہ پریشان ہو گیا "نہیں جی۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ گاہک کیا بتائے گا؟"

اکرام نے کہا "ہو سکتا ہے گاہک کوئی سمجھ دار آدمی ہو۔ اس نے ٹرک کا نمبر نوٹ کر لیا ہو یا ٹرک ڈرائیور کو دیکھ لیا ہو۔ آٹھ دس دکانوں میں سے کسی پر بھی گاہک نہ ہو یہ ناممکن ہے۔ وہاں بہت خریداری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ وہاں بس پر سوار ہونے والے بھی کھڑے رہتے ہیں۔"

پراچہ نے طنز سے کہا "ان سب کو بھی بلا لوں جو اس وقت وہاں سے کسی بھی بس میں سوار ہوئے تھے۔ ذرا ایڈریس لکھوا دیں۔"

محسن نے کہا "ہاں۔ انہیں بھی طلب کرو۔"

ظاہر ہے یہ ناممکن تھا مگر محسن نے طنز کا بہت مناسب جواب دیا تھا اور تھانے دار صاحب کے بس میں نہ تھا ورنہ وہ محسن کا سر پھاڑ دیتا یا اپنا سر پھوڑ لیتا۔

"اچھا اب تم جاؤ۔ ہم آتے ہیں کچھ دیر بعد۔ تھانے والی جاتے ہوئے ان سب دکان داروں کو دعوت نامہ دے جاؤ جن کی دکانیں جائے واردات پر ہیں۔ جہاں ٹرک نے رکشا کو ٹکر ماری تھی۔ وہاں سے لے کر اس جگہ تک جہاں دوسری ٹکر ہوئی تھی۔ جہاں تک ٹرک رکشا کو گھسیٹ کر لے گیا تھا۔ میرا خیال ہے پندرہ بیس دکانوں کے سامنے یہ سب ہوا ہو گا" محسن نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا "تم کہو تو میں آئی جی صاحب سے تمہاری بات کرا دوں؟"

وہ حواس باختہ ہو گیا "نہیں جی۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔"

"ابھی ممکن ہے تمہیں میری باتیں بری لگ رہی ہوں لیکن میں کون ہوتا ہوں تمہیں حکم دینے والا۔ آئی جی صاحب تو تمہارے صوبے کے...."

"ہمارے لیے آپ کا حکم بھی حکم ہے سر" پراچہ نے [illegible]

"آپ کتنی دیر میں تشریف لاؤ گے؟"

میں نے کہا "ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد۔"

"ٹھیک ہے جی۔ گواہان حاضر ہوں گے۔ آپ خود جو پوچھنا پوچھ لیں" اس نے ہاتھ ملایا اور بڑی عجلت میں روانہ ہو گیا۔

"دیکھا تم نے۔ یہ کیس فائل کرنے کے موڈ میں تھا" اکرام نے کہا "یہاں تو ہیر پھیر کو سوا سیر کہا ورنہ ان کا تو اصول ہے کہ جو فریاد لے کے آئے اسی کو ملزم بنا دو۔ مجھے ایک ایسا ہی کیس یاد ہے۔ کوئی شخص ٹیکسی کے نیچے آ کے مر گیا تھا۔ اس کی بیوی نے شوہر کے بزنس پارٹنر پر قتل کا شبہ ظاہر کیا تو پولیس نے بیوی کو پکڑ لیا کہ وہ بھی شریک جرم ہے۔ اس کے بزنس پارٹنر سے ناجائز مراسم تھے۔ وہ ایک ناجائز بچے کی ماں بننے والی تھی۔ شوہر کو اس کے چال چلن پر پہلے ہی شک تھا۔ اس نے آشنا سے مل کے اسے ٹھکانے لگایا اور اب آشنا اس سے شادی کرنے پر تیار نہیں تو وہ انتقام لینے کے لیے اسے پھنسا رہی ہے۔ پولیس نے عورت کا بھی ریمانڈ لے لیا اور بزنس پارٹنر کا بھی۔ ان سے پوچھتے رہے کہ وہ ٹیکسی والا کون تھا اور انہوں نے اسے کتنے پیسے دیے تھے حادثہ کرنے کے۔ بزنس پارٹنر تو پیسے دے کے چھوٹ گیا۔ عورت پر کیا بیتی یہ بڑی افسوس ناک کہانی ہے۔"

محسن نے کہا "مجھے غالب نے بھی ایک واقعہ سنایا تھا کہ کوئی چور ایک گھر میں گھسا تھا۔ وہاں صرف ایک لڑکی تھی۔ اس نے شور مچایا تو چور اسے قتل کر کے بھاگ گیا۔ بعد میں بھائی آیا تو اس نے تھانے جا کے رپورٹ کی۔ پولیس نے بھائی کو دھر لیا کہ چور کا نام کیا لیتے ہو۔ کیا چوری ہوا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ اصل بات بتاؤ کہ اس کا وہ آشنا کون تھا جس کے ساتھ تم نے بہن کو قابل اعتراض حالت میں دیکھا اور مشتعل ہو کے قتل کر دیا۔ ریمانڈ انہیں مل گیا اور وہ بھائی سے یہ تفتیش کرتے رہے کہ کیا اس نے آشنا کو قتل کر کے کہیں اور دفنا دیا ہے یا دریا میں پھینک دیا ہے؟ چور والی کہانی تو جھوٹ ہے۔ آبرو ریزی ہوئی ہے لڑکی کی۔ میڈیکل میں سب آ جائے گا۔ اندازہ کرو اس بھائی کی ذہنی کیفیت کا۔ غالب نے اس کی گلو خلاصی کرائی تھی پانچ ہزار دے کے۔"

میں نے افسوس سے کہا "جس کا کوئی نہ ہو اسے کسی بھی کیس میں اندر کیا جا سکتا ہے۔ کہانی اور واقعات بدل کے یہ لوگ کسی بھی واردات کو کچھ بھی بنا سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب تک یہ ٹرک کا سراغ لگا چکے ہوں گے اور شاید ٹرک کے مالکوں سے کیس دبانے کا معاوضہ بھی جیب میں ڈال چکے ہوں گے۔ جہاں ان کا فائدہ ہو وہاں یہ بہت مستعد اور ذہین ہو جاتے ہیں اور اسامی کو قبر میں سے نکال لاتے ہیں۔"

اکرام شیخ اور محسن بے مکیں ہو جانے والے گھر کے اسباب کی تلاش اور دیگر انتظامی نوعیت کے مسائل کا جائزہ لینے لگے۔ میں نے کوتانیا انٹرپرائز کا نمبر ملایا اور خلاف توقع اس بار لائن جلد ہی مل گئی۔

"ہیلو" کہنے والی وہی حسینہ تھی جسے میں اپنے چوہدری دلاور صاحب کی پہلی قسط کا تحفہ دے کر بھاگ آیا تھا۔

میں نے کہا "مجھے پہچانا بلبل بغداد؟"

"کون.... تم" اس نے چند سیکنڈ میں مجھے شناخت کر لیا۔

"ہاں میں۔ بغداد کا چور۔ بغداد سے بول رہا ہوں۔ تحفہ کیسا رہا؟"

"تم بہت خطرناک آدمی ہو" اس کی آواز کانپ رہی تھی "کیا بات ہے اب۔ کیوں پریشان کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "دیکھو لڑکی۔ تم اتنی چالاک نہیں ہو جتنا بننے کی کوشش کر رہی ہو اور میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں جتنا تم مجھے سمجھتی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ اس وقت لائن پر میری آواز اور کون کون سن رہا ہے۔ شاید ہر لفظ ریکارڈ کیا جا رہا ہو گا۔ یہ نمبر بھی یقیناً آبزرویشن پر ہو گا اور چوہدری دلاور کی بیوہ.... میرا مطلب ہے ہونے والی بیوہ دوسرے فون پر ایکسچینج سے پوچھ رہی ہو گی کہ فون کال کہاں سے موصول ہوئی ہے۔ اسے کو تکلیف نہ کرے۔ میں بتا دیتا ہوں کہ یہ کال کراچی سے کی گئی ہے اور میں سکندر بخت بات کر رہا ہوں۔ یہ بھی بتا دو اسے کہ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے فالتو باتوں کے لیے۔"

"میں.... میں بتاتی ہوں" اس کی آواز سے گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ ظاہر تھی۔

دوسرے لمحے دلاور کی بیوی لائن پر آ گئی "تم سکندر بخت ہی ہو نا؟"

میں نے کہا "تم پہچانتی نہیں ہو میری آواز؟ جانتے بوجھتے انجان بن کے فضول سوالات کرو گی محض وقت گزارنے کے لیے تو میں فون بند کر دوں گا۔ میرے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔"

"پندرہ منٹ.... سکندر میری بات تو پوری سنو گے نا....؟"

"اظہار عشق یا اعتراف سب پندرہ منٹ میں کیا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ وقت دینا میرے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ پولیس میری کال کو ٹریس کر کے یہاں پہنچ جائے گی۔ مجھے پاکستانی پولیس سے اتنی تیزی اور مستعدی کی امید تو نہیں کہ آدھے گھنٹے سے پہلے کوئی تھانے دار کرسی سے ہل بھی سکے خواہ معاملہ کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو لیکن میں خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"سکندر۔ میرا کوئی ارادہ نہیں ہے پولیس کو درمیان میں لانے کا۔ یقین کرو۔"

"سوری مسز دلاور۔ یقین اور اعتبار کے لفظ تمہاری زبان سے اچھے نہیں لگتے اور میرے لیے بھی بے معنی ہو گئے ہیں۔ شکار گاہ میں ہم بیک وقت شکاری بھی ہیں اور شکار بھی۔ موسیو آندرے نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ تم سے بات کروں۔ تم کچھ کہنا چاہتی ہو۔"

www.paksociety.com

"میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ کیا یہ خطرناک کھیل ختم نہیں کیا جا سکتا سکندر؟" وہ بولی "ورنہ سب تباہ ہو جائیں گے۔"

"سب نہیں۔ میرا مقصد تو دلاور کو تباہ کرنا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس نے میرے باپ کو تباہ کیا تھا۔ اب دلاور کی باری ہے۔"

"سکندر۔ جو سب ہوا واقعی بہت برا ہوا۔ سارا قصور دلاور کا تھا۔ میں مانتی ہوں لیکن کوئی صورت ہے اس جرم کا کفارہ ادا کرنے کی۔ تمہارے نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے کسی طرح؟"

"ہاں۔ مجھے رزبر خان لا دو۔ زندہ سلامت اسی حالت میں جیسے میں نے اسے لندن جاتے وقت آخری بار دیکھا تھا۔ تم تمہیں اندازہ ہو رہا ہے کہ تمہیں صرف ایک مرد کی نہیں بچوں کے باپ کی ضرورت ہے اور دلاور کا کوئی مدد دولت یا طاقت سے باپ کو حاصل نہیں کر سکتا۔"

"سکندر۔ میں سمجھتی ہوں تمہارے جذبات کو لیکن کیا تم معاف نہیں کر سکتے اسے۔ میں تم سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ سکتی ہوں۔ رحم کی بھیک مانگ سکتی ہوں۔ تم اتنے سنگدل اور سفاک تو نہیں ہو سکتے کہ ایک بیوی اور ایک ماں کے آنسوؤں اور التجاؤں کو ٹھکرا دو۔ تم جہاں کہو میں سب کے سامنے تمہارے قدموں میں سر رکھ سکتی ہوں۔ میں تمہارا باپ تو تمہیں واپس نہیں کر سکتی لیکن اس کے علاوہ سب دے سکتی ہوں۔ وہ سب جو تمہارا حق تھا اور اس کے علاوہ جو میرا ہے سب لے لو۔"

میں نے کہا "مسز دلاور۔ تم جذباتی باتیں کر رہی ہو۔ اسی طرح جیسے لوگ دل رہنے کی بات کرتے ہیں۔ صرف تمہارے کہنے سے مجھے سب کچھ نہیں مل جائے گا۔ کیا واقعی یہ تمہارے لیے ممکن ہے کہ چوہدری دلاور کے سارے اثاثے میرے نام کر سکو۔ اس کے نام پر جتنی کو ٹھیاں ہیں۔ اس کا سارا بینک بیلنس اور کاروبار۔ تمہاری خاموشی ہی تمہاری بے بسی کا اعتراف ہے۔"

"میں دلاور کو راضی کر سکتی ہوں کہ وہ تم سے صلح کر لے۔"

میں نے ہنس کے کہا "ایسا تو وہ خود مجھ سے کئی بار کہہ چکا ہے۔ وہ میرے مالی نقصانات کی تلافی کرنے کے علاوہ بھی بہت کچھ دینے پر تیار ہے۔ میری ذہنی و جسمانی اذیت کا کفارہ۔ ہرجانہ یا جرمانہ۔"

"پھر تم کیا چاہتے ہو۔ کیوں جاری رکھنا چاہتے ہو یہ کھیل جس میں تم خود بھی بے گھر اور بے سکون ہو۔ تمہارے ساتھ کتنے لوگ عذاب میں مبتلا ہیں....."

میں نے کہا "یہ عورتوں کے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ مردوں کے کھیل ہیں۔ تم صرف اپنی بات کرو کہ تم کیا چاہتی ہو۔ جسمیں چوہدری دلاور کی دوسری قسط کی یا نہیں؟"

"دوسری قسط!" وہ چلائی۔

میں نے کہا "ہاں۔ جمع کرتی رہو ان ٹکڑوں کو پھر سارے پارٹس جوڑ کے سالم چوہدری دلاور بنا لینا۔ بس ایک جان ہی تو نہیں ہو گی اس میں....."

"نہیں، نہیں۔ خدا کے لیے۔ ایسا مت کرو۔ دلاور کو تو مت کرو۔ تمہیں رسول کا واسطہ۔ قسم ہے قرآن پاک کی۔"

میں نے کہا "کیا فائدہ ایسی قسموں کا۔ کسی قاتل کی بیوی یا ماں عدالت میں چلا چلا کے جج سے چاہے کہ وہ انصاف نہ کرے تو یہ ناممکن ہے۔"

وہ زار و قطار رونے لگی "مجھے بتاؤ سکندر تمہیں کیا چاہیے آخر؟"

میں نے کہا "میری چند شرائط ایسی ہیں کہ تم پوری کرنا چاہو تو کر سکتی ہو۔ اس کے بعد میں دیکھوں گا کہ تم کیا کر سکتی ہو اور تمہارے سامنے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"وہ کیا شرائط ہیں بولو" اس نے سنبھل کے کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ غالب اور ساز و کو چوہدری دلاور کے کتے اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ مجھے ان کی مکمل سلامتی کی ضمانت چاہیے۔"

"مجھے... مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔"

"تم معلوم کر سکتی ہو۔ تمہارے پاس وسائل ہیں اور وقت ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پتا چلا لوں گی۔"

"بات صرف زبانی ضمانت کی نہیں ہے۔ لاہور میں رابطہ میرا دوست عبدالودود منظر ہے اور دوسرا یوسف ہے۔ ان میں کوئی تصدیق بھی کرے گا کہ وہ خیریت سے ہیں۔ اس کے بعد تم کو چوہدری دلاور کے تحفظ کی پوری ضمانت ملے گی۔ تمہارا نمائندہ کوئی نمائندہ اپنی آنکھوں سے دلاور کو دیکھے گا۔ اس سے بات کرے گا اور یہ ملاقات مکمل رازداری کے وعدے پر ہو گی۔ ایک فوجی کو دلاور سے ملوانے لے جائیں گے۔"

"تمہیں خوشی ہو گی اس سے... کب ملواؤ گے مجھے۔"

"اتنی بے تابی کی ضرورت نہیں۔ پہلے تم غالب اور ساز و سے ملاقات کا بندوبست کرو۔ تم جسے چاہو جہاں چاہو جب چاہو تو حسین کو لے جاؤ۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کے مسلح محافظوں کے ساتھ۔ تو بھی رات کے وقت وہ جائے گا اور واپس آ کے رپورٹ کرے گا۔ اس رپورٹ پر ہمارے جوابی رد عمل کا انحصار ہو گا۔ تمہیں مطلع کیا جائے گا کہ تم کو کب کہاں اور کیسے دلاور سے ملاقات کے لیے لے جایا جائے گا۔ یہ بات ختم ہوئی۔"

"اس کے بعد....."

"اس کے بعد مرحلہ آئے گا چوہدری دلاور کے مستقبل کا۔ اگر غالب اور ساز و کو کچھ نہ ہوا تو دلاور کو بھی کچھ نہیں ہو گا۔ اس خوش فہمی کو دل سے نکال دینا کہ پولیس یا تمہارے شکاری کتے اس کا سراغ لگا سکتے ہیں۔ ایسی احمقانہ کوشش کی سزا تم سے زیادہ اس کو ملے گی۔ تمہاری ہر غلطی کا نقصان اسے ہو گا۔ عادت سے زیادہ جنونی میں بھی رکھ سکتا ہوں۔ مثلاً اسے چوہیں گھنٹے کے لیے الٹا لٹکا دیا جائے۔ اس کا کھانا پینا دو دن کے لیے بند کر دیا جائے کہیں سے اس کی ایک انچ کھال اتار لی جائے اور اسی دوران میں تین بار نمک کا پانی دیا جائے۔ اسے زبردستی گوبر کھلایا جائے یا گٹے کا پیشاب پلایا جائے۔ یا اس کا اپنا خون۔"

وہ دہشت زدہ ہو کے چیخنے لگی "مت کرو ایسی باتیں خدا کے لیے۔"

"تم کہہ سکتی ہو کہ پھر یہ سب تو غالب اور ساز و کے ساتھ بھی ہو گا مگر ایک فرق ہے ان میں اور دلاور میں۔ وہ ایک ساتھ جینا ہی نہیں مرنا بھی چاہتے ہیں اور ان کی موت بھی شہادت ہو گی۔ یہ بذات خود ایک انعام ہے۔ ان کے نہ والدین ہیں نہ بھائی بہنیں اور بچے۔ اس لیے وہ کبھی نہیں مریں گے لیکن دلاور نہ رہا تو تم بیوہ کہلاؤ گی اور قبیلہ بے تیم۔"

"نہیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں... انہیں کچھ نہیں ہو گا۔"

"ابھی چوہدری دلاور کی رہائی کے موضوع پر بات نہیں ہو سکتی۔ ہاں تمہیں یہ بتایا جا سکتا ہے کہ اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ دلاور خود کو قانون کے حوالے کر دے اور اپنے سب جرائم کا اعتراف کر لے۔"

"یہ ضمانت میں کیسے دے سکتی ہوں" وہ مایوسی سے بولی۔

"دوسری صورت یہ ہے کہ تم اسٹیلا پیڈ سٹو کو غیر مشروط طور پر اقرار حوالے کر دو۔"

"یہ ہو سکتا ہے۔ یہ کر سکتی ہوں میں۔"

"مسز دلاور۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ مجھے دوسرے نہیں مل سکتے اور کیا ان میں اسٹیلا پیڈ سٹو شامل ہے یہ بات خود بھی سمجھ لو۔ پیڈ سٹو کو بھی سمجھا دو اور اسے کہو کہ پولیس کو بتا دے۔ میں اس وقت کراچی میں ہوں مگر دو گھنٹے بعد میں لاہور یا حیدر آباد میں بھی ہو سکتا ہوں۔ پنڈی یا اسلام آباد میں بھی اور چوہدری دلاور کو میں اپنی جیب میں ساتھ ہی رکھتا ہوں۔ جیب میں کسی کو نظر نہیں آتا تو دلاور کیسے نظر آ سکتا ہے۔"

میں نے گھڑی دیکھی اور ریسیور رکھ دیا۔ دوسری طرف دلاور کی بیوی کو یوں لگا ہو گا جیسے لائن کٹ گئی ہے اور وہ ہیلو ہیلو کہتی رہ گئی ہو گی۔

محسن اور اکرام میرے قریب خاموش کھڑے تھے۔ میری گفتگو سے کوئی بھی سمجھ سکتا تھا کہ میں کس سے کیا بات کر رہا ہوں۔

"مجھے اب نکل چلو یہاں سے فوراً۔ کہیں یہ بھی نہ دھر لیے جاؤ" محسن بولا "پولیس کی کارکردگی کا نقص فرض کر کے اتنا رسک نہیں لینا چاہیے۔"

اکرام نے کہا "وہ بعد میں ضرور آئیں گے۔"

ابھی اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ کال بیل بجی پھر کسی نے دروازہ توڑنے کی کوشش کی۔ پولیس والے دروازے پر لاتیں اور گھونسے مار رہے تھے اور چلا رہے تھے "دروازہ کھولو۔ جو بھی اندر ہے۔"

میں نے محسن اور اکرام کی طرف دیکھا "گھبرانے کی بات نہیں۔ وہی فریضہ ادا چلے گا۔"

محسن نے دروازہ کھول دیا۔ ایک ساتھ تین پولیس والے اندر آ گئے۔ ان میں سے دو افسر تھے یعنی اے ایس آئی اور ایس آئی۔ تیسرا ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ ریوالور ان سب کے ہاتھ میں تھے۔ تھری ناٹ تھری صرف حوالدار کے پاس تھی۔

سب انسپکٹر چلایا "ہینڈز اپ۔ منہ دیوار کی طرف کر لو ورنہ میں گولی مار دوں گا۔"

میں نے محسن سے کہا "ان الو کے پٹھوں سے بات کر۔ جیسے پہلے کی تھی۔"

اس نے کہا "وکیل صاحب پوچھ رہے ہیں کہ اس طرح اسلحہ لے کر وارنٹ دکھائے بغیر گھر میں گھس آنے کا کیا مطلب ہے؟"

"کون وکیل صاحب؟" سب انسپکٹر نے غرا کے کہا "فراڈ کرتے ہو میرے ساتھ۔ میں گولی مار دوں گا۔"

"تا دو۔ بار بار اعلان کیوں کر رہے ہو۔ چلاؤ گولی اگر اختیار ہے۔ تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں۔" محسن نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

"پہلے تو سارے غنڈے نارث کے سالے ہی بنتے ہیں۔"

"میں مشہور جرنلسٹ غالب ہوں" محسن نے بے خوفی سے کہا اور پھر فرضی وکیل والی پوری کہانی دہرا دی جس نے کچھ دیر پہلے سب انسپکٹر راجہ کی اکڑ فوں نکال دی تھی۔

"سکندر بخت کون ہے تم میں سے؟" سب انسپکٹر نے ظاہر کیا کہ وہ متاثر نہیں ہوا۔

"سکندر بخت تو کوئی نہیں۔ یہ موسیو آندرے ہیں۔ میں غالب ہوں اور یہ ٹیکسی ڈرائیور جو ہمیں یہاں لایا تھا۔ تم اس کے کاغذات سے تصدیق کر سکتے ہو۔ یہ کراچی میں ہی ٹیکسی چلاتا ہے۔ سب ٹیکسی ڈرائیور اسے جانتے ہیں۔ مجھے لیاقت نہر کا سب انسپکٹر راجہ پہچانتا ہے۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے آیا تھا۔ یہ میری بہن کا گھر ہے جس کا انتقال کل ایک حادثے میں ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا بہنوئی بھی ہلاک ہوا تھا۔ میں یہاں آئی جی ارباب ہدایت اللہ صاحب سے قتل کے تفتیش کے احکامات جاری کرانے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے شک بلکہ یقین ہے کہ یہ حادثہ نہیں قتل تھا۔"

سب انسپکٹر روایتی قسم کا پولیس مین تھا۔ اختیارات، وردی اور ریوالور کے بل پر خود کو فرعون اور قارون سمجھنے والا مگر اندر سے ڈرپوک اور حکم کا غلام جس کی نوکری کے بنیادی اصول تین ہوتے ہیں۔ طاقتور کو سلام، کمزور کو سزا اور تمام صلاحیت کا استعمال

www.paksociety.com

"میں سمجھا نہیں جی، یہ رکشا والا بیچ میں کدھر سے آ گیا؟"

"وہ رکشا والا کہاں ہے؟" محسن نے اس کی بات کو نظرانداز کر دیا۔

"پتا نہیں جی۔ صلح صفائی کرا دی تھی۔ بے شک غلطی بابا جی کی تھی مگر رکشے والے کا بھی تو فرض بنتا ہے کچھ..."

محسن نے کہا "تم میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ رکشا کس کا تھا۔ رکشا کا نمبر کیا تھا۔ وہ بابا کہاں ہے۔ تم نے اسے گھر پہنچایا تھا یا اسپتال بھیجا تھا؟"

تھانے دار کچھ نروس ہوا "وہ جی۔ صلح صفائی ہو گئی۔ بابا اتنا زیادہ زخمی بھی نہیں تھا۔ رکشا والا خود ہی ان کو اسپتال لے گیا تھا۔"

محسن بولا "کیا یہ صحیح ہے کہ جب وہ رکشا والا یہاں مرغا بنا ہوا تھا تو اسی وقت کسی نے تمہیں حادثے کی اطلاع دی تھی؟"

تھانے دار نے مجبوراً اعتراف کیا "ہاں جی۔ ٹائم تو وہی تھا۔"

"رکشا والے نے تمہاری باتیں سنی تھیں۔ فون کرنے والے نے تمہیں ٹرک کا نمبر بھی بتایا تھا اور ٹرک ڈرائیور کا حلیہ بھی۔"

"بکواس کرتا ہے وہ..." تھانے دار گرم ہو گیا "لاؤ اسے میرے سامنے۔"

"کیا واقعی تمہیں اس ٹرک کا نمبر معلوم نہیں؟" محسن نے آگے جھک کے دوستانہ رازداری سے سوال کیا۔

"کمال ہے جی..."

محسن نے اس کی بات کاٹ دی "نمبر ایک دکان دار نے بھی بتایا ہوگا۔ وہ وہیں اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا اور اس نے سب دیکھا تھا۔ ٹرک کا نمبر بھی اور اس رکشا کا نمبر بھی جس کو ٹرک نے دوبار ٹکر ماری تھی اور دور تک گھسیٹتا ہوا لے گیا تھا۔ اس دکان دار نے ہی بچے کو اٹھایا تھا جو ماں کی گود سے اچھل کے رکشا سے باہر سڑک پر جا گرا تھا۔ تمہیں کچھ یاد آیا؟"

محسن نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا مگر خاصے اعتماد کے ساتھ۔ تھانے دار کی صورت پر ہوائیاں اڑنے لگیں مگر وہ ڈھیٹ آدمی تھا "باہر بیٹھے ہیں سارے دکان دار جناب۔ ان میں سے کون ہے؟"

"ان میں وہ نہیں ہوگا۔ میں شرط لگا سکتا ہوں۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہے؟"

"پراچہ صاحب۔ ہم اخبار والے بال کی کھال نکالنا آخر کس سے سیکھتے ہیں؟ تم ہی جیسے لوگوں سے..."

"کیا مطلب ہے جی اس فضول بات کا آخر۔"

"مطلب یہ کہ گرو کو چیلا پہچانتا ہے اور چیلے کو گرو۔ ہم چور کے دھندوں سے بھی واقف ہیں اور کوتوال کے کرتوت بھی جانتے ہیں۔ میں نے اس گواہ کو آئی جی صاحب کے آفس پہنچ کر انتظار کرنے کو کہا ہے۔ اب تم اس کو منحرف نہیں کر سکتے۔ اس کی زبان بند نہیں کر سکتے اور غائب نہیں کر سکتے۔ ابھی معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ مجھے بتا دو کہ ٹرک والے سے تم نے کتنے پیسے وصول کیے ہیں۔"

پراچہ کو پسینہ آ گیا "پیسہ تو جی..."

"ٹرک کہاں ہے؟" محسن نے سپاٹ لہجے میں کہا "نمبر کیا ہے اس کا اور مالک کون ہے؟ مجھے وہ ٹرک جواب چاہیے ورنہ میں جا رہا ہوں۔"

سب انسپکٹر پراچہ کو ایک لمحے کے لیے سکتہ سا ہو گیا۔ وہ کچھ دیر خلا میں گھورتا رہا "ٹھیک ہے سر جی۔ شام کو مالک حاضر ہو جائے گا۔ جہاں آپ بولو گے۔ وہ خود آپ سے بات کر لے گا۔"

محسن نے کہا "ہاں۔ مرنے والی میری ایک عزیز محسن تھی۔ تم اس کے قاتل کو بچانے کی کوشش کرو گے تو خود بھی مارے جاؤ گے۔ یہ کسی ایرے غیرے کا نہیں، میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ باقی لوگوں کو چھوڑ دو۔"

پراچہ نے سہلایا "آپ کل ہی تھانے آ جاتے تو اتنی لمبی بات نہ ہوتی۔ ہمیں کیا پتا تھی کہ وہ آپ کی عزیزہ تھیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں جنازے میں شریک نہ ہوتا۔ یہاں آ جاتا۔ اب آ گیا ہوں میں۔" محسن نے برہمی سے کہا "مجھے بتاؤ کس کا ٹرک تھا۔ کیا نمبر تھا اس کا؟"

"ٹرک تو جناب رانا گڈز کیریئرز والوں کا تھا۔ نمبر بھی لکھ لیں۔"

محسن نے فاتحانہ نظروں سے میری طرف دیکھا "مجھے نمبر لکھ کے کیا کرنا ہے۔ اب تم میری طرف سے ایف آئی آر لکھو۔ اس ٹرک کے ڈرائیور کے خلاف۔ تم مالک کو جانتے ہو تو ڈرائیور کو بھی جانتے ہو گے۔"

پراچہ نے خشک لبوں پر زبان پھیری "مالک... مالک تو سر لاہور میں رہتے ہیں... ڈرائیور مفرور ہے... کمپنی کا ملازم تھا۔"

محسن کھڑا ہو گیا "سب انسپکٹر پراچہ۔ تم ذرا اپنے جرائم کی فہرست دیکھو۔ تم نے حادثے کی رپورٹ کو اہمیت نہیں دی۔ جانے دار دات پر جانے سے گریز کیا۔ جانتے بوجھتے گواہی بدلی۔ ثبات مجرمانہ کے مرتکب ہوئے۔ رشوت لے کر ڈرائیور کو فرار ہونے میں مدد دی۔"

"آپ کچھ ثابت نہیں کر سکتے جی۔"

"ثابت ہو جائے گا پراچہ صاحب اور ثبوت تمہارے سامنے آئیں گے تو تم خود اندر ہو جاؤ گے۔ تم اس وقت بھی ایف آئی آر لکھنے سے انکاری ہو۔ ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والا وکیل میرے ساتھ ہے۔"

سب انسپکٹر پراچہ نے دھڑ سے گھنٹی پر ہاتھ مارا "ارے مولی عقل والے کہاں گئے۔ بلا اپنے اس باپ کو" اس نے کانسٹیبل سے کہا جو گھنٹی کی آواز پر چراغ الہ دین کے جن کی طرح نمودار ہوا

مولوی خادم حسین نے بتا ہی دیا ہوگا۔ گالیاں بقلم خود لاہور جا کے کھا بیٹا۔" محسن بولا۔

اکرام شیخ اور اس کی ٹیکسی کا دم غنیمت تھا ورنہ میں تو کراچی میں پردیسی تھا اور ایسا غیر ملکی جو یہاں کے حاکموں کی زبان بھی نہیں سمجھتا تھا۔ محسن سے بہتر مترجم بھی مجھے کہاں میسر آ سکتا تھا۔ خادم حسین کے مخلص ہونے میں شک نہیں لیکن وہ محسن کی طرح میرے بس کی بات نہیں سمجھ سکتا تھا اور اس کی ذاتی عقل کا محسن کی معاملہ فہمی سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔

لالو کھیت اب بھی لالو کھیت تھا۔ جیسے راولپنڈی کے کمپنی باغ کو لیاقت علی خان کی شہادت لیاقت باغ نہ کر سکی تھی ایسے ہی لیاقت آباد ابھی تک لوگوں کی زبان پر نہیں چڑھا تھا۔ ایم اے جناح روڈ کو بھی اکثریت بندر روڈ ہی کہتی تھی۔ معاشرتی سوچ اور خیالات کی جذبات کی اور ارادوں کی ہم آہنگی اور قول و فعل سے ایک زندہ قوم کا وجود ثابت کرنے کی اجتماعی خواہش ابھی تک مفقود تھی۔ جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو۔ اب ہم پاکستانی ہیں یہ جذبہ کہیں نہ تھا اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی اسی کا شاخسانہ تھی۔

سب انسپکٹر پراچہ نے تقریباً ایک درجن افراد کو برآمدے میں فرش پر دیوار کے ساتھ بٹھا رکھا تھا۔ ان سب کو ابھی تک علم نہ تھا کہ خود انہیں کس جرم میں تھانے بلا کے روک لیا گیا ہے۔ عام آدمی تھانے آ کے یہ سوال کرنے کی جرات نہیں رکھتا۔ وہ جانتا ہے کہ جرم سرزد نہ ہونے سے کوئی بے قصور نہیں ثابت ہوتا اور ضروری نہیں کہ جو جرم کرے وہی مجرم کہلائے۔ یہ تو پولیس والوں کی مرضی اور اختیار کا مسئلہ ہے جسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

مختلف کمروں میں لوگوں کی آمدورفت معمول کے مطابق جاری تھی۔ ایس ایچ او صاحب اپنی گاڑی میں گشت کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ آس پاس سب اٹینشن تھے اور فضا میں وہی دہشت تھی جو شیر کی کچھار سے برآمد ہوتے وقت جنگل پر طاری ہو جاتی ہے۔ انہوں نے جاہ و جلال کی ایک نگاہ غلط انداز سے ہمیں دیکھا مگر ٹیکسی ان کی شان کے خلاف تھا۔

ایک خوشامدی ماتحت نے فرض شناسی کا مظاہرہ کرنے کے لیے اکرام کو گالی دی۔ "او ہٹا۔ یہ ٹیکسی کدھر کھڑی کر دی ہے راستے میں۔"

اکرام نے پلٹ کے کہا "اور بھی گاڑیاں کھڑی ہیں وہاں۔"

"ایس ایچ او صاحب کی گاڑی کا راستہ روک رکھا ہے اور او پر سے بکواس کرتا ہے..." اس نے دوسری گالی دی۔

"گاڑی تو نکل گئی۔ اور بس میں ہوتے ایس ایچ او صاحب تو مار کر جاتی۔" اکرام شیخ نے کہا "تم سمجھتے کیا ہو ہمیں..."

کانسٹیبل نے اس کی بک بک بند کرنے کے لیے مروجہ طریقے کے مطابق اس پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو محسن درمیان میں آ گیا "کیا بات ہے؟ یہ تم اپنی مادری زبان کیوں استعمال کر رہے ہو۔ تمہیں تو پبلک کے ساتھ اخلاق سے بات کرنے کی ہدایت ہے۔" محسن نے کانسٹیبل سے کہا۔

پراچہ نے صورت حال کی نزاکت کو سمجھ لیا اور کانسٹیبل کو ڈانٹا بستر سمجھا "اوئے موٹی عقل والے کہو تے۔ ٹھیک فرماتے ہیں صحافی صاحب۔ چل دفع ہو ادھر سے اور کچھ چائے پانی کا بندوبست کر۔"

موٹے کانسٹیبل کی عقل ہی نہیں کھال بھی موٹی تھی۔ ایک لمحے میں غرانے والا کتا دم ہلانے لگا۔ بے عزتی کرنا اور بے عزتی کرانا ایک ایسا معمول تھا جس کے وہ عادی تھے۔

پراچہ نے ہمیں اپنے کمرے میں بٹھا دیا جو درحقیقت ہیڈ محرر کا دفتر تھا مگر اسے وقتی طور پر کہیں اور بھیج دیا گیا تھا۔

"مو سر جی۔ سب گواہان حاضر ہیں۔ آپ خود پوچھ لو ان سے جو بھی پوچھنا ہے۔"

محسن نے کہا "پہلا مجھے آپ سے معلوم کرنا ہے۔"

"پوچھیں جناب" اس نے بہت اعلیٰ قسم کے غیر ملکی سگریٹ آگے بڑھا دیے۔

"ہم میں سے کوئی نشہ نہیں کرتا" محسن بولا "کل جس وقت حادثہ پیش آیا تھا تو یہاں ڈیوٹی افسر کون تھا؟"

"آپ کا یہ خادم تھا جناب۔"

"تمہیں حادثے کا علم کب ہوا تھا؟"

"تھوڑی دیر بعد۔ کسی نے فون کیا تھا" وہ بولا۔

"پھر تم نے کیا کارروائی کی تھی؟"

"میں نے جناب کانسٹیبل کو روانہ کر دیا تھا فوراً۔ آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں۔" اس نے گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ابھی مت بلاؤ اسے۔ کیا اس وقت یہاں کوئی رکشا والا تھا؟"

وہ چونکا "رکشا والا؟"

"ہاں۔ اسے تم نے مرغا بنا رکھا تھا۔ کیا جرم ہوا تھا اس سے؟"

"اس نے... جناب ایک بڈھے کو ٹکر مار دی تھی۔ رانگ سائڈ سے سامنے آ گیا۔"

"پھر تم نے چالان کیا اس کا۔ یہ تو خاصا سنگین معاملہ تھا۔ دو جرم تو ثابت تھے۔ رانگ سائڈ اور مجرمانہ غفلت..."

"اجی ایسے چھوٹے چھوٹے معاملات پر ہم کیس بنانے لگیں تو ہو چکا کام۔ عدالتی پہلے ہی کم ہے پھر عدالتوں کا کام کتنا بڑھ جاتا ہے۔ بڑے بڑے چوری ڈکیتی قتل اور اغوا کے کیس برسوں سے پڑے ہیں۔"

"چنانچہ تم نے خود ہی عدالت کا کام بھی کیا اور اسے سزا دے کے چھوڑ دیا۔ وری گڈ" محسن نے طنز سے کہا "پھر کتنا جرمانہ لگایا اس پر؟"

www.paksociety.com

صرف مال یا کھال کھینچنے کے لیے۔ محسن کی بات نے اس کو سنبھلنے پر مجبور کر دیا۔

"یہ سکندر بخت کون ہے؟" میں نے کہا "اس سے پوچھو ذرا۔"

محسن کے سوال نے سب انسپکٹر کو پریشان کر دیا "مجھے کچھ نہیں معلوم جی۔ اوپر سے ایس پی نے فون کر کے حکم دیا تھا کہ فوراً اس پتے پر جاؤ۔ یہاں سے ابھی کسی سکندر بخت نے لاہور فون کیا ہے "اسے پکڑ لو۔"

"کس جرم میں؟ کیا فون کرنا بھی جرم ہے۔ فرض کرو یہاں سے کسی سکندر بخت نے لاہور کال کی ہوتی تو کیا صرف کال کرنے پر اسے پکڑا جا سکتا تھا اور تم لوگ محض افسر کے حکم پر کسی کے گھر میں ایسے داخل ہو سکتے ہو؟ پوری پولیس فورس کے ساتھ چڑھائی کرنے کا کوئی قانونی جواز تو ہونا چاہیے۔ تمہارے ساتھ نہ ایس ایچ او ہے نہ لیڈی پولیس اور نہ وارنٹ۔"

سب انسپکٹر نے مردہ لہجے میں کہا "کیا کریں جی۔ یہ نوکری ہی ایسی ہے۔ افسر تو افسری ہوتا ہے۔ اس کا حکم ماننا پڑتا ہے۔"

"اگر افسر کہے کہ جاؤ اپنے باپ کو گولی مار دو تو تم ایسا ہی کرو گے؟"

"صاحب، آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہم سے کہا گیا تھا کہ اس گھر میں ایک مجرم نے پناہ لے رکھی ہے۔ دیر کی تو وہ فرار ہو جائے گا۔ پتا نہیں افسر صاحب نے غلط بتایا ہم نے۔ پتا بالکل ٹھیک ہے اور ٹیلی فون نمبر بھی یہی۔ اگر آپ برا نہ مانیں مروت میں اندر بھی دیکھ لیں۔"

"کیا مطلب؟ کیا ہم نے چھپایا ہے اسے اندر؟" محسن نے برہمی سے کہا "ہم پناہ دیتے ہیں مجرموں کو۔ تمہارا یہ جرم کیا کم ہے کہ تم وارنٹ کے بغیر اس گھر میں گھسے ہو... اوپر سے خانہ تلاشی کی اجازت مانگ رہے ہو۔"

"آپ ہماری مجبوری کو سمجھئے تو اجازت دے دیجیے جناب عالی۔ ہم ایک نظر ڈال کے مطمئن ہو جاتے تو ایس پی کو رپورٹ دیتے کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ کسی نے غلط اطلاع دی تھی۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میری عزت بچ جائے گی صحافی صاحب۔ آپ بادشاہ لوگ ہوتے ہو۔ آئی جی صاحب کو بتا دو گے یا اخبار میں چھاپ دو گے تو ہماری پیٹی اتر جائے گی۔"

محسن نے کہا "اچھا جاؤ دیکھ لو اور پھر اپنی ساری فورس کے ساتھ دفع ہو جاؤ۔"

سب انسپکٹر نے محسن کے لہجے اور رویے کا بالکل برا نہیں مانا اور اچھی طرح گھر کو کھنگال ڈالا "کمال ہے۔ ایس پی صاحب نے سکندر بخت کا نام کیسے لیا۔"

"یہاں سکندر بخت نام کا کوئی شخص پہلے ہی نہیں تھا لیکن ایک بات ہے تھانے دار صاحب۔ تم دیکھ رہے ہو کہ ٹیلی فون کے کھمبے سے ایک تار اس گھر تک آ رہا ہے۔ اب کوئی باہر ہی اس سے ٹیلی فون جوڑ دے تو معلوم کیا ہوگا کہ کسی نے اسی نمبر سے کال کی تھی۔"

"یہ تو ٹھیک فرمایا آپ نے۔ یہ تار تو ایکس چینج تک ہی ہے۔"

"ویسے کال کسے کی گئی تھی؟ اور ایسی کیا بات کہہ دی تھی اس نے۔ کیا نام اس کا سکندر بخت ہے؟"

"ہمیں کیا پتا جی۔ افسر لوگ پورا کیس نہیں بتاتے۔ بس آرڈر دیتے ہیں اور ہماری کیا مجال جو ان سے کچھ پوچھیں۔ یہاں تو کوئی تھا ہی نہیں۔ ابھی الٹا ہمیں ذلت پڑ گئی۔ غلطی معاف جناب عالی" وہ ہاتھ جوڑ کے اپنے دونوں ماتحتوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ دونوں ماتحت اپنے افسر کی اس ہزیمت اور ذلت پر خوش نظر نہیں آتے تھے۔

میں نے باہر جھانک کے دیکھا تو پولیس کی ایک گاڑی میں وہ جوان سوار ہو رہے تھے۔ شاید انہوں نے ہر طرف سے مکان کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ کچھ اہل محلہ اس کارروائی کو بڑی مشکوک دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ پولیس کے جاتے ہی انہوں نے ہم سے رجوع کیا اور ہم نے انہیں آسانی سے مطمئن کر دیا۔ پولیس کو اطلاع ملی تھی کہ حادثے کا ذمے دار ڈرائیور ہم سے معاملت کرنے کے لیے یہاں موجود ہے۔ وہ اسے گرفتار کرنا چاہتے تھے مگر یہ اطلاع بے بنیاد تھی۔

"تم نے دیکھا۔ بعض اوقات پولیس والے کارکردگی دکھا جاتے ہیں۔ یہ لوگ کتنی جلدی آ پہنچے" اکرام نے کہا۔

محسن نے سہارا دیا "فکر اس کے پیچھے بھی باز تھا۔ لاہور سے باز کراچی منتقل ہوا اور سر پر پاؤں رکھ کے دوڑتا چلا آیا۔ نچلے درجے کے ماتحت کو۔ قانون کے مطابق کارروائی اتنے کم وقت میں کیسے ہو سکتی تھی۔ ایس ایچ او، لیڈی پولیس اور وارنٹ سب ساتھ لانے کے لیے تو شاید بیٹھے کی اتنی کارروائی ضروری تھی۔ ابھی کوئی کالا وارنٹ آ رہا ہوتا تو پکڑ کے لے جاتے۔ یہاں الٹے لینے کے دینے پڑ گئے تھے تو اپنی جان بچا کے نکل گئے۔"

"اس انور کی آنکھی نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی۔ دلاور کی بیوی اب سر پر ہاتھ رکھ کے روئے گی" میں نے کہا۔

"یہ بندوبست اس نے پہلے سے کر رکھا ہوگا" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ مگر اب یقین اور اعتبار کی گنجائش تو نہیں رہی نا" اکرام نے کہا۔

"ہاں۔ تم اس غلطی سے مزید فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ ابھی تو خدا کا شکر ادا کرو کہ بال بال بچے۔ وہ بھی میرے جھوٹ کی وجہ سے" اکرام شیخ نے کہا۔

"میں ایک کال اور نہ کر لوں انور کو؟"

"نہیں۔ اب یہ فون آبزرویشن پر ہوگا۔ انور کو تمہارے

تھا۔

"فون سے باپ... کو سر؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"اوپر اس ہیڈ کوارٹر کو۔ ایف آئی آر کٹنی ہے نکلے" پراچہ نے ہنس کے کہا۔

ایف آئی آر کی نقل جیب میں ڈال کے ہم باہر آئے تو میں دل ہی دل میں محسن کی ذہانت کا معترف ہو چکا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اب تک وہ میرے ساتھ تھا مجھے یہ احساس تقویت پہنچاتا تھا کہ سکندر بخت بھی ایک نہیں دو ہیں اور محسن بھی ایک نہیں۔ اس کا اور میرا ذہن، خیالات، احساس اور جذبات اس حد تک مماثلت رکھتے تھے کہ ہمیں کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ محسن سب کچھ ویسے ہی کر لیتا تھا جیسے میں چاہتا تھا۔ ایسا ہی کچھ ہوا تھا جب میں بالکل خاموش رہا تھا اور محسن نے وہی کیا جو میں کرتا۔ غالب اس کا معنوی ہم البدل ثابت ہوا تھا مگر آج محسن نے پھر مجھے احساس دلایا تھا کہ اس کا وجود میری اصل طاقت ہے۔ ایک جسم کمزور ہو تو آنکھیں سارا وجود ہی حرکت تک پہنچاتی ہیں۔ خطرات سے بچاتی ہیں اور حرکت کی بھرپور توانائی فراہم کرتی ہیں۔ ایک ٹانگ نہ رہے تو مصنوعی ٹانگ سے کام چل جاتا ہے مگر ذہنی قوت اور اس کے اعتماد اور کارکردگی میں کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "تو نے کمال کر دیا محسن۔ ایسا لگا کہ اس بدمعاش کو"

محسن اداس ہو گیا "یار میں کوئی بہت اچھا مثالی قسم کا اور قابل رشک بھائی نہیں تھا مگر اب ایسا بھی نہیں کہ میری بہن کو سفاک قاتل سرعام مار ڈالیں اور ان کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکے۔ وہ ثبوت، گواہ اور سراغ سب غائب کر دیں اور پولیس کی دسترس سے محفوظ ہو جائیں۔"

میں نے اسے تسلی دی "اب شک کی کوئی بات نہیں رہی۔ یہ رانا گلزار کی بھی بڑا ہو کے پارٹنر رانا کی لگتی ہوگی۔ ابھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی مگر اس کا چرچا بہت سنا ہے۔ ٹرک اس کا تھا تو ڈرائیور یقیناً اسی کا پیدا ہوا ہوگا۔"

اکرام نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا "اگر کوئی چشم دید گواہ مل جاتا تو اچھا تھا۔"

"گواہ مل جائے گا" میں نے کہا "جائے حادثہ پر کوئی ایسا شخص چھپا ہوگا جو لالچ اور خوف کے بغیر بتا دے گا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔ سب بزدل اور بے کردار نہیں ہوتے۔ وہ دل اور خوف خدا رکھنے والے بھی ہیں جو سامنے نہیں آتے مگر تلاش کرنے سے مل جاتے ہیں۔ یہاں جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک خدا کا بندہ ایسا ضرور ہوگا جو ڈرائیور کو شناخت کرے گا۔"

اکرام شیخ بولا "اب یہ آئی جی صاحب کا ڈراما...."

محسن نے اس کی بات کاٹ دی "ڈراما کیسا... چلو ان سے بھی ملاقات کر لیتے ہیں۔"

محسن بولا "پبلک سے ملاقات کا وقت تو گزر گیا مگر خیر۔ ہم پبلک نہیں ہیں۔ ایف آئی آر کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کیس میں ماتحت عملہ جانب داری برت رہا ہے۔ کیس کی خصوصی تحقیقات کسی اور کے سپرد کی جائیں۔"

"وہ ایک بین الاقوامی شہرت کے حامل وکیل کی بات نہیں ٹالے گا" میں نے مسکرا کے کہا۔

میرا خیال درست ثابت ہوا۔ آئی جی ارباب ہدایت اللہ انتہائی مہذب اور شریف آدمی تھا۔ اس نے بڑے تحمل سے ہماری بات سنی اور کیس فوراً سی آئی اے کے سپرد کرنے کے احکامات صادر کرنے میں فریج ہوتا رہا اور محسن میرا ترجمان بنا رہا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں لاہور میں کس کیس کے لیے لندن سے آیا ہوں۔ شیلی مراد کیس کا ذکر اس نے بھی سنا تھا مگر اسے زیادہ تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ اس نے ہمیں چائے پر بھی مدعو کیا مگر ہم نے معذرت کر لی۔ رخصت کرتے ہوئے اس نے محسن سے تعزیت بھی کی اور اسے پھر یقین دلایا کہ اس کیس میں ٹرک کے مالک اور ڈرائیور کو قانون کے مطابق سخت ترین سزا دی جائے گی۔

ہم تیسرے پہر واپس اکرام شیخ کے گھر پہنچے تو کاجل واپس آ چکی تھی۔ ان کی عدم موجودگی میں راجہ اور گل نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ ان کا وقت باتوں میں اور بولی کے ساتھ کھیلتے ہوئے گزرا تھا۔

"صبح دو مشکوک قسم کے آدمی آئے تھے" کاجل نے بتایا "وہ پوچھ رہے تھے کہ اسکول کس کا ہے اور فون نمبر کیا ہے۔ چوکیدار انہیں میرے پاس لے آیا۔ انہیں معلوم تھا کہ کسی نے رات کو اس فون سے لاہور کال کی تھی مگر چوکیدار نے انہیں یقین دلا دیا کہ ساری رات وہ اسی کمرے میں اندر سے دروازہ بند کر کے سوتا رہا تھا۔ میں نے بھی کہا کہ کسی نے باہر سے کنکشن ملا کے بات کی ہوگی۔ پول سے اسکول تک تار بہت لمبا ہے۔ ٹیلی فون پول سے کیبنٹ اور پھر ایکس چینج تک یا ایکس چینج سے بھی کال ہو سکتی ہے۔ گمنام کال کرنے والے ایسا ہی کرتے ہیں اور ظاہر ہے کسی نہ کسی کا فون نمبر استعمال ہوتا ہے۔"

"انہوں نے نام نہیں بتایا کہ کال کس نے کی تھی اور کسے کی تھی؟"

"نہیں حالانکہ میں نے پوچھا بھی تھا۔ ایک نے کہا کہ یہ ایک بدمعاش لاہور فون کرتا ہے اور ہماری بہن کو پریشان کرتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پولیس کے لوگ تھے۔ تمہیں یقین ہے کہ وہ اسکول سے تمہارے پیچھے نہیں آئے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ چوکیدار نے انہیں موٹر سائیکل پر جاتے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے ایک بار بھی پلٹ کے نہیں دیکھا تھا۔ میں بھی بنگالی آمیز اردو بول رہی تھی تاکہ تمہارے اور میرے درمیان کسی تعلق کا

www.paksociety.com

انہیں خیال ہی نہ آئے۔ میں نے کہا کہ میں اور میرا شوہر ہزارہ سے آئے تھے اور اب یہ اسکول چلا رہے ہیں۔"

صرف چوبیس گھنٹے پہلے میں نے رابعہ سے کراچی جانے کی بات کی تھی اور اچانک ہم کراچی روانہ ہوگئے تھے۔ صرف چوبیس گھنٹے پہلے فوزیہ زندہ تھی اور اس کا شوہر اس کے ساتھ تھا۔ صرف چوبیس گھنٹے بعد ان کے لہو میں غرق شکستہ بدن اپنے اپنے مدفن خاک میں روپوش ہوچکے تھے۔ وہ فکر فردا اور غم دوش سے بیگانہ ہوگئے تھے۔ سارے دکھ اندیشے اور پچھتاوے ان کے لیے رہ گئے تھے جو زندہ تھے۔ جینا چاہتے تھے یا جینے کی مجبوری کو قبول کرتے تھے۔

کراچی آتے وقت میرے ذہن میں ایک خیال یہ تھا کہ یکلخت غائب ہوجانے والے سکندر ربجت کا وجود کراچی میں ثابت کردیا جائے اور دشمنوں کی یہ غلط فہمی رفع کردی جائے کہ خدانخواستہ سکندر ربجت اللہ کو پیارا ہوگیا یا بھاگ کے سات سمندر پار چلا گیا۔ اس غلط فہمی سے ان کے حوصلے بلند ہونے لگے ہوں گے اور وہ زیادہ پُرامید ہوں گے کہ شاید اب انہیں اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے سازگار حالات میسر آجائیں گے۔ ان کی راہ کا اصل کانٹا میں ہی تھا۔ وہ یہ فرض کرنے میں حق بجانب تھے کہ سکندر ربجت نہ رہا تو شاید کوئی ان کے خلاف زیادہ عرصہ محاذ آرائی جاری نہ رکھ سکے۔ باقی سب لوگ میرا ساتھ دے رہے تھے مگر ان کی پیشہ ورانہ مصروفیات بھی تھیں۔ غالب صحافی تھا، مظفر وقار یوسف اور رابعہ وکالت کررہے تھے۔ اس وقت بھی جب میں نہیں تھا اور جب میں نہ رہا تو وہ پھر خود کو اپنے اپنے کام کے لیے وقف کردیں گے۔ محسن میرا دست راست تھا تو وہ پہلے ہی الگ ہوچکا تھا۔

چنانچہ میرے کراچی آنے کا دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ محسن کو پھر اپنی مدد کے لیے آمادہ کروں۔ غالب اور نازو کی عدم موجودگی میں عملاً میں بے دست و پا ہوکے رہ گیا تھا اور مجھے صرف موجودہ صورت حال ہی کی نہیں کسی حقیقی مددگار کی ضرورت بھی محسوس ہورہی تھی۔ رابعہ اپنے جذبات اور خلوص نیت میں سب سے بڑھ کر تھی مگر وہ نازو یا گل کی طرح میدان عمل اور میرے شانہ بشانہ معرکہ آرائی میں کوئی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کرسکتی تھی۔ کیا صورت حال مظہر یا وقار یوسف کی تائید و حمایت کی تھی۔ وہ میرے دفاع کی جنگ میں برابر شریک تھے لیکن میرے جارحانہ عزائم کا ساتھ دینے سے قاصر تھے۔ غالب اور نازو ہی میری وہ طاقت تھے جن پر میں ہر محاذ پر کامیابی کے لیے انحصار کرتا تھا۔ ان کے ساتھ نہ ہونے سے میری جدوجہد ایک بند گلی میں پہنچ کے رک گئی تھی۔ اس بند گلی سے باہر آنے کے لیے غالب اور نازو کی بازیابی ضروری تھی اور یہ کام میں اکیلا نہیں کرسکتا تھا۔

دوسری طرف دلاور کے نہ ہونے سے اس کے خاندان کو سب سے زیادہ فرق پڑتا تھا۔ استاد پیڈرو، رانا اور ڈاکٹر شاہ جیسے تو شاید یہ سوچتے ہوں گے کہ اب اس گروہ کی قیادت انہی کے ہاتھ میں آئے گی۔ استاد پیڈرو کے بارے میں تو مجھے معلوم تھا کہ نہ جانے کب سے وہ دلاور کا نمبر ٹو تھا اور نمبر ون کہلانا اس کا پرانا خواب تھا۔ دلاور کی زندگی میں یہ ممکن نہیں تھا اور نہ پیڈرو میں اتنی ہمت تھی کہ وہ دلاور کو اپنے راستے سے ہٹا سکے۔ اب اسے اپنے خواب کی تعبیر اپنی دسترس میں نظر آرہی تھی۔

جب اس موضوع پر میری محسن سے بات ہوئی تو اس نے کہا "میں خود بھی اب یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ وہ وقت اور تھا جب گل مجھے اپنی مرضی سے یہاں لائی تھی۔ میری مرضی جانے بغیر۔"

میں نے کہا "اچھا ہی کیا تھا اس نے۔"

"عورت اپنی محبت کے معاملے میں بڑی خود غرض ہوجاتی ہے۔" محسن بولا "لیکن میری اپنی وہ حالت تھی کہ مردہ بدست زندہ۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"شاید گل یہ نہیں چاہے گی کہ تیری حالت پھر بگڑے۔"

"نہیں۔ وقت نے وہ زخم مندمل کردیے ہیں اور گل بھی مطمئن ہے کہ اس کی محنت بار آور ہوئی۔ میں یہاں فوزیہ کی وجہ سے رکا ہوا تھا لیکن کیا فائدہ ہوا اس سے۔ میں اس کے لیے کچھ بھی تو نہ کرسکا۔ پہلے گل نے اس لیے مجھے سب سے دور رکھا کہ میری حالت ایسی نہ تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی میری حالت پر ترس کھائے یا میں دوسروں کے لیے تماشا بنوں۔"

"کوئی پتھر نہ مارے میرے دیوانے کو" میں نے کہا۔

"یہ سمجھ لے بعد میں خود میں نے فوزیہ کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کے گھر کا رخ نہیں کیا۔ یہ میری خام خیالی تھی کہ اس طرح فوزیہ کو کچھ نہیں ہوگا۔ میری وجہ سے اس پر آفت نہیں آئے گی۔ شاید معاملہ اس کے برعکس تھا۔ دشمن مسلسل اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ وہ خود بھی یہ جانتی تھی کہ اس طرح کوئی ہمیشہ نہیں بھاگ سکتا اور مسلسل فرار کا انجام بالآخر یہ ہوتا ہے کہ سارے راستے بند ہوجاتے ہیں پھر آدمی بھاگ بھی نہیں سکتا۔"

"کیا تیرے خیال میں اسے معلوم تھا کہ تم دونوں بھی یہاں ہو؟"

"ہاں۔ مجھے شک ہے کہ اسے پتا چل گیا تھا۔ کیا پتا اس کے شوہر نے ہی بتادیا ہو۔ اسے مگر اس نے نہیں چاہا کہ جو دشمن اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں وہ میرے پیچھے لگ جائیں۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی سلامتی کے خیال سے الگ الگ اور دور دور رہے مگر کیا حاصل ہوا اس سے۔"

"پھر اب کیا سوچا ہے تو نے؟"

"اب میں یہاں کیوں رہوں گا۔ کیا کروں گا اپنے آپ کو بچا کے۔ مارنے والے تو یہاں بھی مجھے مار سکتے ہیں۔ میں تیرے ساتھ لاہور چلوں گا۔ اکرام شیخ اور کابل کی پُرسکون زندگی میں اپنے خطرات کا زہر گھولنے کا الزام ہم پر نہیں آنا چاہیے۔"

"خطرہ تو گل کو اور بوبی کو بھی لاحق ہے۔" میں نے کہا۔

"ہم سب مل کے ان کی حفاظت بہتر طور پر کرسکتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہم آج ہی نکل جائیں۔ اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ سکندر ربجت کا وجود کراچی میں ثابت ہوتے ہی وہ کراچی سے غائب ہوجائے۔ یہاں پولیس کے معاملات سے اکرام شیخ نمٹ لے گا۔ ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں۔ جو ہونا تھا ہوگیا۔ ہمیں یہ پتا چل گیا ہے کہ بوبی کو یتیم کرنے والا بھی استاد پیڈرو ہی تھا۔ یہ ایف آئی آر کی نقل ہے جو ہمارے پاس ہے۔"

میں نے کہا "یہ محض کاغذ کا ایک پرزہ ہے۔ ہمارے جانے کے بعد اس کی حیثیت صفر ہوجائے گی۔ اکرام شیخ کو ہم نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا۔ وہ اس کیس میں دلچسپی لے گا تو پولیس اس کے لیے مشکلات پیدا کردے گی۔ اسے آزمائش میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ دلاور کا قتل ان معاملات سے الگ ہی رہے تو اچھا ہے۔ استاد پیڈرو کے خلاف ایک اور فرد جرم ہمارے ہاتھ لگ گئی ہے۔ اس میں ٹرک کا نمبر بھی ہے اور کمپنی کا نام بھی۔ ڈرائیور کو شناخت کرنے والے چشم دید گواہ بھی ہیں۔"

"مگر ان میں سے کوئی سامنے آکے بیان نہیں دے گا۔"

"دیکھ یار۔ ایک تو سچائی ویسے تو کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہوتی مگر کیا کریں۔ قانون کے تقاضے بھی پورے کرنے پڑتے ہیں۔ اگر ایک سچا گواہ جھوٹ بول کے جان بچاتا ہے تو ہم ایک جھوٹا گواہ پیدا کرلیں گے جو سچ بولنے سے نہیں ڈرے گا اور سچ تو سچ ہی ہے خواہ کوئی بھی بولے۔"

گل اور محسن بھی کرائے کے چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے جو درحقیقت ایک کوٹھی کا سرونٹ کوارٹر تھا۔ انہوں نے ضروریات زندگی کو محدود رکھا تھا چنانچہ ذاتی استعمال کے کپڑوں کے علاوہ ان کے پاس کچھ برتن تھے اور تھوڑا بہت فرنیچر۔ برتن انہوں نے کابل کے حوالے کردیے اور فرنیچر وہیں چھوڑ دیا۔ اس کے لیے کابل کے گھر میں بھی جگہ نہیں تھی۔

محسن نے کہا "فوزیہ کے سامان میں سے کچھ ہم لے جا سکتے ہیں۔ چند ذاتی چیزیں۔ تصویریں اور کچھ اس کے شوق کا سامان۔ وہ بچپن میں ڈاک کے ٹکٹ جمع کرتی تھی۔ کالج میں آٹوگراف لینے کا شوق ہوا۔ ٹینس بھی کھیلتی تھی۔ ریکٹ ساتھ رکھتی تھی اب بھی حالانکہ کھیلنا چھوڑ چکی تھی۔ اس کے کپڑے اور گھر کا سب سامان کسی خیراتی ادارے کو پہنچادیں۔ اس نے مکان کرائے پر لیتے وقت مالک مکان کو ایڈوانس دیا ہوگا۔ اس بار کا کرایہ۔"

"وہ میں کرادوں گا" اکرام نے محسوس کیا کہ محسن پر دکھ کے جذبات غالب آرہے ہیں۔

"اکرام بھائی... کبھی وقت ملے تو اس کی قبر پر چلے جانا" محسن نے کہا۔

محسن رونے لگا "نہیں یار۔ مٹی تو مٹی ہے۔ کسے معلوم تھا کہ فوزیہ کی مٹی یہاں پہنچے گی۔ مٹی کے ڈھیر پر آنسو بہانے سے کچھ نہیں ملتا۔ اصل چیز تو یاد ہے جب وہ دل سے محو ہوجاتی ہے تو بس۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "صبر کر۔ یہ تو ہم سب کا انجام ہے۔ آج یا کل۔ یہاں یا وہاں۔"

رابعہ کا براہ راست فوزیہ سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا اور دیکھا جائے تو ان کے درمیان رقابت کے جذبات کا رشتہ تھا مگر زندگی کے حقائق سے رابعہ نے بھی اتنی ہی فراخ دلی سے سمجھوتا کرلیا تھا جیسے فوزیہ نے۔ وہ بھی فوزیہ کے لیے رو رہی تھی اور گل بھی۔

شام کو میں اکرام اور محسن قبرستان گئے۔ یہ عزیز آباد کا قبرستان کہلاتا تھا اور اس کے مین گیٹ سے کچھ فاصلے پر دائیں جانب فوزیہ اور اس کے شوہر کی قبریں تھیں۔ محسن کے جذبات ایک بھائی کے جذبات تھے۔ ہم نے اسے دل کی بھڑاس نکالنے سے نہیں روکا۔ اکرام شیخ اس کے ساتھ بیٹھا رہا اور میں فوزیہ کی قبر کے سرہانے کھڑا ماضی کے دریچوں میں جھانکتا رہا۔ میرا دل پر آزار یادوں سے بوجھل تھا۔ گزرا ہوا وقت میرے تصور کی البم میں کبھی نہ مٹنے والے نقش کی طرح موجود تھا۔ میں نے اسے کہاں کہاں دیکھا تھا۔ کیسے دیکھا تھا اور کیسے چاہا تھا۔ اس سے کیا کہا تھا اور کیا سنا تھا۔ الفاظ 'کھوکھلے' بے معنی بے وجود الفاظ۔ زندگی کا دریا خشک ہوگیا تھا اور یہ الفاظ اس کی تہ میں بچھے ہوئے سنگ ریزوں کی طرح باقی رہ گئے تھے۔ مدتوں کی کڑی دھوپ میں ان پر چلنے سے تلوے جلتے تھے۔

شہر خموشاں کے کوچے سناٹے میں جھینگر رو رہے تھے اور ہوا درختوں میں سسکیاں لے رہی تھی۔ مٹی کے ڈھیر کے نیچے میں نے فوزیہ کا تصور کیا۔ وہ خاموش تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے مجھ سے گلہ نہ کرنے کی قسم کھائی تھی اور مجھے نہ دیکھنے کا عہد کرلیا تھا۔ اس کے آخری خط کے ہر لفظ کی بازگشت خیال کے ویرانے میں بھٹک رہی تھی۔ مٹی پر پڑے ہوئے تازہ پھول، آگربتی کا جلتا ہوا دھواں، تازہ مٹی سے اٹھنے والے پانی کے بخارات کی مہک۔ فوزیہ کو کون سی خوشبو پسند تھی۔

محسن نے میرے کندھے کو ہلایا "چل یار سکندر۔ رات ہوگئی۔"

میں نے اس کے شانے پر سر رکھ کے روتے ہوئے کہا "یار محسن۔ مجھے تو معاف کرسکتا ہے؟ میں نے بہت دکھ پہنچایا تجھے۔ میں بڑا کمینہ دوست تھا تیرا۔ بہت ذلیل آدمی تھا۔ آخر ایسا کیوں کیا میں نے؟"

محسن نے کہا "اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا تھا تو نے۔ یہ سب تو بس ہوگیا۔ پتا نہیں کیسے، تیرا کیا قصور تھا اس میں۔ یہ تقدیر تھی۔"

www.paksociety.com

اگلے دن رابعہ اور گل کی خواہش پر فوزیہ کے گھر پر قل کا اہتمام کیا گیا۔ اس وقت تک گھر خالی ہو چکا تھا۔ چند پڑوسیوں کے ساتھ ہم نے بھی کرائے کی دری چاندنی پر بیٹھ کے قرآن خوانی کی۔ شام کو ہم نے اس کی چابی مالک مکان کے حوالے کر دی۔

رات کو کاجل اور اکرام ہمیں کینٹ اسٹیشن پر چھوڑنے آئے۔ دس بجے خیبر میل نے دوسری سیٹی دی تو کاجل نے بوبی کو پیار کیا اور نیچے اتر گئی۔

اکرام نے کہا "ہم آئیں گے لاہور۔ اپنا خیال رکھنا تم سب لوگ۔"

ایک تاریک رات مخالف سمت میں بھاگتی گئی۔ اندھیرے کی دیوار قائم رہی۔ نحوس اور منجمد خلا کی طرح۔ کبھی کبھی اس پر سے روشنی کے ریلے تیرتے ہوئے نکل جاتے تھے جیسے شہاب ثاقب۔ صرف پہیوں کے فولادی پٹری پر دوڑنے کی صدا سے حرکت کا تاثر قائم ہوتا ورنہ لگتا تھا کہ زمین اپنی جگہ پر کھڑی ہے اور یہ رات ہے جو پیچھے کی طرف دوڑ رہی ہے۔ بالآخر حصار شب ٹوٹنے لگا اور دھندلکا ایک اور دن کی آمد کا اعلان کرنے لگا پھر منظر روشن ہوتا گیا۔ شجر حجر، کھیت کھلیان، ندی نالے ایک متحرک تصویر کا حصہ بن گئے۔ بچے کچے مکانوں سے اٹھتا دھواں۔ ہل چلاتے کسان۔ گلے میں بستے ڈالے اسکول جانے والے بچے۔ سائیکلوں پر ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ سفر کرنے والے۔ زندگی کے ان گنت روپ میں نمودار ہوئے تو فوزیہ کا خیال پس منظر میں چلا گیا۔ گزرے ہوئے دن پر آنے والا دن یوں غالب آ گیا جیسے خواب پر حقیقت غالب آتی ہے۔ کل جو گزر گیا ماضی ہو گیا۔ آنے والا کل محض ایک تصور ہے۔

شام ہوئی تو ہم پھر لاہور میں تھے۔ وہ تین دن جو گزر گئے تھے یادوں میں شامل ہو گئے تھے۔ عمر گزشتہ کے قبرستان میں ہزاروں دن دفن تھے۔ کچھ کے آثار تک نہ تھے۔ کچھ تلاش کرنے سے مل جاتے تھے مگر آدمی سے زیادہ قبروں کے کتبے تک صاف پڑھے جاتے تھے ان پر تاریخ تک واضح تھی۔ تین دن تین نئی قبروں کی طرح تھے جن کی مٹی تک خشک نہ ہوئی تھی۔

رات بارہ بجے تک ہم وقار یوسف کے گھر میں تازہ ترین واردات پر اپنے اپنے رد عمل کا اظہار کرتے رہے اور جذبات کی آگ کو ٹھنڈا کرتے رہے پھر سفر کر جانے کے لیے اٹھا تو رابعہ کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ گل اور محسن کو بھی لے جانا چاہتا تھا مگر محسن کو میں نے روک لیا اور گل نے دو ٹوک لہجے میں اعلان کر دیا کہ باقی سب جہاں چاہیں جائیں مگر بوبی کہیں نہیں جائے گا۔ ظاہر ہے اس کے بعد گل کہاں جاتی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بوبی کی ماں جس کے جملہ حقوق گل نے اپنے نام یک طرفہ طور پر محفوظ کرا لیے تھے اس پر اب رابعہ اور گل بھی اپنا حق جتا رہی ہیں گی۔ رابعہ کا رویہ ذرا مصالحانہ تھا مگر گل نے تو بالکل لحاظ نہیں کیا "ٹھیک ہے تم کو پہلے

اس کی ماں بننے کا حق حاصل ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کچھ نہیں۔"

گل نے فوراً یہ حق تسلیم کر لیا "بوبی سب کا ہے۔ آخر بچی پھوپی اور خالہ کی ضرورت بھی تو ہے بوبی کو۔"

بڑی خوب صورتی سے گل نے بھی گل پر واضح کر دیا تھا کہ ماں تو وہی کہلائے گی۔ وہ اپنی اس حیثیت کا تحفظ بھی کرے گی لیکن خون کے رشتوں کا احترام بھی۔ ظاہر ہے رابعہ اور گل بھی گل کو اس کے مقام سے محروم نہیں کر سکتی تھیں اور نہ ایسا کوئی ارادہ رکھتی تھیں۔

میں نے بھی منظر کے جاتے ہی گھڑی دیکھی "صبح تو آفس جاؤں گا۔"

گل نے کہا "آج تو آرام کر لو۔"

میں نے کہا "وہاں مجھے کون سا پہاڑ کھودنا ہے رات بھر کا۔ چوکیدار تین دن سے غائب تھا۔ اسے ڈیوٹی پر حاضر ہونا چاہیے۔"

محسن نے کہا "میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔"

گل نے اسے ڈانٹا "آتے ہی چل پڑے منکر نکیر ایک ساتھ۔ ایک دن تو آرام سے گزار لیجیے۔"

میں نے کہا "گل۔ ہم آرام ہی کریں گے۔ تم فکر مت کرو۔"

"فکر کیسے نہ کروں۔ میں جانتی ہوں تم مل جاؤ تو آرام حرام ہو جاتا ہے۔"

گل نے اس کی حمایت کی "بیویاں سب بے چاری فکر ہی کر سکتی ہیں۔"

"فکر ضرور کرو مگر قید مت کرو اپنے شوہروں کو۔" میں نے کہا۔ "ان کی نصف بہتر ہو مگر انہیں نصف بدتر ہونے کا احساس مت دلاؤ۔"

"یہ تقریر کرنا رابعہ کے سامنے۔ ہمارے شوہروں کو خراب مت کرو۔" گل نے احتجاج کیا۔

"اگر اچھے شوہر ملے ہوتے تمہیں تو پھر میں یہ بات مان لیتا۔ ابھی تو خطرہ مجھے ہے۔ شریف آدمی میں ہی تو رہ گیا ہوں۔ عقد نے ان کو نکما کر دیا۔ ورنہ یہ بھی آدمی تھے کام کے۔"

محسن اور وقار یوسف نے میرے موقف کی تائید میں مبالغے انہیں مزید خفا کیا۔ میں اور محسن پیدل ہی روانہ ہونے کے موڈ میں تھے لیکن وقار نے گاڑی نکال لی۔ یہ اس کے سسر نقوی صاحب مرحوم کی وہ عالی شان کار تھی جس میں بیٹھنے کا اعزاز ہم پہلے بھی حاصل کر چکے تھے۔ اس جیسی گاڑیاں لاہور میں گنی چنی تھیں۔ امرا کا ایک خاص طبقہ ہی انہیں افورڈ کر سکتا تھا۔ اس خاص طبقے میں بہت بڑے صنعتکار شامل تھے۔ بہت بڑے اسمگلر یا بہت بڑے عہدے پر فائز بہت بڑے ہاتھوں سے مال جمع کرنے والے۔ نقوی صاحب کا شمار آخری قسم کے لوگوں میں تھا۔ وہ زندگی میں بڑے

کہلاتے تھے۔ سن پینسٹھ کی جنگ میں ایک بڑی توپ تھی رانی اور دوسرا شیر۔ جب یہ دھاڑتی گرجتی تھیں تو لاہور والوں کے دل بے پایاں اور یقینی فتح کے احساس سے معمور ہو جاتے تھے۔ چھ سال بعد بڑی توپ کا مفہوم بدل گیا۔ ہر بڑی توپ کا نشانہ خود اہل وطن ہونے لگے۔ کرپشن، اقربا پروری، لاقانونیت، رشوت ستانی اور بدعنوانی کے گولے اسی ملک کے عوام پر اور نظام پر گرنے لگے تو قوم کا شیرازہ بکھر گیا۔ ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔

محسن اور میں آفس سے کچھ دور ہی اتر گئے۔ وقار گاڑی کو موڑ کے واپس چلا گیا اور ہم خراماں خراماں مال کی روش پر چلنے لگے۔ نصف شب کے بعد کا سکوت اِکا دُکا گاڑی کے گزرنے سے مجروح ہو جاتا تھا یا کسی موٹر سائیکل کے شور سے۔

اچانک محسن بولا "یار کیا ملا مجھے کراچی جا کے آخر۔ میں سوچتا ہوں کہ میں بھی تم سب کے ساتھ رہتا تو۔"

میں نے کہا "چھوڑ ایسی باتیں۔ تو ہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ہم خود کچھ نہیں کرتے تقدیر سب کراتی ہے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "ہاں۔ اپنی تقدیر سے بھاگ کے کوئی کہاں جا سکتا ہے۔ فوزیہ اور اس کے شوہر کو تقدیر کراچی لے گئی تھی کیونکہ اجل وہیں ان کے انتظار میں تھی۔ کیا فیصل آباد میں رہنا اس کے بس کی بات تھی؟ نہیں، خود میں وہاں صرف اس کی خون آلود لاش اٹھانے اور اس اجنبی شہر کی مٹی میں دفن کرنے گیا تھا۔ اجنبی اس لیے کہ نہ فوزیہ وہاں پیدا ہوئی تھی نہ کبھی اس نے کراچی جانے کا سوچا تھا۔ ویسے لوگ لندن، نیویارک، دوبئی اور سعودی عرب چلے جاتے ہیں اور برسوں لوٹ کر نہیں آتے۔ کراچی تو پھر بھی اپنے پاکستان کا عروس البلاد ہے مگر پشاور بھی کسی کراچی کے رہنے والے کے لیے اجنبی شہر ہی ہوگا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ اکرام اور کاجل وہاں پہلے سے موجود تھے ورنہ پچاس ساٹھ لاکھ انسانوں کے شہر میں اس کو جاننے والا کون تھا اور میرا بھی کیا پتا میں پھر کبھی کراچی جاؤں یا نہ جاؤں۔ کیا تب بھی کیا مجھے ان دو قبروں کا سراغ ملے گا؟"

میں نے کہا "مل بھی گیا تو کیا ہوگا؟ اسلام آباد میں تیرے ماں باپ دفن ہیں۔ یہاں میرے والد وزیر خان کی قبر ہے اور رابعہ کی ماں دفن ہے۔ ہم کب جاتے ہیں وہاں باقاعدگی سے۔ اپنے اپنے عقیدے کی بات ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یاد رکھنے کا سب سے اچھا طریقہ ہے مغفرت کی دعا اور ایصال ثواب۔"

رابعہ کے آفس کی بلڈنگ کا مین گیٹ مقفل تھا۔ میں نے ہی مولوی خادم حسین کو سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ صبح شام عمارت کو تالا لگائے اور کھول دے۔ اب وہ اوپر آفس کے اندر والے کمرے میں سو رہا تھا۔ میں پیچھے سے لاؤڈ اسپیکر پر چلاتا رہتا تب بھی میری آواز دو دروازوں سے گزر کے خادم حسین کے کانوں تک نہ پہنچتی جو گھوڑے گدھے بیچ کے سوتا تھا۔

"اب کیا کریں؟" میں نے کہا "اوپر کیسے جائیں؟"

"یہاں کوئی کال بیل نہیں ہے؟"

"بھائی صاحب، یہ گھر نہیں ہے کسی کا۔ یہاں سب دفاتر ہیں۔ جو آتا ہے سیدھا اندر چلا جاتا ہے۔"

"پچھلی طرف سے بھی کوئی راستہ نہیں؟"

"ضرور ہوگا۔ ایک کے پیچھے دوسری عمارت ہے جو آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ کیا خیال ہے سب میں گھس کے دیکھیں۔ شاید کسی کا گیٹ بھی کھلا مل جائے۔ چوکیدار بھی نہ ہو اور زینہ سیدھا چھت تک پہنچا دے۔ تو ہم کودتے چڑھتے پھلانگتے صبح تک اس عمارت کی چھت پر پہنچ ہی جائیں گے۔ اس وقت تک گیٹ ویسے بھی کھل جائے گا۔"

محسن نے اوپر دیکھا "آفس کے باہر والا گیٹ وہی ہے جو پہلے تھا یا بدلا ہے کچھ؟"

"گیٹ وہی ہے۔ رنگ بدلا ہے۔"

"میں کوشش کرتا ہوں۔ آپ بھی آ جائیں مقابلے پر۔ دیکھتے ہیں کس کا نشانہ اچھا ہے۔" محسن نے کہا "ایک سیر پتھر لائیے ایک ایک چھٹانک کے سولہ یا آدھا پاؤ کے آٹھ۔"

"بہت بہتر۔ ترازو اور باٹ عنایت فرمائیے۔ یہ بھی بتا دیں کہ پتھر کس رنگ کے ہوں۔ گول ہوں تکونے یا چوکور۔"

محسن نے چند قدم دائیں بائیں دیکھ کے مایوسی سے سر ہلایا۔ ظاہر ہے مال روڈ پر پتھروں کا کیا کام۔ تاہم ایک عمارت کی بغلی گلی میں اسے پتھر مل گئے جو مطلوبہ سائز سے کہیں بڑے تھے اور انہیں اوپر نشانے پر مارنا خاصا مشکل کام تھا۔ خطرہ یہ بھی تھا کہ دور سے بھی کسی چوکیدار یا پولیس والے نے دیکھ لیا تو شور مچا دے گا۔ محسن نے پہلا پتھر اوپر پھینکا۔ پتھر بڑے دھماکے سے دروازے پر لگا۔

میں نے کہا "یہ رابعہ کے ساتھ والے آفس کا دروازہ تھا۔ نشانہ غلط ہو گیا۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"وہ دروازہ ٹھوس لکڑی کا ہے۔ فلش ڈور۔ اس میں شیشہ نہیں ہے۔ اب میری باری۔" میں نے ہاتھ گھما کے پتھر اندازے سے ایسی جگہ پھینکا جو کھڑکی اور دروازے کے درمیان تھی۔ نشانہ چوک جانے کے باوجود دائیں بائیں تین تین فٹ تک پتھر کسی بھی شیشے پر لگ سکتا تھا۔ میری اسکیم کامیاب رہی۔ ایک زبردست چھناکے سے شیشہ ٹوٹا۔

میں نے متانت سے کہا "یہ کھڑکی کا شیشہ تھا۔"

"یعنی دروازے کا نشانہ کھڑکی پر جا لگا؟"

"جی نہیں۔ میں نے کھڑکی کو نشانہ بنایا تھا۔ بائیں جانب کے پٹ کا سب سے اوپر والا شیشہ ٹوٹ گیا ہے۔"

"یہاں سے کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔"

"آدمی میں فرق محسوس کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔

www.paksociety.com

دروازے اور کھڑکی کے شیشے ٹوٹنے کی آوازیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔"

"تم تو مولوی غلام حسین کے سر کا نشانہ بھی لے سکتے ہو۔ ایسا ہی ہے تمہارا نشانہ۔" محسن نے ہنس کے کہا اور مجھے دوسرا پتھر پکڑا دیا۔

میں نے کہا "ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ غور فرمایئے کس قدر غافل شخص ہے یہ مولوی غلام حسین۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی کوئی اندر گھس جائے تب بھی یہ سوتا رہے گا کھوتا۔ خیر میں اسے ایک آخری چانس اور دیتا ہوں۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟ تم اسے گولی مار دو گے اور چلے جاؤ گے؟"

"بالکل۔ صبح ٹھیک ساڑھے چھ بجے۔" میں نے دوسرا پتھر گھما کے پھینکا اور رات کی خاموشی میں دوسری بار شیشہ بکھرنے کا چھناکا سنائی دیا مگر اس کے ساتھ ہی نہ جانے کدھر سے ایک گشتی چوکیدار سائیکل پر سیٹی بجاتا آگیا۔

"اوئے' اوئے تمہارا بیڑا غرق۔ خانہ خراب" وہ سائیکل ایک طرف پھینک کے ہماری طرف دوڑا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے بڑی مسرت سے اسے مطلع کیا "ہم اپنے آفس کے شیشے توڑ رہے ہیں۔"

وہ رک کے مجھے اور محسن کو دیکھنے لگا "مگر کیوں؟"

"یار نئے شیشے لگوانے ہیں اس لیے" میں نے کہا "کیوں جناب شہزادانی صاحب۔ ہم ہر روز ایسا کرسکتے ہیں۔"

"سچ کہا آپ نے اچکن صاحب۔ ہم دن میں دو بار ایسا کرسکتے ہیں۔ ایک دفعہ آپ ایک دفعہ ہم۔ کس کی مجال ہے جو ہمیں روکے۔"

"آخر شیشے ہمارے ہیں ہم شیشے کے نہیں ہیں۔"

"کیا سب شیشے ٹوٹ گئے؟" محسن بولا۔

"بس ایک رہ گیا ہے۔ وہ بھی ٹوٹ جائے تو واپس چلتے ہیں گھر۔"

"توبہ توبہ" چوکیدار پھر سائیکل پر سوار ہوگیا "تم دونوں نے تو صبح کے دو بجے ارے مجھے کیا۔ ایک دوسرے کا سر توڑو۔"

اوپر سے مولوی غلام حسین کی خوف سے کانپتی منمناتی آواز سنائی دی "یہ۔ کون سنگ زنی کررہا ہے جی۔ اور مدعا کیا ہے آخر۔ ہمیں سنگسار کرنا مطلوب ہے؟ خدارا وہ گھروالی ہے ہمارے ساتھ۔ ہماری زوجۂ منکوحہ۔"

میں نے کہا "مولوی غلام حسین۔ نیچے آکے دروازہ کھولو۔"

اب اس نے گیلری سے جھانک کے دیکھا اور شاید کچھ دیر میری صورت دیکھ کے دم بخود کھڑا رہا پھر وہ نیچے دوڑا۔ ایک منٹ بعد ہم اندر تھے۔

میں نے اسے ڈانٹا "ایسے سوئے ہو جیسے مُردے کفن بیچ کے سوتے ہیں۔"

"کفن اوڑھ کے" محسن نے میری تصحیح کی۔

"آپ بھی حد کرتے ہو جی۔ بھلا۔ یہ بھی کوئی وقت ہے کسی شریف آدمی کو جگانے کا؟" غلام حسین نے خفگی سے کہا "میں شادی شدہ بھی ہوں۔"

"یعنی تم بیک وقت شریف آدمی بھی ہو اور شادی شدہ بھی۔ عجیب زمانہ ہے کیا نہیں ہوتا" میں نے کہا۔

"میں تو سمجھا کہ بھارت نے پھر حملہ کردیا ہے اور بمباری ہو رہی ہے آفس میں۔ آپ نے چیخ سنی تھی کیا دل دہلا دینے والی چیخ تھی۔"

"تم نے چیخ بھی ماری تھی تو دیر ہو گئی۔"

"میں نے نہیں جی' میری گھروالی نے۔ رہا ہاں کان ابھی تک بند ہے۔ وہ خدانخواستہ دہشت سے بے ہوش ہو جاتی یا ہارٹ فیل ہو جاتا اس کا جناب تو میرا کیا ہوتا ذرا سوچئے۔"

"حضور والا" میں نے کہا "سوچنے کی کیا بات ہے اس میں مگر غلام حسین کیا جائے واردات پر تمہاری گھروالی بھی موجود ہے؟"

اس نے شرما کے کہا "وہ جی بموجب آپ کی خواہش' ہدایت اور مشورے کے آج ہی اس کو یہاں لے آیا تھا۔"

"اچھا؟ ہم ملاحظہ کریں گے کہ تم جیسے چمن کی بہار بھی ہے۔"

وہ دوڑ کے میری راہ میں حائل ہوگیا "نہیں جی۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ مولوی غلام حسین کی منکوحہ پر کسی نامحرم کی نگاہ پڑے۔"

میں نے کہا "یار کیا ہم اس پر بری نظر ڈال سکتے ہیں۔ مگر ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے۔ ہم آفس میں سو جاتے ہیں۔"

اچانک اندر سے چنگھاڑنے کی آواز آئی "غلام کہاں مرگیا؟ کون آیا ہے اس وقت کم بخت!"

غلام کا چوتھی ہوگیا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا اس کی منکوحہ دروازے میں نمودار ہوئی۔ وہ بلا مبالغہ غلام حسین سے ایک بالشت اونچی اور وزن میں اس جیسے چار کے برابر ہوگی۔ وہ اپنے کمرے جیسی کمر پر پہلوانوں کی طرح ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور ہمیں خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی۔

"بولتا کیوں نہیں۔ زبان کو تالے کیوں پڑ گئے ہیں آخر کون ہیں یہ دونوں آوارہ گرد مشٹنڈے۔"

غلام حسین کی حالت غیر ہوگئی "بیگم یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"ارے جو دیکھ رہی ہوں وہی کہہ رہی ہوں۔ تیری جان کیوں نکلی جا رہی ہے؟ یہ چور ڈاکو ہیں کیا؟ صورت سے تو نہیں لگتے مگر یہ آدھی رات کو پتھر مار کے شیشے کیوں توڑ رہے تھے؟ تم بولتے کیوں نہیں آئے تھے یہاں؟ سیدھی طرح نہیں بتائیں گے تو ابھی پولیس کو بلاتی ہوں۔ یہ دکیلوں کا دفتر ہے۔ ایسے جوتے پڑیں گے تھانے میں کہ نانی یاد آجائے گی۔"

میں اور محسن اس صورت حال سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے۔ غلام حسین کی گھروالی میری توقعات کے بالکل برعکس نکلی

جنگلی اور مردانہ قسم کی چیز تھی جبکہ میرے تصور میں ایک باحیا اور باپردہ حلیم النفس اور شریف الطبع قسم کی بے زبان مخلوق تھی۔ غلام حسین کی سٹی گم تھی اور وہ کوشش کے باوجود حلق میں پھنس جانے والی آواز نکالنے سے قاصر تھا۔ اس آدھی رات کو بھی وہ زرق برق کپڑے پہنے ہوئے تھی جو مولوی غلام حسین نے اسی کے لیے جہیز سے خریدے تھے۔ اس کے گلے اور کانوں میں سونے کا رکھا ہوا زیور بھی نیا ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ ایسی بدصورت اور بدخو اور بدزبان عورت کو خوش رکھنا مولوی غلام حسین ہی کیا کسی بھی شریف آدمی کے لیے ممکن نہ تھا۔

"ارے غلام۔ دیکھ ذرا اس نمونے کو۔ کیسے گھور گھور کے دیکھ رہا ہے مجھے جیسے گردن کاٹ کے زیور اتار لے گا۔ اس کی نیت ٹھیک نہیں لگی مجھے۔ یہاں تو کوئی محلہ والا بھی نہیں ہے کم بخت تو کہاں لے آیا مجھے۔" اس نے واویلا شروع کیا۔

اب غلام نے ہمت کرکے کہا "خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ بیگم' ارے یہی تو مالک ہیں اس دفتر کے۔ یہ منظر صاحب وکیل ہیں اور یہ بیرسٹر یوسف صاحب یہ بھی وکیل ہیں۔"

غلام کی منکوحہ ایک دم "ہائے اللہ" کہہ کے غائب ہوگئی۔ جاہلانہ لہجے میں ذہنی پستی کا مظاہرہ کرتے کرتے اس نے ایک دم لجانے شرمانے اور نخرے دکھانے کا بھونڈا ڈراما کیا اور پھر اندر سے غلام کو برا بھلا کہنے لگی کہ اس نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا کہ سامنے مالک کھڑے ہیں۔

مجھے افسوس ہوا کہ مولوی غلام حسین جیسے خلیق اور مسکین مزاج شخص کے پلے کیسی بدخصلت بیوی پڑ گئی۔ یہ واقعی اس کی محبت تھی کہ وہ گزارا کر رہا تھا اور اسے خوش رکھنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔

صبح ہم سو کے اٹھے تو وہ جا چکی تھی لیکن غلام حسین موجود تھا وہ ہمارے سامنے آتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

"آپ صوفے پر سوتے رہے جی۔ بڑی تکلیف اٹھانی پڑی آپ کو میری وجہ سے۔"

میں نے کہا "معافی تو ہمیں مانگنی چاہیے۔ ہماری وجہ سے تمہاری بے عزتی خراب ہوئی۔ اور ایک رات کی کوئی بات نہیں۔ تمہاری تو زندگی بڑے عذاب میں ہے۔ رات دن کا واسطہ ہے نشے والا اس سے۔"

"بس جی۔ زبان ذرا خراب ہے۔ ویسے دل کی بہت اچھی ہے۔ بڑی خوبیاں ہیں اس میں۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "ہاں۔ تم تو خوش نصیب ہو۔ اچھائی اور بھولپن کی تمام خوبیاں اس میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہیں اس سے زیادہ بھری جائیں تو پھٹ جائے۔"

غلام حسین آزردہ ہوگیا "ایسا مت کہیں جی۔ میری شریکِ حیات ہے وہ۔ پہلی اور آخری۔"

"ایسا ہی تمہارے ساتھ بھی ہو تو اچھا ہے۔ تم اس کے پہلے اور آخری شوہر کہلاؤ' آمین" میں نے ہاتھ منہ پر پھیرا "کیا دعا دی گئی ہے۔"

محسن بولا "یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ کتنی خاموشی ہے اور ماحول بھی آسیب زدہ نہیں لگتا۔"

مولوی غلام حسین نے خفگی سے کہا "دیکھیں جی۔ ان کی بات اور ہے۔ آپ کا مجھ سے کوئی مذاق نہیں ہے۔ میں تو جانتا بھی نہیں آپ کو پہلے کبھی دیکھا نہیں۔ اندازہ کرسکتا ہوں کہ آپ محسن ہوں گے۔"

محسن نے اس سے ہاتھ ملایا "بالکل ٹھیک۔ واقعی تمہیں جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ آج سے ہم بھی تمہارے دوست ہیں۔"

میں نے کہا "بھئی ان کو تم سکندر بخت ثانی سمجھو یا مجھے دوسرا محسن بات ایک ہی ہے۔"

غلام حسین نے فرنچ میں کہا "ایسے بے ہودہ اور بدتمیز شخص کو میں اپنا دوست کیسے سمجھ لوں۔ کہاں آپ کہاں یہ کم ظرف کمینہ اور بد زبان جیسا شخص۔"

محسن نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "اچھا تو پھر آج سے میں اور تم پکے دشمن۔ تم بھی مجھے کیلے سے فرار ہونے والے خصی بکرے لگتے ہو جس کی دم قصائی کے ہاتھ میں رہ گئی ہو۔ بیوی بھی غلام کہتی ہے تم کو وہ حکم کے غلام ابن غلام۔"

مولوی غلام حسین پر بجلی گر پڑی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ محسن ایسی فرانسیسی اور فرنچ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دے گا۔ میں نے بڑی مشکل سے سیز فائر کرایا اور ان کی غلط فہمی دور کرکے گلے ملوا دیا۔

"چلو اب اس خوشی میں ایک ناشتا پارٹی ہو جائے" میں نے کہا "تمہاری طرف سے۔"

مولوی کی خوشی ماند پڑ گئی "ہیں جی۔ میری تو جیب خالی ہے۔"

"کیوں۔ تم نے دس ہزار کمائے تھے۔ ولاور کی بیوی سے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "اس نے۔ میری گھروالی نے ایک ایک پیسہ وصول کرلیا۔ سب لے گئی جی۔"

ناشتا کرتے ہوئے ہم نے اس سے دوبارہ اغوا کی سنسنی خیز کہانی سنی۔ یہ داستان ظلم و ستم سناتے ہوئے اس پر یاسیت طاری ہوئی مگر اس کی بھوک اور خوش خوراکی کے مظاہرے میں فرق نہیں آیا۔

"میں نے سکندر بخت بن کے اسے کراچی سے فون کیا تھا۔ کیا اس کے بعد ولاور کی بیوی نے کسی کو پوچھا؟"

"ہاں جی۔ دو بار اس نے فون کرکے پوچھا کہ وہ گورا وکیل کہاں ہے۔ راجہ بابا کے لیے اس نے منظر صاحب سے بھی بات کی تھی۔ اس کا دماغ درست کردیا آپ نے جناب۔ اب تو مجھ سے بھی شرافت سے بات کرتی ہے اور شکریہ بھی کہتی ہے۔"

www.paksociety.com

میں نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا "تم اس خبیث الزمان کو بھی دیکھنے گئے تھے اس دوران یا نہیں۔ وہ زندہ بھی ہے......؟"

خادم حسین نے بھی ادھر ادھر دیکھ کے کہا "کل رات ہی گیا تھا جی۔ ابھی تک زندہ ہے مردود۔ پاگل ہونے میں کوئی کسر نہیں رہی۔ میں نیچے نہیں اترا تھا۔ اوپر ہی سے اس پر لعنت بھیج کے آگیا تھا۔"

"اچھا۔ تمہیں کچھ یاد ہے۔ دلاور کی بیوی تمہیں اپنے ساتھ لے گئی تھی تو گاڑی کون سی تھی؟"

"گاڑی وہی تھی جی جناب۔ مرسڈیز، جو اوپر سے نیلی ہے اور نیچے سے سرمئی۔"

"کیا تم نے غور کیا تھا کہ گاڑی نے دائیں بائیں کتنے موڑ کاٹے تھے۔ اندازاً وہ جگہ کتنی دور تھی؟"

"کوئی چودہ منٹ لگے تھے جی وہاں پہنچنے میں مگر اس چالاک عورت نے کچھ پتا نہیں چلنے دیا۔ پہلے تو گاڑی مسلسل دائیں جانب موڑ کاٹتی رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گھوم پھر کے واپس وہیں آگئی ہے۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں۔"

"اچھا وہ جگہ تم دوبارہ دیکھو گے تو پہچان لو گے؟"

"کیوں نہیں جناب۔ میرے لیے تو وہ کرانیں حوالات تھی۔ ایک ایک چیز میرے ذہن میں ہے۔ توبہ توبہ، وہاں تو ننگے بت بھی رکھے ہوئے تھے۔ بت ایک مسلمان کے گھر میں۔ وہ بھی عورت کے اور عورت بھی۔"

خادم حسین کے ساتھ ہم وقار یوسف کے گھر گئے تو گل پنجے جھاڑ کے محسن کے پیچھے پڑ گئی۔ "بہت خوب۔ ناشتا بھی کر آئے آپ۔ شروع ہوگئی تو آوارہ گردی۔ لائسنس مل گیا آپ کو خوار ہونے کا۔ بیوی بچے جائیں بھاڑ میں۔ بھوکے بیٹھے ہیں انتظار میں تو بیٹھے رہیں۔"

خادم حسین بہت خوش ہوا "اب کچھ بولیں نا جی۔ وہاں تو مجھے کہہ رہے تھے۔ بیوی کے حکم کا غلام ابن غلام۔"

محسن نے کہا "گل۔ تم میرے ساتھ وہی سلوک کر رہی ہو جو سکندر نے رابعہ۔۔۔ سوری پورس کے ساتھ کیا تھا اور شاہ جنات کی بیٹی نے مولوی خادم حسین کے ساتھ۔"

میں نے کہا "اسی لیے تو میں شادی نہیں کرتا دوست۔ محبوبہ جب بیوی بنتی ہے تو عاشق بن جاتا ہے کاٹھ کا الو عرف زن مرید۔ دیکھ تیری خودی ذرا بھی بلند نہیں رہی بلکہ منہ کے بل گر پڑی ہے۔ تف ہے تجھ پر۔ اگر میری بیوی ایسا سلوک کرتی میرے ساتھ...."

"تو آپ کیا کرتے؟" وقار کی بیوی بولی۔

"ہم صبر کرتے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

وقار آفس جا چکا تھا اور اس کی بیوی نے بتایا کہ رابعہ اور منظر بھی صبح ادھر اسی لیے آئے تھے کہ ہم سے ملاقات ہو جائے مگر انتظار کر کے وہ بھی کورٹ چلے گئے۔

محسن نے کہا "سب ایک ہی گاڑی میں گئے ہیں؟"

"نہیں۔ وقار اپنی گاڑی لے گئے ہیں۔ منظر بھائی بعد میں رابعہ کے ساتھ گئے تھے۔"

"رابعہ کی گاڑی تو یہاں کھڑی ہے" محسن بولا۔

میں نے اسے ڈانٹا "کیا ہوگیا ہے تیری نظر کو اور عقل کو۔ گاڑی اور گدھا گاڑی میں فرق محسوس نہیں کر سکتا۔ یہ منظر کی گاڑی ہے۔ رابعہ کے کھٹارے کا اس سے کیا مقابلہ۔"

"مگر یہ بھی اسی نسل کا جانور ہے۔ بالکل وہی رنگ۔"

میں نے کہا "مولوی خادم حسین اور چوہدری دلاور کی نسل بھی ایک ہے۔ نسل انسانی۔ رنگ بھی ایک ہے دونوں کا اور کردار کے پارٹس بھی وہی ہیں مگر مولوی اپنا یار ہے اور دلاور دشمن۔ اس کی چابی کیا آپ کے پاس ہے مسماۃ گل زوجہ وقار یوسف؟"

گل نے چابی مجھے پیش کر دی "ایک نہ شد دو شد والی بات ہے ایک جیسی دو کاریں۔ ایک جیسے دو آپ لوگ۔"

گاڑی میں نے محسن کے حوالے کی "آفس میں ایک ریڈیو فون رکھا ہوا ہے جو میں نے دلاور کی گاڑی میں سے نکالا تھا۔ وہ اس میں فٹ کرانا ہے تاکہ چلتے پھرتے بات ہو سکے۔ ایک ہی جگہ سے بات کرنے میں بہرحال خطرہ لاحق رہتا ہے کہ شکاری آواز کی لہروں کا سراغ لگاتے ہوئے آپہنچ جائیں۔"

"یہ مواصلاتی رابطہ ابھی تک قائم ہے۔"

"ہاں۔ ایسا لگتا ہے کہ دلاور نے اور بعد میں مسز دلاور نے خود بھی یہ رابطہ ختم نہیں کیا۔ اب تو اس کی ضرورت اور اہمیت بڑھ گئی ہے" میں نے کہا "یہ کام ختم ہو جائے تو آپ دو نمبر پلیٹیں بنوا لیں۔ ایک پر رابعہ کی گاڑی کا نمبر ہو اور دوسری پر اس گاڑی کا۔ رابعہ کی گاڑی میں بھی ایک اضافی نمبر پلیٹ رہے گی اور ہماری گاڑی میں بھی۔ جب ضرورت پڑی بدل لی۔ یہ سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے بھی مفید ہے اور اس سے دشمنوں کو کنفیوز بھی کیا جا سکتا ہے۔"

محسن نے سر ہلایا "اچھا خیال ہے۔"

"میرا دوسرا اچھا خیال یہ ہے کہ تو بھی محسن سے کچھ اور بن جا۔ جیسے میں سوچو آنندے بنا پھر رہا ہوں اور کسی کو ذرا بھی شک نہیں کہ میں سکندر بخت ہو سکتا ہوں۔ اب تو کوئی غور سے دیکھتا بھی نہیں۔ ابھی تک کسی کو علم نہیں کہ تو پھر میدان عمل میں کود پڑا ہے۔"

"یہ خوش فہمی ہے آپ کی" گل نے کہا "میں اس کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتی۔"

"کوئی بات نہیں۔ یہ بلا اجازت کود پڑے گا۔ نافرمان شوہر۔ تم اخبارات میں اس قسم کے بیانات پڑھتی رہتی ہو گی کہ کسی کو عوام کے جذبات سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ کھیلنے والے کھیلتے رہتے ہیں یا یہ کہ کسی کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں" [illegible]

"[illegible] یور آنر" محسن نے سر جھکا کے کہا۔

میں کچھ دیر بوبی کے ساتھ کھیلتا رہا۔ وہ ایک بے بی کاٹ کے اندر اچھل رہا تھا جس میں ربر کے چوں چوں کرنے والے رنگین کھلونے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے بہت اچھے کپڑے پہن رکھے تھے اور گل بانو میں سے کسی نے اس کو نظر بد سے بچانے کے لیے اس کے گالوں پر کالا تل بھی بنا دیا تھا۔ وہ حلق سے بے معنی آوازیں نکال رہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ میں اسے اٹھالوں تو وہ اپنی کاروائی کرے۔ میری گود میں آتے ہی اس نے میرے کپڑے گیلے کر دیے۔

"او تیرا بھلا" میں نے اسے ڈانٹا۔ "پتا نہیں میں کون ہوں؟ نر بچے گل۔ یہ سب اپنے باپ محسن کے ساتھ کرو۔"

وہ رونے لگا تو گل بھاگی بھاگی آئی "کیا ہوا؟ کیا کیا ہے بوبی نے؟"

"وہی جو اس عمر میں تمہارا شوہر کرتا تھا" میں نے کہا۔

گل ہنسی "آج ہم بوبی کے لیے نئے کپڑے لائیں گے۔ نئے کھلونے لائیں گے۔ کیوں بوبی؟ بوبی بڑا اچھا بیٹا ہے۔ چچا کے کپڑے بھرے؟ شاباش۔ اگلی مرتبہ بھی وہ ہو ناشتے ... بہت ہی کیا تھی سرچیں۔ سب مرچی ہوں گی۔"

گل ہنستی رہی اور میں نے مجبوراً وقار یوسف کی قمیص اور کوٹ پہن کے اس کی تالی بجائی۔

"خوشبو تو اب بھی آرہی ہے" گل نے ناک سے سوں سوں کر کے کہا "بیانی نے پرفیوم لگادی ہے۔"

ساڑھے دس بجے مولوی خادم حسین کے ساتھ میں "بی نازی انٹرپرائز" کے گیٹ پر کھڑا ہوا تھا۔ دروازے پر وہی چوکیدار کرسی ڈالے بیٹھا ہوا تھا جس سے پہلے فون پر بات ہوئی تھی۔

"کس سے ملنا ہے" اس نے مولوی خادم حسین کو اور مجھے گھور کے دیکھا۔

خادم حسین نے کہا "یہ تو اندر جا کے ہی پتا چلے گا کہ کون ملتا ہے۔"

"کیا کام ہے؟ آخر یہ دفتر ہے۔"

میں نے ترش لہجے میں کہا "خادم حسین۔ اسے کہو کہ ہم بزنس مین ہیں اور ہمارے پرانے کاروباری مراسم ہیں۔ میں یہ بتانے آیا ہوں کہ گزشتہ بار ہمیں جو ٹرکوز بھیجے گئے تھے ان کا زرنقد کر لینے کی کھیر بجھاتا۔"

ہماری بات سن کے چوکیدار صاحب نے سر ہلایا اور ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ پورچ کے بعد پہلا کمرا ویٹنگ روم جیسا تھا۔ اس میں ملاقاتیوں کے لیے ایک کارنر میں بہت قیمتی صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ ایرانی قالین پر خوب صورت گلاس ٹاپ ٹیبل تھی اور جرمن امپالا کی ایش ٹرے رکھی ہوئی تھی۔

نہیں کر سکتا اور جیسے قانون کو ہمیشہ ہاتھ میں ہی رکھتے ہیں۔"

گل نے خفگی سے کہا "محسن۔ میرا نہیں تو بوبی کا ہی کچھ خیال کرو۔"

محسن نے برہم ہو کے کہا "کیا خیال کروں؟ دن بھر تمہارے ساتھ اس کو کھلاؤں؟ اس کے پوتڑے دھو کر ڈالوں۔ اسے دودھ پلاؤں؟ آج تک بزدلی اور خود غرضی کا الزام نہیں لیا میں نے۔ اب شادی کر لی ہے تو میں سب کچھ چھوڑ دوں۔ دوستوں پر لعنت بھیج دوں۔ سب رشتوں سے منہ موڑ لوں؟ یہی تو مصیبت ہے تم عورتوں کی۔ تم قبضہ چاہتی ہو مکمل۔ سب سے کاٹ کے...."

گل کا رنگ زرد پڑ گیا۔ میں خود حیران تھا کہ محسن اس سے کس لہجے میں بات کر رہا ہے۔

گل نے بڑی مشکل سے کہا "تم... ایسا سمجھتے ہو مجھے؟ کیا یہ سسرال ہے میرا؟ میں غیروں میں ہوں جہاں کوئی میری نند ہے تو کوئی میرا جیٹھ ہے۔ کیا میں تم سب میں شامل نہیں ہوں؟"

میں نے کہا "وری گڈ۔ کیا جواب دیا ہے تم نے گل۔ دانت کھٹے کر دیے۔ اب بول چیتا۔"

گل نے سمجھ لیا کہ میں بات کو مذاق میں ختم کرنا چاہتا ہوں "ہاں اب آپ کی باری ہے۔ بولیے محسن صاحب۔"

"بڑا مزہ آرہا ہے میاں بیوی کی لڑائی دیکھ کے" میں کرسی پر بیٹھ گیا "تم بھی ادھر بیٹھو گل۔ لڑائی تو اب ہوگی ایسی زبردست کہ مزہ آجائے گا۔ جیسی تمہاری وقار سے ہوتی ہے۔"

"میری وقار سے کوئی لڑائی نہیں ہوتی" گل نے احتجاج کیا۔

"اچھا؟ یعنی تم اسے ڈانٹ دیتی ہو اور وہ ربک کے خاموش ہو جاتا ہے؟ وہ دہاڑتا ہے شیر کی طرح تو تمہاری سٹی گم ہو جاتی ہے؟ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ میاں بیوی میں اختلاف ہی نہ ہو اور گھر میں جمہوریت ہو تو اختلاف کا اظہار لڑائی کی صورت میں نہ ہو۔"

محسن نے بھی اندازہ کر لیا تھا کہ ہم اس کی غلطی کو نباہ رہے ہیں۔ "آئی ایم سوری گل۔ نہ تم ایسی ہو نہ میں ویسا اور تم سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ میرا اعصابی نظام کتنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہا ہے۔ سب کچھ کرنے والی تم ہی تو تھیں۔"

"اور اب تمہیں موقع ملا ہے اس کا صلہ دینے کا" گل رونے پر آمادہ تھی۔

محسن نے اسے منایا "تمہیں تو معلوم ہے کہ میں کتنی ٹینشن کا شکار تھا۔ مجھے کنٹرول نہیں رہا اپنے آپ پر۔ مجھے تم سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

"پھر بھی جذبات کیا ہیں تمہارے، یہ تو ظاہر ہو گیا۔"

"جذبات کی گرا وہ تو ساری دنیا ہے۔ ساری خدائی ہے۔ اور میں تمہیں منانے کے دوسرے طریقے بھی جانتا ہوں" محسن آگے بڑھا۔

گل پیچھے ہٹ گئی "چلو بدتمیزی مت کرو سب کے سامنے"

www.paksociety.com

ائرکنڈیشنڈ کمرے میں بڑی دلفریب خوشبو تھی جس کا سرچشمہ دوسری طرف کاؤنٹر جیسی ٹیبل کے پیچھے سجی سجائی گڑیا کی طرح بیٹھی ہوئی حسینہ تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا نام بھی حسینہ ہے۔ وہ کوئی انگلش میگزین دیکھے جا رہی تھی' جو اس نے فوراً نیچے رکھ دیا۔

"میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟" اس نے مسکرا کے کہا۔

میں نے خادم سے کہا "خادم' اچھا موقع ہے اس وقت یہ انکار نہیں کر سکتی کیونکہ خود اس نے پوچھا ہے تم سے۔ آج رات۔"

"دیکھیں نا ایسی بے شرمی کی باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔"

"اسے تو اچھی لگتی ہیں۔ دیکھو کیسے مسکرا کے دیکھ رہی ہے تمہیں۔ لگتا ہے تم پر فریفتہ ہو گئی ہے۔ معقول کمائی پر فوراً راضی ہو جائے گی۔۔۔ اچھا تمہاری مرضی' نہیں تو نہ سہی۔ اس سے کہو کہ ہم مسٹر ولاور سے ملنا چاہتے ہیں۔"

حسینہ اب تک ہماری گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھی تھی مگر مسٹر ولاور کے نام پر وہ چونکی "کون مسٹر ولاور؟" اس نے خادم حسین کی بات پر کہا۔

میں نے کہا "خادم حسین' اسے بتاؤ کہ وہی جن کے نام ایک تحفہ تم نے وصول کیا تھا۔ اگر اس نے انجان بننے کا ڈراما جاری رکھا تو ہم چلے جائیں گے اور مسز ولاور اس سے خود نمٹ لیں گی۔ جب ان کے نام دوسرا تحفہ لائے گا کوئی۔"

حسینہ کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے مشکوک انداز میں مجھے اور مولوی خادم حسین کو دیکھا اور پھر آہستہ سے سر ہلایا "آپ لوگ تشریف رکھیں میں دیکھتی ہوں۔"

وہ ایک دروازہ کھول کے اندر غائب ہو گئی۔ اندر والے کمروں میں مکمل خاموشی تھی۔ غالباً آفس میں کام کرنے والوں کی تعداد محدود تھی اور سب کے اپنے اپنے کمرے تھے ورنہ جہاں لوگ ایک جگہ بیٹھتے ہیں تو آپس میں بات بھی کرتے ہیں۔ کمپیوٹر یا ٹائپ رائٹر' ٹیلی فون کی گھنٹی یا دروازے کھلنے بند ہونے کی آواز سے آفس کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ کاروباری اداروں میں لوگوں کا آنا جانا بھی لگا رہتا ہے مگر یہاں تو ایسا لگتا تھا کہ ایک حسینہ تھی وہ بھی ہماری بات سن کے بھاگ گئی اور اب ایک گوشے میں خادم حسین کے ساتھ میں اکیلا رہ گیا ہوں' ابھی اچانک سارے دروازے کھلیں گے اور ہر طرف سے لوگ ریوالور اور بندوقیں تانے نمودار ہوں گے اور ہمیں ہینڈز اپ کرالیں گے۔ پھر اندر سے پینڈرو فلمی ولن کی طرح آئے گا اور قہقہہ لگا کے کہے گا۔

"آپ اندر آئیں پلیز" حسینہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے کہا "خادم' جاؤ تمہیں بلا رہی ہیں۔ اکیلے میں کچھ کہنا چاہتی ہیں غالباً۔ جاؤ یار' آخر تم مرد ہو۔"

خادم نے منہ بنا کے کہا "کیا اپنے آپ کو مرد نہیں کہتے آپ؟"

میں نے جیب میں ریوالور کو محسوس کر کے تقویت حاصل کی اور اس دروازے سے اندر چلا گیا جو حسینہ کھولے کھڑی تھی۔ کمرے میں میز پر سر جھکا کے کچھ لکھنے والے نے سر اٹھا کے ایک نظر ڈالی اور پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ حسینہ آگے چلنے لگی۔ اس نے بہت چست لباس کے ساتھ بہت اونچی ایڑی کی سینڈل پہن رکھی تھی چنانچہ پیچھے سے اس کے جسم کے سارے پیچ و خم اور نشیب و فراز کا تلاطم کسی رقص سے کم دلفریب نہ تھا پھر اس نے سلیولیس گاؤن پہن رکھی تھی اس کا گلا پشت کی جانب خاصا کشادہ تھا اور اس کے مرمریں جسم کی آب و تاب پوری طرح عیاں تھی اور خود مولوی خادم حسین کی نظریں جھکنا بھول گئی تھیں۔ اس کے جسم سے پھوٹنے والی خوشبو بھی بہت ہیجان انگیز تھی۔

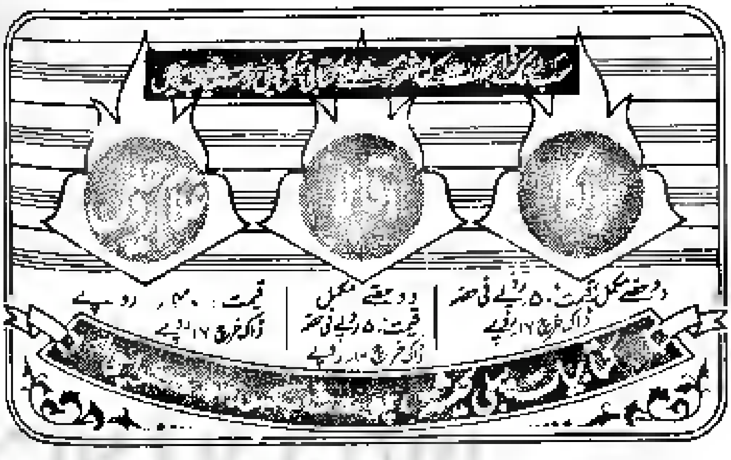

"ایسی ہی عورتیں ترغیب گناہ دیتی ہیں جی۔ اور نام بدنام ہوتا ہے مولانا کا" خادم حسین بولا۔

"میں اتفاق کرتا ہوں تم سے۔ مجھے بھی شیطان ورغلا رہا ہے۔ کیا خیال ہے اسے اغوا کر لیں؟ ریوالور تو ہے میرے پاس۔"

"بھلا ایسی عورتوں کا دفتر میں کیا کام جناب" خادم حسین نے میری بات کو نظرانداز کر دیا۔

"ہاں۔ اس کی جگہ کسی پردہ نشین کو بٹھانا چاہیے۔ [illegible] تمہاری گھر والی جیسی برقع کے بھی بیٹھے تو تمہارے سوا کون آئے گا یہاں۔ جو آئے گا وہ ڈر کے بھاگ جائے گا۔"

حسینہ نے ایک دروازہ کھولا اور خود باہر رک گئی "آپ یہاں انتظار کریں۔"

"کس کا انتظار کریں۔ تمہاری واپسی کا؟" میں نے کہا۔

وہ مسکرائی "آپ مجھ سے ملنے تو نہیں آئے تھے۔"

یہ کمرا بھی عام آفس کا کمرا تھا۔ ایک بیش قیمت مخمل خالی پڑی تھی۔ اس پر ایک فون تھا اور ایک مخمل کیلنڈر۔ میز کے پیچھے مخمل کی گھومنے والی کرسی تھی اور سامنے چار کرسیاں۔ دو صوفے تھے ایک دائیں جانب دوسرا بائیں جانب۔ پیچھے دیوار کے ساتھ ایک صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ میں اور خادم اسی پر بیٹھ گئے۔

میرے سامنے ایک دروازہ تھا اور پیچھے ایک کھڑکی۔ وہ دروازہ چھوٹا تھا اور غالباً باتھ روم میں کھلتا تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ مطمئن اور پُراعتماد نظر آؤں مگر خادم حسین پر گھبراہٹ سوار تھی۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے جی کہ ہم چوہے دان میں پھنس گئے ہیں۔ کیا کھانے کے بھی نہیں آئے تھے ہم۔"

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر آ گیا جس کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ چالیس کے لگ بھگ تھا اور بے داغ سفید سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک سفید چھڑی تھی اور اس نے گہرے رنگ کے شیشوں والا چشمہ لگا رکھا تھا۔ ظاہر ہے وہ اندھا تھا مگر اسی کے تجربات نے مجھے ظاہری حقیقت پر اعتبار نہ کرنا سکھا دیا تھا۔

"السلام علیکم! اور خوش آمدید موسیو آندرے۔ میں شوکت علی رانا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کے ساتھ بطور مترجم مولوی خادم حسین صاحب بھی تشریف لائے ہوں گے۔"

اس کے مہذب اور منکسر لہجے نے خادم حسین کو متاثر کیا۔ "جی ہاں' موسیو آندرے کے ساتھ ہوں اور ان کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

رانا پورے اعتماد کے ساتھ کرسی کی طرف گیا اور چھڑی میز پر رکھ کے بیٹھ گیا "آپ لوگ میرے سامنے تشریف لے آئیں تو مناسب ہوگا۔"

میں نے کہا "اس ایکٹر سے کہہ دو کہ ہم مسز ولاور کے سوا کسی اور سے بات کر کے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔"

رانا نے میری بات سن کے سر ہلایا "آپ مجھ پر اعتبار کر سکتے ہیں۔ جو بات آپ کہیں گے وہ مسز ولاور تک پہنچ جائے گی۔ مجھے انہوں نے اختیار دیا ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "خدا حافظ مسٹر رانا۔ ہم اس اختیار کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ کیا مسز ولاور ذہنی یا جسمانی طور پر معذور ہیں۔ طویل عرصے کے لیے ملک سے باہر گئی ہیں یا انہیں بے اختیار کر دیا گیا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل وہ یہاں رہتی نہیں ہیں۔ یہ آفس ہے اور میں یہاں جنرل منیجر ہوں۔ چوہدری ولاور میرے بزنس پارٹنر ہیں۔ ان کی پُراسرار گمشدگی کے بعد ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ ان کی فیملی ہر جگہ مناسب حفاظتی انتظامات کے بغیر جائے۔"

مناسب کا لفظ اسے بہت پسند تھا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے مسٹر رانا۔ جب مناسب حفاظتی انتظامات کر لیں آپ تو مجھے بلا لیں۔ ویسے میں خود بہت مصروف آدمی ہوں اور مسز ولاور خود ہی مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ انہی کے اصرار پر میں نے کوشش کی تھی کہ ان کے درمیان کوئی قابل عمل سمجھوتا طے پا جائے لیکن ایسا لگتا ہے کہ آپ کی سوچ اس کے برعکس ہے۔"

اس نے میرے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھامنے کی غلطی نہیں کی "مجھے افسوس ہے کہ آپ نے میرے بارے میں ایسی رائے قائم کی۔ آپ خود بھی تو کسی اور کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ مناسب تو یہ ہوتا کہ وہ براہ راست مذاکرات کرتے۔"

"مسز ولاور کی براہ راست بات چیت ہو گئی ہے۔ ملاقات بھی ہو سکتی ہے مگر اس کے لیے وہ خود مجھ سے بات کریں گی جیسے کہ پہلے کرتی رہی ہیں۔ وہ ہر وقت ہر جگہ پہنچ جاتی تھیں۔ کسی قسم کے حفاظتی انتظامات کی انہوں نے کبھی پروا نہیں کی مگر اب غالباً آپ کی کلیرنس کے بغیر وہ کہیں آ جا نہیں سکتیں۔ بالفاظ دیگر کیا وہ آپ کی قید میں ہیں؟"

"ہرگز نہیں" وہ ایسے بولا جیسے میرے الفاظ سے اس کو سخت صدمہ ہوا ہے "ہم ان کے دوست ہیں اور موجودہ حالات میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ان کو مناسب تحفظ فراہم کیا جائے۔"

میں نے کہا "مسٹر رانا سے پوچھو کہ کیا رانا گڈز کیریئرز انہی کی ملکیت ہے؟"

خادم کے بولنے سے پہلے ہی وہ چونک پڑا تھا "ہاں۔ میرے ٹرک پاکستان میں ہر جگہ آتے جاتے ہیں۔"

میں نے خادم کو اس ٹرک کا نمبر بتایا جس نے فوزیہ اور اس کے شوہر کو مار ڈالا تھا "کیا رانا صاحب بتا سکتے ہیں کہ اس وقت یہ ٹرک کہاں ہے؟"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ منشی اور ٹائم کیپر ٹرکوں کے آنے

www.paksociety.com

جانے کا مناسب انتظام چلاتے ہیں۔ شاہدرے میں آفس ہے۔"

خادم نے پوچھا "کیا رانا صاحب کو معلوم ہے کہ اس ٹرک نے تین دن قبل کراچی میں ایک رکشا کو ٹکر ماری تھی۔ اس حادثے میں رکشا والا بھی ہلاک ہو گیا تھا اور دونوں سواریاں بھی۔"

"مناسب حد تک مجھے یقین ہے کہ ایسا کوئی حادثہ پیش آتا تو مجھے ضرور معلوم ہوتا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے اسی دن بتادی جاتی ہے۔"

میں نے کہا "پھر تو رانا صاحب کو ماتحت عملے سے پوچھنا چاہیے کہ یہ خبر انھوں نے کس مصلحت کے تحت چھپائی تھی۔"

رانا کا چہرہ متغیر ہوا "آپ کیسے جانتے ہیں۔ مناسب ہوگا اگر آپ...."

میں نے کہا "رانا صاحب یقیناً بصارت سے محرومی کے باعث خسارے میں ہیں۔ اگر یہ دیکھ سکتے تو میں انھیں ایک ایف آئی آر کی نقل دکھاتا جو اسی ٹرک کے خلاف درج کرائی گئی تھی۔ تاہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس ٹرک کو حادثے کے وقت کون چلا رہا تھا؟"

"یہ ایف آئی آر ہے کہاں ہے۔ لاؤ مجھے دو۔ یہ تمہارے پاس کیسے پہنچی؟"

میں نے کہا "افسوس کہ نقل اس وقت میری جیب میں نہیں ہے۔ مجھے یہ نقل سکندر بخت نے کراچی سے ارسال کی ہے۔ ڈرائیور کے خلاف قتل عمد کا مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ آئی جی صاحب کی ہدایت پر عینی شاہدوں کے بیان کے مطابق قاتل کا حلیہ استاد پیڈرو نام کے ایک شخص سے بہت ملتا ہے جو چودھری دلاور کا دست راست ہے۔ مجھے خاتون ایڈووکیٹ رابعہ قاری نے بتایا ہے کہ یہی استاد پیڈرو ہی درحقیقت چودھری دلاور کا اصل آلۂ کار ہے۔ اس نے بہت سے قتل کیے ہیں جن میں ڈاکٹر شیلی کا قتل بھی شامل ہے اور آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ میں اسی کی تفتیش کے لیے لندن سے آیا ہوں۔"

اب وہ پُرسکون اور بااعتماد رہنے کی کوشش میں ناکام ہو چکا تھا اور اضطرابی کیفیت میں انگلیاں چٹخا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے بات کرنے کا انداز اور لہجہ دونوں مصنوعی تھے۔ شاید وہ اندھا بھی نہیں تھا اور یہ اس کی شخصیت کا اصل روپ ہرگز نہیں تھا۔

میں اور مولوی خادم حسین ایک ساتھ کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے کہا "رانا صاحب، میں آپ کا اور اپنا وقت برباد کرنا نہیں چاہتا۔ آپ اپنے ذاتی اور کاروباری مسائل سے خود بہتر طور پر نمٹ سکتے ہیں۔ مسز دلاور کو میرا سلام کہیے گا۔"

"ضرور کہہ دوں گا لیکن موسیو آندرے یہاں کے آداب مختلف ہیں۔ یہاں کسی اور کی بیوی کو ایسے سلام بھی نہیں کہا جاتا۔" اس نے سرد مہری سے کہا اور میں سمجھ گیا کہ اس بات کا مطلب کیا ہے۔ مجھ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ میں آئندہ مسز دلاور سے رابطہ نہ رکھوں۔ میں وہاں سے نکلا تو بہت غصے میں تھا۔

رانا سے میں بھی ملنا چاہتا تھا مگر مجھے یہ امید نہیں تھی کہ وہ ایسے ظالم سماج کی طرح سکندر بخت اور مسز دلاور کے درمیان حائل ہو کے حالات کا رخ پلٹنے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔ اس کے تیور بتاتے تھے کہ اب تک پس منظر میں رہنے والے رانا کی اہمیت کسی طرح بھی استاد پیڈرو سے کم نہیں۔ شاید زیادہ ہی ہے۔ پیڈرو اس وقت بھی ملازم تھا جب دلاور کے ساتھ ایک پارٹنر میر شرافت علی تھا اور دوسرے میرے والد وزیر خان مرحوم تھے۔ جب وزیر خان اور میر شرافت علی کو یکے بعد دیگرے کاروباری شراکت سے الگ کرنے کے لیے اس دنیا سے رخصت کرنا ضروری ہوا تو یہ کام استاد پیڈرو کے سپرد کیا گیا تھا۔ تب سے استاد پیڈرو نے چودھری دلاور کے لیے انتہائی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ چودھری دلاور کا پرانا وفادار مینیجر ذکی سلوا میرے ہاتھوں مارا گیا تھا اور بعد میں نواب جمشید کو بھی ایم آر ایس نے جہنم رسید کر دیا تھا حالانکہ وہ اپنی حفاظت کے لیے اپنے جیسا ہی دوسرا بھی ساتھ رکھتا تھا۔ یہ سب دلاور کے برابر کے لوگ تھے اور بزنس پارٹنر تھے مگر استاد پیڈرو ہمیشہ ماتحت اور ملازم ہی رہا تھا۔ دلاور نے اس سے ہر جائز اور ناجائز کام لیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ نہ پیڈرو کے لیے دلاور کو چھوڑ کے کہیں جانا ممکن تھا۔ کسی اور کے ساتھ نہ اسے اتنی اہمیت حاصل رہتی اور نہ اتنا مالی فائدہ حاصل ہوتا۔ دلاور نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا تھا تو پیڈرو بھی گھاٹے میں نہیں رہا تھا مگر اب دلاور کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ پیڈرو سے جان چھڑا سکے۔ پیڈرو اسے بلیک میل بھی کر سکتا تھا۔ وہ اس کے ماضی کے ہر تاریک پہلو کا چشم دید گواہ تھا اور شاید ابھی تک اسی لیے محفوظ تھا کہ اس کے پاس چودھری دلاور کے خلاف ایسے ثبوت تھے جو ضائع نہیں کیے جا سکتے تھے ورنہ مطلب نکل جانے کے بعد دلاور اسے بھی کتے کی موت مروا دیتا۔ تاہم دلاور جیسا شخص کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا کتا اسی پر بھونکے اور اس کا ملازم اس کا آقا بننے کی کوشش کرے۔ غالباً اس نے اب رانا کو بزنس پارٹنر بنا کے پیڈرو کو پیچھے کر دیا تھا۔ اس طرح کہ اسے اپنی اہمیت کم ہونے کا احساس بھی نہ ہو۔ اس کا تیسرا بزنس پارٹنر ڈاکٹر شاہ بھی ہو سکتا تھا۔ پیڈرو کی پوزیشن پہلے بھی یہی تھی جو میر شرافت علی اور وزیر خان کے زمانے میں تھی لیکن پرانے پارٹنر شریف اور وضع دار لوگ تھے۔ رانا جیسے پارٹنر خطرناک تھے وہ دلاور کے ہم پلہ اور اسی جیسی مجرمانہ صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ استاد پیڈرو سب سمجھنے کے باوجود چودھری دلاور کو روک نہیں سکتا تھا کہ وہ کاروبار میں کسی کو شریک نہ کرے۔

اگر صورت حال... ایسی ہی تھی جیسی کہ میں فرض کر رہا تھا تو پھر شطرنج کی نئی بازی شروع ہو چکی تھی۔ چودھری دلاور نے اپنی

پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے رانا اور ڈاکٹر شاہ جیسے لوگوں کا سہارا لیا تھا جو کسی طرح بھی اس سے کم نہ تھے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ ان کی رشتہ داری دوستوں کی مدد سے وہ پرانے جھگڑے ختم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ دشمن کے ہاتھ سے بھی نمٹ لیں گے اور استاد پیڈرو جیسے لوگوں سے بھی چھٹکارا حاصل ہو جائے گا لیکن نئے ساتھی اتنے آزمودہ نہیں تھے کہ سو فیصد دلاور کی توقعات پر پورے اترتے۔ اس نے نئے دوستوں کو بتا دیا ہوگا کہ اس کے پرانے دشمن کا بیٹا خود اپنے مستقبل کے بارے میں کیا عزائم رکھتا ہے اور اس کے دشمن کیسے ان عزائم کو خاک میں ملانے پر کمربستہ ہیں۔ زر، زور، زن اور زمین سے انھیں خریدنے اور شکست دینے کے سب حربے بے کار ثابت ہوئے ہیں۔ ایک باعزت خوش حال اور کامیاب مستقبل کا خواب اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے ماضی کی کتاب سے نامۂ اعمال کی ہر سیاہ تحریر کو مٹا کے اس کا نام و نشان تک نہ مٹا دے لیکن جب تک پرانے دوست اور پرانے دشمن اور گھر کے بھیدی اپنی زبان بند رکھنے پر آمادہ نہ ہوں تاریخ کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے اور اس میں کالے کرتوتوں کی جگہ سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل واقعات کو کیسے شامل کیا جا سکتا ہے۔ اور نئے ساتھیوں نے یقیناً ہنس کے کہا ہوگا کہ اپنے چودھری دلاور صاحب، یہ کیا مشکل کام ہے۔ آپ سب کچھ ہم پر چھوڑ دیں۔ سیاست کا میدان آپ کا ہے۔ ایم آر ایس کا جنون تو نکل ہی گیا ہے۔ سکندر بخت اکیلا کیا بگاڑ سکتا ہے اور رہا استاد پیڈرو تو اس کی اوقات ہی کیا۔ بادشاہ لڑتے تھے بادشاہوں سے۔ اپنی سلطنت بچانے کے لیے یا ان کی سلطنت پر قبضہ کرنے کے لیے۔ غلام کے تو زن و بچہ کولہو میں پلوائے جا سکتے ہیں۔ کنیزوں کو دیواروں میں چنا جا سکتا ہے اور چھوٹے موٹے اہلکاروں کی سرکوبی کی جا سکتی ہے۔

اگر دلاور پکڑا نہ جاتا تو شاید تینوں بڑے کوئی موثر حکمت عملی مرتب کر لیتے لیکن اچانک قسمت کے ایک رعونی پنجے نے کامیابی کے خوابوں کا ملیہ کر دیا۔ دلاور ایسا غائب ہوا کہ شب خوار خرم کے کارندے اور زر خرید جاں نثار سب نے شہر کے کونے کونے کی خاک چھان لی مگر اپنے آقا ان داتا اور مالک کا سراغ نہ لگا سکے۔ دلاور نے اپنی حفاظت کے لیے جو انتظامات کر رکھے تھے بے سود ہو کے رہ گئے تھے یہاں تک کہ وہ الیکٹرانک آلہ بھی دغا دے گیا تھا جو ہر لحظہ ہر جگہ سے دلاور کے بارے میں اطلاع فراہم کرتا رہتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ ڈاکٹر شیلی کی لاش کا پوسٹ مارٹم رکوانے کی جو کوششیں کی گئی تھیں وہ ناکام ہو گئیں۔ اس کے لیے ڈاکٹر شیلی کی لاش کو غائب کرانا اس لیے ممکن نہ تھا کہ ہم نے اس کی قبر کا پتا ہی نہیں چلنے دیا تھا۔ دلاور نے نہ جانے کتنے جتن کر کے اور کتنا پیسہ لٹا کے اس کیس کی تفتیش کرنے والی پولیس ٹیم کی طرف سے حمایت کا وعدہ حاصل کیا ہوگا۔ پولیس سرجن کو اور میڈیکل بورڈ کے سربراہ کو صحیح رپورٹ دینے سے روکنے اور باہر انہ راستے سے ہٹانے کے لیے کتنے پاپڑ بیلے ہوں گے مگر اس کی تمام جدوجہد رائیگاں گئی تھی۔ پرانی ٹیم کو معطل کے بعد گرفتاری اور اعانت مجرمانہ کے الزام میں مقدمات کا سامنا تھا۔ نئی ٹیم کے اراکین پولیس اور وکیلوں کے اتحاد سے اور سابقہ ٹیم کے انجام کو دیکھ کر محتاط تھے اور میڈیکل رپورٹ نے ڈاکٹر شیلی کے قتل کی نشاندہی بھی کر دی تھی۔ ایف آئی آر میں دلاور کا نام آ گیا تھا اور اسے مفرور بھی قرار دیا جا چکا تھا۔

ان حالات میں پیڈرو کو امید کی ایک کرن نظر آئی ہوگی کہ وہ دلاور کی جگہ لے سکے۔ اس نے دلاور کے نئے ساتھیوں سے سازباز کی ہوگی اور انھیں اچھی طرح سمجھا دیا ہوگا کہ دلاور اور سکندر بخت کے درمیان ایک خاندانی تنازع ہے جس میں انھیں فریق بننے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ سکندر بخت کو دلاور سے ان مظالم کا بدلہ لینا ہے جو اس کے والد کے ساتھ روا رکھے گئے تھے۔ اس وقت وہ لندن میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ چودھری دلاور نے اس کے ساتھ فراڈ کیا اور اس کا سب کچھ ہتھیا کے اسے پیسے پیسے کا محتاج کر دیا تھا۔ جب افشائے راز کا وقت آیا تو چودھری دلاور کے ایما پر ہی پہلے سکندر بخت کے والد کو قتل کرا دیا گیا تھا۔ بعد میں دوسرے پارٹنر میر شرافت علی کو بھی اسی لیے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے کہ وہ چودھری دلاور کے کاروباری نقطۂ نظر سے اختلاف رکھتا تھا اور اسے ڈر تھا کہ وہ سکندر بخت کو اس کے والد کی موت کے اصل اسباب سے آگاہ کر دے گا۔ میر شرافت علی کے قتل کا الزام سکندر بخت پر عائد کرانے کے بعد چودھری دلاور نے اسے خریدنے اور اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر سکندر بخت تو انتقام کے جنون میں مبتلا تھا۔ اس نے اپنا حق وراثت اور باپ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے چودھری دلاور کو تباہ کرنے اور تختۂ دار تک پہنچانے کی جو قسم کھائی تھی وہ آج تک اس پر قائم ہے اور اب تو ایسا لگتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت دلاور کو اس انجام سے نہیں بچا سکے گی۔

ظاہر ہے دلاور کے نئے ساتھی اس پرانے کھیل میں شریک ہو کے اپنی جان و مال کو داؤ پر لگانے والے نہیں تھے۔ نہ وہ پرانے دوست تھے کہ دلاور کا ساتھ دیتے نہ ان کا خون کا رشتہ تھا۔ انھیں تو الٹا اس جھگڑے میں نقصان ہی نقصان نظر آیا ہوگا اور وہ کاروبار میں منافع کمانے کے لیے شریک ہوئے تھے گھاٹا اٹھانے کے لیے نہیں۔ انھیں استاد پیڈرو جیسے پرانے محرم راز درون خانہ کی باتیں سن کے محسوس ہوا ہوگا کہ بے تاج و تخت بادشاہ کے ساتھ وفادار رہنے کی حماقت تو پرانے وقتوں کے لوگ بھی نہیں کرتے تھے۔ خدا نے انھیں موقع دیا ہے کہ چودھری دلاور کی سلطنت پر وہ قابض ہو جائیں تو اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا کوئی عقل مندی نہیں۔ استاد پیڈرو جیسے مشیر میر جعفر اور صادق بھی تھے لیکن انگریز

www.paksociety.com

نے انہی کی مدد سے ہندوستان پر قبضہ حاصل کیا تھا۔ کاروباری مفادات کی جنگ میں ایسے میر جعفروں کی بڑی اہمیت تھی جو ہوا کا رخ دیکھ کے وفاداری بدل لیتے ہوں اور نئے آقاؤں کو سلام کرنے میں اولیت حاصل کرنا جانتے ہوں۔ پرانے شاہ کے نمک خواروں سے رموز سلطنت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ممکن ہے نئے بزنس پارٹنرز نے پیڈرو کو دس فیصد کا شریک بنالیا ہو۔ اس شرط پر کہ وہ دلاور کے کاروبار پر ان کے مکمل اختیار کی راہ ہموار کرے گا۔ یہ اختیار انہیں چوہدری دلاور کی زندگی میں بھی حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ شاید دلاور کے ساتھ وہ خود دس فیصد کے شریک ہوں۔ استاد پیڈرو کا تجربہ وسیع تھا۔ وہ اندر کی ہر بات جانتا تھا اور اس کے انڈر گراؤنڈ رابطے تھے جن سے نوا دو رانا اور ڈاکٹر شاہ ابھی ناواقف تھے۔ یہی انڈر گراؤنڈ راستے اور رابطے دولت کی ریل پیل کے راستے تھے۔ دن دونی اور رات چوگنی خوش حالی کے راستے تھے اور سونے کی خفیہ کانوں کے راستے تھے۔ چوہدری دلاور کے بعد استاد پیڈرو ان کا پاسبان ہوسکتا تھا۔ دلاور نے جن کو اپنی طاقت میں اضافے اور سہارے کی ضرورت سمجھا تھا وہی شاید اس کے حریف بن گئے تھے۔ بیساکھی چھین لی جائے تو پہلے سے مفلوج آدمی تو کھڑا بھی نہیں رہ سکتا۔ اس کے ساتھ چلنے کا کیا سوال۔

اور شاید استاد پیڈرو ہی تھا جس نے رانا کو اور ڈاکٹر شاہ کو پٹی پڑھائی ہوگی کہ دلاور تو شاید اب کبھی واپس نہ آسکے۔ وہ ایسے دشمنوں کے قبضے میں ہے جو اس کی جان لینے پر ویسے ہی ادھار کھائے بیٹھے ہیں اگر وہ سامنے آیا بھی تو ایک مجرم کی حیثیت سے لایا جائے گا جس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہوگا جو تختہ دار تک جاتا ہے۔ اس کے دشمن تو پہلے ہی اسے وہاں پہنچانے کا پورا انتظام کرچکے ہیں۔ کیا یہ نہ ہم بھی ان کی مدد کرتے ہوئے دلاور کو اور آگے دھکیل دیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ہاتھ بھی کاٹنے ضروری ہوں گے جو دلاور کی مدد کررہے ہیں۔ یہ ہاتھ ہیں اس کی بیوی اور اس کا ولی عہد فیصل۔ وہ خود کو اپنے باپ کی کاروباری سلطنت کا واحد قانونی وارث سمجھتا ہے اور اس کی ماں وہی رول ادا کرنا چاہتی ہے جو انگریزوں کے ہندوستان پر قبضے کی سازش کو ناکام بنانے کے لیے نواب زینت محل نے ادا کیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار دہلی کی اسیری کے بعد اس نے جنرل بخت خان کے ساتھ مل کر فوج کی کمان سنبھال لی تھی۔ یہاں جنرل بخت خان کے روپ میں استاد پیڈرو تھا جو خود غاصبوں سے مل گیا تھا۔ اکیلی ملکہ عالیہ کیا کریں گی اپنے ولی عہد کے لیے۔ بے شک وہ بہت دوڑ دھوپ کررہی ہے اور بہت ہاتھ پاؤں مار رہی ہے مگر ایسا انتظام کیا جاسکتا ہے کہ نہ وہ اس فرنگی وکیل سے مل پائے اور نہ براہ راست سکندر بخت سے دلاور کی رہائی کے لیے اور مفاہمت یا مصالحت کے فارمولے پر مذاکرات کرسکے۔ فیصل نوجوان اور جوشیلا ہے۔ اس سے کوئی خطرہ نہیں لیکن اس عورت کا بندوبست کرنا ضروری ہے جو بیک وقت اپنے سہاگ کی بقا اور اپنے مستقبل کی جنگ لڑ رہی ہے اور شکست کو ناگزیر دیکھ کے دشمن سے باعزت سمجھوتہ کرسکتی ہوگی ہے یہاں تک کہ اس کو خراج تک دینے پر تیار ہے۔ اور اطاعت قبول کرنے اور تاوان ادا کرنے پر بھی راضی ہے۔

بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ میری قیاس آرائی کچھ ایسا غلط تخیل نہیں تھی۔ نمک حرام پیڈرو نے موقع پاتے ہی دلاور کے خلاف سازش کا ایسا جال پھیلا رکھا تھا کہ دلاور اس سے بچ کے نکل ہی نہیں سکتا تھا اور اگر نکل آتا تو یہ الزام آنے سے پہلے ہی اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کردی جاتی۔ اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ اگر وہ اعلیٰ عدالتوں سے غاصبوں کو غاصب قرار دلوا کے دوبارہ آئینی اور قانونی حقوق حاصل کرلیتا اور سزائے موت سے بچ کے باعزت طور پر رہا ہوجاتا تو کسی پیشہ ور قاتل کی ایک گولی وہ کام کرسکتی تھی جو قانون کے طریقہ کار کے مطابق نہیں ہوپایا تھا۔

میں جب وہاں سے رخصت ہوا تو میرے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔ کیا تاریخ اپنے آپ کو خود دہرا رہی ہے۔ آج فیصل کے ساتھ بھی وہی ہونے والا ہے جو کل میرے ساتھ ہوا تھا۔ واقعات وہی ہیں۔ صرف نام بدل گئے ہیں اور وقت بدل گیا ہے۔ کل وزیر خان سے اس کی ساری عمر کی کمائی چھین لی گئی تھی۔ آج یہ چوہدری دلاور کے ساتھ ہورہا ہے۔ کل بے کسی کی موت مرنے والا وزیر خان تھا جس کا ایک ہی بیٹا تھا مگر وہ اس کے لیے کچھ نہ کرسکا تھا۔ آج دلاور کی باری ہے اور فیصل خود کو یتیم اور ماں کو بیوہ ہونے سے نہیں بچا سکتا۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔ وہ دیر کرسکتا ہے اندھیر نہیں کرسکتا۔ دنیا کی ہر عدالت کو بے بس کردینے والا اس کی عدالت میں خود کتنا بے بس ہوتا ہے۔ شاید دلاور نے تقدیر سے بازی ہاردی ہے جو میری تدبیر سے نہیں ہاری تھی۔ مگر اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب چوہدری دلاور سے حساب بے باق کرنے کا وقت آئے گا تو استاد پیڈرو کا کھاتا بھی کھولا جائے گا اور پتا چل جائے گا کہ نئے شکاری کتنے پانی میں ہیں؟

مولوی خادم حسین مجھے خاموش دیکھ کے خود بھی خاموش تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کسی گہری سوچ میں ہوں اور شاید میری صورت سے تشویش اور مایوسی کا اظہار بھی ہورہا تھا۔ ہم نے شملہ پہاڑی تک کا فاصلہ پیدل ہی طے کرلیا۔ دوپہر کے وقت ابھی خاصی گرمی تھی اور سوٹ میں میرا پسینہ سارے جسم پر بہہ رہا تھا۔

بالآخر خادم حسین کی قوت برداشت جواب دے گئی "میں پوچھ سکتا ہوں جناب کہ آخر ہم کہاں جارہے ہیں اور کیوں؟"

میں نے ایک فلسفیانہ جواب دیا "رات دن گردش میں ہیں سات آسمان۔ چاند سورج ستارے سب ہی مسافر ہیں۔ کیا کسی کو اپنی منزل کا پتا ہے؟"

خادم حسین نے کہا "ان کا حال تو خدا جانے مگر آپ کا مجھے پتا ہے کہ کچھ بھول گئے ہیں۔"

میں رک گیا "کیا بھول گیا ہوں اور کہاں؟"

"آپ بھول گئے ہیں جی کہ بندہ بشر کوئی پودا یا درخت نہیں ہے کہ ہوا کھا کے زندہ رہے۔ جو تھوڑی بہت چربی تھی جسم میں وہ تو پگھل کے بہہ گئی۔ اب کچھ رہا نہیں جناب' اندر کی گاڑی چلتی رہے۔"

"گاڑی' کون سی گاڑی؟" میں نے کہا "گاڑی تو محسن لے گیا تھا ہم ٹیکسی میں آئے تھے۔"

"ٹھیک ہے جی۔ آپ جانتے بوجھتے انجان بن رہے ہیں۔ میری دو ٹانگوں کی جگہ دو پہیے ہوتے موٹر سائیکل کی طرح اور پیٹ کی جگہ پیٹرول کی ٹنکی ہوتی تو اس وقت آپ میرے اعصاب پر سوار ہونے کے بجائے کھڑے ہوتے کسی سڑک کے کنارے یا موٹر سائیکل آپ کو چلا رہی ہوتی۔"

مجھے ہنسی آگئی "یار مولوی خادم حسین' پہیلیوں میں باتیں مت کیا کرو۔ صاف کہو نا کہ بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں اور آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔"

"کیا جی۔ چوہے کب کے فوت ہوچکے بھوک سے اور آنتیں ان کے لیے انا للہ پڑھ کے خاموش ہوگئیں۔" اس نے نظریں یوں آسمان کی طرف گھمائیں جیسے اس پر نزع کا عالم ہو۔

الفلاح بلڈنگ تک اسے بہرحال میرے ساتھ پیدل ہی جانا پڑا۔ وہاں الفلاح ریسٹورنٹ کے خنک نیم تاریک ماحول میں سکون سے بیٹھ کے میرا پسینہ خشک ہوگیا تو مجھے بھی احساس ہوا کہ بھوک نے میری عقل ماؤف کردی ہے اور میں ویسے بھی سوچ سوچ کے تھک چکا ہوں۔

ایک شاندار دعوت جیسے لنچ کے بعد مولوی خادم حسین نے خمار کی کیفیت میں کہا "ایک بات کہوں جی' وہ خبیث الدہر دانا ہرگز اندھا نہیں تھا۔"

"بالکل ٹھیک۔ اب دوسری بات کہو۔"

"دوسری بات؟" خادم حسین نے سر کھجایا "یہ تو نہیں کہ آپ کہیں گے جی کہ خادم کا دماغ چل گیا ہے۔"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے' تم بتاؤ۔"

"میں نے اس آنکھوں والے اندھے کو دیکھا ہے پہلے بھی۔ اور شاید اس نے خود کو مجھ سے چھپانے کے لیے ہی یہ بہروپ بدلا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کے مجھے پیچھے سے الٹا لٹکانے والا یہی شخص تھا۔ یہی مجھے پھانسی دینا چاہتا تھا۔ اس نے کالا چشمہ لگا کے آدھا چہرہ چھپالیا تھا ورنہ میں اس کی آنکھوں کے نیچے دیکھ لیتا۔ ایک کے نیچے زخم کا نشان ہے اور یہ آنکھ مصنوعی ہے۔ پتھر کی ہے۔ اس دن حلیہ بہت خراب تھا۔ آج سوٹ بوٹ میں تھا اور آواز بدل کے بات کررہا تھا۔"

میں نے کہا "رائٹ۔ یہی تو میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ یہ اس کی اصل آواز نہیں ہے۔"

"آپ خود سوچیں جناب کہ ایک اندھا کسی کمپنی کا منیجر کیسے ہوسکتا ہے۔ جسے نظر ہی کچھ نہ آتا ہو بھی وہ کسی پر کیا نظر رکھے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ ساری دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔"

"ایسے شخص کو تو بڑا انصاف پسند اور عادل کہا جاتا ہے۔"

"آپ تو محاورے کی طرف چلے گئے جی۔ آپ شرط لگالیں مجھ سے اس کی بائیں آنکھ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "مولوی ہو کے شرط لگاتے ہو۔ شرط تو حرام ہے۔ ذرا سوچو' جتنا بھی اور جیسا بھی دماغ ہے تمہارا۔ اس پر زور دو۔ کیا تم کو اسی آفس میں لایا گیا تھا؟ کیا وہ جگہ یہی تھی جہاں تم پر تشدد ہوا تھا۔ تم نے کانے جلاد کو پہچان لیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارا مشاہدہ اچھا ہے۔"

مولوی نے نفی میں سر ہلایا "وہ تو ڈرائنگ روم تھا کسی کوٹھی کا۔ ہاں جب یہ کانا وہاں اندر آیا تھا تو ایک لمحے کے لیے میں نے کھلے دروازے سے اندر کی جھلک دیکھی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اندر کوئی چیز تھی' کیا تھا آخر؟ ہاں جی' یاد آگیا۔ وہ فانوس' فانوس وہی تھا۔ جب میں الٹا لٹکا ہوا تھا تو میں نے دو چیزیں نوٹ کی تھیں۔ ایک تو اس کی آنکھ میرے اتنے قریب تھی کہ میں نے زخم بھی دیکھ لیا تھا اور پتھر کے رنگ کو بھی۔ دوسری چیز وہ فانوس تھا۔ میں خود بھی فانوس کی طرح لٹکا ہوا تھا جی۔ اور جب وہ مجھے اوپر کھینچتا تھا تو میں فانوس کے قریب پہنچ جاتا تھا۔"

میں نے چٹکی بجا کے کہا "بس خادم حسین' معما حل ہوگیا۔ یہی ہے وہ جگہ جہاں تم کو لایا گیا تھا۔ چوہدری دلاور کی بیوہ یہیں رہتی ہے اور اسی آفس کے فون پر اس سے بات ہوتی ہے لیکن آج اسے ہم سے نہیں ملنے دیا گیا اور شاید آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ نہ وہ بات کرسکے گی اور نہ کسی سے ملاقات۔"

تیسرے پہر میری ملاقات رابعہ کے آفس میں منظر سے ہوئی۔ رابعہ نے اسے کراچی میں پیش آنے والے افسوس ناک واقعات سنادیے تھے چنانچہ وہ خاصا آزردہ تھا۔ اس کی طبعی شوخی میں مایوسی کا رنگ غالب تھا۔

"کچھ نہیں بیٹا۔ تم سارے جہاں میں طرم خاں بنے پھرو۔ اپنی ایم آر ایس کو پی ایل او کی طرح تسلیم کرالو اور خود یاسر عرفات ہوجاؤ تب بھی دلاور اسرائیل کی طرح من مانی کرتا رہے گا۔ فوزیہ کے بعد کسی دن باری آجائے گی کاجل اور اکرام شیخ کی۔"

میں نے کہا "مایوسی کی باتیں مت کرو۔ یہ بتا مقدمے میں کیا پیش رفت ہوئی؟"

"کچھ نہیں۔ ابھی تو چالان پیش ہوا ہے وہ بھی نامکمل۔ وکیل صفائی نے اعتراض کردیا ہے کہ اس پوسٹ مارٹم رپورٹ کی قانونی حیثیت نہیں ہے کیونکہ بورڈ کے سب ارکان نے اس پر دستخط نہیں کیے ہیں۔ میڈیکل بورڈ کا چیئرمین خود ایم ایس تھا۔ دوسرا ممبر پولیس

www.paksociety.com

سرجن تو قتل ہو چکا تھا۔ وہ کہاں سے دستخط کرتا مگر اعتراض درست ہے۔ قانونی طور پر میڈیکل بورڈ دوبارہ تشکیل ہونا ضروری تھا۔ جس بورڈ کا نوٹیفکیشن جاری ہوا تھا وہ ٹوٹ چکا تھا۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"ایس ایس پی جاوید نے وعدہ کیا ہے کہ آج ہی بورڈ کے نئے ارکان نامزد ہو جائیں گے اور اپنے طور پر اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے تبدیل ہونے کا امکان نہیں ہے۔ نیا پولیس سرجن خود ایم ایس نے نامزد کیا ہے اور اس کا سالا ہے۔ وہ اس سے رپورٹ پر دستخط کرا لے گا۔ مجسٹریٹ دستخط کر چکا ہے۔ اگلی پیشی پر گواہوں کی فہرست دی جائے گی۔"

"دلاور کی طرف سے ضمانت کی درخواست دائر نہیں کی گئی۔"

"اسے قانون کا پتا نہیں تو ایسے سوالات سے خود کو جاہل کیوں ثابت کرتا ہے۔ ضمانت کی درخواست کے ساتھ دلاور کا پیش ہونا ضروری ہے۔ قبل از گرفتاری ضمانت کی درخواست تو پہلے ہی مسترد ہو چکی ہے۔ اب ہماری کوشش ہوگی کہ اسے اشتہاری مجرم قرار دلوا دیں۔ اس کی تصویر اخبار میں شائع ہو جائے۔"

رابعہ نے کہا "آخر ہم اسے کب تک قید میں رکھیں گے۔ اب تو غالب اور نازو کے تحفظ کی ضمانت حاصل ہو گئی ہے۔"

"کس نے دی ہے یہ ضمانت؟ اور کیا ہمیں صرف اس ضمانت پر قناعت کر کے بیٹھ جانا چاہیے۔ غالب اور نازو کو بھول جانا چاہیے؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جس نے یہ ضمانت دی تھی کہ غالب اور نازو کو کچھ نہیں ہوگا وہ خود اس پوزیشن میں نہیں کہ اپنے لیے بھی کچھ کر سکے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ دلاور کی بیوی جو پہلے مذاکرات کے لیے وقتی بے چین تھی اور دلاور کا بیٹا دونوں بے بس ہو گئے ہیں۔ معاملات اب شوکت علی رانا کے ہاتھ میں ہیں۔ شاید اس نے ڈاکٹر شاہ اور استاد پیڈرو کے ساتھ مل کے ایک ایسا کاروباری اتحاد قائم کر لیا ہے جس میں چوہدری دلاور کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ وہ جیل جاتا ہے تب بھی ان کی بلا سے اور پھانسی چڑھتا ہے تو انہیں غم نہیں۔ ہر صورت میں دلاور کا نہ ہونا ہی ان کے لیے باعث نجات ہوگا۔ اب وہ نہیں چاہتے کہ دلاور دوبارہ کاروبار کو کنٹرول کرے چنانچہ انہوں نے دلاور کی بیوی کو بھی مذاکرات سے روک دیا ہے۔"

منظر اور وقار یوسف مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں نشے میں اول فول بک رہا ہوں۔ رابعہ بھی اس صورت حال کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ میں نے رانا سے ملاقات کے بعد اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے شکوک کی وضاحت کی تو رابعہ اور وقار یوسف نے مجھ سے اختلاف نہیں کیا۔

"ایسا ہو سکتا ہے" رابعہ نے کہا۔

"ایسا بھی ہو سکتا ہے" وقار یوسف نے بھی۔۔۔ زور دے کے کہا۔

منظر نے بھی سر ہلایا "یہ ایک خیال ہے۔ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔ ثبوت ملنے تک اس کی صداقت مشکوک رہے گی جیسے تیرا کردار مشکوک ہے۔ خواہ رابعہ تجھے ولی کہے۔ بھوت ہی کہے۔"

"اور سولہ بچوں کی ولدیت کے باوجود بحیثیت شوہر تیرا کردار مشکوک ہی رہے گا۔ خواہ بیوی کچھ بھی کہے۔" میں نے کہا "بات ثبوت کی تو بیٹا ہم آج ہی ثابت بھی کرا دیں گے۔"

"ہم کون؟ تم اور تمہارا وہ عم زاد ہم زاد شیر والی؟ تم پہلے ہی بہت کچھ ثابت کر چکے ہو۔ وہ ہے کہاں آخر؟ میں نے تو آج تک اس کی نئی شکل نہیں دیکھی۔ ابھی تک وہ دیا تو ہے یا انسان کا بچہ نظر آنے لگا ہے شادی کے بعد؟"

میں نے کہا "منظر، ایسا لگتا ہے کہ وہ ہم سب کی بلائیں اپنے سر لے لیتا ہے۔ ورنہ ایسا کیوں ہے کہ تقدیر سارے زخم اسے دیتی ہے۔"

رابعہ نے کہا "اور کمال یہ ہے کہ اس کے دل میں بال نہیں آتا۔ کسی سے گلہ نہیں ہے اسے۔ آج بھی اس کا حوصلہ وہی ہے۔"

اچانک منظر نے کہا "مولوی خادم حسین۔ تم بڑے دانا ہو۔"

خادم حسین یوں اچھلا جیسے منظر نے بے خبری میں اسے انگارے سے داغ دیا ہو "یہ۔۔۔ یہ کیا ہے منظر صاحب۔ آپ سے کہہ رہے ہیں شرافت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"ہاں ہوتی ہے مگر تمہیں کیا۔ جو کچھ تم اس آفس میں کرتے رہے ہو اس پر شرم آنی چاہیے تمہیں۔"

"کیا۔۔۔ کیا برا کام کیا ہے میں نے؟" خادم حسین گھبرایا۔

"تم کسے لائے تھے آفس میں؟ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ کون تھی وہ چھنال چھبیل چھبیلی چھنک چھلو؟ مشتری بائی یا زہرہ بائی۔ کنگن کی چوڑیاں پڑی ہیں یہاں اور۔۔۔ بس میرا منہ مت کھلواؤ۔ مجھے رپورٹ مل گئی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ منظر صاحب، آپ بہت واہیات ہو گئے ہیں۔"

"میں واہیات ہوں؟ سالے بیوی کے ہوتے ہوئے تم بھی آفس میں ایسی ویسی عورت کے ساتھ۔"

"آپ۔۔۔ زبان سنبھال کے بات کریں جی۔"

"جوانی تم سے نہیں سنبھالی جاتی۔ مولوی ہم تو بیوی کی وفاداری کے سولہ ثبوت پیش کر چکے ہیں دنیا کے سامنے۔ تمہارا چال چلن پہلے ہی مشکوک تھا۔ ابھی تک چوہے کا بچہ پیدا نہیں کیا تم نے اور یہ۔۔۔"

"دیکھیے، دیکھیے حد ہوتی ہے برداشت کی۔ میں رابعہ بی بی کی وجہ سے خاموش ہوں۔"

"رابعہ بی بی کی آڑ مت لو۔ سب بتا دیا ہے سکندر نے اور وہ بتا رہا تھا کہ رات تین بجے یہاں کیا اندر بھاگی ہوئی تھی۔ تم کس کے ساتھ کون سا ٹانکا لگا رہے تھے۔ کیا تھا وہ گانا سکندر۔ ہاں۔ تو چیز بڑی ہے مست مست بن بیٹھے۔ اور وہ تمہارے ساتھ گا رہی تھی۔"

خادم حسین ایک دم اٹھا "میں لعنت بھیجتا ہوں اس نوکری پر منظر صاحب۔"

"بیٹھ جاؤ۔ مرچیں لگ گئیں سچ سن کے۔ مولوی خادم حسین نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تم واقعی بہت حرامی ہو۔ سچ بتاؤ کون تھی وہ؟"

"وہ میری گھر والی تھی۔" خادم حسین چیخ کے بولا "اور حرامی آپ خود۔ آپ کے والد اور جد امجد۔"

بس ہنس ہنس کے منظر کا برا حال ہو گیا۔ اس نے مولوی کو گلے لگایا "ارے میرے چاند میرے بھولے بھالے پیارے پیارے مولوی خادم حسین۔ اب تم نے کی اصلی بات۔ ارے یار ہم دل لگی کرتے ہیں تم سے۔ تم جتنی گالیاں چاہو دے لو۔ تم تو میرے بھائی ہو میرے باپ ہو۔"

"نہیں جی۔ مجھے معاف کریں" خادم حسین نے خود کو چھڑایا۔

"دیکھو، عورتیں دوپٹہ بدل بہنیں بن جاتی ہیں۔ تو ہم پتلون بدل بھائی بن جاتے ہیں۔ سب کے سامنے" منظر نے اپنا ہاتھ پتلون کی طرف بڑھایا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" مولوی خادم حسین کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا "تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود آپ کی بے شرمی آپ کو زیب نہیں دیتی۔"

"چلو پتلون نہ سہی۔ بیوی بدل بھائی بن جاؤ۔ ویسے بھی تمہاری اور میری بیوی اگر بہنیں ہوں تو میری بیوی تمہاری سالی اور تمہاری بیوی میری سالی۔ تو ویسے ہی ہوتی ہے آدھی گھر والی۔"

خادم حسین باہر چلا گیا کیونکہ اب منظر کے ساتھ میں اور رابعہ بھی ہنس رہے تھے اور وہ اتنا شریف آدمی تھا کہ مذاق بھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ اسی وقت محسن آ گیا اور ہم سب ایسے خاموش ہو گئے جیسے کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔ ابھی بہن کی موت کا صدمہ تازہ تھا اور ہم بے تکلف لگ رہے تھے۔ یہ حقیقت تلخ اور ناقابل تردید ہے کہ آپ ہنسیں تو دنیا آپ کے ساتھ ہنستی ہے مگر آپ روئیں تو دنیا آپ کے ساتھ نہیں روتی۔ منظر نے رسماً اس سے تعزیت کی۔ پھر آفس میں تالے لگے اور ہم اندر والے کمرے میں چلے گئے۔

میں نے کہا "محسن۔ آج ہی موقع ہے۔"

"کیسا موقع؟" وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے اسے آج دن میں رانا سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتایا "مولوی خادم حسین کو اسی گھر میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ ہمت والا آدمی ہے۔ اس نے کچھ بتایا نہیں ورنہ آج میرا کام تمام ہو جاتا۔ دلاور اینڈ کمپنی کی جگہ رانا اینڈ کمپنی آ گئی تو ہماری فتح ایک دم شکست میں بدل جائے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"رانا اور ڈاکٹر شاہ نے استاد پیڈرو کی حمایت سے اس کا تختہ الٹ دیا تو بڑا خونی انقلاب آئے گا۔ وہ سب کا قصہ پاک کر دیں گے۔ چوہدری دلاور کے سارے خاندان کو اڑا دیں گے اور ساتھ ہم سب کو۔ سارے جھگڑے ختم۔ کاروباری رقابت، وراثت کا مسئلہ، عدالت میں پرانے تصفیہ طلب مقدمات اور الزامات سب ختم سمجھا اور کہا جائے گا کہ پرانے دشمنوں نے ایک دوسرے کو ختم کر دیا۔ رانا اینڈ کمپنی کو کسی سے نہ شکایت تھی نہ کسی سے دشمنی۔ وہ سارے کاروبار کے مالک۔"

"یار، یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ چوہدری دلاور اور اس کے خاندان کو ختم کر دیں مگر ادھر تو سلسلہ بہت لمبا ہے۔ تیرے اور رابعہ کے بعد میں اور گل ہیں، غالب اور نازو ہیں۔ وقار اور نگی ہیں۔ منظر ہے اور یہ سب لوگ ان کی جان آسانی سے چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ استاد پیڈرو یقیناً یہ بات سمجھتا ہے۔"

"ہمارا بھی بہت نقصان ہو جائے گا۔ اس کے بعد شاید یہ بات ان کی سمجھ میں آ جائے گی۔"

"آخر تو کیا چاہتا ہے؟"

"سی ڈی انٹرپرائز کے لیے ایک سرپرائز۔ میں اچانک وہاں پہنچ کے رانا سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ رات کے وقت وہاں ہماری ملاقات مسز دلاور سے ہوگی۔ اگر ہم پہرے پر مامور گن مینوں کے حصار کو توڑ کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ وہاں قید میں ہے۔"

"تو کیا اب آپ کو دشمن کے خاندان سے ہمدردی ہو گئی ہے۔"

"یار تو سمجھنے کی کوشش کر۔ اگر چوہدری دلاور کے بیوی بچے محفوظ رہیں گے تو استاد پیڈرو کی یا رانا کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہوگی۔ وہ بھی اس کے کاروبار پر قابض نہیں ہو سکیں گے اور یہ سب کچھ دلاور کا رہے گا۔ مجھے اپنا حق دلاور سے واپس لینا ہے۔ جب اس کے پاس کچھ نہیں ہوگا یا وہ خود نہیں ہوگا اور اس کے وارث نہیں ہوں گے تو میں کس کے خلاف دعوے کروں گا۔ رانا اور ڈاکٹر شاہ سے تو میرا کوئی تعلق نہیں۔ نہ وہ مجھے جانتے ہیں اور نہ میں نے انہیں دیکھا ہے۔ اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے ہمیں چوہدری دلاور کا ساتھ دینا پڑے گا۔ اسے یہ موقع فراہم کرنا پڑے گا کہ وہ پہلے پیٹھ میں خنجر گھونپنے والے دغاباز ساتھیوں سے نمٹ لے۔ اس کے بعد ہمارے مقابل آئے۔ ہم سامنے آ کے لڑتے

www.paksociety.com

ایسا مہیب کے وار نہیں کرتے۔"

"مگر محسن دلاور بھی تو خاصا خطرناک رانا ہو جائے تو ہمیں کیا فرق پڑتا ہے؟"

"انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ

THE DEVIL YOU KNOW
IS BETTER THAN
THE DEVIL YOU DONT KNOW

"وہ شیطان بہتر ہے جسے آپ جانتے ہیں، اس شیطان سے جس کو آپ جانتے ہی نہیں۔" محسن بولا۔

"اب ہم دلاور کی بیوی اور بیٹے کو بچا کے خود بھی محفوظ ہو جائیں گے۔ رانا ایجنڈ کمپنی اور پیڈیو کو پتا چل جائے گا کہ کامیاب ہونے سے پہلے ہی ان کے عزائم کو شکست ہو گئی ہے اور ان کی حیثیت آج بھی وہی ہے جو کل تھی۔ جب تک دلاور زندہ ہے اور اس کے وارث موجود ہیں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ قتل ہی کرنا ہوتا تو بہت پہلے دلاور اور اس کے سارے خاندان کو نیست و نابود کر دیتا۔ اب میں یا رابعہ غالب یا نادر۔ ہم میں سے کوئی بھی ان کے ہاتھوں مارا جاتا ہے تو یہ حرام موت ہو گی۔ چلو مانا کچھ بچ جائیں گے اور وہ ان ہوس پرست قاتلوں کے خلاف قانونی یا غیر قانونی کارروائی کریں گے مگر اس سے نقصان کی تلافی کیسے ہو گی؟ نہیں محسن! اس مرحلے پر جب معاملات ہمارے کنٹرول میں ہیں ہم جیتی ہوئی بازی ہار جائیں؟ یہ تو بڑی حماقت کی بات ہو گی۔"

"اوکے۔ مجھے بتا کیا کرنا ہے۔ کہاں جانا ہے؟"

میں نے کہا "سی ڈی اے انٹرپرائزز کے آفس۔ کسی کو بتائے بغیر مگر پوری طرح مسلح ہو کے۔ مولوی غلام حسین بعد میں آئے گا۔ جب ہم اندر پہنچ جائیں گے سب سے پہلے میں جاؤں گا۔ اس کے بعد آپ تشریف لائیں گے۔ ہم اندھیرا ہونے کے بعد کارروائی کریں گے۔ میں یہ لباس بدل کے چوکیدار کی وردی پہن لوں۔ رات کے وقت میں اپنی اوقات میں آ جاتا ہوں۔"

"وہ زیادہ بہتر ہو گی تجھے۔"

میں نے کہا "تو بیڈ کے نیچے سے ریوالور نکال لے اور خاموشی سے نکل جا۔ مولوی غلام حسین کو ساتھ لے جا۔ کسی کو پتا نہ چلے یہاں ورنہ مشکل ہو جائے گی۔"

محسن نے بیڈ کے نیچے سے باکس نکالا جس میں اب بھی بہت سا کارآمد اسلحہ ایسی ہی ضرورت کے لیے محفوظ تھا۔ اس نے اپنے لیے اعشاریہ چار پانچ کا ریوالور منتخب کیا جس پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔ ایسا ہی دوسرا ریوالور میرے پاس بھی رہتا تھا۔

باہر والے آفس میں منظور، رابعہ اور دلدار اپنے اپنے کیبن میں مؤکلوں سے نمٹ رہے تھے۔ ان کی فائلیں دیکھ رہے تھے اور انہیں قانونی معاملات کے اسرار و رموز سمجھا رہے تھے۔ ضخیم PLD کی کتابوں سے حوالے تلاش کر رہے تھے اور ساختہ کیلوں

کو دوا بات دے رہے تھے۔

محسن اور مولوی غلام حسین ٹہلتے ہوئے باہر گئے [illegible] کچھ دیر اوپر سے ہال کی تمام کا نظارہ کرتے رہے [illegible] اتر گئے۔ چند منٹ بعد میں چوکیدار کی وردی میں باہر آیا [illegible]

"چوکیدار۔ کہاں جا رہا ہے بھوتنی کے؟"

میں نے مسکینی سے کہا "آپ کے گھر جا رہا ہوں [illegible] پیغام بھجوایا تھا کہ آج رات آپ تو ہوں گے نہیں۔"

"اچھا اچھا۔ جاؤ، بس ذرا تیزی سے ہوشیار [illegible] نہیں وہ بات کرنے والے کی کوئی بھی چیز کاٹ سکتی ہے [illegible] کہا "ناک کان وغیرہ وغیرہ۔"

قینچی در اصل بیوی کی زبان کو کہہ رہا تھا۔ باقی بات [illegible] اعتراض تھی جس پر رابعہ نے بھی اسے گھور کے دیکھا [illegible] عجیب چیز تھا۔ میں سیڑھیاں اتر کے نیچے پہنچا تو محسن اور [illegible] حسین میری گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ تو مجھے راستے میں [illegible] اس کی نمبر پلیٹ بدل دی۔ اب یہ رابعہ کی گاڑی نظر آتی [illegible] اس وقت رابعہ اپنے آفس میں تھی۔ اس کی گاڑی بھی نیچے [illegible] تھی اور اس بات کے گواہ بھی کم نہ تھے۔

گاڑی کو زیرو ان روڈ کے موڑ سے کچھ آگے روک کے [illegible] مجھے اتار دیا۔ میں وہاں سے دلاور کے آفس کا گیٹ کچھ فاصلہ [illegible]

"ٹھیک پانچ منٹ بعد تم آ جانا" میں نے محسن سے کہا [illegible] مولوی غلام حسین سے مخاطب ہو گیا "تمہیں گھنٹی بجانے کو [illegible] دوں گا۔ جب تک گھنٹی کی آواز نہ سنائی دے اندر آنے کی [illegible] نہیں۔"

"اچھا جی۔ مگر یہ تو آپ لوگوں نے مجھے مروانے کا [illegible] آپ دونوں کے پاس بھرے ہوئے ریوالور ہیں، خالی ہاتھ [illegible] میں ہوں۔"

میں نے کہا "مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔"

گیٹ بند تھا لیکن کال بیل بجانے پر اندر سے [illegible] چوکیدار نمودار ہوا۔ میری وردی کو غور سے دیکھ کے اس [illegible] "کیا بات ہے، کس سے ملنا ہے؟"

میں نے کہا "رانا صاحب کے لیے خاص پیغام ہے [illegible] نہیں بتا سکتا۔"

"مگر رانا صاحب تو نہیں ہیں یہاں۔"

اس اطلاع پر خوشی کا اظہار میں نے اس کے منہ پر [illegible] رسید کر کے کیا۔ وہ گرنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے سنبھالا [illegible] اندر گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے کیبن میں ایک کرسی پر [illegible] چھوٹی کمرے کا جالی والا دروازہ کھول کے میں اندر داخل [illegible] پر بیٹھی ہوئی حسینہ کی جگہ خالی تھی۔ میں سیدھا گزر [illegible] کمروں میں جہاں دن کے وقت مختلف افراد اپنی اپنی [illegible] امور سر انجام دیتے تھے اس وقت کوئی بھی نہیں تھا [illegible]

[illegible] بھا نہیں بھا نہیں کر رہے تھے۔ مجھے مایوسی ہونے لگی۔ کیا [illegible] تھا یا رانا نے دلاور کی بیوی کو کہیں اور منتقل کر دیا [illegible] کا ایک کمرا بیڈ روم کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ [illegible] استعمال کی بہت سی چیزیں نظر آئیں۔ ڈریسنگ ٹیبل [illegible] کا سامان تھا۔ قالین پر سینڈل الٹے پڑے ہوئے تھے [illegible] میں کپڑے دیکھ کے میرے لیے شک کی کوئی گنجائش نہ [illegible] دلاور کی بیوی کا بیڈ روم تھا۔ سو اس کی مستقل رہائش گاہ [illegible] تھی۔ اس کے بچوں کا یہاں کوئی بیڈ روم نہیں تھا اور [illegible] کے استعمال کی کوئی چیز نظر آ رہی تھی۔ غالباً وہ عارضی قیام [illegible] تھی۔

ابھی میں اس کمرے سے نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے کہا "ہاتھ اوپر اٹھا کے سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"

میں نے تعمیل کی۔ فراز سے میں اسے شناخت نہیں کر سکا

"اب مہربان سے آہستہ آہستہ پیچھے مڑو میری طرف کرو۔" میں گھوم گیا "چہرہ تم سے اچھا تو نہیں ہے۔" میں نے سر اٹھایا۔

"بکواس بند کرو۔ کون ہو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" سوال کرنے والے کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا اور وہ شکل سے ہی خونی لگتا تھا۔

"میں رانا صاحب کے لیے خاص پیغام لایا تھا۔ ایک امریکی [illegible] ٹیکسلا کے اسپتال میں آیا ہوا ہے۔ وہ مصنوعی آنکھ کی [illegible] آنکھ لگا سکتا ہے۔ پھر رانا صاحب کا دوسرا بازار بھی کھل [illegible]"

"دوسرا بازار؟"

"ہاں۔ تم نے لطیفہ نہیں سنا۔ ایک بندہ تھا ایسا ہی۔ ایک [illegible] وہ بازار سے گزرتا تھا تو کہتا تھا۔ عجیب شہر ہے۔ جب [illegible] ایک طرف کا بازار کھلا ہوتا ہے۔ دوسری طرف کا بند۔ آتے [illegible] بھی بند ہوتا ہے۔ ایک لنگڑے نے کہا کہ یار میرے [illegible] سے بھی عجیب بات ہوتی ہے۔ جاتے ہوئے دونوں [illegible] ہو جاتے ہیں۔ واپس آتے ہوئے پھر چھوٹے بڑے [illegible] ہیں۔ در اصل اس وقت وہ ایک پاؤں فٹ پاتھ پر اور [illegible] پر رکھ کے چل رہا تھا۔"

"بھی نہیں آئی" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"تمہارے لطیفہ اسے سنانے کے لیے نہیں وقت گزارنے [illegible] تھا۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد محسن نے پیچھے سے اس کی [illegible] ریوالور رکھ دیا "کوئی ہمارے لطیفے پر نہ ہنسے تو یہ گستاخی ہوتی [illegible] گستاخی کرنے والے کو ہم دوسرا لطیفہ ایسے سناتے ہیں۔ [illegible] چھوڑ دو۔"

اس نے مزاحمت نہیں کی اور خاموشی سے ریوالور گرا دیا

لیکن یہ اس کی چالاکی تھی۔ جیسے ہی میں اس کا ریوالور اٹھانے کے لیے جھکا اس نے ایک دم جھک کے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور مجھے گھما کے اپنے سامنے ڈھال بنا لیا۔ موٹا ہونے کے باوجود وہ بہت پھرتیلا تھا۔ تاہم اس کی گرفت پہلوانوں والی تھی۔

میں نے کہا "واہ پہلوان۔ کیا داؤ لگایا ہے۔ کہاں زور کرتے رہے ہو۔"

اس نے ہانپتے ہوئے کہا "آپ بھی تم جیسے جاسے۔"

میں نے دونوں کہنیاں اس کی پسلیوں میں ماریں۔ پھر ایک لات پیچھے کی طرف رسید کی جو اس کی رانوں کے درمیان لگی۔ وہ بلبلا کے دہرا ہو گیا اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑایا اور گھوم کے پہلوان کے بال پکڑ لیے۔ اس کا سر اوپر اٹھا کے میں نے دو انگلیاں اس کی آنکھوں میں گھسیڑ دیں۔ وہ پاگلوں کی طرح چلانے لگا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ دروازے کے دوسری طرف محسن پہلے ہی پوزیشن لے چکا تھا۔ پہلوان آنکھوں پر ہاتھ رکھے فرش پر لوٹ رہا تھا اور دہائی دے رہا تھا "ارے مار دیا ظالموں نے۔ اندھا کر دیا۔"

ایک اور شخص ریوالور کے ساتھ دوڑتا ہوا آیا "ارے کیا ہوا، کیوں گدھے کی طرح۔"

میں نے سائڈ سے ایک ٹانگ آگے بڑھائی اور وہ اپنی ہی زور میں منہ کے بل گر گیا۔ وہ عام قسم کے چوکیدار تھے جن کا واسطہ چوروں سے پڑے تو وہ انہیں گولی چلا کے فرار ہونے پر مجبور کر سکتے تھے مگر یہاں انہیں کبھی اس قسم کی صورت حال کا سامنا نہیں ہوا تھا۔

میں نے دوسرے شخص کو اٹھنے کا موقع نہیں دیا اور آگے بڑھ کے اس کی گردن پر پیر رکھ دیا "حرکت کی تو گردن توڑ دوں گا۔ سیدھے پڑے رہو اور یہ ریوالور دور پھینک دو۔"

اس کا منہ دوسری طرف تھا اس لیے وہ مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا مگر اس نے نشانہ لیے بغیر ہاتھ اٹھا کے مجھ پر گولی چلانے کی حماقت کی۔ گولی چھت کی طرف نکل گئی مگر اس کے ساتھ ہی میں نے ریوالور والا ہاتھ پکڑ کے پاؤں کو جھٹکا دیا تو اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ وہ تھوڑی دیر تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔ اس وقت تک پہلوان آنکھیں کھول کر دیکھنے کے قابل ہو گیا تھا۔

اس نے بے بسی سے مرنے والے کو دیکھا "یہ۔ یہ تم نے کیا ظلم کیا۔ اس غریب کو مار دیا۔"

"غریب نے منع کرنے کے باوجود مجھ پر گولی چلائی تھی" میں نے پہلوان کو پھر بالوں سے پکڑ کے کھینچا اور سیدھا کھڑا کر لیا "بیگم صاحب کہاں ہیں؟"

اس نے انجان بننے کی کوشش کی "چوہدری دلاور کی گھر والی۔ کہاں قید کیا ہے اسے رانا نے۔ بتا دے تو تمہیں چھوڑ دوں گا ورنہ۔"

www.paksociety.com

"وہ نیچے… تہ خانہ" وہ ہکلانے لگا۔

عمارت میں ایک کمرا زیر زمین بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کا راستہ پچھلی طرف سے تھا۔ پہلوان اب بڑی فرمانبرداری دکھا رہا تھا اور بار بار درخواست کر رہا تھا کہ اس کی گردن نہ توڑی جائے۔ اس نے خود ہی نیچے جانے والے راستے کی لائٹ جلائی۔ خود ہی چابی لگا کے دروازے کا قفل کھولا۔ دروازے کے پیچھے روشنی تھی۔ اچانک میں نے دلاور کی بیوی کو دیکھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی رو رہی تھی مگر اب کھڑی ہوگئی تھی۔ اس سجے سجائے کمرے میں اسے قید تنہائی کے سوا کوئی تکلیف نہیں تھی۔ میں اسے اوپر بیڈ روم میں لے آیا۔

پھر میں نے کہا "چلو۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے ہیں۔"

اس نے پُرخوف نظروں سے مجھے اور محسن کو دیکھا۔ "تم… کون ہو؟"

میں نے کہا "تمہاری سکندر بخت سے بات ہوگئی تھی؟"

اس نے کچھ دیر سوچ کے سر ہلایا "کراچی سے فون کیا تھا اس نے۔"

"اور تم نے پولیس کو پیچھے لگا کے اسے پکڑوانے کی کوشش کی تھی۔ دغاباز عورت۔ تو نے جھوٹی قسم بھی کھائی تھی۔"

"وہ… میں نے… میں نے کچھ نہیں کیا تھا… میں مجبور تھی۔"

"وہ رانا کی حرکت تھی؟"

"ہاں۔ رانا نے ہی مجھے یہاں قید کر رکھا ہے۔ تین دن سے میں نے اپنے بچوں کو نہیں دیکھا۔ معلوم نہیں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا ان شک حراموں نے" وہ پھر رونے لگی۔

"رانا کو اکسانے والا کون ہے؟" استاد چیخ پڑا۔

اس نے چونک کے مجھے دیکھا "تم سب جانتے ہو۔ کیا تم… سکندر بخت تو نہیں ہو۔ وہ بھیس بدلنے کا ماہر ہے۔"

میں نے کہا "آج کل وہ تارزن کا بھیس بدل کے افریقہ کے جنگلوں میں چھلانگیں لگا رہا ہے۔ اس نے ہمیں بھیجا ہے کہ تمہیں بھی وہیں پہنچا دیا جائے۔"

"کہاں… میں اپنے گھر جاؤں گی۔"

"اپنے چوہدری دلاور صاحب سے نہیں ملو گی پہلے" میں نے کہا "ذرا دیکھ لو ان کو بھی ایک نظر۔ تمہارے مجرے نے ان کی کیا حالت کر دی ہے۔"

"تم ضرور سکندر بخت ہو" وہ بولی "تمہاری باتیں…"

"خاتون۔ باتوں کے لیے وقت نہیں ہے" میں نے کہا "تم چاہو تو منہ دھولو۔"

اس نے تیار ہونے میں دو منٹ لگائے۔ باہر آتے ہی میں نے منہ میں انگلی ڈال کے سیٹی بجائی تو سوزوکی خادم حسین گاڑی دوڑاتا ہوا گیٹ تک لے آیا۔ میں نے دلاور کی بیوی کو درمیان میں بٹھالیا۔ اس کے ایک طرف میں تھا اور دوسری طرف محسن۔ وہ بہت خوف زدہ تھی مگر ہمارا رویہ ابھی تک شریفانہ تھا۔

خادم حسین نے کہا "یہ کس بلا کو پکڑ لائے ہیں جی۔ تمام آفات کا مجموعہ ہے یہ عورت۔"

میں نے کہا "یہ اپنے چوہدری دلاور صاحب کی منکوحہ ہیں۔ ان سے ملنا چاہتی ہیں۔ کہتی ہیں دل بہت اداس ہے ان کے بغیر۔"

خادم سمجھ گیا "چلیں جی بڑے ثواب کا ہے یہ کام۔ بچھڑے ہوؤں کو ملوانا۔ لیکن یہ کچھ اور نہ دیکھیں تو اچھا ہے۔ آنکھیں کھلیں تو سامنے وہ ہوں۔"

خادم نے بڑی عقلمندی کی بات کی تھی۔ محسن نے دلاور کی بیوی کی آنکھوں پر اسی کے دوپٹے کو پٹی کی طرح باندھ دیا۔

پندرہ منٹ بعد گاڑی رکی تو میں نے کہا "مسز دلاور، ہم مجرم ہونے کے باوجود آپ کی مدد کر رہے ہیں۔ اگر ہم تمہیں اس تہ خانے سے نہ نکالتے تو شاید تمہاری کبھی دلاور سے ملاقات نہ ہوتی۔ تمہارے بچے اور تم سب مارے جاتے۔"

"اب میں اس کمینے رانا سے بھی نمٹ لوں گی۔ اور پیڈرو کو میں ایسا سبق دوں گی… مگر تم نے ایسا کیوں کیا؟" شدت جذبات سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

میں نے کہا "اس سوال کا جواب وقت آنے پر دیا جائے گا۔ ابھی تم ہم سے تعاون کرو گی تو فائدے میں رہو گی۔ تم دلاور سے ملنا چاہتی ہو نا۔"

"کیا تم… واقعی چوہدری صاحب سے ملاؤ گے مجھے۔ نہیں… تم مجھے قتل کر دو گے۔ اس دنیا میں نہیں ہوگی یہ ملاقات۔"

میں نے کہا "خاموشی سے جیسا ہم کہیں ویسا کرتی رہو۔ چند منٹ بعد تم چوہدری دلاور کو دیکھ سکو گی۔ زندہ سلامت اور ہنستا…"

اچانک وہ بے ہوش ہوگئی۔ یہ جذباتی کمزوری تھی یا جسمانی۔ اس کا بدن سرد پڑ گیا تھا اور وہ اب بھی سسکیاں لے رہی تھی۔ محسن نے اسے کندھے پر اٹھایا اور خیمے کے اندر لے گیا۔ پھر محسن نے مجھے کلیئرنس دی اور میں نے اسے لکڑی کے باکس میں منتقل کیا۔ اب مجھے اس کو نیچے تہ خانے میں اتارنا تھا۔ اور یہ کوئی مشکل نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کسی نے بھی ہمیں نہیں دیکھا ہے۔ میں نے محسن کو اوپر ہی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا۔ دلاور کی بیوی ایک ڈھیر کی صورت میں میرے ساتھ ہی بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اندھیرے میں ٹٹول کر اسکریو ڈرائیور کی مدد سے تختہ ہٹا دیا جو عین فرش کے شگاف پر تھا۔

نیچے گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی ڈالی تو دلاور کسی وحشی درندے کی طرح بھاگا۔ مجھے ڈر ہوا کہ یہ روشنی کا نامہ بر ہے۔ شکاری کی بندوق سے نکلنے والی گولی کو راستہ دکھانے والی۔ دلاور نے اپنے سارے کپڑے پھاڑ ڈالے تھے اور وہ مادر زاد برہنہ روشنی سے بچنے کے لیے ادھر ادھر دوڑ رہا تھا اور چلا رہا تھا۔ "مجھے مت مارو۔ مجھے مت مارو" وہ اپنے چہرے کو روشنی سے بچانے کے لیے ہاتھوں کی آڑ کر رہا تھا۔

میں نے دلاور کی بیوی کو آہستہ آہستہ نیچے لٹکایا اور اس کے ہاتھوں کو پکڑے رکھا۔ اس کے پاؤں فرش سے دو تین فٹ اوپر رہ گئے تھے اور وہ میرے ہاتھوں میں جھول رہی تھی۔ میں نے اسے چھوڑا اور اس کے ساتھ ہی خود بھی اندر کود گیا۔ ٹارچ میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

اسی وقت اچانک دلاور کی بیوی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی تلاشی نہ لے کر میں نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ اس سے بھی بڑی غلطی ہم نے اس پر بھروسا کر کے کی تھی۔ وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی صرف اداکاری کر رہی تھی۔ تریا چلتر سے بڑے بڑے مرد آگہی کے دعوے رکھنے والے ہار کھا جاتے ہیں۔ اس عورت نے ثابت کر دیا تھا کہ دلاور کی بیوی کوئی عام عورت نہیں ہو سکتی۔ نہ جانے کب اس نے ریوالور اٹھا لیا تھا اور ہمیں پتا نہیں چلنے دیا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ تہ خانے سے باہر آکے اس نے بیڈ روم میں رک کے آئینے میں اپنی صورت دیکھی تھی۔ میک اپ درست کیا تھا اور ایک منٹ میں بیگ اٹھا کے ہمارے ساتھ چل پڑی تھی۔ ریوالور یقیناً بیگ میں تھا جو اس نے موقع ملتے ہی ہماری نظر بچا کے گریبان کے سیف ڈپازٹ والٹ میں منتقل کر دیا جو قدرت نے صرف خواتین کو فراہم کیا ہے۔

اب وہ ریوالور کا رخ میری طرف کیے کھڑی تھی اور اس کی فاتحانہ مسکراہٹ کے جواب میں اپنی شکست کی کھسیانی ہنسی پیش کرنے کے سوا میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چشم تصور سے میں تنگ دھڑنگ بکھرے بالوں اور جھاڑ جھنکاڑ داڑھی والے دیوانے چوہدری دلاور کی جگہ خود کو دیکھ رہا تھا۔ ٹارچ فرش پر آڑی ترچھی پڑی تھی لیکن روشن تھی۔

ریوالور میرے پاس بھی تھا لیکن میری جیب میں تھا اور دلاور کی بیوی کے ہاتھ میں تھا۔ میری زندگی اور موت کے درمیان بس یہی فاصلہ تھا۔ جتنی دور یہ ریوالور تھا اتنی ہی دور موت کی سرحد تھی۔

میں رسک لے کر کوشش کر سکتا تھا کہ دائیں بائیں یا سامنے غوطہ مار جاؤں اور اس کے ساتھ ریوالور نکالتے ہوئے نشانہ لیے بغیر فائر کر دوں۔ گولی دلاور کی بیوی کے اس بازو پر لگے جس میں ریوالور تھا یا کہیں اور… ہر صورت میں اس کا نشانہ چوک جانے کے امکانات زیادہ تھے مگر عجلت میں نقصان بھی ہو سکتا تھا اور مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔

دلاور اب ایک کونے میں سمٹ کے کھڑا ہو گیا تھا جہاں تاریکی تھی۔ شاید وہ اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بیوی کا اس زنداں میں نظر آنا دلاور کے لیے ایک ذہنی شاک سے کم نہیں تھا اور بعض اوقات بجلی کے شاک سے ذہن کی بھٹکی ہوئی یادداشت بحال ہو جاتی ہے۔

میں نے رضاکارانہ طور پر اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ "ویری گڈ مسز دلاور۔ تمہاری اداکاری واقعی قابل تعریف تھی۔ اگر مجھے جیوری میں شامل کیا جاتا اور یہاں کوئی مقابلہ ہوتا تو میں پہلا انعام تمہیں ہی دیتا۔"

"فضول باتیں مت کرو" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور ریوالور کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

"یہ تم کیا کر رہی ہو۔ کیا فائدہ اس سے؟"

"مجھے فائدے نقصان کی پروا نہیں۔ آج تک میں نے کسی پر گولی نہیں چلائی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے… ریوالور چلانا نہیں آتا۔"

"تمہارا ہاتھ کانپ رہا ہے مسز دلاور… ایسا نہ ہو گولی چل جائے" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"دیکھو سکندر بخت۔ میں تمہیں مارنا نہیں چاہتی۔"

"پھر کیا چاہتی ہو تم…؟"

"میں… میں بس اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ دلاور کے ساتھ یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں… اور کچھ نہیں۔ اگر تم نے چالاکی دکھائی یا بہادر بننے کی کوشش کی…"

"تمہارا مطلب ہے کہ دیکھنے میں چالاک ہوں اور نہ بہادر؟"

"نہیں۔ تم بہت چالاک اور بہادر ہو۔ بڑے جوان مرد ہو۔ جوڈو کراٹے سب جانتے ہو لیکن اس ریوالور کی گولی کا مقابلہ تم نہیں کر سکتے۔ تم یہ مت سمجھنا کہ تمہارے مقابلے پر ایک کمزور اور بے وقوف عورت ہے۔"

"میں نے کبھی تمہیں بے وقوف نہیں سمجھا تھا لیکن اس وقت جو کچھ تم کر رہی ہو" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"مجھے باتوں میں لگانے کی کوشش مت کرو" وہ چلائی "میں فائر نہیں کروں گی سکندر۔"

"پلیز… پلیز مسز دلاور۔ آرام سے سکون سے بات کرو۔ دماغ کو ٹھنڈا رکھو۔ ذرا سوچو کہ مجھے مار کے تم یہاں سے کیسے نکلو گی؟ باہر میرے ساتھی بھی ہیں۔"

"مجھے کسی کی پروا نہیں۔ جو میرے سامنے آئے گا مارا جائے گا۔ اس ریوالور میں چھ گولیاں ہیں۔"

"کسی کو سامنے آنے کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ تمہیں اوپر سے گولی مار دیں گے" میں نے کہا "فائر کی آواز باہر سنائی دے گی۔ کیا فائدہ اس حماقت سے۔ کیا اس لیے میں نے تمہیں رانا کی قید سے رہائی دلائی تھی۔"

"تم مجھے اپنی قید میں رکھنا چاہتے تھے جیسے تم نے دلاور کو قید کر رکھا تھا۔"

"کیا تمہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے؟"

"میں نے اندازہ کر لیا تھا۔ میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔"

www.paksociety.com

اس لئے مجھے اس فرنچ وکیل کو ایک لاکھ روپے دینے پڑے مگر میرا اندازہ درست ثابت ہوگیا۔ تم نے مجھے لاہور سے فون کیا اور کہا کراچی سے بول رہی ہو۔ میں نے اس جھوٹ پر اعتبار نہیں کیا تھا۔ مگر۔۔۔"

"مگر پولیس کو میرے پیچھے لگادیا۔ تم نے تو قسم کھائی تھی۔۔۔؟"

"میں۔۔۔ میں تو اتنی جہاں ہوں وہ سب رانا نے کیا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ تم مجھ سے ملو۔"

"میں تم سے ملنے آیا تھا مسز ولاور۔ آج ہی دوپہر کے وقت۔"

"جھوٹ۔ تم آتے تو تمہاری لاش ہی واپس جاتی۔"

میں نے کہا "میں بھی جانتا تھا یہ بات۔ اس لئے میں خود سامنے نہیں آیا تھا۔ میں نے پہلے فرنچ وکیل کو بھیجا تھا۔ میں تو جانتا تھا کہ تم یہاں ہوگی مگر رانا نے اس وکیل کو صاف انکار کردیا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ کچھ اور باتیں بھی معلوم ہوئی تھیں مجھے جن سے مجھے شک ہوا تھا کہ باقی پارٹنر اب ولاور کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینکنا چاہتے ہیں تاکہ وہ کاروبار کے مالک ہوجائیں۔ ظاہر ہے انہیں اس کام پر صرف استاد پیڈرو نے ہی اکسایا ہوگا۔ اپنی جان بچانے کے لئے اس نے یہ صلاح بھی دی ہوگی کہ ولاور کی بیوی پر اور فیصل پر نظر رکھو۔ وہ دشمنوں سے ساز باز کررہے ہیں اور ولاور کی رہائی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ وہ دشمنوں کی ہر شرط مان لیں گے۔ اگر ولاور بچ گیا تو ہم مارے جائیں گے۔"

"مجھے ان کی نیت کی خرابی کا علم پر سے ہوا۔"

"اپنے اندازے کی بنیاد پر میں اس وقت وہاں پہنچ گیا تھا مسز ولاور۔ بہت برا سلوک کیا تھا میں نے۔ اس جنگلی کا اچھا صلہ دے نے میرے شوہر کا۔ کیا میں اندازہ نہیں کرسکتی کہ تم نے اس کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا ہوگا۔ پاگل کردیا ہے اسے تمہارے تشدد نے۔ اسے جنگلی کہتے ہو تم؟ اور جتنی اذیت میں تم نے ہم سب کو مبتلا رکھا۔ مجھے اور اس کے بچوں کو کیا میں جنگلی تھی؟"

میں نے اسے شدت جذبات سے کانپتے اور پھوٹ پھوٹ کے روتے دیکھا۔ ہسٹریا کی اس کیفیت میں وہ اچانک مجھ پر ریوالور خالی بھی کرسکتی تھی۔

"دیکھو۔ اب تم اس کے پاس ہو۔ تم اس کی دیکھ بھال کرو گی تو وہ بہت جلد نارمل ہوجائے گا۔ تمہیں یہاں لانے والا میں ہی ہوں اور آج اگر ولاور زندہ ہے تو میری وجہ سے ہے۔ رانا کی قید سے تمہیں کون نکال سکتا تھا۔۔۔ کسی کو علم ہی نہیں تھا اس سازش کا جو تمہارے اور ولاور کے خلاف ان سب نے کی تھی۔ ولاور کے ساتھیوں نے اس کا تختہ الٹنے والے پیڈرو نے کیا تھا پیڈرو جیسے ایک معمولی بدمعاش۔ وہ تمہے کا ملازم تھا ولاور کے ساتھ رہ کے وہ استاد پیڈرو ہوگیا تھا۔ اس نے میرے والد کو قتل کیا تھا۔ وہی میر شرافت علی کا قاتل تھا۔ وہی ولاور کو بھی مروا دیتا۔ تمہیں اور تمہارے بچوں کو سب کو ختم کردیتا تاکہ کوئی حق دار اٹھنے والا ہی نہ رہے۔ یہ الزام بھی مجھ پر آجاتا۔ ان پر کون شک کرتا۔ وہ آسانی سے مالک ہوجاتے۔ میں نے تمہیں اور تمہارے خاندان کو بچالیا۔ میں نے رانا کے عزائم کو خاک میں ملادیا۔ سازش کو ناکام کردیا۔ سوچو اگر میں تمہیں نکال کے نہ لاتا تو کون بچا سکتا تھا۔ بے شک مارنے اور بچانے والا اللہ ہے۔ مگر کیسے اس نے دشمن کو وسیلہ بنادیا۔"

وہ میری باتوں کے جال میں الجھ گئی۔ آہستہ آہستہ الفاظ کا جادو اس کے سر چڑھ کے بولنے لگا۔ میں نے نرمی سے "شرافت سے دلیل سے اور منطقی جواز سے اسے قائل کرلیا اور اس کی سوچ کو اپنی سوچ کا عادی کردیا۔ یہ میرا یقین تھا جس نے اس کو یہ ماننے اور یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ میں اس کا دشمن نہیں ہمدرد ہوں۔ جیسے پہلو کا رخ بدل گیا اور اس کی جارحیت کمزور پڑتی گئی۔ میں اس وقت جب میں سوچ رہا تھا کہ اب آگے بڑھ کے اس کے ہاتھ سے ریوالور اسی طرح لے لوں جیسے روتے روتے سوجانے والے بچے کے منہ سے دودھ کی مصنوعی نپل الگ کردی جاتی ہے" اس نے پھر سے ریوالور کا رخ میری طرف کردیا۔

"وہیں کھڑے رہو۔ تمہاری باتوں کا میٹھا زہر مجھ پر اثر نہیں کرسکتا۔ میں مانتی ہوں تمہارے احسان کو لیکن اس کا بدلہ میں اس وقت چکا دوں گی۔ میں تمہیں زندہ رہنے کا موقع دوں گی۔ لیکن تم میرے راستے میں مت آنا۔ مجھے روکنے کی کوشش مت کرنا۔"

میں نے کہا "کیسی باتیں کرتی ہو تم۔ میری مدد کے بغیر تم نکل سکتی ہو یہاں سے؟"

"تم۔۔۔ تم ان سے کہو گے کہ وہ بھی میری راہ میں حائل نہ ہوں۔"

میں نے ہنس کے کہا "ورنہ میں تمہاری بات نہ مانوں تو تم گولی مار دو گی مجھے؟ کیا اس کے بعد تم نکل سکو گی؟ اس کے علاوہ اپنے چوہدری صاحب کی حالت دیکھو۔ اس طرح تم لے جاسکتی ہو اپنے شوہر کو؟ اس کے پاس تو کپڑے بھی نہیں ہیں اور کپڑے باہر سے منگوانے ہوں گے۔۔۔ کون لائے گا کپڑے؟ اور کپڑوں کے بغیر اس کے ساتھ جیسی میں بھی جاؤ گی تو تمہارے پیچھے مجمع لگ جائے گا۔ سب تماشا دیکھنے والے ہوں گے۔ چوہدری ولاور کی طرف دیکھو ایک نظر۔ یہ پاگل ہی نہیں ایک وحشی جانور نظر آتا ہے۔ اس کو تم کیسے کنٹرول کرو گی۔ چلو مانا کہ یہ سارے کام اپنے طور پر تم کرلو گی لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ فرض کرو تم اسی حالت میں ولاور کے ساتھ اپنے گھر پہنچ گئیں پھر؟ صبح ہونے سے پہلے پولیس آجائے گی۔ خود پیڈرو اور ڈاکٹر شکیلہ یا رانا انہیں اطلاع کردیں گے کہ آپ کا مجرم گھر میں ہے۔ خود اس کی بیوی نے اسے کہیں چھپا رکھا تھا۔ ابھی ابھی لے کر آئی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر شبلی کے قتل کے الزام میں۔۔۔"

کیسے اعتبار کرلوں تم پر؟"

میں نے اچانک چلا کے کہا "نہیں ولاور۔"

ولاور کی بیوی نے چونک کر پیچھے دیکھا اور اسی لمحے میں نے اس کا ریوالور چھین لیا۔ اس نے واجبی سی مزاحمت کی مگر میں نے اس کا بازو مروڑ کے اسے پھر چھوڑ دیا۔ میں نے اس کی توجہ دوسری طرف مبذول کرانے کا پرانا طریقہ اختیار کیا تھا اور باتوں کے ذریعے ایک دم پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ اسے یہ خیال آیا ہوگا کہ ولاور نے اس پر حملہ کردیا ہے یا وہ اس پر کوئی چیز پھینک رہا ہے جب کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ الٹا میرے ولاور ختم کیا تھا اور جس کونے میں وہ بک کے کھڑا ہوا تھا میں سر ہوکے بیٹھ گیا تھا۔

"دغاباز۔ دھوکے باز" ولاور کی بیوی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"سوری مسز ولاور" میں نے کہا "جاؤ اب اپنے شوہر کو سنبھالو۔ تمہارے شوہر کو تمہاری توجہ کی ضرورت ہے۔ جاؤ زندہ نہیں ہے یہ تمہارا جس کے ساتھ تم نے اپنی عمر گزاری ہے۔ وہ پہچان نہیں سکے گا۔"

ولاور کی بیوی اس کی طرف بڑھی۔ چند قدم چل کے اس نے طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے کہا "میں موجود ہوں یہاں۔ اگر اس نے تم پر حملہ کیا تو بچاؤں گا تمہیں۔"

ولاور کی بیوی اس کے بالکل قریب پہنچ گئی "چوہدری صاحب!"

ولاور نے اسے غور سے دیکھا "تم۔ یہاں آگئی ہو؟ تم بھی۔۔۔!"

وہ کچھ اور قریب جاکے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی "میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں۔"

اس نے زور زور سے انکار میں سر ہلایا "بے وقوف عورت یہاں سے کون واپس جاسکتا ہے؟ یہ دوسری دنیا ہے۔"

"نہیں ولاور۔ تم اسی دنیا میں ہو۔ جہاں تمہارا گھر تھا۔ تمہارے بچے ہیں۔ میں بیوی ہوں تمہاری" وہ رونے لگی۔

"عورت کیوں ہے۔ کب تک رونے کی مرنے والوں کو۔ تو بھی جیسے میں نے دوسری شادی کی تھی۔ تو بھی دھوکا دیتا میرے استاد کو۔ حرام زادی کیا تو سمجھتی ہے کہ مجھے لیکن میں نے تجھے اس لئے قتل نہیں کیا تھا۔۔۔ بچوں کی ماں تھی ورنہ۔۔۔ تیرے ایک ایک آشنا کا ایک ایک کو لٹکا دیا تھا جس نے سوائے اس کے اسی نے لٹکانے لگا یا مجھے۔ مجھے یہاں لاکے منصوبہ میں نے اپنے لئے خود ہی بنایا تھا کیسا ہے؟"

ولاور سے لپٹ گئی "ایسی باتیں مت کرو۔ خدا کے لئے تم زندہ ہو۔ ٹھیک ہوجاؤ گے تم۔"

وقت انگیز جذباتی منظر تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ میں

"مجھے معلوم ہے یہ نیکی بھی تم نے کی ہے" وہ تلخی سے بولی۔

اوپر سے محسن نے جھانک کے کہا "کیا بات ہے؟ میں نیچے آؤں؟"

میں نے کہا "نہیں تم اوپر ہی رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

ولاور کی بیوی تذبذب کا شکار ہوگئی تھی "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں کیا کروں؟"

میں نے کہا "ان حالات میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ تم مجھ پر بھروسا کرو۔"

"تم پر بھروسا کروں۔۔۔؟" اس نے میری بات دہرائی۔

"ہاں۔ ورنہ تمہارے دشمن تم سے سب کچھ چھین لیں گے تمہارا شوہر تمہارے بچے تمہاری زندگی گھربار کاروبار۔ وہ کچھ نہیں چھوڑیں گے تمہارے پاس۔ ابھی وہ بہت پریشان ہوں گے جب وہ دیکھیں گے کہ تم ان کی قید سے نکل بھاگی ہو۔ ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ تمہاری مدد کرنے والا کون ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے بھولے سے بھی ان کے ذہن میں میرا خیال نہیں آسکتا۔ وہ ایک دوسرے پر شک کریں گے کہ شاید کسی نے غداری کی۔ کسی نے ولاور کی بیوی کو سب کچھ بتا کے ان کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ کوئی ڈر گیا یا کسی کو ضمیر کی خلش نے پریشان کردیا۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔ سوچیں گے کہ ایسا کون ہوسکتا ہے؟ ان کے درمیان اعتماد کی جگہ بے اعتباری شک اور خوف کا احساس حائل ہوجائے گا۔ اس صورت حال سے تم پورا فائدہ اٹھا سکو گی مگر آج نہیں۔ کل۔۔۔ اپنی پوزیشن کو مستحکم بنانے کے بعد۔ اپنی حفاظت کا پورا بندوبست کرنے کے بعد۔"

وہ خلا میں دیکھ رہی تھی "مگر۔۔۔ محفوظ تو میں یہاں بھی نہیں ہوں اور پھر میرے بچے وہ ان کو یرغمال بنالیں گے۔"

میں نے کہا "یہی وہ جگہ ہے جہاں تم اور تمہارا شوہر پورے اطمینان سے خود کو محفوظ سمجھ سکتے ہیں۔ جب خونی قاتل سڑک پر دندناتے ہوں تو حوالات میں یا جیل ہی زیادہ محفوظ رہتی ہے۔ تمہیں یہیں رہنا چاہئے مسز ولاور۔ اپنے شوہر کے ساتھ۔ باہر پولیس غدار اور نمک حرام تمہارے خون کے پیاسے پھر رہے ہیں مگر یہاں کوئی خطرہ نہیں۔"

"یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ لاؤ یہ ریوالور مجھے دے دو۔ میں جاکے تمہارے شوہر کے لئے کپڑے لاتا ہوں۔ کھانے پینے کا انتظام کرتا ہوں۔ رہنے تم دیکھ سکتی ہو کہ یہاں سب کچھ تھا۔ تمہیں بکسوں کے خالی پیکٹ نظر آرہے ہیں۔ یہ دیکھو یہ دوائیں بھی ولاور کے لئے ہم ہی لاتے تھے ورنہ یہ مرجاتا۔ ایک ڈاکٹر ہر روز اسے دیکھنے آتا ہے۔ قید میں گھر کا آرام تو نہیں ملتا لیکن ہم اس کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ ہم ولاور کو مارنا چاہتے تو نہ تہ خانے میں ڈال کے بھول جاتے۔ آج یہاں اس کا ڈھانچا نظر آتا۔"

www.paksociety.com

باہر نکل جاؤں لیکن دلاور کسی وقت بھی مشتعل ہو سکتا تھا۔ پاگل پن میں وہ ایسی باتیں کر رہا تھا جو حق ہوں گی مگر اس نے ہوش میں کبھی اپنی بیوی کے منہ پر نہیں کی تھیں۔

"مسز دلاور، میرا خیال ہے کہ میں ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔۔۔"

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی "نہیں۔۔۔ چوہدری صاحب کو لے چلو۔ ان کو کسی اسپتال میں داخل کرا دو۔"

"مجھے بہت افسوس ہے۔۔۔ کہ فی الحال ان کا باہر جانا ممکن نہیں۔۔۔ اور نہ تمہارا۔ سب کچھ یہاں آ سکتا ہے۔ ڈاکٹر، دوائیں، کپڑے اور جو کچھ تم کہو۔"

وہ سخت اعصابی کشیدگی میں اپنے ہونٹ کاٹتی رہی۔ "ٹھیک ہی کہا تھا میں نے۔ یہاں بھی قید ہی ہے میرے لئے۔"

"لیکن یہاں تمہاری زندگی کو کسی سے فوری خطرہ نہیں۔ تم کو تو خوش ہونا چاہئے۔ آج کتنے عرصے کے بعد تم کو پھر تمہارا شوہر مل گیا ہے۔ کتنی کوشش کی تھی تم نے اس کے لئے۔۔۔"

"اس کی آزادی کے لئے کوشش کی تھی میں نے۔" وہ تلخی سے بولی۔ "اب شوہر مل گیا ہے تو بچے بچھڑ گئے ہیں۔ ہم دونوں قیدی ہیں پہلے کم سے کم میں تو ان کی دیکھ بھال کر سکتی تھی۔"

"ابھی وہ کہاں ہیں؟"

"وہ جہاں بھی ہیں۔ وہیں رہیں۔ وہ انہیں" وہ تیز لہجے میں بولی۔

میں نے کہا "میرا ارادہ ہرگز یہ نہیں تھا کہ ان کو بھی یہاں لاؤں۔"

"میں سب سمجھتی ہوں سکندر بخت۔ انہیں تم کہیں اور لے جا کے قید کر دو گے پہلے شوہر کی مجبوری تھی۔ اب اولاد کی وجہ سے بے بس ہو جاؤں گی میں۔ ہم دونوں۔۔۔"

میں نے کہا "کیا شوکت علی رانا اور ڈاکٹر شاہ کو معلوم ہے کہ بچے کہاں ہیں؟"

اس کا چونکنا ہو گیا۔ "کیا وہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ تو بچے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ تمہارے بچے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں وہ ایک لیور ہوں گے ذریعہ ہوں گے تم پر دباؤ ڈال کے تم سے اپنی ہر بات منوانے کا۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے فرار سے وہ مشتعل ہو جائیں، انہیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ تم خود ان کی قید سے نکلیں اور تمہیں فرار میں مدد دینے والے ہم تھے۔ جیسے ہی انہیں پتا چلے گا کہ تم وہاں نہیں ہو، وہ سیدھے تمہارے گھر جائیں گے، ہم تمہارے بچوں کو محفوظ مقام پر منتقل کر سکتے ہیں۔"

"نہیں۔ میں نہیں بتاؤں گی کہ وہ کہاں ہیں۔ تم اتنے ہی مخلص ہو اور اچانک تمہارے دل میں اپنے دشمن کی اولاد کے لئے ہمدردی کے جذبات بیدار ہو گئے ہیں تو مجھے بھی ساتھ لے چلو۔"

"میں نے بتا دیا ہے کہ دلاور یہاں سے نہیں جا سکتا۔"

"میں دلاور کی نہیں، اپنی بات کر رہی ہوں" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر میرے مقابل آ گئی "تم رکھو اس قیدی کو۔"

"کیا مطلب۔ تم اپنے شوہر کو چھوڑ رہی ہو؟"

وہ طنز سے بولی "ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ یہاں سب کچھ آ جائے گا۔ ڈاکٹر بھی، دوائیں بھی اور کپڑے بھی۔ کیا اس کے لئے میرا یہاں موجود رہنا ضروری ہے؟ یہ شرط ہے کہ میں بھی تمہاری قید میں رہوں؟"

میں نے ایک لمحہ سوچ کے کہا "نہیں۔ ایسی کوئی شرط نہیں مگر باہر تم کو واقعی سے خطرہ تھا۔"

"میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔ میری حفاظت کے لئے ابھی ہے۔ میں پوری فوج ملازم رکھ سکتی ہوں محافظوں کی۔ تم ذمے داری کیوں لینا چاہتے ہو اپنے سر۔ بس مجھے میرے بچوں کے پاس پہنچا دو۔ اس کے بعد میں جانوں، میرا کام۔ مجھے تمہارا معلوم کون سی جگہ ہے۔ کسی کو کیا بتا سکتی ہوں میں۔ مجھے اطمینان ہے کہ دلاور زندہ ہے۔ تم نے مجھے اس سے ملوا دیا۔ یہی احسان کافی ہے تمہارا۔"

"او کے مسز دلاور۔ جیسی تمہاری مرضی" میں نے کہا۔ ہاں دلاور کی بیوی کے سلسلے یہ بھی حیرانی کی بات تھی۔ اس کا خیال ہو گا کہ میں اس کی خواہش کو مسترد کر دوں گا۔ میرا تو مقصد ہی اسے یہاں لا کے قید کرنا تھا اور شاید اس کے بعد کسی بہانے سے بچوں کو بھی حفاظت کے نام پر کہیں ایسی جگہ لے جانا تھا جہاں وہ اپنا جائیں۔

اب اس نے شرمسار اور مجرمانہ نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا "چوہدری صاحب، میں جاؤں؟"

دلاور چلانے لگا "نہیں، نہیں۔ مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔ مجھے بھی لے چلو اپنے ساتھ۔"

اس نے ضبط سے کام لیا "میں پھر آ جاؤں گی۔ میں تمہارے لئے کپڑے لاؤں گی۔ دوائیں لاؤں گی۔ مجھے بچوں کے پاس جانا ہے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والا بھی تو ہونا چاہئے کوئی۔"

"ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ مجھے یہاں کسی چیز کی ضرورت نہیں میں تو مر چکا ہوں نا۔ بچوں کو ماں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا بچوں کو باپ کی ضرورت نہیں ہوتی؟"

میں نے کہا "اب وقت ضائع مت کرو باتوں میں۔ وہ بچے تو ہاتھ سے جائیں گے۔"

"تم۔۔۔ ان کا خیال رکھو گے نا؟" وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی

"ہاں۔ جس حد تک ایک قیدی کا جیل میں خیال رکھا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ ہی خیال رکھا ہے اب تک۔"

"تم انہیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"اس مسئلے پر یہاں بات نہیں ہو سکتی۔ میں نے کچھ شرائط پیش کی تھیں۔ تم نے کسی کا جواب نہیں دیا۔"

"میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔"

"ابھی تم اس پوزیشن میں نہیں ہو۔ تم سے بعد میں بات کریں گے مسز دلاور۔ جب حالات پر تمہاری گرفت مضبوط ہو جائے گی۔"

"میں سب ٹھیک کرلوں گی۔" اس نے بڑے عزم سے کہا اور ایک دم پلٹ گئی۔ میں نے پھر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔

دلاور اس کے پیچھے دوڑا "کہاں جا رہی ہو؟"

میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا "جا کے چپ چاپ وہیں بیٹھ جاؤ۔"

وہ رک گیا اور مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ "دیکھو۔ اس کو کچھ مت کہنا۔ یہ ماں ہے میرے بچوں کی۔"

دلاور کی بیوی نے ایک سسکی لی اور میری مدد سے سیڑھیاں چڑھ کے باہر نکل گئی۔ میں نے اوپر پہنچ کے محسن کو دیکھا۔ وہ بڑی بے چینی سے خیمے کے قریب ٹہل رہا تھا۔ میرے ساتھ دلاور کی بیوی کو واپس آتا دیکھ کے اسے حیرانی ہوئی "کیا بات ہے۔ اتنی دیر کیوں ہو گئی؟"

میں نے کہا "اتنی زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی۔ گاڑی کہاں ہے۔ خاتون کو اپنے گھر جانا ہے۔"

اس بار محسن نے ہیٹی بجائی اور مولوی خادم حسین جو سامنے کی ایک گلی میں کار لئے اشارے کا منتظر تھا فوراً نمودار ہو گیا۔

"آپ کہاں جائیں گی؟" محسن نے پوچھا۔

"مجھے ریگل بس اسٹاپ پر اتار دو۔ آگے میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ کوئی ٹیکسی لے لوں گی یا گھر فون کر کے گاڑی منگوا لوں گی۔ میں تمہیں اپنے گھر کا راستہ بھی دکھانا نہیں چاہتی تھی۔"

"مجھے امید ہے کہ ریگل پر تم موقعے سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہنگامہ نہیں کرو گی۔ کوئی فائدہ نہیں ہو گا اس سے" میں نے کہا۔

وہ دلاور کے خیال سے بہت ملول تھی۔ اس کا وجود متضاد اور مخالف جذبات کی رسا کشی میں دو نیم ہو رہا تھا۔ ایک طرف شوہر تھا جس کی حالت بیوی کی مکمل توجہ اور نگہداشت کا تقاضا کرتی تھی۔ دوسری طرف اولاد تھی جس کے تحفظ کی ذمے داری اس پر آ گئی تھی۔ خود اس کی جان تائید ایزدی کے باعث بچ گئی تھی۔ قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ مجھے ان گنت موقع یاد تھے جب میں اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو گیا تھا مگر پھر غیب سے کوئی حکم صادر ہو گیا تھا۔ کوئی انتظام، کوئی کرشمہ، کسی معجزے کا ظہور ہو گیا تھا اور میری جان بچ گئی تھی۔ آج اسی دست غیب نے یہ کام مجھ سے لیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال نے امکان کی اور امکان نے یقین کی صورت اختیار کر لی تو میں دلاور کی بیوی کو قید سے نکال لایا۔ اس قید سے دلاور کی بیوی کو صرف موت رہائی دلا سکتی تھی اور اس کے خواب و خیال میں بھی نہ ہو گا کہ اسے بچانے کے لئے خود سکندر بخت آ جائے گا۔ ایسے وقت میں جب دوست ہی دغا دے چکے ہوں، دشمن سے کوئی کیا توقع رکھ سکتا ہے مگر میں اس رب العالمین کی

مشیت کاملہ کی دلیل ہے کہ مارنا یا زندہ رکھنا اس کے اختیار میں ہے کسی بندے کا فیصلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔

گاڑی کے روانہ ہوتے ہی میں نے کہا "مسز دلاور۔ اگر بالفرض تمہیں بچے گھر پر نہ ملے۔۔۔؟"

"نہیں نہیں۔ ایسا مت کہو، یہ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "کل جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا تھا یا ہونے والا تھا کیا ہو سکتا تھا؟ ابھی تم نے سوچا تھا کہ ایسا بھی ممکن ہے کہ دلاور جس پر سب سے زیادہ بھروسا کرتا تھا وہی تمہاری جان کے در پے ہو جائیں اور تمہیں دلاور کا سب سے بڑا دشمن بچانے آ جائے۔"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے کہا "گھر جانے سے پہلے پولیس کو بلا لینا۔ دلاور کے حالات تمہارے کام آ سکتے ہیں۔ صاف بتا دینا کہ تمہیں اپنی اور بچوں کی زندگی خطرے میں محسوس ہوتی ہے۔ پولیس اگر تم سے پہلے پہنچ جائے تو اچھا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ گھر میں موجود ہوں، بچوں کو قبضے میں لے چکے ہوں اور تمہارے منتظر ہوں۔ پورے اعتماد کے ساتھ گھر میں بیٹھے ہوں کہ فرار ہو کے تم کہاں جا سکتی ہو۔ تم بھی تو اپنے گھر جاؤ گی۔ وہ تمہیں پھر پکڑ لیں گے اور اس بار بچوں سمیت۔"

"ہاں۔۔۔ یہ ہو سکتا ہے" اس نے پریشانی سے کہا۔

"تم ایسی اندھی بادشاہت پر بھروسا کر سکتی ہو۔"

"نہیں۔ میری حفاظت کرنے والے بہت ہیں۔ وہ فوراً پہنچ جائیں گے اور ان سب کو پکڑ لیں گے۔"

میں نے ہنس کے کہا "کس جرم میں؟"

"یہ مجھ پر حملہ کرنے کی سازش۔"

میں نے کہا "کون مانے گا تمہاری بات؟ کون یقین کرے گا تم پر؟ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟ کوئی گواہ تمہارے سوا؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی "مگر وہ سمجھ جائیں گے۔"

"تم نہیں سمجھتی وہ۔ پولیس کے سامنے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمہارے ساتھ رانا اور ہیڈ ہو نے کیا کیا تھا۔ نہ انہیں بتانا ضروری ہے کہ تم وہاں سے نکلنے میں کیسے کامیاب ہو گئیں۔ ہماری تو کسی کا نام رکھا نہیں جا سکتا۔ تم کہہ سکتی ہو کہ کچھ ماہر دشمن پشت میں خنجر گھونپنے والے اور نمک حرام ہیں۔ تو تمہارے جانثار بھی ہیں اور انہوں نے جان پر کھیل کے تمہیں بچا لیا۔"

"کیا تمہارا نام نہیں لوں گی۔ فکر مت کرو۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے فکر کرنے کی۔ تم سو بار نام لو میرا۔ مانے گا کون۔ زخم خوردہ سانپ زیادہ خطرناک ہوتا ہے مسز دلاور۔ پہلی چال کے غلط ہو جانے سے چڑھ دوڑیں گے اور رانا تخت تک کے لئے لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے آئندہ کے لئے تمہیں زیادہ ہوشیار رہنا ہو گا۔ اگلی بار وہ کیا بندوبست کریں گے۔ وہ شرمندہ ہونے والے یا ہمت ہارنے والے لوگ نہیں ہیں۔"

www.paksociety.com

"مجھے معلوم ہے۔ وہ مظلوم بن کے اپنی صفائی پیش کریں گے اور خود کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے دس جھوٹ بولیں گے مگر میں ان کو صاف بتا دوں گی کہ اب ان پر اعتبار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"کاروباری معاملات میں تم رلاور کی جگہ فیصلے نہیں کر سکو گی۔ فی الحال ان مسائل سے خود کو الگ کر لو۔ ان پر واضح کر دو کہ جب رلاور آئے گا تو خود ہی ان سے نمٹ لے گا اور وہ ابھی مرا نہیں۔ زندہ ہے۔ اگر وہ مجرم ہے تو پولیس کی نظر میں۔ اس کے روپوش رہنے سے یا گرفتار ہونے سے اس کی کاروباری حیثیت میں فرق نہیں پڑتا۔ تم ایک ترپ کا پتا پھینک کے ان کے جارحانہ عزائم کی راہ میں دیوار کھڑی کر سکتی ہو۔ تم کہہ سکتی ہو کہ شاید بہت جلد رلاور کی طرف سے تم کو کاروباری معاملات میں جنرل پاور آف اٹارنی حاصل ہو جائے گی۔ اس کے بعد تمہارے فیصلوں کو بھی قانونی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ تمہیں وہی اختیارات حاصل ہو جائیں گے جو رلاور کو حاصل تھے۔ ان کی توانائی مرجائے گی یہ سن کے وہ سمجھیں گے کہ تمہارا رلاور سے رابطہ ہے اور اس کا مطلب نہ نکال لیں گے کہ یہ رابطہ تمہاری اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے جو تم دشمنوں سے مل کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کر رہی تھیں۔"

محسن اور مولوی غلام حسین بالکل خاموش رہے تھے۔ غلام نے بولنا خلاف مصلحت سمجھا تھا اور محسن نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ گاڑی ونگل چوک سے گزری تو میں نے اس کی پٹی کھول دی۔ رلاور کی بیوی نے ایک گہری سانس لی اور روانہیں آنکھیں کھولی تھیں۔

"ٹھیک ہے سکندر بخت۔ تمہارے اس احسان کا قرض باقی رہے گا۔" اس نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

میں نے کہا "میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ نہ یہ میرا اخلاقی فرض تھا اور نہ انسانیت کا تقاضا۔"

"پھر تم نے یہ سب کیوں کیا تھا؟"

"مسز رلاور۔ جب میں نے تم سے بات کی تھی۔ اس وقت میں واقعی کراچی میں تھا اور کل پھر کراچی چلا جاؤں گا۔"

"اور چوہدری صاحب کا کیا ہو گا؟"

رلاور قانون کا مجرم ہے۔ اس پر قتل کا الزام ہے۔ اس کے خلاف ثبوت اور گواہی کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ ابھی تک وہ مفرور تھا۔ بہت جلد وہ گرفتار کر لیا جائے گا پھر قانون اسے جو سزا چاہے دے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ کسی کو رلاور سے ملنے کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ اب تم خود اس سے مل آئی ہو لیکن خود تمہارے حق میں یہ بہتر ہے کہ تم کسی سے بھی اس ملاقات کا ذکر نہ کرو۔"

"میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ یہی کہوں گی کہ وہاں سے سیدھی گھر آئی ہوں۔ اگر رونے چلے۔ میرا مطلب ہے رانا اور پیڈرو میں سے کوئی بھی نہ ملا تو میں فوراً گھر سے نکل جاؤں گی۔ ایک بہت محفوظ ٹھکانا ہے میرے پاس اور اب میں حفاظت کا موثر بندوبست بھی کر لوں گی۔"

"میں نے تمہارے سامنے چند شرائط رکھی تھیں؟"

"ہاں۔ مجھے یاد ہے۔ میں نے کوشش کی تھی غالب اور ماند کے بارے میں معلوم کرنے کی لیکن اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا مجھے۔ رانا نے بدتمیزی کی میرے ساتھ اور پیڈرو نے کہا کہ تم کیوں پوچھ رہی ہو۔ تمہارا کیا تعلق ان معاملات سے۔ اگر ہم نے تمہیں بتا دیا تو تم انہیں بتا دو گی۔ سکندر بخت کو یا اس کے حواریوں کو۔ آج کل تم اور تمہارا جبار ان سے بہت قریب ہو رہے ہو۔ یہ مت بھولو کہ وہ تمہارے شوہر کو پھانسی پر لٹکانا چاہتے ہیں۔ وہ تمہیں بے وقوف بنا کے ہر بات معلوم کر لیں گے اور تمہارا خیال ہے کہ تم پر رحم کھاتے ہوئے رلاور کو چھوڑ دیں گے تو یہ تمہاری احمقانہ بھول ہے۔"

میں نے کہا "میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسٹیڈ پیڈرو کو غیر مشروط طور پر میرے حوالے کر دیا جائے۔"

"میں... یہ میں کیسے کر سکتی ہوں۔ تم خود ہی سوچو۔ یہ ممکن ہے کہ میرے کہنے سے رلاور اپنے جرائم کا اعتراف کر لے گا۔ ابھی تو وہ تمہاری قید میں ہے مگر وہ آزاد ہوتا تب بھی یہ ناممکن تھا کہ خود کو قانون کے حوالے کر دیتا۔ تم جانتے ہو وہ ایسا تو ہرگز نہیں ہے۔ اپنی مرضی سے گلے میں پھانسی کا پھندا کون قبول کرتا ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ آئندہ ہمارے درمیان اس مسئلے پر بات نہیں ہو گی۔" میں نیچے اتر گیا اور رلاور کی بیوی کو راستہ دے دیا۔ "اب تم جا سکتی ہو۔"

گاڑی اسے بس اسٹاپ پر چھوڑ کے آگے بڑھ گئی۔ اس وقت رات کے نو بج کر بیس منٹ ہوئے تھے پھر تقریباً پونے دس بجے ہم واپس پہنچے تو آفس میں رابعہ منظر اور رفتار کے سوا کوئی نہیں تھا۔

"السلام علیکم۔ حضرات اور خاتون۔" میں نے کہا۔

"کہاں سے تشریف لا رہی ہیں شاہی سواریاں؟" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "ہم ایسے ہی ذرا دل پشوری کے لئے گئے تھے اپنے مولوی غلام حسین کے ساتھ۔"

منظر کو موقع مل گیا "میں نے ٹھیک کہا تھا۔ مولوی غلام حسین تم واقعی بڑے حرامی ہو۔ اسی ہسپتال چھیل چھبیلی چھک چھلو کے پاس گئے تھے؟"

غلام بھڑک اٹھا "پھر وہی لغو بات۔ منظر صاحب اس قدر غیر شائستہ زبان بازاری لوگ بولتے ہیں۔"

"تم بھی تو بازار سے ہی آئے ہو اسی بازار سے۔"

"اس بازار سے؟ کیا مطلب ہے جی.. خدا کا خوف کرو

تو بہ دراصل تمہی سب کا کھانے پر انتظار کر رہی ہے۔"

"ہم سب میں شامل نہیں ہیں رابعہ بی بی۔ ہم چلیں اپنے گھر عزیزاً"

"تمہیں اب بھی چلیں۔"

"میں نہیں جا سکتا۔ میرے سولہ لخت جگر فطار میں بھوکے بیٹھے ہوں گے اور ان کی اکلوتی ماں لنگر خانے کی انچارج انہیں سنبھال کر رہی ہوگی بڑی مشکل سے۔ آج اس نے بھی کہا تھا کہ ماموں کھانا کھائیں گے۔"

"کیا کوئی خاص بات ہے آج؟" رابعہ بولی۔

"ہاں۔ کوئی بات ضرور ہوگی۔ کسی کی سالگرہ ہوگی شاید۔ مجھے ابھی بھی نہیں رہتا۔ ہر ہفتے کسی بچے کی سالگرہ ہو تو کون کیسے یاد رکھے۔" منظر سوچتے ہوئے بولا "ارے ہاں۔ آج تو اسکول کے سالانہ امتحان کا نتیجہ تھا۔ سب اپنی اپنی رپورٹ لئے بیٹھے ہوں گے رابعہ تم جاؤ ان کے ساتھ۔"

وہ ایک دم بریف کیس اٹھا کے بھاگ گیا۔ مجھے اپنی چوکیدار کی وردی بدلنی پڑی۔ رابعہ مجھے اپنی گاڑی میں لے جانا چاہتی تھی مگر اس سے دروازہ نہیں کھلا پھر میں نے چابی لگا کے دروازہ کھول دیا۔

"اب یہ چابی نہیں لگ رہی ہے" رابعہ نے اگنیشن سوئچ میں چابی گھما کے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"لگے گی بھی نہیں" میں نے کہا "یہ میری گاڑی ہے۔"

"کیا؟" اس نے خفگی سے کہا "یہ کیا بدمعاشی ہے۔ اس کا نمبر۔"

میں نے اسے ٹوکا "نمبر سے کیا ہوتا ہے۔ تم میری گاڑی کا نمبر نکالو۔ ایک اسٹانی نمبر پلیٹ ہے میرے پاس دیکھ لو۔"

"اچھا یہ بات ہے؟"

میں نے کہا "مگر تمہارے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ کل کو کسی نے اپنے ماتھے پر لکھ لیا سکندر بخت تو تم اس کے ساتھ چل پڑو گی۔ جیسے نمبر دیکھ کے گاڑی کو اپنا سمجھ لیا تھا۔ فرق محسوس نہیں ہوتا؟ پہچان کیا ہے گدھے گھوڑے کی؟ چلو ہٹو یہاں سے۔ یہ گاڑی تم سے نہیں چلے گی۔"

"تمہاری طرح اس کا بھی دماغ درست کرنا پڑے گا" رابعہ اتر کے دوسری طرف سے میرے ساتھ آ بیٹھی "جیسا سوار ویسی سواری ہے۔"

"سوار تمہارا ہے۔ اسے جو چاہو کہو۔ سواری کو کچھ مت کہنا گاڑی بے قابو ہو جائے گی۔" میں نے کہا "اس کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔ خاندانی چیز ہے۔"

"مگر اتنی تو تمیز استعمال کرو تاکہ یہ بھی جلد مجبور دوسری گاڑیاں تمہارے نکلنے کو گیا ہیں" اس نے کہا اور پھر اچانک سوال کر دیا "تم کہاں گئے تھے تم لوگ؟"

کچھ"

"دل پشوری کے لئے کہاں لے گئے تھے ان معصوم نوجوانوں کو۔ تمہیں تو اس محلے میں دیکھ کے سب سمجھے ہوں گے کہ شاہی مسجد سے نکلا ہے۔"

میں نے محسن سے کہا "یار ہم نے تو سمجھا یا بھی تھا کہ ادھر جانا ٹھیک نہیں کوئی دیکھ لے گا۔"

محسن نے سہلایا "غلام حسین نے کہا کہ میں تو آتا رہتا ہوں مجھے آج تک کسی نے نہیں دیکھا اور ایک راستہ ہے وہ بھی۔"

"غلام نے کہا تھا کہ میری تو ایک رشتے کی پھوپی کا گھر اسی طرف ہے۔ شاہی محلے میں شرفا بھی رہتے ہیں۔"

"لوگ یا نے کھانے بھی جاتے ہیں۔"

غلام حسین رنجیدہ ہو گیا "بس جی سکندر صاحب ایسا مذاق مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اب آپ اجازت دیں مجھے۔ محسن صاحب کو فریج آئی ہے۔ میری کوئی ضرورت نہیں رہی۔"

رابعہ نے مجھے اور محسن کو گھورا "غلام۔ اتنا عرصہ ہو گیا تمہیں ان لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے ابھی تک تم سمجھے نہیں کہ ان لوگوں کی زبان قابو میں نہیں ہے اور تم چڑتے ہو تو یہ چڑا کے مزے لیتے ہیں۔ کیوں جان جلاتے ہو اپنی۔"

منظر نے ایک دم اٹھ کے غلام حسین کا منہ چوم لیا۔ "ارے میری جان۔ اب تمہیں جانے کون رسے گا۔ ہم تو مرتے ہیں تمہاری انہی اداؤں پر۔ اسی نورانی چہرے پر۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ چھوڑیں منظر صاحب۔ میرا گزارا نہیں ہو سکتا آپ جیسے بے ہودہ شخص کے ساتھ" غلام حسین کا رنگ لال ہو گیا۔

"اور تمہارے بغیر میرا گزارا نہیں ہو سکتا۔ میں بیوی کو چھوڑ سکتا ہوں تمہیں نہیں۔"

"کسی دن میں خنجر گھونپ دوں گا جی آپ کے اور خود بھی مر جاؤں گا۔" غلام حسین پر رابعہ کی بات کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"گھونپ دینا خنجر بھی۔ میری تو وصیت ہے کہ مجھے اور تمہیں ایک ہی کفن میں ایک ساتھ دفن کیا جائے۔ قیامت تک ہم جدا نہ ہوں" منظر نے گلا پھاڑ کے ہنسنا شروع کیا تو اس کا سارا بدن ہلنے لگا۔

رفتار نے کہا "اب چلیں جی۔ کتنی بار فون آچکا ہے گھر سے۔"

"بے یار جب نئی شادی ہوتی ہے ناں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بیویاں فون پر ادائیں دکھاتی ہیں اور دور رلاتی ہیں۔ نئی بھوتنی کا سب کام چھوڑ کے دوڑتا ہے اور جب ہو جاتے ہیں سولہ بچے..." اس نے ایک آہ بھری "پھر آدمی کسی کام کا نہیں رہتا۔ سوائے مولوی غلام حسین کے کام کے۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "دل پشوری کا مطلب سمجھتی ہو تم؟ بقول غالب
سنہ سہی بوصل تو حسرت ہی سہی۔"
"کسی نے تمہاری بات کا یقین نہیں کیا تھا۔"
"تم نے بھی نہیں۔ افسوس مس رابعہ بیسویں صدی میں ایسا بھی ہو گا یہ کسی نے سوچا تھا۔ لیلیٰ بھی کہہ سکتی تھی مجنوں سے کہ جھوٹ مت بولو۔ تم صحرا نوردی کر کے نہیں قلم رکھ کے فریب ہو اور کہتی تو مجنوں۔"
"کیا کرنا مجنوں۔ شرم سے ڈوب مرنا۔"
"نہیں میرا خیال ہے وہ جھوٹ نبھانے کے لیے دس جھوٹ اور بولتا۔ اچھا جھوٹ بولنے کی پریکٹس کرتا۔"
"تم اب کیا کہتے ہو؟ کہاں گئے تھے؟"
"ہم... ہم تینی میں اور محسن۔ ایک تھانیدار اور دوسرا رستم جہاں سے نیچے سیدھے ایک تھانے میں۔ وہ تھانہ تھا ایک انتہائی خطرناک مقام پر۔ جہاں خونخوار مسلح پہرے دار توپ اور بندوقیں لیے کھڑے تھے۔ ہم نے ایک ایک کو خالی ہاتھوں سے ٹھکانے لگا دیا۔ بلکہ جہنم رسید کیا اور تھانے کی قید سے دلاور کی بیوی کو یوں نکال کر لے گئے جیسے ... جیسے جب کترا پرس نکال کر لے جاتا ہے۔ معاف کرنا اس وقت کوئی اچھی مثال ذہن میں نہیں آئی۔ مطلب یہ کہ بڑی صفائی سے۔ ایسے کہ کسی کو پتا بھی نہیں چلا اور ہم نے اسے پہنچا دیا اپنے چوہدری دلاور صاحب کے پاس۔ ٹھیک کہا نا؟ تجلی کا کام عنقریب ابھرے گا۔"
"نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ۔"
اب اسے بتانا ضروری ہو گیا تھا۔ پونے دو گھنٹے کی روداد کو میں نے اختصار کا اعلیٰ استعمال کرتے ہوئے دس منٹ میں سمیٹ لیا اور گھر پہنچنے سے پہلے رابعہ کا موڈ بھی ٹھیک ہو گیا۔
"اب مجھے تشویش ہے کہ بعد میں کیا ہوا؟"
"ہم اسے گھر پہنچا کے آ گئے۔"
"یہ تم طنز کر رہی ہو نا؟" میں نے مسرت سے کہا "جل بھن کے؟"
"جی نہیں۔ میں عقل کی بات کر رہی ہوں۔"
"اچھا!" میں نے سخت حیرانی کا اظہار کیا "اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو کیا ہم روکنے والے کون ورنہ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوا اعلان کرے کہ یا ظرین اب میں آپ کو ہنس کی چال چل کے دکھاتا ہوں۔ یا اونٹ کہے کہ میں سوئی کے ناکے سے گزرنے کا مظاہرہ کروں گا۔"
"ایسے تو بات نہیں ہو سکتی" رابعہ بگڑ کے باہر دیکھنے لگی۔
"جسٹ سوری۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ تم غلطی سے بھی عقل کی بات کرنے کی اہل نہیں ہو۔ تھوڑی بہت عقل تو اللہ تعالیٰ نے چرند پرند کو بھی دی ہے اور آخر میں تم کو بھی بچی کھچی میں سے اپنا حصہ ضرور ملا ہو گا۔ میں تو تمہیں سمجھ رہا تھا۔ یہ دیکھ رہا تھا

کہ تم بیچ بچن سکتی ہو یا نہیں۔ اب دیکھو تا اس وقت تم صوفے پر تمہیں کوئی لگ رہی ہو زرکیل نہیں۔"
"زرکیل تو میں عقل کے بغیر ہی بن گئی تھی۔ تمہاری مہربانی سے۔"
"افسوس کہ میں اس وقت تمہارے آفتاب حسن سے دور سے بہت دور گردش کر رہا تھا۔" میں نے کہا "ورنہ شکل دکھا کر تمہیں بچا ہی لیتا۔"
"آپ تو لندن کے آسمان کی کہکشاں میں بہت اونچے اڑ رہے تھے۔"
میں نے کہا "لندن اور پیرس لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس وقت تم کو گھاس ڈالنے والا کوئی نہیں تھا۔ یعنی ممکن ہے کہ کوئی احمق امتحان لینے والا خود امتحان میں پڑ گیا ہو اور اس نے تمہاری صورت دیکھ کے انکار نہ کیا ہو۔ پرچہ دکھایا ہی نہ ہو گا تو تم ایک بات کر رہی تھیں۔ غالباً عقل کی بات۔ میں تمہارا اشارہ تھا اور مجبوراً۔"
رابعہ جھنجلا کے بولی "جنہیں مت سنو۔ تم بولتے رہو میں اپنے کان بند کر لیتی ہوں۔"
"او کے۔ میں چپ بالکل چپ۔"
"یہ بتاؤ کہ دلاور کی بیوی گھر تک پہنچی تو کیا ہو گا؟ اگر تھانے دار کو پتا چلا کہ پھر گرفتار کرنے والے وہاں پہلے سے موجود ہیں؟"
میں نے کہا "اس امکان پر ہم نے غور فرمایا تھا مگر ایک جو بہ در پر ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ یا اس کے پیچھے جانے تو ہو رہی ہو گی۔"
"اسے دوبارہ پکڑ لیا تو نے پھر؟ تمہاری ساری محنت رائیگاں جائے گی۔"
"وہ خود ہی نہیں چاہتی تھی کہ ہم اس کا گھر دیکھیں۔ اس نے ضرور اپنے گھر سے گاڑی منگوائی ہو گی۔ یا ممکن ہے فون پر کہا ہو ذرا تیار رہے کہ اپنے ساتھ بچوں کو بھی لے تو زیادہ خوش ہو ورنہ کہیں دور چلی گئی ہو۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ جو ہو گا چلی جائے گی۔ دلاور نہ سہی رانا سہی۔ نمٹ لیں گے اس سے بھی۔"
میں نے گاڑی کو وقار یوسف کی گاڑی کے پیچھے روکا تو محسن اندر سے بولی کو گود میں اٹھائے باہر نکلا "بہت پیچھے رہ گئے تم۔"
میں نے تو بھری "ہاں دوست۔ راہ عشق میں بلکل بچھڑ کے بہت پیچھے ہیں ہم۔ شرم کی بات یہ ہے کہ تم سے بھی پیچھے ہیں۔" گئی لور گل نے دن بھر میں یہ کیا تھا کہ ایک کمرے کا سامان نکال کے اسے نئے سرے سے صرف بولی کے لیے سجایا تھا۔ وہ نیا فرنیچر خرید کے لائی تھیں اور کمرے کو نئے کپڑوں اور کھلونوں سے بھر دیا تھا۔ ظاہر ہے بولی بے حد خوش تھا مگر اس سے زیادہ خوش

میں نے سر ہلایا "ہاں۔ وہاں کھانا کھایا اور باتیں کرتے رہے۔"
محسن نے کہا "اور باتوں باتوں میں بھول گئے۔"
وقار بولا "جیسے تم خریداری میں بھول گئی تھیں۔"
"اچھا۔ تو آپ نے بدلہ لیا ہے۔" گل چلائی۔
رابعہ نے کہا "گل۔ پہلے گاڑی میں دیکھ لو۔ ایسے ہی تنگ کر رہے ہیں یہ لوگ تمہیں۔"
گل نے بھی کہا "ہاں۔ کھانا کھا کے لانا کیسے بھول سکتے ہیں یہ لوگ۔"
میں نے کہا "اچھا بھئی دیکھ لو گاڑی میں۔ مل جائے تو کھا لینا۔ ہم تو اب چلتے ہیں۔"
گل نے محسن کا راستہ روک لیا "تم ایسے نہیں جا سکتے۔"
گل نے چند منٹ کے بعد سخت مایوسی اور اشتعال کی کیفیت میں اپنی ناکامی کا اعتراف کیا "گاڑی میں تو کچھ نہیں ہے۔ وقار کیا تم واقعی کھانا نہیں لائے؟"
"نہیں۔ اب تو یقین آ جانا چاہیے تمہیں۔"
"مگر کیوں؟ خود کھایا اور ہمارا بالکل خیال نہیں آیا۔ نہیں تم نے جان بوجھ کے یہ حرکت کی ہے۔" گل نے ہنگامہ شروع کیا۔
"ضرور انہوں نے پٹی پڑھائی ہو گی" رابعہ بولی۔
گل فوراً اس کے ساتھ ہو گئی "ہاں۔ ان دونوں نے کہا ہو گا۔"

گل نے یہ عذر قبول نہیں کیا "کسی کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ان کی اپنی عقل بھی تو ہے۔ یہ بچے تو نہیں ہیں۔ وقار یہ بہت گھٹیا حرکت کی ہے تم نے۔"
"اور جو تم نے کیا تھا... وہ بڑی قابل تعریف بات تھی۔ میرے مہمانوں کی سخت بے عزتی ہوئی۔"
"اور بس" محسن بولا "ہمیشہ بے عزتی ہوئی" میں تو شرم سے ڈوب کر مرنے جا رہا تھا راوی کی طرف۔ سکندر کے ساتھ۔"
میں نے کہا "یار وقار کی گتی کھی ہوئی۔ مدعو تھے دوسری جگہ کھانے کی اور گھر میں کھانا نہیں۔ یہ بھی راوی کی طرف جانا چاہتا تھا محسن کے ساتھ۔"
"تو چلے جاتے" گل کا غصے سے برا حال تھا "اب ہم کیا کریں؟"
"صبر یا فاقہ ایک رات کا" وقار بولا۔
"یا پھر وہی جو ہم نے کیا تھا۔ ہم تو اب چلتے ہیں۔ اچھا کھانا کھا کے نیند بھی اچھی آتی ہے" میں نے کہا۔
محسن نے سمجھایا "تم لوگ بھی سونے کی کوشش کرو۔ رہے بھوک میں نیند نہیں آتی تو کھا کے دیکھو۔"
رابعہ نے سمجھ لیا کہ غصہ کرنے اور شور مچانے سے کچھ نہیں

وہ دونوں تھیں جو اس کے جذبات نچھاور کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتی تھیں۔ رابعہ دن بھر مصروف رہی تھی۔ اب اس نے بولی کو لے لیا اور وہ تینوں اس کے کمرے میں جا کے ایسی مگن ہو گئیں کہ سب کچھ بھول گئیں۔
میں نے کہا "یار محسن۔ آخر ہم کب تک اس خالی میز کو دیکھتے رہیں گے؟"
"گل!" اب وقار نے میز پر ہاتھ مار کے اور چلا کے کہا "سو گئی؟"
گل نے دروازے سے جھانک کے کہا "کیا ہے؟"
"گل! میں پوچھتا ہوں کیا ہم گدھے ہیں؟" محسن نے بھی گرج کے کہا۔
"وقار! سکندر سے پوچھ لو نا۔ گلا کیوں پھاڑ رہے ہو؟"
میں نے کہا "اب ہم کپڑے پھاڑ کے باہر نکل جائیں گے۔ ہاتھوں میں پیالے لے کر صدا لگائیں گے کہ ہے کوئی اللہ کا بندہ جو بلا بیٹھے اچھا کھانا کھلائے تین بھوکوں کو۔"
وقار نے کہا "گل۔ ہم ہوٹل جا رہے ہیں کھانا کھانے۔"
گل نے کہا "اچھا۔ ہمارے لیے بھی لے آنا جو خود کھاؤ۔ ہم نہیں جا سکتے۔"
"یہ کیا مصیبت ہے۔ تم نے تو سب کو یہاں بلایا تھا؟"
گل دانت نکالتی باہر آئی "بلایا تو تھا... مگر۔"
"مگر کیا۔ تم نے واقعی کھانے کا انتظام نہیں کیا... حد ہے۔"
"اس میں گرم ہونے کی کون سی بات ہے۔ بازار گئے تھے تو دیر ہو گئی وہاں۔ خریداری میں یاد ہی نہیں رہا مگر تم روز کے جاتے گاڑی میں اور لے آتے سب کے لیے کھانا۔"
میں نے ہمدردی سے وقار کو دیکھا "آج پہلا دن تھا۔ کل گل یہ بھی بھول جائے گی کہ گھر میں وقار نام کی کوئی بے وقار چیز بھی ہے۔"
محسن نے سر ہلایا "ہم سب کی اوقات دو کوڑی کی ہو گئی ہے۔"
میں نے کہا "ایک کام ہم بھی کر سکتے ہیں۔"
کام ہم نے یہ کیا کہ ایک ساتھ گئے اور ایک گھنٹے بعد کھا پی کے لوٹ آئے۔ واپسی پر نقشہ بدلا ہوا تھا۔ خواتین بولی سے کھیل کے تھک چکی تھیں اور اب بھوک میں بے تابی سے ہماری واپسی کا انتظار کر رہی تھیں۔
پروگرام کے مطابق وقار سیدھا بیڈ روم میں گیا اور لائٹ آف کر کے لیٹ گیا۔ گل نے شور مچایا "وقار۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟"
"بھئی کیوں گلا پھاڑ رہی ہو؟" وقار نے کہا۔
"کھانا کہاں ہے؟ تم کھانا لینے گئے تھے" گل نے کہا۔
"ہاں گئے تھے مگر اس میں گرم ہونے کی کون سی بات ہے؟" وقار نے انہی کے الفاظ دہرائے

www.paksociety.com

ہو گا۔ اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی "ٹھیک ہے۔ جائیں آپ لوگ۔ رقو تم بھی سو جاؤ۔ ہم کیا اکیلے نہیں جا سکتے کھانا کھانے۔"

نگی نے بڑے جوش سے کہا "ہاں۔ ابھی زیادہ رات تو نہیں ہوئی۔"

"اچھا بھئی شب بخیر۔ اُمید ہے صبح تک تم لوٹ ہی آؤ گی۔" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا نہ ملے تو ریلوے اسٹیشن چلی جانا وہاں رات بھر مسافر خانے کھلے رہتے ہیں... خدا حافظ۔"

ہم باہر نکلے اور ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ میرا بھی خیال یہی تھا کہ اتنی رات کو خواتین اکیلی کسی ریسٹورنٹ کی تلاش میں جانے کی ہمت نہیں کریں گی اور یا پھر سمجھیں گی کہ آملیٹ وغیرہ بنا کے گزارا کر لیں۔ ممکن ہے کچھ سالن فریج میں بھی بچا ہوا رکھا ہو۔ روٹیاں پکانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اپنے گھر میں کسی کے لئے ہنگامی حالات میں جو ملے کھا لینا واقعی مسئلہ نہیں ہوتا مگر فی الحال نگی کا مسئلہ یہ تھا کہ اس نے سب کو کھانے پر مدعو کر لیا تھا اور پھر دوسری مصروفیت میں ایسی الجھ گئی تھی کہ اسے کچھ تیار کرنا یاد نہیں رہا تھا یا اس کا خیال بہت دیر سے آیا تھا جب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم سب گھر کے ہی لوگ تھے مگر گھر والوں کو بھی کوئی دعوت کا کہہ کے روکھی سوکھی نہیں کھلاتا۔

میں نے کہا "یار! اس وقت کھانا کہاں ملے گا نہیں؟"

محسن بولا "شاید مدینہ میں مل جائے۔ وہ رات گئے تک کھلا رہتا ہے اور بھی ایک دو مقامات ہیں۔"

"کیا یہ نگی کے علم میں ہے؟"

"شاید۔ کیا رابعہ کو نہیں معلوم؟"

"رابعہ کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ نگی کو یقیناً کچھ پتا نہیں ہو گا۔ ہم کبھی آدھی رات کے بعد کھانے کی تلاش میں نہیں نکلے۔"

"نگی کو شادی سے پہلے بھی گھومنے پھرنے کا شوق تھا اور تھی ماں باپ کی اکلوتی۔"

میں نے کہا "بات تو شوق کی ہوتی ہے میرے بھائی نہ اکلوتے ہونے سے فرق پڑتا ہے۔ نہ جانے ایسی کتنی لڑکیاں ہوں گی۔ سینکڑوں ہزاروں جو ماں باپ کی اکلوتی ہیں اور انہیں بھی گھومنے پھرنے کا شوق ہو گا۔ یہ شوق کس کو نہیں ہوتا مگر ان کے پاس شوق کی تسکین کے اسباب نہیں ہوتے۔ کسی لڑکی کا باپ راج مزدور ہو گا تو کسی کا کلرک یا پھیری لگا کے غبارے اور گول گپے بیچنے والا۔ اس لڑکی کا باپ بڑی توپ چیز تھا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ ایک بھرپور روزگار پر تھیں یہ کوٹھیاں تھیں اور خرچ کرنے کے لئے منہ مانگے پیسے مل جاتے ہوں گے۔"

میں نے کہا "اس کے باوجود یار! یہ لڑکی بگڑی نہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اتنا لاڈ پیار اور پیسہ ہو، روک ٹوک نہ ہو اور اوپر سے خدا نے صورت بھی اچھی دی ہو تو لڑکی کا دماغ ساتویں آسمان پر ہوتا ہے۔ اب یہ سوچو ایک فلمی شادی ہے۔ چاہنے والا سڑک چھاپ وکیل۔ لڑکی انتہائی دولت مند اور مغرور اور ظالم باپ کی اکلوتی بیٹی۔ ان کی محبت اور لڑکی کا باپ کی ساری دولت کو ٹھکرا کے محبت کی لاج رکھنا۔ اپنا کل چھوڑ کے ایک جھونپڑے سے غریبانہ گھر کو قبول کرنا، ہے نا کمال۔"

محسن نے ہنس کے کہا "یار کیا سین پاس ہوا ہو گا۔ بہت کمانے والا باپ اچانک ظالم سماج کا روپ دھار کے دو پیار کرنے والوں کے درمیان حائل ہونا چاہتا ہے۔ وہ گرجتا برستا ہے۔ سوئی پرانے ڈائیلاگ بولتا ہے۔ وہ تم سے نہیں تمہاری دولت سے شادی کر رہا ہے۔ ایک دو کوڑی کے وکیل کی اوقات ہی کیا کہ میری بیٹی کا رشتہ مانگے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ شادی کبھی نہیں ہو سکتی۔ وقار ایسا نہیں ہے ابا جی! اچھے گستاخ لڑکی۔ ہم تمہاری شادی کریں گے اپنے جیسے کسی اونچے خاندان میں۔ اس کے بعد لڑکی کے ڈائیلاگ۔ میری شادی کسی اور سے ہو گی تو میری ڈولی نہیں جنازہ اٹھے گا اس گھر سے اور باپ کی دھمکی۔ میں عاق کر دوں گا تمہیں۔ اس ساری دولت جائیداد سے محروم کر دوں گا۔ کر دیں ابا جی۔ دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔ وقار کے پاس محبت ہے۔ کیا کہا ہے کسی شاعر نے۔ محبت ایسی دولت ہے جو ٹھکرائی نہیں جاتی۔ میں جا رہی ہوں۔ اور باپ کا دہاڑنا، گڑگڑانا اور منت سماجت کرنا۔ پھر لڑکی پہ ہاتھ رکھ کر جھکنا۔"

محسن نے خوب اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ دونوں طرف کے ڈائیلاگ آواز بنا کے بول رہا تھا اور آواز بدلنے کے ساتھ لہجہ بھی بدل کے بول رہا تھا۔ ہم خوب ہنستے رہے۔

اچانک میں نے ایک گاڑی کو آتے دیکھا۔ گاڑی بہت آہستہ آہستہ آ رہی تھی اور اس کی ہیڈ لائٹس جو پہلے روشن تھیں موڑ کاٹنے کے بعد بند کر دی گئی تھیں۔ محسن کی نظر بھی گاڑی پر گئی۔

"یہ کون لوگ ہیں؟ کیا چاہتے ہیں آخر؟"

"شاید کسی کا گھر تلاش کر رہے ہیں۔"

"گھر تلاش کرنے والے لائٹس بجھا کے یہ کام نہیں کرتے" محسن بولا۔

میں نے کہا "میرا مطلب تھا۔ شاید کسی دشمن کا گھر تلاش کر رہے ہیں۔ آپ کو سمجھنا چاہئے شیروانی صاحب۔"

"ضروری نہیں کہ دشمن ہی ہو۔ چور ڈاکو بھی اندھیرے میں خدمت خلق کرتے ہیں۔"

میں نے محسن کو پیچھے کھینچ لیا اگر وہ لائٹ جلا رہے تو ہم سامنے نظر آتے۔ گیٹ کے پیچھے بریگیڈیئر کی کوٹھی کے احاطے کی دیوار تھی جو کچھ آگے بڑھا کے بنائی گئی تھی۔ ظاہر ہے مالک نے اپنی حد سے تجاوز کر کے سڑک کی تھوڑی سی زمین کو اپنے احاطے میں شامل کر لیا تھا۔ اس طرح کی دو دیواروں کے سنگم پر ایک کونا نکلا ہوا تھا۔ اس کونے کے مقابل ایک پیڑ تھا اور پیڑ کے پھیلاؤ نے اس کونے کو

www.paksociety.com

اس طرح ڈھک لیا تھا کہ اسٹریٹ لائٹ کا اُجالا بھی محدود ہو گیا تھا۔ اگر ہم ساکت و صامت اس تاریک کونے میں کھڑے رہتے تو وقار کے گیٹ پر آنے والا بھی ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

ہم دیوار سے لگ کے کھڑے ہوئے ہی تھے کہ اندر کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

میں نے کہا "یہ تو واقعی جا رہی ہے۔"

محسن بولا "یار ہم سے کچھ زیادتی ہو گئی مذاق میں۔"

"ہاں۔ اچھا تھا کہ ہم کھانا لا کے کہیں چھپا دیتے اور تھوڑی دیر پریشان کرنے کے بعد بتا دیتے۔ یہ جیسے ہی گاڑی میں روانہ ہوتیں ہم سامنے آ کے کہتے کہ لیجئے ماحضر تناول فرمایئے۔"

گاڑی ریورس گیئر میں گیٹ سے باہر آئی۔ اسے نگی چلا رہی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ وہ غصے میں ہے۔ اس وقت سڑک پر کوئی گاڑی آتی ہی تیز رفتاری سے آ رہی ہوتی تو تصادم ناگزیر ہو جاتا۔ ہم چھپے تھے اس لئے کسی کی نظر بھی ہم پر نہیں پڑی اور گاڑی ایک دم مخالف سمت میں روانہ ہو گئی۔ پیچھے سے مجھے نگی کا سایہ جو نظر آیا تھا اور ایک لمحے کے لئے میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ انہیں روک لوں۔ وہ اپنے ساتھ محسن کو لے جا سکتی تھیں لیکن اب موقع ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اگر میں چلاتا ہوا ان کے پیچھے دوڑتا تو شاید انہیں متوجہ کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتا لیکن اس طرح ہمارے چھپنے کا مقصد فوت ہو جاتا۔ بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہوئی گاڑی نے مجھے تجسس اور شکوک میں مبتلا کر دیا تھا اور اب میں رفتہ رفتہ اپنی چھٹی حس کو بیدار ہوتا محسوس کر رہا تھا جو مجھے خطرے سے خبردار کر رہی تھی۔

میں نے محسن سے سرگوشی میں کہا "تم نے دیکھا کچھ؟"

"کیا؟"

"گاڑی میں سے ایک آدمی اُترتا ہے۔ گیٹ تک جاتا ہے اور پھر گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے۔ گاڑی آگے کھسکتی ہے اور اگلے گیٹ پر رک جاتی ہے۔ یہ نمبر اور مکان میں رہنے والے کی نیم پلیٹ پڑھ رہے ہیں۔"

"ایسا ہی لگتا ہے... مگر..."

"مگر کیا؟"

"یہ خواتین کیا بوبی کو گھر میں ہی چھوڑ گئی ہیں؟" محسن بولا۔ "بوبی کو اکیلا گھر میں چھوڑ کے کیسے جا سکتی ہیں؟"

"وہ تو سو رہا تھا۔"

"یار! اُٹھا لیا ہو گا گود میں۔ نگی پیچھے تھی، اس کی گود میں لیٹا ہوا ہو گا یا سیٹ پر۔ نظر تو نہیں آ سکتا تھا یہاں سے۔"

محسن نے سہلایا "میں دیکھ آؤں اندر جا کے؟"

"دیکھ لے ویسے اندر بوبی اکیلا نہیں ہے۔ وقار بھی ہے۔ اسے وقار کے پاس سلا دیا ہو گا۔" میں نے کہا۔

محسن مطمئن تو شاید نہیں ہوا تھا مگر اس وقت تک ہر دروازے پر رکنے والے وقار یوسف کے گھر تک آ پہنچے تھے۔ وہ لوگ ایک جیپ میں سوار تھے۔ جیپ چلانے والا شیشے کے پیچھے ایک تاریک سایہ سا نظر آتا تھا اور بالکل ساکت تھا۔ جیپ فرسٹ گیئر میں پیدل کی رفتار سے بڑھتی آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ سامنے والی سیٹ پر غالباً وہی شخص ہو گا جو اب جیپ کے پیچھے چلا رہا تھا اور ہر بند گیٹ پر رک کے نمبر یا نیم پلیٹ کی تصدیق کر رہا تھا۔ غالباً ہر چالیس پچاس فٹ کے بعد رینگتی ہوئی جیپ میں چڑھنے اُترنے سے اس نے یہ بہتر سمجھا تھا کہ تھوڑی سی چہل قدمی کی جائے۔ اصولاً رات کے بارہ بجے کے بعد اگلا دن شروع ہو گیا تو یہ چنانچہ یہ مارننگ واک تھی۔

جیپ بہت قریب آ گئی تو میں نے پچھلی سیٹوں پر بھی دو افراد دیکھا جو بظاہر کچھ نہیں کر رہے تھے مگر وہ حفاظت کر رہے تھے اور شکاری کتوں کی طرح تھوتھنی اُٹھائے ہر طرف خطرے کی بو سونگھنے میں مصروف تھے۔ رات کے وقت سامنے سے آنے والے کی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی اندھا کر دیتی ہے اور وِنڈ اسکرین کے پیچھے اندھیرا ہو تو کسی کی صورت واضح نہیں ہوتی۔ جیپ پیچھے سے کھلی ہوئی تھی۔ محافظ پیچھے سے آنے والی ہر گاڑی پر نظر رکھ سکتے تھے اور خطرے کی صورت میں فوراً چھلانگ لگا کے میدانِ عمل میں کود سکتے تھے لیکن اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ زیادہ سے زیادہ گشت پر مامور کوئی چوکیدار ان سے پوچھ سکتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے تو آسان جواب یہ تھا کہ پتا تلاش کر رہے ہیں اور مشکل جواب یہ کہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں تمہیں کیا۔ چلو اپنا راستہ پکڑو۔ آدھی رات کے وقت مکانوں کے نمبر یا نیم پلیٹ پڑھنا کس قانون کے تحت جرم ہے۔ ہماری مرضی ہم آدھی رات کو ہر درخت پر چڑھ کے بیٹھیں یا سڑک پر پڑے ہوئے پتھر شمار کریں۔ عاشقوں کے شیوۂ اختر شماری پر آج تک کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

قریب سے میں نے اس کی شکل دیکھی تو کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو مجھے یاد آ گیا۔ یہ وزیر خان اسپتال کا وہی چوکیدار تھا جس نے مجھے اور رابعہ کو غلط فہمی اور لالچ میں کسی مخبوط الحواس پروفیسر سے ملوا دیا تھا۔ پروفیسر کو اس کی ناخلف اولاد وہاں جمع کر گئی تھی کہ ابا جی کا دماغ درست کر دیا جائے اور جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو ان کو کسی سے ملاقات کی اجازت نہ ہو۔ غالباً وہ جائداد پر ابا جان کی زندگی میں ہی قبضہ چاہتے تھے لیکن یہ نہیں چاہتے تھے کہ قبل از وقت ہی ابا جان کو دوسری دنیا میں بھیج دیا جائے چنانچہ دماغ کے کل پرزے ڈھیلے ہونے کے بعد لواحقین کو از روئے قانون یہ اختیار حاصل ہو جاتا تھا کہ ابا جان کی عمر بھر کی کمائی کو جیسے چاہیں اُڑا دیں۔ وہ گُڑ سے مرنے والے کو زہر دینے کے قائل نہیں تھے اور باپ کے قاتل کہلانا نہیں چاہتے تھے۔

یہ سب یاد آتے ہی میرا شک یقین میں بدل گیا کہ یہاں وہ کسی کو تلاش کر رہے ہیں۔ وہ رانا کے آدمی تھے اور نئے شکاری تھے۔ ابھی تک رانا نے ہم سے براہِ راست پنگا لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ دلاور کا بزنس پارٹنر تھا۔ اس کی عداوتوں اور ذاتی

بالآخر اس نے ہم سے چند قدم کے فاصلے پر آ کے گیٹ سے اندر جھانکا اور اطمینان کے انداز میں سر ہلایا۔ پھر آہستہ سے کراہا۔ دوسرے نے قریب آ کے سرگوشی میں کہا "تجھے کیا ہو گیا؟"

"مجھے نہیں پتا" اس نے بُرا مان کے اپنے سر کو چھوا "اس نے اتنی زور سے مارا تھا... سالے نے۔"

"چل بس کر۔ زنانیوں والی باتیں مت کر۔"

"وہ جھڑک اُٹھا "تو بڑا مرد ہے نا۔ لگتی تیرے سر پہ تو ابھی تک مرا پڑا ہوتا۔"

جیپ میں بیٹھے ہوئے دونوں محافظ بھی چھلانگ لگا کے نیچے اُتر آئے تھے اور نہایت مشکوک انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اگر ہم ذرا بھی حرکت کرتے تو شاید ان کی نظر سے پوشیدہ نہ رہتے۔ گرد و پیش کی ہر چیز ساکت تھی اور ہم اندھیرے کی پناہ میں دیوار یا گیٹ پوسٹ اور جامد درخت کی طرح ماحول کے سکوت کا حصہ بن گئے تھے۔ ایسے وقت میں پیٹ میں مجھے یہ ڈر محسوس ہوتا تھا کہ کہیں شامتِ اعمال سے اچانک چھینک نہ آ جائے۔ کہیں سے اُڑتا ہوا کوئی مچھر آ کے ناک میں نہ گھس جائے یا کوئی چیونٹا پاؤں سے اوپر کی جانب سفر کا آغاز نہ کرے اور کاٹ نہ لے۔

"مکان یہی ہے..." ایک نے تصدیق کی۔

"ابھی میں نے گاڑی ابھی باہر نکلی تھی نا۔ لال رنگ کی؟"

"ہاں۔ تو نے غور سے دیکھا تھا، کتنے بندے تھے اس میں؟"

دوسرے نے غور فرما کے کہا "چار پانچ تو ضرور تھے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ نکل گئے۔ لال گاڑی تو اسی کی ہے" پہلے نے رابعہ کے لیے غائبانہ گالی استعمال کی۔ "مگر استاد! ایک لال گاڑی اندر بھی ہے، دیکھو۔"

استاد نے گیٹ کے اوپر سے جھانکا۔ "یہ کیا چکر ہے۔ خبر بھی رقی ہے جو مجھے رانا صاحب نے بتایا تھا۔ وہ گاڑی کسی اور گیٹ سے نکل گئی۔"

"استاد! میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"قسم مت کھا اور میرا سر مت کھا۔ ابھی گیٹ سے نکلی تھی تو پھر گاڑی کا رنگ لال نہیں ہو گا۔ کالا یا سفید ہو گا۔"

دوسرا طول ہو گیا "کیسی باتیں کرتے ہو استاد۔ اب میں اندھا تو نہیں ہوں کہ کالا اور نیلا مجھے لال نظر آئے۔"

"ہو جاتا ہے چھڑو ہوتا ہے۔ اندھیرے میں پتا نہیں چلتا اور تو نے چلنے سے پہلے بھی سوٹا لگایا تھا۔" استاد نے کہا۔

"سوٹے کا کوئی اثر نہیں ہے مجھ پر" دوسرے نے احتجاج کیا مگر اس کی بات قابلِ غور نہیں سمجھی گئی۔

"وہ اندر ہی ہیں" استاد نے فیصلہ صادر کیا "ذرا ہوشیاری سے۔"

معلوم نہیں ان چاروں کو کس مشن پر بھیجا گیا تھا لیکن ذہنی و جسمانی اعتبار سے وہ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینے کے اہل نہیں لگتے تھے۔ اگر مقصد ہم میں سے کسی کا اغوا یا قتل ہوتا تو رانا ایسے

مسائل سے رانا کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس نے تو یہی بہتر جانا ہو گا کہ اپنا دامن، اپنی توانائی اور اپنی زندگی بچائے۔ شراکت کو صرف مالی نفع نقصان تک محدود رکھے لیکن اب ہم نے خود آگے بڑھ کے اس سے بچا لیا تھا اور اس کے مفادات کی جنگ کا پانسہ پلٹ دیا تھا۔ وہ حیران بھی ہوا ہو گا اور پریشان بھی کہ آخر ہم نے دلاور جیسے دشمن کی حمایت میں اس کی بیوی اور بچوں کی حفاظت کا بیڑا کیوں اُٹھایا۔ ہمیں تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ رانا نے اس کا بیڑا غرق کر دیا۔

رانا یہ بات نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ذاتی دشمنی اور جنگ میں بھی کچھ وضع داری کے آداب ہوتے ہیں۔ دلاور غاصب اور قاتل تھا۔ میں نے اپنا قانونی حق اور انصاف حاصل کرنے کے لیے اس کے خلاف محاذ آرائی کو اپنا فرض عین سمجھا تھا۔ آج اگر کوئی اور شخص وہ سب کچھ دلاور کے ساتھ کرے جو کل وزیر خان کے ساتھ ہوا تھا تو اس کو جائز سمجھنا میرے لیے ناممکن تھا۔ دُہرے معیار کسی بھی معاشرے میں صرف عدل و انصاف کا خون کرتے ہیں۔ جو غلط ہے وہ سب کے لیے غلط ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی میرے باپ کو قتل کرے تو واجب تعزیر اور میرے دشمن کو قتل کرے تو واجب تعریف۔ دنیا تو یہی کہتی ہے کہ جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ مگر میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس معاملے میں آنکھیں اور کان بند کر لوں۔ اگر دلاور سے سب کچھ چھن جاتا تو پھر میں اپنا حق کس سے وصول کرتا اور انصاف کے تقاضے کیسے پورے ہوتے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے سزائے موت پانے والے قیدی کو مرنے نہیں دیا جاتا۔ اسے اچھی خوراک اور دوا علاج سے صحت مند رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

پیدل چلنے والا اس وقت بالکل مختلف حلیے میں تھا۔ اسی لیے میں اسے فوراً نہ پہچان سکا۔ اس نے عام شریف لڑکوں کی طرح قمیص پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کا چھوٹا کلین شیو تھا اور غنڈا معتبر نظر آنے کے لیے اس نے عینک بھی لگائی تھی۔ اس سے بھی صورت خاصی بدلی ہوئی لگتی تھی مگر اس کی شناخت میں شبہے کی قطعی گنجائش نہیں تھی۔ وہ سی ڈی انٹرپرائز کا وہی نااہل اور کاہل چوکیدار تھا جو اس سے پہلے ریڈیو ٹیلی فون پر پیغامات وصول کرتا تھا۔ دونوں جگہ اس کی کارکردگی مایوس کن تھی۔ نہ جانے دلاور یا شوکت رانا نے اسے کس خوبی کی بنا پر اپنے تنخواہ داروں میں شامل کر لیا تھا۔ شاید وفاداری ہی اس کا سب سے بڑا وصف ہو گی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے اسے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے اس کا سر توڑنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اس ملاقات کی نشانی یقیناً ایک عظیم گومڑ کی شکل میں اس کے سر پر موجود ہو گی۔ افسوسناک بات یہ تھی کہ وہ اندھی ضرب سے فوت یا بالکل تک نہیں ہوا تھا۔ اگر میں اس کے سامنے آ جاتا تو وہ مجھے کبھی معاف نہ کرتا اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے فارمولے پر عمل کرتا۔ میں نے اس کے سر پر ریوالور مارا تھا، وہ میرے سر پر توپ مارتا۔

www.paksociety.com

اناڑی اور ناتجربہ کار افراد کا انتخاب نہ کرتا جو ذرا بھی معاملات سے واقف نہ تھے۔ وہ جو کچھ کر رہے تھے سرانجام کر رہے تھے اور کسی کو بھی گھر سے اچانک نکل آنے والا یا گشت پر مامور چوکیدار ان سے پوچھ سکتا تھا کہ وہ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں۔ رانا صاحب یقیناً یہ جانتے تھے کہ وقار یوسف ایک وکیل ہے اور اس کی پشت پناہی کرنے والے منظر اور خود رابعہ جیسے نامور وکیل ہیں۔ اس گھر میں کسی قسم کی بچگانہ کارروائی کا ردِعمل رانا کے لیے سنگین مسائل پیدا کر سکتا تھا۔ اگر رانا کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میرے ساتھ محسن بھی اسی گھر میں موجود ہے تو ایسے ناتجربہ کار افراد کو یہاں بھیجنا انھیں موت کے منہ میں بھیجنے کے مترادف تھا۔ ان جیسے دس بھی ہوتے تو مقابلے کے لیے ناکافی تھے۔ وہ مارے جاتے یا پکڑے جاتے اور ہم خود یا مصنوعی تفتیشی ٹیم کے ارکان ان سے سب اگلوا لیتے کہ ان کی تحریف فوری کا مقصد کیا تھا۔

ندرت کے اشارے سمجھنا آدمی کے بس کی بات نہیں۔ بعض اوقات خسارے کا سودا ہی نفع بخش ثابت ہوتا ہے۔ ناراضت غلطی ہی صحیح فیصلے کا موجب بنتی ہے اور قابلِ راحت محسوس ہوتے والی کوئی لغزش غیر متوقع طور پر کسی مصیبت کا شکار ہونے سے بچا لیتی ہے۔ ایسا ہمارے ساتھ ہوا تھا۔ ہم شرمندہ تھے کہ خود پیٹ بھر کے بیٹھے گھر خواتین کے لیے کچھ نہ لا کے زیادتی کی۔ اب یہی زیادتی خواتین کے حق میں بہتری ثابت ہو رہی تھی۔ ہماری غلطی نے ان کو بچا لیا تھا اور مجھے ان کی طرف سے بے فکر کر دیا تھا۔ فی الحال ایک گھنٹے تک ان کی واپسی کا امکان نہیں تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس سے بہت پہلے رانا صاحب کے سفیروں کی آمد کا مقصد معلوم ہو جائے گا اور خدا نے چاہا تو ان کے شایانِ شان استقبال، خاطر تواضع اور رخصتی کا مرحلہ بھی تمام ہو جائے گا۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ان سب کو واپس جانا تھا۔ ان کو صرف یہ زحمت دی گئی تھی کہ وہ وقار یوسف کے گھر کا پتا چلائیں۔ یہ معلوم کریں کہ وہاں سب موجود ہیں اور خطرے کی کوئی بات نہیں۔ تاہم اس کا علم مجھے کچھ دیر بعد ہوا۔ میرے سامنے تو وہ جیسے آئے تھے ویسے ہی لوٹ گئے۔

محسن نے گاڑی کو جاتے دیکھا "یار یہ کیا بات ہوئی؟"

اب میں سامنے آ گیا "کتنی اچھی بات ہے کہ کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"نہیں یار۔ اصل بات کچھ اور ہوگی۔ یہ صرف جائزہ لینے والی ٹیم تھی۔ اصل کارروائی ان کی رپورٹ پر ہوگی۔"

"صحیح کہا۔ آپ غیب کا حال جانتے ہیں۔ سہروائی صاحب، اس لیے یہ ارشاد فرمایئے کہ رپورٹ کسے دی جائے گی۔ کارروائی کیا ہوگی اور کون کرے گا۔"

محسن نے سہلایا۔ "میری چھٹی حس کہتی ہے۔"

"آپ بھول گئے چھٹی حس میری ہے۔ آپ کی ساتویں حس

"رک گئے۔ میری ساتویں حس کہتی ہے کہ اب شوکت علی رانا کی طرف سے انھیں رقم اور معقولات کی سزا دی جائے گی۔ پہلے مسز لارڈ کو اس کی قید سے رہائی دلا کے رانا کے مستقبل کو تاریک کر دیا ہے۔ اس نے تو سوچا ہو گا کہ رلاور کا کام تو تقریباً تمام ہوا۔ اگر خود سکندر نے اسے نہ مارا تو رابعہ منظر اینڈ کمپنی اسے تختۂ دار تک پہنچا دے گی۔ مسز لاور کا اور اس کی اولاد کا وجود مٹا دیا جائے تو اس کا راستہ خود بخود صاف ہو جائے گا۔ اس واردات کو بھی منسوب کیا جائے گا ایم آر ایس کے انتقام پسندوں سے۔ رانا صاحب پر انگلی اٹھانے والا کون ہو گا۔ مگر مسز لاور کے بچ نکلنے سے اس پر چودہ طبق روشن ہو گئے ہوں گے۔ وہ سخت پریشان ہو گا کہ اب خود کو مسز لاور جیسی زخم خوردہ ناگن کے انتقام سے کیسے بچائے گا۔ وہ تو ساری سازش کو سمجھ چکی ہے اور اب کچھ بھی کر سکتی ہے۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "بالکل یہی بیان میری چھٹی حس نے دیا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ رانا کیا کر سکتا ہے؟"

"اس سوال کا جواب نہیں ہے آپ کی چھٹی حس کے پاس؟"

"میری چھٹی حس فرماتی ہے کہ رانا جوش سے نہیں ہوش سے کام لے گا۔ وہ ایسا نہیں کرے گا کہ ہم سے جنگ چھیڑ دے۔ وہ جنگ میں لاور کا انجام دیکھ چکا ہے۔ وہ دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھائے گا۔"

محسن بولا "دوستی کا ہاتھ تو چوہدری لاور نے کئی بار بڑھایا تھا۔"

"مگر اس کے ساتھ دوستی اتنی ہی ناممکن تھی جتنا آگ پانی کا ملاپ۔ رانا کہہ سکتا ہے کہ تم نے لاور کے ساتھ جو کچھ کیا بالکل ٹھیک تھا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا لیکن میرے ساتھ تمہاری کوئی دشمنی نہیں۔ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہے تو تلافی کے لیے تیار ہوں۔ میں تمہارا حق بھی تسلیم کرتا ہوں اور ہر مطالبہ پورا کر سکتا ہوں۔ لاور کی بیوی کو میرے حوالے کر دو۔ میں اسٹار پیڈ مدد کو حاضر کرتا ہوں۔"

محسن نے کہا "پھر ہم کیا کریں گے؟ فرض کرو ایسا ہی ہوا؟"

"ہم سر کھجا کے کہیں گے کہ سوری رانا صاحب۔ یہ بات ہماری عقل شریف میں نہیں آئی ورنہ ہم اسی وقت آپ سے رابطہ کر لیتے جب ہم فلاں فلاں کی خبر سن کر وہ بیوی ہمارے قبضے میں تھی وہ تو تمھیں تمہارے گھر نکل گئی۔"

محسن ہنس پڑا "مولوی غلام حسین نے کیا گالی ایجاد کی ہے مگر یہ تو غلط ہے کہ وہ وہ کی بیوی انھیں تمہارے گھر گئی۔"

"یہ سو فیصد صحیح ہے۔ اب وہ ہمارے ہاتھ بھی نہیں آئے گی۔ اس نے اندازہ کر لیا ہے کہ ہم کسی قیمت پر اس کے شوہر کو معاف کرنے والے نہیں ہیں۔ اس کے لیے تشویش کی بات صرف یہ تھی کہ رلاور تندرست بھی ہے یا نہیں۔ لاور سے مل کے اس کی تشویش تو رفع ہو گئی۔ ہمارے عزائم کا بھی اسے علم ہو گیا۔ ہم سے

میں نے کہا "جو ٹھیک کہتا ہے۔ جو کچھ تو نے اس کے شوہر کے ساتھ ہوا۔ وہ اسی طلاق کا نتیجہ تھا۔ اگلی باری اکرام کا جزن کی بھی ہو سکتی ہے اور یہاں وقار یوسف کی۔ انھیں اس سے پہلے ہی اپنا ٹھکانا کہیں اور کر لینا چاہیے۔ ہم جہاں جاتے ہیں تباہی اعمال ساتھ جاتی ہے۔ کیا ضرورت ہے اپنے ساتھ انھیں جلانے کی جن کا جرم صرف ان کا خلوص ہے یا ان کی وفا ہے۔"

"ہاں۔ اس گھر کو آباد رہنا چاہیے۔ میں کل ہی کل کو منت کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ میرے ساتھ گل اور بوبی ہمیشہ خطرے میں رہیں گے۔ انھیں کسی بھی گمنام سی جگہ پر رکھا جا سکتا ہے جہاں وہ محفوظ ہوں۔"

"گل شاید نہ مانے۔"

"میں اسے منا لوں گا۔ مجھ سے زیادہ بوبی کو اس کی ضرورت ہے۔ مرد بڑا غرض پرست اور بے وفا ہوتا ہے یار۔ دیکھو ناشہلا کو کتنی جلدی بھلا دیا میں نے اور اس کا نعم البدل بھی مل گیا مجھے۔"

میں نے اس کے خیالات کا رخ بدلنے کی کوشش کی "دنیا میں مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرتا۔ زندگی اسی کا نام ہے۔"

"ہاں" محسن نے ایک ٹھنڈی سانس بھری "یہ بھی اچھا ہی ہوا یار کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ ہی لے گئی۔ اسے میرے جیسے خبطی، آوارہ اور خود غرض شخص کے حوالے نہیں کیا ورنہ۔"

"ورنہ کیا۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ وہ لاوارث رہ جاتا۔ دنیا کی ٹھوکریں کھاتا۔ تو دوسری شادی کر لیتا تو اس کے ساتھ گھر میں سوتیلوں جیسا سلوک ہوتا۔ گل اس کی سوتیلی ماں ثابت ہوتی" میں نے بے رحمی سے کہا۔

"میں گل کی بات نہیں کر رہا تھا۔"

"جو تو کیا کر رہا تھا۔ ازل تو یہ ناممکن تھا۔ اس کے لیے بھی گل کے جذبات سدری ہوتے جو بوبی کے لیے ہیں اور بفرضِ محال ایسا نہ ہوتا تو بھی فرق نہ پڑتا۔ رابعہ اور تاہید یا گل اسے اپنا سکتی تھیں۔ ہم سب کے ساتھ اس کا رشتہ جذباتی رشتہ ہوتا جو تیرے ساتھ ہے کیا تو نے دیکھا نہیں کہ بوبی کے معاملے میں گل کتنی حاسد ہو گئی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ بوبی کو اور کوئی اتنا چاہے جتنا وہ چاہتی ہے۔"

"سب پاگل پن ہے۔"

"بالکل ہے۔ ہر عورت کی محبت کا یہی انداز ہے۔ خواہ وہ ماں ہو، دلہن، بیوی ہو یا بہن۔ وہ محبت میں شرکت کو ایک حد تک برداشت کر سکتی ہے۔ کوئی اس کے بیٹے کو یا شوہر کو اس سے زیادہ چاہے اس سے زیادہ اپنا سمجھے یہ وہ برداشت نہیں کرتی۔ گل کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا اگر ناہید یا رابعہ یا گل خود کو بھی معانی اختیار کریں اور اپنی اس حیثیت میں بوبی سے جتنا چاہیں پیار کریں لیکن ماں کے رشتے پر وہ اکیلی قابض رہنا چاہے گی۔ بوبی صرف اس کا بیٹا ہوگا۔ اس کی ماں صرف وہ کہلائے گی۔ اب یہ ایک ایسا جذباتی مسئلہ بھی بن سکتا ہے جو ان عورتوں کے درمیان کشیدگی کا سبب بن

کو انتقام لینے کے لیے خود قتل نہیں کریں گے۔ ہم اسے انصاف اور قانون کے تقاضے پورے کرتے ہوئے پھانسی کے تختے تک پہنچائیں گے۔ وہ اب قانونی جنگ لڑنے کی تیاری کرے گی۔ وہ اپنی دولت کی طاقت پر اور بڑے بڑے وکیلوں کی مدد پر انحصار کرے گی۔ اس کے لیے ہم اور رانا ایک جیسے دشمن ہیں۔ وہ رانا کو ہمدرد سمجھنے کی غلطی نہیں کر سکتی۔ وہ بے وقوف عورت نہیں ہے۔ فی الحال وہ روپوشی اختیار کرے گی اور دیکھے گی کہ اب ہم کیا کرتے ہیں اور شوکت رانا کیا کرتا ہے۔ اس کی ناقص عقل میں بھی یہ بات آسکتی ہے کہ رانا شاید ہم سے مل جائے۔"

اب ایک طرف ہم رابعہ، گل اور گل کی واپسی کے منتظر تھے تو دوسری طرف ایک فکر یہ بھی لاحق ہو گئی تھی کہ نہ جانے وقار یوسف کے گھر کا سراغ لگانے والے اور اس کے گھر میں ہماری موجودگی کا یقین حاصل کر کے جانے والے اگلا قدم کیا اٹھانے ہیں اور وہ آج رات ہی کچھ کریں گے یا اس کے لیے مناسب وقت اور موقع کا انتظار کریں گے۔ ذاتی بات اور تھی۔ میری چھٹی اور محسن کی ساتویں حس تحقیق ہماری قیاس آرائی تھی جو غلط بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ رانا کا ردِعمل ہماری توقعات کے برعکس ہو۔

میں اور محسن چھت پر ٹہلتے رہے۔ آس پاس کے بیشتر مکانوں میں لوگ سو چکے تھے۔ کچھ گھروں کے پورچ یا برآمدے میں لائٹ جلتی بھول دی گئی تھی یا پھر گیٹ لائٹس آن تھیں۔ پیچھے کی طرف کچھ فاصلے پر کوئی ناہید اختر کی آواز پر جان دینے والا اپنے ریکارڈ پر ایک ہی گیت کا ایک ہی گانا بار بار لگا رہا تھا۔ گیت کے بول بھی اسے زبانی یاد تھے اور شاید ناہید اختر کا تصور بھی۔ ہر بار گھڑے کے بیچ میں وہ بے آواز بلند نعرہ لگاتا تھا "ہائے او ظالم" او چھڈیا" اسے قطعی پروا نہیں تھی کہ نصف رات گزر گئی اور اس کے اپنے مجروح دل کی پکار سونے والوں کے آرام میں کس حد تک مخل ہو رہی ہوگی۔

محسن نے اچانک کہا "یار یہ ہے پریشانی کی بات۔"

میں نے کہا "حضرت کچھ وضاحت کریں کیونکہ یہاں تو سوائے پریشانی کے کوئی بات ہی نہیں ہے۔"

"یہ لوگ وقار یوسف کے گھر کیوں آئے تھے کیا اب اس کا گھر بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ اس نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ بس رابعہ کی وجہ سے تعلق نبھاتا ہے اور طبعاً بھی اتنا شریف اور خلیق ہے کہ اپنے بدترین دشمن کو بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے گھر سے چلے جاؤ...!"

"...لیکن ہمارا اخلاقی فرض تو بنتا ہے کہ اسے مہمان نوازی کی سزا ملنے سے پہلے ہی اپنا بوریا بستر یہاں سے سمیٹ لیں۔ کمینہ بزدل اور بے اصول دشمن کے لیے تو وقار یوسف کی دوست داری اور فراخ دلی بھی جرم ہے۔ یہ بھی جرم ہے کہ اس نے انھیں گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔"

www.paksociety.com

جائے۔ سب محبت کی انتہا میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں اور بلاوجہ ایک دوسرے کی حریف ہو جائیں۔"

"میں گل کو سمجھا دوں گا....."

میں نے کہا "نہیں۔ یہ بات گل کو سمجھانے والی نہیں۔ وہ سمجھنے سے انکار کر دے گی۔ میں رابعہ کو سمجھا سکتا ہوں اور وقار اپنی بیوی سے کہہ سکتا ہے لیکن ابھی نہیں۔ اگر کبھی اس کی ضرورت محسوس ہو۔ ویسے تو مجھے امید ہے کہ وہ فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے خود ہی گل کو یہ حق دے دیں گی..... مگر ابھی ہم بات کر رہے تھے گل اور بوبی کو بحفاظت کہیں منتقل کرنے کی۔ تو یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ دیکھ لیں گے کہیں کرائے کا کوئی گھر لیکن اس کے بعد یہ بھی ضروری ہو گا کہ تیرا مجھ سے تعلق نہ رہے..... کسی بھی معاملے سے۔"

محسن بھڑک اٹھا "بکواس مت کر۔ یہ ناممکن ہے۔"

"یار! اس کے بغیر گل اور بوبی کیسے محفوظ ہوں گے۔"

"یعنی ان کے ساتھ میں بھی کہیں چھپ کے بیٹھ جاؤں۔ لعنت مجھ پر اگر میں ایسے جینا قبول کروں اور لعنت تجھ پر کہ تو نے ایسی بات کہی۔ آپ زیادہ تردد مت فرمائیں۔ میں سب کر لوں گا۔ ان کی حفاظت بھی میری ذمے داری ہے اور سب کا ساتھ نبھانا بھی۔"

"یار! تو تو ناراض ہو گیا۔"

"تو نے بات ہی ایسی کی ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ غالب اور نازو کی کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ کسی کو خیال ہی نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔"

اب مجھے غصہ آ گیا "دیکھ محسن! ایسی بات مت کر۔ یہ الزام نہیں گالی ہے ہم سب کے لیے۔ بات نہ کرنے کا مطلب یہ کیسے ہو گیا کہ ہم انھیں بھول گئے ہیں یا ان کے لیے کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔"

"وہ بات تو پرانی ہو گئی جب رابعہ کے ساتھ تم وزیر خان اسپتال گئے تھے۔ صرف اندازہ تھا تمھارا کہ انھیں وہاں رکھا گیا ہو گا۔ کوئی ثبوت نہیں دیکھا تم نے اپنی آنکھوں سے۔"

"وہ جہاں بھی ہوں گے۔ بالآخر واپس آ جائیں گے۔ بہت جلد۔"

"بہت جلد!" محسن نے تلخی سے کہا "ان پر ایک ایک لمحہ بھاری ہو گا۔ وہ منتظر ہوں گے کہ ایم آر ایس کے سر بہ کف مجاہد اچانک یلغار کریں گے اور دشمنوں کو تہس نہس کر دیں گے' انھیں چھڑا لیں گے۔ اور کتنی مایوسی کا شکار ہوں گے وہ کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ معلوم نہیں ان پر کیا بیت رہی ہے۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "دیکھ یار۔ قید کبھی خوش گوار نہیں ہوتی خواہ اپنے ہی محل میں قید تنہائی ہو۔ دشمن کی قید میں خیر کی توقع نہیں رکھی جا سکتی مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ میں نے دلاور کو ان کے تحفظ کی ضمانت بنا کے رکھا تھا۔ انھیں خبردار کر دیا تھا کہ غالب یا نازو کو خراش بھی آئی تو دلاور کے جسم پر چھرا چلے گا۔ انھوں نے ہمیں ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ وہ نازو کی انگلی نہیں تھی لیکن ہم نے یہ نہیں کیا کہ مطمئن ہو کے بیٹھ جاتے' انھیں بتاتے کہ اس جعلی کارروائی کو ہم نے ایک احمقانہ حرکت سمجھ کے نظر انداز کر دیا ہے۔ نہیں' ہم نے فوراً جواب ارسال کیا کہ دلاور کی انگلی سنبھال کے رکھو۔ ہم نے تو زنانہ مردانہ ہاتھ کے فرق کو نوٹ کر لیا تھا۔ وہ تو تصدیق بھی نہیں کر سکتے تھے کہ انگلی دلاور کے ہاتھ کی ہے یا کسی اور کے ہاتھ کی۔ اب دلاور کی بیوی نے اپنے شوہر کو زندہ سلامت دیکھ لیا ہے تو اسے یقیناً اطمینان ہوا ہو گا مگر اس سے غالب یا نازو کے لیے خطرہ نہیں بڑھا۔ دلاور اب بھی ہمارے قبضے میں ہے اور اسے تلاش کرنے والے تھک ہار کے بیٹھ گئے ہیں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ غالب یا نازو کے ساتھ جو کچھ ہو گا اس سے بدتر دلاور کے ساتھ ہو جائے گا۔ دلاور کی بیوی بھی اپنے شوہر کی بے بسی کی حالت دیکھ گئی ہے۔ اب وہ خود غالب اور نازو کی حفاظت کرے گی۔"

"مگر کیا یہ اس کے اختیار میں ہے؟"

"ہاں۔ وہ اختیار حاصل کر سکتی ہے۔ شوکت رانا نے اسے بے اختیار کرنے کی ناکام کوشش کی تھی مگر اس نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی۔ ناکام بغاوت کے مجرم کو سزائے موت ہی ملتی ہے۔ شوکت رانا کو اب اپنی جان کی فکر ہو گی کیونکہ دلاور کے نمک خوار ابھی تک اس کے ساتھ ہیں۔ اگر بے یقینی کے باعث کسی نے نمک حرامی کرنے کا سوچا ہو گا تو دلاور کی بیوی ان سے نمٹ لے گی۔ ملکہ عالیہ کا یہ اعلان کہ بادشاہ سلامت زندہ ہیں اس کے اقتدار کو بحال کر دے گا۔ پھر شوکت رانا کا ساتھ دینے والے بہت کم ہوں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ دلاور کی بیوی کو حالات پر پورا کنٹرول حاصل ہو جائے گا۔ ہاں وہ سازش کا شکار ہو جاتی تو پھر شوکت رانا اور بیڈرید یا ڈاکٹر شاہ خود مختار ہو جاتے۔ اب تو ان کی تنظیم اور ان کی ٹولی بھی انتہائی غیر مستحکم ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سب کچھ مطمئن ہیں۔ بے شک قید کی اذیت کم نہیں لیکن غالب اور نازو کی جان کو خطرہ کسی سے لاحق نہیں ہو سکتا جب تک دلاور ہماری تحویل میں ہے۔"

نیچے اپنے بیڈ روم میں وقار یوسف ان تمام معاملات سے بے خبر سو رہا تھا۔ بوبی اس کے ساتھ تھا اور اسی کی طرح سکون کی گہری نیند میں تھا۔ مجھے ان دونوں پر رشک آیا۔ بوبی تو خیر ابھی بچہ تھا اور فکر کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتا تھا مگر وقار یوسف کی زندگی میں بھی تفکرات کا دخل صرف روزمرہ کے معمولات کی حد تک تھا۔ اسے مؤکلوں کے عدالتی معاملات سے ہٹ کے اس کی نجی زندگی میں کچھ تو پریشان کن نہیں تھا۔ نہ اسے آنے والے کل کا خوف تھا اور نہ گزرے ہوئے کل پر کوئی احساس رنج و ندامت۔ خدا نے اسے سب کچھ دے رکھا تھا۔ صحت اور عزت اور پُر آسائش زندگی کی ہر فکر فردا سے بے نیاز کر دینے والی بہت سی دولت جو ایک جیب

سے ساتھ جان بچا کے نکل جائے۔"

"ان سے کہو گاڑی کو پیچھے لے جائیں۔ پورچ میں ایک بھی نظر نہیں آنی چاہیے۔"

میں نیچے اتر گیا "میں کرتا ہوں کچھ بندوبست۔"

محسن نے گاڑی کو باہر ہی لاک کیا اور چابی رابعہ سے لے لی۔ خوش گوار موڈ میں تھیں اور محسن کے لیے بیک وقت تند و تیز جملوں کے اور حملوں کا تین طرف سے سامنا کرنا تھا چنانچہ اس نے دانائی سے کام لیتے ہوئے صرف مسکرانا دلاور کسی کو جواب دیے بغیر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"یہ آنے تھے ہمیں بھر کا مارنے والے۔" گل نے ہاتھ نچایا "ہم ایسی زبردست دعوت اڑا کے آئے ہیں۔"

رابعہ نے اس کی تائید کی "مگر اب تم کہاں جا رہے ہو؟"

محسن نے کہا "شرم سے ڈوب مرنے جا رہا ہوں۔ کوئی اعتراض؟"

رابعہ بھی "کوئی اعتراض نہیں لیکن اکیلے کیوں جا رہے ہو۔ ضرورت ہو تو مجھے بھی ساتھ لے جاؤ۔"

محسن نے انگلی سے اشارہ کیا "وہ اوپر سے کود کے جان دینے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ انتظار کر رہا ہے کہ زمین پھٹ جائے تو اس میں سما جائے۔"

ان تینوں نے ہنستے ہوئے ہاتھ ہلایا "بڑی دیر سے شرم آئی۔ شرم آنی لازم تھا ہمارے جانے کے بعد۔"

میں نے اوپر سے چلا کے کہا "بہتر ہو گا اگر تم ہمیں معاف کر دو۔ آخر ہم محبت کرتے ہیں تم سے۔ ہم میں سے دو تمہاری خاطر تمہارے مجازی خدا ہیں۔ ایسے نہ ہو تمھیں پھر طلاق ہی ملے گی۔"

"اچھا جاؤ معاف کیا۔" گل ہنس کے بولی۔

محسن گاڑی کو آگے لے گیا اور پھر گھوم کے پچھلی گلی میں لے گیا۔ وہ اپنے ساتھ آئس کریم لائی تھیں اور ان کا موڈ اتنا خوش گوار تھا کہ وہ سب بیک وقت بول رہی تھیں اور مسلسل ہنس رہی تھیں۔ ظاہر ہے اس شور میں وقار یوسف کیسے سو سکتا تھا۔ وہ محفل دیکھ کے میں نے بھی کوئی خوف زدہ کرنے والی بات کہنے سے گریز کیا اور محسن نے بھی کچھ نہیں کہا۔ سب سے پہلے گل نے اور پھر رابعہ نے تاڑ لیا کہ ہم زبردستی ہنس رہے ہیں۔ ان کی ہنسی مذاق میں بھی شریک ہیں ورنہ اندر سے ہمیں کسی فکر نے پریشان کر رکھا ہے۔ "تم کچھ چھپا رہے ہو؟" گل نے مجھ سے پوچھا۔

رابعہ نے کہا "ہاں کیا جھگڑا ہوا یا بعد میں ایسی کوئی بات ہوئی تھی؟"

محسن نے کہا "بات تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"مطلب ہم اور بوبی تو ہم تم سے چھپائیں گے؟"

"مطلب یہ ہے ہم دونوں" گل نے دو ٹوک لہجے میں کہا

کرنے والی بیوی اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس کا گھر' اس کی بیوی اور اس کا مستقبل سب شاندار تھے اور وہ اتنا صابر و قانع شخص تھا کہ مزید کی ہوس سے بے نیاز تھا چنانچہ اسے اطمینان قلب کی وہ دولت حاصل تھی جس کے بغیر دنیا کی ہر دولت بے کار ہو جاتی ہے۔

میرے لیے وقار یوسف اور بوبی کی بے فکری کی نیند بھی فکر کا سبب بنی ہوئی تھی۔ اپنے اندازوں پر یقین ہونے کے باوجود میرے دل میں ایک خلش سی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ سوتے رہ جائیں اور تباہی و بربادی کا سیلاب انھیں بے خبری میں اسی طرح بہا لے جائے جیسے ہیروشیما کے لاکھوں شہریوں کو ایک ایٹم بم کی ہلاکت خیز تابکاری نے ہوش میں آنے سے پہلے موت کی آغوش میں پہنچا دیا تھا۔ میں وقار کو کسی ممکنہ خطرے سے خبردار کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ بوبی کے ساتھ بحفاظت نکل جائے۔ گھر کا کوئی کیا بگاڑے گا۔ صرف ہم ہوں گے تو ان اخوان الشیاطین کی یلغار کا مقابلہ کر لیں گے۔

محسن نے میری رائے سے اتفاق نہیں کیا "کل از مرگ واویلا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اسے پیش بندی بھی کہتے ہیں۔"

"اول تو یہاں کوئی جنگ عظیم ہو گی نہیں۔ ہوئی تو ہم غافل نہیں ہیں۔ وقار کو اتنی مہلت ضرور ملے گی کہ وہ بوبی کو اٹھا کے پیچھے سے نکل جائے اور ساتھ والے کسی گھر سے پولیس کو مطلع کر دے۔"

"پولیس کو پہلے ہی بلایا جا سکتا ہے۔"

محسن نے حیرانی سے مجھے دیکھا "صرف اپنی قیاس آرائی کی بنیاد پر کہ کچھ ہو سکتا ہے بلکہ ہونے والا ہے۔ وہ پوچھیں گے نہیں کہ اندیشہ کس سے ہے اور کیوں؟ اتنی مستعد تو باہر کی پولیس بھی نہیں ہو سکتی کہ ہر شہری کو محض اندیشے کی بنا پر تحفظ فراہم کرے۔"

دائیں جانب سڑک کے موڑ پر کسی گاڑی نے ٹرن لیا اور میں نے خاموشی میں ناکس ویگن کے انجن کی غراہٹ سنی۔ گل' رابعہ اور گل لوٹ آئی تھیں اور اچانک یہ سوال اہم ہو گیا تھا کہ انھیں گھر میں داخل ہونے سے قبل ہی خبردار کر دیا جائے اور کہا جائے کہ وہ آج رات منظر کے گھر میں گزار لیں کیونکہ یہاں ہم خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ اس دلیل سے رابعہ اور گل کو قائل کیا جا سکتا تھا مگر وہ کبھی بوبی کو ساتھ لے جائیں۔ گل اپنا گھر اور اپنے شوہر کو چھوڑ کر جانے پر کبھی رضامند نہ ہوتی۔

"کچھ دیر بعد انھیں اصل بات بتائی جا سکتی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم نے کیا دیکھا تھا اور سنا تھا" میں نے کہا۔

"PANIC میں پڑ جائیں گی سب" محسن بولا۔

"نہیں یار۔ رابعہ اور گل ہر تجربے سے گزر چکی ہیں۔ گل شاید گھبرائے۔"

"وہ بھی ناواقف حالات نہیں ہے۔ اسے ہم سب سمجھا سکتے ہیں کہ ڈرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ مقابلہ ہم کریں گے۔ وہ بولی اور

www.paksociety.com

اور پھر وقار کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

وقار نے جمائی لی "ایمان سے پکی نیند میں سو رہا تھا۔ تم نے ہی زبردستی جگا دیا ورنہ۔ کوئی وقت ہے آئس کریم کھانے کا۔"

اسی وقت کسی نے کال بیل بجائی اور ایک ساتھ میں اور محسن اچھل پڑے۔ اب جھوٹ بولنے کی تو گنجائش رہی نہیں تھی اور نہ اس کا کوئی فائدہ تھا۔ ہمارا رویہ خود ہمارے خوف اور اضطراب کی چغلی کھا رہا تھا۔

میں نے ایک دم ریوالور نکال لیا اور کھڑا ہو گیا "تم ٹھہرو۔"

رابعہ نے ڈر کے کہا "کون آ سکتا ہے اس وقت۔"

محسن نے گلا کھنکارا "یہ سوال جواب بعد میں کرنا۔ تم جلدی اندر ببلی کے پاس۔ وقار تم بھی چلو۔"

وقار نے کہا "آخر بات کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تمہیں پہلے سے اندازہ تھا۔ کون آنے والا تھا؟"

میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا "ایک گاڑی ہے۔ پہلے کبھی دیکھی نہیں۔"

وقار اور محسن نے بھی جھانک کے دیکھا پھر میں ریوالور جیب میں ڈال کے اور اس پر اپنی گرفت رکھتے ہوئے باہر گیا۔ محسن نے مجھے کور کیا اور دس فٹ پیچھے ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہی رک گیا۔

گیٹ کے باہر صرف ایک شخص کھڑا ہوا تھا جو میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اسے میں نے صرف ایک بار پہلے دیکھا تھا مگر اب میں اسے تاریکی میں بھی شناخت کر سکتا تھا۔ وہ شوکت علی رانا تھا مگر اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ اس وقت وہ سجا نہیں تھا۔ پیچھے قیمتی کار میں شوفر کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اور وہ نیوی بلیو وردی میں اپنی جگہ مجسمہ بنا بیٹھا تھا۔

میں نے چوکیدار کی طرح سلام کیا "کس سے ملنا ہے جناب؟"

اس نے بالکل بدلی ہوئی، بارعب اور بھاری آواز میں کہا "چوکیدار، ہم شوکت علی رانا ہیں۔ ایم این اے۔"

میں نے سر ہلایا اور پھر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"وہ قانون دان وکیل مس رابعہ قادری گھر پر ہیں؟" اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کے آگے بڑھایا۔

میں نے کارڈ لینے کی کوشش نہیں کی "آپ گھر بھول گئے ہیں شاید۔ یہاں یوسف قادر ایڈووکیٹ رہتے ہیں۔"

"ہم جانتے ہیں۔ لیکن مس رابعہ قادری یہاں بھی ہوتی ہیں۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "وہ اپنے آفس میں ہوتی ہیں یا پھر منظر ایڈووکیٹ کے گھر۔"

"تم کیوں فضول بحث کر رہے ہو ہم سے۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ اس وقت یہاں ہیں" اس نے رابعہ کی گاڑی کی طرف دیکھا "جا کے کارڈ دو انہیں اور کہو کہ ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ معاملہ اہم ہے اس لیے ہم آئے ہیں۔"

میں نے کارڈ لے لیا۔ "رانا صاحب۔ میں کارڈ بڑے صاحب کو جگا کے دے رہا ہوں۔ آپ ان سے بات کر لیں۔ آپ مانتے نہیں کہ مس رابعہ یہاں نہیں ہیں۔ یوسف صاحب بہت ناراض ہوں گے مجھ پہ۔"

شوکت رانا گیٹ کے باہر کھڑا ہوا خود کو بے عزت محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ ایم این اے کا کارڈ مرعوب کرنے کے لیے کافی ہو گا اور میں اسے بصد احترام اندر لے جا کے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤں گا مگر میں نے ایک فرض شناس چوکیدار کی حیثیت سے گیٹ کو مقفل ہی رکھا تھا جبکہ مجھے اس کے ممبر نیشنل اسمبلی ہونے پر شک ہے۔

چند منٹ کی کانفرنس میں ہم نے طے کر لیا کہ شوکت رانا کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے۔

میں نے واپس جا کے کارڈ اسے واپس کر دیا "گڑبڑ کرا دی آپ نے سر۔"

اس نے بے چین ہو کے کہا "کیوں کیا بات ہے؟"

"صاحب نے نوکری سے نکال دیا مجھے کہ تمہیں چوکیداری نہیں آتی۔ ہر ایرے غیرے کے لیے مجھے آدھی رات کو جگاتے ہو۔"

شوکت رانا کا چہرہ سرخ ہو گیا "کیا!... میں ایرا غیرا ہوں؟"

"مجھے کیا معلوم جی آپ کیا ہو۔ میں تو ایک معمولی چوکیدار ہوں۔ میں نے تو کہا تھا کہ وہ بگڑ جائیں گے۔"

شوکت رانا آپے سے باہر ہو گیا "آخر کیا سمجھتا ہے وہ خود کو۔ کیا وہ گورنر سے بھی بڑی چیز ہے۔ ایک معمولی وکیل کی بچی، ایک رکن قومی اسمبلی سے بات تک نہ کرے جو خود چل کے اس کے دروازے تک آیا ہو۔ گیٹ تک نہ کھولا جائے اس کے لیے۔ میں سمجھ لوں گا اس سے۔"

میں نے رونی شکل بنا کے کہا "انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ مس رابعہ سے ملنا ہو تو آفس میں ملیں۔ شریف اور مہذب لوگ آدھی رات کے وقت کسی کے گھر یوں بھی نہیں جاتے۔"

غصے میں شوکت رانا کا سانس اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ شاید ہائی بلڈ پریشر کا مریض تھا "سنو چوکیدار، یہ گاڑی ان کی نہیں ہے؟ رابعہ کی؟ اندر نہیں؟ تمہاری نوکری پکی۔ تم مجھے بیوقوف بنا رہے ہو۔" اس نے کارڈ پھر مجھے دے دیا۔

میں نے اور زور سے سر ہلایا "گاڑی تو انہی کی ہے۔"

"اور وہ اندر بھی ہے؟" رانا نے رازداری سے پوچھا۔

میں نے اندر دیکھا اور پھر انکار میں سر ہلا دیا۔ رانا نے اپنی ذلت کو ختم کرنے کے لیے رابعہ کو ایک پیغام دیا "میں اسی کے فائدے کی بات کرنے آیا تھا مگر اس نے شاید چوہدری دلاور کو کچھ سمجھ رکھا ہے۔"

اس نے مزید بہت کچھ کہا کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور ایک کے ساتھ کیا کرے گا۔ ظاہر ہے اس کی بے کار

www.paksociety.com

www.paksociety.com

کھڑکی کے پیچھے کھڑے ہوئے دوسرے سب لوگوں نے سنی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر مجھ سے کہا کہ اگر صبح بھی وکیل صاحب اپنا فیصلہ نہ بدلیں تو میں بے جھجک ان کی کوٹھی پر پہنچ جاؤں۔ مجھے زیادہ بہتر تنخواہ ملے گی اور نوکری پکی ہوگی۔

میں رانا کی پیش کش پر سنجیدگی سے غور کر رہا تھا کہ کیوں نہ کچھ دن اس کے ساتھ رہ کے دیکھا جائے مگر رابعہ متفکر تھی "یہ آدمی خطرناک ہے۔"

میں نے کہا "وہ بات یاد رکھو کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ دلاور اس کے برعکس انتہائی بے ضرر اور بے وقوف نظر آتا تھا۔ خود کو جاہل اور لاعلم تسلیم کرتا تھا اور اپنی حیثیت کا اظہار نہ کیے ہوئے رہتا تھا اور نہ ہو رہے ہیں۔"

"مگر وہ ایم این اے بہرحال ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟ یہ اس کا حلقۂ انتخاب یا کوئی گاؤں دیہات نہیں ہے جہاں وہ من مانی کرتا پھرے۔ زبانی دھمکی دینا اور بات ہے کیا وہ جانتا نہیں کہ اس کا واسطہ کن لوگوں سے ہے۔"

رابعہ قائل نہیں ہوئی "تم نے وقار یوسف کے لیے پریشانی کا سبب تو پیدا کر دیا۔ کیا حرج تھا اگر میں اس سے مل کے بات کر لیتی۔ پتا چل جاتا کہ وہ کیا بات تھی جس نے اسے آدھی رات کو یہاں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"بات اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ مجھ سے شرط لگالو۔ وہ تم سے پوچھتا سکندر کے بارے میں اور یہ کہتا کہ میں سکندر سے ملاقات طے کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے دلاور کو قتل کر دیا ہے تو ٹھیک ورنہ اب قتل کر دے۔ قانون کے چکر میں نہ پڑے۔ دلاور قانون کی گرفت سے صاف بچ نکلے گا۔"

محسن نے میری تائید کی "اصل فکر اسے یہ لاحق ہوگی کہ سکندر نے ہی دلاور کی بیوی کو قید سے رہائی دلائی ہے یا یہ کسی اور کا کام تھا۔ اگر سکندر نے ایسا کیا ہے تو سودا ہو سکتا ہے۔ وہ دلاور کی بیوی کو اس کے حوالے کر دے یا بتا دے کہ وہ کہاں ہے؟ اور بدلے میں پیٹرول کے علاوہ کاروبار میں برابر کی شراکت قبول کر لے۔ اپنے باپ کے حصے کا مالک بن جائے۔"

میں نے کہا "جو حق مجھے قانونی طور پر مل سکتا ہے وہ میں غیر قانونی حربے استعمال کر کے کیوں لوں۔ دلاور کو مارنا تو اتنا ہی آسان ہے جتنا چوہے دان میں پھنس جانے والے چوہے کو ہلاک کرنا مگر میرا نام بھی سکندر نہیں اگر میں نے اسے قانون کے ہاتھوں تختۂ دار تک نہ پہنچایا۔"

اچانک وقار یوسف بولا "یہ تو کوئی جعل ساز تھا۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا "میں اسے پہچانتا ہوں وہ رانا ہی تھا۔"

وقار نے کارڈ میری طرف پھینک دیا "مگر وہ ایم این اے نہیں ہے۔ یہ کارڈ دیکھو۔ اس پر لکھا ہوا ہے ایم شوکت رانا۔ اس کا نام تو شوکت اے رانا ہو سکتا تھا۔"

"حرام زادہ" میں نے بے اختیار کہا "ہم سے چال بازی۔"

محسن نے کارڈ دیکھ کے کہا "واقعی۔ یہ کارڈ شرکت کی... نہیں ہو سکتا اگر اس کا یہی نام ہے۔"

"اب تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایم شوکت رانا بھی کسی ایم این اے کا نام نہیں ہوگا۔" وقار یوسف بولا "اس نے ... احمقانہ کوشش کی تھی ہمیں مرعوب کر کے اپنا مطلب ... ناکامی نے اسے مشتعل کر دیا اور وہ اپنی اوقات پر آ گیا۔ اب ... کل وہ صاف انکار کر دے گا کہ وہ یہاں آیا تھا۔"

میں نے کہا "میں اس کا گیم سمجھ گیا۔ پہلے اس کے ... لے کر کسی رپورٹ دینے آئے تھے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ... رانا صاحب بات کر سکتے ہیں اور کوشش کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ اس عورت کا پتا لگانا بہت ضروری ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی خطرہ بنے۔"

"یہ رانا تو میری توقع سے کہیں زیادہ بودا ثابت ہوا۔ اس نے ... یا یوں کیا مجھے بھلا ایسی حرکتوں سے ہم متاثر ہو سکتے ہیں ... کبھی ایسی اوچھی حرکت نہیں کی جب وہ ڈراما کرتا ہے تو کمال کرتا ہے۔ خیر! ابھی تو ہم بیٹھتے ہیں۔"

"کہاں چلتے ہیں؟" گل نے کہا۔

"ڈیوٹی پر جانا ہے بھائی! چوکیدار ہوں میں ایک بلڈنگ کا۔"

"ایک رات نہیں جاؤ گے تو بلڈنگ چرا کے اپنے گھر نہیں لے جائے گا کوئی" گل نے کہا "ذرا دیکھو گھڑی میں کیا وقت ہوا ہے؟"

"میری گھڑی میں ایک بجا ہے" میں نے کہا۔

محسن بولا "میری گھڑی میں ایک نہیں بجا ہے۔ یہ کمال کی بات۔"

ہم نے سب کے احتجاج کو مسترد کر دیا اور گلی کے پچھلے ... میں کھڑی ہوئی گاڑی لے کر روانہ بھی ہو جاتے لیکن گل نے ہاتھ کی صفائی دکھائی اور اچانک معلوم ہوا کہ کسی بھی گاڑی کی چابی نہیں مل رہی ہے۔ اس نے رابعہ اور گل کو شاید بتا دیا تھا کہ چابیاں اس نے کہاں چھپائی ہیں۔ وہ سب بالکل انجان بن گئی تھیں لیکن ان ... ہنسی روکے نہیں رکتی تھی۔

میں نے کہا "رابعہ! تمہاری گاڑی تو یہیں کھڑی ہوئی تھی۔"

"پتا نہیں۔ گاڑی سے پوچھو۔ میں تو ابھی ان سب کے ساتھ ہی آئی ہوں" رابعہ بولی۔

"چابی کہاں رکھتی ہو تم یار؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"جہاں میرا جی چاہے رکھ دیتی ہوں۔ کل رات چابی ... والے ڈبے میں رکھی تھی۔ پرسوں منظر کے پرانے جوتے ... جو گھر کی چھت پر پڑے ہوئے پانی کے ٹینک پر رکھ دیا تھا۔"

گل نے کہا "میں بھی ایسا ہی کرتی ہوں۔ چابی سامنے ... جائے تو خطرہ ہوتا ہے کہ چور کو آسانی سے مل جائے گی۔"

"اچھا۔ آج اپنی گاڑی کی چابی تم نے کہاں رکھی ہے ...؟"

اور قالین پر سونے کا مزہ لو۔ دس منٹ اوپر دس منٹ نیچے۔"

اس نے زیر لب کچھ کہا اور کشن سر کے نیچے لگا کے قالین پر ہی لیٹ گیا "الّو کا پٹھا سو رہا ہے۔ اسے سونا کہتے ہیں؟ مچھر ہے پھر۔"

"ہم میں سے ایک سو سکتا ہے۔ اگر دوسرا مچھر مارتا رہے۔ مچھر جہاں بھی بیٹھے اور میں تمہاری خاطر یہ کر سکتا ہوں دوست" میں نے اٹھ کے لائٹ جلا دی "ہوشیار محسن۔ مچھر تمہارے گال پر بیٹھا ہوا ہے۔"

"جوتے پڑنے چاہئیں ان مچھروں کو۔ ایسا کریں آپ سو جائیں آرام سے۔ میں جوتے مار کے...."

اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ اچانک باہر سے کسی گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی ایک مخصوص آواز ہوتی ہے اور ہر گاڑی چلانے والا اپنی گاڑی کے دروازے کی آواز کو پہچان سکتا ہے حالانکہ فرق بہت معمولی ہوتا ہے۔ یہ آواز بھی پورچ میں کھڑی ہوئی گاڑی کے دروازے کی نہیں تھی۔ یہ بہت ہلکی سی مگر واضح آواز تھی جو سڑک کی طرف سے آئی تھی۔

"کون آیا ہے اس وقت" میں نے لائٹ بجھائے بغیر پردے کا ایک کونا ہٹا کے باہر دیکھا۔ خود بخود میرا ہاتھ ریوالور پر چلا گیا تھا۔

"انجن کی آواز تو سنائی نہیں دی تھی" محسن میرے قریب آ گیا۔

"انجن انہوں نے پہلے ہی بند کر دیا ہوگا۔ یہ تو وہی چالاک ہیں۔"

"لائٹ بجھا دوں میں؟"

"نہیں۔ اب نہیں۔ وہ محتاط ہو جائیں گے کہ کوئی جاگ رہا تھا۔"

میں نے دو افراد کو گیٹ کے اوپر سے کود کے اندر آتے دیکھا۔ باقی دو نے دیوار پر سے ایک سلنڈر انہیں تھمایا۔ یہ چھ سات فٹ لمبا ویسا ہی گیس سلنڈر تھا جیسا کہ ویلڈنگ کرنے والے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے عزائم خطرناک معلوم ہوتے تھے۔

محسن نے دوسری کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا "یہ زہریلی گیس لائے ہیں۔ ہم سب کو ہلاک کرنے کے لیے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "زہریلی گیس ہوتی تو یہ خود بھی ماسک پہن کر آتے۔ اور زہریلی گیس امونیا ہو یا کلورین ہو' سلفر ڈائی آکسائیڈ ہو تو اس کی بہت تیز بو ہوتی ہے۔ ایک دم پتا چل جاتا ہے۔ زیادہ خطرناک قسم کی بغیر بو والی گیس آسانی سے ملتی بھی نہیں اور سستی بھی نہیں۔"

"پھر یہ کیا... اوہ میں سمجھ گیا۔ یہ ہائیڈروجن گیس کا سلنڈر ہوگا" محسن بولا "ایک چنگاری کافی ہوگی دھماکے کے لیے۔ پورا گھر اڑ جائے گا۔"

"اب دیکھو یہ سلنڈر کہاں رکھتے ہیں" میں نے کہا۔

شاباش نکال لاؤ وہیں سے۔" میں نے گل سے کہا۔

اس نے سر کھجا کے سوچا "کبھی بھول بھی جاتی ہوں میں۔"

"جیسے اس وقت بھول گئی ہو" رابعہ نے کہا "کوئی بات نہیں صبح ڈھونڈ لینا' مل جائے گی۔"

"ہاں ملے گی کیوں نہیں۔ اس گھر میں آج تک ایک سوئی گم نہیں ہوئی مجھ سے۔ سکندر بہتر اطمینان سے چابیاں تلاش کرے۔"

"ہاں۔ ہم تو سونے جا رہے ہیں بھئی" گل نے کہا۔

"جاتے وقت دروازہ باہر سے لاک کر جانا" رابعہ بولی۔

میں نے محسن کو گھور کے دیکھا "تم نے گاڑی پیچھے کھڑی کی تھی۔ کہاں لائے رکھی تھیں چابیاں۔"

"تیرے سامنے ہی تھیں مگر اب نہیں ہیں تو کیا ہو سکتا ہے۔" محسن نے ٹھنڈی سانس لی "یہاں بھوت کوئی نہیں مگر چڑیلیں ہیں جو چیز وہ غائب کر دیں وہ کہاں مل سکتی ہے۔"

میں نے بے بسی سے کہا "خادم حسین انتظار کر رہا ہوگا۔"

گل نے اونچی بے سری آواز میں گایا "ساری رات تڑا تکی آں راہواں۔"

رابعہ ہنسی "ہائے بے چارہ مولوی خادم حسین۔ کتنا خیال ہے تمہیں اس کا۔ ہے بھی تو اتنا پیارا سا بھولا بھالا کاٹھ کا الّو۔"

"رابعہ۔ مجھے صبح اٹھ کے بھاگنا پڑے گا۔ اور یہ چوکیدار کی وردی پہن کے سونا پڑے گا۔"

گل نے فوراً مسئلے کا حل پیش کر دیا "وقار کے کپڑے ہیں نا۔ ویسے اگر تم صبح صبح بھاگنا چاہو تو اسپورٹس شوز بھی مل جائیں گے۔"

"اب رہنے دو۔ زیادہ نخرے مت دکھاؤ" رابعہ نے کہا "مجھے پتا ہے مولوی خادم حسین کیسے گھوڑے بیچ کے سوتا ہے۔ ایک رات تم نے پتھر مار مار کے دفتر کے سارے شیشے توڑ دیے تھے تو وہ اٹھا تھا۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ ایک دن صبح اٹھ کے مین گیٹ کا تالا کھول دے۔"

"لیں۔ انتہا تو وہ علی الصباح ہوگا نماز کے لیے" گل نے کہا۔

ظاہر ہے اس کے بعد مزید دلائل اور ضد کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وقار پہلے ہی سونے چلا گیا تھا۔ میں نے اور محسن نے ڈرائنگ روم کے صوفوں پر ڈیرا ڈال لیا۔ کچھ میرا ذہن منتشر خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ کچھ صوفے کی محدود چوڑائی پر سونا سولی پر لیٹنے کے مترادف تھا۔ میں نے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے اور چوکیدار کی وردی میں بالکل ایزی نہیں تھا۔ اوپر سے مچھر مسلسل یلغار کر رہے تھے۔ ان کے کاٹنے پر مجھے اعتراض نہ ہوتا اگر وہ ایک ساتھ میرے کان میں بین بجانا چاہتے تھے۔ پھر محسن نیند میں کروٹ لینے سے فرش پر گرا' اٹھ کے پھر لیٹا اور دس منٹ بعد پھر صوفے سے نیچے۔

میں نے ہنس کے کہا "یہ اچھا ہے بیٹے۔ بیک وقت صوفے پر

www.paksociety.com

پورچ لائٹ کی روشنی میں غور سے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ ان چاروں میں سے دو چہرے نئے تھے۔ ریوالور ان سب کے ہاتھوں میں تھے اور وہ بڑی بے خوفی سے اندر آگئے تھے۔ میں نے اور محسن نے انھیں سائڈ کی گیلری سے سلنڈر اُٹھا کے پیچھے جاتے دیکھا۔ میں نے محسن کو سامنے نظر رکھنے کی ہدایت کی اور خود لاؤنج سے گزر کے کچن کی طرف چلا گیا۔ کچن کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے آواز کیے بغیر اس کی کنڈی کھول دی اور اندھیرے میں پوری احتیاط سے چلتا ہوا واپس آگیا۔ میری توقع کے مطابق وہ کچن سے گزر کے لاؤنج میں آگئے۔ تینوں بیڈ روم لاؤنج کے آس پاس تھے اور سب کے دروازے بند تھے۔ لاؤنج ہی وہ مرکزی جگہ تھی جہاں سلنڈر رکھ کے گیس چھوڑی جا سکتی تھی۔ اندر سونے والوں کو پتا بھی نہ چلتا کیونکہ یہ گیس ہوا سے بہت ہلکی ہے اور اوپر اٹھتی ہے۔

دو افراد سلنڈر پہنچا کے واپس باہر لوٹ گئے تھے۔ باقی دو میں سے ایک بجلی کے دو تار پلگ میں لگا رہا تھا اور تاروں کے پیچھے کو کھڑکی سے گزار کے باہر تک پھیلا رہا تھا۔ تار یقیناً اتنا لمبا تھا کہ سڑک تک پہنچ جائے۔ گیس کھول کے وہ باہر نکل جاتے اور گاڑی اسٹارٹ کرکے دونوں تاروں کو صرف ایک بار آپس میں ملاتے تو اندر اسپارک ہوتا اور لاؤنج میں بھری ہوئی ہائیڈروجن گیس دھماکے سے آگ پکڑ لیتی۔ اس کے ساتھ ہی گیس سلنڈر بم کی طرح پھٹ جاتا اور اس گھر کے مکین شعلوں کے ساتھ جل کے اسی گھر کی دیواروں کے ملبے میں دفن ہو جاتے۔ صبح کون کے بتاتا کہ اس واردات کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ غالب اور نازو خود قید میں مجبور اور بے بس تھے۔ اکیلا منظر کس کس پر ہمارے قتل کی فرد جرم عائد کرتا۔

میں ایک پردے کے پیچھے ساکت کھڑا ہوا موقع کے انتظار میں تھا۔ تار لگانے والا اندازے سے تار کو ایک جگہ باندھ کے واپس کچن کی طرف گیا تھا اور اب شاید تار کو گیلری سے گیٹ تک پھیلا رہا تھا۔ گیس سلنڈر درمیان میں رکھنے والے نے اس کا والو چیک کیا اور سلنڈر کو فرش پر لٹانے لگا۔

یہی وہ موقع تھا جب میں اس پر جست لگا سکتا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان دس فٹ کا فاصلہ تھا اور مجھے خود کو ان چیزوں سے بھی بچانا تھا جو بیچ میں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ بھی انتہائی ضروری تھا کہ اسے حلق سے آواز نکالنے کا موقع بھی نہ ملے۔ یہ سب کارروائی مشکل سے دس منٹ کی تھی اور وہ جس رفتار سے کام کر رہے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید دس منٹ سے پہلے ہی وہ بہت دور نکل جاتے۔ اس وقت تک وقار یوسف کا گھر آگ اور ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا ہوتا اور کوئی بتانے والا نہ ہوتا کہ یہ سب کس نے کیا تھا؟

میں نے خدا کا نام لے کر اور سانس روک کے چھلانگ لگائی۔ میں تقریباً اُڑتا ہوا گیا تھا لیکن ایک مشقی مہارت کے ساتھ اس پر

گرتے ہی میرے ہاتھوں نے اس کے گلے کو جکڑ لیا تھا اور اس کا جسم میری ٹانگوں کے شکنجے میں آگیا تھا۔ اسے سانس لینے کی مہلت بھی نہیں ملی اور میں نے اس کی گردن توڑ دی۔ پھر میں اس کی لاش کو لاؤنج کے صوفے کے پیچھے لے گیا۔ میرا ارادہ ہرگز اسے قتل کرنے کا... نہیں تھا مگر جلدی میں اس کی گردن پر ذرا سخت ہاتھ پڑ گیا۔ دیکھنے میں وہ اچھا صحت مند نظر آتا تھا اور اس کی گردن بھی اتنی کمزور نہیں لگتی تھی۔

بجلی کے تار لگانے والا بھی فوراً ہی نمودار ہو گیا۔ لگتا تھا کہ وہ خود بھی بجلی سے چلتا ہے۔ وہ بے حد پھرتیلا اور پارے کی طرح مضطرب تھا۔ اس کے اندر بھی کسی سرخ بلب کی سوئچ ہوگی۔ وہ تاروں کو کاٹ کر چھیلتے ہوئے اس نے او عزرا عمر کہا۔

"اب کدھر چلا گیا۔ کلو؟ کالی رات تو نہیں کھا گئی تجھے۔ جلدی کر بیٹے جلدی۔ میرا کام تو تمام ہو گیا۔ اب بولتا کیوں نہیں کدھر ہے۔ کیا سلنڈر میں گھس گیا؟ گیس کے ساتھ اُڑے گا غبارے کی طرح پھول کے۔ اوڑ کر چھت سے لگ جائے گا سالے۔"

میرا اندازہ درست تھا۔ اس میں ہائیڈروجن گیس ہی تھی جو اوپر اُڑنے والے غباروں میں بھری جاتی ہے۔ اس گیس میں نہ بو ہوتی ہے اور نہ اس کے کوئی مضر اثرات ہیں لیکن سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ خفیف سا شعلہ بھی ملے تو دھماکا۔ اس لیے اب ہیلیم گیس کو زیادہ محفوظ اور قابل ترجیح سمجھا جاتا ہے۔

الیکٹریشن بہت آہستہ بول رہا تھا مگر اس کے الفاظ میرے کانوں تک صاف پہنچ رہے تھے۔ تینوں بیڈ روم اس لیے بھی بند تھے کہ اندر ائرکنڈیشنر چل رہے تھے۔ ایک میں وقار اور اس کی بیوی تھے۔ دوسرے میں گل اور بوبی۔ تیسرے میں رابعہ اکیلی تھی۔ محسن میری وجہ سے گل کے بیڈ روم میں نہیں تھا اور میں اس بیڈ روم میں نہیں سونا چاہتا تھا جہاں اکیلی رابعہ ہو۔ یہ خیال ہم میں سے کسی کو نہیں آیا کہ گل کے ساتھ ہی رابعہ سو جاتی تو ہم دونوں ڈرائنگ روم میں خوار نہ ہوتے۔ صوفے پر سے قالین پر نہ لوٹتے اور مچھروں کی سمع خراشی سے محفوظ رہتے۔ تجربات و یہی ہے کہ بعض اوقات خرابی میں چھپی ہوئی اچھائی کو انسان کی نظر نہیں دیکھ سکتی۔ یہ سب نہ ہوتا تو ہمیں ہائیڈروجن بم سے اُڑانے والوں کی آمد کا پتا بھی نہ چلتا، پتا چلتا اچانک خود کو دوسری دنیا میں پانے کے بعد۔

بجلی والے کو میں نے مرغی کے چوزے کی طرح پکڑ لیا۔ وہ تھا بھی مختصر سا اور چوں چوں کرنے والا۔ وہ تھوڑا سا پھڑپھڑایا مگر میری گرفت سے نہ نکل سکا۔ میں نے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا تھا تاکہ اس کی آواز نہ نکل سکے۔ اسی ہاتھ کے حلقے میں اس کی گردن بھی تھی۔ دوسرا ہاتھ میں نے اس کے شانے پر گردن کے قریب مارا تو وہ آخری بار تڑپ کے ساکت ہو گیا۔ میں نے اسے کے قریب ڈال دیا اور ڈرائنگ روم سے گزر کے ٹیرس میں آگیا جہاں محسن مورچہ بند تھا۔

لازم نہیں۔ ائرکنڈیشنرز کی وجہ سے کمروں کے دروازے کھڑکیاں مکمل طور پر بند رہتے ہیں اور لاؤنج میں وہ کسی کی دخل اندازی کے خطرے سے بے نیاز ہو کے اپنا کام کر سکتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ کیا اس میں ایک گھنٹا بھی صرف ہو جائے تو کچھ نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "وقار کو گیٹ پر ایک مسلح گارڈ ضرور رکھ لینا چاہیے۔ اپنی حفاظت کے لیے چار پانچ سو روپے ہر مہینے خرچ کرنا اس کے لیے کیا مشکل ہے۔"

"آج گیٹ پر چوکیدار ہوتا تو سب سے پہلے وہی مارا جاتا۔ گاڑی بالکل سامنے لا کے روکنا ان کی مجبوری تھی۔ یہ گیس کا بھاری سلنڈر اُٹھا کے زیادہ فاصلہ طے نہیں کر سکتے تھے" محسن نے کہا۔

لاؤنج میں کھڑا ہوا گارڈ وہی شخص تھا جسے میں وزیر خان اسپتال میں بھی دیکھ چکا تھا۔ وہاں اس کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ اس نے خود کو ایک احمق، لالچی اور ڈرپوک آدمی کے روپ میں پیش کیا تھا جبکہ یہاں وہ ایک جری، سفاک اور خون آشام قاتل کا کردار ادا کر رہا تھا اور یقیناً اس کا اہل ہوگا ورنہ اسے یہ ذمے داری ہی نہ سونپی جاتی۔

تقریباً یہی صورت حال دوسرے شخص کی تھی جو باہر گاڑی پر بیٹھا ہوا تھا۔ جب وہ موبائل فون پر میری آواز سن کے پوچھتا تھا کہ "کون؟" اور میں جواب دیتا تھا کہ "تمھارا باپ" تو اس کی آواز میں کاہلی اور غنودگی ہوتی تھی۔ وہ مجھے اس طرح شناخت کرتا تھا اور پھر میری بات دلاور سے کراتا تھا۔ وہ فضولی اور کاہل نظر آنے والا یہ شخص مجھے "سی ڈی انٹرپرائز" میں بھی ملا تھا اور وہاں بھی اس کی شخصیت کا تاثر کچھ مختلف نہیں تھا۔ میں نے اسے بہ آسانی ناک آؤٹ کر دیا تھا مگر یہاں اسے ایک خاص مشن پر بھیجا گیا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ بھی ہلاکو خان سے کم نہیں۔

ان دونوں نے آتشیں اسلحہ محض نمائش کے لیے نہیں اُٹھا رکھا تھا۔ وہ اس کو ضرورت کے وقت پوری مہارت کے ساتھ استعمال کرنا یقیناً جانتے ہوں گے۔ پیشہ ور قاتل اور دہشت گرد اور تربیت یافتہ کمانڈوز کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ انتہائی پُرسکون رہتے ہیں اور صورت سے ذرا بھی خطرناک نظر نہیں آتے۔ انھیں قتل عام بھی کرنا پڑے تو ان کے اعصاب یا ذہن پر کوئی ناخوش گوار ردعمل اثر انداز نہیں ہوتا۔ وہ سو آدمی مار کے سکون سے سو سکتے ہیں اور پیٹ بھر کے کھانا کھا سکتے ہیں۔ ہنسی مذاق کر سکتے ہیں اور موسیقی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

باہر والے گارڈ نے گیٹ کے قریب آ کے اندر والے سے کچھ کہا۔ ان کی بے چینی میں ہر لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ پریشان ہونے لگے تھے کہ اندر اتنی خاموشی ہے اس کے باوجود وہ دونوں ابھی تک واپس نہیں آئے جو کہتے تھے کہ کام تو مشکل سے پانچ منٹ کا ہے۔ پانچ کے دس منٹ ہو سکتے تھے مگر انھیں تو اندر گئے ہوئے پندرہ منٹ سے بھی زیادہ گزر چکے تھے۔

باہر گھومتے ہوئے دونوں مسلح افراد کے ہاتھوں میں خطرناک قسم کا خودکار اسلحہ تھا۔ ان میں سے ایک پورچ میں آگیا تھا اور باربار گیلری کی طرف جھانک کر گھڑی دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کو یہ پریشانی لاحق ہونے لگی تھی کہ اندر جانے والے ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ اسے معلوم ہوگا کہ یہ کام چند منٹ کا ہے۔ اس نے تار نصب کرنے والے الیکٹریشن کی پھرتی بھی دیکھی ہوگی لیکن اس کے بعد غیر معمولی تاخیر ہو رہی تھی۔

دوسرا محافظ گاڑی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس نے شک سے بچنے کے لیے بونٹ اُٹھا دیا تھا اور بظاہر وہ انجن میں کوئی خرابی تلاش کر رہا تھا لیکن اس کی نظر بھی مسلسل اندر کی طرف تھی۔ اس کا اسلحہ یقیناً سامنے ہوگا مگر مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ ابھی تک اندر مکمل خاموشی تھی چنانچہ باہر والے مطمئن تھے کہ سب کام ٹھیک ہو رہا ہے۔

میں بھی اب تک کی کامیابی سے مطمئن تھا اور یہی چاہتا تھا کہ باقی دو کو بھی اسی طرح پکڑ لیا جائے۔ اندر کام کرنے والے تخریب کار جو اپنی حفاظت کرنا نہیں جانتے تھے مگر وہ اپنے کام کے ماہر سمجھے جاتے ہوں گے۔ راناکے نظم میں ایسے تمام افراد کے نام بچے ہوں گے جو وقت اور حالات کی ضرورت کے مطابق تخریب کاری، دہشت گردی، قتل اور خونریزی، ڈکیتی اور اغوا، جعلسازی اور دھوکے بازی اور ہر طرح کی مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے اپنی ماہرانہ خدمات پیش کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر دور میں ہر ملک اور قوم میں ہر جگہ اور ہر زمانے میں صرف سکہ رائج الوقت میں فروخت کے لیے دستیاب رہتے ہیں۔ ان کا ضمیر ایمان اخلاق اور مذہب اصول اور قانون صرف پیسہ ہوتا ہے اور سب رشتے صرف پیسے کے رشتے ہوتے ہیں۔ خون کے رشتے، ہمسائیگی اور خاندان کے رشتے گلی محلے اور شہر کے رشتے، وطن کی مٹی کے رشتے اور انسان ہونے کے ناتے انسانیت کے رشتے ان کے لیے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ ان شیطانی ماہرین کی حفاظت کے ذمے دار بھی شیطان ہی تھے۔ وہ زیادہ خطرناک اس لیے تھے کہ ان کے ہاتھوں میں خطرناک اسلحہ تھا۔

میں نے کم سے کم الفاظ میں محسن کو اندر کے واقعات سے آگاہ کر دیا۔ ہم تاریکی میں دیوار سے لگ کر کھڑے ہوئے تھے اور سرگوشی میں بات کر سکتے تھے۔

"ان کا منصوبہ یقیناً حیرت انگیز شیطانی ذہانت کا ثبوت ہے۔ کم خرچ آسان لیکن انتہائی تباہ کن مگر یہ لوگ خاصے بے وقوف ہیں۔ کتنی بے خوفی سے انھوں نے عین گھر کے سامنے گاڑی کھڑی کی اور دندناتے ہوئے اندر آگئے۔" میں نے کہا "گھر میں اتنے لوگ ہیں کوئی بھی جاگ رہا ہوتا تو انھیں دیکھ لیتا۔"

محسن نے کہا "میرا خیال ہے کہ یہ پہلے ہی سب کے معمولات کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ اس وقت کوئی بھی بیڈ روم سے باہر نہیں ہوتا۔ گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں۔ اندر کوئی

www.paksociety.com

بالآخر انہوں نے میری توقع کے مطابق وہ غلطی کی جو ناگزیر ہو چکی تھی۔ باہر والا محافظ لاؤنج میں آگیا اور جو لاؤنج میں پہرا دے رہا تھا وہ گیلری کی طرف بڑھا۔

میں نے محسن سے کہا "میں ذرا ان سے بھی ملاقات کرلوں۔"

میں دوبارہ ڈرائنگ روم سے گزر کے لاؤنج میں پہنچا اور کچن کی طرف سے آنے والے راستے پر انتظار کرنے لگا۔ کچن کی کھڑکی کے شیشے پر مجھے اس کا دھندلا سا سایہ دکھائی دیا اور چند سیکنڈ بعد اس کا ہیولا کچن کے کھلے دروازے میں نمودار ہوا۔ پس منظر کی ہلکی سی روشنی میں اس کی حرکات و سکنات خاصی واضح تھیں۔ وہ پھونک پھونک کے قدم رکھتا آرہا تھا۔ آدمی کی چھٹی حس بھی ایسی صورت حال میں پوری طرح بیدار ہو جاتی ہے۔ مجھے وہ سب اُلو کے قبیلے والے لگتے تھے۔ کسی نے لائٹ جلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور نہ کوئی اپنے ساتھ ٹارچ لایا تھا۔ پین ٹارچ کی روشنی اتنی محدود ہوتی ہے کہ قدموں میں ایک فٹ کا دائرہ بنتا ہے لیکن ان کی نظر اتنی تیز تھی یا انہیں سخت ہدایات ... اپنا کام اندھیرے میں کر رہے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ اندر گھپ اندھیرا نہیں تھا۔ باہر پورچ میں روشنی تھی۔ پچھلی طرف کی گیلری روشن تھی اور آس پاس کے گھروں کا اجالا بھی منعکس ہو کے اندر پہنچ رہا تھا۔ باہر سے آنے والا ایک منٹ بعد تاریکی میں اس حد تک دیکھنے کے قابل ہو جاتا تھا کہ کسی چیز سے نہ ٹکرائے۔

وہ آگے بڑھا اور لاؤنج میں واش روم کے دروازے پر ٹھہر گیا "گلو" اس نے آہستہ سے کہا "کہاں ہو تم دونوں......"

اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہی تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ وہ جاندار آدمی تھا اور اس نے مزاحمت بھی کی۔ دوبارہ اس نے پیچھے کی طرف کہنی ماری۔ ایک دفعہ تو میری پسلیوں میں ایسی لگی کہ میرا سانس لینا دشوار ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اندھیرا زیادہ گہرا ہو گیا ہے اور میری گرفت اس پر ڈھیلی پڑ رہی ہے مگر یہ صرف ایک لمحے کا احساس تھا۔ میرا خوف تھا یا وہم تھا۔ دوسرے لمحے میں نے اپنی کہنی اس کی کمر پر ماری اور اسی کو آگے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ پیچھے کی طرف دولتی جھاڑے اور میری ٹانگوں کے درمیان اپنے بوٹ کی ایڑی مارے۔ یہ چوٹ فیصلہ کن ثابت ہو سکتی تھی چنانچہ میں اس سے بھوت کی طرح چمٹا رہا اور اسے اپنے ساتھ چمٹائے رکھا۔ میری تمام تر جدوجہد کا مقصد خاموشی کے وجود کو برقرار رکھنا تھا۔ اب تک جو کچھ ہوا تھا اس کا علم نہ اندر سونے والوں کو ہوا تھا اور نہ باہر کھلی آنکھوں اور کانوں سے پہرے داری کرنے والوں کو۔

جب وہ رکوع کی حالت میں تھا تو میں نے اسے گھما دیا لیکن اس کی گردن قابو میں رکھی۔ ایسے بل کھانے سے اس کی گردن ٹوٹ سکتی تھی مگر مجھے گردن سے زیادہ خاموشی کے ٹوٹنے کا خیال تھا۔ اس نے کرب سے ایک بل کھایا اور درد کی شدت سے نیم جان ہو کے ڈھیلا پڑ گیا۔ میرا ایک ہاتھ اب بھی اس کے منہ پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ اگر میں اس ہاتھ کو جھٹکا دیتا تو اس کا منکا ٹوٹ جاتا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی پتلون کو بیلٹ پر سے پکڑا اور اسے آگے دھکیلا۔ وہ آگے نہ جھکتا تو یہیں الٹ جاتا اور اس کا سر فرش پر لگتا۔ آگے صوفہ تھا۔ وہ اس پر اوندھے منہ گرا اور میں نے اس کی کمر پر سوار ہو کے اس کا سر گدے میں گھسیڑ دیا۔ اس کا منہ پہلے ہی بند تھا۔ ناک سے ہوا جانے کا راستہ بھی بند ہو گیا تو وہ تڑپا اور میں اس کی گدی پر سر نہ مارتا تو وہ آزاد ہو جاتا۔ چوٹ میری پیشانی پر بھی آئی مگر اس کا ہلنا جلنا موقوف ہو گیا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اسے چھوڑ دیا۔ یہ تیسرا شکار ذرا مشکل ثابت ہوا تھا لیکن خاموشی سے ہو گیا تھا۔ میں یہی چاہتا تھا کہ سونے والے ڈسٹرب نہ ہوں اور یہ کام ایسے ہو جائے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ صبح سب ٹھیک نظر آئے۔ کوئی یہ سوال بھی نہ کرے کہ کیا رات کو تم نے کچھ سنا تھا؟ کوئی آہٹ، کسی قسم کی کھٹ پٹ، کوئی آواز۔

میرا سانس پھول گیا تھا لیکن میں اس کامیابی پر بے حد خوش تھا جس میں میری کوشش سے زیادہ تائید ایزدی شامل تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ان میں سے کوئی چیخ مار دیتا یا کسی کی لات لگنے سے کوئی میز الٹ جاتی۔ مقابلے میں کوئی ڈیکوریشن پیس شہید ہو جاتا یا اس خبیث کے ہاتھ میں کوئی چیز آجاتی تو وہ دروازے پر کھینچ مارتا۔ پھر ایک ہنگامہ برپا ہوتا۔ گل گل رابعہ میں سے صرف گل ہی لڑکھڑا سکتی تھی مگر وہ بوبی کو سنبھالتی۔ گل صرف چلاتی اور مس رابعہ زیادہ سے زیادہ پولیس کو طلب کرنے کے لیے فون گھماتیں۔ یہ کام وقار یوسف بھی کر سکتا تھا مگر پولیس کے آنے تک نہ جانے کیا ہو جاتا۔ وہ اپنے خود کار ہتھیاروں کا بے دریغ استعمال کرتے۔ انہیں یقیناً سختی سے منع کیا گیا ہوگا کہ وہ گولی نہ چلائیں لیکن یہ نہیں کہا گیا ہوگا کہ پکڑے جاؤ تب بھی ان ہتھیاروں کا استعمال نہ کرنا بلکہ خاموشی سے ہتھیار ڈال دینا۔

جب میں کچن کی طرف سے باہر آرہا تھا تو مجھے محسن ملا۔

"سب خلاص؟"

میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا "الحمدللہ۔ باہر کی کیا رپورٹ ہے؟"

محسن نے مجھے ریوالور دکھایا "یہ اسی کی جامہ تلاشی میں ملا ہے۔ وہ خود گاڑی میں لیٹا ہوا ہے۔"

"زندہ یا مردہ؟"

"پتا نہیں۔ مجھے طبی معائنے کا خیال نہیں آیا۔ میں نے کپڑے دھونے والا ڈنڈا مارا تھا۔ کپڑا لپیٹ کے۔"

"وہ کہاں سے مل گیا؟"

"بس مل گیا۔ کہتے ہیں ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ بالکل صحیح جگہ پر لگا تھا۔ میں نے رسک نہیں لیا۔ پوری قوت سے وار کیا تھا۔"

"یہ خطرناک کام تھا۔ اس نے آواز نہیں نکالی؟"

اچانک محسن نے کہا "یار وہ تار تو رہ گیا۔"

میں نے سر پہ ہاتھ مارا "اُف۔ کیسی غلطی ہو جاتی۔ صبح کیا بتاتے کہ یہ تار کہاں سے آیا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

تار سمیٹ کر میں نے ڈرائنگ روم کی لائٹ بھی آف کی اور ایک بار پھر لاؤنج کی حالت پر غور کیا۔ کہیں کوئی چیز اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی نہیں تھی۔ کچن کا دروازہ بند کر کے میں ڈرائنگ روم کی طرف سے باہر آگیا۔ جہاں محسن گیٹ بند کرنے کے لیے تیار تھا۔ چند منٹ بعد ہم اس شاندار گاڑی میں سواری کا لطف اٹھا رہے تھے۔ ... ہوا کے دوش پر سرسراتی ہوئی بلکہ تیرتی ہوئی محسوس ہوتی ... کاغذات کا معائنہ کر کے مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ ڈائریکٹر وزیر ... ہسپتال کے نام پر رجسٹرڈ ہوئی ہے۔

میں نے محسن سے کچھ نہیں کہا تھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے مگر وہ ... تھا کہ اس سامان کے ساتھ ہم کہاں جا سکتے ہیں۔ رات نے ... تمام سڑکیں خالی تھیں اور محسن گاڑی کو خطرناک حد تک تیز ... رہا تھا۔

میں نے اسے ٹوکا "گاڑی پرائی ہے مگر زندگی تو اپنی ہے۔"

اس نے رفتار دیکھ کے کہا "یار رفتار زیادہ تو نہیں ہے۔ ایک سو ... کو ... محسوس بھی نہیں ہوتا۔ وینڈر فل کار۔"

"مگر یہ لاہور کی سڑکیں ہیں شیروانی صاحب لندن کی نہیں۔ کیا پتا کوئی گدھا بیچ میں آجائے گا۔"

میری بات منہ سے نکلی اور سچ ہو گئی۔ گاڑی ایک دم اچھلی۔ ایک زبردست جھٹکے سے سلنڈر نے چھت کا کپڑا پھاڑ دیا اور ... چھت کو بھی نقصان پہنچایا ہوگا۔ اوپر چھت میں گومڑ نمودار ہو گیا ... میرا سر ... ہونے لگا۔

محسن نے دانت نکال کے کہا "مین ہول تھا گزر گیا۔"

"یہ کوئی گلہ ہے میاں کہ تم نہیں گزرے۔ وہ ہوتی تو وہ تمہارا کیا بناتا" محسن نے مسکرا کے کہا۔

"بڑی کالی زبان ہے تمہاری۔ اچھا ہوا تو نے ہاتھی نہیں کہا تھا ورنہ وہ بھی آجاتا سڑک کے بیچ میں۔ حد ہے یار اتنی صاف سڑک پر کوئی سوچ سکتا ہے کہ گٹر کھلا پڑا ہوگا۔ بالکل بیچ میں۔"

"ہاں میں سوچ سکتا ہوں۔ گٹر بیچ میں اسی لیے بنائے جاتے ہیں اور اسی لیے کھلے رکھے جاتے ہیں کہ لوگ گاڑی آہستہ چلائیں۔ اگر کنارے پر بنائے جاتے تو سائیکل والے غریب لوگ گرتے ... کے دانت ٹوٹتے تو نقلی دانت بھی وہ کیسے بنواتے۔ فٹ پاتھ ... پیدل چلنے والے ان میں گرتے۔ ہڈیوں کے وارڈ تو پہلے ہی بھرے ہوئے ہیں۔"

محسن نے گاڑی کو سائڈ کی گلی میں موڑ دیا۔ رات کے تین بجے ... اس تہ خانے میں اتر کے دیکھا جہاں چوہدری دلاور قید ... رہا تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ مر نہ گیا ہو مگر اس کی حالت ... محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے پاس کھانے پینے کی چیزیں ... ختم۔ بوتل میں پانی بھی نہیں تھا۔ غالباً اس نے قید کو

"نکالی تھی۔ تو نے نہیں سنی؟"

اگلے آدھے گھنٹے میں ہم نے اندر سے ایک لاش کو اور دو نیم مردہ صحت مند آدمیوں کو باہر پہنچایا۔ محسن کا شکار بھی اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ اس طرح گاڑی کی ڈکی میں دو لاشیں سما گئیں اور دو قیدی پچھلی سیٹ پر ڈال دیے گئے۔ ہم نے ان کو اس طرح جکڑ بند کر دیا تھا کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد بھی حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے منہ ٹیپ سے سیل کر دیے گئے تھے جو وہ اپنے ساتھ ہی لائے تھے۔ گاڑی کے ایک خانے سے مجھے کسی بے رنگ محلول کی ایک شیشی بھی ملی جسے میں سونگھنے کی حماقت کرنے ہی والا تھا کہ محسن نے شیشی مجھ سے چھین لی۔

"ابھی چت سے گرو گے بے ہوش ہو کے۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔"

میں نے معصومیت سے کہا "یہ کیا ہے؟"

"یہ کلوروفارم بھی ہو سکتی ہے۔"

"اچھا۔ ڈیری فارم میں مویشی ہوتے ہیں اور پولٹری فارم میں مرغیاں۔ کلورو کے فارم میں کیا ہوتا ہے؟"

"یہ لوگ پوری تیاری سے آئے تھے۔ اگر ضرورت پڑتی تو کلوروفارم سنگھا کے جاگنے والے کو سلا دیتے اور منہ پر ٹیپ چپکا دیتے۔"

میں نے کہا "ہمیں مچھروں کا شکرگزار ہونا چاہیے جنہوں نے ہمیں سونے نہیں دیا اور مسلسل ہمارے کان میں گاتے رہے جاگتے رہو۔ شکر تو گل کو بھی ادا کرنا چاہیے کہ وہ صبح اٹھے گی تو اسے اپنا گھر اپنا سنسار سب اپنی جگہ ویسا ہی ملے گا جیسا گزشتہ شب تھا اس کے سونے سے پہلے۔ اور خدا کے بعد اسے ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ ہم نے اس کی بات مان لی تھی اور یہاں رک گئے تھے۔"

"ہم کہاں ماننے تھے" محسن ہنسا "اس نے منوالی تھی اپنی بات۔ اس کی قسمت بہت اچھی ہے یار۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ابھی تک تو خوش قسمتی کا کوٹا چل رہا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ جو آج نہیں ہوا وہ کل پھر نہ ہو تو اچھا ہے۔"

"اس لیے ضروری ہے کہ ہم فوراً اپنا کیمپ کہیں اور منتقل کر دیں بلکہ کیمپ تو کہیں ہونا بھی نہیں چاہیے۔ آج یہاں کل وہاں۔ اس سے پہلے کہ دشمن ایک ٹھکانے کا سراغ لگائے ٹھکانا بدل دینا چاہیے۔"

"اب کیا خیال ہے، چلیں؟" میں نے گیس کے سلنڈر کو پچھلی سیٹ پر ترچھا ڈال دیا۔ سیدھے رُخ سیٹ کی چوڑائی اتنی نہیں تھی۔ سلنڈر کا اٹھا ہوا حصہ چھت سے جا لگا۔ یہ بھی صرف اس لیے ممکن ہوا کہ وہ گاڑی "ٹاپ ڈارٹ" تھی۔ بالکل نئی امریکن ماڈل ۱۹۹۸ء جس کے ایڈائن نے شائقین کو دم بخود کر دیا تھا۔ یہ گاڑی اس وقت اکتیس ہزار کی تھی اور ظاہر ہے اسے خریدنا صرف رئیسوں کے بس کی بات تھی۔

www.paksociety.com

ناگزیر حقیقت کے طور پر قبول کرنا سیکھ لیا تھا اور اپنی تقدیر پر قانع ہوگیا تھا۔ کمرے میں پیشاب پاخانے کی بو ناقابلِ برداشت تھی لیکن دلاور شاید اس کا بھی عادی ہوگیا تھا۔ میں نے موم بتی جلائی تو اس نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور پھر سوگیا۔ اس کی داڑھی کے بال بہت بڑھ گئے تھے اور سر کے بال بھی مٹی کے رنگ کے ہورہے تھے۔ اس کے بدن پر ابھی تک وہی لباس تھا جو اس نے اسیری کے پہلے دن پہن رکھا تھا ظاہر ہے اس کی حالت بھی قابلِ رحم تھی لیکن دلاور کسی رحم کا مستحق نہیں تھا۔

نئے قیدیوں کی یہاں منتقلی انتہائی دشوار کام ثابت ہوا۔ وہ بے ہوش تھے انھیں میں نے اور محسن نے کندھوں پر ڈالا اور گاڑی سے اٹھا کے اس خیمے تک لائے جو رابعہ کی پرانی کوٹھی کے پلاٹ پر لگوایا گیا تھا۔ یہ شاید سو گز سے زیادہ فاصلہ تھا۔ مجھے سب سے زیادہ ڈر اس بات کا تھا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو ہم کیا صفائی پیش کریں گے کہ یہ کون ہیں اور ہم انھیں اس طرح کہاں لے جارہے ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ میں بھی کپڑا ٹھنسا ہوا تھا ورنہ ہم کہہ سکتے تھے کہ وہ بیمار ہیں۔ حادثے کا شکار ہوئے ہیں یا کرنٹ لگنے سے بے ہوش ہوگئے ہیں اور ہم دیر نہیں کرسکتے تھے اس لیے سڑک تک خود ہی اٹھا کے لے جارہے ہیں۔ وہاں سے کسی گاڑی میں ڈال کے اسپتال لے جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات بھی اتنی قابلِ قبول نہ ہوتی کیونکہ اس علاقے میں ایمرجنسی کی صورت میں سب اپنی گاڑی استعمال کرتے تھے ورنہ پڑوس کے لوگ اپنی گاڑی دے سکتے تھے یا خود اسپتال پہنچا سکتے تھے۔

خیمے تک پہنچ کے میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہماری پوزیشن مشکوک نہیں ہوئی ورنہ آج دلاور کے قید خانے کا راز بھی فاش ہوجاتا۔ اس وقت اگرچہ لوگ سوئے پڑے تھے مگر گشت کرنے والے چوکیدار، پولیس مین اور آوارہ گرد بہرحال جاگ رہے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ بے خوابی کا کوئی مریض یا اتفاقیہ راہ گیر ہمیں دیکھ لیتا۔

خیمے سے انھیں لکڑی کے باکس نما کیبن میں اور پھر خفیہ راستے سے زیرِ زمین قید خانے تک لے جانا بھی مشکل کام تھا مگر پرخطر نہیں تھا۔ اوپر والا راستہ بند کرنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو محفوظ تصور کیا اور ایک بار پھر ایمان لایا کہ یہ سب محض اتفاق نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں مجھ گنہگار کو اس پروردگار کی تائید و حمایت حاصل تھی جس کے سامنے مجھے اپنی بندگی کا اعتراف کرتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔

محسن نے غور سے دلاور کو دیکھا جو اس کارروائی کے دوران جاگ اٹھا۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا اور کسی ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ کچھ حیرت اور کچھ خوف کے ساتھ اپنی آنکھوں کی ویرانی میں سوال لیے بیٹھا تھا۔

"ملیے اپنے چودھری صاحب" محسن نے اسی کے لہجے کی نقل کی "بہت دن اکیلے رہے تھے۔ اب کچھ اور خاص بندے آگئے ہیں تمہارے، انھیں پہچانتے ہو نا۔"

میں نے ان دونوں کے ہاتھ پیر کھول کے منہ سے کپڑا بھی نکال دیا تھا۔ اور کوشش کررہا تھا کہ وہ ہوش میں آجائیں "محسن اپنے شیروانی صاحب، آپ بھی کمال کرتے ہو۔ چودھری صاحب انھیں کیوں نہیں پہچانیں گے۔"

"بھئی ان کی آنکھ میں ہے وہ کیا کہتے ہیں اسے۔ سؤر کا بال" محسن بولا "پہچانتے صرف اُسے ہیں جس سے غرض ہو ورنہ اپنے باپ کو گدھا تک نہیں مانتے۔"

میں نے کہا "یہ کون ہیں دلاور۔ ان کے نام جانتے ہو؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا اور سپاٹ لہجے میں بولا "یہ قادر شاہ ہے 'قادرا' کہتے ہیں اسے۔"

"اور یہ دوسرا؟" میں نے حیران ہو کے پوچھا۔

"یہ فضل ہے۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔

شاید دلاور نے انکار کو اپنے حق میں اچھا نہیں سمجھا ہوگا۔ یہ اس کے خاص آدمی تھے۔ وہ ان کو پہچاننے سے انکار کرتا تو یہ بہت بڑا جھوٹ ہوتا اور پھر سچ اگلوانے کے لیے ہم دوسرے طریقے اختیار کرتے۔ اس نے بہتری اسی میں جانی کہ جو بات اسے معلوم ہے اور جسے چھپانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے وہ بتادے۔ تاہم اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ دلاور کا ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ غلط اور صحیح میں تمیز کرسکتا ہے۔

"فضل کیا کرتا ہے؟" میں نے کہا۔

"سب کچھ۔ جو بھی اس سے کرنے کو کہا جائے" دلاور بولا۔

"اور قادر؟"

دلاور نے نفی میں سرہلایا "اسے میں نے رانا کے ساتھ اکثر دیکھا تھا مگر اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

دلاور کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ اس وقت جھوٹ بولنے سے گریز کررہا تھا۔ ایکسٹریشن قادر کے بارے میں مجھے زیادہ تجسس بھی نہیں تھا۔ وہ رانا کا ملازمِ خاص ہوگا جو ادھر اُدھر کے سب جائز اور ناجائز کام کرلیتا ہوگا مگر وہ کوئی خطرناک مجرم یا رانا جیسے بدمعاش کا دستِ راست نہیں ہوسکتا تھا۔

زیادہ جرح اور سوال جواب کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں نے دلاور سے کہا "یہ دو بندے بھی یہیں رہیں گے دلاور لیکن ان کو باندھ کے رکھنا ضروری ہے۔ تم ان کو آزاد تو نہیں کرو گے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا سوال ہی فضول تھا۔

محسن نے کہا "اس سے پوچھنے کا فائدہ۔ بس دلاور کو الگ کردیتے ہیں۔"

میں نے سرہلایا "دلاور کو باتھ روم میں بند کیا جاسکتا ہے اور انھیں الگ الگ باندھا جاسکتا ہے۔ یہ اب ہوش میں آرہے ہیں پوری طرح ہوش آگیا تو یہ ہنگامہ کریں گے۔"

ہنگامہ دلاور نے بھی کیا مگر ہم نے اسے زبردستی پکڑ کے باتھ روم میں بند کردیا اور باہر سے کنڈی لگادی۔ ان دونوں کو ہم

سے پہلے کہ سنتری بادشاہ ہمیں روک سکتے میں نے گاڑی کو خود اس کے قریب لے جا کر روکا اور اس کے کوئی سوال کرنے سے پہلے پوچھا۔ "کیا کمشنر صاحب کی گاڑی نکل گئی ہے؟"

وہ گھبرا کر اس نے سلیوٹ کیا۔ "جی نہیں سر۔"

محسن نے فوراً گاڑی آگے بڑھادی۔ اگرچہ امکان بہت کم تھا کہ پولیس ہم سے اترنے کو کہے اور ڈکی کھول کر تلاشی لے مگر ہم رسک نہیں لے سکتے تھے۔ دس منٹ میں ہمیں واپس بھی آنا تھا اور سنتری اس گاڑی کو بھول نہیں سکتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ واپسی میں وہ پھر ہمیں سلیوٹ کرے گا۔

جی ٹی روڈ پر گوجرانوالا کی طرف سے آنے والی بس اور ویگن سروس میں صبح پانچ چھ بجے کے بعد اضافہ ہوتا تھا۔ اس وقت ٹرک زیادہ تھے جو دن رات اسی طرح رواں دواں رہتے تھے۔ وہ رات کو خالی سڑک پر ریس لگاتے تھے اور خطرناک انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ چلتے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ کچھ ٹرک ڈرائیور نشہ بھی کرتے ہیں جس کا مقصد جسمانی و ذہنی تھکان کے احساس کو مٹانا ہوتا ہے چنانچہ ان کی طبیعت کی جولانی حادثات کا سبب بنتی ہے۔ سامنے سے ان کی چندھیا دینے والی ہیڈلائٹس میں کار والوں کو اندھیری سڑک پر اپنے سامنے کچھ نظر نہیں آتا کیونکہ ٹرک ڈرائیور کے مقابلے میں وہ بہت نیچے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ایک جگہ محسن نے گاڑی کو اس وقت حادثے سے بچایا جب میں کلمہ شہادت پڑھ چکا تھا۔ سامنے سے ایک ٹرک نے تقریباً پوری سڑک گھیر رکھی تھی مگر اس کی رفتار کم تھی۔ پیچھے سے دوسرے ٹرک نے اسے اندھادھند اوورٹیک کیا تو بالکل ہمارے سامنے آگیا۔ روشنی میری آنکھوں پر پڑی تو مجھے یوں لگا جیسے ٹرک اوپر آچکا ہے اور درمیان میں چند فٹ کا فاصلہ بھی نہیں رہا لیکن ہر ڈرائیور میں ایک جبلت (INSTINCT) ہوتی ہے جو ایسے موقعوں پر تجربے دکھاتی ہے۔ انتہائی برق رفتاری سے دماغ کا کمپیوٹر صورتِ حال کو سمجھتا ہے اور سب سیکنڈ کے سویں یا ہزارویں حصے میں ہوجاتا ہے۔

جب گاڑی کچی سڑک سے نیچے اتر گئی اور ایک گڑھے میں سے بھی گزر گئی تو میں نے محسن کو اسٹیئرنگ وھیل سے لڑتے دیکھا۔ اب ہمارے بالکل سامنے ایک درخت کا خشک تنا تھا جس کی شاخیں ایندھن کے طور پر استعمال کرنے والے کاٹ کر لے جا چکے تھے۔ میں تصادم کے لیے بالکل تیار ہوگیا۔ سر کو ڈیش بورڈ پر ٹکرانے کے گھونسے ہونے سے بچانے کے لیے میں نے اپنے ہاتھ غیر ارادی طور پر چہرے کے سامنے کرلیے تھے مگر یہ نہیں ہوا۔ گاڑی کی سمت گلہری والے فضول درندے کی طرح ایک دم پلٹ گئی۔ آخری لمحے میں سمت بدل لیتا ہے۔ محسن کی آخری بھرپور کوشش تھی۔ میں نے اس نے حاضر دماغی کا پورا ثبوت دیتے ہوئے ذہنی صلاحیتوں پر مکمل کنٹرول رکھا اور دوسرے ہی لمحے ایسا لگا جیسے کائنات زلزلے کی زد میں تھی کہ اچانک زمین

ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر باندھ دیا کہ نہ وہ ہوش میں آنے کے بعد امدادِ باہمی کے اصولوں پر عمل کرپائیں اور نہ دلاور کی مدد حاصل کرنے کے لیے اسے آزاد کرسکیں۔ وہ تینوں آزاد ہوجاتے تو پھر انھیں کوئی اسیر نہیں کرسکتا تھا چنانچہ ہم قادر شاہ اور فضل کو باندھتے ہوئے بہت محتاط رہے۔

میں چاہتا تھا کہ صبح کا اجالا پھیلنے سے قبل ہی ہم فارغ ہو کے گھر لوٹ جائیں اور صبح سب کو ایسے سوتے ہوئے ملیں جیسے رات کے دوران ہم نے خواب تک نہیں دیکھا مگر محسن نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔

"ایسا نہ ہو ہم چوروں کی طرح اپنے ہی گھر میں داخل ہوتے وقت پکڑے جائیں۔ کیا کہیں گے کہ ہم کہاں گئے تھے۔"

"کون پکڑے گا ہمیں۔ سب سو رہے ہوں گے۔"

"فرض کرو کوئی جاگ اٹھا اور اس نے ڈرائنگ روم میں جھانک کر دیکھا تو سب کو پتا چل جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "ہم کہہ سکتے ہیں کہ نیند نہیں آرہی تھی اس لیے ذرا باہر ٹہلنے کے لیے گئے تھے۔"

محسن ہنسا۔ "اب ہماری ایسی باتوں پر یقین کرنے والا کوئی نہیں رہا دوست۔ سمجھا یہی جائے گا کہ ہم کوئی گل کھلانے گئے تھے۔"

"گل آپ کی منکوحہ اور میری بھابی محترمہ ہیں۔ ہم انھیں کھلانے جاسکتے ہیں۔ بچے کھلانے کے لیے لوگ آیا رکھتے ہیں....."

"یار ہم اپنے آفس جا کے سو جاتے ہیں۔ پکڑے جانے کا کوئی ڈر نہیں۔ صبح تلاش ہوگی تو پہلے آفس ہی فون گھمایا جائے گا اور ہم وہاں موجود ہوں گے۔ یہ کہنے کے لیے کہ سب تار کنکشن بند کرکے سوگئے تھے، ہم کیا ساری رات پتھر مارتے۔ آفس آکے سکون سے سونا نصیب ہوا۔ الٹا سوال کرنے والا شرمندہ...."

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "تو ایک کامیاب شوہر بھی ثابت ہوگا۔ تجھے جھوٹ بولنے کا فن آتا ہے۔"

"حق ہے استاد۔ سچ بولنے سے زندگی میں بڑے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ میاں بیوی میں سے ایک میں بھی صلاحیت ہو دوسرے کو الو بنانے کی تو گاڑی چلتی رہتی ہے۔ دونوں فنکار ہوں تو دیکھنے والوں کو رشک آتا ہے ان کی ازدواجی زندگی پر۔"

میں نے کہا۔ "مجھے امید ہے کل کے سامنے بھی آپ اسی بیان پر قائم رہیں گے۔"

"یہ مت بھول کہ یار تجھے بھی شوہر بننا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اب ہم جائیں گے ریوس روڈ..... براستہ شاہدرہ۔"

"براستہ شاہدرہ؟"

"ہاں۔ دو سواریاں آ رہی ہیں، دیاں پھر واپس۔"

راوی کے پُل پر گاڑیاں چیک ہورہی تھیں مگر ان میں بیشتر عام قسم کی کاریں تھیں۔ ہم اس وقت خواص کی گاڑی میں تھے اس

www.paksociety.com

کے سامنے پور روڈ پر سے وزیر خاں کا نام کھرچ ڈالوں۔ وہ ایک ایمان دار، شریف النفس اور خدا ترس آدمی تھا جس نے یہ جگہ ایک ایسے صنعتی منصوبے کے لیے خریدی تھی جس سے مزدور کو مزدوری ملے تو کسان کو فصل کا ثمر۔ صنعتوں کی ہریالی بڑھے اور ملک کی زرعی پیداوار۔ یہاں زرعی مشینری کے پرزے بنتے تھے۔ انسانوں کے خون کا بیوپار کرنے والوں نے اسے اس جگہ سے اور پھر اس دنیا سے ہی رخصت کردیا۔ یہاں وہ اسلحہ بننے لگا جس سے بھائی نے بھائی کا خون کیا، ہم وطنوں کو قتل کیا اور ملک کے دو ٹکڑے کیے۔ پھر انہی زبردست شیاطین نے انسان دوستی کا لبادہ اوڑھ کر مرحوم وزیر خاں کے نام کو استعمال کیا اور خدمت خلق کے لیے اسپتال قائم کرکے یہاں ایک عقوبت خانہ قائم کردیا۔ جو کچھ ان دیواروں کے پیچھے ہوتا تھا اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وزیر خاں کی روح بھی اس ظلم پر کرب میں مبتلا ہوگی اور شاید مجھ سے خفا بھی کہ میں سب کچھ جاننے کے باوجود اس کے نام سے ہونے والے اس انسانیت سوز کھیل کو ختم کیوں نہیں کرتا۔ میں اس کے لیے کوشش کررہا تھا مگر ابھی تک ناکام تھا۔ مجھے اپنی بے بسی پر شرمندگی بھی تھی۔

ہم نے اِدھر اُدھر دیکھ کر دونوں لاشوں کو گاڑی سے نکالا اور گیٹ کے سامنے ڈال دیا۔ اچانک گیٹ لائٹ روشن ہوئی اور کسی نے فولادی گیٹ میں بنی ہوئی چھوٹی سی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔

"اوئے! یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے چیخ کر کہا۔

خطرہ یہ تھا کہ اب وہ گیٹ کھول کر باہر آجائے گا اور ہنگامہ کھڑا کردے گا۔ میں نے قریب جاکر ریوالور نکال لیا۔ اس کا چہرہ کھڑکی کے فریم میں خوف کی تصویر بن گیا۔ "اب دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ ریوالور کی نال کے اندر جھانک کر دیکھو، کچھ نظر آیا؟"

اس نے بڑی مشکل سے نفی میں سر ہلایا۔

"بس تو پھر کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ کھڑکی اور منہ بند کرکے بیٹھ جاؤ۔ بہتر ہوگا کہ آنکھیں اور کان بھی بند کرلو ورنہ تم فوت ہوجاؤ گے۔ کبھی پہلے فوت ہوئے ہو؟"

"نہیں۔" اس نے بدحواسی میں کہا اور فوراً کھڑکی بند کرلی۔

میں نے دوڑ لگائی اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ کار کا انجن چل رہا تھا۔ میں نے گاڑی کو گیئر میں ڈال کر اس طرح بھگایا جیسے کوئی سپاہی چھلانگ مار کے گھوڑے پر بیٹھنے کے بعد چابک مار کے اسے دوڑاتا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ فوری طور پر گیٹ کیپر کی عقل اسے ہرگز کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانے دے گی جس کے نتیجے میں اسے علی الصبح فوت ہونا پڑے۔ موت اگر ناک کو چھو کر گزر جائے تو آدمی ساری بہادری بھول جاتا ہے۔

"خیر یہ بھی اچھا ہی ہوا۔" محسن نے پلٹ کے دیکھا۔ "اب چاہے وہ فوت شدگان کو سمیٹ لے اور بتادے رانا صاحب کو۔"

"ہاں۔ گاڑی کو وہ ضرور پہچان گیا ہوگا۔"

"ہمیں بھی پہچان لے گا میدانِ حشر میں۔" محسن نے قہقہہ

و آسمان پُرسکون ہوگئے۔ میں نے محسن کو دیکھا۔ وہ اسٹیئرنگ پر سر رکھے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

اگر گاڑی کا ٹرک سے تصادم ہوجاتا تو پھر یہ فکر بھی نہ رہتی کہ بعد میں دنیا نے کیا دیکھا، کیا سمجھا اور کیا کہا۔ وہ نامعلوم افراد کے ساتھ دو لاشوں کی دریافت کا معما حل کرنے والا شوکت علی رانا بھی لب نہ کھولتا۔ اگر آگ لگنے کے بعد ایئرکنڈیشن کا سلنڈر پھٹ جاتا تو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ ریزہ ریزہ ہوکے بکھر جانے والی گاڑی میں کتنے لوگ سوار تھے۔ وہ کون لوگ تھے اور کیا تھے۔

درخت سے ٹکرانے کی صورت میں ہم زخمی یا بے ہوش ہو جاتے پھر ہمیں اسپتال یا تھانے پہنچایا جاتا کیونکہ مدد کے لیے آنے والے گاڑی میں سے ایئرکنڈیشن گیس کا ایک سلنڈر اور ڈگی میں سے دو لاشیں بھی برآمد کرلیتے۔ ہمارے لواحقین اور وکلا بھی نہ سمجھ پاتے کہ یہ سب کیوں ہوا اور کیسے ہوا۔ ہم جھوٹ بول رہے ہیں یا سچ اور جو کچھ فرما رہے ہیں وہ دماغی چوٹ کا نتیجہ تو نہیں۔

میں نے محسن کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "کمال کردیا تو نے اس وقت۔"

محسن نے سر اٹھایا۔ "ہم زندہ ہیں نا؟ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"چل تو اِدھر آجا۔ گاڑی اب میں چلاؤں گا۔"

سڑک کی طرف سے کچھ لوگ بھی ہماری خیریت دریافت کرنے پہنچ گئے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد اس ویگن کے مسافروں کی تھی جو ہم سے کچھ پیچھے تھی۔ اس کے ڈرائیور نے سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایک کار بھی رک گئی تھی۔ اس میں سے اتر کر آنے والا کوئی ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ تھا۔ ویگن ڈرائیور نے اسے بتایا کہ ڈرائیور نے تو ان کے اوپر سے ٹرک گزارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مگر اللہ نے بچالیا۔ اے سی ایم خود بھی سب دیکھ چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم ٹرک ڈرائیور کی رپورٹ کریں مگر یہ ایک فضول سی بات تھی۔ نہ کسی نے ٹرک کا نمبر دیکھا تھا اور نہ ڈرائیور کو۔ وہ پکڑا بھی جاتا تو گواہ اور ثبوت فراہم ہونے کے باوجود زیادہ سے زیادہ غلط ڈرائیونگ کا مجرم ہوتا۔

ہم نے سب کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔ سڑک پر آگے میں نے چیک کرنے کے بہانے گاڑی روکی۔ اصل مقصد ویگن کے مسافروں اور اے سی ایم صاحب سے نجات حاصل کرنا تھا جو سب ہمدردی میں چشم دید گواہ بن گئے تھے۔ ویگن کے مسافروں کی مجھے فکر نہیں تھی۔ وہ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی معمولی واقعہ بھول جائیں گے۔ حادثہ ہوجاتا تب بھی کئی دنوں یاد رکھتے۔ اے سی ایم کا کچھ پتا نہ تھا کہ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کرلیا ہو اور بعد میں یاد رکھے۔ یہ بات تشویش کی تھی کہ شوکت علی رانا کی طرف سے بعد میں کوئی رپورٹ ضرور لکھوائی جائے گی۔

وزیر خاں اسپتال کا گیٹ بند تھا اور اوپر نیچے دونوں منزلوں میں تاریکی تھی۔ جب میں یہ سوچتا تھا کہ یہ جگہ کیا ہے اور کس مقصد کے لیے استعمال ہو رہی ہے تو میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس

پانچ کام کرنے والوں کے کمرے خالی پڑے ہوئے تھے۔ جو شخص یہاں چوکیداری کرتا تھا اس کی لاش وزیر خاں اسپتال کے اندر تھی۔ وہ سب بھی نہیں تھے جن کو شوکت رانا نے تہ خانے میں اور حویلی کا داروغہ زنداں مقرر کیا تھا۔ شوکت رانا شاید گھر میں کسی پیغام کا انتظار کررہا تھا یا ان سب کی واپسی کا جو یہ سمجھانے گئے تھے کہ ہم رانا کو دلاور سمجھنے کی غلطی نہ کریں۔ وہ سخت مضطرب ہوگا یہ جاننے کے لیے کہ اس کے جاں بازوں نے ہمارا کام تمام کردیا ہے۔ یہ اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ رانا کی حد تک عجلت پسند اور سوچے سمجھے بغیر انتہائی قدم اٹھانے کا عادی ہے۔ اس نے شدید طیش کے عالم میں ایک فیصلہ کیا تھا۔ ممکن ہے بعد میں اسے احساس ہوا ہو کہ ہر صورت میں اس نے اپنی موت کا سامان کیا ہے۔ اگر ہم میں سے ایک بھی بچ جاتا تو اس کے سارے خاندان کا نام و نشان مٹ جاتا اور ناکامی کی صورت میں تو اس کے لیے بھی وہی طویل پُرعذاب زندگی کی سزا تھی جو دلاور کا مقدر ہوگئی تھی اور جس کا انجام بالآخر دنیا کے لیے نشانِ عبرت بننے والی موت تھی۔ اگر وہ شکست میں دلاور کے ساتھ شریک ہونا قبول کرتا ہے تو اس کی مرضی۔

میں نے محسن کی مدد سے ایئرکنڈیشن سلنڈر کو تہ خانے میں پہنچایا۔ اس عمارت کو منہدم کرنے کے لیے زیر زمین کمرے سے زیادہ موزوں جگہ کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کمرے میں ہوا کی نکاسی کا انتظام بھی پنکھوں کے بغیر کام نہیں کرتا تھا۔ اس میں نہ روشن دان تھے اور نہ کھڑکیاں۔ ہوا باہر پھینکنے والے پنکھوں کے ساتھ چمنیاں اور ایئرکنڈیشنر نصب تھے جو اس وقت بند تھے چنانچہ نیچے سخت گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

محسن نے تار کے سرے گیس سلنڈر کے ہینڈل سے جوڑے اور باقی تار کو اوپر لے گیا۔ تار بہت لمبا تھا۔ میں نے اس کے ایک سرے کو باہر گاڑی تک پہنچا دیا۔ دوسرے تار کو میں نے درمیان سے کاٹا۔ اس کا ایک سرا سلنڈر کے ہینڈل پر تھا، دوسرا میں نے احتیاط سے پلگ میں لگا دیا۔ پلگ کے دوسرے سوراخ میں دوسرا سرا پھنسا کے اسے بھی میں نے گاڑی تک پہنچا دیا۔ یہ کام انتہائی خطرناک تھا۔ معمولی سی غلطی یا بے احتیاطی سے ہم خود بھی ہوا میں اڑ جاتے۔ وقفے سے گلی کے آخری کونے تک زیادہ فاصلہ نہ تھا اس لیے یہ ضروری تھا کہ ہم اسپارک دیتے ہی گاڑی دوڑا دیں۔

میں نے محسن کو گاڑی میں بٹھا کر دونوں تار اسے تھمادیے۔ "اگر یہ آپس میں مل گئے نا تو ہم چھٹ جائیں گے ہمیشہ کے لیے۔"

"یہ بھی اچھا ہی ہے کہ تم دنیا میں کوئی حسین بیوہ چھوڑ کے نہیں جاؤ گے۔" محسن نے رقت زدہ لہجے میں کہا۔ "رابعہ کی فکر نہ کرنا دوست۔ آخر تجھ میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔"

پہنچنے سے پہلے میں نے احتیاطاً گھر دیکھا اور آہستہ آہستہ

مارا۔ "شوکت رانا نے جتنی جلدی کی تھی یہ ثابت کرنے میں کہ وہ دلاور نہیں ہے، اس سے بھی کم وقت میں ہم نے ثابت کردیا کہ ہم دلاور کے باپ سے نہیں ڈرتے۔ اس کی اینٹ کے جواب میں بڑا پتھر مارنے کا مطلب ہے اعلانِ جنگ۔"

"ہاں یار۔ لڑنا ہے تو کھل کے لڑو۔ خالی دھمکی سے تو بات نہیں بنتی اور ہم کسی رانا کے تانا کو بھی خاطر میں لانے والے نہیں۔ اب یا تو وہ پتھر کے جواب میں چٹان لڑھکائے گا اور ہم ارسال کریں گے کوئی پہاڑ۔ یا پھر رانا صاحب کا وہی انجام ہوگا جو ایٹم بم گرنے سے جاپان کا ہوا تھا۔"

گاڑی پھر پل پر سے گزری تو میں نے اس سنتری کو دیکھ کر بریک لگائے۔ وہ فوراً قریب آگیا۔

"ڈپٹی کمشنر صاحب تو نہیں مگر اے سی ایم صاحب گزرے تھے۔"

میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "بے وقوف! وہ کل تک اے سی ایم تھے۔ آج ڈپٹی کمشنر ہیں۔ تم ابھی تک کانسٹیبل ہی ہو۔"

اس کا منہ حیرت اور بے وقوفی سے کھلا رہ گیا۔ اب صبح کے چار بج چکے تھے۔ میں نے آخری مرحلے کی تکمیل کے لیے گاڑی کا رخ ڈیوس روڈ کی طرف کرلیا۔ شیش محل ہوٹل کے پاس ایک ہوٹل کھلا دیکھ کر محسن نے منہ پھاڑا اور جماہی لی۔

"کیا حرج ہے اگر ایک لیٹر چائے ڈال لی جائے؟"

میں نے غرا کر کہا۔ "نیک بخت! ڈیوٹی کے وقت نو ڈرنک۔ وقت کم ہے اور کام بہت۔"

"یہ کام ہے؟" محسن نے جھلا کے کہا۔ "اس سے تو بہتر ہے کہ ہم کوئی کام نہ کریں۔"

میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "عزیزم! کام کے بغیر اس کائنات میں کچھ نہیں ہے۔ انسان، شیطان، فرشتے، حشرات الارض سے جنات تک سب اپنا کام کر رہے ہیں۔ ستارے اور سیارے، پودے اور درخت یہاں تک کہ سنگ و خار کے لیے بھی کوئی نہ کوئی کام ہے۔ سونا، عشق کرنا سب کام ہیں۔"

"جیسے بکواس فرمانا آپ کا کام ہے جو آپ اس وقت کررہے ہیں اور یہ سب سن کر برداشت کرنا میرا کام ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "بس یار! اب اڈے پہ چل کر اپنی مرضی اور پسند کی چائے پئیں گے۔ یہ آخری کام ہے۔"

"ابھی کام باقی ہے۔ اُف!" محسن نے سر پکڑ لیا۔ "یار کل کیا کریں گے ہم! سارے کام آج ہی کرلیے تو....."

"کل؟ کچھ نہیں۔ مگر کچھ نہ کرنا بھی ایک کام ہے۔ میرے اقوالِ زریں نوٹ کرتا جا بے عقل۔" میں نے کہا۔

"مسٹر عاقل! پرانے اقوالِ زریں بہت ہیں۔ آپ مزید ایجاد نہ کریں۔" محسن آنکھیں بند کرکے اور سیٹ سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔

میں نے گاڑی ڈیوس روڈ پر "سی ڈی انٹرپرائز" کے دفتر کے سامنے روکی۔ دفتر گلی میں تھا اور حسب توقع لاوارث پڑا ہوا تھا۔

www.paksociety.com

گیس سلنڈر کا والو کھول دیا۔ گیس بڑی آواز کے ساتھ نکلنے لگی۔ میں تیزی سے باہر نکلنے کے لیے بھاگا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ میں حیران تھا کہ وقار یوسف کے گھر میں سلنڈر کھولنے کے بعد مسٹر کلو اس آواز کو کیسے بند کرتے جو اتنے پریشر سے گیس نکلنے کے باعث پیدا ہو رہی تھی۔ یا تو ان کے پاس اس کا بھی علاج ہو گا یا انہوں نے سوچا ہو گا کہ گیس نکلنے کے شور پر بھی سونے والے فوراً جاگ کر تو باہر نہیں آ جائیں گے۔ اگر کوئی یہ آواز سن کر جاگا تو پہلے غور کرے گا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ یہ کون تصور کر سکتا ہے کہ لاؤنج میں سے آنے والی یہ آواز موت کی پکار ہے۔ جب تک کوئی تصدیق کے لیے باہر آئے گا لاؤنج میں خاصی گیس جمع ہو چکی ہو گی اور اتنی دیر میں دو تار ملا کے سارا کھیل ختم کرنے والے نکل جائیں گے۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے کلچ دبایا اور گیئر میں ڈال کر ریس دی۔ محسن نے میری طرف دیکھا۔ خوف اس کی صورت پر بھی اپنا سایہ ڈال رہا تھا اور میں بھی اندر سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ دھماکا کتنا شدید ہو گا۔ میں گاڑی کو نکال لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا یا گاڑی دھماکے کے ساتھ ہی بے قابو ہو کے الٹ جائے گی۔

جب محسن نے دوبارہ میری طرف دیکھا تو میں نے اس جیلر کی طرح سر ہلایا جو جلاد کو تختہ کھول دینے کا اشارہ کرتا ہے اور پھانسی پانے والا اس اشارے کے ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے ہمیشہ کے لیے۔

محسن نے تار ملائے۔ میں نے اسٹیئرنگ سنبھال کے کلچ چھوڑا۔ دھماکا ہوا تو گاڑی بے قابو ہو کے فٹ پاتھ کی طرف چلی گئی۔ مجھے پیچھے دیکھنے کا ہوش نہیں تھا مگر جب دو دھماکے ہوئے تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ عمارت کا ملبہ ہے جو اڑ کر گاڑی پر گر رہا ہے۔ گاڑی کا پچھلا شیشہ ایک دم بکھر گیا۔ میں نے اور محسن نے ایک ہاتھ سامنے کر لیا کہ اگلا شیشہ ٹوٹے تو ذرات اڑ کر ہماری آنکھوں کو بے نور نہ کر دیں مگر اتنی دیر میں گاڑی فٹ پاتھ سے ٹکرا کے گھوم چکی تھی۔ میں نے اسٹیئرنگ کاٹ کے بریک لگائے تو ہم دوبارہ اسی گیٹ کے قریب پہنچ چکے تھے۔

اب ملبے کی بارش ختم ہو چکی تھی اور سی ڈی اے فرپار کی عمارت ایک کھنڈر ہو گئی تھی۔ سلنڈر تہ خانے میں نہ ہوتا تو ایک سے دوسری عمارت آتش فشاں بن جاتی اور اس کے ساتھ والی عمارات کو بھی خطرہ لاحق ہوتا۔ ممکن ہے دوسری عمارتوں کے شیشے ٹوٹ گئے ہوں یا ان کی دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی ہوں مگر چھت گرنے سے وہ آگ خود بخود بجھ گئی جو تہ خانے میں دھماکے سے لگی تھی۔ گرد کا طوفان دھوئیں کی طرح اوپر اٹھ رہا تھا۔

میں اور محسن گاڑی سے اتر کر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو گئے۔ آس پاس کی عمارتوں سے لوگ دوڑے چلے آ رہے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا مگر کسی کو معلوم نہ تھا کہ کیا ہوا۔ جب وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے تو میرے اور محسن کے لیے خاموشی سے نکل جانا آسان ہو گیا۔ ریلوے اسٹیشن تک پیدل پہنچنے کے بعد ہم نے ایک رکشا لیا اور جب اپنے آفس کے سامنے اترے تو صبح کی اذان ہو رہی تھی۔

پنج وقتہ پابند نماز مولوی خادم حسین اس وقت جاگ اٹھتا تھا۔ ہم نے کچھ دیر انتظار کیا۔ جب اوپر آفس میں روشنی ہوئی تو محسن نے اسے آواز دی۔ چند لمحوں کے بعد خادم حسین کھڑکی میں نمودار ہوا اور فوراً ہی غائب ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد ایسے دوڑتا ہوا آیا جیسے کوئی بدروح اس کے تعاقب میں ہو۔ آخری سیڑھی پر سے اس کا پیر پھسلا اور وہ رکوع کی حالت میں جا کے سنبھل گیا۔

"ایسی بدحواسی بھی کیا خادم حسین۔ ہم اور تم برسوں کے بعد تو نہیں مل رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

خادم حسین نے تالا کھول دیا۔ "بڑا اچھا ہوا جی آپ آ گئے۔ یہاں تو کچھ عجیب سا معاملہ ہو گیا تھا۔"

"کیا کسی نے زیادتی کرنے کی کوشش کی تھی تمہارے ساتھ؟" محسن بولا۔

خادم حسین نے اسے خفگی سے دیکھا۔ "صبح صبح منہ سے کلمۂ خیر نکالنا چاہیے۔ میں تو مخاطب بھی نہیں تھا آپ سے۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اوپر چلنے لگا۔ "یہ سوال میں کرتا ہوں۔ کیا کسی نے تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے؟ بول رب دی۔ میں ٹوٹے کروا دوں گا جس نے بھی تمہاری کارگزاری کو بری نظر سے دیکھا ہو۔"

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "میں محسوس کرتا ہوں سکندر صاحب کہ آپ بھی منظر صاحب اور محسن صاحب کی صحبت میں ایسی باتیں کرنے لگے ہیں۔"

"صحیح کہتے ہو خادم حسین۔ میں کتنا شریف، معصوم اور بھولا بھالا نوجوان تھا۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔ "مجھے صراط مستقیم سے بھٹکانے والے کون تھے اور اب تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

"پریشانی تو اس خر زادے نے پیدا کی ہے جی۔ کل سے براجمان ہے اپنے اہل و عیال کے ساتھ۔ زبان بھی عجیب جناتی بولتا ہے۔ بڑی مشکل ہے۔"

"کس کی بات کر رہے ہو تم؟" میں نے اندر پہنچ کر کہا۔

"دیکھ لیں آپ خود۔ یہ جلوس گزشتہ رات پہنچا تھا۔ پورے چھ۔ پھر ناپ لیں تین تین انچ کا فرق ہے۔ تین فٹ کا ہے نمبر چھ ایک انچ کا۔"

میں نے اور محسن نے دیکھا تو ہر طرف بچے بکھرے پڑے تھے۔ وہ صوفوں پر دراز تھے، قالین پر لیٹے ہوئے تھے اور ان کے پروڈیوسر آفس کے ریفارمنگ سلام میں تھے اور ایک نظر میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ آفس ساتویں کا زچہ خانہ ہو جائے گا۔ یہ سابق چوکیدار اور اس کی اکلوتی منکوحہ تھے جو اتنے عرصے بعد اچانک وارد ہو گئے تھے۔

میں نے اسے ویسے ہی اٹھایا جیسے پولیس گورنر ہاؤس کے سامنے سے دھرنا دینے والوں کو اٹھاتی ہے۔ اس کے باوجود سابق چوکیدار نے مجھ سے گلے ملنے کی کوشش کی پھر میرے اور اس کے درمیان خبیث سرائیکی میں جو مکالمہ ہوا اس کے نتیجے میں وہ بصد حسرت وہاں اپنے جگر کے ٹکڑوں کو سمیٹ کر روانہ ہونے پر مجبور ہو گیا۔ وہ مصر تھا کہ یہ رعایت میں نے ہی اسے دی تھی کہ کبھی کبھار آ جایا کرے اور چاہے تو اپنی فیملی کے ساتھ یہاں قیام بھی کر لیا کرے۔ میں نے واضح کیا کہ کبھی کبھار کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ ہر مہینے آئے اور تنخواہ لے جائے۔ آفس کو ہوٹل سمجھے اور مجھے وغیرہ۔ اس کی چھٹی ہو چکی ہے اور اس کے خلاف پولیس میں پرچہ بھی درج ہے کہ وہ آفس کا بہت سا سامان لے گیا ہے۔ اگر وہ خیریت چاہتا ہے تو فوراً دفع ہو جائے ورنہ تو رکا تو کا اور ساتواں لڑکا حوالات میں ہو گا۔

خادم حسین اتنی دیر میں نماز سے فارغ ہو چکا تھا۔ "بخدا اس لشکر کی یلغار کے سامنے میں بے بس تھا۔ وہ سب مجھے ماموں کہتے تھے اور ان کی ماں بار بار مجھے دیر کہہ کے مخاطب کرتی تھی۔ اس نے تو دیر کو گھوڑی چڑھانے کے لیے اپنی چار بہنوں میں سے ایک کے انتخاب کا حق بھی دے دیا تھا مجھے اور جناب میرے سمجھانے کے باوجود کہ میں شادی شدہ ہوں، وہ بضد تھی کہ پھر کیا ہوا، شرع میں چار کی گنجائش ہے۔ ہمارے گاؤں کے مولوی صاحب پابند شرع ہیں۔"

میں اس کی باتیں سنتا رہا اور ہنستا رہا۔ خادم حسین نے از خود چائے بنانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ محسن نے وقار یوسف کے گھر کا نمبر ملا کے ریسیور مجھے تھما دیا۔ "خرافات کرو رابعہ سے۔"

میں نے کہا۔ "رابعہ کیا حال ہے بلبل بغداد؟"

جواب میں وقار یوسف کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ "بلبل اور الو کی آواز میں فرق ہوتا ہے غالباً۔"

میں نے ہڑبڑا کر کہا۔ "معاف کرنا وقار۔ یہ حرکت محسن کی تھی۔"

"آواز تو مجھے آپ کی لگ رہی ہے۔" وہ بولا۔ "کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"میری آواز سے تو ظاہر ہے کہ میں اپنے منہ سے بول رہا ہوں۔"

"اچھا میں رابعہ کو فون دیتا ہوں وہ دوسرے کمرے میں ہے۔" وہ بولا۔

کچھ دیر بعد رابعہ کی حیران آواز آئی۔ "کہاں ہو تم؟"

"یہ کیا اطوار ہیں عزیزہ، نہ سلام نہ دعا نہ حال احوال۔"

"یہ کیا پریشان کر رہے ہو صبح صبح۔ بتاتے کیوں نہیں کہاں ہو؟"

"جیسے ہم جنت میں ہیں۔ میرا مطلب ہے اپنے آفس میں۔ تم جہنم میں جھونک کر مزے سے سو گئی تھیں۔"

"تمہیں کیا پریشانی لاحق تھی یہاں۔ محسن بھی تمہارے ساتھ تھا۔"

"ہاں۔ ایک ہزار ایک مچھر اس نے ہلاک کیے ہیں۔ میں نے بچا اتنے ہی مچھروں کا صدقہ دیا تمہارے نام پر۔ کچا لے کر نہ سہی کالے مچھر ہی سہی۔ پھر مزید کمک پہنچ گئی مچھروں کی تو ہم فرار ہو گئے۔ یہاں بڑے سکون سے اے سی چلایا اور سو گئے جیسے تم وہاں سوتی تھیں۔ میں طعنہ دے رہا ہوں تمہیں۔"

"فون پر طعنہ دینے کے بجائے تم جانے سے پہلے دستک دے کر بتا دیتے یہ بات تو یہاں بھی انتظام ہو جاتا۔"

"انتظام تو بڑا زبردست ہوا تھا۔ ایسا سوئے کہ... خیر تم پھر سو جاؤ۔"

"ابھی کیا کہا تھا تم نے؟" رابعہ چونکی۔

"یہی تو تم نے سنا تھا۔ فون اس لیے کیا کہ صبح صبح ہمیں نہ پا کر تم اور اوپر والوں نے پریشان نہ ہونا۔ چھوڑ گئے بالم مجھے ہائے اکیلا چھوڑ گئے۔"

مری سریلی آواز میں گیت کا مکھڑا سنے بغیر ہی رابعہ نے ریسیور رکھ دیا۔

محسن نے سڑپ سڑپ کر کے پرچ سے چائے حلق میں انڈیلتے ہوئے دوسری بار شروع کیا۔ "سمجھ میں آئی بات؟"

"ہاں فضول بات تھی اور بے مقصد۔ سمجھ میں کیسے نہ آتی۔" ... "کیا خیال ہے اپنے رانا صاحب..."

خادم حسین نے مجھے چائے پیش کی۔ "سکندر صاحب، براہ مہربانی عرض کروں۔ یہ مخرب اخلاق فلمی گانا ابھی آپ گا رہے تھے۔"

"اس سے تمہارا اخلاق خراب ہو گیا؟" میں نے افسوس سے کہا۔ "اخلاق اتنا کمزور ہے تمہارا مولوی۔ ہمارا اخلاق تو لندن میں رہ کے خراب نہیں ہوا جہاں ایسی ایسی بے شرم و بے حیا فرنگی ہوتی ہیں کہ تم دیکھتے تو ہر قدم پر کہتے سبحان اللہ ماشاء اللہ۔"

محسن نے قہقہہ مارا۔ "اور اپنے ساتھ لے کے..."

"خوش رہا تو حد ہوتی ہے محسن صاحب۔ زبان سے پھر..." خادم حسین کا چہرہ سرخ پڑ گیا اور وہ احتجاجاً واک آؤٹ کر گیا۔

محسن نے قہقہہ مارا اور ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھائی۔ اس میں اسپتال کا نمبر تلاش کرنا مشکل نہیں تھا۔ وہاں دو لاشوں کے وصول ہونے کے بعد افراتفری ہونا لازمی تھا۔ کسی نے فون اٹھا کے ہیلو کہا تو پس منظر میں بہت سی آوازیں سنائی دیں۔

محسن نے آواز بنا کے کہا۔ "ڈاکٹر شاہد یا شوکت رانا میں سے کسی سے بات کراؤ۔"

www.paksociety.com

"کون؟ آپ اپنا نام بتائیں۔"

"نام کے بچے۔ جو کام کہا جائے وہ کرو۔" میں نے غرا کے کہا۔

"رانا۔۔۔ رانا صاحب کو بلاتا ہوں۔۔۔ وہ نیچے ہیں۔"

میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے محسن سے کہا۔ "لے بھئی، رانا کو ایک خبر تو مل گئی۔"

دوسری طرف سے رانا نے کہا۔ "کون ہو تم؟"

میں نے فلمی ولن کی طرح کہا۔ "تمھارا مقتول گیا رانا۔ میں ہوں تمھارا کالا۔ تم نے کہا کہ مجھے ولاور مت سمجھنا۔ ایم این اے کی اولاد۔"

"یہ۔۔۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔" وہ چیخ کر بولا اور مجھے گالی دی۔

میں نے قہقہہ لگایا۔ "میں بڑے لوگوں کے ساتھ برا کام ہی کرتا ہوں۔ ابھی تو وہ بندے میرے پاس ہیں۔ تم ان کی آواز سنو گے؟" میں نے کہا۔

"میری بات سنو۔" اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔

"نہیں، تم ایک پیغام سنو۔ فرشتۂ اجل کی طرف سے۔ جو حشر تمھارے آفس کا ہوا ہے، وہ تمھارے گھر کا بھی ہو سکتا تھا لیکن ایک غلطی کے بعد میں خبردار کرتا ہوں۔ دوسری غلطی نہیں ہونی چاہئے ورنہ وہ آخری ہوگی۔"

"تم۔۔۔ سکندر بخت ہو۔۔۔ دیکھو۔۔۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا رانا۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

محسن بھی ریسیور سے کان لگائے ہوئے تھا۔ "اس کی تو حالت پتلی ہے۔"

"میں نے کہا تھا نا پھر کہتا ہوں کہ خالی برتن زیادہ شور کرتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ اب چوہدری دلاور کو قید رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسا نہ ہو کسی دن کوئی دیکھ لے اور تیری سب محنت رائگاں جائے۔ اسے پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں۔" محسن کچھ دیر بعد بولا۔ "اس کے خلاف چالان تو مکمل ہو گیا ہے نا!"

"ہاں۔ اے ایس پی تو سخت بے چین ہے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پہ۔ اسے اشارہ ملنے کی دیر ہے۔ ثبوت شہادت سب فراہم ہو گئے ہیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ مل گئی ہے۔ فوری طور پر اس کی ضمانت منظور ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں۔ اسے سیشن کورٹ سے ہائی کورٹ میں اپیل کرنے تک دو چار ہفتے تو لگ ہی جائیں گے۔ اس دوران میں لندن سے اس چشم دید گواہ کو بلوانے کا بندوبست کیا جا سکتا ہے جو دلاور کے جرم کی سزا کاٹ رہا ہے۔"

"وہ نمبردار۔ دلاور کی ماں کا ممیرا بھائی تھا۔۔۔"

"ہاں۔ اس نے دلاور کو دوہرے قتل کا ارتکاب کرتے دیکھا تھا۔ دلاور نے اس کی بیوی کو قتل کیا تھا اور اس کی کمسن فرزند کو یہ سمجھ کے مار دیا تھا کہ وہ ڈاکٹر شبلی ہے۔ دلاور کی سوتیلی بہن۔ اس وقت تک دلاور نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ وہ جائے واردات سے فرار ہو گیا تھا اور پکڑا گیا تھا۔ وہ سیاہ فام تھے حالات و واقعات اور شہادت نے مجرم بنا دیا تھا۔ وہ استغاثہ کا سب سے اہم گواہ ہو گا۔"

"بس تو پھر آج اپنے چوہدری دلاور صاحب کی رخصتی کا انتظام کر دیں۔ اب تک ہماری جیل میں تھا۔ اب سرکار کی جیل کا تجربہ بھی کرے۔ تو ذرا غالب کی صحافی برادری سے رابطہ کر۔ میں بطور فرنچ وکیل اے ایس پی سے ملتا ہوں۔"

آٹھ بجے میں نے اس مسئلے پر رابعہ اور منظر سے بات کی تو انہوں نے بھی مجھ سے اتفاق کیا۔ دلاور کی گرفتاری کو لازمی بنانے کے لیے خصوصی تفتیشی ٹیم نے اس کے خلاف خاصا مواد اکٹھا کر لیا تھا۔ اس کے ناقابلِ ضمانت وارنٹ تو پہلے ہی جاری ہو چکے تھے۔ سیشن کورٹ میں اسے مفرور قرار دینے کی درخواست بھی منظور ہو چکی تھی اور چند دن میں وہ اشتہاری مجرم کے عہدے پر فائز ہونے والا تھا۔ یہ میری دیرینہ آرزو تھی کہ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھوں اور قانون کے رکھوالے جو کل تک اس کے حکم کے غلام تھے اس کے ساتھ وہی سلوک کریں جو کل تک میرے ساتھ روا رکھا گیا تھا۔

رابعہ نے کہا۔ "تم ناشتہ کرنے گھر نہیں آؤ گے؟"

میں نے آہ بھر کے کہا۔ "کس کے گھر! وقار یوسف کے گھر! جس دن تم خود اپنے ہاتھوں سے ناشتہ بناؤ گی میرے گھر۔"

اس نے ہنس کے کہا۔ "رات مجھے بتائے بغیر ہی غائب ہو گئے تھے۔"

میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "ایک دن آئے گا جب فرشتۂ اجل بھی مجھے رات کے وقت لے جانا چاہے گا تو میں کہوں گا کہ حضرت شبِ وصل کی سحر تو ہونے دیجئے۔ ہجر تو ویسے ہی موت ہے۔"

وہ پھر ہنسی اور فون رکھ دیا۔

محسن نے مجھے پرملامت نظروں سے دیکھا۔ "خادم حسین کی صحبت نے ٹھیک نہیں کر سکا۔ اتنا بگڑ گیا ہے تمھارا اخلاق۔"

"یہ بھی مولوی خادم حسین کی صحبت کا اثر ہے۔" میں نے کہا۔ "منظر جانتا ہے کہ یہ یہاں ہماری عدم موجودگی میں کیا کیا رلیاں مناتا ہے اور مجھے دل پشاوری کرنے کے لیے کہاں کہاں لے جاتا ہے۔"

خادم حسین نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "ایسی باتیں آپ نے میری گھروالی کے سامنے شروع کر دیں جناب تو بہت مارے گی مجھے۔"

"وہ مارتی ہے تم کو اور تم مار کھاتے ہو؟"

خادم حسین نے مجرمانہ خاموشی سے سر جھکا کے اعتراف کیا۔ "کیا کریں جی۔ والدین کی نافرمانی نہیں کر سکتا تھا اس لیے شادی پر راضی ہونا پڑا۔ حرام نہ ہوتا یوں مرتا تو خودکشی کر لیتا۔ پچھتانا کے وقت۔"

رفتار بولا "بیوی ہے نا۔ چوکیدار کیا جیل۔۔۔"

تجی چاچی "دیکھا۔ اب ان کی زبان بھی چلنے لگی ہے۔"

محسن نے کہا "ہاں تو بے چارہ کب تک خاموشی سے ظلم برداشت کرے گا میری طرح۔ سب تو جورو کے غلام نہیں ہوتے۔ کیوں خادم حسین؟"

خادم حسین جھینپ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے سوچ بچار کی محسن کو بریف کر دیا کہ اسے آج دن میں کیا کرنا ہوگا۔

"میں تو دن کا رابعہ کے ساتھ۔ ہم تیسرے پہر چھاپا مار پارٹی کے ساتھ دلاور کی گرفتاری کے ڈرامے کا آخری سین پیش کریں گے اس وقت تک صحافی برادری کو وہاں موجود ہونا چاہئے۔ غالب کا فیلی دوست تم بھی جاتے ہو اسے۔"

محسن نے سر ہلایا۔ "یہ سب معاملات تو فون پر ہی طے ہو جائیں گے مگر پہلے یہ پتا چلے کہ آج کارروائی یقینی ہے یا نہیں۔"

"یہ تو پولیس ہیڈ آفس جا کے ہی معلوم ہوگا۔ اس وقت تک نہیں ایک کام اور کرنا ہے۔ دلاور کے ساتھ ہم نے صبح جو قیدی رکھے تھے ان سے تھوڑی سی تفتیش ضروری ہے۔"

"تفتیش؟" محسن نے سر کھجایا۔ "یہ کام اتنا آسان نہیں ہوگا۔"

"ان سے اعترافِ جرم حاصل نہیں کرنا ہے۔ ایسے کسی اعترافِ جرم کی کوئی قانونی حیثیت ہی نہیں ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ انہیں دفعہ پرکالوے ضابطۂ فوجداری کے تحت اتنا خوف زدہ کیا جائے کہ وہ جان بچانے کے لیے وعدہ معاف گواہ بننا قبول کر لیں۔"

"دفعہ پرکالوے" محسن چونکا۔ "کیا وہ اتنے کچے مجرم تھے۔۔۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ معمولی کارندے ہیں۔ جرم میں مدد کرتے ہیں اور حکم کی تعمیل پر مجبور ہیں۔ اگر انہیں یقین دلا دیا جائے کہ گزشتہ شب کی ساری کارروائی کا قصہ پولیس کو پہلے سے معلوم تھا اور ان کے آنے جانے تک جو کچھ ہوا اس کے چشم دید گواہ بھی معتبر لوگ ہیں اور اندھیرے میں چھپے ہوئے کیمروں سے ان سب کی عکس بندی بھی کی گئی ہے۔ شوکت علی رانا کو صبح فجر کے وقت گھر سے اٹھا لیا گیا ہے اور اس کی نشاندہی پر وزیر خاں اسپتال سے ڈاکٹر شاہ پکڑا جا چکا ہے۔"

"تو میرے کہنے سے مان جائیں گے؟"

"نہیں۔ لیکن وہ دلاور کو وہاں قید میں دیکھ کر مان جائیں گے کہ جو شکاری پکڑا جا سکتا ہے تو چھوٹے کس شمار و قطار میں ہیں۔ انہیں بتا دیا جائے کہ کچھ دیر بعد دلاور کو بھی پولیس گرفتار کرنے گی۔ اس وقت صحافی بھی ہوں گے۔ اگر وہ سب کے سامنے یہ بتا دیں کہ انہوں نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا تھا بلکہ وہ صرف حکم کے غلام تھے اور انہوں نے جو کچھ کیا شوکت رانا یا دلاور کے کہنے

محسن بولا۔ "تو اب کر لو۔۔۔ میرا مطلب ہے اپنی مرضی سے عقد۔"

"خیال تو کئی بار آیا مگر وہ لگتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ کیسے مرد ہو تم یار! عورت تو ہوتی ہے پاؤں کی جوتی اور تم اس کے مجازی خدا۔ ایسی عورت ہرگز تمھارے لائق نہیں ہے۔"

"بجا فرماتے ہیں آپ۔ لیکن میرے جو برادران شفیق ہیں یعنی اس کے چار بھائی۔ ایک سے ایک مسٹنڈا ہے۔ چھٹا ہوا بدمعاش۔ عقد ثانی کا خیال ہی ظاہر کیا تو وہ بارات کی جگہ میرا جنازہ پہنچا دیں گے قبرستان۔ خود اٹھا کے لے جائیں گے۔ دوبارا اسپتال پہنچا چکے ہیں جناب۔" اس کی آواز میں اتنا درد اتر آیا کہ لگتا تھا اب وہ رو پڑے گا۔

میں نے اسے تسلی دی۔ "فکر مت کرو اس مسئلے کا حل بھی نکالیں گے۔ ویسے تو تم بھی کم نہیں ہو۔ وہ مارتی ہے تمھیں اور تم اس پر مرتے ہو پھر بھی۔"

"بس جی۔ دل کا معاملہ ہے" اس نے آہ بھر کر کہا۔ "مجبوری ہے۔"

میں نے فرنچ وکیل کا حلیہ بنا کے خادم حسین کو ساتھ لیا۔ محسن نے باہر ناشتہ کرنے کی تجویز مسترد کر دی۔

"بیوی مارنے کی یار۔ یہ پکھن ہوتے ہیں اچھے شوہروں کے۔"

"ایک اچھا مثالی شوہر بننے کے سلسلے میں تیرے اور مولوی خادم حسین کے نقشِ قدم پر چلنے کی پوری کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ "ویسے تو رابعہ نے بھی بڑے پیار سے کہا تھا کہ ناشتہ گھر پر کرنا۔"

"سالے گھر ہے کہاں تیرا اور ابھی وہ بیوی نہیں، محبوبہ ہے اس لیے تجھے بڑا پیار محسوس ہوتا ہے اس کے بلاوے میں۔ بیوی کے گی تو ایسے سر کے بل نہیں، مجبوراً جاؤ گے۔"

ہم یہیں اس وقت پہنچے جب ناشتہ لگایا جا رہا تھا۔ تجی نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ بوبی ادھر سے اُدھر تھیلی پر ہاتھ مار رہا تھا۔ ایک نمک اور ایک کپ توڑ چکا تھا۔ نمک والی الٹ چکا تھا اور ڈبل روٹی کے سلائس پر نمک بچھانے میں مصروف تھا۔ اس کے باوجود سب نہال ہوئے جا رہے تھے۔ "بڑا شریر بچہ ہے۔" "بہت میں سب ایک ہی بات کر رہے تھے کسی اور کا بچہ ہوتا تو بدتمیز کہلاتا۔

میں نے کہا "آج اپنے منظر صاحب نہیں آئیں گے کیا؟"

"نہیں، وہ کورٹ چلا گیا ہوگا۔ میں تمھارے ساتھ جاؤں گی۔" رابعہ بولی۔

میں نے وقار یوسف کو مخاطب کیا۔ "اللہ کا دیا سب کچھ ہے تمھارے گھر میں، بھانت بھانت کی مخلوق ہے۔ ایک چوکیدار بھی ہونا چاہئے۔"

www.paksociety.com

پر کیا تھا تو ان کی مظلومیت اور مجبوری سب کے سامنے آجائے گی اور بعد میں عدالت سے انہیں سلطانی گواہ بننے کی صورت میں معافی بھی حاصل ہوگی۔ وہ بے وقوف قسم کے لوگ ہیں۔ میرا مطلب ہے بہت زیادہ چالاک اور ذہین نہیں ہیں۔ تو انہیں ایسا چکر دے کہ وہ تیری باتوں میں آجائیں اور قائل ہوجائیں کہ صرف تیرے مشورے پر عمل کرکے ہی وہ بچ سکتے ہیں۔ یہ کام ہوشیاری سے کرنے کا ہے' انہیں قابو میں کرنے کا۔ اگر وہ مان گئے تو سب کے سامنے دیا ہوا بیان بڑا ٹھوس ثبوت ہوگا۔ وہ بعد میں اس بیان سے مکر نہیں سکتے اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے جبر کے تحت یہ بیان دیا تھا۔ پولیس فوراً انہیں وعدہ معاف گواہ بنالے گی۔"

"مگر کیا اس طرح ان کی زندگی خطرے میں نہیں پڑ جائے گی؟ انہیں کون زندہ رہنے دے گا کہ وہ بعد میں عدالت کے سامنے دلاور اینڈ کمپنی کے سارے راز فاش کریں اور ان کے تمام جرائم کا ریکارڈ عدالت کے سامنے پیش کردیں۔"

میں نے کہا "یہ خطرہ تو ہر گواہ کو لاحق ہوتا ہے۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ انہیں تحفظ ملے۔ ہم پولیس پر دباؤ رکھیں گے' اخبار پہلے سے پولیس کو خبردار کرسکتے ہیں اور ساری ذمے داری ان پر عائد کرسکتے ہیں۔"

"پولیس کسی کو نہیں بچا سکتی۔" محسن بولا "وہ خرید و فروخت کرتے ہیں۔ بیان' ثبوت' گواہ سب کی قیمت لیتے ہیں۔ اب یہ حالات پر منحصر ہے اور خریدار پر کہ معاملہ معمولی ہے یا غیر معمولی۔ خود ان کے لیے خطرہ کم ہے یا زیادہ اور خریدار چھوٹا ہے یا بڑا۔ اسی کے حساب سے سودا ہوجاتا ہے۔"

"ہم خود اس کا انتظام کرلیں گے یار۔ اگر ہم دلاور کو قید میں رکھ سکتے ہیں تو کیا کسی وعدہ معاف گواہ کو غائب نہیں کرسکتے۔ تو انہیں وہاں سے نکال کر آفس لے جا۔ جب پولیس پارٹی دلاور کو گرفتار کرے گی تو لازمی بات ہے کہ اسے سیدھا ہیڈ آفس لے جایا جائے گا اور وہاں پریس کانفرنس میں جو مجھے کہنا ہے میں کہوں گا' جو رابعہ کو کہنا ہے وہ رابعہ کہے گی۔ اس وقت اگر تو ان دونوں کے ساتھ پہنچ جائے تو بہت بڑا دھماکا ہوجائے گا۔"

"میں کوشش کروں گا اور مجھے امید ہے کہ انہیں وہاں لے آؤں گا لیکن یہ وعدہ نہیں کرسکتا کہ وہاں جاکے بھی وہ اپنے بیان پر قائم رہیں گے۔ کیا پتا عین وقت پر وہ بدل جائیں' دلاور کے سامنے بول نہ پائیں۔ خود دلاور بھی پولیس کی تحویل میں بہت زیادہ مطمئن اور پُراعتماد ہوگا۔ وہ کوئی معمولی مجرم نہیں ہے جو گرفتاری سے ڈر جائے گا۔ وہ بہت گرجے گا' برسے گا۔ پولیس کو' وکیلوں کو اور صحافیوں کو بتائے گا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور جب یہ معاملہ عدالت میں پیش ہوگا تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ دشمنوں کی یہ سازش ناکام ہوجائے گی۔ وہ بڑے سے بڑا وکیل کرے گا اور ملک کی اعلیٰ ترین عدالت تک جائے گا۔ اس کا یہ حوصلہ دیکھ کے وعدہ معاف گواہ منحرف ہوسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ رسک تو لینا پڑے گا۔"

"کیوں نہ انہیں بعد میں پیش کیا جائے پولیس کے سامنے جب انہیں یہ معلوم ہوجائے کہ دلاور کو بھی پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے' انہیں کل بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ فی الحال تو انہیں وہاں سے نکال کرلے جا۔ جب پولیس وہاں پہنچے تو صرف دلاور ہی گرفتار ہو۔"

"کیا پولیس سوال نہیں کرے گی کہ دلاور کی اس پناہ گاہ کا علم آپ لوگوں کو کیسے ہوا؟"

"اس کا جواب ہم دے دیں گے۔ رابعہ یہاں آتی جاتی رہتی ہے۔ اسے پاکس دیکھ کر شک ہوا تھا۔ اس نے ایک آدمی نگرانی پر مامور کیا تو اس نے رپورٹ دی کہ آدھی رات کے وقت کچھ لوگ پاکس میں داخل ہوتے ہیں اور پتا نہیں اندر گھس کر کیا کرتے ہیں۔ رابعہ کہے گی کہ اس نے خبر لگوا کے ایک چوکیدار رکھا تھا۔ وہ بہت ہوشیار اور فرض شناس آدمی ہے۔ میری آفس بلڈنگ میں بھی چوکیداری کرتا ہے۔ اس نے حقیقت حال دریافت کرلی اور مجھے بتادی۔"

"پولیس بیان لے گی چوکیدار کا تو آپ جٹ ہوجائیں گے؟ لیکن بعد میں کیا ہوگا ... یہ ڈبل رول کیسے چلے گا؟"

"یہ ہوسکتا ہے کہ چوکیدار غائب ہوجائے۔ اس کا الزام بھی دلاور اینڈ کمپنی پر عائد کیا جائے کہ انہوں نے اسے اغوا کرنے کے بعد مار دیا ہوگا۔ فرنچ وکیل بہرحال ابھی رہے گا پاکستان میں۔ تم نکل جاؤ وقار کے ساتھ۔"

"ہاں" پیچھے سے وقار یوسف نے کہا "میں کورٹ جاتے ہوئے راستے میں ڈراپ کردوں گا۔ آپ کیا کہہ رہے تھے؟ میں چوکیدار رکھ لوں!"

"ہاں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں بھی اپنی حفاظت کی طرف سے اتنا بے فکر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی تو دیکھو کہ تمہارے مہمان کون ہیں۔" "سب دوست ہیں......"

"مگر دوستوں کے دشمن کون ہیں۔ محسن نے تو گل کو اور روبی کو یہاں سے شفٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"کہاں؟"

"فی الحال تو منظر کے گھر۔ اس کے بعد کوئی مکان تلاش کریں گے جہاں یہ محفوظ رہیں۔"

وقار یوسف نے سر ہلایا۔ "میرے خیال میں یہ ضروری ہے۔ ٹھیک سوچا ہے آپ نے۔ مگر یہ مت سمجھئے گا کہ میں ڈرتا ہوں۔"

"نہیں یار' تم ڈرنے والے ہوتے تو بہت پہلے ہم سے کہہ دیتے کہ میں باز آیا محبت سے اٹھا لو پاندان اپنا۔ گل اپنے والد تقوی صاحب کے قتل کے بعد ہم سے برگشتہ ہوجاتی مگر تم نے تو دوستی کی لاج رکھ لی۔ رابعہ تم پر واقعی فخر کرتی ہے کہ تم جیسا چھوٹا بھائی ملا اسے۔"

افسوس ہو رہا تھا۔ یہ سب گزشتہ شب کی فوری جوابی کارروائی کا نتیجہ تھا۔ بزرگوں کا قول صحیح ہے کہ دشمن روز اوّل ... سانپ کا سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دو۔ دفاعی جنگ لڑنے سے پہلے بھرپور جارحانہ اقدام ہی بعض اوقات فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے اور دشمن کی غلط فہمی یا خوش فہمی دور ہوجاتی ہے۔ شوکت رانا بہت جلدی میں کیے گئے ایک فیصلے کے بعد بہت جلد یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اس نے جس ایم آر ایس کے چرچے سنے تھے وہ کتنی منظم' سریع الحرکت اور جاندار قوت ہے۔

"آج دلاور کی گرفتاری کے بعد دیکھیں گے کہ شوکت رانا اب کیا فرماتے ہیں۔" رابعہ بولی۔ "ابھی صورت حال مختلف ہے۔"

"ہاں۔ شام کو یہ بساط ہوگی نہ یہ کھلاڑی۔ کھیل کا نقشہ کچھ اور ہوگا۔" میں نے کہا اور گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ ایک بار پھر گل پکاری۔ رابعہ اس وقت اندر بیٹھ چکی تھی۔ "کیا پھر فون کردیا رانا نے؟"

"میں گل سے کہہ دیتا ہوں کہ انکار کردے۔ کہہ دے کہ وہ چلی گئیں۔"

لیکن اس سے پہلے ہی گل نے پھر چلا کر رابعہ کو آواز دی۔ "رابعہ باجی۔"

"کیا مصیبت ہے۔"

رابعہ دوبارہ اندر گئی۔ میں اس کے ساتھ تھا۔

"دلاور کی بیوی ہے۔" گل نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے سرگوشی میں کہا "سکندر بھائی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ میں نے کہہ دیا کہ یہاں تو کوئی سکندر بخت نہیں ہے۔ اب کہتی ہے کہ اچھا رابعہ باجی سے بات کرادو۔"

میں نے اسے اشارے سے سمجھایا کہ کہہ دو نہیں ہیں۔

"سوری مسز دلاور وہ ابھی ابھی نکل گئی ہیں۔ میں باہر گئی تو گاڑی جا چکی تھی۔ آپ شام کو آفس میں بات کرلیں۔ نہیں۔۔۔ جی راستے میں ہوں گی۔ آپ بارہ بجے کے بعد فون پر بات کرلیں ... گھنٹے کے بعد۔ اب یہ مجھے معلوم نہیں کہ انہیں کس کورٹ میں جانا تھا۔ ممکن ہے وہ ہائی کورٹ جائیں۔ ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کورٹ نہ جائیں اور بھی کام ہوتے ہیں۔ جی! میں آپ سے کہہ رہی تھی تو کیا جھوٹ بول رہی ہوں۔ سکندر بخت ان کے ساتھ کیسے جاسکتا ہے جب وہ یہاں ہے ہی نہیں۔ کراچی۔ آپ کہتی ہیں کہ ... چلا گیا ہوگا۔ مجھے کیا معلوم۔ رابعہ کے پاس کراچی کا فون نمبر ہوگا نہیں۔" گل نے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا مسئلہ تھا؟"

"مسئلہ تو پتا نہیں۔ بار بار کہہ رہی تھی کہ بہت ضروری بات ہے۔ لیکن فون نمبر بتانے پر تیار نہیں تھی۔"

میں نے کہا "چلو اس کی پریشانی سے ہمیں کیا۔ بات کرنی ہوگی تو کرلے گی آفس کے فون پر۔"

"بس یہ تو خلوص ہے آپ سب کا ورنہ ہمارا اپنا اور کون ہے اس دنیا میں۔" یوسف بولا۔ "چلیں محسن صاحب۔"

اندر مولوی خادم حسین چغل خوری میں مصروف تھا اور گل سے شکایت کررہا تھا کہ منظر صاحب تو خیر شریف آدمی ہی نہیں ہیں مگر یہ محسن صاحب بھی کم نہیں اور ان کے ساتھ سکندر صاحب کی زبان بھی خرافات بکنے لگی ہے۔ گل بڑی دلچسپی سے پوچھ رہی تھی "آخر کیا کہتے ہیں یہ لوگ تم سے...... مجھے بھی تو بتاؤ۔"

رابعہ فون کرکے فارغ ہوئی تو اس نے خادم حسین کو ڈانٹا۔ "پیٹھ پیچھے باتیں کرتے ہو۔ جو کہنا ہو سب کے سامنے کہنا۔"

"کہہ دوں گا جی۔ ڈرتا نہیں ہوں میں کسی سے۔" مولوی خادم حسین بولا۔

"سوائے اپنی بیوی کے۔" میں نے کہا "بتادوں وہ کیا سلوک کرتی ہے تمہارے ساتھ؟"

مولوی خادم حسین کا رنگ اڑ گیا "یہ تو بلیک میلنگ ہے جی۔"

رابعہ نے ہنس کے کہا "اچھا اب چلو۔ وہ اے ایس پی اپنی پوری ٹیم کے ساتھ تمہارا انتظار کررہا ہے۔"

ابھی ہم باہر نکلے بھی نہیں تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اندر سے گل نے آواز دے کر کہا "رابعہ باجی ایک منٹ۔"

"کیا میرا فون ہے۔" رابعہ بولی "کون ہے؟"

"کوئی شوکت علی رانا ہے۔" گل نے کہا۔

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ "شوکت علی رانا۔ وہی جعل ساز جو کل رات آیا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ بات کرنا چاہتا ہے تو بات کیوں نہ کرلی جائے اس سے۔" رابعہ نے ریسیور گل سے لے لیا۔ میں نے لاؤنج میں اسی فون کے ایکس ٹینشن کا ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو!" رابعہ نے کہا۔

"مس رابعہ! میں آپ سے کچھ خاص اور اہم مسائل پر بات کرنا چاہتا تھا۔ میں شوکت علی رانا ہوں۔"

"مگر میں تو آپ کو نہیں جانتی۔ کل رات ایک ایم این اے آئے تھے مگر ان کا نام تو ایم شوکت رانا تھا۔"

"اچھا! ہوگا کوئی۔ میں چوہدری دلاور کا پارٹنر ہوں اور باتیں ایسی ہیں کہ جو فون پر کرنا مناسب نہیں۔"

"تو آپ میرے آفس آجائیے۔" رابعہ بولی "آج شاید مجھے دیر ہوجائے گی۔ چھ سات بجے آفس پہنچ جاؤں شاید۔"

"دیکھیں جی' مجھے پتا چلا ہے کہ کل رات کچھ لوگ......"

"مسٹر رانا' باقی باتیں ملاقات پر۔ مجھے دیر ہورہی ہے۔" رابعہ نے ریسیور رکھ دیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا ورنہ گزشتہ شب کا راز فاش ہونے ہی والا تھا۔

ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ شوکت رانا کا لہجہ بہت بدلا ہوا تھا۔ اس کی اکڑ فوں غائب ہوگئی تھی۔ وہ بہت خوف

www.paksociety.com

ہم واپس جانے کے لئے پلٹے ہی تھے کہ تیسری بار فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے رابعہ سے کہا "بس اب نکلو۔" اور اسے بازو سے پکڑ کے باہر کھینچ لیا۔

کسی نے کہا "کون۔ چوہدری دلاور۔ کون چوہدری دلاور۔" میرے قدم رُک گئے۔ میں نے رابعہ کو اشارہ کیا کہ وہ بات کرے مگر خود ریسیور لے لیا۔

میرے کانوں نے واضح طور پر چوہدری دلاور کی آواز سُنی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے بھائی کہ آپ نے میرا نام نہ سُنا ہو۔ شیطان کی طرح ذکر کیا جاتا ہوگا میرا تو۔ وہ اپنے سکندر اعظم کہاں ہیں۔ اللہ اس سے بچائے کیا کہتے ہیں اُسے۔ نظر بد۔ نظر بد سے بچائے۔ بڑی فتوحات مل رہی ہیں آج کل۔ ہیں جی۔"

شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ نہ کوئی اس کی آواز کی اتنی اچھی نقل اُتار سکتا تھا اور نہ اس کے لہجے کی ایسی کاپی کر سکتا تھا۔ وہ چوہدری دلاور ہی تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے میری فتوحات کا فلک بوس مینار کسی ریت کے بنے گھروندے کی طرح مسمار ہو گیا ہو۔ محسن ابھی راہ میں تھا اور اگر دلاور قید سے رہائی حاصل کر چکا تھا تو پھر محسن کے قیدی بننے کی باری آ چکی تھی۔ چوہدری دلاور کو گرفتار کرانے اور ہتھکڑی کے ساتھ حوالات میں دیکھنے کی خواہش ایک بار پھر فریب خیال ہو گئی تھی۔ تاہم میرے دل میں ایک موہوم سی اُمید کی روشنی تھی جو مجھے یقین کا راستہ دکھاتی تھی کہ ممکن ہے یہ مذاق ہو۔ ڈراما ہو۔ کوئی بہت اچھا ایکٹر یقیناً دلاور کی آواز اور لہجے کی مشق کر کے مجھے دھوکا دے سکتا تھا۔

رابعہ نے محتاط انداز میں سوال کیا "کون ہو تم؟"

دوسری طرف سے دلاور نے قہقہہ لگایا "لو جی۔ اب آپ کو بھی بتانا پڑے گا کہ ہم کون ہیں؟"

"تم دلاور نہیں ہو مجھے معلوم ہے۔"

"اچھا جی۔ پھر پوچھا کیوں تھا؟"

"صرف یہ جاننے کے لیے کہ آخر خود کو دلاور ظاہر کر کے تم کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو" رابعہ نے برہمی سے کہا۔

اس نے دوسری بار قہقہہ لگایا تو میں نے اس کی جعلسازی کو پکڑ لیا۔ وہ ہرگز دلاور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے دلاور کی آواز اور لب و لہجہ بڑی مہارت سے اپنایا تھا مگر نقل کے لیے عقل کی ضرورت تو پڑتی ہے مگر اس کے باوجود نقل کبھی اصل کے مطابق نہیں ہو سکتی۔ ماننے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں اور فرق بہرحال نظر آ جاتا ہے۔

دلاور کو میں نے کبھی اس طرح قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا تھا اور نہ کبھی وہ ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے فلمی ولن کا اسٹائل اختیار کرتا تھا۔ غالباً یہ فرق خود رابعہ نے بھی نوٹ کر لیا تھا۔

"دیکھو مسٹر ایکٹر۔ آج تو میں تمہیں معاف کر رہی ہوں۔ دوبارہ یہ حرکت مت کرنا۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ یہ فون آبزرویشن پر ہے۔ مجھے معلوم ہو جائے گا کہ تم نے کہاں سے بات کی تھی۔"

"آپ تو ویسے ہی ناراض ہو رہی ہو جی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں کی میں نے۔" وہ کچھ نروس ہوا۔

"تم نے کیا سمجھ کے فون کیا تھا یہاں؟" رابعہ کا اشتعال ایک دم بڑھ گیا "اگر یہ مذاق تھا تو کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اس کا تمہیں کیا نقصان ہوگا؟ تم مجھے خوفزدہ کرنا چاہتے تھے؟ بلیک میل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے یا...؟"

"دیکھیں جی۔ خدا کی قسم ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے تم کس سے مخاطب ہو؟" رابعہ نے طنز میں کہا۔

"جی... آپ رابعہ ہو" وہ بولا۔

"تمیز تہذیب تو تمہارے باپ کے پاس نہیں تو تم سے کوئی توقع کیسے رکھ سکتا ہے فیصل کہ تم اپنے سے بڑی عمر کی معزز خاتون سے بات کرتے ہوئے رابعہ باجی یا رابعہ آنٹی کہو گے۔ جس دولت نے تمہیں انگلش میڈیم اسکول تک پہنچا دیا تھا وہ ایسی ہی تھی ورنہ کوئی کیچڑ سے نہا کے پاک نہیں ہو سکتا۔"

رابعہ نے مجھ سے پہلے سمجھ لیا تھا کہ وہ دلاور کا بیٹا ہے۔ وہ ابھی جوان ہو رہا تھا مگر یہ عمر اور ماحول کا اثر تھا کہ وہ خود کو اپنے باپ سے بھی بڑا سمجھنے لگا تھا اور ان معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتا تھا جو صرف عمر یا تعلیم سے حل نہیں ہوتے۔ تجربے اور مشاہدے کی بالغ نظری اور زندگی کو ہر پہلو سے دیکھنے سمجھنے اور پرکھنے کی بھرپور صلاحیت اور اپنی تمام ذہنی و جسمانی توانائی کا اندازہ کرتے ہوئے اسے شاطرانہ ذہانت کے ساتھ بروئے کار لانا صرف اٹھارہ سال کی عمر میں نہیں آ جاتا۔ دلاور کا بیٹا اپنے باپ کا نقش ثانی بننے کے لیے اسی کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ آثار بتاتے تھے کہ بنیاد وہی ہے نقشہ بھی وہی ہے تو تعمیر بھی ویسی ہی ہوگی مگر فیصل کے لیے دلاور کی زندگی کا تجربہ حاصل کر لینا یا اس کی خواہش کرنا بھی اتنا ہی ناممکن تھا جتنا شاہین کے بچے کا انڈے کے خول سے باہر آتے ہی بلندیٔ افلاک تک پرواز کی کوشش کرنا یا خود اپنے پنجوں سے اپنے شکار کو ہلاک کرنے کی سوچنا۔ ابھی وہ نو آموز شکاری تھا جس کو شکار گاہ میں قدم رکھے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے مگر فیصل ان سے چھیڑ خانی کر رہا تھا جن سے نمٹنا اس کے باپ کو بھی نہیں آیا تھا۔ یہ ایک طفلانہ اور مضحکہ خیز حرکت تھی۔

رابعہ نے غصے میں فون ایک طرف رکھ دیا تھا۔ دوسری طرف شاید فیصل اب بھی "ہیلو ہیلو" کر رہا ہوگا۔

"اتنی لال پیلی کیوں ہو رہی ہو آخر تم ایک بے وقوف بچے کی بات پر؟"

"بے وقوف بچہ خود کو بچہ کب سمجھتا ہے" رابعہ نے کہا "وہ تو اُلٹا ہمیں بے وقوف بنانا چاہتا ہے۔"

"وہ طلسم ہوتی ہے۔" رابعہ بولی "اب چلو ورنہ اور کچھ ہو جائے گا۔"

"اب ہونے کو کیا رہ گیا ہے" میں نے آہ بھر کے کہا "سوائے مفتون کے۔ آج کسی نجومی کے طوطے سے پوچھوں گا کہ میری مجنوں تقدیر کب جاگے گی۔ شادی کی لکیر بھی ہے ہاتھ میں یا نہیں؟"

رابعہ نے گاڑی اسٹارٹ کی "پہلے طوطے سے یہ معلوم کر لینا کہ اس کی اپنی شادی ہو چکی ہے یا زندگی ایسے ہی فٹ پاتھ پر فن کے کارنامے دکھاتے گزر رہی ہے۔"

پیچھے سے مولوی خادم حسین نے کہا "دو عقل و معقولات نہ کیا جائے جی تو میں کچھ عرض کروں؟"

میں نے کہا "کرو۔ میرا مطلب ہے دو عقل و معقولات۔"

"حضرت دست شناسی کا علم میں نے بھی سیکھا تھا جناب اور کیا عرض کروں، استاد محترم ہاتھ کی لکیروں کو یوں پڑھتے تھے جیسے آئینے میں نوشتۂ تقدیر پڑھ رہے ہوں۔"

"مگر آئینے میں تحریر تو اُلٹی نظر آتی ہے خادم حسین۔"

"اب یہ تو کمال تھا ان کا جی کہ وہ ہاتھ کے آئینے میں تقدیر کا عکس دیکھ کے دو ٹوک بتاتے تھے بس پتھر پہ لکیر ہو جاتا تھا جناب! اور انہوں نے تو چیلنج لکھ کے رکھ دیا تھا کہ پیش گوئی غلط ثابت کرنے والے کو دس ہزار انعام۔ بورڈ پر صاف لکھا ہوا تھا۔"

رابعہ بولی "مگر دس ہزار کیا؟ روپے، ڈالر یا پاؤنڈ؟"

میں نے کہا "دس ہزار گالیاں یا جوتے بھی تو ہو سکتے تھے۔"

خادم حسین سوچ میں پڑ گیا "یہ تو پتا نہیں جی۔ آپ نے چکر میں ڈال دیا ہے مجھے۔ میں نے بھی غور نہیں کیا تھا مگر روپے واقعی نہیں لکھے ہوئے تھے مگر ساری بات نیت کی ہوتی ہے جی۔ ظاہر ہے انعام میں روپے ہی دیتے وہ اگر کوئی آ جاتا۔"

میں نے کہا "ابھی وہ کہہ سکتے تھے کہ جاؤ شہر کے دس ہزار بلوے تمہارے۔ باغ جناح کے دس ہزار پھول تمہارے۔ دس ہزار بجلی کے کھمبے یا میرے دس ہزار گناہ تمہارے۔"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں جناب..."

"اچھا یہ بتاؤ کبھی تم نے ان سے اپنی تقدیر کا حال پوچھا تھا۔ یہ سوال کیا تھا کہ استاد محترم آخر آپ کے دن کب پھریں گے۔"

اس نے پھر آہ بھری "پوچھا تھا جی... ان پر رقت طاری ہو گئی بولے کہ بیٹا نصیب میں جو لکھا ہے وہی ہو رہا ہے۔ ملکہ الزبتھ کی تقدیر میں برطانیہ کے تخت پر بیٹھنا لکھا تھا۔ اس پر کوئی اور نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ ہمارے مقدر میں یہ جگہ تھی جہاں ہم ہیں۔ تقدیر کے لکھے کو بھلا کون بدل سکتا ہے۔"

رابعہ نے مسکرا کے کہا "خود اپنے بارے میں بھی ضرور پوچھا ہوگا تم نے۔ یہ تو سب ہی جاننا چاہتے ہیں کہ شادی کہاں ہو گی؟"

"ہاں جی۔ اور انہوں نے بڑے دکھ سے کہا تھا کہ بیٹا یہ مت

میں نے کہا "ہاں کوشش کر کے ناکام ہو چکی تھی۔ اس نے شاید سوچا ہوگا کہ کسی طرح بات ہو جائے سکندر سے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ناوانی کے باوجود ہمیں شاک دینے میں تقریباً کامیاب ہو گیا تھا۔ کچھ تو اس کے انداز و اطوار اور لب و لہجہ اپنے باپ جیسا ہے۔ باقی کمی اس نے صدا کاری اور اداکاری سے پوری کر لی تھی اور چند منٹ کے لیے تو میرے ہاتھوں کے طوطے بھی اُڑ گئے تھے۔ یہ لڑکا بہت خطرناک ہوتا جا رہا ہے رابعہ۔"

"خطرناک کیوں نہیں ہوگا۔ پرورش کرنے والے والدین کیا کم خطرناک ہیں۔ باپ تو جیسا تھا سو تھا، ماں شریف اور اولاد کی خیر خواہ ہوتی تو شاید بیٹے کی زندگی پر باپ کے کالے کرتوتوں کا سایہ نہ پڑتا مگر مسز دلاور ثابت کر چکی ہے کہ وہ ہر طرح سے اپنے شوہر کی رفاقت کا حق ادا کر سکتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو قابل تعریف بات ہے۔ اسی لیے ان دونوں کی نبھ گئی۔ زندگی کی گاڑی کے دونوں پہیے ایک جیسے تھے۔"

"عورت مجبور ہوتی ہے۔ شوہر کے سانچے میں نہ ڈھلے تو ساتھ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"اچھا!" میں نے سخت حیرت کا اظہار کیا "یعنی شرابی کی بیوی شراب پینے لگتی ہے اور جواری کی بیوی جُوا کھیلتی ہے۔ یہ جو ہماری سوشل فلمیں ہوتی ہیں اس میں تو الٹا دکھایا جاتا ہے کہ نیک پروین ٹائپ بیوی شوہر کی کایا پلٹ دیتی ہے۔ گھر کو جنت بنا دیتی ہے اور فلم ختم ہونے تک سب ٹھیک کر دیتی ہے۔"

موسیقی کی اب دست کا قاعدہ
گانا سیکھنے کے لیے نہایت موزوں کتاب
امجد موسیقی
کتابیات

پوچھو تو اچھا ہے مگر میں نے اصرار کیا تو انہوں نے سب صاف صاف بتا دیا۔ میں نے کہا استاد جی میں باز آیا ایسی شادی سے تو بولے کہ نامعقول۔ کیا ٹل سکتا ہے تقدیر سے۔ قسمت میں تیرے لیے وہ لکھ دی گئی اور اس کے لیے تو۔ اب تم دونوں بھاگ کے کہیں نہیں جا سکتے۔ سچ ہی فرمایا تھا جی انہوں نے۔ یہ نکاح تو موت سے زیادہ اٹل ثابت ہوا۔"

میں نے پلٹ کے کہا "اچھا زیادہ دکھی ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ دنیا میں تو ہی کو جو بھی ملتا ہے اعمال کے بدلے ملتا ہے۔"

"ہاں۔ اب ذرا ان کے اعمال دیکھو اور بتاؤ انہیں اور کیا ملے گا؟" رابعہ بولی۔

"ان کا مطلب ہے اس ذلت کے علاوہ جو میں اٹھا چکا اور ان دھکوں کے سوا جو میں کھا رہا ہوں۔"

خادم حسین نے میرے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے کے یوں پڑھنا شروع کیا جیسے مثل مکمل اپنے ذہن رسا کی مدد سے انگریزی کے اخبار کی سب سے اہم خبر کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ چند منٹ کے بعد اس نے افسوس ناک انداز میں سہلا کے ہاتھ چھوڑ دیا۔

"کوئی فائدہ نہیں جی۔"

"کیا ہوا؟" میں نے کہا "لکیریں کیا کہتی ہیں؟"

"چھوڑیں جناب۔ سچ بولوں گا تو آپ سے زیادہ رابعہ بی بی خفا ہوں گی۔"

"یا وہ پہلے ہی خوش نہیں ہیں۔ تم ان کی پروا مت کرو۔"

مولوی خادم حسین کا سر دائیں بائیں ہلتا رہا "نہیں جی۔ آپ کو بھی خوشی نہیں ہوگی۔ ماشاء اللہ دولت کی کوئی کمی نہیں۔ صحت بھی اچھی رہے گی اور عمر بھی لمبی ہوگی۔ دیکھیں جناب یہ ہے دل کی لکیر۔"

"اس میں تو خاصی خرابی ہے۔ مجھے معلوم ہے۔"

رابعہ نے کہا "دماغ کی لکیر سے بھی زیادہ؟"

خادم حسین نے کہا "دماغ۔ دماغ کی لکیر میں بہت گڑبڑ ہے جناب۔"

"وہ تو پیدائشی ہے خادم حسین۔" رابعہ ہنسی "اور تم دیکھ بھی رہے ہو اپنی آنکھوں سے۔ ذرا غور سے بتاؤ کہ پاگل خانے جانے کی نوبت کب آئے گی۔"

"وہ تو بس آنے ہی والی ہے۔ کیوں خادم حسین؟" میں نے کہا "چھ مہینے سال میں جس دن بھی دشمنوں نے پکڑ کے قاضی کے سامنے بٹھا دیا۔ کیا خیال ہے کب تک پیش آئے گا یہ سانحہ؟"

"کون سا سانحہ جی؟"

"کیا۔ شادی پاگل خانہ آبادی کا۔ ویسے تو سچ کہتی ہیں۔ بس رابعہ کہ دماغ کی خرابی تو پیدائشی ہے۔ دماغ خراب نہ ہوتا تو ہم ولایت سے لوٹ کر یہاں آتے جھک مارنے کے لیے؟ اپنے ایمان سے کہنا مولوی خادم حسین۔ میری جگہ تم ہوتے تمہارے چاروں طرف ایک سے بڑھ کر ایک پری جمال مہ جبین۔ اصلی ولایتی حسینہ۔ گلاب اور سنگ مرمر سے تراشی ہوئی۔ اور وہ سب نازو انداز سے بجلیاں گراتیں۔ تم پر ہزار جان سے فریفتہ ہوتیں۔ تو تم آتے یہاں کی گنوار ناٹ کالی کلوٹی بدتمیز اور بے ہنگم لڑکیوں میں سے زبردستی کسی کو اپنی منکوحہ بنانے کے لیے؟"

خادم حسین کی آنکھوں میں جیسے خواب اتر آئے "ایمان کی بات کی ہے جی آپ نے۔ تو سچی بات یہ ہے کہ میں تو وہیں مر جاتا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ بشر بڑا کمزور اور شیطان قوی ہے مگر اپنے نصیب ایسے کہاں تھے سکندر صاحب۔"

رابعہ نے منہ پھلا کے کہا "سکندر صاحب کو روکا کس نے ہے۔ یہ اب جانا چاہیں تو ولایت میں بہت ہوں گی ان کی راہ دیکھنے والی۔"

"دیکھیں رابعہ بی بی۔ آپ تو ابھی سے خفا ہونے لگیں۔ ابھی تو میں نے یہ بتایا ہی نہیں کہ سکندر صاحب کے ہاتھ میں شادی کی دو لکیریں ہیں اور کیا ضرورت ہے مجھے بتانے کی۔"

میں نے کہا "صرف دو خادم حسین۔ ذرا غور سے دیکھو۔ شاید تیسری بھی ہو، نظر نہ آ رہی ہو۔ اصولاً تو چار ہونی چاہئیں اور مجھے دوسری کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتاؤ۔"

"آپ اسے مذاق نہ سمجھیں جناب۔ ہاتھ کی لکیریں جھوٹ نہیں بولتیں۔ ایک شادی تو آپ کی ہوئی تھی۔"

"اچھا! کمال ہے میری شادی ہو گئی اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ کب ہوئی تھی یہ شادی اور کس سے؟"

خادم حسین نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا "آپ جانتے ہیں جناب۔ میں مرحومہ کا نام اب کیوں لاؤں اپنی زبان پہ۔ اس سے آپ کی نسبت طے تھی اور جناب ذہنی طور پر آپ ایک دوسرے کو قبول بھی کر چکے تھے۔ نکاح کی کسر رہ گئی تھی بس۔ مرحومہ کا ہاتھ تو میں نے نہیں دیکھا تھا مگر اس میں بھی ایسی ہی دو لکیریں ہوں گی۔ ایک ادھوری اور دوسری مکمل۔ ایک پکی اور دوسری کچی۔"

مولوی خادم حسین نے سچ بول دیا تھا اور مذاق کی بات اچانک انتہائی دل آزار موضوع بن گئی تھی۔ میری ساری شوخی ختم ہو گئی تھی اور میں سیدھا ہو کے خلا میں دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں خادم حسین کو غلط بھی نہیں کہہ سکتا تھا اور اسے یہ الزام بھی نہیں دے سکتا تھا کہ اپنی دست شناسی کا بھرم رکھنے کے لیے اس نے میرے حالات سے آگاہی پر انحصار کیا۔ وہ کوئی چالاک اور عیار آدمی نہیں تھا کہ مجھے متاثر کرنے کے لیے اور اپنی علمیت اور قابلیت کا رعب جمانے کے لیے ایسی بات کرتا جو کسی طرح بھی کہی جاتی ایک ناقابل تردید حقیقت رہتی۔ اس نے اپنے محدود کتابی علم سے جو نتیجہ اخذ کیا تھا وہ بتا دیا اور ہاتھ کی لکیروں پر اعتقاد نہ رکھنے کے باوجود میں اسے تسلیم کرنے پر مجبور تھا۔

میں نے دوسری طرف سے اتر کے کہا "ہاں۔ اس کا تعلق بھی شادی سے ہی ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ایک ہی سوال کے دو حصے ہوتے ہیں۔ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد۔"

رابعہ نے خادم حسین کو کھینچ لیا "چھوڑو خادم حسین، تم جیسے باکمال آدمی کو فضول لوگوں کے فضول سوالات کا جواب دینا ہی نہیں چاہیے۔ ایک بات نہ جانے کس نے کہی تھی فارسی میں جو مجھے یاد رہ گئی۔ جواب جاہلاں باشد خموشی۔"

"یہ بات میں نے کہی تھی۔ عقلمندی کی باتیں میرے سوا کون کر سکتا ہے؟"

خادم حسین نے بے بسی سے مجھے دیکھا "حیرت ہے کہ آپ خاموش ہیں جناب اور آپ کی رگ حمیت نہیں پھڑک رہی ہے۔ آپ کی غیرت جوش میں نہیں آئی۔ بخدا آپ کی جگہ میں ہوتا تو خون کر دیتا۔"

"کس کا خون کر دیتے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"اپنا۔۔۔ اپنی گھر والی کا۔ یا اس کا۔۔۔ جس کا ہاتھ وہ ایسے سرعام پکڑ لے۔" خادم حسین نے افسوس سے سر ہلایا "یہ ایک نامحرم کا ہاتھ ہے مس رابعہ۔ مجھے اپنے ساتھ گناہگار مت کریں۔"

رابعہ ہنسی "تم نامحرم کہاں ہو مولوی خادم حسین۔ تم تو میرے بھولے بھالے پیارے پیارے معصوم اور نیک بھائی ہو۔ میں تو سب کے سامنے تمہیں گلے لگا کے پیار بھی کر سکتی ہوں۔ بتاؤں کیسے؟"

"اف۔۔۔ مس رابعہ۔۔۔ خدا کے لیے ایسا مت کریں۔" خادم حسین نے اپنا ہاتھ چھڑایا "مجھے آپ۔۔۔ آپ سے ایسی امید نہیں تھی۔ باقی سب تو خیر شرم و حیا سے عاری ہیں لیکن آپ۔۔۔"

"ایک اور بات خادم حسین۔ یہ میری گھر والی نہیں ہے جس نے تمہارا ہاتھ تھام لیا ہے۔ اس لیے میرے غیرت میں آ کے کسی کو قتل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ چاہو تو خود رابعہ کا ہاتھ تھام لو۔ تم دست درازی کر سکتے ہو۔ اگر ہمت ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" خادم حسین ناراض ہو گیا "ایسے بے ہودہ الفاظ آخر آپ کی زبان پر کیسے آئے؟ اور وہ بھی میرے لیے؟"

"بھئی دست درازی کا مطلب ہے ہاتھ لمبا کرنا، ہاتھ بڑھانا۔ تو ہاتھ بڑھائے بغیر تم ہاتھ پکڑ کیسے سکتے ہو؟"

اور محسن نے گزشتہ شب کے دو اسیروں کو فرش پر اوندھا لٹا رکھا تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں آزاد تھے۔

خادم حسین اندر داخل ہوتے وقت بھی بڑبڑا رہا تھا "یہ کہاں پھنسا دیا تقدیر نے خادم حسین کو۔ مظہر صاحب، محسن صاحب، سکندر صاحب۔ ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ سب ننگے ہیں اس حمام میں۔"

رابعہ نے گاڑی اپنے آفس کے سامنے روک کے اچانک اپنا ہاتھ پیچھے سے خادم حسین کی طرف بڑھا دیا۔

"میرا ہاتھ بھی دیکھو۔"

خادم حسین پہلے ہی نروس تھا "جی۔۔۔ ابھی۔۔۔ یہاں۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ ابھی۔۔۔ یہاں۔۔۔" رابعہ نے تلخی لہجے میں کہا "مجھے بھی بتاؤ کہ میرے ہاتھ میں شادی کی کتنی لکیریں ہیں؟"

خادم حسین کا رنگ اڑنے لگا "دیکھیں جی۔ میں۔۔۔ مجھے تو معاف ہی رکھیں آپ۔"

"نہیں خادم۔ تمہیں بتانا پڑے گا۔ جو بھی سچ ہے، بالکل اسی طرح جیسے تم نے سکندر صاحب کو بتا دیا۔ ورنے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے ہاتھ کی لکیریں جو بھی کہتی ہیں صاف صاف بتا دو۔ خدا کو حاضر ناظر جان کے۔"

میں رابعہ کا مقصد سمجھ گیا تھا مگر اس وقت مداخلت کا جواز نہیں تھا۔ رابعہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کی اپنی پہلی شادی کے بارے میں خادم حسین کا علم کیا کہتا ہے۔ اس کی پہلی شادی ایک ایسے شخص سے ہو گئی تھی جو شادی کے قابل ہی نہیں تھا مگر اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ یہ بات وہ کسی اور کو بتا سکتا مگر وہ اتنا شریف آدمی تھا کہ اس نے رابعہ کو ہاتھ لگائے بغیر اعتراف جرم کر لیا اور وہ باعزت طور پر الگ ہو گئے۔ اب وہ حکومت میں بہت اونچے درجے پر فائز تھا مگر اس نے شادی کی غلطی دوبارہ نہیں کی تھی اور رابعہ کے معاملے میں انتہائی وسیع القلبی کا اور عالی ظرفی کا ثبوت دیا تھا۔ یہ بات رابعہ کے سوا صرف میں جانتا تھا اور مجھے اس نے یہ بات بہت پہلے اس وقت بتا دی تھی جب میں نے اظہار محبت کے بعد اس سے زندگی بھر کی رفاقت مانگی تھی۔

خادم حسین نے مجبوراً رابعہ کا ہاتھ دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولا "دو شادیاں آپ کی بھی ہیں جناب لیکن آپ کے ہاتھ میں دونوں لکیریں گہری ہیں۔ ادھوری لکیر جیسی سکندر صاحب کے ہاتھ میں ہے ایسی لکیر نہیں ہے۔"

رابعہ مسکرائی "تم واقعی ہاتھ دیکھنا جانتے ہو خادم حسین۔ کمال کے دست شناس ہو تم۔ مجھے اور سکندر کو قائل کر لیا تم نے۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا تمہاری دست شناسی کی صلاحیت کا۔ تم تو بہت بڑے پامسٹ بن سکتے تھے۔ ہزاروں کما سکتے تھے۔"

خادم حسین نے نفی میں سر ہلایا "نہیں جناب۔ ہزاروں وہ کماتے ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں۔ سنہرے خواب دکھاتے ہیں۔ مستقبل میں دولت عزت شہرت کی بات کرتے ہیں۔ یہ تو لاکھوں میں کسی ایک کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ باقی سب میری طرح ہوتے ہیں جی۔ ایسے نصیب کا حال کون جاننا چاہتا ہے جس میں خوشی کی بات نہ ملے۔"

رابعہ نے گاڑی کا دروازہ لاک کیا۔ "ایک سوال اور پوچھوں؟"

www.paksociety.com

"پھر تو بہتر ہے کہ تم بھی کپڑے اُتار دو اپنے کیونکہ تم اسی حمام میں ہو" میں نے اسے چھیڑنا جاری رکھا "ویسے معاف کرنا مولوی خادم حسین۔ کم تم بھی نہیں ہو۔ تمہارا نام ایک پردہ ہے دنیا کو دھوکا دینے کے لیے اندر سے تم اچھے رنگین مزاج ہو کر سکندر کو تمہارے مقابلے میں شریف سمجھا جا سکتا ہے۔"

"یہ۔ یہ بڑی زیادتی ہے۔ بڑا رکیک حملہ ہے میری ذات پر سکندر صاحب۔ تہمت ہے مجھ پر۔"

"کیوں۔ ابھی جب میں لندن کی رنگینی کا ذکر کر رہا تھا تو کیا کہا تھا تم نے۔ رال ٹپک رہی تھی تمہاری۔"

خادم حسین میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ ایک خوبی یہ تھی کہ وہ جتنی جلدی بُرا مانتا تھا اتنی ہی جلدی سب کچھ بھول بھی جاتا تھا۔ اس کا دل ایک ایسا آئینہ تھا جس پر غبار آتا تھا اور مٹ جاتا تھا۔ وہ بات دل میں رکھنے والا اور کینہ پرور نہیں تھا۔ اگر وہ سچ مچ خفا ہوتا تو ہمیں چھوڑ کے چلا جاتا مگر ہماری "غیر شریفانہ" صحبت میں رہنا بھی اس کی مجبوری بن چکا تھا۔ ہمارے "بے ہودہ" مذاق سے وہ رنجیدہ اور کبیدہ خاطر ہوتا تھا مگر ذرا سی دیر کے لیے۔ یہ اس کی بے وقوفی تھی یا سادگی کہ وہ خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ کوئی بات اسے ناگوار محسوس ہوتی تھی تو ناگواری کا اظہار وہ لحاظ کیے بغیر فوراً کر دیتا تھا اور ہمیں اس کو مزید تنگ کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

رابعہ نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کے دونوں جنگلی قیدیوں کو غور سے دیکھا "یہ کون ہیں اور یہ کیا ڈرامہ چل رہا ہے؟"

میں نے فرنچ میں کہا "یہ مسٹر قادر ہیں۔ قادر بجلی والا۔ یہ بجلی سے چلتا ہے۔" مترجم کا کردار خادم حسین کو ادا کرنا پڑا۔

محسن نے سہلایا "دو بار بجلی کے جھٹکے بھی کھا چکا ہے ناشتے میں۔ اس کے اندر الارم بھی لگا ہوا ہے جو بجلی لگاتے ہی بولتا ہے۔ آواز سنو گے؟"

میں نے کہا "کیسی آواز ہے؟"

"بہت عجیب۔ بالکل یوں لگتا ہے جیسے بلبل اور بھینس ایک ساتھ مل کے رو رہی ہوں۔ جیسے کسی نے انہیں تیز مرچوں والے پکوڑے کھلا دیے ہوں" محسن نے بجلی کے ایک تار کی نوک قادر کی ناک کے قریب لا کے کہا۔

قادر چلانے لگا "میں مر جاؤں گا جی۔ میرا دل کمزور ہے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے یار۔ خود بھی تو کمزور ہے بے چارا۔ ناشتے میں دو جھٹکے کافی ہیں۔ تیرے سے بدہضمی نہ ہو جائے۔" میں نے کہا۔

محسن نے رابعہ کی طرف دیکھا "یہ فضل داد ہے۔ حویلیاں میں رہتا تھا۔"

"حویلیاں میں کہو۔"

"حویلیاں ایک جگہ ہے۔ ایبٹ آباد کی طرف۔ وہاں گھر کسی کا نہیں ہوتا غالباً۔ سب حویلیاں ہوتی ہیں" محسن بولا "اس کے خون میں جتنا نمک ہے سب چوہدری دلاور کا ہے۔ اس نمک کو خون سے نکالنے کی تجربات نہیں ہیں لیکن طریقہ بڑا مشکل ہے۔ پہلے اسے الٹا لٹکا کے کہیں ایک سوراخ کرنا پڑے گا جہاں سے تمام خون نکل جائے۔ پھر ایک کیمیائی طریقے سے اس خون کو صاف کیا جائے گا۔ اس میں سے نمک الگ کرنے کے علاوہ کچھ دوسری غلاظتوں کو بھی دور کرنا پڑے گا۔ پھر یہ پاک و صاف شریفانہ خون دوبارہ اس کی رگوں میں ڈال کے دیکھیں گے۔"

"مگر یار ایسے تو یہ مر جائے گا۔"

محسن نے سخت حیرانی کا اظہار کیا "اچھا! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ پھر کیا کریں۔ جب تک دلاور کے نمک کا اثر رہے گا یہ اس کی آواز میں بھونکتا رہے گا۔"

میں نے سوچ کے کہا "اسے انجکشن دو۔ پہلے نمک کے بجائے تیزاب کا۔ نمک اس تیزاب میں مل جائے گا پھر شورے کا تیزاب پلا دو اسے۔ ایک چائے کا چمچ دن میں تین بار۔ شورے کے تیزاب سے شوریدہ سری ختم ہو جاتی ہے۔ شور کرتا ہے مریض مگر بالآخر چُپ ہو جاتا ہے۔"

فضل نے سر اُٹھایا "تم جو چاہو کرو۔ میں تمہاری مرضی کا بیان نہیں دوں گا۔"

میں نے سوچ کے کہا "ہوں۔ چلو کوئی بات نہیں فضل۔ تمہاری بیوی بھی پہلے بہت اکڑ رہی تھی۔ بعد میں مان گئی۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ بکواس کرتے ہو۔"

میں نے کہا "تم نے اپنے آقا اور ان داتا کی حالت دیکھی ہو گی فضل، اس کے مقابلے میں تم کیا چیز ہو۔ چوہدری دلاور کی بیوی نے کل اس سے قید خانے میں ملاقات کی تھی۔ اس کے بعد وہ بھی رضامند ہو گئی۔ ہم سے تعاون پر۔ دراصل اس کی بھی وہی مجبوری تھی جو تمہاری ہے۔ دلاور جیسے اور تم جیسے بُرانے بڈھے شوہروں کی اب انہیں اتنی ضرورت بھی نہیں رہی مگر ایک بیٹی دلاور کی ہے جیسے تمہاری بیٹی ہے۔ بھولی بھالی اور معصوم۔ ظاہر ہے کوئی ماں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ باپ کی سزا بیٹی کو ملے۔" مترجم خادم حسین ہی تھا۔

اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا۔ فضل کی صورت پر ایک دم شکست کے آثار نمودار ہو گئے۔ بہن یا بیٹی کا رشتہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری بن جاتا ہے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ فضل شادی شدہ ہے تو اس کی کتنی بیٹیاں ہیں اور کتنے بچے؟

وہ زمین پر سر مار کے رونے لگا "مجھے مار ڈالو۔ میرے ٹکڑے کر دو۔ لیکن اس کو کچھ مت کہو۔"

میں نے کہا "ابھی تک ہم نے اس سے کوئی بات ہی نہیں کی ہے فضل، اسے تمہارے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں۔ وہ بہت آرام سے اور بالکل محفوظ ہے۔ تمہارے اپنے گھر میں ہے مگر تم چاہو تو ہم اسے بھی یہاں لا سکتے ہیں۔"

محسن نے اپنی گھڑی دیکھی۔ "ساڑھے دس بجے ہم تمہاری بیوی کو اور بیٹی کو دوسری دنیا میں۔ میرا مطلب ہے دوسری جگہ پہنچا دیں گے۔"

وہ چلایا "نہیں۔ انہیں وہیں رہنے دو۔"

"تھوڑی سی دیر کے لیے انہیں تم سے ملوانے کے بجائے کہیں لے جانا پڑے گا فضل۔ چند گھنٹے وہ ایک ایسے گھر میں گزاریں گی جہاں ان کے آرام اور آسائش کی ہر چیز ہو گی۔ وہ اتنی ہی محفوظ ہوں گی جتنی اپنے گھر میں تھیں۔ وہاں انہیں تمہارا بیان براہ راست سننے کو ملے گا۔ جو کچھ تم کہو گے سب ان کے کانوں تک پہنچ جائے گا۔ اگر تم نے اپنے بیان کو حقائق تک محدود رکھا، وہی کہا جو سچ ہے تو انہیں کچھ نہیں ہو گا۔ وہ شام کو واپس اپنے گھر میں ہوں گی۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کرو۔ انہیں کچھ معلوم نہیں کہ میں باہر کیا کرتا ہوں" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا "یار اس شخص کو تھوڑی سی رعایت دے سکتے ہیں ہم۔ جو بیان یہ پولیس کے سامنے دے گا وہ ٹھیک ہو گا تو بس وہی سنیں گے جو وہاں موجود ہوں گے۔ اگر یہ بہک گیا اور اس نے پٹری سے اُترنے کی کوشش کی تو پھر اس کی آواز انہیں بھی سنوا دیں گے۔ اس کی بیوی اور بیٹی کو کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال کیا پوچھتے ہو، یہ تو فضل داد حویلیاں والا کی مرضی ہے۔ اس نے دلاور سے وفاداری کو ترجیح دی تو دنیا میں اکیلا رہ جائے گا۔ ہمیں تو اچھے خاصے پیسے مل جائیں گے ان کے۔ لڑکی تو خیر ہے ابھی نو عمر مگر ماں بھی تو بوڑھی تو نہیں ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "بات ہوئی ہے کسی سے؟"

"ہاں۔ ایک پارٹی ہے جو مال ایکسپورٹ کرتی ہے۔ مڈل ایسٹ میں اچھی مارکیٹ ہے۔ بنکاک سے بھی ایک فون آیا تھا۔"

فضل کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا "تم انہیں بیچ دو گے۔ تمہاری اپنی ماں بہن نہیں ہے؟"

میں نے تیزی میں سرہلایا "نہیں۔ اور ہوتیں تو ہم کوئی غلط کام نہ کرتے۔"

محسن بولا "بے گناہ ہونے کے باوجود میری بہن اور میرا بہنوئی کراچی میں قتل کروا دیے گئے۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

"مگر میں۔ میں دلاور کے خلاف نہیں بول سکتا۔ وہ مار ڈالے گا مجھے۔"

"اپنی زندگی اس شخص کو اپنی بیوی اور بیٹی کی عزت سے زیادہ پیاری ہے" میں نے محسن سے کہا۔

"چھوڑیں گے تو ہم بھی نہیں تمہیں فضل۔ اگر تم نے وہ سب نہ کہا جو میں نے بتایا ہے تو بعد میں دلاور تمہیں نہیں بچا سکے گا۔ وہ تو خود کل کوٹھری میں ہو گا۔ سمجھدار کھلاڑی ہو تو سوچ لو۔ جان کا خطرہ مول لے کر بیوی اور بیٹی کی عزت تو بچا لو۔"

زندگی سنوارنے اور نکھارنے والی کتابوں کے سلسلے کی ایک کڑی

مشہور ماہرین نفسیات کی آرا پر مشتمل کتاب

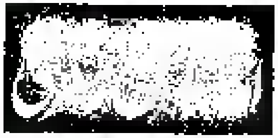

اسباب — تدارک — علاج

یہ کتاب کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ

احساس کمتری سے کس طرح نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

کامیاب زندگی گزارنے کے اصول کیا ہیں

کیا آپ واقعی احساس کمتری کے شکار ہیں یا صرف یہ آپ کا خیال ہے۔

ہو سکتا ہے کہ صرف اس کتاب کے مطالعہ سے ہی آپ کا یہ احساس ختم ہو جائے۔

احساس کمتری

قیمت ۔/۴۰ روپے

ڈاک خرچ ۱۶ روپے

مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس ۹۴۴ کراچی

محسن نے کہا "ہم کوشش کریں گے تمہیں بچانے کی۔ پولیس پر ہم بھروسا نہیں کر سکتے لیکن خود تمہیں تحفظ فراہم کر سکتے ہیں۔ ولاور کی رواداری کا دور گزر گیا۔ تمہارے لئے اس وقت ان سب کے لیے زیادہ بڑا ثابت ہوگا جو سمجھتے تھے کہ ولاور کا سایہ آسمان کی طرح ہے جو ہمیشہ رہے گا۔ اگر ولاور کا ساتھ دو گے تو یہ سو فیصد گھاٹے کا سودا ہوگا۔ ہمارا ساتھ رہنے میں ترقی کا چانس ہے۔ فیصلہ خود کر لو۔"

"میں۔۔۔ میں یہ چانس لوں گا۔" فضل نے سر زمین پر ڈال دیا اور سسکیاں لینے لگا۔

قادر بخش کا کردار زیادہ اہم نہیں تھا۔ وہ اب تک ڈراما کے لیے چھوٹے موٹے کام کر کے ہی خوش تھا کیونکہ اسے معاوضے سے زیادہ بڑا انعام مل جاتا تھا۔ وہ اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا تھا کہ بابا کا خاص نمبر بن جائے اور کسی حد تک اس کوشش میں کامیاب بھی ہوا تھا لیکن اس نے مقصود کا دوسرا رخ آج پہلی بار دیکھا تھا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ محنت کے معاوضے اور وفاداری کے طوق کی قیمت میں کیا فرق ہوتا ہے۔

رابعہ نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں اندر چلنے کا اشارہ کیا تو میں نے خادم حسین سے کہا "خادم حسین۔ یہ حسین اور نوجوان عورت مجھے کیسی بے شرمی سے ورغلا کے اندر لے جانا چاہتی ہے۔ اس سے کہو کہ میں۔۔۔"

خادم نے غصے سے کہا "ایسی خرافات کے لیے آپ اپنی زبان ہی استعمال کریں۔"

"کیوں یہ تمہیں تو اشارے نہیں کر رہی ہے؟" میں نے کہا "تم بھی کم پُرکشش نہیں ہو۔"

محسن نے کہا "مولوی خادم حسین میں ہنسی اچھل کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی ہے۔ میں خود ڈرتا ہوں کہ کہیں قل پر ڈورے نہ ڈالے یا وہ خود اس پر لٹو نہ ہو جائے۔"

خادم حسین واک آؤٹ کر گیا اور گیلری میں کھڑا ہو کے مال روڈ کی ٹریفک کو دیکھنے لگا مگر اس کے دل و دماغ سے غصے کا دھواں ایسے اٹھ رہا تھا جیسے تندور میں جلنے والی گیلی لکڑی سے۔

رابعہ نے کہا "محسن، تم شرافت سے باز نہیں آؤ گے۔ یہ کیا چکر ہے۔ سکندر نے اور تم نے یہ سر پر کیوں لا دیا ہے مجھے؟"

محسن نے سر کھجایا "کیوں کا جواب میں کیا دوں۔ بس یہ سمجھ لیں رکیل صاحب کہ یہ ولاور کے خلاف سلطانی گواہ کسی کا تحفہ ہے۔"

"اور اس سے زیادہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں۔ یہ بھی بتا دو تم خاتون کو" میں نے فریج میں کہا "محدود عقل کے گھوڑے کو لامحدود تفکرات کے میدان میں مت دوڑاؤ۔ ورنہ گھوڑا پاگل ہو جائے گا۔"

رابعہ نے مجھے گھور کے دیکھا "بصورت ہے چند اور چلیے سے کا ہونق نظر آنے والا یہ اس فریج وکیل کو بتا دو کہ۔"

محسن نے ہاتھ اٹھا کے کہا "میرا خیال ہے کہ ایسی باتیں بعد میں بھی کی جا سکتی ہیں۔ اس وقت کام کی بات کی جائے۔"

اب میں نے کہا "تم ان حسین نازنین سے کہو کہ ہم خلوت میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ رپورٹ عرض کریں گے جو خاتون سننا چاہتی ہیں۔"

اندر جاتے ہی میں نے رابعہ کے لبوں پر مہر خموشی ثبت کر دی اور ظاہر ہے اس کے بعد وہ کیا کہتی، سوائے مجھے بدتمیز کہنے کے۔

میں نے کہا "میں ایک نظر اپنے چوہدری ولاور صاحب کو دیکھ کے آتا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ ابھی تو محسن دیکھ کے آیا ہے۔"

"بھئی مجھے پردہ اٹھنے سے پہلے ڈرامے کے اسٹیج کا جائزہ بھی لینا ہے۔ ڈائریکشن کی معمولی سی غلطی بھی ہو گئی تو ڈراما فلاپ ہو جائے گا۔ ہمیں ثابت یہ کرنا ہے کہ ولاور کو وہاں جانے قید کر رکھا تھا۔ ہماری وہاں موجودگی کا کوئی سراغ نہیں ملنا چاہیے۔ ولاور چالاک آدمی ہے۔ وہ الزام عائد کرے گا کہ ایم اور ایس پی، سکندر بخت، غالب اور محسن کے خلاف زہر افشانی کرے گا مگر وہ سچ کو سچ ثابت نہیں کر سکے گا اور ہم جھوٹ کو سچ بنا دیں گے۔ یہ کام اتنا آسان بھی نہیں۔ ولاور کو جب پولیس اور پریس کے سامنے بولنے کی آزادی حاصل ہوگی تو وہ کھل کر کرے گا اور یہ معلوم نہیں کیا ثبوت پیش کرے، وہ جس سے بازی پلٹ جائے۔"

"بازی اب نہیں پلٹ سکتی۔ وہ گوہر تنولی کے قتل کے الزام سے اس کو کون بچا سکتا ہے۔" رابعہ بولی "اگر وہ تم پر یا محسن پر اغوا کا الزام لگاتا ہے یا حبس بے جا کا کیس کرتا ہے تو اس کے کہنے سے جرم ثابت نہیں ہوتا۔ غالب اور راہد کی گمشدگی کے معاملے پر تو پہلے ہی اخبارات نے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ سکندر کو ولاور نے ایک چوکیدار کے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ چوکیدار دوبارہ نظر آیا تو پولیس اسے پکڑ لے گی۔ سکندر بخت پہلے ہی غائب تھا۔ اب بھی غائب ہے۔"

"اور نا چیز ہے ایک فریج وکیل۔ علاوہ تمہارا دیوانہ ہونے کے۔"

"صرف دیوانہ کہو خود کو تو کافی ہے" رابعہ بولی۔

"گویا اب مجھے اجازت ہے جانے کی؟" میں نے کہا۔

"میں نے تو اجازت نہیں دی" وہ مسکرائی۔

"یوں مسکرانے کا مطلب تو یہ کیا ہے۔ خیر اب تم ذرا باہر جا کے ان دونوں کی دلجوئی کرو۔ انہیں کچھ حوصلہ اور تسلی دو۔ کچھ خاطر تواضع کر دو ان کی لیکن اس طرح کہ وہ کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ ربو اور تمہارے ہاتھ میں اسی طرح رہنا چاہیے جیسے شہنشاہ اکبر کے ہاتھ میں گلاب کا پھول رہتا تھا۔"

"مثال غلط ہو گئی۔ وہ پھول کو ہتھیار کے طور پر نہیں سمجھے تھے۔"

میں نے کہا "اور کے۔ جیسے گینڈے کے سر پر سینگ۔ اپنے دفاع اور حملے کے لیے ہر وقت تیار۔"

"تم کتنی دیر میں آؤ گے؟"

"جانے سے پہلے میں آنے کا وقت کیسے بتا سکتا ہوں اور واپسی پر پوچھو گی تو میں جاؤں گا ہی نہیں۔"

"اچھا!! میں چلی جاتی ہوں؟" رابعہ ہنسی۔

"!!! پھر یا؟" میں نے سر پر ہاتھ مارا "سکندر ضرور ہو گئی ہے تمہاری بابو کو بارات لانے میں مگر اب اتنا انتظار بھی نہیں ہے کہ اسے بابو سے بابا بنا دیا جائے۔ بابا جی سکندر بخت۔"

محسن نے اندر آ کے کہا "بابا جی، آپ کی تو مت ماری گئی ہے۔ سٹھیا گئے ہیں آپ۔"

میں نے کہا "بڈھے کھوسٹ۔ کیا بک رہا ہے۔"

"میں کیا بک رہا ہوں۔ آپ کی ساری بک بک باہر آتی صاف سنائی دے رہی تھی جیسے بی بی سی کی نشریات۔"

میں نے خفت سے کہا "یعنی بھانڈا پھوٹ گیا ہمارا۔ کہ ہم فریج نہیں ہیں۔ یہ بڑا اچھا نہیں ہوا۔"

"اگر کسی وقت یہ سلطانی گواہوں نے انگلی اٹھا کے کہہ دیا کہ یہ جعلی سکندر بخت ہے جو فریج وکیل بنا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "نہ پرانی صاحب۔ آپ جانتے ہیں کہ سلطان وزیر ہماری مرضی کے خلاف نہیں بول سکتے۔ یہ بات بھی ان کو سمجھائی جا سکتی ہے کہ فریج وکیل کے معاملے میں اپنی زبان بند رکھیں۔"

"وہ تو میں نے سمجھا دیا ہے مگر تجھے بھی احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ اس کا تیرا یہ رول چلتا رہے۔ ابھی بہت سے قانونی اور عدالتی معاملات درپیش ہوں گے۔ یہ راز فاش ہو گیا تو ہمارا سارا کھیل چوپٹ ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "سوری یار۔ میں آئندہ خیال رکھوں گا۔ یہ بتا کہ اخبار والوں سے رابطہ ہوا؟"

"ہاں۔ قاضی سے بات ہو گئی تھی۔ اس نے کہا کہ ویسے تو یہ اپنی اسٹوری بنتی ہے۔ بالکل EXCLUSIVE مگر معاملہ ہے اپنے ہم پیشہ برادر غالب علی کا۔ اس لیے کوریج کا معاملہ بھی برہیجور۔ تم کو خصوصی طور پر شائع کراؤں۔ چوہدری ولاور کی رنگین تصاویر کے ساتھ۔ میں نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ بس کوریج مکمل ہونی چاہیے اور سب اخبارات میں ایک ہی VERSION ہونا چاہیے۔ یہ نہ ہو ایک کچھ لکھے دوسرا کچھ۔ یہ خبر غالب کے اپنے نام سے شائع ہوگی۔"

میں نے کہا "تو نے اخبارات کا کیا وقت دیا ہے؟"

"سہ پہر کے بعد۔ قاضی کو آدھے گھنٹے کا نوٹس چاہیے۔ ہم پولیس ہیڈکوارٹر سے روانہ ہوتے وقت اسے فون کر دیں گے۔ منتظر کو ہٹ سے سید حاجی پولیس ہیڈ آفس پہنچے گا۔ ایک بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ولاور کی بیوی کا فون آیا تھا۔"

"اس نے وقار یوسف کے گھر بھی فون کیا تھا۔"

"پھر بات ہوئی؟"

"میں کیسے بات کر سکتا تھا۔ وہ سکندر کو پوچھ رہی تھی۔ رابعہ کے لیے تنگی نے کہہ دیا کہ کورٹ چلی گئی ہیں۔ وہ رابعہ سے سکندر بخت کا کراچی کا ٹیلی فون نمبر معلوم کرنا چاہتی تھی۔"

"کیا اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔"

"پھر تو نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا کہ کراچی میں اس کا کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ خود ہی فون کرتا رہتا ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہو۔"

میں نے کہا "وقار کے گھر تو اس فلاں فلاں کی غیر منکوحہ بیوی کی اولاد نے بھی فون کیا تھا۔ سالا خلفۃ نا تحقیق۔ ولاور بن کے بات کر رہا تھا۔ رابعہ نے خوب ذلیل کیا۔"

محسن نے تعجب سے کہا "فیصل۔ اس نے ولاور بن کے فون کیا تھا؟ اس کی یہ ہمت؟"

"وہ بڑا حرامی ہے یار۔ ایسی آواز اور لہجے کی نقل اتار رہا تھا اس نے کہ پہلے تو میں بھی چکرا گیا تھا۔"

"پھر پہچانا؟"

"بیچنے سے ناغلطی ہو گئی" میں نے کہا "ولن کی طرح قہقہہ لگایا تو مجھے شک ہوا۔ ویسے بھی ہم اتنی آسانی سے دھوکا کھانے والے نہیں ہیں۔ ہاں کوئی اور ہوتا تو اس کے لیے فرق محسوس کرنا مشکل تھا۔ وہ لونڈا اپنے باپ کا ڈبل رول کر سکتا ہے۔ دوبارہ فون آئے اس کی ماں کا تو کہہ دینا کہ رات کو وقار یوسف کے گھر پہنچ جائے۔ سکندر شاید فون کرے گا۔"

"اس پر اعتبار ہے تمہیں؟"

"وہ کیا کرے گی؟ ان حالات میں؟"

محسن نے کہا "جس عورت کا شوہر تمہاری قید میں ہے اور اس کی حالت بھی بدتر ہو چکی ہے۔ کیا وہ تمہیں گرفتار نہیں کرا سکتی۔"

"ٹیلی فون پر؟"

"یار وہ ہو سیانا عورت ہے۔ ادھر وہ تم سے بات کر رہی ہوگی۔ ادھر وقار یوسف کے فون پر آبزرویشن لگانے والے جان لیں گے کہ تم کہاں سے بول رہے ہو۔ اگر تم کراچی میں ہوتے تب بھی یہ ہو سکتا تھا کہ ایک کال کر کے وہاں کی پولیس کو مطلع کر دیا جاتا اور۔۔۔"

"میں سمجھ گیا مگر ایک تو میں اس سے بھی بات نہیں کروں گا۔ دوسرے یہ بھی ضروری نہیں کہ آج رات ہی بات کرنا ضروری ہو۔ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اسے کل کہیں اور بلایا جا سکتا ہے۔ پرسوں کوئی اور نمبر دیا جا سکتا ہے۔ کہاں کہاں آبزرویشن لگوائے گی وہ۔ میں نے اس کی مدد بھی کی تھی۔"

www.paksociety.com

"یہ توقع مت رکھو کہ وہ تمہاری احسان مند رہے گی تمام عمر... وہ رانا کے چنگل سے بچ نکلی۔ اسے وہ اپنی خوش قسمتی سمجھے گی کہ خدا کو بچانا منظور تھا چنانچہ وہ بے وقوف سکندر آ گیا۔ وہ نہ آتا کوئی اور آ جاتا۔"

میں نے کہا "لیکن اس کا دوسرا مسئلہ بھی ہے شیروانی صاحب۔ کوئی اور نہیں جانتا کہ دلاور کہاں قید ہے۔ ابھی وہ خود بھی نہیں جانتی کہ ہم نے دلاور کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی' محسن نے کہا "شاید پھر اسی کا فون آیا ہو۔"

پہلے خادم حسین نے ریسیور اٹھا کے ہیلو کہا اور پھر میں نے رابعہ کی آواز سنی "غازی۔ کون غازی؟"

میں نے کہا "لاؤ ریسیور مجھے دو۔ یہ غازی وہی ہے گفتار کا غازی۔ جو کردار کا غازی نہیں تھا۔ اتنی جلدی بھول گئیں۔"

"او... وہ بلیک میلر...؟"

میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے کہا "شش... آہستہ۔ وہ سن لے گا۔ ہمیں اس کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔"

دوسری طرف سے غازی نے کہا "ہم نے سن لیا دوست لیکن ہم لفظوں کے تیروں سے گھائل ہونے والے نہیں ہیں۔"

بالفاظ دیگر چکنے گھڑے اور ڈھیٹ ہیں۔ میں نے دل میں کہا۔

"ہم تو بس یاروں کے یار ہیں۔ تم غالب کے یار تو ہمارے بھی یار ہو گئے نہ سہی سوتیلے سہی۔" وہ قہقہہ مار کے بولا۔

میں نے کہا "خیریت ہے نا اس وقت کیسے یاد کیا؟"

"بس یار ہم... بقول شاعر، کفن باندھے ہوئے چلتے کریاں سب یار بیٹھے ہیں۔ رپورٹر بھی اور فوٹوگرافر بھی۔"

میں نے کہا "ابھی تو کچھ دیر ہے شو شروع ہونے میں۔"

"ہاں۔ مگر اس درمیان میں ایک اور شو کے لیے بلاوا آ گیا تو ہم نے سوچا کہ تم سے پوچھ لیں۔ آخر یہ سلسلہ کیا ہے۔ میاں کا ڈراما ایک طرف اور بیوی کا دوسری طرف۔ دونوں میں کوئی کنکشن ضرور ہو گا۔"

میں نے ہنس کے کہا "بیوی کا ڈراما!"

اس نے قہقہہ مارا "یعنی ویسے تو ہر بیوی ہر وقت ڈراما کرتی رہتی ہے مگر میری مراد تھی مسز دلاور کی پریس کانفرنس سے۔"

میں اپنی حیرت پر قابو نہ رکھ سکا "مسز دلاور... اس نے بلائی ہے کوئی پریس کانفرنس؟ کہاں؟"

"ایک بہت بڑے ہوٹل میں۔ ظاہر ہے لنچ بھی زوردار ہو گا اور ہم ایسے ڈراموں کو بہت پسند کرتے ہیں بھائی جہاں پیٹ پوجا کا بندوبست بھی زبردست ہو۔ صرف خبر ہی زبردست نہ ہو۔ ظاہر ہے وہاں ہاؤس فل جائے گا' ہر ایرا غیرا صحافی بھی پہنچے گا اور ہم جیسا بچے خاں صحافی بھی جو بڑا احسان کرتے ہیں اگر کسی ایرے غیرے کا بیان اور تصویر چھاپ دیں۔ تو پھر اور کیا کنکشن ہے ان دونوں ڈراموں میں؟"

میں نے کہا "مجھے معلوم نہیں۔"

"کہیں اسے پہلے سے علم تو نہیں ہو گیا کہ تم لوگ آج کیا کرنے والے ہو؟"

"اگر تم نے ڈھنڈورا پیٹ دیا ہو تو الگ بات ہے ورنہ ابھی تک تو خود پولیس کو بھی معلوم نہیں کہ انہیں آج کیا کارروائی کرنی ہے۔ یقین نہیں تو ایس ایس پی جاوید صدیقی یا ڈی ایس پی آفتاب سے پوچھ لو۔"

"ہم پوچھ چکے ہیں حضرت۔ انہیں واقعی کچھ خبر نہیں۔ نہ دلاور کی نہ مسز دلاور کی۔ پریس کانفرنس کا مقصد ان کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا مگر وہ آئیں گے۔"

"کیا انہیں بھی مدعو کیا گیا ہے؟"

"ہاں' مسز دلاور نے سنسنی خیز انکشافات کی یقین دہانی کرائی ہے۔ وہ خود اسی ہوٹل میں مقیم ہے مگر اس سے رابطہ نہیں ہوا۔ ہوٹل میں زبردست سیکورٹی ہے اور ہوٹل کی انتظامیہ کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں کہ وہ کس کمرے میں مقیم ہے۔ نہ اس سے کوئی مل سکتا ہے نہ فون پر بات کر سکتا ہے۔ عجیب پُراسرار معاملہ ہو گیا ہے۔ کچھ روشنی ڈالو اس پر بھائی۔"

میں نے سب کچھ جانتے ہوئے انجان بن کے کہا "جو خود اندھیرے میں ہو وہ کیا روشنی ڈالے گا کسی پر؟"

"خیر تم ذرا ہوشیار ہو جاؤ۔ یہ عورت تو ایٹم بم سے زیادہ خطرناک ہے۔"

"تم کیسے جانتے ہو؟"

"ارے یار۔ ہر حسین اور خطرناک عورت محبوبہ ہے غازی کی۔ موت بھی تو ایک عشوہ طراز حسینہ سے کم نہیں۔ آتی ہے اور جھلک دکھا کے چلی جاتی ہے اکثر۔ دل اور جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں ہم لوگ۔ تم ذرا بچ کے رہنا۔ شریف آدمی مارے جاتے ہیں بے خبری میں۔"

"تم مجھے شریف آدمی سمجھتے ہو۔ ٹھیک ہے میں خیال رکھوں گا۔ اور سب کو خبردار کر دوں گا۔"

"آؤ گے پریس کانفرنس میں؟"

"میں صحافی نہیں ہوں بھائی۔"

"ہاں چھوڑو۔ کون پوچھے گا وہاں۔ آؤ کھاؤ اور جاؤ۔ ہاں ڈرتے ہو تو اور بات ہے۔"

"ڈرتا بھی ہوں" میں نے کہا "خود نہ آیا تو اپنے کسی نمائندے کو ضرور بھیج دوں گا۔"

ریسیور رکھ کے میں نے محسن کو بتایا کہ غازی نے کیوں فون کیا تھا۔ رابعہ کے لیے بھی یہ اطلاع پریشان کن تھی۔

"کیا کرے گی وہ عورت اخبار والوں سے۔ ہمارے خلاف زہر

اگلے گی؟"

"نہیں اس نے پتا تو نہیں چلا لیا کہ دلاور سے ملنے کے لیے وہ کہاں گئی تھی؟" محسن بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "ناممکن۔"

"ایسا مت کہو۔ دلاور کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔"

"مگر اس کے باوجود وہ زمین سے صرف دس فٹ نیچے قید ہے۔ اس کے ہاتھ آزادی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ میرا خیال ہے کہ مسز دلاور ہمارے خلاف بیان دینے کا رسک نہیں لے گی۔ ہماری احسان مند ہو یا نہ ہو۔ یہ بات اچھی طرح سمجھتی ہے کہ دلاور کی زندگی اور موت کی جنگ وہ ہم سے لڑ کے نہیں جیت سکتی۔ پولیس اس کی کوئی مدد نہیں کر سکی۔ دلاور کے نمک خوار ناکام ہو گئے۔ اس کی حفاظت کرنے والے شکاری کتے اسے نہیں بچا سکے۔ اس کی دولت اور طاقت اس کے کام نہیں آئی۔ وہ وقت رانا کی سازش کا بھانڈا پھوڑے گی۔ یہ بتائے گی کہ اس نے کیسے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دلاور کے پورے خاندان کو نیست و نابود کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔"

"اور کیا کہے گی کہ اس منصوبے کو ناکام بنانے والا کون تھا؟ اگر تمہیں خوش فہمی ہے کہ اس کا کریڈٹ وہ تمہیں دے گی' یہ کہے گی کہ اس بے ضمیر دوست سے وہ باضمیر دشمن سکندر لاکھ درجے بہتر ہے جس نے جان پر کھیل کے اسے موت کے منہ سے بچایا..."

"مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں" میں نے کہا "لیکن عورت جذباتی ہو کے ایسی بات کہہ دے تو ناممکن بھی نہیں۔"

"اس سے ہمارے لیے ہی نہیں خود اس کے لیے مسائل پیدا ہو جائیں گے" محسن بولا۔

میں نے کہا "مسائل کی دلدل میں تو وہ اُتر چکی ہے۔ یہ اس سے نکلنے کی کوشش ہے۔"

"چلو پھر ایسا کرتے ہیں کہ ایس ایس پی جاوید سے مل لیں۔ وقت بھی نکل جائے گا۔" رابعہ گھڑی دیکھ کے بولی۔

"تمہارے انتظامات مکمل ہیں؟"

"ہاں۔ لیکن اب وقت شاید تھوڑا سا آگے کرنا پڑے گا۔ ہم لنچ کے بعد چھاپا مارنے کا بندوبست کریں گے۔"

"غازی سے وہیں کہہ دیں گے لنچ کے بعد" میں نے کہا۔

رابعہ نے چلتے چلتے محسن کو خبردار کیا "تم ان کا معاملہ پکا کر لینا۔ ایسا نہ ہو..."

"ایسا نہیں ہو گا۔" محسن نے اس کی بات کاٹ دی "تم جاؤ۔ مہمان کے ساتھ بعد میں آؤں گا۔ دلاور کی گرفتاری کے بعد۔"

"نہیں۔ ان کا بیان پہلے ہو گا۔ پولیس ہیڈ آفس میں جہاں دلاور سامنے نہیں ہو گا پھر ہم اپنے ساتھ انہیں بھی لے جائیں گے۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا "یار رابعہ شیروانی صاحب۔ ایک زبردست آئیڈیا ہے۔ کیوں نہ مسز دلاور کی پریس کانفرنس کے فوراً بعد یہ دو سلطانی گواہ بھی پیش ہو جائیں۔"

محسن بولا "کیا میں اچھل پڑوں؟"

رابعہ نے سر ہلایا "بات بڑی زبردست کی ہے سکندر نے۔ پولیس ہیڈ آفس کے مقابلے میں وہ جگہ یقیناً بہت بہتر ہے۔ انہیں ڈرامائی انداز میں پولیس اور پریس دونوں کے سامنے پیش کیا جائے تو یہ الزام نہیں آ سکتا کہ جو کچھ انہوں نے کہا وہ جبر کے تحت یا خوف سے کہا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے پولیس کو بھی نہ بتایا جائے؟" محسن بولا۔

"تم کیسی وکیل ہو؟" میں نے کہا "اقبالی بیان کسی مجسٹریٹ کے سامنے دیا جائے تو مستند مانا جاتا ہے۔"

"اور وہ جو سیکڑوں لوگ وہاں ایک ایک لفظ سنیں گے اور گواہ ہوں گے کیا وہ کافی نہیں۔" رابعہ بولی "مجسٹریٹ کے ساتھ بھی پولیس اپنی مرضی کا بیان حاصل کر لیتی ہے مگر پبلک اور پریس کے سامنے دیا ہوا بیان اگر بعد میں بدلا جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ ایسا دباؤ کے تحت کیا گیا ہو گا۔"

"کیا حرج ہے اگر وہاں ایک مجسٹریٹ بھی موجود ہو۔"

"مجسٹریٹ پریس کانفرنس میں نہیں جاتے۔"

"ایس ایس پی جاوید صدیقی مجسٹریٹ کو بھی لا سکتا ہے۔ اگر اسے صرف اتنا بتا دیا جائے کہ وہاں اس کی ضرورت ہو گی۔"

"یہ میں کیسے بتاؤں ایس ایس پی کو۔ پریس کانفرنس تو مسز دلاور کی ہے اور میں نہ اس کی مشیر ہوں نہ ترجمان لیکن ایک صورت ہو سکتی ہے۔ اگر میں اور مظہر اسے یقین دلا دیں کہ وہاں دلاور کو چھپا کر رکھنے والے اور اس کو قانون کی گرفت سے بچانے کے ذمے دار بھی ہوں گے اور اگر انہیں وہیں پکڑ لیا جائے تو یہ چھاپا مارنے والی ٹیم کی پہلی کامیابی ہو گی۔ اس کے بعد وہ ہوٹل سے سیدھے وہاں جا سکتے ہیں جہاں ہماری اطلاع کے مطابق دلاور کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ دلاور کو برآمد کرنے سے پہلے ہی اس کے مددگار مجرم ہاتھ آ جائیں تو پولیس کا کام بہت آسان ہو جائے گا۔ ورنہ دلاور تو مل جائے گا' وہ گرفتار نہیں ہوں گے جن پر قانون کے خلاف مجرم کو پناہ دینے' قانون کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے اور اعانت مجرمانہ جیسے سنگین الزامات ہوں گے۔ خود دلاور بھی نہیں بتائے گا کہ اس نے اتنا عرصہ روپوش رہ کے کیسے گزارا۔"

"چلو تم جیسے چاہو کرو۔ لیکن اب تم جاؤ پولیس ہیڈ آفس۔ وہاں مظہر بھی آئے گا۔ ایس پی جاوید صدیقی کو بتا دو کہ چار بجے پولیس فورس کو الرٹ رکھے۔ ہمارا اشارہ ملتے ہی وہ حرکت میں آ جائیں۔ اس وقت تک ہم مزید تصدیق کر لیں گے کہ دلاور واقعی وہاں موجود ہے اور اسے کسی دوسری جگہ شفٹ نہیں کیا گیا ہے۔"

"کیوں تم نہیں چلو گے میرے ساتھ؟" رابعہ نے کہا۔

www.paksociety.com

"میں جا رہا ہوں دلاور کا خیال رکھیے۔"

"اس میں رسک ہے۔ ایسا نہ ہو آخری وقت میں کسی کو شک ہو جائے۔ سر وہ ہو گا ورنہ۔"

"ایک نظر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ ہم بہت بڑا قدم اٹھانے والے ہیں۔ ناکامی کے ایک فیصد امکان کا خوف بھی نہیں ہونا چاہیے ورنہ یہ سمجھ لو کہ سب کے سامنے سخت بے عزتی ہوگی ان سب کی جو پولیس سے زیادہ مستعد اور فرض شناس بن رہے ہیں۔ تمہاری رنگیل رادری کے لوگ اور صحافی حضرات۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا کوئی اگر خانہ خالی ملا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو تم۔ یہ ناممکن ہے۔ کیسے نکل سکتا ہے دلاور۔"

"ناممکن کچھ نہیں ہوتا اس لیے۔"

"اوکے چلو" رابعہ نے کہا اور خادم کو آواز دی۔

میں نے محسن سے کہا "تم سمجھ گئے نا کہ یہ کام کیسے ہوگا؟"

"میری فکر مت کرو۔ سلطانی گواہ میری جیب میں ہوں گے۔ جب کہو گے نکال کے سامنے پیش کر دوں گا" محسن بولا۔

گاڑی رابعہ کی ہی تھی مگر اس پر نمبر پلیٹ بدلی ہوئی تھی اور اسے چلانے والا میں تھا جبکہ ایک فرنچ رنگیل۔ ابھی میں گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ میلے کچیلے کپڑوں میں ایک دراز قد داڑھی والا مجہول سا شخص ہماری طرف لپکا۔

"بیگم صاحب جی۔ بیگم صاحب جی۔" اس نے رابعہ کو آواز دی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا میلا کپڑا ہلانے لگا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے کہا "پاگل لگتا ہے مجھے تو۔"

"ایسے ہی غریب لاوارث ہے کوئی۔ نشہ کرتا ہے اور یہاں پڑا رہتا ہے۔ بلا وجہ گاڑیوں پر کپڑا مار کے مٹی دھول صاف کرتا ہے اور چار آنے آنے جو مل سکے لے لیتا ہے۔ ایک طرح سے حفاظت بھی کرتا ہے ان گاڑیوں کی جن کے مالکوں کو پہچانتا ہے اور جن سے کچھ ملنے کی امید ہو۔"

وہ شخص ہانپتا ہوا قریب آ کے رک گیا "بیگم صاحب جی۔۔۔"

"کیا بات ہے؟ آج تو گاڑی بھی صاف نہیں کی تم نے" رابعہ بولی "جیسے لنگے زنگ کیا کرتے ہو جیسے کہ تم زہر بی پی کے مر جاؤ گے کسی دن۔"

وہ دانت نکالنے لگا "کدھر بیگم صاحب جی۔ مرتے بھی تو نہیں ہم جیسے بے غیرت۔ یہ گاڑی آپ کی ہے نا جی۔" اس نے رازداری سے پوچھا۔

"اور کس کی ہے۔ تم ہوش میں نہیں ہو کیا؟"

"ہوش میں ہوں بیگم صاحب جی اسی لیے تو پوچھا ہے۔ یہ نمبر آپ کی گاڑی کا ہرگز نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں۔"

"ارے۔۔۔ خیر گاڑی میری ہی ہے۔ میں کسی اور کی گاڑی چوری کر کے نہیں لے جا رہی ہوں" رابعہ نے کہا۔

"یہ مطلب نہیں تھا جی ہمارا۔ نمبر تو ہم نے بعد میں دیکھا تھا۔۔۔ ہم تو آپ کی گاڑی کو ایسے پہچانتے ہیں بیگم صاحب جی جیسے آپ کو۔۔۔ یہ آپ کی گاڑی پر سامنے انگریزی میں لکھا ہے کسی کا زاز دیبی ہوئی ہے۔۔۔ اور سامنے بمپر کے اوپر ڈینٹ ہے ایک لائٹ جنیوئن ہے۔ سو زاکرام ہو سکی ہے۔"

"اچھا جلدی بتاؤ جو بھی بتانا ہے" رابعہ نے گھڑی دیکھی۔ اس کی نظر بینک کے سڑک کی طرف چلی گئی "وہ جی۔۔۔ ابھی دو مشٹنڈے آپ کی گاڑی میں کچھ گڑبڑ کر رہے تھے۔"

رابعہ چونکی "کیا کر رہے تھے؟"

"ہمیں کیا معلوم جی۔ ہم نے دور سے دیکھا تھا۔"

"کون لوگ تھے وہ؟" رابعہ ڈر گئی۔

"بدمعاش لگتے تھے جی۔ ہمارے آنے تک وہ بھاگ گئے ایک سفید رنگ کی گاڑی میں بہت دیر سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کیوں بیٹھے ہیں۔ ہم سے سگریٹ بھی منگوائی تھی انہوں نے اور پانچ کا نوٹ دے کر بولا تھا کہ باقی رکھ لینا۔ اب ہم سمجھے کہ وہ ہم کو ادھر سے دور رکھنا چاہتے تھے۔"

"تم نے کیسے اندازہ کیا کہ وہ گڑبڑ کر رہے ہیں؟"

"بیگم صاحب جی۔ پیچھے سے گاڑی کھول کے اندر جھانک رہے تھے پھر ایک دم بند کر کے گاڑی میں بیٹھے اور چلے گئے۔ ہم دوڑے ان کے پیچھے ان کو آواز بھی دی کہ سگریٹ لے جاؤ۔" اس نے جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ اور ساڑھے تین روپے کی رقم دکھائی "آپ انجن دیکھ لیں۔"

رابعہ نے میری طرف دیکھا اور تشویش میں پڑ گئی پھر اس نے بیگ سے دس روپے کا نوٹ نکال کے اسے دیا۔ "یہ لو تمہارا انعام۔"

"اللہ خوش رکھے جی آپ کو۔ جوڑی سلامت رہے۔ بچے جئیں آپ کے" اس نے دلی دعائیں دینا شروع کر دیں۔

"چلو اب زیادہ مت بولو" رابعہ نے اسے ڈانٹا "جاؤ۔"

میں نے کہا "دس روپے میں اتنی دعائیں دے گیا۔ پھر بھی زمانہ کہتا ہے۔"

"سکندر۔ یہ کیا کہہ رہا تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں وہ گاڑی میں ٹائم بم تو نہیں لگا گئے ہیں؟"

میں نے آگے بونٹ کھول کے دیکھا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ پیچھے انجن پر غور کرنے سے مجھے ایک اضافی تار کی موجودگی کا احساس ہوا جو کوائل اور کنڈنسر کے درمیان لگا ہوا تھا۔ باقی تار پرانے تھے اور میلے نظر آتے تھے۔ ان پر مٹی اور تیل کی چکنائی تھی۔ یہ تار نیا تھا اور چمک رہا تھا۔ میں نے احتیاط سے اس کو کھینچا مگر جس چیز سے بھی یہ تار منسلک تھا وہ بھاری تھی۔

رابعہ نے پھر کہا "سکندر تم بم ہوا تو؟"

"اگر ہمارا اتنا کام پورا نہیں ہوا ہے تو انجن میں بھی دھماکہ نہیں ہوگا۔ ذرا مجھے اپنی تفتیش مکمل کرنے دو۔ کچھ دال میں کالا ضرور ہے مگر ذرا سا نہیں۔ ٹائم بم کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ ٹک ٹک جو ٹائم بم کا ثبوت ہوتا ہے۔ غالباً دوسرے قسم کا بم فٹ کیا گیا ہے اس میں۔ الیکٹرک شارٹ سرکٹ سے پھٹنے والا۔"

رابعہ کی آواز کانپ گئی "پھر تم کیوں چھیڑ خانی کر رہے ہو اس سے؟"

میں نے اسے گھورا "کیوں الزام لگا رہی ہو مجھ پر ایسا۔ میں نے کب چھیڑ خانی کی ہے تم سے سڑک پر۔"

اس نے مجھے کھینچ لیا "مت چھیڑو تاروں کو۔"

"پھر کسے چھیڑوں؟" میں نے مسکرا کے کہا "اور کوئی تو ہے نہیں یہاں۔ یہ لو صدقہ بنا آج کا لے بکرے کا۔ اللہ نے تمہیں اور تمہارے سہاگ کو بچا لیا۔" میں نے تار کو الگ کر لیا۔

رابعہ نے تار کے ٹکڑے کو بھی ڈرتے ڈرتے پکڑا "یہ سب کیا ہے؟"

"تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟" میں نے ہنس کے کہا "بم کو ناکارہ بنا دیا ہے میں نے تار الگ کر کے۔"

"کہاں ہے بم؟"

"اٹھا دینا نہیں ہے کہ تمہیں نکال کے دکھاؤں چلو بیٹھو۔"

اس نے صاف انکار کر دیا "نہیں۔ اس گاڑی کو یہیں چھوڑ دو۔"

"بیگم اب تم اس میں کبھی نہیں بیٹھو گی۔ کیا خیال ہے کسی نیوز مین کو دے دوں تمہاری طرف سے؟"

"جب تک یہ بم نکالا نہیں جائے گا۔"

"بے وقوف لڑکی۔ بم خود بخود نہیں پھٹتا۔ اس کا فیوز ناکارہ کر دیا ہے میں نے۔ تار نکال دیے ہیں۔ اگر میں انجن اسٹارٹ کروں تو بھی۔"

"میں یہ سب نہیں سمجھتی۔ ابھی میں نہیں بیٹھوں گی اس گاڑی میں اور نہ تمہیں بیٹھنے دوں گی۔ میں پولیس کو رپورٹ کروں گی۔ بم ڈسپوزل والے خود آ کے اسے نکالیں گے اور مجھے کلیرنس دیں گے کہ اب کوئی خطرہ نہیں پھر وہ بھی جانے دیں گی۔"

"تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟"

"کیسا اعتماد؟ کیا تم الیکٹریشن ہو یا کسی اسلحے کے ماہر ہو؟ تم سائنٹسٹ ہو یا بم ڈسپوزل کی ٹریننگ لی ہے؟" وہ بگڑ گئی۔

"اچھا بیگم صاحب جی" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "اب یہ بتاؤ کہ پیدل چلنا ہے یا دو ٹانگوں پر؟"

"دو نہیں دو ہی سا ایک تانگا کافی رہے گا ہمیں۔"

"یہاں قریب ایک بند روم کافی رہتا ہے میاں بیوی کو۔"

رابعہ نے قہقہے اور مسکراہٹ کو دباتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

"یہ خادم کدھر گیا۔ ابھی تو ہمارے ساتھ ہی تھا۔"

"ارے اف۔ مجھے بھی خیال نہیں رہا۔ کہیں اندر تو نہیں دبکا ہوا ہے" میں نے اندر جھانکا "مولوی خادم حسین!"

نہ جانے کہاں سے آواز آئی "جی۔۔۔ میں یہاں ہوں جی۔ بڑی محفوظ جگہ پر۔ کیا بم پھٹ گیا؟"

مجھے غصے کے ساتھ ہنسی بھی آئی "ہاں پھٹ گیا۔ میں عالم بالا سے پکار رہا ہوں تمہیں۔ احمق آدمی باہر نکلو۔"

وہ ایک دم گاڑی کے نیچے سے نکل آیا۔ خوف سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ زمین پر لیٹنے سے اس کے کپڑے بھی خراب ہوئے تھے اور بال بھی۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور ہاتھوں میں رعشہ تھا۔

"حد ہو گئی مولوی خادم حسین۔ اتنا ڈرتے ہو تم؟"

"آپ بھی عجیب۔۔۔ بات کرتے ہیں جی۔ بھلا بم سے کون نہیں ڈرتا۔ بم کیا لحاظ کرتا ہے کسی شریف آدمی کا۔ ہم تو فوراً لیٹ گئے تھے بم کا نام سنتے ہی۔ جل تو جلال تو کا وظیفہ کر رہے تھے اور کلمہ پڑھ رہے تھے۔"

رابعہ نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا "اور۔۔۔ اور کچھ بھی کر رہے تھے تم مولوی خادم حسین یہ دیکھو۔"

اب میں نے رابعہ کی ہنسی اور خادم حسین کی حالت پر غور کیا تو مجھے بھی ایک دم ہنسی آ گئی۔ خادم حسین اٹھ کر بھاگا۔ اس کی پتلون گھٹنوں سے نیچے گیلی نظر آ رہی تھی۔ وہ کپڑے بدلنے گیا تھا مگر اوپر گیلری میں نمودار ہو کے اس نے کہا "آپ چلیں جی۔ میں نماز کا سبب تھا پولیس آفس سے۔"

"ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟" رابعہ نے پیچھے سے کہا۔

"وہ۔۔۔ ذرا مجھے غسل بھی کرنا ہوگا" اس نے جھینپ کے کہا اور غائب ہو گیا۔

رابعہ نے گاڑی کو مقفل کر دیا اور ہم ٹیکسی کے انتظار میں فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کے آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھنے لگے۔

وہ مجہول شخص پھر نمودار ہوا جس نے ہمیں بروقت ایک ایسی بات بتائی تھی جو خود ہمیں دوسری دنیا میں پہنچ کے ہی معلوم ہوتی۔ اس نے ہماری جان بچائی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو میں اسے ہزار روپے انعام کے دیتا اور پھر بھی سمجھتا کہ میں نے اسے کچھ نہیں دیا مگر اس شخص کو سو روپے دینے کا مطلب بھی یہ ہوتا کہ اسے زیادہ نشہ کر کے جلدی مرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔

"بیگم صاحب جی۔ وہ گاڑی ابھی گزری تھی۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"اور وہ دونوں بھی بیٹھے ہوئے تھے اس میں؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی۔ دو بار چکر لگا گئے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پھر آئیں گے" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "تم نے میری گاڑی کے نمبر کا فرق تو دیکھ لیا تھا

www.paksociety.com

اس گاڑی کا نمبر نہیں دیکھا تھا۔"

"نہیں بیگم صاحب جی مگر گھبرا ہی کیا، انہوں نے تو میں دیکھ لوں گا آپ فکر مت کریں۔ میری نظر بالکل ٹھیک ہے۔ میں کھڑا ہوں یہاں پر یہ دیکھنے کے لیے، آپ جائیے۔"

لیکن ہم جاتے تو کیسے جاتے۔ کوئی ٹیکسی خالی نہیں آ رہی تھی اور ادھر مس رابعہ کو مجھ پر اعتبار ہونے کے باوجود مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔ اس کا کیا بھروسا۔ بغیر وجہ کے بہت جائے۔ وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھا رہنے کی۔ مجھے بہت کوفت اور جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔

"ہم نہ ادھر کے رہیں گے اور نہ ادھر کے۔ نہ وارادر کو دیکھنے کے لیے ٹائم ملے گا اور نہ وقت پر پولیس ہیڈ آفس پہنچ پائیں گے۔ تم ایسا کرو، مجھے یہ گاڑی لے جانے دو۔ تم ٹیکسی میں خادم حسین کے ساتھ سیدھی پولیس آفس پہنچ جاؤ۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں تم کو اس گاڑی کی چابی دوں۔ میرا تو خیال ہے کہ وارادر پر لعنت بھیجو۔ وہ اسی تھانے میں پڑا ہوگا۔ ہم چلتے ہیں ٹیکسی لے کر پولیس ہیڈ آفس۔ وارادر کہیں نہیں جا سکتا۔"

خادم حسین نہا دھو کے اور لباس بدل کے آیا تو شرمندگی سے بڑھا ہوا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے رابعہ کی گاڑی کو دیکھا اور اس نشے باز کو پھر ہمارے قریب پا کے چونکا۔

"صورت سے یہ آدمی مشکوک لگتا ہے جی مجھے" اس نے میرے کانوں میں کہا۔

"یہی بات اس نے تمہارے بارے میں کہی ہے ابھی ابھی" میں نے جھلا کے کہا۔

"میری صورت کیا ایسی ہے؟"

"جا کے آئینہ دیکھو۔ معلوم ہو جائے گا کیسی ہے؟"

میری نگاہیں ٹیکسی کی تلاش میں سرگرداں تھیں اور میں ایک طرف رابعہ کی ضد سے عاجز تھا تو دوسری طرف خادم حسین کی باتوں سے۔ اچانک میری نظروں کے سامنے ایک گاڑی بُری طرح لہرائی پھر اس کا ایک آگے والا پہیہ الگ ہو گیا اور پہیہ تین کا ساتھ چھوڑ کے دائیں طرف روانہ ہو گیا۔ ظاہر ہے گاڑی تین پہیوں پر نہیں چل سکتی تھی لیکن اپنی رفتار کے باعث گاڑی اوندھے منہ سڑک پر گرنے کے بعد بھی گھسٹ گئی۔ اسٹیئرنگ پر کنٹرول نہ رہنے سے بائیں طرف گئی اور سڑک کے کنارے پارک گاڑیوں میں گھس گئی۔ اس کا ساتھ چھوڑ دینے والا پہیہ سڑک کے وسط میں دو کاروں کے تصادم کا سبب بنا۔ ان میں سے ایک پولیس کی گاڑی تھی۔

مجہول نشے باز نے نعرہ لگایا "یہ۔۔۔ یہ تو وہی گاڑی ہے۔ رامہ مزہ آباد۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔"

میں نے چونک کے کہا "کیا۔ یہ وہی گاڑی ہے۔ تمہیں یقین ہے، تم اچھی طرح دیکھو۔"

"میں تو ان دونوں کو بھی صاف دیکھ رہا ہوں جی۔ یہ بیٹھے ہیں شاید" وہ بہت خوش تھا "دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والا خود گرتا ہے اس میں۔ اچھی سزا دی ہے خدا نے۔"

میں نے کہا "تم دیکھو بابا۔ یہ مرے نہیں ہوں گے۔ زخمی ہوں گے۔ جن کی گاڑیوں کا نقصان ہوا ہے وہ بھی ان کو آسانی سے معاف نہیں کریں گے اور پیچھے آ رہی تھی پولیس کی گاڑی، وہ ان سے نمٹ لیں گے۔ اب تم ایک کام کرو۔ ذرا قریب جا کے دیکھو، بہت سے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ تمہیں صرف یہ پتا کرنا ہے کہ پولیس انہیں کس اسپتال میں علاج کے لیے لے جاتی ہے۔"

"میں تو سب بتا دوں گا پولیس کو بھی۔"

"خبردار۔ کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ بلاوجہ ہم کسی جھگڑے میں کیوں پڑیں۔"

وہ حیران نظر آنے لگا "آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوا؟ آخر وہ کر رہے تھے وہ انجن میں۔"

میں نے کہا "ایک پرزہ نکالنے کی کوشش کی تھی مگر نکال نہیں سکے۔"

"انجن کا پرزہ؟" اس نے سر کھجایا۔

"ہاں۔ ایک تار لے گئے۔"

"کون سا؟ وہ ڈسٹری بیوٹر کیپ کا۔ درمیان والا؟"

میں بھونچکا رہ گیا "تم۔۔۔"

"میں پہلے موٹر مکینک تھا جی؟" وہ نظر جھکا کے بولا۔

مجھے اس کی حالت پر افسوس ہوا "خیر اب تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔ خاموشی سے ضروری معلومات حاصل کر کے واپس آ جاؤ۔ ہم تم سے شام کو ملیں گے تو پوچھ لیں گے۔"

"کیا پھر اسپتال جائیں گے آپ؟"

"ہاں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر ایک معمولی سی چیز چرانے کی کوشش کیوں کی تھی انہوں نے۔ تو وہ خود بھی بچتے تھے اور پھر ایسی جگہ جہاں ان کے پکڑے جانے کا امکان بہت زیادہ تھا اور اس دوران بھی۔"

اس نے خوش ہو کے مجھے سلام کیا اور پھر دعائیں دینے لگا تھا کہ رابعہ نے اسے گھورا اور وہ بھاگ گیا۔

"جانے بوجھ کے بدمعاشی کر رہا ہے۔ ابھی ٹھیک جاتا ہے"

"مگر تمہاری شادی نہیں ہوئی" میں نے کہا "خانہ آبادی کی دعا ہی دے رہا ہے نا۔ شاید میری تمہاری جوڑی اچھی لگی ہو اسے۔"

"جوڑی تو ماشاء اللہ چاند سورج کی ہے۔" مولوی خادم حسین نے پیچھے سے عرض کی۔

رابعہ نے غرا کے کہا "تم سے پوچھا ہے کسی نے؟"

خادم حسین نے لپک کے ایک ٹیکسی کو روک لیا اور رابعہ کی رائے کے بغیر آگے بیٹھ کے اس نے ہمیں آواز دی "آ جائیں سر۔"

ٹیکسی ڈرائیور پوچھنے لگا "چلے گی یا نہیں؟"

"یہ سلور جوبلی کرسی کی اور گولڈن جوبلی" میں نے کہا۔

رابعہ کا چہرہ گلابی ہوا۔ وہ مسکرا کے باہر دیکھنے لگی۔

منظر ہم سے پہلے پولیس ہیڈ آفس میں موجود تھا اور نہ جانے کہاں پر گلا پھاڑ کے ہنس رہا تھا۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی خود اس کی تعظیم تو خدا کو انہی کے زمرے سے حلال رکھ کے حیران تھا۔

"آپ لوگ اتفاق سے نہیں آئے" وہ بولا۔

میں نے خادم کی معرفت جواب دیا "اتفاق سے تو تم بھی وجود میں نہیں آئے ایس ایس پی۔ اگر تمہاری والدہ نے بار والدے وقت نکاح انکار کر دیا ہوتا۔ باقی سب مولوی کو جنس بدل جاتی۔"

خادم حسین نے اس کا ترجمہ کیا "تمہارا تو پہلے سے طے تھا" گر اس کے اندر سے زلزلہ سا آوازوں کا شور اسی طرح سنائی دے رہا تھا جیسے بند کیتلی میں سے پانی اُبلنے کی آواز بھاپ کے ساتھ نکلتی ہے۔

منظر نے کہا "تو ایس پی صاحب۔ اس بھوتنی والے کی بات کر رہا تھا میں۔ بڑے عیاش ہوتے ہیں قرۃ حسینی۔ دیکھ لیں اس کے اعمال کی جھنکار صورت پر برس رہی ہے۔ ہر وقت شراب کے نشے میں دھت رہتا ہے اور مس رابعہ نہ ہوتیں تو میں بتاتا اس کی عیاشی کے قصے۔"

"یہ جھوٹ ہے منظر صاحب!" مولوی خادم حسین سے برداشت نہ ہو سکا۔

"یہ۔۔۔ ان کو دیکھو۔ مولوی خادم حسین تم نے تو اپنی عاقبت برباد کر لی اس بھوتنی والے کی غلامی کر کے۔ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ تم بھی وسکی تو لگانے ہو گے ولایتی شراب کی۔"

خادم حسین گرم ہو گیا "منظر صاحب! آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔"

منظر پھر ہو ہو کر کے ہنسنے لگا "سچ کہو گا مولوی خادم حسین، کرتے ہم تو تمہاری چال دیکھ کے ہی تاڑ گئے تھے اس دن۔ جس دن تم دُم کی طرح لگے اس کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ وہ جو منافقی کرتے ہیں نا رابعہ تمہارے آفس میں کیا نام ہے اس کا؟"

"منظر صاحب میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اور مولوی بار بار کہہ رہا تھا۔ میری شکل اگر ٹھیک۔ اس میں اپنے حسن و شباب کی دولت مشترکہ ڈال دو" منظر نے قہقہہ مارا۔

جاوید صدیقی کے ساتھ رابعہ بھی ہنسنے پر مجبور تھی۔ مشکل سے ہنسی تھی اور مجھے ہنسی ضبط کرنے کے لیے منظر کو روکنا بھی ضروری تھا مگر میں فریق وکیل تھا اور یہ ظاہر کرنے پر مجبور تھا کہ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ میں تو سب کو دیکھ کے ہنس رہا ہوں۔ منظر نے بیک وقت مجھے اور خادم حسین کو مذاق کا نشانہ بنایا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے گرم ہو کے کہا "پوچھے بغیر بیٹھ گئے ہو؟"

"کیا مطلب ہے اس فضول بات کا؟ آخر یہ ٹیکسی ہے، تمہاری پرائیویٹ کار نہیں ہے کہ تم سے اجازت لیں ہم۔"

"ٹیکسی تمہارے باپ کی نہیں ہے۔"

"ٹیکسی تمہارے باپ کی بھی نہیں ہے۔ ٹیکسی کا مالک ہوتا ہے وہ مسافر جو اس میں بیٹھ جاتا ہے۔ وہ تمہیں اپنی مرضی سے کہیں بھی لے جا سکتا ہے۔ تم کو اپنی مرضی سے پھرنا ہے تو کار خرید لو۔ گھر اور دکان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ گھر میں کوئی بغیر اجازت کے نہیں آ سکتا۔ دکان میں کوئی کسی کو داخل ہونے سے نہیں روک سکتا، کیا سمجھے؟"

"زیادہ قانون مت جھاڑو مجھے۔ زنانہ سواری ہے اس لیے لحاظ کر رہا ہوں ورنہ اٹھا کے باہر پھینک دیتا۔ کدھر جانا ہے؟" ڈرائیور نے کہا۔

میں نے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کے کہا "پولیس ہیڈ آفس۔"

ٹیکسی ڈرائیور کی بولتی بند ہو گئی۔ خادم حسین نے اسے فاتحانہ اور طنزیہ نظروں سے دیکھا "وکیل صاحب بڑے بھائی ہیں ایس ایس پی جاوید صدیقی کے۔"

ڈرائیور پریشان ہو گیا "سوری۔ غلطی معاف۔ آپ نے شکایت کی تو نوکری چھڑا دیں گی مجھے۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاہم خادم حسین نے اسے معاف کر دیا مگر خاصی نصیحت فرمانے کے بعد۔

میں نے رابعہ سے کہا "یہ نشے باز سابق موٹر مکینک کیا نام ہے اس کا؟"

"اصل نام تو میں نے کبھی پوچھا نہیں۔ استاد بادل کے نام سے مشہور تھا پہلے۔ اس کی اپنی ورکشاپ تھی۔ بیوی بچے تھے، سب کو نشے کی لت پر قربان کر دیا۔"

"بادل کیا نام ہوا۔۔۔ ایک فلم ضرور آئی تھی اس نام کی بہت پہلے اور اس کا ایک گانا بھی بہت چلا تھا۔ میں راہی بھٹکنے والا ہوں، کوئی کیا جانے متوالا ہوں۔"

رابعہ نے کہا "تم تو بڑے قالم ہو۔ علم سے عالم تو قلم سے ظالم۔ مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ یہ گانا اکثر گاتا رہتا ہے۔"

"بادل ڈاکو کا رول غالباً پریم ناتھ نے کیا تھا۔ خود میں بہت متاثر ہوا تھا اس کردار سے اور محسن نے تو اپنا نام ہی متوالا رکھ لیا تھا۔ محسن متوالا۔ کبھی کبھی حماقتیں کرتے تھے ہم۔"

"یعنی اب نہیں کرتے؟" رابعہ ہنسی۔

"مگر تم محبت کو حماقت کہتی ہو تو ٹھیک ہے" میں نے فخر کر کے کہا "یہ ایک حماقت نہیں، لاتعداد لامحدود حماقتوں کا نام ہے جو ہم کرتے جایا کریں گے اور ہم سے پہلے۔"

خادم حسین نے کہا "لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا سب نے کی۔ ایک دن آپ کی بھی فلم بنے گی جی۔ رابعہ سکندر۔"

www.paksociety.com

تھا لیکن احتجاج کرنے والا صرف خادم حسین تھا اور منظر جیسے شخص کے سامنے احتجاج کرنا ایسا ہی تھا جیسے بھینس کے آگے بین بجانا۔

خادم اُٹھا ہی تھا کہ منظر نے اسے پکڑ لیا۔ "تم کو آتا ہے پیار پر غصہ۔ ہم کو غصے پر پیار آتا ہے۔ مدتوں کے کہاں جا رہے ہو میری جان۔ ابھی تو بہت کچھ کہنا ہے تجھے۔"

رابعہ نے سنجیدگی سے کہا "منظر صاحب کیا آپ نے وہ بات کہلی ہے جس کے لیے ہم سب آئے تھے۔"

صدیقی نے سمجھایا۔ "جی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج آپ لوگ چوہدری دلاور کو سرکاری مہمان بنانے کی درخواست لے کر آئے ہیں۔"

"آپ حاکم ہیں حضور، ہمارا حکم تو دے نہیں سکتی" منظر بولا۔

صدیقی نے کہا "سوری۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ خادم تو ہم ہیں سب کے۔ خدمت بھی کرتے ہیں مرتے بھی ہیں اور سب کی سنتے بھی ہیں۔"

"بجا ارشاد۔ تمام نیکیاں پولیس والوں کے نامۂ اعمال میں لکھی جا چکی ہیں۔ ماشاء اللہ بڑا جنتی محکمہ ہے۔" منظر بولا "اب یہ فرمایئے کہ آپ کچھ کریں گے باتوں کے علاوہ۔"

"کیوں نہیں بھئی۔ ہم آپ کی خاطر تواضع کریں گے۔ اور اس کے بعد آپ کے ساتھ چلیں گے وہاں۔" اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا اور اندر آنے والے کو چائے لانے کا حکم دیا "ایسا کھیل میں نے پہلے نہیں دیکھا کہ ایک طرف شوہر نہایت ڈرامائی انداز میں گرفتار ہونے والا ہو اور دوسری طرف اس کی بیوی نے پریس کانفرنس طلب کرلی ہو۔ آخر یہ چکر کیا ہے؟"

"چکر ہی چکر ہیں دنیا میں ہر طرف ایس ایس پی صاحب" منظر بولا۔

"کیا مسٹر دلاور کو پہلے سے معلوم ہو گیا ہے؟"

"ابھی تو خود ہم بھی نہیں جانتے کہ دلاور کہاں ملے گا۔ جب ہمارے پاس اطلاع آئے گی تو ہم آپ کو بتائیں گے۔"

صدیقی نے نفی میں سر ہلایا "میں نہیں مانتا۔ یہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔ آپ لوگ ویسے تو وکیل ہیں اور صحافی ہیں مگر آپ سب کی سرگرمیاں اتنی پُراسرار ہیں۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ۔ یہ میرا امپریشن ہے۔ جو کام پولیس اپنے تمام وسائل، تربیت اور تجربے کے ساتھ نہیں کر سکی وہ آپ نے کیسے کیا؟"

منظر بولا "کہا ہے کسی شاعر نے کہ وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا۔ کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔"

"شعر اچھا ہے مگر...."

"مگر اس میں تو پولیس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ انسان کے لیے کہا گیا ہے" منظر نے اس کی بات کاٹ کے قہقہہ مارا۔

صدیقی نے بُرا سا منہ بنایا "آپ لوگ تو جاسوسی کر رہے ہیں۔ پرائیویٹ ڈی ٹیکٹو کا جو تصور انگلش فلموں اور ناولوں میں ہے کچھ ایسا ہی کردار ادا کیا ہے آپ سب نے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کیونکہ پاکستان میں کبھی پہلے وکیلوں اور صحافیوں نے مل کے نہ کسی مجرم کا سراغ لگایا اور نہ اسے پکڑوایا۔"

"بس جی آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ اس سے زیادہ بھی کریں گے ہم اگر ضرورت پڑی۔ اور کسی نے کچھ نہ کیا تو" منظر نے کہا۔

صدیقی بولا "آپ لوگ واقعی کچھ نہیں جانتے کہ دلاور کی بیوی نے یہ پریس کانفرنس کا ڈراما کیوں رچایا ہے اور وہ اتنی سخت سیکیورٹی میں کیوں ہے۔ میں نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر ان کے کسی سیکریٹری نے مجھے بھی ٹرخا دیا کہ میڈم اس وقت تو کہیں گئی ہیں۔ جب آئیں گی تو میں آپ کا پیغام دے دوں گی۔ خیر معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ آپ لوگ چائے پئیں۔"

"اور آپ اپنی فورس تیار کریں" رابعہ بولی۔

"میری فورس میری کمانڈ میں ہے میڈم۔ ابھی تو خود آپ کے پاس کوئی انفارمیشن نہیں ہے۔ یا ہے تو آپ لوگ مجھے بھی اعتماد کے قابل نہیں سمجھتے اور قبل از وقت بتانا نہیں چاہتے۔"

"پولیس کے ساتھ کا تجربہ زیادہ خوش گوار نہیں ہے ایس پی صاحب۔ اندر کی بات باہر نہ پہنچے تو چھاپہ ناکام نہ ہو۔ مسٹر اتنی آسانی سے فرار نہ ہوں اور.... خیر چھوڑیئے یہ لمبی اور متنازع بات ہے۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ ایک ایمرجنسی کال پر آپ کو فوراً پہنچنا ہے اور معاملہ ہے زندگی یا موت کا۔ اب دیکھنا ہے آپ کی مستعدی اور کارکردگی کو" منظر نے سنجیدہ ہو کے کہا "ہم تو صرف مدد کر رہے ہیں آپ کی۔"

ہمارے چائے پی کر فارغ ہونے تک ایک بج گیا تھا اور خصوصی تفتیشی ٹیم کے دیگر ارکان کا ابھی تک کہیں پتا نہ تھا۔ جاوید صدیقی سب کو مطمئن کرنے کی کوشش میں لگا رہا کہ وہ بھی بعد میں پہنچ جائیں گے۔ ابھی تو مسٹر دلاور کا شو ہے اور اگر دلاور کی گرفتاری کا وقت چار بجے ہی ہوا تو اگلے تین گھنٹوں میں صرف پولیس ہی نہیں بری، بحری اور فضائی افواج کو بھی طلب کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اسے اپنے خصوصی اختیارات کے معاملے میں خاصی غرور آمیز خوش فہمی تھی مگر وہ ڈرتا بھی تھا کہ وکیل صحافی اتحاد اس کے خلاف قائم ہو گیا تو اس کا انجام بھی اپنے پیشرو سے مختلف نہیں ہوگا۔ وہ ایک نالائق، نااہل اور کرپٹ افسر کی معطلی اور گرفتاری کے بعد یہ ثابت کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا کہ پولیس کا سارا محکمہ کالی بھیڑوں سے بھرا ہوا نہیں ہے۔ جاوید صدیقی کو محکمے سے زیادہ ذاتی کنٹرول بنانے کی فکر تھی جس پر اس کے مستقبل کا دار و مدار تھا۔ محکمے کا کیا ہے۔ بقول شاعر، یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور....

انٹرکام کا بزر بجتے ہی ایس ایس پی نے فون اُٹھایا "ہاں کیا بات ہے۔ اچھا، ٹھیک ہے۔ کال یہاں دے دو۔"

"؟؟"

"جواب صرف پولیس دے سکتی ہے کہ ہم نے تلاش کیا۔ ہے انہیں پکڑا اور پھر رات بھر تفتیش کے شکنجے میں رکھ کے ان سے جو کچھ اگلوایا وہ آپ بقلم خود لکھتے۔ صرف وہی اختیار رہتے ہیں ریکارڈ ہو جانے کا۔ ہم کسی کو پولیس یا پبلک کے سامنے ملزم بنا کے پیش نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی ملزم ہے تو ہمارا کام ہے اسے پولیس کے حوالے کرنا۔"

"پھر اب کیا ہوگا۔ میں تو حیران ہوں مسٹر اچکن کہ ایسی باتیں ان قانون داں خاتون کی کھوپڑی میں کیوں نہیں آئیں۔ ہم پہلے سے انتظام کر لیتے" میں نے کہا۔

"ابھی تین گھنٹے ہیں۔ میں نے نازی سے مشورہ کیا تھا۔ اس کا کوئی نیا سالا ہے۔ ہونے والا سالا۔ نازی کا اصول ہے کہ کسی منگیتر کو سال بھر سے زیادہ ہونے والی بیوی کی پوسٹ پر نہیں رکھتا۔ ظاہر ہے ہونے والے سب سالے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ یہ نیا سالا نیا پولیس افسر بھی ہے اور اضافی خوبی یہ ہے کہ بے وقوف بھی ہے۔ رو آیا ہے اس مسئلے کو بطریق احسن حل کرنے کے لیے۔"

"وہ حسن طریقہ کیا ہے اچکن صاحب؟"

"تھانیدار وہ ان کے خلاف اپنے تھانے میں کوئی رپورٹ لکھے گا اور ان کی گرفتاری بھی ظاہر کرے گا۔ وقار یوسف ان سے وکالت نامے پر دستخط کروا لے گا اور ان کے وعدہ معاف گواہ بن جانے کے بعد وکیل صفائی کے طور پر ان کا کیس لڑے گا مگر یہ تو بعد کی بات ہے۔ ابھی وکیل صفائی کے کہنے پر ہی نازی کا نوکر وہ بے وقوف نیا سالا اور نیا تھانیدار ان لڑکوں کو پولیس اور پبلک کے سامنے لائے گا کہ یہ شریف لوگ حالات کی مجبوری کے باعث پھنس گئے۔ رابعہ نے ان کی خدمات حاصل کرلیں اور انہیں بہت بڑا معاوضہ پیش کیا۔ مالی مشکلات کی وجہ سے یہ انکار نہ کر سکے مگر پھر ضمیر نے ان کو شرمندہ کیا.... پوری کہانی وہیں تک لپیٹنا ہے۔"

"اگر وقار یوسف بھی اس پلان سے متفق ہے تو ٹھیک ہے۔ یہ قانونی معاملہ ہے۔ وہی بہتر سمجھ سکتا ہے۔ تو نے گواہی پکی کرلی ہے ؟؟"

"گواہی اتنی ہی پکی ہے جتنی دلاور سے ہماری دشمنی۔ ایسا برین واش کیا ہے میں نے کہ وہ دونوں اپنی مرضی سے بولنا ہی بھول گئے ہیں۔ ریکارڈ کی طرح بجنے لگتے ہیں اور ہر بار وہی دہراتے ہیں جو میں نے ریکارڈ کیا ہے۔ تم لوگ ابھی تک یہاں کیوں براجمان ہو؟ جاتے کیوں نہیں لنچ پر؟"

"بس جا رہے ہیں۔ بڑا سسپنس ہے کہ بیک وقت دو دھماکا خیز ڈرامے ہو رہے ہیں۔ ایک طرف مائی گرامی شوہر نامدار کی گرفتاری۔ اس سے پہلے اس کی منکوحہ کا قوم سے خطاب۔ معما کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

"تیری سمجھ میں آیا؟"

منظر نے گھڑی دیکھی "کیا خیال ہے اب چلنا نہیں چاہیے؟"

ایس ایس پی نے ریسیور رکھا اور مجھے دیکھا "اس کی فون کال ہے لندن سے۔ کوئی مسٹر ایم کے اچکن یا اشکن بات کریں گے۔"

رابعہ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر مجھے ہنسی کو ضبط کرنا پڑا۔ یہ محسن خان شیروانی تھے جو کسی ناگہانی ضرورت کے تحت ایم کے اچکن بن گئے تھے۔ اسے شیروانی کی جگہ اچکن صرف میں کہتا تھا جیسے وہ میرے بچپن کے نام کیپر خان کی مناسبت سے مجھے کیپر واس کہتا تھا۔

گھنٹی دوبارہ بجی تو صدیقی نے ریسیور اُٹھایا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کسی خاص حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔

محسن نے فرنچ میں کہا "اپنے چیف کے نو عرف کیپر واس عرض کر رہے ہو؟ خادم کو شیروانی کہتے ہیں۔"

"خادم کو ملازم تو کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے مولوی خادم حسین کے سوا.... کیا تکلیف ہے آپ کو آخر....؟"

"ابھی تو نہیں ہے لیکن ہو سکتی تھی چنانچہ میں نے تم سے مشورہ بہتر سمجھا۔ یہ جو وعدہ معاف گواہوں کی جوڑی ہے ہمارے پاس انہیں میں کیسے لاؤں گا وہاں؟"

"جیسے تم مناسب سمجھو۔ چاہو تو سالم لے آؤ یا ٹکڑے کرکے پیک کرو یہاں پھر جوڑ لیں گے۔"

"یار قانونی پیچیدگی ہے۔ وہاں سوال کیا جائے گا کہ آخر آپ نے یہ وعدہ معاف گواہ کہاں سے حاصل کیے۔ خریدے تو کس سے اور منگوائے تو کیوں؟"

میں نے سوچ کے کہا "یہ سوال تو ہوگا۔ جواب کیا ہو گا اس

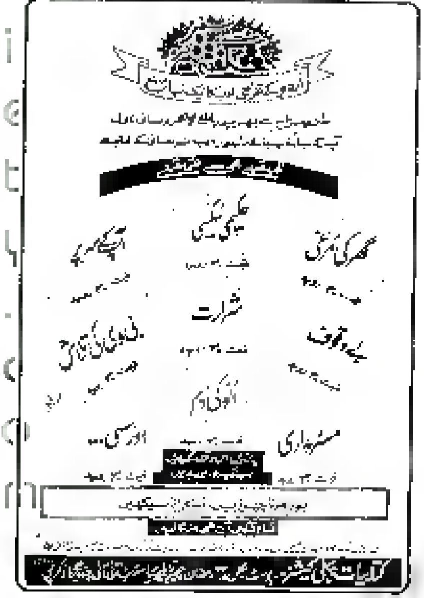

"ہاں۔ وہ رانا کے خلاف بیان دے گی۔ اپنی پوزیشن مستحکم کرے گی۔ اس سے کچھ بعید نہیں کہ اس نے رانا کو پہلے ہی بے دست و پا اور تنہا کر دیا ہو۔ حکومت کا تختہ اُلٹنے والے آخری کارروائی کرنے سے پہلے مواصلاتی رابطے منقطع کر دیتے ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون کے دفاتر پر قبضہ کر لیتے ہیں اور ہوائی اڈے بند کر دیتے ہیں۔ سربراہ کے ٹیلی فون اور بجلی کے تار تک کاٹ دیتے ہیں اور محاصرہ کر لیتے ہیں تمام اہم مقامات کا۔"

صدیقی نے گھڑی دیکھی "اس کی فرنچ کب ختم ہوگی۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

منظر نے خادم سے کہا "تم ہی کچھ سمجھاؤ اسے۔ اتنی بے شرمی کی باتیں سب کے سامنے نہیں کرتے 'یہ پاکستان ہے۔"

"آپ ایک لفظ بھی جانتے ہیں فرنچ کا۔" خادم نے کہا۔

"ہاں۔ ایک پورا جملہ بول سکتا ہوں میں مگر تم ناک کے کاٹ کھانے کو دوڑو گے پاگل کتے کی طرح۔ ایک دوست نے سکھایا تھا کہ خواتین کے سامنے جھک کر انہیں آداب کہنے کا یہی طریقہ ہے۔"

صدیقی ہنسا "آخر کیا تھا وہ جملہ؟"

"ایس پی صاحب، ایک دعوت میں فرنچ کونسلیٹ کے آفس کا کوئی عہدے دار اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے سر جھکا کے کہہ دیا۔ کیا آپ میرے بچے کی ماں بننا پسند کریں گی۔ اب اگر مولوی خادم حسین سے میں یہ بات کہہ دوں۔۔؟"

کمرے میں قہقہوں کا طوفان آ گیا۔ خود مولوی خادم حسین پیٹ پکڑ کے ہنس رہا تھا اور ہر قہقہے کا آغاز حلق سے نکلنے والی "کھی" کی آواز سے ہوتا تھا اور بس۔ پھر اسے دوسری "کھی" تک جھٹکے لگتے رہتے تھے۔ رابعہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

صدیقی نے ہنسی پر قابو پا کے کہا "اس کے بعد کیا ہوا منظر صاحب؟"

"بس یہ مت پوچھیں۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں" منظر اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں رابعہ کے ساتھ منظر کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ "تم لوگ پیدل کیوں ہو؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "تیرے دن ہوں بھائی تو کار والے بے کار ہو جاتے ہیں۔ اللہ کسی کو کسی کا محتاج نہ کرے۔"

خادم نے کہا "مس رابعہ کی کار میں کسی نے بم لگا دیا تھا۔"

"ویری گڈ۔ پھر کیا ہوا؟ ۔۔۔ دھماکا؟"

"نہیں۔ مگر مولوی خادم حسین گاڑی کے نیچے گھس گیا اور گیلی پتلون کے ساتھ باہر نکلا" میں نے کہا۔

"دیکھیں جی۔ آپ غلط فہمی پیدا کر رہے ہیں۔ گاڑی کے نیچے پانی تھا" خادم حسین نے احتجاج کیا "گاڑی عین گٹر کے ڈھکن پر کھڑی ہوئی تھی۔ میں اتنا ڈرپوک نہیں ہوں۔"

"یار پتلون تو گیلی ہوئی نا۔ اب پانی کہیں سے بھی آیا ہو کیا فرق پڑتا ہے۔" منظر نے کہا "یہ بتاؤ تم لوگ فوت کہاں نہیں ہوئے؟"

میں نے اسے مختصراً سب بتا دیا "مجھے رانا پر شک ہے کہ یہ اس کی جوابی کارروائی تھی۔ معلوم کر لیں گے رات کو۔"

"کس سے؟"

"اس کے دونوں غلام کسی اسپتال میں مل جائیں گے۔ استاد بادل نے انہیں پہچان لیا تھا" میں نے کہا۔

"اسے اپنا ہوش نہیں ہوتا۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھ کے نہیں پہچان سکتا۔ سالا نشے باز۔"

"وہ اس وقت ہوش میں تھا۔"

"مگر تم نے اسے بیس روپے دیے تھے۔ بیس گھنٹے کا بندوبست کر دیا تھا اب وہ کل ہی آنکھیں کھولے گا" منظر نے کہا۔

"نہ دیتے تو کیا کرتے۔ اسی امید پر تو نیکی کرتا ہے وہ۔"

"کہ جواب میں اس کے لیے برائی کے اسباب ہوں۔ اس نے تمہاری جان بچائی۔ تم نے اسے کچھ اور موت کی سرحد کے قریب کر دیا۔ بہتر ہوتا اگر تم اسے کچھ نہ دیتے۔"

منظر کی بات غلط نہیں تھی۔ بعض اوقات ہم جانتے بوجھتے غلطی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ اس وقت اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ عقل پر جذبات حاوی آ جاتے ہیں۔ دیوانہ کسی کو مارے تو مشتعل ہو کے اسے مارنا کوئی عقلمندی نہیں مگر غصے کے جذبات کا ردِ عمل ایسا ہی ہوتا ہے۔ استاد بادل کو بھی لوگ یہ سمجھ کے پیسے دے دیتے تھے کہ اب اس کے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ نشے کی لت سے مجبور ہو کے یہ چوری بھی کر سکتا ہے۔ بہتر ہے اس کو حق محنت کے طور پر ہی کچھ دے دیا جائے۔ اتنی فرصت کسے کہ استاد بادل کی زندگی کے لیے کچھ کرے۔

گاڑی کو ہم نے پارکنگ ایریا میں چھوڑ دیا۔ اس وقت تک ایس ایس پی جاوید صدیقی اپنے ماتحت اے ایس پی کے ساتھ ہوٹل کے مین انٹرنس سے اندر جا چکا تھا۔ وہ دونوں پوری وردی میں تھے۔ انہیں وہاں کیسے روک سکتا تھا مگر ہمیں بھی اس نے چیک نہیں کیا تو مجھے عجیب ہوا کہ منتظمین اور سیکیورٹی کے انتظامات اتنے غیر اطمینان بخش کیوں ہیں۔ ویسے تو کوئی بھی اندر پہنچ سکتا تھا۔ میری غلط فہمی فوراً ہی رفع ہو گئی۔

ہال میں کوئی نہیں تھا اور نہ وہاں کسی تقریب کے آثار تھے۔ وقت تقریباً ہو گیا تھا مگر اسٹیج یا روسٹرم اور مائکروفون کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ ایک گوشے کے کاؤنٹر پر ریسپشن والے بڑے مطمئن بیٹھے تھے اور یہی بات مجھے کچھ عجیب لگی کہ اعلیٰ پولیس افسروں کے ساتھ آنے والوں کو وہ ایسے نظر انداز کیوں کر رہے ہیں جیسے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ وہ تو ہال میں سوالیہ نشان بن کے کھڑے ہونے والے عام آدمی سے بھی فوراً بڑے اخلاق سے سوال کرتے کہ فرمایئے ہم آپ کی کیا خدمت کریں۔

صدیقی نے کاؤنٹر پر جا کے کہا "واٹ از آل دس؟"

کلرک نے پلکیں جھپکا کے کہا "سر؟"

"ایک۔ بی۔ کی کانفرنس تھی یہاں ابھی بارہ بجے لنچ کے بعد؟"

منظر نے مجھے دیکھ کے آنکھ ماری۔ "یہ کسی نے مذاق کیا ہے۔ نئی تاریخ کیا ہے تو کسی کو خیال نہیں آیا۔"

صدیقی ایک دم پلٹا "یو آر رائٹ۔ اپریل فول بنایا ہم سب کو۔" رابعہ بھی پریشان ہو گئی "ہم ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"ایسا ہو گیا ہے میڈم۔" صدیقی نے طنز اور تلخی سے کہا "یہ اطلاع کس کے ذریعے ملی تھی آپ کو؟"

"آپ کو کس نے بتایا تھا صدیقی صاحب؟" منظر بولا "آپ نے بھی تصدیق نہیں کی۔"

اتنی دیر میں کاؤنٹر کے پیچھے منیجر ایک فہرست لے کر آ گیا تھا۔ اس نے کہا "پلیز آپ نام بتایئے اپنے اپنے۔"

ایس ایس پی جاوید صدیقی نے خاصی ناگواری سے اپنا اور پھر سب کا نام بتا دیا "اب کیا تم شناخت کے لیے ثبوت بھی مانگو گے؟"

"یس سر۔ آئی ایم سوری مگر مجھے یہی ہدایات ہیں۔"

"یہ ہوٹل ہے یا۔۔۔ آرمی ہیڈ کوارٹرز؟ یا پرائم منسٹر کا چیمبر ہے؟"

منیجر نے اسی شائستگی سے کہا "اگر آپ ہوٹل کے مہمان ہیں تو پلیز تشریف رکھیے۔ ہم ہر خدمت کے لیے حاضر ہیں لیکن آپ نے جس کانفرنس کی بات کی تھی۔ وہاں انہی کو جانے کی اجازت ہے جو بلائے گئے ہیں۔ اور جعلی مسافروں کو روکنے کے لیے شناخت کی کارروائی کے لیے سب ذمے داری ہم پر عائد کر دی گئی ہے۔"

"اوکے اوکے۔ یہ دیکھو میرا شناختی کارڈ" ایس ایس پی نے نکال کے اپنا کارڈ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"آپ ہی سب کو جانتے ہیں سر۔ آپ مطمئن ہیں کہ انہیں بلایا گیا ہے؟" منیجر نے کارڈ اسے واپس کر دیا۔

"آف کورس۔ ان کی ذمے داری میں لے سکتا ہوں۔"

منیجر نے ایک ویٹر کو اشارے سے بلایا "یہ آپ کو لے جائے گا اوپر ایک کانفرنس روم ہے۔"

کانفرنس روم تھرڈ فلور پر تھا اور بزنس ایگزیکٹوز کی میٹنگ یا چھوٹی موٹی محدود تقریبات کے لیے استعمال ہو سکتا تھا۔ اس میں دونوں جانب دیوار کے ساتھ ساتھ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان کی پشت الگ تھی مگر نشست مشترک تھی۔ دو فٹ چوڑے بلیک لیدر کے گدّے کی صورت میں ایک ہی بچھی تھی چاروں طرف فریم کر دی گئی تھی۔ اسے اوپر کی دیوار میں ہلکی لکڑی کی تھیں جن پر پالش چمک رہی تھی۔ یہ شاید تیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا ہال تھا جس کی روشنی کے لیے چار اسے ہی نصب تھے۔ فرش پر ریڈ کارپٹ تھا اور کرسیوں کے سامنے ایک ہی ٹیبل تھی جس کی چوڑائی شاید دس فٹ ہوگی۔ اس کے چاروں کناروں پر دو فٹ کی پٹی پر فارمیکا تھا۔ درمیان میں سفید ٹیبل کور پر گلاس پلیٹیں اور چمچے سجے ہوئے تھے۔ نیپکن کے پھول بنا کے گلاسوں میں لگا دیے گئے تھے۔ بالکل وسط کی پٹی پر تازہ اور رنگین پھولوں کے گلدستے ایک قطار میں رکھے ہوئے تھے۔ یہ ترتیب سادگی اور خوبصورتی کا پُر وقار امتزاج تھی۔

چوتھی سمت میں جو داخلے کے دروازے سے انتہائی فاصلے پر تھی دیوار پر ایک بہت وسیع اور خوب صورت میورل تھا اور اس کے نیچے وہ میز جس کے پیچھے تین کرسیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ سنہرے حاشیے اور نقش و نگار والی کرسیاں تھیں جن کے وسط میں سرخ مخمل تھا۔ بیچ والی کرسی کی گولائی کچھ زیادہ اٹھی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے یہ کسی میٹنگ کا نارمل سیٹ اپ تھا۔ یہاں تین کرسیوں پر میزبان۔ میٹنگ بلانے والے اور کمپنی ڈائریکٹرز وغیرہ بیٹھ سکتے تھے۔ درمیان والی اونچی کرسی چیئرمین صدر یا مہمان خصوصی کو دی جا سکتی تھی۔ میز پر صرف ایک مائکروفون تھا اور ایک گلدستہ۔

نصف سے زائد کرسیوں پر مہمان پہلے سے موجود تھے مگر ان پر اس پُر تکلف یا SOPHISTICATED ماحول کا اثر تھا کہ وہ سلام دعا بھی سرہلا کے کر رہے تھے اور مہذب لوگوں کی طرح آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ میں صرف تازی کو پہچانتا تھا مگر بعد میں کچھ اور شناسا چہرے بھی نمودار ہوئے جو نائب کے ساتھی تھے۔ میں ان کے لیے اجنبی تھا مگر انہوں نے رابعہ اور منظر کو دیکھ کے ہاتھ ہلایا اور ایس ایس پی جاوید صدیقی کو دیکھ کے حیران ہوئے۔ ان میں تازی ہی زیادہ منہ پھٹ تھا "آپ کا آنا خالی از علت نہیں ہو سکتا۔ آپ تو بڑے باخبر لوگ ہو۔۔؟"

صدیقی نے اس کی بات کاٹ دی "مگر ہمیں باخبر رکھنے والے تو آپ لوگ ہیں۔"

"یہ چکر کیا ہے؟" دوسرے نے کہا "آپ کچھ روشنی ڈالیے؟"

صدیقی نے چھت کی طرف دیکھا "کیا ان فانوسوں کی روشنی کم ہے؟"

اچانک پیچھے والے دروازے کا پردہ ہٹا کے دلاور کی بیوی نمودار ہوئی۔ میں ہی نہیں ایک لمحے کے لیے سب دم بخود رہ گئے۔ سب کو توقع تھی کہ آج کی میزبان اتنے بڑے سنگھار کی ہوئی ہے۔ وہ بڑے کروفر اور چمک دمک کے ساتھ نمودار ہوگی۔ جو اسے جانتے تھے انہیں معلوم تھا کہ اس کی عمر بھی اتنی زیادہ نہیں اور جب اتنا زیادہ پیسہ ہو تو عمر کے دس بیس سال تو ساٹھ سال کی عورت بھی پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ وہ بلا شبہ حسین تھی۔ کسی نوخیز حسینہ سے اس کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا تھا مگر عمر کے ساتھ عورت کے انداز و اطوار میں جو رعنائی آتی ہے اس کا تاثر بالکل جدا ہوتا ہے۔ پہاڑی ندی کے پُر شور بہاؤ کا حسن اپنی جگہ مگر گہری جھیلوں کا

www.paksociety.com

پُرسکون ٹھہراؤ بھی کم نظر نواز نہیں ہوتا۔ اگر وہ پورے میک اپ اور نظروں کو خیرہ کرنے والے لباس میں نمودار ہوتی تو شاید ایک مسکراہٹ سے سب کو مسحور کر دیتی۔ وہ شوہر سے جدائی کے غم کی تصویر بن کے آتی۔ سیاہ ماتمی لباس میں زلفیں بکھرا کے اور کاجل کی لکیر کو آنسوؤں کی نمی سے پھیلا کے نمودار ہوتی تو سب کو اُداس کر دیتی مگر وہ دلاور کی بیوی تھی جو عام قسم کے ڈرامے نہیں کرتا تھا۔

دلاور کی بیوی ایسے آئی جیسے ابھی ابھی کسی بڑھوس بھیڑیے کے چنگل سے آزاد ہو کے اپنی آبرو لٹا کے اور جان بچا کے بڑی مشکل سے گرتی پڑتی یہاں پہنچی ہو۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرا جاڑ تھا اور اس پر گہرے نیل صاف نظر آتے تھے۔ اس کے چہرے پر لمبی لمبی خراشیں تھیں اور اس کا عام سا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کے گداز شانوں کی سفید جلد پر بھی خراشوں کی سُرخی تھی اور ان مقامات پر بھی جن کو نظر بھر کے دیکھنے والے بھی نظر چرانے پر مجبور تھے۔

وہ چند لمحے خالی خالی فریاد کناں نظروں سے سب کو دیکھتی رہی اور پھر دھڑام سے کرسی پر گر گئی۔ اس کے ساتھ ہی جیسے سکوت کا وہ طلسم ٹوٹ گیا جو شاک کا نتیجہ تھا۔ بہت سے لوگوں کی ملی جلی آوازیں اُبھریں۔

"یہ کیا ہے مسز دلاور؟"

"کیا ہوا ہے آپ کے ساتھ؟"

"کس نے بنائی ہے آپ کی یہ حالت؟"

میں نے رابعہ کے کان میں کہا "ڈرامے کا پہلا سین زبردست رہا۔"

دلاور کی بیوی نے سر اُٹھا کے کہا "پلیز جنٹلمین۔ آپ سب کو میں نے یہی بتانے کے لیے بُلایا ہے۔ جب کوئی واردات ہوتی ہے تو کسی چیز کو چھیڑا نہیں جاتا۔ میں نے بھی اسی حالت میں سب کے سامنے آنا بہتر سمجھا۔"

"مسز دلاور۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی واردات ہوئی تھی تو آپ کو پولیس اسٹیشن جانا چاہیے تھا۔" ایس ایس پی جاوید صدیقی نے سخت لہجے میں کہا "کب ہوئی تھی یہ واردات آخر اور آپ نے اس صورتِ حال کو ایسے EXPLOIT کرنے کے لیے یہ پریس کانفرنس کا ڈراما کیوں کیا ہے؟"

غازی نے کہا "ہاں۔ کب سے یہ حالت بنائے پھر رہی ہیں آپ؟"

رابعہ بولی "آپ کو میڈیکل رپورٹ کے لیے پیش ہونا چاہیے تھا۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ کچھ لوگوں نے اس کے حق میں اور کچھ نے خلاف بولنا شروع کیا۔ ایک شوخ قسم کے فوٹو گرافر نے تو یہ بھی کہا کہ "میک اپ کس سے کرایا تھا آپ نے۔ شوٹنگ کے لیے۔"

"میں سب کچھ بتاؤں گی۔ سب کے سوالات کا جواب دوں گی۔"

"صبح سے سارے شہر کو معلوم ہے کہ مسز دلاور نے ایک عالی شان ہوٹل میں پریس کانفرنس بلائی ہے۔ صرف یہ بتانے کے لیے کہ کسی نے اسے مارا پیٹا ہے یا اس کے ساتھ زبردستی کی ہے۔" مظلومیت کے اس چلتی اشتہار کے بعد آپ تو قع رکھتی تھیں کہ پولیس فوراً مجرم کو پکڑ لے" اے ایس پی آفتاب نے کہا "گھنٹوں بعد یہ انکشاف فرمائیں گی آپ کہ آپ پر ASSAULT ہوا ہے۔"

"میں پولیس کو کوئی رپورٹ نہیں کر رہی ہوں۔ میں پبلک کو بتانا چاہتی ہوں۔"

"یہ غلط ہے۔"

"مگر جرم نہیں ہے" اس نے پلٹ کے جواب دیا "ورنہ گرفتار کر لیتا تم مجھے۔"

"اس طرح پولیس بدنام ہوتی ہے۔"

"پولیس نیک نام کب تھی؟" غازی نے کہا "میرا خیال ہے ایس ایس پی صاحب کہ اب آپ یہاں آ گئے ہیں اور ہم بھی تو پھر سوچتے ہیں مسز دلاور کو پہلے ان کی سُن لیں۔"

مولوی خادم حسین نے فریج میں کہا "کوئی نہیں کھانا کر پہلے کھانا کھا لیں۔ باتوں سے پیٹ بھر جائے گا کیا؟"

اللہ نے اس کے پیٹ سے نکلی ہوئی فریاد بھی سُن لی۔ ویٹر کھانے کی ڈشیں اُٹھائے ہوئے نمودار ہوئے اور بیچ میں رکھنے لگے۔

رابعہ نے کہا "ڈرامے کا پہلا سین فلاپ ہو گیا۔"

"جاوید صدیقی نے سب چوپٹ کر دیا۔ اب بات بنے گی نہیں خواہ یہ کتنی ہی دردناک ایکٹنگ کیوں نہ کرے۔" غازی بولا۔

میں نے رابعہ کے کان میں کہا "بے وقوف عورت نے اپنا کیس خراب کر لیا۔ ایسے ڈراموں سے کسی کی ہمدردی حاصل نہیں ہو سکتی۔"

مسز دلاور معذرت کر کے پھر پردے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

"آپ سب نے مجھے دیکھ لیا اور اپنی رائے کا اظہار بھی کر دیا۔ اب آپ اطمینان سے لنچ کریں۔ میں ابھی کچھ دیر میں آتی ہوں۔"

جاوید صدیقی کا موڈ خراب ہو گیا تھا مگر سب نے کھانا شروع کیا تو وہ بھی مجبور ہو گیا "میرا دل تو نہیں چاہتا۔"

مولوی خادم حسین نے کہا "سر کیا آپ کھانا دل سے کھاتے ہیں۔ ہمارا تو معدہ بالکل دل کی نہیں مانتا ہے۔"

"تمہارے پاس معدے کے سوا ہے کیا؟" منظر بولا۔

خادم کو سب کی ہنسی نے مشتعل کر دیا "آپ بڑے تیز چالاک ہیں منظر صاحب۔ ایسا چھچھورپن زیب نہیں دیتا آپ کو۔"

"ہم پیدائشی پھکڑ ہیں مولوی خادم حسین۔ چلو غصہ تھوک دو۔"

کھانا کھاؤ۔" منظر نے اسے چمکارا "کبھی سچ سُن بھی لینا چاہیے۔"

بیرا ذہنی الجھن کا شکار تھا اور خود رابعہ بھی یہی سوچ رہی تھی کہ دلاور کی بیوی نے یہ غیر ضروری سوانگ کیوں بھرا۔ اور اگر کسی نے اس کے ساتھ زبردستی کی تھی تو صبح سے اب تک پولیس کو رپورٹ نہ کرنے اور اسی حالت میں سب کے سامنے آنے سے اسے کیا فائدہ ہو گا۔

ہو بیچ مسز دلاور نے پھر انٹری دی۔ اس وقت تک سب کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ ویٹر برتن سمیٹ رہے تھے اور چائے کے لیے آرڈر لے رہے تھے۔ چند منٹ میں مسز دلاور نے ایک بار حاضرین اور ناظرین کو صدمے سے دوچار کیا۔ اب اس کا حلیہ وہی تھا جس میں سب اسے دیکھنے کی اُمید لگائے بیٹھے تھے۔ وہ پہلی بار اس طرح آتی تو شاید اثر اتنا نہ ہوتا مگر چند منٹ پہلے مسز دلاور کے بعد اس کا بالکل بدلا ہوا انداز دیکھ کے سب بھونچکے رہ گئے۔

اس نے کالی قمیص پہن لی تھی۔ شانوں تک جالی میں سے جلد کا گورا پن نظر آ رہا تھا جتنی پشت کی کریز پھوٹ رہی تھیں اور قمیص کے سینے کی تراش بھی اوپر سے اتنی ہی کشادہ تھی۔ بظاہر اس نے بالوں کو کنگھی سے سنوارا تھا مگر شانوں پر ان کی بے ترتیبی بھی کسی ماہر میک اپ آرٹسٹ کے فن کا نمونہ تھی۔ کنٹراسٹ میں زرد شلوار اور دوپٹہ سیاہ کپڑے کے ماحول میں اسے بہت نمایاں کر رہے تھے۔ اس نے چہرے کے میک اپ سے نیل کے نشانوں کو چھپا لیا تھا لیکن آنکھوں کو چھپانا مشکل تھا۔ اب اس کے ساتھ دائیں ہاتھ پر دلاور کا بیٹا تھا اور بائیں جانب ایک خونخوار گوریلا ٹائپ باڈی گارڈ۔

کچھ لوگوں نے پھر زیرِ لب میک اپ کی تعریف کی "کوئی اسٹیج کا میک اپ مین ہو گا۔"

"اس کے بعد تیسرے سین کے لیے بھی وہی میک اپ کرے گا۔"

دلاور کی بیوی نے اپنی بات شروع کی تو سب غیر سنجیدہ تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ انھوں نے یہاں آ کے اپنا وقت ضائع کیا۔ صرف پریس کے لیے صرف یہ خیال تھا کہ چلو لنچ تو اچھا رہا۔ خبر معمولی ہے۔

"آپ سب مجھے جانتے ہیں۔ نہیں جانتے تو میں بتا دوں۔ میں تھی چودھری دلاور کی بیوی۔ اب کچھ یاد آیا آپ کو؟ یہ نام تو اچھی طرح یاد کیا گیا ہے۔ اتنا عرصہ ہو گیا ہر روز کسی نہ کسی حوالے سے کوئی خبر مل ہی جاتی ہے اخباروں کو۔ چودھری دلاور کے بارے میں آپ اپنی اپنی رائے قائم کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ وہ اچھا تھا یا بُرا۔"

"آپ ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کر رہی ہیں۔ تھا کس لیے؟ کیا وہ خدا نخواستہ۔"

"خدا نہ کرے۔ وہ زندہ ہیں لیکن لاپتا ہیں۔ چودھری صاحب کے بارے میں ہزار باتیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ مفرور ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ پولیس کی تحویل میں ہیں۔ یہ سب خیال آرائیاں ہیں۔ چودھری صاحب کو ان کے دشمنوں نے قید کر رکھا ہے۔"

"یہ آپ یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہیں؟"

"وہ دشمن کون ہیں؟ یہ بھی بتا دیں۔"

"سب بتاؤں گی میں۔ مگر کیا آپ سب لوگ جانتے نہیں کہ ان کے اصل دشمن کون ہیں۔ کس نے ان کے نام کو رُسوا کیا۔ انھیں اسمگلر، وطن دشمن، غدار، بے ضمیر شیطان۔ انسانوں کے لہو کا تاجر۔ قاتل اور خونی کیا کچھ نہیں کہا۔ کس نے ان کے لیے مسائل پیدا کیے۔ ان کے خلاف سازش کی۔ انھیں بدنام کیا اور ان کا جینا مشکل کر دیا۔ میں ان کا نام نہیں لوں گی۔ مگر سب جانتے ہیں انھیں۔ وہ خود مجرم ہیں اور قاتل ہیں۔"

"مسز دلاور۔ اگر یہی سب کہنا تھا آپ کو۔"

"نہیں۔ یہ سب کہنے کا کوئی فائدہ نہیں" اس نے جلدی سے کہا۔ "میں تو یہ بتانا چاہتی تھی کہ میرے شوہر کے اغوا۔"

صدیقی بولا "کوئی ثبوت نہیں آپ کے پاس کہ انھیں اغوا کیا گیا تھا۔"

غازی نے کہا "ممکن ہے وہ پردے میں بیٹھے ہوں۔"

"نہیں۔ آپ لوگ وہ سب نہیں جانتے جو میں جانتی ہوں۔" دلاور کی بیوی نے چلا کے کہا "میں مل کے آئی ہوں اپنے شوہر سے۔ اس قید خانے میں جہاں ان کو... کسی جنگلی جانور سے بدتر طریقے پر رکھا گیا ہے۔ میں بتا رہی ہوں آپ کو کہ مجھے چودھری دلاور سے ملوانے کے لیے وہی لوگ لے گئے تھے جن کا میں ذکر کر رہی تھی۔ چودھری دلاور کے دشمن میں کیوں نام لوں ان کا۔ کیا آپ سب میں ہمت نہیں ہے؟"

غازی نے کہا "کیا آپ کو سکندر بخت لے گیا تھا وہاں؟"

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی پھر دلاور کی بیوی نے کہا "ہاں۔ مجھے خود سکندر بخت نے یہ موقع فراہم کیا تھا۔"

جب اس نے رو رو کے بتانا شروع کیا کہ اس نے تہ خانے میں چودھری دلاور کو کس حال میں دیکھا تھا اور وہ کتنی اذیت وہ حالات میں زندہ تھا۔ تو ماحول یکلخت تبدیل ہو گیا۔

صدیقی نے میز پر ہاتھ مار کے کہا "اسٹاپ دس رونا دھونا۔"

فیصل نے چیخ کے کہا "ایس پی صاحب یہ آپ کا تھانہ نہیں ہے اور نہ ہم مجرم ہیں۔"

"شٹ اپ۔ میں ابھی اور اسی وقت گرفتار کر سکتا ہوں تمہاری ماں کو ایڈمنٹ۔" صدیقی بھڑک اُٹھا۔

"کس جرم میں؟" فیصل کچھ دب گیا۔

"جرم؟ یہ جرم کیا کم ہے کہ اس عورت نے ایک مفرور مجرم

www.paksociety.com

سے ملاقات کی۔ جو قاتل ہے اور میں اس قتل کا سراغ لگانے کے لیے خاص طور پر اسلام آباد سے یہاں آیا ہوں۔"

اب دلاور کی بیوی نے کہا "اس پر قتل کا الزام لگانے والے آپ ہیں مگر فیصلہ کرنے کا اختیار آپ کو نہیں ہے۔ آپ نے اسے کس طرح قاتل کہہ دیا سب کے سامنے۔ اور میرے لیے وہ شوہر ہے جیسے اپنی بیوی کے لیے آپ ایس ایس پی نہیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے مسز دلاور۔ میرا کام ہے تفتیش کرنا اور میرے لیے رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں آپ سے بھی پوچھوں گا کہ آپ نے کیسے ملاقات کی تھی۔ آپ کو سکندر کہاں ملا تھا۔ کیا وہ آپ کو گھر سے لے جانے کے لیے پہلے سے ملاقات کا وقت طے کر کے آیا تھا یا زبردستی راہ چلتے آپ کو گاڑی میں ڈال کے لے گیا تھا۔ آپ کی پوزیشن بہت مشکوک ہو گئی ہے اس کہانی سے۔"

"مگر میں کیا کر سکتی تھی۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"اگر اس نے پہلے سے بتا دیا تھا کہ وہ آپ کو دلاور سے ملوانے لگا ہے تو آپ کسی نہ کسی طرح پولیس کو مطلع کر سکتی تھیں۔ آپ کوئی جاہل اور بے وقوف عورت نہیں ہیں۔ بیٹا بھی آپ کا اتنا ہوشیار ہے۔ آپ خود مل کے سکندر کو ٹریپ کر سکتے تھے۔ کوئی آپ کا تعاقب ایسے کرتا کہ سکندر کے باپ کو پتا نہ چلتا لیکن آپ نے کچھ نہیں کیا۔"

"اگر میں ایسا کرتی۔ تو دلاور سے نہیں مل سکتی تھی۔"

"مسز دلاور۔ آپ کے شوہر کا جانی دشمن ہے سکندر۔ آپ نے کیوں اعتبار کر لیا تھا اس پر۔ اگر وہ آپ کو بھی وہیں بند کر دیتا۔ جہاں بقول آپ کے دلاور کسی جنگلی جانور کی طرح بند ہے۔ تو کیا ہوتا؟ آپ سوچے سمجھے بغیر اس کے ساتھ چل پڑیں۔ کسی کو بتائے بغیر کسی کو ساتھ لیے بغیر۔ آپ کو ڈر نہیں لگا۔ آپ کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آپ کی لاش کسی سڑک پر ملتی۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ وہ پہلے سے بتا کے آیا تھا اور میں ہنسی خوشی اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔"

"پھر کیا اس نے آپ کو گن پوائنٹ پر گھر سے اٹھایا تھا یا باہر ہی سے اغوا کر لیا تھا۔ کون سی جگہ تھی وہ۔ کس دن اور کس وقت کی بات ہے یہ؟ آپ نے شور کیوں نہیں کیا تھا۔ سیکڑوں سوالات کا جواب دینا پڑے گا آپ کو مسز دلاور اور مجھے یقین ہے کہ آپ قتل کے اس ملزم کی گرفتاری کے لیے مفید معلومات فراہم کریں گی۔ شاید آپ ... وہ راستہ اور وہ جگہ بھی یاد آ جائے۔"

"ایس ... صاحب۔ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں" قاذی نے اسے ٹوکا "مگر ... کا اعلان کرنے کی کیا ضرورت ہے سب کے سامنے۔ کوئی چیلنج کر رہا ہے آپ کے اختیار کو؟"

دوسرے صحافی نے کہا "آپ کھلی دھمکی دے رہے ہیں۔ ہراساں کر رہے ہیں اس عورت کو جو اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی بات بتانا چاہتی ہے۔"

"غلط ... مائی فٹ۔ یہ عورت ڈراما کر رہی ہے۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ سب جھوٹ ہے اور آپ لوگ مجھے موقع دیں تو میں ابھی اس کا جھوٹ پکڑ کے دکھا سکتا ہوں۔ مجھے یہ بتائیں خاتون کہ آخر آپ کے شوہر کے اس جانی دشمن نے ایسا کیوں کیا تھا؟ دلاور اگر اس کے قبضے میں ہے۔ تو وہ دلاور کو مار کیوں نہیں دیتا۔ اسے قید رکھنے میں سکندر کا فائدہ کیا ہے؟ اور اس کا کیا انٹرسٹ تھا آپ کو دلاور سے ملوانے میں؟ کیوں یہ نیکی کی اس نے آپ کے ساتھ آخر؟ کیا اس کی خواہش آپ نے کی تھی؟ اسے پیغام دیا تھا تو کیسے اور کہاں؟ اور اس نے انسانی ہمدردی یا وسیع القلبی سے کام لیتے ہوئے خود آپ کو دلاور سے ملاقات کا موقع فراہم کیا تھا تو کیوں؟"

"میں آپ کو سب بتاؤں گی بعد میں۔"

"آپ کو بتانا پڑے گا سب کہ وہ آپ کو کیسے لے گیا تھا اور کب۔ اور اس کی اطلاع آج تک پولیس کو کیوں نہیں دی گئی تھی آپ نے۔ آپ خود کو زیر حراست سمجھیں۔ اس پریس کانفرنس کے بعد میں آپ کا مفصل بیان لوں گا۔"

"اگر تھانے میں STATEMENT لی جائے گی تو۔"

"نہیں۔ میں آپ سب کی موجودگی میں بات کروں گا۔ ابھی کے گھر پر یا اسی ہوٹل میں۔" اس نے گھڑی دیکھی "رات آٹھ بجے یہ ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں اپنا بیان دیں گی۔ اس وقت تک یہاں ان کو کمرے سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوگی اور نہ کوئی ان کے کمرے میں جائے گا۔"

"طفیل میرے ساتھ رہے گا۔"

"آپ کے ساتھ صرف ایک لیڈی کانسٹیبل ہوگی۔ طفیل کا بیان ہم الگ لیں گے اب آپ اپنی بات جاری رکھیں" چوہدری صدیقی نے فیصلہ صادر کر دیا۔

ایس ایس پی کا موقف غلط نہیں تھا اس لیے صحافی حضرات بھی کچھ نہیں بولے۔ دلاور کی بیوی نے سب کی ہمدردی حاصل کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکام ہو گئی تھی۔ ایک مظلوم بیوی کی حیثیت سے وہ اخبار والوں کو گھر پر بلا کے یہ سب کچھ بتاتی تو شاید رد عمل مختلف ہوتا مگر اس عالی شان ہوٹل میں اس کا یہ ڈراما الٹا ہو گیا تھا۔ پولیس کی موجودگی نے مسز دلاور کی پوزیشن مزید خراب کی تھی۔ اس کے بیان سے صدیقی کی پوزیشن خراب ہوئی تھی۔

"دیکھیے۔ اپنے شوہر سے ملنے کے لیے جانا میرا ذاتی معاملہ تھا۔ میں ایک بیوی کی حیثیت سے مجبور تھی کہ سکندر جیسے دشمن کا بھی اعتبار کروں۔ آپ اسے میری بے وقوفی کہیں یا اسے میرا جرم سمجھیں۔ اگر وہ مجھے قید کر لیتا یا مار ڈالتا تو یہ میرا رسک تھا جو میں نے لیا۔ سکندر کی دلاور سے دشمنی ضرور ہے اور اس کی وجہ بھی ہے جس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں یہ جانتی ہوں کہ ایک انسان کی حیثیت سے وہ بدمعاش یا بدکردار نہیں ہے۔ کم ظرف اور کینہ ... نہیں ہے۔ اس کی قانونی پوزیشن کچھ بھی ہو۔ خود چوہدری دلاور اسے بہادر اور بااصول دشمن کہتا تھا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ دلاور جیسا دشمن ان بہت سے دوستوں سے بہتر ہے جو مار آستین تھے۔ وہ سامنے آ کے وار کرنے والا دشمن تھا۔ پیٹھ میں خنجر گھونپنے والا دوست نہیں۔ مجھے اپنے شوہر سے ملنا تھا اور اس کے لیے میں نے سکندر سے خود رابطہ کیا تھا۔ اسے پیغام پہنچایا تھا کہ اگر چوہدری دلاور زندہ ہے تو مجھے ایک نظر دکھا دے۔ میں صرف اپنے شوہر کی زندگی کا یقین چاہتی تھی۔ اس نے میری بات مان لی۔ میرے دل کو سکون حاصل ہو گیا کہ وہ جہاں بھی ہے جس حال میں بھی ہے زندہ تو ہے۔ میں بیوہ تو نہیں ہوئی۔ میرا بیٹا یتیم تو نہیں ہوا اور سکندر خود مجھے ساتھ لے کر نہیں گیا تھا۔ اس نے یہ بندوبست کروایا تھا کہ کوئی مجھے دلاور سے ملوا دے۔ وہ مجھے چوک کراس سے گاڑی میں بٹھا کے لے گئے تھے۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی اور گاڑی گھنٹا بھر چلتی رہی تھی۔ آدھے گھنٹے کی ملاقات کے بعد وہ پھر مجھے وہیں چھوڑ گئے تھے۔ اگر میں نے پولیس کو اطلاع نہیں دی اور جرم کیا تو میں اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ کیونکہ میں پولیس کو بتاتی تو پھر میں دلاور سے مل نہیں سکتی تھی۔ میں سکندر کے سامنے بھی اپنا اعتبار کھو دیتی۔"

"کیا آپ اسے اتنا ضروری سمجھتی ہیں" صدیقی کے ماتحت اے ایس پی ذوالفقار نے طنز سے کہا "بڑا احترام ہے آپ کے دل میں سکندر بخت کے لیے۔"

اچانک مسز دلاور کا لہجہ بدل گیا "احترام کیوں نہ ہو۔ وہ دشمن ہے تو دشمن ہے۔ دلاور کے دوستوں کی اصلیت بھی جانتی ہوں میں۔ کون کون اس کے در پر آتا تھا۔ کتے کی طرح دم ہلاتا ہوا۔ اسکی کی وڈیروں والے کتنے لوگ اس کی خیرات پر پلتے تھے اور کتنے معزز صحافی تھے جو اس کی چاکری کے لیے تیار تھے۔ جب سے اس نے پبلک لائف میں قدم رکھا تھا کتنے قلمکار کے غازی اس کے پی آر او کی حیثیت سے کام کرنا چاہتے تھے۔ اس کا امیج بنانے کے لیے اپنی صلاحیت اور قابلیت اور اپنا زور قلم صرف کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ میں ان سب کے نام بتا سکتی ہوں جو صبح و شام حاضری دیتے تھے اور سلام کرنے کے بہانے تلاش کرتے تھے۔ جھوٹے خوشامدی تھے۔ جو اسے یقین دلاتے تھے کہ چوہدری صاحب ضمنی انتخابات میں جگہ خالی ہوئی تو سمجھو آپ کی کھری ہے۔ ایک بار آپ اسمبلی میں پہنچ گئے تو وزیر بننے سے کون روک سکتا ہے آپ کو اور گاڑی پر جھنڈا لگ گیا تو پھر آپ کا راستہ روکنے والا کون ہو گا۔ وزیر اعلیٰ سے وزیر اعظم تک بن سکتے ہیں آپ مگر چوہدری دلاور ایسے لوگوں کو پہچانتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ سب بانس پر چڑھانے والے ہی مروائیں گے مجھے۔ جھوٹ اور سچ کے فرق کو سمجھتا تھا وہ دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کر سکتا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ سکندر اس کا ساتھ دینے پر تیار نہیں۔ اس سے صلح نہیں کرتا۔ وہ بڑا کھرا اور سچی وار کرنے والا ہے۔ دشمن ہے تو کیا ہوا۔ دوستوں میں اس جیسا کسی کا کردار نظر نہیں آتا ہے۔ میں نام نہیں لوں گی کسی کا مگر میں ان سب کو جانتی ہوں۔ جو قانون اور انصاف کے رکھوالے کہلاتے تھے مگر خود لٹیرے تھے۔ وہ نوٹوں کی ایک گڈی کے عوض بک جاتے تھے۔ اگر دلاور نے وہ سب کچھ کیا تھا جس کا اس پر الزام ہے تو کیا اکیلے کیا تھا؟ کسی کی مدد کے بغیر کیا تھا؟ نہیں۔ ایسے ہی مددگار تھے اس کے پیچھے آپ لوگ ہیں۔ آپ ہی میں سے تھے جو اس کو راستے دکھاتے تھے اور اس کے لیے بند راستے کھولتے تھے۔ ایک بہت بڑا پولیس افسر اب ریٹائر ہونے والا ہے۔ اگر میں اس کا نام لوں تو اس کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ الٹا مجھے نقصان ہوگا۔ وہ تو کہہ دے گا کہ کتیا بھونکتی ہے بھونکنے دو مگر اس کے ماتحت جو انسانوں کی زبان گدی سے کھینچ لیتے ہیں کسی کتیا کو کہاں بھونکنے دیں گے۔ اس افسر نے ایک رات چوہدری صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کے کہا تھا کہ فلاں علاقے کا ایم پی اے بیمار ہے اور اسے علاج کے لیے آج رات ایمبولینس میں لاہور پہنچایا جائے گا۔ آپ حکم دیں تو ایمبولینس کا حادثہ ہو جائے گا۔ سیٹ خالی ہو جائے گی اور ضمنی انتخابات میں آپ کو ٹکٹ مل جائے گا۔ یہ خود میں نے سنا تھا اپنے کانوں سے۔"

"اور چوہدری صاحب نے کیا حکم دیا تھا؟"

"چوہدری دلاور کی جگہ تم ہوتے تو کیا کہتے؟ اصول پرستی کی باتیں کرنا بہت آسان ہے مسٹر صحافی۔ جب تک موقع نہ ملے سب کتابی باتیں کرتے ہیں۔ کہ عاقبت خراب کر کے قارون کا خزانہ بھی میں نہ لوں مگر موقع ملتا ہے تو وہی لوگ بڑی کم قیمت لگاتے ہیں اپنی۔ دس ہیں ہزار یا لاکھ دو لاکھ۔ اسمبلی کے رکن تم کیا ہو گے لیکن آج اگر تمہیں موقع ملے کہ سازش کر کے ایڈیٹر کو نکلوا سکو اور خود اس کی جگہ لے سکو تو تم موقع ہاتھ سے جانے نہیں دو گے۔"

"آپ کسی پرذاتی حملہ مت کریں" قاذی نے کہا۔

"میں عام بات کر رہی تھی۔ کردار کے غازی بننا بہت مشکل کام ہے۔"

صدیقی نے پہلو بدل کے کہا "چلیں آپ سکندر کی مدد سے اپنے شوہر سے مل آئیں۔ بڑی نیکی کی اس نے آپ کے ساتھ۔ اور کچھ؟"

"آپ میرے مہمان ہیں اور مجھے اپنا مہمان بنا چکے ہیں۔ مجھے ڈر نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ میں نے دوستوں اور دشمنوں کے چہرے اچھی طرح پہچان لیے ہیں۔" دلاور کی بیوی اب شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھی "کیا تیر مارا آپ نے یا دلاور کے دوستوں نے۔ وہ اسی شہر میں ہے۔ زمین سے چند فٹ نیچے قید ہے۔ لاہور شہر کے کسی علاقے میں۔ کتنا رقبہ ہے لاہور کا۔ یہ کوئی بلک یا برا اعظم تو نہیں ہے۔ سنا ہے اب جہاز آسمان میں پرواز کرتا ہے اور آلات زیر زمین خزانوں کا سراغ بتا دیتے ہیں۔ کہاں سوتا ہے کہاں پولیس

www.paksociety.com

کہاں تھل ہے اور کہاں پانی۔ ہمارے یہ بڑی بڑی تنخواہیں لینے والے، مقابلے کے امتحان میں پاس ہو کے شاندار کرسیوں تک پہنچ جانے والے ذہین پولیس افسران اور ان کے تجربہ کار ماتحتوں کی فوج چوہدری دلاور کو تلاش نہیں کر سکی۔ کیا اس پر مجھے شرم آنی چاہیے۔ اس کے محافظ اسے بچا نہیں سکے اس کے دوست اسے بھول گئے۔ اس کا نمک کھانے والے "اس کے گن گانے والے اس کے پلٹو کتے۔ وفادار ملازم اور شہر میں دندنانے والے شکاری۔ سب مل کے کچھ نہیں کر سکے۔ پھر میں کیا کرتی۔ کب تک انتظار کرتی۔ کب تک اس کرب میں مبتلا رہتی جو ایک بیوی اور ایک ماں اٹھاتی ہے۔ جو بیٹے اور بیٹیاں جھیلتے ہیں۔ کوئی نہیں تھا یہ خبر لانے والا کہ چوہدری دلاور زندہ ہے یا مر گیا۔ ایسے میں اگر مجھے امید کی کرن نظر آئی تو کیا میں پولیس کو یا چوہدری دلاور کے دوست نما دشمنوں کو بتا کے اسے بھی بجھا دیتی؟ چوہدری دلاور کے کاروباری معاملات سے میرا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس کی اولاد کا تعلق نہیں رہا مگر ان حالات میں کیا یہ ممکن تھا کہ میں گھر میں بیٹھی رہتی۔ صرف آنسو بہاتی رہوں۔ میلاد اور ختم کراتی رہوں اور دعائیں مانگتی رہوں۔ مجھے گھر سے نکلنا پڑا اور آج یہاں آپ سب کو بلا کے یہ بتاتے ہوئے مجھے کوئی ندامت نہیں کہ میں نے دشمن کا سہارا لیا مگر اپنے شوہر کا سراغ لگا لیا۔ جو کام آپ سب اور اس کے دوست ساتھی مددگار وظیفہ خوار نہ کر سکے وہ میں نے کیا۔ میں بتاتی ہوں آپ کو کہ چوہدری دلاور زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اب آپ کتنی بھی تفتیش کر لیں ایس پی صاحب اور ایک بار نہیں دس بار STATEMENT لیں تھانے میں۔ جو بات مجھے معلوم ہی نہیں وہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی کہ چوہدری دلاور کہاں ہے۔ جتنا مجھے معلوم تھا میں نے سب کے سامنے بتا دیا۔ اب باقی کام آپ کریں۔"

ایس ایس پی صدیقی کے لیے ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ پورے پولیس کے محکمے پر آنے والے نالائقی کے الزام کا دفاع کرتا "مسز دلاور۔ کیا آپ کی بات ختم ہو گئی۔ ابھی تک آپ نے اس واردات کا حوالہ نہیں دیا جس کے نتیجے میں آپ پر جسمانی تشدد ہوا تھا۔ جس حالت میں آپ سب کے سامنے آئی تھیں۔"

"اس کا سکندر بخت سے یا چوہدری دلاور کے دشمنوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ مہربانی تھی اس کے دست راست کی۔ اس شخص کی جس پر وہ سب سے زیادہ اعتبار کرتا تھا۔ جسے اس نے کاروبار میں حصے دار بنا رکھا تھا۔ جو دلاور کا پارٹنر تھا، رازدار تھا، دوست اور ساتھی تھا۔"

صدیقی نے طنز سے کہا "اس کا نام بھی نہیں لیں گی آپ؟"

"اس کا نام ہے شوکت رانا" وہ چیخ کے بولی "سن لیا آپ نے وہ احسان فراموش کتا جو کل تک چوہدری دلاور کو دیکھ کے دبک جاتا تھا اور میرے سامنے خوشامدانہ انداز میں دم ہلاتا تھا جس کے پاس صرف پیسہ تھا۔ حوصلہ اور دم خم نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ پیسہ کس کا تھا لیکن پیسے کے سوا اس کے پاس اپنا کچھ نہیں تھا۔ نہ خاندان، نہ حوالہ۔ نہ کردار نہ شخصیت۔ دلاور نے اسے سہارا دیا۔ اسے اہمیت دی۔"

نہ جانے کس نے کہا "اللہ نیکی کا اجر دے گی چوہدری دلاور صاحب کو۔"

سب کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی مگر دلاور کی بیوی نے اس طنز کو نظرانداز کر دیا "مجھے اس کے بیک گراؤنڈ سے کوئی غرض نہیں اور اس سے بھی کہ وہ چوہدری دلاور کے ساتھ مل کے کیا کرتا تھا۔ مگر چوہدری دلاور کے غائب ہوتے ہی اس کمینہ خصلت انسان کے اندر چھپا ہوا شیطان باہر آگیا۔ اس وقت جب دلاور کے بیوی بچے پریشان تھے کیا یہ اس کا فرض نہیں بنتا تھا کہ وہ ان سے ہمدردی کرتا اور ان کو تسلی دیتا لیکن اس نے تو سمجھ لیا کہ چوہدری دلاور نہیں رہا تو سب کچھ اس کا ہو گیا ہے۔ اللہ انہیں سلامت رکھے چوہدری صاحب کی زندگی ہی میں ان کے دوستوں کا اصلی چہرہ سامنے آگیا۔ ان نمک حراموں نے مل کے سازش کی اور شوکت رانا کو یقین دلایا کہ دلاور کا قصہ تو ختم سمجھو۔ اب کاروبار کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن دلاور کی بیوی تمہاری راہ میں روڑے اٹکائے گی۔ اس کا بیٹا ابھی بالغ تو نہیں مگر بچہ بھی نہیں۔ ان کو ختم کر دو تو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ کل رات اس نے مجھے ایک اہم کاروباری معاملے پر بات کرنے کے لیے بلایا۔ کاروبار سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا مگر اس نے کہا کہ ایسے کب تک چلے گا۔ چوہدری دلاور کا کچھ پتا نہیں اور ایک پارٹنر کے نہ ہونے سے بہت سے کاروباری اور قانونی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ میں نے وکیل کو بلایا ہے جو چوہدری دلاور کی طرف سے تمہارے نام جنرل پاور آف اٹارنی تیار کرا دے گا اور اس کے بعد تم چوہدری دلاور کی جگہ تمام معاملات طے کرنے کی مجاز ہو جاؤ گی۔ شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔"

"شک کی بات کیوں نہیں تھی مسز دلاور۔" رابعہ نے کہا "آپ اتنا تو جانتی ہوں گی کہ پاور آف اٹارنی دینے والے کو موجود ہونا چاہیے۔ کسی کی عدم موجودگی میں یا فوت ہو جانے کی صورت میں پاور آف اٹارنی کیسے مل سکتی ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ یہ بات مجھے معلوم تھی مگر وکیل صاحب آپ کو عدالتوں کا تجربہ ہے۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ کیا وہاں سب کچھ قانون کے عین مطابق ہوتا ہے؟ کیا واقعی رجسٹرار کے سامنے مختار نامے پر دستخط کرنے والا وہی شخص ہوتا ہے جو مختار نامہ بناتا ہے۔ اسے ایک وکیل شناخت کرتا ہے۔ وکیل اپنا ہو تو کیا چوہدری دلاور کے دستخط کوئی اور نہیں کر سکتا اور اگر رجسٹرار کو سب پہلے سے سمجھا دیا جائے کہ ایسا ہوگا تو کیا وہ خاموشی کی قیمت وصول کر کے مختار نامہ رجسٹر نہیں کرتا؟ میں یہ نہیں کہتی کہ سب کرتے ہیں لیکن ایسا بھی ہوتا ہے۔ رجسٹرار کو صرف یہ یقین ہونا چاہیے کہ وہ شخص زندہ ہے اور اس کی گردن کسی فراڈ میں نہیں پھنسے گی۔"

"آپ تو خاصا قانون کو سمجھتی ہیں۔؟"

"یہ سب میں جانتی نہیں تھی۔ مجھے سمجھا دیا گیا۔ وکیل نے مجھ سے کہا کہ اس کے لیے پچھلی تاریخ کا اسٹامپ پیپر حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ چوہدری صاحب کو لاپتا ہوئے ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا یہاں تو ایک سال پرانی تاریخ کے اسٹامپ پیپر مل جاتے ہیں۔ بس ان کی قیمت خریدار کی ضرورت کے مطابق سو گنا یا ہزار گنا وصول کی جاتی ہے۔ رکھنے والے ہر تاریخ کے اسٹامپ پیپر خرید کے محفوظ رکھتے ہیں اور بعد میں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کون چیلنج کر سکتا تھا اس مختار نامے کو جس پر دو مہینے پہلے کی تاریخ ہو اور چوہدری دلاور کے دستخط ہوں۔ وہ دستاویز میں نے ایک اور وکیل کو بھی دکھائی تھی اور اس نے کہا کہ بے شک اس کی رو سے تمام اختیارات آپ کو حاصل ہو جائیں گے۔ اس میں کوئی بات غیر قانونی نہیں۔ چوہدری صاحب کسی کو بھی اپنا اٹارنی بنا سکتے ہیں۔ آپ تو بیوی ہیں ان کی۔ لوگ ملک سے باہر ہوتے ہیں یہاں ان کے نام سے پراپرٹی خریدی اور بیچی جاتی ہے۔ گیس فون لگ جاتے ہیں۔ گاڑیاں ٹرانسفر ہوتی ہیں۔ دستخط کوئی بھی کرتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"یہ سب ہوتا ہے یو آر رائٹ" غازی نے کہا جو اب اپنی پوزیشن ٹھیک کرنا چاہتا تھا کیونکہ مسز دلاور نے دوبارہ اسے گفتار کا غازی کہہ دیا تھا۔

"شوکت رانا نے مجھے اس دستاویز پر دستخط کرنے کے لیے آفس بلایا تھا" مسز دلاور نے کہا "اس آفس میں ایک کمرا میرا بھی تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ چوہدری دلاور کا پرائیویٹ روم تھا جہاں میں اکثر چلی جاتی تھی۔"

"اور کون جاتا تھا" پیچھے سے کسی نے کہا تو لوگ پھر مسکرا گئے۔

"میں جانتی ہوں کہ چوہدری دلاور کوئی شریف اور پاکباز آدمی نہیں تھا۔ جب پیسہ آتا ہے تو کتنے لوگ ہیں جو شرافت کے پرانے اصولوں پر اسی طرح قائم رہتے ہیں اور اسی صراطِ مستقیم پر چلتے رہتے ہیں جس پر چلنا کسی عام آدمی کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا۔ مگر میں اپنے شوہر کی جیلر نہیں تھی۔ میرے لیے یہ اطمینان کافی تھا کہ شوہر وہ صرف میرا ہے اور باپ صرف میرے بچوں کا ہے۔ پلیز مجھے ادھر ادھر کی باتوں میں مت الجھائیں۔ جو ہے وہ آپ سب کے علم میں ہے۔ وہ سن لیں جو آپ نہیں جانتے۔ شوکت رانا نے مجھے آفس کے تہہ خانے میں قید کر دیا تھا۔ وہاں وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ وکیل بھی تھا۔ اوپر چوکیدار بھی تھا مگر وہ سب اسی کے ساتھی تھے۔ سب غدار نمک حرام اور ضمیر فروش بک چکے تھے۔ چند منٹ کے بعد وکیل اٹھ گیا کہ میں ابھی آتا ہوں اوپر سے ایک فون کال کر کے۔ فون نیچے بھی تھا مگر ڈیڈ کر دیا گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی شوکت رانا نے پہلے مجھے قائل کرنا چاہا کہ میں چوہدری دلاور کا خیال چھوڑ دوں۔ وہ اب واپس نہیں آئے گا۔ کسی دن اس کی لاش مل جائے گی یا ممکن ہے کسی گمنام قبر سے ڈھانچا برآمد ہو جائے۔ اسے سکندر بخت یا اس کے ساتھیوں نے قتل کر دیا ہوگا۔ جب میں نے اسے گالیاں دیں اور شرمندہ کرنے کی کوشش کی تو وہ کھل کے سامنے آگیا۔ اس نے مجھ پر دست درازی کی کوشش کی۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو مجھے بلیک میل کر سکتا تھا۔ اس نے پورا بندوبست کر لیا تھا کہ میری تصویریں اتاری جائیں اور فلم بنائی جائے مگر میں نے اس کا مقابلہ کیا۔ وہ مرد ہے اور بہت توانا ہے مگر آپ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ میں بھی اتنی گئی گزری نہیں ہوں۔ جان بچانے کے لیے تو بلی بھی شیر کا مقابلہ کرتی ہے۔ میں عزت بچانے کے لیے جان دے بھی سکتی تھی اور لے بھی سکتی تھی۔ ناکامی نے اسے پاگل کر دیا۔ میں نے اپنی تمام جسمانی طاقت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور اس مزاحمت کے نتیجے میں میرا جو حال ہوا آپ سب نے دیکھا۔ میں نے کسی سے میک اپ نہیں کرایا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ اخبار والوں کو اور پولیس کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ اب میں میڈیکل چیک اپ کے لیے بھی تیار ہوں۔ پولیس سرجن کے سامنے پیش ہو سکتی ہوں۔ وہ مجھ پر دست درازی اور میری جسمانی حالت کے بارے میں پوری رپورٹ دے سکتا ہے اور یہ بھی بتا سکتا ہے کہ میں کس حد تک اپنی عزت کی حفاظت کرنے میں کامیاب رہی۔ وہ شیطان شوکت رانا بھی زخمی ہوا تھا مگر چیخ پکار سن کے چوکیدار ڈر گیا اور اس نے نیچے آ کے شوکت رانا کی مدد کی۔ وہ جاتے جاتے مجھے تہہ خانے میں مقفل کر گیا۔ تہہ خانے میں ہوا کا کوئی گزر نہیں۔ اس کے ہوا باہر پھینکنے والے پنکھے اور ایئرکنڈیشنر سب کا کنکشن کاٹ دیا گیا تھا۔ میں بالآخر وہاں دم گھٹ کے یا بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کے مر جاتی مگر باہر کسی کے کانوں تک میری فریاد نہ جاتی۔ کوئی بھی میری مدد کو نہ آتا لیکن خدا کو شاید یہ منظور نہیں تھا کہ میرے بچے یتیم ہوں۔ شوکت رانا کے جاتے ہی چوکیدار نے مجھے آزاد کر دیا۔ وہ بہت ڈر گیا تھا۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ کے مجھ سے معافی مانگی کہ وہ لالچ کی وجہ سے شوکت رانا کی باتوں میں آگیا تھا۔ میں نے اسے معاف کر دیا کیونکہ اس نے بہرحال میری زندگی بچائی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ اب تم رفع ہو جاؤ۔ دوبارہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا اگر شوکت رانا نے پھر تمہیں دیکھا تو گولی مار دے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ چوکیدار اب کسی کو نظر نہیں آئے گا۔"

صدیقی نے کہا "مسز دلاور وہی ایک گواہ تھا اس ساری کہانی کا جسے آپ نے فرار کرا دیا۔"

غازی بولا "وہ وکیل بھی تو ہے۔"

www.paksociety.com

"وکیل کے خلاف آپ رپورٹ لکھوا دیں۔ ایکشن میں لوں گا مگر یہ سوچ لیں کہ اس کے خلاف جرم ثابت کیسے ہوگا؟"

"وہ مختار نامہ کہاں ہے مسز دلاور؟" قاضی بولا۔

"وہ اسی وکیل کے پاس تھا۔ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں لیکن شوکت رانا اصل مجرم ہے۔ آپ بے گناہوں سے اعتراف جرم کرا لیتے ہیں ایس پی صاحب تو مجرم سے نہیں پوچھ سکتے۔"

"کسی کے کہنے سے کوئی مجرم نہیں ہو جاتا مسز دلاور۔ لیکن آپ مطمئن رہیں۔ میں انکار نہیں کر رہا ہوں۔"

دلاور کی بیوی نے کہا "آزادی ملتے ہی میں سیدھی اپنے گھر گئی مجھے ڈر تھا کہ جیسے ہی شوکت رانا کو معلوم ہوگا کہ میں قید سے رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہوں وہ میرے گھر پہنچے گا اور مجھے قتل کر کے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ وہ میرے بچوں کی زندگی کا دشمن نہ ہو جائے۔ میں سب کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آگئی اور رات میں نے اس ہوٹل میں گزاری۔ میں نے اپنی حفاظت کا پورا بندوبست کر لیا ہے مگر ایس پی صاحب' میں آپ سے بھی تحفظ مانگتی ہوں۔ میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ شوکت رانا کے عزائم کیا تھے۔ وہ چوہدری دلاور کے کاروبار پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ چوہدری دلاور زندہ ہے اور اللہ نہ کرے کچھ ہوتا ہے تو جو کچھ ان کا ہے وہ میرا ہے اور میرے بچوں کا ہے۔ میرے حق کی اور میری زندگی کی حفاظت کرنا قانون کا فرض ہے۔ شوکت رانا کو گرفتار کرنا بھی آپ کا کام ہے۔"

"مجھے یہ مت بتائیں کہ میرے فرائض کیا ہیں۔ میں صرف ایک کیس کی تفتیش کر رہا ہوں مسز دلاور۔ مجھے ڈاکٹر شبلی کے قاتل کو گرفتار کرنا ہے اور اسے مقامی حکام کے حوالے کر کے واپس لوٹ جانا ہے۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا ہے۔ اس کا ذمے دار میں نہیں ہوں۔ آپ اپنا کیس مقامی پولیس کے پاس لے جائیں اور جو کہنا ہے ان سے کہیں۔"

رابعہ نے کہا "یہ کیس بھی دلاور سے RELATED ہے۔"

"RELATED؟ اگر دلاور کے گھر میں چوری ہو جائے یا ڈاکا پڑے' کوئی اس کی بیوی کو اغوا کر لے یا اس کی گاڑی کو آگ لگا دے۔ ان معاملات کا ڈاکٹر شبلی کے قتل سے کیا تعلق؟ اگر ہے تو مجھے بتائیں۔ میں اسے بھی تفتیش کے دائرے میں شامل کر لوں گا۔ فی الحال تو مجھے براہ راست شہادت یہ ملی ہے کہ مبینہ قاتل کی بیوی نے چھپ کر اس سے ملاقات کی تھی اور اس کا دعویٰ ہے کہ وہ اسی شہر کے کسی مکان کے تہ خانے میں قید ہے۔ مجھے دیکھنا ہے کہ یہ کہانی کس حد تک قابل قبول ہے اور اگر یہ ٹھیک ہے تو مسز دلاور پر بھی اعانت مجرمانہ کا الزام ہے اور قانون سب کے لیے ایک ہے خواہ کوئی ملزم کا دوست ہو یا رشتے دار۔ ملزم کی مدد کرنا اور اسے روپوشی میں مدد دینا' اس کے بارے میں حقائق کو پوشیدہ رکھنا۔ سب جرم کے دائرے میں آتے ہیں اور اسی لیے میں آپ کو حراست میں لینے پر مجبور ہوں مسز دلاور۔ تاہم اس سے آپ کے دیگر حقوق متاثر نہیں ہوتے۔ میں اتنا کر سکتا ہوں کہ متعلقہ ایس ایچ او خود یہاں آجائے۔ آپ کی رپورٹ لکھے اور شوکت رانا کی گرفتاری کے لیے ضابطے کی کارروائی کرے۔"

"آپ اپنا اثر و رسوخ استعمال نہیں کر سکتے؟" قاضی بولا۔

"میرا خیال ہے کہ مسز دلاور کا اثر و رسوخ مقامی پولیس کی حد تک کم نہیں ہے۔" صدیقی نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ان کی بات کون ٹال سکتا ہے۔ کس کی مجال کہ ان کو کوئی [illegible] نہ رہے۔ میں ان کے مراسم کی نوعیت سے واقف ہوں۔ اتنا ہی جتنا آپ جانتے ہیں۔ رہی حفاظت کی بات تو یہ ذاتی محافظوں کی فوج رکھ سکتی ہیں اور یہ نہ چاہیں تو پرندہ ان کے قریب پر نہیں مار سکتا۔ اس کا تجربہ بھی آپ سب کو کل سے آج تک ہوا ہوگا۔"

"آپ بہت بول چکے ایس ایس پی صاحب" دلاور کی بیوی کے بجائے فیصل نے اچانک بلند آواز میں کہا "اس بار آپ نے میرے باپ کو قاتل کہا۔ جرم ثابت ہونے سے پہلے ہی۔ میں پوچھتا ہوں کیا ملزم کے کوئی قانونی حقوق نہیں ہوتے۔ کیا اسے انصاف فراہم کرنا آپ کی ذمے داری نہیں ہے۔"

"ٹیک اٹ ایزی بوائے۔" صدیقی نے نرمی سے کہا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مجھے بتائیں کہ آج کچھ لوگ آپ کو انتقام لینے کے لیے اٹھا کر لے جائیں۔ دشمنی ان کی ہو آپ سے۔ سزا کسے ملے گی؟ آپ کو اور آپ کی بیوی کو؟ اگر اسی طرح آپ کو جانوروں کی طرح کسی تہ خانے میں ڈال دیا جائے۔ جہاں انسان تو کیا روشنی کا گزر بھی نہ ہو۔ جہاں آپ کو دن رات تشدد کا نشانہ بنایا جائے۔ آپ کو بھوکا رکھا جائے۔ آپ اسی کوٹھری میں پیشاب پاخانہ کرتے اور اسی غلاظت میں اٹھنے بیٹھنے اور سونے پر مجبور ہوں اور پھر یہ تماشا آپ کی بیوی کو دکھا دیا جائے۔ تو مجھے بتائیں ان پر کیا گزرے گی؟ اگر وہ مجرم ہے تو اسے گرفتار کریں۔ عدالت میں لائیں اور جرم ثابت ہو جائے تو جیل میں ڈال دیں۔ پھانسی دے دو مگر جو کچھ میرے باپ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ وہ کس کھاتے میں جائے گا۔ کیا عدالت اسے سزا میں شمار کرے گی۔ کوئی رعایت دے گی اسے کہ اس نے جیل سے زیادہ سخت جیل کاٹی؟ میں آپ سب سے مطالبہ کرتا ہوں کہ میرے باپ کے ساتھ یہ انسانیت سوز سلوک کرنے والوں کو پکڑا جائے۔ میرے باپ کو عدالت میں پیش کیا جائے تاکہ اسے انصاف ملے۔ اسے ملک کے قانون کے مطابق اپنی صفائی پیش کرنے کا حق ملے ایک عام شہری کی طرح۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہو رہا ہے وہ تو قانون میں بھی نہیں ہوتا۔ آخر کب تک ہوگا اس پر یہ تشدد۔ کب تک ہم یہ سوچ سوچ کے پاگل ہوتے رہیں گے۔ اگر وہ ذلیل ہو کر مر گیا تو کون ذمے دار ہوگا اس کی موت کا؟ پولیس کا اتا پتا نہ ملا۔ سراغ رساں ادارے' سی آئی اے' ایف آئی اے' خفیہ پولیس' [illegible]

"اور وہ مجرم تھا تو اسے سزا دلوا دیں۔ ہم تو مجرم نہیں ہیں۔" لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ لوگ مسز دلاور کے گرد جمع ہو گئے اور اسے تسلی دینے لگے کہ وہ فکر نہ کرے۔ کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور دلاور کو بھی قانون کے مطابق عدالت میں خود کو بے گناہ ثابت کرنے کا موقع ضرور ملے گا۔ پریس اس معاملے میں ان کا ساتھ دے گا۔

مسز دلاور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے میری بات کو ہدف نہیں بنایا تھا اور میرے کردار کی خوبیوں کا اعتراف کر کے بالواسطہ طور پر سب کی ہمدردی حاصل کر لی تھی۔ اگر وہ جاہل عورتوں کی طرح مجھے گالیاں اور کوسنے دیتی تو کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اس نے شوکت رانا کا بھی خانہ خراب کر دیا تھا اور اپنی پوزیشن اتنی مستحکم کر لی تھی کہ عام لوگوں کی نظر میں چوہدری دلاور جیسے شخص کو بھی مظلوم کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔

خود صدیقی خاموش تھا اور اس پر فیصل کی بات کا اثر کچھ زیادہ ہی ہوا تھا "منظر صاحب۔ آپ ابھی تک خاموش ہیں۔ اور آپ کی رائے۔ کچھ بتائیے کہ دلاور کے بارے میں کوئی اطلاع دی ہے آپ کے پرائیویٹ سراغ رسانوں نے؟"

محسن ابھی تک نہیں پہنچا تھا اور ظاہر ہے اس کے آنے تک کوئی بھی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ مجھے یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ اس پریس کانفرنس کے فوراً بعد چوہدری دلاور کے گرفتار ہونے کا رائے عامہ پر بہت برا اثر پڑے گا۔ سمجھا یہی جائے گا کہ پولیس بھی شوکت رانا سے ملی ہوئی تھی۔ خصوصی تفتیشی ٹیم نمبر دو کی مستعدی اور گرفتاری میں بھی پریس کے دباؤ کا ہاتھ تھا اور یہ دوسری ٹیم بھی [illegible] نہیں تھی۔ یہ بھی اس وقت حرکت میں آئی جب اس پر اخبارات کا دباؤ پڑا۔ مسز دلاور کی پریس کانفرنس نہ ہوتی تو دلاور کی گرفتاری نہ ہوتا۔ وہ پولیس کی تحویل میں رہتا جس نے اسے کسی تہ خانے میں ڈال رکھا تھا لیکن پبلک کے سامنے وہ ظاہر کرتے کہ انہیں کچھ معلوم نہیں۔ شاید شوکت رانا نے انہیں اس کام کی بہت بڑی قیمت ادا کی ہوگی کہ جب تک وہ دلاور کے کاروباری معاملات پر پوری طرح قابض نہ ہو جائے اسے کسی عدالت میں نہ پیش کیا جائے۔ شوکت رانا نے دلاور کے کاروبار پر قبضہ کرنے کی سازش ہی نہیں کی تھی۔ یہ بھی طے کر لیا تھا کہ دلاور کے خاندان کو نیست و نابود کر دے۔ اس کا الزام مقتول رحمت پر آتا اور شوکت رانا کے لیے کسی قسم کے قانونی مسائل پیدا نہ ہوتے۔

ہم نے ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھ کے چائے پینے اور محسن کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ چار بجنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ صدیقی نے اے ایس پی آفتاب کو ہدایت کی تھی کہ وہ مسز دلاور کی حفاظت کا انتظام کرے اور اسے ہر سہولت فراہم کرے۔ اگر وہ رپورٹ لکھوانا چاہے تو متعلقہ تھانے کے ایس پی یا ڈی ایس پی سے کہا کہ ایک گھنٹے میں فوراً ایس ایچ او یہاں ایف آئی آر لکھنے کے

"تم یہ سب کس کام کے اگر اس شہر میں ایک آدمی انصاف انصاف چلاتا مر گیا۔ کون ہیں اسے یہ سزا دینے والے۔ کیا قانونی اختیار حاصل ہے انہیں کہ وہ خود کسی کو گرفتار کریں اور خود سزا دیں۔ وہ کون ہیں اور کیوں پکڑے نہیں جاتے۔ کیا یہاں جنگل کا قانون ہے۔ ہر شخص جسے ملزم سمجھے اسے خود سزا دے سکتا ہے۔ اپنی جیل بنا سکتا ہے۔ خود اسے پھانسی دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر پولیس کا محکمہ توڑ دینا چاہیے۔ عدالتوں کو ختم کر دینا چاہیے۔ ضابطوں اور تعزیرات کی قانونی کتابیں جلا دینی چاہئیں۔ اگر میرا باپ اسی تہ خانے میں مر گیا تو میں آج آپ سب کو بتا رہا ہوں کہ پھر میں بھی یہی کروں گا۔ میں خود ان سب کو چن چن کے مار ڈالوں گا جو اس کی موت کے ذمے دار ہوں گے۔ میرا اپنا قانون ہوگا اور اپنا نظام انصاف۔ میں ان سب سے نمٹ لوں گا آج نہ سہی کل۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے پہلے ہی وہ مجھے بھی مار دیں اور آپ کا کام آسان ہو جائے۔ آپ کو کسی دن دلاور کی لاش مل جائے ایس ایس پی صاحب تو آپ کا خصوصی تفتیش کا یہ کام ہی ختم ہو جائے جس کے لیے آپ نے اسلام آباد سے لاہور تشریف لانے کی زحمت گوارا کی ہے۔ شاید اسی کا انتظار کر رہے ہیں آپ بھی۔ ایبانڈی اے ڈی اے مل رہے ہیں اور بس۔ آپ کا کام صرف ایک جملے پر ختم ہو جائے گا کہ ملزم کی ہلاکت کے بعد کیس داخل دفتر سمجھا جائے۔ یہی ہے آپ کی خصوصی تفتیشی ٹیم کا مقصد اور کمال۔ آئی سے۔ ٹو ہیل ود یو آل۔" وہ ایک دم کرسی پر گرا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ "لعنت بھیجتا ہوں میں تم سب پر۔"

چلانے سے اس کا سانس پھول گیا تھا مگر اپنی ماں سے زیادہ فیصل نے اپنی بات سے سب کو احساس دلا دیا تھا کہ قانون اور انصاف کا یہ فرسودہ نظام کتنا بے حس اور بے مصرف ہے اور وہ سب ادارے جو معاشرے میں عدل و انصاف کے ٹھیکے دار بنے ہوئے ہیں کتنے بے بس ہیں۔ اس حقیقت کی سفاکی آج چوہدری دلاور کا بیٹا محسوس کر رہا تھا۔ جو کل وزیر خان کے بیٹے نے محسوس کی تھی۔ وقت کا پہیہ الٹا چلنے لگا تھا اور جہاں کل میں تھا وہاں آج فیصل اتنا ہی دکھی بے بس اور مشتعل تھا جتنا میں۔ اس کے سچ کو سب نے اپنے منہ پر پڑنے والے طمانچے کی طرح محسوس کیا تھا۔

خود میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اب یہ قصہ تمام ہو جانا چاہیے۔ مجھے دلاور کو قانون کے حوالے کر دینا چاہیے۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کا فیصلہ ہم پہلے ہی کر چکے تھے۔

"ٹھیک ہے جنٹلمین۔ آپ تشریف لائے' بڑی مہربانی آپ کی۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب آپ لوگ کیا کرتے ہیں۔ آپ سب نے جو چاہا دلاور کو لکھا اور کہا۔ آج وہ مظلوم ہے اور اس کا خاندان ناانصافی کا شکار ہے۔ اسے انصاف دلانے کے لیے انہیں عزت آبرو سے زندہ رہنے کے مواقع فراہم کرنے کے لیے بھی کچھ کریں۔"

www.paksociety.com

لیے پہنچ جائے۔

وہ خود ہمارے ساتھ رہا "رائٹ ہاؤ جینٹل مینز۔ مجھے بتائیے میں کیا کروں؟ میں خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا ہوں۔ صرف آپ لوگوں کی وجہ سے۔ عام لوگ ہوتے آپ تو میں آپ سب کو آج رات کسی تھانے میں بلاتا اور پوچھ لیتا کہ چوہدری دلاور کہاں ہے؟"

"اور اسے برآمد بھی کر لیتے صبح تک؟"

اس نے دھڑ سے میز پر ہاتھ مارا "میں اسے شرطیہ برآمد کر لیتا مگر میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ آپ سب مدعی ہیں اور بہت بڑے اور نامور وکیل ہیں۔ میں آپ کی بات ماننے پر مجبور ہوں کہ آپ کی پرائیویٹ سراغ رساں ایجنسی کی اطلاع ملے گی تو دلاور کی گرفتاری عمل میں آئے گی۔ ورنہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ خود کو اتنا احمق اور بے بس میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔"

منظر نے خوش دلی سے کہا "ابھی سے مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ زندگی میں بہت مواقع آئیں گے۔"

اس نے مشتعل ہو کے کہا "سیدھی طرح بتاؤ مجھے۔ چوہدری دلاور کہاں ہے۔ میں اسے قانون کے مطابق گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ میری پوزیشن کلیئر ہو۔ الزام مجھ پر آ رہا ہے کہ میں شاید شوکت رانا سے ملا ہوا ہوں۔"

"کس نے روکا ہے آپ کو اپنی پوزیشن کلیئر کرنے سے ایس ایس پی صاحب۔ اگر آپ کو ہمارے تعاون کی ضرورت نہیں تو ٹھیک ہے۔ ہم کیا بتائیں کہ چوہدری دلاور کہاں ہے۔ ہم تو خود اس کیس میں مدعی ہیں اور یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اسے گرفتار کیا جائے" رابعہ نے کہا۔ "اگر پولیس کے روایتی طریقے کے مطابق اسی کو پکڑنا ہے جو شکایت کرے تو پھر دیر کیسی؟ ہمیں لے چلیں اپنے ساتھ اور آج رات تفتیش کا شوق بھی پورا کر لیں۔ کل جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

صدیقی ٹھنڈا پڑ گیا۔ "پلیز جینٹلمین۔ میری مدد کریں، مس رابعہ! برا مت مانیں۔ آپ کا بس..." اچانک وہ رک گیا۔ "نہیں یہ بات نہیں کہنی چاہیے مجھے۔ ورنہ آپ میری زبان پکڑ لیں گے۔ زبان خلق کی بات اور ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ وہ رابعہ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کا تو سکندر سے ہر وقت ہر جگہ اور ہر حال میں رابطہ ہوگا۔ نہ وہ آپ سے جدا ہے نہ آپ اس سے دور۔ کون نہیں جانتا رابعہ اور سکندر کے درمیان کیسا اٹوٹ رشتہ ہے۔

لیکن اس نے احتیاط کو ملحوظ رکھا یا احترام کو۔ یہی بات وہ منظر سے بھی کہہ سکتا تھا کہ تمہارا تو وہ جگری یار ہے اور کون نہیں جانتا کہ تم اس کی پشت پناہی میں سب سے آگے ہو۔ وہ یقیناً ایم آر ایس کے وجود اور اس کے اغراض و مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں شامل تمام افراد کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہوگا مگر اس کے سامنے سکندر کا دوست اور سکندر کی جان تمنا تھی… نیک نام وکیل تھے جو قانون کی زبان میں بات کرتے تھے۔

"آج دلاور کو گرفتار کرنا مناسب نہیں رہے گا" صدیقی نے… یوں کہا جیسے خود سے ہم کلام ہو۔

"میں متفق ہوں آپ سے۔ اس سے مسز دلاور کے الزامات کی تائید اور توثیق ہو جائے گی۔ زبان خلق کہے گی کہ ادھر مسز دلاور نے دہائی دی اور پولیس نے گھبرا کے دلاور کو پیش کر دیا۔ ایک… گزر جائیں تو کیا فرق پڑے گا۔ درمیان میں آپ بھی… جاری کر سکتے ہیں کہ مسز دلاور نے غصے میں پولیس کی کوشش کو یکسر نظرانداز کر دیا۔ ہم اپنی کوشش میں تقریباً کامیاب ہو چکے ہیں اور چند دن یا چند گھنٹے میں چوہدری دلاور کو برآمد کر لیا جائے گا۔"

صدیقی نے کچھ اطمینان کا سانس لیا "ایک بات عجیب ہے ابھی تک کسی نے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ… عام بات نہیں ہے۔"

رابعہ نے کہا "معموں میں بات نہ کریں آپ۔"

"گزشتہ شب چوہدری دلاور کے آفس "سی ڈی انٹرپرائزز" کو دھماکے سے اڑا دیا گیا۔ عمارت بالکل تباہ ہو گئی۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں مسز دلاور کے کہنے کے مطابق انہیں قید رکھا گیا تھا۔"

"میں نے آج کا اخبار نہیں دیکھا" رابعہ بولی۔

"صبح کے اخبارات میں یہ خبر نہیں چھپی۔ واقعہ آخر شب کا ہے" صدیقی نے کہا "لیکن مسز دلاور نے بھی کچھ نہیں کہا۔"

"ممکن ہے اسے معلوم ہی نہ ہو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"وہ کل رات سے ہوٹل میں چھپی ہوئی تھی۔ اپنے بچوں کے ساتھ اسے وہاں یہ خبر سنانے والا کون تھا۔"

صدیقی نے سر ہلایا "ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر کیا یہ بھی شوکت رانا کی حرکت ہو سکتی ہے۔ کیا اس نے یہ فرض کر کے کہ مسز دلاور ابھی تک وہیں قید ہے اس جگہ پہلے سے نصب بم دھماکا کیا۔ وہ کوئی چانس نہیں لینا چاہتا ہوگا۔ مسز دلاور کو دم گھٹنے سے یا بھوک پیاس سے مرنے میں دو تین دن بھی لگ سکتے تھے۔ ایک ہفتہ بھی گزار لیتی وہ تو ناممکن نہیں تھا۔ اور اتنے عرصے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مسز دلاور کو شاید پتا نہیں تھا کہ شوکت رانا کا بندوبست مکمل ہے۔"

"یو آر ویری رائٹ۔ شوکت رانا چانس کیسے لے سکتا تھا… کارروائی خود اسی نے کی ہوگی مگر الزام آئے گا پھر سکندر پر حالانکہ وہ کراچی میں ہے۔"

"آپ کو معلوم ہے؟" صدیقی بولا۔

"ہاں۔ وہ کبھی کبھی فون کرتا ہے۔ مسز دلاور سے بھی اس کی بات فون پر ہوئی تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ ابھی تک کوئی… تسلی دی "غازی سے بھی نمٹ لیں گے بعد میں اور اس تھانے… بھی۔"

"تم لوگ ابھی تک یہاں بیٹھے ہو۔ چوہدری دلاور کے معاملے… پولیس نے اسے اپنی تحویل میں نہیں لیا۔"

"نہیں۔ ناگزیر وجوہ کی بنا پر یہ معاملہ مؤخر کرنا پڑا۔"

"لیکن یار اب تو ہمارے لیے مسائل بڑھ جائیں گے۔ اگر… فضل نے بیان دے دیا کہ چوہدری دلاور ہماری قید میں ہے… خود اس سے مل چکے ہیں۔ اسے قید میں رکھنے والے سکندر… ہیں۔ وہی ہمیں بھی وہاں لے گئے تھے اور وہ ہمیں دلاور کے خلاف وعدہ معاف گواہ بنانا چاہتے تھے۔ مجبوراً ہم نے ان کی… ورنہ ہم بھی اسی تہ خانے میں پڑے رہتے۔ باہر آ کے جیسے ہی ہمیں موقع ملا ہم فرار ہو گئے۔ میں نے اسی لیے اپنا حلیہ فوراً… اور تو بھی اب چوکیدار کی وردی مت پہننا۔ بس یہی حلیہ… ہے۔"

"مگر تیرا یہ حلیہ اطمینان بخش نہیں ہے۔"

"مجھے زیادہ وقت نہیں ملا تھا۔ آج رات تک کچھ اور وضع… تم لوگ اب یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ جب کرنا کچھ نہیں۔"

"ہم تیرا انتظار کر رہے تھے۔" میں نے کہا اور خادم حسین کی… صدیقی سے مخاطب ہوا "جس اطلاع کا انتظار تھا وہ مل گئی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اسی وقت چوہدری دلاور کو گرفتار کر سکتے ہیں۔"

صدیقی نے محسن کو غور سے دیکھا "یہ شخص اطلاع لایا ہے؟… ہے یہ؟" اس نے بھی خادم حسین سے پوچھا۔

میں نے کہا "ایک ہم وطن ہے۔ دوست بھی ہے۔"

"مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے تم بہت عرصے بعد ملے ہو۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک لگا تمہیں۔ ہم دو سال بعد ملے ہیں… اتفاق سے۔ اسے علم نہیں تھا کہ میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔"

"پھر یہ اطلاع کیسے لایا تمہارا دوست؟"

میں نے کہا "وہ خود حیران تھا۔ ہوٹل کے گیٹ پر کسی نے… روک کے میرا نام لیا اور کہا کہ تمہیں ایک پیغام دینا ہے… ٹھیک چار بجے اپنا مال اٹھانے آ جائیں۔ میرے… نے کہا کہ یہ کیا بکواس ہے۔ موسیو آنوری کون۔ اس نام کا… دوست تھا میرا مگر اس سے میری ملاقات دو سال سے نہیں… اس نے کہا کہ آپ اندر جائیں تو ملاقات بھی ہو جائے گی۔… چلا گیا اور میرا دوست مجھے اندر موجود پا کے مزید حیران ہوا۔… پوچھ رہا تھا کہ یہ کیا پُراسرار کھیل ہے۔ میں نے اسے ٹال…"

"تمہارے دوست نے حلیہ تو دیکھا ہوگا پیغام دینے والے…"

"… کی موٹا پست قد گنجے سر اور بڑی بڑی مونچھوں والا

افغانستان تو ہے نہیں۔" صدیقی بولا۔

اچانک محسن کو ہال کے دروازے سے اندر آتا دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ وہ دیر سے آیا تھا اور اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کے ہمراہ وہ پولیس آفیسر بھی ہوگا جس کی کوٹھی میں دونوں وعدہ معاف گواہ تھے۔ شاید وہ چند منٹ کے وقفے سے بعد میں آئے میں نے سوچا۔

محسن نے اپنا حلیہ بھی خاصا بدل لیا تھا۔ ایک نظر میں اسے پرانے دوستوں کے سوا کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ اس کے بالوں کا رنگ براؤن ہو گیا تھا۔ اس نے چشمہ لگا لیا تھا جس کا نمبر صفر ہوگا۔ اس کے سر پر فرنچ کیپ تھی اور اس نے براؤن چیک کا کوٹ اور گہرے نیلے کی پینٹ کے ساتھ مضحکہ خیز حد تک چوڑی ٹائی لگا رکھی تھی۔

میرے پاس آ کے اس نے چونکنے کی بہترین اداکاری کی اور پھر ایک نعرہ لگا کے مجھ سے یوں گلے ملا جیسے برسوں بعد ملنے والے دوست ملتے ہیں۔ ظاہر ہے مجھے بھی اس کے ساتھ یہی رویہ اختیار کرنا پڑا۔ ہم فرنچ بول رہے تھے جسے مولوی خادم حسین کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

"یار ایک تو تم پہنچے ہو شو ختم ہونے کے بعد۔"

محسن نے کہا "بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے یار۔ غازی کے اس سالے نے حرامی پن کیا۔ اس نے رابعہ کے آفس پہنچ کے دونوں گواہان کا بیان لیا اور انہیں حراست میں لے کر چلا گیا۔ مجھ سے اس نے کہا تھا کہ وہ تین بجے ہوٹل کے گیٹ پر ہوگا۔ تین بجے سے میں گیٹ پر اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ ساڑھے تین بجے میں نے ہوٹل کے کاؤنٹر سے اسے فون کیا تو پتا چلا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہو گیا۔"

"کیا وہ جعلی تھانے دار تھا؟ جو انہیں لے گیا تھا۔"

"نہیں تھانے دار تو ہے وہ۔ مگر حرامی نسل ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ غازی پر بھروسا کرنا ہی نہیں چاہیے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ سب سے بڑا حرامی ہے۔ آج مسز دلاور نے بھی اسے ذلیل کر دیا۔ گفتار کا غازی کہہ دیا دوبارہ۔ سننے والے سب سمجھ گئے۔ اس نے چوہدری دلاور کی بہت جی حضوری کی تھی اور جب وہ سیاست کی دکان چمکانے کی فکر میں تھا تو غازی اس کے لیے پبلک ریلیشنگ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا پی آر او بننے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے اس نے۔ بعد میں وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔ تو ممکن ہے یہ شوکت رانا سے مل گیا ہو۔"

"یہی ہوا ہے دوست۔ فون پر اس نے جواب دیا کہ کون قادر اور کیسا فضل۔ میں کسی کو نہیں جانتا۔ نہ میں نے کسی کو گرفتار کیا ہے اور نہ ساتھ لایا ہوں۔ تم کون ہو؟ کہاں سے بول رہے ہو۔ میں نے اسے گالیاں دیں کہ میں تمہارا ناجائز باپ ہوں اور جہنم سے بول رہا ہوں سور کے بچے۔ اپنی ماں کو بتا دینا۔ اور کیا کرتا میں۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ کبھی دھوکا بھی ہو جاتا ہے" میں نے

www.paksociety.com

تھا۔"

صدیقی بہت کائیاں ثابت ہوا "ان کے درمیان گفتگو کیسے ہوئی؟ کیا پیغام دینے والا فرنچ جانتا تھا۔"

"نہیں۔ میرا دوست انگلش سمجھ لیتا ہے" میں نے بات بنائی۔

"اور اس قبیلے کا آدمی کون ہو سکتا ہے۔ جس نے چودھری دلاور کا سراغ لگا لیا تھا۔ وہ کوئی عام آدمی تو نہیں ہو سکتا۔ تم جانتے ہو گے۔"

"میں تو نہیں جانتا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ منظر یا رابعہ جانتے ہوں۔ میرے ذریعے انہیں پیغام پہنچانا مقصود ہو۔"

صدیقی نے رابعہ اور منظر سے تصدیق چاہی لیکن انہوں نے مجھ سے زیادہ لاعلمی کا اظہار کیا۔

صدیقی کا حوصلہ جواب دے گیا "تم لوگ ایک خطرناک کھیل کھیل رہے ہو میرے ساتھ۔ مجھے بتاؤ کہ اس انفارمیشن پر تم پولیس کو وہاں کیسے لے جاتے جہاں دلاور قید ہے۔ کون راہنمائی کرتا تمہاری؟ یہ تو بہت باشرف۔"

منظر نے غرا کے کہا "ایس ایس پی صاحب۔ دماغ کو ٹھنڈا رکھو۔ تمہیں آم کھانے سے غرض ہے یا پیڑ گننے سے۔ تم چودھری دلاور کو گرفتار کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟ یہ مت بھولو کہ تم مدعی ہیں اور ہمارے ساتھ پولیس کا روایتی طریقہ اختیار کرو گے تو پچھتاؤ گے۔ تمہارے خلاف ایک مشترکہ درخواست دی جا سکتی ہے کہ تم ناکامی کے پیش نظر ہم پر دباؤ ڈال رہے ہو کہ ہم کہیں رابطہ لے لیں۔ بے عزت ہو کے واپس اسلام آباد جانے سے بہتر ہے کہ کچھ کر کے عزت کے ساتھ جاؤ۔ جس سے تمہارا سروس ریکارڈ بہتر ہو۔ تمہیں پروموشن ملے۔ اگر ہم تعاون کر رہے ہیں تم سے تو ضابطے کا پکا مت لو ہم سے۔ سمجھے؟"

صدیقی کا چہرہ احساس ذلت سے سرخ ہو گیا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ ایک دو زور سے کر منظر نے اس کی اکڑ فوں کے غبارے سے ساری ہوا نکال دی تھی۔

"ہم پھر بھی بتائیں گے تمہیں کہ چودھری دلاور کہاں ہے" منظر بولا۔

"یعنی۔ تم اعتراف کر رہے ہو کہ تمہیں معلوم ہے؟"

"جب ہمارے سراغ رسانوں کو معلوم ہے تو ہمیں معلوم ہے۔ اور وہ اتنے زبردست سراغ رساں ہیں کہ تم واقف ہو جاؤ تو ان کے جوتے پالش کرنا۔" منظر نے قریب جا کے رازداری سے کہا "وہ انسان نہیں ہیں ایس ایس پی صاحب۔ جنات ہیں۔ کسی سے ذکر مت کرنا ورنہ لوگ ہنسیں گے تم پر مگر یہ حقیقت ہے۔"

صدیقی ایک دم اٹھا اور اندر چلا گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں اس کی دال نہیں گلے گی۔ ایک لفظ ضائع کیے بغیر ہم مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔ چند منٹ بعد منظر کی گاڑی ہوٹل کے گیٹ سے باہر تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں صدیقی مشتعل ہو کے خفیہ پولیس کے ارکان کو ہمارے پیچھے نہ لگا دے کہ ہماری جو ہیں مجھے گمراہ کیا جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم تعاقب کرنے والوں کو ایسا چکر دیتے کہ وہ خود چکر میں آ جاتے مگر بلاوجہ مصیبت کو پیچھے لگانے اور پھر اس سے جان چھڑانے میں وقت اور توانائی کا زیاں تھا۔

رابعہ نے پریس کانفرنس کا خلاصہ محسن کے گوش گزار کیا اور پھر منظر کے ساتھ اپنے آفس چلی گئی۔ میں خادم اور محسن ہال روڈ کے چوراہے پر اتر گئے۔ خادم حسین بار بار ٹھنڈی سانس لیتا تھا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے۔ تم اس کوّے کی طرح اداس ہو جس کی محبوبہ نے فرمائش کی ہو کہ ہنس کی چال چل کے دکھاؤ۔"

اس نے پھر آہ بھری "ہائیں آنکھ پھڑک رہی ہے جی۔ دوپہر کو کھانے کے وقت ہچکیاں بھی بہت آئیں۔"

"جلدی جلدی زیادہ کھانے سے ایسا ہوتا ہے۔"

"نہیں جی۔ میرا دل کہتا ہے وہ یاد کر رہی ہو گی" میری گھر والی۔ اس کی صورت نظر میں پھر رہی ہے۔"

"یعنی اس کے تصور سے تم پر ہچکی طاری ہے۔ حوصلہ رکھو خادم حسین اللہ تمہاری مشکل آسان کرے گا۔"

محسن بولا "کوئی وظیفہ یاد نہیں تمہیں۔ اس بلا سے چھٹکارے کا۔"

"آپ پڑھیں جی وہ وظیفہ کسی بانو سے نجات کے لیے۔ وہ ہوگی بلا آپ کے لیے۔ میرے لیے تو گھر والی سے بڑھ کے اس دنیا میں کوئی نعمت نہیں" وہ خفگی سے بولا۔

"اب گلے میں ڈھول پڑا ہے تو بجانا ہی پڑے گا لیکن اس بچے ڈھول جیسی چیز کے گن گانا ضروری نہیں ہمارے سامنے۔"

"اب آپ کو کیا بتاؤں جی دل کتنا اداس ہے وہ بیرے۔ مچھلی کھانے کے بعد" وہ بولا "اسے بڑا شوق ہے مچھلی تل کے کھانے کا۔ ایک بار راوی کے کنارے تازہ مچھلی کھائی تھی ہم نے کتنے ہی۔ خادم حسین! مچھلی اچھی ہوتی ہے بشرطیکہ مگر کاش تم مچھیرے ہوتے۔ مچھلی پکڑ سکتے۔ میں کنارے پر جیتی تازہ مچھلی کھائی جاتی۔ صبح سے شام تک۔"

"یا پھر تم ایک بغیر کانٹے والی مچھلی ہوتے" محسن نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں فرائی کر کے تمہیں پیار سے راوی کا مزا چکھتی۔ ابھی تو تم صرف مولوی خادم حسین ہو۔"

مگر یہ بات سن کے بھی مولوی خادم حسین خفا نہیں ہوا تو میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ چاہے تو گھر جا کے آج رات تہجد پڑھ کر آ جائے۔ صبح تک ہم اس کی جدائی برداشت کر سکتے ہیں۔ میں نے اسے ایک ہزار روپے بھی دیے کہ بیوی بچے میں ہوا خالی ہاتھ آنے والے جنوائی کو ایسے ہی دیکھا جاتا ہے جیسے بارات میں پیدل آنے والے دولہا کو۔"

نہیں پوچھتے۔ بیوی خفا ہے تو میں سب اسے دے دیتا ہوں۔ وہ بھی بادل کی جیب میں سے ملتا ہے میرے پاس جمع رہتا ہے۔"

میں نے افسوس سے کہا "بیوی اسے ساتھ کیوں نہیں لے بالا؟"

"جی یہ تو وکیل صاحب ہمیں پتا ہے وہ کیوں آتی ہے۔ ایک تو اسے پیسہ ملتا ہے جو آپ جیسے بادل کو دیتے ہیں اور بادل کے پاس تو وہ اپنی رکھداری کرتی ہے۔ بادل سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اسے ... تمام ہوتے ہی بن سنور کے۔ نکھری۔ وہی وقت ہوتا ہے خوش مزاج لوگوں کے سیر سپاٹے کا۔ کوئی اس کی جوانی کا دل بھی لگائے رہتا ہے۔ وہ خیال کرنے والی ہوتی تو بادل کا یہ حال کیوں ہوتا۔"

"بہت دکھ ہوا یہ جان کے" میں نے دکھ سے کہا۔

"بس کس کس کا دکھ اٹھائیں گے جی آپ۔ یہاں تو ہر فٹ پاتھ پر کوئی بادل ہے یا کوئی بدلی۔"

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ آدمی کو اپنے غم سمیٹنے کی فرصت نہیں۔ سارے جہاں کے لیے دکھی ہونے کی فرصت کہاں سے لائے۔ میں نے بھی بادل کو بھلا دیا اور اس کے دیے ہوئے کاغذ کے پرزے پر غور کرنے لگا۔ اس وقت تک میں محسن کو رابعہ کی گاڑی کے بارے میں سب بتا چکا تھا اور وہ گاڑی اس وقت بھی وہیں کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بم بھی شاید وہیں نصب ہو گا۔ [illegible] بادل نے کی تھی۔ دنیا کے لیے بادل کا وجود سنگ راہ سے بھی زیادہ بے مصرف اور باعث آزار تھا مگر قدرت کے کارخانے کی ہر دان مشینری میں ہر کا نام نظر آتا ہے اللہ تبارک اور حقیر ترین بھی اپنی افادیت کا جواز رکھتا ہے۔ مال روڈ پر رونق، چمکتی دمکتی گاڑیوں اور بے فکروں کے ہجوم میں کون جانتا تھا کہ ایک طرف کوڑے کے ڈھیر کی طرح پڑا ہوا استاد بادل آج ایک نہیں دو انسانوں کی زندگی بچانے کا وسیلہ بنا تھا۔

میو اسپتال کے شعبہ حادثات کے بیڈ نمبر سات پر ایک عورت کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹروں میں سے ایک نے بمشکل تمام ایک منٹ کی فرصت میں ہمیں رجسٹر دیکھ کے یہ بتا دیا کہ ملتوی سے پہلے جو شخص اس بیڈ پر تھا وہ اب سینٹرل وارڈ کے کس نمبر پر ہے۔

میں نے کہا "ڈاکٹر۔ اس حادثے میں دو افراد زخمی ہوئے تھے۔"

"او یس۔ [illegible]" اس نے مختصراً کہا اور پھر کسی نئے کیس کی طرف چلا گیا۔ وہاں مسلسل حادثات کا شکار ہونے والے یا لڑائی جھگڑوں میں زخمی ہونے والے پولیس کیس آتے تھے۔ کچھ تڑپتے کچھ قریب المرگ۔ لہولہان اور شکستہ۔ ایمبولینس کے سائرن اور ساتھ آنے والوں کی چیخ پکار۔ زخمیوں کی لوبان۔ یہ سب یہاں چوبیس گھنٹے کا معمول تھا۔

تلاش تھی۔ وہ مجھے زیدی فوٹو گرافر کی دکان کے سامنے فٹ پاتھ کے ساتھ ہی لیٹا ہوا نظر آیا۔ میرے ہلانے جلانے پر اس نے آنکھیں کھول کے دیکھا اور نشے میں پوچھا "گاڑی نہیں چلتی...؟ دھکا لگاؤ۔ زور لگا کے۔ ہاں! بھئی ذرا چلا! ہے گاڑی کو کبھی... گاڑی چلاتی ہے آدمی کو۔"

میں نے کہا "استاد بادل۔ میری گاڑی ٹھیک ہے۔"

"گاڑی ٹھیک ہے تو پھر سب ٹھیک ہے۔ گاڑی چلتی کا نام ہے۔ کیسی بھی ہو۔ اپنی زندگی کو دیکھو چل رہی ہے نا۔ پرانے ماڈل کی کار۔"

اس سے بات کرنا بے سود تھا۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ ایسے میں وہ کیا بتاتا کہ دوپہر کو میں نے اس سے کیا کہا تھا۔ میں مایوس ہو کے پلٹنے ہی والا تھا کہ ایک بچے نے میرے کوٹ کو کھینچا۔

"صاحب جی آپ کو بلاتا ہے۔ پان والا" بچے نے کہا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو سگریٹ پان کے کھوکھے میں بیٹھا ہوا شخص مجھے ہاتھ کے اشارے سے قریب آنے کا کہہ رہا تھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھ کے سوال کیا "حلیہ تو ٹھیک بتایا تھا بادل نے۔ آپ اوپر وکیل صاحب کے آفس میں ہو؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

"بادل نے کہا تھا۔ یہ آپ کو دے دوں۔" اس نے اپنی [illegible] سے کاغذ کا ایک [illegible] مجھے تھما دیا۔

اس پرزے پر گاڑی کے نمبر کے علاوہ میو اسپتال کے شعبہ حادثات کا ایک نمبر لکھا ہوا تھا جو بیڈ نمبر ہی ہو سکتا تھا۔

"وہ کیا جانے گا اس حالت میں آپ کو۔ اس نے مجھے یہ کاغذ دیا تھا اور کہا تھا کہ وکیل صاحب آئیں گے۔ اس وقت پتا نہیں میں کچھ بتا سکوں یا نہیں۔ تم انہیں یہ دے دینا۔"

"اپنی ساس کے لیے بھی کچھ لے جانا۔ مثلاً نمو نما مشورا وغیرہ" محسن بولا "سسر کے لیے چرس الیون کا تحفہ مناسب رہے گا۔"

"کیوں جی! ایسا کیا برا کیا ہے انہوں نے میرے ساتھ؟"

"کمال ہے۔ ایسی بیٹی پیدا کی اور تمہارے سر منڈھ دی۔ یہ کم خطا ہے ان کی؟" محسن بولا۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے رابعہ کے آفس تک پیدل مارچ کیا اور کاروں کی قطاروں کے درمیان دیکھتا گیا۔ مجھے استاد بادل کی

میں نے افسوس سے بادل کو دیکھا "تم بہت خیال رکھتے ہو اس کا۔"

اس نے تلخی سے کہا "جو اپنا خیال خود نہ رکھے اس کا خیال دوسرا کیسے رکھ سکتا ہے جی۔ کس کے پاس ہے اتنا وقت۔ بس رات کو کمبل ڈال دیتے ہیں اس پر۔ بیمار پڑ جائے تو دوا دارو کر دیتے ہیں۔ مر جائے گا تو کفن دے کے گاڑ دیں گے۔ اب تو گھر والے بھی

www.paksociety.com

میڈیکل وارڈ میں بھی ملاقات کا وقت تھا اور ہر بیڈ کے گرد مریض کے عزیز و اقارب جمع تھے لیکن اس بیڈ کو سب سے الگ کر دیا گیا تھا۔ وہاں ایک پولیس مین کرسی ڈالے اور گن تھامے بیٹھا تھا۔ بیڈ پر لیٹے ہوئے مریض کی حالت بھی تشویشناک ہی لگتی تھی۔ اس کے بازو میں بیک وقت خون اور گلوکوز کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں اور اس کے خون آلود پٹیوں سے لپٹے ہوئے چہرے پر آکسیجن ماسک تھا۔

سو کے صرف ایک نوٹ نے ہمارے راستے سے قانون کی دیوار ہٹا دی۔ "آپ رانا صاحب ہو؟" پہرے پر مامور سپاہی نے کہا۔

میں نے اقرار میں سر ہلا دیا "تم سے کچھ کہا اس نے؟"

"بس جناب دو منٹ کے لیے ہوش آیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ شوکت رانا صاحب کو بلا دو۔ یہ فون نمبر بھی دیا تھا۔" اس نے جیب میں سے ایک بجلی کا بل نکالا اور اس کا کونا پھاڑ کے مجھے دے دیا۔

"یہ تو میرا ہی فون نمبر ہے۔" میں نے کہا "اس وقت تو یہ بے ہوش ہے کیا کہتے ہیں ڈاکٹر؟"

"کہنا کیا ہے سر کسی سے میں بھی انتظار کر رہا ہوں۔ اس کی جان چھوٹے تو میری بھی چھوٹے۔ اپنے اے ایس آئی اشرف صاحب تو گھر چلے گئے ہیں مجھے پھنسا کے۔ افسر لوگوں کے عیش ہیں جی۔"

میں نے مریض کے سرہانے رکھا ہوا چارٹ اُٹھا کے دیکھا۔ اس پر بہت کچھ لکھا ہوا تھا جو میرے لیے ناقابلِ فہم تھا مگر اس کا نام صاف پڑھا جاتا تھا۔ وحید قریشی ولد رشید قریشی۔ کیس نمبر سات سو کتنا رہ۔ پتا نامعلوم۔

اچانک مریض نے کرب میں ہاتھ پاؤں ہلانے شروع کیے۔ کانسٹیبل نے چلا کے نرس کو پکارا "اجی سسٹر صاحب۔ اس کو دیکھو ذرا۔ بندہ مر چلا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ۔"

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا مگر اس کو مرتا دیکھنے کے لیے وہاں رکنے کی ہمت ہم میں نہیں تھی۔ ہم واپس ہوئے۔ اس وقت تک دو نرسوں کے ساتھ ایک ڈاکٹر نے طبی امداد کی رسمی کارروائی شروع کر دی تھی۔ وہ بھی جانتے تو ہوں گے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں مگر آخری سانس تک زندگی کے لیے موت سے لڑنا ان کا اخلاقی فرض تھا۔ کام تھا اور پیشہ تھا۔

باہر آ کے میں نے کینٹین کا فون استعمال کیا اور نمبر ملایا۔ "رانا صاحب سے بات کرنی ہے مجھے۔" میں نے کہا۔

کسی نوکرانی ٹائپ عورت نے تذبذب کے ساتھ کہا "آپ کون ہو جی؟"

"پیر غیاث الدین جمن سمرقندی رحمتہ اللہ علیہ" میں نے بارعب لہجے میں کہا۔

"وہ جی۔ رانا صاحب تو ابھی ابھی نکل گئے ہیں۔ نئے گھر گئے ہوں گے۔ شاید نئی بیوی کے پاس۔ نئی گڈی میں۔ آپ ایک منٹ ٹھہریں۔ میں ذرا چھوٹی بی بی سے معلوم کروں۔"

چند منٹ بعد کسی لڑکی کے چلانے کی آواز آئی "سوچے سمجھے بغیر ہر ایک کے سامنے زبان چلانے لگتی ہو۔ کیا ضرورت تھی سب کہنے کی۔ اتنا کافی تھا کہ ابا جی نہیں ہیں۔"

"وہ جی۔ پیر صاحب ناراض ہو جاتے۔"

"بے وقوف عورت۔ پتا نہیں وہ پیر ہے یا کوئی دھوکے باز۔" اس نے دبے دبے لہجے میں کہا مگر میرے کانوں نے سن لیا پھر وہ بولی "ہیلو!"

"تم شوکت رانا کی بیٹی ہو نا؟۔۔۔ ماشاءاللہ" میں نے کہا۔

"جی۔ ابا جی کچھ بتا کے نہیں گئے" اس نے رکھائی سے کہا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ بس اس کو یہ بتانا تھا کہ وحید کا انتقال ہو گیا ہے اسپتال میں" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"یہ فون نمبر شوکت رانا کے گھر کا ہی ہے۔ تصدیق ہو گئی" میں نے محسن کو مطلع کیا "ایک بے وقوف نوکرانی نے ایک سوال کے جواب میں تین کار آمد باتیں بتا دیں۔ رانا نے نئی شادی کی ہے نئی کوٹھی بنائی ہے اور نئی گاڑی لی ہے۔"

"رانا جیسے لوگوں کے ایسے ہی شوق ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا اس فون نمبر سے رانا کے گھر کا پتا نہیں مل سکتا ہے؟"

"مل تو سکتا ہے بشرطیکہ نمبر ڈائریکٹری میں ہو۔ کچھ لوگ اپنے پرائیویٹ نمبر رجسٹر نہیں کراتے۔" محسن بولا "[illegible] ڈائریکٹری میں سب نمبر ترتیب وار لکھے جاتے ہیں اور ان کے سامنے پتا ہوتا ہے۔"

"ایکسچینج والے جانتے ہیں گے" میں نے کہا اور کینٹین والے کی اجازت سے دوسرا نمبر ملایا۔ یہ نمبر مجھے انکوائری نے دیا تھا اور ڈیوٹی افسر کا نمبر تھا۔

"کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"نام کو چھوڑیں میں ڈیوٹی افسر ہوں۔ کام بتائیں۔"

"میں روزنامہ جلال کا چیف ایڈیٹر تمیز فاروقی بول رہا ہوں۔" ڈیوٹی افسر کا لہجہ ایک دم بدل گیا "فاروقی صاحب۔ کیا حکم ہے؟"

میں نے کہا "ہمارے ایک کالم نویس ہیں۔ ابوبکر مشہدی۔ ان کا فون نمبر تو ہمارے پاس ہے۔ ان کے گھر سے کالم منگوانا تھا۔ ان کے گھر پر صرف ایک جاہل نوکر بیٹھا ہے اس وقت جو پتا بھی نہیں سمجھا سکتا۔"

"ایک منٹ ٹھہریے" ڈیوٹی افسر بولا "ہاں جی۔ لکھ لیں اور فاروقی صاحب اگر مجھے تصویر لگوانی ہو بچی کی سالگرہ کی؟"

"کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ میرے نام لفافے میں ڈال کے کاؤنٹر پر دے جائیں۔" میں نے کہا۔

بھی سکتا تھا یا پیچھے آ کے پوچھ سکتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جب اپنی ہی گھر میں چوری کرتا ہوا پکڑا جائے تو اس سوال کا جواب کیا دے سکتا۔

بم کو نٹ بولٹ سے کسنا غیر ضروری تھا۔ لگانے والے اسے ایک کے نیچے پھنسا کر چھوڑ گئے تھے۔ میں نے اسے ڈسٹری بیوٹر کے نیچے سے نکال لیا اور ایک بار پھر اس کے کنکشن چیک کیے۔ دو تاروں میں سے ایک کو مین کوائل سے ملایا گیا تھا اور دوسرے کو کنڈنسر سے۔ یہ بم ساخت میں بھی مین کوائل کے برابر تھا۔ تقریباً چھ انچ لمبا اور تین انچ موٹا۔ سیاہ رنگ کا یہ سلنڈر اپنی ساخت سے ہی بے ضرر لگتا تھا۔ جب میں نے اسے کچھ دور جا کے روشنی میں دیکھا تو اس پر ہندی کے الفاظ کندہ نظر آئے جن کو پڑھنے کی ضرورت کسی نے محسوس نہیں کی تھی۔

ٹیلی فون ایکسچینج سے جو پتا معلوم ہوا تھا اسے تلاش کرنا مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔ وہ ملتان روڈ کی طرف ایک نئی بستی کا تھا اور وہاں شوکت رانا صاحب جانی پہچانی شخصیت تھے۔

میں اور محسن نئی نویلی کہلانے والی اس کوٹھی کے سامنے زیر تعمیر مکانات کے سائے میں کھڑے رہے۔ یہ کوٹھی دو تین سال پہلے ہی بنی تھی مگر اب رانا صاحب نے نئی بیوی کے لیے اس سے بھی بہتر کوٹھی خریدی تھی۔ ابھی رات کے نو بجے تھے اور ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ رانا واپس آیا تو کس وقت آئے گا اور اس کے واپس آ جانے کے بعد ہمارے لیے کامیابی کے امکانات کیا رہ گئے۔

رانا دس بجے آیا جب ہم تقریباً مایوس اور انتظار کی کوفت سے بیزار ہونے کے علاوہ تھکن اور بھوک سے بھی پریشان تھے۔ اس کی نئی گاڑی کو ایک شوفر چلا رہا تھا۔ رانا پچھلی سیٹ پر تھا۔ شوفر نے گاڑی گیٹ کے سامنے روک کے پچھلا دروازہ کھولا تو رانا نے انتظار رکھا۔ اس کے لیے خود ہینڈل سے دروازہ کھولنا شان کے خلاف تھا۔

میں اور محسن دیوار کی اوٹ سے سر نکالے دیکھتے رہے۔ رانا نے شوفر کو کچھ ہدایات دیں اور وہ سر ہلاتا رہا۔ سنتری نے بڑا پھاٹک کھول دیا۔ ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ بند کیا مگر لاک نہیں کیا اور اندر چلا گیا۔ شاید اسے کچھ دیر بعد کہیں جانا تھا اور یہاں کار کو کسی چور سے خطرہ نہیں تھا۔

ہم نے چند منٹ کی مہلت سے فائدہ اُٹھایا۔ کوٹھی کا گیٹ بند ہوتے ہی میں اور محسن ایک جست میں بجلی کی سی سرعت سے سڑک پار کر گئے۔ میں نے محسن کو بتا دیا کہ بم کے دونوں کناروں سے دو تار کیسے جوڑے جائیں گے۔ اس نے بونٹ کھولا اور اندر سر ڈال کے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں نے گیٹ کی اوٹ سے چپکے ہوئے خود کو ہر خطرے کے لیے تیار رکھا۔ اس وقت اگر اچانک ڈرائیور نمودار ہو جاتا تو مارا جاتا اور میں مجبور ہو جاتا کہ اس کی لاش کو وہیں

جب میں نے ٹیلی فون کال کے پیسے دینے کی کوشش کی تو کینٹین کے مالک نے بڑی انکساری سے کہا "بادشاہو۔ اخبار والوں کے تو غلام ہیں ہم۔ میرا بچہ گم ہو گیا تھا۔ اخبار میں تصویر لگوائی۔ اگلے دن مل گیا۔ کسی نے اخبار کے دفتر پہنچا دیا۔ ایڈیٹر صاحب خود گھر چھوڑ کے گئے۔ آپ سے ہم پیسے نہیں لے سکتے جی۔ بیٹھو کوئی چائے شائے ٹھنڈی بوتل۔"

کبھی ایک جھوٹ سے کام تو نکل آتا ہے مگر وہی جھوٹ آدمی کو شرمندہ بھی کرتا ہے۔ ہم اس کا شکریہ ادا کر کے نکل آئے۔

اب مغرب کے بعد کا اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ میں نے اور محسن نے مال روڈ تک پیدل سفر کیا اور شیزان میں داخل ہو کے کونے والی میز پر براجمان ہو گئے۔ اندر چائے کافی کی مہک خوشبوؤں اور قہقہوں سے معمور فضا تھی۔

محسن نے کچھ سوچ کے کہا "یار یہ شوکت رانا کیوں نہیں آیا آخر اس پریس کانفرنس میں۔"

میں نے کہا "اسے مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ ایک طرح سے یہ انتہائی خفیہ پریس کانفرنس تھی۔ اسے رات کو پتا چلے گا کسی سے یا صبح کے اخبار سے۔"

"آج کا پروگرام گڑبڑ ہو گیا۔ اگر ہم پہلے ہی دلاور کو پولیس کے حوالے کر دیتے تو اچھا تھا۔"

"میں سوچ رہا ہوں آج رانا کا گھر دیکھ لیا جائے۔ کچھ دیر بعد وہ نئی گاڑی میں لوٹ کر آئے گا۔"

"نئے گھر اور نئی بیوی کو چھوڑ کر؟ مشکل ہے" محسن بولا "مگر کام کیا ہے؟"

"کام معمولی ہے۔ اس کا تحفہ واپس کرنا ہے۔ جو بم اس نے رابعہ کی گاڑی میں نصب کیا تھا وہ اس کی نئی گاڑی میں لگانا ہے۔"

"یہ معمولی کام ہے؟"

"ہاں۔ میں نے جب تار الگ کیے تھے تو دیکھ لیا تھا کہ کس تار کو کہاں جوڑا گیا تھا۔ مشکل یہ ہے کہ رابعہ گاڑی کی چابی تک دینے پر تیار نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ خود بم ڈسپوزل والے بم نکالیں۔"

"بونٹ تو چابی کے بغیر بھی کھولا جا سکتا ہے یار" محسن بولا۔

اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ ہم چائے پی کے تازہ دم ہو گئے تو ایک بار پھر رابعہ کے آفس تک گئے۔ اس کی فائس ویگن ابھی اسی حالت میں کھڑی ہوئی تھی۔ محسن نے یہ ظاہر کیا کہ اس کی چابیاں گم ہو گئی ہیں اور ایک ورکشاپ والوں سے ان کی چابی لے کر .... بونٹ میں لگائی۔ ایک چابی نے مسئلہ حل کر دیا۔

بم نکالنے کی کارروائی کے دوران مجھے اور کسی کا ڈر نہیں تھا۔ وہاں سب ہی مجھے صورت سے پہچانتے تھے اور کوئی یہ شک نہیں کر سکتا تھا کہ میں گاڑی کی چوری کر رہا ہوں۔ خطرہ مجھے رابعہ کی طرف سے تھا۔ منظر اور وقار یوسف میں سے کوئی اوپر سے جھانک

www.paksociety.com

اندھیرے میں کہیں ڈال دوں۔

محسن نے اپنا کام پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں مکمل کر لیا۔ ہم ایک بار پھر نامکمل مکان کے کھنڈر جیسی عمارت میں روپوش ہو گئے۔ میری دلی خواہش تھی کہ رانا خود گاڑی اسٹارٹ کرے مگر اس کا امکان بہت کم تھا۔ ہر صورت میں مرنا ڈرائیور ہی کو تھا۔ گیہوں کے ساتھ گھن ایسے ہی پستے ہیں۔ رابعہ کے ساتھ عمر بھی مارا جا سکتا تھا اور منظر یا مولوی خادم حسین بھی جس کا ہمارے کسی معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔

اچانک گیٹ کھلا اور ایک شخص آہستہ آہستہ چلتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں۔

محسن نے میرا شانہ ہلایا "یہ۔ یہ تو غالب ہے۔"

"میں۔ میں سمجھا تھا۔ دھوکا ہو رہا ہے میری آنکھوں کو۔"

میں نے اسے روکنے کے لیے آواز دی "غالب!"

غالب کے قدم ایک لمحے کے لیے رکے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں اور محسن اس پناہ گاہ سے نکل کر دوڑے مگر ہمیں اندازہ تھا کہ یہ کوشش بے سود ہے۔ ہمیں بہت دیر ہو گئی تھی۔

میں نے حلق کی پوری قوت سے غالب کو آواز دی تھی اور پھر محسن نے اسے چیخ کے پکارا تھا۔ بے شک ہمارے درمیان سڑک حائل تھی مگر یہ ناممکن تھا کہ اس پُرسکوت ماحول میں ہمارے دل کی گہرائی سے نکلنے والی پُرکرب چیخ غالب نے نہ سنی ہو۔ اس وقت تمام خطرات کا وجود میرے لیے بے معنی ہو گیا تھا اور میرے لیے ایک ہی احساس کی ناقابلِ برداشت اذیت باقی رہ گئی تھی کہ میں نے خود اپنی تدبیر سے اپنی بدقسمتی سے اور اپنی بدخواہی سے خود اپنے عزیز ترین دوست کی ہلاکت کا سامان کر دیا تھا۔ میری حالت اس شخص کی طرح تھی جس نے دشمن کے سینے میں اتاری جانے والی گولی اپنے ہی بھائی کی پشت کی جانب سے اس کے دل میں پیوست کر دی تھی۔ مجھے اس وقت وہ سب یاد آیا جو ازلی و ابدی سچائی کی طرح تسلیم کیا جاتا ہے کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود اس میں گرتا ہے۔

جیسے آج صبح شوکت کے بچاتے ہوئے دامِ اجل کو ایک شاطر باز نے پاگل شخص کی آنکھوں نے دیکھ لیا تھا اور موت نے مجھے یا رابعہ کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا ایسے ہی اس وقت موت نے شوکت رانا کو سلامتی اور تحفظ کے ساتھ نظرانداز کر دیا تھا۔ اجل غالب کو وہاں لے آئی تھی۔ یہ اختیار قدرت نے کسی فانی انسان کو نہ دیا ہے نہ دے گی کہ وہ کسی دوسرے انسان کو زندگی دے سکے یا اس کی زندگی لے سکے۔ یہ انتخاب قضا کا ہے کہ جس کو جہاں چاہے لے جا کر مارے اور جس طرح چاہے مروا دے۔

میرے ساتھ محسن نے بھی غالب کو روکنا چاہا تھا مگر یہی لگتا تھا جیسے وقت آ جائے تو اسے ٹالنے کی تدبیر بھی آدمی کی بے بسی کا مذاق اڑاتی ہے۔ غالب تو جیسے بہرا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار مڑ کے دیکھا ضرور تھا مگر اس کے بعد تو جیسے ہماری آواز کے لیے اس کے کان بند ہو گئے تھے یا تقدیر نے اس آواز کو بھی سماعت کی سرحد پار کرنے سے پہلے ہی روک دیا تھا۔

وہاں ہم زرا بلند آواز میں بھی اسے پکارتے تو وہ سن سکتا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ اس کے قدم بلاوجہ نہیں رکے تھے۔ اس نے اپنا نام پکارنے والی میری آواز پہچان بھی لی ہو گی۔

اس کے باوجود وہ گاڑی کا دروازہ کھول کے اندر بیٹھ گیا۔ میں اور محسن دیوانہ وار چلاتے ہوئے اس کی طرف دوڑے۔ "غالب رک جاؤ۔ آگے مت بڑھو۔ غالب۔ غالب گاڑی مت اسٹارٹ کرنا۔"

لیکن غالب نے دروازہ بند کرتے ہی گاڑی اسٹارٹ کی۔ مجھے یوں لگا جیسے قیامت آ گئی ہے۔ میں کسی آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا تھا مگر مجھے معلوم نہیں تھا اور اچانک وہ آتش فشاں پھٹ گیا ہے۔ زمین آسمان کے درمیان جو کچھ تھا دہکتے سلگتے سنگ ریزوں کے غبار میں تبدیل ہو گیا تھا اور میں، محسن، غالب ہمارا احساس اور وجود سب وقت کی بیکراں حدود میں تحلیل ہو کے مٹ گیا تھا۔ ختم ہو گیا تھا۔ ماضی کا حوالہ بن گیا تھا۔

لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ میرے تصور کا فریب تھا۔ بے حسی یقین کی وہ انتہا تھی جہاں آدمی رسی کو سانپ سمجھ لیتا ہے مارگزیدہ کی طرح خوف سے ہلاک ہو جاتا ہے۔ مفروضے اعصاب اس درجہ راسخ ہو جاتے ہیں تو آدمی کو وہ سب نظر آتا ہے اور محسوس ہوتا ہے جس کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ دنیا اسے پاگل کہتی ہے۔

میں بھی پاگل ہو گیا تھا اور میرا پاگل ہو جانا برحق تھا۔ اگر غالب سچ مچ میرے بچھائے ہوئے موت کے جال میں گرفتار ہو کے مر جاتا تو اسی پاگل پن کی حالت میں میری موت بھی ہو جاتی۔ گروقت کا وہ مختصر ترین لمحہ جسے بیان تو کیا محسوس بھی نہیں کیا جا سکتا گزر گیا اور اچانک میں پھر ہوش میں آ گیا۔ مجھے صرف اپنی ذہنی کیفیت کا علم ہے اور یہ معلوم ہے کہ زندگی اور موت کے بیچ اس پل صراط سے میں کیسے گزرا تھا۔ شاید ایسی ہی کچھ محسن پر بیتی ہو گی۔

ہم تو ایک ساتھ چلا کے دوڑے تھے پھر شاید رک گئے تھے یا رکے بغیر پھر دوڑے تھے کیونکہ غالب نے کار اسٹارٹ کر لی تھی اور کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا۔ گاڑی آگے سرک گئی تھی اور ہم دیوانوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگنے لگے تھے۔ پچاس گز سے بھی کم فاصلے پر گاڑی بائیں جانب گھوم گئی۔ میں نے چیخ کے کہا "محسن۔ محسن اسے روکو یہ غالب ہے۔"

محسن نے چلا کے کہا "کیا غالب کو پتہ نہیں ہو گا وہ زندہ ہے؟"

میں نے کہا "ہاں ہاں۔ وہ زندہ ہے مگر اسے روکو۔ وہ شاید ..."

پانچ مزدوروں کی ٹولی بڑے انہماک سے فلمی گانے سننے میں مصروف تھی۔ ان سب نے ہماری دیوانگی کو بھی دیکھا مگر کسی نے ہم سے دیوانگی کا سبب نہیں پوچھا اور نہ دخل در معقولات ضروری سمجھا۔ وہ دن بھر کے تھکے ہارے اس وقت آرام کے موڈ میں تھے۔

تنگ سڑکوں کے کناروں پر جھاڑیاں اور گھاس پھوس اور خودرو پودے تھے۔ اس علاقے کے گھروں تک بجلی گئی تھی۔ سڑک پر بجلی اور ٹیلی فون کے کھمبے بھی نظر آ رہے تھے مگر اسٹریٹ لائٹس لگنے کا مرحلہ ابھی نہیں آیا تھا۔ اندھیرے میں سڑک کو صرف کار کی ہیڈ لائٹ روشن کر رہی تھی اور ہم اس کے تعاقب میں دوڑتے ہوئے کئی بار ٹھوکر کھا چکے تھے۔ میرا سانس بری طرح پھول گیا تھا مگر کار کے اور اپنے درمیان بتدریج کم ہوتے ہوئے فاصلہ میری ہمت کے لیے مہمیز کا کام کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس مرحلے پر میں سست پڑ گیا یا رک گیا تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بہت سے سوال تشنہ جواب رہ جائیں گے اور اس کوتاہی سے ہونے والے نقصان کی تلافی کبھی نہ ہو سکے گی۔

رانا کے گھر سے ہم دو سو گز دور آ گئے تھے۔ ابھی تک ہم گاڑی سے دس بیس گز پیچھے تھے اور گاڑی کے چوڑی سڑک پر پہنچ جانے کے بعد میری مایوسی بڑھنے لگی۔ اب تک غالب مجبور تھا کیونکہ ان پُرپیچ اور تنگ و تاریک سڑکوں پر گاڑی کو تیز دوڑانے کی گنجائش نہیں تھی لیکن اب کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ کار کی رفتار میں اضافہ نہ کرے۔ چند سیکنڈ میں کار ہمیں اتنا پیچھے چھوڑ سکتی تھی کہ ہم اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ پاتے۔

تعجب تھا کہ ہمارے آوازیں دینے کے باوجود غالب نے گاڑی کیوں نہیں روکی۔ اس کے کانوں تک ہماری آواز کے نہ پہنچنے کا بھی کوئی سبب نہیں تھا لیکن بفرض محال وہ سماعت سے محروم ہو چکا تھا تب بھی پیچھے ...... شیشے پر پتھر لگنے کے بعد دھماکا ہوتے ہی اس کے ذرات ہر طرف اڑ گئے تھے۔ کچھ ذرات یقیناً غالب کے سر پشت اور گردن سے بھی ٹکرائے ہوں گے۔ کیا وہ پاگل ہو گیا تھا؟ کیا کچھ ایسا کر دیا گیا تھا کہ اب وہ ہمیں پہچان رہا تھا نہ ہماری آواز پر دھیان دے رہا تھا یا وہ خوف زدہ تھا اور ہم سے بھاگ رہا تھا۔ کہیں اسے بھاگنا ہوتا تو وہ ایکسیلریٹر پر زرا سا پاؤں کا دباؤ بڑھاتا اور تیز رفتار گاڑی اسے اڑا کے لے جاتی۔

عین اسی وقت جب گاڑی کی رفتار بڑھ چکی تھی اور میں غصے، بے بسی اور شکست کے احساس میں چلاتا مایوس ہو کے رفتار کم کر چکا تھا قدرت کو ہم پر رحم آ گیا۔ اچانک گاڑی کی چال بدل گئی۔ اس کا ایک پہیہ لڑکھڑانے لگا اور گاڑی کی رفتار پھر کم ہو گئی۔ اس کا پچھلا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا اور غالب نے گاڑی کو روک دیا تھا۔

ایک منٹ میں ہم نے گاڑی کو جا لیا اور دروازہ کھول کے باہر نکلنے والے غالب کو دبوچ لیا۔ اب تک ہمارے ذہن میں کوئی شک تھا کہ ہم نے غالب کو پہچاننے میں غلطی تو نہیں کی تھی تو وہ غالب کیوں نہیں ہماری "غالب!"

محسن چلایا "غالب سنتا کیوں نہیں سور کے بچے۔"

میں نے پیچھے دوڑتے ہوئے پتھر اٹھا کے گاڑی پر مارا۔ اس غیر آباد علاقے کی سنسان اور تاریک سڑکوں پر پتھر بہت تھے۔ دوسرا پتھر محسن نے مارا۔ ہم چیختے ہوئے گاڑی کے پیچھے دوڑتے رہے۔ وہ بڑی گاڑی تھی اور اتنی دیر میں ہمیں بہت پیچھے چھوڑ سکتی تھی لیکن غالب اسے بہت کم رفتار سے چلا رہا تھا معلوم نہیں کیوں؟

جب گاڑی پر پتھر لگے تو گاڑی کی رفتار کم ہوئی۔ اس سے پہلے کہ گاڑی رکتی میرے ہاتھوں سے نکلنے والا دوسرا پتھر اس کے پچھلے شیشے پر لگا۔ شیشہ ایک دھماکے سے ریزہ ریزہ ہو گیا۔ گاڑی نے دوسرا موڑ کاٹا اور پکی سڑک سے نسبتاً چوڑی سڑک پر آ گئی۔ یہاں پر سڑک کے کنارے بنے ہوئے گھر تعداد میں بہت کم تھے۔ عام طور پر ہر مکان الگ تھا اور کہیں کہیں ان کے درمیان فاصلہ سو گز سے بھی زیادہ تھا۔ کچھ مکان مکمل نظر آتے تھے مگر آباد نہیں تھے اور جو تعمیر کے مختلف مراحل سے گزر رہے تھے وہاں صرف نکاسی ویرانی تھی۔ جگہ جگہ روڑی، کنکر اور ریت کے ڈھیر تھے اور اینٹوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان کسی چارپائی پر یا فرشِ خاک پر کوئی چوکیدار سو رہا تھا یا اکیلا بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ ایک جگہ چار

www.paksociety.com

کے گرفت میں آتے ہی دور ہو گیا۔

غالب بہت سہما ہوا تھا اور ہمیں بڑی اجنبی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "تم... کون ہو تم لوگ... کیا چاہتے ہو؟"

میں نے اسے جھنجھوڑ کے کہا "کیا تو نشے میں ہے؟"

اس نے محسن کی طرف دیکھا "مجھے... چھوڑ دو۔ میں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ ایسے کیوں پکڑ رکھا ہے تم نے مجھے۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ غالب کا سپاٹ لہجہ اور اس کی ویران آنکھوں میں ناآشنائی کے جذبات کو اداکاری نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ نہ وہ ہم سے مذاق کر رہا تھا اور نہ اس کا مقصد ہمیں پریشان کرنا تھا۔

میں نے اسے چھوڑ دیا "غالب کیا ہو گیا ہے تجھے یار۔ دیکھ میں سکندر ہوں۔ تو شاید میرے بدلے ہوئے حلیے سے دھوکا کھا گیا لیکن میری آواز بھی تو نے نہیں سنی۔"

محسن نے کہا "آج تو میرا حلیہ بھی بدلا ہوا ہے غالب لیکن تو ہماری آواز پر رکا کیوں نہیں تھا۔ کان تو ٹھیک ہیں تیرے۔"

اس نے ہم دونوں کو دیکھا "میں تمہیں نہیں جانتا۔ پھر تم کیوں میرا پیچھا کر رہے تھے۔ کیوں پتھر مار رہے تھے میری گاڑی پر۔ یہ شیشہ بھی توڑ دیا تم نے میری گاڑی کا۔"

میں نے کہا "اب میں ایک جھانپڑ مار کے تیرا دماغ درست کر دوں گا۔"

محسن نے کہا "یار بار میری گاڑی میری گاڑی... کہہ رہا ہے تیرے باپ کی گاڑی ہے کیا۔"

"گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔" اس نے کھوکھلے لہجے میں کہا "مجھے پہیہ بدلنا ہے۔ میرا راستہ چھوڑ دو۔"

اب مجھے تشویش ہونے لگی "غالب کیا واقعی تو نے ہمیں نہیں پہچانا؟ سکندر بخت اور محسن کو نہیں جانتا تو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ نام سنے ہوئے لگتے ہیں۔"

اب مجھے یقین آنے لگا کہ اس کا ذہن اور یادداشت متاثر ہو چکی ہے۔ شاید وزیر خان اسپتال میں اس کا ادویات، برقی آلات اور تشدد کے ذریعے برین واش کیا گیا تھا۔ وہ غالب ہونے کے باوجود غالب نہیں رہا تھا۔ اس کی شخصیت بدل دی گئی تھی۔

میں نے غالب کو چھوڑ دیا۔ وہ ڈکی کھول کے جیک اور اسپیئر وہیل نکال رہا تھا اور ہماری طرف بالکل متوجہ نہیں تھا۔ اس کا رویہ بالکل متوازن نہیں تھا۔ اگر ہم اس کے لیے اجنبی تھے تو پھر وہ مشتعل کیوں نہیں تھا کہ ہم نے اس کی گاڑی پر پتھر مارے اور اس کا اچھا خاصا مہنگا ونڈ اسکرین توڑ دیا۔ اگر وہ سمجھتا تھا کہ ہم اسے نقصان پہنچانے کے لیے اس کا پیچھا کر رہے تھے تو وہ اسپیڈ بڑھا کے بھاگا کیوں نہیں گیا تھا۔ یقیناً اس کے ذہن میں بھی خلفشار تھا اور بے یقینی کی الجھن تھی۔ اس کی سوچ واضح اور پُراعتماد نہیں تھی اور شاید وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ اگر وہ جانتا تھا تو یہ نہیں سمجھتا تھا کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح۔ وہ اصل غالب اور اس کی بدلی ہوئی شخصیت کے درمیان کشمکش بے اختیاری کے خلا میں معلق تھا۔ اس کے شعور میں بہت کچھ بھر دیا گیا تھا خصوصاً یہ کہ تم غالب نہیں ہو۔ تم کسی سکندر بخت، محسن یا رابعہ کو نہیں جانتے۔ نہ تم صحافی تھے اور نہ ایم آر ایس کے رکن۔ اور وہ سب باتیں جو اس کے اور ہمارے مشترک ماضی کا حصہ تھیں اس کی یادداشت سے کھرچ دی گئی تھیں مگر شعور کے نہاں خانوں میں لاشعور میں بہت کچھ تھا جسے آسانی سے مٹایا نہیں جا سکتا تھا اور شخصیت کی انتہائی گہرائی میں تحت الشعور کا وہ حصہ تھا جس میں محفوظ یادوں کے عکس تک خود غالب کی رسائی نہیں تھی تو کوئی اور اس خزانے کو کیسے چھیڑ سکتا تھا۔ بدلنے والے صرف شعور پر قابو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ لاشعور میں سب کچھ وہی تھا اور اسے دوبارہ شعور کی سطح تک لانا مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔

میں نے محسن سے کہا "یار یہ کیا حال کر دیا ہے انہوں نے غالب کا۔"

محسن نے افسوس سے اسے دیکھا "جس وقت مل گیا انہیں سکندر۔ انہوں نے غالب کو جیتے جی مار دیا۔ نازو کو بھی مار دیا ہو گا۔ وہ بھی اب ہمیں نہیں پہچانے گی۔"

"مایوس مت ہو یار۔ دیکھ قدرت کو منظور تھا کہ غالب زندہ رہے۔ اسے نہ دشمنوں نے مارا اور نہ یہ ہماری غلطی سے ہلاک ہوا۔ کیا یہ اشارہ کافی نہیں؟ یہ ہمیں کہاں اور کیسے ملا۔ کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے اس اتفاق سے؟ یہی کہ غالب کو کچھ نہیں ہو گا۔"

"اب کیا رہ گیا ہے ہونے کو؟"

"نہیں محسن۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہمیں غالب کبھی نہ ملتا۔ یا ملتا تو صرف اس کا بے جان جسم ملتا۔ وہ جسمانی معذوری کے ساتھ کسی فٹ پاتھ پر پڑا نظر آتا یا کسی پاگل خانے کی سلاخوں کے پیچھے ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ ہمیں زندہ سلامت اور صحت مند حالت میں ملا ہے۔ اسے پاگل بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ ایک ذہنی مسئلہ ہے، عارضی اور وقتی خرابی ہے۔ بہت معمولی۔ اسے ہم ٹھیک کر لیں گے۔"

غالب پہیہ بدلنے میں مصروف تھا لیکن بار بار ایسی نظروں سے ہماری طرف دیکھتا تھا جیسے ہم سے پوچھنا چاہتا ہو کہ اب کیا ہے۔ یہاں کیوں کھڑے ہو تم اور کیا باتیں کر رہے ہو۔ شاید کوئی خلش اس کے ذہن میں بھی تھی کہ ہم وہاں بے سبب نہیں کھڑے ہیں اور ناآشنا ہونے کے باوجود اس کے دشمن نہیں ہیں۔ شاید وہ بھی سوچ رہا تھا مگر اس کی سوچ بے یقینی کے خلا میں گردش کر رہی تھی۔ ایک دائرے میں جس کی کوئی سمت نہیں ہوتی۔ کوئی انتہا نہیں ہوتی۔

محسن نے کہا "آخر یہ شوکت رانا کے گھر میں کیا کر رہا تھا؟ اب اس کی گاڑی لے کر کہاں جا رہا ہے؟"

"پورا نام بتاؤ۔ فیروز دین، فیروز احمد یا محمد فیروز؟"

"نہیں... فیروز۔ ایسے ہی پکارتے ہیں سب۔"

میں نے کہا "اپنے باپ کا نام یاد ہے تمہیں؟"

وہ خلا میں دیکھنے لگا "یاد تو تھا... بھول گیا مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "رانا صاحب کے پاس تم کب سے ہو؟"

وہ سوچنے لگا "بہت دن سے... میں ڈرائیور ہوں ان کا۔"

"اچھا۔ کیا وہ پوچھیں گے نہیں تم سے کہ یہ شیشہ کیسے ٹوٹا؟ خفا نہیں ہوں گے تم پر۔ ماریں گے نہیں تم کو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ بہت اچھے ہیں۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ فیروز کسی سے مت ڈرو۔ کوئی تمہیں کچھ کہے تو مجھے بتانا۔ بس کبھی جھوٹ مت بولنا مجھ سے۔ باہر کچھ بھی ہو جائے مجھے بتا دینا۔"

"تم کیا بتاؤ گے انہیں؟ شیشہ کیسے ٹوٹ گیا؟"

"سچ سچ بتا دوں گا کہ تم نے توڑا پتھر مار کے۔"

"وہ پوچھیں گے نہیں ہمارے بارے میں... کہ وہ کون تھے۔ ان کا حلیہ کیا تھا آخر انہوں نے پتھر کیوں مارا تھا اور پھر تم نے کیا کیا تھا؟"

وہ الجھن میں پڑ گیا "معلوم نہیں۔"

"کیا معلوم نہیں؟" محسن بولا۔

"مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا پوچھیں گے... اور... میں کیا بتاؤں گا۔ تم بتا دو نا مجھے میں کیا کہوں اگر وہ مجھ سے پوچھیں۔"

اس کی حالت افسوس ناک اور قابل رحم تھی۔ میرا دل بیک وقت مختلف جذبات کی کشمکش کا شکار تھا۔ مجھے اپنی کوتاہی پر صدمہ تھا کہ میں نے اس کی بازیابی کے لیے سنجیدگی سے کوشش نہیں کی اور صرف ہوائی کارروائی کرتا رہا تھا کہ غالب اور نازو کی زندگی محفوظ رہے۔ انہیں جسمانی گزند نہیں پہنچا تھا مگر شکاری بہت چالاک تھے۔ انہوں نے زیر دام آنے والے کے جسم کو نہیں ذہن کو اسیر کر لیا تھا۔ مجھے خوشی بھی تھی کہ غالب جس حال میں بھی ملا زندہ سلامت مل گیا اور خود ہمارے ہاتھوں نہیں مارا گیا ورنہ اس گناہ کا ہم کیا کفارہ ادا کرتے۔

غالب کے ہلاک نہ ہونے کی وجہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی کہ محسن نے بم کے کنکشن غلط کر دیے تھے یا پھر تار ٹھیک سے نہیں جوڑے تھے کہ بونٹ بند کرتے ہی کوئی جوڑ کھل گیا۔ بات غلطی کی نہیں قدرت کے اشارے کی تھی جس کے بغیر سب اجل بے اختیار ہے۔ گولی کا نشانہ خطا ہو جاتا ہے۔ قضا کا تیر ہدف تک نہیں پہنچتا۔ سر پہ کھڑی عمارت منہدم ہو جاتی ہے اور ملبے سے تین ہفتے بعد کوئی زندہ نکال لیا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کریش ہو جاتا ہے اور مسافروں یا برف پوش پہاڑوں پر گر کر... دانا کوئی بچہ محفوظ رہتا ہے۔ ایسے واقعات منظر عام پر آتے ہی رہتے ہیں۔

"ہم اس کے ساتھ جا کے دیکھ لیں گے۔"

"لیکن کیا یہ ہمیں لے جائے گا اپنے... ٹھکانے؟ اگر ہم زبردستی بیٹھ گئے تو وہیں جائے گا جہاں پہلے جا رہا تھا۔"

میں نے کہا "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر ہماری اتنی چیخ پکار کے باوجود شوکت رانا کی کوٹھی میں سے کوئی باہر کیوں نہیں آیا؟ اتنا شور سن کے چوکیدار نے بھی نہیں دیکھا۔"

محسن نے سوچ کے کہا "یہ ہو سکتا ہے کہ شوکت رانا اندر ہو۔ کسی ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں جہاں باہر کی آواز نہ پہنچتی ہو۔"

"لیکن چوکیدار تو گیٹ پر موجود تھا۔ اس نے کار کے ہارن پر گیٹ کھولا تھا... جب ہم نے چیخ کر غالب کو آواز دی تھی تو اس نے ضرور سنی ہو گی۔ اس نے باہر جھانکا تک نہیں۔ اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟" محسن نے بے خیالی میں کہا۔

"شاید غالب کا نام اب کچھ اور ہے" میں نے کہا۔

محسن چونکا "رائٹ۔ اسی لیے خود غالب بھی متوجہ نہیں ہوا تھا کہ اب وہ خود کو غالب نہیں سمجھتا۔ یہ لفظ اس کے لیے بے معنی ہے۔"

"وہ چونکا ضرور تھا ایک بار اور یہ ایک غیر ارادی حرکت تھی۔ ایک لاشعوری ردعمل تھا۔ ہم غالب کو پکارتے رہے اور اس کے ذہن نے یہ پکار نہیں سنی مگر لاشعور میں اس نام کی بازگشت نے تحریک پیدا کی تھی۔ رہا چوکیدار تو غالباً اسی لیے وہ بھی باہر نہیں آیا کہ کوئی غالب کو آواز دے رہا ہے تو مجھے کیا۔ وہ کسی غالب کو نہیں جانتا۔ اگر اسے ذرا بھی شبہ ہوتا تو وہ فوراً فائر کرتا یا شوکت رانا کو اطلاع دیتا کہ نہ جانے کون پاگل کے بچے ہیں جو آپ کی گاڑی کے پیچھے بھاگتے ہوئے دوڑ رہے ہیں اور اسے پتھر بھی مار رہے ہیں۔ پھر شوکت رانا یقیناً تعاقب میں آتا۔ اس کے پاس [illegible] گاڑی تو ہے۔"

بظاہر یہ توضیح سمجھ میں آتی تھی اور ان حالات کے پس منظر میں قابل قبول محسوس ہوتی تھی مگر اصل حقائق کا علم اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک غالب خود نہ بتاتا کہ ماجرا کیا ہے۔ وہ پہیہ بدلنے سے فارغ ہو چکا تھا اور ڈکی بند کر کے پھر کار میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ میں نے کہا "بات سنو۔"

وہ رک گیا اور مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کیا تمہارا نام غالب نہیں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "غالب کون ہے؟"

بے اختیار مجھے غالب ہی کا شعر یاد آیا۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

محسن بولا "اچھا تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے سوچ کے جواب دیا "فیروز۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "غالب۔ میرا مطلب ہے فیروز۔ اب تم کہاں جاؤ گے؟"

"رانا صاحب کی نئی کوٹھی۔ چھوٹی چک۔ صاحب آج کل وہیں ہیں نا۔ مجھے رات کو وہیں رہنا ہے۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

محسن بولا "کیا ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں؟"

"تم میرے ساتھ نہیں جا سکتے۔ تم بدمعاش ہو، پھر مار دو گے۔"

"نہیں۔ ہم رات کو تمہارے ساتھ رہیں گے۔ تم اکیلے ہو گے نئی کوٹھی میں تو تمہیں ڈر لگے گا۔"

"میں اکیلا نہیں ہوں وہاں۔"

"اچھا۔ اور کون ہے وہاں؟"

"اور...... چوکیدار ہے۔ خادمہ ہے۔۔۔۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ ہمارے سوالات کا جواب بھی دے رہا تھا اور بار بار یہ سوال بھی کر رہا تھا کہ تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ ایک طرف اسے ہم سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا تو دوسری طرف ذہن میں یہ خوف رکاوٹ بنا ہوا تھا کہ اسے رانا صاحب کے بارے میں کسی اجنبی سے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بات اسے سمجھائی گئی تھی۔ اس کے ذہن میں بٹھا دی گئی تھی۔ [illegible] لاشعور کے ریشوں سے نکالنا ناممکن تھا۔ نتیجہ اس کے اور ہمارے تعلق کی بنیاد تھیں۔ اسے سمجھایا گیا تھا کہ کوئی روکے تو مت رکنا چنانچہ ہمارے چیخنے چلانے اور پتھر مارنے کے باوجود اس نے گاڑی نہیں روکی تھی۔ وہ ہمیں بدمعاش ہی کہہ رہا تھا اور ہم سے باتیں کرتے ہوئے پریشان یا خوف زدہ بھی نہیں تھا۔ اگر اسے اپنی حفاظت اور دشمن کے خلاف استعمال کرنے کے لیے اسلحہ دیا گیا تھا تو اس نے ابھی تک نکالا نہیں تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ غالب کے ذہن کی سلیٹ پر لکھے ہوئے ناموں کی ترتیب بدل دی گئی تھی۔ دوستوں کے نام کی جگہ دشمنوں کے اور دشمنوں کے نام کی جگہ دوستوں کے نام لکھ دیے گئے تھے اور غالب کو یہ سبق ایسے پڑھایا گیا تھا کہ اس کے ذہن میں یہ نقش کندہ ہو جائے۔ تاہم وقت کے ہاتھ جو تحریر ماہ و سال کے ساتھ لکھتے ہیں وہ ایسی ناپائیدار نہیں ہوتی کہ کوئی چند لمحوں میں یا پھر دو چار دن میں اسے مٹا دے۔ یہی خیال میرے لیے امید کی وہ کرن تھا جس پر مجھے بھروسا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ غالب اگر آج غالب نہیں ہے تو کل پھر غالب ہو گا۔ اس کی شخصیت کا یہ بدلا ہوا رنگ بہت کچا ہے۔ اصل رنگ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ تھوڑی سی محنت درکار ہو گی اور آہستہ آہستہ ہم سب کی متفقہ کوشش سے غالب کی اصل شخصیت دوبارہ ابھر کے سامنے آ جائے گی۔

فوری مسئلہ یہ تھا کہ ہم غالب کے ساتھ زبردستی کریں اور اسے اپنے ساتھ لے جائیں یا کسی طرح اسے منا لیں کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے پر راضی ہو جائے۔

محسن نے کہا "آخر تم کیوں ڈر رہے ہو ہم سے؟"

غالب نے رازدارانہ انداز میں کہا "اس لیے کہ تم مجھے فیروز نہیں کہتے۔ غالب کہتے ہو۔ رانا صاحب نے کہا تھا کہ جو بھی تم کو غالب کہے وہ تمہارا دوست نہیں دشمن ہے۔ تم نے پتھر مار کے شیشہ توڑا تھا۔"

میں نے کہا "وہ غلطی سے لگ گیا تھا۔ ہم تمہارا نقصان پورا کر دیں گے۔"

محسن نے کہا "رانا صاحب کو معلوم بھی نہیں ہو گا کہ کسی نے شیشہ توڑا تھا۔ ہم صبح اسے بدلوا دیں گے۔"

میں نے کہا "ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔"

"نہیں۔ تم مجھے غالب کہتے ہو۔ تم دشمن ہو" غالب کا فیصلہ اٹل تھا۔

"بھئی فیروز! مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی پھر اب ہم دوست ہیں تمہارے۔ لاؤ ہاتھ اسی بات پر" محسن نے ایک چال چلی۔

خلاف توقع یہ چال کامیاب رہی۔ غالب نے ہاتھ بڑھایا "پھر تو میں بھی تمہارا دوست ہوں۔ مجھے غالب مت کہنا۔"

"مجھ سے بھی دوستی کر لو" میں نے ہاتھ بڑھایا "مجھ سے غلط فہمی ہو گئی تھی کہ تمہیں غالب سمجھا۔ تو تم فیروز ہو؟"

[illegible] "ہاں میں فیروز ہوں۔"

میں نے کہا "اب ہم تمہارے ساتھ چلیں۔ تم چوکیدار کو بتانا کہ ہم تمہارے دوست ہیں۔ ہم رات بھر باتیں کریں گے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "رانا صاحب کا حکم ہے کہ کوئی اندر نہیں جائے گا۔ جب تک خود چوکیدار اسے نہ پہچانے یا رانا صاحب کی اجازت نہ ملے۔ خیر میں پوچھ لوں گا رانا صاحب سے۔"

"کیا پوچھو گے؟"

"یہی... کہ میں اپنے ساتھ دو دوستوں کو اندر لے جاؤں مگر رات بھر کیا باتیں کریں گے ہم؟"

میں نے کہا "... رات بھر کیا باتیں کریں گے ہم۔ چھوڑو، رانا صاحب سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ بس ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ جہاں رانا صاحب کی نئی کوٹھی ہے نا۔ وہیں میرے بڑے بھائی رہتے ہیں۔ عبدالودود مظہر۔"

یہ نام سن کر وہ چونکا نہیں مگر اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آنے لگیں۔ "عبدالودود مظہر کیا [illegible] وکیل ہیں؟"

میں نے خوش ہو کے کہا "ہاں ہاں۔ کیا تم جانتے ہو انہیں؟"

اس نے کہا "ہاں۔ ادھر ہی کہیں رہتے ہیں وہ۔"

"[illegible] بھی وہیں رہا۔ وقار یوسف بھی اسی علاقے میں ہے۔"

اس کے نتیجے میں غالب وحشت یا جنون میں مبتلا ہو جائے یا جارحانہ انداز اختیار کرے۔ وہ بھی رانا کا دشمن تھا اور یہ سب کچھ اس سے کہیں زیادہ غالب کے ساتھ بھی ہوا ہو گا اور نازو کے ساتھ بھی۔

میں نے فوراً موضوع بدل دیا "اچھا فیروز۔ اب تو ہم دوست ہیں لیکن تم نے ابھی تک اپنے دوستوں کے نام نہیں پوچھے۔"

محسن نے بھی کہا "کیا تمہیں ہمارے نام پہلے سے معلوم تھے؟"

غالب نے بے چینی سے کہا "نہیں۔ کیا نام ہیں تمہارے؟"

میں نے کہا "میرا نام ہے اسٹیو پیٹرو۔"

محسن بولا "میں چوہدری دلدار ہوں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو" غالب نے کہا "وہ تو رانا صاحب کے دوست ہیں، میرے نہیں۔"

میں نے کہا "ہم مذاق کر رہے تھے یار۔ میرا نام ہے اکرام شیخ۔"

وہ چونکا "اکرام شیخ کیا تم پولیس میں تھے پہلے؟"

"بالکل ٹھیک۔ اب میں ٹیکسی چلاتا ہوں۔ بتاؤ کہاں؟"

"کراچی میں" غالب بولا اور پھر اپنی بات پر خوش ہوا۔

اب محسن نے اس کی یادداشت کو ایک اور جھٹکا دیا "میرا نام [illegible] کیا کرتا ہوں؟"

غالب پھر چونکا "نہیں۔ تم صحافی ہو۔ اخبار والے۔"

"رائٹ۔ یہ بتاؤ کس اخبار میں کام کرتا ہوں میں؟"

غالب نے اپنے اخبار کا نام بتا دیا۔ اسے بہت کچھ یاد تھا۔ اس کے ذہن سے صرف وہ باتیں محو ہوئی تھیں جن کا تعلق براہ راست شوکت رانا یا چوہدری دلدار کے معاملات سے تھا اور جو بہت زیادہ پرانی نہیں تھیں۔ ظاہر ہے اتنے کم عرصے میں تمام عمر کی یادوں کے نقوش مٹانا ناممکن تھا۔

اس وقت تک میں طے کر چکا تھا کہ آج رات ہمارا لائحہ عمل کیا ہو گا۔ میں نے محسن سے فرنچ میں کہا "ابھی اتنا کافی ہے۔ اس کے سامنے اور کسی کا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ ایسا نہ ہو زیادہ دباؤ کا الٹا اثر ہو جائے۔"

"تم جس نام سے ڈر رہے ہو وہ تو میں بھی نہیں لوں گا" محسن نے نازو کا نام لیے بغیر کہا۔

میں نے کہا "ہم آج رات ہی کارروائی کریں گے۔"

"کسی تیاری کے بغیر؟"

"تیاری کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ اس نے بتایا۔ اندر ایک خادمہ ہے اور ایک چوکیدار۔ ان سے نمٹا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا خیال ہے وہ خادمہ رہی ہے؟"

"ممکن ہے" میں نے بھی نازو کا نام لینے سے گریز کیا۔

غالب نے پھر اقرار میں سر ہلایا "رانا صاحب ذکر کر رہے تھے۔"

"تو ہمیں رانا صاحب کی کوٹھی کے دروازے پر اتار دینا۔ تم اندر چلے جانا۔ ہم اپنے بھائی کے گھر پیدل چلے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے" غالب مان گیا۔

اگلی سیٹ پر غالب کے ساتھ میں اور پیچھے محسن بیٹھ گیا۔ غالب بالکل کسی ڈری یا روبوٹ کی طرح ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ بے جان اور سپاٹ ہر احساس سے عاری لگتا تھا لیکن اب میں بہت زیادہ پرامید تھا۔ مظہر اور وقار یوسف کے نام سن کے غالب کو یاد آ گیا تھا کہ وہ وکیل ہیں۔ یادوں کا سلسلہ ایک زنجیر کی طرح ہوتا ہے جو حلقہ در حلقہ پیوستہ ہوں اگر درمیان کی کڑی ٹوٹ جائے تو یادداشت ادھوری رہ جاتی ہے اور کسی بھی شخص کو دوبارہ اپنے ماضی سے جوڑنے کے لیے تمام ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو آپس میں جوڑنا ضروری ہوتا ہے۔ اب مجھے یہ کام بہت آسان محسوس ہونے لگا تھا۔ غالب دوبارہ ہمارے درمیان ہو گا اور اسے پھر وہی جانا پہچانا اور پرخلوص رشتوں کا محبت بھرا ماحول ملے گا تو بحالی کا عمل تیز سے تیز تر ہو جائے گا۔

محسن نے شیشے کے ذرات کو کپڑے سے جھاڑ کر اپنے لیے جگہ بنائی تو غالب کی صورت پر پھر پریشانی کے آثار عیاں ہوئے "تم نے شیشہ توڑا ہو گا نا۔ تم نے کہا تھا۔"

"ہاں۔ فیروز ہم دوست ہیں۔ دوست جھوٹ نہیں بولتے۔"

"اچھا تو پھر لگوا دو۔"

"ابھی؟ اس وقت؟" محسن نے حیرانی سے کہا "اس وقت تو سب دکانیں بند ہوں گی فیروز۔ یہ کام تو صبح ہی ہو گا۔"

"اچھا۔ پھر تو رانا صاحب کو معلوم ہو جائے گا۔" غالب نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا "ابھی چوکیدار دیکھے گا۔"

"تم جھوٹ نہیں بول سکتے؟"

"میں جھوٹ نہیں بول سکتا" غالب نے قطعی لہجے میں محسن کی بات کاٹ دی۔

میں نے کہا "بے وقوف کیا تم اپنے دوستوں کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ تمہارے دوستوں کو ماریں گے رانا صاحب۔ بجلی کے جھٹکے دیں گے۔"

غالب کا بازو ایک دم اسٹیئرنگ پر سخت ہو گیا اور وہ خوف زدہ نظر آنے لگا "بجلی کے جھٹکے دیں گے ننگا کر کے۔"

"ہاں ننگا کر کے" میں نے کہا "تمہیں معلوم ہے نا وہ دشمنوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔ انہیں کہاں رکھتے ہیں۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "ان کو نیچے رکھتے ہیں۔ وہاں میں جہاں بہت ٹھنڈ ہوتی ہے اور سونے نہیں دیتے کسی کو۔"

ظاہر ہے غالب وہ سب بتا رہا تھا جو اس پر بیتی تھی مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت یادوں کا یہ سلسلہ دراز ہو اور کسی ناخوش گوار

www.paksociety.com

"مگر یہ سب ہمارے لیے فکر مند ہوں گے۔ انہیں بتا دینا چاہیے کہیں سے فون کر کے۔"
میں نے کہا "اگر موقع ملا تو بتا دیں گے۔"
غالب اچانک بولا "... رہے ہو۔"
میں نے کہا "تم ... کیا تم فرنچ جانتے ہو۔"
محسن نے کہا "کیا پہلے کسی کو فرنچ بولتے سنا ہے تم نے۔"
"ہاں۔ مگر یاد نہیں آتا کہ کون بولتا تھا۔ یہ رانا صاحب کی کوٹھی آگئی۔" اس نے گلبرگ کے علاقے میں پہنچ کے کہا "اگلے موڑ پر ہے۔"
"اچھا۔ تو پھر ہمیں اتار دو یہاں۔ ہمیں ادھر جانا ہے" میں نے دائیں جانب اشارہ کیا اور گاڑی رک گئی۔
ہمارے اترتے ہی غالب نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ موڑ پر سے ہم نے اسے چھٹی یا ساتویں کوٹھی کے سامنے رکتے دیکھا۔ یہ گلبرگ کا نیا اور جدید ترین علاقہ تھا جہاں رہنے والوں کے لیے صرف دولت مند ہونے کی شرط پوری کرنا کافی نہیں تھا۔ ان کا انتہائی دولت مند ہونا ضروری تھا۔ وضع قطع طرز تعمیر اور زیبائش و آرائش میں ہر کوٹھی اپنی مثال آپ تھی۔ ان میں رہنے والے بھی بہت قیمتی لوگ تھے چنانچہ ان کی حفاظت کے لیے فصیل جیسی دیواریں تھیں اور الیکٹرانک لاک والے فولادی دروازے تھے۔ مسلح دربان تھے اور ہر گوشے کو منور کرنے والی سرچ لائٹیں تھیں۔ خونخوار کتے آزادانہ پھرتے تھے جو اپنے پرائے کا فرق سونگھ کے جان لیتے تھے۔

میں اور محسن ویران سڑک پر سے گزرے تو غالب کی کار کوٹھی کے اندر جا چکی تھی اور گیٹ بند ہو جانے کے بعد اندر کا منظر کسی دروازے سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ ہم اس کے سامنے سے سیدھے گزرے۔
میں نے سست رفتاری سے چلتے ہوئے دونوں طرف سے متصل کوٹھیوں کا جائزہ لیا "کیا چوکیدار نے دیکھا ہوگا کہ نئی کار کا پچھلا شیشہ غائب ہے؟"
محسن بولا "شوکت رانا کے چوکیدار کی کوئی چیز خراب نہیں ہو سکتی۔ نہ آنکھیں۔ نہ صحت۔ نہ بندوق اور نہ اس کا نشانہ۔"
"بعض اوقات بالکل صاف اور شفاف شیشہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے کوئی اسٹیکر لگایا جاتا ہے یا اس پر کچھ لکھ دیتے ہیں۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ رات کے وقت کار کی کھڑکی کا کوئی شیشہ کھلا رہ جاتا ہے مگر پتا نہیں چلتا۔"
"بات اگر امکان کی ہے تو میں اسے ناممکن نہیں سمجھتا کہ گاڑی چوکیدار کے پاس سے گزرتی ہو اور اس کو پتا چلا ہو کہ پچھلی گاڑی کے پیچھے والا شیشہ ٹوٹا ہی نہیں۔ ایک تو اس کی نظر کا دھوکا پھر عقل کے لیے یہ غیر متوقع مگر اس سے زیادہ حقیقت سے بے خبری کا سبب یہ ہوگا کہ گاڑی کے اندر داخل ہو جانے کے بعد

چوکیدار کو خیال ہوگا گیٹ پھر بند کرنے کا۔ سامنے والا دروازہ اگر نہ ہوتا تو وہ گاڑی کو دیکھتے ہی اڑ جاتا مگر پچھلے شیشے کو شاید اس نے دیکھا ہی نہ ہو۔ وہ گاڑی کے گزرتے ہی پلٹ گیا ہوگا۔"
"کیا غالب اسے بتائے گا ہمارے بارے میں؟"
"میرا خیال ہے کہ نہیں۔ وہ اب پہلے سے زیادہ کنفیوژن کا شکار ہے۔ اسے برین واش کرنے والوں نے بہت اچھی طرح دوست اور دشمن کا فرق سمجھایا ہوگا مگر ہم سے مل کے ہماری صورتیں دیکھ کے اور ہماری باتوں سے غالب ڈانواں ڈول ہو جائے۔ اس کے لاشعور میں ہمارے لیے دوستی اور خلوص، ہمدردی اور رفاقت کے جو جذبات دبا دیے گئے تھے وہ پھر جاگ چکے ہیں۔ وہ اب بے یقینی میں مبتلا ہے۔ اگر آج رات ہی شوکت رانا اس کے سامنے آجائے اور اپنے طریقے سے پوچھے تو شاید وہ سب بتا دے۔ شوکت رانا کے نفسیاتی خوف کے حلقہ اثر سے نکلنا تو چاہتا ہے مگر ایسی کوشش کرتے ہوئے ڈرتا بھی ہے۔ ہر قیدی اپنی ذہنی تھکن کے کاٹتا ہے اس وقت جب جیلر سامنے نہ ہو۔ جیلر کے سامنے تو وہ ذہنی اور جسمانی طور پر مغلوب اور مظلوم رہتا ہے۔ ذہنی و جسمانی طور پر مفلوج ہو جاتا ہے۔"
"آج رات شاید غالب اور شوکت رانا کی ملاقات نہیں ہوگی۔ اس کا مطلب ہے غالب پر ہماری باتوں کا اثر باقی رہے گا۔ اس کا لاشعور کشمکش میں رہے گا اور اسے سوچنے پر ... کرنے پر مجبور کر رہا ہے گا۔"
"ہاں۔ اور اگر ہم نے اسے آج رات ہی یہاں سے نکال لیا تو ... وہ ہمارے بارے میں رانا کو تفصیل سے بتا دے گا۔ یہ بات ہمارے ... ناممکن ہے کہ رانا ٹوٹا شیشہ نہ دیکھے اور غالب سے کچھ نہ پوچھے۔ ویسے بھی آج موقع اچھا ہے۔ ... بیگم صاحب بھی موجود نہیں ہیں۔ چوکیدار بھی زیادہ بے فکر ہوگا اور خادمہ بھی چین سے سوئے گی۔ یار تم نازو کی بات کر رہا ہے "وہ خادمہ نازو ہو سکتی ہے۔"
میں نے کہا "نہیں یار۔ نہ جانے کیوں میرا ذہن یہ تسلیم نہیں کرتا کہ نازو اس کوٹھی میں شوکت رانا کی خادمہ بن کے رہ سکتی ہے۔ وہ آسانی سے زیر ہونے والی چیز نہیں ہے۔ اس کو جسمانی طور پر شکست دینا بھی آسان نہیں تھا مگر ایک عورت بہرحال عورت ہوتی ہے۔ نازو کو بھی مغلوب کیا جا سکتا ہے مگر اس کی قوت ارادی بھی بہت زبردست ہے محسن۔ وہ انتہائی ذہین اور چالاک بھی ہے۔"
"لیکن انتہائی حسین عورت ہے" محسن بولا۔
"ہاں۔ حسین، جوان اور پرکشش" میں نے کہا "وہ شوکت رانا جیسے شخص کے گھر میں ہوگی تو خادمہ نہیں ہوگی۔ اگر ذہنی طور پر اس کی حالت بھی ویسی ہی فرض کر لی جائے جیسی ہم نے غالب کی دیکھی ہے تو پھر وہ شوکت رانا کے بیڈ روم میں ہوگی۔ خادمہ کے طور پر نہیں۔ داشتہ کے طور پر... بیوی..."

... گیٹ بند تھا اور چوکیدار بھی باہر نظر نہیں آرہے تھے۔ ... بڑے ہوئے چوکیدار کو قابو کرنا آسان ہوتا ہے اور اس کے ... کو بے خوفی سے گھر میں داخل ہو کے اپنی کارروائی جاری ... مگر تجربے نے لوگوں کو سیانا بنا دیا تھا۔ اب چوکیدار گیٹ کی آنکھ جیسی کھڑکی سے جھانک کر آنے والوں کی پہلے دیکھتے تھے اور ذرا بھی شک ہو تو الارم آن کر دیتے۔

... میں دو کاریں ہمارے پاس سے گزری تھیں مگر ہم ملنے ... چوکیدار نظر نہیں آئے تھے چنانچہ کسی نے ہماری چہل قدمی پر ... کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ اصل مسئلہ رانا صاحب کی کوٹھی کے اندر داخل ہونے کا تھا۔ باقی سب ... اور امکانات تھے جن پر ہم کافی بحث کر چکے تھے۔
تیسرے چکر میں ہم اس کوٹھی سے چند قدم ہی آگے گئے تھے ... کانوں نے ایک چیخ کی آواز سنی۔ یہ آواز محسن نے بھی ... یہ چیخ کسی عورت کی تھی۔ ہم دونوں کے قدم خود بخود رک ...

دوسری بار چیخ زیادہ واضح تھی۔ وہ عورت مدد کے لیے پکار رہی ... مگر اس کی آواز جیسے اچانک دبا دی گئی۔ وہ پھر چلائی اور شاید پھر ... نے اس کا منہ بند کر دیا۔ اس چیخ میں دکھ اور کرب کے ساتھ ... بے بسی اور کمزور ہونے کا اعتراف تھا اور بے ناامیدی کی انتہا ... علم نہیں تھا کہ خدا نے اس کی دعا نہیں سنی اور ہو بھی ... تھا۔ اب وہ خدا کے بندوں سے فریاد کر رہی تھی کہ عرش ... آواز نہیں پہنچی۔ کیا کوئی فرشتہ کہیں میری مدد کے لیے ... مگر اوپر سے حکم نہ ہوتا تو شاید ممکن اس وقت ہم یہاں ... نہ ہوتے جب اس عورت نے چیخ ماری تھی اور یہ حکم ... اس عورت کی دعا پر ہی صادر ہوا تھا۔
میں نے کہا "محسن۔ اس بنگلے میں کیا ہو رہا ہے آخر؟"
محسن نے کہا "جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ اچھا تو نہیں ہو رہا ہے ... ہم کیا کریں؟"
"یار۔ یہ تو بڑی افسوسناک بے حسی ہوگی۔ اگر ہم نے ... کچھ نہ کیا۔ سنا نہیں وہ کیسے چیخ رہی تھی۔"
"آس پاس اور لوگ بھی رہتے ہیں۔ انہوں نے بھی سنا ہوگا۔ ... آوازیں سنتے ہوں۔ شرابی شوہر بیوی کو مار رہا ہو..."
"... اگر ہم پوچھیں تو اس میں کوئی غیر اخلاقی یا غیر قانونی بات ... زیادہ شوہر کہے گا کہ رفع ہو جاؤ۔ یہ میری بیوی ہے ... اور بیوی بھی اس کی تائید کرے گی کہ ہاں جی ہمارا ... معاملہ ہے۔ تم بھلا کون ہوتے ہو دخل دینے والے۔ پھر ہم ... ہو کے لوٹ جائیں گے۔"
"مسئلہ حل کرانے کے بہتر طریقے بھی ہیں۔ اور یہ شوق کسی ... پورا کر لیں آپ۔"

محسن سمجھ گیا "بائی بیگم کے روپ میں۔ یہی کہنا چاہتا ہے نا تو؟"
"ہاں۔ اس تلخ حقیقت کو نگلنے یا اگلنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ ایسا ہو سکتا ہے محسن۔ یہ ناممکن نہیں ہے۔ خدا اسے برے وقت سے بچائے۔"
"او مائی گاڈ!" محسن نے ایک ہاتھ پیشانی پر رکھا "بے چارا غالب اتنا لاچار اور مجبور بھی ہو سکتا ہے۔ نہیں یار، اگر ایسا ہوتا تو غالب بالکل پاگل ہو جاتا۔ اس حد تک کہ خود کو ہلاک کر لیتا۔ یا شوکت رانا کی جان لے لیتا۔"
"اسی لیے تو میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ خادمہ کوئی عام عورت ہوگی۔ نازو نہیں، اگر میری اور تیری صورت سے مظہر یا وقار یوسف اور اکرام شیخ کے نام سے غالب کے ذہن کو جھٹکا لگتا ہے تو نازو سے اس کی مکمل جذباتی بے نیازی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ شوکت رانا اتنا بے وقوف نہیں کہ نازو کو غالب کے سامنے لانے کا رسک لے۔ نازو سے اس کی محبت کا جذبہ نہ اسیر کیا جا سکتا ہے اور نہ مجبور۔ اسے صرف موت آ سکتی ہے۔ نازو نہ رہے یا غالب مر جائے تو یہ محبت ختم ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے کوئی شوکت رانا یا چوہدری دلاور کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ نازو جب بھی سامنے آئے گی غالب کے وجود میں بھڑکنے والا اس کی محبت کا آتش فشاں پھر روشن ہو جائے گا۔ اتنی ہی شدت کے ساتھ۔"
محسن نے کہا "میں یہ بات مانتا ہوں مگر نازو کو ذریعہ تو بنایا جا سکتا ہے۔ غالب کی کمزوری ہے نازو تو نازو کی کمزوری بھی غالب ہی ہے۔ کیا نازو کی زندگی کی ضمانت پر غالب کو غلامی کا طوق پہننے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور کیا اسی طرح غالب کو ظلم و تشدد سے بچانے کے لیے نازو بھی شوکت رانا کی ہر جائز و ناجائز بات ماننے پر راضی نہیں ہو سکتی؟ اس کے ہر مطالبے پر سر تسلیم خم نہیں کر سکتی۔"
میں نے کمزور لہجے میں کہا "ایسا تو ہوتا ہے۔ ایسی محبت ہر قربانی دے سکتی ہے۔ جان و مال کی بھی، آبرو کی بھی۔ اپنے لیے نہیں صرف اپنے محبوب کی خاطر۔"
محسن تلخی سے بولا "اگر شوکت رانا غالب سے جان نہیں مانگتا تو آخر کیوں؟ صرف اس لیے کہ پھر وہ سودا کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہتا۔ غالب کی زندگی کے بدلے میں نازو سے وہ کیا سودا کر سکتا ہے۔"
"نہیں یار" میں نے کہا "خدا نہ کرے۔ خدا نہ کرے کہ اس قسم کی صورت حال درپیش ہو۔ ایسی صورت میں نازو کوئی سودا نہیں کرے گی۔ وہ اپنی جان کی بازی لگا دے گی مگر غالب کو خود پہلے مروا دے گی۔"
ہم اس مختصر سی سڑک پر تیسرا چکر لگا رہے تھے جس کے دونوں طرف شاید دس دس کوٹھیاں تھیں مگر ہمیں دیکھنے والا کوئی بھی

www.paksociety.com

میں نے اس کی بات کاٹ دی "محسن، اس امکان پر غور فرماؤ کہ شاید ایسے ہمیں اندر جانے کا موقع مل جائے اور اندر جا کے ہم پڑوس والے شوکت رانا صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں یا کوئی راستہ نکل آئے ساتھ والے گھر میں داخل ہونے کا۔"

محسن نے میری بات کو اہمیت نہیں دی تھی اور میں بھی یہ سوچ کے خاموش ہو گیا تھا کہ شاید ممکن نہیں۔ ان کوٹھیوں میں عام لوگ نہیں رہتے کہ راہ چلتے جس کا جی چاہے اندر داخل ہو جائے اور ان کے نجی معاملات میں ٹانگ اڑانے لگے۔ ایسی کوٹھیوں میں کیا نہیں ہوتا۔ بیوی کی تو بات ہی اور ہے۔ جاہل اور پڑھے لکھے۔ نچلے طبقے کے اور طبقہ اشراف سے تعلق رکھنے والے۔ مشرق کے غیر مہذب اور مغرب کی روشن خیال سوسائٹی کے جمہوری مزاج رکھنے والے۔ ہر قسم کے شوہر بیویوں کو مارتے ہیں۔ وہ چیختی چلاتی ہیں اور اس کے باوجود انہی کے ساتھ زندگی گزارتی ہیں لیکن بیوی کے علاوہ بھی نہ جانے کتنی مجبور اور کمزور عورتیں ایسے ہی چیخ چیخ کر ساری دنیا کے عشرت کدوں، قحبہ خانوں سے، کوٹھوں سے اور کوٹھیوں سے، تھانوں سے اور عقوبت خانوں سے مردوں کی مردانگی کے خلاف فریاد کرتی ہیں۔ اپنے جسم اور اپنی روح پر ہونے والے تشدد پر چلاتی ہیں۔ اپنی آبرو پر ڈاکا ڈالنے والوں سے بچانے والے دست غیب کو پکارتی ہیں۔ معاشرے کے سورماؤں کو اور فلمی ہیرو کو آواز دیتی ہیں مگر ان کی مدد کے لیے کوئی نہیں آتا۔

میں نے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ عورت نے پھر چیخ ماری "خدا کے لیے، رسول کے لیے مجھے جانے دو، مجھے چھوڑ دو۔"

اس بار یہ آواز گیٹ کے پیچھے بہت قریب سے آئی تھی لیکن پھر کسی نے آواز کو دبا دیا۔ وہ چیخ گھٹ کر رہ گئی۔

"حرام زادی" کسی مرد نے کتے کی طرح غرا کے کہا۔

عورت شاید پھر آزاد ہو گئی۔ اس نے چیخ کے کہا "کوئی بچاؤ" مگر اب یہ آواز اندر کچھ فاصلے سے آئی تھی۔ کوئی دروازہ بند ہوا اور آواز بھی بند ہو گئی۔

میں نے چشم تصور میں دیکھا کہ ایک مجبور مظلوم عورت جان یا عزت بچانے کی جدوجہد میں تنہا ہے۔ اس کے مقابل خونخوار بھیڑیے جیسی سفاک فطرت والا طاقتور مرد ہے یا ہوس کے شیطانی جذبات سے مغلوب شیطانی ٹولہ ہے اور وہ اکیلی ہی ان سے لڑ رہی ہے۔ ایک ایسی لڑائی جس میں کوئی اس کے ساتھ نہیں اور جو بالآخر اسے ہارنی ہے۔ وہ ایک بار ان کے چنگل سے نکل آئی تھی لیکن وہ پھر اسے پکڑ کر اندر لے گئے ہیں۔

یہ صرف چند سیکنڈ کی بات تھی پھر میں نے اور محسن نے ایک ساتھ گیٹ کا رخ کیا۔ وہاں کال بیل کوئی نہیں تھی۔ کال بیل چھوٹے لوگ لگاتے ہیں جن کے دروازے پر آ کے سائل میں۔ فقیر اور غریب رشتے دار [illegible] وہ کوئی بھی گھنٹی پہ انگلی رکھ کر انہیں [illegible] بھی [illegible] رات کو [illegible] لوگ [illegible] بے نام ناپسندیدہ ملاقاتیوں سے محفوظ رہنے کے لیے [illegible] چوکیدار بٹھاتے ہیں جو آنے والے کی صورت دیکھ کے اور موقع محل دیکھ کے دروازہ کھولتا ہے یا انٹرکام پر اندر صاحب اور بیگم صاحبہ سے اجازت طلب کرتا ہے کہ اس جانے کے غور اس نام کے ملاقاتی سے کیا کہا جائے۔ یہ کہ دفع ہو جاؤ، یا یہ کہ صاحب سو رہے ہیں، بیگم صاحبہ کے ساتھ باہر گئے ہیں۔ گھر سے باہر گئے ہیں۔ شہر سے باہر یا ملک سے باہر؟ یہ کچھ پتا نہیں۔ ذرا سے چوکیدار تو ایسے صورت شناس ہو جاتے ہیں کہ فوراً ہی طے کر لیتے ہیں کہ کون ملاقاتی اس قابل ہے کہ اسے اندر جانے دیا جائے اور کسے دروازے کے باہر ہی سے لوٹا دیا جائے۔

یہاں بھی ایسا ہی معاملہ تھا۔ میں نے دروازہ بجایا مگر نہ کسی نے اندر سے جھانک کے دیکھا اور نہ یہ پوچھا کہ کون دروازہ توڑ رہا ہے۔ ہمارے دروازہ بجانے کا انداز ہی ایسا تھا۔

میں نے کہا "میاں محسن شیروانی۔ یاد کرو محمد بن قاسم کو۔ وہ کہاں سے ایک لڑکی کی فریاد سن کے آیا تھا۔ اس کی راہ میں سمندر نہیں حائل ہوا تھا۔ ہم کیا یہ گیٹ بند دیکھ کے لوٹ جائیں گے؟"

محسن نے کہا "ویسے تو ہم محمد بن قاسم نہیں ہیں مگر اس وقت میری بھی یہی کیفیت رہی ہے۔"

میں نے دو بار گیٹ پر لات ماری مگر اندر خاموشی رہی۔ مجھے حیرانی تھی کہ پڑوس کی کوٹھی کا چوکیدار بھی نہ عورت کی چیخ پر باہر آیا تھا اور نہ آس پاس کی کسی کوٹھی سے کوئی نکلا تھا۔ چوکیدار شاید مجبور تھے۔ ان کو حکم ہو گا کہ باہر قیامت آ جائے تب بھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔ یا پھر محسن کی بات ٹھیک تھی کہ لوگ ایسی چیخوں کے عادی تھے۔

"اگر ہم گیٹ کے اوپر سے اندر کود جائیں تو کیا ہو گا؟"

محسن بولا "شاید ایک فائر۔ ویسے یہ جرم ہے زیر دفعہ ض ف ۴۴۹...."

میں نے کہا "لعنت تجھ پر اور تیرے ضابطہ فوجداری پر" اور گیٹ پر چڑھ گیا۔

گیٹ آٹھ نو فٹ اونچا تھا مگر اس کے آہنی فریم پر بنے ہوئے نقش و نگار اور گرل کے زینوں پر قدم جمانا آسان تھا۔ اوپر والے حصے پر نوکدار سلاخوں نے تھوڑی سی مشکل پیدا کی مگر اندر جھانکنے کے بعد جب مجھے یہ اطمینان حاصل ہو گیا کہ فائر کرنے والا چوکیدار کوئی نہیں تو میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ میں سرکس کے بازیگر کی مہارت کے ساتھ اندر اترا۔ سلاخوں میں الجھ کر میرا کوٹ اور پتلون دونوں پھٹ گئے۔ محسن کو پہلے سے اندر موجود پا کے مجھے حیرانی ہوئی "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" میں نے کہا "ہیلی کاپٹر سے؟"

محسن نے دیوار کی طرف اشارہ کیا "یہ شارٹ کٹ ہے۔ آپ نے مشکل راستہ چنا تھا۔"

ہمارے سامنے وسیع لان پھیلا ہوا تھا جس پر گارڈن چیئر رکھی گئی تھیں مگر ان میں سے دو الٹی ہوئی تھیں۔ بائیں جانب ڈرائیو وے پر ایک ہی لمبی سی بیش قیمت کار [illegible] رہی تھی۔ پورچ لائٹ کے سوا باہر کی کوئی لائٹ نہیں جل رہی تھی حالانکہ مجھے سرچ لائٹس اور گارڈن لائٹس صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس بلیک آؤٹ نے ماحول کو زیادہ پراسرار اور بھیانک بنا دیا تھا۔

میں اور محسن آگے بڑھتے ہوئے بہت محتاط تھے۔ ٹریس پاس کرنے یعنی کسی کی ذاتی حدود میں بلا قانونی جواز کے مداخلت کرنے کا جرم ہم کر چکے تھے۔ اگر ہم پکڑے جاتے تو یہ عذر قانون کی نظر میں فضول بہانہ سمجھا جاتا کہ ایک درد بھری فریاد سن کے ہمارے ضمیر نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ ہم اپنا انسانی اور اخلاقی فرض ادا کریں۔ اب ہمیں اپنا دفاع بھی خود ہی کرنا تھا۔

ابھی ہم پورچ تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ ایک ساتھ دو کتے بھونکتے ہوئے ہم پر حملہ آور ہوئے۔ اگر ہم پرانے محاورے پر بھروسا کرتے تو بھونکنے والے کتے کاٹ بھی لیتے۔ وہ سائز میں گدھے سے کچھ ہی کم تھے اور ان کے بھونکنے کی آواز بھی دل دہلاتی تھی۔ خون آشامی ان کے تیور سے عیاں تھی۔

محسن تو چلایا "یار، مروا دیا نا" اور سرپٹ سیدھا دوڑا۔ مجھے بس اتنی ہی مہلت ملی کہ میں ایک کتے کو فٹ بال سمجھ کے ایسی ٹھوکر ماروں جیسی گول کیپر مارتے ہیں تو بال کو گراؤنڈ کے دوسرے سرے تک پہنچا دیتے ہیں۔ کتا خود ہی بوٹ کی نوک پر آیا اور ٹھوکر اس کی تھوتھنی پر لگی۔ ایک دم اس کی آواز بدل گئی۔ اس کا سارا تعصب ختم ہو گیا اور وہ درد سے چلانے لگا۔ میری ٹھوکر جان لیوا ثابت ہوئی۔ کتا وہیں گر کے لوٹنے لگا اور بھیانک آوازیں نکالنے لگا۔

دوسرا کتا محسن کی طرف لپکا تھا مگر محسن پورچ کے گول ستون کی آڑ میں اس کے ساتھ ڈانس کر رہا تھا۔ کتا اس کی طرف آتا تو وہ گھوم کے دوسری طرف چلا جاتا۔ وہ دو فٹ قطر کے اس ستون کے چاروں طرف چکر لگا رہے تھے۔ محسن اسے گالیاں دے رہا تھا "ابے جان چھوڑ میری۔ کتے کے بچے مجھے کاٹے گا تو خود پاگل ہو جائے گا۔ تیری تو ایسی کی تیسی۔ تیرا باپ بھی مجھے نہیں پکڑ سکتا۔ دیکھ... وہ دیکھ۔ مارا گیا تیرا بھائی۔ اب تیری باری ہے۔"

اس وقت تک میں بھی اس کی مدد کے لیے تیار تھا مگر شور سن کے اندر سے ایک شخص عجیب و غریب حلیے میں برآمد ہو چکا تھا۔ صرف انڈرویئر میں اپنے بھاری بھرکم بالوں بھرے جسم کے ساتھ وہ انسان کم اور بھالو زیادہ لگتا تھا۔ اندر کہیں وہ عورت پھر شور مچا رہی تھی اور کسی بند دروازے کو کوٹ رہی تھی۔ بھالو اس کی طرف سے بھی پریشان تھا۔

"کون... کون ہو تم... یہ کیا کر رہے ہو..." اس نے گرجنے کی کوشش کی مگر لکنت کے باعث اس کی آواز میں ہچکی آ گئی۔

میں نے دوسرے کتے کو لات ماری۔ غالباً وہ پہلے ہی میدان چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لات اس کی دم کے نیچے پڑی تھی۔ وہ دم دبا کے بھاگ گیا۔

محسن نے کہا "تم بتاؤ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے چیخ لی "بدمعاش۔ تو مجھ سے پوچھتا ہے۔ میرے گھر میں گھس کے یہ پوچھتا ہے۔ چور اچکے تو اندر کیسے آیا آخر؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ نشے میں ہے۔ "ہم چور اچکے نہیں ہیں۔"

"تو پھر کیا ہو... تمہارے باپ کا گھر ہے کیا؟ ایسے ہی اندر آ گئے، میرے سالے کو... سالے کو مار دیا" اس نے مردہ کتے کی طرف دیکھ کے افسوس سے سر ہلایا "میرا سالا تو مجھے... مجھے دیکھ کے دم ہلاتا تھا۔"

میں نے کہا "اندر سے یہ کس کے چیخنے کی آواز آ رہی ہے؟"

محسن نے کہا "کوئی عورت مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ ہم نے سڑک پر سے گزرتے ہوئے اس کی آواز سنی تھی۔"

عالو نے کہا "ارے بھائی۔ سڑک پر سے گزر رہے تھے... تو گزر جاتے۔ سڑک کسی کے باپ کی نہیں۔ مگر یہ کوٹھی میرے باپ کی ہے۔"

اب میں نے آگے بڑھ کے اسے دھکا دیا "آخر کون ہے یہ عورت۔ کیوں چلا رہی ہے؟"

وہ لڑکھڑا کے پیچھے دیوار سے جا لگا "مجھے... میرے ہی گھر میں... دھکا دیا۔ یہ جرأت تمہاری... خیر میں سمجھ لوں گا۔"

"تم نے بہت پی رکھی ہے۔ ہم خود اندر جا کے دیکھیں گے۔"

اس نے ہمارے سامنے یوں ہاتھ پھیلا دیے جیسے وہ سچ مچ ہمیں روک لے گا "دیکھو... شراب بھی میری ہے۔ عورت بھی میری۔ کیونکہ... کیونکہ وہ پیسہ بھی میرا تھا۔"

"جس سے تم نے یہ دونوں چیزیں خریدی تھیں" میں نے نفرت سے کہا۔

"تم... سمجھ دار آدمی ہو۔ مگر تم میرے سالے کے قاتل ہو۔ پھر بھی میں تم کو معاف کرتا ہوں۔ جاؤ، اپنا کام کرو... ورنہ..."

محسن نے دروازہ کھولا اور میں اسے گردن سے دبوچ کے اندر لے گیا۔ صورت حال مجھ پر پوری طرح واضح ہو چکی تھی اور میرا خوف دور ہو گیا تھا۔ "تمہارا نشہ ابھی اتر جائے گا۔ تم کتے کو اپنا سالا کہتے ہو؟"

"ہاں۔ وہ کتا ہے اور اس کی بہن... وہ کتیا ہے۔ اچھا کیا تم نے اس کی... پر لات ماری۔ مگر تم مجھے نہیں جانتے... میں کتا نہیں ہوں۔ میں انیس احمد... کلکٹر کسٹم" وہ لڑکھڑا کے ایک صوفے پر گر گیا۔

دروازے سے داخل ہوتے ہی اس کا ڈرائنگ روم آ گیا تھا۔ جس کی آرائش کے انداز میں مال حرام کی شان و شوکت پوری طرح عیاں تھی۔ اندر کہیں وہ بیڈ روم تھا جس میں کوئی عورت قید

www.paksociety.com

تھی اور انسانی آواز میں محسن کے پہلے سے زیادہ دردناک انداز میں مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ چند منٹ بعد محسن اسے اپنے ساتھ لے کر آیا تو اس کی حالت خود اس پر ہونے والے ظلم کی گواہی دے رہی تھی۔

وہ کوئی نوعمر لڑکی نہیں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق پینتیس سال کی عورت تھی لیکن پچیس سال کی لگتی تھی۔ اس نے اپنی عمر کی پیش قدمی کی رفتار کو قابو میں رکھا تھا۔ وہ بلاشبہ حسین عورت تھی اور اس کے جسمانی خدوخال بھی پرکشش تھے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اس نے شوخ رنگ کی ساڑی کو جسم پر چادر کی طرح لپیٹ لیا تھا۔ نیچے کا بلاؤز اور چھوٹی کوٹ شاید بھالو نے نوچ کے پھاڑ دیا تھا۔

عورت کو دیکھتے ہی انیس نے اٹھنے کی کوشش کی "میرے ساتھ... دھوکا... مکار عورت... کہاں سے آگئے تم میرے پاس..."

میں نے اسے پھر صوفے پر گرا دیا "چپ چاپ بیٹھے رہو اگر خیریت چاہتے ہو۔"

وہ گرم ہو کے پھر اٹھا "تم جانتے نہیں مجھے..."

میں نے اس کو الٹے ہاتھ سے تھپڑ مارا "بہت اچھی طرح جانتا ہوں میں تم جیسے حرام خور ہوس پرست شیطانوں کو... لیکن تم مجھے نہیں جانتے۔"

وہ ڈر گیا "تم... تم ایف آئی اے... والے ہو... اس عورت نے بلایا ہوگا تمہیں... مجھے دھوکا دیا اس نے... میں بتاتا ہوں۔"

محسن نے اسے روک دیا "تمہاری باری میں نہیں آئے گی... خاتون آپ بتائیں یہ کیا معاملہ ہے؟"

عورت اب کچھ فاصلے پر بیٹھی تھی پلو سے آنسو صاف کر رہی تھی اور بال سنوار رہی تھی۔ اس کا جسم اور بھی کانپ رہا تھا۔ "میں ایک شریف عورت ہوں' آپ یقین کریں..."

"چلو مان لیا تم شریف عورت ہو" میں نے کہا "آگے بولو۔"

"میرا شوہر ایک بزنس مین ہے... دوبئی میں رہتا ہے۔ اس کا مال آتا جاتا رہتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔ وہ اسمگلر ہے اور کلکٹر کسٹم اس کا مددگار ہے۔"

"اس کی بیوی... میری سہیلی تھی۔ ہم ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ مجھ سے میرے شوہر نے کہا' اپنی سہیلی سے بات کرو۔ ہم اس کے شوہر کو حصے دار بنائیں گے۔ جتنا مال کلیئر ہوگا... اس کا پچیس فیصد..."

"یہ... جھوٹ بولتی ہے یہ عورت... یہ ایک بدکار اور بدچلن عورت ہے... میں اچھی طرح جانتا ہوں' اس کا شوہر اسے کہاں کہاں بھیجتا ہے..."

صورت حال کچھ دیر میں واضح ہوگئی۔ وہ عورت واقعی کوئی شریف زادی نہیں تھی اور اس کا شوہر جو دوبئی کے علاوہ سنگاپور بنکاک اور ہانگ کانگ سے بھی ہر قسم کا مال ادھر ادھر کرتا تھا اپنے کاروبار کو چمکانے اور راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے تمام حربے استعمال کرنا ایک کاروباری ضرورت سمجھتا تھا۔ جہاں خوشامد سے کام چل جائے وہاں خوشامد۔ کہیں شراب کی ایک بوتل کافی ہو وہاں دو بوتلیں۔ نقد کی بات ہو تو سکہ رائج الوقت پیش اور مانگنے والا شراب کے ساتھ شباب بھی مانگے تو حاضر۔ رشوت میں اپنی پرائی عورت کی کیا تخصیص۔ اس کا کوئی کام رکتا نہیں تھا۔ مال کلیئر ہوتا جاتا تھا ایک وقت سب کے بینک بیلنس میں بھی اضافہ ہو رہا تھا اور اس انجمن مفاد باہمی کے تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے ہونے سے سب خوش تھے۔ کسٹم افسر کی بیوی اس کے لیے مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ ایک تو وہ حرام حلال کے چکر میں پڑی رہتی تھی۔ اسے دنیا سے زیادہ عاقبت کی فکر تھی اور مزید یہ کہ وہ اپنے شوہر کو راہ راست پر لانے کی کوشش سے باز نہیں آتی تھی۔ دن رات جوتے کھانے اور گھر سے نکالے جانے کے باوجود۔ مشکل یہ تھی کہ اس عورت کا باپ ایک اسٹری تھیٹر تھا اور بڑا نامی گرامی بدمعاش۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ اس کی بیٹی بر عکس تھی۔ شاید یہ ماحول سے نفرت کا رد عمل تھا۔ اس عورت کے دو بھائی بھی اچھی پوزیشن کے مالک تھے چنانچہ شوہر نہ اسے طلاق دے سکتا تھا اور نہ ہمیشہ کے لیے گھر سے نکال سکتا تھا۔

یہ سہیلی جب انیس کی بیوی سے معاملے کی بات کرنے گئی تو اسے علم نہیں تھا کہ ایسے راشی افسر کی بیوی اتنی ایماندار بھی ہو سکتی ہے۔ وہ اس کے باپ کے کرتوتوں سے واقف تھی اور یہ سمجھے ہوئے تھی کہ اس ماحول کی پروردہ لڑکی جب انیس جیسے شخص کی بیوی بنی ہوگی تو گزارا کر لیا تم جھا ہوگا۔ شادی کے بعد وہ اس سے ملی ہی نہیں تھی۔ جب اتفاق سے ان کی ملاقات ہوئی تو پرانے رشتے پھر استوار ہوئے۔

انیس کی بیوی نے کاروباری معاملے پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا اور اپنی بچپن کی سہیلی کو بے عزت کر کے رخصت کر دیا۔ اس وارننگ کے ساتھ کہ دوبارہ مجھے اس گھر میں اپنی صورت نہ دکھانا۔ انیس کے علم میں یہ بات آئی تو اس نے اپنی بیوی کو برا بھلا کہا اور اس مسئلے پر بات چیت کے لیے بیوی کی سہیلی کو پھر بلایا۔

انیس احمد کلکٹر کسٹم کی اپنی بیوی بھی حسن و جمال میں کم تر نہ تھی اور دس سال میں صرف دو بچوں کی ماں بنی تھی چنانچہ ابھی تک جوان نظر آتی تھی۔ یہ اس کا اپنا حسن انتظام نہیں تھا بلکہ ایک حادثے کے باعث دو بچوں کی پیدائش کے بعد وہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہوگئی تھی۔ وہ نیک خو اور وفا شعار عورت اور شوہر پرست نہ ہوتی تو انیس احمد کو کب کا چھوڑ چکی ہوتی' اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیتا۔ اس کی بڑی بہن ایک کرائتی مگر انیس احمد کے لیے اس کی یہ وفا پرستی بھی عذاب جان تھی۔

بیوی کی سہیلی نے اسے پہلی نظر میں گھائل کر دیا۔ وہ اس کے بھرپور شباب کی جھلک دیکھ کے دیوانہ ہوگیا۔ وہ لباس ہی ایسا پہن کے آئی تھی جو چھپانے سے زیادہ دکھائے۔ کسی بھی محاذ پر فتح حاصل کرنے کے لیے یہ تو ضروری ہوتا ہے کہ دشمن کی قوت مزاحمت کے مطابق اسلحے کا انتخاب اور استعمال کیا جائے۔ اس کی انہی ناز و ادا اور میٹھی میٹھی باتوں نے انیس احمد کو اس کے سامنے سرنگوں کر دیا۔ تم ایک بار آ کے مجھے حکم تو دو' تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔ جو تم کہو گی جو تم چاہو گی ویسا ہی ہوگا۔

انیس احمد نے اپنی بیوی کو بڑے پیار سے میکے بھیج دیا۔ تمام ملازموں کو انعام و اکرام سے نواز کے رخصت کر دیا۔ چوکیدار کی ڈیوٹی آفس میں لگا دی اور بڑے اشتیاق و انتظام کے ساتھ بیوی کی سہیلی کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ آئی تو اس نے دیکھا اور اس نے فتح کر لیا۔ اس نے ایک کے بعد ایک فائل انیس احمد کے سامنے رکھی اور وہ دیکھے بغیران پر دستخط کرتا چلا گیا۔ شراب نے اس کی آتش شوق کو مزید بھڑکا دیا تھا اور بیوی کی سہیلی بھی نادان بچی نہیں تھی جسے معلوم نہ ہوتا کہ ہر دستخط کی قیمت اسے کیسے چکانی ہے۔ یہ اس کے لیے پہلا تجربہ نہیں تھا اور نہ کوئی معیوب بات تھی مگر اچانک اسے پتا چل گیا کہ کمرے میں ایک مووی کیمرا نصب ہے۔

انیس احمد اسے بعد میں بلیک میل کرنا چاہتا تھا اور شاید اس پر اپنا [illegible] چاہتا تھا۔ انیس احمد کا موقف اس کے برعکس تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ مووی کیمرا چھپانا اس عورت کی سازش تھی۔ جب وہ ڈرائنگ روم میں اس کے شوہر کا مال کلیئر کرنے کے احکامات جاری کر رہا تھا تو اس کے ساتھ آنے والے شوفر نے یہ کیمرا فٹ کیا تھا اور اس کا مقصد انیس احمد کو بلیک میل کر کے آئندہ ہمیشہ کے لیے تابع فرمان بنانا تھا۔

یہ طے کرنا بہت مشکل تھا کہ ان دونوں میں سے سچا کون ہے اور جھوٹا کون۔ بدکردار اور بدچلن دونوں تھے اور دونوں کا جرم اتنا سنگین تھا کہ انہیں سرعام سنگسار کر دیا جاتا۔ رشوت اور بدعنوانی سے اس ملک کے خزانے کو نقصان پہنچانے کے جرم کی سزا الگ تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ نہ ہم ان کے خلاف مدعی ہو سکتے تھے اور نہ اس معاملے کی پولیس کو رپورٹ کر سکتے تھے۔ عام حالات میں تو ایسے مجرم قانون کے شکنجے سے بھی نکل جاتے ہیں۔ بقول شاعر

لے کے رشوت پھنس گیا ہے
دے کے رشوت چھوٹ جا

لیکن یہاں ہمارے پاس وہ فائلیں بھی تھیں جن پر انیس احمد نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے غیر قانونی احکامات جاری کر دیے تھے۔ اس کے باوجود ہم نے پہلے تو خاتون کو لعنت ملامت کر کے رخصت کیا اور مووی کیمرا بھی اس کے سامنے ہی توڑ پھوڑ دیا۔ اس کی سوچ کے رد عمل کو غور سے دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ بلیک میلنگ کی حد تک مرد کا الزام درست تھا۔ کیمرا وہ عورت ہی لائی تھی کیونکہ اسے اپنی اسکیم کے قبل ہو جانے کا دکھ تھا اور کیمرا توڑنے پر اس نے برہمی کے جذبات پر بڑی مشکل سے قابو پایا تھا۔ یقیناً یہ اس کے چالاک شوہر کی اسکیم تھی کہ انیس احمد کو پچیس فیصد کا شریک کرنے سے بہتر ہے کہ اس کی ایک فلم بنائی جائے تاکہ سند رہے اور ہمیشہ کام آئے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس بے غیرت عورت کو قتل کر دوں جو کسی اور کی بیوی ہونے کے باوجود ایک غیر مرد کے ساتھ اس قسم کی فلم بندی پر بھی تیار ہوگئی تھی۔ ممکن ہے شوہر نے اسے یقین دلایا ہو کہ فلم کوئی عام نمائش کے لیے پیش نہیں کی جائے گی بلکہ صرف انیس احمد کو ایک بار دکھا کے کسی محفوظ مقام پر رکھوا دی جائے گی مگر اس کے باوجود یہ بے شرمی اور بے حیائی کی انتہا تھی۔ میرے اختیار میں ہوتا تو میں اس کے شوہر کو پہلے قتل کرتا۔ یہ میاں بیوی زیادہ بڑے مجرم تھے جو بدعنوانی اور بدمعاشی کو ہر جائز اور ناجائز طریقے سے فروغ دے رہے تھے۔ انیس احمد جیسے کرپٹ موقع پر جگہ ہیں لیکن انہیں کرپٹ بنانے والے نہ ہوں تو وہ کیا کر سکتے ہیں۔

انیس احمد بولا "اللہ تیرا شکر ہے۔"

میں نے کہا "ذلیل آدمی... کس منہ سے اللہ کا شکر ادا کرتے ہو اور کس بات پر؟"

اس نے ڈھٹائی سے دانت نکالے "اللہ نے بچا لیا بڑی فضیحت سے... میری تو زندگی تباہ ہو جاتی۔"

میں نے کہا "زندگی تباہ کرنے میں کون سی کسر چھوڑی ہے تم نے اپنے ساتھ ایک فرشتہ سیرت بیوی کی زندگی بھی برباد کی اور تمہارے بچے کیا وہ کچھ نہیں جانتے اپنے باپ کے بارے میں؟"

اس نے سر جھکا کے کہا "جانتے ہوں گے۔ ان کی ماں تو ہر وقت مجھے برا بھلا کہتی رہتی ہے۔ ان کے سامنے بھی وعظ جاری رہتا ہے اس کا۔ وہ مجھے اپنے ہی بچوں کی نظر میں شیطان سے بھی زیادہ گنہگار ثابت کر چکی ہے۔"

"کیا یہ حقیقت نہیں ہے اور بچے جب خود دیکھتے ہوں تو کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"آج تو تم نے مجھے بچا لیا۔ نوکری بھی جاتی اور میں جیل بھی جاتا۔"

میں نے کہا "بہت خوش ہو تم کہ جیل جانے سے بچ گئے مگر جہنم میں جانے سے تمہیں کون بچائے گا۔ جیل کی سزا زیادہ سخت ہے یا عذاب دوزخ مگر یہ بات ہے تمہارے سمجھنے کی۔ ابھی تم مطمئن ہو کر نوکری کرو' تمہیں بھی عمر عاقبت تو گئی۔"

وہ بےحمیت آدمی ہنسنے لگا "یار تم بھی مولوی ہو... ورنہ"

"ورنہ کیا ہوتا۔ تم ہمیں شکر گزاری کے طور پر دعوت ناؤ نوش دیتے؟ اعلیٰ قسم کی ولایتی شراب سے ہماری تواضع کرتے۔ ہمارا جام صحت تجویز کرتے اور جاتے وقت ہماری جیبوں میں وہ نوٹ بھر دیتے جو جنتر کے انکاری ہیں۔ حرام کو حرام سمجھنے کی حد تک ہم محروم ہی ہیں مگر درحقیقت ہم بھی بڑے گنہگار ہیں۔" میں نے

www.paksociety.com

کہا۔

محسن بولا "افسوس کی بات صرف یہ ہے کہ ہم تمہیں کوئی سزا نہیں دے سکتے۔ حالانکہ بات اختیار کی نہیں۔ قانون نہیں ہے ہمارے پاس۔"

اس کا نشہ اب ہرن ہو چکا تھا۔ "آخر تم ہو کون؟"

محسن نے کہا "ہم خدائی فوجدار ہیں۔ ایسے ہی اچانک نازل ہو جاتے ہیں، جہاں بھی ہماری ضرورت ہو۔"

اس نے شراب کی آدھی بوتل کو سنبھال کے الماری میں رکھ دیا "مطلب یہ کہ تم مجھے بھی نہیں پینے دو گے۔ اس کو کہتے ہیں رنگ میں بھنگ۔ پہلے اس سالی نے اپنے ہاتھ سے پلائی۔ میری آنکھوں پر کیا عشق کی پٹی باندھ دی۔ میں نے دیکھا ہی نہیں کہ اس نے ایسا جال پھیلایا ہے کہ ساری عمر نہیں نکل سکتا تھا میں۔ خیر اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

محسن نے کہا "اس موی کیمرے سے یہ فلم نکال لی تھی میں نے۔"

اس نے بے تابی سے ہاتھ بڑھایا "یہ۔۔۔ یہ مجھے دو۔ تمہارے لئے یہ بے کار ہے۔"

"بے کار چیز کے لئے اتنی بے تابی کیوں؟" محسن نے ہاتھ پیچھے کر لیا "یہ تو دیکھنے سے پتا چلے گا کہ فلم کیسی ہے؟"

اس کا چہرہ اتر گیا "اس کا مطلب ہے۔۔۔ تم بھی بلیک میل کرو گے مجھے۔ سچ بتاؤ کیا تم اسی کے ساتھی ہو؟"

میں نے مناسب سمجھا کہ انیس احمد کی تھوڑی سی گوشمالی کر دی جائے تاکہ اسے ہمارے بارے میں غلط فہمی نہ رہے۔ میں نے اسے گردن دبوچ کے اوپر اٹھا لیا۔ چوٹی سے پکڑ کے اونچا کیا اور سر کے اوپر گھما کے صوفے پر دے مارا۔ ابھی اس نے سانس بھی نہیں لیا تھا کہ میں نے اس کی ٹانگ پکڑی اور اسے ایسے چکر دیا جیسے بچے رسی سے چڑیا موت کے گھماتے ہیں۔ اگر میں اسے چھوڑ دیتا تو وہ کرچھن کی طرح اڑتا ہوا جاتا اور کسی دیوار سے ٹکرا کے اللہ کو پیارا ہو جاتا۔ وہ حلق سے بھیانک آوازیں نکالتا ہوا اور چلاتا رہا۔ "ہائے۔ تم مارے میں مر گیا۔ میں مر جاؤں گا۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ چھوڑ دو مجھے۔"

میں نے اسے خوب اچھی طرح اوپر نیچے اور دائیں بائیں گھمانے اٹھانے بٹخنے اور رگڑنے کے بعد گوشت کے بد وضع بے حس و حرکت ڈھیر کی طرح فرش پر ڈال دیا۔ وہ ہوش میں تھا مگر اس کو دنیا گھومتی ہوئی اور آسمان زمین کے ساتھ کمرے کی دیواریں اور فرنیچر سب الٹا پلٹا ہوتے لگ رہے ہوں گے۔

میں نے کہا "اب سیدھی طرح اٹھ کے بیٹھ جاؤ۔ زیادہ نہیں چلے گا انیس احمد۔"

وہ کراہتا ہوا اٹھا "میں معافی مانگتا ہوں۔ ہاتھ جوڑ کے بھائی صاحب۔"

نہیں۔۔۔ سے لات مارتی ہیں کسی شیطان کا بھائی نہیں ہوں۔"

محسن نے اسے بار دلایا "ہم خدائی فوجدار ہیں۔ تمہاری شامت اعمال ہمیں تالی ہے پھر بھی تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ ہم ہی نہیں۔ پولیس نہیں آئی یا سی آئی اے والے نہیں آئے۔"

وہ اسی مضحکہ خیز حلئے میں کراہتا ہوا اٹھا اور بمشکل سے صوفے پر گر کے لمبے لمبے سانس لینے لگا "مجھے بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ تم جو کو کے رہی ہو گے میں تمہارا غلام ہوں۔ گھر تمہارا۔ یہاں کی ہر چیز تمہاری۔ جو چاہو لے جاؤ۔ لیکن یہ فلم دے دو مجھے۔"

میں نے کہا "آخر کیا ہے اس فلم میں۔ ابھی تو کیمرے نے اپنا کام بھی شروع نہیں کیا ہوگا۔"

وہ ہانپنے لگا "نہیں۔ کیمرا کام کر رہا تھا۔"

محسن بولا "میں کہہ رہا ہوں کہ اصل فلم تو شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔"

اس نے کہا "بس۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔ اس حرافہ نے پہلے اٹل لگا رکھی تھی مگر ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ کہتی تھی پہلے ان کاغذوں پر دستخط کرو۔ میں پہلے سے پی رہا تھا۔ پھر اس نے پلا دی۔ اور آہستہ آہستہ عمل کر سامنے آتی گئی۔ مجھے پاگل کرنے کے لئے اس نے ایک ایک کر کے اپنے اور میرے کپڑے۔۔۔ اف۔ وہ عورت نہیں فتنہ ہے قیامت ہے۔ اس وقت وہ مجھ سے کچھ بھی منوا سکتی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھتا تھا اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ کے میرے ہاتھوں سے پھسل جاتی تھی۔"

"اور یہ سب ہے فلم میں۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "آخر کار۔ میں نے اس کی بات مان لی اور کاغذوں پر دستخط کر دیئے۔ وہ میرے دفتری کاغذ تھے۔ معلوم نہیں اس کے ہاتھ کیسے لگیں۔ دس لاکھ کم سے کم دس لاکھ کے دستخط تھے وہ۔ کوئی اور ہوتا تو میں ڈھائی لاکھ نقد لیتا۔ ڈھائی لاکھ میں۔ اس جیسی ڈھائی سو عورتیں مل جاتیں مگر ساری بات ہے طلب کی۔ اور رقت کی۔ بادشاہوں نے تاج اور تخت لٹا دیئے تھے ایک عورت کی ایک ادا پر۔ میں نے ڈھائی لاکھ بخش دیے اس کی اور ساڑھے سات لاکھ؟ یہ کے دے شوہر کو۔ اور پھر بھی۔ کیا ملا مجھے۔"

میں نے کہا "دیکھو انیس احمد۔ ہمارا نہ تمہاری زندگی سے کوئی تعلق ہے نہ تمہارے اعمال سے۔ نہ تمہارے جرائم سے نہ ان گناہوں سے۔ سزا تمہیں کبھی بھی نہ قانون دے گا یا پھر عذاب شروع ہوگا قبر سے۔ ہم نہ مجرم ہیں نہ بلیک میلر۔ فلم ہمارے پاس اسی طرح محفوظ رہے گی جیسے تم خود رکھتے۔"

"میں یوں رکھنا ایسی چیز کو حماقت ہے۔"

"مگر ہم رکھیں گے۔ ہمیں تم سے کچھ کام لینا ہے۔ اگر تم نے

خرافات سے تعاون کیا تو یہ فلم تمہیں واپس مل جائے گی۔"

وہ پریشان ہو گیا "ایسا کون سا کام ہے؟ ہر مجھ میں شرابی ہوں اور اناڑی ہوں۔ مگر میں قتل نہیں کر سکتا کسی کو۔"

میں نے اسے تسلی دی "یہ کوئی غیر قانونی کام نہیں ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آج رات تم اکیلے ہو۔ یہ بتاؤ فون کہاں ہے؟"

وہ حیران ہوا "فون۔ رہے تو ہر کمرے میں ہے۔ دو نمبر ہیں اور ہمارا اپنا ایکسچینج۔ جہاں سے چاہو کرلو۔ جہاں چاہو کرلو۔ امریکا آسٹریلیا۔"

"مجھے ایک لوکل کال کرنی ہے۔" میں نے کہا اور اٹھ کے اندر چلا گیا۔

کوٹھی کے دو بیڈ روم زیر استعمال تھے۔ ایک میں بچوں کے کھلونے ان کی کتابیں اور شوق کے سب اسباب فراہم کئے گئے تھے۔ دوسرا انیس اور اس کی بیوی کا تھا۔ تیسرا پوری طرح آراستہ بیڈ روم آتے جاتے مہمانوں کے لئے وقف تھا۔ ایسی ہی ایک خاص مہمان وہ عورت تھی جو کچھ دیر پہلے اس جگہ قبضہ جمائے رہی تھی۔ اس کے اتارے ہوئے کپڑے جو وہ گھبراہٹ میں بے کار سمجھ کے یہاں چھوڑ گئی تھی۔ بستر کی پرشکن بے ترتیب چادر۔ کچھ فرش پر گری ہوئی چیزیں۔ اس کمرے میں پیش آنے والے واقعات کی منہ بولتی تصویر پیش کر رہے تھے۔

میں نے اسی کمرے میں رکھا ہوا فون اٹھایا اور رقاصہ یوسف کے گھر کا نمبر ملایا۔ گھنٹی بجتے ہی رقاصہ نے کہا "ہیلو۔"

میں نے کہا "رقاصہ شور مت کرنا۔"

اس ماتریان نے چلا کے کہا "کیوں نہ شور کیوں نہ کروں۔ مصیبت تو مجھے پڑی ہوئی ہے۔ میں اکیلا اور وہ تین۔"

"کون تین؟"

"خواتین اور کون۔ اب یہ مت پوچھنا کہ کون خواتین۔ آخر آپ ہیں کہاں جناب والا۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا رابعہ کی آواز آئی "سکندر۔"

میں نے کہا "السلام علیکم۔ کہئے مزاج کیسے ہیں آپ کے۔"

"میں کہتی ہوں تم دونوں۔۔۔"

"وہ بھی تم دونوں کی نہیں۔ ہم دونوں کی بات کرو جلیل پشتدار۔"

"تمہیں کیا پتا گلی کتنی پریشان ہے۔"

"کیا تم نہیں ہو میرے لئے؟" میں نے اس کی آواز بنا کے کہا "تم؟"

"ہم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ کسی نے بھی۔ تم بھی حد کرتے ہو۔" رابعہ بہت خفا تھی۔

"ہاں۔ ابھی میں حد کا خیال رکھتا ہوں۔ حد سے آگے نہیں بڑھتا مگر کسی دن۔۔۔"

"حکومت فوراً آجاؤ۔ جہاں بھی ہو۔ ابھی۔ اسی وقت۔"

"معاف کرنا یہ نہیں بتا سکتا میں کہ اس وقت کہاں ہوں۔ اور تم ابھی سے ایسے ڈانٹ رہی ہو مجھے۔ ایسے حکم چلا رہی ہو مجھ پر جیسے میں محسن ہوں۔ بعد میں کیا بنے گا میرا۔ مجھے سوچنا پڑے گا خاتون اپنے مستقبل کے بارے میں۔"

"اچھا سوچتے رہو بابا۔"

میں نے کہا "ارے بھائی مذمت کر رہا تھا غصے میں۔ بتانا صرف یہ تھا کہ۔۔۔"

"آگے بھی بولو نا۔" رابعہ نے کچھ دیر انتظار کے بعد کہا۔

"اب کیا بتاؤں۔ بڑی شرم آتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے اس وقت میں کہاں ہوں؟"

"اب بتا ہی دو شرمیلے صاحب۔"

"نہیں۔ کچھ زنانہ استعمال کی اشیا ہیں اس بیڈ روم میں۔ ایک خاتون کی جو ابھی ابھی باہر گئی ہیں۔" میں نے کہا "اور یہ بے حد پرانی بہت چیزیں ہیں۔ خوشبو ہے بلا کی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے نوچ کھسوٹ میں پھٹ گیا تھا۔ اور یہ چٹی کوٹ ہے۔ گلجت میں چھوڑ گئیں خاتون۔ یہ تکیے پر بیئر کلپ بھی رکھا ہوا ہے اور بہت کچھ۔ میں خود بھی اسی بیڈ پر ہوں ویسے تو۔ اوہ وہ خاتون۔ ان کے حسن و شباب کا کیا بیان کروں۔"

"کیوں فضول بولتے جا رہے ہو۔" رابعہ پریشان سی ہو گئی۔

"تمہاری جان کی قسم اس میں ایک لفظ جھوٹ نہیں ہے۔"

رابعہ کے لئے اب یقین نہ کرنے کی وجہ کوئی نہیں تھی "سکندر بتاتے کیوں نہیں کہاں ہو تم۔ کون ہے وہ خاتون۔ تمہیں کیوں لے گئی تھی اپنے ساتھ۔"

میں نے خوش ہو کے کہا "وہ کہاں لے گئی تھی۔ میں خود ہی چلا گیا۔"

رابعہ نے آہستہ سے کہا "آخر کیوں؟"

"سبق گھر کا گھاس کھانا ہے۔ گھاس دیکھ کے جائے گا نہیں؟ اور تم تو مجھے گھاس ڈالتی نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

"بس۔ کھالی گھاس۔ جی بھر کے۔" اس نے طنز کیا۔

میں نے تو بھری "یہ جو گدھا تم نے پال رکھا ہے نا اور کوئی گھاس اس کے من کو بھاتی ہی نہیں۔ خواہ کوہ قاف کی گھاس ہو یا جنت کی۔ جل بھن کے کوئلہ ہو گئیں نا؟ بو آ رہی ہے جلنے کی فون میں سے۔"

وہ ہنسی "جلتی ہے میری جوتی۔"

"اچھا تو جوتا جلنے کی بو ہوگی۔ فکر مت کرو۔ بقول شاعر میں تم کو پہلے سے نئی کر کالی لاکے دوں گا۔ جس کو پہن کے تم مورنی کی چال چلو گی اور مورنی کے پیچھے گدھا دیکھ کے لوگ کہیں گے کیا جوڑی ہے۔ اچھا اب زیادہ مت ہنسو۔ کام کی بات سنو۔ اتفاق سے آج غالب مل گیا۔"

www.paksociety.com

بیلن اور سینڈل جیسے زنانہ اسلحے کے ساتھ۔ بنا بنایا کام بگڑ گیا اور مصیبت ہو گی ہمارے لئے اسے بچائیں گے خود کو یا تمہیں۔"
میں نے اسے ڈانٹا۔
"فل سے نہاں "محسن کہاں ہے؟"
میں نے کہا "محسن؟ کون محسن۔ یہ کس جانور کا نام ہے۔ ارے بھئی صاف پوچھو نا۔ اب ڈر گیا۔ کیونکہ میرا گھر والا۔ میرا میاں، میرے سر کا تاج میرا مجازی خدا کہاں ہے۔ میں بتلاتا ہوں اسے۔ تم کوئی اچھا سا گانا سوچ لو جو ہیروئن گاتی ہے جدائی میں۔ ولن کے ہاتھوں مجبور ہو کے۔"
میں نے واپس جا کے محسن کو بھیج دیا۔ اس وقت تک انیس اور محسن کے درمیان خاصی گفتگو ہو چکی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے انیس کے موڈ سے ہوا جو اب خاصا مطمئن نظر آ رہا تھا۔
"ساتھ والی کوٹھی حال ہی میں کسی نے خریدی ہے۔ مہینہ بھر پہلے۔" اس نے مجھے بتایا "ایسے ہی ایک بار آتے جاتے شکل دیکھی ہے اس کی۔ فیملی نہیں ہے غالباً۔ ورنہ میری بیوی ضرور بتاتی کہ اس کی بیوی کیسی ہے۔"
میں نے کہا "ہم اس کوٹھی میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں؟"
"یہی آپ کے دوست پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ طریقے تو بہت ہیں مگر سب مشکل ہیں اور خطرناک بھی۔ چوکیدار بھی بڑا خونخوار ہے۔ میرے چوکیدار نے بتایا کہ وہ تو بلا وجہ پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔ انسانوں والی کوئی بات ہی نہیں سور کے بچے میں۔ اس نے میرے چوکیدار سے کہا تھا کہ تجھ سے بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم جیسوں کو منہ نہیں لگاتا۔ جواب میں اس نے بھی کہا کہ لعنت تیری منحوس شکل پر۔ میں تو تیرے جنازے میں بھی نہیں آؤں گا۔ اس کے علاوہ دو کتے ہیں۔ میرے سامنے جیسے نہیں شکاری کتے ہیں۔"
"یہ تم اپنے کتوں کو سالا کیوں کہتے ہو؟"
"وہ بھونکتے جو رہتے ہیں اپنی بہن کی طرح مجھ پر۔ کچھ بگاڑ تو سکتا نہیں ان کا۔ دل کی بھڑاس نکالتا ہوں انہیں سالا کہہ کے۔ بیوی بہت ہنگامہ کرتی تھی پہلے۔ میں نے کہا کہ کتے کی کیا اوقات ہوتی ہے۔ اسے بھائی تو کہنے سے رہا میں۔ گالی دے کر بات کرتا ہوں۔ چل سالے ادھر آ۔ تم کیوں برا مانتی ہو۔ اگر تمہارے بھائی کتے نہیں ہیں۔ میں انہیں سالا کہتا ہوں تو یہ ایک رشتہ ہے گالی نہیں۔ گالی ہے صرف کتے کے لئے۔ ایم آئی رائٹ؟"
میں نے کہا "چوکیدار اور کتے۔ ان سے ہم نمٹ لیں گے۔ مسئلہ اندر داخل ہونے کا ہے۔ کیا تمہاری کوٹھی کی دیوار کہیں سے ملتی ہے یا چھت ملتی ہے۔"
"تمہارے دوست کے ذہن میں تو کچھ اور تھا۔" انیس بولا "وہ پوچھ رہے تھے کہ تمہاری بیوی ولی تھی ہے یا بھاری بھر کم۔ اس کے کپڑے تو ہوں گے۔ کیا میرے جسم پر فٹ آ سکتے ہیں۔ میں نے

ظاہر ہے وہ دوسری طرف اچھل پڑی ہو گی "کیا غالب مل گیا؟"
پس منظر میں ایک دم کئی آوازیں سنائی دیں۔ "غالب مل گیا۔ کہاں ہے غالب۔"
میں نے کہا "ہم تو گئے تھے شوکت رانا کو قتل کرنے میں اور محسن۔ کوئی کام نہیں تھا۔ سوچا یہ کام کر لیں۔ اچانک اس کی کوٹھی میں سے غالب نکل آیا مگر وہ ہمیں پہچانتا نہیں۔"
"کیوں مذاق کرتے ہو۔"
"مذاق نہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ اس کا کچھ ایسا برین واش کیا گیا ہے کہ وہ خود کو غالب نہیں فیروز کہتا ہے اور شوکت رانا کا ڈرائیور سمجھتا ہے۔ ہم کسی نہ کسی طرح اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کے یہاں آ گئے۔"
"کہاں۔ شوکت رانا کی کوٹھی میں؟"
"ہاں۔ اندر تو ہم جا نہیں سکتے تھے۔" میں نے کہا "یہ اس کی نئی کوٹھی کملاتی ہے۔ کار بھی نئی تھی اور سنا ہے یہاں اس کی نئی بیوی رہتی ہے۔ کیا خوش قسمت آدمی ہے۔ ہر سال بیوی کا ماڈل بھی بدل لیتا ہے اور ظاہر ہے اتنی اچھی گاڑی ہے تو بیوی بھی اچھی ہی ہو گی۔ تم جیسی نہیں۔ تم سے میری مراد ہے وہ سب خواتین جو بڑی بے تابی سے ریسیور کے ساتھ کان لگائے کھڑی ہیں۔"
"تم سب کی قسمت ہی خراب ہے تو ہم کیا کریں۔" یہ جواب وقار کی بیوی نے دیا تھا جو شاید دوسرے کمرے میں دوسرا ریسیور اٹھائے بیٹھی تھی۔
"چھپ چھپ کے باتیں سنتی ہوں۔" میں نے اسے ڈانٹا
"میاں بیوی۔۔۔ میرا مطلب ہے ہونے والے میاں بیوی کی۔"
غالباً گل نے اس سے ریسیور لے لیا "بتاؤ نا غالب کہاں ہے؟"
میں نے کہا "ساتھ والی کوٹھی میں۔"
"اور نازو؟" رابعہ بولی "وہ بھی ساتھ تھی؟"
"نہیں۔ ابھی تک نازو کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ بھی غالب کے ساتھ ہے یا کہیں اور ہے لیکن تم فکر مت کرو۔"
"تم کہہ رہے تھے غالب نے پہچانا نہیں تھا تمہیں۔"
"ہاں مگر یہ بہت معمولی سا مسئلہ ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم اسے اپنے ساتھ ہی لے کر آئیں گے۔"
رابعہ بولی "کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے نا؟"
"تم اب بھی یہ سوال کرتی ہو۔ خطرہ تو ہر بچے کے ساتھ ہی دنیا میں آتا ہے اور ہم تو وہ ہیں جو خطرے کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ اس کا بھی نشہ ہوتا ہے۔ جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔"
"یہ بتاؤ تم کہاں ہو۔"
"اس سے کیا ہو گا۔ تمہاری زنانہ فوج چڑھائی کرے گی پیچھے

بتایا کہ تم میری بیوی بننا چاہتے ہو تو اس کا سارا میک اپ کا سامان استعمال کر سکتے ہو۔ اس کے باوجود تم میں نسوانیت اس حد تک آئے گی جتنی تالی بجانے والوں میں ہوتی ہے۔"
میں نے مسکرا کے کہا "دروازہ کھلوانے کے لئے نسوانیت پیدا کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بس عورت نظر آنی چاہئے رات کے وقت تو تالی بجانے والا بھی چلے گا۔"
محسن آیا تو اس کا موڈ آف تھا "تو بی بی جی۔"
میں نے غرا کے کہا "شٹ اپ جو رابعہ کو کچھ کہا۔"
"لاحول ولا قوۃ۔ میں گل کو کہہ رہا تھا بھائی۔"
"بھائی صاحب۔ میری بہن کے بارے میں بھی ذرا منہ سنبھال کے۔ ہم نے دیکھ لیا تھا کہ لونڈا زن مرید ٹائپ ہے۔ جورو کا غلام بن کے رہے گا۔ اب آنکھیں دکھاتے ہو۔"
"اور کیا دکھاؤں؟" محسن نے ایسے کہا کہ انیس بھی ہنس پڑا۔
محسن کی ترکیب مجھے بھی پسند آئی تھی۔ انیس کی طرف سے تو اب کوئی اندیشہ ہی نہیں تھا کہ وہ تعاون نہ کرے یا کسی کو کچھ بتا دے۔ ایک قسم کی وجہ سے اس کا کنٹرول ہمارے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ کوٹھی میں وہ خلل اندازی کرنے والا اور کوئی نہیں تھا اور ہمیں جلدی بھی نہیں تھی۔ محسن نے انیس کے بیڈ روم میں میک اپ کیا اور اس کی بیوی کے کپڑوں میں سے چھانٹ کے ساڑھی باندھی۔ آنچل سر پہ لینے کے بعد اس کے مردانہ بالوں پر بھی پردہ پڑ گیا۔ وہ بڑی ادا کے ساتھ لچکتا اور مٹکتا ہوا کمرے سے برآمد ہوا تو انیس کی حالت ہنستے ہنستے خراب ہو گئی۔ وہ پیٹ پکڑ کے صوفے پر لوٹنے لگا۔
"قسم خدا کی۔ نشہ اتر گیا ورنہ تمہیں نہ چھوڑتا میں۔"
محسن نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہائے میں مر گئی۔ کیسی بے شرمی کی باتیں کرتا ہے یہ دیکھو کا تچا۔"
میں نے کہا "میں بھی بری نظر ڈال رہا ہوں تجھ پر۔"
محسن نے کمر پر ہاتھ رکھ کے کہا "تو کیا میں بھی شور مچاؤں؟ جیسے وہ بچاری تھی کہ لوگ نہ شد و مد۔ ہائے کہاں لے جاؤں اس حسن اور جوانی کو۔"
میں نے کہا "باہر ساتھ والی کوٹھی کے گیٹ پر جا کے دکھانا یہ نخرے۔ اصل آزمائش تب ہو گی۔"
انیس بولا "ویسے چوکیدار کا بھروسا نہیں۔ بدمست آدمی ہے۔ پٹری بدل بھی سکتا ہے۔ عورت نہ سہی عورت جیسی چیز تو ہو۔"
"پٹری بدلنے سے پہلے اس کا پتا ہو جائے گا۔ انیس احمد۔ قلم میرے پاس ہے اس لئے یہ مت سمجھنا کہ ہم نے تمہاری جان چھوڑ دی۔ جاؤ اتنی دیر میں اپنے بیڈ روم کی حالت ٹھیک کر دو ورنہ بیوی آتے ہی شور مچا دے گی کہ میرے جوتے کپڑے کس نے نکالے تھے۔ کون آئی تھی یہاں میک اپ کرنے والی اور ہاں اس گیسٹ بیڈ سے اپنی مہمان اپنی بیوی کی سہیلی کی قابل اعتراض

چیزیں بھی ہٹا دو۔"
"ورنہ بیوی سب سمجھ جائے گی۔ تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ۔ عام عورت بھی فوراً تاڑ جاتی ہے۔ تم تو پہلے سے مشکوک شوہر ہو۔"
اب مجھ سے آگے محسن گیا اور اس نے باہر نکل کے پہلے سڑک پر ادھر ادھر دیکھا مگر ہر سمت وہی ویرانی تھی۔ اس نے ساتھ والی کوٹھی کے دروازے پر دستک دی تو اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں بج اٹھیں۔
اندر سے کسی نے کہا "کون اے؟"
محسن نے زنانہ آواز بنا کے کہا "اے چوکیدار۔ دروازہ کھولو۔"
میں اس کے بالکل پیچھے تھا مگر دروازہ کھولے بغیر چوکیدار مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے کچھ حیران پریشان ہو کے کہا "خوب بیگم صاحب۔ اس وقت۔" اور پورا یقین نہ ہونے کے باوجود اس نے دروازہ کھول کے دیکھنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ ایک تنومند پٹھان چوکیدار کے لئے جو مسلح بھی ہو آدھی رات گئے آنے والی عورت سے ڈرنے کی کوئی بات بھی نہ تھی۔
"او کون اے تم؟" اس نے محسن کو دیکھ کر کہا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "کس سے ملنا اے؟"
"شوکت رانا سے۔" محسن نے خاصی بھونڈی ادا سے کہا۔
"او۔۔۔ وہ تو نئیں اے اور۔۔۔"
"میں سالی ہوں ان کی۔ نئی بیگم کی بڑی بہن۔" محسن اندر گھستا چلا گیا "ایسے کیا دیکھتا ہے الو کی طرح۔ بارہ بجے۔"
وہ اچھل پڑا "کالی۔ گالی دیتا اے ام کو۔ کیسا عورت ہے۔ چلو نکلو اور سے۔ ابھی بیگم صاحب بھی نئیں اے۔ ام نئیں جانتا تم کو۔"
"ہائے تو جانتے میں کتنی دیر لگتی ہے۔" محسن بانہیں پھیلا کے آگے بڑھا "رات بھر میں ایسی جان پہچان ہو جائے گی کہ۔۔۔"
چوکیدار بدحواس ہو کے پیچھے ہٹا "اوئے۔ اوئے تم کیسا بے شرم عورت ہے۔ پیچھے ہٹو۔ ام۔۔۔ ام ایسا۔۔۔ مرد نہیں اے۔"
محسن نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہائے میں مر گئی۔ کیا کہا مرد نہیں ہے؟ دیکھنے میں تو مرد ہی لگتا ہے۔ ہٹا کٹا۔ الو کا پٹھا۔"
وہ پھر اچھلا "اوئے اوئے تم پھر گالی نکالا۔ ام گولی مار دے گا تم کو۔"
اب محسن نے چیخ ماری "ابی مٹھے کے ابا۔"
میں دوڑتا ہوا اندر گیا "کیا۔۔۔ کیا۔۔۔ ہوا سب بیگم۔" میں نے ہکلاتے ہوئے اور ہانپتے ہوئے کہا۔
"دیکھو جی یہ موا مشٹنڈا کیسے بندوق تان رہا ہے مجھ پر اور مجھ سے زبردستی۔۔۔"
میں نے چوکیدار کی بندوق پکڑلی "کیوں بے۔ تانا۔۔۔ تا۔۔۔

www.paksociety.com

ماتنجاب۔ ہے ہے۔ غیری بے جرات۔ زندو ہے۔ رن۔ ردس ۔فی۔ ہماری۔ الیہ کے۔ سانب سانب۔ ساتھ۔ ہم نیری موت کردیں۔ ریں۔ دیں گے۔ کسے۔ کیسے کیا بیگم۔ ہم کیا۔ کے۔ کر تے ہیں۔"

ابی اسکی کی نیسی اور کیا۔" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ اے اے۔ سی پی۔ کی نیسی۔" میں نے چوکیدار سے بندوق چھیننے کی کوشش کی۔

چوکیدار ابھی تک اس ڈرامے کو سمجھ نہیں پایا تھا "ارے چلو۔ تم بھی باہر جاؤ۔ خانہ خراب کا بچہ۔ ام تم کو بھی گولی مار دے گا۔"

"تم۔ مجھے۔ ہے گم۔ یہ ما۔ ما ماتنجاب۔ تو ہم۔ ہم کو بھی۔ گنی۔ وہ۔ قتل کرنا چاہتا ہے۔" میں نے بدحواسی میں کہا اور محسن کا ہاتھ پکڑ کے اندر بھاگا۔

محسن زمانے بھر کو کھینچتا اور ساری سنبھالا دوڑا۔ چوکیدار نے ہمارا پیچھا کیا۔ "ارے ٹھہرو۔ ابی ٹھہر جاؤ۔ ام بوت ظالم ہے۔ بوت گولی مارے گا تم کو۔"

ہمارا مقصد اندر پہنچنا تھا اور وہ پورا ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ ابھی تک چوکیدار نے رائفل پر سے سیفٹی کیچ بھی نہیں ہٹایا تھا۔ وہ صرف ہمیں بندوق دکھا کے ڈرانا چاہتا تھا۔ اگر اس کا ارادہ سچ مچ گولی چلانے کا ہوتا تو وہ ہمارے پیچھے نہ دوڑتا۔ وہیں سے نشانہ لے کر فائر کرتا اور گولی ہمارے سر کے اوپر سے جاتی یا ہماری ٹانگ میں لگتی مگر وہ فائر کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ مجھ جیسے احمق شوہر اور محسن جیسی بے حیا بیوی سے وہ ویسے ہی نمٹ سکتا ہے۔

اندر پہنچتے ہی میں نے محسن کو آگے نکلنے کا موقع دیا اور جیسے ہی چوکیدار دوڑتا ہوا میرے پاس آیا میں ایک دم نیچے بیٹھ گیا۔ چوکیدار سنبھل نہ سکا اور میرے اوپر سے گزرا تو میں نے اس کی کالی پکڑ کے جھٹکا دیا۔ اس کی بندوق اب میرے ہاتھ میں تھی اور وہ میرے سامنے چت پڑا ہوا تھا۔ سیمنٹ کے فرش پر گرنے سے اس کی کمر میں چوٹ آئی تھی۔

"ہم نے کسے۔ کے۔ کہا تھا۔ ہاے ہم اسکی کی پی۔ ۔ ۔ تھیں کرتے ہیں۔" میں نے بندوق کے کندے سے اس کا پیٹ دبا کے کہا۔

وہ چلایا "ارے ظالم کا بچہ۔ ام تمہیں چھوڑے گا تم کو۔"

میں نے بندوق کا میگزین خالی کر کے گولیاں اپنی جیب میں ڈالیں اور پھر بندوق اسے پکڑا دی "تو یہ لاٹھی استعمال کرو۔ اٹھو شاباش۔"

محسن نے کہا "اندر آ جاؤ میری جان۔ بیڈ روم میں ہے۔"

اب پٹھان کی آنکھوں میں خوف، تجسس اور الجھن کے آثار پیدا ہوئے "تم۔ تم کون اے۔" وہ اٹھ کے کھڑا ہو گیا "بیگم کرنی اے ام کو۔"

میں نے اسے اندر دھکیلا۔ اس نے مزاحمت کی تو میں نے اس کے پیٹ میں اپنے سر سے ٹکر ماری اور اسے اوپر اٹھا کے اندر پھینک دیا۔ محسن اندر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے چوکیدار کو دوبارہ پیروں پر کھڑا کیا اور ایک کمرے کا دروازہ کھول کے اسے بھی اندر دھکیل دیا۔ یہ ایک پرتعیش بیڈ روم تھا۔ چوکیدار نے خالی بندوق گھما کے میرے سر پر وار کرنے کی کوشش کی تو میں نے سر نیچا کر لیا پھر ساپ لوٹ کے چوکیدار کے جبڑوں پر ایک مکا رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کے بیڈ پر گرا۔

"ارے۔ خانہ خراب۔ ام کو کیوں مارتا اے۔ ام غریب چوکیدار اے۔ ام تمہارا کیا بگاڑا۔"

میں نے کہا "چوکیدار۔ تم شوکت رانا کی نئی کوٹھی میں کب سے ہو؟"

وہ میرا بدلا ہوا لہجہ اور آواز سن کے بھونچکا رہ گیا "دو مہینہ سے۔"

میں نے کہا "یعنی جب سے رانا صاحب نے یہ کوٹھی خریدی ہے اپنی نئی بیگم کے لئے۔ نئی بیگم صاحبہ آج کہاں ہیں؟"

"اپنے گھر گئی ہے۔ اپنا ماں باپ کا گھر۔ ام نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "اچھا۔ اس وقت گھر میں تمہارے علاوہ کون ہے؟"

"ایک بی بی روز ہے۔ ڈرے رہ۔ ایک چھوٹا بیگم صیب کا نوکرانی اے۔ نرس اے۔"

اچانک میری نظر بیڈ سائیڈ ٹیبل کی تصویر پر جم گئی۔ یہ مائدہ کی تصویر تھی۔ میرے ذہن میں دھماکا ہوا اور میں نے لباس عروسی میں سجی مائدہ کو دیکھا "یہ۔ یہ کون ہے؟"

"یہ چھوٹا بیگم صیب اے۔ نیا بی بی۔" چوکیدار کا جواب سن کے میرے خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ ایک موہوم سے اندیشے نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ ایک بار پھر احساس شکست کی ذلت کے جذبات نے میرے دل کا لہو نچوڑ لیا تھا۔ آزمائشوں کے سفر کی خون رلانے والی داستان کا آخری باب قدرت نے اپنے لہو سے لکھا تھا۔ اس سے پہلے بھی بہت نام تھے جو کل تک ہماری زندگی کا حصہ تھے مگر آج دل پر ایک مندمل ہو جانے والے زخم کا نشان بن گئے تھے لیکن ان سب کو ہم سے دست اجل نے جدا کیا تھا۔ ہم نے ان کی موت کو مشیت ایزدی سمجھ کے صبر اختیار کیا تھا اور اپنی بے بسی پر آنسو بہا کے خاموش ہو گئے تھے۔ مائدہ جیتے جی ہم سے بچھڑ گئی تھی۔ یہ طمانچہ مارنے والے ہاتھ ہمارے دشمنوں کے تھے اور یہ وار ہماری غیرت پر ہوا تھا۔

تصویر میں دلہن بنی ہوئی سرخ عروسی جوڑے والی مائدہ کی وہ تصویر میرے احساس پر ایک تازیانہ تھی جس کی اذیت نے مجھے تڑپا دیا۔ اس روپ میں اپنے محبوب کو کس کی آنکھیں نہیں دیکھتیں؟

کبھی تصور میں تو کبھی خواب میں اور کتنے کتنے جب ہجر کے رشت کا سفر تمام ہوتا ہے اور اس خواب کو تعبیر ملتی ہے تو کون اپنی خوش قسمتی پر رشک نہیں کرتا۔ ایسی ہی کوئی خیالی تصویر غالب کے ذہن میں بھی کبھی ابھری ہو گی۔ بقول شاعر

نیرنگئی سیاست دوراں تو دیکھیے

منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

اس خواب کی تعبیر ملی بھی تو کسے۔ شوکت رانا جیسے دشمن کو۔ جس نے ہم سے غالب کو چھینا تھا اس نے غالب کی متاع حیات پر شب خون مارا تھا اور اس کی زندگی کو لاحاصل کر دیا تھا۔ معلوم نہیں یہ سب کیسے ہو گیا اور کیوں ہو گیا تھا۔ اگر مائدہ مر جاتی اور اس کی مسخ شدہ بدصورت لاش دیکھ لیتا تب بھی اتنی اذیت نہ ہوتی جتنی اسے سولہ سنگھار کئے ایک نوبیاہتا لڑکی کے روپ میں دیکھ کے ہوئی۔

جب میں نے اس تصویر پر غور کیا تو ظلم کا یہ احساس شدید تر ہو گیا۔ وہ خوشی جس میں منزل حیات پالینے کا اجالا ہوتا ہے۔ وہ حیا جس میں ارمان جاگتے ہیں اور وہ دبی دبی مسکراہٹ جس میں عورت کی تکمیل کا غرور ہوتا ہے۔ اس تصویر میں یہ سب نہیں تھا۔ مائدہ کا چہرہ احساس اور تمام جذبات سے عاری ایک ایسی تصویر کی طرح تھا جس کا ہر رنگ بے بسی اور مجبوری کا آئینہ دار تھا۔

میں اس تصویر کو دیکھتے ہوئے خود تصویر بن گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک طوفان بپا تھا اور خیالات کے گرداب میں ان گنت سوالوں کے بدصورت چہرے رقصاں تھے۔ اب غالب کا کیا ہو گا؟ آج تک وہ کسی کے لئے جیا تھا اور آج کے بعد وہ کیوں جینا چاہے گا۔ کیا یہ دل فگار اور سفاک حقیقت اس کا ذہن قبول کر پائے گا کہ اس کی مائدہ اب کسی اور کے پہلو کی زینت ہے؟ اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو۔

پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں غالب کی موجودہ ذہنی کیفیت کا سبب یہی تو نہیں۔ مگر اس خیال کو میری عقل نے مسترد کر دیا۔ مائدہ کے بغیر غالب نہ فیروز ہو تا نہ کسی شوکت رانا کا ڈرا نیورہ۔ وہ پاگل ہو کے گلی کوچوں میں مائدہ کو پکارتا نظر آتا یا کہیں یہ غالب اپنے ارمانوں کے ساتھ سوتا نظر آتا۔

چوکیدار میری صورت کو غور سے دیکھ رہا تھا اور اس نے میری محویت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کی مگر میں نے اسے لات مار کے پھر گرا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھوں نے وہ فریم کی ہوئی تصویر اٹھائی اور اسے دیوار پر دے مارا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ یہ تمہاری نئی بیگم صاحب نہیں ہو سکتی۔" میں نے دھاڑ کے کہا۔

چوکیدار کراہنے لگا "ام۔ ام جھوٹ نہیں بولتا صاحب۔ آپ مالزم کرلو۔ نرا ابی سے۔"

دروازے کے فریم میں مجھے محسن کسی بت کی طرح استادہ نظر آیا۔ وہ نہ جانے کب سے وہاں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے تصویر کو اور میری ذہنی کیفیت کو بھی دیکھ لیا تھا۔ اس کا چہرہ تاریک ہو رہا تھا۔

"اس سے کیا ہو گا۔" محسن نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔"

"نہیں۔" میں نے چلا کے کہا "میں نہیں مانتا۔ مائدہ جان دے سکتی ہے مگر اپنے آپ کو کسی اور کے سپرد نہیں کر سکتی۔"

"ہم نہیں جانتے اس کی مجبوری کیا تھی۔" محسن بولا۔

میں نے کہا "ٹھیک۔ غالب اسے بھی معلوم ہے!"

محسن نے نفی میں سر ہلایا "میں نے گاڑی میں پوچھا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ مائدہ تو میرے ساتھ ہے۔ میرے گھر میں۔ میں نے پوچھا کہ تمہارا گھر کہاں ہے تو بولا کہ وہی جہاں مائدہ رہتی ہے۔ اس نے اپنے خوابوں میں کوئی گھر بسا رکھا ہے۔ جہاں مائدہ شادی کے بعد رخصت ہو کے گئی تھی۔ اس دیوانے کو میں کیا سمجھاؤں۔ اور کیسے سمجھاؤں۔ جسے خبر ہی نہیں کہ......"

میں نے کچھ دیر بعد کہا "وہ خود ہے کہاں؟"

"وہ اور خادمہ اندر ایک ساتھ سو رہے ہیں۔ ایک ہی بیڈ روم میں۔" محسن نے یہ اعتراف کرتے ہوئے بھی دکھ اور شرمندگی محسوس کی۔

"وہ خادمہ ایک نرس ہے۔ چوکیدار نے بتایا ہے۔"

"اچھا۔ پھر اس سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔" میں نے دوسرے سب کمروں میں گھوم پھر کے دیکھا۔ یہ تصویر کہیں اور نظر نہیں آئی۔ جو یہاں تھی شاید یہی شوکت رانا کا بیڈ روم ہو گا۔"

"اور ان کی نئی بیگم کا۔" میں نے تلخی سے کہا "جہاں غالب کا داخلہ ممنوع ہو گا۔"

چوکیدار محسن کی مردانہ آواز سے بجلی سی گر پڑی تھی "خو یارا ام کو بولو۔ تم کون اے۔ کیا ڈراما کرنی اے۔"

میں نے کہا "چوکیدار۔ میں شوکت رانا کی پہلی بیوی کا بڑا بھائی ہوں۔ میجر عبدالرحیم بھٹی۔ اور زمانے میں میرا دوست ہے خفیہ پولیس کا انسپکٹر رحمانی۔ ہم تو آئے تھے رانا کو اٹھانے کے لئے۔ اس نے دھوکا کیا ہے میری بہن کے ساتھ۔ دوسری شادی رچا کے وہ مجھ سے چھپتا پھر رہا ہے۔ گھر جاتا ہوں تو پتا چلتا ہے وہ یہاں ہے۔ یہاں فون کرتا ہوں تو کوئی کہتا ہے وہ چلا گیا۔ ایک بار وہ ہاتھ آ جائے تو میں اسے مزا چکھا دوں ایسے چوری چھپے شادی رچانے کا۔"

چوکیدار کی حالت مزید خراب ہو گئی "خو میجر صاحب جی۔ ام بوت غریب چوکیدار ہے۔ ام کو معافی دو۔ اماما ڈیوٹی اور گیٹ پر ہوتا۔ ام کو اندر کا معاملہ نہیں معلوم۔ رانا صاحب ہم کو مار ڈالے گا۔"

میں نے اسے تسلی دی "فکر مت کرو۔ تم پر الزام نہیں آئے گا۔ ہم رانا کی گرفتاری کا وارنٹ لے کر آئے تھے۔ تم کو کچھ

www.paksociety.com

بعد میں اس اطلاع پر انتہائی پریشان ہوا کہ کوئی عورت اور مرد کسی طرح فیروز اور رضیہ کو لے گئے ہیں۔ میں فون کی ایکسٹینشن پر اس کے چیخنے چلانے کی آواز سنتا رہا۔ وہ چوکیدار کو گالیاں دے رہا تھا۔ "میں شوٹ کردوں گا تمہیں۔ یہ سب تمہاری غفلت کا نتیجہ ہے۔ اندر کیسے آگئے تھے وہ۔ تم نے دروازہ کیوں کھولا تھا۔ حرام خور۔ نمک حرام۔ تم سو رہے ہو گے۔ تمہارے پاس بھری ہوئی بندوق تھی۔ تم نے گولی کیوں نہیں ماردی انہیں۔"

چوکیدار نے میری مرضی کے مطابق بیان دیا تھا۔ خود اس کی جان اسی طرح بچ سکتی تھی کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے اور جبر کا اقرار کرلے۔ میری ہدایت پر چوکیدار نے کہا تھا کہ وہ ضرور کسی گاڑی میں آئے ہوں گے اور فیروز کے ساتھ رضیہ کو بھی اسی گاڑی میں ڈال کے لے گئے ہوں گے مگر اس نے کوٹھی کے سامنے کسی گاڑی کے رکنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ شاید وہ گاڑی دور چھوڑ کر آئے تھے۔

رانا نے غصے میں اسے مزید گالیاں اور دھمکیاں دے کے کہا "میں آتا ہوں۔ پتا چل جائے گا کہ یہ کس کا حرامی پن تھا۔"

چوکیدار نے ریسیور رکھا تو میں نے کہا "تم نے ثابت کردیا تھا کہ تم فرض شناس بھی ہو اور شریف بھی۔ تم اس عورت کے چکر میں نہیں پڑے تھے اور تم نے اپنی طرف سے ہمارا راستہ روکنے کی پوری کوشش بھی کی تھی۔ تمہیں کوئی شرمندگی نہیں ہونی چاہئے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم ہمارا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اب آخری بات غور سے سن لو اور سمجھ لو۔ جب رانا یہاں آئے گا تو تم اسے بے ہوش ملو گے۔ ہوش میں آنے کے بعد کہنا کہ تم نے انہی کے کہنے پر فون کیا تھا۔ وہ ریوالور لئے کھڑے تھے اور تم ان کی نہ مانتے تو وہ تمہیں گولی ماردیتے۔ وہ تم سے فون کرانے کے بعد تمہیں ناک آؤٹ کرگئے تھے۔"

چوکیدار نے اپنی ناک کو چھوا "ہمارا ناک آؤٹ کیسے؟"

میں نے اس کی کنپٹی پر ریوالور کا دستہ مارا "ایسے" میں نے کہا اور اسے وہیں فرش پر چھوڑ دیا۔

اس کے بعد ہم نے غالب کے بیڈروم کا دروازہ بجایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ کھڑکی کے نیچے بھی پردہ تھا مگر اس کی جھری میں سے وہ بیڈ نظر آتا تھا جس پر غالب سو رہا تھا۔ دستک پر عورت نے کروٹ لی اور سر اٹھاکے پوچھا "کون ہے؟"

محسن نے پھر دروازہ بجایا تو وہ اٹھی۔ اس نے تقریباً شفاف کپڑے کا نائٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اندر ہلکی نیلگوں روشنی میں اس کا گہرا سانولا رنگ تقریباً کالا محسوس ہوتا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی محسن اندر داخل ہوگیا تو اس نے چیخ ماری "ہو... ہو آر یو۔ کون ہے تم؟"

"ہائے مجھے نہیں پہچانا مارگریٹ۔" محسن نے اسے چمکار کے چوم لیا "میں تمہاری بہن ہوں۔ الزبتھ۔"

چھپانے کی ضرورت نہیں۔ تم اسے بتاسکتے ہو کہ ہم کس طرح تمہیں دھوکا دے کر اندر آگئے تھے اور تمہیں بے بس کردیا تھا۔ تم نے ہمارا مقابلہ کیا تھا مگر ہم نے تم سے بندوق بھی چھین لی تھی۔ یہ سب جھوٹ تو نہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ بولے گا۔ ام کو بتایا کیوں نہیں۔ ٹیلی فون کیوں نہیں کیا۔"

میں نے کہا "اٹھاؤ فون اور اسے بتادو۔ یہ بولو کہ ایک مرد اور عورت زبردستی گھر میں گھس آئے ہیں۔ انہوں نے مجھے بہت مارا ہے اور جاتے وقت فیروز کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں اور نارس کو بھی۔ کیا نام ہے اس نرس کا۔"

"مارگریٹ۔ کرسٹان اے میجر صاحب۔ پی روز پاگل کا بچہ اس کے ساتھ شادی بنایا۔ ام بولتا رہ گیا۔"

"کیا فیروز نے شادی کرلی ہے اس سے؟"

"آہو کالا۔ بولتا ام کرسٹان کو مسلمان کیا۔ نکاح بنایا اسلام کا طریقہ سے۔ اس کا نام رضیہ رکھا۔ خو سب جھوٹ بولتا اے۔ ام اس کو کرسٹان کا طریقہ سے ایسا کرتا دیکھتا۔" چوکیدار نے اپنے سینے پر صلیب بناکے دکھایا۔

یہ اطلاع مزید دکھ کا سبب بنی کہ ذہنی خود فراموشی کی اس کیفیت میں غالب نے کسی کرسچن نرس سے شادی تک کرلی ہے۔ یا شاید کسی اور نے اس کو باور کرایا ہے کہ مارگریٹ مسلمان ہونے کے بعد رضیہ کے نام سے اس کی بیوی بن چکی ہے۔ غالب نے خود کو فیروز تسلیم کرلیا ہے تو پھر مارگریٹ کو بھی رضیہ مان لیا ہوگا لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی چشم تصور مارگریٹ کے روپ میں نازو کو دیکھتی ہو۔ دیوانے کو ہر چہرے میں محبوب کا جلوہ نظر آتا ہے۔ جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔

یہ محض جذباتی یا اخلاقی مسائل ہی نہیں تھے۔ ان کا ایک قانونی پہلو بھی تھا۔ کیا نازو کی شوکت رانا سے اور غالب کی مارگریٹ سے شادی جائز تسلیم کی جائے گی؟ اس میں رضامندی جبر سے حاصل کی گئی تھی یا ایسی ذہنی کیفیت میں جسے پاگل پن کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ایسا کوئی معاہدہ کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتا جو "جاگتی ہوش و حواس" نہ کیا جائے یا برضا و رغبت نہ ہو۔ نشے میں کسی دوا کے زیر اثر۔ غنودگی کی حالت میں یا ذہنی عدم توازن کی کیفیت میں سرزد ہونے والے کسی فعل کو دنیا کی کوئی عدالت جائز اور درست قرار نہیں دے سکتی۔

میں نے محسن سے فرنچ میں بات کی اور باہمی صلاح و مشورے سے ہم نے طے کیا کہ پہلے تو رانا کو فون کرکے یہاں بلوایا جائے اور اس کے آنے سے پہلے غالب کو مارگریٹ کے ساتھ انہی کے بنگلے میں پہنچادیا جائے۔

چوکیدار نے کانپتے ہوئے فون اٹھاکے رانا سے بات کی۔ وہ آدھی رات کے وقت موصول ہونے والے اس فون پر چونکا ہوگا

اس نے بڑی مشکل سے خود کو چھڑایا "واٹ نان سنس۔ ہمارا کوئی سسٹر نہیں ہوتا۔"

"ہائے میں مرگئی۔" محسن نے پھر سینے پر ہاتھ رکھا "ساری دنیا کو معلوم ہے یہ بات کہ ملکہ الزبتھ کی بہن ہے یہ نرس مارگریٹ۔"

"شٹ اپ" وہ چلائی "یو فول۔ یو بلڈی فول۔ الفریڈ۔ یہ کون آگیا ہے ادھر۔ چوکیدار۔ اے چوکیدار۔ یو باسٹرڈ۔"

فیروز یعنی غالب اس چیخ پکار پر اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے محسن کو اور پھر مجھے دیکھا پھر وہ مجھے پہچان گیا مگر میں نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے چپ رہنے کا اشارہ کیا تو وہ کچھ بولتے بولتے خاموش ہوگیا۔ مجھے اس کے تعاون سے خوشی ہوئی۔ لاشعوری طور پر وہ ہمارے ساتھ تھا۔

مجھے دیکھتے ہی مارگریٹ نے چلا چلا کے چوکیدار کو پکارا تھا مگر میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا تو وہ پلٹ کے پیچھے گری اور دیوانہ وار چیخنے لگی۔ میں نے اس کو اٹھاکے دوسرا تھپڑ زیادہ قوت سے رسید کیا تو اس کی آواز بالکل بند ہوگئی۔ میرے ہاتھ کی انگلیوں کے نشان اس کے گال پر ابھر آئے۔ میں نے محسن کو غالب کے ساتھ چھوڑا اور اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

وہ اٹھائیس تیس سال کی یا شاید کچھ زیادہ عمر کی عورت تھی جس کے سوکھے جسم میں شباب یا نسوانیت کی دلکشی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کے اطوار ہی گواہی دیتے تھے کہ وہ کوئی شریف عورت نہیں تھی۔

میں نے کہا "جتنا چاہو چلاؤ مارگریٹ عرف رضیہ۔ نہ کوئی چوکیدار آئے گا تمہاری مدد کے لئے نہ شوکت رانا۔ فیروز سے کیا رشتہ ہے تمہارا؟"

اس نے انگریزی میں کہا "پلیز مجھے مت مارو۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے مجھے تو رانا نے...." اس کی آواز بھرا گئی۔

"پیسہ دیا تھا۔ کتنا پیسہ دیا تھا؟" میں نے کہا۔

"اس نے ہزاروں..." وہ رونے لگی "میں انکار نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے جو کہا میں نے کیا۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "فیروز تمہارا شوہر نہیں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "نہ میں رضیہ ہوں۔ نہ یہ۔ یہ تو پاگل ہے کوئی.... مجھے نازو کہتا ہے۔ نازو کون ہے؟"

میں نے کہا "شٹ اپ۔ تمہیں سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ تم نے اس پاگل کو اپنا شوہر کیسے مان لیا۔"

"میں نے بتایا۔ میں مجبور تھی۔ اتنا پیسہ کون دیتا ہے۔ میں تو ہر رات سو سو روپے میں بکنے والی عورت ہوں اور میرا اصل شوہر تو سو کا نوٹ ہوتا ہے۔ وہ مرد مسلمان ہو یا عیسائی۔ مجھے اس کے نام سے کیا لینا۔ فیروز پاگل ضرور تھا مگر وہ پاگل نہیں جو مجھے سوتے میں مار ڈالے۔ اس نے تو.... مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ یہ تو کسی بچے کی طرح مجھ سے چمٹ کے سو جاتا تھا۔ اور بس.... مجھ سے بہتر کون جانتا ہے آدمی کے اندر کے حیوان کو۔ اور سو روپے میں ملنے والی عورت کے سامنے تو وہ بھی اپنی مردانگی کے جوہر دکھاتے ہیں جو اندر سے مرد ہی نہیں ہوتے لیکن غالب کے وجود میں مجھے بڑی تلاش اور کوشش کے باوجود ایک آدمی ہی ملا۔ ڈرا ہوا اور سہما ہوا۔ کسی پناہ کی تلاش میں سرگرداں۔ کسی سہارے کا متلاشی۔ بے چین اور بے قرار زخمی روح والا...."

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "یہ تم نے کیسے جان لیا؟"

وہ اب خلا میں دیکھ رہی تھی "میں نے کہا نا میں ہر رات ایک تجربے سے گزرتی آئی ہوں۔ کب سے؟ یہ مجھے یاد نہیں۔ شاید تیرہ برس کی تھی میں جب میں نے مرد کو ایک الگ روپ میں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے وہ صرف باپ تھا یا بھائی۔ تب مجھے پتا چلا کہ وہ بھی دو ٹانگوں والے جانور ہی ہوں گے اور تب سے آج رات تک کتنی راتیں آئی ہیں۔ بیس برس تو ہوگئے مجھے ایک ہی تجربہ کرتے پھرتے سوال کیوں۔ میں تو مرد کو اس کی ایک نظر۔ ہاتھوں کے لمس۔ چہرے کی تحریر اور انداز محبت ہی سے سمجھ لیتی ہوں۔ ننانوے فیصد مرد ایک رات میں ایسے سامنے آجاتے ہیں جیسے کھلی کتاب۔ ہاں ایک فیصد کسی طرح خود کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ مجھے اندازہ بلکہ یقین ہے کہ تمہارا دوست بڑے عذاب میں ہے۔ مجھے اس نے کچھ نہیں بتایا کہ اس پر کیا واردات گزری ہے لیکن وہ بہت دکھی ہے اور کسی سے اپنا دکھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ اس لئے وہ بھٹکا ہوا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جیسا کسی گھر کا راستہ بھول جانے والے کے ساتھ کرنا چاہئے اور اس لئے وہ میرا ہاتھ پکڑ کے میرے ساتھ چلنے پر راضی ہوگیا۔ اسے تو شاید خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ جو کچھ وہ کررہا ہے یا کہہ رہا ہے وہ کیوں کہہ رہا ہے اور کیوں کررہا ہے۔ شاید اسے یاد بھی نہ ہو کہ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا مگر پھر بھی بہت کچھ کہہ دیا۔ وہ کئی بار رات کے وقت سسکیاں لے کر روتا رہا۔ کئی بار اس نے کہا کہ نازو تم نازو ہو نا۔ یہ ہمارا گھر ہے نا۔ میرا اور تمہارا اور میں نے اس سے جھوٹ بولنے کا گناہ کیا۔ اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں نازو ہوں اور یہ ہمارا ہی گھر ہے۔ میں جانتی ہوں وہ اس جھوٹ کو تسلیم کرنے والا نہیں تھا۔ اور اس نے سوتے میں جو کہا وہ جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔"

میں نے اسے مارا تھا۔ اب مجھے شرمندگی ہورہی تھی۔ بدکردار ہونے کے باوجود وہ بری عورت نہیں تھی۔ وہ ان شرافت کی نقاب اوڑھے رکھنے والوں جیسی نہیں تھی جو کسی مجبوری کے بغیر خود کو بیچتے ہیں۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ تمہارا شکریہ ادا کرنے کے بجائے میں نے تمہارے ساتھ بے رحمی کا سلوک کیا۔"

"مجھے ایسی بے رحمی اچھی لگتی ہے۔ سو روپے والی چاہت کے اظہار سے...."

"تم پڑھی لکھی اور حساس عورت ہو۔"

www.paksociety.com

میں تم کو بھی آزماؤں گی۔ کیا ہوگا اگر ایک بار پھر میرے ساتھ دھوکا ہوا۔ پہلے بھی میں ہر بار کو آخری بار سمجھنے کی بے وقوفی کر چکی ہوں۔"

میں نے کہا "تم نرس ہو؟"

"میں نرس تھی۔ اس سے پہلے میں ٹیچر تھی۔ اور اس سے پہلے بھی بہت کچھ تھی لیکن میں نے ہر نام کو رسوا کیا۔ نرس یا ٹیچر کا لیبل لگانے سے نہ میں اپنی نظر میں معتبر ہوئی اور نہ دنیا کی نظر میں معتبر۔"

یوں لگتا تھا جیسے وہ مسلسل بولتی رہے گی اور میں اس سے کوئی بھی بات کروں جواب میں وہ اپنے وجود میں جمع ہو جانے والا زہر اگلے گی۔ اس کی زبان سے پھول جھڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ تو بالکل ہی ٹوٹا پھوٹا سے تختہ مضراب بے ساز۔ کی تفسیر تھی اور میرے پاس فی الحال اتنا وقت نہیں تھا کہ اس سے عمر رفتہ کے ہر لمحے کے عذاب کی کہانی سنوں۔

"چلو تم غالب کے ساتھ نکل جاؤ" میں نے کہا۔

"نکل کے کہاں جاؤں؟"

"سامنے والی کوٹھی میں۔ انیس احمد نام کا ایک شخص وہاں تمہیں خوش آمدید کہے گا۔ ویسے تو وہ بھی اسی جنس سے تعلق رکھتا ہے جن کو تم درندگی والا حیوان کہتی ہو لیکن ہم نے اس حیوان کو اپنے اشاروں پر چلنا سکھا دیا ہے بالکل اسی طرح سرکس والے جنگل کے باشندوں کو سدھا کر سیدھا کر دیتے ہیں اور وہ پالتو کتے کی طرح ہو جاتا ہے۔ غالب کو تم سنبھال سکتی ہو۔ ہمیں تمہاری ضرورت رہے گی۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

اس نے میری بات مان لی اور غالب کو ساتھ لے گئی۔ انیس احمد گیٹ کے قریب ہی ٹہل رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ یہ ہمارے دوست اور معزز مہمان ہیں۔ انہیں کوئی تکلیف نہ ہو ورنہ!

اس نے تو بھری "آج کی رات تو بلاؤں کا نزول ہے۔ غریب خانے پہ موجود ہر بلا کے لئے اور بھی جسے چاہے لے آئے۔"

میں نے کہا "ان سے کوئی فضول بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ نہ اپنے بارے میں نہ ہمارے بارے میں۔ بس انہیں کسی بیڈ روم میں جگہ دے دو اور اگر یہ کچھ کھانا پینا چاہیں۔"

"میں تو جانتے بھی نہیں بنا سکتا۔ انڈا دے سکتا ہوں اُبال نہیں سکتا۔ کچن کا راستہ دکھا دوں گا۔" وہ اندر جاتے ہوئے بولا۔

میں نے اور محسن نے ایک طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد شوکت رانا کی کوٹھی کے ہر بیڈ روم کی تلاشی لی۔ الماریوں اور میزوں کی درازوں کو کھنگالا۔ مجموعی طور پر ہمیں ایک لاکھ سے زائد نقد رقم ملی۔ بے گنتی نہیں گنتی رقم کے زیورات اور کچھ ہیرے جواہرات ملے جن کی مالیت کا اندازہ ہم کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں تو یہ بھی پتا نہیں چلا کہ وہ اصلی ہیں یا نقلی مگر ہم نے انہیں بھی مال غنیمت

"یہی کاروبار کرنا ہوتا ہے۔ میں ایک عام عورت ہوں۔ ان جیسی ہوں تو ٹھوں سے گلیوں بازاروں اور سات پردوں کے پیچھے بھی یہی دھندا کرتی ہیں۔ پہلے مجبوری تھا پھر شوق بن گیا۔ اب تو پیشے میں چھوڑنا بھی چاہوں تو چھوڑ نہیں سکتی اور چھوڑ کے مجھے ملے گا بھی کیا۔ میں لوٹ کر بھی کہاں جاؤں گی۔ اب پیسہ ہی تو میرا سہارا ہے میرا سب کچھ ہے۔"

میں نے کہا "اچھا تم ہمارے ساتھ چلو۔ یہاں زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ شوکت رانا آنا ہی ہوگا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اب میں کسی کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ مجھے رانا نے خرید لیا ہے ہمیشہ کے لئے جیسے پہلے لوگ غلام خریدتے تھے۔ اگر غلام بھی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا تو اسے ہمیشہ کے لئے آزادی مل جاتی تھی قید حیات سے۔"

میں نے کہا "ڈرو نہیں۔ ہمارے ساتھ رانا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم خود کو اتنا ہی محفوظ سمجھو گی جتنا اپنے گھر میں تھیں۔ اپنے باپ کے گھر میں۔ آج سے بیس سال پہلے۔ رہی دس ہزار کی بات تو تم جب چاہو اس کی ادا کی ہوئی قیمت اس کے منہ پر مار دینا۔ ہم سے لے لینا۔"

وہ ہنسی سے مسکرائی "تم سے بھی پیسہ لوں؟ نہیں پیسہ تو بہت ہے میرے پاس۔ غلیظ بدبودار اور ناپاک پیسہ۔ پتا نہیں کیوں جمع کرتی جا رہی ہوں میں غلاظت کا یہ ذخیرہ۔ کیا اس سے میں خداوند یسوع مسیح کی رضا حاصل کر سکتی ہوں۔ خدا کی مہربانی اور بخشش کا سودا کر سکتی ہوں۔ ایک بار میں اعتراف کرنے چرچ گئی تھی۔ پادری نے بڑی ناگواری سے میری باتیں سنیں اور پھر ایسے مجھے دھکا مار کر نکال دیا جیسے کوڑھی کو خیرات دیتے ہیں۔ جاؤ ہمارے دروازے سے دور رہو ہم سے دور۔"

میں نے اس کو سہارا دے کر اٹھا لیا "سمجھو کہ وہ سب تم نے پا لیا جو چاہا تھا۔ جس کے لئے تم چرچ گئی تھیں یسوع کی رضا اور خدا کی مہربانی سب حاصل ہو گئی ہے تمہیں۔ بخشش کے دروازے کھل گئے ہیں تمہارے لئے اب تم بالکل محفوظ ہو۔"

"ایسا میں نہیں سمجھ سکتی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تمہیں سمجھنا چاہئے کہ جو دعا بھی اپنے رب پر قبول ہوتی ہے اس کے بعد سب تم پر منحصر ہے۔ تمہارے ارادے اور تمہاری ہمت پہ۔ شوکت رانا سے ڈرنا چھوڑ دو۔ یہ جان لو کہ وہ کیا کر سکتا ہے زیادہ سے زیادہ تمہیں قتل کر سکتا ہے تو ایسا بھی خدا کے حکم پر ہی ہوگا۔ رانا کے چاہنے سے نہیں اور مارنے والے ہاتھ سے بچانے والا ہاتھ زیادہ زبردست ہے بیٹی سے۔ لیکن خدا بھی انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ یہ بات تو سچ ہے۔"

"سچ بہت کچھ ہے۔ لیکن سچ بولنے والوں پر سے میرا اعتبار اٹھ گیا ہے۔ پتا نہیں تم بھی کتنا سچ بول رہے ہو اور کس غرض سے تم

میں شامل کر لیا۔ درازوں میں سے ایک کارآمد ڈائری ملی جس میں کچھ نام اور پتے درج تھے۔ اس میں چار چیک بھی تھے جو ابھی کیش نہیں کرائے گئے تھے ان پر چند دن پہلے کی تاریخ تھی۔ محسن نے ایک رجسٹر بھی ڈائری رکھی جس کے ہر صفحے پر ایک ہی نام تھا اور نیچے تاریخ وار چیک نمبر اور رقوم درج تھیں۔ یہ چار چیک بھی چار مختلف صفحات کے اکاؤنٹ میں موصول ہوتے تھے۔ ہزار روپے کا ایک چیک محمد محبوب نام کے کھاتے میں شامل تھا۔ اس سے پہلے والے چیک سیریل نمبر میں تھے جس سے ثابت ہوا کہ وہ ایک ہی چیک بک سے نکالے گئے تھے اور یہ ایک ہزار ماہانہ کی رقم پچھلے سات ماہ سے بڑی باقاعدگی سے وصول ہو رہی تھی۔ جلدی جلدی میں نے شوکت رانا کی گاڑی میں بم کے کنکشن صحیح طرح سے جوڑے۔ میرے اور محسن کے لئے شوکت رانا کی آمد کسی بھی لمحہ متوقع تھی اور ابھی ہم تلاشی کے عمل میں مصروف ہی تھے کہ کوئی گاڑی اندر آئی۔ میں اور محسن پچھلی طرف چلے گئے۔ سامنے سے شوکت رانا چنگھاڑتا ہوا آ رہا تھا۔

"چوکیدار۔ کہاں مر گیا۔ باہر آ حرام زادے۔" وہ سخت غصے میں تھا اور شاید نشے میں بھی۔

میں نے اور محسن نے ساتھ کی گیلری سے جھانک کے دیکھا تو اس کی گاڑی سے دو خطرناک قسم کے گورلے بھی باہر آ چکے تھے ان کے ہاتھ میں "سب مشین گن" تھی اور ان کے تیور بتاتے تھے کہ وہ اپنی راہ میں مزاحم ہونے والے کسی بھی شخص کو چھلنی کر دیں گے۔

شوکت رانا اچانک چیخنے لگا "یہ۔ یہ گاڑی کا شیشہ کیسے ٹوٹا ہے۔ میری نئی گاڑی برباد کر دی۔ کہاں ہے وہ۔ فیروز؟"

اتنی گالیوں کے جواب میں بھی خاموشی رہی تو اس نے گورلوں کو اندر جا کے صورت حال کا جائزہ لینے کا حکم دیا "شکل کیا دیکھ رہے ہو میری؟ دل آ گیا ہے کیا مجھ پر؟ یا سینگ نکل آئے ہیں میرے۔ اندر جاؤ۔ دیکھو وہ کہاں مر گئے ہیں۔"

گورلے برا مانے بغیر اندر چلے گئے۔ وہ اسی طرز تخاطب کے عادی تھے۔ کچھ دیر بعد ہی ان کی اندر سے چلانے کی آواز آئی "رانا صاحب اندر زخمی پڑا ہے چوکیدار تو مر گیا شاید۔ فیروز بھی غائب ہے اور وہ کنجری بھی نہیں ہے۔"

شوکت رانا کے اندر جاتے ہی میں اور محسن باہر نکل گئے۔ گیٹ سے نکلتے ہوئے میں نے اس گاڑی کی چابی نکال لی جس میں شوکت رانا آیا تھا پھر محسن نے ایک عقل مندی اور کی۔ اس نے گیٹ کے قریب ٹیلی فون کا کھمبا دیکھا۔ اس کے اوپر سے دو تار شوکت رانا کی کوٹھی میں بھی جا رہے تھے۔ محسن پہلے انیس احمد کی کوٹھی کے گیٹ پر چڑھا اور پھر دیوار پر۔ وہاں سے ٹیلی فون کے تار محسن کی دسترس میں تھے۔ اس نے دونوں تار کھینچ کے الگ کر دیئے اور خود پول سے نیچے اتر آیا۔

انیس احمد اندر تھا اور گھبرایا ہوا تھا "معاف کرنا۔ اس کے بغیر میرے اعصاب ساتھ نہیں دیتے۔ میں ذرا نروس ہوں۔ پتا نہیں تم کیا کرنے پھر رہے ہو اور میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی تک تو کچھ ہوا نہیں ہے۔"

"ہاں" وہ آہ بھر کے بولا "تم کو غلط کیسے کہوں میں۔"

"اس میں غلط کیا ہے۔ جو ہوا ہمارے آنے سے پہلے ہو چکا تھا۔ ہم نے تمہاری گلوخلاصی کرا دی اس عورت سے۔ اگر وہ قلم لے جائے۔"

"قلم؟ مجھے تو نہیں ملی۔"

میں نے کہا "مل جائے گی۔ فکر مت کرو۔ بہت جلد۔"

محسن بولا "ہاں تم بس وہی کرو جو تم سے کہا جائے۔ باتیں کم کرو۔"

"یہ تم کیا مصیبت لائے ہو۔ اف۔ تم نے تو ڈکیتی کی ہے اور چوری کا مال میرے گھر میں۔"

میں نے اس کے ایک گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا "ابھی کہا تھا میرے دوست نے کہ باتیں کم کرو۔ مال غنیمت کو چوری کا مال نہیں کہا جاتا۔ مال غنیمت حلال ہوتا ہے۔ ہم نے یہ سب اپنے دشمن سے چھینا ہے۔ تمہاری طرح قومی خزانے میں نقب نہیں لگائی ہے۔ چور ہو تم۔ ٹیکس اور کسٹم ڈیوٹی چرانے والوں کے ساتھی۔ تم کو اختیار دے کر حکومت تم پر اعتبار کرتی ہے مگر تم ڈاکا ڈالتے ہو اسی حکومت کے خزانے پہ۔ پھر اس دولت سے مجبور عورتوں کی عصمتوں کو لوٹتے ہو۔ تم سے بڑا چور ڈاکو بھلا کون ہوگا۔ یہ کوٹھی اور یہ ٹھاٹ باٹ اس کوٹھی میں یہ سب چوری کا مال ہے۔ اپنی تنخواہ میں تو صرف کرائے کا چھوٹا سا مکان لے کر رہتے اور مشکل سے تمہاری دال روٹی چلتی۔ یہ ٹھاٹ باٹ کہاں سے آئے۔"

وہ جبڑا پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا "جس کا مال ہے وہ چوری کی رپورٹ تو لکھوائے گا۔ اگر اسے معلوم ہو گیا۔" وہ دوسرا جام بھرنے لگا۔

"اگر مگر کی اولاد۔ اسے کیا فرشتے بتانے جائیں گے۔" میں نے اس کے ہاتھ پر ٹھوکر ماری۔ جام شراب اچھل کے چھت تک گیا اور چکنا چور ہو گیا۔ شراب کے چھینٹے اس کے اپنے منہ پر گرے۔

محسن بولا "ابھی وہ فون کرنے آئے گا یہاں۔"

"فون تو اس کے گھر میں بھی ہے۔ مدد ہیں شاید۔"

"وہ خراب ہیں۔" محسن نے جھنجلا کے کہا "تم باہر جا کے بیٹھو۔ ذرا سکون سے۔ وہ فون کرنے آئے تو کہنا کہ میرا اپنا فون خراب ہے۔ ہمارے فون خراب ہیں۔ بیوی میکے گئی ہوئی ہے۔ شام تک آنا تھا۔ ابھی تک نہیں آئی۔ اکیلا پریشان ہو رہا ہوں گھر میں۔ لفظ بہ لفظ یہی کہنا ہے تمہیں۔ سمجھے۔"

"سمجھ گیا۔ اگر وہ اور کوئی بات پوچھے؟"

www.paksociety.com

اس نے فریادی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا "یا میرے مولا۔ اب میں کس کی مانوں کس کی نہ مانوں۔ آگے کھائی پیچھے خندق کہاں جاؤں۔"

محسن بولا "تم جہاں کھڑے ہو وہیں کھڑے رہو۔ حقیقت ایک دن تمہارے سامنے آجائے گی۔ ابھی تم پر آنچ نہیں آسکتی۔ تمہارا پڑوسی یہ تو کہنے سے رہا کہ ڈاکا بھی انیس احمد نے ڈالا تھا اور قاتل بھی وہی ہے لیکن تم نے غلطی سے بھی ہمارا نام لیا تو یہ قلم بہت سے لوگ دیکھیں گے۔ تمہارے سسرال والے اور محلے والے۔"

"خدا کے لئے یہ غضب مت کرنا۔ میں تمہارا غلام تمہارے باپ کا غلام ہو کر رہوں گا۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔

اسی وقت پڑوس کے بنگلے میں زبردست دھماکا ہوا۔ میں اور محسن بھی اُچھل پڑے۔

انیس احمد نے گھبرا کے کہا "یہ سب کیا ہوا؟"

میں نے کہا "شاید بینک نے کیا ہے کسی گاڑی نے۔"

محسن بولا "نہیں یار۔ فائر برسٹ ہوا ہوگا۔"

"یہ بم کا دھماکا تھا۔" انیس بولا "دیکھو مجھے سچ سچ بتادو۔ تم کیا کر کے آئے تھے۔ تمہاری کیا دشمنی ہے رانا سے۔"

میں نے کہا "انیس احمد۔ بعض اوقات زیادہ جاننا خطرناک ہوتا ہے۔"

"اور زیادہ بولنا بھی۔" محسن نے کہا۔

"تمہاری بھلائی اور سلامتی اسی میں ہے کہ تم اندھے گونگے اور بہرے بن جاؤ۔ تم نے کچھ نہیں دیکھا۔ کچھ نہیں سنا۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ آج نہ ہم یہاں آئے نہ ایسی ویسی کوئی بات ہوئی۔ تم اکیلے تھے جب تم اکیلے ہوتے ہو تو کیا کرتے ہو؟"

"بدمعاشی۔" محسن بولا "ہم تو چشم دید گواہ ہیں۔"

"میرا مطلب تھا بدمعاشی کے علاوہ۔ فرض کرو اپنی بیوی کو بتانا پڑے کہ تم نے یہ وقت کیسے گزارا۔ تو کیا کہو گے؟"

اس نے سوچ کے کہا "وہی جو اکثر کرتا ہوں۔ کہ بہت اداس تھا۔ کچھ دیر ٹی وی دیکھا۔ گانے سنے۔ ایک رسالہ یا کتاب پڑھنے کی بھی کوشش کی مگر دل نہیں لگا۔ جو فریج میں چھوڑ گئی تھیں تم وہی کھایا۔ بھوک بھی نہیں تھی۔ گرم کیا اور ٹھنڈا کیا۔ بس اس کے بعد سو گیا۔"

"وہ ری گڈ۔ یہی بیان چلے گا۔"

"مگر میری بیوی اس پر یقین کہاں کرتی ہے۔"

محسن بولا "نہ کرے۔ اس کی مرضی۔"

رانا پھر چیختا چلاتا انیس کے دروازے پر آیا "انیس صاحب۔ یہ آواز سنی آپ نے۔ اٹھئے پڑوسی ہیں آپ۔ باہر آکے پوچھا تک نہیں۔"

"وہ دراصل" انیس نے جماہی لے کر آنکھیں ملیں "میں سو رہا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں اگر وہ سوال کرے کہ تم نے کچھ سنا۔ یا میری کوٹھی میں کسی کو آتے جاتے دیکھا۔ کوئی گاڑی دیکھی جس میں ایک مرد اور ایک عورت آئے تھے۔ تو ذرا سوچ کے کہنا کہ ہاں ایک سفید رنگ کی گاڑی آپ کے دروازے پر کھڑی ہوئی ہے۔ یہ تو دیکھا تھا میں نے لیکن جاتے وقت اس میں ایک نہیں دو مرد اور دو عورتیں تھیں۔ میں یہیں ٹہل رہا تھا اس لئے نظر پڑ گئی۔ زیادہ غور سے نہیں دیکھا۔ پہچان نہیں سکتا دوبارہ دیکھوں تو۔ اتنی دور سے کیا پتا چلتا ہے۔ روشنی بھی کم ہے یہاں۔ اس سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔"

"مگر بعد میں پولیس میرا بیان ضرور لے گی۔"

"تم ایک معزز آدمی ہو۔ میرا مطلب ہے سمجھے جاتے ہو۔ پولیس سے کیوں ڈرتے ہو۔ بے خوفی سے یہی بات کہہ دینا کہ مجھے کیا معلوم وہ کون تھے اور کس نیت سے آئے تھے۔ میں تو سمجھا ہوں گے ان کے مہمان۔ ابھی تو میں انہیں بھی پوری طرح نہیں جانتا۔ یہ نئے آئے ہیں۔ ان کے مہمانوں کے بارے میں کیسے جان سکتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے وہ میرے گھر نہیں آئے۔ میں تو بالکل اکیلا تھا چوکیدار تک نہیں تھا یہاں۔"

گھنٹی کی آواز پر محسن نے کہا "لو آگئے تمہارے پڑوسی۔ اُمید ہے تم ہمارا پتا نہیں دو گے۔ کوئی غلط بات کی تو بہت کھاتے میں رہو گے۔ یہ سمجھ لینا۔"

انیس احمد کی لگام پوری طرح ہمارے ہاتھ میں تھی۔ اس نے وہی کیا جو ہم نے سمجھا دیا تھا۔ میں اور محسن ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے لگے کھڑے رہے۔ رات کی خاموشی میں گیٹ پر ہونے والی گفتگو کا ہر لفظ صاف سنائی دے رہا تھا۔ شوکت رانا بہت مشتعل تھا۔

"پتا نہیں کون تھے۔ خیر پولیس پتا چلا لے گی۔ چوکیدار کو جان سے مار دیا۔ میری گاڑی تباہ کر دی۔ گھر میں سے لاکھوں نقد اور میری بیوی کے سارے زیورات چرا کے لے گئے۔ ہیروں کے سیٹ بھی لاکھوں کے تھے۔ خانساماں کو اور ڈرائیور کو اغوا کر لیا۔ میں تو اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا پولیس والوں کی اگر انہوں نے مجرموں کا سراغ نہ لگایا۔"

انیس احمد نے عقل مندی کی اور پرسکون رہتے ہوئے اسے تسلی دیتا رہا "ہاں جی یہ تو بات ہی ایسی ہے۔ آج آپ کے ساتھ ہوا۔ کل میرے ساتھ ہو سکتا ہے۔ یہاں رہنے والوں کو مل کے کچھ کرنا چاہئے۔ اوپر سے یہ فون ہمیشہ ڈیڈ رہتے ہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

وہ واپس آیا تو بہت گھبرایا ہوا تھا "تم تو قتل بھی کر آئے ہو ایک چوکیدار کو۔"

میں نے کہا "بکتا ہے وہ حرام زادہ۔ خود اس نے مار دیا ہوگا چوکیدار کو غصے میں۔"

"آپ بھی حد کرتے ہیں۔ بم کا دھماکا ہو گیا اور آپ کو پتا نہیں چلا نیند میں۔"

"بم۔ کس نے مار دیا آپ پر۔"

"مجھ پر نہیں۔ میری گاڑی تباہ کر دی۔ میرے دو باڈی گارڈ مارے گئے۔ وہ پولیس اسٹیشن جا رہے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں خود گاڑی لے کر نہیں گیا۔" شوکت رانا کی حالت خراب تھی۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا "یہ تو بہت بُرا ہوا۔"

محسن نے سر ہلایا "رانا کے مقدر میں زیادہ ذلت کے ساتھ مرنا لکھا ہے۔"

اب انیس گرم ہو گیا "اجی تو میں کیا کروں اب۔ ضرور کسی سے دشمنی ہوگی آپ کی ورنہ ایسا تو پہلے یہاں کبھی کسی کے ساتھ نہیں ہوا۔ بار بار مجھے پریشان کرنے آجاتے ہیں آپ۔ میں کلکٹر کسٹم ہوں۔ کوئی چوکیدار نہیں ہوں آپ کا۔ آخر دوسرے پڑوسی بھی تو ہیں۔"

ظاہر ہے اس کے بعد شوکت رانا سے اس کے تعلقات خراب ہو گئے اور اس نے جاتے جاتے کہا "اچھا اچھا آپ جا کے سو جائیں آرام سے۔ مجھے پولیس اسٹیشن جانا تھا۔ اب آپ سے کیا کہوں کہ ذرا خیال رکھئے۔ گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

"میرے گھر میں بھی کوئی نہیں ہے۔ مجھے اپنے گھر کا خیال رکھنا ہے اور اب آپ جیسے لوگ آگئے ہیں یہاں تو سب کو ہی خیال رکھنا پڑے گا اپنے اپنے گھر کا۔" انیس اسے مزید مشتعل کر کے لوٹ آیا۔

رانا کی گاڑی کے شعلے اوپر تک اُٹھ رہے تھے اور آس پاس کی دوسری کوٹھیوں سے بھی چوکیدار یہ معلوم کرنے آگئے تھے کہ کیا ہوا ہے۔ انہیں مالکوں نے بھیجا تھا جن کی نیند ڈسٹرب ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک نے فائر بریگیڈ والوں کو فون کرنے کی پیشکش بھی کی مگر رانا نے کہا کہ وہ اب کیا کریں گے آکے۔ گاڑی تو جل کے ختم ہو گئی۔

وہ خود اپنی گاڑی میں پولیس اسٹیشن گیا تو میں نے اور محسن نے بھی یہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔

میں نے انیس سے کہا "تم ہمیں اپنی گاڑی میں چھوڑ کے آسکتے ہو۔"

"کہاں تک۔ اور میرے گھر کا کیا ہوگا؟"

"تمہارا گھر تمہیں واپسی پر یہیں ملے گا۔ تم ہمیں وہاں ڈراپ کر دینا جہاں سے ٹیکسی مل جائے۔"

محسن نے کہا "ایک بات اور۔ تم انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ ہم تم سے پوچھے بغیر بھی تمہاری گاڑی لے جا سکتے ہیں۔"

میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا "مگر اس صورت میں تمہیں زیادہ پریشانی ہوگی۔ فلم کی بالکل فکر مت کرو۔ تمہارا یہ راز ایک امانت ہے۔"

موسیقی کے شائقین کے لیے
اپنے طرز کی اچھوتی کتاب

امجد موسیقی

سازوں کی سنگت میں گانا ایک مشکل فن ہے

سُر، لَے، گیت، راگ، ٹھاٹھ اور
موسیقی کے دیگر اسرار و رموز
آشکار کرنے والی بیمثال کار آمد کتاب

برصغیر کے نامور گلوکار اس کتاب کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

مہدی حسن کا تفصیلی تبصرہ
مع اُن کی رنگین تصویر کے
اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں

قیمت: ۱۰۰ روپے ۔ ڈاک خرچ: ۱۸ روپے
پیشگی رقم بذریعہ منی آرڈر بھیجنے پر ڈاک خرچ معاف

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس نمبر ۲۳ رمضان چیمبر طور روڈ نزد آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

انیس احمد نے ہمیں ہوٹل سے زیادہ دور لے جا کے اتار دیا۔ وہاں ایک ٹیکسی والا اپنا ٹائر بدل رہا تھا۔ شاید وہ کسی کو چھوڑ کے آیا تھا کہ ٹائر پنکچر ہو گیا۔ ڈر گئے حادثے پر وہ ہمارے ساتھ جہنم میں بھی جانے پر تیار تھا۔ ہم اسے وقار یوسف کے گھر لے گئے۔

حسب توقع وہاں سب لوگ جاگ رہے تھے اور باقاعدہ فکر مند ہو رہے تھے مگر غالب کو دیکھ کے سب کچھ بھول گئے۔ رابعہ نے "کل سے اور کئی نے کورس میں چیخ ماری اور غالب سے چمٹ کے کورس میں ہی سوال بھی کر ڈالا "استاد کہاں ہے؟"

غالب نے مارگریٹ کی طرف دیکھا "استاد۔ تم نازو ہو نا۔"

وہ درم بخود کھڑے تھے کہ میں اور محسن موقع پا کے پھر فرار ہو گئے۔ میں نے راستے میں محسن کو اپنی اسکیم سمجھا دی تھی۔ ٹیکسی کو محسن نے کراچی جمخانہ کے سامنے روک دیا "میں آتا ہوں ایک فون کر کے۔"

میں نے کہا "ہم ادھر گلی میں انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے ذرا دو۔"

محسن نے میرے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اٹھی ہوئی دیکھی "شوشو ٹھیک ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور گاڑی کو گلی میں لے گیا۔ وہاں اندھیرا تھا اور ایسی ہر سنسان جگہ رات کے وقت پبلک ٹائلٹ کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہے۔ خود ڈرائیور ایک دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ میں رابعہ کی کوٹھی کے خالی پلاٹ پر گیا اور پھر غائب ہو گیا۔

باکس کے اندر سے نیچے اترنے میں مجھے دو منٹ ہی لگے ہوں گے۔ ابھی جلا کے میں نے دلاور کو دیکھا۔ وہ ایک کونے میں سمٹا پڑا تھا۔ میں نے اسے ہلایا جلایا مگر اس پر بے ہوشی طاری تھی۔ چوبیس گھنٹے میں کسی نے اس کی خبر نہیں لی تھی اور وہ کچھ کھائے پیئے بغیر وہاں کسمپرسی کی حالت میں پڑا تھا۔ اس کو دیکھ کر اب واقعی رحم آتا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو گیا تھا۔ اس کے سر اور چہرے کے بال اتنے بڑھ گئے تھے اور ایسے بکھرے ہوئے تھے کہ وہ دیوانہ لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں اور گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ اس کے جسم سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

میں اسے کندھے پر ڈال کے اوپر پہنچا تو پریشان ٹیکسی ڈرائیور ہر سمت میں مجھے یا محسن کو تلاش کر رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ ہم لوگ اسے کرایہ ادا کئے بغیر چکر دے کر غائب ہو گئے ہیں۔ مجھے دیکھ کر اس کی پریشانی بڑھ گئی۔

"یہ کسے اٹھا لائے ہو جی۔"

میں نے کہا "یار میں تو ادھر پیشاب کرنے گیا تھا۔ وہاں یہ پڑا ہوا تھا۔ پتا نہیں کون ہے۔"

اس نے نفرت اور حقارت سے کہا "نشے باز ہے کوئی۔ چھوڑیں اسے ورنہ خوب مشکل میں پڑیں گے۔"

میں نے کہا "یار یہ مر جائے گا۔ تم ہمیں اسپتال کے گیٹ تک لے جاؤ آگے ہم نمٹ لیں گے۔"

جب محسن نمودار ہوا تو ہمارے درمیان پھر یہ ڈائیلاگ دہرائے گئے۔ میں نے اسے بھی وہی کہانی سنائی جو ٹیکسی ڈرائیور کو سنائی تھی۔ اس نے فریج کا ایک لفظ بول کے کہا "کام ہو گیا" اور میں نے سمجھ لیا کہ اخبار والوں کو خبر مل گئی ہے۔

تو گے راستے میں ایک پرائیویٹ اسپتال کے سامنے ہم نے دلاور کو ٹیکسی سے اتار لیا اور ٹیکسی کو سو روپے دے کے رخصت کر دیا۔ وہاں ایک اور ٹیکسی موجود تھی۔ ہم نے دلاور کو اس میں منتقل کیا تو ٹیکسی والا شک میں پڑ گیا۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے کہا "یہ پولیس کیس ہے۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور سیدھا اسپتال جانے پر راضی نہیں تھا۔"

"راضی تو میں بھی نہیں ہوں۔"

میں نے سو کا نوٹ اس کو دکھایا "اب کیا خیال ہے؟"

"راضی کرنے کا طریقہ تو آتا ہے جی آپ کو۔" اس نے زحمائی سے اپنی ہنسی کی نمائش کی۔

ٹیکسی ابھی روانہ ہو کے سو گز دور ہی گئی ہو گی کہ محسن نے اسے روک لیا اور میں نے اسے پیچھے سے ہاتھ مار کے ناک آؤٹ کر دیا۔ اسے میں نے پچھلی سیٹ پر دلاور کے ساتھ ڈال دیا اور خود اس کی جگہ بیٹھ گیا۔

حسب توقع ابھی تک نہ شوکت رانا واپس پہنچا تھا اور نہ پولیس آئی تھی۔ قتل جیسی سنگین واردات کی اطلاع ملنے پر بھی ان کی فرض شناسی کی حس زیادہ متاثر نہیں ہوئی۔ یہ ان کے موڈ کی حیثیت اور "دباؤ" کی قوت پر منحصر ہے کہ وہ جائے واردات پر پہنچنے میں چھ منٹ لگاتے ہیں، چند گھنٹے یا چند دن۔ وہ شوکت رانا کی بات کرتے کے اور اس کی مالی حیثیت کا تعین کر کے حرکت میں برکت سمجھیں گے تو آئیں گے ورنہ ضابطے کے مطابق کارروائی ہو تو پھر پرواہ نہیں ہے۔

میں نے محسن کو دروازے پر کھڑا کیا اور خود چوہدری دلاور کو کندھے پر ڈال کے اندر در آیا۔ دلاور پہلے جتنا صحت مند تھا اب اس کا نصف بھی نہیں رہا تھا چنانچہ یہ مشکل کام بھی آسان ہو گیا۔ اس وقت میں اور محسن ایک انتہائی خطرناک کھیل کا آغاز کر چکے تھے۔ اس میں ہماری کامیابی کا انحصار سو فیصد تقدیر پر تھا۔ ہماری تدبیر اس کے بغیر ایک احمقانہ فعل اور خود کشی کے مترادف بھی جاتی۔ ہماری جرأت مندی اور ذہانت بھی ہمیں تختہ دار تک پہنچانے کا سبب بن جاتی۔ دیکھنا اب یہ تھا کہ تقدیر ہمیں چند منٹ کی مہلت عطا کرتی ہے یا نہیں۔ پولیس ابھی تک آئی نہیں تھی مگر یا شوکت رانا یقیناً اس وقت بھی نکلنے تھے جب ہم نے ٹیکسی اس کوٹھی کے دروازے پر روکی تھی۔

اس پاس رہنے والے گواہی سے بچنے کے لئے روپوش تھے اور ان کے پاس معقول عذر تھا کہ آدھی رات کے وقت کون

شریف زندہ جاگتا ہے اور کون اپنے پڑوس کے گھر پر نظر رکھتا ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ ہماری خواب گاہ اور ہمارے اپنے گھر سے باہر کی دنیا میں کیا ہوا اور کیوں ہوا۔ رہے چوکیدار تو ان کا کام گپ شپ ہوا کرتا ہے۔ سراغرسانی نہیں۔

لیکن ہم پکڑے جاتے تو ہمارے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لئے کچھ بھی نہ ہوتا۔ حالات اور واقعات کی کڑیاں خود بخود مل جاتیں۔ میرے فریج رکیل ہونے کا راز فاش ہو جاتا۔ فریج رکیل آخر دلاور کو اٹھا کے کیوں لایا تھا۔ شوکت رانا کی کوٹھی تک۔ پھر اس کے ساتھ محسن تھا۔ ظاہر ہے اس کا ساتھی سکندر رجنٹ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ دونوں کا مشترکہ دشمن شوکت رانا تھا۔ اس کے گھر میں لوٹ مار آتش زنی اور قتل کی وارداتوں کا مقصد رانا کو پھنسانا تھا مگر خود پھنس گئے۔ بڑے سیانے اور گھاگ بنے پھرتے تھے۔ ایم آر ایس کے کمانڈر انچیف آخر کار پکڑے گئے۔

جب میں دلاور کو اندر چوکیدار کی لاش کے قریب فرش پر ڈال رہا تھا تب بھی میرا دل خوف سے ڈوبا جا رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے موت سائے کی طرح میرا تعاقب کر رہی ہے اور میں اس سائے سے بچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دست اجل میرے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنا چاہتا ہے اور میں اپنی گردن بچا رہا ہوں۔ یہ پاگل پن تھا۔ بے وقوفی کی انتہا تھی۔ میرے کانوں میں رابعہ کے چلانے کی آواز گونج رہی تھی۔ "سکندر خدا کے لئے سوچو تم کیا کر رہے ہو۔ تمہیں میرا بھی خیال نہیں سکندر۔ اگر تم پکڑے گئے تو کوئی تمہیں کیسے بچائے گا۔ کل کے دھوکے کی آواز مجھے پریشان کر رہی تھی کہ تم نے مجھے بھی نہیں بتایا۔ کسی کو بھی اس قابل نہیں سمجھا کہ مشورہ کرتے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ میرا کیا ہو گا" بوبی کا کیا ہو گا۔

ایک آواز مسلسل مجھے پکار رہی تھی۔ بھاگو۔ بھاگو۔ جلدی کرو۔ پولیس آنے والی ہے۔ رانا پہنچ جائے گا۔ اخباری نمائندے پہنچیں گے۔ تم کیا بتاؤ گے کیا کہو گے اپنی صفائی میں۔ تمہارا راز رانا کھل جائے گا۔ تمہارا بھانڈا پھوٹ جائے گا کہ تم فریج رکیل نہیں سکندر بخت ہو پھر تمہارے سچ پر بھی کون اعتبار کرے گا۔ جلدی جلدی نکلو یہاں سے۔

میں پلٹ کے بھاگا تو میرے جسم سے پسینہ پھوٹ رہا تھا اور میرے ہاتھ پاؤں میرے قابو میں نہیں تھے۔ یہ زندگی سے پیار تھا جو مجھے موت سے فرار کی ہمت دے رہا تھا۔ شاید یہ میری زندگی کا سب سے خطرناک جوا تھا جب میں نے پھانسی کا پھندا خود اپنی حماقت سے اپنے گلے میں ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

محسن کی حالت مجھ سے بھی زیادہ ابتر تھی۔ ایک ایک سیکنڈ کا انتظار اس کے لئے ایک صدی کاٹنے کے برابر تھا۔ سامنے سے پیچھے سے پولیس کہیں سے بھی آ سکتی تھی۔ وہ بھاگنا چاہتا تب بھی بھاگ نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کے نہیں جا سکتا تھا اور پولیس اسے بھاگنے بھی نہ دیتی۔ اس کی نظریں مسلسل دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھ رہی تھیں اور اس کی اضطرابی کیفیت اس کی حرکات و سکنات سے عیاں تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ بے اختیار چلایا اور زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا "جلدی کرو" اس نے ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کے ٹیکسی کو اسٹارٹ کیا۔

میں صرف گھبراہٹ کے باعث ایک جگہ ٹھوکر کھا کے گرتے گرتے بچا۔ وہ گٹر لائن کا ڈھکنا تھا جو میرا پیر پڑنے سے ہل گیا تھا۔ اس کا ایک کونا اندر چلا گیا تھا جس سے میرا پاؤں کنارے میں الجھا تھا۔ میرا دل اس وقت ایسے دھڑک رہا تھا کہ میرے کان اس کی دھمک سن سکتے تھے۔

محسن نے ٹیکسی کا دروازہ کھلا رکھا تھا۔ میں ہانپتا کانپتا اندر جا گرا۔ محسن نے ایک دم ٹیکسی چلا دی۔ ابھی میرا ایک پاؤں باہر ہی تھا دروازہ جھٹکے سے پیچھے گیا اور پھر لوٹ کر آیا تو میری ٹانگ پر لگا۔

محسن نے دانت پیس کے کہا "اسے بند کرو۔ اُلو کے پٹھے کٹ جائے گا پاؤں۔"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "نہیں نہیں۔ تم گاڑی چلاؤ۔ میں نہیں کروں گا۔ ہم نکل آئے۔ اب کچھ نہیں ہو گا۔"

وہ آخری چند سیکنڈ بھی کم خطرناک نہیں تھے۔ میں نے دروازہ کھینچ کے بند کیا اور پلٹ کے دیکھا۔ ابھی تک ویران سڑک پر کوئی نہیں نظر آ رہا تھا۔ اگر وہ عین اسی وقت پہنچ جاتے تو ہمیں فرار نہ ہونے دیتے۔ جل تو جلال تو۔ تو نے پھر بلا سے سکندر کو بچایا۔ بس آج اور بچا لے میرے معبود۔

جب ٹیکسی نے موڑ کاٹا تو میں نے سر پیچھے ٹکا کے آنکھیں بند کر لیں۔ میرے خدا نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ خود کو بہت چالاک بہت ذہین، بہادر اور جری سمجھنے والے ایم آر ایس کے چیف کے تو۔ تم کچھ بھی نہیں ہو۔ حق اور لگتے ہو اور باغی ہو۔ اپنی تقدیر سے کھیلتے ہو۔ یہ سوچے بغیر کہ تمہاری تقدیر اور زندگی پر کسی اور کا بھی حق ہے۔ دلدل میں آنکھ بند کر کے کود جاتے ہو اور پھر خدا سے زندگی کی دعا مانگتے ہو۔ اپنے قول سے اپنے فعل سے عمل سے اور فکر سے۔ تم کب تک ناشکرے پن کا اظہار کرو گے اور تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ ٹیکسی رکی ہوئی ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو محسن اسٹیئرنگ پر سر رکھے لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "سب ٹھیک ہو گیا محسن۔"

اس نے سر اٹھایا "ہاں۔ مگر ذرا سوچ یار۔ کتنی بڑی نادانی تھی جیسے ہم نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ بڑے خود غرض ہیں ہم کسی اور کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔ ہم خود غرض نہیں۔

www.paksociety.com

پاگل ہیں۔"

"ٹھیک کہتا ہے تو۔ رابعہ اور گل بھی کیا کہیں گی۔ سب کی کہیں گے جب انہیں معلوم ہوگا۔ مگر خیر۔ اصل چیز کامیابی ہے جو سب سے بڑی سند ہے۔ اب ہم بہادر اور وسیع ذہن اور با صلاحیت ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

ALL IS WELL THAT ENDS WELL."

محسن نے پلٹ کے دیکھا "یہ ابھی تک اتنا قفل ہے۔"

"چل اسے بھی کہیں چھوڑ دیں۔ ہمیں لوٹ کر بھی آنا ہے ڈرامے کا ڈراپ سین دیکھنے کے لئے۔"

محسن نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی۔ اب ہم بہت پُرسکون اور پُر اعتماد تھے "دوسرے لوگ بھی وقت پر پہنچ جائیں تو بات ہے۔"

"کس کس کو مدعو کیا تھا تو نے؟"

"میں نے غازی کو فون کیا تھا۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی کو اور منظر کو۔ اب دیکھو کون کون آتا ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور ابھی تک ہوش میں نہیں تھا۔ ہم نے اسے پچھلی سیٹ پر آرام سے لٹایا اور ٹیکسی کو ایک مسجد کے دروازے کے عین سامنے کھڑا کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ نماز فجر سے پہلے ہی وہ ہوش میں آجائے گا اور نہ آیا تو نماز پڑھنے کے لئے منہ اندھیرے آنے والے خدا کے نیک بندوں میں سے کوئی اس کی مدد ضرور کرے گا۔ چلنے سے پہلے میں نے اس کی جیب میں پانچ سو روپے بھی ٹھونس دیئے۔ یہاں اس بات کا امکان نہیں تھا کہ کوئی موقع پا کے اس کی جیب پر ہاتھ صاف کر دے گا۔

ایک بار پھر ہم انیس احمد کے دروازے پر پہنچے تو وہاں خاصی گہما گہمی دیکھنے میں آئی۔ ایک گاڑی پولیس کی تھی اور ایک شوکت رانا کی۔ پولیس کی گاڑی میں صرف ایک ڈرائیور مخالف سمت میں منہ کئے بیٹھا ہوا تھا۔ پھر تیسری گاڑی ہمارے پاس سے گزری۔ یہ منظر کی کار تھی۔ ہم فوراً انیس کے بنگلے میں داخل ہو گئے۔

وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں سے نیند کے آثار ہی غائب ہو گئے "پھر آگئے تم لوگ۔" وہ منہ بسور کے بولا۔

میں نے کہا "اب گھر دیکھ لیا ہے تمہارا۔ تم سے مل کے تو آنا جانا لگا رہے گا۔ ہم تمہاری عاقبت سدھارنے کا سوچ رہے ہیں۔"

محسن نے کہا "ایک تمہارا سسر، دو سالے اور ایک بیوی۔ ہم اب ان کے ساتھ ہیں۔ ہم تمہیں کتے کی دم سے زیادہ سیدھا کر دیں گے۔"

"دیکھو۔ مجھے جانے دو جہنم میں۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اب تو یہ دنیا بھی میرے لئے جہنم ہو گئی ہے۔ تم ایسا کرو کہ وہ فلم نمائش کے لئے پیش کر دو۔ جو ہم پہ گزرنی ہے ایک بار گزر جائے۔"

میں نے کہا "تم کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ ہم پر بھروسا رکھو۔ فلم کی حد تک تمہارا راز ہمارا راز۔ ابھی تو ہم بس ذرا ہاتھ منہ دھو کے اپنا حلیہ ٹھیک کرنے آئے ہیں اور یہ یاد دلانے کہ تم نے ہمیں پہلے بھی نہیں دیکھا۔ تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں۔"

"مجھے اپنا سبق یاد ہے۔" وہ بولا۔

ہم پانچ منٹ بعد حلیہ درست کر کے باہر گئے تو وہاں دو گاڑیاں اور نظر آئیں۔ پولیس کی دوسری جیپ کے اوپر گھومنے والی لائٹ اور سائرن یہ ظاہر کرتے تھے کہ ایس ایس پی جاوید صدیقی بھی پہنچ گیا ہے۔ دوسری گاڑی رابعہ کی تھی۔ غالباً منظر نے اسے مطلع کیا ہوگا۔ غازی کی چھٹیچر موٹر سائیکل وہیں دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔

میں اور محسن بڑی بے نیازی اور احساس اجنبیت کے ساتھ رابعہ اور منظر سے ملے۔ ترجمانی کے فرائض محسن کو ادا کرنے تھے مگر وہاں مولوی خادم حسین بھی موجود تھا۔ وہ رابعہ کے ساتھ آیا تھا۔

میں نے اس سے فرنچ میں پوچھا "کیا بیوی نے لات مار کے حجلۂ عروسی سے خارج کر دیا؟"

اس نے کہا "حجلۂ عروسی تو خواب کی بات ہو گئی۔"

"میری مراد تھی اس دڑبے سے جس کو تم اپنا بیڈروم کہتے ہو۔ اگر اس نے حقوق زوجیت کی ادائیگی سے انکار کیا ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں...."

"یہاں سب کے سامنے یہ باتیں مناسب نہیں ہیں بیگ۔"

"ایسی کی تیسی سب کی۔ تم تو بڑے چاؤ سے گئے تھے۔ پھر لوٹ کیوں آئے۔"

محسن بولا "میں بتاتا ہوں اس کے ساتھ کیا ہوا۔ اس نے دروازے پر دستک دے کے شرافت سے پوچھا ہوگا۔ باجی میں اندر آجاؤں۔ اور اندر سے اس نے کہا ہوگا کہ دفع ہو جاؤ۔ پھر بھی تم۔ اس وقت اندر تمہارے چچا جی ہیں۔ تمہیں خیال رکھنا چاہئے۔ جب جی چاہتا ہے منہ اٹھا کے چلے آتے ہو۔"

خادم حسین سخت بڑبڑ ہوا اور میں نے بھی بڑی مشکل سے ہنسی کو ضبط کیا "آپ ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں فرنچ کا۔ مجھے گالی دی ہے آپ نے۔ گھر والی کو بہن بنا کے اور اسے بھی گالی دی ہے...."

ایس ایس پی جاوید صدیقی نے میری طرف دیکھا "یہ گورا دیکھیں بھی آ گیا آدھی رات کو۔ اسے ہم سے زیادہ تکلیف ہے۔"

محسن نے کہا "مجھے تو آپ کو یہاں دیکھ کے تعجب ہو رہا ہے۔ واقعی نوکری بڑی بُری چیز ہے۔ غلامی ہے پبلک کی۔ ورنہ آپ جیسے افسر تو بادشاہ لوگ ہیں۔ خود کہاں تکلیف کرتے ہیں۔ نوکری خطرے میں پڑی تو آدھی رات کو بھی اٹھ کے آنا پڑا۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے تمہاری۔ ایسی کچی نوکری نہیں ہوتی کسی پولیس افسر کی۔" صدیقی نے برہمی سے کہا۔

منظر نے فوراً مداخلت کی "اب کیا آتے ہی بک بک شروع کر دی۔ کس کے منہ لگ رہا ہے۔"

صدیقی نے مزید بُرا منایا "کیا مقصد ہے آخر اس فضول بات کا۔"

اب غازی سامنے آگیا "یہ سب فضول لوگ ہیں جی۔ سب کو ذک دیں ہتھکڑی لگوا دیں۔ بڑے اختیارات ہیں آپ کے کیا ہوگا اگر ایک خبر آ بھی گئی۔ نوکری تو پکی ہے۔ ان سب کا دماغ درست کر دیں۔"

"آپ لوگ بہت زیادتی کرتے ہیں۔" صدیقی نے افسوس سے کہا "کیا میں نے ایک گمنام فون کال پر یہاں آ کے کوئی غلطی کی ہے۔ آپ لوگوں کو کبھی تعریف بھی کرنی چاہئے۔ اتنا تعصب اور کینہ ہے آپ کے دل میں کہ سب پولیس والے آپ کے نزدیک گولی مار دینے کے قابل ہیں۔ ان میں سرے سے کوئی اچھائی ہے ہی نہیں۔"

رابعہ نے کہا "صدیقی صاحب جانے دیں۔ یہ لوگ منہ پھٹ ہیں۔ مذاق میں حد سے بڑھ جاتے ہیں۔"

غازی نے بھی کہا "یار آپ بُرا مت مانیں۔ وقت آنے پر اندازہ ہوگا آپ کو کہ ہم کتنے فراخدل لوگ ہیں۔"

اب دوسرے کمرے سے شوکت رانا کے دھاڑنے کی آواز آئی "آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ لوگ سمجھتے کیوں نہیں کہ میرے خلاف کتنی بڑی سازش کی گئی ہے۔ پولیس کو رپورٹ میں نے کی تھی۔ ڈکیتی میرے گھر میں ہوئی۔ گاڑی میری تباہ ہوئی۔ قتل میرے چوکیدار کا ہوا اور گرفتار بھی مجھے کیا جا رہا ہے۔ آخر کس جرم میں؟"

"زیادہ ڈرامہ مت کرو۔ یہ چوہدری دلاور یہاں کیسے آیا؟" کسی نے دہاڑ کے کہا "اس بات کا کیا جواب ہے تمہارے پاس۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں۔ جب میں گیا تھا تو یہ یہاں نہیں تھا۔" رانا نے چیخ کر کہا۔

کسی نے اس کے تھپڑ مارا "زیادہ بھونکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب تفتیش ہوگی تو سب پتا چل جائے گا۔ یہ تیرا پارٹنر تھا یا نہیں؟ تو جانتا ہے اسے یا نہیں؟ بول۔ کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ مفرور مجرم ہے؟ اس کی بیوی نے تیرے خلاف جو الزامات لگائے ہیں سب؟"

چوہدری "ڈکیتی" آتش زنی اور چوکیدار کے قتل کے معاملے سے نہ ایس ایس پی جاوید صدیقی کا تعلق تھا نہ رابعہ یا منظر کا۔ وہ سب شوکت رانا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ متعلقہ تھانے والے اپنی تفتیش مکمل کر لیں تو چوہدری دلاور کو سامنے لایا جائے۔ میں اور محسن بھی تمام معاملات سے لاتعلق معصوم صورت بنائے بیٹھے رہے۔ رابعہ کا موڈ بتاتا تھا کہ وہ مجھ سے کتنی خفا ہے مگر یہ سالا دبنگ بھی مجھے خوں خوار نظروں سے گھور رہے

کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ میں اور محسن جانتے تھے کہ واپس گھر جا کے کیا ہوگا۔ رابعہ اور گل ہمیں کتنی باتیں سنائیں گی۔

صدیقی نے رابعہ کو مخاطب کیا "اس ڈرامے نے میری عقل خبط کر دی ہے خاتون۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ کیس ہاتھ میں لے کر میں نے اپنے حق میں اچھا نہیں کیا۔ میں صرف بے وقوف بنا یہاں آ کے۔"

منظر بولا "چلو دیر سے سہی۔ اپنے بارے میں صحیح بات تو پتا چل گئی۔ کچھ لوگ تمام عمر خود کو عقل مند سمجھتے رہتے ہیں۔"

"منظر صاحب۔ آپ کو بھی گمنام کال موصول ہوئی ہوگی اور جناب صحافی صاحب۔ آپ کو بھی۔"

غازی نے کہا "ہم تو عادی ہیں جی۔ سارے شہر کی فکر رہتی ہے۔ جیسے باپ کہیں بھی ہو اسے بچوں کی فکر رہتی ہے کہیں کچھ بھی ہو ہمیں تو جانا ہی پڑتا ہے۔"

"کیا یہ عجیب بات نہیں ہے۔" صدیقی بولا "آج ہی آپ صحافی اور دوکا برادری نے دعویٰ کیا تھا کہ دلاور کو گرفتار کرا دیا جائے گا۔ مگر عین وقت پر تماشا شروع ہو گیا۔ کہا یہ گیا کہ صحیح اطلاع نہیں ملی۔ صدقہ خبر نہیں آئی۔ میں کیا کرتا اگر یقین نہ کرتا۔ دلاور کی بیوی نے بھی بڑی تفصیل سے بتایا تھا کہ اس نے اپنے شوہر سے کہاں ملاقات کی تھی۔ اور وہ کیا دیکھ کے گئی تھی۔ وہ بہت چالاک عورت ہے۔ اس نے ان کو صاف بچا لیا جو اسے ساتھ لے گئے تھے۔ میں نے اس کا بیان لیا اور بڑی جرح کی مگر وہ یہی کہتی رہی کہ مجھے معلوم نہیں وہ کون لوگ تھے۔ انہوں نے مجھے فون کر کے رنگل پر بلایا تھا اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ کے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ دلاور سے ملا کے واپس وہیں چھوڑ گئے۔ اب آپ لوگ ہی بتائیں یہ بات ماننے والی ہے۔ ایک عورت کیسے چلی گئی اپنے دشمنوں کے ساتھ۔ کیسے یقین کر لیا اس نے کہ فون کرنے والے مذاق نہیں کر رہے ہیں اور رنگل چوک پر ضرور ملیں گے۔ پھر اس نے ان کو کیسے پہچانا۔ اور اگر اسے لے جانے میں اور..."

"صدیقی صاحب۔ پولیس تو سچ اگلوا لیتی ہے۔"

"ہاں۔ میں بھی اگلوا لیتا۔ مگر اس ڈرامے میں وہ عورت بھی شریک ہے آپ سب کے ساتھ۔ ایک طوفان کھڑا ہو جاتا اگر میں اس پر انگلی بھی اٹھاتا۔ وہ تو مظلوم بنی ہوئی تھی۔ ہمیں ملزم ٹھہرانے کے بعد۔ ہم پر نااہلی کا الزام لگانے کے بعد۔ میں مجبور تھا اس کے جھوٹ کو ماننے پر۔"

غازی بولا "آپ اتنے یقین کے ساتھ اسے جھوٹا کہہ رہے ہیں۔"

صدیقی نے چیخ کے کہا "اور کیا ثبوت چاہئے اس کے جھوٹ کا۔ دلاور تو یہاں ملا ہے۔ کہاں ہے وہ تہ خانہ جس کی اس نے منظر کشی کی تھی۔ اچانک آدھی رات کو فون آ گیا کہ دلاور فلاں جگہ ہے۔ اتفاق۔ ایک ہی شخص نے سب کو فون کر کے بلا لیا۔ وکیلوں کو

www.paksociety.com

بھی پولیس کو بھی اور صحافیوں کو بھی۔ کون ہے وہ شخص آخر؟ ظاہر ہے وہ جو سب جانتا ہے اور سب کچھ ایک منصوبے کے تحت کرتا ہے صحیح وقت پر۔ پوری تیاری کے بعد۔ خود کو بچاتے ہوئے۔"

"آپ پکڑ کیوں نہیں لیتے اس شخص کو۔" منظر بولا۔

"آپ سب سے معذرت کے ساتھ۔ وہ آپ ہی میں سے کوئی ہے۔ اس بات پر میرا یقین ایسا ہی ہے جیسا اپنے ایس ایس پی ہونے پر مگر جب تک میں پولیس کے مروجہ طریقے سے تفتیش نہ کروں مجھے کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ میرا ایک انسپکٹر صبح تک مجھے اس کا نام بتا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اسے میری طرف سے تفتیش کی اجازت ملے اور یہ ناممکن ہے۔"

اس کی بات کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ کسی نے اس سے اختلاف بھی نہیں کیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا ٹھیک تھا۔ اس بات کو ہم سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا۔ غازی اور محسن، رابعہ اور میں اور منظر۔ سب جانتے تھے کہ یہ سچ ہے۔

"آدھی رات کے وقت یہ میلہ لگانے کا مطلب بھی جانتا ہوں میں۔ مدعی اور اخبار والے یہاں صرف اس لئے آئے ہیں کہ انہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔ یہ ڈر تھا کہ کہیں میں رشوت لے کر چوہدری دلاور کو فرار کروا دوں اور اسے بحفاظت ملک سے باہر نہ بھجوا دوں۔ آپ سب محض چشم دید گواہ بننے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ گرفتار تو میں اکیلا بھی کر سکتا تھا دلاور کو۔ لیکن آپ سب کو یا مجھے فون کرکے بلانے والے کے دل میں یہ خیال ضرور تھا کہ پولیس کا کیا ہے۔ صبح صاف مکر جائے نہیں۔ دلاور ابھی کہاں گرفتار ہوا ہے۔ اس کا پیسہ، اس کی فیملی کا اثر و رسوخ کام کر جائے اور دلاور نظر آئے انگلینڈ میں۔ یہ سب آف دی ریکارڈ ہے جنٹلمین۔ اسے آپ میری پریس کانفرنس نہ سمجھیں۔ میں ذرا کھل کے بات کر رہا ہوں۔"

"چلیں پھر یہ بھی بتا دیں کہ آپ کو کس پر شک ہے؟"

"مجھے شک ہے کہ یہ سازش شوکت رانا کے خلاف ہوئی ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔"

"لیکن اس کی بیوی نے جو شوکت رانا پر جو الزامات عائد کئے ہیں۔"

"وہ اپنی جگہ درست ہیں۔ میرا مطلب ہے وہ ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ غالباً اس نے ہی بدلہ لیا ہے شوکت رانا سے اور وہ بھی اس سازش میں شریک ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی مدد کرنے والے رہی ہوں جو اس کو دلاور سے ملوانے لے گئے تھے۔ وہ دلاور کے دوست تو نہیں ہو سکتے پھر دلاور کی بیوی نے ان پر کیسے اعتبار کر لیا۔ کیوں ان کے ساتھ چلی گئی۔ یہی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مگر ابھی تو ابتدا ہے آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

اسی وقت انسپکٹر نے اندر آ کے سیلوٹ کیا "دھماکا کام ختم ہو گیا سر۔ ہم کو اجازت ہے ملزم شوکت رانا کو ساتھ لے جانے کی؟"

ایس ایس پی نے اقرار میں سر ہلایا۔ "انسپکٹر اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ یہ کوئی عام کیس نہیں ہے۔ حوالات کے اندر ملزم کی پوری حفاظت کا بندوبست تمہاری ذمے داری ہے۔ اگر اسے تمہاری تحویل میں کوئی نقصان پہنچا تو تمہاری خیر نہیں۔"

"آپ فکر ہی مت کریں سر۔ پرندہ پر نہیں مار سکتا۔"

"پرندے کو چھوڑو۔ تمہارا اپنا کوئی بندہ نہ بک جائے۔ خریدار بیٹھے ہیں اور قیمت بھی بہت بڑی لگائیں گے۔ یہ نہ ہو کہ کوئی اسے تجربلیڈ پہنچا دے یا کسی حوالاتی سے اس کا گلا کٹوا دے۔ اسے کھانے میں زہر دے دیا جائے۔ یہ حوالات میں خودکشی کا کیس نہیں بنے گا۔ زیر دفعہ تین سو دو تمہارے خلاف ایف آئی آر درج ہوگی۔ سمجھ آ گئی ہے نا میری بات کی!"

"یس سر۔" انسپکٹر بولا۔

"ایمبولینس کیوں نہیں آئی ابھی تک؟"

"آ گئی ہے سر۔"

"پھر مجھے بتایا کیوں نہیں۔" صدیقی نے گرج کے کہا "میں جھک مار رہا ہوں یہاں آخر کس لئے۔ چوہدری دلاور کو فوراً اسپتال شفٹ کرنا ہے۔"

"وہ۔ سر جی۔ اضافی نفری آنے والی ہے۔ ایمبولینس کے ساتھ جائے گی۔" انسپکٹر نے کہا۔

صدیقی نے سر ہلا کے اسے جانے کی اجازت دی۔ تھانے والے چوکیدار کی لاش اٹھا کے لے گئے اور اپنے ساتھ پیچھے چلانے شوکت رانا کو بھی۔ انہوں نے شوکت رانا کو مارا ابھی تھا اور اسے کہیں فون کرنے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ ویسے بھی وہاں کوئی فون کام نہیں کر رہا تھا۔ تھانے کے کچھ لوگ اس گاڑی کا معائنہ کرتے رہے جس میں بم کے دھماکے سے شوکت رانا کے دو باڈی گارڈ ہلاک ہوئے تھے۔

صدیقی نے کہا "اس وقت سب لوگ چوہدری دلاور کو صرف دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی تصویر بھی بنا سکتے ہیں مگر اس سے بات نہیں کر سکتے۔"

"کیا وہ بے ہوش ہے؟" غازی بولا۔

"نہیں۔ اس پر بہت تشدد ہوا ہے۔ ہم اسے سخت حفاظتی انتظام کے ساتھ اسپتال میں رکھیں گے۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ وہ مرے گا نہیں۔ نہ مارا جائے گا۔ چوبیس گھنٹے میں ہم اس کا جوڈیشل ریمانڈ لینے کے پابند ہیں۔ آپ مجھ پر بھروسا کر سکتے ہیں کہ تفتیش اور چالان مکمل ہونے تک دلاور کی شناسی کا ذمے دار میں ہوں۔ وہ میری تحویل میں ہے اور بہت جلد میں پریس کانفرنس میں آپ کو سب بتا دوں گا۔ جو کچھ میں معلوم کر سکا۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ خود یا اس کے وکیل بھی بہت کچھ بتائیں گے آپ کو۔ جیسے ہی وہ اس قابل ہوا۔ فی الحال آپ کے لئے میرے پاس اس خبر کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ڈاکٹر شبلی کے مفرور قاتل چوہدری دلاور کو

گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ابتدائی اندازہ میں لکھ سکتے ہیں اخبار والے اسے اگر چاہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اس کے بعد کی کارروائی بہت مختصر رہی۔ غازی کے ساتھ آنے والے فوٹو گرافر نے چوہدری دلاور کی تصاویر بنائیں۔ وہ آج ہی اس شرط پر تھے کہ اب یہ خبر ان کی ایکس کلیو سو اسٹوری ہوگی یعنی وہ خبر جو کسی اور کے پاس نہیں ہوگی۔ غازی اس کے لئے بالکل تیار تھا۔ وہ آخری کاپی روک آیا تھا اور اب اسے واپس جانے کی جلدی تھی جب ایس ایس پی کے حکم پر چوہدری دلاور کو ہتھکڑی لگائی گئی تو میرے وجود میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہ وہ لمحہ تھا جس کا خواب میری آنکھیں نہ جانے کب سے دیکھ رہی تھیں مگر اسے تعبیر آج میسر آئی تھی۔ یہی کیفیت رابعہ منظر اور محسن کے دلی جذبات کی تھی۔ ان کے چہرے ایک بہت بڑی کامیابی کی خوشی سے کھلے ہوئے تھے۔

موقع پاتے ہی میں نے رابعہ کے کان میں کہا "مبارک ہو خدا نے یہ دن بھی دکھایا۔"

وہ مسکرائی۔ تاہم یہی بات اس کے دوسرے کان میں محسن نے کہی۔

میں نے کہا "اس تقریب سعید پر یہ مسکراہٹ کا تقاضا ظاہر کرتا ہے کہ اب تم خفا نہیں ہو۔"

"ہم معافی مانگ رہے ہو تو جاؤ معاف کیا۔"

پولیس نے دلاور کے ساتھ ایک خطرناک مجرم کا سلوک کیا تھا۔ ایمبولینس میں بھی اس کے ساتھ دو مسلح گارڈ بٹھائے گئے اور آگے پیچھے پولیس کی گاڑیاں اس کے ساتھ ہی روانہ ہوئیں۔ اگلی گاڑی میں خود جاوید صدیقی تھا اور ہم سے بدگمان ہونے کے باوجود وہ اس کامیابی پر خوش تھا کہ اسے جس مشن پر اسلام آباد سے بھیجا گیا تھا وہ پورا ہوا۔ اس کے پیش رو کے حصے میں صرف شرمندگی رسوائی اور بے طرفی آئی تھی۔

"راستے میں آنکھیں کھلی رکھنا۔" اس نے اسکواڈ کو کہا "کوئی بھی بیچ میں آنے کی کوشش کرے یا حملہ کرکے قیدی کو چھڑانا چاہے تو اسے فوراً گولی مار دو۔ سب الرٹ رہیں اوکے۔"

اس نے ہاتھ ہلایا اور چوہدری دلاور کو ایک قاتل کی حیثیت سے وہی پولیس سخت ترین حفاظتی انتظامات کے ساتھ لے گئی۔ جن کو وہ اپنے زرخرید نمک خوار اور وفادار ذاتی ملازم سمجھتا تھا۔ یہ اس کے غرور کی شکست اور قانون کی بالادستی کی پہلی فتح تھی کہ شکاری خود زیر دام آ گیا تھا اور اس کے لئے کسی طلسم دام کو توڑنا ناممکن ثابت ہوا تھا۔ اس کی دولت اور طاقت کا نشہ اتر گیا تھا اور اب وہ ایک تصویر عبرت تھا جس کا عنوان صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

انیس احمد اپنے دروازے پر بھاگا بھاگا کھڑا ہوا تھا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ جن کو وہ بلیک میلر چوہدری کو اور دہشت گرد سمجھنے

پر مجبور تھا وہ اتنے معتبر اور معتبر ہیں کہ خود پولیس کا ایس ایس پی ان سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو رہا تھا۔ مجھے اور محسن کو خوش ہوتا دیکھ کے بھی اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا ہوگا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو کچھ ہوا تھا اس کا وہ عینی شاہد تھا اور اب جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کے برعکس تھا۔ وہ الجھ رہا تھا کہ ہم بالکل بے فکری سے ہنس رہے ہیں اور ایک بہت حسین لڑکی میرے ساتھ ہے۔ پھٹ پھٹ کرتی موٹر سائیکل پر غازی اور اس کے ساتھ آنے والا فوٹوگرافر دونوں ہی کارٹون لگتے تھے مگر انیس نے باتوں سے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ پریس کے نمائندے تھے۔ انہوں نے بھی ہم سے ہاتھ ملایا اور جاتے جاتے یہ آواز بلند اعلان کیا "دیکھنا کیا دھماکا خیز سرخی جماتا ہوں میں۔ صبح صبح سارے شہر کے لئے ایک دھماکا ہوگا۔"

منظر نے کہا "بھوتنی کے۔ تصویریں بھی اتاری ہیں نا! فلم بھی کیمرے میں؟"

غازی اس انداز تخاطب پر ذرا جھوم سا گیا پھر اس نے قہقہہ مارا اور بولا "بے بھوت۔ چند گھنٹے کی بات ہے اخبار بے فکر ہو رہے آئے گا مگر پہلے صفحے پر باکس میں ہوں گی تصویریں۔ گرفتاری سے پہلے گرفتاری کے بعد۔ خود دیکھ لینا۔ میرے پاس پرانی تصویر بھی ہے اس کی۔ جس میں وہ واقعی ہیرو نظر آتا ہے۔ اب تو نجانے کی بلی ہو گیا ہے۔"

منظر نے ہو ہو ہو کرکے ہنسنا شروع کیا اور غازی کے ایک دھپ رسید کرنے کی کوشش کی مگر وہ موٹر سائیکل کو بھگا کر لے گیا۔ موٹر سائیکل کی چال بالکل لنگڑے جیسی تھی۔

محسن کو منظر نے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ مولوی غلام حسین رابعہ کی گاڑی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ منظر نے اسے آواز دی "مولوی صاحب ادھر آ جائیے۔ ہم سے خفا ہو گئے۔"

"نہیں جی۔ مجھے تو معاف ہی رکھیں آپ دونوں۔"

"ابے بھوتنی کے۔ کیوں کباب میں ہڈی بن رہا ہے۔" منظر نے اسے ڈانٹا "داڑھی اتنی بڑی ہو گئی عقل پھر بھی نہیں آئی۔"

"یہ بھوتنی کا کس کو کہا ہے آپ نے جی!"

"بس جی کے بچے۔ تیرے جیسا مولوی میں اگر ایسے ہی آ جاتا کوئی بکرا۔ جنگلوں میں سے۔ خیر تمہارے مقابلے میں تو بیوی اس کو رنج پہنچی۔"

منظر مجھے اور رابعہ کو تھوڑا سا تخلیہ فراہم کرنا چاہتا تھا مگر اس کے بعد غلام حسین کے اس کی گاڑی میں بیٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا "جی کس قدر بدزبان ہے جی اس شخص کی۔ اور اس کے دماغ میں فحاشی اور بے حیائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ معلوم نہیں آپ لوگ اسے کیسے برداشت کر لیتے ہیں جی۔ خدا کسی دن یہ گند بھی مسترد ہو جائے گا مجھ سے۔"

میں نے کہا "کون سا گند؟" اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

"نہیں جی۔ سولہ بچوں کی فیس کا خیال آ جاتا ہے۔ ایک دو کی

www.paksociety.com

بات نہیں ہے۔" وہ بولا "میدان حشر میں اتنی بڑی پلٹن سے جان چھڑانا مشکل ہوگا۔"

رابعہ ہنسی "ابھی گناہ تو ایک ہی ہے۔"

"مولوی۔ آپ بھی کمال کی بات کرتی ہو۔ یہ تو سیدھا سادا حساب کا سوال ہے۔ ایک کے مقابلے میں سولہ گنا بار ہوگا۔ اور جو ہوتیں ان کی چار بیویاں اور پھر لسنے بچے تو۔"

"مولوی خادم حسین تم دیکھتے جاؤ۔ یہ کام ہم کر کے دکھائیں گے انشاء اللہ۔ کوئی شرعی قباحت تو نہیں ہے نا اس میں؟"

"آپ کے لئے نہیں ہے جی۔" وہ دانت نکالنے لگا۔

رابعہ نے اسے گھورا "ان کو خصوصی اجازت نامہ دے رہے ہو۔"

"وہ بھی چار میں انصاف کی شرط اپنے سکندر صاحب ہی پوری کر سکتے ہیں۔ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔"

"اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تم نے منہ پر کلمۂ حق کہہ دیا۔"

رابعہ نے جل کے کہا "یہ کارِ خیر تم ہی کرو خادم حسین۔ ابھی سے تلاش کر کے رکھو باقی تین بھی۔"

میں نے زور سے کہا "بات چار کی ہو رہی ہے۔ تین کی نہیں۔ ابھی تو ایک بھی نہیں کی ہم نے۔ زیر غور ہے ایک نام لیکن ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔ ابھی تک تو تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوتی آئی ہے وہ سنار ٹی سے۔"

"سمجھو وہ فیل ہو گئی۔" رابعہ بگڑنے لگی۔

"بھئی مولوی خادم حسین۔ آدمی کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ ایک سے ایک چیز پیدا کی ہے اللہ نے۔ پھر آدمی خوب سے خوب تر کی تلاش کیوں نہ کرے۔ اب اپنے ایمان سے کہو۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ عقد ثانی تمہارا ہو جائے نیلو سے۔"

"نیلو سے؟" وہ سوچ میں پڑ گیا "محترمہ تو کرسچن ہے جی۔"

"چلو چھوڑو اسے۔ زیبا کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"سبحان اللہ۔ کیا رخ زیبا عطا کیا ہے اسے خدا نے۔ مگر وہ مجھ سے کیوں عقد ثانی کرنا چاہے گی جی۔"

"بھئی مایوسی کفر ہے۔ اللہ مسبب الاسباب ہے اور پتھر دل محبوب کے لئے خصوصی وظیفہ ہے میرے پاس۔ بڑا آزمودہ۔"

"اچھا جی؟" خادم حسین چوکنا ہو گیا "ایک عمل مجھے بھی بتایا تھا ایک بڑے پہنچے ہوئے پیر صاحب نے۔ مسرت نذیر پر آزمایا تھا۔"

رابعہ ہنس پڑی "مولوی۔ کچھ شرم کرو۔ تمہاری بیوی کو بتاؤں گی میں یہ ساری باتیں۔"

"بیبا غضب مت کرنا جی۔ آج ہی بڑا کہرام مچایا اس نیک بخت نے حالانکہ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ خود ہی تعریف کر رہی تھی۔ علم تجے والی دیکھ کے آئی تھی۔ میں نے کہہ دیا کہ مسرت نذیر تو آتش فشاں ہے حسن و شباب کا۔ تو جل کر بولی کہ اچھا میں؟ میں نے جھوٹ نہیں بولا تو کیا غلطی کی؟ میں نے کہا کہ پہاڑ تو تم بھی ہو۔ سنگ خارا کا۔ پہلے خوش ہوئی۔ جب میں نے بتایا کہ سنگ خارا بہت سخت پتھر ہوتا ہے سیاہ رنگ کا۔ تو پھر غصے میں جو تا اٹھا لیا مجھ پر بیلن لے کر۔ پراٹھے پکا رہی تھی سوئی بھرے۔ اللہ معاف کرے اسے۔ جو منہ میں آیا بکا اپنے مجازی خدا کو۔ یہ بھی کہا کہ جاؤ اسی حسن کے آتش فشاں میں۔ نہیں تو کسی تنور میں جا کر مرو۔ بس جی میں تو جان بچا کے بھاگ آیا۔ ایک بیلن پھر بھی اس نے مار ہی دیا۔ ادھر شانے پہ۔ اور ایک بعد میں پھینک کے مارا تو یہاں لگا ٹخنے کے ذرا نیچے ہے۔ آپ مجھے .... بتا دیں اب سکندر صاحب۔ کچھ کام اس عمل نے کیا ہے۔ ہاں اللہ کو منظور ہوا تو یہ وظیفہ کرے گا۔ آپ کہہ رہے تھے کہ آزمودہ ہے۔"

جب میں نے وقار یوسف کے گھر کے سامنے گاڑی روکی تو رابعہ کا بھی ہنس ہنس کے برا حال تھا اور خود میں ہنسی ضبط کرنے میں ناکام تھا لیکن مولوی خادم حسین کی سنجیدگی میں فرق نہیں آیا تھا۔

اس وقت تین بجے تھے۔ صرف وقار یوسف تھا جو سب فکروں سے بے نیاز سو رہا تھا۔ گل کے ساتھ نگی جاگ رہی تھی اور وہ دونوں بوبی کے پاس سر جوڑے خاصی سنجیدہ بلکہ تشویش میں مبتلا نظر آتی تھیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے غالب اور مارگریٹ کا عقد ہی سب سے سنگین اور سنسنی خیز مسئلہ تھا اور جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ اس کے شرعی قانونی اور اخلاقی پہلو کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

نگی نے سب سے پہلے پوچھا "کیا ہوا؟"

منظر بولا "ابھی نہیں ہوا۔ چار ماہ باقی ہیں۔ ویسے لڑکا ہوگا یا لڑکی۔"

"تم سے کس نے پوچھا تھا۔" نگی نے کہا۔

میں نے اس کی تائید کی "ہاں بھئی تم پوچھتی ہو نگی سے کہ کیا ہونا چاہئے۔"

"وہ بھوتنی کا کہاں ہے۔" منظر قہقہہ مار کے بولا "سو رہا ہے؟ اس کی تو ایسی کی تیسی۔ ابے اٹھ۔" منظر نے اسے ٹانگ پکڑ کے کھینچ لیا۔

وقار یوسف ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا "کیا۔ کیا ہوا۔"

"ہوا یہ بھی وہی پوچھ رہا ہے۔ ابے پھر کیا تا ہے۔ تو بتا کہ کیوں نہیں ہوا اب تک۔ جھک مار رہے ہو کب سے سالے۔ مولوی خادم حسین کی طرح۔ یہ بھوتنی کا بھی اندھیرے میں تیر چلا رہا ہے کوئی جا رہا ہے زیبا کی طرف کوئی کیک والی کی طرف....."

"منظر صاحب۔ آپ ذرا زبان کو لگام دیں۔" خادم حسین بولا۔

"ابے میں زبان کی بات نہیں کر رہا تھا۔ سولہ بچے زبانی جمع خرچ سے پیدا نہیں کئے ہیں۔ چل جا کے پانی لا میرے لئے۔"

"کتنا چلو بھر۔ کیا ڈوب مرنے کا خیال ہے؟"

"ارے کمبخت کے مریں میرے دشمن کسی گٹر میں۔ بھوتنی کے پانی پلانا کار ثواب ہے پھر ایک وظیفہ میں بھی سکھا دوں گا تجھے۔ رو تو بڑی ہیں مگر چوکا بھی لگ جائے تو کچھ بعید نہیں۔ گھر بھر جائے گا بچوں سے۔"

"جی تو چاہتا ہے کہ زہر دے دوں پانی میں ملا کے۔ آپ کی زبان کس قدر حیا سوز۔ اور آپ کا اخلاق کتنا گرا ہوا ہے۔ یعنی خواتین کی موجودگی میں بھی آپ ایسی بازاری گفتگو کرتے ہیں جی۔"

منظر نے اس کی نقل اتاری "بازاری گفتگو کرتے ہیں جی۔ ابے چل الو کے پٹھے۔ ہم نے بہت دیکھے ہیں تیرے جیسے شرفاء۔ ہمت نہیں ہے ورنہ بیٹھ جائیں گوشت کیک والی کی گود میں۔ ابھی تو بس خوابوں پہ گزارا ہے۔"

وہ بھڑک اٹھا "گالی گلوچ پر اتر آئے ہیں آپ اور صرف آپ کی وجہ سے بلڈ پریشر بڑھتا جا رہا ہے میرا۔"

"بیٹے ہارٹ فیل بھی میری وجہ سے ہی ہوگا تمہارا۔"

اس وقت وقار یوسف کے گھر میں دو محاذ کھلے ہوئے تھے۔ دوسرے محاذ پر گل اور محسن کی جنگ جاری تھی۔ نگی بھی وقار یوسف کو ڈانٹ رہی تھی کہ کیا بے وقت گھوڑے بیچ کر سوتے رہتے ہیں۔ سب جاگ رہے ہیں اتنا شور ہو رہا ہے اور جناب کو فکر ہی نہیں کسی بات کی۔

"اونچی نیند بے فکری سے ہی آتی ہے باقی سب تو پاگل ہیں۔" وہ پھر لمبی تان کر سو گیا۔

"وقار۔ تمہیں پتا ہے آج کیا ہوا۔" گل چائے بنانے میں مصروف تھی۔

"جو بھی ہوا۔ صبح بتانا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔" وقار بولا۔

"میں یہ کھولتا ہوا پانی ڈال دوں گی سر پہ۔ غالب واپس آ گیا اور چوہدری والا دھر پکڑا گیا۔"

"چلو بہت اچھا ہوا۔ اب مجھے سونے دو۔"

"اور غالب کی شادی بھی ہو گئی ہے۔ ایک کرسچن لڑکی سے۔"

"ہاں میں بھی کرلوں گا۔ اتنی جلدی کیا ہے۔" وقار بولا اور پھر اٹھ کے سب کے درمیان آ بیٹھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب گل سچ مچ اس پہ چائے کا پانی ڈال دے گی۔

میں نے دوسرے کمرے میں جا کے دیکھ لیا تھا۔ غالب سو رہا تھا اور مارگریٹ ایک کرسی پہ گم صم بیٹھی تھی۔

"تم کیوں اکیلی بیٹھی ہو۔" میں نے کہا۔

"غالب سو رہا ہے نا۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ وہاں بیٹھ کے غالب کی حفاظت کر رہی ہے۔ کسی ماں کی طرح جسے فکر ہو کہ وہ اٹھی تو بچہ جاگ جائے گا۔

میں نے کہا "اسے سونے دو۔ اب وہ اپنے گھر میں ہے۔ وہ تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گا۔"

"ڈر تو مجھے لگ رہا ہے۔ مجھے نہیں آنا چاہئے تھا یہاں۔"

میں نے کہا "تمہیں آنا ہی چاہئے تھا یہاں۔ جب تم یہاں رہو گی تو خود تمہیں احساس ہو جائے گا اس بات کا۔ آؤ میں تم کو دوسرے لوگوں سے ملواؤں۔"

وہ تامل اور تذبذب میں مبتلا ہو گئی "مجھے۔ اکیلا رہنے دو۔ مجھے شرم آتی ہے ان سب کے سامنے جاتے ہوئے۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔"

میں ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ گل اور محسن کے روٹھنے منانے کا ڈراما ختم ہو گیا۔ خادم حسین اور منظر جیسے بھی چپ تھے۔ خادم حسین کی خاموشی میں احتجاج کا انداز تھا جب کہ منظر شاید اس سے پھر پنگا لینے کے لئے نیا بہانہ سوچ رہا تھا۔ صرف رابعہ اور وقار چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے اور وقار کی دلچسپی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ رابعہ کی زبانی خادم کی گرفتاری کا قصہ سن رہا ہے۔ نگی نے چائے دم ہونے کے لئے رکھ دی تھی اور اب ہر ایک کی پسند کے مطابق کپ میں چینی ڈال رہی تھی۔

میں نے انگریزی میں کہا "لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ یہ مارگریٹ ہے۔"

خواتین کی نظروں میں تجسس سے زیادہ ناپسندیدگی کے جذبات تھے اور ایک سوالیہ نشان تھا کہ اچھا ہے تو پھر؟ ہم کیا کریں؟

میں نے کہا "یہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اس نے غالب کا بہت خیال رکھا۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ میں سے کوئی رکھتا۔ یہ اردو سمجھتی ہے لیکن روانی سے بول نہیں سکتی۔"

مارگریٹ ایک صوفے پر ٹک گئی "وہ۔ جھوٹ بولا تھا میں نے۔ میں اردو اسی طرح بولتی ہوں جیسے سب بولتے ہیں۔"

میں نے کہا "خیر کوئی بات نہیں بلکہ یہ تو بہت اچھی بات ہے مارگریٹ۔ ان لوگوں سے ملو۔ یہ چائے بنانے والی خادمہ ٹائپ لڑکی دراصل اس عظیم الشان گھر اور اس مظلوم شخص دونوں کی مالک ہے۔"

"بھائی سکندر۔ میں نمک ڈال دوں گی آپ کی چائے میں۔"

"ضرور ڈالو۔ میں وہ چائے وقار کو دے دوں گا ایسی چالاکی سے کہ اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔" میں نے کہا "اور وہ اف تک نہیں کرے گا۔ مسکراتے ہوئے پی جائے گا۔ بڑا فرمانبردار شوہر ہے اور مارگریٹ۔ وقار یوسف ایک زبردست وکیل ہے جس کی زبان اور وکالت عدالت میں خوب چلتی ہے گھر کے سوا.... خیر چھوڑو یہ دردناک قصہ۔ یہ محسن ہے پہلے میرا دوست تھا اب یہ بھی صرف شوہر ہے۔ روایتی قسم کا بزدل اور بیوی سے ڈرنے والا۔ بیوی کو جھوٹ اور خوشامد سے خوش رکھنا جانتا ہے۔ اس کی بیوی توبہ توبہ۔ ذرا سی بات پر کوئی مارتا تو اس کے بائیں ہاتھ کا تھپڑ ہے اور گولہ

OLG

www.paksociety.com

ایک مشنری اسکول میں پڑھا جہاں اسے وظیفے کے نام پر خیرات ملتی تھی۔ اس کی ایک بڑی بہن تھی جو ہیروئن بننے کے لئے لاہور بھاگ گئی تھی۔ ایکسٹرا سپلائی کرنے والے ایک شخص نے اسے سبز باغ دکھائے اور کہا کہ وہ بھی نیلو بن سکتی ہے بلکہ ایک وقت آئے گا جب نیلو کا چراغ نہیں جلے گا اس کے سامنے۔ اس چکر میں وہ کہاں کہاں گئی۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ انجام وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ تاہم اس نے اپنے گھر والوں کو اور جاننے والوں کو کبھی حقیقت نہیں بتائی اور ہمیشہ یہی کہا کہ وہ عیش کر رہی ہے۔ اس کی باتوں سے گمراہ ہو کے مارگریٹ بھی گھر سے نکلی۔ اسے اپنے ساتھ لے جانے والا ایک لڑکا تھا جو چرچ میں آرگن بجاتا تھا۔ وہ میوزک ڈائریکٹر بننا چاہتا تھا اور اسے ایک حسین سہارے کی ضرورت تھی۔ جب اسے سہارے کی ضرورت نہیں رہی تو اس نے مارگریٹ کو بے سہارا چھوڑ دیا اور وہ ادھر سے ادھر بھٹکتی رہی۔ سو روپے کے نوٹ کے پیچھے بھاگتی رہی یہاں تک کہ ایک دن وزیر خان اسپتال پہنچ گئی جہاں اسے ایک ٹھکانا مل گیا۔ رہنے کے لئے جگہ اور تین سو روپے ماہانہ۔ دن میں کام رات کی چھٹی۔ تنخواہ اس کی تین دن کی کمائی کے برابر تھی۔ اس کا معمول وہی رہا مگر وہ سوں کی نظر میں معتبر ہو گئی۔ نرس کو لوگ بڑے احترام سے سسٹر کہتے ہیں۔ اس پیشے اور اس نام کی تقدیس کو اس نے جتنا رسوا کیا شاید کسی اور نے نہیں کیا ہوگا۔ خدا اس کے سارے گناہ معاف کر دے گا مگر یہ گناہ ایسا نہیں جس کی معافی ہو۔

زار و قطار روتے ہوئے اس نے بتایا کہ کس طرح اس کو شوکت رانا نے دس ہزار کا لالچ دے کر یہی راز داری سے ایک کام کرنے کو کہا تھا۔ وہ کام تھا خود کو رضیہ بنا کے غالب کی بیوی ظاہر کرنا اور غالب کو یقین دلانا کہ ان کی شادی ہو چکی ہے۔ صرف زبانی نہیں۔ اسے عملاً غالب کی بیوی بن کے رہنا تھا۔ وہیں جہاں اسے تین سو روپے ماہانہ ملتے تھے۔ اسی کمرے میں اور اس نے یہ ذمے داری اس لئے قبول کر لی کہ یہ کام بہت معمولی تھا۔ ہر رات باہر جا کے کسی اجنبی کو شوہر بنانے اور صبح سو روپے لے کر لوٹنے سے یہ کہیں زیادہ آسان کام تھا۔ تاہم اپنی انتہائی کوشش کے باوجود وہ غالب کی بیوی نہ بن سکی۔ اس ڈر سے کہ کہیں شوکت رانا دس ہزار واپس نہ مانگ لے اس نے یہ جھوٹ بھی بولا کہ غالب واقعی اس کا شوہر بن گیا ہے اور وہ میاں بیوی کی حیثیت سے ہی رہتے ہیں۔

مارگریٹ نے سب کی ہمدردی حاصل کر لی تھی۔ اس کے سچ نے سب کا دل جیت لیا تھا۔ اس کی مظلومیت نے خواتین کو اس حد تک جذباتی کر دیا تھا کہ اس کے ساتھ وہ بھی رونے لگی تھیں۔ اب اس کے ایک طرف رابعہ بیٹھی ہوئی تھی اور دوسری طرف گل۔ گل بار بار اسے تسلی دیتی تھی اور پانی پلاتی تھی "مت رو میری بہن اب کچھ نہیں ہوگا۔" وہ بار بار کہہ رہی تھی۔

مانتا وائیں ہاتھ کا۔"

گل ہنسنے لگی "آپ کا تعارف میں کراؤں گی۔"

مظہر نے مولوی خادم حسین کے کندھے پر ہاتھ مارا جو بڑی دلچسپی سے میری بات سننے میں مگن تھا "اور اس کا سارا کچا چٹھا میں بیان کروں گا۔ بڑا حرامی ہے یہ۔ بیوی سے جوتے کھاتا ہے مگر پھر بھی باز نہیں آتا۔"

خادم حسین نے خلاف معمول برہمی کا اظہار نہیں کیا "آپ سے بڑا حرامی کون ہوگا مظہر صاحب۔ اب ہاتھ مارا تو آپ نے میرے کندھے پر تو میں آپ کو لات ماروں گا۔"

"ہاں گدھے کا بچہ دولتی ہی جھاڑے گا۔"

"بس یہ پھر آپ حد سے بڑھ گئے۔ والد صاحب تک جا رہے ہیں آپ؟ پھر میں نے کچھ کہا تو۔"

مظہر نے اسے چوم لیا "ارے مری جان۔ تم کچھ کہو تو سہی۔ جو بڑا اسے وہ کافر۔ ہم تو ویسے بھی گدھے کو باپ بنانے والے لوگ ہیں۔ ضرورت پڑنے پر۔ تمہیں اپنا باپ کر سکتے ہیں بلکہ الاعلان۔"

مارگریٹ ہنسنے لگی "سب بڑے دلچسپ لوگ ہیں۔"

میں نے کہا "یہ ڈھول جیسے پیٹ والا ہم سب سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ یہ سولہ بچوں کا باپ ہے۔"

"ساڑھے سولہ یار۔" مظہر نے چائے پیتے پیتے کہا۔

"اور اس کے باوجود تفکرات سے اتنی دور ہے۔ ہر وقت ہنستا رہتا ہے یا ہنساتا رہتا ہے۔ یہ یاروں کا ہی نہیں دشمنوں کا بھی یار ہے۔ اس کی بات کا کبھی کوئی برا نہیں مانتا۔ یہ ایک شریر اور معصوم بچہ ہے خود بھی۔"

مظہر ہنسنے لگا "بھوتنی کے اب میں بتاتا ہوں تیرے بارے میں۔"

میں نے جلدی سے کہا "مس مارگریٹ جانتی ہیں مجھے۔ میں سکندر ہوں اور یہ رابعہ ہے۔ چاند سورج کی جوڑی۔"

"مس مارگریٹ یا رضیہ۔" محسن نے طنز سے کہا "مسز غالب!"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا "نہیں۔ یہ نہ مسز غالب ہے اور نہ رضیہ۔"

اب مارگریٹ نے سر اٹھایا "سچ کہا ہے۔ یہ میں آپ کو بتاتی ہوں۔"

اور اس نے سچ بتا دیا۔ اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں چھپایا۔ وہ ایک بہت غریب اور رذیل سمجھے جانے والے ماں باپ کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ بھی کارپوریشن میں ملازم تھا اور ماں بھی۔ دونوں سیالکوٹ کی سڑکوں پر جھاڑو دیتے تھے۔ وہ محنت اور حق حلال کی روزی کماتے تھے۔ ہر اتوار کو باقاعدگی سے چرچ بھی جاتے تھے لیکن معاشرے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس نے

اسے غالب کے ساتھ ہونے والے سلوک کا بھی علم تھا۔ اس کا بڑے سائنٹیفک انداز میں برین واش کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر شاد نے اسے پہلے مختلف دوائیں دی تھیں اور اس کی مزاحمت ختم کرا دی تھی۔ وہاں اور بھی لوگ تھے جو غالب کو یہ یقین دلانے کی پوری کوشش کرتے رہے کہ وہ غالب نہیں فیروز ہے۔ ہم اس کے دوست نہیں دشمن ہیں اور وہ سب اس کے ہمدرد اور ساتھی ہیں۔ غالب پر تشدد بھی بہت ہوا۔ اس کو بجلی کے جھٹکے بھی دیئے گئے یہاں تک کہ وہ ذہنی طور پر بالکل ختم ہو گیا۔ انہوں نے نئے سرے سے اس کو اپنی مرضی کے مطابق فیروز کی شخصیت میں ڈھال دیا اور اس کے دماغ میں سے نرالی باغی شال کے نئی باتیں بھر دیں۔

صبح کا سورج نکل آیا تھا مگر سب اپنی اپنی جگہ دم بخود بیٹھے تھے۔ یہ دکھ بھری کہانی اختتام کو پہنچنے کے بعد بھی پُر اثر رہی۔ ابھی مارگریٹ وہی پرانی مارگریٹ تھی۔ غالب اب بھی غالب نہیں تھا اور سب سے زیادہ دکھی کرنے والی بات یہ تھی کہ کسی کو بھی نادر کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

ہم سب رات بھر کے جاگے ہوئے اور بہت تھکے ہوئے تھے مگر اتوار کی صبح کسی کو کام پر جانے کی فکر نہیں تھی۔ چھٹی والے دن سب دیر سے سو کے اٹھتے تھے مگر آج کسی کو سونا ہی نصیب نہیں ہوا تھا۔

آٹھ بجے میں نے بہتر سمجھا کہ تھوڑی دیر کے لئے ماحول اور موضوع بدل دیا جائے۔ میری تجویز کی تائید محسن نے کی اور وقار گاڑی لے کر ناشتے کے لئے پوری چھولے اور حلوہ لینے نکل گیا۔ میں نے زبردستی مارگریٹ کو نہا دھو کے کپڑے بدلنے کے لئے بھیجا اور خود بھی دوسرے باتھ روم میں گھس گیا۔ گل پھر چائے بنانے کے لئے برتن سمیٹنے لگی۔ مظہر کو بیوی بچوں کی یاد ستا رہی تھی۔ وہ ناشتے کے لئے بھی نہیں رکا اور وقار یوسف کے ساتھ ہی روانہ ہو گیا۔

ناشتے کی میز پر مارگریٹ کی حالت بہت بہتر تھی۔ وہ کچھ نروس اور مطمئن بھی نظر آ رہی تھی۔

اس نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا "غالب سو رہا ہے۔"

غالب نے بڑے ڈرامائی انداز میں انٹری دی "مجھے بھوک لگی ہے۔"

"فیروز" میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے اپنی جگہ بٹھا دیا "آؤ ہمارے ساتھ بیٹھو۔"

وہ ادھر ادھر نظریں گھماتا رہا پھر اس کی نظر مارگریٹ پر رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں وہی الجھن اور پریشانی تھی۔ ایک مستقل سوال کی کیفیت تھی اور بے یقینی تھی "نادر نادر کہاں ہے؟"

"میں ہوں نا یہاں۔" مارگریٹ بولی۔

غالب ایک دم مشتعل ہو کے اٹھا "سؤر کی بچی۔ حرام زادی' جھوٹ بکتی ہے تو۔ بتا رے مجھے نادر کہاں ہے ورنہ میں تجھے جان

سے مار ڈالوں گا۔" اس نے عالم وحشت میں مارگریٹ پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے روک لیا۔

میں نے کہا "یہ تم کیا کر رہے ہو فیروز۔"

اس نے مجھے دھکا دے کر گرا دیا "میں فیروز نہیں ہوں۔"

ناشتے کی میز پر بیٹھے ہوئے سب افراد کے چہرے غالب کی اس دیوانگی کے مظاہرے پر امید اور خوشی کی روشنی سے منور ہو گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا غالب اپنی شخصیت کی جانب لوٹ رہا تھا اور خلاف توقع اس کی ذہنی صحت کی بحالی کا یہ عمل بہت تیز تھا۔ شاید یہ ماحول کا اثر تھا۔

میں نے خود کو سنبھال کے کہا "تم کون ہو پھر؟"

اس نے کہا "میں؟ پتا نہیں۔ تم کیوں نہیں بتاتے مجھے؟"

میں نے کہا "تم غالب ہو۔"

رابعہ نے بھی کہا "ہاں تم غالب ہو۔ میں رابعہ ہوں۔"

"میں محسن اور یہ گل۔"

غالب نے سب کو دیکھا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں فون کے قریب تھا۔ ریسیور میں نے اٹھایا۔ ٹیلی فون رلا رد کی بیوی کا تھا۔ وہ رابعہ سے بات کرنا چاہتی تھی۔ میں نے ریسیور اس کی طرف بڑھا دیا۔

رابعہ نے کہا۔ ہیلو۔ پھر اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا "تم جھوٹ بول رہی ہو۔ وہ تو پولیس کی تحویل میں ہے اور شوکت رانا بھی۔ ان کے سوا کوئی نادر کے بارے میں نہیں جانتا۔"

اس کا ہاتھ کانپنے لگا اور ریسیور اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

دنیا کے حیرت انگیز فن تحریر شناسی کی مدد سے
دوسروں کی شخصیت کو کھلی کتاب کی طرح پڑھیں۔
تحریر شناسی سیکھنے کی نہایت ہی رہنما کتاب
تحریر اور شخصیت
قیمت ۱۲۰ روپے
ڈاک خرچ ۱۴ روپے
○ آپ کو بتائے گی کہ آپ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔
○ آپ کن صلاحیتوں کے مالک ہیں ○ تحریر کے ذریعے ... کی روشنی
ملنے کا پتہ مکتبہ ... پوسٹ بکس ... کراچی

میں نے پہلے رابعہ کو اور پھر ریسیور کو سنبھالا۔ رابعہ کو میں نے دایاں ہاتھ کمر کے گرد حمائل کرکے سہارا دیا اور بائیں ہاتھ سے ریسیور پکڑا۔ اس امید میں کہ شاید دوسری طرف دلاور کی بیوی اب بھی لائن پر ہو اور ہیلو ہیلو کررہی ہو مگر ریسیور میں ڈائل ٹون کی سائیں سائیں آواز کے سوا کچھ نہیں تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنی بات کہتے ہی اس نے فون بند کردیا تھا۔ وہ ہوشیار عورت تھی۔ اسے علم ہوگا کہ لمبی بات کرنے سے کال کرنے والے کا پتا چلایا جاسکتا ہے۔

رابعہ نے خود کو میری بانہوں کی گرفت سے آزاد کیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے سہمی ہوئی ویران آنکھوں سے مجھے دیکھا

میں نے ریسیور کو احتیاط سے کریڈل پر رکھ دیا "میری رائے تو یہ ہے کہ ہر عورت جھوٹ بولتی ہے۔"

بگی نے فوراً احتجاج کیا "اپنے الفاظ فوراً واپس لیں۔"

میں نے کہا "میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہر عورت ہر وقت اور ہر جگہ صرف جھوٹ بولتی ہے۔ سچ بھی نکل جاتا ہے بعض اوقات منہ سے اور کبھی مجبوراً سچ بولنا پڑتا ہے۔"

اب گل چراغ پا ہوگئی "اور اگر میں کہوں کہ عورتوں سے زیادہ یہ بات مردوں کے لئے سچ ہے۔"

محسن بولا "تو ہم اسے بھی ایک جھوٹ سمجھ کے مسکراتے

"یہ۔۔۔ یہ عورت جھوٹ بولتی ہے۔"

ہوئے نظرانداز کردیں گے۔ سچ سن کر چراغ پا نہیں ہوں گے تمہاری طرح۔"

وقار نے کہا "یار حد ہوگئی۔ رابعہ کی بات کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ یہ کون عورت تھی اور اس نے کیا جھوٹ بولا تھا۔"

میں نے کہا "یہ دلاور کی بیوی تھی جو صرف جھوٹ بولتی ہے اس لئے پوچھنے اور پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بات تو رابعہ بھی جانتی ہے۔"

میرا مقصد صرف یہ تھا کہ پہلے رابعہ کے دل سے اس خوف کو دور کروں جو اس کی صورت پر نقش ہو کے رہ گیا تھا اور اسے ایک نفسیاتی سہارا فراہم کرنے کے بعد کوئی سوال کروں۔

رابعہ نے سر ہلا کے مجھے دیکھا "میں بلاوجہ ہی گھبرا گئی تھی۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "اب کیا فرما رہی تھیں مسز دلاور؟ وہ تو بھاڑ میں جھونکی جانے والی خشک لکڑی کی طرح تپ رہی ہوگی۔ تم نے اس کے گھر والے کو بڑے گھر پہنچا دیا ہے۔"

محسن نے کہا "اب اور کیا دھمکی دے سکتی ہے وہ اس کے سوا کہ نازو کی خیر مناؤ۔"

رابعہ نے اور میں نے ایک ساتھ محسن کی طرف دیکھا لیکن اب تنبیہ کا فائدہ نہیں تھا۔ غیر ارادی طور پر محسن کے لبوں پر نازو کا نام آگیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ اس بات کا غالب پر کیا اثر ہوگا جس کا ذہن پہلے ہی خیالات کی الجھنوں سے ماؤف تھا۔ اس کے ماضی و حال کے درمیان شکوک کی دھند تھی اور بے یقینی کے جالے تھے۔ خود اپنی نفی کرنے والے حقائق کا تضاد تھا اور جھوٹ کا کھوکھلا پن تھا۔

اب غالب کی نئی شخصیت کا مصنوعی خول بکھر رہا تھا۔ پرانے رشتے استوار ہوتے ہی اسے وہ سازگار ماحول میسر آگیا تھا جو اس کی خود اعتمادی کی بحالی میں معاون و مددگار تھا۔ اسے ایک اندھے کنوئیں کی گہرائی میں دھکیل دیا گیا تھا جہاں سے اس کا اپنی کوشش سے نکلنا محال تھا لیکن اب ہم سب نے اس کی دستگیری کے لئے ہاتھ بڑھا دیے تھے۔ حالات کے بدلتے ہی اس کے قدم روشنی کی جانب لے جانے والی سیڑھی پر جم رہے تھے اور اس کے ہاتھ یقین کے سہاروں کو تھام رہے تھے۔ اس کا اندازہ ہم نے صرف ایک رات میں رونما ہو جانے والی تبدیلی سے کرلیا تھا۔

غالب کی نظریں محسن پر جم گئیں "کس نے دھمکی دی ہے نازو کو۔ مجھے بتاؤ۔"

محسن نے مسکرا کے کہا "یار اتنا سیریس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں مذاق کررہا تھا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو مجھ سے۔ یہ۔۔۔ پھر یہ اتنی پریشان کیوں ہے۔" اس نے رابعہ کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا "یہ کون؟"

اس نے ذہن پر زور دیا "یہ۔۔۔ رابعہ۔ یہی نام بتایا تھا تم نے ابھی مجھے۔"

"کیا تم بھول گئے تھے؟" رابعہ مسکرا دی۔

غالب کے لبوں پر پہلی بار ایک حوصلہ افزا مسکراہٹ آئی "میں تو اپنا نام بھی بھول گیا تھا۔ یہ تو عجیب بات۔ ایسا ہوتا ہے کہیں۔ لیکن ابھی تم نے رانا صاحب کی بات کی تھی۔ اور دلاور کا ذکر بھی کیا تھا۔ بالکل ٹھیک کہا تھا تم نے۔ نازو کے بارے میں ان کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔"

"تم بھی نہیں؟" رابعہ بولی۔

غالب نے افسردگی سے انکار میں سر ہلایا "معلوم نہیں وہ مجھے ایسے چھوڑ کے کہاں غائب ہوگئی ہے۔ بغیر کچھ بتائے۔ الو کی پٹھی۔ کیا اسے نہیں معلوم کہ میں اکیلا رہ جاتا ہوں تو مجھے کتنا ڈر لگتا ہے۔"

"کس سے ڈر لگتا ہے؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا "پتا نہیں۔ ڈرنے کی کون سی بات ہے میرے لئے۔ وہ عورت ہے ڈرنا اسے چاہئے۔ جیسا بہت مکار اور سنگ دل ہوتا ہے۔ شوکت رانا جیسا ہے۔"

میں نے اسے تسلی دی "فکر مت کرو۔ نازو کو کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ اس کا محافظ ہے اور وہ خود بھی اپنی حفاظت کرنا جانتی ہے۔"

غالب مسکرانے لگا "وہ ایسی کی تیسی کردے گی شوکت رانا کی۔ ابھی رانا کو معلوم نہیں کہ نازو کیا چیز ہے۔ ہے تو بڑی نازک سی شاخ گل جیسی مگر وہ مچلے تو شعلہ ہے اور کڑکے تو بجلی ہے۔ پتا ہے اس کے ہاتھ کیسے چلتے ہیں۔ شوں شوں۔ بڑی کاٹ دار شمشیر آبدار۔ جو اس کی زد میں آگیا وہ گیا کام سے۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔"

ہم سب اسے دیکھتے رہے۔ وہ نازو کے بارے میں بتاتے ہوئے اتنا پرجوش اور جذباتی ہوگیا تھا کہ تصور میں نازو تھی مگر ہاتھ خود غالب کے چل رہے تھے۔ وہ بھول گیا تھا کہ ہم بھی وہاں ہیں۔ وہ نازو کی طرح پورے ایکشن سے دشمنوں کو گرا رہا تھا۔ پھر وہ ہنسنے لگا اور اپنی بے سری آواز میں گانے لگا۔ یہ محمد رفیع کا بہت پرانا اور بہت مشہور گانا تھا۔

موقع پاتے ہی میں نے رابعہ کو اشارہ کیا اور وہ چپکے سے کھسکنے ہی والی تھی کہ غالب نے لپک کے اس کا راستہ روک لیا "میں تم کو ایسے نہیں جانے دوں گا۔ پہلے بتاؤ نازو کی کیا بات تھی۔"

رابعہ ڈر گئی "نازو کی۔۔۔ کون سی بات؟"

غالب اسے گھورنے لگا "وہی جو تم فون پر کہہ رہی تھیں۔ کس سے بات کررہی تھیں۔ بتاؤ نہیں تو۔"

رابعہ ایک دم چیخ اٹھی "غالب۔۔۔۔"

میں تیزی سے آگے بڑھا کیونکہ مجھے غالب کی آنکھوں میں وحشت کے آثار نظر آگئے تھے اور اس کے ہاتھ رابعہ کی طرف بڑھنے لگے۔

"غالب یہ کیا کررہے ہو۔" میں نے درمیان میں آکے اسے پیچھے دھکیل دیا "ہوش میں آؤ۔"

وہ سہم گیا اور مست کے دیوار سے لگ گیا "مجھے۔۔۔ مت مارو۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں کسی سکندر کو نہیں جانتا رانا صاحب۔ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہے۔"

اچانک اس کی حالت میں رونما ہونے والی یہ تبدیلی بڑی ڈرامائی تھی۔ جیسے اچانک کیمرا زوم سے سینما کے پردے پر کوئی کردار اپنا روپ بدل لیتا ہے۔ فرشتہ صفت اور شریف صورت ڈاکٹر کے خدوخال مسخ ہو کے مکروہ اور شیطانی کردار والے مسٹر ہائیڈ میں ڈھل جائیں۔

غالب کی صورت پر جسمانی اذیت اور کرب کے آثار نظر آرہے تھے اور چند لمحے قبل جو غالب خوش و خرم تھا وہ اب سخت عذاب میں مبتلا نظر آتا تھا۔ میری ذرا سی سختی نے اس کی زخم خوردہ شخصیت کو پھر اسی جہنم میں دھکیل دیا تھا جس سے وہ پوری طرح نکلا بھی نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود کو شوکت رانا کے عقوبت خانے میں محسوس کررہا ہے جہاں غالب سے میرا پتا پوچھنے والے اس کے جسم کو تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ وہ کراہ رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔ خود کو بچا رہا تھا اور ایسے جھٹکے لے رہا تھا جیسے کوئی الیکٹرک شاک دے رہا ہو۔

اس کی حالت نے ہم سب کو ہی دکھی کردیا تھا۔ میں سخت پشیمان تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی کی۔ میں اسے پیار سے بھی تو روک سکتا تھا۔

مارگریٹ ایک دم آگے بڑھی اور اس نے غالب کو اپنے ساتھ چپٹا لیا "او ڈیئر۔ یہ کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ تم پھر ڈر گئے ہو بلاوجہ۔ دیکھو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اور کون ہے یہاں۔"

غالب نے اس کے بازوؤں میں سر چھپا لیا تھا "وہ۔۔۔ شوکت رانا۔۔۔"

"کدھر ہے شوکت رانا؟ دیکھو یہ سب دوست ہیں تمہارے۔ شوکت رانا یہاں کیسے آسکتا ہے۔"

"آسکتا ہے۔ وہ آسکتا ہے ہر جگہ۔۔۔۔"

"نہیں فیروز۔ یہ دوسری جگہ ہے۔ تم اپنے گھر میں ہو۔"

"اپنے گھر میں؟ یہ میرا گھر ہے؟ نہیں۔ یہ میرا گھر ہوتا تو نازو بھی یہاں ہوتی۔" اس نے سر اٹھا کے مارگریٹ کو دیکھا "تم کون ہو؟"

"تم۔۔۔ تم مجھے نہیں پہچانتے۔" مارگریٹ نے افسردگی سے کہا۔

"پہچانتا ہوں۔ تم۔ تم وہی ہو۔ تم خود کو نازو کہتی تھیں۔ جھوٹ بولتی تھیں مجھ سے۔ بدشکل چڑیل۔ اپنی صورت دیکھی ہے آئینے میں۔"

مارگریٹ رونے لگی "ایسا مت کہو فیروز۔"

غالب نے اسے دھکیل دیا "کون ہے فیروز۔ میں غالب ہوں۔ میرے سامنے آنسو بہانے کی ضرورت نہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں تم جیسی عورتوں کو۔ تم شوکت رانا کی زرخرید ہو۔ تم مارگریٹ ہو۔"

"ہاں۔ مگر میں نے تم کو اس سے بچایا تھا۔ یاد کرو۔"

غالب سوچنے لگا "تم نے بچایا تھا؟ اچھا۔ مجھے معاف کردو پلیز۔ میں نے تمہارا دل دکھایا۔ میں احسان فراموش اور کمینہ ہوں۔ میں بھول گیا تھا۔"

غالب کا موڈ اور اس کی ذہنی کیفیت ہر پل بدل رہی تھی۔ وہ گھر کا راستہ بھول جانے والا مسافر تھا۔ اب اسے واپسی کا راستہ یاد آیا تھا تو اس کے قدم بار بار بھٹک جاتے تھے۔ وہ بھٹک جاتا تھا لیکن پھر بہت جلد اپنے راستے پر لوٹ آتا تھا۔

مارگریٹ نے غالب کو کسی بچے کی طرح منایا جو ضد میں بگڑ کے سرکشی پر آمادہ ہو "اوکے اوکے۔۔۔ اب چلو میرے ساتھ۔"

وہ غالب کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ ایک نرس کی حیثیت سے وہ غالب کی دیکھ بھال کرتی رہی تھی اور اسے معلوم تھا کہ اس قسم کی کیفیت ہو تو کون سی دوا کارگر ہوگی۔ اس نے ہم سب کو وہیں

www.paksociety.com

بلاک دیا تھا۔

"بے چارہ" بگی نے سب سے پہلے رقت انگیز لہجے میں کہا "کیا حالت ہو گئی ہے اس کی۔ آخر کیا بنے گا اس کا۔"

"پاپا کچھ نہیں بنے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وقار بولا۔

"کیسے ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ ٹھیک ہو گا اور اسے پتا چلے گا کہ نازو کا کچھ پتا نہیں تو پھر اس کی حالت بگڑ جائے گی۔ ابھی تو اسے ہوش ہی نہیں ہے۔" بگی نے کہا۔

وقار بگڑ گیا "تم کسی اور کو بھی کوئی کام کی... بات کرنے کا موقع دو گی یا نہیں۔ تم ایسی کون سی ماہر نفسیات ہو کہ تمہاری ہر پیش گوئی تسلیم کر لی جائے۔ آخر ہم بھی کچھ کر رہے ہیں۔ سب مل کے۔"

گل نے سنجیدہ لہجے میں کہا "بگی ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔"

اب محسن کی باری تھی "بگی اور تم یا رابعہ۔ سب ہو ایک ہی ٹائپ کی جذباتی مخلوق۔ میں لحاظ کرتے ہوئے ناقص العقل نہیں کہتا۔ غالب کا مل جانا بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس کو ہم اپنے ساتھ رکھیں گے لیکن علاج ہو گا کسی ماہر نیورولوجسٹ کا اور ضرورت پڑی تو ہم اسے کسی بہترین نفسیاتی کلینک میں داخل کرا دیں گے۔"

"پاگل خانے میں؟" گل نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"وہاں تمہیں داخل کرائیں گے۔ جو نفسیاتی کلینک کو پاگل خانہ سمجھے اس کا ٹھکانہ وہیں ہونا چاہئے۔"

میں نے کہا "گل، نازو بھی مل جائے گی۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اور اب تو حالات پوری طرح ہمارے قابو میں ہیں۔ دلاور گرفتار ہو چکا ہے اور شوکت رانا بھی۔ صرف ڈاکٹر شاہ رہ گیا ہے۔"

"اور استاد پیڈرو؟" گل نے کہا۔

"اس سے بھی نمٹ لیں گے۔" میں نے کہا "جب بڑے بڑے شکاری زیر دام آ گئے ہیں تو پیڈرو جیسے چوزے کس شمار قطار میں ہیں۔"

"تم لوگ مارے جاؤ گے خوش فہمی میں" بگی نے منہ بچکا کے کہا "خطرناک صرف شیر چیتے اور بھیڑیے ہی نہیں ہوتے۔"

"سچ فرمایا آپ نے" وقار بولا "تم جیسی معصوم بھیڑیں زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔"

محسن بولا "بھیڑیں نہیں۔ اللہ کی گائے کہلانے والی مخلوق۔ قوم انہیں بے ضرر سمجھتا ہے اور وہ ٹکر مار کے گرا دیتی ہیں جیسے۔"

میں نے کہا "رابعہ، یہ تو انہیں میں طے کر لیں گے کہ کون زیادہ بے وقوف ہے اور کون زیادہ خطرناک۔ تم بتاؤ کہ فون پر دلاور کی بیوی نے کیا کہا تھا۔"

"وہ بہت بکواس کر رہی تھی۔"

"گالیاں دے رہی ہو گی تمہیں۔ کوئی بات نہیں۔ اس کا حق بنتا ہے۔ آخر تم نے اس کے عظیم شکاری شوہر کو شکار کر کے اسے زبردست شکست کی ذلت سے دوچار کیا ہے۔"

"یہ بات نہیں۔" رابعہ نے ہونٹوں پر زبان پھیری "وہ کہہ رہی تھی کہ نازو میرے پاس ہے۔"

"اگر ہے تو شرافت سے لوٹا دے ورنہ ہم خود اسے لے جائیں گے۔"

"وہ... اس نے کہا کہ نازو مل جائے گی تمہیں۔ ابھی کچھ دن میں اس کی بس... اس کی لاش..." رابعہ کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "میں دہرا نہیں سکتی اس کے الفاظ۔"

"یہ کیا بے وقوفی ہے۔ تم جاہل عورتوں کی طرح رو رہی ہو۔" میں نے کہا "اس عورت کے یا کسی بھی بدخواہ کے کچھ کہنے سے نازو کو کیا ہو سکتا ہے؟ ایسے فون کر کے کوئی میرے یا تمہارے بارے میں ہو جائے گی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہو گا وہی جو خدا کو منظور ہو گا۔"

گل اور بگی کے چہرے بھی حزن و ملال کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑی کامیابی کی خوشی بھی اس لئے بے معنی ہو کے رہ گئی تھی کہ اکیلی نازو دشمنوں کے قبضے میں تھی اور ہم سب اسے انتقامی ردعمل کے عذاب سے نہیں بچا سکتے تھے۔ چوہدری دلاور جب تک ہماری قید میں تھا اس کا نازو سے تبادلہ ہمارے اختیار کی بات تھی مگر اب ہم خود اسے قانون کی تحویل میں دے چکے تھے اور اس کے ساتھ ہی شوکت رانا بھی پکڑا گیا تھا۔ اب ان کی رہائی صرف عدالت کے حکم سے ضمانت پر ہو سکتی تھی مگر اس کے لئے ضابطے کی کارروائی لازمی تھی۔ محاورے کے مطابق قانون اندھا ہوتا ہے اور اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ قانون امیر غریب یا اپنے پرائے میں تمیز نہیں کر سکتا مگر یہ کتابی بات عملی زندگی میں کچھ اور نظر آتی ہے۔ قانون کو اندھا کر دیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ قانون کی آنکھوں پر دھن دھونس یا دھاندلی کی پٹی باندھ دیتے ہیں۔ پھر قانون کی نظر حقائق کو نہیں دیکھ سکتی اور شہادت دستیاب ہو تو سیاہ کو سفید یا دن کو رات ثابت کر دیا جاتا ہے۔ شہادت حسب ضرورت اور استطاعت مل جاتی ہے۔ پیشہ ور گواہ ایک ہاتھ سے اپنی مخبری کی فیس وصول کرتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے مقدس کتاب تھام کے اور خدا کو حاضر و ناظر جان کے حلفیہ بیان دیتے ہیں کہ جسے قاتل سمجھ لیا گیا ہے وہ تو وقوعہ کی شب ان کے ساتھ محفل سماع کے روح پرور اجتماع میں موجود تھا۔ بجائے فلاں فلاں بھی تھے۔ آدھی رات کے وقت بیمار بچے کی دوا لینے کے لئے نکلنے والا آوارہ گردی کے الزام میں دھر لیا جاتا ہے اور آخرکار اصل قاتل کی حیثیت سے چشم دید گواہ اسے شناخت کر لیتے ہیں۔

ایسے اندھے قانون سے بہت زیادہ توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتی تھیں کہ وہاں جو کچھ ہو گا عین انصاف ہو گا۔ زیادہ امید یہی تھی کہ اب چوہدری دلاور کی بیوی شہر کے نامور ترین فوجداری

مقدمات کے وکیلوں کی خدمات حاصل کرے گی۔ ابھی ان کی ساری تگ و دو ضمانت پر رہائی کے لئے ہو گی۔ پیسہ پانی کی طرح بہانے والے ملک کی اعلیٰ ترین عدالت تک بھی جا سکتے ہیں لیکن ان کی کوشش ہو گی کہ سیشن کورٹ ہی ضمانت منظور کر لے۔ پھر سرکار کو اس فیصلے کے خلاف اپیل نہ کرنے دینا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ اور اگر ضمانت کی منسوخی کے لئے استغاثہ ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دے تب بھی ایڈووکیٹ جنرل سے یہ کہلوانا مشکل نہیں رہتا کہ ان حالات میں حکومت کو اعتراض نہیں اگر عدالت مطمئن ہونے کے بعد ملزم کی ضمانت کی توثیق کر دے۔ اعلیٰ عدالتوں سے ضمانت کی درخواست مسترد ہو جائے تو پھر سپریم کورٹ سے فیصلہ بدلوانا کسی کے بس کی بات نہیں رہتی۔

دلاور اینڈ کمپنی کو اب ہم سے نہیں قانون سے جنگ لڑنا تھی اور اس جنگ میں ان کے ساتھ ناانصافیوں کے سارے وسیلے تھے اور ضمانت پر رہائی کے بعد مہلت حاصل کرنے کے لامحدود ذرائع تھے۔ ایک ایک نکتے پر طویل بحث اور اعتراضات کرنے اور تاخیری حربوں سے ایک ہی عدالت میں سماعت کو برسوں تک کھینچ لے جانا کوئی مشکل کام نہیں تھا اور اپیل پر اپیل دائر کر کے کیس کو اتنا لمبا بھی کیا جا سکتا تھا کہ سزائے موت ہونے سے پہلے دلاور کی عمر بھی تمام ہو جائے اور سرکاری جلاد سے پہلے ہی فرشتہ اجل اس مقدمے کو داخل دفتر کر دے۔ اس طویل عرصے میں اور بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ حالات اور واقعات ثبوت یا گواہ سب بدل سکتے تھے۔

یہ سب جانتے ہوئے بھی میں ناامیدی کو کفر سمجھتا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ دلاور کے لئے فرار کے سب راستے بند کر دوں گا۔ اگر یہ جنگ وکیلوں کے درمیان ہو گی تو ادھر بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والے وکیل تھے۔ اس معاملے میں دیر کا امکان تھا۔ اندھیر کا نہیں۔

نازو کا معاملہ اس لئے مختلف تھا کہ اس میں قانون ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے قانون چوہدری دلاور کو بازیاب کرانے میں ناکام رہا تھا۔ ہم ابھی تک نازو کا سراغ نہیں پا سکے تھے۔ غالب کا مل جانا ایک اتفاق تھا۔ وہ ہمیں ایسی جگہ ملا تھا جہاں اس کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور وہ جس حال میں ملا تھا وہ سب کے سامنے تھا۔ ان حالات میں یہ بات یقینی تھی کہ نازو تک رسائی پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل ہو جائے گی۔ میں یہ بات کسی کے سامنے نہیں کہنا چاہتا تھا مگر یہ خیال میرے ذہن سے نکلتا نہیں تھا کہ شاید اب نازو کبھی نہ ملے یا ملے تو بس سپرد خاک کرنے کے لئے۔ مایوسی اور اشتعال کی انتہائی کیفیت میں دلاور کی بیوی وہی کر سکتی تھی جس کی اس نے فون پر رابعہ کو دھمکی دی تھی۔ اب ہمارے پاس سودا کرنے کے لئے کیا تھا۔ وہ ہمیں سزا دے سکتی تھی کہ تم بازی ہار گئے۔ تم نے نازو کی زندگی کو داؤ پر لگا کے اپنی ضد پوری کی۔ تم نے سودا کرنے کا موقع کھو دیا۔ اب تمہارے پاس مجھے دینے کے لئے کچھ نہیں مگر میرے پاس ایک چیز تھی۔ آج حساب برابر ہوا۔

جب رابعہ خاموش ہوئی تو ہم سب بھی خاموش بیٹھے تھے اور شاید وہی سوچ رہے تھے جو میں سوچ رہا تھا۔ مسئلہ صرف نازو کا ہی نہیں تھا۔ اصولی طور پر یہ محسن نے بھی طے کر لیا تھا کہ وہ گل اور بونی کو کسی محفوظ مقام پر شفٹ کر دے گا۔ خود ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ ہم سب کا وقار یوسف کے گھر میں اکٹھا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس میں خطرہ سب کے لئے تھا اور آسانی صرف ہم سب کے دشمنوں کے لئے۔ وہ ایک ہی ٹھکانے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے پھر کوئی ویسی ہی کارروائی کر سکتے تھے جیسی ایک رات میں نے اور محسن نے ناکام بنا دی تھی لیکن وہ اتفاق تھا کہ ہم جاگ رہے تھے اور ہم نے حملہ آوروں کو پہلے دیکھ لیا تھا۔ اگر ہم بھی سو رہے ہوتے تو پھر سوتے ہی رہ جاتے۔ ہمارے جسموں کے منتشر اجزا سمیٹنے والے صرف قیاس کی بنیاد پر بتاتے کہ اس حادثے میں ہلاک ہونے والوں میں غالباً تین مرد تھے اور تین خواتین۔ حادثے کا سبب یہ بتایا جاتا کہ گھر میں گیس کھلی رہ گئی تھی اور کھڑکی دروازے بند تھے چنانچہ گیس اندر ہی جمع ہوتی رہی۔ پھر شاید کسی نے غلطی سے سگریٹ جلائی یا کوئی الیکٹرک اسپارک ہوا اور نتیجے میں دھماکا۔

ایک بار اپنی کوشش میں ناکام ہو جانے والے دوسری بار بہتر منصوبہ بندی کے ساتھ کامیاب بھی ہو سکتے تھے۔ غالب کے آ جانے کے بعد اس جگہ سے منتقلی ناگزیر ہو گئی تھی۔

یہ سوال رابعہ نے کیا "کیا غالب یہیں رہے گا؟"

میں نے کہا "وقار اس کو انکساری میں غریب خانہ کہتا ہے لیکن یہ پاگل خانہ بن گیا ہے۔"

گل نے خفگی سے کہا "ابھی آپ نے کیا فرمایا تھا۔"

"وہ بھی صحیح تھا۔ پاگل غالب نہیں ہم سب ہیں۔" میں نے کہا "وقار پاگل ہے کہ اس نے ابھی تک ہمیں ہاتھ جوڑ کے یا کان پکڑ کے گھر سے نہیں نکالا کہ بھائی اور بہنو۔ اپنے ساتھ مجھے مت مرواؤ۔ جاؤ کہیں اور جا کے مرو۔"

اب بگی نے برا مانا "وقار کا دل اتنا چھوٹا نہیں ہے۔"

وقار نے کہا "میرا دل بہت چھوٹا ہے۔ اس میں صرف تم رہتی ہو۔ کسی اور کی گنجائش نہیں ہے۔"

"بات گھر کی ہو رہی ہے۔ دل کی نہیں۔"

"ویسے بھی سکندر کی بات غلط نہیں۔ تمہارے ابا جان مرحوم اکثر کہتے تھے کہ تم پاگل ہو۔ کسی کنگال وکیل سے شادی کر رہی ہو۔ اور میں تو خیر پاگل تھا ہی تمہارے لئے۔"

محسن ہنس پڑا "میں تو سچ مچ پاگل تھا۔ جیسے آج غالب ہے۔ میری حالت تو اس سے زیادہ خراب تھی۔ میں ایک مستند پاگل ہوں۔ گل کے بارے میں بھی میری وہی رائے ہے جو سکندر کی۔"

www.paksociety.com

جس طرح اس نے میرے جیسے شخص کو اپنا بنالیا۔ میں تو اسے پاگل پن ہی کہوں گا۔"

ظاہر ہے گل اس بات سے خوش ہوئی "کہتے رہو۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

میں نے کہا "فلادر کے نزدیک تو سب سے بڑا پاگل میں ہوں کہ حق اور انصاف کے چکر میں خود کو بھی تباہ کیا اور اسے بھی۔ لیکن یہ سب مذاق کی بات تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمیں الگ الگ رہنا چاہئے۔ اپنے ٹھکانے بدلتے رہنا چاہئے۔"

رابعہ نے میری تائید کی "رفتار یوسف کے گھر کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی یہ ضروری ہے۔ ورنہ ہمارے ساتھ یہ بھی مارے جائیں گے۔"

ہمیں کسی سے نہیں ڈرنا۔" گل نے اعلان کیا۔

رفتار نے آنکھیں نکال کے کہا "کیوں کفر بکتی ہو۔ خدا سے ڈرنا چاہئے تمہیں اور اس کے بعد اپنے مجازی خدا سے۔"

"تم سے میں کیوں ڈروں آخر؟"

"تم چوہے سے ڈرتی ہو۔ چھپکلی اور کاکروچ سے ڈرتی ہو۔ میک اپ کے بکھر جانے سے ڈرتی ہو۔ بڑھاپے کی ان علامات سے ڈرتی ہو جو ابھی سے نمودار ہو گئی ہیں۔ اور بتاؤں؟ تم چکر والے جھولے میں بیٹھنے سے ڈرتی ہو۔"

محسن نے مجھ سے کہا "غالب کہاں رہے گا؟"

"بڑا اچھا سوال کیا تم نے شیرانی صاحب۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ ایک جگہ تو ہو سکتی ہے سابقہ ٹرک کمپنی۔ لیکن میری نظر میں ایسی کوئی جگہ نہیں جو موزوں ہو۔ دیکھنا پڑے گا کہ اسے کس جگہ چھوڑا جائے۔"

رابعہ نے کہا "کیا یہ ضروری ہے کہ غالب کسی نفسیاتی اسپتال میں رہے؟"

میں نے کہا "تم نے بھی بڑا اچھا سوال کیا ہے عزیزہ۔ یہ واقعی ضروری نہیں۔ غالب کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اسے ہر وقت ڈاکٹر اور نرس کی توجہ درکار ہو۔ اگر اسے پرسکون ماحول میسر آجائے تو ہم سب بھی اس کی مدد کر سکتے ہیں لیکن سب سے بڑھ کر خود مارگریٹ اس کام میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔"

"جو کچھ میں کر سکتی ہوں۔ ضرور کروں گی۔" مارگریٹ کمرے میں واپس آگئی تھی۔

"ایک نرس بھی آدھی نہ سہی چوتھائی ڈاکٹر ضرور ہوتی ہے۔ اور تم کو غالب کا اعتماد بھی حاصل ہے۔ ساتھ تجربے کی بنا پر تم اس کی بہتر دیکھ بھال کر سکتی ہو۔"

"لیکن آپ سب کا ساتھ ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ لوگ ہی غالب کی اصل پہچان ہیں۔ آپ کے ساتھ اس کی یادوں کے پرانے حوالے منسوب ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات۔ غالب آپ سے بچھڑ گیا تھا۔ اب اسے واپس اسی راستے پر جانا ہے جہاں سے وہ جدا ہوا تھا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے پرانی نشانیاں نظر آئیں۔ محسوس ہوں۔ چہرے اور مقام پرانی باتیں اور واقعات کی یادیں۔ یہ سب اس کی مدد کریں گی اور اس کے ذہن کی الجھن دور ہوتی جائے گی۔ اس کا یقین بحال ہو جائے گا کہ وہ فیروز نہیں غالب ہے۔ ابھی اس نے مان تو لیا ہے کہ وہ غالب ہے۔ لیکن وہ غالب بنا نہیں ہے۔ اس کے لاشعور میں پھر غالب بننے کی آرزو بڑی شدید ہے۔ اسے شعور تک پہنچانا آپ سب کا کام ہے۔"

ہم اسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بظاہر عام قسم کی اور معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والی لڑکی بڑی دانائی کا مظاہرہ کر رہی تھی اور اس کی باتوں میں اتنی گہرائی تھی کہ ہم سب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

میں نے کہا "مارگریٹ۔ بعض اوقات بدبختی کے بطن سے خوش بختی جنم لیتی ہے اور جب راہ گم کردہ مسافر مایوسی کے اندھیرے میں بھٹک رہا ہوتا ہے تو اچانک کوئی دست غیب اس کی صحیح سمت میں راہنمائی کرتا ہے۔ ساتھ ہی اسے کوئی اتنا بڑا اور غیر متوقع انعام بخش دیتا ہے کہ اس کی تمام تکالیف اور آزمائشوں کی تلافی ہو جاتی ہے۔"

"ہاں، اسی دست غیب نے مجھے یہاں پہنچایا ہے۔ آخر کار۔"

میں نے کہا "میں تو غالب کی بات کر رہا تھا جس کو تم جیسا چارہ گر مل گیا۔ جو کام ڈاکٹر نہیں کر سکے وہ تم کر سکتی ہو۔ کیا تم یہ ذمے داری قبول کرو گی؟"

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا "میں؟"

محسن نے کہا "بے شک ہم تمہیں مجبور نہیں کر سکتے کہ تم اس کے ساتھ رہو اور چوبیس گھنٹے اس کی دیکھ بھال کرو۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہوگا۔ اگر تم جانا چاہو تو ہم تمہیں روک نہیں سکتے۔"

رابعہ نے کہا "ہاں انسان کی اپنی زندگی ہے لیکن تم غالب کے ساتھ رہنا چاہو تو یہ بڑی نیکی ہوگی۔ یہ تمہارا احسان ہوگا ہم پر۔"

گل نے کہا "اور ہم تمہیں منہ مانگا معاوضہ بھی دیں گے۔"

مارگریٹ کو گل کی بات نے رنجیدہ کر دیا "اگر معاوضے کی بات ہے تو پھر مجھے جانے دیں۔ ایک سے ایک اچھی نرس مل سکتی ہے آپ کو۔ پیسہ دے کر تو آپ چوبیس گھنٹے کسی سند یافتہ ڈاکٹر اور نرس کو بھی ملازم رکھ سکتے ہیں۔"

میں نے گل کو گھورا "گل کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

"ایک طرف آپ احسان کی بات کرتے ہیں۔ دوسری طرف معاوضے کی۔ کیا احسان کا بدلہ قیمت سے چکایا جاتا ہے؟"

محسن نے کہا "میں اس احمق لڑکی کا شوہر تم سے معافی مانگتا ہوں۔ اس کے الفاظ پر مت جاؤ۔"

گل نے بھی کہا "مجھے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ تمہاری تمام ضروریات کی ذمے داری ہم سب پر ہوگی۔ بالکل

www.paksociety.com

اسی طرح جیسے ہم ایک خاندان کے فرد ہیں تو سب کی ذمے داریاں بھی مشترک ہیں۔ خوشیاں اور غم بھی۔ جیسے ہم رہتے ہیں ویسے تم رہو گی۔ جو ہمارا ہے وہ تمہارا ہو گا۔ معاوضہ نہیں حق سمجھ کے تم سب کچھ مانگ سکتی ہو۔ بلکہ خود لے سکتی ہو۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "اس وضاحت سے تمہیں مطمئن ہو جانا چاہئے۔ اب صرف ایک بات اور ہے۔ وہ بھی صاف ہو جائے تو اچھا ہے۔ تم نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ ہم سب چودھری ولاور، شوکت رانا اور ڈاکٹر شاہ کے دشمنوں میں شامل ہیں۔ ان کے اور ہمارے درمیان عداوت کا یہ رشتہ بہت پرانا ہے اور اگر اس کے اسباب بیان کریں تو صبح سے شام ہو جائے گی مگر بات ختم نہیں ہو گی۔ مختصر یوں سمجھ لو کہ ہمارے درمیان حق و باطل کی جنگ ہے۔ اب تک تم دوسری طرف تھیں۔ اپنی مرضی سے نہ سہی مجبوراً سہی۔ ادھر تمہیں مشکلات کا سامنا ہو گا۔ خطرات بھی در پیش ہوں گے لیکن یہ زندگی تمہاری سابقہ زندگی سے بہت مختلف ہو گی۔ یہاں تمہیں عزت نفس احترام اور شرافت ملے گی۔ اپنائیت اور خلوص ملے گا اور بے غرض رشتوں کا تحفظ ملے گا۔ اگر تم میں ذہانت کے ساتھ جینے کی توانائی ابھی تک زندہ ہے اگر تم چاہتی ہو کہ اپنے مجبور ماضی کی تاریکی سے نکل کے آزادانہ ایک روشن مستقبل کی طرف بڑھو۔ اگر تم مایوسی اور پشیمانی کی دلدل کو چھوڑ کے ہم سب کی طرح امید اور توانائی اور خوشیوں کے خوب صورت سفر کا آغاز کرنا چاہتی ہو تو پھر ہم تمہارے ساتھ ہیں اور تم ہمارے ساتھ ہو۔"

وہ رونے لگی "کیا اب بھی یہ ممکن ہے۔ اب بھی ایسا ہو سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا مارگریٹ؟"

"نہیں، اب تو بہت دیر ہو گئی ہے۔ میں سر تا پا غلاظت میں لتھڑی ہوئی ہوں۔ میرا وجود مجسم تعفن اور کراہیت ہے۔ نفرت کے قابل ہے۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "ہم سب بھی تم جیسے ہی ہیں۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ کس کے اعمال کا گناہ بڑا ہے اور کون گناہ گار نظر آنے والا اس کی رحمت کا حق دار ہو گا۔ وہی نیت کا حال جانتا ہے چنانچہ توبہ کے دروازے آخری وقت تک کھلے رکھتا ہے۔ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"مگر کاش پہلے مجھے یہ موقع ملتا۔"

میں نے کہا "موقع تقدیر فراہم کرتی ہے۔ اس میں دیر ہو سکتی ہے مگر ممکن نہیں۔ آج تمہاری زندگی پھر ایک ایسے موڑ پر آ گئی ہے جہاں فیصلہ تمہارے اختیار میں ہے۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کس سے، شوکت رانا سے؟"

"نہیں، اپنے آپ سے۔ کہیں میں پھر غلط فیصلہ نہ کر لوں۔ ذرا پہلے بھی تو اپنی زندگی کو خود میں نے گزارا تھا۔"

"پہلے تم نے حالات کے جبر کے تحت فیصلے کئے تھے۔ آج تم پر کوئی دباؤ نہیں۔ سب تمہاری ہمت پر منحصر ہے۔"

"پتا نہیں مجھ میں اتنی ہمت ہے یا نہیں۔" وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔

میں نے کہا "آزما کے دیکھ لو۔ میرا خیال ہے کہ تم میں اس سے کہیں زیادہ حوصلہ ہے جتنا تم سمجھتی ہو اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ آدمی پہلا قدم اٹھاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ پھر ہر قدم کے ساتھ حوصلے اور اعتماد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اتنی تیزی سے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔"

"ہم۔ آپ سب لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔" اس نے رابعہ، گل، محسن، وقار اور نکی کو دیکھا۔

"ڈر کو دل سے نکال دو مارگریٹ۔" رابعہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

گل نے کہا "خدا بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔"

"رابعہ کیا زبردست اور نئی بات کی ہے میری گھر والی نے علم و دانش اور فہم و فراست سے بھرپور کتابوں میں بھی یہی لکھا ہے۔"

گل نے خفگی سے کہا "کیا یہ غلط ہے کہ مذاق اڑا رہے ہو۔"

"بھلا تم غلط کہہ سکتی ہو۔" بولا "سچ کہ تم نے نہیں کہی ہے یہ بات اور مارگریٹ، گل کبھی مذاق نہیں کرتی بلکہ مذاق کو سمجھتی ہی نہیں ہے۔"

اس سے پہلے کہ گل مزید برا مانتی ناشتے کے ساتھ مولوی خادم حسین نمودار ہوئے "کچھ ایسا ہی ولیٹ اپنا بھی ہے جی۔" وہ ہنس کر بولا "اس تک بخت کی سمجھ میں کوئی لطیفہ نہیں آتا۔ پورا لطیفہ سن کے پوچھتی ہے پھر کیا ہوا؟"

محسن نے کہا "تمہارے لطیفے پر رونی نہیں۔ بڑا حوصلہ ہے اس کا؟"

"اسے تو ہنسنا آتا ہی نہیں جی۔" خادم نے کہا۔

محسن بولا "تمہاری صورت دیکھ کے بھی؟ کمال ہے۔"

"محسن صاحب۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ مظفر صاحب کی وجہ سے آپ بھی بے لگام ہو رہے ہیں۔" خادم خفا ہو گیا "اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صورت کا مذاق اڑانا بھی کفر ہے۔ اور پھر میری صورت تو ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہے۔"

"انسانوں کی بات کر رہے ہیں؟" محسن نے اسے مزید مشتعل کیا "تمہارے والد ماجد کیا تھے؟"

خادم حسین بھڑک اٹھا "دیکھیں جی۔ گالی برداشت نہیں ہوتی مجھ سے خالی پیٹ۔ میں کیا گدھے کی طرح دولتی جھاڑتا ہوں یا گھوڑے کی طرح ہنہناتا ہوں۔ سینگ ہیں میرے سر پہ نکل آئے۔"

میں نے ہنس کے کہا "یار خادم حسین۔ تم بلا وجہ ناراض ہو رہے ہو۔ محسن کا مطلب تھا کہ تمہارے والد کیا چیز تھے۔ نمبردار تھے یا جاگیردار، وزیر تھے یا فقیر۔"

"خدا نہ کرے جی۔"

محسن نے کہا "یار ذرا مولوی خادم حسین کی صورت پر تفصیل سے غور کرو۔ اس کے کان ہیں نا بالکل ریچھ جیسے۔ خرگوش جیسے۔"

"میں جانتا ہوں۔ کوئی کہتے ہیں کان کو۔ اور خرگوش کے کہ داڑھی ہے میں نے۔" خادم حسین نے چمک کے کہا۔

"اور آنکھیں" محسن نے اپنی بات جاری رکھی "وہ تو ہم پچھلی عید پر بکرا لائے تھے۔ ہیں نا وہی آنکھیں۔ سرمے کے بغیر ڈراؤنی لگتی ہیں۔ الو جیسی اور چال شتر مرغ جیسی ہے تو ڈھال بجو جیسی۔ آواز جیسے مینڈکی کو زکام ہو گیا ہو۔ چلتا پھرتا چڑیا گھر ہے اپنا خادم حسین۔"

خادم حسین میں اتنا سننے کی تاب کہاں تھی۔ وہ زچ ہو جاتا تھا زور زور سے "یا اللہ، یا غوث" کہہ کے راگ فرزت کر جاتا تھا۔ نکی نے محسن کو ڈانٹا "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ آپ نے تو اس کے پیچھے پڑ گئے۔ حد ہوتی ہے ہر بات کی۔"

"ہاں جیسے ایک حد ہے تمہاری عقل کی۔ مگر بے وقوفی کی حد نہیں ہے۔" وقار بولا۔

"کیا کہا؟" نکی جاتے جاتے پلٹ گئی۔

"کچھ نہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ غصے میں تم کتنی حسین لگتی ہو۔" وقار نے دانت نکال کے کہا "مولوی خادم حسین سے بھی زیادہ۔"

"رقاب، وقار ذرا ہوش میں رہو ورنہ ابھی سب کے سامنے۔"

"ابھی سب کے سامنے؟ نہیں نہیں۔ اب اتنے بے شرم بھی نہیں ہیں ہم مانا کہ بڑی محبت ہے ہم میں۔" وقار نے گھبرانے کی اداکاری کی "جی تو میرا بھی چاہ رہا ہے لیکن۔"

نکی نے غصے میں کشن مارا جو وقار کے بجائے میرے لگا "ذرا دیکھ کے مسز وقار۔ یہ کسی اور کی پراپرٹی ہے اور خاتون اول آپ کیس کر دیں گی۔"

"چلو جاؤ تم اس بیچارے مولوی خادم حسین کو ناشتا کراؤ۔ ہم تو جیسے ہی کشتہ تیغ ستم ہیں۔ وہ مر جائے گا بھوک سے۔" وقار نے ہنس کے کہا۔

اچانک مارگریٹ نے کہا "میں رہوں گی تم سب کے ساتھ۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ ہم آج ہی تمہارے لئے رہائش کا انتظام کرتے ہیں۔"

"کیا میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ سب کے ساتھ؟" مارگریٹ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا "اس لئے کہ میں۔ مسلمان نہیں ہوں؟"

میں نے سنجیدگی سے کہا "فضول بات مت کرو۔ ہم سب ساتھ ہی ہیں مگر یہ فیصلہ تو پہلے ہی کر چکے تھے کہ ایک جگہ نہیں رہیں گے تمہارے ساتھ اس گھر میں غالب اور گل ہوں گے۔ محسن ہو گا اور بوبی۔"

"بوبی کون ہے؟ وہ بچہ۔"

"ہاں، ہمارا بیٹا۔" گل نے کہا "تم نے دیکھا نہیں؟ کتنا پیارا ہے۔ ابھی سو کے اٹھے گا تو دیکھنا۔ اتنی شرارتیں کرتا ہے کہ تنگ کر دیتا ہے سب کو۔"

گل کا چہرہ ممتا کی روشن تصویر ہو گیا تھا۔ اب نہ مجھے یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ وہ فوزیہ کا بیٹا ہے اور نہ محسن کو یہ بتانے کی کہ بوبی اس کا بھانجا ہے۔ اس کے ماں باپ کو قتل کرنے والے بھی وہی ہیں جو ہمارے دشمن ہیں اور تقدیر نے بوبی پر یہ ستم کیوں کیا تھا۔

اب تک مسئلہ صرف گل کا تھا جسے ہم بوبی کی وجہ سے دور رکھنا چاہتے تھے مگر اب غالب کے لئے بھی ایک گوشۂ عافیت ضروری ہو گیا تھا جہاں وہ مارگریٹ کی نگرانی میں رہے اور خود مارگریٹ کو بھی تحفظ ملے۔ ابھی تک تو ہم نے سنجیدگی سے مکان کی تلاش بھی شروع نہیں کی تھی۔

مجھے خیال آیا کہ اتوار کی صبح شائع ہونے والے اخباروں میں ہر قسم کے اشتہارات شائع ہوتے ہیں اور شاید کرائے کے لئے خالی مکانوں میں سے کوئی ہمیں مل جائے۔ لیکن اخبار ابھی تک نہیں آیا تھا۔

وقار نے کہا "اتوار کو کچھ دیر سے آتا ہے۔ لیکن جس اخبار کا تمہیں انتظار ہے وہ نہیں آئے گا۔"

محسن بولا "کیوں؟ اس کی اشاعت پر پابندی لگ گئی ہے؟"

"میں انگریزی کا اخبار پڑھتا ہوں۔ میرا اسٹینڈرڈ اونچا ہے۔"

"اخبار والا تو فٹ ہو گا۔" میں نے گھڑی دیکھی "ڈر لگتا ہے کہ اسے کسی صحافی نے چوکیداری لگا دی ہے یا نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ صفحۂ اول پر باکس میں سے کالمی سرخی اور تصاویر ہوں گی۔"

اسی وقت باہر ایک دھماکا ہوا۔ وقار ایک دم اچھلا "وہ آیا۔ اور گیا۔"

"کون آیا اور گیا؟" محسن نے کہا۔

"اخبار والا۔" وقار بولا "ہم پہلے سے دروازے پر موجود ہوتے تو اسے روک سکتے تھے۔ اب تو وہ پہنچ گیا ایک فرلانگ دور۔"

"یعنی اب بازار جا کے اخبار لانا پڑے گا؟"

"نہیں۔ میں باہر ہی انتظار کرتا ہوں۔ اور اخبار والے آئیں گے اس کے بعد بھی۔ کسی کو پکڑتا ہوں۔" وقار بولا اور باہر نکل گیا۔ مارگریٹ غالب کو دیکھنے چلی گئی۔ وہ اس کی طرف سے اتنی ہی فکر رہتی تھی جتنی بوبی کے لئے گل۔ بچوں کا رات تک سونے رہنا

www.paksociety.com

اچھی بات ہے مگر گل کو فکر تھی کہ ہر روز یہاں نو بجے تک اُٹھ جاتا ہے تو آج ساڑھے نو تک کیوں سویا ہوا ہے۔

میں اور محسن، محسن اور جنید کے بیٹھے ہوئے صوفوں پر دراز تھے۔ میں ابھی تک گزشتہ رات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"محسن۔ وہ قلم کہاں ہے؟ انیس احمد کی فہرستوں کی؟"

محسن نے کہا "مالِ غنیمت کے بنڈل میں باندھی تھی میں نے۔"

"وہ مالِ غنیمت کیا ٹیکسی میں رہ گیا؟ چلتے وقت انیس کے گھر میں تو نہیں چھوڑ دیا تھا سب کچھ۔"

"نہیں یار۔ اتنا بدحواس ابھی نہیں تھا میں۔" محسن بولا "ہم جالب کو اتار کے واپس گئے تھے تو میں نے وہ گٹھڑی بھی اتاری تھی۔ وہیں گیراج میں ڈال دی تھی۔"

"ایک لاکھ سے زیادہ تو نقد تھے اور لاکھوں کے زیورات تھے۔"

"سب وہیں پڑے ہوں گے۔ وہاں سے کون اٹھائے گا لیکن سوال۔ ہم کیا بتائیں گے افسرانِ بالا کو۔"

"افسرانِ بالا؟"

"میرا مطلب تھا گل سے اور رابعہ سے۔ ان کے سوا کون جواب طلبی کر سکتا ہے ہم سے۔" محسن ہنسا "نقدی کی تو خیر کوئی بات نہیں مگر زیورات کے بارے میں مجھے بھی علم نہیں کہ اصلی ہیں یا آرٹیفیشل۔ اصلی ہیں تو کتنی مالیت کے۔"

"زیادہ اہم وہ نوٹ بک ہے۔ ڈائری اور رجسٹر ہیں۔"

"چار چیک میری جیب میں ہیں۔" محسن نے چیک نکالے "یہ تو صرف ایک ہزار کا ہے۔ یہ دوسرا سترہ ہزار کا۔ پھر ایک اور سترہ ہزار کا۔"

"کیا یہ دونوں ایک ہی بک سے پھاڑے گئے ہیں؟ ایک ہی شخص کے دستخط ہیں دونوں پر؟ ایک پر اس ماہ کی تاریخ ہے دوسرے پر گزشتہ ماہ کی؟"

"واقعی۔ آپ کی نظر نے وہ دیکھ لیا جو میری نگاہ نہ دیکھ سکی۔ حالانکہ چیک میرے سامنے ہیں۔"

"ہزار کے دوسرے چیک پر غور کرو۔ دونوں کی رقم اور دستخط ایک ہیں۔ دونوں ایک ہی چیک بک سے جاری ہوئے ہیں۔"

محسن دنگ رہ گیا "آپ بڑے پہنچے ہوئے ہیں یا پیر و مرشد۔ آپ نے کیسے جانا۔"

"ابھی ایسے بہت سے انکشافات ہوں گے۔ حیران ہونا چھوڑ دے۔ یہ رانا کا بزنس نام و دھندا لگتا ہے۔ وہ لوگوں کو بلیک میل کر کے ہر ماہ ایک بندھی رقم وصول کرتا ہوگا۔ جب سارے چیک وصول ہو جاتے ہوں گے تو ایک دن میں کیش کرا لیتا ہوگا۔ خود یا کسی کو بھیج کے۔ نوٹ بک اور ڈائری میں اور بھی نام ملیں گے۔"

"کیا یہ رانا کی بے وقوفی نہیں تھی۔ وہ چیک لیتا رہا۔"

"اس سے کیا ثابت کیا جا سکتا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ مثال کے طور پر یعقوب صاحب ہیں جو ہر ماہ صرف ایک ہزار دیتے ہیں۔ ممکن ہے ایک بار ہی ان سے رسید لے لی گئی ہو کہ انہوں نے شوکت رانا سے ایک لاکھ روپے ادھار لئے ہیں اور ایک معاہدے کے تحت یہ قرض وہ ایک ہزار روپے ماہانہ ادا کریں گے۔ سود کے ساتھ یہ رقم ڈیڑھ لاکھ ہوگی۔ بارہ سال چھ مہینے میں قرض ادا ہو جائے گا۔ اس میں کون سی بات خلافِ قانون ہے؟"

"اور یعقوب صاحب کے بلیک میل ہونے کی وجہ؟"

"وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ دنیا میں ہر شخص کوئی غلطی کرتا ہے یا جرم جو اس کی کمزوری بن جاتا ہے۔ وہ خاموشی سے اس کا کفارہ نہ ادا کرے تو بدنامی اور سزا سے نہیں بچ سکتا۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے کسی عزیز کو مستقل کہیں ہٹانے کے لئے یا پاگل بنا کے ان لوگوں کی تحویل میں دے رکھا ہے۔ اپنے جنسی فائدے کے لئے وہ خرچ ادا کرتے ہیں، پھر راز کو راز رکھنے کا معاوضہ۔ میں ایک رات رابعہ کے ساتھ وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہاں چوکیدار نے لالچ اور تلاشی میں ہمارے سامنے ایک پروفیسر کو پیش کر دیا یہ کہتے ہوئے کہ ہم ہی اس کے لواحقین ہیں جو اس کو وہاں چھوڑ گئے تھے۔ بظاہر علاج معالجے کے لئے لیکن درحقیقت ان کو ذہنی طور پر ناکارہ کر کے منصوبہ معطل بنانے کے لئے۔ یہ چوکیدار ہمیں پروفیسر کا بیٹا اور بہو سمجھ بیٹھا تھا۔"

"خود بیٹے نے باپ کو وہاں بند کرا دیا تھا؟"

"ہاں جائیداد ہتھیانے کے لئے۔ جس پر آپ ہی سانپ بنے بیٹھے تھے۔"

"تو مار دیتا سانپ کو۔" محسن تلخی سے بولا۔

میں نے کہا "اتنی ہمت نہیں تھی۔ اور قتل جرم ہے۔ پروفیسر کا بیٹا مجرم نہیں شریف آدمی ہوگا۔"

"کیا کہنے اس کی شرافت کے۔" محسن نے کہا "ضرور یہ بہو کی سازش ہوگی۔"

"یار یہی تو خرابی ہے ہم میں۔ الزام سے بچنے کا آسان طریقہ ہے کہ خود معصوم بن جاؤ۔ میں کہتا ہوں بہو تو ہوتی ہے پرائی۔ بیٹا اپنا خون ہوتا ہے۔ وہ کیسے مان لیتا ہے بیوی کی ہر بات۔ جائز ناجائز کی تمیز کئے بغیر۔ وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوتا کہ ایک عورت اس سے کچھ بھی کرا لے۔ مگر اس کے اعصاب پر عورت سوار ہو جاتی ہے تو دماغ بھی ماؤف ہو جاتا ہے۔ اور یہ تو چھوٹی بات ہے۔ مجھے تو رنج ہوا تھا وزیر خان ٹرسٹ اسپتال کے اندر کا ماحول جان کے۔ وہاں شاید پہلے شفا ملتی ہو۔ اب وہاں موت کا سامان ہوتا ہے۔ [illegible] پاگل خانے سے بھی زیادہ عذاب ناک ہے۔ [illegible] لوگ اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ بھی [illegible]

ہیں کہ وہاں ان کا علاج ہوگا تو کسی دن وہ نارمل انسانوں کی دنیا میں واپس لوٹ آئیں گے۔"

"ایسا کہاں ہوتا ہے دوست۔ جو ایک بار دیوانوں کی دنیا میں گیا وہ واپس نہیں آیا۔"

"نہیں یار۔ بہت سے لوگ ٹھیک بھی ہو جاتے ہیں۔ وقتی صدمے سے پاگل ہونے والے یا عارضی حالات سے متاثر ہونے والے لیکن وزیر خان ٹرسٹ اسپتال میں شاید ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں دیوانے نہیں آتے۔ دیوانے بنائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ جو خود کو ہوشیار سمجھتے ہیں وہ اپنے سے زیادہ ہوشیار انسانوں کے شکاری ذہن سے مار کھا جاتے ہیں۔ شکار ہونے والے اور شکاری اپنے اپنے رشتوں کی پہچان اور حوالے بھی رکھتے ہیں۔ شاید اسی لئے شکاری رحم دلی سے کام لیتے ہیں اور انہیں جینے کی رعایت دیتے ہیں۔ انہیں مارتے نہیں اور مرواتے نہیں۔"

"قفس میں جینے کی آزادی کیا رعایت اور رحم دلی ہے؟" محسن بولا۔

"ان سے پوچھو تو وہ یہی کہیں گے کہ گوشے میں قفس کے انہیں آرام بہت ہے۔ کون سی تکلیف ہے یہاں۔ علاج آرام اور ضرورت کی ہر چیز میسر ہے اور کیا چاہئے۔ باقی سب بھی آرام سے ہیں اب۔"

اندر سے گل، رابعہ اور تگی کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ بوبی جاگ اٹھا تھا اور وہ سب اس کے ساتھ کھیلتے ہوئے بچی بن گئی تھیں۔ سب اپنی اپنی آوازیں نکال رہی تھیں اور اس کی طفلانہ معصومیت پر صدقے واری ہو رہی تھیں۔ اس کے حلق سے نکلنے والی بے معنی آوازوں پر وہ خوشی سے بے حال تھیں۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے دیکھا تو ہنسی کی اصل وجہ معلوم ہو گئی۔ رابعہ گھوڑا بن کر اسے سیر کرا رہی تھی اور گل نے بوبی کو اس کی پیٹھ پر بٹھا رکھا تھا۔ ابھی اس نے خود بیٹھنا نہیں سیکھا تھا۔ تگی نے دوپٹے کو بل دے کر چابک بنا لیا تھا اور گھوڑے کو ہانک رہی تھی۔ سوار نے اظہارِ تشکر کے طور پر رات بھر کے جمع شدہ پانی سے گھوڑے کو سیراب کر دیا تھا اور مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ کے سب کپڑے ناپاک ہو گئے تھے۔

"شاباش بیٹا۔ ایک بار اور۔" تگی نے ہنستے ہنستے کہا۔

رابعہ اٹھ کھڑی ہوئی "بدتمیز۔ یہ کیا حرکت ہے۔" اس نے بناوٹ سے بوبی کو ڈانٹا۔

"شکر ہے بیٹا تھینک یو پھوپھی جان۔ ہم تو ایسا ہی کرتے ہیں اور پھر کریں گے۔" تگی نے دوپٹا کھول لیا "پہلے چھوٹی شوشو۔ پھر بڑی شوشو۔"

رابعہ غسل خانے سے صدا لگائی "بوبی یہ کیا کیا ہے! بہت ماروں گی۔"

بوبی بسورنے لگا۔ گل نے اسے سینے سے لگایا "ہائے ہائے۔ ہائے اس لئے مار مار کے بچے کا برا حال کر دیا۔" گل نے کہا۔

تگی ہنسی "جب اپنے ہوں گے تا پتہ چلے گا۔ تھوڑے دن کی بات ہے۔"

گل نے اب رابعہ کی سائیڈ لی "پہلے تو بتا تیرے کتنے ہیں۔"

تگی شرمائی "پہلے میں بتاؤں؟ نہیں رابعہ باجی پہلے آپ۔"

رابعہ نے اسے گھورا "پہلے آپ کی بچی۔ ابھی سے میرا نمبر کیسے آ گیا۔"

"اچھا کان لاؤ ادھر۔" تگی نے رابعہ کے کان میں کچھ کہا۔

رابعہ نے چیخ ماری۔ تگی نے اس کا کان کاٹ لیا تھا مگر بات کہنے کے بعد۔ "سچ؟" رابعہ کی آنکھیں چمکنے لگیں "وقار کو بتایا؟"

"یار مجھے بھی تو بتاؤ کچھ۔" گل نے کہا "تگی....."

تگی نے پھر وہی حرکت کی اور اب گل چلائی "کیا واقعی۔ میں بتاتی ہوں سب کو۔" وہ کان ملنے لگی۔

"ارے گل۔ ابھی نہیں۔" تگی کا رنگ لال ہو رہا تھا "ابھی نہیں۔"

"پھر کیا ڈھول تاشے کے ساتھ اعلان ہوگا۔ ٹی وی ریڈیو پر بتایا جائے گا۔" رابعہ بولی۔

"وہ تو خود بتا دیں گے پہلے میں انہیں بتا دوں۔" تگی خوشی سے بے قابو ہو رہی تھی مگر پھر بھی منہ چھپا رہی تھی "کل سالگرہ ہے ہماری شادی کی۔ یہ خبر ایک تحفہ ہوگی میری طرف سے۔ ایک سرپرائز۔"

رابعہ اور گل کو اسی دلیل نے قائل کر لیا۔ میں نے محسن کو دیکھا جو میرے تجسس کو دیکھتے ہوئے ساتھ آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے گردن لمبی کر کے بلند آواز میں کہا "بھئی مبارک ہو سب کو۔"

میں نے بھی سر نکال کے کہا "خیر مبارک شیروانی صاحب۔"

خواتین پہلے اچھل پڑیں۔ پھر چلانے لگیں "شرم نہیں آتی۔" گل نے محسن کو ڈانٹا۔

محسن نے دانتوں کی نمائش کی "نہیں جی بالکل نہیں۔"

رابعہ نے شور مچایا "چھپ چھپ کے عورتوں کی پرائیویٹ باتیں سننا بہت بری بات ہے۔"

"کیا کریں" میں نے مسکینی سے کہا "ہماری عادتیں ہی ایسی ہیں جی ہماری۔ بلکہ کچھ تو اس سے بھی بری ہیں۔ بچپن میں ہی بگڑ گئے تھے ہم۔"

محسن بولا "آپ لوگوں نے بالکل ہی چوپٹ کر دیا۔ اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی۔"

بارگریٹ ایک طرف بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ ہماری آپس کی بے تکلفی، اپنائیت اور خلوص کے رشتے نے اسے حیران کر دیا تھا۔ شاید کبھی اس نے ایسے ہی ہنستے کھیلتے خوشیوں سے معمور گھر کے خواب دیکھے ہوں گے لیکن ان کی تعبیر الٹی نکلی۔ پھر وہی خواب اس کا عذاب بن گئے تھے۔

www.paksociety.com

رفتار مذاق نہیں کر رہا تھا۔ اردو کے اخبار میں مجھے پانچویں صفحے پر جہاں شہر کی غیر اہم خبریں ہوتی ہیں دو مختصر خبریں ملیں۔ ایک خبر میں یہ بتایا گیا تھا کہ ڈاکوؤں نے چوکیدار کو قتل کر کے کوٹھی کا صفایا کر دیا۔ یہ کوٹھی مشہور سماجی کارکن اور بزنس مین شوکت رانا کی ہے۔ عین رات پر جب ڈاکو اس کارروائی میں مصروف تھے شوکت رانا اپنے محافظوں کے ساتھ پہنچ گئے مگر ڈاکوؤں نے مقابلہ کیا اور شوکت رانا کے محافظ بھی ہلاک ہو گئے۔ ڈاکو جاتے جاتے گاڑی کو بھی آگ لگا گئے۔" اس خبر کا عنوان تھا "جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے" خود شوکت رانا اس لئے بچ گئے کہ ان پر ڈاکوؤں کی نظر نہ پڑ سکی۔

دوسری خبر کا تعلق ایک حادثے سے تھا۔ اس میں اخبار کے سینئر رپورٹر اور بے باک نامور صحافی کے ساتھ پریس فوٹو گرافر کی المناک موت کا ذکر تھا جو نصف شب کے قریب موٹر سائیکل پر اخبار کے دفتر لوٹتے ہوئے کسی نامعلوم تیز رفتار ٹرک کی ٹکر سے ہلاک ہو گئے تھے۔ غازی کی موت پر قتل کا شبہ تک ظاہر نہیں کیا گیا تھا لیکن کہا گیا تھا کہ پولیس تندہی سے تفتیش کر رہی ہے اور ڈی آئی جی نے کہا ہے کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ٹرک ڈرائیور کو گرفتار کر لیا جائے گا۔

عالم اشتعال میں محسن نے اور میں نے غازی کو جتنی گالیاں دی تھیں وہ دوسری خبر پڑھنے کے بعد ہمارا گناہ بن گئی تھیں۔ وہ مر چکا تھا بلکہ مارا جا چکا تھا۔ کل تک ہم جس کو غدار کا غازی کہتے مفرور غازی آج شہید ہو گیا تھا۔

یہی خبر انگریزی کے اخبار میں بھی تھی جسے ہم نے صبح سے اب تک کھول کے نہیں دیکھا تھا۔ صرف اس لئے کہ چوہدری دلاور کی گرفتاری کی خبر صرف اور صرف غازی کی خصوصی خبر یا EXCLUSIVE اسٹوری تھی۔ وہ خبر جو کسی اور اخبار میں نہیں مل سکتی تھی۔

میں اور محسن سخت صدمے کی کیفیت میں تھے اور ہمیں اس سے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا۔

"یہ کوئی بہت بڑا کھیل ہوا ہے محسن۔" میں نے کہا "آخر یہ خبر دوسرے اخبارات تک کیسے پہنچی؟ وہاں صرف غازی تھا اور اسی کے ساتھ آنے والا ایک فوٹو گرافر۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ اتنی بڑی اسٹوری کے لئے آدھی رات کے بعد آئے اور خبر اس کے ہاتھ سے نکل جائے یا LEAK کر جائے۔"

"مخبر غازی نے نہیں ان لوگوں نے مخبری کی۔ جنہوں نے غازی کو اپنے اخبار کے دفتر پہنچنے سے پہلے ہی مار دیا۔" محسن سخت مشتعل تھا۔

اس نے بجلی کو گل سے لے لیا "آواز میں اسے راضی کر دوں۔"

گل نے کہا "اجازت بھی لے لینا۔"

"ارے رہا بیوہ مت رونا۔" رابعہ نے کہا "رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آنسو کبھی تقدیر کے لکھے کو نہیں مٹاتے۔ جینا سیکھو یا مارگریٹ موت بھی آئے تو مسکراتے ہوئے استقبال کرو۔"

گل نے کہا "ہاں رونا نہیں ہمارے دشمن۔ کوشش یہی کرو۔"

پیچھے سے رفتار نے اخبار کا گولا میزائل کی طرح اتار کر محسن کی کمر پر لگا۔ وہ اچھل کے پلٹا۔ پھر ہم ایک ساتھ اخبار کی طرف جھپٹے۔ اس کا آدھا حصہ میرے ہاتھ آیا۔ آدھا محسن کو ملا۔

"پہلا صفحہ یہ ہے۔" میں نے چھلانگ لگائی اور صوفے پر جا بیٹھا۔

رفتار نے کہا "کچھ نہیں ہے پہلے صفحے پر۔"

"کیا مطلب؟" میں نے شہ سرخی سے بیزار ہو کر خبر کی سرخی تک نظر دوڑائی۔ محسن صوفے کی پشت سے آگے جھک کر دیکھتا رہا۔ اس پر واقعی دلاور کی گرفتاری کے بارے میں ایک سطر کی خبر بھی نہیں تھی۔

"رات از دوسی۔ اس حرام زادے نے تو کہا تھا کہ یہ کالی سرخی ہو گی یا کس میں۔" میں نے بے بسی سے کہا "نہ خبر نہ تصویر۔"

محسن بولا "یار صفحہ پلٹ کے دیکھو۔"

رفتار نے مایوسی سے سر ہلایا "میں نے اخبار خریدتے ہی دیکھ لیا تھا۔ اندر باہر کہیں کچھ بھی نہیں ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" محسن نے اپنے حصے کے اخبار کو کھنگالتے ہوئے کہا "اتنا بڑا واقعہ۔"

"جو واقعہ پیش ہی نہیں آیا اس کی خبر کہاں سے آئے گی چنا جی۔" رفتار نے اس کی بات کاٹ دی "کوئی خواب دیکھا ہو گا تم نے۔"

"اور خواب میں سے قتل کے طالب اور مارگریٹ بھاگ گئے۔" محسن نے چڑ کے کہا۔

"یہ دوسری اسٹوری ہے۔" رفتار نے کہا "اس کا بھلا دلاور کی گرفتاری سے کیا تعلق۔"

"اور وہ جو انیس احمد کلکٹر کسٹم کے چوروں میں ہوا۔ شوکت رانا کی نئی کوٹھی میں!"

"وہ بھی دوسری اسٹوری ہے۔" رفتار بولا۔

"بکواس کرتے ہو تم۔" محسن نے غصے میں کہا "کوئی دوسری تیسری اسٹوری نہیں ہے۔"

"اچھا تو دیکھ لو خود اپنی آنکھوں سے پڑھ لو۔" رفتار بولا "پہلے اردو میں پڑھو۔ پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں۔"

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات انتیسویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد و مقبول سلسلہ
شکاری
انیسواں حصہ
www.paksociety.com

شکاری

معاشرے کے ان ناسوروں کی روح جو گوشت و پوست سے گزر کر انسانی ضمیر سب اتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شعور و موت کی بستی سب گزر رہے تھے۔ جلد دن شگفتہ ہوئی آس و یاس، خوف و ہراس، تلخ حقائق، شیریں خواب

ہیں۔ وہ لب نہیں کھول سکتے۔ اصل مشکل وہی ہو گی جو ایس ایس پی صاحب بتا نہیں سکے اگر وہ صاف انکار کر دیں کہ گزشتہ رات وہ کہیں بھی نہیں گیا۔ نہ اس نے دلاور کو گرفتار کیا، نہ شوکت رانا کو، تو اسے جھوٹا کون کہہ سکتا ہے۔ شاید خود ڈی آئی جی صاحب گواہی دیں کہ وہ رات بھر ان کے ساتھ تھا۔ تو کسی اور کی بات کون مانے گا۔"

"لیکن اتنا بڑا جھوٹ وہ بول نہیں سکتا۔" وقار نے پھر کہا۔

"اس کی تصدیق ہو جائے گی۔ تم فون کر لو۔" میں نے کہا۔

محسن بولا "لیکن فون وہ آفس میں نہیں ملے گا۔ چھٹی بھی ہے۔"

"اگر اسے دلاور کو گرفتار کرنے کے لئے انوار کو بلایا جاتا تو کیا وہ چھٹی کا عذر پیش کر سکتا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر ہے۔ آفس میں نہیں تو گھر پر ملے گا۔"

"اس کا گھر کہاں ہے؟" وقار نے کہا "وہ اسلام آباد سے آیا تھا۔ شاید کسی دوست یا ہوٹل میں ٹھہرا ہو گا۔ میں پتا کرتا ہوں۔"

"تم کیا پوچھو گے اس سے۔" میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا "بہتر ہے کہ رابطہ فون کرے۔ تم اس سے پہلے اپنا بندوبست کر لو۔"

"بندوبست... میں سمجھا نہیں۔"

میں نے کہا "میں اچانک ہر طرف خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ ثاقب اور مارگریٹ کو یہاں سے لے جاؤ۔"

اچانک محسن نے کہا "یار سکندر، کیا مارگریٹ؟"

"مجھے ایک لڑکے کے لئے بستی میں آنا بہت مشکل لگتا ہے۔"

"وہاں ہم تھے اور پولیس والے۔ یقیناً انہی میں سے کسی نے حق نمک ادا کیا۔ چوہدری دلاور اور شوکت رانا تک کسی ذریعہ نے راز فاش کر دیا۔ دلاور اپنی گاڑی کے شکار ہونے سے ہوشیار ہو گئے۔ یقیناً انہوں نے راستے میں ہی چوہدری دلاور کو بھی فرار کرا لیا ہو گا اور شوکت رانا کو بھی۔"

وقار یوسف نے کہا "ایس ایس پی جاوید صدیقی کیا آدمی ہے کیا؟"

"ایسا ویسا کچھ نہیں۔ بس چھپا ہے وقار۔ جو قومی وزیر تھا اور پنجاب اس کے تحت ایمان، فرض شناسی اور اصول پرستی کے ہمارے وعدوں کے ساتھ۔ وہ بھی بہت دعوے کر رہا تھا اور اپنے ماتحتوں پر بہت رعب جھاڑ رہا تھا۔ حفاظتی انتظامات بھی بہت زبردست تھے بظاہر۔ مگر یہ سب ڈراما ہی تھا۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

محسن سخت پریشان تھا "اب کیا ہو گا یار۔ یہ صورت حال تو پہلے سے زیادہ خطرناک ہو گئی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ ہم تو کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔ گرفتاری کے گواہ تھے ڈی ایس پی اور اس کے ساتھ آنے والی پولیس فورس۔"

"اور وہ سب جاوید صدیقی کے ساتھ آئے تھے۔ ڈاکٹر، ایمبولینس والے۔ تھانے کے لوگ۔"

"وہ ہر جگہ پہنچ ہیں۔ جہاں بھی ان سے کہا جائے۔ وہ کسی کو کیا بتا سکتے ہیں؟" میں نے کہا "جاوید صدیقی کے ماتحت بھی مجبور

www.paksociety.com

"مگر یہ ممکن نہیں ہے۔"

"ہم اس کے ساتھ تھے۔ اسے کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ خیر ابھی تم جاؤ" اپنے ساتھ گل اور روبی کو بھی لے جاؤ۔"

"مگر کہاں۔ کہاں لے جاؤں؟" وقار گھبرا گیا۔

میں نے کہا "وقار۔ آج کا اخبار دیکھو۔ کتنے مکان خالی پڑے ہیں۔ کرائے کے لئے۔ کوئی سا بھی لے لو۔ گیراج میں ایک گاڑی کھڑی ہے۔ اس میں ایک لاکھ سے زیادہ نقد ہیں۔ اس کے علاوہ زیورات ہیں۔ وہ ساتھ لے جاؤ اور جو مکان محفوظ ہو جو تمہیں ٹھیک لگے اس کا ایڈوانس دے کر مکان کا قبضہ لے لو۔ سب کو وہیں چھوڑ دو اور واپس آ کے سامان لے جاؤ۔ تھوڑا بہت یہاں سے اٹھاؤ۔ کچھ بازار سے لے لو تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔"

گل یا رابعہ میں سے کسی نے پوری بات نہیں سنی تھی لیکن میرا موڈ دیکھتے ہوئے کسی نے بھی مجھ سے اختلاف نہیں کیا۔

رابعہ نے کہا "میں یہیں رہوں گی۔"

گل نے کہا "میں گھر چھوڑ کے نہیں جاؤں گی۔ مارگریٹ جائے غائب کے ساتھ۔ گل کا آپا کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔"

گل نے کہا "اور تم... بعد میں آؤ گے؟ باقی سب لوگ؟"

میں نے کہا "ہاں وقار تمہیں چھوڑ کے آئے گا تو ہمیں لے جائے گا۔ چند دن ہم سب وہیں گزار دیں گے۔"

گل نے پھر کہا "گھر میں اپنے گھر کو چھوڑ کے ایسے ہی چلی جاؤں۔"

وقار نے کہا "اچھا گھر کو بھی سر پر اٹھا لیتا۔ ایسا نہ ہو بعد میں چور لے جائیں۔ ... آئیں تو یہاں خالی پلاٹ ہو۔ ہو سکے تو پلاٹ کو بھی لے جانا۔"

میں نے کہا "بی بی جی۔ تمہارے گھر کو کچھ نہیں ہو گا لیکن تمہیں کچھ ہو گیا تو وقار کا کیا بنے گا۔ ایک دو دن کی بات ہے۔"

محسن بولا "یہ سمجھ لو کہ تم ہمارے گھر میں رہو گی۔ جیسے ہم یہاں رہتے ہیں۔"

"کیا یہ بہت ضروری ہے؟" گل نے سر جھکا لیا۔

"ہاں۔ ہمارے خلاف ایک بہت بڑی سازش ہو گئی ہے۔ اتنی محنت سے اور ہوشیاری سے ہم نے دلاور کو گرفتار کرا دیا تھا اور ساتھ ہی شوکت رانا کو۔ لیکن کسی نے ہماری کامیابی کو ناکامی میں بدل دیا ہے۔ چوہدری دلاور اور شوکت رانا کو خود پولیس نے چھوڑ دیا ہے یا ان کے ساتھی انہیں رہا کرا کے لے گئے ہیں۔ ابھی تو خیر دلاور کی حالت ایسی نہیں کہ وہ فوراً کچھ کر سکے۔ بیوی نے اسے غائب کرایا ہو گا۔ ... سے ہی وہ شوکت رانا کے ساتھ مل کر کوئی کارروائی کرے گا اور ہم سے اپنی اسیری کے ہر لمحے کا حساب لے گا۔ تم جانتی ہو وہ کتنا کینہ پرور آدمی ہے۔ اس مرتبہ وہ کسی کو نہیں بخشے گا۔"

وقار یوسف نے کہا "میں اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا۔"

محسن نے بھی کہا "تمہارا گھر تباہ کرنے میں کون سی کسر چھوڑی تھی اس نے۔"

میں نے کہا "وہ کارروائی ہمارے خلاف تھی۔ ہم یہاں نہ ہوتے تو شاید وہ ادھر کا رخ نہ کرتے۔"

"میری ان سے کوئی دشمنی نہیں۔" وقار نے کہا "اور نہ میرا کوئی قصور بھی نہیں۔ میں رابعہ کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ وہاں تو اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔"

محسن نے کہا "لیکن تم نے ہمیں پناہ دی۔ یہ قصور کیا کم ہے؟"

"لیکن میں نے ان کے خلاف کبھی کسی کارروائی میں عملی حصہ نہیں لیا اور نہ ان میں سے کسی کا براہ راست مجھ سے اختلاف ہوا۔ آخر منظر صاحب بھی تو دوست ہیں سب کے۔ یہ شکاری ان کے پیچھے کہاں نہیں پڑے؟ میرا تعلق تو ملازمت کی حد تک ہے۔"

"وقار۔ تم ملازم نہیں ہو کسی کے۔" رابعہ نے کہا۔

"چلیں پارٹنرشپ کہہ لیں۔ میں قانونی معاملات میں آپ کا ساتھ دیتا ہوں اور بس۔ اگر آپ لوگ یہاں رہتے ہیں تو ہماری دوستی کی وجہ سے۔ چوہدری دلاور کے بھی بہت دوست ہوں گے مگر وہ سب آپ کے محسن نہیں ہیں۔ شاید اسی لئے دلاور اینڈ کمپنی نے آج تک مجھے براہ راست ملوث نہیں کیا اور میں ہمیشہ محفوظ رہا۔"

اب گل بھی شوہر کے ساتھ دلائل میں شریک ہو گئی "ہم سب کا ایک ساتھ بھاگ جانا یہ ثابت کر دے گا کہ ہم بھی ڈرتے ہیں اور ہم نے کوئی ایسا کام کیا ہے۔"

"اچھا بھئی۔ تمہارا دل نہیں چاہتا تو تم مت جاؤ۔" میں نے کہا۔

"یہ دل کی بات نہیں سکندر بھائی۔ آپ خود ہی تو کہہ رہے ہیں کہ یہاں خطرہ آپ کی موجودگی کے باعث ہے۔ آپ لوگ چلے جائیں گے تو پھر خطرہ کہاں رہے گا لیکن ہم خطرے کے ساتھ رہے اور آپ کے ساتھ گئے تو پھر محفوظ کیسے رہیں گے۔"

میں نے مسکرا کے کہا "وقار۔ تمہاری بیوی بھی وکیل ہو گئی ہے۔"

"قاضی کے گھر کی چوہیا بھی سیانی ہوتی ہے۔" وقار بولا۔

"قاضی اب نکاح پڑھوا رہے ہیں۔" گل بولی "تم قاضی نہیں ہو۔"

"میں نے کب تمہیں چوہیا کہا ہے۔" وقار بولا "سیانی تم پہلے ہی تھیں۔ ایسا جال پھینکا کہ پھانس لیا مجھے بھولا بھالا... شریف خوبرو اور فرمانبردار۔ ایک ہی تو تھا لاکھوں میں مثالی شوہر۔"

"او ہو... ذرا صورت ملاحظہ فرمائیں سب مثالی شوہر کی۔" گل نے کہا "تمہیں تو سجدے سے سر نہیں اٹھانا چاہئے کہ میرے جیسی

میں نے کہا "رابعہ کیا ہمارا گھر قابل رہائش ہو گا؟ میرا مطلب تھا اتنا عرصہ ہو گیا۔"

"ہم صاف کر لیں گے۔ اسی بہانے جھاڑ پونچھ ہو جائے گی ورنہ ادھر جانے کا کسی کو خیال بھی کہاں آتا ہے۔"

گل نے شرارت سے کہا "خیر ایسی بات بھی نہیں۔ سکندر کی زندگی کا اور کوئی مقصد اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا کہ وہاں جا کے رہے مگر اکیلا نہیں۔ اپنی دلہن کی ڈولی لے کر جائے۔ بینڈ باجے کے ساتھ۔"

رابعہ نے جھینپ کے کہا "گل تو بہت بولنے لگی ہے۔"

محسن نے سنجیدگی سے کہا "تو مسئلہ کیا ہے۔ دلہن دستیاب نہیں ہے یا ڈولی۔"

"فی الحال ڈولی دستیاب نہیں ہے۔" گل نے کہا۔

جان چھڑانے کے لئے میں نے کہا "اچھا چلو تم لوگ نکلو یہاں سے۔ رابعہ ٹھیک کہتی ہے۔ ہمارا اپنا گھر ہے تو ہم کرائے کے مکان میں کیوں رہیں۔"

"پھر تو میں بھی جاؤں گی۔" گل نے جوش سے کہا۔

میں نے اوپر جا کے گرد و پیش کا غور سے جائزہ لیا مگر مجھے آس پاس کہیں کسی مشتبہ شخص کی نقل و حرکت محسوس نہیں ہوئی۔ صبح سویرے دلاور کی بیوی کے فون نے رابعہ کو دہشت زدہ کیا تھا تو پریشان مجھے بھی کیا تھا۔ دلاور کی بیوی نے ہمیں ایک چیلنج دیا تھا۔ اچانک اور غیر متوقع طور پر اس کو چوہدری دلاور کے کسی وفادار نے اطلاع دے دی تھی کہ شوکت رانا کی کوٹھی میں ... ہے اور اسے اتنی مہلت مل گئی تھی کہ وہ اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لا سکے۔ اس نے سب قابل اعتماد شکاری جمع کئے۔ اس جانثار فورس کو تفصیل سے ہر بات سمجھائی اور اسلحہ فراہم کیا۔ دولت کی طاقت آزمانے کے لئے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ ضمیر فروش تلاش کر لئے۔ جائے واردات پر پولیس کے پہنچنے اور روانہ ہونے تک اس نے سارے انتظامات اپنے اطمینان کے مطابق کر لئے تھے۔ شاید کسی خون خرابے کے بغیر وہ اپنا شوہر حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گئی۔ اس باہمت اور چالاک عورت کا ساتھ دینے والا اس کا نوجوان بیٹا فیصل بھی ہو گا جو وقت سے بہت پہلے خود کو دلاور کا صحیح جانشین ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اب شاید انہوں نے دلاور کو ایسی جگہ رکھا ہو گا جہاں پولیس کیا ایم آئی فائیو کے فرشتوں کا گمان بھی نہیں جا سکتا۔ وہاں اسے زبردست حفاظتی انتظامات کے ساتھ زیر علاج رکھا جائے گا اور بہت جلد دوبارہ اقتدار حاصل کر لینے والے بادشاہ کی طرح چوہدری دلاور پھر سامنے آئے گا تو پہلے سے زیادہ خطرناک عزائم کے ساتھ اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرنے کے لئے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ کیا قانون اور کیا پولیس! سکندر جیسے دس ہوں یا رابعہ جیسے وکیل۔ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ

مثالی بیوی اتنی آسانی سے مل گئی۔ مل جاتی کوئی مولوی غلام حسین کی گھروالی تبھی تو ٹھیک رہتا۔"

سب ہنسنے لگے۔ میں نے کہا "اچھا تم دونوں ہی مثالی ہو مان لیا مگر اب کام کی بات کرو۔"

"سکندر بھائی۔ آپ خفا تو نہیں ہوں گے میں ڈرتی نہیں۔"

وقار بولا "سب جانتے ہیں کہ تم اپنے باپ سے نہیں ڈریں حالانکہ میرے سسر مرحوم نقوی صاحب بڑی توپ چیز تھے۔"

"مگر تم ڈرتے تھے ان سے۔"

"میں تو تم سے بھی ڈرتا ہوں تب ہی بنی ہے۔" وقار بولا۔

رابعہ نے کہا "سکندر تمہارا گھر بھی تو مدت سے خالی ہے۔"

میں نے چونک کے اسے دیکھا۔ وہ میرے آبائی گھر کی بات کر رہی تھی۔ وہ گھر جس میں وزیر خان رہتا تھا۔ ماڈل ٹاؤن کی وہ حویلی جو اس نے بڑے چاؤ سے اور ارمانوں سے اپنی حق حلال کی کمائی سے خریدی تھی۔ جہاں اس نے مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن بھیجا تھا لیکن بعد میں یہ حویلی بھی اس سے چھن گئی تھی۔ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا کہ آخر وہ اچانک مفلس و قلاش کیسے ہوا تھا۔ کیسے اس کے سارے اثاثے دشمنوں کی تحویل میں چلے گئے تھے اور وہ در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مجھے تو اس کے انتقال کے بعد معلوم ہوا تھا کہ اس کی موت بھی اپنے ہی ایک ملازم کے گھر میں ہوئی تھی جہاں وہ ملازم کی حیثیت سے رہتا تھا۔ اسے سرکاری اسپتالوں کی دوا بھی میسر نہ تھی اور وہ شخص جس نے ایک معمولی دکان سے کاروبار چلایا تھا اور جو ذاتی محنت سے ترقی کرتے کرتے لاکھوں کا مالک ہو گیا تھا۔ جس نے کرائے کے معمولی مکان کی جگہ ذاتی کوٹھی بنائی تھی وہ اس بے سروسامانی کے عالم میں کیسے مرا تھا۔ اس نے لندن میں مجھے کیوں نہیں بتایا تھا کہ اس کے خلاف کیا سازش ہو رہی ہے اور سازش کرنے والے کون ہیں۔ اسے قتل کرنے والوں نے اس کی جائیداد پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ بعد میں رابعہ نے بہت بھاری قیمت ادا کر کے میرے والد کی نشانی اس حویلی کو پھر حاصل کر لیا تھا۔ مگر اس کے بعد سے یہ گھر خالی اور غیر آباد تھا۔ رابعہ نے بھی اسے غلطی سے بھی اپنا گھر نہیں کہا تھا۔ اسے وہ ہمارا گھر کہتی تھی۔ خود اس کا گھر تباہ ہو چکا تھا اور ایک کھنڈر کا ملبہ رہ گیا تھا۔ میں نے اسے کبھی ہمارا گھر نہیں کہا تھا۔ ہمیشہ رابعہ کا گھر سمجھا تھا۔

"کس سوچ میں پڑ گئے؟" رابعہ نے کہا۔

"سوچ کی بات مت کرو۔ صاف پوچھو کہ مجھے کیوں دیکھے جا رہے ہو اتنی دیر سے۔" محسن نے ہنس کے کہا۔

میں نے چونک کے سر جھکایا "اب دیکھنے پر بھی اعتراض ہے آپ کو۔ حضرات و خواتین۔"

"دیکھو مگر نظر مت لگا دینا۔" گل بولی "ایسے ندیدوں کی طرح مت دیکھو۔"

www.paksociety.com

سکتا۔

میں پیچھے آیا تو گل اور بوبی کے ساتھ وقار کی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر مارگریٹ بیٹھ چکی تھی پھر کچھ سوچ کے گل اور بوبی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور غالب کو درمیان میں بٹھا کے ایک طرف گل نے پوزیشن سنبھالی تو دوسری طرف مارگریٹ نے۔ شاید انہیں اندیشہ تھا کہ غالب راستے میں دروازے کھول کے باہر چھلانگ نہ لگا دے۔

غالب کو نیند سے جگایا گیا تو اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن ذہن ابھی تک خوابیدہ تھا۔ ایک مدت سے وہ دوسروں کی مرضی کے مطابق جی رہا تھا اور اپنی مرضی سے کچھ کرنا بھولا ہوا تھا۔ وہ ایک بے جان کٹھ پتلی تھا یا روبوٹ۔ اسے جو کہا جائے کر لیتا تھا۔ جو سمجھایا جائے مان لیتا تھا۔ کوئی سوال نہیں کرتا تھا اور مزاحمت نہیں کرتا تھا۔ سوچتا نہیں تھا اور سمجھتا نہیں تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔ اس کا کام صرف تعمیل کرنا ہے۔ اگرچہ حالات بدل گئے تھے اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کے ساتھ اب وہ لوگ نہیں جو اس پر تشدد کرتے تھے۔ وہ ذہنی و جسمانی اذیت کے خوف سے ان کی غلامی کرتا تھا اب وہ دوستوں اور ہمدردوں کے درمیان تھا۔ اس کا ذہن اس تبدیلی کا اثر قبول کرنے میں بہت سست روی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کی عادات و اطوار میں خود اعتمادی کا فقدان تھا۔ وہ اب بھی مردہ بدست زندہ نظر آتا تھا۔ یہ رویہ خاصا حوصلہ شکن اور مایوس کن تھا مگر صرف ایک رات میں کسی بہت بڑی تبدیلی کی توقع رکھنا بھی غلط تھا۔ مارگریٹ نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم سب مل کے اسے سہارا دیں گے چونکہ خواہش اس کے لاشعور میں موجود ہے اس لئے آہستہ آہستہ وہ پھر پرانا غالب بن جائے گا۔ اس کے لئے وقت درکار تھا اور یہ ہم سب کی مستقل مزاجی اور حوصلے کی آزمائش تھی۔

میں نے گیراج کے اس حصے کی طرف دیکھا جہاں میں نے جلدی میں ایک بنڈل پھینک دیا تھا "یہ تو تم یہیں چھوڑے جا رہے ہو؟"

گل نے دلچسپی سے کہا "اس میں کیا ہے؟"

"زادِ راہ۔ راستے کے لئے کھانا۔" وقار بولا "پراٹھے قیمہ۔"

میں نے وہ بنڈل گل کو پکڑا دیا "تم خود ہی دیکھ لینا۔ اور وہ سکے تو آپس میں پیار و محبت سے اور انصاف سے تقسیم کر لینا۔"

"ایسی کیا چیز ہے اس میں؟" گل نے کہا۔

"ہے آپ لوگوں کے مطلب کا مال۔ ہمارے لئے بے کار ہے۔"

رابعہ بولی "ہمارا گھر کس نے دیکھا ہے آپ سب میں سے؟"

سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ غالب نے وہ گھر دیکھا تھا مگر اس کی راہنمائی پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

وقار بولا "میں تلاش کر لوں گا۔ تلاش کرنے سے خدا تو کیا ایمان ملتا ہے کہ ہمیں نہیں ملا۔ اچھا رشتہ تک مل جاتا ہے۔ مجھے نہیں ملا تو کیا ہوا۔"

"ابھی نوکری بھی مل جاتی ہے۔ جیسے تمہیں مل گئی گھر کے کام کاج کے لئے۔" محسن بولا۔

میں نے پتا سمجھا دیا تو دوسرا سوال پھر رابعہ نے کیا "چابی بھی ہے انہیں؟"

محسن بولا "یہ چابی سے چلنے والے کھلونے تو نہیں ہیں۔ چابی دینے کی کیا ضرورت ہے۔"

"چابی کے بغیر گھر میں کیسے داخل ہوں گے یہ لوگ۔" رابعہ نے کہا۔

"تو دے دو نا چابی۔ چابی کیا میرے پاس ہے؟"

"ہائے کیوں نہیں کہ گم کر دی ہے۔ لاپروا آدمی۔"

میں نے کہا "گھر کی مالکن تم ہو اور چابیاں سنبھال کے رکھنا تمہاری ذمے داری ہے پھوہڑ لڑکی۔ گھر میں وکالت نہیں چلتی۔"

"آپ لوگ تسلی سے لڑیں۔ ہم تالے توڑ کے داخل ہو جائیں گے تمہارے گھر میں۔" وقار بولا "سامان کی ضرورت تو نہیں پڑے گی وہاں۔"

"ہر چیز مل جائے گی تمہیں۔ شاید فریج میں مہینوں پرانا منجمد دودھ ہو گا۔ انڈے ڈبل روٹی بھی ہوں۔" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "انڈوں میں سے جو چوزے نکلے ہوں گے اب تو وہ بھی انڈے دے رہے ہوں گے۔"

ان کے جاتے ہی میں نے کہا "رابعہ ڈارلنگ۔ آج موسم کتنا سہانا ہے۔ تم بھی خاصی حسین لگ رہی ہو۔"

محسن نے کہا "یار تمہید مت باندھو۔ ہمت کر کے کہہ دو کہ چائے چاہئے۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "کیسے کہوں۔ ابھی تو پھوہڑ لڑکی کہا تھا میں نے رابعہ کو۔ بس سچ نکل گیا تھا منہ سے۔ اب جھوٹ بولتے ہوئے شرم آتی ہے کہ رابعہ تمہارے ہاتھ کی چائے میں تو نائی کا مزہ ہے اور کالی میں ساری مستی شراب کی سی ہے۔"

"میری مانو تو جھوٹ بولنے کی پریکٹس شروع کر دو۔ ایسے ڈائیلاگ تو چلتے رہتے ہیں اور آدمی کو ایک منٹ میں قلابازی کھانی پڑتی ہے۔ کہہ دو کہ میں نے مذاق کیا تھا۔" محسن بولا۔

رابعہ ہنسنے لگی "کیسے پٹی پڑھا رہے ہو۔ استادوں کے استاد ہو۔ تم بچے ہو ان کے سامنے۔"

"میں تو آپ کے سامنے بھی بچہ ہوں خالہ۔" محسن معصومیت سے بولا۔

جب رابعہ چائے بنانے میں مصروف تھی تو میں اور محسن پورچ میں کرسیاں ڈال کے بیٹھے رہے۔

میں نے کہا "آج مولوی خادم حسین منظر سے غائب ہے۔"

"صبح وہ دیر تک سوتا رہا پھر دیر تک ناشتا کرتا رہا اور اس کے بعد دیر تک مارگریٹ کو مشرف بہ اسلام کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا اب بہت دیر سے نظر نہیں آیا۔"

میں نے کہا "لو وہ آ گیا۔ تھا جس کا انتظار وہ شہکار آ گیا۔"

محسن نے کہا "مگر یہی کا مقولہ زیادہ درست ہے کہ شیطان کی بات کرو اور شیطان حاضر۔"

خادم حسین وہیں سیڑھیوں پر براجمان ہو گیا "پھر یوں کہیں نا جی کہ شیطان نے یاد کیا اور شیطان حاضر۔"

"ہم کہہ رہے تھے کہ کل سے تمہارے رُخِ پُرنور کی زیارت بہت کم ہوئی۔ تم نے زیادہ وقت زنان خانے میں ہی گزارا۔ یہ تم نے کیا چکر چلا رکھا ہے پرنس مارگریٹ کے ساتھ۔" محسن بولا۔

"چکر کیسا جی۔" خادم حسین چونک کے بولا "میں تبلیغِ دین کے فریضے میں مصروف تھا۔"

"مہاتمے بازی مت کرو۔ تمہاری آنکھوں میں جو چمک پیدا ہو جاتی ہے مارگریٹ کو دیکھ کے اور سفلی جذبات جیسے تمہاری صورت پر ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ سب دیکھ رہے ہیں۔"

"بہتان تراشی مت کریں محسن صاحب۔ آپ جیسے لوگ ہی کسی بھی نیک کام کرنے والے پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔"

"تم کون سا نیک کام کر رہے ہو۔ ذرا بتاؤ مولوی۔"

"میں اسے دینِ اسلام کی طرف لا رہا ہوں۔"

"عقدِ ثانی کے لئے؟" محسن نے کہا "میں سب سمجھتا ہوں۔ تم بوڑھے ذلیل ہے ہوا اس پر بڑی چالاکی سے۔"

"کیسی جی۔ فضول باتیں مت کریں۔"

"تمہاری فضول باتیں بھی سنی ہیں میں نے۔ گل نے بتایا ہے کہ تم نیند میں کیا بول رہے تھے۔ مائی ڈارلنگ مارگریٹ۔ آئی لو یو۔" محسن نے آہ بھر کے اور سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "میں تمہارے لئے سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ اپنی بیوی کو، اپنے کیریئر کو۔ اپنے عقیدے کو۔"

"محسن صاحب۔ آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔" خادم حسین چلایا۔

"حد تم کر رہے ہو خادم حسین۔ پوچھ لینا گل سے۔ اس نے بھی سنا تھا اور دوسروں نے بھی۔ مارگریٹ نے بھی۔ اسے بڑا افسوس ہو گا تم پر۔"

خادم حسین کا رنگ اڑ گیا "کیا یہ سچ ہے جی؟ اور کیا سنا تھا؟"

"اور رابعہ سے پوچھ لو۔" محسن نے رابعہ کو چائے لاتا دیکھ کے کہا۔

رابعہ نے بات کو سمجھے بغیر کہہ دیا "بھئی مجھ سے کیا پوچھنا۔ تم ہی بتاؤ۔"

خادم حسین کی حالت غیر ہو گئی "وہ دراصل محسن صاحب یہ کوئی اپنے اختیار کی بات ہوتی ہے۔ خواب میں جو نظر آتا ہے۔"

"خواب میں وہی نظر آتا ہے جو لاشعور میں ہوتا ہے۔" محسن نے کسی فلسفی کی طرح کہا "اور تمہارے شعور میں ہے وہ بیوی جس

روشنی کے مینار
اسلام کے خاموش مبلغوں اولیائے کرام کے دلچسپ اور ایمان افروز واقعات
ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے
قیمت ۲۵۰ روپے ڈاک خرچ ۱۸ روپے

عظمت کے مینار
ضیا تسنیم بلگرامی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ
قیمت ۱۵۰ روپے ڈاک خرچ ۱۸ روپے

ایمان کا سفر
محی الدین نواب کی معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ جو دل پر اثر کرے
قیمت ۱۵۰ روپے ڈاک خرچ ۱۸ روپے

کچرا گھر
محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے۔
قیمت ۲۰۰ روپے ڈاک خرچ ۲۴ روپے

آدھا چہرہ
محی الدین نواب کا ناولٹ معاشرتی
قیمت ۲۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۸ روپے

کالی کہانیاں
برائی، جادو، شیطانی علوم، طلسم، اسرار و خوف، سسپنس اور تجسس سے بھرپور ۲۰ کہانیاں
قیمت ۲۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۸ روپے

نک ویلوٹ کی چوریاں
قیمت فی جلد ۵۰ روپے
ڈاک خرچ فی جلد ۱۶ روپے

www.paksociety.com

کا خوف تمہارے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ لاشعور میں بے مارگریٹ کی خواہش۔"

خادم حسین بڑی سنجیدگی سے اس کی بات سن رہا تھا اور اس کی مظلوم صورت پر اعتراف جرم کی تحریر پڑھ کے مجھے ہنسی آرہی تھی۔

"یہ مارگریٹ کہاں سے آ گئی مولوی خادم حسین کے لاشعور میں گڑبڑ پھیلانے۔" رابعہ نے کہا۔

محسن نے آہ بھری "بس رابعہ۔ آدمی کا مقدر بڑی ظالم چیز ہے۔ شامت اعمال کو آدمی نہ بلائے تو وہ خود آجاتی ہے مارگریٹ بن کے۔ اب جیسا کہ تم نے بھی خود سن کے بتایا۔ خادم حسین خواب میں کیسی شرمناک باتیں کر رہا تھا۔"

رابعہ چائے بناتے بناتے مڑی "کیا کہہ رہے ہو۔"

"وہی جو تم نے کہا تھا۔ تم نے اور کسی نے۔" محسن جلدی سے بولا "یہ کہہ رہا تھا کہ مارگریٹ۔ تمہاری خاطر میں یہ حلیہ بھی بدل لوں گا۔ میں شیو کراؤں گا۔ سوٹ پہنوں گا اور ٹائی باندھوں گا۔ تم کہو گی تو اپنا نام بھی جارج رکھ لوں گا۔ چرچ جاؤں گا تمہارے ساتھ۔"

رابعہ ہنسی تو خادم حسین کو احساس ہوا کہ محسن جھوٹ بول رہا تھا اور اس نے سادگی میں بہت کچھ تسلیم کرلیا۔ اس کے دل کا چور بڑی آسانی سے پکڑا گیا تھا۔

"آپ...... بے ہودہ آدمی ہیں جی۔ بدنام کرنا چاہتے ہیں مجھے۔ میری کردار کشی مت کریں۔" وہ خفا ہونے لگا "میری نیت بالکل صاف تھی۔ میں تو چاہتا تھا کہ وہ میری کوشش سے مشرف بہ اسلام ہو جاتیں۔"

"یار مولوی۔ بے وقوف کسی اور کو بنانا۔ مارگریٹ کو دیکھتے ہی یہ خیال کیوں آیا تمہیں۔ اس سے پہلے بھی تو غیر مسلموں سے واسطہ پڑا تھا تمہارا۔ ایک تو وہ جو آفس میں صفائی کرنے آتی ہے اور جھاڑو پھیر جاتی ہے تمہارے دل پر۔"

خادم حسین اچھلا "لعنت اس پر جو......"

"کیوں بیچ گزرو اتنا۔ تم نے ہی پڑھا تھا وہ شعر اس کو دیکھ کے۔ جب اس کے سر پہ ٹوکری تھی اور ہاتھ میں جھاڑو۔ وہ دیکھو چلا آتا ہے معشوق ہمارا۔ ہے سر پہ فلک ہاتھ میں وہ دار ستارا۔"

"وہ منظر صاحب کی کرامت تھی۔" خادم حسین چلانے لگا۔

"خیر ہو گی۔ مگر تم نے کبھی اسے دعوت اسلام نہیں دی۔ اور اس کا جو شوہر ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والا۔ اسے مسلمان ہونے کا نہیں کہا۔ اصل بات یہ ہے مولوی کہ مارگریٹ تمہیں اپنی دسترس میں محسوس ہوئی ہے۔ تم نے والی مسرت نذیر اور "چھنی لے کے آیا ماہیا" والی نیوٹ تو متصور ثانی نہیں کر سکتے۔ جو تمہاری بیوی ہے وہ تمہارے خوابوں کی الٹی تعبیر ہے۔ ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ مارگریٹ کی شکل میں تم کو......"

رابعہ نے اسے ڈانٹا "بس کرو محسن۔ کیا بلاوجہ بولے چلے جا رہے ہو۔ پیچھے ہی پڑ گئے اس بیچارے کے۔"

"بیچارا!" محسن بولا "بیچارے کی صورت تو دیکھو۔"

خادم حسین نے سر جھکا کے کہا "یہ ٹھیک کہتے ہیں جی۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ یہ خیال ضرور آیا تھا میرے دل میں لیکن کوئی گناہ کی بات نہیں ہے یہ۔ اگر وہ میری ذاتی دلچسپی اور کوشش سے دائرہ اسلام میں آجاتی ہے تو اس کا ثواب ہے۔"

"ہم خرما و ہم ثواب" محسن بولا "ثواب پہلے لوٹ کے خرما بعد میں کھاؤ گے۔ خرما کسی اور کو کیوں نہیں بخش دیتے۔"

رابعہ نے کہا "خادم حسین۔ تمہاری بیوی ہے ایک؟"

"جی۔ لیکن عقد ثانی بھی مباح ہے جی۔ اور کسی کی دستگیری کے لئے جس کا دنیا میں کوئی سہارا نہ ہو۔ اصلاح کے لئے۔"

"تم واقعی سیریس ہو۔" رابعہ نے اسے غور سے دیکھا "کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔ اتنا مارے گی تمہاری بیوی مارگریٹ کے ساتھ مل کے۔"

خادم حسین نے ٹھنڈی سانس لی "یہی تو اصل مشکل ہے جی کہ دنیا کسی کے ساتھ کسی کو نیکی کرتا بھی نہیں دیکھ سکتی۔"

وہ رابعہ کے مڑنے کا انداز کرکے وہاں سے کھسک گیا۔

محسن نے مذاق ہی مذاق میں اس سے سب قبول کروالیا تھا اور اب مولوی خادم حسین میں ہمت نہیں تھی کہ ہم سے بھی نظر ملا سکے۔

میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "اب تم فون کرو ایس ایس پی کو۔"

رابعہ نے کہا "وہ ملے گا نہیں۔ شرط لگا لو۔"

محسن نے کہا "یار کیا یہ بات عجیب نہیں ہے کہ رپورٹر اور فوٹو گرافر تو راستے میں ہی مار دیئے گئے مگر خبر لگ گئی۔ بے شک اصل خبر کو بدل دیا گیا۔"

"یا پھر کسی نے فون کر دیا ہو اخبار کے دفتر۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا "غازی کا کہنا تھا کہ یہ خبر اسٹاپ پریس ہے۔ یعنی اخبار کی آخری کاپی روک کے لگائی جائے گی۔ اس کا مطلب ہے آخری وقت تک کسی کو پتا نہیں چل سکتا تھا۔ عام خبر ہوتی اور وقت پر مل جاتی تو سب لگا دیتے۔ غازی نے اپنا اخبار لیٹ کروایا تھا مگر سوال یہ ہے کہ خبر انگریزی اخبار میں کیسے آئی۔ کیا انہوں نے بھی آخری کاپی روک لی تھی؟ یہ معاملہ ناقابل فہم ہے۔"

"یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی کو ہمارے پروگرام کا پہلے سے علم ہو۔"

"مگر اس کی اطلاع فوراً ہو گئی۔ شاید ایس ایس پی جاوید صدیقی اور غازی کے ساتھ ہی یہ خبر کسی تیسرے شخص کو ملی اور اس نے ایک کام تو یہ کیا کہ دادا اینڈ کمپنی کو ہوشیار کر دیا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ دیگر تمام اخبار والوں کو بھی خبر پہنچا دی۔ ابھی ہم نے صرف ایک انگریزی کا اخبار دیکھا ہے۔ باقی ہم نے دیکھے ہی کہاں ہیں۔

اگر یہ خبر ان میں بھی لگی تو صاف ظاہر ہے کہ آخری کاپی پریس میں جانے سے پہلے یہ خبر سب کے پاس پہنچ گئی تھی اور ایسا جب ہی ممکن ہے جب کارروائی کا آغاز ہوتے ہی خبر دی جاتی۔ اس وقت جو ختم تھا جب کارروائی ختم ہوئی تو سب اخبارات زیر اشاعت تھے۔ غازی جس خبر پر اپنی اجارہ داری رکھنا چاہتا تھا تو وہ باقی نہیں رہی تھی۔ اس لئے خود غازی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔"

"گویا شک صرف ایس ایس پی جاوید صدیقی پر ہی جاتا ہے۔"

"بالکل۔ یہ اطلاع سب سے پہلے اس کو دی گئی۔" میں نے کہا "کیا فون خود اس نے ریسیو کیا تھا؟"

"ہاں ریسیور اس نے اٹھایا تھا۔" محسن بولا۔

"پھر یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا فون ٹیپ ہو رہا ہو۔ یہ جاننے کے لئے کہ تحقیق کس رخ پر جا رہی ہے اور کہاں تک پہنچی ہے۔ دادا اینڈ کمپنی کو تازہ ترین صورت حال کا علم رہتا تھا۔ اس اطلاع پر وہ فوراً حرکت میں آگئے اور انہوں نے دونوں بندوبست کر لئے۔ دادا کو پولیس کی تحویل سے چھڑا لے جانے کا۔ اس کے لئے زر کے ساتھ زور بھی استعمال کرنے کا پکا انتظام ہو گا۔ دوسرا خبر بدلنے کا۔ انہوں نے خصوصی خبر اور خصوصی تصاویر بنانے والے رپورٹر اور فوٹو گرافر کا کام تمام کر دیا اور اخبارات کو بالکل بدلی ہوئی خبر جاری کروا دی۔ اس سے معاملے کی نوعیت یکسر بدل گئی اور پولیس پر بھی نااہلی کا الزام نہیں آیا۔ شوکت رانا کی کوٹھی میں قتل اور آتش زنی و ڈکیتی کا رنگ دے دیا گیا اور ساتھ ہی ایک صحافی اور فوٹو گرافر کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی خبر کے بعد کوئی ثبوت باقی نہیں چھوڑا گیا کہ وہ کہاں سے آرہے تھے اور کہاں جا رہے تھے۔ کیمرا فلم اور خبر سب غائب۔ شوکت رانا کی کوٹھی کے فون خود ہم نے بے کار کر دیئے تھے۔ وہاں سے کوئی تصدیق کرتا بھی تو کیسے اور کرنے والوں نے پکا بندوبست کیا تھا کہ خبر ایسے ہی چھپے جیسے وہ چاہتے ہیں۔"

"نہ جانے کیوں مجھے یقین نہیں آتا کہ خود ایس ایس پی جاوید صدیقی یہ حرکت کر سکتا ہے۔" محسن بولا "وہ بہت صاف گو آدمی ہے اور اس معاملے میں اپنی نیک نامی کو بالکل داؤ پر لگانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے ہم سے پورا تعاون کیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ صحافی اور وکیل مل کے کوئی چکر چلا رہے ہیں اور پولیس سے زیادہ پولیس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ رات بھی اس نے کہا تھا کہ مجھے لگتا ہے شوکت رانا کے خلاف سازش ہوئی ہے۔"

"چلو پھر اسی سے پوچھتے ہیں۔ خبر اس نے بھی پڑھی ہو گی۔ دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔"

رابعہ نے پولیس ہیڈ آفس سے اس کی رہائش کا نمبر پوچھا تھا مگر وہ آفس ہی میں مل گیا۔ میں اور محسن دوسرے کمرے میں فوراً فون پر ان کی گفتگو سننے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ ٹیلی فون کا چھوٹا سا اسپیکر دونوں طرف کی آواز سنا رہا تھا۔

"مس رابعہ۔ کیا ابھی سو کے اٹھی ہیں آپ۔" وہ بولا۔

"اب تو دوپہر ہونے والی ہے۔"

"ہاں۔ مگر رات بھر کی جاگی ہوئی تھیں آپ بھی۔ میں سمجھا کہ دیر سے آنکھ کھلی ہو گی۔ اس لئے فون نہیں آیا۔"

رابعہ بولی "آپ انتظار کر رہے تھے میرے فون کا؟"

"میں تو صبح سے آپ کو فون کر رہا ہوں۔" جاوید صدیقی نے کہا "لیکن آپ سے کہیں بھی رابطہ نہیں ہوا۔"

"میں یہاں وقار یوسف صاحب کے گھر میں تھی۔"

"وہاں گھنٹی مسلسل بج رہی تھی مگر ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔ اس سے اندازہ ہوا مجھے کہ سب سو رہے ہیں۔"

"لیکن یہاں تو گھنٹی نہیں بجی۔ ایک بار بھی... اور فون ٹھیک نہ ہوتا تو آپ سے بات بھی نہ ہوتی۔"

"آپ کا فون ون وے تو نہیں چل رہا ہے۔ ایسا ہوتا ہے بعض اوقات۔ کال صرف آتی ہے یا صرف جاتی ہے۔"

"میں چیک کر لیتی ہوں۔" رابعہ نے کہا "آپ نمبر ملایئے۔"

رابعہ نے ریسیور رکھا اور انتظار کرتی رہی۔ دو منٹ کے بعد اس نے دوبارہ ایس ایس پی کا نمبر ملایا "کال کی تھی آپ نے؟"

"کم از کم چار مرتبہ۔ مجھے گھنٹی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔"

رابعہ نے کہا "پھر آپ کی بات ٹھیک ہے۔ یہ فون کی خرابی ہے۔ صبح سے نہ جانے کس کس نے کال کیا ہو گا۔"

"مجھے منظر صاحب نے کال کیا تھا۔ ابھی دس منٹ پہلے۔ وہ واقعی سو کے اٹھے تھے اور سونے سے پہلے انہوں نے ریسیور نیچے رکھ دیا تھا تاکہ نیند ڈسٹرب نہ ہو۔ وہاں بھی کوشش کی تھی میں نے آپ سے رابطہ کرنے کی مگر فون مسلسل انگیج ملا۔ تیسری جگہ آپ کا آفس ہو سکتی تھی مگر آپ ہماری طرح چوبیس گھنٹے کی پبلک سرونٹ تو نہیں ہیں کہ اتوار کو بھی موجود رہیں۔ آزادی بھی حاصل ہے آپ کو اور عزت بھی۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ آپ کے پاس تو سب کچھ ہے۔ دولت بھی اور شہرت بھی اور برا نہ مانیں تو عرض کروں کہ دولت حسن بھی۔ جو شاید کسی وکیل کے پاس نہیں۔"

"شکریہ۔" رابعہ نے کہا "اب اصل بات کی طرف آیئے۔ کیا آپ نے اخبار دیکھا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کیسے پولیس افسر ہیں آپ۔ حالات سے اتنی بے خبری۔"

"افوہ۔ ذرا مجھے بھی عرض کرنے دیں نا۔ آپ نے اخبار پوچھا تھا تو میں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے اخبارات دیکھے ہیں سب اور اسی لئے مجھے انتظار تھا آپ کے فون کا۔ بڑی شدت سے۔ مجھے حیرت تھی کہ آپ نے مجھے یاد نہیں کیا۔ کیا ہماری گفتگو کوئی اور بھی

www.paksociety.com

سن رہا ہے؟"

رابعہ چونکی "جی... جی نہیں۔ یہ شک کیوں ہوا آپ کو؟"

"دیکھیں جی ہمارے کان بڑے تیز ہوتے ہیں۔ ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ ایک شخص بات کر رہا ہے یا دو ریسیور استعمال ہو رہے ہیں۔ آپ کی آواز کے ساتھ ہلکی سی گونج ہے اور سرسراہٹ ہے۔ ویسے کوئی حرج نہیں اگر ایکس ٹینشن پر وقار یوسف یا وہ فرنچ وکیل بھی کان لگائے بیٹھے ہوں۔"

"میرا شک اس کے برعکس ہے ایس ایس پی صاحب۔ غالباً آپ کا فون ٹیپ ہو رہا ہے۔ کوئی اور ہماری گفتگو سن رہا ہے جس کا آپ کو علم نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ایسے ہوتا ہے سر کہ جو ٹیلی فون لائن یہاں سے وہاں تک جا رہی ہے وہ جنکشن باکس اور ایکسچینج سے گزرتی ہے اور پھر ایکسچینج سے اتنے لمبے راستے پر کوئی بھی فون ٹیپ کرنا چاہے تو اسے کون روک سکتا ہے۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ فون پہلے سے ٹیپ ہو رہا تھا اور آپ اسی خوش فہمی کا شکار رہے کہ کسی ایس ایس پی کا فون ٹیپ کرنے کی جرات بھلا کون کر سکتا ہے۔"

"دیکھیں۔ آپ کی فکر بجا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ایسا ہو سکتا ہے۔"

"ایسا ہوا ہے صدیقی صاحب" رابعہ نے اس کی بات کاٹ کے تیز لہجے میں [illegible] "ورنہ یہ سب ممکن نہیں تھا۔ میں قصوروار آپ کو نہیں سمجھتی مگر کوتاہی ضرور ہوئی آپ سے۔ ذمے دار آپ ہی کو سمجھا جائے گا۔ [illegible] ہم ہی ہوں گے تو آپ کے پیش رو کا ہوا تھا۔ یہ معاف نہ کرنے والا [illegible] ہے۔"

"آپ فضول بولتی جا رہی ہیں مس رابعہ۔ ایسی کون سی کوتاہی ہوئی ہے مجھ سے آخر۔ کس معاملے کو دبانے کی کوشش کی ہے میں نے۔" صدیقی گرم ہو گیا "میں نے جتنا تعاون کیا ہے اتنا کوئی اور پولیس آفیسر نہیں کر سکتا تھا۔"

"مگر اس تعاون کا نتیجہ کیا رہا۔ صفر جمع صفر مساوی ہے صفر۔"

"کیوں؟ کیا دلاور گرفتار نہیں ہوا؟ آپ کی اطلاع کے لئے ہی میں نے پہنچایا تھا۔"

"اور اس کے بعد؟" رابعہ نے طنز سے کہا۔

"اس کے بعد کیا؟"

"وہ کیسے نکل گیا آپ کی تحویل سے۔ زور یا زر؟"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔" صدیقی ایک دم بگڑ گیا "کس الو کے پٹھے نے دی ہے یہ خبر۔ کوئی اور ہوتا تو میں پوچھتا کہ تم نشے میں تو نہیں ہو یا دماغ تو نہیں چل گیا ہے تمہارا۔"

رابعہ نے کہا "دلاور کہاں ہے پھر؟"

"دلاور اسپتال میں ہے۔ پولیس کے پہرے میں۔ پرندہ پر نہیں مار سکتا وہاں خاتون۔ چنڈو خانے کی خبروں پر اعتبار مت کریں۔"

"کس اسپتال میں ہے وہ؟"

"یہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا ورنہ کوئی معلوم کر سکتا ہے۔ ایسا سیکیورٹی کی خاطر کیا گیا ہے۔"

رابعہ الجھن میں پڑ گئی "میں کیسے مان لوں کہ....."

"دیکھیے۔ آپ ایک ذمے دار خاتون ہیں۔ بہت بہتر ایڈووکیٹ ہیں۔ آپ کوئی عام قسم کی گھریلو عورت نہیں ہیں جس کو بات کرنے کے آداب نہ آتے ہوں۔ آپ ایک ایس ایس پی سے مخاطب ہیں۔ یہ خیال رکھیں بالکل اسی طرح جیسے آپ کسی جج سے بات کرتے ہوئے اس کے عہدے اور مرتبے کا لحاظ کرتی ہیں۔ میرے عہدے کی بھی ایک PRESTIGE ہے۔ آپ جھوٹا کہہ سکتی ہیں ایک نچلے درجے کے اہلکار کو۔"

"آئی ایم سوری۔" رابعہ نے کہا "میں ہرگز آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتی۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ کے یقین کی بنیاد کیا ہے؟"

"یقین کی بنیاد ہے میرا فول پروف بندوبست۔ جب تک چوہدری دلاور میری تحویل میں ہے اس کی روح پر تو ہمارا اختیار نہیں مگر جسم سلامت رہے گا اور ہم اسے مرنے بھی نہیں دیں گے۔ میرے علاوہ صرف شہر کے ڈی آئی جی کو علم ہے کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے جو لوگ اس کی حفاظت پر مامور ہیں انتہائی ذمے دار اور مستعد ہیں۔ پھر بھی انہیں بتا دیا گیا ہے کہ کوتاہی پر بخشش نہیں ہے۔ دلاور کے بارے میں کوئی انفارمیشن لیک آؤٹ ہوئی یا میری تحریری اجازت کے بغیر کوئی اس سے ملا تو انہیں فوراً برخاست کروایا جائے گا۔ گرفتاری بھی ہو سکتی ہے ان کی۔ وہ اسپتال ایک پرائیویٹ کوٹھی ہے جس کو سب جیل قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کے گرد دوہرا حفاظتی انتظام ہے۔ اندر تربیت یافتہ کمانڈوز ہیں۔ باہر سادہ لباس والے مسلح محافظ پھر کوٹھی کے احاطے کو مسلح پولیس فورس نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ مجھے بتائیے اس سے زیادہ سیکیورٹی ممکن ہے؟ اور یہ سب میں دلاور کی وجہ سے نہیں کر رہا ہوں۔ اپنی گڈول بچانے کے لئے کر رہا ہوں مس رابعہ۔ اس مرحلے پر جب میرا ایک مشن پورا ہو گیا ہے میں بدنامی کا داغ کیوں مول لوں؟ جب ملزم کو ریمانڈ کے لئے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا تو میری ذمے داری ختم ہو جائے گی۔"

رابعہ کے ساتھ ہم بھی اس اطلاع پر حیران تھے مگر اب شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

رابعہ نے کہا "اچھا شوکت رانا کہاں ہے؟"

"تو جیل وہ بھی ہے۔ وہ میرا سر درد نہیں ہے۔ مقامی پولیس کی تحویل میں ہو گا۔" صدیقی نے کہا "لیکن دلاور کے بارے میں آپ کو کس نے یہ بے بنیاد اطلاع دی تھی کہ وہ فرار ہو گیا یا کرا دیا گیا۔ زور یا زر والی تو بات کس نے کی آپ سے؟"

"وہ دراصل۔ خبر سے مجھے مغالطہ ہوا۔" رابعہ نے اپنی صفائی

پیش کی "ایک تو اس کی گرفتاری کا سرے سے کوئی تذکرہ نہیں۔"

"اس کی جواب طلبی کے لئے میں ہی رہ گیا تھا خاتون؟ یہ کام ہے آپ کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے والے صحافیوں کا۔ ان سے پوچھا آپ نے؟"

رابعہ نے کہا "ان سے کیسے پوچھ سکتی تھی میں۔ انہیں تو مار دیا گیا ہے۔ نازی کے ساتھ جو فوٹوگرافر تھا۔"

"ویری گڈ۔ آپ کو شبہ ہے یا پولیس پر شک ہے کہ یہ کارنامہ بھی ہم نے سر انجام دیا ہے؟" صدیقی نے تلخی سے کہا "یہ گفتگو ٹیپ ریکارڈ ہو رہی یا کسی کے سامنے ہوتی تو میں آپ پر ہتک عزت کا کیس کر دیتا۔"

"نہیں قتل تو کیا گیا ہے۔"

"یہ ثابت کر سکتی ہیں آپ؟ میں آپ کی طرف سے رپورٹ لکھوا دیتا ہوں ابھی دو منٹ میں۔" صدیقی نے کہا۔

"یہ تو صاف ظاہر ہے سر۔ کون سی ڈھکی چھپی بات ہے۔"

"کیوں صحافی صرف قتل ہوتے ہیں۔ حادثے کا شکار بھی نہیں ہو سکتے۔ کوئی گارنٹی ملتی ہے انہیں فرشتہ اجل کی طرف سے؟ ہم ادائے فرض میں بھی مارے جائیں تو پبلک کہتی ہے کتے کی موت مارے گئے۔ صحافی کیا آسمانی مخلوق ہیں کہ ان کا مقدر شہادت ہو؟"

"اس اتفاق سے آپ کیا نتیجہ نکالتے۔ صرف وہی دو افراد جانتے تھے گزشتہ رات کی کارروائی کے بارے میں۔"

"یہ بھی مفروضہ ہے آپ کا۔ ہر اخبار میں یہ خبر ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ انہیں یہ خبر دینے والا کون تھا؟"

رابعہ پھر چونکی "نہیں۔ آپ جانتے ہیں؟"

"جی مگر آپ نہیں کی کہ مرنے والا تو نازی سے شہید ہو گیا۔ اب آپ جو الزام چاہیں عائد کریں۔ وہ تردید کرنے کے لئے نہیں آئے گا۔"

"یہ... یہ خبر نازی نے خود فراہم کی تھی؟"

"فراہم نہیں کی تھی۔ فروخت کی تھی۔ صرف [illegible] مسز دلاور سے بھی اس اطلاع کا معاوضہ وصول کر لیا تھا اس نے اور دلاور کی بیوی نے پورا بندوبست بھی کر لیا تھا پولیس کی تحویل سے اپنے شوہر کو چھیننے کا مگر ایک تو یہ ممکن نہیں تھا۔ اتنی زیادہ مسلح گارڈ ساتھ رکھی تھی میں نے کہ اس کا مقابلہ دلاور کی غنڈا فورس نہیں کر سکتی تھی۔ واپسی پر میں نے راستہ بھی بدل دیا تھا اور دلاور کو لے جانا تھا سیدھا اسپتال۔ میں لے گیا کہیں اور۔ اس کے علاوہ خود نازی نے اسے منع کر دیا تھا کہ ایسی حماقت نہ کرے۔ اس سے دلاور کا کیس زیادہ خراب ہو جائے گا۔ قانونی طور پر اس کی ضمانت کے لئے کوشش کرنا بہتر ہو گا۔"

"یہ مشورہ نازی نے دیا تھا؟"

"یس میڈم۔ نازی ایک طرح سے دلاور کا پے رول پر تھا۔ وہ ڈبل ایجنٹ تھا۔ کالی بھیڑیں صحافیوں میں بھی ہوتی ہیں۔"

"یہ تو خیر ٹھیک کہا آپ نے۔ لیکن آپ کو یہ سب کس نے بتایا؟"

"وکیل صاحبہ۔ میرے وسائل اور [illegible] کو چیلنج مت کریں۔ اگر میں صورت سے بے وقوف لگتا ہوں تو الگ بات ہے لیکن میرا آئی کیو سو سے اوپر ہی ہے۔ صحافی نے قیمت وصول کی تھی تصاویر شائع نہ کرنے کی۔ تصویریں صرف اس کے پاس تھیں۔ گرفتاری کے وقت ایک ہی فوٹوگرافر تھا جسے وہ خود لایا تھا۔ مسز دلاور کو گرفتاری پر اعتراض نہیں تھا۔ وہ باعزت گرفتاری کی خبر بنانا چاہتی تھی۔ ہتھکڑی اور حوالات کے بغیر۔ اگر وہ دلاور کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو بعد میں دلاور خود تھانے آ کے گرفتاری پیش کرتا۔ ضمانت قبل از گرفتاری لینے کے بعد۔ آئی بات سمجھ میں!"

ایس ایس پی نے غصے میں فون بند کر دیا تھا اور اب رابعہ خفت زدہ سی بیٹھی تھی۔

میں نے کہا "یہ معاملہ تو کچھ اور نکلا۔ ساری کارستانی نازی کی تھی۔"

"ایسا بھی ہوتا ہے بھائی۔ مگر ایسے لوگوں کا انجام بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ نازی کے بارے میں ہم شروع سے جانتے تھے کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے۔ وہ بلیک میلر تھا اور بے کردار۔"

رابعہ نے کہا "آخر مارا گیا۔ جو پیسہ لیا تھا وہ کس کام آیا؟ کفن تک تو لے گا نہیں اس سے۔"

میں نے کہا "تم جذباتی ہو رہی ہو۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ ان حالات میں دلاور کی بیوی کا رد عمل کیا ہو گا۔ صبح اس نے دھمکی دی تھی کہ اب نازی کی خیر نہیں۔ اس وقت وہ ناکامی کی جھلاہٹ میں مبتلا تھی اور اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ فی الحال تو اس کی ساری جدوجہد دلاور کا سراغ لگانے کے لئے ہو گی۔ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ دلاور کو پولیس نے گرفتار کیا تھا مگر یہ نہیں معلوم کہ پولیس اسے کہاں لے گئی ہے۔ ظاہر ہے وہ ہر تھانے سے ہر ذریعے سے افسران اعلیٰ سے پتا چلانے کی کوشش کرے گی۔ وہ اسپتالوں سے معلوم کرے گی اور جیل میں دیکھے گی۔ مجھے ڈر ہے کہ ایس ایس پی صاحب کا فول پروف سیکیورٹی نظام زیادہ موثر ثابت نہیں ہو گا۔"

محسن بولا "بات صرف چوبیس گھنٹے کی ہے۔ آج چھٹی تھی۔ کل لازمی طور پر پولیس اس کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرے گی اور اس کا جسمانی ریمانڈ لے گی۔"

میں نے کہا "اس کیس میں ایسا نہیں ہو گا۔ ملزم کی جسمانی حالت اس قابل ہی نہیں کہ اسے عدالت میں پیش کیا جائے۔ عدالت خود اس کے پاس جائے گی۔ مجسٹریٹ وہیں جا کے ریمانڈ دے گا جہاں دلاور کو علاج کے لئے رکھا گیا ہے۔"

محسن بولا "لیکن اس کا وکیل مل سکتا ہے اس سے۔"

"اگر خود دلاور یہ درخواست کرے تو" رابعہ نے کہا "بصورت

www.paksociety.com

مگر اس کی بیوی اپنے شوہر کی طرف سے درخواست دے گی کہ وہ پولیس کی تحویل میں ہے۔ اس کو خطرہ ہے کہ پولیس تفتیش میں تشدد کرے گی۔ اس کا شوہر بیمار ہے۔ اس کی جان جا سکتی ہے۔ اس کا طبی معائنہ کرائے' اس کی ضمانت منظور کرائے اور دلاور کے وکیل کو اس سے ملنے کی اجازت دلوانے کے لئے بہت سی درخواستیں دائر ہوں گی اور ان پر قانون کے مطابق نوٹس جاری ہوگا۔ سرکاری وکیل کو جواب داخل کرنے اور عدالت کے احکامات ہونے میں کچھ وقت بہرحال لگے گا۔ پھر یہ ایس ایس پی جاوید صدیقی بھی بہت گھاگ ہے۔ وہ آخری حربہ استعمال کرے گا۔ ہفتہ دس دن گزار دے گا اور اس عرصے میں دلاور اس قابل ہو جائے گا کہ عدالت میں پیش ہونے یا وکیل کی ملاقات سے پہلے اس کا بیان ریکارڈ کرلے۔"

فی الحال ہم بھی ایس ایس پی کی بات پر یقین کرنے پر مجبور تھے۔ ہمارے پاس تصدیق کے ذرائع نہیں تھے اور دلاور کا سراغ لگانا آسان نہیں تھا۔ شوکت رانا کا پتا چلایا جا سکتا تھا کہ وہ کس تھانے میں ہے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ثاقب کی بازیابی اور مارگریٹ کے ساتھ آجانے سے وہ مسئلہ باقی نہیں رہا تھا جس کا تعلق شوکت رانا سے تھا۔

ہمیں اب صرف نازو کی فکر تھی۔ ہمارے سر سے یہ بوجھ تو اتر گیا تھا کہ ثاقب نے مارگریٹ سے شادی کرلی ہے مگر یہ خطرہ اپنی جگہ موجود تھی کہ کیا شوکت رانا نے نازو کو زبردستی اپنی بیوی بنا لیا تھا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جو دل نہیں مانتا تھا لیکن عقل کو اندیشوں سے دور رکھنا محال تھا۔

رابعہ نے کچھ دیر بعد کہا "آخر دلاور کی گرفتاری کی خبر چھپائی کیوں گئی ہے۔ جبکہ ان لیا کہ دلاور کی بیوی نے تذلیل سے بچنے کے لئے فوٹو گرافرز، رپورٹرز کو خرید لیا تھا مگر پھر انہیں سوانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"غازی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے اس کے دل میں بے ایمانی آگئی ہو۔ پہلے اس نے وعدہ کرلیا ہو کہ وہ دلاور کی گرفتاری کے بارے میں کوئی خبر صبح کے اخبار میں نہیں دے گا اور نہ تصویر۔ خبر چھپائی نہیں جا سکتی مگر تصویر کسی اور کے پاس تھی ہی نہیں۔ غازی نے سوچا ہو گا کہ بعد میں مسز دلاور سے کچھ اور رقم اینٹھی جائے۔ اس نے تصویروں کے ساتھ نیگیٹو بھی مانگے ہوں گے جو غازی کو منظور نہیں ہوگا۔ دلاور اس کے لئے سونے کی کان تھا۔ خود دلاور سے بعد میں اس کی عزت کا سودا کیا جا سکتا تھا۔" محسن بولا۔

"شاید مسز دلاور بھی یہ سمجھتی ہوگی کہ صرف غازی کا وعدہ کافی نہیں۔ وہ فلم بھی چاہتی تاکہ اسے ضائع کروایا جائے اور آئندہ کا خطرہ باقی نہ رہے۔ اب آدھی رات کے وقت کیا ہوا۔ یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسی فلم کی وجہ سے ان کی جان گئی۔ ممکن ہے انہوں نے فرار ہونے کی کوشش کی ہو اور فلم واپس لینے کے لئے ان کا تعاقب کرنے والے مجبور ہوگئے ہوں کہ انہیں ٹکر مار کے گرا دیں۔ وہ موٹر سائیکل پر ہوں گے پیچھا کرنے والے گاڑی میں۔ یہ ٹرک والی بات فضول ہے۔ صرف زیب داستان کے لئے۔ یہ کوئی کیسے بتا سکتا ہے کہ ٹکر کار نے ماری تھی جیپ نے ویگن بس یا ٹرک نے۔" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "وہ خود گرفتاری پیش کرتا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"سمجھ میں تو میری بھی نہیں آئی تھی۔" رابعہ نے کہا۔

"پھر ایس ایس پی صاحب سے پوچھا کیوں نہیں تھا؟"

رابعہ نے کہا "موقع ہی کہاں رہا اس نے فون بند کردیا۔ وہ اپنی بے عزتی کے احساس سے مشتعل تھا۔"

"تم نے کیا بے عزتی کی تھی اس کی؟"

"اس کا خیال ہے کہ ہم اس کے عہدے اور مرتبے کا لحاظ نہیں کرتے۔ اسے مجھوٹے وار سمجھتے ہیں۔ اور بے وقوف۔ اسی لئے تو کہہ رہا تھا کہ میری ذہانت کا معیار سو سے اوپر ہے۔" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "اس سے پوچھو کہ آخر وہ گرفتاری کی خبر کتنے دن چھپائے گا۔ اور جب بھی دلاور کو عدالت میں پیش کیا جائے گا تو اخبار والے ہوں گے "ایک نہیں دس ہوں گے۔ تصویریں بنائیں گے اور دلاور کے ہاتھوں میں ہتھکڑی بھی لازمی ہوگی۔"

رابعہ نے کہا "دلاور کی بیوی کل ہی ہائی کورٹ میں جس بے جا کی درخواست دائر کردے گی کہ پولیس نے اس کے شوہر کو پکڑا ہے لیکن کسی عدالت میں پیش نہیں کیا اور اس نے وہ لواحقین کو اطلاع نہیں۔ پولیس سے پوچھا جائے کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے پھر کیا ایس ایس پی صاحب یہ حلف نامہ داخل کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے کہ دلاور پولیس کی تحویل میں نہیں ہے۔"

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا "محسن صاحب آپ اسے ناممکن کیوں سمجھتے ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"کیا پولیس والے جھوٹ نہیں بولتے؟ کیا وہ عدالت میں حلفیہ بیان داخل نہیں کرسکتے کہ دلاور ان کی تحویل میں نہیں ہے اور انہوں نے دلاور کو گرفتار ہی نہیں کیا۔ وہ دلاور کا سودا اس کی بیوی سے کرلیں اور اس سے کہہ دیں کہ اپنے شوہر کی وہ خود ذمے دار ہے۔ اب تک وہ لاپتا تھا۔ آئندہ بھی لاپتا رہے ورنہ پولیس اسے گرفتار کرنے پر مجبور ہوگی۔ دلاور کی بیوی اسے چپکے سے باہر نکال دے گی۔ ملک سے باہر۔"

رابعہ پریشان نظر آنے لگی "یہ ہو تو سکتا ہے مگر....."

"مگر کیا۔ تم سمجھتی ہو جھوٹا بیان حلفی داخل نہیں کیا جا سکتا۔"

"نہیں۔ اتنا عرصہ پریکٹس کرنے کے بعد مجھے یہ خوش فہمی نہیں رہی کہ جھوٹا حلف کوئی نہیں اٹھاتا۔ پولیس کی بات چھوڑو عام آدمی بھی بڑا گناہ گار ہوتا ہے۔ میں نے تو بڑی بڑی داڑھی والوں' شرعی حلئے اور صوفیانہ وضع رکھنے والوں کو ایسا سفید جھوٹ بولتے اور جانتے بوجھتے جھوٹا حلف اٹھاتے دیکھا ہے کہ میں دنگ رہ گئی تھی اور کمال یہ ہے کہ ایسے لوگ بڑی ڈھٹائی سے اپنا دفاع بھی کرتے ہیں کہ اشد ضرورت میں جب سوال زندگی اور موت کا ہو تو حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔ کسی بے گناہ کی جان بچانے کے لئے جھوٹا حلف اٹھانا جائز ہے۔ کیا عجیب منطق ہے۔"

"پھر تمہیں کیوں خوش فہمی ہے کہ دلاور کے کیس میں ایسا نہیں ہو سکتا۔" محسن بولا۔

میں نے کہا "ایک تو مجھے یہ ایس ایس پی ذرا مختلف قسم کا آدمی لگتا ہے۔"

"ایک شعر مرزا غالب نے سو سال پہلے آج کے لئے کہا تھا اور آج سے سو سال بعد بھی ہوگا۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا"

محسن بولا "جو جیسا لگتا ہے ویسا ہو۔ یہ ضروری تو نہیں اور صدیقی کیا ہے۔ ایک ایس ایس پی جسے کسی بھی وقت اس کی تفتیش سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ اوپر سے احکامات صادر ہو جائیں گے۔ فلاں کو چارج دو اور ہیڈ آفس میں رپورٹ کرو۔ اس کے خلاف ... نہیں ہے تو صدیقی کو باعزت طور پر او ایس ڈی بنا یا ... ہیڈ آفس میں کسی فضول سے شعبے کا نگراں بنا کے بٹھایا ... نامہ کوئی اور داخل کرنے آجائے گا۔"

... "محسن کی بات میں بہت وزن ہے مس رابعہ۔ اگر ... کی بیوی اوپر تک ذور ڈلانے میں کامیاب رہی تو ایک دو دن ... یہ ہوگا۔ صدیقی اتنا بے وقوف بھی نہیں ہے کہ دلاور کی خاطر اپنے کیریر کو داؤ پر لگا دے اور اوپر سے حکم آئے کہ شٹ اپ تو شٹ اپ نہ ہو۔"

"مرحوم انکل محسن رضوی کو یاد کرو۔ وہ ہوتے تو کیا ان کی آواز کو دبا سکتا تھا کوئی۔ وہ عدالت میں پہنچ جاتے بیان دینے کے لئے کہ جناب والا میں نے گرفتار کیا تھا دلاور کو فلاں دن اتنے بجے رات کو اور فلاں فلاں کی موجودگی میں اور پھر فلاں جگہ پہنچایا تھا۔ پولیس نے جھوٹا حلف نامہ داخل کیا ہے۔ انہوں نے اسے فرار کرادیا ہے۔ فرض کرو یہ صدیقی بھی ایسا ہی ثابت ہوا۔"

میں نے کہا "او کے ہم فرض کرلیتے ہیں کہ صدیقی ... فرض شناس ہے اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہے گا۔ کوئی افسر اس کو دھمکیاں دے وہ اپنے ضمیر کی آواز دنیا کو سنوائے گا۔ نوکری گنوائے گا اور نقصان اٹھائے گا۔ پچھتائے گا مگر اس سے فرق کیا پڑے گا پولیس کو یا دلاور کو۔ پولیس؟ محکمہ ایسے ہی رہے گا۔ دلاور باہر جا چکا ہوگا آپ جتنا چاہیں راویلا کریں۔"

محسن بولا "آخر منظر اور راوی رابعہ۔ تم یہ گواہ ہیں۔"

"ہم پارٹی ہیں' ایک فریق ہیں۔" رابعہ نے کہا "ہماری کیسی گواہی۔"

"اپنے فریق وکیل صاحب ہیں۔"

"مجھے مت مروا یار۔ عدالت میں گیا تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ میں ان سرکاری اور قانونی معاملات سے دور ہی محفوظ ہوں۔ کیس میری شناخت مانگ لی گئی تو جو پکڑا جائے گا وہ سکندر بخت ہوگا۔ رہ گئے تم اور مولوی خادم حسین۔ تمہیں پولیس بند کرائے گی تو تمہاری زبان بھی بند ہو جائے گی۔ تم پر درجنوں مقدمات قائم ہو جائیں گے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ ابھی تک آزاد پھر رہے ہو۔"

دوپہر ہو گئی تھی۔ ابھی تک وقار یوسف لوٹ کر نہیں آیا تھا اور رابعہ کو خانہ دار خاتون کی حیثیت سے دوپہر کے کھانے کی فکر لاحق ہو رہی تھی۔ یہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ انتظار کا وقفہ کتنا طویل ہوگا۔

محسن نے کہا "وقار نے حد کردی۔ دو گھنٹے اور ہیں منٹ ہوگئے۔"

"جانے اور آنے میں ہی ایک گھنٹا لگ جاتا ہے۔ وہاں پہنچ کے ہی وقار فوراً واپس نہیں آسکتا۔ تین عورتوں کے ساتھ وہ ایک مرد ہے سب ذمے داری اس کی ہے۔" میں نے کہا۔

"اسے فون کرکے بتا دینا چاہئے۔"

رابعہ ہنسنے لگی "وہاں فون کب کا کٹ چکا ہوگا۔ سارے بل اندر پڑے رہ گئے ہوں گے۔ یہ بھی پتا نہیں کہ بجلی والوں نے بھی بجلی کاٹنے میں اپنی کارکردگی کا مظاہرہ تو نہیں کیا۔"

"ہاں۔ فراہمی کے معاملے میں وہ اتنے مستعد نہیں ہوتے۔"

"بجلی فون سب سے پہلے کٹ جاتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"اور اگر وہ کہیں سے فون کرے گا تو ہمیں کیسے پتا چلے گا۔ یہاں تو فون ایک طرف دھرا ہے۔ وقار یوسف پریشان ہو رہا ہوگا کہ گھنٹی مسلسل بج رہی ہے مگر ریسیور کوئی نہیں اٹھاتا۔"

محسن نے کہا "تمہیں یاد ہے پہلے کیا نمبر تھا تمہاری حویلی کا۔"

"اسے حویلی کیوں کہتا ہے یار۔" میں نے کہا۔

"پھر کیا غریب خانہ کہوں۔ اتنے عالی شان محل کو۔"

"یہ حویلیاں اور محل اب کہاں رہے ہیں۔ جو ہیں وہ آسیب زدہ لگتے ہیں اور آثار قدیمہ ہیں۔ یاد ایام عشرت فانی۔ محل اور مقبروں کی ایک ہی فضا لگتی ہے۔ لوگوں نے عبرت پکڑنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ ہمارا گھر تو بس گھر ہے اور گھر کے پیچھے ... سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

محسن نے کہا "میں نے نمبر پوچھا تھا۔ ٹیلی فون ... آپ تو جذباتی اور فلسفی ہوگئے۔"

میں نے کہا "نمبر رابعہ کو معلوم ہے۔"

www.paksociety.com

رابعہ نے کوشش کی مگر حسب توقع وہاں بھی گھنٹی بجتی رہی۔
"لائن کٹ چکی ہے۔" اس نے مایوسی سے کہا۔
"آخر ہم کب تک انتظار کریں گے۔ میں تو سونے جا رہا ہوں۔ کل رات بھی ایسے ہی گزری۔" محسن نے کہا اور اٹھ کے اندر چلا گیا۔
رابعہ نے کہا "اب ہم کیا کریں۔"
"ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں مل کے۔" میں نے کہا۔
"مثلاً تم آلو چھیلو اور پیاز کاٹو۔ میں آٹا گوندھ کے روٹی ڈالوں۔"
"لاحول ولا قوۃ۔ میں سخت رومانٹک ہو رہا تھا۔" میں نے کہا "تم کچن میں آلو پیاز لے آئیں۔ ہم محبت بھی تو کر سکتے ہیں۔"
"وہ تو زبانی نہیں کی جاتی اور پہلے سے ہے۔"
"اچھا" میں نے اس کا ایک ہاتھ تھام کے کہا "ہم ایک جذباتی فلمی سین کی ریہرسل کر سکتے ہیں۔ تم ظلم و جبر عشق کے اس سین کی۔"
"جس میں ہیروئن زبردستی ہیرو کو اور دولہن کے ساتھ چلی جاتی ہے۔" رابعہ ہنسی۔
"اف۔ تم کس قدر جاہل اور بدذوق ہو۔ فلم کے معاملے میں۔ ایسی فلم بن سکتی ہے بھلا۔" میں نے کہا "اچھا فرض کرو یہ سوئٹ نہیں چودھویں کا چاند ہے مس رابعہ اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ میں اور تم ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی پر کھڑے ہیں۔ دوپہر کا وقت ہے۔ ہر طرف دھول اڑ رہی ہے اور ہم پسینے میں شرابور ہیں۔ دھوپ اتنی تیز ہے۔"
رابعہ کھلکھلا کے ہنسی "کیا زبردست ڈائریکشن ہے۔ چاند سورج۔ برفانی چوٹی اور دھول۔ چاندنی پھوار اور دھوپ سب کو ایک ساتھ کر دیا ہے۔"
"ایسی ہی فلمیں کامیاب ہو رہی ہیں تو میں کیا کروں۔ آرٹ فلم بناؤں اور حقیقت پسندی کے چکر میں دیوالیہ ہو جاؤں۔" میں نے اونگھتے ہوئے کہا۔
"تمہیں بھی نیند آ رہی ہے؟"
"ہاں۔ کیا تم میری خاطر ظالم سماج سے ٹکرا سکتی ہو۔"
"اس ظالم سماج کو سامنے لا کے کھڑا کرو۔ میں تمہاری کھٹارا کار کے ساتھ اس سے ٹکرا سکتی ہوں۔"
"اس کار کی توہین مت کرو۔ وہ کار ایک گھوڑا ہے جس پر سوار ہو کے تمہارے خوابوں کا شہزادہ ایک دن تمہارے گھر آنے گا کہ ... سواڑ والے۔ وہ کار ڈولی ہے جس میں بیٹھ کے تم پیا گھر سدھاروگی۔ پس منظر میں گانا چل رہا ہو گا۔ چھوڑ بابل کا گھر۔"
"اور تم جھے راستے میں پہلے ٹائر پنکچر ہو گا۔ پھر تم ... وہ ٹائر بدلو گے جس کا ٹائر پھٹا ہوا ہے۔ گاڑی اچھلتی ہوئی چلے گی تو سنتری روک لے گا کیونکہ اس کی ایک آنکھ بے نور ہو گی۔ تمہارا چالان ہو جائے گا اور گاڑی دوبارہ اسٹارٹ ہونے سے انکار کر دے گی۔ تم دھکا لگاؤ گے۔ سہرے کے ساتھ۔ کیسا زبردست رومانٹک سین ہو گا۔"
میں نے خفگی سے کہا "تم بہت سنگدل حسینہ ہو۔ ایسی دل توڑنے والی باتیں آج تک کسی ہیروئن نے نہیں کی ہوں گی۔ میں جا رہا ہوں سونے۔"
"کھانا نہیں کھاؤ گے؟"
"نہیں۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔
"اچھا پھر میں جاتی ہوں خادم حسین کے ساتھ۔ تم دروازے بند کر کے سوتے رہو شام تک۔" رابعہ بولی۔
"مولوی سے ہوشیار رہنا۔ اس کا کوئی بھروسا نہیں۔ تمہیں ہی بھگا کے لے جائے۔" میں نے کہا "وظیفہ بھی ہے اس کے پاس کوئی۔"
"ہر وقت اس کے پیچھے مت پڑے رہا کرو۔"
"اس نے بھی حد کر دی۔ فوراً اس کا کرکٹ پر لٹو ہو گیا اور جواز دیکھو ذرا۔" میں نے کہا "ویسے تم کہاں جا رہی ہو؟"
"وہیں۔ جہاں سب گئے ہیں۔"
میں نے کہا "خدا حافظ۔ جاتے ہوئے باہر سے تالا ڈال جانا گیٹ میں بلکہ لکھ جانا کہ اندر کوئی نہیں ہے۔ حملہ آور قاتل اور اغوا کرنے والے زحمت نہ کریں۔ اور ذرا خیال رکھنا۔ اپنا گدھا گاڑی لے جانا دیکھنے میں وہ بھی گاڑی ہی لگتی ہے۔ میری اول بیوی کو ہاتھ مت لگانا۔"
رابعہ ہنسی "میں تمہیں دکھا کے لے جاؤں گی۔ مجھے معلوم ہے میری ... کا نمبر کیا ہے۔"
نمبر پلیٹ خود ہم نے بدل رکھی تھی۔ رابعہ میری گاڑی لے گئی۔ اس کے جاتے ہی میں بستر پر گر کے سو گیا۔ ساتھ والے بیڈ پر محسن پہلے ہی بے سدھ پڑا ہوا تھا۔
میری آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ باہر لائٹ جل رہی تھی اور کسی کے باتیں کرنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے دوسرے بیڈ کی طرف دیکھا۔ محسن مجھ سے پہلے اٹھ گیا تھا۔
"کیا بات ہے۔ صور اسرافیل سے پہلے اٹھ گئے ہو؟" محسن مجھے دیکھ کے بولا۔
وقار اور نگی واپس آ گئے تھے۔ نگی کچن میں تھی۔ اس نے وہیں سے چلا کے کہا "وقار۔ سکندر بھائی کو بھی جگا دو۔ میں بار بار چائے نہیں بناؤں گی۔"
میں نے ڈانٹ کے کہا "مت بناؤ۔ ہم نہیں اٹھیں ..."
وقار نے کہا "آج دن میں تم لوگوں نے کچھ ... ہے۔"
محسن بولا "ہم نے ایک دوسرے ... رہ گئے ... تمہارے غریب خانے میں۔ نقوی صاحب ... تکلیف ہوتی ہو گی کہ ان کی شہزادی بیٹی کس فقیر کے ساتھ ... عسرت کی زندگی گزار رہی ہے۔ بھرے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔"
"فریج میں جھانکنے کی تکلیف کرتے آپ تو بہت کچھ مل جاتا۔" نگی نے کہا "یوں بھوکے کیا لیٹے۔"
"لیکن اس سے میرے مرحوم سسر کی روح کو زیادہ تکلیف ہوتی۔ خیر سے وہ اتنے کنجوس تھے کہ مہمان آ جاتے تو خود بھی سارا دن اور ساری رات بھوکے بیٹھے رہتے تھے۔" وقار نے کہا "تم نے دیکھا تھا انہیں۔ فاقہ زدہ لگتے تھے مگر خود کو اسمارٹ کہتے تھے۔ دن میں ایک بار کھاتے تھے مجبوراً۔"
"وقار۔ بس کرو۔ جھوٹ کی حد ہوتی ہے۔" نگی نے کہا۔
میں نے کہا "باتوں سے میرا پیٹ نہیں بھرے گا نگی۔ میں فریج میں گھس گیا تو سب کچھ کھا جاؤں گا۔ فریج سمیت۔"
"تم تو گھوڑے بیچ کے ایسے سوئے کہ ہمارے آنے کا بھی پتا نہیں چلا۔" نگی نے کہا "ہم وہاں سے بھی فون کرتے رہے۔ فون کا نہیں گیا تھا۔ یہاں کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ اس وقت بھی سو رہے تھے کیا؟"
"نہیں" میں نے کہا "تمہارا یہ فون تمہارے شوہر سے زیادہ ناقابل اعتبار ہو گیا ہے اور جیسے تمہارے شوہر کی تمہارے سامنے آواز نہیں نکلتی۔ ایسے ہی اس کی گھنٹی نہیں بجتی۔ دونوں کو باہر پھینک دو۔"
"ہاں نگی۔ فون کے ساتھ مجھے بھی باہر پھینک دو۔ سڑک پر میں ان کے قدموں میں جا گروں گا۔" وقار نے دانت نکالے "جان دینے کے لئے۔"
"کس کے قدموں میں جان دینا چاہتا ہے آخر۔" میں نے افسوسناک لہجے میں کہا۔
"ارے سکندر بھائی۔ ہمارے ساتھ والے گھر میں دو ولایتی چھمک چھلو آئی ہیں۔ ہیں تو میدان پاکستان مگر ساری عمر لندن میں رہتی ہیں تو اب بات تو یہاں ایسے ٹہلنے نکلتی ہیں جیسے یہ بھی لندن کی سڑک ہے۔ سب مرد کسی نہ کسی بہانے پورچ یا لاؤنج میں بیٹھ کے مطالعہ کرنے لگتے ہیں اور کچھ تو باقاعدہ چہل قدمی کے عادی ہو گئے ہیں۔"
میں نے محسن کی طرف دیکھا "لندن سے آئی ہیں تو پھر انہیں ضرور جانتی ہوں گی۔ یا ہم انہیں ضرور جانتے ہوں گے۔"
"... ہے۔" نگی مسکرائی۔
"... کی بات ہے۔" میں نے کہا "ہماری ایسی دھوم تھی لندن میں بلکہ پورے انگلستان میں کہ جب ہم واپس وطن لوٹے ..."
"بلکہ برطانیہ سے نکالے گئے۔ باقاعدہ ڈی پورٹ کیا تھا پولیس نے پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ۔" محسن بولا۔
"لندن کی نصف لڑکیاں میرے لئے زار و قطار رو رہی تھیں اور باقی نصف محسن کے لئے۔" میں نے کہا "کیا خیال ہے اگر ہم ایک نظر دیکھ لیں۔"
"ایک نظر کیوں۔ رابعہ تو ہے نہیں جی بھر کے دیکھو۔ کل بھی نہیں ہے۔"
وقار مسکینی سے بولا "آپ اجازت دیں تو میں بھی...."
"خبردار جو گھر سے قدم بھی نکالا۔ ٹانگیں توڑ دوں گی۔" نگی نے کہا۔
صرف نگی کو تنگ کرنے کے لئے ہم چائے پینے کے بعد باہر نکل گئے۔ آٹھ بجے کے بعد بھی یہ سڑک بٹ اسٹریٹ کہنا مناسب تھا خالی پڑی تھی۔ سوائے یہاں رہنے والوں کے یہاں سے گزرتا بھی کوئی نہیں تھا۔ دو لڑکیاں بڑے بے باک انداز میں سڑک پر ٹہل رہی تھیں۔ یہ شلوار بھی نہیں تھا ایک طرح کی واک تھی۔ وہ صرف نیکر اور مردانہ قسم کے بغیر آستینوں اور کھلے گلے والے بنیان پہنے تیز تیز قدموں سے آ جا رہی تھیں پھر انہوں نے کچھ جوگنگ کی اور اسی دوران کم سے کم چھ بار ہمارے پاس سے گزریں مگر انہوں نے ایک بار بھی نظر اٹھا کے ہمیں نہیں دیکھا۔ میں ان کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ عام باتیں تھیں۔ وہ یہاں کے موسم سے، یہاں کی معاشرتی اور اخلاقی پابندیوں سے، لوگوں کے رویے سے خاص طور پر خاندان والوں کی سازشوں سے نالاں تھیں جس پر بزرگ حاوی تھے اور خود کو ان ... معاملات کا نگران اور ٹھیکیدار سمجھتے تھے جو لندن کی پروردہ ان لڑکیوں کے نزدیک سو فیصد ان کے ذاتی مسائل تھے۔ ان کے بالغ اور خود مختار ہونے کے حق کو یہاں تسلیم نہیں کیا جاتا تھا اور بزرگوں کی تان اس بات پر ٹوٹتی تھی کہ ہم بڑے ہیں اور تمہارا برا بھلا بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔
میں نے اندازہ کیا کہ وہ لندن کے کس علاقے کی رہنے والی تھیں اور ان کی گفتگو میں کس علاقے کا مقامی اثر تھا۔ درمیان میں ایک نے فرنچ کا محاورہ بھی استعمال کیا اور میں نے اسٹریٹ لائٹ کے نیچے اس کو غور سے دیکھا تو میرا یہ شک بھی یقین میں بدل گیا کہ میں اس کو جانتا ہوں۔ بس مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ لندن میں اس سے میری ملاقات کس تقریب میں اور کہاں ہوئی تھی لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔
میں نے محسن کو اندر بھیج دیا اور جب وہ جوگنگ کے بعد ہانپتی ہوئی میرے قریب سے گزری تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ میرے خیال میں فرنچ جانتی تھی۔
وہ فرنچ سن کے ایک دم ٹھٹکی اور اس کی صورت پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے "تم نے مجھ سے کچھ کہا؟" وہ فرنچ میں بولی۔
"ظاہر ہے تمہارے سوا کسی نے میری بات نہ سنی نہ سمجھی۔"
میں نے کہا "یہ تمہاری دوست...."
"یہ میری بڑی بہن ہے روشی۔ اور میں میری۔" اس نے بے تکلفی سے ہاتھ بڑھا کے مصافحہ کیا بعد میں پتا چلا کہ ایک روشن

www.paksociety.com

آرا تھی اور دوسری صرالنسا۔"

میں نے کہا "میں کبیر ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری تم سے لندن میں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔"

اس کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا "رئیلی؟ تم لندن میں ہو؟"

میں نے دوسری بہن سے ہاتھ ملایا مگر توجہ میری پہلی پر مرکوز رکھی "میں سو فیصد لندن میں ہوں لیکن میری انتہائی بے وقوفی اور بدقسمتی یہ ہے کہ مجھے اتنا حسین چہرہ یاد رہا مگر نام یاد نہیں رہا۔"

وہ مزید خوش ہوئی "ہم بھی لندن سے ہی آئے ہیں دو مہینے کے لئے یہاں سزا بھگتنے۔ اپنے والدین کے ساتھ۔ وہ وطن اور پاکستان کی محبت' خاندان اور رشتوں کے بارے میں انتہائی جذباتی سوچ رکھتے ہیں۔"

اب روشی نے کہا "انتہا یہ ہے بے وقوفی کی کہ ہم سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ ہم بھی انہی جیسے جذبات کا اظہار کریں۔ بھلا یہ ممکن ہے۔ ہمارا کیا تعلق ان سب خرافات سے۔ ہم نے صرف یہاں پیدا ہونے کی غلطی کی تھی مگر کیا وہ ہماری غلطی کہی جا سکتی ہے؟"

"ہمارا کیا اختیار تھا یہاں یا لندن میں پیدا ہونے پر۔ چوائس ہمارا ہوتا تو ہم لندن کو ترجیح دیتے اس فضول سے نام والے گاؤں پر۔ کیا نام ہے اس کا روشی۔ ڈسکہ۔ ادھر ہے سیالکوٹ میں کہیں۔ وہاں ہمارے کچھ آباد اجداد ابھی تک زمانہ قبل از تاریخ کی دنیا میں رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "میں بھی کئی سال سے لندن میں ہوں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے گیا تھا اب ایک طرح سے خود اپنے کاروبار کا مالک ہوں۔ میری فرم ہے ساؤتھ ایسٹ ایشین میڈیا فاؤنڈیشن۔ تم نے نام سنا ہو گا؟"

یہ ایک فرضی کمپنی کا نام نہ ہوتا تب بھی اس کی سمجھ میں نہ آتا مگر اس نے عمدہ اداکاری کی "آف کورس۔ کہیں دیکھا تھا میں نے یہ سائن۔ بھلا کہاں روشی۔ اور اب مجھے بھی یاد آ رہا ہے کچھ کہ ہم مل چکے ہیں۔"

اس کے بعد مراحل خاصے آسان ہو گئے۔ میں نے کہا کہ میرا تو کوئی بڑا بوڑھا ہے نہیں جو میرے معاملات میں ٹانگ اڑائے۔ میں ایک کاروباری دورے پر آیا ہوں اور بہت جلد واپس چلا جاؤں گا۔ قیام دوست کے ساتھ ہے۔ ابھی تک شادی کے چکر میں نہیں پڑا کیونکہ اب تک میری جیسی کوئی لڑکی میری زندگی میں آئی ہی نہیں۔

... کے اس ذومعنی جملے نے میری کو نہال کر دیا۔ وہ سمجھی کہ ... اور اب روشی کے لئے کوئی چانس نہیں۔ روشی ویسے بھی فریج نہیں سمجھی جاتی تھی۔ میری نے اس کو بیک گراؤنڈ کے طور پر چنا تھا اور وہ بولتی بھی کتابی فرنچ تھی۔ میں نے اسے چائے کی دعوت دینے کا سوچا اور پھر ڈنر کی دعوت دے ڈالی جو اس نے تھوڑے سے

سوچ بچار کے بعد قبول کر لی۔ اس نے کہا کہ مسئلہ روشی کا ہو گا۔ ہم ایک ساتھ کہیں بھی جا سکتے ہیں' یہاں ہماری ایک دقیانوسی خیالات والی چچی ہے اسے چکر دینا کوئی مشکل نہیں اور اس کی بک بک سنتا کون ہے۔ میں نے کہا کہ میرے ساتھ ایک دوست ہو گا جو فرنچ نہیں جانتا مگر لندن میں میرے ساتھ ہی ہے۔ وہ روشی کو کمپنی فراہم کرے گا۔ انہوں نے آدھے گھنٹے میں تیار ہو کے آنے کا وعدہ کیا۔

میں نے فوراً اپنی کارگزاری کی رپورٹ محسن کو دی "دیکھو یار یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس لڑکی سے لندن میں کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ اور کیوں؟"

محسن نے اس دلیل کو مسترد کر دیا "لندن میں ایک سو ایک لڑکیاں ہوں گی جن کے ساتھ آپ نے چکر چلایا تھا۔ نوجوانی کی غلطیاں۔"

میں نے کہا "اس لڑکی سے ایک کام ہے مجھے۔ اگر یہ وہی ہے جو میرا دل کہتا ہے کہ ہے۔ تو پھر یہ ہمارا مسئلہ حل کرے گی۔"

"یار گل کیا ہے۔ اس نے اپنے شوہر کو دھمکی دی تھی کہ باہر نکلے تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

"وہ بزدل اور جورو کا غلام ہے۔" میں نے کہا۔

وقار نے کہا "میں شرط لگاتا ہوں کہ جب گل رابعہ اور گل کو بتائے گی تو وہ بھی میری ٹانگیں توڑ دے گی۔"

"بھلا کیا ضرورت ہے گل کو ایسی خطرناک بات بتانے کی۔ اس سے کہیں گے کہ ہم جا رہے ہیں ماڈل ٹاؤن اور انہیں پک کر کے ڈنر کے لئے لے جائیں گے۔ دس گیارہ بجے تک واپس چھوڑ دیں گے پھر گھر جا کے رابعہ اور گل کو ایسی دردناک کہانی سنائیں گے کہ ان پر رقت طاری ہو جائے گی۔ اگر انہوں نے پوچھا کہ اتنی دیر کیوں کی۔"

"تمہاری مرضی بھیا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔" وقار بولا۔

گل چاہتی تھی کہ میں اور محسن کھانے کے بعد جائیں مگر میں نے کہا کہ وہ پہرے اب تک رابعہ اور گل کے پاس غائب تھا! اب مولوی خادم حسین ہے۔ مجھے اور محسن کو ان کی خبر گیری ضرور کرنا چاہئے۔ میرے اپنے کپڑے میلے اور بغیر استری کے تھے۔ محسن نے بھی مجھ سے اتفاق کیا کہ ان میڈ ان انگلینڈ پاکستانی لڑکیوں کے ساتھ ڈنر پر جانے کے لئے ہمارا ڈریس قطعی غیر موزوں بلکہ باعث شرم تھا۔ اگر ہم بہت زیادہ تیزی کے ساتھ جب یہاں کے نکلتے تو گل کی ناک فوراً خطرے کی بو سونگھ لیتی۔ زنانہ تجسس اور شکی فطرت سے مجبور ہو کے وہ فوراً رابعہ اور گل کو مطلع کرتی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

اس مشکل میں وقار نے ہماری مدد کی۔ اس نے چائے منگائی تھی۔ جب گل ٹرے لا رہی تھی تو اس نے لے لی اور بڑی معذرت اور احتیاط کے ساتھ ہم پر گرا دی۔ ہم نے شور مچایا اور اس نے معذرت کی مگر اس کے بعد ہمارے لئے کپڑے بدلنے کا جواز پیدا

محسن نے "ایک بات کی جو قابل غور ہے۔ وِلاور کی بیوی اگر یہ کہتی ہے کہ مجھے معلوم ہے نازو کہاں ہے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا نازو اس کے گھر میں ہے؟ اپنے گھر میں تو وہ خود بھی نہیں ہے۔ شوکت رانا کے ڈر سے بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہی تھی۔ اگر پھر بھی اسے دعویٰ ہے کہ وہ نازو کے بارے میں جانتی ہے اور دھمکی دیتی ہے کہ اس کی لاش ارسال کر دی جائے گی تو غور طلب بات یہ ہے کہ نازو کہاں ہو سکتی ہے کیا وہیں جہاں پہلے تھی؟"

"یعنی وزیر خان ٹرسٹ اسپتال میں؟"

"وہ ان کا تھانہ ہے جہاں وہ سب کا دماغ درست کرتے ہیں۔ غالب کا کرایا۔ کیا پتا نازو کا ابھی تک یہ ہوا ہو۔"

"درانت۔ یہ ہو سکتا ہے۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہم آج ہی چیک کریں گے۔"

"بالکل۔ ہم آج رات ہی خود ملاحظہ فرمائیں گے۔ ہم وقت ضائع نہیں کر سکتے۔"

"وقت ہے کہاں ضائع کرنے کے لئے۔"

"اس کے باوجود آپ نے یہ دو بلائیں پیچھے لگا لیں۔"

"یہ بھی ضروری تھا۔" میں نے کہا "میری چھٹی حس کہتی ہے کہ یہ وقت ضائع نہیں ہو گا۔ کوئی بات ہے جو مجھے یاد نہیں آ رہی ہے لیکن اہم ہے۔"

محسن نے کہا "میری ساتویں حس کہتی ہے کہ آپ کی عقل گھاس کھا گئی ہے۔"

میں نے اپنی گاڑی مال پر "لا سوڈز" کے باہر کھڑی کی اور کچھ فاصلے پر انہیں گاڑی پارک کرتے دیکھا۔ روشن آرا عرف روشی نسبتاً سنجیدہ مزاج اور کم شوخ تھی۔ اس کے لباس کا انتخاب بھی کم عامیانہ تھا مگر صرالنسا عرف میری مزاج اور لباس کے معاملے میں حد سے زیادہ فرنچ بن گئی تھی۔ اس کے انداز و اطوار میں بھی اتنی بے تکلفی تھی کہ جب ہر نظر ہماری طرف اٹھی تو مجھے پسینہ آ گیا۔ ایسے میں کوئی جاننے والا مجھے دیکھ لیتا تو میری ساکھ بہت متاثر ہوتی۔ رابعہ دیکھتی تو اس کا دل ٹوٹ جاتا اور مولوی خادم حسین دیکھتا تو اسے دل کا دورہ پڑ جاتا۔

روشی خود بخود محسن کے ساتھ منسلک ہو گئی تھی لیکن وہ اتنا پریشان نہیں تھا۔ مینیو دیکھ کے بھی میری نے برا سا منہ بنایا اور مجھ سے بہت سے فضول سوالات کے جن کا مطلب یہ تھا کہ کیا یہاں شیمپین نہیں ملے گی۔ مجھے اس کو یاد دلانا پڑا کہ وہ لندن میں نہیں لاہور میں ہے۔

آہستہ آہستہ باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں بہت محتاط تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ لندن میں میرا قیام کہاں کہاں تھا اور میرے حلقہ احباب میں کون لوگ تھے۔ ان میں لڑکیاں کتنی تھیں اور کیسی تھیں اور میں صرف ذہن لیتا رہا کہ کبھی کسی کے بارے میں میری کیا ہوا! میں نے مونا الرشید کے ذکر سے گریز کیا جو ایک متعصب انگریز

ہو گیا۔ ہم نے رتا کے سوٹ پہن لئے۔ اس کی قمیص اور ٹائی لے لی۔ گل کو ذرا شک نہیں ہوا۔

میں نے اپنی گاڑی نکالی جس پر رابعہ کی گاڑی کا نمبر تھا۔ دونوں لڑکیاں بھی بالکل تیار کھڑی ہمارا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ معلوم نہیں انہوں نے اپنی چچی کو کیا بہانہ کر کے مطمئن کر لیا تھا۔ میری نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں آگے نکل جانے کے لئے کہا اور پھر اپنی گاڑی میں ہمارے پیچھے آ گئیں۔ مجھے یہ سب بڑا عجیب سا لگا۔

"بڑی شرم کی بات ہے۔ شیروانی صاحب بھلا یہ عمر ہے آپ کی کسی لڑکی کو ایسے چوری چھپے ساتھ لے جانے کی۔"

"میری تو شادی ہو گئی۔ تم سوچ لو کہ رابعہ کو پتا چلا تو۔"

میں نے کہا "وہ آ رہی ہیں پیچھے؟"

"ہاں لیکن ان کے ساتھ کم سے کم وقت میں کام کی بات کر لینا۔ رابعہ اور گل پریشان ہوں گی وہاں۔ اس کے علاوہ گل نے مجھے ایک بات بتائی تھی۔ آج رابعہ کی منظر سے بات ہوئی۔ پہلے اس نے گلہ کیا کہ وقار کے گھر میں سب مر گئے تھے کیا۔ کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ رابعہ نے بتایا کہ فون میں کچھ خرابی تھی جس کی وجہ سے بات نہ ہو سکی۔ دوپہر کے بعد منظر کی بیوی کے میکے والوں کی ایک فوج نے بغیر بتائے یلغار کی اور منظر پھنس گیا میزبانی کے چکر میں۔ اس نے رابعہ سے کہا کہ پلیز۔ تم کو ولاور کی بیوی سے بات کرنی چاہئے تھی۔"

"وہ کس لئے؟"

"ابھی اس نے خاص طور پر نازو کا نام لے کر ہمیں شاک دینے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے یہ ظاہر کیا کہ ہم شاک پروف ہیں اور اس کی دھمکی رائیگاں گئی۔ غالباً ولاور کی بیوی یہ بتانا چاہتی تھی کہ مجھے نازو کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے۔ تم مجھے ولاور کے بارے میں بتاؤ کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے کیونکہ تم نے ہی اسے گرفتار کرایا تھا۔ تم وہیں موجود تھے اور تم پولیس کے ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے۔"

"مگر ہم نہیں جانتے۔"

"ولاور کی بیوی نہیں جانتی کہ ہم نہیں جانتے۔ ہم کہہ سکتے تھے کہ ہاں ہمیں علم ہے اور صورت حال سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ ولاور کی بیوی کو خوب EXPLOIT کر سکتے تھے۔ وہ بتاتی کہ نازو کہاں ہے۔"

"وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے۔"

"معلومات کا تبادلہ کرنے کے بہانے اس سے ملاقات کرنے میں کیا نقصان تھا۔ وہ اپنی شرائط رکھتی۔ ہم اپنی شرائط رکھتے کیا پتا اس سے کوئی کام کی بات اگلوا لیتے۔ پیچھے مڑ کے مت دیکھو۔ ان کی گاڑی ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔"

"ہم ولاور کی بیوی سے دوبارہ خود رابطہ کر سکتے ہیں۔"

www.paksociety.com

لانڈا کی نور نظر تھی۔ اگر وہ کینہ اور کالوں سے نفرت کرنے والا لارڈ میرا دشمن نہ ہوتا تو شاید مجھے اتنی بے عزتی کے ساتھ ڈی پورٹ نہ کیا جاتا۔ میں الزبتھ سے شادی کر لیتا اور لندن میں خوش و خرم رہتا۔ وہ بلاشبہ محبت کرنے والی لڑکی تھی اور اس کی محبت میں بھی مشرق کی روایتی وفا کا انداز شامل تھا۔

میں نے ایک آہ بھری۔ یادِ ماضی عذاب ہے یارب۔ میں پرانی یادوں میں کھو گیا تھا اور اب میری مجھے اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ میں بہت کم سن رہا تھا کیونکہ اس کی گفتگو کا محور اس کی اپنی ذات تھی اور وہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ لندن کا سارا حسن اسی کے دم سے تھا اور اب وہ لندن میں نہیں ہے تو لندن گیا اور گوجر خان گیا۔ ایک طویل فہرست ان عشاق کی تھی جو خودکشی کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ کسی کو مایوس کرنے کی قائل نہیں۔

الو کی پٹھی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ کاش اس وقت میری جگہ ہوتا مولوی خادم حسین تو بھول جاتی ساری الف لیلیٰ۔ اچانک اس نے ایک نام لیا تو میں چونکا۔

"کیتھرین۔ کون کیتھرین۔۔؟" میں نے کہا۔

وہ ہنسی "جب اس کا قتل ہوا تو وہ کیتھرین خان تھی۔ خان وی کارپینٹر۔"

میں نے کہا "کارپینٹر سے اس کی ایک بیٹی تھی؟"

"ہاں وہ ڈاکٹر تھی۔ البرٹ ڈاکٹر ہو جیسے میں لیکن میری اس سے کبھی نہیں بنی۔ وہ خود کو پتا نہیں کیا سمجھتی تھی۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی۔ وہ ریئلی ریزروڈ ٹائپ۔"

"یہ کیتھرین خان۔" میں نے کہا "کیا کرتی تھی؟"

"وہ ہمارے گھر میں ملازمہ تھی۔" اس نے بڑے غرور سے کہا "اس کا آخری شوہر ہمارا شوفر تھا۔ ایک نیگرو تھا۔"

آہستہ آہستہ بات میری سمجھ میں آنے لگی۔ میری بھی اسی اسکول میں پڑھتی تھی جس میں الزبتھ۔ کیتھرین کا شوہر اسے لینے آتا تھا۔ جو گاڑی الزبتھ کے لئے آتی تھی اس کا شوفر بھی نیگرو تھا۔ وہ دونوں دوست تھے اور اسکول کے باہر ایک ساتھ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں وہاں الزبتھ کو دیکھنے اور اسے اشارے کرکے یہ بتانے کے لئے کھڑا ہوتا تھا کہ رات کو ہماری ملاقات کہاں اور کتنے بجے ہوگی۔ یہ اشاروں کی زبان خود ہم نے ایجاد کی تھی جسے اس کا بدتمیز شوفر نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اسے سخت ہدایت تھی کہ الزبتھ کو اسکول کے باہر کسی سے نہ ملنے دے۔ خصوصاً کسی ایشیائی سے۔

میری کو میں نے اکثر الزبتھ کے ساتھ اسکول سے باہر آتے دیکھا تھا۔ وہ ایک ساتھ اس لئے آتی تھیں کہ ان کی گاڑیاں ساتھ ساتھ کھڑی ہوتی تھیں اور شوفر ایک ہی جگہ انتظار کرتے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ الزبتھ لمبی چوڑی جھم جھم کرتی سیاہ کیڈلک میں جاتی تھی اور میری ایک عام بلیک کار میں۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی "تمہاری خادمہ کو اس کے شوہر نے قتل کیا تھا اور غلطی سے اپنی گرل فرینڈ کو بھی مار دیا تھا۔"

"ہاں وہ اس کی سوتیلی بیٹی کو مارنا چاہتا تھا کاؤنٹی جیل میں ہے۔" میری نے بتایا۔

"یہ ڈبل مرڈر کیس تھا۔" میں نے کہا "میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ کیا نام تھا تمہارے اس شوفر کا؟"

"ایڈورڈ امنسو۔ میں ایک بار پاپا کے ساتھ اس سے ملنے گئی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ بے قصور ہے۔ قتل کسی اور نے کیا تھا لیکن ایسا تو سب ہی کہتے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں میری۔ وہ ٹھیک کہتا تھا۔"

"کمال ہے۔ پاپا بھی یہی کہتے تھے۔ اس کا کیس لڑنے کے اخراجات بھی انہوں نے برداشت کئے تھے مگر انہیں افسوس تھا کہ وہ اسے بچا نہیں سکے۔"

"میری میں تمہارے پاپا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

خوشی سے اس کا چہرہ دمکنے لگا "او ڈارلنگ۔ کیا کہو گے تم ان سے؟"

"یہ میں ابھی تم کو نہیں بتا سکتا۔" میں نے دل ہی دل میں اس نادان لڑکی کی غلط فہمی پر افسوس کیا جو سمجھ رہی تھی کہ شاید اتنی جلدی میں اس کے باپ سے ملنا چاہتا ہوں تو اس کا ہاتھ مانگنے کے لئے۔

"پاپا کراچی گئے ہوئے ہیں؟" اس نے کہا "اگلے ہفتے آ جائیں گے پھر ہم واپس چلے جائیں گے۔ تم کب آؤ گے؟"

میں نے کہا "میری۔ تمہارے پاپا سے مجھے آج ہی بات تو؟"

"ان کا فون نمبر ہے لیکن اتنے بے تاب کیوں ہو تم۔" وہ ہنسی۔

"پلیز مجھے نمبر بتاؤ۔"

"نمبر ایک ہوٹل کا ہے۔ کراچی کے میٹروپول میں سوئٹ نمبر ایک سو ایک۔ اے یو زکوری" وہ تقریباً مجھ سے چمٹ کے بولی۔

"خدا کے لئے میری۔ ہوش میں رہو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

"دیکھنے دو۔ میں صرف تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ تم صرف مجھے دیکھو اور بس۔ آئی ڈونٹ کیئر۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔"

میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا "ویٹر" میں نے چٹکی بجائی۔

روشی نے اپنی بہن کو گھورا "آج تم پہ یہ کیسا نشہ ہے؟"

"یہ محبت کا نشہ ہے روشی۔ تم کیا جانو۔" وہ بولی۔

"میں جانتی ہوں۔ یہ نشہ چڑھتا اترتا رہتا ہے بدلتے موسموں کی طرح۔" روشی نے کہا "ناٹی بیو یو رسیلف۔"

"شٹ اپ۔ کیا میں تمہارے درمیان حائل ہو رہی ہوں۔ مائنڈ یور اون بزنس روشی۔"

میں نے کہا "میری۔ میں شاید کل خود تمہارے پاپا سے ملنے

کراچی چلا جاؤں۔" میں نے کہا "یہ معاملہ بہت اہم ہے۔"

"اوہ ڈیئر۔ یو آر سو سویٹ۔ تم بالکل پاگل ہو گئے ہو۔ ایک ہفتہ بھی انتظار نہیں کر سکتے۔" وہ خوشی کے مارے آپے سے باہر ہونے لگی "کیا حرج ہے اگر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔ میں خود ملواؤں گی تمہیں پاپا سے۔ وہ بہت لبرل ہیں۔ کسی کی طرح پرانے خیالات نہیں رکھتے۔ وہ بہت خوش ہوں گے اور اس کے علاوہ پاپا سے ہم دو چار دن بعد بھی مل سکتے ہیں۔ وہ دو چار دن ہم اکیلے رہ سکتے ہیں کہیں بھی۔ بڑے اچھے ہوٹل ہیں کراچی میں اور بڑے اچھے ساحل ہیں۔ بڑا مزہ آئے گا۔ وہی شعر ہو جائے گا جتنی جنی سون پلی فور وی رمبل ون۔" اس نے مجھے آنکھ ماری۔

میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ روشی کو میری کا رویہ پسند نہیں تھا اور محسن اس صورت حال سے مزہ لے رہا تھا۔ اگر میں اس آوارہ مزاج بلکہ فاحشہ لڑکی سے کہتا کہ وہ غلط سمجھ رہی ہے اور اس کی غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کرتا تو نہ جانے احساس ذلت اور غصے میں اس کا طوفانی ردعمل نہ جانے کتنا رسوا کن ہو جاتا۔

"اب تم جاؤ۔" میں نے باہر آکے اسے گاڑی میں بٹھایا لیکن اس نے بیٹھتے بیٹھتے بھی میرا منہ چوم لیا اور میں نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا مگر سائیڈ میں ہونے کی وجہ سے یہ سنسنی خیز منظر کسی نے دیکھا نہیں تھا۔

"کل ملو گے؟"

"شاید۔ میں نے بتایا نا کہ مجھے کراچی جانا ہو گا۔ میں کال کروں گا تمہیں گھر پر۔ ابھی تم اپنے پاپا کو کچھ مت بتانا۔"

"تم مجھے ساتھ لے جاتے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تمہاری اولڈ فیشن آپا جی ہے۔"

"اب تو میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکتی ہوں کہ جہنم میں جاؤ نصیحتوں سمیت۔ میں جا رہی ہوں۔"

"کہاں جہنم میں؟" روشی نے کہا۔

میری کھلکھلا کے ہنس پڑی "اپنی جنت میں۔ آخر کار۔"

"کتنی بار آباد کر چکی ہو تم اپنی خیالی جنتیں اور کتنی بار کھو دیں۔ ہر خواب کو حقیقت کیوں سمجھ لیتی ہو بے وقوف۔" روشی نے کہا۔

"تم جلتی ہو مجھ سے۔ تمہاری زبان کالی ہے۔ او کے ڈارلنگ۔ سی یو۔ بائی۔" اس نے گاڑی چلاتے ہوئے میری طرف مسلسل ہوائی بوسے پھینکے۔

میں نے ایک گہری سانس لی "اُف۔ یہ کس عذاب میں پڑ گیا تھا میں۔ توبہ میرے باپ کی بھی توبہ۔"

محسن نے میرے دھکا رسید کیا "اب توبہ سے فائدہ۔ اُلو کے پٹھے۔ [illegible] وقار کے گھر چکر لگانا شروع کر دیے تھے اور لڑکی کو خود [illegible]"

کہا [illegible] "میں ادھر لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ جب تک یہ [illegible] ختم نہیں ہو جاتی۔"

"اس سے کیا ہو گا۔ رابعہ کو معلوم ہو جائے گا۔"

"اسے میں ابھی جا کے سب بتاتا ہوں۔ چھپنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن کچھ مبالغہ میں ضرور کروں گا۔ میرے پیارے دوست۔ جھوٹے ہی سہی مگر عورت کی آنکھ اپنے ساتھ نہیں دیکھ سکتی۔ جو وہاں سب دیکھ رہے تھے۔"

"میں یہ نوٹ نکال سکتا ہوں۔ بشرطیکہ آپ اسٹوری میں سے روشی کو فارغ کر دیں۔ کل مجھے خنجر گھونپ دے گی یا طمنچہ چلا دے گی۔ اندر سے وہ ناگن ہے اب بھی۔ کوئی اس کے حق پر ڈاکا ڈالے۔ یہ برداشت کرنا اس کے لئے ناممکن ہے۔"

ہم نے ہاتھ ملائے اور ماڈل ٹاؤن جاتے ہوئے ایک ایسی کہانی پر متفق ہو گئے جو خاصی بے ضرر اور پاکیزہ تھی۔ ہم نے نظریہ ضرورت کا جواز بھی سامنے رکھا تاکہ ثابت ہو جائے کہ ہم نے ایک مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ایسا کیا تھا اور کامیابی حاصل کی تھی۔

رات کے گیارہ بجے ماڈل ٹاؤن کی سڑکوں پر خاموشی اور سکون تھا۔ یہاں آکے ہمیشہ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میدان کارزار کے اعصاب شکن پرخطر اور اجل گزیدہ ماحول سے بچ کے میں اپنے شہری دوست دار فضا کے محفوظ حصار میں داخل ہو گیا ہوں۔ یہاں کے شجر حجر راستے اور موڑ۔ دکانیں اور گھر۔ دیواریں۔ در یہاں تک کہ ہوائی خوشبو اور آسمان کی وسعت دنیا کی تناہت اور رات کے ستارے سمیت میرے اپنے اور بچپن کے جانے پہچانے ہوئے تھے۔ گھروں میں پہلے کی طرح بند دریچوں کے پیچھے روشنیاں تھیں۔ ایک گھر اور خاندان کے رشتوں کے حصار میں مطمئن رہنے والے اکٹھے بیٹھ کے ٹی وی دیکھ رہے تھے یا مونگ پھلی کھا رہے تھے یا آنے والی عید پر بننے والے نئے کپڑوں کا حساب کر رہے تھے یا لڑ رہے تھے یا رو کر گنا رہے تھے۔ خوب صورت زندگی کے یہ سارے عکس ان کے اپنے تھے۔

وزیر خان مرحوم کی کوٹھی کے گیٹ کی ایک لائٹ جل رہی تھی۔ میں نے اندر داخل ہو کے ویران پڑے ہوئے لان کو دیکھا۔ اس کی ہریالی باقی نہیں رہی تھی۔ پہلے باقاعدگی سے تراشی جانے والی گھاس بے ترتیبی سے بڑھ گئی تھی۔ بدرنگ کرسیوں پر لگی ہوئی رنگین چھتری بھی پھٹ گئی تھی۔ باغ کے پھول اور ان کے سارے رنگ خزاں سے پہلے ہی عدم توجہی کی نذر ہو گئے تھے۔ میں نے شرمندگی سے کہا بس اور کچھ دن۔ فرصت کشاکش غم دوراں سے مل لے تو میں سیدھا یہاں آؤں گا اور سب کچھ ویسے ہی ہو گا جیسا کہ تھا۔

گھر میں فرنیچر تو پہلے ہی بدل دیا گیا تھا۔ وزیر خان مرحوم کے پرانے کمرے کو اصل حالت میں رکھنے کی خواہش اس لئے پوری نہ ہو سکی تھی کہ درمیان میں مالک بدل گئے تھے۔ میرے اپنے کمرے کی ہر چیز نئی تھی جہاں پرانی ڈیسک ٹاپ میز تھی وہاں جدید وضع کی

www.paksociety.com

بہت خوب صورت اور قیمتی رائٹنگ ٹیبل آگئی تھی۔ چوبی پٹی کی جگہ بڑی ٹیپ وروز کا فانوس لگا ہوا تھا۔

رابعہ اور گل کے ساتھ نگی نے بھی جھاڑ پونچھ کی مہم میں بھرپور حصہ لیا تھا اور مارگریٹ کو دن بھر میں ہم سب کے خاندانی اور جذباتی معاملات کے بارے میں مفصل معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ اس کو حسب توقع سب نے ہی ہینڈسم دی تھی۔

حیرت اور خوشی مجھے یہ بیان کر کے ہوئی کہ اس گھر میں پہنچتے ہی غالب کی حالت میں بڑی خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔ وہ اکیلا سارے گھر میں پھرتا رہا تھا اور اس نے رابعہ سے بہت سے سوالات ایسے کئے تھے جس کا تعلق میرے ماضی سے تھا۔

"اس وقت وہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"اوپر چھت پر ٹہل رہا ہے۔ کچھ دیر پہلے باہر نکل گیا تھا۔ ہم بہت پریشان ہوئے مگر مولوی خادم حسین نے اسے تلاش کر لیا۔ وہ نواب خسرو جمشید کی پرانی کوٹھی کے سامنے کھڑا تھا۔"

میں نے کہا "وہ تو جل کے کھنڈر ہو گئی تھی۔"

"اب وہاں ایک بالکل نئی وضع کی کوٹھی بن چکی ہے۔ غالب نے مولوی خادم حسین کو بتایا کہ یہاں ایک نواب صاحب رہتے تھے مگر وہ ایک نہیں دو تھے۔ ایک جیسے دو۔ خادم حسین اس سے مزار کے مسئلے پر بحث کرتا رہا اور وہ سمجھاتا رہا کہ وہ دو مزار تھے اور وہ جڑواں بھائی۔ بس وہ ایک نہیں دو تھے بالکل ایک جیسی۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ سیاہ شیروانی۔ سر پر کلف لگے شملے والی سفید پگڑی۔"

"بالکل ٹھیک بتا رہا تھا وہ۔"

"ایک مزے کی بات سنو۔ نواب خسرو کے محل میں اس کے باپ اور دادا کی قبریں تھیں۔ ایک گوشے میں۔"

"ہاں۔ ان پر گنبد والی چھت تھی۔ سنگ مرمر کا سارا کام تھا۔"

رابعہ نے کہا "اب وہ مزار شریف بن گیا ہے۔ کسی نے موقع پا کے قبضہ کر لیا اور مجاور بن بیٹھا۔ ساتھ ہی مسجد کے جگہ گھیر لی۔ عرس کرنے لگا اور ہر جمعرات کو قوالی۔ کتبہ تک بدل ڈالا ہے اس سفے جاہلوں کی کمی نہیں۔ اب اچھی خاصی دکانداری ہے۔"

"یہاں کے پرانے رہنے والوں نے روکا نہیں؟"

"یہی تو خرابی ہے۔ لوگ برائی ہوتی دیکھتے رہتے ہیں اور بولتے نہیں کہ ہمیں کیا ضرورت ہے۔ جس کی جگہ ہے اسے اعتراض نہیں تو ہم کیوں بلاوجہ پھڈے میں پڑ کے وقت ضائع کریں۔"

محسن نے کہا "تم باتیں ہی کرو گی۔ کھانے کو نہیں پوچھو گی۔"

گل نے کہا "زیادہ بننے کی ضرورت نہیں۔ تم کھا کے آئے ہو۔ کسی کے ساتھ گئے تھے بلکہ کسی کو ساتھ لے گئے تھے۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھا "اگر اس وقت زمین پھٹ جائے تو میں شرم سے سما جاؤں مگر بڑا مضبوط فرش ہے۔"

"اسے جوانی کی لغزش سمجھ کے بھول جاؤ دوست۔" محسن بولا "اور تم بھی یہ سمجھو گل کہ انتہا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ شام کا بھولا رات کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔"

"ہاں۔ اسے بدمعاش آوارہ اور ہرجائی کہتے ہیں۔" گل نے آستین چڑھا لی۔

رابعہ نے کہا "ذاتی جھگڑوں کی چھٹی نہیں ہوئی ابھی تک۔"

میں نے کہا "کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"وہی جو نگی نے ہمیں بتایا ہے۔" گل نے کہا "زیادہ ایکٹنگ مت کرو۔"

میں نے کہا "یہ نگی ہے بڑی مصیبت۔ ولن کا کیم کھیلتی ہے۔ پہلے ہمیں ان سے ملوایا کہ میری سہیلیاں ہیں۔ لندن سے آئی ہیں اور بہت بور ہو رہی ہیں۔ ان کو ذرا گھما لاؤ پلیز۔ میری خاطر۔ ڈنر پر لے جاؤ۔"

"یہ نگی نے کہا؟" گل شک میں پڑ گئی۔

رابعہ نے کہا "گل۔ بڑے ذہین لوگ ہیں یہ۔ جھوٹ پر جھوٹ بول رہے ہیں۔"

ظاہر ہے اس کے بعد ہم نے ان کو وہ سب بتا دیا جو سچ تھا مگر طے شدہ پالیسی کے مطابق بے حیائی کے مناظر سنسر کر لیے اور شرمناک سین کاٹ لیے۔ مخرب اخلاق گفتگو بھی حذف کر دی۔ ساری ملاقات ایک پاکیزہ ماحول اور شریفانہ گفتگو تک محدود رہی۔

"میں نے تو اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ استھوان کا شوہر تھا۔" میں نے کہا۔

"استھو کون؟"

"وہی تیکرو جو اپنی بیوی اور گرل فرینڈ کو قتل کرنے کے جرم میں طویل قید کاٹ رہا ہے۔ ہمارا سب سے اہم گواہ جو اصل قاتل کی حیثیت سے دلاور کو پہچانے گا۔"

رابعہ نے کہا "حد ہو گئی۔ پتا نہیں میرا ذہن ادھر کیوں نہیں گیا۔"

"تمہارا ذہن شک اور حسد کی قیادت سے بخار میں جلتا ہے۔" محسن بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" گل نے کہا "ہم تھوڑی سی تفریح لے رہے تھے۔"

میں نے کہا "یہ معراقتباس عرف نیری آج کل وقار کے پڑوس میں اپنی بچی کے ساتھ مقیم ہے۔ وہ الزبتھ کے ساتھ پڑھتی تھی۔"

"کون الزبتھ یا الزبتھ ٹیلر؟ یہ بھی وضاحت کر دو۔"

"رابعہ جانتی ہے اسے۔ میں سب بتا چکا ہوں۔" میں نے کہا "نیری نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ باتوں باتوں میں استھو کا ذکر آیا اور مجھے پتا چلا کہ یہ وہی اینڈریو استھو ہے۔ شیلی کی ماں کا تیسرا شوہر۔ تو یہ ضروری ہو گیا کہ میں اور معلومات حاصل کروں۔ اتفاق کہو یا دلاور کی شامت اعمال۔ نیری کی فیملی پاکستان آئی ہوئی ہے عرف نیری کو شدید غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

"کیسی غلط فہمی۔ تم نے کی ہو گی ایسی بات۔" رابعہ بولی۔

"ہاں پتہ رہنے دو۔ جانے دو۔ ہیرا پھیری سے کیسے جائے گی۔" گل نے کہا۔

"گل بانو۔ کیا وہاں کبھی تمہارے دل میں خیال آیا کہ مٹی بنے گا۔ یا ڈاکا ڈالنے کا۔ نہیں تو پھر ایسی بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"یہ سچ نہیں ہے تو کڑوا کیوں لگ رہا ہے؟" رابعہ ہنسی۔

"وہ لڑکی احمق ہے۔ تم خود ہی اندازہ کر لینا۔" میں نے کہا "میں نے کہا کہ مجھے اس کے باپ سے ملنا ہے تو وہ سمجھی کہ میں اس کا رشتہ مانگنا چاہتا ہوں۔ اہم اور پرائیویٹ بات کا اس نے یہی مطلب نکالا تو میں کیا کروں۔"

"تم اسے بتا سکتے تھے کہ میں منگنی شدہ ہوں۔" محسن نے کہا۔

میں نے اسے گھورا "نہ میں منگنی شدہ ہوں اور نہ تمہاری طرح شادی شدہ۔ تم نے کیوں نہیں بتا دیا تھا سدرہ کو۔"

"وہ۔۔۔ دراصل۔ یہ غلطی واقع ہوئی ہم سے۔" محسن نے سر کھجا کے کہا "بندہ بشر خطا کا پتلا ہے۔ اور وہ تھی خطا کی پتلی۔ لیکن اصل چیز ہے نیت اور وہ بالکل صاف تھی۔"

میں نے کہا "اب مجھے اچانک فریج وکیل کا رول ختم کرنا پڑے گا۔ ورنہ اس کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ وقار کے گھر تو شاید اب میں جا بھی نہیں سکتا۔ وہاں وقار کو اور نگی کو سمجھانا پڑے گا کہ اسے کچھ نہ بتا دیں۔"

"کچھ تو بتانا پڑے گا۔"

"میں کراچی سے واپس آ جاؤں پھر بتایا جا سکتا ہے کہ وہ تو فراڈ تھا کوئی اور اس نے جو بھی کہا سب جھوٹ کہا۔ ایک دوست کے حوالے سے یہاں آیا تھا مگر وہ دوست لندن میں ہے۔ اس کا پتا نہیں معلوم۔ ایسی ہی کوئی بات کر کے اسے ٹالنا ہو گا۔ میں یہاں رہتے ہوئے بھی غائب ہو جاؤں گا اور تم فریج وکیل کے بارے میں کہہ سکتی ہو کہ تحقیق مکمل ہو گئی۔ قاتل گرفتار ہو گیا اس لئے وہ واپس چلا گیا۔ اب اینڈریو استھو کے ساتھ آئے گا۔ اگر ضروری ہوا۔ ورنہ دلاور سے نمٹنے کے لئے ہم کافی ہیں۔ میرا وعدہ پھر کراچی میں ثابت ہو جائے گا۔ میں سکندر بخت کے نام سے میٹروپول میں قیام کروں گا اور وہیں سے ایس ایس پی صدیقی کو فون کروں گا۔ گل ٹرین سے آ جائے گی۔ پولیس کے آنے سے پہلے میں ائیرپورٹ روانہ ہو جاؤں گا۔ ریکارڈ سے مسز اے کیو ڈسکوی اور مجیرو وغیرہ کے بیان سے ثبوت بھی مل جائے گا کہ وہ خاکسار ہی تھا۔ نعوذ مطلب۔"

"عرابی میں کچھ فرمایا آپ نے۔۔۔"

"اس کا مطلب ہے۔ یہی چاہئے۔" میں نے کہا۔

"اور بہت جلد واپس جا رہی ہے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ باقی بات اس کے باپ سے کروں۔ مسز اے کیو ڈسکوی۔"

"تم جانتے ہو نیری کے باپ کو؟"

"نہیں۔ میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن نیری نے بتایا کہ وہ بھی استھو کو بے گناہ سمجھتے تھے اور اس کے مقدمے میں قانونی اخراجات بھی انہوں نے ہی برداشت کئے تھے لیکن انہیں افسوس ہے کہ وہ استھو کو نہیں بچا سکے تھے۔ میں نے نیری سے پوچھا تو پتا چلا کہ وہ کراچی میں ہیں اور مزید ایک ہفتہ وہیں رہیں گے۔ ان کا قیام ہے سوئٹ نمبر ایک سو ایک ہوٹل میٹروپول میں۔"

"تم ان سے فون پر بات کر لو۔"

"فون پر اتنی لمبی بات نہیں ہو سکتی اور ایسا کرنا ٹھیک بھی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب وہ واپس لندن جائیں تو دلاور کی تازہ ترین تصویر ان کے پاس ہو۔ وہ کاؤنٹی جیل جا کے اینڈریو استھو سے ملیں اور اسے یہ تصویر دکھائیں۔ امید ہے وہ چوہدری دلاور کو پہچان جائے گا۔ مسز اے کیو ڈسکوی بتا دیں گے کہ یہ ہے اصل قاتل۔ وہ اپنی سوتیلی ماں اور سوتیلی بہن کو قتل کرنے آیا تھا۔ ماں تو مر گئی مگر بہن کی جگہ غلطی سے اس کے شوہر کی ایک گرل فرینڈ کا قتل ہو گیا جو فلیٹ میں موجود تھی۔ اس گرل فرینڈ کے مسئلے پر ہی شیلی کی ماں اور اس کے تیکرو شوہر میں زبردست جنگ چل رہی تھی۔ ایسے میں دلاور نے بیچ کے فائرنگ کی۔ تیکرو نے چھپ کے جان بچائی مگر اس کی بیوی ماری گئی اور شیلی کی غلط فہمی میں گرل فرینڈ۔ تیکرو اینڈریو استھو نے قاتل کو اچھی طرح دیکھا تھا مگر وہ بھاگ گیا اور پکڑا گیا استھو۔ آس پاس والوں نے گواہی دی کہ وہاں سے بہت چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں پھر دو فائر ہوئے اور استھو پکڑا گیا آلۂ قتل سمیت۔ مگر اس پر انگلیوں کے نشان استھو کے نہیں تھے۔ یہ فرض کیا گیا کہ اس نے دستانے پہن رکھے ہوں گے اور ایک متعصب جیوری نے اسے شک کا فائدہ دیتے ہوئے چودہ سال قید کی سزا سنا دی۔ کسی نے اس کی نہیں سنی کہ قاتل کوئی اور تھا۔ وہ کیسے بتاتا کہ قاتل کون تھا لیکن تصویر دیکھنے کے بعد وہ پہچان جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ جب اسے یہاں گواہی کے لئے بلایا جائے تو وہ پورے یقین کے ساتھ چوہدری دلاور کو شناخت کرے۔ اس نے دلاور کی ایک جھلک دیکھی تھی ذرا سی دیر کے لئے۔ وہ بھی انتہائی بدحواسی اور دہشت کے عالم میں۔ اب وہ تصویر کو اچھی طرح دیکھ لے۔ یہ تصویر اسے صرف مسز اے کیو ڈسکوی دکھا سکتے ہیں۔"

"یہ اے کیو کیا بات ہوئی۔ اور ڈسکوی؟"

میں نے کہا "یعنی عبدالقیوم یا عبدالقادر ہوگا۔ ڈسکہ ایک تحصیل ہے سیالکوٹ میں۔ بڑی مشکل ہے یہ رابعہ ڈیئر کہ میرا قصہ"

www.paksociety.com

رابعہ اپنی اور منظر کی ... کے بارے میں اتنا ہی کہہ سکی تھی کہ میری آنکھوں نے ایک بھیانک منظر دیکھا۔ باہر کا بلب جل بجھ رہا تھا اور اس سے پہلے کہ مولوی خادم حسین دروازہ کھولنے جاتا کوئی چیز کچن سے نکلی اور اس نے بڑے جارحانہ لہجے میں کہا "میں دیکھتی ہوں جاکے۔ تو بھی رات کو آخر کون آیا ہے نامراد۔"

"یہ... خادم حسین کی گھر والی۔" میں نے کہا "یہ سالی..."

رابعہ ہنسی "اب یہ یہیں رہے گی ہمارے ساتھ۔ یہ کچن کی انچارج ہے اور پوری طرح بااختیار ہاؤس میڈ۔ اس کا ماتحت اور معاون ہے مولوی خادم حسین۔"

"اف... یک نہ شد دو شد۔ بلا یہاں کیوں نازل ہو گئی اور اس کی تقرری کس نے کر دی کچن انچارج کے طور پر۔"

"میں نے کی۔ بہترین پکاتی ہے۔ بہترین ایڈمنسٹریٹر ہے۔ اس کے ہوتے کسی کو کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے کہا "مگر یہ خود مجموعہ افکار ہے۔ ایک نیام میں دو تلواریں رہ سکتی ہیں مگر اس گھر میں مولوی خادم حسین... اس کی گھر والی اور مار کٹائی... اف... میری آنکھیں صرف خانہ جنگی کے مناظر دیکھ رہی ہیں۔ میرے کان ابھی سے جنگ و جدل کی گھن گرج سن رہے ہیں۔"

خادم حسین کی بیوی اندر آئی تو غصے میں تھی "تھا وہ کمینہ چوکیدار کہتا ہے ... رات بھر گشت کرتا ہوں۔ سب پیسے دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ابھی ہمیں آئے ہوئے ایک دن نہیں ہوا اور تو ... ہو وہ مار مار کے بوتھا سجا دوں گی۔ خادم او خادم کہاں مر گیا۔"

خادم حسین اوپر سے دوڑتا ہوا آیا "کیا ہوا جی۔ ایسے کیوں چلا رہی ہو جیسے موت کا فرشتہ چمٹ گیا ہو۔"

"تو جو چمٹ گیا ہے میری جان کو۔ تو کم ہے کسی موت کے فرشتے سے۔ گھنٹی بج رہی تھی باہر۔ تو نے نہیں سنی تھی کیا؟ کان بند ہو گئے ہیں تو لا میں گرم تیل کا تڑکا لگا دوں۔ مجھے جانا پڑا دروازہ کھولنے۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "کیا اب ہر روز ہر وقت یہی ہو گا۔"

"دیکھو جی۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ اپنے گلے کا یہ لاؤڈ اسپیکر نکلوا دو ورنہ۔" خادم حسین نے کہا۔

"ورنہ کیا۔ بول گلا دبا دے گا میرا؟"

"کٹوا دوں گا کسی سے لے جاکے یا سیمنٹ ڈال کے بند کر دوں گا اگر پھر اونچی آواز میں بات کی۔" خادم حسین ایک دم شوہروں کی طرح گرجنے لگا "ایسے تو یہاں کے کتے بھی نہیں بھونکتے۔"

اس کی بیوی دم بخود رہ گئی۔ شاید پہلے کبھی اس نے خادم حسین کو ایسے بات کرتے نہیں سنا تھا۔ خود ہمارے لئے اس کا یہ انداز نیا تھا مگر اس سے صورت حال ایک دم بدل گئی۔ خادم حسین کی بیوی خاموشی سے کچن میں چلی گئی۔

خادم حسین نے کہا "میں اوپر غالب صاحب کے ساتھ ہوں جی۔"

"اس وقت تو خادم حسین نے لاج رکھ لی سارے شوہروں کی۔" میں نے کہا "مولوی جلال میں آگیا تھا۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے محسن سے کہا "ذرا تم دیکھو۔" مگر اس سے پہلے ہی محسن اس گوشے کی طرف چلا گیا جہاں فون رکھا ہوا تھا۔

میں نے کہا "رابعہ میں اور محسن آج رات چھاپا ماریں گے۔ صبح ہونے سے پہلے نازو کو ساتھ لے آئیں گے۔ وہ وہیں ہو گی۔ منظر ٹھیک کہتا ہے۔"

محسن نے چلا کے کہا "وقار کیا ہوا۔ بات کر ٹھیک طرح سے۔ اچھا اچھا ہم آتے ہیں۔"

میں نے پریشانی سے کہا "خیریت تو ہے!"

"وقار نے کچھ بتایا نہیں۔ سخت بدحواس تھا۔ بس کہتا رہا کہ تم دونوں فوراً آجاؤ۔" محسن بولا "خدا خیر کرے۔"

چند منٹ کے بعد میں اور محسن وقار کے گھر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ہماری ناکس ویگن خالی سڑک پر طوفانی انداز میں گرجتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔

"کیا واقعی اس نے کچھ نہیں بتایا تم کو؟" میں نے کہا "آخر گھبراہٹ کی وجہ ہے؟"

"نہیں یار۔ اس نے بتایا ہی نہیں... حالت خراب تھی اس کی۔"

وقار اپنے گھر کے گیٹ پر اکیلا کھڑا ہوا تھا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے۔ بچی کہاں ہے؟"

"وہ اندر ہے۔ سو رہی ہے۔" وقار نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے کسی نے گھنٹی بجائی۔ میں باہر آیا تو یہاں یہ رکھا تھا۔"

میں نے اس کے اشارے پر وہ تابوت دیکھا جو لان پر رکھا ہوا تھا۔

"باہر کوئی نہیں تھا۔ نہ جانے کون یہ تابوت چھوڑ گیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے کھینچ کے اندر رکھا۔"

"کیا ہے اس میں؟"

"میں نے کھول کے نہیں دیکھا۔ تابوت میں لاش ہی ہو سکتی ہے۔ تم دیکھو۔" وقار نے کہا۔

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

یہ کوئی پرانا اور استعمال شدہ تابوت تھا۔ اس کی بیرونی سطح پر مٹی کا رنگ غالب تھا اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ تابوت کسی قبرستان سے کوئی قبر کھود کے نکالا گیا تھا۔

اس قسم کے تابوت مسلمان ناگزیر حالات میں استعمال کرتے

ہیں۔ دیار غیر میں مرنے والوں کی میت وطن ارسال کرنی پڑے تو ائیر کارگو کے قواعد و ضوابط کے مطابق لاش کو محفوظ کرانے کے مخصوص طریقے کے بعد ائیر ٹائٹ تابوت میں بند کرنا ضروری ہوتا ہے ورنہ سفر آخرت کے لیے تو گورے لٹھے کا کفن ہی کافی ہوتا ہے۔ عیسائی لکڑی کے تابوت ہی کو کفن کہتے ہیں۔

لاہور کی عیسائی آبادی بہت کم تھی مگر وہ بھی تابوت بنواتے تھے یا خریدتے تھے۔ اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ لاہور میں تابوت کہاں ملتے تھے۔ میں نے کہیں ایک دکان دیکھی ضرور تھی۔ یورپ میں مجھے ہر جگہ کفن دفن کے انتظامات کرنے والے اداروں کے اشتہار بھی نظر آتے تھے اور میں نے لندن کے takers care بھی دیکھے تھے۔ وہاں تابوت اور جنازے کی شان و شوکت سے مرنے والے کی حیثیت کا بھی تعین ہوتا تھا اور لواحقین کی اس سے محبت کا بھی۔ غریب آدمی معمولی لکڑی کے تابوت میں سپرد خاک یا راکھ کر دیا جاتا تھا۔ باقی سب استطاعت کی بات تھی۔ انتہائی قیمتی لکڑی کے منقش تابوت سینکڑوں پاؤنڈ کے بھی تھے اور ہزاروں پاؤنڈ کے بھی۔ اس کاروبار میں کیٹر گری کی جا رہی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ سب کچھ ہم پر چھوڑ دیں۔ بس یہ بتا دیں کہ مرنے والے کے لیے آپ کی جیب میں کتنی رقم ہے۔ اسی حساب سے تدفین کا بندوبست ہو جائے گا۔

جب محسن نے کہا "بھائی صاحب کیا ہم اس تابوت سے کسی مردے کے برآمد ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

میں چونکا "مردہ تو مردہ ہوتا ہے۔"

"یہ مردہ بدست زندہ کا کیس ہے۔ کون ہے اس تابوت میں آخر اور یہاں کیوں آیا ہے؟" محسن نے کہا۔

"حضور مردہ جواب دے سکتا تو یہ شعر پڑھتا کہ

تری محفل میں اے جان تمنا
میں ... نہیں لایا گیا ہوں"

وقار سخت نروس تھا "یار آپ لوگ کیسی نان سیریس گفتگو کر رہے ہیں۔ میرا حال خراب ہے وحشت سے اور دہشت سے۔"

میں نے کہا "ہاں یہ ہے تو خاصا ڈراونا سین۔ آدھی رات کے وقت ایک پراسرار تابوت اور نامعلوم مردہ۔"

"مردہ دیکھا کس نے ہے ابھی۔" وقار بولا۔

"کیا مطلب۔ تم نے ایسے ہی فرض کر لیا کہ تابوت ہے تو مردہ بھی ہو گا اس کے اندر۔" محسن نے کہا۔

"اگر انڈا دیکھ کے آدمی فرض کرے کہ اس میں سفیدی اور زردی بھی ہو گی تو کیا یہ غلط ہے۔"

"یہ انڈا نہیں۔ تابوت ہے۔ کیا تم میں اتنی ہمت بھی نہیں وقار کہ کھول کے اندر جھانک سکو۔ تف ہے تم پر۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ تف ہے مجھ پر۔" وقار بولا "یہ کام تم کرو ورنہ تم پر دوبارہ تف۔"

"... میں نے کبھی بہادری کا دعویٰ نہیں کیا۔ میں ایک ... شخص ہوں۔ کیوں نہ سکندر اعظم یہ کارنامہ سرانجام دے۔"

میں نے کہا "میں سوچ رہا ہوں کہ اسے کھولا جائے یا ویسے ہی پولیس کو اطلاع کر دی جائے؟"

محسن نے سمجھایا "ہاں۔ اس سے پہلے کہ پولیس خود آ کے ہم سے پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے۔ یا مردہ تنگ آ کے ڈھکنا اٹھائے اور خود باہر آ کے ہمیں ڈانٹے کہ فیصلہ کیوں نہیں کرتے۔"

میں نے تابوت کے ڈھکنے کو ایک خشک ٹہنی سے اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ ٹوٹ گئی۔ ڈھکن بھاری تھا یا کیلوں سے جڑا ہوا تھا۔ اصل خوف جو ہم سب کے دل میں بیٹھا ہوا تھا وہ یہ نہیں تھا کہ ہم کسی قانونی الجھن میں پڑ جائیں گے یا یہ مردہ ہمارے گلے پڑ جائے گا۔ خود میرے ذہن میں ایک سوال کا آسیب تھا۔ ... اس کے اندر وہ ... نہ ہو جو چوہدری دلاور کی بیوی نے ... مجھ میں اس سوال کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔ چنانچہ میں بھی اسے ناممکن قرار دے کے جھٹک دیتا تھا۔ نازو کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کی زندگی محفوظ ہے۔ دلاور کی بیوی نے بکواس کی تھی۔ تابوت کے اندر نازو ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ حرکت کسی ... مگر کس نے... اور کیوں...؟

بالآخر میں نے اپنے خوف پر قابو پا لیا اور دل کو قائل کیا کہ زندگی یا موت سب منجانب اللہ ہے اور کسی کے چاہنے یا نہ چاہنے سے حقائق تبدیل نہیں ہو سکتے۔ ہم سب راضی برضا رہنے پر مجبور ہیں اور صرف ڈرنے یا سوچتے رہنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا۔

میں نے دل کڑا کر کے کہا "محسن... میں تابوت کھولنے لگا ہوں۔" محسن اور وقار چپ کھڑے تابوت کو گھورتے رہے۔ اب سوال ان کی صورت پر صاف نظر آتا تھا۔ ایک تاریک اور مہیب سایہ ان کے خیالوں کا حقیقت بن گیا تھا جس سے وہ نظر چرا رہے تھے۔ اندر سے ان کے وجود میں خوف منجمد ہونے لگا تھا۔

میں نے کہا "اس میں نازو بھی ہو سکتی ہے۔"

محسن نے ... رکھ کے مجھے دیکھا۔ اس کی خاموشی بھی فریاد بن گئی تھی۔ ... کے لیے اتنے ظالم نہ بنو کہ ایسے الفاظ تو منہ سے مت نکالو۔ اگر ایسا ہوا تو...

تو کیا ہو گا؟ کیا ہم مر جائیں گے۔ صدمے سے ہماری حرکت قلب بند ہو جائے گی! ہم ہوش سے بیگانہ ہو کے خودکشی کر لیں گے۔ یہ صدمہ ہماری جان لے لے گا۔ نہیں ایسا نہ ہوا نہ ہو گا۔ ہم سے پہلے ہمارے پیارے اور ہمارے اپنے وجود کا حصہ بن کر رہنے والے کتنے ہی چہرے بے جان ہوئے اور پتھرائی آنکھوں سے ہم نے ان کو رزق خاک ہونے کے لیے اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور انہیں لحد میں اتار کے ان پر منوں مٹی ڈال دی۔ لیکن ہم زندہ

www.paksociety.com

سمجھتے تھے کہ اب نہ یہ باتیں سے تج بھی زندگی کی بھرپور تھکن اور توانائی کے ساتھ بیتتے ہیں۔

تو پھر کچھ نہیں ہوگا اگر نازو بھی نہیں ہوگی اور جب تابوت کا ڈھکن اٹھایا جائے گا تو اس کا بے حس و حرکت سراپا مجسم فریاد نظر آئے گا۔ لہو پکارے گا کہ اس کا حساب لو۔ ویرانی چھا جائے گی کہ انتقام لو۔ اندر کی آگ دل کو جلائے گی۔

لیکن ایسا کس طرح ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

میں نے خود اپنی آواز سنی جو مجھے اجنبی لگی۔ "بے شک ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔"

پھر میں نے ڈھکنا زور لگا کے اٹھایا۔ اندر کوئی یوم حشر کے انتظار میں محو خواب تھا۔ گیٹ لائٹ کی مدھم روشنی میں اچانک میں نے وہ چہرہ دیکھا۔ ایک تیز اجنبی خوشبو کا جھونکا آیا جس نے میرے لہو کو سرد کر دیا۔ معلوم نہیں وہ ایک لمحہ تھا یا ایک قیامت کی گھڑی تھی جب میں خود بھی کہیں وجود اور عدم کے درمیان کھو گیا تھا۔ میرا احساس خلا میں تھا اور میں مکمل سکوت کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ شاید میرے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا تھا۔ میں سانس بھی نہیں لے رہا تھا۔ میری آنکھیں کچھ نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ سوائے اس کے جو نہیں تھا۔

کیا وہ چہرہ نازو کا نہیں تھا؟

میں نے آنکھیں مل کے دیکھا۔ نہیں میں دیکھ سکتا ہوں۔ محسن بھی دیکھ رہا ہے۔ وقار بھی۔ یہ تو نازو ہی ہے۔ نازو کے سوا بھلا کون ہو سکتا ہے اس جیسا۔

نازو میت کی ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں

اجل کی نیند آ جاتی ہے آخر سننے والوں کو
قیامت کا افسانہ ہوں دنیا کی کہانی میں

وہ سو رہی تھی۔ حسین معصوم خواب ناز میں ہے کتنا سکون ہے اس کے چہرے پر۔ گناہ کو نظر کو حجاب آتا ہے۔ گیٹ لائٹ کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ یوں روشن ہے جیسے اس پر چاندنی کی کرنیں نثار ہو رہی ہوں۔ کیا نازو مر گئی ہے؟ ایسا کون کہتا ہے؟ جو کہتا ہے وہ بکواس کرتا ہے۔

میرے سامنے وقار جھکا اور اس نے نازو کا ہاتھ تھام لیا۔ نازو کی بے زبانی نے کہا "میرا ہاتھ غالب نے تھاما تھا۔ اب کہاں ہے وہ میرا دیوانہ۔ کیا اس کے دل کو ابھی تک خبر نہیں ملی۔ بے ہودہ اور لاوائی خیال کی لہروں نے اس کے احساس کو مجروح نہیں کیا۔ کوئی جا کے اسے کہے کہ نازو آ گئی ہے نازو لوٹ آئی ہے۔"

وقار نے پلٹ کے کہا "سب... یہ تو زندہ ہے"

ایک دھماکا ہوا۔ اس کی بازگشت فضا میں پھیل گئی جیسے ساکت پانی کی سطح پر شہاب ثاقب گرا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ بالکل غیر محسوس انداز میں کائنات کا جمود ٹوٹنے لگا۔ زمین و آسمان کے درمیان ہر چیز اپنے ازلی و ابدی معمول کی جانب لوٹنے لگی۔ زمین اپنے مدار پر اور محور پر گردش پذیر ہو گئی۔ میرا رکا ہوا دل پھر پورے جسم میں انگلیوں کی آخری پور تک خون پمپ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ضعیف سانس چلنے لگی۔ میرے جسم کے ہر مسام سے پھوٹنے والا پسینہ یوں بہنے لگا جیسے یخ بستہ پانی سے بھرے ہوئے جگ کی بیرونی سطح پر ہوا کے بخارات کا لعاب پانی کا دھارا بن جائے

میں نے ایک گہری لمبی سانس لی۔

محسن نے کہا "او مائی گاڈ۔"

او مائی گاڈ۔ خدا وند! تو بڑا رحمان اور مہربان ہے۔ تیری عنایت اور تیرا اکرم کہ تو نے مایوسی کے اندھیرے کو روشنی میں بدلا۔ ہم خود کچھ بھی نہیں۔ تیری اعانت کے بغیر کس منہ سے ہم تیرا شکر ادا کریں؟

محسن نے مجھے جھنجوڑا "سکندر۔ نازو زندہ ہے۔"

میں اس سے لپٹ گیا "نازو زندہ ہے نازو واپس آ گئی ہے۔"

محسن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے "نازو ہمارے ساتھ رہے گی۔ اب نازو کہیں نہیں جائے گی ہمیں چھوڑ کے۔"

وقار نے کہا "خدا کے لیے سکندر صاحب! محسن۔"

میں نے آنسو صاف کر دیے "سوری یار! چلو نازو کو اٹھاؤ۔"

محسن نے بھی کہا "ہاں ہاں! اندر لے چلو اسے۔ نازو! اے نازو کی بچی! یہ کیا ڈراما ہے؟ چل اٹھ۔"

وقار نے کہا "محسن! تم پاگل ہو گئے ہو۔ ہسٹریا کے دورے میں نے عورتوں پر دیکھے تھے تم پر کیسے پڑ گیا۔ نازو بے ہوش ہے۔"

میں نے جھک کے غور سے دیکھا "ہاں۔ نازو بے ہوش ہے چلو ہم اس کو اٹھا کے اندر لے جائیں۔"

محسن نے کہا "ایسے ہی؟ تابوت سمیت؟"

وقار نے اس وقت اپنے اعصاب پر قابو پا کے صورت حال کو سنبھالے رکھا اگرچہ وہ ہم سے بدتمیزی نہیں کرتا تھا مگر اس وقت وہ بگڑ گیا "ابھی ایک جھانپڑ ماروں گا تو شادی عقل ٹھکانے آ جائے گی۔ اندر لگی ہے اس کا تو خیال کرو۔"

میں نے سر کو جھٹکا اور ایک دم مجھے صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔ میں نے نیچے جھک کے نازو کا ایک ہاتھ تھاما اور دوسرا ایک ہاتھ اس کی گردن کے نیچے ڈال دیا۔ نازو کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ میں نے سہارا دے کے اسے اوپر اٹھایا۔ وقار نے اس کے پاؤں پکڑے۔ پھر محسن جھکا اور اس نے درمیان سے نازو کو سہارا دیا۔

وہ سیدھی اوپر اٹھ گئی۔ تابوت سے نکلتے ہی وہ مجھے پرانی نازو محسوس ہوئی۔ زندگی کی حرارت سے معمور جیتی جاگتی۔

میں نے اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اندر کی جانب چل پڑا۔ وقار نے دوڑ کے دروازہ کھولا "سیدھے ہاتھ والے بیڈ روم میں لے جاؤ۔"

میں نے کہا "ہم دونوں اس تابوت کا کچھ کریں۔"

وقار نے میرے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ چھوڑ دیا اور واپس چلا گیا۔ میں نے نازو کو گیسٹ بیڈ روم میں بستر پہ لٹایا اور اس پر کمبل پھیلا دیا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی۔ اس کے بالوں کی ایک شوخ لٹ عادت کے مطابق چہرے پر آ رہی تھی۔ میں نے اسے بڑے پیار سے پیچھے کر دیا اور پھر بے اختیار اس کی پیشانی کو چوما۔ "شریر لڑکی! کتنا ستایا تم نے ہم سب کو۔ کتنا رلایا ہمیں۔ خیر اب تم آ گئی ہو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بھی ٹھیک ہو جاؤ گی۔ غالب بھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

میرے جذبات اس وقت وہی تھے جو کسی باپ کے ہو سکتے ہیں جس کا لخت جگر برسوں بعد اچانک مل جائے یا اس بڑے بھائی کے جس نے اپنی گم شدہ ننھی منی سی بہن کو پھر پا لیا ہو۔ اس وقت جب امید دم توڑ چکی ہو اور یاد کا زخم دل کا ناسور بن گیا ہو۔

وقار اور محسن اندر آئے تو میں اسی طرح نازو کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ نازو کے چہرے پر تھکن اور نقاہت کی زردی تھی۔ اس کے گالوں کے گلاب پژمردہ تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور اس کے بال بھی الجھے الجھے سے تھے مگر پھر بھی وہ نازو تھی۔ اس نے نہ جانے کس کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ بہت قیمتی کپڑے تھے۔

اچانک اس خیال سے میرے دل میں ٹیس اٹھی کہ یہ نازو کون ہے۔ غالب کی جان تمنا یا شوکت واحد کی بیوی؟

محسن نے کہا "وقار! کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔ جو بھروسے کے قابل ہو۔"

وقار سوچ میں پڑ گیا "کیا بتائیں گے ہم ڈاکٹر کو؟"

"کیا بتائیں؟ ڈاکٹر خود اندازہ نہیں کر سکتا۔"

"پہلا تو ہم سے یہی سوال کرے گا کہ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ انہیں کیا معلوم ہے۔ تم ہی سمجھاؤ اور بتاؤ۔"

محسن نے کہا "ہم کہہ سکتے ہیں کہ... ہم تو باہر تھے ابھی آ کے دیکھا تو یہ اسی طرح سوئی ہوئی ملی۔ لیکن ہمیں شک ہوا... کیونکہ ہم نے لائٹ جلائی، پھر یہاں باتیں کرتے رہے اور اچھا خاصا شور ہوا مگر یہ نہیں جاگی۔ اس کی نیند ایسی نہیں ہوتی۔ یہ تو آہٹ پا کے بیٹھ جاتی ہے۔"

میں نے اس بیان کی منظوری دی "یہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن تم پہلے اس کو جگا دو۔"

"ابھی سونے دو اسے یار۔ پہلے نازو کو سنبھال لیں" وقار نے کہا۔

"وہ خود اٹھ کے آ گئی پھر؟"

"وہ گھوڑے بیچ کر سوتی ہے۔ چور اٹھا کے لے جائیں اسے تو پتا نہ چلے" وقار نے کہا اور ایک نمبر ملانے لگا۔

میں نے دوبارہ نازو کی نبض چیک کی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی رفتار نارمل سے کچھ کم تھی لیکن ایسا تو نیند میں بھی ہوتا ہے۔

"تابوت کا کیا ہوا؟"

محسن نے کہا "ہم نے باہر رکھ دیا۔"

"باہر کہاں۔ اپنے گیٹ کے سامنے؟"

محسن مسکرایا "تمہاری مسز جمیل کے گیٹ پر۔"

"کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"دیکھتا تو پوچھتا ضرور کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ درمیان میں ایک کوٹھی کا چوکیدار ہے۔ وہ بھی غالباً سو رہا تھا۔"

وقار نے فون رکھ دیا۔ "ایک لیڈی ڈاکٹر ہے۔ فاطمہ جعفری۔"

"کوئی بھی ہو۔ بس ہماری مدد کرو۔ اعتبار کیا جا سکتا ہے نا اس پر؟"

وقار نے کہا "بیگم اسے اپنی سوکن سمجھتی تھی بلکہ سمجھتی ہے۔"

"اچھا۔ کیا بہت حسین ہے؟" محسن بولا۔

"حسین؟ ہاں کسی حد تک۔ لیکن اصل مصیبت ہے اس کی زبان۔ حد سے زیادہ بے باک اور منہ پھٹ ہے۔ مردانہ لطیفے سنانے سے نہیں چوکتی۔ ایسے کہ مردوں کو بھی پسینہ آ جاتا تھا مگر وہ قہقہے لگاتی رہتی تھی۔ غالباً اسے ہر عورت اپنی ہونے والی سوکن سمجھ سکتی ہے جس کے شوہر سے وہ ملتی ہو۔ اس کا رویہ خطرے کی گھنٹی نظر آنے لگتا ہے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ کوئی آوارہ مزاج یا بدکردار عورت نہیں ہے۔"

"آپ اسے شریف زادی کیسے سمجھتے ہیں؟"

"وہ مجھے عجیب سی چیز ہے۔ سائیکو کیس سمجھ لو۔ مردوں کی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتی اور ثابت کرنا چاہتی ہے کہ وہ مردوں کی اس دنیا میں اسی طرح رہ سکتی ہے جیسے مرد رہتے ہیں۔ عورت ہونے کے باوجود ایک ضد ہے یا بغاوت ہے یہ۔ کسی کو غلط فہمی ہو جائے تو وہ مارا جاتا ہے۔ میں نے بڑے بڑے شہ زوروں کی کلائی کی مٹی پلید ہوتے دیکھی ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ ایسی عورت تو بہت آسان حاصل ہوگی۔"

محسن بولا "مٹی پلید کرانے والوں میں آپ بھی شامل ہیں؟"

وقار نے سر کھجا کے کہا "جی۔ آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ بیوی کے سامنے بولنا پڑتا ہے۔ لڑکی مجھی نے ایبا نزیل لیا تھا مجھے بھری محفل میں کہ کیا بتاؤں؟"

محسن نے ہنس کے کہا "شاعرے یار کیا ہوا تھا؟"

"ہونا کیا تھا میں بھی غلط سمجھا تھا۔ اس نے بھی لفٹ دی اور ایک رات بلا لیا اپنے گھر۔ میں بڑے شوق سے دھڑکتے دل اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ گیا اور اس کی ہدایات کے مطابق عقبی راہ پچھلی طرف سے اس کے بیڈ روم کی کھڑکی پر دستک دی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ جاگ رہی ہوگی مگر اندر واقعہ عجیب تھا۔ میں نے یہ سوچے

www.paksociety.com

ہوئے کہ کیا؟ انتظار کرتے کرتے سو گئی ہو وہ بہت زیادہ واضح طور پر دستک دی۔ اس کے بعد اچانک کھڑکی کھلی اور میں نے اپنے سامنے بندوق کی نال دیکھی اور پیچھے ایک خوفناک مونچھوں والا چہرہ۔ اس کے ڈیڈی کا۔ وہ تو بس زندگی تھی کہ میں ایک دم بیٹھ گیا اور پھر اٹھ کے جو بھاگا تو مت پوچھو کیا حال تھا۔ اس نے تو چلا دی تھی گولی اور ساتھ ہی للکارا بھی ڈاکو کی طرح چلا رہا تھا۔ "چور کی اولاد ڈاکو کے بچے تیری اتنی ہمت کہ پہلے دستک دے کر جھانکتا ہے۔ کیا سمجھ رکھا تھا یہاں کرنل چوڑیاں پہنے بیٹھا ہو گا..."

میں اور محسن ہنستے رہے۔ "کیا کرنل نے بھی ڈراما کیا تھا؟"

"ہو سکتا ہے ورنہ کیسے ممکن ہے کہ گولی مجھے نہ لگتی۔ پہلے فائر کے وقت تو میں بالکل سامنے تھا۔ دوسرا فائر ہوا تو میں چند ہی قدم ہی دوڑا تھا۔ کسی ریٹائرڈ کرنل کا نشانہ بھی اتنا خراب نہیں ہو سکتا۔ مزید ظلم یہ ہوا کہ میرے پیچھے پولیس لگ گئی۔ وہ سمجھے کہ میں کچھ چرا کے یا کوئی واردات کر کے بھاگ رہا ہوں۔ انہوں نے سیٹی بجا کے مجھے رکنے کا اشارہ کیا تو میں گھس گیا ایک گلی میں۔ بدقسمتی اس دن ہر قدم پر ساتھ تھی۔ آگے جا کے وہ گلی ہی بند ہو گئی۔ اس کے بعد کیا ہو سکتا تھا۔ پولیس والے مجھے پکڑ کر تھانے لے گئے۔ وہاں مجھے سچ بولنا پڑا کہ یہ سب عشق خانہ خراب کی کرامت ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے پکڑنے کا نذرانہ وصول کیا۔"

"اگلے دن ملاقات تو ہوئی ہو گی۔"

"ہاں۔ ... کی بچی صاف مکر گئی۔ کہنے لگی کہ تم تو پاگل ہو۔ میں نے داہنی طرف والا کمرا کہا تھا۔ تم بائیں طرف مڑ گئے تو میرا کیا قصور۔ خیر قسمت بہت اچھی ہے تمہاری ورنہ اس وقت مردہ خانے میں نہیں لیٹے ہوتے۔ ڈیڈی کا نشانہ تو غضب کا ہے۔ پہلے لوگ ایک تیر سے دو شکار کرتے تھے ڈیڈی ایک گولی سے کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے موقع ملا تو میں دو گولیوں سے ایک شکار کروں گا۔ تمہارے ڈیڈی کو۔ لیکن پاگل پن ملاحظہ ہو کہ اس نے پھر مجھے بلایا اور میں پھر پہنچ گیا۔"

محسن نے کہا "عشق میں ایسا ہوتا ہے۔"

"دوسری بار کیا اس کی اماں نے سر پہ بیلن مارا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ وہ خود تھی۔ مجھے اندر بلا لیا۔ ابھی میرے حواس بھی بحال نہیں ہوئے تھے کہ دروازے پر کسی نے دستک دی اور اس نے گھبرا کے مجھے باتھ روم میں چھپا دیا۔ اور بس... اس کے بعد بھول گئی۔ میں کیا کرتا۔ شور مچاتا تو خود کرنل صاحب آجاتے۔ کہتے

جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں...... جب خون جگر برفاب ہوا

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی

علی یار خان کی سرگزشت

مجاہد

کتابی صورت (گیارہ حصوں میں مکمل) میں تیار ہے

قیمت فی حصہ -/50 روپے ۔۔ ڈاک خرچ -/16 روپے

گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت صرف -/400 روپے

رعایت حاصل کرنے کے لئے پوری رقم پیشگی بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں

ہو گی سمجھنے والا۔ یہ کہاں اس کے قابو میں آنے والی تھی۔ ایک دن اسے بھنگ کھلا دیا اور اس کے کپڑے پھاڑ کے بال مونڈ کر لٹا دیا۔ خود بھاگ کے باپ کے گھر آ گئی۔ اس کے شوہر نے نشے میں مار پیٹ کی خاصی سنسنی پھیلائی اور بالآخر پکڑا گیا۔ عدالت میں اس کی نہیں سنی گئی۔ کرنل صاحب بیٹی کے گواہ بن گئے کہ اس دن تو وہ گھر میں تھی اور گھر میں فلاں فلاں مہمان مدعو تھے۔ یہ سب نام ایسے تھے کہ کوئی ان کی گواہی کو جھوٹا نہیں کہہ سکتا تھا۔ شوہر صاحب کو چھ ماہ جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ وہیں سے اس نے طلاق بھیج دی۔"

"ایسی کیا غلطی کی تھی اس نے؟"

"میں تو کہتا ہوں کہ شادی ہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اسے تو کسی سیدھی سادی ان پڑھ یا میٹرک پاس گھریلو قسم کی لڑکی سے شادی کرنی چاہیے تھی۔ یہ بلا اس کے قابو میں آنے والی نہیں تھی۔"

جب دروازے پر دستک ہوئی تو وقار گیا اور اپنے ساتھ ایک چھ فٹ کی بے حد صحت مند اور گوری چٹی عورت کو اندر لے آیا۔ اس عورت کی صورت کے نقوش میں نسوانیت کا حسن کم تھا۔ رنگ صاف ہونے اور متناسب جسم کے باوجود اس کی سیکس اپیل نہ ہونے کے برابر تھی۔ شاید یہ ایک نفسیاتی ردعمل کا نتیجہ تھا۔ وقار کی بات سن کے وہ عورت ہمیں مردوں سے زیادہ خطرناک نظر آنے لگی تھی۔

اس نے مجھے اور محسن کو غور سے دیکھا اور پھر وقار کے شانے پر ہاتھ مارا "وکی۔ یہ کیا حرامی پن ہے۔ وسکی ذرا سا تو نہیں ہے؟"

وقار نے کندھے اچکائے "مائی بجاناں۔ تم ڈاکٹری چھوڑ دو پہلوانی شروع کر دو۔ ہاتھ مار کے کسی کا کندھا اتار دیا۔ کسی کی پسلی توڑ دی۔ پھر اس سے علاج کی فیس وصول کر لی۔ یہ بزنس ہے میری۔"

مائی بجاناں یعنی فاطمہ جعفری نے ایک بلند بانگ قہقہہ مارا "تم سے جھوٹ بولتے ہو۔" اس نے انگریزی میں کہا۔

میں نے اور محسن نے دل کے اندر دیکھا جہاں کی سو رہی تھی۔

"یار! جھوٹ کیسا...؟"

"اتنی معصوم اور حسین لڑکی تم جیسے بانگڑو کی بہن ہو ہی نہیں سکتی۔ اور کیا حرامی پن کیا ہے تم نے؟ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ مجھے پھر تم مجرم نظر آرہے ہو اور ایک لڑکی۔ کیا اس نے بھی تمہیں دو دن تک باتھ روم میں بند رکھا تھا؟"

"فاطمہ۔ پلیز بی سیریس۔ یہ بے ہوش ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔ باتیں مت کرو اسے دیکھو" وقار نے کہا "یہ دونوں میرے معزز دوست ہیں۔ لندن سے آئے ہوئے ہیں۔ صرف فرنچ سمجھتے ہیں یا اردو۔"

وہ کچھ متاثر ہوئی اور اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا "تم کو میں نے پہلے کہیں دیکھا ہے۔ تم کسی خاص فلموں

اچھا۔ چور کی اولاد ڈاکو کے بچے تیری اتنی جرأت کہ آج پھر آ گیا۔"

"تم رات بھر باتھ روم میں بند رہے؟"

"رات بھر نہیں۔ اگلے دن بھی۔ دوپہر دو بجے وہ آئی تو مجھے رہائی ملی مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا کرنل صاحب کی آواز آئی اور اس نے مجھے کھڑکی کے راستے فرار ہونے کا مشورہ دیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا۔ تھکن اور بھوک سے بے حال۔ میں کھڑکی سے کودا تو پاؤں مڑ گیا۔ ایسی موچ آئی کہ ہفتہ بھر لنگڑاتا رہا۔ میں کسی سے کیا کہتا۔ خود بھی تماشا بنتا۔ اس لڑکی بچی سے بھی بات نہیں کی۔ مگر میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے جانتے بوجھتے میرے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔ اس کا بدلہ میں نے بعد میں لیا۔ میرے جیسے دو اور مل گئے جو اس پر عاشق ہوئے تھے اور اس کے بعد عشق کے لفظ سے الرجک تھے۔ ہم سب نے مل کے۔ چھوڑو یار بڑی پرانی بات ہے۔ ہم نے بڑی شرمناک حرکت کی تھی۔"

"اب ہم سے کیا شرمانا یار۔ تمہاری حرکتیں تو اب بھی شرمناک ہی ہیں۔" محسن بولا۔

"ہم نے اسے اٹھا لیا۔ ایک گاڑی میں ڈال کے لے گئے۔ وہ سڑک پر اکیلی جا رہی تھی۔ ہم نے پیچھے سے جا کے کھینچ لیا اور بالکل اغوا کے انداز میں دبوچ لیا۔ ظاہر ہے ہم سب دل جلے تھے سب نے اسے خوب ستایا۔ اس کا برا حال ہو گیا۔ ہاتھ جوڑنے لگی اور رونے لگی کہ مجھے معاف کر دو۔ ہم نے کہا کہ آج رات بھر تمہیں معاف کریں گے۔ غلطی کا تاوان ادا کر کے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔ بڑی فحش کلامی کرتے رہے ہم کہ یہ ہو گا اور وہ ہو گا اور ہم نے مووی کیمرے کا بندوبست بھی کیا ہے۔ کرنل صاحب کو فلم کی ایک کاپی ارسال کریں گے۔ ہم اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کے گھماتے رہے اور پھر ایک دوست کے گھر میں لے گئے جو اس زمانے میں خالی تھا۔ وہ بہت چیخی چلائی۔ روئی پیٹی، دھمکیاں دیں کہ یہ کروں گی اور وہ کروں گی۔ ہم نے کہا کہ یہ سب بعد کی بات ہے۔ پہلے یہ دیکھو کہ ہم کیا کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "اور تم نے وہ سب کیا؟"

"نہیں سکندر۔ اتنے ذلیل ہم بہرحال نہیں تھے۔ اس نے مجھے رات بھر اور اگلے دن تک باتھ روم میں بند رکھا تھا۔ ہم نے تو اسے خوب وحشت زدہ کیا اور ایک گھنٹے بعد چھوڑ دیا۔ وارننگ دے کر کہ آئندہ کے لیے خبردار جو ایک بار نہیں ہوا وہ دوسری بار بھی ہو سکتا ہے۔ وہ ڈری نہیں تھی مگر قائل ہو گئی ہماری شرافت کی۔ ظاہر ہے اس وقت وہ انتہائی بے بس تھی اور ہم شریف نہ ہوتے تو اسے اصل حالت میں واپس نہ جانے دیتے۔ بس اس کے بعد سے دوستی ہے ہماری۔ اس کا رویہ تو وہی ہے۔ اس وقت ڈاکٹری پڑھ رہی تھی۔ اب ڈاکٹر بنے بھی چار سال ہو گئے۔ شادی کر دی تھی کرنل صاحب نے مگر شوہر تھا روایتی قسم کا۔ بیوی کو پاؤں کی

www.paksociety.com

میں کام تو نہیں کرتے؟"

مجھے واقعی پسینہ آ گیا۔ لیکن میں نے بھی ہل کڑا کر کے اس سے یوں ہاتھ ملایا کہ بعد میں وہ ہاتھ جھٹکتی رہ گئی "اگر تم بیوٹی شن ہوتیں تو میں ایسا ضرور کرتا لیکن جیسے تم ڈاکٹرز میں معتبر ہو۔ اور یہ دونوں شریفانہ پیشے ہیں۔"

اس نے محسن سے ہاتھ ملاتے وقت احتیاط سے کام لیا "یقیناً تم بھی وکیل ہو گے؟"

"جی نہیں۔ میں گھاس کھودتا ہوں" محسن نے سنجیدگی سے کہا "میری فرم یہی کام کرتی ہے۔"

فاطمہ نے پھر قہقہہ مارا "یو آر اے رنگیلی باسٹرڈ۔ وکی یہ تمہارا معاملہ ہے۔ لیکن مجھے چکر مت دو۔ کوئی لندن میں رہتا ہو اور بولتا ہو صرف فرنچ یا اردو۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی پاکستان میں رہتا ہو مگر صرف روسی زبان جانتا ہو یا فارسی۔ نہ انگریزی بھی فرنچ بولتا ہے نہ فرانس کا رہنے والا انگلش۔ یہ تو پاکستان کے انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھے ہوئے لگ رہے ہیں۔ تم کچھ چھپا رہے ہو۔ خیر کیا ہوا ہے اس لڑکی کو؟"

وقار نے ایک قاش غلطی کی تھی اور اس مردمار عورت نے تاڑ لیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس کی نظر بھی بہت تیز تھی کہ مجھے اس نے میک اپ کے باوجود پہچان لیا تھا۔ حافظہ ساتھ دیتا تو شاید وہ بتا دیتی کہ جناب آپ ہیں سکندر بخت۔ آپ کی تصویریں تو اخبار اور اشتہار میں دیکھی ہیں میں نے اور کارناموں کا شہرہ تو ہر جگہ ہے۔

فاطمہ جعفری نے روایتی طریقے سے نازو کا معائنہ شروع ہی کیا تھا کہ دروازے میں گی نمودار ہوئی۔ وہ سوتے سے اٹھ کے آئی تھی اور جگا لیا اسے فاطمہ کے لرزہ خیز قہقہوں کی آواز نے بیدار کیا تھا۔ گی نے پہلے قہر آلود نظروں سے وقار کو اور پھر فاطمہ کو دیکھا مگر ہماری موجودگی کے خیال سے خاموش رہی ورنہ شاید پوچھتی کہ آدھی رات گئے یہ بے حیا یہاں کیا لینے آئی ہے۔

فاطمہ نے پلٹ کے دیکھا اور مسکرائی "ہائے گی۔ لگتا ہے تم کوئی برا خواب دیکھ رہی تھیں۔"

"ہاں' وہ تو ابھی تک دیکھ رہی ہوں" گی نے کہا۔ پھر اس کی نظر نازو پر گئی اور وہ ایک چیخ مار کے لپکی مگر وقار نے اسے روک لیا۔

"نازو کب آئی' کیسے آئی" گی نے مچل کے کہا "مجھے کیوں نہیں بتایا تم نے؟"

وقار نے کہا "شور مت کرو۔ ابھی سب پتا چل جائے گا۔"

"کیا ہوا ہے نازو کو سکندر بھائی؟" وہ مجھ سے مخاطب ہو گئی۔

میں نے کہا "کچھ نہیں۔"

"کچھ نہیں تو پھر یہ ڈاکٹر کیا دیکھ رہی ہے؟"

میں نے کہا "یہی دیکھ رہی ہے کہ نازو کو کچھ ہوا تو نہیں ہے۔"

فاطمہ نے سرسری معائنے سے فارغ ہو کے اعلان کیا "اس کی کنڈیشن شاک جیسی ہے۔ کیا ہوا تھا؟"

"کچھ نہیں ہوا تھا۔ اگر باہر ہوا ہو تو ہمیں معلوم نہیں۔ یہ آئی اور لیٹ گئی۔ اس نے کچھ کھا تو نہیں لیا؟"

"تمہاری بہن ہے تم بتاؤ کہ اس نے کیا کھایا ہو گا اور کیوں۔ کسی سے عشق کا چکر تھا' شادی ہوئی ہے اس کی؟"

"ہاں... نہیں' میرا مطلب ہے طے تو ہو چکی ہے" وقار نے کہا۔

"یہی تو مصیبت ہے تم لوگوں کی۔ لڑکا لڑکی کو منسوب کر کے بیٹھ جاتے ہو۔ شادی کرتے نہیں۔ وہ جذبات کی آگ میں اندر ہی اندر جلتے ہیں' بھوکے آدمی کی بھوک تو روٹی سے ہی ختم ہوتی ہے نا۔ تم ڈش سامنے رکھ کے انہیں ترساتے ہو۔"

اس نے بعد میں جو کچھ فرمایا وہ فحاشی کے زمرے میں آتا تھا۔ اس نے بتایا کہ لڑکے جو جنسی تشنگی یا محرومی کے احساس کا شکار ہوں وہ کیا کرتے ہیں اور لڑکیاں کیا کرتی ہیں۔ یہ سب سچ تھا مگر اتنا ننگا سچ ہم سب کے سامنے نہیں بول سکتے۔ خصوصاً اس وقت جب قریبی رشتے رکھنے والے حضرات و خواتین ایک ہی جگہ موجود ہوں۔

گی سخت کنٹرول کرنے کے باوجود اس بے ہودہ گفتگو پر چراغ پا تھی اور اس کی صورت سے نفرت' کراہیت اور غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ نازو کب تک ٹھیک ہو جائے گی۔" گی نے بالآخر برہمی سے کہا "یہ کون سا وقت ہے نفسیاتی الجھنوں کے اسباب پر لیکچر دینے کا۔ جو تم کر رہی ہو وہ ہر لڑکی نہیں کرتی۔"

"ہاں۔ اور اس کا نتیجہ ہوتے ہیں ہسٹریا کے دورے۔ خیر اس کا بی پی ٹھیک ہے۔ نبض بھی ٹھیک ہے اور نظام تنفس بھی۔ جس کا مطلب ہے اس نے کوئی خطرناک زہر نہیں نگلا ہے۔ اور اگر خواب آور گولیاں کھائی ہیں تو ان کی مقدار کم تھی۔"

"یہ کب تک ہوش میں آ جائے گی؟"

"صبح تک امید کی جا سکتی ہے لیکن صبح مجھ سے لڑنے مت آ جانا۔ یہ وقفہ ایک دن سے بڑھ کر ایک مہینے کا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ابھی آبزرویشن کا پیریڈ ہے۔ صحیح رائے تمام ٹیسٹ لینے کے بعد دوں گی۔ وکی' تمہاری بیوی تو بہت خوب صورت ہے' تمہارے مقابلے میں۔"

"ٹھیک ہے۔ نازو کے لیے خطرے کی بات تو نہیں؟"

"نہیں۔ کیا تم نے اپنی بیوی کو وہ بات بتائی تھی؟"

وقار گھبرا گیا "تم بھی حد کرتی ہو۔"

"تمہارا شوہر بڑا لفنگا تھا۔ پھر بھی بتاؤں گی' اس نے میرے ساتھ کیا بدمعاشی کی تھی۔" وہ گی سے مخاطب ہوئی "اچھا میری جان میں چلتی ہوں۔"

میں نے کہا "میرا نام سکندر بخت ہے۔"

فاطمہ نے چٹکی بجا کے کہا "رائٹ۔ تم تو ٹی وی کے ہیرو ہو۔ تمہارے کارنامے سن سن کے عاشق تھی میں۔ جی چاہتا تھا کہ تمہارے ساتھ شامل ہو کے سب کی ... کر دوں۔ تم سب سے ملے اس دن ... کیا نام تھا اس کا' چوہدری دلاور..."

اس نے بڑے فراٹے سے مردانہ گالیاں دی تھیں۔ میں اور محسن دم بخود بیٹھے تھے اور اگر وقار نے اس کا تفصیلی تعارف نہ کرایا ہوتا تو پتا نہیں کیا سمجھتے۔

"تم بالکل ویسی ہی ثابت ہو رہی ہو جیسا وقار نے بتایا تھا۔" وہ اپنے بیگ میں کچھ تلاش کر رہی تھی "میں بالکل بے مہار۔ تمام اخلاقی قدروں کی ایسی تیسی کرنے والی۔ تم سمجھتے ہو کہ زبان گندی ہو تو دماغ کے اندر بھی گندگی ہوتی ہے۔ عورت کو تو بالکل آپ جناب اور حضور پرنور' شکریہ' تسلیمات یا اوئی اللہ اور ہائے میں مر گئی کے سوا کچھ بولنا ہی نہیں چاہیے 'لو مگر ہٹ ہی۔"

"میں چھوڑ چکا ہوں" میں نے کہا۔

"کیفر کا ڈر تھا؟" وہ ہنسی "یا معیوب سمجھتے تھے۔ دونوں باتیں غلط۔ مجھ سے پوچھو' میں ڈاکٹر ہوں کہ کینسر کے زیادہ کیس نان اسموکرز میں ملتے ہیں۔ اور یہ جو بے شرمی اور گندگی کا مسئلہ ہے نا' یہ بھی انتہا ہے۔ میں سب نکال دیتی ہوں۔ وہ جو شرمیلے اور خاموش رہنے والے شریف زادے اور شریف زادیاں ہوتی ہیں نا۔ ان کی حقیقت جانتی ہوں میں۔ ان کے اندر گندگی جمع ہوتی رہتی ہے۔ ان کو اکیلے میں دیکھو۔ چھپ چھپ کے وہ کیا کرتے ہیں۔ آنکھوں سے اور زبان سے یا محض خواہش سے وہ کیا نہیں کرتے؟"

میں نے کہا "کبھی تم نے غور کیا کہ تم جیسی عورت ابنارمل کیوں بن گئی' ننانوے فیصد لیڈی ڈاکٹرز اور عورتیں ایک رویہ رکھتی ہیں۔ تم اس کے برعکس ہو۔ یہ کیسے ہوا؟ ظاہر ہے اس کے بھی عوامل ہوں گے۔ ایک شعر سنو گی۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا"

اس نے کش لیتے ہوئے مجھے دھوئیں کی اوٹ سے دیکھا "تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "تمہارے والدین۔ کیا وہ نارمل لوگ تھے اور آپس میں ایسے ہی رہتے تھے جیسے سب میاں بیوی رہتے ہیں۔ تمہارے ساتھ کیسے پیش آتے تھے کوئی محبت کرتا تھا تم سے؟"

میں نے محسوس کیا کہ تیر نشانے پر لگا ہے اور میں نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔ وہ اب سیریس ہو کے مجھے گھور رہی تھی۔

میں نے کہا "کیا تم ان کی جائز اولاد تھیں؟ تم لوگ انتہائی غریب تھے۔ باپ کوئی کام نہیں کرتا تھا اور گھر میں غیر متعلق لوگ آتے تھے غیر مرد۔"

وقار نے سکون کا سانس لیا "تم صبح تک رک کیوں نہیں جاتیں؟"

وہ قہقہہ مار کے ہنسی "رک سکتی ہوں ایک شرط پر۔ تمہارے ساتھ سونے کی اجازت مل جائے تو تمہارے بیڈ پر۔"

گی کو جیسے آگ لگ گئی "تم تو انتہائی بے شرم عورت ہو' ایسی باتیں کرتی ہو۔"

"میں باتیں ہی کرتی ہوں۔ اور کچھ نہیں۔ میری جان ساتھ سونے کا مطلب تم پتا نہیں کیا لے رہی ہو۔ وکی تمہارا شوہر ہے میرا نہیں۔ اور یہ بڑا بدمعاش ہے اس لیے اپنا تو بس یار ہے۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔"

"مجھے ایسی باتیں بالکل پسند نہیں۔"

"مگر مجھے پسند ہیں" اس نے گی کے گالوں پر چٹکی لی "یار وکی' یہ بیوی کہاں سے مارلی ظالم۔ خیال رکھنا' جیسے کوئی بھگا کے نہ لے جائے۔ پہلو نے حور میں لنگور' خدا کی قدرت۔ اچھی چیز دیکھ کے سب کی رال ٹپکتی ہے۔ چلو میں یہاں صوفے پر سو جاتی ہوں گر پاس۔"

"مگر کیا...؟" وقار نے سر کھجا کے کہا۔

"جب میں اکیلی ہوتی ہوں نا۔ تو ذرا پراٹھنکی ہونی چاہیے۔ یہ کپڑوں کا کچھ نفسیاتی مسئلہ ہے۔ جسم آزاد ہو تو نیند آتی ہے اچھی ورنہ عجیب سی الجھن ہوتی ہے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسی اور پھر ایک دم میری طرف پلٹ گئی "مجھے یاد آ گیا۔ میں نے تمہاری تصویر دیکھی تھی' تم کچھ بدلے ہوئے ضرور لگ رہے ہو۔ کیا میک اپ کر رکھا ہے؟"

میں نے نارمل نظر آنے کی ناکام کوشش کی "میک اپ کرتی ہیں خواتین۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "میری جان' ڈاکٹر کرتے ہیں پوسٹ مارٹم' یعنی لاش سے پوچھ لیتے ہیں کہ کیا سچ ہے۔ ایک ہڈی تیرے نکال کے بتا سکتے ہیں کہ وہ مرد تھا یا عورت تھی۔ اس کی کیا عمر تھی اور اس کی موت کب اور کیسے ہوئی تھی۔ تم تو میرے سامنے زندہ پورے کے پورے۔"

میں نے کہا "اوکے۔ تم بیٹھ جاؤ آرام سے۔ میں بتاتا ہوں۔"

گی سخت جھنجلاہٹ کے عالم میں وقار کو بازو سے پکڑ کر لے گئی "تم نے بلایا تھا اس فاحشہ کو؟ میں کہتی ہوں اب کیوں لائے ہو تم ایسی عورت سے۔ یہ تو جنسی مریضہ ہے۔ بے شرمی کی بھی حد ہوتی ہے۔"

"بابا وہ ڈاکٹر ہے" وقار باہر اسے آہستہ آہستہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا "اس وقت میں اور کسے بلاتا۔ معاملہ رازداری کا بھی تھا۔ تم تو سو رہی تھیں۔ تمہیں کیا معلوم یہاں کیا ہوا۔ چلو غصہ چھوڑو۔ چائے بناتے ہیں ہم کچن میں چل کے" پھر ان کی آواز دور ہو گئی۔

www.paksociety.com

"مرو نہیں" اس نے سگریٹ کو پاؤں سے مسل دیا "وہ جانور تھے۔"

میں نے کہا "بس اتنا کافی ہے۔ میں سمجھ گیا۔ میرے سامنے پوز بھی مت کرنا۔ میں امپریس نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک تم قابلِ رحم ہو۔ تمہارے نزدیک یہ معیوب بات نہیں اگر مرد عورت شادی سے بغیر بالکل فیملی بنا کے رہیں؟ تم کو خاندان کی روایتی قدریں بھی ایسی ہی لگتی ہوں گی جیسے یہ کپڑے جو تم نے پہن رکھے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم باہر چلی جاؤ۔ یہاں کے معاشرے میں تم مس فٹ ہو۔"

اس نے سر ہلایا "تم بہت چالاک آدمی ہو۔ ذہین اور خطرناک بھی۔ آئی لائک یو۔"

"تمہیں سخت مایوسی ہوگی۔ میں حد درجہ دقیانوسی خیالات رکھتا ہوں۔ تم اگر مغرب ہو تو میں مشرق۔ میری ایک منگیتر ہے جس کے سوا کسی اور کی طرف نظر اٹھا کے دیکھنا بھی میں گناہ سمجھتا ہوں اور شادی سے پہلے اپنی منگیتر کو اپنی بیوی سمجھ لینا میرے نزدیک جرم ہے۔"

"میں نے اپنی ماں کو قتل کیا تھا" وہ بولی "میں بچوں کی جیل میں رہی۔ اس وقت میں دس سال کی تھی۔ ایک وکیل نے مجھے جھوٹی گواہیوں کی مدد سے بچا لیا۔ بورسٹل جیل کے تجربات اپنی جگہ بہت تلخ یادیں رکھتے ہیں۔ اس وکیل نے مجھے کرنل حامد کی تحویل میں دے دیا۔ کرنل میرا باپ نہیں ہے مگر ان لاکھوں سے بہتر ہے جن کا نام ولدیت کے خانے میں لکھا جاتا ہے۔ اس نے مجھے بچا لیا ورنہ میں گلیوں بازاروں میں پلنے والی لڑکی ہوتی۔ اب تک مر کھپ چکی ہوتی۔"

"میں حیران ہوں کہ تمہارا یہ رویہ کرنل صاحب اور تمہارے مریض کیسے برداشت کرتے ہیں؟"

وہ ہنسی "ان کے سامنے میں ایکٹنگ کرتی ہوں۔ شرافت اور معصومیت کی۔ بالکل بے زبان اور احمق نظر آتی ہوں۔ مریضوں سے کاروباری بات ہوتی ہے۔ وہ بولتے ہیں اور میں سنتی ہوں۔ یہ تو ایک میرا یار دوست ہے اور اس کے ساتھی ہیں جن کے سامنے میں پوز نہیں کرتی۔ یہ نہ ہوں تو میں پاگل ہو جاؤں۔"

وقار چائے لے کر اندر آ گیا "مائی پیجا تان۔ تم کو سب معلوم ہو گیا؟"

"نہیں۔ تمہارے دوست کو سب معلوم ہو گیا میرے بارے میں" وہ ہنسی۔

وقار نے کہا "تم نازو کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ جب تک یہ ٹھیک نہ ہو جائے اسے اپنے پاس رکھو۔ یہاں اس کا رہنا ٹھیک نہیں۔"

"کیوں کیا مسئلہ ہے 'ڈک' ڈارلنگ بتاؤ۔"

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ وقار تمہیں سب کچھ بتا سکتا ہے۔ ہماری یہاں موجودگی ضروری نہیں ہے۔"

میں نے وقار کے کمرے سے فون کیا۔ وہاں گل آنٹی [illegible] بیٹھی تھی۔ "قسم خدا کی سکندر بھائی۔ اس عورت کو میں [illegible] وہاں کی کچا نہیں وقار اسے کیوں برداشت کرتے ہیں۔ ایسی بے شرم عورت ہے کہ توبہ۔ ضرور وقار اور اس کے درمیان [illegible] ہے۔"

میں نے اسے ڈانٹا "بلاوجہ شک کا روگ مت پالو۔ تمہارا میاں صرف تمہارا ہے اور اس میں ہمت ہی نہیں ہے کہ [illegible] کرے۔"

"اس عورت میں تو ہے۔"

"نہیں۔ وہ تھوڑی سی ذہنی مریض ہے لیکن بے ضرر ہے۔ کم سے کم تمہیں کوئی خطرہ نہیں اس سے" میں نے کہا۔

"میں کیا کروں؟"

"تم سو جاؤ بس۔" میں نے کہا اور اپنے گھر کا نمبر ملانے لگا۔

رابعہ نے ریسیور اٹھا کے کہا "جی کیا خبر ہے؟"

"خبر یہ ہے کہ گندو باگو میں گنڈوں کا باغ برائے فروخت ہے۔ کل کی ہیڈ لائن یہی ہوگی" میں نے کہا "یہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ فون کسی اخبار کے دفتر سے کسی رپورٹر نے کیا ہے؟"

"تمہارے لہجے سے لگتا ہے کہ خیر اچھی ہے۔ حالانکہ بھاگے تم ایسے تھے جیسے تم نے دیر کی تو قیامت آ جائے گی۔"

"قیامت تو آ گئی ہے" میں نے سرگوشی میں کہا "یہ بتاؤ اس وقت تم کتنی ہوا ہو رہی ہو۔ تمہارے آس پاس [illegible] ایسی خطرناک چیز تو نہیں ہے جس پر [illegible] خدانخواستہ۔۔۔ خدانخواستہ۔۔۔ وہ ہو جائے۔ جس کے لیے ارشاد فرمایا ہے کسی۔۔۔ حسرت اس غنچے پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گیا۔"

"میں آرام سے بیٹھی ہوں صوفے پر۔ اور میرے ساتھ گل بھی ہے خبر گیری کے لیے۔"

"وعدہ کرو تم چیخ نہیں مارو گی۔ بے ہوش ہونے کا ارادہ نہیں کرو گی اور جب میں واپس آؤں گا تو میرا منہ چوم لو گی۔ اچھی خبر کے لیے کوئی تو انعام بھی ملتا ہے۔"

"اب کچھ بولو بھی۔"

"ایسے نہیں انعام کی بات گول مت کرو۔"

"بابا انعام ملتا نہیں لیا جاتا ہے۔" اس نے گول مول جواب دیا۔

"اوکے۔ میں لے لوں گا۔ مگر بابا کہتی ہو تم مجھے تو میرا رومانٹک موڈ کی ایسی تیسی ہو جاتی ہے۔ مجھے بابائے اردو مولوی عبدالحق اور بابائے قوم یاد آنے لگتے ہیں۔ خیر یہ ہے۔۔۔ پانی لاؤ تھوڑا سا۔"

"اف۔۔۔ میں فون بند کر دوں گی۔"

"کر دو۔ مجھے کیا پڑی ہے جو تمہیں بتاؤں کہ نازو آ گئی ہے۔"

ساتھ کہا۔

"وہ اچھا اچھا لیکن یہاں مت آنا۔"

"ہم ابھی اور اسی وقت آ رہے ہیں" یہ آواز پھر رابعہ کی تھی "تم روک سکتے ہو تو روک لو۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے ریسیور رکھ دیا اور پھر میں نے بہت کوشش کی مگر نمبر نہیں ملا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے انہیں یہ خبر دی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ آدھے گھنٹے میں ان کا پہنچ جانا یقینی تھا۔

"کیئر ڈیئر۔ اب تمہیں نیند تو آئے گی نہیں۔ تمہارا خون جل رہا ہے یہاں بیٹھے بیٹھے۔ چلو ڈرائنگ روم میں۔ رابعہ اور گل بھی آ رہی ہیں۔"

گھنٹی پھر بجی تو میں جاتے جاتے رک گیا۔ میں نے اس خیال سے ریسیور اٹھایا تھا کہ رابعہ ہوگی مگر دوسری طرف سے دلاور کی بیوی نے کہا "کیا یہ مسٹر وقار کا گھر ہے؟"

میں نے آواز بنا کے کہا "ابھی تک تو ہے جناب۔"

"میری رابعہ ایڈووکیٹ سے بات ہو سکتی ہے؟"

"ابھی تو نہیں ہو سکتی۔ آپ نمبر دے دیں یا پیغام۔"

"تم کون ہو؟" اس نے تنے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں ان کا ماموں۔ چوہدری لال دین کھتا والا آف چونا منڈی۔"

وہ سمجھ گئی کہ اس قسم کی بات کرنے والا کون ہو سکتا ہے "تم سکندر نہیں ہو تو پھر محسن ہو۔"

"دونوں۔۔۔ [illegible]" میں نے کہا "آپ اپنے بارے میں کچھ فرمائیے۔ آپ کی میٹھی آواز ہے کہ لگتا ہے مٹھائی کھا کے بول رہی ہو۔"

"میں مسز دلاور ہوں۔ تحفہ مل گیا میرا۔ شکریہ تو کہہ دو۔"

میں نے کہا "آپ نے تو کچھ اور فرمایا تھا۔ رابعہ کا ہارٹ فیل ہو جاتا پھر؟"

"پھر کیا۔ تمہیں دوسری کوئی رابعہ مل جاتی' سال چھ مہینے میں۔"

میں نے کہا "میں محسن ہوں۔ سکندر کراچی میں ہے اور شاید کل آپ سے بات بھی کرے گا۔ مسز دلاور اس عنایت کا سبب؟"

"سبب کچھ نہیں۔ میں نے اپنا قرض چکا دیا۔ تم نے مجھے میرا شوہر زندہ سلامت واپس کر دیا۔ اس کے بدلے میں اور کیا دیتی میں۔ پہلے تو صرف شکریہ ہی ادا کیا تھا۔ تم نے مجھے ملوایا تھا اس سے اس وقت جب میں سمجھ رہی تھی کہ شاید میں بیوہ ہو چکی۔ تم اسے مار بھی سکتے تھے لیکن تم نے اسے زندہ رکھا۔"

میں نے کہا "اب میں کیا کہوں۔ تمہارا شوہر دشمنی نبھانے کے معاملے میں اتنا با اصول بھی ثابت ہوا تھا۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔

گل دانت نکالنے لگی "آپ کیوں تنگ کرتے ہیں رابعہ باجی کو؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "اس لیے کہ ابھی میرا وقت ہے۔ باقی زندگی وہ مجھے تنگ کرے گی جیسے تم کر رہی ہو وقار کو۔"

"میں تنگ کر رہی ہوں اسے یا وہ مجھے ستا رہا ہے۔ اس وقت بھی دیکھ لو جا کے کیسی باتیں کر رہے ہوں گے دونوں۔ اور وقار کیا کم ہیں۔"

میں نے کہا "تم وقار کو ورکی کیوں نہیں کہتیں۔ مجھے تو افسوس ہے کہ یہ خیال تم کو پہلے کیوں نہیں آیا۔"

"اچھا تو لگتا ہے مگر اس عورت سے کہو کہ پہلے وہ وقار کو ورکی کہنا چھوڑے۔ اسے کیا حق حاصل ہے کہ۔۔۔"

"تم بھی کیا بات کرتی ہو۔ ساری دنیا اسے ورکی کہے گی تو تم پابندی لگوا دو گی کہ خبردار' اس نام کے جملہ حقوق محفوظ ہیں کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت۔ ورکی اور گل کیا زبردست جوڑی بنتی ہے۔ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد بھی کچھ نہیں اس کے مقابلے میں اور مستقبل پر نظر رکھو تو بعد میں ورکی گل اینڈ سنز بھی زبردست کاروباری نام ثابت ہوگا۔ سن کے بجائے سنز بھی ہو سکتے ہیں اگر تم کچھ ہمت کرو۔"

گل شرمانے لگی۔ فون کی گھنٹی بجی تو میں اچھل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ فون ابھی تک ڈاؤن رہے گا اور جب تک میں خود نمبر نہیں ملاؤں گا رابعہ اور گل سخت سسپنس میں مبتلا رہیں گی۔

ریسیور اٹھا کے میں نے کہا "ہاں جی' چوہدری لال دین کھتا والا بول رہا ہوں چونا منڈی سے۔ کیا بات ہے۔ اچھا اچھا۔۔۔ سکھ اندر ہے۔۔۔ پھر ہم کیا کریں جی" میں نے فون بند کر دیا۔

گھنٹی پھر بولی تو میں نے ریسیور اٹھاتے ہی رابعہ کی آواز سنی "کیا مجھے خود آنا پڑے گا تمہارا دماغ درست کرنے کے لیے۔"

"آ جاؤ بلبل' دماغ خراب بھی تم نے ہی کیا ہے۔ وہ کیا خوب گا کے فرمایا ہے اپنے محمد رفیع صاحب نے۔۔۔

تم ہی نے درد دیا ہے تم ہی دوا دینا"

غالباً جھلا کے رابعہ نے ریسیور گل کو دے دیا تھا "سکندر بھائی کیوں پریشان کرتے ہو۔ سچ بتاؤ' نازو آ گئی ہے؟ تمہیں رابعہ کی قسم۔"

"عقل کی بچی۔ یہ ناول ہے" میں نے چلا کے کہا "قسم دے کے تم نے پابند کر دیا۔ نازو واقعی آ گئی ہے۔"

"بات کرائیں میری۔ وہ ٹھیک ہے نا؟"

"نہیں۔ وہ بات نہیں کر سکتی۔ وہ بے ہوش ہے مگر ہم نے ایک ڈاکٹر کو بلا لیا ہے۔ اس نے یقین دلایا ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہم اسے اسپتال شفٹ کر رہے ہیں۔"

"ابھی نہیں۔ ہم دیکھیں گے اسے" رابعہ اور گل نے ایک

www.paksociety.com

"براہ راست میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں لیکن تم میرے شوہر کے دشمن ہو تو میرے بھی ہو۔" وہ بولی۔

"ٹھیک تو ہو گی۔ تم نے واقعی احسان کیا ہم پہ۔ اب یہ بھی بتا دو کہ نازو تمہیں کہاں سے ملی؟"

"چھوڑو یہ سب باتیں۔ تمہارے لیے ناممکن ہوا اس کا سراغ لگانا۔ جیسے میں دلاور کو تلاش کرنے میں ناکام ہو گئی تھی۔"

"نازو بے ہوش کیوں ہے؟ اور اسے تابوت میں بھیجنے کا مقصد کیا تھا؟"

"مقصد صرف ایک پیغام دینا تھا۔ ویسے بھی نہیں تھی کہ تم اسے دفن کرنے کے سوا کچھ نہ کر پاتے۔ میرا خیال تھا کہ تم سمجھ جاؤ گے۔ عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے محسن۔"

"میں عقلمند نہیں ہوں۔ عقل ہوتی مجھ میں تو جذباتی ہو کے سکندر کا ساتھ نہ دیتا اور خود سکندر میں عقل ہوتی تو آج وہ دلاور کا دشمن نہیں بزنس پارٹنر ہوتا۔ ہم ایسے خوار نہ ہوتے۔ یورپ اور امریکا میں عیش کر رہے ہوتے۔"

"یہ تم آج بھی کر سکتے ہو۔"

"نہیں۔ سو پیاز کھا کے اب سو جوتے کھانے سے فائدہ نہیں۔ ہم خود کو مزید بے وقوف ثابت کرنا نہیں چاہتے۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ نازو کی بے ہوشی کس قسم کی ہے؟"

"میں کیا ڈاکٹر ہوں؟"

"نازو کو تم وزیر خان اسپتال سے لائی تھیں نا؟"

"اگر یہ اندازہ ہے تو سمجھو بالکل ٹھیک ہے۔ غالب بھی رہتے وہیں تھا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر شاہ نے نازو کو آسانی سے تمہارے حوالے کر دیا؟"

"آسانی سے کوئی کام نہیں ہوتا مسٹر محسن۔ لیکن مشکل کام بہت کیے ہیں میں نے۔ یہ بھی مشکل تھا مگر ڈاکٹر شاہ کو موقع بھی نہیں ملا کچھ کرنے کا۔ اسے مجھ پر کیسے شک ہو سکتا تھا۔ میں بھی اکیلی نہیں گئی تھی۔ میں نے صرف ڈاکٹر شاہ کو کمرے میں روکے رکھا۔ نازو کو میرے رفقا وارڈ بوائز نکال کر لے گئے۔ پھر میں بھی نکل آئی۔ میں اس سے پوچھ نہیں سکی کہ نازو کیسی ہے؟ میں نے تو نازو کو بعد میں دیکھا۔"

"اس وقت وہ تابوت میں بھیجنا نہیں تھی۔ یہ بندوبست تم نے پہلے سے کر لیا تھا۔"

"یہ خیال مجھے اچانک آیا۔ ایک تابوت دیکھ کے۔ مجھے معلوم نہیں وہ کس نے کس کے لیے بنوایا تھا۔"

"وہ تابوت نیا نہیں تھا۔ اسے کسی کی قبر کھود کے نکالا گیا تھا۔ کیونکہ اس پر مٹی بہت تھی۔ باقی رہا یہ "تابوت تمہیں اچانک کہاں نظر آیا تھا۔ گھر میں اچانک نہیں نکلتا اور سڑک پر رکھا ہوا بھی اچانک نظر نہیں آتا۔"

"تابوت وزیر خان اسپتال کے احاطے میں رکھا ہوا تھا۔ تمہیں ڈاکٹر شاہ بتائے گا کہ کیوں رکھا ہوا تھا" وہ جھنجلا کے بولی "اس سے پوچھو اگر بہت شوق ہے سراغ رسانی کا اور وہاں فرصت نکالنے کا۔ کیا اضافہ ہوگا تمہاری معلومات میں اگر تابوت کا پتا چلتے کرتے رہے۔"

میں نے کہا "یہ میں وقت آنے پر بتاؤں گا۔ ابھی تو مسئلہ ہے نازو۔ جب تک وہ ہوش میں نہیں آجاتی" ایک سوال اور۔

"ایک نہیں دو پوچھو۔ پھر مجھے بھی پوچھنا ہے۔"

"کیا نازو کی واقعی شوکت رانا سے شادی ہوئی تھی؟"

اس نے کہا "اس کا جواب نازو دے سکتی ہے یا پھر تم شوکت رانا سے پوچھ سکتے ہو۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے صرف پتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور میں نے اسے وہاں سے نکال کے تمہارے پاس پہنچا دیا لیکن تم نے رانا کو مقامی پولیس کے حوالے کر کے غلطی کی۔"

"پھر ہم کیا کرتے؟"

"تم چودھری دلاور کو قید میں رکھ سکتے ہو تو شوکت رانا کیا چیز ہے مسٹر محسن۔ پولیس اور وہ الگ نہیں ہیں۔ اگر ڈاکو کسی چور کو پکڑے گا تو کیا عدالت میں پیش کرے گا؟ ان کے درمیان کچھ پہلے سے ہے۔ تمہارے سامنے گرفتاری کا ڈراما ایک مجبوری تھی۔ اب تک وہ رہا ہو چکا ہوگا۔ اس کی کوشش کامیابی کے قریب ہوگی صرف نساوے کے لیے ہی نہیں وہ میرے اور بچوں کے لیے بھی خطرہ ہے۔"

"تم نے خطروں سے کھیلنا سیکھ لیا ہے۔"

"دیکھو۔ مجھے غلط مت سمجھو۔ دلاور کی خاطر جو کچھ میں نے کیا وہ مجھے کرنا ہی تھا۔ آئندہ بھی جو مجھ سے بن پڑا وہ ضرور کروں گی۔"

"اتنی محبت ہے اس سے؟"

"وہ میرے بچوں کا باپ ہے۔ یہ بات کتنی دفعہ بتا چکی ہوں کہ تمہارے لیے اور دنیا کے لیے وہ کچھ بھی ہو۔ میری نظر میں صرف میرا شوہر ہے اور ویسے بھی اس میں اور شوکت رانا میں بڑا فرق ہے۔ شوکت رانا اور جتنے جرائم پیشہ گھٹیا ذہنیت رکھنے والے چھوٹے لوگ ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ پیسے کے لیے یا معزز اپنی بدمعاشی کا بھرم رکھنے کے لیے۔"

میں نے ہنس کے کہا "اور دلاور شریف آدمی ہے؟"

وہ چیخ کے بولی "مجھے بتاؤ وہ کیا کرتا ہے۔ کیا وہ شرابی ہے جواری ہے؟ رنڈی باز ہے یا عورتوں کی عصمتوں سے کھیلتا ہے۔ اس کا یہ کاروبار غیر قانونی ہے۔ ایسے تو نہ جانے کتنے لوگ ہیں غیر قانونی کام کر کے بچ جاتے ہیں مگر شریف اور معزز سمجھے جاتے ہیں۔"

"لمبی بحث کا وقت نہیں ہے۔ اور پھر تم سے کیا بحث کی جائے ایک بیوی کی طرح سوچتی ہو۔" میں نے کہا "یہ بتاؤ کیا نازو

اسی حالت میں ملی تھی۔ یا تمہیں علم تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟"

"کیا غالب سے مل کے تم نے اندازہ نہیں کیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

میں نے کہا "گویا تمہیں غالب کی واردات کا بھی علم ہے اور اس کی حالت کا بھی۔ تم جانتی ہو کہ وزیر خان اسپتال میں کیا ہوتا ہے؟"

"میں رہنا میں رہ کے دنیا سے اتنی بے خبر بھی نہیں۔ ایک نام سنا ہے تم نے؟ ڈاکٹر فاطمہ جعفری۔ بڑی عجیب چیز ہے وہ۔ اسے عورت تو میں نہیں کہوں گی۔"

میرے ذہن میں ایک دھماکا سا ہوا "کیا نام لیا تم نے؟ فاطمہ جعفری؟"

"ہاں۔ مجھے تو وہ بھی نفسیاتی کیس ہی لگتی ہے۔ کہتے ہیں کہ باقاعدہ ڈاکٹری پاس ہے۔ ایم بی بی ایس ہے۔"

میں نے خود کو سنبھال کے کہا "تم ملی ہو اس سے؟"

"ملے بغیر یہ سب کیسے بتا سکتی تھی۔"

"اور کیا جانتی ہو اس کے بارے میں؟" میں نے کہا۔

وہ بولی "اس نے اپنی ماں کو قتل کر دیا تھا۔ باپ کا کچھ پتا نہیں۔ کوئی کرنل ہے جس نے اس کو پالا مگر یہ بھی سنا ہے کہ زبح کل وہی اس کا شوہر بنا ہوا ہے۔ جس سے اس کی شادی ہوئی تھی وہ شریف تو تھا اور کوئی ڈاکٹری تھا جو بھس کیا تھا۔ اس کی دوسری بیوی کو میں جانتی ہوں۔ اسی نے مجھے بتایا ہے کہ فاطمہ جعفری اپنے شوہر کے ساتھ صرف تین مہینے رہی تھی اور اس عرصے میں جو کچھ ہوا وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر تو کل ہو جاتا۔ یہ عورت وہ ہے۔"

میں نے کہا "NYMPHOMENIAC?"

"ارے۔ تم نے کیسے جان لیا۔ مجھے تو یاد نہیں آرہا تھا یہ لفظ۔ خیر تم سمجھ گئے ہو گے۔"

میں نے کہا "جیسے مرد جنسی جنونی ہوتے ہیں ایسے ہی کچھ عورتیں ہو جاتی ہیں۔"

"یہ عورت ڈاکٹر شاہ کی خاص معاون ہے۔"

یہ دوسرا شاک زیادہ شدید تھا "تمہیں یقین ہے؟"

"کیا تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو اس کے بارے میں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ میں تو کبھی نہیں ملا اس سے۔ تم سے ہی نام بھی سنا ہے اس کا۔"

"وہاں ڈاکٹر شاہ کی اور اس کی جوڑی مل کے کیا کرتی ہو گی۔ اس کا اندازہ بھی کر لینا چاہیے تمہیں۔ وہاں مرد بھی داخل ہیں اور عورتیں بھی۔ ان پر جسمانی تشدد بھی ہوتا ہے مگر جنسی تشدد بہت برا کیا جاتا ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ مرد عورت کو وہاں جانور سمجھا جاتا ہے اور ان پر ایسے جنسی تجربات بھی کیے جاتے ہیں جن کا تصور کوئی نہیں کر سکتا۔"

"او خدایا! کیا ان تجربات کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ فلم بنا کر؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔"

"شوکت رانا ایک بلیک میلر ہے۔"

"ضرور ہو گا۔"

"اور اس کے پاس بلیک میلنگ کا ذریعہ یہی فلمیں ہوں گی۔"

"اگر تم جانتے ہو تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"مجھے افسوس ہے کہ تم کو سب معلوم تھا۔ لیکن آج تک تم نے کچھ نہیں کیا۔"

"تم میری جگہ ہوتے تو کیا کر سکتے تھے۔ میں کوئی مجاہد نہیں تمہاری طرح۔ میں چودھری دلاور کی بیوی تھی۔ ڈاکٹر شاہ اس کا بزنس پارٹنر تھا۔ لیکن اب حالات اس کے برعکس ہیں۔ وہ دلاور کا جانی دشمن ہے اور اس کا بس چلے تو وہ دلاور کے خاندان کا نام ونشان مٹا دے۔ کون سی کسر چھوڑی تھی اس نے مجھے اور میرے بچوں کو مار کے سارے کاروبار پر قابض ہونے میں۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ دلاور کا کانٹا راستے سے نکل گیا۔ اب وہ زخمی سانپ ہے۔ اس کی رعیت میں چھپ کر رہنے پر مجبور ہوں۔"

"اور اسی لیے تم یہ سب مجھے بتا رہی ہو۔"

"ہاں۔ یہ دشمنی کا رشتہ کچھ ایسے جڑ گیا ہے۔ پہلے تم نے میری مدد کی تھی۔ میری زندگی بچائی تھی اور مجھے دلاور سے بھی ملوا دیا تھا۔ میں نے بدلے میں نازو کی زندگی بچائی اور اسے تم سے ملا دیا۔ اب میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ شوکت رانا کو ختم کر دو۔ وہ میرا اور تمہارا دونوں کا دشمن ہے۔ میں یہ کام نہیں کر سکتی۔ تم کر سکتے ہو۔ تم نے بہت بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ شوکت رانا کے معاملے میں پولیس پر یا قانون پر بھروسا مت کرو۔ تمہاری ایم آر ایس اسے ٹھکانے لگا سکتی ہے۔"

میں حیران تھا کہ دلاور کی بیوی کس قسم کی گفتگو کر رہی ہے۔ اس کی کوئی بات غلط نہیں تھی لیکن مجھے ایسا لگا جیسے وہ چالاک عورت مجھے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے۔

میں نے کہا "تمہیں دلاور کے معاملے میں کوئی تشویش نہیں؟"

وہ بولی "اب دلاور کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"کیا تم ملی ہو اس سے؟"

"ابھی تک مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ پولیس اس کی گرفتاری سے بھی لاعلمی ظاہر کر رہی ہے لیکن میں سب سمجھتی ہوں۔ میں معقول کر رہی ہوں اور اس کی ضمانت پر رہائی بھی ہو جائے گی۔"

فاطمہ جعفری کے بارے میں دلاور کی بیوی کے انکشافات نے میرے ذہن کو غیر متوقع الیکٹرک شاک کی طرح جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ناوا قفی میں ہم سے کبھی خوفناک غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے تجہیز و حفاظت کے لیے کوئی بچہ بھیڑیے کی تحویل میں دے دیا جائے۔ یہ ساری باتیں وقار کے علم میں بھی نہیں تھیں جو مجھے دلاور کی بیوی نے بتا دی

www.paksociety.com

تھیں۔ دلاور کی بیوی اور دلاور کی بیوی ہونا اس کا جرم ...
کچھ برسے ... حویلی کے اندر مکمل مرکز ... وہ باتیں سیاہ
خانے میں اقامت کی ایک کرن ہمیشہ روشن ...
دلاور کی بیوی کے وجود میں شرافت باقی تھی۔ اس کے لیے دلاور کی
بھی دوسری عورت کے شوہر سے کم اہم نہ تھا۔ سو فیصد بازاری اور
بے نصیب تھا تو اس کی بیوی بھی بے خطا نہ تھی مگر اس کے باوجود
معاشرے اور خاندان کے رواجی بندھن میں دونوں بھی خوشی
بندھے ہوئے تھے اور اپنے گھر کی حفاظت ایک ہی طرح کرتے
تھے۔

دلاور کی بیوی کا احسان مند ہونا بھی غنیمت تھا۔ کہتے ہیں نیکی
کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ دلاور کی بیوی نے اپنے وقت میں کیا نیکی
کا بدلہ چکایا تھا جب ہم بے بس تھے اور یہ حساب ایسے برابر کیا تھا
کہ شاید کچھ ہم ہی زیادہ مقروض ہو گئے تھے۔

میں واپس اس کمرے میں پہنچا جہاں وقار، محسن اور فاطمہ
فراغت سے قالین پر پاؤں پھیلائے بیٹھے ہوئے تھے۔ محسن نے
فاطمہ کو اعتبار کے قابل سمجھتے ہوئے وہ سب بتا دیا تھا۔ دشمن کے
تجربے اپنا ہر راز افشا کرنے کے مترادف تھا۔ دوست بن کے آنے
والے دشمن کو ... سے آگاہ کرنے اور اس کے سامنے
اپنی جنگی حکمت عملی کی وضاحت کرنے کے مترادف تھا۔

فاطمہ یقیناً دل ہی دل میں ساری صورت حال سے لطف اندوز
ہو رہی تھی۔ نازو اسی کی کشتہ تیغ ستم تھی جسے مسیحائی کے لیے اسی
کے سپرد کیا جا رہا تھا۔ یہ اتفاق بھی کیا بے رحمانہ تھا۔ دلاور کی بیوی
فون نہ کرتی تو نازو پھر اسی زنداں میں پہنچ جاتی اور الزام ہم پر آتا کہ
دوسری بار خود ہم نے اسے عذاب دینے والوں کے حوالے کیا۔

میرے ذہن میں اب بہت سے سوالات تھے اور الجھنیں
تھیں۔ مگر میں مطمئن اور پرسکون تھا۔ مجھے صبح تک مہلت مل گئی
تھی اور سوچ سمجھ کر ہی میں محسن کو بھی شریک راز کر سکتا تھا۔ ان
حالات میں فاطمہ جعفری کی واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
مجھے تو یہ تشویش بھی لاحق ہو رہی تھی کہ اس نے نازو کو کیا دوا
انجکشن کی صورت میں دی تھی۔ کیا یہ نازو کی بے ہوشی کو طول
کرنے والی دوا تھی؟ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ اس نے بے ہوشی کو
ختم کرنے کے بجائے زندگی کو ختم کرنے کا فیصلہ نہ کیا ہو۔ وہ ابھی

ایکٹریس بھی تھی۔ اس نے نازو کو دیکھ کر کسی حیرانی کا اظہار نہیں
کیا تھا اور پریشان نہیں ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے نازو کی زندگی
محفوظ تھی کہ فاطمہ جعفری کو افشائے راز کا ڈر نہیں تھا۔ وہ مطمئن
تھی کہ قید سے فرار ہونے والے قیدی کو اس کی ... نے پھر جیلر
کے سامنے پہنچا دیا اور اب فکر کی کوئی بات نہ تھی۔ اس کے
ہوش میں آنے سے پہلے وہی جیل خانہ ہوگا اور وہی قید کی اذیت۔
وہ نازو کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔ اس بار سختی زیادہ ہوگی تو وہ خود
بتا دے گی کہ اس کو زنداں سے نکالنے والا کون تھا؟

دلاور کی بیوی بہت میری گفتگو کی نے بھی سنی تھی اور وہ میرے
پیچھے آ گئی تھی۔ میں نے اسے ڈانٹ کے رخصت کر دیا۔ "چلو باتیں
باتیں ہیں۔"

"مگر مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔"

"آ رہی ہے" میں نے ڈانٹ کے کہا "تم کو اپنی صحت کا خیال
رکھنا چاہیے۔"

وقار نے کہا "یہی میں بھی کہتا ہوں۔"

محسن بولا "مگر ایسے خیال نہیں کرتے جیسے مولوی خادم حسین
خیال رکھتا ہے اپنی بیوی کا۔"

وقار نے کہا "بیوی کو دیکھو۔ کتنی ماتا ہے اس کے پیار
میں۔"

گل کے جاتے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا "ڈاکٹر فاطمہ
جعفری۔ آج کل تم کہاں پریکٹس کرتی ہو؟ کلینک کہاں ہے؟"

"کلینک گھر میں ہی ہے۔ جو مریض آ جائیں دیکھ لیتی ہوں۔"

میں نے کہا "ہاں آمدنی کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ٹھیک ہے کیا
ضرورت ہے تمہیں زیادہ مغز ماری کرنے کی۔ تمہارے شوہر کی
جائیداد کافی ... ملی ہے۔"

"کس شوہر کی بات کر رہے ہو تم؟ میرا کوئی شوہر نہیں۔"

میں نے حیرانی سے کہا "تو پھر یہ کرنل صاحب کون ہیں؟"

"اس نے بتایا ہے تمہیں" وہ بھڑک کے بولی۔

"مگر لوگ تو کچھ اور کہتے ہیں۔"

اس نے چند موٹی موٹی گالیاں دیں "ذلیل لوگ۔"

"مگر اگر پہلے لوگ کہتے تو ..."

اس نے غرا کے میری بات کاٹ دی "کیا مطلب؟"

"غلاظت تو تمہارے اپنے اندر اتنی بھری ہوئی ہے کہ ابل
ابل کے باہر آ رہی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میرے سامنے یہ مت
کرنا۔ تم منٹو کا افسانہ نہیں کوئی فحش ناول ہو۔"

وہ بھڑک اٹھی "وقار... ایسے... دوست ہیں تمہارے۔"

میں نے اس کی کلائی پکڑ کے جھٹکا دیا اور وہ پھر بیٹھنے پر مجبور
ہو گئی۔

میں نے کہا "بیٹھو جان من۔ ہم سے آج ہی ملی ہو اور اتنی
جلدی روٹھ کے جا رہی ہو۔ ابھی تو کچھ کہا نہیں ابھی تو کچھ سنا
نہیں۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا ہے۔"

میں نے جواب میں ایسی بات کہی جو یہاں لکھی نہیں جا سکتی۔

"یہ تو تمہارا فیلڈ ہے۔ ذہنی مریضوں کا علاج تم کیسے کرتی ہو
آخر؟" میں نے کہا "ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ ڈاکٹر شاہ اور تم ان کے
کس قسم کے تجربات کرتے ہو۔ میں اس سے ملا تو نہیں مگر میں نے
سنا ہے کہ وہ بھی ایک سیکس MEDIAC ہے۔ SADIST قسم
کا۔"

کر سکا۔ اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے اور وہیں گر گئی۔ ایک
دفاعی انداز اختیار کر کے اس نے سر کو پاش پاش ہونے سے ضرور
بچا لیا تھا۔

میں نے زمین پر قدم جماتے ہی پھر دوسرے وار کے لیے خود کو تیار
کر لیا۔

محسن بولا "بس بھائی۔ تم مقابلہ جیت گئے ایک عورت سے
مبارک ہو۔"

وقار بھونچکا کھڑا تھا۔ شور سن کر گل بھی کمرے میں آ گئی تھی۔
گل نے اسے بلایا "کیا ہے یہ سب؟"

وقار نے نفی میں سر ہلایا جس کا مطلب تھا کہ مجھے کچھ معلوم
نہیں۔

میں نے کہا "پیچھے رہو گل۔ ہو سکتا ہے یہ مکر کر رہی ہو۔ ایسا نہ
ہو تم کو دبوچ لے۔"

گل دوڑ کے وقار کے پیچھے ہو گئی "یہ تو مر گئی ہے شاید۔"

میں گھوم کے گیا اور سر کی طرف سے اس کے بالوں کو مٹھی
میں لے کر ایک جھٹکا دیا۔ وہ چیخ مار کے اٹھ گئی۔ اس کے منہ سے وہ
گالیاں نکلیں جو عام حالات میں مرد نہیں دیتے۔ اب میں نے
روایتی انداز میں اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا بھرپور تھپڑ رسید کیا۔
اس کا منہ گھوم گیا اور جلد پر چار انگلیوں کے نشانات واضح ہو گئے۔

"بند کرو اپنی بکواس۔ آس پاس کے لوگ سنیں گے تو بدنامی
میری ہو گی۔" گل نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اپنا پچھلا غصہ بھی
نکال لیا اور اس کے دوسرے گال پر تھپڑ مار دیا۔ بدقسمتی سے اس
کا چہرہ گل کے سامنے بالکل صحیح زاویے پر آ گیا تھا۔

اس نے گل کو بہت بری گالی دی۔ گل کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ
پاؤں سے سلیپر اتار کے اس کی مرمت کرنے کے لیے آگے بڑھی
"حرام زادی۔"

وقار ہنس پڑا "بس" اور گل کو روک لیا۔

محسن نے کہا "میں بار دیا دوں۔ کیسی چڑیل ہے..."

میں نے اسے کھینچ کھینچ کے صوفے پر ڈال دیا اور ایک گھٹنے
سے پیچھے دبا لیا "کوئی فائدہ نہیں مقابلے کا مائی ڈیئر۔ تمہاری
اصلیت مجھے معلوم ہو چکی ہے۔ وقار کے گھر تمہیں شامت اعمال
لائی تھی۔"

وقار سخت بدحواس تھا "یار... مجھے تو کچھ پتا نہیں تھا۔ آخر
معاملہ کیا ہے؟"

فاطمہ جعفری کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور وہ سانس
لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی شعلہ فشاں آنکھیں جیسے حلقوں
سے ابل آئی تھیں۔ اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی ورنہ اس
حالت میں بھی مقابلہ جاری رکھتی۔ یہ اس کے حق میں اچھا ہوا۔ وہ
ہاتھ اٹھاتی تو میں لحاظ نہ کرتا اور اس کا بازو اتر جاتا یا ٹوٹ جاتا۔

اس وقت مولوی خادم حسین نے بآواز بلند "لاحول ولا قوۃ" کا

اس کی شخصیت میں نمایاں ہونے والی تبدیلی اتنی واضح تھی کہ
وقار اور محسن جو پہلے میری باتوں پر حیران تھے اب اس کو یوں دیکھ
رہے تھے جیسے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ انسانی روپ میں چڑیل یا
بھوت ہے جس کو میرے منتر نے اصلی چہرہ دکھانے پر مجبور کر دیا ہو۔

وہ ایک دم اٹھ کے مجھ پر جھپٹی مگر میں اس کے لیے بالکل تیار
تھا۔ میں نے خود کو دائیں ہتھیلی زمین پر رکھ کے ایک طرف جھکا لیا
اور میرے پیر اٹھے تو اس کے پیٹ پر لگے۔ وہ اس کے لیے تیار
نہیں تھی۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی مگر پھر اس کا جسم اکڑ گیا
اور یہ اشارہ میرے لیے کافی تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جوڈو کراٹے
جانتی ہے۔ بس اسے یہ علم نہیں تھا کہ میں اس کا بھی استاد ہوں۔

وہ زخم خوردہ شیرنی کی طرح دہاڑی اور پیچھے ہٹتے ہی پھر پلٹ
کے آئی۔ اس وقت تک میں تو کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی کمر
کے پاس سے کپڑوں کو گرفت میں لیا اور جھٹکا دے کر اسے تھوڑا سا
اوپر اٹھایا۔ میرے دوسرے ہاتھ نے اسے پیچھے سے دھکیلا۔ وہ
میرے اوپر سے گزر گئی اور منہ کے بل صوفے کے پیچھے والی دیوار
سے ٹکرائی۔

وہ بھرے بدن والی لمبی چوڑی عورت تھی۔ دیوار اس تصادم
سے لرز گئی اور خود اس نے ایک بھیانک چیخ بلند کی۔ وقار نے ایک
دوبارہ دبے لہجے میں کہا کہ بھئی یہ کیا ہو رہا ہے تو محسن نے اسے
یہ کہہ کے خاموش کر دیا کہ تمہیں کیا۔ مفت کی فائٹ دیکھو آرام
سے بیٹھ کے۔

فاطمہ جعفری صوفے پر پڑی ہانپ رہی تھی۔ اس کی شکل غصے
اور نفرت کے جذبات سے مکروہ نظر آنے لگی تھی۔ وہ مجھے اور وقار
کو غلیظ گالیوں سے نواز رہی تھی اور خطرناک دھمکیاں دے رہی
تھی۔

اب میں پوری طرح مستعد کھڑا ہوا اسے بلا رہا تھا "کم آن
مائی بےبی... دیکھتے ہیں تم کس حد تک مرد ہو۔"

وہ بپھرا بادل کے حملہ آور ہوئی۔ اس کے بال بکھر گئے تھے اور
آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ خون اس کے ہونٹوں کے کنارے
سے بھی بہہ رہا تھا۔ غالباً اس کا منہ صوفے کی لکڑی پر لگ گیا تھا۔

اس نے خالص پیشہ ورانہ انداز میں مجھے فلائنگ کک مارنے
کی کوشش کی۔ یہ کک کسی عام آدمی کے پڑ جاتی تو اس کی پسلیاں
ٹوٹ جاتیں یا اس کا سانس رک جاتا۔ میں نے اس کا جواب اپنی
فلائنگ کک سے دیا۔ ہمارے پاؤں فضا میں پرواز کرنے والے
جہازوں کی طرح ٹکرائے۔ مہارت کے اعتبار سے ہماری کارکردگی
کا معیار برابر تھا مگر وہ جسمانی طاقت سے مار کھا گئی۔ اگر آسمان کی
وسعت میں شکاری باز کا تصادم چیل سے ہو جائے تو چیل کہاں
جائے گی۔

وہ بھی کریش کرنے والے جہاز کی طرح واپس گئی اور ریورس
گیئر میں دیوار سے ٹکرائی تو اس کا سر ضرب کی شدت برداشت نہ

www.paksociety.com

ورد کرتے اور تقریباً دوڑتے ہوئے نازل ہوئے۔ ان کی نصف بہتر ان کے پیچھے لڑھکتی چلی آرہی تھی اور چلا چلا کے کہہ رہی تھی "ارے رکو ظالم بخت۔"

میں نے کہا "تم لوگ کیسے آگئے یہاں؟ اور تم کیوں مار رہی ہو اسے آدھی رات کو؟"

"لعنتی۔ آپ بھی کیا بات کرتے ہو۔ ہاتھ ٹوٹ جائیں میرے جو میرے دل میں ایسا خیال بھی آیا ہو۔ ہمیں رابعہ بی بی نے بھیجا زبردستی۔"

مولوی خادم حسین نے کانپتی آواز میں کہا "سکندر صاحب کچھ تو خدا کا خوف کیجئے جی۔ یہ سخت غیر شرعی رنگ ہے۔ توبہ توبہ عورت کے ساتھ آدھی رات کو دھینگا مشتی، ہم تو خیریت معلوم کرنے آئے تھے۔"

وقار نے کہا "یہ عورت نہیں۔ بلا ہے بلا۔ تمہیں نہ چمٹ جائے۔"

خادم حسین نے فوراً آیت الکرسی پڑھ کے پھونک ماری "مجھ سے ایک تو پہلے ہی چمٹی ہوئی ہے جی" اس نے زیر لب کہا۔

میں نے فاطمہ جعفری کو بیٹھنے کا موقع فراہم کیا۔ اس نے وقار سے کہا "میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"اب تم بڑے گھر جاؤ گی۔ تمہارا اپنا گھر تو ہے نہیں" میں نے کہا۔

وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا "وقار یہ سب کچھ تمہارے گھر میں ہوا ہے میرے ساتھ، یاد رکھنا۔"

جواب میں نے دیا "ابھی تو بہت کچھ ہونا باقی ہے جو تم یاد رکھو گی ساری عمر کی ریوالور والا ڈارلنگ۔"

نگی نے لرزتی آواز میں کہا "سکندر بھائی... یہاں خون کروگے اس کا... نہیں... اسے باہر لے جاؤ کہیں۔ گولی چلنے کی آواز سب سنیں گے اور... خون نہیں دیکھ سکتی میں۔"

میں نے سوچ کے کہا "اچھا۔ پھر اسے پھانسی دے دیں یا گلا دبا کے ہلاک کردیں۔"

وقار نے کہا "تم نگی کو موقع کیوں نہیں دیتے۔ اس کے دل میں بڑی تمنا تھی اس عورت کو قتل کرنے کی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھ سے بھی کہہ رہی تھی کہ میرا بس چلے تو اسے زہر دے دوں۔ تم قسم دے کے پوچھ لو کہ کیا میری بات غلط ہے؟"

محسن نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ کم از کم نگی کا ارمان پورے کر دو اب جب۔"

مولوی خادم حسین ایسے ہل رہا تھا جیسے اسے جاڑا بخار چڑھ رہا ہو "اللہ کیسی بھیانک باتیں کررہے ہیں آپ لوگ۔ میری گھر والی کا دل بہت کمزور ہے۔"

"یہ تو ڈاکٹر صاحب بتاسکتی ہیں کہ دل کی کیا حالت ہے۔ تم بھی چیک کرالو مولوی خادم حسین اچھا موقع ہے۔ دماغی امراض کی ماہر بھی ہے۔"

خادم نے پھر لاحول پڑھی "میرے دماغ کو کیا ہوا ہے جی۔"

"ہاں۔ جو چیز موجود ہی نہ ہو اس کو کیا ہوگا۔ خیر اب تم سب خواتین کو یہاں سے لے جاؤ۔ اور دیکھو اگر کوئی دروازے پر آکے سوال کرے کہ یہ کیسا ہنگامہ ہے تو کہہ دینا..."

محسن نے کہا "کہہ دیں گے کچھ نہیں۔ ہم میاں بیوی پیار محبت کی باتیں کررہے تھے۔"

جب کمرے میں میرے ساتھ محسن اور وقار رہ گئے تو میں نے کہا "ڈاکٹر۔ اب یہاں سے زندہ سلامت اور خیر و عافیت کے ساتھ واپس جانا صرف ایک صورت میں ممکن ہے۔ تم بتاؤ کہ مارا کیوں بے ہوش ہے اور کب تک رہے گی۔ اس کی ذہنی کیفیت کیا ہے اور..."

اس نے میری بات کاٹ دی "میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "یعنی اپنے لیے بھی مشکل پیدا کروگی اور ہمارے لیے بھی۔"

محسن نے کہا "پوچھ گچھ کے وہ سب طریقے آتے ہیں ہمیں جو پولیس والے استعمال کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم نے غالب پر بھی کیے ہوں گے۔"

اس نے چیلنج کرنے والے انداز میں میری طرف دیکھا "آزما کے دیکھو۔ تم نے مجھے عام عورت سمجھ رکھا ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔"

"تم اس پیشے کے نام پر دھبا ہو۔"

"اور میں لاوارث بھی نہیں ہوں۔ جب ڈاکٹر شاہ کو معلوم ہوگا اور کرنل کو پتا چلے گا..."

میں نے کہا "کیسے پتا چلے گا؟"

اس نے کچھ سوچ کے کہا "میں کرنل کو بتا کے آئی تھی... یہاں۔"

اس کے لہجے کا کھوکھلا پن ہی اس کے دعوے کی نفی کررہا تھا۔ "چلو پھر انتظار کرتے ہیں اس کی کال کا۔ آخر کب تک تمہاری واپسی کی راہ دیکھے گا وہ؟"

میں نے وقار کو سونے کے لیے بھیج دیا "تم جاکے ذرا نگی کو تسلی دو۔ محسن شیروانی، تم اگر خود آرام کرو تو کچن تک جانے کی تو نہیں۔ کوئی چائے بنالاؤ۔"

"میں خادم حسین کی بیوی سے کہہ رہا ہوں" وہ مجھے اکیلا چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

چند منٹ کے لئے تنہائی میسر آئی تو میں نے فاطمہ جعفری کے قریب بیٹھ کے اطمینان سے پاؤں پھیلائے ایک جماہی لی اور یہ ظاہر کیا کہ تکان اور بے خوابی سے میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ میں اسے کچھ کرنے کا موقع فراہم کررہا تھا اور وہ اس چال کو نہیں سمجھ سکی۔ وہ سمجھی مجھ پر غنودگی کا اثر ہے اور میں اس کی طرف سے غافل ہوں۔

وہ تڑپ کر اٹھی اور ایک دم میرے اوپر آگئی۔ اس کا ہاتھ ایک مہلک وار کرنے کے لیے اٹھ چکا تھا۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ وہ مجھے جان سے ماردے گی اور کسی کے واپس آنے سے پہلے فرار ہوجائے گی۔ اس وار سے کسی کی جان لینا گولی مارنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے جو دماغ اور نچلے جسم کے درمیان زندگی کے احساس کا رشتہ قائم رکھتی ہے۔ یہ ٹوٹ جائے تو جسم کا سر سے تعلق ہی نہیں رہتا اور حلق سے کوئی آواز نکالے بغیر آدمی موت سے ہمکنار ہوجاتا ہے۔

میں نے حرکت محسوس کرتے ہی آنکھیں کھول دی تھیں۔ خود کو بچانے کے لیے میں پلٹ کر صوفے سے فرش پر گر گیا اور میں نے دائیں ٹانگ لوصیٹ کر ایک جھٹکے سے دراز کیا۔ لات اس کے پیٹ پر لگی اور وہ درد کی شدت سے کراہ کے دوہری ہوگئی۔ میں نے دوسرا پاؤں ایسے ہی اس کے گھٹنے پر مارا تو وہ بری طرح لڑکھڑا کے گری۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنی کھڑی ہتھیلی سے اس کے کان پر وار کیا اور وہ فرش پر گرتے ہی بے حس ہوگئی۔

جب وہ پوری طرح مستعد تھی تو اس پر حملہ کرکے اسے ناک آؤٹ کرنا مشکل کام تھا۔ وہ اپنا دفاع کرتی اور اگر میں کامیاب ہوتا تو خاصی جدوجہد کے بعد۔ مجھے بے خبر سمجھنے کی غلطی اس کو مہنگی پڑی۔

محسن نے اندر آکے دیکھا "کیا غلام کردیا اسے؟"

میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا "نہیں۔ اسے یہاں سے منتقل کرنا ضروری تھا۔ اور یہ کام ایسے ہی ہوسکتا تھا۔"

"کہاں لے جائیں گے اس وقت ہم اسے؟"

میں نے کہا "آج رات اپنے گھر میں رکھیں گے کل دیکھیں گے جہاں دوسرا ہوتا۔"

میں نے اور محسن نے مل کے اسے اٹھایا اور گاڑی کی ڈکی میں ڈال دیا۔ دروازے کی آواز پر خادم حسین دوڑتا ہوا آیا "کون ہے؟ اچھا آپ ہیں۔"

میں نے کہا "ہم جارہے ہیں مولوی خادم حسین۔ اپنے گھر۔"

بدنام ترین مجرم چارلس سوبھراج کے جرائم کی مکمل تفصیل

چارلس سوبھراج کی سرگزشت

میں ملاحظہ فرمائیں

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا ادارے سے حاصل کریں

کتابیات پبلی کیشنز ◎ پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

زندگی کے نشیب و فراز

گناہ و ثواب

اندھیروں اور اجالوں

وقت اور حالات کے بھنور میں جنم لینے والی ایک

بصیرت افروز کہانی

غلام روحیں

میاں شاہد علی کی داستانِ حیات، سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی سلسلہ وار کہانی جو پہلی بار کتابی شکل میں منظر عام پر آگئی ہے۔ ایک مجبور و بے بس شخص کی الم انگیز کہانی... اس نے جرم و گناہ کے راستوں کو اپنانے سے انکار کیا تو مجرم بنا کر اسے جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پھینک دیا گیا۔ قسمت نے اسے گھر بار اور والدین کے سائے سے محروم کردیا...!!

وہ جیل سے رہا ہوکر باہر آیا تو اس کا سینہ سلگ رہا تھا۔ انتقام کے شعلے اس کے وجود کو جھلسا رہے تھے۔ لیکن... ایک دوست نے اس کی رہنمائی ایک مردِ کامل کے آستانے تک کردی...!!

وہ عشقِ حقیقی میں ڈوب گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں تو قلب روشن ہوگیا۔ لیکن ایک اچانک حادثے نے ماضی کے زخموں کو کرید کر پھر ہرا کردیا تو اس نے تڑپ کر آنکھیں کھول لیں...!!

تاریک راہوں کی گھٹن سے ابھرنے والی ایک خوبصورت اور عبرت انگیز داستان۔

قیمت: ۳۰/ روپے

ملنے کا پتہ

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

www.paksociety.com

"اور وہ جو بتا چکی ہوئی تھی آپ سے۔"
میں نے کہا "وہ رفع ہو گئی۔ وقار کہاں ہے؟"
"وہ تو لاہور گئے ہیں جی اپنی بیگم صاحب سے۔ بلکہ بیگم صاحب تو یہیں لاہور رہ رہی ہیں۔ میری طرح۔"
"اچھا یہاں کسی کا فون آئے اور کوئی پوچھے ڈاکٹر فاطمہ جعفری کو تو کہنا رانگ نمبر اور فون بند کر دینا۔ دوسری بار بھی یہی ظاہر کرنا کہ یہاں کوئی فاطمہ جعفری کو نہیں جانتا۔ اور نہ اس نام کی کوئی خاتون کبھی یہاں آئی ہے۔"
"میں سمجھ گیا جی۔ میں تو کہوں گا کہ یہ نام ہی پہلی بار سنا ہے میں نے۔ اور اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی گھر والی کو دے دوں گا ریسیور اگر دوسری بار بھی فون آئے۔ وہ سمجھا دے گی صحیح طرح۔"
میں نے کہا "تم جیسا مناسب سمجھو کرو مگر خیال رہے نہ میں اور محسن یہاں آئے نہ کوئی اور آیا۔ سب معمول کے مطابق ہوتا رہے۔"
میں نے راستے میں محسن کو دلاور کی بیوی سے فون پر ہونے والی تمام گفتگو سنا دی۔ "اسی لیے فرمایا ہے بزرگوں نے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے۔"
"سچ کہا تم نے نادان دوست۔ مگر اب اس عورت کو چھوڑنا تو بہت خطرناک بات ہے۔"
"کس نے کہا ہے کہ چھوڑ دو؟"
"اسے معلوم ہو گیا ہے کہ تم سکندر ہو۔"
"میں صبح ہوتے ہی لاہور سے بھاگ جاؤں گا۔ مجھے فوراً شرف ملاقات بخشنا ہو گا میری کے والد کو۔"
رابعہ اور گل اس انتظار میں تھیں کہ مولوی خادم حسین انہیں فون کر کے کچھ بتائے گا اور پھر یہ جان کر سخت پریشان ہو گئیں کہ آدھی رات کو ان کا فون بھی مر گیا یعنی ڈیڈ ہو گیا تھا۔ ابھی میں نے گاڑی روکی ہی تھی کہ وہ باہر آ گئیں۔ انہوں نے ہم دونوں کو دیکھا تو خاصی مایوس ہوئیں "نازو کہاں ہے؟"
میں نے کہا "نازو؟ کون نازو؟"
محسن نے کہا "سوتے سوتے اٹھی ہیں اس لیے بہکی بہکی باتیں کر رہی ہیں۔"
گل نے کہا "کیوں تنگ کر رہے ہو بیچاری کو۔"
میں نے کہا "بھئی معاف کرنا۔ ہم نے مذاق کیا تھا۔ مانا کہ بہت بے ہودہ تھا یہ مذاق۔ مگر سچ یہی ہے کہ نازو نہیں آئی۔"
رابعہ نے آگے آ کے کہا "کھاؤ میری قسم۔"
"اف!" میں نے سر پکڑ لیا "خدا کے لیے قسم نہیں دو گی مجھے۔ تمہیں میری قسم۔"
محسن بہت خوش ہوا۔ "اور گل تم بھی قسم کا لفظ استعمال نہیں کرو گی۔ تمہیں میری قسم۔"

"اب آپ لوگ پابند ہیں اپنی قسم کے۔" رابعہ بولی۔
میں نے کہا "تمہارے سر کی قسم رابعہ نازو نہیں آئی۔"
محسن نے افسوس سے کہا "ہمارے ساتھ" اور میں نے سر ہلایا۔
گل چونکی "پھر کہاں گئے تھے تم لوگ ایسی افراتفری میں؟"
"یار کیا ساری پوچھ گچھ یہیں ہو گی۔ اندر تو جانے دو۔" محسن نے کہا۔
رابعہ کا موڈ سخت خراب تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں نے جھوٹی قسم کھائی ہے یا پھر قسم کھانے کا ڈرامہ کیا ہے۔
"ہم نے مولوی خادم حسین کو بھی بھیجا تھا" گل بولی۔
میں نے حیرانی سے کہا "کہاں بھیجا تھا؟"
"وقار کے گھر اور کہاں۔ تم کہاں گئے تھے آخر؟"
"ہم۔۔۔ ہم وہاں ضرور گئے تھے۔ لیکن مولوی وہاں نہیں پہنچا۔ کتنی دیر ہوئی اسے روانہ ہوئے؟"
"تمہارے پیچھے پیچھے گئے تھے وہ میاں بیوی۔ ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا۔" گل نے بتایا۔
رابعہ سخت خفا تھی "ابھی سے یہ اوقات ہو گئی ہے ہماری۔ جھوٹی قسم بھی کھانے لگے ہیں لوگ۔"
میں نے کہا "موت کیا کریں گی۔ ابھی رجسٹر کھا کے آئے ہیں۔"
محسن نے میری تائید کی "اور ایسی شاندار گالیاں بھی کر کر سنو تو ایسی کہ ہم لوٹ کرتے ہیں تو جھاڑ کھانے کو دل چاہتا ہے۔"
"مزہ تو جب ہے کہ کھاؤ گے ہم سے۔ جھوٹی قسم ہی سہی۔"
"لیکن اب دونوں تیلی جیسی اور جھوٹے ہیں" گل نے کہا "فراڈ بھی۔"
"بالکل ٹھیک پہچانا تم نے۔ لیکن ہماری تمہاری جوڑی تو خدا میاں نے آسمان پر بنائی تھی۔ جب بنانے والے جوتوں کی جوڑی ایک جیسی بناتے ہیں تو ظاہر ہے اللہ میاں نے تمہیں بھی ہمارے سانچے میں ڈھالا ہو گا۔" میں نے کہا "چنانچہ آپ نے ہماری تعریف ہی کی۔"
لیکن انجام کار انہیں سب کچھ بتانا ہی پڑا۔ گل اور رابعہ کا شوق، اضطراب، تجسس اور بے چینی کے جذبات سے برا حال تھا۔ ایک بار میں بار بار یہ پوچھتے گیا کہ ہماری مہمان کا کیا حال ہے۔ ان دونوں نے پیچھے پیچھے آ کے اس خوفناک چیز کو خود ملاحظہ کیا جس کے بارے میں ہم انتہائی سنسنی خیز بیانات دے چکے تھے۔
رابعہ نے کہا "یقین نہیں آتا۔ یہ ڈاکٹر بھی ہے۔۔۔"
میں نے کہا "مت کرو یقین۔ تمہیں دیکھ کر کون مانے گا بھلا کہ ایسی توپ قسم کی وکیل ہو۔ سر دیکھنے میں تم تو میٹرک فیل گاؤدی سی لڑکی۔"

گل نے کہا "اگر یہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اور چلانے لگی؟"
رابعہ نے سہلایا "اس کو ڈکی میں کب تک رکھا جا سکتا ہے۔ مر ہی نہ جائے کہیں۔"
"اچھا ہے۔ خود ہی مر جائے۔ ہم پر الزام نہ آئے" محسن بولا۔
"ایسے نہیں بھائی۔ پہلے اس کا اعتراف جرم تو لیا جائے اور میرا خیال یہ ہے محسن کہ اس مصیبت کو گھر سے دور ہی رکھنا بہتر ہے۔ چل اسے ابھی وہاں چھوڑ آئیں۔ بعد میں تو اکیلا کیسے قابو پانے کا اس بلا پر۔"
محسن نے مجھ سے اتفاق کیا "دن کے اجالے میں یہ کام مشکل ہی ہو گا۔"
میرا تھکن اور نیند سے برا حال ہو رہا تھا لیکن یہ کام ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ ادھر رابعہ اور گل نے پریشانی کے متعدد اسباب پیدا کر لیے تھے۔ فون پہلے ٹھیک کام کر رہا تھا اور وہ مسلسل وقار کا نمبر ملاتی رہیں مگر وہاں میری اور مسز دلاور کی گفتگو طویل ہو گئی اور ادھر فون کا حوصلہ جواب دے گیا۔ پھر انہوں نے مولوی خادم حسین کو گاڑی میں روانہ کر دیا۔ اس کی گھر والی رضاکارانہ طور پر ساتھ گئی۔ اب ہم لوٹ آئے تھے مگر مسٹر اور مسز خادم حسین کو کسی نے روک لیا تھا کہ جہاں نازو کی دیکھ بھال کے لیے کوئی ہونا چاہیے۔ نتیجہ یہ کہ اتنے بڑے گھر میں گل اور رابعہ کا ڈر سے برا حال تھا۔ انہیں شک تھا کہ فون کی لائن کسی نے کاٹ دی ہے اور ہمارے جاتے ہی فاطمہ جعفری کی بو سونگھتے ہوئے شکاری کتے وہاں پہنچ جائیں گے۔
میں نے کہا "یار بزدل ہو تم؟"
"ہاں میں بزدل اور میٹرک فیل گاؤدی نظر آنے والی لڑکی ہوں" رابعہ نے چڑ کے کہا "تم افلاطون ہو اور سپرمین ہو۔ کہو تو لکھ کے دے دوں۔"
"تفریح میں لکھنا تاکہ میں سمجھ سکوں" میں نے کہا۔
"گل۔ اپنے شاندار ماضی کو یاد کرو۔" محسن بولا "کیسے تم سنسان راتوں میں گھوڑے پر جنگلوں میں پھرتی تھیں۔ رہزن گولیاں چلاتی تھیں اور ناگ منی کے نام سے بڑے بڑے سورما کانپتے تھے۔ اب تم انکار کرنے لگی ہو۔"
"بزدل ہوئی ہوں میں بوبی کی وجہ سے یا تمہاری وجہ سے۔ جب بوبی نہیں تھا تو کیا میں تمہارا ساتھ نہیں دیتی تھی ہر جگہ" گل نے خفگی سے کہا۔
"پھر دروازے بند کر لو اور ہاتھ میں ریوالور پکڑ کے بیٹھ جاؤ۔ کوئی بھی آئے اسے گولی مار دینا۔ بس پہلے پوچھ لینا کہ ایمان سے کہو تم محسن یا اقبال سکندر بخت تو نہیں ہو۔"
"کوئی تمہارے پاس آ کے کتنا اچھا کہے میری قسم" میں نے کہا۔

انہیں چھوڑ کر جانا نہ چاہا اور تھا۔ رات کے ڈھائی بج چکے تھے اور اس وقت ہم انہیں اپنے ساتھ رکھنے کو تیار نہ تھے۔ صبح کے تین بجے ہم پھر وہیں پہنچے جہاں اسی طرح۔۔۔ ابھی دوران بھی آتے رہے تھے۔ اس جگہ نے ہماری جدوجہد کے باب میں ایک تاریخی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ یہیں میں رابعہ سے ملا تھا۔ یہیں میں معرکۂ دل کا فرنٹ بنا تھا۔ مجھ سے عشق کے جرم کی سزا میں پہلے رابعہ کی ماں کی جان گئی اور پھر اس گھر کو ایک دھماکے نے نیست و نابود کر دیا۔ چوہدری دلاور نے ایک خاص مقصد کے تحت اس جگہ پر غاصبانہ قبضہ کیا اور یہاں ایک قصر عالی شان بنوایا۔ یہیں ہم مشہور طوائف چاندنی بیگم اور اس کے پرستار گوگو پہلوان سے ملے تھے جو یہاں ایسے رہتے تھے جیسے یہ ان کے باپ کی جاگیر ہو۔ ان کے قتل کے بعد یہ حویلی کسی قانونی جنگ کے بغیر رابعہ کو مل گئی تھی مگر ایک رات پھر خوفناک آگ اور دھماکوں کے ساتھ یہ جگہ کھنڈر بن گئی۔ ہم خوش قسمتی سے بچ گئے تھے ورنہ گل کے ساتھ ہی ہمارے بھی پرخچے اڑ جاتے۔ گل کا پراسرار تہ خانہ ملبے کے نیچے سلامت رہا تھا اور ہمارے بہت کام آیا تھا۔
چوہدری دلاور نے اس تہ خانے میں اسیری کے دن یوں گزارے تھے کہ صرف پولیس ہی نہیں اس کی غنڈا فورس اور شکاری کتے مل کر بھی اس کا سراغ نہ لگا سکے تھے۔ عین شہر کے درمیان یہ خفیہ تہ خانہ کسی کی نظر میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔
تہ خانے کا راستہ بھی یہی تھا۔ پہلے محسن نے کیبن جیسے باکس کا ڈھکنا کھولا اور اندر غائب ہو گیا۔ ہم بہت سی چیزیں گھر سے ہی ساتھ لے کر چلے تھے مثلاً ٹارچ، موم بتی اور ماچس۔ پینے کے پانی کا پلاسٹک کین اور کھانے کے لیے فریج میں ملنے والی ڈبل روٹی، بسکٹ کے دو ڈبے اور پیکٹ میں بچا کھچا کھانا یہاں تک کہ ابھی دو ٹانگیں تک تھیلے میں بھری تھیں۔
محسن نے دس منٹ میں تہ خانے کے اندر رکھی موم بتی روشن کر دی اور باہر آ گیا۔ پلاٹ پر لگا ہوا کھمبا اپنی جگہ موجود تھا۔ میں اسی میں فاطمہ جعفری کے ساتھ اشارے کا منتظر تھا۔ محسن نے آس پاس کسی کو موجود نہ پا کے سیٹی بجائی اور میں نے کھمبے سے باکس تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ فاطمہ جعفری کو میں نے اوپر سے ہی باکس میں دھکیل دیا اور خود آرام سے اترا۔ پھر محسن نے اندر سے باکس کا ڈھکنا اوپر سے بند کر دیا۔
باکس کے فرش کا وہ سوراخ جو عین فرش کے سوراخ پر تھا اندھیرے میں ایک روشن مستطیل کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ محسن لٹک کر نیچے گیا پھر میں نے فاطمہ جعفری کو بازوؤں سے تھام کے لٹکایا اور محسن نے نیچے سے اس کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ میں نے تہ خانے میں اترنے کے اوپر والے چوکور سوراخ کا تختہ برابر کر دیا۔ اب کوئی ڈھکن اٹھا کے بھی دیکھتا تو اسے باکس میں کچھ نظر نہ آتا۔
دھندلی روشنی میں ہمارے سائے دیواروں پر لرزاں تھے۔

www.paksociety.com

اس بال جیسے کمرے میں آرام و آسائش کے جتنے لوازمات موجود تھے سب بے مصرف اور ناکارہ ہوگئے تھے۔ بجلی کے بغیر وال لائٹس بے نور تھیں۔ اے سی پر گرد اور جالے تھے۔ رابعہ نے یہاں میوزک و جسٹنی کے لیے جو ریڈیو گرام گراموفون ریکارڈز اور کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ سب آثار قدیمہ کی طرح ایک شاندار ماضی کی تصویر عبرت بنی ہوئی تھیں۔ فرش پر اتنا گرد و غبار اور کوڑا جمع تھا کہ فرش غائب ہوگیا تھا۔

دلاور جتنا عرصہ یہاں رہا تھا۔ شاید ایک مہینے سے زیادہ تقریباً چالیس دن۔ اس کے لیے یہی قید خانہ ساری دنیا تھی۔ اس کی نقل و حرکت محدود تھی۔ وہ ہاتھ اور پیر استعمال کر سکتا تھا مگر ان زنجیروں سے نجات حاصل نہیں کر سکتا تھا جو ناقابل شکست تھیں۔ اٹھنا بیٹھنا اور سونا جاگنا۔ سب ان زنجیروں کے ساتھ تھا۔ اس کے لیے جائے رہائش کو جائے اجابت کے طور پر استعمال کیے بنا چارہ نہ تھا۔ ایک گوشہ اس کا بیڈ روم بھی تھا اور لیٹرین بھی۔ یہیں اس کے کھانے پینے کی چیزیں کوڑا کرکٹ کے ساتھ پڑی رہتی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ قیدخانے کی محبوس فضا میں ایک ناقابل برداشت بدبو بس گئی تھی اور اس پُرتعفن ہوا میں سانس لینا بھی مشکل تھا۔

ہم نے دلاور کی جگہ فاطمہ جعفری کو دست و پا بستہ چھوڑا اور کھانے پینے کا سامان اس کے قریب چھوڑ کے باہر آگئے۔ میں نے کچھ بڑے ... جو سب بھی دیکھے جو ہماری شکل دیکھتے ہی نہ جانے کہاں غائب ہوگئے تھے۔ غالباً انہوں نے ڈھول مٹی سے اسے ہوئے ... ہوجانے والی الماری کے پیچھے اپنی کالونی آباد کرلی تھی۔

میں نے کہا "اب دیکھتے ہیں اس ماحول میں مائی بھاتاں کا حوصلہ کب تک ساتھ دیتا ہے؟"

محسن بولا "مجھے یقین ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزار سکے گی یہاں۔"

ہم صبح ساڑھے تین بجے واپس پہنچے اور پڑ کے ایسے سوئے کہ صبح بیت گئی اور دوپہر آگئی۔ گیارہ بجے کے قریب مجھے یوں لگا جیسے زلزلہ آگیا ہو اور کوئی ڈائنوسار قسم کا دیوہیکل جانور مجھے لقمہ تر بنانے کے لیے ٹانگ پکڑ کے گھسیٹتا ہوا لے جا رہا ہے۔ میرا سر زمین پر لگا تو خواب کی یہ کیفیت ختم ہوئی اور میں نے عبدالودود منظر کو دیکھا جس نے مجھے سوتے میں صوفے پر سے گھسیٹ کر نیچے ڈال دیا تھا۔ اور اب ہو ہو ہو کرکے ہنس رہا تھا۔ ہنسی کے ساتھ اس کی عظیم توند کا سارا گوشت اتھل پتھل ہو رہا تھا۔

"یہ تو زندہ ہے بھئی رابعہ مبارک ہو۔"

میں نے سر جھٹک کے آنکھیں ملیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا "اُلّو کے پٹھے۔ کیا بیوی اسی طرح جگاتی ہے تجھے ہر صبح؟"

"اب ہم تو ایسے حکم کے غلام تھے کہ بیوی نے ایک آواز لگائی اور ہم اٹھ کر دوڑے سر کے بل۔ اب تو ماشاءاللہ اس کی اُمت ایسا ہوا کیا کرتی ہے۔ ناشتے کے وقت سیاسی جلسہ عام کا سماں ہوتا ہے جس میں اپوزیشن والے بھی شامل ہوں۔" منظر صوفے پر بیٹھ گیا "دراصل مجھے جگہ نہیں مل رہی تھی بیٹھنے کے لیے تو نیچے پڑا ہوتا تو پڑا رہتا۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا "محسن کہاں ہے؟"

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا" منظر نے آہ بھری "بیوی کو پیارا ہوگیا۔ وہ رات کو ہی لے گئی تھی یہاں سے اٹھا کے۔ تمہاری کوئی بیوی ہوتی تو بیٹے یہاں ایسے اکیلا نہ پڑا ہوتا سا گروکن۔ بھوتنی کے! رابعہ بھی گئی وقار کے ساتھ کورٹ۔ میں وہیں سے آرہا ہوں۔"

میں سنبھل کے بیٹھ گیا "یعنی وہاں اب نازو کے ساتھ مرفو گئی ہے۔"

"گل میرے ساتھ یہاں آگئی ہے۔ نازو کو میں نے ایک پرائیویٹ کلینک کے پرائیویٹ روم میں شفٹ کرادیا ہے۔" اس نے مجھے ایک کارڈ دیا "یہ ہے نام اور پتا۔ ڈاکٹر میری بیوی کا ماموں ہے۔ اسپیشلسٹ ہے۔"

"کیا کہتا ہے وہ؟ نازو کے بارے میں۔"

"فکر کی کوئی بات نہیں۔ لیکن دلاور کی بیوی نے رٹ دائر کردی ہے پولیس کے خلاف جس میں بے جا کی۔ وکیل اور اہل خانہ سے ملاقات اور طبی معائنے کی درخواست کی ہے۔"

میں قالین پر پاؤں پھیلا کے بیٹھ گیا "یہ بھی پوچھا ہوگا کہ اس کا جرم بتایا جائے۔"

"نہیں۔ اس نے کہا ہے کہ اسے اپنے وکیل سے اور اہل خانہ سے ملنے کا اور اپنا دفاع کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ دوسری درخواست میں اس نے دلاور کے پرانے معالج کی رپورٹ کے حوالے سے کہا ہے کہ پولیس کی تحویل میں اس کی جان کو خطرہ ہے اور یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ تفتیش کے نام پر تشدد کیا گیا تو دلاور کی موت بھی واقع ہوجائے گی۔ عدالت اس کے طبی معائنے اور مناسب علاج کی سہولت فراہم کرنے کا حکم دے۔"

"یہ تو متوقع تھا۔" میں نے کہا۔

"آج نوٹس جاری ہوجائے گا صوبائی سیکریٹری داخلہ کو اور عدالت شاید چوبیس گھنٹے میں آئی جی کو پیش ہوکے اپنا موقف بیان کرنے کی ہدایت کرے گی۔"

"آئی جی صاحب کیا کہیں گے وہ ایس ایس پی صدیقی کو اپنا نمائندہ بنا کے بھیج دیں گے۔"

"صدیقی نے پتا نہیں کہاں غائب کروایا ہے اس کو۔"

"وہ کہتا ہے کہ سیکیورٹی کے نقطہ نظر سے اس کو ایک محفوظ مقام پر رکھا گیا ہے۔ مگر عدالت میں اسے حلف نامہ تو داخل کرانا پڑے گا کہ دلاور ان کی تحویل میں ہے۔ پھر عدالت ہو سکے تو طبی معائنے کے لیے یا وکیل اور اہل خانہ سے ملاقات کے لیے۔"

"بھائی۔ سب کچھ آدمی کی نیت پر منحصر ہے۔ کیا تو جانتا نہیں ان پولیس والوں کو؟ صدیقی کہہ سکتا ہے کہ جناب والا! دلاور تو مفرور ہے اور ابھی تک پکڑا ہی نہیں گیا۔"

"صدیقی ایسا نہیں کرے گا۔"

"دلاور کی بیوی اسے ایک لاکھ سے دس لاکھ تک کسی بھی قیمت پر خریدے گی۔ راتوں رات اسے نکال دیا جائے گا۔ اور میرا خیال ہے یہ درخواست عدالت میں پیش کرنے سے پہلے ہی معاملات طے کرلیے گئے ہوں گے۔ تجھے کیا معلوم بھوتنی کے وہ اس وقت لاہور میں ہے یا بمبئی میں بیٹھا ہوا ہے یا لندن کی فلائٹ میں پرواز کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "میں پھر کہتا ہوں صدیقی جھوٹا حلف نامہ داخل نہیں کرے گا۔ وہ گرفتاری ظاہر کردے گا۔ رات میری بات ہوئی تھی دلاور کی بیوی سے۔ اس نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔"

"اسے کیا ضرورت تھی تجھ سے بات کرنے کی۔ اب وہ پریشان ہوتی تو پوچھتی کہ دلاور کہاں ہے؟ اسے تو سب معلوم تھا اور وہ اتنی مطمئن تھی کہ اس نے احسان کا بدلہ چکایا اور اس طرح اپنی جان چھڑالی ہم سے۔ نازو نہ ملتی تو تم آرام سے کہاں بیٹھتے۔ خواہ مخواہ اس کے لیے بھی مسائل پیدا کرتے۔ کتنے پیچھے لگے ہوئے ہوں تو آدمی بڑی بھینک کے ان کی پیش قدمی روک دیتا ہے۔ اب دلاور کی رہائی کے لیے اس کو قانون سے نمٹنا ہے اور قانون بھی تو سونے کی زنجیر سے بے بس ہوجاتا ہے یا پھر وکیل لمبی اور سست جنگ کی منصوبہ بندی کرتے ہیں جس میں ہر دلیل اور ہر قانونی نکتے سے نکتہ پیدا کرکے اور اعتراضات اٹھا کے غیر ضروری درخواستیں دائر کرکے اصل معاملے کو زیر بحث آنے ہی دیتے اور اس طرح جو مہلت ملتی ہے وہ گواہوں کو توڑنے اور شہادتوں کو بدلنے یا حقائق کو مسخ کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔"

"تیرا کیا خیال ہے کہ دلاور کی بیوی کیا کرے گی؟"

"میں اس کا وکیل ہوتا تو اسے مشورہ دیتا کہ دلاور کو فرار کرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ کتنا عرصہ روپوش رہ سکتا ہے۔ دو چار مہینے یا سال دو سال۔ یہی وقت مقدمات کو ختم کرنے میں استعمال کرنے میں فائدہ ہے۔ ایک اچھا وکیل چھ مہینے میں اس کو ضمانت پر رہائی دلا سکتا ہے۔ پولیس یا جوڈیشل ریمانڈ کے دوران اس کو ہر قسم کی سہولت حاصل رہے گی۔ یہ عدالت کے حکم سے زیادہ پیسے کا کھیل ہے۔ قانونی طور پر تو وہ بی کلاس کی درخواست بھی کرے تو نامنظور ہوجائے گی مگر دیتے وہ ٹھاٹ سے رہے گا۔ ضمانت پر رہائی کے بعد واویلا ... ہے کرے۔ کیس کا فیصلہ سالوں بعد ہوگا۔ پھر اپیل ہائی کورٹ میں اور سپریم کورٹ میں۔"

میں نے ... ہو کے کہا "پھر تو ہوجا اس کا وکیل بھوتنی کے۔"

"خیال تو اچھا ہے۔ سالے کا مال کیوں چھوڑا جائے۔"

"اتنا سالا ہے؟"

منظر آہ بھر کے بولا "کاش کہ ہوتا۔ سالے بھی ملے تو بچے لنگے۔ چنگیز خاں کی اولاد۔ میں نے سنا ہے کہ بڑی زبردست ٹکڑی ہے کوئی تم سے اندھے کے ہاتھ بٹیر۔"

"ہم ایسے ویسے شکاری نہیں ہیں بیٹا" پھر میں نے چلا کے گل کو آواز دی "گل صدیقی۔"

وہ بھاگی ہوئی آئی "کیا ہوا؟ کیوں چلا رہے ہو؟"

"جو شخص بھوک پیاس سے دم توڑ رہا ہو کیا اس کا چلانا بھی جرم ہے اس گھر میں" میں نے اور چلا کے کہا۔

"ناشتا تو کب سے میز پر رکھا ہے۔ گل اور محسن کر چکے۔"

"تب بھولا وارث کو پوچھنے والا کوئی نہیں" میں نے کہا۔

گل ہنسی "اسی لیے تو کہتی ہوں کہ اب گھر بسالو اپنا۔ ہر شکایت رفع ہوجائے گی۔"

"ارے چھوڑ دو بس گل" میں نے کہا "ہم جانتے ہیں ہمارے گھر میں کیا ہوگا۔ رات کو بیوی مطالعہ کرتی رہے گی پی ایل ڈی کی دس دس سیر وزن والی کتابوں کا۔ مداخلت ہونے کی کوشش کی تو بتانے لگی کہ تعزیرات پاکستان کی کون سی دفعہ کے تحت تحریری رضامندی حاصل کیے بغیر بیوی کو ہاتھ لگانا بھی HARASSMENT ہے۔"

منظر ہو ہو ہو کرکے ہنسا "اسے چھوڑو اس کے حال پر عزیزہ گل۔ گدھا تو شادی کے بعد بھی گدھا ہی رہتا ہے۔ جیسے تمہارے ابا مرحوم۔ ماشاءاللہ بڑی توپ چیز تھے مگر جتنے کنوارے شادی سے پہلے تھے اتنے ہی بعد میں رہے۔"

گل نے برا مان کے کہا "یہ سب وقار نے بدنام کیا ہے ان کو۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ ابا تمہارے کنوارے نہ ہوتے تو کم سے کم ایک سالی ہی چھوڑ جاتے وقار کے لیے۔ آدھی گھر والی اور ملی جاتی بے چارے کو۔"

گل نے چراغ پا ہو کے کہا "ہر شخص آپ جتنا فراخ دل تو ہونے سے رہا کہ بچے بھی ہوں تو درجن کے حساب سے" اور وہ واک آؤٹ کر گئی۔

"بچے تو ماشاءاللہ رحمت خداوندی ہوتے ہیں جی" مولوی خادم حسین نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

"دیکھا۔ خادم حسین جیسا کمینہ دشمن اور کم ظرف شخص بھی اس معاملے میں میری تائید کر رہا ہے" منظر نے کہا۔

"میں حق بات کر رہا ہوں جی۔ آپ جیسے بدزبان اور حیا سے عاری شخص کی حمایت نہیں۔"

"دیکھو نا لائق۔ یہ گل آخر ہے تو گل۔ بڑی باتیں کیوں کرتی ہے پھر ہمارے سامنے۔ کتنا عرصہ ہوگیا شادی کو۔ وقار بے چارہ ہر جتن کرچکا کہ کچھ تو ہو۔ بچے نہ سہی انڈے سہی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ آگئے نا آپ اپنی اوقات پر۔"

www.paksociety.com
www.paksociety.com

منظر نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا "ابے اوقات سے باہر مت ہو۔ آدمی گھر میں مرغی بھی پالتا ہے اور اسے دانہ کھلاتا ہے تو کبھی [illegible] دیتی ہے۔"

"[illegible] بھی شروع کردی آپ نے" غلام حسین اپنا [illegible] سے نکلا۔

"تم نے بھی تو ایک خطرناک قسم کی بھینس پال رکھی ہے بلاوجہ۔"

"وہ تو اللہ میاں کی گائے ہے یار۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"یار گائے ہی سہی۔ مگر اس بکرے کے ساتھ اس کا کیا جوڑ۔ گائے بھینس کم سے کم دودھ تو دیتی ہے۔"

"بھینس کا انڈا بھی دے سکتی ہے۔ کسی نے مرزا غالب سے ایک شعر منسوب کیا ہے۔ پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال۔"

غلام حسین نے سخت خفگی سے کہا "دیکھیں جی۔ گھر کی عزت ہوتی ہے گھر والی۔ میں ایسی بے ہودہ گفتگو کروں آپ کی زوجہ محترمہ کے بارے میں تو آپ کو کیسا لگے گا۔"

"اگر ہمت ہے مولوی تو میری طرف سے اجازت ہے۔ کہو جو کہنا ہے بلکہ اس کے منہ پر کہو کہ تم عورت نہیں بچے جننے والی مشین ہو۔"

میں نے کہا "یار کیوں پٹوانا چاہتا ہے شریف آدمی کو۔"

"جھوٹ کیا ہے اس میں۔ ایمان سے کلاتی۔ اب تو بس تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم ہی کچھ کرو۔ کوئی تعویذ یا وظیفہ ہو جس سے آبادی میں اضافہ رک جائے۔ خاندانی منصوبہ بندی والے تو ناکام ہو گئے۔"

"توبہ کریں جی۔ یہ گناہ ہے۔"

"یہ حقیقت ہے مولوی صاحب میں تو اسے ہاتھ بھی لگاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ بلکہ ایک فٹ دور رہوں تب بھی کچھ ہو جاتا ہے۔ لڑکا یا لڑکی۔"

میں نے کہا "یار اپنی بیوی کو قصوروار کیوں ٹھہراتا ہے۔"

"تم آزما لو یار۔ بڑی زرخیز اور زود اثر چیز ہے وہ۔ صرف ایک بار غلام حسین بیمار ہے اس کو چھو کر دیکھو شرطیہ اب جو بچہ ہوگا تو وہ بالکل [illegible] ہوگا۔" منظر نے غلام حسین کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

اوپر سے غلام حسین کی بیوی نے چلانا شروع کیا "ارے کہاں جا کے بیٹھ گیا تم جنت۔ جھاڑو لینے بھیجا تھا تجھے جھاڑو پھرے۔ صبح سے ایک کمرے کی صفائی پوری نہیں ہوئی۔ شام تک سارا گھر کیا میرے سسرال والے صاف کرنے آئیں گے۔ دوپہر کا کھانا کیا جنات پکائیں گے؟"

"ابھی آرہا ہوں" غلام حسین لرزا "بازار بھیجا تھا مجھے جھاڑو لانے کے لیے اور کچھ سبزی وغیرہ۔ فضول باتوں میں الجھا لیا آپ نے۔"

منظر نے کہا "ذرا پتلی اور کمزور سی جھاڑو لانا۔ بعد میں اسی سے تمہیں مارے گی مولوی صاحب۔ خواہ پیار سے مارے۔"

منظر کو رابعہ اور گل نے نازو کی واپسی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ناظرہ جعفری کے بارے میں محسن سب بتا چکا تھا۔ جب میں ناشتا کرنے بیٹھا تو گل اور نکی نے مجھے مطلع کیا کہ وہ نازو کو دیکھنے جا رہی ہیں۔

"رابعہ باجی تو صبح آٹھ بجے ہی نکل گئی تھیں" نکی نے کہا "وقار ان کے ساتھ چلے گئے اور میں منظر بھائی کے ساتھ نازو کو لے گئی تھی۔ بڑا اچھا اسپتال ہے لیکن وہ ڈاکٹر جس نے نازو کو دیکھا۔ وہ عجیب سا لگا مجھے۔ صورت سے بھی وہ ڈاکٹر لگتا ہی نہیں تھا۔ گوالا نظر آتا تھا۔ باتیں بھی ایسی ہی کر رہا تھا۔"

میں نے ہنس کے کہا "وہ منظر کا ماموں سسر ہے۔ اس کی بیوی کے سامنے ایسا مت کہنا۔"

"نکی ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ پتا نہیں کس نے اسے اتنا بڑا اسپیشلسٹ بنا دیا۔ معائنہ کرنے کے بعد مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ اسے کیا ہوا ہے اور ابھی تک یہ ہوش میں کیوں نہیں آئی بھوتنی کا۔"

نکی نے کہا "اسے خود کلامی کی عادت ہے۔ جو سوچتا ہے وہ بولتا ہے۔ بعد میں کہنے لگا کہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ خیر چھوڑ جاؤ اسے۔ میں ٹھیک کر دوں گا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مکینک ہے اور گاڑی کی بات کر رہا ہے۔" نکی نے کہا۔ "میں نے پوچھ لیا کہ ڈاکٹر صاحب کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے تو لڑکی وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔ کہ پریشانی تو دنیا میں ہے اور پریشان تو مُردے بھی رہتے ہوں گے قبر میں کہ میدان حشر میں کیا ہوگا۔ کون ہے جو پریشان نہیں ہے اور آدمی پریشانی ہوتی ہے تو اسے تم دور کرا سکتی ہو۔ عورتیں کرتی کیا ہیں خود پریشان ہونے اور مردوں کو پریشان کرنے کے سوا۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں ٹھیک کر دوں گا تو پھر مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو۔ توبہ توبہ کیسا خبطی اور جھکی آدمی ہے۔"

مجھے بہت ہنسی آئی "اسے تو بگڑا رہنا چاہیے منظر کی بیوی سے۔"

منظر بولا "آپ مت پوچھ کیا ہوتا ہے جب وہ ہمارے گھر آتا ہے کبھی۔ ماموں بھانجی ایک ساتھ بولتے ہیں۔ سنتا کوئی نہیں اور کسی کو پتا نہیں چلتا کہ کیا بول رہے ہیں اور کیوں بول رہے ہیں۔ لیکن آخر میں خاموش اسے ہی ہونا پڑتا ہے۔ وہ سیر ہے تو میری بیوی سوا سیر۔"

مجھے معلوم ہوا کہ آج صبح مہرالنسا عرف میری کے میزبانوں کو اپنے دروازے پر ایک خالی تابوت ملا اور اس سے بڑی سنسنی پھیلی۔ میزبان یعنی صاحب خانہ کی کیفیت اختلاجی ہو گئی اور ان کی منکوحہ پٹ سے گر کے بے ہوش ہو گئیں پھر پولیس کو بلایا گیا اور اس وقت تک بہت سے لوگ دور دور کھڑے چہ میگوئیاں کرتے

علاج ہے۔"

میں نے کہا "وہ منظر کا ماموں۔ کیا نام ہے اس کا۔ ہاں تو خان کا۔"

محسن نے کہا "آج کل چنگیزی نام ہے۔ حشمت خان چنگیزی لیکن کہنے والے بلا کو خان چنگیزی کہنے لگے ہیں۔ اس کی صورت دیکھ کے ٹھیک لگتا ہے۔"

منظر نے ہم سے مشورہ کیے بغیر نازو کا کیس اس کو دے دیا ہے تو ظاہر ہے اسے اپنے ماموں سسر پر بھروسا ہوگا۔" میں نے کہا "یہ تو بہت اچھی بات ہوگی اگر غالب بھی وہیں رہے۔ اسے نازو سے اور نازو کو اس سے جذباتی رفاقت کا احساس ہوگا۔ یہ شاید دوا سے بہتر ثابت ہو۔" میں نے مزید کہا "اگر ڈاکٹر بلا کو خان چنگیزی اجازت دے گا تو غالب کو شاید بطور مریض قبول کرے گا لیکن مارگریٹ کو ہرگز اس کے ساتھ نہیں رہنے دے گا۔ تیمارداروں کو اسپتال میں کون رہنے دیتا ہے۔ خصوصاً ایسی جگہ جہاں دیکھ بھال کرنے والے بھی خصوصی تربیت یافتہ افراد ہوں۔"

محسن نے کہا "بات تو ٹھیک ہے آپ کی مگر سفارش چلتی ہے ہر جگہ۔ یہاں بھی چلے گی۔ اس کی بھانجی کی۔ اور منظر کی بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی بیوی کی زبان کے سامنے چنگیزی کو خاموش ہونا پڑتا ہے۔"

"یہاں کے معاملات کو تم لوگ جیسے چاہو سنبھالو۔ میں تو چلا" میں نے کہا "مہرالنسا کا فون آئے 'میرا مطلب ہے میری کا' تو اسے دلاسا دینا کہ وہ واقعی کراچی گیا ہے تمہارے پاپا سے ملنے۔"

"رابعہ سے کیا کہوں؟"

"اسے [illegible] بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا۔

میں نے ایک سوٹ کیس سے چھوٹا بریف کیس کافی سمجھا۔ یہ وقار کے سسر مرحوم کی نشانی تھا اور وہ اس میں سرکاری فائلیں اٹھائے پھرتے تھے۔ ٹاپ سیکرٹ قسم کی فائلیں یا پھر منافع بخش فائلیں جن پر ان کے ہر دستخط کی قیمت کا تعین ضرورت مند کی حیثیت سے متعلق ہوتا تھا۔ وہ واقعی بڑی توپ چیز تھے۔ حکمران جیسی ہر توپ نے ملک کے مفاد کا دفاع نہیں کیا تھا۔ ایک نظام کو قانون کی ساکھ کو۔ پہلے سوٹ کے انچ کو اور ایک ترقی پذیر قوم کی اجتماعی جدوجہد کے مقصد کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

سوٹ پہننا میرے لیے مجبوری بن گیا تھا کیونکہ میں دیسی آدمی نہیں تھا۔ میں ایک فرنچ وکیل تھا اور وکیل بھی بہت بڑا۔ [illegible] کو سلطنت سے مراسم اور وزارت دولت مشترکہ کے حوالے سے یا [illegible] کے ذکر سے میں اپنا اعتبار قائم کر چکا تھا اور [illegible] تک میری رسائی مشکل نہ تھی۔ [illegible] اب سے زیادہ فرنچ لوگ کے میں سب کی آنکھوں میں دھول جھونک چکا تھا اور اب حالات اتنی پرانی ہو گئی تھی کہ مجھے دیکھ کے کسی کا ذہن خواب میں بھی مفرور [illegible] کی طرف نہیں جاتا تھا۔ یہ انتہائی حیرت انگیز اور

رہے اور خیال کے گھوڑے دوڑاتے رہے کہ تابوت میں سے لاش برآمد ہوئی یا لاپتا تھا۔ عورت کی لاش ہوگی یا مرد کی۔ لیکن پولیس نے خالی تابوت دیکھا تو انہیں سخت مایوسی ہوئی اور پھر انہوں نے یہ سوچا کہ جب لاش نہیں تھی تو پھر انہیں کیوں طلب کیا گیا تھا۔ اور اگر لاش تھی تو کہاں گئی؟ اس دوسرے نکتے کو بنیاد بنا کے انہوں نے بہت سے مفروضے قائم کیے کہ آس پاس رہنے والوں میں سے کسی بیوی نے بے وفا شوہر کو یا شوہر نے بے حیا بیوی کو مار کے تابوت اس کے آشنا کو ارسال کرنے کا پروگرام بنایا ہوگا مگر عملی دشواری کے باعث ملتوی کر دیا اور لاش کہیں اپنے ہی باغیچے میں گاڑ دی۔ تفتیش کے نتیجے میں جب شوہر بھی پورے نکلے اور بیویوں کا ٹوٹل بھی ٹھیک ثابت ہوا تو وہ تابوت لے گئے۔ دروغ برگردن راوی۔ عقلمندوں کے مشورے پر تابوت میں نامعلوم مرحوم کے سوئم چہلم کے اخراجات کی رقم رکھ دی گئی تھی۔

منظر میرے ساتھ ایک کپ چائے پی کے چلا گیا۔ محسن اور گل اس وقت تک بونی کے ساتھ کھیل رہے تھے اور ایسی حرکات فرما رہے تھے جن پر بونی کو ہنسی آ جائے۔ وہ انا تو ہنس رہا تھا یا شاید ان کی احمقانہ کوشش پر۔

بالآخر محسن اس کھیل سے اکتا گیا "گل نے وہ ساری رقم شمار کی ہے جو ہم شوکت رانا سے بطور تاوان لائے تھے۔"

"مال غنیمت بھی حرام نہیں ہوتا" میں نے کہا "ٹوٹل کیا ہوا؟"

"ایک لاکھ اٹھارہ ہزار چھ سو پانچ۔ زیورات بہت قیمتی ہیں۔ خود رابعہ اور گل میں مالیت پر اختلاف ہے۔ [illegible] سے ساڑھے تین لاکھ کے درمیان ہوگی۔"

میں نے کہا "میں اب پہلی فلائٹ سے کراچی فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میری کے ابا سے ملنا ہے۔"

"ولایتی ابا کو ڈیڈی کہتے ہیں۔ مسٹر اے کے ڈسکوی پیدائشی انگریز نہ سہی 'وہاں کے موجود تو ہیں۔'"

میں نے کہا "مجھے تعجب ہے ابھی تک میری نے وقار کے گھر فون نہیں کیا۔"

"دراصل صبح صبح ان کے گھر کے مقابل تابوت ملنے سے بڑی نحوست پھیل گئی۔ پولیس کے جانے کے بعد ڈاکٹر آئے۔ پھر کچھ روحانی عامل بلائے گئے ہیں جو وہاں اپنے عمل سے بدروح کو بھگانے میں مصروف ہیں۔"

"کس کی بدروح؟" میں نے کہا۔

"پتا نہیں۔ تابوت میں سے نکلی ہوگی اور سیدھی ان کے گھر میں داخل ہو کے روپوش ہو گئی ہوگی۔ کیا معلوم کسی کے [illegible] میں حلول کر جائے۔ اس گھر میں ساس بہو کا ایک جوڑا [illegible] رہتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو پہلے ہی بدروح سمجھتی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ غالب اور مارگریٹ کو بھی وہیں پہنچا دوں جہاں نازو زیر

www.paksociety.com

خطرناک بات تھی کہ ڈاکٹر فاطمہ جعفری کی نظر نے مجھے شناخت کرلیا تھا۔

مجھے احساس ہوا کہ میرے پاس کپڑے بہت کم ہیں۔ دو سوٹ میں وقار کے استعمال کرچکا تھا۔ ایک میں نے پہن رکھا تھا اور دوسرا میں نے بریف کیس میں ڈال لیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کراچی سے دو چار سوٹ ریڈی میڈ خرید لوں گا۔ لاہور میں سوٹ صرف سلوائے جاسکتے تھے مگر کراچی کے بارے میں سنا تھا کہ وہاں ایسے ماہر ہیں جو چند گھنٹوں میں کسی بھی سوٹ کو آپ پر فٹ کرسکتے ہیں اور وہ سوٹ کسی کو ریڈی میڈ نہیں لگتا۔

ابھی میں پیکنگ میں مصروف ہی تھا کہ گل آئی "کراچی جارہے ہو تو اکرام شیخ سے ملو گے؟"

"ہرگز نہیں۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور سے ملنے کے لیے میں لاہور سے بائی ایئر کراچی جاؤں۔ اتنا احمق سمجھتی ہو تم مجھے۔"

گل نے کہا "کاجل کو سلام کہنا اور کہنا کہ اس سال گرمیوں کی چھٹیوں میں لاہور آجائے۔"

اور گل نے بولنا شروع کیا "ان سب کی تصویریں لانا مت بھولنا۔ اور میں تمہیں اپنی تصویریں دیتی ہوں جمع کرکے۔ یہ اکرام شیخ کو دے دینا۔ اسے نادر کے بارے میں کچھ مت بتانا۔"

میں نے ہنس کے کہا "جہاز کی کھڑکی کھول کے باہر مت جھانکنا"

پیچھے جھ... کی کوشش مت کرنا۔ جہاز شہر سے گزر رہا ہو تو باتھ روم استعمال مت کرنا۔ خالہ اماں کی طرح بولا ہی ہو تم کی۔ جو عورتیں پہلے نصیحت کی پوٹلی ساتھ کردیتی تھیں۔ پانی ... لوٹا، قیمہ پراٹھا...۔"

"کیا تم واقعی نہیں ملو گے ان سے؟" گل نے کہا۔

"میں جارہا ہوں اپنے ہونے والے میڈان انگلینڈ سسر سے ملنے میری میری کے ڈیئر ڈیڈ سے۔"

اسی وقت باہر کوئی گاڑی آکے رکی۔ "کون آیا ہے اس وقت۔"

پھر محسن کی آواز آئی "آپ... صدیقی صاحب!"

میں نے کہا "جاوید صدیقی... ایس ایس پی، خدا خیر کرے۔"

جسے میں ڈرائنگ روم میں گیا تو جاوید صدیقی صوفے پر بیٹھ چکا تھا مگر مجھے دیکھ کے پھر اٹھا "ہیلو!"

میں نے بھی مسکرا کے کہا "ہیلو۔ کیا حال ہے؟"

وہ مسکرایا "اردو سیکھ رہے ہو۔ کیا فائدہ! انگلش سیکھتے تو زیادہ کام آتی۔"

محسن نے کہا "صدیقی صاحب۔ آپ کا آنا خالی از علت نہیں ہوسکتا۔"

اس نے بھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "خالباً میں رخصت ہونے آیا ہوں۔ ممکن ہے کل تک مجھے او ایس ڈی بنا دیا جائے۔"

محسن نے میری طرف دیکھا "کوئی جرم سرزد ہوا ہے آپ سے؟"

"ہوا تو نہیں۔ مگر ہوجائے گا۔ جو مجھ سے کہا گیا ہے۔ وہ شاید میں کر نہیں سکتا۔ کم از کم ابھی تک میرا یہی خیال ہے۔"

میں نے اب محسن کی معرفت گفتگو شروع کی "تمہاری اس آزمائش کا تعلق چوہدری دلاور کی گرفتاری سے ہوگا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "مجھے آج آئی جی صاحب نے طلب فرمایا تھا۔ شک مجھے اسی وقت ہوگیا تھا کہ میرے جیسے چھوٹے افسر سے براہ راست آئی جی صاحب کو کیا کہنا ہوگا۔ ہم تو اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ ہم کوئی غیر معمولی کارنامہ سرانجام دیں یا کوئی غیر معمولی کوتاہی سرزد ہوجائے تو پھر بڑی سرکار بھی یاد کرلیتی ہے۔ میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ میں نے کیا کیا ہے؟"

"اور انسپکٹر جنرل صاحب بہادر نے اسے کیا قرار دیا؟"

"انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ نہ تعریف کی نہ خفگی کا اظہار کیا۔ صرف یہ پوچھا کہ چوہدری دلاور کون ہے۔ میں نے بتا دیا۔"

"کیا بتایا؟"

"وہی جو میری معلومات کے اور یقین کے مطابق سچ ہے۔ میں نے کہا کہ ویسے تو چوہدری دلاور پر ایک ہی الزام ہے۔ ڈاکٹر شبلی کے قتل کا اور اس میں تمام ثبوت اور شواہد اس کے خلاف ہیں لیکن سب سے زیادہ سنگین جرم اس کا اسمگلر ہونا بھی ثابت ہے اور وہ رنگ میں خوش رہا ہے GUN RUNNING جدید دنیا میں دہشت گردی کا سب سے زیادہ منافع بخش کاروبار ہے۔ جہاں بھی کسی ملک میں شورش ہو۔ بغاوت ہو، آزادی یا علیحدگی کی تحریک ہو وہاں حکومت کے خلاف لڑنے والوں کو اسلحہ فراہم کرو۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ کون ہیں اور ان کے مقاصد کیا ہیں۔ چوہدری دلاور نے مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسند عناصر کو اسلحہ فراہم کرکے کروڑوں کمائے تھے اور میری نظر میں جو باغیوں کا حامی ہو وہ غدار وطن ہے۔"

میں نے کہا "دیگر الزامات کی تحقیق تو آپ کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ یہی کہا ہوگا آئی جی صاحب نے۔"

"وہ کیا کہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے۔ کیا دائرہ اختیار سے باہر ہے اور کیا نہیں ہے؟ یہ آپ کی اپنی نظر اور فرض شناسی پر منحصر ہے۔ اگر میں راہ چلتے کسی کو چوری کرتے دیکھ لوں یا کوئی میری نظروں کے سامنے قتل کردے تو میں صرف نظر نہیں کرسکتا۔ یہ عذر نہیں پیش کرسکتا کہ میں تو یہاں صرف ڈاکٹر شبلی کے قتل کی تحقیق کے لیے آیا ہوں۔ مجھے کیا؟ دیگر جرائم کی ذمے دار مقامی پولیس ہے۔"

محسن بولا "آپ کو یہ کس نے بتایا کہ چوہدری دلاور اسلحہ اسمگل کرتا تھا اور مشرقی پاکستان کے باغیوں کو فراہم کرتا تھا؟"

وہ ہنسا "اگر پولیس کی نوکری میں مجھے یہ بھی علم نہ ہو کہ

میں یہاں نہیں رہوں گا۔ چارج مجھے دینا ہوگا لیکن چارج لینے کے بعد کیا ہوگا۔ یہ میرے رویے پر منحصر ہے۔ مجھے لاکھوں روپے کی ... نہیں ملیں گے ترقی بھی ملے گی۔ اے ڈی آئی جی کے عہدے پر ... یا میں پولیس ہیڈ آفس میں ڈائریکٹر جیکشن کا انچارج ہو جاؤں گا۔ ... یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے او ایس ڈی بنا دیا جائے یا وی آئی پی پروٹوکول کی ذمے داری سونپ دی جائے۔ صدر مملکت یا وزیراعظم کے چہرے تک جائے اور آتے وقت حفاظتی انتظام کرنا اور کوئی گڑبڑ نہ ہونے دینا۔ گڑبڑ کوئی شخص خود بھی کرسکتا ہے کہ اچانک راستے میں کوئی درخواست لے کر کھڑا ہوجائے اور جلوس کا راستہ روکنے کی کوشش کرے۔ اور یہ حرکت کروائی بھی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد چیف پروٹوکول معطل۔"

میں نے کہا "پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

"سوچنے کو کیا ہے میرے لیے۔ میں یہ حلف نامہ داخل نہیں کرسکتا۔ جب میں نے چوہدری دلاور کو گرفتار کیا ہے تو اسے عدالت میں پیش بھی کروں گا۔ آگے عدالت کی مرضی۔"

"یعنی تم حلف نامہ داخل نہیں کروگے۔"

"ہرگز نہیں۔ اتنا بڑا جھوٹ بولنا میرے لیے ممکن بھی نہیں۔ میری نوکری کیا جان بھی چلی جائے مجھے پروا نہیں۔"

میں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا "کیا تم نے یہ بات صاف صاف کہہ دی آئی جی صاحب سے۔"

وہ ہنسنے لگا "شاید یہ ایک بے وقوفی کرچکا تھا۔ اگر جذباتی ہوجاتا مگر عین وقت پر عقل نے مجھے ہوش سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ میں نے کہا کہ سر میں تو حکم کا غلام ہوں۔ جیسی آپ کی مرضی۔ اور آئی جی صاحب مطمئن ہوگئے مگر میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے وقت چاہتا تھا۔"

"یعنی آپ کے نزدیک یہ فیصلہ تبدیل بھی ہوسکتا تھا۔"

"نہیں۔ میرا فیصلہ تو ایک ہی تھا۔ مجھے عدالت میں حاضر ہوکے ایک ہی بیان دینا ہے جو مبنی بر حقیقت ہوگا۔ جو میں نے سنا، دیکھا اور کیا۔ وہی میرا بیان ہوگا لیکن قبل از وقت میں اپنے ارادے کا اظہار کردیتا تو میری ساری محنت رائیگاں جاتی۔ آئی جی صاحب اسی وقت چائے منگواتے اور جتنی دیر میں چائے پیتا ان کے اسٹینو میری فوری تبدیلی یا معطلی کے احکامات ٹائپ کرلاتے اور میرے سامنے رکھ دیتا۔"

میں نے کہا "معطلی کس بات پر؟"

"اوپر والوں کے لیے جواز پیدا کرنا مسئلہ نہیں ہوتا۔ صرف یہ کہہ دینا بھی کافی ہے کہ تمہارے خلاف بدعنوانی کی شکایات موصول ہوئی تھیں جو بہت سنگین نوعیت کی ہیں۔ تفتیش مکمل ہونے تک تم معطل کیے جاتے ہو۔ اگر بے گناہ ثابت ہونے تو دو چار دن سے دو چار مہینے ... دو چار سال میں تم بحال کردیے جاؤگے ورنہ ... اپنے گھر آرام سے ... ہر روز حاضری لگانے آؤ اور

پاکستان میں کون کیا کررہا ہے تو پھر لعنت اس نوکری پر۔ جتنا بڑا عہدہ ہوتا ہے اتنی ہی ذمے داری بڑھ جاتی ہے۔ آئی جی صاحب کا نقطہ نظر مختلف تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے ہر آدمی کے دشمن ہوتے ہیں جو اس پر کوئی بھی الزام عائد کرسکتے ہیں۔ آئی جی صاحب اصل معاملے کی طرف آئے۔ انہوں نے کہا کہ چوہدری دلاور کی بیوی نے پولیس کے خلاف جو استغاثہ دائر کیا ہے، جس پر جو ہوگا۔ اس کے بارے میں میری رائے کیا ہے؟ میں نے کہا کہ وہ کچھ بھی کہے، ہم نے اسے ایف آئی آر کے حوالے سے گرفتار کیا ہے اور یہ قانونی گرفتاری ہے۔ ہم اسے عدالت میں پیش کریں گے اور اس کا ریمانڈ لیں گے۔"

"اور آئی جی صاحب نے کہا کہ بند کرو اپنی قانونی بکواس۔ ہم نے چوہدری دلاور کو گرفتار نہیں کیا۔"

وہ کچھ حیران ہوا۔ "بالکل۔ انہوں نے بالکل یہی کہا مگر بہت شرافت سے۔ انہوں نے کہا کہ بہتر ہے ہم اس معاملے میں نہ پڑیں۔ چوہدری دلاور ایک بااثر سیاسی شخصیت ہے اور وہ اگلے انتخابات میں اپنے حلقے کا نمائندہ بھی ہوگا۔ اس کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔"

محسن بولا "آپ نے پوچھا نہیں کہ اس کے بارے میں یہ نیک خیالات رکھنے کا مطلب مکمل اور فی الوقت میں کیا ہے؟"

صدیقی مسکرایا "کیا تم سمجھ نہیں سکتے؟"

میں نے کہا "کتنی رشوت کی پیشکش ہوئی ہے تمہیں؟"

وہ سوچنے لگا "مجھے تو ایک طرح سے بلینک چیک ملا ہے۔ یعنی میں منہ مانگی رقم لکھ سکتا ہوں اس پر۔ یہ تو کمال کی بات ہے ایک کاغذ کا پرزہ مجھے دستخط کرکے دینا ہوگا اور اس کے بدلے میں مجھے بہت چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ ملے گا لیکن سرکاری حلف نامے کی مالیت بہت کم ہوگی اور اس کے بدلے میں ملنے والے کی لاکھوں میں۔ مجھے صرف یہ بیان حلفی دینا ہوگا کہ میں نے چوہدری دلاور کو گرفتار نہیں کیا اور ایڈووکیٹ جنرل میرے بیان کی بنیاد پر آئی جی صاحب کی جانب سے عدالت میں بیان دے گا کہ چوہدری دلاور پولیس کی تحویل میں نہیں ہے چنانچہ اس سے وکیل کی ملاقات کرانے یا اسے طبی معائنے کے لیے پیش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اس بیان کے بعد مسز دلاور کی درخواست غیر مؤثر ہونے کی بنا پر خارج ہوجائے گی۔" میں نے کہا۔

محسن بولا "تم آنکھوں میں دھول جھونک کر خیر و عافیت کے ساتھ واپس اسلام آباد چلے جاؤگے۔ یا یہیں نام نہاد تفتیش میں مصروف رہوگے؟"

www.paksociety.com

رہتے ایک چوتھائی تنخواہ لیتے رہو۔ تبدیلی تو لازمی تھی۔ وہیں ہیڈ آفس سے کوئی میری جگہ چلا جاتا اور میں اس کی جگہ بیٹھ جاتا۔"

"اور اب تم کیا کرو گے؟"

"میں آئی جی صاحب کو بھی آگاہ کروں گا۔ نئے سرے سے عدالت میں حاضر ہو کے وہی بیان دینا ہے جو سرکار کی مرضی۔ پھر ایڈووکیٹ جنرل صاحب کیس خارج کرنے کی درخواست کرتے ہیں لیکن...."

"لیکن کیا....؟" میں نے کہا۔

"کیا یہ بات مجھے بتانی چاہیے؟"

میں نے کہا "ہم تمہیں کیسے مجبور کر سکتے ہیں کہ ہم پر اعتبار کرو لیکن ایک ایماندار، فرض شناس اور باضمیر افسر خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس جنگ میں اصولی طور پر کون فریق حق پر ہے اور قانون کس کا ساتھ دینا چاہیے۔ یہ ذاتی دوستی کا مسئلہ ہے یا مجرم کو بچانے اور بے گناہ کو تحفظ فراہم کرنے کا۔"

محسن بولا "بے شک تمہارا دائرہ کار بہت محدود کر دیا گیا ہے لیکن جو کچھ تم جانتے ہو اسے نظر انداز کیسے کر سکتے ہو۔ ڈاکٹر شبلی کا قاتل تو دلاور یقیناً ہے لیکن اس کے دیگر جرائم...."

"افسوس تو یہی ہے کہ میں صرف ایک معاملے میں بیان دے سکتا ہوں جس کی تفتیش میرے سپرد تھی۔ دیگر معاملات کا نہ مجھ سے تعلق ہے نہ میرے پاس کوئی ثبوت ہے کہ میں اس پر رائے بھی دے سکوں۔ لیکن اسے ڈاکٹر شبلی کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار کر لینے کا اقدام بھی کافی ہے۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ان کی مرضی وہ جو حکم دے کر وہ لوگ دلاور کو چھوڑنے کی پابند ہوں گی۔"

"تم جانتے ہو کہ تم کتنا بڑا رسک لے رہے ہو؟ تم لاکھوں روپے کی کچی غیر مشروط پیشکش کو ٹھکرا رہے ہو" محسن بولا۔

"ہاں۔ میں سارے رسک لوں گا۔"

"شاید یہ نقصان تمہارا نہ ہو۔ تمہارے خاندان کا ہو۔ تمہاری بیوی کو بھی صدمہ ہو اور تمہارے بچے...."

"وہ میں جانتا ہوں۔ میری بیوی پہلے ہی مجھ سے خوش نہیں ہے۔ وہ ایک اعلیٰ سرکاری افسر کی بہن ہے جس نے میرے عہدے سے شادی کی تھی مگر محبت کے نام پر۔ اسے بعد میں اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑا۔ میں راولپنڈی میں پرانے کے مکان میں رہتا ہوں اور میرے پاس ایک پرانی گاڑی ہے۔ میرا گھر صرف اور صرف تنخواہ میں چلتا ہے۔ اگر میرے گھر میں ٹھاٹ باٹ کا کچھ سامان نظر آتا ہے تو وہ سب میری بیوی جہیز میں لائی تھی۔ رشوت کی پیشکش کو میں نے آج تک ٹھکرایا ہے اور میری بیوی نے میرے جبر کے تحت کچھ لیا ہے لیکن وہ خوش بالکل نہیں ہے۔ میں تو اس کے باپ کی طرف سے ملنے والی مالی امداد بھی قبول نہیں کرتا تاکہ وہ کار

بڑھا مجھے قائل کرنے کے لیے دلیل یہ دیتا ہے کہ میں اپنے بچوں کا پیٹ نہ دیتے کا پابند نہیں۔ کون سی شرع میں یہ پابندی ہے کہ شادی کے بعد باپ اپنی بیٹی کے لیے کچھ نہ کرے۔ میں نے کہا کہ شرط یہ ہے کہ بیوی وہی کرے جو شوہر چاہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ میری آمدنی میں چلائے۔ سادگی قناعت اور کفایت شعاری اسلامی شعائر ہیں اور بیوی کے سلیقے کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بیوی تو انکار نہ کرے مگر کسی خیراتی ادارے سا دینا کیا کیا دے دے۔ دنیا کے لیے میں کماتا ہوں۔ آخرت کے لیے ادھر طرف سے بندوبست ہو جائے۔ اس سے اچھی کیا بات ہے؟"

محسن ہنسنے لگا "گویا تمہارے پاس ہر دلیل کا جواب ہے۔"

"دلائل دونوں طرح دیے جا سکتے ہیں اور لوگ دیتے ہیں۔ چور ڈاکو، نشہ کرنے والے، جواری، بدقماش اور بدمعاش ہر طرح کے لوگ اپنا دفاع کرتے ہیں۔ اپنی غلطی نہیں مانتے۔ معاشرے کو بھی مجبوری کو آڑ بناتے ہیں مگر دلیل ایک ہو سکتی ہے۔ کوئی بھی چیز بیک وقت سیاہ اور سفید نہیں ہو سکتی۔"

صدیقی بولا "جب میری بیوی کو معلوم ہوگا کہ میں نے دولت اصول پرستی پر قربان کر دی ہیں اور نوکری کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے تو وہ بہت ہنگامہ کرے گی کہ اس رقم سے ہم کوٹھی بنا لیتے اور کار خرید سکتے تھے۔ ہمارے بچے اچھے ماحول میں رہتے اسکول میں جاتے۔ کسی کو کیا پتا کسی کی اولاد کی جنگ ان کا مستقبل تاریک کیا ہے۔ باپ ایسا کرتے بچوں کے لیے۔ وہ کے تک رہ سکتے ہیں۔ ہر طرح کی مصیبت اٹھاتے ہیں۔ تم نے تو جیب میں پڑے دس لاکھ کے چیک کو پھاڑ پھینکا حالانکہ تمہیں کچھ بھی نہ تھا۔ ایسی باتیں میں سنتا رہتا ہوں۔ شاید اس مرتبہ زیادہ ہوگا۔ ممکن ہے وہ میکے جا کر بیٹھ جائے۔ اس کا باپ مجھے برا کہے اور پھر خود بے عزت ہو" وہ خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر بعد محسن نے کہا "تم واقعی عجیب آدمی ہو۔"

"کیا تم نے پولیس کے بارے میں اپنی رائے بدل دی میرے جیسا کوئی اور بھی ملا ہے تمہیں؟"

"ہاں۔ ہمارے ایک بزرگ تھے انکل خان صاحب مرحوم۔ وہ بھی ایس ایس پی تھے۔ ان کے اور تمہارے بیچ میں ایک فیصد کا فرق نہیں۔ خود مجھے جیسے ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ ان کی عزت بہت تھی پولیس ڈپارٹمنٹ میں بھی۔"

"اب وہ حالات نہیں رہے۔ پہلے ایماندار آدمی نایاب نہیں ہوتا تھا۔ اسے چھوڑ دیا جاتا تھا اس کے حال پر۔ ایمانداری اس کا جرم بن جاتی ہے۔"

"تمہارا بیان کب ہوگا؟"

"غالباً کل۔" صدیقی نے کہا۔

"ان آئی جی صاحب کا باپ بھی میری مرضی کے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔ جب میں تمہیں ملوں گا تو شاید انہیں بہرحال ہو جائے گا۔ جیسے جیسے وقت گزرے گا میری تلاش اور ان کی پریشانی بڑھتی جائے گی۔ آئی جی صاحب بھی سمجھ جائیں گے کہ میں انہیں چکر دے کے نکل گیا۔ بدنام تو پہلے ہی ہوں گے۔ وہ دلاور کی رہائی کا رسک کیسے لے سکتے ہیں جب مجھے راستے سے ہٹانے کے بغیر۔ وہ مجھے ٹرانسفر کر دیتے یا معطل۔ پھر سب کچھ ہو سکتا تھا۔ سمجھانے والے انہیں بتا دیں گے کہ صدیقی پاگل ہے۔ وہ نوکری اور جان کی بازی لگا کے بھی اپنے موقف پر قائم رہے گا اور عدالت میں وہی بیان دے گا جو دے چکا ہوگا۔ وہ آپ کے سامنے جب عدالت سے نکل گیا۔ میں کل عین وقت پر عدالت پہنچ جاؤں گا اور وہاں مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ نہ ڈرا دھمکا سکتا ہے اور نہ زبردستی بیان دلوا سکتا ہے اپنی مرضی کا۔"

"تم جانتے ہو کہ تمہارا واسطہ کس قسم کے لوگوں سے ہے؟ اپنے محکمے کو چھوڑو۔ دلاور ایک طاقت کا نام ہے۔ بدی کی طاقت۔ تمہیں راستے سے ہٹانا کوئی مشکل کام نہیں ایس ایس پی صاحب!" محسن نے کہا۔

"میں خدا پر بھروسا رکھتے ہوئے یہ رسک لوں گا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "ایک منٹ۔ کہاں جا رہے ہو تم؟ میرا خیال ہے کہ تم کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تمہارے لیے سب سے محفوظ جگہ ہے جہاں تم پہنچ گئے ہو۔ تم کل رابعہ کے یا میرے ساتھ کورٹ جا سکتے ہو۔"

وہ چونکا "یہ جگہ محفوظ ہے؟"

"ہمارے لیے نہ سہی۔ تمہارے لیے ہے۔" محسن نے کہا "کون شک کر سکتا ہے کہ تم یہاں ہو؟"

اس نے سوچ کے کہا "اسلام آباد جانے اور آنے میں کیا حرج ہے۔ پانچ گھنٹے جانے میں اور پانچ آنے میں صرف ہوں گے۔ آج رات اپنے گھر میں گزار کے میں صبح چار بجے نکلوں تو نو بجے کورٹ میں۔"

"لیکن تلاش کرنے والے اسلام آباد میں تمہارے گھر میں پہنچ سکتے ہیں۔" محسن بولا "بہتر ہے کہ تم یہاں سے فون کر دو اپنے گھر اور بیوی سے کہو کہ بچوں کے ساتھ کہیں چلی جائے۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر۔ آج کی رات کسی دوست کے گھر میں یا ہوٹل میں گزار لے۔ باپ کے گھر بھی نہ جائے۔"

"اس انتہا تک بات جا سکتی ہے؟"

"وہ تمہاری کے لیے انتہا کچھ نہیں اور تمہارے اپنے محکمے کے لوگ اب تمہارے ساتھی نہیں رہے۔ وہ دشمن ہو گئے ہیں۔ آئی جی صاحب کے نمبر پر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس نے حتی رشوت کی پیشکش

وہ سوچنے لگا "یہ کہا جا سکتا ہے۔ اوپر کی سطح پر رشوت سے

"اور تب تک تم دلاور کو اپنی تحویل میں رکھو گے؟"

"ظاہر ہے۔"

"اگر آج ہی تم سے کہا گیا کہ دلاور کو جانے دو؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ آج کا دن اور یہ رات گزارنی ہے مجھے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ بس مجھے ملنا نہیں چاہیے اپنے آفس میں یا اپنے کمرے میں جہاں میری رہائش ہے۔" وہ بولا۔

"اس لیے تم یہاں چھپے ہوئے ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "اور تم شاید کہیں جا رہے ہو؟"

میں نے بریف کیس کی طرف دیکھا "اسلام آباد!"

"کوئی بھی کام ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ اسی مسئلے پر برٹش کونسلیٹ سے ہدایات لینی ہیں۔ یہ بتانا ہے کہ ڈاکٹر شبلی کا مبینہ قاتل گرفتار ہو گیا ہے اور اب اس کے خلاف واحد عینی شاہد کو لندن سے بلوانے کا انتظام کیا جائے۔ اس پر لندن میں دوہرے قتل کی واردات کا الزام بھی تھا جو ثابت نہیں ہو سکا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

"میں برا مان کے تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں؟"

صدیقی نے کہا "تم وکیل ہو تو ڈاکٹر شبلی کے لواحقین کے نامزد کیے ہوئے .... میں رہتی تھی۔ تم انگلش بالکل نہیں جانتے صرف فرنچ زبان اور سمجھ سکتے ہو۔ یہ کیا چکر ہے؟"

"کوئی چکر نہیں۔ میں فرنچ ہوں۔ فرنچ اگر انگریزی جانتے ہوں تب بھی انگریزی نہیں بولتے۔ میں بھی انگریزی سمجھ لیتا ہوں اور ٹوٹی پھوٹی بول سکتا ہوں لیکن میں ایسا کیوں کروں؟ رہا یہ سوال کہ مجھے ہی کیوں نامزد کیا ڈاکٹر شبلی کے لواحقین نے؟ تو راز یہ کہ ان کی مرضی۔ وہ زیادہ .... کی خدمات حاصل کرنے کے لیے آزاد .... انہیں عدالت کا تجاہد فرانس کی عدالت کا۔ رہا یہ کہ فارسی بولنے والا وکیل بھی لے سکتے تھے یا جاپانی۔ برٹش کونسلیٹ اس لیے بیچ میں آتا ہے کہ مقتول برطانوی شہری تھی۔ اور کوئی کنفیوژن ہے تو بتاؤ؟"

"نہیں۔ کنفیوژن کوئی نہیں۔" صدیقی نے کہا "کیا حرج ہے اگر تم میرے ساتھ اسلام آباد چلو۔"

"تم اسلام آباد جاؤ۔"

"خیال تو ہے۔ جب سارا .... غائب رہنا ہے تو کیوں نہ ایک چکر اسے بھی لگا لوں۔ اپنی کار میں۔"

مجھے شک ہوا کہ وہ اس بہانے مجھ پر نظر رکھنا چاہتا ہے یا پھر تصدیق کرنا چاہتا ہے کہ میں نے جھوٹ تو نہیں بولا۔

محسن نے کہا "اگر تمہاری عدم موجودگی میں ان آئی جی صاحب نے خود جا کے دلاور کی رہائی کے احکامات صادر کر دیے اور دلاور کو اس کی بیوی کے حوالے کر دیا.... پھر؟"

www.paksociety.com

زیادہ دباؤ پڑتا ہے۔ ٹیلی فون پر احکامات دیے جاتے ہیں۔ تعمیل پر عمل بعد میں ہوتا ہے۔ کوئی پلاٹ یا لائسنس۔ حکم عدولی پر زیادہ بھگتنا پڑتا ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ مسٹر ڈاور نے ڈوری کہاں سے ہلائی ہے اور کس کی۔ لیکن میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ مجھے فون پر بات کرنی چاہیے۔"

"اچھا مسٹر صدیقی۔ اب ہمارا ساتھ نہیں رہا۔ مجھے اجازت دیں" میں نے کہا "میری فلائٹ کا ٹائم ہے۔"

صدیقی نے گھڑی دیکھی "ٹھیک۔ تمہیں نکل جانا چاہیے۔ دو بجے والی فلائٹ ہے نا!"

میں نے سرہلایا "ہاں۔ صبح کورٹ میں ملاقات ہوگی۔ بات کوچ سے واپسی ہوئی میری۔"

میں نے بریف کیس اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ صدیقی نے اچانک ہمارے کیمپ میں پناہ لے کر صورت حال کو ڈرامائی موڑ دے دیا تھا۔ اس سے مجھے بہت خوشی اور اطمینان حاصل ہوگیا تھا۔

گل نے مجھے ائرپورٹ ڈراپ کیا اور میں نے اسے بتایا کہ صدیقی کیوں آیا تھا۔ وہ خود بھی چھپ کے ہماری … سن رہی تھی۔

"اب کل تک کا معرکہ درپیش ہے۔ دلاور کو قید کرنے اور کرانے والے ایک طرف ہیں۔ اسے چھڑانے والے دوسری طرف جن کے ساتھ پولیس بھی ہے۔ محسن بھی صورت حال کو سمجھتا ہے۔ ذلیب اور مارگریٹ کو سب سے پہلے نکال … یہاں سے۔ رابعہ، محسن اور گل آج رات رہیں مظہر کے گھر میں۔ تم اور وقار بھی اپنے گھر میں نہ رہو تو اچھا ہے۔"

"پھر کہاں رہیں ہم؟"

"ایک رات کی تو بات ہے۔ چلے جاؤ کسی ہوٹل میں۔"

میرے پاس کراچی کا ٹکٹ تک نہیں تھا۔ چانس پر دو مسافر تھے جو پہلے سے موجود تھے۔ میرا نمبر تیسرا تھا لیکن عین وقت پر چار سیٹوں کی گنجائش نکل آئی۔ میں نے شجاعت علی بغدادی کے نام سے سفر کیا۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک باتونی اور جاہل شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بڑے تجسس کا مظاہرہ کیا۔

"کیا آپ بغداد کے رہنے والے ہو بغدادی صاحب!"

میں نے کہا "نہیں۔ تم نے الف لیلہ کی کہانیاں پڑھی ہیں۔"

"ہاں۔ الہ دین کا چراغ اور…"

میں نے کہا "اس میں ایک حجام کی کہانی ہے۔ خلیفہ ہارون رشید اور اس کی بیوی زبیدہ کو بے وقوف بنا کے انعام بھی حاصل کرلیا تھا اس نے۔ وہ میرے پردادا کے پردادا تھے۔ میں بھی نائی ہوں۔"

"میرا نام سعید احمد کرمانی ہے۔ کریانہ کی دکان ہے۔"

"یعنی تم کرمان کے رہنے والے ہو۔"

اس نے برا مان کے کہا "یہ تو ذات ہے میری۔"

میں نے کہا "کرمان ایک شہر ہے ایران کا۔ اگر تمہیں پسند نہیں تو اپنا نام بدل کے سعید احمد کریانی کرلو یا سعید احمد پنساری۔"

اس کے بعد ہمارے درمیان بات چیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ویسے بھی میں انگریزی کا اخبار پڑھنے لگا تھا اور وہ کھانے پینے میں مصروف ہوگیا تھا۔ وہ ان مسافروں میں سے تھا جو اس لیے جہاز سے جاتے ہیں کہ کھانا مفت ملتا ہے اور ائرہوسٹس مذاق پر خفا نہیں ہوتی بلکہ مسکراتی ہے۔

کراچی ائرپورٹ سے میں سیدھا میٹروپول گیا اور اس میں کمرا حاصل کیا۔ میں نے اپنا پتا بھی غلط لکھا مگر میرے جیسے خوش صورت آدمی پر شک کون کرسکتا تھا۔ مجھے تین سو … میں نے انکار کردیا۔

"تمہیں ذرا دیر ہی ہوئی یہ خطرناک خبر ہے۔"

"وہ کیسے سر؟ اس میں تیمو کا ہاتھ … نہیں ہے" کلرک …

"یہ قتل عمد کی دفعہ ہے۔ جس میں ضمانت … ہوجاتی ہے۔"

"او۔ وکیل ہیں آپ" وہ مسکرایا اور مجھے …

وہ سو روپے دے دیا۔ "اس کا ویڈیو دیا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میں یہاں کھڑکی سے کراچی شہر کا نظارہ کرنے نہیں آیا ہوں۔ مجھے مسٹر اے کیو دسکوی سے ملنا ہے۔ کیا وہ ہوٹل میں موجود ہوں گے؟"

اس نے … کے دیکھا اور نفی میں سرہلایا "جا چکے ہیں … وہ رات کے وقت واپس آنے کا کہہ گئے تھے۔"

ابھی شام کے پانچ بجے تھے۔ میں نے غسل کیا اور … طلب کی۔ دو گھنٹے میں یقیناً فارغ تھا۔ میں رات نو بجے … پایا ہے مل سکتا تھا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے … لباس بدلا اور باہر نکل گیا۔ دوبارہ اکرام شیخ کے گھر جانے … میں براہ راست اس کے گھر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ٹیکسی میں … پہنچ جانے کے بعد میں نے کچھ دیر پتا تلاش کرنے کی ناکام … اور بالآخر اسکول پہنچا۔ وہاں پرانا نیپالی چوکیدار نہیں تھا۔ … جگہ مجھے ایک مہذب نوجوان ملا جو اپنے حلیے سے بھی چوکیدار لگتا تھا۔ اس کے بال بڑے بڑے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ … ہونٹوں پر پان کی لالی۔ اس نے رنگین ریشمی قمیص اور تنگ … پہن رکھی تھی۔ ٹیکسی والے کو سمجھانے کے بجائے وہ … ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور مجھے سیدھا کاجل کے گھر لے آیا۔

میں گھر کو باہر سے دیکھ کے دنگ رہ گیا۔ … سے زیادہ … بنی ہوئی کوٹھی تھی جس کے پورچ میں … کھڑی ہوئی تھی۔

"یہ میڈم کی گاڑی ہے۔ ابھی لی ہے دو مہینے پہلے۔"

گھنٹی بجی تو ایک بنگالی ملازمہ نمودار ہوئی "آپ کون …"

… مجھے اندر لے گئی۔ اکرام شیخ باتھ روم میں سے تولیا لپیٹے … اور ایک اجنبی کو دیکھ کے سخت جھینپا جو اس کی بیوی کو … پہ کھڑا تھا۔ کاجل عینک اتار کے رو رہی تھی۔

"کاجل … یہ کیا ہے۔ کون ہے؟"

میں اس کی طرف لپکا "ابھی بتاتا ہوں تجھے الو کے پٹھے … سے پوچھتا ہے کہ میں کون ہوں؟"

وہ واپس باتھ روم کی طرف بھاگا۔ میرے ہاتھوں میں تولیا رہ گیا۔ اس کی حالت غیر ہوگئی۔ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ کاجل بھی ہنسنے لگی۔ اکرام شیخ نے باتھ روم کا دروازہ بند کرلیا اور پھر ایک پرانی پتلون پہن کے برآمد ہوا۔ ہم گلے ملے اور ہنس ہنس کے ایک دوسرے کو مکے مارتے رہے۔

جب یہ طوفان بدتمیزی تھما تو ڈرائنگ روم میں بیٹھ کے باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کاجل فوراً بنگالی بنیادوں پر خاطر مدارات میں لگ گئی۔ میں نے انہیں وہ تصاویر پیش کردیں جو گل نے دی تھیں۔ انہوں نے ایک ایک تصویر کو دس دس بار دیکھا اور سب کے بارے میں ان گنت سوالات کیے اور اپنی رائے دی۔

کاجل نے حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ اب وہ گولیمار کے ایک اسکول کی نہیں دو اسکولوں کی مالک تھی۔ دوسرا انگلش میڈیم اسکول تھا جو سوسائٹی کے فیشن ایبل علاقے میں بڑی کامیابی سے چل رہا تھا۔ سابق پولیس سب انسپکٹر اکرام شیخ اور سابق ٹیکسی ڈرائیور اکرام شیخ اب ان اسکولوں کا ایڈمنسٹریٹر تھا۔ وہ بلاشبہ بہت معزز اور دولت مند ہوگئے تھے۔

رات نو بجے میں اگلے دن آنے کا جھوٹا وعدہ کرکے رخصت ہوا تو میرا پیٹ حلق تک بھرا ہوا تھا اور اس میں کاجل نے مرغن کھانے روسٹ، میٹھا، ٹھنڈا اور گرم، چائے کافی سب کچھ ٹھونس دیا تھا۔

"آج رات ہی مجھے ہیضہ ہوجائے گا۔ کھایا پیا اور کہا سنا معاف کردینا" میں نے ہچکی لے کے کہا "ہم سے بھی دشمنی نکالی تم نے۔"

ڈرائیو شروع کرتے ہوئے اکرام شیخ ہنسا "مجھے نہیں دیکھا تو نے کتنا پیٹ نکل آیا ہے۔"

"اچھا یہ زیادہ کھانے سے نکلا ہے؟"

"اور کیا۔ اچھا کھانا اور بیٹھے رہنا۔ دو قدم پیدل نہ چلنا۔"

میں نے کہا "میں تو کچھ اور سمجھا تھا۔ شاید تو بھی کاجل کی طرح…"

کاجل نے شرما کے کہا "بے شرم بھی ہوگئے ہو تم۔"

"ہوگئے ہو کیا مطلب۔ شروع سے ہیں۔ ہم نے ابھی دیکھا نہیں اپنے میاں کو کیسے … کھڑا ہوا تھا ڈرائنگ روم میں۔"

میں نے کہا "اور یہ بنگالن بالکل ٹھیک جارہی ہے۔ ہر سال کیلنڈر چھاپ دے گی۔"

میں نے کہا "ہم تمہاری میڈم کا ماموں ہے" اور اندر … ہوگیا۔ بنگالی ملازمہ میرے پیچھے پیچھے آئی۔

"ادھر کدھر جاتا۔ بیگم صاحب ہم پر ناراض ہوگا۔ ڈرائنگ روم کھولنے کا ابھی … تم۔"

میں نے کہا "تمہاری بیگم صاحب اور اس کے صاحب دونوں کی ایسی تیسی۔"

شور سن کے کاجل باہر آئی تو میں پھر بھونچکا رہ گیا۔ وہ واقعی میڈم ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے بال پرم کرا کے سیٹ کرالیے تھے۔ اس کی آنکھوں پر سنہرے فریم والا نازک سا چشمہ تھا اور وہ بہت خوب صورت ساڑی میں تھی۔ بدلے ہوئے حلیے میں وہ مجھے کیسے پہچان سکتی تھی۔

"کون ہو تم۔ ایسے اندر گھسے چلے آرہے ہو۔ ماسی! تمہارا دماغ خراب ہے کیا۔ اور چوکیدار تم یہاں کیا کررہے ہو؟" وہ بگڑ گئی۔

ملازمہ نے اپنی صفائی میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میرے ساتھ آنے والے اسکول کے چوکیدار نے بدحواس ہوکے وضاحت کی "یہ تو ماموں ہیں آپ کے۔"

"ماموں کا بچہ" کاجل کا لہجہ بھی بدل گیا تھا "تو وہاں سے یہاں کیوں آیا۔ فون کرکے پوچھ نہیں سکتا تھا۔"

میں نے آواز بدل کے کہا "ارے بٹیا یہ کا کہت ہو۔ ہم اصل ماما ہیں تمہارے۔ شجاعت علی بغدادی۔"

"شٹ اپ۔ تم غلط جگہ آگئے ہو۔ خیریت چاہتے ہو تو نکل جاؤ ورنہ میں پولیس کو بلالوں گی۔ چوکیدار … چوکیدار!" وہ چلانے لگی۔

نہ جانے کہاں سے اس کے گھر کا پٹھان چوکیدار دوڑتا ہوا آیا۔ اس کی مونچھیں ہی اسے چوکیدار ثابت کرتی تھیں "کیا ہے بیگم صیب جی۔"

"دیکھو یہ کون گھس آیا ہے گھر میں۔ تم دونوں مل کے اسے باہر نکالو۔"

اب میں نے اپنی اصلی آواز میں کہا "ارے کاجل۔ کیوں ان بے چاروں کی بڑی پسلی ایک کراتی ہو۔ کیا اتنی کمزور ہوگئی ہے تمہاری نظر؟"

اب وہ چونکی "کون … سکندر … سکندر بھائی۔"

میں نے کہا "کدھر ہے وہ ٹیکسی ڈرائیور؟ تمہارا خصم!"

کاجل نے گھبرا کے کہا "چلو تم دونوں جاؤ۔ یہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ میں پہچان نہیں سکی تھی۔" پھر وہ مجھ سے انگریزی میں مخاطب ہوئی "خدا کے لیے ان کے سامنے تو عزت رکھ لو میری۔ یہ ملازم ہیں۔"

میں نے کہا "اب فکر پڑی ہے اپنی عزت کی۔ ہماری بے عزتی کیوں خراب کرا رہی تھیں۔ خیر ہم نے معاف کیا۔"

www.paksociety.com

"اور وہ تو تمہارا دوست ہے 'چودہ بچوں والا۔"
"کاجل۔ اپنی معلومات اپ ٹو ڈیٹ کرلو۔ اس کے ساڑھے سات بچے ہیں۔"
جیسے تیسے انہوں نے مجھے ہوٹل کے گیٹ پر اتار دیا "کل کس وقت آؤ گے۔ مجھے بتا دو 'میں خود آؤں گی اور اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"
"یار تکلف میں مت پڑو۔ میرا کچھ پتا نہیں۔ بس میں پہنچ جاؤں گا خود ہی۔ جیسے آج پہنچا تھا" میں نے کہا۔
اس ملاقات نے مجھے تازہ دم کردیا تھا۔ میں نے کاجل اور اکرام شیخ کو سب بتا دیا تھا۔ سوائے ایک بات کے۔ میں نے کہا تھا کہ نازو بالکل خیریت سے ہے اور بس اب تھوڑے دن کی بات ہے۔ پھر سب کے گھر آباد ہو جائیں گے۔ غالب اور نازو کا' میرا اور رابعہ کا۔ انہوں نے کہا کہ ہم آج رات ہی فون پر بات کرلیں گے۔
مجھے معلوم تھا کہ رات کو شاید انہیں کوئی بھی نہیں ملے گا۔ گھنٹی بجتی رہے گی مگر فون کوئی نہیں اٹھائے گا۔ اگلے دن میرا ارادہ خاموشی سے لوٹ جانے کا تھا۔ میں اکرام شیخ اور کاجل کی مطمئن' پُرسکون اور مصروف زندگی میں کوئی رخنہ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔
رات ساڑھے نو بجے میری ملاقات مسٹر اے گیو زسکوی سے ہوئی۔ اسے ہوٹل کلرک نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مسٹر شجاعت علی بغدادی اس سے ملنے کے لیے لاہور سے آئے ہیں۔ اس کا حیران ہونا برحق تھا۔ وہ اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا تھا' لیکن میرا انتظار کر رہا تھا۔
خلاف توقع وہ شریف اور وضع دار آدمی ثابت ہوا۔ اس کے گھنے بال بالکل سفید تھے اور اس کے مزاج میں نہ رعونت تھی نہ والایت کی جعلی چھاپ۔
میں نے کہا "آپ یقیناً مجھے نہیں جانتے لیکن آپ کی بیٹی میری لندن کے جس اسکول میں پڑھتی تھی اس میں میری ایک گرل فرینڈ تھی۔ اس کا نام الزبتھ تھا۔ وہ ایک مغرور اور متعصب انگریز لارڈ کی بیٹی تھی جس نے مجھے اس جرم میں برطانیہ سے ڈی پورٹ کروا دیا تھا کہ میں الزبتھ سے شادی کا ارادہ رکھتا تھا۔"
"انگریز سے زیادہ تنگ نظر اور متعصب قوم کوئی نہیں" وہ بولا۔
میں نے کہا "آپ کا ایک شوفر تھا۔ ایک نیگرو جس کا نام جارج تھا۔"
وہ چونکا "وہ..... وہ تو جیل میں ہے بے چارہ۔"
میں نے کہا "وہ دُہرے قتل کے جرم میں عمر قید کاٹ رہا ہے حالانکہ قتل اس نے نہیں کیے تھے۔"
"رائٹ۔ مگر تم کیسے جانتے ہو۔ ضرور میری نے بتایا ہوگا۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا "میری سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی تھی لاہور میں۔ اس کیس کے حقائق پہلے سے میرے علم میں تھے۔

میری نے مجھے یہ بتایا کہ آپ نے جارج کو بچانے کی کوشش بھی کی تھی۔ قانونی اخراجات آپ نے برداشت کیے تھے۔"
اس نے مایوسی سے کہا "بعض اوقات سو فیصد بے گناہی ثابت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"
میں نے کہا "میں اصل قاتل کو جانتا ہوں۔"
اس نے چونک کے مجھے دیکھا "تم جانتے ہو؟ کب سے؟"
"بہت عرصے سے۔"
"پھر اب تک تم کیوں خاموش تھے اور اب اچانک بتانے کا خیال کیسے آگیا تمہیں۔" اس نے ناگواری سے کہا "فائدہ۔"
میں نے کہا "خدا نے ہر وقت کے لیے ایک کام اور ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے۔ وقت اب آیا ہے کہ میں بتاؤں اور آپ جارج کے لیے نئے سرے سے کوشش کریں۔"
"اب مشکل ہے' بلکہ ناممکن۔"
"ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔ نیک نیتی سے جو کام کیا جائے اس میں خدا کی رضا بھی شامل ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو میری ملاقات آپ کی بیٹی سے نہ ہوتی اور مجھے کبھی پتا نہ چلتا کہ جارج اب تک جیل میں ہے۔ اس کا اقرار نہ ہوتا تو میں نے مناسب سمجھا کہ فوراً کراچی پہنچ کے آپ سے رابطہ کروں۔ یہاں اصل قاتل گرفتار کرلیا گیا ہے۔"
وہ حیران ہوا "یہاں؟"
میں نے کہا "اس نے یہاں ایک لیڈی ڈاکٹر کو قتل کیا۔ ڈاکٹر شیلی کو۔ یہ نام ضرور سنا ہوگا آپ نے؟"
"آف کورس۔ جارج پر ڈاکٹر شیلی کی ماں کو قتل کرنے کا الزام تھا اور اپنی گرل فرینڈ کو۔"
میں نے کہا "وہ آیا تھا ڈاکٹر شیلی کو قتل کرنے کے لیے لیکن اس کو پہچانا نہیں تھا۔ اس نے جارج کی گرل فرینڈ کو شیلی سمجھ کر شوٹ کردیا۔ پھر جارج کی بیوی کو مار دیا۔"
"لیکن کیوں' کیا مقصد تھا اس قتل کا؟"
"جارج کی بیوی اصل قاتل کی سوتیلی ماں تھی۔ اور اس کی بیٹی ڈاکٹر شیلی اس کی سوتیلی بہن۔ وہ دونوں کا قصہ پاک کرنے کے لیے لندن پہنچا تھا۔ کچھ جائداد ہتھیانے کا چکر تھا کچھ بدلہ لینے کا۔ سوتیلی ماں کے اطوار اچھے نہیں تھے۔ بدقسمتی سے ادھر قاتل جائے واردات سے فرار ہوا ادھر جارج پہنچ گیا اور پکڑا گیا۔ اس نے قاتل کی ایک جھلک دیکھی تھی مگر قاتل صرف ایک دن کے لیے لندن گیا تھا۔ واپسی کی فلائٹ پر اس کی سیٹ کنفرم تھی۔ اگلے دن وہ پھر کراچی میں تھا۔ جارج نے اس کا جو حلیہ بتایا اس نام کا کوئی شخص لندن میں مل بھی نہیں سکتا تھا۔"
"کون ہے آخر وہ؟"
میں نے جیب میں سے دلاور کی ایک تصویر نکالی "یہ اصل قاتل ہے۔ اس کا نام ہے چوہدری دلاور۔"

"وہ کیا چارہ ہو سکتے ہیں مگر میرا خیال ہے دلاور کے گرفتار ہونے سے ایک رستہ کھل سکتا ہے۔ لندن میں ہونے والے قتل کا سراغ پاکستان تک بات نہیں پہنچی۔ لندن میں ہونے والے قتل کا سراغ پاکستان سے کیسے لگایا جاسکتا تھا۔ اور ان سب معاملات کے لیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ صرف اتنا کریں کہ جارج کو یہ تصویر دکھا دیں۔ اس کو سنبھال کر رکھیں لیکن خدانخواستہ یہ گم ہو جائے تو کوئی بات نہیں۔ آپ مجھے لندن کا فون نمبر دے دیں۔ میں تصدیق کروں گا اور ضرورت پڑی تو دوسری تصویر روانہ کردوں گا۔"
"تم مطمئن رہو' میں اپنی ذمے داری پوری کروں گا۔ یہ ایک نیک مقصد ہے۔ ایک بے گناہ سیاہ فام کی رہائی کے لیے تو میں برطانیہ میں تحریک چلا سکتا ہوں۔ اب حالات پہلے جیسے نہیں ہیں۔ میں اس تصویر کو پوسٹر بنا کے شائع کروں گا۔ ہم پلے کارڈ پر پوسٹر لگا کے وزارت انصاف کے سامنے مظاہرے کا انتظام کر سکتے ہیں کہ یہ ہے اصل قاتل۔ بے گناہ جارج کو رہا کیا جائے۔"
"اس سے یقیناً فائدہ ہوگا" میں نے کہا "وش یو گڈ لک۔"
اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی اور اگلے دن لنچ پر مدعو کیا مگر میں نے معذرت کرلی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ میں لاہور میں کہاں رہتا ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ میں مسلسل جھوٹ بولتا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جارج کی رہائی کے لیے چلائی جانے والی تحریک سے میرا کوئی تعلق ثابت ہو۔ اصل قاتل کی تصویر فراہم کرنے والے شجاعت علی بغدادی کا کسی کو پتا ہی نہ چلے کہ کون تھا۔
رات دس بجے میں نے وقار کے گھر فون کیا اور پھر اپنے گھر۔ دونوں جگہ گھنٹی بجتی رہی مگر ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔ اس کا مطلب تھا کہ کل سے میری ہدایات آگے پہنچا دی گئی تھیں اور محسن نے ان پر عمل بھی کیا تھا۔ گل اور وقار کہیں بھی جاسکتے تھے۔ گل زرابعہ اور محسن کے لیے بھی منظر کا گھر محفوظ جگہ تھا مگر ایس ایس پی جاوید صدیقی کہاں گیا ہوگا؟ کیا وہ بھی منظر کے گھر میں ملے گا۔
رات کے بارہ بجنے والے تھے جب میں نے منظر کے گھر کا نمبر ڈائل کیا تھا مگر کچھ دیر بعد جواب ملا کہ نمبرا انگیج ہے۔ میں نے کال کینسل کرادی اور آرام سے سو گیا۔ چوہدری دلاور کے گرد شامت اعمال اپنا گھیرا تنگ کرتی جارہی تھی۔ جاوید صدیقی کا انقلابی فیصلہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ اگر وہ ڈر جاتا یا بک جاتا تو چوہدری دلاور کو اس کی ذہنی بیکیو رٹی کے تمام انتظامات کو شکست دے کر اپنے ساتھ لے جاتی۔ قانون کے محافظ خود قانون کی فصیل کرا دیتے اور انصاف کے راستے میں دیوار بن جاتے۔ سزا سے کیو ڈسکونیا کا فنا ہو جانا دوسرا اتفاق تھا جس نے دلاور کے انجام پر مُہر عبرت ثبت کردی تھی۔ قاطمہ جعفری کی گرفتاری بھی ہماری ایک اہم کامیابی تھی۔
صبح سات بجے میری ہدایات کے مطابق بیڈ ٹی لانے والے ویٹر نے دستک دی۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کے چائے پی اور ناشتا کیا اور ٹیپ ریکارڈر کو منظر

وہ دلاور کی صورت کو غور سے دیکھتا رہا "تم کہتے ہو کہ یہ ڈاکٹر شیلی کا سوتیلا بھائی ہے؟"
"جی۔ اب وہ ڈاکٹر شیلی کے قتل کے جرم میں پکڑا جا چکا ہے اور اس کو پھانسی ہونا یقینی ہے۔"
"کیا شیلی اس سے انتقام لینے آئی تھی؟"
"نہیں۔ اسے قاتل نے دھوکے سے بلایا تھا۔ مگر آپ کیوں۔"
"دیکھو مسٹر بغدادی۔ میں یہاں کسی قانونی چکر میں پڑنے نہیں آیا تھا 'آئی ایم سوری!"
میں نے کہا "آپ کو کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ یہاں برٹش کونسلیٹ کی معرفت جارج کو بلانے کا بندوبست کرلیا گیا ہے۔"
"پھر میں کیا کرسکتا ہوں۔"
میں نے کہا "آپ جارج سے ملیں اور اسے یہ تصویر دکھائیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دلاور کو پہچان جائے گا۔"
"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"
میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ وہ دلاور کی صورت ذہن نشین کرلے اچھی طرح دیکھ لے۔ اس نے پہلے قاتل کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ یہ پرانی بات ہے۔ ہو سکتا ہے اب وہ دلاور کو شناخت نہ کر پائے مگر یہ تصویر دیکھنے کے بعد اس کے لیے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ پولیس جب دلاور کو شناختی پریڈ کے لیے کھڑا کرے گی تو وہ دلاور کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرے گا' یہ حالیہ تصویر ہے۔"
"میں سمجھ گیا" اس نے تصویر جیب میں رکھ لی "یہ بہت اچھا کیا تم نے۔ غلطی کا امکان نہیں رہنے دیا۔ میں یہ تصویر جارج کو دکھاؤں گا۔ لندن پہنچتے ہی۔"
"مجھے یقین ہے کہ اس سے جارج کی رہائی میں مدد ملے گی۔"
"لیکن جارج کے کیس پر نظر ثانی کے لیے وزارت انصاف کے پاس ٹھوس مواد ہونا چاہیے۔"
میں نے کہا "کیا چوہدری دلاور کا اعتراف جرم کافی نہیں ہوگا۔"
"تمہیں یقین ہے وہ اتنے پرانے قتل کا الزام بھی اپنے سر لے گا جس میں مجرم کسی اور کو قرار دیا جاچکا ہے۔"
میں نے کہا "ارے کیو صاحب' آپ تو پاکستانی ہیں۔ پاکستان کی پولیس کے طریقہ تفتیش سے واقف ہوں گے۔ وہ ہر بے گناہ سے ہر جرم کا اعتراف کرا سکتے ہیں لیکن دلاور کے خلاف اہم ثبوت ہوگا اس کا پاسپورٹ جس پر لندن آنے جانے کی تاریخ کا اندراج ہوگا۔"
وہ اُچھل پڑا "اور قتل انہی تاریخوں میں ہوا تھا۔"
"ہاں۔ دلاور کیا کہے گا کہ وہ ایک دن کے لیے لندن کیوں گیا تھا' ریٹرن ٹکٹ پر؟"
"کیا پتا وہ فرضی نام سے کسی جعلی پاسپورٹ پر گیا ہو۔ یہاں

www.paksociety.com

کے گھر کا فون نمبر دیا۔ کال فوراً مل گئی۔

مظہر نے کہا "ابے بھوتنی کے بغداد کے چور۔"

میں نے کہا "یار یہ کوئی طریقہ ہے شرفا کے سلام دعا کا۔"

"یہ شرفا کون ہے ہم میں سے؟" مظہر نے کہا "سب سالے ایک سے ایک چھٹے ہوئے بدمعاش۔"

میں نے کہا "میری وہ ہیں؟ نام لیتے ہوئے شرم آتی ہے مجھے۔"

"ایک وہ گیا۔ رات تو ایسی یلغار ہوئی ہر طرف سے کہ گھر بنا ہوا ہے مہاجر کیمپ۔ وہ میری بیوی کی مدد کر رہی ہے کچن میں۔ کل بھی وہیں ہے۔ میرا خیال ہے میں بیوی کو بھیج دوں میکے اور بچوں کو داخل کرا دوں یتیم خانے میں۔ زیادہ آرام سے رہیں گے۔"

میں نے کہا "ایک دن میں مرا جا رہا ہے۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ اب ذرا محسن کو بلاؤ۔"

"وہ یہاں کہاں۔ رات اس نے گزاری ہے اس کے ساتھ۔ اکیلے ایک یتیم خانے میں۔ محسن اور وہ مس جعفری۔ توبہ توبہ میں نے کل کو خاصا بھڑکایا ہے۔ انشاء اللہ اچھی خاصی ہوگی ان کے درمیان جب محسن واپس آئے گا۔ سالا آفت کا بچہ" وہ قہقہہ مار کے چہکا۔

میں نے کہا "غالب اور مارگریٹ کو انھوں نے بھیج دیا تھا تیرے وہ سسر کے اسپتال۔"

"ہاں غالب کو اجازت مل گئی تھی وہاں قیام کی مگر مارگریٹ کو نکال دیا تھا باہر۔ پھر محسن نے میری گھر والی سے فون کے لئے کہا تو وہ خود ساتھ چلی گئی۔ ماموں کی۔۔۔" اس نے ایک بے ہودہ بات کی۔

"یعنی مارگریٹ بھی اب وہیں ہے۔ نازو کا کیا حال ہے؟"

"نازو ہوش میں ہے۔ غالب کو ابھی تک اس سے دور رکھا گیا ہے۔ اب یہ ڈاکٹر بلاکو خان چنگیزی کا کام ہے یار۔ ہمیں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "ایس ایس پی جاوید صدیقی کی کچھ خبر ہے۔"

"وہ بھی چلا گیا تھا محسن کے ساتھ ہی۔ دونوں نے مل کے......"

میں نے کہا "یار کیا ہر وقت فضول بکواس کرتا رہتا ہے۔"

"میری معلومات کے مطابق تو وہ عورت ایسی ہی ہے اور تیری کیا لگتی ہے بھوتنی کے جو تو برا مانتا ہے۔ نو بجے صدیقی ہمارے ساتھ ہی جائے گا۔ میرے اور رابعہ کے ساتھ۔"

اس سے پہلے کہ میں مزید بات کرتا دروازہ زور سے کھلا اور ایک پولیس انسپکٹر اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے ہوٹل کا منیجر تھا۔

"آئی ایم سوری سر۔ انھوں نے میری بات ہی نہیں سنی۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور سب انسپکٹر کو دیکھا "کیا مطلب ہے اس طرح میرے کمرے میں گھسنے کا؟ وارنٹ ہے؟"

"وارنٹ بھی آ جائے گا وکیل صاحب۔ لیکن مجھے کچھ سوال کرنے تھے آپ سے۔" وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "بیٹھو اور آرام سے بات کرو۔"

"مسٹر شجاعت علی بغدادی؟"

میں نے کہا "یس؟"

"آپ مسٹر اے کے ڈسکوی کو کیسے جانتے ہیں؟"

میں نے کہا "میں ان سے کل پہلی بار ملا تھا۔"

سب انسپکٹر نے کہا "کل کس وقت؟"

"رات گیارہ۔ ساڑھے گیارہ بجے تک میں ان کے ساتھ تھا۔"

سب انسپکٹر کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "آپ ان کو زندہ دیکھنے والے آخری آدمی تھے۔"

میرا دل ڈوبنے لگا "کیا مطلب؟"

"مطلب بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ میں آپ کو ان کے قتل کے شبے میں گرفتار کر رہا ہوں۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

کمرا میری نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ میں نے تو ہوٹل میں اپنا نام بھی غلط لکھوایا تھا۔ میری اپنی شناخت بھی میرا ایک راز تھی۔

"یہ کوئی غلط فہمی معلوم ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

منیجر نے معذرت آمیز لہجے میں کہا "میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی تھی سر۔"

سب انسپکٹر نے اسے گھور کے دیکھا "تمھارا کیا نام ہے؟"

"میں پہلے بتا چکا ہوں۔" منیجر نے دفاعی انداز اختیار کیا "ایک بات کا خیال رکھنا انسپکٹر۔ میں نے تمھیں صرف کارروائی کے لئے یہاں تک آنے کی اجازت دی ہے۔"

"کسی قانونی کارروائی کے لئے مجھے تم سے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن غیر قانونی کارروائی کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ یہ عام ہوٹل نہیں ہے۔" منیجر بولا۔

میں نے کہا "قتل کا الزام معمولی بات نہیں ہے۔ کیا کسی نے رپورٹ کی ہے میری......"

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کل جب آپ ہوٹل آئے تو آپ نے مسٹر اے کے ڈسکوی کو پوچھا تھا۔" سب انسپکٹر بولا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

منیجر نے اقرار میں سر ہلایا "یہاں ہر روز لوگ کسی نہ کسی سے ملنے کے لئے آتے ہیں۔ بزنس مین میٹنگ کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "پہلے تو مجھے یہ بتایا جائے کہ مسٹر اے کے ڈسکوی کا قتل کب ہوا؟"

"رات بارہ بجے کے بعد۔"

"کیا میں ان کی لاش دیکھ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

میرے آفس میں آ جائیں۔ ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

انسپکٹر نے مطلب کی بات منیجر کی نگاہ میں اور لہجے میں پڑھ لی تھی مگر اس نے اپنی ٹھوڑی کو بلند رکھا "ایسی کون سی بات ہے جو یہاں نہیں ہو سکتی۔ اگر ملزم فرار ہو گیا پھر؟"

منیجر نے خوشامدانہ انداز اختیار کر لیا "نہیں سر۔ یہ تو خود قانون کی مدد کرنے والے اتنے نامور وکیل ہیں۔ ملک کے سارے مشہور وکیل اور جج تک انھیں جانتے ہوں گے۔"

میں نے اکڑ کے کہا "اگر اخبار پڑھتے انسپکٹر صاحب تو آپ بھی میرے نام سے واقف ہوتے۔ خیر یہ اپنے محکمے کے کسی سینئر افسر سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ یہاں ڈی آئی جی کرائمز کون ہیں آج کل۔"

سب انسپکٹر نے میری بات کا جواب نہیں دیا "یہ بڑی مشکل ہے جی۔ اگر ہم فرض شناسی کا مظاہرہ کریں تو بیچ میں آ جاتے ہیں آپ جیسے لوگ۔ اور ملزم بھی تڑی دینے لگتے ہیں۔"

منیجر نے کہا "نہیں سر۔ آپ کو تڑی کون دے سکتا ہے۔ دراصل ابھی ابھی ہوٹل کے ڈاکٹر نے معائنہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مسٹر ڈسکوی کا ہارٹ فیل ہوا ہے۔"

میرا حوصلہ دوچند ہو گیا "یہ قتل کی بات آخر کس نے پہنچائی تھی پولیس کو؟ تم منیجر ہو۔ یہ ذمے داری صرف تمھاری ہے۔"

"میں نے کسی کو فون نہیں کیا سر۔"

میں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "وہ آئے ہیں۔ پھر یہ خود ہی آ گئے۔ ان کی چھٹی حس نے انھیں بتا دیا ہوگا کہ یہاں چانس ہے۔"

"کیسا چانس؟" سب انسپکٹر گرم ہو کے بولا۔

"بلاوجہ معصوم مت بنو۔ مال کی خوشبو سونگھنے میں تمھارے حواس بہت تیز ہوتے ہیں۔ راڈار کی طرح خبر مل جاتی ہے تمھیں کہ کہاں سے پیدا کی جا سکتی ہے؟"

"میرے ساتھ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"اپنی اوقات میں رہو انسپکٹر۔ یہ پٹی کچھ نہیں۔ تمھاری وردی تک اتروا سکتا ہوں میں۔ بولو؟" میں نے چٹکی بجا کے کہا "کیسے فرض کر لیا تم نے آخر کہ یہ قتل کی واردات تھی اور الزام میں کیا تم ان سب کو پکڑو گے جو اے کے ڈسکوی سے ملے تھے؟ میں نے شرافت سے اعتراف کر لیا تو میں ملزم ہو گیا۔ اب میں بتاتا ہوں کہ میرے بعد اور کون وہاں گیا تھا۔"

"کون گیا تھا؟ کیا تم نے دیکھا تھا کسی کو وہاں سے نکلتے ہوئے؟"

"ہاں۔ دس افراد باری باری ملے تھے۔ سب اسی ہوٹل میں مقیم ہیں۔ اسے میرا بیان سمجھو اور گرفتار کر لو ان دس افراد کو۔ میں ان سب کو شناخت کروں گا۔ شناخت کے لئے ہوٹل میں مقیم تمام افراد کو ایک جگہ اکٹھا کرنا تمھارا کام ہے۔"

ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی اور ہو۔"

سب انسپکٹر کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی "آپ بھی لاش کو دیکھ لیں۔"

میں انسپکٹر کے ساتھ اے کے ڈسکوی کے کمرے میں گیا۔ اس کی لاش سفید چادر سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ سو رہا ہو۔ میں نے چادر ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا اور پھر ڈھک دیا۔

"یہی۔ رات کو میری اس شخص سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔"

"اور دوسری ملاقات میں تم نے اسے قتل کر دیا۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

اگر میں گھبرا جاتا تو وہ سب انسپکٹر شاید مجھے ہتھکڑی پہنا دیتا۔ میں نے کہا "اس میں کوئی شک نہیں کہ میں رات کو گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک مسٹر اے کے ڈسکوی کے پاس تھا۔ لیکن یہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ میرے بعد ان سے کوئی نہیں ملا اور میں ہی وہ آخری آدمی ہوں جس نے انھیں زندہ دیکھا تھا۔"

سب انسپکٹر نے کہا "اگر تمھیں معلوم ہے اور کسی کا نام تو بتا دو۔"

وہ عام پولیس انسپکٹروں کے مقابلے میں مہذب تھا یا مجھے احساس تھا کہ وہ ایک ایسے ہوٹل میں ہے جہاں [illegible] قیام نہیں کرتے۔

میں نے کہا "دیکھو میں ایک مشہور وکیل ہوں۔ مجھ سے غیر قانونی بات کرو گے تو۔۔۔"

وہ کچھ تیز ہو کے بولا "ابھی تک ایسی کون سی بات کی ہے میں نے۔"

"سب سے پہلی بات تو یہ کہ تم میرے کمرے میں کسی وارنٹ کے بغیر داخل ہوئے ہو۔ پھر تم نے کچھ بتائے بغیر مجھ پر قتل کا الزام عائد کر دیا۔ مجھے گرفتار کرنے کی دھمکی دے دی۔ صرف چھ سات گھنٹے میں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ یہ واردات قتل کی ہے اور اس میں میرا ہی ہاتھ ہے۔"

اس کا اعتماد متزلزل ہو گیا "ابھی یہ شبہ ہے ہمارا۔"

"کیا پوسٹ مارٹم رپورٹ مل گئی ہے؟ اس میں موت کی کیا وجہ بتائی گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"دیکھیں جی بحث مت کریں۔ شبے میں ہم کسی کو بھی تھانے لے جا سکتے ہیں۔ پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ بھی سکتے ہیں۔ ہمیں تو آج صبح کسی نے فون پر اطلاع دی تھی کہ اس ہوٹل میں مسٹر اے کے ڈسکوی کا قتل ہو گیا ہے۔"

"کسی نے کیا مطلب؟ ہوٹل کا منیجر ہی یہ اطلاع دے سکتا ہے۔ لاش اگر سب سے پہلے کسی ویٹر نے دیکھی ہو تب بھی....."

"منیجر کو بھی معلوم نہیں تھا۔"

منیجر پھر کمرے میں داخل ہوا "انسپکٹر صاحب۔ آپ ذرا

www.paksociety.com

فیجر نے پیچھے سے مجھے اشاروں میں سمجھایا کہ میں غصہ نہ کروں۔ وہ سب ٹھیک کرلے گا "انسپکٹر صاحب۔ آپ آئیں میرے ساتھ۔ آپ کو بلاوجہ زحمت ہوئی۔ کسی نے شرارت سے فون کیا ہوگا۔"

"شرارت کرنے والوں کی اطلاع غلط ثابت ہوتی ہے۔ یہ بات تو خود تمہیں معلوم نہیں تھی کہ ایک مسافر کمرے میں مرا پڑا ہے۔"

"اب کیا پتا جی۔ کسی ویٹر نے دیکھا ہو۔ ویٹر بھی بعض اوقات پریشان کرتے ہیں ہمیں۔ آپ آئیں تو سہی؟" وہ انسپکٹر کو گھسیٹ کر لے گیا "یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں سر۔ میں پوری ذمے داری سے بتا رہا ہوں۔"

جب وہ چلے گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جان بچی۔ فیجر دخل اندازی نہ کرتا تو مجھے پولیس کے ساتھ جانا پڑتا اور جب پتا چلتا کہ میرا نام اور پتا دونوں کا اندراج غلط ہے تو پھر میرے قاتل ہونے میں شک وشبے کی کوئی بات ہی نہ رہتی۔

میں نے ریسیور اٹھا کے آپریٹر کو کاجل کا نمبر دیا۔ وہ مجھے ساتھ لے جانے کے لئے روانہ ہونے ہی والی تھی "میں تمہاری طرف ہی آرہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ تم کہیں فرار نہ ہو جاؤ۔"

"تم سے فرار ہو کے کہاں جاؤں گا میں؟"

"عادت پڑگئی ہے نا فرار ہونے کی۔ پتا نہیں رابعہ نے باندھ کے رکھنے کی کوشش کی۔"

میں نے کہا "بہت مشکل ہے۔ میں اسے بھی بھول جاؤں گا۔ خیر کاجل ایک بات سن کر حیران ہو گی۔ یہاں بلاوجہ ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ صبح تک پولیس مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔"

"کیا؟ تم مذاق تو نہیں کررہے ہو۔" وہ گھبرا گئی۔

"بالکل نہیں۔ شیخ صاحب کہاں ہیں؟"

"یہ کھڑے ہیں میرے ساتھ۔ مجھے بتاؤ۔۔۔"

"تمہیں نہیں اکرام شیخ کو بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔

شیخ نے میری بات سنی اور بولا "جلدی میں کوئی حماقت مت کر بیٹھنا۔ ہم پہنچ رہے ہیں۔ نام کیا بتایا تم نے۔"

"شجاعت علی بغدادی۔"

"میں فون کراتا ہوں۔ ایک ایس پی سے۔ اس کے بچے ہمارے اسکول میں پڑھتے ہیں۔"

ایس پی کا فون موصول ہوتے ہی سب ٹھیک ہو گیا۔ ہوٹل کا فیجر اس سے پہلے ہی سب ٹھیک کرچکا تھا۔ سب انسپکٹر دوبارہ میرے پاس آیا تو اس کا لہجہ اور انداز گفتگو بدلا ہوا تھا۔ اب وہ معذرت پیش کررہا تھا اور مجھے بار بار سر کہہ رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو مجھے اس کی ایک جیب پہلے کی نسبت کچھ پھولی ہوئی نظر آئی۔ یہ میرا شک اور وہم بھی ہو سکتا تھا۔

پولیس کے جانے سے پہلے ہی کاجل اور اکرام شیخ پہنچ گئے۔ کاجل نے خوب اداکاری کی "ارے شجاعت۔ یہ کیا چکر ہے۔"

میں نے کہا "اب کوئی چکر نہیں۔ تمہارے بھیا ایس پی صاحب نے فون کرادیا تھا۔"

"اف۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔ میں نے اسلام آباد فون کرکے ڈیڈی کو جگا دیا۔ وہ کہنے لگے کہ میں ابھی بات کرتا ہوں کمشنر سے۔"

سب انسپکٹر نے فوراً مجھ سے ہاتھ ملایا "اچھا سر۔ غلطی معاف مجھے اجازت دیں۔"

دروازہ بند ہوتے ہی شیخ نے مجھے پکڑلیا "یہ کیا ہے سر۔ آپ کو کھانا ہضم نہیں ہوتا اگر کوئی چکر نہ چلائیں۔"

میں نے کہا "یار خدا نے تقدیر ہی ایسی بنادی ہے۔ میں کیا کروں۔ اس میں چکر ہی چکر ہیں۔ اب بتاؤ یہ کوئی موقع تھا ڈسکوی صاحب کے مرنے کا۔ ایسا لگتا ہے کہ بس میرا ہی انتظار کررہے تھے۔ فرشتہ اجل دروازے کے باہر کھڑا ہوا تھا کہ میں نکلوں تو وہ اندر جائے۔"

شیخ نے کہا "تمہارے نقش قدم پر ہی کیوں چل رہا تھا موت کا فرشتہ۔"

میں نے کہا "مجھے تو سخت شکایت ہے اس سے۔ چند دن کی مہلت اور مل جاتی تو ڈسکوی صاحب اپنے چوہدری دلاور کی تصویر ولایت لے جاتے۔"

"موت کا ایک دن معین ہے۔" شیخ نے کہا "اب تم یہاں سے نکلو ورنہ کچھ اور ہو جائے گا۔ تصویر تم اس کی بیٹی کو بھی دے سکتے ہو۔"

"صرف اتنا عرف میری کو؟" میں نے کہا "واقعی۔ یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا۔ ابھی تو میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ یہی کہوں گا کہ مجھے کراچی جانے کا موقع نہیں ملا۔ ایس ایس پی صدیقی کے ساتھ اسلام آباد چلا گیا تھا۔"

"تعزیت اور ہمدردی تو کرو گے اس سے۔ دل ٹوٹ جائے گا بچاری کا۔" کاجل بولی "اس سے پہلے کہ تم ڈیڈی سے اس کا ہاتھ مانگتے ڈیڈی کا ہاتھ اجل نے تھام لیا۔"

فیجر نے پانچ ہزار میں معاملہ طے کرلیا تھا "پولیس کا کیا کام سر شرفا کے ہوٹل میں۔ بس یہ حیرانی ہے مجھے کہ فون کس نے کیا تھا۔ آپ کو کچھ معلوم ہے مسٹر اے کیو ڈسکوی کے بارے میں۔ کہاں رہتے ہیں۔ ان کا بیٹی کہاں ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ یہ لندن میں قیام پذیر ہیں اور آج کل فیملی کے ساتھ پاکستان آئے ہوئے تھے۔"

میں ہال وے کے نکل رہا تھا جب میں نے فیجر کو کسی سے فون پر باتیں کرتے سنا اور سمجھ گیا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔ میری تو

بھی یہ ہوگا۔ کیا تم یہی تصویر اس کی بیٹی کو نہیں دے سکتے۔ یا میری کے ذریعے لندن نہیں بھیج سکتے۔"

میں نے کہا "شیخ۔ میں کاجل کے ساتھ انتظار کروں گا لیکن تو جا کے ذرا دیکھ کہ پیڈرو یہاں کیوں نظر آیا تھا۔"

"او کے۔ میں دیکھ لیتا ہوں۔ لیکن مجھ سے وعدہ کرو کہ واپس تم مجھے یہیں ملو گے۔ کاجل کو پتا دے کر غائب نہیں ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا "میں قسم کھانے کا قائل نہیں لیکن تم کہو تو۔۔۔"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ کاجل۔ گاڑی واپس لے چلو۔"

کاجل نے خفگی سے کہا "آ گئے نا تم بھی ان کی باتوں میں۔"

"تم بالکل فکر مت کرو۔ میں کسی چکر میں پڑنے والا نہیں ہوں۔"

کاجل نے گاڑی کو پیلس سینما کی طرف سے موڑا اور میٹروپول کے دوسرے گیٹ سے گھوم کے ہم پھر واپس آ گئے۔ دس منٹ اور پھر پندرہ منٹ گزر گئے۔ کاجل مجھ سے بہت کچھ پوچھتی رہی۔ اس کے تمام سوالات کا تعلق مستقبل سے تھا۔ میں کب تک گھر بساؤں گا۔ نازو اب کیا کررہی ہے۔ غالب اور نازو کب شادی کریں گے۔ وقار کب باپ بنے گا۔ سب کا میں نے ایک ہی جواب دیا "غیب کا حال صرف خدا جانتا ہے۔ میں کوئی دعویٰ نہیں کرسکتا۔"

"ٹالنا چاہتے ہو مجھے۔ انہیں سمجھتے لگے ہو۔"

میں نے کہا "میڈم۔ یہ حقیقت ہے۔ بندہ کچھ نہیں جانتا۔ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے واپس پہنچتے ہی مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑے اور میں دو گھنٹے میں چار شادیاں کرلوں۔ کم سے کم ایک رابعہ سے ہوگی۔ باقی تین کا بندوبست اللہ کرے گا۔ اسی طرح غالب اور نازو کا پتا نہیں۔ وہ لیلیٰ مجنوں سے زیادہ دردناک عشق کی داستان لکھ جائیں یا شادی کریں تو نوے سال کی عمر کو پہنچ کے۔ یہ بھی ایک ریکارڈ ہوگا۔"

کاجل کا منہ سوج گیا۔ وہ باہر دیکھنے لگی۔

میں نے کہا "اب رہا تمہارے آخری سوال کا جواب تو بھئی یہ ہو سکتا ہے کہ وقار کو پتا ہی نہ چلے اور گل ماں بن جائے۔ دیکھو نا۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے۔ کوئی آ کے کہتا ہے کہ مبارک ہو آپ ایک بیٹی یا بیٹے کے باپ بن گئے۔ تب کہیں بچارے باپ کو پتا چلتا ہے اور اس سوال کا جواب تو گل بھی نہیں دے سکتی کہ وہ کب ماں بنے گی۔ کس دن کہاں اور کتنے بجے۔"

کاجل ہنس پڑی "تم بالکل نہیں بدلے۔"

میں نے کہا "مگر تم بہت بدل گئی ہو۔ بالکل یقین نہیں آتا کہ تم وہی کاجل ہو۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ بہت ترقی کی ہے تم نے۔ میم صاحب بن گئی ہو بالکل۔ بس یہ بدقسمتی کہ تمہیں شوہر بھی ملا تو

معلوم تھا کہ اس کے ڈیڈی کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ اسی کی کال تھی۔ اب اسے باپ کے انتقال کی خبر سنانا فیجر کا کام تھا۔ میں نے قدم کچھ تیز کئے اور باہر کھڑی ہوئی کار میں جا بیٹھا۔

کاجل نے ڈرائیونگ سنبھالی۔ شیخ میرے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔ کار آگے بڑھی اور میں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے میٹروپول کے مین گیٹ پر نظر ڈالی۔ رسید وبود بالائے وطن گزشت۔ لیکن پھر میرا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا۔ مین گیٹ سے ایک شخص اندر جارہا تھا۔ اچانک اس نے بھی پلٹ کے دیکھا اور ایک لمحے کے لئے ہماری نظریں چار ہوگئیں۔ میرے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ میٹروپول میں داخل ہونے والا بھی اپنی جگہ پر منجمد ہوگیا۔ یہ استاد پیڈرو تھا۔

میں نے کہا "شیخ۔ ادھر دیکھو۔ وہ کون ہے؟"

اکرام شیخ نے بے اختیار کہا "استاد پیڈرو۔ یہ کیا کررہا ہے یہاں؟"

میں نے کہا "شاید یہی فرشتہ اجل ہے۔ یہی میرے پیچھے پیچھے تھا اور یہ جانتا تھا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ تم مجھے اتار دو۔"

شیخ نے میرا ہاتھ پکڑلیا "شرافت سے بیٹھے رہو شجاعت علی بغدادی اور خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم پہلے پہنچ گئے تھے۔"

میں نے کہا "یار شیخ۔ مجھے معلوم تو کرلینا چاہئے کہ اس حرام زادے کو میرے پیچھے لگانے والا کون تھا۔ یہ یہاں پہنچا کیسے اور اس کو کیا معلوم ہے میری اور اے کیو ڈسکوی کی ملاقات کے بارے میں۔"

شیخ نے میری کلائی پر اپنی گرفت زیادہ مضبوط کرلی۔۔۔ سابق پولیس مین تھا اور اس سے ہاتھ چھڑانا آسان نہیں تھا۔ ہماری گفتگو کی بھنک پڑتے ہی کاجل نے صرف ایک بار پلٹ کے دیکھا تھا اور پھر کار کی رفتار بڑھا دی تھی۔

"اس نے یقیناً اے کیو ڈسکوی سے وہ تصویر حاصل کرلی ہوگی۔ اور شاید یہ بھی پوچھ لیا ہو کہ میں نے اسے تصویر کیوں دی تھی مگر اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے شیخ کہ پیڈرو نے مجھے اس حلیے میں بھی پہچان لیا تھا۔ یا کسی اور کو معلوم ہے کہ قریشی وکیل کے بھیس میں سکندر بخت ہے۔ کوئی لاہور میں میری نقل و حرکت کی نگرانی کررہا تھا اور اس گفتگو کا ہر لفظ سن رہا تھا جو میں نے یہاں آنے سے پہلے محسن یا وقار سے کی۔ یا ہم سب نے آپس میں کی۔" میں نے کہا۔

"آپ کر رہے ہیں۔" شیخ نے کہا "پیڈرو کا نظر آنا ایک اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے۔ تم نے آخری بار اسے کب دیکھا تھا اور کہاں؟"

میں نے تسلیم کیا "دیکھا تو مدت سے نہیں اور یہ بھی پتا نہیں کہ اتنا عرصہ وہ کہاں غائب رہا۔"

"وہ ہوگا کراچی میں۔ چوہدری دلاور کی ایک تصویر حاصل کرنے کے لئے اسے قتل کرنا ضروری نہیں تھا۔ اور اس سے فائدہ

www.paksociety.com

اکرام شیخ جیسا پولیس والا۔ محبت بھی کرنا ہوگا تو رشوت پہلے مانگتا ہوگا۔ لو وہ آگیا۔"

اکرام شیخ میرے ساتھ آ بیٹھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور کابل کو اشارہ کیا کہ گاڑی چلائے "اچھا ہوا جو ہم نے تمہیں کہیں اور نہ دھر لیا ورنہ جیل میں جتا ہوتے آپ خودکشی فرما لیجئے۔ سامنے جا کے کہنے کہ آنٹی مجھے مار ڈالنے جائے۔"

میں نے کہا "ذرا اس کا مطلب سلیس اردو میں بتائیے۔"

"پیڈرو کا کوئی پارٹنر ہے بھائی۔ الپی کے نام ایڈ سنز وہ کچھ امپورٹ ایکسپورٹ کا دھندا کرتے ہیں۔"

"بلیک سمگلر ہیں۔"

"ہوں گے۔ میں نے کہا۔ استاد پیڈرو بھی قاسم ایڈ سنز کا پارٹنر ہے اور صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک اسی آفس میں بیٹھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی سے الگ ہو چکا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ تائب ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے ماضی کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور ظاہر ہے ایسا تمہارے ڈر سے کیا ہے یا دلاور سے جان چھڑانے کے لئے۔"

میں نے سوچ کے کہا "دلاور سے تو جان چھوٹ جائے گی اس کی۔ لیکن میرا حساب بے باق کئے بغیر وہ اپنے ماضی سے کیسے دامن چھڑا سکتا ہے۔ کیا اس نے مجھے دیکھا تھا۔"

"ایسے ہی دیکھا ہوگا جیسے ہوٹل کے دروازے سے اندر جاتے ہوئے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہوگا یا سامنے سے گزرنے والی کاروں میں بہت سے چہرے دیکھے ہوں گے۔ اس نے تمہیں پہچانا نہیں۔ پہچان بھی کیسے سکتا تھا جب کابل تمہیں اپنے ساتھ دبا کے گزر گئی تھی۔"

میں نے کہا "چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ میرا یہاں آنا بے مقصد نہیں رہا۔"

"ہاں۔ ایک کار خیر تو یہ کیا کہ مینی کے باپ کو ڈی راستے سے ہٹا دیا۔ ورنہ کیا پتا وہ بچی تمہارا سسر بن جاتا۔ اب میں تمہیں بلیک میل بھی کر سکتا ہوں۔ مینی کو بتا دوں گا کہ شجاعت علی بغدادی کون تھا۔ اگر۔۔۔"

"اگر کیا۔ اپنا مطالبہ پیش کرو۔"

"اگر تم نے کابل سے این او سی حاصل کئے بغیر واپسی کا قصد کیا۔"

"نامنظور" میں نے کہا "مجھے جیل جانا منظور ہے۔ چلو تھانے۔"

کابل ہنسنے لگی "ہائی مطالبات تو سنتے ہی تم نے۔"

وہ سارا دن بڑا اچھا گزرا۔ کابل اور شیخ مجھے پتا نہیں کہاں کہاں ساتھ لے کے پھرتے رہے۔ میں نے پوچھا کہ پرنسپل صاحب اور ایڈمنسٹریٹر صاحب کے بغیر اسکول کیسے چل رہے ہوں گے تو انہوں نے کہا کہ پڑھانے والے ہیں ٹیچر اور پڑھنے والے ہیں بچے اور انتظامی امور سے نمٹنے کے لئے وائس پرنسپل اور منیجر بھی ہیں۔ میرے اصرار پر انہوں نے مجھے سوسائٹی کے نئے انگلش میڈیم اسکول کا وزٹ بھی کرایا۔ اسکول کی عمارت، بچوں کی تعداد اور ڈسپلن دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ وہاں فیس بھی بہت زیادہ تھی اور سارے بچے شہر کے اعلیٰ ترین گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ کابل کی کامیابی واقعی قابل رشک تھی۔ وہ شہر کی اہم شخصیات میں شمار ہونے کی جدوجہد میں کامیابی کی منزل کے بہت قریب تھی۔

شام کو میں نے بہت منت سماجت اور جھوٹے وعدوں کے بعد ان میاں بیوی کی مہمان نوازی سے جان چھڑائی اور وہ مجھے ائرپورٹ چھوڑنے بھی آئے۔ میں نے ٹکٹ خریدا اور انہیں مطلع کیا کہ میری سیٹ بھی کنفرم ہو گئی ہے۔ فلائٹ انفارمیشن بورڈ پر دی جانے والی اطلاع کے مطابق اسلام آباد براستہ لاہور جانے والی فلائٹ تیار تھی اور اسپیکر پر مسافروں سے درخواست کی جا رہی تھی کہ وہ بورڈنگ کارڈ حاصل کر لیں۔

بظاہر کابل اور شیخ کا ارادہ جہاز کی پرواز سے پہلے رخصت ہونے کا نہیں تھا۔ اور میں دل ہی دل میں پریشان تھا کہ جب میرا جھوٹ پکڑا جائے گا تو میں وضاحت کیا کروں گا۔ نہ میری سیٹ کنفرم ہوئی تھی اور نہ مجھے اس فلائٹ سے لاہور جانا تھا۔

عین وقت پر کابل کو یاد آگیا کہ انہیں ساڑھے سات بجے کہیں پہنچنا تھا اور وہ مجھ سے گلے مل کے رخصت ہو گئے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جب ان کی گاڑی نظر سے اوجھل ہو گئی تو میں باہر کھڑی ہوئی ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ شہر میرے لئے اجنبی تھا اور میں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہاں میری مدد کون کر سکتا ہے لیکن ٹیکسی ڈرائیور نے پلٹ کے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا تو میں نے اچانک کہہ دیا "ٹی وی اسٹیشن۔"

ٹی وی اسٹیشن کے گیٹ سے استقبالیہ تک پہنچتے ہوئے میں طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ٹی وی اسٹیشن کے اندر داخل ہونے کے لئے کوئی حوالہ یا بہانہ ضروری تھا۔ اچھے خاصے شریف صورت اور معزز لوگ بھی سیکیورٹی والوں کے توہین آمیز رویے سے دل برداشتہ تھے۔

میں نے فرنچ سے آغاز کیا۔ کاؤنٹر پر رابطے کی سلپ بنانے والی اسمارٹ سی لڑکی نے مجھے غور سے دیکھا اور انگریزی میں کہا "پلیز انگلش میں بتائیے۔"

میں نے بے بسی سے سر ہلایا "نو انگلش۔ فرنچ۔"

اب وہاں ایک غیر متوقع اور دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی۔ میں کرسی سے بیٹھنے پر آمادہ نہ تھا اور بآواز بلند اعلان کر رہا تھا۔ کسی فرنچ سمجھنے والے کو بلایا جائے مگر یہ بات بھی کون سمجھتا۔ آخر کار ایک وردی پوش مجھے غیر ملکی سمجھ کے اندر لے گیا۔ مجھے عزت کے ساتھ لاؤنج میں بٹھا دیا گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد ایک شخص برآمد ہوا جو واجبی حد تک فرنچ سمجھ سکتا تھا مگر بولنے سے قاصر تھا۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ میں کسی ٹی وی میک اپ آرٹسٹ کی تلاش میں تھا جس کا نام میں بھول گیا ہوں جس سے فرانس کی ... میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں ایک ڈاکومنٹری فلم کی تیاری کے سلسلے میں پاکستان آیا ہوا ہوں۔

اس نے اندر جا کے پروگرام منیجر سے بات کی اور مجھے ایک فرنچ فلم پروڈیوسر کی حیثیت سے اسٹیشن منیجر کے کمرے میں باعزت طور پر لے جایا گیا۔ میں دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی فرنچ کا ماہر وزیر سرف نہ جائے جس کے سامنے میری قلعی کھل جائے۔ فلم پروڈکشن اور اس کی تکنیک کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں لیکن اس آدمی اور فرنچ جاننے والے کے سوا کوئی مترجم دستیاب نہ ہوا۔ بہت معقول خاطر مدارات کے بعد میک اپ کے شعبے سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون کو مجھ سے ملوایا گیا۔

پروگرام منیجر نے کہا "یہ بھی فرانس سے آیا ہے کوئی فلم بنانے کے چکر میں۔ میک اپ کرانا چاہتا ہے تا یا۔ نہ انگریزی سمجھتا ہے اور نہ اردو۔"

میں نے مترجم کے ذریعے اپنی بات کہی "میرا کام زیادہ لمبا نہیں ہے ایک گھنٹے میں فارغ کر دوں گی۔ معاوضہ بہت اچھا دوں گا۔"

مترجم نے جو بات اردو میں کہی وہ ذو معنی ہو گئی تھی اور اس کا دوسرا مطلب انتہائی غلط نکلتا تھا۔ خفت اور شرم سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ مجھے درمیانی شخص پر سخت غصہ آیا مگر میں نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہیں دس ہزار تک دے سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ زیب کا چہرہ بھبکا اور انکار کیا کہ شاید جواب مثبت ہو جاتا مگر وہاں موجود لوگوں کی نظریں اس عورت پر یوں پڑ رہی تھیں جیسے میں دس ہزار میں ایک رات کے لئے اسے اپنے ہوٹل کے کمرے میں لے جانے والا خریدار تھا۔ کام ایک گھنٹے کا ہو یا ایک رات کا۔ وہ عورت طوائف نہیں تھی کہ ہاں کہہ دیتی۔

باہر آ کے میں نے اسے فون کیا۔ آپریٹر کے ذریعے مجھے اس سے براہ راست بات کرنے کا موقع ملا تو میں نے کہا "خاتون۔ آپ سے ابھی میرے ایک دوست نے ملاقات کی تھی۔ وہ فرانس سے یہاں ایک فلم بنانے آئے ہوئے ہیں۔ آپ نے انکار کیوں کر دیا؟"

اس نے کہا "دراصل۔۔۔ مجھے پتا نہیں وہ کیسے آدمی ہیں۔ اور آپ کون ہیں۔ یہ بھی میں نہیں جانتی۔"

میں نے کہا "سارا شہر مجھے جانتا ہے۔ میں شاہد مراد ہوں۔ وحید مراد کا باپ۔ لیکن تم کو کسی کے نام سے کیا لینا دینا۔ اس کا کام کر دو اور پیسے لو۔"

"آپ۔ والد ہیں وحید مراد کے۔" خوشی سے اس کا برا حال ہو گیا "آپ مجھے کیسے جانتے ہیں سر؟"

"وہ کسی نے تمہارے کام کی تعریف کی تھی۔ اور شناسائی بھی۔"

"پھر تو سر میں انکار کر ہی نہیں سکتی۔ کہاں ملیں گے وہ اب؟"

"وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے تخت مالی سی۔ میں اسے بھیج رہا ہوں۔ تمہارا کام کب ختم ہوگا؟"

"ساڑھے آٹھ بجے سر۔"

"نو بجے وہ تمہیں ٹی وی اسٹیشن کے باہر ملے گا۔" میں نے فون بند کر دیا۔

جھوٹ بولنا مشکل کام تھا مگر یہ بے ضرر جھوٹ تھا اور ناگزیر تھا۔ ٹھیک نو بجے میں نے اسے ٹی وی اسٹیشن سے باہر آتے دیکھا اور اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کا خیال تھا کہ میرے پاس گاڑی ضرور ہوگی مگر میں نے ٹیکسی روک لی اور پھر ہمارے درمیان اشاروں کے علاوہ انگریزی کے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں بات ہوئی۔ وہ سمجھ گئی کہ میں اپنا میک اپ کر کے حلیہ بدلنا چاہتا ہوں لیکن ہوٹل میں جہاں میں مقیم ہوں اس کا میرے ساتھ جانا مناسب نہیں۔ پس وہ مجھے ایک بیوٹی پارلر لے گئی جہاں وہ پارٹ ٹائم جاب کرتی تھی۔ رقم اس نے مجھ سے پہلے ہی لے لی تھی اور شاید اس میں سے ایک ہزار اس نے پارلر کے مالک کو دیے۔ ایک گھنٹے بعد میں وہاں سے نکلا تو بدلا ہوا آدمی تھا۔

ایک رات کے لئے میں پھر مینو ہول گیا اور وہاں مرزا سلیم بیگ کے نام سے قیام کیا۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے شیخ کو فون کیا۔

"پہنچ گئے خیر سے۔ لوٹ کے بدھو اپنے گھر۔"

میں نے کہا "شیخ جی۔ مجھے صبح تمہاری کار چاہئے۔ ہوٹل مینو ہول کے گیٹ پر۔ ٹھیک دس بجے۔"

وہ چلانے لگا "کیا؟ تم یہیں ہو؟ الو کے پٹھے ہمیں الو بناتے ہو۔"

میں نے کہا "اللہ نے تمہیں جو بنایا تھا بنا دیا۔ میں نے تو سیدھا سادہ سوال کیا تھا۔ مجھے ہاں یا نہ میں جواب چاہئے۔"

"لیکن چکر کیا ہے؟"

میں نے کہا "ارے یار۔ میں یہاں رینٹ اے کار والوں سے گاڑی خریدنا چاہوں تو مل جائے گی لیکن میں نہیں چاہتا کہ شک پیدا کرنے والی کوئی بھی بات ہو۔"

"مقصد سارا کسی مصیبت میں پڑنے سے پہلے مجھے بتا دو۔"

میں نے کہا "تمہاری کار کے کاغذات مکمل ہیں نا؟ اس کا ٹرانسفر لیٹر بنا دو اوپن لیٹر۔ میں نقد قیمت ادا کر دوں گا۔ تم دوسری نئی کار بعد میں خرید لینا۔ مجھے کل بائی روڈ لاہور جانا ہے۔ ایک لڑکی کے ساتھ۔"

"گواہی کسی کی ضرورت نہیں۔" شیخ نے کہا "کون ہے وہ لڑکی؟"

میں نے کہا "میرے جہاز میں قدم رنجہ فرمانے تک وہ

www.paksociety.com

ارتھو سٹس تھی۔ پھر اچانک بقول شاعر نین سے نین ہوئے چار۔ کیوپڈ نے تیر چلایا اور بس۔ پہلی نظر میں پیار ہوگیا۔ اس نے نوکری چھوڑی اور میں نے رابعہ کو چھوڑا۔ عشق ایسی ہی خانہ خراب چیز ہے شیخ صاحب۔ اب ہم شادی کر کے ہنی مون کے لئے جا رہے ہیں شفقہ ترین۔

شیخ نے مجھے ایک سو ایک گالیاں دینی شروع کی ہی تھیں کہ میں نے قہقہہ مارا اور فون بند کر دیا۔ رات میں بڑے سکون سے سویا۔

صبح ٹھیک پونے دس بجے میں نے قاسم اینڈ سنز کے آفس میں قدم رکھا۔ شیشے کی دیوار والے ایک کیبن کے پیچھے مجھے استاد پیڈرو کا نیبیٹ جو نظر آیا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کے میرا استقبال کیا۔ لوڈڈ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔

اگر اس وقت میں معمولی سے خوف اور تذبذب کا مظاہرہ کرتا یا ایک خطرناک دشمن کے ریوالور کا رخ اپنی طرف پا کے دہشت زدہ ہو جاتا۔۔۔ جان بچانے کے لئے بھاگنے یا فرار ہونے کی کوشش کرتا یا جان کی بازی لگاتے ہوئے پیڈرو سے ریوالور چھیننے کی کوشش کرتا تو یہ میری فاش غلطی ہوتی۔

کوئی عام آدمی قاسم اینڈ سنز کے آفس میں صرف کاروباری معاملے کی بات کرنے ہی جائے گا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال نہیں ہوگا کہ اندر قدم رنجہ فرماتے ہی اس کا استقبال فرشتۂ اجل کرے گا اور آفس میں داخل ہوتے ہی اسے گولی مار دی جائے گی۔ اگر وہ کسی کے ہاتھ میں ریوالور دیکھے گا تو یہی سمجھے گا کہ ریوالور رکھنا بھی ہر کاروباری ادارے میں حفاظتی انتظامات کی ضرورت ہے۔

میں بھی چونک کے سنبھل گیا اور پھر مسکراتے ہوئے آگے بڑھا "میرا خیال ہے کہ میں نے اسلحے کی کسی دکان میں آنے کی غلطی نہیں کی ہے۔ یہ ایس کے قاسم اینڈ سنز کا آفس ہے؟"

پیڈرو بھی اخلاقاً مسکرایا "اگر آپ کی ضرورت اسلحہ ہے تو پھر آپ نے کوئی غلطی نہیں کی۔"

"میرا نام سلیم بیگ ہے۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر اس شخص سے مصافحہ کیا جس کے ہاتھ میرے باپ کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔

پیڈرو نے ریوالور اپنی دراز میں رکھ لیا "فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

میں نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا "کیا واقعی۔ آپ اسلحہ بھی فروخت کرتے ہیں؟"

پیڈرو ہنسا "میں نے مذاق کیا تھا۔ دراصل یہی ہمارا بزنس موٹو ہے کہ "ہم سب کچھ لا سکتے ہیں اور لے جا سکتے ہیں۔ ہر جگہ ہر وقت۔"

"اور سب کچھ میں تو اسلحہ بھی آجاتا ہے۔" میں سمجھ گیا لیکن پھر بھی آپ کا رسک بہت بڑا ہے۔ مدور چہ مبالغہ آمیز۔ کاروباری نوعیت کو حقیقت پسندی سے کام لینا چاہئے۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "آپ اتنا کچھ لیجئے۔ قطب کی برف سے افریقہ کے گینڈے تک۔۔۔ سب رکھوا سکتے ہیں۔"

"اور یہاں سے کیا لے جا سکتے ہیں؟" میں نے کہا "کوہ ہمالیہ، برادر یا بنگا پاکستان کو زمبابوے؟"

اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نمایاں ہوگئے "مسٹر سلیم بیگ ہم صرف ہوش مند انسانوں سے ڈیل کرتے ہیں۔"

میں نے ایک مضبوط قہقہہ بلند کیا "اور آپ کا خیال ہے کہ میں نشے میں ہوں یا پھر پاگل ہوں۔"

پیڈرو سنجیدہ رہا "ابھی تک آپ کے آنے کا مقصد واضح نہیں ہوا۔"

میں نے میز پر کہنی ٹکا کے کہا "میں کسی ذمے دار شخص سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ رازداری کے ساتھ۔ تم کون ہو؟"

"میں مسٹر قاسم کا بزنس پارٹنر ہوں۔"

"قاسم نے کبھی تمہارا ذکر نہیں کیا۔ خیر۔ قاسم کہاں ہے؟"

پیڈرو کی نظر مجھ پر جمی رہی "وہ باہر گیا ہوا ہے۔ کاروباری دورے پر۔ تم مجھ سے بات کر سکتے ہو۔"

"مگر میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں۔ اور یہ بات۔۔۔۔"

"میرا نام شیخ مختار ہے۔" پیڈرو نے کہا "میری حیثیت کسی طرح سے بھی کم نہیں اور جو لوگ قاسم سے ڈیل کرتے ہیں وہ مجھ پر بھی بھروسا کرتے ہیں۔ تم کو بھروسا نہیں ہے مجھ پر تو تمہاری مرضی۔ قاسم شاید دو ہفتے نہ آسکے۔"

"دو ہفتے" میں نے گویا سخت پریشانی کا اظہار کیا "یہ تو بڑی غلط بات ہے۔ اس نے مجھ سے تذکرہ تک نہیں کیا تھا کہ وہ اتنا عرصہ ملک سے باہر رہے گا۔ اب میں کیا کروں؟"

"تم مجھ سے بات کر سکتے ہو" پیڈرو نے پھر کہا۔

"لیکن وہ بات ایسی ہے۔۔۔۔"

"میں ہر طرح کی بات سمجھ لیتا ہوں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

میں سوچ میں پڑ گیا "اگرچہ وہ ایک مذاق تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مذاق نہیں تھا۔"

پیڈرو نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا "یعنی وہ اسلحے والی بات؟"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "ذہین آدمی ہو تم۔ فطرت کی حد تک۔"

"تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہئے۔"

میں نے کہا "اچھا پھر نکالو دراز سے وہی ریوالور۔ جو تم ابھی رکھ رہے تھے۔"

میری کامیابی کا بہت کچھ انحصار میری اداکاری پر تھا۔ پیڈرو اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا اور شاید صورت دیکھنے ہی

سے اندازہ کر سکتا تھا کہ کون اسلحے کا اصلی خریدار ہے اور کون باتوں باتوں میں ان سے کاروبار کا بھید لینا چاہتا ہے۔ عام آدمی لائسنس کے تحت ایک ریوالور یا شکاری بندوق خریدنے کے لئے ان کے پاس نہیں آتا۔ لائسنس کے بغیر بھی ذاتی استعمال کا اسلحہ خریدنے والے صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں کا رخ کرتے ہیں جہاں سے ایران اور افغانستان کے راستے پہنچنے والا غیر ملکی اسلحہ بھی دستیاب ہوتا ہے۔

استاد پیڈرو نے چوہدری دلاور کے ساتھ جو کاروبار کیا تھا وہ ایک طرح سے ہول سیل بزنس تھا۔ ساری دنیا میں ایسے بہت سے افراد اور گروہ ہیں جو دنیا کے کسی بھی ملک کا بنا ہوا جدید ترین اسلحہ کسی بھی مقدار میں ہر جگہ فراہم کر سکتے ہیں۔ ان کے ایجنٹ ہر ملک میں موجود رہتے ہیں لیکن کبھی خود کو ظاہر نہیں کرتے اور نہ کسی سے براہ راست رابطہ رکھتے ہیں۔ وہ پرامن اور بے ضرر شہریوں کی طرح پردہ داری کے لئے کوئی عام قسم کا کاروبار کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی نظر ملک کے حالات پر رہتی ہے جہاں بھی علیحدگی پسندی کے عوامل ہوں۔ لا اینڈ آرڈر کا فقدان ہو یا خانہ جنگی کے امکانات محسوس ہوں وہاں وہ فعال ہو جاتے ہیں۔ دشمن ممالک کی سیکرٹ سروس کے اشارے پر وہ باغیوں یا نام نہاد آزادی کے متوالوں جیسے تخریب کاروں تک کے کام آتے ہیں اور اگر کوئی سپر پاور چاہے تو حکومت کا تختہ الٹنے والوں کی مدد بھی کرتے ہیں۔ روایتی اسلحہ بنانے والے مغربی ممالک انہیں اپنے سیلزمین کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ ایک طرف سے بھاری کمیشن لیتے ہیں اور دوسری طرف سے منہ مانگی قیمت۔ ہر ملک کے بدعنوان اور زر پرست سرکاری حکام انہیں پروانۂ راہداری ہی نہیں تحفظ بھی فراہم کرتے ہیں اور ان کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔

پیڈرو نے چوہدری دلاور کے دست راست کی حیثیت سے جو اسلحہ مشرقی پاکستان کے باغیوں کو فراہم کیا تھا وہ بھی دنیا کے دور دراز علاقوں کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا۔ یہ بات میں نہیں جانتا تھا مگر استاد پیڈرو کو یقیناً معلوم تھی کہ اس طویل راستے میں رکاوٹ کہاں کہاں ہے اور ان رکاوٹوں کو دور کرنے والے کون ہیں؟ کیسا اسلحہ کہاں سے ملتا ہے اور کس کس ملک سے ہو کے کہاں پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس پورے نیٹ ورک میں دوست اور دشمن کو پہچاننا بھی اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ اصل خریدار کو پرکھنا۔

استاد پیڈرو دیر تک میری صورت دیکھتا رہا اور میں کامل اعتماد کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتا رہا۔ میرا حلیہ ایسا تھا کہ وہ مجھے ہرگز نہیں پہچان سکتا تھا اور کچھ بھی سمجھ سکتا تھا۔

آخر کار اس نے دراز میں سے ریوالور نکالا "یہ بہت مہنگا ریوالور ہے۔"

میں نے کہا "سستی چیز کیا ہے؟ آدمی کی زندگی۔"

"یہ تمہارا پہلا سودا ہوگا؟"

"نہیں۔"

"پہلے کیا خریدا تھا۔ اور کس سے؟"

"یہ نہیں بتایا۔ یہ سب بتانا ضروری ہے؟"

"بھائی کسی حوالے کے بغیر ہم کوئی ڈیل نہیں کرتے۔" پیڈرو نے ریوالور اپنے ہاتھ میں ہی رکھا اور اس کا معائنہ کرتا رہا۔

میں نے کہا "حوالہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ نام تو میں کسی کا بھی لے سکتا ہوں۔"

"تمہیں میرے پاس کس نے بھیجا ہے آخر؟"

میں صرف موقع کے انتظار میں تھا اور پیڈرو نے ابھی تک بہت ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا "یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ پہلے یہ تو اندازہ ہو جائے کہ تمہاری پوزیشن کیا ہے۔"

"پوزیشن سے تمہاری مراد کیا ہے؟"

"تم کتنے بڑے دکاندار ہو۔ اور کس حد تک قابل اعتبار۔ میرے لئے نام شنیدوں کی اہمیت ہے جیسے کچھ نہیں۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"مال ڈیلیوری کہاں ہوگی؟"

میں نے کہا "جاپان یا برازیل۔"

پیڈرو نے نفی میں سر ہلا دیا "صرف سوئٹزرلینڈ، جرمن مارک۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "مجھے دیکھنا پڑے گا۔"

"جرمن مارک کے بجائے ڈالر بھی چلیں گے۔" وہ ریوالور کو چیک کرتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "پھر ٹھیک ہے میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟" پیڈرو چونک کر بولا۔

میں نے کہا "ڈیل کو باس فائنل کرے گا۔"

"باس کون ہے؟" اس نے مجھے رکانے کے لئے ہر چہرے کی شکل کھینچی اور مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

"باس کا نام رکھا نہیں ہوتا۔ وہ صرف باس ہوتا ہے۔"

اس نے مجھ سے اتفاق کیا "لیکن میں آفس چھوڑ کے کہیں نہیں جا سکتا۔ تمہارا باس یہاں آتے ہوئے ڈر کیوں رہا ہے۔"

میں ہنسا "ڈرنے والے بھی باس نہیں ہوتے۔ لیکن ہر ڈیل آفس میں فائنل نہیں کی جا سکتی۔ تمہیں بھی محتاط رہنا چاہئے۔"

ظاہر تھا بے نیازی اور اعتماد کے مظاہرے کے۔۔۔ باوجود پیڈرو دل ہی دل میں میری حیثیت کا اندازہ کرنے میں مصروف تھا اور نفع نقصان سے زیادہ اس معاملے میں رسک کے امکانات پر غور کر رہا تھا۔ وہ بھی سمجھتا تو ہوگا کہ ناجائز اسلحے کی کھیپ کے سودے کسی آفس میں بیٹھ کے یوں نہیں کئے جا سکتے جیسے آلو پیاز کی سپلائی کے ٹھیکے کئے جاتے ہیں۔

"تمہارے باس سے ملنے کے لئے مجھے کہاں جانا ہوگا؟" پیڈرو نے ریوالور کو جیب میں رکھ لیا۔

www.paksociety.com

"چند قدم۔ سڑک کے اُس پار۔" میں نے کہا "ایک کار تک۔"

پیڈرو نے پھر میری صورت کو غور سے دیکھا کہ میں کس حد تک سنجیدہ ہوں اور پھر کھڑکی کا پردہ ہٹا کے باہر جھانکا لیکن سڑک کے دوسرے کنارے پر درجنوں کاریں صف بستہ تھیں پھر اس نے یہ سمجھتے ہوئے کہ ایک مصروف ترین شاہراہ پر اس کے لئے کسی سے بات کرنے میں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ریوالور کو اس نے پھر جیب میں رکھ لیا تھا۔

"چلو مسٹر سلیم بیگ۔ تمہارے باس کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔" اس نے یوں کہا جیسے میرا چیلنج قبول کر لیا ہو۔

"ٹاٹ ازاے بگ ڈیل مسٹر رچرڈ۔" میں نے کہا۔

آفس کے نصف حصے میں دو کیبن تھے۔ ایک میں پیڈرو کا آفس تھا لیکن اس کے باہر نام کی کوئی تختی نہیں تھی۔ دوسرا کیبن یقیناً ایس کے قاسم کا ہی ہوگا۔ باقی نصف حصے میں چار میزوں پر تین کلرک اور ایک سپروائزر قسم کا شخص کام میں مصروف تھا۔ اس کے عین پیچھے ریک میں فائلیں بڑی ترتیب سے ترچھی کھڑی ہوئی تھیں۔ سانولی رنگت اور کٹے ہوئے بالوں والی ایک عورت ٹائپ رائٹر پر بڑی تیزی سے انگلیاں چلا رہی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ جسمانی ساخت سے اس کی طبعی عمر تیس سال تھی تو تجربات کے حوالے سے چالیس بھی ہو سکتی تھی مگر میک اپ سے وہ خود کو بیس برس کا دکھانا چاہتی تھی۔ اس کا گداز بدن مائل بہ فربہی تھا اور جامے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ اس نے مجھے قطعی لفٹ نہیں دی اور اپنے کام میں مصروف رہی۔

سپروائزر ٹائپ خشک مزاج اور گنجے شخص نے نوکیلی ناک پر رکھی ہوئی عینک کے اوپر سے مجھے دیکھا "ایک فائل پر سائن کرنے کو ہے سر۔"

پیڈرو نے سر ہلایا! "میں کہیں دور نہیں جا رہا ہوں۔ فائل میز پر رکھ دو۔"

وہ مطمئن تھا۔ میں بھی مطمئن تھا۔ شک اس کے دل میں ہوتا تو وہ میرے ساتھ ہرگز نہ جاتا اور مجھے اس کی نیت پر ذرا بھی شک ہوتا تو میں اسے اتنی مہلت نہ دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مسلح ہے اور ایک مجنون گاہک سے ڈرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ مجنون گاہک اگر کاروباری معاملہ کرنے آئے تو آفس میں اس کی تلاشی بھی کوئی نہیں لیتا خواہ وہ ماضی کی گولیاں خریدنے آیا ہو یا مشین گن کی۔ میں بھی جلدی میں کام خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے شیخ کو دس بجے کا وقت دیا تھا اور اب سوا دس ہو چکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ سابق سب انسپکٹر سید اکرام شیخ جسے ہم سب مذاق میں ڈبل ایس آئی شیخ کہتے تھے تن آسانی اور بے فکری کی زندگی کا عادی ہو جانے کے باوجود وقت کی پابندی کرنا نہیں بھولا ہوگا۔ آدمی کی عادت بدل سکتی ہے فطرت نہیں۔ اکرام شیخ کو میری فطرت کا بھی علم تھا اور میری ضرورت کا بھی۔ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا مگر اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ میرا بھیس بدل کے آنا اتفاقیہ نہیں ہو سکتا۔

اکرام شیخ کی گاڑی سندھ کلب کے گیٹ سے ذرا ہٹ کر "ایم پی" ریسٹورنٹ کے عین مقابل موجود تھی۔ سڑک عبور کرتے ہوئے میں نے ادھر اُدھر دیکھا تو اکرام شیخ مجھے [illegible] بک شاپ کے سامنے نظر آیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو [illegible] انگوٹھا دکھایا جس کا مطلب یہ تھا کہ سب ٹھیک ہے اور [illegible] جواب میں دو انگلیوں سے وی کا نشان بنا کے فتح اور کامیابی کا [illegible] دیا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ بدلے ہوئے حلیے میں اکرام [illegible] مجھے کیسے پہچان لیا۔ جواب بھی فوراً ہی میری سمجھ میں آ گیا۔ پیڈرو کے ساتھ آفس سے برآمد ہو کے کار کی جانب جانے والا میرے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ میرے جوابی اشارے سے وہ مطمئن ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے آیا۔ پیڈرو نے اس اشارے بازی پر غور نہیں کیا تھا۔ اس کی زیادہ توجہ ٹریفک پر تھی جو بہت تیزی سے دونوں طرف سے آ رہی تھی۔ خود میں [illegible] پریشان تھا۔ میٹروپول اور صدر کی جانب سے آنے والی گاڑیوں کا سلسلہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ میں انتظار [illegible] تک سڑک پار نہ کیا جا سکا۔ یہاں ون وے ٹریفک تھی [illegible] طرف کا ریلا یہاں ایک ہو جاتا تھا۔ کراچی کے رہنے والے اپنی رفتار ٹریفک سے گزرنے کا فن جانتے تھے۔ کچھ وہ اعتماد [illegible] کرتے تھے کچھ کار ڈرائیور پر کہ وہ خود بریک لگا کے انہیں بچا لے گا اور ننانوے فیصد صورتوں میں وہ صاف بچ کے نکل جاتے تھے۔

میں نے کار کا دروازہ کھول کے پیڈرو سے کہا "بیٹھو۔"

پیڈرو نے جھجک کا مظاہرہ کیا "کدھر ہے وہ تمہارا باس؟"

میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا "پریشان کیوں ہو۔ آ جائے گا ابھی۔ ایسے وہ گاڑی چھوڑ کے دور تو نہیں جا سکتا۔"

پیڈرو مطمئن ہو گیا "مجھے کیا ضرورت ہے پریشان ہونے کی۔"

"ہاں بہت زیادہ احتیاط پسند ہے۔"

پیڈرو میرے ساتھ بیٹھ گیا "تم اور تمہارا باس۔ کس کے نمائندے ہو؟ میرا مطلب ہے کس تنظیم کے؟"

میں نے پُرسکون رہتے ہوئے کہا "ہم آر ایس کے۔"

میری آواز پہچان کے اور یہ نام سن کے پیڈرو یوں اچھلا جیسے اس کی سیٹ کے نیچے اسپارک ہوا ہو۔ اس کا ردعمل غیر اختیاری تھا۔ اس کا ایک ہاتھ دروازے کے ہینڈل کی طرف اور دوسرا جیب کی طرف بڑھا مگر میں نے گردن دبا کے اسے بند دروازے اور اپنے درمیان دبا لیا۔

"آرام سے بیٹھے رہو پیڈرو۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

پیڈرو نے زور لگا کے خود کو چھڑانے کی کوشش جاری [illegible]

"مجھے جانے دو سکندر بخت۔"

"ورنہ؟" میں نے سوال کیا "تم کیا کرو گے؟ شور مچاؤ گے؟ قانون کو مدد کے لئے آواز دو گے یا مجھے گولی مار دو گے؟"

پیڈرو چلانے لگا "تم مجھے اغوا کر کے کہاں لے جا رہے ہو۔"

میں نے کہا "تمہارے سسرال۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم وہاں صحیح سالم پہنچنا چاہتے ہو یا ٹوٹے ہوئے؟"

اکرام شیخ تیزی سے آگے آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ میں نے بھی نہیں دیکھا تھا کہ چابی پہلے سے اگنیشن سوئچ میں موجود تھی۔ اکرام شیخ نے عقلمندی سے کام لیا تھا۔ اس نے گاڑی میرے لئے چھوڑ دی تھی کہ جہاں چاہوں لے جاؤں مگر اس نے مجھے پچھلی سیٹ پر پیڈرو کے ساتھ بیٹھتے دیکھا تو فوراً میری مدد کے لئے پہنچ گیا۔

پیڈرو نے آخری کوشش کی اور مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا مگر میں نے کہنی اس کے سینے پر ماری تو اس کا منہ کھل گیا اور سانس رک گیا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو مجھے پیڈرو۔" میں نے اس کی ناک پر اور پھر پیشانی پر کہنی ماری۔

پیڈرو کی ناک سے خون ٹپکنے لگا۔ وہ کراہ کے پیچھے گر گیا۔ وہ میرے دائیں جانب تھا اور اکرام شیخ کے عین پیچھے۔ گاڑی اس وقت تک ڈرگ روڈ پر گورا قبرستان کی طرف آدھا فاصلہ طے کر چکی تھی۔

"سکندر۔ تم میری بات سنو؟" پیڈرو نے بڑی مشکل سے کہا۔

"اور کیا میں تمہاری بہن کا رشتہ مانگنے آیا ہوں یہاں۔" میں نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کے ریوالور نکال لیا "میں تمہاری سب باتیں سنوں گا، بہت سی باتیں ہیں جو تم نے آج تک مجھے نہیں بتائیں۔ کبھی تم مصروف تھے کبھی میں مفرور تھا۔ کبھی معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اگر ہم ملے بھی تو کام کی بات نہیں ہوئی۔ تم نے مجھے فضول باتوں میں اُلجھا کے بڑی ہوشیاری سے وقت کو ٹال دیا اور مجھے وہ بات نہیں بتائی جو میں جاننا چاہتا تھا۔ دراصل ہر کام اور ہر بات کے لئے مناسب موقع اور وقت کا انتظار کرنا ہی پڑتا ہے۔ تم غور کرو میری بات پر۔ کیا آج صبح تمہارے ذہن میں سکندر بخت کا خیال بھی آیا تھا۔ تم نے سوچا تھا کہ ہماری یوں ملاقات ہوگی؟ تمہارے لئے آج کا دن بالکل اسی طرح شروع ہوا تھا جیسے گزرا ہوا دن۔ تم نے سب کچھ معمول کے مطابق کیا ہوگا اور یہ فرض کر رکھا ہوگا کہ باقی دن بھی معمول کے مطابق کاروباری امور نمٹاتے گزر جائے گا۔ پونے دس بجے میں نے تمہارے آفس میں قدم رکھا تھا۔ اس وقت بھی تمہارے فرشتوں کو خبر نہ تھی کہ شامت اعمال کس کو تمہارے مقابل لے آئی ہے۔ تم کیسے اندازہ کر سکتے تھے کہ اس حلیے میں اچانک سکندر بخت نمودار ہو جائے گا۔ تم تو اس کو بھول چکے تھے۔ تم نے اپنے ماضی سے دامن چھڑا لیا تھا۔ تم ایس کے قاسم اینڈ سنز کے آفس میں لاہور سے ایک ہزار میل دور شیخ مختار بنے بیٹھے تھے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سکندر بخت تمہارے تعاقب میں یہاں بھی پہنچ جائے گا۔ تم نے اپنی دانست میں بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا تھا کہ اپنا نام شیخ مختار رکھ لیا تھا مگر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ شیخ مختار ایک انڈین ایکٹر تھا اور اس فلم کا ہیرو بھی جس کا نام تھا "استاد پیڈرو" فلم کی ہیروئن تھی بیگم پارہ اور یہ فلم میں نے راولپنڈی کے امپیریل سینما میں دیکھی تھی۔ شیخ مختار بنا تھا استاد پیڈرو اور تم استاد پیڈرو سے بن گئے شیخ مختار۔ کیا بات ہے!"

کراچی کے چند راستے میرے دیکھے بھالے تھے۔ ڈرگ روڈ کے علاوہ میں بندر روڈ، صدر بازار کی وکٹوریہ روڈ اور ایلفنسٹن اسٹریٹ سے واقف تھا۔ اکرام شیخ نے گفتگو کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے کسی رہائشی علاقے کی سڑکوں کو ترجیح دی تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سوسائٹی کا علاقہ تھا۔ بڑی بڑی عالی شان کوٹھیوں کے درمیان پھیلی ہوئی سڑکوں کا سلسلہ کسی جال کی طرح تھا۔ کہیں تنگ اور کہیں کشادہ، خاصی خستہ حال اور ویران سڑکوں پر اکا دکا گاڑیوں کے سوا کوئی ٹریفک نہیں تھی۔

ابھی تک اکرام شیخ نے پیڈرو کو اپنا چہرہ دکھانے سے گریز کیا تھا اور گفتگو میں بھی دخل نہیں دیا تھا۔ یہ بھی دور اندیشی کی بات تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کراچی میں دوبارہ استاد پیڈرو سے آمنا سامنا بھی ہو تو اس کے لئے بلاوجہ پریشانی کے اسباب پیدا ہوں۔ وہ اور کامل پہلے سے کہیں زیادہ خوش حال اور بہتر مستقبل کی راہ پر گامزن تھے اور ابھی زیادہ مشہور نہیں تھے تو اتنے غیر معروف بھی نہیں رہے تھے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ آج وہ دو اسکول چلا رہے ہیں تو کل چار کے مالک ہوں اور ان اسکولوں کے کسی فنکشن کی تصویر شائع ہو تو پیڈرو کی نظر اسے شناخت کر لے۔

اکرام شیخ کو میں نے کچھ نہیں بتایا تھا کہ میرا پروگرام کیا ہوگا۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا جیسا میں نے چاہا تھا۔ مجھے منع کرنا اس کا فرض تھا کہ میں کسی مصیبت میں نہ پڑوں مگر مصیبت میں ساتھ نہ دینا بھی اس کے نزدیک دوستی کی رسوائی کے مترادف ہوتا چنانچہ وہ خاموشی سے ساتھ نبھا رہا تھا۔

پیڈرو نے سمجھ لیا تھا کہ مزاحمت بے کار ہے اور مقابلہ بے سود۔ اگر وہ مسلح ہوتا تب بھی شاید ہار اسی کا مقدر ہوتی۔ خالی ہاتھ تو اس جیسے چار بھی میرے مقابل نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ اس نے خود کو سنبھال لیا اور کچھ پُراعتماد نظر آنے لگا۔ وہ بزدل یا بے وقوف آدمی ہرگز نہیں تھا اور زندگی اس کی بھی خطرات سے کھیلتے ہی گزری تھی۔

اس نے اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا "مجھے رومال چاہئے۔ ناک صاف کرنے کے لئے۔"

میں نے کہا "ناک میں صاف کر دوں؟ چاقو ہے میرے پاس۔"

www.paksociety.com

"یہ خون جو ناک سے بہہ رہا ہے؟"

میں نے کہا "بہت خون ہے تمہارے جسم میں اور گندا خون ہے شاید خود تمہیں بھی علم نہ ہو کہ یہ کس کا خون ہے۔ چند قطرے بہہ جانے سے تم مر نہیں جاؤ گے۔"

اس نے سر پیچھے ٹکایا "تم کیا چاہتے ہو مجھ سے سکندر۔"

"چاہتا تو میں بہت کچھ ہوں اور جب میں سوچتا ہوں کہ تمہاری ذات کی خباثت نے مجھے کیسے کیسے عذاب دیے تھے تو میرا دل چاہتا ہے کہ تم کو طویل ترین اور بدترین عذاب کے ساتھ تڑپا تڑپا کے ہلاک کروں اور تمہاری اذیت کے ہر لمحے کی فلم بناؤں۔ میرے ذہن میں ان گنت طریقے تھے۔ میں تم کو ہفتوں یا مہینوں ایسے تشدد کا نشانہ بنا سکتا ہوں کہ جینے کی سزا پر مرنے کی خواہش غالب آجائے۔ تم مرنا چاہو مگر مر نہ سکو۔ تم مجھ سے رو کے گڑگڑا کے موت مانگو مگر میں تمہاری رحم کی درخواست کو زیادہ بے رحمی سے مسترد کرتا رہوں۔ لیکن یہ سب میں نہیں کرسکتا۔ فطرت اور مزاج کے اعتبار سے میں کوئی سفاک درندہ نہیں۔ ایک بااصول قانون پرست اور مہذب انسان ہوں۔"

"قانون کی نظر میں تم ایک مفرور مجرم ہو اور جتنے جرائم تم سے منسوب ہیں......"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "منسوب ہیں۔ یہ ٹھیک کہا تم نے۔ جرم میں نے کوئی نہیں کیا مگر مجھ سے اتنے جرائم منسوب ہوگئے کہ میں فرار پر مجبور ہوگیا۔ میں نے اپنا حق مانگا یا انصاف تو یہ کوئی جرم نہیں۔ میں نے اپنا دفاع کیا اور میرے قتل کی نیت کرنے والا میرے ہاتھوں مارا گیا تو یہ جرم نہیں۔ اگر میں نے کسی ملک دشمن غدار کو ٹھکانے لگایا تو یہ بھی جرم نہیں۔"

پیڈرو تلخی سے مسکرایا "واقعی۔ بڑے معصوم فرشتے ہو تم لیکن اپنے بارے میں تمہاری رائے کی کیا اہمیت ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ بے گناہ وہ جسے عدالت بے گناہ قرار دے اور مجرم وہ جس کا جرم ثابت کیا جاسکے۔ دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"ہاں۔ اسی لیے تو میں نے ابھی تمہیں یا چوہدری دلاور کو قتل نہیں کیا۔ یہ بات نہیں کہ مجھے کسی کا ڈر تھا یا موقع نہیں ملا تھا۔ مواقع بہت ملے اور تمہیں مار کے تمہاری لاشیں غائب کرنا تو بہت ہی آسان تھا۔ ایم آر آئی کا تجربہ اور اس کے وسائل تم نے تھے مگر میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اسی دنیا کی عدالت تمہیں مجرم اور مجھے بے گناہ تسلیم کرے۔ تم اپنی ساری دولت اور بدمعاشی کی طاقت استعمال کرو اور نظام انصاف کی راہ میں جھوٹ مکر و فریب رشوت اور بدعنوانی کی مدد سے جتنے روڑے چاہو اٹکاؤ۔ حالات و واقعات کی شہادت کو مسخ کرو۔ ثبوت اور گواہ باقی نہ رہنے دو۔ دن کو رات اور سیاہ کو سفید ثابت کردینے والے قابل ترین وکیل کرلو۔ مگر میں تمہیں مجرم کی حیثیت سے تختہ دار تک پہنچا کے دم لوں گا۔ یوم حشر کی آخری عدالت کی بات چھوڑو۔ اسی دنیا میں ایسا ہوگا۔ قانون اندھا ضرور ہے مگر اس کی آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی جاسکتی۔"

"تمہاری زندگی میں شاید وہ دن کبھی نہ آئے۔"

"لیکن تمہاری زندگی میں آئے گا جب تم سورج کو طلوع ہوتا نہ دیکھ سکو گے اور نہ اس اشارے کو جو تمہارے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لے گا کیونکہ تمہارے چہرے پر سیاہ نقاب ہوگا۔ زندگی کے اس آخری لمحے میں جب تمہارا جسم پھانسی کے تختے سے موت کے اندھے کنوئیں کی جانب سفر کرے گا تمہیں خدا بھی یاد آئے گا اور شاید سکندر بخت کی یہ بات بھی یاد آئے گی لیکن ابھی بس۔ آج میں کیا چاہتا ہوں۔" میں نے ایک گہری سانس لی "اس سوال کا جواب یہ ہے پیڈرو کہ میں تم سے اس جگہ کا پتا معلوم کرنا چاہتا ہوں جہاں تم نے میرے والد وزیر خان کی ہڈیوں کو دفن کیا تھا۔ تم مجھے اس مقام تک لے جاؤ گے جہاں اب وزیر خان کی قبر ہے۔ تم نے ہی وزیر خان کو اس کے اصل مدفن سے بے دخل کیا تھا۔"

پیڈرو نے خشک لبوں پر زبان پھیری "یہ... یہ تو بہت پرانی بات ہے۔"

"کتنی پرانی؟ صدیاں تو نہیں بیت گئی ہیں پیڈرو۔" میں نے کہا۔

"یہ ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔"

"ڈیڑھ سال کچھ نہیں ہوتا۔ زمین کا چہرہ اتنی جلدی نہیں بدلتا۔ اس علاقے میں تو سیلاب یا زلزلے تک نہیں آتے۔ انسانی آبادی بھی وہاں سے بہت دور ہے ابھی۔" میں نے کہا۔

"یہ تم کیسے جانتے ہو؟"

"ایک بار تم نے ہی اعتراف کیا تھا کہ تم نے وزیر خان کی لاش کو قبر کھود کے نکالا تھا تو کہاں لے گئے تھے۔" میں نے عیاری سے کہا۔

پیڈرو سوچ میں پڑ گیا "میں نے بتایا تھا تمہیں؟ کہ میں لاش کو اسلام آباد لے گیا تھا۔"

میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا تھا "ہاں تم نے اسے کہیں نورپور اور سید پور کی پہاڑیوں پر دوبارہ دفن کردیا تھا۔"

پیڈرو نے اقرار میں سر ہلایا "لیکن میں نے کوئی نشانی نہیں چھوڑی تھی۔ زمین برابر کردی تھی۔"

"زمین کی نشانیاں مل جائیں گی تمہیں۔" میں نے کہا۔

"وہاں تو بارش بھی بہت ہوتی ہے۔ سردی میں برف بھی پڑجاتی ہے۔ یہ ناممکن ہے۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ناممکن کو ممکن بنانا تمہارا کام ہے۔ جب تم وہاں جاؤ گے تو تمہیں بہت کچھ یاد آجائے گا۔ تمہیں راستہ تو یاد ہوگا۔ اندازے سے تم اس جگہ پہنچ سکتے ہو۔ اگر وہاں پہنچ کے بھی تمہیں کچھ پتا نہ چلا تو باقی کام میرا۔ تم نزدیک ترین مقام

کی نشاندہی کرسکتے ہو۔"

"شاید..." پیڈرو نے کہا "مگر اس کے بعد؟ تم چھوڑ دو گے مجھے یا اسی قبر میں گاڑ دو گے؟"

میں نے مسکرا کے کہا "میں بتا چکا ہوں کہ اپنے ہاتھوں سے میرا تم کو قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس کے علاوہ بہت کچھ تمہارے رویے پر منحصر ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مجبور تھے تم نے جو کیا دلاور کے حکم پر کیا۔ ذاتی طور پر تمہاری مجھ سے یا میرے والد وزیر خان سے کوئی عداوت نہیں تھی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تم میرے سامنے اعتراف جرم کرلو۔ سب کچھ سچ سچ بتادو۔ جو بھی میری عدم موجودگی میں وزیر خان کے ساتھ ہوا تھا۔"

"تحریری طور پر؟" وہ متحیر لہجے میں بولا۔

"نہیں صرف میرے سامنے۔"

"تاکہ تم اسے ریکارڈ کرلو۔"

میں نے کہا "یہ میرا وعدہ ہے کہ تمہارے بیان کو ریکارڈ نہیں کیا جائے گا۔ وہ سچ صرف میری ذات تک محدود رہے گا۔ تم جیسے چاہو اپنا اطمینان کرنے کے بعد اکیلے میں مجھے سب بتا سکتے ہو۔ ظاہر ہے اس سچ کی کوئی بھی قانونی حیثیت نہیں ہوتی جس کا نہ گواہ ہو نہ ثبوت۔ لیکن اس کے بعد میں شاید تمہاری مجبوری کو مدنظر رکھتے ہوئے تم کو تھوڑی بہت رعایت دینے پر غور کرلوں۔"

"کیا مطلب... تم... تم مجھے معاف کردو گے؟"

"ابھی سے میں کوئی وعدہ کیسے کرسکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

اکرام شیخ ساری باتیں سن رہا تھا اور گاڑی کو ایک ہی رفتار سے سوسائٹی کی سڑکوں پر چلا رہا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ ہیڈ ریسٹ والی سیٹ کے پیچھے نظر نہیں آتے تھے۔ شیخ نے عقب نما آئینے کا زاویہ بھی بدل دیا تھا اور گاڑی کے سائیڈ میں لگے ہوئے شیشوں سے پیچھے کی ٹریفک کو دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے ڈرائیور کی جگہ سنبھالی تھی تو پیڈرو اپنی رہائی کی جدوجہد کر رہا تھا اور اکرام شیخ نے بیٹھتے ہی گاڑی چلا دی تھی لیکن وہ سارا دن مجھے سوسائٹی کی سڑکوں پر سیر کرانے کے لئے نہیں آیا تھا۔ میں نے اسے فارغ کرنے کا فیصلہ کیا۔

پیڈرو خاموش اور متفکر بیٹھا ہوا شاید یہی سوچ رہا تھا کہ کیا آج تقدیر اسے کوئی موقع فراہم کرے گی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ فرار کی کوشش میں کامیاب ہوجائے۔ بظاہر یہ بہت مشکل تھا اور مایوسی اس کی صورت سے عیاں تھی۔ میں انتہائی مستعد تھا اور اس کی خفیف سی حرکت بھی میری نظر سے پوشیدہ نہ تھی۔ اگر وہ دروازے کا ہینڈل گھما کے چلتی گاڑی سے سڑک پر چھلانگ مارنے کا فیصلہ کرتا تو اس کے ہاتھ کی جنبش ہی مجھے خبردار کردیتی کہ اس کے عزائم کیا ہیں۔ اگر وہ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوجاتا تو باہر کودنے میں ناکام رہتا۔ میں اس کی ٹانگ پکڑ لیتا تو وہ آدھا باہر لٹکا رہ جاتا اور اس کا دھڑ گاڑی کے ساتھ ساتھ سڑک پر رگڑتا اچھلتا یا اس کا سر پچھلے پہیوں کے نیچے آجاتا۔ بفرض محال وہ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا تب بھی فرار ہو کے کہاں جاتا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ میں اس کو ویسے ہی تعاقب کرکے پکڑ سکتا تھا یا ٹانگ پر فائر مار کے اسے گرا سکتا تھا۔ ان سنسان سڑکوں پر اس فل آف ایکشن ڈرامے کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہاں مجمع لگنے کا امکان نہیں تھا۔ اگر اتفاق سے کوئی راہ گیر یہ تماشا دیکھتا تو اپنی جان بچانے کی فکر کرتا۔

مایوسی کی انتہا میں آدمی کچھ بھی کرسکتا ہے۔ پیڈرو نے بھی سمجھ لیا کہ عقل کی بازی گری اور تدبیر کی مشکل کشائی سے جب کچھ نہیں ہوگا تو اس نے تقدیر پر بھروسہ کرتے ہوئے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بیٹھے بیٹھے ایک دم اوپر اچھلا۔ اس کے دونوں ہاتھ ذرا سی دیر کے لئے آزاد ہوگئے۔ اس نے بائیں ہاتھ کا مکا میرے جبڑے پر مارا اور اسی وقت دائیں ہاتھ سے دروازے کا ہینڈل گھما دیا۔

میرا سر سائیڈ کی کھڑکی سے ٹکرایا اور میں بائیں جانب جھک گیا۔ جھکے جھکے ہی میں نے گاڑی کا دروازہ کھلتے اور پیڈرو کو جست لگانے کے لئے تیار دیکھا اور میں یوں اس کے پیچھے گیا جیسے ربڑ کی گیند دیوار سے ٹکرا کے واپس آتی ہے۔ میرا ہاتھ اسے گرفت میں لینے کے لئے بڑھا اور میری انگلیاں اس کی کمر پر پتلون کی بیلٹ میں جم گئیں۔ اس نے اپنا سر آگے بڑھایا تھا۔ سر کے بعد دھڑ گزرتا اور پھر وہ ٹانگوں کے زور پر جمپ لگا کے سڑک پر اتر جاتا مگر میری انگلیوں کی گرفت بہت مضبوط تھی اور میرے ہاتھ نے جھٹکا دے کر اسے پیچھے کھینچا تو اس کا سر دروازے پر لگا اور وہ کمر کے بل پیچھے گرا تو مجھ پر آیا۔

کار کا دروازہ کھلنے کے بعد ایک دھماکے سے خود ہی بند ہوچکا تھا۔ پیڈرو کی کوشش ناکام ہوگئی تھی۔ میرا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا اور ریوالور کی ضرب پیڈرو کی گدی سے ذرا اوپر پڑی۔ پیڈرو اٹھتے اٹھتے پھر گر گیا۔ اب وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔

میں نے خود کو اس کے بوجھ سے آزاد کیا اور پیڈرو کو ایک طرف دھکیل کے باہر دیکھا۔ بہت پیچھے ایک سائیکل سوار پاؤں زمین پر ٹکائے ہکا بکا کھڑا ہوا تھا اور بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک موٹر سائیکل والے کو بھی کچھ بتا رہا تھا جو سامنے سے آیا تھا اور ہمارے قریب سے گزرا تھا مگر عملی زندگی میں کوئی ہیرو بننے کی کوشش نہیں کرتا۔ اتنی فرصت اور ہمت کس کے پاس ہے کہ راہ چلتے کہیں ارتکاب جرم ہوتا دیکھے تو مجرموں کو چیلنج کرے اور مقابلے پر سینہ سپر ہوجائے۔ سب کے لئے اپنے اپنے روزمرہ زندگی کے مسائل زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور ایسے معاملات میں پڑنے کا وقت کسی کے پاس نہیں جن میں تھانے کچہری کے چکر ہوں یا جرائم پیشہ افراد سے دشمنی مول لینی پڑے۔

سائیکل والا اور موٹر سائیکل والا بھی عام لوگ تھے۔ ہیرو

www.paksociety.com

نہیں تھے۔ اگر انہوں نے اسے اغوا کی واردات سمجھا ہو گا تو بڑھتی ہوئی لاقانونیت پر تبصرہ کر کے اپنی راہ لی ہوگی۔ یہ ایک سنسنی خیز واقعہ تھا جو انہوں نے بعد میں نمک مرچ لگا کر کی حیثیت سے نہ جانے کتنی بار لوگوں کو سنایا ہو گا۔

اکرام شیخ نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی اور پوچھا "سب ٹھیک ہے نا؟"

میں نے سکون کی سانس لے کر کہا "آپ کی دعا ہے۔"

"اب کیا حکم ہے میرے لئے۔ کلفٹن کے ساحل پر چلوں یا نیٹی جیٹی کے پل پر؟"

"وہ کس لئے؟"

"اس لاش کو پھینکنے کے لئے بحیرہ عرب سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔"

میں نے کہا "کون سی لاش۔ پیڈرو زندہ ہے۔"

"چل چھوڑ یار۔ زندہ و مردہ کی تفصیل مت کر۔ جان چھڑا اپنی اس مصیبت سے۔ خیر سے لوٹ کے گھر جا بد ھو۔"

میں نے کہا "اسے میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

اکرام شیخ نے گاڑی روک دی "یار یہ تو نے بلاوجہ کا پنگا لیا۔ تو یہاں کس کام سے آیا تھا اور کیا کر کے جا رہا ہے۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا شیخ صاحب۔ نیمی کے پاپا مسٹر فوم کو ان کے دل نے جیسے غلط وقت پر دھوکا دیا۔ ان کا ہارٹ فیل میں نے نہیں کرایا تھا۔ پیڈرو سے میں نے نہیں کہا تھا کہ اچانک نظر آ جائے۔ یہ قسمت کے کھیل ہیں۔ میری نظر نہ پڑتی اس پر تو میں خاموشی سے لوٹ جاتا لیکن اسے دیکھنے کے بعد نظر چرا کے جانا بھی ممکن نہیں تھا۔"

"تمہاری مرضی بھیا۔ میں کیسے روک سکتا ہوں تمہیں۔ تمہیں تو مشہور ہے جو الّو بھی الّو کا پٹھا۔"

"ہم تو الّو کے پٹھے نہیں ہے۔"

"میں ہوں اور اسی لئے میں کہتا ہوں سکندر کہ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ یہ سارے دھندے چھوڑ دے۔ لعنت بھیج ولاور اینڈ کمپنی پر۔ ختم کر و سارے پرانے جھگڑے۔ دیکھو محسن اور گل نے اپنی زندگی کی راہ متعین کر لی ہے۔ میری اور کاجل کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ غالب اور نازو بھی صرف تمہاری وجہ سے رکے ہوئے ہیں۔"

"میں نے کسی کو مجبور نہیں کیا؟"

"اور مجبوری کیا ہوتی ہے۔" اکرام شیخ نے کہا "اگر تم بھی فیصلہ کر لو رابعہ سے شادی کا۔ ولاور سے کوئی تصفیہ کر لو تو کوئی مسئلہ ہی باقی نہیں رہتا۔ تم بھی پُرسکون اور خوش حال زندگی کا راستہ اختیار کر سکتے ہو۔"

"چھوڑ یار۔ بہت سن چکا ہوں میں نیکی باتیں۔ تیرا کیا خیال ہے کہ میں عقل سے بالکل پیدل ہوں؟ یہ سب مجھے نظر نہیں آتا؟

میں نہیں سمجھ سکتا ان باتوں کو؟ میرا دل نہیں چاہتا؟"

"تیرا مت مان یار" شیخ نے کہا "رہی لوگ تجھے مشورہ دیتے ہیں جو تیرے اپنے ہیں۔ غیروں کو کیا پڑی ہے کہ کسی کے لئے پریشان ہوں۔ تو گھر رہے سب سے کہ بھاڑ میں جاؤ۔ میں کسی کی نہیں سنوں گا اور کسی کی نہیں مانوں گا۔ وہی کروں گا جو میرا دل چاہے گا۔ نہ میں کسی کا دوست ہوں نہ کوئی میرا دوست ہے۔"

"اب یہ ناراضگی بلاوجہ ہے کہ نہیں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"نہیں میں ناراض کیسے ہو سکتا ہوں اور پھر فرق کیا پڑتا ہے کسی کے ناراض ہونے سے۔ یہ تیرے مسائل ہیں۔ میرے نہیں۔"

"یہ بات نازو کا بھائی کہہ رہا ہے؟"

"نازو کا بھائی اب کاجل کا شوہر بھی ہے۔ جس کے دو بچے ہوں وہ اپنے مسائل میں اتنا الجھ جاتا ہے کہ دوسروں کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ وہ بزدل اور خود غرض ہو جاتا ہے۔ مجھے شرم آتی ہے یہ اعتراف کرتے ہوئے مگر حقیقت یہی ہے کہ اب میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں وہ پہلے والا اکرام شیخ نہیں ہوں۔ روشن کے ساتھ ہی میری سوچ بھی بدل گئی ہے۔ فن اصلاحی نے میرے خیالات کا رخ موڑ دیا ہے۔ اب میں صرف پیسہ اور شہرت کمانے کے چکر میں ہوں۔ میں سماجی معاشی یا معاشرتی مسائل وغیرہ کے بارے میں سوچتا بھی نہیں ہوں۔ گھر۔ بیوی۔ بچے اور کاروبار۔ یہی محور ہیں میری زندگی کا۔ اس کے بعد دوست آتے ہیں۔"

میں نے کہا "ایسا ہی ہوتا ہے دنیا میں درست مگر مجھے خوشی ہے کہ تو نے جھوٹ نہیں بولا۔ منافقت سے کام نہیں لیا۔"

"اس گاڑی کی کوئی بات نہیں تو لے جا۔"

"میں اس کی قیمت ادا کروں گا۔" میں نے کہا۔

"میں نہیں لوں گا۔"

"پھر میں گاڑی نہیں لے جاؤں گا۔ صاف بات ہے۔ بازار میں گاڑیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔"

"وہ تیری مرضی لیکن میں اپنی گاڑی تجھے بیچ نہیں سکتا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے پیسے کی کمی نہیں۔ میں دوسری گاڑی خرید لوں گا لیکن اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کروں گا۔ میں اب کوئی رسک نہیں لوں گا۔ جس سے میری زندگی کا شیرازہ بکھر جائے۔ اسی لئے میں پیڈرو کے سامنے بھی آنا نہیں چاہتا تھا۔"

"پیڈرو نے تجھے نہیں دیکھا۔ فکر مت کر۔" میں نے کہا "تو یہ گاڑی شام تک کے لئے میرے پاس چھوڑ دے۔ شام کو گاڑی تیرے گھر پہنچ جائے گی۔"

"مطلب یہ کہ الوداع۔"

"نہیں شام کو میں خود آؤں گا۔ کاجل سے ملنا بھی ضروری ہے۔

"رات سرے تب بالکل مطمئن ہو جاؤ گے۔"

"ایک بات اور۔ گاڑی میرے نام پر ٹرانسفر ہو گی۔ آج۔"

وہ چونک گیا "آج۔ اب تو آفس بند ہونے والا ہے۔"

"یہ بہت ارجنٹ کام آفس بند ہو جانے کے بعد ہی کئے جاتے ہیں۔ تمہارے بھی تو تمام ہوں گے تمہارے لئے یہ کام مشکل نہیں ہو سکتا۔ دو چار سو روپے کی کوئی بات نہیں۔"

وہ مسکرانے لگا "یہاں تو سارا کھیل پیسے کا ہے۔ سرے آدھی رات کو آفس کھلوا سکتے ہیں۔ ای ٹی او کو گھر سے اٹھا کے لا سکتے ہیں۔ بیوی کے پہلو سے۔"

میں نے کہا "یہاں کی بات نہیں۔ ساری دنیا میں یہی ہو رہا ہے۔"

پہلے میرا خیال تھا کہ رسید پر منظر یا وقار یوسف کا نام لکھوا دوں گا مگر یہ سوچتے ہوئے کہ واپسی کے سفر میں کوئی غیر متوقع حادثہ پیش آ گیا تو وہ بلاوجہ مشکل میں پڑ جائیں گے میں نے اپنا نام شجاعت علی بغدادی لکھوایا اور پتا بھی میٹروپول کے ہوٹل کے اسی کمرے کا دیا جس میں پہلی بار قیام کیا تھا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو شاید کنفیوژن رہتا۔ نام پتے کی تصدیق تو ہو جاتی مگر یہ جان کر خود شوروم کا مالک رہتا کہ بغدادی صاحب تو بائی روڈ یورپ کے سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔

دو گھنٹے میں نے تھوڑی سی تاخیر کے امکان کو مدِنظر رکھتے ہوئے لئے تھے ورنہ گاڑی مجھے شام تک درکار تھی۔ میں چاہتا تھا

کیبن میں رکوں گا نہیں۔ آج رات ہی واپس لوٹ جاؤں گا۔"

اکرام شیخ کچھ شرمسار تھا مگر میں اس کی مجبوری کو سمجھتا تھا۔ میں نے اسے دوپہر تک اپنے ساتھ رکھا۔ اس نے مجھے ایک رقم فراہم کی اور پیڈرو کو باندھنے اور بنڈل بنا کے پچھلی سیٹ میں ڈالنے میں میری مدد کی پھر اس نے مجھے ایک ایسی سڑک پر چھوڑا جس پر کاروں کے بہت سے شوروم تھے۔ وہ خود ٹیکسی میں بیٹھ کے رخصت ہو گیا تو میں نے ایک گھنٹے تک پرانی کاروں میں سے اپنے مطلب کی گاڑی کا انتخاب کیا۔ یہ سفید رنگ کی "رائس بال" تھی۔ دو کنورٹیبل ایک سو ایک ماڈل سنز۔ اس کے سابق پارسی مالک نے گاڑی کو ایسے سنبھال کے رکھا تھا کہ یہ ابھی تک نئی نظر آتی تھی۔

سیلزمین خود منیجر اور مالک بھی تھا۔ وہ مہذب آدمی تھا اور مجھے اس لئے بھی خوشی تھی کہ میں نے اس کے مخلصانہ مشورے کو مسترد نہیں کیا تھا اور قیمت کے معاملے میں بھی زیادہ بحث نہیں کی تھی۔ قیمت اور اس کا کمیشن ادا کرنے کے بعد میں نے کہا کہ وہ گاڑی کی سروس کرا دے۔

"میں بائی روڈ یورپ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" میں نے کہا "کیا یہ گاڑی دو گھنٹے میں اس قابل ہو جائے گی۔"

"دو گھنٹے میں؟" وہ بوکھلا گیا۔

"ہاں۔ سروس اور ٹیوننگ کے لئے دو گھنٹے بہت ہیں۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم اس کے پانچوں ٹائر بدل دو۔ بالکل نئے ڈال دو۔"

www.paksociety.com

کہ اس کے کاغذات مکمل ہوں اور اس میں ایک ہزار میل کا سفر آسانی سے کٹ جاتا ہے۔ ویسے ایک ہزار میل کچھ بھی نہیں ہوتے اور شہر کے اندر ہی گھر سے آفس آنے جانے لوگ اس سے زیادہ فاصلہ ہر ماہ طے کرتے ہیں۔ شہر کے مقابلے میں شہر سے باہر کی شاہراہوں پر ڈرائیو تک آسان بھی ہو جاتی ہے اور محفوظ بھی۔ نہ بار بار کلچ دبا کے گیئر بدلنا پڑتا ہے اور نہ بریک لگانا پڑتا ہے۔ گاڑی ٹاپ گیئر میں خود ہی چلتی جاتی ہے۔

ڈکی کھول کے میں نے پیڈرو کا حال دیکھا۔ وہ ہوش میں آچکا تھا۔ آنکھیں کھول کے اس نے مجھے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے بے بسی کی خاموش زبان میں وہ اپنے کئے پر ندامت کا اظہار کر رہا ہے اور وعدہ کر رہا ہے کہ اگر اسے رہا کر دیا جائے تو وہ مجھ سے تعاون کرے گا لیکن میں اس کے کسی وعدے پر اعتبار کرنے والا نہیں تھا خواہ وہ اشٹامپ پیپر پر اپنے دستخط کے ساتھ لکھتا۔

گاڑی کی سیٹ کے پچھلے حصے میں دونوں طرف ہک سے بنے ہوئے تھے اور درمیانی حصے میں پشت کو سہارا دینے والی فولادی پٹیاں تھیں۔ جو ڈکی میں بھی نظر آتی تھیں۔ میں نے پیڈرو کے ہاتھوں کو نائلون کی مضبوط رسی سے دائیں جانب کے ہک اور فولادی پٹی سے ملا کے باندھا تھا اور اسی طرح پیروں کو بائیں جانب فکس کر دیا تھا۔ وہ اپنے درمیان کے دھڑ کو اوپر نیچے کر سکتا تھا اور اسی طرح ہاتھوں پیروں کو سن ہونے سے بھی بچا سکتا تھا اور کبھی ہاتھوں یا پیروں کے اکڑ جانے کی اذیت کو چند سیکنڈ کے لئے کم کر سکتا تھا مگر اس کے لئے رہائی ناممکن تھی۔ وہ کمر کو زور زور سے گاڑی کے فرش پر مارتا تو اس سے بھی آواز پیدا نہ ہوتی۔ گاڑی کے فرش پر موٹا قالین تھا اور اس کے نیچے پٹرول ٹینک تھا جو نٹ بولٹ کے ساتھ ڈکی کے فرش میں نصب تھا۔ یہ نٹ بولٹ ابھرے ہوئے تھے اور پیڈرو ہی کمر کو زخمی کر سکتے تھے۔

اس کا منہ بند کرنے کے لئے میں نے سختی سے چپکنے والا مضبوط ٹیپ استعمال کیا تھا۔ وہ اپنے سر کو چار چھ انچ اوپر اٹھا سکتا تھا۔ سر کے بالکل نیچے ایک مڈگارڈ کی خفیف گولائی تھی۔ وہ اس پر اپنا سر مارتا تو ہلکی سی آواز ہوتی مگر ایسا وہ کتنی بار کر سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو چار مرتبہ۔ پہلے ہی اس کا سر چوٹ سے درد کر رہا ہوگا۔ یہ تقریباً ناممکن تھا کہ وہ اتنی زور سے مڈگارڈ کی موٹی چادر پر اپنا سر مارے کہ باہر بھی آواز سنائی دے۔ اول تو ٹریفک کے شور میں ایک بار یہ آواز کسی کو بھی متوجہ نہ کرتی اور مسلسل دھمادھم کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

میں نے احتیاطاً گاڑی ایک سائڈ اسٹریٹ میں پارک کی تھی جہاں قریب کوئی۔۔ دوسری گاڑی نہیں تھی۔ اس گلی میں دونوں طرف پرانے بنگلے تھے اور بنگلوں میں رہنے والوں کی گاڑیاں اندر کھڑی ہوئی تھیں یا پھر اپنے اپنے گیٹ کے سامنے ورنہ اس راستے سے گاڑیوں کا گزر ہی کم تھا۔

ڈکی بند کرتے ہوئے میں نے پیڈرو سے کہا "کمال ہے یار۔ تم ابھی تک موجود ہو۔ میں تو اس لئے چلا گیا تھا کہ تم موقع سے فائدہ اٹھاؤ گے اور بھاگ جاؤ گے۔ خیر تم نے میرا ساتھ رہنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو تمہاری مرضی۔ بھوک لگی ہے یا پیاس؟"

پیڈرو نے نفی میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "بس پھر عیش کرو۔ تمہاری خلوت میں کوئی دخل اندازی نہیں کرے گا۔"

لوٹ کے میں میٹروپول کی طرف آیا تو مجھے پھر ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں میری گاڑی کے قریب رہ کر کسی دوسری گاڑی کے پارک ہونے کا امکان نہ رہے۔ یہ جگہ مجھے فاطمہ جناح روڈ پر فلیگ اسٹاف ہاؤس کے مقابل نظر آئی۔ اور بلٹ کی یہ رہائش گاہ کسمپرسی کے باعث ویران پڑی تھی اور ادھر آنے والا کوئی نہ تھا۔ اس سڑک پر ٹریفک کم نہ تھی۔ یہ سڑک کینٹ اسٹیشن کی طرف جاتی تھی اور اس پر دونوں جانب قدیم طرز تعمیر کی وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی شاندار کوٹھیاں تھیں جن میں سے کچھ سفارت خانوں کی تحویل میں تھیں۔

ایس کے قاسم اینڈ سنز کا آفس اس گیٹ کی طرف تھا جو سندھ کلب کے متصل پڑتا تھا۔ میں بلیس سینما کی طرف سے پیدل چلتا ہوا دوسرے گیٹ سے اندر گیا۔ مجھے یقین تھا کہ قاسم اینڈ سنز کے دفتر میں مسٹر غفار شیخ کا بے چینی سے انتظار کیا جا رہا ہوگا۔ وہ کہہ کر گیا تھا کہ زیادہ دور نہیں جا رہا ہے۔ کسی فائل پر اس کے دستخط ارجنٹ درکار تھے اور اس نے دو گھنٹے پہلے کہا تھا کہ فائل میرے کمرے میں رکھ دو۔ اس کے دفتر میں کام کرنے والے سب ہی لوگوں نے مجھے دیکھا تھا۔ تنہا سپروائزر اور ٹائپسٹ لڑکی میرا حلیہ تفصیل سے بیان کر سکتے تھے مگر دو گھنٹے اتنے زیادہ بھی نہیں ہوتے کہ ماتحت عملہ تشویش میں مبتلا ہو کے پولیس سے رجوع کرے۔ باس قسم کے لوگ خودمختار اور مرضی کے مالک ہوتے ہیں کہ کسی شخص کے ساتھ جب اور جہاں چاہیں جائیں۔ ضروری ہو تو ان کے ساتھ لنچ باہر کریں اور پھر لوٹ کے آفس ہی نہ آئیں۔ کم سے کم چوبیس گھنٹے تک شیخ غفار عرف استاد پیڈرو کی گمشدگی کا خیال کسی کو نہیں آ سکتا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کے میں نے روم سروس سے لنچ منگوایا اور یہ کہا کہ میں شام تک چیک آؤٹ کروں گا چنانچہ میرا بل پانچ بجے تیار رکھا جائے پھر میں نے آپریٹر کو وقار یوسف کے گھر کا نمبر دیا۔

حسب توقع نگی نے چیخ ماری "حد کر دی آپ نے۔ یہ کیا نام رکھ لیا تھا۔ شجاعت علی بغدادی۔"

"مجھے معلوم تھا۔" میں نے کہا "کہ تمہیں پسند نہیں آئے گا اس لئے میں نے سلیم بیگ رکھ لیا خیر چھوڑو۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ تمہارا نام کچھ ہوتا ڈرتی۔۔ رہو گی تم ڈرتی ہی بدتمیز بدشکل بدبخت بدمزاج جو ہمارے وقار یوسف سے چپٹ گئی ہے۔"

وہ ہنسنے لگی "آپ آرہے ہو واپس۔ اور ہاں ٹیری کا فون آیا تھا تم ملے اس کے بابا سے۔ بابا نے فرزندی میں قبول کیا یا نہیں؟"

میں نے اداس اور افسردہ لہجے میں کہا "نہیں۔ ان کے دل کو اتنا شدید صدمہ ہوا کہ وہ فوراً مر گئے۔"

"مذاق مت کرو۔ کیا بات ہوئی ان سے؟"

میں نے کہا "باتیں تو خیر بہت ہوئیں مگر رات کو ان کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ ٹیری کو شاید اب تک اطلاع مل چکی ہوگی۔ اگر نہیں ملی تو تم جا کے بتا دو۔"

نگی نے کہا "ہا ہا۔ میں نہیں پڑتی اس چکر میں۔ تمہارا کیا بھروسہ خاندان میں مجھے مروا دو گے۔"

"یار نگی۔ تمہاری جان عزیز کی قسم۔ تمہارے اکلوتے سرتاج کی قسم۔ اس کی قسم جس کے مقدر میں تم جیسی فضول کی بلا لکھی گئی۔"

"اچھا اچھا۔ میں نے مان لیا مگر میں پھر بھی یہ کام نہیں کروں گی۔ خود پتا چل جائے گا اسے۔ یا تم فون کر کے بتا دو۔ واپس کب آرہے ہو۔"

"بہت جلد کل یا پرسوں تک۔ ایک بات تو یہ کہ میں تنہا ہوں باقی سب۔ اپنی کار میں۔ اور دوسری یہ کہ تمہارے لئے ایک تحفہ لا رہا ہوں۔"

وہ خوش ہو گئی "سچ؟ کیا تحفہ ہے؟"

"بہت زبردست۔ مگر بتاؤں گا نہیں۔ سرپرائز میں زیادہ مزہ ہے۔ میں لمبی بات نہیں کر سکتا۔ وہاں کی صورت حال بتاؤ مختصر الفاظ میں۔"

"سب ٹھیک ہے ویسے تو۔ مگر تم رابعہ سے بات کر لو۔"

"کہاں؟ گھر پر یا آفس میں؟"

"آفس میں رہے گی۔ وہاں سب مل جائیں گے۔"

"یعنی میری یہ کال ضائع ہوئی۔ خدا حافظ۔"

نگی نے خفگی سے کہا "خدا حافظ۔ مجھے بھی خوشی نہیں ہوئی آپ سے بات کر کے۔"

آفس میں فون کسی کلرک نے اٹھایا اور رابعہ کو دے دیا "کوئی سلیم بیگ گھوڑے والے ہیں۔" کلرک نے اسے بتایا۔

رابعہ نے محتاط لہجے میں کہا "ہیلو۔"

میں نے آواز بنا کے کہا "جی ہم سلیم بیگ ہیں۔ گھوڑے والے۔"

رابعہ نے کہا "معاف کیجئے گا۔ میں نے پہچانا نہیں۔"

"جی پہچانو گی کیسے؟" میں نے پہلی آواز میں کہا "تمہارے دادا کی بارات جس گھوڑے پر گئی تھی وہ ہم لائے تھے پھر تمہارے ابا اسی گھوڑے پر بیٹھے تھے۔ سہرا باندھ کے۔ ہمی گھوڑا لائیں گے جب تمہاری بارات آئے گی۔ ہم سے زیادہ بوڑھا ہو گیا ہے ذرا خیال رکھنا۔ وہ سالا ذرا الٹا چلتا ہو۔"

رابعہ ہنسنے لگی "کتنا؟ سیر سوا سیر کا۔ ویسے سلیم صاحب یہ آپ ہی تھے جو گھوڑے بیچ کر سو گئے تھے تو کیا رہن کیا تھا؟"

میں نے کہا "یہ ہی محاورہ کہا۔ بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ گڑی ہوئی شہ رگ بن جاتی ہے۔ تمہیں ہی تو ہماری تمہاری بات۔ بقول شاعر

ایک ہیں آپ ہی ہمارے نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا"

"ایک منٹ۔ تھمو۔ میں اندر والے کمرے سے بات کروں گی۔" رابعہ نے کہا اور تھوڑی دیر بعد بولی "ہاں اب کہو۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "بہت کچھ کہہ دیا ہم نے تو۔ تم کم سے کم الفاظ میں ہی کہہ دو کہ سکندر آئی لو یو۔"

وہ ہنسی "یہی بات تو زیادہ سے زیادہ الفاظ میں کہی جائے پھر بھی کم ہوگی۔ اور کہے بغیر بھی بہت ہے۔ کہاں سے بول رہے ہو؟"

میں نے کہا "کراچی سے اور کہاں سے۔ اس وقت ہوٹل میٹروپول میں ہوں۔"

مجھے شک تھا کہ رابعہ کے آفس کا فون پولیس آبزرویشن پر ہوگا اور اسی لئے میں نے اپنا نام ہی نہیں بتایا تھا اور ٹھکانا بھی بتا دیا تھا۔ رابعہ بھی سمجھ گئی تھی کہ اس طرح میں اپنے کراچی میں موجود ہونے کا ثبوت فراہم کرنا چاہتا ہوں۔

"کیا؟ تم میٹروپول میں ہو؟" رابعہ نے سخت حیرت کا اظہار کیا۔

"فکر مت کرو۔ تمہارا باپ بھی۔ میرا مطلب ہے کسی کا باپ بھی مجھے پہچان نہیں سکتا۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ چوہدری دلاور پکڑا گیا؟"

"ہاں مجھے خبر مل گئی تھی۔"

"دلاور کی بیوی نے ضمانت کی درخواست دائر کی تھی۔ آج پیشی تھی مگر ایڈووکیٹ جنرل نے دو دن کی مہلت مانگ لی۔ پولیس کی طرف سے جواب جمعرات اب اتوار کے بعد داخل کیا جائے گا۔ دراصل جس ایس ایس پی نے چوہدری دلاور کو پکڑا تھا وہ لاپتا ہے۔"

"کون۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی؟"

"ہاں اسلام آباد میں اس کے گھر کو بھی تالا لگا ہوا تھا۔ صرف وہی بتا سکتا تھا کہ چوہدری دلاور کہاں ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "اب تو شاید معاملہ الٹا ہو گیا۔ اب چوہدری دلاور ہی بتائیں گے کہ ایس ایس پی کہاں ہے۔"

"جاوید صدیقی کی جگہ دوسرا ایس ایس پی چارج لینے پہنچ گیا ہے ارشد کریم روانی۔ مگر وہ چارج کس سے لے اور دلاور کو گرفتار کرنے والا تو جاوید صدیقی تھا۔ عدالت صرف اسی کے بیان کو تسلیم کرے گی۔"

"تمہیں دلاور کی بیوی کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

"وہ روپوش ہے۔ چوہدری دلاور کے شریک کار کے ذریعے تم جانتے ہوگے اسے۔"

"کرنل شاہد رانا شریک کار؟"

"میں رانا کی بات کر رہی تھی۔ رانا اس کی جان کا دشمن ہو رہا

www.paksociety.com

ہے۔ اس نے دلاور کی بیوی کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور رانا بے دلاور کو بھی اسی نے اغوا کیا تھا۔"

"پولیس نے دلاور کو رانا کے بنگلے سے برآمد کیا تھا۔ تم مجھے پرانی خبریں مت سناؤ۔" میں نے کہا "رانا اب کہاں ہے؟"

"یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔ اگر ایس ایس پی جاوید صدیقی نے عدالت میں بیان دے دیا کہ اس نے چوہدری دلاور کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا تھا اور کس حالت میں۔ تو رانا بھی پھنس جائے گا اور پولیس مکر گئی تو رانا بھی چھوٹ جائے گا جب اس پر الزام کوئی نہیں تو گرفتاری کیسی۔"

"دلاور کی بیوی سے رابطے کی کوئی صورت نہیں؟"

رابعہ نے کہا "ایک نمبر ہے۔ کوشش کر کے دیکھ لو۔ لکھو۔"

"غالب اور نازو کیسے ہیں؟" میں نے نمبر لکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل خیریت سے ہیں۔ مگر میں بتا نہیں سکتی کہ کہاں ہیں۔"

"مت بتاؤ۔ میں خود معلوم کر لوں گا۔ میں نے سنا ہے کہ ڈاکٹر شاہ کی ایک شریک جرم فاطمہ جعفری......"

"ہاں وہ ماری گئی۔ بڑے پراسرار طریقے سے۔ اس کی لاش کسی نے تابوت میں ڈال کے وزیر خان اسپتال بھیج دی تھی۔ ڈاکٹر شاہ کے نام۔ آج صبح منہ اندھیرے چوکیدار نے تابوت دروازے پر رکھا ہوا دیکھا تو پولیس کو اطلاع دی۔ ابھی پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں ملی۔"

میں نے کہا "کون قتل کر سکتا ہے اسے؟"

"دیکھو سکندر۔ تم کو احتیاط کرنی چاہئے۔ اتنی لمبی کال کرو گے تو ٹریس ہو جاؤ گے۔"

"کیا تمہارا فون بھی آبزرویشن پر ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔ میں زیادہ بات نہیں کر سکتی۔ آفس ٹائم ہے ویسے بھی۔" رابعہ نے کہا۔

"اچھا بلبل بغداد عرف جنت کی حور۔ خدا کرے تم سدا یوں ہی چہکتی مہکتی رہو۔ دل تو بہت چاہتا ہے تمہارے دیدار کو۔"

"خبردار ابھی لاہور آنے کی کوشش نہ کرنا۔ جب تک ہم تمہارے معاملات ٹھیک نہ کر لیں۔ امید ہے دلاور کی گرفتاری کے بعد بہتری کی صورت نکل آئے گی۔ اگر اس کی ضمانت منظور کی گئی تو ہم تمہاری ضمانت کی درخواست بھی دائر کر دیں گے۔ اور وہ بھی قبول کر لی جائے گی۔"

"تم نے پہلے سے فرض کر لیا ہے۔"

"نہیں۔ دراصل ڈاکٹر ظلی مرڈر کیس میں دلاور کا سزائے موت سے بچنا محال ہے۔ وہ جو فرخ وکیل ہے نا۔ اس نے برطانوی کونسلیٹ کی معرفت لندن سے ایک چشم دید گواہ کو بھی یہاں کی عدالت میں پیشی کے لئے طلب کیا ہے۔"

"تم اس نجمہ جارج کی بات کر رہی ہو نا۔ جس پر دوہرے قتل کا الزام تھا۔"

رابعہ نے کہا "ہاں اصل قاتل تو چوہدری دلاور تھا۔ جارج اسے یہاں شناخت کرے گا۔ پھر شاید دلاور کو لندن لے جایا جائے۔ وہ کیس دوبارہ سماعت کے لئے پیش ہو گا۔ ایک سیدھا سادا آدمی کیسے جیل میں رکھا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا باقی باتیں پھر......"

"سکندر۔ تم مجھے فون مت کیا کرو۔ میں کسی کو کیا جواب دوں کہ تم سے میرا کوئی رابطہ نہیں۔ ہمیشہ تم مجھے فون کرتے ہو۔ کبھی ایک جگہ سے تو کبھی دوسری جگہ سے۔ تمہارا نیا ٹھکانا فون نمبر مجھے پھر معلوم نہیں ہے۔"

"وہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میرے اندازے کے مطابق کراچی سے کی جانے والی کال کا سراغ لگانے کے لئے آدھے گھنٹے کی مہلت کافی تھی۔ اگر رابعہ کے آفس کا فون نمبر آبزرویشن پر ہو گا تو لاہور کی پولیس کراچی کی پولیس سے رابطہ کرے گی اور انہیں میٹروپول سے سکندر بخت کو گرفتار کرنے کے لئے چھاپا مارنے کا کہے گی مگر ایک تو پولیس کی مستعدی اور کارکردگی اتنی قابل رشک ہے کہ جہاں برطانوی پولیس صرف تین منٹ میں پہنچ سکتی ہے وہاں ہماری پولیس تین گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچ سکتی۔ اس کے علاوہ میٹروپول جیسے ہوٹل میں چھاپا مارنے والے قانونی کارروائی مکمل کئے بغیر داخل نہیں ہو سکتے۔ وارنٹ کے ساتھ مجسٹریٹ خود بھی ہو اور اس کے ساتھ پولیس کی نفری کے علاوہ لیڈی پولیس سرچ بھی ہو۔ یہ چٹکی بجاتے ہی ہو سکنے والا کام نہیں تھا۔ بفرض محال یہ سب ایک گھنٹے میں ہو جاتا تب بھی مجھے فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ میٹروپول ہوٹل کے ہر کمرے کی تلاشی لی جا سکے یا وہاں قیام کرنے والے سب مہمانوں کو شناخت کے لئے لائن اپ کر دیا جائے۔

میں نے اطمینان سے دوسری کال اس نمبر پر کی جو رابعہ نے لکھوایا تھا مگر وہاں گھنٹی بجتی رہی۔ ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔ پھر میں نے آپریٹر کو نئے ایس ایس پی ارشد کریم ربانی کا نمبر دیا۔

کسی نے کرخت لہجے میں کہا "ڈیوٹی افسر خداداد اے ایس آئی۔"

میں نے کہا "خداداد۔ مجھے ایس ایس پی جاوید صدیقی سے بات کرنی ہے۔"

اس نے کہا "کون بول رہے ہو آپ؟"

میں نے کہا "لکھو کراچی سے سکندر بخت بات کرنا چاہتا ہے۔"

"کون سکندر بخت؟"

"تمہارا باپ سکندر بخت۔" میں نے غرا کے کہا۔

"وہ تو سر چلے گئے۔ نئے ایس ایس پی ارشد کریم ربانی ہیں۔"

اے ایس آئی خداداد بھی نیا تھا اور یقیناً میرے نام سے ناواقف تھا۔

لئے میرا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ انکار نہیں کرتے اور سزا پاتے ہیں۔ میری کوتاہی نہیں تھی کہ میں پیڈرو کو گاڑی میں چھوڑ گیا تھا۔ میری مدد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی بھی نہیں تھی۔ میری غلطی تھی کہ میں نے اس معاملے میں شیخ کو ملوث کیا۔ مجھے کیا ضرورت تھی اس سے گاڑی منگوانے کی۔ مجھے کرائے کی گاڑی بھی مل جاتی۔ مروت میں اگر وہ شیخ انکار نہ کر سکا اور مارا گیا۔

میں پریشانی اور پشیمانی سے نروس ہونے لگا تھا۔ میں سخت PANIC کا شکار ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے پیڈرو کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ وہ چھپ کر میری واپسی کا انتظار کر رہا ہو گا۔ جو کچھ میں نے اس کے ساتھ کیا اس سے بدتر میرے ساتھ ہونے والا ہے۔ پیڈرو ایک گولی سے میرا کام تمام کر سکتا ہے مگر وہ مجھے اسی طرح پکڑے گا جیسے میں نے اس کو پکڑا تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں نے سوچا کہ اب میرا یہاں کھڑے رہنا بے کاری نہیں حماقت ہے۔ مجھے خود کو اتنی آسانی سے کسی شکاری کے جال میں نہیں گرفتار ہونا چاہئے۔ چھپ کر تو کوئی بھی مجھے گولی کا نشانہ بنا سکتا ہے مگر مجھے پکڑنے کے لئے پیڈرو کو سامنے آنا ہو گا۔ وہ اکیلا آئے یا اپنے ساتھ بدمعاشوں کی فوج لے آئے۔ میں مقابلہ کئے بغیر ان کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے پکڑنے آئیں مجھے بھاگ جانا چاہئے۔ جہاں مقابلے کی گنجائش نہ ہو وہاں فرار ہی بہترین دفاع ہے۔ مجھے جان بچانے کی کوشش ضرور کرنی چاہئے۔

اب خوف نے میرے اعصاب پر غلبہ حاصل کر لیا تھا تو مجھے اس پرہجوم شہر میں ہر اجنبی چہرہ ایک شکاری دکھائی دینے لگا تھا۔ نہ جانے پیڈرو نے آزادی حاصل کرتے ہی انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کے کیا فیصلہ کیا ہو گا۔ اس کا آفس بہت قریب تھا۔ وہ سب سے پہلے پولیس کو اطلاع بھی کر سکتا تھا کہ ہوٹل میٹروپول سے اس کو اغوا کر کے لے جانے والا سکندر بخت تھا۔ پولیس وہاں پہلے ہی موجود تھی۔ پیڈرو انہیں میرا حلیہ بتا سکتا تھا اور پھر ہوٹل والے بتا سکتے تھے کہ ہاں۔ وہ شخص اگر میک اپ میں تھا تو سلیم بیگ کے نام سے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ڈی ایس پی تو غصے سے پاگل ہو جائے گا کہ وہ اس کی نظروں کے سامنے اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل گیا۔

میں چاروں طرف محتاط نظروں سے دیکھتا ہوا واپس ہوا پھر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ مجھے واپس نہیں آگے جانا چاہئے۔ واپس گیا تو میٹروپول کے چاروں طرف موجود پولیس کے اہلکار دوسری مرتبہ مجھے نکلنے کا موقع نہیں دیں گے۔ وہ تو فوراً مجھے دبوچ لیں گے کہ چلو کیا ہوا خیر ہے تم خود ہی لوٹ آئے شامت اعمال کے ساتھ۔ اب تمہاری کھال کھینچ کر دیکھیں گے کہ تم کیا ہو۔ شجاعت نہیں خودداری۔ سلیم بیگ یا سکندر بخت۔ مجھے کچھ تو عقل سے کام لینا چاہئے۔

"اچھا انہیں بتا دو۔"

"وہ تو سر میٹنگ میں ہیں۔" وہ بولا۔

"اچھا جب وہ فارغ ہوں تو بتا دینا کہ میٹروپول ہوٹل میں مجھ سے بات کر لیں۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جب میں نیچے اترا تو سب ٹھیک تھا مگر میں نے جتنی دیر میں اپنے بل کی ادائیگی کی۔ ٹھیک نہیں رہا۔ میں نے مین گیٹ سے ایک

ان کتابوں کا مطالعہ آپ کی شخصیت کے نکھار کے
آپ کو صحت مند رکھنے اور کامیابیاں حاصل کرنے
کے لیے مددگار ثابت ہو گا۔

ٹیلی پیتھی مستقبل بینی	۳۰/-	دست شناسی کے نئے زاویے	۳۰/-
ٹیلی پیتھی کی جدید تحقیقات	۳۰/-	تحریر اور شخصیت	۲۵/-
ہپناٹزم	۲۵/-	مسائل اور حل	۳۰/-
ہپناٹزم کے عملی طریقے	۳۰/-	باخبری	۲۵/-
ہپناٹزم کی جدید تحقیقات	۳۰/-	حیرت انگیز علوم	۲۵/-
ذاتی ہپناٹزم	۲۵/-	احساس کمتری	۲۵/-
خوابوں کے اسرار	۲۵/-	سگریٹ نوشی چھوڑیئے	۳۰/-
عورتوں کی نفسیات	۳۰/-	کامیابی	۲۵/-
مقناطیسیت	۳۰/-	[illegible]	۳۰/-
ازدواجی نفسیات	۳۰/-	مٹاپا اور اس کا سدباب	۲۵/-
خوف و تشویش اور اس کا سدباب	۳۰/-	امتحان میں کامیابی	۲۵/-
فکر کمزوری اور اس کا سدباب	۲۵/-		

اندرون ملک ڈاک خرچ ایک یا دو کتابوں کا ۱۲ روپے
تمام کتابوں کا [illegible]

بیرون ملک کے طلبات
بیرون ملک ڈاک خرچ مشرق وسطیٰ ۔۔۔ روپے فی کتاب یورپ
شمالی امریکہ ۔۔۔ روپے فی کتاب آسٹریلیا امریکا ۔۔۔ روپے فی کتاب
رقم پیشگی بذریعہ ڈرافٹ ارسال فرمائیں کسی قسم کی
نقد رقم لفافے میں نہ رکھیں۔ ڈرافٹ اس نام پر بنوائیں۔

MAKTABA NAFSIAT A/C 683 H. B. L
MANSFIELD STR. BR. KARACHI

ڈی ایس پی کو تیزی سے اندر آتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک انسپکٹر بھی تھا۔ وہ متجسس نظروں سے ہر شخص کی صورت دیکھ رہے تھے۔ میں صرف یہ دیکھنے کے لئے رکا کہ کیا میرے شبہات درست ہیں۔

ڈی ایس پی نے کاؤنٹر پر آ کے کلرک کو میری ایک پرانی تصویر دکھاتے ہوئے کہا "اسے غور سے دیکھو۔ کیا یہ شخص ہوٹل میں موجود ہے؟"

کلرک نے تصویر ہاتھ میں لے کر اس پر سرسری نظر ڈالی اور بولا "یہ کون صاحب ہیں؟"

"صاحب نہیں۔ یہ ایک خطرناک مجرم ہے۔ ہم اسے گرفتار کرنے آئے ہیں۔" ڈی ایس پی نے کہا۔

کلرک نے تصویر واپس کر دی "یہ آپ کو کس نے کہہ دیا۔۔۔"

"ارے فضول بک بک مت کر۔ ہم بے وقوف نہیں ہیں۔ ہمیں معلوم ہے وہ یہاں ہے۔ اس نے کالیں کی ہیں یہاں سے۔ اپنے منیجر کو بلا ذرا۔"

کلرک یوں متاثر ہونے والا نہیں تھا "چھاپا مارنے کے لئے مجسٹریٹ کا وارنٹ کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔"

ڈی ایس پی غرایا "مجسٹریٹ صاحب باہر گاڑی میں موجود ہیں۔"

کلرک نے بے نیازی سے کہا "ان سے کہیں منیجر سے مل لیں۔ وہ ہے ان کا کمرا۔"

تصویر میں میری دلچسپی دیکھ کے ڈی ایس پی نے پوچھ لیا "آپ بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں۔"

میں نے سر ہلایا "مجھے بھی شک ہوتا ہے کچھ۔ اسے دیکھا ہے میں نے کچھ دیر پہلے۔۔۔ ممکن ہے وہم ہو میرا۔"

"وہم نہیں جی۔ پکی بات ہے۔" اس نے جوش سے کہا اور مجسٹریٹ کو یہ اطلاع دینے کے لئے واپس ہو گیا۔

میں نے انسپکٹر سے کہا "ہوٹل سے باہر جانے کے اور بھی راستے ہیں۔"

اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا "ہر طرف پولیس کی نفری موجود ہے جی۔ ہم کچا کام نہیں کرتے۔"

"اچھا گڈ لک۔" میں نے گھڑی دیکھی "میری تو فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔"

انسپکٹر نے مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ نہ وہ ہوٹل کی ناکہ بندی کر سکتے تھے اور نہ اس کا محاصرہ کر سکتے تھے۔ یہاں ہر وی آئی پی قسم کے مہمان ٹھہرتے تھے جن کے ساتھ بدتمیزی سے بات کرنے میں پیٹی اتر جانے کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ میں اطمینان سے چلتا ہوا سامنے والے گیٹ سے نکلا۔ مجھے گیٹ کے مقابل ایک جیپ نظر آئی۔ ڈی ایس پی اب ایک بھاری بھرکم صورت سے کالے اور جاہل نظر آنے والے شخص سے بات کر رہا تھا۔ میں نے ان کو سنانے کے لئے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے یہ ذرا بلند آواز میں کہا "ائیرپورٹ جانا ہے" اور دروازہ کھول کے بیٹھ گیا۔

مجسٹریٹ اور ڈی ایس پی اندر جا رہے تھے جب ٹیکسی ڈرائیور نے مؤدبانہ کہا "سر میں فارغ نہیں ہوں۔"

"اوہ۔ تم انتظار کر رہے ہو کسی کا؟ سوری۔" میں نے کہا اور اتر کے پیدل چل پڑا "ٹریج" ریسٹورنٹ کی طرف سے میں نے چوراہے کو عبور کیا تو میری نگاہ اس طرف گئی جہاں میں نے گاڑی پارک کی تھی۔

گاڑی وہاں موجود نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین کرنا مشکل ہوا۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید میں نے گاڑی دوسری سڑک پر کھڑی کی ہوگی۔ اس چوراہے پر پانچ سڑکیں ملتی تھیں مگر شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ فاطمہ جناح روڈ بالکل میرے سامنے تھا اور فلیگ اسٹاف ہاؤس کی تاریخی عمارت بھی۔

قدرتی طور پر مجھے یہ خیال سب سے پہلے آیا کہ بیڈرو کسی طرح خود کو رہا کرانے میں کامیاب ہو گیا اور رہائی پاتے ہی گاڑی سمیت فرار ہو گیا۔ مجھے یہ ناممکن لگتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں کی رسی کی قید سے آزاد کرا سکے مگر ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔

یہ خیال آتے ہی میرا دل ڈوبنے لگا۔ گاڑی کے اندر وہ کاغذات بھی تھے جن سے گاڑی کی ملکیت کا پتا چلتا ہے۔ اکرام اور کاجل نے گاڑی حال ہی میں خریدی تھی۔ اس کی رجسٹریشن کیسے کرانے کا مجھے موقع بھی نہیں ملا تھا۔ میں نے گزشتہ شب اکرام شیخ سے کہا تھا کہ وہ میرے نام اوپن لیٹر بنا لائے۔ جب اس نے قیمت لینے سے انکار کیا تو میں نے گاڑی لینے سے انکار کر دیا تھا کہ ٹرانسفر لیٹر بھی کاغذات میں مل جائے گا۔ معلوم نہیں اس کے نیچے کس نے دستخط کئے تھے۔ اکرام شیخ نے یا کاجل نے۔ بہرصورت بیڈرو ان کا سراغ لگا لے گا۔

اکرام شیخ نے آج ہی مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ اب وہ معاملات سے کسی مصیبت میں پڑنا نہیں چاہتا مگر اب اس کو مصیبت سے کون بچا سکتا ہے۔ استاد بیڈرو جیسے بدمعاش کو خود میں نے اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔ وہ اکرام شیخ سے پوچھے گا کہ بتاؤ سکندر بخت کہاں ہے۔ وہ تمہاری گاڑی میں مجھے ڈال کے پھر رہا تھا۔ ضرور تم نے اسے پناہ دے رکھی ہے اور تم ہی اس سے پرانی دوستی کا رشتہ نبھا رہے ہو۔

کیا کرے گا شیخ اپنی صفائی میں اور کیوں مانے گا بیڈرو اس کی بات۔ شیخ کا گھر بار۔ بیوی بچے۔ اسکول۔ اس کی نیک نامی کی عزت۔ زندگی کا سکون اور مستقبل۔ سب اچانک غیر محفوظ ہو گئے تھے۔ صرف میری وجہ سے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ بار بار وہی نقصان اٹھاتے ہیں جو مجھ سے خلوص اور دوستی کا رشتہ نبھانے کی

بھاگ جانے کے خیال سے میں نے قدم بڑھائے ہی تھے کہ کسی نے میرے پیچھے سے پکار کے کہا "بابو جی۔۔۔" اور میری آستین کھینچی۔

میں اچھل پڑا اور ایسے پلٹا جیسے میرے کوٹ کی آستین کو کھینچنے والا کوئی پاگل کتا تھا یا کوئی دشمن۔ لیکن وہ ایک مسکین صورت شخص تھا۔

"ہیں۔ کیا۔ کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"گاڑی کو دیکھ رہے ہو بابو جی؟" اس پھٹے پرانے کپڑوں والے عمر رسیدہ اور کمزور شخص نے کہا جس کے سر اور داڑھی کے بالوں میں سفیدی نمایاں تھی۔

"ہاں ہاں تم نے دیکھی تھی؟"

"ہاں جی۔ جب آپ ادھر چھوڑ کے گئے تھے اس وقت بھی دیکھی تھی۔" اس نے کچھ فاصلے پر موجود ریڑھی کی طرف اشارہ کیا جس پر ایک بچہ چنے بھون رہا تھا۔

"پھر کہاں گئی وہ گاڑی؟" میں نے کہا۔

"پولیس لے گئی۔ غلط جگہ کھڑی تھی نا۔" وہ بولا "غلط نہ ہو پھر بھی وہ اٹھا لیتے ہیں۔"

میں نے خود کو سنبھالا "اب کہاں سے ملے گی وہ گاڑی؟"

"پہلے ادھر دیکھ لیں۔ یہ ٹریفک والوں کی چوکی ہے۔ ورنہ صدر تھانے جائیں۔ سو دو سو جرمانہ بھرنا پڑے گا۔"

"اچھا کیا تم نے بتا دیا۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا کہ گاڑی چوری ہو گئی۔" میں نے جیب سے ایک دس کا نوٹ نکال کے اسے دے دیا۔

"بابو جی" اس نے مجھے سلام کیا "اب ایک بات اور بتا دوں آپ پہلے جلدی پولیس ہیڈ آفس۔"

"کیا کیوں؟"

"دراصل۔ میں نے دیکھا تھا۔ سب انسپکٹر نذیر لے گیا ہے وہ گاڑی۔ اس نے منع کیا تھا مجھے کہ میں کسی کو نہ بتاؤں۔ لیکن آپ ہو شریف آدمی۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "اور تم کون ہو؟ پولیس کے مخبر؟"

وہ دانت نکالنے لگا "کیا کریں بابو جی۔ ایسے ادھر کوئی کھڑا بھی نہیں ہونے دیتا۔"

میں فوراً ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا لیکن میں نے اسے پولیس ہیڈ آفس جانے کو نہیں کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب میں گاڑی لینے گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ صورت حال میرے قابو سے باہر ہو گئی تھی لیکن اس مخبر کی اطلاع نے میرے اعتماد کو کسی حد تک بحال کر دیا تھا۔ شاید ابھی کچھ وقت تھا جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

ریگل سنیما کے چوراہے پر پٹرول پمپ سے میں نے شیخ کے گھر فون کیا۔ کنیز کا آفس خالی تھا اور ٹیکسی ڈرائیور گاڑی کا ٹینک فل کرا رہا تھا۔

شیخ کی آواز سنتے ہی میں نے کہا "شیخ یار گڑبڑ ہو گئی۔"

"پھر پریشان کیوں ہو بھائی۔ تمہارے ساتھ گڑبڑ نہ ہو تو تم گڑبڑ کے ساتھ ہوتے ہو۔"

میں نے کہا "شیخ۔ وہ گاڑی کس کے نام پر تھی؟"

"کیا مطلب۔ بم دھماکے سے اڑ گئی؟ کاجل کے نام پر تھی۔"

میں نے کہا "فوراً کاجل سے کہو کہ گاڑی چوری ہو گئی ہے۔ اگر تعلقات سے کام لے کر یا پیسہ دے کر رپورٹ کے اندراج کا وقت آج صبح کا ہو جائے تو بہتر ہے۔"

"آخر ہوا کیا ہے۔ پتا تو چلے۔"

"یار میں نے بیڈرو کو اس میں بند کیا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جا کر دوسری گاڑی میں۔"

"پھر کیا وہ بھاگ گیا؟"

"نہیں۔ میں نے گاڑی غلط جگہ پارک کی تھی۔ پولیس اٹھا کے لے گئی اور اب ظاہر ہے وہ بیڈرو کو برآمد کر لیں گے۔ پولیس پہلے ہی ہوٹل پہنچ گئی تھی سکندر بخت کی گرفتاری کے لئے۔ کاجل رپورٹ لکھوا دے کہ کسی نے اس سے گاڑی چھین لی۔ حلیہ وہی بتائے جو میرا تھا۔ تو خود سامنے مت آنا۔ اس طرح تم بچ جاؤ گے ورنہ بیڈرو تمہارے پیچھے پڑ جائے گا۔"

اکرام شیخ نے کہا "لیکن گاڑی تو نے کہاں چھینی تھی۔ گاڑی تو ہوٹل کے سامنے موجود تھی۔ اسے میں چلا رہا تھا۔"

"یار کہہ دینا کہ وہ دو تھے۔ میرا حلیہ بالکل ٹھیک بتانا۔ دوسرا غلط حلیہ بیان کر دینا۔ میں اب جا رہا ہوں واپس۔ بائی روڈ۔"

"تو فکر مت کر۔ ایسا نہ ہو راستے میں ہی ایکسیڈنٹ کر بیٹھے۔" اکرام شیخ بولا۔

میں نے کہا "یار شیخ۔ مجھے واقعی بہت افسوس ہے۔"

"یار تیرا کیا قصور ہے اس میں۔ ہونے والی بات تھی ہو گئی۔ کاجل سب ٹھیک کر لے گی۔ بیڈرو اسے نہیں جانتا۔ کاجل کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ حسب منشا رپورٹ درج کرا سکتی ہے۔ لیکن اس کے بعد خطرہ تجھے درپیش ہو گا۔ اپنا حلیہ اب بدل لینا ورنہ پولیس دھر لے گی ڈکیتی اور اغوا کے جرم میں۔"

"یہ اچھا یار لایا تو نے یار۔ خیر ٹھیک ہے۔ کاجل کو سمجھا دینا کہ میں نے ایسا نہیں چاہا تھا لیکن ہو گیا۔"

"کاجل کے لئے تم سب نے اس سے کہیں زیادہ کیا تھا۔ تم لوگ اسے مشرقی پاکستان سے نکال کر اپنے ساتھ نہ لاتے تو اس کے ساتھ نہ جانے کیا ہوتا۔ شاید وہ بھی کسی کیمپ میں پڑی ہوتی۔ وہ تم سب کی بہت احسان مند ہے۔ اسے کوئی گلہ نہیں ہو گا۔"

اکرام شیخ کو خدا حافظ کہنے کے بعد میں نے سیدھا شورومز کا رخ کیا۔ گاڑی میری حسب منشا علی رحلائی تیار کھڑی تھی۔ اس

www.paksociety.com

کے پانچوں ہزار بھی بدل دیے گئے تھے۔ شوروم کے مالک نے مجھے یقین دلایا کہ انشاء اللہ یورپ تک سفر میں مجھے گاڑی میں پیٹرول ڈلوانے کے سوا کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ گاڑی کے کاغذات میں شجاعت علی بغدادی کا نام بھی درج ہو گیا تھا۔ میں نے ڈیلر کو باقی رقم ادا کی اور چابی لے لی۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے خود کو زیادہ محفوظ اور پُرسکون محسوس کیا۔ میک اپ بدلنا آسان کام نہیں تھا۔ جو میں گاڑی میں بیٹھے ہوئے کر لیتا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک رات کسی عام سے ہوٹل میں گزار دوں لیکن عقل کی دلیل اس کے خلاف تھی۔ ابھی کسی پولیس چیک پوسٹ کو میرے فرضی نام اور حلیے سے آگاہ نہیں کیا گیا ہو گا کہ یہ شخص جہاں بھی نظر آئے اسے گرفتار کر لیا جائے۔ پولیس نے ڈکی میں سے استاد پیڈرو کو برآمد کر لیا ہو گا تو پولیس کو کچھ وقت تفتیش کے لئے درکار ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ استاد پیڈرو شاید خود بھی پولیس کے چکر میں نہ پڑے۔ اگر وہ سکندر بخت کا نام لے گا تو پھر یہ معاملہ بہت لمبا ہو جائے گا اور اسے بھی بتانا پڑے گا کہ وہ شیخ مختار ہے یا استاد پیڈرو۔ وہ اپنی جان چھڑانے کے لئے یہی کہہ سکتا ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔ وہ کون لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے۔ اس نے اغوا کرنے والوں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور وہ کسی پر شک بھی ظاہر نہیں کر سکتا۔ اس کا دشمن بھی کوئی نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ بڑا حوصلہ افزا خیال تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس کو کسی شجاعت علی بغدادی یا سلیم بیگ کی تلاش نہیں ہو گی جو ایک بزنس مین شیخ مختار کے اغوا میں ملوث تھا اور در حقیقت سکندر بخت تھا۔ میٹروپول ہوٹل میں سکندر بخت کو پکڑنے کے لئے چھاپا مارنے والے تو باہر ہی سے لوٹا دیے گئے ہوں گے کہ اس نام اور حلیے کا کوئی شخص نہ یہاں تھا اور نہ ہے۔ ہوٹل کے ریکارڈ سے اس کی تصدیق بھی ہو جائے گی اور پولیس رسمی کارروائی کے بعد رپورٹ دے دے گی کہ لاہور کا کیس کرنے والا کوئی سلیم بیگ تھا جو جا چکا تھا۔

میرے خلاف دوسری رپورٹ کابل کی ہو گی لیکن وہ ابھی لکھی بھی نہیں گئی ہو گی یا شاید لکھی جا رہی ہو گی۔ شام پانچ بجے لکھوائی جانے والی اس رپورٹ کے اندراج کا وقت کیا ہو گا۔ یہ میں نہیں جان سکتا تھا۔ اس کا انحصار حالات پر تھا۔ اگر آخری اندراج گزشتہ رات کا ہوا تو پولیس صبح کا وقت ڈال دے گی لیکن خدانخواستہ صبح سے دوپہر یا شام تک دوسرے جرم کی رپورٹیں ہو گئیں تو پھر پچھلا وقت ڈالنا ممکن نہیں رہے گا۔ یہ رپورٹ لکھنے کے بعد بھی راوی کے پل پر سے گزرنے والی ہر گاڑی چیک کی جائیں گی جو اکرام شیخ کی گاڑی جیسی ہو گی مگر اصل گاڑی تو پولیس ہیڈ آفس میں ہی ہے۔ وہ کل تک کہیں نہ کہیں مل جائے گی۔

یہ اطمینان ہو جانے کے بعد میرا سب خوف دور ہو گیا۔ میں نے ایس کے قاسم اینڈ سنز کا ٹیلی فون نمبر ڈائریکٹری میں تلاش کیا۔ اس کے سامنے امپورٹر ایکسپورٹر لکھا ہوا تھا جو بڑی عام سی اصطلاح تھی اور اس کی آڑ میں ہر جائز و ناجائز کام کیا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ایس کے قاسم کے گھر کا پتا اور رہائشی نمبر بھی دیا ہوا تھا۔

کاروباری ادارے عام طور پر پانچ چھ بجے بند ہو جاتے ہیں۔ میں نے گاڑی کے رنگ دار شیشے چڑھا لئے اور ایس کے قاسم اینڈ سنز کے دفتر سے کچھ فاصلے پر گاڑی روک لی۔ آفس ابھی کھلا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے باری باری عملے کے چاروں ارکان کو روانہ ہوتے دیکھا۔ خاتون اسٹینو سب سے پہلے گئی۔ کیا سپروائزر وہاں سے نکلنے والا آخری شخص تھا مگر آفس اب بھی کھلا ہوا تھا۔ شاید اکیلا سیٹھ قاسم ابھی آفس میں موجود تھا اور اپنے پارٹنر شیخ مختار کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا یا اس کی تلاش میں ادھر ادھر فون کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سیٹھ قاسم باہر نہیں گیا تھا۔ میں اگر چاہتا تو آفس میں ہی اس سے ملاقات کر سکتا تھا۔ وہ سب لوگ جا چکے تھے جنہوں نے شیخ مختار کو میرے ساتھ جاتا دیکھا تھا۔ مجھے تعاقب کرنے میں سیٹھ قاسم کو دیر لگتی اور جتنی دیر میں وہ اسٹاف کے بتائے ہوئے حلیے سے میری صورت کا موازنہ کرتا میں اسے گن پوائنٹ پر باہر لے آتا لیکن ایسا کرنے میں رسک تھا۔ قاسم شور مچاتا تو سب سے پہلے ہوٹل میٹروپول میں سیکیورٹی کے ذمے دار متوجہ ہوتے اور وہ اس سلیم بیگ کو ضرور پہچان لیتے جو در حقیقت سکندر بخت تھا اور جس کی تلاش میں پولیس کچھ دیر پہلے ہی وہاں آئی تھی۔

میں باہر انتظار کرتا رہا۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اکرام شیخ کی گاڑی میں مقید استاد پیڈرو رہائی پا کے اپنے آفس پہنچا ہے یا نہیں۔ رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا کہ آخری شخص آفس میں سے برآمد ہوا۔ اس نے شیشے کے بند والے دروازے کو مقفل کیا۔ پھر فولادی جالی کے شٹر کو اوپر سے نیچے کھینچا اور اس میں نیچے دونوں کے چابی والے دو قفل لگا دیے۔ وہ دبلا پتلا اور لمبا شخص تھا جس نے سر کے تھوڑے سے بالوں کو کسی ماہر ہیئر ڈریسر کی مدد سے یوں پھیلا دیا اور پھیلایا تھا کہ وہ گنجا نظر نہ آئے۔ اس نے اپنی پتلون پر شاید کبھی استری کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کبھی دھل کے آتی ہو گی تو سیٹھ قاسم ایک دن میں کریز کا ستیاناس کر دیتا ہو گا۔ غالباً وہ ٹانگیں کرسی پر اٹھا کے بیٹھنے کا عادی تھا اس کے لئے پتلون ایک ڈھیلا پاجامہ تھا۔ کوٹ کے ساتھ اس نے ٹائی نہیں باندھی تھی۔ وہ ملتانی دروبے کے بزنس مین ایسے ہی حلیے میں پھرتے تھے۔ جب تک کہ ممکن تھا چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے رکن نہ بن جائیں ان کے نزدیک لباس سے زیادہ اہم پیسہ رہتا تھا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ سیٹھ قاسم نے اپنا آفس میٹروپول جیسے شاندار ہوٹل میں کھولا ہے تو اس کا بزنس بھی بڑا ہو گا۔ وہ گاڑی خرید سکتا تھا مگر وہ ٹیپ ٹاپ رکھنے کے لئے فضول خرچی کا قائل معلوم نہیں ہوتا تھا۔ جب رکشا ٹیکسی ہی اتنا ہے۔ اپنی گاڑی میں پھنسانے کی کیا ضرورت ہے جو پیسہ کاروبار میں لگایا جائے تو منافع دیتا ہے۔ رکشا ٹیکسی کے کرائے سے دس گنا۔ پھر ذاتی کار صرف شو مارنے کے لئے۔ فاتحہ پڑھنے والی بات ہے نا!

سیٹھ قاسم چند قدم ہی چلا تھا کہ میں نے اسے جا لیا "قاسم بھائی" وہ ٹھٹک کے رک گیا "کیا بات ہے کون ہے تم؟"

میں نے کہا "تم نہیں پہچانا ہم کو؟ ہم غلام علی لوٹا والا۔ سیٹھ ابراہیم لوٹا والا کا بھائی۔ تم کو شیخ مختار بلاتا پڑا ہے۔"

شیخ مختار کے نام پر وہ چونکا "کدھر بلاتا پڑا ہے؟"

میں نے کہا "ابھی ٹیم نہیں ساتھ۔ اس کا بڑا... ہو گیا ہے ایسا نہ ہو تم بھی پھنس جائے۔"

وہ میرے ساتھ چل پڑا "بابا جلدی بولو کیا ہوا ہے۔ ابھی اپنا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ بہت کمزور دل ہے اپنا۔"

میں نے کہا "کیا کرتے ہیں ادھر بیٹھ کے ایک کپ چائے پیتے ہیں۔ ورلڈ ریسٹورنٹ میں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ادھر بہت شور ہوئیں گا۔ یہ لوگ اپنا بینڈ بجاتا ہے۔ اپن کو میوزک سے الرجی ہے۔"

"پھر تم بتاؤ۔ بات بہت ضروری ہے اور تمہارے فائدے کی ہے۔"

اس نے سوچ کے کہا "ابھی گاڑی کو گھماؤ۔ پیچھے چلو۔ ادھر کیفے گرینڈ ہے۔ ایک دم ڈارک اور خاموش جگہ ہے۔"

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ کیفے گرینڈ میں وال لائٹس اتنی مدھم تھیں کہ باہر سے آنے والے کو کچھ دیر تو اندھیرا ہی محسوس ہوتا تھا۔ قاسم مجھے اوپر لے گیا۔ وہاں دیواروں پر سرخ مخمل جیسا وال پیپر ماحول کو مزید تاریک کرتا تھا۔ لوگ الگ الگ کیبن میں بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ موم بتی کی شکل والی لائٹس میں دور سے کسی کا چہرہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ مجھے اس کی فضا بہت اچھی لگی۔ بعد میں چائے اور سینڈوچز نے بھی بڑا مزہ دیا۔

ایک گوشے میں قیام کرتے ہی سیٹھ قاسم نے بے چینی سے کہا "ہم کیا بولا کون سا لوٹا والا؟"

"غلام غنی لوٹا والا۔" میں نے کہا "شیخ مختار کے ساتھ ہم نے پہلے ایک ڈیل کیا تھا اور پھنس گیا تھا مشکل میں۔ ابھی ہمارا بھائی پھنس گیا ہے ہم وہی ہزار روپے کے پیچ کیا تھا لیکن ابراہیم۔"

"کون ابراہیم؟"

"سیٹھ ابراہیم لوٹا والا۔ ہمارا بڑا بھائی۔ اس کا ایک لاکھ مانگتا ہے ایف آئی اے والا۔ ادھر شیخ مختار بولتا ہے کہ سیٹھ قاسم سے بات کرو۔"

وہ اچھل پڑا "ہم۔ ہم ایک لاکھ دے گا ایسا بات مت کرو بابا۔ اپنا ہارٹ فیل ہو جائیں گے۔ سالا دل بڑا کمزور ہے۔"

میں نے کہا "سیٹھ قاسم۔ تم شریف آدمی ہو۔ شریفانہ بزنس کرتے تھے۔ یہ تم نے شیخ مختار کو اپنے ساتھ کیوں شامل کر لیا۔ اس کے کہنے پر تم نے غلط دھندا شروع کیا ہو گا۔"

"کیسا غلط دھندا؟" وہ ڈر کے بولا "ہمارا دھندا ہے ادھر سے گارمنٹ اور ہینڈ کرافٹ بھیجتا ہے۔ چمڑا اور اونیکس کا ڈیکوریشن پیس۔ کبھی لیدر گڈز یا گارمنٹ۔"

"اور ادھر سے کیا منگوا تا ہے؟"

"کیا تم کو نہیں معلوم۔ کاسمیٹک اور پرفیوم۔ الیکٹرانکس۔"

"لیکن قاسم بھائی۔ تمہارا پارٹنر تم کو ڈبل کراس کرتا ہے۔ وہ ادھر سے امونیشن اسمگل کر رہا ہے۔"

سیٹھ قاسم اچھل پڑا۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا "یہ ایسا مت بولو۔"

میں نے کہا "ہاں۔ تمہارا دل بہت کمزور ہے۔ ہارٹ فیل ہو جائے گا لیکن یہ سوچو سیٹھ قاسم کہ تم کو ایف آئی اے نے پکڑ لیا پھر کیا ہو گا؟ تم بھی پارٹنر ہے۔ تم نے شاید کبھی دیکھا نہیں کہ ادھر سے جو مال آتا ہے اس میں کیا ہوتا ہے۔ اس بار شاید تم بچ جاؤ ایک لاکھ دے کے۔"

"ہم کیوں دے گا۔ وہ سالا شیخ مختار دے گا۔"

"ہاں وہی دے گا۔ لیکن تم سنبھل جاؤ۔ اس سے بات کرو گے تو وہ انکار کرے گا۔ اگلی بار خود مال چیک کرو۔ تمہیں پتا چل جائے گا۔ ہم تم کو بتاتا ہے شیخ مختار بہت خطرناک چیز ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم اس کا سیکرٹ آؤٹ کرے اور وہ تم کو بزنس سے آؤٹ کر دے یا دنیا سے آؤٹ کر دے۔"

"اف۔ ابھی ہم کیا کریں گا۔" اس نے کانپتے ہاتھوں سے پانی پیا۔

میں نے کہا "چائے پیو۔ دل کو مضبوط کرو۔ اگر شیخ مختار ایک لاکھ مانگے تو خاموشی سے دے دو۔ نہیں مانگے تو خاموش ہو جاؤ۔ اس سے کوئی بات نہیں کرو۔ جب موقع ملے۔ مال پکڑو اور اس کو پکڑا دو۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ اندر ائرکنڈیشنر کی ٹھنڈک تھی مگر سیٹھ قاسم کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا "ہم۔ ایسا ہی کرے گا۔"

میں نے کہا "پولیس اور ایف آئی اے والوں کو پہلے بتا دینا۔ ان کی موجودگی میں اور شیخ مختار کے سامنے مال پکڑنا۔ وہ بچ کے نہ نکل سکے۔ تمہاری تو بہت اچھی گڈول ہے۔ رپورٹ بھی تم کرو گے شیخ مختار اندر ہو جائے گا۔ اس کے بعد پارٹنرشپ ختم۔"

"ایک دم ختم۔" سیٹھ قاسم نے وہیں فیصلہ کر لیا۔

بلاشبہ سیٹھ قاسم ایک ایماندار بزنس مین تھا اور استاد پیڈرو دھوکے سے اس کا پارٹنر بن گیا تھا۔ پیڈرو کے پاس پیسہ ہو گا مگر وہ خود کوئی کاروبار چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ سوائے بدمعاشی کے کاروبار کے۔ ہر جائز کاروبار میں لگایا ہوا سرمایہ دن دوگنی اور

www.paksociety.com

رات جو کبھی ختم نہیں کرتا۔ شیخ منافع محدود رہتی ہے اور سرمایہ نہیں بڑھتا ہے۔ اسمگلنگ، گن رننگ، منشیات یا بردہ فروشی جیسے دھندے میں لگی پونجی کو کروڑ پتی بنتے دیر نہیں لگتی مگر یہ کام صرف استار پیڈ و جیسے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ وہ نہ سائن بورڈ لگا کے دکان کھولتے ہیں اور نہ اپنا اشتہار دیتے ہیں۔ وہ سیٹھ قاسم جیسے کسی شریف کاروباری کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلانے ہیں۔ ایک سو فیصد قانونی کام کرنے والے کی کنڈول کے پردے میں اپنا دھندا شروع کرتے ہیں اور کبھی گرفت ہوتی ہے تو خود غائب ہو جاتے ہیں۔ پکڑا جاتا ہے لاعلمی میں سیٹھ قاسم جیسا شخص۔

ایک گھنٹے بعد میں نے سیٹھ قاسم کو اس کے گھر سے کچھ دور ڈراپ کر دیا۔ وہ کمزور دل اور کمزور سا آدمی میرا بے حد شکر گزار تھا اور بار بار کہہ رہا تھا "غلام علی تو نے رلا دیا۔ تم نے بچالیا ہم کو۔"

میں نے رخصت ہوتے ہوئے کہا "آپ تم مجھے مت مروا دینا۔ میرا نام مت لینا شیخ مختار کے سامنے۔ میرا کام تمہیں خبردار کرنا تھا۔ اب تم خاموشی سے ایسا ہاتھ ڈالو شیخ مختار پر کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"بابا ہم لاٹھی بھی توڑ دے گا اس سالا سانپ پر۔ ابھی وہ جانتا نہیں ہم کو۔ ہم ایسا پکڑے گا اس کو جیسا بلی پکڑتا ہے چوہے کو۔" اس نے پچھتاوے کے لیے کے انجکشن کو واضح کیا "پر ہم پیار نبھانے میں دوسرا غلطی کیا ہے۔"

میں نے کہا "پہلی غلطی کب کی تھی؟"

"بہت ٹائم ہو گیا۔ اٹھائیس سال پہلے لائف پارٹنر بنایا تھا۔ وہ بھی ہم کو دھوکا دیا۔ سالا ایک دم لاسٹ ریٹ تھا زیبا کے مالک۔ ابھی سو پارٹنر سے بھی جو کر ممن سو پارٹنر ہمری ریٹ ہو گیا ہے۔ ابھی تم کو ایک ایڈوائس دیتا ہے۔ شادی جلد تو لڑکی دیکھو لیکن لڑکی کی ماں کو بھی دیکھو کہ لڑکی کا فیوچر کیا ہو گا۔ یہ ایک دم تجربے کا بات ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور چل پڑا۔ اس کے مشورے کی روشنی میں رابعہ کو شریک حیات بنانے میں کوئی رسک نہیں تھا۔ میں نے رابعہ کی ماں کو بھی دیکھا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں جب اس کا انتقال ہوا تھا تو اس میں اور رابعہ میں صرف عمر کا فرق تھا۔ اگر وہ خود پر ہوگی کا غم۔ رابعہ کی فکر اور بڑھاپا مسلط نہ کرتی۔ چہرے اور جسم کو عمر کی یلغار سے بچانے کے لئے میک اپ اور افزائش حسن کے اسباب کا سہارا لیتی تو سب اسے رابعہ کی بڑی بہن سمجھتے

لاہور تک ایک ہزار میل کا سفر بہت زیادہ نہیں تھا مگر میں اکیلا تھکن اور بے زاری کا شکار رہا۔ کوئی شریک سفر ہوتا تو باری باری ڈرائیو کرتے اور باتیں کرنے میں سفر کی طوالت کا احساس بھی نہ ہوتا۔ میں نے گاڑی کا سودا نہ کیا ہوتا تو دو گھنٹے میں اُڑ کر لاہور پہنچ جاتا۔ گاڑی میں نے جس مقصد کے لئے خریدی تھی وہ ناکامی کی نذر ہو گیا تھا۔ بہتر ہوتا اگر یہ گاڑی میں اکرام شیخ کو دے دیتا یا کے نام کرا دیتا۔ اس کو میری دنیا سے جو پریشانی ہوئی تھی اس کا ازالہ تلافی ہو جاتی۔

رات بھر سفر جاری رکھنا زیادہ مشکل کام تھا۔ اندھیرے میں فاصلہ طے ہونے کا احساس بھی کم ہو جاتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں خلا میں سفر کر رہا ہوں پھر نیند اور تھکن کا احساس بڑھتا گیا اور میں نے وہ رات حیدر آباد کے ایک ہوٹل میں گزاری۔ اس سے اگلا دن بہتر رہا۔ میں رات کو ملتان پہنچ گیا۔ اب لاہور رہ جانا پانچ گھنٹے کی مسافت تھی مگر مجھ میں ہمت باقی نہ رہی تھی۔ میں نے ملتان میں آٹھ گھنٹے قیام کیا اور صبح چھ بجے لاہور کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

دس بجے میں لاہور میں تھا۔ اس وقت رابعہ یا رفتار یوسف کے ملنے کی امید نہیں تھی۔ ماڈل ٹاؤن والے گھر کو مقفل دیکھ کے مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ میں نے رفتار یوسف کے گھر کا رخ کیا۔ وہاں صرف گل تھی جو ایک ڈھیلا ڈھالا نائٹ گاؤن پہنے پھر رہی تھی۔ دراصل مہترانی ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے مجھے سرہانے ہوئے بتایا۔

"باقی لوگ کیا اللہ کو پیارے ہو گئے؟" میں نے بوٹ کے تسمے کھولتے ہوئے کہا "وہاں تو تالا پڑا ہوا تھا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو تم۔ سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔" گل نے کہا۔

"مگر ہیں کہاں؟" میں نے کہا۔

"محسن نے گل کو شفٹ کر دیا ہے اندرون شہر لاہور کے موچی دروازے کے اندر۔" گل نے مجھے مطلع کیا "ہم بھی ابھی نے دیکھا تو نہیں مگر سنا ہے کسی پرانی عمارت کی سب سے اوپر والی منزل پر جہاں کبوتر رہتے ہیں وہیں ایک خانہ انہیں بھی مل گیا ہے۔"

"ایک خانہ یعنی صرف ایک کمرا؟"

"کتنے کو دو کمرے ہیں۔ ایک وہ جس میں پہلے کبوتر تھے دوسرے میں مالک مکان کا کبوتر باز بیٹا رہائش پذیر تھا۔ انہوں نے سب کو خالی کر دیا۔ نیچے کی تین منزلوں پر تین بھائیوں کے خاندان بستے ہیں۔ سب سے اوپر اکیلے ابا میاں ہیں اور ان کی قدر بہت بلند ہے۔ نیچن میں گزارا ہوتا نہیں۔ اب کرایہ بھی ملے گا۔ بیٹوں سے کچھ لینے کے روادار نہیں۔"

میں نے کہا "یہ بھی اچھا کیا محسن نے۔ کم سے کم گل اور رابعہ کو محفوظ کر دیا۔"

"مولوی خادم حسین اور اس کی گھر والی پاگل ہو گئے۔" گل نے ایسے کہا جیسے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔

"پاگل ہو گئے؟"

"کچھ تو پہلے سے تھے۔" گل نے کہا "پھر خادم حسین کی بیوی کو تمہارے گھر میں آسیب کا سایہ نظر آنے لگا۔"

"کیسا آسیب؟ جن بھوت یا چڑیل۔"

"اس نے رات کے وقت آوازیں سنی تھیں اور باہر نکل کے دیکھا تو کچھ لوگ سبز چوغے پہنے ہاتھوں میں مشعل روشن کیے باغ میں پھر رہے تھے۔ ہر ایک کی گود میں بچہ تھا۔ سب نے اس سے پوچھا کہ بتاؤ کون سا بچہ چاہیے جو اچھا لگے وہ لے لو۔ پھر اس نے ایک بچے کو دیکھا جو گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اس کی جانب آ رہا تھا۔ اس نے اسی بچے کو اٹھا لیا۔"

"اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔" میں نے کہا۔

"جی نہیں ہم سب کی کھلی۔ اس کی چیخ سے۔ جا کے دیکھا تو وہ برآمدے میں بے ہوش پڑی تھی۔"

میں نے افسوس سے کہا "بیچاری۔ مامتا کی پیاسی عورت کے خیالوں کا عذاب۔"

"کمال کی بات یہ ہے کہ اسی رات مولوی خادم حسین کو خواب میں اپنا دادا مرحوم نظر آیا۔ وہ بھی سبز لباس میں تھے۔"

"ہاتھ میں مشعل لئے ہوئے؟"

"یہ پتا نہیں۔ انہوں نے خادم حسین کو بہت ڈانٹا کہ وہ ابھی تک حاضری دینے کیوں نہیں گیا۔ بدبخت کر سیدا لکھا ہے کیا کہتے رہے۔"

"کون سا میرا؟ ہزرائی فروت۔"

گل ہنسی "مولوی خادم حسین کے دادا اور پھر والد گجرات میں کسی پیر کے آستانے پر ہر سال چادر اور دیگ چڑھانے تھے۔ خادم حسین نے اس خاندانی روایت پر عمل کرنے میں کوتاہی سے کام لیا تھا۔ اس نے یہ خواب دیکھا اور پھر کسی ماہر علوم روحانی کے پاس گیا۔ اسے اپنے خواب اور بیوی کے بارے میں بتایا۔"

میں نے کہا "کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں کیا؟"

"نہیں۔ وہ کچھ دیر بعد ہوش میں آ گئی تھی اور اس نے خود ہی انکار کر دیا تھا کہ ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ کل شام وہ بیوی کے ساتھ اسی پیر کی درگاہ پر چادر اور دیگ چڑھانے چلا گیا۔"

"کسی نے اسے روکا بھی نہیں۔ سمجھایا بھی نہیں؟"

"محسن اور رفتار نے کہا کہ کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ان کے دل کو ایسے سکون ملتا ہے تو ٹھیک ہے۔ انہیں جانے دو۔ آ جائیں گے کل پرسوں تک۔"

"غالب اور رضا زدی کی طرف بھی گیا تھا کوئی؟"

"مظفر بھائی نے سب کو منع کر دیا ہے۔ ارے ہاں۔" اس نے اچانک چیخ ماری "آپ نے کہا تھا کہ ایک تحفہ ہے میرے لئے" میں گڑبڑا گیا "تحفہ۔ ہاں کہا تو تھا۔"

"پھر کہاں ہے وہ تحفہ؟"

میں اسے کیا بتاتا کہ میری مراد پیڈرو سے تھی جو میرے جال میں گرفتار ہو کے نکل گیا تھا اور ٹیلی فون پر میں نے اسی کو تحفہ کہا تھا۔

گل نے منہ پھلا کے کہا "جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔ اُلّو بنایا تھا۔"

اچانک میرے ذہن میں گاڑی کا خیال آ گیا۔ میں نے فخر سے کہا "الّو تو ہو تم۔ وہ ایسا تحفہ تو ہے نہیں کہ یہاں لا کے تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں۔"

وہ کنفیوژ نظر آنے لگی "بتاؤ نا کیا ہے؟"

میں اسے ہاتھ پکڑ کے باہر لے گیا "یہ۔ یہ گاڑی۔ یہ ہے تمہارا تحفہ۔"

اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "یہ گاڑی۔ میرے لئے۔"

میں نے کہا "کیوں۔ پسند نہیں آئی کیا؟"

اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا "یہ تو بہت خوب صورت ہے۔ بہت اچھی ہے۔ یہ آپ نے سچ مچ میرے لئے خریدی تھی؟"

گل کے لئے گاڑی کوئی انوکھی چیز نہیں تھی۔ اس کے باپ کے گھر میں ایک نہیں دو گاڑیاں تھیں جو اس سے کہیں زیادہ قیمتی تھیں۔ بعد میں وہ گل کی ملکیت ہو گئی تھیں۔ گل کے شوہر کے پاس بھی ایک گاڑی تھی مگر ساری خوشی تحفے کی تھی۔ اسے زندگی میں مختلف مواقع پر ہر طرح کے تحفے ملے ہوں گے۔ کبھی سالگرہ پر۔ کبھی سال نو پر تو کبھی عید پر لیکن اتنا قیمتی تحفہ کسی وجہ کے بغیر اسے کسی نے نہیں دیا تھا۔ کسی نے اسے کار تحفے میں نہیں دی تھی۔ ورثے میں ملنے والی گاڑیاں بک چکی تھیں صرف ایک شوہر کی تھی اور اب یہ کار اس کی اپنی تھی۔ وہ خوشی سے پاگل ہو گئی۔ اس نے کار کو اندر سے باہر سے دیکھا۔ اس پر پیار سے ہاتھ پھیر کے دیکھا۔ اندر بیٹھ کے دیکھا اور پھر باہر آ کے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تھینک یو۔ تھینک یو ویری مچ۔" وہ سخت جذباتی ہو رہی تھی "لیکن۔"

"لیکن کیا۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"یہ تحفہ صرف میرے لئے ہی کیوں؟ اور لوگ بھی ہیں۔"

"تم یہ سمجھو کہ تحفہ ہم سب کی طرف سے ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن کیوں؟ ایسی کیا بات تھی؟"

میں نے کہا "جو کچھ تم نے ہم سب کے لئے کیا ہے گل۔ اس کے بدلے میں تو یہ کچھ بھی نہیں۔ میں نے سوچا کہ روپے تو خدا نے سب کچھ دیا ہے تمہیں۔ کوٹھیاں اور کاروں کی تمہیں کمی نہیں۔ مگر یہ کار مجھے پسند آ گئی تھی تمہارے لئے۔ بس میں نے لے لی۔"

گل رونے کے قریب ہو گئی "سکندر بھائی۔ وہ سب کوٹھیاں اور کاریں مجھے ورثے میں مل گئیں ورنہ میں نے تو انہیں ٹھکرا دیا تھا۔ یہ کون نہیں جانتا کہ ڈیڈی نے اتنی دولت کیسے اکٹھی کی تھی۔ اس کار کی بات کچھ اور ہے۔ یہ میری ہے۔ آپ نے خلوص اور محبت کے ساتھ دی ہے مجھے۔ یہ تو اصل کار ہے۔ اگر کھلونا کار بھی ہوتی تو میں اسے سنبھال کے رکھتی اور کہتی تھینک یو۔"

"اچھا اب تم اچھی بچی کی طرح اندر جا کے ابھی ہی چائے بناؤ میرے لئے اور اچھی اچھی چیزیں کھانے کے لئے لاؤ۔"

www.paksociety.com
www.paksociety.com

"آپ نہا دھو لیں۔ ابھی تک جوتے بھی نہیں اُتارے۔"
میں نے کہا "مجھے جانا ہے۔ پہلے محسن کی طرف۔ پھر غالب اور نازو کو دیکھنے کے لئے اور بھی بہت سے کام ہیں۔"
"محسن کے گھر پہنچنا کوئی آسان کام ہے؟ وہ خود ہی لے جا سکتا ہے ان گلیوں میں۔" گل نے اندر جاتے ہوئے کہا۔
اسی وقت محسن گیٹ پر نمودار ہوا۔ اس کی نظر دھوکا نہیں کھا سکتی تھی "آپ کی تعریف؟" وہ ہاتھ ملا کے بولا "کس سرکس کے مسخرے ہیں آپ؟ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟"
میں نے کہا "ہم شجاعت علی بغدادی ہیں۔"
"نو ایک فلم تھی بغداد کا چور۔ کیا وہ آپ کی زندگی پر بنی تھی؟"
وہ گاڑی کو غور سے دیکھ کے بولا "اور یہ کیا چیز ہے۔ دیکھنے میں تو کار لگتی ہے۔"
"اس سوال کا صحیح جواب تمہیں گل دے گی۔" میں نے کہا
"تو جواب دے کر اکیلا کیوں آیا ہے۔ گل کہاں ہے؟"
"گھر والی گھر میں۔" محسن بولا "تو بھی اب آجا اپنے فرنچ وکیل والے روپ میں۔ ہمیں جانا ہے۔"
"کہاں جانا ہے۔ میں تو تجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ بہت سی باتیں کرنی تھیں۔" میں نے کہا۔
"باتیں ہوتی رہیں گی۔ ٹھیک دو بجے پولیس ہیڈ آفس پہنچنا ہے۔"
میں نے گھڑی دیکھی "ڈیڑھ گھنٹہ ہے ابھی۔ پروگرام کیا ہے؟"
"ایس ایس پی جاوید صدیقی ایک سنسنی خیز ڈرامے کا ڈراپ سین کرے گا۔" محسن نے کہا۔
"میں نے سنا ہے کہ نیا ایس ایس پی آگیا ہے۔"
"بالکل ٹھیک سنا ہے آپ نے۔ جاوید صدیقی آج چارج اس کے حوالے کرے گا۔ لیکن اس سے پہلے وہ ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرے گا اور اس میں ہو گا دھماکا۔"
"پولیس ہیڈ آفس میں دھماکا؟"
"ہاں۔ اس نے پریس کانفرنس بلانے کی ذمے داری مجھے سونپی تھی۔ ارشد کریم سے اس نے صرف یہ کہا ہے کہ وہ دو بجے چارج دینے آئے گا۔ وہ کئی دن سے روپوش تھا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی صحافی وہاں پہنچ جائیں گے۔ جاوید صدیقی اعلان کرے گا کہ اس نے چوہدری دلاور کو کہاں سے کب اور کیسے گرفتار کیا تھا۔ اسے پولیس کی تحویل میں کہاں رکھا گیا ہے۔"
"اسے یہ بیان دینے کی اجازت کون دے گا؟"
"ابھی تک ایس ایس پی کا چارج اسی کے پاس ہے۔ چارج کے بغیر ارشد کریم اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اجازت کی ضرورت جاوید صدیقی کو نہیں۔ ارشد کریم کو ہوگی کہ وہ اس کے کمرے میں اس کی سیٹ پر بیٹھ جائے۔ دلاور کی گرفتاری کا اعلان کرنے کے بعد جاوید صدیقی بتائے گا کہ اس پر اوپر سے کس قسم کا دباؤ تھا۔ دلاور کا نام لئے بغیر یہ بات کرے گا کہ افسران بالا اس سے کیا توقع رکھتے تھے۔ جھوٹا حلف نامہ عدالت میں داخل کرنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ اس نے سارے حقائق عام کر دیئے ہیں اور یہ سرکاری قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی ہے تو وہ ہر سزا بھگتنے کے لئے تیار ہے۔ چونکہ وہ حق پر ہے اس لئے وہ چارج نہیں دے گا۔ استعفیٰ دے گا۔ احتجاجاً۔"
"اس حد تک جائے گا وہ؟"
"جاوید صدیقی سخت مشتعل ہے۔ اور دل شکستہ۔ اس نے ایمانداری اور فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے تو اس کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ محکمہ اسے اچھی کارکردگی دکھانے پر انعام دینے کے بجائے سزا دینا چاہتا ہے۔ اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے وہ پریس کانفرنس میں استعفیٰ دے گا۔"
"ابھی وہ کہاں ہے؟"
"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ وہ ٹھیک وقت پر نمودار ہوگا۔"
"فرض کرو ارشد کریم نے پریس کانفرنس کی اجازت نہ دی۔"
"وہ کون ہوتا ہے اجازت نہ دینے والا۔ ابھی تو اس نے جاوید صدیقی کی جگہ ہی نہیں لی ہے۔ لیکن میں نے اس کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔ وہ چند سرکردہ صحافی ہوں گے جنہیں ارشد کریم کی طرف سے ہی مدعو کیا گیا ہے۔ ان سے پنگا لے کر ارشد کریم اپنے حق میں برا کرے گا۔ صحافیوں میں جاوید صدیقی کے بیان اور استعفیٰ کی نقول تقسیم کر دی جائیں گی۔ کیا بگاڑ سکتا ہے کوئی اس شخص کا جو اپنا مستقبل داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر چکا ہو۔"
میں نے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں آدھے گھنٹے میں شجاعت علی بغدادی سے پھر فرنچ وکیل کا روپ دھار لوں۔"
"اس کے لئے آدھا گھنٹہ درکار ہے؟"
میں نے کہا "فرنچ وکیل کا حلیہ تو میں پانچ منٹ میں بنا لیتا ہوں۔ کافی پریکٹس ہو گئی ہے مگر جو میک اپ اس وقت میں نے کر رکھا ہے یہ ذرا مشکل سے اُترے گا۔ گل چائے بنا رہی ہے۔ آپ اس سے براہ راست کچن میں جا کے اس گاڑی کے بارے میں وہی سوال کریں جو مجھ سے کیا تھا۔ اگر ہمت ہے؟"
"ہاں ہاں پوچھ لیں گے۔ ہم کوئی ڈرتے ہیں کسی سے؟"
جب میں باتھ روم میں چہرہ صاف کر رہا تھا اور شیو بنا رہا تھا تو کچن سے محسن اور گل کے چیخ چیخ کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔
"گل۔ یہ باہر کیا چیز کھڑی ہوئی ہے؟"
"کون سی چیز۔ باہر تو بہت کچھ کھڑا ہوا ہے۔ پورے دن تک بجلی کا کھمبا اور خود آپ کھڑے ہوئے تھے۔"
"وہ جس کے چار پہیے ہیں۔ تقریباً گول۔ اس پر اُٹھنے کی

کے جو تم بتاتی ہو۔ اوپر ایک ڈبا سا لگا ہے۔"
"وہ گاڑی مجھے سکندر نے تحفے میں دی ہے۔"
محسن نے قہقہہ مارا "بہت بدمعاش ہے یہ سکندر بھی۔ ہر فضول اور ناکارہ چیز کسی کو تحفے میں پیش کر دیتا ہے۔ آدمی مروت میں انکار بھی نہیں کر سکتا احسان خواہ مخواہ کا۔ چلتی ہے یہ گاڑی؟ اور چلتی ہے تو سیدھی یا الٹی۔"
"آپ جل کر کوئلہ ہو چکے ہیں اس لئے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسی شاندار کار ہے۔"
"اور؟" محسن پھر ہنسا "تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں مگر گل۔ اس پر سوار ہو کے باہر مت جانا۔ لوگ ہنسیں گے اور کتے بھونکتے ہوئے دوڑیں گے تمہاری طرف۔ بڑی بے عزتی کی بات ہے تمہارے لئے ایسی گاڑی میں جانا۔"
"آپ کو کیا معلوم گاڑی کیا ہوتی ہے۔"
"مگر تمہیں تو معلوم ہے۔ ماشاء اللہ سے تمہارے والد ماجد کے پاس کیا شاندار گاڑیاں تھیں۔ تم نے جذباتی ہو کے بیچ ڈالیں ورنہ یہ نوبت نہ آتی۔ آج تم ایسی کھٹیچر گاڑیاں تحفے میں قبول کرنے پر مجبور نہ ہوتیں جن کے مقابلے میں گدھا گاڑی بہت ویلیو رکھتی ہے۔"
"تمہیں تو آج تک کسی نے گدھا گاڑی بھی نہیں دی تحفے میں۔"
میں نے غسل خانے سے منہ نکال کے کہا "میں دے سکتا ہوں مگر پھر گل اسے آگے باندھ دے گی۔"
کچھ دیر بعد ہمیں یہی گاڑی لے جانی پڑی۔ میری ایلی فاکس ویگن تو ماڈل ٹاؤن کے گھر "وزیر منزل" میں کھڑی ہوئی تھی۔ رابعہ اور رقیہ اپنی گاڑی میں کورٹ گئے تھے۔ گل نے کہا "محسن اب تو مت بیٹھنا اس گاڑی میں۔ بڑی بے عزتی ہوگی۔ کتے پیچھے لگ جائیں گے۔"
محسن نے خوش ہو کے کہا "اس کا مطلب ہے تم نے کافی برا مانا ہے۔ میری بات تمہارے دل میں یا کلیجے میں تیر کی طرح لگی ہے۔ تم اگر رشوت دو مجھے۔ شام کو مرغ مسلم کھلانے کا وعدہ کرو تو میں اس گاڑی کی تعریف کر سکتا ہوں بلکہ اسے مرسڈیز سے بہتر ثابت کر سکتا ہوں۔"
"کوئی ضرورت نہیں۔" گل نے خفگی سے کہا۔
"پھر میں مجبوراً اس میں بیٹھتا ہوں۔ حالانکہ یہ میرے لئے باعث شرم ہے۔" محسن نے گاڑی کو لات ماری اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔
"بدتمیز۔" گل نے چلا کے کہا "اللہ کرے پاؤں ٹوٹ جائے تمہارا۔"
باہر آنے کے بعد محسن بولا "یار گاڑی واقعی شاندار ہے لیکن گل کو تحفے میں دینے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ تو کبھی کوئی نہیں۔۔۔"
میں نے اسے وجہ بتادی کہ اصل تحفہ تو استاد پیڑو تھا مگر وہ ہاتھ سے نکل گیا تو مجھے یہ گاڑی ہی گل کو دینی پڑی۔ ہوٹل میٹروپول میں میری کے ڈیڈی قیوم اسکوں سے استاد پیڑو کے پارٹنر سیٹھ قاسم سے ملاقات تک تمام واقعات محسن نے بڑی دلچسپی سے سنے۔
"تو یہ ہے وجہ استاد پیڑو کے نظر نہ آنے کی۔ میری بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس ڈرامے کا اتنا اہم کردار اچانک غائب کیسے ہو گیا۔ وہاں وہ شیخ تکا بنا ہوا ہے۔" محسن بولا۔
"ہاں۔ یہ معلوم کرنے کا تو موقع ہی نہیں ملا کہ آخر وہ یہاں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کراچی کیوں چلا گیا۔ اس نے چڑی بدل لی یہ دیکھتے ہوئے اب کھیل ختم ہونے کو ہے یا دلاور نے رانا اور ڈاکٹر شاہ جیسے پارٹنر بنائے تو پیڑو کی اہمیت نہیں رہی اور اس نے عزت اسی میں دیکھی کہ دودھ کی مکھی کی طرح نکالے جانے سے پہلے خود چلا جائے۔"
محسن نے سر ہلایا "دھندا تو اب بھی اس کا وہی ہے جو پہلے تھا۔ ناجائز اسلحے کی فروخت۔"
"اور وہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ میں نے سیٹھ قاسم کو خبردار کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ وہ شریف آدمی بے خبری میں مارا جاتا۔"
محسن بولا "تیرا شریف آدمی تو اب بھی مارا جائے گا اگر اس نے پیڑو کو پھنسایا۔"
میں نے کہا "وہ پرانا جہاں دیدہ بڈھا ہے۔ اس کے وسیع تعلقات ہیں اور دیکھنے میں وہ سیدھا سادہ لگتا ہے مگر بے وقوف نہیں ہے۔ بے وقوف ہوتا تو اتنی ترقی نہیں کر سکتا تھا۔ پیڑو کو وہاں کون جانتا ہے۔ یہاں تو اسے دلاور اینڈ کمپنی کی حمایت حاصل تھی چنانچہ وہ کچھ بھی کرے اس پر حرف نہیں آتا تھا۔"
"مجھے شک گزرتا ہے کہ اس نے بھی دلاور کے دشمنوں کا ساتھ دیا ہوگا۔ رانا نے تو فرض کر لیا تھا کہ دلاور کی ملک عدم سے واپسی کا کوئی امکان ہی نہیں۔ اس نے دلاور کی بیوی اور اس کے بچوں کا قصہ پاک کرنے کا پلان بھی بنالیا تھا۔ قسمت نے دلاور کی بیوی کو بچالیا۔ افسوس ہو گئی لیکن اسے بچایا بھی تو وسیلہ بنایا ہمیں۔ یہ قدرت کے کھیل ہیں۔ دلاور کے دشمن یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ بازی ایسے پلٹ جائے گی اور ان کی یقینی فتح کو ہم شکست میں بدل دیں گے۔ دلاور کی بیوی نے سازشی عناصر کو پہچان لیا تھا اور اپنی پریس کانفرنس میں سب کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ دلاور اس سے پہلے ہی فرار ہو گیا ہوگا۔"
"اتنی جلدی وہ کراچی پہنچ کے سیٹھ قاسم کا پارٹنر بھی بن گیا؟" محسن نے کہا۔
"یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے کاروبار کی بنیاد اس نے پہلے ہی رکھ دی ہو۔ اس کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ ایک نہ ایک دن چوہدری دلاور اس کی چھٹی کرا دے گا۔ وہ ویسے بھی دلاور کا ماتحت تھا۔ بزنس

www.paksociety.com

پارٹنر نہیں تھا۔ وہ دلاور کی برابری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دلاور کے پارٹنر تھے میرے والد وزیر خان اور میر شرافت علی مرحوم اور اب ان کی جگہ لے چکے ہیں شوکت رانا اور ڈاکٹر شاد جیسے لوگ مگر دلاور کی حیثیت پھر بھی وہی ہے جو پہلے تھی۔ خود دلاور کے سامنے سیاست کے میدان میں طبع آزمائی کے بلند ارادے تھے اور اسے اپنے ماضی سے دامن چھڑانے کے لیے پیڈرو جیسے لوگوں کی ضرورت نہیں تھی۔ ان سے وہ پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ یہ سب دیکھتے ہوئے پیڈرو نے پہلے سے اپنا بندوبست کر لیا تھا۔ نہ جانے کب سے وہ سیلو قاسم پر ڈورے ڈال رہا ہوگا اور شیخ مختار کی حیثیت سے اس کا پارٹنر بننے کی کوشش میں مصروف ہوگا۔ اس نے یقیناً سیلو قاسم کو سرمایہ فراہم کیا ہوگا اور اصل آمدنی ہوگی ناجائز اسلحہ بیچ کے مگر اس نے ظاہر کیا ہوگا کہ اس کے شامل ہونے سے کاروبار چمک اٹھا ہے اور منافع بڑھ گیا ہے۔"

محسن نے کہا "افسوس کہ قسمت نے اسے بھی بچا لیا۔"

"خدا کی مصلحت خدا ہی جانے۔" میں نے کہا "جب وقت آئے گا تو شامت اعمال پیڈرو کو ضرور گھیر کر ہمارے پاس لے آئے گی۔" میں نے کہا "مجھے تھوڑی سی فکر ہے اکرام شیخ کی۔"

"مجھے اس کی بات سن کے افسوس ہوا۔ اتنا خود غرض اور کمینہ ہو گیا ہے وہ۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ہمن کے بارے میں بھی کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔"

میں نے کہا "تشویش اسے تب ہوتی جب میں نازو کے بارے میں حقیقت حال بتاتا۔ میں نے تو کہہ دیا کہ سب ٹھیک ہیں پھر وہ کیوں پریشان ہوتا۔ اس نے اچھا کیا کہ منافقت نہیں کی۔ اپنی مجبوری کا اعتراف کر لیا۔ ہم اس سے توقعات وابستہ کر لیتے تو مایوسی ہوتی۔"

"کیا تم نے واقعی محسوس نہیں کیا کہ وہ بدل گیا ہے؟"

میں نے کہا "تبدیلی یقیناً آگئی ہے۔ وہ پہلے جیسا پرجوش نہیں تھا۔ اس نے اور کاجل نے تم سب کے بارے میں پوچھا ضرور لیکن ایسے ہی جیسے کوئی اپنے شہر ہو کے آئے تو دور دراز کے رشتے دار پوچھتے ہیں کہ ہاں بھئی سنا کیا حال ہے ماسے فضل دین کا اور چاچا کرم دین ابھی تک زندہ ہے یا مر گیا۔ اور نمبردار کے بیٹے کا کیا ہوا جس نے بھوری بھینس کی چوری کرنے پر ایک مزارع کو قتل کر دیا تھا۔ جس کی بھوری آنکھوں والی بہن اسے پسند آ گئی تھی۔"

محسن نے افسوس سے سر ہلایا "ایسا ہی ہوتا ہے کبیر خان، آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ سامنے ہو کوئی تو رشتہ کمزور نہیں پڑتا اور جذبات سرد نہیں پڑتے۔"

میں نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا "چھوڑ یار۔ سب تیری طرح نہیں ہو سکتے۔ ہر آدمی بھی نہ کبھی کسی کمزوری سے مار کھا جاتا ہے۔ اور اکرام شیخ تو اپنی گاڑی دے رہا تھا۔"

"چھوڑ یار۔ یہ پیسہ ہی ہے جس نے اس کو بزدل بنا دیا ہے۔ تو نے اچھا کیا جو اس کی گاڑی نہیں لی۔ زیادہ اچھا ہوتا اگر بھی اسے دے آتا اپنی طرف سے کہ لے بیٹا۔ وہ کافی تو کی ہے تا یہ ہماری طرف سے تیرے لیے۔ جو آپڑے تھے وہ مجھے خیال نہیں آیا ورنہ میں ایسا ہی کرتا تو ہوائی جہاز سے۔ خیر کی خوش ہو گئی۔ اکرام شیخ صرف اور ہمیں کیا ضرورت ہے کسی کے منہ پر جوتا مارنے کی۔ وہ نازو کا بھائی ہے اور دوست بھی رہے گا۔ کل ہم سب اسلام آباد شفٹ ہو جائیں گے تو ایک ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔

ڈیڑھ بجے میں نے گاڑی کو پولیس ہیڈ آفس کے پارکنگ میں کھڑا کر دیا پھر میں اور محسن ٹہلتے ہوئے گیٹ پر آ گئے۔ ابھی کسی اخبار کا کوئی نمائندہ نہیں پہنچا تھا۔ محسن نے بتایا کہ ٹھیک دو بجے ایس ایس پی جاوید صدیقی کے ساتھ ہی آئی جی دو چار منٹ کے فرق سے۔

مجھے کچھ شک ہوا "کیا نئے ایس ایس پی کو علم ہے کہ کوئی پریس کانفرنس بھی ہوگی؟"

"نہیں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دعوت تو اسی کی طرف سے ملی ہے سب کو۔ اس نے بلایا ہے صحافیوں کو۔"

"اسے معلوم نہیں مگر بلایا اس نے ہے۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

محسن ہنسا "یہ ذرا اہم نے کیا ہے۔ صحافیوں کو شک نہیں ہوا کہ جب کوئی ایسی ویسی بات ہوتی ہے تو انہیں فون ریسیو ہوتا ہے پی آر او کی طرف سے۔ پی آر او ریٹائرڈ بڈھا ڈی ایس پی۔ اس کی آواز کی نقل میں نے اتاری تھی۔"

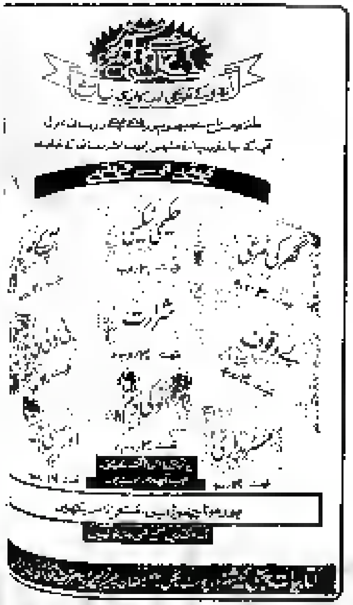

اور خیالی ہے۔ وہ غالباً شوکت رانا یا ڈاکٹر شاد کی قید میں تھا جہاں اسے تشدد کیا گیا اور اس کے ذہن کو بدلنے کے لیے دوائیں دی گئیں جن کے زیر اثر وہ یہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔ یہ سب اس کے ذہن میں ڈالا گیا تھا جو اس کے بیان میں شامل ہے ورنہ درحقیقت کہیں ایسا نہ خانہ ہے اور نہ دلاور کے ساتھ وہ سب ہوا ہے جو وہ کہتا ہے۔"

میں نے کہا "اتنا بڑا جھوٹ بول سکیں گے ہم؟"

"جھوٹ کے بغیر گزارا ہی نہیں ہمارا۔ چوہدری دلاور جیسے لوگوں کے ساتھ سچ بول کے کون جیت سکتا ہے۔ عیاری مکاری اور بے ایمانی دھوکا فریب کون سا عیب ان کی شرع میں جائز نہیں۔ اسی لیے آج تک قانون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا کہ نظام انصاف کو ان کے خلاف ثبوت اور شہادت نہیں ملی۔ لاقانونیت کا توڑ لاقانونیت ہی ہو گیا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ ایم آر ایس کا اصول بھی یہی تھا کہ اینٹ کا جواب پتھر۔ دشمن کو اسی کے سکوں میں ادائیگی کرو۔ جیسے کو تیسا۔"

"یہ تو اگر بڑی محاورے کی بات ہے مگر میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اس تہ خانے کا وجود مٹا دینا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ چوہدری دلاور کا ذہن رابعہ کے گھر کی طرف چلا جائے۔ وہاں ایک محل جیسی عمارت اسی نے بنوائی تھی اور اسی نے تباہ کرا دی تھی مگر تہ خانہ تو نہیں بھلا ہوگا وہ۔ وہ چالاک آدمی ابھی تک خاموش ہے۔ اس نے بھی عدالت میں نشاندہی کر دی کہ وہ تہ خانہ کہاں ہے تو عدالت خود معائنہ کر کے تصدیق کر لے گی۔"

محسن مسکرایا "یہ سب بھی کر لیا ہے میں نے۔ اب جا کے لاشیں کرو گے تو وہاں کچھ نہیں ملے گا۔ رابعہ کے گھر کا خالی پلاٹ بالکل خالی ہے۔ نہ وہاں کوئی خیمہ ہے اور نہ کوئی باکس۔ تہ خانہ میں نے بالکل صاف کرا دیا تھا۔ ہر چیز کباڑی خود سمیٹ کر لے گیا پھر راتوں رات مزدوروں نے فرش کھود ڈالا تو سارا ملبہ نیچے گرا اور تہ خانہ بھر گیا۔ وہاں بلڈوزر کام کر رہے ہیں۔ رابعہ نیا مکان بنوا رہی ہے۔ دلاور کا بیان ہونے تک بھرائی مکمل ہو جائے گی۔ شاید بنیادیں بھی نظر آنے لگیں گی۔ کیسا تہ خانہ اور کہاں کا تہ خانہ۔ چوہدری دلاور نے تو ہمیں مروانے کا انتظام کیا تھا مگر دھماکا ہوا تو ہم یہاں نہیں تھے۔ مکان اسی دن ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا۔ کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ جس کا دل چاہے جا کے سائٹ کا معائنہ کر لے۔ اسی پرانے ملبے پر نئی عمارت تعمیر ہو رہی ہے مگر تہ خانہ نہیں ہے اس میں۔ تصدیق ہو جائے گی۔"

"ویری گڈ۔ دلاور ان میں بہت کام کیا تو نے۔ کل کو بھی شفٹ کر دیا۔"

"کل کو کہیں سے نہیں دکھانے شفٹ کیا ہے۔ مجھے تو ابھی خود بھی علم نہیں کہ میرے بیوی بچے کہاں ہیں۔" محسن ہنسا "میں آج ہی سیدھا سائٹ سے ایک ٹھیکیدار دن رات کام کر رہا ہے یہ"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے اچھا خاصا تماشا ہوگا۔ خیر ابھی کچھ دیر ہے۔ تو بتا کہ جاوید صدیقی کہاں روپوش تھا۔ میں تو اسے تیرے ساتھ چھوڑ کر گیا تھا۔ مجھے رابعہ نے بتایا کہ تم دونوں رات بھر اس خونخوار لیڈی ڈاکٹر فاطمہ جعفری سے تفتیش کرتے رہے تھے؟ وہ مر گئی تھی؟"

"جاوید صدیقی میرے ساتھ تھا مگر میں خود اسے وہاں لے جانا نہیں چاہتا تھا جہاں فاطمہ جعفری تھی۔ وہ بہت ذہین آدمی ہے فوراً سمجھ جاتا کہ اسی تہ خانے میں ہم نے چوہدری دلاور کو بھی قید کر رکھا تھا اور چوہدری دلاور کی بیوی نے غلط نہیں کہا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے ایک تہ خانے میں ملی تھی۔ اسے ملوانے کے لیے خود سکندر بخت لے گیا تھا اور وہاں چوہدری دلاور انتہائی قابل رحم اور غیر انسانی حالت میں پابند سلاسل تھا۔ جاوید صدیقی کو پہلے بھی شک تھا کہ دلاور کے اغوا کا الزام سازش کے تحت شوکت رانا پر عائد کیا گیا ہے۔ جب اس نے یہ بات کہی تھی تو اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ وہ تہ خانہ دیکھ لیتا تو یہ بھی پتا چل جاتا کہ وہ جگہ رابعہ کی ملکیت ہے۔ جاوید صدیقی نہ دلاور کا دشمن ہے اور نہ ہمارا دوست۔ وہ صاف گو، ایماندار اور فرض شناس آدمی ہے۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ فاطمہ جعفری کو غیر قانونی قید سے رہائی دلانے کے لیے مجھ پر دباؤ ڈالتا۔ وہ کوئی غیر قانونی کام پسند نہیں کرتا۔ وہ مجھ پر حبس بے جا اور اغوا کا مقدمہ کر دیتا اور شاید مجھے گرفتار کرا دیتا۔ اس کے بعد وہ خود چوہدری دلاور کی بیوی کے بیان کی تائید کرتا اور چوہدری دلاور جب ہم پر یہ الزام لگاتا کہ ہم نے اس کو کس طرح قید میں رکھ کے اذیت دی تو جاوید صدیقی خود اس ظلم کا چشم دید گواہ بن جاتا۔ وہ عدالت کو بتاتا کہ میں نے خود وہ جگہ دیکھی ہے اور ان انسانیت سوز حالات کا بھی مشاہدہ کیا ہے جہاں سکندر بخت اور محسن نے چوہدری دلاور کو زنجیروں میں باندھ کے رکھا تھا۔ جب وہ مرنے کے قریب ہو گیا تو وہ اسے اٹھا کے شوکت رانا کے گھر میں ڈال آئے۔ خود ہی پولیس اور اخبار والوں کو بلا لیا اور اسے گرفتار کرا دیا۔ شوکت رانا کے گھر میں جو کچھ ہوا اس کے ذمے دار وہی دونوں ہیں۔ شوکت رانا تو صاف بچ جاتا۔ قتل ڈکیتی اور آتش زنی کے سارے الزامات ہم پر آ جاتے۔ دلاور کے سابقہ جرائم کی نوعیت تو نہ بدلتی مگر اس صورت حال کے سامنے آتے ہی ہم ظالم بن جاتے اور وہ مظلوم کہلاتا۔"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "تم نے دور اندیشی سے کام لیا برخوردار۔ ہم خوش ہوئے تمہاری دانائی اور فہم و فراست پہ۔"

محسن نے اپنی بات جاری رکھی "اب تو ہم ڈٹ کے جھوٹ بول سکتے ہیں اور سچ بتانے والوں کو بھی جھوٹا کر سکتے ہیں۔ چوہدری دلاور کی بیوی کہتی ہے تو بتائے کہ وہ تہ خانہ ہے کہاں۔ چوہدری دلاور نے اسیری کے حالات کا جو دردناک نقشہ کھینچا ہے وہ فرضی

www.paksociety.com

ثابت کرنے کے لیے کہ کام نوٹ بٹنے سے چل رہا ہے۔ وہ بھی اپنا ہی کوئی ہے۔ منظر نے کسی کیس میں اس کی بیوی کی تھی اور اسے سزائے موت سے بچا کے صاف بری کرالیا تھا۔ وہ لاہور کارپوریشن کا پرانا ٹھیکے دار ہے۔ اس نے بیک ڈیٹ میں ٹھیکہ دو ٹھیکہ پاس کرا کے کام شروع کردیا۔ کہہ رہا تھا کہ تہ خانے کو تو میں کنکریٹ سے ایسا بھروں گا کہ کوئی پھر کھود کے دکھا دے۔ وقار نے آفس کے کسی چپراسی سے مکان کی بات کی تھی۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ کس کے لیے چاہیے۔ یہ کہا تھا کہ جگہ کچھ محفوظ ہونی چاہیے۔ وہ چپراسی خود لے گیا کل کو اور یوں کر۔"

"کہاں سے لے گیا؟"

"کل آفس میں آئی تھی برقعہ اوڑھ کے۔" محسن نے کہا۔

اب وہ بجنے والے تھے۔ فاطمہ جعفری کے بارے میں کوئی بات کرنے کے لیے وقت ہی نہیں رہا تھا۔ ٹھیک دو بجے ایک کار گولی کی طرح اندر آئی۔ اس میں چھ سات افراد ٹھنسے ہوئے تھے۔

محسن نے کہا "اخبار والے تو آگئے۔"

"ہم ان کے ساتھ چلیں یا انتظار کریں جاوید صدیقی کا۔"

محسن نے مجھے آنکھ ماری "پہلے ہم سب مل لیں نئے ایس ایس پی سے۔ جاوید صدیقی اپنے کمرے میں خود پہنچ جائے گا۔"

اندر آنے والی دوسری گاڑی منظر کی تھی جس میں اس کے ساتھ رابعہ زخمی ہوئی تھی۔ محسن اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

منظر نے سر نکال کے کہا "بھونک کے۔ پہنچے بھی وہ آنکھیں نکلوا لے۔"

محسن نے کہا "تو اپنی آنکھیں عطیہ کرکے مرجاؤ میں نکلوا لوں گا۔"

پانچ اخبار والے اور ایک فوٹو گرافر ایک ہی گاڑی میں سے برآمد ہو چکے تھے۔ انھوں نے باری باری سب سے مصافحہ کیا۔ وہ سب پولیس ہیڈ آفس کے راستوں سے واقف تھے اور جانے پہچانے لوگ تھے۔ منظر نے اس جلوس کی قیادت کی اور ہم سیڑھیوں کے راستے اوپر جاوید صدیقی کے کمرے میں پہنچ گئے جہاں اب "ارشد کریم ربانی" کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

ارشد کریم ربانی کو ابھی ابھی وکیلوں اور صحافیوں کی یلغار کی اطلاع ملی تھی اور وہ فیصلہ نہیں کرپایا تھا کہ انھیں کیسے روکے۔ وہ صرف جاوید صدیقی کا انتظار کررہا تھا جو ٹھیک دو بجے اسے چارج دینے کے لیے آنے والا تھا۔

اس کے دروازے پر کھڑے ہوئے کانسٹیبل نے منظر کو روکنے کی ناکام کوشش کی۔ منظر اکیلا نہیں تھا۔ ایک کمزور سا کانسٹیبل اس کی راہ میں حائل ہوکے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ منظر نے حسب عادت اسے بھی بھونک کا کہا اور اندر گھس گیا "ہم ملنے آئے ہیں جاوید صدیقی سے۔ ہمارا اس کا معاملہ کچھ اور ہے۔ ایس ایس پی ہوگا وہ تمھارا۔"

ارشد کریم گڑبڑا کے کھڑا ہوگیا۔ وہ حلیے اور صورت سے روایتی قسم کے پرانے پولیس مین کی تصویر تھا۔ اس کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس نے اپنے کیریئر کا آغاز ایک کانسٹیبل کی حیثیت سے کیا ہوگا۔ بیس پچیس سال میں درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے اس نے ایس پی کا عہدہ حاصل کیا ہوگا اور اسے عارضی طور پر ایس ایس پی کا عہدہ ملا تھا۔ ایسے لوگ ڈی ایس پی بن کے ریٹائر ہو جاتے ہیں مگر کچھ خوش نصیب ہیں جن کو ذاتی اوصاف کی بنا پر آگے بھی ترقی مل جاتی ہے۔ اوصاف میں ذہانت، کارکردگی کا اعلیٰ ریکارڈ یا تجربہ ہی شمار ہوتا۔ سفارش، سازشی ذہن اور خوشامد پرستی کے عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔

براہ راست افسر بننے والے نوجوان [illegible] مہذب بھی ہوتے ہیں۔ ارشد کریم کی صورت پر اس کی عمر بھر کے سارے تجربات کی تحریر نے ایک ایسی کرختگی پیدا کردی تھی جس میں تھانوں کے ماحول کا عکس نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش میں بے حسی آمیز سفاکی جھلکتی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ نفرت اس کی شخصیت میں یوں رچ بس گئی ہے کہ وہ وکیلوں اور صحافیوں جیسے معزز لوگوں کو بھی مجرم کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہے۔

اس نے میز پر ہاتھ مار کے کہا "واٹ از دس؟"

منظر نے بہترین اداکاری کی "یہ؟ اسے میز کہتے ہیں محترم۔ اس پر زور سے ہاتھ مت ماریں۔ ٹوٹ جائے گی۔ قدیم چیز ہے اور پرانی ہوگی۔"

باقی لوگ ہنسے اور کرسیوں پر قابض ہوگئے۔ ارشد کریم بے بسی اور غصے سے ہونٹ کاٹتا رہا "کس نے اجازت دی ہے آپ سب کو میرے کمرے میں آنے کی۔"

"ہم بدتمیز لوگ ہیں۔ بلا اجازت ہر جگہ گھس جاتے ہیں۔" ایک صحافی بولا۔

"مگر اس وقت تو مہمان ہیں آپ کے۔ آپ نے ہی بلایا تھا نہیں؟" دوسرا بولا۔

"میں نے؟" ارشد کریم بگڑ کے بولا "یہ کیا بکواس ہے؟"

اب منظر نے اسے آڑے ہاتھوں لیا "آپ سے مخاطب ہوں۔ زیادہ شور مچانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایس ایس پی جاوید صدیقی کا کمرا ہے۔ سمجھے!"

"یہ میرا کمرا ہے۔ میں ایس ایس پی ارشد کریم ربانی ہوں۔ مجھے جاوید صدیقی کی جگہ پوسٹ کیا گیا ہے۔" ارشد کریم کچھ سنبھل گیا۔

"کب چارج لیا تم نے اس سے؟" یہ سوال میں نے معروف کیا۔

اس نے مجھے گھورا "تم ہو کون؟ [illegible] سمجھا دو میری طرف سے۔ میں جاوید صدیقی نہیں ہوں [illegible]

"[illegible] لے رہے میں اس کی ساری فریج نکال دوں گا۔"

محسن نے براہ راست کہا "وہ طریقہ بھی بتا دیں مجھے کہ آپ کسی کی فریج کیسے نکالتے ہیں۔ آکر میں اسے سمجھا دوں۔"

اب منظر نے کہا "میرے خیال میں یہ سمجھاؤ کہ چارج لیے بغیر تم کیسے نئے ایس ایس پی ہوگئے۔ رہے تو خاص کوئی چیز ہو تم بھی۔ مگر جاوید صدیقی کی جگہ بیٹھنے کا اختیار خود تم نے کیسے لے لیا۔"

اچانک جاوید صدیقی چہکتا ہوا اندر آگیا "ہیلو ایوری باڈی۔ ہیلو ارشد!" اس نے مسکرا کے سب سے مصافحہ کیا اور فرداً فرداً سب کی خیریت دریافت کی۔

ارشد کریم نے اندازہ کرلیا کہ جاوید صدیقی کے سب سے ذاتی سطح پر اچھے مراسم ہیں اور وہ جاوید صدیقی کی عزت کرتے ہیں۔

"سنا ہے آپ جا رہے ہیں چارج دے کر؟" ایک صحافی نے کہا۔

"ہاں میں چارج دینے کے لیے ہی آیا تھا مگر آپ لوگ یہاں کیسے؟ سب ایک ساتھ؟"

"ہمیں پریس کانفرنس کے لیے بلایا گیا تھا۔"

ارشد کریم نے زہر خند مسکرا کے کہا "عجیب بات ہے۔ میں نے کسی کو بھی نہیں بلایا تھا مگر یہ لوگ بضد ہیں۔"

جاوید صدیقی نے کہا "ارشد کریم! اگر تم برا نہ مانو تو مجھے اپنی درازیں خالی کرنی ہوں گی۔ چارج رپورٹ بنانے کے بعد تم دستخط کردو گے تو میں سب تمھارے لیے خالی کردوں گا۔"

ارشد کریم کو ان سب کے چہروں پر تمسخر آمیز طنزیہ مسکراہٹ نظر آئی جو ابھی چند منٹ پہلے اس کی پوسٹ اور اختیار کو چیلنج کرچکے تھے مگر جاوید صدیقی کو انکار کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نے کرسی چھوڑتے ہوئے خود کو سخت بے عزت محسوس کیا اور خون کے گھونٹ پی کے دائیں طرف والی کرسی پر آگیا۔

میں نے محسن سے فرنچ میں کہا "ذرا اس اکڑ فوں خاں سے پھر پوچھو کہ یہ کیا کرے گا میرے ساتھ۔ اسے تھوڑا سا مرچ مصالا لگا۔"

محسن نے کہا "وکیل صاحب پوچھ رہے ہیں کہ نئے ایس ایس پی [illegible] کے عام [illegible] جتنی عقل بھی نہیں رکھتے؟ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے الفاظ کو وکیل سمجھ کے ہر شخص کو [illegible] کے ساتھ رپورٹ ارسال کی گئی تو شاید ان کی وردی اتر جائے۔"

"شٹ اپ۔ کوئی صحافی وردی اتروا سکتا ہے۔" اس نے بھڑک کے ایک گالی دی۔

جاوید صدیقی نے بگڑ کے کہا "ارشد کریم! زبان کو لگام دو۔ تم ابھی میرے آفس میں بیٹھے ہو اور یہاں ایک خاتون وکیل بھی موجود ہے۔"

"آپ چارج رپورٹ بنائیں۔"

"مجھے سر کہو۔ تم بہت جونیئر ہو مجھ سے اور ایس پی ہو ابھی۔ اگر میں چارج رپورٹ بنانے سے انکار کردوں تو تم کیا کرو گے؟"

"یہ تو ڈسپلن کی بات ہے سر۔ آپ کو آرڈر مل چکے ہیں۔"

"فرض کرو میں آرڈر پھاڑ کے پھینک دیتا ہوں ایسے۔" جاوید صدیقی نے پوسٹنگ آرڈر کے پرزے کرکے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیے "اب تم جاؤ اور ڈی آئی جی کو رپورٹ کرو۔ وہ میرے خلاف ڈسپلن کی خلاف ورزی پر جو ایکشن لینا چاہیں لے سکتے ہیں۔ وہ مجھے معطل کرسکتے ہیں زیادہ سے زیادہ۔ پھر انکوائری ہوگی اور چارج شیٹ۔ میری ایک سال کی ترقی روک لی جائے گی۔ اس سے زیادہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ کوئی مجھے گرفتار کرسکتا ہے اور نہ پھانسی چڑھا سکتا ہے۔"

ارشد کریم کا رنگ فق ہوگیا۔ سب کی نظریں اس کا مذاق اڑا رہی تھیں اور وہ سخت ذلت محسوس کررہا تھا۔

"تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا۔" جاوید صدیقی بولا "کس نے تم سے کہا ہے کہ میرے آفس سے جاؤ۔ میں چارج نہیں دے رہا ہوں۔ جا کے کہہ دو ڈی آئی جی صاحب سے۔ ان کو یہ بھی بتا دینا کہ میں استعفیٰ دے رہا ہوں لیکن اس سے پہلے یہ جو صحافی اور وکیل یہاں آئے ہوئے ہیں، میں ان کے سامنے سارے حقائق رکھوں گا۔ تم نے انھیں بلایا ہوگا چارج رپورٹ کی تقریب میں شاندار کوریج کے لیے۔"

"نہیں۔۔۔ میں نے کسی کو نہیں بلایا سر۔"

"یہ تم بعد میں وضاحت کرتے رہنا۔ یہ لوگ بہرحال اپنی بات پر قائم ہیں کہ تم نے انھیں مدعو کیا تھا۔ اب میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کررہا ہوں۔ یہ بھی ڈسپلن کی خلاف ورزی ہے لیکن اس کے بعد استعفیٰ دے کر میں ہر ذمے داری سے سبکدوش ہوجاؤں گا۔ آگے جو ڈی آئی جی صاحب کی مرضی۔ وہ میری جگہ تمھیں بٹھادیں یا خود بیٹھ جائیں۔"

ارشد کریم بڑی مشکل سے اٹھا "آپ غلطی کررہے ہیں سر۔"

"شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔" جاوید صدیقی نے دہاڑ کے کہا۔

غصے سے ارشد کریم کا چہرہ سرخ پڑ گیا "میں سمجھ لوں گا تم سے۔" اس نے جاتے ہوئے زیر لب کہا۔

"ایک منٹ رکو۔" جاوید صدیقی بولا "اگر میں چاہوں تو تمھیں گرفتار کرا سکتا ہوں۔ تم نے دھمکی دی ہے مجھے اور سب نے سنی ہے۔ بیٹھ جاؤ۔"

ارشد کریم بیٹھ گیا "میں فون پر بات کرنا چاہتا ہوں ڈی آئی جی صاحب سے۔"

"کرلینا بعد میں۔" جاوید صدیقی بولا "یہ بتاؤ کہ تم نے میری عدم موجودگی میں کوئی احکامات تو جاری نہیں کیے تھے۔"

"احکامات جاری کیے تھے ابھی آرڈر نہیں ہوئے اسٹینو

www.paksociety.com

کے پاس ہیں۔"
جاوید صدیقی نے انٹرکام پر اسٹینو کو حکم دیا "ارشد کریم صاحب نے جو احکامات دیے ہیں نافذ ہونے کے لیے۔ ان پر کس کا نام ہے۔ کیوں؟ کیا وہ چارج لے چکے ہیں مجھ سے؟ ابھی میں انچارج ہوں انچینٹ؟" پھر وہ ارشد کریم سے مخاطب ہوا "ابھی تمہیں یہ اختیار نہیں ملا ہے ارشد کریم کہ تم میرے آفس کے معاملات چلانے لگو۔"

سب صحافی اور وکیل خاموش بیٹھے ہوئے قدرے افسوس کے ساتھ یہ تماشا دیکھ رہے تھے حقیقت سے سب آگاہ تھے مگر انتظامی امور میں دخل اندازی کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

جاوید صدیقی نے اپنے پی اے کو چائے کے لیے کہا اور بولا "آئی ایم سوری جنٹلمین۔ یہ مجبوری اور غیر متوقع بریس کانفرنس ہے جس کے لیے شاید آپ بھی تیار نہیں تھے اور میں بھی تیار نہیں ہوں۔ آج آپ کی خاطر تواضع کچھ ادھوری رہے گی لیکن خبر آپ کو بھرپور ملے گی۔ ویسی ہی جیسی آپ لوگ پسند کرتے ہیں۔"

کسی نے کہا "خبر تو صرف خبر ہوتی ہے۔ پسند یا ناپسند کا کیا سوال۔"

"میرا مطلب تھا ایک اچھی سنسنی خیز سرخی کے لیے۔ آپ سب لوگ ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ یہاں ایک طرف وکلا ہیں۔ یہ سب مدعی ہیں ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس میں۔ جس کی تفتیش کے لیے مجھے بطور خاص اسلام آباد سے یہاں بھیجا گیا تھا۔ میرے آنے سے پہلے اس کیس میں جو پیش رفت ہوئی تھی وہ آپ جانتے ہیں۔"

پیش رفت کے لفظ پر کچھ لوگ مسکرائے۔ اس کے آنے سے پہلے تفتیشی ٹیم سر براہ عید منوانی کے الزام میں اندر ہو گئی تھی۔

جاوید صدیقی نے پھر کہنا شروع کیا "جب میں نے تفتیش کے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیا تو مجھے متعدد مسائل کا سامنا تھا۔ یہ کیس مشکل تھا مگر بہت سے کیس مشکل ہوتے ہیں اور میں خود مشکل پسند ہوں۔ شاید اسی لیے یہ چیلنج مجھے دیا گیا تھا جو میں نے قبول کر لیا لیکن دوسری مشکل تھی عدم اعتبار کی فضا کو ختم کرنا۔ کچھ قصور ہے ہی عوام کا پولیس کے رویے کے باعث یہ خیال ہے کہ سب پولیس والے حرام خور گدھ ہوتے ہیں اور کام اس لیے نہیں کرتے کہ یہ ان کا فرض ہے بلکہ اس لیے کہ ہر کیس میں انہیں مال ملتا ہے اور وہ زیادہ محنت کرتے ہیں زیادہ مالی فائدے کے لیے۔ میں نے اس تاثر کو غلط ثابت کیا۔ جیسے سب صحافی بلیک میلر نہیں ہوتے ایسے ہی سب پولیس والے کرپٹ نہیں ہوتے۔"

ایک صحافی نے کہا "فرق صرف تناسب کا ہے صحافیوں میں ایک فیصد بلیک میلر ہیں پولیس میں ایک فیصد جاوید صدیقی۔"

دوسرے لوگ ہنس پڑے۔ ارشد کریم کا موڈ مزید خراب ہو گیا۔

"اس رقت میں اعداد و شمار سے اس بات کو غلط ثابت کرنے میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔" جاوید صدیقی بولا "راستے اور خلاف کرنے میں بھی کچھ کردار پولیس کا ہے تو کچھ اخبارات کے تعصب کی بنا پر یا اس لیے کہ لوگ ایسا ہی پڑھنا چاہتے ہیں پولیس کے کردار کو ہر معاملے میں مشکوک بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تعریف کرتے ہوئے بھی کچھ صحافی ادیب اور پبلشر کہ بلاشبہ یہ پولیس کی بڑی کامیابی کہی جا سکتی ہے کہنے کے بعد۔ خیر مجھے اپنی بات کرنی چاہیے۔ میں نے آپ سے تعاون مانگا اور کچھ عرصے بعد مجھے کامیابی ہوئی۔ اس کیس کی تیسری مشکل یہ تھی کہ مدعی بیک وقت بارہ سینئر وکلا ہیں جو یہ گیارہ ہو گئے۔ ایک اکیلا اور وہ گیارہ والی بات سنی ہو گی آپ نے اکیلا میں تھا گیارہ کے مقابلے میں۔ میرے سامنے ہر وقت آڑے تلوار رہتی تھی اور میں سخت دباؤ میں تھا۔ افسوس کی بات ہے وکلا نے مجھے اپنا حریف سمجھا۔ حالانکہ ہم حلیف تھے۔"

مظہر نے کہا "یہ رشتہ تو سوکنوں جیسا ہے۔ قانون ہمارا خصم ہے۔ ہماری آپس میں کیسے بن سکتی ہے۔"

سب لوگ ہنس پڑے۔ اسی وقت چائے آگئی۔ جاوید صدیقی کی معذرت کے باوجود کہ کچھ ہو نہیں سکا ضیافت کا پورا اہتمام تھا۔

"اور جناب سب سے بڑی مشکل تھی میرے اپنے محکمے کا رویہ" جاوید صدیقی نے چائے پیتے ہوئے کہنا شروع کیا "سب سے زیادہ عدم تعاون کا مظاہرہ خود پولیس نے کیا۔ میں اس کی وضاحت کر کے اختلاف کو ہوا نہیں دوں گا۔ یہ آپ سب لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کون لوگ تھے جو چاہتے تھے کہ یہ کیس داخل دفتر ہو جائے۔ مجھ پر بہت دباؤ ڈالا گیا۔ ٹیلی فون کروائے گئے۔ بلینک چیک آفر ہوا۔ دھمکیاں دی گئیں کہ میں خطرناک ہو چکا ہوں اور کوئی غرض نہ اٹھاؤں لیکن ایک تو حقیقت کی پروا ہے میرے مزاج اور فطرت کے خلاف ہے کوئی مجھے خرید نہیں سکتا۔"

"کہا یہ جاتا ہے کہ ہر فرد کی ایک قیمت ہوتی ہے اور جو دعوے کرتا ہے کہ وہ بک نہیں سکتا وہ صرف اپنا مول بڑھاتا ہے۔" ایک صحافی بولا۔

"مول کہاں تک بڑھ سکتا ہے آخر؟" جاوید صدیقی نے برا مانے بغیر کہا "بلینک چیک میں مول تول نہیں ہوتا۔ یہ اختیار مجھے دے دیا گیا تھا کہ اس پر میں جو رقم چاہوں لکھ لوں۔ وہ چیک میں نے واپس کر دیا مگر اس کی فوٹو کاپی میرے پاس ہے۔ اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ وہ چیک مجھے دیا گیا تھا۔ وہ بینک کا تھا آپ لوگ یہ تو معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ اکاؤنٹ کس کا تھا اور دینے والا کون تھا۔"

اس انکشاف نے تھوڑی سی ہلچل پیدا کی۔ صحافی لوگ مستعد ہو گئے۔ کسی نے کہا "وہ فوٹو کاپی دے سکتے ہیں آپ انہیں؟"

کے لیے۔ اب میں نے کشتیاں جلانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ حالانکہ اس سے میرے لیے دشواریاں پیدا ہوں گی اور خطرات بڑھ جائیں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو بھی پولیس مین ہے وہ اس فیلڈ میں قدم رکھتا ہے تو دشواریوں سے نمٹنے کے لیے اور خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے۔ یہ کلرکی نہیں ہے! یہ کیریئر نہیں ہے۔ یہاں واسطہ پڑتا ہے مجرموں سے اور مجرموں کے بڑے بڑے گروہوں سے۔ ایسے طاقتور قانون شکن عناصر سے جو ایک ہاتھ میں اہل وزر کے خزانوں کی چابی رکھتے ہیں تو دوسرے ہاتھ میں وہ گولی جس پر آپ کا نام لکھا ہوتا ہے اور اگر آپ پہلے ہاتھ کو جھٹکنے کی گستاخی کریں تو دوسرے ہاتھ کی گولی آپ کے سینے میں اتر جاتی ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ ابھی تک میں کامیاب ہوں اور زندہ بھی ہوں۔ کوئی مجھے فرض کی راہ سے نہیں ہٹا سکا اور میرا ایمان نہیں خرید سکا۔ آگے بھی وہی ہوگا جو خدا چاہے گا لیکن ابھی جو کچھ ہوا ہے وہ بہت افسوسناک ہے۔"

جاوید صدیقی نے ایک گہری سانس لی۔ رومال سے چہرہ صاف کیا اور خاموشی کے ایک ذرا سے وقفے میں جائزہ لیا کہ وہ کس حد تک صحیح تاثر پیدا کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

"مجھے آپ سب کو یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں نے ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس میں قاتل کا سراغ لگا لیا ہے اور چوہدری دلاور کو گرفتار کر لیا ہے۔"

یہ اعلان کیا وہ دھماکا تھا جس کے لیے اس نے خاصی تمہید باندھی تھی۔ میں نے مظہر، رابعہ اور محسن کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے ملی مسرت کے آئینہ دار تھے۔ ہماری جدوجہد رائیگاں نہیں گئی تھی۔ آخر کار قانون کا شکنجہ دلاور کو گرفت میں لے چکا تھا اور اسے چھڑانے کی کوشش کرنے والے ناکام ہو گئے تھے۔ اس کا سارا کریڈٹ جاوید صدیقی کو جاتا تھا جس نے اپنا کیریئر اور اپنی زندگی دونوں کو داؤ پر لگا کے یہ اعلان کیا تھا۔

سب سے پہلے خود رابعہ نے کہا "آپ کو یہ کامیابی مبارک ہو۔"

جاوید صدیقی مسکرایا "اور آپ کو بھی۔ آپ کی مدد کے بغیر یہ کامیابی ممکن نہیں تھی۔"

ایک صحافی نے کہا "آپ کو یقین ہے کہ ڈاکٹر شبلی کو چوہدری دلاور نے قتل کیا تھا۔"

"اس یقین کے بغیر میں یہ الزام کیسے عائد کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے میرے پاس ثبوت ہیں۔ شہادت ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ ہے اور گواہ ہیں۔ میں نے سب کچھ ایک رپورٹ میں لکھ کے آئی جی صاحب کو بھیج دیا ہے اور اب آگے عدالت کی مرضی۔ انصاف کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں اور میں اس نظام انصاف پر پورا اعتماد رکھتا ہوں۔ آپ سب بھی جانتے ہیں کہ جہاں انصاف کا

خون کیسے ہوتا ہے کس طرح حقائق کو مسخ کیا جاتا ہے۔ شمار میں ضائع ہوتی ہیں۔ گواہ توڑے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہماری اعلیٰ عدالتوں میں جو فاضل جج صاحبان بیٹھے ہیں ان کی نظر حقیقت کی گہرائی تک دیکھ لیتی ہے۔ وہ بھی اسی نظام کا حصہ ہیں اور مجھ سے یا آپ سے بہتر طور پر ساری خرابیوں کو سمجھتے ہیں۔ وکیلوں کی دلیل بازی کے مقابلے کو وہ بڑی غیر جانبداری سے دیکھتے ہیں اور کوئی انہیں کنفیوژ نہیں کر سکتا۔ گمراہ نہیں کر سکتا اور ان کے فیصلے پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مجرم شک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بچ جائے اور ایسا شاید کبھی نہیں ہوا کہ بے گناہ کو پھانسی دے دی جائے۔ میرا کام تو ختم ہوا۔ اب آپ لوگوں کا کام شروع ہوتا ہے۔ اس کیس میں آپ انصاف حاصل کر سکتے ہیں۔ جہاں سے بھی ملے۔"

بہت سے سوالات کے بعد جاوید صدیقی نے بتایا کہ اس نے چوہدری دلاور کو کب کہاں اور کیسے گرفتار کیا تھا۔

"افسوس کی بات یہ ہے کہ اس خبر کو دبا دیا گیا۔ حالانکہ چوہدری دلاور کی گرفتاری کے وقت ایک رپورٹر اور فوٹو گرافر موجود تھے۔ آپ سب نے یہ خبر ضرور پڑھی ہوگی کہ غازی اور اس کے ساتھی کو ایک ٹرک نے کچل کر ہلاک کر دیا مگر یہ شاید آپ نہیں جانتے کہ اس وقت وہ چوہدری دلاور کی گرفتاری کی رپورٹ اور تصاویر بنا کے اپنے اخبار کے دفتر جا رہے تھے۔"

ایک دم کئی لوگوں نے کہا "کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ انہیں خاموش رکھنے کے لیے قتل کرا دیا گیا تھا؟"

"یہ تو آپ کہہ رہے ہیں۔" جاوید صدیقی مسکرایا "میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ صرف حقائق بیان کیے ہیں۔ مطلب نکالنا ہے تو آپ کھوج لگا کے نکالیں۔ میں نے احتیاطی سخت حفاظتی اقدامات کے ساتھ چوہدری دلاور کو ایک ایسی جگہ منتقل کیا جہاں کسی کی رسائی نہ ہو۔ اگر میں محتاط نہ ہوتا اور اپنا راستہ نہ بدلتا تو شاید چوہدری دلاور کو پولیس کی تحویل سے چھڑانے کی کوشش بھی کامیاب ہو جاتی۔ جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں وہ تقریباً پیٹا لیس دن غائب رہنے کے بعد گرفتار ہوا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی مگر اب ٹھیک ہے۔"

"کیا اسے اغوا کر کے قید میں رکھنے والا اسی کا پارٹنر شوکت رانا تھا؟" ایک صحافی نے سوال کیا۔

"حالات اور واقعات کی شہادت سے یہی ثابت ہوتا ہے مگر میری ذاتی رائے ہے کہ نہیں۔"

"کیا گرفتاری کے بعد آپ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اسے کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے کے پابند نہیں تھے؟"

"مجسٹریٹ سے اس کا ریمانڈ لے لیا گیا تھا۔" جاوید صدیقی بولا "سات دن کا فزیکل ریمانڈ رہیں دیا گیا جہاں چوہدری دلاور کو علاج کے لیے رکھا گیا تھا۔ باقاعدہ علاج سے اس کی حالت بہت بہتر

www.paksociety.com

ہوگئی ہے۔ کل مسٹر دلاور کی حبس بے جا کی درخواست کے جواب میں ایڈووکیٹ جنرل کا بیان ہوگا۔ اصولاً حلف نامہ مجھے داخل کرنا تھا کیونکہ تفتیش بھی میں نے کی تھی اور گرفتاری بھی مگر جیسا کہ آپ سب دیکھ رہے ہیں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اس فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہو جاؤں۔ یہ کام اب مسٹر ارشد کریم رہانی کریں گے۔ اب آپ لوگ سوال کریں گے کہ اس مرحلے پر تبدیلی کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی۔ اس کا ایک سیدھا سادہ جواب یہ ہو سکتا ہے کہ میرا کام تفتیش کرنا تھا۔ وہ میں نے کرلیا۔ اب مقدمے کی پیروی کون کرتا ہے یہ سوچنا میرا کام نہیں ہے لیکن کاش جواب اتنا ہی سیدھا سادہ اور منطقی ہوتا۔ اصل بات یہ ہے کہ افسران بالا میری کارکردگی کے نتائج سے خوش نہیں ہیں۔ یہ تو برطانوی حکومت کا دباؤ تھا جس کی وجہ سے تفتیش کو ادھورا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا ورنہ کیس تو داخل دفتر کیا جا چکا تھا۔ اے کے مدنی بھی بہت بڑے گیارہ وکیل تھے مگر معذرت کے ساتھ ڈاکٹر شیلی اگر برطانوی شہری نہ ہوتی پاکستانی ڈاکٹر ہوتی تو آپ سب کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ عدالت میں ثبوت اور شہادت پیش کرنا پولیس کا کام ہے اور پولیس کے کچھ بدعنوان افسر ملزموں کا ساتھ دینے کے جرم میں گرفتار بھی ہوئے مگر ان کے علاوہ ملزموں کے بہت ساتھی اور حمایتی ہیں۔ ملزم چوہدری دلاور کا اثر رسوخ اور اس کے تعلقات کا سلسلہ بہت لمبا ہے۔ میں صحیح سمت میں تفتیش کرکے اور تفتیش کے نتیجے میں ملا چوہدری دلاور کو گرفتار کرکے مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ یہ خبر کسی اخبار کو فراہم نہیں کی گئی۔ گرفتاری ایسے وقت میں ہوئی جب وہاں پنچایت کے دو ہی ارکان تھے گروہ مارے گئے یا مار دیے گئے۔ باقی تھے یہ سب لوگ جو اس وقت یہاں موجود ہیں مگر یہ ایک پارٹی ہیں۔ ان کی گواہی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مجھ سے افسران اعلیٰ نے مطالبہ کیا کہ میں چوہدری دلاور کو چھوڑ دوں جب میں نے اس سے انکار کیا تو مجھے لالچ اور پھر دھمکی سے یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ میں جھوٹ بولوں۔ مسٹر دلاور نے عدالت میں جو درخواست دائر کی ہے اس کے جواب میں یہ حلف نامہ داخل کروں کہ میں نے چوہدری دلاور کو گرفتار ہی نہیں کیا۔ اس کے بعد ایڈووکیٹ جنرل حکومت کی طرف سے بیان دے گا کہ چوہدری دلاور پولیس کی تحویل میں نہیں ہے۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے بعد کیا ہوتا۔ چوہدری دلاور ابھی کڑے پہرے میں ہے۔ پہرا ہٹا لیا جاتا اور چوہدری دلاور کو آزاد کر دیا جاتا کہ اب تم جہاں چاہو جاؤ۔ وہ مجرم ہے۔ اسے گرفتار کرکے چھوڑنے کا کیا مقصد ہے آخر؟ یہی کہ وہ ملک سے فرار ہو جائے اور پھر ہاتھ نہ آئے۔ لیکن میں اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول سکتا تھا۔ وہ بھی عدالت میں۔ سب کچھ میرے بیان پر منحصر تھا اور مجھے بیان بدلنے کے لیے کس قسم کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا یہ میں بتا نہیں سکتا۔ میں تین دن روپوش رہا تاکہ مجھ سے چارج نہ لیا جا سکے۔ میں نے اپنے بیوی بچوں کو بھی گھر سے بے گھر کر دیا۔ میری تلاش میں کچھ لوگ اسلام آباد پہنچے اور انہوں نے میرے گھر کے بند دروازے کھول کے مجھے اندر تلاش کیا صرف اس کے لیے کہ میں اندھیرا کرکے گھر میں تو چھپا ہوا نہیں ہوں۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں مل جاتا تو شاید اب تک میری تدفین عمل میں آچکی ہوتی۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ جان جاتی ہے تو جائے۔ میں جانتے بوجھتے ضمیر فروش نہیں بنوں گا۔ مجھے عاقبت میں سرخرو ہونا ہے دنیا میں نہیں۔ اب میں آپ سب کو بتا رہا ہوں کہ چوہدری دلاور کو میں نے گرفتار کیا تھا۔ میں آپ کی اس سے ملاقات کرا دوں گا۔ آپ دیکھ لیں گے کہ وہ حفاظتی تحویل میں ہے۔ ایڈووکیٹ جنرل نہیں کہہ سکتا کہ وہ پولیس کو مطلوب ضرور ہے مگر پولیس کی تحویل میں نہیں۔ حکومت اسے عدالت میں پیش کرنے کی پابند ہے۔ اس کے خلاف مکمل تفتیشی رپورٹ میں نے انسپکٹر جنرل کو ارسال کر دی ہے۔ اس کی ایک نقل میں نے چیف جسٹس کو بھی بھیج دی ہے۔ یہ تمام حقائق بیان کر دیے ہیں۔ میں نے گورنر، صدر اور چیف جسٹس سے درخواست کی ہے کہ میری اور میرے خاندان کی جان کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ یہ سب ڈسپلن کی خلاف ورزی ہے اور قواعد و ضوابط کے مطابق ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں یہ برطرفی بھی منظور ہے۔ میں تو استعفیٰ اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔ اس میں بھی میں نے استعفیٰ دینے کی وجوہات بیان کر دی ہیں اور سب کو اس کی نقل مل جائے گی۔ میرا جو انجام ہو سو ہو مگر میں امید رکھتا ہوں کہ اگر میں نے کوئی غلطی نہیں کی تو میرا ساتھ دیں۔ بالکل اسی طرح جیسے غلطی کرنے پر آپ سب میرا احتساب کرتے۔ خدا کے سوا میں کسی سے نہیں ڈرتا مگر میں صاحب ضمیر لوگوں سے حمایت کی توقع رکھتا ہوں۔ صرف انصاف کی خاطر۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں جاوید صدیقی ہانپتا رہا۔ وہ بے حد جذباتی ہو گیا تھا اور اس کا بیان کسی سیاسی جلسے کا خطاب بن گیا تھا مگر یہ فطری بات تھی جس کے ساتھ ناانصافی ہو وہ فریاد کرتا ہے اور جسے جان کا خطرہ ہو وہ مدد کے لیے پکارتا ہے۔

سب سے پہلے منظر نے آگے بڑھ کے جاوید صدیقی سے ہاتھ ملایا "تم گریٹ ہو ایس ایس پی صاحب۔ یہ سارے وکیل تمہارا کیس سپریم کورٹ تک لڑیں گے۔ جو آج مدعی ہیں۔"

رابعہ نے کہا "ہمیں تمہاری جرات اور ہمت کی داد دینی چاہیے۔ واقعی بہادر تم ہی ہو۔"

ایک صحافی نے کہا "اب آپ ہم پر چھوڑ دیں۔ ہم سب باجا بجا دیں گے۔"

"دیکھتے ہیں کون مائی کا لال تمہاری اس پوزیشن اور حیثیت کو خراب کرتا ہے۔" دوسرا بولا۔

"اس کیس کا پورا کریڈٹ تمہیں ملے گا۔" تیسرے نے کہا۔ "اس کے بعد تم یہاں رہو یا نہ رہو۔"

جاوید صدیقی اٹھ کھڑا ہوا "ٹھیک ہے۔ اب آپ لوگ میرے ساتھ چلیں لیکن پہلے یہ لیں میرے استعفیٰ کی نقل۔"

مظہر نے کہا "اتنی کیا جلدی ہے یار استعفیٰ دینے کی۔"

"مظہر صاحب۔ میں جانتا ہوں کہ اب نوکری جاری رکھنا میرے لیے عملاً ناممکن ہے۔ میں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔"

رابعہ نے استعفیٰ کی نقل کو دیکھا "اس میں وضاحت ہے کہ تم کیوں استعفیٰ دینے پر مجبور ہوئے۔"

"سب تفصیل ہے اس میں۔"

"پھر ہم کل ہی بار کی میٹنگ کال کرتے ہیں۔ یہ قرارداد پاس کرنے کے لیے کہ جاوید صدیقی کا استعفیٰ نامنظور کیا جائے۔"

"وفد آئے گا تم سے مطالبہ کرنے کہ استعفیٰ واپس لو۔"

"یہ سب بے کار ہے۔ ملازمت میں سیاست کرنا بھی جرم ہے۔ ملازمت کے قاعدے قانون بدلے نہیں جا سکتے۔ اعلیٰ افسران کے پاس جو انتظامی اختیارات ہیں ان کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے کہیں بھی ٹرانسفر کر سکتے ہیں یا غیر معینہ مدت کے لیے معطل کر سکتے ہیں۔ جب تک کوئی مجھے سزا نہ سنا دے میں اپیل نہیں کر سکتا اور جب تک اپیل مسترد نہ ہو جائے کسی عدالت میں نہیں جا سکتا۔ یہ سب ایسے ہی سہی۔ مجھے نوکری کی فکر نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس قسم کی غلامی کیے بغیر بھی میں عزت سے گھر بیٹھ کے دو وقت کی روٹی کھا سکتا ہوں۔ ہر شریف آدمی کی طرح میں بھی لاقانونیت سے ڈرتا ہوں۔ جس کا نشانہ میں بھی ہو سکتا ہوں اور میرے بیوی بچے بھی۔"

ارشد کریم کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ شاید تھانہ انچارجی کے زمانے سے بہت سفاک اور منہ زور افسر مشہور ہوگا جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا ہوگا۔ اپنے اختیارات سے بھرپور تجاوز کرتے ہوئے عیاری اور مکاری سے خود کو محفوظ رکھتا ہوگا مگر یہاں پہنچ کے اچانک اسے احساس ہوا کہ تیر کر ندی پار کر لینے والا سمندر پار نہیں کر سکتا۔ اس کے مقابل وہ صحافی تھے جو مملکت کے چوتھے ستون کی حیثیت رکھتے تھے اور وہ وکیل تھے جو نظام انصاف کے تحفظ کے ذمے دار اور قانون کے رکھوالے تھے۔ یہ عام لوگ نہیں تھے۔ مجتمع حالت میں بہت طاقتور اور مضبوط لوگ تھے۔

جاوید صدیقی نے کہا "ارشد کریم۔ اگر تم چاہو تو ہمارے ساتھ چلو۔ ملزم کا چارج پہلے لے لو یا تم چاہو تو یہیں فون پر ڈی آئی جی صاحب سے بات کرلو۔"

"شکریہ۔ یہاں رکنا پسند کروں گا سر۔" ارشد کریم نے سنبھل کر کہا "آپ واپس آکے چارج رپورٹ بنا لیں۔"

صورت حال سنگین ہوگئی تھی۔ میں اور محسن جاوید صدیقی کے لیے فکرمند تھے جس کا مستقبل مخدوش ہو گیا تھا اور ہم فرنچ میں باتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ جاوید صدیقی نے انتہائی قدم اٹھا کے دلاور اینڈ کمپنی کی دشمنی مول لے لی ہے اور اپنے محکمے کے گندے تالاب کے مگرمچھوں سے بیر کے بعد وہ اس تالاب سے باہر بھی محفوظ نہیں۔ مشکل یہ تھی کہ ہم اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

جاوید صدیقی نے یہی سمجھا کہ محسن اب مجھے پریس کانفرنس کے بارے میں بتا رہا ہے۔ میری تجویز پر تین گاڑیوں کے مسافروں کو اس طرح تقسیم کیا گیا کہ منظر کی گاڑی میں رابعہ کے ساتھ میں خود بیٹھا اور ہم نے اپنے ساتھ جاوید صدیقی کو رکھا۔ دوسری گاڑی میں ایک صحافی اور ایک فوٹو گرافر کے علاوہ جاوید صدیقی کے ڈرائیور کو رکھا گیا۔ جو اس کا ذاتی گن مین بھی تھا۔ یہ گاڑی پائلٹ کار کے طور پر آگے رہی۔ تیسری گاڑی جس میں سارے صحافی بھر کے آئے تھے پیچھے ہو گئی اس میں اب چار ہی افراد تھے جن میں ایک محسن تھا۔

ریوالور میرے پاس بھی تھا اور یہ وہی ریوالور تھا جو میں نے شیخ مختار عرف استاد پیڈرو سے چھینا تھا۔ یہ ریوالور میں نے محسن کے حوالے کر دیا۔ اس طرح ہر کار میں کم سے کم ایک مسلح شخص ہو گیا اور یہ کارواں مین گیٹ سے باہر آیا تو پیچھے پولیس ہیڈ آفس میں افراتفری پھیل چکی تھی۔ جاوید صدیقی کی بغاوت نے صورت حال کو ڈی آئی جی صاحب کے قابو سے بھی باہر کر دیا تھا۔ شاید ارشد کریم خود ان کو بتانے کے لیے دوڑا ہوگا کہ چارج دینے کے لیے آنے والے جاوید صدیقی نے پریس کانفرنس کر ڈالی ہے اور سب کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ ڈی آئی جی صاحب اس وقت تک مطمئن ہوں گے کہ جاوید صدیقی کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اس کا دماغ ٹھکانے پر آ گیا ہوتا تو وہ چارج دینے کیوں آتا۔ انہیں شک ہوتا کہ وہ دھماکا کرنے آیا ہے تو وہ اس کا کچھ بندوبست کرتے۔

آدھے گھنٹے تک گاڑیاں آگے پیچھے چلتی رہیں۔ پھر کوٹ لکھپت کا علاقہ آ گیا جہاں جیل بھی تھی۔ جاوید صدیقی نے جیل کے احاطے میں داخل ہو کے گاڑیاں اس حصے میں رکوا دیں جہاں جیل حکام اور وی آئی پی قسم کے لوگوں کی گاڑیاں ہی کھڑی ہو سکتی تھیں۔

"آپ نے چوہدری دلاور کو یہاں پہنچایا تھا۔ سزا سے پہلے۔" رابعہ نے کہا۔

"مس رابعہ۔ اس کو جیل کے اسپتال میں رکھا گیا تھا۔" جاوید صدیقی نے کہا۔

"مگر پہلے آپ نے کچھ اور بتایا تھا۔"

"مصلحت اور ضرورت کے تحت تھوڑی بہت غلط بیانی کرنی پڑتی ہے ورنہ سراغ لگانے والے ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ اصل مقصد تھا اس کی سیکیورٹی۔" جاوید صدیقی نے باہر کے آفس سے

www.paksociety.com

جیلر کا نمبر ملایا۔

"دلاور کو یہاں رکھنے کے لیے آپ کو متعلقہ حکام نے اجازت بھی دی ہوگی۔" منظر بولا۔

"ہاں جیل میں تو میرا حکم نہیں چلتا نا۔ ویسے جیلر دوست ہے میرا۔ ہم ایک ساتھ سول سروس میں آئے تھے۔ ہاں کون؟ خورشید۔ یار میں جاوید ہوں۔ یہاں باہر اور کہاں۔ ہاں او کے مگر کتنی دیر میں؟ دس منٹ نہیں ہونے چاہئیں۔"

ہم سب ایک آفس جیسے ویٹنگ روم میں کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ عام قیدیوں کے ملاقاتیوں کو کسی انتظار گاہ کی سہولت میسر نہیں تھی مگر یہ اے اور بی کلاس قیدیوں سے ملنے والوں کا ویٹنگ روم تھا۔ مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا مجھے جاوید صدیقی کے ڈرامے کی ناکامی کا خیال زیادہ پریشان کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ عین وقت پر کچھ ہو جائے گا اور ہم سب ٹھنڈے ٹھنڈے واپس لوٹ جائیں گے۔

خورشید پندرہ منٹ گزرنے سے پہلے ہی آ گیا۔ وہ لمبا تڑنگا اور ایتھلیٹ قسم کا جوان تھا جو ذرا بھی جیلر نہیں لگتا تھا۔ جاوید صدیقی نے ہم سب کا تعارف کرایا۔ خورشید کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔

"یہ صحافی اور وکیل کیوں لگے یہاں؟"

کسی وجہ کے بغیر میں نے محسن سے کہا "یار میں باہر انتظار کرتا ہوں۔ مجھے یہاں کچھ گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔ یہ کمرا ہر طرف سے بند ہے۔"

میں نے باہر آ کے ایک گہری سانس لی۔ یہ میری چھٹی حس تھی یا میرا وہم تھا۔ میں نے باہر رک کے سوچا۔

اچانک خورشید اور جاوید صدیقی باہر آ گئے "کیا بات ہے؟"

خورشید نے میری طرف دیکھا "آپ اندر جائیں پلیز۔"

جاوید صدیقی نے کہا "یہ فریج کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ اس کی فکر مت کر۔"

"میں بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔"

"وہ کیسی مشکل؟"

"انسپکٹر جنرل پریزن کا فون آیا تھا۔ اس نے مجھے بہت ڈانٹا کہ تم نے ایک ایسے ملزم کو اسپتال میں کیوں رکھا جس کا چالان بھی ابھی تک پیش نہیں ہوا تھا۔ اور سنا ہے مجسٹریٹ نے تمہارے اسپتال میں آ کے اس کا ریمانڈ دیا تھا۔"

"اس میں کون سی بات خلاف قانون تھی؟"

"تفتیش کے نتیجے میں اس کی حالت بگڑ گئی ہے۔ ابھی وہ اس قابل نہیں تھا کہ اس پر فرد لگے۔"

"کس نے جسمانی تشدد کیا ہے اس پر؟ کس کے حکم سے اور کس کی اجازت سے؟" جاوید صدیقی بگڑ گیا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ تمہارے اپنے آدمی اس کی حفاظت پر مامور تھے۔ اس کا بچنا مشکل ہو گیا ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" جاوید صدیقی بولا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہ کچھ دیر کا مہمان ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔"

"یار میں تم سے جھوٹ بول سکتا ہوں۔" خورشید نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"خورشید۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ جیسا بھی ہے۔"

خورشید نے نفی میں سر ہلایا "تمہارے ساتھ تو جلوس ہے۔"

"میں صرف ایک وکیل اور ایک صحافی کو دکھانا چاہتا ہوں کہ میں نے واقعی چوہدری دلاور کو گرفتار کیا تھا۔"

"کیا یہ لوگ یقین نہیں کرتے تمہاری بات کا۔ جیل میں ہوا یا فوٹو گرافر تو صرف ہوم سیکرٹری کی تحریری اجازت سے جا سکتے ہیں۔"

"اچھا تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔ ممکن ہے میں مرنے سے پہلے اس کا اعتراف جرم حاصل کر لوں۔"

"سوری یار۔ وہ۔ دراصل۔ وہ مر چکا ہے۔"

"تو بکواس کرتا ہے الو کے پٹھے۔" جاوید نے اس کا گریبان تھام لیا "سچ بتا دے مجھے۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

خورشید نے خود کو چھڑایا اور میری طرف دیکھا مگر میں مسکرایا تھا اور قطعی بے نیاز کھڑا تھا۔

"جاوید یہ کہا گیا ہے مجھ سے کہ اس کی لاش وارثوں کے حوالے کر دی جائے۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے ساتھ۔"

"جھوٹے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے ساتھ؟"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی ہوگی۔" خورشید نے سر جھکائے کہا۔

"لیکن چوہدری دلاور تو زندہ سلامت ہوگا۔ کون لے جائے گا اسے اپنے ساتھ؟ اس کی بیوی؟" جاوید نے تلخ لہجے میں کہا۔

"شاید۔ اپنا وعدہ مت بھولنا۔ میں نے دوست سمجھ کے سب بتایا ہے تجھے۔" خورشید بولا۔

جاوید صدیقی کچھ دیر سکتے کی کیفیت میں کھڑا رہا "خورشید تو یہ سب کیوں کر رہا ہے؟"

"میں کیا کروں یار۔ نوکری تو کرنی ہے۔"

"اتنی عزیز ہے تجھے نوکری۔"

"سب تیرے جیسے کھاتے پیتے لوگ تو نہیں ہیں۔ جب میں آفیشلی پولیس سروس میں گیا تھا۔ خدمت خلق اور معاشرے کی اصلاح کے لیے۔ دماغ ٹھکانے آ گیا کہ نہیں؟ مجھ پر تو وقت ... بھی ہے۔ میرا باپ دو سال سے مفلوج پڑا ہے۔ ماں کو ... ڈپریشن سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اپنے گھر کے بجائے ہم اب کرائے کے مکان میں ہیں اور مجھے دو بہنوں کی شادی کرنی ہے یہاں رہ کے میں سب کچھ کر لوں گا ایک دو سال ہی میں۔"

لیکن جاوید صدیقی کچھ نہیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا "میں نے ہو گا منظوری کی بھی بھال۔"

"یہ سب بدل دیے گئے تھے۔ کوئی تیرا حکم نہیں مانے گا۔"

"خورشید۔ جب میں نے چوہدری دلاور کو تمہاری تحویل میں دیا تھا تو ایک رسید لی تھی۔ تو نے دستخط کیے تھے اس پر۔"

"ہاں مگر میں اسے پہچانتا نہیں تھا۔ چوہدری دلاور کو۔ میں نے تیرے کہنے سے مان لیا تھا۔"

جاوید صدیقی اسے حقارت سے دیکھتا رہا "کتنا پیسہ ملا ہے تجھے یہ سب کہنے کا؟"

"رہنے دے ایسی باتیں جاوید۔ دوستی نہ خراب ہو ہماری تو اچھا ہے۔ تو میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا۔"

جاوید صدیقی کچھ دیر خاموش کھڑا رہا اور پھر اندر چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ کیا وضاحت پیش کرے گا۔ جتنی دیر میں ہم پولیس ہیڈ آفس سے کوٹ لکھپت جیل پہنچے تھے ڈی آئی جی یا ڈی آئی جی صاحب نے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات سے رابطہ کر لیا تھا اور دلاور کی رہائی کے متبادل انتظامات کر دیے گئے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جاوید صدیقی نے چوہدری دلاور کو گرفتار کرایا تھا۔ اس کی حالت خراب تھی چنانچہ اسے کوٹ لکھپت جیل کے اسپتال میں رکھا گیا تھا مگر جاوید صدیقی نے انتظار کیے بغیر تفتیش کی اور اس پر تشدد کیا گیا جس کے نتیجے میں چوہدری دلاور ہلاک ہو گیا۔ یہی ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں درج کیا جائے گا۔ یہی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ہوگا لیکن چوہدری دلاور کو اس کی بیوی زندہ سلامت نکال کر لے جائے گی۔ کل تک اس کی تدفین بھی ہو جائے گی۔ کتبہ بھی لگ جائے گا۔ اصل چوہدری دلاور اس وقت تک کسی فلائٹ سے باہر نکل چکا ہوگا۔ کل جب عدالت میں بیان حلفی داخل کرنے کا وقت آئے گا تو ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ داخل کی جائے گی۔ جاوید صدیقی پر ایک اور فرد جرم عائد ہوگی۔ غیر ارادی قتل۔ اس کی تحقیقات کے لیے کوئی کمیشن بٹھایا جائے گا کہ زیر حراست ملزم کی موت کیسے ہوئی اور اس کا ذمے دار کون ہے۔ رابعہ یا منظر کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ عدالت میں درخواست دائر کر سکتے ہیں کہ لاش کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کرایا جائے مگر اول تو یہ درخواست منظور نہیں ہوگی اور ہو گئی تو دوسری رپورٹ دینے والے بھی تو وہی ہوں گے۔ سرکار کے حکم کے غلام۔ جو نوکری کو بچانے پر قربان نہیں کر سکتے۔ چھ مہینے سال بعد کیا ہوگا۔ چوہدری دلاور دوبارہ نمودار ہو جائے گا تو صرف کنفیوژن پھیلے گی۔ دلاور زندہ ہے تو وہ کون تھا جو مر گیا تھا۔ خورشید کہے گا کہ میں تو دلاور کو نہیں پہچانتا تھا۔ جو قیدی میرے حوالے کیا گیا تھا وہ یقیناً مر گیا تھا۔ میں اس کا نام چوہدری دلاور نہ لکھتا تو کیا کرتا۔ مجھے جاوید صدیقی نے یہی نام بتایا تھا۔ ایک بار پھر داخل دفتر ہو جانے والا کیس کھولنے کے لیے رابعہ اور منظر کو نئے سرے سے درخواست دینی پڑے گی پھر نوٹس اور سمن جاری ہوں گے۔ دلاور کی بیوی حاضر ہو کر بتائے گی کہ کیا اس نے اپنے شوہر کو شناخت کیا تھا؟ تدفین سے پہلے دیکھا تھا؟ وہ کہے گی کہ میں تو بے ہوش ہو گئی تھی صدمے سے۔ نبیل کہے گا کہ پورے ڈرامے میں تو اس نے پہلے ہی گھر سے دور بھیج دیا تھا پھر تدفین کرنے والے کون تھے؟ انہیں بلاؤ۔ کوئی سامنے نہیں آئے گا اس وقت کچھ پتا نہیں چلے گا۔ صرف کنفیوژن پھیلے گا۔ جاوید صدیقی کی تفتیش کی رپورٹ ضائع کر دی جائے گی اور دلاور خود کو عدالت کے سپرد کر دے گا۔ اسے نہیں معلوم کہ اتنا عرصہ وہ کہاں رہا۔ اس کی یادداشت کھو گئی تھی۔

سب لوگ جاوید صدیقی کے ساتھ باہر آئے اور گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ وہ کچھ مایوس تھے۔ خبر اپنی جگہ مکمل تھی مگر وہ چوہدری دلاور کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔ حراست میں اس کی تصویر نہ بنا سکے۔ چوہدری دلاور پھر کامیاب ہو گیا تھا۔ اسے ہتھکڑی لگا کے عدالت میں پیش کرنے کی خواہش رکھنے والے پھر ہار گئے تھے۔ جھوٹ اور فریب سے ہر قانونی مسئلے کو اس حد تک الجھا دینا کہ اس کا کوئی حل نہ نکل سکے یہی اس کا کمال تھا۔ اس کے پیسے کی طاقت کا کمال تھا۔ میں نے اتفاق سے جو کچھ سنا تھا وہ صرف مجھے معلوم تھا لیکن جاوید صدیقی کے بجھے بجھے چہرے سے بھی بہت کچھ اندازہ ہو جاتا تھا کہ قانون کی پاسداری کرنے والے اور ناویل کرنے والے فرض شناسی کے دعویدار اور ہم ایسے خدائی فوجدار۔ وکیل صحافی سب منہ دیکھتے رہ گئے تھے اور دلاور نکل گیا تھا۔

واپسی کا سفر ایک اذیت ناک عمل تھا۔ صحافی حضرات کی بات اور تھی۔ ان کے لیے چوہدری دلاور کی گرفتاری کی خبر بھی سنسنی خیز تھی اور کوٹ لکھپت جیل میں اس کی زیر حراست موت کی خبر میں بھی ڈرامائی عنصر تھا۔ وہ اس سے کچھ بددل تھے کہ چوہدری دلاور کی تصویریں نہ بنا سکے۔ نہ پس دیوار زنداں اس کی زندگی میں اور نہ اس کی موت کے بعد۔ زیادہ جوشیلے صحافی اب یہ پروگرام بنا رہے تھے کہ کسی طرح چوہدری دلاور کی لاش اس کے لواحقین کے حوالے کیے جانے کی اور بعد میں اس کی تدفین کے موقع کی تصویر حاصل کر لیں مگر یہ کام مشکل تھا۔ ان کو پتا نہیں تھا کہ وہ کب لاش لینے آئیں گے اور اس وقت انہیں جیل خانے کے اندر کوئی جانے دے گا یا نہیں۔ اسی طرح یہ بھی غیر یقینی تھا کہ چوہدری دلاور کے اہل خانہ میں سے کون آئے گا۔ لاش کو لے کر کہاں جائے گا اور تدفین کب ہوگی؟

پولیس ہیڈ آفس واپس پہنچنے تک ہم سب مایوسی کا شکار تھے۔ محسن یا رابعہ اور منظر یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ حقیقت کیا ہے۔ حقیقت میں نے حادثاتی طور پر جان لی تھی۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی اور اس کے جیلر دوست نے یہ سمجھتے ہوئے کہ میں کچھ نہیں سمجھ سکتا آپس میں جو گفتگو کی تھی وہ میں نے سن لی تھی لیکن جیسے جاوید صدیقی کسی کو کچھ نہ بتانے کا پابند تھا ایسے ہی میں بھی خاموش

www.paksociety.com

رہنے پر مجبور تھا۔ جاوید صدیقی نے صرف اتنا کہا تھا کہ جیل کے اسپتال میں جو ہیڈ نمبردار مر گیا تھا۔ غالباً ہارٹ فیل ہونے سے۔ وہ دل کا پرانا مریض تھا۔ اس نے دلاور کی موت پر کسی قسم کی قیاس آرائی سے انکار کر دیا تھا۔

جب... صحافیوں کو پولیس ہیڈ آفس کے باہر اُتارا گیا تو یہ سوال بھی کیا گیا کہ دلاور کی موت کے پُراسرار حالات کی عدالتی تحقیقات ہوں گی؟ جاوید صدیقی کے لیے جانتے بوجھتے سچ کو چھپائے رکھنا ایک صبر آزما کام تھا۔ وہ ایک دوست سے شریفانہ وعدے کا پابند تھا ورنہ ابھی اصل بات بتا دیتا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔

اس نے کہا "جنٹلمین۔ اول تو یہ موت پُراسرار نہیں ہے مگر آپ لوگ چاہیں تو بنا سکتے ہیں۔ وہ زیرِ علاج تھا۔ ابھی تفتیش کا مرحلہ آیا ہی نہیں تھا کہ تشدد کی ضرورت پیش آتی۔"

ایک صحافی نے کہا "مگر آپ لوگ اتنے بااصول اور بامروت کہاں ہوتے ہیں کہ کسی بیمار کو بخش دیں۔ پولیس کی تحویل میں زیرِ تفتیش ملزم ہلاک ہو جاتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے سے بیمار تھے یا انہوں نے خودکشی کر لی۔"

دوسرا بولا "پھر عدالتی تحقیقات کا ڈراما ہوتا ہے اور کوئی بے چارہ ایس ڈی ایم یہ ڈراما اوپر والوں کی حسبِ منشا کرتا ہے۔ اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کبھی کسی پر الزام نہیں آتا۔ ثابت صرف یہ ہوتا ہے کہ پولیس کا مؤقف درست تھا۔"

"کیا اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوگا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" صدیقی نے جھلا کے کہا "نہ وہ میری تحویل میں تھا۔ نہ میں تفتیش کر رہا تھا اور نہ میں نے اس کو مرتے دیکھا۔ آج میں چارج دے دوں گا۔ کل کیا ہوگا، یہ وہ بتا سکتے ہیں جو کل اس کیس کے ذمے دار ہوں گے یا آپ ڈی آئی جی صاحب سے معلوم کر سکتے ہیں۔ آپ صحافی حضرات ویسے تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ سراغ رساں بھی ثابت کر دیتے ہیں خود کو۔ خیال کے گھوڑے دوڑاتے ہیں تو ہر سچ کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ پھر سب کچھ ابھی اسی وقت صرف مجھ سے کیوں معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

وہ اندر چلا گیا اور صحافی اپنی اپنی قیاس آرائی اور اپنے اپنے تبصرے کرتے ہوئے واپس اسی گاڑی میں بیٹھ گئے جس میں بھر کے وہ پولیس ہیڈ آفس آئے تھے۔

صرف ہم لوگ جو رکیں سمجھے جاتے تھے اندر اس کے ساتھ گئے اور ہم نے جاوید صدیقی جیسے بااصول، فرض شناس اور معزز افسر کی بے عزتی کے ساتھ معطلی کے ڈرامے کا آخری سین دیکھا۔ اس کا چارج عدم موجودگی میں ہی ارشد کریم نے لے لیا تھا اور ڈی آئی جی صاحب کے حکم سے اس کو آفس میں داخل ہونے سے روک دیا گیا تھا۔ استعفیٰ منظور ہونے تک وہ معطل سمجھا جائے گا اور خود ڈی آئی جی صاحب اعلیٰ حکام کو اس کے باغیانہ رویے، اس کے ناپسندیدہ کردار اور پولیس کو بدنام کرنے کے لیے سستی شہرت حاصل کرنے کے طریقے کے بارے میں رپورٹس دیں گے اور فیصلہ ہوگا کہ اسے برطرف کیا جائے یا خاموشی سے اس کا استعفیٰ منظور کر لیا جائے کہ تم بدلے ہم چھوٹے۔

جاوید صدیقی سخت دل شکستہ اور مشتعل تھا لیکن اس نے خاموشی سے معطلی کے احکامات وصول کیے۔ ڈی آئی جی صاحب احکامات جاری فرما کے رخصت ہو گئے تھے ورنہ صحافیوں کے ان سوالات کا جواب دینا مشکل ہوتا۔ ہم سے بھی ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔

منظر نے بڑے بھیگتے ہوئے لہجے میں ارشد کریم کو مبارکباد دی "جی آپ نے بھی قبضہ کر لیا ایس ایس پی کی سیٹ پر جیسے بھارتی فوج نے مقبوضہ کشمیر میں ڈیرا ڈال رکھا ہے۔"

وہ بگڑ گیا "آپ اپنے الفاظ واپس لیں۔ میری پوسٹنگ قاعدے قانون کے مطابق ہوئی ہے۔"

منظر نے مزید آگ لگائی "جی سر۔ مذاق نوٹ کریں، یہ ہے۔ میں مانتا ہوں ہم نے تو دیکھا نہیں پولیس کو قاعدے قانون پر عمل کرتے۔"

رابعہ نے کہا "البتہ قاعدے قانون کا غلط استعمال کرتے ضرور دیکھا ہے۔ اندھے کے ہاتھوں میں لاٹھی۔"

منظر نے کہا "الفاظ کوئی رشوت کے نوٹ تو ہیں نہیں جنہیں دے کر واپس لے لوں۔ منہ سے نکل گئے تو فضا میں گم ہو گئے۔"

"آپ کا جی چاہے تو کیس کر دیں ہم پہ۔ میرا مطلب جان کی ہمت ہے تو۔" رابعہ بولی "ہم قائم ہیں اپنے الفاظ پہ۔"

"سب دیکھا ہے ہم نے اپنی آنکھوں سے۔" محسن نے کہا "اور اب آپ بہت کچھ دیکھیں گے۔ ایس ایس پی صاحب۔"

"دیکھ لوں گا میں بھی تم سب کو۔ اب اس سے پہلے کہ میں آپ سب کو نکلوا دوں، میں ورآ نہیں۔"

منظر پھر ہنسا "آپ تختی چھوڑیں۔ نرمی سے ہم سب کو نکلوا دیں۔ حوالات تو ہوگی یہاں۔ زر کس کا بھلا آپ کو بیان کیے کو توال۔"

جاوید صدیقی پہلے ہی جا چکا تھا۔ رابعہ نے منظر کو کھینچ لیا۔ محسن نے بھی کہا کہ کیا ضرورت ہے کسی کے منہ لگنے کی۔ ان کے درمیان اس نے کچھ کہا تھا۔ کمینہ یا کتا، مگر ایسے کہ خود نہیں سن پایا تو ارشد کریم کیا سمجھتا مگر اس نے اندازہ کر لیا کہ جاتے جاتے بھی اس کو ذلیل کر گئی ہے۔

ہم دو الگ الگ گاڑیوں میں باہر آئے تو خلافِ توقع جاوید صدیقی کو منتظر پایا۔ رابعہ اب میرے ساتھ تھی اور وہ منظر کے ساتھ محسن کو اپنی گاڑی میں بٹھا لیا تھا۔ میری حالت ہم بھی تھی جو بیٹھنے کے قریب ہو۔ اصل حقائق کسی کو نہ بتانے کا پابند جاوید صدیقی تھا۔ میں نہیں تھا۔ میں باہر آتے ہی

وہ ہوٹل جہاں جاوید صدیقی مقیم تھا لوئر مال پر واقع تھا۔ ہم جس ڈائننگ ہال میں بیٹھ گئے جہاں اس وقت بہت لوگ تھے۔ شام کے پانچ بجے سب ہی چائے کافی پینے والے تھے۔

جاوید صدیقی نے ادھر اُدھر نگاہ ڈالی اور مطمئن ہو گیا تو بولا "میرا خیال ہے کہ ابھی تک میں محفوظ ہوں۔ مطمئن ہوں، معتوب نہیں۔ کوئی میرا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔ رہا میں وہ کے کہ مجھ سے بیر کرنے کا انجام بھی اچھا نہیں ہوتا لیکن مجھے کارنر کر دیا گیا ہے۔ میں کیا کروں، ایک نوبتِ جنگ آمدہ والی صورت حال ہے۔ میں ایک کشمکش سے دوچار تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ معطل ہونے کے بعد میں اپنے ضمیر کے مطابق ہر فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہوں۔"

رابعہ نے حوصلہ افزائی کے لیے مسکراتے ہوئے کہا "ایک فیصلہ تو آپ کر چکے۔ اب کون سا فیصلہ باقی ہے؟"

"مس رابعہ۔ کچھ باتیں ہیں جو میں آپ کو بتانا چاہتا تھا۔" اس نے اضطرابی کیفیت میں کہا "جیلر خورشید میرا دوست ہے۔ اس نے مجھے پابند کر دیا تھا کہ میں سچ کسی کو نہ بتاؤں۔ جو اس نے مجھے بتا دیا تھا۔ یہ فرض اور دوستی کی کشمکش کا پرانا کیس ہے۔ اس میں جیت بالآخر میرے فرض کی ہوئی۔ میں دوستی کو قربان کر دوں گا۔ ایسا ہی ہونا چاہیے ورنہ انصاف نہیں ہوگا۔"

رابعہ اور محسن بھی حیران تھے کہ وہ کیا بتانا چاہتا ہے مگر جب اس نے وہ سب بتایا جو مجھے پہلے سے معلوم تھا تو اس انکشاف نے انہیں سن کر دیا۔ محسن نے فوراً میں مجھے بتانے کی کوشش کی تو میں نے اس سے کہا کہ میں تو سب سن چکا ہوں لیکن اب ہم طے کر سکتے ہیں کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے تو یہ بات منظر کو اور قادر یوسف کو بتانا ضروری ہے لیکن یہ بھی معلوم ہو جائے تو اچھا ہے کہ کیا جاوید صدیقی ہمارا ساتھ دے سکتا ہے۔ اگر وہ ہماری مدد کرے تو ہم آج رات ہی چوہدری دلاور کی موت کا ڈراما کرنے والوں کی کوشش کو ناکام بنا سکتے ہیں۔

جاوید صدیقی نے محسن کی بات سنی تو مسکرایا "اور آخر کس لیے میں تم سب کو یہاں لایا تھا۔ اسی لیے یہ بات بتائی تھی میں نے کہ مجھے تمہاری مدد درکار تھی۔ میں اکیلا شاید کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہارے وہ سب ساتھی کہاں ہیں، ایم آر ایس کی تنظیم کے ارکان؟"

محسن نے میری طرف دیکھا۔ "وہ سب تو نہیں آ سکتے۔ ان میں سے دو جسمانی طور پر اس قابل نہیں کہ کسی کارروائی میں حصہ لے سکیں۔"

"تمہارا دوست سکندر بخت تو ہے۔" جاوید صدیقی بولا۔

محسن نے سکون سے کہا "ہاں مگر..."

"وہ اکیلا ہی چار کے برابر ہوگا۔" جاوید صدیقی نے مسکراتے ہوئے کہا "اکیلا مس رابعہ!"

بتا دینا چاہتا تھا کہ دلاور کو فرار کرانے کے لیے اور کیس کو فی الحال داخلِ دفتر کرانے کے لیے اس کی موت کا ڈراما رچایا گیا ہے اور غلط ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور جعلی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ زندہ دلاور کو جیل خانے سے نکال دیا جائے گا یا کسی لاوارث بندے کی لاش دلاور کے ورثا کے حوالے کر دی جائے گی جو اسے خاموشی سے دفن بھی کرا دیں گے مگر دفن ہونے والا دلاور نہیں ہوگا۔ یہ سب گھپلا ہونے سے پہلے ہی ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔

اب میرے لیے نئی مشکل پیدا ہو گئی۔ رابعہ نے مجھ سے کہا "گاڑی روکو۔ جاوید صدیقی کو ساتھ بٹھا لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "دوسری گاڑی بھی ہے۔"

رابعہ نے کہا "ابھی مجھے کچھ بات کرنی ہے اس سے۔"

میں مجبور ہو گیا۔ جاوید صدیقی نے پیچھے بیٹھتے ہی رابعہ کا شکریہ ادا کیا "ہمیشہ بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے۔ آپ نے دیکھا آیا تھا میں سرکاری گاڑی میں۔ واپس پیدل جا رہا تھا۔"

رابعہ نے کہا "صدیقی صاحب۔ عزت ایسی باتوں سے کم نہیں۔ زیادہ ہوتی ہے۔ آپ جیسے لوگ ہی تو مثال قائم کرتے ہیں۔"

"جی نہیں۔ درسِ عبرت بنتے ہیں دوسروں کے لیے۔"

میں بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ محسن میرے ساتھ ہوتا تو میں بھی گفتگو میں حصہ لیتا۔ صدیقی ساتھ نہ بیٹھتا تو میں رابعہ کو بتا دیتا کہ میں نے اس کی اور خورشید کی ساری گفتگو سن لی تھی۔ میں کوئی غلط جذباتی فیصلہ کرنا نہیں چاہتا تھا کہ صدیقی کے سامنے اپنے بہروپ کو ظاہر کر دوں۔ ابھی اس نے پولیس کی نوکری کو لات ماری تھی اور وہ انتہائی بددل بھی تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا تھا کہ اب وہ ہمارے ساتھ ہے۔

میری یہ مشکل خود جاوید صدیقی نے آسان کر دی۔ اس نے رابعہ سے کہا "مس رابعہ۔ میں آپ سے اور آپ کے دوستوں سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ کیوں نہ ہم کہیں بیٹھ کے ایک کپ چائے پی لیں۔"

"کیوں نہیں۔ کیا آپ میرے آفس چلنا پسند کریں گے؟"

"دیکھیے۔ میرا گھر تو ہے اسلام آباد میں۔ یہاں میں سرکاری خرچ پر ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ شاید اب وہاں سے میرا بوریا بستر گول ہو جائے گا لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا۔ میں اپنی جیب سے خرچ کر کے بھی وہاں ٹھہر سکتا ہوں اور اپنا سارا بل خود دینے کی پوزیشن میں ہوں۔ آپ کے آفس جانا کچھ مناسب نہیں۔ کیا پتا میرا تعاقب کیا جا رہا ہو۔"

رابعہ نے اس سے اتفاق کیا اور قادر کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا "قادر۔ تم اور منظر جاؤ آفس۔ محسن کو ادھر بھیج دو۔ ہم کچھ دیر میں آتے ہیں۔"

محسن ہماری گاڑی میں آ گیا اور میرا مترجم کا مسئلہ حل ہو گیا۔

www.paksociety.com

رابعہ نے پہلو بدلا "صحیح کہا آپ نے۔ لیکن وہ ہے کہاں؟"

"میری معلومات کے مطابق۔ وہ یہیں ہے" جاوید صدیقی اپنے لیے کافی کا دوسرا کپ بنانے لگا۔

"یہاں۔ کس نے بتایا آپ کو؟"

"مس رابعہ۔ ایک ہوتی ہے ظاہر کی آنکھ۔ وہ دھوکا کھا جاتی ہے اور زیادہ تر لوگ اس پر بھروسا کرتے ہیں۔ ایک ہوتی ہے عقل کی آنکھ جو باطن کا حال جان لیتی ہے اور چھٹی حس کی مدد سے یا تجربے کی کسوٹی پر رکھ کے وہ پہچان لیتی ہے۔ جو حقیقت کو جان لیتی ہے اور ثبوت کی محتاج نہیں ہوتی۔ کیا یقین کسی ثبوت کا محتاج ہوتا ہے؟"

رابعہ نے چونک کے کہا "میں سمجھی نہیں۔"

محسن نے کہا "شاید ہاں۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ مگر آپ یہ بات کس حوالے سے کر رہے ہیں؟"

اس نے کہا "مس رابعہ۔ مجھے معلوم ہے کہ سکندر بخت کہاں ہے۔ بہت عرصے پہلے میں یہ بات جان چکا تھا۔ میرے پاس ثبوت نہیں تھا۔ صرف یقین تھا کہ وہ کون ہے لیکن میں نے جانتے بوجھتے اس کو پہچاننے سے گریز کیا۔ اس کی شناخت پر پڑا ہوا پردہ نہیں ہٹایا۔ آپ جانتی ہی ہیں۔"

رابعہ نے کہا "نہیں۔ میں نہیں جانتی۔"

"میں اس مقصد کی شکست نہیں چاہتا تھا جس کی خاطر سکندر بخت اور آپ جدوجہد کر رہے تھے۔ ایک ولن ٹائپ کی بات سناؤں آپ کو؟ ایک ڈاکو تھا جو مصیبت زدہ افراد کی مدد کرتا تھا اور ڈاکے ڈالتا تھا دولت مندوں کے گھر میں۔ مجھے مخبروں کے ذریعے وہ اطلاع بھجوا کر وہ فلاں وقت فلاں کی مدد کرنے کے لیے جائے گا۔ ایک موقع تھا شادی کا۔ اس کی مدد اور سرپرستی سے ایک لڑکی رخصت ہوئی تھی جس کی ماں کینسر میں مرچکی تھی۔ میں اسے ٹھانے میں گرفتار کرسکتا تھا مگر میں نے اسے رخصتی کا موقع دیا اور وہ فرار ہوگیا۔ شادی کے بعد نہ جانے کیسے نکل گیا۔ دوسرا موقع بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں نے جانتے بوجھتے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک مجرم کو ارتکاب جرم کے وقت پکڑوں۔ ایسے وقت میں نہیں جب اس کے پکڑنے سے نیکی کا راستہ رکتا ہو اور نقصان ان کا ہو جو اس سے فیض پا رہے تھے۔ ان کے لیے نہ میں کچھ کرسکتا تھا اور نہ کوئی اور۔ میں نے اسے بعد میں گرفتار کیا لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ اس نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے اسے یہ مواقع فراہم کیے تھے۔ وہ جانتا تھا جب وہ جیل میں تھا تو اس نے کئی بار مجھ سے کچھ کام کہے۔ وہ بھی میں نے کیے۔ ان کا ذکر میں نہیں کروں گا۔ وہ پھانسی کے وقت بھی کچھ ذمے داریاں مجھے سونپ گیا تھا۔ وہ میں پوری کر رہا ہوں۔ اس کی طرف سے" وہ ایک دم کھڑا ہوگیا "میں چاہتا ہوں مس رابعہ۔ ایک گھنٹے بعد آپ مجھے کوٹ لکھپت جیل کے باہر ملیں اور ممکن ہو تو سکندر بخت کو بھی ساتھ لے آئیں۔"

"وہ کس لیے؟"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں ایک بار پھر دلاور کو گرفتار کرسکوں گا۔ آپ سب لوگوں کے سامنے آپ کی مدد سے۔"

محسن نے کہا "مگر کیسے؟"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں بھی اکیلا نہیں آؤں گا۔ میری گاڑی میں چار آدمی ہوں گے۔ وہ آپ کی مدد کریں گے۔ کیونکہ صرف آپ میرے ساتھ جیل کے اندر جا سکیں گی۔ باقی سب باہر انتظار کریں گے۔ ہم دلاور کو ایسے فرار نہیں ہونے دیں گے۔ میں نے نوکری پر لات ماری ہے ان سب سے نمٹنے کے لیے۔ وہ میرا ساتھ دے رہے ہیں۔"

وہ پلٹ کے ڈائننگ ہال کے دوسرے حصے کی طرف چلا گیا جہاں سے زینہ اوپر جاتا تھا۔

ہم نے اسے زینے پر گھوم کے اوپر غائب ہوتے دیکھا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے پھر رابعہ نے کہا "صدیقی سب کچھ جانتا ہے۔"

محسن نے آہستہ سے سر ہلایا "اس نے بس نام نہیں لیا، سب کچھ تو کہہ دیا۔"

میں نے کہا "میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ میں کیا کروں۔"

"فیصلہ تو اب بھی ہمیں ہی کرنا ہے۔ اور یہ آسان فیصلہ نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ جاوید صدیقی پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔" محسن نے کہا۔

"اگر وہ میرا راز فاش کرنا چاہتا۔ تو بہت پہلے خود مجھے گرفتار کرلیتا۔ آج ابھی ہم پولیس ہیڈ کوارٹرز سے آئے ہیں۔ اس نے ابھی فیصلہ ہم پر چھوڑ دیا ہے کہ چاہو تو یہ کھیل جاری رکھو۔ سکندر بخت روپوش رہنا چاہے تو اس کی مرضی۔"

"اور سکندر بخت کی مرضی کیا ہے؟"

"جو سرکار کی مرضی" میں نے رابعہ کی طرف دیکھ کے کہا۔

ایک گھنٹے کی مہلت زیادہ نہیں تھی۔ ہمیں کوٹ لکھپت پہنچنے میں کم سے کم بھی آدھا گھنٹا درکار تھا۔ وہ بھی سڑک صاف ملنے کی صورت میں اور راستہ انتہائی تیز رفتاری سے طے کرکے۔ میں نے راستے سے منظر کو فون کیا کہ ہمارے گھر کہہ دے کہ ہم کچھ دیر سے آئیں گے۔ وقار یوسف یہ پیغام گل تک بھی پہنچا دے۔"

"مگر تم ہو کہاں؟" منظر بولا۔

"ہم جاوید صدیقی کے ساتھ ہیں۔ اور کوٹ لکھپت جیل جارہے ہیں۔"

"ابے بھونڈے کے۔ اس کے چکر میں مت پڑ۔ وہ بہت کائیاں شخص ہے۔ ایک بار جیل کے باہر سے لوٹ آیا ہے اگلی بار اندر ہوگا۔"

میں نے کہا "رابعہ اور محسن بھی ہیں میرے ساتھ یار۔"

فون بند کر دیا۔

مجھے کچھ اندازہ تھا کہ صدیقی نے ایک گھنٹے کا وقفہ کیوں دیا ہے؟ شاید اسے معلوم تھا کہ چوہدری دلاور کو کب جیل سے نکالا جائے گا۔ اس نے اپنے دوست خورشید کی دوستی کو بھلا کے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنی ناکامی کو کامیابی میں بدلنے کے سبب کا خواہ اس کا نقصان خورشید کو ہی اٹھانا پڑے۔ اس کے نزدیک فرض کی ادائیگی مقدم تھی۔

میں نے جو ریوالور محسن کو دیا تھا وہ رابعہ کو دے دیا گیا اور محسن تو پہلے ہی مسلح ہوکے آیا تھا۔

رابعہ نے کہا "اس کا فائدہ کچھ نہیں۔ اگر میں جیل کے اندر جاؤں گی۔ تو میری تلاشی میں سب کچھ باہر ہی رکھوا لیا جائے گا۔"

"اس وقت تم یہ امانت مجھے لوٹا دینا" میں نے کہا "ابھی کیا پتا باہر کیا صورت حال درپیش ہو۔"

"صورت حال کچھ بھی ہو۔ ہم وہاں فائرنگ نہیں کرسکتے یہ بات طے ہے" رابعہ نے کہا "اپنے دفاع میں بھی نہیں۔"

"یعنی ہم پر جس کا دل چاہے گولی چلا دے۔"

"کون گولی چلا سکتا ہے وہاں۔ کوٹ لکھپت جیل کے اندر اور باہر سخت حفاظتی انتظامات ہیں" رابعہ نے کہا۔

"میں تو یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم اندر جاکے کیا کرو گی اور ہم باہر بیٹھ کے کیا کریں گے" محسن بولا "اگر چوہدری دلاور زندہ ہے۔"

"وہ زندہ ہے۔ اس میں شک کی بات ہی نہیں۔"

"ایسی صورت میں خورشید کبھی اس کو رابعہ کے سامنے پیش نہیں کرے گا اور اگر وہ مرچکا ہے..."

"لاحول ولا قوۃ۔ جو آدمی زندہ ہے وہ کیسے مرچکا ہے" میں نے کہا۔

"یار فرض کرو کوئی ڈراما رچایا گیا۔ کسی کی لاش دکھا دی گئی کہ یہ ہے چوہدری دلاور۔" محسن بولا "رابعہ کہے گی کہ غلط۔ یہ دلاور نہیں ہے۔ تو خورشید کو موقع ملے گا اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کا۔ وہ کہے گا کہ مجھے تو پہچان تھی نہیں لیکن یہی تھا وہ شخص جس کو ایس ایس پی صاحب میرے حوالے کرگئے تھے۔ جیلر کو جو پیسہ ملا ہے یہ کام کرنے کا۔ اس نے دوستی کے رشتے کا تو خون کردیا ہے اور دوستی کی لاش تو پیسے کے ڈھیر میں دفن ہوگئی ہے۔ اب صدیقی فیصلہ کرچکا ہے کہ جب جنگ ہے تو پھر سب کچھ جائز ہے۔ وہ خورشید کے جرم میں شریک نہیں ہوگا اور خاموش رہ کے اس کی نوکری کو بچانے کا نہیں۔ جیلر خورشید اگر کسی مجرم کو فرار کرانے کی بھاری رشوت لے چکا ہے تو صدیقی کے نزدیک وہ بھی مجرم ہے۔"

میں نے کہا "اوکے۔ ہم سب کچھ قسمت پر چھوڑ کے دیکھتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں۔"

محسن نے گاڑی کو کوٹ لکھپت جیل کے بیرونی احاطے میں گیٹ سے کافی فاصلے پر روک دیا۔ میں گاڑی سے اتر کے ایک پیڑ کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ رابعہ گاڑی سے باہر نکل کے کھڑی ہوگئی۔ محسن گاڑی میں بیٹھا رہا۔

اب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ جیل کی بلند و بالا فصیل پر سرچ لائٹس جل اٹھی تھیں اور باہر بھی ہر طرف روشنی کم نہ تھی۔ چھوٹے دروازے سے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ان میں زیادہ تر لوگ احاطے کے اندر بنے ہوئے رہائشی کوارٹروں میں رہتے تھے جو جیل کے عملے کے لیے تھے مگر بہت سے ملاقاتی اور غیر متعلقہ لوگ بھی تھے جو اپنے اپنے معاملات نمٹانے کے لیے باہر اور اندر کی دنیا کے درمیان رابطے رکھنے والے ایجنٹوں سے بات کر رہے تھے۔ جیل کے اندر مختلف قسم کے قیدی تھے۔ ایسے بھی تھے جو بے قصور تھے کوئی جرم کیے بغیر کسی اور کے جرم کی پاداش میں وہاں بند تھے اور انہیں ابھی عدالت میں پیش تک نہیں کیا گیا تھا۔ اور ایسے بھی تھے جو سنگین جرائم میں ملوث تھے لیکن جیل کے اندر ہر سہولت حاصل کرلیتے تھے۔ باہر سے ہر چیز ان کو پہنچا دی جاتی تھی۔ گھر کے کھانے اور ڈرامے والے سیزر سے اور اخبار تک۔ یہ کاروبار ہر جیل میں پلا ہوا کاروبار فروغ پر تھا۔

سات بجے میں نے گھڑی دیکھی۔ صدیقی نے چھ بجے ہم سے کہا تھا کہ کوٹ لکھپت جیل کے باہر پہنچ جائیں لیکن وہ خود ابھی تک غائب تھا۔ اچانک ایئر کی طرف سے ایک کار رکی اور میرے سامنے سے گزر کے مین گیٹ کی طرف گئی۔ میں نے اس کے بند شیشوں کے پیچھے فیصل کے چہرے کی ایک جھلک دیکھی۔ یہ گاڑی دلاور کی تھی اور اسے چلانے والا اس کا بیٹا تھا۔

رابعہ نے کہا "یہ تو دلاور کی گاڑی ہے۔"

محسن بولا "میں نے تو اسے بھی دیکھ لیا۔ جو گاڑی چلا رہا تھا۔ تم نے پیچھے کچھ دیکھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔"

دلاور کی گاڑی گیٹ سے دائیں جانب مڑ کے وہیں رک گئی تھی جہاں سے پہرے کے بعد ہم سب ایک ویٹنگ روم میں بیٹھے تھے۔ اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ برآمدے میں روشنی تھی مگر کمرا تاریک تھا۔ پھر کوئی شخص سائے کی طرح چلتا ہوا نمودار ہوا اور اس نے مقفل دروازہ کھول کے اندر کی لائٹ جلا دی۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کے دلاور کی بیوی اتری اور کمرے میں داخل ہوگئی۔

میں نے رابعہ کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ محسن نے گاڑی کو آگے بڑھایا اور دلاور کی گاڑی کے برابر لگا دیا۔

اس وقت جیل کے احاطے کی طرف سے ایک گاڑی اندر داخل ہوئی جسے خود جاوید صدیقی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں نے دوسری طرف دیکھا تو جیل کی فصیل کے فولادی دروازے سے بھی ایک گاڑی باہر

www.paksociety.com

آرہی تھی۔ دونوں گاڑیاں مخالف سمت سے ایک دوسرے کی طرف بڑھتی جارہی تھیں۔ شاید زنداں کے اندر سے نکلنے والی گاڑی کے ڈرائیور کو امید تھی کہ مقابل سے نمودار ہونے والی گاڑی خود ہی ایک طرف ہوجائے گی اور اسے نکل جانے کا راستہ مل جائے گا۔ اس سڑک پر اتنی جگہ تھی کہ دو ٹرک ایک دوسرے کے پاس سے گزر سکتے تھے لیکن جاوید صدیقی نے ہیڈ لائٹس کو فل بیم پر رکھتے ہوئے سڑک کو بلاک کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اصولاً اسے اپنے بائیں ہاتھ پر رہنا چاہیے تھا مگر وہ دائیں جانب آگیا تھا لیکن دونوں گاڑیوں میں تصادم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ان کی رفتار کم تھی۔

میری نظر ایک طرف تھی اور میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جب گاڑیاں رُک جائیں گی تو کیا ہوگا؟ جیل کے اندر سے آنے والی گاڑی میں کون ہوگا۔

جب رابعہ نے چلا کے مجھے دوسری طرف متوجہ کیا تو میں اُچھل پڑا۔ محسن مجھ سے پہلے ادھر دوڑ چکا تھا پھر رابعہ بھی ویٹنگ روم کی طرف لپکی۔ فیصل نے اس کا راستہ روک لیا۔ رابعہ کے مقابلے میں پورا مرد تھا اور ایک تندرست و توانا نوجوان۔ گاڑی کا دروازہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ اس نے رابعہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

محسن کچھ آگے برآمدے میں تھا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا۔ میرے لیے فیصلہ کرنا ضروری ہوگیا کہ مجھے کدھر جانا چاہیے؟

بائیں طرف دونوں گاڑیاں سڑک پر یوں آمنے سامنے رک گئی تھیں کہ چوڑائی کے سبب سڑک بلاک ہوچکی تھی اور دائیں بائیں کسی طرف سے کوئی سائیکل بھی نہیں گزر سکتی تھی۔

جیل کے اندر سے آنے والی گاڑی ہر طرف سے بند فولادی وین تھی۔ اس کا اگلا حصہ تو عام ٹرک جیسا کیبن تھا جس میں دو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ڈرائیور تھا۔ قیدیوں کو جیل خانے سے پیشی کے لیے عدالت لے جانے والی وین بھی جیل خانہ ہی تھی۔ فولادی دیواروں والے اس ڈبے میں صرف ہوا کے گزرنے کے لیے اوپر چھت کے ساتھ چھ انچ چوڑا جالی والا روشن دان تھا۔ پیچھے سے یہ کیبن بند تھا اور اس میں دُہرے دروازے تھے۔ پہلا دروازہ مقفل کرنے کے بعد باہر کے حصے میں جو جگہ بچی تھی اس میں دو مسلح محافظ بیٹھے تھے اور وہ دروازے کو اندر سے بند کرلیتے تھے۔

جیل کی وین میں رات کے وقت کسی قیدی کو کہیں پیشی کے لیے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تاہم جیل کی گاڑیاں جیل حکام کی ذاتی ملکیت ہوتی ہیں۔ کوئی جیلر بازار سے چپل منگوانے کے لیے وین کے ساتھ ڈرائیور کو بازار بھیج سکتا تھا تو اس کی بیوی بھی یہ گاڑی سبزی لانے کے لیے استعمال کرسکتی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ آتے جاتے پولیس کی گاڑی کو روک سکے۔ ظاہر ہے وین کے ڈرائیور نے یہی سمجھا ہوگا کہ سامنے سے آنے والی گاڑی کا ڈرائیور نشے میں ہے۔ اس نے گاڑی کو دائیں طرف سے نکالنے کی کوشش کی تو سامنے والی کار بھی دائیں طرف ہوتی اور پھر [illegible] لگا کے دونوں گاڑیاں ترچھی کھڑی ہوگئیں۔

کار میں سے اترنے والا پہلا شخص خود ایس ایس پی جاوید صدیقی تھا جس نے پوری یونیفارم پہن رکھی تھی۔ اس کے ساتھ اُترنے والے بھی پولیس کی وردی میں تھے اور ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔

میں اتنی دیر میں ویٹنگ روم کی طرف قدم بڑھا چکا تھا مگر مجھ سے پہلے محسن وہاں پہنچ چکا تھا۔

رابعہ نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی "فیصل! چھوڑ دو میرا... ورنہ..."

فیصل نے اسے ایک جھٹکا دیا "ورنہ کیا...؟"

"ورنہ کی اولاد" محسن نے پیچھے سے اس کے سر پر مکا مارا۔

فیصل کی ماں اندر سے چلائی "فیصل۔ جان سے مار دے اس حرام زادی کو۔ ہڈیاں توڑ دے اس کی۔ جلدی کر۔"

کمرے کے اندر سے ایک شخص آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا جو وہاں پہلے سے موجود ہوگا۔ کمرے کا قفل کھولے جانے کے بعد میں نے کسی کو باہر سے اندر جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مقفل اور اندھیرے کمرے میں چھپا ہوا تھا۔ جب وہ روشنی میں آیا تو میں نے اسے دیکھا۔ وہ چوہدری دلاور تھا۔

ماں کی آواز فیصل کے کانوں تک ضرور پہنچی ہوگی مگر اس سے پہلے ہی محسن کا مکا اس کے سر میں مغز کو ہلا چکا تھا۔ شاید اسے دن کو سورج نظر آگیا ہوگا۔ جیسے دن میں تارے نظر آجاتے ہیں۔

فیصل نے سر جھٹکا اور پھر رابعہ کو چھوڑ کے محسن کی طرف پلٹا۔ محسن دوسرا مکا گھما چکا تھا۔ یہ مکا فیصل کے چہرے پر سامنے سے عین ناک پر لگا لیکن وہ ابھی کاٹھی والا مضبوط نوجوان تھا۔ تازہ زخم میں پلنے کے باوجود وہ نازک نہیں تھا۔ وہ محسن سے چمٹ گیا۔

چوہدری دلاور کو دیکھتے ہی میں نے فیصل اور محسن کی دست بدست جنگ میں دخل دینے کا خیال ترک کردیا۔ اوّل تو محسن اس لونڈے سے خود ہی نمٹ سکتا تھا مگر جیل کے احاطے میں اور گیٹ کے سامنے اس قسم کی لڑائی زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ آس پاس کے لوگ جمع ہوجاتے تو فرار کے راستے بند ہوجاتے پھر جیل کے محافظ پہنچ جاتے اور فریقین کو گرفتار کرلیتے۔ مجھے اس سے پہلے ہی چوہدری دلاور کو نکال کرلے جانا تھا۔

رابعہ نے کہا تھا کہ ہم وہاں اپنے دفاع میں بھی فائرنگ نہیں کرسکتے۔ وہ ریوالور اپنے پاس رکھنے کے موڈ میں ہی نہیں تھی مگر اچانک اس نے بھی محسوس کیا کہ یہ دنگل فوراً ختم کرانے کے لیے اسے آتشیں اسلحے کی قوت کا مظاہرہ کرنا ہی پڑے گا۔

اس نے ریوالور نکال کے کہا "فیصل۔ رُک جاؤ ورنہ میں گولی ماردوں گی" لیکن یہ صرف دھمکی رہی۔

[illegible] کے قریب تھا۔ میں نے اسے [illegible] روک دی۔ دلاور کی بیوی نے چیخ ماری۔ اس نے دلاور کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "جلدی کرو دلاور۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ مگر خیر... تم بیٹھو۔ میں چلاؤں گی گاڑی فیصل!"

دلاور کی نظر مجھ پر تھی اور وہ منجمد ہوگیا تھا "نہیں۔ تم جاؤ۔ فیصل کے ساتھ نکل جاؤ۔ چھوڑو مجھے۔"

"یہ مصیبت کہاں سے نازل ہوگئی یا میرے خدا!" دلاور کی بیوی چلانے لگی۔ پھر اس نے مجھے دیکھ لیا "یہ وکیل کیا کررہا ہے یہاں؟"

"بے وقوف عورت!" دلاور نے کہا "فضول سوالات مت کرو۔ تم جاؤ ورنہ تم بھی پھنس جاؤ گی۔"

"اور تم...؟" وہ کانپتے ہوئے بولی "تم کیا کروگے؟"

"میں واپس اندر چلا جاؤں گا۔" دلاور نے کہا "مجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

میں اب کسی ایکشن کی ضرورت محسوس نہیں کررہا تھا۔ دلاور کو جیل سے لے جانے کی کوشش ناکام ہوچکی تھی۔ فیصل کے سر پر رابعہ نے ریوالور کا دستہ مارا تھا۔ محسن نے اسے گرنے سے پہلے ہی گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر دھکیل دیا تھا اور وہ سیٹ پر گرا تھا۔ صورت حال کسی حد تک ہمارے حق میں تھی۔ محسن پھر دلاور کی بیوی نے اپنا ہینڈ بیگ کھول کے ریوالور نکالنے کی کوشش کی تو میں نے اس کا ہاتھ تھام کے فرینچ میں کہا "اب کوئی فائدہ نہیں۔"

دلاور نے مجھے گالی دی "چھوڑ اسے کتے" وہ مجھ پر حملہ آور ہوا مگر میں نے دلاور کی بیوی کو پیچھے دھکیل دیا اور دلاور کو ایک ہی دھکے میں سڑک کے محسن کی طرف پھینک دیا۔ میں اس کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی جسمانی حالت ابھی اتنی اچھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ میرا مقابلہ کرسکتا یا مار کھا سکتا۔

محسن نے اسے دبوچ کے اپنے ساتھ گھسیٹا۔ پیچھے سے میں نے دلاور کو لات ماری۔ وہ دوسری طرف سے گاڑی کی پچھلی والی سیٹ پر گرا۔ وہاں اس کا بیٹا پہلے ہی اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس پر گرتے ہی دلاور نے اٹھنے کی کوشش کی مگر میں ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر پیچھے کا دروازہ بند کرکے سیٹ پر بیٹھ کر اس کو دبا چکا تھا۔

دلاور کی بیوی سمجھ گئی کہ وہ اپنے شوہر کو حاصل کرنے کی کوشش میں الٹا اسے گنوا بیٹھی ہے۔ اس نے مدد کے لیے چلانا شروع کیا ہی تھا کہ میں نے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ پھر ہمارے دونوں دروازے بند ہوگئے۔ محسن نے گاڑی کو پوری ریس دے کے اٹھایا۔ رابعہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ گاڑی زخم خوردہ جانور کی طرح دیوانہ وار بھاگی۔

رابعہ نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا "سیدھے چلو۔ سیدھے کر ادھر سے گھوم کے۔"

محسن نے گاڑی کو پورا دائرے میں گھما دیا اور گاڑی پودوں کو روندتی ہوئی ویٹنگ روم کے پچھلے حصے میں آگئی۔ دلاور کی بیوی نے ریوالور سے اندھا دھند فائر کیے۔ آس پاس افراتفری پھیل گئی۔ میں نے جیل کے محافظوں کی سیٹی کی آواز سنی اور اپنا سر نیچے رکھا۔ دلاور کی بیوی غصے، مایوسی اور صدمے سے پاگل ہورہی تھی۔ جب میں نے اسے دھکا دیا تھا تو وہ بری طرح دیوار سے ٹکرائی تھی۔ ایسی حالت میں وہ نشانہ لے کر کیسے فائر کرسکتی تھی۔ اس کی یہ دیوانہ وار کوشش رائیگاں گئی۔ رات بھی کسی حد تک ہماری محافظ تھی۔ گاڑی اندھیرے اجالے میں درختوں کے درمیان سے لہراتی ہوئی آگے جارہی تھی۔

محسن صرف ڈرائیونگ کررہا تھا۔ اس علاقے کے جغرافیے سے رابعہ واقف تھی۔ وہ محسن کو ہدایات دے رہی تھی۔ محسن بھی گاڑی کو سیدھا چلانے کے بجائے لہراتا ہوا آگے بڑھا رہا تھا۔ سڑک جو سیدھی باہر لے جاتی تھی کچھ دور رہ گئی تھی۔ اب ہم عملے کے رہائشی کوارٹروں والے علاقے سے گزر رہے تھے اور درختوں کی اوٹ میں نظروں سے اوجھل ہوگئے تھے۔

ہمارے پیچھے جیل کے دروازے پر ایک ہنگامہ بپا تھا جس کا شور ہمارے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ اس شور میں چیخ پکار کی آوازوں کے ساتھ سیٹیاں بھی شامل تھیں۔ جیل کی فصیل پر سے محافظ ہوائی فائرنگ کررہے تھے اور اضافی سرچ لائٹس جلادی گئی تھیں۔

www.paksociety.com

جیل میں اس قسم کے ہنگامے کا مطلب یہی سمجھا جاتا ہے کہ شاید کوئی قیدی فرار ہو گیا ہے یا کسی کو نکال کر لے جانے کی کوشش ہوئی ہے۔ دور سے دیکھنے والوں کو اصل واقعے کا علم کیسے ہو سکتا تھا۔ ہم سبزی کے کھیت سے گزرے پھر اچانک ہمارے سامنے دیوار آگئی۔ یہ دیوار شاید چھ سات فٹ اونچی تھی اور اس کے پیچھے کوئی بازار تھا۔ کوارٹروں میں رہنے والوں نے اپنی آسانی کے لیے اس دیوار کی کچھ اینٹیں نکال کے ایک تنگ سا راستہ بنا لیا تھا۔ یہ بے ہنگم سوراخ تین ساڑھے تین فٹ لمبا چوڑا ہوگا اور اس میں سے کوئی بھی تھوڑی سی کوشش سے سر جھکا کے گزر سکتا تھا۔ بازار تک پہنچنے کا یہ راستہ شارٹ کٹ تھا جس سے ہم گزر کے آئے تھے اور یہ راستہ عام پبلک بھی استعمال کرتی تھی مگر کوارٹروں میں رہنے والے بچے عورتیں اگر اس راستے سے بازار جانے تو انہیں بہر حال ایک میل کا پڑتا۔ ایسے شارٹ کٹ ہر جگہ لوگ خود بنا لیتے ہیں۔

محسن نے مجھ سے فرنچ میں سوال کیا "گاڑی اس شگاف میں سے گزار دوں؟"

میں نے کہا "پاگل ہو گئے ہیں آپ؟"

"دیوار گر جائے گی۔ راستہ نہیں بند ہوگا" محسن نے یقین دلایا۔

"لیکن دیوار کی دوسری طرف کیا ہوگا؟ نہ جانے کون نیچے دب جائے گا یا کوئی دیوار سے برآمد ہونے والی کار سے کچلا جائے گا۔ تم گاڑی اسی جگہ روک لو۔" میں نے کہا۔

محسن نے گاڑی روک لی "اب کیا ہم ان کا انتظار کریں جو ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "رابعہ سے کہو کہ نکل جائے۔"

محسن نے کہا "مس رابعہ۔ آپ کے لیے حکم ہے کہ اس شگاف سے نکل جائیں۔"

"مگر۔۔؟"

"اگر مگر نہیں چلے گی" محسن دہاڑا "جاؤ۔!"

رابعہ نے احتجاجاً دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ جاتے جاتے وہ دیوار اور محسن کی طرف اچھال گئی۔ میں نے اسے دیوار کے خلا سے غائب ہوتے دیکھا۔ میرے دماغ کا کمپیوٹر تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"تم مخالف سمت میں دوڑ لگاؤ۔ اس دیوار کے ساتھ ساتھ جہاں تک جا سکتے ہو۔"

"دیوار کے ساتھ ساتھ تو میں گیٹ تک پہنچ سکتا ہوں۔"

"سو گز دور جا کے دو تین فائر کرو" میں نے کہا "پھر دیوار کے اوپر سے باہر کود جاؤ۔ اور موقع ملے تو واپس ادھر آ جانا۔"

محسن سمجھ گیا کہ میں دھوکے سے دشمن کی توجہ دوسری طرف کرنے کی حکمت عملی اختیار کروں گا۔ میں اپنے پیچھے آنے والوں کی آوازیں بھی سن سکتا تھا۔ وہ پولیس کی گاڑی میں تھے۔ موٹر سائیکلوں پر اور پیدل دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔

محسن دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ یہ دیوار جیل کی آخری حد تھی۔ اس کے اور کوارٹروں کے درمیان وہ کھیت تھے جن میں قیدی کام کرتے تھے۔ قید بامشقت کاٹنے والوں کو یہاں سارا سال ایسے ہی کاموں میں مصروف رکھا جاتا تھا۔ وہ زمین کھودتے تھے گھاس صاف کرتے تھے اور سبزی کاشت کرتے تھے جو مفت میں جیل کے عملے کو مفت مل جاتی تھی۔ قاعدے قانون کے مطابق قیدیوں سے لی جانے والی مشقت کی پیداوار کو فروخت کر کے انکی فلاح و بہبود پر خرچ کرنا ضروری تھا۔ لیکن اس قانون پر عمل کب ضروری ہے۔ یہ شاید کہیں نہیں لکھا گیا تھا چنانچہ جیل کے اندر بھی قیدی جو کپڑا بنتے تھے دریاں اور قالین بناتے تھے اس کی دنیا کا حساب کوئی نہیں رکھتا تھا۔ نمائشی طور پر کہیں ایک شو کیس میں کچھ چیزیں ضرور سجا دی جاتی ہیں جو کبھی جیل کے معائنے کے لیے آنے والے کسی بڑی وی آئی پی کو دکھائی جاتی ہیں کہ یہ قیدیوں نے بنائی ہیں۔ وی آئی پی مسکرا کے کہتا ہے "ویری گڈ" اور آگے بڑھ جاتا ہے۔

ہم اپنی مشقتی قیدیوں کی محنت کو برباد کرتے ہوئے سبزیوں کے پودوں کو گاڑی سے روندتے دیوار تک پہنچے تھے۔ ہم کوارٹروں کے بالکل پیچھے سے گزرے تھے اور اب بالکل اندھیرے میں تھے۔ محسن نے گاڑی کی لائٹس بھی بجھا دی تھیں۔ کافی فاصلے پر کچھ لوگ ہاتھ سے اشارے کرتے نظر آ رہے تھے۔

محسن نے چند منٹ کے بعد فائر کیے تو ہمارے پیچھے دوڑنے والے ایکدم رک گئے۔ کسی نے چلا کے کہا "ادھر گئے ہیں وہ" کسی اور نے کہا "گاڑی تو ادھر نظر آ رہی ہے؟"

"وہ گاڑی چھوڑ کے بھاگے ہیں۔"

"وہ دیکھو وہ کوئی دیوار پھاند کے گیا ہے" کئی آوازیں آئیں اور پھر ایک فائر ہوا۔ تعاقب کرنے والی جیپ کا رخ بدل گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ چوہدری دلاور بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ اگر وہ مکر نہیں کر رہا تھا تو میرے وزن کے بوجھ سے اس کا دم گھٹ گیا تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکال کے اس کا کونا ایک بتی کی طرح دلاور کی ناک میں گھمایا۔ اگر وہ سچ مچ بے ہوش نہ ہوتا ضرور سر جھٹکتا یا ہاتھ ہلاتا۔

پیچھا کرنے والے اب واضح طور پر دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک ٹولی ادھر گئی تھی جہاں سے محسن نے فائرنگ کی تھی اور پھر دیوار پھاند کے فرار ہو گیا تھا۔ اس ٹولی میں ایک جیپ کے علاوہ کچھ لوگ سائیکل پر اور پیدل بھی دوڑ رہے تھے۔

دوسری ٹولی سیدھی کار کی جانب آ رہی تھی۔ اس کی قیادت کوئی موٹر سائیکل والا کر رہا تھا لیکن موٹر سائیکل اندھی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹ کام نہیں کر رہی تھی۔ جیپ کے لیے سبزی کے کھیتوں کی نرم مٹی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ جیپ فور وہیل ڈرائیو ہوتی

ہے۔ دلاور کو بھی کھینچ کر چار فٹ اونچی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ باہر کی آوازوں سے میں اندازہ کر رہا تھا کہ تعاقب کرنے والے کار تک پہنچ چکے تھے۔ ان سب کو یقین تھا کہ ہم دیوار کے شگاف سے نکل کے فرار ہو گئے اور گاڑی چھوڑ گئے۔

میں نے جو سوٹ پہنا تھا اس کے گھٹنے زمین پر چلنے سے پھٹ گئے تھے اور مٹی دھول کے ساتھ جھاڑ جھنکار نے کوٹ پتلون کے حاشیوں کو میلا اور مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ میں فرنچ رنگ سے زیادہ کسی سرکس کا مسخرہ لگتا تھا۔ میں نے چوہدری دلاور کی اور اپنی حالت پر غور کیا۔ گردش حالات نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ میں ایک صنعت کار کا بیٹا لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ چوہدری دلاور خود صنعت کار تھا۔ اس وقت ہم دونوں ...... جیل کے کچرا خانے میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک شکاری دلاور تھا جو میرے پیچھے لگا ہوا تھا پھر بازی پلٹ گئی اور میں شکاری بن کے دلاور کا تعاقب کرنے لگا لیکن اصل شکاری وقت تھا تقدیر تھی اور ہمارے مقاصد و عزائم تھے۔ دلاور مجھے اپنی راہ سے ہٹانا چاہتا تھا تو میں دلاور کو اس کے اعمال کی سزا میں تختہ دار پر دیکھنے کا آرزو مند تھا۔ شوکت رانا سارے کاروبار پر قابض ہونے کے لیے دلاور کو ختم کرنا چاہتا تھا تو دلاور کی بیوی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ شوکت رانا کو مار دو۔ نہ جانے کتنے لوگ تھے جو انجام سے بے خبر اس شکار گاہ میں ایک دوسرے سے الجھتے پھر رہے تھے اور ایک دوسرے کی تلاش میں بھی تھے۔

چند افراد دیوار کے ساتھ ساتھ کوڑے خانے تک بھی آئے۔ اگر دن کا اجالا ہوتا تو ان کی کھوجی نظریں فرش خاک پر وہ نشانات دیکھ لیتیں جو میرے ہاتھوں پیروں کے بل گھسٹنے سے نمایاں ہو گئے تھے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مایوس ہو گئے ہیں۔ ان کو یقین تھا کہ ہم دیوار کے شگاف سے نکل گئے اور اب ہمارے اندر کہیں ملنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ ان میں سے کسی کو ہمارے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایک کا خیال تھا کہ گاڑی میں دو مرد تھے اور دو عورتیں تھیں۔ دوسرے نے ایک عورت کے ساتھ تین مرد دیکھے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ جیل سے قیدی فرار ہوئے ہیں تو کسی کا خیال تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے اور محافظوں کی فائرنگ نے قیدی چھڑانے والوں کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

رابعہ سب سے پہلے باہر گئی تھی۔ محسن کے بارے میں بھی مجھے شک نہیں تھا کہ پیچھا کرنے والوں کو گمراہ کر کے وہ بھی دیوار کے اوپر سے باہر کود گیا اور بازار میں عام لوگوں کے ساتھ مل گیا۔ ریٹائرڈ جاوید صدیقی کا پتا نہیں تھا کہ اس نے جیل کی دیوار کا راستہ کیا اپنایا تھا اور وہ کس حد تک اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر سکا۔ اس کی تمام تر کارروائی غیر قانونی اور بلا جواز تھی۔ معطل کیے جانے کے بعد وہ ایس ایس پی کی وردی پہن کے کسی کو بھی

ہے۔ ہم تو کار میں اس راستے سے رکے بغیر گزر گئے تھے کھیت میں چھوٹی بڑی کیاریاں بنی ہوئی تھیں اور کہیں پانی اتنا زیادہ دیا گیا تھا کہ مٹی بھی کیچڑ بن گئی تھی مگر تقریباً نئی کار کے انجن کی ٹیوننگ بھی بہترین ہوئی تھی اور اس کے ٹائر بھی بالکل نئے تھے چنانچہ تیز رفتاری میں گاڑی زمین پر سے کیچڑ اچھالتی نکل گئی تھی۔

موٹر سائیکل کے لیے یہ راستہ انتہائی ناموزوں تھا مگر موٹر سائیکل والا بھی ہوشیار تھا۔ وہ شاید یہیں کا رہنے والا تھا اور اس کچے صاف راستے سے واقف تھا جو بازار جانے والے شگاف تک پہنچنے کے لیے استعمال کرتے ہوں گے۔ وہ اسی راستے پر موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ قسمت ساتھ دیتی یا وہ جلدی میں نہ ہوتا تو ناکام ہی نہ ہوتا۔ رات کے اندھیرے میں وہ منڈیر سے اتر گیا اور اس کی موٹر سائیکل پانی کے کھیت میں بند ہو گئی۔ سوار اپنی سواری سمیت کیچڑ میں گر گیا۔ جیسے کہ جھٹکا گرا دے برقی کے بازار میں۔

اس سے پہلے کہ لوگ گرا ہوا جھٹکا اٹھاتے میں نے چوہدری دلاور کو کندھے پر اٹھایا اور دیوار کے ساتھ ساتھ رینگتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ چوہدری دلاور میری پیٹھ پر تھا اور اس بوجھ کا توازن برقرار رکھتے ہوئے میں چاروں ہاتھوں پیروں پر چل رہا تھا۔ دلاور کے دونوں ہاتھ میرے دونوں بازوؤں کے ساتھ لٹک رہے تھے اور اس کی ایڑیاں میرے بازوؤں سے ٹکرا رہی تھیں مگر میں نے پیش قدمی جاری رکھی۔

دیوار کی جڑ میں مکمل اندھیرا تھا۔ یہاں سخت مٹی تھی اور کنکر تھے جو میری ہتھیلیوں میں گڑ رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دیوار میں ایک پتلی سی نالی تھی۔ میں مشکل سے سو قدم ہی گیا تھا کہ کھلے گٹر میں گر گیا۔ یہ گٹر دیوار کے نیچے سے گزرنے والی سیوریج لائن کا تھا اور اس پر ڈھکن کا نہ ہونا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ہم تو مصروف شاہراہوں پر کھلے منہ والے مین ہول دیکھ کے بھی حیران نہیں ہوتے۔

مکمل تاریکی میں کھلے مین ہول کا اندھیرا مجھے دکھائی ہی نہیں دیا۔ جب میں اندر گرا تو میرے ہاتھ پہلے خلا میں آئے۔ میں منہ کے بل غلاظت کے سیال مشروب میں اتر جاتا تو پھر باہر نکل کے دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ ایک خود کار اور فوری ردعمل کے ساتھ میرا جسم اکڑ گیا اور میں نے دلاور کے بوجھ سمیت خود کو اتنا اوپر اٹھا لیا کہ میرے ہاتھ گٹر کے دوسرے کنارے پر جم گئے۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے گٹر کی سائیڈ سے گزر گیا۔ اس کے فوراً بعد وہ مختصر سا احاطہ تھا جس میں کوڑا کرکٹ جلایا جاتا تھا۔ ایک لمحے کا توقف کیے بغیر میں نے پہلے دلاور کو اندر دھکیلا اور پھر خود بھی اندر اتر گیا۔

گندگی اور کوڑے کرکٹ کی بدبو میرا دماغ خراب کر رہی تھی لیکن میں دم سادھے اس کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں نے

www.paksociety.com

کوئی حکم نہیں دے سکتا تھا۔ معلوم نہیں وہ چار مسلح سپاہی کیسے ساتھ لایا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ ابھی تک اس کے معطل ہونے کی خبر عام نہیں ہوئی تھی۔ خود اس کے دوست جیلر نوشید کو علم نہیں ہوگا کہ جاوید صدیقی کی ذہانت اس انتہا پر پہنچ جائے گی کہ وہ اپنے ساتھ اس کی نوکری کو بھی داؤ پر لگا دے گا۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

اس تاریک منحوس احاطے سے نکلنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ دیوار کے شگاف تک راستہ صاف ہو جائے۔ میں نے سر کو دیوار سے اوپر اٹھایا تو بمشکل ٹوٹی گاڑی کے پاس دو مسلح گارڈ نظر آئے۔ یہ گاڑی نہیں بھاگتے چور کی لنگوٹی تھی۔ اب تفتیش کرنے والے اس لنگوٹی کا خوردبینی معائنہ فرما کے پتا چلانے کی کوشش کریں گے کہ چور کون تھا۔ گاڑی میں دستیاب فنگر پرنٹس کے فوٹو بنائے جائیں گے۔ کاغذات کی مدد سے شجاعت علی بغداری کا سراغ لگایا جائے گا اور بات پہنچے گی ایک بڑا موبیل روڈ کراچی کے جینوپل ہوٹل تک اور اس شوروم تک جہاں سے میں نے گاڑی خریدی تھی۔ بہت جھک مارنے کے بعد ماہرین رپورٹ دیں گے کہ شجاعت علی بغداری نام کا کوئی شخص نہیں۔ وہ غالباً چوہدری دلاور کا پرانا دشمن سکندر بخت تھا جس نے یہ گاڑی فرضی نام سے اسی لیے خریدی تھی کہ دلاور کو اغوا کر لے۔ اس خیال کی تائید گاڑی میں رابعہ اور محسن کی موجودگی سے بھی ہو جائے گی۔ تاہم یہ اندازے اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہوں گے کہ آخر دلاور کے کوٹ لکھپت جیل میں زندہ پائے جانے کی خبر عام کیسے ہوئی جب کہ اسے تو مردہ قرار دیا جا چکا تھا۔

ہم سب تو یہاں ایک ہی مقصد لے کر آئے تھے مگر حادثاتی طور پر افراتفری کا شکار ہوئے تھے۔ اور اب ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ ابھی یہ کہنا بھی قبل از وقت تھا کہ وہ مقصد حاصل ہو گیا۔ مقصد میرے سامنے کچرے کے ساتھ پڑا ہوا تھا لیکن اس کی ترسیل کا مسئلہ حل ہونا باقی تھا۔

جیل خانے کی حدود سے نکل جانے والے یعنی رابعہ اور محسن تو یقیناً باہر ایک دوسرے سے مل چکے ہوں گے۔ رابعہ دیوار کے بیچ ہی سے گزر گئی تھی تو محسن دیوار کے اوپر سے گزرا تھا اور وہ بال بال بچ گیا تھا ورنہ کنزا آتی میں سوئمنگ کرتا ہوا دیوار کے نیچے سے گزر جاتا۔ جتنی فکر مجھے اپنے کم عمر لواحقین کی تھی اتنی ہی ان کو میری ہوگی اور مجھ سے زیادہ مال غنیمت یعنی اپنے چوہدری صاحب کی۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی کا معاملہ الگ تھا لیکن اسے رونے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ تو شاید دو چار کو ہمراہ ہی لے گیا ہوگا مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا اور ہم سے پھر کہاں ملے گا۔ صورت حال دہری ہو گئی تھی کہ میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ بڑی مشکل سے ہم نے دلاور کو پولیس کے حوالے کیا تھا مگر وہ پھر ہمارے ساتھ بلائے بے درماں کی طرح چپٹا ہوا تھا۔ گاڑی

میں اس کا ہونا ثبوت جب ہوش میں آئے گا تو چلائے گا اور یا شاید ابا کو یاد کرے گا اور پوچھے گا میں کہاں ہوں؟

چوہدری دلاور نے اچانک کراہ کے کہا "ملک بخت..."

"... چپ کرکے پڑا رہ بدبخت سور..."

"ابے..." شاید سکندر بخت کی زبان سن کے وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کی خاموشی کو بے ہوشی سمجھ کر مطمئن ہونا بھی غلط تھا۔ اس کے حواس بحال ہو رہے تھے اور شاید اسے نظر آنے لگا تھا کہ جیل خانے سے فرار کا عظیم الشان منصوبہ اچانک ناکامی کی نذر ہو گیا تھا۔ اسپتال کے ریکارڈز میں فوت ہو جانے والا چوہدری دلاور یہاں کچرا خانے میں پڑا تھا۔ نہ جانے اس کار خیر پر چوہدری دلاور کے وارثوں نے کتنا پیسہ خرچ کیا تھا۔ بیچ میں ہم نہ کودتے تو یک وقت دو مقاصد حاصل ہونے تھے۔ دلاور کی گرفتاری کی بات غلط ہو جاتی۔ یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔ دلاور چھ ماہ یا سال ولایت کے صحت افزا اور پرسکون ماحول میں گزار کے لوٹتا اور اچانک اعلان کر دیتا کہ میں دنیا میں نہیں لندن اور پیرس میں تھا۔ کون کہتا ہے کہ میں اغوا ہوا یا بیمار ہو گیا تھا۔ وہ کوئی اور دلاور ہوگا اور اگر وہ چوہدری دلاور تھا تو فوت ہو گیا ہوگا۔ ایک نام کے کئی لوگ ہوتے ہیں۔ میری شناخت ثبوت کی محتاج نہیں اور چوہدری دلاور کی عدم موجودگی میں دوسرا مقصد یہ پورا ہوتا کہ دو جراءت مند افسر کو تفتیش کے دوران ملزم سے ہلاک کروانے پر ایس ایس پی جاوید صدیقی کو سزا ہو جاتی۔ نوکری اور عزت تو لازمی جاتی۔ جیل جانے کی نوبت بھی آ جاتی۔ چوہدری دلاور کے دوسرا جنم لینے پر گویا معمہ بن جاتا۔ سب کو تعجب ہوتا کہ آخر یہ سب کس نے کیا تھا اور کیوں؟ لیکن گڑے مردے اکھاڑ کے پرانے سوالات کا جواب حاصل کرنا آسان نہ ہوتا۔

معلوم نہیں چوہدری دلاور کے ذہن میں ایسا ہی کوئی منصوبہ تھا یا کچھ اور۔ میرے ذہن میں اس وقت ایک ہی منصوبہ تھا کہ چوہدری دلاور کو کندھے پر بٹھا کے الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح پرواز کر جاؤں۔ سیدھا جا کے اتروں ایس ایس پی جاوید صدیقی کی کوٹھی میں اور سر جھکا کے کہوں کہ غلام حاضر ہے۔ یہ چوہدری دلاور کو سامنے رکھ دوں۔ مگر اس سے زیادہ مشکل مجھے چھ فٹ اونچی دیوار عبور کرنا لگ رہا تھا۔

میرے کانوں میں اب ایک نئی آواز گونج رہی تھی۔ یہ ملک بخت کی آواز تھی جسے اپنے چوہدری صاحب نے بے ہوشی کے عالم میں یاد فرمایا تھا۔ ایک ماں کا اپنا لخت جگر... فرط جذبات میں چلا رہی تھی "ہائے ہائے قبیل کیا ہوا ہے تجھے... اللہ بیڑا غرق کرے ان کا۔ جنہوں نے تیرا یہ حال کیا ہے" اس عورت کے جگر کا ٹکڑا تو قتل کیا گیا تھا مگر دل کا ٹکڑا جہاں... ہوا تھا۔ اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ چوہدری دلاور کے...

تھے اور پکڑے جانے کے خوف کی سنسنی ختم ہو گئی تھی۔ میں نے کچرا خانے سے نکل کے تازہ ہوا کھانے کا سوچا اور پھر خود کو صبر کی تلقین کی۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ مجھے دریافت کرنے کے بعد محسن اور رابعہ مجھے جلد از جلد یہاں سے نکال کر لے جانے کی تدبیر میں مصروف ہوں گے۔ انتظار فرمایئے۔

میں نے مزید دس منٹ انتظار فرمایا اور اس دورانیے میں کم سے کم بیس بار گھڑی دیکھی۔ ادھر میں باہر دیوار کے اوپر سے سر نکال کے دیکھا مگر اس سارے علاقے میں اندھیرے کا راج تھا اور ہر طرف سوالیہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس سے آگے محلے کے رہائشی کوارٹر اور جیل کی سرچ لائٹس سے منور علاقہ تھا۔ یہ ایک الگ دنیا تھی۔

محسن نے کچرے خانے کی دیوار کے اوپر سے کہا "ہیلو کچرا ہاؤس! میں بھی آ گیا تھا۔ میں اوپر سے جھانکنا چاہتا تھا۔"

میرا سر اس کی ٹھوڑی پر لگا "ہو گیا نا...؟"

"اور کیا باہر کی گھوڑے ساتھ لاتا؟" وہ بولا "خود بھی بڑی مشکل سے پہنچا ہوں۔ رابعہ باہر کھڑی ہے۔ میں بھی جا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "اپنے چوہدری صاحب کا جنازہ کیسے جائے گا؟"

محسن نے ہاتھ بڑھا کے کہا "اسے اٹھا کے دیوار پر رکھ۔ میں دوسری طرف سے اتاروں گا۔ اس کے بعد آپ خود جیسے چاہیں تشریف لے آئیں۔ دیوار میں سے یا دیوار کے اوپر سے۔"

اس نے عملی مظاہرے کے لیے چھ فٹ کی دیوار پر ہاتھ رکھے اور خود کو اوپر اٹھایا۔ پھر جمناسٹک کا نمونہ پیش کرتے ہوئے دوسری طرف غائب ہو گیا۔ میں نے بلا توقف چوہدری دلاور کو کچرا خانے کی دیوار پر لٹا دیا اور خود باہر نکل آیا۔ یہاں سے بیرونی دیوار تک کا فاصلہ چند قدم تھا جسے عبور کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے چوہدری بہادر کو لٹایا تو وہ فوراً ہی غائب ہو گیا۔ دوسری طرف محسن مستعد کھڑا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ ہم سب کے لیے سواری بھی دستیاب تھی۔ یہ وہ گاڑی جو کراچی میں شجاعت علی بغداری نے خریدی تھی اور لاہور میں سکندر بخت نے بڑی محبت سے گلی کوچے میں دی تھی پولیس کے قبضے میں پہنچ چکی تھی اور اب اسے بھول جانا ہی بہتر تھا۔ سبار زندہ و مصیبت باقی۔ تمہیں ہم اس سے بھی زیادہ عالی شان کار کا تحفہ دیں گے کبھی انشاءاللہ۔

میں نے محسن کی طرح جمپ لگا کے دیوار کو عبور کیا تو عین محسن کے اوپر اترا۔ اس میں قصور میرا نہیں تھا۔ محسن کو کسی اور جگہ کھڑے ہونا چاہیے تھا۔ وہ بہت خفا ہوا۔

"سیدھے لالہ آپ کا کہانی کی طرح نازل ہونا ضروری تھا؟"

میں نے اسے تسلی دی "نیوٹن کے سر پر سیب گرا تھا تو اس نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ وہ ناریل کے درخت کے نیچے نہیں بیٹھا تھا۔ آرام سے بجائے مجھ پر سواری خادم حسین کی گھر والی جھاڑ لگا دیا؟"

نہیں کر سکتی تھی اور اس کی لاش کے غائب ہو جانے کا ماتم کرنے سے بھی قاصر تھی۔ وہ شور کر رہی تھی کہ آخر وہ کمینہ محسن وہ لفنگا کورا کتیل اور وہ حرافہ رابعہ نکل کیسے گئے۔ اتنے لوگ رکھے ہوئے تھے۔ اتنے لوگ دوڑ رہے تھے۔ سیٹیاں بجا رہے تھے اور گولیاں چلا رہے تھے۔

جو سوال اس کے ذہن میں ہوگا لیکن وہ پوچھ نہیں سکتی تھی یہ تھا کہ آخر وہ سب عین اس وقت یہاں وارد کیسے ہوئے جب اپنے چوہدری صاحب کی رخصتی ہو رہی تھی۔ دلہن تو صرف اعلان کرنا ہے کہ منصوبہ شادی نہیں ہو سکتی۔ وہ دولہا کو ہی لے گئے۔

مسز دلاور کے ہنگامے کا مقصد کچھ نہیں تھا۔ میں نے دوبارہ سر اٹھا کے دیکھا تو مجھے دیوار کے شگاف کے پاس آٹھ دس افراد نظر آئے۔ ان میں سے کچھ باہر جا کے بھی مایوس لوٹے ہوں گے۔ دلاور کی بیوی کو غالباً اس کا بیٹا ہی وہاں سے لے جانے پر آمادہ کر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر ماں کو گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ ہیڈلائٹس روشن ہوئیں تو میں نے اپنا سر نیچے کر لیا۔ لائٹ ایک نصف دائرے میں گھوم گئی اور میں نے گاڑی کو واپس جاتا دیکھ کے خدا کا شکر ادا کیا۔

اچانک میرے کانوں میں ایک نئی آواز آئی "کبیر داس۔ کہاں ہو تم؟" مگر میرے بگڑے ہوئے نام کے سوا باقی سب الفاظ فریج کے تھے۔ کبیر خان کو کبیر داس کہنے والا بھی محسن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ باہر دیوار کے پاس سے گزر رہا تھا۔

میں نے جواب میں ہانک لگائی "مشیر والی پچکاری ہے کہ انجن۔"

ظاہر ہے یہ دونوں سوالات اتنے بے سروپا تھے کہ کوئی اور متوجہ نہیں ہو سکتا تھا مگر میری آواز محسن کے کانوں تک پہنچی تو وہ رک گیا۔ اس کا علم مجھے یوں ہوا کہ محسن کی کھوپڑی دیوار پر نمودار ہوئی۔

اس نے آہستہ سے کہا "کہاں ہو تم کبیر داس؟"

میں نے کہا "یہاں کچرے میں پڑا ہوں۔ مال سمیت۔"

اس نے کہا "اچھا دوست۔ جہاں رہو خوش رہو۔" اور غائب ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پھر آئے گا۔ اس نے میرا سراغ لگا لیا تھا اور اب اس کے لیے مجھے باہر لے جانے کا مسئلہ تھا جو شاید وہ رابعہ کی مدد سے حل کرے گا۔ میں نے پھر سر اٹھا کے باہر نگاہ ڈالی تو مطلع صاف ہو چکا تھا۔ دیوار کے شگاف کو گھورنے والا واحد شخص بھی میری نظروں کے سامنے واپس روانہ ہو گیا۔

دلاور نے سر اٹھا کے نقاہت سے سوال کیا "میں کہاں ہوں، تم کون ہو؟"

میں نے کہا "میں تمہارا باپ ہوں اور تم جہنم میں ہو" اور اسے پھر ناک آؤٹ کر دیا ورنہ وہ مزید سوالات کرتا۔ شاید میرا نام پکارتا۔ ابھی اس کو چپ رکھنا ضروری تھا۔

اب مجھے محسن کا انتظار تھا۔ میرے اعصاب پرسکون ہونے

www.paksociety.com

محسن نے کہا "جلدی سے بیٹھو گاڑی میں۔"
میں نے کہا "یہ تو ری پولیس کی گاڑی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اندر ایس ایس پی جاوید صدیقی صاحب بھی ہوں گے۔"
محسن نے چوہدری دلاور کو جیپ میں ڈال دیا تھا۔ اس کی اگلی سیٹ پر خود جاوید صدیقی موجود تھا اور اس کے ساتھ رابعہ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اور محسن پیچھے سوار ہو گئے۔ جیپ نصف دائرے میں گھوم کے واپس ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ دیوار جس پر سے ہم کودے تھے ایک گیراج کے مقابل تھی لیکن گیراج بند تھا اور اس کے باہر بہت سی مرمت طلب گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کارروائی کو کسی نے نہیں دیکھا۔ ویسے بھی پولیس کی جیپ پر شک کی نظر ڈالنے کی گستاخی کوئی نہیں کرتا۔
میں نے کہا "آخر ہم سب کیسے اکٹھے ہو گئے۔ جو بچھڑ چکے تھے۔" میں نے فرنچ میں بات چیت شروع کی۔
محسن بولا "رابعہ نے باہر نکلتے ہی ٹیکسی پکڑی اور احاطے کے مین گیٹ کی طرف سے دوبارہ اندر پہنچ گئی۔ وہاں جاوید صدیقی کی جیپ موجود تھی۔ رابعہ اس میں جا کے بیٹھ گئی۔"
"اور خود صدیقی صاحب کہاں تھے؟"
"وہ جیل کے اندر سے آنے والی وین چیک کرا رہے تھے۔ ان کے ساتھ آنے والی فوج نے وین پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس میں ڈرائیور کے علاوہ بھی ایک زندہ شخص تھا اور ایک لاش تھی۔ وین ابھی چلی گئی تو رابعہ ہی صدیقی صاحب کو ادھر لے آئی۔"
"لاش کس کی تھی؟"
"چوہدری دلاور کی" محسن نے جواب دیا "پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ قبضے میں لے لی گئی۔"
"بھئی واہ کیا بات ہے" میں نے کہا "بیک وقت دو عدد چوہدری دلاور۔ ایک زندہ ایک مردہ۔"
"ظاہر ہے وہ چوہدری دلاور نہیں تھا۔"
میں نے تیز اعلان کے کہا "میں شرط لگا سکتا ہوں کہ جسے میں کوڑا خانے سے اٹھا کے لایا ہوں وہ چوہدری دلاور ہے۔"
محسن مسکرایا "میں دوسرے کی بات کر رہا ہوں جو فوت ہو چکا تھا۔ اس کی صورت کافی حد تک چوہدری دلاور سے ملتی تھی۔ ویسی ڈیل ڈول بھی تھا۔ باقی کمی اسے دلاور کے کپڑے پہنا کے داڑھی، ہیئر اسٹائل بنا کے اور میک اپ سے پوری کی گئی تھی۔"
"آخر وہ تھا کون جسے چوہدری دلاور کی لاش کہلانے کا شرف حاصل ہوا؟"
"یہ تو میں نے اس سے نہیں پوچھا" محسن بولا۔
"بے وقوف۔ ایسے تم کبھی سراغ رساں نہیں بن سکتے۔"
میں نے اسے ڈانٹا "اب وہ کہاں ہے؟"
"وہ قیدیوں کو عدالت میں پیشی کے لیے لے جانے والی وین تھی۔ آج رات ہائی کورٹ کے احاطے کے پیچھے کھڑی رہے گی۔

اس کے اوپر ترپال ڈال دی جائے گی تاکہ اسے پہچانا نہ جا سکے۔ جعلی چوہدری دلاور کی لاش ... پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ باہر نکالنے والوں کی تو یہ ترکیب تھی۔ اس خیال سے کہ لاش ہی نہیں جھوٹا پوسٹ ... پوسٹ مارٹم رپورٹ عدالت میں پیش کر دی گئی تو ... کریں گے کہ مرنے والا درحقیقت کون تھا جسے ... چوہدری دلاور بنانے کا مقصد کیا تھا؟"
"ایس ایس پی جاوید صدیقی نے تو ... سوال کا اس حد تک فرض شناس فرض ... چاہیے۔" میں نے کہا "اچھا ہوا جو اس کی باتوں میں ... اپنے محکمہ کے کرپٹ ہونے کا اعتراف نہیں کیا۔"
"ڈاکٹر خورشید بہت گالیاں دے رہا ہو گا ... نے رپورٹ بھی دے دی ہو گی ڈی آئی جی صاحب ... خبردار ہو گیا۔ دونوں چوہدری دلاور چوری ہو گئے ... والا ہے پولیس کا اپنا جاوید صدیقی۔ وہ ہمارے ... میں شامل ہو گیا ہے اور اب یا تو رات بھر میں ... کر لیا جائے یا پھر اپنی اپنی نوکری کی خیر منائی جائے ... کہا۔
"پولیس رات بھر اس وین کو تلاش کرے گی۔ اگر ... سے کامیاب ہو گئے۔"
"صدیقی نے اپنے اغوا کا امکان باقی نہیں رہنے دیا ... جاوید صدیقی کی بقا کا انحصار ہے کہ وہ پولیس کے چند ... افسروں کی ضمیر فروشی کا بھانڈا پھوڑ دے۔ ساری سازش ... عدالت میں بیان کر دے تو وہ بھی بچ جائے گا اور چوہدری ... بھی گرفتار کرا دے گا۔ وہ سب دلیلوں کے ساتھ ہائی کورٹ ... بیان دینے حاضر ہو گا۔ بیان دینے کے بعد عدالت عالیہ ... اٹھے گا۔ صبح کے اخبارات چیخ رہے ہوں گے جس ... کی پولیس کانفرنس کی روداد چھپی ہو گی اور ان کے استعفے ..."
میں نے کہا "آج کی رات بہت اہم ہے۔ یہ خیریت ... جائے اور ہم خیریت کے ساتھ ہائی کورٹ پہنچنے میں ... ہو جائیں۔"
"تم رابعہ کے ساتھ رہو۔ رفتار یوسف اور اس کی ... ہی غائب ہو گئے ہیں۔ تمہارے لیے نہ رابعہ کا آفس محفوظ ... اور نہ مشتاق کا گھر۔"
"پھر میں کہاں جاؤں۔ میری تو کوئی سسرال بھی نہیں ..." میں نے کہا۔
"تم کو مولوی غلام حسین کے ساتھ جانا ہے ... سسرال" محسن نے کہا۔ "میں رہوں گا اپنے بیوی بچوں ... اندرون لوہاری دروازہ۔"
"اور اپنے چوہدری دلاور صاحب ... صاحب!"

... تو دیکھنا چاہیے کہ گلی سے کون گزر رہا ... بیزاری کا اظہار کیا۔
رابعہ نے ... کہا "کمال ہے۔ کیا تو مہارت ہے کہ گرا کر بھی ... پیچھے کا ... نہیں گرا۔"
"... اسی لیے تو میرے سر پر نہیں گرا۔"
... اچانک رابعہ کا پاؤں ٹوکرے یا ... اور وہ گرتے گرتے بچی۔ "یہ گڑھا کس نے کھود رکھا ہے؟"
... کہا "جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ ... میں گرتے ہیں۔ ویسے یہ گلیاں اونچی ایڑی کے جوتے پہن کر ... پیچھے والوں کے لیے نہیں بنائی گئی ہیں۔ دیکھو جینس ... سامنے سے۔ اب وہ اس کے اوپر سے گزر جاتا یا پھر ... نالیوں میں۔"
"پھر کیا جوتے ہاتھ میں لے کر چلوں۔ غلام حسین ... نہیں ہوتے؟" رابعہ گھبرا کے بولی۔
چند قدم ابھی پورے ... غلام حسین نے فوراً ایک دروازے پر دستک دے دی ... ہو گئے بات یہ ہے کہ گلی میں رکشا ٹیکسی تو آ نہیں سکتے۔"
"بھینس ... ہے کیا حرج ہے اگر بھینس ٹیکسی چلا دی جائے نازک مزاج مسافروں کے لیے۔ وہ مسافر تو بیٹھ سکتے ہیں اس ..."
گلی اس بھینس سے کچھ زیادہ ہی پڑی تھی۔ رابعہ اور میں دیوار سے لگ کے کھڑے ہو گئے تھے لیکن گھر کا دروازہ بروقت کھل گیا اور ہم فوراً اندر داخل ہو گئے۔ اگر بھینس مجھ سے ذرا بچ نکل کے گزر جاتی تب بھی میں اتنا حیران نہ ہوتا جتنا غلام حسین کے گھر میں مارگریٹ کو دیکھ کے ہوا۔ وہ شلوار قمیص کے ساتھ دوپٹہ سر پر رکھے مسکرا رہی تھی۔ بظاہر اس چھوٹے سے گھر میں کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔
رابعہ نے سخت حیرانی سے کہا "مارگریٹ۔ تم یہاں...؟"
مارگریٹ نے مسکرا کے کہا "مارگریٹ نہیں۔ اب میں مریم ہوں۔ یہ میرا اسلامی نام ہے۔"
"اچھا؟ تو تم مسلمان ہو گئی ہو" رابعہ نے بے حد مسرت کا اظہار کیا۔
"ہاں جی۔ اور مجھ سے نکاح بھی پڑھوا لیا ہے مریم نے" غلام حسین نے شرافت نکالتے ہوئے شرما کے کہا "بڑا ثواب ہے جی اس کا۔"
میں بھونچکا رہ گیا "یعنی! تم نے شادی کر لی ہے مارگریٹ.... میرا مطلب ہے مریم سے۔ کب... اور کیوں؟"
"بس جی اللہ کی مرضی یہی تھی۔ اور جب اس کا حکم ہوتا ہے تو ... سب ہو جاتا ہے جی۔ میں نے تو عرض کی تھی جناب سے بھی۔"
رابعہ کا صدمے سے برا حال تھا "غلام حسین۔ شرم آنی چاہیے تمہیں تو مولوی ساری ..."

"جاوید صدیقی نے اپنا کوئی بندوبست کیا ہے جو اس نے ہمیں بھی نہیں بتایا۔ وہ چوہدری دلاور کو ساتھ ہی لے جائے گا اور صبح ٹھیک نو بجے ہائی کورٹ پہنچے گا۔"
میں نے پوچھا "اخبار والے حسب معمول ہوں گے؟"
"نہیں۔ صدیقی نے منع کر دیا ہے۔ دراصل وہ اس معاملے میں کسی پر بھروسا کر کے کوئی رسک لینے کے موڈ میں نہیں ہے۔ سوال صرف اس کی زندگی یا نوکری کا نہیں۔ اس کے بیوی بچوں کے مستقبل کا بھی ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جنگ ہے تو پھر سب کچھ جائز ہے۔"
"جنگ بھی ہے اپنے ہی محکمے کے سرغنوں سے۔ بدمعاشوں سے اور ان کی سرپرستی کرنے والوں سے۔ معرکہ سخت ہے اور جان عزیز۔"
جیپ اچانک رک گئی۔ محسن نے کہا "پلیز گیٹ آؤٹ۔"
میں نے کہا "کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ آپ شرافت سے جاتے ہیں یا آپ کو اٹھا کے پھینکا جائے باہر۔"
میں نے فٹ پاتھ پر غلام حسین کا چہرہ اور پھر رابعہ کو اترتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہاں سے ہمارے راستے جدا ہوں گے۔ "مجھے کس کے حوالے کر کے جا رہے ہو دوست؟" میں نے آواز میں رقت پیدا کر کے غلام حسین کو دیکھا "اگر اس نے رابعہ کو ورغلا کے اس سے نکاح پڑھوا لیا تو میرا کیا ہو گا۔ یہ مولوی سخت ناقابل اعتبار چیز ہے۔ ہر ایک پر اس کی رال ٹپک پڑتی ہے۔"
جیپ آگے بڑھ گئی تھی۔ غلام حسین نے افسوس سے سر ہلایا "کیسی لغو باتیں کرنے لگے ہیں آپ بھی۔ رابعہ میرے لیے ہمشیرہ صاحبہ کی طرح ہیں۔"
"ہمشیرہ کی طرح" میں نے طنز سے کہا "ہمشیرہ کیوں نہیں۔ مولوی غلام حسین! میں تم کو تمہاری سسرال پہنچتے ہی قتل کر دوں گا۔ اس کے بعد ہی میں خود کو محفوظ سمجھ سکتا ہوں۔"
رابعہ نے مجھے ڈانٹا "کیا فضول بولتے جا رہے ہو۔ چلو کوئی ٹیکسی کرو۔"
غلام حسین نے کہا "اس کی ضرورت نہیں۔ ناچیز کی منکوحہ کا آبائی غریب خانہ چند قدم کی مسافت پر ہے۔ اس گلی میں تشریف لائیے۔"
وہ چند قدم چند سو گز ثابت ہوئے اور غلام حسین مختلف گلیوں سے گزر کے ایک ذیلی سڑک پر طلوع ہوا۔ پھر گلیوں کا دوسرا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے واضح کیا کہ یہ شارٹ کٹ ہے۔ وہ عام سی گلیاں تھیں جن میں عام سے لوگ رہتے تھے۔ عام گھروں میں ٹی وی چل رہے تھے۔ بچوں کی لڑائی چل رہی تھی یا میاں بیوی کی۔ ایک جگہ کسی جلد مند اور مہذب خاتون نے کھڑکی کھول کے کچن کا تمام کچرا گلی میں پھینک دیا جو عین میرے سامنے گرا۔

www.paksociety.com

"محبت میں کیسی شرم" خادم حسین بولا "مریم نے برضا و رغبت میرے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور میں نے اس سے عقد کرلیا۔"

"اور وہ پہلے والی؟ اسے نکال باہر کیا تم نے؟"

"نہیں جی۔ وہ بھی ہے۔ شرط صرف عدل و انصاف کی ہے نکاح ثانی کے لیے۔ وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔ مریم اپنے گھر میں۔"

"اور تم۔ تمہارا گھر کون سا ہے خادم حسین؟" رابعہ نے کہا "یہ تو مجھے معلوم ہے کہ انصاف تم کتنا کروگے۔ تمہیں سوتیلا تو دو اور نکاح کروگے تم ثواب کی خاطر۔ گھر کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ان کے گھر تمہارے گھر۔ آخر تمہاری عقل کو کیا ہوگیا تھا مریم کہ تم نے خادم حسین جیسے شخص سے شادی کرلی؟"

مریم کا چہرہ بجھ گیا "کیوں؟ پھر کس سے شادی کرتی؟ سکندر بخت جیسے کسی گبرو جوان سے۔ ویسے تو بہت آئے میری زندگی میں اور گئے۔ سب سچا عشق کرنے والے اور خود کو دوسروں سے مختلف ثابت کرنے والے تھے مگر شادی کسی نے کی مارگریٹ سے۔ خدا کا شکر ادا کرو مس رابعہ کہ تم نے زندگی کا صرف روشن پہلو دیکھا ہے۔ تم میری جگہ ہوتیں' ہر آنے جانے والے سے آس لگاتیں کہ وہ تمہیں ایک گھر اور ایک محفوظ مستقبل کے خواب کی تعبیر دے لیکن خواب دکھانے والا تمہیں صرف احساس گناہ یا اس کی نشانی دے کر چلا جائے۔ جس سے پیچھا چھڑانے کے لیے تمہیں قتل کرنا پڑتا۔ اپنی ممتا کو مارنا پڑتا۔ پھر شاید تمہیں مولوی خادم حسین کی قدر ہوتی۔ جو تو ہی کے روپ میں انسان ہے۔ میں اسے فرشتہ نہیں سمجھتی۔"

رابعہ کو شاید زندگی میں اتنی شرمندگی کبھی نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ وہ مجرم بنی سر جھکائے کھڑی تھی۔ میں خود اپنے آپ سے شرمسار تھا۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔ مجنوں کو بھی تو لیلیٰ کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ میرے نزدیک خادم حسین مضحکہ خیز حلیے والا ایک بے وقوف سا شخص تھا جس میں کوئی غیر معمولی صلاحیت نہیں تھی ہم اس سے ہر طرح کا مذاق کرلیتے تھے اور اس کی باتوں کا تمسخر اڑاتے تھے مگر وہ برا نہیں مانتا تھا۔ اس میں بہت سی خامیاں تھیں' مریم نے اسے فرشتہ نہیں کہا تھا۔ خادم حسین نے خود کو انسان ثابت کردیا تھا۔ اس نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ اس نے واقعی ایک غیر مسلم کو مسلمان کرلیا تھا اور پھر اس سے شادی کرلی تھی۔ اس نے صرف اپنا مطلب پورا کرنے کا نہیں سوچا تھا۔ اس نے ایک بے سہارا لڑکی کو سہارا دیا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کو شریک حیات بنالیا تھا جو معاشرے کے روایتی معیار سے آبرو باختہ تھی اور جس کا ماضی اس حد تک شرمناک تھا کہ دوسرے اس کو دیکھ کے اپنا منہ نفرت سے پھیر لیتے تھے۔

مریم نے کہا "آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں' اندر آئیے۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری خادم حسین' تم نے واقعی بہت بڑا کام کیا ہے۔ تمہیں شادی مبارک ہو۔"

رابعہ نے بھی کہا "مجھے معاف کردو مریم۔ میں نے غلط کہا تھا۔"

مریم نے کہا "آپ ہمارے گھر آنے والے پہلے مہمان ہیں۔ مہمان خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔"

میں نے مزید شرمندہ ہوکے کہا "مولوی خادم حسین تم نے بتا دیتے تو ہم خالی ہاتھ نہ آتے۔ کم سے کم مٹھائی ضرور لاتے۔"

خادم حسین کے چہرے پر خوشی کی روشنی پھیل گئی۔ "تکلف والی بات مت کریں جی۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ بتایا میں نے کسی کو نہیں ابھی تک۔ محسن صاحب سے اور مظفر صاحب سے ڈر لگتا ہے مجھے۔ ان کی زبان بڑی بے لگام ہے۔"

میں نے کہا "تم فکر مت کرو۔ میں سمجھادوں گا انہیں۔ ویسے وہ بھی کتنے اچھے ہیں' یہ تم بھی جانتے ہو۔"

مولوی خادم حسین ہنسنے لگا "معلوم ہے جی۔ یہ بات کیا مجھے نہیں معلوم؟ آپ سب کا دل تو ہیرا ہے جی ہیرا۔ اس پر چاہے جیسا غلاف ہو۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "شاید اس سے زیادہ اچھے الفاظ میں کسی نے ہمیں یاد نہیں کیا تھا۔"

وہ گھر مارگریٹ کا تھا جو اب مریم خادم حسین ہوچکی تھی اس گھر کے بارے میں رات کو مجھے پتا چلا کہ کسی زمانے میں اس کے ماں باپ کا گھر تھا۔ اس وقت کی بات ہے جب مارگریٹ کی ماں اپنے شوہر کے ساتھ سائیکل کے کیریئر پر بیٹھ کے جاتی تھی اور اس کی حاضری نیلا گنبد پر ہوتی تھی۔ پھر وہ سارا دن لاہور کی گلیوں اور سڑکوں پر سے کوڑا کرکٹ سمیٹ کر شہر کو اجلا اور صاف ستھرا اور خوب صورت بنانے والوں کی اس فوج میں شامل ہوجاتے تھے جن کا ہر سپاہی گندا تھا اور گندا سمجھا جاتا تھا۔ ان کا لباس اور حلیہ ہی نہیں ان کا پیشہ بھی ان کے نزدیک قابل نفرت تھا۔ جو علم اور ہنر کے اس مرکز اور کالجوں کا شہر کہلانے والے لاہور کی رونق تھے جو اس شہر دلنواز میں رنگ و نور' خوشبو اور قہقہے بکھیرتے تھے لیکن لاہور کی جھلک کرتی مہکتی لشکتی شام کا جوبن نکھارنے والے جب تھکے ہارے اپنے تاریک گھروندوں کا رخ کرتے تھے تو یہ بھی نہ سوچتے تھے کہ ان کے نصیب میں صرف اندھیرا اور بدبو اور نفرت کیوں ہے۔ یہ نوشتہ تقدیر تھا اور ان کو ملنے والا اجدادی ذہنی غربت کا ورثہ۔ اس سیدھی سادی حقیقت کو تسلیم کرلینے کی وجہ سے ہی وہ سکون اور قناعت کی زندگی گزارتے تھے مگر جب وقت بدلا اور گرد و پیش کا ماحول زیادہ زہرناک ہوگیا تو دکھ کا احساس جاگ اٹھا۔ پاکستان بننے کے بعد اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی معاشرے نے ان کو اسلامی مساوات کے تحت نہیں

اپنایا۔ صدیوں تک ہندوؤں کے ساتھ رہنے سے وہ ملت بھی ذات پات اور حسب نسب کے اعتبار سے انسانوں میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا فرق کرلی تھی جس میں غلام اور آقا ایک تھے اور جس میں برتری صرف تقویٰ کی بنیاد پر تھی۔ جس کو آخری نبیؐ نے آخری خطبے میں واضح طور پر بتادیا تھا کہ گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت نہیں۔

کمتر سمجھے جانے والے بلحاظ پیشہ نیچ ذات کے سمجھے جانے لگے ان میں جاروب کش' نائی' موچی' جلاہے' مزدور اور کاشتکار سب ہی شامل تھے۔ مارگریٹ کے خاندان کی اگلی نسل نے جاروب کشی ترک کردی اور تعلیم حاصل کی مگر ان کے حسب نسب کی ذلالت کا لیبل پھر بھی نہ اترا۔ جہاں وہ رہتے تھے وہاں بھنگی ہی کہلاتے تو انہوں نے بغاوت کے طور پر آباؤ اجداد کی سکونت ترک کردی۔ ایک ایک کرکے مارگریٹ سے پہلے اور اس کے بعد سب بھائی بہن اس گھر سے نکل گئے۔ ماں باپ مرکھپ گئے اور وہ چھوٹا سا گھر برسوں غیر آباد اور مقفل پڑا رہا۔ اب برسوں بعد اسے خادم حسین اور مریم نے آباد کیا تھا۔ یہ پرانی نسل کا عہد نو تھا۔

صاف ستھرے گھر میں سامان کم تھا اور سلیقہ زیادہ۔ تکلف کم تھا اور خلوص زیادہ۔ مریم نے خود کھانا پکا کے ہمارے سامنے رکھا۔ اس کی کوشش تھی کہ ہم کھائیں اور وہ کھلائے مگر ہم نے اسے اپنے ساتھ بٹھالیا۔ وہ کچھ معذرت خواہانہ انداز میں بتاتی رہی کہ ابھی گھر میں کچھ بھی نہیں ہے۔ بہت جلد رنگ و روغن ہوگا اور نیا سامان آجائے گا۔ ان کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ اس گھر کو بیچ کے وہ کسی اور آبادی میں کوئی نسبتاً بڑا گھر لے لیں۔ پیسہ مریم کے پاس بھی تھا اور اب اس کے ارمان پورے ہونے کا وقت آیا تھا۔ وہ ایک گرہستن کی طرح ایسا گھر بنانا چاہتی تھی کہ جو دیکھے تعریف کرے۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس محلے میں اب بھی پرانے کم ظرف اور متعصب لوگ باقی ہیں یا ان کی اولادیں ہیں جو مریم کو وہی مارگریٹ سمجھتے ہیں۔ وہ ایک بھنگی کی بیٹی تھی اور گھر سے بھاگ گئی تھی۔ وہ اسے اپنے برابر عزت دینے پر کبھی آمادہ نہ ہونے والے لوگ تھے۔ میں نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا کہ نئی زندگی کا آغاز نئے ماحول میں کیا جائے تو بہتر ہوگا جہاں کوئی ان کے ماضی کی بنیاد پر ان کے مستقبل میں نفرت کا زہر نہ گھولے۔

اس مکان میں دو ہی کمرے تھے جو اتنے چھوٹے تھے کہ ان میں ایک چارپائی ہی لگ سکتی تھی۔ دراصل الگ الگ بیڈروم تو کیا الگ الگ چارپائی پر سونے کا تصور بھی ان کے نزدیک عیاشی تھی جو وہ افورڈ نہیں کرسکتے تھے۔ وہ سب بہن بھائی فرش پر پہلو بہ پہلو سمٹ سمٹا کے سوجاتے تھے۔ اب بھی یہاں فرش پر دری بچھی ہوئی تھی جو بالکل نئی تھی۔ ایک کمرے میں مریم کے ساتھ رابعہ نے ڈیرا جمالیا اور دوسرے میں خادم حسین نے میرے ساتھ۔

میں نے کہا "یار مولوی خادم حسین۔ تم تو بڑے چھپے رستم

نکلے۔ چپکے چپکے ہی سارا کام کرلیا۔"

وہ ہنسنے لگا "بس جی۔ اللہ نے توفیق دی۔"

میں نے کہا "سخت عاشق مزاج مولوی ہو تم۔ پہلے دن ہی فریفتہ ہوگئے تھے مارگریٹ پر۔"

"مریم کہیں جی" وہ بولا "میرے فریفتہ ہونے سے کیا ہوتا جی۔ فریفتہ تو اس پر جانے کتنے ہوئے۔ اصل بات تو یہ ہے جی کہ اللہ نے اس کو ہدایت دی۔ بے شک وسیلہ مجھے بنایا کہ میں اسے صراط مستقیم دکھاؤں مگر قلب کو اس نے بدلا۔"

"میں مانتا ہوں کہ تم نے بڑی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا۔ یہ بہت بڑا کام تھا اور تم نے کار ثواب بھی کیا لیکن مولوی خادم حسین سچ سچ بتاؤ' تم اب زیادہ خوش ہو یا پہلے بھی خوش تھے؟"

وہ خاموش ہوگیا۔ "آپ تو جانتے ہیں جی۔ میں اپنا فرض ضرور نبھا تا تھا۔ اس عورت کی تلخ ترشی بھی سنتا تھا اور صبر شکر سے کام لیتا تھا۔ کوشش کرتا تھا اور دعا کرتا تھا کہ خدا اسے عقل اور ہدایت دے۔ وہ مجازی خدا کی طرح میری پرستش نہ کرے لیکن مجھے اتنی عزت تو دے جتنی ایک شوہر کا حق ہے۔ جتنی میں اسے دیتا تھا۔ اس کی تلخ کلامی اور بدزبانی کا علاج کوئی نہیں تھا جی۔ میری زندگی جہنم بنا رکھی تھی اس نے۔ پھر ظلم یہ کہ وہ ماں بننے کے لائق بھی نہیں تھی۔ اولاد کی خواہش کی وجہ سے ہی آدمی شادی کرتا ہے مگر وہاں تو یہ امید بھی نہیں تھی۔"

میں نے کہا "یعنی تم اس سے جان چھڑانا چاہتے تھے؟"

وہ تذبذب کا شکار ہوگیا "بس جی۔ خیال ضرور آتا تھا مگر میں سوچتا تھا کہ نبھاؤں جب تک ممکن ہو۔ چھوڑا تو نہیں ہے میں نے اسے۔"

"کیا اسے معلوم ہے کہ تم نے دوسری شادی کرلی ہے؟"

خادم حسین نے نفی میں سر ہلایا "یہی سوچ کے ڈر لگتا ہے۔ وہ عورت تو بڑا ہنگامہ کرے گی۔ یوں بھی ہاتھ اٹھاتی تھی مجھ پر۔ اب کیا پتا خنجر اٹھالے۔ اس کے بھائی تو مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔ جن میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ کوئی گناہ نہیں کیا جی۔ گھر بسانا خوشی پانے کے لیے کوئی جرم نہیں۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔ مگر وہ بات تو غلط ہوگئی نا کہ تم شرط انصاف پوری کرنے کے اہل تھے۔"

اس نے سر جھکالیا "ہاں جی۔ انصاف اس نے میرے ساتھ نہیں کیا تو پھر میں کیا کروں۔ وہ کبھی مجھے خوشی نہ دے سکی تو میں کیسے رکھوں۔ میں نے تو سارے جتن کیے تھی پر خوشی نصیب سے ملتی ہے۔ اس کے نصیب میں نہیں تھی۔"

میں نے کہا "تم بڑے عذاب میں پڑ جاؤ گے۔ کہتے ہیں نا کہ دو کشتیوں کا مسافر ڈوب جاتا ہے جب یہ دونوں کشتیاں مخالف سمت میں چلیں گی تو تم کدھر جاؤ گے کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے۔"

www.paksociety.com

وہ بتانے لگا "آپ تو گیسا کی بات نہ کریں جی۔ وہ مسلمان ہو گئی ہے۔ مگر آپ کی بات ٹھیک ہے۔ میں نے مریم سے پوچھا تھا تو وہ مجھے منع کرنے لگی کہ اسے میری وجہ سے مت چھوڑو۔ مصنف طرف سے اجازت ہے کہ تم اس کو بھی ساتھ رکھ لو۔ مگر ایسا ہوتا نہیں ہے جی۔ اپنے پاؤں پر میں خود کلہاڑی مار لوں۔ ایک گھر تو برباد ہوا ہی تھا۔ یہ دوسرا گھر بھی وہ برباد کر دے یہاں آ کے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اسے طلاق دے دوں تاکہ مجھ پر بار نہ رہے۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھ گنہگار کو یہ توفیق دی کہ میں کسی کا سہارا بنوں مگر اس سے زیادہ شکر کا مقام ہے جی کہ اس نے میرے جیسے عاجز اور گنہگار بندے پر آزمائش کا سلسلہ موقوف کیا اور مجھے صبر و شکر کے انعام سے نوازا۔ اس کی ذات بڑی بے نیاز ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اب انشاء اللہ میں صاحبِ اولاد بھی ہو جاؤں گا مگر اس مصیبت کا کیا کروں جو پہلے سے گلے پڑی ہوئی ہے۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ اس کا یقین قابلِ رشک تھا اور اس کا ایمان کامل۔ ہم سب جو اس کا تمسخر اڑانے تھے کنارے سے دریا کی گہرائی کا اندازہ لگانے والوں کی طرح تھے۔ جب اس نے مارگریٹ کو مشرف بہ اسلام کرنے کی اور اس سے عقدِ ثانی کی بات کی تھی یا جب اس نے مجھ سے رقعہ مانگا تھا کہ در مسرت نذیر یا نیلو کا دل جیتنا چاہتا ہے تو ہم ہنس رہے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس چند صورت احمقانہ انداز میں باتیں کرنے والے مسکین اور مولوی ٹائپ شخص کو بھلا کوئی عورت کیسے پسند کر سکتی ہے۔ جس میں ہیرو والی کوئی بات ہی نہیں مگر اس میں کوئی بات ضرور تھی۔ مارگریٹ نے اس کی خاطر اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس سے نکاحِ ثانی کے لیے مسلمان ہو گئی تھی۔ وہ عورت ... راہ گم کردہ مسافر کی طرح بھٹک رہی تھی اور جس کا ایمان آدمی کی انسانیت پر سے اٹھ چکا تھا۔ جس کے لیے دین مذہب زنار زخرفت تبلی یدی کا تصور بے معنی ہو چکا تھا اور جس کا اعتبار صرف پیسے پر تھا۔ اس نے مولوی غلام حسین پر اعتبار کر لیا تھا۔ وہ دل سے اس کی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا آبائی دین چھوڑ دیا تھا اور وہ اس گھر میں بہت خوش تھی جہاں مولوی غلام حسین اس کا سب کچھ تھا۔ شوہر بھی، محافظ بھی، پرستار بھی اور قابلِ پرستش مجازی خدا بھی۔ واقعی عورت کو کس نے سمجھا ہے؟

سونے کا ارادہ کرنے سے پہلے میں نے کہا "غلام حسین، کیا سو گئے؟"

"نہیں جی۔ میں تو آپ کے جواب اور مشورے کا انتظار کر رہا تھا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیسا جواب اور مشورہ؟"

"میں نے پوچھا تھا جی کہ اس مصیبت کا کیا کروں جو پہلے سے گلے پڑی ہوئی ہے۔ آپ غور فرما رہے تھے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اس کا جواب ہم مزید غور فرما کے دیں گے اور سب سے مشورہ کرنے کے بعد۔ صبح تمہیں ایک کام کرنا ہے۔"

"صبح تو بہت سے کام کرنے ہیں۔ آپ حکم کریں۔"

"حکم نہیں غلام حسین۔ درخواست ہے" میں نے کہا "تم میرے کپڑوں کی حالت دیکھ رہے ہو؟ پتلون کے گھٹنے تک پھٹ گئے ہیں۔ اس حلیے میں یہاں تک پہنچنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ عدالتِ عالیہ میں کیسے پہنچ سکتا ہوں میں۔"

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا "مجھے تو خیال ہی نہیں آیا جی۔ آپ نے وہی پتلون پہن رکھی ہے۔ سوتے وقت تو بدل ڈالیں یہ کانوانہ لباس۔ میرا پاجامہ پہن لیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "اور تم کیا کرو گے؟ ایسے ہی سو جاؤ گے صرف بنیان پہن کے۔"

"نہیں جی۔" وہ جھینپ کر بولا "دوسرا پاجامہ یا شلوار رکھتا ہوں میں۔"

"اچھا لاؤ" میں نے کہا "صبح تمہیں وقار کے گھر سے مجھے کپڑے اور جوتے لا کر دینے ہوں گے ٹیکسی رکشا میں جا کے۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں جی۔"

صبح نو بجے ہم سب ہائی کورٹ پہنچا تھا اور میرے نقطہ نظر سے یہ انتہائی اہم اور فیصلہ کن معرکہ تھا۔ وقار کو ایک مجرم کی حیثیت سے عدالت میں پیش کرنا پولیس کی ذمے داری تھی مگر چوہدری دلاور نے اس کی دولت کی طاقت نے اور اس کے وارثوں نے پولیس کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور قانونیت کی انتہا کر دی تھی۔ یہ ہم سب کے اور ان کے درمیان حق و باطل کی جنگ بن گئی تھی اور یہ اصولی جنگ اب کسی اصول کے مطابق نہیں لڑی جا رہی تھی۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی جیسے شخص نے بھی مجبور ہو کے مان لیا تھا کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔

○☆○

مجھے آٹھ بجے رابعہ نے نیند سے بیدار کیا۔ میں یہ دیکھ کے حیران رہ گیا کہ وہ نہا دھو کے کپڑے بدل چکی ہے۔

"وقت دیکھو۔ مجھے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"رفتہ۔ وقت سے کہو رک جائے اس وقت تم جتنی حسین نظر آ رہی ہو بس اسی لمحے ہر وقت ٹھہر جانا چاہیے۔ میں تمہیں دیکھتا رہوں دیکھتا رہوں۔"

وہ مسکراکے مسکرائی "وقت رک گیا تو چوہدری دلاور کو عدالت میں کون پیش کرے گا؟"

"اف۔ کتنا سوچ کے ایک انتہائی جذباتی رومانٹک ڈائیلاگ بولا تھا میں نے۔ کوئی اور ہوتی تو آنکھوں میں خواب سجا کر میرا ہاتھ تھام لیتی اور کہتی سکندر اس لمحے کے ساتھ مجھے اپنی بانہوں میں قید کر لو۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اداکاری کی۔ "مگر تم تو صرف بیوی نکلیں۔"

"شرم نہیں" اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا "فرصت میں بولنا یہ ڈائیلاگ تو میں کسی کی طرح جواب دوں گی۔"

میں نے کہا "سب کس کے کپڑے مانگ کے پہنے ہیں؟"

"مریم کے ہیں۔ تم نے بھی تو مولوی غلام حسین کی ٹخنوں سے اونچی شلوار پہن رکھی ہے۔ تمہارے تو گھٹنوں تک آئی ہو گی۔"

"تم دیکھ رہی ہو رابعہ۔ مولوی غلام حسین نے دوبارہ گھر بسا لیا" میں نے فخر سے کہا "ایک ہم ہیں کہ ابھی تک گردش میں ہیں۔ چاند زمین کے گرد گھوم رہا ہے۔ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ خاک چاند سورج کی جوڑی ہے ہماری۔"

مریم نے آواز لگائی "ناشتا تیار ہے۔ جلدی سے نہا لیں۔ وہ بھی آنے ہی والے ہیں آپ کے کپڑے لے کر۔"

"رہنے" میں نے کہا "وہ کون۔ تمہارا خادم؟"

رابعہ ہنسی "ہم کہنے سے نکاح ٹوٹ جائے گا۔"

غلام حسین کے آتے ہی میں نے شیو اور غسل سے فراغت حاصل کی۔ گھر کا غسل خانہ اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں ایک بالٹی کے علاوہ ایک اوسط قسم کے فرد کی جگہ بھی مشکل سے نکلی تھی۔ ابھی تک اس میں دروازے کے بجائے پردہ لٹکا ہوا تھا۔ میں ساور کا عادی تھا۔ ایک مدت کے بعد میں نے بالٹی سے مگ بھر کے نہانے کا تجربہ کیا۔ ناشتے کے لیے بھی فرش پر دسترخوان بچھایا گیا اور مریم نے گرم گرم پراٹھے اتارے۔ سب گھر ایک سے ہوتے ہیں۔ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ گھر آدمی کو اپناتے ہیں۔ خلوت کی آزادی عطا کرتے ہیں۔ راحت اور سکون دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کو خوشی فراہم کرنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ سب نہ ہو تو پھر ہزاروں گز پر محیط شاہانہ تعیش کے اسباب رکھنے والے محل بھی صرف مکان ہوتے ہیں۔

مولوی غلام حسین کے کپڑے مریم نے خود دھوئے تھے اور ان پر بڑی محنت سے استری پھیری تھی۔ میں اس کی خدمت گزاری میں عیاں پرستاری کے جذبات کی تحریر کو صاف پڑھ سکتا تھا۔ شاید ہر عورت بیک وقت پرستش بھی کرانا چاہتی ہے اور کرنا بھی۔ مگر اس کے اختیار میں کچھ نہیں ہوتا۔ مریم کو یہ اختیار کئی منزلیں بڑے پرخطر اور رجان لیوا تجربات کی کٹھن راہوں پر چل کے ملی تھی۔ وہ برسوں کے احساسِ محرومی کا ازالہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ گھر اس کا تھا۔ شوہر اس کا تھا۔ یہاں جو کچھ بھی تھا اس کا تھا۔ اس خیال کی آسودگی بھی مریم کے لیے متاعِ بے بہا تھی۔

جب مولوی غلام حسین نفیس شلوار کے سوٹ لگا کے ٹوپی کو بڑی نزاکت سے سر پر جما کے اور داڑھی میں عطر لگا کے میرے ساتھ جانے کے لیے روانہ ہوا تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔ مریم اسے بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی اور وہ ایک ناز اٹھانے والی بیوی کے اس اندازِ دلربا پر فریفتہ تھا۔ وہ نئے شادی شدہ نوجوان لڑکے اور لڑکی بنے ہوئے تھے حالانکہ دونوں کی عمر زندگی کے تجربات اور حادثات کے اعتبار سے کہیں زیادہ تھی۔ اصل میں تو جذبات ہی آدمی کو جوان رکھتے ہیں۔

اس محلے کے بہت سے لوگوں نے رابعہ کو اور مجھے تجسس، تعجب اور حیرانی کے ساتھ دیکھا۔ گلی میں بچے کھیل رہے تھے۔ کھڑکیوں اور بالکونیوں پر عورتیں کپڑے سکھاتے یا بال بناتے ہوئے سامنے والی سے یا پڑوسن سے اظہار خیال کر رہی تھیں۔ دکانوں کے تھڑے پر، حجام کی اور حلوائی کی دکان پر فارغ بوڑھے اخبار پڑھتے اور بدلے ہوئے وقت کا اپنے زمانے سے موازنہ کر کے آہیں بھرنے میں مصروف تھے۔

ایک خبطی بوڑھے نے واضح الفاظ میں کہا "ارے یار، احمد صوفی اور یہ لڑکی دا گھر والا ہے نا۔"

دودھ کو کفگیر سے کڑاہی میں متحرک رکھنے والے حلوائی نے کہا "اوہو جی۔ اوپر والا تمہیں ہی کا کرامت سمجھے۔ اوہی کڑی مارگریٹ۔ نس گئی سی گھروں۔ آندرے نے ویاہ کرلیا اے، چلے چلے۔"

مجھے افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ یہ پرانے عمر رسیدہ لوگ جن کے پاس عقل بھی تھی اور زندگی کا تجربہ بھی۔ مولوی خادم حسین کو سنانے کے لیے انہوں نے عمداً بلند آواز میں بات کی تھی اور مارگریٹ کو بھتیجی کی لڑکی بتانے کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ اب شادی کرلی ہے۔ واقعی راحم ان کے الفاظ میں طنز کے نشتر تھے اور تذلیل کا زہر آلود انداز بھی۔ میں نے مولوی خادم حسین کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا۔ یوں جیسے اس نے کچھ نہیں سنا۔

ٹیکسی میں رابعہ پیچھے میرے ساتھ بیٹھی۔ مولوی خادم حسین نے ڈرائیور سے کہا "ہائی کورٹ" تو جیسے ان جادوئی الفاظ نے ایک دم میرے خیالات کی سمت بدل دی۔ میں چوہدری دلاور کے بارے میں اور ایس ایس پی جاوید صدیقی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا آج ہم کامیاب ہوں گے یا شکاری پھر ہماری راہ میں رکاوٹوں کا نیا جال پھیلا دیں گے۔ مرزا نے کہا تھا۔

ہم تو سمجھے تھے کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

تو کیا آج یہ تماشا ہوگا؟ جیسے جیسے ٹیکسی ہائی کورٹ کی طرف بڑھ رہی تھی میری اور رابعہ کی بے چینی بھی بڑھ رہی تھی۔

ہم باہر اترے اور پھر پیدل اندر گئے۔ میری نظریں ہر طرف تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا دلاور کی بیوی یا اس کا بیٹا فیصل بھی یہاں نظر آسکتے ہیں؟ کیا گزشتہ شب کے واقعات کی روشنی میں انہوں نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا؟ رات بھر میں انہوں نے کیا پیش بندی کی ہوگی؟

رابعہ نے چپکے سے کہا "ڈرو نہیں۔ ہم ہائی کورٹ کے اندر ہیں۔ یہاں کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔"

میں نے سرہلایا "ابھی ہم کورٹ کے باہر ہیں۔"

میرے الفاظ لبوں پر ہی تھے کہ میری نظر نے ارشد کریم کو دیکھ لیا۔ وہ زخمی مینڈکی کی طرح برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ وہ سخت بے چین اور مضطرب تھا۔ رابعہ کو دیکھتے ہی وہ ہماری طرف لپکا۔

"مس رابعہ۔ مجھے آپ سے ہی بات کرنی ہے اور آپ کے وکیل سے بھی۔"

رابعہ نے متانت سے کہا "سوری۔ ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔"

وہ پھر سامنے آگیا "آپ کو سننی پڑے گی میری بات۔"

"ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔ مجھے اندر جانا ہے۔" رابعہ نے برہمی سے کہا "ایک کیس ہے میرا ٹھیک نو بجے۔"

"کون سا کیس ہے مجھے بتائیے۔"

"میں تمہیں بتاؤں؟ تم کون ہوتے ہو مجھ سے پوچھنے والے۔ میں رپورٹ کرسکتی ہوں تمہاری جج کو۔ یہ توہین عدالت ہے کہ تم کسی وکیل کو عدالت عالیہ میں پیش ہونے سے روکو۔"

میں نے دوسری طرف سے منظر اور آغا یوسف کو عدالت کے برآمدے سے گزر کے اندر جاتے دیکھا۔ رابعہ میرے ساتھ تھی، اس لیے یہ فرض کرنا غلط نہ تھا کہ اس کیس میں جاوید صدیقی کی طرف سے وکالت نامہ منظر داخل کرے گا اور وہی بیان کی درخواست بھی پیش کرے گا۔

میں انجان بننے کے باوجود اپنی تشویش کا اظہار یوں کررہا تھا کہ رابعہ کو ایس ایس پی کی جانبدارانہ پیش قدمی سے بچانا اور دفاع کرنے والے کا کردار ادا کرتے ہوئے فرنچ میں مولوی خادم حسین سے کہتا رہا کہ وہ میری طرف سے بولے۔ اس خود دماغ پولیس افسر کا مزاج درست کرنا ہی پڑے گا۔

خادم حسین نے چلانا شروع کردیا۔ "آپ تو ہوش کے ناخن لیں جی۔ یہ تھانہ نہیں ہے۔ ہائی کورٹ ہے اور آپ کے سامنے ملکی رہبر ملکی وکیل ہیں۔ کوئی اسٹری بیٹر نہیں۔"

"تم اپنی بکواس بند کرتے ہو یا نہیں" ارشد کریم نے دہاڑ کے کہا۔

میں فوراً اس کے سامنے آگیا اور غصے میں زور زور سے بولنے لگا۔ موقع پاتے ہی رابعہ نکل گئی۔

مولوی خادم حسین نے میرے پیچھے سے زبانی جاری رکھی "مسیو آندرے بہت سخت ناراض ہیں اور اب تمہاری خیر نہیں۔ یہ ابھی فون کریں گے اسلام آباد اور تمہاری چھٹی کرادیں گے ایس ایس پی صاحب۔ یہ براہ راست ہوم سیکرٹری سے بات کرتے ہیں۔ ابھی وزارت خارجہ میں پہنچ جائے گا برٹش کونسلیٹ۔"

"تم سے بھی نمٹ لوں گا مولوی۔"

"مجھ سے تم کیا نمٹو گے۔ میں ان کے ساتھ ہوں اور انہی کے ساتھ لندن چلا جاؤں گا۔"

"دیکھو۔ مجھے صرف یہ پوچھنا تھا کہ کل رات یہ کون لوگ

جیل کے باہر کیا کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ رابعہ آگئی تھی۔"

"منظر! تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہوگا۔" میں نے کہا "اس سے کہو کہ کل رات ہم فرانس کے تجارتی وفد کے اعزاز میں لاہور کے چیمبر آف کامرس کے ڈنر میں شریک تھے۔ وہاں فرانسیسی اور برطانوی قونصلیٹ، سفارت خانوں کے ٹریڈ کمشنر بھی، اتاشی اور صوبائی کابینہ کے ارکان سب موجود تھے۔ رابعہ ہمارے ساتھ تھی۔"

مولوی خادم حسین نے مجھ سے کہا "لیکن۔ کل شام تو۔"

میں نے کہا "تم ترجمہ کرو۔ اسے کیا پتا جھوٹ سچ کا۔ ایسے بہت سے ڈنر ہوتے ہیں ہر روز۔ یہ کس سے تصدیق کرے گا اور کیا پوچھے گا۔"

خادم حسین نے میری بات فرفر دہرادی۔ اس نے اتنی تیزی سے ان اہم عہدوں کے نام لیے جن کا پولیس سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

ارشد کریم کی صورت پر جھلاہٹ اور مایوسی پھیل گئی "قسمت والی چیز ہے یہ گورا وکیل بھی۔ اس نے پکا انتظام کیا ہوگا لیکن بتانا اسے کہ میں بھی اس کا باپ ہوں۔"

"اگر کسی نے سن لیا کہ تم کسی حرامی کے باپ ہو" مولوی خادم حسین بولا "تو سوچ لو کتنی بدنامی کس کی ہوگی بعد میں۔ بچے کتنے ہیں تمہارے؟"

ارشد کریم نے جاتے جاتے اسے پلٹ کے چند شاندار گالیوں سے نوازا اور یہ اعلان بھی کیا کہ وہ تمہارے ساتھ کیا کرے گا۔ یہ سب قابل اشاعت نہیں۔

میں آرام سے باوقار انداز میں آگے بڑھتا۔ مولوی خادم حسین سینہ آگے نکال کے اس سرزمین کے مالک کی طرح چلنے لگا جس نے بازی جیت لی ہو۔

"ابھی تک ایس ایس پی صاحب غائب ہیں" میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو مجھے مختلف راستوں پر سادہ کپڑوں والے نظر آئے جو اپنے حلیے سے بھی پولیس والے نہیں لگتے تھے اور بھوکے شکاری کتوں کی طرح شکار کو دبوچ لینے کے لیے بے چینی سے ہر طرف متلاشی تھے۔ آخر جاوید صدیقی کس طرف سے آئے گا اور چوہدری دلاور کو کیسے اندر لائے گا۔ مجھے تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔

ایک کورٹ سے منظر برآمد ہوا اور سیدھا میری طرف آیا "کیا بلنڈر ہے۔ یہ یہاں کس کا انتظار کر رہا ہے آخر۔"

میں نے کہا "تیار رہو۔ دیکھو۔ پولیس والوں نے کیسا جال پھیلا رکھا ہے ہر طرف۔"

مولوی خادم حسین نے کہا "وہ تو ایس ایس پی ابھی بہت گرمی دکھا رہا تھا۔ سخت ناراض تھا کل رات کے جی اس سے۔"

منظر نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا "اب تو تمہارے منہ میں زبان کی جگہ کیا ہو ہے... پھر تم بڑا مانو گے۔"

"بات ہی ایسی بے ہودہ کرتے ہیں آپ اور یہ بھائی۔"

"کیا بات تھا تمہارے منہ میں۔ تم نہیں بول سکتے تھے؟ اس نے گالیاں دی تھیں تو جواب میں تم کیا منظومات بجا لاتے رہے؟ اس کی تو ایسی تیسی کردیتے۔ سارے شجرۂ نسب میں آباؤ اجداد کی جگہ ناپاک جانوروں کو شامل کردیتے۔ خواتین کے رشتے ادھر سے ادھر کردیتے۔"

"لاحول ولا قوۃ جی۔ میں اپنی زبان گندی کرتا۔ اور وہ تو تمہارے بلا کے میلادی حشر کرتا جو قصائی عید والے دن بکرے کا کرتا ہے۔ کھال الگ، سری پائے الگ۔"

"ابے مولوی۔ کیوں ڈرتا ہے تو اتنا۔ سالے ہم ہیں تو پھر تجھے کیا غم ہے بھوتنی کے۔ کوئی تیری طرف آنکھ اٹھاکے تو دیکھے۔ تھانے بلانا تو دور کی بات ہے۔ تم لوگ چلو اندر جاکے بیٹھو۔"

"ابھی اندر کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"اگلا کیس ہے ہمارا۔ میں نے درخواست لگادی ہے۔ دوسری درخواست رابعہ کی ہے" منظر نے کہا۔ "سات وکلا اور بھی موجود ہیں جو ڈاکٹر جلیل مراد کیس میں مدعی ہیں۔"

"لیکن خود جاوید صدیقی کہاں ہے۔ وہ کیسے اندر آئے گا؟ یہ تو اسے باہر ہی گرفتار کرلیں گے۔"

منظر نے ایک قہقہہ مارا "ان کی تو... جھک مارتے رہے سالوں کو۔ وہ پہنچ چکا ہے اندر۔ یہ مت پوچھو کیسے۔"

میں نے کہا "اس راستے سے جو ججوں کے لیے مخصوص ہے؟"

منظر نے اقرار میں سرہلایا "ایک جج کی گاڑی میں۔"

"اور چوہدری صاحب کی سواری کیسے آئے گی؟"

"اندر چل کے تماشا دیکھو۔ ہم نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں بیٹا۔ رات بھر ہم اپنی کارروائی میں مصروف رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم قانون سے ہٹ کے کام نہیں کرتے لیکن چور دروازے اور خفیہ راستے جتنے ہم جانتے ہیں" اس نے مجھے آنکھ ماری "ان کا اب کوئی وار نہیں چل سکتا۔ کھیل ختم ہوگیا۔"

اتنی واضح یقین دہانی کے باوجود میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ اندر ایک خلش سی تھی کہ پھر کچھ ہوجائے گا۔ پہلے بھی ہم بہت پراعتماد تھے اور ہمیں یقین تھا کہ ہم نے بڑا پکا کام کیا ہے لیکن دلاور اینڈ کمپنی نے ثابت کردیا تھا کہ وہ ہم سے بڑے فنکار ہیں۔

عدالت میں مکمل خاموشی تھی اور جج کسی کیس میں فائل پر احکامات صادر کررہا تھا۔ رابعہ اور چند سینئر وکلا جن کو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اگلی صف کی پہلی بنچ پر موجود تھے۔ ان کے پیچھے والی بنچ پر دو اخبار والے تھے اور محسن تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دوسری طرف میں نے چوہدری دلاور کی بیوی کو اور اس کے بیٹے فیصل کو دیکھا جو اپنے وکیلوں کے پورے پینل کے ساتھ ہونے کے

www.paksociety.com

باوجود سخت مضطرب اور پریشان نظر آ رہے تھے۔ وہ بار بار آپس میں باتیں کرنے لگتے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ اجنبی چہرے بھی تھے جن کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

بالآخر "مسز چوہدری دلاور حسین بنام سرکار" کی آواز لگی اور اس کے وکیل نے جھٹ سے جا کے کیس میں اپنا مختصر بیان دیا۔

"جناب والا۔ میری موکلہ مسز چوہدری دلاور حسین نے اپنی درخواست میں اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ پولیس نے اس کے شوہر کو گرفتار کرلیا ہے مگر اسے غیر قانونی طور پر کسی نامعلوم جگہ حراست میں رکھا ہے۔ اسے کسی مجسٹریٹ کے سامنے نہیں پیش کیا گیا اور اس پر جسمانی تشدد کیا جارہا ہے۔ چونکہ دلاور حسین پہلے سے امراض قلب میں مبتلا ہے اس لیے میری موکلہ کو ڈر ہے کہ وہ پولیس کی غیر قانونی حراست میں ہلاک بھی ہوسکتا ہے۔ یہ انتہائی ضروری ہے کہ فاضل عدالت کے روبرو پولیس اپنی پوزیشن کی وضاحت کرے اور دلاور حسین کی ذہنی و جسمانی صحت کے بارے میں مجاز افسر کی رپورٹ دے۔ عدالت عالیہ اس کیس میں پہلے ہی ایس ایس پی جاوید صدیقی و بیان حلفی داخل کرنے کے لیے طلب کرچکی ہے لیکن مصدقہ اطلاعات کے مطابق پولیس افسر عمداً ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے اور بیان حلفی نہ داخل کرنے کی نیت سے روپوشی اختیار کیے ہوئے ہے۔"

مظہر نے فوراً اعتراض دائر کردیا "فاضل وکیل استغاثہ کی معلومات انتہائی ناقص ہیں اور غلط ہیں۔ میرا ان کو مشورہ ہے کہ چنڈو خانے کی خبریں سن کے یقین کرنا چھوڑ دیں۔"

کچھ لوگ ہنسے۔ عدالت نے دوبار "آرڈر۔ آرڈر" کہا۔

"حقیقت یہ ہے جناب والا کہ ایس ایس پی جاوید صدیقی عدالت کے روبرو اپنا بیان دینے کے لیے حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہیں۔ انہیں خود پولیس کے اعلیٰ حکام نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے عدالت عالیہ میں حاضر ہونے سے روکا تھا اور بیان حلفی نہ داخل کرنے کی تاکید کی تھی مگر ایس ایس پی جاوید صدیقی نے جو اب میرے موکل بھی ہیں' ان غیر قانونی احکامات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو انہیں معطل کردیا گیا اور ان کے چارج چھوڑنے سے قبل ہی دوسرے افسر ارشد کریم ربانی کو ان کی جگہ بٹھادیا گیا۔ جناب والا' ایس ایس پی جاوید صدیقی نے ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس میں خصوصی تفتیش مکمل کرلی تھی۔ ایک ایماندار' فرض شناس اور باضمیر پولیس افسر کی حیثیت سے انہوں نے ملزم چوہدری دلاور حسین کا سراغ بھی لگالیا تھا اور ان کو گرفتار بھی کرلیا تھا۔"

عدالت میں ایک دم سنسنی پھیل گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں کافی تعداد میں دوسرے لوگ بھی موجود ہیں۔ ان میں اخبار والے بھی ہوسکتے تھے اور چوہدری دلاور کے اپنے حمایتی بھی۔ جج نے پھر "آرڈر آرڈر" کہا۔

"ایس ایس پی جاوید صدیقی کو عدالت میں پیش ہونے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی" جج نے کہا۔

"یس سر۔ لیکن ان کے اعلیٰ افسران نے پیشہ ورانہ [illegible] سے کام لیتے ہوئے جاوید صدیقی کو ادائے فرض سے روکا اور پھر اسے معطل کردیا۔ اسے دھمکیاں دی گئیں یہاں تک کہ [illegible] آباد میں اس کے بیوی بچوں کو ہراساں کیا گیا۔ اس سے کہا گیا کہ اس عدالت عالیہ کے روبرو جھوٹا بیان حلفی داخل کرے کہ چوہدری دلاور کو گرفتار نہیں کیا تھا۔ اور اگر ایسا نہیں کرتا تو خاموشی اختیار کرے تاکہ اس کی جگہ لینے والا یہ کام کرسکے۔ جناب والا اس بدمعاشی کا مقصد تھا چوہدری دلاور حسین کو پولیس کی تحویل سے فرار ہونے کا موقع فراہم کرنا۔"

"آخر کیوں۔ پولیس ایسا غیر قانونی کام کس لیے کرے گی؟"

"حضور والا۔ اس سوال کا جواب تو متعلقہ افسران ہی دے سکتے ہیں مگر کیا ایک عام آدمی بھی یہ نہیں سمجھتا کہ پولیس مجرموں کو کیسے تحفظ فراہم کرتی ہے اور کس طرح انصاف کی راہ میں رکاوٹ کی دیوار کھڑی کی جاتی ہے۔ میرے موکل نے صرف اس لیے روپوشی اختیار کی تھی کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے جان سے مار دیا جاتا۔ اس نے گزشتہ روز ایک پریس کانفرنس میں یہ سب بتایا اور وہ اپنی رپورٹ محترم چیف جسٹس صاحب کو بھی ارسال کرچکا ہے۔ اس وقت بھی عدالت کے باہر سادہ کپڑوں والے پولیس اہلکار موجود ہیں جو جاوید صدیقی کو عدالت میں حاضر ہونے سے پہلے گرفتار کرکے ساتھ لے جانے پر مامور ہیں مگر میرے موکل گزشتہ شب ہی اس عدالت میں پناہ حاصل کرچکے تھے۔ وہ اب بھی عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔"

ایس ایس پی جاوید صدیقی نے بڑے ڈرامائی انداز میں عدالت کے سامنے پیش کیا۔ میں نے دوسری طرف سے ایک پوش عورت کو آتا دیکھا۔ اس شخص کا کٹ ٹاپ پہنے ہوئے جاوید صدیقی نے جج کو تعظیم دی۔

عدالت میں جیسے بھونچال آگیا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ کے آگے دیکھنے لگے۔ بہت سے لوگ جو پہلے باہر تھے اندر آگئے اور میں نے بہت سے چہروں کو شناخت کرلیا۔ یہ واچ ڈاگ تھے جو باہر جاوید صدیقی کے نظر آتے ہی اسے ہوا سے گھیر کر گرفتار کرلیتے۔ جاوید صدیقی کی تلاش میں ناکامی پر سخت مشتعل تھے۔ اس شخص نے اپنا مستقبل تو داؤ پر لگایا! اب وہ ان کی نوکری کے لیے بھی خطرہ بن گیا تھا۔ اسے ہوتے چپ چاپ خاموش کردینے کی ضرورت تھی۔

یہ ناکام شکاری سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا شکار ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل جائے گا۔ انہیں کیا پتا کہ جاوید صدیقی جیسا سینئر پولیس افسر کورے تھے کہ تہہ خانے میں چھوچھپا کے کسی پرانی بڑھیا کی طرح کرچھ کا کے چھپا ہوا

معطل کردیا تھا۔ ان اسباب کی نشاندہی متعلقہ حکام افسران بالا نے مجبور کیا کہ آج کے اخبارات کہتے ہیں "مسٹر جاوید کرکے انہیں استعفیٰ دے دیا ہے۔ اس کی ایک نقل میں عدالت کے ریکارڈ پر رکھنا چاہتا ہوں۔"

"عدالت صرف یہ جاننا چاہتی ہے کہ چوہدری دلاور کو گرفتار کیا گیا ہے یا نہیں؟" جج نے اسے ٹوک دیا "اگر گرفتار کیا ہے تو اسے کہاں رکھا گیا ہے اور اسے اب تک ریمانڈ کے لیے مجسٹریٹ کے سامنے کیوں پیش نہیں کیا گیا؟"

ایڈووکیٹ جنرل نے کہا "مجھے کچھ مہلت دی جائے تاکہ میں پولیس کے محکمے سے بدلی ہوئی صورت حال میں حقائق دریافت کرسکوں۔"

"عدالت مزید مہلت نہیں دے سکتی۔ کیا ایڈووکیٹ جنرل اس سیدھے سادے سوال کا جواب ہاں یا نہ میں نہیں دے سکتے کہ چوہدری دلاور کو پولیس نے گرفتار کیا ہے یا نہیں؟ اس سوال کا کسی ماتحت افسر کی معطلی سے یا اس کے استعفے سے کوئی تعلق نہیں" جج نے کہا۔

"اس کا جواب میرے موکل جاوید صدیقی کے پاس ہے یور آنر۔ اگر وہ عدالت عالیہ کے روبرو اپنا بیان حلفی پیش کردے تو ایڈووکیٹ جنرل صاحب کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔" مظہر نے کہا "جناب والا جیسے طلاق کے مقدمے میں شوہر کے موقف کو بیوی کے موقف سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے ہی جاوید صدیقی کی معطلی کے معاملے کو چوہدری دلاور کی گرفتاری کے معاملے سے الگ نہیں سمجھا جاسکتا۔ میرے موکل نے اس کیس میں کی جانے والی ناانصافی کے خلاف احتجاجاً استعفیٰ دیا ہے اور ان اسباب کی وضاحت اپنے استعفے میں بھی کردی ہے۔ میں پھر درخواست کروں گا کہ جاوید صدیقی کو اپنا بیان حلفی داخل کرنے کی اجازت دی جائے۔"

ایڈووکیٹ جنرل نے کہا "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن ایڈووکیٹ جنرل صاحب کیا یہ بات عجیب نہیں کہ آج عدالت میں آپ کی معاونت کے لیے ارشد کریم ربانی موجود نہیں جس کو ایس ایس پی کے عہدے پر عارضی تقرری دے کر جاوید صدیقی کی جگہ لایا گیا تھا۔ سنا ہے ہمارے کسی چڑیا گھر کا زیبرا فوت ہوگیا تھا تو جلدی میں ایک خچر پر کالے سفید رنگ کی پٹیاں ڈال کے کھڑا کردیا گیا تھا۔ پینٹ تو اچھا تھا مگر جب اس نے معائنے کے لیے آنے والے افسر کے سامنے اپنی مادری زبان میں خوشی سے بے قابو ہوکے گانا شروع کیا۔"

ایڈووکیٹ جنرل بھی مسکرانے لگا "آپ چڑیا گھر کے منتظم ہوتے تو آپ کو بھی نوکری بچانے کے لیے کچھ ایسا ہی کرنا پڑتا۔"

عدالت میں ایک قہقہہ پڑا تھا۔ جج نے مسکراتے ہوئے تنبیہ کی نظروں سے لوگوں کو دیکھا اور ایڈووکیٹ جنرل سے سوال

سامنے سے گزر جائے گا اور وہ آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود اسے دیکھ نہ پائیں گے۔

ایک دروازے میں مجھے ذرا سی دیر کے لیے ارشد کریم ربانی بھی نظر آیا مگر اس سے پہلے کہ کوئی عدالت میں پولیس کی موجودگی پر اعتراض اٹھاتا وہ غائب بھی ہوگیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی قسمت چلی۔ ذہانت نے طاقت کو ہمیشہ کی طرح آج بھی رسوا کیا تھا۔

جاوید صدیقی کی آمد سے وقتی طور پر جو ہلچل پیدا ہوئی تھی وہ جج کے متعدد بار "آرڈر۔ آرڈر" پکارنے سے ختم ہوچکی تھی۔ جاوید صدیقی کو پہلی قطار میں بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ وہ بہترین سوٹ میں بہت وجیہہ اور بڑا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ چوہدری دلاور کی بیوی کی حالت غیر تھی اور لیلیٰ اسے بڑی خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ غالباً ان کو بھی جاوید صدیقی سے پہلے کوئی ایسا شخص نہیں ملا تھا جس نے ان کی دولت کو یوں حقارت سے ٹھکرا دیا ہو۔ اس دور میں سب پیسہ ہی سب کچھ ہے۔ یہ شرافت اور نجابت کا پیمانہ ہے۔ عزت اور طاقت دیتا ہے۔ ساری دنیا کی خوشیوں کو آدمی کی دسترس اور قوت خرید میں کردیتا ہے۔ اخلاق اور انصاف کی قدریں بدل سکتا ہے اور ہر ہتھیار سے بڑا ہتھیار ہے۔ ایسے سرپھرے بھی کہیں ہوتے ہیں جو پولیس کی وردی پہن لیں اور پھر بھی انصاف اور قانون کے رکھوالے بن کر ثابت کردیں کہ یہ وردی اپنے اختیارات کو کیش کرانے کے لیے نہیں' مظلوموں کو ظالموں سے تحفظ فراہم کرانے اور مجرم کو قانون کے مطابق سزا دلوانے کے لیے پہنی جاتی ہے۔

مظہر نے اپنا بیان یوں شروع کیا "حضور والا۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میرا موکل عدالت میں کیسے چھپ کر آنے پر مجبور کردیا گیا تھا ورنہ وہ ایک سینئر پولیس افسر ہے۔ میں درخواست کروں گا کہ اسے عدالت عالیہ کے روبرو اپنا بیان اور موقف پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔"

وکیل مخالف فوراً کھڑا ہوگیا "آبجکشن یور آنر۔ عدالت چوہدری دلاور حسین کی گرفتاری اور مسز دلاور کی درخواست کی سماعت کررہی ہے جس کا ایس ایس پی جاوید صدیقی کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تعلق تو ہے جناب والا۔ چوہدری دلاور کو جاوید صدیقی نے ہی گرفتار کیا تھا۔" مظہر نے کہا۔

"مگر اس قانونی معاملے میں سرکاری موقف کی وضاحت صرف ایڈووکیٹ جنرل کرسکتا ہے۔ جاوید صدیقی کو معطل کیا جاچکا ہے۔"

جج نے اعتراض منظور کرتے ہوئے ایڈووکیٹ جنرل کو طلب کیا "آپ اس معاملے میں کیا کہتے ہیں؟"

ایڈووکیٹ جنرل مشکل میں پڑ گیا تھا مگر اس نے حالات کے پیش نظر اپنا بیان بدل دیا "یہ ٹھیک ہے یور آنر کہ جاوید صدیقی کو

www.paksociety.com

کیا "مسٹر منظر نے آپ سے ایک سوال کیا تھا؟"
"یور آنر۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیوں حاضر نہیں ہو سکا۔"
منظر نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے وہ عدالت کے باہر موجود تھا۔ متعدد وکلا اور صحافیوں نے اسے دیکھا تھا۔"
رابعہ نے اٹھ کے کہا "اس نے مجھے عدالت میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش بھی کی تھی یور آنر۔ فزیکلی۔"
ایک اور وکیل نے کہا "میں نے اسے عدالت میں آتے دیکھا تھا۔"
اب میں نے اٹھ کے کہا "وہ غالباً جاوید صدیقی کی صورت دیکھتے ہی فرار ہو گیا۔"
مولوی خادم حسین نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا "اس کے دل میں چور نہ ہوتا تو وہ دم دبا کے نہ بھاگتا۔"
جج نے مجھے غور سے دیکھا "آپ کی تعریف؟"
منظر نے میرا تعارف کرایا "یہ فاضل وکیل مقتولہ لیڈی ڈاکٹر شبلی کے لواحقین کی طرف سے تفتیش میں شامل ہیں۔ بحیثیت غیر جانبدار مبصر۔"
دلاور کے وکیل نے کہا "ان کو عدالتی کارروائی میں حصہ لینے یا مداخلت کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔"
منظر نے کہا "یہ صرف گواہ ہیں اور وہی بتائیں گے جو انہوں نے دیکھا ہے۔"
جج نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا "ابھی گواہی کا مرحلہ نہیں آیا۔"
ایڈووکیٹ جنرل نے کہا "اتنے سینئر وکلا غلط بیانی نہیں کر سکتے۔ میں معلوم کروں گا کہ ارشد کریم ربانی کی غیر حاضری کا سبب کیا ہے؟"
"ایسی صورت میں جاوید صدیقی کو بیان جاری رکھنے کی اجازت ہے۔" جج نے کہا۔
"تھینکس یور آنر۔" منظر نے سر خم کر کے کہا "مسٹر جاوید صدیقی کیا آپ نے ملزم دلاور حسین کو گرفتار کیا تھا؟"
"جی۔ میں نے اسے متعدد افراد کے سامنے گرفتار کیا تھا۔ ان میں آپ بھی شامل تھے۔"
"میرے علاوہ کون تھا؟"
"مس رابعہ قاضی ایڈووکیٹ۔ موسیو آندرے' ان کا مترجم۔ ایک اخبار کا چیف رپورٹر جس کا نام غازی تھا اور ایک فوٹو گرافر جو غازی کے ساتھ ہی آیا تھا۔ میں اس کے نام سے واقف نہیں۔"
"ملزم دلاور کو آپ نے کہاں سے گرفتار کیا تھا؟"
"میں نے اسے شوکت رانا کی کوٹھی سے گرفتار کیا تھا۔ تقریباً بارہ بجے شب مجھے یہ اطلاع ملی کہ ملزم دلاور حسین وہاں موجود ہے۔ میں پولیس کی مسلح نفری کے ساتھ وہاں پہنچا۔ میں نے علاقے کے تھانے فون کر کے ایس ایچ او کو بھی طلب کر لیا تھا۔ وہاں آتش زنی اور ڈکیتی کی واردات بھی ہوئی تھی۔ لیکن وہ میری تفتیش میں شامل نہیں۔"
"قتل کس کا ہوا تھا؟"
"ایک چوکیدار اور دو گارڈ۔ شوکت رانا انہیں اپنے … رکھتا تھا۔ آگ اس کی گاڑی میں دھماکے سے لگی تھی اور دونوں گارڈ بھی ہلاک ہو گئے تھے لیکن چوکیدار کو خود شوکت نے قتل کیا تھا۔ میں نے اسے مقامی پولیس کی تحویل میں … تھا۔"
"آپ وہاں صرف چوہدری دلاور کی گرفتاری کے لیے گئے تھے؟"
"جی ہاں۔ چوہدری دلاور قتل کی ایک ایف آئی آر میں … کو مطلوب تھا۔ اس نے لندن سے آنے والی ڈاکٹر شبلی کو … مگر اسے حادثاتی موت بتا دیا گیا تھا۔ مقتولہ برطانوی شہری تھی۔ چنانچہ برٹش گورنمنٹ نے اس کیس میں خصوصی تفتیش کی درخواست کی۔ پہلے تشکیل دی جانے والی ٹیم کے ارکان … رشوت اور بدعنوانی کے الزام میں پہلے معطل پھر گرفتار اور … برطرف کر دیے گئے تھے۔ اس کے بعد مجھے اسلام آباد سے ٹیم کے سربراہ کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔"
"کیا آپ نے اپنی تفتیش مکمل کر لی تھی؟"
"جی۔ یہ انتہائی دشوار اور خطرناک کام تھا کیونکہ … میں قتل کا الزام چوہدری دلاور حسین پر ہی آتا تھا اور وہ انتہائی بااثر اور طاقتور شخص سمجھا جاتا ہے۔ اس نے مختلف طریقوں سے تفتیش کے کام کو روکنے یا غلط سمت میں موڑنے کی پوری کوشش کی۔ ناجائز طور پر اس نے مجھے بھی لالچ اور دھمکیوں سے متاثر کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے۔ اس کی طرف سے متعدد افراد نے یہ پیغام مجھ تک پہنچایا کہ اگر میں …"
جج نے اسے ٹوک دیا "مسٹر جاوید صدیقی۔ جواب کو مختصر رکھیں۔ ابھی یہ عدالت قتل کے کیس کی تفصیلات سے دلچسپی نہیں رکھتی۔"
منظر نے پھر کہا "مختصر یہ کہ آپ نے تفتیش مکمل کر لی تھی؟"
"جی۔ مکمل رپورٹ افسران بالا کو بھی دے چکا ہوں اور اسلام آباد بھی ارسال کر چکا ہوں۔"
منظر نے کہا "آپ کے خیال میں ملزم چوہدری دلاور ہی ہے؟"
"مگر اس کا آخری فیصلہ عدالت کرے گی۔"
"ملزم چوہدری دلاور حسین کو اس کیس میں مفرور قرار دے دیا گیا تھا؟"
"ہاں۔ لیکن اس کے وارثوں نے یہ رپورٹ درج کرائی تھی کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے۔"
"اس کے اغوا کا شبہ کس پر ظاہر کیا گیا تھا؟"

"پہلے ملزم کی بیوی نے جو رپورٹ لکھوائی تھی اس میں سکندر اور اس کے ساتھیوں پر یہ الزام عائد کیا گیا تھا مگر بعد میں اس کی بیٹی اور ایک بیٹے نے اس الزام کی خود ہی نفی کر دی اور کہا کہ چوہدری دلاور کو اس کے شریک کاروبار شوکت رانا نے اغوا کیا ہے جو سارے کاروبار پر قابض ہونا چاہتا ہے اور اپنے مقصد کے لیے اس نے دلاور کی بیوی کو اور اس کے بچوں کو بھی قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔"
"اور چوہدری دلاور آپ کو شوکت رانا کی کوٹھی کے اندر ہی ملا۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے اغوا کرنے والا شوکت رانا ہی تھا؟"
"حالات اور واقعات کی شہادت یہی ہے۔"
"چوہدری دلاور آپ کو کس حال میں ملا تھا؟"
"اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ منہ پر ٹیپ تھا اور وہ انتہائی بری حالت میں تھا۔"
"اغوا کی رپورٹ کے کتنے عرصے بعد چوہدری دلاور کی بازیابی ہوئی تھی؟" منظر نے سوال کیا۔
"پینتالیس دن بعد۔ اور اس عرصے میں اس پر خاصا جسمانی اور ذہنی تشدد کیا گیا ہوگا ورنہ اس کی حالت تشویش ناک حد تک خراب نہ ہوتی۔ اسے فوری طبی امداد اور انتہائی نگہداشت کی ضرورت تھی۔"
جج نے کہا "یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟"
"آج سے ٹھیک پانچ دن پہلے کی۔ میں نے اسے آٹھ تاریخ کی رات بارہ بجے گرفتار کیا تھا۔ روزنامچے میں گرفتاری کے وقت اور تاریخ کا اندراج خود میں نے کیا تھا۔"
"پھر اسے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیوں نہیں کیا گیا؟" جج نے کہا۔
"یور آنر۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اگر اسے فوراً طبی امداد نہ ملتی تو شاید وہ مر جاتا۔ میں نے اسے انتہائی سخت حفاظتی انتظامات کے تحت کوٹ لکھپت جیل کے اسپتال منتقل کر دیا تھا۔ میں نے اسے جیلر خورشید عالم کی تحویل میں دیا تھا اور اسپتال کے ریکارڈ سے اس کے داخل کیے جانے کی تاریخ اور وقت کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ اس کا معائنہ ڈاکٹر شفاعت علی نے کیا تھا اور … ملزم کا … ایس ڈی ایم مشاہد حسین زیدی نے اسپتال جا کے لیا تھا۔"
منظر نے کہا "کیا ملزم کی حفاظت کے لیے آپ نے بھی وہاں پولیس رکھی تھی؟"
"جی۔ میں نے چار افراد کو اس کام پر مامور کیا تھا۔ بعد میں انہیں میرے افسران بالا نے واپس بلا لیا۔"
"کیا ملزم دلاور حسین سے تفتیش کی گئی تھی؟"
"ملزم کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ کسی سوال کا جواب دے سکتا۔ میں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ میری تحریری اجازت کے بغیر کسی کو ملزم سے نہ ملنے دیا جائے۔"
منظر نے کہا "مگر اس کے باوجود ملزم دلاور پر تفتیش میں تشدد کیا گیا تھا۔"
"یہ غلط ہے۔"
"اس سے پوچھ گچھ کرنے والے وہی تھے جن کو آپ نے وہاں ملزم کی حفاظت کے لیے چھوڑا تھا۔ اور آپ ہی نے حکم دیا تھا۔"
"یہ بھی جھوٹ ہے۔ وہ عام سپاہی تھے۔ تفتیش کرنا ان کے فرائض میں شامل نہیں تھا اور وہ جانتے بھی نہیں تھے۔ پھر اس کیس میں تفتیش کا اختیار صرف اس خصوصی ٹیم کو حاصل تھا جو اسلام آباد میں وزارت داخلہ کے حکم پر تشکیل دی گئی تھی۔"
"لیکن آپ پر الزام ہے کہ زیر حراست ملزم آپ کی تفتیش کے نتیجے میں ہلاک ہو گیا۔"
"یہ شاید اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔"
جج نے کہا "آپ کا مطلب ہے چوہدری دلاور زندہ ہے؟"
"یس یور آنر۔"
منظر نے ایک پوسٹ مارٹم رپورٹ جج کے سامنے رکھی۔ "حضور والا۔ یہ ہے وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ جس میں بتایا گیا ہے کہ ملزم دلاور حسین کی موت تفتیش کے دوران کیے جانے والے تشدد کے باعث واقع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسپتال سے جاری ہونے والا سرٹیفکیٹ منسلک ہے جس پر ڈاکٹر شفاعت علی نے دستخط کیے ہیں۔"
جج نے دونوں دستاویزات کا معائنہ کیا۔ عدالت میں ایک ایسی اعصاب شکن پراسرار اور سنسنی خیز فضا پیدا ہو گئی جس میں عام آدمی کے لیے تجسس اور دلچسپی کا اضطراب تھا۔ دلاور کی بیوی اور اس کے حامی اپنی شکست کی آواز سن سکتے تھے اور ہم سب جو دلاور کی گرفتاری کے ذمے دار تھے دل ہی دل میں ایک دوسرے کو اس کامیابی پر مبارک باد دے رہے تھے۔
آہستہ آہستہ بڑی فنکاری کے ساتھ اور پیشہ ورانہ مہارت سے منظر جال پھیلا رہا تھا اور حلقۂ دام کو تنگ کرتا جا رہا تھا۔
جج نے کہا "اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ملزم دلاور حسین کی موت واقع ہو گئی ہے۔"
جاوید صدیقی نے مسکراتے ہوئے کہا "یور آنر۔ میں نے بھی اسی لیے کہا تھا کہ شاید یہ اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ یہ دونوں دستاویزات غلط اور جھوٹی ہیں۔ مرنے والا چوہدری دلاور حسین وہ ملزم نہیں تھا جس کو میں نے گرفتار کیا تھا۔"
جج نے کہا "کیا یہ چوہدری دلاور حسین کوئی اور تھا؟"
"مجھے نہیں معلوم جناب والا کہ اس شخص کا نام کیا تھا اور وہ کس جرم میں کوٹ لکھپت جیل میں بند تھا" جاوید صدیقی نے کہا

www.paksociety.com

"لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کی شناخت بدل دی گئی۔ یہ کہا گیا کہ وہ چوہدری دلاور حسین ہے۔ یہ عدالت اس معاملے کی تفتیش کے لیے احکامات جاری کر سکتی ہے۔"

منظر نے کہا "اس جعلی دلاور حسین کی لاش کہاں ہے؟"

جاوید صدیقی نے کہا "اگر معزز عدالت ایک بیلف کو میرے ساتھ روانہ کرے تو ایک شخص بتا سکتا ہے وہ جگہ۔"

جج نے کہا "آخر آپ معاملے کو اتنا پُراسرار کیوں بنا رہے ہیں؟ آپ زبانی بتا سکتے ہیں کہ لاش کہاں ہے؟"

"یور آنر، میں معافی چاہتا ہوں۔ اگر میں نے جگہ کی نشاندہی کی تو مجھے ڈر ہے کہ بیلف کے پہنچنے سے پہلے ہی لاش وہاں سے غائب کر دی جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ عدالت بعد میں بیلف کو بھیج سکتی ہے۔ فی الحال زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ اصل چوہدری دلاور حسین زندہ ہے تو کہاں ہے؟" جج نے کہا۔

"میں اس معزز عدالت سے تھوڑی سی رعایت کی درخواست کروں گا۔ مجھے اجازت دی جائے کہ پہلے میں اپنا بیان مکمل کروں اور پھر چوہدری دلاور کو عدالت میں پیش کروں۔"

"اگر یہ انتہائی ناگزیر ہے تو عدالت آپ کو چند منٹ میں اپنا بیان مکمل کرنے کی اجازت دے سکتی ہے۔"

"تھینک یو یور آنر۔" جاوید صدیقی نے کہا "یہ اٹھ تاریخ کی رات کی بات ہے جب مجھے کسی نے فون پر مطلع کیا کہ ڈاکٹر بیلی مرڈر کیس کا نامزد ملزم ایک شخص شوکت رانا کی زیرِ تعمیر کوٹھی میں موجود ہے۔"

"کیا اطلاع دینے والے نے اپنے متعلق کچھ بتایا تھا؟" منظر نے کہا۔

"جی نہیں۔ اس نے اپنا نام پوشیدہ رکھا تھا" جاوید صدیقی بولا "عموماً ہم کسی گمنام کال پر ایکشن نہیں لیتے لیکن بعض اوقات ایسا کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے مثلاً کوئی شخص فون پر اپنا نام نہ بتائے مگر یہ کہے کہ اس کے گھر کے پاس فلاں جگہ قتل کی واردات ہوئی ہے اور قاتل ابھی وہیں موجود ہے تو ہم کو جانا پڑتا ہے خواہ بعد میں جھوٹ یا کسی احمق کالج اسٹوڈنٹ کا مذاق ہی کیوں نہ ثابت ہو۔ ویسے بھی پولیس کو گمنام کال پر ایکشن لینے سے منع نہیں کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے پولیس کی مسلح نفری کے ساتھ فوراً چھاپا مارنے کا فیصلہ کیا اور ملزم چوہدری دلاور حسین کو گرفتار کر لیا۔"

عدالت میں بیان وکیل دلواتے ہیں۔ وہ سوال کرتے جاتے ہیں اور اپنے موکل کو پہلے سے تاکید کر دیتے ہیں کہ جتنا اس سے پوچھا جائے اتنا ہی بتائے اس طرح وہ اپنے موکل کی قانونی پوزیشن کا دفاع کرتے ہیں۔ اس کو ایسی بات منہ سے نہیں نکالنے دیتے جو کسی طرح بھی اس کی قانونی پوزیشن کو متاثر کرے اور دوسری طرف وہ تمام جزئیات کو سامنے لاتے ہیں جن کا تعلق [illegible] ہو۔

منظر نے جاوید صدیقی کو ٹوک دیا "ایک منٹ جاوید صاحب، یہ گمنام فون کال کتنے بجے موصول ہوئی تھی؟"

"تقریباً ساڑھے گیارہ بجے رات۔"

"اور اس کے کتنی دیر بعد آپ اس جگہ پر پہنچ گئے تھے؟"

"مجھے پتا پہلے سے معلوم تھا۔ میں وہاں بارہ بجنے میں [illegible] پر پہنچا تھا۔"

"کیا آپ شوکت رانا کو جانتے تھے؟"

"جی نہیں۔ وہ ملزم چوہدری دلاور حسین کا دوست اور بزنس پارٹنر تھا۔" جاوید صدیقی نے کہا "اس کیس کی تفتیش کے سلسلے میں میری اس سے بھی کئی بار ملاقات ہو چکی تھی۔"

"یہ وہی شوکت رانا ہے جس پر ملزم دلاور حسین کی بیوی نے ایک پریس کانفرنس میں سنگین نوعیت کے الزامات عائد کیے تھے؟"

"جی۔"

"کیا آپ عدالت کو بتا سکتے ہیں کہ وہ الزامات کیا تھے؟"

"چوہدری دلاور کی بیوی نے شوکت رانا پر دو سنگین الزام لگائے تھے۔ ایک یہ کہ چوہدری دلاور کو اغوا کرنے والا [illegible] دوسرا یہ کہ شوکت رانا یہ فرض کر چکا ہے کہ شاید چوہدری [illegible] نہیں ہے۔"

"اس نے ایسا کیوں فرض کیا تھا؟"

"اس لیے کہ چوہدری دلاور پچھلے بیس دن سے بے [illegible] دوران نہ اس نے کسی سے رابطہ کیا تھا اور نہ اس کے بارے میں کوئی اطلاع تھی حالانکہ پولیس نے اس کی تلاش میں اپنے ذرائع استعمال کیے تھے۔ خود چوہدری دلاور کی بیوی نے اپنے طور پر کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے ذاتی وسائل کم نہیں ہیں مگر وہ دلاور کا سراغ لگانے میں سب ناکام رہے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ناامید ہو چکے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔ آگے بتایئے۔"

"شوکت رانا پر الزام لگانے والی چوہدری دلاور کی بیوی تھی۔ اس نے کہا کہ غالباً میرے شوہر کا بزنس پارٹنر سارے کاروبار پر قابض ہونے کی سازش کر رہا ہے۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ چوہدری دلاور کے زندہ ملنے کے امکانات معدوم ہو گئے ہیں اس نے دلاور کے قانونی وارثوں کو بھی ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا [illegible] مسز دلاور اور اس کے بچوں کے قتل کی سازش کی۔"

"صرف سازش کی جاوید صدیقی یا کوشش بھی کی؟"

"مسز دلاور نے تو کہا تھا کہ اسے قتل کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ ایک دن شوکت رانا نے بجانے سے اس کو [illegible] بنگلے میں بند کروا دیا۔ اس نے گیس کھلی چھوڑ دی اور بنگلے اور اس کے ملحقہ خانے میں آمد و رفت کے تمام راستے بند کر دیے۔ ہوا باہر نکلنے کے تمام راستے، [illegible] کے کنکشن منقطع کر دیے تاکہ وہ دم گھٹنے سے ہلاک ہو جائے یا گیس میں دھماکے سے آگ لگ جائے۔"

"پھر وہ کیسے بچ گئی؟"

"اس کے بیان کے مطابق اسے بچانے والا وہی شخص تھا جو اس کے شوہر کا جانی دشمن سمجھا جاتا ہے یعنی سکندر بخت۔"

"کیا سکندر بخت کا وہاں پہنچ جانا ایک اتفاق تھا؟"

"اس کو اور کیا سمجھا جا سکتا ہے۔ چوہدری دلاور کی بیوی نے انکشاف اپنی پریس کانفرنس میں کیا تھا۔ اس نے اعتراف کیا تھا کہ سکندر بخت ایک شریف النفس اور فراخ دل شخص ثابت ہوا۔"

"مگر اس نے اپنے دشمن کی بیوی کو زندہ بچانا کیوں ضروری سمجھا؟"

"ایک اخلاقی فرض کے طور پر۔ مسز دلاور کا بیان یہی تھا کہ سکندر بخت نے اس کی بحفاظت نکلنے میں مدد کی۔ چند منٹ بعد ہی وہ عمارت دھماکے سے تباہ ہو گئی جس کے تہہ خانے میں مسز دلاور قید تھی۔ اس میں گیس بھر چکی تھی اور آگ بجلی کے تاروں کے شارٹ سرکٹ ہونے سے لگی تھی۔ سکندر بخت نے ہی مسز دلاور کو گھر پہنچایا اور کہا کہ اس کی قانونی جنگ چوہدری دلاور سے ہے اس کے بیوی بچوں سے نہیں۔"

جج نے اسے ٹوکا "آپ بیان کو چوہدری دلاور کی گرفتاری تک محدود رکھیں۔"

"آئی ایم سوری یور آنر" جاوید صدیقی بولا "میں رات بارہ بجنے میں پانچ منٹ پر شوکت رانا کی کوٹھی پر پہنچا۔"

"کیا شوکت رانا بھی وہاں موجود تھا؟" منظر نے کہا۔

"جی ہاں۔ وہ وہاں موجود تھا۔"

"اس کے علاوہ آپ نے کسے دیکھا؟"

"میں نے کوٹھی کے باہر ڈیپ کو دیکھا تھا۔ ڈیپ کے ساتھ [illegible] مسز رابعہ قادری تھیں اور غالباً آپ کے ساتھی وکیل [illegible] بھی تھے۔ یہ فریق وکیل اپنے موکل کے ساتھ تھے اور دو [illegible] تھے ایک اخبار کا چیف رپورٹر نازی تھا جو اس رات حادثے [illegible] ہلاک ہو گیا۔ دوسرا شخص فوٹو گرافر تھا۔"

"کیا آپ نے کسی کو گمنام فون کر کے اطلاع دی تھی؟"

"جی ہاں۔ مجھے انہوں نے یہی بتایا تھا" جاوید صدیقی نے کہا "میں نے ہر طرف سے کوٹھی کا محاصرہ کر لیا۔ روانگی سے پہلے میں [illegible] علاقے کے ایس ایچ او کو بھی طلب کر لیا تھا۔ وہ بھی اپنی [illegible] کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ رکھوروں پہلے [illegible] ہو چکا ہے۔ اس دھماکے میں ملزم شوکت رانا کی [illegible] مکمل طور پر تباہ ہو گئی تھی اور اس کے دو بندے ہلاک ہوئے تھے۔ ایک اس کا پرسنل باڈی گارڈ تھا اور دوسرا ڈرائیور۔ ان کی جلی ہوئی لاشیں وہیں پڑی تھیں۔"

"آپ نے شوکت رانا کے لیے ملزم کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے مسٹر جاوید صدیقی؟"

"جب میں اندر پہنچا تو میں نے ایک اور لاش دیکھی۔ یہ کوٹھی کے پٹھان چوکیدار کی لاش تھی جس کو شوکت رانا نے گولی ماری تھی۔"

"وہ کس لیے؟"

"اس کی نااہلی پر مشتعل ہو کے۔ آلۂ قتل اس کے ہاتھ میں تھا اور اس میں اتنی ہی گولیاں کم تھیں جتنی چوکیدار پر چلائی گئی تھیں۔"

"آپ نے اسے آلۂ قتل کیسے تسلیم کر لیا؟"

"واقعاتی شہادت کی بنا پر۔ میرا تجربہ یہی کہتا تھا اور ان گولیوں کا کیلی بر بھی ساخت اور ساخت ایک تھی۔ پھر میں نے شوکت رانا کی گفتگو سے بھی یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہی چوکیدار کا قاتل ہے۔ میں نے اس ایس ایچ او کو ہدایت کی کہ وہ ملزم کو اپنی تحویل میں لے کر اس کے خلاف ایف آئی آر درج کرے اور آلۂ قتل پر اس کے فنگر پرنٹس کی رپورٹ حاصل کرے۔"

جج نے کہا "کیا چوہدری دلاور وہاں موجود تھا؟"

"یس سر۔ چوہدری دلاور وہیں تھا۔" جاوید صدیقی نے کہا "اس کے ہاتھ پاؤں سختی سے بندھے ہوئے تھے اور اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا گیا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔"

"خراب سے آپ کی کیا مراد ہے مسٹر جاوید صدیقی؟"

"ایسا لگتا تھا کہ چوہدری دلاور پر تشدد کیا گیا تھا۔ اس کو زنجیر سے باندھ کے [illegible] تھا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کے زخم اس [illegible] وہ کافی عرصہ زنجیر کے ساتھ گزارا رہا تھا۔ [illegible] اور اس کا وزن کافی کم ہو گیا تھا۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ پہلے چوہدری دلاور کا وزن کیا تھا؟" منظر بولا۔

"جی نہیں۔ جب کسی صحت مند یا فربہ بدن شخص کو بھوکا رہنا پڑے اور ایک لمبے عرصے تک اس کی خوراک میں کمی ہو جائے تو اس کے بدن کی چربی گھل جاتی ہے۔ وزن کم ہونے سے اس کے جسم کی کھال ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور اس میں خشک شکنوں کے علاوہ رنگت کی تبدیلی نظر آتی ہے۔ ملزم چوہدری دلاور کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے تھے اور وہ اتنا کمزور تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ درحقیقت اس پر بے ہوشی طاری تھی۔ میں نے اس کی نبض اور دل کی دھڑکن کی رفتار دیکھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی جسمانی حالت تشویشناک ہے اور اس کو فوراً اسپتال منتقل کرنا ضروری ہے ورنہ اس کی ہلاکت یقینی ہے۔ میں نے اسے مسلح حفاظتی دستے کے ساتھ روانہ کر دیا۔"

www.paksociety.com

"آپ نے ایک رپورٹر اور ایک فوٹوگرافر کا ذکر کیا تھا۔ کیا یہ سب کارروائی انھوں نے دیکھی تھی؟"

"ہاں۔ اس رپورٹر کا نام غازی تھا۔ اس کے ساتھ آنے والے فوٹوگرافر نے جائے واردات کی تصاویر بھی بنائی تھیں۔ رپورٹر نے کہا تھا کہ وہ اپنے اخبار کی آخری کاپی رکوا چکا ہے اور صبح یہ خبر اور تصویریں شائع ہوں گی۔ وہ اس خصوصی یعنی EXCLUSIVE اسٹوری پر بہت خوش تھا۔"

"لیکن صبح کے اخبار میں نہ خبر تھی اور نہ تصویر۔"

"ہاں۔ جیسا کہ مجھے صبح پتا چلا۔ اس کے اخبار کی خبر ہے۔ غازی اور اس کا ساتھی فوٹوگرافر واپس جاتے ہوئے حادثے کا شکار ہوگئے۔ ان کی موٹر سائیکل کو کسی ٹرک نے ٹکر ماری تھی۔"

"کیا آپ کے خیال میں انھیں صرف خبر کی اشاعت روکنے کے لیے ہلاک کیا گیا تھا؟"

"ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر اس بارے میں تفتیشی افسر ہی قطعی رائے دے سکتا ہے۔ جس تھانے کی حدود میں یہ حادثہ پیش آیا تھا تفتیش کی رپورٹ اسی تھانے میں ہوگی۔"

"آپ نے چوہدری دلاور کو کس اسپتال میں بھیجا تھا؟"

"میں نے بہت سوچ سمجھ کے کوٹ لکھپت جیل کے اسپتال کا انتخاب کیا تھا کیونکہ وہاں کا جیلر میرے لیے قابل اعتبار تھا۔ اس نے میرے ساتھ ہی پی سی ایس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی اور ہم کورس میٹ تھے۔ ہمارے کمرے ایک تھے اور تربیت کے دوران ہم ایک دوسرے کے دوست بن چکے تھے۔ بعد میں اس نے جیل سروس جوائن کی اور میں نے پولیس سروس۔"

"آپ نے ملزم چوہدری دلاور حسین کو متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او کی تحویل میں کیوں نہیں دیا تھا؟"

"دراصل مجھے یہ اندیشہ لاحق تھا کہ ملزم چوہدری دلاور حسین کو غیر قانونی طور پر پولیس کی حراست سے چھڑانے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اسے تھانے لے جانے والے راستے پر کہیں روک لیا جائے اور مسلح افراد اسے پولیس کی تحویل سے چھین کر لے جائیں۔"

"آخر اس اندیشے کی وجہ؟"

"ملزم چوہدری دلاور کی خراب REPUTATION۔ میری خصوصی تفتیش کے دوران جو حقائق میرے سامنے آئے ان سے یہ ثابت ہوا تھا کہ وہ صرف اپنی سوتیلی بہن ڈاکٹر شیلی کے قتل میں ہی ملوث نہیں۔ اسی نے لندن میں اپنی سوتیلی ماں اور اس کے تیسرے شوہر کی گرل فرینڈ کو بھی قتل کیا تھا اور فرار ہو گیا تھا۔"

"قتل کا مجرم کون ثابت ہوا تھا۔ جو اب جیل کاٹ رہا ہے؟"

"وہ تیسرا شوہر جو وہاں موجود تھا اور چھپ کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا یعنی ڈاکٹر شیلی کی ماں کا تیسرا شوہر۔ جارج۔"

"اس کا دوسرا شوہر کون تھا مسٹر جاوید صدیقی؟"

"چوہدری دلاور کا باپ۔"

جج نے مظہر کو وارننگ دی "آپ غیر متعلقہ تفصیلات سے بیان کو طول مت دیں۔"

"یہ تفصیلات غیر متعلقہ نہیں ہیں یور آنر۔ ان کا براہِ راست تعلق چوہدری دلاور سے ہے۔" مظہر نے کہا۔

جاوید صدیقی نے اپنا بیان پھر شروع کیا "مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ملزم چوہدری دلاور کے ماضی کا ریکارڈ بہت خراب ہے۔ وہ مختلف نوعیت کے غیر قانونی کاروبار کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ایسے افراد تھے جو ہسٹری شیٹر تھے اور باقاعدہ اس کے ملازم تھے جس کا سرغنہ چوہدری دلاور تھا۔"

جاوید صدیقی نے مختصراً ان حالات کا حوالہ بھی دیا جن کی وجہ سے میرے والد وزیر خان اور میر شرافت علی کی پُراسرار موت ہوئی اور یہ بھی بتایا کہ بعد میں وزیر خان کے بیٹے سکندر بخت سے دشمنی کا آغاز حقِ وراثت کا جھگڑا تھا۔ جاوید صدیقی نے انگلینڈ اور پاکستان میں چوہدری دلاور کے دشمن کردار کا ذکر بھی کیا اور اس کے انسانیت کش کاروبار کا بھی۔

"مجھے ڈر تھا کہ پولیس وین پر چوہدری دلاور کے گینگ کے ارکان حملہ نہ کر دیں یا اسے تھانے کی حوالات سے چھڑوا کے لے جائیں۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ پیسے اور طاقت کا بھرپور استعمال کرنا جانتا ہے اور اسے تھانے کے بعض پولیس افسران کی تائید و حمایت بھی حاصل رہی ہے۔ میں نے حکمتِ عملی کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھا اور آخری وقت تک کسی کو نہیں بتایا کہ میں نے ملزم چوہدری دلاور حسین کو کہاں رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے بعد میں سنا، چوہدری دلاور کے مسلح ساتھی تھانے کی طرف جانے والے راستے پر بیٹھے تھے لیکن وہ انتظار کرتے رہ گئے اور میں نے مسلح محافظوں کے ساتھ اس کو لے جانے والی گاڑی کا رخ کوٹ لکھپت جیل کی جانب کر دیا۔ جیلر خورشید عالم نے میری خواہش پر ملزم کی تحویل میں لیے جانے کا اندراج کیا اور اسے جیل اسپتال منتقل کرنے کے احکامات جاری کیے۔ اسپتال میں اسے ایک الگ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ اس کے علاج کے لیے ڈاکٹر شفاعت علی کو میں نے خصوصی ہدایات دی تھیں۔ یہ بات کون نہیں جانتا کہ جیلوں کے اسپتالوں کی کیا حالت ہے اور وہاں علاج کے نام پر قیدیوں کو جو سہولت حاصل ہے اس سے کسی عام مریض کو بھی شفا حاصل نہیں ہو سکتی۔ دلاور کے لیے میں نے کہا تھا کہ اس کی صحت کی بحالی کے لیے ضروری ادویات خریدی جائیں خواہ وہ کتنی بھی مہنگی کیوں نہ ہوں۔ میں اس کا بل بھی ادا کرنے پر تیار تھا مگر ... بتا دیا کہ سرکاری خرچ پر ہی چوہدری دلاور کو ہر دوا فراہم کی جائے گی۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو چوہدری دلاور کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ میں نے ملزم کی حفاظت کی ذمے داری جیلر خورشید عالم کو سونپی تھی۔ ذاتی طور پر بھی وہاں کچھ افراد کو مامور کیا تھا جو میرے نزدیک انتہائی قابل اعتبار تھے۔ ان میں سے ایک کمرے کے اندر اور دوسرا باہر دروازے پر ہر وقت موجود رہتا تھا۔ میں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ میری تحریری اجازت کے بغیر اور پھر مجھ سے تصدیق کیے بغیر کسی کو بھی ملزم سے ملنے کی اجازت نہ دی جائے۔ نہ اس کے وکیل کو نہ رشتہ داروں کو۔ جناب والا! ایسی حالت میں ملزم کو تشدد کا نشانہ بنانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور نہ میں نے کسی کو یہ ذمے داری دی تھی کہ وہ اس سے پوچھ گچھ کرے۔ حفاظت پر مامور کانسٹیبل دیانت دار بھی تھے اور انھیں طریقۂ تفتیش کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔"

"لیکن آپ پر الزام ہے کہ آپ کے حکم پر ملزم دلاور حسین پر تفتیش کے دوران تشدد کیا گیا جس سے وہ ہلاک ہو گیا" مظہر نے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے" جاوید صدیقی نے کہا "نہ میں نے ایسا کوئی حکم دیا تھا اور نہ چوہدری دلاور تشدد سے ہلاک ہوا۔ اصل حقیقت یہ ہے جناب والا کہ جب میں نے ملزم چوہدری دلاور حسین کو گرفتار کیا تو اس کے دولت خانے سے ذاتی اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے اور دولت کو پانی کی طرح بہاتے ہوئے میرے محکمے کے افسرانِ اعلیٰ سے ساز باز حاصل کی تاکہ چوہدری دلاور کو یہ خبر عام ہونے سے پہلے فرار کرا لیا جائے۔ خبر کس طرح دبا دی گئی تھی، اس کا اندازہ اُس اخبار کے رپورٹر اور فوٹوگرافر کی موت کے پراسرار حالات سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو گرفتاری کے وقت موجود تھے۔ تاہم کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ملزم کس تھانے کی حوالات میں ہے اس لیے وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تیسرے دن مجھے میرے ایک افسرِ اعلیٰ نے طلب کیا اور مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ چوہدری دلاور کی گرفتاری ظاہر نہ کر کے میں کس قسم کے فوائد حاصل کر سکتا ہوں۔ شاید میں لاکھوں کما لیتا اور مجھے ترقی بھی مل جاتی لیکن جناب والا! یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ میں عدالت میں جھوٹا بیان بھی داخل کر دوں کہ میں نے تو کسی چوہدری دلاور کو گرفتار ہی نہیں کیا تھا۔ جو ایسا کہتا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس واقعے کے دو غیر جانبدار گواہ بھی تھے۔ ان دونوں رپورٹر اور فوٹوگرافر تھے جو ہلاک ہو چکے تھے۔ باقی سب پولیس والے تھے جو چوہدری دلاور کے اس کیس میں ایک فریق ہیں۔ ظاہر ہے ان کی گواہی کی کوئی اہمیت نہیں۔" اس نے ہم سب کی طرف اشارہ کیا "لیکن جناب والا! میں ضمیر کا گلا گھونٹ کے اتنا بڑا جھوٹ کسی قیمت پر نہیں بول سکتا تھا۔ حقیقت حالات سے چشم پوشی کرنا بھی جرم ہے۔ میں نے صاف انکار کر دیا تو مجھ سے کہا گیا کہ میں اسلام آباد واپس جا کے خاموشی سے بیٹھ جاؤں۔ میری جگہ لینے والا افسر خود اس کیس سے نمٹ لے گا۔ اسلام آباد جا کے خاموش بیٹھ جانے میں بھی میرا ذاتی نقصان بہرحال نہیں تھا۔ اپنے آپ کو بھی میں مطمئن کر سکتا تھا کہ میں نے تو جھوٹ نہیں بولا۔ بعد میں میری جگہ آنے والا جو چاہے کرے۔ میں کسی اور کے قول و فعل اور گناہ و ثواب کا ذمے دار نہیں لیکن یور آنر، اس کیس میں مجھے اسلام آباد سے ایک چیلنج دے کر بھیجا گیا تھا۔ مجھ سے پہلے والے رشوت ستانی، بدعنوانی اور مجرمانہ غفلت کے باعث پہلے معطل پھر برطرف اور بالآخر گرفتار ہو چکے تھے۔ شاید مجھے یہ چیلنج دینے والوں کا خیال تھا کہ میرا انجام بھی مختلف نہیں ہوگا یا پھر میں ناکامی کا داغ چہرے پر سجا کے لوٹ آؤں گا لیکن اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے مجھے سرخرو کیا۔ بے شمار مشکلات پر قابو پا کے اور ان گنت رکاوٹوں کو دور کر کے میں ڈاکٹر شیلی کے قتل کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ افسوس یہ ہے جناب والا کہ میری کامیابی پر مجھے انعام نہیں سزا ملی۔ یہ میرا جرم اور میری غلطی بن گئی۔ میں نے بڑی محنت سے دن رات ایک کر کے رپورٹ مرتب کی تھی جو میں اسلام آباد بھی ارسال کر چکا ہوں۔ اس کی ایک نقل میرے پاس بھی ہے۔ ایک میں اس عدالت کی تحویل میں دینا چاہتا ہوں۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ اس رپورٹ کو سرد خانے میں ڈال دیا جائے اور بالآخر قاتل کو قانون کے شکنجے سے نکل جانے کا موقع مل جائے۔ یہی وجہ تھی یور آنر کہ میں نے صاف انکار کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ اب میری نوکری جائے یا زندگی۔ جب میں نے چوہدری دلاور کو گرفتار کیا ہے اور اس کا ریکارڈ بھی موجود ہے تو پھر اسے عدالت میں بھی پیش کیا جائے گا۔ عدالت چاہے تو اسے چھوڑ دے لیکن میں یہ بیان ضرور دوں گا کہ میں نے چوہدری دلاور کو گرفتار کیا تھا۔ میں نے اس کا ریمانڈ لیا تھا۔ میں نے اسے کوٹ لکھپت جیل اسپتال میں رکھا تھا۔ میں نے اس کا علاج کرایا تھا ورنہ وہ مر جاتا۔ وہ مجسٹریٹ جس نے ریمانڈ دیا تھا۔ وہ ڈاکٹر جس نے علاج کیا تھا۔ جیلر خورشید عالم یہاں آئیں اور کتاب مقدس پر ہاتھ رکھ کے اور خدا کو حاضر ناظر جان کے کہیں کہ کیا یہ جھوٹ ہے؟ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں حقائق کو منظرِ عام پر ضرور لاؤں گا۔ میری نیت کو بھانپتے ہوئے میری عدم موجودگی میں افسرانِ بالا نے میری معطلی کے احکامات صادر کیے۔ ان سے پوچھا جائے کہ میرا قصور کیا تھا؟ میں وہ دن روپوش رہا تھا کہ افسرانِ بالا کو میرے عزائم کی خبر نہ ہو۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں میرے بیوی بچوں کو پریشان نہ کیا جائے۔ میری تلاش میں میرے گھر پر اسلام آباد میں چھاپا نہ مارا جائے۔ میں اس وقت کا اور آج کے دن کا انتظار کر رہا تھا۔ میری جگہ ایک ایس ایس پی کو بٹھا دیا گیا تھا۔ میں نے اسے چارج دینے سے انکار کر دیا اور معطلی کے احکامات بھی وصول نہیں کیے۔ ٹھیک ہے میں نے سروس رولز کی خلاف ورزی کی اور ڈسپلن توڑا۔ اس کی پاداش میں زیادہ سے زیادہ مجھے برطرف کیا جا سکتا تھا سو میں نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا ہے احتجاجاً۔ اس استعفے کی نقل میں نے اخبار والوں کو بھی فراہم کر دی کیونکہ اس میں وہ تمام اسباب تفصیل سے لکھ دیے گئے ہیں

www.paksociety.com

جس کی بنا پر میں استعفیٰ دینے پر مجبور ہوا تھا۔"

عدالت میں مکمل خاموشی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ چوہدری دلاور کے کیمپ پر سکتہ طاری ہے۔ اس کی بیوی سخت مایوس بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کا نوجوان اور سرکش بیٹا سخت مشتعل تھا۔

جج نے کہا "کیا آپ کو اور کچھ کہنا ہے؟"

منظر فوراً کھڑا ہو گیا "اپنے مؤکل کی طرف سے میری استدعا ہے کہ اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا نوٹس لیا جائے اور پولیس کے افسرانِ بالا کو عدالت میں طلب کر کے ان سے وضاحت طلب کی جائے کہ انہوں نے میرے مؤکل کو کس جرم میں معطل کیا تھا؟"

جج نے کہا "یہ کیس الگ سماعت کے لیے پیش کیا جانا چاہیے پھر اس پر میرٹ کے مطابق قانونی کارروائی ہوگی۔ مسٹر جاوید صدیقی! کیا اب آپ عدالت کو بتائیں گے کہ چوہدری دلاور کہاں ہے؟"

منظر نے کہا "میں معافی چاہتا ہوں یور آنر۔ اس سے پہلے کہ میرا مؤکل اس سوال کا جواب دے، میں اس سے صرف ایک سوال کروں گا۔"

جج نے مسکرا کے کہا "سوال اور جواب دونوں مختصر ہونے چاہئیں۔"

منظر نے کہا "ٹھیک ہے سر۔ مسٹر جاوید صدیقی! اصلی اور نقلی چوہدری دلاور کے بارے میں حقائق کا علم آپ کو کیسے ہوا اور یہ دستاویزات یعنی ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ آپ نے کیسے حاصل کرلیں؟"

جاوید صدیقی نے کہا "کوٹ لکھپت جیل کے اندر کچھ فرض شناس ماتحت افسروں نے میری مدد کی۔ ان کی اطلاع پر میں نے بروقت چھاپا مارا اور سب کچھ اپنے قبضے میں کرلیا۔ جیل کی وین جس میں چوہدری دلاور سے ملتے جلتے ایک شخص کو میک اپ سے چوہدری دلاور بنا کے اس کی لاش روانہ کی گئی تھی، یہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ۔ اصل چوہدری دلاور کو میں نے اس وقت گرفتار کیا جب وہ جیل کے عملے کے رہائشی کوارٹرز کی طرف سے ایک دیوار کے شگاف سے نکل کے فرار ہو رہا تھا۔"

اچانک ایڈووکیٹ جنرل نے کھڑے ہو کے کہا "جنابِ والا! مجھے ابھی ابھی ایک اطلاع ملی ہے ڈی آئی جی صاحب کی طرف سے۔ غلط فہمی کی بنا پر ایس ایس پی جاوید صدیقی کی معطلی کے احکامات منسوخ کر دیے گئے ہیں اور ان کا ٹرانسفر بھی روک دیا گیا ہے۔ وہ بدستور اپنی جگہ پر کام کرتے رہیں گے۔"

رابعہ اور منظر کی طرف سے کچھ وکیلوں نے ایک ساتھ زور سے ہنس کے کہا "ہیئر ہیئر" کچھ نے بہ آوازِ بلند جاوید صدیقی کو مبارک باد دی۔ ایک نے زور سے بنچ پر ہاتھ مارا اور بولا "واہ بھئی واہ" اور دوسرے نے قہقہہ مار کے کہا "بڑی جلدی پڑ گئی اوپر والوں کو" منظر نے مسکرا کے شعر پڑھا

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

جج نے اپنی متانت برقرار رکھی اور باتیں کرنے والوں کو "آرڈر آرڈر" پکار کے کہا "آپ سب خیال رکھیں کہ یہ عدالت ہے" اور پھر جاوید صدیقی سے مخاطب ہوا "ایس ایس پی صاحب۔ غالباً اب آپ پوری طرح بااختیار ہیں۔"

"یس یور آنر" جاوید صدیقی نے مسکرا کے کہا "اور میں اپنے بیان پر پوری طرح قائم ہوں۔"

ایڈووکیٹ جنرل اٹھ کر جاوید صدیقی کے پاس آیا اور اس نے جج سے مشورے کی اجازت کے بعد جاوید صدیقی سے کچھ پوچھا جس کا جواب اس نے سر ہلا کے دیا۔

"یور آنر۔ میں پوری طرح مطمئن ہوں" ایڈووکیٹ جنرل نے کہا "اور ایس ایس پی جاوید صدیقی کی یقین دہانی کے بعد میں یہ پوزیشن میں بھی ہوں کہ چوہدری دلاور حسین پولیس کی تحویل میں ہے۔ ملزم کی بیوی کی طرف سے دائر کردہ حبسِ بے جا کی رٹ غیر مؤثر سمجھی جائے۔"

جج نے اپنے آرڈر میں کہا "حبسِ بے جا کے کیس میں دلاور حسین کی درخواست غیر مؤثر ہونے کی بنا پر خارج کی جاتی ہے تاہم عدالت یہ حکم بھی دیتی ہے کہ ملزم کو اپنے وکیل سے اور اہلِ خانہ سے ملنے کا موقع فراہم کیا جائے اور اس کی صحت کے بارے میں میڈیکل رپورٹ متعلقہ سیشن کورٹ کو پیش کی جائے۔ یہ عدالت امانت میں خیانت کے الزام میں جیلر خورشید عالم کے خلاف مقدمہ درج کرنے کا حکم بھی دیتی ہے۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی کے خلاف عائد کردہ الزامات کی تفتیش کے لیے سیشن جج کی عدالت میں درخواست دی جا سکتی ہے۔ تاہم ایس ایس پی جاوید صدیقی پولیس کے افسرانِ بالا کے غیر قانونی طرزِ عمل کے خلاف ہرجانے کی درخواست پر مبنی رٹ دائر کرنا چاہیں تو انہیں اس کا اختیار ہے۔"

جج کے چیمبر میں جاتے ہی عدالت کے کمرے میں ہلچل مچ گئی۔ بیک وقت بہت سے لوگ جاوید صدیقی سے ہاتھ ملانے کے لیے لپکے۔ وہ مسکرا کے سب سے ہاتھ ملاتا رہا اور ان کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ وہ سب وکیل جو بحیثیت مدعی وہاں موجود تھے منظر کو بھی صدیقی کی شاندار طریقے پر پیروی کرنے پر مبارک باد دے رہے تھے۔ ظاہر ہے ان میں رابعہ اور محسن کے ساتھ میں بھی تھا۔ سب سے زیادہ جوش اور جذبے کا مظاہرہ مولوی غلام حسین کی طرف سے دیکھنے میں آرہا تھا۔ وہ اچھل اچھل کر منظر کو تھپکی دے رہا تھا "آفرین ہے آپ پر۔ آپ نے تو بولتی بند کر دی۔"

منظر نے اس کے ایک دھپ مارا "ابے بھوتنی کے طرح کہہ......" منظر کا اگلا جملہ ناقابلِ اشاعت تھا۔

مولوی جھینپ گیا کیونکہ اس کے ساتھ ہی رابعہ بھی تھی اور منظر جوش میں حضرتِ شب کی اصطلاحات بھی بھول گیا تھا۔

طرف دیکھا تو میدان خالی تھا۔ چوہدری دلاور کی بیوی بے دھڑک وکیل کے ساتھ باہر چلی گئی تھی جب اٹارنی جنرل نے اس کی درخواست کو غیر مؤثر قرار دینے کی استدعا کی تھی۔ اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب عدالت کا فیصلہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ اس کی پیروی کرنے والے پانچ وکیل بھی اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔ شاید وہ بیوی کو تسلی دینے کے لیے کہ عدالت نے چوہدری دلاور کو قانونی مشیر مقرر کرنے کا اختیار بھی دے دیا ہے اور گھر والوں سے ملاقات کرانے کا بھی۔ اب کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم جلدی ضمانت منظور کرالیں گے۔ عدالت نے فیصلہ ہمارے حق میں دیا ہے۔ پولیس کو بتانا پڑا کہ چوہدری دلاور ان کے پاس ہے۔

ملزم کی تسلی کے لیے وہ ایسی ہی باتیں کر سکتے تھے ورنہ چوہدری دلاور کی بیوی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ ناکام ہو گیا ہے۔ چوہدری دلاور کو جیل سے نکال کے فرار کرانے کی اسکیم یقیناً بہت شاندار تھی اور شاید اس کو عملی جامہ پہنانے میں چوہدری دلاور کی بیوی نے لاکھوں خرچ کروا لے ہوں گے۔ جیلر خورشید عالم نے اس کے حسبِ منشا سب کچھ کر دیا تھا۔ ایک لاش فراہم کر دی تھی۔ معلوم نہیں وہ کون لاوارث قیدی تھا اور اس کی موت کے کیا اسباب تھے۔ اس کی بدقسمتی کہ قد و قامت اور چہرے مہرے سے وہ چوہدری دلاور جیسا تھا۔

اس خیال کے ساتھ ہی میرے ذہن میں دوسرا خیال آگیا۔ کیا یہ محض اتفاق تھا کہ مرنے والے کی لاش کو چوہدری دلاور کی لاش بنا دیا گیا یا مار دیا گیا تھا؟ جب آدمی پیسے کی خاطر اس حد تک گر جائے تو پھر وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ یہ ناممکن نہیں سمجھا جا سکتا کہ قیدیوں میں سے ایسے شخص کا انتخاب کیا گیا جس کی صورت چوہدری دلاور سے ملتی جلتی ہو پھر اس کی لاش بنا دی گئی۔ اور قیدیوں پر کیا منحصر ہے یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ کہیں سے اس حلیے کے شخص کو لانے کی فرمائش کی گئی ہو اور تھانے والوں نے لاک اپ میں سے کسی لاوارث کو بھیج دیا ہو یا کہیں سے مطلوب حلیے کا بندہ اٹھا لائے ہوں۔ یہ خیال بڑا ہی لرزہ خیز تھا جس نے میری ہڈیوں میں گویا خوف کی سنسنی پھیلا دی۔ میں نے طے کیا کہ بعد میں تفتیش کے دوران جاوید صدیقی کو یہ نکتہ اٹھانے کے لیے کہوں گا۔

چوہدری دلاور کی بیوی مجھے عدالت سے باہر بھی دکھائی نہ دی۔ شاید اس کو اپنی شکست کا صدمہ بہت زیادہ ہوا تھا۔ اس نے تو ایک خواب کی تعبیر کو اپنی دسترس میں دیکھ لیا تھا۔ وہ لمحہ جب چوہدری دلاور طیارے میں جہاز سے پرواز کر کے اس ملک کی حدود سے نکل جائے گا اس لمحے کے تصور سے نکل کے حقیقت کا روپ دھار چکا ہوگا۔ انہوں نے ٹکٹ خرید لیے ہوں گے اور سیٹ کنفرم کرالی ہوگی۔ وہ اس خیال ہی سے بہت لطف لے رہی ہوگی کہ کل ہم بنکاک مارتے اور چوہدری دلاور کی تلاش میں رہ جانے والوں سے سر پیٹتے رہ جائیں گے۔ فرض شناس اور ایماندار سمجھے جانے والا ایس ایس پی معطل ہی نہیں گرفتار ہو چکا ہوگا اور اس پر زیرِ حراست ملزم کو ہلاک کرنے کا الزام ہوگا۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ثابت ہو جائے گا کہ مرنے والا چوہدری دلاور ہی تھا تو پھر قبر میں سے نکل کے مردہ تو کہنے سے رہا کہ یہ جھوٹ ہے۔ وارث رونے دھونے کی تھوڑی سی اداکاری کریں گے اور چوہدری دلاور کہیں لندن نیویارک ٹوکیو میں ہوگا۔ اس کا سب کاروبار اسی طرح چلتا رہے گا۔ اس کی بیوی کم ہوشیار نہیں اور اب تو ماشاء اللہ اس کا بیٹا فیصل بھی جوان ہو گیا ہے۔ پھر چوہدری دلاور کو کیا غم ہے۔ وہ باہر عیش کرے گا اور آتا جاتا بھی رہے تو کسی کو کیسے معلوم ہوگا۔ اسے تختۂ دار تک پہنچانے کے دعوے دار خود چڑھ جائیں گے پھانسی۔

لیکن یہ سب ایک خواب ثابت ہوا تھا جو ادھورا رہ گیا تھا۔ اب چوہدری دلاور گرفتار تھا اور اس کی رہائی کا امکان بھی کم تھا۔ تاہم نہ چوہدری دلاور کی بیوی ہمت ہارنے والی عورت تھی اور نہ اس کا وکیل عدو اس شکست کو تسلیم کر سکتا تھا۔ اب وہ عدالتِ عالیہ تک اور سپریم کورٹ تک ضمانت پر رہائی کے لیے قانونی جنگ لڑیں گے اور اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چوہدری دلاور کے طریقِ جنگ پر عمل بھی جاری رکھیں گے یعنی لاقانونیت کے داؤ پیچ اور شیطانی ہتھکنڈے آزما کے سکندر بخت کو زیرِ دام لانے والے شکاری اپنا کھیل ختم نہیں کریں گے۔ بازی وہی ہوگی بس کچھ کھلاڑی پسِ پردہ رہ کے چال چلیں گے اور کچھ نئے شکاری سامنے آجائیں گے۔

جاوید صدیقی کے بحال ہونے کی خبر بہت تیزی سے باہر تک پہنچ گئی تھی۔ وہ سب پولیس فورس جس کی کمان صبح سے اب تک ارشد کریم ربانی کر رہا تھا ایک دم الرٹ ہو چکی تھی۔ ایک افسر گیا دوسرا آیا۔ دوسرا گیا پھر پہلا آگیا۔ اباؤٹ ٹرن۔ سیلوٹ... بادشاہ مرگیا... بادشاہ زندہ باد۔

درجنوں گاڑیوں میں موجود سیکڑوں کی تعداد میں پولیس کے ماتحت اور نائب افسران آگے بڑھ چڑھ کے ایس ایس پی جاوید صدیقی کو سیلوٹ مارنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل قسم کے پیادے اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن سب انسپکٹر اور انسپکٹر حضرات میں اتنی ہمت (یعنی بے غیرتی) تھی کہ کچھ دیر پہلے وہ جس شخص پر شکاری کتوں کی طرح جھپٹنے کے لیے مستعد تھے اور اب اس سے خوشامدانہ انداز میں ہاتھ ملا کے مبارک باد دے سکیں۔

جاوید صدیقی کے لیے یہ کوئی نیا سین نہیں تھا۔ نہ یہ کوئی غیر متوقع رویہ تھا۔ دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہر جگہ، ہر محکمے میں، ہر ادارے اور معاشرے میں۔ جو پکڑا جائے وہ چور ہے۔ جو اوپر ہے وہ افسر ہے۔ جس کے پاس طاقت اور اقتدار ہے وہ حاکم ہے۔ نیچے والے کمزور اور بے بس ہوتے ہیں۔ ان سے اصول پرستی اور

www.paksociety.com

وفاداری کی توقع رکھنا بھی اتنا ہی بے فائدہ ہے جتنا ان سے شکایت کرنا لاحاصل۔

اے ایس پی آفتاب اور خصوصی تفتیشی ٹیم کا تیسرا فریق انسپکٹر ساجد اب تک سامنے نہیں آئے تھے۔ ان کا اس معاملے میں کوئی اہم کردار نہیں تھا اور مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ انہیں بھی واپس کردیا گیا ہے یا ارشد کریم کی کمان میں دے دیا گیا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ بلاچوں وچرا تعمیل کرتے۔ تاہم میں نے ان کو آگے بڑھ کے ارشد کریم ربانی کے ساتھ تعاون کرتے بھی نہیں دیکھا تھا۔

اب اچانک وہ جاوید صدیقی کے سامنے آئے تو ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے اور میں یہ اندازہ کرسکتا تھا کہ ان کے دلی جذبات کی عکاسی میں کوئی تصنع نہیں ہے۔ وہ واقعی خوش تھے۔ اگر انہیں ارشد کریم ربانی کے ساتھ کام کرنا پڑتا تو وہ اپنا فرض نباہتے مگر خوش ہوکے نہیں۔

"مجھے معلوم تھا سر کہ آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا" اے ایس پی آفتاب نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"وہ کیسے بھئی' کیا تم نے کسی نجومی سے پوچھا تھا؟" جاوید صدیقی مسکرایا۔

"نہیں سر۔ میرا دل گواہی دیتا تھا۔"

"خیال رکھنا۔ یہ دل کی گواہی صرف دل کے معاملات میں چلتی ہے' عدالتی معاملات میں نہیں۔"

انسپکٹر ساجد نے کہا "بڑا اچھا ہوا سر۔ سچی بات ہے میں تو بڑا مایوس تھا۔ ہم نے بہت محنت کی تھی۔"

"ابھی اور محنت کرنی ہے ساجد۔ ہمت ہے؟" جاوید صدیقی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ہمت بہت بڑی جناب عالی" اس نے سینہ تان کے کہا۔

"اچھا تو پھر تم یوں کرو۔ آفتاب' تم مسلح گارڈز لے کر جاؤ تھانہ انارکلی اور ملزم چوہدری دلاور کو اپنی حوالات میں منتقل کرو۔"

"رائٹ سر۔"

"کوئی مزاحمت کرے یا گڑبڑ کا خطرہ ہو تو تمہیں پورا اختیار ہے کہ اپنے اور قانون کے دفاع میں گولی چلانے کا حکم دو۔"

"یس سر۔" آفتاب نے کہا اور سلیوٹ کرکے پلٹ گیا۔

"انسپکٹر" اس نے کہا پھر اسے ہمارا خیال آیا "سوری جنٹلمین۔ میں ابھی کچھ مصروف ہوں' شام تک۔"

"کیا شام کو آپ کے آفس میں بات ہوگی؟" ایک اخبار نویس نے پوچھا۔

اس نے پلٹ کے دیکھا "میں وعدہ نہیں کرسکتا۔"

"آپ ملزم چوہدری دلاور کو اخبار والوں سے بات کرنے کا موقع دیں گے" دوسرے صحافی نے کہا۔

"سوری۔ یہ میرے اختیار میں نہیں۔ یہ ایک عام قتل کا کیس ہے۔ میں اس کو شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنا سکتا۔ کسی قاتل کو پریس کانفرنس کی اجازت نہ پہلے تھی اور نہ اب … ہے۔"

"ہم اس شخص کی تصویر تو بنا سکتے ہیں جس کو چوہدری … مارا گیا تھا اور جس کے بارے میں جھوٹا ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری ہوگیا تھا۔"

"اور پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی دے دی گئی تھی۔"

"آخر وہ کون تھا؟"

جاوید صدیقی بھی مسکرانے لگا "ایک دم اتنے سوالوں کا جواب دینا تو مشکل ہے۔ ہاں تصویر بنانے کے لیے آپ میرے ساتھ میو اسپتال کے مُردہ خانے چل سکتے ہیں جہاں وہ لاش آج بھی ہے۔ اس کے فنگر پرنٹس بنانے' موت کے اصل اسباب معلوم کرنے کے علاوہ اس کی شناخت ضروری ہے اور آپ لوگ اس کام میں یقیناً پولیس کی مدد کرسکتے ہیں۔ تصویر کی اشاعت سے اس کا کوئی وارث سامنے آسکتا ہے۔"

"آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے سر۔" انسپکٹر ساجد بولا۔

"ہاں۔ میری جیپ لاؤ۔ تم میرے ساتھ ہوگے" جاوید صدیقی نے کہا۔

میو اسپتال یا پاکستان کے کسی بھی سرکاری اسپتال میں سلوک علاج کے نام پر بیمار انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ کم شرمناک نہیں مگر مُردوں کی حالت پر تو انسانوں کا سر بھی شرم سے جھک جاتا ہے کہ یہ ملک اتنا غریب تو نہیں اور اس کے وسائل اتنے کم تو نہیں کہ ہم مُردہ خانے کو کیفے سے بدتر حالت میں رکھنے پر مجبور ہوں۔ سارا قصور اور فتور نیت کا ہے۔ کچھ کرتا دھرتا بیماروں اور مُردوں کی دیکھ بھال کے لیے ملنے والا فنڈ اپنی کوٹھیوں اور کاروں کی دیکھ بھال پر صرف کردیتے ہیں۔

میو اسپتال کے مُردہ خانے کی حالت میں نے پہلے بھی دیکھی تھی اور ایک بار پھر دیکھی تو مجھے یہ منظر غیر انسانی سا لگا۔ دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہم مرجانے والوں کا احترام دیتے ہیں۔ ان کو اہتمام سے سفر آخرت پر روانہ کرتے ہیں اور پھر بڑی عقیدت کے ساتھ ان کی مغفرت کے لیے وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ہمارے اختیار میں ہے۔ لیکن یہاں انسانوں کی لاشیں ایسے پڑی تھیں جیسے قسائی کی دکان پر بکرے۔ یہاں اے سی بھی بند تھا اور بدبو کی شدت۔

مُردہ خانے کے نگران کا آفس سرے سے کوئی آفس نہیں تھا۔ وہ ایک اسٹور جیسا کمرا تھا جس میں دواؤں کی بو بھی آتی تھی جو پوسٹ مارٹم میں اور لاشوں کو بحفاظت رکھنے کے لیے استعمال ہونے والی دوائیں تھیں چنانچہ ان کی بو بھی عجیب تھی۔ اعصاب پر دہشت طاری کرنے والی اور پُر آسیب۔

ہم سب برآمدے میں آگئے۔ رابعہ کا یہاں نہ آنا ہی بہتر تھا۔ میں نے اسے منظر کے اور وقار یوسف کے ساتھ ان کے آفس بھیج دیا تھا اور وہیں اپنا انتظار کرنے کو کہا تھا۔ میرے ساتھ صرف

… خانے میں نہیں ہے۔ اس کے کپڑے موجود ہیں۔"

"کیا؟ کپڑے چھوڑ گیا مُردہ اور بھاگ گیا۔ تم نے پاگل بنا رکھا ہے؟"

"عقل خود حیران ہے سر۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ مُردہ جی اٹھا ہو یا کپڑے بدل کے بھاگ گیا ہو۔"

"بکواس مت کرو۔ مجھ سے بے وقوفی کی بات مت کرو۔ مُردے نہ بھاگ سکتے ہیں اور نہ کپڑے بدل سکتے ہیں" جاوید صدیقی نے دھاڑ کے کہا "کسی نے لاش غائب کی ہے۔ ان سب کو گرفتار کرلو جو وہاں ڈیوٹی پر تھے۔ میں ان سب کو جان سے ماردوں گا۔"

"میں نے سب کو گرفتار کرلیا ہے سر۔ ایک سب انسپکٹر ایک کانسٹیبل اور وارڈ کا کانسٹیبل وہاں ڈیوٹی پر تھے۔"

"آفتاب! آر یو شیور کہ تم نے اسے ایک گھنٹا پہلے دیکھا تھا؟" جاوید صدیقی کی آواز میں شکست بولنے لگی۔

"یس سر۔ آئی ایم کوائٹ شیور۔ میں خود وقفے وقفے سے ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ خود سب انسپکٹر خدا' رسول اور قرآن کی قسم کھا کے کہتا ہے کہ ایک گھنٹے پہلے لاش تھانے میں تھی۔ پھر ہم لوٹ آئے تھے۔"

"اوکے... تم جہاں ہو وہیں رہو۔ اس بات کو سیکرٹ رکھو۔ تمہیں چاہیے تھا کہ مجھے وائرلیس کوڈ میں پیغام … میرے سوا کوئی نہ سنتا۔"

"اور کون سن رہا ہے سر؟"

"ایڈیٹ۔ میرے سامنے پوری فوج ہے وکیل اور صحافی برادری کی۔ اب بتاؤ میں اسے کیسے سیکرٹ رکھ سکتا ہوں۔ تم نے مجھے تباہ کردیا۔"

"سوری سر!"

"شٹ اپ۔ میں آتا ہوں یہاں سے فارغ ہوتے ہی" جاوید صدیقی نے ریسیور ہک سے لگا کے ہم سب کی طرف دیکھا۔

میں نے محسن سے کہا "شیروانی صاحب' یہ کیا ہوگیا؟"

"یہ قرب قیامت کے آثار ہیں کیروانی۔ مُردہ کپڑے بدل کے بھاگ گیا۔ شاید اپنی گرل فرینڈ مُردی سے ملنے۔ اچھا ڈراما ہے جاوید صدیقی کا۔"

"مُردی بھی میک اپ کرکے کہیں سے بھاگی ہوگی۔"

جاوید صدیقی نے کہا "جنٹلمین۔ اندازہ تو آپ لوگوں نے کرلیا ہوگا کہ حادثہ ناقابل یقین ہے۔"

"جنٹلمین' زندہ تو نکلا چوہدری دلاور تھا۔ وہ غائب ہوگیا" ایک صحافی نے کہا [illegible]

دوسرا بولا "اور آپ نے جو اسٹوری کورٹ میں سنائی تھی اس کی صداقت مشکوک ہوگئی۔"

"[illegible]" جاوید صدیقی نے سختی سے کہا "جو کچھ میں نے بتایا تھا حقیقت پر مبنی تھا۔"

تھا اور ایک وکیل جو بحیثیت مدعی ہمارے ساتھ تھا۔ اس کو سب ہاشمی صاحب کہتے تھے۔ اور وہ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کا کوئی عہدے دار بھی تھا۔ چار صحافی کورٹ سے اپنی جیپ میں لد کر آئے تھے جس میں خود جاوید صدیقی آیا تھا اور جسے انسپکٹر ساجد چلا کے لایا تھا۔ انہی میں سے دو کے پاس کیمرے تھے۔

تمام گاڑیاں پارکنگ ایریا میں کھڑی تھیں۔ ان میں جاوید صدیقی کی سرکاری جیپ بھی تھی جس کے اوپر لائٹ گھومتی تھی اور ایک سائرن بھی نصب تھا۔ سائرن وہی کام کرتا تھا جو گئے وقتوں میں شاہی سواری کے آگے دوڑنے والا کرتا تھا کہ ہٹو بچو۔ باادب باملاحظہ ہوشیار۔ ایک وی آئی پی کی گاڑی آرہی ہے۔ حشرات الارض کی طرح رینگنے والو' راستہ دو ورنہ مارے جاؤ گے۔ ایمبولینس کو سائرن کی واقعی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ کسی کی زندگی بچانے کے لیے چند سیکنڈ بھی راستہ بنانے میں ضائع نہیں کیے جاسکتے۔ پولیس بھی کسی مجرم کے تعاقب میں ہو تو راستہ مانگنے کے لیے سائرن بجانا کسی حد تک جائز سمجھا جاسکتا ہے مگر یہاں تو بزعم خود ہر وی آئی پی سائرن کا بے دریغ استعمال کرنا اپنی شان سمجھتا ہے۔ جاوید صدیقی کو میں نے کبھی ایسا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ انسپکٹر ساجد کے ساتھ جیپ میں بیٹھا تھا اور خود اس کی جیپ میں صرف ایک ڈرائیور تھا یا اس کے ساتھ رہنے والا گارڈ۔

… کے آنے میں نہ جانے کیوں دیر ہو رہی تھی۔ اچانک جاوید صدیقی کا ڈرائیور دوڑتا ہوا آیا اور سلیوٹ مار کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا بات ہے؟"

"سر جی۔ اہم پیغام ہے۔ اے ایس پی صاحب وائرلیس پر ہیں" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

جاوید صدیقی نے سر ہلایا "میں ابھی آتا ہوں" اس نے کہا اور چل پڑا۔ اس سے اجازت لیے بغیر صحافی حضرات بھی تجسس سے مجبور ہوکے پیچھے روانہ ہوگئے۔ پھر میں اور محسن کیوں پیچھے رہتے۔ میں بھی جاننا چاہتا تھا کہ ایسی کیا خاص بات ہوگئی آدھے گھنٹے میں کہ اے ایس پی کو وائرلیس پر رابطہ کرنا ضروری ہوگیا۔

جب میں نے سُنا تو جاوید صدیقی چلا رہا تھا "کیا بک رہے ہو تم' آر یو میڈ؟"

"نہیں سر۔ میں پاگل نہیں ہوا ہوں" وائرلیس کے اسپیکر سے آواز آئی "یہ حقیقت ہے۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے آفتاب۔ فار گاڈز سیک..."

"مجھے خود معلوم نہیں سر۔ ابھی زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے پہلے وہ تھانے میں موجود تھا۔ میں نے خود دیکھا تھا۔"

"پھر کیا وہ جن بھوت بن کے غائب ہوگیا؟ کبھی ہوا ہے آفتاب' اور مُردے فرار نہیں ہوسکتے" جاوید صدیقی سخت برہم تھا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔ لیکن میں وہی بتا رہا ہوں جو یہاں ہوا ہے" اسپیکر سے آفتاب کی آواز سنائی دی "ڈیڈ باڈی

www.paksociety.com

"لیکن سر، ثبوت اور شہادت کے بغیر کوئی اسٹوری نہیں بنتی۔ حقیقت کیسے تسلیم کرے گا کوئی؟"

"اور اب قانونی پوزیشن کیا ہوگی آپ کے بیان کی؟"

جاوید صدیقی پھر گرم ہوگیا "لیکن بہرحال لاش غائب نہیں ہوئی۔ چوری کی گئی ہوگی۔"

"پولیس گارڈز کی موجودگی میں چوری!" ایک صحافی نے مسکرا کے کہا۔

"جی۔ آپ اسے ڈکیتی کہہ سکتے ہیں۔ پولیس گارڈ اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کی مرضی کے بغیر کوئی ایسی حرکت ناممکن تھی۔ انہیں رشوت دی گئی یا ان پر ناجائز دباؤ ڈالا گیا۔"

"کیسا ناجائز دباؤ؟"

"یہ ایک مفروضہ ہے۔ کیا پتا کسی نے ان کے بیوی بچوں کو پکڑ لیا ہو کہ پہلے مُردے کو چھوڑو ورنہ تم گھر لوٹو گے تو مُردے ہی ملیں گے۔ یہ مشکل ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔ دباؤ ڈالنے کے ہزار طریقے ہیں مگر میں رشوت کے امکان کو زیادہ قابلِ غور سمجھتا ہوں۔ اگر خریدنے والوں نے پولیس گارڈ کو خرید لیا تھا۔"

"آپ کے خیال میں خریدار کون ہو سکتے ہیں؟"

جاوید صدیقی نے پلٹ کے جواب دیا "کیا یہ بات آپ نہیں سمجھے؟ آخر خدا نے آپ کو بھی عقل دی ہے۔ ہر بات میری زبان سے کیوں کہلوانا چاہتے ہیں۔ جعلی ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنوانے اور بنانے والے کون تھے؟ غلط پوسٹ مارٹم رپورٹ کس نے حاصل کی ہوگی؟ کس کا مفاد وابستہ تھا اس سے اور اب فردِ جرم کس پر عائد ہوتی تھی۔ خیر اس کی بھی تفتیش ہوگی۔"

"صرف تفتیش سر!" ایک صحافی نے طنز سے کہا۔

"نہیں۔ تفتیش میں خود کروں گا۔ نتائج آپ کے سامنے آجائیں گے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر۔" جاوید صدیقی نے کہا "لیکن میری آپ سے ایک گزارش ہے۔ پلیز ہیلپ می۔ آپ لوگوں نے عدالت کی توہین والی تباہ ہو جاؤں گا۔ میرا کیریئر نہیں میری گڈول داؤ پر لگادی گئی ہے۔"

ایک صحافی نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ چوبیس گھنٹے تک ہم کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔"

باقی سب نے تائید میں سر ہلایا۔ اس وقت میں کچھ اور سوچ رہا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ محسن کے ذہن میں بھی وہی بات تھی۔ ہمارے اندیشے فوراً ہی درست ثابت ہوگئے۔

ہم واپس مُردہ خانے کے برآمدے میں پہنچے تو اچانک ایک صحافی نے کہا "جاوید صدیقی صاحب! یہ کیا ہے آخر؟"

"کیا ہے؟"

"آپ اتنی دیر سے ہم سب کو بے وقوف بنا رہے تھے۔ آپ نے تو ہمارے سامنے اے ایس پی آفتاب کو تھانہ انارکلی بھیجا تھا۔ ملزم دلاور حسین کو حوالات سے شفٹ کرنے کے لیے۔"

اب دوسرے لوگ بھی چونکے "واقعی۔"

ایک رپورٹر نے کہا "کیا تھانہ انارکلی کی حوالات کا سائز مُردہ بند تھا؟"

جاوید صدیقی طنز سے مسکرایا "بہت دیر میں خیال آیا آپ سب کو؟"

"یہ کیا گڑبڑ ہے؟"

"ابھی سب معلوم ہو جائے گا۔ گڑبڑ کوئی نہیں" جاوید صدیقی نے کہا۔

محسن نے مجھ سے کہا "میں تو سمجھ گیا تھا۔"

میں نے کہا "آپ سے پہلے میں نے اندازہ کرلیا تھا۔ یہ صدیقی نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے لاش کو وہاں رکھوایا تھا اور دلاور کو یہاں۔ لیکن جناب شیروانی صاحب، گڑبڑ اب بھی کہیں۔ میری چھٹی حس کہتی ہے۔"

"نہیں۔ میرے ساتویں حس سو فیصد متفق ہے۔ گڑبڑ کہاں آخر؟"

"اس کا بھی پتا چل جائے گا۔" میں نے کہا۔

جاوید صدیقی نے سب کو مطمئن کرنے کے لیے کہا "دراصل یہ میرے پلان کا ایک حصہ تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کچھ لوگ لاش غائب کرنے کی کوشش کریں گے تو کچھ چودھری دلاور کو چھڑانے کی۔ لاش کی تلاش میں وہ کہاں جا سکتے تھے؟ یہاں لاشیں کیا محفوظ رکھی جاتی ہیں؟ وہ شہر کے مُردہ خانوں کو دیکھتے اور اگر وہ لاش یہاں ہوتی تو چوری ہو جاتی یا بدل دی جاتی۔ میں نے لاش تھانہ انارکلی کے انچارج کے سپرد کردیا۔"

"مگر وہ اس کے باوجود غائب ہوگئی!" ایک صحافی بولا۔

"ثابت یہ ہوا کہ ہونی کو انہونی کرنا کسی کے بس میں نہیں" دوسرے نے کہا۔

جاوید صدیقی نے خفت سے کہا "نہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ وہ نہیں ہوتا جو آدمی چاہتا ہے۔ بیکیر رُلی پلان فیل ہو جاتے ہیں تو تجربہ کار جنرل جنگ ہار جاتے ہیں۔ چودھری دلاور کو بچانے کے لیے میں نے یہاں پہنچا دیا تھا۔ کسی زندہ آدمی کی توقع میں یہاں کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ چودھری دلاور یہاں محفوظ رہا۔"

ایک رپورٹر نے کہا "آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے آپ کا سیکیورٹی پلان یہاں فیل نہیں ہوا۔"

"ورنہ مُردہ فرار ہو سکتا ہے تو زندہ بھی ہو جاتا۔"

تیسرے نے سوال کیا "جاوید صدیقی صاحب، کیا رات کو نے یہاں سے لاش لے جانے کی کوشش کی تھی؟ کوئی یہاں آیا لاش کی تلاش میں؟"

"آئی ڈونٹ نو۔" جاوید صدیقی بولا۔ "کیا یہ غلطی نہیں کہلائے گی۔ اگر آپ اپنے آدمی خفیہ طور پر یہاں مُردہ خانے میں پوسٹ کردیتے تو وہ ان کو گرفتار کرسکتے تھے جو یہاں آئے۔"

"میرا خیال ہے کہ" وہ بولا "میں بتانے کا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا سچ تھا۔ کہاں ہے وہ لاش جس کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ اس نے عدالت میں پیش کی تھی؟ لاش غائب ہوگئی تو کیا اس کی مجرمانہ غفلت کی ذمہ داری سب سے پہلے براہِ راست اس پر عائد نہیں ہوتی؟ کیا پتا نکلتا ہے کہ لاش لے جانے والے کون تھے؟

جاوید صدیقی خود بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ سخت مشکل میں پڑ گیا ہے۔ اس نے افسرانِ بالا سے اپنے جیلر دوست خورشید عالم تک سب کو لوٹ کرکے اپنی فرض شناسی اور ایمانداری ثابت کی تھی اور جب وہ بحال ہوا تھا تو یہ اس کے حق پر ہونے کا ثبوت تھا۔ ذلت کے عارضی دور کے بعد بہت جلد اسے اپنی کھوئی ہوئی عزت واپس مل گئی تھی مگر کتنا مختصر ثابت ہو رہا تھا۔ کامیابی کی خوشی کا یہ وقت آگے زیادہ سخت آزمائش تھی اور شاید پہلے سے زیادہ رسوائی کا اندیشہ تھا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ اس کا سارا اعتماد متزلزل ہوگیا تھا۔

جب پولیس کی ایک جیپ آگے روانہ ہوئی تو اس میں مسلح محافظ کسی بھی مداخلت سے نمٹنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ایس ایس پی کی جیپ پر لائٹ گھومنے لگی تھی اور اس کا سائرن گونج رہا تھا۔ جاوید صدیقی اب کوئی رسک لیتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ ورنہ وہ چودھری دلاور کو انسپکٹر ساجد کی نگرانی میں ہیڈ آفس روانہ کرتا اور خود تھانہ انارکلی جاتا جہاں اے ایس پی آفتاب بے چینی سے اس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

تو سے راستے میں صحافیوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں اُتار دیا جائے۔ وہ ٹیکسی لے کر چلے جائیں گے۔

"کہاں جائیں گے آپ لوگ؟" جاوید صدیقی نے کہا۔

"تھانہ انارکلی۔" ایک رپورٹر نے کہا۔

"میں بھی وہیں جاؤں گا۔ ہیڈ آفس میں چودھری دلاور کو چھوڑ کر۔"

"ٹھیک ہے۔ ہمیں ذرا جلدی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ سب اب اے ایس پی آفتاب پر یلغار کرنا چاہتے ہیں اور یہ بات جاوید صدیقی بھی نہیں جانتا وہ اس سے پہلے پہنچنے کے موڈ میں ہیں۔ مجبوراً جاوید صدیقی نے انہیں ڈراپ کردیا۔

"کیا وکیل صاحب ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟" ان میں سے ایک نے محسن سے سوال کیا۔

محسن نے میری طرف دیکھا "میرا خیال ہے ان کے ساتھ ہمارا رہنا ٹھیک رہے گا۔ اے ایس پی کی اسی تفتیش کریں گے یہ لوگ۔"

میں نے کہا "مگر میرا خیال ہے کہ پولیس ہیڈ آفس میں زیادہ سنسنی خیز ڈراما ہوگا۔"

"مجھے امید نہیں کہ جاوید صدیقی ہمیں چودھری دلاور سے

لاوارث لاش لینے آتے۔ رشوت دے کر مُردہ خانے میں چودھری دلاور جیسے طاقتور کسی آدمی کی لاش کو تلاش کرتے۔" ایک رپورٹر نے کہا۔

"جب آپ کو شک تھا کہ ایسا ہونا ممکن ہے تو پھر یہ خیال کیوں نہیں آیا آپ کو؟"

"اور ایسے ہی کیا کسی نے تھانہ انارکلی یا دوسرے تھانوں کی حوالات میں چودھری دلاور کو تلاش کیا؟"

"ابھی مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔ ہر تھانے کی رپورٹ نہیں ہے میرے پاس" جاوید صدیقی نے جھلا کے کہا "میرے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ چودھری دلاور اور ایک لاش کو رات بھر محفوظ رکھنے کا۔ اس کے لیے میں نے جو مناسب سمجھا کیا تھا۔"

"مگر تھانہ انارکلی مناسب جگہ نہیں تھی۔" ایک رپورٹر بولا۔

"آپ نے کہا تھا کہ وہاں کا انچارج بھروسے کے قابل ہے۔ آپ کا اندازہ غلط ہوگیا۔"

جاوید صدیقی اب مشتعل ہونے لگا تھا "انچارج کے بارے میں میری رائے نہیں بدلی۔ یہ بدمعاشی نچلی سطح پر ہوئی ہے۔ آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔ میں اس وقت ہر بات کا صحیح جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں معلوم کروں گا کہ تھانے میں ایک لاش کی موجودگی کا راز کس نے فاش کیا اور اس لاش کا سودا کرنے والے کو کیا ملا؟ اس نے بہت گھاٹے کا سودا کیا تھا۔ یہ اسے معلوم ہو جائے گا۔"

چودھری دلاور کو ایس ایس پی نے اپنی گاڑی میں بٹھانے کا حکم دیا۔ اس وقت تک فوٹوگرافر اس کی تصویریں لے چکے تھے لیکن ابھی تک کسی کو بھی چودھری دلاور سے سوال جواب کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ جب اسے ہتھکڑی لگا کے پولیس نے گاڑی میں بٹھایا تو فوٹوگرافرز کے ساتھ رپورٹرز بھی آگے بڑھے۔

جاوید صدیقی نے انہیں روک دیا "میں نے بتا دیا تھا کہ چودھری دلاور ایک قاتل ہے۔ عدالت نے صرف اس کے وکیل کو اور گھر والوں کو اس سے ملاقات کی اجازت دی ہے۔"

صحافی خاصے مایوس تھے اور نقلی چودھری دلاور کی لاش کے غائب ہو جانے سے اچانک جاوید صدیقی کی ساری نیک نامی مشکوک ہوگئی تھی۔ اس نے غیر ضروری ذہانت کا مظاہرہ کر کے حماقت کی تھی۔ اس کے سب اندازے اور اقدامات غلط ہوگئے تھے۔ چوبیس گھنٹے خاموش رہنے کا وعدہ کرنے والے صحافی جانتے تھے کہ اب لاش واپس نہیں مل سکتی اور خواہ اس لاش کو غائب کرنے والوں کی مدد کے جرم میں پولیس کے ایک سب انسپکٹر، ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل برطرف کردیے جائیں، گرفتار ہو جائیں یا جیل چلے جائیں۔ جو داغ جاوید صدیقی کے کردار پر لگ گیا تھا وہ ختم ہونے والا نہیں تھا۔ نہ جانے اسے افسرانِ بالا کے سامنے اور عدالت کے روبرو اپنے دفاع میں کتنے دلائل دینے پڑیں گے مگر

www.paksociety.com

بات بھی کر لیتے ہوئے۔" محسن بولا۔

"ہم کوشش ضرور کریں گے کہ اپنے چوہدری دلاور صاحب سے تنہائی میں کچھ باتیں ہو جائیں۔"

محسن نے اخبار والوں سے معذرت کر لی۔ پولیس کا قافلہ پھر چل پڑا۔ سہ پہر ڈھل چکی تھی لیکن ابھی تک نہ کسی کو کھانے کا ہوش تھا اور نہ پینے کا۔ سارا راستہ میں آگے پیچھے دیکھتا رہا۔ ہر گاڑی میں جھانکتا رہا کہ شاید کسی میں چوہدری دلاور کی بیوی کا چہرہ نظر آ جائے یا نبیل کا۔ کیا پتا وہ کورٹ سے ہی ہمارے پیچھے لگ گئے ہوں۔

سائرن کی وجہ سے راستہ صاف مل رہا تھا اور گاڑیاں بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ دس منٹ بعد ہم پولیس ہیڈ آفس پہنچے تو ایک دم ہلچل مچ گئی۔ ہر طرف سے جاوید صدیقی کو سلیوٹ ملا اور جوان اٹین شن ہو گئے۔ اس کی جیپ عین اپنے آفس کے سامنے جا رکی۔

جاوید صدیقی نے نیچے اتر کے چوہدری دلاور کی منتقلی کے احکامات صادر کیے اور پھر ہماری طرف متوجہ ہوا "کیا بات ہے، تم لوگ... میرا مطلب ہے یہ فرنٹ وکیل کیا چاہتا ہے؟"

میں نے محسن سے کہا "اس سے کہو کہ ہم ایک اہم مسئلے پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں۔"

"کون سے ساتھی؟"

میں نے کہا "رابعہ اور منظر کو فوراً یہاں پہنچنے کی تاکید کرے۔ ہم ایس ایس پی کے آفس سے فون کر سکتے ہیں۔"

محسن نے یہ بات ایس ایس پی کو سمجھا دی۔ اس نے صاف انکار کر دیا "سوری۔ میں نے شام کو بات کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ میں سخت مصروف ہوں۔"

"اس کو چاہیے کہ انکار کر کے اپنے لیے مزید پریشانی کے اسباب پیدا نہ کرے" میں نے کہا۔

"یہ سمجھے گا کہ ہم دھمکی دے رہے ہیں۔"

"ہم سے بات کرنے میں اسی کا فائدہ ہے" میں نے کہا "اس کو یہ سمجھ لینا چاہیے ورنہ مارا جائے گا۔"

محسن نے اسے پھر قائل کرنا چاہا مگر وہ بہت جلدی میں تھا اور کچھ نروس بھی "مجھے تھانہ انارکلی جانا ہے۔ تم اسے سمجھاتے کیوں نہیں۔ میں یہاں بیٹھ کے اس سے باتیں کرنے میں وقت ضائع کیسے کر سکتا ہوں۔"

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ہم اس کے پیچھے پیچھے تھانہ انارکلی جائیں۔ میں نے محسن کو چلنے کا اشارہ کیا اور ہم ایس ایس پی سے پہلے ہی نکل آئے۔

محسن نے کہا "یار آخر ایسی کیا بات تھی؟"

میں نے کہا "اب تو سب کے سامنے ہی بات ہوگی۔ وقت کم ہے۔ ہمیں راستے میں رابعہ اور منظر کو بھی آفس سے اٹھانا ہوگا۔ زندہ ہے۔"

"یہ اغوا کا کیس ہوگا؟" محسن بولا "کیا ہم یہ کار خیر کس بنیاد پر کریں گے؟"

"کیا ہم توپ بھی استعمال کریں گے۔ اگر ضرورت ہوئی" میں نے کہا۔

رابعہ اور منظر مصروف تھے۔ یہ وقت ان کے لیے معمول کے مطابق اپنے موکلوں کے مقدمات پر مشورے کا تھا۔ عام قسم دیوانی اور فوجداری مقدمات سے ان کے ماتحت وکلا نمٹتے تھے۔ رابعہ اور منظر کے پاس ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے کیس جاتے تھے یا پھر وہ پیچیدہ قسم کے قانونی مسائل میں ماتحت وکلا کو ہدایات دیتے تھے اور ان کی راہنمائی کرتے تھے۔ تجربے کے ساتھ رابعہ یا منظر کی عدم موجودگی میں وقار یوسف یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیتا تھا اور یہ ثابت بھی کر چکا تھا کہ وہ پوری فرم کے سب مسائل کو سنبھالنے کا اہل ہے اور تمام صلاحیت رکھتا ہے۔

اس روز بھی چند موکل مختلف نوعیت کے قانونی مشورے حاصل کرنے کے لیے موجود تھے۔ ہر وکیل کے لیے ایک الگ کمرہ تھا تاکہ وہ رازداری اور سکون کے ساتھ کیس کو سمجھ اور سمجھا سکیں۔ دائیں بائیں ایک سے تین تین کیبن تھے۔ ان میں سے ایک میں اسسٹنٹ بیٹھے تھے۔ ہال میں وقار یوسف صاحب اپنی ماتحت سامنے کے رخ پر تین نسبتاً بڑے کمرے تھے۔ درمیان والا آفس تھا۔ دائیں جانب منظر کا اور بائیں طرف کے کونے کو کے لیے ریٹائرنگ روم بنا دیا گیا تھا جہاں آرام کرنے کے لیے بیڈ اور صوفہ سیٹ تھے۔ باتھ روم تھا اور چھوٹا سا کچن جس میں چائے کافی بنائی جاتی تھی۔ درمیانی حصے کو انتظار گاہ کا درجہ حاصل تھا اور یہاں ایک قالین پر تین طرف صوفے لگے ہوئے تھے اور درمیان میں گلاس ٹاپ ٹیبل پر وقت گزاری کے لیے رسالے اخبار پڑے رہتے تھے۔

محسن نے منظر کے آفس کا اور میں نے رابعہ کے کمرے کا رخ کیا۔ اندر وہ کسی سے اس کے کیس پر بحث کر رہی تھی۔ اس نے مجھے نظر اٹھا کے دیکھا اور میں واپس باہر آ کے اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً دس منٹ بعد موکل رخصت ہوا تو میں نے اندر قدم رکھا۔

"تم بیل کی طرح منہ اٹھائے اندر آ جانے پر بھی شرمندگی نہیں" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "کوئی بات نہیں، بیل کے لیے شرمندگی، جذبات نام کی چیز ہوتی بھی نہیں۔"

"منظور کرو تو میری بات میں تمہارے لیے بھی تعریف کا پہلو تھا کہ مسز بیل کو گائے کہا جاتا ہے۔ تم اور میاں کی طرح بھولی بھالی بلکہ احمق بھی ہو۔ گائے ہر روز دودھ دیتی ہے مجھے گالی دے سکتی ہو۔"

رابعہ ہنسی "اگر گائے بھی نہیں بنا سکتے تم تو پھر بیل بھی نہیں۔ نچلے درجے کی مخلوق ہو گھوڑے جیسی اگر یہ بتاؤ کہ۔"

"میں کچھ بتانے نہیں۔ تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں" میں نے چلا کے کہا۔

رابعہ گھبرا گئی "آہستہ بولو باہر لوگ بیٹھے ہیں۔"

میں نے مصنوعی نعرہ مارا "میں کسی کے باپ سے نہیں ڈرتا۔ تم میری ہونے والی بیوی ہو... اور میں تم کو اپنے ساتھ کہیں بھی لے جا سکتا ہوں۔"

ہونے والی بیوی کے الفاظ میں نے مزا لے کے کہے تھے۔

"کچھ پتا تو چلے کہ کہاں جا رہے ہو تم؟"

"جہنم میں۔ میرا مطلب ہے تھانہ انارکلی۔ وہاں سے ایک مجرم فرار ہو گیا ہے اپنے کپڑے چھوڑ کے۔ چنانچہ حسب حال ایک نعرہ ہے کہ تن بچاؤ کے مجرم بولا ہم تو چلے سسرال۔ ہمت ہے تو روک کے دکھائے کوئی مائی کا لال۔"

"تم مجبور ہو میرے.... کام کا وقت ہے۔ میں فضول باتوں پر نہیں ہنس سکتی۔"

اتنی دیر میں محسن نے سنجیدگی سے منظر کو ساری بات بتا دی تھی۔ اس نے دروازے سے جھانک کے کہا "اب چلو باہر۔ دیر تو کس لیے ہو رہی ہے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "میں رابعہ کو قائل کر رہا تھا کہ ہم سب کو لوٹ کر وہیں جانا ہے۔"

رابعہ سمجھ گئی کہ اصل بات کچھ اور ہے۔ باہر آ کے اس نے وقار یوسف سے اشاروں کی زبان میں کہا کہ مجھے جانا ہے اور وہ معاملات کو سنبھال لے۔ وقار یوسف نے سرہلا کے معاملہ فہمی کا ثبوت دیا۔ غلام حسین خود ساتھ ہو لیا۔

"یہ کیا اشارے بازی ہو رہی تھی سب کے سامنے" میں نے باہر آ کے اسے چڑایا۔

رابعہ نے کہا "یہ میرا اور وقار یوسف کا معاملہ ہے۔"

"تمہارا اس سے بھی معاملہ ہے۔ معاملہ یعنی افیئر۔ جب بھی میری غیرت جوش میں آئی میں کچھ کروں گا۔"

"مثلاً کیا کرو گے؟" رابعہ مسکرائی۔

"قتل!" میں نے کہا۔

"میں آج عدالت کی کچی کو کہ تم وقار یوسف کا نکاح کرانے والا ہوں۔" رابعہ ہنسی "وہ خود نمٹ لے گی تم سے۔"

میں نے شوخی بھری "میں سیریس ہوں رابعہ۔ نکاح ہونا ہے وہ بھی فلاں ابن فلاں گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول۔" منظر اور محسن تیار ہیں۔ ہم تھانہ انارکلی پہنچنے سے پہلے ہی یہ کام نمٹا سکتے ہیں۔ ہمارا غلام حسین بھی ساتھ ہے۔"

"مولوی ہیں تو لیکن عاقل و بالغ بھی ہیں یا نہیں...؟" رابعہ نے سوچ کے کہا۔

منظر نے خفگی سے کہا "دیکھو سالے کس طرح خراماں خراماں چلے آ رہے ہیں راز و نیاز کرتے ہوئے۔ اب کوئی وقت ہوتا ہے رومانس کا۔"

میں نے پیچھے بیٹھ کے کہا "یہ بات تو سمجھا رہا ہے مجھے تو نے کبھی ہوتی یہ بات تو آج سولہ بچے نہ ہوتے تیرے۔"

منظر نے گاڑی چلا دی "اب تو ساڑھے سولہ ہیں۔ ایک مثال قائم کرنی تھی تم سب کے لیے کہ کامیاب ازدواجی زندگی کیا ہوتی ہے۔ ہمارے نقش قدم پر چلو گے پتا تو چلے گا کہ کتنے فائدے ہیں کثرت اولاد کے۔ سارا کنبہ ریٹے ہی دورے کا اس لشکر سے۔ ایک سال میں بیس بار بچوں کی سالگرہ کر کے تحفے خائف لوگے مگر تمہیں کوئی نہیں بلائے گا اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی میں بھی کہ بارات کا کھانا کم نہ پڑ جائے۔ پھر ایک جلوس ہے اپنے گھر کا۔ جب چاہو کسی کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کرا لو، محاصرہ کر لو۔"

محسن نے ہنس کے کہا "گویا بیس کا ٹارگٹ ہے۔"

"ٹارگٹ کی مت پوچھو۔ باہمی تعاون کا یہی جذبہ عشق سلامت ہے تو ہم بیس کے درجن کا حساب چلے گا بلکہ کریں گے۔ سو سال کی عمر میں ننھے درجن اللہ دے کیا مشکل ہے۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ اب پرانے ماڈل کی گاڑی جیسی ساتھ نباہنے والی بیوی ہے۔ تمہاری اور غلام حسین جیسی نہیں کہ اب تک تم دو سے زیادہ نہیں ہوئے سالے۔ اور وہاں سنا ہے اس بھونی والے نے شادی کر لی ہے پرنسس مارگریٹ سے بھی۔"

"وہ اب مرحوم ہے" میں نے کہا۔

"بڑی چیز ہے یہ مولوی بھی۔ نیچ کر بچی کو پھانسا ہے کل کسی ہندو، سکھ، یہودی یا بدمذہب کی پکڑے گا اور انہیں بھی داخل حرم کرے گا اعرابی۔"

غلام حسین بگڑ گیا "افسوسناک حد تک گھٹیا سوچ ہے آپ کی منظر صاحب۔ یہ کار ثواب تھا جی۔"

"اسے کہتے ہیں ہم خرما و ہم ثواب" منظر کا بھاڑ کے ہنسا "اب مولوی ہم نے تو پہلے ہی تاڑ لیا تھا کہ تیری نیت میں فتور ہے۔ میں تو سب سے کہتا ہوں کہ اپنی اپنی بیویوں کو بچا کے رکھو اس کی نظر سے۔"

"لاحول ولا۔ سب خلق خدا ہیں میرے لیے تو۔"

"اب کسی اور کو الو بنانا۔ میں نے تو پہلے ہی خبردار کر دیا ہے اپنی بیوی کو کہ مولوی غلام حسین کے جال سے بچنا۔ اب میں بھی دیکھ لینا اسے تو پاؤں بھاری ہو جائے گا تمہارا اور اگلے بچے کا نام غلام حسین ہی ہوگا۔ پیدا ہوگا۔ بالکل ہی نورانی چہرہ۔"

www.paksociety.com

خادم حسین کا چہرہ غصے اور شرم سے لال ہو گیا "اف۔ منظر صاحب یہ بے حرمتی نہیں بے غیرتی ہے جی۔ آپ اپنی منکوحہ کے بارے میں کیا خرافات بک رہے ہیں سب کے سامنے۔"

"مشتہر کر رہا ہوں سب کو۔ بھولی کے۔ کسی دن پتا چلے گا اچانک کہ گئی رابعہ اور گئی۔ منتوں کے نام نہاد شوہر بیٹھے ہیں چھڑے چھانٹ۔ لاوارث گدھے کی طرح۔ اور سب کے چہیتے مولوی خادم حسین ہیرو شپلوں کے مجازی خدا..."

"آپ گاڑی روکیں جی۔ منظر صاحب مجھے سخت غصہ آ رہا ہے۔ میں پیچھے کر بیٹھوں گا۔" خادم حسین نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"چھوڑو اسے رابعہ۔ چھلانگ مارنے دو سالے کو۔ دس دن بعد فاتحہ کر لیں گے کہ مرحوم کس کی۔"

رابعہ کا اور میرا ہنس ہنس کے برا حال ہو گیا تھا۔ مولوی خادم حسین ہم سے بھی خفا تھا کہ اس بے ہودہ گفتگو پر ہنس رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ بات زیادہ بڑھتی منظر نے گاڑی کو تھانہ انارکلی کے باہر روک دیا۔

میں نے کہا "خادم حسین۔ تم بھی بے وقوف ہو۔ مذاق کو نہیں سمجھتے۔"

"لاحول ولا قوۃ جی۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے مذاق پر بھی۔" وہ اسی طرح خفا رہا۔

جاوید صدیقی کی جیپ اندر موجود تھی۔ اس نے یہاں پہنچنے میں دیر نہیں کی تھی۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ اے ایس پی آفتاب کو اخبار والوں اور وکیلوں نے گھیر لیا تو نو عمری اور ناتجربہ کاری کے باعث وہ گھبرا جائے گا اور بات بگڑتی تو بنے گی نہیں۔ تاہم اے ایس پی اس کی توقع سے زیادہ سمجھدار ثابت ہوا۔ اس نے چپ سادھ لی اور ہر سوال کے جواب میں کہا کہ میں کچھ نہیں کہوں گا۔ جو پوچھنا ہے ایس ایس پی صاحب سے پوچھیں۔

وہ ایس ایچ او انارکلی کا کمرا تھا لیکن وسعت اور آرائش کی شان و شوکت سے کسی وزیر کا کمرا لگتا تھا۔ جاوید صدیقی اس کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جس پر ایس ایچ او بدلتے رہتے تھے مگر اس کرسی کا اقتدار و اختیار باقی رہتا تھا۔ اے ایس پی آفتاب اور انسپکٹر ساجد کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ کسی سے نظر نہیں ملا رہے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ وہ سب ملزم بنے کھڑے تھے جن پر ایک مُردے کے فرار کی ذمے داری عائد ہوتی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں تھیں مگر وہ زیر حراست تھے۔ باقی صحافی اور وکیل صحن کے گرد کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ماحول سخت کشیدہ تھا۔

آخری شخص ہمارے بعد وہاں پہنچا۔ وہ نوجوان اور دبلا شخص تھا۔ اس نے کوئی بات کیے بغیر وہ کپڑے میز پر رکھ دیے جو اس کے ہاتھ میں تھے۔ وہاں موجود ہر شخص نے کپڑوں کو ایسے دیکھا جیسے وہ کسی مقتول کے لہو سے آلودہ ہوں۔

جاوید صدیقی نے کہا "یہ کیا ہیں وہ کپڑے جو اس شخص نے پہن رکھے تھے۔"

"جسے آپ نے مُردہ فرض کر لیا تھا؟" ایک صحافی بولا۔

"مُردہ ہی نہیں۔ ملزم چودھری دلاور حسین بھی فرض کر لیا تھا؟" دوسرے نے پُرتمسخر لہجے میں کہا۔

"اور یہ ہیں وہ ایس ایچ او صاحب، جن کو آپ نے بے حد قابلِ اعتماد فرض کر لیا تھا" تیسرے نے گرہ لگائی۔

جاوید صدیقی نے خاموشی سے سب کچھ سنا "ٹھیک ہے۔ میں نے بہت کچھ فرض کر لیا تھا۔ میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہوں لیکن یہ غلطی نتیجہ تھی میری خود اعتمادی کا۔ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کہہ سکتے ہیں آپ لیکن ایسا ہوتا ہے ہر جگہ اور ہر شعبے میں ہوتا ہے۔ آج کوئی بھی احمق مجھے احمق کہہ سکتا ہے۔ جس کے ریکارڈ پر کوئی معمولی سی قابلِ ذکر کامیابی نہیں۔ جس نے تمام سروس میں صرف حاضری لگائی ہے۔ رہوی مین کے سرگشت کی ہے۔ افسران کو سلیوٹ مارے ہیں اور ملزموں سے سودے کیے ہیں۔ وہ بھی مجھ پر یہ الزام عائد کر سکتا ہے کہ کیا میری عقل ماری گئی تھی کہ میں نے جیتے جاگتے زندہ آدمی کو مُردہ مان لیا۔ لیکن میرا سروس ریکارڈ بہت شاندار رہا ہے۔ یہ میں نہیں کہتا، وہ سب جانتے ہیں اور مانتے ہیں جنہوں نے میرے ساتھ کام کیا تھا۔ اس کا تازہ ترین ثبوت ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس میں میری کارکردگی ہے۔ میں نے قاتل کا سراغ لگایا تھا۔ یہ آسان کام بہرحال نہیں تھا اور پہلے بھی میں نے ایسے بہت سے کارنامے سرانجام دیے تھے۔ میں ناتجربہ کار یا بے وقوف نہیں ہوں لیکن وہ حالات ہی ایسے تھے کہ میں نے حقیقت کو ایسے تسلیم کر لیا۔ تصدیق کی ضرورت محسوس کیے بغیر۔ جیسے آپ کسی سے وقت پوچھیں اور وہ گھڑی دیکھ کر کہے کہ سات بجے ہیں تو آپ اس کی کلائی پکڑ کے خود گھڑی نہیں دیکھتے۔ مان لیتے ہیں کہ سات ہی بجے ہوں گے۔ مجھے میرے مخبروں نے یہ اطلاع دی تھی کہ چودھری دلاور کو فرار کرانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ اس کا اندیشہ پہلے سے موجود تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ ملزم چودھری دلاور کو کوٹ لکھپت جیل اسپتال میں ہونے کی خبر بھی باہر پہنچ گئی تھی۔ یہ چودھری دلاور کے مخبروں کی کامیابی تھی یا ہمارے اپنے لوگوں کی ضمیر فروشی۔ یہ میں نہیں جانتا۔ چودھری دلاور کے ہاتھ بھی بہت لمبے تھے۔ اس کے پاس ہر شعبے کے کارکن تھے جو مختلف وقتوں میں اس سے مالی فوائد حاصل کر چکے تھے اور اپنی دولت سے وہ لوگوں کا ایمان اور ان کی وفاداری خرید سکنے پر پورا یقین رکھتا تھا۔ وہ بھی کہتا تھا کہ ہر آدمی برائے فروخت ہوتا ہے لیکن ہر شخص کی مزاحمت کرنے کی قوت کم زیادہ ہوتی ہے۔ اسی حساب سے اس کی قیمت کا تعین ہوتا ہے۔ کم مزاحمت کرنے والے کم قیمت پر بک جاتے ہیں اور جو بہت زیادہ مزاحمت کرتے ہیں وہ بھی بالآخر بک جاتے ہیں۔ ایک حد ایسی آ جاتی ہے جب وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

زیادہ تر کام آئے گا یا ان کے اصول۔ پھر بیوی بچوں کا مستقبل اور دنیا کی مادی خوشیوں کا خیال ان کے اصولوں کی دیوار گرا دیتا ہے اور وہ آمدن کا خزانہ قبول کر کے ضمیر کی شکست قبول کر لیتے ہیں۔"

"کبھی آپ کے ساتھ بھی تو ایسا ہی نہیں ہوا تھا؟" ایک رپورٹر نے سپاٹ لہجے میں پوچھ لیا۔

جاوید صدیقی کا چہرہ صدمے کی شدت اور احساسِ ذلت سے ایک بار تو تمتما اٹھا مگر وہ مشتعل نہیں ہوا۔ اب اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ سنگ زنی کرنے والے ہاتھ بہت زیادہ ہوں گے۔ دشنام طرازی کرنے والی زبانیں بہت ہوں گی۔ توصیف و تحسین کے پھول پیش کرنے والے ہاتھ ہمیشہ بہت کم ہوتے ہیں۔ دوسروں کی خوبی کا اعتراف کرنے میں آدمی ہمیشہ تنگ دلی اور کنجوسی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

"آپ مجھے براہِ راست بھی گالی دے سکتے ہیں" جاوید صدیقی نے کہا "لیکن میں نے خود کو بھی کسی اور کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اپنا منصف ہمیشہ میں خود رہا۔ لہٰذا میں مطمئن ہوں کہ میرا دامن صاف ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مجھے ایک ناکردہ گناہ کی سزا مل جائے۔ نظامِ انصاف دنیا میں کہیں بھی سو فیصد فول پروف نہیں ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے لیکن ہوتا ہے۔ کہ بے گناہ پکڑے جاتے ہیں اور مجرم بھی ثابت ہو جاتے ہیں۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں۔ میں نے ایک غلطی کی۔ ایک جبری غلطی، جس سے کوئی انسان مبرا نہیں۔ جب میں نے دن میں لاش دیکھی تو اس کی نبض دیکھنے اور دل کی دھڑکن کو محسوس کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لاش کو لے جانے والی وین جیل کے اندر سے آئی تھی۔ اس میں دو محافظ موجود تھے۔ انہوں نے بھی بتایا کہ اس لاش کو لے کر وہ کہاں جا رہے تھے۔ میں نے ان کے قبضے سے ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی برآمد کر لیا اور مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی مل گئی۔ اس پر ڈاکٹروں کے دستخط بھی تھے اور مُہر بھی تھی۔ میں کیوں شک کرتا اور کیسے شک کرتا کہ جو شخص لاش بنا پڑا ہے وہ زندہ ہے۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھ کے سر ہلایا اور اس نے مسکرا کے کندھے اچکاتے ہوئے خاموشی کی زبان میں جواب دیا۔ "یس۔ یہی میرا بھی خیال تھا۔"

رابعہ نے کہا "کیا اب آپ نے یہ تصدیق کر لی ہے کہ وہ ڈاکٹر کون تھے، ڈیتھ سرٹیفکیٹ پر اور پوسٹ مارٹم رپورٹ پر دستخط کرنے والے؟"

"کیا مس رابعہ۔ وہ دستخط کسی کے بھی نہیں تھے۔ دستخط پڑھے نہیں جا سکتے تھے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ اکثر لوگوں کے دستخط سے ان کا نام پتا نہیں چلتا۔ دستخط کے نیچے مُہر بھی تھی۔ مُہر جعلی بھی بنائی جا سکتی ہے اور چرائی بھی جا سکتی ہے مگر اس کی ضرورت

نہیں تھی۔ کسی نے آفس سے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کا ایک سادہ فارم چوری کیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کا فارم حاصل کیا اور اس کی خانہ پُری کر کے مُہر لگا دی۔ اوپر والے دستخط کون پہچان سکتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اس معاملے میں تفتیش کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آ سکتا۔ کسی پر شک نہیں کیا جا سکتا اور سب پر شک کیا جا سکتا ہے۔ کوئی ڈاکٹر نہیں مانتا کہ یہ اس کے دستخط ہیں اور وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن میں نے تو دستاویزی شہادت اور گواہوں کے بیان پر یقین کرتے ہوئے مان لیا تھا کہ وہ واقعی ایک لاش ہے۔"

"مگر وہ لاش نہیں تھی" رابعہ بولی۔

"کوئی کیریکٹر ایکٹر تھا جو لاش بن کے دم سادھے پڑا تھا" منظر نے کہا "کیا پتا سانس بھی لے رہا ہو۔"

"ہاں۔ شام کے وقت اور وین کے اندر اندھیرے میں کوئی خفیف سی حرکت نظر نہیں آ سکتی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب کہ غور سے کوئی نہ دیکھے۔ اب دونوں سپاہی جو لاش کے ساتھ تھے وہ بھی کہتے ہیں کہ ہمیں کیا معلوم وہ بندہ تھا کہ لاش تھی۔ ہم سے کہا گیا کہ لاش کے ساتھ جاؤ۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گیٹ پر ڈرائیور رکا۔ اسے گیٹ پاس پکڑا دیا گیا تھا کہ ایک ڈیڈ باڈی باہر جائے گی۔"

"کیا گیٹ پاس بھی بوگس تھا؟"

"ہاں۔ گیٹ پاس پر جیلر کے دستخط ہوتے ہیں۔ گیٹ پر محافظ چیک کرتے ہیں مگر پاس پر ڈیڈ باڈی بھی ہو تو زیادہ غور نہیں کرتے۔ دن جیلر کی تھی۔ ماتحتی محافظ جیل کے تھے۔ انہوں نے پاس رکھ لیا اور انٹری کر کے گاڑی کو گزر جانے دیا۔"

"آپ نے یہ بھی مان لیا کہ وہ لاش ملزم چودھری دلاور کی نہیں ہے؟" میں نے محسن کی معرفت سوال کیا۔

"نہ ماننے کی وجہ کوئی نہیں تھی۔"

"چونکہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ پر ملزم چودھری دلاور حسین لکھا ہوا تھا۔ اس لیے وہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں ملزم کو پہچانتا بھی ہوں۔"

"اس کے باوجود آپ دھوکا کھا گئے۔ وہ لاش تو کسی اور کی تھی؟"

"یہ غلط ہے۔ مجھے کوئی دھوکا نہیں ہوا تھا۔ لاش کو میک اپ کر کے چودھری دلاور بنا دیا گیا تھا۔" جاوید صدیقی نے کہا۔

"اس کی صورت چودھری دلاور سے ملتی جلتی تھی۔ باقی کام میک اپ کا تھا۔ پھر آپ نے کیسے پہچانا۔ کیسے معلوم ہوا آپ کو کہ دراصل چودھری دلاور نہیں ہے۔"

رابعہ نے میری تائید کی "ہاں۔ کیا فرق دیکھ کے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔"

اب منظر بولا "آپ تسلیم کر چکے ہیں کہ آپ نے لاش کو غور

www.paksociety.com

سے نہیں دیکھا تھا۔ آپ کو تو زندہ یا مُردہ کے فرق کا پتا نہیں چلا تھا پھر شناخت میں فرق کا علم آپ کو کیسے ہوا؟"

جاوید صدیقی نے کہا "میں مانتا ہوں کہ میں نے اس پر سرسری نگاہ ڈالی تھی۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ وہ چوہدری دلاور نہیں ہے۔"

"چنانچہ آپ نے تسلیم کرلیا کہ وہ چوہدری دلاور نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔"

"مگر وہ چوہدری دلاور تھا" میں نے کہا۔

ایک لمحے کے لیے جاوید صدیقی میرے سوال سے کنفیوز ہوگیا۔ باقی سب نے بھی میرے سوال کو ویسے ہی سمجھا جو درحقیقت سوال تھا ہی نہیں۔ یہ ایک بیان تھا۔ ایک انکشاف، حقیقت کی طرح۔

"آپ نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا ہے کہ وہ چوہدری دلاور ہی تھا۔"

"چوہدری دلاور ہماری تحویل میں ہے زندہ سلامت۔ آپ سب دیکھ چکے ہیں۔"

"وہ چوہدری دلاور نہیں ہے" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

جاوید صدیقی نے محسن سے کہا "کیا یہ نشے میں ہے؟"

محسن نے متانت سے کہا "سر یہ آندرے پینے پلانے کے معاملے میں مسلمانوں سے کم نہیں ہے۔ یہ شراب کو چھوتے تک نہیں۔"

"پھر اس احمقانہ سوال کا مطلب اور مقصد کیا ہے؟"

"آپ اس سوال کو کس طرح احمقانہ قرار دے سکتے ہیں؟ جب تک یہ ثابت نہ ہوجائے" محسن نے اردو میں بھی کہا۔

"مجھے یقین ہے۔"

"آپ کا یقین ایک بے معنی چیز ہے۔ اس یقین کی بنیاد پر آپ بہت دھوکے کھا چکے ہیں۔ بہت نقصان اٹھا چکے ہیں۔ آپ نے زندہ کو مُردہ مان لیا تھا۔ آپ کی نگاہ اور آپ کے حواس ناقابلِ اعتبار ہیں۔ جو غلط ہے اسے سب کے سامنے غلط ثابت کرکے دکھائیں ایس ایس پی صاحب۔ میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ وہ چوہدری دلاور ہی تھا" میں نے کہا۔

پہلے سب مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں واقعی پاگل ہوں یا میں نے اتنی پی لی ہے کہ میری عقل ماری گئی ہے مگر میرے مدلل جواب نے اچانک سب کو اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کردیا۔

جاوید صدیقی نے جھنجلا کے کہا "وات نان سنس۔ جو شخص دھوکے باز تھا اور فرار ہوگیا۔ اسے میں کیسے آپ سب کے سامنے پیش کرکے ثابت کرسکتا ہوں کہ وہ چوہدری دلاور نہیں تھا۔"

میں نے کہا "اس کا دوسرا آسان طریقہ بھی ہے۔ اگر بھینس گم جائے اور ثابت کرنا ہو کہ وہ دودھ دینے والا چار ٹانگوں اور سینگوں اور ایک دُم والا جانور بھینس ہی تھا تو آپ گائے کو ... کرسکتے ہیں کہ وہ گائے نہیں تھی۔ گائے تو الگ ہوتی ہے" میں نے کہا۔

لوگ مسکرانے لگے۔ محسن سمجھ گیا کہ میں نے کس بھینس کا ذکر کیا تھا۔ رابعہ اور منظر نے بھی میرے سوال کا مقصد سمجھ لیا اور اب مجھے رابعہ کی نظر میں قابلِ فخر ستائش کے جذبات نظر آرہے تھے۔ اس کے چہرے پر وہ خوشی تھی جس میں اعلانیہ اعتراف تھا کہ دیکھا۔ اتنی ذہانت کی بات صرف سکندر ہی کرسکتا تھا۔ میرا سکندر۔

"وکیل صاحب سے کہو کہ وضاحت ... بتائیں کہ وہ ملزم چوہدری دلاور حسین ہی تھے" جاوید صدیقی ...

"آپ چوہدری دلاور حسین کو بیٹھا لیجیے" میں نے کہا "یہاں سب کے سامنے ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ چوہدری دلاور نہیں ہے تو از خود یہ ثابت ہوجائے گا کہ چوہدری دلاور حسین وہ ہیں جو فرار ہوگیا۔"

"آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ اگر یہ غلط ہوا؟"

"میں جوا نہیں کھیل رہا ہوں ایس ایس پی صاحب۔ یہ غلط ہوا تو میں اس کیس سے الگ ہوجاؤں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔ جانے سے پہلے میں آپ کو تحریر دے کر جاؤں گا کہ میں پہلے درجے کا بے وقوف تھا اور میں نے آپ پر ایک ایسا احمقانہ الزام عائد کیا تھا جس کی سزا میں اصولاً مجھے پاگل خانے جانا چاہیے تھا۔"

ایک دم وہاں خاموشی چھا گئی۔ میں نے ایک ناقابلِ یقین چیلنج دیا تھا اور اتنا ہی ناقابلِ یقین چیلنج قبول کرلیا تھا۔ انگریزی محاورے کے مطابق گیند اب جاوید صدیقی کے کورٹ میں تھی اور وہ کھیلنے پر مجبور تھا۔ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ بے ایمانی ہے، میں نہیں کھیلتا۔

میں نے اس ڈرامائی لمحے سے فائدہ اٹھایا "لیکن سر یہ ثابت ہوا۔ پھر؟ آپ کیا کریں گے۔"

جاوید صدیقی زبردستی مسکرایا "میں مستعفی ہوجاؤں گا۔"

"آپ تو پہلے بھی استعفیٰ دے چکے تھے" کسی اور نے کہا۔

"یہ ڈراما تو چلتا رہتا ہے۔ ڈی آئی جی صاحب اسے پھر نامنظور کرادیں گے" دوسرا بے باک رپورٹر بولا۔

"شٹ اپ" جاوید صدیقی بھڑک اٹھا "یہ ڈراما نہیں تھا۔ پہلے میں نے احتجاجاً استعفیٰ دیا تھا۔ تو اب اپنی نالائقی، نااہلی، ایک مجرمانہ غفلت کا اعتراف کرتے ہوئے استعفیٰ دوں گا۔ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردوں گا۔ اس وقت جذبات کا دھارا میرے خلاف ہے۔ آپ سب لوگ ہر بے بنیاد بات پر یقین کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ سب کا رویہ جارحانہ ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ میں چوہدری دلاور کو آپ کے سامنے پیش کررہا ہوں۔ آپ

خود اس سے سوال کرلیں۔ جو پوچھنا چاہیں پوچھ لیں۔ اس کی شناخت کے بارے میں اور کچھ نہیں۔"

جاوید صدیقی نے بیک وقت دو احکامات جاری کیے۔ وہ سخت جلال میں تھا۔ اس نے فون اٹھا کے کہا کہ چوہدری دلاور کو ایک گھنٹے بعد پولیس کے نمائندوں اور وکیلوں کے سامنے شناخت کے لیے پیش کیا جائے گا۔ دوسرا حکم اس نے تھانہ انچارج کو دیا کہ وہ لاش کے غائب ہوجانے کے واقعے کی تفصیل خود بتائے۔

اس نے کہا "کل رات میں گشت پر تھا جب مجھے ایس ایس پی صاحب کا پیغام ملا اور میں دس منٹ بعد تھانے پہنچ گیا۔ یہاں باہر تھانے کے احاطے میں پولیس کی ایک وین کھڑی ہوئی تھی۔ اس میں ایک لاش تھی، یہ کپڑے اسی لاش کے ہیں۔ ایس ایس پی صاحب نے کہا کہ وہ لاش کو ایک رات کے لیے تھانے میں چھوڑنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ جناب لاش کو مُردہ خانے میں رکھوا دیں تو انہوں نے کہا کہ مجھے یہ سب مت بتاؤ۔ میں بھی جانتا ہوں مُردہ خانہ کہاں ہے۔ تم سے جو کہا جارہا ہے وہ کرو۔ میں نے عرض کی کہ جناب مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے مگر لاش خراب نہ ہوجائے۔ انہوں نے کہا کہ لاش زیادہ پرانی نہیں اور صبح تک خراب نہیں ہوگی۔ میں اسے الگ کمرے میں رکھوا دوں بہتر ہے وہاں ٹھنڈک رہے۔ پھر جناب میں نے لاش اسی کمرے میں رکھوا دی۔ اس میں ایک اے سی لگا ہوا ہے۔ لاش ادھر تھی بینچ، اے سی کے سامنے والی بینچ پر۔"

سب نے بینچ کی طرف دیکھا۔ کمرے کی مشرقی دیوار والی کھڑکی کے نیچے اے سی نصب تھا۔ لکڑی کی بینچ اس کے بالکل سامنے تھی۔ کھڑکی پر بھاری پردے تھے جو اس وقت ہٹا دیے گئے تھے۔

"میں نے تاکید کردی تھی کہ کسی کو بھی کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ دروازے کی چابی میں نے اے ایس پی صاحب کے حوالے کردی تھی۔ وہ رات کو ایک بجے چکر لگا گئے تھے۔ صبح پھر آئے۔ انسپکٹر ساجد صاحب نے بھی دو بار چیک کیا۔"

"تالے کی ڈپلی کیٹ چابی۔۔۔؟"

"کوئی نہیں۔ پہلے تھی میرے پاس مگر کھو گئی تھی۔"

"یعنی اس بات کا امکان نہیں کہ کوئی اور اندر گیا ہو۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جی۔ اصل میں ہوا یہ ہے کہ وہ بعد از لاش بن کے پڑا رہا۔ جب کسی نے اسے اٹھایا تو اس نے سانس روک لیا اور جسم کو اکڑا کے لاش کی طرح کرلیا۔"

"لیکن لاش کا جسم ٹھنڈا ہوتا ہے" ایک رپورٹر نے کہا۔

"فوراً تو ٹھنڈا نہیں ہوتا جی۔ اور اس نے چھپنے ہوئے تھے کیونکہ کسی کا ہاتھ جسم سے لگا بھی نہیں ہوگا۔ وہ ادھر چپ کرکے لیٹا رہا اور مکر کرتا رہا۔ اس نے ڈبل کپڑے پہن رکھے ہوں گے۔ اوپر والے کپڑے اس نے ادھر ہی اتار دیے۔ اندر والے کپڑوں میں وہ اس کھڑکی سے نکل گیا۔ باہر نکل کے اس نے کھڑکی پھر بند کردی۔"

"اس کھڑکی کے پیچھے کیا ہے؟۔۔ سڑک۔۔؟"

"نہیں جی۔ دوسرا کمرا ہے۔ وہ بھی باہر سے بند تھا لیکن وہ کھڑکی کھول کے اس میں سے بھی گزر گیا۔ اس کمرے میں کچھ نہیں ہے۔ پہلے برآمدہ تھا۔ ادھر انچارج صاحب کے کمرے میں لگا ہوا اے سی گرم ہوا نکالتا تھا مگر بعد میں ایک بندے نے پیچھے دیوار بنا کے دروازہ لگا لیا اور ایک کھڑکی۔"

"کون تھا وہ بندہ؟"

"پہلے والے انچارج صاحب کا آدمی تھا۔ رات کو ادھر سوجاتا تھا۔ دن میں گھر پر کام کرتا تھا۔ کھڑکی دروازے دن میں کھلے رہتے ہیں۔ رات کو بند کردیے جاتے ہیں۔ وہ کھڑکی سے باہر گیا اور فرار ہوگیا۔"

منظر نے کہا "کیسے فرار ہوگیا؟ احاطے سے گزرا ہوگا۔ کیا کسی کو نظر نہیں آیا؟"

انچارج نے سر کھجایا "نظر تو ضرور آیا ہوگا جی لیکن۔۔۔ یہ خیال کس کو آسکتا تھا کہ یہ وہی مُردہ ہے جو اب فرار ہورہا ہے۔ اس کی شکل پر بھی غور نہیں کیا کسی نے اور کرتا تو اس کے کپڑے اندر سے پتا نہیں کیسے تھے۔"

"یہ واقعہ کس وقت پیش آیا ہوگا۔۔۔ اندازاً۔"

"آج صبح گیارہ سے بارہ کے درمیان ایسا ہوا۔ گیارہ بجے خود اپنے انسپکٹر ساجد نے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے دس بجے اے ایس پی صاحب بھی راؤنڈ لگا گئے تھے۔"

"انہوں نے تو دو بجے فون کرکے بتایا تھا" میں نے کہا۔

"ادھر بارہ بجے کے بعد سب انسپکٹر نے دیکھ لیا تھا کہ بینچ خالی ہے۔ اس پر صرف کپڑے پڑے تھے۔ پھر اس نے دیکھا تو کھڑکی اندر سے کھلی ہوئی تھی۔ پٹ ایسے ہی بند تھے۔ اس نے انچارج کو اطلاع کی اور میں نے فوراً آکے ایکشن لیا۔"

"کیا ایکشن لیا؟ مُردہ بھاگ گیا تھا۔ زندہ محافظوں کو پکڑ لیا۔"

منظر نے کہا "یا آپ خود مُردے کی تلاش میں نکل گئے تھے؟"

رابعہ نے کہا "کل رات سے آج دوپہر تک وہ سیدھا لیٹا رہا، ہلے جلے بغیر۔ اس نے کچھ کھایا پیا نہیں؟"

انچارج نے جاوید صدیقی کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا مگر جاوید صدیقی نے خود ہی بات شروع کردی۔ "اس کیس میں پولیس کے ساتھ بڑا دھوکا ہوا۔ مجرم حد سے زیادہ چالاک تھا۔"

"مجرم ہمیشہ پولیس کے مقابلے میں زیادہ ذہین ثابت ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں" منظر بولا۔

"وہ مکر کیے پڑا رہا اور اس نے سب کو یقین دلا دیا کہ وہ مُردہ ہے۔ یہ اداکاری زیادہ مشکل نہیں تھی مگر اس نے خطرناک جوا کھیلا تھا۔ اگر اس کا راز فاش ہوجاتا۔۔۔؟"

"تو آپ کو عقلمندی کی ایک اور سند مل جاتی" منظر نے کو

www.paksociety.com

بھری۔

جاوید صدیقی اس طعنے کو پی گیا "ایک تو وہ ڈبل کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ یہ سب سوچا سمجھا منصوبہ تھا اور جس نے بھی بنایا تھا اس کی تعریف نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔"

"تعریف اس خدا کی جس نے تمہیں بنایا" ایک رپورٹر بولا۔

"دہرے کپڑوں میں نیچے والا لباس یقیناً بالکل مختلف ہوگا۔ رنگ اور وضع قطع ہر اعتبار سے۔ وہ سانس کے جسم کو لاش کی طرح سخت کرنا چند منٹ کی بات تھی۔ باقی وقت وہ آرام سے لیٹا رہا اور سانس بھی لیتا رہا۔ اس نے اندر کہیں کھانے کے لیے بسکٹ بھی چھپا رکھے تھے۔ یہ بسکٹ وہ رات کے وقت کھاتا رہا۔ ہمیں بسکٹوں کا چورا ملا ہے کپڑوں کے ساتھ۔"

صحافی ہنسنے لگے "وہ تو شاید چائے کافی بنانے کا سامان بھی لایا ہوگا کہ رات کو ضرورت پڑے گی تو بنا لیں گے۔"

رابعہ بولی "سوال یہ ہے جاوید صاحب کہ اگر اسے مُردہ خانے میں رکھ دیا جاتا۔۔۔ پھر؟"

"وہ وہاں سے بھاگ جاتا۔ وہاں سے فرار ہونا تو بہت آسان کام تھا" جاوید صدیقی بولا "مُردوں کی حفاظت کے لیے کوئی بھی موجود نہیں ہوتا۔"

"اسے باتھ روم جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی؟" منظر بولا۔

انچارج نے کہا "باتھ روم تو تھا مگر وہ اُٹھا نہیں۔ اس نے بینچ پر لیٹے لیٹے ہی فراغت حاصل کی۔ اس کے کپڑے گیلے تھے۔"

محسن نے کہا "آخر وہ رات بھر کیوں لیٹا رہا؟"

"دراصل رات کو ادھر ایک بندہ سوتا ہے۔ باہر والے کمرے میں۔ اور رات کو آنے جانے والے بھی کم ہوتے ہیں۔ کوئی اندھیرے میں اس سے پوچھ لیتا کہ تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو۔ کہاں سے آ رہے ہو۔ تو اس کو مشکل پڑتی۔ وہ صبح تک پڑا رہا۔"

"اطمینان سے لمبی تان کے سوتا رہا" منظر بولا۔

"دن میں آنے جانے والے بہت ہوتے ہیں۔ کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔"

منظر نے کہا "میرا خیال ہے وہ نقلی مونچھیں داڑھی، رنگین چشمہ، ٹوپی۔ سب لایا ہوگا اپنے ساتھ۔ خیر اب دفع کریں اس مُوئے کو جو آپ جیسے سیانے زندہ انسانوں کو اُلّو بنا کے نکل گیا۔ ذرا اپنے چوہدری دلاور حسین کو چل کے دیکھتے ہیں۔"

"اوکے اوکے" جاوید صدیقی نے ہاتھ اٹھا کے کہا "لگتا ہے کہ اب مجھے ہر جائز ناجائز بات کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا۔ اس نوکری کی تو مجھے پروا بھی نہ تھی اور خدا کے سوا میں کسی سے ڈرتا بھی نہیں۔ مگر یہ سوال ہے میری INTEGRITY کا۔ میں کسی کے سامنے جواب دہ ہوں تو وہ میرے افسرانِ بالا ہیں۔ لیکن آپ لوگ ایک رائی کی تلاش میں ہیں جس کو پہاڑ بنا دیں۔"

"رائی کیا جناب! اچھا بھلا بھاری پتھر ہے ہمارا … ابھی لڑھکا سکتے ہیں۔" ایک رپورٹر نے کہا جو حد سے زیادہ … اور بے مروت تھا "آپ کی جگہ وہ ہوتا … تک یہ خبر ارسال کر چکے ہوتے کہ آپ نے بہت زیادہ … بننے کے چکر میں کیا عظیم الشان حماقت کی تھی۔"

"شٹ اپ۔ تم کیا مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو … کچھ کیا تھا نیک نیتی سے کیا تھا" جاوید پھٹ پڑا۔

"بہت مہنگی پڑی ان سب کو آپ کی یہ نیک نیتی" … ترکی بہ ترکی جواب دیا "یہ سب جو یہاں مجرم بنے کھڑے … کی حماقت کا شاہکار ہیں۔"

"یہ مجرمانہ غفلت کے مرتکب ہوئے ہیں۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔ یہ آپ کی بے وقوفی کا نشانہ … بنے ہیں" رپورٹر لڑنے پر آمادہ تھا "کون اُلّو کا پٹھا … سکتا ہے کہ حوالات میں مُردہ ہو اور مُردہ خانے میں … جائے۔"

"زبان سنبھال کے بات کرو" جاوید صدیقی دھاڑا … نے سیکیورٹی کو بھی نظر رکھا تھا۔"

"جب یہ معاملہ عدالت کے سامنے جائے گا تو اسے … نہیں حماقت ہی سمجھا جائے گا۔ تمہاری غلط بیانی عدالت کے … پر ہے۔ تم نے کہا تھا کہ چوہدری دلاور راہِ فرار کی تھانے کی حوالات … ہے۔"

میں نے محسن سے کہا "یہ تو شاید ٹھیک ہی ہوگا۔"

محسن نے آہستہ سے کہا "یار کیوں بلاوجہ یہ شوشا چھوڑ رہا …"

جاوید صدیقی نے کہا "میں خود عدالت کو بتا سکتا ہوں کہ … نے عمداً ایسا کیا تھا۔ اور عدالت مجھے مجرم سمجھے گی تو سزا دے … کون ہوتے ہو مجھے چارج کرنے والے؟"

دوسرے صحافیوں نے اپنے ساتھی کو بڑی مشکل سے روکا … نوجوان زیادہ جوشیلا تھا اور کسی کی سننے پر تیار نہ تھا۔ "میں … اسٹوری لگاؤں گا آج کے اخبار میں۔ میں کسی وعدے کا پابند … ہوں۔"

"ضرور لگاؤ۔ تمی ڈیم کیئر" جاوید صدیقی اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے کہا "کیا ہم چوہدری دلاور سے ملتے۔"

"فارگیٹ دلاور۔۔۔ میں کسی کو بھی پریس کے آپ کے سامنے پیش کرنے کا پابند نہیں۔ ایک مجرم ہے میری تحویل میں … جانوں اور عدالت جانے۔ ٹھیک ہے چوہدری جی" وہ ایک … لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

بنا بنایا کھیل بگڑ گیا تھا۔ کچھ اس رپورٹر کے رویے کی وجہ … اور کچھ جاوید صدیقی کے غصے کی وجہ سے۔ صحافی اس … تفصیلات جاننا چاہتے تھے اور اپنے ساتھی پر برہم ہو رہے … اس نے برداشت سے کام لیا ہوتا تو صرف … سکتی تھی۔

… ان کے پاس چھاپنے کے لیے اس سے کہیں زیادہ دھماکا خیز … اس وقت ہے۔

… اے ایس پی آفتاب نے ان سب صحافیوں کو معذرت کے … تھانہ انچارج سے اور دیگر مجرمانہ غفلت کے … سے مزید سوالات کرنا چاہتے تھے۔

… محسن کا ہاتھ دبا کے کہا "ہمیں موقع سے فائدہ اٹھانا … یہاں سے بہتر ہے ہم پولیس ہیڈ آفس چلیں۔"

"… جاوید صدیقی ہمیں بند کرا دے گا وہیں۔"

میں نے کہا "اس کی تو ایسی تیسی۔ ہم صرف چوہدری دلاور … سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"ہمیں ملنا چاہتے ہیں آخر۔ آپ اس کے وکیل ہیں یا … راشن؟" محسن بولا "عدالت نے انہی کو اجازت دی تھی۔"

رابعہ نے کہا "لیکن یہ تو پتا چلے کہ وہ واقعی چوہدری دلاور … ہے۔"

منظر نے سوچ کے کہا "ہاں یار۔ اس بھوتنی والے نے بات … مجھے بھی تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ گائے تھی یا بھینس؟"

مولوی خادم حسین اب تک خاموش تھا اور منظر کی طرف تو … بھی نہیں بولا تھا۔ جب ہم باہر آئے تو اس نے رابعہ سے کہا "میں اس بدتمیز شخص کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔"

اس کی بدقسمتی کہ منظر نے سن لیا "ابے میں کب تیرے جیسے لنگور کو ساتھ بٹھانا چاہتا ہوں۔ وہ تو پتا نہیں کیسے بَلا ٹل رہی تھی ایک … دیکھ کے بچے کو جس کے منہ … نہیں چھپا کدھر ہے۔"

خادم حسین خون کے گھونٹ پی کے بھی خاموش رہا۔

محسن بولا "ایسا مت کہو یار۔ اب دیکھو … میرا مطلب ہے مرحوم نے ابھی تو اسے پسند کر لیا آخر۔"

"حوروں کو شوہر نہیں کاٹھ کے اُلّو زیادہ پسند آتے ہیں۔ شوہر کی ضرورت تھی انہیں۔ ایک جوکر بھی مل گیا اور نوکر بھی۔"

مولوی خادم حسین بڑبڑاتا ہوا رابعہ کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ "… یہ شخص اس لیے بچ جاتا ہے کہ میرے پاس ریوالور … کسی دن آپ کے دفتر میں ہی خون ہو جائے گا اس کا۔"

رابعہ نے گاڑی اسٹارٹ کی "ریوالور خرید لو گے اس کے لیے؟"

"نہیں باجی۔ مجھے تو ایسی چیزوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر … مانگ لیتا آپ سے یا سکندر صاحب سے۔"

"پھر کیا کرو گے؟" میں نے کہا "اس کو تم نے قتل نہ کیا تو یہ … مار ڈالے گا۔ اپنی باتوں سے ہلاک کر دے گا۔"

"… میرے پاس ہے ایک طریقہ۔ اس کی زبان بند … کے لیے۔ مسلمان کا قتل ویسے بھی ناجائز ہے اور … خیال آتا ہے۔ ورنہ میں تو بہت پہلے یہ کام کر دیتا۔ وظیفہ ہے میرے پاس زباں بندی کا۔"

"اچھا؟ اس سے آدمی کی زبان بند ہو جاتی ہے ہمیشہ کے لیے؟ گونگا ہو جاتا ہے" رابعہ نے کہا "کہاں سے ملا یہ وظیفہ؟"

"بس جی۔ ایک درویش کا تحفہ ہے۔ میں بہت عاجز تھا اپنی پہلی منکوحہ کی زہریلی قینچی جیسی زبان سے۔ ایک ہزار تو کچھ نہیں ہوتے جی سکون کی خاطر۔"

"درویش نے ایک ہزار ٹھگ لیے تھے تم سے بے وقوف!"

"ایسا مت کہیں جی۔ درویش نے کچھ نہیں لیا تھا" وہ بولا "اس نے ایک پیسہ نہیں مانگا تھا۔ مجھ سے کہا تھا کہ جس دن شہر میں کوئی گونگا مر جائے ہمیں فوراً بتاؤ اور اس کی قبر کی مٹی لا دو۔ آدھی رات کو جب پورا چاند نکلے گا تو ٹھیک بارہ بجے اس کے سرہانے کی طرف سے ایک تعویذ ملے گا۔ اس پر پانچ تولہ سونے کا خول چڑھاؤ اور اس میں ایک چٹکی اس مٹی کی ڈال دو جو ہم تمہیں پڑھ کر دیں گے۔"

"پھر تم نے یہ سب کیا؟"

"ہاں جی۔ کمال دیکھیں درویش کا۔ نو دن بعد چودھویں رات کا چاند نکلا تو میں نے سرہانے کی طرف سے کھودا۔"

"کس کی قبر تھی؟ کون تھا وہ گونگا؟"

"اپنے محلے کا ہی آدمی تھا جی۔ کہتے ہیں پہلے منظر صاحب کی طرح بدزبان تھا۔ پھر کسی کی بددعا ایسے لگی کہ زبان بند ہو گئی۔ میں قبر کی مٹی دے آیا تھا۔ پھر سونے کے خول والا تعویذ بھی دے دیا اور اگلے دن انہوں نے تعویذ واپس کر دیا۔ ایک چٹکی مٹی کے ساتھ۔"

میں نے کہا "اور وہ تم واپس وہیں گاڑ آئے تھے؟"

"نہیں جی۔ وہ میرے پاس ہے۔ اس کے استعمال کا طریقہ ہے لیکن میں نے ابھی تک آزمایا نہیں تھا۔ بس میرا دل نہیں مانا تھا۔"

میں نے کہا "اور اب دل مان رہا ہے؟ منظر کی زبان بند کر دو گے؟"

"ہاں جی۔ گندی زبان کا بند ہو جانا ہی بہتر ہے۔"

رابعہ نے کہا "اچھا پہلے مجھے دکھانا وہ تعویذ۔ مجھے شک ہے کہ اس درویش نے تمہیں ٹھگ لیا ہوگا۔"

میں نے بھی اس کی تائید کی "اگلے دن اسے پیتل کے خول والا تعویذ دے دیا ہوگا۔"

اس سے پہلے کہ مولوی خادم حسین درویش پر عائد کردہ الزام کی تردید کرتا رابعہ نے گاڑی کو پولیس ہیڈکوارٹر کے باہر روک لیا۔ ہم پیدل اندر گئے اور ایس ایس پی جاوید صدیقی کے کمرے کی جانب بڑھے۔ اس کی جیپ برآمدے کے سامنے موجود تھی لیکن دروازے پر کھڑے ہوئے کانسٹیبل نے بتایا کہ ایس پی صاحب اندر کسی سے ملنے گئے ہیں۔

www.paksociety.com

ہم انتظار کر سکتے تھے۔ میں چق ہٹا کے اندر داخل ہوا تو میرا خیال تھا کہ اندر کوئی بھی نہیں ہوگا۔ پہلا سناٹا مجھے لگا۔ پھر میرے بعد آنے والے سب رہاں رلاور کی بیوی، اس کے جوان بیٹے فیصل اور ایک وکیل کو دیکھ کر چونکے جو پہلے سے اندر موجود تھے۔

انہوں نے رابعہ، محسن اور منظر کے سلام کا جواب تک نہیں دیا۔ ان کے نفرت آمیز رویے کا اظہار ان کے ماتھے کی ہر شکن سے ہو رہا تھا۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو وہ ہم پر لعنت بھیج کے چلے جاتے یا سلام کے جواب میں ہمیں گالیاں دیتے لیکن یہاں وہ خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہنے پر مجبور تھے صرف وکیل نے اخلاقاً سر ہلایا۔ کسی مؤکل کی خاطر وکیل آپس میں نہیں لڑتے۔

جاوید صدیقی تھوڑی دیر بعد آ گیا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کا موڈ بگڑ گیا "آپ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"کیا آپ سے ملنے پر پابندی لگ گئی ہے۔ ناراض ہیں آپ صحافیوں سے اور غصہ وکیلوں پر اتار رہے ہیں۔" منظر نے کہا۔

"ہمارا تو آپ سے تعلق ختم نہیں ہو سکتا" رابعہ نے کہا۔

جاوید صدیقی نے ناگواری سے کہا "مس رابعہ۔ آپ سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ اس امپورٹ کیے ہوئے ولایتی وکیل کو سمجھا دیں کہ اب یہاں گوروں کی حکومت نہیں ہے۔ یہ کیا سمجھتا ہے آخر خود کو۔"

محسن نے کہا "وہی جو اس نے کہا تھا۔ ہم یہاں چوہدری دلاور کو دیکھنے آئے ہیں۔"

"سوری۔ اس کی اجازت صرف انہیں ہے" جاوید صدیقی نے دوسری طرف اشارہ کیا "آپ لوگ جا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "ان سے کہو کہ جب چوہدری دلاور تمہارے پاس ہے ہی نہیں تو ان سے تم کس کو ملواؤ گے؟"

محسن نے اس کا ترجمہ کیا تو دلاور کی بیوی، بیٹا اور وکیل چونکے "کہاں گیا چوہدری دلاور؟" دلاور کا وکیل بولا۔

"یہ انہی سے پوچھو لیکن یہ وہ دلاور نہیں ہے جس سے تم ملنے آئے ہو۔"

"پھر کون ہے۔ دلاور کہاں ہے؟"

منظر نے کہا "یہی میں تم سے پوچھتا ہوں۔"

"مسٹر شرلاک اسٹاپ دس نان سنس" جاوید صدیقی نے میز پر مکا مارا "ورنہ میں۔۔۔؟"

"ورنہ آپ کیا کریں گے" منظر بدستور غیر سنجیدہ رہا "مجھے دھکے دے کر نکلوا دیں گے یا دلاور کے سامنے لے جا کے کھڑا کر دیں گے کہ دیکھو یہ کون ہے تمہارا باپ؟"

فیصل نے غصے سے کہا "اور اگر وہ تمہارا باپ ہوا؟"

"تو میں اس سے کہہ دوں گا کہ میں بن باپ کے ہی بھلا۔ جیسے بڑے حرامی رکھے ہیں ہم نے جو وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں۔ کچھ واقعی گدھے کے بچے ہوتے ہیں۔ رہتے ہیں انسانوں کے درمیان" اس نے غور سے فیصل کو اوپر سے نیچے تک دیکھ کے کہا۔

اس نوجوان لڑکے فیصل میں منظر جیسے شخص کی زبان کا شعور کرنے کی صلاحیت کہاں تھی۔ مگر اس کا خون گرم تھا اور وہ جوش اس کے جسم میں ایسے بھرا ہوا تھا جیسے کولڈ ڈرنک کی بوتل میں پانی کے ساتھ گیس بھری رہتی ہے۔ وہ مشتعل ہو کے اٹھا تو ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے بٹھا لیا۔

"فیصل! کیا کہا تھا میں نے۔ کوئی کتا بھونکے تو اس کو کاٹا نہیں جاتا ہے" اس کی ماں نے کہا۔

میں نے اشارے سے منظر کو روک دیا کہ بات بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک کانسٹیبل نے سلیوٹ کر کے کہا "قیدی حاضر ہے سر۔"

جاوید صدیقی اٹھا "آئیے مسز دلاور۔ آپ بھی آئیں ڈاکٹر صاحب۔"

اس نے جاتے جاتے ہم سب کو نظرانداز کیا تھا۔ یہ ظاہر تھا کہ ملاقات کی اجازت صرف انہی کو ہے یعنی بیوی، بیٹے اور قانونی مشیر کو۔ میں شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ اگر میرا شک و شبہ غلط نہیں تھا تو چوہدری دلاور کی بیوی، اس کا بیٹا اور قانونی مشیر سب سازش میں شریک تھے اور اس ملاقات سے زیادہ توقعات وابستہ کرنا عبث تھا۔

جب وہ اندر چلے گئے تو منظر اور محسن نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے اشارے سے ان کو صبر کرنے کے لیے کہا۔ ویٹ اینڈ سی۔ رابعہ بے چینی سے کرسی پر پہلو بدل رہی تھی اور بار بار اس بند دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جس کے پیچھے چوہدری دلاور تھا۔ اس کے بیوی بچے تھے اور ایک وکیل تھا۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ اچانک دلاور کی بیوی چیخ مارے گی۔ فیصل چلانے لگے گا اور اپنے وکیل کے ساتھ وہ غصے میں پاؤں پٹختے باہر آ رہا ہوگا اور جاوید صدیقی سے پوچھے گا کہ کیا ہے یہ سب۔ یہ ہم سے کس قسم کا مذاق کیا گیا ہے۔ یہ تو چوہدری دلاور نہیں ہے جس سے ہمیں ملوایا گیا۔

لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ دروازہ کھلا اور وہ تینوں بڑے مطمئن انداز میں ایک فاتحانہ مسکراہٹ چہروں پہ سجائے نمودار ہوئے۔ جاوید صدیقی ان کے پیچھے تھا۔

"تھینک یو مسٹر صدیقی!" چوہدری دلاور کی بیوی نے کہا "میں قدردان ہوں۔" جاوید صدیقی نے خوش اخلاقی سے کہا "عدالت کا حکم تھا اور میں اس کا پابند تھا۔"

وکیل نے کہا "کل کسی وقت میں پھر آؤں گا۔"

"سوری خلیل صاحب۔ اس کے لیے آپ کو پھر عدالت سے رجوع کرنا ہوگا۔"

"کیا مطلب؟ پھر ملاقات کے لیے مجھے عدالت کے احکامات کی ضرورت ہوگی؟" وکیل نے خفگی سے کہا۔

"ظاہر ہے۔ یہ تو عدالت نے اپنے حکم میں واضح نہیں کیا کہ آپ سب کو ہر روز ملنے دیا جائے۔ آپ نے ملاقات کی درخواست کی تھی۔ وہ منظور ہو گئی۔ آپ نے ملاقات کر لی۔ یہیں تک عدالت کا حکم جاتا۔"

"آپ خود یہ مطلب نکال رہے ہیں۔"

"اگر مجھے مطلب نکالنا ہو تو میں پانچ منٹ ہی اور کہوں کہ عدالت نے اپنے حکم میں کچھ نہیں کہا کہ کتنی دیر کے لیے ملوایا جائے۔ اس کے برعکس آپ یہ مطلب نکال سکتے ہیں کہ ملاقات کا وقت مقرر نہیں ہے اس لیے ہم رات بھر بیٹھے رہیں گے۔ یہ سب مجھ پر چھوڑ دیا گیا ہے اور میں نے سہولت کے علاوہ معقولیت کے ساتھ آپ کو موقع فراہم کر دیا۔"

"عجب ہے۔ ہم پھر درخواست لگا دیں گے۔ یہ بھی طے ہو جائے گا کہ ہم ہفتے میں کتنی بار مل سکتے ہیں اور کتنی دیر کے لیے" وکیل نے کہا "آئیے مسز دلاور۔"

چوہدری دلاور کی بیوی کے ساتھ ہی میں اور محسن باہر نکل آئے کیونکہ منظر پھر جاوید صدیقی سے قانونی بحث میں الجھ گیا تھا کہ اب اس کیس میں شناختی پریڈ ضروری ہو گئی ہے یہ طے کرنے کے لیے کہ اصل چوہدری دلاور وہ تھا جو لاش بن کے پڑا ہوا تھا اور فرار ہو گیا یا یہ ہے جو پولیس کی تحویل میں ہے۔

میں نے محسن کی معرفت کہا "مسز دلاور۔ کیا آپ اس ملاقات سے مطمئن ہیں؟"

اس نے تیکھے لہجے میں کہا "میں اس فضول سوال کا مطلب نہیں سمجھی۔"

میں نے کہا "مطلب یہ آپ کو یقین ہے کہ وہ آپ کا شوہر ہی تھا جس سے آپ کو ملوایا گیا تھا؟"

چوہدری دلاور کی بیوی بگڑ گئی "اس گورے وکیل سے کہو کہ اپنے دماغ کا علاج کرائے۔ اور یہاں کس سے ملنے آئی تھی میں آخر۔ اپنے باپ سے؟"

فیصل نے لال پیلا ہو کے کہا "ممی۔ اس ولایتی ٹٹو کو لے جاؤ یہاں سے۔ ورنہ میں اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔ جان سے مار دوں گا اسے۔"

محسن نے اسے غور سے دیکھا "بیٹا۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ ابھی سے اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنے لگے تو زیادہ دن نہیں جیو گے۔ ایک ہڈی تمہاری گردن میں بھی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ٹوٹ جائے۔"

"تمہارے منہ میں خاک" فیصل کی ماں نے گھبرا کے کہا۔

"ایسا ہوتا ہے مسز دلاور جب پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی جاتی ہے اور گلے میں پھندا ہوتا ہے تو گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ کب تک لوگوں کی ہڈیاں توڑے گا یہ شہہ زور۔ کسے کسے جان سے مارے گا؟"

فیصل کی ماں اسے کھینچ کر لے گئی۔ وکیل نے محسن سے کہا "یار تم بھی ذرا خود اس بچے سے الجھتے ہو۔"

میں نے کہا "اس سے بحث چھوڑو۔ کیا چوہدری دلاور سے ملا تھا؟"

اس نے محسن کی بات پر غصے سے کہا "تمہارا دماغ واقعی خراب ہے۔"

ہم جب لوٹ کر جاوید صدیقی کے کمرے میں گئے تو وہاں صرف رابعہ اور منظر تھے۔ ان کے موڈ سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی جاوید صدیقی سے جھڑپ ہوئی ہوگی۔ خود جاوید صدیقی موجود نہیں تھا۔

اچانک اندر کے کمرے میں کوئی چیخنے لگا۔ بلند آواز میں کچھ کہنے لگا۔ یہ بولی ہمارے لیے اجنبی تھی۔ پھر ایک فائر ہوا۔

سب سے پہلے میں دوڑا۔ میرے پیچھے محسن اور منظر لپکے۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک فاصلہ ہی کتنا تھا۔ درمیانی دروازے کو عبور کرتے ہی میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا اور میرے قدم ایک لمحے کے لیے رکے۔ اس منظر نے میری رگوں میں لہو کو منجمد کر دیا تھا اور میرے جسم کو مفلوج۔

جاوید صدیقی فرش پر گرا ہوا تھا اور اس کے سر سے ابلنے والا خون کا سرخ فوارہ ہر طرف چھینٹے اڑا رہا تھا۔ اس نے خود کو اپنے ہی ریوالور سے گولی ماری تھی۔

گولی مارنے کی وجہ وہ شخص تھا جو ایک کرسی پر دہشت زدہ بیٹھا تھا۔ دلاور کا ہم شکل ضرور تھا مگر دلاور نہیں تھا۔

یہ صدمے کی شدت کا اثر تھا کہ میں اداکاری بھول گیا اور میں نے بے اختیار گھٹنوں کے بل بیٹھ کے گھٹی گھٹی آواز میں کہا "صدیقی۔ یہ تم نے کیا کیا؟"

صدیقی نے مسکرانے کی کوشش کی اور میرا ہاتھ دبایا "شکریہ۔ ٹیک کیئر۔ سنبھال رکھو اپنا۔ رتی۔۔۔ وش یو۔ گڈ لک۔"

یہ آخری الفاظ اس نے رازدارانہ سرگوشی میں بڑی مشکل سے ادا کیے تھے۔ میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کر کے مجھے دھوکا دینے اور ایک مزاحیہ خلوص کے طور پر مجھے میرا مقصد یاد دلا کے وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ شاید کبھی میں نے اپنا دوست سمجھا تھا اور دشمن کہا تھا۔ زندگی کے آخری لمحے میں اس نے ثابت کر دیا تھا کہ انسان کی سطحی نگاہ صرف چہرے دیکھتی ہے انسان کی پہچان نہیں رکھتی۔ کبھی اجنبی جو دوست نظر نہیں آتے دوستی کے لازوال جذبے کی وہ مضبوط بن جاتے ہیں جو نگاہوں کو خیرہ کر دیتے ہیں اور پھر یوں رخصت ہو جاتے ہیں جیسے ویران اور تاریک دل پر شہاب ثاقب پل بھر کے لیے اجالے کی لکیر بنائے اور پھر اندھیرے میں گم ہو جاتے ہیں۔

www.paksociety.com

زندگی کے آخری لمحے میں صدیقی نے مجھے بتا دیا کہ سکندر بخت۔ کچھ لوگ دھوکا نہیں کھاتے مگر دوستوں کا دل رکھنے کے لئے ان کے جھوٹ کو بھی سچ مان لیتے ہیں۔ میری وردی اور میرا عہدہ میری شناخت نہیں تھے مگر میرے اور تمہارے درمیان قانونی مجبوری کی یہ خلیج ہمیشہ حائل رہی۔ اسے پاٹنا نہ تمہارے لئے ممکن تھا اور نہ میرے اختیار کی بات تھی۔ شاید یہاں مجھ سے ایک ایسی غلطی اور کوتاہی سرزد ہو گئی جو ہمیشہ دانستہ بددیانتی اور جرم بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ میں نے جانتے بوجھتے ایک ملزم کو گرفتار نہیں کیا جو بھیس بدل کے میرے سامنے موجود تھا لیکن اس کا کفارہ میں نے ادا کر دیا ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے۔

چند سیکنڈ میں جیتا جاگتا ایس ایس پی جاوید صدیقی اپنے ہی ندامت زدہ لہو میں غرق ایک لاش رہ گیا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا وقت پورا ہو گیا تھا چنانچہ اسے ایسے ہی اچانک مرنا تھا اور کسی کے مرنے یا جینے کے انداز میں کیا مصلحت تھی یہ بھی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ میرے نزدیک نہ وہ مجرم تھا اور نہ گناہ گار۔ خطا کار ہم سب فانی انسان ہیں۔

اس کی مرگِ ناگہاں کا ایک سبب تو یہی تھا کہ وہ بے ضمیر اور بے اصول، سازشی اور لالچی، سفاک اور دوغلا نہیں تھا۔ جیسے کہ اس کے آس پاس والے دوسرے ماتحت اور افسران تھے۔ وہ اس محکمے میں مس فٹ تھا۔ اس کے مقدر کی دوسری خرابی یہ تھی کہ وہ عام لوگوں سے زیادہ حساس اور خوددار تھا۔ وہ بدنامی کی گرد سے بھی ڈرتا تھا اور رسوائی کے غبار کو بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جب کہ لوگ سب و شتم اور تہمت و الزام سب کچھ ہنس کے جھیل جاتے تھے۔ ایسے بھی تھے کہ ان پر ذلت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے تب بھی نہ ان کا سر ندامت سے جھکتا تھا اور نہ آنکھیں۔

جاوید صدیقی کے اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو کا گواہ محسن یا منظر کے سوا کوئی نہیں تھا۔ رابعہ ذرا دیر بعد آئی جب ایک ایس ایس پی ایک ملزم پر احسان کا قرض چھوڑ کے اس دنیا سے بھی جا چکا تھا۔ جہاں اب اس کے لئے بے بسی و ناکسی کے عائد کردہ نااہلی کے الزامات کی شرمندگی تھی۔ احتساب اور جواب طلبی کی ذلت تھی۔ محکمہ جاتی اور قانونی کارروائی کے عذاب ناک مرحلے تھے اور آخرکار برطرفی تھی یا گرفتاری تھی۔ حق پر ہونے کے باوجود ایسی شکست کا تصور بھی اس کے لئے تماشا بنے، عبرت بن جانے والی موت سے کم نہ تھا چنانچہ اس نے فوراً بلا تذبذب آبرومندی کے ساتھ مر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا سب سے اچھا دوست اور سب سے بڑا دشمن خود اس کا ضمیر ہی تھا۔

پولیس ہیڈ آفس میں ایک ایس ایس پی کی خودکشی نے کھلبلی مچا دی تھی۔ ہمارے بعد وہاں اور نہ جانے کتنے لوگ گھس آئے تھے۔ وہ سب ذہنی تھے اور مشتعل تھے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ جاوید صدیقی کو کس نے مارا اور کسی نے نہیں مارا تو پھر اچانک اس نے اپنے آفس میں خودکشی کیوں کر لی۔ اب تو وہ باعزت طور پر بحال ہو چکا تھا۔

ہمارے پاس ہر سوال کا جواب تھا مگر ہم خاموش رہے۔ اس شخص کو دیکھتے رہے جو چوہدری دلاور بنا بیٹھا تھا مگر چوہدری دلاور نہیں تھا۔ غصے کے جذبات سے مشتعل ہو کے کچھ لوگوں نے اس کی دھنائی بھی کر ڈالی تھی لیکن وہ حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا رہا اور چلاتا رہا۔ ہم نے اسے نہ بچایا ہوتا تو شاید اسے بھی مار دیا جاتا۔ جیسے لیاقت باغ کے جلسہ عام میں قائد ملت لیاقت علی خان کو شہید کرنے والے قاتل سید اکبر کو خود پولیس کے ایک افسر نے گولی مار کے ہلاک کر دیا تھا حالانکہ اس کا فرض بنتا تھا کہ وہ اسے عوام کے غیظ و غضب سے بچاتا۔ اس سے تفتیش کے دوران بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا مگر لیاقت علی خان کو شہید کرانے والے نہ چاہتے تھے کہ کسی کو کچھ بھی پتا چلے۔ بے وقوف اور لالچی سید اکبر کا کام پورا ہو گیا تو اس کا کام بھی تمام کر دیا گیا اور [illegible] اس شاندار کارنامے پر اس پولیس افسر کو بعد میں ترقی بھی دی گئی۔

نہ جانے کیوں مجھے اس وقت اتنی پرانی بات یاد آ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ نقلی چوہدری دلاور بھی سید اکبر کی طرح احمق اور لالچی تھا۔ وہ ایک ایسی سازش میں شریک ہو گیا تھا جس کی سنگینی کا اسے بھی کوئی اندازہ نہیں تھا۔ چوہدری دلاور کو پولیس کی حراست سے نکالنے کا منصوبہ انتہائی چالاکی سے بنایا گیا تھا اور اس میں پولیس کے نچلے درجے کے اہلکاروں سے افسر تک سب شریک تھے۔ جیل کے ماتحت عملے کے ساتھ خود جیلر خورشید عالم نے سازش کرنے والوں کا ساتھ دیا تھا اور صاف ظاہر ہے کہ سب نے اپنا اپنا حصہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق وصول کیا تھا۔

نقلی چوہدری دلاور سے تفتیش کی جاتی تو شاید وہ بہت کچھ بتا دیتا۔ افشائے راز کے خطرے سے بچنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہی تھا کہ اس کھیل میں کلیدی کردار ادا کرنے والے کو ہی ختم کر دیا جائے۔ ہم نے اسے وقتی طور پر بچا لیا تھا مگر وہ اب بھی پولیس کی تحویل میں ہی تھا۔

چند منٹ بعد ڈی آئی جی آصف جاہ بڑے وقار کے ساتھ اور انتہائی پُرسکون انداز میں وارد ہوا۔ اس کے چہرے پر معمولی پریشانی یا ظاہری تشویش کے آثار تک نہ تھے۔ وہ دراز قد اور وجیہ شخصیت کا مالک تھا۔

اس نے آتے ہی سب کو باہر نکال دیا۔ سب میں ایس ایس پی ارشد کریم ربانی شامل نہیں تھا جو ضرورت سے زیادہ رنجیدہ اور سنجیدہ نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ یہ ہم چند لوگ جانتے تھے کہ اس کی یہ اداکاری بھی کتنی بھونڈی اور قابل نفرت ہے۔ دل ہی دل میں اس سے زیادہ خوش کون ہو سکتا تھا کہ آج وقت کی اس لڑائی میں اسے پسپا کر دینے والے کو موت نے پسپا کر دیا تھا۔ شاید ربانی کی نظر میں وہ بہت بے وقوف تھا جس نے خواہ مخواہ اصول کی بات پر افسروں سے بھی ٹکر لی۔ اپنا نقصان بھی کیا۔ پریشانی بھی اٹھائی اور پھر ایک معمولی سی بات پر خود اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی۔ ایسے معاملات تو پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ ایس ایس پی کی نوکری پکی ہوتی ہے اس کا کچھ نہیں بگڑتا اگر وہ خود سارے زمانے سے نہ بگاڑے۔

"ربانی۔ سب کو باہر نکال کے پہرے پر مسلح گارڈ لگا دو۔"

"یس سر۔"

"کوئی... اندر آئے گا نہ باہر جائے گا۔"

"یس سر۔"

"باہر جانے والے سب راستے بند کر دو۔ دوسرے سب راستوں کو بھی دیکھو۔"

"یس سر۔" ربانی ہر بار اٹن شن ہو جاتا تھا۔

"ہمارے ایکسچینج کو بلاک کرا دو۔ نہ کوئی کال باہر جائے گی نہ ریسیو ہوگی۔"

"یس سر۔"

منظر نے سنجیدگی سے کہا "کیا ان حفاظتی انتظامات کا مقصد قاتل کو فرار ہونے سے روکنا ہے؟"

"آپ کو سنجیدہ ہو جانا چاہئے منظر صاحب۔" ڈی آئی جی نے ناگواری سے کہا۔

"اس سے زیادہ سنجیدہ میں کبھی نہیں ہوا۔ اور میرے سوال میں آپ کو بھلا کون سی بات مضحکہ خیز لگی ہے؟"

اب رابعہ نے کہا "یہ قتل کا کیس تو ہے نہیں۔"

"ویری گڈ۔ آپ نے تفتیش مکمل کر لی اور نتیجہ بھی اخذ کر لیا۔ مس رابعہ میں آپ کے قانونی طریق کار میں دخل نہیں دیتا۔ آپ پولیس کے طریق کار میں دخل اندازی مت کریں۔ پلیز۔"

منظر بولا "ٹھیک ہے۔ آپ کریں ضابطے کی کارروائی۔ ہم بیٹھے ہیں۔"

"آپ بھی چلیں باہر۔" ارشد کریم ربانی نے توہین آمیز انداز میں انگلی ہلا کے منظر کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

منظر نے متاثر ہوئے بغیر کہا "میرا خیال ہے کہ تم باہر چلو۔ مجھے کچھ خاص بات کرنی ہے ڈی آئی جی سے۔"

محسن نے کہا "ہاں چشم دید گواہ تو ہم ہی ہیں۔"

"یعنی ایس ایس پی صاحب نے آپ کے سامنے خودکشی کی تھی۔" ارشد کریم ربانی بولا "اور آپ دیکھتے رہے۔"

"ایسی باتیں کر کے خود کو ایک نااہل پولیس افسر مت ثابت کرو ربانی صاحب۔ اور سوچ سمجھ کے بولو۔" منظر نے کہا "تمہاری زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کو اور لوگ بھی سن رہے ہیں۔"

محسن نے کہا "فائر کی آواز پر سب سے پہلے ہم اندر پہنچے تھے اور اس وقت صدیقی صاحب زندہ تھے۔ تم تو بہت دیر بعد پہنچے تھے۔ [illegible] کیا معلوم مرتے مرتے وہ ہم سے کیا کہہ گئے تھے۔"

ڈی آئی جی کے چہرے کا تاثر بدل گیا "کچھ کہا تھا صدیقی [illegible]"

"جی ہاں انہوں نے کہا تھا وہ میں نے ہی نہیں، منظر صاحب نے بھی سنا تھا اور مس رابعہ قاری نے بھی۔" محسن بولا۔

"کیا کہا تھا انہوں نے؟" ارشد کریم ربانی محتاط ہو گیا۔

"انہوں نے کہا تھا یہ سب ربانی کا کیا دھرا ہے۔" محسن نے بڑے اعتماد کے ساتھ بڑے مضبوط لہجے میں جھوٹ بولا۔

ارشد کریم ربانی کا رنگ فق ہو گیا "یہ... کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ بے تکی بات ہے۔"

منظر نے کہا "جو واقعہ ہو جائے اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، بے وقوفی ہے۔"

"جو ہم نے سنا ہے وہ ہم جانتے ہیں۔" رابعہ بولی "اور بہت جلد سب جان لیں گے۔ تفتیش کرنا واقعی ہمارا کام نہیں ہے۔ ڈی آئی جی صاحب فرما چکے ہیں۔"

منظر نے سر ہلایا "ویسے تو آپ لوگ بادشاہ ہو۔ چاہو تو اس بیچارے خودکشی کے کیس کو قتل بنا دو۔ الزام ہمی پر لگا دو یا اپنے نقلی چوہدری دلاور پر۔"

"آپ کا کیا مطلب ہے آخر آپ کا؟" ربانی گرم ہو گیا۔

"اسے کہتے ہیں چور کی داڑھی میں بانس۔ تنکا تو بہت چھوٹا ہوتا ہے۔" منظر بولا "کیا تم اسے اپنا سمجھتے ہو؟"

"نہیں سمجھتے تو پھر اس لفظ پر خفگی کیوں؟" محسن بولا۔

"یہ تو چوہدری دلاور کے بات کرنے کا انداز ہے۔ وہ آپ کے سامنے ہو گا تو اسی طرح کہے گا کہ اپنے ربانی صاحب۔" منظر بولا۔

"او کے۔ او کے۔ ہم فضول باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ چلیں آپ اُدھر دوسرے کمرے میں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا۔ انتہائی غیر متوقع اور افسوس ناک ہے۔ صدیقی ہمارے محکمے کا قابل فخر افسر تھا۔" ڈی آئی جی اٹھ کھڑا ہوا۔

"اسی لئے معطل بھی آپ نے ہی کیا تھا۔" رابعہ بولی۔

"مس رابعہ۔ طنز کرنے کی ضرورت نہیں۔ غلطی ہر آدمی سے ہوتی ہے اور غلط فہمی میں غلط فیصلے بھی ہو جاتے ہیں۔" ڈی آئی جی نے خود کو سختی سے بچایا "مجموعی طور پر وہ بہت محنتی اور ایماندار افسر تھا۔"

"شاید اب اس جیسا کوئی نہیں رہا۔" منظر نے کہا۔

ڈی آئی جی نے وہی سیٹ سنبھال لی جس پر کچھ دیر پہلے جاوید صدیقی بیٹھا ہوا تھا "ون مین شو کہیں نہیں ہوتا مسٹر منظر۔ کم علمی یا لاعلمی کے باعث کوئی ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کی مرضی۔ اب پلیز مجھے بتا دیں کہ یہ حادثہ اچانک کیسے ہوا؟ کس نے سب سے پہلے دیکھا اور کیا دیکھا؟"

محسن نے میری طرف اشارہ کیا "گولی چلنے کی آواز پر یہ سب

www.paksociety.com

سے پہلے اندر پہنچے تھے۔ گران کے ساتھ ہی میں بھی اندر گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ پانچ سیکنڈ میں ہم سب اندر تھے۔ جو ایک نے دیکھا وہ سب نے دیکھا اور جو ایک نے سنا وہ سب نے سنا۔"

"اور سنا وہی جو مرحوم جاوید صدیقی نے کہا تھا۔" منظر بولا۔

رابعہ بولی "رہی یہ بات کہ حادثہ کیسے ہوا تو ڈی آئی جی صاحب عام آدمی کے نزدیک حادثہ وہی ہوتا ہے جو اچانک پیش آتا ہے جس کو غیر متوقع سمجھا جاتا ہے اور جس سے بچاؤ کے لئے پیش بندی ممکن نہیں ہوتی۔ ایسا نہ ہو تو وہ افسوس ناک واقعہ کہلائے گا یا سانحہ۔ لیکن ایک خیال اور بھی ہے۔ قدرے فلسفیانہ کہ۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا"

ڈی آئی جی مسکرایا "میں فلسفہ ذرا کم ہی سمجھتا ہوں۔"

"میں سمجھاتی ہوں آپ کو۔ دیکھنے میں یہ حادثہ تھا۔ اچانک اور غیر متوقع پیش آنے والا وہ ہولناک واقعہ۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے بارے میں پہلے سے اندازہ کرنا مشکل تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس کے اسباب پہلے سے پیدا کر دیئے گئے تھے۔ وہ باہمت تھا اور آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ گزشتہ چند دن کے واقعات پر غور فرمائیے۔ کس کس طرح اس کو مجبور کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں کسی ایک کا نام کیا لوں۔ اسے تو خود اس کے دوستوں نے دھوکا دیا۔ وہ اپنے استعفیٰ میں سب لکھ چکا تھا اور اس نے عدالت میں بھی ہر بات بتادی تھی۔ نتائج کی پروا کئے بغیر۔ وہ ڈرتا نہیں تھا نوکری جانے سے۔ انتہا یہ ہے کہ وہ بیوی بچوں والا تھا مگر پھر بھی دشمنوں کے عزائم اس کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکے۔"

"مس رابعہ۔ خودکشی کرنے والے بزدل ہوتے ہیں۔"

"غیرت مند بھی خودکشی کر لیتے ہیں۔ اور وہ بھی جو اتنے حساس ہوتے ہیں کہ اپنے ضمیر کو نہیں مار سکتے۔ جو ذلت اور رسوائی کے ساتھ جینے پر مرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔" منظر نے برہمی سے کہا "اس کے خلاف سب ایک ہو گئے تھے۔ چوہدری دلاور کے سب حامی۔ زرخرید اور دشمن۔ ان سب نے آخر کار اسے مار ڈالا۔ میں اسے خودکشی نہیں قتل قرار دیتا ہوں۔ ڈی آئی جی صاحب جس میں آپ بھی شریک ہیں۔"

"اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر منظر۔"

"یہ جذباتی بات نہیں حقیقت ہے۔ کیا آپ انکار کر سکتے ہیں اس بات سے کہ آپ نے اس پر کتنا دباؤ ڈالا تھا کہ وہ عدالت میں جھوٹ بولے۔ جھوٹا بیان حلفی داخل کرے۔ اس کے انکار پر کسی قانونی جواز کے بغیر ارشد کریم ربانی کو اس کی جگہ لایا گیا۔ صدیقی کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ جان بچانے کے لئے روپوش ہو جائے۔ اس کے چھوٹے بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا اور وہ انہیں ان کی جان بچانے کے لئے گھر سے بے گھر کرنے پر مجبور ہوا۔ کیا یہ سب جھوٹ ہے۔ اس کو بحال کیا تھا آپ نے خود کو بچانے کے لئے۔ اس سے پہلے کہ صدیقی کے بیان کا عدالت نوٹس لیتی اور غیر قانونی اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے والے زیرِ عتاب آتے۔"

"کنٹرول یور سیلف مسٹر۔" ڈی آئی جی نے ڈانٹ کے کہا۔

"نہیں۔ تم اب مجھے خاموش نہیں کر سکتے۔" منظر نے پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز کے ساتھ میز پر مکا مارا "ہمت ہے تو بند کرا دو میری زبان۔ مجھے بند کرا دو۔ لیکن باقی سب کے ساتھ کیا کرو گے؟ ان کی اور میری زبان ایک ہی بات کہے گی۔ ایس پی جاوید صدیقی کو قتل کیا گیا ہے۔"

"جاؤ پھر میرے خلاف ایف آئی آر درج کرا دو۔"

"صرف تمہارے خلاف کیوں۔ اس کے قاتلوں میں تو وہ عالم جیلر بھی شامل ہے۔ جو اس کا دوست تھا۔ جس پر اعتبار کیا تھا۔ وہ سب جنہوں نے مل کے چوہدری دلاور کو پولیس کی حراست سے نکل جانے کا موقع فراہم کیا تھا۔ اس کے لئے ایک ایسی اسکیم بنائی گئی تھی جو شیطانی ذہانت کا شاہکار تھی۔ تم جیسے مجرم اور اختیار والے افسر کہہ رہے ہوں اسے تم سب نے مجرم بنا دیا تھا۔ دلاور کو فرار کرانے کا منصوبہ تم سب کی کوشش سے کامیاب ہوا مگر الزام آیا ایس ایس پی جاوید صدیقی پر۔ آج اس کے منہ پر کہا گیا کہ وہ بے وقوف ہے۔ ایک لاش میں اور زندہ انسان میں فرق محسوس نہیں کر سکا۔ اصلی اور جعلی دلاور کو نہ پہچان سکا۔ اس نے بڑی محنت سے چوہدری دلاور کو گرفتار کیا تھا۔ بہت سے خطرات مول لے کر اسے اپنی ذمے داری پر جیل میں رکھا تھا۔ اس نے دولت کی طاقت کا اپنے ایمان کی قوت سے مقابلہ کیا تھا۔ اس نے ہر مشکل کو نظر انداز کر دیا تھا۔ کسی کے دباؤ میں نہیں آیا تھا۔ اس نے بڑی ذہانت سے کام لیا تھا اور بالکل صحیح پیش بندی کی تھی کہ زندہ دلاور کو مردہ خانے میں رکھا تھا اور ایک جعلی دلاور کی لاش خانے میں رکھوا دی تھی۔ مگر آخر کار ہوا کیا؟ وہ سب جیت گئے جو اس کے خلاف متحد ہو چکے تھے۔ جو بک چکے تھے۔ جو ناممکن تھا وہ ممکن ہو گیا۔ مکاری عیاری اور فریب کے سامنے اس کی ذہانت ناکام ہو گئی۔ اب کہا جا رہا تھا کہ اس نے حماقت کی تھی۔ جانتے بوجھتے ایسا کیا تھا کیونکہ اس کی ہمت جواب دے گئی تھی اور اس کا ایمان کمزور پڑ گیا تھا۔ اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ اصلی چوہدری دلاور تو نکل گیا ہے اور اس کے پاس جعلی دلاور رہ گیا ہے۔ جسے نہ وہ عدالت میں پیش کر سکتا ہے اور نہ پبلک کے سامنے۔ وہ اچانک مجرم بن گیا ہے کہ اس نے دلاور کو گرفتار کرنے کے بعد فرار کرا دیا۔ اس کا دوسرا جرم یہ ہوتا کہ اس نے ایک بے گناہ شخص کو بلاوجہ گرفتار کر کے غیر قانونی حراست میں رکھا۔ کون یقین کرتا اس کی بات پر کہ اصل دلاور ایک لاش تھی اور وہ لاش خانے سے فرار ہو گئی۔ کل سارا زمانہ اس پر ہنستا۔ سب اسے جھوٹا کہتے۔ الزام آتا کہ اپنی قیمت بڑھانے کے لئے اس نے دوبارہ گرفتاری اور فرض شناسی کا ڈراما کیا تھا۔ دلاور نے اسے خرید ہی لیا تو فرار کا

ڈی آئی جی نے فوراً صورت حال کو مزید خراب ہونے سے بچا لیا۔ "آپ اس شخص کو بلا کے پوچھتے کیوں نہیں کہ وہ کون ہے؟"

"ضروری ہے کہ تفتیش آپ کے سامنے ہو۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

"ہم اس جعلی دلاور سے ملنا چاہتے ہیں۔" محسن نے کہا "اس سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس کی کس بات نے اچانک صدیقی کو خودکشی پر مجبور کر دیا تھا۔"

"یہ بات بھی معلوم ہو جائے گی آپ کو۔"

"لیکن آپ کی معرفت؟" رابعہ نے کہا۔

منظر بولا "اس وقت جب وہ آپ کی مرضی کا بیان دینے کے قابل ہو جائے گا۔"

محسن نے کہا "ان سے کہہ دو کہ ہم صرف اس کی ذہنی و جسمانی کیفیت کے بارے میں اپنا اطمینان چاہتے ہیں اور صرف ایک سوال کریں گے جس کا تعلق نہ چوہدری دلاور سے ہوگا نہ صدیقی کی موت سے۔"

محسن نے میری بات دہرا دی اور ڈی آئی جی نے کچھ سوچ کے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اس نے گھنٹی بجا کے ارشد کریم ربانی کو طلب کیا۔

"ربانی کیا کر رہے ہو تم؟ لاش اٹھوانے کا بندوبست کیا ہے یا نہیں کیا؟"

"ہو گیا ہے سر۔"

"ورثا کو تم مطلع کر دو۔ ان سے پوچھ لیا کہ دفن کب اور کہاں ہوگی۔"

"جی سر۔"

"وہ ملزم کہاں ہے؟"

"محمود حوالات میں ہے سر۔" ربانی نے مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھا۔

ڈی آئی جی نے کہا "اسے یہاں لاؤ۔"

"کس لئے سر؟"

"یہ لوگ اس سے ملنا چاہتے ہیں۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

"لیکن اس سے تفتیش جاری ہے۔"

"ربانی۔ اپنے لئے مشکلات میں اضافہ مت کرو۔ اسے لے آؤ۔"

کچھ دیر بعد جعلی دلاور کو پیش کیا گیا تو اس کی حالت سے ہی تفتیش کی نوعیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس کے چہرے اور جسم پر بار تشدد کے نشانات نمایاں تھے۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔ کانپ رہا تھا کسی ...

"اچھی خاصی تفتیش کر ڈالی تم نے ایس ایس پی صاحب۔" منظر بولا۔

رابعہ نے کہا "ڈاکٹر کیا معلوم ہوا؟"

جب اس نے خود اپنی آنکھوں سے اس جعلی دلاور کو دیکھ لیا اور اس سے مل کے یقین کر لیا کہ ذلت و رسوائی اس کا مقدر ہو چکی ہے اور اب کوئی اسے تباہی سے نہیں بچا سکتا تو اس کے لئے مر جانے کے سوا چارہ نہ رہا۔ میں تم سب کو مبارکباد دیتا ہوں کہ تم آخر کار اسے کارنر کرنے میں کامیاب ہو گئے اور تمہارے راستے کا سب سے بڑا پتھر ہٹ گیا۔"

ڈی آئی جی نے خلاف توقع بہت صبر و سکون کے ساتھ منظر کی بات سنی تھی۔ شاید اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔ صدیقی کے معاملے میں پولیس کا موقف پہلے ہی کمزور تھا اور اس نے خودکشی بھی ایسے وقت میں کی تھی کہ اس واردات کے عینی گواہ نہ مانے جا سکتے تھے اور نہ بدلے جا سکتے تھے۔ پھر محسن نے جو بیان صدیقی سے منسوب کر دیا تھا وہ بھی کم پریشان کن نہ تھا گو خود ڈی آئی جی صاحب کی ذات ان معاملات سے بالاتر تھی۔ اس نے صدیقی کو معطل ضرور کیا تھا مگر پھر بحال بھی کر دیا تھا۔ ایسا غلط فہمی کی بنا پر ہوا تھا اور غلط فہمی پیدا کی تھی نیچے والوں نے۔ اب اس نے مرتے مرتے کہہ دیا تھا کہ یہ سب ارشد کریم ربانی کا کیا دھرا ہے۔ تو اسے کیا۔ وہ تحقیقات کا حکم دے سکتا ہے۔ اس بیان کی بنیاد پر ارشد کریم ربانی کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ بعد میں تحقیقات کی رپورٹ اسی کے سامنے آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ یہ تو معمولی سا خودکشی کا کیس ہے۔ یہاں بڑے بڑے تفتیشی ٹریبونل اور عدالتی کمیشن بنائے گئے اور انہوں نے مہینوں یا برسوں وقت اور پیسہ ضائع کر کے رپورٹ بھی مرتب کی مگر ایسی ردی رپورٹیں حکومت کے سرد خانے میں پڑی ہیں اور ان کی اشاعت کے لئے چیخ پکار مچانے والے بھی تھک ہار کے پرانی باتوں کو بھول گئے ہیں۔

"آپ کے دل کا غبار نکل گیا یا کچھ باقی ہے منظر صاحب۔" ڈی آئی جی نے پرسکون لہجے میں کہا "آپ میں سے اور کوئی بولنا چاہتا ہے تو ضرور بولے۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

"بڑی مہربانی ہے جناب کی۔ میں نے بھی اپنی گلی کے کتوں کو بھونکنے کی اجازت دے رکھی ہے۔" منظر نے تلخی سے کہا "پھر بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں کاٹ نہ لیں۔"

"میں نہ بھونکنے والے کتوں سے ڈرتا ہوں نہ کاٹنے والے شخصوں سے۔"

"میں نے یہ بھی دیکھا ہے ڈی آئی جی صاحب کہ گلی کے کتے ایک دوسرے سے بالکل نہیں ڈرتے۔" منظر بولا۔

ڈی آئی جی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا "آپ حد سے بڑھ رہے ہیں منظر صاحب۔"

"کون سی حد۔ مجھے تو اپنی حد کا بھی علم نہیں۔ شرافت اور انسانیت کی تو حد ہوتی ہے۔ بدمعاشی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ آپ کے قانونی اختیارات کی کوئی حد نہیں ہے۔"

www.paksociety.com

ڈی آئی جی نے کہا "اب آپ لوگ ایک ایک سوال کرلیں تو ہم بھی اپنا کام کریں۔"

اس شخص میں اور دلاور میں حیرت انگیز مماثلت تھی۔ پینتالیس دن اخباری قید میں اور ایک ہفتہ جیل میں گزارنے کے دوران دلاور نے شیو نہیں بنائی تھی۔ اس کی داڑھی بہت بڑھ گئی تھی اور ویسی ہی داڑھی اس شخص کی تھی۔ داڑھی نے چہرے کے نچلے حصے کے نقوش کا فرق چھپالیا تھا لیکن یکسانیت کے تاثر میں اضافہ کردیا تھا۔ دونوں کی داڑھی مشت بھر اور ناہموار تھی اور داڑھی کے بال بھی آدھے سے زیادہ سفید تھے۔ یہی کیفیت سر کے بالوں کی تھی جو ایک جیسے تھے۔ چوہدری دلاور پچاس سال کا ہونے کے باوجود کسی سے بھی گنجا نظر نہیں آتا تھا۔ اس دوسرے شخص کے بال عمداً اسی طرح بنائے گئے تھے جیسے چوہدری دلاور بناتا تھا۔

فرق غور سے دیکھنے پر آنکھوں میں نظر آتا تھا۔ چوہدری دلاور کی آنکھوں میں اعتماد اور غرور کی جارحانہ کیفیت نظر آتی تھی اس شخص کی آنکھوں میں دکھ بھری مظلومیت تھی اور خوف تھا۔ چوہدری دلاور اتنی دیر بولے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ شخص بالکل خاموش تھا۔

رابعہ نے پہلا سوال کیا "اپنا نام پیشہ اور پتا بتاؤ۔"

"علیم الدین ولد چراغ دین ساکن دارو غہ والا۔ عقب مسلم گرلز اسکول معرفت شاہ جی نیلر ماسٹر۔" اس نے ایک سانس میں یوں کہا جیسے وہ اس بات کے لئے پہلے سے تیار تھا۔

شاید پولیس نے اس سے یہ سوال اتنی بار کیا تھا کہ اب وہ ادھورا جواب دینے کی غلطی نہیں کرتا تھا یا پھر خود پولیس نے اسے یہ شائستہ دی تھی اور اسے یہ جواب رٹا دیا تھا۔

محسن نے کہا "تم کو عدالت سے کس جرم میں جیل کی سزا ہوئی تھی؟"

اس نے ڈی آئی جی کی طرف بے بسی سے دیکھا "میں... میں نے چوری کی تھی۔"

ربانی نے غرا کے کہا "پورا جواب دے۔"

"ہاں جی... بتاتا ہوں جی۔ میں نے کچھ چوری کئے تھے۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا "اور... جوتے چرائے تھے مسجد سے اور... اور ہاں جی ایک ریڈیو۔ ٹھیک ہے نا جی۔"

ربانی نے اس کی ٹھوڑی پر جھانپڑ مارا "مجھ سے کیوں پوچھتا ہے گدھے۔"

منظر نے کہا "ربانی صاحب اگر آپ کے ہاتھوں میں کھجلی ہورہی ہے تفتیش کی تو آپ اندر جاکے حوالات میں اس تکلیف کا علاج کرلیں۔ ورنہ مجھے ڈر ہے کہ میرے کسی سوال پر زیادہ گرمی آگئی تو آپ مجھے ہاتھ ماردیں گے۔ یہ تو پہلے ہی آپ کا پڑھایا ہوا سبق دہرا رہا ہے مگر ابھی نیا اور کچا شاگرد ہے اس لئے پوچھ لیتا ہے کہ میں نے غلطی تو نہیں کی۔"

ڈی آئی جی نے ناگواری سے کہا "ربانی تم ذرا تحمل سے بیٹھ جاؤ آرام سے۔"

"ویسے بھی اس ماحول میں جہاں آپ فرشتۂ اجل بنا کی طرح سوار ہوں گے یہ بیچ بولے گا لیکن کوئی بات نہیں کہ ڈی آئی جی صاحب نے ایک ایک سوال کی اجازت دی ہے تو میں بھی ضرور کروں گا۔ اتنا تجربہ ہوگیا ہے میرا اس پیشے میں کہ جھوٹ کے سات پردوں میں بھی سچ نظر آجاتا ہے مجھے آپ ربانی صاحب" منظر بولا پھر وہ ملزم سے مخاطب ہوگیا "دیکھو بیٹا۔ تم جانتے ہو پولیس کے چنگل میں ہو اس لئے اپنی مرضی سے جھوٹ بھی بول سکتے۔ لیکن یہ سچ ہے تو اس موقع سے فائدہ اٹھالو ہم بہت بڑے وکیل ہیں۔ کسی کو بھی اپنا وکیل بنالو۔"

ڈی آئی جی نے اعتراض کیا "یہ آپ کیا کررہے ہیں۔"

"میں ایک ملزم کو قانونی مشورہ دے رہا ہوں۔" منظر بولا "کیا یہ بھی غیرقانونی کام ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ بعد میں یہ تو کمال میں بھس بھریں گے اگر تم نے سچ بولا۔ لیکن تم اِدارا نہیں رہو گے۔ اگر خدا کے بعد کوئی تمہیں بچا سکتا ہے تو وہ ابھی پولیس تم کو استعمال کررہی ہے۔ جب تمہارا مصرف کوئی رہے گا تو شاید تم بھی نہیں رہو گے ایسے غائب ہوجاؤ گے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔"

ڈی آئی جی اٹھ کھڑا ہوا "ربانی اسے اندر لے جاؤ۔"

منظر نے کہا "ایک منٹ سر میں ایک سوال تو کرلوں؟"

"نہیں آپ نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔"

"علیم کتنی سزا ہوئی تھی تمہیں اور کس عدالت سے؟"

ربانی بڑی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ لیکن علیم الدین کو پیچھے کے لئے اسے ہمارے پیچھے سے گھوم کے جانا تھا۔ منظر بھاری بھرکم آدمی تھا اور کرسی پر بیٹھتا نہیں تھا اس میں اٹھ کر فٹ ہوجاتا تھا۔ اسے پاؤں پھیلانے کے لئے بھی زیادہ جگہ ضرورت پڑتی تھی۔ اس نے اپنی کرسی میز سے کچھ دور کرلی ربانی کے لئے دیوار اور کرسی کے درمیانی فاصلے سے گزرنا ہوگیا۔ کوئی اکا پھلکا آدمی ہوتا تو وہ پشت کو آگے دھکیل کر گزر جاتا مگر منظر کو ہٹانا کسی پہاڑ کو ہلانے سے کم مشکل کام نہ تھا۔

علیم سخت مشکل میں پڑگیا تھا۔ اسے فوراً فیصلہ کرنا تھا رد عمل میں ہونے والے پولیس کے تشدد سے بھی خائف تھا۔ موقع بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔ آخر کار اس نے ہکلاتے ہوئے کہا "کسی... کسی عدالت سے نہیں جی۔ کوئی سزا نہیں ہوئی تھی مجھے۔"

ربانی نے برہمی سے کہا "وکیل صاحب راستہ دیں مجھے۔"

منظر نے متاثر ہوئے بغیر کہا "تمہارا راستہ کون روک سکتا ہے ربانی صاحب۔ شیطان کے سوا۔" اور کرسی کو تھوڑا سا سرکا لیا۔

نے سب کا حوصلہ چھین لیا تھا۔ لگتا تھا اب کرنے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ ہم ایک جیتی ہوئی بازی ہار گئے تھے اور فوری طور پر خود مجھے بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ چوہدری دلاور کے خلاف میری انتہا کا عکس عمل ہوگی۔ قانونی اور غیرقانونی۔ دونوں طریقوں سے ابھی تک اس کی دولت نے اور تعلقات نے ہم سب کی متحدہ کوششوں کو ناکام کردیا تھا۔ وہ ابھی تک آزاد تھا اور اس کے خلاف سارے جرائم کا ثبوت مہیا ہونے کے باوجود وہ قانون کی گرفت میں نہیں آیا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ خود قانون کے لمبے ہاتھ چھوٹے ہوگئے تھے اور ڈھیلے پڑ گئے تھے یہی سب سے بڑی خرابی تھی کہ لاوارث اور بے زور پکڑے جارہے تھے خواہ انہوں نے کچھ بھی نہ کیا ہو اور جو بڑے بڑے مجرم تھے وہ سب کچھ کرنے کے باوجود قانون کے خوف سے بے نیاز گھوم رہے تھے۔ وہ جو محنت کرکے آدھی رات تک گلی گلی صدا لگا کے مونگ پھلی بیچتا تھا اور محنت سے رزق حلال کماتا تھا بے عزت تھا اور جو ایک نیلی ٹاپ کال پر بینک کے خزانے سے لاکھوں چرا لیتا تھا عزت دار کہلاتا تھا۔

منظر کو اتنا تلخ اور سنجیدہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ میرے ساتھ ہی باہر نکلا تھا مگر اس کا موڈ بہت خراب تھا۔

میں نے کہا "آپ کا کہاں کا ارادہ ہے۔"

"جہنم میں جانے کا۔ چلوگے؟" وہ چڑ کے بولا "لیکن تمہارے ساتھ نہیں۔"

"یار دوست تو ہر جگہ ساتھ ہی جاتے ہیں" میں نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لئے کہا۔

"بھاڑ میں گئی دوستی۔ جو خود کو تمہارا دوست سمجھتا ہے وہ دنیا کا سب سے بڑا الو کا پٹھا ہے۔"

"شکریہ" میں نے کہا۔

"دیکھو یار خدا کے لئے تم کہیں چلے جاؤ۔ رابعہ اور تم اس شہر ہی میں نہیں اس ملک سے بھی چلے جاؤ۔ مت کرو شادی وادی کیا رکھا ہے یہ سب۔ کہیں سیٹ کرو فی الحال چلے جاؤ۔ وہ جو تمہارے باپ کا خاندانی کوٹ ہے نا اور جو رابعہ کے آبائی گھر کی منحوس زمین ہے یہ سب بیچ کے بھاگ جاؤ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو۔ ورنہ کسی دن ہم سب کتے کی موت مارے جائیں گے جیسے آج صدیقی مارا گیا۔"

میں نے برا نہیں مانا کیونکہ منظر کا غصے میں ہونا برحق تھا "صدیقی تو غیرت مند تھا اور آدمی تھا۔"

"ٹھیک ہے میں گدھا ہوں اور بے غیرت ہوں۔ لیکن تم بھی جان چھوڑو۔ چھوڑو سارے جھگڑے۔ عیش کرو بھوتنی کے۔ بلا میں کیا رکھا ہے اور تم یہ زندگی ایسے گزار رہے ہو کہ اس جینے سے تو مرجانا اچھا۔ اگر دلاور کے ہاتھوں کتے کی موت نہ مارے گئے تو فریب سے مروگے پیارے ان دونوں کی طرح۔ غالب اور نازو کی

ربانی کو اس کے باوجود بڑی مشکل سے گزرنے کی جگہ ملی۔

منظر نے کہا "ہاں بھئی علیم الدین مجھے وکیل کرو گے اپنا۔"

"کروں گا جی۔" اس نے اچانک چلا کے کہا "ورنہ یہ تو مار ڈالیں گے مجھے۔ آپ بچالو مجھے وکیل صاحب۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں ایک غریب آدمی ہوں۔"

ربانی نے اس کی گردن دبوچ لی "غریب کی اولاد کہتا ہے تو نے کچھ نہیں کیا؟ کل پھر پوچھیں گے یہی لوگ تجھ سے پھر سچ بولے گا تو۔"

وہ چیخنے لگا "یہ لوگ ماریں گے مجھے..."

منظر نے کہا "پہلے کیا سوچ کے پولیس کا ساتھ دیا تھا؟ اب مار تو کھانی پڑے گی۔ یہ لوگ قورمہ بریانی نہیں کھلائے مگر پھر بھی تم اب محفوظ ہو۔ یہ تم کو جان سے نہیں مار سکتے۔"

میں نے محسن سے کہا "میری طرف سے ڈی آئی جی صاحب کو بتادے کہ میں مدعی نہیں ہوں صرف غیرجانبدار مبصر ہوں۔ سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ میں عدالت کو بتادوں گا کہ میں نے علیم الدین کو کس حال میں دیکھا تھا۔ اس کی ذہنی اور جسمانی حالت کیا تھی۔"

محسن نے میری بات دہرادی "موسیو آندرے کا کہنا ہے کہ وہ کوئی سوال کرنے کا حق نہیں رکھتے مگر جو کچھ انہوں نے دیکھا ہے اسے نظرانداز بھی نہیں کرسکتے۔ اس ملزم کی ذہنی و جسمانی صحت بحال رہنی چاہئے جیسی اس وقت ہے۔"

منظر نے چلا کے کہا "علیم الدین کل میں وکالت نامہ لے کر آؤں گا۔ اس پر دستخط کردینا۔"

ڈی آئی جی نے برہمی سے کہا "آئندہ میں آپ پر اعتبار نہیں کرسکتا آپ نے مجھے دھوکا دے کر صورت حال کو EXPLOIT کیا۔"

"یہ EXPLOITATION کا زمانہ ہے ڈی آئی جی صاحب لیکن دھوکا دینے والی بات غلط ہے۔"

"میں نے ایک سوال کی اجازت دی تھی۔"

منظر بولا "برا نہ مانیں تو عرض کروں کہ آپ نے غلطی کی تھی۔ اب میں کل آؤں گا وکالت نامے کا فارم لے کر۔ کل کا مطلب ہے رات کے بارہ بجے کے بعد کسی وقت۔"

رابعہ نے کہا "مرحوم صدیقی صاحب کی خودکشی کے معاملے میں ہم اپنا اپنا تحریری بیان داخل کردیں گے۔"

ہم باہر آئے تو ریڈ کراس والوں کی ایک ایمبولینس مین گیٹ سے اندر آرہی تھی۔ ایس ایس پی جاوید صدیقی کے جسد خاکی کی آخری منزل کے سفر کا پہلا مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ ہم سب کے دل دکھ سے بوجھل تھے۔ صدیقی کی موت ایک مقصد کی موت تھی۔ ایک جذبے کی موت تھی۔ ہم سب دل شکستہ اور مایوس تھے۔ یہ ایک طویل جدوجہد تھی جس میں ہم کامیابی کے اتنے قریب تھے کہ ناکامی کے خیال کو بھی بھول گئے تھے۔ اچانک شکست

www.paksociety.com

میں نے کہا "اگر یار اپنا سب کچھ بیچ کے بھی ہمیں جو رقم ملے گی اس سے زندگی تو نہیں گزر سکتی۔ عیش خاک ہوگا۔"

"تو سالے اپنا ضمیر بیچ دو۔ ایمان بیچ دو اور اصول بیچ دو۔ چوہدری دلاور جیسا خریدار بھی ہے۔ جو کروڑوں کا خریدار ہے۔ سودا کرلو اس سے۔ اس کے پاؤں پکڑو... کے معافی مانگ لو۔ اپنے چوہدری صاحب۔ آپ بڑے اور ہم چھوٹے۔ تبھی تو داؤ دے آئے اسی لئے۔ ہاں معافی لوائیں۔ ناک اور مونچھیں نیچی کرلوائیں۔ فائدے میں رہو گے۔" اس نے اپنی گاڑی کا دروازہ زور سے بند کیا۔ محسن اور مولوی خادم حسین پہلے ہی اس کی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔

میں نے رابعہ کو دیکھا تو اس کی شکل ایسے ہو رہی تھی۔ جیسے وہ بات کرتے ہی رو دے گی۔ میں نے منظر کی باتوں کو ڈھٹائی سے ہنس کے ٹال دیا تھا۔ یہ باتیں نہ جانے کتنے لوگ کتنی بار کہہ چکے تھے اور ہر شکست کے بعد جب ڈیپریشن کا عارضی وقفہ آتا تھا تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ واقعی جدوجہد لاحاصل ہے۔ ابھی تک مجھے کچھ بھی تو نہیں ملا۔ نہ اپنا حق اور نہ انصاف۔ شاید ملے گا بھی نہیں۔ آنے والا ہر دن گزرے ہوئے ہر دن کے مقابلے میں امید کی روشنی کو کم کرتا ہے۔ یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ وقت کی چال الٹی ہو جائے گی اور حق گوئی و بے باکی۔ اصول پرستی اور ایمانداری۔ خلق کی شرم اور خدا کا خوف۔ قانون کی پاسداری اور شرافت۔ اخلاق کی اعلیٰ قدروں پر فخر کا عہد زریں لوٹ آئے گا۔ دنیا اب دولت اور صرف دولت کے مدار پر گھوم رہی تھی۔ دولت ہے تو دنیا تمہاری ہے۔ کل کس نے دیکھا ہے۔ جو کچھ ہے یہی آج کا دن ہے۔

لیکن ڈیپریشن کا یہ دورہ ختم ہوتا تھا تو اپنی کم ہمتی اور مایوسی پر افسوس ہوتا تھا۔ نیکی آج بھی دنیا پر غالب ہے۔ سچ آج بھی سچ مانا جاتا ہے۔ دنیا صرف شیطان کی آماجگاہ ہوتی تو انسان اور انسانیت کا وجود کب کا مٹ گیا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ پتھر کے زمانے کا انسان مسلسل ارتقا کی منازل طے کر رہا ہے۔ تعلیم اور تہذیب کی روشنی افریقہ کے تاریک براعظم تک پھیل چکی ہے۔ فاصلے سمٹ رہے ہیں اور انسان قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ غلامی کا دور کہیں نہیں رہا۔ پہلے کے مقابلے میں انسان زیادہ لمبی عمر پاتے ہیں۔ کہیں اوسط عمر دگنی ہوگئی ہے تو جاپان جیسے ممالک میں سو سال سے پہلے کوئی مرتا ہی نہیں کیونکہ انسان پہلے سے زیادہ خوش و خوشحال اور صحت مند ہے۔ شیطان کی ساری تباہ کاری اور قدرتی آفات کے نزول کے باوجود۔

"آؤ ہم بھی چلیں رابعہ" میں نے کہا۔

اس نے اپنی گاڑی کی چابی مجھے دے دی۔

"اگر تمہارا دل رونے کو چاہتا ہے تو میرا کندھا حاضر ہے لیکن ذرا باہر نکل جائیں" میں نے گاڑی میں بیٹھ کے دروازہ اس کے لئے کھول دیا۔

"میرا دل واقعی پھوٹ پھوٹ کے رونے کو چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے بھئی۔ رو لو۔ زیادہ سے زیادہ دیکھنے والے یہی سمجھیں گے نا کہ میرے سسر کا انتقال ہو گیا ہے جو مرحوم نے لاکھوں کروڑوں کی جائداد میں سے تمہیں پھوٹی کوڑی نہیں دی۔ سب اپنی نوبیاہتا تو خیر اور نو عمر جو تھی منکوحہ کو دے گیا ہے۔ یا میں کوئی بہت ہی ظالم سنگدل اور بدتمیز شوہر ہوں جو دل پر ایسی حسین بیوی کی اتنی خوبصورت آنکھوں سے جھڑتے اتنے قیمتی موتیوں جیسے آنسوؤں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

رابعہ اس کے باوجود نہیں مسکرائی "منظر کی باتوں نے مجھے ڈپریس کردیا ہے۔"

"منظر تو پاگل ہے اور تم اس سے بڑی پاگل ہو۔ دیکھ لینا صبح وہ آئے گا تو سب بھول چکا ہوگا اور پھر کسی کے کان ... چوہدری دلاور صاحب کی قوالی کی تھی۔ بھوتنی کا ذرا سے ... سے بچ کے کہاں جائے گا۔ ہم سالے کو عبرت کا نمونہ بنا دیں گے اگر ہم سے بچنے کے لئے بچ بھی مرگیا۔ تم بھی دل پر مت لو اس کی باتوں کو۔"

رابعہ نے افسردگی سے کہا "صدیقی کی موت نے مجھے اندر تک توڑ پھوڑ دیا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے وہی منظر ہے ابھی تک۔"

میں نے کہا "جرات مت ہارو مس رابعہ۔ تم جذباتی ہو کے سوچ رہی ہو ابھی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ خود صدیقی ایک جذباتی اور بے وقوف آدمی تھا۔"

"سکندر مت کرو ایسی باتیں" رابعہ چلائی۔

"تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اپنی جان لے کر اس نے کوئی بھلا نہیں کیا۔ اسی لئے خودکشی کو حرام موت سمجھا جاتا ہے۔ چوہدری دلاور کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا جاتا تو میں اسے شہید کہتا۔ مگر جو شخص بدنامی کے خیال سے ڈر جائے۔ جس میں شکست تسلیم کرنے کا حوصلہ ہی نہ ہو۔ جو زندگی میں صرف فتح اور کامیابی مانگتا ہو۔ جسے احساس نہ ہو کہ اس کے مرنے کے بعد بیوی بچوں کا کیا ہوگا۔ ان سب پر کیا بیتے گی جو اس پر انحصار کرتے تھے؟ مایوس اور بیت زدہ ہو کے اسے آنے والے کل کی اچھائی پر بھروسا نہیں تھا اسے اور کیا کہا جائے گا؟ کیا ایک شکست اور ناکامی کے بعد جدوجہد ترک کر کے قبر میں سو جانا چاہئے۔ ہار تو آزمائش ہوتی ہے۔ کیا خدا آزمائش میں پورا اترنے والوں کو اس کا صلہ نہیں دیتا؟ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ بہت بڑا عہدہ تھا اس کے پاس۔ اختیارات تھے۔ اسے فکر معاش نہیں تھی۔ اگر وہ برطرف ہو جاتا تو کیا فرق پڑتا اسے۔ وہ لوٹ سکتا تھا اپنا ... تھا۔ اور بفرض محال اسے جیل بھی جانا پڑ جاتا تو کیا تھا۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ ہوتا ... سے نکل کے بھی وہی جاوید صدیقی ہوتا۔ اس کا گھر ہوتا، بیوی بچے ہوتے۔ وہ نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرسکتا تھا۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اچھا جی۔ جیسے آپ کی مرضی۔ ذرا ٹھہر۔ ایک کپ چائے تو پی لے اگر اجازت ہو۔"

رابعہ کا موڈ ٹھیک کرنے کے لئے میں اسے مال پر زرلس رینل لے گیا جو ایک پرانی کوٹھی تھی۔ اس کے وسیع احاطے یا باغ کے ایک جانب قطار میں کیبن بنے ہوئے تھے۔ یہ کیبن پرانے انداز میں سرکنڈوں اور بانس سے بنائے گئے تھے لیکن یہاں بیٹھ کے چائے پینے کا اصل لطف دھیمے سروں میں بجنے والی موسیقی تھی جو کسی چھوٹے سے پوشیدہ اسپیکر سے نشر ہوتی رہتی تھی اور گفتگو میں مخل نہیں ہوتی تھی۔ عام طور پر یہاں کلاسیکی موسیقی کے ریکارڈ چلتے تھے۔ روی شنکر کا ستار یا علی اکبر خان کا سرود۔ عبدالکریم خان کی ٹھمریاں اور دادرے۔ ظاہر ہے اس کا لطف اٹھانے والے خوش ذوق افراد ہی یہاں آتے تھے۔

کیبن ایک طرف سے کھلا ہوا تھا اور اس طرح خلوت کے ساتھ سبزہ و چمن کا نظارہ بھی میسر آتا تھا۔ اس رومان پرور فضا میں آپ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو تکتے رہیں اور چائے پڑی ٹھنڈی ہوتی رہے یا لفظوں کے منتخب رومانی مکالمے بولیں تو کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا تھا مگر عملاً عشق کی وارفتگی کے مظاہرے کی یہاں قطعی گنجائش نہیں تھی۔

رابعہ نے ہینڈ بیگ یوں اتار کے سائیڈ میں رکھا۔ جیسے ریلوے اسٹیشن کا قلی پلیٹ فارم سے اٹھا کر لانے والا سامان باہر رکھ کے سکون کا سانس لیتا ہے۔ "اُف۔ بہت تھک گئی ہوں میں سکندر۔"

میں نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا "تھکن ایک نفسیاتی مسئلہ ہے مجھے تو تم صبح کی پہلی کرن سے زیادہ تابناک اور تروتازہ لگ رہی ہو۔ ہر گزر جانے والا دن تمہاری عمر کو ایک دن کم کرتا جارہا ہے۔"

"ایسی باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔"

"صرف کرتا۔ میں عاشق ہوں۔ بنیا نہیں کہ محبت میں بھی فائدہ نقصان دیکھ کے بات کروں۔"

وہ مسکرائی "آخر کیا چاہتے ہو تم؟"

"میں چاہتا ہوں جواب میں تم بھی اپنی آواز میں سوات کے اصلی شہد کی مٹھاس اور ادا کاری کے خالص دیسی گھی کی خوشبو بھرے زنانہ طرح سرگوشی میں کہو کہ سکندر۔ تم بھی مال پر لگے ہوئے بجلی کے کھمبے سے زیادہ شاندار لگ رہے ہو جس کے مرکری بلب کی روشنی ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ بڑھتی جارہی ہو۔"

رابعہ ہنسی "اس سے خوشی ہوگی تمہیں؟"

"بہت زیادہ خوش ہوگیا۔ تمہارے چہرے پر ہنسی آگئی۔ اب بولو چائے کے ساتھ اور ... کافی لیں ... پیزا سب منگا لے۔"

ویٹر عین وقت پر نمودار ہوا تو میں نے کہا "بھائی صاحب۔ پہلے

رابعہ نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ صدیقی بہت جلد میدان چھوڑ گیا۔ ہم اس کے ساتھ تھے۔"

"وہ ہم سب کو بے سہارا کر گیا اور میدان ارشد کریم ربانی جیسے لوگوں کے لئے خالی کر گیا۔ اس کا نقصان کسے ہوا اور فائدہ کس کو ہوا۔ صرف ربانی یا ڈی آئی جی صاحب ہی نہیں۔ چوہدری دلاور بھی خدا کا شکر ادا کرے گا کہ اس بلا سے جان چھوٹی۔ ایسا دوسرا افسر اب کہاں سے آئے گا۔ لیکن سچا اور اچھا آدمی ہمیشہ جذباتی ہوتا ہے اور جذبات کی رو میں بہہ کے ایسے ہی جان لیوا فیصلے کر بیٹھتا ہے۔ اگر وہ چوہدری دلاور کی طرح ٹھنڈے دماغ سے کام لینے والا شاطر اور عیار آدمی ہوتا جسے نہ زمانے کی پروا ہے نہ کسی کے اچھا برا کہنے کی۔ جس کے لئے شرم و حیا اور خوف خدا نام کی کوئی چیز نہیں۔ جو دنیا کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہے۔ جو دولت کمانے اور ترقی کرنے کے لئے جائز اور ناجائز کے فرق کو اہمیت ہی نہیں دیتا۔ تو صدیقی بھی زندہ رہتا اور سینے پر ہاتھ مار کے کہتا کہ بیٹا تم چوہدری دلاور ہو تو میں بھی ڈی ایس پی ہوں۔ آج بچ کے نکل گئے تو کیا ہوا۔ کل میں نے ہی تمہیں کتے کی موت نہ مارا تو میرا نام بھی جاوید صدیقی نہیں۔ چلو چھوڑو جان۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔"

"اب ہم کیا کریں گے سکندر۔"

میں نے اس کے ایک ہاتھ اس کے شانے کے گرد حائل کردیا اور اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی "ہم محبت کریں گے۔ پہلے سے بھی زیادہ۔"

اس نے خود کو چھڑا لیا "کیا کرتے ہو۔"

"جو میرا دل چاہتا ہے۔"

"دل کو سمجھاؤ یہ سڑک ہے۔"

میں نے کہا "دل پوچھتا ہے کہ کیا سڑک پر محبت کرنا منع ہے۔"

رابعہ مسکرانے لگی "ہاں منع ہے۔"

"تو پھر وہیں چلتے ہیں۔ جہاں محبت کرنا منع نہ ہو۔ کیا خیال ہے فلم دیکھنے چلیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں کب دیکھتی ہوں فلم۔"

"اچھا لکشمی چوک چلیں۔ چکن تکہ کھانا۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"تو پھر شملہ پہاڑی پر چل کے چاند کو گھورتے ہیں۔ کسی بنچ پر بیٹھ کے اداس الوؤں کا جوڑا۔"

"نہیں۔ گھر چلو۔ سب انتظار کر رہے ہوں گے ہمارا۔"

میں نے جھنجھلا کے کہا "بھاڑ میں ڈالو سب کو۔ سمجھ لو کہ آج کوئی نہیں بس ہم دونوں ہیں۔ آج پہلی بار چوری چوری ملے ہیں۔"

"سکندر چلو غالب اور نازو کو دیکھ آئیں" رابعہ کا موڈ ذرا بھی رومانٹک نہیں ہوا تھا۔

www.paksociety.com

کو کیا ملے گا۔"
"جو آپ حکم کریں جناب۔"
"اچھا تو ہمارا حکم یہ ہے کہ ایک جگ میں ایک گلاس لسی۔ ایک بوتل کوکا کولا۔ ایک گلاس شربت روح افزا۔ ایک کپ چائے اور ایک کپ پانی ڈال کے لے آؤ۔ ہم اپنے آنسو اور خون جگر ملا کے پی لیں گے۔"
ویٹر دانت نکالنے لگا "آپ ڈرامے لکھتے ہیں نا جی اپنے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مل کے۔ ڈاکٹر انور سجاد کے دوست ہیں نا۔"
میں نے کہا "یار تم مرواؤ گے۔ ان سے کہہ دیا تو وہ سیدھا پاگل خانے بھجوا دیں گے۔"
رابعہ نے کہا "بس چائے لے آؤ۔"
"بس ذلیل ذکر نہ ہو" میں نے کہا "لیکن کھانے پینے کے سامان سے بھری ہوئی ہو۔ تمہارے آنے تک میں قوم کا غم کھا ہوں یا ان کا سر۔"
رابعہ نے مجھے گھورا "کیا سوچتا ہو گا ویٹر بھی۔"
"یہاں ایسے خبطی بھی آتے ہیں" میں نے ہنس کے کہا "تم نے دیکھا نہیں ایسی باتوں پر وہ مجھے پاگل نہیں ڈاکٹر انور سجاد کا دوست سمجھا۔ آرٹس کونسل کی مدح بولاں ہے وہ۔ وہ ایک شخص نہیں واقعی انجمن ہے۔ بیک وقت افسانہ نگار۔ مصور۔ ڈائریکٹر۔ ڈراما رائٹر اور ڈاکٹر۔ زندگی نے فرصت دی تو میں بھی یہاں کچھ کروں گا۔"
"ہاں۔ گھاس خراب ہو رہی ہے۔ پھر جھاڑ پونچھ کا بھی کام ہو گا۔ ڈرامے ہوتے ہیں تو ٹکٹ دینے والا بھی چاہیے۔"
"ہاں ہاں۔ بڑے نصیبوں والے ہوں گے جو یہ کام کرتے ہیں۔ سارے لاہور کے منتخب لوگ آتے ہیں یہاں۔ جو ہمارا قومی سرمایہ افتخار ہیں۔ ان کو قریب سے دیکھ لینا۔ ان سے ہاتھ ملا لینا یا بات کر لینا بھی کم عزت کی بات نہیں۔ اب یہی دیکھ لو کہ سارے لاہور میں ایک ہی رابعہ تھی اور اس کی چاہت میں مرنے والے بھی بہت ہوں گے مگر سرکاری طور پر اسناد عاشقی قبول ہوئیں صرف اس ناچیز ہیچمدان کی۔"
وہ پھر ہنسی "یہ ہیچمدان کیا ہوتا ہے۔"
میں نے سر پکڑ کے کہا "ایک افریقی ساز ہوتا ہے۔ ایک طرف سے بجاؤ تو نالۂ بلبل کی صدا سنائی دیتی ہے۔ دوسری طرف سے فغان درویش۔ جنگل میں ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور گھر میں فالودہ کھانے کے لیے۔"

جب ہم چائے پی کر نکلے تو رابعہ کا موڈ بہت اچھا ہو گیا تھا۔ اس پر شام کے واقعات کا ذرا بھی اثر باقی نہیں رہا تھا۔ مایوسی اور دکھ کے جذبات سے میرا دل بھی بوجھل تھا مگر رابعہ کو اداس دیکھ کے میں نے زبردستی مزاج میں شگفتگی پیدا کی۔ یہ ادب آداب کی روایات کا تقاضا تھا۔ مرد ہونے کی حیثیت سے میری اخلاقی ذمے داری تھی۔ عورت رو کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہے اور آنسو پونچھنے والا بھی مل جاتا ہے اور غمگسار بھی۔ مرد خاموشی سے سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور ہوتا ہے یہاں تک کہ میری طرح اداس اور ناامیدی کا شکار ہونے کے باوجود زبردستی ہنسنے ہنسانے پر مجبور۔ اگر میں رونی شکل بنا کے حوصلہ شکن باتیں شروع کر دیتا تو رابعہ آنسوؤں کے دریا بہا دیتی اور اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ بوڑھے ہونے میں نے ان معاملات سے پہلو تہی کی جس پر میں اظہار خیال اور صلاح مشورے کی اشد ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ مجھے امید تھا کہ کچھ دیر بعد یا کل تک رابعہ بھی صدمے سے سنبھل جائے گی اور ہم سب پہلے کی طرح اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے کوئی حکمت عملی اختیار کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ ابھی تو خود میرا موڈ اتنا خراب تھا کہ وہ مجھے اور رابعہ کو برا بھلا کہہ کے اپنا سارا غصہ ہم پر اتار کے چلا گیا تھا حالانکہ وہ ایسا شخص تھا جس کو غصہ آتا ہی نہیں تھا اور جو آلام و مصائب کی سخت ترین گھڑی میں بھی ہنستا جانتا تھا۔

محسن اور مولوی خادم حسین نے اچھا ہی کیا تھا کہ اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔ منظر نے باقی غبار ان پر بھی نکالا ہو گا اور پھر محسن نے بھی اس کو سمجھا بجھا کے ٹھنڈا کیا ہو گا۔ محسن نے رابعہ کی حالت کا بھی اندازہ کر لیا تھا اور مجھے موقع فراہم کیا تھا کہ میں جذباتی رفاقت کا حق ادا کرتے ہوئے اس کی دلجوئی کروں۔
گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے کہا "اب ہم کہاں جا رہے ہیں۔"
"عجائب گھر اور غالب کو دیکھنے۔ اور کہاں۔"
میں نے کہا "ویری گڈ۔ یہ نمونے عجائب خانے میں ہی دیکھے جا سکتے ہیں یا چڑیا گھر میں۔ یا ان کی نمائش کہیں اور ہو رہی ہے۔"
"وہ وہیں ہیں جہاں تم نے دیکھے۔ آ گئے مجھے کچھ یاد ہے؟" رابعہ بولی۔
میں نے کہا "عجب کی بات ہے۔"
"جب۔۔۔ صدمے سے میری ایسی حالت ہو گئی تھی کہ شاید میں پاگل ہو جاتی۔"
"وہ تو خیر تم آج بھی ہو۔ لیکن تمہاری مراد اس نفسی ڈاکٹر سے تو نہیں ہے۔ جو شاید غالب کے باپ کا دوست تھا۔ اس کی ایک بڑی نیک دل بیوی تھی۔"
"بیویاں نیک دل ہی ہوتی ہیں۔" رابعہ نے کہا۔
"اور شوہر؟" میں نے احتجاج کیا۔
"شادی سے پہلے وہ بھی ہوتے ہیں۔ بڑے جاں نثار۔ فاکسار۔ وفا شعار۔ اور خدمت گزار۔ ایکٹر کہیں کے۔ اصلیت بعد میں ظاہر ہوتی ہے۔"
میں نے کہا "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ یہ وہی بات ہے جو کسی نے رخصتی کے وقت دلہن کو روتا دیکھ کے کہی تھی۔ دولہا کو

مسکراتا دیکھ کے اس کی کسی سہیلی نے کہا تھا کہ دیکھو تو ذرا اسے کیسا باچھیں بنے تو دولہا کے کسی دوست نے جواب دیا تھا کہ بی بی۔ تمہاری سہیلی تو ابھی کچھ دیر میں چپ ہو جائے گی۔ اس بے چارے کو تو ساری عمر رونا ہے۔ تو اداکاری کا بھی یہی ہے کہ لڑکیاں شادی کے بعد ساری عمر کرتی ہیں۔ اپنی اصلیت بھول جاتی ہیں۔"
اس سے پہلے کہ یہ بحث لڑائی میں بدل جاتی رابعہ نے چلا کے کہا "سیدھے کہاں جا رہے ہو۔ دائیں طرف چلو۔ راستہ بھول گئے کیا؟"
میں نے جذباتی لہجے میں کہا "راستہ تو میں اسی دن بھول گیا تھا رابعہ جس دن تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ میں تو سب کچھ بھول گیا تھا۔ تمہارے سوا۔"
"دیکھا۔ یہ ہوتی ہے ایکٹنگ" رابعہ ہنسی "بعد میں رابعہ کو بھول جاؤ گے۔ اور سب کچھ یاد رہے گا۔"
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" میں نے کہا "تمہیں سامنے بٹھا کے تمہارے نام کی مالا جپتا رہوں گا۔ تارک الدنیا ہو جاؤں گا۔ سب کو چھوڑ دوں گا۔ سب دنیا سے رشتے توڑ لوں گا۔ کوئی کام نہیں کروں گا۔ چھپر خدا چھپر پھاڑ کے دے گا۔ رزق آسمان سے اترے گا۔ ہمارے سارے کام نوکر کریں گے۔ ہم صرف محبت کریں گے۔ دن رات چوبیس گھنٹے۔ ایک لمحے کے لیے بھی ہم ایک دوسرے کی نظر سے اوجھل نہیں ہوں گے چنانچہ کھانا پینا نہانا دھونا سب وہیں ہو گا۔ وہی ہمارا حجلۂ عروسی ہو گا۔ وہی ٹوائلٹ۔ یااللہ تحروبین سے ایک ساتھ۔"
رابعہ نے ہنستے ہوئے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بس۔ بہت بول چکے اس سے آگے کچھ نہیں۔"
میں نے گاڑی اس پرانی کوٹھی کے سامنے روک دی جو اپنی خستہ حالی کے باعث آج بھی ویران اور آسیب زدہ لگتی تھی۔ اس کا گیٹ نہ جانے کب سے پورا کھلا ہوا تھا۔ اندر جانے والے اینٹوں کے بنے ہوئے راستے پر بھی گھاس پھوٹ رہی تھی۔ دائیں بائیں سبزہ و گل کی فراوانی دیکھ کر صاحب خانہ کے شوق باغبانی کا پتا چلتا تھا۔
ایک چھوٹا سا سفید اون کا بنا ہوا کھلونے جیسا کتا بڑی تیزی سے بھونکتا ہوا ہماری طرف لپکا اور چند قدم کے فاصلے پر رک کے سوالیہ انداز میں بھونکتا رہا۔ اتنے مختصر کتے کا اندازِ جارحانہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک طرح سے کال بیل کا کام کرتا تھا۔ اندر فوراً اطلاع مل جاتی تھی کہ باہر کوئی ہے۔
"کم ان ریڈو۔ کون ہے۔ ابھی شٹ اپ کرو۔" کسی نے کہا۔
میں نے رابعہ سے کہا "یہ ریڈو ہے یعنی گینڈا۔ غضب خدا کا۔ گینڈے کا تو بچہ بھی اس سے بڑا ہو گا۔"
"آہستہ بولو۔ کسی نے سن لیا تو برا مانے گا۔" رابعہ نے مجھے گھورا۔

بالینڈے نے سن لیا تو اس کے جذبات کتنے مجروح ہوں گے۔ بے حد بے عزتی محسوس کرے گا۔" میں نے کہا۔
ایک شخص میلی والی پرانی پتلون پہنے باہر آیا۔ پتلون کے ٹخنے نکلے ہوئے تھے اور اسے وہ شاید سوتے وقت بھی نہیں بدلتا۔ موٹے شیشوں والی عینک اور سفید خشخشی داڑھی والے اس ڈاکٹر کو میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ وہ ستر سال سے زیادہ کا تھا مگر بالکل سیدھا کھڑا ہوا تھا۔
میں نے اس سے ہاتھ ملایا "آپ نے شاید مجھے نہیں پہچانا۔"
"آف کورس پہچانا۔ تم کبیر ہے" اس نے رابعہ کی طرف دیکھا "کبیر خان۔ تم اس سویٹ گرل کے ساتھ آیا تھا۔ ابھی کیوں آیا ہے؟ شی کس تِل رائٹ۔ تم اس کا ساتھ میرج بنایا کہ نہیں؟"
"شادی بنانے گا انکل۔" میں نے اس سے مصافحہ کیا "لیکن آپ یہ بتائیں کہ آپ نے کبیر اس کو کیسے پہچان لیا۔ بہت پہلے ملا تھا میں آپ سے اور اب تو میری صورت ہی بدلی ہوئی ہے۔"
وہ ڈھیلی پتلون کو سنبھالنے والے بیلدار گیلس پر انگوٹھے اوپر نیچے چلا رہا۔ "نیور مائنڈ۔ تمہارا وائس۔ آواز تم نہیں بدلا۔ نیور نو۔ تمہارا ہونے والا وائف۔ یہ بھی نہیں بدلا تم۔ اس سویٹ گرل کو کیسے بھول سکتا ہے جو بھی دیکھے۔ ہمارے جیسا اولڈ مین بھی۔"
میں نے رابعہ کی طرف دیکھا وہ ہنس بھی رہی تھی اور شرما بھی رہی تھی۔ "اور نیبر تمہیں انکل۔۔۔؟"
"نیبر تمہیں۔ تمہارا فرینڈ غالب۔ اس کا واسطے کبیر خان کے سوا کون آئے گا۔ ایسا دوستی ہمارا اور غالب کا فادر میں تھا۔ ابھی ہم کو بہت دکھ ہوتا۔ وری پوا سے" اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اس کا فادر بھی اتنا بڑا ڈاکٹر تھا۔ اس نے سب کو مایوس کیا۔ بہت ٹیلنٹ تھا اس میں لیکن۔۔۔ خیر ابھی اندر آؤ۔"
میں نے کہا۔ "کیا حال ہے اس کا؟"
"وہ ری یا سٹرڈ از آل رائٹ" اس نے شفقت سے گالی دے کر کہا۔ "لیکن اس کا فیانسی۔ گرل فرینڈ۔ واٹ از شی؟"
"سب کچھ" میں نے کہا "جیسے رابعہ میرے لیے سب کچھ ہے۔"
اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہم سمجھ گیا تھا۔ تم ابھی کیا دونوں کو ادھر ایک ساتھ لایا۔ بیوی۔ یہ کوالیفیکیشن نہیں تھا۔ انگل لایا ہے۔"
میں نے کہا۔ "عشق کا روگ بھی کم تو نہیں ہوتا۔"
وہ ہنسا۔ "ایک دم ٹھیک بولا تم۔ عشق کا وائرس اور اس کا اثر کرتا ہے" اس نے اپنی کھوپڑی پر انگلی ماری۔ "ہوگ ہارٹ کو ہوتا۔ اس سے دماغ میں سیریس پرابلم ہوتا۔ لیکن ابھی ہم میڈیکل ٹرم استعمال کرتا ہے۔ تمہارا فرینڈ اور اس کا سویٹ ہارٹ کو فزیکلی پرابلم نہیں تھا۔ کیا بولتا سائیکالوجیکل کو؟"
"نفسیاتی۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

نہیں۔ ایسا مسئلہ ہو تو دوا بھی کم کام کرتا۔" اس نے ہمیں اندر لے جانے کے بجائے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ "دوا کم کام کرتا۔ تھوڑا سکون رہتا۔ دماغ کا تھوڑا بہت کول ڈاؤن کرتا لیکن ایسا کوئی انجکشن کوئی نہیں جو اس کا علاج کرے۔ یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ دونوں کو ساتھ لایا۔ ایک سے دوسرے کا علاج کیا۔ غالب کا کنڈیشن اچھا تھا۔ اس نے ماذو کو سپورٹ کیا اور ماذو کو بہت CONSOLE کیا۔"

میں نے کہا۔ "ہمدردی اور غمگساری کی۔"

"او گاڈ۔ اتنا مشکل اردو ہم نہیں جانتا۔ غالب اس کو بہت لو اور اٹینشن۔ توجہ دیا۔ جو ہم نہیں دے سکتا تھا۔ ہمارا میڈیکل سائنس میں لو اور توجہ SYMPATHY اور DEVOTION یہ سب نہیں ملتا۔"

میں بھی غالب اور ماذو سے ملنے کے لیے اتنا ہی بے چین تھا جتنا رابعہ تھی مگر ہم اس نیک دل اور مخلص مگر باتونی ڈاکٹر سے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ فضول باتیں چھوڑو۔ بتاؤ کہ وہ دونوں کہاں ہیں۔ وہ بے مقصد بات نہیں کر رہا تھا چنانچہ میں تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے سنتا رہا۔

"یہ جو پیار کا ری ایکشن ہوتا ہے۔ یہ میڈیکل ہوتا ہے۔ نیوٹن کا فارمولا کے مطابق ایکشن اور ری ایکشن برابر ہوتا اور ایک جیسا ہوتا۔ محبت کے ری ایکشن میں محبت پیدا ہوتا۔ اسی نے ان کا علاج کیا۔ جادو کی طرح۔ غالب نے جب ماذو کا حالت دیکھا تو اس نے خود کو سنبھالا۔ یہ محسوس کیا کہ ابھی ہمارا فرض اسی ہے۔ ماذو کو ایک دم نارمل ہونا چاہیے۔ یہ اس کا خواہش تھا۔ اس کا مقصد تھا اور یقین تھا۔ اس نے کوشش کیا۔ دل سے کوشش کیا۔ اس کا دل بہت دکھی تھا۔ اس نے گاڈ سے بہت دعا مانگا۔ بولا "او گاڈ۔ ماذو ہم کو واپس کر دو۔ نہیں تو ہم بھی مر جائے گا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ نے اس کے دل کی آواز بھی سن لی؟"

"او یس۔ اس کی جگہ ہم ہوتا تو ایسا دعا مانگتا۔ وہ سب کرتا جو اس نے کیا۔" ڈاکٹر بولا "اور پھر ماذو نے اس کو دیکھا۔ اس کا فورس کو فیل کیا۔ محسوس کیا۔ اس کا DEVOTION کو دیکھا۔ تو اس کے ہارٹ میں ایک ری ایکشن ہوا۔ بہت پاور فل۔ کہ ابھی ہم کو اس آدمی کا واسطے جینا مانگتا اور ٹھیک ہونا مانگتا۔ ماذو نے غالب کے SENTIMENTS۔ کیا بولتا اس کو؟"

"جذبات" رابعہ نے کہا۔

"یس۔ جذبات کی فورس کو فیل کیا۔ غالب کا جذبات اتنا اسٹرانگ تھا کہ ماذو کو چارج کر دیا۔ اس کے دماغ میں جو گڑبڑ تھا۔ سب کو ٹھیک کر دیا۔ FEELING ایسا ہی جادو کرتا ہے۔ ابھی تم یہ سمجھو۔ تمہارا گھر ہے۔ بیوٹی فل اینڈ نائس۔ تم صاف کیا اور سجایا۔ ڈیکوریٹ کیا۔ فرض کرو کوئی چور یا کوئی ڈاکو اندر گھس کے سب خراب کرتا ہے۔ دیوار کا پینٹ کارپٹ سب ڈرٹی کر دیتا ہے۔ سامان خراب کرتا ہے۔ چیزیں گراتا ہے۔ ڈیکوریشن بھی سارا توڑ دیتا ہے۔ تم سمجھے گا تو کیا کرے گا۔ تم روئے گا نہیں۔ تم ایک دم اٹھ جائے گا۔ سب ٹھیک کرنے میں۔ سب اٹھائے گا۔ سب صاف کرے گا۔ ری ڈیکوریٹ کرے گا۔ جو چیز جیسا تھا ویسا بنائے گا۔ جہاں تھا وہاں رکھے گا۔ رائٹ؟ تو ایسا ہی غالب نے کیا۔ اس کا فورس نے اس نے ماذو کو اسی طرح ڈے اینڈ نائٹ محنت کر کے RESTORE کیا۔ اس کا اوریجنل پوزیشن کو۔"

میں بوڑھے ڈاکٹر کی مثال پر پھڑک اٹھا۔ "اور اب ماذو بالکل ٹھیک ہے۔"

"یس۔ شی از ناؤ وانڈر فل اینڈ ایبل۔ اس میں بڑا کریڈٹ غالب کا ہے اتنا ہی ماذو کا ہے کہ اس نے RESPOND کیا۔ تعاون کیا۔ وہ بولا کہ تم چاہتا ہے تو ہم پھر دوبارہ جیے گا۔ زبان سے نہیں بولا۔ دل سے بولا۔ دل کا ایک خاموش زبان ہوتا ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "بالکل ہوتی ہے۔ ہر دل کی زبان الگ ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر مسکرایا۔ "یہ کام ہم نہیں کر سکتا تھا۔ ہم کیا دنیا کا سارا ڈاکٹر لوگ مل کے نہیں کر سکتا تھا۔ ایک پاگل کا دماغ ٹھیک کرنا آسان ہے۔ لیکن دل میں لائف کا واسطے ول پیدا کرنا۔ ناممکن۔ سوئے ہوئے جذبات کو لائف دینا۔ ناممکن۔ ابھی تم یہ بولے گا کہ ڈاکٹر کریک ہے۔"

میں نے کہا "یہ آپ کیسی بات کرتے ہیں سر۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں۔"

"بزرگ تو ہم سب کا واسطے ہے۔ لیکن یہ نام ہے ہمارا۔ ابھی تک لوگ ہم کو ڈاکٹر کریک بولتا۔ ہم کو اچھا لگتا۔ یہ بھی ایک کریڈٹ ہے۔ تعریف ہے۔ لوگ آئن سٹائن کو کریک بولتا۔ پہلی فون والا گراہم بیل کو کریک بولا۔"

میں نے کہا "ہر جینئس ہاف میڈ ہوتا ہے۔"

"اوہ نو۔ ہم کدھر جینئس ہے۔ ہم ڈاکٹر کریک ہے۔ ایسا ہی ہم کو اچھا لگتا۔ ابھی ہم اتنی دیر سے باتیں کرتا۔ تم اپنا دوست سے ملنا چاہتا ہے نا۔ آئی نو لیکن وہ سب تھوڑا گھومنے کے واسطے گیا ہے۔ اپنا آنٹی لوگ کے ساتھ۔"

یہ بہت پرانی کوٹھی اس تاریخی کوٹھی کے ساتھ ہی تھی جس میں سب سے پہلے ریڈیو پاکستان لاہور کا براڈ کاسٹنگ اسٹیشن تھا۔ یہ کسی معروف سیاست داں کی کوٹھی تھی جو غالباً مرحوم نے اس مقصد کے لیے وقف کر دی تھی۔ ڈاکٹر کریک بھی [illegible] اس کے گھر کی فضا میں نفاست یوں رچ بس گئی تھی کہ میں خود کو کسی میوزیم میں محسوس کر رہا تھا۔ اس اینگلو انڈین ڈاکٹر کے آباؤ اجداد کی بڑی بڑی تصاویر دیوار پر آویزاں تھیں جن کے فریم بھی

دروازہ کھلا اور ڈاکٹر کی بیوی اندر آئی۔ اس کے پیچھے ماذو تھی۔ ابھی اس کا جملہ پورا ہوا ہی تھا۔ ایک چیخ مار کے وہ رابعہ کی طرف بڑھی اور اس سے لپٹ گئی۔

غالب میری طرف مڑا تو میں نے کہا۔ "مجھے پہچانا؟"

غالب نے کہا۔ "تم سکندر ہو؟ تم ہو؟" اور پھر میرے گلے لگ

بوڑھا ڈاکٹر اور اس کی بیوی شفقت بھری مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں یوں دیکھتے رہے جیسے ہم سب ان کے بچھڑے ہوئے برسوں بعد ملے ہوں۔

ماذو میری طرف بڑھی۔ "سکندر بھائی۔ کہاں چلے گئے تھے

ماذو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خود رابعہ رو رہی تھی۔ میں نے [illegible] کے دوپٹے کے کونے سے آنکھیں صاف کرنے لگا۔

ماذو میرے پاس پہنچ کے رک گئی اور بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ "نہیں۔ تم سکندر تو نہیں ہو۔"

غالب نے کہا۔ "یہ سکندر ہی ہے ماذو۔"

اس نے بات کاٹ کے کہا۔ "کیا میں سکندر کو نہیں پہچانتی۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ اب میں پاگل ہوں؟"

میں نے کہا۔ "ماذو۔ جو تمہیں پاگل کہے وہ خود پاگل۔ میرا چہرہ بدل گیا ہے۔ کیا تم آواز سے نہیں پہچان رہی ہو مجھے۔"

"آواز؟" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اور کیا یہ سب لوگ تم سے جھوٹ بول سکتے ہیں؟ غالب تم سے غلط کہہ سکتا ہے۔ تم رابعہ سے پوچھو۔"

رابعہ نے سر ہلایا۔ "انہوں نے میک اپ کر رکھا ہے ماذو۔ یہ

تھے مگر بلیک اینڈ وائٹ تصاویر بھی تھیں۔ مردوں کے سر پہ لمبے فلیٹ ہیٹ تھے اور خواتین نے اسکارف باندھ رکھے تھے یا ان کے سر کے بالوں میں درمیان سے مانگ نکلی ہوئی تھی۔ فرنیچر۔ قالین۔ بڑے بڑے لیمپ اور فانوس۔ ڈیکوریشن سب کا شمار نوادرات میں کیا جا سکتا تھا تاہم اس نفاست میں بھی سلیقہ اور حسن تھا۔ کوئی چیز گرد آلود یا خراب نظر نہیں آتی تھی۔

پاکٹ سائز کتا جو ڈاکٹر کی گود میں سکون سے بیٹھا ہوا تھا ایک دم چھلانگ مار کے اترا اور باہر دوڑ گیا۔

"ابھی وہ لوگ آ گیا۔"

میں نے کہا۔ "کیا پیدل گھومنے گئے تھے سب لوگ۔"

"نہیں۔ گاڑی ابھی رکتا ہے ہمارا۔" وہ ہنسا۔

میں نے حیرانی سے کہا۔ "مگر میں نے تو کسی گاڑی کی آواز نہیں سنی۔"

"ابھی سنے گا۔ اسپائی کو پہلے پتا چل جاتا ہے۔ بہت دور سے سونگھ لیتا ہے۔"

"اسپائی۔ یعنی جاسوس۔" رابعہ نے کہا۔

"ہاں۔ یہ کتا۔ اس کا نام SPY ہے۔ یہ سب پتا چلا سکتا ہے۔ صبح اخبار ڈھونڈ لیتا ہے کہ کدھر گرا ہے۔ گاڑی کے نیچے ہے یا گملے کے پیچھے۔ گھر میں گاڑی کا چابی گم ہوا۔ یہ پتا نہیں کدھر سے لایا۔"

ڈاکٹر کریک نے غلط نہیں کہا تھا۔ کتے کے جانے کے تقریباً ایک منٹ بعد میں نے گاڑی کے انجن کی اور پھر دروازے بند ہونے کی آواز سنی۔ پھر باہر سے کسی عورت نے کہا۔ "ابھی کون [illegible] اس کا نام؟"

ماذو نے کہا "رابعہ۔ رابعہ بھابی ہوں گی۔ یہ۔۔۔ جو باہر گاڑی کھڑی تھی نا۔ انہی کی تھی۔ کیوں غالب؟"

ایک افسانوی کردار جو زندہ ہو گیا تھا۔
ایک حیرت انگیز قیدی جو چہرے بدل سکتا تھا۔
ایک مجہول سا آدمی جس کے پاس بے پناہ دولت کا ذخیرہ تھا۔
★ وہ شخص جس نے قیامت اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔
★ ایک پراسرار مجرم جس کے پاس مافوق الفطرت قوتیں تھیں۔
★ ایک قلم جس کے قدموں میں ایک جن بند تھا۔
★ وہ اشتہاری مجرم جس نے زندگی میں کوئی نیک کام نہیں کیا تھا۔
قیمت: ۳۰۰ روپے
☆ جرائم
☆ جادو
☆ ازدواج
☆ شیطان ازم
☆ ذہانت
☆ فطانت
☆ اسرار
☆ طنز و مزاح
عجیب کہانیاں ۔ فطین کی کہانیاں ۔ ذہنی کہانیاں
مکتبہ نفسیات

www.paksociety.com

سکندر رہی ہیں۔"

وہ ایک قدم آگے بڑھی "میک اپ کر کے کیوں آئے ہو میرے پاس۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "مجبوری تھی نازو۔ کچھ لوگ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ تم تو جانتی ہو انہیں۔ چوہدری دلاور کو اور استاد پیڈرو کو؟"

اس نے سر ہلایا "میں سمجھ گئی۔ مجھے تو پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا۔"

وہ پھر رونے لگی۔ میں نے اسے گلے لگا کے اس کے سر پہ محبت سے ہاتھ پھیرا "اب کیوں رو رہی ہو؟"

"میں بہت ناراض ہوں سب سے۔ کہاں چلے گئے تھے سب مجھے اکیلا چھوڑ کے۔" اس نے آنسو پونچھ کے گلہ کیا۔

"اکیلا کہاں چھوڑا تھا۔" میں نے کہا "غالب بھی تو تمہارے ساتھ تھا۔"

"مگر آپ شادی میں بھی نہیں آئے۔"

"شادی... کس کی شادی میں۔؟" رابعہ نے کہا۔

"میری شادی اور کس کی شادی۔ رابعہ باجی آپ بھی ایسی باتیں کر رہی ہیں جیسے آپ کو پتا ہی نہیں۔"

"تمہاری شادی ہو گئی؟ کس سے... اور کب؟" میں نے کہا۔

نازو خفا ہونے لگی "یہ کیسا مذاق ہے؟"

میں ہنس پڑا "میں چھیڑ رہا تھا تمہیں؟"

غالب نے مجھے آنکھ ماری "پچھلے مہینے تھی نا ہماری شادی!"

میں نے کہا "ہاں لیکن پچھلے مہینے ہم تو یہاں تھے ہی نہیں۔"

غالب بولا "میں نے یہی بتایا تھا اسے۔ بھلا یہ ہو سکتا تھا کہ تم لوگ لاہور میں ہوتے اور ہماری شادی میں شریک نہ ہوتے۔"

"وہ گل اور محسن بھی نہیں آئے تھے" نازو نے شکایت کی۔

"ان کی بھی مجبوری تھی" غالب نے میرے کچھ کہنے سے پہلے کہا "محسن کی بہن اور اس کا بہنوئی حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے وہ کراچی گئے ہوئے تھے۔ ابھی آئے تو نہیں؟"

میں نے کہا "نہیں' لیکن ایک دو دن میں آنے والے ہیں۔"

"آرام سے بیٹھ جاؤ... میں چائے بھجواتی ہوں" ڈاکٹر کی بیوی نے انگریزی میں کہا۔

ڈاکٹر بولا "ہاں۔ آکے تم چائے پی کے جاؤ۔ کھانے کا ٹائم ہے پہلے۔"

"کیسا بات کرتا ہے یہ ڈاکٹر۔" اس کی بیوی بولی "بابا کچھ ٹائم لگے گا کھانے میں۔ اتنی دیر چائے پیو' باتیں کرو۔"

"چائے پی کے ٹھنڈا تم کھائے گا۔ باتوں سے بھی پیٹ بھر جائے گا۔ میری بیوی بہت چالاک ہے" ڈاکٹر ہنسنے لگا۔

"چالاک ہوں ڈاکٹر کریک نہیں۔" وہ اندر چلی گئی۔ ڈاکٹر بھی اس کے پیچھے تھا۔ وہ ہمیں تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع فراہم کر رہا چاہتے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ غالب سو فیصد نارمل ہو گیا تھا۔ اس کی تمام فکر اور سوچ کا مرکز و محور نازو کی ذات تھی۔ پہلے بھی اپنی جگہ تھی مگر وہ ہمارے دیگر مسائل سے بے نیاز نہیں تھا جیسے وہ برسوں پرانے مسائل تھے۔

نازو کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ سو فیصد ہو چکی تھی۔ اسے بہت کچھ یاد آ گیا تھا جو پہلے اس کی یادداشت سے محو ہو گیا تھا لیکن اس سے گفتگو کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے ذہن کا وہ حصہ تاریک ہے جس کا تعلق ماضی کے ناخوشگوار اور تلخ تجربات سے تھا۔ اسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ اغوا کے بعد اس نے کیا اذیت برداشت کی تھی۔ ڈاکٹر شادی کے خانے میں اس پر کیا ذہنی و جسمانی تشدد ہوا تھا۔ وہ کتنا عرصہ رہی تھی اور اس نے کیا دیکھا تھا۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ اپنی شوکت رانا کے ساتھ شادی کے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا۔ یاد نہیں تھا کہ وہ دلہن بنی تھی یا اس نے دلہن کے کپڑوں میں تصویر بنوائی تھی۔ وہ شوکت رانا کی نئی حویلی میں رہی تھی کس حیثیت سے۔

یہ سب مجھے غالب نے خاموشی سے بتایا تھا۔ ہم صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ رابعہ اور نازو بھی صوفے پر تھیں مگر ہم سے کچھ دور۔ حیرت اور دکھ کے جذبات کے ساتھ رابعہ بھی نازو کی بہت سی باتیں خاموشی سے سننے پر مجبور تھی۔ غالب نے رابعہ کو بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ نازو اسے بتا رہی تھی کہ ان کی شادی کیسی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ اس نے کیسے کپڑے پہنے تھے اور غالب نے کیسے۔ انکل نے سارا انتظام خود کیا تھا۔ وہ غالب کے والد کی جگہ اس کے والد اور انکل یعنی ڈاکٹر بہت گہرے دوست تھے۔

نازو کے ذہن نے تصورات کو حقیقت کا روپ دے دیا۔ یہ حقیقت جو محض افسانہ تھی نازو کے الفاظ میں ڈھل کر زبان پر آ گئی تھی۔ اس نے دیوانگی اور اذیت کے ایک آشوب پر تصوراتی خوشی کا ایک پردہ ڈال دیا تھا۔ یہ حقیقت قرار تھا یا بدل تھی لیکن یہ ضروری تھا۔ ابھی اس کے حق میں بہتر تھا کہ وہ اپنے سفاک اور بے رحم عذاب ماضی کی آسیب زدہ یادوں سے بھی دور رہے۔

ہم سب کے لیے ہی اسے خوش رکھنا ضروری تھا۔ نازو دل کے بہت خوش ہوئی تھی اور اب باتیں کرنے کے بعد وہ مسلسل بولتی رہی اور ہنستی رہی۔ اس نے اپنے بھائی کے بارے میں بھی پوچھا۔

میں نے کہا "تمہارا بھائی بہت بڑا آدمی ہو گیا ہے کراچی میں ہے اس کی اور ایک زبردست گاڑی ہے۔"

"اچھا؟ لیکن وہ تو ٹیکسی چلاتے تھے۔"

"بڑی بات ہے۔" کاجل نے اسکول کھولا تھا۔ اسکول نے ترقی کی۔ اب دو انگلش میڈیم اسکول ہیں ان کے۔ کراچی کے مشہور اسکول ہیں جہاں بڑے بڑے لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ کاجل پرنسپل ہے اور اکرام شیخ ایڈمنسٹریٹر۔ ان کا شمار شہر کے بڑے لوگوں میں ہوتا ہے۔"

"اچھا کیا اکرام بھائی نے پولیس کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ اس میں عزت نہیں تھی۔ ٹیکسی چلانے میں کوئی بے عزتی نہیں۔ محنت اور حق حلال کی کمائی تھی اور دیکھو خدا نے اس کا صلہ دیا۔ خدا نے کیسی دی۔"

غالب نے کہا "تجربے سے اچھی تو تجھے دی ہے۔"

بہت رات گئے ہم کھانے کے بعد رخصت ہونا چاہتے تھے مگر نازو بچوں جیسی ضد کرنے لگی "آج رک جائیں نا یہاں۔"

میں نے کہا "ابھی رکنے کا کیا ہے۔ کہیں بھی سو سکتے ہیں لیکن یہ ڈاکٹر صاحب کا گھر ہے۔"

رابعہ نے بھی کہا "ہاں۔ تمہارا اپنا گھر ہو تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"یہاں جگہ کی کمی تو نہیں ہے۔" غالب نے نازو کی حمایت کی "ہمارا گھر بھی بن جائے گا بہت جلد۔"

"ہاں۔ زمین تو خرید لی ہے ہم نے" نازو نے کسی کم عمر بچی کی طرح فخر کا اظہار کیا "بہت اچھی جگہ ہے۔ انگوری باغ اسکیم۔"

میں نے کہا "انگوری باغ۔ یہ تو بالکل شالیمار باغ کے سامنے ہے۔"

"بالکل وہی۔" نازو خوش ہو کے بولی "ون مرلہ زمین لی ہے انہوں نے۔ اس کی قیمت ادا کر رہے ہیں ابھی۔ بعد میں گھر بنائیں گے بہت شاندار۔"

ان کے اصرار کے سامنے میری ایک نہیں چلی۔ ڈاکٹر کریک اور اس کی بیوی نے ہمیں اپنے گیسٹ بیڈ کی آفر کی تھی۔ میں نے بتایا کہ کسی تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ اول تو ہم سوئیں گے کہاں۔ باتیں ہی کرتے رہیں گے اور ضرورت پڑی تو نازو اور غالب کا کمرا خالی ہے۔

بوڑھا ڈاکٹر اب سرکاری طور پر ریٹائر ہو چکا تھا۔ وہ لاہور مینٹل اسپتال کا ڈائریکٹر بھی رہا تھا مگر اس کا مسئلہ بھی ایمانداری اور فرض شناسی بن گیا۔ وہ بدعنوانی' غفلت یا مریضوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک برداشت نہیں کرتا تھا۔ شاید اس سے بھی اتنا فرق نہ پڑتا جب وہاں ذہنی طور پر سو فیصد صحت مند لوگوں کو داخل کرانے کی کوشش کی گئی اور ڈاکٹر کریک نے معائنے کے بعد کہا کہ یہ بالکل ٹھیک ہیں لیکن انہیں وہاں لانے والے یقیناً پاگل خانے میں رکھے جانے چاہئیں تو معاملات خراب سے خراب تر ہو گئے۔ ان لوگوں نے اسے بھاری رشوت پیش کی۔ یہ پہلا کیس نہیں تھا۔ وہ دولت مند اور بااثر لوگ تھے مگر شخص کا تھا جو مرتا تو دور کی بات ہے بیمار تک پڑنے کا نام نہیں لیتا تھا اور اپنی ساری عمر کی کمائی کے خزانے پر سانپ بن بیٹھا تھا۔ اس کے وارث کہلانے کے انتظار میں دو بیٹے مر چکے تھے اور دو بیویاں اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ وہ تیسری کے چکر میں پڑا تو لواحقین یعنی دو بیٹوں اور دو دامادوں نے سنجیدگی سے اس فیصلے پر میٹنگ کی اور فیصلہ کیا کہ بزرگوار نے بہت دنیا دیکھی اور بہت عیش کر لیا۔ اب خود دوسری دنیا کو سدھار جائیں تو بہتر ورنہ ان کی رخصتی عمل میں لائی جائے۔ بعد میں بیٹیوں کو پتا چلا کہ دولت کے چکر میں ان کے لالچی شوہر ہی نہیں کتنے بیٹے بھی پیارے ابا جان کو مرحوم کرنے پر متفق ہو گئے ہیں تو انہوں نے رحم کی اپیل داخل کی اور سزائے موت کا حکم صادر کرنے والوں کو قائل کر لیا کہ انہیں زندہ رہنے دیا جائے بشرطیکہ وہ اپنی ساری دولت جائداد سے رضاکارانہ دستبرداری اور اسے منصفانہ طور پر تقسیم کے لیے راضی ہو جائیں۔ ابا جان کے سامنے کئی متبادل بھی رکھے گئے۔ وہ باری باری سب بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہیں۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ جس گھر میں میری عمر گزری اور جہاں سے میری دو بیویوں کے جنازے اٹھے' اسے میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ اس بات کا مطلب کچھ یوں بھی نکلتا تھا کہ اللہ نے چاہا تو ابھی مزید دو بیویاں آئیں گی اور چلی جائیں گی کیونکہ ابھی تو میں جوان ہوں۔ میں خود تو کہیں بھی رہ سکتا تھا مگر ساس بہو کے ساتھ امن و سکون کہاں رہے گا۔ داماد کے گھر میں رہنا ان کی غیرت کو گوارا نہیں تھا۔ انہوں نے کرائے پر کوئی ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان لینے' ماہانہ گزارے کے لیے مناسب رقم قبول کرنے اور مستقل آمدنی کے لیے چھوٹی سی پرچون کی دکان پر بیٹھنے سے بھی انکار کر دیا۔ ساری عمر افسرانہ شان کے ساتھ سیکڑوں ہزاروں یومیہ رشوت لینے والے ہاتھ اب مسور کی دال اور مرچ مسالہ تولیں' چونی اٹھنی کے سودے کریں' ناممکن۔

ایسے ضدی شخص کا انجام صاف ظاہر تھا۔ بیٹوں نے ان کے بارے میں افواہیں پھیلائیں اور ان سے بے بنیاد باتیں منسوب کرنے کی باقاعدہ مہم چلائی یہاں تک کہ خود بزرگوار پریشان ہو گئے اور انہیں یقین آنے لگا کہ انہیں یاد نہیں رہتا لیکن وہ سب افسوسناک حرکات ان سے یقیناً سرزد ہوئیں جن کی وجہ سے اولاد کو شرمندگی اٹھانی پڑی۔ جب وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئے تو کام آسان ہو گیا لیکن تدبیر کند بندہ' تقدیر کند خندہ "ہدروں" کو کیا معلوم تھا کہ آگے ابا جان سے بھی بڑے پاگل سے واسطہ پڑے گا۔ ڈاکٹر کریک نے تاڑ لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس نے پہلے تیمارداروں سے اور پھر بیمار سے الگ الگ بات کی تو حقیقت کھل کے سامنے آ گئی' پہلے اس نے بیٹوں اور دامادوں کو اخلاقیات پر لیکچر سے قائل اور شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔ والدین کے حقوق اور ان کے فرائض پر لیکچر' مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ الٹا انہوں نے ڈاکٹر کریک کو رشوت کی پیشکش کر کے

www.paksociety.com

اپنے پارٹس پر کلہاڑی ماری۔ ڈاکٹر کریک نے پولیس کو طلب کر لیا اور سارے معاملے کی رپورٹ کر دی۔ اس خدشے کا اظہار بھی کر دیا کہ بزرگوار کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے اور جب بھی ان کی وفات حسرت آیات ہو تو پوسٹ مارٹم رپورٹ ضرور حاصل کی جائے۔

بعد میں ایسے چند کیس اور بھی آئے جہاں لوگ کسی ناپسندیدہ شخص کو قتل کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے تو پاگل خانے میں چھوڑ آنے کا فیصلہ کر لیتے تھے تاکہ وہ اپنی باقی زندگی پاگلوں کے درمیان گزارے اور وہیں مر جائے۔ ایسے سب لوگ مایوس ہوئے مگر ڈاکٹر کریک کے لیے اس وقت سنگین مسائل پیدا ہوئے جب خود حکومت نے ایک سیاسی حریف کو جیل خانے سے نکالا اور پھر پاگل خانے پہنچانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر کریک نے اسے داخل تو کر لیا مگر بعد میں اس نے تفصیل سے حقائق کا جائزہ لیا تو مریض کو سو فیصد نارمل قرار دے کر ڈسچارج کر دیا۔ اگلے ہفتے اس کا تبادلہ وزارت صحت میں کر دیا گیا جہاں وہ کچھ عرصہ او ایس ڈی بنا مکھیاں مارتا رہا۔ پھر ایڈیشنل سیکریٹری بنا دیا گیا کیونکہ حکومت بدل گئی تھی اور وہ شخص جسے پاگل قرار دینے کی سرکاری کوشش ناکام ہو گئی تھی اب وزیر باتدبیر تھا۔ وہ ڈاکٹر کا احسان بھولا نہیں تھا مگر اس کی فطرت کو بخوبی سمجھ گیا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ اب نئی حکومت کسی پرانے سیاسی حریف کو اٹھا کر پاگل خانے بھیجے تو وہ پھر اڑ جائے۔ ایسے شخص کو پاگل خانے کا ڈائریکٹر بنانا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ ترقی پانے کے باوجود ڈاکٹر کریک بے کار ہو گیا۔ وزارت صحت میں وہ ڈاکٹر نہیں صرف افسر تھا۔ کرسی پر بیٹھا وہ کرسی کا ایک بے مصرف پرزہ۔ اس نے استعفیٰ دے دیا اور اپنا سائیکاٹرک کلینک کھول لیا اور اسے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی جب اسے ایک لاکھ کا عطیہ پیش کرنے کے لیے سب سے پہلے وہی بزرگوار تشریف لائے جن کو ان کی اپنی اولاد نے پاگل خانے میں مرنے کے لیے چھوڑ جانے کی پوری کوشش کی تھی۔ بزرگوار کے ساتھ ان کی شریک حیات تبسم تھیں اور بقایا سفر اتنا لمبا نظر آ رہا تھا کہ تیسری کا بھی راستے میں تھک کے ساتھ چھوڑ جانا بعید از قیاس نہ تھا۔ ڈاکٹر کریک کی مہربانی سے وہ ذہنی و جسمانی طور پر صحت مند بھی تھے اور زندہ بھی۔ اس کے بعد کئی نامعلوم افراد کی طرف سے عطیات موصول ہوئے اور نیک خواہشات کے پیغامات بھی۔ ان سب نے ڈاکٹر کا پھر شکریہ ادا کیا تھا جس کی وجہ سے وہ آج بھی پاگل نہیں سمجھے جاتے۔ ظاہر ہے یہ سب پرانے لوگوں میں سے تھے۔ نیکی بھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اس کا عملی ثبوت ڈاکٹر کو اب ملا تھا جب اسے واقعی مالی معاونت کی ضرورت تھی۔ اس کا سائیکاٹرک سینٹر آسانی سے بن گیا اور اس کی توقعات سے بڑھ کے رسپانس ملنے سے کامیاب ہوا۔ اب وہاں درجنوں ڈاکٹر اور نرسیں کام کرتی تھیں مگر ان سب پر ڈاکٹر کریک اور اس کی بیوی نگراں تھے۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ ڈاکٹر کا مرضی کہ اس نے

ہم کو اولاد نہیں دیا۔ ہم خوش ہے۔ ایسا اولاد ہوتا جو اولڈ ہم کو بے کار چیز سمجھتا اور ہمارا ڈسپوزل ایسے کرتا جیسے پھوٹا ٹوٹا آف فیشن فرنیچر نکالتا یا ہم کو اتنا تنگ کرتا کہ ہم خودکشی کرتا۔ اس سے بے اولاد ہونا اچھا۔ ابھی دیکھو، میں ہر چیز بہت اولڈ ہے۔ ہم جیسا اولڈ اور کا زمانہ کا ہے۔ اولڈ از گولڈ۔ لیکن یہ بات آدمی کا واسطے نہیں۔ اولڈ مین تو مصیبت ہوتا۔ اس کا بات سنو، پرانی باتیں۔ وہ اس کا خدمت کرو۔ اس کا بیماری کا خرچہ اٹھاؤ۔ اس کا اور بچے بیکار سنو۔ معذور ہو جائے تو اس کو اٹھا کے لے جاؤ۔ کبھی وہیل چیئر پر تو کبھی اسٹریچر پر ڈال کے۔ اس کا ڈولی بیڈ کرو۔ صرف اس لیے کہ لوگ بولے۔ کتنا اچھا اولاد ہے۔ ڈرٹی لوگ۔ اس سے زیادہ آسان ہے کہ اس کا ڈسپوزل کرو۔ خدا آرام کرے۔ ہم کو بھی آرام سے جینے دے۔ ادھر اولڈ ہوم ہے۔ لوگ پاگل خانے لے جاتا۔ اور پتا نہیں کتنا ہے جو لے جاتا۔ لوگ سمجھتا کہ بڈھا مر گیا۔ کون سا عجیب بات ہے۔ بھر میں زکام بھی بہانہ بن جاتا ہے۔ کوئی شک نہیں کرتا۔ کوئی تفتیش کا بات نہیں کرتا۔ سب ڈیتھ کو نیچرل سمجھتا لیکن ہم جانتا ہے کہ کتنا ڈیتھ کا سبب نیچرل نہیں ہوگا۔ تھوڑا سا ہمت چاہیے۔ بڈھا کو دوا مت دو۔ غلط دوا دو۔ ڈاکٹر کسی جلد کو رشوت دو کہ ایک انجکشن لگا دے۔ ورنہ انجکشن لگانا کون مشکل کام ہے۔ ضمیر کا ایک نبی، تھوڑا ان تنگ کرے گا۔ پھر ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم نے دنیا دیکھا ہے۔ دنیا کا گلہ پیسہ ہے۔ ابھی پرانی کتابوں میں کیا لکھا ہے؟ ہولی بک کیا ہے۔ اچھا کیا ہے، زل مان، ہمارا عمر کم نہیں ہے۔ پورا ہاف سنچری ہم اس پروفیشن میں گزارا۔"

میں اور غالب ہی نہیں رابعہ اور ماڈو بھی دم بخود بیٹھے فطرت کے اس غیر انسانی مشاہدے کی داستان عبرت سن رہے تھے اور خود اپنے بڑھاپے کے تصور سے ہم پر لرزہ طاری ہو رہا تھا۔ جوان زندگی بہت حسین تھی جس میں خواہشات کے ساتھ تھی۔ عزائم کے ساتھ قوت تھی۔ ہم اپنے ارادوں پر اپنی کا اختیار ضرور رکھتے تھے اور کسی پر بار نہ تھے۔ مگر کیا اب وقت آئے گا؟

میں نے ذہن سے ان دہشت زدہ کرنے والے خیالوں کو جھٹک دیا۔ نہیں، ڈاکٹر نے زندگی کا تاریک پہلو دیکھا ہے مگر تاریکی کو زندگی سمجھ لیا ہے۔ ایسا ہمارے معاشرے میں ہو ہوگا تو اس کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہے۔ سو کیا ہزار ایک بھی ایسا ناخلف بیٹا نہیں ہوگا جو باپ کی دولت ہتھیانے کے لیے اسے مروا دے یا پاگل خانے میں پہنچا دے۔ ایسا تو ابھی یورپ امریکا میں نہیں ہوتا۔ ان کے اولڈ ہوم ہمارے لوگوں کہیں زیادہ آرام دہ اور پرآسائش ہیں جہاں انسان

www.paksociety.com

بعد اپنی قلیل پنشن میں وہ بھی سوکھی کھا کے بمشکل تمام زندگی کے دن پورے کرتا ہے۔ ناخلف یہاں بھی ہیں مگر بہت کم۔ بیشتر ماں باپ کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اس فرض کو عبادت کی طرح ادا کرتے ہیں۔ جہاں مرنے کے بعد بھی کم سے کم دو نسلیں باپ اور دادا کی برسی پر انہیں ضرور یاد کرتی ہیں اور لوگ باقاعدگی سے شب برات یا عید بقر عید اور برسی کے موقع پر ان کی مغفرت کے لیے فاتحہ خوانی کرنے قبرستان بھی جاتے ہیں۔

جب ڈاکٹر کریک سونے چلا گیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس عمر میں آدمی کتنا ہی نارمل رہنے کی کوشش کرے اس کا تھوڑا سا خبطی اور قنوطی ہو جانا عین فطری ہے۔ مجموعی طور پر وہ فرشتہ سیرت ڈاکٹر انتہائی شریف اور قابل تعظیم تھا۔

رابعہ اور نازو کو باتوں میں مصروف چھوڑ کے میں اور غالب باہر نکل آئے۔ شملہ پہاڑی کے گرد و نواح میں دن کے مقابلے میں کم ٹریفک تھی مگر لاہور پریس کلب کی سائیڈ پر سکون تھا اور خاموشی تھی۔ ہم ایک بینچ پر بیٹھ گئے جو سڑک سے کچھ فاصلے پر لگی ہوئی تھی۔ ایسی ہی دوسری بینچ پر جو بیس پچیس گز دور تھی ایک عورت اور مرد چپ بیٹھے رات کی خاموش رفاقت سے لطف اندوز ہو رہے تھے یا شاید اداس تھے اور تنہائی میں ان کے لیے سکون تھا۔

میں نے غالب سے کہا "کیا بات ہے۔ تو نے اور کوئی بات نہیں کی۔"

"اور بات؟"

"ہاں۔ میرے بارے میں ہمارے معاملات کے بارے میں۔ کیا میں تجھے یاد دلاؤں کہ وہ معاملات کیا تھے؟"

اس نے سوچ کے کہا "یاد دلانے والی تو کوئی بات نہیں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سب یاد ہے مجھے۔"

"پھر کیا تو مجرا کر رہا تھا؟"

"دراصل... تم سب سے اتنا عرصہ دور اور لاتعلق رہنے کے بعد... ابھی تک میرے ذہن میں کنفیوژن ہے۔ بعض اوقات پرانے واقعات پر شک ہوتا ہے کہ وہ کسی ڈراؤنے خواب کا حصہ تھے یا حقیقت۔ کبھی سارے واقعات کی کڑیاں مل جاتی ہیں تو کوئی شک نہیں رہتا اور گزرے ہوئے وقت کی ساری تاریخ پر اپنی آپ بیتی ہونے کا یقین آ جاتا ہے۔ پہلے جو کچھ ہوا وہ سب تو مجھے یاد ہے لیکن درمیان میں کچھ وقت ایسا گزرا جو واقعی ایک بھیانک خواب تھا لیکن یہ خواب بھی مجھے پوری طرح یاد نہیں۔ اس خواب کی منتشر یادیں اچانک ذہن پر یلغار کرتی ہیں۔ میں کہاں رہا۔ کس کے ساتھ رہا اور کتنا عرصہ تم سب سے دور رہا۔ یہ سب تم ہی بتاؤ گے مجھے بتانے والا کون تھا۔ میں خود ذہنی خود فراموشی کے خلا میں سرگرداں تھا۔ جب آہستہ آہستہ پھر اپنی دنیا کی طرف لوٹا تو میں نازو کے خوف میں مبتلا ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی نامعلوم شیطانی طاقت مجھے نازو سے دور کرنا چاہتی ہے اور میں بالکل اکیلا ہوں۔

بے بس ہوں۔ پہلے اس طاقت نے مجھے جہنم میں دھکیل دیا تھا... جہنم کی اذیت کو جھیلنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں ... نازو کے لیے زندہ رہنے پر مجبور تھا اس لیے وہ سب کچھ ... برداشت کر لیا۔ اس جہنم سے نکل کے میں نہ جانے کس ... چلا گیا تھا جہاں مجھے اپنے پرائے کسی کی شناخت نہیں رہی تھی ... یہ بھی بھول گیا تھا کہ میں کون ہوں لیکن اس حالت میں بھی ... نازو کی جستجو کر رہا تھا۔ اچانک نازو مجھے مل گئی لیکن اب ... ہو گیا تھا۔ نازو وہ نازو نہیں تھی۔ لگتا تھا کسی دوسری دنیا کی ... ہے۔ کسی اور سیارے سے آئی ہے۔ وہ مجھے نہیں جانتی تھی ... کو بھی نہیں پہچانتی تھی۔ میرا یقین زیادہ پختہ ہو گیا کہ یہ وہی ... قوت ہے۔ پہلے اس نے مجھے نازو سے دور کر دیا تھا اب نازو ... سے دور کر دیا ہے۔ لیکن میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ نازو کو ... حاصل کر کے رہوں گا۔ اس کے بعد حالات بہتر ہونے لگے ... رفتہ اس شیطانی قوت کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ اگرچہ ... ہم اس کے اثر سے آزاد ہو گئے۔ کسی نے سفلی عمل کرایا ... اس کی نحوست کے اثرات زائل ہونے لگے۔ اندھیرا اور ... چھٹتی گئی اور صورت حال واضح ہونے لگی۔ ڈاکٹر انکل فرشتہ ... کی طرح ہماری راہنمائی کرنے لگے اور ہم دنیا کو پہچاننے لگے ... مسائل کو سمجھنے لگے۔ ایک دوسرے کے قریب آنے لگے ... کی ہم آہنگی نے ہمیں ایک دوسرے کا سہارا بنا دیا اور اب ... رہے ہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ نازو بھی ٹھیک ہے لیکن ... ماضی سے گریزاں ہے۔ وہ صرف حال میں زندہ رہنا چاہتی ہے ... مستقبل کی بات کرتی ہے۔"

"کیا تم نے کبھی اس سے گزرے ہوئے وقت کی کوئی بات ... تھی جو کسی پُر آزار تلخ یاد سے وابستہ ہو۔"

"ہاں۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اتنے دن تم کہاں تھیں ... اس نے حیرانی سے کہا "یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ تم خود کہاں ... تھے۔ میں نے کہا کہ تمہیں تو اغوا کر لیا گیا تھا۔ وہ خفا ہو گئی کہ کیا پاگل ہو گئے ہو۔ مجھے کون اغوا کر سکتا ہے۔ کس میں ہے اتنی ہمت؟" میں نے ہنس کے کہا کہ بھئی یہ تو ٹھیک ہے کہ تم نازک ... بھی ہو مگر چوہدری دلاور، شوکت رانا اور ڈاکٹر شاہ کی ہتھکڑی بھی ... نہیں ہے۔"

"پھر؟ کیا ردِ عمل ہوا اس پر۔"

"کچھ نہیں۔ وہ ایک دم بلینک ہو گئی۔ اس کا چہرہ ... ہو گیا۔ اس نے کہا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ میں کسی کو نہیں جانتی ... نے کچھ نام اور بھی لیے مگر اس نے تو جیسے حافظے کے دروازے ... بند کر لیے تھے۔"

"تم نے ہمارے بارے میں پوچھا ہوتا؟"

"میں نے پوچھا تھا۔ تمہارا، محسن انکل، رابعہ اور مظہر کے ... اسے یاد تھے۔ وہ مجھ سے پوچھتی رہی کہ آخر یہ سب لوگ کہاں ...

... نہیں چھوڑ کے۔ کئی سال ہو گئے۔ ہم سے کوئی ملنے نہیں ... نے فون نہیں کیا۔ خط نہیں لکھا۔ میں نے کہا کہ یہ سال ... نہیں دیکھنے گئی کہ اچھا میں تو ان کی ہو گی۔ کتنے مہینے سے میں ... نہیں دیکھا۔ میں نے پھر اسے یاد دلانے کے لیے کہا کہ یہ ... نہیں کیا، چند ہفتوں کی بات ہے۔"

"اس نے مان لی تمہاری بات؟"

"ہاں۔ بس میرا دل رکھنے کے لیے مان لی کہ اچھا تم کہتے ہو تو ... ہوں گے مگر وہ لوگ ہیں کہاں۔ ابھی کیا مصروفیت ہے کہ ... تک نہیں آئے۔ اکیلے تم ہو جو میری تیمارداری میں ... دن رات ایک کر رہے ہو۔"

"یعنی اسے احساس تھا کہ وہ بیمار ہے؟"

"ہاں۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ اسپتال ہے۔ لیکن اسے اپنی بیماری کی نوعیت کا علم نہیں تھا۔"

"اس نے کبھی تم سے نہیں پوچھا کہ مجھے کیا بیماری ہے؟ میں یہاں کیسے پہنچ گئی؟"

"اس نے ڈاکٹر انکل سے پوچھا تھا۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے کہا کہ بیٹی سوچ ذہن پر زور دو کہ کیا ہوا تھا۔ نازو نے بہت کہا کہ مجھے کچھ یاد نہیں۔ تو ڈاکٹر انکل نے کہا کہ بس یہی تمہاری بیماری ہے۔ جس دن تمہیں یاد آ گیا اس دن تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میں نے غالب کو بھی کچھ بتانے سے منع کر دیا ہے۔ ٹھیک ہونے کے لیے تمہیں خود کوشش کرنی ہو گی۔ نازو نے بعد میں مجھ سے کہا کہ آخر میری یادداشت کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا میرے سر میں کوئی چوٹ آئی تھی؟ کوئی شدید ذہنی صدمہ ہوا تھا مجھے؟ میں نے ... کہا کہ یہ تمہیں خود سوچنا ہو گا۔ اگر تمہارا یہ مسئلہ یا مرض ختم ہو... اس کا علاج خود تمہارے ہاتھ میں ہے اور میں ڈاکٹر انکل کے احکامات کی خلاف ورزی کر کے کیس خراب کرنا نہیں چاہتا۔ بعض اوقات اس پر جھنجھلاہٹ سوار ہو جاتی تھی۔ وہ مجھ پر بگڑتی تھی اور ... کہ تم میری مدد نہیں کر رہے ہو۔ پھر میں کہتا تھا کہ اور ... کیا میں یہاں چوکیدار بنا ہوا ہوں تمہارے ساتھ۔ دن بھر تمہارے ساتھ رہتا ہوں اور رات بھر تمہارا خیال رکھتا ہوں۔ پھر وہ شرمندہ اور جذباتی ہو جاتی تھی کہ غالب شاید اب میں کبھی تمہارے لیے نہ ... سکوں۔ میں نے کہا کہ خدا نہ کرے کہ اس کی ضرورت پیش آئے۔ وہ میرے لیے پاگل پن کی حد تک جذباتی تھی۔ کہتی تھی کہ ... نے مجھے بچا لیا۔ میں نے کہا کہ بچانے والا تو خدا ہے یا پھر ... ڈاکٹر انکل کی کوشش ہے تو وہ کہتی تھی کہ نہیں۔ تم نہ ہوتے تو ... کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں تمہارے لیے زندہ رہنا ... تھی۔ یہ زندگی بھر تمہارے ساتھ رہنے کے لیے زندہ رہنے کی ... جس نے مجھے مرنے نہیں دیا۔ تم محبت کی وہ زمین ہو جس ... کر لی تک میرے وجود کی جڑیں اتری ہوئی ہیں۔ اسی ... کے سہارے پر میں زندہ ہوں۔ زمین کے ساتھ جڑوں کا رشتہ ٹوٹ

جائے تو پودے اور درخت بھی سوکھ کے مر جاتے ہیں۔ خدا نہ کرے، خدا نہ کرے، کبھی تم نہ رہے تو میں کہاں رہوں گی۔ بس ایسی ہی باتیں کرتی رہتی تھی وہ۔"

"اسے بالکل یاد نہیں کہ ڈاکٹر شاہ نے اس پر کیا ظلم اور تشدد کیا تھا۔"

"نہیں۔ اسے ڈاکٹر شاہ کا نام بھی یاد نہیں۔"

"پھر تو یہ بھی یاد نہیں ہو گا کہ ڈاکٹر شاہ سے اس کی شادی ہوئی تھی۔"

غالب ایک دم بھڑک اٹھا "یہ کیا فضول بات ہے۔"

میں نے کہا "یہ واقعی ایک فضول بات ہے جو ڈاکٹر شاہ نے مشہور کی تھی۔"

"پھر اس کا حوالہ دینے کی بھی کیا ضرورت ہے۔"

"غالب۔ کیا تم نے نازو سے شادی کر لی ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر نازو ایسا کیوں سمجھتی ہے؟"

"اس کی وجہ میں کیسے بتاؤں۔ بس اس کی خواہش ہے یا ایک خیال ہے جو اس کے دماغ میں بیٹھ گیا ہے۔ ظاہر ہے میں انکار نہیں کر سکتا۔ بحث کر کے اور دلائل دے کے اسے قائل نہیں کر سکتا کہ یہ سب مفروضات ہیں۔"

"پھر بھی۔ یہ خیال اچانک حقیقت کیسے بن گیا۔"

"پھر وہی نامعقول بات۔ کیسے کا جواب تو ڈاکٹر انکل بھی نہیں دے سکتے۔ نازو نے خود ہی ایسا سمجھ لیا ہے۔ کیونکہ وہ ایسا چاہتی تھی۔"

"میرا مطلب تھا یہ کب ہوا؟ چاہنے والی بات سے مجھے انکار نہیں۔"

"بس ایک صبح وہ اٹھی تو ایسی ہی باتیں کرنے لگی۔ جیسے ہماری شادی ہو چکی ہے۔ وہ سب باتیں جو اس نے سنی تھیں یا دیکھی تھیں اس نے اپنی اور میری شادی سے منسوب کر لیں۔ شادی کے سین جو فلموں میں، ڈراموں میں، ناولوں میں اور گھروں میں نظر آتے ہیں۔ ان سب کو نازو نے جوڑ کے اپنی اور میری شادی کی پوری فلم بنا لی اور ظاہر ہے اس میں سارا کمال اس کے مشاہدے، حافظے اور تصور کا ہے۔ یہ ہوا تھا، وہ ہوا تھا۔ تم نے یہ کہا تھا۔ فلاں نے یہ کہا تھا۔ کس نے کون سے کپڑے پہنے تھے۔ کون کون شریک ہوا تھا۔ وہ ایسی تفصیل سے بتاتی ہے کہ کوئی شے تو یقین مان لے۔ غالباً یہ خواب تھا۔"

"نازو کا کیا خیال ہے۔ شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

"پتا نہیں۔ اس سے پوچھا بھی تھا میں نے تو وہ ہنسنے لگی کہ ایسا تو برسوں بعد ہوتا ہے کہ شوہروں کو شادی کا دن یاد نہیں رہتا۔ مذاق سمجھی وہ میری بات کو۔ اس کے ذہن میں یہ ہے کہ شادی کو زیادہ دن نہیں گزرے۔ غنیمت ہے کہ وہ سب باتیں خود کرتی ہے

www.paksociety.com

مجھ سے کچھ نہیں پوچھتی۔"

"جب سے تم یہاں ہو" میں نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "اور جب سے نازو یہ سمجھنے لگی ہے کہ تم میاں بیوی ہو تب سے تمہارے تعلقات کی نوعیت میں کوئی فرق پڑا ہے؟"

میرا سوال بہت گول مول تھا مگر غالب سمجھ گیا "تیرا مطلب ہے کہ کیا میں بھی خود کو اس کا شوہر سمجھنے لگا ہوں؟"

"یار، یہاں تو تمہی اس کا تیماردار تھا۔ تم ایک ہی کمرے میں تھے۔ ایک عورت اگر اپنے شوہر کے ساتھ تنہا ہو۔۔۔ تو۔۔۔"

"صاف پوچھ لے یار کہ کیا تمہارے درمیان ازدواجی تعلقات ہیں؟"

میں نے ایک گہری سانس لی "کیا نازو نے بھی کوشش نہیں کی۔۔۔ میرا مطلب ہے یہ تو ایک فطری سی بات ہوتی۔ تو تم کو اجتناب کرنا۔"

"ہاں۔ مجھے خاصی مشکل پیش آئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر انکل سے مدد مانگی۔ انہوں نے کہا کہ نو پرابلم۔ وہ تم سے پہلے سو جائے گی۔ تم دونوں کھانا تو ایک ساتھ ہی کھاتے ہو۔ کھانے کے بعد آدھا گھنٹا اس کے ساتھ گزارنا تو کوئی مشکل نہیں۔ وہ مطمئن ہو کے سو جائے گی۔ صبح تم اس سے پہلے اُٹھ جاؤ گے۔ لیکن اس پر یہی ظاہر کرنا کہ اس کے ساتھ ہی تھے۔ اسے تمہارا بیڈ بالکل صاف نظر آئے۔ ایک شکن بھی نہ ہو چادر میں۔"

میں نے ہنس کے کہا "اور یہ ڈرامہ چلتا رہا۔"

"مجبوری تھی یار۔ ایک طرف وہ میرے اتنے قریب تھی، میری دسترس میں تھی اور خود کو میرے سپرد کر چکی تھی۔ اس کے ذہن میں احساس جرم و گناہ بھی نہیں تھا۔ اس کا دل رکھنے کے لیے بلکہ اس کو ذہنی طور پر مطمئن رکھنے اور احساس تحفظ عطا کرنے کے لیے شوہر کا کردار ادا کرنا بھی لازمی تھا۔ دوسری طرف احتیاط کے تقاضے تھے۔ ڈر تھا کہ کہیں جذبات کی شدید رو مجھے تنکے کی طرح نہ بہا لے جائے۔ مجھ سے شجر ممنوعہ کو چکھ لینے کا گناہ آدم نہ سرزد ہو جائے۔ اور اس کی پاداش میں اپنی محبت کی جنت سے نکل کے میں ندامتوں کی پستی میں گر جاؤں۔ اب میں تجھ سے کیا چھپاؤں، کسی اور کے سامنے تو میں ایسی بات بھی نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات مجھے اس کے ساتھ سونا پڑتا تھا۔ وہ مجھ سے چمٹ کے سو جاتی تھی۔ میں دل ہی دل میں ڈرتا رہتا تھا۔ خدا سے امان مانگتا رہتا تھا کہ مجھ سے قبل از وقت کوئی غلطی سرزد نہ ہو جائے۔ مجبوری کا عذر اپنی جگہ، غلطی تو غلطی ہی رہتی ہے۔ اگر کوئی کسی سے گن پوائنٹ پر زیادتی کرے تب بھی احساسِ ندامت تو ختم نہیں ہوتا خواہ دنیا کی نظر میں یا قانون کی نظر میں یہ مجبوری ہو۔ اس کی باتیں، اس کا رویہ، بالکل بیویوں جیسا ہوتا تھا مگر میں ٹالتا تھا۔ بہانے کرتا تھا۔ کبھی اچانک اٹھ جاتا تھا۔ ایک بار اس نے کھانا نہیں کھایا۔ کہنے لگی بھوک نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ بیٹا غالب، آج تم مارے گئے۔ آج یہ خود بھی نہیں سوئے گی اور ہمیں بھی نہیں سونے دے گی۔ خیر اس وقت میں نے طے کر لیا تھا کہ [illegible] ذہن سے یہ خوش فہمی دور کرنے کے لیے سچ کی کڑوی گولی [illegible] اس کے حلق سے اتارنی پڑی تو میں ایسا ہی کروں گا۔ اس کا [illegible] اور خراب ہوتا ہے تو ہو جائے۔ میں شادی سے پہلے اس کا [illegible] نہیں ہو سکتا۔ میں اسے بتا دوں گا کہ یہ سب اس کے [illegible] اختراع ہے اور دماغ کا فتور ہے۔ لیکن پھر مجھے ایک بات [illegible] میں کھانے کے بعد پیٹ پکڑ کے ہائے ہائے کرنے لگا اور ڈاکٹر [illegible] نے مجھے ہاضمے کی دوا دی جو میں نے بڑے شوق سے پی لی۔ [illegible] رات بھر جاگتی رہی اور میں بھی جب آنکھ کھلی کراہنے لگتا۔"

مجھے غالب کی حالت کا تصور کر کے بہت ہنسی آئی "اب بات چھڑ گئی ہے تو ایک دو سوال اور کر لوں۔ آپس کی بات ہے، ہم میں کون سا پردہ ہے شرم کا۔"

"ہوگی کوئی بے شرمی کی بات۔"

"ہاں اگر تم سمجھو۔ ورنہ یہ ایک بیمار عورت کی ذہنی کیفیت [illegible] حال ہے۔ وہ تم سے زیادہ مجبور تھی۔ تمہیں اپنے ذہن پر [illegible] تھا۔ اسے نہیں تھا۔ اس پر ایک لطیفہ عرض ہے۔ امید ہے [illegible] نے سنا ہوگا۔ کسی خاتون نے ڈاکٹر سے کہا کہ میں بہت پریشان ہوں۔ میرے شوہر خود کو چوہا سمجھنے لگے ہیں۔ بلی کو اور مجھے دیکھتے ہی کانپنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا پریشانی کی کوئی بات نہیں آپ انہیں محبت سے یقین دلائیں کہ وہ مرد ہیں اور آپ کے شوہر۔ بیوی نے کہا۔ میں نے تو بہت سمجھایا۔ مگر ڈاکٹر صاحب [illegible] میری بات نہیں سمجھتی نا۔"

غالب نے کہا "اس لطیفے میں مجھے کیا سمجھا جا سکتا ہے؟ شوہر، بیوی یا بلی؟"

میں نے کہا "تمہارے ذہن میں تو بیوی کی سوچ نہیں تھی نا۔"

"ماحول ملا تو تھا۔ اتنا عرصہ تو رابعہ کے ساتھ رہا۔ کہاں کہاں بھٹکتے پھرے تم دونوں۔ جہاں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ کبھی تو دماغ بھٹکا تھا؟"

"نہیں۔ دراصل ہم دونوں کے دماغ صحیح تھے۔ یہاں نازو بالکل ٹھیک نہیں تھی اور تیرا کچھ کچھ خراب تھا۔ کیا کبھی نازو نے تیری بے التفاتی کا شکوہ نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا کہ روز جلدی سو جاتے ہو۔"

"نہیں۔"

"صبح افسوس یا معذرت بھی نہیں کرتی تھی کہ وہ خود اتنی جلدی سو گئی تھی۔"

"یار اب کیا میں سارے ڈائیلاگ سناؤں۔ وہ سب [illegible] میں آتے ہیں۔ تو بیا چتا میاں بیوی کی گفتگو بہت پرائیویٹ [illegible] ہے۔ بس میں نے اسے کسی نہ کسی طرح مطمئن رکھا کہ ہم میاں بیوی ہیں اور ہمارے ویسے ہی تعلقات بھی ہیں۔"

ہمیں نہیں مانتا۔۔۔ کہ وہ مان گئی ہو۔"

"معلوم ہے اس نے ایک دن کیا پاگل پن کیا؟" غالب ہنس [illegible] "میرا خیال ہے کہ یہ بدہضمی تھی یا شاید ہچکی آئی۔ اس نے ڈاکٹر انکل کی وائف سے کہا کہ خالہ میں امید سے ہوں۔"

افسوس کی بات تھی مگر مجھے بھی بے ساختہ ہنسی آئی "یار چل تو اب اس سے شادی کر ہی لے۔"

"اب تو زیادہ مشکل ہو گیا ہے؟"

"وہ کیوں؟"

"یار پہلے اسے یقین دلاؤں کہ شادی وادی کچھ نہیں ہوئی تھی اور ابھی تک یہ سب ڈرامہ تھا۔ میں اسے بے وقوف بنا رہا تھا۔ وہ تو جان سے مار ڈالے گی مجھے یا پھر پاگل ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ مشکل تو ہے۔ خیر اس کا بھی کوئی حل تلاش کر لیں گے۔"

"اتنا عرصہ میں اس پریشانی میں جلتا رہا۔ صبح سے شام تک شوہر کا رول کرتا اور ساتھ ہی خود کو شوہر بننے سے بچاتا۔"

"یہ ڈاکٹر انکل کو معلوم تھا؟"

"ہاں۔ انہوں نے میری مدد نہ کی ہوتی تو میں بھاگ جاتا نازو کو چھوڑ کے۔"

"اس مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں بتایا؟"

"ان کا بھی یہی کہنا تھا کہ سب خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ جب اس کا رابطہ پھر زندگی کے حقائق سے ہوگا تو نازو خود سمجھ جائے گی کہ خواب اور خیال کو اس کے تصور نے حقیقت بنا رکھا تھا۔ جیسے آدمی فلم دیکھتے ہوئے بھول جاتا ہے کہ وہ فلم دیکھ رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ اندھیرے میں اس کے سامنے اسکرین پر جو کچھ ہے محض ایک عکس ہے۔ اس کے باوجود لوگ تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ جب ہیرو کے ہاتھوں ولن کی درگت بنتی ہے اور خواتین خوب آنسو بہاتی ہیں جب ظالم شوہر یا سوتیلی ماں کے ظلم کے المناک مناظر سامنے آتے ہیں۔ جذبات کا کھیل ایسا ہی ہوتا ہے۔ تو بھی جب تین گھنٹے بعد ہال سے باہر آتا ہے تو نارمل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اچانک نازو بھی نارمل ہو جائے گی۔"

"مطلب یہ کہ اسے سنیما ہال سے نکالا جائے۔"

"ہاں۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے۔"

"او کے۔ صبح ہم ڈاکٹر انکل سے اجازت لیں گے اور تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"شاید وہ اتنی جلدی اجازت نہ دیں۔"

"ہم ان سے کب اجازت مانگ رہے ہیں۔ ہم تو بس شکریہ ادا کریں گے اور کہیں گے کہ خدا حافظ۔ نازو بھی ٹھیک ہے اور غالب بھی۔ جو ایک دو فیصد خرابی ہے کہیں تو ہم سب مل کے ٹھیک کر لیں گے۔"

غالب نے کہا "تم سب نے بھی ہماری کوئی خبر نہیں لی۔"

"خبر کیا لیتے۔ ہم خود خبر بنے ہوئے تھے۔ خبروں کی زینت تھے۔"

غالب نے معذرت کی "میں نے تو اخبار بھی نہیں دیکھا عرصے سے۔"

"ہاں۔ آپ تو دوسری دنیا میں تھے۔ آدم و حوا کی حیثیت میں۔"

"شجر ممنوعہ اور شیطان کے ساتھ۔ خیر چھوڑ اب اس ذکر کو۔ یہ بتا خبریں کیا تھیں؟" غالب بولا۔

میں نے گھڑی دیکھی "ایک بج رہا ہے بیٹے۔"

"بجنے دے۔"

"بیوی مارے گی۔ پوچھے گی کہاں آوارہ گردی کر رہے تھے۔ یہ بیویاں بہت چڑتی ہیں ایسے نکھٹو یاروں سے جن کی صحبت میں وہ گھر کا راستہ بھول جائیں۔"

غالب نے کہا "میں مار کھاؤں گا۔ پہلے بھی کھاتا تھا۔ اور زندگی بھر کھاؤں گا شاید۔ بیوی ہی قسمت سے ایسی ملی ہے، مار دھاڑ سے بھرپور۔"

میں نے خاصے اختصار سے کام لیا اور اسے تازہ ترین صورت حالات سے آگاہ کر دیا۔ ہم ٹہلتے ہوئے واپس پہنچے تو رابعہ اور نازو مختصر سے باغ میں کرسیوں پر بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ طنز سے کہیں گی کہ آ گئے خیر سے لوٹ کے گھر۔ اور ہم بدھو کی طرح سر جھکا کے کہیں گے کہ ذرا کچھ دیر ہو گئی مگر انہوں نے تو ہمارے آنے کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ وہ اپنی باتوں میں اتنی منہمک تھیں کہ انہیں ہمارے اندر جانے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد ہم نے باہر آ کے انہیں ڈانٹا کہ کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ پتا ہے کیا بجا ہے؟"

رابعہ نے کہا "معلوم ہے۔"

"خود سونے کا ارادہ نہیں ہے تو ہمیں سونے دو۔" غالب بولا۔

"سو رہے تھے تو اٹھ کے کیوں آئے۔ ہمیں چکر دیتے ہو؟" رابعہ بولی۔

"ہمارے پاس اب کچھ نہیں ہے تمہیں دینے کو۔ چکر شکر۔" میں نے کہا۔

"ویسے بھی ہم کچھ لے تو نہیں رہے ہیں تم سے اگر چکر دے رہے ہیں تو تمہیں کہنا چاہیے تھینک یو۔" غالب نے کہا۔

میں نے اور غالب نے ڈرائنگ روم کے قالین پر کشن ڈال کے ڈیرا جمایا اور لیٹتے ہی سو گئے۔ غالب نے لیٹتے ہوئے کہا "اللہ کا شکر ہے۔ آج تو چین سے سونا نصیب ہوگا۔"

میں نے کہا "بیٹے تمہاری عادت تو نہیں بگڑ گئی۔ مجھ سے ذرا دور رہنا ورنہ ایسی لات ماروں گا کہ فٹ بال کی طرح کھڑکی سے باہر جا کے گرے گا۔"

www.paksociety.com

صبح ناشتے کی میز پر پہنچنے سے پہلے رابعہ نے مجھے پکڑ لیا۔ وہ سخت تشویش میں مبتلا تھی۔ "یہ نازو کا کیس تو بہت سیریس ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "میرا اور تمہارا کیس بھی خاصا سیریس ہے۔"

"وہ... پاگل لڑکی کہہ رہی تھی کہ وہ اُمید سے ہے۔"

"اللہ مبارک کرے۔" میں نے کہا "کیا تم نہیں ہو؟"

"سکندر۔ یہ بدتمیزی ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا ہے کہ کیا مستقبل کے بارے میں تم پُرامید بھی نہیں ہو" میں نے معصومیت سے کہا "وہ تو میں بھی ہوں۔"

وہ ہنس پڑی "مگر آخر ہو گا کیا......؟"

"لڑکا یا لڑکی" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بے ہودہ نگوڑا کہیں" اس نے مجھے تکیے سے مارنا شروع کیا۔

"اُف۔ آخر تم پر بھی اثر ہو گیا نا" میں نے اپنا دفاع کیا "پورا جملہ سنا نہیں گالی گلوچ شروع کر دی۔ میں کہنے والا تھا کہ لڑکا یا لڑکی کچھ نہیں ہو گا تم بالکل فکر مت کرو۔ میں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔"

وہ چلانے لگی "پاگل ہو گئے ہو' تم کچھ نہیں ہونے دو گے' وہ کیسے؟"

میں نے کہا "یہ بھی شادی کے بعد بتاؤں گا۔ اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں جتنا کہ نظر آتا ہوں۔ ہماری حکومت خود چاہتی ہے......"

"سکندر...... سکندر۔ میں قتل کر دوں گی تمہیں" وہ دانت پیس کے بولی "میں نازو کی بات کر رہی تھی۔"

"میں بھی نازو کی بات ہی کر رہا تھا" میں نے کہا "اپنی نسل ہمارے تو سال میں دو ہوں گے۔ ربیع کی فصل اپریل میں اور پھر خریف کی نومبر میں۔"

وہ ضبط کی کوشش کے باوجود ہنس پڑی "سخت ذلیل اور بے شرم چیز ہو۔"

"دیکھو ڈارلنگ۔ جو بھی نازو نے تمہیں بتایا ہے ماکل رات' وہ سب غلط ہے۔ بے بنیاد ہے' بکواس ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"جب تمہارے راز و نیاز جاری تھے نا۔ تو میں نے تمہاری صورت بھی ملاحظہ فرمائی تھی اور تمہاری نازو کی شکل بھی۔ وہ تو خیر ہے ہی پاگل۔ تم اس سے زیادہ پاگل ہو رہی تھیں۔ جیسے دلہن شب عروسی کے بعد میکے لوٹتی ہے تو سہیلیاں گھیر لیتی ہیں اسے اور پھر انتہائی سنسنی خیز مگر شرم کے قابل آپ بیتی بڑے خشوع و خضوع سے سنتی ہیں' ایسے ہی تم بھی سن رہی تھیں۔ نازو نے تمہیں جو بتایا' سب تصوراتی ہے' غیر حقیقی ہے۔ اس کی خواہشات کا عکس ہے جسے اس نے حقیقت بنا لیا ہے اور اس کو تسلیم بھی کر لیا ہے۔"

"غلط خیال ہے آپ کا۔ اس نے اتنی تفصیل سے......"

"اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ میں آپ کو سنا سکتا ہوں میرے دماغ میں بھی سارے نزلے ہیں۔ کچھ فلموں کے کچھ ناولوں کے۔ کچھ اپنے مشاہدے کی بات ہے۔ بے وقوف لڑکی کیا میں تمہیں ملکہ الزبتھ کے ساتھ بکنگھم پیلس کے اندر اس کی خواب گاہ کا حال سنا سکتا ہوں۔ یہ بتا سکتا ہوں کہ اس نے مجھے کیسے چوری چھپے بلایا۔ کیسے میں اندر پہنچا اور پھر صبح تک ملکہ عالیہ نے کیا کہا اور کیا کیا۔ صبح مجھے کیسے نکالا گیا۔ باعزت طور پر۔ کون سی شاہی گاڑی مجھے چھوڑنے گئی۔ اور یہ سب اتنا سچ ہو گا کہ تمہارے حسن مجرا باپ کی۔ کوئی بھی تصدیق کر لے۔ اگر ایک لفظ غلط ثابت ہو جائے تو میں مجرم۔ میں نے ملکہ کو دیکھا ہے۔ اس کے بیٹے بہو کی تصاویر دیکھی ہیں۔ لندن میں تھا تو شاہی گاڑیاں آتے جاتے دیکھی ہیں۔ بکنگھم پیلس کے باہر کھڑے ہوئے سنتریوں کو سیاح ہر روز آتے جاتے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ شاہی محل کے خدام خاص اور عملے کے ذرائع سے محل کے اندر کی ایسی ایسی کہانیاں وہاں کے ان اخباروں میں شائع ہوتی ہیں جو بے پر کی اُڑانے میں مشہور ہیں اور جنہیں یہ چیتھڑے کہتے ہیں۔ وہاں TABLOIDS کہا جاتا ہے۔"

رابعہ میری بات نہیں سن رہی تھی بلکہ اس جھوٹ پر غور کر رہی تھی جو گزشتہ شب نازو نے بڑی تفصیل سے اور پورے اعتماد کے ساتھ بولا تھا۔

"ساری بات تمہیں پھر بتاؤں گا۔ غالباً کوئی ہمیں پکار رہا ہے۔"

"ناشتے کے لیے آوازیں دے رہا ہو گا۔ کچھ معلوم ہے کیا وقت ہوا ہے؟"

"یہ وقت ہے شگفتہ گلہائے ناز کا" میں نے اس کے گال چٹکی لینے کی کوشش کی۔

اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور کھڑی ہو گئی "گیارہ بج رہے ہیں۔ غالب تو عادی ہو گیا ہے صبح سویرے اٹھ جانے کا۔ نازو نے مجھے دس بجے اٹھایا۔"

"مگر تم نے مجھے کیوں اُٹھایا۔ میں ایک خواب دیکھ رہا تھا سنو گی؟"

"جی نہیں' ایک خواب کل رات تین گھنٹے سن لیا۔ وہ کافی ہے اب چلو۔ ہم یہاں رہنے نہیں آئے ہیں۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا "رائٹ۔ ہم غالب اور نازو کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ ڈاکٹر کریک کدھر ہے؟"

"شرم کرو کچھ۔ ڈاکٹر انکل نہیں کہہ سکتے۔ وہ گئے اپنے کلینک۔ گھر میں صرف ان کی ماڈرن بیگم ہے۔"

"ہم کلینک جا کے ان سے مل لیں گے اور اخلاقاً اجازت بھی لے لیں گے" میں نے کہا۔

"لیکن اس حالت میں۔"

بیٹھنے والا آدمی نہیں تھا۔ ایڈمنسٹریٹر اس کی بیوی تھی جو اسٹور میں نہ جانے کیا چیک کر رہی تھی۔ اس نے کہا کہ مجھے تو کوئی زحمت نہیں ہے۔ تم خود تلاش کر لو۔ وہ اندر ہی کہیں ہو گا۔

ہم اس کے تعاقب میں تین مختلف وارڈز سے گزرے۔ پہلا وارڈ ابنارمل مریضوں کا تھا۔ یہ لوگ دیکھنے میں بالکل نارمل نظر آتے تھے اور ان کے آپس میں ملنے جلنے یا باہر جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ سب اپنے اپنے گھر کے کپڑوں میں تھے' ان میں سے کچھ اخبار پڑھ رہے تھے اور فضول خبروں پر بے سروپا بحث میں مصروف تھے۔ یہی ان کے ابنارمل ہونے کا ثبوت تھا۔ ایک بیٹھے ہوئے افراد لطیفے سنا کے ایک دوسرے کو ہنسانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے لیکن لطیفہ سننے کے بعد سب سیریس بیٹھے رہتے تھے اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے کہ یہ کیا بات ہوئی؟ ہم سے کچھ لوگوں نے تپاک سے مصافحہ کیا اور ہماری خیریت یوں پوچھی جیسے ان سے ہمارے پرانے مراسم تھے۔

ڈاکٹر پہلے وارڈ کا دورہ کر کے دوسرے میں جا چکا تھا۔ دوسرے وارڈ کے مریض واقعی پاگل نظر آتے تھے لیکن وہ سب بے ضرر لوگ تھے۔ ایک شخص اپنے تکیے کو سامنے بٹھا کے اس سے باتوں میں مصروف تھا۔ اس کے خیال میں وہ تکیہ اس کا نالائق بچہ تھا جو پھر حساب میں فیل ہو گیا تھا۔ وہ اس سے بہت خفا تھا۔ دوسرے بھی ایسی حرکتیں کر رہے تھے۔ ایک شخص بلاوجہ ہنس ہنس کے دُہرا ہو رہا تھا۔ دوسرا اسے بڑی اداسی سے دیکھ رہا تھا۔ تیسرا اپنے بیڈ پر سر کے بل کھڑا ہونے کی کوشش میں بار بار گرتا تھا۔ کچھ لوگ یہ تماشا بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ آج تک وہ دنیا کو اُلٹا دیکھتا رہا۔ آسمان نیچے ہے اور زمین اوپر۔ ایک شخص بار بار اسے سمجھانے میں مصروف تھا کہ وہ ٹانگیں نیچے لٹکوا لے اور سر اوپر۔ ورنہ ایسے وہ دنیا کو ہمیشہ اُلٹا دیکھے گا۔ آخر باقی سب نے بھی تو ایسا ہی کیا تھا تب جا کے یہ دنیا سیدھی نظر آئی تھی۔ ڈاکٹر اس وارڈ سے بھی رخصت ہو گیا تھا۔ تیسرے وارڈ میں ہم نے اسے پکڑ لیا۔ اس وارڈ میں وہ ذہنی مریض تھے جو دورے کی کیفیت میں خطرناک ہو جاتے تھے اور کچھ بھی کر سکتے تھے۔ وہ کپڑے پھاڑ سکتے تھے یا دیوار سے ٹکرا کے سر۔ کسی پر حملہ کر سکتے تھے یا ہاتھ میں خنجر آ جائے تو اپنا ہی گلا بھی کاٹ سکتے تھے۔ ظاہر ہے ان کو خصوصی توجہ کی ضرورت تھی۔ یہ کسی اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے شعبے یا ICU کی طرح تھا۔ دورے کے آثار نمودار ہوتے ہی صحت مند وارڈ بوائے اور ڈاکٹر مریض کو دبوچ لیتے تھے اور اسے انجکشن دے کر سلا دیتے تھے یا بے بس کر دیتے تھے۔

ایسا ہی ایک اسپتال وزیر خان ٹرسٹ اسپتال تھا لیکن جو سلوک مریضوں کے ساتھ وہاں ہوتا تھا یہاں اس کے برعکس تھا۔ یہاں مریضوں کو محبت' ہمدردی اور توجہ بھی ملتی تھی اور ان کا علاج کیا ہوتا تھا۔ یہاں ذہنی صحت کی نعمت سے محروم ہو جانے والے

میں نے کہا "اگر نازو یہاں رہے گی تو اپنی خیالی دنیا سے باہر نہیں آئے گی۔ اسے ہمارے ساتھ رہ کے اندازہ ہو گا کہ حقیقت وہ نہیں تھی جو اس کے خیالوں کی دنیا میں نظر آ رہی تھی۔ یہ ضروری ہے کہ وہ اصل حقیقت کا سامنا کرے' اسے خود دیکھے اور محسوس کرے۔ اس کا دواؤں سے جس حد تک علاج ممکن تھا اور ضروری تھا' وہ سب ہو گیا۔ اب اسے شاک ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ میں اور غالب کل ساری صورت حال کو پوری طرح ڈسکس کر چکے ہیں۔"

میرا اور غالب کا خیال بہت جلد حقیقت کا کرشمہ بن کے سب کو حیران کرنے والا تھا مگر اس کے اوّلین آثار میں نے فوراً ہی محسوس کر لیے۔ ناشتے کی میز پر غالب کی کوشش تھی کہ وہ نازو سے اداسی اور خاموشی کا سبب پوچھے اور اسے ہنسائے مگر وہ نہ جانے کیوں خاموش تھی اور نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ نظر اٹھا کے یوں رابعہ کو دیکھتی تھی جیسے اس سے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر اس میں کہنے کی ہمت نہیں ہے یا اس کے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے وہ اپنا مافی الضمیر پوری طرح بیان کر سکے۔

بالآخر رابعہ کے پوچھنے پر اس نے کہا "رابعہ باجی۔ کیا میں جھوٹ بولتی ہوں؟"

رابعہ نے کہا "نہیں۔ یہ خیال کیوں آیا تمہیں؟"

"ایسے ہی۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے کل رات میں نے آپ کے سامنے بہت جھوٹ بولا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"اس وہم کو دل سے نکال دو۔ تم ہم سے کیسے جھوٹ بول سکتی ہو بھلا" رابعہ نے کہا۔

اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ سر ہلایا "یہی میں سوچ رہی تھی کہ مجھے ایسا خیال کیوں آیا۔ آپ سے تو کچھ پوشیدہ نہیں۔ آپ میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ ہم سب ایک ہیں۔"

میں نے کہا "چلو اب فافٹ ناشتا ختم کرو۔ ہمیں جانا ہے۔"

"کہاں جانا ہے؟" نازو کا سوالیہ چہرہ اُمید خوشی کی تصویر بن گیا۔

میں نے ہنس کے کہا "کیا ساری عمر رہنے کے لیے آئی تھیں یہاں۔ بھئی بہت ہو گیا بیماری کا ڈراما۔ اب چلو ہمارے ساتھ۔ تمہارے بغیر سب بہت اداس رہتے ہیں۔ بہت مس کرتے ہیں تمہیں۔"

"سچ سکندر" وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی "سب یاد کرتے ہیں مجھے۔ میں بھی بہت تنگ تھی تم سب کے بغیر۔ پلیز مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔"

"یہ پلیز کہنے کی کیا ضرورت تھی خاتون جب ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ تمہیں ہمارے ساتھ جانا ہے۔ ہم اسی لیے آئے تھے" میں نے کہا۔

ڈاکٹر ہمیں اپنے اسپتال میں دیکھ کے حیران ہوا۔ وہ آفس میں

www.paksociety.com

انسان جب لوٹ کر اپنی دنیا میں جاتے تھے تو زندگی کی ساری خوشیاں انہیں منتظر ملتی تھیں۔ ڈاکٹر شاہ کے پاگل خانے میں وہ آتے تھے جن سے زندگی کی خوشیاں چھین لی جاتی تھیں اور انہیں وہاں اس لیے چھوڑا جاتا تھا کہ وہ پھر لوٹ کے اپنی دنیا میں جانے کے قابل نہ رہیں۔ ایک ڈاکٹر اور دوسرے ڈاکٹر کے مقصد حیات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک ڈاکٹری کے مقدس پیشے کے نام پر بدنما داغ تھا۔ دوسرا اس پیشے کی تقدیس کا رکھوالا۔

اس نے مجھے اور غالب کو دیکھا تو حیران ہوا "تم ادھر آگیا داخل ہونے کا واسطے آیا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں انکل۔ اب میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"جس آدمی کو یہ معلوم ہو۔ وہ ٹھیک ہے۔ جو دنیا کو پاگل سمجھتا ہے۔ وہی پاگل ہوتا ہے۔"

غالب نے کہا "اکثریت میں وہ ہیں جو آپ کو کریک سمجھتے ہیں۔"

وہ ہنسا "یاد رکھو! پہلے اکثریت ہمیشہ غلطی پر ہوتی ہے۔ حقیقت تو بہت کڑوی چیز ہے۔ اسے تو آہستہ آہستہ قبول کرتا ہے۔ بڑی مشکل سے اور بہت مزاحمت کے بعد۔ میں نے بتایا تھا … کر برالفت جیسی جینیوں اور موجودہ لوگوں کی اکثریت نے کیا کیا تھا اور کتنا پریشان کیا تھا لیکن سچ بالآخر غالب آجاتا ہے۔ کبھی اس میں سینکڑوں سال بھی لگ جاتے ہیں۔"

"ہم اس لیے آئے تھے کہ اب آپ ہمیں اجازت دیں۔"

"کس بات کی اجازت" وہ مریضوں کو بھی دیکھ رہا تھا۔

"جانے کی۔ ہم سب جانا چاہتے ہیں۔"

"تو جاؤ بابا۔ کس نے روکا ہے۔ اپنی مرضی سے آیا تھا تم ابھی میری مرضی سے کیوں جانا چاہتا ہے۔"

"اس لیے کہ ڈاکٹر آپ ہیں" غالب نے کہا۔

"ڈاکٹری ضرورت ہوتی ہے مریض کو۔ بیمار کو" وہ مسکرایا۔

مطلب خود ہم نے سمجھ لیا۔ اس کی طرف سے این او سی مل گیا تھا۔ نازو اور غالب کو اب کسی دوا علاج کی ضرورت نہیں۔ غالب کچھ نروس نظر آرہا تھا مگر نازو پر تو وحشت سوار تھی۔

"جلدی چلیں یہاں سے" نازو نے کہا۔ "یہ تو بری جگہ ہے"

میں نے کہا "کونسی جگہ؟"

"جہاں۔۔۔ انہوں نے مجھے باندھ کے رکھا تھا۔ مجھ پر تشدد کیا تھا۔ بجلی کے جھٹکے دیے تھے مجھے۔ ڈاکٹر شاہ نے۔"

غالب نے اس کی ناشتہ میں سہلایا "یہ ویسی جگہ نہیں ہے نازو۔ یہاں تو ڈاکٹر انکل ہیں۔"

"نہیں۔ لیکن باقی سب تو وہی ہیں" وہ چلانے لگی "یہ پاگل نہیں ہیں۔ انہیں پاگل بنایا جا رہا ہے۔"

غالب نے کہا "نہیں نازو۔ ان سب کا علاج ہو رہا ہے۔"

"جھوٹ۔ وہ بھی ایسا ہی ظاہر کرتے تھے۔ یہی کہتے تھے خدا کے لیے یہاں سے چلو۔ ورنہ میں بھاگ جاؤں گی۔ میرا دل گھبرا رہا ہے یہاں۔ پتا نہیں کیا ہو رہا ہے مجھے۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس ماحول کا اثر نازو کے اعصاب پر ضرور پڑا ہے مگر اس کا فائدہ بھی ہوا ہے۔ اس نے منفیت … کیا ہے۔ اس کے ذہن کے نہاں خانے کھل گئے ہیں۔ اسے شاید یاد آگیا۔ اور وہ سلوک جو اس کے ساتھ … اسپتال میں ہوا تھا۔ تاہم اس کے اعصاب فی الحال اتنی … برداشت کر سکتے تھے اور غالب فوراً اسے وہاں سے نکال لے آتے۔ نازو اب بھی نروس تھی۔ اس نفسیاتی … لوگوں کو دیکھ کر وہ سب یاد دیا اس کے شعور تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کلبلانے لگی تھیں جن کو اس نے ابھی تک … خوف کے باعث ذہن کی تاریک گہرائی میں کہیں تحت الشعور کر دیا رکھا تھا۔ اگر ہم وہاں زیادہ دیر قیام کرتے اور اس کے سامنے کوئی مریض چیخنے چلانے لگتا تو شاید نازو کی قوت برداشت بھی جواب دے جاتی۔

غالب نے بھی باہر آ کے خود کو زیادہ پراعتماد محسوس کیا تھا۔ نازو نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ اس بچے کی طرح جس نے اجنبی شہر کی بھیڑ میں گم ہو جانے کے ڈر سے والدین کی انگلی تحفظ کی ضمانت سمجھ لیا ہو۔

رابعہ کی گاڑی میں بیٹھ کے نازو پر وحشت کا اثر تو کم ہو گیا مگر وہ کچھ خائف اور خاموش ہو گئی۔ وہ گاڑی سے باہر دیکھتی رہی اور منصور مقامات پر اس نے بہت سی پرانی باتیں … سب کی تھیں۔ اس کے حافظے کا انتشار ختم ہونے لگا تھا اور اس کی سوچ پرانے راستوں پر آرہی تھی۔

ہم وقار یوسف کے گھر پہنچے تو وہاں نگی اور محسن ہم سے پہلے پہنچ چکے تھے اور ہماری پراسرار گمشدگی کے مضمرات پر غور کرنے کے لیے ایک ہنگامی اجلاس میں خاصا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ جیسے رابعہ کو اور مجھے اور پھر ہمارے ساتھ غالب اور نازو کو دیکھ کے خاموشی چھا گئی۔

نگی سب سے پہلے چیخ مار کے بھاگی اور اس نے راہ میں حائل پانی کا ایک جگ گرا دیا۔ بوبی کو پھلانگ گئی۔ بوبی ڈر کے … وقار صوفے سے چھلانگ لگا کے اور قالین پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ہوا تھا۔ نگی ٹھوکر کھا کے گرتے گرتے بچی۔

"نازو۔ نازو تم آگئیں۔۔۔ کتنی خوشی ہو رہی ہے مجھے" وہ نازو سے لپٹ گئی۔

پھر نگی نے دوڑ لگائی اور بوبی جو پہلے بچ گیا تھا اپنی جان والدہ کی یلغار سے نہ بچ سکا۔ وہ گرا تو اسے وقار یوسف نے تھام لیا۔

"بار حشت۔۔۔ تیرا ہی آسرا" وقار نے بوبی کو خاموش کراتے ہوئے کہا "نازو آئی ہے کہ قیامت آگئی ہے۔"

محسن بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "ان سب کا ایک ساتھ …

… کے بول چاہے دے کر نکل جانے کا نہیں تھا۔ … نے اسے انا کا مسئلہ بنا کے جان دے دی" رابعہ نے افسوس …

"… زیادہ جذباتی اور حساس آدمی تھا" محسن بولا "زمانہ ایسا … چوہدری ولاور کی طرح بے حس بلکہ بے غیرت … کو اہمیت نہ دیتا ہو۔ زبان خلق اور نقارہ خدا … عزت کو دولت کی طرح آنی جانی اور خرچ ہو جانے والی اور چھنی جانے والی چیز سمجھتا ہو۔ … سکتا ہے۔"

"اور صدیقی ایسا آدمی نہیں تھا۔ شاید ولاور اسے بے وقوف …"

… بولا "سکندر اس معاملے میں چوہدری ولاور کا ہم خیال … ہے"

… نے اس کی تردید نہیں کی "ہاں۔ مرنے والے میں … تھیں جن کا میں اعتراف کرتا ہوں مگر یہ خامی سب سے بڑی … کہ جذبات پر کنٹرول نہیں تھا اور مزاج میں انا پرستی یا خودداری … سے بڑھی ہوئی تھی۔ اہانت ہو تو ایک ناکامی پر زندگی قربان نہ کرتا۔ زندگی بہرحال خدا کی امانت ہے اور ایسی ہزار ناکامیوں پر بھی قربان نہیں کی جا سکتی۔"

وقار نے کہا "یہ تو مولا آپ نے سچ کہا آپ نے۔ مرحوم ہمارا بھی سارا تھے ہمارا … بھی ساتھ دے سکتے تھے۔ رات کو ملنے نے … زن کیا تھا … کر دیا تھا۔ اس کے اپنے الفاظ میں۔ بھوتنی کا بلدی میں مر گیا۔ ہم سے کم ہم سے تو مشورہ کر لیتا۔"

"جب نہ تھا دے گا ارشد کریم ربانی سے" محسن بولا۔

میں نے کہا "لعنت بھیجو۔ جب شیطان سے نسبت لینے … لو اب چوہدری ولاور سے تنتے ہیں تو یہ تو شیطان کا چیلہ ہے"

"یار۔ انگریزی کا محاورہ مت بھولو کہ وہ شیطان زیادہ خطرناک ہے جسے آپ نہیں جانتے۔"

نگی اور نگی کی مشترکہ کوشش سے نازو پھر ہوش میں آگئی تھی اور اب وہ دونوں پھر رو رہی تھیں لیکن اس بار طوفان کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ یہ بعد میں محسوس ہونے والی ہوا تھی۔ ہم اٹھ کے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ وقار نے خالص شوہرانہ رعب کے ساتھ نگی کو حکم دیا تھا کہ چائے حاضر کرے لیکن اس باغی حسینہ نے … اعلان کی اور وقار کو بے وقار کرتے ہوئے تکا سا جواب دے دیا "کر لو۔"

ہم کچن میں تشریف لے گئے۔ وقار نے چائے بنانے کا عمل شروع کیا "سکندر صاحب بھی کم جذباتی نہیں ہیں۔ اس وقت تمہیں ناکام کر کے چلے گئے۔ رات کو تم سے فون پر بات کرنا چاہتے تھے کچھ پشیمان تھے اور کچھ پریشان۔ میں نے کہا کہ وہ دونوں تو پا…

کے آنے سے کم بھی نہیں۔"

نازو اپنی محبت کا اظہار برداشت نہ کر سکی۔ اس نے دشمنوں کے درمیان ایک انتہائی عذاب ناک اور پژمردہ وقت کی بھی سزا کاٹی تھی اور کسی حد تک وہ سب سے بچھڑ کے اپنا بچپن بھی کھو چکی تھی کہ ہم سے پھر ملاقات ہو گئی۔ وہ آنسوؤں کی بے تابی یلغار میں بہہ گئی اور دونوں ملیں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ خود نگی اور نگی کی پوری کوشش تھی کہ آنسو بہانے کے اس مظاہرے یا مقابلے میں بھرپور شرکت کریں حالانکہ ان کا فرض تھا نازو کو تسلی دے کر پرسکون کرنا۔

نازو روتے روتے بے ہوش ہو گئی تو نگی اور نگی کو اپنا فرض یاد آیا۔ انہوں نے اسے فوراً بستر پر لٹا دیا۔ ایک پانی لینے دوڑی دوسری اسے پنکھا جھلنے لگی۔ ان کا رونا کچھ کم ہو گیا۔

وقار یوسف اور محسن کو نازو سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ پھر بیٹھ گئے اور نگی نے نازو پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے وقار کو ڈانٹا "تم سے کہہ ڈاکٹری کو فون کرو۔"

"کیا مطلب۔ جو تم سے کہہ ڈاکٹر ہو۔ یعنی کچھ عذاب ہوا بہت ہو۔" وقار نے کہا "ویسے تو میں بھی ڈاکٹری کر لیتا ہوں۔"

"مجھے تو محبت کرنے سے زیادہ علاج کرنا آتا ہے۔ خصوصاً ان بیویوں کا جن کے دماغ میں خرابی ہو" محسن بولا۔

"بیویوں کے پاس دماغ ہوتا کہاں ہے جس کا آپ علاج کریں۔ یہ کیوں کہ ان کا مزاج درست کر سکتے ہو۔" وقار بولا۔

"کیا سمجھو تم۔ اب دیکھو میری بیوی رو رہی ہے۔ … لگ رہے ہیں اس کی یاد اپنی آنکھوں میں بہتی آنسو …"

وقار نے کہا "اور میری گھر والی کی اکھڑی آنکھوں میں خشکی آنسو"

میں نے کہا "رونے سے آنکھیں دھل کے صاف ہو جاتی ہیں۔"

محسن بولا "اچھا۔ تو آپ بھی ہیں یہاں؟ آپ کو بھول ہی گیا تھا میں۔ اور خیر سے مس رابعہ قاری بھی ساتھ ہیں۔"

وقار نے کہا "اب پوچھنا ان سے … ڈرتے کیوں ہو۔ پہلے تو بہت بول رہے تھے کہ آ جائیں تو دونوں فرار کر دو۔"

"میں نے فرار کرو نہیں کہا تھا۔ بدمعاش اور لوفر کہا تھا" محسن بولا "میں خفا اتنے غصے میں کہ سکندر کو گنجا کرا دیا اور رابعہ کا نکاح پڑھوا دیا اس سے۔ مگر یہ نازو اور غالب کو ساتھ لے آئے ہیں اس لیے معاف کیا۔"

رابعہ ہنسی "کل شام تو سکندر اتنا مشتعل تھا کہ ہماری ہمت نہیں پڑی گھر آنے کی۔ اب کیا حال ہے اس کے غصے کا۔"

"یہ غصہ نہیں دکھ تھا۔ ناکامی کا ملال تھا" محسن بولا۔

"ملال تو ہمیں بھی تھا" ناکامی سے ہم بھی دل برداشتہ تھے لیکن آدمی مقدر سے نہیں لڑ سکتا" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

نہیں کدھر بھاگ گئے اور کیا کیا لوٹ کے لے گئے۔ ممکن ہے رلاور کے گھر پہنچ چکے ہیں ہاتھ جوڑ کے معافی مانگتے اور آپ اسی کے سائے عاطفت میں اپنی زندگی سکھ چین سے بسر کریں۔ اس پر بگڑ گئے کہ وقار تم بھی کسی دن بہت مار کھاؤ گے مجھ سے بھوتنی کے۔ اسے وہ سکندر بڑی زعیب چیز ہے ہم سے بھی زیادہ۔ ہم جانتے ہیں وہ پھر رلاور کو پکڑنے کے لیے نکل گیا ہوگا۔ ابھی اس چھکے چھکے۔ سوری تم چلو کہا تھا اس نے تم چلا محسن کو کہا تھا۔"

محسن نے سہلایا "رلاور اب آسانی سے ہاتھ نہیں آئے گا۔"

میں نے کہا "پہلے وہ کب آسانی سے پکڑا گیا ہے۔ درست۔ اسے ہر مشکل سے پکڑلیں گے۔ بچ کے جائے گا کہاں۔ دنیا تو بہت چھوٹی سی جگہ ہے۔"

وقار غالب کی طرف متوجہ ہوا "اب کیا حال ہے آپ کے اس نام نہاد رابطے کا۔ جس میں نازو کے عشق سے خلل واقع ہو گیا تھا۔"

غالب نے کہا "تجھ بہت بولنے لگا ہے۔"

"میں شادی شدہ اور اب بالغ بھی ہوں" وقار بولا۔

"ہم ذہنی بلوغت کی بات کر رہے تھے۔"

"نازو بھی ٹھیک ہو گئی ہے اب؟" محسن نے کہا۔

"ہاں لیکن پوری طرح جب وہ یہاں ہم سب کے ساتھ رہ کے ہوگی۔ یہ میری نہیں ایک مستند ڈاکٹر کی رائے ہے جو اس کا معالج بھی تھا۔"

کچن میں ایک ہی اسٹول تھا جس پر خود صاحب خانہ تشریف فرما تھے۔ میں اور محسن کچن کے سلیب پر بازی لگا کے بیٹھے رہے اور چائے بن گئی تو لے کر پورچ میں چلے گئے جہاں گارڈن چیئرز پڑی ہوئی تھیں۔

"مجھے رات ہی کو سکندر نے وہ سب بتایا جو میری عدم موجودگی میں ہوا" غالب نے کہا۔

"رات ہی کو نازو نے بھی رابعہ کو بہت کچھ بتایا۔" میں نے کہا "جو بتانے کے قابل نہیں۔"

غالب بولا "لیکن رابعہ نے تمہیں بتایا ہے شری لی بھی حد ہوتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ صدیقی کے جسد خاکی کو اسلام آباد روانہ کر دیا گیا ہے۔ تدفین وہیں ہوگی۔"

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا" میں نے افسوس سے کہا۔

"چوہدری دلاور نے اس طرح فرار ہو کے خود اپنے پاؤں پر ایک اور کلہاڑی ماری ہے۔ وہ پہلے ہی مفرور اشتہاری مجرم تھا" محسن بولا۔

"اسے کسی بات سے فرق نہیں پڑتا۔ ممکن ہے اس وقت جب ہم اس کو پھر گرفتار کرنے کے خیالی منصوبے بنا رہے ہیں کسی جہاز میں لندن کی طرف پرواز کر رہا ہو" میں نے کہا "کون جانتا ہے۔ تم آگے اور ہم پیچھے۔"

محسن بولا "میرا خیال ہے کہ وہ ملک سے فرار نہیں ہوگا اس کے کچھ سیاسی عزائم ہیں۔ وہ اپنا مجرمانہ ریکارڈ ختم کرا جائے گا کہیں ریفرنس کچھ نہیں۔ اس سے کہیں زیادہ سنگین جرائم کر جاتے ہیں اور لوگ بھی انہیں بھول جاتے ہیں۔ جو کھاتے تھے اور جن کے خلاف مردہ باد کے نعرے لگوائے تھے۔ رہی بعد میں شرافت کی سند پا کے قوم کی قیادت کرنے جھنڈے والی گاڑی میں پھرنے ہیں تو لوگ بھی زندہ باد کے ہیں۔ مرحوم فضل حق 'کل تک صوبہ پاکستان تھے پھر غدار کہلائے بعد میں سب بھول گئے کہ وہ کیا تھے یا کیا ہیں؟ لیکن چوہدری اس وقت تک بے بس ہے جب تک وہ ہم سے یعنی ایم ایز کے با اصول اور محب وطن ارکان کے ساتھ کوئی باعزت تصفیہ کرے۔"

"بے عزت آدمی کے ساتھ باعزت سمجھوتا کیسے ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ کوشش ضرور کرے گا۔ تم شرط لگا لو مجھ سے۔ وہ ملک چھوڑ کے کہیں جائے گا اور نہ دشمنی میں پہل کرے گا۔"

"میں لگاتا ہوں شرط۔ اس کے ساتھ جو سلوک ہم نے کیا ہے وہ چوہدری رلاور جیسے شخص کو انتقام کے جذبات میں اندھا کر دینے کے لیے کافی ہے" میں نے کہا "وہ ایک زخم خوردہ سانپ ہے۔"

"وہ سانپ نہیں' انسان ہے۔ سانپ سوچتا نہیں اور انتظار نہیں کرتا ایک بار نوز خم پر ڈسنا اور نکل گیا۔ ممکن ہے کہیں انگوٹھا مار کر نہ ڈالے۔ جب چوہدری دلاور کو سخت سختی پڑتی ہے یہاں سے پیچھا لیں۔ موت اور زندگی کی کشمکش میں انتہائی ذلت برداشت کرتے ہوئے گزارے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس کی توقع سے کہیں زیادہ عبرت ناک تجربہ رہا ہے۔ سوچنے کا ... اور ... جیسا کہ تھا ... ہو جانے کا اور وہ مستقل رفتار سے کہ اسے نئی زندگی ملی ہے ایسا دوسرا چانس اسے شاید نہیں ملے گا۔ دوسری طرف مایوس ہو کے ہار ماننے والے نہیں ہیں' ہم تو اس کے نزدیک پاگل ہیں جنہیں کوئی جنون ہوتا ہے کہ اسے اپنی جان کی اور دنیا کی کوئی پروا ہی نہیں ہوتی۔ وہ شہادت کو منصب اعلیٰ سمجھتا ہے لوگ کرتا ہے خدا کی رضا کے لیے کرتا ہے۔ ایسا ہی جذبہ ہمارا ہے ہم بھی مرنے سے نہیں ڈرتے۔ جنونی ہم بھی ہیں۔ دنیاداری کا کوئی ہم نہیں رکھتے اور مقصد ہمارے نزدیک بھی زیادہ اہم ہے۔ اس کے برعکس رلاور کی ... 'اپنا کاروبار' اقتدار اور دولت کا نشہ ہے حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ وہ مرنا نہیں چاہتا۔ تب ہی ...

www.paksociety.com

حسین اور منظر کی جوڑی۔ وہاں اپنے چوہدری دلاور اور
اس کے خادم
پڑ رہے۔ اغوا اور تشدد کے مناظر، بموں کے دھماکے، جنگ
جاری۔
"شیروانی صاحب! آپ رضاکارانہ طور پر خاموش ہونا پسند
فرمائیں گے۔"
"نہیں جی! آپ بولیے۔ دنیا میں بے وقوف ہی زیادہ بولتے
ہیں۔" محسن نے کہا۔
"ابھی ہمارے پاس دلاور سے رابطے کا ذریعہ کوئی نہیں ہے۔ یہ
بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں روپوش ہو گا۔ اس کے منظر عام پر
آجانے سے پہلے اس کی بیوی اور بیٹا دونوں پیچھے ہٹ جائیں گے۔
اور یقیناً بہت خوش ہو گا کہ اس کی شریک حیات نے کھلا ثبوت
فراہم کیا کہ وہ چوہدری دلاور جیسے شخص کے لیے ہی بنائی گئی تھی۔ اس
کا خون آج بھی اس کا خون ہے۔ قاتل فرزند نے بھی اپنی عمر سے
بڑے کارنامے سر انجام دیے مگر اب دلاور انہیں بھی بچائے گا۔
اسے کوئی جلدی نہیں ہے۔ وہ دو چار ہفتے یا دو چار مہینے بالکل خاموشی
سے بھی گزار سکتا ہے لیکن ہم اسے باہر لا سکتے ہیں۔ شوکت رانا
اور ... شاہ یہ دو دروازے ہیں۔"
"چور دروازے" غالب نے میری تصحیح کی۔
"ٹھیک کہا تم نے۔ ایک چور دروازے کو ہم نے اکھاڑ پھینکا
تھا۔ اس کے خلاف قتل کا الزام تھا اور چوہدری دلاور کے اغوا کا۔
اب معلوم نہیں کہ بات صرف الزامات تک محدود رہی یا اس کے
خلاف کسی نے ایف آئی آر بھی لکھی۔ وہ اپنے اثر و رسوخ اور
پیسے کی طاقت استعمال کر کے بچ گیا تھا۔ چوہدری دلاور کی بیوی نے
اس پر نکاح حرام ہونے کا الزام عائد کیا تھا۔"
"اور بھی بہت سے الزامات تھے۔"
"ہاں۔ اور ایسی صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ چوہدری دلاور
دوبارہ اقتدار سنبھالنے کے بعد اس کے ساتھ وہی سلوک کرے جو
قزلباش نے ندیم کے ساتھ فلم بشیرا میں کیا تھا۔"
"سلاجیت میں نہ محمد علی تھا نہ ندیم۔"
"اچھا؟ معاف کرنا میں نے بھی فلم دیکھی نہیں تھی۔" میں نے
کہا "اب تم دو کوئی مثال۔"
"جو امریکا اپنے حلیف اور اتحادی دوست ممالک کے ساتھ
کرتا ہے۔" محسن نے سوچ کے کہا "کیسی ہے؟"
"فلمی ہوتی تو اچھا تھا مگر خیر۔ یہ بھی چلے گی۔" میں نے کہا
"امکان ہے شوکت رانا کی مزاج پرسی کریں اور اسے چوہدری دلاور
کے خلاف تحفظ کے لیے مشروط امداد کی پیشکش کریں۔ وہ ہمیں
چوہدری دلاور یا اس کے بیوی بچوں کے بارے میں باخبر رکھے کہ وہ
کہاں ہیں؟"
"اور ہم اس کے لیے کیا کریں گے؟ دروازے پر مورچہ بند
ہو کے بیٹھ جائیں گے یا توپ لے کر ساتھ پھریں گے تو مر کر

ہے جب اس کے مقابلے پر ہم نہ ہوں۔ یہ اس صورت میں ممکن
ہے کہ ہمارا وجود ہی نہ رہے۔ اس کے لیے وہ پوری کوشش کر کے
ناکام ہو چکا ہے۔ یا یہ کہ ہم اس سے صلح کر لیں یا ہار مان جائیں۔ یہ
سب ناممکن ہے۔ اس لیے میں دوبارہ شرط لگانے کے لیے تیار ہوں
کہ چوہدری دلاور خود ہم سے رابطہ کرے گا۔ اس بار وہ ٹھنڈے
دماغ سے بہت سوچ سمجھ کے قدم اٹھائے گا۔"
"پہلے بھی وہ ایسا ہی کرتا تھا۔"
"میرا مطلب ہے کہ وہ مقابلہ نہیں کرے گا۔ ہمارے خلاف
سازش کا نیا جال نہیں پھیلائے گا۔ چالاکی اور عیاری سے ہمیں
مات دینے کی کوشش نہیں کرے گا۔"
"پھر کیا کرے گا؟ ہاتھ جوڑ کے سامنے آجائے گا اور
سر جھکا کے کھڑا ہو جائے گا کہ میں تمہارا مجرم۔ جتنے جوتے چاہو
مارو۔ تلوار تمہارے ہاتھ میں تھما دے گا کہ میری گردن اڑا دو۔"
"رائٹ۔" محسن نے چٹکی بجا کے کہا "میری چھٹی حس کہتی
ہے۔"
"گستاخی معاف۔ چھٹی حس میری ہے۔"
"سوری۔ میری ساتویں حس کہتی ہے کہ اس بار کچھ ایسا ہی
ہو گا۔ کیسے ہو گا یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔"
غالب نے سوال کیا "ایسی صورت میں آپ کیا کریں گے
جوتے ماریں گے اس کے سر پر مجمع عام میں یا اس کا سر تن سے جدا
فرمانے کے نعرے لگائیں گے؟ وہ مارا پڑ دوالے کو۔"
"یہ ہم اس وقت بتائیں گے جب وقت آئے گا۔ ابھی تو آپ
فرمائیں کہ آپ کب تک دیوانے بن کے پھرتے رہیں گے۔"
"جب تک دیوانگی باقی ہے۔"
"یہ حرام خوری کا بہانہ ہے۔ مرزا غالب کے گھوڑے۔ تم پھر
آجاؤ میدان صحافت میں ہنہنانے کے لیے۔ ایک غازی تھا وہ بھی
شہید ہو گیا۔ اب تم ہی ہو جو آزادی کی مملکت کا چوتھا ستون۔
تلوار ہمارے ہاتھ میں ہے تم قلم اٹھا لو۔"
"کیا قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہے؟" محسن نے ایک فلسفیانہ
نکتہ اٹھایا۔
"دونوں کی اپنی طاقت ہے۔ تلوار کی نوک سے غزل نہیں
لکھی جا سکتی اور قلم کی نوک سے ہینڈز اپ نہیں کرائے جا سکتے۔"
"میرا بھی دل چاہتا ہے کہ پھر اپنے اخبار میں جا کے صحافت کی
دنیا میں جھنڈے گاڑ دوں۔"
"ہمیں جھنڈے سے زیادہ ڈنڈے کی ضرورت ہے اور اخبار
والوں کے ڈنڈے سے دنیا ڈرتی ہے۔" میں نے کہا "اس کے علاوہ
ایک انوکھا خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔ حسب معمول۔"
محسن بولا "یعنی کیوں نہ ایک فلم بنائی جائے بارہ مسالے
والی۔ اس میں سب کچھ ہو گا جو ہم نے کیا۔ عشق و محبت، ہنسی
مذاق، مار دھاڑ۔ بیک وقت تین مجنوں اور تین لیلائیں۔ کامیڈین

www.paksociety.com

چوہدری دلاور نے اسے سزائے موت دینے کا ارادہ کرلیا تو ہم شوکت رانا کو نہیں بچا سکیں گے۔ یہ بات وہ خود بھی سمجھتا ہو گا۔ اس کے سامنے اب ایک ہی راستہ ہے کہ دلاور کے قدموں میں گر جائے اور اس سے جان کی امان طلب کرے کہ حضور والا مجھے شیطان نے بہکا دیا تھا۔ مجھے ایک موقع اور دیا جائے اپنی وفاداری اور جاں نثاری ثابت کرنے کا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں چوہدری دلاور اس کی خطا کو معاف کر کے اسے خرید سکتا ہے۔ دلاور کو بھی دوستوں اور ساتھیوں کی ضرورت ہے۔ وہ اپنوں کو اپنائے گا۔ دشمن نہیں بنائے گا۔" محسن بولا۔

میں نے کہا "تب ہم ملیں گے ڈاکٹر شاہ سے۔"

محسن نے غالب سے کہا "یار۔ اس بات کا کچھ پتا چلا۔"

"کس بات کا؟" غالب چونکا۔

"وہی۔ شوکت رانا کی نازو سے شادی والا معاملہ۔"

"وہ جھوٹ ہے" غالب تیز ہو کے بولا "کیا تم اسے سچ سمجھے ہو۔ صرف ایک تصویر کی وجہ سے۔"

"تصویر نازو کی بھی تو نہیں۔" محسن نے کہا۔

غالب کا چہرہ تاریک ہو گیا "کیا تصویریں جھوٹی نہیں ہوتیں؟"

میں نے محسن کو اشارے سے روک دیا کہ غالب کی اس جذباتی کمزوری پر بات کرنے سے گریز کرے "شوکت رانا ہاتھ میں آئے گا تو خود اعتراف کرلے گا کہ اس نے جعلسازی اور فراڈ سے وہ تصویر بنوائی تھی۔"

غالب اٹھ کے اندر چلا گیا اور نازو کے پاس جا بیٹھا۔ محسن کی بات نے اسے پریشانی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ خود محسن کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ہم اندر گئے تو نازو سو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے جو سکون آور دوائیں دی تھیں یہ ان کا اثر تھا مگر نازو کے حق میں نیند بھی دوا سے کم نہ تھی۔ وہ ذہنی طور پر سخت مضطرب ہو گئی تھی۔ اسے اب احساس ہونے لگا تھا کہ وہ حقائق کی وجہ سے ڈر رہی تھی۔ اسی لیے نازو نے رابعہ سے سوال کیا تھا کہ کیا میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ اسے یاد تھا کہ رابعہ سے اس نے کس قسم کی باتیں کی تھیں لیکن ساتھ ہی اس کا یقین متزلزل ہو رہا تھا اور وہ سمجھنے لگی تھی کہ غالب سے شادی کی بات صرف فریبِ خیال تھی۔ شاید اس نے سب کچھ خواب میں دیکھا تھا یا تصویر میں اور سچ مان لیا تھا۔ ظاہر ہے اس خیال کی شرمندگی کا آزار بھی کم نہ تھا۔

گل نے گل کے ساتھ کچن میں دوپہر کے کھانے کا اہتمام شروع کر دیا تھا اور میں رابعہ وہیں بیلی کے ساتھ کھیل میں مصروف تھیں۔ میں نے صبح کے اخبارات دیکھنا شروع کیا جن میں ایس ایس پی جاوید صدیقی کی خودکشی کی خبر کوئی سنسنی خیز سرخی نہیں بنی تھی۔ انگریزی کے اخبار نے تو اندر یہ خبر دی تھی کہ ایک ... کے دھوکا دے کر فرار ہو جانے سے جاوید صدیقی کو ایک ... شدید دھچکا پہنچا تھا۔ وہ کچھ عرصہ معطل رہنے کے بعد بحال ہوا تھا اور اس کا ریکارڈ بہت صاف تھا۔ رسوائی کے خوف سے اس نے گولی مار کے ہلاک کر لیا۔ اردو کے اخبارات نے زیادہ ... تھی اور جاوید صدیقی کی خودکشی کا سبب اس کی اپنی غفلت ... جس کی وجہ سے دہرے قتل کا ایک زبردست مجرم پہلے ... پھر پولیس کی تحویل سے نکل بھاگا۔ ایک الگ باکس میں ... کہ جاوید صدیقی نے کس طرح زندہ آتش کو لاش ... جیسے ہی موقع ملا وہ فرار ہو گئی۔ اصل مجرم کا ایک ہم ... اغوا اس قسم کے شخص کو پولیس نے بلاوجہ پکڑ رکھا ہے۔

یہ سب خبریں ہمارے لیے پرانی ہو گئی تھیں۔ ہم ... دیکھا تھا اور ہم اخبار والوں سے زیادہ حقائق کو جانتے تھے ... طرف سے آنے والی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بیلی ... نازو اٹھ کے رابعہ کو دودھ سے نہلا دیا۔ اب گل ... اور دعائیں دے رہی تھی "دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو" پھر ایک دھماکا ہوا اور گل ساری دعائیں بھول کے چلانے لگی "ہائے اللہ ... لے جاؤ یہاں سے اسے اس شیطانی چرخے کو۔ دیکھو کیا توڑا ہے اس نے میرا سیٹ۔"

"ابھی بچہ ہے نا۔ ذرا بڑا ہو جائے گا تو زیادہ قیمتی سیٹ توڑے گا" گل نے معذرت کے ساتھ کہا۔

"یہ کیتلی بچی ہے نا۔ اس سے کہو اپنے باپ کے سر پر توڑے" گل نے کہا۔

میں رابعہ کو غلط باتھ کی حالت میں دیکھنے گیا تو محسن نے ... کی آواز پر کہا "ابھی حاضر ہوا جی۔"

"گل چاہتی ہے کہ بیلی یہ کیتلی تمہارے سر پر توڑے" گل نے کہا۔

"اور تم بھی کیا یہی چاہتی ہو۔"

"ہاں۔ کیتلی فالتو ہے۔ بچہ بھی خوش ہو جائے گا۔"

"مگر میرا سر فالتو نہیں ہے" محسن چلا کے بولا "گل سے کہو وقار کا سر منگوا لے تب اس کے سر پر کیتلی کیا ہانڈی توڑ دے کا پھوڑے۔"

وقار نے پیچھے سے کہا "بے وقوف نہیں ہے میری بیوی۔ دل توڑ سکتی ہے میرا' سر نہیں۔ ایک ہی تو سر ہے ہمارے گھر کا معزز والا۔"

اندر فون کی گھنٹی بجنے لگی اور وقار کو کھسکنے کا موقع مل گیا۔ اس نے کہا "کون مولوی غلام حسین۔ ہاں بھئی' تمہیں بتا دو کہاں ہوں گے۔ ہاں' بالکل زندہ ہیں۔ تمہیں یقین نہیں تو خود بات کر لو۔"

میں نے ریسیور لے لیا "کیوں غلام حسین۔ خیریت تو ہے نا۔"

"بس جی۔ اللہ کا نام لے کر ڈرتے ڈرتے فون کیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ بالکل زندہ سلامت ہیں۔ رابعہ بی بی کے بارے میں بھی ... بتا دیں ... آپ ... دل ... کو ... تسلی ہو جائے ... خدا۔"

www.paksociety.com

مال کے لیے۔ خلوص اور دوستی کا جذبہ ہو تا تو تم کہتے کہ مجھے قتل کریں جناب۔"

"دوستی۔ میں تو کہہ دیتا۔ لیکن بڑا فرق ہے جی میت اور زندہ آپ کے بچ جانے میں اور میری وفات حسرت آیات میں۔ وہ بیوہ انہیں کس کے آسرے پر چھوڑ سکتا ہوں میں۔"

"ابھی خدا کے بعد ہم سب ہیں۔ اور وہ منظر نے الو کا پٹھا۔ اس کا نام منظر کہاں ہے جو اس نے تمہارے سامنے قسم کھائی۔ نام تو اس کا ہے عبدالودود۔"

"شاید اسی لیے بچ گئے جی آپ۔"

"مگر تم کیسے بچ گئے اس کے ساتھ جا کے بھی۔"

"میں تو جناب ورد کرتا رہا آیت الکرسی کا اور ایسی کوئی بات بھی نہیں کی میں نے جی کہ ان کا غصہ میری قضا بن جاتا۔ انہوں نے پوچھا جی کہ کیسے قتل کروں انہیں۔ گولی ماروں یا تلوار سے سر اڑا دوں۔ دادا جان مرحوم کی تیغ آبدار بھی ہے۔ تو جی میں نے کہا کہ شمشیر اسلاف کو زنگ لگ رہا ہے۔ یہ بھی اسلامی ہتھیار ہے۔"

میں نے کہا "حیرت ہے کہ تم کو بخش دیا اس نے حالانکہ دشمنوں کی فہرست میں سب سے پہلا نام تمہارا ہے۔"

"بس جی یہ تو حسن ظن ہے آپ کا ورنہ کل رات وہ اتنے غصے میں تھے کہ انہوں نے بہت سے خطرناک اعلانات کیے تھے۔ کہ ابھی اس الو کی پٹھی کو بیوہ کرتا ہوں۔ ان کی مراد اپنی اکلوتی منکوحہ سے تھی۔ اور جہنم رسید کرتا ہوں اس کی ساری پیداوار کو۔ جب انہوں نے مجھے گھر کے قریب چھوڑا اس وقت البتہ کہا تھا کہ مولوی غلام حسین فکر مت کرو۔ ہم ذرا ایسا ہی بک رہے تھے اس کے سوا ہم سب کریں گے جو ہم نے ابھی کہا تھا۔"

مجھے بے ساختہ ہنسی آئی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ منظر کا غصہ بھی چند منٹ میں ختم ہو گیا تھا اور باقی رات وہ صرف مولوی غلام حسین کو ڈراتا رہا اور اس کے ساتھ تفریح کرتا رہا۔

"عرض مجھے یہ کرنا تھی جناب کہ اس ہفتے شاید میں خدمت کے لیے حاضر نہ ہو سکوں۔ محسن صاحب کی موجودگی میں خادم کی چنداں ضرورت بھی نہیں رہی اور تاجی کی منکوحہ نے اپنے آبائی گھر کا سودا کر لیا ہے۔ اچھی قیمت مل گئی ہے جی۔ پڑوس کے ہی دو آپس میں مقابلے پر تھے۔ ایک دائیں طرف والا اور دوسرا بائیں طرف والا۔ دونوں کو اپنے پرانے گھر چھوٹے پڑتے تھے۔ لہٰذا گھر ملانے سے ان کا مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔ بس جی ایک نے جتنی قیمت لگائی دوسرے نے اس میں دس ہزار کا اضافہ کر دیا۔ پہلے کو معلوم ہوا تو اس نے مزید دس بڑھا دیے اور میں تو جناب ادھر کی بات ادھر پہنچاتا رہا کہ حاجی صاحب۔ اب آپ فرمائیں۔ حاجی صاحب اگر بڑھا دیتے تھے تو میں سردار صاحب کو بتا دیتا تھا جی کہ حاجی صاحب تو آپ سے بڑھ گئے۔ ان کی آپس میں ٹھن گئی جی اور یہ کھلا مقابلے پر آ گئے۔ بالآخر حاجی صاحب نے میدان مار لیا

خواست... خدا نخواست... وہ فوت تو نہیں ہو گئیں؟" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "کیا بک رہے ہو؟"

"بک نہیں رہا ہوں جی۔ یہی کہا تھا اپنے منظر صاحب نے۔ میں تو شامت کا مارا غلطی سے ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ سخت غصے میں بالکل پاگل ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ مولوی غلام حسین۔ دونوں کو قتل نہ کر دیا تو میرا نام منظر نہیں۔ کسے پہلے ٹھکانے لگاؤں کون... کا زیادہ واجب القتل ہے دونوں میں سے سکندر یا رابعہ؟"

میں نے ہنسی ضبط کر کے کہا "پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے جی۔ گستاخی معاف آپ پہلے آپ ہی کا نام لیا تھا میں نے 'یہ لیڈیز فرسٹ' تو فرنگیوں کی روایت ہے۔ ویسے بھی جناب رابعہ بی بی کا بھلا کیا قصور ہے اس میں۔ وہ تو برات لے کر آنے سے رہیں بغرض نکاح۔ اور آپ ان کو صرف باتوں سے بہلا رہے ہیں جی۔ بلکہ الو بنا رہے ہیں۔"

"غلام حسین تم تو ذکر ہوتا ہے لیکن یہ بتاؤ کیا تم منظر کو سمجھا نہیں سکتے تھے کہ فوراً قتل نہ کرے۔ یہ ارادہ ملتوی کر دے پچاس

www.paksociety.com

جی۔ جتنی قیمت کی اُمید تھی اس سے دگنی مل گئی۔"

"بھئی مبارک ہو۔ تمہاری لگائی بجھائی کا کچھ تو فائدہ ہوا۔"

"شوہری۔ لگائی بجھائی تو عورتوں کا کام ہے۔ یہ کاروباری معاملہ تھا اور ہوشیاری بھی میری" وہ بولا "اس کے علاوہ جناب۔ حاجی کو اس کے ایک دوست نما دشمن نے بانس پر چڑھا دیا تھا کہ حاجی صاحب! ہار گئے تو مونچھیں نیچی ہو جائیں گی۔ زمانہ کیا کہے گا۔ اب حاجی رو رہا ہے۔ بیعانہ دے چکا ہے اور ایک مہینے میں باقی سب رقم دینا ہے۔"

"تو کیا اس کے پاس ہے نہیں؟"

"ہے تو سہی مگر اس کے گھر میں خانہ جنگی کا سماں ہے جی۔ اُدھر اس کی دونوں بیویاں لڑ رہی ہیں کہ تم سٹھیا گئے تھے۔ اتنی قیمت کا ہے یہ مکان؟ دوسری طرف جوان اولاد خفا ہے کہ ابا جی نے کمانے کا سودا کر لیا اور سر والی سمجھ دار تھا کہ اس نے اپنی مونچھیں نیچی کر لیں کہ چلو جی آپ جیتے ہم ہارے۔ حاجی صاحب کو تباہ کرنے کے بعد۔ خیر جی! ہم نے نہ دھوکا کیا نہ زبردستی۔"

"ظاہر ہے تمہاری تو لاٹری نکل آئی۔"

"اب دوسرا اچھا سا گھر تلاش کرنا ہے جی۔ عقد ثانی کے برکات و فیوض اب سامنے آ رہے ہیں۔ پہلا تجربہ تو میری بدبختی کی سزا تھی جناب یا پھر میرے گناہوں کی سزا تھی منجانب اللہ۔"

"چلو تم خوش ہو تو ہم بھی خوش ہیں" میں نے کہا اور فون بند کر دیا کیونکہ کھانے کی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے باقی سب لوگ مجھے چلا چلا کے پکار رہے تھے اور محسن مجھ پر ایک نمک دانی اور دو چمچے پھینک کے مار چکا تھا اور اعلان کر چکا تھا کہ میں نے فون نہ رکھا تو چمچوں کے بعد کانٹے اور پھر چھریاں ماری جائیں گی۔

غالب کوشش کر کے نازو کو میز پر لے تو آیا تھا مگر وہ سخت نڈھال اور افسردہ سی چپ چاپ بیٹھی تھی اور ایک ہی بات دُہرا رہی تھی۔ "مجھے بھوک نہیں ہے" اس کی آنکھیں خلا میں دیکھتی محسوس ہوتی تھیں اور مجھے یہ اندیشہ لاحق تھا کہ اچانک حقائق کی دنیا میں لوٹ آنے کا ردعمل زیادہ شدید نہ ہو جائے۔

کھانے کے بعد میں نے غالب سے کہا کہ وہ نازو کو سیر کرا لے جائے۔ اس نے ہم سب کے ساتھ چلنے کی شرط عائد کر دی۔ اتوار کی چھٹی کی وجہ سے سب ہی تفریح کے موڈ میں تھے اور چوہدری دلاور کیس کے اینٹی کلائمکس نے اچانک سب کو بے عملی کے احساس میں مبتلا کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اب کرنے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ جدوجہد ختم ہو گئی۔ جدوجہد ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس میں ایک نیا موڑ آ گیا تھا اور اس بالائنڈ کارنر سے آگے کی اقبال کسی کی نظر کچھ دیکھنے سے قاصر تھی۔

رابعہ کی گاڑی میں میرے علاوہ غالب اور نازو بھی بیٹھ گئے۔ دوسری گاڑی وقار کی تھی۔ اس میں گل اور محسن ہمارے پیچھے رہے۔ ابھی ہم روانہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ مہرالنسا عرف

میری نمودار ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ میں اسے کتنی دور لے کر رات کی فلائٹ سے وہ واپس لندن جا رہی تھی۔ اپنے پاپا کی موت نے اسے سخت دل برداشتہ کر دیا تھا۔ وہ مجھ سے تو قع رکھتی تھی کہ میں ایسے وقت میں اس کی غمگساری کروں مگر خدا نے مجھے بال بال بچا لیا۔ میں نے کہا "ہم تو اسپتال جا رہے ہیں۔ محسن کے قادر ابا کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"واپس کتنی دیر میں آؤ گے؟"

میں نے کہا "شام تک یا آٹھ بجے تک زیادہ وقت لگ جائے۔"

"ٹھیک ہے مجھے ائرپورٹ سی آف کرنے ضرور چلنا۔ میں انتظار کروں گی تمہارا لندن میں۔ کب تک آؤ گے؟"

میں نے کہا "لندن۔ شاید اب نہ آ سکوں۔ دراصل میں نے شادی کر لی ہے یہاں۔ میٹ مائی وائف مسز رابعہ۔"

اس کے لیے یہ پاپا کی موت کی خبر سے بھی بڑا صدمہ تھا۔ اس نے رابعہ کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا۔ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی اور پھر چیخ کر بولی "یو چیٹ۔ ٹریکل ورلڈ۔ تم کیا سمجھتے تھے میں مرتی ہوں تم پر..... آخر نکلے نا تم بھی ویسے ہی مرد....."

اس سے پہلے کہ میں "ویسے ہی مرد" کی وضاحت کا مطالبہ کرتی وہ روتی ہوئی بھاگ گئی۔

"الو کی پٹھی" میں نے برہمی سے کہا۔

رابعہ نے افسوس سے کہا "تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"کیا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"کیا ضرورت تھی اس کو دکھ پہنچانے کی۔ آج کی رات تھی۔ رات کو اسے چھوڑ آتے ائرپورٹ۔ بعد میں بات تو ہو جاتی۔ وہ لندن میں کتنے دن انتظار کرتی۔ کچھ دن بعد بھول جاتی۔"

غالب نے کہا "آخر آپ نے ایسا غلط تاثر دیا ہی کیوں تھا۔ جیسے آپ اس پر فریفتہ ہیں۔"

"قسم خدا کی میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ وہ خود ہی میرے پیچھے پڑی تھی۔ محسن جانتا ہے سب کچھ۔ میں نے کسی کو منہ نہیں لگایا تھا۔ میں نے اور محسن نے وقار سے لگائی اور مشکل میں پڑ گئے۔ فرینچ ول کے بعد میں پتا چلا کہ انگلینڈ کیا ہام ہے اس کا۔ جارج یا رابرٹ۔ وہ دلاور کے بدلے میں اُدھر قتل کی سزا کاٹ رہا ہے۔ وہ ان کا شوہر تھا۔"

"مذاق میں تم نے اس کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی اور پھر یہ کھیل اچانک ختم کر دیا۔ ایسا ہی کوئی تمہارے ساتھ کرے پھر....." رابعہ نے کہا۔

"لاحول ولا قوة۔" میں نے کہا "کون سی شریف زادی ہے جس نے پہلی بار کسی سے دل لگایا ہو۔ اس کے لیے بھی یہ دل لگی تھی۔"

"ایسا ہو تو وہ روتی کیوں؟"

"ذرا شوق ہے لڑکیوں کا۔ خوشی ہو یا غم۔ اور تمہیں اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی ہے اس سے۔ میرے جیسے ایک سو ایک وہ پہلے بھی زخمی کر چکی ہوگی۔"

"ایسی شادی لڑکی کے سامنے دل نشانہ رکھنے کی حماقت بھی آپ ہی نے کی تھی۔ اگر یہ سب پہلے سے جانتے تھے تو....."

میں نے کہا "رابعہ۔ تم لڑنے کے موڈ میں ہو تو واپس چلتے ہیں گھر۔"

"یہاں لڑنے میں بھی کوئی حرج نہیں" غالب نے پیچھے سے کہا "ہم یہ سمجھ لیں گے کہ شادی کے بعد کی زندگی کا منظر ہے۔ ڈراما چل رہا ہے۔"

"ڈراما کرنے کے لیے اب ان کو ریہرسل کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ دیکھا نہیں کیسی روانی سے اتنا بڑا جھوٹ بول دیا۔ میں نے شادی کر لی ہے یہاں۔ میٹ مائی وائف" رابعہ نے میری نقل اُتاری۔

"اور تم نے فوراً ہاتھ آگے بڑھا دیا کہ واقعی ہوں۔"

اچانک نازو نے کہا "رابعہ باجی۔ میں نے بھی تو ایسا ہی جھوٹ بولا تھا۔ بڑی روانی سے۔ مجھے معاف کر دیں پلیز۔"

"ارے نازو۔ چھوڑو یہ باتیں۔"

"نہیں۔ میں واقعی پاگل تھی۔ خیال کو حقیقت سمجھ کے آپ سے پتا نہیں کیا کچھ کہتی رہی" وہ دُکھی لہجے میں بولی۔

"آج کا خیال ہی کل کی حقیقت ہوتا ہے اور کوئی کہہ سکتا تھا اس قسم کی بات" غالب نے کہا۔

"ہاں۔ جیسے پاکستان پہلے ایک خیال یا تصور تھا۔ آج حقیقت ہے مگر اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی کیا ہر مسلمان پاکستان زندہ باد کے نعرے نہیں لگاتا پھرتا تھا" میں نے کہا۔

"مجھے شرم آتی ہے یہ سوچ کے۔"

میں نے کہا "اچھا؟ تمہیں شرم بھی آتی ہے۔ بھئی ہمیں تو نہیں آئی کیوں غالب۔"

"بالکل نہیں۔ شرم میں کیسی شرم۔ آپس کی بات ہے نا" غالب نے کہا "اگر ہم بات کریں زینت امان یا ہیما مالنی سے شادی کی تو یہ شرم کی بات ہے۔"

"لیکن وہ ایسی بات کریں ہمارے بارے میں تو خوشی کی۔" میں نے کہا۔

اسی وقت اچانک نازو نے کہا "غالب..... وہ..... وہ گاڑی۔"

غالب نے پلٹ کے دیکھا "کیا ہوا۔ کون تھا اس میں؟"

"وہی استاد پیڈرو۔"

"کیا مطلب..... تم کی گاڑی میں؟" غالب نے کہا "تمہیں یقین ہے؟"

"یہ کیسی فضول بات ہے۔ کیا میں استاد پیڈرو کو پہچاننے میں غلطی کر سکتی ہوں۔ کل کو تم کہہ دو گے کہ چوہدری دلاور کو پہچان نے میں غلطی ہوئی۔ اتنی پاگل نہیں ہوں میں۔" وہ بگڑ گئی۔

"ارے بھئی نازو یہ مطلب نہیں تھا میرا۔ گزرتی ہوئی کار میں کسی کو دیکھ کے مجھے بھی دھوکا ہو سکتا ہے" غالب بولا۔

میں نے بھی اس کی تائید کی "ملتی جلتی شکلوں والے لوگ نظر آ جاتے ہیں۔ پیڈرو تو کراچی میں ہے۔"

نازو مجھ سے بھی خفا ہو گئی "تم تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے کراچی سے کوئی لاہور آ ہی نہیں سکتا۔"

میں نے کہا "آ تو سکتا ہے..... لیکن اس کا وہاں کاروبار ہے۔"

وہ اپنی بات پر قائم رہی "کاروبار کے سلسلے میں کسی کے کراچی سے لاہور آنے پر پابندی ہے کیا؟ تم نہیں جاتے کراچی؟ اور یہ غلط فہمی کی بات نہیں ہے۔ نہ میری نظر کو دھوکا ہوا تھا۔ میں نے اسے بالکل صاف دیکھا تھا۔ تم ذرا ٹیک کر رہے ہو۔ غالب اور رابعہ دوسری طرف بیٹھے ہیں۔ یہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ گاڑی میرے پاس سے گزری تھی۔ پیڈرو نے بھی دیکھا تھا مجھے بلکہ..... آنکھ ماری تھی اس بدمعاش نے مجھے۔"

"آنکھ ماری تھی؟" غالب نے مصنوعی غصے سے کہا "سکندر۔ واپس چلو اس کار کا پیچھا کرو۔ جب تک ہم اس نابکار کی اس گستاخی پر اس کی آنکھ نہیں نکال لیں گے اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔"

نازو کی بات نے مجھے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر وہ استاد پیڈرو ہی تھا جو کراچی میں شیخ مختار ہو گیا تھا تو اس کا لاہور آنا خالی از علت نہیں ہو سکتا تھا۔ کاروباری ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا مگر میرے اپنے خیال کے مطابق اس کے اور چوہدری دلاور کے درمیان اختلاف کے باعث یا شوکت رانا کا ساتھ دینے کی غلطی کرنے کے بعد ہی استاد پیڈرو لاہور سے فرار ہو کے کراچی گیا تھا۔ یہ مفروضہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔ چوہدری دلاور کو اب استاد پیڈرو کی ضرورت نہیں رہی تھی اور وہ خود اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ ممکن ہے وہ کسی جھگڑے کے بغیر الگ ہو گئے ہوں۔ چوہدری دلاور نے اس کی سابقہ جانثاری کے بدلے میں اس کی جان بخشی کر دی ہو اور نئی زندگی کے آغاز کے لیے دعاؤں کے ساتھ اور بھی بہت کچھ دے دیا ہو۔ خود چوہدری دلاور کی خواہش یہی تھی کہ وہ اپنے ماضی سے دامن چھڑا کے ایک باعزت مستقبل کی اُمید رکھتے ہوئے نئی زندگی شروع کرے۔ مشکل یہ تھی کہ اس کا ماضی ہم تھے۔ اب وہ کمبل کو چھوڑتا تھا مگر کمبل اسے نہیں چھوڑتا تھا۔

میں بھی بھی عقب نما آئینے میں دیکھ لیتا تھا کہ وقار یوسف کی گاڑی ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔ ٹریفک کے رش میں ساتھ رہنا مشکل بھی ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تیز رو اور عجلت پسند ڈرائیور بیچ میں آ جاتے ہیں۔ کبھی ایک گاڑی سگنل کراس کر جاتی ہے مگر دوسری کے لیے لائٹ سرخ ہو جاتی ہے۔ ہم کوئی باقاعدہ پروگرام

www.paksociety.com

جا کے نہیں روانہ ہوئے لیکن میرے ذہن میں رابعہ کی بات تھی۔ وہ اپنا بنا گھر تعمیر ہوتا دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے وقار کے سامنے ہی محسن سے کہا تھا کہ "ٹھیکے دار صاحب۔ کتنا کام ہو گیا ہے؟" اور محسن نے خالص ٹھیکیداری کے انداز میں کہا تھا "بی بی جی۔ آپ بنفس خود چل کے دیکھیں۔"

میرا خیال تھا کہ یہ بات محسن کو بھی ناگوار رہے گی۔ اب وقار کی گاڑی پیچھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ رکنے کے بجائے میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ رابعہ کے زیر تعمیر گھر تک پہنچنے تک وقار کی گاڑی مجھے نظر نہیں آئی تھی۔

رابعہ نے بھی کہا "وہ لوگ کہاں رہ گئے؟"

میں نے کہا "آ رہے ہوں گے پیچھے۔ کیا پتا ٹائر پنکچر ہو گیا ہو وقار کا۔ میرا مطلب ہے اس کی گاڑی کا۔"

"یا اس کی بھی نگی سے لڑائی ہو گئی ہو اور جیسے تم نے کہا تھا کہ لوٹنا ہے تو واپس گھر چلتے ہیں۔ ایسے ہی وقار نے کہا ہو اور نگی نے کہا ہو کر چلو۔"

"جھگڑنے کے معاملے میں وہ نگی نہیں وقار ہے" میں نے کہا "وقار بھی کم نہیں۔ خاموشی سے کوئی بات کر کے معصوم بن جاتا ہے اور جب جواب سنتا رہتا ہے۔ نگی کو عادت ہے شور کرنے کی۔ وہ خاموش ہوتی ہے تو وقار پھر چھیڑتا ہے۔ اسے بھی مزہ آتا ہے پنگا لے کے۔"

"پنگا لیے بغیر ازدواجی زندگی کی گاڑی چلتی بھی نہیں" محسن نے کار سے اترتے ہوئے کہا "جتنا بولنا ہوتا ہے شادی سے پہلے بول لیتے ہیں مرد تو۔"

"ہاں۔ خوب ڈائیلاگ مارتے ہیں" رابعہ نے کہا۔

"شادی کے بعد باری آتی ہے بیوی کی" غالب نے کہا "پھر شوہر کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔"

"یہ ذرا بازاری سی بات کہی آپ نے مگر خوب کہی۔ دراصل یہ لڑکیاں بہت چالاک ہوتی ہیں۔ شادی سے پہلے ایسی بھولی اور شرمیلی بنی رہتی ہیں جیسے منہ میں زبان ہی نہیں۔"

"سب ایکٹنگ ہوتی ہے۔"

"اور ڈر ہوتا ہے کہ زیادہ بولنے سے بات نہ بگڑ جائے کاٹھ کا اُلو ڈر کے بھاگ نہ جائے۔ جب بعد میں یہ خوف دل سے نکل جاتا ہے تو پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ شادی سے پہلے کی خاموشی کی ساری کسر نکال لیتی ہیں۔"

رابعہ نے طنز سے کہا "افوہ کیا زبردست اور پُر مغز عالمانہ گفتگو ہو رہی ہے۔"

ناز بولی "ہاں۔ جیسے بہت تجربہ ہے شادیوں کا۔"

"اچھا ایمان سے کہو کیا ایسا نہیں ہوتا۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جہاں محبت ہو گی میاں بیوی میں وہاں لڑائی ضرور ہو گی۔ لڑائی نہ ہو تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی نہ پرواہ ہے نہ فکر۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ اختلاف رائے تو رہیں ہو گا جہاں بیوی کی دلچسپی ہو گی گھر کے معاملات میں۔ ورنہ شوہر کی ساری دلچسپیوں کا مرکز ہو گھر سے باہر تو وہ کہتا ہے کہ بھگے کیا۔ بیوی بور ہو جاتی ہے اور بیوی خود گھر سے بیزار ہو جاتی سمجھتی ہو کہ شوہر کو پرواہ نہیں تو بچے کیا۔ نتیجہ یہ کہ زندگی کی گاڑی ایسے چلتی رہتی ہے جیسے بلندی سے ڈھلوان کی طرف خود بخود چلتی جا رہی ہو۔"

رابعہ نے گھڑی دیکھ کے کہا "کہاں رہ گئے وقار اور محسن؟"

میں نے کہا "چلو ہم اتنی دیر میں نقشہ تو پاس کر دیں۔ محسن کا تو دیکھا ہوا ہے۔"

بجلی کا رن ہونے کی وجہ سے محسن کا وہ دوست ٹھیکیدار بھی موجود نہیں تھا جس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ تہ خانے کو ایسے چھپوا دے گا کہ ماہر تعمیرات و آثار قدیمہ بھی اس کا وجود ثابت کرنے میں ناکام ہو جائیں گے۔ معلوم نہیں اس نے اتنے وسیع تہ خانے میں کتنا ملبا بھرا تھا اور وہاں اب خلا تھا یا نہیں۔ لوہے سے ایک بیوی طرز کی کوٹھی کا مکمل نقشہ نظر آتا تھا۔ غبار کے اوپر فرش اور ستون بھی ظاہر کرتے تھے کہ تعمیراتی کام کتنی تیز رفتاری سے کیا گیا تھا۔

وقار کی گاڑی ابھی تک نہیں پہنچی تھی چنانچہ مجوزہ عمارت میں دلچسپی لینے کے باوجود رابعہ کا اور میرا دھیان بٹا ہوا تھا۔ مجھے اب تشویش ہونے لگی تھی۔ ٹائر پنکچر ہو جائے تو اسے بدلنے میں دس منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوتے۔ ناز کی بات نے مجھے فوراً پریشان کر دیا تھا۔ اس نے پیڈرو کو مخالف سمت میں جاتے دیکھا تھا۔ اگر یہ اتفاق ہوتا تو شاید پیڈرو بھی ہمیں دیکھے بغیر گزر جاتا مگر اس کا ناز کو آنکھ مارنا محض ایک گھٹیا حرکت نہیں سمجھی جا سکتی تھی۔ اس کا مقصد کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے جانتے بوجھتے اپنی موجودگی کا اور اپنے شرپسندانہ عزائم کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی۔

مزید دس منٹ گزر گئے تو ہم نے واپس اسی راستے پر جا کے دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ان کی گاڑی میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے۔ اچانک فین بیلٹ کا ٹوٹ جانا یا ریڈی ایٹر ہیٹ اپ ہو کر جام ہو جانا کوئی خرابی نہیں ہوتی مگر اس کو ٹھیک کیے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی۔ کسی حادثے کے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہماری اپنی گاڑی سائڈ کی گلی میں موڑ سے کچھ آگے کھڑی ہوئی تھی۔ عین موڑ پر گاڑی پارک کرنے میں یہ رسک رہتا ہے کہ کوئی تیزی سے گلی میں داخل ہو اور گاڑی سے ٹکرا جائے تاہم اس سے دوسرا نقصان ہوا۔ گاڑی نظر کے سامنے ہوتی تو یہ نہ ہوتا۔ ہمارا یہاں قیام بھی چند منٹ سے زیادہ کا نہ تھا۔ وقت گزرتے ہوئے ہم سب رابعہ کی نئی کوٹھی کا نقشہ دیکھنا چاہتے تھے اسی لیے میں نے گاڑی کو لاک بھی نہیں کیا تھا۔ یہ بد قسمتی

تھی جس کا ہم نے خمیازہ بھگتا مگر یہ خیال بھی دل کو خوش رکھنے والی بات تھی کہ گاڑی سامنے ہوتی اور لاک ہوتی تو کچھ اور ہوتا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے اپنی سیٹ پر ایک ریڈیو رکھا ہوا دیکھ لیا۔ اس کے نیچے ایک رقعہ دبا دیا گیا تھا۔ رقعے پر لکھا ہوا تھا "اس ریڈیو کو اپنی گاڑی کے ریڈیو کی جگہ لگا لو۔ پھر ایف ایم ایک سو دو کی نشریات سنو۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ کسی خرابی کا اشارہ ہے۔ رابعہ کی گاڑی میں پہلے ایک پیڈ کا سیٹ ریڈیو ٹیپ رکھا تھا جو بعد میں چوری ہو گیا تھا اور رابعہ نے دوسرا ریڈیو لگوانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ اس ریڈیو کی جگہ خالی تھی مگر پوائنٹ پر جوائنٹ نصب تھا اور اپنی جگہ موجود تھا اور ریڈیو چرا کر لے جانے والے نے جب تار کھینچے تھے تو وہ ساکٹ الگ ہو گیا تھا جس کے چار سوراخوں میں ریڈیو کی چار پنوں کو داخل کرنے سے کنکشن مکمل ہو جاتا تھا۔ یہ کام ایک بچہ بھی کر سکتا تھا۔ اگر وہ ریڈیو کے پیچھے بنے ہوئے نشانات پر غور کرے کہ کس رنگ کا تار کہاں جوڑا جائے گا۔ ایریل اور بیٹری کے ہر ٹرمینل کے تار کا رنگ الگ تھا۔ انٹینا کی لیڈ والی سوئی پن کا سوراخ سب سے الگ تھا۔ یہ کام میں نے پانچ منٹ میں ختم کر لیا۔

رابعہ نے دوبارہ سوال کیا "یہ کیا ہے؟"

میں نے جھنجلا کے کہا "تمہارے خیال میں کیا ہے؟ بم یا گلاب جامن؟ یا ریڈیو ہے اور کیا ہے۔"

غالب نے وہ رقعہ اسے تھما دیا "سوال یہ ہے بڑے بھائی کہ یہ حرکت آخر کس نے کی؟ اور کب؟"

"چھوٹے بھائی، یہ بھی پوچھ لو کہ کیوں کی؟"

رابعہ نے ڈرتے ڈرتے کہا "دیکھو سکندر۔ نظر تو مجھے بھی آ رہا تھا کہ یہ ریڈیو ہے مگر یہ کچھ اور بھی تو ہو سکتا ہے۔"

غالب نے سہلایا "گلاب جامن ہے تو چکھ کے معلوم ہو جائے گا۔ بم ہوا تو پتا نہیں چلے گا۔"

"کیسے پتا نہیں چلے گا؟ دھماکا ہو گا" ناز بولی۔

"میرا مطلب تھا کہ ہمیں پتا نہیں چلے گا۔ دوسروں کو یقیناً پتا چلے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "کوئی ہمیں ہلاک کرنا چاہتا تو ریڈیو لا کر سیٹ پر چھوڑ کے نہ جاتا۔ یہ بہتر ترکیب استعمال کے ساتھ گاڑی میں بم رکھ جاتا۔ ٹائم بم سب سے آسان چیز ہے۔"

غالب نے میری تائید کی "یہ اپنے چوہدری دلدار کی طرف سے ہمارا رابطہ ہے۔ وہ بات کرنا چاہتے ہیں کوئی۔ ہمارے فائدے کی۔"

"بے چارے بڑے نیک اور مخلص فرد ہیں" میں نے کہا "اب میں ریڈیو آن کرنے والا ہوں۔ کلمہ پڑھ لیں سب لوگ۔"

رابعہ نے دہشت زدہ ہو کے کہا "کیسی منحوس باتیں کرتے ہو۔"

"اچھا بھئی۔ آپ سب کو شہادت مبارک ہو۔" میں نے ریڈیو آن کر دیا۔ اسپیکر میں سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔

میں نے فخر سے رابعہ کی طرف دیکھا "یہی ثابت ہوا کہ میں ایک ریڈیو انجینئر بھی ہوں۔ اور یہ نہ بم تھا نہ گلاب جامن۔"

رابعہ نے گاڑی کو واپس کیا اور ہم سڑک پر آ گئے۔ وقار کی گاڑی ابھی تک لاپتا تھی اور ریڈیو خاموش تھا۔

"کیا مصیبت ہے کدھر چلے گئے وہ لوگ" رابعہ نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ سیدھے نکل گئے" میں نے کہا۔

"تمہارا خیال غلط ہے سکندر بخت" ریڈیو میں سے آواز آئی۔

ہم سب بری طرح چونکے۔ ناز تو واقعی اچھل پڑی "یہ پیڈرو ہے۔"

غالب نے اسے تھپکی دی "یہ استاد پیڈرو کی آواز ہے۔ صرف آواز، وہ خود نہیں ہے۔"

ریڈیو نے کہا "مگر اس کی آواز بھی عالم بالا سے نہیں آ رہی ہے۔ وہ خود بھی تم سے زیادہ دور نہیں ہے غالب صاحب۔"

"دور ہی رہو تو اچھا ہے۔ سامنے آئے تو مرد کیا عورتیں ہی تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دیں گی۔"

"ہم جیسے مرد اپنی مردانگی پر نہیں۔ ناز جیسی عورت کی طاقت پر ناز کریں تو کیا کریں" پیڈرو نے کہا "پاگل کے بچے۔"

غالب سخت خفیف ہوا مگر اس نے کہا "سور کے بچے۔"

میں نے اسے روک دیا "پیڈرو۔ کام کی بات کرو۔"

"ایک بات تو عقل شریف میں اچھی طرح آ گئی ہو گی تمہاری کہ میں کراچی سے لاہور کیوں آیا ہوں؟ دوسری بھی تمہیں سمجھ لینی چاہیے کہ میں نے تم کو اس مجلس میں پہچان لیا ہے بالآخر۔ اور صرف تمہاری اپنی غلطی کے باعث۔ تم تو مجھے اکرام شیخ کی گاڑی کی ڈکی میں زوال کے چھوڑ گئے تھے۔ خدا بھلا کرے پولیس والوں کا۔ وہ مجھے گاڑی سمیت اٹھا لے گئے اور میری جان بچائی مگر تم زندہ نہیں۔ میں نے کچھ نہیں بتایا ان کو تمہارے متعلق۔ اور نہ میں نے اکرام شیخ سے کچھ کہا۔ میں اس کے گھر گیا تھا گاڑی واپس کرنے کے لیے۔ اس سے ملا بھی تھا۔ وہ بہت پریشان ہوا مگر میں نے اسے بھی تسلی دی کہ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں اور نہ میرا ارادہ اسے نقصان پہنچانے کا ہے۔ اس نے سکندر بخت کا ساتھ دے کے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ دوست ہی کام آتے ہیں دوستوں کے۔"

بالآخر یہی ہوا تھا جس کا مجھے ڈر تھا اور میں انکار نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا میری اپنی کوتاہی سے ہوا تھا۔ اسے اتفاق یا پیڈرو کی خوش قسمتی بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ کراچی کی سڑکوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے میں نے گاڑی غلط جگہ پارک کر دی تھی اور نو پارکنگ ایریا سے پولیس نے اکرام شیخ کی گاڑی اٹھانے میں جو مستعدی کا مظاہرہ کیا تھا۔ گاڑی وہاں نہ کھڑی ہوتی یا پولیس پھر دیر سے نوٹس لیتی یا وہ میری واپسی کا انتظار کرتے کہ کچھ مک مکا ہو جائے تو پیڈرو کو یہ سب کہنے کا موقع کیسے ملتا۔

میں نے کہا "پیڈرو۔ ٹھیک ہے تم کو قسمت نے بچالیا۔"
"اور تمہیں بدقسمتی نے مروادیا۔ گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ تم بلاوجہ مجھ سے پنگا لینے کراچی آگئے میں تو بھول گیا تھا سب کچھ۔"
"لیکن میں نہیں بھولا تھا پیڈرو! اور نہ بھولوں گا۔"
اس نے آہ بھری "اکثر لوگ تمہیں بھول جائیں گے۔ کیپر خان کے دوست سکندر بخت کی محبوبہ 'چیف' کے نوکے جانباز۔ ایم آر ایس کے مجاہد۔ مجھے مجبوراً لاہور آنا پڑا۔ میں استاد پیڈرو سے شیخ عقار بن گیا تھا اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرچکا تھا جس کا تعلق میری پہلے والی زندگی سے نہیں تھا مگر شاید تم نہ خود جینا چاہتے ہو اور نہ مجھے جیتا دیکھ سکتے ہو۔"
"یہ تم نے ٹھیک کہا۔ میں تو بس تمہاری لاش کو تختۂ دار پر جھولتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔"
"یہ حسرت تو پوری ہوتی ہے نہ ہوگی۔ اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ بہتر ہوتا کہ تم مجھے بھول جاتے۔"
"یعنی یہ بھول جاتا کہ تم میرے باپ کے قاتل ہو؟"
"اچھا مت بھولو۔ تمہیں بھی پہنچا دیتے ہیں ابا جی کے پاس۔ جہنم میں وہ بھی شاید چاہتے ہیں کہ تم جلد از جلد آجاؤ۔"
"ایسی باتوں اور دھمکیوں سے نہ میں مشتعل ہوتا ہوں اور نہ ڈرتا ہوں۔ یہ بتاؤ کیا تم نے روک لیا ہے وقار یوسف کی گاڑی کو۔"

"صرف گاڑی کو نہیں۔ اس میں سوار چار افراد بھی تھے۔ وقار کی ننھی سی بیوی 'محسن کی ہٹ کٹ منی' اور تمہاری سابق محبوبہ اور منگیتر کی آخری نشانی۔" اس نے ایک شیطانی قہقہہ مارا۔
میرے منہ سے اس کے لئے بے اختیار ایک گالی نکلی۔
"نہیں۔ بُری بات۔" اس نے کسی بزرگ کی طرح کہا "ابھی کیا کہا تھا تم نے؟ اتنی جلدی بھول گئے۔ غصے میں آدمی کی عقل کام نہیں کرتی۔ میں تم سے زیادہ دور نہیں ہوں لیکن تم مجھے دیکھ نہیں سکتے۔"

"ٹائر نے دیکھ لیا تھا تمہیں خبیث۔"
وہ ہنسا "اچھا۔ اس پاگل نے پہچان لیا تھا مجھے۔ خیر اب صورت حال یہ ہے کہ وقار یوسف کی گاڑی واپس گھر کی طرف جارہی ہے۔ ابھی تک سب خیریت سے ہیں۔ میرا مطلب ہے زندہ ہیں۔ ان کی گاڑی سگنل پر رکی تو ہم نے ایک معمولی سا کام کیا تھا۔ ہاتھ کی صفائی تھی۔ ایک لڑکے نے بچے کو غبارا تھمادیا تھا۔ وہ غبارے بیچنے والا ہی تھا۔ کسی نے اسے پیسے بھی دیئے تھے مگر گاڑی کے چلتے ہی وہ غبارا پھٹ گیا۔ غبارے بیچنے والے لڑکے نے ہی اس میں ایک پن چبھودی تھی۔ کسی نے دیکھا نہیں۔ غبارے میں تام ہوا یا گیس نہیں تھی۔ سگنل کراس کرتے ہی وقار نے بھی چکر محسوس کیے اور گاڑی ایک طرف روک لی۔ اس وقت تک پیچھے والے بے ہوش ہوگئے تھے۔ وقار باہر نکل کے تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتا تھا۔ مگر وہ باہر ہی لیٹ گیا۔ کچھ لڑکوں نے فوراً اسے سنبھالا اور فٹ پاتھ پر ایک طرف لٹادیا۔ ہمارا ایک آدمی کار چلاکے لے گیا۔ اسے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ اس وقت تک وہ بھی شور مچانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ اب تک گھر پہنچ چکے ہوں گے۔"

ہم سب نے ساری بات سانس روک کے سنی۔ پیڈرو پر شبہ نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔
میں نے بڑی مشکل سے کہا "وقار اب کہاں ہے؟"
"ابھی تو وہیں لیٹا ہوا ہوگا۔ ممکن ہے ہوش میں آگیا ہو۔ غبارے میں تھوڑی سی گیس ہوتی ہے۔ محسن اور منی پر زیادہ اثر رہے گا۔ تازہ ہوا میں خود بخود آدھے گھنٹے بعد ہوش آجائے گا لیکن اس وقت تک وہ گھر پہنچ جائیں گے۔ ہمارے آدمی نے پیچھے چھپا دیئے ہوں گے۔ جو کار کے اندر ہیں وہ اتنی جلدی ہوش میں نہیں آسکتے۔ وقار کو اگر کسی نے اسپتال پہنچادیا تب بھی کوئی فکر کی بات نہیں۔ وہ پولیس کو فون کرے گا۔ یہ بتائے گا کہ اس کی بیوی اور گاڑی دونوں کو نہ جانے کون لے گیا ہے۔ گاڑی میں اس کے ایک دوست کی فیملی بھی تھی۔ پولیس شاید رپورٹ لکھنے کے لئے وکیل صاحب کو تسلی دے دی کہ ہم ابھی سب جگہ اطلاع کردیتے ہیں اور ناکا بندی کرادیتے ہیں تمام راستوں پر۔ وہ گاڑی کہیں سے بھی گزرے پکڑی جائے گی۔ ویسے آپ کو شک کس پر ہے؟ اور سکندر بخت وہ میرا نام تو لے گا نہیں۔ وہ نام لے گا چوہدری والا ور کا۔ وقار کی پوزیشن خاصی خراب ہوگی کیونکہ بالآخر وہ گھر پہنچے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ گھر والے تو گھر میں ہیں اور اس عرصے میں ایک رپورٹ وہ بھی لکھوا چکی ہے۔ یا فون کرکے پولیس کو گھر بلاکے یہ بات بتا چکی ہے۔ پولیس والے بڑے..... ہوتے ہیں۔ وہ سمجھیں گے کہ لوئی 'بیٹی' ایک نئی ہوگی۔ گھر والے سب گھر پر مزے سے بیٹھے ہیں اور وکیل صاحب جانے کیا اسٹوری سنانے بیٹھے ہیں۔ خود وکیل صاحب اسپتال میں آرام سے لیٹے تھے اور بیوی نے گھر پر پولیس کو بلالیا...... یہ کیسا اغوا ہے کہ اغوا کرنے والے نے سب کو خیریت کے ساتھ گھر پہنچادیا یا اسپتال... لیکن... یہ سب کچھ ہوگا کم سے کم ایک گھنٹے بعد۔ اس میں دو گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں۔ اگر تم نے میری ہدایات پر عمل کیا تو انہیں کچھ نہیں ہوگا۔ وکیل صاحب بھی خیر و عافیت کے ساتھ گھر پہنچ جائیں گے۔ سب بچھڑے ہوئے مل جائیں گے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا ورنہ بہت کچھ ہوجائے گا۔"
"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔
"پہلی بات تو یہ کہ تم چاروں میں سے کوئی بھی گاڑی سے باہر قدم نہیں رکھے گا۔ رابعہ ذرا ڈرائیونگ سیٹ پر ہے۔ اسے ڈرائیو کرنے دو۔ میری نظر میں ہے تمہاری گاڑی۔ کوشش کرکے تم بھی

یہ اطلاع مل گئی ہے۔"
رابعہ نے کہا "دیکھو ان کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ ہے۔"
"تم کیوں پریشان ہو اس کے لئے ایک طرح سے سوکن تھی ماری ہے۔ جس کا بچہ ہے۔"
"ہائی گھٹیا سوچ اپنے پاس رکھو۔ بڑوں کے مقابلے میں اس پر گیس کا اثر زیادہ ہوگا۔"
غالب نے کہا "وہ کون سی گیس تھی؟"
"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔" پیڈرو بولا "لیکن میں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ کسی کی جان کو خطرہ لاحق نہ ہو۔"
"اگر ممکن ہو تو اس بچے کے لئے کسی ڈاکٹر کو بلانے کی اجازت دے دو۔"
"ٹھیک ہے میں اپنے ساتھیوں سے کہہ دیتا ہوں۔" پیڈرو نے بڑی شرافت سے کہا "تم اب درست کرو۔"
رابعہ نے میری طرف بے بسی سے دیکھا اور میں نے سرہلا کے پیڈرو کے حکم کی تعمیل کے لئے کہا۔ تعمیل نہ کرنا ہمارے اختیار کی بات نہیں رہی تھی۔ اگر پیڈرو جھوٹ نہیں بول رہا تھا تو ہم مجبور تھے۔ اس نے وقار یوسف اور منی کے ساتھ محسن اور منی کو بھی یرغمال بنالیا تھا۔ پانچواں بونی تھا اور پیڈرو جیسے ذلیل آدمی سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ سب کو کسی نامعلوم مقام پر لے جاکے قید کردے۔ ہم پہنچ جائیں لیکن وہ عذاب میں مرجائیں۔

خود میرے لئے افشائے راز کی دھمکی بہت بڑا خطرہ تھی۔ میری معمولی سی غلطی نے ایک ایسے دشمن کو اپنے پیچھے لگالیا تھا جس سے فوری طور پر ہمیں کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا بلکہ جو خود ہم سے پیچھا چھڑا کے روپوشی اختیار کرچکا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی راہ چلتے کسی پاگل کتے کو پتھر ماردے اور خاموش سونے والا کتا اٹھ کے پتھر مارنے والے کے پیچھے دوڑے۔ اب پیڈرو حکم دے رہا تھا اور ہم بلا چون و چرا تعمیل کررہے تھے۔
گاڑی کا ریڈیو خاموش ضرور ہوگیا تھا مگر اس کی سرسراہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ رابطہ ختم نہیں ہوا۔ واکی ٹاکی قسم کا دوسرا ریڈیو ریسیور ہم سے زیادہ دور نہیں تھا اور پیڈرو واقعی کسی گاڑی میں ہمارے پیچھے آرہا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہوتا تو سرسراہٹ کم ہوجاتی یا ختم ہوجاتی مگر اس کے اور ہمارے درمیان مواصلاتی رابطہ برقرار رہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے آپس میں کوئی بات کی تو استاد پیڈرو بھی سُنے گا۔

مال روڈ تک میں نے کئی بار پلٹ کے دیکھا مگر ہمارے پیچھے ایک نہیں درجنوں گاڑیاں تھیں۔ رابعہ نے مجھے اشاروں کی زبان میں سمجھایا کہ میں سر کھپانے کی تکلیف نہ کروں۔ وہ بیک مرر میں گاڑیوں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ پھر میں نے اشاروں کی زبان میں خاموشی سے کہنا چاہا کہ وہ اس کار کو پہچانے جس میں پیڈرو نظر آیا تھا مگر

مجھے دیکھ سکو گے مگر اس کا فائدہ کچھ نہیں۔ اگر تم نے راستے میں کسی سے مدد مانگی۔ پولیس کو کچھ بتایا یا میری ہدایات پر عمل کرنے میں چالاکی اور بہادری سے کام لیا۔ تو نقصان انہیں ہوگا جو ایک گھنٹا تو ہماری تحویل میں ہیں۔ تم خود بھی پکڑے جاؤ گے اور ایک غیر ملکی وکیل کا ڈراما آج حوالات میں ختم ہوجائے گا۔ یہ گتی بڑی رعایت دے رہا ہوں میں تمہیں کہ ابھی تک تمہارا راز میرے سینے میں دفن ہے۔ اس سے پہلے کہ تم خود کچھ کرسکو میں تو پھر غائب ہوجاؤں گا لیکن پھر وقار یوسف کے گھر میں بھی تمہیں کوئی نہیں ملے گا۔ ایک گھنٹے تک میرے آدمی وہاں موجود رہیں گے۔ پھر وہ انہیں اپنے ساتھ ہی لے جائیں گے لیکن تم نے شرافت سے کام لیا اور وہی کیا جو میں کہوں گا تو آدھے گھنٹے بعد وہ آزاد ہوں گے۔ میرے ساتھی... رخصت ہوجائیں گے۔ میں خود انہیں حکم دوں گا کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہ جائیں۔"
"اور تمہارے یہ آدمی آخر ہیں کون؟ کیا تم نے بھی کوئی گروہ بنالیا ہے؟"
"کیا کرو گے یہ جان کے" پیڈرو بولا۔ "گروہ تو سب ہی بناتے ہیں کبھی وہ یونین کہلاتی ہے۔ کبھی اسے ٹیم یا کلب کہتے ہیں' کبھی مافیا اور سنڈیکیٹ جیسے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ تجارت پیشہ افراد کی بھی انجمن ہوتی ہے۔ چیمبر آف کامرس بھی ایک گروہ ہوتا ہے۔"
"بڑی اونچی باتیں کرنے لگے ہو تم پیڈرو۔ ایک گھٹیا بدمعاش....."
"کیا یہ غلط ہے۔ تمہارا بھی ایک گروہ تھا۔ ایم آر ایس۔ دراصل سب کا مشترکہ مفاد ہو تو لوگ آپس میں مل جاتے ہیں۔ متحد ہوجاتے ہیں۔ رہا اچھے بُرے مقاصد کا فرق تو اس کا فیصلہ کرنے والے تم کون۔ بڑی اونچی سطح پر اسمگلر اور تھوک اندوز تاجر بھی گروہ بنا کے ملک اور قوم کی ایسی تیسی کرواتے ہیں۔ بیوروکریسی ایک گروہ ہے مگر وہ بڑے معزز کہلاتے ہیں۔ کچھ میرے ساتھی ہیں۔ نہ ہوتے تب بھی کیا فرق پڑتا۔ ساتھی کرائے پر بہت ملتے ہیں۔ آج کل تو کرائے کی فوج مل جاتی ہے۔ کرائے کے فوجی دنیا کے بہت سے ممالک حاصل کرتے ہیں۔"
میں نے کہا "بند کرو یہ فضول بکواس اور یہ بتاؤ کہ اب کہاں جانا ہے؟"
"یہاں سے چلو ملتان روڈ کی طرف۔ چوبرجی سے سیدھے نکلو۔ وہاں تک تمہیں رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ اپنے لاہور کی سڑکوں سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ بس یہ مت بھولنا کہ میں تم پر نظر رکھوں گا۔ بہت زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرکے یا الٹا سیدھا راستہ اختیار کرکے تم مجھے چکمہ دے سکتے ہو مگر ایسا کرنے سے پہلے ان سب کے بارے میں سوچ لینا جو صرف ایک گھنٹے کے لئے ہماری تحویل میں ہیں اور ابھی اپنے ہی گھر میں ہیں۔ لو وہ گھر پہنچ گئے

www.paksociety.com

نازو نہیں۔ کبھی تو میں نے پیچھے جھک کے سرگوشی میں یہ بات کہہ دی۔ نازو نے سر ہلایا اور پلٹ کے دیکھا۔ شاید اس کی یہ حرکت بھی پیڈرو کی نظر سے پوشیدہ نہ رہی ہو مگر مجھے پروا نہیں تھی۔

ایرپال تک نازو کو اور مجھے کئی گاڑیوں پر شک ہوا کہ ان میں پیڈرو ہوگا مگر وہ سب گاڑیاں آگے نکل گئیں۔ رابعہ نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے رفتار کو تیس چالیس میل سے بڑھنے نہیں دیا تھا تاکہ پیڈرو کو شک نہ ہو۔ وہ چالاک آدمی یقیناً کافی پیچھے تھا۔ وہ سو گز پیچھے رہ کے آرام سے تعاقب جاری رکھ سکتا تھا۔ درمیانی فاصلے میں گاڑیاں حائل ہوتی رہتی تھیں چنانچہ وہ محفوظ تھا۔

ایرپال سے چوبرجی تک کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا مگر ملتان روڈ پر بھی ٹریفک کا رش کم نہ تھا۔ رابعہ نے ایک ہی رفتار سے سفر جاری رکھا۔ ریڈیو کی خاموشی میرے اعصاب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ پیڈرو اور کچھ کہے۔ اگر اس نے رابعہ کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے بوبی کے لئے کسی ڈاکٹر کو بلانے کے لئے کہا تھا تو ہم نے اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دو طرفہ مواصلاتی نظام استعمال کر رہا تھا۔ وہ ہم سے کسی اور فریکوئنسی پر بات کر رہا تھا اور اپنے ساتھیوں سے دوسری فریکوئنسی پر ورنہ اس کی آواز ہم بھی سنتے۔

ہمیں مسلسل چلتے ہوئے بیس منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ پیڈرو نے آدھے گھنٹے بعد سب کی رہائی کا وعدہ کیا تھا۔ ہم نے وہی کیا تھا جو پیڈرو نے چاہا تھا اس کے باوجود پیڈرو جیسے شخص کے وعدے پر اعتبار وہی کر سکتا تھا جو اسے نہ جانتا ہو۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ کہیں یہ سب جھوٹ نہ ہو۔ رابعہ اور نازو اس خیال سے سہمی بیٹھی ہوئی تھیں کہ نہ جانے باقی سب کس حال میں ہوں گے۔ خود پیڈرو کو علم نہیں تھا کہ وہ کون سی گیس تھی۔ معمولی سی زہریلی گیس بھی زیادہ مقدار میں استعمال کر لی جائے تو مہلک بن جاتی ہے۔ بہت سی عام استعمال کی زہریلی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو بچوں کی غلطی سے پیٹ میں چلی جاتی ہیں یا پی لیتے ہیں مگر معمولی مقدار ہو تو بچے کو بھی نقصان نہیں ہوتا۔ غبارا بوبی کے ہاتھ میں دیا گیا تھا اور اسی کے ہاتھ میں پھٹ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سب سے زیادہ گیس کی مقدار اسی کے سانسوں میں شامل ہوئی ہوگی۔

اندر سے میرا خون بھی تیزاب کی طرح کھول رہا تھا۔ پیڈرو جیسے حقیر شخص نے سامنے آئے بغیر وہ کام کر دکھایا تھا جو دس مسلح افراد سامنے آ کے نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ دشمن کو کبھی حقیر مت جانو۔ اس حقیقت سے انکار بھی ناممکن تھا کہ پنگا لینے والا میں خود تھا کہ ایک محاذ پر لڑتے لڑتے اچانک دوسرے دشمن کو چھیڑ دیا تھا۔ اسے بدقسمتی بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ میں ایسا چاہتا نہیں تھا۔ میں تو کسی اور کام سے کراچی گیا تھا۔ وہاں مجھے پیڈرو نظر آ گیا تو میرے جذبات بھڑک اٹھے۔ یہی میری غلطی تھی۔ جنگ کبھی جذبات سے نہیں جیتی جاتی۔ میں نے جذبات پر قابو رکھا ہوتا۔ صرف یہ معلوم کر لیتا کہ استاد پیڈرو آج کل شیخ مختار بن کے کاروباری آدمی بن گیا ہے اور معزز بننے کے چکر میں ہے۔ اس کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ مجھے اس کے نئے بدلے ہوئے انداز زندگی کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ وار اور سے نمٹنے کے بعد اس سے نمٹنا آسان تھا۔ وہ بے خبری میں مارا جاتا۔

ابھی تو ہم ایک ہی سطح پر ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ مجھے یہ علم تھا کہ وہ شیخ مختار بنا ہوا ہے تو وہ جان گیا تھا کہ میں نے ایک فرضی وکیل کا بھیس بدل رکھا ہے۔ یہ خطرہ تو ہر وقت تھا۔ لاہور میں کوئی بھی وکیل، پولیس افسر یا جج مجھ سے شناختی دستاویزات طلب کر لیتا تو میں پکڑا جاتا۔ یہ صرف رابعہ، عبدالودود، مظفر، وقار جیسے وکیلوں اور کچھ صحافیوں کا ساتھ تھا جس نے میری شناخت کو شک و شبے سے بالاتر کر دیا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری یہ حیثیت مستحکم ہوتی گئی تھی۔

شہر کی رونق ختم ہونے لگی اور پیچھے اکا دکا گاڑیاں رہ گئیں تو مجھے کچھ شک ہونے لگا۔ رابعہ کی نظر بھی عقب نما آئینے پر تھی اور شک کی یہ پرچھائیں اس کی صورت پر بھی نظر آ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ ہلا کے اشارے سے مجھ پر واضح کیا کہ پیچھے تو کوئی بھی نہیں ہے۔

میں نے دیکھا تو پیچھے صرف ایک ٹرک تھا۔ ایسے بہت سے ٹرک دن رات ایک قطار میں اس سڑک پر چلتے رہتے تھے۔ ہم نہ جانے کتنے ٹرکوں کو اوورٹیک کر آئے تھے۔ ہم سے آگے بھی ٹرک جاتے نظر آ رہے تھے اور ان کی رفتار بھی تقریباً وہی تھی جو ہماری۔ عام حالات میں کاریں بہت زیادہ تیز رفتاری سے نکل جاتی ہیں اور وقفے وقفے سے کوئی کار ہماری سست رفتاری کا مذاق اڑاتی گزر جاتی تھی مگر ہم کسی کو کیا بتاتے اور کیسے بتاتے کہ تیز رفتاری میں شہرۂ آفاق یہ جرمن کار کیوں خراماں جاری ہے۔ اس میں جاننے کی کوئی بات نہیں۔ ہٹلر نے جنگِ عظیم دوم سے قبل فاکس ویگن بنانے کا حکم دیا تھا کہ ایک عوامی کار بنائی جائے جس کا خرچ کم سے کم ہو، لاگت کم سے کم ہو اور جس میں خرابی کم سے کم ہو اور جسے ایک عام آدمی کم سے کم قیمت میں خرید سکے چنانچہ انیس سو اڑتیس میں جب یہ کار بنی تھی تو ایک جرمن مزدور اپنے تین ہفتے کی تنخواہ میں خرید سکتا تھا۔ چالیس سال بعد بھی اس کی شکل صورت وہی تھی اور یہ ہر سال گاڑی کی شکل اور ماڈل بدلنے والوں کے لئے ناقابلِ یقین سی بات تھی کہ ابھی تک ساری دنیا میں اس گاڑی کی مقبولیت کم نہیں ہوئی۔ یہ آج بھی دنیا کی سب سے زیادہ ری سیل میں بھی بار بار خریدی جانے والی گاڑی ہے اور دنیا بھر میں کروڑوں کی تعداد میں چل رہی ہے۔

رابعہ نے چونک کے سوال کیا "آخر کب تک چلتے رہیں گے ہم ایسے ہی۔ تیس میل دور تو آ گئے ہیں۔"

نازو نے بھی کہا "مجھے تو پیچھے کوئی بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

غالب نے بھی اثبات میں سر ہلایا "پیڈرو کی بدمعاشی لگتی ہے مجھے۔"

مجھ سے پہلے کار کے ریڈیو کا اسپیکر بولا "پیڈرو شریف آدمی ہے ہی نہیں۔ لیکن اب سو پیاز کھانے کے بعد سو جوتے کھانے کی بے وقوفی مت کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے ساتھ وہ بھی مارے جائیں۔"

"آخر ہمیں جانا کہاں ہے؟" میں نے کہا "گاڑی میں پیٹرول ختم ہو گیا ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ دو چار میل آگے جا سکتے ہیں۔"

رابعہ نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھا "مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ اس سڑک پر آگے بیس پچیس میل تک کوئی پیٹرول پمپ ہو۔ یہ لو گاڑی جھٹکے لینے لگی ہے۔ دو چار میل کیا اب تو دو فرلانگ بھی نہیں جائے گی۔"

میں نے کہا "بیچ میں مت چلو۔ ورنہ دھکا لگا کے ایک طرف کرنا پڑے گا۔ دیکھا ہوتی بند۔"

رابعہ نے کہا "میں کر لوں گی ایک سائیڈ پر۔"

اس سے پہلے کہ رابعہ گاڑی کو سائیڈ پر لگاتی، ہمارے پیچھے آنے والا گھاس سے اوپر تک لدا ہوا ٹرک بھی رک گیا اور اس میں سے تین افراد کود کے اتر آئے۔ ایک آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور دو پیچھے کہیں گھاس کے انبار میں تھے یا اس کے اوپر لیٹے ہوئے تھے۔ ٹرک ڈرائیور نے ذرا سی دیر کے لئے رفتار کم کی تھی اور ممکن ہے چند سیکنڈ کے لئے ٹرک رکا بھی ہو۔ وہ تینوں اس سے پہلے ہی ہمیں گھیر چکے تھے۔ ٹرک ڈرائیور دوبارہ روانہ ہو گیا تھا۔

قریب آنے والے تینوں افراد ہم جیسے ہی تھے۔ ان میں ایک عورت کو دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ وہ رابعہ اور نازو کی طرح ہی نظر آتی تھی۔ جوان اور خوب صورت ہونے کے علاوہ وہ فیشن ایبل بھی تھی اور کسی طرح بھی بدمعاش یا بدمعاشوں کی ساتھی نظر نہیں آتی تھی۔

اس کے دو ساتھی بھی پینٹ شرٹ والے میرے اور غالب جیسے تھے۔ یہ ان کی چالاکی تھی۔ اس طرح سڑک پر سے گزرنے والے یہی سمجھتے کہ ہم ساتھ ہیں۔ ان کے اور ہمارے ایک سے حلیے اور انداز دیکھ کے کوئی بھی ہمیں ایک ہی خاندان کے فرد یا دوست سمجھ سکتا تھا۔

ریوالور ان سب کے پاس تھے جو صرف ہم دیکھ سکتے تھے۔ ان کے چہروں پر تو بڑی دوستانہ شریفانہ مسکراہٹ تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمیں کوئی حکم دیتے یا ہم ان سے کچھ پوچھتے، پیچھے آنے والی ایک سفید کار ہمارے قریب آ کے ٹھہر گئی۔ یہ وہی گاڑی تھی جس میں نازو نے پیڈرو کو اپنے پاس سے گزرتے دیکھا تھا۔

ایک شخص نے ہم سے کہا "خواتین نیچے اتر آئیں اور دوسری کار میں چلیں۔ اس میں پیٹرول ہے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "ہم جہنم میں بھی جائیں گے تو ساتھ۔"

غالب نے کہا "خواتین کو حضرات سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہم کر سکتے ہیں۔" وہ بولا۔

"تماشا ہوگا" میں نے کہا "کیسے۔ سڑک پر اتنا ٹریفک ہے۔ زبردستی کرو گے تو سب دیکھیں گے۔"

"ٹرک تو وہاں بھی دیکھ رہے تھے جہاں ہم نے ایک بچے کو ایک رنگین غبارہ دیا تھا۔" وہ بولا۔

"وہ بچہ تھا۔ ہمارے ساتھ زبردستی کر کے دیکھو۔" میں نے کہا۔

"بلکہ میرا مشورہ ہے کہ گولی مار کے دیکھو۔" غالب نے کہا۔

"میرے ریوالور میں گولی ہوتی تو میں تمہاری فرمائش ضرور پوری کر دیتا مگر افسوس کہ یہ گیس گن ہے۔" اس نے کہا "بے آواز ہے۔"

دوسرے نے کہا "اس میں وہی گیس ہے جو غبارے میں تھی مگر یہ زیادہ تیز ہے۔"

ظاہر ہے اس کے بعد مقابلے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ وہ بڑے تربیت یافتہ لوگ تھے۔ انہیں یقیناً معلوم ہوگا کہ ہم میں سے کون کم خطرناک ہے اور کون غالب یا مجھ سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا "کیا یہ رعایت نہیں دو گے کہ ایک مرد اور ایک عورت ساتھ رہیں۔"

اس نے سوچ کے کہا "ہاں ایسا ہو سکتا ہے کہ تم اتر کے پیچھے چلے جاؤ اور پیچھے والی گاڑی چلاؤ۔ اور جو تمہاری گاڑی میں پیچھے بیٹھے ہیں وہ تمہاری جگہ آگے آ جائیں۔ لیکن گاڑی عورت چلائے گی۔ مرد اسی طرح تمہاری جگہ بیٹھ جائے گا۔ چلو جلدی کرو۔ زیادہ وقت نہیں ہمارے پاس۔"

میں سمجھ گیا کہ انہیں سمجھانا مشکل ہوگا۔ ان کا ہوم ورک مکمل تھا۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ اصل خطرہ مجھ سے لاحق ہوگا یا نازو سے۔ جب ہم دونوں ہی ذرا بھی تنگ کر رہے ہوں گے تو اور کچھ بھی نہ کر پائیں گے۔

پھر بھی میں نے ایک کوشش کی "یہ لڑکی گاڑی چلانا نہیں جانتی۔"

اس نے اپنے ریوالور کا رخ میری طرف کر دیا "ہم جانتے ہیں کون کیا ہے۔"

چند منٹ بعد دونوں کاریں پھر روانہ ہو گئیں۔ وہ چالاک لوگ تھے۔ انہوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ پیٹرول ختم ہونے کا بہانہ ہماری اداکاری ہے کیونکہ اگلا پیٹرول پمپ اب سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔

دو میل جانے کے بعد پیچھے والے نے کہا "گاڑی کو بائیں جانب موڑ لو۔ جو نیلی سفید دھاریوں والا مکان نظر آ رہا ہے وہیں جانا ہے۔"

www.paksociety.com

"اگر میں ایسا نہ کروں پھر؟" "اب تو تم بھی ہمارے ساتھ ہو۔"
"ہاں مگر ہم جیب میں گیلے رومال رکھ کے لائے ہیں۔ ہم پر گیس کا اثر نہیں ہوگا۔" وہ بولا۔

میں نے گاڑی کا رُخ موڑ دیا۔ وہ کوٹھی سڑک سے ایک فرلانگ دور بھی نہیں تھی اور بالکل نئی بنی ہوئی تھی۔ اس علاقے میں فلم اسٹوڈیوز بھی تھے اور بہت سے نامور اداکار بھی کوٹھیاں بنوا چکے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی فلم کے کسی منظر میں یہ کوٹھی میں دیکھ چکا ہوں۔ ہمارے نزدیک پہنچتے ہی گیٹ کھل گیا اور دونوں گاڑیوں کے اندر داخل ہوتے ہی بند بھی ہوگیا۔ استاد پیڈرو نے

ہمارا استقبال پورچ میں ہی کیا۔
میں نے کہا "پیڈرو کیا تمہارے ساتھیوں نے انہیں چھوڑ دیا ہے؟"

وہ ہنسا "ہم نے کسی کو بھی نہیں پکڑا تھا۔ گیس کے غبارے والی کہانی تو ایک مذاق تھی۔ خیر تم نے اچھا کیا کہ ہمارے لئے کوئی مشکل پیدا نہیں کی۔"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے کہ تم اب جھوٹ بول رہے ہو۔"
اس نے مسکرا کے ہمیں اندر آنے کی دعوت دی "یہاں فون بھی ہے۔ تم خود بات کرلو ان سے۔"
"پیڈرو اگر ان میں سے کسی کو کچھ ہوا تو؟"
"تو کیا؟" اس نے طنز سے کہا "سکندر بخت۔ تم کیا بگاڑ سکتے ہو میرا۔ میں ان سب کو بھی مروا سکتا ہوں اور تم سب کی لاشیں بھی یہاں چھوڑ کے جاسکتا ہوں۔ لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں نے تو آخری بار تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ خیرسگالی کے طور پر تمہارے ایک دشمن کو تمہارے حوالے کردوں۔ اور تمہیں یقین دلادوں کہ میرے دل میں تمہارے خلاف کچھ نہیں۔ تمہارے دل میں ہے تو بھول جاؤ۔"

میں نے کہا "تم کس دشمن کی بات کررہے تھے؟"
اس نے حیرانی سے کہا "ایک ہی تو دشمن ہے تمہارا۔ اصل دشمن۔ چوہدری دلاور۔"
"تم اسے میرے حوالے کروگے؟" میں نے پُرتمسخر اور تلخ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ اندر آؤ۔"
میں بے یقینی اور تذبذب کی کیفیت میں پیڈرو کی صورت کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اندر سے کسی کے چلانے کی آواز سنی۔ وہ پیڈرو کو گالیاں دے رہا تھا۔

اُستاد پیڈرو کا رنگ اچانک متغیر ہوگیا۔
جب کوئی اپنے بدترین دشمن کے چنگل میں اتنا بے بس ہو جتنے ہم تھے۔ فرار کے راستے مسدود ہوں، مقابلے کا حوصلہ اور اُمید کے رشتے ٹوٹتے محسوس ہوتے ہوں۔ دل کو بہلا دینے کا بہانہ بھی نہ ہو تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے کہ عقل کام نہیں کرتی اور کوئی دُعا تک یاد نہیں آتی۔
ابھی تک استاد پیڈرو کی کیفیت اس کے برعکس تھی۔ ہم تھے اور وہ تماشائی۔ کامیابی اور فتح مندی کی خوشی اس کے انداز و اطوار سے جھلکی پڑتی تھی۔
وہ ایک جاہل، بدکردار اور کم ظرف شخص تھا مگر خود کو وسیع القلب اور ہم سے برتر و اعلیٰ ثابت کرنے کی کوشش میں اس فلمی مسخرے کی طرح نظر آتا تھا جو فلم اسکرین پر چھچھوری حرکتوں سے لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتا ہو مگر ہمارے بنائی ہوئی فلم میں وحید مراد کی طرح پُرکشش رومانٹک ہیرو بننے کی کوشش کرے۔
پیڈرو بہت خوش تھا۔ اس خوشی کا اظہار اس کی زبان کے علاوہ سے بھی ہوتا تھا اور اس کی مکروہ صورت پر نظر آنے والی پُرغرور مسکراہٹ سے بھی۔ وہ فخر و غرور سے خود کو رستم اور نادر شاہ سے بڑا سورما سمجھ رہا تھا اور جم کاربٹ سے بھی بڑا شکاری جو وحشی انسانوں کو چٹ کرجانے والے آدم خور شیر کو خالی ہاتھ پکڑ لے جا کے کان سے پکڑ لایا ہو۔
اب اچانک وہ اپنا مصنوعی کردار بھول گیا تھا۔ اس کا غرور اور خوداعتمادی کافور ہوگئی تھی اور مسکراہٹ غائب ہوچکی تھی۔ وہ پریشان اور خوف زدہ نظر آنے لگا تھا۔
اس کی حالت میں یہ تبدیلی کسی کی بھی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو مگر اچانک اس کی ذات کو شکست کے احساس سے دوچار دیکھ کے مجھے خوشی ہوئی تھی۔ کسی غیرمتوقع تبدیلی حالات کے خیال نے میرے لیے ناامیدی کے اندھیرے میں اُمید کا دھندلا سا اُجالا بکھیر رہا تھا۔
جب پیڈرو نے ریوالور نکالا تو میں نے کہا "شیخ کا۔۔۔ یہ کیا ہے؟"
اس نے غرا کے کہا "یہ اصلی ریوالور ہے۔ گولیوں والا۔"
میں نے سر ہلایا "کیا معاملہ کچھ گڑبڑ ہوگیا ہے؟"
غالب نے کہا "کیا تم غلط جگہ لے آئے ہو ہمیں؟ اوراستہ بھول گئے۔"
پیڈرو نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کے تین ساتھیوں میں سے دو نے ہمیں اپنی گیس گن کی زد پر رکھا۔ کھلی جگہ پر گیس گن اتنی کارگر نہیں رہتی۔ اگر میں چاہتا تو وار کرکے ان سے گن چھین سکتا تھا لیکن میں نے مزاحمت اور مقابلے کا ارادہ صورت حال کے واضح ہونے تک ملتوی کردیا تھا۔

پیڈرو کے ایک ساتھی نے بھی ریوالور نکال لیا اور پیڈرو کی طرف یوں دیکھا جیسے اس سے توپ چلانے کی اجازت کا طلب گار ہو۔

پیڈرو نے افسوس سے سر ہلایا "یہ کون بدتمیز ہے جو تمہارے باپ کو گالیاں دے رہا ہے۔ اندر جاکے ریوالور خالی کردو اس پر۔"

میں نے کہا "یار اس سے بھی بڑی گالیاں ہم دے رہے ہیں دل میں۔"
"بکواس بند کرو ورنہ دل کو چھلنی کردوں گا۔" گیس گن والے ایک چھوٹے بدمعاش نے سوچ کے کہا۔
خاندانی باتوں کی آواز اندر پہنچ گئی تھی۔ گالیوں کی فائرنگ بند ہوگئی۔ اب سنسنی خیز خاموشی کا سسپنس تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔
میرے لیے یہ صورت حال ایسی تھی جیسے چور کسی شریف شہری کو لوٹ رہے ہوں کہ پولیس والے بھی پہنچ جائیں اور معاملہ اُلٹ ہو جائے۔ نہ چور کو یقین ہو کہ اس مال غنیمت میں سے پولیس حصہ لے گی اور سب لینے کے بعد بھی انہیں خاطر تواضع کے لیے سرکاری مہمان خانے لے جائے گی یا نہیں۔ لٹنے والا فریادی الگ پریشان ہو کہ اب نہ جانے قانون کے لیے ہاتھ کس کی گردن پکڑیں گے اس کی یا چور کی۔
پھر آناً فاناً سب کچھ ہوگیا۔ پیڈرو کے اشارے پر اس کے دو بدمعاشوں نے ایک دم دروازے پر یلغار کی۔ انہیں یقین ہوگا کہ دروازہ مضبوطی سے بند ہے اور وہ کندھے ملاکے اپنی متحدہ قوت سے ٹکرائیں گے تو دیواروں سے اکھڑ کے دروازہ دور جاگرے گا اور پھر اس سے پہلے کہ اندر والے دشمن کے حواس بجا ہوں وہ اسے دبوچ لیں گے۔ چند ذرا آپ!
لیکن ہوا یہ کہ عین تصادم کے وقت دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے۔ یہ کسی خودکار نظام کا کمال نہیں تھا۔ اندر کوئی دروازے کی جھری سے آنکھ لگائے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسی نے یہ حرکت کی تھی اور پھر فوراً وہیں لیٹ گیا تھا۔
بالکل بگولوں کی ہوا کی طرح دوڑنے والے جب دروازے سے سیدھے گزر گئے تو انہیں بریک لگانے کی مہلت ہی نہ ملی۔ راستے میں کھمبے کی طرح پڑے ہوئے شخص سے ٹھوکر کھاکے سنبھلنا ان کے لیے ناممکن ثابت ہوا۔ وہ ایک نعرۂ مستانہ کے ساتھ منہ کے بل زمین پر بکھرے ہوئے گئے۔ میں نے دو خطرناک قسم کے ریوالور ان کے ہاتھ سے اُڑتے ہوئے ان کا استقبال کرتے دیکھا۔ انہوں نے ہماری استعداد کے دو ہاتھ کھول دیے جن میں ریوالور تھے۔ پھر چیخ کر اور ٹھوکریں مار کے دونوں جانبازوں کو اُٹھنے کے ناقابل بنادیا۔ ان میں سے ایک نے اپنی امان کو اور دوسرا اپنے کو آوازیں دیتا ہوا بے حس و حرکت اور بے ہوش ہوگیا۔ انہیں مُردہ کتوں کی لاش کی طرح

جاسوسی ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ

انسان کی ترقی و تہذیب کے حیات افروز واقعات
صدیوں سے زندہ ایک پُراسرار شخص کی آپ بیتی، ہَوا جس کی دوست تھی، سمندر جس کے لیے آغوش مادر تھا، آگ اس کے بدن کو نمو دیتی تھی۔
✱✱✱✱✱✱✱✱✱✱✱✱✱✱
وہ کہانی جس نے اپنے وقت میں مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیے

پانچ حصوں میں مکمل

قیمت فی حصہ ۹۵ روپے ✱ ڈاک خرچ فی حصہ ۱۶ روپے

مکمل سیٹ منگانے پر قیمت صرف ۴۰۰ روپے، ڈاک خرچ معاف۔ صرف ۴۰۰ روپے کا منی آرڈر روانہ فرمائیں۔ یہ رعایت صرف منی آرڈر ارسال کرنے پر ہی مل سکے گی

www.paksociety.com

گھسیٹ کر اندر لے جایا گیا۔
باہر بھی جنگ و جدل اور مقابلے کی نوبت نہیں آئی۔ نہ جانے کس سمت سے دو گولیاں آئیں' پیڈرو کا ریوالور طوطے کی طرح ہاتھ سے اڑ گیا۔ ایک درخت پر سے کوئی بولا "اب مردانہ وار آگے بڑھو۔"

دوسرے درخت پر سے... کہا گیا "مگر رکوع کی حالت میں اپنے دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھو اور سر جھکا کے قدم بڑھاؤ... ورنہ..."

"ورنہ اگلی گولی سے تمہارے چہرے پر ناک نہیں رہے گی" پہلے درخت میں کہیں لنگور کی طرح چھپے ہوئے کسی شخص نے کہا۔

میں نے پیڈرو کو اشارہ کیا "ان کی بات مان لو شیخ جی۔ ناک بچ نہ کٹ جائے۔ ان کا نشانہ اچھا ہے۔"

غالب نے اپنی ناک کو چھوا "ناک نہ پھر جوڑی جا سکتی ہے نہ کسی اور کی لگائی جا سکتی ہے۔"

پیڈرو نے مجھے اور غالب کو خونی نظروں سے دیکھا اور آگے بڑھا۔ اس کے قدم بڑھاتے ہی فائر ہوا اور میں نے پیڈرو کی ناک سے خون ٹپکتا دیکھا۔ گولی اس کی ناک کو چاٹتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اس کی ناک عبرت ناک ہو چکی تھی۔

پیڈرو فوراً حالت رکوع میں چلا گیا۔ اس کے معاون خاص نے فوراً اپنی ناک کی سلامتی کی خاطر اپنے باس کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کیا۔ باس کی ناک سے ٹپکنے والا قطرہ قطرہ خون فرش پر سرخ چھینٹے بنا رہا تھا اور وہ اسی کو دیکھتا ہوا غالباً یہ سوچ رہا تھا کہ ایسی حالت میں کوئی بھی اپنی خودی بلند نہیں رکھ سکتا۔

میں نے بہ آواز بلند کہا "کیا خیال ہے اب ہم بھی اندر چلیں۔ یہاں کب تک کھڑے رہیں گے۔"

"ہاں" غالب نے بہادری کا ثبوت دیتے ہوئے قدم آگے بڑھایا "اب یہاں تک آگئے ہیں تو صاحب خانہ سے بھی مل لیں۔"

نازو نے اس کو روکنے کی کوشش کی۔ خوف سے رابعہ کی حالت بھی غیر تھی مگر میں اور غالب بے خوفی کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب رہے اور جب کسی بھی سمت سے نہ کوئی گولی آئی اور نہ کسی نے ہمیں روکا تو ہمارے حوصلے میں اضافہ ہوا "یہ لڑکیاں ذرا ڈرپوک ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے مسکرانے کی بہترین اداکاری کی "ہمیں! ہم نے تو کوئی غلطی نہیں کی ہے یہاں آکے۔ ہماری ناک محفوظ ہے۔"

ہمارے تبصرے پر کسی نے تبصرہ نہیں کیا۔ ہم نے اندر قدم رنجہ فرمایا تو دروازہ ہمارے پیچھے خود بخود بند ہو گیا۔ پرسکون اور پراعتماد نظر آنے کا ڈراما کرنے کے باوجود ہمارے اعصاب اتنے کشیدہ تھے کہ دروازہ بند ہونے کی آواز پر ہم سب اچھل پڑے۔ خواتین نے تو لاحول یا ہائے اللہ بھی کہا تھا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو بس دیکھتا رہ گیا۔ شاید اسکی ... کا شکار دوسرے بھی ہوں گے مگر میں انہیں دیکھ ہی کب ... میرے سامنے دلاور کی بیوی بڑے وقار اور تمکنت ... کھڑی تھی۔ اس عورت کے میں نے کئی روپ دیکھے تھے ... سال کی عمر میں بھی وہ حسین اور پرکشش جسم کی مالک ... میں ذہانت اور جرأت کی بھی کمی نہ تھی۔ وہ بہترین اداکارہ ... ایک نیوز پریس کانفرنس میں وہ مختلف کردار بڑی کامیابی ... کر چکی تھی۔ میں نے اسے اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے ... بازی لگاتے بھی دیکھا تھا۔ زمین دوز تہ خانے میں موت کا ... کرتے بھی دیکھا تھا اور پھر دیوانہ وار اپنے قیدی شوہر سے ... محبت کرتے بھی۔ دلاور شاید اس کا مثالی شوہر نہیں تھا مگر ... شوہر کی صحیح شریک حیات تھی۔ اس کے گھر اور کاروبار کی ... کی حفاظت کرنا جانتی تھی اور اس کے ساتھ ہی جب وہ ... انتہائی جذبے سے مضطرب ہو جاتی تھی تو شوہر سے بے وفائی ... مرتکب ہو کے بھی شرمندہ نہیں ہوتی تھی۔ عجیب عورت تھی ... شاید ہر عورت ہی عجیب ہوتی ہے۔

جب اس نے کہا "بہت حیران ہو مجھے دیکھ کے سکندر ..." تو میں نے چونک کے کہا "ہاں۔ لیکن اس سے پہلے بھی ... بار مجھے حیران کر چکی ہو۔"

رابعہ نے کہا "تم واقعی حیران کن صلاحیتوں کی مالک ہو۔ واقعی کمال ہے کہ تم نے چوہدری دلاور کو بچا لیا۔"

حیرت کا دوسرا جھٹکا ہمیں چوہدری دلاور کی آواز سے پہنچا "تو سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ اپنے سکندر صاحب' یہیں آپ ... پکڑے گئے۔"

ہم سب پتلیوں کی طرح گھوم گئے۔ چوہدری دلاور ہم سے ... قدم کے فاصلے پر ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ قید و ... صعوبت کے اثرات اتنی جلدی زائل نہیں ہو سکتے تھے ... کے مقابلے میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ مگر وزن کم ہو جانے کے ... پہلے سے زیادہ جوان نظر آنے لگا تھا۔ اس کا چہرہ بغیر ... اس کے بیر کلر سے سیاہ نظر آنے والے بال ... ہوئے تھے۔ اسے پینٹ اور اسپورٹس شرٹ میں دیکھ کے مجھے تعجب ... وہ ایک بالکل مختلف چوہدری دلاور نظر آ رہا تھا۔

"اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" چوہدری دلاور نے مسکرا کے کہا "پلیز آرام سے بیٹھ جائیں۔ مس رابعہ آپ ... مایوس ہوں گی مجھے یہاں دیکھ کے۔ آپ کی تو بڑی خواہش تھی ... کوشش کی تھی آپ نے مجھے وہاں پہنچانے کی۔ ہیں جی کیا کہتے ... اسے... تختہ دار پر۔"

رابعہ میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے ... "ابھی چھوڑی نہیں ہے دلاور۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "ٹھیک ہے جی۔ جاری رکھو اپنی کوشش ..."

اس کنیزو کی طرح۔ ہیں جی' جس کی وہ کہانی ہے نرالی' نرالی الجھن۔"

"آخری جیت ہماری ہو گی دلاور۔"

اس نے ایک اور قہقہہ مارا "آخری جیت۔ واہ جی واہ ابھی پہلی جیت ہوئی نہیں۔ تم آخری کی آس لگائے بیٹھے ہو۔ ایک پیچھے پاگل دے پڑ اور تم سب۔ بڑے بڑے وکیل اور صحافی۔ اور پھر تم سے اپنے فرنچ وکیل صاحب۔ کیا بات ہے جی ان کے ڈرامے کی۔ بڑے اچھے ایکٹر ہیں اور سارے زمانے کو کب سے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ کیسا کیسا سوانگ بھرتے ہیں ماشاءاللہ... مگر فائدہ؟ میں تو کہتا ہوں اپنے سکندر صاحب 'تم بچے جاؤ تلوں میں اب تو۔"

"اس وقت تم کچھ بھی کہو جائز ہے۔ میں برا نہیں مانوں گا۔"

"یار ایک بات بتاؤ مجھے" وہ کچھ آگے جھکا "تم ویسے تو اچھے پڑھے لکھے اور پڑھے لکھے بندے ہو۔ ہم تو مانتے ہیں جی کہ دس جماعت فیل ہیں مگر تم خیر سے ولایت بھی ہو آئے ہو۔ اور اپنی رابعہ بی بی ماشاءاللہ سے اتنی بڑی وکیل ہیں۔ تمہاری عقل خراب ہو گئی ہے کہ ایک معمولی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یہی تو مشکل ہے۔ ہم غیر معمولی بات ہی سمجھتے ہیں۔ تم جیسے معمولی لوگوں کی بات سمجھتے بھی نہیں اور..."

اس نے میری بات کاٹ دی "مجھے یہ بتاؤ کہ اتنی جھک ماری تم سب نے مل کے... ہیں جی' خوار پھرے سارے زمانے میں۔ بڑی بولی انصاف کی۔ کیا ملا تمہیں اس سے؟ کچھ نہیں بگاڑ سکے تم چوہدری دلاور کا۔ خود تباہ ہو گئے' بے گھر ہو گئے' پاگل ہو گئے۔ تم کیا سمجھتے ہو مجھے پتا نہیں' سب سے پہلے یہ پاگل ہوئی تھی۔ رابعہ تو دی بد ابیت لا۔ پھر محسن پاگل ہوا۔ وہ کیا نام ہے اکرام شیخ کی بیوی کا سیدھی جس کو تم ڈھاکا سے ساتھ لائے تھے۔ ہاں "کاجل" وہ پاگل تھی۔ پھر غالب پاگل ہوا... نازو پاگل ہوئی۔"

میں نے کہا "چلو چھوڑو جی' لمبی بات کرنے کی کیا ضرورت ہے... ہم مان لیتے ہیں کہ سب پاگل ہیں۔ پورا قبیلہ ہے دیوانوں کا۔"

غالب بولا "لیکن خیر سے ہم وہ نہیں ہیں جو آپ ہیں۔ کیا کہتے ہیں اسے اپنے سکندر صاحب... ہاں 'نطفہ ناتحقیق'!"

اس نے غالب کی گالی کو اہمیت ہی نہیں دی "اتنی مشکل فارسی کی کیا ضرورت ہے۔ ہیں جی 'اپنی ماں کی...' میرا مطلب ہے مادری زبان میں حرامی کہہ دو۔ ہم تو خود مانتے ہیں کہ حرامی ہیں۔ بلکہ سارا حرامی ہوں میں اور پتا نہیں جی ہزار حرامی مرے ہوں گے تو ایک چوہدری دلاور نے جنم لیا ہو گا۔ مگر آج کون پوچھتا ہے... چھوڑو کر آج کا وہ کیا ہے... کیا کہتے ہیں اسے 'شجرہ نسب' اور کون تحقیق کرتا ہے۔ اگر تم چھاپ دو اپنے اخبار میں کہ چوہدری دلاور وہی ہے جو تم نے ابھی کہا تھا۔ نطفہ ناتحقیق۔ اور اس کا تو باپ بھی یہی تھا تو کون پڑھے گا اور کون یقین کرے گا۔ ہیں جی' لطیفہ سمجھ کے مسکرائیں گے بھی نہیں پڑھنے والے۔ الٹا یہ سمجھیں گے کہ لکھنے والا پاگل ہے۔ یہ بات غلط نہیں ہو گی البتہ۔"

"آخر کب تک سنیں گے ہم تمہاری یہ بکواس؟" میں نے کہا "چائے کہاں ہے؟"

اس نے کرسی کے ہتھے پر مکا مارا "تم سنو گے جب تک میں چاہوں گا۔ اور تم کر کیا سکتے ہو سننے کے سوا... بکواس کے بچے۔"

دلاور کی بیوی نے آہستہ سے کہا "چوہدری صاحب۔ چھوڑیں نا... کام کی بات کریں۔ میں چائے کے لیے کہتی ہوں۔"

چوہدری دلاور نے بیوی کی طرف دیکھ کے گہری سانس لی "میں غصے میں آجاتا ہوں۔ ابھی اعصاب پر قابو نہیں ہے پوری طرح۔ خیر جی' تم لوگ آرام سے اور تسلی سے بیٹھو۔ یہ مت سمجھنا کہ تم میری قید میں ہو۔ تم مہمان ہو۔"

میں نے کہا "کیا تم اپنے مہمانوں کو اسی طرح بلاتے ہو؟ گن پوائنٹ پر انہیں اغوا کرا کے یہ عزت دیتے ہو؟"

"دیکھو سکندر۔ یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں ہے کہ تمہیں یاد نہ ہو" وہ پھر مشتعل ہو گیا "جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا اس کا بدلہ لے سکتا ہوں میں۔ حق پہنچتا ہے مجھے کہ چن چن لیں دن جس طرح تم نے مجھے ذلیل کیا تھا اور جو سلوک میرے ساتھ ہوا تھا اس کے بدلے تو سے دن تمہاری..."

اس کی بیوی نے پھر اسے کنٹرول کیا "چلیں جی چوہدری صاحب۔ مٹی ڈالیں پرانی باتوں پر۔"

چوہدری دلاور نے کچھ دیر خاموش رہ کے سر ہلایا "قسم خدا کی۔ اتنا مجبور چوہدری دلاور کبھی نہیں تھا۔ اور نہ اتنی شرافت تھی اس میں۔ بہت بدذات اور کینہ پرور ہوں میں۔ ہیں جی' دشمن کو رعایت دینا یا معاف کرنا میں نے نہیں سیکھا تھا۔"

غالب نے آہ بھری "وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے چوہدری دلاور۔"

چوہدری دلاور کی بیوی نے طنز سے کہا "مگر صرف انہیں جو سیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ وقت نے تمہیں کچھ نہیں سکھایا۔ آج بھی تم بولنے سے پہلے سوچتے نہیں۔"

دلاور بیوی کی بات سے خوش ہوا "یہ ٹھیک کہا تو نے۔ دل تو آج بھی چاہتا ہے میرا کہ ان سب کو ننگا کر کے الٹا لٹکا دوں۔ اور ان کو اس وقت تک کوڑے مارتا رہوں۔ جب تک کہ ان کی ہڈیوں پر سے چمڑی اور گوشت کا ایک ایک ریشہ نہ اتر جائے۔ یہ چوہدری ہائی کورٹ کی وکیل بنی پھرتی ہے اور یہ چھچھلا جو خود کو بہت بڑا صحافی سمجھتی ہے۔ ان پر تو میں وہی کتے چھوڑ دیتا۔ ان کے یار بھی دیکھے خاص کتے ہیں وہ۔"

دلاور کی بیوی نے نظریں جھکا کے کہا "غصہ مت کریں نا چوہدری صاحب۔ آج تو یہ مہمان ہیں نا ہمارے۔ سن لیں ان کی۔"

www.paksociety.com

دلاور نے سر ہلایا۔ "ہاں یاد ہے مجھے۔ تو فکر نہ کر جگنی۔ ابھی میں ان کو دکھاؤں وہ جگہ جہاں ایک دن ان کو باری باری آنا ہو گا۔ وہ جگہ بھی تہ خانہ ہے۔ اسی کے نیچے" دلاور نے فرش پر پاؤں مارا۔

"وہ وہاں ہمارے ساتھ ویسا ہی سلوک ہو گا۔" میں نے اسے مزید اشتعال دلایا۔

"نہیں اپنے سکندر صاحب۔ وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ چوہدری دلاور جب وہ قرض چکائے گا تو اصل سے زیادہ سود ادا کرے گا۔ پھر تمہیں خیال آئے گا کہ وہ کمرا تو بہت آرام دہ تھا۔ جہاں تم نے مجھے زنجیریں ڈال کے رکھا تھا۔ وہاں تم مجھے کھانے کے لیے بسکٹ کے ڈبے لا دیتے تھے اور پینے کے لیے صاف پانی تھا۔ تم نے تو میرے لیے رفع حاجت کا بندوبست بھی کیا تھا۔"

"اور تم کیا کرو گے؟" میں نے کہا "لاہور ہوٹل سے سب کچھ سپلائی کرو گے؟"

دلاور کی بیوی نے کرسی کے پیچھے سے اشارہ کیا کہ ہم اشتعال انگیز باتیں نہ کریں اور بولی "جب وقت آئے گا تو تمہیں پتا چل جائے گا۔"

دلاور نے سر ہلایا "ہاں۔ مگر ان کو بتا دینے میں کیا حرج ہے کہ اس قید خانے میں سے گٹر لائن گزرتی ہے۔ سارے شہر کا گند ایک طرف سے بہہ کر آتا ہے اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے۔ یہ پانچ فٹ کی لائن ہے۔ ہیں جی؟ خیر سے تم او چھ فٹے اور یہ تمہاری۔ دو کل زاوی۔ ساڑھے پانچ سے کم یہ بھی نہیں۔ کوئی بھی اس میں سیدھا تو کھڑا نہیں ہو سکتا۔ پر یہ جو گٹر ہے نا یہ کوئی اٹھارہ فٹ۔ تو اپنے سکندر صاحب! نو فٹ جگہ ہو گی تمہارے پاس... اور نو فٹ مس رابعہ کے لیے۔ درمیان میں ہیں سلاخیں۔ تمہارے قدموں کے نیچے فرش بھی نہیں ہو گا۔ پانچ فٹ قطر کی ڈرین لائن میں کوئی جگہ سیدھی نہیں ہوتی۔ نہ اوپر نہ نیچے۔ نہ دائیں بائیں۔ تم اس میں بہنے والے گندے کالے رنگ کے بدبودار کیچڑ میں کھڑے رہ سکتے ہو۔ جھک کے دوڑ لگا سکتے ہو۔ چہل قدمی کر سکتے ہو لیکن اس کی گول دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ نہیں سکتے۔ دور دور سے ایک دوسرے کا نظارہ کر سکتے ہو۔ جب تک ہمت ساتھ دے تسلی دے سکتے ہو اور پیار بھرے فلمی ڈائیلاگ بول سکتے ہو مگر قریب نہیں آ سکتے۔ لوہے کی سلاخیں ڈلی ہیں۔ درمیان میں تین فٹ کا فاصلہ ہے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گا اپنے سکندر صاحب کہ لوگ گٹر لائن میں کیا کچھ بہاتے ہیں۔ لاہور ہوٹل کا کھانا تمہیں پسند ہے۔ لوگ خوب کھاتے ہیں اور پھر باتھ روم کے راستے یہاں پہنچا دیتے ہیں۔ ہیں جی! جب بھوک برداشت نہ ہو تو اسی پانی میں ہاتھ مارنا۔ شاید کوئی روٹی کا ٹکڑا بہتا ہوا آ جائے۔ پینے کے لیے بھی وہی پانی ہو گا۔ جب تک پیاس برداشت ہو مت پینا۔ گھبرانا مت تم وہ پانی پیو گے۔"

دلاور کی بیوی مسلسل ہونٹوں پر انگلی رکھ کے ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھی اور اس کی صورت پر اتنی لجاجت تھی کہ کسی نے بھی دلاور کی بات نہیں کاٹی۔ وہ خود اپنی بات سے بہت لطف اندوز ہو رہا تھا اور شاید تصور میں وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو بیان کر رہا تھا۔

"... گٹر لائن میں کیڑے مکوڑے ہوتے ہی ہیں۔ کاکروچ تو رہتے ہی اندھیرے میں اور ٹھنڈی جگہ پر ہیں۔ ہزاروں ہوں گے مگر چوہے بھی بہت ہیں۔ بڑے بڑے 'کیا کہتے ہیں اسے... گھوس' یا چھچھوندر۔ بڑے ظالم دانت ہوتے ہیں اس کے۔ اور وہ تیز بھی بہت ہے۔ اس کے علاوہ چھپکلیاں ہیں۔ زیرو واٹ کے بلب لگوا دیے ہیں میں نے تاکہ تم ایک دوسرے کی صورت تو دیکھ سکو۔ اور ایک دوسرے کو مرتا ہوا دیکھ سکو۔ سوچو ذرا اپنے سکندر صاحب! اگر تم نے شادی کر لی ہوتی تو خیر سے اپنی رابعہ بی بی کا یہ خوب صورت جسم ایسے ضائع نہ ہوتا۔ ہیں جی! اسے تو چوہے کھا جائیں گے... یہ کیا سزا ہے؟ تمہارے سامنے۔ یہ پاگل ہو کے مرے گی۔ ذرا تصور تو کرو اس جگہ کا۔ اس حجلۂ عروسی کا جہاں دولہا دلہن ایک دوسرے کو بے لباس دیکھیں گے مگر دور دور سے..." وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

اس کی باتیں بہت گھٹیا تھیں۔ شرم سے رابعہ کے لیے نظر اٹھانا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ غصے سے لال ہو رہی تھی اور خود میرے دل سے اٹھنے والا دھواں اب دماغ میں خرابی پیدا کر رہا تھا۔ میں اس لیے ضبط سے کام لے رہا تھا کہ شاید دلاور کی بیوی اپنے شوہر کی اس جنونی کیفیت پر قابو پا لے مگر ابھی تک اس کی کوشش پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

پھر اچانک وہ بات ہو گئی جس کی طرف میرا دھیان بھی نہیں گیا تھا حالانکہ یہ بھولنے والی بات نہیں تھی کہ اس وقت ذہنی و اعصابی طور پر سب سے کمزور شخصیت نازو کی ہے۔ دلاور ہمیں جس عذاب سے ڈرا رہا تھا وہ نازو جھیل چکی تھی۔ جب اس نے ہمیں نفسیاتی خوف میں مبتلا کرنے کے لیے اپنے انتقام کے جذبات کی تصویر کشی بے رحم الفاظ میں کی تو نازو کی روح کا ہر ناسور دوزخ کے انگاروں سے کرب کی ایک چیخ بن گیا۔

میں نے نازو کے لبوں کو ہمیشہ گل فشاں دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں دیکھی تھی یا شرارت کی شوخ ادا۔ اچانک وہ اس آتش فشاں کی طرح پھٹ گئی جس کی سرسبز ڈھلانیں اور گل بداماں چوٹیاں ہمیشہ ذوقِ حسن کو دعوتِ دید دیتی ہوں۔ اس میں سے جو دہکتا، بدبودار اور تباہ کن لاوا پھوٹ کے نکلا وہ ان گالیوں کی صورت میں تھا جو شاید پولیس کے تفتیش پر مامور اہل زبان کے سوا کوئی مرد بھی نہیں دے سکتا۔

وہ ایک چیخ مار کے مقناطیس سے کھنچی ہوئی دلاور پر ایسے جھپٹی کہ اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا۔ "ایسا کرے گا تو... بول تیری تو... کیا سمجھ کے ایسی بات کی تھی تو نے... اس سے پہلے ہی میں

تجھے..." دلاور کرسی سمیت الٹ گیا۔ بالکل پیچھے کھڑی ہوئی اس کی بیوی بھی دلاور کی مدد نہ کر سکی۔ جب دلاور گرا تو نازو اس کے اوپر تھی۔ دلاور کی بیوی کے پاؤں پر کرسی ان دونوں کے وزن کے ساتھ گری تھی۔ اس نے ایک چیخ مار کے اپنا پنجہ پکڑ لیا اور وہیں بیٹھ گئی۔

دلاور چلانے لگا "کیا دیکھ رہے ہو تم سب۔ ہٹاؤ اس پاگل کتیا کو۔"

مشکل یہ تھی کہ مستعد کھڑے ہوئے مسلح محافظ بھی نازو پر گولی نہیں چلا سکتے تھے اور نہ اس پر گیس گن فائر کر سکتے تھے۔ نازو کے ساتھ دلاور کے نشانہ بن جانے کے امکانات بہت زیادہ تھے اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ نازو بچ جائے۔ صرف دلاور مارا جائے۔ دلاور کی پکار پر وہ جسمانی طور پر نازو کو قابو کرنے کے لیے آگے بڑھے مگر اس وقت تک نازو نے دلاور کا حشر نشر کر دیا تھا۔ وہ دلاور کو اپنے سر کے اوپر سے اٹھا کے فرش پر دھوبی پٹکا دے چکی تھی اور اسے ایک ہاتھ سے پکڑ کے پورا چکر دینے کے بعد چھوڑنے ہی والی تھی کہ دلاور کے مددگار بیچ میں آ گئے ورنہ دلاور توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح دیوار پر لگتا تو چپٹا ہو جاتا اور دیوار کے پلستر کے ساتھ فرش پر گرتا۔

محافظ حائل ہوئے تو دلاور کے تصادم سے دو کے قدم اکھڑ گئے۔ اس وقت کمرے میں بھی دو محافظ تھے۔ باقی نہ جانے کب پیڈرو کو اندر لے گئے تھے۔ نازو پر جنون سوار تھا۔ مارشل آرٹ میں اس کی مہارت کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ غصے کے پاگل پن کی آگ نے اسے زیادہ خطرناک اور ناقابلِ تسخیر بنا دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ کسی کے قابو میں آنے والی نہیں ہے اور اگر میں نے مداخلت نہ کی تو دلاور مارا جائے گا یا نازو ہلاک ہو جائے گی۔ دونوں صورتوں میں باقی تین کے لیے بھی زندگی کے امکانات معدوم ہو جاتے تھے۔

ابھی تک دلاور کی اشتعال انگیز گفتگو کے باوجود امید باقی تھی۔ اس نے ہمیں مہمان کہا تھا اور اس کی بیوی مسلسل اشارے کر کے ہمیں ضبط سے کام لینے کی اہمیت کا احساس دلا رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ چوہدری دلاور نے بھی انتقام کے جنون پر قابو پانے کی مجبوری کو سمجھ لیا ہے اور شاید صورت حال اتنی مایوس کن نہیں جتنی ہم سمجھ رہے تھے۔ ابھی بہت کچھ غیر واضح تھا مثلاً یہ کہ استاد پیڈرو کی پوزیشن کیا ہے۔ وہ ہمیں دھوکے سے یہاں لایا تھا یا خود دھوکے میں مارا گیا تھا۔ یہ سارا پلان چوہدری دلاور کا تھا یا اس نے استاد پیڈرو کے کسی منصوبے کو غیر متوقع طور پر ناکام کر دیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ضرور آیا تھا مگر پھر اندر کہیں غائب ہو گیا تھا۔

نازو پر دورہ پڑ جانے کے بعد بہت سے سوالات ادھورے اور جواب طلب رہ گئے تھے اور اس کی وحشت کا یہ انداز اتفاقی خودکشی کے مترادف تھا جب کہ ہم عقل سے کام لے کے یہ امید ضرور کر سکتے تھے کہ شاید پھر قسمت ساتھ دے تو کوئی معجزہ رونما ہو۔ تائید ایزدی سے صورت حال پلٹ جائے اور ہم موت کی وادی میں اتر جانے کے بعد پھر زندگی کی گم گشتہ راہ تلاش کر لیں۔

چند سیکنڈ کے وقفے سے میں نے نازو کو دبوچ لیا۔ میری اس حرکت میں بھی زندگی کو داؤ پر لگانے کا پورا رسک تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ جو نازو پر گولی نہیں چلا سکتے تھے وہ غلط فہمی میں مجھے شوٹ کر دیتے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ میں بھی نازو کے ساتھ مل کے دلاور کی ہڈی پسلی ایک کرنا چاہتا ہوں اور اسے یرغمال بنا کے اپنی آزادی کا سودا کروں۔

میں نے چلا کے کہا "نازو۔ اسے چھوڑ دو بے وقوف۔" اور پھر اسے پیچھے سے آرم لاک لگا کے بے بس کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ کسی جنگلی بلی کی طرح غراتی رہی اور ناخن چلاتی رہی لیکن میں نے اسے پیچھے گھسیٹ لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی نے سوچے سمجھے بغیر ہمارا کام تمام نہیں کیا۔ غالباً انہیں پہلے سے یہ ہدایت تھی کہ جب تک کمانڈ نہ جائے وہ ایسی کوئی حرکت نہ کریں۔

میں نے نازو کو بڑی مشکل سے اپنی گرفت میں رکھا
"نازو... نازو' ہوش میں آؤ۔"

"نہیں۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں اس... کا خون پیوں گی۔ میں اسے... تو... کچا چبا جاؤں گی میں اسے... یہ بھیڑیے کا جنا ہے تو میں آدم خور شیرنی ہوں..."

چوہدری دلاور کی بیوی الگ چلا رہی تھی "جلدی کرو۔ ڈاکٹر کہاں مر گیا ہے۔ اتنی دیر کیوں لگ رہا ہے۔ اندر لے جاؤ چوہدری صاحب کو۔"

دونوں محافظوں کو بہت گالیاں پڑ چکی تھیں اور دلاور کی بیوی اتنی مشتعل تھی کہ ہنٹر ہاتھ میں ہوتا تو وہ ان کی کھال ادھیڑ دیتی۔ انہوں نے بے ہوش دلاور کو احتیاط سے اٹھایا اور دوسرے کمرے میں لے گئے۔

دلاور کی بیوی نے جاتے جاتے مجھ سے پلٹ کے کہا "سکندر۔ اس پاگل کو قابو میں رکھنا۔ میں ابھی آتی ہوں۔ اور دیکھو کوئی بے وقوفی مت کرنا۔ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔"

میں نے صرف سر ہلایا اور نازو کو سنبھالنے لگا جو اب میرے ہاتھوں میں جھول رہی تھی "وہ... مسز دلاور..."
وہ غصے میں چیخی "کیا ہے؟"
میں نے کہا "یہ... بے ہوش ہو گئی ہے۔"
"پھر میں کیا کروں' مرنے دو اسے۔"
میں نے نرمی اور لجاجت سے کہا "اگر اسے بھی... ڈاکٹر دیکھ لے تو..."

دلاور کی بیوی میری بات سنے بغیر ہی غائب ہو گئی تھی۔ اسے نازو کی زندگی سے زیادہ اپنے شوہر کی فکر تھی اور شاید یہ پریشانی تھی کی

www.paksociety.com

کہ نہ جانے ہوش میں آنے کے بعد اس کا موڈ کیسا ہوگا۔ وہ اس کے اشتعال کو قابو میں رکھ سکے گی یا نہیں۔

غالب نے افسردگی سے سر ہلایا "اب نہ جانے کیا ہوگا؟"

رابعہ نے اسے تسلی دی "کچھ نہیں ہوگا۔"

"ہوگا کیسے نہیں" غالب بھڑک اٹھا "تم کچھ سمجھتی ہو مجھے کہ میں بھول جاؤں گا۔ ابھی نازو پوری طرح ٹھیک کہاں ہوئی تھی۔ اس حرام زادے نے جاتے جاتے اپنی باتوں سے نازو کو پہلے سے زیادہ پاگل کر دیا ہے۔"

میں نے کہا "غالب۔ بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ اگر یہ پہلے سے زیادہ پاگل ہو گئی تب بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ لیکن اس کے لیے ہم سب کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ ہم مل کے اسے ٹھیک کر سکتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "ہاں۔ اگر دلاور نے اپنا ارادہ نہ بدلا۔ ابھی تک وہ زبان سے ضرور کہہ رہا تھا کہ ہم مہمان ہیں۔"

"اور تم کو اس کمینے کی زبان پر اعتبار ہے۔"

"اعتبار نہ کریں تو کیا کریں" میں نے کہا "دلاور کی بیوی کے رویے سے بھی اندازہ یہی ہوتا ہے کہ وہ انتقام ضرور لے گا۔ مگر ابھی نہیں۔ شاید وہ ہمیں ایک چانس دینا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ ہم نے اس کے بیوی بچوں کو مرنے سے بچایا تھا۔ ہم مدد نہ کرتے تو شوکت رانا انہیں قتل کر کے دلاور کے کاروبار پر قابض ہو جاتا۔"

"غلط فہمی ہے تمہاری۔" غالب نے کہا "سانپ اور بچھو کسی کے احسان مند نہیں ہوتے۔ شیطان نیکی نہیں کر سکتا۔"

"دلاور کے بارے میں تمہاری رائے درست ہے۔ مگر ہمیں یہ موقع فراہم کرنے والی اس کی بیوی ہے۔"

"دلاور پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے بیوی کو۔"

میں نے کہا "سمجھتا تھا لیکن اس کی رہائی میں اور اسیری کے دوران میں جو کردار بیوی نے ادا کیا پھر جس طرح اس نے دلاور کو جیل سے نکالا۔ اس کے بعد دلاور کے خیالات یقیناً بدل چکے ہوں گے۔ تم نے دیکھا نہیں وہ کس طرح بیوی کے سمجھانے سے خود کو کنٹرول کر لیتا تھا۔"

غالب نے کہا "اب یہ مشکل ہوگا۔"

اس کی زبان سے نکلی ہوئی بات فوراً ہی سچ ہو گئی۔ استاد پیڈرو اندر آیا تو اس کی صورت پر برہمی کے آثار تھے "تم سب واقعی پاگل ہو۔ اس لیے لایا تھا میں تمہیں یہاں؟"

میں نے کہا "یہ تم خود بھی نہیں جانتے تھے اور شاید اب بھی تمہاری پوزیشن ہم سے مختلف نہ ہو۔"

"سب معلوم ہو جائے گا بیٹا۔"

میں نے کہا "کہاں ہے ہمارا وہ سب سے بڑا دشمن جسے تم ہمارے حوالے کرنا چاہتے تھے؟ اور کون تھا وہ دشمن؟"

غالب نے سر ہلایا "ہاں۔ یہ اعزاز تو تمہیں بھی حاصل ہے کہ خود کو ہمارا سب سے بڑا دشمن کہہ سکو۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "مجھے کوئی خوش فہمی نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے پیڈرو۔ میں یہ نہیں مان سکتا کہ تم کراچی سے لاہور ہمارے ساتھ کوئی نیکی کرنے آئے تھے اور ہم سے ملنے کا نیک مقصد لے کر آئے تھے۔ تمہارے نام سے نیکی کا تصور ایسا ہی ہے جیسے شیطان لعین کے نام سے۔ اور تم نے جس طرح یہ کارنامہ سرانجام دیا اس سے اور کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ تم پیڈرو ہو شیخ مختار کے باڈی گارڈ۔ کینچلی بدلنے سے سانپ کی فطرت نہیں بدلتی۔ تم یہاں پُرامن مفاہمتی مذاکرات کے مشن پر نہیں اپنا انتقام لینے آئے تھے پیڈرو۔"

"یہ نہ ماننے سے مجھے فرق نہیں پڑتا تمہیں ضرور پڑے گا۔"

میں نے کہا "تمہارے دماغ میں بدمعاشی کے خانے میں بہت عقل ہوگی مگر شرافت اور انسانیت تو تمہارے باپ کے خاندان میں بھی نہیں تھی۔ ہوتی تو اس کا تھوڑا بہت اثر تمہاری ذات میں بھی نظر آتا۔ جس طرح تم ہمیں یہاں لائے تھے کیا وہ شریفانہ طریقہ تھا؟ وہ تمہارا تجربہ اسٹائل تھا پیڈرو۔ تم آئے تھے مجھ سے اپنا بدلہ لینے۔ اس ذلت کا انتقام لینے جس کا شکار تم کراچی میں ہوئے تھے۔ مجھ سے بھول ہو گئی کہ تمہیں وہیں مار کے کسی گٹر لائن میں کیوں نہیں ڈال دیا تھا۔ یہاں آ کے تمہیں خیال آیا کہ کیوں نہ دلاور کے کندھے پر بندوق رکھی جائے۔ اگر تم بچھو ہو تو وہ کوبرا سانپ ہے۔ دشمن کو مارنے کے لیے بچھو کا ڈنک کافی نہیں۔ اسے زخم خوردہ سانپ کے حوالے کر دینا بہتر ہے۔ اب تم استاد پیڈرو نہیں شیخ مختار ہو۔ سکندر سے انتقام تو چوہدری دلاور بھی لے سکتا ہے اور بہتر طریقے سے لے سکتا ہے۔ تم نے سوچا کہ اب شیخ مختار کی کاروباری گڈول کیوں متاثر ہو۔ کیوں نہ سکندر کے خطرے کا بھی علاج ہو جائے اور دلاور پر بھی احسان کر دیا جائے۔ ہم سے تم نے کہا کہ چلو دلاور کو پھر پکڑ لو اور دلاور سے کہا کہ ہاں ابھی نانا ہوں ان سب کو جو جیسے ایم آر ایس کے سوداگر بنے پھرتے ہیں۔ میں نے پہچان لیا ہے سکندر کو اس کے بدلے ہوئے روپ میں بھی۔ ختم کرو ان کا قصہ ورنہ یہ پھر تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔ جو کچھ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا اس کے بعد بھی کیا یہ کسی رعایت کے مستحق رہ جاتے ہیں؟ ہاں کتنا دلی ڈان پیڈرو۔ یہ کام کیا تم نے۔ اب ان سے تو میں نمٹ لوں گا۔ تم جاؤ کراچی شیخ مختار۔ اپنا دھندا کرو۔ دلاور سے ڈرنے کی اب کوئی وجہ نہیں۔ یہ احسان کر کے تم نے دلاور کو خرید لیا ہے۔ اور دلاور کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد تم ہم سے کہتے کہ سوری سکندر، دلاور مجھ سے وعدہ کر کے مکر گیا۔ تم تو جانتے ہو اس کی فطرت کو۔ مجھ سے تو یہی کہا تھا اس نے کہ سکندر کو اور اس کے سارے دوستوں کو لے آؤ۔ میں ان سے صلح کی بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو" غالب نے میری بات کی تائید کی۔ "تم نے ایسا ہی سوچا ہو اور دلاور نے یہی کہا ہو مگر آثار بتاتے ہیں یہاں تمہاری پوزیشن بھی ہم سے مختلف نہیں۔ دلاور بہت شاطر ہے۔ اس نے جال بچھایا دشمنوں کے لیے لیکن تمہیں دوستی کا جھانسا دے کے پھانس لیا۔"

استاد پیڈرو کی خاموشی ہی اس تلخ حقیقت کا اعتراف تھی کہ اندر کا بدمعاش ہمارے سامنے ہار ماننے پر تیار نہ تھا۔ اس نے سر کسی کے شیر کی طرح دھاڑ کے کہا "افلاطون کی اولاد... جو دلاور کر سکتا ہے اس سے بڑا میں کر سکتا ہوں تمہارے درمیان۔ ابھی تک رسی بھی جل جائے گی اور اس کے بل بھی جائیں گے۔"

اس نے ناقابل اشاعت زبان میں بہت کچھ کہا کہ وہ کیا کر سکتا ہے مگر اس کا کسی پر کیا اثر ہوتا۔ میں اسے چڑانے کے لیے یوں دیکھتا رہا جیسے میرے سامنے کوئی مسخرا اپنی احمقانہ باتوں کو مذاق کے پیش کر رہا ہو یا مجھے بے تھرڈ کلاس لطیفے سنا رہا ہو۔ ایسا ہی سب نے بھی کیا۔ وہ بھی اپنی ہنسی کی نمائش کرتا رہا۔

جب چوہدری دلاور کی بیوی اندر آئی تو پیڈرو ایسے ٹھٹک گیا جیسے کتے کے آتے ہی بھونکنے والا کتا چپ ہو جائے اور نظر کا ... کے روپوش ہو جائے۔

وہ بہت پریشان، افسردہ اور تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی "تم نے بہت اچھا کیا سکندر۔"

میں نے کہا "غلطی آپ کی ہے میڈم کہ آپ نے مجھ سے توقعات وابستہ کر لی تھیں۔"

"تم نے میرے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا" اس نے دکھی انداز میں سر ہلایا۔

"تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی" رابعہ نے کہا "یہ معاملہ تھا ہمارے اور دلاور کے درمیان یا دلاور کے اور قانون کے درمیان۔"

وہ ایک دم بھڑک اٹھی "قانون کی بات مت کرو وکیل کی اولاد۔ یہ عدالت نہیں ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے پھر رہے تھے کیا وہ قانون کے مطابق تھا؟ تم نے تو قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ کیا تھی یہ تمہاری ایم آر ایس آخر۔ سائٹ از رائٹ سوسائٹی۔ کہاں گئی اس کی بجنس کا فلسفہ۔ جنگل کے قانون کو تم نے اپنا دستور بنا لیا تھا۔ کیا نہیں کیا تم نے قانون اور انصاف کے نام پر؟ قتل تم نے کیے، ڈاکے تم نے ڈالے، اغوا تم نے کیے۔ کہاں کہاں بم رکھے تم نے۔ کہاں کہاں آگ لگائی۔ کیسے کیسے بھیس بدلے۔ بات کرتے ہو قانون کی۔ ذرا حلیہ دیکھو اپنے ایم آر ایس کے چیف کا، اپنے ہیرو، دستور ساز اعظم کا۔ یہ کیوں ترچھو وکیل بنے پھرتے ہیں۔ اس جعلسازی میں تم سب ایک دوسرے سے بڑھ کر ہو۔ تم نے دلاور جی کو نہیں، دشمنوں کو، پولیس کو، یہاں تک کہ عدالت کو دھوکا دیا۔ کیا تمہارا یہ جرم کم سنگین ہے؟ باقی سب نے تو قانون نہیں پڑھا مگر مس رابعہ قادری، تم تو بہت بڑی اور معزز وکیل سمجھی جاتی ہو۔ کس منہ سے قانون کی بات کر سکتی ہو تم میرے سامنے۔ مجرم پیڈرو ہے، دلاور ہے تو تم بھی ہو۔ قانون کا اتنا ہی احترام کرتے ہو سکندر تو پہلے خود کو قانون کے حوالے کرو۔ قانون کی نظر میں آج بھی تم ایک مفرور مجرم ہو۔ اگر میں چاہوں تو ابھی اور اسی وقت ایک ٹیلی فون کر کے پولیس کو طلب کر سکتی ہوں کہ آؤ اور اپنے مجرم کو لے جاؤ۔"

"اور وہ جو سب سے بڑا مجرم ہے؟"

وہ ہنسی "ہاں وہ سب سے بڑا مجرم ہے مگر وہ میرا شوہر ہے اور وہ خود کو شریف آدمی بھی نہیں کہتا۔ جب تک میں زندہ ہوں اسے میں بھی اسی طرح بچاؤں گی جیسے ہر بیوی بچاتی ہے۔ تم بیوی نہیں ہو۔ تم رابعہ، محبوبہ ہو بلکہ داشتہ ہو۔ ابھی تم ماں نہیں بنی ہو سکندر کے بچوں کی۔ تم نے میری طرح اولاد کو پال پوس کر بڑا نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود تم سکندر کی خاطر جان دے سکتی ہو تو میں کیوں نہ بچاؤں اپنے گھر کو، اپنے شوہر، اپنے بچوں کے باپ کو۔"

ہم سب خاموش تھے۔ کسی کے پاس دلاور کی بیوی کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بلاشبہ یہ قانونی جنگ نہیں تھی۔ یہ لاقانونیت کے خلاف لاقانونیت کی جنگ تھی۔ ہم نے تو اس جنگ کی ابتدا قانونی طریقے سے کی تھی مگر بہت جلد ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ جن سے ہمارا مقابلہ ہے وہ تو قانون کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اس کے وجود کو نہیں مانتے۔ الٹا وہ قانون کی تذلیل یوں کرتے ہیں کہ اسے اپنی قوت خرید میں سمجھتے ہیں۔ وہ ایسے فرعون ہیں جو اپنی دولت اور بدمعاشی کی طاقت کے سامنے نعوذباللہ خدا کی خدائی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ ایسے مردود شیطانوں کا مقابلہ ہم قانون کی مدد سے کیسے کر سکتے تھے۔ ویسے بھی قانون حفاظت کرتا ہے انسانوں کی۔ کسی سانپ کا سر کچلنے والے کو قانون کچھ نہیں کہتا۔ پاگل کتے کو گولی مارنے والے کے لیے کوئی سزا نہیں۔ آدم خور درندے کو ہلاک کرنے کے لیے قانون سے اجازت نہیں لینی پڑتی۔

دلاور کی بیوی نے پھر خاموشی کو توڑا "میں نے بڑی کوشش سے چوہدری صاحب کو قائل کیا تھا کہ صرف ایک بار میری خاطر اور میرے بچوں کی خاطر ان سے بات کر لو۔ شاید یہ آگ اور خون کا انتقامی سلسلہ ختم ہو جائے۔ اور یہ سفارش میں پہلے کرتی تو چوہدری صاحب خود مجھے گولی مار دیتے کہ تم میری جان کے دشمنوں کی حمایت کر رہی ہے حرام زادی... لیکن۔"

میں نے کہا "لیکن تم نے کہا کہ سکندر نے میری جان بچائی تھی۔ وہ مدد نہ کرتا تو شاید ہم سب بھی مارے جاتے اور تم بھی۔ تمہارے کاروبار پر تمہارے اپنے پارٹنر شوکت رانا اور ڈاکٹر شاہ قابض ہو جاتے۔ اور جب تم نے اس احسان کا واسطہ دیا تو دلاور مان گیا کہ اچھا بلا لاؤ انہیں۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "مگر اب کیا فائدہ؟"

www.paksociety.com

میں نے کہا "اب وہ احسان کوئی احسان نہیں رہا؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ چوہدری صاحب جب ہوش میں آئیں گے اور ان کا غصہ اُترے گا تو وہ کیا کریں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں پھر ان کو منالوں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میری ایک نہ مانیں۔ اس پاگل کا دماغ تو میں بھی درست کروں گی۔ اگر چوہدری صاحب نے اسے زندہ چھوڑا۔"

غالب نے کہا "جانے دیں بی بی! ایسی باتوں سے نہ ہم پہلے ڈرے تھے نہ ڈریں گے۔ ہم جانتے ہیں تمہارے چوہدری صاحب کو۔"

"اور وہ بھی جانتے ہیں اچھی طرح کہ ہم مسلمان ہیں۔ کوئی مسلمان موت سے نہیں ڈرتا۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ موت ایک ہی بار آتی ہے۔ کب آتی ہے اور کیسے آتی ہے' یہ کوئی نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔

وہ بیزار صورت بنا کے اُٹھ گئی۔ شاید یہ گفتگو اسے سمجھائی گئی تھی اور اس کی مشکلات کا حل کسی کتاب میں نہیں تھا۔

میں نے کہا "مسز ولاور!"

وہ رک گئی "اب کیا ہے؟"

میں نے کہا "اگر تم واقعی کچھ کرنا چاہتی ہو اور کر سکتی ہو تو ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو یا کم از کم ان کو چھوڑ دو۔"

میرا اشارہ نازو کی طرف تھا جو بدستور بے ہوش تھی اور غالب کی طرف بھی۔ "تم جانتی ہو یہ پاگل تھی۔ اور اسے پاگل کرنے والا بھی کون تھا۔ اسے اپنا ہوش نہیں۔"

غالب نے برہمی سے کہا "کوئی ضرورت نہیں اس سفارش کی۔"

میں نے غالب کے احتجاج کو نظر انداز کر دیا "اگر تمہیں احسان کا قرض اتارنے کا خیال ہے تو ان کی جاں بخشی کرا دو۔"

غالب نے چیخ کے کہا "لعنت اس پر جو ولاور سے جاں بخشی کی درخواست کرے۔"

میں نے کہا "اس کی باتوں پر مت جاؤ۔ اس کے حصے کی سزا میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔"

رابعہ نے کہا "نازو کے بدلے مجھے ہر سزا منظور ہوگی۔"

غالب نے رابعہ کو شعلہ بار نظروں سے دیکھا "رابعہ۔ نہیں چاہیے مجھے تمہارا یہ احسان۔ مجھے خدا پر بھروسا ہے۔ وہ ہمارا محافظ ہے۔"

ولاور کی بیوی نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے باری باری ہم سب کے چہروں کو دیکھا اور پھر سہلاؤ کے اندر چلی گئی۔

میں نے کہا "دیکھو غالب۔ اچھا مجھے بھی نہیں لگتا بھیک مانگنا اور پھر ولاور جیسے دشمن سے رعایت طلب کرنا۔"

غالب نے تلخی سے کہا "آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں آپ؟ یہی کہ آپ بڑے مخلص دوست ہیں اور دوستی میں جان بھی قربان کر سکتے ہیں۔"

"یہ ثابت کرنے والی کوئی بات نہیں۔ جیسے دن نکلے تو اس میں سورج کا وجود کسی ثبوت کا محتاج نہیں ایسے ہی ہم دوستی' ہمارا خلوص اور ہمارے جذبات ہیں' زندہ حقائق ہیں۔"

"پھر آپ نے مجھ پر یہ احسان کیوں کیا؟"

"پھر وہی احمقانہ بات۔ ہم ایک دوسرے کے لیے کرتے ہیں کیا وہ احسان ہوتا ہے؟" میں نے کہا "اس کو تو مرزا غالب کے وقت کی سلطنت کو سمجھا ہی عقل مندی ہے۔ ضرورت پڑنے پر گدھے کو باپ بنا لو۔"

"نہیں۔ آبرو مندی کے ساتھ حالات سے سمجھوتا کرنا بھی جنگ کی حکمت عملی میں شامل ہے۔ اگر ولاور کی بیوی کا دعویٰ ہے اور خود چوہدری ولاور تسلیم کرتا ہے کہ ہم نے اس پر احسان کیا تھا۔ حالانکہ ہم نے تو بس اپنا اخلاقی فرض پورا کیا تھا اور وہ اس احسان کا بدلہ بھی چکانا چاہتے ہیں تو ہم موقع سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔ ہم اس سے اپنا ادھار وصول کر لیں اور وہ بھی اشد ضرورت کی مجبوری میں تو اس میں کون سی معیوب اور غیر اخلاقی بات ہے۔ اگر نازو پوری طرح ٹھیک ہوتی تو میں اس کی سفارش نہ کرتا۔ ابھی جو کچھ ہوا اسے ایک وقتی دورہ ہی سمجھنا چاہیے ورنہ وہ میرے نزدیک نوے فیصد ٹھیک ہے۔ دس فیصد پاگل تو سب ہوتے ہیں۔"

رابعہ مسکرائی "ہم شاید دس فیصد پاگل نہیں ہیں۔ سو فیصد ہی ٹھیک ہیں۔"

میں نے کہا "ایسی حالت میں نازو کا دوبارہ ان حالات سے دوچار ہونا جو اس کے ذہنی عدم توازن کا سبب بنے تھے بڑا خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہوتا۔ اس کے ساتھ تمہارا رہنا اس لیے بہتر ہے کہ۔"

"کہ ایک مسئلہ ہے دماغ کا تو دوسرا دل کا" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "رائٹ۔ لیکن تیسرا مسئلہ ہے ہم سب کی بقا۔ ایک ساتھ پکڑے گئے تو کیا کریں گے۔ اچھا ہے کسی بہانے ہم نکل جائیں۔ اس سے ہماری امید کا رشتہ قائم رہے گا خواہ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ امید رہے گی کہ تم ضرور کچھ کرو گے کوئی راستہ تلاش کرو گے۔ کوئی وسیلہ بناؤ گے۔ کوئی تو ہے مجھے معلوم ہے کہ رابعہ اور میں تیمی حالات سے گھبرا کے یا عشق کے پاگل پن میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے فرار نہیں ہوئے ہیں۔"

"اور کسی خانے میں بھی نہیں ہیں" رابعہ بولی۔

"خانے میں؟" غالب بولا۔

رابعہ نے کہا "ہاں۔ پاگل خانے' جیل خانے' عجائب خانے اور مُردہ خانے یا...سے خانے میں مقفل ہیں۔"

"رابعہ کی مراد ہے خانہ عشق سے ہے۔" میں نے کہا۔

غالب بھی اب قائل ہو چکا تھا "سب سے اچھے تو خانے ہوتے ہیں نا؟"

رابعہ نے حیرانی سے کہا "پہلے والے تین خانے؟"

"بنیں۔ ایک اپنا غریب خانہ' اس کے اندر غسل خانہ اور باورچی خانہ۔ یہ بھی ہمارا اپنے نصیب میں نہیں۔"

"ہاں نا۔ یہ بھی نصیب میں تو ہوں گے یار۔ بس آگے پیچھے کی بات ہے۔ میرا ایک دل کہتا ہے یہاں تک کہ مولوی خادم حسین کو مل گئے۔"

رابعہ بولی "مولوی خادم حسین کو دوبارہ مل گئے۔"

میں نے ہنس کے کہا "بقول شاعر کریا مرے ہوئے چلنے کو سب یار بیٹھے ہیں۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔"

غالب بولا "آج انکشاف ہوا کہ انشاء اللہ خان انشا نے یہ شعر مرنے سے پہلے کسی کی بارات دیکھ کے کہا ہوگا۔"

ولاور کی بیوی دوسری بار کسی فاتح کمانڈر کی طرح چلتی ہوئی آئی جو محافظوں کی معیت میں پہلی بار جنگی قیدیوں کا معائنہ کرنے نکلا ہو۔ اس کے ساتھ چار غلام کے غلام تھے جن کے چہرے ہر طرح کے جذبے سے خالی تھے۔ وہ بڑے تندرست و توانا ظالم اور خونخوار قسم کے مشینی انسان لگتے تھے جو احساس سے نا آشنا تھا اور صرف اشارے پر حرکت کرتے ہوں۔

"دیکھو۔ یہ جو لڑکی پڑی ہوئی ہے۔ اسے بھی لے جاؤ اور اس کے خصم کو بھی" اس نے بڑی بدخوئی سے غالب کی طرف اشارہ کیا "باہر گاڑی کھڑی ہے۔ ان کو کہیں چھوڑ آؤ۔ جہاں یہ کہیں۔"

غالب نے ایک آہ بھری "نیک دل خاتون۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔ ہمیں یہ لوگ بس کے اڈے پہ پہنچا دیں۔"

ولاور کی بیوی نے برہمی سے کہا "بکواس بند کرو۔"

غالب مسکینی سے بولا "ناراض کیوں ہوتی ہیں جی۔ چلیں کوئی بات نہیں۔"

"کوئی ماڑا!"

"کراچی کا ایک علاقہ ہے جی۔ اپنا ماموں رہتا ہے وہاں" غالب نے کہا۔

حکم کی تعمیل کرنے والے نازو کی طرف بڑھے تو غالب کھڑا ہو گیا "آپ مت تکلیف کریں۔ میں اُٹھا لیتا ہوں اس مصیبت کو۔ ہماری مصیبت ہے میرے لیے تو۔"

ولاور کی بیوی نے مسکراہٹ کو دبا لیا۔ غالب نے نازو کو اُٹھا کے کندھے پر ڈالا اور بولا "اچھا جی۔ اجازت ہے!" اس نے مجھے اور رابعہ سے رخصت کے انداز میں مصافحہ کیا۔

میں نے ہاتھ ملا کے کہا "رب را کھا۔ آتے جاتے رہنا۔"

رابعہ نے کہا "ہاں۔ جب بھی موقع ملے۔"

ولاور کی بیوی ہمارے غیر سنجیدہ رویے پر حیران تھی۔ جب وہ محافظوں کے ساتھ غالب چلا گیا تو اس نے سہلاؤ کے خود کلامی کے انداز میں کہا "واقعی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔"

میں نے کہا "سچ فرمایا آپ نے۔ چند روز سے بڑھ کے ولاور اور خود سے بڑھ کے آپ۔ باقی بسلہ پھر بھی۔"

ولاور کی بیوی کے ساتھ رہ جانے والے دونوں شکاری کتے ہم پر جھپٹ پڑنے کے لیے تیار تھے۔ اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک ریوالور نکال کے گویا ثابت کر دیا کہ ابھی تو میں جوان ہوں۔ وہ کوئی رسک لینا نہیں چاہتی تھی اور یہ بات میں بھی سمجھتا تھا کہ دوسری غلطی کی گنجائش نہیں۔ نہ جانے کیوں اور کیسے ولاور کی بیوی نے غالب اور نازو کو رہا کرانے کی کوشش میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس نے ولاور سے منظوری لی تھی یا خود فیصلہ کرنے کا رسک لیا تھا۔ غالب اور نازو کو واقعی رہا کیا گیا تھا یا کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا تھا۔ ان سب سوالات کا جواب وقت کے پاس تھا۔ محافظوں نے میری تلاشی لی اور پھر ہمیں دوسرے کمرے میں لے گئے۔

"دیکھو سکندر۔" ولاور کی بیوی نے دروازے میں رک کے کہا۔

میں نے پلٹ کے کہا "دیکھ لیا جی۔ اچھی لگ رہی ہیں آپ۔"

وہ زیادہ سیریس ہو گئی "خودکشی کرنا چاہو تو تمہیں کوئی روک نہیں سکتا لیکن جس طرح تم نے غالب اور نازو کی زندگی بچانے کے لیے عقل سے کام لیا ایسے ہی خود کو بچا سکتے ہو۔ تم زندگی کا سودا کر سکتے ہو۔ زندہ رہنے کا حق مانگ سکتے ہو لیکن چھین نہیں سکتے۔ سمجھے؟"

میں نے کہا "یہ بات اسے سمجھاؤ جو سمجھتا ہو کہ انسانوں کی زندگی اور موت پر اس کا اختیار ہے۔ خدا سے دعا مانگی جا سکتی ہے۔ نہ سودا کیا جا سکتا ہے اور نہ کچھ چھینا جا سکتا ہے۔"

"پھر بھی۔ جذبات کے جوش میں مت آنا۔ تم نوجوان ہو ابھی۔ لیکن میرے فیصل کی طرح نوعمر لڑکے نہیں رہے۔ ولاور بھی جب تمہاری عمر کا تھا تو بہت جوشیلا تھا۔ اب عمر کا تقاضا یہ تھا کہ وہ زیادہ بردبار ہوتا لیکن اس کے اعصاب پہلے جیسے مضبوط نہیں رہے۔ پھر ابھی ابھی بڑے سخت امتحان سے گزرا ہے وہ اور اس کے دل میں تمہارے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی ہے۔ بس اس پر تیل مت چھڑکنا۔" وہ اپنے پیچھے دروازے کو مقفل کر کے چلی گئی۔

رابعہ نے اس کے جانے کے بعد کہا "آخر اسے اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی ہے ہم سے؟"

"یہ جذباتی ہمدردی ہے" میں نے کہا "بلکہ جذباتی وابستگی۔"

"جذباتی وابستگی... کس سے؟"

"ظاہر ہے مجھ سے" میں نے کہا "تم سے تو ولاور کو ہو سکتی تھی۔ اور کیا پتا ہو۔"

وہ ہنس پڑی "یعنی یہ خوش فہمی ہے جناب کو۔ کہ وہ فریفتہ ہے آپ پر۔"

میں نے عاجزی سے کہا "وہ... دراصل۔ قصور میری نیت کا نہیں... بلکہ کچھ شخصیت ہی ایسی عطا کی ہے خدا نے... آخر تم بھی

www.paksociety.com

تو مری ہو مجھ پر۔"

"یہ اطلاع بھی غلط ہے۔ اپنی صورت ملاحظہ کی ہے کبھی آئینے میں؟" رابعہ نے کہا "اونہہ... مری ہو مجھ پر!"

"اب کیا عرض کروں۔ یہ رقابت اور حسد کے جذبات بول رہے ہیں ورنہ تم خود جانتی ہو کہ شخصیت کے طلسم کا صورت کے حسن سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ یہ سیکس اپیل کچھ اور ہی چیز ہے۔ دیکھو نا اب لوہے جیسی فضول اور بدصورت دھات میں کشش ہے مقناطیس کے لیے۔ سونے چاندی میں نہیں ہے۔"

"تو آپ مقناطیس ہیں یا لوہا؟"

"پتا نہیں۔" میں نے سر کھجا کے کہا "تمہارا کیا خیال ہے کیوں نہ ہم ٹاس کرلیں آپس میں کہ کون لوہا ہے اور کون مقناطیس۔"

یہ دوسرا کمرا نسبتاً چھوٹا تھا اور غالباً اس کوٹھی میں اسٹور کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی اور نہ کوئی روشندان تھا۔ اندر فرش پر گرد تھی اور مختلف چیزوں کی ملی جلی بو جو یہاں پڑی رہتی ہوں گی۔ فرش پر تیل کے داغ نمایاں تھے اور بہت بلندی پر روشن چالیس واٹ کے بلب کی روشنی میں دیواروں کا بوسیدہ رنگ، کونوں میں مکڑیوں کے جالے اور کہیں کہیں سے اکھڑا ہوا پلستر دیکھ کے اندازہ ہوجاتا تھا کہ ہمارے لیے قید و بند کا پہلا مرحلہ شروع ہوگیا ہے۔

میں نے رابعہ سے غیر سنجیدہ لہجے میں جتنی باتیں کی تھیں ان کا مقصد ہی خوف کے نفسیاتی دباؤ کو کم کرنا تھا۔ خود رابعہ نے ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس کے ذہن پر ماحول کا کوئی اثر نہیں اور وہ دلاور کی قید میں میرے ساتھ ہر قسم کی سختی برداشت کرنے کے لیے تیار ہے۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

میں نے کہا "رابعہ۔ تمہیں ڈر لگ رہا ہے نا؟"

وہ مجھ سے چمٹ گئی "ہاں۔" اس نے سہما کے میرے کانوں میں سرگوشی کی "بہت بزدل ہوں میں۔"

میں نے اسے بانہوں میں سمیٹ لیا "نہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کتنی بہادر ہو۔ ڈر تو مجھے بھی لگ رہا ہے۔"

ہم دیوار سے ٹیک لگا کے فرش پر بیٹھ گئے۔ رابعہ نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا "پتا ہے میں کیا چاہتی ہوں اس وقت؟"

"دیکھو۔ بانو بازار کے دہی بھلوں کی فرمائش مت کرنا۔"

وہ مسکرائی "اگر تقدیر مجھے موقع دے۔ ایک خواہش کی تکمیل کا۔"

"میں بتاؤں۔ تم خواہش کرنا کہ جو میں مانگوں وہ مل جائے۔ ایک خواہش کے کوزے میں خواہشات کا سمندر بند کردینا۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھی "میں مرجانا چاہوں گی ابھی اور اسی وقت۔"

میں نے اس کی آنکھوں کو، اس کے لبوں کو، اس کے بالوں کو اور گردن پر ستارۂ سحری کی طرح جگمگاتے تل کو چوما "بالکل فضول بات ہے۔"

"نہیں سکندر۔ یہ خواہش ہے اور خواہشات پر کوئی ذہن کا کنٹرول نہیں ہوتا۔ یہ تو اس وقت اور اس لمحے کی بات ہے میرا جی چاہتا ہے کہ اچانک فرشتۂ اجل ہم دونوں کی روحیں قبض کرلے ایسے کہ ہمیں پتا بھی نہ چلے۔ اچانک دلاور آئے اور ہم دونوں کو گولی مار دے۔"

"مس رابعہ قادری۔ آپ کی خواہش آپ کو مبارک۔ وہ اس نیت سے آیا تو میں اسے صاف بتادوں گا کہ خاتون کی یہ خواہش تھی۔ آپ اچھی طرح نشانہ لے کر بسم اللہ کریں۔ مجھے تو شکایت نہیں ہوگی بلکہ میں کہوں گا کہ شکریہ یار۔ تم نے اکلوتی محبوبہ کی وہ تمنا پوری کی جو میں نہیں کرسکتا تھا۔ آپ اجازت دیں۔"

رابعہ نے ہنستے ہوئے میرے سینے پر مکا مارا "کمینے۔"

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "آہ۔ دل توڑ دیا ظالم بھرپور پنچ مارا ہے محمد علی کلے والا۔ عین دل کے مقام پر۔"

رابعہ نے میرے کان کھینچ کے کہا "اچھا اگر میں مرگئی تو کیا کرو گے؟"

"تم سے ہو جائے تو میں جواب دیتا کہ دوسری شادی۔ اگر جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ۔ مرد کی ذات میں وفا تو ہے نہیں۔ یا چہلم تک اللہ صبر جمیل بھی عطا کردیتا ہے اور تمہاری صورت کا البدل بھی۔ ویسے ایک بات طے ہے "تم جیسی...." میں اسے دیکھ کے چپ ہوگیا۔

"مجھ جیسی کیا۔۔؟"

"زبردست احمق۔ تمہارا خیال ہوگا کہ میں حسین کہوں گا؟ احمق کہنا چاہتا تھا۔ تم جیسی احمق واقعی دوسری نہ ملتی۔"

"چلو کچھ تو ہے مجھ میں ایسی بات۔ جو کسی اور میں نہیں" افسردگی سے بولی۔

"ظاہر ہے۔ رابعہ تو ایک ہی تھی۔ وہ مل گئی تھی۔"

دوسرے روز ایک سین میں روایتی فلمی ولن سے زیادہ خبیث قسم کے ایک شخص نے داخلت کی۔ اس کا سر بالکل گنجا تھا۔ غالباً وہ چہرے کے ساتھ ہر روز سر کو بھی شیو کرتا تھا کیلا کی طرح۔ چہرے کے کرخت نقوش اور گلف دار مونچھیں کسی پہلوان کے سے پھڑکتی مچھلیوں والے بازو، مستطیل سینہ چوڑے صاف پر گوشت سینے اور فولادی ستون نظر آنے والی ٹانگوں سے اس کی شخصیت کی ہیبت ناکی کا تاثر زیادہ ڈرامائی محسوس ہوتا تھا۔

میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ تھا کہ ایسے شو پیس محض دکھانے کو ڈرانے کے ہوتے ہیں۔ جو واقعی خطرناک ہوتے ہیں وہ صورت سے بے ضرر اور غیر متاثر کن [illegible]

ہاتھ میں ایک فولادی زنجیر تھی۔ اس نے پاؤں پھیلا کے اور بنا کے کہا "چلو۔"

رابعہ نے اسے غور سے دیکھا "جہاں تم مرد ہو لیکن اوپر تمہیں کچھ پہن لینا چاہیے۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

رابعہ نے مجھے ٹوکا دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ بے تکی بات کرے۔ "کہاں چلیں؟"

"میرے ساتھ" وہ غرا کے ایک قدم آگے آیا۔

میں نے کہا "میرا دل چاہتا ہے کہ۔۔۔ گدگدی کروں تمہارے۔"

اس نے زنجیر کو بڑے وحشیانہ انداز میں گھمایا۔ وہ بھینس باندھنے والی موٹی زنجیر تھی۔ اگر میرا جسم اس کی زد میں آجاتا تو میرا گوشت ادھڑ جاتا مگر مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ وہ اس بار زنجیر کیسے استعمال کرے گا۔

میں نے رابعہ کو بچاتے ہوئے غوطہ مارا اور زنجیر کو ایسے پکڑلیا جیسے کیچ کرنے والا اس گیند کو پکڑ لیتا ہے جو کرکٹ کے گراؤنڈ کی باؤنڈری عبور کرنے کے لیے گولی کی طرح جا رہی ہو۔ ساری بات مہارت اور ٹائمنگ کی ہوتی ہے۔

زنجیر میری گرفت میں آئی تو اسے ایک جھٹکا لگا۔ اپنے وزن کی وجہ سے وہ منہ کے بل نہیں گرا مگر زنجیر اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔

"یہ لو۔ پھر کوشش کرو۔" میں نے زنجیر اس کی طرف پھینک دی۔

رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "سکندر۔ دلاور کی بیوی نے کیا کہا تھا؟"

میں نے کہا "اسی لیے تو مقابلہ نہیں کر رہا ہوں۔ پھر کتنی محبت سے کہا تھا اس دشمن جاں نے۔ میرا مطلب ہے دشمن کی ہونے والی بیوہ نے۔"

رابعہ نے کہا "چلو پہلوان۔ ہم لڑنا نہیں چاہتے۔"

پہلوان نے زنجیر پھر اٹھالی تھی مگر وہ جتنا حیران تھا اتنا ہی رابعہ کی بات سے پریشان ہوا "میرے پاس۔۔۔ ریوالور بھی ہے۔"

میں نے کہا "اچھا؟ ذرا دکھاؤ تو۔ گولیاں بھی ہیں اس میں؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "اصلی گولیاں ہیں۔"

"چلانا آتا ہے تمہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ چلا کے دکھاؤں؟" وہ بولا۔

رابعہ نے گھبرا کے کہا "نہیں نہیں۔ اسے جیب میں ہی رہنے دو کہیں اتفاقاً نہ چل جائے۔"

وہ ذہنی طور پر پسماندہ تھا۔ اس کے پاس صرف جسم بڑا تھا۔ دماغ بہت چھوٹے بچے کا تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ میں اس سے ریوالور بھی چھین لوں مگر مسلح ہو جانے کے باوجود لڑ بھڑ کے اس کوٹھی سے زندہ سلامت نکل جانا ناممکن تھا۔ اس لیے دلاور کی ہدایت ہی کارگر رہ گئی تھی کہ خودکشی کی کوشش مت کرنا۔

مجھ پر اس وقت چودہ طبق روشن ہوگئے جب دروازے سے باہر آتے ہی میرے سر پر کسی نامعلوم ہاتھ نے ڈنڈا دے مارا اور دوسرے لمحے میرا وجود تاریکی اور خلا میں گم ہوگیا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو مجھے ویسا ہی لگا جیسا کہ ہر بار ہوش میں آنے کے بعد لگتا تھا۔ زمین گھوم رہی تھی۔ اس کے ساتھ میں بھی گردش میں تھا اور میرے سر کے اندر دھم دھم ہتھوڑے چل رہے تھے۔ مجھے متلی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسی حالت میں یہ خیال آنا بھی فطری سی بات تھی کہ یہ عالم نزع ہے اور میں فوت ہو رہا ہوں۔

چند سیکنڈ یا چند منٹ کے بعد صورت حال کچھ واضح ہوئی تو مجھے سب سے پہلے تاریکی، ٹھنڈک اور نمی کا احساس ہوا۔ میرے جسم پر کپڑے بھی نہیں تھے۔ اوہ میرے خدا! میں فوت نہیں ہو رہا ہوں، فوت ہو چکا ہوں۔ کسی زبردست غلط فہمی کی بنا پر لواحقین مجھے مردہ سمجھ کے دفن کرگئے حالانکہ میں زندہ تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے اس احمقانہ خیال کو بھی مسترد کردیا۔ یہ ماحول کا اثر تھا کہ میں خود کو قبر میں محسوس کر رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں زندہ تھا۔ ایک دم مجھے یاد آگیا کہ یہ کیا جگہ ہو سکتی ہے اور میں کہاں ہوں۔ چوہدری دلاور نے اسی جگہ کا ذکر کیا تھا۔ الفاظ میں تصویر کشی کی تھی اور یہ بالکل وہی منظر تھا۔

میں نے آنکھیں پوری طرح کھول کے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ میں ایک سرنگ میں نیم دراز تھا۔ گندا بدبودار پانی میرے بے لباس جسم کو چھوتا ہوا گزر رہا تھا۔ یہ پانی دائیں طرف سے آرہا تھا جہاں فولادی سلاخوں والی جالی تھی۔ اس جالی کے پیچھے کافی فاصلے پر ایک بلب جل رہا تھا۔ اب مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سر گھما کے دوسری طرف دیکھوں۔ مجھے معلوم تھا کہ دوسری طرف کیا نظر آئے گا۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھاما اور اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہوگیا۔ اب بھی میرا سر کسی چٹان کی طرح ہو رہا تھا جو زلزلے کی زد میں ہو۔ درد کے دریا کا ایک سیلاب تھا جس کا ریلا سر کی ہر دیوار سے ٹکرا رہا تھا۔ اس کا اثر میری آنکھوں پر بھی پڑا تھا۔ مجھے سارا منظر کچھ دھندلا سا نظر آرہا تھا۔ ہر چیز یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے ایک حقیقی وجود کے ساتھ اس کا سایہ بھی ہے۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کچھ دیر بعد مجھے دو کی جگہ ایک چیز نظر آنے لگے۔ چوٹ نے سر کے اس حصے کو متاثر کیا تھا جس کا براہ راست تعلق بصارت سے تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اندھا ہونے سے بال بال بچ گیا تھا۔

چوہدری دلاور نے وہی کیا تھا جو کہا تھا۔ شاید یہ سزا فوراً نہ ملتی۔ اس نے ایک موقع فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن نادر کی جرات نے جو اس کے نزدیک گستاخی تھی چوہدری دلاور کو اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کردیا تھا۔

www.paksociety.com

سیوریج لائن واقعی پانچ فٹ قطر کی تھی مگر لائن کے تناسب سے اس میں پانی بہت کم تھا۔ نکاسی آب کا نظام بھی ایک اصول کے تحت بچھایا جاتا ہے۔ گھر کے اندر سے گلی میں آنے والی لائن چھ انچ کی ہو تو گلی کی لائن ایک فٹ کی ہوتی ہے۔ پھر ایک فٹ کی بہت سی لائنوں کا سلسلہ دو فٹ کی ایک لائن سے جا ملتا ہے۔ دو فٹ کی ہر لائن مزید آگے جا کے تین یا چار فٹ کی لائن میں شامل ہوتی ہے۔ استعمال شدہ پانی اور اس کے ساتھ بہہ کر آنے والی غلاظت کا تناسب اسی حساب سے بڑھتا جاتا ہے۔ ایک فٹ کی لائن میں سو گھروں کی نکاسی ہوتی ہے تو دو فٹ والی میں ہزار دو ہزار گھروں کی۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

حساب کے اس اندازے سے پانچ فٹ کی سیوریج لائن سے پانچ دس ہزار گھروں کا پانی اور غلاظت کا ریلا گزرتا تو میں اس کے فرش پر بیٹھ نہیں سکتا تھا اور پانی کی سطح صرف ایک فٹ نہیں ہو سکتی تھی۔ عام طور پر شہر کی گٹر لائنیں ابلتی نظر آتی ہیں۔ صاف ہوں تب بھی پانچ فٹ کی لائن میں تین چار فٹ تک سیاہ بدبودار کیچڑ اور ہزاروں گھروں میں بسنے والے لاکھوں انسانوں کی گندگی بھری ہوئی نظر آتی ہے۔

یہ نتیجہ اخذ کر کے مجھے کچھ مایوسی ہوئی کہ جہاں ہم قید تھے وہاں آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ پانچ دس ہزار گھروں کا نہیں سو پچاس گھروں کا پانی تھا۔ اس علاقے میں مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے پانچ دس ہزار مکانوں کے لیے سیوریج لائن پہلے سے بچھا دی گئی تھی مگر ابھی بہت کم گھر آباد ہوئے تھے۔ یہ کوئی ترقیاتی اسکیم تھی یا نئی آبادی جس میں زیادہ پلاٹ خریدے جا چکے ہوں گے مگر شہر سے فاصلے اور دیگر سہولیات کی عدم دستیابی کے باعث ابھی ہر شخص کو یہاں گھر بنانے کی جلدی نہیں تھی جو شہر کے وسط میں اور آبادی میں بازار کے نزدیک رہتے تھے۔ خواہ وہ اپنے مکان میں ہوں یا کرائے کے۔ انہیں ادھر آنے کی مجبوری نہیں تھی۔ ہاں مجبور لوگ مکانوں کے بڑھتے ہوئے کرایوں سے گھبرا کر یا اپنا مکان اپنی زندگی میں بنانے کی خواہش کے باعث دوری کی مجبوری بھی قبول کر لیتے ہیں۔ ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ شہر پھیلتا ہے اور جو باہر کی آبادی "نیا شہر" سیٹلائٹ ٹاؤن اور مضافات ہوتے ہیں وہ بھی بالآخر شہر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مضافات اور آگے نکل جاتے ہیں۔

مجھے یاد آیا کہ گرفتار کرنے والے ہمیں ملتان روڈ پر لائے تھے اور جس مکان میں ہم کو "مہمان" بنایا گیا تھا وہ سڑک سے بہت کم فاصلے پر تھا۔ وہ مکان الگ ضرور تھا مگر وہاں آبادی کم نہیں تھی۔ اس کے پیچھے سیکڑوں مکان نظر آ رہے تھے۔ کسی بھی مین روڈ کے ساتھ عموماً کمرشل پلاٹ ہوتے ہیں جو بڑے بھی ہوتے ہیں اور مہنگے بھی۔ پھر مین سیوریج لائن بھی سڑک سے کچھ فاصلے پر مگر اس کے متوازی اور نشیب کی جانب چلتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم

اس مکان میں بہرحال نہیں تھے جس کے فرش پر پاؤں مارتے ... نے کہا تھا کہ اس کے نیچے وہ زمین دوز تہہ خانہ ہے جہاں ... جائے گا۔ اس نے الفاظ سے جو نقشہ کھینچا تھا یہ جگہ اس ... مطابقت رکھتی تھی مگر وہ اس گھر کا حصہ بہرحال نہیں تھی ... عیاری نہیں بے وقوفی تھی کہ اس نے غلط بیانی کی۔ یہ فرض ... غلط تھا کہ ہم اس کی بات کا یقین کر لیں گے۔ ایسی ... کوئی معمولی مجرم بھی نہیں کرتا کہ چار افراد کو اغوا کرے اور ... کھلی آنکھوں سے وہ جگہ دیکھنے کا موقع فراہم کرے جہاں ... قانونی طور پر قید رکھا جائے گا اور پھر ان میں سے دو کو ... واپسی کی اجازت بھی دے کہ وہ سیدھے پولیس اسٹیشن جائیں ... جگہ کی نشاندہی کر دیں۔ ناز اور غالب پولیس سے مدد ... بھی اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اور ... اس جگہ پہنچنے میں دیر نہ لگاتے۔ خواہ وہ سرنگ بنا کے ہم تک ... حاصل کرتے یا توپ خانہ لے کر چڑھائی کرتے مگر وہ آگے ... صاف نکال لے جاتے اور اس قید خانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔

یہ سب سوچ کے میری مایوسی بڑھ گئی۔ اگر غالب اور ... واقعی چھوڑ دیا گیا تھا تب بھی یہ آس رکھنا بے سود تھا کہ وہ ... رہائی کی کوشش میں کامیاب ہوں گے۔ شاید وہ دوبارہ اس گھر ... داخل ہوں گے تو وہاں نقشہ ہی بدلا ہوا ملے گا۔ کوئی بوڑھا ... کرنل یا سول سرونٹ انہیں اپنے آراستہ ڈرائنگ روم ... بٹھا کے پوچھے گا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ کچھ مجھے بھی بتائیں ... یہاں تو میں ایک سال سے اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہوں۔ ... مکان میں چادریں کھیس اور تولیے بننے کی دیسی کھڈی ... مصروف ہوں گے اور مالک یا منیجر کو غالب اور ناز دونوں مشکوک نظر آئیں گے۔ اگر آپ نشے میں نہیں ہیں تو پھر خود اور بات ہے آپ غلط گھر میں، غلط سڑک پر یا غلط شہر میں آ گئے ہیں۔ کیا کہیں گے غفلت کے بارے غالب اور ناز اس کے جواب میں ... سمجھائیں گے کہ جب واسطہ چوہدری دلاور جیسے حریف سے ہو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ دن میں تارے نظر آ سکتے ہیں۔ جو سچ تھا جھوٹ ہو سکتا ہے۔ دو اور دو پانچ بن سکتے ہیں۔

پہلے دلاور ہمارے رحم و کرم پر تھا۔ صرف ہم جانتے تھے کہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ ایسے ہی اب ہم چوہدری دلاور کے "مہمان" تھے اور اس کی خاطر تواضع کا انداز تھا۔ ... اس نے جوشِ جذبات میں بتایا تھا۔ وہ نہ بتاتا تب بھی ... کر سکتے تھے کہ ہماری سزا کئی گنا سخت اور زیادہ عبرت ناک ... کھیل وہی تھا۔ مہرے بدل گئے تھے۔ پہلی بازی دلاور کے ... ہوئے اصولوں پر ہوتی تو دوسری بازی کے لیے ہم اپنے اصول ... کرتے ہوئے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے۔

جہاں دلاور قید تھا وہاں ہمیں یہ خطرہ ہر وقت لاحق رہتا تھا ...

... ہمیں آ جاتا نہ دیکھ لے۔ کوئی تعاقب کرتا ہوا ہمارے ... اس قید خانے تک نہ پہنچ جائے جو عین شہر میں ایک ... زمین اور ہر وقت آباد رہنے والی جگہ پر واقع تھا۔ یہاں ... کے لیے کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔ یہ جگہ ... اور آنے جانے والوں کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ اگر کوئی ... کر آتا تو خود بھی پکڑا جاتا۔ غالب اور ناز کا ہم تک پہنچ ... نا ممکن تھا۔ ... کے اتفاقات کا نتیجہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ... بھی کوئی بات غیر منطقی نہیں ہوتی۔ اس خیال سے ... کھلا آ کر غیب سے کوئی فرشتہ نمودار ہو گا اور ... کر لے جائے گا جیسے الٰہ دین کو چراغ کا جن غار سے ... تھا۔ اگر کچھ امید کی جا سکتی تھی تو چوہدری دلاور کی ... سے۔ شاید وہ ہمت کرے اور کوشش کرتی رہے کہ اس کے ... کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے۔ وہ پھر چوہدری دلاور کے دل میں یہ ... کرے کہ احسان کا بدلہ ضرور چکانا چاہیے۔ خود دلاور ... دشمن کے لیے رعایت کا تصور نہیں تھا۔ یہ حیرت کی ... تھی کہ بیوی نے اسے اپنے اصول بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ... کے ایک آتش فشاں کو تنہا اپنی ذاتی کوشش سے اس حد تک ... کر دیا تھا کہ اس نے ہمیں جلا کے راکھ نہیں کیا۔ عورت بڑی ... ہے۔ جس نے آدم کو جنت سے نکلوا دیا۔ ہٹلر جیسے ڈکٹیٹر کے ... حکمرانی کی اور اسے اپنے ساتھ ہی دنیا سے لے گئی۔ جس نے ... کو مجبور کر دیا کہ تاجِ برطانیہ کو ٹھکرا دے۔ ایسی ہی کوئی ... چوہدری دلاور جیسے پتھر کے انسان کو موم کا پتلا بنا سکتی تھی ... وہ ایسی ہی عورت تھی۔ اسے اپنی ذہانت اور بدن کی ... کے ساتھ ہی دلاور کی ذات کے حصار کی ہر کمزوری کا بھرپور ... تھا۔ رہ جاتی تھی کہ کب مفتوح اور مغلوب کمزور کے مرد ... کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر کے سب کچھ برداشت کر لینا چاہیے اور کب کسی کمزوری کو اپنی شہ زوری کا ایٹم بم بنا کے استعمال کر لینا چاہیے کہ ... ہیروشیما کی طرح ڈھیر ہو جائے۔ جیسے ہر مرد انتھونی، ہٹلر یا ... نہیں ہوتا ایسے ہی ہر عورت بھی قلوپطرہ، ایوا براؤن یا ... نہیں ہو سکتی۔ تاہم چوہدری دلاور کے لیے اس کی بیوی کو ... قدرت نے بطور خاص بنایا تھا۔ جس طرح میرے لیے رابعہ کو یا غالب کے لیے ناز کو۔

... گھٹنوں میں سر رکھے سٹا سمٹایا اپنے خیالات میں گم اور ... بیٹھا ہوا تھا۔ غلاظت اور بدبو کا احساس مجھے ابھی تک نہیں ... تھا۔ بڑے عذاب میں مبتلا آدمی کے لیے چھوٹی سی تکلیف بے ... ہو جاتی ہے۔ جو گٹر میں مبتلا ہو اس کو ایک پھنسی کا پتا بھی ... مجھے بھی سب سے زیادہ تکلیف اپنی بے لباسی پر تھی۔ ... کی اذیت کا خیال اس کے بعد تھا۔ مجھے یہ بھی علم تھا ... فاصلے پر رابعہ کے لیے بھی عذاب کا سامان ہے مگر میں اس

کی طرف کیسے دیکھتا۔ مجھ میں تو خود کو دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

لائن کی دیواروں پر کاکروچ پھر رہے تھے۔ گندے پانی میں کیڑے کلبلا رہے تھے اور اوپر چڑھنے کی کوشش میں بار بار نیچے گر رہے تھے۔ میں نے مکڑیاں اور بچھو بھی دیکھے۔ پھر اچانک میرے پاؤں کے انگوٹھے کو جیسے کسی نے خنجر کی تیز نوک سے ادھیڑ دیا۔ تکلیف سے تڑپ کر میں نے پاؤں کو کھینچ لیا اور بڑی مشکل سے اپنی چیخ کو دبایا۔

بلی کے سائز کا ایک چوہے جیسا جانور تیزی سے بھاگتا ہوا جال کے پیچھے غائب ہو گیا۔ خوف سے میرا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔ کیا یہ گوشت خور جانور مجھے لاش سمجھ کے میرے بدن کو کھانے آیا تھا؟ چوہے بلی کیا شیر تک انسان سے ڈرتا ہے اور جب تک مجبور نہ ہو جائے حملہ نہیں کرتا۔ لاش پر تو چیل کوے بھی بھیڑیوں کے ساتھ آ جاتے ہیں۔

میرے انگوٹھے سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے زخم کو انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے دبا کے روکا۔ صاف پانی ہوتا تو میں زخم کو دھو کے صاف کرتا مگر اس پانی سے تو انفیکشن ہو جانے کا ڈر تھا۔ سردی کے باوجود مجھے پسینہ آ گیا تھا۔ یہ خطرناک اور سفاک چوہا اس جال سے نکل کے فرار ہوا تھا جدھر سے بلب کی روشنی آ رہی تھی۔ اس محدود روشنی میں سرنگ جیسی لائن سو دو سو گز تک بھی مشکل سے نظر آتی تھی۔ اس کے بعد اندھیرا تھا جو ٹھوس سیاہ دیوار کی طرح ہمارے اور زندہ انسانوں کی دنیا کے درمیان حائل تھا۔ یہ اندازہ کرنا محال تھا کہ اس سرنگ میں کوئی موڑ کہاں آتا ہے اور زمین کی سطح کے اوپر طلوع ہونے کے لیے مین ہول کتنی دور ہے۔ مین ہول اگر ایک گز دور ہوتا تب بھی بے کار تھا۔ کیونکہ درمیان میں لوہے کی سلاخوں کی مضبوط جالی تھی جس سے صرف میرا ہاتھ گزر سکتا تھا۔ یہ سلاخیں آدھا انچ موٹی تھیں اور صاف ظاہر تھا کہ خصوصی انتظام کے طور پر نصب کی گئی ہیں ورنہ کسی گٹر لائن میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ جنگلا بنانے والوں کو فوری طور پر یہ اندیشہ بھی لاحق نہیں تھا کہ اس سے سیوریج کا فلو متاثر ہو گا اور لائن چوک ہو جائے گی۔ چھوٹا موٹا کچرا چھ انچ مربع جالی سے نکل سکتا تھا اور بالفرض کوئی بڑی چیز اڑ جاتی تو وہ پیچھے آ کے اس کو ہٹا بھی سکتے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق بلب لگانے کے لیے مین ہول ہی کا انتخاب کیا گیا ہو گا اور کوئی نیچے آئے گا تو ڈھکنا ہٹا کے ہی اترے گا۔

رابعہ نے چیخ ماری تو میں اچھل پڑا اور گھبرا کے اٹھا تو میرا سر اوپر کی مدور چھت سے لگا۔ اس چیخ کی گونج کسی اسٹیم انجن سے زیادہ بھیانک اور سمع خراش تھی۔

میں نے چلا کے کہا "رابعہ" اور پھر اس کی طرف دیکھا تو میری آنکھیں خود ہی بند ہو گئیں۔

میری طرف اس کی پشت تھی اور وہ بھی میری طرح گھٹنوں میں

www.paksociety.com

سمو سے اور دونوں ہاتھوں سے جسم سمیٹے یوں بیٹھی ہوئی تھی کہ خود کو بھی نہ دیکھ سکے۔

وہ چلانے لگی "سکندر۔ سکندر! میری طرف مت دیکھو۔ میں چیخ چیخ کر مر جاؤں تب بھی مجھے مت دیکھنا۔"

میں نے کہا "جان۔ میری آنکھیں بند ہیں لیکن میں اندھا تو نہیں ہو سکتا۔ پردہ ہوتا ہے نظر کا اور نیت کا۔"

وہ چلائی "نہیں' نہیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا میں نے غلطی کی جو چیخ ماری۔"

"کیا تم مرنے سے ڈرتی ہو؟"

"مجھ سے یہ ذلت کی موت برداشت نہیں ہوگی سکندر۔" وہ زار و قطار رو رہی تھی "دلاور سے کہو ہمیں گولی مار دے۔ زہر دے دے۔ جیسے چاہے مار ڈالے۔ ہماری لاشوں کو یہاں پڑا رہنے دے لیکن ایسے زندہ نہ رکھے۔"

"وہ ایسے ہی زندہ رکھنا چاہتا ہے ہمیں رابعہ۔ اور موت اپنے وقت پر آئے گی" میں نے اسے تسلی دی "اگر یہ آزمائش ہے تو اسے برداشت کرنا ہوگا۔ ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

"یہاں چوہے بھی ہیں سکندر۔ آدم خور چوہے۔"

"ہاں۔ ایک چوہے نے میرے پاؤں کے انگوٹھے پر کاٹا تھا۔"

وہ بولی "میرے بھی انگوٹھے کا گوشت نوچ لیا تھا اس نے۔ میں خون دیکھ کے وحشت زدہ ہو گئی تھی۔"

میں نے کہا "دیکھو رابعہ۔ تم بھی اپنی آنکھیں بند کر لو۔ اور پھر اٹھ کے آہستہ آہستہ میری طرف آؤ۔"

"نہیں' نہیں سکندر۔"

"حوصلہ رکھو جان۔ یہاں کون ہے ہمارے سوا اور جب ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ ہی نہیں رہے تو پھر قریب آ کے بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ سمجھ لو تم بھی باتھ روم میں ہو' اور میں دوسرے باتھ روم میں ہوں لیکن ہم ایک دوسرے کی آواز سن سکتے ہیں۔"

"سکندر۔ تم کچھ نہیں کر سکتے' خدا کے لیے کچھ کرو۔"

میں نے کہا "مجھے بتاؤ' میں کیا کروں؟ یہاں کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں خالی ہاتھوں سے ان سلاخوں کو نہیں اُدھیڑ سکتا۔ میں دائیں بائیں اوپر نیچے کہیں بھی اس سرنگ میں سوراخ تک نہیں کر سکتا۔ ایک ذرہ تک نہیں ہلا سکتا۔ یہ سیمنٹ اور جال کی طرح کھنچے ہوئے فولادی تاروں سے بنی ہوئی لائن ہے۔ میرے ہاتھ میں ہتھوڑا ہوتا تب بھی میں اس کے اوپر کئی فٹ مٹی نہیں کھود سکتا تھا۔"

"میں نے کہا تھا نا۔ میں مرنا چاہتی ہوں تمہارے ساتھ۔ کتنا اچھا وقت تھا وہ۔ وہ کتنی اچھی موت ہوتی" اس کی آواز اب زیادہ نزدیک آ گئی تھی۔

"کیا تمہیں معلوم ہے۔ یہ جگہ کہاں ہوگی؟"

"دلاور نے کہا تھا۔"

"دلاور نے جھوٹ بولا تھا" میں نے اسے اپنے اندازے کے بارے میں بتایا۔

وہ قائل ہو گئی "ایسے کتنے دن زندہ رہیں گے ہم سکندر؟"

"جب تک خدا کو منظور ہوگا۔ لیکن ہم حوصلہ رکھیں گے [illegible] رابعہ۔ آخری سانس تک' وعدہ کرو۔"

"پہلے مجھے مرنے دینا سکندر۔"

"ایسی باتیں مت کرو۔ ہم زندہ رہیں گے۔ مجھے خدا پر بھروسا ہے۔"

"بھروسا تو مجھے بھی ہے۔ لیکن میں اکیلی [illegible]"

"ایسا نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے ہی کوئی بچانے کا [illegible]"

اس نے کہا "کون؟ یہاں تو غالب اور نازو بھی نہیں [illegible] تم نے ہی کہا ہے۔"

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ رابعہ کو پُرامید رکھنے کے [illegible] مجھے اپنی اخذ کردہ معلومات کو اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہیے تھا۔ یہ امید اس کا بہت بڑا سہارا رہتی کہ ہم اسی گھر کے تہ خانے میں ہیں جہاں غالب اور نازو کا کسی وقت بھی پہنچ کے ہمیں ساتھ [illegible] جانا ممکن ہے۔ میں نے اس امید کی بنیاد ہی ختم [illegible] تھی۔ احمق... احمق... میں نے خود سے کہا۔

میں نے کہا "رونا بند کرو جاناں۔ میں اتنا مجبور [illegible] تمہارے آنسو پونچھ بھی نہیں سکتا۔ میں تو دیکھنے کے باوجود [illegible] آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا ہوں۔ رونے سے کچھ فائدہ نہیں [illegible] یہ ٹھیک ہے کہ غالب اور نازو کا یہاں پہنچنا شاید ممکن نہ ہو [illegible] اس لیے کہ جو کچھ میں نے تم کو بتایا وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"نہیں۔ تمہارا ذہن کام کر رہا ہے۔ بالکل ٹھیک [illegible] مجھے تم نے۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "لیکن میں سمجھتا ہوں کہ [illegible] کی بیوی کی کوشش سے ہم بچ جائیں گے۔ اس عورت کے [illegible] احسان مندی کے جذبات ہیں۔ ہم نے اسے بچایا' اس کے [illegible] کو' شوہر کو اور بچوں کو اور دیکھا جائے تو ان کا سب کچھ [illegible] بچایا تھا۔ میں اور محسن اسے نہ نکالتے تو وہ بھی آتش [illegible] آگ میں جل کے خاک ہو جاتی یا اس سے پہلے ہی دم گھٹ [illegible] ہلاک ہو جاتی۔ پھر شوکت رانا اس کے بچوں کو بھی ٹھکانے لگا [illegible] اس کے کاروبار پر قابض ہو جاتا اور پھر دلاور رانا تو اسے کیا [illegible]"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر دلاور۔"

میں نے کہا "ہاں دلاور' کمینہ اور احسان فراموش ہے۔ [illegible] اس میں ایک تبدیلی تو آئی کہ تم نے پہلے وہ بیوی کو کچھ نہ [illegible] تھا لیکن اب وہ اسے کتنی اہمیت دینے لگا ہے۔ وہ سمجھتا ہے [illegible] کی شریک حیات نے اس کی عدم موجودگی میں حالات کا مردانہ [illegible] مقابلہ کیا۔ عورت ہونے کے باوجود ہار نہیں مانی۔ شوکت رانا [illegible]

دشمنوں سے خود کو بھی بچایا اور بچوں کو بھی۔ پولیس کانفرنس میں ان دشمنوں کے عزائم کا پردہ چاک کروایا اور انہیں کاروبار پر قابض نہیں ہونے دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دلاور کو بھی تلاش کرتی رہی اور اس تلاش میں کامیاب بھی ہو گئی۔ جو کام چوہدری دلاور کے تنخواہ دار اور پولیس کے وظیفہ خوار نہیں کر سکتے تھے وہ ایک عورت نے کر دکھایا۔ اس لیے اب وہ بیوی کی قدر کرتا ہے اور اس کی بات مانتا ہے۔ ابھی غصے میں اس نے ایک قدم اٹھایا ہے۔ مگر وہ کچھ بیوی نے ایک بات تو فوراً ہی منوالی تھی اس سے۔ غالب اور نازو کو چھوڑ دیا گیا۔"

رابعہ نے بالکل بدلے ہوئے لہجے میں کہا "تمہیں امید ہے کہ وہ چوہدری دلاور سے ہماری سفارش کرے گی تو۔ دلاور ہمیں چھوڑ دے گا۔"

"امید ہی نہیں۔ یقین ہے" میں نے رابعہ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا "دلاور نے کہا تھا کہ احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے وہ ہمیں ایک چانس دے گا۔ آخر کیا مطلب تھا اس بات کا؟ یہی کہ وہ ہم سے بدلہ نہیں لے گا۔ وہ بدلہ لے سکتا ہے مگر ایک بار ہم نے اس کی زندگی بچائی...."

"ہم نے اس کی زندگی نہیں بچائی۔"

"یار' ایک ہی بات ہے۔ ہم نے بیوی کو بچایا اور بیوی نے چالاکی سے اور ہمت سے کام لے کر شوہر کو بچا لیا۔ اب بیوی کے کہنے پر ہی وہ ہمیں چھوڑے گا کہ جاؤ' یار زندہ صحبت باقی۔ اگلے راؤنڈ میں ہم پھر ملیں گے تو دشمنی کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع کریں گے جہاں سے ٹوٹا تھا۔ احسان برابر۔ لیکن میرا دل یہ بھی کہتا ہے کہ دلاور احسان کو بہانہ بنا کے اپنی جان چھڑانا چاہتا ہے۔ وہ تھک گیا ہے یا اس کا حوصلہ جواب دے رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اب ہر قیمت پر صلح ہو جائے۔ وہ تاوان جنگ ادا کرنے کی بات پہلے بھی کر چکا ہے۔ ہو سکتا ہے اب وہ کہے کہ چلو شرائط تم بتاؤ' میں ہر شرط منظور کرتا ہوں۔"

"سوائے ایک شرط کے۔ مجھے تختہ دار تک پہنچانے کی ضد چھوڑ دو۔"

"ہاں۔ بالکل ٹھیک سمجھا تم نے۔"

"پھر ہم کیا کریں گے سکندر! اگر اس نے واقعی ہر بات مان لی؟"

"قانون داں تم ہو۔ تم بتاؤ۔ اور دیکھو' میں مزید آنکھیں بند نہیں رکھ سکتا۔"

"نہیں سکندر۔ میں مر جاؤں گی شرم سے۔"

"اچھی میں منہ پھیر کے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ تم بھی میری طرف پشت کر لو۔ بلکہ جہاں کھڑی ہو وہیں بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا۔

"یہاں... یہاں تو کاکروچ بہت ہیں۔"

"کاکروچ کاٹتے ہیں؟"

"مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے کہا "کتنے رو۔ میرے تمہارے درمیان چھ فٹ کا فاصلہ ہے اور تم بیری جالی ہے اسے توڑ کے میں تمہارا خوف دور کرنے آ سکتا تب بھی اس حالت میں نہ آتا۔"

"یہاں تو... چھپکلیاں بھی ہوں گی۔"

"ایک تو تم خود ہو" میں نے کہا۔

"کیڑے رینگ رہے ہیں دیواروں پر' چھوٹے ہیں۔"

"اب یہ کیسی دیکھتی رہو گی آنکھیں بند کر لو۔ سب غائب ہو جائیں گے۔ حیرت ہے ابھی تک تم نے بدبو پر ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔"

"سکندر۔ کھائے پیے بغیر آدمی کب تک زندہ رہ سکتا ہے؟"

میں نے کہا "آدمی؟ کون سا آدمی۔ اپنا یار منظر شاید ایک دن بعد اللہ کو پیارا ہو جائے گا۔ میں نے کبھی اس کا تجربہ نہیں کیا۔ ہر آدمی کی قوت برداشت الگ ہوتی ہے۔ ایک ہفتہ جی سکتے ہیں ہم۔"

"پھر تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے" وہ سہم کے بولی۔

"پھر وہی بے وقوفی کی بات۔ اس سے پہلے ہمیں نکال لیا جائے گا" میں نے کہا۔

میں بہت پُراعتماد لہجے میں بات کر رہا تھا مگر اندر سے میری اپنی بھی وہی حالت تھی جو رابعہ کی تھی۔ جتنا میں اس تصور کو ذہن سے دور رکھنے کی کوشش کرتا تھا اتنا ہی اپنے انجام کا خوف میرے اعصاب پر مسلط ہوتا جاتا تھا اور میرے لیے آنے والے وقت کی بھیانک تصویر زیادہ واضح ہونے لگتی تھی۔ ابھی چند گھنٹے گزرے تھے۔ باہر کی دنیا میں نہ جانے کیا وقت ہوا تھا لیکن اندر وقت تھم سا گیا تھا اور تاریکی جو رات کی علامت ہوتی ہے منجمد ہو کے ٹھہر چکی تھی۔ ایک بلب تھا جو تھوڑی سی روشنی فراہم کر رہا تھا۔ روشنی بھی زندگی کی علامت ہوتی ہے۔ جب سورج طلوع ہوتا ہے اور دن کی مسافت طے کر کے غروب ہوتا ہے تو چاند نکل آتا ہے اور تاروں کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ اس حرکت سے روز و شب اور ماہ و سال کا اور زندگی کے سفر میں پیش رفت کا احساس باقی رہتا ہے۔ مسلسل ایک ہی جگہ ایک ہی انداز میں جلنے والا بلب جمود کی علامت بن گیا تھا۔ اگر میری کلائی پر گھڑی ہوتی تو اس کی متحرک سوئیاں دیکھ کے بھی وقت کے ساتھ رشتہ استوار رکھا جا سکتا تھا۔ مگر انہوں نے میرے پاس کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا جو آج کے وقت کے فیصلے کی مد سے بااختیار تھے۔

قید میں ایک عذاب اپنی بے بسی کے احساس کا ہوتا ہے اور دوسرا اپنے ہی خیالات کے غول بیابانی کا جو اکیلا پاکے ہر سمت سے یلغار کرتے ہیں جیسے جنگل میں تنہا مسافر کو رات کے وقت بھیڑیے ہر طرف سے گھیراؤ کر کے ڈراتے ہوں۔ کوئی ان سے بھاگ کے جا بھی کہاں سکتا ہے۔

www.paksociety.com

ابھی سارا دن اور پھر آنے والی رات ہے۔ میں نے سوچا۔ لیکن مجھے کیا معلوم کہ باہر رات ہے یا دن باقی ہے۔ میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ اس کا میرے پاس کوئی حساب نہیں۔

رابعہ نے کہا "تمھارے سر پر پیڈرو نے ریوالور کا بٹ مارا تھا۔"

میں نے چونک کے کہا "تم نے دیکھا تھا؟"

"ہاں۔ تم دروازے سے بائیں طرف مڑے تھے۔ اس نے دائیں جانب سے آکے وار کیا تھا۔ میں پیچھے تھی اس لیے میں نے دیکھ لیا تھا۔"

"کیا تمھارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا؟"

"نہیں۔ میں نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ میں... کچھ نہیں کروں گی۔"

میں نے کہا "تم کر بھی کیا سکتی تھیں۔ خطرہ انھیں صرف مجھ سے تھا۔"

رابعہ نے شرمندگی سے کہا "واقعی۔ میں بالکل بے کار ہوں۔ کچھ بھی نہیں تو آتا مجھے قانونی دلائل دینے کے سوا۔ وہ کون سنتا ہے یہاں۔"

میں نے کہا "جو تم نے کیا وہ کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ صرف میرے لیے نہیں، دلاور کے خلاف قانونی جنگ میں ہمارا سب سے مؤثر ہتھیار تم تھیں۔ قانون کی زنجیر میں تم نے ہی دلاور کو جکڑا تھا۔"

"کیا فرق پڑا اس سے... وہ زنجیریں اسے روک نہیں سکتی تھیں، کتنی آسانی سے نکل گیا وہ اور ہم۔"

میں نے کہا "ہر مجرم موقع ملتے ہی قید سے فرار ہو جاتا ہے مگر موت سے فرار ہو کے کوئی کہاں جا سکتا ہے۔ چودھری دلاور کو گولی مارنا تو ایک معمولی بدمعاش کے لیے بھی آسان تھا مگر اسے تختۂ دار تک پہنچانے کی طاقت تمھارے پاس ہے۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔"

میں نے کہا "کیا یہ بھی غلط ہے کہ میرے لیے جینے کا سہارا بھی تم ہو اور بہانہ بھی۔ میری زندگی کی تمنا بھی تم ہو اور حاصلِ تمنا بھی۔"

"یہاں بھی۔ اس حالت میں بھی رومانٹک شاعری سوجھ رہی ہے تمھیں؟" رابعہ نے بدمزگی سے کہا۔

میں نے کہا "اچھا یہ بتاؤ، کتنی دیر ہو چکی ہے ہمیں یہاں آئے۔ تم تو ہوش میں تھیں۔"

"میرا خیال ہے تین چار گھنٹے۔"

"یعنی دو گھنٹے سے زیادہ بے ہوش پڑا رہا میں۔"

رابعہ نے کہا "ابھی نہ جانے کتنا وقت اور گزرے گا ایسے ہی۔ میں نے کہا ہے... اور پڑھا بھی ہے کہ بھوک اور پیاس جب ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو آدمی بالکل جانور ہو جاتا ہے۔"

میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا "آدمی بہرحال جانور ہے، حیوانِ ناطق۔ دو ٹانگوں پر چلنے والا، بندر کی طرح۔"

رابعہ بولتی رہی "وہ سب کچھ کھا جاتا ہے۔ گھاس پھوس اور کچرا، حرام اور مردار۔ اور ایسا پانی تک پینے لگتا ہے۔"

میں نے درشتی سے کہا "دیکھو رابعہ۔ یہ سب میں بھی جانتا ہوں لیکن ہم پر خدا نہ کرے ایسا وقت آئے۔ ایسی مایوسی کی باتیں کرنے سے فائدہ؟ میں مانتا ہوں کہ ذہن میں مایوسی کا غلبہ ہو تو ایسے خیالات پریشان کرتے ہیں مگر ان کا اظہار زبان سے کر کے تم دوسروں کو بھی پریشان کرتا ہے۔ خود اپنی پریشانی کم نہیں ہوتی۔ یہ فریاد اور واویلے سے بہتر تو خاموشی ہے۔ اچھی باتیں کرو، حوصلہ بڑھانے والی۔ یقین رکھو کہ خدا ظالم نہیں ہے، وہ رحمان اور رحیم ہے۔ وہ عدل کرتا ہے، دنیا و آخرت میں اس کی سزا و جزا کا نظام نہیں جو چودھری دلاور کا ہے۔ اسی لیے ناامیدی کو کفر سمجھا جاتا ہے۔"

وہ رونے لگی "آئی ایم سوری سکندر۔ بتاؤ میں کیا کروں۔ مجھ میں تمھارے برابر حوصلہ نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ یا شاید ہو گئی ہوں ابھی سے۔ تم ٹھیک کہتے ہو، تمھاری ہر بات میرے دل کو لگتی ہے۔ میں نے بچپن میں ایک نظم پڑھی تھی کہ کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ، بس ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔"

وہ بولتی رہی۔ میں سنتا رہا۔ پھر وہ بھی خاموش ہو گئی اور میں بھی خاموشی میں بہت کچھ سوچتا رہا اور سنتا رہا۔ وہ آوازیں جو خیالوں میں دلاسا دیتی تھیں اور وہ آوازیں جو امید کا سراب بنتی تھیں۔ غالب اور ناصر کی آواز، دلدار یوسف اور گل، محسن اور گل، منظر اور مولوی خادم حسین۔ ہر آواز کا ایک روپ تھا۔ یہ جیتی جاگتی آوازیں تھیں جن کا راستہ دیواریں نہیں روک سکتی تھیں۔ مولوی خادم حسین کا خیال آیا تو میں مسکرانے لگا۔ ہر قصہ مجھے بہت دور لاہور سے کراچی لے گیا۔ جہاں آرام تھا اور کاجل تھی۔ جہاں سے ساری خرابی شروع ہوئی تھی۔

ایک بار پھر رابعہ نے مجھے حقائق کی سنگین دنیا میں کھینچ لیا۔ اس نے کہا "جب رات ہو گی تو کیا نیند آئے گی؟"

میں نے بے خیالی میں کہا "نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔"

"یہ محاورہ ہے۔ وہ ہمیشہ کی نیند ہوتی ہے۔ یہاں تو سیدھا کھڑا ہونا بھی مشکل ہے۔ تم کیسے بیٹھے ہو۔ کمر سیدھی کرنے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ میرے پاؤں سن ہو گئے ہیں اس پانی میں۔ اب بھی اکڑ رہی ہیں۔ تم کہتے ہو ایسی حالت میں نیند آ جائے گی؟ تم ہی بتاؤ، تمھیں تجربہ ہے مجھے۔ یہاں شاید اس سے پہلے ہی میں تھک کے گر جاؤں گی، اسی پانی میں۔"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "کوشش کرنا کہ سرپانی سے اوپر رہے ورنہ ڈوب کے مر جاؤ گی چلو بھر پانی میں۔ اور یہ بھی ایسا ہی کہتا ہوں تم چپ نہیں بیٹھ سکتیں؟" کچھ دیر بعد پھر بولنے لگی کہ

بھوک لگی ہے۔ سردی لگ رہی ہے، نیند آ رہی ہے۔ پیاس لگی ہے۔ پاؤں میں کیا کروں، اور کیسے کروں پھر شروع کر دیا رونا۔ ٹھیک ہے بہادو سارے آنسو اس غلیظ پانی میں۔"

میری بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ بلب جھولنے لگا۔ پھر مین بلب کی جگہ روشنی کا ایک دائرہ نمودار ہوا۔ یہ اوپر کی دنیا سے آنے والی سورج کی روشنی تھی۔

میں نے کہا "رابعہ۔ کوئی آیا ہے۔"

"میں پلٹ کے نہیں دیکھوں گی، تم بتاؤ کون آیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ گٹر کا ڈھکن تھا۔ اسے کھول کے اُترے گا کوئی۔ رسی کی سیڑھی لٹکائی ہے کسی نے۔ ایک شخص کا غلام اُترا ہے۔ اس کا مطلب ہے... نہیں، یہ تو خالی ہاتھ آیا ہے۔ ایک طرف کھڑا ہو گیا ہے سر جھکا کے۔ اب کسی نے اوپر سے کرسی چھوڑی ہے۔ اس نے سیڑھی کے پاس فولڈنگ کرسی کو کھول دیا ہے۔ جیسی مقدموں والی وکیل چیئر ہوتی ہے۔ یہ بھی ایسی ہی کرسی ہے۔ اس میں نیچے پہیّے لگے ہوئے ہیں۔ بہت چھوٹے چھوٹے۔ میرا خیال ہے کہ اب دلاور آئے گا۔ وہ سیدھا چل نہیں سکتا اس کا اور کھڑا بھی نہیں رہ سکتا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کے آگے آئے گا۔ اس کے پاؤں بھی پانی سے اوپر رہیں گے۔ میرا خیال درست تھا رابعہ۔"

رابعہ نے کہا "چودھری دلاور آیا ہے... اکیلا؟"

"ہاں۔ اس نے محافظ کو واپس اوپر بھیج دیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہاکی ہے۔ اس ہاکی سے وہ اپنی کرسی کو آگے بڑھانے میں مدد لے رہا ہے۔ کرسی خاص طور پر بنوائی گئی ہوگی۔ اس کے دو پہیے دائیں جانب کی دیوار پر ہیں۔ دو بائیں جانب۔ کرسی پھسلتی آ رہی ہے۔"

"میں کیا کروں سکندر۔ وہ کمینہ مجھے اس طرح دیکھے گا۔"

"اپنی آنکھیں بند کر لو۔ کان کھلے رکھو۔ آخر میں بھی تو اس کا سامنا کروں گا... بے شرمی کے ساتھ۔"

دلاور جالی کے دوسری طرف مجھ سے دس فٹ کے فاصلے پر رُک گیا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس کی ہر بات پر مشتعل ہونے سے گریز کروں گا۔ وہ کچھ بھی کہے، میں ہوا بن جاؤں گا اور اس کے کسی سوال کا جواب دینا ہی پڑا تو اشتعال انگیزی سے کام نہیں لوں گا۔ زندہ رہنے کی کوشش کرنا میرا فرض تھا۔ مصلحت اور مصالحت کی ذلت میں بھی اس فرض کا حصہ تھی۔

"تم لالاؤں تو روتے مجھے جیتے ہو" دلاور نے کہا "ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے۔ ہیں جی! اچھا۔ شرم آ رہی ہے میرے سامنے۔ ویسے تو اسے سکندرِ اعظم نے مس رابعہ کی ساری دنیا فتح کرلی ہوگی نہ جانے کتنی بار۔ فتح کے جھنڈے گاڑ دیے ہوں گے ہر جگہ۔ خیر سے کیسا لگ رہا ہے میرا بندوبست؟ میں نے سوچا کہ

مہمان ہیں۔ کہیں خاطر داری میں کمی نہ رہ جائے۔ ہیں جی! خود چل کے دیکھنا چاہیے۔ کیسی خوب صورت جگہ ہے۔ سنسنی فضا ہے اور سمجھو لوکہ نہر بہہ رہی ہے درمیان میں۔ یہ بلب نہیں چودھویں کا چاند ہے اور چاندنی بڑی رومانٹک ہوتی ہے۔ تنہائی البتہ ادھوری ہے۔ خیر میں اس ادھوری کو بھی مٹانے کی سوچ رہا ہوں۔ جذبات کا خیال تو کرنا ہی پڑے گا۔ یہ جالی ہٹوا رہا ہوں میں تاکہ رات تو اچھی گزرے۔"

"بڑی مہربانی ہے آپ کی چودھری صاحب" میں نے کہا۔

وہ ہنسا "سچ بتاؤ یار۔ بھوک تو نہیں لگی؟ ورا اصل مرغ روسٹ ہو رہے تھے۔ کھانا آتا ہی ہو گا۔ خوب ڈٹ کے کھانا۔ اور تکلف بالکل مت کرنا۔ جس چیز کی ضرورت ہو بتا دینا۔ ہیں جی! آخر تم چودھری دلاور کے مہمان ہو اسے سکندر صاحب۔ خیر سے اپنی مس رابعہ گھری بنی بیٹھی ہے۔ لاج کی ماری ہائے ہائے۔ کیسی مجبوری ہے۔ بیرو کچھ بھی تو نہیں کر سکتا ہیروئن کے لیے۔"

میں نے کہا "دلاور۔ میں نے فرض کر لیا ہے کہ میں بہرا ہو گیا ہوں۔"

"ویری گڈ۔ وہ میں نے تین بندر خریدے تھے پیرس میں۔ یا شاید جنیوا کی کسی دکان سے۔ بہت بڑی آرٹ کی دکان تھی۔ ہیں جی! میرے جیسے جاہل ہی وہاں جاتے تھے جاہل اور دولت مند۔ اب یہ آرٹ وارٹ سمجھتا کون ہے آرٹسٹ کے سوا مگر وہ کیا کہتے ہیں اسے... ہاں، سرپرست۔ سرپرست بنتے ہیں ہم اور نمائش کرتے ہیں اپنے اعلیٰ ذوق کی۔ ہیں جی! تو خیر میں نے جو بندر خریدے تھے بڑے بدشکل اور لاوارث تھے، اچھے لنگور کھوڑے بیچنے والے اس سے اچھے بنا سکتے ہیں مگر وہ تھے فن کا نمونہ۔ ایک بندر کان میں انگلی دیے بیٹھا تھا۔ دوسرا آنکھیں بند کر کے اور تیسرا ہونٹوں پر انگلی رکھ کے۔ دکان دار نے مجھے سمجھایا تو بات اچھی لگی مجھے۔ بُرا مت سنو، بُرا مت دیکھو، بُرا مت کہو۔"

"برائی کو سمجھتے ہو تم کہ کیا ہوتی ہے؟"

وہ ہنسا "سچ ہی۔ اب تم جو کچھ میرے خلاف کر رہے ہو یہ برائی ہے میرے لیے اور یہ جرم ہے تمھارا... خیر چھوڑو، بحث کا کیا فائدہ۔ ہیں جی! تم اگر اس بندر کی طرح دیکھنا بھی چھوڑ دو اور منہ بھی بند رکھو تو واہ واہ۔ مگر یہ ہے بہت مشکل کام۔ یہ اپنی رابعہ کو ابھی چھت سے باہر سے دیکھا ہے ہم نے تو مگر خیال ہے کہ آج اندر سے بھی دیکھیں۔ یہ بھی آرٹ کا نمونہ تو ہے۔ یہاں ضائع ہو گا۔ اس کی جگہ تو ہے کوئی خوب صورت ڈرائنگ روم۔ میرا بیڈ روم بھی اچھا ہے اس جیتی جاگتی حُسن کی مورت کے لیے۔"

ضبط کے باوجود میرے وجود میں آگ بھڑکنے لگی۔ "اگر تم نے ایسا کیا۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "تو کیا؟ تم گولی مار دو گے مجھے یا اس سے پہلے ہی رابعہ کے ساتھ وہ کر لو گے... کیا کہتے ہیں اسے، اجتماعی

www.paksociety.com

خودکشی سمجھے جائے۔ اخبار میں خبر آئے گی کہ وہ محبت کے متوالوں نے کیسے جان دی۔ تو آنکھوں میں آنسو آجائیں گے پڑھنے والوں کے۔ اوئے پاگل دے پتر۔ تو خود تو مر سکتا ہے ان دیوانوں سے سر ٹکرا کے۔ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ جتنا چاہے شور کر۔ چلا چلا کے بلا اپنے ان ایم آر ایس کے سوساٹی کو۔"

اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا تھا۔ وہ غصے میں گالیاں بک رہا تھا لیکن ابھی تک میں نے ایسی بات نہیں کی تھی جو مزید اشتعال انگیزی کا سبب ہوتی۔ اس کا نقصان بھی ہمیں ہوتا۔

میں نے ایک گہری سانس لی "تم نے ٹھیک کہا دلاور۔ میں واقعی کچھ نہیں کر سکتا۔"

"ابھی اور بھی بہت کچھ ہوگا جو ٹھیک ہوگا۔ سمجھ آئی؟ پہلی بازی تم نے جیت لی۔ دلاور کو کتا مار دیا۔ اب دلاور کی بازی ہے۔ دیکھو یہ کتا کیسے کتا ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ ہیں جی؟ آنکھیں اور کان بند کرنے سے کچھ نہیں ہوگا اپنے سکندر صاحب۔ اس کتیا کے ساتھ جو ہونے والا ہے وہ تم دیکھو گے، سنو گے، کیا پھر بھی خاموش رہو گے؟ تت... تت... تت... ولن تو ہر فلم میں ہیروئن پر بری نیت رکھتا ہے۔ اور دست درازی کی تھوڑی سی کوشش بھی کرتا ہے۔ جتنی اجازت ملے سنسر والوں سے... ہیں جی؟ لیکن جو فلم ہم بنائیں گے اس میں سنسر کا دخل نہیں ہوگا۔ شوقین بڑے مزے لیں گے اسے دیکھ کر۔ اچھا بزنس کرے گی مارکیٹ میں۔ جتنی شہرت قانون کی پریکٹس سے نہیں ملی تھی اپنی رابعہ کو اتنی اس فلم سے مل جائے گی سارے ملک میں۔"

میں نے غصے پر قابو رکھنے کے پرانے نسخے پر عمل کرتے ہوئے گنتی شروع کی۔ ایک سے سو تک گننے کے باوجود میں اپنا دھیان دلاور کی باتوں سے نہ ہٹا سکا۔

میں نے کہا "چوہدری دلاور۔ میں نے کبھی تم سے کوئی درخواست نہیں کی اور توقع نہیں رکھی۔"

"رکھنی بھی نہیں چاہیے، دشمنی ہے تو پھر کیا۔"

"جب تمہاری بیوی میرے قبضے میں تھی..."

"تو یہ سب تم بھی کر سکتے تھے ہیں جی؟" اس نے میری بات کاٹ دی "یہی کہنا چاہتے ہو نا؟ لیکن تم نے بڑی شرافت کا ثبوت دیا۔ بہن بنا کے رکھا اسے۔"

"ہمارے جھگڑے میں آج تک کسی عورت کی عزت کو نہیں گھسیٹا گیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

"ہونا کیا ہوتا ہے؟ بہت کچھ نہیں ہونا چاہیے اس دنیا میں مگر ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ نہیں ہونا چاہیے، تم کہتے ہو وہ نہیں ہونا چاہیے۔ تم ہو شریف زادے اور میں ہوں... کیا مشکل لفظ ہے... ہاں 'نطفہ ناتحقیق'۔ پھر فرق تو ہوگا نا ہمارے اور تمہارے رویے میں۔ اور ہے... ہمارے دھندے خراب ہیں۔ تمہارے سب اعمال اچھے ہیں۔ ہم جاہل، تم ولایت کے پڑھے ہوئے۔ میں تو کہتا ہوں غلط کیا تھا تم نے۔ اس عمر میں کیا فرق پڑتا ہے اسے۔ کوئی کنواری لڑکی تو تھی نہیں کہ عزت لٹ جاتی تو وہ آکے مجھے بتاتی اور... خاک پھانک چلتا۔"

"دلاور۔ وہ ماں ہے تمہارے بچوں کی۔"

وہ مسکرانے لگا "ہاں۔ کہتی تو یہی ہے۔ میں بھی مان لیتا ہوں ورنہ کیا اس بات کا پتا عورت کے سوا کسی کو ہوتا ہے؟ پتا نہیں کس کی اولاد کو جنم دے رہی ہے۔ میرا باپ بھی کچا نہیں تھا، پتا نہیں اور تم بھی خوش رہو وزیر خان کی ولدیت پر۔ اس کا بھلا ہے دنیا کا کہ جسے ماں کہے اسے باپ مان لے۔"

مجھے اس کی بے غیرتی پر تعجب ہوا۔ یہ جاننے کے باوجود دلاور سے زیادہ بے کردار اور بے ضمیر انسان تو ہو نہیں سکتا۔ شیطان ہو سکتا ہے۔ اس کی سوچ اور اس کی ذہنیت کی ساری غلاظت اس کے خیالات کی تمام عفونت اور شخصیت کی ساری بدصورتی اس وقت میرے لیے ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔ ایسی ذلالت کا اعتراف کسی تھرڈ ریٹ طوائف کا حرامی بیٹا بھی نہیں کر سکتا تھا جو خود اپنی ماں کا دلال ہو۔

"اچھا جی، اپنے سکندر صاحب۔ ہم تو چلتے ہیں۔ تم نے تمام رات یہاں بسر کرنی ہے یا اوپر میرے مہمان خانے میں۔ ہیں جی؟ ادھر بڑی سخت جسمانی تکلیف ہوگی۔ اوپر ذہنی اذیت ہوگی کیونکہ اپنی رابعہ بی بی تو آج رات ہوں گی میرے ساتھ۔ اور تم کو دیکھنا پڑے گا سب کچھ۔"

رابعہ نے اچانک چیخ کے کہا "میں مر جاؤں گی کتے مگر تجھے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔"

دلاور نے پھر قہقہہ مارا "اچھا جی۔ جو تمہارا جی چاہے کرنا۔ ہم بھی وہی کریں گے جو ہمارا جی چاہے گا۔ شیر جب شکار کرتا ہے تو پہلے خود کھاتا ہے۔ یہی سنا ہے ہم نے۔ ہم شکاری تو ہیں نہیں۔ بعد میں آجاتے ہیں بھیڑیے اور پھر دوسرے جانور۔ آخر میں گدھ اور چیل کوے۔ اپنے سکندر صاحب تو... کیا کہتے ہیں اسے... ہاں، بالقلم خود... بالقلم خود ملاحظہ کریں گے۔ آپ کے جو لواحقین ہیں نا جی، لواحقین اس لیے کہ مر تو جانا ہے آپ نے۔ نہیں کیا؟ بعد میں آپ کچھ بھی کریں۔ لواحقین فلم دیکھ لیں گے 'آخری یادگار سین'۔"

رابعہ چیخ چیخ کے اسے گالیاں دے رہی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ ساری احتیاط اور شرم و حیا بھول گئی تھی۔ خوف نے اسے ہر احساس سے بے گانہ کر دیا تھا۔ وہ جالی سے سر ٹکرا رہی تھی... اور سامنے ایسے کھڑی تھی جیسے وہ پوری طرح مستور ہے۔ میں اسے سمجھا رہا تھا۔ تسلی دے رہا تھا کہ دلاور کو بھونکنے دو۔ اسے کچھ نہیں ہوگا مگر خود مجھے اپنی بات کا یقین نہیں تھا تو وہ کیسے مان لیتی کہ کچھ نہیں ہوگا۔

اچانک چوہدری دلاور نے اپنی جیب سے گیس گن نکالی "یہ کیا ہے؟ معلوم تو ہوگا تمہیں مگر نہیں پتا تو میں بتا دیتا ہوں۔ اگر اس سے فائر کیا جائے تو تم مرو گے نہیں۔ اس میں سے کوئی گولی نہیں نکلے گی، گیس نکلے گی اور تمہارا سارا شور شرابا ختم۔ تم بے ہوش ہو جاؤ گے۔ پہلے تم لیٹ جاؤ گے پھر رابعہ پر اثر ہوگا۔ تمہاری آنکھ کھلے گی..." اس نے گن کو واپس جیب میں رکھا اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

حالات ایسے خطرناک موڑ پر آگئے تھے کہ اپنی شکست تسلیم کرنا میرے لیے ناگزیر ہونے لگا۔ میں اپنی انا پر، اپنی انتقام کی آگ پر، اپنے اصولوں پر، اپنے حق کے لیے، انصاف کے لیے... رابعہ کی عزت کو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ سب سے بڑا داؤ چوہدری دلاور کے ہاتھ میں تھا اور میرے لیے اس کھیل میں رکنا ناممکن ہو گیا تھا۔ میں سب کچھ چھوڑنے پر تیار تھا۔ اس کی ہر بات مان سکتا تھا۔

میں نے کہا "چوہدری دلاور۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم سب کچھ کر سکتے ہو مگر سب کچھ کرنے کے بعد بھی تم کچھ حاصل نہیں کر سکو گے۔ یہ مسئلہ جس کا ہم ایک قانونی حل چاہتے تھے ختم نہیں ہوگا۔ رابعہ خود مر جائے گی ورنہ میں اسے کوئی امداد دوں گا۔ اس کے بعد میں خود بھی مر جاؤں گا۔"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "حل تو اچھا ہے۔ نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری اور نہ اسے بجانے والا۔ ہیں جی؟ محاورے میں ہم سب فٹ ہیں۔ بانس میں، بانسری اپنی مس رابعہ اور بجانے والا..."

جملہ مکمل کرنے سے پہلے اس نے قہقہہ لگایا اور پھر اچانک وہ کیا جس کی مجھے اس وقت امید نہیں تھی۔ دلاور ہر صورت حال کو ڈرامائی موڑ دینے کا عادی تھا۔ اس نے ایک دم جیب سے ریوالور نکالا اور فائر کر دیا۔ گن سے دھواں سا نکلا اور اس کی سرمئی سی لکیر میری طرف آئی۔ پھر یہ دھواں غبار بن کے پھیلنے لگا۔ میں نے خود کو اس کی براہ راست زد سے تو بچا لیا تھا مگر اس کے زہریلے اثرات سے بچنا ناممکن تھا۔ وہاں نہ بھاگنے کی جگہ تھی نہ پناہ لینے کی۔ پانچ فٹ مربع کے اس کوٹھڑی نما کمرے میں گیس پھیلتی جارہی تھی۔

میرا خیال ہے کہ میں اس وقت اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔ میں بیک وقت دلاور کو گالیاں دے رہا تھا جن کا اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ دھمکیاں دے رہا تھا جو بے مقصد تھیں۔ چلا چلا کر رابعہ کو کہہ رہا تھا کہ وہ حوصلہ نہ ہارے حالانکہ اس سے زیادہ فضول کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ خود رابعہ کا رویہ بھی ایسا ہی تھا۔ وہ چیخ چیخ کے دلاور کو بتا رہی تھی کہ وہ اس کے شیطانی عزائم پورے ہونے سے پہلے جان دے دے گی۔ اسے قتل کر دے گی۔ وہ مجھے مدد کے لیے پکار رہی تھی، خدا سے فریاد کر رہی تھی۔ جالیوں سے لڑ رہی تھی، سر ٹکرا رہی تھی۔

آہستہ آہستہ میرے جسم سے جان نکلنے لگی۔ مجھ میں اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کی سکت باقی نہ رہی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا جس میں رابعہ اور دلاور تحلیل ہو گئے۔ بلب بجھ گیا۔ میرے کانوں میں چیخنے والی آوازیں دور ہوتے ہوتے معدوم ہو گئیں۔

غفلت اور بے ہوشی کے ایک اور وقفے سے گزر جانے کے بعد میں پھر ہوش کی دنیا میں لوٹا تو دنیا بدل چکی تھی۔ ہمیشہ کی طرح حقیقت کے ادراک تک میرے ذہن کا سفر بے یقینی کے پرسراب صحرا میں رہا اور آنکھوں نے جو پہلے پہل دیکھا یا کانوں نے جو سب سے پہلے سنا اسے دل نے نہیں مانا یا عقل نے تسلیم نہیں کیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ میری نظر کا فریب ہے۔ دھوکا ہے۔ ایسی باتیں سوچتے، زندگی کے احساس کو تقویت پہنچانے کے لیے میں نے آنکھیں مل کے ادھر ادھر دیکھا اور سوچا کہ شاید جھوٹ اور سچ کا فرق واضح ہوتے ہی حقیقت سامنے آئے تو منظر کچھ اور ہو لیکن ایک سین تھا جو کسی تصویر کی طرح میری نظر کے فریم میں فٹ ہو گیا تھا۔

پھر میں نے رابعہ کی آواز سنی اور اس کے ہاتھ کا لمس اپنی پیشانی پر محسوس کیا "سکندر۔ میری طرف دیکھو سکندر۔"

میں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا "رابعہ... مجھے معاف کر دو۔ یہ سب... میری وجہ سے ہوا۔"

اس نے کہا "کچھ نہیں ہوا سکندر۔ ہوش میں آؤ..."

"نہیں۔ نہیں رابعہ۔ میں نظریں نہیں ملا سکتا تم سے... میں تمہارا مجرم ہوں۔"

"پلیز سکندر۔ رونے کی کوئی بات نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

میں اپنی کہتا گیا "مجھے... مجھے کوئی حق نہیں... زندہ رہنے کا... میں نے تمہاری زندگی برباد کر دی۔ اپنے ساتھ سب کی زندگی برباد کی... لیکن رابعہ... مرنے سے پہلے... میں اس شیطان، اس درندے کا خون پیوں گا... تم دیکھ لینا... میں اسے ذبح کروں گا اور اس کے خون سے اپنی پیاس بجھاؤں گا... میں مرنے سے پہلے... ایسا ضرور کروں گا... جس نے..."

"سکندر، پاگل پن کی بات مت کرو۔ دیکھو میری طرف۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اور تمہارے پاس ہوں" اس نے پیار سے کہا اور پھر میری پیشانی کو چوم لیا۔ اس کے ساتھ ہی گرم پانی کا ایک قطرہ میرے چہرے پر گرا۔ پھر دوسرا۔

میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ رابعہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے بدن کی خوشبو وہی تھی۔ اس کی زلفوں کا مشکبو سایہ مجھ پر مہرباں رات کے طلسماتی اندھیرے کی طرح پھیلا ہوا تھا جس میں رنگ بھرے خواب جنم لیتے ہیں اور جذبات کی کیف آفریں مدہوشی میں خوابوں کو تعبیر ملتی ہے۔

میں نے اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیے اور اسے اپنے زیادہ قریب کر لیا "رابعہ... میری جان، یہ تم ہو... میرے قریب۔" اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی "سکندر۔ خدا کے لیے

www.paksociety.com

www.paksociety.com

"اسے موت نہیں قتل کہو دلاور۔"

"اچھا قتل سہی۔ ان کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔"

"کسی نے نہیں، تم نے۔"

"نہیں، یہ غلط ہے۔ میں نے ان کو قتل نہیں کیا تھا۔"

"تم نے اپنے ہاتھوں سے قتل نہیں کیا تھا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم نے دراصل ان کے قتل کے، تمہاری مرضی سے، تمہارے حکم پر، تمہارے کسی زرخرید نے کیا تھا۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ قاتل وہ نہیں تھا جس نے گولی چلائی تھی۔ قاتل تم تھے جس نے ایک شخص کے ہاتھ میں ریوالور دے کر کہا تھا کہ وزیر خان کو مار دو۔ تمہارے دوسرے ہاتھوں میں نوٹوں کی گڈی تھی یا وہ شخص تمہارے سامنے بے بس تھا۔"

اس نے قدرے تامل سے کہا "ہاں۔ یہ کہہ سکتے ہو تم مگر دیکھو۔ جیسے تم دشمن ہو اپنی جان کے۔ ایسے ہی وہ بھی ضدی تھا۔ حالات سے سمجھوتا کرنے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ تم خود کب سے اس جنون میں مبتلا ہو۔ پتا نہیں ایسے کتنے مواقع آئے جب تم بال بال بچ گئے۔ تم نے ہر جگہ پنگا لیا۔ میں تو کہتا ہوں خودکشی کی پوری کوشش کی۔ ایم آر ایس کے چکر میں تم نے جان کی بازی لگا کے بڑے کارنامے سرانجام دیے۔ یہ قسمت تھی تمہاری کہ محفوظ رہے اور آج بھی زندہ ہو۔ مر جاتے تو کیا اس موت کو بھی قتل کہا جاتا۔ کون مانتا کہ یہ قتل میں نے کیا تھا؟ یا کرایا تھا؟ قتل کرانا ہوتا تو میں کسی سے بھی کہتا کہ جاؤ سکندر کو اور اس کے ایک ایک بندے کو مار کے شام تک سب کی لاشیں ٹھکانے لگا دو۔ پچھلی بات چھوڑو۔ کل تمہارے کہنے پر میں نے نازو اور غالب کو چھوڑ دیا۔ تم کو مہمان کا درجہ دے رکھا ہے۔ کیا مشکل تھا میرے لیے تم چاروں کو اس سرنگ میں بند کر کے گیس یا گن سے ہلاک کر دینا۔ کسی پوسٹ مارٹم میں ثابت ہوتا کہ یہ قتل تھا۔ کنز لائنوں میں زہریلی گیس سے لوگ ہلاک ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہ سمجھا جاتا کہ ایک مفرور مجرم سکندر بخت وہاں چھپا ہوا تھا اور اس سے ملنے کے لیے دوست وہاں گئے تھے مگر سب زہریلی گیس کا شکار ہو گئے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے اپنے سکندر صاحب کہ تمہارے باپ نے ایسے حالات پیدا کر لیے تھے۔ خود اپنے لیے کہ وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس ایک آدمی کی بے وقوفی سے دس دوسرے آدمی مارے جاتے۔ جیسے تمہاری بے وقوفی سے اتنے لوگ مارے گئے۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اسے زہر دے دیا جائے یا گولی مار دی جائے۔ نہ میں نے کسی کو ایسا حکم دیا تھا۔ ہاں یہ ضرور کہا تھا کہ یہ آدمی خطرناک ہو گیا ہے۔ یہ زندہ رہا تو ہم سب مارے جائیں گے۔ میں نے اسے کاروبار سے الگ کر دیا تھا۔ اپنے ایک نمک خوار کے گھر میں قید کر دیا تھا۔ یہ احساس دلانے کے لیے کہ چوہدری دلاور سے ٹکر لینے میں نقصان ہی نقصان ہے۔ اس کے پاس اپنے فائدے کی بات سمجھنے کی عقل نہیں رہی تھی تو میں کیا کرتا۔"

میرے ضبط کا حوصلہ جواب دینے لگا تھا "تم کو اس موت کو خودکشی ثابت کرنے سے کوئی فائدہ [illegible] حقیقت اپنی جگہ رہے گی کہ اسے قتل کیا گیا تھا۔"

"یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اسے قتل کیا گیا تھا۔ ایسا کرنا بھی ہو گیا تھا۔ میرا بھی یہی خیال تھا مگر نہ [illegible] اس کا قصہ پاک کر دو۔ نہ خود میں نے اس کو قتل کیا [illegible] ہوں کہ اس کو قتل کرنے والا کون تھا۔"

رابعہ نے حیرانی سے کہا "تم جانتے ہو؟"

"ہاں جی۔ ہم تو سب کچھ جانتے ہیں اپنے بارے میں [illegible] اپنے بندوں کے بارے میں بھی۔ یہ سب یار [illegible] کہتے ہیں نمک خوار ہیں یا غلام ہیں۔ اپنے آقا کی خوشنودی [illegible] بہت کچھ کرتے ہیں۔ مجھے کسی سے کچھ کہنا نہیں پڑتا [illegible] لیتے ہیں کہ میں کیا چاہتا ہوں اور آگے بڑھ کے وہ کر [illegible] جس سے میں خوش ہو جاؤں۔ ان کی قدر و منزلت بڑھ جائے نظر میں۔ ظاہر ہے میں ان کو صرف پیسہ دیتا ہوں۔ مثلاً [illegible] انہیں بھی ضرورت نہیں۔ صرف تعریف سے بھی کام [illegible] ان میں سے جس نے میری خوشی کے لیے خود یہ کام کیا [illegible] کون تھا؟"

میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا "استاد پیڈرو۔"

وہ ہنسا "مانتے ہیں اپنے سکندر صاحب، تمہاری [illegible] بالکل ٹھیک بندے کا نام لیا تم نے۔ وزیر خان کو مارنے والا پیڈرو ہی تھا۔ میں یہ چاہتا ضرور تھا کہ وزیر خان میرے راستے سے ہٹ جائے۔ اس نے مجھے وحشت زدہ کر دیا ہوا تھا۔ یہ بھی غصے میں کہ وہ باز نہ آیا تو میں گولی مار دوں گا اسے۔ اور بھی کہا تھا۔ وہ سب دہرا کے میں تمہارے جذبات کو مجروح [illegible] چاہتا۔ مگر اسے قتل کرانے کی کوئی سازش نہیں کی گئی [illegible] سازش کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ کمزور سا بڑھا بندہ تھا [illegible] الگ کر کے بٹھا دیا تھا میں نے اور خبردار کر دیا تھا کہ اپنی [illegible] رکھے ورنہ زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی جائے گی۔ وہ بھی [illegible] طرح ڈائیلاگ بولتا تھا کہ دلاور، خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ انجام سے ڈر۔ زندگی اور موت تیرے ہاتھ میں نہیں ہے [illegible] فراموش۔ جب پیڈرو نے اسے قتل کر دیا اور مجھے بتایا تو میں [illegible] کہ یہ تو نے بُرا کیا۔ اوئے وہ تو ویسے ہی مرنے والا تھا [illegible] دن جینا تھا اس نے۔ زندگی کے سارے راستے تو اس نے [illegible] کر لیے تھے۔ پھر پیڈرو نے بتایا کہ اس نے ایسا کیوں کیا [illegible] نے کہا کہ چلو جو ہونا تھا ہو گیا۔ خس کم جہاں پاک۔ میرا [illegible] پارٹنر تھا۔ ذی سوزا، اس نے بھی کہا کہ چوہدری صاحب چھٹی۔ شکر کرو، اسے پیڈرو نہ مارتا تو میں مار دیتا۔ ذی [illegible] پیڈرو میرے ساتھی تھے۔ ان کے بغیر میرا کام نہیں چلتا [illegible] اور ہوتا تو میں اسے وہیں گولی مار دیتا اور خود تمہیں [illegible]

وہیں۔ اسی حالت میں" دلاور کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہو گئے۔

رابعہ نے مجھے آنکھ کے اشارے سے منع کیا کہ میں مصلحت کو سمجھتے ہوئے اشتعال انگیزی نہ کروں اور خاموش رہوں۔ یہ بات اس کی آنکھوں میں چھپے ہوئے نفرت کے جذبات سے عیاں تھی۔

"اگر مجھ میں سمجھ نہ ہوتی تو اپنے سکندر صاحب۔ اور میں ایسا ہی دشمن ہوتا تو کہتا کہ لعنت میرے ساتھ نیکی کرنے والے پر اور مجھ پر بھی اگر میں اس نیکی کے بدلے سر جھکا دوں اور کہوں کہ ٹھیک ہے۔ میں اپنی بیوی کو قتل کر رہا کہ اتنی بڑی تعریف کرتی ہے میرے دشمن کی۔ جا اس سے نکاح پڑھوا لے اور اتنا کمینہ ہوتا میں تو اب تک وہ سب ہو جاتا جو میں نے تمہیں ڈرانے کے لیے کہا تھا۔ دیکھو، تمہاری مس رابعہ تمہارے سامنے ٹھیک ٹھاک بیٹھی ہے اور پوچھ لو اس سے کہ چوہدری دلاور نے غلط نہیں کہا تھا۔ جب تم مہمان ہو تو کوئی بری نظر سے نہیں دیکھ سکتا تم کو۔ دیکھا ہے تو مجھے بتاؤ، میں اس کی آنکھیں نکلوا دوں گا۔ تم بھی مزے سے لیٹے ہو یہاں پر۔"

"آخر کیوں کر رہے ہو تم یہ سب کچھ؟ کس اُمید میں؟"

"میں نے بتایا نا۔ ایک تو میری بیوی بچے بے وقوف ہیں۔ جذباتی ہیں، کہتے ہیں ایک بار ان کی وجہ سے ہم سب کی جان بچ گئی تھی۔ ہم سب برباد ہونے سے بچ گئے تھے۔" دلاور ہنسا "انہوں نے مجبور کر دیا مجھے کہ اس احسان کا بدلہ چکا دو۔ ہم کسی دشمن کے مقروض نہیں رہنا چاہتے۔ بس میں نے ان کی یہ بات مان لی۔ اس کا مطلب غلط مت سمجھنا۔ یہ بات برابر ہو جائے گی تو اگلی بار وہ بھی لحاظ نہیں کریں گے۔ یہ حساب ختم، دوسرا کھاتا ہے دشمنی کا۔ وہ بند نہیں ہوا۔ خود میں بھی ایک آخری موقع دینا چاہتا تھا تمہیں کہ چلو جو ہوا سو ہوا۔ بہت نقصان کر لیا تم نے اپنا بھی اور مجھے بھی برباد کیا۔"

میرے لبوں پر اس کی بات سے مسکراہٹ آگئی۔ کم سے کم اتنا ضرور ہوا تھا کہ دلاور جیسا نمرود کی خدائی کا دعوے دار بھی میرے جیسے حقیر انسان کے سامنے یہ اعتراف کر رہا تھا کہ وہ برباد ہو گیا۔

"ابھی ساری زندگی پڑی ہے تمہارے سامنے۔ اپنے ساتھ اس بے چاری کو اور اپنے دوستوں کو برباد مت کرو۔ یہ دوستی نہیں دشمنی ہے ان کے ساتھ کہ تم ان کی زندگی کو بھی حرام کر رہے ہو۔ ضائع کر رہے ہو۔ ان سے بھی مشورہ کرو۔ ٹھنڈے دل سے سوچو۔ کیا دلاور سے لڑنے میں یہ عمر گنوا دو گے؟ نہیں جی، اس زندگی کی قدر کرو۔ بہت کچھ کر سکتے ہو تم اپنے لیے اور دوسروں کے لیے۔ یہ جنگ لاحاصل ہے۔ تم کو بھی وہ کامیابی نہ پہلے حاصل ہوئی ہے... جو تم چاہتے تھے نہ آئندہ ہوگی۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ بات ختم کرو۔ میرے تمہارے درمیان ذاتی دشمنی کی بنیاد تھی تمہارے والد کی موت۔"

اس کے جذبات کا اور باتوں سے نیت کا اندازہ کیا ہی نہیں [illegible] تھا۔

[illegible] دنیا والی ہے اپنے سکندر صاحب۔ خیر سے بھلے چنگے لگتے ہو۔ [illegible] ہم تو یونہی مذاق کر لیتے ہیں کبھی تم سے۔ شکر کرو یہ بھی [illegible] تھا۔"

میں نے کہا "شکر میں صرف خدا کا ادا کر سکتا ہوں۔ آگے بھی [illegible] جو اس کی رضا ہو گی۔"

اس نے طنز سے کہا "کیا شک ہے جی اس میں۔ ایک نیکی کام [illegible] تمہارے۔"

[illegible] نیکی بھی رائیگاں نہیں جاتی۔"

"اچھا پرانے لوگ یہی کہتے تھے اور کتابوں میں بھی یہی لکھا [illegible] جی مگر ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو اس دنیا کو۔ اپنے [illegible] طرف دیکھو کیا ایسا ہو رہا ہے؟ نیکی کا فائدے میں ہیں؟ بڑی [illegible] ہے ان کی اور ساری دنیا پر حکومت ہے۔ زندگی کا صحیح لطف [illegible] کے نیک بندے ہی اٹھا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "دلاور۔ خدا کے نیک بندوں کا دنیا سے اور [illegible] کے نفع و نقصان سے کیا تعلق۔ زندگی کی کامیابی کو جس [illegible] سے تم دیکھتے ہو وہ بالکل اس کے برعکس ہے۔"

"اچھا جی منع کرو۔ ہمیں کیا لینا اس بحث سے" اس نے [illegible] بےزاری سے کہا "میں تو ایک چھوٹا سا سبق دینا چاہتا تھا تمہیں۔ [illegible] تھا کہ سو فیصد برا کوئی نہیں ہوتا۔ دشمنی کے جذبات میں تم نہ [illegible] تمہاری مرضی مگر دیکھ لو میں نے تمہیں صرف ٹریلر دکھایا۔ تم [illegible] نظر دیکھتے تو اندازہ ہوتا کہ چوہدری دلاور کیا چیز ہے۔"

"اس کا اندازہ بہت پہلے سے ہے مجھے۔"

"نہیں۔ نہیں اپنے سکندر صاحب، دلاور بہت بڑی چیز ہے [illegible] تم نے اس کا ایک چھوٹا سا حصہ دیکھا ہے۔ لندن، پیرس یا [illegible] لاہور دیکھ کے تم دعویٰ نہیں کر سکتے کہ تم نے ساری دنیا [illegible] ابھی بہت کچھ دیکھنا باقی ہے اور تم دیکھو گے۔ ہیں جی لیکن [illegible] ہم ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے جائیں، وہ الگ بات ہے ورنہ تم بھی بہت دن جیو گے اور مجھے بھی کوئی خاص جلدی [illegible] مرنے کی۔ ایک آخری موقع اور دینا چاہتا ہوں میں۔ [illegible] والی ہے نا۔ اس نے مجبور کیا ہے مجھے۔ وہ بھی بڑی چیز [illegible] دلاور کی بیوی ہے۔ تم نے اسے بچایا اور دیکھو اس نے [illegible] تمہارے جال سے نکال لیا۔ بڑے شکاری تھے تم بھی، مار [illegible] ایک عورت سے۔ اسی لیے سیانے کہتے ہیں کہ سانپ کو [illegible] کبھی مت چھوڑو۔ سپولیوں کو بھی مار دو۔ تم نے نیکی کی [illegible] تھا۔ تم تو کسوٹے وہی بات کر دی یہ تو ہمارا اخلاقی فرض [illegible] ضرورت ہنسا۔

"افسوس کہ تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔"

"اوئے باقی دے چھڈ۔ یہ بات نہ سمجھتا تو تم بڑے ہوتے

www.paksociety.com

مجھے چھوڑو! میں تمہارے پاس ہوں۔ کہیں جا نہیں رہی ہوں کر ایسے پکڑ لیا ہے۔ ابھی کوئی اندر آ جائے گا۔"

میں نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اور اسے چھوڑ کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ بڑا پُر آسائش کمرا تھا۔ کوئی خواب گاہ، جس میں ایک آرام دہ بیڈ پر میں وہی کپڑے پہنے ہوئے لیٹا تھا جو میرے اپنے تھے۔ میرے ساتھ لگی ہوئی رابعہ بیٹھی تھی اور اس کے کپڑے بھی وہی تھے جو اس نے آخری بار پہن رکھے تھے۔

میرا ذہن اُلجھن میں پڑ گیا۔ کیا وہ ایک بھیانک خواب تھا یا خواب یہ ہے جو میں اب دیکھ رہا ہوں۔

میں نے رابعہ کا ہاتھ پکڑ لیا "رابعہ..... یہ آخر یہ سب کیا ہے؟"

اس نے کہا "میں کافی لاتی ہوں تمہارے لیے، ڈاکٹر نے کہا تھا۔" اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

میں نے اس کا ہاتھ پھر پکڑ لیا "کس ڈاکٹر نے.....؟"

"جس نے تمہیں دیکھا تھا۔ میں اس کا نام نہیں جانتی" رابعہ بولی "اس نے انجکشن بھی لگایا تھا اور کہا تھا کہ جب یہ ہوش میں آئیں تو ان کو بہت اسٹرانگ بلیک کافی دینا۔"

"اسٹرانگ بلیک کافی؟" میں نے حیرانی سے دُہرایا "کہاں سے لاؤ گی تم۔ کس کا گھر ہے یہ..... ہم کہاں ہیں؟"

"ہم دلاور کے مہمان ہیں" وہ مسکرائی "اور ظاہر ہے یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ دلاور کا کوئی گھر ہے۔"

میں اُٹھ کے بیٹھ گیا "وہ..... وہ خود کہاں ہے؟"

"ابھی بتاتی ہوں۔ میرا ہاتھ تو چھوڑو جنگلی۔ اتنی سختی سے پکڑ رکھا ہے۔" اس نے جھٹکا دے کے اپنی کلائی چھڑائی اور ان نشانات کو ملنے لگی جو اس کی نازک مرمریں جلد پر نمودار ہو گئے تھے۔

رابعہ نے قریب ہی ایک میز پر رکھے ہوئے تھرموس سے کافی کا مگ بھر کے مجھے دیا "یہ لو۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔"

میں نے کہا "رابعہ۔ پلیز مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے۔"

"وہی۔ دلاور کا ڈراما۔" رابعہ بولی "وہ صرف ہمیں ڈرا رہا تھا جو اس نے کہا تھا وہ کیا نہیں۔ نہ اس کا ارادہ تھا۔"

"اس کا مطلب ہے....."

"ہاں۔ اس کی بیوی دوبارہ آ چکی ہے۔"

"ہمیں یہاں آئے کتنی دیر ہوئی ہے؟"

"صرف ایک گھنٹا۔ تم پر گیس کا اثر زیادہ تھا۔ میں تو دس منٹ کے بعد ہوش میں آ گئی تھی اور اس وقت ہم دونوں کے علاوہ یہاں ایک ڈاکٹر تھا اور دلاور کی بیوی تھی۔"

"اور ہم اسی حالت میں تھے؟"

"ہاں۔ جس حالت میں لائے گئے تھے" رابعہ نظر جھکا کے بولی۔

میں نے گرم گرم کافی پیتے ہوئے اس کو غور سے دیکھا "دلاور چاہتا کیا ہے ہم سے؟"

"جلدی ہی معلوم ہو جائے گا یہ بھی۔ جہاں تک دلاور کی بیوی کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں تمہارا اندازہ درست تھا۔ اس کے کہنے سے ہی دلاور نے ہماری جان بخشی کی۔ اس کے ارادے کو بدلنے والی وہی ہے جس کو بقول تمہارے تم سے جذباتی وابستگی ہو گئی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"اب تو مجھے بھی محسوس ہو رہی ہے" میں نے جواباً کہا "دل کی اچھی ہے یہ عورت۔"

"صرف دل کی؟" رابعہ نے شریر لہجے میں کہا "دل تو جسم کا حصہ ہے" اس کے بارے میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار فرمایا تھا آپ نے۔"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی "حسد سے تمہارا دل جل رہا ہے۔ جلنے کی بو آ رہی ہے مجھے۔"

"دل ہی کہاں ہے میرے پاس۔ ہاں حسد محسوس ہوتا ہے جب تم میرے علاوہ کسی کو دیکھتے ہو۔"

"بڑی اُلو کی پٹھی ہو تم بھی۔ نظر کا فرق محسوس نہیں کیا تمہیں؟"

"مرد کی نظر کیا دیکھتی ہے یہ نظر آ جاتا ہے۔"

"ایک چھانپڑ رسید کروں گا تو ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ دیکھتا تو میں بہت کچھ ہوں۔ جو سامنے آئے، ان کی دنیا یا آسمان زمین۔ مگر تم کو دیکھنے والی نظر دوسری ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "مجھے کس نظر سے دیکھتے ہو؟"

"سچ بتاؤں؟ بُری نظر سے" میں نے کہا "تمہارے جیسی اچھی صورت بھی کیا بُری شے ہے۔ جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی۔"

"کیسی گھٹیا باتیں کرنے لگتے ہو تم بھی۔ یہ کوئی شعر ہے؟"

"یہ بھی شعر ہے" میں نے کہا "کہا جائے تو شعر ہے۔"

دلاور نے اچانک اس دروازے پر دستک دی جس میں اگرچہ کوئی بات نہ تھی۔ مروت آ رہا تھا لیکن حاکم تھا اس لیے مجھے بڑی گیا کہتے ہیں ''دخل اندازی'' ۔"

"تم چُھپ کر دیکھ رہے تھے اور سُن رہے تھے؟"

وہ میرے قریب بیٹھ گیا۔ جس دروازے سے وہ اندر آیا اس کے پردے کی حرکت بتاتی تھی کہ پیچھے کوئی اور بھی ہے۔ دلاور کے محافظ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اتنی بے تکلفی سے اندر آیا تھا مگر اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں تھا۔ میں نے دوسرے پردوں کی طرف دیکھا تو مجھے شک ہوا کہ ان کے پیچھے سے بھی خفیہ آنکھیں میری ہر حرکت کا جائزہ لے رہی ہیں۔

رابعہ سمٹ کے کچھ دور ہو گئی۔ چوہدری دلاور مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ وہ آدمی انتہائی خطرناک تھا۔ اس کی

اس کے بغیر دنیا کے کام نہیں چلتے۔ میں تو اس سے زیادہ رشوت ادا کر رہا ہوں۔ تم کو لینے سے انکار ہے تو تمہاری مرضی۔ میرے بیٹے پڑو رو کی امانت ختم ہو چکی ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ تمہارا اور میرا راستہ الگ ہے۔ ویسے تو تم جیسے لوگ اتنی شرافت اخلاقی کو رخصت نہیں کرتے۔ راستہ بدلنا ہو تو پرانے راستوں کے ہر ہم سفر کو دوسری دنیا کا راستہ دکھا دیتے ہیں تاکہ کسی کو راستہ بتا نہ سکے۔ پڑو رو بھی شیخ مختار بن گیا تھا اور کراچی میں پتا نہیں کیا کر رہا تھا کہ تم نے وہاں جا کے اس سے پنگا لیا۔ وہ بہت مشتعل تھا اور اس نے سوچا کہ خود کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سابق باس یہ کام زیادہ خوش ہو کے اور بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ وہ تم کو میرے پاس لے آیا۔ ویسے تو بڑا کام کیا اس نے مگر ایک تو اس نے چالاک بن کے بندوق میرے کندھے پر رکھی 'جان اپنی بچائی۔ احسان مجھ پر کیا۔ دوسری غلطی اس کی یہ تھی کہ اس نے ماضی کے حوالے سے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ جاؤ۔ اتنی بڑی دنیا پڑی ہے اپنی شکل گم کرو۔ پھر میرے سامنے مت آنا اور آؤ تو بچانے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ نقصان میں رہو گے۔ پڑو رو نے میری وارننگ کو نظر انداز کر دیا اور دوبارہ میرے سامنے آ گیا۔ پھر اس کی بدقسمتی کہ وہ غلط وقت پر آیا۔ اسے یہاں کے حالات کا علم نہیں تھا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ میری بیوی اور میرا بیٹا یہ چاہتے تھے کہ دشمن کا قرض فوراً ادا کر دیا جائے۔ عورت کی ذات تو خیر ہوتی ہی جذباتی ہے مگر فیصل بھی نوجوان ہے۔ جنگ میں عقل سے کام لینا چاہیے جذبات کو دور رکھنا چاہیے۔ مگر خیر ہم نے ان کی مان لی اور کہا کہ چلو ایک کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔ شاید بات بن جائے۔ جنگ جاری رکھنی ہے تو شوق سے رکھو۔ نہ ہم بھاگنے والے ہیں اور نہ تم بھاگ کے کہیں جا سکتے ہو۔ چوہدری دلاور بھی مرتے دم تک ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہے۔ اسی لیے میں تم کو چھوڑ رہا ہوں اور پڑو رو کو تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ چاہو تو اسے جان سے مار کے وہیں گاڑ دینا جہاں اس نے وزیر خان کی ہڈیاں کو قبرستان سے لے جا کر دفن کیا تھا۔ مجھے کیا پتا وہ جگہ کدھر ہے اور کہاں ہے؟ پڑو رو کا وجود تو میرے لیے پہلے ہی صفر ہو گیا تھا۔ اسے میں خود مار دوں گا مگر اس کے ساتھ ہی تمہارے لیے حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے سارے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ وہ معلومات جو تمہارے لیے اہم ہیں کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکیں گی۔ مجھے معلوم ہے تم جاننا چاہتے ہو کہ وزیر خان کی موت کا ذمے دار کون تھا اور اس کی موت کیسے اور کب ہوئی تھی۔ یہ تمہیں پڑو رو کے سوا کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔ جاؤ اس کو ساتھ لے کر کہیں بھی چلے جاؤ۔ اپنے دوستوں ساتھیوں سے مشورہ کر لو اور جب یہ پڑو رو والا معاملہ ختم ہو جائے تو پھر مجھ سے رابطہ کر لینا۔ یا میں تم سے بات کر لوں گا۔ اگر تمہیں اعتبار آ جائے کہ میری یہ پیش کش جسے تم رشوت کہہ رہے ہو تمہارے حق میں نیکی تھی تو پھر مگر

ایک نمک حرام نے ایسا کیا تھا۔ میں نے اسے خود مار دیا۔ تم بھی مطمئن ہو جاؤ کے مگر استاد پڑو رو کو میں بُرا بھلا کہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ وزیر خان کا مر جانا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔ مجھے پڑو رو کی ضرورت تھی، میں نے اسے بچا لیا۔ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں تو یہ سب تمہیں بتا رہا ہوں۔ تمہارا مجرم وہ ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں خود اسے تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ باقی باتیں تم خود پوچھ سکتے ہو اس سے۔ اس کام کے تم بھی ماہر ہو۔ میرا مطلب ہے سچ اگلوانے کے۔"

میں نے کہا "تم مجھے رشوت دے رہے ہو۔ قربانی کا بکرا پیش کر رہے ہو کہ صدقے میں اسے مار ڈالو۔ میری جان بخشی کر دو۔"

"دیکھو سکندر۔ یہ موقع گنوا کے تمہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا۔ تم انکار کر سکتے ہو۔ اس کا نقصان مجھے نہیں ہو گا۔ پڑو رو اگر تمہارے ساتھ مل جائے تب بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور تم ایم آر ایس کیا بین الاقوامی دہشت گردوں کی کسی تنظیم کو ساتھ ملا لو تب بھی دلاور کا بال بیکا نہیں کر سکو گے۔ تم کو گے میں شیخی مار رہا ہوں۔ یہ بڑا بول ہے۔ ہاں ہے، آج جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے۔ تمہارا قانون، پولیس انصاف کے ٹھیکے دار۔ بڑے بڑے وکیل اور عدالتیں۔ جیل اور تھانے۔ کیا کوئی مجھے قید کر سکا؟ آج میں آزاد ہوں اور تم میری قید میں ہو۔ تم حق کا بول بالا رکھو۔ انصاف کے علمبرداروں کے نعرے لگاتے پھرو۔ عالمی پولیس یا سلامتی کونسل سے اپیل کرو۔ کوئی بھی کسی چوہدری دلاور کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور۔ بنیادی آئینی حقوق۔ شخصی آزادی، جمہوریت۔ عالمی عدالت انصاف۔ اور ہزاروں ایسے ہی ادارے سب ڈرامے ہیں۔"

"یہ تمہاری اور تم جیسوں کی وجہ سے ہے۔ اور تم کو ہر آئینے میں اپنا عکس نظر آتا ہے تو قصور وار آئینہ نہیں ہے۔"

"پڑو رو سے پوچھو کہ اس نے وزیر خان کو کیسے اور کب قتل کیا تھا پھر اس کی لاش کو دفن سے نکال کے کہاں لے گیا تھا۔ وہ تمہیں سب بتا دے گا۔ میں تمہیں ایک ٹیپ دوں گا جس میں اس کی اور میری گفتگو ہے۔ میں نے جانتے بوجھتے اسے باتوں میں اُلجھا کے ایسے سوالات کیے ہیں کہ جواب میں اس نے ہر بات بتا دی ہے۔ بڑے فخر اور غرور کے ساتھ۔ میرا رویہ بھی حوصلہ افزائی اور شاباشی کا تھا اس لیے وہ بولتا گیا۔ یہ جانے بغیر کہ سب کچھ ریکارڈ ہو رہا ہے۔ پہلے اس سے سب کچھ پوچھنا، وہ آسانی سے سچ نہیں بولے گا۔ جو وہ پہلی بار خود بتائے وہ بھی ریکارڈ کر لینا۔ پھر ایسے پوچھنا جیسے پولیس تھانوں میں پوچھتی ہے اور آہستہ آہستہ جھوٹ میں سے سچ ایسے نکال لیتی ہے جیسے دہی کو بلو کے خالص مکھن نکالا جا سکتا ہے۔ جب خالص مکھن حاصل ہو جائے تو وہ ٹیپ سن لینا جو میں دوں گا۔ دونوں کا موازنہ کر لینا فرق ہو تو مجھے بتانا۔ سچ تو ایک ہی ہو گا نا۔ رہی بات رشوت دینے کی تو اپنے سکندر صاحب

www.paksociety.com

"اصولی بات کریں گے۔"
"کون سے دیگر اصول؟"
"وہ کیا۔۔۔ کیا کہتے ہیں۔۔۔ تصفیہ طلب۔"
میں نے کہا "ان پر تصفیہ ناممکن ہے۔"
وہ بتا "سب وقت اور حالات پر منحصر ہے۔ تصفیہ کرنا پڑتا ہے اپنے سکندر صاحب۔ ہم جیسا بندہ بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ اب میں بتاؤں کہ میں تمہارے ساتھ یہ سلوک کرنے پر کیوں مجبور ہوا تھا؟"
"تم بتانے لگے ہو۔"
اس نے نفی میں سر ہلایا "میری بیوی میرا فیصلہ نہیں بدل سکتی تھی۔ نہ میں نے اسے کبھی اجازت دی کہ میرے معاملات میں بولے۔ نہ یہ اس کا کام تھا۔ وہ بھی سمجھتی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ مردوں والے کام اسے کرنے پڑے۔ مگر وہ اکیلی نہیں تھی۔ بیٹا اس کے ساتھ تھا۔ دلاور جونیئر۔ جس طرح میری بیوی نے تمہاری سفارش کی اور تعریف کی۔ وہ شاید میں برداشت نہ کرتا۔ طلاق دے کے کہتا کہ بے غیرت جا اسی سے نکاح پڑھوا لے یا اسی کے ساتھ رہ جس کا کلمہ پڑھ رہی ہے۔ مگر ماں کے ساتھ جب اس سے ایک بالشت زیادہ قد کا بیٹا کھڑا ہو۔ جو تمہارے برابر آتا ہو اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہو۔ تو پھر کچھ نہیں کر سکتا چوہدری دلاور بھی۔ فیصل نے بھی کہا کہ ابا جی! اماں ٹھیک کہتی ہے۔ منہ پر مارو اس کمینے کا احسان تاکہ ہم آزاد ہو جائیں۔ پھر میں سمجھ لوں گا اس سے۔ اور میں نے کہا کہ اچھا بیٹا' تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ فیصل وہی زبان بول رہا تھا جو میری زبان تھی۔ وہ کل کا چوہدری دلاور ہے۔ میرا مستقبل ہے۔ اس راستے پر چل رہا ہے جس پر میں چل رہا ہوں اور اپنے سکندر صاحب! اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے کہ جب آپ کمزور پڑنے لگیں تو جوان بیٹا آپ کے کندھے سے کندھا ملا کے کھڑا ہو جائے اور کہے ابا جی! اب آپ چھوڑیں' میں نمٹ لوں گا آپ کے دشمنوں سے۔ تو چوہدری دلاور بھی مجبور ہو گیا۔"
"یعنی تم اپنی بیوی کی محنت' لگن اور جدوجہد۔ اس کی محبت اور خلوص کی قدر نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ وہ بیوی ہے۔" رابعہ نے کہا "بیوی دوسری بھی مل جاتی ہے۔ تیسری چوتھی بھی مگر فیصل جیسا جوان بیٹا نہیں ملتا۔"
"ٹھیک کہا تم نے۔ فیصل کی ماں کو بھی تم سے زیادہ میں جانتا ہوں مس رابعہ" اس نے تلخی سے کہا اور ایک دم اٹھ کے باہر چلا گیا۔
ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ کمرے میں ہمارے سامنے کوئی بھی نہیں تھا۔ شاید کسی پردے کے پیچھے بھی نہیں تھا مگر یہ خیال اپنی جگہ تھا کہ کہیں دیواروں یا کسی خفیہ گوشے میں نصب کیمرے کی آنکھ سب کچھ دیکھ رہی ہوگی اور کسی کمرے کے ٹی وی اسکرین پر دیواروں کے اندر کا پورا منظر نہ جانے کتنے لوگوں کی نظر میں ہو گا۔ گلدان یا فینسی لیمپ اور کسی بھی ڈیکوریشن پیس میں چھپا ہوا مائیک فون ہماری گفتگو کے ہر لفظ کو واضح طور پر سنوا رہا ہو گا۔
میں نے رابعہ کی طرف دیکھا "میرا ذہن کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہے۔ تم کیا کہتی ہو؟"
"ہم فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں کہاں ہیں؟"
"ہم اعتبار بھی نہیں کر سکتے۔ دلاور کی بات کا مطلب کبھی نہیں ہوتا جو سمجھ میں آ جائے۔"
"ہاں۔ اس کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔"
میں نے ایک کونے میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف دیکھا "کیا یہ فون کام کرتا ہے؟"
"میں دیکھ کے بتاتی ہوں۔ کسے فون کرو گے؟"
"وقار یوسف کو" میں نے کہا۔
رابعہ نے مجھے حیرانی سے دیکھا "اس سے کیا کہو گے؟"
"یہ معلوم کروں گا کہ غالب اور نازو پہنچ گئے ہیں یا نہیں؟"
رابعہ نے تھوڑے سے تذبذب کا مظاہرہ کیا۔ پھر وہ کہنے لگی کہ میں صرف تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ ان تمام باتوں کی جو دلاور نے کی ہیں۔ کیا ہم واقعی آزاد ہیں۔ ہم قیدی نہیں ہیں۔ ہم فون پر کسی سے بھی بات کر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فون پر ہماری گفتگو سنی جائے گی مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نہ ہم پولیس کو یہاں بلا سکتے تھے نہ کسی مددگار کو۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے یا اس فون کا نمبر کیا ہے۔ کال سے فون نمبر کا پتا لگایا جا سکتا ہے اور فون نمبر سے ایڈریس معلوم ہو جاتا ہے لیکن اس میں بہت وقت لگتا ہے۔ غالب کیا کر سکتا ہے اور پولیس کیا کر سکتی ہے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے تو دلاور ہمیں دوسری جگہ شفٹ کرا دے گا۔
رابعہ نے کہا "فون تو کام کر رہا ہے۔"
میں نے کہا "نمبر ملاؤ کسی کا بھی۔"
"میرا خیال ہے کہ منظر سے بات کرو" اس نے ریسیور مجھے تھما دیا۔
ریسیور اس کے کسی بچے نے اٹھایا "کون ہے۔۔۔؟" وہ بد تمیزی سے بولا۔
"تمہارا ابا گھر میں ہے؟" میں نے کہا۔
"ابا اشارے سے پوچھ رہا ہے کہ معلوم کرو کون ہے؟"
"اس کو بتاؤ کہ میں اس کا ہونے والا قاتل ہوں۔"
میں نے بچے کی آواز سنی "ابا۔ تمہارا ہونے والا قاتل ہے" پس منظر میں منظر کی غصے سے بھری ہوئی آواز ابھری "بھوتنی کا ہے سالے کو میں نہ قتل کر دوں پہلے۔"
اس کی بیوی نے دور سے کہا "کیوں تیرے سالے نے کیا کیا؟ تمہارا یا کوئی اور سالا بھی ہے تمہارا۔ کون ہے یہ نیا سالا آخر؟ عجیب ہے۔"
اس کی زبان کی قینچی ایسے ہی چلتی تھی۔ منظر نے اسے ایک شاندار گالی سے نواز کے خاموش کیا اور فون میں دہاڑا "کون اُلو کا پٹھا ہے؟"
"بتایا ہے نا ابھی" میں نے فرا کے کہا "سمجھ میں نہیں آئی بات جو یہ ناری بولی تھی میں نے۔"
وہ صدمے اور حیرت سے ایک سیکنڈ خاموش رہا' پھر چلایا "ابے تو بھوتنی والے۔۔۔ ابے کہاں سے بول رہا ہے۔"
"پھر وہی احمقانہ سوال۔ ابے میں اپنے منہ سے بول رہا ہوں۔ تو کہاں سے بول رہا ہے۔"
"تیری تو بیوی کی۔۔۔ اُلو کے پٹھے۔ اتنا بڑا مجمع ہے میرے سامنے۔ اس جلسۂ عام میں گالیاں کھائے گا مجھ سے۔۔۔ ابھی تو یہیں کی اطلاعات ملی تھیں تیرے بارے میں کہ رات کو نیند بھی ابھی آئی۔ بھوک بھی کھل گئی اور باقی پوچھ لے اپنی بھابی سے۔"
میں نے کہا "کیسی کون سی خوش خبری تھی ہمارے بارے میں؟"
"معلوم ہوا تھا کہ تم دونوں۔ یعنی تم اور تمہاری خیر مکنہ زوجہ مہمان ہوا اپنے چوہدری دلاور صاحب کے۔ ہم نے کہا چلو جو اللہ کو منظور۔ ایک دن یہ تو ہونا ہی تھا۔ ہم تو کب سے دعائیں مانگ رہے تھے کہ خس کم جہاں پاک ہو۔ تمہارے زندہ رہنے سے ہماری زندگی حرام تھی۔"
میں نے کہا "اور تم نے یقین کر لیا تھا۔"
"یقین۔۔۔ ابے سارا بندوبست کر لیا تھا۔ غائبانہ نمازِ جنازہ کا بھی۔ اور میں تو شکرانے کے دو نفل پڑھتا۔ کہ اپنے چوہدری صاحب نے بڑا احسان کیا ورنہ تم ایسے کہاں تھے بھوتنی کے۔ ہماری جان چھوڑنے والے۔ بس وہ اتنی نیکی اور کر دیں کہ خود بھی کہیں کا نہ رہیں۔"
"مگر اس بچے جا رہا ہے کب سے۔ کس اُلو کے پٹھے نے ایسی بے پر کی اڑائی تھی" میں نے کہا۔
"اور کون ہے اپنے جاننے والوں میں۔ چنڈو خانے کی خبریں لانے والا تاریخی گراوٹی صحافی' مرزا غالب کا دعا۔۔۔ اب میں کیا کہوں' صرف دعویٰ نہیں اس کی وہ قاتل حسینہ۔۔۔ جس کا نام نکاح نامے میں بھی ایف آئی آر میں لکھا جانا چاہیے کہ اس نے غالب کو زوجیت میں قبول کیا تھا زیر دفعہ تین سو سات ارادۂ قتل کے تحت۔ وہ بھی یہی کہہ رہی تھی۔"
"تم نے یقین نہیں کیا ان پر تو ان کا کیا قصور؟" میں نے سکون کا سانس لیا۔
"کیا ابے تم۔۔۔ واقعی تم وہیں ہو۔ اس کے گھر میں۔۔۔ اور زندہ بھی ہو؟" وہ چلانے لگا "یہ تیری سدھ تو ہم کلام نہیں ہے ناں فون پر؟"
"ابے ہم بالکل خیریت سے ہیں۔ غالب اور نازو نے جو بتایا سو فیصد سچ تھا۔" میں نے کہا۔
"اچھا بھئی۔ جہاں رہو خوش رہو۔ ہم تو ہمیشہ یہی دعا دیتے ہیں اور ہم سب کی فلاح اسی میں ہے کہ وہیں رہو" منظر بولا "اچھا کیا تم نے کہ اسے ماموں بنا لیا۔ گلے مل لیے اور سارے گلے شکوے تمام ہو گئے۔"
"یہ کون کہہ رہا ہے۔ ابے ہم جھگڑے بڑھانے کے لیے خود یہاں اپنی مرضی سے قیام پذیر ہیں۔ جلتی پر تیل چھڑک رہے ہیں اور ایک معاہدہ کر رہے ہیں کہ جنگ میں کچھ مزہ نہیں آ رہا ہے' نئے اسباب تلاش کیے جائیں اور کچھ سنسنی پیدا کی جائے۔ دشمنی میں اضافے اور خونریزی کی رفتار بڑھانے کے اقدامات پر غور کر رہے ہیں۔"
منظر نے آہ بھری "کھلا دیا نا اس نے کچھ؟ پاگل کتے کے گوشت کی بریانی وغیرہ۔ فون کہاں سے کر رہا ہے تو آخر۔"
"ارے بتایا تو ہے۔ اس کے گھر سے جس کے مہمان ہیں۔"
"دیکھ اس وقت میں ذرا مصروف ہوں۔ میرا سالا گیارہواں اور تیرہواں بچہ۔ نہیں' تیرہویں تو بچی ہے شاید۔ خیران کو ہے بخار۔ تیسرا اور چودھواں ہمیشہ کی طرح لڑائی میں مبتلا ہیں۔ میری بیوی اگلے بچے کے وارد ہونے کی تاریخ کا اعلان کرنے ہی والی تھی یعنی سترھویں کا اور ہم اٹھارہویں کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اس لیے سوری" اس نے فون رکھ دیا۔
رابعہ نے کچھ میری باتوں سے اندازہ کر لیا تھا کہ منظر سے گفتگو کی نوعیت کسی حد تک شریفانہ ہے۔ وہ ہنس رہی تھی اور میرے کان سے اپنا کان لگائے کچھ سننے کی کوشش میں مصروف تھی۔
میں نے ریسیور رکھ کے کہا "کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا غالب اور نازو کی بات پر۔"
"یقین کیسے آ سکتا تھا۔ مجھے بھی لگتا ہے کہ یہ بھی کوئی ڈراما ہے جو اچانک ختم ہو جائے گا" رابعہ بولی۔
"ویسے دلاور کو اتنا میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اشتعال کی حالت میں دیکھا ہے اور بدمعاشی کے زعم میں دیکھا ہے۔ آج تو عجیب باتیں کر رہا تھا۔ یہ بھی حیرت ہے کہ غالب اور نازو کو انھوں نے واقعی چھوڑ دیا۔ کسی نے فون ٹیپ بھی نہیں کیا۔ لائن نہیں کاٹی۔"
"تم نے ایسی کوئی بات جو نہیں کی۔ ویسے وہ سب سن رہے ہوں گے اسی گھر کے کسی کمرے میں۔"
اب میرا خوف ختم ہو گیا تھا "رابعہ۔ اگر دلاور نے ہمیں بھی رہا کر دیا اور پیڈرو کو ہمارے حوالے کر دیا۔"
رابعہ بھی بے یقینی کا شکار تھی "ہاں۔ کیا کریں گے ہم؟"
میں نے افسوس سے سر ہلایا "دلاور سے یہ بھی پوچھ لیتے تو اچھا تھا۔ اتنا مشکل ہے اس سوال کا جواب کہ افلاطون سے کیا

www.paksociety.com

جانا تو وہ بھی سر پھوڑ لیتا۔"

رابعہ خفا ہو گئی "تم پاگل سمجھتے ہو مجھے؟"

"اس سوال کے بعد تو ثابت ہو گیا۔ میرے سمجھنے کی بات نہیں رہی۔ بے وقوف لڑکی ہم یہاں سے چلے جائیں گے اور کیا کریں گے۔ استاد پیڈرو کے ساتھ۔"

"میرا مطلب تھا کہ دلاور کے ساتھ ہمارے معاملات۔"

"ان کا پیڈرو سے کیا تعلق۔ حیرت ہے کہ تم وکیل ہو کے اتنا نہیں سمجھتیں۔ پیڈرو کا جرم الگ ہے اور سزا بھی اسے ملے گی۔ دلاور کے جرائم کی فہرست دوسری ہے۔ کیا دنیا میں اچھا ہو سکتا ہے۔ کسی عدالت کے نظام انصاف میں یہ ممکن ہے کہ ایک قاتل کہے جناب والا۔ میں دوسرے کیس میں مطلوب ایک قاتل آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ اسے پھانسی دیں اور مجھے اجازت۔ اس نیکی کے بدلے میرا جرم معاف کر دیا جائے۔"

"میں دنیا اور قانون کی بات نہیں کر رہی تھی۔" رابعہ نے خفت سے کہا "اس دلدل سے نکلنے کا کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ قانون اور عدالت کے معاملات ہی نہیں ہیں۔ اور شاید ایسے ختم بھی نہیں ہوں گے۔ ہم خود بھی تو مجرم ہیں اگر ایمانداری سے دیکھا جائے تو۔ کیا نہیں کیا ہے ہم نے اور جو کیا ہے قانون کی نظر میں وہ جرم ہے۔ تمہارا یہ نظریہ اور فلسفہ بھی ٹھیک ہے کہ جو قانون کو مانتا ہی نہ ہو اس سے قانون کی زبان میں کیسے بات کی جائے اور خود قانون بے بس ہے تمہارے بغیر۔"

میں نے کہا "رابعہ اس گھر میں خاموشی کیوں ہے؟"

"رافعی الو بول رہے ہیں یہاں تو۔"

"رو الو ایک زرا ایک مارو۔" میں نے کہا "اور کوئی ڈرا دی نہیں۔ میں دیکھتا ہوں۔"

رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "بیٹھے رہو آرام سے۔"

"بیٹھ کے کیا کروں۔ تمہیں دیکھتا رہوں؟" میں نے کہا "اس سے ذہن میں فاسد خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں بھی رومانی جذبات کا ٹمپریچر بڑھتا ہے۔"

"ابھی ٹھنڈے پڑ جائیں گے سارے جذبات اگر سر پر پھر پڑا دیا۔" رابعہ بولی "مزاج ٹو مزاحمت کروا رہا۔"

"کوئی خاص ہے" میں نے کہا "میری بیماری کا سبب۔ آخر تم کب تک فضول باتیں کرتے رہیں گے یا تو تم وہی ڈائیلاگ بولو جو فلم ساتھ لاکھ میں مسرت نذیر نے بولے تھے اور ویسا ہی ڈانس کرو۔"

"مسرت نذیر بہت اچھی لگتی ہے؟"

"ہاں۔ بس ایک خرابی ہے اس میں۔ محبت نہیں کرتی مجھ سے۔ مجبوراً تم سے دل لگانا پڑا۔ ورنہ نہ ملے تو ٹھڈے ہی کھانے پڑتے ہیں۔ اب برائے مہربانی میرا ہاتھ چھوڑ دیں آپ۔ ورنہ اس کے غیر اخلاقی نتائج کے لیے تیار ہو جائیں۔ میں کوئی ایسی جذباتی

گستاخی کروں گا کہ منصور والے بھی دم بخود رہ جائیں گے۔"

رابعہ نے گھبرا کے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے دروازے تک جا کے دیکھا "لاحول ولا قوۃ۔ یہ تو باتھ روم تھا۔ خیر اب ڈیکوریٹ یہاں تو استعمال بھی کر لیجئے آپ۔"

دوسرا دروازہ رابعہ نے کھولا "ادھر بھی ایک کمرا ہے۔"

میں نے کہا "مبارک ہو۔ کولمبس کی بچی۔ اس نے امریکا دریافت کیا تھا۔ تم نے ایک کمرا دریافت کر لیا۔ کمرے میں کون ہے اور کیا ہے؟ میری مراد ان اشیا سے نہیں جو یہاں بھی ہیں بلکہ بندہ بشر یا کوئی شریر انکا بلی جن بھوت غالب کے سر جیسا۔"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا "ایک ہی بھوت کو رکھ سکتی ہوں جو میری جان کو چمٹ گیا ہے۔ چھوڑتا ہی نہیں۔"

"چھوڑنے کا بھی نہیں۔ جان کو کیا کسی دن تم کو ایسا جکڑوں گا جیسے ویلڈنگ سے لوہا لوہے کو پکڑ لیتا ہے۔" میں نے دوسرے کمرے میں داخل ہو کے دیکھا "میرے جذبات کی قوت ویلڈنگ کے شعلے سے زیادہ ہے اور دم ہیں بھی فولادی۔ عزائم کی وجہ سے۔"

رابعہ ہنستی رہی اور کچھ شرمائی بھی رہی۔ اس کے خیال میں میری باتیں فحاشی کے زمرے میں آتی تھیں جبکہ میں بڑی شریفانہ گفتگو کر رہا تھا۔ ظاہر ہے قصور اس کی سمجھ کا تھا۔

ہم ایک کے بعد دوسرے کمرے میں گئے۔ یہ بہت بڑی اور شاہانہ انداز میں آراستہ کوٹھی تھی لیکن اس میں دلاور خان اور اس کے محافظ اور نہ بیوی بچے۔ سجا سجایا لیکن انسانوں سے خالی گھر ڈیپ ریزن لگتا ہے۔

یہ کیسی عجیب بات ہے۔ قیدی موجود ہیں۔ قید کرنے والے بھاگ گئے تم نے کبھی سنا کہ جیلر فرار ہو گیا ہو جیل سے۔"

رابعہ نے ڈر کے میرا بازو تھام رکھا تھا "یہاں سے نکل چلو سکندر۔ نہ جانے کس کی کوٹھی ہے۔ کوئی آ گیا تو خواہ مخواہ پکڑے جائیں گے۔"

"واقعی خواہ مخواہ کیوں پکڑے جائیں۔ چلو ایسا کرتے ہیں کچھ چرا کے لے جاتے ہیں۔ ابھی نہیں مالک آ جائے اس کے سامنے چوری کریں گے ورنہ تو پکڑا جانا مشکل ہے۔ دو تم ایک معزز وکیل ہو اور میں۔"

"ہائے اللہ۔" رابعہ نے ایک دروازہ کھولا اور پھر ایک چیخ مار کے بند کر دیا۔

میں نے کہا "کیا ہے اندر؟ لاش؟ آدم خور شیر... بھوت؟"

"وہ ... پیڈرو... اندر پیڈرو ہے۔" رابعہ نے بمشکل تھام کر کہا۔

"استاد پیڈرو کہو۔" میں نے اسے ڈانٹا "خوف کی حالت میں ہے؟"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا اور دروازہ کھول دیا۔ یہ ایک منظر کا رد عمل تھا ورنہ پیڈرو کو دیکھ کے چیخ مارنا ضروری نہیں تھا۔ خواتین بعض اوقات ایسی زنانہ حرکات شوقیہ بھی کرتی ہیں۔

"انجام پیڈرو ابو ہام عصر سے برآمد ہونے والی ممی کی طرح اپنا ہوا تھا۔ روٹین تھا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک بہت مضبوط جو لمبی رسی اس کے جسم پر اوپر سے نیچے تک ایسے لپیٹی تھی کہ ایک بل سے دوسرا بل ملا ہوا تھا۔ رسی نیلے رنگ کی تھی پیڈرو کے جسم پر نیلی ڈوریوں کی نظر ڈبی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن منہ بند تھا۔ منہ بند رکھنے کے لیے جو ٹیپ استعمال کیا جا سکتا تھا اور ٹیپ بھی مگر پیڈرو کے منہ میں ٹھونسا ہوا تھا۔

بتا قائل ہونے لگا تھا کہ رابعہ نے جو چیخ ماری تھی وہ بے سبب نہیں تھی۔ اگر یہ منظر پہلے میں دیکھتا تو حلق سے کوئی آواز نکلتی خواہ چیخ مار کے ہائے اللہ نہ کہتا۔

چوہا بالکل ویسا ہی اور اتنا ہی بڑا تھا جیسا میں نے کنٹرول روم کی تصویر میں دیکھا تھا۔ میرا زخمی انگوٹھا ابھی تک درد کر رہا تھا اور مجھے خطرہ تھا کہ اس کے زہریلے اثرات سے بچنے کے لیے مجھے کوئی انجکشن یا دوا بھی کھانی پڑے گی۔ شاید اے ٹی ایس کا انجکشن لگوانا پڑے۔

اتنا بڑا چوہا پیڈرو کے حلق سے نہیں اتارا جا سکتا تھا اور پورا اس کے منہ میں بھی نہیں ٹھونسا جا سکتا تھا چنانچہ چوہے کا پچھلا نصف دھڑ اندر تھا۔ مگر وہ چوہے کی کھلی آنکھوں والا منہ باہر تھا اور یوں لگتا تھا جیسے چوہا اپنے بل سے باہر آ رہا ہو۔ یہ بھی میں نے دیکھا کہ پیڈرو کیوں سر کو جھٹک کے چوہے کو منہ سے اگل نہیں سکتا تھا۔ اس کا سر دونوں طرف سے شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ یہ شکنجہ خاص طور پر بنوایا گیا تھا۔ سر کے ایک طرف دو ہتھوں سے دیوار اور آگے دو سپاٹی تختہ کو ٹر کر دیا گیا تھا۔ دوسری طرف لکڑی کا بلاک موٹر کار کو اٹھانے والے جیک سے لوہے کی ایک سلاخ کے ذریعے فٹ کیا گیا تھا۔

پیڈرو کے پاس بھی ڈزار نہیں تھے۔ جانے سے پہلے چوہدری یا ان کا انتظام کر گیا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ایک سوت بھر ادھر ادھر نہ ہل سکے۔ پیڈرو بہت بڑا بدمعاش تھا اور اس نے بے خوفی سے بڑے بڑے جرائم کیے تھے انسانوں کو بڑی بے رحمی سے مارا تھا مگر اس وقت وہ اتنا دہشت زدہ تھا کہ اس کی حالت الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

"شیخ صاحب۔ میں کیا بتاؤں کہ یہاں تم سے مل کے اور تمہیں اتنا خوش و خرم دیکھ کے مجھے کتنی دلی مسرت حاصل ہوئی ہے۔" میں نے اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کے کہا۔

رابعہ نے ابکائی لی "سکندر۔ خدا کے لیے اس چوہے کو تو منہ سے باہر نکالو۔"

میں نے کہا "تم ادھر مت دیکھو۔ یا باہر چلی جاؤ۔ دیکھو کسی کمرے میں فریج تھا۔ اس میں رکھ لی جائے گا۔ ٹھنڈا پانی پی لو۔

اپنے استاد پیڈرو جو کھا رہے ہیں انہیں کھانے دو۔ انہیں ایسی ہی چیزیں مرغوب ہیں۔ نہ جانے کتنے انسانوں کا خون پیا ہو گا۔ چوہا کیا چیز ہے۔"

رابعہ باہر چلی گئی تو میں نے چوہے کو مخاطب کیا "بھیے۔ کنٹرول لائن سے پیڈرو کے پیٹ میں ریخ کیا تھا۔ خیر ایک جیسی گندی جگہ ہے یہ بھی۔ مگر دیکھنا ذرا جنس کیا استاد پیڈرو کے اس ٹکے بڑے شکاری ہیں یہ۔ مار گیا تو بھی۔"

ادھر ادھر دیکھ کے میں نے ایک جوتا اٹھا لیا۔ یہ کوئی زنانہ سینڈل تھا۔ اس سے میں نے چوہے کے سر پر یوں مارا جیسے اسے اندر اتارنا چاہتا ہوں۔ چوہے کی دم غالباً پیڈرو کے حلق میں ہو گی۔ اس کا جسم یوں تھرتھرایا جیسے الیکٹرک شاک لگا ہو۔ اس کی آنکھوں کی دہشت خطرناک حد تک بڑھ گئی۔ عام آدمی کا اس قسم کی اذیت میں باعث قتل بھی ہو سکتا تھا مگر پیڈرو عام آدمی نہیں تھا اس کا دل بہت سخت تھا۔ وہ ابکائی تک نہیں لے سکتا تھا اور قے نہیں کر سکتا تھا۔ قے کرنے کا راستہ ہی بند تھا۔

"جی تو یہی چاہتا ہے پیڈرو کہ تم کو اسی حالت میں چھوڑ جاؤں۔ اتنی بڑی اذیت موت کا ذائقہ بھی تو میرے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ یہ کمال ہے اپنے چوہدری صاحب کے دماغ کا۔ تمہارے باس تمہارے ان داتا تمہارے آقا اور رالہ ماجد۔ بڑی رفاداری سے تم نے ان کے ہر حکم کی تعمیل کی۔ وہ کہتے تو ان کے اشارے پر تم اپنی ماں... خیر چھوڑو تم نے جو کچھ کیا اس کا انعام بھی پایا۔ یہ آخری خدمت کا صلہ بھی خوب ملا تمہیں۔ اس نے تمہیں میرے حوالے کر دیا ہے۔ اور صاف کہہ دیا ہے کہ..."

میں نے محسوس کیا کہ پیڈرو کی آنکھیں بند ہو گئی ہیں اور وہ میری باتیں نہیں سن رہا ہے۔ اس کی قوت برداشت ختم ہو گئی تھی۔

میں نے اس کے منہ سے چوہے کو کھینچ کے نکالا تو کراہت سے خود میرا جی متلانے لگا اور پھر مجھے الٹی آ گئی۔ شاید چوہا اس وقت زندہ تھا جب اسے پیڈرو کے منہ میں ٹھونسا گیا تھا۔ پیڈرو نے مزاحمت ضرور کی ہوگی۔ اس نے اپنا منہ بند کر لیا ہو گا اور دانت مضبوطی سے دانتوں پر جمائے ہوں گے لیکن وہ لوگ منہ کھلوانا جانتے ہیں۔ پیڈرو ان کی طاقت کے سامنے اتنا ہی بے بس تھا جتنا چوہا۔ اس کوشش میں چوہا مر گیا تھا اور اس کا جسم پیڈرو کے دانتوں سے کٹ گیا تھا۔ ادھڑے ہوئے جسم سے نکلنے والی غلاظت میں خون بھی شامل تھا۔ یہ سب پیڈرو کے حلق میں اتر گیا تھا۔ جب تک چوہا مرا نہیں ہو گا اسے پیڈرو کے منہ میں دبا کے رکھا گیا ہو گا اور پھر پیڈرو کو چھوڑ دیا گیا ہو گا کہ اب وہ چاہے تو اپنا منہ بند کرے۔ اپنے دانتوں کو چوہے کے جسم میں گاڑ دے اور چوہے کے گوشت کا ذائقہ اچھا نہیں لگتا تو پھر منہ کھلا رکھے۔

یہ بدترین اذیت تھی جس کو پیڈرو جھیل گیا تھا۔ اس خیال

www.paksociety.com

www.paksociety.com

سے ان کے بھی پھر بھی آگئی کہ کوئی یہ میرے ساتھ کرتا تو کیا میں برداشت کرپاتا۔ چوہدری دلاور نے جو پیڈرو کے ساتھ کیا تھا وہ رابعہ کے ساتھ بھی کرسکتا تھا۔ رابعہ تو مرجاتی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے یہ ظلم دلاور نے نہ کیا ہو۔ اس کے کسی حکم کے غلام نے پیڈرو سے بدلہ لیا ہو۔ جب وہ دلاور کا دست راست اور منظور نظر تھا تو اس نے بہت سے لوگوں کے ساتھ انسانیت سوز سلوک روا رکھا تھا۔ اب وہ معتوب تھا اور کل کے معتوب مقربین خاص کے عہدے پر فائز تھے۔

میں نے کپڑے سے پکڑ کے چوہے کو ایک پلاسٹک کی تھیلی میں ڈالا اور باہر کی گیلری میں پھینک دیا۔ رابعہ صوفے پر نڈھال پڑی تھی اور کوئی شربت پی رہی تھی۔ اس نے مجھے باہر آتے دیکھا اور تھیلی دیکھ کے سمجھ گئی کہ میں کیا کارروائی کررہا ہوں۔

جب میں واپس آیا تو وہ پیڈرو کے پاس موجود تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بھی کوئی ڈرنک تھا "لو یہ ٹیسٹ کرو۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں نہیں پیتا۔ تم غلط کرنے کے لیے۔"

"دودھ میں ہارلکس" اس نے کہا "گلوکوز کے ساتھ۔"

"اور کچھ نہیں ملا گھر میں؟" میں نے گلاس لے لیا۔

"میرے سسر کا گھر نہیں ہے یہ کہ مجھے معلوم ہو۔ فریج میں جو تھا وہ بنالیا۔" وہ بولی "جلدی سے نکلو یہاں سے ورنہ بے عزتی ہوگی۔"

"یہ فکر مجھے تو نہیں ہے کیونکہ فی زمانہ اپنی کوئی عزت ہی نہیں، مسئلہ ہے اس ممی کا۔"

"یہاں کون سی ممی ہے بھائی؟"

"جاہل لڑکی۔ فرعون مصر کی لاش کو ممی کہتے ہیں۔ جو اہرام مصر سے نکالی گئی تھی۔ ڈر رکھنے والے اس کا نام ڈیڈی رکھ دیتے تو میں ڈیڈی کہتا۔"

رابعہ نے کہا "یہ بے ہوش ہے یا مرگیا ہے؟"

"ایسے نہیں مرنے دوں گا میں اس کو۔ اور ویسے بھی بے غیرت مشکل سے مرتے ہیں۔" میں نے کہا "اب ہم یہاں میں تو اسے کیسے لے جائیں؟"

"پہلے تو اس کی رسیاں کھولو۔ شکنجے سے نکالو اسے ورنہ لاش ہی لے جانی پڑے گی۔ بے ہوشی میں ہی اٹھالیتے ہیں۔ راستے میں ہوش آیا تو پھر بے ہوش کردینا۔ تم تو ماہر ہو اس کام کے۔"

میں نے عاجزی سے تسلیم کیا "اب تو اتنی مہارت ہے خاتون کہ مجھے کوئی بھی سرجن آپریشن سے پہلے بلاکے کہہ سکتا ہے کہ مریض کو ایک گھنٹے کے لیے بے ہوش کردو یا چار گھنٹے کے لیے۔ اسی کے حساب سے دار ہوگا۔ بہت خرچہ بچ جائے گا" انیس تھیزیا (ANES THESIA) کے ماہرین کی فیس بھی سرجن سے کم نہیں ہوتی۔"

رسی ایک کنارے سے کھل گئی تو پھر کھلتی چلی گئی۔ ہرطرح کے ساتھ پیڈرو کو اٹھنے بیٹھنے میں البتہ محنت ہوئی۔ یہ اطمینان ہوجانے کے بعد کہ دلاور اینڈ کمپنی واقعی ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ کے اسی طرح چلی گئی ہے جیسے انگریز ہندوستان چھوڑ کر گئے تھے تو میں خود بہت آزاد اور پراعتماد محسوس کررہا تھا۔ میں نے باہر نکل کے اندازہ کرنا چاہا کہ ہم کہاں ہیں مگر سمت کے سوا کسی بات کا پتا نہیں چلا۔ صحن میں ایک گاڑی موجود تھی اور یہ سفید رنگ کی اولی لیکن گاڑی تھی۔ اس کی ڈکی میں دلاور جیسے وہ بھی مزے سے لیٹ سکتے تھے۔ گاڑی میں چابی دیکھ کے میں سمجھ گیا کہ یہ ہمارے ہی استعمال کے لیے چھوڑی گئی تھی لیکن اس بھروسے پر سوچے سمجھے بغیر گاڑی اسٹارٹ کرنے کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا تھا کہ پھر پتا چلنے سے پہلے ہم کے اجزائے خاکی منتشر ہوجائیں اور روح پہنچ جائے عالم ارواح میں۔ اپنی مرگ ناگہاں پر حیران ہونے یا افسوس کرنے کا موقع بھی نہ ملے۔

میں نے احتیاط سے کار کا بونٹ کھولا اور انجن کا معائنہ کسی ماہر کی طرح فرمایا۔ انجن کے پرزے ہر گاڑی میں وہی ہوتے ہیں ذرا ان کی جگہ بدلی ہوئی ہو اور بم یا الیکٹرک اسپارک سے پھٹنے والا بم سامنے ہی کہیں نصب کردیا جائے۔ ٹرانسسٹری ٹیوز کیپ یا کسی گوند کے ساتھ تو نظر آجاتا ہے۔ اگلے والا تو بہت کم جب کہ کار والا تو دروازہ کھول کے بیٹھتے ہی۔ چابی لگا کے گاڑی اسٹارٹ کرے گا اور اللہ کو پیارا ہوجائے گا چنانچہ بم کو چھپانے کے لیے زیادہ محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن چالاک یا محتاط شخص بم کو ایسے چھپا سکتا تھا کہ مجھے ایک نظر میں خاک پتا نہ چلتا۔

میں نے جھک کے باڈی کے نیچے جسم اور سسپینشن کے حصوں کو دیکھا۔ پھر ڈکی کھولی اور لائنس کے کشن چیک کیے۔ بظاہر سب ٹھیک تھا اور گاڑی لے جانے میں خطرے کی بات صرف اس حد تک تھی کہ ہم کار چوری کرنے کے الزام میں پکڑے جاتے تو ثبوت دینا مشکل ہوجاتا کہ ہماری نیت نیک تھی اور ہم شریف لوگ ہیں۔

آخری جگہ گلوز کمپارٹمنٹ تھی۔ اس میں گاڑی کے کاغذات تھے اور جب مالک کی جگہ میں نے رابعہ کا نام دیکھا تو واقعی ہکا بکا رہ گیا۔ اب شبے کی کوئی بات نہیں رہی تھی کہ دلاور نے ہمیں رشوت میں آزادی، استاد پیڈرو اور یہ کار پیش کردی تھی کہ اب آگے تمہاری مرضی، جو چاہو کرو۔ کاغذات کے ساتھ تھے ایک ٹیپ بھی ملا جو ہر طرف سے بند تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا "یہ مجرم کے اعتراف جرم کے بعد سنا جائے" دوسری طرف یہ لکھا تھا کہ گم ہونے یا ضائع ہوجانے کی صورت میں اس کی نقل حاصل کی جاسکتی ہے۔

میں کاغذات لے کر اندر جانے لگا تو رابعہ مجھے دروازے میں کھڑی ہوئی نظر آئی۔ "میں نے پتا کرلیا ہے کہ کوٹھی کس کی ہے اور کہاں ہے؟"

"میں نے بھی بہت کچھ معلوم کرلیا ہے" میں نے کاغذات کو یوں لہرایا جیسے میں سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر سے انتہائی خفیہ دستاویزات نکال لایا ہوں "تمہارا کیا خیال تھا کہ مجھے پتا نہیں چلے گا۔ اتنا الو ہوں میں؟"

"تم نے کبھی بتایا بھی نہیں کہ تم کتنے الو ہو" رابعہ نے معصومیت سے کہا "ویسے کیا تمہارا ہے آپ نے؟"

"یہ دیکھو۔ تم نے اتنی بڑی اور مہنگی کار خریدی۔ مجھے کیا کسی کو بھی نہیں بتایا۔ آخر کیوں" آگیا یہ۔ کہاں سے آیا تمہارے پاس اور یہ کار یہاں کیوں کھڑی ہوئی تھی۔ کیا تعلق ہے تمہارا اس قصر عالی شان سے اور اس میں رہنے والے سے۔"

"رہنے والی سے بھی تو ہوسکتا ہے" رابعہ نے کاغذات مجھ سے لے کر دیکھے اور مجھ سے زیادہ حیران ہوئی "گاڑی میرے نام پر!"

"ہاں۔ یہ بھی جذباتی وابستگی کا ثبوت ہے۔ کون ہے وہ آخر جس نے اتنا قیمتی نذرانہ پیش کیا ہے تمہیں؟"

"دلاور کی بیوی تم پر فریفتہ ہوسکتی ہے تو دلاور مجھ پر ہوسکتا ہے۔ اور میں بھی اسے جذباتی ہمدردی کہہ سکتی ہوں۔ اب بتاؤ کرنا کیا ہے۔ ایسا نہ ہو پیڈرو اٹھ کے شور مچادے یا حملہ کردے۔ ہم نے اس کی تلاشی بھی نہیں لی ہے۔ کیا پتا اس کی جیب میں توپ ہو۔"

میں نے سہلا کے رابعہ کی ذہانت کی داد دی "واقعی۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ خیر یہ بتاؤ گھر کس کا ہے؟"

"کوئی راجا گل زمان ہے۔ اور کوٹھی سے گھبرا کے تجوری میں وہ شاید یہاں رہتا نہیں ہوگا۔ دلاور نے باپ کا گھر سمجھ کے استعمال کرلیا۔ اب ہمیں فوراً کوچ کرنا چاہیے یہاں سے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم چل کے گاڑی میں بیٹھو اور گاڑی اسٹارٹ کرو۔ میں پیڈرو کو لاتا ہوں۔"

رابعہ نے صاف انکار کردیا۔ "میں دلاور پر بھروسا نہیں کرسکتی۔ چابی لگاتے ہی دھماکا ہوگیا پھر؟"

"پھر کیا؟ ساری دنیا کا اصول ہے کہ لیڈیز فرسٹ۔ تمہارے پیچھے پیچھے میں بھی پہنچ جاؤں گا۔ وعدہ۔ اگلے جہان کی فلائٹ سے ویسے میں نے سب چیک کرلیا ہے۔ اپنی عقابی نظروں سے۔"

"ٹھیک ہے۔ جب تم بیٹھ جاؤ گے میرے ساتھ تو میں گاڑی ذرا موو بھی کرلوں گی" رابعہ نے کہا۔

کوٹھی بہت بڑی تھی۔ غالباً وہ کینال پر بنی ہوئی تھی۔ آدھا حصہ تو لان اور باغات کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن آدھے حصے کی عمارت بھی شاندار تھی اور اندر کے تمام اسباب سے مکینوں کی امارت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ یہاں ہماری پوزیشن واقعی انتہائی مشکوک تھی لیکن آدھی رات کے وقت ہم جتنا محفوظ تھے یہ بھی حیرانی کی بات تھی کہ اتنی بڑی کوٹھی لاوارث پڑی تھی۔ راجا صاحب نے یہاں چوکیدار تک نہیں چھوڑا تھا۔ اگر چھوڑا تھا تو اسے دلاور اینڈ کمپنی نے نہیں چھوڑا تھا۔ بصورت دیگر وہ بھی کسی طرح کھلا چھوڑ کے جانے پر مجبور تھے۔ میرا دل یہی چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے کچن میں جاکے دیکھا جائے اور تو بہت کچھ نظر آیا جائے کہ اشیائے خورونوش تلاش کرے یا تیار کرے اور رابعہ کو کافی کے ساتھ پیش کرے مگر مجھے پتا تھا کہ ایسی فرمائش کے جواب میں مجھے کیا سننے کو ملے گا۔ میں نے خود کو یاد دلایا کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور یہاں سے نکلنے کے بعد ہم وقار یوسف کے یا حضرت کے گھر پہنچ کے حسب خواہش خاطر تواضع کراسکتے ہیں۔

پیڈرو کو میں نے پھر ڈکی میں ڈالا تو مجھے کراچی کا حادثہ یاد آگیا۔ ایک معمولی سی انجانے میں سرزد ہونے والی غلطی نے مجھے اور پیڈرو کو کہاں سے کہاں پہنچادیا تھا۔ نہ میں گاڑی غلط جگہ پارک کرتا اور نہ پیڈرو کو رہائی نصیب ہوتی اور نہ میری فریحہ وکیل کی مصنوعی صورت کا راز فاش ہوتا۔ نہ دلاور میرے تعاقب میں آتا اور نہ ہم دلاور کے مہمان ہوتے۔ وہ تو یہ کہو پیڈرو کے ہی ستارے گردش میں تھے کہ اس کی تدبیر الٹی ہوگئی اور وہ پھر اسی طرح کار کی ڈکی میں قید تھا اور مجھے ایک نیکی نے دلاور کی قید سے نجات دلادی تھی۔

گاڑی باہر نکلنے تک مجھے یقین نہیں تھا کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ دلاور کی ہر بات کا مطلب اتنا سیدھا اور آسان بھی ہوسکتا ہے۔ یہ انتہائی بعید از امکان تھا بلکہ وظیفے اور نقش اعظم کے باوجود مولوی ناظم حسین کا اثر تھا کہ ٹلے سے عقد چہارم تیرا نمبر اس نے کسی بیچ والی مسرت نذیر کو پہلے سے دے رکھا تھا۔

جب رابعہ نے گاڑی دوڑانی شروع کی تو میں نے کچھ دیر مڑ مڑ کے دیکھا اور سننے کی کوشش بھی کی کہ کار میں سے ٹک ٹک کی آواز تو سنائی نہیں دے رہی ہے۔ کیا پتا ایسا ٹائم بم ہو جس کا الیکٹرانک ڈائمر (ٹائمر) دس منٹ بعد شارٹ سرکٹ ہوجائے۔ پریشانی سے رابعہ کی حالت بھی غیر تھی اور میرے جسم پر بھی پسینہ بہہ رہا تھا۔

"اف۔ مجھے ابھی تک ایسا لگتا ہے.... جیسے کچھ ہوجائے گا؟"

میں معمولی طور پر اچھل پڑا "کچھ ہوجائے گا؟ کیا....." میں نے چلاکے کہا "اور چلتی گاڑی میں۔ آخر کیسے..... گاڑی سو ڈولو میٹر کی ہم کی طرف.....!"

رابعہ نے لال آنکھیں نکال کے کہا "اتنی بے شرمی کی باتیں کروگے تو سچ مچ کچھ ہوجائے گا۔"

میں نے ڈر کے کہا "کیا؟ لڑکا یا لڑکی؟"

"کمینے۔ باز آجاؤ۔ میں ایکسیڈنٹ کردوں گی گاڑی کا" وہ تنگی سے بولی "یہ وقت ہے اس قسم کے مذاق کا؟"

"سوری سوری۔ تم اگر چاہو کی چلتی گاڑی سے تو گاڑی چڑھ جائے گی فٹ پاتھ پر" میں نے کہا "میں تو ذرا تمہارے ذہن کا بوجھ ہلکا کررہا تھا۔ تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ تاکہ تمہارے اعصاب....."

"میرے اعصاب ٹھیک ہیں یہ بتاؤ کہ مرد کہاں چلیں؟"

www.paksociety.com

"تم پھر مذاق سمجھو گی مگر میں سیریس ہوں" میں نے کہا "ہمیں کہیں بھی نہیں جانا چاہیے۔"

"کیا مطلب؟ ایسے ہی سڑکوں پر پھرتے رہیں؟"

"نہیں۔ ہمیں وہاں نہیں جانا چاہیے۔ جہاں دلاور سمجھتا ہو کہ ہم جائیں گے۔ ہمیں غائب ہو جانا چاہیے فی الحال۔ مجھے یہ فرنچ وکیل کا ڈراما فوراً ختم کرنا پڑے گا۔ ابھی دلاور کے معاملے کو کچھ دن کے لیے ڈراپ کر دیتے ہیں۔ وہ ابھی ہاتھ آنے والا ہے بھی نہیں۔ پھر ہم کیوں اس کے ہاتھ آئیں۔ وقار یوسف کے یا منظر کے گھر۔ تمہارے آفس یا محسن کے گھر سے تو وہ ہمیں دوبارہ بھی پکڑ سکتا ہے۔"

"تمہاری بات غور طلب ہے۔"

"تم بلاوجہ دماغ پر بوجھ مت ڈالو۔ چھوٹی موٹر بھی زیادہ لوڈ سے جل جاتی ہے۔" میں نے کہا "سوچنے کے لیے میرا دیو ہیکل دماغ جو ہے۔"

وہ بھنا کے بولی "اتنی بڑی وکیل میں دماغ کے بغیر بن گئی تھی؟"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا کہ کافی استعمال کر لیا۔ جتنا بھی تھا۔ اب یہ بحمد اللہ نے کیا حسین صورت دی ہے۔ اس پر جتنا چاہو ناز کرو اور اتراؤ۔ کوئی حرج نہیں۔ دل بچارا دل تو ذرا دل سے فٹ بال کھیلو۔ میرے جذبات سے کھیلو۔ جذبات میں آگ لگاؤ۔ ذہنی قتل کا کیس نہیں بنے گا۔"

"اف توبہ۔ کیا ارل فول بولے جا رہے ہو۔"

"وہ دراصل۔ یہ حال ہوا ہے بھوک سے۔ پیٹ خالی ہو تو دماغ اُتر آتا ہے معدے میں" میں نے کہا "ایسا کرتے ہیں۔ پہلے تو چلتے ہیں کہیں پیٹ پوجا کرنے۔ وہیں سے اپنے لواحقین کو فون کر کے بتا دیں گے کہ ہم جا رہے ہیں کہاں نا معلوم۔"

"کہاں جا رہے ہیں؟ یہ بھی بتانا پڑے گا۔"

"یہ ہم کیسے بتا سکتے ہیں۔ جہاں تقدیر لے جائے یا استاد پیڈرو۔"

"یعنی رات کو قیام نہیں ہو گا کہیں بھی۔"

"میری مانو تو لاہور سے نکل چلو آج ہی رات۔ سو پچاس میل دور جا کے کہیں گاڑی روک لیں گے۔ کسی بھی جگہ جہاں ٹرک اور بسیں وغیرہ کھڑی ہوتی ہوں۔ وہیں ہم ایک سائڈ پر کار پارک کر دیں گے۔ میں کہہ دوں گا کہ بیوی کی طبیعت۔"

"کون سی بیوی۔ کس کی بیوی۔؟"

"اچھا بھئی کار کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔ صبح تک تم کار میں بھی سو سکتی ہو۔ چارپائی بھی مل جائے گی۔ میں پیڈرو کا خیال رکھوں گا۔ صبح پھر روانہ ہو جائیں گے۔"

"لیکن جائیں گے کدھر۔ کس سمت میں؟"

میں نے کہا "جی ٹی روڈ پر مغرب کی طرف۔ مجھے یقین ہے کہ پیڈرو بھی ہمیں ادھر ہی لے جائے گا۔ ارکانہ سے آگے۔"

"یہاں سب پریشان ہوں گے۔"

"ان کو سمجھا دیں گے کہ بچو۔ پریشان مت ہونا۔ ہم لوٹ آئیں گے ہنی مون سے۔ تم کہہ دینا کہ شادی کر لی ہے۔"

"پھر کیا؟"

"اچھا بھئی میں کہہ دوں گا کہ میں نے شادی کر لی ہے تو کیا اعتراض ہے۔ اور اس بات کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں نے تم سے شادی کی ہے۔ یا تم نے مجھ سے۔ ہنی مون اکیلے بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"پاگل ہو رہے ہو تم۔ چلو کہیں کھانا کھائیں۔"

میں نے متفکر ہو کے کہا "مس رابعہ۔ ہم تو بالکل قلاش ہیں۔"

"میرے پاس ہیں کچھ پیسے۔ لیکن ان سے زیادہ دن گزارا نہیں ہو گا" رابعہ بولی۔

میں نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا "ہائے جانی دل خوش کر دیا اس وقت۔"

"کیا بدتمیزی ہے سکندر۔ لوفروں کی طرح مت بات کرو۔"

میں نے کہا "سارا مسئلہ ابھی کا تھا۔ بعد میں تو ہم کہیں کام کرتے رہیں گے۔ آخر تم اس کی جائز مالک ہو۔ ہمیں ہزار دو ہزار روپے نکالے جا سکتے ہیں اگر کوئی کم قیمت گاڑی مل جائے۔"

رابعہ نے کہا "مجھے یہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ دلاور کا یوں گرفتار کرنا۔ قید میں رکھ دینا اور عزت کے ساتھ رخصت کر دینا۔ جیسے واقعی ہم بڑے عزیز اور معزز مہمان تھے۔ میں تو حیران ہوں اس گاڑی سے بھی پیچھا چھڑا لینا چاہیے۔ ضرور اس میں کوئی چال ہے جو ابھی ہم سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ دلاور آسانی سے ہار ماننے والا نہیں۔ جب پتا چلتا ہے اصل بات کا تو پچھتانے کا وقت بھی نہیں ملتا۔"

میں نے کہا "چلو اس مسئلے پر تمہارے نقطۂ نظر سے بھی غور فرماتے ہیں مگر پہلے دماغ ٹھکانے آ جائے معدے سے باہر نکلے تو۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب معدے کو اتنا بھر دیا جائے کہ اس میں دماغ کے رہنے کی جگہ نہ رہے۔"

رابعہ نے ایک چکن ہاؤس کے سامنے گاڑی روک دی جہاں اب بھی کچھ لوگ مرغوں اور مرغیوں کی نسلیں تباہ کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ صبح تک کھاتے رہیں گے جب آخری مرغی بھی ختم ہو جائے گی۔ گاڑی میں کھانے کے بجائے ہم نے باہر فٹ پاتھ پر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ باہر بیٹھے ہوئے لوگ رابعہ کو بھی مرغی کی طرح دیکھ رہے تھے اور ان کا بس چلتا تو نظروں ہی نظروں میں کچا چبا جاتے۔ میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ پروا نہ کرے۔

"جب ایک حسین منظر کو دیکھنے کا حق سب کو ہے تو ایسے حسین چہرے کے دیدار پر پابندی نہیں" میں نے کہا۔

"گاڑی میں بیٹھے رہتے تو کیا تھا؟"

چاہیں تو اُٹھ کر بیٹھے رہیں۔ دکان کل پھر کھلے گی۔

میں نے اس کی عاجزی کو دیکھتے ہوئے بل ادا کرنے کے لیے رابعہ کی طرف دیکھ کے شوہرانہ تمکنت سے کہا "بیگم۔ بل ادا کر دو۔ ہم بھی بھول ہی گئے تھے کہ رات کتنی ہو گئی ہے۔ گھر پہ بچے اکیلے ہیں۔ تمہاری ساس ابھی خبر لیں گی۔"

ریسٹورنٹ کا مالک خوش ہوا "اوجی اپنی ساس بھی ایسی ہی ہے۔ وہ تو شروع ہو جاتی ہے آدھی رات کو بھی۔ توبہ توبہ۔"

"بیٹی کا ساتھ دیتی ہے؟"

"نہیں جی، اگر داماد ہی اے۔ توبہ توبہ۔"

"اور تم جو کھا لیتے ہو تم بھی خوش؟" میں نے اس کے پہلوان جیسے ڈیل ڈول کو ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔

"ہیں جی۔ گھر والی کو تو خوش رکھنا ہی پڑتا ہے۔ کوئی چار پانچ ہیں اکیلا چھوٹا پہاڑ کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔"

بازو کے ساتھ غالب عین وقت پر نمودار ہوا جب ہم اٹھ چکے تھے۔ میں نے کہا "کیا عبرت ناک وفا شعار شوہر ہے۔ محبت کرنے والے ایسے اُلو کے پٹھے بھی ہوتے ہیں۔"

غالب نے گاڑی سے سر نکال کے کہا "تسلیمات بجا لاتا ہوں۔ خیر سے یہ لو برڈز (LOVE BIRDS) اس وقت یہاں!"

"یہ شارع تھی نہ چمن تھا نہ آشیانہ تھا۔ پھر ہم کہاں جاتے۔ اب ہم آگے چلتے ہیں۔ تم ہمارا تعاقب ایسے کرو جیسے اپنی جوانی میں کسی حسینہ کا کرتے تھے۔ چلو محبوب۔"

"مگر جانا کہاں ہے۔ محبوب کے بچے" غالب نے چلا کے کہا۔

رابعہ نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ غالب کو مجبوراً پیچھے آنا پڑا۔ رابعہ بھی موڈ میں آ گئی تھی۔ غالب جتنا سائڈ میں آ کے پیچھے پہنچنے کے لیے گاڑی دوڑاتا تھا رابعہ اپنی رفتار اس سے زیادہ کر دیتی تھی۔ یہ اوپل ریکارڈ بھی اسٹینڈرڈ ماڈل نہیں تھی۔ اس کا انجن ایک سو سی سی والا تھا۔

گوجرانوالے تک خطرناک قسم کی دوڑ ہوئی۔ خطرہ غالب کے لیے زیادہ تھا۔ اس کی گاڑی اپنی بساط سے بڑھ کر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ غالب پہلے غصے میں ہو گا۔ بعد میں اس کھیل میں شریک ہو گیا۔ چالیس میل کا راستہ طے کرنے میں چالیس منٹ بھی نہیں لگے۔ آخری راؤنڈ میں غالب نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور کافی پیچھے رہ گیا۔

میں نے ایک پٹرول پمپ کے ساتھ والے ہوٹل پر اپنی گاڑی رکوا دی اور بقول رابعہ کے بدتمیزی کی انتہا کر دی۔ تاہم میرے بیان پر ہوٹل کے مالک کے دل میں انسانی ہمدردی اور شرافت کے جذبات کا طوفان آ گیا اور اس نے میری بیمار بیوی کے لیے خصوصی انتظامات کر دیے۔ پچھلے حصے میں اس کے اپنے آرام کرنے کی جگہ تھی۔ اس نے دروازہ کھول کے کہا "جی۔ بیگم صاحب کو ادھر لے آئیں۔ فکر سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر ضرورت ہے تو لوگ رات بھر

ہمیں جو باتیں یہاں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا تھا۔ وہ گاڑی میں نہیں کر سکتا تھا" میں نے کہا۔ "مجھے ڈر تھا کہ ہماری ساری گفتگو کوئی سن رہا ہو گا۔ مجھے اپنے پلان کو سیکرٹ رکھنا تھا اور انہیں گمراہ کرنے کے لیے وہ ساری گفتگو ضروری تھی جو میں نے کی تھی۔"

"اچھا اصل پلان کیا ہے؟"

"اس گاڑی کے استعمال کا رسک ہم نہیں لے سکتے۔ دلاور نے ہمیں پھنسانے کی کوشش کی ہے اور ہم ظاہر کریں گے کہ پھنس چکے ہیں۔ یہاں سے تم فون کرو مرزا غالب کو۔ اس سے کہو کہ دوسری کار کپڑے اور کیش لے کر گوجرانوالہ روانہ ہو جائے۔"

"گوجرانوالہ۔۔۔۔ یا ارکانہ؟"

"گوجرانوالے میں جی ٹی روڈ سے پہلے جو ٹرک اسٹینڈ یا پٹرول پمپ آئے۔ وہاں ہمیں تلاش کرے۔ اسے گاڑی کے بارے میں بتا دیتے ہیں۔ اس کا رنگ اور نمبر وغیرہ۔ وہ پہنچ جائے گا صبح تک۔ صبح ہونے سے پہلے ہم چوہدری دلاور کی تحفے میں دی ہوئی کار وہیں چھوڑیں گے اور ایسے غائب ہو جائیں گے کہ پھر ڈھونڈتے رہیں ہمیں۔ جب تک انہیں معلوم ہو گا کہ کار تو مخالف سمت میں فلاں جگہ کھڑی ہوئی ہے یا گوجرانوالہ کے فلاں پولیس اسٹیشن پر موجود ہے۔ ہم بہت دور جا چکے ہوں گے اور وہ خاصے کنفیوز ہوں گے کہ بندے نے ارکانہ کہا تھا مگر پہنچا گوجرانوالہ۔ گاڑی ملی ہے گوجرانوالہ میں تو اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ وہ دھوکا دے کر نکل گیا اور دھوکا دینے والے سیدھے راستے پر نہیں جاتے۔ یہاں سے بھی وہ دائیں بائیں نکل گیا ہو گا یا واپس لوٹ کے ارکانہ گیا ہو گا۔ اوکانہ براستہ گوجرانوالہ۔ چکر دینے والے ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ انہوں نے تعاقب کیا تو اُلٹی سمت میں کریں گے۔"

"تمہیں یہ بھی یقین ہے کہ وہ تعاقب کریں گے۔"

"اتنا ہی جتنا مجھے یقین ہے کہ نکاح کے وقت تم انکار نہیں کرو گی خواہ خود چوہدری دلاور تمہارے سر پر سلطان راہی کی طرح گنڈاسا لہرا کے اعلان کر رہا ہو کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ میں تو نے کروا لوں گا اس رشتے۔ یعنی میرے۔"

رابعہ نے غالب کو فون کیا اور ہم نے کھانے کے بعد چائے صرف وقت گزارنے کی خاطر پی جب آخری گاہک بھی رخصت ہو گیا اور چکن تکہ ہاؤس بند ہونے کی تیاری ہونے لگی کہ۔

گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ

اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

تو مجھے تشویش ہونے لگی کہ کہیں غالب کے آنے سے پہلے ہماری رخصتی عمل میں نہ آ جائے۔ بالآخر ہوٹل کا بہرا اور چکن تکہ ہاؤس بقلم خود ہمارے پاس تشریف لائے اور سخت شرمندگی کے ساتھ عرض کی کہ آخری وقت آ گیا۔ رہے ہم

www.paksociety.com

آتے جاتے رہتے ہیں۔ شور شرابا ہوتا ہے اور ان کی باتیں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

میں نے کہا "آپ نے بڑی تکلیف کی۔ پیچھے میرا سالا آرہا ہے وہ ہمیں اپنی گاڑی میں لے جائے گا۔ گاڑی ٹھیک کرنے کے لیے کل میں خود آؤں گا۔ اس کے ٹائر تو بالکل ہی گل ہو گئے ہیں۔"

وہ کمرا ہمیں ہماری ضرورت کے مطابق تھا لیکن آرام دہ اور سڑک سے کچھ فاصلے پر پیچھے کی طرف۔ خرابی صرف یہ تھی کہ دیواروں پر چند تصاویر خاصی قابل اعتراض تھیں اور خالص مردانہ ذوق کا مطلب۔ تاہم یہ ایک شریف آدمی کی خلوت گاہ تھی اور خلوت میں شرافت کی نقاب پہن کے کون رہتا ہے۔

رابعہ نے میرے اصرار کے باوجود بیڈ پر لیٹنے سے انکار کر دیا۔ اسے بیڈ سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ اپنے جذبات کے اظہار میں بر حق تھی۔ نہ جانے اس بیڈ پر کتنی عورتیں اور کتنے مرد سو چکے تھے۔ یہ بات اس نے الفاظ میں نہیں کی مگر میں سمجھ گیا کہ کراہیت کا سبب اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ بستر بالکل صاف ستھرا تھا۔ رابعہ ایک کرسی پر بیٹھی رہی اور میں نے پھر سڑک پر آ کے غالب کا انتظار کیا۔ مجھے کچھ تشویش ہونے لگی تھی کہ وہ اتنا پیچھے کیسے رہ گیا۔

بالآخر وہ آہستہ آہستہ گاڑی چلاتا ہوا نمودار ہوا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا "اوئے۔ شرم کر۔ ہار گیا ایک زنانی سے۔"

غالب نے خالص لاہوری پنجابی کا مظاہرہ کیا "شرم تو کر۔ نہ زنانی اپنی نہ گاڑی۔ خود دوڑ کے دیکھ لے میرے ساتھ۔"

اس نے اپنی گاڑی کو سڑک کے کنارے ہی چھوڑ دیا۔ پھر ہم اوپل ایکارڈ کو منتقل کر پائے پیچھے لے گئے جیسے کہ ہم اس کے بریک کام نہیں کر رہے ہیں۔ ہوٹل والے نے مزید مہمان نوازی کا مظاہرہ یوں کیا کہ زبردست ملائی والی اسپیشل چائے خود لے کر آیا۔

"گاڑی صبح ٹھیک ہو جائے گی۔ ادھر پیٹرول پمپ پر مستری آجاتا ہے قریب تک۔ میں خود بتا دوں گا اسے۔"

میں نے کہا "گاڑی تو محفوظ رہے گی نا۔"

"ہو جی۔ سمجھو کہ اپنے ہی گھر میں کھڑی ہے۔ مجال ہے جو کوئی ہاتھ بھی لگا دے" اس نے ہمیں چائے پیش کی اور پھر رابعہ سے مخاطب ہو گیا "آپ کے لیے بیگم صاحب الائچی والی چائے ہے۔"

چائے پیتے ہوئے میں نے ندامت کا اظہار کیا "ہم کتنا جھوٹ بولتے ہیں اور لوگ کتنے شریف ہیں کہ شک نہیں کرتے۔"

غالب نے کسی فلسفی کی طرح ارشاد کیا "سچ اس دنیا میں ایک شجر ممنوعہ ہے۔"

میں نے اسے بعد کے واقعات کا خلاصہ سنایا جب وہ نازو کو ساتھ لے کر چلا گیا تھا۔ رابعہ نے کیا سب کچھ زنانہ جذبات کی رنگ آمیزی کے ساتھ نازو کو بتایا۔ ہماری فرمائش پر وہ [illegible] ایک سوٹ کیس بھی بھروا لائے تھے جس میں رابعہ کے اور میرے کپڑوں

کے ساتھ ایک لاکھ روپے بھی تھے۔ یہ وہی رقم تھی جو شوکت رانا کے گھر سے مال غنیمت کے طور پر [illegible]

غالب نے میری اسکیم سے اتفاق کیا "[illegible] پیڈرو سے اعتراف جرم حاصل کرنے کا یہی [illegible] مل سکتا ہے مگر ایک تو آپ دونوں کو اکیلا نہیں رہنا چاہیے۔"

"دونوں اور اکیلے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ [illegible] چور اور لاٹھی دو۔"

"ہم تمہارے درمیان ظالم سماج کی دیوار [illegible]" رابعہ نے احتجاج کیا "یہ فضول [illegible] آخر؟"

"دیکھو میری بے عزتی برداشت نہیں کرنی۔ نازو [illegible] بندے اور بچی ہے اب تک" غالب نے کہا۔

نازو نے کہا "ایسے ہی کبھی کھیل کھیل میں [illegible] ہوں یار ہے۔ اور کے مارے ہی رہتے ہیں؟"

"نہیں یار تو کیا مار دی نہیں۔ اگر کوئی ایسے [illegible] کے کہ تو کیا خطرہ ہے۔"

نازو بولی "میں شرافت سے بتا دوں گی کہ یہ کیا چیز [illegible] غالب ہے۔"

"اور یہ بات بھی کتنی غلط ہے۔ سارے [illegible] مجھے تو زندگی کا [illegible] کرالینا چاہیے۔ اگر مجھے [illegible] ہاتھ [illegible] بھوت کی بچی۔"

"غصہ تم لا رہے ہو نا۔ بھوت کے کہاتے۔"

غالب نے بے نیازی سے کہا "بھوت کا اور [illegible] بھوت کون کہہ سکتا ہے۔ یا کدو کو بھوت کون کہتا ہے۔"

"کیا میرے ابا انسان نہیں تھے؟" نازو چلا کے بولی۔

"دیکھنے میں تو لگتے تھے۔ دیکھنے میں تم بھی انسان [illegible] ہو۔"

"بس۔ شروع ہو گئی تمہاری منہ ماری۔" میں نے کہا "[illegible] ہو رہی تھی۔ تم نے کیا فساد شروع کر دیا۔"

"بات یہ کہی تھی میں نے کہ ہم تمہارے ساتھ رہیں گے [illegible] یار مانو۔ ہم پوری تیاری کے ساتھ آئے ہیں اور کوئی بھگانے والا بھی ہمیں نہیں بھگا سکتا۔"

"تم نے پھر بھوت کہا مجھے۔"

غالب بولا "بھوت میں نے اپنے آپ کو کہا ہے [illegible] الٹے پاؤں والی [illegible] دیکھے بغیر کسی کو پتا نہیں ہوتا۔"

"میرے پاؤں الٹے ہیں؟ تمہاری کھوپڑی الٹی ہے۔"

"سکندر۔ چل یار تو بتا۔ کیا اس کے پاؤں [illegible] مجھے [illegible]"

میں نے کہا "پاؤں تو خیر الٹے ہیں۔ مگر [illegible] جذبات ہوتے ہیں۔ خیال رکھنا چاہیے۔ میں بھی رابعہ سے کتنا ایسی بات۔"

بچنے والے تھے۔ اوپل ایکارڈ آگے تھی اور اس کو اکیلا [illegible] فاکس ویگن کو رابعہ نے خود ڈرائیو کیا۔ رات [illegible] کم ٹریفک تھا۔ ٹرک بھی گزر رہے تھے اور [illegible] سے آنے والی کاریں تھیں یا رات بھر چلنے والی [illegible] سڑک خالی تھی۔

[illegible] سطح مرتفع پوٹھوہار کا علاقہ شروع ہوتے ہی سڑک میں [illegible] اور نشیب و فراز کا خطرناک سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ موڑ [illegible] تو نہیں جتنے مری سے آگے کاغان تک نظر آتے ہیں [illegible] آگے ناران یا جھیل سیف الملوک تک مگر پھر بھی [illegible] اور زردی مائل پتھروں کے بلند ٹیلے اور [illegible] کہانیاں حادثات کا سبب بنتی ہیں۔ یہاں بارش کی افراط [illegible] ہیں اور زمین بھی اپنی ہیئت بدلتی رہتی ہے۔

[illegible] آگے جانے والی اوپل ایکارڈ کی ٹیل لائٹ پر نظر رکھے [illegible] غالب نے مسلسل کچھ دیا تو میں نے رابعہ سے کہا [illegible] گاڑی روک لے۔ اس وقت تک ہم راستے کے ایک [illegible] ریسٹورنٹ کے قریب پہنچ گئے تھے۔ پیڈرو کی حالت ابتر [illegible] موقع تھا کہ ہم اسے کچھ کھلا پلا دیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں [illegible] کھول دیے تھے مگر اس کے باوجود وہ نقاہت سے کھڑا [illegible] ہو سکا تھا۔

غالب نے گاڑی کو ایک پہاڑی کے کنارے میں روک دیا تھا اور [illegible] ایسے کھول دیا تھا کہ دیکھنے والے کو گاڑی کی خرابی کے [illegible] کی وجہ نظر آتی۔ تاہم وہ گاڑی ہماری نظر سے [illegible] اور پہاڑی کے موڑ سے پہلے صرف فاکس ویگن ہی نظر [illegible] رابعہ نے اس کے انجن کا کور بھی اٹھا دیا تھا۔ کسی جگہ دو [illegible] کا خراب ہو جانا کوئی غیر معمولی اتفاق نہیں تھا۔

غالب نے کہا "تم یہیں میرا انتظار کرنا۔ میں گاڑی کو ٹھکانے لگا آتا ہوں۔"

نازو کچھ پریشان ہو گئی "غالب اپنا خیال رکھنا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ گاڑی کے ساتھ میں بھی چلا تک [illegible] اور وہ بھی تمہارے بغیر۔"

میں نے کہا "ہم یہاں پیڈرو میں چائے پانی ڈالتے ہیں تاکہ یہ [illegible] گاڑی کی طرح خراب نہ ہو جائے۔ نازو خیال رکھے گی پیڈرو [illegible] رابعہ گاڑی ٹھیک کرنے کی کوشش میں مصروف رہے گی۔ میں [illegible] انتظام کرتا ہوں سب کے لیے۔"

"میرا کام آدھے گھنٹے میں یا اس سے پہلے ہی ختم ہو جائے [illegible]" غالب بولا۔

میں نے کہا "اس کی ڈکی میں پیٹرول کا کین ہے۔ مگر [illegible] میں کاغذات ہیں۔ خیال رہے کہ وہ باہر گریں اور آگ [illegible] اور وہاں ایک ٹیپ ہے وہ ضرور نکال لینا۔"

[illegible] ہوٹل کے پچاس قدم دور واقع جمبو پیزی ریسٹورنٹ

"کیا خیال ہے چلیں؟" غالب نے کہا۔

"چلیں نہیں۔ آپ واپس تشریف لے جائیں" میں نے کہا۔ رابعہ کے ووٹ سے مجھے شکست ہو گئی۔ وہ پہلے ہی نازو سے اتفاق کر چکی تھی کہ انہیں ہمارے ساتھ چلنا چاہیے۔

"ایک اور شاندار اسکیم ہے میرے ذہن میں جس کا اعلان میں کچھ دیر بعد کروں گا۔" غالب نے کہا۔

"بلاوجہ سسپنس مت پیدا کرو۔ ابھی بتا دو۔"

"اچھا۔ ہم یہ گاڑی بھی لے جائیں گے جو خراب تھی۔ تھی کا مطلب یہ ہے کہ میں نے ٹھیک کر دی۔ اتفاق سے میں ایک ماہر مستری بھی ہوں۔ دماغ تک درست کرتا ہوں۔" اس نے نازو کو دیکھ کے کہا۔

"لیکن اپنا دماغ خراب ہے" نازو نے فوراً کہا "نائی اپنے بال خود نہیں کاٹ سکتا۔"

"ہم اسی طرح روانہ ہوں گے جیسے لاہور سے آئے ہیں۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد جہلم کے بعد وہ پہاڑی علاقہ شروع ہو گا جہاں سڑک پر خطرناک موڑ آتے ہیں۔ ٹرین کی سرنگ سے گزرتی ہے وہاں تمہاری گاڑی کو ایسا حادثہ پیش آسکتا ہے کہ تم سب ہلاک ہو جاؤ۔"

"کیا بک رہے ہو بلاوجہ" نازو گھبرا کے بولی۔

"بات سمجھ میں نہ آئے تو بیچ میں نہیں بولنا چاہیے۔ ہم ایسا حادثہ خود کریں گے۔ آگے تم لے جانا رابعہ کی گاڑی۔ اور اس میں ڈال لینا پیڈرو کو۔ ہم بعد میں پنڈی پہنچ جائیں گے۔ کسی بس کے ذریعے یا کسی سے لفٹ لے کر۔"

"ہمارے ساتھ رہنے میں کیا حرج ہے؟"

"حرج تو کچھ نہیں۔ تمہارے ساتھ ایک لاش بھی تو ہو گی۔ میرا مطلب ہے استاد پیڈرو۔ فاکس ویگن کی ڈکی میں تو اسے رکھا نہیں جا سکتا۔" غالب نے کہا۔

"مگر ہم اسے درمیان میں بٹھا سکتے ہیں۔ پچھلی سیٹ پر" نازو نے تجویز پیش کی۔ "کسی کو کیا پتا کہ وہ سو رہا ہے یا بے ہوش ہے۔"

"اب تو ہوش میں ہو گا۔" میں نے کہا "اسے نکالنا بھی ضروری ہے ورنہ مر جائے گا تو ہماری سب محنت رائگاں جائے گی۔"

وقت عمل آیا تو میں نے اور غالب نے بڑی پھرتی سے پیڈرو کو ڈکی سے نکال کے فاکس ویگن میں رکھا اور اس کے دائیں بائیں نازو اور میں بیٹھ گئے۔ ہمارے حفاظتی حصار کو توڑ کے فرار ہونا پیڈرو کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ ہوش میں تھا مگر نقاہت اور بھوک سے نیم جاں ہو رہا تھا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ اگر اس نے پیڈرو پن نہ دکھایا تو آگے جا کے ہم اس کے ہاتھ پاؤں کھول کے آزاد بھی کر دیں گے اور اس کی خاطر تواضع بھی کریں گے۔

ہم ہوٹل کے مالک کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہوئے تو رات

www.paksociety.com

تک گیا مگر وہاں سب سو رہے تھے۔ ایک بار پھر جھوٹی کہانی سنا کے اور کچھ رقم کا لالچ دے کے میں نے ایک شخص کو مٹی کے تیل کا اسٹوو جلانے اور چائے بنانے پر رضامند کر لیا۔ اس کے پاس خاصے پرانے اور بڑا نقد جمع تھے سو کا نوٹ بطور ضمانت رکھنے کے بعد اس نے چائے مع برتنوں کے میرے حوالے کر دی۔

بیس منٹ تک میری نظر رابعہ پر رہی اور کان رات کے سناٹے میں سنائی دی جانے والی آواز پر۔ گاڑی کے سڑک سے نیچے پتھریلی کھائی میں گرنے سے دھماکا ہونا لازمی تھا۔ یہ بھی یقین تھا کہ اس میں آگ لگے گی تو پہاڑی کے پیچھے آسمان روشن ہو جائے گا۔ چائے بنانے والا بھی یہ منظر ضرور دیکھے گا اور دور سے آنے والی گاڑیوں کے مسافر اور ڈرائیور بھی سمجھ جائیں گے کہ کوئی حادثہ ہوا ہے۔

تین منٹ بعد میں چائے لے کر روانہ ہوا ہی تھا کہ دھماکا ہوا۔ میں ٹھٹک گیا "یہ کیسی آواز تھی؟"

چائے والے نے پہاڑی کی طرف دیکھا "گڈا اے کوئی گڈی ڈگ گئی اے۔"

"اوہ۔ یہ شعلے دیکھا نہ صاحب۔ آگ بھی لگی ہے۔"

"چلو جی۔ بندہ کیا کر سکتا ہے۔ جو رب کی مرضی" اس نے قطعی بے حسی کے ساتھ کہا "چائے پی کے برتن رکھ جانا۔ مجھے مت جگانا۔ تھوڑی دیر میں تو اٹھنا ہی ہے۔"

لاہور اور پنڈی کی طرف سے آنے والی اکا دکا گاڑیاں حادثے کی جگہ پر رکنے لگی تھیں۔ لاہور کی طرف سے آنے والے پہلے یہ سمجھے تھے کہ حادثہ ہماری گاڑی کو پیش آیا ہوگا مگر ہمیں اطمینان سے چائے پیتا دیکھ کے آگے بڑھ جاتے تھے۔

غالب اطمینان سے چلتا ہوا نمودار ہوا اور ہمارے ساتھ کھڑا ہو کے چائے پینے لگا۔ پہاڑی کے پیچھے روشنی یہ ظاہر کرتی تھی کہ گاڑی کی آگ خوب بھڑک چکی ہے۔ دس منٹ بعد میں نے چائے کے برتن واپس جھونپڑی ہوٹل میں لے جا کے رکھے تو مالک بے خبر سو رہا تھا۔ اس کی بلا سے ساری دنیا جل جائے۔ جب تک اس کا چھپر محفوظ ہے سب ٹھیک ہے۔ سو کا نوٹ اس نے ضمانت کے طور پر رکھا تھا کہ ہم برتن لے کر نہ بھاگ جائیں مگر اب اس کی نیند سے صاف ظاہر تھا کہ نہ اسے برتنوں کی پروا تھی اور نہ اس کا باقی رقم واپس کرنے کا ارادہ تھا۔

کچھ دیر بعد ہم بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے جو سڑک کے کنارے گاڑیاں روک کے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ حادثہ کیسے ہوا۔ گاڑی میں کتنے لوگ تھے کون تھے وغیرہ وغیرہ۔ عملی طور پر کسی کے کچھ کرنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ہم دیکھ سکتے تھے کہ کار ٹکڑے ٹکڑے ہو کے کتنی گہرائی تک چلی گئی تھی۔ اس کے ٹکڑے سیکڑوں فٹ کی گہرائی تک جگہ جگہ روشن تھے۔ تاریکی میں جلنے والے یہ دیے خود اپنی کہانی کہتے تھے۔ جب کار کا کچھ نہیں بچا تھا تو اندر موجود لوگوں کے بچنے کا کیا سوال۔ یہ بڑا بھیانک اور عجیب منظر تھا۔ کاروں اور ویگنوں میں بیٹھے ہوئے کو شخص ہو عورتیں اور بچے صرف تصور کر سکتے تھے کہ کار کے حادثے میں مرنے والوں کی موت کتنی اذیت ناک ہوگی۔ شاید وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہے ہوں گے کہ وہ محفوظ ہیں اور زندہ ہیں۔ اس راستے انہوں نے زیادہ احتیاط کے ساتھ طے کیا ہوگا۔

ہر گاڑی کے مسافر وہاں دس پندرہ منٹ رک کے دکھ اور افسوس سے سر ہلاتے روانہ ہو جاتے تھے۔ کسی نے پولیس کو مطلع کرنے کا ذکر بھی کیا تو دوسرے نے کہا کہ یہاں پولیس کہاں، پولیس صبح آئے گی جہلم سے یا "محفوظ" تھانے سے۔ انہیں یہاں آ کے ضابطے کی کارروائی کے سوا کرنا ہی کیا ہے۔ ہاں ڈاکٹر یا ایمبولینس کا مسئلہ ہوتا تو ہم ابھی لے آتے۔

ایسی ہی باتیں کر کے ہم نے بھی روانگی کا فیصلہ کیا۔ بلاوجہ تمام وقت پنڈولا کی طرف سے کھٹکا رہا جو کھانا کھا کے سو گیا تھا۔ اسے کچھ آرام ملا تھا۔ یہ اس کا نتیجہ تھا یا شاید وہ مکر کر رہا تھا۔ وہ مجمع کی موجودگی سے فائدہ بھی اٹھا سکتا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ نادر اس کے حلق سے آواز نکلنے سے پہلے ہی پنڈولا کا حشر نشر کر دے گی۔ اسے کر کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔

مجموعی طور پر کسی حادثے کا نظارہ کرنے والوں کی تعداد اور ہی رہتی تھی۔ ایک گاڑی روانہ ہوتی تھی تو ایک رک جاتی تھی۔ یہ تانتا صبح تک ایسے ہی جاری رہتا تھا۔

رابعہ نے گاڑی کو قطار میں سے نکالنے کے لیے کچھ پیچھے کیا ہی تھا کہ ایک جیپ ٹائپ اسٹیشن ویگن تیزی سے آگے نکلی اور اس نے سائڈ دے کر رابعہ کی گاڑی کو ٹکر ماری۔ رابعہ کی گاڑی کا انگارا بال نما کاروز تباہ ہو گیا اور پینٹ کے ساتھ رگڑ کھانے لگا۔

رابعہ نے غصے میں گاڑی بند کی اور باہر اترنے لگی مگر جیپ سے اترنے والوں نے بڑی پھرتی دکھاتے ہوئے اس کا راستہ روک لیا۔ غالب کے اترنے سے پہلے ہی دوسری طرف بھی آ گئے۔

اس دن مجھے پہلی بار فاکس ویگن کی اس خرابی کا شدت سے احساس ہوا کہ اس کے صرف دو دروازے ہوتے ہیں۔ جب تک آگے والے نہ اتر جائیں پیچھے والے بیٹھے رہنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس وقت اتفاق سے آگے بیٹھنے والے دونوں لوگ کے راستہ بنانے والے لوگ نہیں تھے۔ آگے میں ہوتا یا نادر ہوتی تو صورت حال مختلف ہوتی۔ اب میں اور نادر کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اچانک پنڈولا نے بھی آنکھیں کھول کے انگڑائی لی اور اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

www.paksociety.com

وہ سب بچے کچے نوجوان تھے جو اسی کراچی کو ذاتی ملکیت سمجھتے تھے کہ وہ انداز و اطوار سے بدمعاش نظر آئیں۔ لوگ ان سے ڈریں اور ان کو سلام کریں۔ غلطی ان کی ہو تب بھی معافی مانگیں اور اپنی ہو تو جو بھی سزا ملے اسے خاموشی سے قبول کرلیں۔ غالباً یہی ان کے نزدیک عزت کا تصور تھا۔

صرف ایک شخص گاڑی میں بیٹھا ہوا باہر دیکھ رہا تھا اور اس کے انداز میں اتنی بے اعتنائی تھی کہ وہ ہماری طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ اسے قطعی دلچسپی نہیں تھی کہ باہر جھگڑا کیوں ہو رہا ہے اور کس سے ہو رہا ہے۔ جب میری نظر گاڑی کے پچھلے حصے پر گئی تو ان سب کا رویہ مجھ پر واضح ہو گیا۔

قیمتی گاڑی کے پیچھے پیتل کی چمکتی ہوئی گول پلیٹ پر ابھرے ہوئے حروف میں "ایم این اے" لکھا ہوا تھا۔ آگے جھنڈا دیکھ کے میری عقل میں یہ بات بھی آگئی کہ گاڑی کسی وزیر کی تھی اور غالباً وزیر صاحب خود ہی گاڑی میں تشریف فرما تھے۔ باقی ان کے ڈرائیور، باڈی گارڈ وغیرہ تھے۔

پہلے گفتگو پنجابی میں ہوئی تھی۔ رابعہ کا راستہ روکنے والے نے غرا کے کہا "ایسے کہاں جاتی ہو جانی۔ گاڑی میں بیٹھنے کا مطلب یہ نہیں کہ پکی ڈرائیور بن گئی ہو اور اب جسے چاہو ٹکر مار کے بھاگ جاؤ۔"

رابعہ نے کہا "بدتمیزی مت کرو..... اور راستہ چھوڑو میرا۔"

"راستہ چھوڑ دیا تو پھر باقی کیا رہا۔ یہ نقصان تمہارا باپ پورا کرے گا" اس نے اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"دیکھو۔ بکواس مت کرو۔ غلطی تمہاری تھی۔ تم گاڑی سامنے لے آئے۔ نظر نہیں آتا تھا کہ گاڑی نکل رہی ہے۔"

"بڑی تیکھی ہے بھئی۔ ہمیں کہہ رہی ہے کہ غلطی ہماری ہے۔"

دوسری طرف والا بھی کم نہیں تھا۔ غالب نے اسے دھکیل کر دور کرنے کی کوشش کی مگر اس نے دروازے کو دبائے رکھا "بیٹھا رہ اپنی جگہ پہ۔"

"جب تک ہمارا نقصان پورا نہیں ہوگا، ہم جانے نہیں دیں گے۔ گاڑی چلانے سے پہلے ڈرائیور کو دیکھ لینا چاہیے کہ پیچھے سے کوئی گاڑی تو نہیں آرہی ہے۔" پہلے نے رابعہ سے بحث جاری رکھی۔

غالب نے کہا "یار باہر آکے دیکھیں گے پہلے پھر بات ہوگی۔ ایسے راستہ روکنے کا کیا مطلب ہے آخر؟"

"ارے گاڑی کا بیڑہ غرق کردیا تیری زنانی نے۔"

رابعہ نے کہا "ذرا ہوش میں رہو۔ یہ بھائی ہے میرا۔"

نادر نے ساری توجہ استاد پیڈرو پر مرکوز کردی تھی اور غالباً اسے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ وہ اپنی جان سے کھیلنے کی کوشش نہ کرے۔ خود پیڈرو سمجھتا تھا کہ شور مچانے سے فائدہ نہیں ہوگا۔ ہم تو ڈو بجے کے نکل ہی جائیں گے۔ خمیازہ بعد میں اسے بھگتنا پڑے گا پھر شاید خطرہ محسوس کرتے ہوئے اس نے پیڈرو کو ناک آؤٹ کردیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ زیادہ نقصان رابعہ کی گاڑی کا ہوا تھا۔ وزیر کی گاڑی ویسے بھی سرکاری تھی اور وہ خود بھی صاحب حیثیت تھے۔ مرمت اور رنگ و روغن کے لیے وہ گاڑی کو باہر بھیج سکتے تھے اور ایسے بھی کم نہ تھے جو اپنا کام نکالنے کے لیے خدمت کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے لیکن غلطی رابعہ کی تھی۔ اسے روڈ پر آنے سے پہلے دیکھ لینا چاہیے تھا کہ پیچھے سے کوئی گاڑی تو نہیں آرہی ہے۔ یہ ہائی وے تھی اور یہاں گاڑیاں تیز رفتاری سے گزرتی تھیں۔ کوئی ڈرائیور کیسے اندازہ لگا سکتا ہے کہ سائیڈ میں کھڑی ہوئی گاڑی اچانک چل پڑے گی اور یوں اس کے سامنے آجائے گی کہ اسے بریک لگانے کے لیے وقت ہی نہیں ملے گا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ ہم نقصان پورا کریں گے۔ ہم سے غلطی ہوئی لیکن تم پہلے انہیں باہر نکل کے وزیر صاحب سے بات کرنے کا موقع دو۔"

"وزیر صاحب سے پہلے ہم بات کریں گے۔ ملک صاحب ہر ایرے غیرے کو منہ نہیں لگاتے۔"

میں نے کہا "تمہیں معلوم ہے یہ کون ہیں؟"

اب رابعہ نے کہا "ہو۔ یہ میرا کارڈ دو وزیر صاحب کو۔ میں رابعہ قادری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ہوں۔"

صورت حال ایک دم بدل گئی۔ بدمعاش اپنی ساری بدمعاشی بھول گئے اور کسی قدر بدحواس ہو کے پیچھے ہٹ گئے۔

میں نے رابعہ کے کان میں کہا "گاڑی پیچھے کرو اور فرار ہو جاؤ۔"

رابعہ نے حیرانی سے کہا "اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے اسی لیے کہہ رہا ہوں۔ جلدی سے نکلو۔"

رابعہ نے دروازہ بند کرکے ایک دم گاڑی کو پیچھے کیا اور پھر اس سے پہلے کہ وزیر صاحب کا ڈرائیور اور باڈی گارڈ سامنے آتا اس نے گاڑی کو بڑے خطرناک انداز میں نکال لیا۔ جو رابعہ کا راستہ روکے کھڑا تھا اس نے بھی خود کو بڑی مشکل سے بچایا ورنہ کاس ویگن کا باہر نکلا ہوا گارڈ اسے چھو جاتا تو وہ سڑک پر گرتا۔

میں نے انہیں مشتعل ہو کے گاڑی میں بیٹھتے دیکھا۔ ابھی تک وہ کارڈ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ نہیں پائے تھے۔ انہوں نے یہی سمجھا کہ ہم انہیں چکر دے کر نکل گئے۔ انہوں نے کارڈ کو وزیر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے سے زیادہ ضروری یہ سمجھا ہوگا کہ پہلے مجرمان کا تعاقب کرکے انہیں گرفتار کیا جائے۔ وکیل بھی ہوگی تو اپنے گھر کی۔ اس کا بھی دماغ درست کردیں گے۔

رابعہ نے کہا "وہ لوگ پیچھے آرہے ہیں۔"

غالب نے بھی کہا "آنے دو۔ وہاں مجمع لگ جاتا۔ یہاں نمٹ لیں گے ان سے بھی اور وزیر صاحب سے بھی۔"

"یہ میں بھی چاہتا تھا۔ شرافت کی زبان ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اب تم رفتار کم کرو اور گاڑی ایک طرف روک کے نیچے اتر جاؤ تاکہ میں باہر نکل سکوں۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "کیا فائدہ جھگڑے سے۔ دے دو ان کو جتنے پیسے مانگتے ہیں، غلطی میری تھی۔"

"بات غلطی کی نہیں، غلطی پر ہم معذرت کرلیتے اور نقصان بھی پورا کردیتے مگر وزیر ہوتا ہے عوامی نمائندہ، کوئی فرعون نہیں۔ یہ بات اسے بھی سمجھا دیں اپنی زبان میں۔"

غالب نے کہا "اس کے لیے یہ نقصان کیا ہے۔ ایسی تو درجن گاڑیاں ہوں گی اس کے پاس اور سب سرکاری خرچ پر چلتی ہوں گی۔"

دیوہیکل گاڑی پھر ہمارے سامنے آکے ٹھہر گئی لیکن اب میں اور غالب ان کا استقبال کرنے کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ شاید انہوں نے بھی سمجھ لیا تھا کہ ہم وہاں سے کیوں فرار ہوئے تھے اور پھر رک کر ان کا انتظار کیوں کر رہے تھے۔

میں نے غالب سے کہا "تم مت بولنا۔ بس تماشا دیکھنا۔"

وزیر کے ایک محافظ نے ریوالور نکال لیا تھا۔ "اچھا ہوا جو خود ہی رک گئے تم۔ بھاگ کے کہاں جاسکتے تھے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "ہم تو بہت دیر سے کھڑے ہیں یہاں۔ ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا۔"

دوسرا بولا "تو بڑا غلطی مان کے نقصان پورا کرنے کی بات کر رہا تھا۔ غلطی سے بچے... ہمارے ساتھ چالاکی۔"

میں نے ایک دم اس کی کلائی پکڑ کے جھٹکا دیا اور اسے گھما کے اپنے سامنے کرلیا "اب چلاؤ گولی، دیکھتے ہیں تم کتنے چالاک ہو۔"

ہیمر لاک کی وجہ سے میرے سامنے ڈھال بننے والا بڑی اذیت میں تھا اور اپنے بھاری بھرکم جسم کے باوجود خود کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش میں ناکام تھا۔ دوسرا باڈی گارڈ اپنے ساتھی کی مدد کے لیے آگے بڑھا تو میں نے پہلے کو اس پر یوں دے مارا کہ وہ دونوں ایک ساتھ سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔ ایک لمحے کے لیے ریوالور والے کی توجہ اپنے ساتھیوں کی طرف ہوگئی۔ میں نے اسی لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گھوم کے اس کے ہاتھ پر کک ماری۔ غالب نے کہا "بھئی سبحان اللہ۔"

ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اڑتا ہوا نیچے گہرائی میں گم ہو گیا۔ اس نے ایک زوردار ہائے کی اور اپنا ہاتھ پکڑ کے ناچنے لگا۔ غالباً اس کی کلائی ٹوٹ گئی تھی۔ غالب نے کہا "بھئی کیا ڈانس ہے۔"

"کتنا نقصان ہوا ہے؟" میں نے کہا "لاؤ میں پورا کروں۔"

ایک ساتھ گرنے والے باڈی گارڈز غضب ناک ہو کے ایک ساتھ اٹھے اور مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ میں نے غوطہ مار کے ایک کو سیدھا گزرنے کا موقع دیا اور دوسرے کو پیٹ میں ٹھڈا مار کے تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور سر کے اوپر اٹھا کے وزیر صاحب کی گاڑی پہ دے مارا۔ غالب نے تالی بجا کے کہا "بھئی بہت خوب۔"

جو شخص اپنے زور میں سیدھا گزرا تھا وہ سڑک کے ساتھ لگی ہوئی جھاڑی میں گر گیا تھا۔ جھاڑی نہ ہوتی تو وہ نیچے لڑھک جاتا۔ اس نے ہمت کرکے پھر میری طرف رخ کیا۔ اپنے ساتھیوں کا حشر دیکھنے کے باوجود نمک خواری کا تقاضا یہ تھا کہ وہ مزید مار کھائے۔ اپنی جان پر کھیل جائے مگر وزیر صاحب کو اپنی وفاداری کا یقین دلا دے۔ ایسے مواقع روز کہاں آتے ہیں بلکہ زندگی میں ایک بار ہی آتے ہیں۔

میں نے تیسرے کو اس کی قابل رحم حالت کے باوجود پہلے یوں الٹ دیا کہ زمین آسمان اس کی نظر میں گھوم گئے ہوں گے۔ پھر اس کی ٹانگ پکڑی اور اسے یوں گھمایا جیسے ہیمر تھرو والے گولے کو دائرے میں گردش دیتے ہیں۔ وہ سمجھا کہ میں ابھی اچانک اسے چھوڑ دوں گا تو وہ پتا نہیں کتنی دور تک اڑتا ہوا جائے گا اور کس جگہ گرے گا۔ اگر وہ گاڑی سے ٹکراتا تو اس کا سر پاش پاش ہو جاتا اور میں اسے گہرائی کی طرف روانہ کردیتا تو اس کا انجام زیادہ برا ہوتا۔ وہ چلانے لگا۔ غالب نے قہقہہ مار کے کہا "بھئی ماشاء اللہ کیا آواز پائی ہے۔"

بالآخر وہی ہوا جس کا مجھے انتظار تھا۔ وزیر صاحب نے دو منٹ کی یہ کارروائی بڑے غور سے ملاحظہ فرمائی تھی اور متاثر ہوئے تھے۔ جان نثاروں کی جان بھی چلی جاتی تو وہ متاثر نہ ہوسکتے۔ یہ ان کا کام تھا اور ضرورت پڑنے پر انہوں نے صرف اپنی نااہلی ثابت کی تھی۔ انہوں نے گاڑی سے باہر آکے ایک شان استغنا کے ساتھ ہاتھ اٹھایا جس کا مطلب تھا کہ بس۔

میں نے آگے بڑھ کے ان سے ہاتھ ملایا "غالباً آپ کوئی وزیر ہیں۔" میں نے کہا "میں سب وزیروں کو پہچانتا نہیں۔"

اس نے کہا "پہچاننا چاہیے۔"

"دراصل میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ آدمی خود اپنی پہچان بن جاتا ہے۔ مگر عہدے یا وزارت سے نہیں، یہ تو آنی جانی چیزیں ہیں۔"

"میں ملک خداداد عباسی ہوں۔ صوبائی وزیر جنگلات۔"

میں نے درمیان میں غالب سے کہا "بھئی ان کا مال گاڑی میں ڈال دو۔ ٹوٹا پھوٹا جیسا بھی ہے۔ مرمت یہ خود کرالیں گے۔ ہاں جی! کون سا محکمہ بتایا آپ نے؟"

اس نے کہا "جنگلات۔"

"پھر تو یہ سارا علاقہ آپ کا ہی ہوا۔ خیر جی ہم تو رہتے ہیں شہر میں۔"

وہ مجھ سے متاثر نظر آرہا تھا اس لیے کسی بات کا برا نہیں مان رہا تھا۔ "کرتے کیا ہو؟" اس نے مسکرا کے کہا۔

www.paksociety.com

"کچھ بھی — جو کام مل جائے۔ کام تو دیکھا آپ نے؟"
وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "کام اچھا ہے۔ کتنا کما لیتے ہو اس طرح؟"
میں نے پیشہ ور گھریلو کلاس بدمعاشوں کی عاجزی اختیار کی "آپ اگر تیکس والوں کو پیچھے لگا دیں گے بس گزارا ہو جاتا ہے۔"
"آج کل کس کے لیے کام کر رہے ہو؟" اس نے مجھے پچ یا کرانے کا بدمعاش سمجھ لیا تو مجھے افسوس ہوا کہ کیا میں شکل سے شریف نظر نہیں آتا۔
میں نے کہا "یہ وکیل صاحب ہیں۔ کچھ لوگ ان کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ ایک کو تو پکڑا یا ہوں میں۔ باقی کے بارے میں یہ خود بتا دے گا۔"
"کون وکیل؟"
میں نے کہا "یہ لڑکی جو گاڑی چلا رہی تھی۔ اس نے اپنا کارڈ بھی دیا تھا آپ کے بندوں کو۔ وہ شاید پڑھنا نہیں جانتے۔ بہت نامور وکیل ہے یہ لاہور کی۔"
"کمال ہے" اس نے دلچسپی سے کہا "صورت سے تو یہ ناول یا فلم کی ہیروئن لگتی ہے۔ ایسی وکیل پہلی بار دیکھی ہے۔ باقی لوگ کون ہیں جو ساتھ ہیں؟ اس کی فیملی کے لوگ ہوں گے۔ شوہر وغیرہ۔"
"اس نے شادی نہیں کی ابھی۔"
وزیر صاحب کی دلچسپی مزید بڑھ گئی "اچھا بھئی یہ لو میرا کارڈ۔ اگر دل چاہے تو ہم سے کوئی بڑی ڈیل لینا۔ تمہارے جیسے بندے کی ہم بڑی قدر کرتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ رہو گے تو فائدہ ہو گا۔"
"مگر ایسے آپ کی کوٹھی میں کون گھسنے دے گا مجھے؟"
وہ مسکرایا "اس کے پیچھے میرے دستخط ہیں۔ دستخط والا کارڈ جس کے پاس ہو وہ کسی بھی وقت مجھ سے مل سکتا ہے۔ نام کیا ہے تمہارا؟"
"بہادر۔ بہادر علی" میں نے کہا۔
"بالکل اسم بامسمیٰ ہو۔ تم نے تو ہمارے بندوں کا حلیہ اتنا بگاڑ دیا ہے۔ اتنا تو گاڑی کا حلیہ نہیں بگڑا۔ خیر تم وکیل صاحب سے کہنا کہ۔"
میں نے کہا "آپ خود ہی کہہ دیں جو کہنا ہے۔"
اس نے سر ہلایا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا کار تک گیا۔ وزیر کے ساتھی پٹنے کے بعد اٹھ کے گاڑی میں بیٹھ چکے تھے مگر شرمندگی سے زیادہ ان کی صورت سے پریشانی عیاں تھی۔ میری وجہ سے پہلے ان کی زندگی خطرے میں پڑی تھی۔ اب نوکری خطرے میں تھی۔ مگر وہ مجھے خونی انجام نظروں سے گھورنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔
عباسی نے بڑی شائستگی سے رابعہ کو مخاطب کیا "خاتون میں پنجاب کا وزیر جنگلات عباسی ہوں۔"
رابعہ بولی "آپ ہی کے جنگلی ساتھ رہتے ہیں آپ کے؟"
وہ ہنسا "مجھے افسوس ہے کہ انہوں نے آپ کے ساتھ بد تمیزی کا مظاہرہ کیا۔ دراصل ہمیں بھی اپنی حفاظت کے لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے۔"
"لیکن آپ تو عوامی نمائندے ہیں۔" رابعہ بولی "عوام سے آپ کا رابطہ ہونا چاہیے۔ ایسے لوگوں کا نہیں جو بیچ بھی نہیں پہنچنے کر کسی سے مخاطب ہیں۔ ایسے محافظ رکھیں گے تو آپ کی ساکھ۔" رابعہ غصے میں تھی۔
"میں نے کہا ناکہ غلطی ہوئی ان سے۔ آپ کی گاڑی کا نقصان کی ذمہ داری میری۔ جہاں سے چاہیں ٹھیک کرا لیں اور بل مجھے بھجوا دیں۔ میں نے بہادر علی کو کارڈ دے دیا ہے۔ اس کے ساتھ آئیے غریب خانے پر۔ اچھا خدا حافظ۔" اسے اچانک اپنے مرتبے کا خیال آگیا۔
رابعہ کو میں پیچھے سے اشارہ نہ کرتا تو وہ بول پڑتی کہ کون بہادر علی۔ جب وزیر اپنی شاہی سواری میں بیٹھ کے رخصت ہو گیا تو رابعہ مجھ پر برس پڑی "کیا یہ سب ضروری تھا؟"
میں نے کہا "دیکھو کیسے سب ٹھیک کر لیا میں نے۔ ان کی دھول بھی جھاڑ دی اچھی طرح۔ تمہاری گاڑی ٹھیک کرانے کا بندوبست کرا دیا۔ شاندار رزلٹ چیک کراؤ سرکاری خرچ پہ۔"
"جی نہیں۔ میں خود بھی افورڈ کر سکتی ہوں۔"
غالب نے کہا "وہ کون سا اپنی جیب سے دے گا۔ سکندر عقل سے کام نہ لیتا تو الٹا تمہیں سرکاری گاڑی کی مرمت کا خرچہ دینا پڑتا۔"
"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کون سی عقلمندی ہے۔ جب بات ختم ہو سکتی تھی ایسے ہی تو مار پیٹ کی ضرورت کیا تھی۔"
"ان کی خر دماغی کا علاج ضروری تھا" میں نے کہا۔
"تم ایک کلینک کھول لو۔ اس پہ لکھوا دو کہ یہاں خر دماغ افراد کا دماغ درست کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر بہادر علی۔"
"اب گاڑی چلاؤ گی یا سنگر کی بیوی کی طرح زبان ہی چلاتی رہو گی۔"
رابعہ نے گاڑی آگے بڑھائی "یہ وضاحت کر کے کیا فائدہ ہوا کہ آپ پروفیشنل بدمعاش ہیں؟"
"تم نے دیکھا نہیں۔ وزیر جنگلات کتنا متاثر ہوا۔ انہیں ایسے لوگوں کی ضرورت رہتی ہے۔"
"اور تم اب ان کے لیے کام کرو گے؟"
"بے وقوف لڑکی۔ وزیر کی دشمنی سے وزیر کی دوستی اچھی۔"
"دونوں خراب۔"
میں نے کہا "میرا مطلب تھا کہ چوائس کرنا ہے تو دوستی دشمنی کے نقصانات سے بچا جا سکتا ہے۔ یہ کرسی ہمارے کام آئے گی کیونکہ یہ جاہل اور احمق گھمنڈی ہے اور امیر ہے۔"
غالب نے سر ہلایا "خاص طور پر اگر تم چاہو۔ مدعو کیا ہے اس نے تمہیں۔"
نازو "غالب۔ میں لعنت بھیجتی ہوں اس کی وزارت، امارت اور اس پہ۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں میں ایسے لوگوں کو اور ان کے ارادوں کو۔"
نازو نے کہا "ٹھیک کہا تم نے۔ حسین عورت دیکھتے ہی رال ٹپکنے لگتی ہے۔"
غالب کچھ کچھ کر کے ہنسنے لگا "حسین عورت۔ اسے کہتے ہیں اپنے منہ میاں مٹھو۔"
نازو نے جھینپ کے کہا "میں اپنی بات نہیں کر رہی تھی۔ مگر بھی کیسے لگتی ہو۔ تمہیں دیکھتے ہی وہ بے جل تو جلال تو بچاتا ہوا بھاگے گا۔ جیسے بھوت یا چڑیل کو دیکھ کے ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے نذیر کی۔"
"بابے سے بات کر رہا ہوں میں" میں نے کہا۔
"اس وقت تک پیچھے نظر نہیں پڑی ہوگی اس کی۔ بعد میں جو سر کاپڑ گیا تھا۔ فقیر کب سے چاپ رہا تھا۔ بے چارہ۔"
"مو ہتے رہو۔ میں نہیں سن رہی" نازو نے چڑ کے کہا۔
"میں کب تمہیں سنا رہا ہوں۔ میرا مسئلہ ہونا سامنے تو اسے ساری ٹھوڑی کر کے توڑ دیا تو اس نے یہ دشمنی کیوں کی مجھ سے منہ چڑا یا کہ میں بھوت ہوں۔ بھوتوں کے خاندان میں کوئی الو کا پٹھا نہیں تھا کہ بلا میرے سر منڈھ دی۔"
"غالب۔ غالب۔ حد سے مت بڑھو۔ پھر ابا کو بھوت کہا تھا؟"
"ابا بھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ میں نہیں سن رہی مگر بھی سب سن رہی تھیں چوری چوری تو یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں سکندر سے مخاطب ہوں۔ کیا تم بھوت کی بچی؟"
"پھر کس کی بات کر رہے تھے آخر؟"
"میں نے جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔ تم بھوت کی بچی ہو۔ نہیں تو پھر بتاؤ کیوں ہو۔" غالب بولا "یار سکندر۔ ایک بار بچپن میں عید کی نماز پڑھنے میں بادشاہی مسجد گیا اور بھیڑ میں ابا سے بچھڑ گیا۔ لوگوں نے مولوی صاحب کے پاس پہنچا دیا اور انہوں نے اعلان کرایا کہ ایک بچہ اس حلیے کا روتا ہوا ملا ہے۔ جس کا بچہ ہے وہ لے جائے۔ ابا آئے اور لے گئے۔ انہوں نے تو کسی سے جھگڑا نہیں کیا اعلان کرنے والے کو کہ جن کا بچہ کیوں کہا؟"
نازو ہنس پڑی "یہ اتنا لطیفہ ہے؟"
"مجھے ہنسنے والا ہے بے وقوف" غالب نے پیچھے پلٹ کے کہا "ذرا اپنے بارے میں بھی سوچا کرو۔"
اس کا موڈ پھر خراب ہو گیا "جیو لیں سب بھوت کھاریں؟"
غالب سیدھا ہو کے بیٹھ گیا "تم نے دیکھا سکندر۔ اسے پھر شک ہو گیا کہ میں سیدھا اسکار کرنا چاہتا تھا۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔"
"سچ، اگر عورت ہو بھی" میں نے کہا۔
"اس کی باتوں میں تنکوں والی جھاڑو" غالب نے کہا۔
میں نے کہا "رابعہ بہت غصے میں ہے ابھی تک۔ ایسی حالت میں ذرا زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ دوسروں کے حق میں۔"
"ہاں مجھے غصہ آ رہا ہے۔ تم اب بہادر علی بننے کے چکر میں ہو بلاوجہ" رابعہ بولی "ہم اس لیے نہیں آئے تھے یہاں۔ تم اس جنگلی وزیر جنگلات سے ملنے تو ٹھیک نہیں ہو گا۔"
"وہ تم سے ملنے میں زیادہ INTERESTED تھا۔" میں نے زور سے کہا "آخر جذبات تو وزیر کے بھی ہو سکتے ہیں۔"
"وہ نیک بھی ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے وہ جنگل کی کسی کٹیا میں رہتا ہو۔ رات دن عبادت کرتا ہو۔ بادشاہ کا گزر ہوا ادھر سے تو وزیر بنا دیا۔"
"یا جنگل کا بادشاہ ہو۔ وزیر اعظم نے کابینہ میں لے لیا۔ اور وہی قلمدان دے دیا جو اس نے جنگل کے جنگل صاف کر کے بنایا تھا۔ ایک دن جنگل میں اس نے دیکھ لیا ایک شہزادی کو۔ وہ ہزار جان سے فریفتہ ہو گیا۔"
"شہزادی کے ساتھ اس کی سہیلی کے روپ میں ایک بد روح بھی تھی" غالب نے کہانی کو آگے بڑھایا۔
"چپ کرتے ہو یا نہیں" نازو نے پیچھے سے اس کی گدی پر ہاتھ مارا۔
غالب نے زور سے کہا "اللہ" اور پھر ایسے گردن ڈھلکا دی جیسے اس کا منکا ٹوٹ گیا ہو اور ساکت ہو کے پڑ گیا۔
"مکار" نازو بولی۔
میں نے تشویش سے کہا "نازو۔ یہ کوئی بات نہیں لگتی مجھے۔ ذرا دیکھو۔"
نازو کا رنگ فق ہونے لگا "غالب۔ اے غالب۔"
غالب کی گردن دوسری طرف لڑھک گئی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی اور بالکل ساکت تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی اداکاری کو سراہا۔
"رابعہ۔ گاڑی روکو۔ کچھ گڑبڑ لگتی ہے مجھے۔"
نازو بدحواس ہو گئی "غالب۔ ہوش میں آؤ۔"
میں نے کہا "تم بھی غصے میں پاگل ہو جاتی ہو۔ بغیر دیکھے ہاتھ چلانے کی عادت بہت بری ہے۔ یہ تو ہونا تھا ایک دن۔"
نازو رونے لگی "سکندر۔ میں نے تو بہت آہستہ سے مارا تھا۔"
رابعہ نے اسے ڈانٹا "بے وقوف۔ کن کی باتوں میں آ رہی ہو۔ رونے کے بجائے نبض دیکھو اس کی۔"
نازو نے فوراً غالب کا ہاتھ پکڑ لیا "راضی۔۔۔"

www.paksociety.com

غالب نے خوابیدہ لہجے میں کہا "کوئی فائدہ نہیں۔ نبض رکی ہوئی ہے۔" اور پھر قہقہہ مار کے اٹھ بیٹھا۔

"یہ تو حال ہے عقل کا" میں نے کہا۔

نازو کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے "غالب ایسے مت ڈرایا کرو مجھے اگر میرا ہارٹ فیل ہو جاتا پھر۔"

"میں دل کو بند ہرگز نہ ہونے دیتا۔ اس دل میں تو میں رہتا ہوں۔" اس نے تسلیم بجالا کے کہا "کیسا زور دار ڈرامہ تھا یہ"

رابعہ نے اسے ملامت کی "وہ رو رہی ہے۔ تم دانت نکال رہے ہو۔"

"پھر کیا میں بھی ساتھ ہی رونا شروع کردوں۔ ابھی ایک چھانپڑ رسید کروں گا تو چپ ہو جائے گی۔"

میں نے بھی کہا "حد ہے نازو۔ اتنا کمزور ہے تمہارا دل؟"

نازو کا رد عمل محض جذباتی دیوانگی تھا۔ یہ دیوانگی محبت کی تھی ورنہ جو مارشل آرٹ میں تھوڑی بہت مہارت رکھتا ہو وہ بھی حریف پر وار کرتا ہے تو ناپ تول کر اور اسے وار کی نوعیت، شدت اور نتائج کا اتنا ہی صحیح اندازہ ہوتا ہے جتنا آرٹلری کے کسی ماہر کو توپ سے نکلنے والے گولے کی رینج، ہدف اور تباہ کاری کے دائرے تک بقول شاعر، مرگیا صدمہ یک جنبش لب سے غالب ایسا صرف ایک ہی حالت میں ہوتا ہے یعنی پھر غالب کی زبان میں کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔

آداز اذاں کے ساتھ ہم نے سواں ندی کا پل پار کیا اور ایوب نیشنل پارک کے ساتھ ہی راولپنڈی کا علاقہ شروع ہو گیا۔ ایوان صدر اور اس کے مقابل سڑک کے دوسری جانب کافی فاصلے پر ای او ڈی کی ہیرک نما عمارات نظر آرہی تھیں۔ سڑکوں پر ابھی لائٹس جل رہی تھیں۔ صبح دم اٹھنے والوں میں دو ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کو فکر آخرت سحرخیزی پر مجبور کرتی ہے۔ دوسرے وہ جو فکر معاش میں نکلتے ہیں۔ اس جہان کا غم اس جہان کا غم، غم جاناں، غم دوراں۔ یہی انسان کا مقدر ہے اور اس کی زندگی کا محور۔

نازو اب کچھ شرمندہ اور چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ پیڈرو پھر ہوش میں آگیا تھا۔ اس کے سامنے غالب کے لیے نازو کو پورے آداب دلبری کے ساتھ منانے کا موقع نہ تھا اور خیر سے مرزا غالب بھی بڑی بے نیازی سے سر پیچھے کیے سونے جاگنے میں مصروف تھے۔ نازو کے نزدیک یہ بے حسی تھی کہ مذاق کرلیا، رلا دیا اور پھر سو گئے۔ کیا اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اتنے بے وقعت تھے۔

رابعہ کا موڈ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اس نے مجھے بڑے طنزیہ لہجے میں مخاطب کیا "جناب کی نیند میں خلل ہونے کی اجازت ہو تو عرض کروں؟"

میں پوری طرح جاگ رہا تھا مگر میں نے غنودگی میں کہا "اجازت نہیں ہے۔"

اس نے گاڑی روک کے بند کی اور دیا۔ غالب ... "سخت بد تمیز ہیں آپ دونوں۔ کیا یہ فرض ہے ... تک میں نے ڈرائیونگ کی ہے۔ کسی کو خیال نہیں ... گئی ہوں۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اچھا! کیا تمہیں خیال ... تھک گئی ہو؟"

رابعہ نے کہا "نازو۔ تم بھی آجاؤ باہر۔ یہ سوتے رہیں ... سے۔"

غالب نے بھی کاہلی سے کہا "اچھا بھئی خدا حافظ ... پھر نہیں جانا نہیں۔ اور ذرا خیال رکھنا۔ تو بچے سے پہلے ... نہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اور جگانے سے پہلے ... نازو نے غالب کو آگے دھکیلا۔ "تم خود ہی باہر نکل ... پھینک دوں؟"

"بڑی مہربانی ہوگی اگر تم ہی یہ کام کردو۔ مجھے واقعی ... ہے؟"

رابعہ نے دوسری طرف کا دروازہ باہر سے کھول دیا ... انہیں باہر۔ لڑھکا دو سیٹ پر سے۔"

غالب کھسک کے ڈرائیونگ سیٹ پر ہو گیا "تم واقعی ... سے بھری بیٹھی تھیں۔ چلو اب تم آرام کرو۔ گاڑی میں چلاتا ... اور بلاوجہ معافی بھی مانگ لیتا ہوں کہ تمہارے ساتھ ... تھے۔ تم سے کسی نے پھوٹے منہ نہیں پوچھا کہ چلو اب تم ... کرو۔ آخر تم بھی انسان ہو۔"

میں نے کہا "ہم یہ بھی بلاوجہ مان لیتے ہیں..." ... رابعہ نے بیٹھ کے کہا "اب جہاں جانا ہے چلو۔ پنڈی ... گئے۔"

غالب نے سوچ کے کہا "کہاں چلیں؟ کسی ہوٹل میں ... سکتے۔ یہاں کسی کے ماں باپ کا پتہ بھی نہیں ... کوئی دوست نہیں۔ اتنی صبح کہیں کرائے کا مکان بھی نہیں مل سکتا۔"

میں نے کہا "یہ مسئلہ بہادر علی حل کرسکتا ہے۔"

رابعہ سمجھ گئی "اس وزیر جنگلات کی بات مت کرنا۔"

"تم بھی بعض اوقات بچوں کی طرح ضد کرتی ہو۔ ایک ... ضرورت ہے جو وہی پوری کرسکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم اس ... گھر میں قیام کریں اور بعد میں بھی تعلق رکھیں۔ اس ... گھر پہنچ چکا ہوگا۔ کچھ دیر بعد شاید سو جائے گا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ فوراً کسی مکان کی چابی ... کر جائزہ لیں گے۔ باپ کا گھر سمجھ کے رہو۔" غالب نے کہا۔

"بھائی وزیر کو کیا سمجھتے ہو تم؟ ملک کے اصل مالک تو ... ہیں وہ تو گھر خالی کرا کے بھی دے سکتا ہے۔ ایک ...

... کے سوا کیا کرتے ہیں یہ لوگ۔ اصل چراغ کا جن تو ان ... ذرا سی کوشش کرنے میں کیا حرج ہے آخر۔"

... اس نے کہا کہ کوٹھی حاضر ہے۔ مہمان خانہ کھلوا دیتا ... کے لیے" رابعہ نے تلخی سے کہا "اتنی بڑی کوٹھی میں جگہ ... نواب کا پسند ہو۔ وہ کھلوا دی جائے۔"

... نے کہا "تم خواہ مخواہ اتنا REACT کررہی ہو۔ اول تو ... جانا نہیں۔ بات میں کروں گا اور جانا پڑے تو ڈرنے ... بات ہے۔ وہ تمہیں کھا تو نہیں جائے گا۔ کسی اسکول گرل کی ... BEHAVE مت کرو جس نے پہلی بار کسی دفتر میں ملازمت ... قدم رکھا ہو۔ وہ وزیر ہے تو تم بھی بڑی توپ چیز ہو۔ وہ کل ... رہے نہ رہے۔ تم سپریم کورٹ کی وکیل بن جاؤ گی۔ کیا پتا ہائی ... میں جج ہو جاؤ۔ بابا عقل سے کام لو اور اسے استعمال کرو۔ ... لڑکیوں کو استعمال کرتے ہیں، ان کے جذبات سے کھیلتے ...

... میں بھی اس کے جذبات سے کھیلوں؟ تم یہ مشورہ دے ... رہے ہو مجھے؟"

... ہرگز نہیں۔ مجھے تو اس کا تمہیں یوں دیکھنا ہی اچھا نہیں لگا ... نے کہا "لیکن یوں تو نہ جانے کتنے لوگ تمہیں دیکھتے ہیں۔ ... والوں کی بات نہیں، لاکھوں ہوں گے۔ سچی بات کڑوی ... ہوگی۔ حسین صورت نظر آئے تو کیا ہم نہیں دیکھتے؟ مگر ہر ... اس جرم میں سزا نہیں دی جاسکتی کہ اس نے تمہیں یا نازو کو ... کیا بری نظر سے کیوں دیکھا۔ ایسا ہونے لگے تو ہم عادی مجرم ... شمار ہوں گے اور اکثر سزا کاٹیں گے۔"

"کتنی ڈھٹائی سے اعتراف جرم کررہے ہو" نازو نے کہا۔

"... دیکھتی تم بھی ہو۔ مگر مانو گی نہیں۔ فلم اسٹار اور کرکٹر ... لاکھوں نظر آتے ہیں ہم سے زیادہ وجیہہ اور خوبرو۔" ...

... نے کہا "مرزا جی۔ یہ میں نہیں مان سکتا۔"

رابعہ خوش ہو گئی "سکندر نے کی نا پتے کی بات۔ ہم کسی کو نہیں ... "

... نے کہا "خاتون۔ حسب معمول آپ نے غلط سمجھا۔ میں ... نہیں مان سکتا کہ ہم سے زیادہ وجیہہ اور خوبصورت بھی ہو سکتے ..."

غالب نے کمی کم کرکے مصنوعی ہنسی سے نازو کو چڑایا۔ نازو ... کے صبح کی خنکی اور لطیف ہواؤں میں لمبے لمبے سانس لے ... ایوب نیشنل پارک کے گھنے جنگل جیسے میلوں تک پھیلے ... سرسبز و شاداب علاقے میں پرندوں کا ملا جلا شور گونج رہا تھا ... خالص شفاف خوشبو تھی جو خالص تھی اور قدرت کے ہاتھوں کی ... کثافت کی خوشبو تھی۔ یہ رات کی نمی کی خوشبو تھی جو ... کے ہر پتے سے پھوٹ رہی تھی اور صبح کے اجالے کی خوشبو تھی جو فرش خاک پر گل کاری کرنے والے سبزے سے اٹھ رہی تھی۔ اس میں انسان کی شامل کردہ کثافت نہیں تھی۔ پٹرول اور ڈیزل کے دھوئیں کی بو، کارخانوں میں استعمال ہونے والے کیمیکلز کی بو اور سیوریج کی بو۔

اب صرف پیڈرو گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خلاف معمول خاموش تھا اور کچھ افسردہ بھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے چوہدری دلاور کی سنگدلانہ خود غرضی اور بے وفائی کا دکھ ہے۔ اس نے پیڈرو کو اپنی جان کا صدقہ سمجھ کے قربان کردیا تھا اور اسی طرح ہمارے حوالے کردیا تھا جیسے لوگ کالے بکرے کو قصاب کے سپرد کردیتے ہیں۔ اسے یہ احساس بھی ہوگا کہ خوش قسمتی کے ستارے ڈوب جائیں تو اندھیرے میں امید کی کرن کو بھی راستہ نہیں ملتا۔ شاید وہ ذہنی طور پر یہ تسلیم کرچکا تھا کہ اب جدوجہد سے رہائی کی کوشش سے کچھ نہیں ہوگا لیکن ہم سے تعاون کرکے اور معافی مانگ کے اس کی جان بچ سکتی ہے۔

میں خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ پیڈرو کچھ بتائے بغیر مرجائے۔ سب سے پہلے تو اسے وزیر خان کے بارے میں وہ سب بتانا تھا جو میرے لیے ابھی تک ایک راز سربستہ تھا۔ جب میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت گیا تھا تو وزیر خان ایک صحت مند اور خوش و خرم، مطمئن اور پرسکون زندگی گزارنے والا شفیق باپ تھا، تلخی حالات اور حادثات اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے۔ جب میں واپس آیا تو وہ ایک قبر تھا۔ پختہ اینٹوں کی بے حس خاموشی پر لوح مزار وہ کتبہ تھا جس پر وزیر خان کے نام اور اس کی تاریخ وفات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وزیر خان صرف ایک نام نہیں تھا۔ وہ ایک عہد تھا۔ میرا ماضی تھا اور میری شناخت تھا۔ پھر وہ ایک قبر بھی نہیں رہا۔ زمین کا خلا ہو گیا اور یہ خلا آج بھی مجھے اپنے وجود میں محسوس ہوتا تھا۔

مجھے پیڈرو سے صرف وزیر خان کے بارے میں ہی نہیں پوچھنا تھا۔ اس کے ذریعے چوہدری دلاور کی زندگی کے خفیہ اور تاریک گوشوں تک بھی رسائی حاصل کرلی تھی جیسے دلاور نے ایک سودا کیا تھا ایسے ہی پیڈرو بھی اپنی زندگی کا سودا کرسکتا تھا اور اس کے بدلے میں چوہدری دلاور کے خلاف مجرمانہ الزامات کے ثبوت اور شواہد بھی فراہم کرسکتا تھا۔

"چلو بیٹھو گاڑی میں۔ یہاں کب تک کھڑے رہیں گے ہم" غالب نے گاڑی اسٹارٹ کی تو میں چونکا۔

رابعہ نے میری طرف دیکھا "واپس آجاؤ خیالوں کی دنیا سے۔"

میں نے کہا "حاضر جناب۔ کیا حکم ہے میرے لیے۔ آپ کو بھی لے چلوں خیالوں اور خوابوں کی دنیا میں۔"

"آپ رہیں خیالوں کی دنیا میں، خیالی پلاؤ کھائیں اور خیالی گھوڑے دوڑائیں۔ مجھے رہنے دیں حقائق کی دنیا میں" رابعہ بولی۔

www.paksociety.com

میں نے بھیجے بھنچ کے کہا "یہ تو بہت مشکل کام ہے گھوڑا دوڑاتے ہوئے پلاؤ کھانا۔ خواہ وہ خیالی ہو یا اصلی۔"

غالب نے آہ بھری "کتنا اجنبی لگتا ہے یہ لفظ۔ پلاؤ! اب اس کی خوشبو تک تصور میں نہیں آتی۔ نہ جانے کب کھایا تھا۔ اور قورمہ۔ آہ۔"

میں نے اسے تسلی دی "زیادہ دن نہیں بیٹے! تمہیں اپنی بارات اور ولیمے میں سب مل جائے گا۔ خانہ بدوش!"

"آمین۔ اللہ تجھے بھی جلد ٹھکانے لگائے۔ صحرا میں بھٹکنے والے مجنوں کے اونٹ کی روح۔"

اب روشنی ہو گئی تھی۔ سڑک پر ٹریفک بھی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے رابعہ کو قائل کر لیا کہ اس وقت بہادر علی بدمعاش کو موقع دیا جائے تو وہ سب کے مسائل حل کر سکتا ہے۔ رابعہ اس شرط پر مان گئی تھی کہ نہ وہ کسی وزیر کے سامنے جائے گی اور نہ اس سے کوئی بات کرے گی۔

"ہم کچھ بھی مت کرو۔ سب مجھ پر چھوڑ دو۔"

"یہی میں نازو سے کہتا ہوں۔ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ بارات، بینڈ، گھوڑے اور سہرے کا انتظام۔ باورچی سے قاضی تک۔" غالب بولا۔

میں نے کہا "تو ابھی تک پلاؤ اور قورمے کی دنیا میں ہے؟ ولیمے سے پہلے ناشتے کی ضرورت ہے مرزا جی۔"

"اچھا یار ولا! کہاں ہے ناشتا؟ کیا ہے ناشتے میں؟ آخر ایسے کب تک چلے گا۔ روز ناشتے میں ریسٹ۔ روز جلے ہوئے سلائس اور ٹھنڈی چائے۔" اس نے نازو کو واشتا شروع کیا "مجھے کیا پتا تھا کہ ایسی پھوہڑ عورت سے واسطہ پڑے گا جو صرف زبان چلا سکتی ہے یا ہاتھ۔ گھر چلانا نہیں آتا۔ لاتوں کے بھوت کی بچی۔"

نازو نے کہا "بکواس بند۔"

غالب نے کہا "پلیز برا مت مانیے۔ میرا دماغ چل گیا ہے غالباً اور ویسے بھی میاں بیوی کی لڑائی میں آپ کو بولنے کا حق نہیں۔"

وزیر صاحب کا گھر خاصی تلاش کے بعد ملا۔ پتا سمجھانے والے خود نہیں جانتے تھے کہ وہ کتنے لاپتا ہیں۔ وزیر موصوف کی شہرت بھی ایک خاص حلقے تک محدود تھی اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ان کی سوشل لائف بھی محدود تھی۔ خواتین تک۔ وہ خواتین تنظیموں کی سرپرستی کے شوقین تھے۔ ان کی فلاح و بہبود کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے خواہ خواتین کا تعلق کسی بھی شعبے یا طبقے سے ہو۔ وزیر جنگلات تھے مگر مسائل خواتین کے حل کرتے تھے۔ بشرطیکہ وہ دیکھنے میں اچھی لگیں۔ اکثر کے لیے وہ خود ایک مسئلہ تھے۔

ملک نے مجھے اندر بلوا لیا۔ گاڑی کو میں نے در خاص سے خاصے فاصلے پر روک لیا تھا۔ ہر کسی کو دیتا کسی کو زیادہ قریب آنے سے روکنے کے لیے معقول سرکاری انتظام تھا۔ پولیس کا ایک سپاہی بندوق لیے بند دروازے پر بڑی کاہلی سے پہرا دے رہا تھا۔ سامنے خیمے لگائے دو گارڈ اس سے بھی زیادہ بیزار بیٹھے تھے۔

ملک صبح صبح کوئی "مسئلہ" حل کر رہا تھا مگر اس نے مجھے بلانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ اس کی تھی زندگی کی یہ جھلک دیکھنے والا ایک بدمعاش ہی تو تھا۔ کوئی سیاسی حریف تو نہیں جو اس کی تصویر پبلک میں اچھالے۔

"کیا بات ہے بہادر علی۔ اتنی جلدی تم سے ملاقات کی امید نہیں تھی۔"

"معاف کرنا جی۔ مجھے پتا ہوتا کہ آپ مصروف ہیں تو نہ۔"

"نہیں۔ تم کہو کیا بات ہے؟" اس نے مصروفیت کو مسکرا کے دیکھا۔

مصروفیت تیس سال سے کچھ کم کی فربہ اندام لڑکی تھی۔ وہ چائے کے کپ سے جام شراب کی طرح چسکیاں لے رہی تھی اور میز پر رکھے ہوئے خشک میوے کو ایسے چھو رہی تھی جیسے بجنس چارا کھاتی ہے۔

"وہ جناب! راستے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ اب کو میں نے بتایا تھا کہ وکیل صاحب کے ایک مخالف کی۔"

اس نے آنکھ دبا کے کہا "ہاں ہاں۔ کیا حال ہے وکیل صاحب کا۔ ان کا مخالف کچھ گڑبڑ کر رہا ہے کیا؟"

"نہیں گڑبڑ تو نہیں کر رہا ہے مگر اس سے ہمیں کچھ خطرہ ہے اس لیے اب وکیل صاحب کچھ پریشان ہیں۔ ویسے تو ان کا فلیٹ ہے یہاں اور ہوٹل میں بھی جگہ مل سکتی ہے مگر ان کو ڈر ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

"یہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

"سر کوئی ایسی جگہ مل جائے عارضی طور پر۔ دو کمرے کا ہوں بے شک جہاں وہ چند دن قیام کریں تو خطرہ کوئی نہ ہو۔"

"بھئی وکیل صاحب سے کہنا کہ ہم ہیں تو انہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے ایک فون اٹھا کے اکرم کا نمبر ملایا "ہم اپنے وکیل صاحب سے ملنے۔ ہاں مسکین شاہ کے بھیجے بہادر علی کا ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے۔ لاہور سے ہمارے ایک وکیل دوست آئے ہوئے ہیں۔ یہ ان کا ڈرائیور ہے۔ بات یہ تو سمجھا دے گا تمہیں۔ اسے ریسٹ ہاؤس کی چابی دے دو۔ کیا مری والا نہیں۔ یہ جو مری روڈ پر ہم نے ابھی لیا ہے۔ ہاں گرلز کالج کے پاس۔"

اس نے فون رکھ کے مجھ سے کہا "بہادر علی۔ وکیل صاحب سے کہنا آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔ دن میں ذرا مصروفیت ہے۔"

مصروفیت نے اکرم کا فون دبا کے کہا "میں نے ناشتے میں مغز پائے کے ساتھ۔ اور دیکھو گاڑی جائے تو ہاتھی دانت کے اندر چوک سے پہلے ایک دکان ہے ادھر سے حلوا منگا لینا۔"

میں دل ہی دل میں افسوس کرتا ہوا باہر آ گیا۔ جب وزیر ایسے ہوں اور ان کی مصروفیات ایسی ہوں گی تو پھر ملک کا اللہ ہی حافظ ہے۔ میں نے وزیر خان مرحوم سے ایک فارسی شعر اکثر سنا تھا۔ جس کا مطلب وہ بتاتے تھے کہ ایسے ہی اسکول اور ایسے ہی پڑھانے والے ہوں گے تو بچوں کا کام تمام۔ اب معاملات بڑے بچوں تک آ گئے تھے اور خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔

چابی ایک جوان اور گریہ مسکین شخص تھا جو صورت سے غلام ابن غلام نظر آتا تھا۔ اس نے چابی میرے حوالے کر کے کہا "اور کوئی حکم میری سرکار۔" اور پھر سینے پر ہاتھ رکھ کے جھکا۔

میں نے کہا "یہ بتاؤ کہ چابی لے کے میں کدھر جاؤں۔ مشرق یا مغرب کی طرف۔"

اس کے لبوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جو تو دی کو خوش کرنے کے لیے چپکا لی جاتی تھی۔ "گاڑی خود لے جائے گی جی آپ کو۔ یہ چابی ڈرائیور ہے اور بس۔ آپ کا کام ختم۔ جاؤ موجاں کرو۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "کسی دن تم بھی سوچ لینا۔ بس نوکری ہی کرتے رہو اور سب کو سوچ کر تار کیے رہے ہو۔"

اس کا چہرہ زرد ہو گیا مگر میں اس پر مسکراتا ہوا باہر آ گیا۔ گاڑی اسے چابی لینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایک شخص نے خود مجھ سے چابی لے لی اور بڑی تحوت سے مجھے حکم دیا کہ میں اس کے پیچھے چلوں۔

سرکاری گاڑی کا پیچھا کرتے ہوئے ہم واپس جنڈی کی طرف شفٹ ہوئے۔ جیپ پر بھی جھنڈا لگانے کی جگہ تھی مگر اس پر کور چڑھا دیا گیا تھا۔ سرکاری نمبر پلیٹ ہی عوام کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھی۔ گاڑی چلانے والا بھی اپنی ذرا اونچی شکل سے بدمعاش لگتا تھا اور شاید وہ اطوار سے بدمعاشی کا اظہار کرنا بھی ضروری سمجھتا تھا۔ اس نے اپنا بھاری ہاتھ یوں رکھی جیسے کوئی غصے میں تھپڑ کے ہاتھ پر رکھتا ہے۔

"خیال رکھنا کوئی چیز ادھر سے ادھر نہ ہو۔" اس نے مونچھوں کو تاؤ دے کے کہا۔

میں نے کہا "تم بھی خیال رکھو۔ کہیں یہ مونچھیں ادھر ادھر نہ ہوں اور ہاتھ میں نہ آ جائیں۔"

وہ گڑبڑا گیا "کیا مطلب ہے اس بات کا؟"

"مطلب جا کے ملک صاحب سے پوچھنا۔ ان کا لحاظ نہ ہوتا تو میں خود یہ مونچھیں اکھاڑ کے تمہارے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ تم کب سے کوشش کر رہے ہو۔ اور اب خود بھی ادھر ادھر ہو جاؤ تو اچھا ہے میرے غصے کا ٹائم ہو گیا ہے۔" میں نے گھڑی دیکھ کے کہا۔

وہ کچھ سوچتا ہوا اور مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں کھلا چیلنج تھا کہ اس وقت جانا مجبوری ہے لیکن پھر ملیں گے تم سے۔ اس کے رخصت ہونے تک غالب نے ملک صاحب کے "ریسٹ ہاؤس" کا تالا کھول لیا تھا اور خواتین کے ساتھ بیڈ روم بھی اندر چلا گیا تھا۔ یہ ریسٹ ہاؤس پرانی عمارت تھی۔ ملک صاحب نے حال ہی میں خرید فرمائی ہو گی۔ وہ اسے نیا کہنے میں حق بجانب تھے۔ پرانے ریسٹ ہاؤس نہ جانے کتنے اور کہاں تھے۔ شاید ہر شہر میں تھے۔ ہمارا وزیر عوامی کام کرتے کرتے اتنا تھک جاتا ہے کہ اسے ہر قدم پر ایک ریسٹ ہاؤس کی ضرورت پڑتی ہے۔

اندر جاتے ہوئے مجھے اچانک یاد آ گیا کہ مجھے ملک صاحب کی مصروفیت کو دیکھ کے ایسا کیوں لگا تھا جیسے میں نے پہلے بھی اس کو دیکھا ہے۔ وہ ایک فلم اسٹار تھی۔ ملک جیسے خاندانی جاگیردار اور جدی پشتی حاکم مرد بھی ہوتے ہیں اور دولت مند بھی چنانچہ وہ فلم اسٹارز اور ماڈل گرلز کے ناز و ادا اور رعنائی و دلبری سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں تو جوانی کے مختصر وقت میں حسن و شباب کے چیک کو کیش کرانے والی ہر فلمی محبوبہ بھی ان کو دولت و اقتدار میں ضرور پسند کرتی ہے۔ دونوں کے لیے یہ ماضی کے ریکارڈز کو قلب تحریانے کے لیے زیادہ سے زیادہ کامیابیاں سمیٹنے کا زمانہ ہوتا ہے۔ ملک صاحب بھی اس مصروفیت کو لاہور کے ستاروں بھرے فلمی آسمان پر کمند ڈال کے لائے تھے اور اپنے دل کی ڈائری کے اسکور میں شامل کر چکے تھے۔ خود فریبی ثانی کے لیے شاید یہ پہلا وزیر نہ ہو۔ اس کی اپنی اسکور بک ہو۔

ریسٹ ہاؤس میں وہ سب کچھ تھا جو آرام کے لوازمات میں شامل سمجھا جا سکتا ہے۔ کچھ آرام سے آگے حرام کی حد میں شامل تھا۔ رابعہ اور نازو نے بہت ناک بھوں چڑھائی کہ یہ بھی ہونا ہے یہاں اور وہ بھی ہے تو کیوں ہے؟ میں نے کہا کہ اعتراضات اپنے پاس رکھو۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے چنانچہ بقول شاعر۔ جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں۔ اپنے کام سے کام رکھو۔

وہاں دو اٹیچ باتھ روم تھے۔ ایک میں نازو چلی گئی اور دوسرے میں غالب۔ رابعہ نے کچن کا دورہ کیا اور میں ریوالور کو دسترس میں رکھے ایک کرسی پر نیم دراز لیکن مستعد بیٹھا رہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ بیڈ پر لیٹا تو سو نہ جاؤں۔ بیڈ روم لیٹ گیا تھا اور سو چکا تھا۔

رابعہ نے کچھ دیر بعد رپورٹ دی کہ بجلی، پانی اور گیس اور چولہا سب ہیں۔ برتن بھی کم نہیں مگر چائے کافی بنانے کا سامان نہیں ہے۔ قریب کے کسی ہوٹل سے چائے لانے سے بہتر تھا کہ ناشتا ریڈی میڈ لایا جائے اور پتی چینی دودھ لا کے چائے خود بنائی

www.paksociety.com

جائے۔ میں نے ٹیپ کا چارج نازو کو دیا اور غالب کو بازار بھیج دیا۔
پیڈرو جتنا جسمانی تھکن سے بے حال تھا اس سے زیادہ ذہنی احساس شکست سے نڈھال تھا۔ اس نے خود ہم سے بات کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی شاید چوہدری دلاور نے اسے اس کے انجام سے آگاہ کر دیا تھا یا وہ چاہتا تھا کہ اپنے دفاع کی کوشش کرنے سے پہلے ہمارے رویے اور الزامات کی سنگینی کو سمجھ لے۔ ڈیپریشن کا شکار صرف ذہنی طور حساس لوگ ہی نہیں ہوتے۔ بدمعاش اور بے کردار لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ فرق صرف وجہ کا ہوتا ہے۔
رابعہ کے اور میرے غسل سے فارغ ہونے تک غالب بازار سے نہیں لوٹا تھا۔ نازو کرسی پر بیٹھی کسی پرانے رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی مگر پیڈرو کی طرف سے غافل نہیں تھی۔
رابعہ نے تولیہ پشت کی جانب سے شانوں پر پھیلا لیا تھا اور گیلے بالوں کو برش سے سلجھا رہی تھی "سکندر یہ سب مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"
میں نے اسے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا "بیلجئی میرا یوں تم کو گھورنا۔ یا ایسے دور دور رہنا؟"
"بات کو مت ٹالو۔ ہم اس ریسٹ ہاؤس کے بغیر بھی گزارا کر سکتے تھے۔ تم نے اپنے معاملات میں ملک کو ملوث کر کے اپنے خلاف ایک گواہ پیدا کر لیا ہے۔"
"صاف کہو کہ تمہیں ملک سے ڈر لگتا ہے۔"
"ہاں۔ ڈر لگتا ہے مجھے۔ اس جیسے ہر مرد سے ڈر لگتا ہے۔"
میں نے کہا "ہم یہاں سیر و تفریح کی غرض سے نہیں آئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو دن کی بات ہے۔ کل نہیں تو پرسوں ہم واپس لوٹ جائیں گے۔"
"ملک نے تو آج ہی کھانے پر بلا لیا ہے۔"
"بھئی دعوت میں زبردستی تو نہیں چلتی۔ اس نے مدعو کیا تم مصروفیت کے عذر پر انکار کر دو۔"
"وہ خود آ دھمکے گا یہاں۔"
"پھر کیا ہوا۔ ہم بھی ہیں یہاں۔ تم اس کے ساتھ حوصلہ شکن رویہ اختیار کرو۔ بلکہ توہین آمیز۔ یہ احساس جرم کے مارے ہوئے لوگ پہلے ہی بے غیرت ہوتے ہیں۔ وہ بُرا مانے تو زیادہ سے زیادہ یہ کینہ پیدا کرے گا کہ ریسٹ ہاؤس خالی کرنے کے لیے کہہ دے گا۔ ہم فوراً سامان اٹھائیں گے کل پرسوں۔ آج میں اسے ٹال دوں گا کہ وکیل صاحب کی طبیعت ناساز ہے اور وہ سو رہی ہیں۔ کل تم غائب ہو جانا۔ گھومنے پھرنے نکل جانا اور رات کو دعوت ناگزیر ہو جائے تو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ ذرا بھی بدتمیزی کا مظاہرہ کرے تو اسے دل کھول کے بے عزت کرنے میں بھی حرج نہیں۔ پرسوں ہمیں بہرحال جانا ہے۔"
"میں کہتی ہوں کہ آخر کہیں اور کیوں نہیں جا سکتے ہم؟"
"مثلاً؟" میں نے چڑ کے کہا "ابھی ناشتے کے بعد میں اور غالب یا ہم سب کرائے کا مکان ڈھونڈنے نکلیں۔ فرض کرو ملے کوئی مکان ملے تو جھوٹ بول کر لیں۔ کہیں کہ ہم نکلے ہیں۔ سامان کل پرسوں تک آئے گا۔ مہینے بھر کا کرایہ ایڈوانس جمع کرائیں اور پھر چلے جائیں۔ کیا وہ گواہ ہمارے خلاف ملک سے پبلک کا آدمی۔ اپنا امیج خراب ہونے سے ڈرتا ہے۔ وہ بے عزتی کو بھی خاموشی سے پی جائے گا اور شکر ادا کرے گا کہ جان چھوٹی۔ پھر تم لاہور میں خوشی خوشی مصروفیات میں گم۔ رہا میں تو میرا سے چھو بھی آج کل کا ... ہے۔ فرنچ وکیل پرسوں کے بعد نظر نہیں آئے گا۔ غالب ... جس سے ملک جیسے عوامی نمائندے ویسے ہی ڈرتے ہیں۔ ... ہو کہ میں نے تو لاہور سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اور ... گواہی دے۔ غالب تو ملک کیا کرے گا۔ تاہم اس کی نوبت ... آئے گی۔"
رابعہ نے سر ہلایا "پتا نہیں کیوں۔ سب ٹھیک ہے ... باوجود مجھے غلط لگتا ہے۔"
"بات یہ ہے جان کہ ہم ہوٹل میں ٹھہر سکتے تھے ... نہیں تھا لیکن پھر گمنام رہنا مشکل تھا اور ہمارے خلاف ... واقعات کی گواہی بھی ہوتی۔ ہم انکار نہیں کر سکتے تھے کہ ... تو ہم گئے ہی نہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہمیں پیڈرو سے پوچھنا اور جیسے پوچھنا ہے۔ اس کے لیے بھی جگہ مناسب ترین ہے۔"
غالب نے دروازے میں نمودار ہوتے کہا "اگر آپ زلفیں اور آپ نے معاملات کو سلجھا لیا ہو تو ہم ناشتا کریں۔"
"مرزا جی۔ کیا خیال ہے؟ خواتین آج کا دن شاپنگ میں ... تفریح میں نہ گزاریں۔" میں رابعہ کے ساتھ کھانے کے کمرے میں پہنچ گیا۔
"کمال ہے۔ یہی مشورہ میں نازو کو دے چکا ہوں۔ ناشکری خواتین ہمارے سنہرے مشورے مفت بھی قبول نہیں کرتیں" غالب نے ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ نازو ... سے پراٹھا لا رہی تھی۔
رابعہ بولی "مفت ہم کچھ بھی نہیں لیتے۔"
میں نے کہا "خیر اب اتنا مفت بھی نہیں۔ اس کا معاوضہ رقم کی صورت میں نہ سہی کسی اور طرح بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔"
"بالکل۔ بدلے میں آپ بھی کچھ مفت دے دیں۔ مثلاً محبت کا کوئی تحفہ" غالب شرارت سے مسکرایا "کا ... خوش ہو جائے۔"
رابعہ چائے بنانے میں مصروف تھی "چھوڑو چائے بنانے سے "تکلف کیسا؟"
"اچھا سکندر کیا آج نازو قیامت نہیں ڈھا رہی ہے؟"
"ذرا غور سے ... سے میک اپ اتر گیا ہے اس کے ... لگ رہی ہے۔ تم رابعہ کو دیکھو جی چاہتا ہے ناشتے ...
... ناشتا چھوڑ دو۔ تم کھا لو، ذرا دو چار غزلیں" غالب نے کہا ... رابعہ کو۔ میں اور نازو غیر شاعرانہ مزاج رکھتے ... ناشتے پر پوری طرح اپنا طوفان بپا ... ختم کرتے ہیں۔"
... نے کہا "اور پیڈرو جیسی وہ تو ختم نہیں ہو گیا۔"
... نے لاک کر دیا ہے۔ نیند میں تھا" نازو بولی۔
غالب نے کہا "اب تم ناشتا کرو اور آنکھیں اور کان بند ... چلی جاؤ شام تک کے لیے کہیں۔ میں نے گاڑی کی ... لی ہے۔"
"... کیسے بدلی؟" میں نے حیرانی سے کہا۔
"... اصل میں جب میں نے چوہدری صاحب کا تحفہ نذر آتش ... نمبر پلیٹ آ گئی تھی۔ کچھ کنفیوژن پیدا کرنے کے لیے ... گاڑی پر دوسری نمبر پلیٹ ہے۔ اصل کے اوپر۔"
"تم ایک قابل فخر مجرمانہ ذہن کے مالک ہو مرزا جی۔"
غالب نے عاجزی سے کہا "سب آپ سے سیکھا ہے سر ... ہے یہاں؟"
میں نے کہا "آپ صحافی ہیں، عاشق ہیں، بے دال کے بودم ..."
"بے دال کا بودم کیا ہوتا ہے؟" نازو نے شک بھرے لہجے میں ...
"... بودم ہے۔ دال نکال دو تو کیا بچا۔ ... بوم۔ فارسی میں بوم ... پرندے کو کہتے ہیں جسے انگریزی میں دانائی کا مظہر سمجھتے ہیں جبکہ ..."
رابعہ اور نازو نے باہر جانے پر سو جانے کو ترجیح دی۔ پیڈرو ... جگانے پر بادل ناخواستہ تھوڑا سا ناشتا کیا اور چائے پی۔
"پیڈرو۔ تم جانتے ہو ..." میں نے کہا۔
"ہاں۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے یہاں راولپنڈی کی سیر کرانے ... نہیں لائے ہو" وہ بولا۔
"... چوہدری دلاور نے ..."
"اس کا نام مت لو میرے سامنے" وہ دلاور کو گالیاں بکنے ... تمام عمر اس کا ساتھ دیا میں نے۔ ہر جائز ناجائز کام کیا۔"
"ناجائز کام بھی کیا تھا کوئی؟" میں نے حیرانی سے کہا۔
غالب نے کہا "اس نے بھی تمہیں مالا مال کر دیا۔ اتنا دیا کہ ... اپنے کاروبار کے مالک ہو۔ شیخ بگھارتے بیٹھے ہو۔ احسان ... انصاف کے نام سے نہ تم آشنا تھے اور نہ چوہدری ... ان الفاظ کی کوئی اہمیت تھی۔"
"... کا احساس مجھے بہت دیر سے ہوا۔ ... خیر اب بتاؤ کیا ... میں تم سے کوئی درخواست، کوئی التجا نہیں کروں گا۔"
غالب نے کہا "چلو کچھ تو عقل سے کام لیا تم نے۔ اس کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ خود ہم نے بھی یہ بے وقوفی نہیں کی تھی۔ دشمن تو دشمن ہوتا ہے۔"
میں نے کہا "شاید تمہیں معلوم ہو گا تمہیں ایک سودے کے بدلے میں ہمارے حوالے کیا گیا ہے۔"
"ہاں۔ اور تم میری جان لے سکتے ہو یا مجھ سے بھی سودا کر سکتے ہو" پیڈرو بولا۔
میں نے غور کر کے کہا "سودا کرنے کے لیے کچھ ہے تمہارے پاس؟"
"بہت کچھ ہے" وہ بولا۔
میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ یہ بعد میں دیکھا جائے گا کہ جان سے بڑی کیا چیز ہے جو تم دے سکتے ہو۔ اس وقت صورت حال یوں ہے کہ ہمیں تم سے بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔ جھوٹ سننے کے ہم عادی نہیں۔ سچ بولنے میں دونوں کا فائدہ ہے۔ ہمارا وقت بچے گا تم تکلیف سے بچو گے۔"
اس نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ تم وہی کرو گے جو تمہیں کرنا ہے۔ جھوٹ سچ سے فرق نہیں پڑتا۔ تم مجھ سے جتنی نفرت کرتے ہو اور جس طرح اس کا اعلان کرتے رہتے ہو اس کے بعد تم سے یہ امید رکھنا کہ تم مجھے آرام سے رکھو گے پیڈرو اتنا بے وقوف نہیں ہے۔ تم مجھے سخت اذیت دو گے اور آسانی سے مرنے نہیں دو گے یہ مجھے معلوم ہے۔"
میں نے کہا "اس بحث سے کیا فائدہ۔ چوہدری دلاور نے کہا ہے کہ میرے والد وزیر خان کو قتل کرنے والے تم تھے۔"
اس نے تلخی سے کہا "صدر کینیڈی کو اور اس سے پہلے لیاقت علی خان کو بھی میں نے ہی قتل کیا تھا۔"
میں نے اس کے منہ پر ہاتھ گھما کے جو تھپڑ مارا۔ وہ الٹ کے بستر پر گر گیا اور چیخنے لگا "میں نے بہت قتل کیے ہیں۔ اخبار اٹھا کے دیکھتے جاؤ۔ جتنے قتل نامعلوم قاتلوں سے منسوب ہوتے ہیں وہ نامعلوم قاتل میں ہوں۔"
میں نے سکون سے کہا "جواب کو سوال تک محدود رکھو۔"
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا "ابھی ایک قتل اور کروں گا میں۔ سب کو بلا لو۔ میں سب کے سامنے کہنا چاہتا ہوں تاکہ گواہی کسی کی جھوٹی نہ ہو۔ میں لکھ کر بھی دے سکتا ہوں کہ چوہدری دلاور کو میں قتل کروں گا۔"
"اچھا؟" میں نے کہا "کب کرو گے؟ وقت اور تاریخ کا بھی اعلان کر دو۔ اخبار والے اور فوٹوگرافر پہنچ جائیں گے۔"
"اگر میں زندہ رہا۔ اگر تم نے مجھے مہلت دی اور تمہیں مہلت دینی چاہیے۔ آخر وہی تو ہے تمہارا دشمن نمبر ون۔ میں تو نمبر ٹو بھی نہیں جیسا کہ تم سمجھتے ہو۔ تم اس کے ساتھ بھی حساب برابر کرنا چاہتے تھے۔ چھوڑو، یہ کام میں کر سکتا ہوں تو تمہیں کیا ضرورت ہے اپنے سر الزام لینے کی۔ یہ ٹھیک ہے کہ الزام تم پر

www.paksociety.com

ثابت نہیں ہوگا مگر مجھے چوہدری دلاور سے اپنا بدلہ لینا ہے۔ تمہارا کام ایسے ہی ہو جائے گا۔ اسے دوبارہ دنیا واپس نہیں جا سکتا۔"

میں نے غالب کی طرف دیکھا "پیڈرو کتنی سمجھ داری کی باتیں کرنے لگا ہے ایک جھانپڑ کھا کے۔"

"اس کا دماغ ٹھکانے آ گیا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ گنجے کی دُم اتنی جلدی سیدھی نہیں ہوتی لیکن ہو جائے گی۔ کیا چوہدری دلاور جھوٹ کہتا ہے پیڈرو؟"

"کیا کہتا ہے وہ... کہ وہ بے قصور ہے......؟"

"اس نے بتایا ہے کہ ویسے تو وہ واقعی جان سے مار دینا چاہتا تھا وزیر خان کو۔ اس نے کہا بھی تھا کہ بڑھاپے نے وکیل اور معقولات بند نہ کیا تو اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا پکا بندوبست کرنا پڑے گا۔ لیکن ابھی وہ نوبت نہیں آئی تھی کہ وہ کسی سے کہتا کہ جاؤ' وزیر خان کو ٹھکانے لگاؤ اور' یہ کام تم نے ساہو سے بڑھ کر ساہو کے وفادار کی حیثیت سے کیا۔ دلاور کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس نے الٹا تمہیں برا بھلا کہا تھا۔"

"یعنی برا بھی کہا تھا اور بھلا بھی۔ تو یہی بات سچ ہے۔"

"یعنی اس نے کہا کہ پیڈرو تم نے اچھا کیا..." غالب بولا۔

پیڈرو نے کہا "یہ مطلب تم نے نکالا ہے میری بات کا۔"

"پھر کون سی تو یہی بات سچ تھی۔ تم خود ہی بتاؤ" میں نے کہا۔

"اس نے مجھے برا کہا تھا۔ اس بات پر گالیاں دی تھیں کہ میں نے حرف بحرف اس کے احکامات پر عمل کیوں نہیں کیا تھا؟"

"یہ بات تفصیل سے بتاؤ۔ اس نے کیا کہا تھا اور تم نے کیا غلط کر دیا تھا؟"

پیڈرو سوچ میں پڑ گیا "مجھے کچھ یاد نہیں۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ یاد آ جائے گا۔ ہمارے پاس یادداشت کی بحالی کا نسخہ نمبر نو بہت کارگر ہے۔ حافظے پر اس کا اثر حیرت انگیز ہوتا ہے۔ آدمی کو وہ غلطیاں بھی یاد آ جاتی ہیں جو اس نے پیدائش سے پہلے کی تھیں۔ چوہدری دلاور نے تم سے کہا تھا کہ وزیر خان کو قتل کر دو؟"

"ہاں۔ صرف ایک بار نہیں' کئی بار اور میرے علاوہ بھی کئی لوگ تھے جن سے اس نے یہ کہا تھا۔"

"مگر تم سب سبقت لے گئے تھے۔"

"نہیں۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں وزیر خان کو اپنے ساتھ راوی کے پل پر لے جاؤں اور وہاں سے نیچے دھکا دے دوں۔ اس کے بارے میں یہ پہلے سے مشہور کر دیا گیا کہ وزیر خان خبطی الحواس ہے۔ اگر میں ایسا کرتا تو وزیر خان ڈوب کے مر جاتا۔ اسے تیرنا نہیں آتا تھا لیکن اس کی لاش بہہ کر آگے نہ جاتی۔ اسے وہاں پہلے سے موجود لوگ نکال لیتے لیکن اس سے پہلے وہ لوگ مجھے پکڑ لیتے جو پل پر ہی تاک میں تھے کہ پیڈرو کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیں۔ ایک بڈھے کو دریا میں پھینکتے ہوئے پل کے دونوں جانب پولیس بھی موجود رہتی ہے۔ وہ مجھے پکڑ کے پولیس کے حوالے کر دیتے اور گواہی میں اپنے اپنے نام لکھوا دیتے [illegible] چشم دید گواہ جن کے آنے والوں کے نام [illegible] لوگ ہوتے۔ یہ بات مجھے پتا چل گئی تھی۔"

"کس سے؟"

"ڈی سلوا سے۔ بلکہ اس کے ایک خاص بندے سے۔"

"پھر کیا تم نے چوہدری دلاور سے شکایت کی تھی؟"

"ہاں۔ اس نے کہا کہ 'پیڈرو! تو میرا یار ہے' میرا دایاں ہاتھ ہے' سب سے زیادہ بھروسا میں تجھ پر کرتا ہوں۔ [illegible] ہے؟ سارے اہم کام میں تیرے سپرد کرتا ہوں۔ [illegible] تیرے علم میں ہیں کسی اور کے علم میں نہیں۔ میرا کام [illegible] چل ہی نہیں سکتا۔ جب تو یہ سب جانتا ہے تو پھر [illegible] اعتبار کر کے مجھ پر شک کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟'

میں نے کہا 'چوہدری صاحب! میرے جیسے رازدار [illegible] بھی جاتے ہیں اگر کوئی خود [illegible] ہو کہ یہ [illegible] ہے اس کو میری بہت سی کمزوریاں معلوم ہیں۔' [illegible] لگا اور بولا 'پیڈرو! ایسے تو دنیا کا کوئی دھندا نہیں چلتا۔ کسی نہ کسی پر اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ کوئی نہ کوئی شریک راز ضرور ہو جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ میں بھروسے کے آدمی مار ڈالوں۔ ہر بندے کو ٹھکانے لگا دوں اور ہر بندے مجھے کوئی استاد پیڈرو جیسا ہو [illegible] جائے۔ قتل کرنے سے مسئلے پیدا ہوتے ہیں حل نہیں ہوتے۔ اس وزیر خان کو ختم کرنا ہی اتنا بڑا مسئلہ ہے۔ دوسرا مسئلہ [illegible] قتل سے پیدا ہو جائے گا۔ چوہدری دلاور [illegible] جس نے تجھے ورغلایا ہے وہ یقیناً اس صورت حال سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ تجھ سے حسد کرتا ہے اور شاید تیری جگہ لینا چاہتا ہے۔ جیسے ڈی سلوا میری جگہ لینا چاہتا ہے۔' دلاور کی اس بات [illegible] مجھے قائل کر لیا اور میں نے اسے بتا دیا کہ میرے دل میں شک پیدا کرنے والا کون تھا۔ اس کی لاش تین دن بعد راوی سے [illegible] کئی میل آگے۔"

"پھر تم نے بعد میں وزیر خان کو کیسے قتل کیا تھا؟"

"میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔"

"تم جھوٹ بکتے ہو۔"

"تم سچ اگلوا سکتے ہو" اس نے تسلیم کیا۔

سچ اگلوانا ایک مشکل کام ثابت ہوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور بھی جگے۔ اسی ریسٹ ہاؤس میں رابعہ اور نادرہ [illegible] تھیں مجھے ان کی نیند میں خلل ڈالنا بھی منظور نہیں تھا چنانچہ [illegible] نے ایک دم ہاتھ مار کے پیڈرو کو ہوش سے بے گانہ کر دیا۔ باقی کارروائی اس کے بعد شروع ہوئی۔ میں نے [illegible] کپڑے اتار کے اسے پولیس اسٹائل میں [illegible] سے الٹا لٹکایا [illegible] کے لیے میں نے [illegible] ٹیلی فون [illegible] کا استعمال کیا۔ پیڈرو نے [illegible] کے درمیان تین فٹ لمبا ڈنڈا غالب نے ایسے باندھا کہ پیڈرو کی ٹانگیں اردو میں اٹھ کا ہندسہ بن گئیں۔ پھر پیڈرو کے دونوں ہاتھ سر کے اوپر کر کے باندھے گئے اور اسے سر کی طرف [illegible] اوپر اٹھایا گیا۔ [illegible] وہیں باندھ دیا گیا جہاں پنکھے کا ہک [illegible] اب پیڈرو کا نچلا دھڑ اپنی [illegible] میں تھا۔ پھر غالب کچن سے [illegible] لایا جس میں چھری' چاقو' نمک مرچ اور بیلن وغیرہ [illegible] تھے۔

پیڈرو کو ہوش میں لانے سے پہلے ہم نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ جب تفتیش کے عمل کا آغاز ہوا تو پیڈرو کی [illegible] تک نہیں نکلی۔ [illegible] کے بعد ہم نے اسے آنا [illegible] دوسرے مرحلے میں ہر سوال کے بعد میں نے پیڈرو کے [illegible] پر بھی چاقو سے کٹ لگایا اور غالب نے نمک ملے پانی سے [illegible] صاف کیا۔

پیڈرو کے بدن پر پانی سے زیادہ پسینہ تھا اور وہ کرب سے [illegible] مگر اس کا جسم [illegible] سے یوں بندھا ہوا تھا کہ وہ صرف سر کو [illegible] ہلا سکتا تھا۔ اس کی مزاحمت کی صلاحیت اور قوت برداشت دیکھتے ہوئے مجھے یہ فکر لاحق ہونے لگی تھی کہ وہ مر جائے [illegible] کا نہیں۔

غالب بھی کچھ بے چینی کا شکار تھا "یار! یہ مر گیا تو ایک مسئلہ [illegible] ہو جائے گا۔ دلاور نے تو خیر اسے ہمارے سپرد کیا ہی تھا۔ [illegible] اور بھی لوگوں نے دیکھ لیا ہے۔ اس کا ڈسپوزل۔"

"ڈسپوزل بعد کی بات ہے۔ ابھی ہم اسے مرنے نہیں دیں گے۔ اس کو تھوڑا سا وقفہ دیتے ہیں۔ پھر دوسرے زاویے سے تجزیہ کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ سچ ہو۔ وزیر خان کو اس نے قتل نہ کیا ہو۔ دلاور اسے ہمارے ہاتھوں مروانا چاہتا ہو جیسے یہ دلاور کے ہاتھوں ہمیں مروانے کے لیے لایا تھا۔"

[illegible] کے بعد پیڈرو کی حالت کچھ بہتر ہو گئی۔ ہم نے خود اسے [illegible] آرام کی [illegible] کچھ درد کا احساس کم کرنے والی گولیاں اور ایک سکون بخش گولی۔ میں نے اسے گرم دودھ پیش کیا تو اس نے [illegible] کے گرا دیا۔

"یہ سب چھوڑو۔ اپنا کام شروع کرو۔"

میں نے کہا "پیڈرو! ہم بھی سودا کرنا چاہتے تھے سودا اپنے [illegible]"

"سودا کیسے ہو سکتا ہے تم سے۔ تم صرف جان لینا چاہتے ہو [illegible] میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔ ایک دن دو دن... جتنے دن [illegible] مجھے تڑپا تڑپا کے مارو۔"

غالب نے کہا "فرض کرو ہم یہ بات مان لیں کہ وزیر خان کو تم نے [illegible] نہیں کیا تھا۔"

"اس میں فرض کرنے کی کون سی بات ہے۔ یہ سچ ہے۔"

"پھر وزیر خان کا قاتل کون تھا؟"

"خود چوہدری دلاور۔ کیا تمہاری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات کہ کسی نے بھی وزیر خان کو گولی نہیں ماری تھی۔ اس پر خنجر سے وار نہیں کیا تھا' اس کا گلا نہیں گھونٹا تھا۔"

"پھر اس کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟"

"سلو پوائزننگ سے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے اسے زہر دیا گیا تھا۔"

"کس طرح؟ کس نے زہر دیا تھا؟"

"چراغ دین کے ایک ملازم نے جہاں وہ رہتا تھا۔"

میں نے کہا "وہاں اس کی حیثیت ایک ملازم کی تھی؟"

"ہاں۔ چراغ دین نے کہا تھا کہ وزیر خان۔ میرے پاس آ جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔ تم چوہدری دلاور کا اور میر شرافت علی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تم ان کے لیے خطرہ بن گئے ہو مگر اصل خطرہ خود تمہیں لاحق ہے۔ کسی دن تم اچانک سڑک کے حادثے میں مارے جاؤ گے یا ولز میں بیٹھے بیٹھے مر جاؤ گے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا جائے گا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ اس نے چراغ دین کی بات مان لی۔ اس نے اپنے پرانے نمک خوار کے گھر میں پناہ لی تھی اور ایک طرح سے روپوشی اختیار کر لی تھی۔ وہ ملازم بن کے رہتا تھا تاکہ کسی کو شک ہی نہ ہو۔ زہر کے اثرات سے وہ بیمار ہو گیا اور علاج کے باوجود اس کی بیماری بڑھتی گئی۔"

میں نے کہا "کیا تم جانتے ہو کہ اسے زہر کیسے دیا گیا تھا؟"

"اس کے استعمال کے برتنوں میں" پیڈرو نے کہا "اس کے پانی پینے کا ایک مخصوص کٹورا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ چاندی کا نقشی کٹورا تھا۔ مراد آباد کا بنا ہوا۔ اسے وہ اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس پر وزیر خان کے والد یعنی میرے دادا کا نام بھی کھدا ہوا تھا۔"

"یہ سب مجھے نہیں معلوم۔ زہر کی بہت خفیف سی مقدار اس کٹورے کے نقوش پر مل دی جاتی تھی۔ جب وہ اس میں پانی انڈیلتا تھا تو زہر پانی میں حل ہو جاتا تھا۔"

میں نے کہا "مگر اس کی ایک عادت یہ تھی کہ پانی پینے سے پہلے تھوڑے سے پانی سے کٹورے کو صاف کر لیتا تھا۔ پانی کو ہلا کے پھینک دیتا تھا۔"

"اس سے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ زہر اوپر کے کناروں پر بھی لگایا جاتا تھا۔ جس کو اس کے لب چھوتے تھے۔ ظاہر ہے لب ہمیشہ ایک ہی جگہ کو نہیں چھوتے۔ وہ کھانے کے درمیان پانی پیتا تھا۔ یوں زہر خوراک کا جزو بن جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا نظام ہضم بگڑا پھر جگر کا فعل خراب ہوا اور زہر کے اثرات خون میں سرایت کر گئے۔ ڈاکٹر تو اسے صرف ہاضمے کی خرابی سمجھتے رہے۔"

غالب نے پوچھا "جب تم اتنا جانتے ہو تو یہ بھی تمہارے علم میں ہونا چاہیے کہ زہر کس نے دیا تھا۔"

"مکھیا" پیڈرو بولا۔

www.paksociety.com

"سنکھیا" غالب چونکا "یعنی آرسینک۔ تمہیں یقین ہے؟"
"مجھے جڑ زہر کا نام نہیں معلوم۔ بتایا تو تھا سنکھیا۔ پچھلا ہی چند نام آتے ہیں۔"
غالب نے کچھ سوچ کے کہا "ہوں۔" اور خاموش ہو گیا۔
میں نے کہا "وہ چراغ دین کے گھر میں ملازم بن کے رہتا تھا۔ آخر کیوں؟ اس کے پاس بہت دولت تھی۔ وہ چراغ دین جیسے دس کو خود ملازم رکھ سکتا تھا۔ کیا یہ دولت اس نے کہیں چھپا رکھی تھی؟ کسی بینک میں؟"
"نہیں اور جا کے وہ خود زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ اسی کا خیال تھا۔ زندہ تو وہ بہرحال نہیں رہا۔ مگر دولت والی بات غلط ہے۔ اس کے پاس نہ بینک میں پیسہ تھا نہ اس نے دولت کہیں گاڑ رکھی تھی۔ چوہدری دلاور نے سب کچھ ہتھیا لیا تھا۔"
میں نے کہا "کیا تم جانتے ہو کہ یہ سب کیسے ہوا تھا؟"
"ہاں۔ میں نے بڑی محنت سے ساری معلومات اکٹھی کی تھیں۔ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اور زندہ رہنے کے لیے میں نے یہ ثبوت اکٹھے کیے تھے اور بالواسطہ طریقے پر دلاور تک بھی یہ بات پہنچا دی تھی کہ مجھے کچھ ہوا تو وہ بھی محفوظ نہیں رہے گا۔"
میں نے کہا "مگر تمہیں یہ معلومات فراہم کرنے والا کون تھا؟"
"ذکی سلطان۔ تم جانتے ہو وہ کیسے مارا گیا تھا۔ وہ گواہ تھا میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ ہم کلاس فیلو تھے۔ وہ زیادہ پڑھ لکھ کے جنرل منیجر بن گیا مگر اس نے مجھے بھی ساتھ رکھا لیکن چوہدری دلاور کو بھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ ہمارا آپس میں کوئی اور تعلق بھی ہے۔ وہ بڑا اچھا دوست تھا۔ اپنا ایک ہی یار تھا۔ ہم ایک ساتھ بیٹھ کے پیتے تھے اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ پیڈرو کو برا سانپ پر بچھو سا کرتا' دلاور پر نہیں۔ اگر وہ میرے خلاف سازش کرے تو مجھے بتانا اور تیرے خلاف بات ہوگی تو میں تجھے خبردار کروں گا۔ ہم ایک دوسرے کا سہارا تھے اور اسی نے مجھے سب کچھ بتایا تھا۔"
"کیا بتایا تھا؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔
"تم نے پوچھا تھا مجھ سے کہ سودا کرنے کے لیے میرے پاس کیا ہے؟ اب کیا خیال ہے' سودا ہو سکتا ہے؟"
ابھی تو تم نے کوئی خاص بات نہیں بتائی۔"
"خاص باتیں بہت" وہ بولا "استاد پیڈرو تو مر گیا۔ اب تم شیخ مختار سے بات کر رہے ہو۔ اسے مار کے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ ایک آدمی کو مار کے تمہارے انتقام کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ پھر تم پچھتاؤ گے۔ مجھے سلطانی گواہ سمجھ لو۔ جو کچھ میں جانتا ہوں میرے لیے بے کار ہو گیا ہے مگر تمہارے لیے کارآمد ہے۔ تم چوہدری دلاور سے تصدیق بھی کر سکتے ہو اور بھی بہت سے ثبوت دے سکتا ہوں میں۔ بتا سکتا ہوں کہ ناقابل تردید شہادت کہاں سے ملے گی

لیکن مجھے ضمانت چاہیے پکی۔ کسی کاغذ پر نہیں [illegible] کس کی...؟ یہ بھی میں بعد میں بتاؤں گا۔"
"مثلاً میں؟" میں نے نفی میں سر ہلایا "تمہارے پاس وقت کم ہے پیڈرو اور اس کا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ تمہارے پاس [illegible] نہیں ہے۔"
غالب نے کہا "رہی ضمانت کی بات تو تمہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ تمہاری کوئی بات ہمارے لیے قابل اعتبار نہیں رہی۔ آخر تم بھی چوہدری دلاور کے تربیت یافتہ شاگرد۔ تمہارا [illegible] ہو۔ اسی لیے کہ تم بھی اپنی صلاحیت کے اعتبار سے [illegible] اداکار باز ہو۔ ایکٹر ہو اور بڑی روانی اور مہارت سے [illegible] کہانی سناتے ہو جو سچ سے زیادہ قابل اعتبار لگتی ہے لیکن سننے والے ہم جیسے ہوں تو پرکھے بغیر اور تصدیق کے بغیر تمہاری بات ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"
میں نے کہا "جھوٹے آدمی کے سامنے میں قسم کوئی بھی نہیں کھا سکتا اور نہ کوئی وعدہ کر سکتا ہوں۔"
"تم بلاوجہ میرے دشمن ہو رہے ہو۔ اگر معاملہ وزیر خان کا ہے تو اس کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔"
میں نے مشتعل ہو کے کہا "سنو کے بچے۔ اور کس کس کے خون کا داغ ہے تیرے دامن پر۔ یہ بھی دیکھ لے۔ استاد [illegible] کس نے مارا تھا؟ محسن کی بیوی شمیلہ کو اور اس کے بیٹے کا قتل کس نے کیا تھا؟"
اس نے کچھ دیر بعد کہا "صرف مجھے ہی قاتل کہتے ہو تم ان سب کا اور سزا بھی مجھے ہی دے کے مطمئن ہونا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے' مجھے تو ایک نہ ایک دن مرنا ہی تھا۔ میں جس کام پر تھا چوہدری دلاور کے ساتھ تھا اس میں موت تو ہر وقت سامنے رہتی تھی۔ مجھے مارنے کے لیے صرف ایک گولی کافی تھی جو کوئی بھی مار سکتا تھا۔ میرا کوئی دشمن' کاروباری حریف' خود میرا باس دلاور یا تم سب میں سے کوئی۔ جیسے تم سمجھ رہے ایسے ہی میں بھی بچ گیا تو لیکن میرے ساتھ بہت کچھ دفن ہو جائے گا۔ بہت جلد احساس ہوگا تمہیں کہ جلدی میں تم نے استاد پیڈرو یا شیخ مختار کو مار کے اصل قاتلوں تک پہنچنے کے راستے خود بند کر لیے۔"
ہم دوپہر تک سوچتے رہے۔ پیڈرو مکمل طور پر ہماری تحویل میں تھا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نہ کوئی اس کا مددگار یہاں [illegible] تھا اور نہ وہ فرار ہونے کی پوزیشن میں تھا۔ ہم نے اس پر [illegible] حربہ آزمایا تھا وہ اچھے خاصے سخت جان مجرم سے اعتراف جرم کرانے کے لیے کافی تھا مگر لگتا تھا پیڈرو ہماری توقعات سے کہیں زیادہ مزاحمت کی طاقت رکھتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ وہ مر جائے لیکن کچھ نہ بتائے۔ جسم کی قوت برداشت بھی ایک حد تک ساتھ دیتی ہے۔ اچانک کہیں وہ نظر نہ آنے والی اور محسوس نہ ہونے والی لکیر آ جاتی ہے جو زندگی اور موت کے درمیان حائل ہے اور ایک

[illegible] ہو کے آیا تھا۔ آخر وزیر خان بھی تو زندہ رہا تھا۔ [illegible] دل کے ساتھ۔ میرا بار غم کیا اس سے زیادہ بھاری ہے۔"
غالب نے کہا "یہ بار ہم سب مل کے اٹھائیں گے۔ ہم سب کا [illegible] مشترک ہے۔"
نازو نے اندر سر ڈال کے کہا "کیا مطلب؟ دونوں کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے؟"
غالب نے سر ہلایا "پہلے پیٹ میں تھا۔ تمہیں دیکھ کے دل میں ہو گیا۔"
"وجہ بہرحال بھوک ہے" میں نے وضاحت کی "پیٹ تو بھر جائے گا روٹی سے۔"
"دل کے درد کا علاج بھی ہے" نازو نے اندر آ کے کہا "اس کو انجائنا کہتے ہیں۔ ایسے لوگ زیادہ دن جیتے نہیں جن کو اس عمر میں یہ روگ لاحق ہو جائے۔"
"تمہاری تشخیص غلط ہے۔ اسے انجائنا نہیں۔ نازلی کہتے ہیں۔ یہ بیماری مجھے بہت پہلے لاحق ہوئی تھی۔ اس میں مرنے والا اکیلا نہیں مرتا۔ کسی کو مار کے مرتا ہے۔" غالب بولا۔
نازو کا اصل نام تو نازلی ہی تھا۔ غالب کی بات پر اس نے برا سا منہ بنا کے کہا "اور کیا مرنا پڑے گا؟"
"پھر وہ بھوت بن جاتا ہے اور کسی بھوتنی کی چوٹی سے چمٹ جاتا ہے۔" غالب نے کہا۔
اس سے پہلے کہ وہ لڑنے لگتے باہر کوئی گاڑی آ کے رکی اور کسی نے کال بیل بجائی۔ نازو فوراً اندر غائب ہو گئی۔ میں نے غالب سے کہا کہ وہ استاد پیڈرو کو سنبھالے "میں دیکھتا ہوں کہ ہم سے ملنے کون آ گیا یہاں؟"
باہر وہی ڈرائیور کھڑا ہوا تھا جس سے صبح میرے تعلقات میں اس کی مونچھوں کے باعث کچھ کشیدگی آ گئی تھی۔
"ملک صاحب نے یہ کھانا بھیجا ہے۔ وکیل صاحب کے لیے" اس نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔
"اچھا میں کھا لوں گا" میں نے اس سے ٹفن کیریئر لے لیا۔
"تم وکیل ہو؟" اس نے غرا کے کہا اور گاڑی میں سے دوسرا نکال لیا "یہ ہے تمہاری خوراک۔"
میں نے وہ بھی لے لیا "میں سب صاف کر دوں گا۔ تم ذرا [illegible] باہر برتن لے جانا۔ وکیل صاحب تو ہیں نہیں۔ ملک صاحب کا شکریہ ادا کر دینا۔"
دروازہ بند ہو جانے کے بعد وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ پہلے پوچھ لیتا تو شاید کوئی لنچ واپس لے جاتا۔ "اوئے تم شرافت سے کھانا وکیل صاحب کے لیے چھوڑ دینا۔ وہ آ کے کھائیں گے۔"
مجھے اندر سے ہی جواب دیا "مسٹر سونچھ۔ وکیل صاحب کی والدہ ہی تھی کہیں۔ کھانے آئیں گی۔"

لبِ گل دھڑکتے دل اور جسم میں رواں خون کے ساتھ سانس لینے والا جیتا جاگتا آدمی دوسرے لمحے میں لاش رہ جاتا ہے۔
دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو میں نے کہا "لڑکیوں کو اٹھانا چاہیے۔ بہت دیر سو لی ہیں۔"
"کیا ان سے کھانا پکواتا ہے۔ وہ ہانڈی چولہا کریں گی؟"
"ہانڈی چولہا نہ کریں۔ یہاں وہ سونے کے لیے بھی نہیں آئی ہیں۔ ہم ان سے مشورہ تو کر سکتے ہیں" میں نے کہا۔
"ہاں ایک قانونی پہلو ہے غور طلب" غالب نے کہا "پیڈرو نے کہا ہے کہ تمہارے والد کو تھوڑا تھوڑا سنکھیا دیا گیا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے' سنکھیا جسم میں جذب ہو جاتا ہے۔ ہڈیوں اور بالوں میں بھی اتر جاتا ہے اور اس کے آثار برسوں بعد بھی ملتے ہیں۔ جسم خاک میں مل جاتا ہے۔ ہڈیاں اور بال رہتے ہیں۔"
میں نے کہا "رائٹ۔ یہ میں نے بھی سنا ہے اور پڑھا ہے کہ دس سال بعد بھی پوسٹ مارٹم سے آرسینک کی موجودگی کا پتا چلایا جا سکتا ہے۔"
"ان کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا تھا؟"
"ہاں۔ پوسٹ مارٹم سے قبل ہی لاش ان کے مدفن سے غائب کر دی گئی تھی۔ پیڈرو نے کیا تھا یہ کام" میں نے کہا۔
غالب بولا "اب وہ ہمیں بتا سکتا ہے کہ اس نے ہڈیاں کہاں دفن کی تھیں؟"
"اگر اس نے ہڈیوں کو واقعی کہیں دفن کیا تھا۔ تو وہ ہمیں اسی جگہ لے جائے۔ ہم رابعہ سے کہیں گے کہ وہ میڈیکل ایگزامنر سے رپورٹ حاصل کرے۔ اگر سنکھیا کی موجودگی ثابت ہو گئی تو پیڈرو کی کہانی قابل اعتبار ہو جائے گی۔"
"اس کے بعد؟"
"ہم رپورٹ اپنے پاس رکھیں گے اور ہڈیوں کو واپس وہیں دفن کرا دیں گے۔ جہاں خالی جگہ آج بھی موجود ہے۔ اپنی امانت وصول کرنے کے انتظار میں۔"
غالب نے افسوس اور دکھ سے سر ہلایا "کاش یہ سب نہ ہوتا۔"
میں نے ٹھنڈی سانس لی "زندگی لوگوں کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ بے رحمی کے ساتھ پیش آئی ہے۔ ہم نے اپنے مشرقی پاکستان میں کیا نہیں دیکھا تھا۔ باپ کے سامنے بیٹی اور بھائی کے سامنے بہن کو جس درندگی سے ہلاک کیا گیا تھا۔ ماؤں کے شیر خوار بچے بھون دیے گئے تھے۔ اور اس سے بھی پہلے میرے اپنے خاندان کے سب لوگ۔ میری ماں اور میرے بھائی بہن۔ جس طرح شہید کیے گئے تھے۔ صرف مسلمان ہونے اور پاکستان کے حامی ہونے کے جرم میں۔ وہ سب مجھے یاد تو نہیں مگر میرے والد نے پورے خاندان کی لاشیں بے گور و کفن چھوڑ دی تھیں اور پاکستان پہنچنے والا اس بھرے گھر کی کل واحد نشانی ایک بچہ میں تھا جو اس

www.paksociety.com

"یہ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔ مونچھ کے بچے تمہارا وڈا شوق۔"
"تم نے پوچھا کب تھا۔" میں نے اندر ہی سے جواب دیا "تمہاری مونچھ کا بڑا شوق۔"
"مونچھ ہوتی ہے مردوں کی نشانی۔"
"پھر تم نے کیوں لگا رکھی ہے؟" میں نے کہا۔
"میرا نام ہے شیر خان۔ چیر کے رکھ دوں گا۔"
"میرا نام بہادر علی ہے۔ پالتو شیر تو بلی سے بھی گیا گزرا ہوتا ہے چابک نہیں مار سکتا۔"
"تو ذرا باہر آ کے دیکھ۔"
"چھاپلی کی بات کرتا ہے۔ میں بتا دوں گا وکیل صاحب کو۔ وہ ملک صاحب سے بات کریں گی کہ کھانا لانے والا بل کی بات کر رہا تھا۔ ملک صاحب کے کچن میں کیا ہوٹل چل رہا ہے۔ ان کے مہمانوں سے پیسہ وصول کرتے ہو تم؟ کتنا بل ہے اس کھانے کا۔ ہم شام کو ادا کر دیں گے۔"
وہ پتا نہیں کیا کہتا رہا۔ میں نے اس کی نہیں سنی اور بالآخر اسے ہی جھک مار کے جانا پڑا۔
رابعہ نے خفگی سے کہا "کیا بلاوجہ اس کے منہ لگتے ہو۔"
"جب تمہارے منہ نہیں لگ سکتے اور تم ہمیں منہ نہیں لگاتیں تو پھر کیا کریں" میں نے کہا۔
غالب نے فوراً ٹفن کیریئر کھول لیا "واہ بھئی واہ۔ کبھی تو خدا بھی فوراً سن لیتا ہے معدے کی فریاد۔ کل ہی پلاؤ اور قورمے کی بات کی تھی۔"
رابعہ نے کہا "آپ اوقات میں رہیے اپنی۔ آپ کا کھانا وہ ہے "دال چاول۔""
میں نے کہا "تم نے غلط سنا۔ وکیل صاحب کا نام لے کر دیا تھا اس نے۔ چاہو تو فون کر کے پوچھ لو۔"
غالب نے کہا "بڑا افسوس ہوتا ہے اس ذہنیت پر۔ عورتوں کے ساتھ کتنا غیر مساوی اور امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ جیسے یہ انسان نہیں "پاؤں کی جوتیاں" ہیں۔ کنیزیں ہیں۔"
"مگر ہم فراخ دل لوگ ہیں۔ انہیں برابر بٹھا کے وہی کھلاتے ہیں جو خود کھاتے ہیں۔"
نازو نے جل کے کہا "اور خود کیا کھاتے ہیں۔ دنیا بھر میں دھکے "زمانے بھر کے جوتے" اور ہر ایک سے گالیاں۔"
پیڈرو نے پھر بھوک نہ ہونے کا عذر پیش کر کے کھانے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک کمرے میں منتقل تھا اور اس کے فرار ہونے کے راستے مسدود تھے۔ دو کھڑکیوں میں لوہے کی گرل تھی۔ ایک دروازہ جو ساتھ والے کمرے میں کھلتا تھا دوسری طرف سے بند تھا اور باتھ روم کے روشندان سے وہ صرف اسی صورت میں گزر سکتا تھا جب وہ انسان کا نہیں بلے کا بچہ ہوتا یا اس کی عمر دو سال ہوتی۔

رابعہ اور نازو سو کے اٹھی تھیں تو نہا دھو کے تازہ دم نظر آتی تھیں اور ان کے چہروں پر تھکن کی پرچھائیں بھی نہیں تھی۔ انہوں نے ہماری تفتیشی رپورٹ بڑے دھیان سے سنی۔ اس کی مکمل سماعت کے بعد پرتشدد اور رقابتی اعتراض متاثرات دیے تھے۔
"یہ سب پیڈرو نے خود ہی بتا دیا؟"
میں نے اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کے بہ آواز "ہاں خود ہی بتا دیا۔ رضاکارانہ طور پر۔"
رابعہ بولی "شٹ اپ۔ جھوٹ پر شرم آنی چاہیے آپ دونوں کو۔"
"بالکل نہیں" میں نے کہا "اسے ہم افغان بھائی کہتے ہیں یہ برادرانہ اعتماد کہتے ہیں۔"
غالب بولا "ویسے بھی آپ اپنی توجہ نتائج پر مرکوز رکھیں۔ ذرا کما تھیں سرٹ کھا گئیں ہمارا کہہ یہ کتنا اونچا تھا۔ اس کے پیچھے سکتے تھے اور عمر کیا تھی۔ کس نے لگایا تھا۔"
رابعہ نے کہا "پیڈرو کی بات اگر مان لی جائے اور بعد میں اس کی صداقت بھی ثابت ہو جائے تو کیا ہم اسے کوئی ضمانت فراہم کر سکتے ہیں۔"
"یہ تم بتاؤ۔ تم قانون کو سمجھتی ہو اور سمجھاتی ہو۔ کیا ایسے مجرم کے لیے رعایت اور معافی کی گنجائش ہو سکتی ہے۔"
"مجرم وہ ہوتا ہے جس پر جرم ثابت ہو جائے۔ عدالت اسے سزا سنا سکتی ہے۔"
"پیڈرو پر جرم ثابت ہے۔"
"کس بنیاد پر۔ ہمارے یقین کی بنیاد کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ خیال اور یقین کی شہادت کسی عدالت میں تسلیم نہیں کی جاتی۔ کیا ہم میں سے کوئی اس کے جرائم کا چشم دید گواہ ہے؟" رابعہ نے کہا۔
"اگر وہ خود اعتراف جرم کر لیتا ہے تو کافی ہے۔"
رابعہ نے کہا "اعتراف جرم تو پولیس بھی حاصل کر لیتی ہے۔ تشدد کے تحت حاصل ہونے والا تحریری بیان بھی بے معنی ہے۔"
میں نے جھنجلا کے کہا "پھر کیا کریں۔ اس سے کہیں سوری پیڈرو اور اسے باعزت طور پر رخصت کر دیں۔ گھر چھوڑ آئیں۔"
رابعہ نے کہا "یہ تو میں نے نہیں کہا۔ ہم پیڈرو سے وعدہ کر سکتے ہیں اگر وہ ثبوت اور شہادت فراہم کر سکتا ہے جن سے اصل مجرم تک پہنچنا اور اسے کیفر کردار تک پہنچانا ممکن ہو جاتا ہے تو ہمیں پیڈرو کے سامنے یہی شرط رکھنی چاہیے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے سب ہمیں بتا دے۔ اس کا بیان زبانی نہیں تحریری ہونا چاہیے جو بھی لکھے اپنی ذمے داری پر لکھے اگر وہ اپنی بے گناہی ثابت کر سکے وزیر خان مرحوم کے قتل کی حد تک اور اس کی فراہم کردہ معلومات سے اصل حقیقت سامنے آ جاتی ہے "اصل قاتل بے نقاب ہوتے ہیں تو پھر ہم اسے وعدہ معاف گواہ کی حیثیت سے

ہم اسے چھوڑ دیں گے۔"
"ابھی کہنا قبل از وقت ہے" میں نے کہا۔
"ابھی سب کچھ قبل از وقت ہے" غالب بولا "ابھی تو یہ ایک تجویز ہے۔ ممکن ہے پیڈرو لکھ کر کچھ نہ دے اس کی گواہی بیان کی صورت میں ہو گی۔ تو عدالت میں بھی پیش کر دی جائے گی اب عدالت میں ہو گی کہ یہ تحریر مجھ سے جبراً لکھوائی گئی تھی۔ تو ہمارا دشمنی کا رشتہ زیادہ انتقامی ہو جائے گا۔ اگر وہ اسے درست مانے تو پھر اصل مجرم اور اس کے ساتھی دلاور اینڈ کمپنی ہم سے بڑھ کے جان کے دشمن۔"
رابعہ نے کہا "وہ عدالت کے چکر میں نہیں پڑے گا۔ نہ زبانی گواہی دے گا نہ تحریری۔"
"دوسری صورت یہ ہے کہ اس کا پورا بیان سنا جائے اور ریکارڈ کر لیا جائے۔ اس کے لیے بہتر ہے یہی ایسا کرنا پڑے گا کہ پیڈرو کو شک نہ ہو۔ ہم باتوں باتوں میں سب پوچھ سکتے ہیں۔ تفصیل کے ساتھ۔ ہر بات معلوم ہو سکتی ہے۔ اگر وہ کچھ بھول جائے یا چھپانے کی کوشش کرے تو ہم سوالات کر سکتے ہیں۔ ایسے سوالات جن کا جواب اسے دینا ہی پڑے۔ وہ کوئی گول مول بات نہ کر پائے۔"
"یعنی اس سے وکیلوں والی جرح کی جائے۔"
"ہاں۔ سچ ہو گا تو اس میں تضاد نہیں ہو گا۔ اس کے وہ مطلب نہیں نکالے جا سکیں گے" نازو نے کہا "یہ کام تو رابعہ باجی ہی کر سکتی ہیں۔"
غالب نے کہا "بات تو معقول ہے۔"
"کمال ہے۔ یہ تم کہہ رہے ہو؟" نازو نے طنز کیا۔
غالب نے ٹھنڈی آہ بھری "آدمی کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے محبت میں۔ جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے۔ اللہ معاف کرے۔"
میں نے کہا "چلو یہ کام ہم سب مل کے کریں گے۔ اس کا بیان سنیں گے سوال و جواب کریں گے جس کے دماغ میں جو آئے پوچھ لے۔"
"ہاں۔ بشرطیکہ اس کے پاس دماغ ہو۔ نازو سوال کر کے اس کا بیان ریکارڈ کرے گی تمہیں بیٹھ کے" غالب بولا۔
"اس کے لیے بھی مجھے تمہارے دماغ کی ضرورت ہو گی" نازو نے جل کے کہا۔
"مجھے تم پہلے ہی کھا چکی ہو۔ جو تھوڑا بہت بچا ہے اس کی مجھے بھی ضرورت ہے۔ سوری۔"
"میں کوئی بھینس نہیں ہوں کہ بھوسا کھاؤں۔"
"ہو تو جب میں گھاس ڈالوں گا تمہیں تب پتا چلے گا کہ تم کیا چیز ہو۔ گائے بھینس سے زیادہ تم دولتی جھاڑنے والی مخلوق لگتی ہو۔ گدھے کے سینگ غائب ہو گئے ہیں۔"
"سکندر اس نے مجھے گدھا کہا ہے" نازو نے بے بسی سے کہا۔

"میں ڈر کر موت کی غلطی نہیں کر سکتا۔"
"تم احمق گدھے۔ میرے سامنے تم نے نازو کو گدھی کہا تو بہت برا ہو گا تمہارے ساتھ" میں نے اسے ڈانٹا "کبھی میں نے بدتمیزی کی ہے ایسی رابعہ سے؟"
"تم نام کے بہادر علی ہو۔ میں کسی کے باپ سے نہیں ڈرتا خواہ وہ بھوت کی بچی ہو یا کوئی چڑیل۔ نازو کو تم کیا سمجھتے ہو۔"
"غالب مجھے غصہ نہ دلاؤ ورنہ میں پھر ہاتھ مار دوں گی۔"
"مار دو۔ میں پھر مر جاؤں گا۔ ہم تو ایسے ہی مرتے رہیں گے تم پر۔ اگر ہزار بار مریں گے تو نو سو ننانوے بار تمہارے لیے۔"
"اچھا!" نازو ہنسنے لگی "اور ایک بار؟"
"اور ایک بار تو یقیناً مرنا پڑے گا" غالب منہ لٹکا کے بولا "ورنہ نہیں بچے گا۔"
رابعہ نے تنگ آ کے کہا "اب کسی اور کو بھی بولنے دو گے یا نہیں؟"
"سوری۔ چلو اب تمہاری باری۔ تم کہو کیا کہتا ہے سکندر۔ ہم تو رہیں دردناک جدائی رومانی سین کے لیے" غالب نے کہا۔
رابعہ نے کہا "پہلے پیڈرو سے کہو کہ ہمیں وہاں لے چلے۔"
میں نے کہا "وہاں بھی لے جائیں گے اسے لیکن آج نہیں کل۔ آج ہم اس کا بیان ریکارڈ کرتے ہیں۔ میرے خیال میں نازو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ قانونی مسئلہ ہے۔ اگر پیڈرو تحریری بیان نہیں دیتا تو پھر اس سے ہر سوال رابعہ ہی کو کرنا چاہیے تاکہ قانونی سقم کوئی نہ رہے اور پیڈرو خود اپنی باتوں کے جال میں پھنس جائے۔ باتوں میں الجھا کے حقیقت کیسے معلوم کی جا سکتی ہے یہ قدرت رابعہ کے پاس ہے۔"
"یعنی چکر دینے کا آرٹ" غالب نے کہا۔
"یہی سمجھ لو۔ ہم سے کوئی بھول چوک ہو سکتی ہے۔ کوئی قانونی نکتہ مس ہو سکتا ہے۔ رابعہ اپنے تجربے سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔"
"تمہارا مطلب ہے یہ عقل اور ذہانت کا کام نہیں ہے" غالب بولا "جیسے تجربے کی بنا پر موچی جوتے گانٹھتا ہے یا نائی بال کاٹتا ہے۔"
نازو نے فوراً داد دی "تم جیسا صحافی خبر بناتا ہے۔"
میں نے کہا "ایک وجہ اور بھی ہے۔ میری تو آواز ریکارڈ نہیں ہونی چاہیے اس اعتراف جرم میں۔ ویسے بھی پیڈرو مجھ سے اور غالب سے کھل کے بات نہیں کرے گا۔ اس کے ذہن پر نفسیاتی دہشت سوار ہو گی۔ رابعہ کچھ نرمی سے اس کی حوصلہ افزائی کر سکتی ہے کہ وہ اول و آخر سب کچھ بتا دے۔ جو کچھ اسے معلوم ہے کسی جھجک کے بغیر رابعہ کو یوں سنا دے جیسے رابعہ اس کی طرف سے وکیل صفائی ہے اور حقائق کی روشنی میں رابعہ اس کے کیس کو سمجھ لے گی تو بتا دے گی کہ اس کے لیے رعایت کی کتنی گنجائش ہے۔ قانون

www.paksociety.com

کی نظر میں اور ایم آر ایس کی عدالت میں اس کے لیے وعدہ معاف گواہ کی حیثیت سے معافی کی سفارش ممکن ہے یا نہیں۔ اگر رابعہ اس کو یقین دلانے میں کامیاب ہو جائے کہ وزیر خان کے معاملے میں وہ بے گناہ ثابت ہوا تو شاید سکندر رابعہ کے کہنے سے اس کو چھوڑ دے۔"

رابعہ نے کہا "میں پوری کوشش کروں گی۔"

غالب نے کہا "یہ کام آج ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔ ہم چلتے ہیں بازار اور کوئی اچھا سا ریکارڈنگ سسٹم خرید لاتے ہیں۔"

"ہم سے آپ کی مراد کیا ہے؟ میں اور تم ایک ساتھ نہیں جا سکتے۔ یہ دونوں خواتین بھلا اکیلی رہ سکتی ہیں؟"

"تو کیا یہ دونوں اور اکیلی؟"

"ہاں۔ رابعہ تو موجود ہی نہیں ہے۔ وزیر صاحب کا کچھ بھروسا نہیں۔ ان کی مصروفیت موقع دے تو وہ شرف نیاز حاصل کرنے آ جائیں۔"

"مصروفیت کو وہ لاہور سے لائے ہیں۔ اتنی جلدی فارغ نہیں ہوں گے" غالب نے کہا "مصروفیت خود بڑی جان لیوا ہے۔"

"تم اور نازو چلے جاؤ۔ واپسی میں گاڑی کہیں چھوڑ دینا۔"

"کہاں چھوڑ دوں؟ کسی سڑک پر یا قبرستان میں؟"

"کسی گیراج میں سروس کے لیے دے آنا۔ صبح لے آئیں گے۔ رات کو گاڑی نظر نہیں آئے گی تو وزیر صاحب کو یقین آ جائے گا کہ وکیل صاحب واقعی موجود نہیں۔ اگر ان کا نامہ بر آیا یا وہ خود آئے تو میں ان سے نمٹ لوں گا۔ رابعہ ابھی سے پیڈرو کی جذباتی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کر کے دیکھ لے۔"

نازو نے کہا "ٹھیک ہے۔ چلو غالب۔"

غالب نے اسے تنقیدی نظروں سے دیکھا "اس حلیے میں؟ ان کپڑوں میں میرے ساتھ جاؤ گی؟"

"کیوں کیا خرابی ہے ان میں؟"

"خرابی ہی خرابی ہے۔ تمہارا کیا ہے' بے عزتی میری ہو گی۔"

نازو بگڑ گئی "جاؤ پھر اکیلے۔ میں نہیں جاتی۔"

غالب فوراً خوشامد پر اتر آیا "ارے یار تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے حسین چہرے کو نہ میک اپ کی حاجت ہے اور نہ تمہارے حسن و جمال میں کوئی کمی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ جب تم میرے ساتھ ہو تو ہر طرف چکا چوند ہو جائے جو دیکھے دم بخود رہ جائے پلٹ کے دیکھے۔ تمہارے حسن کو چار چاند لگ جائیں۔ پانچواں میں خود تمہارے ساتھ لگا ہوا نظر آؤں۔"

ہم سب ہنسنے لگے۔ نازو نے بھی مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے غالب کو کیا اسی کہا مگر تیار ہونے چلی گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ لوٹی تو غالب اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے حسن کی آب و تاب پر واقعی نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔

"چلو اب اٹھو" نازو نے شرما کے کہا "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میں اجازت چاہتا ہوں بہت سے گرنے کے قدم ملانے دینے کی۔ پروانہ وار شمع حسن پر نثار ہونے کی۔"

میں نے اسے لات مار کے دھکیل دیا "زیادہ ایکٹنگ مت کرو۔ ابھی باہر نکلو گے تو لڑائی شروع ہو جائے گی۔ واپسی تک تمہارے منہ سوجے ہوئے ہوں گے۔"

غالب نے نازو کی طرف دیکھا "یہ بات ہے تو شرط لگا لو۔ جتنے جائیں گے مسکراتے آئیں گے کیوں نازو؟"

نہ جانے کیسے نازو نے کہہ دیا "بالکل۔ شرط لگا لو۔ کیا ہے؟"

میں نے سوچ کے کہا "اگر تم اسی موڈ میں لوٹے تو تمہارے میں نذر سے کہتا۔ تم شرط ہار گئے اور لڑتے آئے تو ہم تمہارے کان میں یہی بات کہیں گے۔"

"چلا کے نہیں۔ بیچ کے" غالب نے ہاتھ ملا کے کہا "نازو۔"

ریسٹ ہاؤس دو بیڈ روم کی پرانی عمارت تھی جو شاید مرلے پر محیط تھی۔ اس کے سامنے والے حصے میں چھوٹا سا لان تھا۔ اور ایک جھولا بھی لگا ہوا تھا۔ رابعہ اس میں جھولتی رہی پھر اندر جا کے چائے بنانے لگی۔ میں نے پیڈرو کو دیکھا۔ وہ آنکھیں کھولے نڈھال پڑا چھت کو گھور رہا تھا۔

مجھے دیکھ کے اس نے کہا "ایسے میں مر جاؤں گا مجھے دوا دو۔ میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دیکھو مجھے بخار بھی ہو گیا ہے" رابعہ صحیح وقت پر دروازے میں نمودار ہوئی "کھول دو سکندر۔"

رابعہ کی بات کا مطلب اور مقصد سمجھنے کے باوجود میں نے "تمہیں بہت ترس آ رہا ہے اس پر؟"

"ترس کی بات نہیں۔ اس کی حالت دیکھو ذرا۔ اب تم سے کچھ کرنے کا تم بلا وجہ ہی ڈر رہے ہو۔"

میں نے برہمی سے کہا "کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔ دلاؤں گا اس سے۔ اس جیسے دس بھی ہوں تو خالی ہاتھوں سب کی ہڈیوں کا سرمہ کر دوں۔"

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے رابعہ کی بات پر مشتعل ہو کے میں نے پیڈرو کو کھول دیا ہے۔ وہ اپنی کلائیاں اور ٹخنے ملتا ہوا اٹھ گیا۔ ٹیلی فون کا تار بہت سخت ہوتا ہے۔ اس کی جلد پر گہرے نشان پڑ گئے تھے۔

رابعہ کے ہاتھ میں چائے کے دو مگ تھے۔ ایک اس نے مجھے تھما دیا اور دوسرا خود لے کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے پیڈرو کو دیکھا جس کی نظر چائے پر تھی "یہ لو۔ میں اپنے لیے اور لے آتی ہوں" رابعہ نے مگ اس کی طرف بڑھا کے کہا "اسے اسپرین بھی دے دو اگر ہے۔ اسے تو واقعی بخار ہے۔"

ذرا اب بھی تم ہی کھا لو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

پیڈرو نے پوچھا "تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

میں نے اسے گالی دی "فیصلہ مجھے کرنا ہے یا تجھے؟ ابھی تک نہیں بتایا ہے تو نے۔"

میں نے کہا تھا کہ میرے پاس تمہارے مطلب کی معلومات ہیں۔ تمہیں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوں گی۔ اس سے تمہارے خیالات بدل جائیں گے میرے بارے میں۔"

"شیطان اپنی صفائی میں بول رہا ہے کہ کسی کو اس کے نیک ہونے کا یقین نہیں آ سکتا۔ رہی معلومات کی بات تو اس ذخیرے کو میں کسی ماہر کے ذریعے برآمد کر لوں گا۔"

"نہیں سکندر۔ تم پھر کوشش کر کے دیکھ لو۔ تمہیں تو تشدد کرنا ہی نہیں آتا۔ تم اگر ماہرین کی خدمات حاصل کر لو تب بھی یہ ہے زیادہ سے زیادہ تم میری جان لے سکتے ہو۔ اس کے لیے تیار ہوں۔ میری جان تمہارے کسی کام کی ہے تو لے لو۔ چاہو تو میرا خیال تھا کہ تم اپنے آپ کو با اصول' شریف اور انسان سمجھتے ہو۔ کردار اور ضمیر پر یقین رکھتے ہو۔"

"تمہارے خیال سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر بدل بھی جائے۔"

"اب دنیا کا قاعدہ ہے کہ جسے سزائے موت دی جاتی ہے اسے کم اذیت دی جاتی ہے۔ پھانسی سے الیکٹرک چیئر اور پھر گیس چیمبر اسی کا مقصد اور تقاضا تھا۔ پہلے تو لوگوں کو مروا دیتے تھے۔ ہاتھی کے پاؤں سے روندنے کا حکم دیتے تھے یا دیوار میں چنوا دیتے تھے۔"

رابعہ اپنے لیے چائے اور پیڈرو کے لیے اسپرین لے آئی تھی۔ اس نے ظاہر کیا کہ پیڈرو کی بات اس کے دل کو لگی ہے اور وہ بے حد مجبور ہو رہی ہے۔ پیڈرو نے گولیاں نگل کے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔

"میں اب مرنے کے لیے بالکل تیار ہوں۔ اگر تمہارا فیصلہ ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ تم پہلے مجھے عذاب دو گے۔ جتنوں یا دکھ اپنی نوعیت پسندی کے جذبات کی تسکین کرو گے مجھے مارنے سے تمہارے اندر کا بے رحم اور سفاک درندہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"بکواس بند کرو۔ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ تم گولی مار دو گے مجھے۔ ہاتھ مار کے میری گردن کا منکا توڑ دو گے۔ یہی میں چاہتا ہوں۔"

"تم بکواس کر رہے ہو پیڈرو۔ سکندر کا دل ایسا نہیں ہے۔" "سکندر کا دل تمہارے لیے کچھ اور ہے مس رابعہ۔ تمہارے جذبات کی نوعیت مختلف ہے۔ یہ دو طرفہ بھی نہیں۔ اس لیے تمہیں ہو گا کہ خود تمہاری آنکھوں پر جذبات کی پٹی ہے۔ سکندر کی صرف اچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے بتاؤ تمہارا ساتھ ہے۔ مت سے مقدمات ہوں کسی ایک شخص پر تو یہ

اکثر ہوتا ہے کہ ہر جرم کی سزا الگ سنائی جاتی ہے۔ کم سنگین جرم میں قید کی سزا ہو تو قتل عمد میں اسی مجرم کو سزائے موت دی جاتی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا کہ پہلے مجرم کئی سال کی جیل کاٹے اور پھر اسے پھانسی دی جائے۔ پھانسی سے بڑی سزا کیا ہو گی۔ باقی سزائیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔ یہی میں بھی چاہتا ہوں۔ تم کو مارنا ہے تو مجھے آسانی سے مار دو۔ اگر تم اپنے آپ کو واقعی مجھ سے مختلف سمجھتے ہو۔ یہ دعوے ہیں تمہارے کہ میں شیطان ہوں اور تم انسان ہو۔ تو پھر انسانیت کا ثبوت دو مس رابعہ!"

"رابعہ!" میں نے کہا "مت سنو اس کی بکواس۔ جو ہمارا ہی چاہنے کا کریں گے۔ آج اسے انسانیت کا درس یاد آ رہا ہے۔"

رابعہ نے تہہ سے کہا "کیا غلط ہے یہ بات؟"

"یہ تمہارے جذبات سے کھیل کے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے رابعہ۔"

"یہ عقل کی بات ہے سکندر۔"

"ٹھیک ہے پھر تم سنو مگر یہ مت بھولنا کہ اس شیطان کا نام استاد پیڈرو ہے۔ شاید شیطان کو بھی یہ نام دیا جائے تو وہ ذلت محسوس کرے" میں نے اسے ریوالور تھمایا اور خود احتجاجاً واک آؤٹ کر گیا۔

ہم دونوں نے بڑا متوازن ڈراما کیا تھا۔ پیڈرو کے سامنے یہ اختلاف رائے کا اظہار بالکل فطری تھا۔ اس سے رابعہ کو حصول مقصد میں مدد ملی۔ میں بڑی گرمی میں باہر گیا تھا مگر باہر آتے ہی مسکرانے لگا اور دروازے سے لگ کے کھڑا ہو گیا۔

"مس رابعہ۔ آپ یقین کریں۔۔۔"

"میرے یقین کرنے نہ کرنے سے فرق نہیں پڑتا۔ یہ مسئلہ ہے سکندر کے جذبات کا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی جگہ میں ہوتی یا تم ہوتے تو اپنے باپ کے قاتل کو کیسے رعایت دے سکتے تھے۔"

"میں رعایت نہیں مانگ رہا ہوں۔ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں مس رابعہ کہ میں وزیر خان کا قاتل نہیں ہوں۔ اور سب جرم کیے ہیں میں نے۔ لیکن یہ جرم نہیں کیا جس کا تعلق سکندر کی ذات سے ہے۔ سکندر میری بات تو سنے پہلے۔"

"بات سننے سے کس کو انکار ہے لیکن جو ضمانت تم چاہتے ہو۔۔۔"

"وہ بھی زبانی بات ہے۔ اگر بعد میں کچھ جھوٹ ثابت ہو یا سکندر کو احساس ہو کہ مجھے معاف کرنا اس کی غلطی تھی۔ اس نے کھانے کا سودا کیا تھا اور مجھے مارنے میں زیادہ فائدہ تھا تو کیا وہ مجھے قتل نہیں کر سکتا۔ قتل کرنا کسی کے لیے بھی مشکل نہیں ہوتا اگر اس میں ایک گولی چلانے کی ہمت ہو۔ موقع ہر شخص کو ملتا ہے۔ ہر جگہ' ہر وقت بعد میں بھی مل سکتا ہے۔"

"دیکھو پیڈرو۔ ہم جو فیصلہ کرتے ہیں اتفاق رائے سے کرتے

www.paksociety.com

ہیں۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ مجھے سب بتادو۔ میں دوسروں کو بتا کے رکھتی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے بارے میں فیصلہ کیا ہوا تھا؟ اتفاق اس بات پر تھا کہ تم اپنا مفصل بیان لکھ کے دو۔ تحریری بیان ہوگا تمہارا۔ تم جو لکھو گے سوچ سمجھ کے لکھو گے تاکہ بعد میں مکرنے اور سچ جھوٹ کو بدلنے کی گنجائش نہ رہے۔"

"مس رابعہ۔ کیا واقعی آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پیڈرو اپنا اعتراف جرم یا اپنے انکشافات تحریری طور پر آپ کے حوالے کر سکتا ہے۔ اگر میرا دماغ بالکل خراب ہو جائے تب بھی یہ ناممکن ہے۔ تمہارے جیسے بھی آزمالو جتنے تمہیں آتے ہیں ورنہ انٹیل پولیس کے ماہرین کو بلالو۔ ریکھو کیا وہ پیڈرو سے وہ معلوم کر سکتے ہیں جو اس کے دماغ میں محفوظ ہے۔ میں کوئی انوکھا اور نیا دعویٰ نہیں کر رہا ہوں۔ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو مر جاتے ہیں مگر کچھ نہیں بتاتے۔ آپ تو جانتی ہوں گی۔"

"پھر تو کچھ نہیں ہو سکتا پیڈرو۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو بتادوں۔ آپ سب مل کے اس پر غور کریں۔ پھر جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھیں۔"

رابعہ نے سوچ کے کہا "ہاں۔ یہ شاید ممکن ہے۔ لیکن ایک بات ضرور اپنے ذہن میں رکھنا کہ جھوٹ ایک فیصد بھی ہوگا تو تم ننانوے فیصد سچ کے فوائد بھی حاصل نہ کر سکو گے۔ فرض کرو تم کو یہ ضمانت حاصل ہو جاتی ہے کہ تم کو وعدہ معاف گواہ کی حیثیت مل جائے گی۔ بشرطیکہ نمبر دو بر خان کے قاتل ثابت نہ ہوئے تو پھر تم کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تم جو بھی جانتے ہو یا تم سے جو بھی پوچھا جائے اس کا جواب بالکل ٹھیک ہونا چاہیے۔ تمہاری معلومات کی حد تک۔ جانتے بوجھتے تم نے کوئی بات چھپائی یا حقائق کو توڑ موڑ کے پیش کیا تو بالآخر ہمیں پتا چل جائے گا۔ ہم آنکھیں بند کر کے یقین کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔"

"ہم ایک دفعہ نہیں۔ دس دفعہ تصدیق کرو۔ لیکن کوئی مجھے جھوٹا کہے تو پہلے مجھ سے بھی پوچھ لو۔ کیا سچ مجھے جھوٹا کہنے والا اپنی جان بچانے کے لیے ایسا کہہ رہا ہو۔"

رابعہ نے اٹھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔ پہلے میں سکندر سے اور باقی سب لوگوں سے بات کر لوں۔"

رابعہ نے باہر سے کنڈی لگائی اور میری طرف دیکھ کے مسکرائی۔ میں اسے باہر لے گیا۔ اور ہم مختصر سے باغیچے میں بیٹھ گئے۔ پھر میں رابعہ کی گود میں سر رکھ کے سبزے پر لیٹ گیا۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی اور میں اس کی زلفوں سے کھیلتا رہا جو میرے چہرے پر سایہ فگن تھیں۔ میرا موڈ خاصا رومانٹک ہو رہا تھا اور میرے احساس پر رابعہ کے وجود کی خوشبو نے جادو سا کر دیا تھا۔ میں وقتی طور پر سارے جہان کو بھولا ہوا تھا۔ میں نے اس کے لب و رخسار کو چوما تو اس نے کچھ نہیں کہا پھر میں نے اس کے گال پر کاٹ لیا۔

"تو تم خوبصورت ہو" اس نے اپنا گال سہلا کے کہا۔

"کیا بڑا نقص ہے" میں نے لبوں پر زبان پھیری "کئی دانشور چاہتا ہے کہ تمہیں کھا جاؤں۔"

"یہ کھاس کھانے کی الکال" رابعہ بولی۔

"تمہارے گال پر نشان پڑ گیا ہے" میں نے انگلی رکھ کے کہا۔

"شرم تو نہیں آتی" وہ اپنا گال ملنے لگی۔

"بالکل نہیں۔ شرمانا لڑکیوں کا کام ہے۔ تم کو مبارک ہو۔"

"نازو غالب دیکھیں گے۔ کیا کہیں گے۔ تم بھی جانور ہو جاتے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا "ہر گز نہ سے یہ داغ محبت نہیں جائے گا۔ کہنے والے کچھ بھی کہیں۔ تمہیں ندامت کیوں؟ میں اعتراف جرم کر سکتا ہوں سب کے سامنے کہ یہ گستاخی اور بدتمیزی میں نے کی تھی اور پھر کروں گا جب موقع ملا۔"

"اچھا چلو اٹھو" اس نے مجھے دھکیل دیا "شرافت کے ساتھ دور بیٹھو۔"

"شرافت؟ کون شرافت؟" میں نے ادھر ادھر دیکھا "اگر یہ کسی لڑکی کا نام ہے اور وہ تم سے لاکھ درجہ حسین ہے تب بھی میں اس کے ساتھ جا کے دور نہیں بیٹھ سکتا۔ تمہارے قریب ہوں۔"

"تمہارے جذبات کا گھوڑا بے لگام ہو جاتا ہے" رابعہ نے بات کاٹ کر کہا۔

"یہ گھوڑا ایسا ہی ہوتا ہے خاتون۔ اسے سدھایا نہیں جا سکتا۔ اپنے ایمان سے کہو۔ کیا تم نے بھی نازو کے گال پر ایسا نشان نہیں دیکھا؟"

رابعہ ہنس پڑی "لیکن تم بھی بڑے غور سے دیکھتے ہو۔"

میں نے کہا "چاند کا داغ کسے نظر نہیں آتا۔ غور کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ محبت کرنے والے عشق کے ہر نقش پر ناز کرتے ہیں۔ جیسے اپنا یار عبدالودود مظہر۔ سر بازار سینہ تانے پھرتا ہے اسے تمغہ حال ہے جو اسے ذرا بھی شرمندگی ہو۔"

"وہ بھی پاگل ہے۔"

"میں اس سے بڑا پاگل ہوں۔ یہ وقت ثابت کرے گا" میں نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا "جب مقابلے پر ایک ساتھ دو مجنوں میدان میں اتریں گی۔"

"کون سی دو مجنوں؟"

"یعنی میں اور تم ایک ٹیم۔ غالب اور نازو دوسری۔ اسکور سے پتا چلے گا کہ کس کی محبت کے طوفان میں زیادہ زور ہے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو!" رابعہ کا چہرہ لال ہو گیا۔

"دیکھ لینا۔ بڑا سخت مقابلہ ہوگا اور انشاء اللہ ہم جب جانیں گے۔ خود مظہر ہاتھ جوڑ کے کہے گا کہ مان گئے استاد۔ لو دیکھنے والے ہوں گے اس کے سو سواسو تو اسے پوچھنے ممکن ہے دو سو ہوں تماشائی۔"

ابھی بچے کی ممی نے پہلے سے فرض کر لیا ہے کہ ہر بچہ باپ پہ جائے گا۔"

میں نے افسوس زدہ لہجے میں کہا "نہیں۔ اتنا جوش و خروش نہیں۔ سب کی ازدواجی محبت میں۔ اور اپنے خشوع کے ساتھ ایک ہی مقصد کے لیے کون زندگی وقف کرتا ہے۔"

"اور بھی جیتی ہیں یہ بھی مقصد ہے کوئی کثرت یا رالاد۔"

"یہ عظیم مقصد ہے" میں نے کہا "حکومت کے مخالف بیوی کے ساتھ مل کے خاندانی منصوبہ بندی کے لیے چیلنج ہے۔ اسے شرمندہ کرنے والا خود ہوتا ہے جب وہ علی الاعلان کہتا ہے کہ ابھی تو میں جوان ہوں اور دس پورے نہ ہوئے تو نام سطر نہیں۔"

غالب اور نازو کچھ دیر بعد آئے تو سوال کیے بغیر ہم نے جان لیا کہ تعلقات خوشگوار ہیں اور جاتے وقت جذبات جتنے رومان پرور تھے واپسی میں جارحانہ ہیں۔

غالب نے ایک چیتل مجھے تھمایا "اس میں سب کچھ ہے۔ اگر فون نمبر نہیں ملا تو۔"

میں نے لفافہ کھول کے دیکھا۔ "روغنی نان۔ چکن تکہ۔ اور ہے آرس لائی۔"

غالب نے سر ہلایا "وہ دوسرا بیگ اس کے پاس ہوگا۔"

"کون ہے؟" میں نے نازو کا سوجا ہوا منہ دیکھ کے کہا۔

غالب نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "میری شامت اعمال۔ مزید کا عذاب۔ مصیبت جو میرے گلے پڑ گئی ہے۔"

نازو پھٹ پڑی "دیکھو۔ میرے منہ مت لگو۔"

"خرافات ہے اس قابل؟" غالب نے کہا "کدو جیسے چہرے پر بھنڈی ناک۔ ٹماٹر جیسی آنکھیں۔ پہاڑی مرچ جیسے کان۔ منہ کرلی ہوئی سڑی کچلی کریلے سے زیادہ کڑوی زبان۔ تم لڑکی کہاں ہو سبزی منڈی ہو۔"

نازو رونے کے قریب ہو گئی "اور اس سے پہلے۔ ابھی جو تم نے کہا تھا کہہ رہے تھے۔ چہرے کو چاند آنکھیں ستارے میں اپنا ایک زمرد والی انگوٹھی ہوں۔ بولتی ہوں تو فضا میں نغمے بکھر جاتے ہیں۔"

"وہ سب شاعری تھی جس کا حقیقت سے کوئی رشتہ نہیں۔ بچپن یاد آرہا تھا میں۔ الو بنا رہا تھا تمہیں" غالب نے بیاز۔

نازو نے وہ بیگ غالب پر کھینچ مارا "تم کو پیار ہے تھے مجھے اب لگا تمہیں کیسے مرتا جاتی ہوں۔"

زینب نے بیگ کو کیچ کر لیا "پاگل کی بچی۔ ابھی سب کا بیڑا غرق ہو جاتا ابھی نازک چیزیں ہیں۔"

تک۔ آخر تم نے سبزی منڈی کیسے کہا۔ پوچھ جانے" نازو اس کی طرف لپکی "سامنے آکے بات کرو نا۔"

غالب میرے پیچھے ہو گیا "مرکھنی گائے کے سامنے جا کے مرنا ہے مجھے۔"

رابعہ نے نازو کو پکڑ لیا "بھئی بس بہت ہو گئی۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ ابھی سے پکڑ لیا تم نے۔ کچھ مزہ نہیں آیا خیر اب آرام سے بیٹھ کے بتاؤ کہ خود کیا کھا کے آئے ہو؟"

نازو بولی "ڈٹ کے کھا کے آئے ہیں ہم۔ رفت ہوا کر کے آئے ہیں۔"

"میری تو زندگی برباد ہو گئی۔ ایسا پھنسایا ہے اپنی محبت کے جال میں۔ میرے جیسے بھولے بھالے معصوم شخص کو" غالب بڑبڑایا۔

"تم کیا سمجھتے ہو ایسی باتوں سے متاثر ہو کے میں جان چھوڑ دوں گی تمہاری؟ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ بھولے بھالے معصوم شخص۔"

غالب نے آہ بھری "ہو گئیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے۔"

"بھئی تم لوگ تو بڑے اچھے موڈ میں گئے تھے گھومنے پھرنے۔"

نازو نے کہا "لیکن اس سے پوچھیں کیا میں نے ایسی کوئی بات کی تھی پہلے۔ وہاں رش بھلے کھانے لگے تو اس نے پوچھا کہ بیگم صاحب کے لیے مسالا تیز رکھوں؟"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ تم بیگم صاحب نہیں ہو" میں نے کہا۔

"غالب کو کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ بیگم صاحب کی پلیٹ میں بے شک بارود ڈال دو۔ یہ آتش فشاں ہیں بھائی۔ اور وہ خبیث دانت نکال کے بولا کہ سوری پھر آپ کیا ہیں تو کہہ دیا کہ میں کیا ہوں یار۔ آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھا ہوا الو۔"

اب غالب کی باری تھی "اور تم نے کیا کہا اس فرمائی تھی۔ اس سے پہلے میں لڑکیاں تاڑ رہا تھا۔ فخریہ ہوں میں۔"

"یہ تو نہیں کہا تھا میں نے۔ تم میری طرف متوجہ نہیں تھے۔"

"باغ میں جا کے پھول اور سبزہ۔ کھلا آسمان اور درخت بھی نہ دیکھنا۔ بیچ پر تمہاری طرف کبھرے کی طرح دیکھتا رہتا۔"

"تم مسکرا بھی رہے تھے بدتمیزی سے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ وہاں جا کے کیا رونے بیٹھ جاتا۔ اور بدتمیزی سے تو میں تمہیں دیکھ کے ہی مسکراتا ہوں۔ تمہاری اپنی نیت بڑی صاف ہے۔"

"تانگے میں بیٹھ کے کیا بدتمیزی ہو رہی تھی۔ سڑک پہ۔"

"جھٹکے تو لگتے ہیں۔ اور دو قریب بیٹھے ہوں تو آپس میں ٹکرا بھی جاتے ہیں" غالب نے ڈھٹائی سے کہا "تانگا سڑک پر ہی چلتا ہے ہوا میں نہیں اڑتا۔"

"میں نے کہا تھا ٹیکسی لے لو۔"

www.paksociety.com

"یہ بھی تم نے ہی کہا تھا کہ تانگے میں بڑا مزہ آرہا ہے۔ شرم تو مجھے آرہی تھی۔ تم جان بوجھ کے گر آئی تھیں مجھ پر اور مجھے سنبھالنا پڑا تھا۔ یہ بھی خیال نہیں تھا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

نازو پھر آپے سے باہر ہو کے اٹھی تھی کہ میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے بٹھا لیا۔ رابعہ کا ہنسی سے برا حال تھا۔

"پتا نہیں تم دونوں کی زندگی کیسے گزرے گی؟"

غالب نے کہا "بہت اچھی گزرے گی۔ کم سے کم بور تو نہیں ہوں گے۔ جیسے تم دونوں بت بنے بیٹھے رہتے ہو۔ بس کبھی آنکھ بھی کبھی نظر ملالی۔ انتہائی فضول اور بور قسم کی افلاطونی محبت سے یہ لڑائی بہتر ہے۔"

نازو اچانک غالب کی طرف وار ہو گئی "اور کیا۔ ہم تو محبت میں لڑتے ہیں۔ انداز ہے اپنا اپنا۔ رابعہ! یہ تمہارے گال پر کسی کیڑے نے کاٹا ہے؟"

غالب نے قہقہہ مارا "نہیں۔ یہ کیڑے مکوڑے کا کاٹا ہوا نہیں لگتا مجھے۔"

میں نے ریکارڈنگ کے اسباب کا معائنہ کیا۔ غالب نے خاصی محنت اور مہارت سے بڑے حساس آلات کا انتخاب کیا تھا۔ اگلا مرحلہ اس کو نصب کرنے کا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ کمرے میں پیڈرو موجود نہ ہو اور ہماری خفیہ کارروائی خفیہ ہی رہے۔ طے یہ ہوا کہ نازو یا رابعہ اسے تازہ ہوا خوری کے بہانے باہر لائیں گی اور یہ ظاہر کریں گی کہ ہم گھر میں موجود ہی نہیں۔ ہم اندر ہی اندر دس پندرہ منٹ میں اپنا کام مکمل کر لیں گے تو پیڈرو کو واپس اسی کمرے میں پہنچا دیا جائے گا۔

غالب اور نازو نے !!! بلا تو کھا لیا تھا مگر اپنا کھانا بھی ساتھ ہی لے آئے تھے۔ اب ان کو بھوک نہیں تھی۔ رابعہ نے اور میں نے کھانا شروع بھی نہیں کیا تھا کہ باہر سے موٹر کا ہارن سنائی دیا اور پھر گیٹ پر رکنے والی گاڑی کی ہیڈلائٹس تاریک ہو گئیں۔

میں نے آہستہ سے کہا "یہ مسٹر موچھ ہو گا۔ تم کو ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہو گا۔"

رابعہ نے ناگواری سے کہا "میں کیوں جاؤں گی اس کے ساتھ۔"

"یاد نہیں وزیر صاحب نے تمہیں بطور مہمان خصوصی ڈنر پر مدعو کیا تھا۔"

نازو کے ساتھ رابعہ اندر چلی گئی۔ مسٹر موچھ نے تیسری بار گھنٹی بجائی تو میں نے دروازہ کھولا "سن لیا یار سن لیا۔ بہرے نہیں ہیں ہم۔ گھنٹی کو گھنٹے کی طرح مت بجاؤ۔"

مسٹر موچھ کے بجائے دروازے پر ملک صاحب جنجی تشریف موجود تھے "یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔"

میں نے کہا "سوری۔ میں سمجھا کہ آپ کا وہ جاہل اور جانگلوس نوکر ہے۔ مسٹر موچھ۔"

اس نے مجھے گھور کے کہا "وہ نوکر نہیں۔ میرا باڈی گارڈ بھی ہے اور میرا پی اے اور ڈرائیور بھی۔"

"پھر تو مجھے ہمدردی ہے آپ سے۔" میں نے زیرِ لب کہا۔

"وکیل صاحب کہاں ہیں؟" اس نے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔

"وہ تو نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

اس نے غرا کے کہا "نہیں ہیں کا کیا مطلب ہے؟"

"وہ دوپہر کو راولپنڈی بار کے عہدے داروں سے ملنے گئی تھیں۔ وہیں ان کے اعزاز میں لنچ تھا۔ اس کے بعد کیا پروگرام تھا۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ اب تک آجانا چاہیے تھا انہیں۔" میں نے شرافت سے کہا۔

"میں نے ان کے لیے ڈنر رکھا تھا آج۔"

"غالباً میں نے بتا دیا تھا آپ کو سر کہ ان کا آنا ممکن نہیں ہو گا۔"

"مجھے خود آنا پڑا اور ان کا پتا نہیں" وہ سخت جھنجلایا ہوا تھا۔

"آپ چاہیں تو انتظار کر لیں یا بار کے صدر سے فون پر پوچھ لیں۔" میں نے کہا۔

"اندر کون ہے؟"

غالب نے کہا "میری وائف ہے۔ اور وہ شخص۔"

میں نے کہا "جس کے بارے میں آپ کو بتایا تھا میں نے۔ وکیل صاحب کا ایک جانی دشمن ہے۔"

"تم اسے اغوا کر کے یہاں لائے ہو؟"

"مجبوری تھی جناب" میں نے کہا۔

عباسی نے غالب کو مخاطب کیا "اور تم صحافی صاحب یہ سب دیکھ رہے ہو۔ کوئی اسٹوری بنا رہے ہو اپنے اخبار کے لیے۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ میرا نام اس کیس میں نہیں آنا چاہیے اور یہ کہ میں نے تمہیں اپنے ریسٹ ہاؤس میں جگہ دی تھی۔"

"آپ مطمئن رہیں۔"

"اصل بات یہ ہے کہ میں مطمئن نہیں ہوں۔" عباسی نے کہا "مجھے اس کیس میں گڑبڑ نظر آرہی ہے۔ کیا نام ہے تمہاری اس وکیل خاتون کا؟"

میں نے کہا "کیا آپ نے کارڈ ملاحظہ نہیں فرمایا؟"

"کارڈ اس الو کے پٹھے نے وہیں پھینک دیا تھا۔ ورنہ میں لاہور فون کر کے پوچھ لیتا۔"

"میں آپ کو دو فون نمبر دیتا ہوں۔ دونوں وکیلوں کے گھر کے فون ہیں۔ وقار یوسف اور عبدالودود منظر ہائی کورٹ کے وکیل ہیں۔ آپ ان سے پوچھ لیں یا لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر کا نمبر ان سے حاصل کر لیں۔ رابعہ قاری بہت مشہور وکیل ہیں۔"

عباسی نے کہا "وہ لال فاکس ویگن کس کی تھی؟"

"مس رابعہ کی۔"

"اس کا نمبر کیا ہے؟" عباسی نے کہا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ آخر گاڑی کے نمبر کے بارے میں یہ تفتیش کیا ہے۔ اس پر چودھری ولاور کی تھجے میں دی جانے والی گاڑی کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ گاڑی بھی رابعہ کے نام پر تھی۔ عباسی جانتا تھا کہ ایک گاڑی کو جہلم کے قریب حادثہ پیش آیا تھا۔ ہم بھی وہاں موجود تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جائے واردات سے ملنے والے کاغذات کو دیکھ کر پولیس نے عباسی کو بھی مطلع کر دیا ہو کہ وہ گاڑی ایک خاتون وکیل رابعہ قاری کی تھی جو اس حادثے میں ہلاک ہو چکی ہیں۔ عباسی نے رابعہ کی گاڑی پر وہی نمبر دیکھا ہو گا ممکن ہے نوٹ کر لیا ہو۔ اس کا شک میں مبتلا ہونا یقینی تھا کیونکہ وہ رابعہ قاری کو زندہ سلامت دیکھ چکا تھا اور اسی نمبر کی دوسری گاڑی بھی۔

میں نے عباسی کو رابعہ کی گاڑی کا اصل نمبر بتا دیا۔ گاڑی کو غالب میری ہدایات کے مطابق سروس کے لیے ایک گیراج میں چھوڑ آیا تھا اور صرف وہی جانتا تھا کہ گاڑی کہاں ہے۔ وہ صبح گاڑی لانے سے پہلے ہی اس کے اوپر سے تباہ شدہ گاڑی کی نمبر پلیٹ ہٹا سکتا تھا۔

میں نے کہا "عباسی صاحب۔ خیر تو ہے؟ آپ کچھ پریشان ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "کچھ دیر پہلے علاقہ ایس پی میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں کہا کہ گزشتہ رات جہلم کے پاس ایک بڑا ہی بھیانک حادثہ ہوا۔ میں نے کہا کہ ہاں میں نے بھی دیکھا تھا وہ کہنے لگا کہ آپ کی گاڑی دیکھ لی تھی میں نے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ لاہور کی ایک بڑی مشہور وکیل خاتون اس حادثے میں ہلاک ہو گئی۔ پتا نہیں اور اس کے ساتھ کون تھا۔ گاڑی میں تو کچھ بچا ہی نہیں۔ گاڑی پرزہ پرزہ ہو کے وادی میں سیکڑوں فٹ تک بکھر گئی تھی اور آگ لگ جانے کے بعد سب کچھ جل کے ختم ہو گیا۔ اس کی بات پر چونک کے میں نے پوچھا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس میں لاہور کی مشہور خاتون وکیل تھی۔ کیا نام تھا اس کا؟" وہ بولا "رابعہ قاری۔ گاڑی کے کاغذات اتفاق سے ادھر گرے تھے اور جلنے سے بچ گئے تھے۔ ان پر گاڑی کا نمبر بھی تھا اور یہ نام بھی۔" مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں نے کہا۔ تم کو یقین ہے کہ نمبر یہی تھا اور نام بھی۔ اس نے کہا کہ جناب عالی! تماشا دیکھنے کے لیے وہاں بہت لوگ رکے تھے لیکن پولیس افسر ایک میں ہی تھا۔ میں نے یہی کیا کہ کاغذات کو قبضے میں لے کر اپنے ڈرائیور کانسٹیبل کو ادھر ہی کھڑا کر دیا اور اس کی ڈیوٹی لگا دی کہ کسی کو نیچے نہ جانے دے۔ پھر میں نے ہی پنڈی سے جہلم فون کر کے حادثے کی اطلاع دی تھی مگر اس سے پہلے ہی فون مل چکے تھے۔ پولیس صبح نو بجے وہاں پہنچی تھی۔ میں تو اس کی بات سن کے چکر میں پڑ گیا اور میں نے کہا کہ "ایس پی صاحب کیا عجیب بات ہے۔ میں نے اس خاتون وکیل کو زندہ دیکھا ہے اور اس سے بات بھی کی ہے۔ اتفاق سے یہ نمبر بھی میں نے نوٹ کیا تھا۔ یہ لال رنگ کی فاکس ویگن ہے جس کو وہ خود چلا رہی تھی۔" ایس پی نے یہ تو نہیں کہا کہ سر آپ نشے میں ہوں گے لیکن اس کی نگاہ میں کچھ ایسی ہی بات تھی۔ اتفاق سے اسی وقت میرا ایک فون آگیا اور میں اندر بات کرنے گیا تو کچھ دیر لگی۔ وہ ایس پی اتنی دیر میں اٹھ کے چلا گیا۔ اسے بھی کوئی کام تھا۔ اب تم بتاؤ یہ معاملہ کیا ہے؟"

"میں کیا بتاؤں جناب عالی۔ جو خود آپ نے دیکھا وہ غلط تو نہیں ہو سکتا اور گاڑی آجائے تو کاغذات بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں آپ۔ مس رابعہ قاری کی فاکس ویگن انہی کے نام پر رجسٹرڈ ہے اور اس کا نمبر بھی وہی ہے جو میں نے بتایا۔"

"لیکن رات کو یہ نمبر نہیں تھا اس پر۔ اور پھر دوسری گاڑی کے کاغذات پر بھی رابعہ قاری کا نام تھا۔ کیا ان کے پاس دو گاڑیاں ہیں؟"

میں نے گڑبڑا کے کہا "جی... نہیں... میرا مطلب ہے مجھے معلوم نہیں۔"

"اگر ان کے پاس دو گاڑیاں ہوتیں تو انہیں یہ بھی معلوم ہوتا کہ دوسری گاڑی کہاں ہے؟"

"کیا پتا انہوں نے کسی کو دی ہو۔ اور اسے حادثہ پیش آگیا۔ مس رابعہ نے حادثہ ضرور دیکھا مگر یہ خیال ان کو کیسے آسکتا تھا کہ گاڑی انہی کی تھی۔ اوپر سے تو کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ اندھیرے میں وہ نیچے سے جل رہے تھے۔ آپ نے بھی دیکھا ہو گا۔"

"پھر یہ نمبر والا چکر کیا ہے؟ اگر انہوں نے کسی کو گاڑی دی تھی تو کیا اس پر اپنی فاکس ویگن کا نمبر لگا رکھا تھا؟ اور خود جو فاکس ویگن چلا رہی تھیں اس پر تباہ ہو جانے والی گاڑی کی نمبر پلیٹ تھی؟ کیا پہلے سے تھا تو اس کا مقصد؟ اور اگر گاڑی دینے سے پہلے نمبر پلیٹوں کو ادھر ادھر کیا گیا تھا تو کس لیے؟ کیا اتنی مشہور وکیل کو یہ نہیں معلوم کہ قانوناً یہ جرم ہے۔ انہیں قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے اتنی دیر میں ایک جواب سوچ لیا تھا "جناب عالی۔ ان کے پاس ایک گاڑی ہے یا دو ہیں۔ یہ تو خود مس رابعہ قاری ہی بتا سکتی ہیں۔ مجھے تو فاکس ویگن کا نمبر یاد ہے۔ آپ صبح دیکھ لیں۔ ممکن ہے نمبر انہوں نے اپنے انہی جانی دشمنوں کو چکر دینے کے لیے بدلا ہو جو ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔"

لیکن عباسی بہت کائیاں تھا "چکر تم مجھے دے رہے ہو بہادر علی۔ کیا ان کے دشمن اتنے بے وقوف تھے کہ نمبر دیکھ کے گاڑی کا پیچھا کرتے تھے؟ گاڑی کو نہیں پہچانتے تھے۔ تباہ ہونے والی اوپل ایکارڈ تھی جو بہت لمبی چوڑی کار ہوتی ہے۔ مس رابعہ کی لال فاکس ویگن بالکل الگ چیز ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم نے ان کے ایک دشمن کو پکڑا تو دوسرے کی چھٹی کر دی۔"

www.paksociety.com

"جی۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔"

"شاید یہ حادثہ نہیں قتل تھا۔ گاڑی میں جو لوگ تھے ان کی موت کا سامان پہلے سے کرلیا گیا تھا۔ جہلم کی پہاڑیوں کے موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی کو حادثے کا شکار ہونا ہی تھا۔ اس کے پہیوں کے نٹ بولٹ ڈھیلے کردیے گئے ہوں گے یا بریک لائن کاٹ دی گئی ہوگی۔ اسٹیرنگ وہیل نکل گیا ہوگا۔ لیکن نمبر پلیٹ بدلنے والی بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ تم بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے؟"

"میں کیا بتاؤں جی۔۔!"

"کتنے لوگ تھے اس گاڑی میں۔۔۔ جو حادثے کا شکار ہوئی؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم سر۔۔۔ میرا کوئی تعلق نہیں اس حادثے سے۔"

"تم وکیل صاحب کے دشمنوں کو جانتے ہو؟"

"جی۔۔۔ کسی حد تک۔۔۔ میرا مطلب ہے سب کو نہیں جانتا۔"

"عباد علی۔ اول تو کسی مشہور وکیل کا کوئی دشمن اتنا طاقتور نہیں ہوتا کہ اسے راستے سے ہٹانے کے لیے وکیل کو تم جیسے بدمعاش کی خدمات حاصل کرنی پڑیں۔ چلو مان لیتے ہیں کہ کوئی دشمن تھا۔ بعض اوقات لوگ جج کے بھی دشمن ہوجاتے ہیں جو ان کے کسی بہت قریبی عزیز کو سزائے موت سناتا ہے اور منت سماجت سفارش یا رشوت اسے تختۂ دار تک پہنچنے سے نہیں بچا پائی۔۔۔ وکیل کے دشمن بھی ہوسکتے ہیں کہ اس نے کبھی لوٹنے کی فیس پوری لی مگر محنت پوری نہیں کی۔ پھانسی تو نئے دن ہونی وہی پہ مگر ابھی تک میں نے ایسا نہیں سنا کہ کسی نے وکیل یا جج سے بدلہ لیا ہو۔"

میں نے کہا "جناب عالی۔ یہ خاندانی تنازعہ ہے۔"

"کیسا خاندانی تنازعہ۔ زمین جائداد کا؟ پھر تو سب دشمن ان کے اپنے ہی عزیز ہوں گے۔ چچا یا ماموں، سوتیلے یا سگے بھائی بہن۔"

میں بُری طرح پھنس گیا تھا "میرا خیال ہے سر کہ کچھ رشتے کا مسئلہ ہے۔۔۔ ابھی تک شادی نہیں ہوئی مس رابعہ کی۔"

"آئی سی" وہ مجھے گھور کے بولا "رقابت کا چکر ہے۔ لڑکی خوب صورت ہے۔ پیسہ بھی بہت ہوگا۔ دولت کے علاوہ شہرت ہے۔ ویسے تو سونے کا انڈا دینے والی خوب صورت مرغی پر سب کی نظر ہوگی مگر میرا خیال ہے کہ مقابلے پر دو ہی حریف ہوں گے۔ شاید ایک کوئی پرانا منگیتر جس سے بچپن میں منگنی طے کردی گئی ہوگی یا والدین کی مرضی ہوگی کسی چاہنے والے کو لڑکی دینے کی۔ لڑکی نے کسی اور کو پسند کرلیا ہوگا۔"

میرا دماغ عباسی کی جرح سے چکرا گیا تھا "یہ آپ خود انہی سے پوچھیں تو اچھا ہے سر۔"

"سر کے بچے۔ تم کسے ٹھکانے لگا رہے تھے؟" وہ ایک دم گرم ہوگیا "کیا کام تمہارے سپرد کیا گیا تھا؟ مس رابعہ نے کیا کہا تھا تم سے کہ ان کا جانی دشمن کون ہے؟"

میں نے کہا "آپ بلاوجہ مجھ پہ ناراض ہو رہے ہیں جناب عالی۔"

"بلاوجہ۔۔۔؟ خود تم نے بتایا تھا کہ تم ایک بدمعاش ہو۔ کون ہے یہ بندہ؟ اور کہاں ہے؟ میں خود اس سے جاکر پوچھ لیتا ہوں۔ اگر وہ سب جھوٹ نکلا جو تم نے مجھے بتایا تو تمہاری خیر نہیں۔" [illegible]

اب میرے لیے فوراً کچھ کرنا ضروری ہوگیا۔ رابعہ پر نظر پڑتے ہی اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت [illegible] سلیم جھوٹ اس کے غیظ و غضب کے باعث [illegible] ہوتا۔

میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ سیدھا اس کمرے کی جانب بڑھا جہاں پیڈرو بیٹھے پہ بندھا پڑا تھا۔ "کون ہو تم؟" عباسی نے اس کے قریب جاکے کہا۔

پیڈرو کے جواب دینے سے پہلے ہی میں نے اسے بار... قدموں کی آہٹ سن کے پلٹا۔ میرے عزائم میرے چہرے سے عیاں تھے اور وہ میری آنکھوں میں اپنا انجام دیکھ سکتا تھا۔ خوف سے اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ اسے حلق سے آواز نکالنے کی مہلت بھی نہیں ملی کیونکہ میرا ہاتھ تو اُٹھ چکا تھا۔ اس نے بچانے کی واجبی سی کوشش کی مگر کھڑی ہتھیلی کا وار اس کی گردن پر پڑا تو وہ لڑکھڑا کے فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ میں ساتھ والے کمرے کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ رابعہ، غالب اور نازو خاموشی سے سب آکر کھڑے ہوگئے۔ غالباً وہ سب میری اور عباسی کی ساری گفتگو سن چکے تھے۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا" غالب نے کہا۔

رابعہ نے پھنسی ہوئی آواز میں کہا "اب کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "ایک منٹ ٹھہرو۔ پہلے میں وزیر بنگلات کے ساتھ آنے والوں کو بھی اندر لے لوں۔ نازو تم اسے لیجاؤ۔"

رابعہ گھبرائی "ان کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں رخصت کرو کوئی بہانہ کرکے۔"

"وہ وزیر صاحب کے باڈی گارڈ ہیں۔ انہیں کسی بات پر کہیں چھوڑ کے نہیں جاسکتے جب تک خود وزیر صاحب نہ کہیں" غالب نے کہا۔

"کیا مصیبت ہے" نازو بولی "ایک پیڈرو ہی کم نہیں تھا! وزیر اور اب اس کا باڈی گارڈ۔ ہم بُری طرح پھنس جائیں گے۔"

میں نے کہا "صحیح جملہ یوں ہوگا۔ ہم بُری طرح پھنس چکے ہیں۔"

میں دروازے سے باہر نکلا تو مجھے گاڑی میں ایک ہی شخص تنہا ڈرائیور اسکرین کے پیچھے سائے کی طرح لگتا تھا۔

کئی رنگ بدلتے تھے۔ وہ کش لیتا تھا تو چنگاری سی روشن ہوتی تھی۔ قریب جاکے دیکھا تو وہ مسٹر مونچھ تھا۔

"کیا تم سگریٹ پی رہے ہو؟"

"تمہیں کیا تکلیف ہے؟" وہ کش لے کر دھواں پھر چھوڑتے "ابھی سگریٹ پیوں یا شراب۔۔۔؟"

میں نے کہا "شراب کیا تم چرس پیو یا زہر پیو۔ مجھے تو ایسا لگا تھا سارے ملک میں جگنو چمک گیا ہے۔ تم منہ کھولتے ہو تو اس کی غزل ہے۔"

"کام کی بات کرو۔"

"کام کی بات یہ ہے کہ تم جاؤ" میں نے کہا۔

"عباسی صاحب کو تمہارے پاس چھوڑ کے؟"

"نہیں مسٹر مونچھ۔ عباسی صاحب کے پاس جاؤ۔ انہوں نے بلوایا ہے۔ یہ شریفانہ الفاظ میرے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا جنگلی مونچھوں والے پاگل سانڈ کو بلا کے لاؤ۔"

"بچے ہو تم۔ عباسی صاحب ایسا نہیں کہہ سکتے" وہ نیچے اُترا۔

"یہ بھی پوچھ لینا اندر جاکے" میں بے نیازی سے واپس...

گیٹ بند کرنے کے بعد میں باہر ہی ٹھہر گیا۔ وہ سیدھا اندر پہنچا۔ چند سکنڈ کے بعد میں نے پہلے ایک آواز سنی۔ جیسے کل نے... پھر ایک دھماکا ہوا جیسے نقل کمرے کے زمین پر گر گیا۔ میں نے مطمئن ہوکے اندر کا رخ کیا۔ مسٹر مونچھ اپنے آقا کے وزیر بنگلات کے قریب ہی چت پڑے ہوئے تھے۔ محمود ابا دی صف میں نظر آرہے تھے اور نازو اپنے ہاتھ جھاڑ رہی تھی۔

"یہ مجھے پھنسانے کیا مصیبت مول لے لی" رابعہ نے پریشانی سے کہا۔

میں نے کہا "دیکھو رابعہ۔ تقدیر کے لکھے کو ہم کیسے مٹا سکتے ہیں۔ جب جب جو جو ہوتا ہے تب تب سو سو ہوتا ہے۔"

نازو نے فلسفیانہ انداز میں سمجھایا "مصیبت اس وقت سے شروع ہوئی جب ڈاکو نے پیڈرو کو ہمارے حوالے کیا اور ساتھ ہی ایک کار تمہیں تحفے میں پیش کردی۔ تم کہہ سکتی ہو کہ کار کا حادثہ اور نمبر پلیٹ بدلنا میری حماقت کی روشن مثال ہے لیکن اس وقت کون جانتا تھا کہ ایک وزیر بنگلات سے اچانک نو میں رات کو ملاقات ہوگی۔"

"کون وہ تم پر فریفتہ ہوکے ہمارے پیچھے لگ جائے گا۔"

رابعہ نے برہمی سے کہا "مجھے الزام مت دو۔"

نازو نے کہا "الزام میں تمہارے قاتل حسن کو دے رہا ہوں۔"

"وزیر بنگلات تمہارے جنگلی پن سے متاثر ہوا تھا۔ تم نے اس کے محافظوں کے مقابلے میں خود کو تارزن ثابت کیا ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔"

"ہاں۔ بس وہ میری ہڈیاں توڑ کے چلے جاتے۔ اور کچھ نہ ہوتا۔"

رابعہ نے کہا "کیسے ہڈیاں توڑ سکتے تھے وہ۔ مجھے تو ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تم نے۔"

"انجام تب بھی یہی ہوتا۔ وہ تم سے بات کرتا تو کباڑ ہو کے بھاگ جاتا" غالب نے کہا "خیر اب جو ہونا تھا ہوگیا۔ آگے کی سوچو۔"

"ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

اچانک کمرے میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمیں فون کرنے والا کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ کسی کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم اس ریسٹ ہاؤس میں مقیم ہیں۔

میں نے ریسیور اُٹھا کے کہا "جی؟"

کسی عورت نے کہا "خیر سے عباسی صاحب یہاں ہیں؟"

میں نے کہا "آپ کون ہیں جی؟"

"تمہیں کیا اس سے۔ میری بات کا جواب دو" وہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔

"مجھے آرزو نہیں ہے ہر ایک کو بتانے کی۔"

"ہر ایک کے بچے۔ میں پوچھتی ہوں آخر تم ہو کون؟ میں ان کی پہلی بیوی ان کے گھر سے بول رہی ہوں۔"

"اوہ۔ معاف کرنا بیگم صاحبہ۔ میں تو آپ کی آواز نہیں پہچان سکا ٹیلی فون پر۔"

"عباسی صاحب کہہ گئے تھے کہ کچھ مہمانوں کو لینے جا رہا ہوں۔ انہوں نے کھانے پر بلایا تھا۔ کوئی خاص ہی لوگ ہوں گے کہ وہ خود گاڑی لے کر گئے ورنہ کھانے پر تو وزیر سب ہی آتے رہتے ہیں۔"

میں نے سوچ کے کہا "عباسی صاحب آئے تو تھے۔ لیکن چلے گئے۔"

"کس کے ساتھ؟ وہ جو لاہور سے وکیل آئی ہوئی ہے؟" پہلی بیوی کے لہجے میں حسد، غصہ اور بے بسی کے جذبات کی فراوانی تھی "کیا بہت خوب صورت ہے وہ؟"

میں نے کہا "بیگم صاحبہ۔ عباسی صاحب باہر ہی سے چلے گئے تھے۔ اچانک انہیں ایوان صدر سے بلاوا آگیا تھا۔"

"اور وہ وکیل۔۔۔؟"

میں نے کہا "وہ تو ویسے بھی یہاں نہیں ہیں۔ دن میں انہیں کسی کے ساتھ لنچ کرنا تھا۔"

"ہاں جی۔ ایسی عورتوں کو دیوانوں کی کیا کمی۔ بس میں ہوں جسے اس کا شوہر بھی اب نہیں پوچھتا۔ میری بلا سے جو بھی اس وکیل سے کرلے۔" اس نے فون بند کردیا۔ مجھے غصہ بھی آیا اور

www.paksociety.com

افسوس بھی ہوا۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خیر سے وزیر جنگلات کی پہلے سے تین بیویاں موجود ہیں۔

میں نے رابعہ سے کہا "بہت مبارک ہو۔ تم اب جھنڈے والی گاڑی میں پھرو گی۔"

"کیا بک رہے ہو" رابعہ نے کہا۔

"وزیر جنگلات نے تمہیں اپنی چوتھی منکوحہ کے عہدے پر فائز کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم کب سے فیصلہ کرنے کے بعد بولی نہیں کر سکے۔"

"سکندر۔ میں اس وقت بے ہودہ مذاق برداشت نہیں کر سکتی۔"

"یہ مذاق کی بات نہیں۔ اب تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس رقیب روسیاہ کو ہوش میں لا کے اس سے پوچھوں کہ کیوں بے جنگلی تیری یہ مجال اور اسے دوبارہ ایسا ناک آؤٹ کر دوں کہ صور اسرافیل پر ہی ہوش آئے۔"

بات پُر لطف تھی مگر سب پریشان تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ نازو فوراً پیڈرو کو باہر لائے گی۔ غالب کم سے کم وقت میں ریکارڈنگ کے آلات نصب کرے گا۔ میں عباسی کو اور مسٹر مونچھ کو دوسرے کمرے میں بحفاظت رکھنے کا بندوبست کروں گا اور اس کے بعد رابعہ پروگرام کے مطابق پیڈرو سے مفصل انٹرویو لے گی۔ یہ کام ایک گھنٹے میں ہو جائے گا تو ہم وزیر صاحب کی گاڑی میں ہی یہاں سے اپنی موجودگی کے سارے آثار مٹا کے رخصت ہو جائیں گے۔ وزیر جنگلات اور جنگلی مونچھوں والے باڈی گارڈ کو ہم گاڑی سمیت کسی سنسان مقام پر چھوڑ دیں گے اور صبح ہوتے ہی اپنی گاڑی میں فرار ہو جائیں گے۔ جانے سے پہلے میں اپنا فرضی وگ کا میک اپ بدل دوں گا اور غالب گاڑی پر اصلی نمبر پلیٹ لگا دے گا۔

"یہ سب تو صبح ہوگا۔ نو دس بجے سے پہلے سروس اسٹیشن پر کوئی نہیں ملے گا" غالب نے کہا۔

"اور صبح نو دس بجے تک ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں وزیر صاحب کی بیوی نمبر ایک یا دو تین میں سے کسی کو ان کی ضرورت محسوس ہوگی یا کسی اور کو تلاش ہوگی تو پھر یہاں فون آئے گا" نازو بولی۔

"اب فون نہیں آئے گا۔ کوئی خود آئے گا۔" میں نے کہا "جب ایوان صدر سے معلوم ہوگا کہ وزیر جنگلات وہاں نہیں ہیں بلکہ وہاں گئے ہی نہیں تو ظاہر ہے تشویش کے اسباب پیدا ہو جائیں گے۔"

میری بات نے مزید افراتفری پیدا کی۔ "ان کی بیویوں سے کون لڑے گا" نازو نے گھبرا کے کہا "ایک نہیں ایک وقت تین۔"

غالب بولا "وہ بھی وزیر جنگلات کی۔ کڑوا کریلا نیم چڑھا اور نمک کے پانی میں۔"

اب ایکشن شروع ہوا تو بہت سی بدحواسیاں سرزد ہوئیں۔

میں نے سوچا کہ وزیر کی گاڑی کو اندر لے جانا چاہیے۔ میں ہی تھی۔

میں نے رابعہ سے کہا "گیٹ کھول۔ میں گاڑی اندر کروں گا۔"

"بڑے گیٹ میں تالا لگا ہوا ہے۔"

"تو پھر تالا کھولو۔ اندر سے چابی لے کر آؤ۔ جاؤ۔"

"خواہ مخواہ مت چلاؤ۔ چابی میرے پاس ہے تو جاؤں؟"

جب میں گاڑی اندر لے کر گیا تو نازو بھی پیڈرو کو لا رہی تھی۔ "جب کہہ دیا کہ تم کو تازہ ہوا کھانی ہے تو اندر ہم جو بھی دیں گے وہ کھانا پڑے گا تمہیں اور یہ میرا حکم ہے۔"

اندر سے غالب چلایا "کیا مصیبت ہے سارے ... ہیں۔"

نازو نے پیڈرو سے کہا "دیکھا۔ غالب جھنجھلا رہا ہے۔ یہ بھی میرا حکم ہے۔"

پیڈرو بولا "کیا تم نے جنگل کے وزیر کو قتل کر دیا ہے؟"

"میں جنگل کے بادشاہ کو بھی قتل کر دوں۔ تمہیں کیا؟"

"تم سب پریشان ہو۔ وزیر کا قتل بہت سنگین بات ہے۔"

"کوئی سنگین بات نہیں۔ دوسرا وزیر حلف اٹھا لے گا جلد" میں نے کہا "جنگل ختم نہیں ہو گیا ایک وزیر کے ختم ہونے سے۔"

پیڈرو بولا "میری مانو تو یہاں سے نکل چلو۔"

"یہ تو رابعہ اکثر کہتی ہے مجھ سے لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہارے ساتھ کیسے نکل جاؤں؟" میں نے کہا۔

رابعہ بولی "بہتر ہے کہ تم اس کی مان لو اور اس کے ساتھ چلے جاؤ۔"

"پھر تمہارا کیا ہوگا۔ تمہاری ڈولی کیسے اٹھے گی؟"

"میں اگلے وزیر جنگلات سے شادی کرا لوں گی" رابعہ جھنجھلا کے کہا اور اندر چلی گئی۔

بالآخر پیڈرو کو اندر لے جایا گیا۔ اس وقت تک میں نے وزیر کو اور اس کے باڈی گارڈ کو پیڈرو کے کمرے سے ہٹا دیا تھا کہ شاید اسی لیے نازو اسے باہر لے گئی تھی۔ رابعہ کو پریشان بیٹھی ایک پاکٹ ریڈیو سن رہی تھی۔ اسی کے اندر مائیکروفون بھی تھا جو سو فٹ کے دائرے میں ہر آواز کو ... تھا۔ پاکٹ ریڈیو کا چھوٹا سا ... اس کے لیے کافی تھا۔ ساتھ والے کمرے میں مشکل سے دس فٹ کے فاصلے پر ریکارڈر لیے بیٹھی تھی۔ اتنے کم فاصلے پر آواز بالکل صاف سنائی دیتی تھی۔

غالب نے بھی نازو سے کہا "کیا تمہارا اب بھی ... ہے۔"

[illegible] ہار کے بیٹھ گئے۔ ہم سے چند [illegible] فاصلے
گفتگو کا ہر لفظ یہاں صاف سنائی دیتا تھا۔

پیڈرو کو شیشے میں اتار لیا تھا اور یہ یقین دلانے میں [illegible] تھی کہ جو کچھ وہ رابعہ کو بتائے گا اس کی بنیاد پر وہ [illegible] بخشش کے لیے ہم سے سفارش کرے گی۔

[illegible] نے کہا "وعدہ میں کیسے کر لوں۔ تم تو کہو گے کہ وزیر خان کا قتل نہیں کیا تھا۔ ساری بات ثبوت کی ہے یا گواہی کی۔"

[illegible] بولا "میں جانتا ہوں تم بہت بڑی وکیل ہو۔ ایسے نہیں [illegible] بات کا ثبوت نہیں ہے میرے پاس۔ بہت سے واقعات [illegible] خود ہوں لیکن چوہدری دلاور کا جرم ثابت کرنے کے لیے [illegible] بہت کچھ ہے جو تم عدالت میں پیش کر سکتی ہو۔"

"پہلے وزیر خان کے قتل کا مسئلہ ہے جو سکندر کے لیے سب سے اہم ہے۔ اس معاملے میں وہ اتنا جذباتی ہے کہ میری بھی نہ سنے۔ تم سنتے ہو کہ اسے تھوڑا تھوڑا زہر دے کے مارا گیا [illegible] دلاور کے کہنے پر چراغ دین کے نوکر نے کیا تھا۔ اب وہ [illegible] ہی ہے۔ زہر اب بھی نہیں ہے۔ خیر تم یہ بتاؤ کہ جب ان کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا گیا تھا تو کیا میر شرافت علی بھی شریک تھا؟"

"چوہدری دلاور اکیلا تو اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ لیکن میر شرافت علی اور وزیر خان دوست تھے۔"

"کاروبار میں جب لالچ غالب آ جائے تو دوستی خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ میر شرافت علی کے دل میں لالچ پیدا کرنے والا دلاور تھا۔ اس نے قائل کیا تھا میر شرافت علی کو کہ جو کام کرتے ہیں اس میں پچاس سال اور گزار دیں تب بھی ہاتھ کچھ نہیں آئے گا جتنا دوسرے کاروبار میں صرف ایک [illegible] سکتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے اسمگلنگ کے کاروبار میں؟"

"ہاں۔ یہ سلسلہ ایوب خان کے زوال سے شروع ہوا تھا۔ جب ان کی حکومت کا تختہ الٹا گیا تھا تو پاکستان میں سازشی عناصر [illegible] ہو چکے تھے۔"

"تمہارا مطلب ان سپر پاورز سے ہے جو پاکستان کی سیاست [illegible] کھیل شروع کر چکے تھے۔"

"[illegible] کچھ لیں آپ۔ مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندوں کے [illegible] ہوا دینے والے تو نہ جانے کب سے سرگرم تھے۔ وہ [illegible] کے عوام میں نفرت کی خلیج بڑھانے کے لیے بدگمانیاں [illegible] پیدا کر رہے تھے۔ بالآخر وہ کامیاب ہو گئے۔"

"یہ سب مجھے معلوم ہے۔"

"جب انتخابات کے نتائج آ گئے تو بیرونی عناصر عمل کے [illegible] ایک ہمسایہ ملک کی خفیہ فوجی تنظیم کے رکن نے

"ہاں ہاں۔ تم جاؤ۔ میری جان چھوڑو۔ سر مت کھاؤ میرا۔"

"ظالم میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کمایا۔ زمانے کے دھکے دنیا والوں کی گالیاں" غالب دردناک لہجے میں بولا "پاگل خانے کی ہوا۔ تمہارے نازک ہاتھوں کی پیار بھری مار، پھر روح کی دوا مسور کی دال... اور نخرے۔"

رابعہ نے کہا "زیادہ ڈرامہ مت کرو۔ جلدی سے جاؤ اور انہیں ٹھکانے لگا کے آ جاؤ۔ مگر دیکھو اپنا خیال رکھنا۔"

"تم خواہ مخواہ ڈر رہی ہو۔ یہ تو معمولی وزیر ہے۔ کتنے وزیراعظم ٹھکانے لگا چکے تھے ہم مارشل لا سے پہلے۔ دنیا نے کیا بگاڑ لیا ہمارا؟" میں نے کہا۔

غالب بولا "ہاں۔ خود ہم نے بگاڑ لیا اپنا۔ جتنا بگاڑ سکتے تھے۔"

میں نے ایک کندھے پر عباسی کو اٹھایا اور غالب نے اس کے باڈی گارڈ مسٹر مونچھ کو۔ ہم پیڈرو کے کمرے سے گزرے۔

پیڈرو نے حیرانی سے یہ سب دیکھا "کیا واقعی۔ یہ لوگ ان کو ٹھکانے لگانے جا رہے ہیں۔ یہ مر چکے ہیں۔"

رابعہ نے بے نیازی سے کہا "ہاں۔ راول ڈیم میں ڈالنے جا رہے ہیں۔"

"راول ڈیم میں۔ اس وقت؟"

"وہی قریب ہے اور محفوظ جگہ ہے۔ گاڑی بھی ڈوب جائے گی تو کسی کو پتا نہیں چلے گا صبحوں" میں نے رابعہ کی آواز سنی۔

غالب نے ہانپتے ہوئے کہا "نازو ساتھ والے کمرے میں موجود ہے۔ اگر ذرا بھی خطرہ ہو۔ تو اسے کوئی اشارہ۔ نازو کو نہیں ایسے۔"

رابعہ بولی "مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔ اور میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔"

میں نے وزیر کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ غالب نے اس کے باڈی گارڈ کو اوپر پھینک دیا "دیکھنے میں اتنا بھاری نہیں لگتا۔"

میں نے کہا "زیادہ بوجھ گناہوں کا ہوگا۔ گاڑی میں شراب کا پورا کریٹ رکھا ہوا ہے۔ ایک بوتل آدھی ہے۔"

غالب نے سہلایا "کیا پی رہا ہوگا۔ مونچھ والا۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ریس دے کر انجن بند کر دیا۔ پھر ہم آہستہ سے نیچے اترے اور میں نے گیٹ کو یوں ہلایا کہ محسوس ہو بند کیا ہے۔

اندر پیڈرو کو یہی محسوس ہوا ہوگا کہ گاڑی باہر نکل گئی تو نازو نے گیٹ بند کر دیا۔

میں اور غالب گھوم کے پچھلی طرف سے اندر داخل ہوئے اور اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں نازو کسی ریڈیو اناؤنسر کی طرح کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے بے حد مستعد بیٹھی ہوئی تھی۔ ایف ایم مائیکروفون سے موصول ہونے والی آواز ریکارڈ بھی ہو رہی تھی اور اس کے کانوں میں بھی پہنچ رہی تھی۔ میں اور غالب دروازے کے قریب

www.paksociety.com

خود چوہدری دلاور سے رابطہ کیا۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ وہ کوئی غیر ملکی تھا۔ شاید امریکن۔ وہ ظاہر یہی کرتا تھا کہ اردو نہیں سمجھتا اور اپنے ساتھ ایک مترجم رکھتا تھا۔ اس مترجم کا نام نوازش علی تھا۔ مجھے بعد میں کئی بار اندازہ ہوا کہ وہ امریکن۔۔۔ ہاں! اس کا نام اچانک یاد آگیا ہے مجھے۔ مسٹر ہربرٹ بیکر۔ دلاور اسے مسٹر بیکر کہتا تھا اور اکثر مذاق میں کہتا تھا کہ یار کوئی بیکری بھی ہے تمہاری یا ایسے ہی بیکر بن گئے ہو۔"

"کیا دلاور کو اندازہ نہیں تھا کہ بیکر اردو سمجھتا ہے؟"

"جب میں نے تاڑ لیا تھا تو چوہدری دلاور سے یہ بات کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ وہ تو جان بوجھ کے ایسی بات کہتا تھا کہ بیکر اپنے جذبات کے ردِعمل کو چھپا نہ سکے۔ مثلاً ایک بار اس نے ابراہیم لنکن کو اور دوسری بار جارج واشنگٹن کو بڑی گالیاں دیں۔ کسی وجہ کے بغیر۔ اس کی جگہ کوئی پاکستانی ہوتا اور کوئی یہ حرکت... بابائے قوم کو گالی دیتا... مشتعل تو ہوتا۔ بیکر مجبور تھا کہ سب سنے اور خاموش رہے۔ وہ بہت جلد نارمل ہو کے مسکرانے لگتا تھا اور نوازش علی سے پوچھتا تھا کہ ابراہیم لنکن اور جارج واشنگٹن کا کیا حوالہ تھا۔ اور وہ خبیث مسکرا کے کہتا تھا کہ چوہدری صاحب ان کی تعریف کر رہے ہیں کہ لنکن نے سیاہ فاموں اور غلاموں کو ان کے حقوق دلوانے کے لیے جان دے دی۔ اور جارج واشنگٹن نے جمہوریت کی جو روایات قائم کی تھیں "کاش ایسی ہی یہاں بھی ہوتیں۔""

"یہ نوازش علی کون تھا؟"

"چوہدری دلاور نے معلوم کرلیا تھا۔ وہ ہماری وزارتِ خارجہ کا ایک سیکشن افسر تھا اور ان تین سو تین افسران میں شامل تھا جن کو یحییٰ خان نے نکال دیا تھا۔ اس کا ایک پورا گروہ تھا۔ یہاں ہر محکمے میں کچھ بنگالی افسر تھے۔ ان میں کچھ غدار تھے۔ کچھ ضمیر فروش تھے۔ ان کو خرید لیا گیا تھا۔ مسٹر بیکر کے علاوہ بھی امریکن سی آئی اے نے ایران سے کچھ لوگ یہاں بھیج دیے تھے۔"

"یہ بیکر سی آئی اے کا آدمی تھا؟ تم جانتے تھے؟"

"سی آئی اے کا تو ہونے سے رہا مس رابعہ" پیڈرو نے جواب دیا "میرا بس اندازہ تھا۔ دلاور کا بھی یہی خیال تھا۔ یہ لوگ ایسے افراد کو خریدتے پھر رہے تھے جو ان کے مقصد کی تکمیل کے لیے مددگار ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ صحیح آدمی کو تاڑتے تھے۔ نہ جانے کب سے ان کی نظر چوہدری دلاور پر تھی اور انہیں معلوم تھا کہ یہ شخص پیسے کے لیے سب کچھ کرسکتا ہے۔ وہ سرمایہ کار بن کے آیا۔ اس نے سب کے ساتھ میٹنگ کی۔ وزیر خان سے بھی کہا کہ وہ ایم ڈبلیو ڈی انڈسٹری کو جدید خطوط پر وسعت دینے اور اس کے لیے بین الاقوامی مارکیٹ بنانے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے پچاس لاکھ سے ایک کروڑ ڈالر تک لگانے کی بات کی تھی۔ ظاہر ہے یہ بہت بڑی رقم تھی۔ ہربرٹ بیکر کا خیال یہ تھا کہ انہیں زرعی مشینری کے پرزوں تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ جب ان کے پاس کارخانے کو وسعت دینے کی گنجائش بھی ہے، ان کے پاس ماہر انجینئر بھی ہیں اور بہترین مشینری بھی تو ان کو دیگر بلکہ ہر قسم کے مشینی پرزے بنانے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ اس نے ایک میٹنگ میں کہا کہ ہم جو ٹریکٹر، ٹیوب ویل وغیرہ کے پرزے بناتے ہیں تو ان کی ملک میں تعداد کیا ہے۔۔۔ دس بیس سال میں کیا ہوگی۔ ان کے علاوہ اور کتنے لوگ اسی طرح یہی کام کر رہے ہیں اور آگے جاکے مزید کتنے کرنے لگیں گے۔ زراعت میں کام آنے والی مشینری صرف دیہات میں جاتی ہے اور وہاں نوے فیصد لوگ مشینی زراعت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے بہت کم ہیں۔ گاؤں میں ورکشاپ نہیں کھولے جاسکتے اور پرزے فراہم کرنا مشکل ہے۔ دیہاتی ان پرزوں کی منہ مانگی قیمت بھی نہیں دے سکتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی باتیں سب اثر کررہی ہیں۔ اس نے اچانک سوال کردیا کہ فرض کریں ہم گاڑیوں کے پرزے بنائیں۔ سب نہیں، کچھ پرزے۔ گاڑیوں میں کاریں جیسے ٹرک اور جیپ سب شامل ہیں۔ پورے ملک میں ان کی تعداد کتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور موٹر کے پرزے تو ہم باہر بھی بھیج سکتے ہیں۔ ہمارے پڑوسی ملک کی موٹر انڈسٹری اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھارہی ہے۔ وہ پرزے خود بناتے ہیں اور ان پر جاپانی ہونے کی مہر لگا کے ایران اور کوریا کی مارکیٹ میں پھیلادیتے ہیں۔ اور اس میں فائدہ دو سو فیصد سے آٹھ سو فیصد تک ہوسکتا ہے۔ بیکر کی بات کا اثر سب سے زیادہ چوہدری دلاور نے قبول کیا۔ میر شرافت علی تھوڑا بہت قائل ہوا مگر وزیر خان نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ ابھی ہمارے پاس اتنی پیداوار نہیں کہ ہم صرف اپنے ملک کی ضرورت پوری کرسکیں۔ باہر کی بات کررہا ہے۔ اگر کاروبار کو وسعت دینی ہے تو دو سو یا آٹھ سو فیصد منافع کے لیے وہی جعلسازی کیا ضروری ہے جو ہمارا پڑوسی ملک کرتا ہے؟ ابھی ہم کسان کی ضرورت پوری کرتے ہیں اور ملک کی زرعی پیداوار بڑھنے کے عمل میں شریک ہیں۔ ہمیں موٹر انڈسٹری کے دھوکے بازوں میں شامل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میر شرافت علی نے کہا کہ جعلی مارک نہ سہی۔ ہم اپنے ٹریڈ مارک سے اپنی مارکیٹ میں گاڑیوں کے پرزے فراہم کریں تو کیا حرج ہے۔ جب ہماری گڈول بن جائے گی تو یہی پرزے فل ایسٹ بھی جاسکتے ہیں۔ مجھے یہ ساری روداد ڈی سلوا نے بتائی تھی جو خود بھی چوہدری دلاور کا ہم خیال تھا۔ دنیا بزنس کررہی ہے "آخرت کے چکر میں نہیں ہے۔ منافع کمارہی ہے ثواب نہیں۔ مقابلہ سخت ہوتا جارہا ہے جو آج آگے بڑھ جائے گا وہی آگے رہے گا۔ جو ناجائز طریقے سب اختیار کرتے ہیں کیونکہ کاروبار ایک سوشل جنگ ہے جس میں سب آپ کے حریف ہیں اور حریف کو نیچا دکھانے اور اس پر سبقت لے جانے کے لیے سب کچھ کیا جاسکتا ہے۔ آہستہ آہستہ اختلافات کھل کر سامنے آتے گئے۔ وزیر خان نے بیکر کی تجاویز کو رد کر دیا۔ چوہدری دلاور نے اس کی حمایت کی مگر وہ میر شرافت علی کا ووٹ لینے میں بھی کامیاب ہوگیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ کاروبار کو وسعت دی جائے اور موٹر پارٹس بنانے کے لیے نئی مشینری لگائی جائے مگر اس کے لیے مسٹر بیکر کے ڈالر نہ لیے جائیں۔ زرعی ترقیاتی بینک کے علاوہ صنعتی ترقیاتی بینک سے قرضہ لیا جائے اور موٹر پارٹس پر "ایم ڈبلیو ڈی" کا وہی مونوگرام ہو جو زراعت میں کام آنے والی مشینری کے پرزوں پر مارکیٹ میں اپنی ساکھ بنا چکا ہے۔ وزیر خان نے اس پر بھی زور دیا کہ ہر پرزے پر "میڈ ان پاکستان" صاف لکھا جانا چاہیے۔ گویا اس کے بعد شروع ہوئی۔ کاروبار کے تین شعبے "تینوں پارٹنرز کے حوالے کر دیے گئے۔ ایک کے کام میں دوسرے کی دخل اندازی سے گریز کرنے کی پالیسی اپنائی گئی۔ دلاور نے ہم سے کہا کہ ہم سب اعتماد کی بنیاد پر اپنا اپنا کام کریں گے اور دوسروں کو ان کا کام کرنے دیں گے۔ ہر شخص ہر معاملے میں ٹانگ اڑائے گا تو پوری توجہ اپنے شعبے کے کام کو کیسے دے گا اور دوسروں کے لیے بھی کام کرنا دشوار ہوگا۔ وزیر خان نہیں مار کھاگیا۔ صرف اس لیے کہ وہ شریف آدمی تھا اور سب کو قابلِ اعتماد سمجھتا تھا۔ اس وقت تک ایسی کوئی بات بھی نہیں تھی کہ وہ شک کرتا۔ دلاور نے پروڈکشن کا شعبہ سنبھال لیا۔ کارخانے کے اندر کیا بن رہا ہے، کیسا بن رہا ہے اور کتنا بن رہا ہے، یہ اس کی ذمے داری تھی۔ اکاؤنٹ اور ایڈمنسٹریشن کو سب سے اہم قرار دیتے ہوئے وزیر خان کو مجبور کیا گیا کہ یہ شعبہ وہ سنبھالے۔ میر شرافت علی نے مارکیٹنگ کی ذمے داری لے لی۔ اس کے بعد بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے عملے کا انتخاب ہوا۔ وزیر خان کو ایسے ماتحت دیے گئے جو دلاور کے بھروسے کے آدمی تھے اور بھاری انعام کے لالچ میں اس سے مل گئے تھے۔ وزیر خان کو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس کے اپنے پرانے کارکن بھی نمک حرام اور غدار ہوسکتے ہیں لیکن پیسہ چیز ہی ایسی ہے کہ کسی کا بھی ایمان خریدا جاسکتا ہے۔ اکاؤنٹ کے شعبے میں اس کا چیف اکاؤنٹنٹ اور اکاؤنٹنٹ ہی سب کچھ کرتے تھے۔ وہ آمدنی اور خرچ کا حساب تیار کرتے تھے اور وزیر خان سے ہر جگہ دستخط کرا لیتے تھے۔ ممکن ہے شروع شروع میں وزیر خان نے اکاؤنٹ بکس، لیجر وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہو اور حسابات دیکھے ہوں۔ اس وقت کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔ بعد میں وہ دیکھے بغیر کاغذات پر دستخط کرنے لگا۔ چیف اکاؤنٹنٹ تھا ڈی سلوا جو بعد میں جنرل منیجر بنا۔ ڈی سلوا پہلے ایماندار تھا۔ وہ گوا سے لٹ لٹا کے آیا تھا مگر یہاں اس نے محنت سے سب کچھ دوبارہ حاصل کرلیا تھا۔ سوائے بیوی بچوں کے۔ اس کی بیوی ہالینڈ چلی گئی تھی۔ وہ خوب صورت عورت تھی۔ ڈی سلوا کے خیال میں دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی اسے بدقسمتی سے مل گئی تھی۔"

رابعہ نے کہا "بدقسمتی یا خوش قسمتی!"

پیڈرو بولا "اسے وہ بدقسمتی کہتا تھا کیونکہ پھر ساری دنیا اس کے پیچھے پڑ گئی اور بالآخر اسے ورغلانے میں کامیاب ہوگئی۔ ڈی سلوا ایک ڈچ فرم میں اچھے عہدے پر تھا۔ گوا کا ماحول سو فیصد ہالینڈ کا ماحول تھا۔ گھر سب انگریزی بولتے تھے اور گوا کو یورپ سمجھ کر رہتے تھے۔ ڈی سلوا ہی نہیں، سب لوگ شام کو کلب جاتے تھے اور گھروں پر پارٹیاں بہت کرتے تھے۔ ڈی سلوا کے تین باس بیک وقت اس کی بیوی پر مرمٹے۔ ماتحت تو شاید درجن بھر ہوں گے جو اس کو دیکھ دیکھ کے صرف آہیں بھرسکتے تھے۔ وہ ڈی سلوا کی سیکریٹری بھی تھی چنانچہ دن میں بھی اس کے ساتھ رہتی تھی۔ اس سے ساری خرابی پیدا ہوئی۔ اس کے دو بچے ہوگئے مگر اسے فرق نہیں پڑا۔ وہ بدستور لڑکی بنی رہی اور ہر محفل میں اپنے حسن اور ناز و ادا سے لوگوں کے عقل و ہوش لوٹتی رہی۔ ہر عورت کو اس کھیل میں لطف آتا ہے۔ شریف عورت کو معاشرتی پابندیاں ایک حد میں رکھتی ہیں ورنہ وہ بھی پرستاروں کی بھیڑ میں خوش رہنا چاہتی ہے۔ ایک شوہر سے وفا کرنا ان کو ایسا ہی لگتا ہے جیسے کوئی ہر روز ایک ہی ڈش کھاتا رہے خواہ وہ دنیا کی سب سے اچھی اور مہنگی ڈش ہی کیوں نہ ہو۔"

"کیا مرد ایسا نہیں کرتے؟" رابعہ بولی۔

"مرد ہی زیادہ کرتے ہیں مگر کیا تالی ایک ہاتھ سے بجتی ہے؟" پیڈرو بولا "بعد میں ڈی سلوا روتا تھا کہ پتا نہیں وہ دو میرے ہی تھے یا سب کی دولت مشترکہ تھے۔ جب بالآخر ایک ڈچ جنرل منیجر تھا۔ جوان اور ہینڈسم ہونے کے علاوہ وہ خاندانی دولت مند تھا۔ اس کی بیوی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ خود پہلے ایک کو چھوڑ چکا تھا۔ ڈی سلوا اتنا بددل ہوا کہ اس نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ تین مہینے وہ روتا رہا اور شراب پیتا رہا۔ اس کی داڑھی بڑھ گئی تھی اور وہ میلے کپڑوں میں ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا تھا لیکن خود کو۔۔۔ جاتا تھا۔ اس کو شراب پی کے ہنگامہ کرنے اور لوگوں سے مارپیٹ کے جرم میں تین بار حوالات جانا پڑا۔ ایک بار اسے جرمانہ ہوا جو کسی دوست نے ادا کیا اور اسے چھڑالیا۔ دوسری بار اس نے تین ماہ کی جیل کاٹی۔ پھر بھارت نے گوا پر قبضہ کیا تو بہت سے لوگ وہاں سے فرار ہوئے۔ وہ بھی بھاگنے والوں کے ساتھ پاکستان پہنچا۔ اس کے پاس اکاؤنٹس کی ڈگری تھی اور تجربہ تھا۔ حالات نے اسے وزیر خان کے پاس پہنچادیا۔ خود وزیر خان کا گھر اسی طرح تباہ ہوا تھا۔"

رابعہ نے اس کی بات کاٹ دی "وزیر خان کے حالات بالکل مختلف تھے۔"

"ہاں۔ مگر دونوں کے بیوی بچے اور بھرا ہوا گھر پیچھے رہ جانے کا دکھ ایک تھا۔ وزیر خان نے اسے حوصلہ اور سہارا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر خان کو جتنا بھروسا ڈی سلوا پر تھا کسی اور پر نہیں تھا۔ ڈی سلوا اس کے سامنے رجسٹر اور کیش بک یا کوئی بھی کاغذ رکھ دیتا تھا

www.paksociety.com

اور کہتا تھا کہ سر یہاں دستخط کر دیں تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ پوچھتا تھا کہ تم نے ٹھیک سے دیکھ لیا ہے نا؟ اور ڈی سلوا کہتا تھا کہ سر میں نہیں دیکھوں گا تو کیا فرشتے دیکھیں گے اور وزیر خان ہنس پڑتا تھا اور دستخط کر دیتا تھا۔ بھئی سوا مست دینا۔ یہ بات وہ عادتاً کہتا تھا اور ڈی سلوا جواب میں کہتا تھا کہ سر جب مروانا ہو گا تو بتا دوں گا۔ بس اسی چکر میں وزیر خان مارا گیا۔ ڈی سلوا کو جنرل منیجر بننے کے لالچ نے اپنے محسن کا بیڑا غرق کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کہتا تھا کہ میری خوب صورت بیوی کو ایک جنرل منیجر لے گیا۔ میں جنرل منیجر بن جاؤں تو کسی سے اس کی خوب صورت بیوی چھین لوں گا۔ کارخانے میں نئی مشینری آ گئی۔ پیداوار بڑھ گئی۔ منافع بہت زیادہ ہو گیا۔ مشرقی پاکستان سے بھی آرڈر آنے لگے اور وہاں مال کی کھپت میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ وزیر خان کا خیال تھا کہ یہ شرافت علی کی سمجھ بوجھ اور دلاور کی محنت کا نتیجہ ہے۔ بھئی میں کیا کرتا ہوں' سارا دن دفتر میں بیٹھ کے دستخط کرتا ہوں۔ میرا کام ڈی سلوا کرتا ہے۔ ڈی سلوا نے ہی اس کا کام تمام کر دیا۔"

"اکاؤنٹس کے شعبے میں اور لوگ بھی تھے؟" رابعہ نے پوچھا "کسی نے وزیر خان کو خبردار نہیں کیا۔"

"ایک اکاؤنٹنٹ تھا مگر اس کو بھی بہت دیر سے پتا چلا کہ ڈی سلوا کیا کر چکا ہے۔ ڈی سلوا ڈبل کیپ اکاؤنٹ رکھتا تھا۔ ایک وہ اکاؤنٹس بکس تھیں جو آڈٹ کے لیے پیش کی جاتی تھیں۔ دوسری وہ جو ڈی سلوا کی تحویل میں رہتی تھیں۔ اکاؤنٹنٹ کا حساب کچھ اور تھا۔ ڈی سلوا اس پر بھی وزیر خان سے دستخط کرا لیتا تھا اور دوسرا حساب کتاب خود تیار کرتا تھا۔ وزیر خان اس پر بھی دستخط کر دیتا تھا۔ اکاؤنٹنٹ کو پتا چلنے تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ کسی ثبوت کے بغیر اکاؤنٹنٹ بھی ڈی سلوا پر فراڈ اور نمک حرامی کا اتنا بڑا الزام عائد نہیں کر سکتا تھا۔ پروڈکشن کے شعبے میں چودھری دلاور کیا کر رہا ہے۔ یہ وزیر خان نے کبھی پلٹ کے نہیں دیکھا۔ وہ ایک شریفانہ معاہدے کا پابند تھا۔ اس کے دونوں پارٹنر بھی اکاؤنٹ کے شعبے سے دور رہتے تھے۔ چودھری دلاور نے ایک سال میں سات افراد کو برطرف کرایا۔ انہیں وزیر خان کے سامنے پیش کیا گیا کہ وہ چوری اور غبن کے مرتکب ہوئے ہیں۔ دلاور ان کا کیس پولیس کو دینا چاہتا تھا مگر وزیر خان کے سامنے انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تو انہیں برطرفی کی سزا دینا کافی سمجھا گیا۔ یہ سب ایک ڈراما تھا۔ ان کی برطرفی کے احکامات صرف وزیر خان ہی جاری کر سکتا تھا۔"

"ڈراما کیا تھا اس میں" رابعہ نے کہا "وہ مجرم نہیں تھے؟"

"انہیں مجرم بنایا گیا تھا اور پھر یہ سمجھایا گیا تھا کہ وہ وزیر خان کے سامنے اپنا جرم تسلیم کر لیں تو انہیں پولیس کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ گزارے کے لیے مستقل رقم دے دی جائے گی اور برطرفی کے خط میں یہ لکھا جائے گا کہ وہ فاضل ہو گئے تھے۔ ان کی اچھی کارکردگی کی تعریف بھی ہو گی اور اس سے انہیں یہ فائدہ ہو گا کہ وہ کسی دوسرے کارخانے میں ملازمت حاصل کر لیں گے۔ شرط یہی ہے کہ وہ چپ رہیں ورنہ ان کا مستقبل جیل کی دیواروں کے پیچھے ہو گا۔ آج بھی اور کل بھی۔ یہاں سے جا کے بھی وہ خود کو آزاد نہ سمجھیں۔ آدمی پکڑا اسی وقت جاتا ہے جب جرم کا سراغ اور ثبوت سامنے آ جائے۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہیں گے تو سب ٹھیک رہے گا۔ ظاہر ہے انہوں نے وہی کیا جو ان سے کہا گیا تھا۔ ان کی جگہ دلاور نے اپنے کام کے ماہر آدمی رکھے۔ ان کی تقرری کا حکم بھی وزیر خان نے جاری کیا۔ یہ خاص لوگ تھے۔"

"یہ خاص لوگ کون تھے؟ کس کام کے ماہر تھے؟"

"یہ اسلحہ بنانے والے کاریگر تھے اور علاقہ غیر سے لائے گئے تھے۔ وزنے سے اور لنڈی کوتل سے۔ ان کے کام کرنے کا انداز اور تھا۔ وہ اور ان کے بڑے پہاڑوں میں صدیوں سے اسلحہ بنا رہے تھے اور یہ اسلحہ یورپ کی جدید ترین فیکٹریوں کے مقابلے کا بھی ہوتا تھا۔ یہاں ان کو خراد مشینوں پر۔ ڈرلنگ' ٹرننگ اور ملنگ کی تربیت دی گئی۔ یہ کام ان کو میں نے سکھایا۔ ان کو سرحد سے لانے والا بھی میں تھا۔ ان میں بڑی صلاحیت تھی۔ وہ ہاتھ کا کام مشین سے کرنا بہت جلد سیکھ گئے تو ان کو سپروائزر بنا دیا گیا اور ان میں سے ہر ایک کو تین تین اپرنٹس دے دیے گئے۔ تین لڑکے مشینوں پر ان کی ہدایات کے مطابق کام کرتے تھے اور وہ کام کی کوالٹی پر نظر رکھتے تھے۔"

"یہ ایکسپرٹ لڑکے بھی تم نے ہی بھرتی کیے تھے؟"

"ہاں جی۔ وہ سب لاہور کے چھوٹے موٹے کارخانوں میں ورکشاپ اور فونڈری میں بہت کم تنخواہ پر کام کرتے تھے۔ میں نے ہنرمند اور ذہین لڑکے منتخب کیے اور دس گنا تنخواہ پر۔ ہر لڑکے کو میں اور دلاور اچھی طرح سمجھا دیتے تھے کہ جب تک وہ اپنے کام سے کام رکھیں گے عیش کریں گے۔ ان کو تنخواہ کے علاوہ اچھی کارکردگی اور اچھے رویے پر اضافی بونس بھی ملے گا۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ یہ وزارت دفاع کا ایک خفیہ یونٹ ہے۔ ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے یونٹ پورے ملک میں لگائے گئے ہیں۔ ان کا مقصد پیداوار میں اضافے کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جنگ کی صورت میں آرڈیننس فیکٹری جیسے بڑے کارخانے بمباری سے تباہ ہو جائیں تب بھی دفاعی ضروریات کسی حد تک پوری ہوتی رہیں مگر یہ انتہائی ذمے داری کا کام ہے۔ اگر غلطی سے بھی ان کی زبان سے کوئی لفظ نکلا کہ وہ کیا کرتے ہیں یا انہوں نے کسی کو بتایا کہ وہ کہاں کام کرتے ہیں تو فوراً معلوم ہو جائے گا اور پھر ... ان کے ساتھ خاندان والے بھی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ وہ ایم اینڈ ڈی انجینئرنگ کمپلکس میں زرعی مشینری کے پرزے بناتے ہیں۔ ہر جگہ ان کا ایک ہی بیان ہونا چاہیے۔ کوئی ملٹری کا جنرل پوچھے یا صدر۔ کوئی پولیس افسر پوچھے یا سپریم کورٹ کا جج۔ سب کو کہنا

جواب دینا ہے۔ ظاہر ہے جو لڑکے پانچ سو روپے ماہانہ پا رہے تھے وہ پانچ ہزار کی نوکری کو بچانے کے لیے سب کچھ کر سکتے تھے۔ یہ تو سرے سے کوئی کام ہی نہیں تھا۔ ان کے نزدیک تو یہ قومی خدمت تھی اور ملک کا دفاع کرنے والوں کا ساتھ دینے والی بات تھی۔ پہلے ہی مہینے ان کو ایک ایک ہزار کا بونس بھی دے دیا گیا تو وہ ہمارے ذاتی ملازم بن گئے۔ انہوں نے دن رات ایک کر دیے' ان کے تو جیسے دن پھر گئے تھے۔"

"یہ سات سپروائزر اور اکیس لڑکے اب کہاں ہیں؟"

"چھ سپروائزر تھے اٹھارہ کاریگر۔ ساتواں سپروائزر ان سب کا فورمین تھا۔ وہ اسلحے کی فائنل چیکنگ کرتا تھا اور اس کی آنکھوں میں تو جیسے مائیکرو اسکوپ یا محدب عدسے لگے ہوئے تھے کہ وہ بال کے سویں حصے کا فرق دیکھ لیتا تھا اور اس کے ہاتھ نقص والے مال کو فوراً پکڑ لیتے تھے۔ بعد میں ان سب کو مروا دیا گیا۔"

رابعہ اچھل پڑی۔ میں اور غالب بھی اچھل پڑے۔ پیڈرو نے اتنی بڑی بات بڑی آسانی سے کہہ دی تھی۔

"مروا دیا گیا۔ سب کو؟" رابعہ نے صدمے سے سنبھل کے کہا۔

"ہاں۔ یہ تو پہلے سے طے تھا۔"

"اُف۔ ایک ساتھ اتنے افراد قتل کر دیے گئے؟"

"ایک ساتھ نہیں۔" پیڈرو بولا "سات افراد جو سرحد کے علاقہ غیر سے آئے تھے ایک ویگن میں واپس جا رہے تھے۔ ان کی ساری کمائی تقریباً ایک ایک لاکھ کی رقم بھی ان کے پاس تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اب وہ اپنے اپنے گھر والوں کو ساتھ لے کر شہر آ جائیں گے اور ایک لاکھ سے کوئی کاروبار کریں گے' گھر بنائیں گے اور آرام سے رہیں گے۔ کوئی رکشا چلانے کا سوچ رہا تھا کوئی ٹیکسی خریدنا چاہتا تھا۔ صرف ایک خود بھی حج پر جانا چاہتا تھا اور اپنے ماں باپ کو بھی لے جانے کی خواہش رکھتا تھا۔ یہ فورمین تھا جس کے پاس رقم بھی دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ اٹک کا پل پار کرنے کے بعد ویگن اکوڑہ خٹک میں شاید چائے پینے میں رکی اور پھر روانہ ہوئی تو ویگن میں بم کا دھماکا ہوا۔ وہ ساتوں ایک ساتھ آئے تھے' ایک ساتھ اس دنیا سے گئے۔ میرے پاس ان سب کے نام اور پتے موجود ہیں۔ آج بھی ان کے رشتے داروں کو معلوم ہو جائے کہ ان کو قتل کرنے والا کون تھا تو وہ اس کی اگلی سات پشتوں کو نہ چھوڑیں۔"

"اور باقی کاریگر۔ ان کا کیا انجام ہوا؟" رابعہ سخت نروس تھی۔

"وہ باری باری ختم کر دیے گئے۔ اس طرح کہ ایک کو دوسرے کی موت کا پتا بھی نہیں چلا۔ وہ مختلف علاقوں میں رہتے تھے اور میرے ساتھ آنے سے پہلے ایک دوسرے سے قطعی ناواقف تھے۔ ان کو یہ بھی سمجھایا گیا تھا کہ بات چیت میں بھی نہیں

کمل ملاقات میں بھی محتاط رہیں' یہ ہو سکتا ہے کہ دشمن ملک کے جاسوس جو پاکستان میں پہلے سے بہت ایکٹو ہیں کسی طرح لاہور کے پروڈکشن یونٹ کا سراغ نکالیں اور کسی ایک بندے کا پیچھا کرتے ہوئے باقی لوگوں تک پہنچ جائیں۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ ایسے ہی خفیہ یونٹ پشاور' پنڈی' کراچی' کوئٹہ اور حیدر آباد جیسے بڑے شہروں کے علاوہ بھی بہت سے چھوٹے قصبوں میں موجود ہیں۔ وزیر آباد یونٹ میں ایسا ہی ہوا تھا۔ بھارتی ایجنٹوں نے سب کو قتل کرا دیا تھا۔ پھر یونٹ کو اڑا دیا تھا۔ وہ بے چارے اتنے ڈر گئے تھے کہ فیکٹری سے سیدھے گھر جاتے تھے اور بعد میں گھر سے نکلتے ہی نہیں تھے۔ انہیں ایک سال کے کنٹریکٹ پر رکھا تھا۔ مئی میں ان کا کنٹریکٹ ختم ہوا تو ہر ایک کو پچاس پچاس ہزار کا بونس دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ نہ جانے کیوں جی ایچ کیو نے ان کے کنٹریکٹ کی تجدید نہیں کی۔ کام تو ابھی چلے گا' ممکن ہے کوئی بجٹ کا مسئلہ ہو۔ جولائی سے ان کی ملازمت ہر حال میں شروع ہو جائے گی۔ وہ بھی پریشان نہیں ہوئے۔ مسلسل کام نے ان کو تھکا دیا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ چلو دو مہینے آرام کر لیں گے۔ پچاس ہزار تو مل ہی گئے ہیں۔ ایک مہینے میں ان سب کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔"

"پیڈرو' تم لوگ بڑے سفاک ہو۔ کتنے گھروں کے چراغ بجھا دیے تم نے۔ زندگی کی تھوڑی سی قیمت دے کر۔"

"رابعہ بی بی۔ آپ جذباتی ہو رہی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں اور ہماری سرحدوں پر بے گناہ مرنے والوں کا حساب کریں۔ ہر روز جو ذاتی دشمنی کے باعث قتل ہو جاتے ہیں۔"

"چھوڑو بحث کو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس ان کے بارے میں کیا معلومات ہیں؟ کیسے قتل کیا گیا تھا انہیں اور کس نے کیا تھا؟"

"دو کی لاشیں دریائے راوی سے نکالی گئی تھیں۔ دو سڑک کے حادثات میں ہلاک ہوئے تھے۔ دو ایسے غائب ہوئے کہ آج تک ان کا سراغ نہیں ملا۔ یہ پہلے ہفتے کی کہانی ہے۔ دوسرے ہفتے میں کچھ اسی طرح کے واقعات پھر پیش آئے۔ اب تفصیل جان کے آپ کو کیا فائدہ ہو گا۔ ان کو جیسے مرنا تھا ویسے مر گئے۔ مارنے والوں کے نام میں نہیں بتاؤں گا۔"

"اس لیے کہ خود تمہارا نام بھی ان میں شامل ہو گا۔ چلو' تم اپنے علاوہ دوسرے لوگوں کے نام بتا دو۔"

"جو سڑک کے حادثات میں ہلاک ہوئے تھے انہیں تو خود چودھری دلاور نے مارا تھا۔ انہیں بلایا گیا کہ فلاں جگہ آ جاؤ۔ وہ سمجھے کہ شاید کام پھر شروع ہو گیا۔ وہ مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گئے جہاں موت کو ان کا انتظار تھا۔ دریا میں غرق کرنے کی کارروائی کا ذمے دار ڈی سلوا تھا۔ دلاور نے ان کو خاموشی سے کام ران کی بارہ دری میں طلب کیا تھا اور وہ بھی دن کے وقت وہاں پہنچے تھے۔ ڈی سلوا نے انہیں مبارک باد دی کہ انہیں مزید ایک سال کے کنٹریکٹ پر رکھ لیا گیا ہے اور ان کی تنخواہ بھی اب چھ ہزار ہو گی۔

www.paksociety.com

ظاہر ہے کہ وہ بہت خوش ہوئے۔ ڈی سلوا نے ان کو ٹھنڈی بوتلیں پیش کردیں اور خود بھی ان کے ساتھ بوتل پی۔ چونکہ گرمی بہت تھی اور پیاس سے سب کا بُرا حال تھا اس لیے وہ غٹاغٹ پی گئے اور چند منٹ میں ختم ہو گئے۔ ڈی سلوا نے لاشوں کو کنارے سے پانی میں لڑھکا دیا اور ہاتھ جھاڑ کے روانہ ہو گیا۔ وہ ہرن مینار گئے تھے پکنک منانے ان کی لاشیں جھیل سے ملیں۔ پکنک کا تمام سامان پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ دو ٹرین سے کٹ گئے تھے۔ ایک رائے ونڈ ریلوے اسٹیشن پر خیبر میل کے سامنے آگیا تھا۔ دوسرا شاہدرہ میں مال گاڑی کے سامنے۔"

"غائب کتنے ہوئے تھے جن کا پتا ہی نہیں چلا؟"

"چار۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھیں کہ غائب کرنے والا میں تھا۔" پیڈرو بولا۔

"تم ماہر ہو اس کام کے۔ خیر یہ بتاؤ تمہارے پاس ان سب کے نام پتے ہیں، تم نے ابھی کہا تھا۔"

"سب کے نام پتے ایک ڈائری میں ہیں۔ ایکس کاریگر، سات سپروائزر مع فورمین جو وکین میں مارے گئے تھے ان سب کے بارے میں ایک صفحے پر ساری تفصیل ہے۔ وہ کب ملازم ہوئے تھے، کتنی تنخواہ یا بونس کتنا ملا، کب مارے گئے اور کیسے؟"

"اور یہ ڈائری کہاں ہے؟"

"بہت محفوظ جگہ پر۔ ایک بینک کے لاکر میں۔ اگر یہ ڈائری نہ ہوتی تو چوہدری دلاور مجھے زندہ چھوڑتا؟ اب اس نے مجھے تمہارے حوالے کیا ہے، اس یقین کے ساتھ کہ تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے۔"

"اور تمہارا یقین اس کے برعکس ہے؟"

"مس رابعہ۔ اگر اب بھی مجھے قتل کیا گیا تو نقصان کس کا ہوگا، آپ کے ہاتھ وہ ڈائری نہیں آئے گی۔ اس میں تو اور بھی بہت کچھ ہے۔ تاریخ وار۔ ترتیب وار، دلاور اس جال سے مر کے بھی نہیں نکل سکتا ہے۔"

"مگر اس میں تمہارے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔"

"ظاہر ہے اپنے لیے پھانسی کا پھندا خود کون بناتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "لیکن پیڈرو۔ کیا ایسا ہی جال دلاور نے تمہارے لیے نہیں بنا ہوگا، وہ تم سے بڑا شکاری ہے۔"

"تقدیر سے بڑا شکاری کوئی نہیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ آخر میں کون کس کو شکار کرتا ہے۔ ڈی سلوا، نواب صاحب، میر شرافت علی سب ہی بڑے شکاری تھے۔ اب میدان میں کتنے رہ گئے ہیں؟"

"اچھا اب جلدی سے باقی بات بھی بتادو۔ اصل بات کی طرف آؤ۔ وزیر خان کو سب پتا چلا اس سازش کا؟ اور کیسے؟"

"کسی نے اسے گمنام فون کیا۔ اس سے کہا کہ وزیر خان، ہوش میں آؤ۔ دیکھو تمہارے کارخانے میں کیا ہو رہا ہے۔ تمہیں خبر ہی نہیں۔ وہ پریشان ہو گیا۔ فون کرنے والے نے اور کچھ نہیں بتایا تھا۔ فون بھی آدھی رات کے وقت کیا تھا۔"

"تاریخ یاد ہے؟"

"نہیں۔ لیکن تین چار مہینے گزر چکے تھے۔ اسلحہ سازی شروع ہوئے۔ مال خوب سپلائی ہو رہا تھا اور مانگ بڑھتی جا رہی تھی۔ ظاہر ہے دلاور کو قیمت بھی منہ مانگی مل رہی تھی۔ وزیر خان نے سب سے پہلے ڈی سلوا سے کہا کہ رات کسی نے فون پر عجیب سی بات کی۔ ڈی سلوا نے بات سنی تو ہنسنے لگا کہ سر ایسے فون تو مجھے بھی آتے ہیں۔ لڑکے شرارت کرتے ہیں، لوگوں کو پریشان کر کے خوش ہوتے ہیں۔ مگر وزیر خان مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے کہا کہ یہ شرارت نہیں ہو سکتی۔ وہ بہت سیریس تھا۔ ڈی سلوا نے کہا کہ سب ایکٹر ہوتے ہیں بدمعاش۔ آپ فکر نہ کریں مت پڑیں۔ سب کام ٹھیک چل رہا ہے۔ وزیر خان نے چوہدری دلاور سے اور پھر میر شرافت علی سے ذکر کیا تو انہوں نے بھی وہی کہا جو ڈی سلوا نے کہا تھا۔ اس سے وزیر خان کا شک بڑھ گیا۔ تین آدمی ایک ہی بات کہہ رہے ہیں۔ کیا وہ آپس میں طے کر چکے تھے کہ اس قسم کی صورت حال میں انہیں کیا کہنا ہوگا۔ کوئی یہ بھی تو کہہ سکتا تھا کہ رانگ نمبر تھا یا مزید اطمینان کی بات ہوتی اگر وہ کہتے کہ وزیر خان، چل کے دیکھ لو خود اپنی آنکھوں سے تاکہ تمہارے دل کا وہم دور ہو جائے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی اس فون کے ذکر سے پریشان ہوئے ہیں کہ وزیر خان نے اسے غیر ضروری اہمیت کیوں دی۔ اس دن وزیر خان نے ایک دو مخلص ساتھیوں سے بھی مشورہ کیا۔ شاید انہی میں سے کوئی فون کرنے والا تھا۔ اس نے رات بارہ بجے پھر فون کر دیا اور وزیر خان کو بہت ڈرایا کہ تم بے خبری میں مارے جاؤ گے۔ جن پر تم نے بھروسا کیا ہے وہ آستین کے سانپ ہیں۔ فون پر زیادہ نہیں بتایا جا سکتا اور کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ سامنے آکے بات کرے۔ تم ڈرتے کیوں ہو۔ فیکٹری کے ایک مالک تم بھی ہو۔ صبح وزیر خان آفس پہنچا تو اس نے چوہدری دلاور سے کہا کہ وہ فیکٹری دیکھنا چاہتا ہے۔ دلاور نے کہا کہ فیکٹری میں دیکھنے کی کیا چیز ہے؟ جو مال تیار ہے وہ گودام میں چل کے دیکھ لو۔ میر شرافت علی نے بھی اس کی حمایت کی کہ یہ تو پہلے ہی طے ہو گیا تھا کہ ہم چوہدری دلاور کے کام میں مداخلت نہیں کریں گے۔ پروڈکشن کے شعبے سے ہمارا کیا تعلق۔ اس پر وزیر خان بگڑ گیا کہ تعلق کیوں نہیں، میرا کارخانے کے ہر شعبے سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا تمہارا۔ آخر میں بھی مالک ہوں۔ میرے کہیں جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جیسے تم اکاؤنٹ بکس دیکھ سکتے ہو یا مارکیٹ کا سروے کر سکتے ہو اور ڈسٹری بیوٹرز، خریدار تک کسی سے بھی مل سکتے ہو۔ چوہدری دلاور اور شرافت علی اپنی بات پر اُڑے رہے کہ معاہدے کی رو سے یہ نہیں ہو سکتا۔ وزیر خان کی جھنجھلاہٹ غصے میں بدل گئی۔ وہ چلانے لگا کہ معاہدے کی ایسی تیسی۔ یہ آپس کی بات تھی۔ قانونی دستاویز ہوتی تو میں اسے بھی پھاڑ کے پھینک دیتا۔ چلو مجھے ابھی دکھاؤ کہ فیکٹری میں کیا ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد بات بگڑ گئی۔ چوہدری دلاور نے اسے آفس کے کمرے میں ہی روک لیا اور بتا دیا کہ وہ خیریت چاہتا ہے تو خاموش رہے اور منافع میں سے اپنا حصہ وصول کرتا رہے ورنہ مارا جائے گا۔ اچانک وزیر خان کو معلوم ہوا کہ زرعی مشینری کے پرزوں کی آڑ میں وہاں اسلحہ بن رہا ہے اور اس خطرناک کام میں اب تک اس کی معاونت شامل تھی۔ اعتماد میں اس نے بہت سی ایسی دستاویزات پر دستخط کر دیے تھے جن سے اس کا شریک جرم ہونا ثابت ہوتا تھا بلکہ اصل مجرم وہی بنتا تھا۔ اس نے قرض کی دستاویز پر دستخط کیے تھے۔ مشینری امپورٹ کی تھی۔ اس کی قیمت ادا کی تھی۔ مشینوں کو نصب کرنے کا معاوضہ ادا کیا تھا لیکن ان کا وجود کاغذی تھا۔ کیا جائے گا وہ کہ اصل مشینیں کہاں گئیں۔ باہر سے آنے والی مشینیں جو کارخانے میں اسلحہ سازی کے لیے استعمال ہو رہی تھیں، بالکل مختلف تھیں۔ وزیر خان کی حالت بگڑ گئی۔ اس کو اسپتال لے جایا گیا اور وہ ایک ہفتے آئی سی یو میں رہا۔ وہاں چوہدری دلاور کا کڑا پہرا تھا۔ ڈاکٹر، نرسیں اور آنے جانے والے وزیر خان سے کوئی بات نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے پاس فون نہیں تھا اور دلاور اسے بار بار یہ بتاتا تھا کہ تمہارا بیٹا سکندر بخت لندن میں ہے۔ اس کی تعلیم ختم ہو جائے گی۔ مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ تم اب خاموشی سے الگ ہو جاؤ۔ اسپتال ہی میں اسے پتا چلا کہ وہ عملاً خود کو کاروبار سے الگ کرنے کی قانونی دستاویز پر بھی دستخط کر چکا ہے اور اب محض ایک سلیپنگ پارٹنر ہے۔ اس کے حصے کا معاوضہ بھی اسے ادا کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس نے جو قرض لیا تھا وہ اتنا زیادہ تھا کہ اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ اس کی وہ کوٹھی بھی کمپنی نے لے لی ہے جس میں وہ رہتا تھا اور اب اسے فروخت کر دیا جائے گا۔ وزیر خان پر قرض میں لاکھوں کا غبن ثابت ہوتا تھا۔ اس نے پچاس لاکھ کا قرض لیا تھا۔ خرچ صرف بیس لاکھ ہوئے تھے۔ باقی تیس لاکھ کا حساب ہی نہیں تھا۔ وزیر خان بُری طرح پھنس گیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو بھی کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ سارے ثبوت اس کے خلاف تھے۔ حالات اور واقعات کی گواہی اس کے خلاف تھی۔ وہ سکندر بخت کا مستقبل تاریک کرنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ وہ خاموشی سے چراغ دین کے گھر چلا گیا اور خاموشی سے مر گیا۔ وہاں اس کی حیثیت ایک قیدی جیسی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دلاور نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ اگر تم نے زبان کھولی تو تمہارے ساتھ تمہارے بیٹے کو بھی سزا ملے گی۔ وہ لندن میں ہے تو کیا ہوا۔ ہم اسے پاکستان لا سکتے ہیں۔ وزیر خان نے ان کی ہر بات مان لی تھی۔ وہ تمام معاملات سے لاتعلق ہو گیا تھا۔ اس نے کاروبار سے علیحدہ ہونا قبول کر لیا تھا۔ اپنا گھر ان کے حوالے کر دیا تھا، ساری نقد رقم بھی انہیں دے دی تھی۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ چوہدری دلاور اور میر شرافت علی کی توقعات کے برعکس۔ ان کا یہ خیال تھا کہ وزیر خان ایک تو ویسے ہی پٹھان ہے۔ اپنی بات پر اَڑ جائے تو جان دینے اور لینے سے دریغ نہ کرے۔ پھر اس کی ساری عمر بھی کاروبار کرتے گزری تھی۔ وہ لوگوں کو جانتا تھا اور لوگ اسے جانتے تھے۔ اگر وہ چاہتا تو قانون کی مدد لے سکتا تھا اور یہ معاملہ ایسا تھا کہ چوہدری دلاور اور میر شرافت علی کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ جس طرح وزیر خان کو کاروبار سے بے دخل کیا گیا اور پھر اس کا سب کچھ چھینا گیا، یہ سو فیصد غیر قانونی تھا۔"

"پھر وہ کیوں خاموش رہا؟ بیٹے کی وجہ سے؟"

"ہاں۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ دلاور بین الاقوامی سطح پر اسلحے کی خرید و فروخت میں ملوث تھا۔ بہت سے دہشت گرد بھی دلاور کے ساتھی ہیں۔ وہ سکندر بخت کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اس نے ہر ظلم اور سب زیادتی اور ناانصافی قبول کر لی اور کہا کہ بس سکندر بخت کو کچھ پتا نہ چلے ورنہ اس کی تعلیم کا حرج ہوگا۔ وہ سب کچھ چھوڑ کے آ جائے گا۔"

"پھر سکندر بخت کو پاکستان کیوں بُلایا گیا تھا؟"

"دراصل۔ وزیر خان کے سکون اور اطمینان نے دلاور کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔" پیڈرو بولا "وہ اور میر شرافت علی اس بات پر پریشان تھے کہ وزیر خان پریشان کیوں نہیں۔ وہ اتنے آرام سے کیوں بیٹھا ہوا ہے۔ چراغ دین کے گھر میں وہ نوکر کی طرح کام کرتا تھا مگر مسکراتا رہتا تھا۔ کوئی مطالبہ نہیں کرتا تھا۔ کسی سے شکایت نہیں کرتا تھا۔ غصہ نہیں کرتا تھا۔ روتا نہیں تھا۔ بس زیر لب کچھ کہتا رہتا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ تلاوت کیا کرتا تھا۔ وہ حافظ قرآن تھا۔ ایک بار ختم ہو جانے کے بعد پھر پہلے حرف سے شروع کرتا تھا اور اس تمام عرصے میں جب وہ ایک طرح سے قید تنہائی کاٹ رہا تھا شاید اس نے سیکڑوں قرآن ختم کیے ہوں گے۔ یہ بھی اس کے دلی سکون کی ایک وجہ تھی مگر دلاور کا خیال تھا کہ اصل بات کچھ اور ہے۔ چوہدری دلاور کے دل میں تھا اور خوف جن کے اندر بیٹھ گیا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ وزیر خان کو مار کے اس کے اطمینان کا سبب پوچھتا۔ اس نے یہ شک بھی ظاہر کیا کہ وزیر خان اندر ہی اندر کچھ کر رہا ہوگا مگر چراغ دین کے پاس ہر لمحے کی رپورٹ تھی۔ نہ وہ کسی سے ملتا تھا اور نہ کوئی اس سے ملنے آتا تھا۔ بیماری میں وہ ریلوے اسپتال سے دوا لینے جاتا تھا تو سائے کی طرح ایک آدمی اس کا تعاقب کرتا تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ چراغ دین محض اسے ذلیل کرنے کے لیے اس سے کام لیتا تھا لیکن بعد میں وہ ڈرنے لگا تھا۔ اس نے دلاور سے کہا تھا کہ وہ تو میرے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔ اس نے میرے گھر کو آسیب زدہ کر دیا ہے۔ مجھے خوف آتا ہے اس کی مسکراہٹ سے اور اس کے ہونٹ ہلتے دیکھ کر۔ ایسا لگتا ہے کہ میں نے ہاتھ بھی لگایا تو مجھے کچھ ہو جائے گا۔ کسی دن وہ اچانک مجھے جلالی نظروں سے دیکھے گا اور میرا وجود پانی بن کے بہہ جائے گا یا جل کے خاک ہو جائے گا۔"

www.paksociety.com

دلاور نے اسے سمجھاتا تھا کہ وہ تو پاگل ہو گیا ہے۔ صدمے سے وزیر خان کا دماغ چل گیا ہے۔ پہلے اسے نانی یاد آ گئی ہو گی اور چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہو گا۔ اب خدا یاد آیا ہے۔ نماز اور تلاوت سے کسی کو نقصان کیسے ہو سکتا ہے۔ تیرا گھر تو آسیب سے اور بلاؤں سے محفوظ ہو گیا ہے۔ چراغ دین نے وزیر خان کو کام سے منع کر دیا اور کہا کہ وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے۔ وہ خود وزیر خان کا بہت خیال رکھنے لگا۔ اس کو جو کمرا پہلے ملا ہوا تھا وہ سرونٹ کوارٹر تھا۔ بعد میں اسے کوٹھی کا ایک بیڈ روم دے دیا جس میں آرام و آسائش کے سب اسباب مہیا تھے۔ ایک بہت اچھا ڈاکٹر ہر روز اس کو دیکھنے کے لیے آنے لگا۔ اس کی خوراک اور آرام کا خیال رکھنے کے لیے چراغ دین نے ایک نوکر بھی رکھ دیا۔ وہ خود بھی اکثر وزیر خان سے پوچھتا رہتا تھا کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے اور وزیر خان جواب میں ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ شکر ہے اس مالک کا جس نے مجھے ہر تکلیف اور ضرورت سے بے نیاز کر دیا۔ پھر دلاور نے ایک چال چلی۔ اس نے وزیر خان کے ایک پرانے نمک خوار کو تلاش کیا جس کو بہت پہلے نکال دیا گیا تھا۔ اسے چراغ دین کی کوٹھی پر وزیر خان سے ملنے کے لیے بھیجا گیا۔ وہ وزیر خان کی حالت دیکھ کے بھونچکا رہ گیا اور رونے لگا کہ مالک یہ کیا ہو گیا۔ وزیر خان نے کہا کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ مگر وہ بھی پیچھے ہی پڑ گیا تو راز داری کے وعدے پر اور قرآن کی قسم دے کر وزیر خان نے اسے دلاور کی پوری سازش کی کہانی سنا دی۔ وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ نہ کوئی وعدہ اور نہ قسم۔ میں جاتا ہوں اخبار والوں کے پاس اور وکیلوں کے پاس۔ وزیر خان نے کہا کہ ایسے سکندر بخت کو نقصان ہو گا۔ دلاور نے جو کیا وہ اپنی جگہ مگر سکندر کو کچھ ہوا تو اس کا ذمے دار تو ہو گا۔ یہ لوگ سکندر بخت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ خدا نے ظالم کی رسی کو اتنا دراز نہیں کیا کہ وزیر خان کی گردن کا پھندا اس کے بیٹے کے گلے میں بھی پڑ جائے۔ ہر روز ایک ہی دعا مانگتا ہوں خدا سے لیکن اپنے لیے نہیں۔ خدا نے مجھے سب کچھ دے دیا تھا۔ اب مجھے اپنے لیے کسی دعا کی ضرورت نہیں۔ زندگی جتنی بھی ہے خدا کے اختیار میں ہے۔ اس میں نہ میری کوشش سے ایک سانس کا اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ دلاور ایک سانس کم کر سکتا ہے۔ میں دعا مانگتا ہوں سکندر بخت کے لیے کہ جب وہ واپس آئے تو اس کو حق اور انصاف دینا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ لوٹ کر آئے گا تو اسے سب معلوم ہو جائے گا۔ وہ خود معلوم کرے گا۔ اور وہ بھی وزیر خان کا خون ہے۔ جو اس کا حق ہے وہ حاصل کرے گا۔ میرا جو کچھ تھا اسی کا تھا اور رہے گا۔ وقتی طور پر کسی کے قابض ہو جانے سے حق ختم نہیں ہوتا۔ میری اپنی زندگی اب زیادہ نصیب ہو گی۔ مجھے اس دنیاوی مال و متاع کی ضرورت بھی نہ تھی۔ یہ سب کچھ سکندر بخت کے پاس ہی جاتا تھا۔ ہر ختم قرآن کے بعد میں سکندر بخت کے لیے خدا سے تحفظ اور سلامتی مانگتا ہوں۔ باقی کام وہ خود کرے گا۔ اسی یقین سے میں مطمئن ہوں اور میرے اطمینان نے چوہدری دلاور کا سکون چھین لیا ہے۔ سکندر بخت جب بھی آیا سب حساب برابر کر دے گا۔ میرا بھی اور اپنا بھی۔ چوہدری دلاور نے چھپ کر یہ ساری گفتگو سنی تھی۔ وہ اتنا پریشان ہوا کہ اس نے فوری طور پر دو فیصلے کیے۔ ایک وزیر خان کو قتل کرنے کا اور دوسرا سکندر بخت [illegible] میں میر شرافت علی کا بھی حال خراب تھا۔ وزیر خان کے ساتھ ہونے والے ظلم کے احساس نے اسے پشیمانی میں مبتلا کر رکھا تھا اور وہ احساس جرم کا بھی شکار تھا۔ اسے یہ خوف بھی تھا کہ وزیر خان کے بعد اس کا اپنا بھی ایسا ہی انجام نہ ہو۔ اس نے چوہدری دلاور کے خلاف اپنا دفاع مضبوط کر لیا تھا اور اسے صاف بتا دیا تھا کہ وہ ایسی بات بھی نہ سوچے کہ سارے کاروبار پر اکیلا قابض ہو جائے گا۔ اگر اس نے میر شرافت علی کو وزیر خان سمجھنے کی غلطی کی تو یہ غلطی خودکشی کے مترادف ہو گی۔ دلاور نے بھی سمجھ لیا تھا کہ میر شرافت علی نے اس کے خلاف اتنا مواد اکٹھا کر رکھا ہے جو اسے تختہ دار تک پہنچا سکتا ہے۔ ایک بار نہیں ہوا۔ جب دلاور نے میر شرافت علی سے اپنے فیصلے کا ذکر کیا تو اس نے مخالفت کی۔ اس نے کہا کہ دلاور، تم نے اس کا سب کچھ لے لیا ہے۔ اب اسے بھول سے الگ پڑا رہنے دو۔ اس کو قتل کرنے کا گناہ مت کرو۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ سکندر بخت سے ڈرتے ہو تو اسے بلا لو یا اس کی واپسی کا انتظار کرو۔ جب وہ پاکستان آئے تو اس سے سودا کر لو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سب کچھ معلوم کر لے گا۔ تم اس سے کہہ سکتے ہو کہ چلو جو ہوا اس کا جرمانہ لے لو اور قانون کے چکر میں مت پڑو۔ اسے اتنی دولت دے دو کہ وہ تمام عمر لندن میں بیٹھ کے خرچ کرنا چاہے تو کم نہ پڑے۔ اتنا عرصہ لندن میں رہنے کے بعد وہ خود کب چاہے گا کہ اس جھمیلے میں پڑے۔ وہ لندن میں بیٹھ کے کوئی کاروبار کرے گا اور پھر وہیں کسی گوری میم سے شادی کر لے گا۔ میری اطلاع کے مطابق وہ کسی لارڈ کی بیٹی کے عشق میں مبتلا ہے اور یہ فیصلہ پہلے ہی کر چکا ہے۔ اس لڑکی کا نام [illegible] ہے۔ دلاور کو یہ تجویز پسند آئی لیکن ذکی سلطان نے اس سے کہا کہ چوہدری صاحب، فرض کریں وہ نہ مانا۔ ہے تو پٹھان کا سپوت اور ... کا آدمی۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کی پیش کش آپ کے منہ پر مارے اور کہے کہ یہ سب تو میرا ہے۔ میں لے ہی لوں گا۔ پہلے وزیر خان کے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب دو۔ ذکی سلطان نے یہ تجویز دی کہ سکندر بخت شرافت سے نہ مانے تو اسے مجبور کر دیا جائے۔ اس کو کسی ماہر شکاری کی طرح گھیر کر ہانک کر یہاں اپنی شکار گاہ تک لایا جائے اور اس پر واپسی کے سارے راستے بند کر دیے جائیں۔ جب وہ محصور ہو جائے تو اس کے سامنے دو متبادل رکھ دیے جائیں۔ یا تو ہماری مصالحتی پیش کش قبول کرو ورنہ تمہاری ایسی کی تیسی۔ دلاور کو یہ تجویز زیادہ پسند آئی۔ اس نے وزیر خان کو

مارنے کا فیصلہ نہیں بدلا لیکن طریقہ وہ اختیار کیا جس سے میر شرافت علی کو شک نہ ہو۔ اس نے چراغ دین کے اس نوکر کو خرید لیا جو وزیر خان کی خدمت پر مامور تھا۔"

رابعہ نے ایک گہری سانس لی۔ "اس نے وزیر خان کو زہر دیا؟"

"ہاں۔ وہ اس کے کھانے میں تھوڑا تھوڑا سنکھیا ملا دیا کرتا تھا۔ دلاور کی ہدایات کے مطابق۔ دلاور اس معاملے میں بہت محتاط تھا۔ سنکھیا کی بہت معمولی مقدار خود فراہم کرتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وزیر خان ایک دم نہ مر جائے اور شرافت علی کو شک نہ ہو جائے۔"

"یہ نوکر کون تھا؟ تم اسے جانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح۔ اس کا نام بھی اور پتا بھی۔"

"وہ زندہ ہے؟"

"ہاں۔ زندہ ہے اور اسی شہر میں ہے۔ اب تو بہت معزز ہو گیا ہے۔ اس دولت سے جو اسے دلاور نے اس کی کارگزاری پر خوش ہو کے انعام میں دی تھی۔"

"پھر تو یہ خیال رکھنا کہ جھوٹ اور مبالغہ نہیں ہونا چاہیے۔ خود کو بے گناہ ثابت کرنا تمہارا حق ہے لیکن تم کسی کو بے قصور نہیں پھنسا سکتے۔"

"مس رابعہ۔ یہ سب کچھ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"وزیر خان کی موت کا میر شرافت علی پر کیا اثر ہوا تھا؟"

"اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ وہ اعصابی مریض بن گیا تھا۔ اس نے کارخانے کے آفس میں بیٹھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس نے دلاور سے کہہ دیا تھا کہ میرا کام کسی اور کے سپرد کرو۔ منافع میں میرا حصہ مجھے دیتے رہو۔ بعد میں اس نے کہا کہ سارا کاروبار تم سنبھالو۔ مجھے میرے حصے کی رقم دے دو۔ میں الگ ہونا چاہتا ہوں۔ دلاور نے اس کے حصے کی جو قیمت لگائی وہ بہت کم تھی مگر میر شرافت علی نے وہ بھی قبول کر لی۔ دوسری طرف ذکی سلطان بڑی ہوشیاری سے چوہدری دلاور کو راستہ دکھا رہا تھا۔ وہ انتہائی ذہین آدمی تھا۔ زندگی کے ایک حادثے نے غلط راہ پر ڈال دیا ورنہ بہت ترقی کرتا اور عزت پاتا۔ اس نے سکندر بخت کو لندن سے لاہور لانے کی پوری اسکیم تیار کی تھی۔ اسی نے دلاور کو بتایا تھا کہ میر شرافت علی سے بات کرتے رہو۔ سودا فائنل مت کرو۔ وہ ہمت ہار بیٹھا ہے اور ہمارے لیے خطرناک ہو گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ضمیر کی خلش کے چکر میں خود تھانے پہنچ جائے اور اپنے ساتھ ہمیں بھی مروا دے۔ اس کی نگرانی ضروری ہے۔ یہ ذکی سلطان کا پلان تھا کہ ایک تیر سے دو شکار کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس نے بڑی مہارت سے منصوبہ بنایا کہ جیسے ہی سکندر بخت لاہور پہنچے اس کی ملاقات میر شرافت علی سے کرا دی جائے اور سکندر بخت کو میر شرافت علی کے قتل میں ملوث کر دیا جائے۔ ایک حصے دار کا قتل، ایک وارث کو اس قتل میں پھانسی کی سزا۔ چوہدری دلاور کے سارے مسائل ختم۔"

رابعہ نے غصے سے کہا "اور اس طرح تم نے سکندر بخت کو پھنسا دیا؟"

"میں نے...؟"

"ہاں تم نے۔ تم ہی اسے میر شرافت علی کے گھر لے گئے تھے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر جو کچھ وہاں ہوا..."

رابعہ نے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے وہاں کیا ہوا تھا؟"

"سکندر کی تکرار ہو گئی تھی میر شرافت علی کے ساتھ اور اچھی خاصی مارپیٹ ہوئی تھی۔ سکندر نے سامان توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ کوئی چوٹ ایسی لگی تھی کہ میر شرافت علی مر گیا۔"

"یعنی یہ سب تم دیکھ رہے تھے۔ باہر سے تم ٹیکسی لے کر رخصت ہو گئے تھے مگر پھر لوٹ آئے تھے اور کسی طرح اندر چلے گئے تھے۔ تم کو معلوم تھا وہاں کیا ہو گا؟"

"نہیں جی۔ میں وہی بتا رہا ہوں جو میں نے سنا تھا۔"

"کس سے سنا تھا؟" رابعہ بولی۔

"اندر نوکر چاکر سب ہی دیکھ رہے تھے۔"

رابعہ نے کہا "اتنے نوکروں کے ساتھ تم بھی تھے۔ نوکروں نے اپنے آقا کو بچانے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی۔ پولیس کو فون کیوں نہیں کیا تھا؟"

"پولیس اتنی جلدی کہاں آتی ہے؟"

"وہ شور ہنگامہ کر کے پاس پڑوس کے لوگوں کو اکٹھا کر سکتے تھے۔ لیکن تم سب خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہے اور جب سکندر چلا گیا تو تم نے میر شرافت علی کو خود مار دیا۔"

"میں تو... باہر ملا تھا سکندر کو۔ گاڑی ٹھیک کر رہا تھا اور مس رابعہ، بات یہی ہے۔ وزیر خان کے قتل کی۔ سکندر کا مجرم تب ہوتا میں جب مجھ پر وزیر خان کے قتل کا الزام ہوتا۔ میں نے بتا دیا ہے کہ میرا اس میں بالکل ہاتھ نہیں تھا۔ دلاور کے حکم پر یہ کام چراغ دین کے ایک نوکر نے کیا تھا۔ خود چراغ دین اب دنیا میں نہیں ورنہ سکندر اسے بھی نہ چھوڑتا حالانکہ اس نے دلاور کی مخالفت کی تھی۔ میر شرافت علی نے بھی وزیر خان کو بچانا چاہا تھا۔ ہاں ذکی سلطان نے دلاور کو قتل پر اکسایا تھا۔ اس کی مکمل منصوبہ بندی کی تھی۔ اسے شریک جرم سمجھا جا سکتا تھا مگر وہ بھی مر چکا ہے۔"

"تم نے میر شرافت علی کو قتل کیا تھا یا نہیں؟"

"آپ مانیں گی نہیں۔ مگر میرا جواب ہے نہیں۔"

"یہ عدالت نہیں ہے۔ یہاں میرے سوا کوئی موجود نہیں جو تمہارے خلاف گواہی دے کہ تم نے کیا کہا تھا؟"

"میں پھر کیوں کہوں کہ اسے قتل کرنے والا میں نہیں تھا۔"

رابعہ نے کہا "لیکن تم وہاں موجود تھے۔ تم نے قتل ہوتے

www.paksociety.com

دیکھا تھا۔"
"پہچان سکتا ہوں میں۔"
"قتل کسی ملازم نے کیا تھا؟" رابعہ نے وکیلانہ جرح جاری رکھی۔
"ہاں۔ وہ بھی مارا گیا تھا بعد میں۔"
رابعہ بولی "تم نے اس سے کہا تھا کہ شرافت علی کو مار ڈالو؟ بولو! جواب کیوں نہیں دیتے؟ تمہاری خاموشی ہی اعتراف جرم ہے۔ اسی لیے تم اصرار کر رہے تھے کہ شرافت علی کا قتل تم نے نہیں کیا۔ وہاں تم پاس تھے۔ تم نے اپنے ہاتھوں سے مارنے کے بجائے تم نے حکم دیا کہ اسے ختم کردو اور پھر سکندر کے باہر آنے سے پہلے تم نکل آئے۔ سڑک پر کھڑی ہوئی اپنی ٹیکسی ٹھیک کرنے لگے۔"
"مس رابعہ۔ یہ سب باتیں آپ کے کس کام کی ہیں۔ اگر میں نے میر شرافت علی کو قتل کیا ہوتا۔ خود اپنے ہاتھوں سے تب بھی اس معاملے کا سکندر بخت سے کیا تعلق۔ ایسے تو میں نے نہ جانے کتنے قتل کیے ہیں زندگی میں۔"
رابعہ نے کہا "کبھی حساب نہیں رکھا؟ سنچری ہوئی یا ہاف۔؟"
پیڈرو ہنسنے لگا "توبہ جی۔ میرے حساب سے گیارہ قتل کرنے پڑے مجھے۔ خود اپنے ہاتھوں سے۔ مگر اس کاروبار میں یہ تو ہوتا ہے۔ جو بھی راستے میں آئے یا خطرہ بنے اسے راستے سے ہٹانا پڑتا ہے۔ شوقیہ قتل کوئی بھی نہیں کرتا اور جہاں پیسہ یا دھمکی کافی ہو یا قاتلانہ حملے کا ڈراما چل جائے وہاں قتل کرنا بھی نہیں چاہیے۔ ایسے چھوٹی چھوٹی باتوں پر قتل ہوتے تو روز کوئی مارا جاتا میرے ہاتھوں۔ خود چودھری دلاور کے دوسرے معاملات کو چھوڑ دیں۔ اس سے صرف وزیر خان کا حساب لیں۔ اس کے مال کا اور اس کی جان کا۔ مجھ سے آپ نے کہا تھا کہ اگر وزیر خان کو تم نے قتل نہیں کیا تھا اور تم شریک جرم بھی نہیں تھے تو تمہیں وعدہ معاف گواہ بنالیا جائے گا۔ میں نے سب بتا دیا۔"
"ابھی بہت کچھ باقی ہے پیڈرو۔"
"وزیر خان کے بارے میں بتانے کو اب کچھ نہیں رہا۔"
"ابھی وہ بات نہیں ہوئی۔ جس کی خاطر ہم تمہیں یہاں اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔"
پیڈرو نے کہا "اچھا۔ وہ بات۔۔۔ وزیر خان کی لاش کو میں نے کہاں دفن کیا تھا؟"
"ہاں۔ تم اس جگہ کی نشاندہی کرو گے؟"
"میں کوشش کروں گا۔"
"تمہاری کوشش کی کامیابی پر ہی تمہاری زندگی کا انحصار ہے۔ یہ بات ہوگئی تھی۔"
"اب تم لوگ کیسے مار سکتے ہو مجھے۔ تمہیں میری ضرورت ہے۔ میری مدد کے بغیر تم وہ سب معلومات حاصل نہیں کرسکتیں جو تمہارے لیے بے حد ضروری ہیں۔ زبردستی تم کر کے دیکھ لو۔"
رابعہ نے کہا "زبردستی نہیں ہوگی۔ ہمارے اور تمہارے درمیان ابھی صرف وزیر خان کا معاملہ ہے۔ بے شک یہ سکندر کا جذباتی مسئلہ ہے۔"
"لیکن وہ تمہارا جذباتی مسئلہ ہے" پیڈرو ہنسا۔
"ہم سب ایک دوسرے کے لیے ایسے ہی جذبات رکھتے ہیں۔" رابعہ نے مشتعل ہو کے کہا "ہمارے درمیان دوستی، انسانیت اور شرافت کے وہ رشتے ہیں جن کو سمجھنا تمہارے لیے ممکن ہی نہیں۔ چلو چھوڑو یہ بھی وقت کم ہے۔ مجھے بتاؤ کہ کیا وزیر خان کی قبر تم نے کھودی تھی؟"
"کیا میں گورکن ہوں؟"
"ٹھیک ہے تم نے پیسے دیے تھے اور کام گورکن نے کیا تھا؟"
"مجھے دلاور کا حکم تھا اور میں انکار نہیں کرسکتا تھا۔ ہر نوکر مجبور ہوتا ہے۔"
"یہ کام تم نے کب کیا تھا؟"
"ظاہر ہے رات کے وقت۔ گورکن نے کہا تھا کہ آپ مغرب کے بعد کسی وقت بھی آ کے ہڈیاں لے جانا مگر میں نے کہا کہ نہیں میں رسک نہیں لے سکتا جب میں آؤں تب قبر کھودنا۔"
"اس میں رسک کیا تھا؟"
پیڈرو بولا "یہ گورکن بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔ وہ ہر طرح کی ہڈیاں اور ڈھانچے بیچنے کا دھندا کرتے ہیں۔ میڈیکل کے طلبا انہیں اچھی قیمت دیتے ہیں۔ مجھے شک تھا کہ وہ پہلے سے رکھی ہوئی ہڈیاں بوری میں ڈال کے مجھے پکڑا دے گا۔ یہ کام وہ دن میں آسانی سے کر لیتے ہیں پھر رات کو تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ مجھے بھی مرواتا اور دلاور کو بھی۔ اگلے دن مجسٹریٹ کی موجودگی میں پوسٹ مارٹم کے لیے قبر کھودی جاتی تو اصل لاش نکل آتی۔ دلاور تو مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔ وہ کہتا کہ میں نے حرام خوری کی اور کسی قبرستان سے ہڈیاں خرید لایا۔"
"چنانچہ تم نے خود اپنی نگرانی میں قبر کھدوائی اور ہڈیاں ساتھ لے گئے۔ پھر انہیں کہاں دفن کیا؟"
"نور پور شاہاں اور سید پور کے درمیان۔ کچھ نشانیاں میرے ذہن میں ہیں۔ مس رابعہ! ایک بات بتاؤ، تم اتنی تفصیل سے ہر بات کیوں پوچھ رہی ہو؟"
"تم جانتے ہو؟"
"میرا مطلب تھا تمہیں بالکل فکر نہیں۔ ابھی وہ لاشیں پڑی تھیں یہاں۔ وہ عام لوگ نہیں تھے۔ ہم جیسے لاوارث بدمعاش۔ ایک وزیر تھا اور دوسرا اس کا باڈی گارڈ۔ اگر کوئی ان کی تلاش کرتا ہوا یہاں آگیا تو کیا ہوگا؟"
"فکر تو مجھے بھی ہو رہی ہے۔ اتنی دیر ہوگئی ہے ان لوگوں کو

"ویری گڈ پیڈرو۔ کس قدر ذہانت کی بات کی ہے تم نے۔" "وہ سب دوسرے کمرے تھے نازو کے ساتھ۔ کیا کر رہے تھے وہاں تم جانتے ہو گے؟"
"میں ایک وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ایک بھوت سے جان چھڑانے کے لیے جو میرا سر پھٹنے پر آمادہ ہے۔" غالب نے کہا۔
"میں نے نازو کے رد عمل سے پہلے کہہ دیا تھا ہمیں تم پر شک کر رہا ہوں۔ دوستی باتیں رابعہ نے بھی مجھ سے ایک نشست میں نہیں کی ہوں گی۔"
"کیا اس کرتے ہو تم سب۔ اس طرح باتیں سننے کا ضرور کوئی مقصد ہوگا۔ ضرور تم نے وہ سب ریکارڈ کر لیا ہوگا۔" پیڈرو چلانے لگا۔
اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ غالب کا ہاتھ آگے بڑھا اور رک گیا۔ رابعہ اور نازو کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔
پیڈرو نے کہا "اب کیا ہوگیا۔ فون اٹھانے کی ہمت نہیں ہے کسی میں۔ اچھا میں اٹھاتا ہوں۔"
میں نے اس کے ہاتھ پر کک ماری "مجھے غصہ مت دلاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری لاش بھی یہیں پڑی رہ جائے۔"
پیڈرو کراہتے ہوئے گالیاں بکنے لگا "تم سب پکڑے جاؤ گے بچو جب وہاں میں یہ پکڑا جاتا ہے۔"
"بجنے دو گھنٹی کو۔ ہم نکل جاتے ہیں" میں نے غالب سے کہا۔
غالب نے سر ہلایا! "ہم گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔"
"میں آتا ہوں لائٹس آف کر کے۔ اور دروازے بند کر کے" میں پیڈرو کی طرف بڑھا "تم شرافت سے چلو گے یا۔۔۔؟"
پیڈرو کے کچھ کہنے سے پہلے کال بیل بجی۔ میں اچھل پڑا۔ پیڈرو نے قہقہہ لگایا۔

گئے ہوئے" رابعہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"یہ بھی عجیب سا لگتا ہے کہ دوسرے کمرے میں نازو اطمینان سے بیٹھی ہے۔ ایسی صورت حال میں کون مطمئن رہ سکتا ہے؟"
اب میں اور غالب پھر پچھلی طرف سے نکل کر باہر آئے اور ہم نے گاڑی کے انجن کو اسٹارٹ کر کے بند کردیا۔ پھر غالب نے گیٹ کھولا اور میں گاڑی کو باہر لے گیا۔ عباسی اور اس کا محافظ اسی طرح بے خبر پڑے ہوئے تھے۔ رابعہ کا انٹرویو ایک گھنٹے جاری رہا تھا اور یہ وقت ہم نے سخت پریشانی میں گزارا تھا۔ میرے اعصاب پر یہ خوف بھی سوار تھا کہ اچانک کوئی عباسی کو تلاش کرتا ہوا آگیا تو ہماری مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔ گاڑی اندر موجود تھی اور اس میں عباسی بھی لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔ ہمارے پاس اس کے سوا چارہ نہ ہوتا کہ عباسی کی تلاش میں آنے والے کو بھی گاڑی میں لٹائیں اور فرار ہو جائیں۔
پیڈرو کی باتیں سن سن کے میرا خون الگ کھول رہا تھا۔ پرانے زخم پھر تازہ ہوگئے تھے اور یادوں کے ناسور پھر رسنے لگے تھے۔ غالب میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پاتا۔ وہ بار بار مجھے تھپکی دے کر یہ احساس دلاتا تھا کہ مجھے ضبط سے کام لینا ہوگا ورنہ ہماری ساری محنت رائگاں جائے گی۔ رابعہ نے بڑی ذہانت سے ہر سوال کیا تھا اور نازو نے سب ریکارڈ کر لیا تھا۔ اس نے کئی بار اشاروں میں بتایا کہ سب بالکل ٹھیک جا رہا ہے۔
رابعہ نے بات ختم کی تو ایک دم سب ایکشن میں آگئے۔ نازو نے اپنا ریکارڈنگ کا سامان سمیٹ لیا اور احتیاط سے سوٹ کیس میں رکھ دیا۔ اس سوٹ کیس میں ہمارے کپڑے تھے اور ایک لاکھ سے کچھ کم رقم تھی۔ غالب نے اسے بھی گاڑی میں منتقل کیا۔ پھر ہم سب نے کپڑے سے ہر اس جگہ کو صاف کرنا شروع کیا جہاں ہمارے فنگر پرنٹ ملنے کا امکان تھا۔ پیڈرو سب حیرانی سے دیکھتا رہا۔
"تم واقعی انہیں راول ڈیم میں پھینک آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔
میں نے کہا "راستے میں ارادہ بدل گیا۔ ہم نے سوچا کہ وہ پھیرے کیوں کریں تمہیں بھی ساتھ ہی لے جائیں اور غرق کردیں۔"
غالب نے کہا "چلو اٹھو۔"
"تم نے کوئی ڈراما کیا ہے میرے ساتھ۔ تم کہیں بھی نہیں گئے تھے۔ تم انہیں گاڑی سمیت راول ڈیم میں پھینکنے کا ارادہ رکھتے تھے پھر گاڑی کیوں واپس لے آئے ہو؟ شک تو مجھے ہوا تھا تمہارے واپس آنے پر۔ دور سے آنے والی گاڑی پاس آکے رک جائے تو انجن کی آواز ایسے نہیں سنائی دیتی جیسے کسی نے اسٹارٹ کیا اور بند کردیا۔ گاڑی وہیں کھڑی ہوئی تھی۔ جانے کا ڈراما بھی ایسا ہی ہوگا۔"

www.paksociety.com

"اللو۔ اب گرا ہو کر بات نہ کرنا تمہارے جوانی ا......"
پیڈرو ہم سب کی صورت پر اڑتی ہوئی ہوائیاں دیکھ کر بہت خوش تھا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے اس کی ہنسی نے اتنا مشتعل کیا تھا کہ میں شاید اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ نازو نے زیادہ سمجھداری سے کام لیتے ہوئے پیچھے سے ہاتھ مار کر اسے خاموش کر دیا۔

"اس وقت کون آ گیا!" رابعہ نے پرخیال انداز میں کہا۔

"اس وقت کسی کے آنے پر پابندی نہیں ہے۔ ویسے بھی گاہک اور موت کا کوئی وقت مقرر نہیں" غالب بولا۔

"میں دیکھتا ہوں" میں نے نازو کو اشارہ کیا "تم میرے پیچھے رہو۔"

نازو نے مجھے پیچھے کر دیا۔ "تم نہ جاؤ کسی کے سامنے تو بہتر ہے۔ بات میں کرتی ہوں۔"

نازو نے بڑے گیٹ میں بنا ہوا چھوٹا گیٹ کھولا۔ جھری سے مجھے ایک جیپ نظر آئی۔ ایک شخص ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرا گیٹ سے کچھ فاصلے پر ... باادب انتظار کر رہا تھا۔

"ملک صاحب نے بھیجا ہے جی؟"

نازو نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا "کیا کام ہے تمہیں؟"

"کام ... تو کچھ نہیں ہے جی۔ یہ کچھ چیزیں منگوائی تھیں انہوں نے۔"

"وہ ایوان صدر گئے ہیں کسی ضروری کام سے۔ تم چیزیں دے جاؤ" نازو بولی۔

"اچھا جی۔ ملک صاحب کو بتا دیں کہ مرشد سے راجا شاہنواز حویلی دار خود آیا تھا" اس نے زور دے کر کہا اور پھر ڈرائیور سے مخاطب ہو گیا "اوئے بوستی، سامان اٹھا کے لا اوئے۔"

بوستی اس کا نام بالکل ٹھیک تھا۔ وہ کالی سے اترا اور انتہائی مجبوری اور بے زاری کے ساتھ گتے کا ایک ڈبا اٹھا کے لایا۔ یہ باکس تقریباً دو فٹ لمبا، ڈیڑھ فٹ چوڑا اور اتنا ہی اونچا بھی تھا۔ اس کا وزن زیادہ نہیں تھا مگر بوستی نے اسے یوں اٹھایا جیسے اس کے اندر ایک ہی بڑا پتھر ہے۔ نازو نے اسے اندر پہنچانے کے لیے آسانی سے اٹھا لیا۔ بوستی نیند کی کیفیت میں چلتا ہوا واپس گیا۔ بادل ناخواستہ ایسا ہی دوسرا باکس بھی لایا۔

"کیا ہے ان میں؟" نازو نے پوچھا۔

"وہ جی۔ ملک صاحب کو معلوم ہے" راجا نے سلام کیا اور جیپ میں بیٹھ گیا۔

نازو نے دروازہ بند کر دیا "کیا ہو گا اس میں؟"

"وہی تحفے تحائف اور نذرانے" میں نے کہا "انگریز حاکم کی خدمت میں راجا نذرانے لے کر حاضر ہوتے تھے۔ اب ہم آزاد ہیں اور خود حکمران ہیں۔"

"چنانچہ اپنوں سے ہی سلامی اور رشوت لیتے ہیں۔ سب نے کام کرتے ہیں۔ جائز ہوں یا ناجائز۔ حویلی دار کا کوئی کام ہو گا۔"

غالب نے کہا "پھر بھی دیکھ لینا چاہیے۔ اس میں کوئی ٹائم بم نہ ہو۔"

"بم ایک ہی کافی تھا" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "اس کے علاوہ بم ہو گا تو پھٹ جانے کا پتہ معلوم ہو جائے گا۔ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

دونوں ڈبے بھی گاڑی میں رکھ دیے گئے تو میں اندر سے بیگ کو اٹھا کے لایا اور گاڑی کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔ رابعہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ غالب کے ساتھ نازو۔ اس نے گیسٹ ہاؤس کو مقفل کر کے چابیاں دور پھینک دی تھیں۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ راجا شاہنواز کے سوا کوئی گیسٹ ہاؤس نہیں پہنچا اور ہم خیروعافیت کے ساتھ نکلنے میں کامیاب رہے۔

"اب پہلا کام یہ کرو کہ ملک صاحب سے جان چھڑاؤ" رابعہ بولی۔

"یہ بھی بتا دو کہ کیسے؟" میں نے کہا۔

غالب بولا "میں دروازہ کھول کے ملک صاحب اور مسز ملک کو باہر گرا دیتا ہوں۔ جب بھی آنکھ کھلے گی کہیں جا کے اٹھیں گے اور گھر چلے جائیں گے اپنی کسی نانی کے پاس۔"

"اپنی پسندیدہ بیوی کے پاس" میں نے تصحیح کی "ان بڑے لوگوں کے مزے ہیں یار۔ ضرورت، فرمائش اور موڈ کے مطابق انہیں ہر چیز مل جاتی ہے۔ یہاں گرمی پڑے تو مری کی کوٹھی ہے۔ سردی ہو تو کراچی ہے۔"

"بے وقوف انسان۔ ان کا اپنا موسم ہوتا ہے۔ گرمی سردی سے انہیں فرق نہیں پڑتا۔ ائرکنڈیشنر اور ہیٹر ہر جگہ موجود ہیں۔ گھر میں، دفتر میں اور گاڑی میں۔ ہاں بیویاں انہیں موڈ اور ضرورت کے مطابق دستیاب ہیں۔ ایک سنجیدہ مشیر اور منتظم۔ دوسری خوش اور سوشل۔ تیسری اعلیٰ ذوق کی حامل باشعور تانپ۔ ایک کالی دوسری سانولی، تیسری گوری۔ ایک میلی گاڑی تو دوسری امارت اور علم۔"

نازو نے کہا "بڑا رشک آ رہا ہے تمہیں۔"

غالب بولا "کیوں نہ آئے مس نازو۔ ایک ہم ہیں کہ ایک عورت کی پکی چٹ کی سوچ بھی ساری عمر کے لیے۔"

رابعہ نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی "محبت میں وفا تو ایک سے ہی ممکن ہے۔"

غالب نے آہ بھری "ہاں۔ مجبوری کا نام وفا۔"

نازو نے کہا "کوئی مجبوری نہیں، جاؤ دس کرو۔"

غالب خوش ہوا "اچھے ایمان سے کہو، تم برا نہیں مانو گی۔ ایک وقت میں دس تو مشکل ہیں۔ چار کی گنجائش ہوتی پھر بھی ہاں

ہے اڑ جائے یا اللہ کو پیاری ہو جائے، پاگل ہو کے گھر سے نکل جائے۔"

"پاگل تو ہو گی جو تمہارے چکر میں پڑے گی" نازو جل کے بولی۔

"یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ تم اپنی مثال لو۔"

رابعہ نے خفگی سے کہا "یہ کیا فضول باتیں شروع کر دی ہیں تم نے۔ بڑی سنگین صورت حال سے دوچار ہیں ہم لوگ۔ اس مشکل کا حل سوچو۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ "فکر مت کرو۔ تمہارا یہ ذلیل و ادنیٰ خادم اس وقت یہی کام کر رہا ہے اور جو تک سوچنا کام ہے دماغ کا اس لیے میرے سوا کوئی اور مثلاً غالب کیا کر سکتا ہے سوائے فضول باتوں کے۔"

غالب نے مصنوعی قہقہہ مارا "ہاہاہا۔ بس یہی فرق ہے تمہارے اور ہمارے دماغ میں دوست۔ تم ابھی سوچ رہے ہو اور ہم نے بیٹھے بیٹھے حل تلاش بھی کر لیا ہے، پوچھو کیا؟"

"ہم نہیں پوچھتے۔"

"سب سے پہلے تو ہمیں جان چھڑا لینی چاہیے اس گاڑی سے یعنی راجا صاحب کے ہاتھی سے۔ اس کو یہاں کے لوگ ضرور پہچانتے ہوں گے جس حلقے سے منتخب ہو کے ملک صاحب اسمبلی میں پہنچے ہوں گے اور پھر وزیر بنے وہاں ان کی سیاست کا آغاز برسوں پہلے ہوا ہو گا۔ انہوں نے اس علاقے میں جلسے جلوس، جوڑ توڑ اور بڑی بازی سب کی ہو گی۔ اب تو خیر وہ اسی کے مستقل ہو گئے۔ لیکن پہلے بھی وہ کم دولت مند اور بااثر نہیں ہوں گے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ان کو جاننے اور پہچاننے والے بہت ہیں۔ ان کی سواری بھی جس سڑک سے گزرتی ہو گی...."

میں نے کہا "ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ ان کی ذاتی گاڑی نہیں۔ سرکاری گاڑی ہے۔ ایسی ہی گاڑیاں دوسرے وزیروں اور اعلیٰ سرکاری افسروں کے پاس بھی ہوں گی اور نمبر کوئی اتنے غور سے دیکھتا نہیں۔ لیکن غالب کی بات سے مجھے اتفاق ہے۔ یہ گاڑی ہم جتنی جلد چھوڑ دیں اچھا ہے۔"

رابعہ نے بھی کہا "وہ تو ٹھیک ہے مگر ہماری اپنی گاڑی بھی تو نہیں ہے اس وقت۔"

میں نے کہا "وہ گاڑی صبح مل جائے گی۔"

غالب بولا "یار کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ پیٹرول پمپ تو رات بھر کھلے رہتے ہیں۔"

"لیکن سروس اسٹیشن بند ہو گا۔"

"اگر ہم اپنی شدید ضرورت بیان کریں۔ کوئی دکھ بھری داستان سنائیں تو ممکن ہے وہ پٹرول پمپ والے انسانیت کے ناتے ہماری مدد کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ انہیں علم تو ہو گا کہ سروس کرنے والے کہاں رہتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا "اس گاڑی میں پٹرول پمپ جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ابھی ہم صدر کی طرف جا رہے ہیں۔"

نازو نے گھبرا کے کہا "یعنی ایوان صدر۔ پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟"

میں نے کہا "ملک کو وہیں پہنچا دیں جہاں ہمارے بیان کے مطابق اس کو ہونا چاہیے۔"

غالب نے بھی لطف لینے کے لیے کہا "اس بہانے صدر سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

"تم صدر سے ملو گے۔ اس وقت!"

"ظاہر ہے صدر تو ہم سے ملنے نہیں آئے گا اور وقت کی کوئی بات نہیں۔ ہر مسلمان جب چاہے خلیفۂ وقت سے مل سکتا ہے۔"

نازو سمجھ گئی کہ اسے بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ "یہ نذرانے پیش کر دینا امیرالمومنین کی خدمت میں۔ اور ساتھ ان کے تین نمونے بھی یہ بتا دینا کہ ایک تو آپ کے وزیر باتدبیر ہیں۔ دوسرے ان کے محافظ و مشیر اعلیٰ اور تیسرے ہمارے استاد محترم پیڈرو صاحب ہیں۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا ہم صدر بازار کی طرف جا رہے ہیں۔ وہاں ہم تمہیں سامان کے ساتھ کامران ہوٹل میں چھوڑ دیں گے اور پھر جائیں گے اپنی گاڑی لینے۔ ملک صاحب کو گاڑی میں ہی کہیں سڑک کے کنارے چھوڑا جا سکتا ہے۔"

"لیکن تمہیں اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا" نازو نے کہا۔

"کیوں؟ کیا ہم نادان بچے ہیں؟" غالب بولا۔

نازو نے کہا "تم پر بھروسا نہیں کر سکتے ہم۔"

رابعہ نے بھی اس کا ساتھ دیا "ہاں۔ تمہارے ذہن میں کچھ اور ہے۔ ہمیں ہوٹل میں چھوڑ کر جاؤ گے تو پتا نہیں کیا کرو گے۔"

"کیا مقصد ہے آخر اس تحریک عدم اعتماد کا۔ کیا ہم اور سکندر ... اڑائیں گے۔ آوارہ گردی کریں گے، عیاشی کریں گے" غالب نے کہا۔

نازو بولی "جو مطلب چاہو سمجھ لو۔"

میں نے کہا "یہ ہماری کردار کشی کی مذموم کوشش ہے۔ ہم ابھی سے ایسا نہیں کر سکتے۔"

"ہاں۔ کرنا ہی ہو گا تو یہ سب شادی کے بعد کریں گے۔ تمہیں گھر میں بٹھا کے جیسا کہ شرفا کا قاعدہ ہے" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "لیکن ابھی ہم ایسا کام نہیں کر سکتے جس سے عاشقی کا نام بدنام ہو۔"

"وہ تو ہو چکا" رابعہ بولی "اب تو ہمیں صرف یہ فکر ہے کہ تم کسی وجہ کے بغیر شامت اعمال کو گلے نہ لگاؤ۔"

"وہ تو ہم لگا چکے ہیں" غالب نے فوراً بول دیا۔

نازو نے کہا "تو بھگتو، بے ہودہ آدمی" اور غالب نے آہ کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ مرزا غالب نے کیا حرکت فرمائی ہو گی۔ افسوس

www.paksociety.com

سے وہی کیا ہو گا جو کہا تھا۔

کامران ہوٹل کوئی بہت بڑا یا عالی شان ہوٹل نہیں تھا۔ وہاں عام لوگ قیام کرتے تھے۔ اس کے شریفانہ ماحول، کل وقوع اور نسبتاً کم ریٹ کے باعث ہوٹل میں جگہ کم ہی ملتی تھی۔ میں نے خود اندر جانے سے گریز کیا۔ غالب نے سوٹ کیس اتار کے نیچے رکھا۔ پھر ملک صاحب کے تحفظ کی خاطر میں نے گاڑی آگے بڑھا کے ایک سائیڈ پر روک دی اور غالب کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ ایک چوراہا سا تھا۔ بائیں جانب سڑک سیدھی صدر بازار اور مال روڈ کی طرف جاتی تھی۔ اس پر دن کے وقت ٹریفک کا بہت رش ہوتا تھا۔ راجا بازار اور مری روڈ جانے والی بسیں، کاریں اور تانگے سب کا یہی راستہ تھا۔ ایک سڑک عین میرے سامنے گوال منڈی کی طرف جا رہی تھی اور ریلوے پل کے نیچے سے گزرتی تھی۔ گوال منڈی اور شہر کے درمیان نالہ لئی حائل تھا اور ایک زمانے میں اس پر چند فٹ چوڑا عارضی پل بنا ہوا تھا جس پر سے صرف سائیکل یا موٹر سائیکل گزر سکتی تھی۔ بارش کے دنوں میں پل ڈوب جاتا تھا اور گارڈن کالج یا نشاط سینما جانے والے شارٹ کٹ سے محروم ہو جاتے تھے۔ متبادل راستہ ریلوے پل سے بائیں جانب تھا جس پر آج کل سینما سے پہلے پختہ پل موجود تھا۔ تانگے والے عموماً اسی راستے سے جاتے تھے۔ یہاں میں نے ایک اور تماشا دیکھا تھا جو مجھے کسی دوسرے شہر میں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ راجا بازار کی طرف سے سائیکل پر آنے والے جب نالہ لئی کا پل پار کر کے موڑ پر پہنچتے تھے تو ریلوے کا اوورہیڈ برج آ جاتا تھا۔ اس کے نیچے ریلوے لائنوں کا جال تھا اور یہ پل شہر کو صدر سے ملاتا تھا۔ لوگ سائیکل کندھے پر اٹھا کے پل عبور کرتے تھے اور صدر بازار میں جا اترتے تھے۔ جو یہ مشقت نہیں کر سکتے تھے ان کی خدمت کے لیے نوجوان لڑکے موجود رہتے تھے۔ وہ ایک آنہ لینے تک کے چھ پیسے میں آپ کی سائیکل اٹھا لیتے تھے۔ پھر آپ فراغت سے پیچھے چلے جائیں اور پل سے اتر کے دوبارہ سائیکل پر سوار ہو جائیں۔ یہ شارٹ کٹ نہ لینے کی صورت میں سائیکل پر دو میل کا راؤنڈ لگانا پڑتا تھا اور خاصے پُرہجوم، مشکل اور اونچے نیچے راستے سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس پریشانی سے ایک آنے میں بچنا آسان تھا۔ تاہم اس وقت بھی ایسے بہت تھے جو ایک آنہ بچاتے تھے۔

غالب خاموشی سے چلتا ہوا آیا اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ ”ایک ڈبل روم ملا ہے۔ منیجر نے بڑی مہربانی کی اور ہم چاروں کو اسی میں قیام کرنے کی اجازت بھی دے دی۔“

”ڈبل کرایہ چارج کیا ہو گا؟“

”نہیں۔ اسے ترس آ گیا ہماری مجبوری پر۔ میں نے کہا کہ ہمیں صرف رات گزارنی ہے۔ ہوٹل کے قواعد و ضوابط میں اس کی گنجائش نہیں تھی۔“

”لیکن بیڈ روم بھی ہے ہمارے ساتھ۔ ہم پانچ ہیں۔“

”مجھے اس وقت خیال نہیں آیا۔ خیر، یہ بھی بات کی گنجائش نہ نکلی تو پھر ہم میں سے ایک جنی... لال رنگ کی بے ہودہ شکل والی چیز میں رات... رابعہ اپنی گاڑی کہتی ہے اور تمہیں بھی اس پر شرم نہیں آتی۔“ میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا ”لیلیٰ کے لیے مجنوں کے دل میں عقیدت و احترام کے کیا جذبات تھے۔“

غالب نے سہلایا ”سچ کہا تم نے دوست۔ مجھے معاف کرو۔ میں نے تمہارے جذبات مجروح کیے۔ نادر کی گدھا گاڑی... تو مجھے مرسیڈیز سے زیادہ عزیز ہو گی۔“

”لیکن بیوی کی مرسیڈیز بھی ہو گی تو تمہیں اس میں بیٹھتے ہوئے اتنی ہی شرم آئے گی جتنی گدھا گاڑی میں بیٹھتے ہوئے۔“

”پھر کیا کروں یار۔ گدھا گاڑی خرید لوں شادی سے پہلے۔ مرسیڈیز۔ میرا خیال ہے دونوں خرید لوں۔ آگے گدھا گاڑی... مرزا غالب پیچھے رتی سے بندھی ہوئی مرسیڈیز میں مرزا صاحب... پیٹرول کی صاف بچت اور گاڑی کا انجن ہمیشہ زیرو میٹر... کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہمیں کس سمت میں جانا ہے... اسٹیشن کہاں ہے...“

”اگر میں غلط جا رہا ہوں تو تم مجھے ٹوک دیتے۔“

”مجھے تو کچھ یاد نہیں رہا۔“ غالب نے دانت نکال کے کہا ”غلط جا رہے ہو واپس چلو۔“

پیچھے سے ملک نے کراہنا شروع کیا۔ پھر وہ بڑبڑانے لگا ”ارے خبیث۔۔۔ آہ۔۔۔ میرے اوپر سے لیٹا ہے۔“

غالب فوراً پیچھے چلا گیا۔ اس نے شراب کی آدھی بوتل کھول کے ملک صاحب سے کہا ”ہوش۔۔۔ دو گھونٹ لے لو۔“

ملک نے دھکیل کر اپنے بازی گارڈ کو الگ کیا اور سر پکڑ کے بولا ”یہ۔۔۔ یہ میرے سر کو کیا ہو گیا۔“

”آپ کا سر پھر گیا ہے جی۔ اس سے ٹھیک ہو جائے گا۔“

ملک نے بوتل پکڑ کے دو گھونٹ بھرے اور بولا ”یہ۔۔۔ میرے سر پہ۔۔۔ کس نے وار کیا تھا؟“

غالب نے بوتل اس سے لے کر کہا ”میں نے۔“ اور بوتل اس کے سر پر ماری۔ ملک پھر لڑھک گیا۔ غالب نے بوتل اس کے ہاتھ میں تھما دی ”پھر ضرورت پڑے تو سب پی جانا۔ مفت کی ہے اور بہت ہے۔“

میں نے کہا ”یار مجھے راستہ بتاؤ کدھر جانا ہے؟“

غالب نے سر پر ہاتھ مارا ”اوہ۔ وہ راستہ تو پیچھے رہ گیا... جانب مڑنا تھا۔ پیرودز سینما کی طرف۔ لیکن یہ گاڑی تم پیرودز سینما کے پاس روک لینا۔ پیٹرول پمپ اور سروس اسٹیشن والے... پہچانتے ہیں۔ میں خود جا کے رابعہ کی گاڑی لے آؤں گا۔ یہ... ہے کہ مجھے چابی حاصل کرنے کے لیے سروس اسٹیشن والے کے

...یا مالک سے ایمن اوسی الاٹا پڑے۔“ اس میں کچھ وقت ...گتا ہے۔“

...نے کہا ”گاڑی یہاں کھڑی ہوگی تو مشکوک لگے گی۔ میں ...ادھر کی سڑکوں پر گھوم پھر کے وقت گزاروں گا۔ تھوڑی ...دیر بعد چکر لگا جاؤں گا۔ مجھے غیر حاضر پا کے یہ مت سمجھنا کہ ...بھاگ گیا ہوں۔“

غالب نے سہلایا ”ویسے پکڑے جانے کے امکانات بھی ...روشن ہیں۔“

”سروس اسٹیشن یہاں سے کتنی دور ہے؟“

”سینما کے پیچھے ہے۔ پانچ منٹ کی واک ہو گی۔“ غالب اتر گیا ...سینما کی چوڑائی کے رخ پتلی سی سڑک پر غائب ہو گیا۔ اس گلی ...عین مقابل دوسری طرف کی سڑک پر ووگ ہاؤس کی وہ دکان ...جہاں سے ایک بار میں نے اور رابعہ نے بڑے دل چسپ انداز ...شاپنگ کی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ وہاں سے مجھے گہرے نیلے رنگ ...کی ساڑی مل گئی تھی جس پر ننھے ننھے شوخ سفید ستارے یوں ...لگتے تھے جیسے وہ ساڑی نہیں بہاروں کے روشن آسمان کا ایک ...ٹکڑا ہے۔ ایسی ساڑی میرے لیے جذباتی وابستگی سے بڑھ کر ...ہو گئی تھی۔ یہ سب وقت کے ایک جادوئی لمحے OBSESSION کا... پیار کا کرشمہ تھا جب میں نے رابعہ کو پہلی بار اچانک مقابل دیکھا ...تھا۔

گاڑی کو مناسب رفتار سے چلاتے ہوئے میں سیدھا کینٹ ...اسٹیشن کی طرف جانے والی سڑک پر لے گیا۔ اگلے چوک سے ...بائیں ہاتھ گھوم کے میں مال پر آ گیا۔ وہاں سے پھر دائیں طرف مڑا ...اور چلتا ہوا پلازا سینما کے سامنے ایم اسمٰعیل ٹیلرز تک گیا اور ...بائیں جانب کی سڑک سے دوبارہ پیرودز سینما پہنچ گیا۔ اس راؤنڈ ...میں دس منٹ بھی نہیں لگے تھے اور اتنی جلدی غالب کے لوٹ ...آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن میں کیپٹل سینما اور ...کنٹونمنٹ جنرل اسپتال کی طرف سے جیسے ہی کینٹ کا راؤنڈ لگا کے پہنچا ...رابعہ کی گاڑی مجھے جی پی او کا موڑ کاٹتے ہی نظر آ گئی۔

غالب بلاوجہ اس کا بونٹ اٹھائے انجن کا معائنہ کر کے وقت ...گزار رہا تھا ”بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔“

میں نے کہا ”یہ دوسرا پھیرا تھا۔ تم تو معلوم ہوتا ہے گئے اور ...پلٹے۔“

”ہاں۔ وہ شریف النفس نوجوان جس نے مجھ سے گاڑی ...کے لیے وصول کی تھی سروس اسٹیشن پر ہی سو رہا تھا۔ میں ...نے ایک جھوٹ بولا مگر اس سے کام نہیں چلا۔ پھر سو ...روپے... تو وہ اندر گیا اور چابی لا کے میرے حوالے کرتے ہی ...سو گیا۔“

”شکریہ کس بات کے؟“

”کوئی نہ کرنے کے اور احسان کرنے کے۔“ غالب بولا۔

”خیر اب تم آ گئے ہو، رابعہ کی لال پری کو کامران ہوٹل میں چھوڑ دو۔ خواتین کو تسلی دو کہ ابھی تم ہم دل و جان سے انھی کے ہیں اور وہ ہماری خیر و عافیت سے واپسی کی دعائیں مانگنا جاری رکھیں۔ گاڑی اندر کے حصے میں کہیں کھڑی کرنا اور چابی رابعہ کے حوالے کرتے ہوئے بتا دینا کہ ایک گھنٹے میں ہمارے لوٹ آنے کے امکانات نوّے فیصد ہیں۔“

”میرے اکیانوے فیصد“ غالب نے کہا۔

”لیکن بفرضِ محال۔۔۔ ایسی کوئی بات ہو جائے۔۔۔“ میں نے کہا۔

”مثلاً ہمیں کوہ قاف کی پری کے روپ میں کوئی چڑیل مل جائے جو ہمیں اغوا کر لے یا حسنِ اتفاق سے ہمیں صوفیہ لارین اور ٹیلر مال روڈ پر ٹہلتی ہوئی مل جائیں اور وہ رضا کے بھگا لے جائیں تو وہ صبر کر لیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ غالب بولا۔

”میں رابعہ کو چھوڑ کے نلو کے ساتھ نہیں بھاگ سکتا۔“

”چلو تم صوفیہ لارین کے ساتھ بھاگ جانا“ غالب نے کہا ”آپس کی بات ہے یار۔“

یہ مرحلہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا تو غالب پھر ملک کی گاڑی میں میرے ساتھ آ بیٹھا ”اب بقول شاعر، جاتے ہو کس طرف کو کدھر کا خیال ہے؟“

”مرزا گدھے ہو تم مگر اچھا سوال ہے۔“ میں نے مرتضیٰ کی ”جب تم گئے ہوئے تھے تو میرے ذہن میں ایک بہت شاندار اسکیم آئی۔ تم کبھی پل پار گئے ہو؟“

”پل پار؟“

”پل ہر شہر میں اور ہر ندی نالے پر ہوتے ہیں مگر پنڈی میں پل پار کی اصطلاح خاص معنی رکھتی ہے۔“

”نا چیز اپنی کم آگاہی علمی کا اعتراف کرتا ہے۔“

”کبھی بازارِ حسن دیکھا ہے یہاں کا؟“

غالب نے گرج کے کہا ”استغفراللہ۔ اس کلِ بے حیائی پر ہم خجلت میں تھر تھر کانپا چاہتے ہیں اور مارے شرم کے چاہتے ہیں کہ زمین پھٹ جائے۔۔۔ اور تم اس میں سما جاؤ۔“

میں نے کہا ”یہاں پل پار بازارِ حسن ہے۔ راجا بازار کے چوک سے سیدھا راستہ ہے۔“

”سیدھا راستہ یعنی صراطِ مستقیم۔ سکندر، مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ ہماری مستقبل کی شریکِ حیات ہم پر کتنا اعتماد کرتی ہیں۔ جب انھیں معلوم ہو گا کہ ابھی سے ان کے مجازی خدا اس بازار میں قدم رنجہ فرما چکے ہیں۔“

”میں ایک جہانپزاروں کا قبضہ ہو جائے گی ساری بک بک۔ میرا خیال ہے ملک صاحب کو وہیں پہنچا دیں۔ ان کو ہوش آنے سے پہلے یہ خبر خاص و عام تک پہنچ جائے گی کہ محترم وزیرِ جنگلات کہاں کس حال میں تھے اور ان کی تمام بیویوں کو بھی پتا چل جائے کہ بلا را

www.paksociety.com

ایوان صدر سے نہیں کسی مشتری بائی یا زہرہ جان کے کوٹھے سے آیا تھا۔ اس کے بعد ملک صاحب اسے سازش کہیں یا کردار کشی کی مہم، یقین کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔"

غالب بہت خوش ہوا "یا پیر و مرشد۔ نیک کام میں دیر کیسی، چلئے۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔"

چوک را بازار سے گزرنے کے دس منٹ بعد گاڑی نے پل عبور کیا۔ اس علاقے میں کچھ گڈز ٹرانسپورٹ کمپنیوں کے دفاتر اور بڑے ٹرکوں کے اڈے بھی تھے۔ نیم پختہ دیواروں اور چھپر والے ہوٹلوں میں ڈرائیور، کلینر اور کلینک برادری کے لوگ میلی بان کی چارپائیوں پر گندے بستروں پر اور بینچوں پر سو رہے تھے۔ لکڑی کی بدوضع کرسیوں اور میزوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے اور بے سری آوازوں میں پرانے فلمی گانے سن رہے تھے لیکن یہ سب رونق پل تک محدود تھی۔ پل کے بعد والی سڑک سیدھی ویسٹرن چھاؤنی جاتی تھی اور اس کے شروع میں آدھا میل یا کچھ کم میں بازار حسن تھا اور وہ بدنام گلی کوچے تھے جہاں قدم رکھنے کے خیال سے ہی عزت دار آدمی کو پسینہ آ جاتا تھا۔

یہاں سے گزرنا بھی لوگوں کی مجبوری تھی۔ جو ویسٹرن چھاؤنی کے علاقے میں رہتے تھے یا ملازمت کرتے تھے ان کے لیے شہر پہنچنے کا کوئی متبادل راستہ نہیں تھا۔ چند لوگ اس "مجبوری" سے فائدہ بھی اٹھاتے تھے اور بعض اوقات وہ جنہوں نے مجبوراً اچانک آمنا سامنا ہونے پر سوچتے تھے کہ انہیں پل سے چھلانگ لگا کے ندی میں ڈوب مرنا چاہیے۔ مگر وہ ڈوب مرا بھی تو نہیں جاتا تھا۔ یہ سوچ کے وہ مطمئن ہو جاتے تھے۔

اس بازار کی رونق بھی اب ماند پڑ رہی تھی۔ شوقین مزاجوں کے تھکے ہارے قدم واپسی کی راہوں پر گامزن تھے۔ جن کا دامن تہی دست و تہی دل۔ اپنی اپنی تنہائی کی محرومیوں اور مایوسیوں کی طرف مراجعت۔ بھولی خوشیوں کے چند دغاباز لمحے لوٹ کر لے اڑے تھے۔ دروازے اور دریچے بند ہو رہے تھے۔ روشنیاں گل ہونے لگی تھیں مگر کہیں کہیں سے اب بھی پائلوں کی چھن چھن اور سکوں کی کھنک میں کوئی رقص کتاں تھا یا تھرک رہا تھا۔

میں نے غالب سے کہا "دیکھو مرزا جی۔"

"سب دیکھ رہا ہوں۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا "تماشائے عبرت۔"

"یہ جذباتی ہونے کا وقت نہیں۔" میں نے کہا "اب تم اتر کے واپس جاؤ۔ سوا بجے تمہیں کوئی ٹیکسی ضرور مل جائے گی۔ وہ آخر شب تک کسی راہ گم کردہ مسافر کی واپسی کا انتظار کرتے ہیں جو انہیں دگنا معاوضہ دیتا ہے۔ رازداری سے گھر پہنچانے کا۔ یا وہ نشے میں دھت ہو تو اس کی جیب خالی کرنا کوئی مشکل نہیں ہوتی۔"

"یہاں سے تو سب ہی خالی جیب جاتے ہوں گے۔ خیر میں کیا کہوں ٹیکسی ڈرائیور سے۔ کہاں جانا ہے؟"

"ہمیں واپس جانا ہے" میں نے کہا۔

"کہاں۔ کامران ہوٹل؟"

"ظاہر ہے۔ ٹیکسی والے کو چار پانچ ایک خواب تو بھی لے جانا ہوگا۔" میں نے کہا "تمہارے آنے تک پیر صاحب کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔"

غالب روانہ ہوا تو میں نے گاڑی کو تھوڑا سا آگے چوبارے ایک روشن بالکونی کے سامنے روک لیا۔ زینے کے ساتھ بنے ہوئے تھڑے پر سونے والا ایک مدقوق سا شخص ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔

"کون۔ کون ہے بے" اس نے نیند خراب کرنے..."

میں نے کہا "یہ نیلم بائی کا کوٹھا ہے نا؟"

وہ ہنس پڑا "نیلم بائی کے کوٹھے۔ یہ چنگی بائی کا کوٹھا ہے جی... آنکھ کی پتلی... گھنگرو... چنگی بائی۔ نیلم بائی تو اب کیا ناچتی ہے۔ سونے کی ڈوری ہے... اور چنگی بائی کے اشارے پر تیرے جیسے کھوٹے گدھے... سب ناچتے ہیں اچھن بھانت یہاں پہ۔"

وہ پھر سو گیا تو میں اوپر گیا۔ کسی طوائف کے بالا خانے پر چڑھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اس سے پہلے میں نے کوٹھوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا، سنا تھا اور فلموں میں دیکھا تھا۔ اگر میں یہاں چوری چھپے دل لگی کے لیے آتا تو میرے قدم لڑکھڑاتے اور دل دھک دھک کرتا اور میرے پسینے چھوٹ رہے ہوتے لیکن میرے یہاں آنے کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔

ایک سوالی ٹائپ شخص نے مجھے آخری زینے پر روک دیا "کیا بات ہے۔" اس نے میرا بازو سختی سے تھام لیا تھا۔

میں نے کہا "مجھے نیلم بائی سے ملنا ہے۔"

"کل آنا شہزادے۔ اس وقت تو بچھڑے پھرتے نظر آ رہے ہیں ادھر سے۔"

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا "میری جیب میں ریوالور ہے لیکن اس کے بغیر بھی میں تم کو سیڑھیوں سے نیچے پھینک سکتا ہوں۔"

وہ ڈر گیا "کیا چاہتے ہو آخر تم؟"

"ایک وزیر صاحب کی گاڑی کھڑی ہے نیچے۔ میں ان کا ڈرائیور ہوں۔"

"وزیر... کون سے وزیر؟" اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"عباسی صاحب، وزیر جنگلات... نام سنا ہے ان کا؟"

"وہ... وہ خود آئے ہیں اس وقت...؟"

میں نے کہا "ہاں۔ انہیں جلدی آنا تھا مگر وزیر وقت کے پابند نہیں ہو سکتے۔ نیلم بائی سے کہو انہیں اوپر بلوا لے۔"

"بلوا لے سے کیا مطلب... وہ خود نہیں آ سکتے؟"

"وہ وزیر... اور وہ ہو گئے ہیں" میں نے کہا "زیادہ سوالی مت بنو...

اپنے کمرے میں پہنچنے تک ہوش آ جائے گا کچھ دیر میں۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "اس وقت تو پیر صاحب آئے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "کون سے پیر؟ بائی جی کے پیر؟"

"بائی جی کے کیا، وہ تو سب کے پیر ہیں آج کل۔ ان کے جانے پر جانے لوگ حاضری دیتے جاتے ہیں" وہ بولا۔

مجھے کچھ خطرہ محسوس ہوا "پھر تو عباسی صاحب کی دال نہیں گلے گی۔"

"میرا خیال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔" وہ بولا "میں جا کر بتاتا ہوں بائی کے کان میں۔ آگے جیسی ان کی مرضی۔"

میں نے کہا "چھوڑو۔ میں عباسی صاحب کو واپس لے جاتا ہوں۔"

"نہیں شہزادے۔ وزیر بڑی شے ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو بعد میں الٹی مجھ پر پڑے۔ میں تو یہاں چھوٹا ہوں۔ یہاں تو بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ اس وقت بھی موجود ہیں پیر صاحب کی وجہ سے۔ جب اشارہ ہوگا باقی سب اٹھ جائیں گے۔ پیر صاحب رہ جائیں گے۔"

میں نے کہا "چنگی بائی بھی بڑی شے ہے۔ ہمیں تو پتا بھی نہیں تھا۔"

"تھوڑی چڑھی ہوئی ہے آج کل۔ قسمت قسمت کی بات ہے۔"

میں نے کہا "نیچے کوئی گاڑی نہیں۔"

وہ بولا "سب کی گاڑیاں سائڈ کی گلی میں ہیں۔ یا ڈرائیور کہیں دور لے گئے ہیں۔"

میں نے کہا "پھر تو مجھے بھی گاڑی یہاں نہیں روکنی چاہیے تھی۔"

"تم نئے ڈرائیور ہو۔ ابھی تجربہ نہیں ہے۔ تھوڑا سا آگے بائیں ہاتھ پر گلی ہے۔ اس میں کہیں بھی گاڑی کھڑی کر دو۔ میں آتا ہوں بائی جی سے بات کر کے۔"

میں نے باتوں میں کچھ وقت گزار دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جتنی دیر میں چنگی بائی کے کوٹھے سے کوئی نیچے اتر کے آئے محسن بھی ٹیکسی لے کر پہنچ جائے اور ہم سرکاری گاڑی کو وہیں چھوڑ کے پیر صاحب کو لے کر نکل جائیں۔ میں نیچے اترا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ جس گلی کا چنگی بائی کے دربان یا دربار کے کارندے نے کہا تھا وہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اس تاریک گلی میں مجھے تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہوئی تین شاندار گاڑیاں نظر آئیں۔ میں نے عباسی کی گاڑی بھی وہیں روک لی۔

محسن نے عین وقت پر مجھے گاڑی بڑھاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی پیچھے گلی میں پہنچ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور ان گلی کوچوں کے رموز سے بخوبی آشنا معلوم ہوتا تھا اور شاید ایسے تماشے ہر روز دیکھتا تھا۔ وہ عباسی کی سرکاری گاڑی دیکھ کے کچھ مرعوب نظر آنے لگا تھا۔

ابھی تک چنگی بائی کے کوٹھے سے کوئی بھی عباسی کو لے جانے کے لیے نہیں اترا تھا جب میں نے اور غالب نے پیر صاحب کو ٹیکسی میں شفٹ کیا۔ اب بھی کوئی اس وزیر با تدبیر کی پذیرائی کے لیے نہیں آیا تھا۔ غالباً نیلم بائی نے خود یا پیر صاحب قبلہ کی نظر کا اشارہ سمجھتے ہوئے عباسی کو شریک محفل نہیں کیا تھا۔ ایک پیر اور ایک وزیر میں سے کون زیادہ طاقتور تھا۔ شاید پیر... وزارت آنی جانی چیز ہے۔ پیری فقیری کا سلسلہ نسب در نسب چلتا ہے۔

ویسٹرن کے سنسان علاقے کی طرف جانا بے سود تھا۔ ہم پل کو عبور کر کے پھر شہر کی طرف لوٹ آئے تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "کیا ہوا ہے اس بندے کو؟"

میں نے کہا "بہت زیادہ پی گیا ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے اپنے ساتھ لے کر ہوٹل کیسے جائیں۔ ہوٹل والے نہ جانے کیا سمجھیں گے؟"

غالب نے کہا "کیا تم تھوڑا سا انتظار نہیں کر سکتے؟"

"تھوڑا سا کیوں جی۔ بہت انتظار بھی کر سکتا ہوں میں۔"

غالب اس کا مطلب سمجھ گیا۔ "ٹھیک ہے۔ ہم تمہارے وقت کی قیمت ادا کریں گے۔"

میں نے کہا "ظاہر ہے تم رات کے وقت ٹیکسی چلاتے ہو کچھ زیادہ کمانے کے لیے ورنہ دنیا کے لیے یہ آرام کا وقت ہے۔"

اس نے مجھے ممنونیت سے دیکھا "پھر آپ بتائیں جی کہاں چلوں۔ گاڑی سڑک کے کنارے روکی تو پولیس والے آ جائیں گے سوال جواب کرنے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم کہیں بیٹھ کے چائے پیتے ہیں اور اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتے ہیں۔ لیکن پہلے کسی اخبار کے دفتر چلو۔"

"کون سے اخبار کے دفتر؟" اس نے حیرانی سے کہا۔

غالب نے کہا "روزنامہ "کوہستان" کا دفتر دیکھا ہے؟"

"بالکل دیکھا ہے۔ روزنامہ مشرق کا بھی دیکھا ہے۔"

"پھر جو قریب ہو وہاں چلو" غالب نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا "وہی خبر دینی ہے نا۔"

غالب نے اشاروں کی زبان میں کچھ اور سوال کیا تھا۔ میں نے کہا "ہاں۔ اگر اخباری نمائندے تصدیق کرنا چاہیں کہ عباسی صاحب کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں تو ابھی وقت ہے۔ آخری کاپی کے پریس میں جانے سے پہلے وہ خبر لگا سکتے ہیں۔"

غالب کے لیے اشارہ کافی تھا۔ وہ اپنا پریس کارڈ ایسے ہی مواقع پر استعمال کرتا تھا۔ وہ ٹیکسی سے اتر کے دس منٹ کے لیے اخبار کے آفس میں گیا مگر اس کے واپس آنے سے پہلے ہی میں نے رپورٹر ٹائپ ایک شخص کو بڑی افراتفری میں فوٹوگرافر کے ساتھ موٹر سائیکل پر روانہ ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اخبار والوں کو ایسی چٹپٹی خبر شائع کرنے کا موقع خدا دے۔ بس وزیر جنگلات کا وہاں ملنا شرط ہے۔ صبح کا اخبار ان کی نظر سے بہت دیر میں گزرے گا۔ اس سے

www.paksociety.com

پہلے ہی سارا شہر جان لے گا کہ گزشتہ شب ایوان صدر کا کمرہ کے وہ کہاں پہنچے تھے اور کس حال میں پائے گئے تھے۔ کیا بتائے گا عباسی کسی کو اور کون یقین کرے گا اس کی بات پر۔ خود اس کی تین بیویاں نہیں مانیں گی کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ کون بہادر علی کون رابعہ قاری ایڈووکیٹ؟ گیسٹ ہاؤس میں تو کسی نے بھی قیام نہیں کیا تھا۔ اگر اس نے کسی کو کھانے کی دعوت دی تھی تو وہ آئی کیوں نہیں تھی۔ گھر سے تو عباسی خود اسے اپنے ساتھ لانے کے لیے روانہ ہوا تھا۔ پلیا ڈ کیسے پہنچا؟ وہ لاکھ شور کرے۔ قسمیں کھائے کون مانے گا کہ اس کے خلاف سازش کا اتنا مضبوط جال بُننے والے شکاری بہت چالاک لوگ تھے جنہوں نے خود کو بچانے کے لیے اس کے خلاف بدنامی کی ایک جھوٹی کہانی کو ناقابل تردید بنا کے دنیا کی گواہی کے ساتھ اخبار میں چھاپ دیا ہے۔

صدر میں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے اڈے پر ٹیکسی روک کے ہم نے چائے پی۔ ہر طرف موجود خالی بسوں کے درمیان وہ خاصی محفوظ جگہ تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں چائے لا کے دی اور پھر خود باہر ٹہلتے ہوئے سگریٹ پیتا رہا۔

میں نے اس وقت مہلت سے فائدہ اٹھایا "مرزا جی۔ اس خبیث سے تو جان چھوٹ گئی۔"

"الٹا وہ مشکل میں پڑ گیا" غالب نے مجھ سے ہاتھ ملایا "تمہاری اسکیم خطرناک تھی مگر کامیاب ہو گئی۔"

"اب تم پہلی فرصت میں لاہور چلے جاؤ۔"

"میں اکیلا چلا جاؤں؟"

"اکیلے نہیں۔ اپنے ساتھ رابعہ کو لے جاؤ۔"

"میری عقل شریف میں یہ بات نہیں آئی" غالب نے کہا "کچھ وضاحت فرمایئے۔"

"دیکھو بھائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس حالت میں پیڈرو کے ساتھ میرا کامران ہوٹل جانا ٹھیک نہیں۔ انہوں نے پہلے ہی بڑی مشکل سے دو کے بجائے چار افراد کو ایک کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت دی تھی۔ پانچواں ساتھ ہوگا اور وہ بھی اس حالت میں تو صورت حال مشتبہ ہو جائے گی۔ خدانخواستہ انہوں نے پولیس کو بلا لیا تو ہم سب پھنس جائیں گے۔"

"لیکن ہم نے کیا جرم کیا ہے؟"

"یار تم کیسے صحافی ہو۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ ہوٹل کے مالکان پولیس والوں سے بنا کے رکھتے ہیں۔ وہ شک کی بنیاد پر خاموشی سے انہیں بلا کے کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میں آج رات پیڈرو کے ساتھ رہوں' تم جاؤ ہوٹل۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟"

"میں' میں چلا جاؤں گا کہیں بھی۔ ورنہ یہ ٹیکسی ہے۔ اگر رات بھر اسی جگہ کھڑی رہے تو کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ یہاں اور بھی کتنے رکشے کھڑے ہیں اور کئی ٹیکسیاں موجود ہیں۔ ڈرائیور بھی جاتے ہوں گے اور اس جگہ کا کرایہ بھی ادا کرتے ہوں گے کو۔ سرکاری جگہ ہے۔ کرایہ کچھ لوگ جیب میں ڈال لیتے ہوں گے۔"

"بھاڑ میں جائیں سب۔ مجھے یہ بتاؤ کہ میں کیا کروں؟"

"تم صبح ہوتے ہی رابعہ کے ساتھ روانہ ہو جاؤ۔ پہلے تمہیں لاہور میں ہونا چاہیے۔ رابعہ سپریم کورٹ بار میں نظر آ جائے۔ اپنے عبدالودود مظفر اور رفیق یوسف کے بھی بہت سے لوگ اسے دیکھ لیں تاکہ بعد میں وہ ثابت کر سکیں کہ گزشتہ روز بھی وہ لاہور میں تھی۔"

"بعد میں یہ کیسے ثابت ہوگا؟"

"یار غالب' رابعہ کے پاس خاصی عقل ہے اور وہاں اس کے بہت سے لوگ ہیں۔ رابعہ کل کی تاریخ میں موکلوں کی کاغذی نوٹ کر سکتی ہے۔ تم کوئی خبر لگا سکتے ہو کہ مس رابعہ قاری نے خواتین کی فلاں انجمن کی تقریب میں شرکت کی تھی۔ تم خود لاہور میں موجودگی کے حالات اور گواہ پیدا کر لو تاکہ عباسی کو جھوٹا ثابت کیا جا سکے۔ تمہارے یا رابعہ کے ہم پیشہ لوگ اور دوست احباب آخر کس مرض کی دوا ہیں۔"

"او کے۔ یہ سب ہو جائے گا۔ اگرچہ آسانی سے نہیں ہوگا اور خرابی بہت ہوگی اس میں۔ وہ بھی وزیر ہے اور اتنا بڑا جھوٹ برداشت نہیں کرے گا۔ اس کی اتنی رسوائی ہوئی تو وہ بدلہ لے گا۔"

"وہ عقل سے کام لے گا تو مزید رسوائی سے بچ جائے گا۔ میں اور نازو تو پکچر میں آتے ہی نہیں۔ آج کے بعد یہ فرنچ وکیل کا چہرہ پبلک کی نظر سے اوجھل ہو جائے گا۔ نازو کا نام کون جانتا ہے۔ تم ماشاء اللہ سے اتنے بڑے صحافی ہو اور مس رابعہ ماشاء اللہ سے اتنی بڑی وکیل ہیں کہ وزیر جنگلات اس بدنامی کے بعد تمہارے خلاف کچھ بولیں گے تو اپنا ہی نقصان کریں گے اور میرا خیال ہے کہ اس کا کوئی پی آر او صورت حال کو سنبھال لے گا۔ اسے سمجھا دے گا کہ وہ سوچے سمجھے بغیر بیان نہ دے۔"

"ہو سکتا ہے اس چکر میں عباسی کا دادا اور سے رابطہ ہو جائے پھر دادا اور اسے ساری بات سمجھا دے گا۔ ہم سب سے متعارف کرا دے گا۔"

میں نے کہا "اتنی دور کی مت سوچ۔ کل کی کل دیکھی جائے گی اور جب ہم نے دلاور کا جینا ہی حرام کر دیا ہے تو عباسی سے بھی نمٹ لیں گے۔ ابھی تو مجھے پیڈرو کے ساتھ جا کے اپنے والد کا قاتل تلاش کرنا ہے اور یہ کام آسان بہرحال نہیں ہے۔ اس نے پولیس کو شہر میں تو قتل کیا نہیں ہوگا۔ اور اب کے ساتھ جنگل یا پہاڑوں کی طرف جانا پڑا اور کھدائی کرانی پڑی تو یہ کام ایک دن میں نہیں ہوگا۔ صرف پیڈرو کا مسئلہ نہیں ہے اب کے لئے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ لیکن مجھے ایک ایسے معاون کی ضرورت ہے جو ضرورت پڑنے پر خود اپنی حفاظت بھی کر سکے۔"

غالب نے کہا "یہ تو صرف نازو کر سکتی ہے۔"

"ہاں۔ ایک تو یہ ہمیں گھنٹے کی گمراہی کا مسئلہ ہے۔ اگر میں ہو گیا یا مجھے کہیں جانا پڑے تو میرے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ نازو کا پیڈرو کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"میں سمجھ گیا یار۔ لیکن ہمارے لاہور جانے کے بعد تم کیا کرو گے؟"

"یہ تو خود مجھے معلوم نہیں۔ اس کا انحصار پیڈرو کے رویے پر ہے۔ اس نے تعاون جاری رکھا اور ہماری صحیح سمت میں راہنمائی کی تو کام آسان ہو جائے گا۔ ایک دو دن میں ہم بھی لوٹ کے لاہور آ جائیں گے۔"

"اور پیڈرو کے بارے میں کیا سوچا ہے' اسے چھوڑ دو گے؟"

"سچ تو یہ ہے کہ ابھی اس سوال کا میرے ذہن میں کوئی واضح جواب ہی نہیں' اسے چھوڑنے کا مطلب ہے کہ میں اس کے سارے گھناؤنے جرائم کو بھول جاؤں تو صرف میرا ذاتی معاملہ ہوتا تب بھی میں اس کو نہیں معاف کر سکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ معاف کرنے میں بڑائی ہے۔ پیڈرو شریف آدمی ہوتا اور اس نے ناراضگی میں یا مجبوری میں میرے والد کو قتل کیا ہوتا تو میں اس غلطی سے درگزر کر لیتا مگر یہ غلطی نہیں تھی۔ یہ ایک سوچا سمجھا بہیمانہ قتل تھا اور بات صرف وزیر خان کے قتل پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ اور بھی بہت سے بے گناہوں کا قاتل ہے۔ ایسی کون زندگی کی ہے اس نے یا کون سا احسان کیا ہے مجھ پر کہ میں اسے جان بخشی کے ساتھ بے فکری کی زندگی گزارنے کی کھلی چھٹی دے دوں کہ جاؤ استاد پیڈرو' شیخ مختار بن کے باقی زندگی عیش سے گزارو۔"

"لیکن تم نے اس سے وعدہ کیا تھا؟"

"میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ اور کیا تھا تب بھی پیڈرو جیسے درندوں کے ساتھ بدعہدی کوئی اخلاقی جرم نہیں۔ ایک جرم کا سراغ لگانے یا مجرم سے اعتراف جرم حاصل کرنے کے لیے شرافت کے اصولوں کی پاسداری نہیں کی جا سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اب تم جاؤ۔ رابعہ اور نازو پریشان ہوں گی۔ یہاں سے پیدل دس منٹ کا راستہ ہے۔"

"صبح تم نازو کو ہوٹل سے لے جاؤ گے نا؟"

"نہیں۔ میرا ہوٹل جانا ٹھیک نہیں۔ میں اسے فون کر کے بلا لوں گا۔" میں نے کہا "اسے کہنا گھبرائے نہیں۔"

غالب بادل ناخواستہ رخصت ہوا۔ پیڈرو ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا اور اس سے مجھے تھوڑی سی تشویش لاحق ہونے لگی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ انجانے میں ہاتھ زیادہ سخت پڑ گیا ہو اور کنپٹی پر لگنے والی چوٹ سے دماغ کی کوئی شریان پھٹ گئی ہو۔

میں نے پیڈرو کو ہلا جلا کے دیکھا اور پھر اس کی نبض کی رفتار دیکھی۔ نبض کی رفتار بے ہوشی میں کچھ سست پڑ جاتی ہے۔ میں کوئی ڈاکٹر نہیں تھا کہ اس رفتار سے بے ہوشی کی نوعیت کا اندازہ کر سکتا۔ میں نے ایک گلاس میں کینٹین سے پانی لا کے پیڈرو پر چھینٹے مارے تو اس نے خفیف سے رد عمل کا اظہار کیا۔

ٹیکسی ڈرائیور اس کارروائی کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا "آخر معاملہ کیا ہے؟"

میں نے چونکے بغیر اسے پلٹ کے دیکھا "کون سا معاملہ؟"

"یہ بندہ شراب کے نشے میں نہیں ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "ٹھیک سمجھے ہو تم۔ یہ بے ہوش ہے۔"

"پھر اسے یہاں کیوں ڈال رکھا ہے۔ اسپتال یا کسی ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں لے جاتے؟ ایسے یہ مر گیا تو؟"

میں نے اسے تسلی دی "نہیں۔ ایسی بات بھی نہیں ہے۔ یہ مرنے والا نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں ہوش آ جائے گا۔ ڈاکٹر اس وقت کون ملے گا۔ اسپتال لے گیا تو وہ دس سوال کریں گے اور پھر کہیں گے کہ سرکاری اسپتال لے کر جاؤ۔ سرکاری اسپتال میں پولیس ہوگی۔"

"کیا تم نے اسے زہر دیا تھا؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ خیال کیسے آیا تمہارے دماغ میں؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "پھر کیا ہوا تھا؟ اگر یہ تمہاری غلطی سے بے ہوش نہیں ہوا ہے تو پھر تمہیں پولیس سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"پولیس سے بے گناہ ہی ڈرتے ہیں" میں نے کہا "وہ کسی کے سچ پر اعتبار نہیں کرتے۔"

ٹیکسی ڈرائیور کچھ فکرمند ہو گیا تھا "تم مجھے تو بتا سکتے ہو کہ سچ کیا ہے؟"

میں نے سوچ کے کہا "ہاں۔ تم شریف آدمی ہو۔ تم نے ہماری مدد کی ہے۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ اس کا اصل نام تو ہے شیخ مختار لیکن سب استاد پیڈرو کہتے ہیں۔ آٹھ دس سال سے عباسی صاحب کے ساتھ تھا۔"

"کون عباسی؟"

میں نے کہا "پہلے کونسلر تھا اور ٹھیکے داری کرتا تھا۔ پھر اسمبلی میں منتخب ہو گیا اور آج کل وزیر ہے۔ تم اس علاقے کے رہنے والے ہو؟"

"ہاں جی۔ اچھی طرح جانتا ہوں اسے۔ اور اس کے سارے دھندوں سے بھی واقف ہوں۔"

"پھر تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ عباسی کے ساتھ کیسے کام کرتا ہوگا۔ یہ بدمعاشوں والا نام خود اختیار کیا تھا اس نے کہ اس سے رعب پڑتا ہے۔ ہم تو سمجھاتے تھے کہ زیادہ لالچ مت کر۔ بدمعاشی

www.paksociety.com

کے کاروبار میں نہ کوئی کسی پر بھروسا کرتا ہے اور نہ مشکل وقت میں کوئی بچاتا ہے۔ عباسی کو شک ہو گیا تھا کہ استاد پیڈرو اسے دھوکا دے رہا ہے اور اس کی بدمعاشی حد سے بڑھ گئی ہے۔ وہ تو اسے مروا دیتا۔ ہم نے خوشامد کی' ہاتھ پاؤں جوڑے تو اس نے کہا کہ اچھا لے جاؤ اسے مگر دوبارہ اس کی شکل نظر نہ آئے مجھے۔ اسے سمجھا دینا کہ عباسی کو بلیک میل کرنے کا خیال دل میں آنے سے پہلے اپنی قبر کی جگہ دیکھ لے۔"

"بلیک میل کیا ہوتا ہے؟" وہ سر کھجا کے بولا۔

میں نے کہا "اتنا عرصہ عباسی کے لیے سارے ناجائز کام کیے تھے اسے سب معلوم ہے۔ عباسی نے دولت کیسے کمائی اور اس کا ساتھ دینے والے کون تھے۔ شاید اس نے دھمکی دی ہوگی کہ میں سب کو بتا دوں گا۔ کیا پتا اپنا حصہ مانگا ہو۔ ہوش میں آئے گا تو بتائے گا۔ برے کام کا برا نتیجہ۔" میں نے کہا "اور اس کا عباسی سے کیا مقابلہ۔"

"تم اس کے کیا لگتے ہو؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ پہلے ہم ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔"

"دوست ہوا نا پھر تمہارا؟"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ میرے دوست سب شریف آدمی ہیں۔ پڑھے لکھے اور مہذب لوگ۔"

اس نے بے چینی سے گھڑی دیکھی "آخر تم کب تک روکے رکھو گے مجھے؟"

میں نے کہا "ایک رات میں تم جتنا کما لیتے ہو اس سے دگنا مجھ سے لے لو۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "ٹھیک ہے۔ صبح مجھے پانچ سو دے دینا مگر کیا ساری رات گاڑی میں گزارو گے... یہاں؟"

"ویسے تو ہوٹل کم نہیں ہیں لیکن اس الو کے پٹھے کو ایسی حالت میں اپنے ساتھ کیسے لے جاؤں۔ تمہارے پاس ہے کوئی جگہ تو مجھے بتاؤ۔ ایک رات کا اچھا معاوضہ دے سکتا ہوں میں۔ صبح تک یہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"پیسہ بہت ہے تمہارے پاس؟" اس نے طنز سے کہا۔

میں نے کہا "زیادہ تو نہیں لیکن تم بیچنا چاہو تو میں یہ ٹیکسی بھی خرید لوں گا۔ مجھے گاڑی کی ضرورت ہے۔"

وہ مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا "میرا خیال ہے کہ ایک رات تم میرے گھر میں بھی گزار سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے اور تمہیں کوئی پریشانی نہیں تو چلو۔" میں نے کہا۔

"گھر تو چھوٹا سا ہے۔ بس دو کمرے ہیں" وہ بولا "ایک میں تم رات گزار لینا لیکن..."

"لیکن کیا...؟"

"میری بیوی... غصے کی ذرا تیز ہے۔ اس کی کسی بات کا برا مت ماننا۔" وہ بولا "مگر پانچ سو ملیں گے تو وہ بھی خوش ہو جائے گی۔"

اس کی پیشکش بڑی مخلصانہ اور بے غرض تھی۔ میں نے کہا "تم رہتے کہاں ہو؟"

"سید پوری روڈ پر۔ اصغر خان چوک سے آگے۔" اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

چند مشہور مقامات اور سڑکوں کے سوا مجھے راولپنڈی کے غیر معروف محلوں کے بھی گنے چنے نام آتے تھے جیسے کمیٹی چوک اور وارث خان۔ باقی نام خاصے مشکل تھے مثلاً ڈھوک [illegible] بھی ہوگا شہر کا کوئی پرانا علاقہ۔ میں نے سوچا۔ مجھے [illegible] ٹیکسی میں بیٹھ کے جاگتے پیڈرو کے ساتھ کسی محفوظ مقام کی تلاش میں بھٹکنے کی پریشانی سے نجات مل گئی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور کا گھر ایک سنسان گلی میں تھا اور اس گلی کا آخری مکان تھا۔ اس کے بعد کسی اسکول کا بچوں کا گراؤنڈ تھا۔ میدان اور گھر کے درمیان ایک خستہ حال سڑک تھی۔ ڈرائیور کے گھر سے پہلے والا پلاٹ بھی خالی تھا شاید اس کا مالک بھی [illegible] تھا اور ادھر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ گلی والے وہاں کوڑا ڈالتے تھے۔ کوڑے کے ڈھیر کی بلندی خود بتاتی تھی کہ [illegible] کارپوریشن کا کوڑا لے جانے والا ٹرک ادھر نہیں آیا ہوگا [illegible] سے اور ہوا کے باعث نیچے والا کوڑا اڑتا جاتا تھا لیکن اوپر [illegible] میں مسلسل اضافے سے تین طرف کے مکانوں کی دیواروں سے گھرا ہوا یہ پلاٹ کئی فٹ اونچا کچرا گھر بن چکا تھا۔ اس کی بدبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور اسی کی وجہ سے ٹیکسی ڈرائیور کا گھر کسی حد تک گلی کے دوسرے گھروں سے کٹ گیا تھا۔

"کیا تمہارے لیے اس سڑک کے راستے آنا آسان نہ ہوتا جو تمہارے گھر اور میدان کے درمیان ہے۔"

اس نے کہا "آگے سڑک کو ہر شخص نے دیوار بڑھا کے اپنے گھر میں شامل کر لیا ہے۔ گلی کے آخری مکان میں رہنے والے کو تین مرلے جگہ مفت میں مل گئی ہے۔ ایک نے دیوار کو اسکول کی دیوار سے ملایا تو دوسرے نے بھی ملا دیا۔"

"پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"میں کرائے پر ہوں۔ مالک مکان جب چاہے گا کر لے گا۔ ابھی تو یہ جگہ گاڑی کھڑی کرنے کے لیے اچھی ہے۔ میری ٹیکسی یہیں ہوتی ہے۔"

میں نے دیکھا تو وہاں سفید رنگ کی ایک کار پہلے سے موجود تھی۔ "یہ کس کی گاڑی ہے؟"

اس نے بے خیالی میں کہا "کوئی آیا ہوگا" اور پھر خود ہی اس کی وضاحت بھی کر دی۔ "میرا بھائی اکثر آ جاتا ہے۔"

اس نے دروازے کی کنڈی بجائی لیکن دروازہ کھلنے پر اپنے گھر میں داخل ہوا جیسے گھر کا مالک وہ نہیں ہے۔ اس نے کسی سے آہستہ

کچھ کہا۔ میں نے کسی عورت کے تیز لہجے میں باتیں کرنے کی آواز سنی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے چور نظروں سے میری طرف دیکھا تو اس کا انداز مشکوک لگا مگر اب محتاط ہو جانے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔

"آؤ جناب" ٹیکسی ڈرائیور نے بالآخر کہا۔

میں نے کہا "تم تو ذرا مدد کرو میری۔"

ڈرائیور نے سہارا دیا اور پیڈرو کو کھینچ کر باہر نکالنے اور گھر کے اندر لے جانے میں میری مدد کی۔ پرانے کواڑ مشکل سے ڈھائی فٹ چوڑے تھے اور ان کی اونچائی بھی چھ فٹ سے کم تھی۔ مجھے سر جھکا کے گزرنا پڑا۔ اندر کا نقشہ وہی تھا جو ایک چھوٹے سے پلاٹ پر بنے ہوئے گھر کا ہوتا ہے۔ مختصر صحن' ایک کونے میں لیٹرین' برآمدے میں کچن اور پیچھے دو چھوٹے چھوٹے کمرے۔

برآمدے میں جلنے والے چالیس واٹ کے بلب کی روشنی کے باوجود ایک کمرہ اندھیرے میں تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ ٹیکسی ڈرائیور کا بھائی اگر دوسرے کمرے میں تھا تو وہاں لائٹ کیوں نہیں جل رہی تھی اور ایک خالی کمرے کے ہوتے وہ اپنی شادی شدہ بہن کے کمرے میں کیوں سو گیا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کمرے کی لائٹ جلائی تو اندر داخل ہوتے ہی مجھے بہت سے سوالات کا جواب مل گیا۔ دس فٹ لمبا اور چوڑا کمرہ بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا۔ اس میں پلنگ نہیں تھا مگر فرش پر نہایت عمدہ اور دبیز کشمیری قالین بچھا ہوا تھا۔ قالین کا سائز سات ضرب نو فٹ تھا۔ دروازے کے سامنے ڈھائی تین فٹ چوڑی ایک کھڑکی تھی۔ اس کے ساتھ والی دیوار کے وسط میں دروازہ ہوگا جو پردے کے پیچھے نظر نہیں آتا تھا۔ اسی کمرے میں ایک چھوٹا سا ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ قالین کی طرح اس پر بھی شوخ رنگ کے بھاری پردے لٹک رہے تھے۔

قالین کے اوپر سفید چادر بچھی ہوئی تھی اور سرہانے کی طرف دونوں کے لیے ایک ہی تکیہ تھا۔ جب میں نے پیڈرو کو اس پر لٹایا تو سستی قسم کے سینٹ کی خوشبو میں اضافہ ہو گیا جو کمرے کی فضا میں بسی ہوئی تھی۔ پھر میری نظر دیوار پر گئی تو میرے لیے شک کی گنجائش ہی نہ رہی۔ دیواروں پر انتہائی قابل اعتراض تصاویر چوڑی ٹیپ سے یوں چپکا دی گئی تھیں کہ ٹیپ کا حاشیہ فریم کی طرح نظر آتا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے شک میری آنکھوں میں یا میرے چہرے کے تاثرات میں پڑھ لیا "وہ... دراصل... یہاں میری بیوی سوتی ہے۔"

میں پوچھتے پوچھتے رہ گیا کہ کس کے ساتھ؟ مجھے رات کے چند گھنٹے ہی یہاں گزارنے تھے۔ اگر کوئی عورت جو اس ٹیکسی ڈرائیور کی منکوحہ تھی یا نہیں تھی۔ اس گھر میں جسم فروشی کرتی تھی تو مجھے کیا۔ جب تک کسی کی نیت خراب نہیں ہوتی مجھے کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے اور ایسے دھوکے ہر شخص ہر قدم پر کھاتا ہے۔ نہ کوئی فاحشہ مجھے رجھا سکتی تھی اور نہ اس کا دلال مجھے لوٹ سکتا تھا۔

میں نے قالین پر بیٹھ کے اپنے جوتے کھولے تو میری نگاہ ان مردانہ جوتوں پر گئی جو وہاں پہلے سے موجود تھے۔ یہ پولیس یا فوج کے جوانوں کو وردی کے ساتھ ملتے تھے۔ خود ٹیکسی ڈرائیور کی صحت ایسی تھی کہ وہ کسی بھرتی کے دفتر میں جاتا تو لطیفہ بن جاتا۔ جوتوں کی پالش یہ بتاتی تھی کہ وہ آج بھی وردی کے ساتھ پہنے گئے تھے۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا "تم کیوں ایسے کھڑے ہو جیسے مہمان ہو؟"

اس نے جھینپ کے کہا "نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"ابھی تک نام بھی نہیں پوچھا میں نے تمہارا۔ یہ تمہارا ہی گھر ہے نا؟"

"ہاں۔ ہاں جی... اور میرا نام ہے عبدالرحمان۔" وہ کچھ نروس ہونے لگا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں دیواروں پر چپکی آرٹ کے نمونوں کے بارے میں کوئی سوال کرتا' اس کی نام نہاد بیوی خود اپنے ذوق و شوق کی عملی تفسیر بن کے آ گئی۔ اس کے لبوں کی لالی بھونڈی سی نہیں نقش تھی۔ اس کا رنگ اچھا خاصا تھا مگر اس نے پھر بھی غازہ تھوپ رکھا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں سرمے کی لکیر کھنچی گئی تھی۔ وہ عمر میں عبدالرحمان سے یقیناً دو چار سال بڑی تھی۔ اس کا بدن مائل بہ فربہی تھا۔ کپڑے پہلے کے سلے ہوئے تھے یا جان بوجھ کے تنگ سلوائے گئے تھے کہ وہ کسی طرف سے بھی جسامت نہیں سنبھال سکتے تھے اور اس کے بدن کا سارا گوشت باہر چھلکنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔

"اس گھر کو اپنا ہی سمجھو۔" اس نے مجھے گھور کے کہا "کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔"

میں نے دل کڑا کر کے کہہ دیا "پہلے تو پانی ایک گلاس۔"

"بس..." وہ ہنس پڑی۔

میں نے کہا "اس کے بعد اگر مل جائے تو چائے۔"

عورت نے مایوسی سے اور کچھ خفگی سے عبدالرحمان کو دیکھا۔ اس کی نظروں کا مفہوم بہت واضح تھا۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ یہ کیا مصیبت اٹھا لائے ہو تم۔ یہ بندہ تو ایویں ہے۔ عبدالرحمان نے میری نظر بچا کے اسے آنکھ ماری جو میں نے دیکھ لیا۔

"ہاں جی۔ چائے بھی آ جائے گی۔" عبدالرحمان بولا اور پھر عورت سے مخاطب ہو گیا "او جھلی لوک۔ یہ ایسے ویسے لوگ نہیں ہیں۔ رات بھر کے لیے ٹیکسی لی تو پانچ سو دیے۔ ہوٹل میں جانا چاہتے تھے مگر جا نہیں سکتے تھے۔ میں ادھر لے آیا۔ تجھے بھی مل

www.paksociety.com

جائیں گے پانچ سو۔"

عورت نے سر ہلایا "چل اچھا کیا۔ تو بھی چائے پیئے گا؟"

عبدالرحمان کے جواب دینے سے پہلے ایک تازہ جیسا لمبا اور سیاہ رو شخص اندر آ گیا۔ اس کا سر چوکھٹ سے لگا تو اس نے ماں کی گالی بکی۔ عورت ہنس پڑی۔

یہ صورت حال میرے اعصاب پر سوار ہونے لگی تھی۔ میں نے کہا "تم عبدالرحمان کے بھائی ہو؟"

اس نے مجھے پلٹ کے گھورا "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "تم بھائی لگتے نہیں' کیا پولیس میں نوکری کرتے ہو؟"

وہ چونکا "ہاں۔ اے ایس آئی ہوں' تم جانتے ہو مجھے؟"

"دیکھا تو آج ہی ہے مگر پھر بھی پہچان لیا' پوچھو کیسے؟"

معاشرے کے سارے چور اچکے اور بدمعاش پولیس والوں کو پہچانتے ہیں۔" اس نے غرا کے کہا اور ایک دم روانہ ہو گیا۔ باہر جاتے ہوئے اس نے دروازے کو دھڑ سے لات مار کے بند کیا۔ پھر میں نے اس کی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ اے ایس آئی کو میری آمد ناگوار گزری تھی۔ عبدالرحمان نے انجانے میں یہ حرکت کی تھی کہ رنگ میں بھنگ ڈال دی تھی یا اس کا بھی کوئی مقصد تھا؟ میں عبدالرحمان کے ساتھ آ کے پچھتا رہا تھا لیکن میری اب بھی یہ خواہش تھی کہ صبح تک مزید خرابی نہ ہو۔ میں نے عمداً عبدالرحمان سے اس کے گھر' اس عورت یا ان کے مذموم کاروبار کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا' اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ غلطی مجھ سے عبدالرحمان کی نیت کو سمجھنے میں ہوئی تھی اور اب پانچ سو دے کے یہاں رات گزار لینا یہاں سے واپس جانے اور ٹیکسی میں رات گزارنے سے بہرحال بہتر تھا۔

پیڈرو کچھ دیر بعد ہوش میں آ گیا' میں نے اسے پانی پلایا اور پھر گرم چائے دی۔ وہ حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔

"یہ کون سی جگہ ہے۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟" اس نے کہا۔

"صرف میں اور تم بچے ہیں" میں نے اوپر دیکھ کے کہا "باقی سب لوگ گئے۔ اس جگہ کے بارے میں مجھے بھی علم نہیں ہے۔"

وہ سمجھ گیا کہ میں اسے کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ عبدالرحمان اور وہ عورت دوسرے کمرے میں نہ جانے کس بات پر لڑ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی بیوی کو وہی پانچ سو دے گا جو میں اسے رات بھر کے لیے ٹیکسی بک کرنے کا دوں گا مگر اب ایسا لگتا تھا کہ قیام وطعام کے پانچ سو الگ نہ دیے تو وہ خوش نہیں ہو گی۔ میں نے احمقانہ حد تک غیر ضروری فیاضی کا مظاہرہ کیا تھا۔ عبدالرحمان شاید رات بھر میں سو ہی کماتا ہو گا مگر اسے ٹیکسی چلائے بغیر پانچ سو مل گئے تھے۔ کوئی شوقین مزاج ہوتا تو اس عورت سے بھی پانچ سو وصول کر لیتا۔ ان کے نزدیک مجھ سے بڑا بے وقوف کون ہو گا جس نے ایک ہزار دے کے لیا کچھ بھی نہیں۔

اب میں کچھ دیر کے لیے سونا چاہتا تھا۔ عبدالرحمان نے اور اس کی نام نہاد بیوی نے ہماری ہر فرمائش پوری کی تھی۔ بس کچھ فریج میں سے کھانے کے لیے نکال لیا گیا تھا کہ صبح تک گزارا کیا جا سکتا تھا۔ پیڈرو کو اسپرین بھی مل گئی تھی اور اب اسے آرام کی ضرورت تھی مگر ہم ایک ہی کمرے میں سو نہیں سکتے تھے۔

جب پیڈرو سو گیا تو میں نے عبدالرحمان سے کہا "اس کمرے کو باہر سے تالا لگانا ہے۔"

وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا "باہر سے۔۔۔ یا اندر سے؟"

میں نے کہا "پیڈرو اندر سوئے گا۔ میں تالا لگا کے باہر سونا چاہتا ہوں۔ یہ مت پوچھنا کہ کیوں؟ میں نے بھی تم سے کوئی سوال نہیں کیا۔"

وہ کچھ پریشان ہوا لیکن پھر اس نے مجھے تالے کی چابی لا دی۔ میں نے دروازے کے باہر دری بچھا کے تکیہ رکھا اور چابی جیب میں ڈال کے لیٹ گیا۔ عبدالرحمان اور وہ عورت دوسرے کمرے میں بند ہو گئے۔ ان کے درمیان بحث جاری تھی۔ کوشش کے باوجود میں ان کی گفتگو کا ایک لفظ نہیں سمجھ پایا۔ وہ دبے دبے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ ایک بار کسی نے دروازہ کھول کے دیکھا تو میں نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔ دروازہ بند ہوتے ہی وہ پھر جھگڑنے لگے۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیے۔

عورت عبدالرحمان کو گالیاں دے رہی تھی "کمبخت دیکھا کہ چابی نہیں ہے۔"

"چابی دے دی تو کیا ہو گیا؟"

"اسے شک ہو گیا ہے' اسی لیے وہ باہر سونا چاہتا تھا۔"

"میں نے کہا نا کہ تو فکر مت کر۔ وہ رات کو بھاگ کر کہیں جانے والا نہیں ہے۔"

"چلا گیا پھر؟ تو کہاں سے ڈھونڈ کے لائے گا۔ ابھی سراج سے بات کر لیتا۔"

"جلدی میں کام خراب ہو جاتا ہے پاگل۔ تیرے ایک ہزار کے لیے یہ بندہ تو ٹیکسی خریدنے کی بات کر رہا تھا۔"

لاحول ولا قوۃ۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور اور ایک جسم فروش عورت صرف پیسے کے لیے پریشان ہیں۔ میں نے اطمینان سے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا۔ عورت کو فکر ہے کہ میں ان کے بیدار ہونے سے پہلے ہی ہزار روپے لے کر نہ چلا جاؤں۔ اچھا ہوتا اگر میں دونوں کے منہ پر پانچ پانچ سو پہلے ہی مار دیتا۔ سکون کی نیند سوتے دونوں۔

لیکن میرا اخذ کردہ نتیجہ غلط تھا۔ اس کا اندازہ مجھے صبح ہوا۔ چار پانچ گھنٹے کی نیند کے بعد میں جاگا تو دن کا اجالا صحن میں بہت پہلے پھیل چکا تھا۔ میری آنکھ عورت کی کھٹ پٹ سے کھلی تھی۔ وہ باورچی خانے میں چائے بنا رہی تھی۔ وہ ہاتھ منہ دھو چکی تھی اور میک اپ کے بغیر عام قسم کی عورت نظر آئی تھی۔

شکست اور فولادی عزم رکھنے والے دہشت گردوں کے ...ب بھی جواب دینے لگتے ہیں اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ...کہ دولت اور طاقت کے کھیل کی سنسنی خیزی میں بھی اب لطف ...نہیں آتا؟ وہ دوسروں کی پرسکون اور خوشیوں سے معمور ...ی کی طرف دیکھنے لگتے ہیں اور بعض اوقات اس احساس کی ...ت ان کی اپنی زندگی کا رخ بدل دیتی ہے۔

شاید ایسا ہی خاموش انقلاب پیڈرو کی سوچ میں آیا تھا۔ وہ ہم ...بھرپور تعاون کر رہا تھا۔ اس نے مقابلہ کرنے یا فرار ہونے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اس امید میں کہ ہم اسے وعدہ معاف ...گواہ کی حیثیت دے کر اس کی جان بخشی کے وعدے پر قائم رہیں ...ے' وہ ہمیں بہت کچھ بتا چکا تھا جو ہم پہلے نہیں جانتے تھے لیکن ...کچھ ابھی باقی تھا۔ وہ سمجھتا کہ اس نے سب بتا دیا تو اس کے ...اپنے تحفظ کی کوئی ضمانت باقی نہیں رہے گی۔ سوائے ہمارے ...ے کے۔ دشمن کے وعدے کا کیا اعتبار جب دوست بھی وعدہ ...کے مکر جاتے ہیں۔

پیڈرو کے بیان نے کسی حد تک صورت حال کو بدل دیا تھا۔ ...نے ثابت کر دیا تھا کہ وزیر خان کو قتل کرنے والا وہ نہیں تھا۔ ...نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ اس نے تو آج تک کسی کو بھی قتل ...ہیں کیا۔ اس کے بیان کی صداقت پر آنکھ بند کر کے یقین کرنے ...کوئی نہیں تھا۔ اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ وزیر خان کا قاتل وہ نہیں ...پھر اس کے اور میرے درمیان ذاتی عداوت کا خونی رشتہ کمزور ...ہو جاتا تھا۔ پھر اسے اپنے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچانے کی قسم بھی ...ڑی جا سکتی تھی۔ اس کے دیگر جرائم کی سزا باقی رہتی تھی۔ دنیا ...ں اور آخرت میں مکافات عمل کے قانون کو بدلنا کسی کے اختیار ...میں نہیں تھا۔

چائے ختم کر کے میں نے پیڈرو کو جگایا۔ وہ جمائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ ایک بار پھر اس نے گرد و پیش کو حیرانی سے اور غور سے دیکھا۔

میں نے کہا "ہم صرف رات گزارنے کے لیے یہاں آئے تھے۔"

"یہ کوئی شریفانہ جگہ تو نہیں ہے۔"

میں نے طنز سے کہا "تم بھی شریفانہ اور غیر شریفانہ ماحول کے ...کے قائل ہو۔"

"وہ عورت۔۔ اسے جانتے ہو تم۔۔۔ یا پہلی بار۔۔۔"

میں نے کہا "بکواس مت کرو۔"

"میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تم ایسے آدمی نہیں ہو۔"

"ہاں۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں ...یہاں ایسی عورت سے پالا پڑے گا ورنہ میں کبھی نہ آتا۔ اب ...ار ہو جاؤ۔ ہمیں آگے جانا ہے" میں نے کہا "صرف مجھے اور تم کو۔"

میں نے تالے میں چابی لگائی تو وہ چونکی اور مجھے دیکھ کے مسکرانے لگی "تم نے اپنے دوست کو تالا ڈال کے کمرے میں کیوں بند کر دیا تھا۔"

میں نے کہا "اس لیے کہ وہ میرا دوست نہیں' دشمن ہے۔"

"عبدالرحمان کو تم نے کچھ اور بتایا تھا۔"

"عبدالرحمان نے بھی مجھے کچھ اور بتایا تھا" میں نے کہا۔

وہ کھسیا کے خاموش ہو گئی "چائے پیو گے؟"

"ہاں۔ عبدالرحمان کہاں ہے؟" میں نے جیب سے ہزار روپے نکالتے ہوئے کہا "یہ پانچ سو تم رکھ لو' پانچ سو اسے دے دینا۔"

"وہ لیٹرین میں ہے۔ کیا تم جا رہے ہو؟" وہ متفکر ہو گئی۔

"ابھی نہیں۔ یہ تمہارے دل کی تسلی کے لیے ہیں" میں نے کہا "تمہیں بہت پریشانی تھی کہ میں بھاگ نہ جاؤں۔"

اس کا رنگ اڑ گیا "کیا تم ہماری باتیں سن رہے تھے؟"

"تمہارے درمیان آخر کیا جھگڑا ہو رہا تھا؟ میرے لیے باہر سونا مشکل ہو گیا تھا" میں نے کہا اور اندر جا کے بیٹھ گیا۔ پیڈرو ابھی تک سو رہا تھا۔

وہ میرے لیے چائے کا کپ لے کر آئی تو میں نے سوچا کہ اب پیڈرو کو بھی جگا دینا چاہیے۔ صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ہوٹل میں رابعہ' غالب اور نازو رات بھر چین کی نیند نہیں سوئے ہوں گے۔ انہیں میری طرف سے پریشانی لاحق ہو گی اور صبح سے ہی وہ میری فون کال کے انتظار میں ہوں گے۔ اب تو شاید نازو اکیلی ہو گی۔ میری ہدایات کے مطابق رابعہ اور غالب واپس لاہور چلے گئے ہوں گے۔

پیڈرو کا رویہ میرے لیے حیران کن ثابت ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ساری بدمعاشی بھول گیا ہے۔ اس کی وہ اکڑفوں اور خونخواری بھی باقی نہیں رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اب وہ استاد پیڈرو نہیں [illegible] بن گیا تھا۔ اس کے کاروبار کی نوعیت بھی وہ نہیں رہی تھی تو اس نے ضرورت کے پیش نظر اپنا رویہ' اپنی عادات اور مزاج بھی بدل دیے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پیڈرو کی عمر کو پہنچ کے آدمی کی فطرت نہیں بدلتی۔ چوہدری دلاور کی طرح اسے بھی اپنے بدنام ماضی سے دامن چھڑانے کی مجبوری لاحق تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو بھی چھوڑ دیا تھا لیکن ان کے پرانے دشمن یعنی ہم بدستور ان کی زندگی کا آسیب بنے ہوئے تھے۔

پیڈرو اب زندہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ دوسری زندگی مختلف انداز میں جینے کا خواہش مند تھا جس میں احساس جرم' پکڑے جانے کا ڈر' ہر گام پر تعاقب کرتی ہوئی موت کا خوف اور ہر سمت میں موجود لیکن نظر نہ آنے والے دشمنوں کا اندیشہ نہ ہو۔ ایک وقت آتا ہے جب بڑے بڑے خود کو قانون کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور

www.paksociety.com

"یہاں ناشتا ملے گا لیکن پہلے میں لیٹرین جاؤں گا۔"

"پیڈرو۔ ابھی تک تمہارا جیسا رویہ تھا۔ آگے بھی رہا تو رہے گا تو تم زندہ رہو گے۔ یہ مت سمجھنا کہ کوئی جگہ ایسی ہوگی یا کوئی لمحہ ایسا آئے گا جب تم موقع سے فائدہ اٹھا سکو۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "زبان سے تو کہہ دیا۔ ویسے تمہاری مرضی ہے۔ لکھے ہوئے پر بھی اعتبار کرو۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "موت ہمیشہ تم سے بس ایک ہاتھ دور تمہارے ساتھ ہوگی۔ محاورے کے مطابق یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے کہ ایک وار میں تمہارے جسم و جان کا رشتہ منقطع کر دوں۔ بہت مضبوط نظر آنے کے باوجود یہ رشتہ بہت نازک ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگ شمشیر آبدار سے گردن کو بھٹے کی طرح اڑا دیتے تھے۔ اب یہ کام خالی ہاتھ سے بھی کیا جا سکتا ہے اور کمال یہ ہے کہ الگ ہو جانے کے باوجود گردن الگ نظر نہیں آتی۔"

پیڈرو میری بات سننے اور برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ اس کے لیے کوئی بات نئی نہیں تھی مگر میں یہ ضروری سمجھتا تھا کہ ابھی بھی اس کو دہشت زدہ کیا جائے تاکہ اس کا حوصلہ پست رہے اور وہ ذہنی طور پر بھی خود کو مغلوب اور شکست خوردہ محسوس کرے۔

اس نے کہا "یہ باہر سے کنڈی کیوں لگائی ہے؟"

"رات کو میں برآمدے میں سویا تھا" میں نے کہا "تمہیں کھلا چھوڑ دیتا؟"

"میں اس وقت کی بات کر رہا ہوں۔" پیڈرو بولا "میرے ساتھ تم بھی اندر بند ہو۔"

اپنے پیچھے میں نے دروازہ بند ہوتے محسوس کیا تھا اور پلٹ کے دیکھا بھی تھا کیونکہ برآمدے کی طرف سے آنے والی روشنی کچھ کم ہو گئی تھی۔ مجھے کوئی بھی نظر نہیں آیا تو میں نے سمجھا تھا کہ دروازہ ہوا کے جھونکے سے خود ہی بند ہو گیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس میں لوہے کی آدھا انچ موٹی سلاخیں تھیں جو تین انچ کے فاصلے سے لگی ہوئی تھیں۔ اس میں سے بھی روشنی کا گزر تھا اور اندر ٹیوب لائٹ روشن تھی۔

میں نے کھڑکی کے قریب جا کے دیکھا۔ عبدالرحمان برآمدے میں بڑی بہادری سے کھڑا یوں مسکرا رہا تھا جیسے عیار شکاری شیر کو دھوکے سے پنجرے میں بند کر دینے کے بعد مسکراتا ہے۔ اس کی صورت سے کمینگی اور خباثت برس رہی تھی۔ اس کی ہم نوا ملیحہ غالباً دوسرے کمرے میں روپوش تھی۔

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا "دروازے کو تالا کیوں لگایا ہے؟"

اس نے کہا "رات کو تم نے بھی لگایا تھا۔"

"کھولو اس بند کرو۔ آخر کیا مقصد ہے اس حرکت کا۔" میں نے برہمی سے کہا۔

وہ بولا "رات کو تمہیں ڈر تھا کہ یہ بندہ بھاگ جائے۔ اب مجھے ڈر ہے کہ تم نہ بھاگ جاؤ۔"

"کیا مطلب؟ تم مجھے قید میں رکھو گے؟"

"ہاں۔ جب تک پولیس نہیں آ جاتی" وہ بولا۔

"تم نے پولیس کو بلایا ہے؟"

"پولیس خود آئے گی۔ میں تم کو ان کے حوالے کروں گا۔"

"لیکن کیوں۔۔۔ آخر پولیس خود کیوں آئے گی؟" میں نے پیڈرو کی طرف دیکھا تو مجھے زیادہ غصہ آیا "کیا جرم کیا ہے میں نے؟"

"یہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ میں تو رات کو ہی سمجھ گیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے" پولیس خود معلوم کرے گی اصل بات۔" وہ بولا "رات کو جو ایسے ایسی آئی سراج تھا۔ اس کو بھی شک ہو گیا تھا۔"

میں نے محسوس کیا کہ شور مچانے یا چیخنے چلانے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اگر واقعی معاملہ پولیس کے ہاتھ میں چلا گیا اور انہوں نے شک کے بغیر ہی پوچھ گچھ شروع کر دی تو آفت کھڑی ہو جائے گی۔

"تم نے کہا تھا کہ وہ بھائی ہے تمہارا" میں نے حقارت سے کہا "وہ خود مجرم ہے۔ اس کے ساتھ مل کے تم یہاں بے حیائی کا دھندا کر رہے ہو۔ شرفا کے رہائشی علاقے میں۔ جس عورت کو تم نے اپنی بیوی بتایا تھا وہ ایک جسم فروش فاحشہ اور طوائف ہے۔"

اس نے کسی تلملاہٹ کی طرح کہا "طوائف کہہ دیا تو پھر جسم فروش اور فاحشہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ تم اس عورت کے شوہر نہیں دلال ہو۔ یہاں لوگ تمہیں میاں بیوی اور شریف سمجھتے ہوں گے جب انہیں تمہاری اصلیت کا پتا چلے گا۔"

"کیسے پتا چلے گا؟ ابھی تک تو کسی کو پتا نہیں۔ دو سال ہو گئے ہیں یہاں رہتے اور پتا چل گیا تو ہمارا کیا بگڑے گا؟ ہم مکان بدل لیں گے۔"

"کیا تمہیں نہیں پتا کہ وہ غیر قانونی کام ہے؟"

"کون سا کام؟" وہ ڈھٹائی سے بولا "عبدالرحمان بے وقوف نہیں ہے۔ پکا نکاح نامہ بنوا رکھا ہے میں نے۔ رپورٹ تم لکھواؤ گے؟ ثبوت اور گواہ تم لاؤ گے۔ سراج کے علاوہ بھی اپنے بہت سے لوگوں سے تعلقات ہیں۔ ایک ڈی ایس پی صاحب بھی آتے ہیں کبھی کبھی۔"

میں پریشانی میں مبتلا ہونے لگا تھا۔ یہ شامت اعمال تھی جو مجھے گھیر کر یہاں لے آئی تھی ورنہ ایک رات کہیں بھی گزر جاتی۔ خطرے سے بچنے کے لیے میں اوٹ پٹانگ نہیں گیا تھا۔ یہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے کی بہترین مثال تھی۔

پیڈرو اس صورت حال سے خوش نظر آتا تھا۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ اندر میرے ساتھ ہوتے ہوئے وہ عبدالرحمان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار بھی نہیں کر سکتا اور اس نے زبان سے!

شاید یہ عبدالرحمان کی حوصلہ افزائی کی تو نقصان اسے ہوگا۔ بھی پچھ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کیا ہوگا۔ پیڈرو کے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ خاموش رہے۔ اگر وہ خبیث ٹیکسی ڈرائیور سچ مچ مجھے پولیس کے حوالے کرتا ہے تو پیڈرو کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ کہے گا کہ اچھا ہوا بھی، شکند ر خدا حافظ۔ ہمارا تمہارا اتنا ہی ساتھ تھا۔ افسوس ہے کہ تمہاری یہ دوسری کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ تم نہ وہ اور کچھ بگاڑ سکے اور نہ میرا۔ تم اپنی خوش بختی پر بہت غرور کرتے تھے۔ اب بدبختی کا زمانہ ہے۔ پہلے تم بال بال بچ جاتے تھے۔ اب تمہارا بال بال قانون کے شکنجے میں ہے اور تمہارے پرانے دشمنوں کو بھی اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم سے نمٹنے کے لیے وزیر بنگلات ہی کافی ہے اور اس کے ساتھ تمہارے تعلقات کی نوعیت میں بتا سکتا ہوں۔

اگر کسی سبب سے بازی پلٹ جاتی اور میں آزاد ہو جاتا تو پیڈرو پر کوئی الزام نہ ہوتا کہ اس نے صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اسے پہلے سے اپنے کیے کرائے پر پانی پھیرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں اس کی نیک نیتی پر اعتبار کرنے والا نہیں تھا مگر ابھی تک اس کے ظاہری رویے سے میرے لیے پریشانی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ یہ ثابت کر چکا تھا کہ وہ مجھ سے خوف زدہ ہے۔

اس وقت بھی جب میں عبدالرحمان کی نیت کو سمجھنے اور اس مشکل سے نکلنے کی الجھن میں گرفتار تھا پیڈرو نے آہستہ سے کہا "اس سے پوچھو کہ یہ کیا چاہتا ہے؟"

میں نے چونک کے اس کی طرف دیکھا اور سر ہلایا "عبدالرحمان۔ تمہاری یہ بدمعاشی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔"

"سستی تو بھائی کی موت بھی نہیں ہوتی" وہ بولا۔

"ہم اگر چاہیں تو یہ دروازہ توڑ کے بھی باہر آ جائیں گے۔ تم کیا کرو گے؟ شور مچاؤ گے؟ جتنا محلے والے ماریں گے اس سے زیادہ ہم تمہیں ماریں گے۔"

"اچھا جی" وہ بولا "بڑی جان ہے تمہاری۔ دروازہ تو ایسا ہے مگر ایک منٹ ٹھہرو۔"

وہ دوسرے کمرے میں گیا اور واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ "رات کو سراج اتنا غصے میں تھا کہ یہ بھول گیا تھا۔ اس لیے میں نے کہا کہ پولیس خود آئے گی۔ ڈیوٹی پر جانے سے پہلے وہ پھر ادھر آئے گا۔ میں نے کسی پر گولی تو نہیں چلائی پہلے لیکن اس چیز کا استعمال آتا ہے مجھے۔ تم نکلو باہر دونوں کو ادھر ہی ٹھنڈا کر دوں گا۔ کہہ دوں گا میرے گھر میں بری نیت سے گھسے تھے۔ میں نے اندر بند کر دیا تھا اور پولیس کو بلایا تھا۔ انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے گولی مار دی۔"

میں نے کہا "یہ ریوالور پولیس کا ہے، بے وقوف آدمی۔"

"اس کی تمہیں کیوں فکر ہے۔ تم کو مرنا ہے تو آ جاؤ باہر۔ بعد میں سراج خود نمٹ لے گا۔"

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "آخر تم ایسا کیوں کر رہے ہو عبدالرحمان۔ کیا بگاڑا ہے ہم نے تمہارا۔ تم نے ہماری مدد کی اور ہم نے تمہیں اس کی منہ مانگی قیمت ادا کر دی۔ کیا فائدہ ہوگا تمہیں۔"

"فائدہ تمہیں دیکھنا چاہیے۔ نقصان بھی تمہارا ہو سکتا ہے میرا نہیں۔ میں تو ایک غریب ڈرائیور ہوں جس کی ٹیکسی بھی اپنی نہیں۔ یہ ٹیکسی بھی سراج کی ہے اور وہ دوسری بھی۔" اس نے بے غیرتی سے دانت نکالتے ہوئے ساتھ والے کمرے کی طرف اشارہ کیا "مجھے تو دونوں کے لیے سواریاں لانے سے کمائی ہوتی ہے تھوڑی بہت۔"

میں نے کہا "اب تم زیادہ کمائی کرنا چاہتے ہو؟ اپنی ٹیکسی چلا کے؟"

"بڑی جلدی سمجھ گئے۔ سیانے بندے ہو تم۔ تم نے بھی ٹیکسی خریدنے کی بات کی تھی۔ جو ٹیکسی باہر کھڑی ہے وہ میں بھی خریدنا چاہتا ہوں۔ اپنی ہوگی تو آدھی کمائی کسی کو نہیں دینی پڑے گی۔"

"اور تم یہ چاہتے ہو کہ میں وہ ٹیکسی سراج سے خرید کے تمہارے نام کر دوں؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "بس اتنی سی بات ہے۔"

پیڈرو نے کہا "کیا قیمت ہے اس کی؟"

"ہوگی تیس چالیس ہزار۔ میرے لیے سراج خاص رعایت بھی کر دے گا۔" اس نے پُرامید لہجے میں کہا۔

پیڈرو بولا "اگر اس ٹیکسی کی بات کر رہے ہو تو سودا مجھ سے کرو۔ اس کی قیمت پچیس ہزار سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ میں خود بھی یہی کام کرتا ہوں۔"

"تم ٹیکسی چلاتے ہو؟" عبدالرحمان کچھ مایوس نظر آنے لگا۔

"نہیں۔ میں پرانی گاڑیوں کی خرید و فروخت کرتا ہوں۔"

"سراج اس قیمت میں یہ گاڑی نہیں دے گا۔"

پیڈرو نے کہا "لعنت بھیجو سراج کی ٹیکسی پر۔ تمہیں اس سے اچھی گاڑی میں دلوا سکتا ہوں اس سے بھی کم قیمت میں۔ اب صاف بات کرو کہ ٹیکسی چاہیے یا پیسہ چاہیے؟"

وہ چکر میں پڑ گیا "ٹیکسی میں خود لے لوں گا۔"

"ہم پیسے نہیں دیں گے۔ اور دیں گے تو پچیس ہزار۔ منظور ہے تو بولو۔"

اس نے کچھ دیر سوچ کے کہا "اچھا نکالو پچیس ہزار۔"

میں نے کہا "تمہارا دماغ خراب ہے۔ ہم کیا جیب میں بینک والے پھرتے ہیں؟ میری جیب میں دو ڈھائی ہزار روپے ہیں۔"

"باقی تم منگوا سکتے ہو" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اس کے لیے کسی کو کامران ہوٹل جانا پڑے گا۔" مجھے معلوم تھا کہ عبدالرحمان خود اپنے پھیلائے ہوئے جال

www.paksociety.com

میں پھنس چکا ہے۔

پیڈرو بولا "تم ٹیکسی لے کر جاؤ تو ایک گھنٹے میں واپس آسکتے ہو۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "میں تم کو اس بے وقوف عورت کے سپرد کر جاؤں؟"

"تو پھر اسے بھیج دو۔ وہ تو شہر میں ہر جگہ آتی جاتی ہوگی۔ خصوصاً ہوٹلوں میں۔"

اس نے پھر انکار کردیا "یہ کام سراج کرے گا۔ تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

ہم آرام سے بیٹھ گئے۔ سلاخوں کو پکڑنے سے میری انگلیاں درد کرنے لگی تھیں اور بظاہر مذاکرات ایک ایسے نتیجہ خیز موڑ پر پہنچ گئے تھے کہ اب ہم پچیس ہزار ادا ہوجانے کے بعد ہی رہائی حاصل کرسکتے تھے۔

"اس کی اور سراج کی قسمت۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر زیرلب کہا۔

پیڈرو نے سرہلایا "میں اس کی نیت کو سمجھ گیا تھا۔"

"ہر لالچی اور بے ضمیر آدمی کو پیسے سے ہی خریدا جاتا ہے۔" پھر بھی میں نے تمہارا سودا کرادیا۔ اور دس پندرہ ہزار بھی بچالیے۔"

میں نے کہا "میں تمہارا احسان نہیں لے سکتا۔ جو رقم بچی ہے تمہاری کوشش سے وہ تم لے سکتے ہو۔ میرے لیے اس پیسے کی اتنی اہمیت نہیں۔"

باہر ایک کار آئی تو عبدالرحمان کا چہرہ کھل اٹھا "وہ آگیا تھانے دار بھی۔" پھر وہ کنڈی کھولنے چلا گیا۔

"کیا اندھیر نگری ہے۔ ایک معمولی اے ایس آئی ایسی شاندار گاڑی میں عیاشی کرتا پھرتا ہے اور کوئی سوال نہیں کرتا کہ اس تنخواہ میں یہ ٹھاٹ باٹ کیسے؟" میں نے کہا۔

پیڈرو بولا "ڈیوٹی پر وہ پیدل ہی جاتا ہوگا یا موٹر سائیکل پر۔ گاڑی ہوگی اس کی بیوی کے نام پر۔ سب ایسا ہی کرتے ہیں۔"

"یہاں ریوالور ہوگا میرا۔ رات کو ادھر ہی چھوڑ گیا تھا۔ بھول کے۔" سراج بولا۔

عبدالرحمان نے کہا "اچھا جی؟ دیکھ لو ادھر ہی جدھر چھوڑا تھا۔"

وہ ایک منٹ کے لیے کمرے میں گیا اور لوٹ آیا۔ اس کے اور عورت کے درمیان بلند آواز میں ناقابلِ اشاعت کلموں کا تبادلہ ہوا۔ پھر سراج گالیاں بکتا ہوا باہر آیا "اوئے سید می طرح بتا تو نے اٹھایا ہے ریوالور؟"

عبدالرحمان دانت نکالنے لگا "اوئی۔ میں بھی بھول گیا تھا آپ کی طرح۔"

"کیا بھول گیا تھا؟"

"یہ بتانا کہ ریوالور میں نے دیکھ لیا تھا۔ یہ لو" اس نے ریوالور جیب سے نکال کر اسے پیش کردیا۔

سراج نے اسے ایک اور گالی دی "مخول کرتا ہے۔ اوئے گم جاتا تو تو تیری اتر جاتی۔ نوکری گل ہوجاتی۔"

"رات تم بہت غصے میں تھے ورنہ ایسی غلطی نہ کرتے۔"

اب سراج کی نظر بند دروازے پر گئی "یہ کیا۔ تو نے ان کو بند کر رکھا ہے؟"

"ہاں۔ اب تم لے جاؤ ان کو اور ڈال دو حوالات میں۔"

عبدالرحمان آہستہ آہستہ کھڑکی کے قریب آیا۔ اس کی نظر پیڈرو پر جمی ہوئی تھی "یہ وہ ہے نا۔ اس کی وجہ سے میں نے بڑی مار کھائی تھی۔ پانچ ہزار روپے کے ایک مہینے بعد بڑی مشکل سے جان چھوٹی تھی۔"

پیڈرو شاید اسے پہچاننے کی کوشش کررہا تھا "میری وجہ سے؟"

عبدالرحمان چلایا "ہاں ہاں تیری وجہ سے.... تھوڑے عرصے پہلے کی بات ہے.... نہیں اب تو کافی وقت گزر گیا ہے۔"

پیڈرو نے گالی کھانے کے باوجود نرمی سے کہا "تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے پہلی بار دیکھا ہے تمہیں۔"

عبدالرحمان نے پھر اسے ایک شاندار گالی سے نوازا "لیکن میں تیری شکل کیسے بھول سکتا ہوں.... تیری وجہ سے میں ایک مہینہ بستر پر پڑا رہا۔ کل غور سے تیری شکل نہیں دیکھی تھی۔ یہ ادھر آکے میں تو حیران ہوگیا۔ غصہ تو مجھے اتنا تھا کہ تجھے قتل کردیتا لیکن میں نے کہا کہ پہلے تیری وجہ سے تھانے میں چھترول برداشت کی اب پھانسی چڑھ جاؤں؟ نہیں۔ میں نے اب حساب برابر کیا ہے۔"

"اوئے پاگل۔ یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔ پورا مہینہ اس کی چھترول ہوجائے گی لیکن اس کا فائدہ؟" سراج بولا "جب تک کر لے۔"

"وہ کرلیا ہے میں نے" عبدالرحمان بولا "یہ چالیس ہزار روپے کا مجھے۔"

پیڈرو نے احتجاج کیا "پچیس ہزار کی بات ہوئی تھی۔"

سراج کی دلچسپی ایک دم بڑھ گئی "اچھا تو سودا بھی ہوگیا۔ اوئے جو پچیس ہزار دے سکتا ہے ہم پچاس بھی نکلوا سکتے ہیں اس.... سے۔ یہ کام عبدالرحمان کا نہیں ہے۔ تو نے مجھے کیا کہا ہے؟"

"یہ کیا معاملہ ہے؟" میں نے پیڈرو سے پوچھا۔

وہ انجان بن گیا "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اچانک اسے کیا ہوگیا ہے؟"

"اچانک کچھ نہیں ہوا۔ رات کو تم پچھلی سیٹ پر لیٹے ہوئے تھے اور اس نے تمہارا چہرہ صاف نہیں دیکھا تھا۔"

سراج اور عبدالرحمان برآمدے میں ہی کھڑے ہوئے تھے ...نے کہا تھا کہ میں اس ٹیکسی سے جان چھڑانا چاہتا ہوں۔"

...رحمان بولا۔

"...جان تو میں تجھ سے چھڑانا چاہتا ہوں۔ ...تجربہ کرکے دیکھ چکے ہو۔ دوسروں نے زیادہ نقصان پہنچایا۔ ...بھی نقصان میں رہے۔ تمہاری ٹیکسی تو مٹے گا، آخر میں ...گا۔ تم تو جانتے ہو کہ جتنا وہ کمائے اس سے زیادہ تمہیں ...تمہاری تھانے داری کے ساتھ ٹیکسی کیسے چل سکتی ہے۔ ...ڈرائیور کچھ کمائے گا نہیں تو خود کیا کھائے گا اور گھر والے کیا ...کھائیں گے۔"

"...اچھا زیادہ بکواس مت کر۔ تو خرید رہا ہے ٹیکسی؟"

"ہاں۔ اللہ نے میری سن لی اور بندوبست کردیا۔ گھر بیٹھے۔"

سراج نے کہا "قیمت اس سے وصول کرے گا۔"

"...اور میرے پاس اتنی رقم کہاں ہے۔ اس نے ٹیکسی کے ...ہزار ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"ٹیکسی چالیس کی ہے۔"

"دیکھو تم اس سے چالیس وصول کرسکتے ہو تو کرلو۔ پچاس ...ہزار جتنے ہوں سب تمہارے۔ مجھے بس ٹیکسی چاہیے اور ...کا مجھے پتا ہے کہ پچیس میں آرام سے مل جاتی ہے۔ دیکھو ...تمہاری تو میری ہی ہے۔ میں ہی لایا ہوں اسے اور جب تک میں نہ ...نا کہ پہلے کا جرم کیا ہے تم اس سے کیا وصول کرو گے۔ میں ...رقم جمع کرکے دیتا تو شاید نہیں پورے پچیس بھی نہ ملتے۔ اس ...سارا بھی فائدہ ہے جتنی قیمت تھی ہے اس نے تو۔ مجھے یہ ...نا چاہیے اور کچھ نہیں۔"

بات سراج کی سمجھ میں آگئی "چل تو خوش رہ۔" اس نے ...بے تکلفی کے ساتھ عبدالرحمان کے دھپ مارا "اب مجھے بتا ...نا بات۔"

"سراج۔ تمہاری ٹیکسی چلانے سے پہلے میں بے روزگار تھا۔ ...کوئی کام آتا بھی نہیں تھا ورنہ اسے دھکے نہ کھاتا۔ صحت ایسی ...نہ تھی کہ فوج میں بھرتی ہوجاتا یا کہیں چوکیدار بن جاتا۔ میں تو ...کا نام ہاں "ترکھان موچی" کچھ نہیں بن سکتا تھا۔ بس مزدوری مل ...جاتی۔ سارا دن پتھر کوٹتا۔ کسی راج کے ساتھ محنت مشقت ...کرتا، زمین کھودتا، بوجھ اٹھاتا۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے کہ میں ...کندھے پر کدال رکھے واپس جارہا تھا۔ ادھری ایک چھپر تھا ...میرے ساتھ تین مزدور رہتے تھے۔ چھپر ایک فقیر کا تھا جو ...روپے روز کے لیتا تھا۔ میرا حلیہ بہت خراب ہورہا تھا ...تھکاوٹ سے میرا برا حال تھا۔ سارا جسم مٹی میں بھرا ہوا تھا اور ...سوچ رہا تھا کہ اب کنوئیں پر نہا کے سیدھا تندور پر جاؤں گا اور ...روٹی کھا کے سوجاؤں گا۔ کھانا کیا تھی وہی تین روٹیاں اور دال یا ...سچ پوچھو تو میں اس زندگی سے بہت عاجز تھا۔ گاؤں سے شہر آیا

تھا کمائی کرنے کے لیے۔ باپ کا گزارا ہوجاتا تھا اپنی زمین سے اور اس کی مدد کرنے والا میرا بھائی تھا۔ باپ کے بعد ہم دونوں بھائیوں کا اس سے گزارا نہ ہوتا۔ میں نے سوچا کہ چلو زمین چھوڑو بھائی کے لیے۔ وہ تھا بھی بے وقوف سا اور بس ہل چلا سکتا تھا۔"

"اوئے لمبی کہانی مت ڈال۔ ڈیوٹی پر جانا ہے مجھے۔"

"آج ذرا دیر سے چلے جانا۔" اس عورت نے بڑی ادا سے کہا "میری خاطر۔"

"تیری خاطر" سراج نے تلخ لہجے میں کہا "رات بڑی خاطریں کی تھیں تو میری۔"

"چل آج کسر پوری کرلینا" وہ بولی "معاملہ ہی ایسا آگیا تھا سراج۔"

سراج کو اس کے ناز و ادا کی اور بونس میں ملنے والی شب وصل کی رشوت نے فوراً احساسِ فرض سے بیگانہ کردیا "چل تو کہتی ہے تو یوں ہی سہی۔"

عبدالرحمان نے پھر بولنا شروع کردیا "میں سڑک پار کرنے کے لیے رکا تو ایک گاڑی میرے سامنے آکے رک گئی۔ اس بندے نے مجھ سے پوچھا کہ مزدوری کرنی ہے؟ میں نے کہا کہ آج نہیں کل۔ وہ بولا کہ ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلو تو اچھے پیسے ملیں گے۔ صرف کھدائی کرنی ہے۔ میں نے کدال تو اٹھایا ہوا تھا۔ اس سے یہ سمجھ گیا کہ میں مٹی کھود سکتا ہوں۔ اچھے پیسوں کی بات سن کے میں نے کہا کہ جناب اس وقت میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اس نے مجھے بہت سارے نوٹ دکھائے اور بولا کہ یہ پورے ہزار ہیں۔ تم تین چار گھنٹے میں کما سکتے ہو۔ مزدور بہت ہیں۔ ایک گڑھا کھودنے کے سو روپے بھی بہت ہوں گے۔ لیکن ہزار کے نوٹ دیکھ کے میں سب کچھ بھول گیا۔ تھکن بھی اور بھوک بھی۔ میں اللہ کا نام لے کر اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اندر دو بندے اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک آگے بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا پیچھے۔ گاڑی میں عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ لوجی گاڑی سیدھی اسی سڑک پر چلتی گئی اور سیدپور جا کے رکی۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ یہ بوری اٹھاؤ اور چلو۔ میں نے مجبوراً بوری اٹھائی۔ وزن زیادہ نہیں تھا مگر بدبو میرا دماغ خراب کررہی تھی جو اس بوری میں سے نکل رہی تھی۔ میں نے گاڑی والے سے پوچھا کہ آخر اس میں کیا ہے تو اس نے کہا کہ تیرے باپ کی لاش ہے۔ فضول سوال کرے گا تو اپنا نقصان کرے گا۔ ہم یہاں سے کوئی مزدور پکڑلیں گے۔ ان کا کہنا ٹھیک تھا۔ گاؤں میں مزدوروں کی کیا کمی۔ تیری کدال تو ہر کسان کے پاس ہوتا ہے۔ میرے لیے ہزار روپے ایک لاکھ سے کم نہیں تھے۔ میں چپ ہوگیا اور ان کے پیچھے چلتا گیا۔ شک مجھے پہلے بھی تھا۔ اب پکا یقین ہوگیا تھا کہ لاش کے سوا بوری میں کچھ نہیں ہوسکتا۔"

سراج نے جو اب جرم کی ایک واردات کا حوالہ بڑی دلچسپی اور توجہ سے سن رہا تھا پوچھا "بوری میں سے خون شون نہیں نکل

www.paksociety.com

رہا تھا۔ لاش کتنی پرانی تھی؟"
"ادھی لاش کی بس ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ لاش ہوتی تو میں ایسے آرام سے نہیں اٹھا سکتا تھا۔"
"صرف ہڈیاں؟"
"نری ہڈیاں جناب۔ ایسا لگتا تھا کہ کہیں سے کئی ہفتے یا مہینے پرانی لاش نکالی گئی تھی اور ہڈیوں کو الگ کر کے بوری میں ڈال دیا گیا تھا۔ ہڈیاں میری پیٹھ پر لگ رہی تھیں اور ان کے آپس میں ٹکرانے کی عجیب آواز آتی تھی۔ میرا تو برا حال ہو گیا تھا۔ ڈر سے میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ مُردے کی روح میرے کندھوں پر سوار ہے۔ ادھر ایک ہزار کا لالچ تھا اور وہ تینوں بندے بھی خطرناک لگتے تھے۔ میں لالچ میں ایسا پھنسا تھا کہ ان کے آگے انکار کرنے کے قابل نہیں رہا تھا ورنہ بوری وہیں پھینک کے بھاگ جاتا کہ ہزار روپے کی خاطر میں تمہارے گناہ میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اور گناہ کیا تھا۔ یہ تو جرم تھا۔ ان کے ساتھ میں بھی پکڑا جاتا۔"
"اب پکڑا جائے گا" سراج نے بڑے یقین سے کہا۔
"مذاق مت کر یار۔ اپنا سمجھ کے میں سب بتا رہا ہوں تمہیں۔ اتنی پرانی بات بھی ہو گئی ہے کہ اب گڑے مُردے اکھاڑنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ پتا نہیں کون تھا وہ جس کی ہڈیاں تھیں۔ اس کے دونوں ساتھی آگے پیچھے چل رہے تھے اور سب سے آگے یہ تھا" عبدالرحمان نے پیڈرو کی طرف اشارہ کیا "ان سب کے پاس ریوالور تھے۔"
"تجھے کیسے معلوم ہوا؟"
"انہوں نے باری باری نکال کے دکھائے تھے۔ دراصل مجھے دکھائے تھے ڈرانے کے لیے۔ تم نے سیدپور دیکھا ہے؟"
"سیدپور کس نے نہیں دیکھا؟" سراج بولا۔
"جب پہاڑی کے اوپر جانے والے راستے پر جاتے ہیں تو ایک لکڑی کا پل سا آتا ہے۔ ادھر حمام بنے ہوئے ہیں۔ عورتوں کے اور مردوں کے نہانے کی جگہ ہے۔ سیڑھیوں والے حوض ہیں جو ہندوؤں نے بنوائے تھے۔ ان میں اوپر پہاڑی چشمے سے پانی آتا تھا اور دوسری طرف سے نکل جاتا تھا۔ سنا ہے پہلے اوپر کوئی مندر بھی تھا۔ عورتیں اب بھی سیڑھیوں پر بیٹھ کے کپڑے دھوتی ہیں اور بچوں کو نہلاتی ہیں۔"
سراج بولا "خود نہیں نہاتیں؟"
"نہیں۔ ادھر عام راستہ بن گیا ہے۔ ہندو ہوں گے تو شاید یہ جگہ الگ ہو گی۔ اب اوپر سے صاف نظر آتا ہے۔ پردہ نہیں رہتا۔ خیر جی ہم بھی ادھر سے گزرے اور سیدھے چلتے ہوئے پہاڑی کی طرف نکل گئے۔ میں اتنا تھک گیا تھا کہ ایک جگہ گر گیا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ چل تھوڑی دیر آرام کر لے۔ ادھر پہاڑ کے اوپر سے آنے والے چشمے کی ایک دھار گرتی ہے۔ چند وہ میں منٹ کی بلندی سے۔ نیچے پتھروں کے درمیان ہو جاتا ہے۔ ہم سب نے ادھر غسل کیا۔ ایک ساتھ تھی پھر بھی مجھے شرم آئی۔"
"اچھا۔ اس زمانے میں شرم آتی تھی تجھے؟"
"اب تیرے جیسا بے شرم دوسرا کوئی نہیں۔"
"کیوں۔ تو مجھ سے کم ہے کیا؟ روز خصم کون"
عبدالرحمان گرم ہو گیا۔ اس نے نوسو چوہے کھانے والی کے حوالے سے اس عورت کے بارے میں جو بات کی وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔
سراج نے ان دونوں کو گالی دے کے خاموش کیا "اپنی کر۔ اور تو بھی چپ کر۔"
سراج نے پایا اس کی نام نہاد بیوی نے تھکی
"اتنا کے میرے جسم میں تھوڑی سی جان آ گئی۔ پھر انہوں نے کھانا دیا اور چائے دی۔ ایک بندے نے جو بیگ لٹکا رکھا تھا اسی میں تھا۔ انہوں نے بعد میں شراب کی بوتل نکال کے خود تھوڑی پی اور مجھ سے بھی پوچھا مگر میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ سمجھ میں اچھی طرح آ گئی تھی کہ یہ کیسے لوگ ہیں۔ میں نے کہا کہ عبدالرحمان آج تیری خیر نہیں۔ یہ ایک ہزار دینے والے نہیں ہیں۔ یہ تجھے ایک گولی ماریں گے اور چلے جائیں گے۔ تیری لاش ادھر رات بھر پڑی رہے گی۔ کل دن بھر چیل کوے گدھ کھائیں گے۔ رات کو گیدڑ۔ ہزار کا مجھے خیال بھی نہ تھا۔ بس یہ فکر تھی کہ کسی طرح جان بچ جائے۔ خیر جی ایک گھپ اندھیرے میں آ گئے اور اوپر۔ وہاں ایک جگہ رکے۔ انہوں نے مجھے گڑھا کھودنے کا حکم دیا اور خود ایک طرف بیٹھ گئے۔ اللہ ہی جانتا ہے اس وقت میری حالت کیا تھی۔ اندھیرا گھپ تھا اور وہ جگہ ویران تھی۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ درختوں سے گزرتی تو رونے کی آواز آتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ چاروں طرف بدروحیں جمع ہو گئی ہیں۔ گڑھا کھودتے ہوئے میرے ہاتھ پاؤں بس میں نہیں تھے۔ میں نے سوچا کہ پتا نہیں بوری میں کس کی ہڈیاں ہیں۔ وہ کون تھا۔ اس کا گھر کہاں تھا۔ بیوی بچے، ماں باپ بھائی سب اس کو رو دھو کے صبر سے بیٹھ گئے ہوں گے۔ اب انہیں پتا چلے کہ قبر سے لاش بھی غائب ہو گئی ہے تو کتنا دکھ ہو گا۔ میں نے سوچا کہ انہیں شاید پتا ہی نہیں چلے گا کہ اندر سے قبر خالی ہے۔ اس وقت میں نے پوسٹ مارٹم کا لفظ سنا بھی نہیں تھا۔ میں یہ سمجھ سکتا تھا کہ کسی قبر سے ہڈیاں نکال کے دوسری جگہ گاڑنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ یہ لوگ کوئی کے گھر یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں گڑھا کھودنے کے بعد مجھے بھی مار کے اسی میں دفن نہ کر دیں۔ زمین بہت سخت اور پتھریلی تھی۔ صبح ہو گئی اور جب انہوں نے کہا کہ بس اتنا کافی ہے تو میں گر کے لیٹ گیا۔ مجھ میں اٹھنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ انہوں نے ڈالی کے خود ہی مٹی برابر کی۔ اصل کام تھا گڑھا کھودنا۔ زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ پھر بھی یہ ایک دوسرے کو سمجھے کہ کسی جان دار بندے کو نہیں لائے اور ایک نہ جانے تو کام جلدی ہو جاتا۔ یہ بندہ جو اندر بیٹھا ہے کہا کہ چلو جو ہوا ٹھیک ہوا۔ یہ آدمی بے ضرر لگتا ہے۔ بہت مسکین اور بے وقوف نظر آتا ہے۔ ایک کہتا تھا کہ بات چھوڑو مار کے ادھر ہی چھوڑ جاؤ۔ باقی دو کی وجہ سے بچ گیا۔ انہوں نے کہا کہ اسے کچھ پیسے اور دیں گے اور یہ مسکین دیہاتی ہے تو یہ خاموش رہے گا۔ وہ بحث کر رہے تھے اور میں خاموش پڑا سن رہا تھا۔ آرام کرنے کے بعد میں نے ہمت کی۔ "اب جو کام ہو گیا" میں نے کہا کہ جناب مشین بھی خراب ہو جاتی ہے۔ انسان ہوں۔ کام ہو گیا تو انہوں نے مجھے ایک کے بجائے دو دیے اور کہا کہ جو کچھ میں نے دیکھا یا سنا ہے وہ بھول جاؤں۔ میں اور اس کام کے بارے میں کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا کہ جناب میں پاگل نہیں ہوں۔ سب میں پکڑا جاؤں گا اگر میں نے کسی سے بات کی۔ واپسی میں بڑے نے کپڑے بدلے۔ تم تو جانتے ہو ادھر ایک لڑکا ہے سیدپور میں کے کھلونے بناتا ہے۔ اس نے مٹی کی ایک ریل گاڑی بنا کے کمرے میں رکھی ہوئی ہے۔ ان کو وہ چابی دے کے چلاتا ہے۔ آنے والے خوش ہو کے اس کی کوئی چیز خرید لیتے ہیں تو انعام بھی دیتے ہیں۔ ہم نے اس سے کھلونے لیے اور وہاں تماشا بھی کیا۔ لسی گھی کے پراٹھے اور تکے۔ ساری رات محنت کرنے کے بعد میرا بھوک سے دم نکل رہا تھا۔ اس وقت جو مزہ آیا تھا وہ پھر نہیں ملا۔ پھر آگے انہوں نے کہا اب تم ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے۔ ان کی گاڑی چلی گئی اور مجھے بڑی مشکل پیش آئی۔ نہ ادھر سے کوئی تانگہ تھا اور نہ بس تھی۔ میں پیدل ہی چل پڑا۔ ادھر ہوا تیز تھی۔ تھکن سے پہلے ہی میرے لیے چلنا مشکل ہو گیا۔ رات بھر سونا نصیب نہیں ہوا تھا۔ پھر اتنی سخت محنت کی اور پیدل چلنا پڑا۔ میں ادھر ہی سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے پڑ کے سو گیا۔ دو ہزار میں نے شلوار کے نیفے میں رکھے تھے۔ میں ایسا سویا جیسے مُردے سوتے ہیں۔ چار پانچ گھنٹے بعد مجھے پولیس والوں نے لات مار کے جگایا۔ وہ گشت پر تھے۔ میں ان کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے الٹے سیدھے سوال کیے کہ کون ہے تو؟ کیا کرتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ مجھے آوارہ گرد اور چور کہا۔ دو ہزار پاس ہونے کی وجہ سے میں ڈرا ہوا تھا۔ میں نے قسمیں کھائیں کہ مزدور ہوں اور تب ایک پولیس والے نے کہا کہ مزدور ایسے بھی کسی سڑک پر سوتے ہیں؟ یہ مزدوری کا وقت ہے۔ چل تلاشی دے اپنی۔ تلاشی کے نام پر میں بدک گیا تو ان کا شک بڑھ گیا۔ انہوں نے میرے دو ہزار نکال لیے اور پھر مجھے بہت مارا کہ یہ نئے نوٹ کہاں سے آئے تیرے پاس۔ میں نے ان کو کچھ نہیں بتایا اور یہی کہتا رہا کہ میں نے مزدوری کر کے بچائے تھے۔ وہ مجھے تھانے لے گئے اور حوالات میں بند کر دیا۔ ادھر ہر رات وہ میری چھترول کرتے تھے۔ ان کا پکا خیال تھا کہ میں چور ہوں۔ وہ مجھ سے پوچھتے تھے کہ اس علاقے میں کہاں کہاں چوری کی۔ کیا مال تھا۔ وہ مال کہاں گیا۔ وہ میرے ٹھکانے سے باقی لوگوں کو بھی اٹھا لائے۔ جس فقیر کا چھپر تھا وہ بھی پکڑا گیا۔ ہم سب لاوارث لوگ تھے مطلب یہ کہ شہر میں کوئی ہماری ضمانت دینے والا نہیں تھا۔ پولیس نے فرض کر لیا کہ ہم چوروں کا گروہ ہیں۔ اس زمانے میں اچانک چوری کی وارداتیں بھی بہت بڑھ گئی تھیں اور اخباروں میں بہت شور تھا کہ پولیس کچھ نہیں کرتی۔ اصل چور ہاتھ کہاں آتے ہیں۔ وہ تو خود پولیس سے ملے ہوتے ہیں۔"
"او ئے عبدالرحمان۔ سوچ سمجھ کے بولا کر" سراج گرم ہو گیا۔
"ادھی تمہاری بات کون کر رہا ہے" عبدالرحمان خوشامدانہ لہجے میں بولا "تم ہو تھانے دار۔ افسر لوگوں کا چوری سے کیا واسطہ۔"
شاید دل ہی دل میں اس نے کہا ہو کہ اوپر والوں کا معاملہ ہوتا ہے ڈاکوؤں سے اور اسمگلروں سے۔ دس نمبریوں سے اور جگا ٹیکس لینے والوں سے۔ بڑے افسر کا واسطہ بڑے دھندے سے ہے۔ چوروں، جیب کتروں، ٹھگوں اور آوارہ گردوں سے، پیدل فرشوں سے نیچے والوں کا واسطہ ہوتا ہے۔
"جب پولیس والے مار مار کے تھک گئے اور ہم تفتیش فرمان میں سے ایک نے جان دے دی لیکن کسی چوری کا اعتراف نہیں کیا اور نہ چوری کے مال کی نشاندہی کی تو انہیں ہم سب کو چھوڑنا پڑا۔"
"تو نے بتا دیا ہو گا جو تیرے ساتھ ہوا تھا؟"
عبدالرحمان بولا "کیسے بتا دیتا باپ۔"
"دیکھ عبدالرحمان۔ تو میرا گرائیں ہے اور میرے تیرے درمیان دوسرے معاملات بھی ہیں۔ لیکن یاری نہیں ہے۔ کوئی۔"
عبدالرحمان سمجھ گیا "نہیں جی ایسے ہی منہ سے نکل گیا۔ میں پولیس کو سچ سچ بتا دیتا تو مارا جاتا۔ وہ کہاں مانتے میری بات اور الٹا مجھ پر ہی قتل کا کیس بنا دیتے۔ یہ پوچھتے کہ لاش کس کی ہے۔ تو نے کیوں دفن کی یہاں لا کے۔ میں اصل لوگوں کے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں تھا۔ میں نے تو ان کی گاڑی کا نمبر بھی نہیں دیکھا تھا۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ گاڑی کا نیا رنگ تھا۔ اور اگر پولیس لاش برآمد کر لیتی تو خبر چھپ جاتی اور پھر ان کو بھی پتا چل جاتا۔ بعد میں وہ آ جاتے میری زبان بند کرنے کے لیے۔ اس بات کو میں نے بھولے

www.paksociety.com

سے بھی نہیں چھوڑا۔ اسی لیے بچ گیا اور دیکھو قدرت کے کھیل۔ جتنی مصیبت میں نے اٹھائی۔ اللہ توبہ! آج اس کا بدلہ لینے کے لیے قسمت نے کیسی الٹی چال چلی ہے۔ وہ بندہ خود میرے قبضے میں آگیا جس کی وجہ سے میں مرتے مرتے بچا تھا۔ مجھے بھی یقین تھا کہ اس شہر میں ہوگا تو کبھی سامنے ضرور آئے گا۔"

عبدالرحمان کی باتوں نے جہاں پیڈرو کے ہوش گم کردیے تھے وہیں میرے لیے خیالات اور امکانات کے بہت سے دریچے وا کردیے تھے۔ عبدالرحمان ایک سیدھا سادہ دیہاتی انسان کا بیٹا اور ان پڑھ محنت کش آج جو کچھ تھا ایک حادثے کے سبب تھا۔ گیدڑ کے بارے میں مشہور ہے کہ شامت اسے شہر لے آتی ہے۔ یہی عبدالرحمان کے ساتھ ہوا تھا۔ استاد پیڈرو کی نگاہ اس مزدور پر نہ گئی ہوتی جو سڑک کے ایک کنارے پر کدال اٹھائے تھکا ہارا گھر لوٹ رہا تھا تو عبدالرحمان کی کہانی میں کوئی سنسنی خیز ڈرامائی موڑ نہ آتا۔ دو ہزار کمانے کے گنوانے کے بعد اس کو جرم بے گناہی کی جو سزا ملی تھی اس نے عبدالرحمان کی زندگی کا رخ بدل دیا تھا۔ بعد میں پولیس نے اسے مخبر بنالیا اور بدلے میں اس کو شہر میں رہ کے پیسہ کمانے کے ایسے طریقے سکھا دیے جن میں محنت کیے بغیر پیسہ کمایا جاسکتا تھا۔ آج وہ سراج کی ٹیکسی چلا رہا تھا اور ایک عورت کے لیے گاہک لاتا تھا۔ ظاہر ہے اس کی کمائی میں بھی وہ سراج کے ساتھ حصے دار ہوگا۔ وہ عورت کون تھی؟ کیسے ان بے غیرت لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ یہ بھی کوئی کہانی ہوگی مگر مجھے اس سے دلچسپی نہیں تھی۔ ایسی کہانیاں عام ہیں اور ہر دور کے ہر معاشرے میں ملتی ہیں۔ یہ اتفاق تھا یا نوشتہ تقدیر جس نے مجھے، عبدالرحمان کو اور استاد پیڈرو کو ایک ہی چھت کے نیچے جمع کردیا تھا۔

اتنے عرصے بعد عبدالرحمان کو موقع ملا تھا کہ وہ استاد پیڈرو کے ساتھ پرانا حساب برابر کرے۔ ابھی تک وہ پیڈرو کو بھی میرا ساتھی سمجھ رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ہم پھر کوئی واردات کرنے یہاں آئے ہیں۔ اچانک میں بری الذمہ ہوگیا تھا اور اب اپنی جان بچانے کی قیمت خود پیڈرو کو ادا کرنی تھی۔ اس کا مجھ پر کوئی احسان نہیں رہا تھا کہ میرے اور عبدالرحمان کے بیچ میں پڑ کے اس نے سستا سودا کرادیا تھا۔ اب یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا کہ استاد پیڈرو دھوکا دے سکے اور گمراہ کرسکے یا کہے کہ مجھے اصل جگہ یاد نہیں۔ عبدالرحمان بھی اس جگہ کی نشاندہی کرنے میں مدد کرسکتا تھا۔

سراج نے کہا "پھر اب کیا صلاح ہے تیری۔ اس بندے کو ادھر لے جائیں اور لاش برآمد کرلیں۔ تجھے جگہ تو معلوم ہے نا؟"

"جگہ تو معلوم ہے لیکن اب اس گڑے مردے کو اکھاڑنے سے کیا ملے گا۔ پتا نہیں وہ کون تھا؟"

"ہم پتا کرلیں گے۔"

"نہیں سراج۔ ساری بات میں نے بتادی۔ اب بندہ یہ اپنی جان بچانے کا دے سکتا ہے اس سے وصول کر۔ معاملے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ تمہاری بات اور ہے۔ میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔"

سراج نے سوچ کے کہا "چل ٹھیک ہے۔ میں اپنا بندہ تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ تو اپنا بندہ میرے حوالے کر۔"

میں نے پیڈرو سے کہا "اب کیا خیال ہے پیڈرو؟"

پیڈرو نے سکون سے کہا "میں نے اس کو بچایا نہیں تھا۔ جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک ہے۔"

سراج نے سلاخوں والی کھڑکی کے قریب آکے ایک فصاحت و بلاغت سے پُر تھانے دارانہ تقریر کی جس میں گالیوں کے ساتھ وہ تمام سلیس اردو کے الفاظ میں کیا تھا کہ آج تک ہم نے جتنے قتل کیے جتنے ڈاکے ڈالے عورتیں اٹھائیں۔ اور اسی نوعیت کے جتنے سنگین جرائم کیے ان سب کا حساب ہوگا اور اس سے پہلے جو کچھ ہوگا اس کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ہم اس دن کو روئیں گے جب پیدا ہوئے تھے اور پھر اس دن کو جب سراج سے ملے تھے۔ تیسرا دن جب ہمیں رونے والا کوئی نہ ہوگا۔

سراج نام کا یہ دوسرا تھانے دار تھا جو میرے سامنے اپنے فرعونی لہجے میں آتش فشاں تھا۔ شاید اس کا انجام بھی وہی ہونے والا تھا جو پہلے والے انسپکٹر سراج کا ہوا تھا۔ اس کی بکواس سنتے ہوئے میں پریشان تھا اور نہ پیڈرو۔ جو حکمت عملی ہمارے ذہن میں تھی وہ سراج یا عبدالرحمان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ اس کے لیے اداکاری کا اچھا مظاہرہ ضروری تھا۔

بالآخر مجھے بھی کچھ عرض کرنے کا موقع ملا "تھانے دار صاحب۔ ویسے تو بات ہوگئی تھی عبدالرحمان سے۔"

اس نے مجھے اور عبدالرحمان کو ایک درجن گالیاں دیں "مذاق سمجھ رکھا ہے تم نے قانون کو۔ اب بات ہوگی تھانے میں۔"

میں نے کہا "سرکار۔ آپ مالک ہیں۔ مائی باپ ہیں۔ تھانے میں اور لوگ بھی ہوں گے۔ ادھر ہی بات ختم ہوجائے تو اچھا ہے۔"

سراج کے ذہن میں بھی یہ نکتہ ہوگا کہ تھانے میں اس کو ان کے حصے سے زیادہ کچھ نہیں ملے گا۔ تھانہ انچارج صاحب کے علاوہ اوپر نیچے کے سب لوگ ہاتھ پھیلائیں گے۔ یہاں سارا مال اپنی جیب میں جائے گا اور پوچھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

"تم پچیس ہزار میں بات ختم کرنا چاہتے ہو؟" اس نے دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا کہ سراج کو عبدالرحمان سمجھنا ان کی غلطی ہے اور اگر ہم تھانے میں تفتیش کے چھتر لیے بغیر گزرے بغیر ایک لاکھ دے کے چھوٹ جائیں تو یہ بڑی خوش قسمتی ہوگی۔

کافی رد و کد کے بعد پچاس ہزار میں معاملہ پھر طے پاگیا۔ قناعت پسند عبدالرحمان ایک ٹیکسی کا مالک بن جانے پر ہی بہت خوش تھا اور اسے سراج سے کوئی حسد محسوس نہیں ہو رہا تھا جس نے پچیس ہزار کی چیز کے پچاس وصول کرلیے۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور کے مقابلے میں تھانے دار اتنا با اختیار ضرور ہوتا ہے۔

میں نے عبدالرحمان کو بتایا کہ وہ سیدھا کامران ہوٹل جائے اور بستر پر نازو کو ہی چلا جائے۔ میں نے اسے نازو کا کمرا نمبر بھی بتادیا اور ایک رقعہ لکھ دیا جس کا مضمون سراج کی مرضی کے عین مطابق خط میں نے لکھا تھا۔

"نازو۔

یہ رقعہ ملتے ہی پچاس ہزار روپے نقد لے کر اس پتے پر آجاؤ جو میں نے پیچھے لکھا ہے۔ تمہاری آسانی کے لیے نقشہ بھی بنادیا ہے۔ اگر میری زندہ سلامت واپسی مطلوب ہے تو کسی کو کچھ مت بتانا۔ اپنے ساتھ کسی کو مت لانا۔ کسی کو فون بھی مت کرنا۔ خالی ہاتھ آنا۔ ہوٹل کے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک ٹیکسی کھڑی ہوگی۔ اس میں بیٹھ جانا۔ اسے پتا سمجھا دینا بلکہ یہ رقعہ اسے دے دینا۔ وہ خود تمہیں لے آئے گا۔ یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ دیر مت کرنا۔ تمہارا کبیر خان۔"

مجھے اندازہ تھا کہ دس بجے تک میری طرف سے رابطہ نہ ہونے کے باعث اکیلی رہ جانے والی نازو کتنی پریشان ہوگی۔ رابعہ اور طلب صبح ہوتے ہی چلے گئے ہوں گے اور اب وہ کمرے میں میرے فون کا، میرا یا کسی پیغام کا انتظار کرتے کرتے بھی تھک گئی ہوگی لیکن وہ ہوٹل چھوڑ کے کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی۔

عبدالرحمان ٹیکسی لے کر چلا گیا تو سراج کھڑکی کے سامنے کرسی ڈال کے بیٹھ گیا۔ "کیا تم جنت کے چکر میں پڑگئے؟"

"جنت؟ ہم تو جہنم کے عذاب میں پڑ گئے جی... بڑے گنہگار لوگ ہیں۔"

"اوئے پاگل دے پتر۔ جنت بی بی۔ وہ کیسی جو سوئی پڑی ہے اُدھر دوسرے کمرے میں۔"

میں نے کانوں کو ہاتھ لگائے "توبہ جی۔ ہمیں پتا ہوتا تو ہم کبھی عبدالرحمان کے ساتھ نہ آتے۔ اس نے کہا کہ رات گزارنے کی جگہ ہے۔"

سراج ہنسا "یہ تو ٹھیک کہا تھا اس نے۔"

"ہم غلط سمجھے تھے۔" میں نے بے وقوفوں کی طرح سہلایا "ایسے یہ عورت جنت بی بی کون ہے؟"

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ رپورٹ کرنی ہے میری؟ اس کے مامے لگتے ہو تم؟" سراج نے مجھے گالیاں دے کے کہا۔

"وہ عبدالرحمان... اسے اپنی بیوی کہتا ہے۔"

"کہتا ہے نکاح نامہ ہے اس کے پاس" پیڈرو بولا۔

"پھر تو یہ بات۔ وہ بندہ کون تھا جس کو تم نے قتل کیا تھا اور ادھر لا کے گاڑا تھا؟"

"تھانے دار صاحب۔ آپ بڑے تجربہ کار ہو۔ کیا ہم صورت سے قاتل لگتے ہیں؟" میں نے عاجزی سے کہا۔

"یہی تو بات ہے۔ قاتل شکل سے پہچانے جائیں تو سب پکڑے جائیں اور پھانسی چڑھ جائیں۔"

میں نے کہا "جناب عالی۔ ایسی بات نہیں ہے۔ ہم تو چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں۔ قتل کرنا، ڈاکے ڈالنا یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ ہم سے تو کسی نے کہا تھا کہ یہ کام کرنا ہے۔ اس کے دس ہزار دیے تھے۔ ہم نے دو ہزار عبدالرحمان کو دے کے کام کرالیا۔"

اس نے غور سے مجھے دیکھا "بکواس کرتا ہے۔ اُلّو بناتا ہے مجھے؟"

میں نے کہا "سر جی۔ اب جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے مجھے۔ بات ہوچکی۔"

"کام کرانے والے کون لوگ تھے؟"

"وہ جی۔ اُدھر لاہور کے بندے ہیں۔ الف دین اور ان کے ساتھی۔ پہلے ریڈیو پر قوالی کرتے تھے۔ پھر بدمعاشی کرنے لگے۔"

سراج نے پھر مجھے شک سے دیکھا "قوالی... قوالی چھوڑ کے بدمعاشی شروع کردی؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "کسی شریفانہ پیشے میں آمدنی نہیں رہی۔ گزارا نہیں ہوتا۔ آپ بتاؤ اگر صرف یہ وردی اور تنخواہ ہو تو پورا پڑے گا؟"

وہ کسی اور چکر میں تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا کے کہا "تم لاہور سے آئے ہو۔ الف دین کے کسی کام سے؟"

میں نے کہا "نہیں جی۔ ابھی تو ایسے ہی سیر سپاٹے کے لیے آئے تھے۔ اسی لیے ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔"

"لیکن عبدالرحمان نے بتایا کہ تم اسے کئی بار ملے تھے۔"

"ہاں جی۔ ادھر جانا منع تو نہیں ہے" میں نے مسکرا کے کہا "اس کو زیادہ شوق تھا۔ ادھر جانے سے پہلے ہی ٹُن ہوگیا۔"

"ٹُن ہوگیا؟"

"میرا مطلب ہے جی۔ بہت زیادہ پی گیا۔ مفت کی ملی تھی۔"

سراج نے کہا "وہ گاڑی تو سرکاری تھی اور بہت شاندار تھی جس میں سے...."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ہاں جی۔ الف دین ان کا خاص آدمی ہے۔ اس کی سفارش سے ہمیں گاڑی مل گئی تھی۔"

"یہ کون ہے جس کو تو نے رقعہ بھیجا ہے؟"

"بس جی۔ آپ کچھ بھی سمجھ لیں۔ بیوی کے علاوہ...." میں نے کہا۔

وہ سہلانے لگا "الف دین کو ضرور معلوم ہوگا۔ کہ یہ بندہ کون تھا؟"

www.paksociety.com

میں سمجھ گیا کہ ایک بڑا اسرار و قتل کے معاملے میں وہ صرف پچاس ہزار پر سودا کرکے مطمئن نہیں ہے۔ اس کی نیت میں فتور آ گیا تھا۔ شاید اب وہ سوچ رہا تھا کہ پچاس ہزار بیعانہ رکھ لے اور ہمیں حوالات میں بند کرکے الف دین کو بلوائے۔ اس سے پوچھا جائے کہ مقتول کون تھا اور قتل کیوں ہوا تھا اور کس نے کیا تھا۔ پولیس ویسے تو بہت کم جرائم کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوتی ہے اور کامیابی کا جو بھی تناسب ہے اس میں عقل اور ذہانت سے زیادہ اتفاق کا دخل ہوتا ہے۔ کوئی مخبری کر دیتا ہے یا شک میں دس بیس بندوں کی کھال میں بھس بھرا جاتا ہے تو ایک اعتراف کر لیتا ہے۔ اس کیس میں پولیس دعویٰ کر سکتی تھی کہ انہوں نے مہینوں دن رات ایک کرکے جرم کا سراغ لگایا اور قاتل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ سراج زیادہ کے چکر میں رہ گیا تھا۔ وہ الف دین سے بھی کچھ وصول کرنا چاہتا تھا اور قاتل سے بھی اس کو لمبی رقم کی امید تھی۔

پیڈرو بھی جانتا تھا کہ نازو آئے گی تو کیا ہوگا۔ اس وقت وہ سو فیصد میرے ساتھ تھا۔ ولاور سے اسے کوئی امید نہ تھی۔ الٹا وہ پیڈرو کا جانی دشمن ہو گیا تھا۔ پیڈرو میں اس سے مقابلے کا دم خم نہیں تھا۔ اب وہ ہر قیمت پر اپنی جان چھڑا کے اور بچا کے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ شیخ مختار کے لیے اپنی نئی زندگی میں بڑی کشش تھی۔ سکون کا احساس تھا اور تحفظ کی ضمانت تھی لیکن اس کے لیے عمر رفتہ کا آسیب وبالِ جان تھا۔ اس کے مجرم ماضی کا ہر لمحہ کسی بدروح کی طرح اس کے تعاقب میں تھا۔ شاید یہی قدرت کا نظامِ انصاف ہے کہ جب آدمی نفرت کی زمین میں دشمنی کے بیج ڈالتا ہے تو پھر اسے انتقام کا پھل بھی کھانا پڑتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمام عمر کوئی بے گناہوں کو دکھ اور عذاب، خوف اور دہشت، ظلم اور جبر کی چکی میں پیستا رہے اور جب دل بھر جائے یا موت کا خوف غالب آنے لگے تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے سکون اور عافیت کی زندگی میں یوں داخل ہو جائے جیسے آدمی اندھیرے سے اجالے میں چلا جاتا ہے۔ یہ اتنا آسان اور خود اختیاری نہیں ہوتا۔ عمل کے بعد مکافاتِ عمل ہے۔ گناہ کے بعد اس کا کفارہ ادا کرنے اور جرم کے بعد اس کی سزا بھگتنے سے ایسے کون بچ سکتا ہے۔ اسی لیے دمِ آخر توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔

گیارہ بجے کے قریب سراج نے ہم سے پہلے ٹیکسی کی آواز سن لی اور بولا "لو عبدالرحمان تو آ گیا۔" اس کے ساتھ ہی ٹیکسی دروازے کے سامنے رک گئی۔ عبدالرحمان پہلے اندر آیا۔ اس کے لبوں کی فاتحانہ مسکراہٹ بتاتی تھی کہ وہ اپنی کامیابی پر خوش ہے۔

نازو اس کے پیچھے سخت بدحواسی اور گھبراہٹ کا مظاہرہ کرتی داخل ہوئی۔ اس نے اے ایس آئی کو دیکھا تو سہم کر رک گئی۔ لیکن اسے دیکھ کر سراج بھونچکا رہ گیا۔ وہ حسن و رعنائی اور نزاکت کے ایسے خیرہ کن نظارے کے لیے تیار نہ تھا۔ سادگی کے باوجود نازو کے انداز و اطوار میں پرکاری تھی اور یہ سراج کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ہم جیسے لوگوں کے ساتھ ایسی صورت بھی نظر آ سکتی ہے۔ اس کے تصور میں کوئی عام سی عورت ہوگی۔ موٹی بھدی، کالی اور جاہل۔ سرمے کاجل اور مسی سے لیس اور زیورات سے بنی سنوری۔ جب نازو میری طرف لپکی تو سراج کو ہوش آیا۔

اس نے ایک دم نازو کی راہ میں حائل ہو کے اسے پکڑ لیا "رک جا او مرغی۔ تجھے بڑی جلدی ہے اپنے یاروں سے ملنے کی۔ ہم تو راستے میں دوری پہ بیٹھے ہیں۔"

اس کا اتنا بولنا ہی بارود میں چنگاری بن گیا۔ پلک جھپکنے میں نازو کا روپ بدل گیا۔ وہ چاندنی کی کرن سے آسمانی بجلی بن گئی۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔ پھر اس نے سراج کی کلائی پکڑی اور اسے جھٹکا دے کے اپنی طرف کھینچا۔ اس کی عقل تو پہلے ہی خبط تھی۔ اس کے دل و دماغ کو بنتِ حسن کا زبردست الیکٹرک شاک لگا تھا۔ پھر چند سیکنڈ میں یہ آسمانی بجلی اس پہ یوں گری کہ وہ اپنی تھانے داری اور مردانگی کے زعم سمیت زمین بوس ہو گیا۔ وہ چلایا "او یہ کیا کرتی ہے۔" مگر اس وقت تک نازو نے اس کے پیٹ میں گھٹنا مار کے اسے دوہرا کر دیا تھا اور پھر گھٹنے کو اونچا کرتے ہوئے سراج کو بھی اوپر اٹھا لیا تھا۔

سراج کا سر نیچے ہو گیا اور ٹانگیں چھت کی طرف اٹھ گئیں۔ اس پوز میں ایک سیکنڈ سے زیادہ نہیں رہا۔ نازو کے دوسرے ہاتھ نے اس کو کمر کی بیلٹ پکڑ کے جھٹکا دیا، وہ خود کسی ماہر رقاصہ کی طرح جھک گئی اور سراج اس کے سر کے اوپر سے گزرتا ہوا پیچھے کھڑے ہوئے عبدالرحمان پر جا لگا۔ عبدالرحمان اس کے نیچے دب گیا۔

نازو بڑی تیزی سے پلٹی اور اس نے سراج کے اٹھنے سے پہلے ہی لات گھما کے اس کی گردن پر ماری۔ ایسا کرتے ہوئے نازو خود بھی دوسرے پاؤں کی ایڑی پہ گھوم گئی تھی۔ نتیجہ یہ کہ پورے تین سو ساٹھ ڈگری کے دائرے میں گھوم کر آنے والی لات کی ضرب سراج کے حق میں آفت ہی ثابت ہوئی اور وہ اس طرح رسّے سے گرا جیسے گھومتے ہوئے بجلی کے پنکھے کی زد میں آ جانے والی چڑیا دیوار سے ٹکرا کے گرتی ہے۔

عبدالرحمان نے چلا کے کہا "او نے مجھے مت مارو" مگر نازو اس رحم کی درخواست کی وصولی سے قبل ہی سزا پر عمل درآمد کرنے کے لیے ایکشن میں آ چکی تھی۔ سراج کا حشر دیکھ کے عبدالرحمان پر ویسے ہی دہشت طاری تھی۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو پیچھے دیوار آ گئی۔ نازو کی پہلی ٹک اس کی پسلیوں میں لگی اور اس نے منہ کھول کے سانس لینے کی کوشش کی اور پھر آگے جھک گیا۔ نازو نے اس کا لاسہ پکڑ کے کھینچا اور مخالف سمت میں مکا دے

"اب کیا کرنا ہے مجھے؟" اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"تم نے اپنا فرض بطریقِ احسن پورا کیا عزیزہ۔ باقی کام ہمارا ہے۔ تم چاہو تو ایک چیز اپنے ساتھ لے کر جاؤ اس گاڑی میں جو باہر موجود ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا چیز لے جاؤں؟" اس نے بے سدھ پڑے ہوئے دونوں افراد کی طرف دیکھ کے کہا۔

"اسی کو لے جاؤ جو تمہیں لایا تھا۔" میں نے کہا "میں اسے گاڑی کی ڈگی میں ڈال دیتا ہوں۔"

"اسے لے کر میں کہاں جاؤں؟ ابھی تو میں نے ہوٹل بھی نہیں چھوڑا۔"

"تم راولپنڈی کے راستوں سے واقف ہو۔ نہیں؟ خیر واپس کامران ہوٹل پہنچو کوئی مشکل کام نہیں۔ اطمینان سے چیک آؤٹ کرو اور لوٹ کے اسی راستے پر آ جاؤ تو ہم کہیں نہ کہیں مل جائیں گے۔ کسی گلی میں مڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سیدھی سڑک ہے اس پر سیدھا چلتی جانا۔"

"تم ساتھ کیوں نہیں چلتے؟"

میں نے کہا "کیوں اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے؟"

"نہیں۔ تم کو اکیلا چھوڑ کے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جانے کب پھر کوئی واپسی تک نئی حماقت نہ سوجھ جائے۔"

"تم سمجھتی ہو کہ یہ چکر میں نے جانتے بوجھتے لیا تھا تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے جو میں بعد میں دور کروں گا۔" میں نے کہا "چلو تم باہر جا کے گاڑی میں بیٹھو۔ میں ان سب کا بندوبست کر کے آتا ہوں۔"

"میرے یہاں رکنے میں کیا حرج ہے؟"

"حرج ہے نایاب۔" میں نے کہا "اچھا تم اس کمرے میں پیڈرو سے باتیں کرو۔ وہ تمہیں بتا سکتا ہے کہ ہم یہاں کیسے پہنچ گئے تھے؟ بڈھے کس منہ لگیں گے مجھے۔"

نازو نے سراہا "جو کرنا ہے جلد کرو۔"

میں نے وہی کیا جو پہلے سے میرے ذہن میں تھا۔ دوسرے کمرے میں عبدالرحمان کی بیگم منکوحہ اپنا منہ دوسری طرف کر کے بیٹھی رہی جیسے اس سے زیادہ باحیا اور شرمیلی عورت کوئی نہ ہو۔ جب میں نے اسے بھی تیار ہونے کا حکم دیا تو اس کو پہلے سمجھ نہیں آیا۔

"تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا ہے؟"

"لیکن... اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں پہلے ہی وعدہ کر چکی ہوں کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ اور شور بھی نہیں کروں گی۔"

"بحث کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔" میں نے دھاڑ کے کہا "مجھے زبردستی پر مجبور نہ کرو۔ یہ عورت سو رہی ہے۔ تم مر جاؤ گی اگر یہ ہاتھ سخت پڑ گیا۔ جلدی کرو۔"

اس نے ڈر کے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے اسے اور

کر اسٹارٹ کر دیا۔ وہ دوڑتا ہوا گیا اور اپنے سامنے کی دیوار سے ٹکرا کے سراج کے ساتھ ہی لیٹ گیا۔

اس ہنگامہ آرائی نے دوسرے کمرے میں سارے معاملات سے بے خبر سونے والی عورت کو بھی جگا دیا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے فلموں میں سلطان راہی کا یہ ایکشن ضرور دیکھا ہوگا مگر حقیقی زندگی میں ایک دبلی پتلی نازک اندام اور حسین لڑکی چند سیکنڈ میں دو مردوں کو مقابلے کی مہلت دیے بغیر لٹا ڈالے۔ ایسا اس نے سنا بھی نہیں تھا اور شاید وہ کسی کو سناتی تو وہ یقین نہ کرتا۔ وہ سمجھتا کہ وہ مذاق نہیں کر رہی ہے تو پھر نشے میں ہوگی یا اس نے خواب میں ایسا دیکھا ہوگا۔

جب نازو نے اس کی طرف دیکھا تو وہ تھرتھر کانپنے لگی اور ہاتھ جوڑنے لگی "میں... میں بے قصور ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

میں نے نازو سے کہا "اس سے کہو کہ اندر جا کے خاموش بیٹھے۔ تم تالا کھولو۔"

نازو نے مسکرانے کی کوشش کی "تالا کیسے کھولوں۔ کہو تو دروازہ توڑ دوں۔"

میں نے کہا "مانا کہ آپ بڑی شہ زور ہیں مگر بے جب ان نازک ہاتھوں کو زحمت نہ دیں۔ یہ بے حس دروازے متاثر نہیں ہوں گے۔"

"پھر کیا کروں؟ چابی کہاں ہے تالے کی؟"

میں نے کہا "مسٹر عبدالرحمان کی جیب میں۔"

"اور مسٹر عبدالرحمان کون ہیں؟" اس نے سراج کی طرف دیکھا "یہ تھانے دار صاحب!"

"نہیں۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور جو اپنی نامناسب اعمال کو خود بلا کے لایا تھا۔"

نازو نے عبدالرحمان کی جیب میں سے چابی کے ساتھ ہی پچاس ہزار روپے بھی نکال لیے۔ پھر اس نے تالا کھول دیا "تم بھی کمال کی بے وقوفی کرتے ہو سکندر بعض اوقات۔"

میں نے تسلیم کیا "بعض اوقات بڑے بڑے دانشور بھی بے وقوفی کرتے ہیں۔ غلطی کرنا انسان کا پیدائشی حق ہے کیونکہ وہ خطا کا پتلا ہے۔"

نازو پر اب غصے کا بھوت سوار ہو رہا تھا "یہ مذاق کی بات نہیں۔ میں بہت پریشان تھی۔ رابعہ کو غالب کے ساتھ تم نے بھیجا۔ میں اکیلی تھی ہوٹل میں۔"

میں نے افسوس اور ہمدردی سے کہا "اچھا؟ سب ہوٹل چھوڑ کے بھاگ گئے۔ سارے مسافر اور انتظامیہ کے ارکان...؟ ویری بیڈ۔"

نازو سمجھ گئی کہ اس وقت سیریس ہونے کا کوئی فائدہ نہیں

www.paksociety.com

تھانے دار کو ایک ساتھ باندھ دیا۔ تھانے دار کے ہاتھ عورت کی کمر کے گرد حائل تھے اور ایک رسی نے ان کو پیچھے سے اوپر تک یک جان دو قالب کردیا۔ اس حالت میں وہ ایک دوسرے کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ تھانے دار ہوش میں آجاتا تب بھی کسی اور کی مدد کے بغیر اس جبری ہم آغوشی سے نجات حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ جتنی ذلت گزشتہ شب عباسی نے جھیلی تھی اس تھانے دار کے مقدر میں اس سے کہیں زیادہ تھی۔ جب بالآخر لوہے اور حقہ نلکیس کی طرح چپکے ہوئے طالب و مطلوب کو جدا کرنے والا ظالم سماج آئے گا تو اس غیر متوقع شدہ غیر فلمی منظر کے جتنے گواہ ہوں گے وہ تی باتیں۔ یہ قصہ کسی نے مرچ مسالے کے ساتھ اخبار والوں تک پہنچادیا تو تھانے دار کی وردی ہمیشہ کے لیے گئی۔ عبدالرحمان اور اس کی نام نہاد بیوی کے لیے یہاں رہنا ناممکن ہوگا لیکن وہ بے غیرت ہیں۔ کچھ دن تھانے میں گزار کے کوئی اور سراغ تلاش کرلیں گے۔

عورت کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ آنے والے وقت کے تصور سے خوف زدہ تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ہم پیشہ ور چوروں کو نہیں ہیں۔ اس سے کسی نے نقد یا زیور طلب نہیں کیا تھا۔ اس کے جسم کو بدنیتی سے چھوا تک نہیں تھا۔ وہ سمجھ رہی ہوگی کہ کسی نے سراج کی دشمنی میں ایسا کیا۔ ظلم اور زیادتی سراج کے معمول کا حصہ تھا اور آمدنی کا ذریعہ۔

کمرے کی کنڈی باہر سے لگانے سے پہلے میں نے سراج کی وردی لپیٹ کر رکھ لی۔ اس میں ریوالور بھی تھا اور اس کا بٹوا بھی۔ مجھے اپنا میک اپ اتار کے اصل چہرہ بحال کرنے کے لیے بھی وقت درکار تھا اور لباس بھی بدلنا تھا۔ میک اپ کرنے کے لوازمات کی طرح میک اپ کو اتارنے کے لیے بھی کچھ ضروری چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ عارضی میک اپ پانی اور صابن سے منہ دھوکے اتارا جاسکتا تھا مگر میرا فریج وکیل والا حلیہ مشکل سے بنتا تھا اور مشکل سے بگڑتا تھا۔ میں نے سراج کی گاڑی میں سے پیٹرول نکالا اور ایک تولیے کو گیلا کرکے چہرے کو صاف کرتا رہا۔ دس پندرہ منٹ بعد میں چہرے کے اصل رنگ روپ کو بحال کرنے میں نوے فیصد کامیاب ہوگیا تھا۔ میں نے آنکھوں کے اندر سے سبزی مائل بھورے رنگ کے کنٹیکٹ لینز نکال دیے اور ناک میں سے وہ اسپرنگ جو میری خاندانی ناک کو افسوس ناک بنادیتے تھے۔ میں نے بالوں کی وگ اتار دی تو بہت دن بعد آئینے میں سکندر بخت کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔

جب ہم وہاں سے نکلے تو حسب ضرورت سب نے تھوڑا بہت حلیہ تبدیل کرلیا تھا۔ میں نے عبدالرحمان کا ایک پرانا اور خستہ حال قمیص شلوار پہن کے سر پر ایک گول ٹوپی رکھ لی تھی جو شاید عبدالرحمان جمعے کے جمعے نماز پڑھتے وقت استعمال کرتا ہوگا یا عید بقرعید۔ خود نازو نے بھی ایسے ہی میلے کچیلے اور مسترد شدہ پرانے

کپڑے پہننا منظور کرلیا تھا مگر بعد میں اسے خیال آیا کہ ابھی اسے ہوٹل جاکے سامان اٹھانا ہے۔ پھر اتفاق سے عورت کی کپڑوں کی الماری میں سے ایک برقع نکل آیا۔ اسے بھی رات کے اندھیرے میں آتے جاتے اپنا چہرہ چھپانے کی ضرورت پڑتی ہوگی اور محلے دار اس محنت کش ٹیکسی ڈرائیور کی بیوی کو بھی شریف اور پردہ دار عورت سمجھتے ہوں گے۔

عبدالرحمان کی ٹیکسی ہم نے وہیں چھوڑ دی اور دروازے کو مقفل کردیا۔ عبدالرحمان کو میں نے بے ہوشی کی حالت میں اٹھایا اور سراج کی گاڑی کی ڈکی میں ڈال دیا۔ سراج کی حالت بھی میں نے دیکھی تھی اور میرا اندازہ تھا کہ ایک گھنٹے میں اسے ہوش آجائے گا۔ ہوش آنے کے بعد بھی وہ دل ہی دل میں مجھے گالیاں دینے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ جس عورت کی جسم کی غضب میں وہ اپنی عزت اور غیرت کو بھول کے بصد شوق آیا تھا اب اسی عورت کے وجود سے چپٹے رہنا اس کے لیے باعث اذیت ہوگیا تو اصل کھیل جذبات کا ہے۔ شاید زندگی میں پھر کبھی سراج اس سے ملے تو یہ سب بھول گیا ہو اور اس کی ہوس کے فطری جذبات پھر وہی ہوں جو آج ہیں۔

کامران ہوٹل تک گاڑی نازو نے ڈرائیو کی۔ اسے ہوٹل سے چیک آؤٹ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ دس منٹ بعد ایک پورٹر اس کا سوٹ کیس باہر رکھ کے اور ٹپ لے کر چلا گیا تو میں نے سوٹ کیس اٹھا کے پچھلی سیٹ پر اپنے ساتھ رکھ لیا۔ نازو اگلی سیٹ پر تھا اور میں عین اس کے پیچھے۔ اس کے پُرتعاون جذبے پر اعتبار کرتے ہوئے یہ فرض کرلینا کہ اب وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرے گا میرے لیے ناممکن تھا۔ اس کی مکاری اور فطری خطرناکی سے ہوشیار رہنا از حد ضروری تھا۔ وہ نرا نازو نہیں تھا اور شاید اتنا بے بس اور مجبور بھی نہیں تھا جتنا نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔

نازو پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تو میں نے کہا "کل وہ بکس بھی سامان میں شامل تھے۔"

"وہ لاہور گئے" نازو بولی۔

"کیا تھا ان میں؟"

"یہ پوچھو کیا نہیں تھا۔ نہایت قیمتی غیر ملکی کپڑوں کے سوٹ پیس، گھڑیاں، کیمرے، شراب اور سگریٹ کے کارٹن۔ یہ فوم اور جیولری کا لاکھوں کی رشوت تھی۔"

"کروڑوں کمانے کے لیے۔ تم نے آج کا اخبار دیکھا؟"

"ہوٹل میں تمہارے فون کا انتظار کرتے ہوئے میں نے سارے اخبار اور رسالے پڑھ ڈالے تھے۔"

میں نے کہا "عباسی کے بارے میں کیا خبر ہے؟"

"صرف ایک ہی اخبار نے رنگیلے وزیر کی مصروفیات کا احوال چھاپ دیا ہے۔ بجلی بائی اور خبر دینے والا دونوں مشکل میں پڑ جائیں گے۔ خبر میں پیر صاحب کا حوالہ تو نہیں ہے وہ بھی وہیں موجود ہے۔"

"نہیں۔ پیر صاحب تو عباسی کے سیاسی حریف ہیں۔ انہوں نے اس افسوسناک واقعے کو اپنے مخالفین کے خلاف بیان بازی کے لیے استعمال کیا ہے۔ بقول ان کے 'جب پولیس اسٹیشن پر فون موصول ہوا تو وہ ایک بے گناہ کی رہائی کے لیے تھانہ انچارج سے بحث کررہے تھے۔"

"پھر تو عباسی مارا گیا اس کی وزارت بھی گئی۔"

"بھاڑ میں جائے عباسی۔ یہ بتاؤ اب جانا کدھر ہے۔ یہ گاڑی بھی فوراً چھوڑ دینی چاہیے۔"

میں نے کہا "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ سراج کو اس وقت تک رہائی نہیں مل سکتی جب تک خود عبدالرحمان اپنے گھر نہ پہنچے۔ گھر میں باہر سے تالا لگا ہوا ہے۔ کسی اور کو یہ شک کیسے ہوسکتا ہے کہ اندر تھانے دار صاحب کس حال میں ہیں اور کس کے ساتھ ہیں۔ عبدالرحمان کو شاید کسی اسپتال میں ہی ہوش آئے۔ ہم تم چلو پشاور کی طرف۔"

نازو نے متفکر ہو کے کہا "یہ مر تو نہیں جائے گا؟"

"میں ڈاکٹر نہیں ہوں خاتون۔ آپ زیادہ ہی غصے میں آگئی تھیں۔"

نازو نے کہا "ہاں۔ اس نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔ میں نے ان کو وہ رقعہ دیا جس پر تم نے پتا لکھا تھا تو یہ رات نکالنے لگا کہ مجھے اس نے۔ مجھے معلوم ہے آپ کو کہاں جانا ہے۔ میں ہی تو یہ رقعہ لایا تھا لیکن آپ نے شور مچایا اور پولیس سے مدد لینے کی کوشش کی تو پھر آپ کا بندہ کبھی نہیں ملے گا۔ اگر ملا تو زندہ نہیں ملے گا۔ میں نے کہا کہ تم بچ نہیں سکتے۔ میں نے تمہاری ٹیکسی کا نمبر نوٹ کرلیا تھا۔ عبدالرحمان نے کہا کہ جناب پہلی بات تو یہ کہ میں صرف ٹیکسی چلا رہا ہوں۔ ٹیکسی کسی اور کی ہے اور اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دوسری بات یہ کہ نمبر تو خود میں صاف نہیں ہم سکتا آپ نے کیسے نوٹ کرلیا۔ پھر اس نے مجھ سے پچاس ہزار کا مطالبہ کیا کہ یہ رقم اسے ابھی ادا کی گئی تو وہ مجھے صحیح پتے تک لے جائے گا۔"

"عبدالرحمان احمق اور کم عقل آدمی ہے۔"

"ہاں۔ رقم کی مجھے فکر نہیں تھی۔ وہ میں نے واپس وصول کرنا تھی۔ اس کا دماغ راستے میں ہی درست کردیتی مگر مجھے تمہاری کے پیچھے میں تم تک پہنچنا چاہتی تھی۔ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ تمہیں اغوا کرنے والے کون لوگ ہیں۔ تم آسانی سے اغوا ہوجانے والی چیز نہیں ہو۔"

میں نے کہا "یہ تو اغوا کرنے والے پر منحصر ہے۔ اگر تم جیسی لڑکیاں ہوں تو ہم سب چاہیں گے برضا و رغبت اغوا ہونے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں ان کو مطلع کردوں گی۔ بلکہ رابعہ سے کہوں گی کہ وہ بتادے۔"

"رابعہ کے نام سے مجھے ڈرانے یا بلیک میل کرنے کی کوشش فضول ہے۔ یہ میرے حقیقی دلی جذبات ہیں" میں نے کہا "میں غالب کی طرح بزدل نہیں ہوں۔"

نازو مسکرائی "کیا ہم واقعی پشاور جارہے ہیں؟"

"نہیں۔ ہم پشاور کی طرف اور پنڈی سے دور جارہے ہیں۔ پندرہ میل کے فاصلے پر سنگ جانی ہے۔ دو پہاڑیوں کے درمیان تمہیں ایک ستون سا کھڑا ہوا نظر آرہا ہے نا۔ وہیں تھانہ سنگ جانی ہے۔ اس سے کچھ آگے گاڑی کو سڑک کے کنارے چھوڑ دیں گے خود وہاں سے کیسے واپس آئیں گے یہ سوال غور طلب ہے مگر میرا خیال ہے کہ ٹیکسی نہ ملی تو تانگا ضرور مل جائے گا۔ شاید تمہیں دیکھ کے کوئی لفٹ دے دے دل والے ایک ہم ہی تو نہیں۔"

ٹیکسلا کے آثار قدیمہ اور اس شہر گم گشتہ کی تاریخی اہمیت سے بہت لوگ واقف ہیں۔ اس سے کچھ آگے پاکستان کی اکلوتی اور غالباً واحد قرا اسلحہ ساز فیکٹری واہ میں ہے۔ سنگ جانی کوئی معروف جگہ نہیں۔ ٹیکسلا سے چند میل پہلے سڑک مٹی اور بکھرے پتھروں کی دو پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتی ہے تو ایک پہاڑی پر بنی ہوئی لاٹ یا کھمبے کی طرح لمبی یادگار نظر آتی ہے۔ اینٹ، چونے اور سیمنٹ سے بنا ہوا یہ تمیں چالیس فٹ بلند ستون پہاڑی پر ہونے کے باعث آسمان کو چھوتا محسوس ہوتا ہے۔ کسی انگریز کی موت پر تعمیر کی جانے والی لاٹ فرنگی سامراج کی نشانی تھی۔ انگریز حاکم اپنا بوریا بستر گول کرگئے مگر راولپنڈی اور اس کے نواح میں ان کے عہد حکومت کی نشانیاں اسی طرح موجود ہیں جیسے لاہور میں مغل دور حکومت کی۔ راولپنڈی میں سیکڑوں سال پرانا گورا قبرستان ہے۔ آفس لک پول' لیڈ وروڈ' ڈلہوزی روڈ' لاکھڑی بازار (افتخاری رحمت بازار) آدرے بازار (راکل آرٹلری بازار) کمپنی باغ (جسے ہم نے پہلے وزیر اعظم کو شہید کرکے لیاقت باغ کیا) کینٹ ایریا اور صدر بازار کے ماحول میں اب بھی انگریزوں کے زمانے کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔

میں نے نازو کو سنگ جانی تھانے کے بعد گاڑی روکنے کو کہا تھا۔ تھانہ عین پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ دور سے لاٹ کو دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ایسی ہر نشانی کوئی مقبرہ یا لوح مزار کسی جذباتی سانحے کا وقتی ردعمل ہوتی ہے۔ پھر وقت آگے بڑھ جاتا ہے اور پلٹ کر دیکھنے کی نہ کسی کو فرصت ہوتی اور نہ ضرورت۔ اس انگریز کے وارثوں کو شاید خبر بھی نہ ہوگی کہ ان کے کسی جد امجد کو غلام وطن کے کسی کالے آدمی نے کیوں اور کیسے مارا تھا اور کہاں مارا تھا۔ میں بھی وزیر خان کی مثال ہو جانے والا قبر کی امانت اس کی ہڈیاں واپس لانا چاہتا تھا کہ انہیں پھر اسی زمین میں دفن

www.paksociety.com

کروں، جس پر اس کی لوحِ مزار نصب ہے۔ خاک ہو جانے والوں کے لیے مٹی صرف مٹی ہے۔ کتبہ صرف پتھر پر نقش ہو جانے والی یاد ہے اور یادوں کا اصل مدفن تو آدمی کا دل ہے۔ اگر مجھے وزیر خان مرحوم کی ہڈیوں کے کیمیائی معائنے سے قتل کا ثبوت حاصل نہ کرنا ہوتا تو شاید دل کی تسلی کے لیے میں اس جگہ تک جاتا جو اس کا دوسرا مدفن تھی اور مغفرت کی دعا کر کے آجاتا۔ آخر انہیں بھی تو لوگ یاد رکھتے ہیں جو کسی ہوائی حادثے میں ریگِ صحرا میں بکھر جاتے ہیں یا سمندر کی مخلوق کا رزق بن جاتے ہیں اور جو آگ میں راکھ ہو کے اڑ جاتے ہیں۔ وزیر خان کی یہی قبر تھی۔ اس احساس میں میرے لیے عجیب سی تسکین تھی کہ میں نے اس کے قتل کا سراغ لگا لیا۔ قاتلوں کو پہچان لیا اور اب وزیر خان کو اس کی ابدی آرام گاہ تک پہنچانے کے بعد میرے انتقامی جذبات کی آگ بھی ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ کیا اس کے بعد مجھے سکون مل جائے گا؟

نازو نے میرے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ گاڑی سنگ جانی کے تھانے سے سو گز پہلے ہی رُک گئی تھی۔

میں نے کہا "اس پہاڑی کے بعد رُکنے کو کہا تھا میں نے۔ آگے چلو۔"

نازو نے کہا "رُک کے دھکا لگائیں آپ لوگ۔"

"کیا مطلب؟"

"پیٹرول ختم ہو گیا ہے" نازو نے مجرمانہ معصومیت کے ساتھ کہا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "خدا کا شکر ہے کہ ہم پشاور نہیں جا رہے تھے کیا اس گاڑی کا فیول میٹر کام نہیں کر رہا۔"

"وہ دراصل۔ دیکھا تو تھا میں نے۔ لیکن بھول گئی کہ پیٹرول ڈلوا لینا چاہیے۔" نازو نے کہا "مگر اب کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے تمہیں وہاں پہنچا دیا جہاں جانا تھا۔"

"گاڑی نے پہنچایا۔"

"جی نہیں۔ میں نے پیٹرول کا ہر قطرہ بہت کفایت شعاری سے اور سوچ سمجھ کے استعمال کیا۔" نازو نے ڈھٹائی سے کہا۔

اس زنانہ منطق کا جواب نہیں تھا۔ میں نے نیچے اُتر کے سوٹ کیس بھی اُتار لیا۔ پیڈرو جیسٹر رفت خاموش ہی رہا تھا۔ یہ اس کے مزاج اور اس کی عادت کے خلاف تھا۔ بعض اوقات مجھے شک ہوتا تھا کہ یہ خاموشی بے سبب نہیں اور غالباً کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ وہ مشتعل ہو کے مقابلے میں نقصان اٹھانے کا رسک لینا نہیں چاہتا۔ وہ سوچ رہا ہے کہ کیا چال چلے اور چال چلنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کا شعار بھی نظر کھا رہا ہے اور دھوکا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ لاشعوری طور پر میں چوکس رہتا تھا۔ پیڈرو غلطی سے بھی مجھے غافل سمجھتا تو مارا جاتا۔ میرے ذہن کا خود کار دفاعی نظام پوری طرح فعال تھا۔

"کیا بھر لیا ہے اس سوٹ کیس میں آخر" میں نے کہا "یہ اتنا بھاری کیوں ہے؟"

"ایک لاکھ روپے کافی وزن رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمہارے کچھ کپڑے ہیں اور میرے چند جوڑے۔"

"پھر شاید یہاں کشش ثقل زیادہ ہے؟" میں نے کہا "سائنس کی زبان میں اسی کو وزن کہتے ہیں۔ لیکن تم اس جنگل بیابان میں اس ویران سڑک پر یہ بآواز بلند اعلان کیوں کر رہی ہو کہ اس میں ایک لاکھ روپے ہیں۔"

"سوری۔ اس میں ایک لاکھ دس ہزار روپے ہیں" نازو نے دروازہ لاک کرتے ہوئے کہا۔

سوٹ کیس کو اٹھا کے میں نے اپنے پیچھے رکھ لیا "اگر کوئی ہمیں لوٹ لے پھر؟"

"پھر کیا؟ ہم اسے لوٹ لیں گے" نازو نے بڑے تحمل سے کہا۔

قدرے بلندی پر بنے تھانے سے اُترنے والا ایک سپاہی گاڑی کو مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہوا ہماری طرف آیا "کیا بات ہے جی؟"

میں نے عاجزی سے کہا "کوئی بات نہیں جی۔"

"پھر یہ گاڑی ادھر سڑک کے بیچ میں کیوں کھڑی کر دی ہے؟" اس نے مذاق پر اُتر آنے کے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ بیچ میں نہیں ہے۔ بیچ میں وہ لکیر ہے جو سڑک کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔"

وہ اور ناراض ہو گیا "دیکھتے نہیں اس سے حادثہ ہو سکتا ہے۔ ٹریفک میں خلل واقع ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "حوالدار صاحب۔ جو گاڑیاں ادھر سے جاتی ہیں ان کے ڈرائیور گاڑی کو ایک میل سے دیکھ لیں گے۔ جو دوسری طرف سے آرہی ہیں وہ پچاس فٹ دور سے گزر جائیں گی۔"

"اس کے باوجود آپ کا خیال ہے کہ ٹریفک میں خلل پڑتا ہے تو بلا لیں اپنی نفری کو۔ اسے اٹھا کے اوپر تھانے میں لے جائیں۔" نازو بولی۔

"میں گرفتار بھی کر سکتا ہوں تمہیں" اس نے برہمی سے کہا۔

"ہاں۔ سب کچھ کر سکتے ہو تم۔ اس سوٹ کیس میں سے چرس برآمد کر سکتے ہو یا اسلحہ۔" میں نے کہا "لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ بعد میں ہم کیا کریں گے اس لیے بہتر ہے کہ سودا کر لو۔"

"سودا؟ کیسا سودا؟"

"ہم پشاور جا رہے تھے گاڑی خراب ہو گئی" میں نے کہا۔

"گاڑی میں پیٹرول ختم ہو گیا" نازو نے تصحیح کی "تم یہ سو روپے لو پیٹرول کے۔ اور سو روپے محنت کے۔ کسی گاڑی کو روک کے اگلے پیٹرول پمپ تک جاؤ اور کسی ڈبے میں پیٹرول لے آؤ۔ تم وردی میں ہو کسی بس کو بھی روک سکتے ہو۔ ادھر خیال رکھو گاڑی کا

یار سے واپس آنے تک۔"

اس نے دو سو روپے جیب میں رکھ لیے "یہ کر سکتا ہوں میں۔ آپ کی گاڑی کو کچھ نہیں ہوگا۔ دراصل آج میری ڈیوٹی ہے ورنہ۔"

"کوئی خاص ڈیوٹی ہے؟"

"ہاں۔ میری ڈیوٹی ہے کہ آتی جاتی گاڑیوں پر نظر رکھوں۔ کل پہاڑ پر سخت ناکا بندی ہے۔ خود ڈی ایس پی صاحب چیکنگ کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "کوئی واردات ہوئی ہے؟"

"کچھ مہمان ہیں۔ دو عورتیں اور تین مرد۔ ان کی لال رنگ کی گاڑی ہے۔ کل انہوں نے اس علاقے کے وزیر عباسی صاحب کو قتل کر دیا۔"

اگر حوالدار دوسری طرف نہ دیکھ رہا ہوتا تو وہ ہمارے شدید ردِعمل سے شک میں پڑ جاتا۔ اس کی نگاہ پشاور کی طرف سے آنے والی گاڑیوں پر تھی۔

"قتل کر دیا؟ آخر کیوں؟" میں نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔

"ہیں جی۔ اخبار والے تو کہتے ہیں کہ انہوں نے عباسی کو دشمنی میں قتل کیا۔ سیاست میں یہ دشمنی تو چلتی ہے۔ الزام مخالفین پہ ہے لیکن۔"

"لیکن کیا؟"

"اصل بات کچھ اور ہے۔"

نازو بولی "تم بڑے یقین کے ساتھ کہہ رہے ہو۔"

"اسی علاقے کا رہنے والا ہوں میں جی۔ اور عباسی کے ساتھ بھی رہا تھا کچھ عرصہ۔ ایسے بندے کو بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا۔ بہت مہلت مل گئی اسے۔ اس کے دشمن بہت تھے اور سب خطرناک۔ بہت مال کھایا لوگوں کا اور عورتوں کے معاملے میں....."

وہ نازو کی طرف دیکھ کے خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا "کسی نے رقابت میں قتل کیا ہوگا اسے؟"

نازو بولی "سنا ہے اس کی چار بیویاں ہیں۔"

"ہوں گی۔ پہلے تین تھیں۔ اس کے علاوہ بھی ادھر اُدھر منہ مارنے کی عادت تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ قتل اس کے بھائی نے کیا۔"

میں نے اور نازو نے ایک ساتھ کہا "بھائی نے؟"

"ہاں۔ بھائی اس کا باڈی گارڈ بھی تھا اور وارث بھی۔ اتنی شادیاں آخر کس لیے کی تھیں اس نے صرف اولاد کے لیے اور اولاد نصیب میں ہوتی تو کسی سے ہو جاتی۔ اس کا سب کچھ اب بھائی کو ملے گا۔"

"کیا۔ بیویوں کو نہیں ملے گا؟"

"ملے گا۔ مگر بہت تھوڑا۔ نقد رقم جو ان کے حساب میں ہو گی سو ایک ایک کوٹھی مل جائے گی۔ سارا کاروبار بھائی کے نام

پر تھا۔ سارے ٹھیکے بھائی کو ملتے تھے۔ پتا نہیں کہاں کہاں تک پاؤں پھیلا رکھے تھے دونوں بھائیوں نے۔ وزیر خود کچھ نہیں کرتا تھا۔ بھائی بھی ایسے ساتھ رہتا تھا جیسے ڈرائیور ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ وہ کروڑوں کا مالک تھا۔"

"اگر سب اسی کے نام پر تھا تو پھر اسے کیا ضرورت تھی ایسے بھائی کو مارنے کی۔"

"آپ نہیں سمجھتے جی یہاں کی سیاست کو۔ اب عباسی کی سیٹ پر کون کھڑا ہوگا؟ اس کا بھائی۔ ابھی تک اس کی عزت نہیں تھی۔ اب اسمبلی کی ممبری بھی مل جائے گی۔ پارٹی اس کو ٹکٹ دے گی اور لوگ بھی اسے ہی ووٹ دیں گے۔ وزیر بھی بن جائے گا وہ کسی دن۔ عباسی زندہ رہتا تو یہ سب کیسے ہوتا۔ اللہ معاف کرے جو جیسا کرتا ہے ویسا بھرتا ہے۔"

"تمہارے ساتھ عباسی نے کیا کیا تھا؟"

"میرے ساتھ..." وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولا "کچھ نہیں۔"

"یار ہم سے کیوں چھپاتے ہو" ہم تو اجنبی ہیں۔ نہ عباسی کے طرف دار ہیں نہ تمہارے دشمن۔"

"اس نے میری بیوی چھین لی مجھ سے..... زبردستی طلاق دلوائی..... پھر اس سے شادی کر لی۔ میں بے غیرت اور بزدل تھا ورنہ اسے قتل کر دیتا۔ اس کے علاوہ خود میری بیوی اس کے ساتھ خوش ہے۔ خوش نہ ہوتی تو اس کے ساتھ رہتی؟ بھاگ جاتی یا مر جاتی۔"

نازو نے ہمدردی سے کہا "عورت تو مرد سے بھی زیادہ مجبور ہوتی ہے۔"

"یہی میں بھی کہہ رہا تھا۔ پہلے وہ میرے ساتھ رہنے پر مجبور تھی۔ اب وزیر کی تین بیویوں کے ساتھ رہتی تھی یہ بھی مجبوری تھی۔"

نازو بولی "یہ کوئی مجبوری نہیں تھی۔ ہوس تھی پیسے کی ہوس۔"

وہ فلسفی حوالدار بولا "کیا ہوس مجبوری نہیں ہوتی۔ اسی ہوس نے عباسی کو بالآخر مروا دیا۔"

"پھر تو تمہارے پاس بھی مجبوری کا عذر ہوگا۔"

"نہیں۔ بس میں بزدل تھا اور سوچتا رہ گیا کہ کیسے قتل کروں وزیر کو یا اپنی بیوی کو۔ تم دیکھتے ہو کہ جتنا میری مجبوری بن گیا تھا۔ میں نے بالآخر طے کیا کہ دونوں پر لعنت۔ زندگی کیوں ضائع کروں۔ ایک ہفتے بعد میں دوسری بیوی لے آیا۔ یہ والی تو پہلے والی سے زیادہ خوب صورت۔ اس سے پہلے میں رشوت نہیں لیتا تھا۔ پھر رشوت لینے لگا۔ خوب رشوت لی کیونکہ پیسے کی وجہ سے پہلی گئی تھی۔ پیسہ نہ ہوتا تو دوسری کو بھی کوئی لے جاتا۔ اچھا اب تم جاؤ ڈی ایس پی صاحب نے باتیں کرتا دیکھ لیا تو۔"

میں نے کہا "کیا باتیں کرنا بھی جرم ہے۔ اس کے علاوہ ہم

www.paksociety.com

کہاں جائیں اور کیسے جائیں؟"

نازو بولی "تم ہمارا مسئلہ حل کر دو۔ تو ہم جا سکتے ہیں پشاور۔"

"میں بس روک لیتا ہوں، کسی نہ کسی میں جگہ مل جائے گی۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "ہمیں یہاں بس نہیں رکے گی۔ سب پنڈی سے فل ہو کے چلتی ہیں۔ نیستا پور سے پہلے کوئی نہیں رکتا۔"

"تم کوئی گاڑی روک لو۔ جس میں ایک ڈرائیور کے سوا کوئی نہ ہو۔ چالان کروا اس کا۔" نازو نے مشورہ دیا۔

"چالان کروں؟ کس جرم میں؟"

"جرم تلاش کر لینا۔ اس کی کوئی لائٹ خراب ہو گی۔ آگے یا پیچھے کی انڈیکیٹر لائٹوں میں سے ایک کا بلب فیوز ہو سکتا ہے۔ کاغذات میں کمی بیشی نکل آئے گی۔ کچھ نہ ہو تو کار کے ریڈیو کا لائسنس مانگ لینا۔ وہ کسی کے پاس نہیں ہوتا۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "لگتا ہے تم نے بھی پولیس کی نوکری کی ہے یا تمہارا کوئی بندہ پولیس میں ہے۔"

"تم ہو نا یار" میں نے کہا "روکو کسی گاڑی کو۔"

"تین سو اور نکالو" اس نے کہا "کار میں آرام سے پشاور جانے کا کرایہ۔"

وہ صاف گو آدمی پہلے ہی وضاحت کر چکا تھا کہ رشوت لینا اس کی مجبوری ہے۔ میں نے اسے تین سو دیے تو اس نے دس منٹ میں ایک گاڑی روک لی۔ چیکنگ کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اس شریف آدمی نے اندازہ کر لیا کہ یہ ہماری گاڑی ہے جو سڑک کے کنارے رک کے کھڑی ہو گئی ہے۔ پچھلی سیٹ پر نازو کو ساتھ دیکھ کر اور پولیس مین کا اشارہ سمجھ کے اسے اپنا اخلاقی فرض یاد آ گیا ورنہ شاید وہ بھی زوم سے گزر جاتا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے کہا "ہمیں لارنس پور پر اُتار دینا ہم براستہ غازی تربیلا ڈیم جائیں گے۔"

اس نے کہا "میں تربیلا ڈیم ہی جا رہا ہوں۔"

نازو نے مجھے گھور کے دیکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب کیا کرو گے۔ آدھا جھوٹ کافی تھا۔ باقی آدھا نہ بولتے تو لارنس پور پر اُتر جاتے۔

میں نے کہا "دراصل لارنس پور پر ہمیں خاندان کے دوسرے افراد کا انتظار کرنا پڑے گا۔ یا وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ وہ پشاور سے آ رہے ہیں گے۔"

اس نے پوچھا "تربیلا ڈیم پر کون ہے تمہارا؟"

مزید جھوٹ بولنے سے بچنے کے لیے میں نے کہا "میرا تو کوئی نہیں۔ میرے بھائی کا رشتہ ہو رہا ہے کہیں، وہی بتا سکتا ہے۔"

اس شریف آدمی نے ہمیں لارنس پور والی طرف کے سامنے اُتار دیا اور خود غازی جانے والی سڑک پہ نکل گیا۔ اب دوپہر ہو گئی تھی۔ ہم نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا اور وہ اخبار پڑھا جس کو صبح سے سیکڑوں افراد نے پڑھنے کے عمل میں اتنا رگڑا تھا کہ اس کی ساری آرائش جاتی رہی تھی۔ اس کا مسلا ہوا اور خستہ حال کاغذ نرم پڑ گیا تھا۔ جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور اس پر ہوٹل کے سالن اور چائے کے داغ اخبار بینوں کے ذوق و شوق کی عکاسی کرتے تھے۔

اس میں دو خبریں تھیں۔ ایک تالاب کے رپورٹر دوست یا ساتھی نے لگائی تھی کہ عباسی صاحب اور ان کے بھائی شراب کے نشے میں دُھت چنگی بائی کے کوٹھے پر پائے گئے۔ ان کی گاڑی بھی موجود تھی اور اس میں بھی شراب کی قابلِ گرفت مقدار موجود تھی۔ اس خبر کے ساتھ ہی رنگی بائی کے کوٹھے سے رپورٹر کے ہمراہ نکل جانے والے پیر صاحب کا مذمتی بیان تھا۔ پیر صاحب نے رپورٹر سے "ٹھیک ٹھاک" لین سودا کر لیا ہو گا کہ وہ ان کی موجودگی کا راز فاش نہ کرے تو وہ اس کی تائید میں بیان کا صداقت نامہ جاری کر دیں گے۔

دوسری خبر کی تفصیل ہمیں مل گئی تھی مگر اخبار میں اس کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ کسی نے اخبار کے دفتر میں فون کر کے یہ اطلاع دی تھی کہ عباسی صاحب جو گھر سے اپنے گیسٹ ہاؤس گئے تھے وہاں ہیں۔ گیسٹ ہاؤس سے کسی نے یہ بتایا تھا کہ انہیں ایوانِ صدر بلایا گیا ہے مگر یہ بات جھوٹ ثابت ہوئی۔

ہم سڑک کے کنارے ریسٹورنٹ کی پشت پر ایک گھنے سایہ دار درخت کی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹین کی کرسیاں اور میزیں پتلون پوش ہی استعمال کرتے تھے۔ عوام اپنے عوامی لباس میں چارپائی کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ چارپائیاں کھانے کی میز کا کام بھی دیتی تھیں۔ چارپائیاں اور کچھ میزیں ایک وسیع علاقے میں ہوٹل کے سامنے پھیلی ہوئی تھیں اور وہاں رکنے والی بسوں کے مسافر بس سے اُترتے تھے تو انہیں سیدھی کرنے کے لیے فوراً کسی چارپائی پر لیٹ جاتے تھے۔ پیچھے ہونے کی وجہ سے ہمیں کچھ تنہائی میسر تھی۔

اخبار نازو نے اور پیڈرو نے بھی پڑھ لیا تھا جو الدار کی بات بھی سمجھ میں آنے لگی۔ اس نے سیاست میں رقابت کی بجائے بھائی کے ہاتھوں بھائی کے قتل کا بالکل صحیح تجزیہ کیا تھا مگر اس تجزیے کے ساتھ وہ پولیس اسٹیشن جا کے سچ بولنے کی کوشش کرتا تو اس کی دوسری بیوی کو طلاق نہ ہوتی۔ وہ بیوہ ہو جاتی اور عباسی کے بھائی کے حرم میں جگہ پاتی۔

میں نے کہا "عباسی کے بھائی نے قتل کا الزام ہم پر تھوپ دیا ہے۔"

پیڈرو بولا "تھوپنے کا کیا مطلب؟ تم نے قتل کیا ہے عباسی کو۔"

میں نے اسے چونک کے دیکھا "میں تم کو بھی قتل کر سکتا ہوں۔"

وہ مسکرانے لگا "میں نے تمہارے خلاف گواہی تو نہیں دینی

www.paksociety.com

کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب الزام ایک مقتول وزیر کا بھائی لگائے اور وہ بھائی بھی بہت جلد اسمبلی کا ممبر یا وزیر بننے والا ہو۔ تو پولیس اس کے بیان کو ایک سو ایک فیصد سچ ثابت کرنے کے لیے چشم دید گواہ اور واقعاتی شہادت خود پیدا کر سکتی ہے۔"

نازو نے کہا "اس خبیث نے ہم سب کے حلیے ضرور بتائے ہوں گے۔"

"حلیے کیا نام بھی بتائے ہوں گے" میں نے کہا "صرف وہ نام اصلی تھے رابعہ کا اور غالب کا۔ اب بتاؤ میں نے انھیں فوراً یہاں سے دور لا کے عقلمندی کا ثبوت دیا تھا یا نہیں؟"

نازو نے کہا "کاغذ قلم نکالو۔ میں لکھ دیتی ہوں کہ ثبوت تم نے فراہم کر دیا ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔"

پیڈرو نے کہا "اس چکر میں ہم سب پھنس ہی نہ جائیں۔ میرا پہلے ہی بہت وقت ضائع ہو گیا ہے۔"

"پھر وہی احمقانہ بات۔ اس بات پر خدا کا شکر ادا نہیں کرتے کہ ابھی تک خود ضائع نہیں ہوئے۔"

نازو نے کہا "تھانہ سنگ جانی کے پاس کھڑی ہوئی گاڑی سے عبدالرحمان برآمد ہو گا۔"

"ابھی اس کا کوئی امکان نہیں۔"

"شام تک ضرور ہو جائے گا۔" نازو نے کہا "اس کے ساتھ ہی دوسرا کیس پبلک کے سامنے آئے گا۔"

"اس کیس میں دم نہیں ہو گا" میں نے کہا "حوالدار خود بتائے گا کہ جو گاڑی میں تھے وہ پشاور چلے گئے۔ وہاں سے ہم فوراً واپس ہو جاتے تو اسے شک ہوتا۔ اے ایس آئی سراج اپنی عزت بچانے کے لیے اس معاملے کو دبا دے گا۔ اس کے پچاس ہزار گئے عبدالرحمان کی ٹیکسی گئی۔ تاہم وہ اپنی بدمعاشی جاری رکھیں گے تو کسی دن ضرور کامیاب ہوں گے۔ اندر ہونے میں۔"

نازو نے کہا "موٹر پر بہت سی رنگینوں کے ساتھ کاریں بھی کھڑی ہیں۔"

پیڈرو نے کہا "ان کرائے پر چلنے والی گاڑیاں ہیں۔ یہاں سے لوگ کیمبل پور بھی لے جاتے ہیں اور ٹیلا بھی۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔" میں نے کہا "ان سے کیا بات کی جائے ہمیں اب کہاں جانا ہے؟"

"واپس۔ ایک گھنٹے میں ہم سید پور پہنچ جائیں گے" پیڈرو بولا۔

یہ پرانے ماڈل کی شیورلٹ اور فورڈ گاڑیاں تھیں جو اب مضافات کے کچے پکے راستوں پر مسافر ڈھو رہی تھیں۔ ایسی گاڑیاں شہروں میں غیر مقبول ہونے لگی تھیں لیکن گاؤں دیہات اور قصبوں والوں کو یہ اس لیے پسند تھیں کہ ان میں پوری برات بھی ٹھونسی جا سکتی تھی خواہ انھیں چھت پر ڈگی میں اور بونٹ پر بٹھانا پڑے۔ یہ بھاری بھرکم مضبوط گاڑیاں ان سب کا بوجھ اٹھا لیتی تھیں

اور ان کا مضبوط سسپنشن کچے راستوں کے جھٹکے برداشت کر لیتا تھا پھر یہ انھیں بہت کم قیمت پر مل جاتی تھیں۔ شہر والے ان کے پٹرول کے خرچ اور اسپیئر پارٹس کی مہنگائی کے باعث جلد ایسی گاڑیاں فروخت کر دیتے تھے۔

ایک ٹیکسی کے مالک نے جو پچھلی صدی پر بھی نان کے سوالی ہمیں غور سے دیکھ کے پانچ سو مانگے۔ غالباً اس نے ہمیں بے وقوف راستوں سے ناواقف یا جیب کو ہاتھ کا میل سمجھنے والا فرض کر لیا تھا۔ ہم نے مول تول کر کے اس کے علم قیافہ شناسی کو غلط ثابت کر دیا۔ ڈھائی سو لے کر بھی وہ نقصان میں نہیں تھا مگر اپنی الٹی صورت سے اور مہنگائی کا رونا رو کے وہ یہی ثابت کرتا رہا کہ اس دھندے میں دس روپے بھی مشکل سے بچتے ہیں گے۔

"سمجھ گیا ایک تو یہ گاڑی نہیں جہاز ہے۔ پٹرول تو ایسے پیتی ہے جیسے سری غٹ غٹ کہ ادھر ٹنکی فل کرائی اُدھر خالی۔"

میں نے ہمدردی سے کہا "ایک میل میں کتنے گیلن ختم ہو جاتے ہیں؟"

اس نے میرے طنز کو نظر انداز کر دیا "پھر جناب پٹرول کا بھاؤ دیکھو۔ اپنے برادر اسلامی ملک چاہیں تو پاکستان تک لائن ڈال دیں۔ تیل کے اور مدینے سے سمندر کے نیچے نیچے تیل کی لائن پہنچے کراچی۔ امریکا کو پتا ہی نہ چلے اور جناب پٹرول ملے پانی کی طرح۔ گھر کا نلکا کھولا اور ٹنکی بھر لی۔"

"ابھی سے نہا نہیں اسی میں فوراً ہوائی اڈا کا..."

"آپ تو پڑھے لکھے ہو جی۔" وہ بولا "اب تو اس گاڑی کے پارٹس بھی نہیں ملتے۔ پنڈی کے فراڈیے ہیں۔ دس کے پچاس لیتے ہیں تو کام چل جاتا ہے مگر اصل والی بات کہاں۔ اصل پرزہ چلتا تھا بیس سال۔ نقلی والا بیس مہینے نہیں چلتا۔ مستری کہتا ہے اب انجن ہوا لو۔ لگی چھ مہینے کی کمائی انجن کھا جائے گا۔"

میں نے کہا "ایک مشورہ ہے بُرا نہ مانو تو۔ تم یہ انجن نکال دو آگے دو گھوڑے لگا دو۔ دیکھو وہ کیسا کھینچتے ہیں گاڑی کو بھی اور سواری کو بھی۔ سارے جھنجھٹ ختم۔ دو پارس پارو کی گاڑی میں کیا پٹرول کا خرچ۔ گھوڑے تو سادہ پانی سے چلتے ہیں اور ان کے پارٹس کا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ گھوڑے میں خچر اور گدھے کے پارٹس بھی لگ جاتے ہوں گے۔"

کچھ دیر پہلے اس نے مجھے مخولیا قرار دیا تھا لیکن اس مخول سے وہ لطف اندوز نہیں ہوا۔ نازو کی ہنسی نے اسے مزید کبیدہ خاطر کیا۔ وہ سمجھ گیا کہ میرے یاراں پر کلام نرم و نازک بے اثر۔ وہ مجھے قائل نہیں کر سکتا۔ الٹا یہ خطرہ ہے کہ میں ڈھائی سو میں تین سو کا مستحق ثابت کر دوں۔

اسلام آباد کا حصہ بننے سے پہلے سید پور ایک پکنک پوائنٹ تھا اور سید پوری روڈ جب ہولی فیملی اسپتال سے آگے نکل آتی تھی تو اس کی چڑھائی چند فٹ رہ جاتی تھی۔ اس پر سے ایک وقت میں

ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ دوسری گاڑی آ جاتی تھی تو دونوں کو کچے راستے پر اترنا پڑتا تھا۔ اس سڑک پر خوبانی اور آلوچے کے باغات تھے اکثر جگہ اور سے درختوں کی شاخیں اور سبزیوں کے ہوتے تھے کہ لگتا تھا سڑک کوئی سرسبز سرنگ ہے۔ لوگ خوبانی اور آلوچے توڑ کے کھا لیتے تھے۔ شاخ سے توڑے جانے والے پکے ہوئے تازہ پھلوں کا ذائقہ اور ان کی خوشبو کا الگ لطف تھا۔ عام طور پر مالی بُرا نہیں مانتے تھے۔ ادھر سے گزرنے والے ہی کتنے ہوتے تھے۔ ایک روپے یا سوا روپے میں وہ مٹھی بھر کے پکڑا دیتے تھے۔ اب نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ نہ سید پور کا پتا چلتا ہے نہ اس سرسبز سرنگ جیسی سڑک کا۔

ٹیکسی والا ڈھائی سو روپے لے کر رخصت ہو گیا تو میں، نازو اور پیڈرو سہ پہر کی سنسان خاموشی میں کھڑے رہ گئے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اس جگہ سے بہت قریب ہوں جہاں میرے والد کی ہڈیاں کسی پہاڑ کے دامن میں یا کسی چٹان کے سائے میں دُکھی پُرسکون گوشۂ عافیت میں مدفون ہیں۔ یہ بڑی خوب صورت جگہ تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال بھی آیا کہ اب انھیں اس ابدی مسکن سے اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب یوم حساب آئے گا اور صورِ اسرافیل کی صدا تمام خفتگانِ خاک تک پہنچے گی تو سب ہی اٹھیں گے اور سب ہی محشر کی جانب رواں ہوں گے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون کہاں سے آیا؟

پیڈرو اپنے جرم کا اعتراف پہلے ہی کر چکا تھا اور وزیر خان کے قتل کے راز سربستہ کی ساری تفصیل چودھری دلاور کی سفاکانہ محسن کشی خود غرضی اور بے رحمی کے آئینے میں واضح ہو گئی تھی مگر میرے دل میں ایک خلش سی تھی کہ میں ہی وزیر خان کا واحد وارث۔ اگر اس کے دروازے کی حفاظت میں اس حد تک ناکام رہا کہ اس کی قبر سے چوری ہو جانے والی ہڈیاں بھی واپس نہ حاصل کر سکا تو مجھے اپنے آپ سے ہمیشہ شرمندگی رہے گی۔ یہ اتنا ہی ضروری تھا جتنا قاتلوں کو سرِعام مجرم ثابت کرنا۔ ایک خواہش تھی کہ جب تک زندگی ہے میں وزیر خان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جاؤں تو مجھے یہ احساس نہ ہو کہ وہاں صرف کتبے پر وزیر خان کا نام ہے، کتبہ صرف تختہ ہے وزیر خان کا جسد خاکی نہیں ہے۔

چودھری دلاور نے بھی مجھے ایک کیسٹ دیا تھا اور اس تاکید کے ساتھ کہ جب میں اسے پیڈرو سے اعتراف جرم حاصل کر لوں تو پھر اسے سنوں اور موازنہ کروں کہ سچ اور جھوٹ کی آمیزش کا کیسا کیا ہے۔ کہاں سچ کا جو مسخ کر کے اسے جھوٹ بنا دیا گیا ہے اور کہاں جھوٹ پر سچ کا ملمع ہے۔ دلاور کا دیا ہوا کیسٹ بھی محفوظ نہیں تھا۔ جھوٹ اس میں بھی ہو سکتا تھا مگر اس کے باوجود دو کیسٹ دو آئینوں کی طرح تھے جو میں پیڈرو کو بھی دکھا سکتا تھا اور چودھری دلاور کو بھی۔ اور پوچھ سکتا تھا کہ ایک سچ دوسرے کے آئینے میں مختلف کیوں نظر آتا ہے۔ سچ اٹل ہے، دو رُخا نہیں کا ثبوت ہے۔

نازو گھنے درختوں سے اور آبشار اب جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑ کو دیکھ رہی تھی جس کے دامن میں سید پور کا چھوٹا سا گاؤں سویا سویا لگتا تھا۔ جہاں کوئی ہلچل نہیں تھی۔ وہ زندہ نہیں تھی۔ ٹریفک نہیں تھی۔ شور نہیں تھا۔ حرکت نہیں تھی اور حیرت ہوتی تھی کہ دن و رات کے چوبیس گھنٹے یہاں کے لوگ کچھ بھی نہیں کرتے تو پھر کیا کرتے ہیں؟

میں نے کہا "بس نازو، یہ سوٹ کیس اٹھا لیجیے۔"

نازو نے بے نیازی سے کہا "ہوٹل کے پورٹر کو بلا لو۔ اور دیکھو گرا دار دیکھ کے لینا۔ بڑا اچھا ہو۔"

اچانک گھوڑے پر سوار ایک باریش شخص نمودار ہوا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کیونکہ خاموشی کے باوجود میں نے گھوڑے کے سموں کی آواز تک نہیں سنی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کوئی پُراسرار مخلوق ہے جو اوپر سے اُڑتی ہوئی آئی ہے۔ صوفی ٹائپ شخص جوان نظر آتا تھا۔ اس کے سر پر ٹوپی سے باہر نکلتے ہوئے بال اور داڑھی سب سیاہ تھے۔ اس نے ہمیں بڑی قرأت سے "السلام علیکم" کہا اور ہمارے پاس ہی پہنچ کے اُترا۔

میں نے کہا "صوفی صاحب، ہم مسافر ہیں۔ یہاں ہمارے ٹھہرنے کی کوئی جگہ ہے؟"

"حضرت یہ شہر نہیں ہے۔ ہوٹل یا سرائے کا یہاں کیا کام۔ یہاں ٹھہرنا مقصود ہے تو بسم اللہ۔ مسجد میں تشریف لائیے۔ خیر سے میرا گھر بھی ساتھ ہی ہے۔ مستورات کے قیام کا انتظام بھی ہو جائے گا۔"

میں نے قدرے تامل سے کہا "آپ کو زحمت ہو گی۔"

"زحمت... نعوذ باللہ۔ مہمان تو رحمتِ خداوندی ہوتے ہیں۔ کسی اور کے گھر میں نہ جگہ ہو گی نہ وہاں آپ کا قیام مناسب ہو گا۔ آپ کھلے آسمان کے نیچے بھی نہیں رہ سکتے۔ مستورات ہیں آپ کے ساتھ۔"

ایک نازو کے لیے وہ جمع کا صیغہ استعمال کر رہا تھا مگر وہ مہذب اور باحیا شخص تھا۔ نازو بے پردہ تھی چنانچہ اس کی نظر جھک رہی۔ اپنی طرف سے وہ آنکھ کا پردہ رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

میں نے کہا "ہم صرف آج رات قیام کریں گے۔"

اس نے کہا "حضرت خدا کے گھر میں اور بندے کے دل میں جگہ کی کمی تو نہیں۔ جب تک جی چاہے قیام کریں۔ رزق تو ذری کو رب ملتا ہے جو ان کے نصیب میں ہو اور جہاں بھی ہو۔ رب کے بندے کو بشارت احمد قادری کہتے ہیں۔ مسجد میں موذن اور پیش امام ہوں۔"

اب ضروری ہو گیا کہ میں اپنا تعارف کراؤں۔ جھوٹ بولنا چاہتا نہ تھا۔ پھر بھی میں نے سچ بولنے کی پوری کوشش کی "میں کبیر خان ہوں۔"

صوفی اب گھوڑے کی لگام پکڑے چلنے کے لیے تیار تھا "اور

www.paksociety.com

یہ آپ کی ہے۔"

میں نے فوراً کہا "میری ہمشیرہ نازلی بیگم کی وجہ سے مجھے یہاں آنا پڑا۔"

صوفی نے میرا سوٹ کیس اُٹھا لیا "آیئے میرے ساتھ۔"

میں نے کہا "مولوی صاحب۔ آپ یہ کیا کرتے ہیں۔ لائیے سوٹ کیس مجھے دیجئے۔ آپ تھوڑے ہی کام تھامیں۔"

اس نے انکار کر دیا "حضرت یہ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "آپ کے ساتھ خالی ہاتھ چلتا میں اچھا لگوں گا۔"

"دوسری صورت میں مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ تھوڑا سا فاصلہ ہی تو ہے حضرت" وہ بولا "خیر سے یہ صاحب۔۔۔ آپ کی ہمشیرہ کے۔۔۔"

میں نے کہا "بالکل نہیں۔ ان کا نام ہے شیخ نثار۔ اور ان کا معاملہ میں پھر عرض کروں گا۔"

ہم تنگ راستوں اور کچے مکانوں کے سامنے سے گزرے تو ہر شخص نے ہمیں دلچسپی سے دیکھا۔ مؤدبانہ انداز میں مولوی صاحب سے مصافحہ کرنے والے ہم سے بھی ہاتھ ملاتے تھے۔ اس وقت تک بچوں اور بڑوں کی زبانی یہ خبر شاید پورے سید پور میں پہنچ گئی تھی کہ مولوی صاحب کے گھر مہمان آئے ہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ ہوگا۔ نازو کو ساتھ لائے بنا چارہ نہ تھا اور اس کے ساتھ ہونے سے قیام کا مسئلہ پیدا ہوا تھا ورنہ ہم سیدھے گزر جاتے اور ایک رات کھلے آسمان کے نیچے بھی گزار دیتے تو کسی کو خبر نہ ہوتی۔ ہمارے حلیے میں کوئی بات غیر معمولی نہ تھی مگر نازو کے حسن کی تب و تاب غیر معمولی تھی۔ وہ ہر جگہ مرکزِ نگاہ تھی۔ اسے مرد ایسے دیکھتے تھے جیسے وہ کوہ قاف سے سیدھی سید پور میں اُتری ہے اور عورتیں حسد، رشک اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ۔ وہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ہوتی تب بھی فرق نہ پڑتا۔ زیرِ لب یہ بھی کہا گیا کہ وہ فلم ایکٹرس ہے۔ گاؤں کے نوجوان اور بوڑھے ایسی من موہنی صورتیں صرف فلموں میں دیکھنے کے عادی تھے۔

تشویش مجھے پیڈرو کی طرف سے تھی۔ کہیں عین وقت پر وہ دغا نہ دے جائے۔ یہاں وہ موقع سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ تھانے دار کا ریوالور میرے پاس تھا۔ مجھے اس بارے میں کوئی کنفیوژن نہیں تھا کہ پیڈرو نے حرامی پن کیا تو میں کیا کروں گا۔ میں اسے گولی ماروں گا اور نازو کو ساتھ لے کر بھاگ جاؤں گا۔ اس گاؤں میں میرا راستہ روکنے والا کون ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مجھے اپنا سوٹ کیس چھوڑ کے جانا پڑے گا۔ بھاڑ میں جائے سوٹ کیس۔ اس میں ایک لاکھ دس ہزار روپے ہیں اور چند جوڑے کپڑوں کے۔ ان سے ہمارا سراغ نہیں ملے گا۔ بھاگنا ذرا مشکل کام ہوگا۔ یہاں نہ کار ہے نہ رکشا ٹیکسی۔ یہاں کے لوگ سائیکلوں پر یا گھوڑے پر ہمارا تعاقب کریں گے کوئی بات نہیں۔ ہم سڑک چھوڑ کے کسی اور سمت میں نکل جائیں گے۔ وہ جب ہم تک پہنچ گئے تو انہیں کیا لتاڑیں گے۔

اچانک پیڈرو نے میرے کان میں کہا "کیا تم انہیں سب کچھ بتاؤ گے۔"

"پتا نہیں" میں نے کہا "جھوٹ بولنا بہت مشکل ہوگا۔"

"تم خود بھی پھنس جاؤ گے۔ اپنے ساتھ مجھے بھی پھنساؤ گے۔ کوئی پولیس کو بلا لے گا۔ یہ دیہاتی نہیں شہری لوگ ہیں، روز شہر جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "مگر یہ گاؤں ہے۔ یہاں کوئی کام چھپ کے نہیں کیا جا سکتا اور اگر ہم کوئی قبر کھود کے ہڈیاں نکالیں گے تو یہاں اشتعال پھیل جائے گا۔ اس کا جواز ہونا چاہیے ہمارے پاس۔ جواز بھی ایسا کہ سب قائل ہو جائیں، سب کو ہمدردی ہو ہم سے۔"

ہم اشنان کے پرانے تالابوں کے قریب سے گزرے اور دائیں جانب مڑ گئے۔ اشنان گھاٹ میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا۔ اس میں پہاڑ کی بلندی سے جس چشمے کا پانی آتا تھا وہ سوکھ گیا تھا یا اس کا راستہ بدل گیا تھا۔ مجھے پرانا مندر کہیں دکھائی نہ دیا۔ تھوڑا سا آگے جا کے مسجد آ گئی۔ اس کے احاطے سے متصل پیش امام کا گھر تھا۔ مسجد کی عمارت اینٹوں سے تعمیر ہوئی تھی اور خاصی کشادہ تھی مگر امام صاحب دو ہی کوٹھڑیوں والے گھر میں رہتے تھے۔ نازو نے مجھے بے بسی سے دیکھا مگر میں بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ایک رات بہرحال انہی لوگوں کے درمیان گزارنی تھی۔ یہ بے ضرر اور مخلص لوگ تھے۔ مہمان نوازی ان کی روایات اور سرشت میں شامل تھی لیکن ڈر ہمارے اندر تھا۔ ہم ان سے اصلیت چھپانا چاہتے تھے لیکن یہاں من مانی کرنا بھی مشکل تھا۔

مسجد کے ایک خالی حجرے میں دو چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہاں مجھے پیڈرو کے ساتھ رات گزارنی تھی۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ ہم یہاں اتنی دیر سے پہنچے۔ اگر ہم صبح آتے تو شام تک اپنا کام نمٹا کے واپس جا سکتے تھے۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ سب سے پہلے ملنے والا شخص مسجد کا پیش امام تھا۔ اس کی میزبانی کی پیشکش کو ٹھکرایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا مہمان بننا عام حالات میں اعزاز کی بات ہوتی مگر اسے دھوکا دینا اور جھوٹ بول کے شریک جرم ہونے پر آمادہ کرنا ناممکن تھا۔ اچھا ہوتا اگر ہم کسی عام دیہاتی کے گھر میں ٹھہر جاتے۔ اس کے گھر کے آنگن میں سو جاتے۔ وہ ہماری مدد کرتا اور دو چار سو یا ہزار روپے لے کر راز داری میں معاون ثابت ہوتا۔ اب ہم خدا کے گھر میں تھے اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہاں جھوٹ کیسے بولا جا سکتا ہے۔ عیسائیوں کا ایک فرقہ پادری کے سامنے جا کے ہر گناہ یا جرم کا اعتراف کر لیتا ہے۔ پادری اس کے لیے دعا کرتا ہے اور اس کے راز کو راز رکھتا ہے۔ مگر ایک پیش امام کسی جرم کی پردہ پوشی نہیں کر سکتا۔ نہ وہ کسی مجرم کو ادھ

ہے اور نہ اس کے جرم میں بالواسطہ طور پر بھی شریک ہو سکتا ہے۔

ابھی سورج غروب ہونے میں دیر تھی۔ پیش امام نے عصر کی اذان دی اور پھر نماز پڑھائی۔ موقع پاتے ہی میں نے پیڈرو سے کہا کہ اس سے کچھ بات کرنی ہے۔ وہ میرے ساتھ باہر آ گیا۔ ہم دور چل گئے اور ایک چٹان کی اوٹ میں بیٹھ گئے جہاں سے بلندی کی نشیب میں بسے ہوئے گھر، دور تک پھیلے ہوئے پہاڑ سب نظر آتے تھے۔

"اب تمہیں کچھ یاد آیا۔ وہ جگہ کس طرف ہے؟"

"ہاں۔ ہم دائیں جانب مڑ گئے تھے۔ بائیں طرف ذرا بلندی پر کچھ نشانیاں اور ملیں گی۔"

"مگر یہ کام کیسے ہوگا۔ ہمیں ایک مزدور کی ضرورت ہوگی۔ ہم کھدائی نہیں کر سکتے۔ گاؤں میں مزدور بہت۔ لیکن میں کیا بتاؤں گا کہ قبر کس کی ہے اور اگر میں اپنے والد کی ہڈیاں نکال کے لے جاؤں تو پہلا سوال یہ ہوگا کہ ہڈیاں اس جگہ دفن کرنے والا کون تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا تھا اور اب مجھے کیسے معلوم ہوا ہے۔"

"یہ سب بتاؤ گے تو مشکلات میں پھنس جاؤ گے۔ حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ ہم کسی کو کچھ بتائے بغیر بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔ وہ آبادی سے باہر ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ ناممکن ہے پیڈرو۔ کوئی دیکھ لے گا۔"

"ہم یہ کام رات کے وقت کر سکتے ہیں، آج رات۔"

"اندھیرے میں قبر کھودو گے؟"

"یہ کام مشکل ہے مگر ناممکن نہیں" پیڈرو نے کہا۔

"اگر کسی نے آواز سُن لی" میں نے کہا "اس کے علاوہ میں ہڈیوں کو اپنے ساتھ کیسے لے جاؤں گا جو ایک بوری میں ہیں۔"

پیڈرو نے سوچ کے کہا "یہ ہو سکتا ہے کہ ابھی میں اس جگہ کی نشاندہی کر دوں۔ تم بعد میں مجھے ہوٹل کے اکیلے آ جاؤ۔ کسی مزدور کے ساتھ۔ اور اپنا کام کر کے چلے جاؤ۔ اس وقت نازو کے ساتھ ہونے سے کام خراب ہوا۔"

"مجھ میں کب؟" میں نے کہا "اور تم پر میں کیسے اعتبار کر لوں کہ صحیح جگہ کی نشاندہی کرو گے۔"

"یہ گاؤں کا قبرستان تھا۔ اس کے ایک کونے میں ہم نے قبر بنائی تھی۔ جہاں دو دیواریں ملتی تھیں۔ وہاں ایک درخت بھی تھا۔ ایک ٹیک کی طرح۔ اب وہاں دوسرے درخت شہتوت کے تھے یا املی کے۔ تم دیکھ لو۔ وہ قبر شاید موجود ہوگی۔ گورکن تمہاری مدد کر سکتا ہے۔"

"اصل مسئلہ پیش امام صاحب کا ہے۔ اسے میں کیا بتاؤں گا کہ میرا سید پور آنے کا مقصد کیا تھا۔ میں مسجد میں بیٹھ کے جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"تم مسجد سے باہر آکے جھوٹ بول سکتے ہو۔"

"نہیں۔ یہ گناہ بھی نہیں ہوگا مجھ سے۔"

پیڈرو نے کہا "اچھا پھر سب مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اپنے آپ کو اور تمہیں محفوظ رکھتے ہوئے سچ بتا دوں گا۔"

"مجھ سے حمایت کی اُمید نہیں رکھنا۔ میں تمہارا دوست نہیں دشمن ہوں پیڈرو۔ تم میرے مجرم ہو اور یہاں خود کو بے گناہ ثابت کرنے آئے ہو۔"

ہم واپس گئے تو پیش امام ہمارا منتظر تھا "آپ کہاں نکل گئے تھے حضرت۔ میں نے چائے بنوائی تھی۔ آپ شہر کے لوگ اس وقت چائے پیتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ آپ کس تکلف میں پڑ گئے؟"

"ہم یہاں کھانا بھی سرِ شام ہی کھا لیتے ہیں۔ مغرب کے بعد اور عشا کی نماز پڑھ کے سو جاتے ہیں۔" وہ بولا "لیکن آپ جب چاہیں کھانا کھائیں۔ رات کو مچھر بہت ہوتے ہیں۔ ہم تو عادی ہیں۔"

"ہم بھی چادر لپیٹ کر سو جائیں گے" میں نے کہا۔

"آپ کی بہن اردو پنجابی نہیں بول سکتی۔ سمجھتی ہے تھوڑا بہت۔"

ظاہر ہے نازو نے خاموش رہنے کے لیے یہ ڈراما کیا تھا "ہاں جی۔ دراصل ہم کئی سال سے لندن میں تھے" میں نے کہا "میری یہ بہن گونگی بہری تھی۔ بچپن میں ٹائیفائیڈ ہوا تھا۔ یہاں کیس خراب ہو گیا۔ لندن میں بہت علاج کرانے سے اب کچھ سننے اور بولنے لگی ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے" وہ مطمئن ہو گیا۔

جھوٹ کی ابتدا نازو نے کی تھی اور میں اسے نباہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس وقت ہم مسجد میں نہیں تھے۔ پیش امام کے گھر کے سامنے کھلی جگہ میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن اس عذرِ گناہ سے میرے ضمیر کی خلش کم نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اپنی مجبوری پر شرمندگی بھی تھی اور میں نے دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگی کہ وہ میرے جھوٹ پر مجھے معاف کر دے۔

رات کے کھانے کے بعد میں نے پیش امام سے کہا "آپ نے ابھی تک ہم سے یہاں آنے کا مقصد نہیں پوچھا۔"

"یہاں بہت لوگ آتے ہیں۔ سیر و تفریح کے لیے۔"

"وہ رات کو یہاں قیام نہیں کرتے ہوں گے" میں نے کہا "اور ان کے ساتھ خواتین نہیں آتی ہوں گی۔"

"یہ بات نہیں حضرت۔ یہاں تو غیر ملکی بھی آتے ہیں۔ وہ اس علاقے میں تاریخی تحقیق کرتے ہیں۔ گاؤں سے باہر کیمپ لگا کے رہتے ہیں۔"

اچانک میری مشکل آسان ہو گئی تھی۔ "پھر تو آپ سب سمجھتے

www.paksociety.com

ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہاں کے لوگوں کو کیسے قائل کروں گا۔ ہم جیسے لوگ جنھیں تحقیق کرنے والے عموماً قبرستانوں میں جھانکتے نظر آتے ہیں۔ اہرام مصر کھود ڈالے تاریخ دانوں نے اور ہزاروں سال پرانی لاشیں نکال لیں۔ پھر یہاں اپنے پاکستان میں موئنجو ڈرو ہے یا ہڑپہ، چوکھنڈی کا قبرستان، تاریخ کے آثار قدیمہ کی طرح ہیں۔"

"یعنی آپ بھی گڑے مردے اکھاڑتے پھرتے ہیں حضرت۔"

"نہیں مولوی صاحب یہ مسلمانوں کے قبرستان ہیں لیکن یہ سارا علاقہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ٹیکسلا یہاں سے زیادہ دور نہیں میل ہے سڑک کے راستے۔ اصل میں اس جگہ سے چند میل بھی نہیں ہوگا۔ گندھارا تہذیب کے کچھ آثار کا سراغ یہاں بھی ملا ہے۔"

"اچھا حضرت!" مولوی صاحب کی دلچسپی بڑھ گئی "گویا یہاں سے بھی کوئی ٹیکسلا برآمد ہوگا۔ یہاں کوئی میوزیم بن جائے گا؟ اس میں مجسمے رکھے جائیں گے۔ پھر انھیں دیکھنے کے لیے دن و رات سیاح آئیں گے۔"

میں نے کہا "مولوی صاحب۔ آپ تو بہت دور کی سوچنے لگے۔"

"سوچنا پڑتا ہے حضرت۔ ابھی تک یہ گاؤں ہی ہے حالانکہ یہاں کے سب مرد پنڈی شہر میں کام کرنے جاتے ہیں اور یہاں کی عورتیں بھی نور پور شاہان والی بس میں جمعہ کے جمعہ پنڈی چلی جاتی ہیں۔ پھر بھی وہ بے حیائی نہیں ہے یہاں جس کو آپ پڑھے لکھے لوگ آزادی، ترقی یا روشن خیالی کہتے ہیں۔"

"آپ نے ٹھیک کہا۔ یہ تعلیم اپنے ساتھ بہت خرابی لائی ہے کیونکہ یہ مغربی نظام تعلیم ہمارا نہیں ہے۔"

"آپ کیا قبرستان میں ہی تحقیق کریں گے۔"

"ضروری نہیں۔ آس پاس کا سب علاقہ دیکھیں گے۔ لیکن کہیں کھدائی کرتے ہوئے کوئی قبر نکل آئی یا کسی قبر کو نقصان ہوا تو۔"

وہ فکر مند ہو گیا "دیکھیے حضرت۔ رہے ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ علم حاصل کرنے کے لیے ایک غیر جذباتی انداز اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یہ ڈاکٹر جو آج آپریشن کر رہے ہیں۔ آنکھوں کو بینائی دے رہے ہیں۔ دل کی مرمت کر رہے ہیں یہاں تک کہ دل بدل رہے ہیں۔ تو یہ سب اسی طرح ممکن ہوا کہ پہلے چوہوں پر خرگوشوں پر تجربات ہوئے۔ پھر انسانوں پر۔ پوسٹ مارٹم بھی تو ایک ضرورت ہے۔ اس سے قتل کا سراغ ملتا ہے اور مجرم پکڑا جاتا ہے۔ پوسٹ مارٹم کے لیے بھی قبریں کھودی جاتی ہیں۔ اصل مسئلہ ہے نیت کا۔ نیت اگر بے حرمتی کی نہ ہو تو میری ذاتی رائے میں قبر کھودنا اشد ضرورت کے تحت ناجائز نہیں۔ یہ ناپسندیدہ فعل ہو سکتا ہے مگر میں اسے شرع کے خلاف یا کفر قرار نہیں دوں گا۔"

"ماشاء اللہ آپ بہت روشن خیال ہیں۔"

"اسلام ہی روشن خیال دین ہے حضرت۔ اب ہم نے اپنی تنگ نظری کے باعث اس کو عام ترقی کے لیے بہت مشکل بنا دیا ہے۔ فروعی مسائل میں الجھ گئے ہیں اور فرقہ بندی کر لی ہے تو اسلام کا کیا قصور۔ میں نے تو اسلامی علوم میں اسناد بھی حاصل کی ہیں اور ایم اے بھی کیا ہے معارف اسلامیہ میں۔ لیکن یہاں کے لوگ ذرا جذباتی ہیں کیونکہ یہ قبریں ان کے عزیزوں کی یا آبا و اجداد کی ہیں۔"

"ہم کسی قبر کو نہیں چھیڑیں گے" میں نے کہا۔

"آپ کی بہن بھی ساتھ رہیں گی؟"

میں نے کہا "اصل میں تو یہ اسی کا شوق ہے۔"

"برا نہ مانیں تو کچھ عرض کروں حضرت۔ آخر اس شوق میں ایسی تعلیم کا فائدہ؟ عورتوں کو بالآخر گھرداری کرنی ہے۔ امورِ خانہ داری کے علاوہ بھی عورت کے لیے علوم ہیں۔ صحت عامہ، بچوں کی نفسیات، سماجی اور قانونی مسائل۔"

"میں آپ سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ اعلیٰ تعلیم نے تب کو یہ تعمیری سوچ عطا کی ہے۔ آپ کو تو کہیں پڑھانا چاہیے تاکہ ہمارے بچوں میں بھی وسیع النظری پیدا ہو" میں نے کہا۔

وہ بولا "ارادہ تو ہے حضرت مگر میری تنگ نظر خاندانی مجبوریاں مانع ہیں۔ خانے میں طوطی کی آواز۔ بعض فرقوں کے بعض نام نہاد علما اپنی اپنی دکان چمکا رہے ہیں۔ پتا نہیں میری سوچ پر کیسے کیسے کفر کے فتوے جاری ہو جائیں گے اس لیے یہیں عافیت ہے۔ خیر اب آپ آرام کریں۔ ہاں ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا آپ نے۔"

پیڈرو بہت پہلے ہی سو گیا تھا۔ یا سونے کی اداکاری میں مصروف تھا۔ میں نے کہا "یہ کھدائی کے ماہر ہیں۔ زمین کھودنے کا کام کوئی بھی مزدور کر سکتا ہے مگر بعض اوقات زمین کی تہ سے احتیاط سے ہٹانی پڑتی ہے۔"

پیش امام رخصت ہو گیا تو میں بھی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اگرچہ مسجد کے حجرے میں سونے تو گرمی اور حبس سے پریشانی ہوتی۔ یہ کھلی جگہ بہت بہتر تھی جو دراصل گلی تھی۔ مسجد کے صحن سے آگے مکان دور دور بنے ہوئے تھے۔ یہاں کوئی ہموار میدان نہیں تھا۔ لوگ ایک قطار میں رہ رہے تھے۔ ہر وار ملا کے مکان کھڑے کیے تھے جیسے جہاں ہموار قطعہ زمین ملا اس نے وہاں گھر بنا لیا اور جب کبھی ضرورت پڑی تو اونچی نیچی جگہ کو خود برابر کر لیا۔

پیڈرو بہت گہری نیند میں تھا اور خراٹے بھی لے رہا تھا۔ میرا اپنا حال تھکن سے برا حال تھا لیکن میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ پیڈرو کی نیت میں فتور آ جائے گا۔ جس وقت بے خبری سے سو رہے یا اس کو موقع ملے تو نقصان کا بہ ذرا یا ختم کر کے بھاگ جائے جس موقع کی تلاش میں وہ ابھی تک تھا وہ اسے میری غفلت سے فراہم ہو جائے۔ میں سو نہ جاؤں اور وہ فرار ہو جائے اس سے

کہ جاتے جاتے مجھے مار جاتے۔ نہیں "پیڈرو ایسا نہیں کرے گا۔ شاید اسے ملے ہوں گے مگر اس کا ارادہ بھاگنے کا نہیں تھا۔ وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ہمارے ساتھ آیا ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ میں اسے وہیر خان کا قاتل سمجھنا چھوڑ دوں۔ اگر اس کا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو وہ اتنے سکون سے نہ سوتا۔

میرا ذہن بڑی الجھن میں تھا۔ عقل کے دلائل دونوں طرف سے تھے۔ جسم آرام مانگتا تھا اور آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر میں نے جاگتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ اگر اس میں درست فیصلہ ہو تب بھی سونا غلط ہوگا۔ میری ساری محنت رائگاں جائے گی۔ بارات پھر ہاتھ آنا نہیں۔ دوبارہ پیڈرو کے ساتھ ادھر آنا ہو گا۔ اتنی تحقیق جھیلنے کے بعد ایک رات کی بے آرامی کیا ہے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ اس بلندی سے اسلام آباد کا اور راولپنڈی کا منظر بادِ نوشین آسمان کی طرح نظر آتا تھا۔ آس پاس صرف تاریکی تھی۔ کچے گھروں میں چراغ بھی نہیں جل رہے تھے۔ نہ جانے کب سے رنگ و بو پر گونگے ٹنڈر ہو رہے تھے کوئی شوقین مزاج نوجوان ہانک رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے بعض گھروں پر ٹی وی انٹینا بھی دیکھے تھے۔ ابھی ہم صرف بلیک اینڈ وائٹ نشریات دیکھ رہے تھے۔ ٹی وی عام نہیں تھا۔ پاک بھارت جنگ سے کچھ پہلے ہی لاہور کے پہلے ٹی وی اسٹیشن نے نشریات کا آغاز کیا تھا۔ چند سالوں میں ٹی وی سیٹ ہر گھر پہنچ گیا تھا۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ دہرا تھا۔ کچھ شوق کے مارے یہ تفریح کا سامان جیسے مصروف رہنے لگے تھے۔ اسے لہو و لعب میں شمار کرنے والے بھی بہت تھے اور اس کے دیوانے بھی۔

نازو کا ساتھ آنا ضروری تھا اور یہ اپنی افادیت کا بھرپور ثبوت دے چکی تھی۔ اس نے عبدالرحمان سے اور سراج سے ہماری شناسائی کرائی تھی۔ ان کا خیال آیا تو میں ہنس پڑا۔ سنگ جانی خانے والوں نے اب تک عبدالرحمان کو ٹیکسی سے نکال کے گھر پہنچایا ہوگا۔ اور عبدالرحمان کے گھر پہنچ کے پولیس نے کھلے دروازے کے سامنے دروازہ کھولا ہوگا۔ اسے اور اپنی سراج اور اس کی بیوی بچوں کو میں نے اتنی مضبوطی سے جوڑا تھا کہ شاید رسی کاٹنے کے بعد بھی ان کو وہ رنگ کے الگ کرنا پڑا ہوگا۔ پیوند کاری ایسی ہی ہوتی ہے۔ اگر وہ چند دن یا چند ہفتے اسی طرح گزارتے تو کیا ان کا انجام ایک ہو جاتا؟

یہ بڑا مضحکہ خیز خیال تھا۔ میں نے جڑے ہوئے آم دیکھے تھے اور ایسے بچوں کی تصویر دیکھی تھی جو پیدائش کے وقت آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ پھر کسی سرجن نے انھیں الگ کر دیا۔ ایسے بچوں کو SIAMESE TWINS کہا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟ ماضی میں ایسے بچے زیادہ ہوتے ہیں یا پہلی بار وہیں قدرت کا یہ ظہور میں آیا تھا؟ یہ سوال جواب طلب ہے۔

اچانک میری پشت پر ایک پتھر لگا تو میں اچھل پڑا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو نازو ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

"یہ کیا حرکت ہے" میں نے کہا "تم کیوں آئی ہو یہاں؟"

"تم کیوں بے چین روح کی طرح اس ویرانے میں سرگرداں ہو؟"

"مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔"

نازو نے کہا "سچ صرف دوسرے جملے میں بولا تم نے۔ میری اپنی کیفیت یہی تھی۔"

"کیفیت کی بچی۔ اندر جاؤ" یہ شہر نہیں ہے۔"

"کیا یہاں بہن بھائی باتیں نہیں کر سکتے اگر انھیں نیند نہ آ رہی ہو۔"

"لاحول ولا قوۃ" میں نے کہا "بلاوجہ شک کریں گے لوگ۔"

"کون لوگ؟ مجھے تو یہاں کوئی بھی نظر نہیں آ رہا ہے اور شک کی بھلا کون سی بات ہے۔ جسے شک ہو یہاں آ کے بیٹھ جائے" وہ میری چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"تم نے خواتین کے سامنے کیا ظاہر کیا تھا؟ یہ کہ تم نہ اردو بول سکتی ہو نہ پنجابی۔"

"وہ خواتین سو رہی ہیں۔ زور زور سے خراٹے لے رہی ہیں۔"

"میں نے بڑی مشکل سے بات سمجھائی۔ یہ کہا کہ تمھیں انفلوئنزا ہو گیا تھا۔ تم بچپن سے لندن میں زیر علاج تھیں اور اب کچھ بولنے سمجھنے لگی ہو۔ کسی نے تمھیں چناخ چناخ بولتے سن لیا تو۔"

"میں چناخ چناخ بول رہی ہوں؟ میں تو کانا پھوسی کر رہی ہوں۔ میری آواز پہنچ رہی ہے تمھارے کانوں تک۔ تم سن رہے ہو میری بات۔"

"نہیں۔ اور سننا بھی نہیں چاہتا۔ تم اندر جا کے سو جاؤ۔"

"اندر گرمی ہے اور مچھر ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم سو جاؤ تھوڑی دیر کے لیے میں تمھاری جگہ ٹہلنے کی ڈیوٹی دے رہی ہوں۔"

"خدمت مت کرو۔"

"تم خدمت کرو۔ یہ بتاؤ کہ کل کے لیے کیا طے ہوا؟"

"میں اور پیڈرو جائیں گے کھدائی کے لیے" میں نے کہا "ہم آثار قدیمہ پر تحقیق کر رہے ہیں۔ مولوی بہت پڑھا لکھا اور روشن خیال آدمی ہے۔ بات سمجھ گیا۔"

"کمال ہے۔ میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا۔ کیا میں ساتھ نہیں جا سکتی۔"

"جا سکتی ہو۔ لیکن ضرورت نہیں۔ تم تماشا بن جاؤ گی" میں نے کہا۔

وہ بولی "تماشا تو اب بھی بن رہی ہوں۔ میں سارا دن یہاں ان جاہل عورتوں کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔"

www.paksociety.com

"اچھا تو پھر جا کے سو جاؤ۔ شرط یہی ہے ورنہ۔۔۔"

"اچھا ایسا کرو۔ تین گھنٹے تم آرام کرلو۔ میں بیٹھتی ہوں دروازے کے پاس۔ کسی نے پوچھا تو کہہ دوں گی نیند نہیں آرہی تھی۔ اس کے بعد تمہیں جگادوں گی اور خود صبح تک سوتی رہوں گی۔۔۔ وعدہ۔"

"دیکھو بے ایمانی مت کرنا۔" میں نے کہا "یہ نہ ہو صبح تک میں سوتا رہوں اور تم یہاں بیٹھی رہو۔"

دروازہ کافی دور تھا اور وہاں نازو کے بیٹھے رہنے میں کوئی حرج یا شک کی بات نہیں تھی۔ میں لیٹ گیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔ نازو نے مجھے چار گھنٹے بعد رات دو بجے جگادیا اور خود سونے چلی گئی۔ ایک سے دو گھنٹے۔ یہ بات سچ تھی۔ چار گھنٹے آرام کرنے سے میری حالت میں نمایاں تبدیلی آئی۔ میں بالکل تازہ دم ہوگیا۔ اب میں اگلا پورا دن آرام سے گزار سکتا تھا۔ میری ساری تھکن دور ہوگئی تھی۔ رات کا باقی حصہ میں نے وادی اور بلندی پر گیدڑوں کی آوازیں سنتے گزارا۔ ایک گیدڑ میرے سامنے سے گزرا تو میں نے اسے کتا سمجھا۔ صرف اس کی چال پر مجھے شک ہوا اور میں نے اسے دوبارہ دیکھ کے گیدڑ قرار دیا۔ وہ اتنا بزدل بہرحال نہیں تھا جتنے گیدڑ مشہور ہیں۔ ممکن ہے کتا ہی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مجھے پیڈرو پر سخت غصہ آیا۔ اس خبیث کی وجہ سے میں جاگنے پر مجبور تھا اور وہ ساری رات مردے کی طرح پڑا رہا۔ پانچ بجے اذان ہوئی تو مجھے کچھ سکون ملا۔ حیرانی بھی ہوئی کہ صبح اتنی جلدی ہوجاتی ہے۔ شہروں میں کسی کی صبح نو بجے ہوتی ہے کسی کی دس بجے۔ ابھی اندھیرا ہی تھا کہ نمازی میرے سامنے سے گزرنے لگے۔ سلام سب کرتے تھے۔ ایک دو نے مجھے شرمندہ کرنے والی نظروں سے دیکھنے پر اکتفا کی۔ ایک بزرگ نے براہ راست شہر کے مغرب زدہ نوجوانوں کو اور بالواسطہ طور پر مجھے دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا۔ میں نے مؤدبانہ گزارش کی کہ آپ چلیں میں حاضر ہوتا ہوں۔ واپسی پر انہوں نے مجھ جیسے مردود کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ انہیں میں کیسے سمجھاتا کہ پیڈرو کو چھوڑ کے میں کہیں نہیں جاسکتا۔ تاہم مجھے اس کوتاہی گناہ یا جرم سے انکار نہیں تھا کہ عام نوجوانوں کی طرح میں بھی نماز پابندی سے نہیں پڑھتا۔

جب مکھیاں پیڈرو کو پریشان کرنے لگیں تو وہ بھی جماہیاں اور انگڑائیاں لیتا اٹھا "تم رات بھر بیٹھے جاگتے رہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ ایک ٹانگ پر کھڑا سوتا رہا۔"

وہ ہنسا "تمہیں ڈر تھا کہ میں بھاگ جاؤں گا۔"

"میں تم کو پھر پکڑ کے لاسکتا تھا۔ لیکن تم مجھے قتل کرکے بھاگ جاتے پھر" میں نے کہا۔

"اعتبار نہ کرنا تمہاری فطرت بن گئی ہے۔"

"تمہاری حد تک" میں نے کہا۔

"اگر تم اپنے ساتھ ایک ہتھکڑی لاتے۔ اس کا سرا میری کلائی میں اور دوسرا اپنی کلائی میں ڈال کے لاک کردیتے۔"

"فضول باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بھی کچھ دیر پہلے ہی اٹھا ہوں۔"

"تم اور مولوی صاحب بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر میں تو سو گیا تھا۔ اب میں غسل کرنا چاہتا ہوں" وہ بولا۔

"مسجد میں جاکے آخری غسل کرلو۔ تمہاری تو نماز جنازہ بھی نہیں ہوگی۔"

پیڈرو کا رنگ اڑ گیا۔ "ایسا مذاق مت کرو۔ مجھے مارنے کے لیے اتنی دور لانا ضروری نہیں تھا۔ کسی کو مقابلے کا موقع دیے بغیر اور اعتماد کو دھوکا دے کر قتل کرنا تمہارے نزدیک جائز ہے۔ تم نے قسم بھی کھائی تھی۔"

میں نے ہنس کے کہا "پیڈرو۔ جائز ناجائز، وعدہ خلافی اور قسم توڑنا، دشمنی میں ان کی کوئی اہمیت نہیں لیکن تم ڈرو نہیں۔ تمہیں مارنا ہوتا تو میں بہت پہلے ماردیتا۔ بے شک تم میری گرفت میں ہو لیکن وعدے کے مطابق میں تمہیں ایک موقع دوں گا جیسے نازو نے مجھے ایک موقع دیا۔ احسان کا بدلہ چکانے کے لیے۔ بازی اس کے بعد پھر شروع ہوگی۔"

صبح چھ بجے ہم ناشتے سے فارغ ہوگئے۔ اسی وقت دھوپ نکل آئی تھی۔ پیڈرو کا خیال تھا کہ پہاڑ کی اتنی بلندی کے باعث سورج یہاں بہت پہلے نظر آنے لگتا ہے۔ شہر والے دیر سے دیکھتے ہیں۔ بشارت احمد قادری حد درجہ خلیق اور فراخ دل آدمی تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن اپنے علم و فضل سے وہ بہت معتبر اور ممتاز مقام حاصل کرچکا تھا۔ اس نے بطور خاص شہری ناشتے کا بندوبست کیا تھا یعنی پراٹھا انڈا اور چائے۔ ہم نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی جو اس نے حسب توقع بڑی عاجزی سے مسترد کردی۔

"مجھے یہاں بہت مصروفیت رہتی ہے۔ صبح سے شام تک قرآن کی تدریس ہے۔ مؤذن بھی میں ہوں۔ تیسرے پہر درس الگ ہے۔"

میں نے کہا "ایک گزارش اور تھی۔"

"حکم فرمائیں حضرت" اس نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میری بہن پردہ تو کرتی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ غلط ہے۔ مگر یہاں شاید اسے زیادہ پریشانی ہوگی۔ ایک خالص علمی سطح کی تحقیق میں مصروف ہوں گے مگر کام اب سب بے کار نوجوان اور بچے ہی نہیں عورتیں بھی تماشا دیکھنے آجائیں گی۔ ایک جمگھٹا لگ جائے گا قبرستان میں۔ اگر آپ تھوڑی سی مدد کریں۔"

"کھل کر بات کیجئے حضرت۔ میں کیا کرسکتا ہوں۔"

"آپ لوگوں کو منع کرسکتے ہیں کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں اور ہمارے کام میں مخل نہ ہوں۔"

"یہ تو بہت مشکل ہے میرے لیے" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "لیکن

ترکیب ہے۔ دو لڑکے ہیں ذرا تگڑے ہوئے۔ ان سے سب ڈرتے ہیں۔ آپ خود ان سے بات کرلیں اور ان کی ڈیوٹی لگا دیں۔"

"کیا نام ہیں ان کے؟" میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کے کہا۔

"صمد اور محمود۔ سگے بھائی ہیں حضرت۔"

"اس وقت کہاں ملیں گے؟" میں نے کہا۔

"اسی گاؤں میں۔ کوئی بتادے گا کہ وہ کدھر ہیں یا انہیں خبر مل گئی تو وہ خود آجائیں گے۔ میں اب اجازت چاہوں گا۔ مسجد میں بچے درس کے لیے آگئے ہیں۔ دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہوگی حضرت۔"

میں نے کہا "آپ دوپہر کے کھانے کی فکر نہ کریں۔"

"کھانے کے بغیر تو کام بھی نہیں ہوتا حضرت۔ اگر آپ کو بہت دور نہ جانا ہو تو کسی کو ادھر بھیج دیں۔ صمد یا محمود کو۔ وہ کھانا لے جائے گا۔ یا چھوڑیں میں بھجوادوں گا کسی کے ہاتھ۔"

پیش امام کی شرافت، مہمان نوازی اور فراخ دلی مجھے زیادہ زندہ کر رہی تھی۔ عام مولویوں کی طرح نہ اس نے مجھے غیر اسلامی شعائر پر برا بھلا کہا تھا۔ نہ راتوں رات میرے اخلاق و کردار کی اصلاح فرمانے کی کوشش کی تھی اور نہ مجھ پر کسی شک شبے کا اظہار کیا تھا۔ وہ ایسا شخص تھا جو صرف قول سے نہیں بلکہ عمل سے متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور اس کا کردار یقیناً قابل تقلید تھا۔

میں نے اور پیڈرو نے صمد اور محمود کو خود ہی دریافت کیا۔ اس وقت وہ ایک اجنبی کی ٹھکائی کرکے فارغ ہوئے تھے۔ اجنبی غلطی سے ادھر جانکلا تھا جدھر عورتیں کپڑے دھوتی تھیں اور نہاتی تھیں۔ ثابت ہوا کہ وہ گاؤں کے تھانے دار بھی تھے جو خود اپنی نوعیت کا شعبہ ہوتا ہے مگر قانون کا رکھوالا کہلاتا ہے۔

محمود ہٹا کٹا لیکن قدرے احمق تھا۔ اس نے سو روپے کا نوٹ لے کے ہاتھ ملا لیا "ٹھیک ہے بابو۔"

صمد نے اسے ڈانٹا "کیا ٹھیک ہے۔ سو روپے میں سارا دن لوگوں سے لڑو اور کھجل خواری۔ لوگوں کو روکنا کوئی آسان کام ہے۔ تھانیدار ہے گا نے سوچی کے دادا کی۔ تو روک لے گا ناں۔ اور اگر کوئی مر گیا آج تو جنازہ کہاں جائے گا؟"

محمود نے کہا "کون مرا ہے آج۔ ابھی تک تو۔۔۔"

میں نے فوراً بات ختم کرنے کے لیے کہا "صمد ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے کام واقعی بہت مشکل ہے۔ چلو صمد تم خود ہی بتادو۔"

"سو میرے، سو اس کے" وہ بولا۔

"مجھے منظور ہے" میں نے ان کو سو سو کے نوٹ پکڑا دیے۔

"کیا آج کا ہی کام ہے؟" صمد بولا۔

"نہیں۔ کام ایک ہفتے جاری رہے یا ایک مہینے۔ تمہارا حساب روز کے روز ہوگا۔"

اس کے بعد ہمارے سب مسائل خود بخود حل ہوگئے۔ صمد نے گاؤں کی طرف سے آنے والے ایک راستے پر چوکی بٹھادی۔ اس کا نگراں وہ خود تھا۔ دوسری طرف سے محمود نے ناکابندی کردی۔ انہوں نے ہمیں کدال، گینتی اور بیلچہ وغیرہ بھی فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔

گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے ہمیں بہت لوگوں نے گھور گھور کے دیکھا۔ ہم شہر کی طرف سے آتے اور پکنک منانے والے ہوتے تو کسی کو دلچسپی نہ ہوتی مگر یہ بات گاؤں میں سب جان چکے تھے کہ ہم مولوی صاحب کے مہمان ہیں اور کسی خاص کام سے آئے ہیں۔ نازو نے خود کو چادر میں لپیٹ کر کسی حد تک بے پردگی کے الزام سے بچنے کی کوشش کی تھی مگر اس کا چہرہ از خود دعوت نظارہ دیتا تھا۔ نوجوانوں کی آنکھوں میں حسرت اتر آتی تھی اور بوڑھے دم بخود رہ جاتے تھے۔ ایک عورت نے دوسری سے کہا "ہائے نی یہ تو میم ہے میم" اور دوسری نے کہا "ولایت سے آئی ہے تو میم ہی ہوگی پاگل۔"

قبرستان کا احاطہ بھی مختصر تھا۔ ایک کچی پکی دیوار تھی جو ہر طرف دو سو گز تک پھیلی ہوئی تھی۔ پرانی دیوار کئی جگہ سے گر گئی تھی۔ ناہموار اور اونچی نیچی جگہ پر دیوار جیسے سیدھی اٹھائی جاسکتی تھی۔ کہیں یہ نشیب کی جانب مائل تھی تو دوسری طرف سے بلندی کی طرف اٹھتی نظر آتی تھی۔ اندر قبریں بھی بے ترتیب تھیں اور کچھ بہت اونچی تھیں تو کچھ بہت نیچے۔ جو نوجوان اور بچے ہمارے ساتھ ہولیے تھے ان کو صمد محمود اینڈ برادرز نے علاقہ ممنوعہ کی سرحد پر روک دیا اور خاصی اشتعال انگیزی کے ساتھ دفع ہوجانے کا حکم دیا۔ کچھ نافرمان اور مایوس بچوں نے اس حکم پر پوری طرح عمل نہیں کیا اور دور دور کھڑے تماش کلاٹی کرتے رہے۔ صمد اور محمود کا بیشتر وقت ان کی طرف پتھر مارنے اور انہیں ڈرانے کی دوڑ دھوپ میں صرف ہوا۔ تاہم قبرستان کی حدود کے قریب آنے کی جرأت بھی کسی نے نہیں کی۔

اس قبرستان میں شہر کی طرح کوئی بھی کُل وقتی گورکن نہیں تھا۔ جس کا کوئی مرجاتا تھا اس کے اعزا خود ہی قبر بھی کھود لیتے تھے۔ میں نے دور ہی سے جائزہ لیا تو مجھے شیشم کا واحد درخت دوسرے کنارے پر نظر آیا۔ باقی چند درخت شہتوت کے تھے یا دریک کے جو نیم ہی نظر آتا ہے۔ املی کا درخت کوئی نہیں تھا اور کیکر غالباً صاف کردیے گئے تھے۔

پیڈرو کچھ نروس تھا۔ بہت پہلے اس نے ایک سنگین جرم کیا تھا۔ گردش حالات اسے ایسے موڑ پر لے آئی تھی کہ وہ خود اس جرم کا ثبوت فراہم کرنے پر مجبور تھا۔ جب اس نے وزیر خان کی ہڈیاں کھود کے نکالی تھیں اور پھر یہاں لاکے دفن کی تھیں تو اس کے جذبات کچھ اور تھے۔ وہ طاقت اور بد معاشی کے زعم میں مبتلا تھا۔

www.paksociety.com

قبر پھر ان ہڈیوں کو کھود کے نکالتے ہوئے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اعتراف جرم کے بعد تو اسے یقین نہیں تھا کہ ہم اس سے کیے ہوئے وعدے پر قائم رہیں گے۔ شاید اس کے لیے یہ خیال زیادہ پریشان کن ہوگا کہ اپنے والد کی "ہڈیاں" دیکھ کے مجھ پر اشتعال اور جنون کا دورہ نہ پڑ جائے۔ میں غیظ و غضب کے جذبات سے مغلوب ہو کے اسے جان سے نہ مار دوں۔ اس جرم میں پیڈرو اول تا آخر شریک تھا۔ قتل کرنے والا وہ نہ سہی، دلاور کی طرح وہ بھی قتل کرانے والوں میں شامل تھا۔

میں نے کہا "پیڈرو۔ پھر سوچ لو۔ تم ہمیں ٹھیک جگہ لائے ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "یہی جگہ ہے وہ۔"

میں نے کہا "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر لاہور سے اتنی دور آنے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟ سید پور کا خیال کس کو آیا تھا؟"

"میں نے وہی کیا جو دلاور نے کہا تھا۔ اس بات کا جواب میں نہیں دے سکتا۔" پیڈرو بولا "شاید اس نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں کسی کے تصور کی رسائی بھی نہ ہو۔"

نازو نے کہا "اب انتظار کس کا ہے؟"

میں نے کہا "مزدور کھدائی کے آلات لے آئے، پھر چلتے ہیں۔"

نازو نے کہا "تم نے انہیں کتنی گہرائی میں دفن کیا تھا؟"

"زیادہ نہیں، ڈھائی تین فٹ گہرا کھودا تھا۔ وہاں کسی اور کی قبر ہوگی زمین اندر سے کھوکھلی تھی۔"

"قبر ہوگی تو اندر کسی کا ڈھانچا بھی ہوگا" میں نے کہا۔

"رات کے وقت ہم نے غور نہیں کیا۔ شاید اور کھودتے تو ڈھانچا بھی نکل آتا۔" پیڈرو نے کہا "وزیر خان کی ہڈیاں ایک بوری میں بند تھیں۔ وہ ہم نے ویسے ہی رکھ دی تھی۔"

"اور گڑھا برابر کر دیا تھا؟"

"نہیں۔ ہم نے اسے قبر کی شکل دے دی تھی۔ تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ سرہانے پتھر بھی لگا دیا تھا۔"

محمود نے کدال گینتی اور بیلچے ہمارے سپرد کرتے ہوئے کہا "ان کا کرایہ دس روپے الگ ہوگا۔ ایک دن کا۔"

میں نے کہا "محمود۔ کیا اس قبرستان میں دوسرے گاؤں کے مُردے بھی دفن کیے جاتے ہیں؟"

"ہاں۔ کبھی ادھر اُدھر کے گاؤں سے کوئی میت آ جاتی ہے۔ دراصل آس پاس پہاڑ ہیں۔ یہی ایک جگہ ہے قبرستان کی۔ جہاں قبر کھودنا آسان ہے" محمود نے کہا۔

ہم کچی قبروں کے درمیان سے گزرے۔ شہر کے لوگوں کی طرح یہاں پکی قبر بنوانے کا رواج بہت کم تھا۔ کتبے بھی وہ چار ہی نظر آ رہے تھے لیکن کچی قبروں کی دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ لوگ مرجانے والوں کو اتنی جلدی بھولتے نہیں تھے کہ موسم کی مار سے قبر کا نشان تک باقی نہ رہے اور انہیں خبر نہ ہو۔

شیشم کے درخت پر سبز ریشمی کپڑے کا ایک ٹکڑا جھنڈا ہوا سے لہراتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ قریب پہنچنے پر مجھے اس کے نیچے قبر نظر آئی جس پر سبز غلاف بھی پڑا ہوا تھا۔ غلاف کے چاروں طرف کرن تھی۔ قبر کے کناروں پر اینٹوں کا حاشیہ بنا ہوا تھا اور سرہانے یا بالیں مٹکا رکھا ہوا تھا۔ چار بانس گاڑ کے قبر کے چار کونوں پر مختلف رنگ کے جھنڈے لگائے گئے تھے۔ یہ کسی غیر معروف پیر کا مزار تھا جس کا مجاور ایک ننگ دھڑنگ مجذوب تھا۔ اس نے لنگوٹی کے نام پر چیتھڑا سا لپیٹ لیا تھا۔ میرے خیال میں وہ جوان قوی تھا کیونکہ اس کے چوڑے مضبوط جسم پر سارے بال کالے تھے۔ سر کے بالوں میں اس نے سب کچھ ڈال رکھا تھا۔ کھانا بھوسی مٹی اور آٹا۔ اس کے گلے میں ہر رنگ کے بڑے بڑے منکوں کی مالا تھی۔

میں نے کہا "بابا جی۔ یہ کس کا مزار ہے؟"

اس نے کڑک کے کہا "کیا تو نہیں جانتا نادان؟"

پیڈرو نے کہا "لیکن یہ تو وہی قبر ہے۔"

میں نے اسے بے یقینی سے دیکھا "کیا؟"

"ہاں۔ بالکل یہی جگہ تھی۔ یہاں کوئی مزار نہیں تھا۔"

اچانک نازو نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "سکندر۔ اُدھر دیکھو۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ ایک تھانے دار نائب افسر کی ماتحتی میں دو بندوق بردار پولیس مین قبرستان کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے بہت سے بچے اور نوجوان تھے جن کو محمود نے چیک پوسٹ سے آگے نہیں آنے دیا تھا۔ تھانے دار کے ساتھ خوش رفتار ہم قلوری پیش امام تھا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ آخر پولیس ہم تک کیسے پہنچ گئی۔ ہم نے اپنی طرف سے پوری احتیاط کی تھی اور کہیں بھی نقشِ پا کا سراغ تک نہیں چھوڑا تھا۔ لنگر پر تشتہ تک مٹا دیے تھے اور تعاقب کرنے والوں کو گمراہ کرنے والی نشانیاں دے آئے تھے۔

فطری طور پر مجھے یہی خیال آیا کہ کسی نے شک کی بنا پر شاید خود پیش امام نے پولیس کو مطلع کر دیا۔ وہ پڑھا لکھا اور سمجھ دار آدمی تھا۔ میری باتوں سے وہ قائل نہیں ہوا تھا لیکن اس نے اخلاق اور شائستگی کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا رویہ نہیں بدلا تھا۔ پولیس کو بلوا لیا تھا تاکہ اس پر بعد میں اعانت جرم کا الزام نہ آئے۔

اس چیک پوسٹ پر محمود تھا جو پولیس کے راستے میں حائل ہو سکتا تھا۔ اس نے خوشامدانہ عاجزی سے جو بھڑکنے بدمعاشوں کی خو ہوتی ہے۔ تھانے دار کو سلام کیا اور اس کے پیچھے آنے والوں کو روک دیا۔

دریافت کرنے چلے آئے۔ میں نے کہا کہ حضرت یہ مہذب اور تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔"

تھانے دار نے کہا "مولوی صاحب یہ بھی پڑھے لکھے بندے ہیں۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "میرا نام پروفیسر کبیر ہے۔ میرا ہیڈ کوارٹر ہے کراچی میں یونیسکو کے کمیشن برائے نادر تاریخی نوادرات میں پاکستان کا نمائندہ ہوں اور یہ میری بہن نازو رفیق۔ یہ مسٹر پیڈرو ہیں۔ مس نازلی خان۔ بہت جلد یہ ڈاکٹر خان کہلانے گی اور مجھے جوائن کرے گی۔ یہ میرے اسپیشل اسسٹنٹ ہیں شیخ۔"

انتی رولانی سے میں نے ایک ایسے ادارے کا حوالہ دیا تھا جس کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس کی جگہ تاریخ کا پروفیسر یا تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے کسی سرکاری محکمے کا افسر ہوتا تو وہ بھی کنفیوز ہو جاتا۔

تھانے دار نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور نظر نازو پر رکھی۔

میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے فرنچ میں کہا "جان چھوڑ دی اور خود بھی خیریت سے چلا جا۔" اور پھر اس کا ترجمہ کیا "اپنے وطن کے اردو پنجابی بولنا بڑا اچھا لگتا ہے۔ وہاں تو فرنچ بولنا پڑتی ہے منہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔"

تھانے دار نے سر ہلایا "بے شک جی۔ آپ کی سوچ ہے پروفیسر صاحب۔ پیرس میں رہتے ہو اور یہاں آئے ہو تو یہاں بھی خوش ہیں۔ بس ہم ذرا دیر ہیں۔"

میں نے ہمدردی سے کہا "ایسی کیا بات ہے تو فیصد"

"دیکھو لونی ہتھیلی پر جان رکھ کے پھر رہے ہیں جنگلوں میں۔ اب پتا نہیں یہ مجرم کون ہیں کہاں گئے ہیں۔ ہمیں تو آرڈر آیا ہے کہ اپنے علاقے پر نظر رکھو جو اجنبی نظر آئے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔"

میں نے تشویش کا اظہار کیا "خیر بات کیا ہے۔ کوئی سنگین واردات ہو گئی ہے؟"

"ادھر فرانس میں کوئی وزیر قتل ہو جائے تو کیا ہوتا ہے؟"

میں نے سرسری لہجے میں کہا "تفتیش ہوتی ہے جیسے کسی عام آدمی کے قتل کا معاملہ ہوتا ہے۔ قتل کسی کا بھی ہو قاتل پکڑا ضرور جاتا ہے۔"

"یہاں ایک وزیر کا قتل ہوا ہے 'بھائی' کا۔ اس کے اپنے نوکر تھے جو اسے لوٹ کے اور مار کے بھاگ گئے۔"

"اس کے اپنے بندے؟"

"ہاں۔ سنا ہے اس کے مہمان تھے" تھانے دار نے کہا "وہ لوگ تین مرد ایک لال گاڑی میں ہیں۔ وہ جو لال بیگ گاڑی ہوتا ہے۔"

"کافی سنگین" میں نے کہا۔

"چلو چھوڑو ادھر سے۔ کوئی تماشا ہو رہا ہے یہاں۔ تھانے دار صاحب کو آرام سے کام کرنے دو ورنہ سب کو پکڑ لیں گے۔"

پیچھے آنے والے مایوس ہوئے۔ محمود نے پہلے انہیں بدمعاشی کے اقتدار سے روک دیا تھا۔ اب قانون کا چمچہ بن کے۔

مزار کے مجاور ملنگ نے پہلے ہمیں اور پھر پولیس کے ساتھ پیش امام کو دیکھا تو اس نے لاتعلقی اور خیالی عارفانہ کا مظاہرہ کرنے میں عافیت دیکھی۔ بابا فقیر کو دنیا کے معاملات سے کیا سروکار۔ وہ آلتی پالتی مار کے اور آنکھیں بند کر کے فرش خاک پر بیٹھ گیا۔

اس وقت اچانک مجھے پولیس کے سروس ریوالور کا خیال آیا جو میں نے جیب میں چھپا رکھا تھا۔ یہ واحد چیز تھی جو میری پوزیشن کو قانونی طور پر خراب کر سکتی تھی۔ ایک ممنوعہ بور والے اور بغیر لائسنس کے ریوالور کا کسی کے پاس سے برآمد ہو جانا اور وہ بھی اپنے چشم دید گواہوں کے سامنے 'پولیس کو گرفتاری کا مضبوط جواز فراہم کر دیتا تھا۔ میری ہر بات جھوٹ ہو جاتی۔ تاریخ پر ریسرچ کرنے والے کو اسلحے سے کیا کام۔ جنگل اور ویرانوں میں خود اپنی حفاظت مقصود ہو تو لائسنس ہونا چاہیے اور اسلحہ بھی عام قسم کا۔ پولیس اور فوج کے زیر استعمال ریوالور میں نے کہاں سے حاصل کیا؟

ملنگ آنکھیں بند کر کے جھوم رہا تھا اور "حق اللہ" کے نعرے لگا رہا تھا۔ نازو کی اور پیڈرو کی نظریں پولیس پر تھیں۔ میں نے پیڈرو کی آڑ لیتے ہوئے ریوالور نکالا اچک کے قبر کے غلاف کا ایک کونا اٹھایا اور ریوالور کو نیچے سرکا کے غلاف برابر کر دیا۔ میری یہ حرکت کسی نے نہیں دیکھی۔ دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میں کوئی چیز اٹھانے کے لیے جھکا تھا مگر میں فوراً سیدھا نہیں ہوا۔ میں نے شلوار کا پائنچا تھوڑا سا اونچا کر کے جھٹکا۔ یوں جیسے کوئی کیڑا مکوڑا میری پنڈلی پر چڑھ گیا ہے۔ پھر میں نے موزے کو نیچا کیا اور جوتا اتار کے جھاڑا۔

پیش امام کی آواز پر میں نے سر اٹھا کے دیکھا اور جوتا پہننے لگا۔ "آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے حضرت۔"

"چھوڑیں جی مولوی صاحب۔ ایسی باتیں آپ نہیں سمجھتے" تھانے دار بولا۔

میں نے کہا "خیریت تو ہے پیش امام صاحب"

"جی حضرت۔ یہ فقیر ہے اپنا بچہ ہے۔ اسی گاؤں کے مکتب کا پڑھا ہوا۔ میرے والد مرحوم سے قرآن پڑھتا تھا۔ آج اس علاقے کا تھانے دار ہے" مولوی صاحب نے بڑے فخر سے بتایا۔

تھانے دار اب میری اور پیڈرو کی صورتوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ آنے والے سپاہی تھکے ہوئے اور بیزار سے کھڑے تھے۔

"انہیں کہیں سے اطلاع ملی تھی کہ کچھ مفرور مجرم ادھر آئے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ پیش امام صاحب کے گھر میں مہمان ہیں۔ یہ

www.paksociety.com

فقیر کی آواز بند ہوگئی۔ وہ ایک دم ساکت ہوگیا اور اس کی
پی چیرا کے ریوالور پر جم گئیں۔

"جب اس میں سے کوئی نکلتی ہے تو نواز نہیں نکلتی" نازو
نے مزید خوف زدہ کرنے کے لیے کہا "اور جسے گولی لگے اس
کی جان بھی گولی کی طرح نکل جاتی ہے۔ کوئی اندر سب جان باہر"
وہ عجیب سی منتکہ خیز آواز میں بولا "کیا ملے گا مجھے مار کے
بھی۔ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا "بابا جی۔ ہم بھی تمہارا کچھ بگاڑنا
نہیں چاہتے۔ چند سوالوں کے جواب چاہتے ہیں۔"

نازو نے ریوالور اپنے بیگ میں ڈال لیا "ہم بلاوجہ لوگوں کو
تنگ نہیں کرتے پھرتے۔ خوار دنیا کو ان کے فریب اور شر سے
باخبر لانے کے لیے ایسا کرنا عین کار ثواب ہو۔"

بڈھا نے کہا "او کے بابے یہ کیا ڈراما ہے۔ کس کا مزار ہے
یہاں تو کوئی مزار نہیں تھا۔ یہ کتبہ کس کے نام کا لگا لیا ہے؟"
میں نے کہا "تمہیں معلوم ہے یہ کس کی قبر ہے؟"
اس نے اقرار میں سر ہلایا "میرے پیر و مرشد کرامت بادشاہ
کی۔"

میں نے اس کی گردن دبوچ لی "جھوٹ نہیں چلے گا۔ ہمیں
سب معلوم ہے اس لیے آخری بار سچ بول۔ تم نے سچ نہ بتایا تو ہم
تمہیں مار کے اسی جگہ دفن کر جائیں گے۔"

نازو بولی "اور اپنا کوئی بندہ بھی بٹھا جائیں گے۔ زیادہ اچھے
گیٹ اپ میں۔ وہ تم سے زیادہ کمائی کرے گا۔ امام ہوا ہو بن جائے
گا۔"

اس نے سر ہلایا تو میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ لمبی لمبی
سانسیں لینے لگا "مجھے۔ مجھے نہیں معلوم۔"

"کیا نہیں معلوم؟"
"یہ قبر کس کی ہے۔" وہ بولا "اس رات میں قبرستان میں
سو رہا تھا جب یہاں کچھ لوگ آئے اور کسی کو دفن کر گئے۔ میں
خود جھنگ سے فرار ہو کے یہاں آیا تھا۔"
"فرار ہو کے کیوں؟"
"وہاں میں ایک خانقاہ میں تھا۔ اس کا مجاور مجھے قتل کرا رہا تھا۔
کیونکہ اس کی بیوی سے لڑ گئی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔
ایک ساتھ؟
"ہم تو بھاگ آئے۔ اس نے بیوی کو قتل کردیا ہوگا۔"
فقیر نے کہا "ہو سکتا ہے۔"
"تم فراڈی نہیں بے غیرت اور بزدل بھی ہو" نازو نے کہا۔
میں نے کہا "مزار چلانے کی ٹریننگ تم پہلے ہی لے چکے تھے۔
کتنا عرصہ رہے تھے جھنگ کی خانقاہ پر؟"
"چار سال۔"
"پھر تو سلطنت پیر بن گئے ہوگے تم" میں نے کہا "یہ خیال تو

یہاں پہنچی کیسے لیکن یہاں اظہار رائے کسی طرح بھی مناسب نہیں
تھا۔ مجھے یقین تھی جس نے بروقت خطرے سے آگاہ کردیا تھا اور
میں نے ریوالور چھپا دیا تھا۔ یہ انتہائی مشکل کام تھا اور خطرناک
بھی۔ وہ ریوالور پیڈرو کے ہاتھ میں بھی جا سکتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ
پولیس پارٹی یا ان کے ساتھ آنے والوں میں سے کسی کی نظر میری
حرکت کو تاڑ جاتی۔ پیڈرو کی آڑ میں ہونے کی وجہ سے کسی نے دکھ
نہیں دیکھا اور جو دیکھا وہ کسی طرح بھی قابل اعتراض حرکت نہیں
تھی۔

قبر کا مجاور ملنگ ابھی تک دھونی رمانے کے اسٹائل میں
آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ چالیس پینتالیس سال کا ادھیڑ عمر
شخص تھا مگر بے فکری، مفت خوری اور صحت بخش آب و ہوا میسر
ہونے سے وہ جوان لگتا تھا۔ اس کی جوانی بھی محنت مشقت کرتے
گزری ہوگی چنانچہ اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط تھے۔ درویشی کا بہروپ
بھرنے کے لیے اس نے داڑھی اور سر کے بالوں کو جھاڑ جھنکاڑ کی
طرح بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دیا تھا۔ منکے مالا میں اور بے لباسی
اس سوانگ کا ایک رواجی انداز ہے۔

اس کی پُرفریب شخصیت کا بھرم اس وقت چاک ہوا جب اس
نے اچانک آگے بڑھ کر غلاف کے نیچے سے ریوالور نکالنے کی
کوشش کی۔ نازو کی نظر سے میری حرکت پوشیدہ نہ تھی اور میری
طرح اسے بھی شک تھا کہ درویشی بھی عیاری ہے۔ گاؤں کے سادہ
لوح یا خوش عقیدہ لوگ دنیاوی معاملات کی ہیرا پھیری سے زیادہ
واقف نہیں ہوتے اور جہالت کے باعث بزدل فقیروں کی پُرفریب
شعبدہ گری کو بھی نہیں سمجھ پاتے چنانچہ وہاں دل کی مراد پوری
کرانے والے نام نہاد بنے ہوئے لوگ انہیں خوب لوٹتے ہیں اور
ایسے جھوٹے مزاروں کی صنعت روز افزوں ترقی پر ہے جہاں منت
ماننے اور نذرانے پیش کرکے امراء لوگ جھوٹے پیروں سے خدا
کے حضور اپنی دعا کو سفارش کے ساتھ پہنچاتے ہیں۔ حالانکہ خدا تو
سب کی سنتا ہے اور بلا واسطہ سنتا ہے۔

صرف نازو کی اس پر نظر تھی۔ میں اور پیڈرو دور جاتے لوگوں
کو دیکھ رہے تھے۔ فقیر اچانک چلایا تو ہم چونک کر پلٹے۔ نازو کا پیر
زیادہ تیزی سے حرکت میں آیا تھا اور اس کی ٹھوکر نے فقیر کے ہاتھ
کو ریوالور تک پہنچنے سے پہلے ہی جھٹک کر دور کردیا تھا۔ نازو ایک
کک سے کلائی توڑنے پر قادر تھی۔ اس نے احتیاط سے صرف
ہاتھ کو نشانہ بنایا تھا۔

فقیر اپنے ہاتھ کو بغل میں دبا کے کراہ رہا تھا "اوہ
اوف۔ ہاتھ توڑ دیا فقیر کا۔ خدا پوچھے گا تجھے۔"
نازو نے کہا "بابا جی۔ حکم کریں کیا چاہیے آپ کو یہ
بچے؟"

اس نے قبر پر پڑے ہوئے سبز غلاف کا کونا اٹھا کے ریوالور
نکال لیا اور اس کا رخ فقیر کی طرف کردیا۔

"ہاں جی۔ آپ ہمارے مولوی صاحب کے مہمان ہو۔ لیکن
ہماری ڈیوٹی ہے کہ اپنی تسلی کریں" اس نے معذرت خواہانہ انداز
میں کہا۔

"کیوں نہیں۔ اگر ہماری پولیس میں تم جیسے فرض شناس
نوجوان ہوں تو حالات نہ بدل جائیں اس ملک کے" میں نے کہا۔
وہ خوش ہوگیا "تلاشی کا تقاضا تو ہوں گے آپ کے پاس۔"
"کیوں نہیں۔ میرا ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہے اور مس خان کے
پاس لیٹر آف اتھارٹی ہے اس علاقے میں کھدائی کرنے کا۔
آرکیالوجی کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر عبدالودود منظر نے خود دیا ہے لیکن
سوٹ کیس میں ہے۔ ڈپٹی امام صاحب کے گھر میں....."
ڈپٹی امام صاحب نے تائید میں سر ہلایا تھا کہ سوٹ کیس واقعی
ان کے گھر میں موجود ہے۔ تھانے دار نے غالباً یہ سمجھا کہ وہ
دستاویزات موجود ہونے کی تصدیق کررہے ہیں۔
"چلو جی ٹھیک ہے۔ ایک رسمی سی کارروائی ہے۔ برا نہ مانیں
تو میں تلاشی لے لوں سب کی۔"
"ضرور۔ اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟"
ڈپٹی امام صاحب نے فوراً کہا "صرف آپ کی حضرت۔"
تھانے دار نے کہا "ہاں جی صرف آپ دونوں کی۔ لیڈی
سرچ نہیں ہے اس لیے یہ ایک طرف ہو جائیں۔"
میں نے کہا "تم چاہو تو اپنے اطمینان کے لیے گاؤں سے کسی
عورت کو بلا لو۔ مس خان کو تلاشی دینے پر اعتراض نہیں ہوگا۔"
ڈپٹی امام نے فیصلہ صادر فرمایا "اس کی ضرورت نہیں
حضرت۔ آپ کی تلاشی لینا بھی مجبوری ہے۔"
تھانے دار کے اشارے پر دونوں سپاہی حرکت میں آئے اور
انہوں نے ہماری ہر جیب خالی کردی۔ اس میں سوائے تھوڑی سی
رقم کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے مولوی صاحب اور اپنے
افسر کو دکھا کے بڑی ایمان داری اور احتیاط سے واپس ہماری تحویل
میں دے دی۔ اپنے دھرم ویر کو اور خصوصاً ڈپٹی امام صاحب نہ ہوتے
تو شاید یہ وہ مال غنیمت کو اپنی دوڑ آنے کی زحمت کا معاوضہ سمجھ کے
رکھ لیتے۔
"تکلیف معاف" تھانے دار نے مجھ سے ہاتھ ملایا "کیا آپ
کسی عورت کو جانتے ہو جو وکیل ہے۔ رابعہ، رابعہ قادری۔"
میں نے سخت حیرت کا اظہار کیا "عجیب سا نام ہے۔ قادری
ہوگا۔"
ڈپٹی امام بشارت احمد قادری نے بھی کہا "قادری ہو سکتا
ہے۔"
"رابعہ قادری کو جانتے ہو؟"
"ہاں۔ میرے کولیگ ہیں۔ انڈیا کے پروفیسر حق نواز قادری۔
ان کی بیٹی ہے۔ بہت بیچاری سی گھریلو ہوگیا ہے بیچاری کو۔"
"ارے سکندر بخت مرزا غالب؟"

"مرزا غالب۔ تھانے دار... ان کو تو مرے ہوئے بھی زمانہ
ہوگئے۔ بڑے نامور شاعر تھے۔..." ڈپٹی امام نے کہا۔
"پتا نہیں جی۔ ہمیں تو یہ نام لکھوائے گئے تھے۔ خیر" اس
نے رخصت ہونے کے لیے مجھ سے مصافحہ کیا اور پھر احتراماً
سے۔ اسی وقت نازو نے ایک حرکت کی۔ اس نے تھانے دار
ہاتھ ملا لیا۔ یوں جیسے وہ عادی ہے۔
میں نے اسے سرزنش کی دھمکی خان۔ میں کئی بار دہرا تا
تھیں کہ ہم پاکستان میں ہیں۔ BE VERY CAREFUL
مولوی صاحب کی صورت پر عیاں ناپسندیدگی کے جذبات
کم ہوئے مگر تھانے دار مسکراتا ہوا گیا۔ شاید وہ نازو کے نازک
ہاتھوں کے لمس کے احساس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مگر اگر
انہی ہاتھوں کی نزاکت میں پنہاں ہلاکت خیز قوت کا مشاہدہ کرنے
کا موقع ملتا تو اس کی حیرت کا ٹھکانہ نہ ہوتی۔
محمود کی جیپ پوسٹ سے کچھ فاصلے پر سڑک پر کھڑی تھی اس کے
ارد گرد بے کار دیہاتیوں اور فضولی بوڑھوں کا ایک ٹولہ اب بھی کھڑا
تھا۔ ان سب کو خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ کسی سنسنی خیز ڈرامائی
ڈرامائی انجام میں ہماری گرفتاری کے منتظر تھے۔ جیسا کہ فلموں
میں ہیرا پھیری ہوتے دیکھا۔ پولیس کی آمد نے سب کو ہی تماشے
کا موقع فراہم کردیا تھا لیکن وہ فلمی نظریات پر زیادہ انحصار کرتا
تھا۔ ایک یہ کہ ہم ہیروں کے بین الاقوامی اسمگلر ہیں۔ دوسرا یہ کہ
ہیرے جواہرات اس دور افتادہ مقام پر دفن کرنے آئے تھے یا
ہمیں یہاں کسی مدفون خزانے کا سراغ ملا تھا اور ہم چوری چھپے
اسے نکال کر لے جانا چاہتے تھے۔ خزانہ کسی بادشاہ کا بھی ہو سکتا
اور کسی ڈاکوؤں کے گروہ کا بھی۔
جب یہ ہنگامہ فرو ہوا اور ہمارا تماشا بنانے والوں سے بچ
والوں تک سب ہی چلے گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے
ہماری عزت رکھ لی۔ اس گاؤں کے تھانے دار کو بہت کم تفصیل
فراہم کی گئی تھیں اور وہ ہمارے کارناموں سے بھی ناواقف تھا۔
ڈپٹی امام صاحب کا مہمان ہونے سے ہم معتبر بھی ہوگئے تھے ورنہ
پولیس والوں کی نظر نے بھی ہمیں شک کی اس نظر سے نہیں دیکھا
جس سے ان کو ساری دنیا مجرم نظر آتی ہے۔ اگر ہم چوری چھپے اس
گاؤں سے اور کہیں قیام کرتے اور پُراسرار انداز میں قبرستان میں
مصروف کار نظر آتے تو صورت حال یقیناً بہت مختلف ہوتی۔ یہ
معاملہ سرسری تفتیش سے ختم نہ ہوتا اور ہمیں تھانے ضرور جانا
پڑتا یا جان چھڑانے کے لیے دس بیس ہزار قربان کرنا پڑتا۔ اس کے
باوجود ہم اپنا کام اطمینان سے نہ کر پاتے لیکن ہم سرخرو ہی لوٹ
آئے تھے۔ ہم نے اپنے سُرغ رسانی کے کام کو یوں مشتبہ نہیں رکھا تھا۔
ہماری خوش قسمتی تھی کہ جس نے ڈپٹی امام کو ہمارا میزبان بنا کے بھیج
دیا تھا۔
حیرانی اس بات پر مجھے بھی، مجھ دو سے کو ہوئی کہ پولیس

www.paksociety.com

آنا ہوگا تمہارے دل میں کہ مجاور کو قتل کردو تو دونوں چیزیں تمہاری ہو سکتی ہیں۔ مزار بھی اور روپیہ بھی۔"

وہ خاموش رہا اور کچھ دیر بعد بولا "وہ اس گاؤں کے لوگ نہیں تھے۔ شہری لوگ تھے۔ میں نے ان کا حلیہ دیکھ لیا تھا۔"

"تم انہیں پھر دیکھو گے تو پہچان لو گے؟" یہ سوال پیڈرو نے کیا۔

"نہیں۔ اندھیرا تھا اور میں بہت دور تھا۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "ان کے جاتے ہی تمہیں یہاں مزار بنانے کی سوجھی؟"

"ہاں۔ گاؤں کے لوگ ہر جگہ ایک سے ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چالاکیوں کو کرامات سمجھ لیتے ہیں۔" وہ بولا "میں نے راتوں رات وہاں ایک قبر بنادی۔ جو لوگ یہاں کسی کو دفن کر گئے تھے انہوں نے مٹی کا ڈھیر برابر کردیا تھا۔ میں نے اس کو اونچا کرکے چاروں طرف اینٹوں کا احاطہ سا بنا دیا۔ اس کے لیے اینٹیں میں نے قبرستان کے اندر سے ہی جمع کی تھیں۔ قبر کو میں نے گارے سے لیپ پوت کے برابر کیا اور اگلے دن صبح صبح شہر سے یہ غلاف وغیرہ لے آیا اور دوسری ضروری چیزیں۔"

نازو نے دلچسپی سے پوچھا "مثلاً؟"

اس نے ضروری چیزوں کی تفصیل بتائی "ایک تو یہ ریشمی غلاف۔ اس کا رنگ اب اڑ گیا ہے۔ نیا تھا تو شکارے مارتا تھا۔ یہ جھنڈے اور کچھ خاص لباس۔ پیروں کی کرامات کی شہرت ہو تو بزنس چلتا ہے۔"

"تم جیسے لوگوں کو گولی ماردینی چاہیے جنھوں نے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کردیا ہے اور اصل دین سے دور کرکے اپنا الو سیدھا کررہے ہیں۔" نازو بولی۔

"اپنا الو سب سیدھا کررہے ہیں۔ کیا بزنس مین اور کیا سیاست دان۔ فراڈ کس پیشے میں نہیں ہے؟ حلال کی جائز آمدنی کس کی ہے؟"

میں نے کہا "لیکچر مت دو۔ یہ بتاؤ کہ تم نے کیا چکر چلایا تھا؟"

اس نے بتایا کہ ایک رات وہ سراپا کفن جیسا سفید لباس پہن کے لمبی سفید داڑھی لگا کے قبرستان کے اس گوشے میں درخت پر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنی ٹانگ سے ایک ٹارچ باندھ لی تھی۔ اس کا رخ اوپر کی طرف تھا۔ ٹارچ روشن ہونے سے سفید لباس کے اندر سے روشنی پھوٹنے لگی اور جو لوگ ادھر سے گزرے انہوں نے تاریکی میں ایک نورانی ہیولے کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ ہوا میں بلند ہوتے تھے اور وہ کہتا تھا "بری امامؒ کے غلام کا تم پر سلام ہے۔"

صبح تک یہ بات گاؤں میں پھیل گئی۔ نورانی ہیولے کو دیکھنے والوں میں دو نوجوان تھے۔ ان کو ناقابلِ اعتبار سمجھا جاسکتا تھا مگر ایک بچے نے اور گاؤں کی ایک عورت نے بھی گواہی دی کہ یہ سچ ہے۔ لوگ قبرستان کی طرف گئے تو قبر کو دیکھ کر حیران رہ گئے جس پر سفید گوٹے والا سبز غلاف پڑا ہوا تھا اور سرہانے کتبے پر لکھا ہوا تھا "بری امامؒ کا غلام بندۂ بے دام سید کرامت بادشاہ" اس پر پچاس سال پہلے کی تاریخ وفات درج تھی اور کتبہ بھی بہت پرانا تھا۔ سارا دن گاؤں میں اس بات کا چرچا رہا۔ ایک نورانی ہیولا دیکھنے والوں نے سنا تھا کہ وہ خود کو بری امامؒ کا غلام کہہ رہا تھا۔ قبر پر جانے والوں کو عجیب سی سحر آفریں خوشبو کی لپٹیں بھی محسوس ہوئیں۔ یہ خوشبو قبر کی مٹی سے اٹھ رہی تھی۔ دوسرے دن پھر ایک نیا تماشا ہوا۔ کچھ لوگوں نے اسی نورانی ہیولے کو فضا میں معلق دیکھا۔ وہ پیپل کے پیڑ کے نیچے ہوا میں زمین سے آٹھ دس فٹ اوپر کھڑا ہوا تھا۔ اس کا لباس وہی کفن جیسا تھا۔ بے داغ سفید اور اس میں سے روشنی نکل رہی تھی۔ یہ کرامت دکھانے کے لیے اس نے کالے رنگ کی رسی استعمال کی تھی جو رات کے اندھیرے میں نظر نہیں آسکتی تھی۔ رسی اس کے بغل سے گزار کے درخت کی شاخ میں باندھ دی تھی۔ ایسے لٹکنا آسان کام نہیں تھا مگر وہ باآواز بلند تلاوت کرتا رہا اور وہاں سے گزرنے والوں کو ہاتھ ہلا ہلا کے وہی بات کہتا رہا "بری امامؒ کے غلام کا تم سب پر سلام ہے۔" اس کے دونوں ہاتھ ہوا میں ایسے لہراتے تھے کہ لگتا تھا وہ پرواز کررہا ہے۔ کالی رسی اس کی بغل کے نیچے تھی اور کمر کی طرف سے درخت کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ رسی کسی نے بھی نہیں دیکھی اور خوف زدہ لوگ دور ہی سے یہ کرشمہ دیکھ کے گاؤں کی طرف دوڑے تاکہ دوسروں کو بھی ساتھ لا کے یہ نظارہ دکھائیں۔ رات کے وقت ادھر آنے کی ہمت بہت کم لوگوں نے کی۔ پیش امام صاحب کا ان باتوں پر اعتقاد نہیں تھا۔ وہ چند عمر رسیدہ افراد کے ساتھ لالٹین لے کر قبرستان کی طرف گئے۔ نورانی ہیولا انہیں دور سے ہی فضا میں معلق نظر آیا۔ ڈرے تو دور ہی سے لوٹ گئے۔ وہ چار آگے بڑھے تو اچانک وہ روشنی غائب ہوگئی۔ اس چالاک شخص نے کفن کے اندر جلنے والی ٹارچ لائٹ بجھادی تھی اور لوگوں کو قریب آتا دیکھ کے رسی کے سہارے درخت پر چڑھ گیا تھا۔ اوپر پہنچ کے اس نے رسی کھولی اور اپنا کفن اتار کے زیادہ بلندی پر گھنے درخت کی شاخوں اور پتوں میں روپوش ہوگیا۔ پیش امام صاحب نے درخت کے نیچے جاکے لالٹین کی روشنی میں ہر طرف دیکھا مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک روشن ہیولے کے وجود کو سب کے ساتھ انہوں نے بھی دیکھا تھا۔ اس کی آواز بھی سنی گئی۔ وہ واقعی ہوا میں کھڑا ہوا تھا اور اچانک غائب ہوگیا تھا۔ نہ وہ کسی کو قائل کرسکے اور نہ کسی نے ان کی مانی۔ اس علاقے کے لوگوں کا بری امامؒ پر بہت اعتقاد ہے اور ان کا سالانہ عرس بڑی دھوم دھام سے نور پور شاہاں میں ان کے مزار پر ہوتا ہے۔ اس میں تقسیم ہند سے قبل بھی لوگ ہزاروں میل کا سفر طے کرکے آتے تھے اور آج بھی یہ جگہ مرجع خلائق ہے۔ ان کے غلام سید کرامت بادشاہ کا نام کیسے نہ چلتا۔ اس واقعے کی شہرت گرد و نواح کے دیہات تک ہوگئی۔ لوگ اگلی رات سے وہاں دیے روشن کرنے لگے اور مر...

فقیر سمجھ چکا تھا کہ سچ بتانے سے بچا جاسکتا نہیں۔ اتنے عرصے بعد مزار کی اصل حقیقت جاننے والے اس کی شناخت والے افعال بن کے پہنچے تھے اور اسے دونوں طرف سے خطرہ لاحق تھا۔ ایک طرف ہارا ہوا مجاور جانا تھا تو دوسری طرف اس کو جعلسازی کا معاملہ پکڑے جانے کے بعد عقیدت مندوں سے اندیشہ تھا کہ جوتے مار مار کے وہاں سے سارے نذرانے وصول کرلیں گے۔ "کاروبار ٹھپ ہوجاتا" بہرحال اسے جان کے لالے پڑگئے تھے۔

اس نے اعتراف جرم کے بعد پوچھا "یہاں آپ کے کوئی عزیز دفن تھے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اور وہ کوئی پیر فقیر نہیں تھے۔ عام آدمی تھے۔"

وہ ڈر کے خوشامد پر اتر آیا "اے بھوجی؟ میں نے کوئی بے حرمتی والی بات نہیں کی۔ میں نے تو ان کی قبر کو عزت دی۔"

میں نے اس کے الٹا جھانپڑ مارا "قبر کو عزت دینے والا تجھے کس نے بنایا۔ دنیا میں ان کی عزت تھی اپنے کردار سے اور آخرت میں کام آئیں گے ان کے اعمال۔ جو کچھ تو یہاں کررہا تھا وہ ان کی روح کے لیے باعث آزار ہوگا۔"

وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ "مجھے معاف کردو۔ میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔"

میں نے کہا "ہم ہے تو ہم نہیں جانے دیں گے تجھے۔ ہم اپنا جرم معاف کرسکتے ہیں۔ جو تو نے اس گاؤں کے لوگوں کے ساتھ کیا اس کی معافی انہی سے مانگنا۔"

"وہ بہت ماریں گے مجھے۔ منہ کالا کرکے گدھے پر بٹھائیں گے۔"

"مال بھی بہت کھایا تھا انہوں نے۔ جس کے مقدر میں رسوائی ہو اسے کون بچا سکتا ہے۔"

نازو نے کہا "انہیں چھوڑ دیا تو تم کہیں اور جاکے یہی فراڈ کرو گے۔"

وہ کان پکڑ کے بولا "میری توبہ جی۔ آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔"

میں اس کی منت سماجت سے متاثر ہونے یا قسموں وعدوں سے چکر میں آنے والا نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ سارے گاؤں والوں کو یہاں جمع کرلوں۔ پیش امام سے کہوں کہ وہ سارے چشم دید گواہوں کو ضرور لائیں جنھوں نے قبرستان میں ایک کفن پوش روشن ہیولا لٹکا ہوا یا ہوا میں کھڑا دیکھا تھا۔ مجاور بن کے بیٹھنے والا خود ان کو اپنی شعبدہ بازی کا کچا چٹھا سنائے اور گاؤں کے لوگوں کی آنکھوں پر بندھی ہوئی عقیدت کے اندھے جذبات کی پٹی اتر جائے تو انہیں اس شخص کا اصل روپ نظر آئے جس نے بری امامؒ جیسی برگزیدہ شخصیت کے نام کو اپنے مذموم کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا۔

مانگنے کے لیے آنے لگے۔ مجاور بن کے بیٹھنے والا جمعرات کی شام کو گاؤں میں نمودار ہوا۔ اسی حلیے میں جو اب نظر آرہا تھا۔ وہ گاؤں کی گلیوں میں لوگوں سے پوچھتا رہا "ارے کسی نے میرے کرامت بادشاہ کو دیکھا ہے۔ بری امامؒ صاحب نے کہا ہے کہ وہ سید پور میں ہیں۔" ظاہر ہے جن لوگوں نے اس کی شعبدہ گری کا تماشا دیکھا تھا وہ پہلے ہی عقیدت کے جذبات سے مغلوب تھے۔ ایک فقیر جب نعرۂ مستانہ لگاتا ہوا قبرستان کی طرف گیا تو وہ اس کے پیچھے ہولیے۔ فقیر نے قبرستان کے اس گوشے میں پہنچتے ہی دیوانہ وار رقص کرتے ہوئے کہا "مل گیا۔ میرا کرامت بادشاہ مجھے مل گیا۔ میں آگیا کرامت بادشاہ۔ بری امامؒ کے غلام کا غلام آگیا۔"

بعد میں اس نے مشہور کیا کہ سید کرامت بادشاہ کو بری امامؒ صاحب کے خاص مریدوں کا درجہ حاصل تھا اور وہ ان کے حکم پر بنگال چلے گئے تھے۔ ان کا وصال کلکتہ میں ہوا تھا اور وہ دفن بھی وہیں تھے۔ ان کے ہزاروں عقیدت مند ہیں لیکن بدبخت اور بدکردار ہندوؤں نے مزار شریف کے ساتھ کالی کا مندر بنانے کا قصد کیا تو بری امامؒ نے ان کو کفر و شرک کی نجاست سے دور اس مقام کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا جو اسلام کے نام پر آباد کیا گیا تھا۔ سید کرامت بادشاہ اپنے مرقد کے ساتھ پرواز کرکے یہاں تشریف لے آئے۔ یہ سید پور والوں کی خوش قسمتی ہے۔ وہ اپنے پیر و مرشد بری امامؒ کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونا چاہتے تھے لیکن عذاب کے باعث نور پور شاہاں کو اپنا مسکن نہیں بنا سکتے تھے۔ کلکتہ والے ان کے مزار کو نو پید شاری درگاہ کہتے تھے لیکن ان کی بدقسمتی نے انہیں اپنے پیچھے ہوئے بزرگ کے سایۂ رحمت سے محروم کردیا۔ یہ باتیں بہت جلد مشہور ہوگئیں اور لوگوں کی اکثریت نے ان پر آنکھ بند کرکے یقین بھی کرلیا۔ تحقیق کون کرتا کہ تاریخی اعتبار سے یہ کس حد تک درست ہے۔ کلکتہ اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا شہر تھا۔ وہاں جاکے تصدیق کون کرتا کہ نور بادشاہ کی درگاہ کہیں تھی یا نہیں تھی۔ پیش امام صاحب کے سمجھانے کا بھی جاہل لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ مزار پر آنے والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ مجاور کبھی کبھی کوئی شعبدہ گری کا کمال بھی دکھا دیتا تھا اور بہت جلد مزار کی تعمیر کا آغاز کرنے والا تھا تاکہ عرس مبارک دھوم دھام سے ہو۔

اس کی روداد میں کوئی بات انوکھی اور چونکا دینے والی نہیں تھی۔ خدا رسیدہ بزرگان دین کبھی نام و نمود اور کشف و کرامات کی نمائش میں ملوث نہیں ہوتے اور نہ انہوں نے کبھی مریدان باصفا سے بالواسطہ طور پر بھی یہ چاہا کہ بعد از مرگ وہ ان کے مزار کو دنیاوی خواہشات کی تکمیل کا وسیلہ اور کاروبار بنالیں۔ شاید انہیں علم ہوتا کہ مرید ایسا کریں گے تو وہ سختی سے انہیں منع بھی کرجاتے مگر اب ہر گاؤں اور شہر میں جعلی پیر اسی طرح روحانی مسائل کا علاج کررہے ہیں جیسے جعلی ڈاکٹر جسمانی امراض کا۔ ذہنی و جسمانی روگ میں مبتلا مایوس اور بے خبر آدمی آسانی سے ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔

www.paksociety.com

مشکل یہ تھی کہ اس کے بعد خود میں اپنی پوزیشن کی وضاحت کیسے کروں گا۔ میں نے پیش امام سے کچھ اور کہا تھا۔ پیر وہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اگر میں نے اعتراف کر لیا اور معافی بھی مانگ لی کہ ضرورت اور مصلحت کے تحت میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا تو سچ جان کے بھی اسے خوشی نہیں ہوگی اور وہ ایسے بات ختم نہیں کرے گا کہ اچھا بھئی، سب ایک دوسرے کا کہا سنا معاف کرو اور جاؤ اپنے اپنے راستے۔ گاؤں والے اپنے گھر جائیں۔ تم اپنا راستہ پکڑو۔ مجاور صاحب اور آپ لوگ جو یہاں تاریخ پر تحقیق کرنے آئے تھے، اپنے والد مرحوم کی ہڈیاں لے کر لوٹ جائیں اپنی دنیا میں۔ یہ پولیس کیس تھا۔ پیش امام کسی معاملے میں ملوث نہ ہوتا۔ وہ کہتا کہ جب پولیس آجائے تو آپ اس جعلی پیر کو ان کے حوالے کریں اور پھر قانون کے مطابق اجازت حاصل کر کے قبر کھودیں۔ پوسٹ مارٹم کرائیں اور مجرم کے ساتھ جو کچھ ہو قانون کے مطابق ہو۔ مجرم کون ہے، یہ فیصلہ کرنا بھی قانون کا کام ہے۔

خود پیش امام یا گاؤں والے ہمیں ہرگز اجازت نہ دیتے کہ ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جو چاہیں کریں۔

میں نے نازو سے مشورہ کیا تو اس کی رائے بھی میری رائے سے مختلف نہیں تھی۔ "ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔"

"یعنی اس خبیث کو ایسے ہی چھوڑ دیں۔"

"اور کیا کر سکتے ہیں ہم۔ نہ ایسے لوگ ختم ہوں گے اور نہ ان کے دھندے۔" نازو نے کہا "جب تک بے وقوف زندہ ہیں ایسے ٹھگ انہیں لوٹتے رہیں گے۔"

"پھر کیا کریں، اس سے کہیں کہ دفع ہو جائے؟"

"اس سے بہتر ہے کہ بطور سزا... اسی سے قبر کھدوا لو۔ یہ یہاں کے راستوں سے واقف ہوگا۔ اس سے کہو کہ پوری شہر جانے والے راستے پر پہنچا دے، اس کے بعد جہاں چاہے جائے۔ واپس آ کے اپنی دکان پھر جمالے یا خالی قبر میں خود دفن ہو کے کسی اور کو مجاور بنا دے، ہمیں کیا؟"

پیڈرو نے کہا "اگر اس معاملے میں پولیس آگئی تو اس جعلی پیر سے زیادہ تم پھنس جاؤ گے سکندر بخت۔ خود غور کرو کہ تمہاری اپنی پوزیشن کیا ہے۔"

میں دشمنی ہونے کے باوجود اس کی رائے کو مسترد نہ کر سکا۔ بے شک میں نے جعلسازی سے دنیا کو لوٹا نہیں تھا مگر قانون کی نظر میں ایک جعلی پیر کا حلیہ بنانے والا اور ایک جعلی فرنچ وکیل کے جرم کی نوعیت برابر تھی۔ دوسرے معاملات میں بھی جعلی پیر کے جرائم کی نوعیت اتنی سنگین نہیں تھی جتنی مجھ پر پہلے سے قائم مقدمات کی۔ اگر اس پیر کو پتا چل جاتا کہ میں ہی سکندر بخت ہوں جس کے خلاف میر شرافت کے قتل کا بڑا مقدمہ ہنوز تصفیہ طلب ہے کیونکہ میں ضمانت پر رہائی کے بعد بھاگ گیا تھا اور پولیس کے ریکارڈ میں آج بھی میرا نام مفرور مجرمان کی فہرست میں شامل ہے تو الٹا وہ مجھے بلیک میل کرتا۔

وہ بڑی التجا بھری اور پُرامید نظروں سے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کے کہا "پیری فقیری کے علاوہ تم کیا کر سکتے ہو؟"

"میں سب کچھ کر سکتا ہوں جی۔ بس آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔ خلق خدا کو اور خدا کو دھوکا نہیں دوں گا۔"

"اسی لیے پوچھ رہا ہوں کہ ہم تمہیں ایک شرط پر یہاں سے جانے دیں گے۔ تم حلف اٹھاؤ گے کہ دوبارہ یہ دھندا کبھی نہیں کرو گے۔"

"ایک بار نہیں جی۔ دس بار حلف اٹھانے کو تیار ہوں۔"

حلف تو ایک بار بھی بہت ہوتا ہے۔ عام طور پر قسم توڑنے کا کفارہ اسی دنیا میں ادا کر کے عہد شکنی کی زیادہ سخت سزا سے بچا جا سکتا ہے جو اسے دوسری دنیا میں ملے گی۔ حلف اٹھانے کے بعد وہ خدا سے وعدہ شکنی کا تصور بھی نہیں کر سکتا مگر جھوٹے لوگ وہی ہوتے ہیں جو دس بار حلف اٹھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں کیونکہ وہ بندوں سے جھوٹ بولنے کو بھی اتنا ہی آسان سمجھتے ہیں جتنا خدا سے جھوٹ بولنا۔

دس بار حلف اٹھانے کی بات جعلی پیر نے جذباتی ہو کے کہہ دی تھی۔ میری بات اس کے لیے معافی کے اعلان اور اس خوش خبری کے مترادف تھی کہ ہم نے اسے کوئی سزا نہ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مجھے اس جھوٹے اور لعنتی شخص کو سزا دیے بغیر چھوڑ دینے کا ملال تھا۔ وہ لوگوں کے جذبات کا استحصال کرتا تھا۔ ان کی زندگی کی مایوسیوں اور ناکامیوں، حسرتوں اور امیدوں کے بدلے انہیں ایک پُرفریب دعا کے ذریعے یہ گارنٹی فراہم کرتا تھا کہ اب ان کے سارے دکھ خوشی میں بدل جائیں گے۔ سب ناکامیوں کے بدلے کامیابی حاصل ہوگی۔ ہر خواہش پوری ہو جائے گی اور جائز ہو یا ناجائز۔ خدا ان کی ہر تمنا پوری کرے گا۔ ان کے ہر خواب کو تعبیر مل جائے گی خواہ اس کا تعلق زر، زمین یا زن کی ہوس سے ہو یا نفرت، خونریزی اور شیطانی جذبات کی بالادستی سے۔ اس کارنامے کے معاوضے میں وہ غریب آدمی کا تمام عمر کا اندوختہ بھی لے سکتا تھا۔ اس کی حق حلال کی ساری کمائی بھی مانگ سکتا تھا اور کسی مجبور عورت کا سرمایۂ حیات اس کی عزت بھی لوٹ سکتا تھا لیکن تقدیر نے ہر انسان کو دکھ اور غم سہنے ہیں تو اس کا درماں اور مداوا بھی فراہم کیا ہے۔ دعا کے ساتھ دنیا پر بھروسا کرنے کے لیے عقل کی راہنمائی بھی عطا کی ہے مگر بدبخت انسان خود ہی نادانی اور جہالت کے اندھیرے غار میں بھٹکنا چاہے تو اس کو تباہی سے کون بچا سکتا ہے۔

"چار سال تم نے جنگل کی کسی خانقاہ میں بسر کیے۔ سال بھر یہاں ہونے کو آیا۔ اس سے پہلے تم کیا کرتے تھے؟"

"میں نے بہت پاپڑ بیلے تھے جی۔" وہ افسردگی سے بولا "بابا کا چھوڑا ہوا تانگا چلاتا تھا۔ تانگے کی ٹکر ایک ڈپٹی کمشنر کی گاڑی سے ہوگئی۔ ساری غلطی اس کے ڈرائیور کی تھی مگر اس کی خوب صورت اور قیمتی گاڑی کا بہت نقصان ہوا تھا۔ پولیس نے مجھے پکڑ لیا اور کہا کہ مرمت پر پانچ ہزار کا خرچہ ہوگا۔ میں پانچ ہزار کہاں سے لاتا۔ میں نے ان کی منت سماجت کی کہ مجھے صاحب یا بیگم صاحبہ سے ملوا دو۔ میں ان کے پاؤں پڑ کے معافی مانگ لوں گا۔ رحم کی بھیک مانگ لوں گا لیکن پولیس والے اپنے چکر میں تھے۔ انہوں نے مجھے بہت مارا اور ڈی سی سے نہیں ملنے دیا۔ مجھے یقین ہے کہ اتنا بڑا افسر اتنا بے رحم نہیں ہو سکتا کہ کسی غریب سے اس کی روزی بھی چھین لے اور اسے جیل بھی کرا دے۔ اس کو خدا نے سب کچھ دیا تھا۔ وہ ضلع کا حاکم تھا۔ اپنی جیب سے ایک پیسہ خرچ کیے بغیر جہاں سے چاہتا اپنی گاڑی ٹھیک کرا لیتا۔ سرکاری خرچ پر وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ میں اسے بتاتا کہ غلطی میری نہیں تھی، اس کے پاؤں میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ وہ میرا تانگا گھوڑا مجھے واپس دلوا دیتا لیکن پولیس کو ڈی سی صاحب کے ڈرائیور نے کہا کہ ایسا نہ ہو یہ مجھے نوکری سے نکلوا دے۔ پولیس نے مجھ پر شراب کے نشے میں تانگا چلانے کا کیس بنا دیا۔ یہ لکھ دیا کہ میں رانگ سائیڈ پر تھا اور مجسٹریٹ نے مجھے تین مہینے کے لیے جیل بھیج دیا۔ تین کے بجائے میں چھ مہینے میں باہر آیا تو نہ تانگا تھا نہ گھوڑا۔ میں نے لاہور کے اسٹیشن پر قلی بننا چاہا تو ٹھیکے دار بیچ میں آ گیا۔ اس نے پانچ سو پہلے مانگے اور پھر مہینے کے سو روپے۔ میں نے ٹرین میں مسافروں کو نمکین دال مونگ بیچنے کی کوشش کی تو ڈائننگ کار والے اور اسٹیشن پر کھانے پینے کی چیزوں کے ٹھیکے داروں نے مجھے پکڑ لیا کہ ہمارا دھندا خراب کرتا ہے۔ پشاور سے کراچی تک کہیں تو نے دال مونگ یا نمکین دیکھا ہے کسی اسٹال پر یا کسی وینڈر کے پاس۔ انہوں نے مجھے چور بنا کے ریلوے پولیس کے حوالے کر دیا اور وہاں میں نے چند دن گزارے۔ بس وہیں سے میری لائن غلط ہو گئی۔ ایک کانسٹیبل میرے گاؤں کا نکل آیا اور اس نے مجھے بہت سے کام سکھا دیے۔ میں ٹکٹوں کی بلیک کرتا تھا۔ ٹکٹ خود کانسٹیبل خریدتا تھا اور میں یہ ٹکٹ آخری وقت میں آنے والے مسافروں کو زیادہ قیمت پر بیچ دیتا تھا۔ ایسے مسافروں کو تاڑنا ہی اصل کام تھا۔ ضرورت مند منہ مانگی قیمت ادا کر دیتے تھے۔ میں وہاں واشنگ لائن سے برتھ پکڑ لیتا تھا اور پچاس روپے کھرے ہو جاتے تھے۔ یہ کام سب کی ملی بھگت سے ہوتا تھا جن میں ریلوے کے بکنگ کلرک سے لے کر افسران تک سب شامل تھے۔ اگر میں سو کماتا تھا تو مجھے صرف پچیس ہی ملتے تھے۔ باقی اوپر تک سب میں تقسیم ہو جاتے تھے۔ بڑے افسروں کو ماہانہ رقم پہنچ جاتی تھی پھر وہ پبلک کی یا پریس کی آوازیں کیوں سنتے۔ وہ اپنے کمروں سے ہی باہر نہیں آتے تھے۔ وہ بھی کبھی اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے چھاپا مارتے تھے تو ہمیں پہلے سے خبر ہو جاتی تھی۔ دکھانے کے لیے دو چار قلی پکڑے بھی جاتے تھے یا بکنگ کلرک معطل ہو جاتے تھے لیکن بعد میں سب ٹھیک ہو جاتا تھا۔ میرا گزارا ہو رہا تھا مگر کانسٹیبل نے مجھے نئی راہ دکھائی۔ اس نے مجھے بتایا کہ رات کو اس کی ٹرین میں ڈیوٹی ہوتی تو اسے کیا کچھ مل جاتا ہے۔ وہ بے ٹکٹ مسافروں سے کچھ وصول کر لیتا تھا۔ کچھ مسافروں سے پیسے لے کر ان کو گاڑی میں سوار کرا دیتا تھا۔ اسے تلاشی کے بہانے چیزیں غائب کرنا آتا تھا اور وہ بے خبر سونے والے مسافروں کی کوئی قیمتی چیز بھی اٹھا لاتا تھا۔ اس نے کہا کہ میرے ساتھ چلو اور دیکھو، کام مشکل نہیں۔ تھوڑی سی ذہانت ہونی چاہیے۔ پھر وارے نیارے۔ اس کے پاس دو سرکاری وردیاں تھیں۔ ایک میں نے پہن لی اور ہم مل کے کام کرنے لگے۔ یہ تو ناممکن تھا کہ ہم کبھی پکڑے نہ جاتے۔ ایک رات کسی مسافر نے اسے پکڑ لیا اور اگلے اسٹیشن پر پولیس کے حوالے کر دیا۔ ریلوے کی پولیس، ریلوے کا چور۔ انہوں نے اپنے آدمی کو بچانے کے لیے مجھے پھنسا دیا۔ میرے اس گرائیں نے الزام لگا دیا کہ میں نے اس کی وردی چرا کے پہنی اور میں اس کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا کے یہ کام کر رہا تھا۔ پکڑا وہ گیا تھا۔ سزا مجھے ہو جاتی۔ ریلوے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ میرا تو وکیل بھی کوئی نہیں تھا۔ پہلی پیشی کے بعد میں نے اپنے اس گرائیں کو بلایا اور اس سے کہا کہ میری وجہ سے اس کی کمائی ڈبل ہو گئی تھی۔ سارا مال بھی اس نے ہضم کر لیا اور اپنا جرم میرے سر منڈھ دیا۔ اب اتنا لحاظ تو کرے کہ میرے فرار کا کوئی راستہ نکالے۔ بعد کی ذمے داریاں بھی۔ ورنہ مجھے چھ ماہ کی جیل ہونی لازمی ہے۔ اس کو کچھ شرم آئی یا یہ خیال آیا کہ کیس میں مجسٹریٹ کے سامنے سچ نہ بک دوں، یہ نہ بتا دوں کہ مجھے یہ راستہ دکھانے والا وہی تھا۔ اس نے مجھے پیشی پر لے جانے والوں سے کہا کہ یہ اپنا بندہ ہے اور شریف آدمی ہے اس کا خیال کیا کرو۔ خیال کرنے کا مطلب ہوتا ہے تھوڑی سی

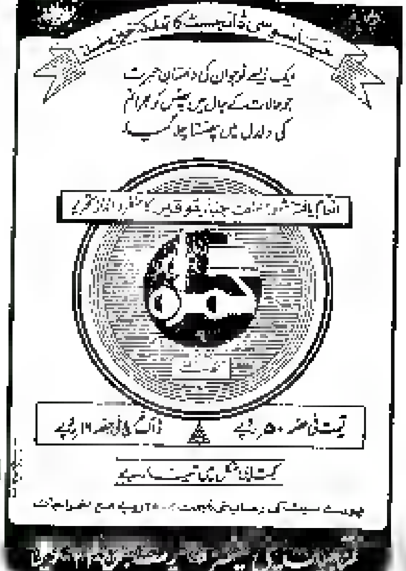

www.paksociety.com

آزادی دیتا۔ کینٹین میں چائے پینے کی اجازت یا کھانا منگوانے کی اجازت۔ کسی سے ملاقات کی اجازت اور لیٹرین جانے کی اجازت۔ ملاقاتی میرا کون تھا۔ میں لیٹرین جانے کے بہانے فرار ہو گیا۔ کینٹین اور لیٹرین میں وہ میری ہتھکڑی کھول دیتے تھے۔ لیٹرین کے اندر مجھے پرانے فلش ٹینک کا لوہے کا پائپ اکھاڑنے کا موقع مل گیا۔ جب میں باہر نکلا تو مجھے ساتھ لے جانے والے دونوں کانسٹیبل آرام سے کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ میں نے پائپ ان کے سر پر مارا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگنا آسان نہیں تھا مگر میں کسی نہ کسی طرح نکل گیا۔ پتہ نہیں وہ کون سی ٹرین تھی اور کہاں جا رہی تھی۔ آدھی رات کے وقت میں آ گیا اور پھر بھاگتا تو سیدھا اسی خانقاہ میں پہنچ گیا جہاں میں نے چار سال گزارے۔ مجاور کو میں نے سب بتایا اور اس نے مجھے تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ تو میرا بندہ لگتا ہے مجھے۔ یہاں شرافت سے رہے گا تو بخشش کرے گا۔ میں اس کا مددگار بن گیا اور خانقاہ کی آمدنی دن دگنی رات چوگنی ہونے لگی۔ میں نے خانقاہ پر آنے والی ایک لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ اس کے بھائی کا خیال تھا کہ لڑکی پر جن آتے ہیں۔ لڑکی بہت خوب صورت تھی بس اس کو ہسٹیریا کے دورے پڑتے تھے۔ اس کی عمر زیادہ ہو گئی تھی۔ ماں باپ مر گئے۔ بھائی نے خود شادی کر لی۔ بہن کی شادی کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ ایک لڑکا اسے پسند کرتا تھا اور کسی خرچے کے بغیر اس سے نکاح پڑھوا لینے پر تیار تھا مگر بھائی نے اسے محبت کرنے کی سزا دی اور لڑکے کو دھمکی دی کہ وہ باز نہ آیا تو اسے قتل کرا دیا جائے گا۔ وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گیا مانا کہ قتل کرانا بھائی کے بس کی بات نہ تھی۔ بھائی اپنی بیوی کے ساتھ ایک کمرے کے مکان میں رہتا تھا اور اتنا بے غیرت تھا کہ بہن کی موجودگی کا بھی خیال نہیں کرتا تھا۔ بہن کے جذبات کو ازدواجی زندگی کے مناظر نے بھڑکایا لیکن اس کے لیے تسکین کے ذرائع نہ تھے۔ اس پر ہسٹیریا کے دورے پڑنے لگے۔ شادی کے بعد وہ ٹھیک ہو گئی اور ہم اپنے گھر میں بہت خوش تھے۔ گھر بھی خانقاہ کے احاطے میں ہی ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ کچھ دن بعد مجاور کی نیت خراب ہو گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ میری بیوی خانقاہ میں ہونے والی ساری بدمعاشی دیکھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میں اور مجاور کس طرح لوگوں کو بے وقوف بنا کے لوٹتے ہیں۔ خیر اس سے بھی فرق نہ پڑتا مگر اسے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ ہم مجبور اور احمق عورتوں کے ساتھ کیا ڈراما کرتے ہیں۔ اولاد یا اولادِ نرینہ کی خواہش مند کسی سوکن کی ستائی ہوئی یا ساس کے ظلم سے پریشان عورت کبھی کبھی ہمارے چنگل میں پھنس جاتی تھی۔ یہ بات میری بیوی کو سخت ناپسند تھی اور اس کا اکثر مجھ سے جھگڑا ہوتا تھا۔ مجھے بری عادت پڑی ہوئی تھی ورنہ اس جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے مجھے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جب مجاور نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو شاید مجھے سزا دینے کے لیے یا انتقامی جذبے سے مغلوب ہو کے اس نے مزاحمت نہیں کی۔ مجھ سے شکایت ہی نہیں کہ بُرے ماحول میں بُرائی کو قبول کرنا آسان ہوتا ہے۔ شاید اس نے سوچا کہ میرا شوہر ایک عورت پر اکتفا نہیں کرتا تو میں کیوں ایک مرد سے وفا کروں۔ بس میری بدقسمتی یا بے وقوفی! تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ مجاور نے میری بیوی کو پھانس لیا۔ جب مجھے پتا چلا تو میں نے دونوں کو قتل کر دیا اور وہاں سے بھاگ کے یہاں آ گیا۔"

اگرچہ ہمیں اس مجاور نما جعلی پیر کی پوری کہانی سننے کا موقع نہ ملا مگر اس کی داستانِ عبرت میں ایسا اثر تھا کہ ہم سب محو ہو گئے۔ اس سے پہلے اس نے سب کچھ غلط بتایا تھا اور خود کو مجاور کی بیوی کے ساتھ منسوب کیا تھا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی مجھے وقت کا خیال آیا۔

"اُف۔ وہ پھر ہو گئی۔ ابھی تک ہم نے کچھ نہیں کیا۔"

نازو بولی "چلو اب دیر مت کرو۔"

میں نے پیر سے کہا "دیکھو پیر صاحب۔ جو ہوا سو ہوا۔ تم نے مجبوری میں غلط راستہ اختیار کیا یا شیطان کا مقابلہ کرنے میں تم نے کمزوری دکھائی۔ اب بھی وقت ہے کہ تم زندگی کا راستہ بدل دو۔"

اس نے کہا "میں وعدہ کر چکا ہوں۔"

"تمہارے وعدے پر ہمیں اعتبار نہیں۔ لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہم کسی لمبے چکر میں پڑنا نہیں چاہتے۔ ورنہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دیتے۔"

وہ پھر قسم کھانے لگا "میں محنت مزدوری کروں گا جی۔"

نازو نے کہا "کبھی کی ہے محنت مزدوری۔ ہمیشہ حرام کی کھاتے آئے ہو۔ تم مشقت کا کوئی کام نہیں کر سکتے۔"

"کر سکتے ہو تو یہ کام کرو" میں نے کہا "اس قبر کو کھودو۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "قبر کھودوں؟ وہ کس لیے جی؟"

میں نے کہا "اس جگہ میرے والد مرحوم کی ہڈیاں دفن ہیں۔ ان کا انتقال سفر کی حالت میں یہاں ہوا تھا۔ ہم نے انہیں امانتاً یہاں سپردِ خاک کر دیا تھا۔"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا "نہیں جی۔ تین آدمی کسی میت کو نہیں لائے تھے۔ یہاں کوئی جنازہ نہیں آیا تھا۔ جنازہ اٹھانے والے کم سے کم چار ہوتے اور اپنے ساتھ چارپائی لاتے۔ یہ معاملہ کچھ اور ہے۔"

میں نے پیڈرو اور نازو کی طرف دیکھا اور ایک گہری سانس لی "معاملہ تو واقعی کچھ اور ہے۔ ان کا قتل ہوا تھا۔"

وہ اچھل پڑا "قتل ہوا تھا؟"

میں نے کہا "تم تو ایسے حیران ہو جیسے قتل کا لفظ ہی پہلی بار سنا ہے حالانکہ تم خود دہرے قتل کا ارتکاب کر چکے ہو۔"

"وہ۔۔۔ وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن اب قبر کھودنے کا مطلب"

میں نے کہا "ان کو یہاں وہی لوگ دفن کر گئے تھے جو ان کے قاتل تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان کے قتل کا سراغ لگایا ہے۔"

"تو قاتل گرفتار بھی ہو گیا ہے؟"

"نہیں ابھی۔ سمجھ لو اس نے جگہ کی نشاندہی کر دی ہے اب تو بس صرف پوسٹ مارٹم رپورٹ کا۔ اسی سے پتہ چلے گا کہ میرے والد کو یہاں دفن کیا گیا تھا۔"

"اب تم پوسٹ مارٹم کرو گے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اس کے بعد قاتل گرفتار ہو جائے گا۔"

وہ بولا "تم یہ کام پولیس کو کرنے دو۔ عدالت کے حکم پر وہ خود قبر کھود کے لاش لے جائیں گے۔ یہ کام خود کرو گے تو خود بھی پکڑے جاؤ گے۔"

میں نے بے رخی سے کہا "تم بہت جانتے ہو قانون کو۔"

"ایسے کیس ہوتے ہیں۔ جھنگ کی خانقاہ میں رہتے ہوئے میں نے دو بار دیکھا تھا۔ ایک عورت تھی اسے شوہر نے خود شک کی بنیاد پر ہلاک کر دیا تھا کہ اس کی کسی سے یاری ہے۔ وہ شوہر کو بھنگ کے پکوڑے کھلا کر رات کے وقت غائب ہو جاتی تھی۔"

میں نے سوچ کے کہا "بھنگ تو خانقاہ میں بھی گھولی جاتی ہوگی۔"

اس نے سر ہلایا "اس کے اولاد نہیں ہوتی تھی۔ جب پیر صاحب کی دعا سے ہوئی تو بچہ کروا چکا تھا۔ ماں باپ کالے ذات کے میراثی ہوتے۔ شک اس کو پہلے بھی تھا۔ لوگوں نے باغی بنائی تھی۔"

"بھنگ اسے کون دیتا تھا۔ تم یا پیر صاحب۔ کس سے یاری تھی اس کی؟"

اس نے اعترافِ جرم کر لیا۔ "دونوں سے۔"

"اس کے شوہر کو تم دونوں پر شک نہیں ہوا تھا؟"

"نہیں جی۔ پیروں فقیروں پر شک کون کر سکتا ہے۔ شوہر نے اسے بہت مارا تھا۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ وہ اپنے یار کا نام بتا دے۔ اسی میں کوئی چوٹ لگ گئی اور وہ مر گئی۔ شوہر پکڑا گیا تھا اور اسے مرشد ہو گئی تھی۔"

میں نے کہا "اچھا چھوڑو یہ ساری باتیں۔ اگر تم کہتے ہو تو ہم پولیس کو لے آتے ہیں۔ مجسٹریٹ بھی ساتھ آئے گا۔ ان کے سامنے تم وضاحت کر دینا کہ سرہانے سید کرامت بادشاہ کا کتبہ کہاں سے آیا۔ پچاس سال تو ابھی تمہاری عمر بھی نہیں۔"

نازو نے کہا "پھر جو کچھ تم نے ہمیں بتایا ہے وہ مجسٹریٹ کی عدالت میں بھی بتانا پڑے گا۔ گواہ یہاں بہت ہیں تمہارے فراڈ کے۔"

وہ پریشان ہو گیا "دیکھو جی۔ یہ بڑا گناہ ہے۔"

اب میں برداشت نہ کر سکا اور میں نے اس کو اچھی خاصی گالی نکال کر غصے سے نوازا۔ "نہیں نکالتے ہیں مُردوں کے پیچھے۔ جو کچھ تم تنگ کرنا ہوتا ہے اس کے بعد گناہ، ثواب کی بات کرتا ہے؟"

اس نے روتے ہوئے کہا "اچھا جی۔ جیسا تم کہو گے میں کروں گا مگر اس کے بعد مجھے بخش دو گے؟"

میں نے کہا "ہم تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ کے چلے جائیں گے۔ آگے تمہارے ساتھ کچھ ہوا تو ذمے دار ہم نہیں۔"

"کبھی نہ کبھی اس دنیا میں تم کو اعمال کی سزا ملے گی۔" نازو بولی۔

جب اس نے بادلِ ناخواستہ غلاف ہٹا کے قبر کھودنا شروع کی تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا "یا رب میری توبہ" وہ تندرست و توانا آدمی تھا اور اس کا حلیہ جیسا تھا۔ مٹی میں اٹ جانے سے زیادہ خراب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے زندگی میں ہر گناہ کیا تھا اور ہر جرم کیا تھا مگر یہ جگہ ایسی تھی جہاں آنے والا ہر شخص یہ ضرور سوچتا ہے کہ ایک دن اس کو بھی یہاں لایا جائے گا اور وہ بھی مٹی کا ایسا ہی ڈھیر رہ جائے گا۔ قبر کے عذاب سے وحشت سب کو ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود زندگی کے سارے کاروبار بُرائی کی ڈگر پر چلتے رہتے ہیں۔

تقدیر نے بھی ایک مٹی کے ڈھیر پر جعلی مجاور کا کاروبار شروع کیا تھا۔ یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن اسے یہی قبر کھود کے اندر اُترنا پڑے گا اور کسی نامعلوم ڈھانچے کو نکالنا ہوگا۔ ہڈیوں کا پنجر آدمی کو کچھ نہیں کہتا مگر احساسِ گناہ میں مبتلا شخص کو اس کا ضمیر بہت کچھ کہتا ہے جو اس نے پہلے کبھی نہ سنا ہوتا ہے۔

پیڈرو نے بتایا تھا کہ انہوں نے زیادہ گہرائی تک کھدائی نہیں کی تھی اور دو تین فٹ کا گڑھا کھود کے ہڈیاں دبا دی تھیں۔ اس گڑھے کو قبر کی شکل دینے والا کوئی فقیر تھا جو اب وہیں کے مرنے پر قابض ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

دوپہر گزر گئی تو میں نے صمد کو پیش امام صاحب کے گھر روانہ کر دیا "تم ان کے گھر سے کھانا لے آؤ۔"

وہ ڈر گیا "اکیلا میں مولوی صاحب کے گھر گیا تو وہ مار دیں گے۔"

"نہیں ماریں گے۔" میں نے اسے تسلی دی "انہیں بتانا کہ مہمانوں نے کھانا منگوایا ہے۔"

صمد اور صمد گاؤں کے بدمعاش تھے اور اچھی شہرت نہیں رکھتے تھے۔ ظاہر ہے ایک نیک سیرت پیش امام ان کے وجود کو ناپسند کرتا ہوگا۔ انہیں وہ اپنے دروازے پر دیکھنا کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ صمد اور صمد کی بدمعاشی کے مقابلے میں مولوی صاحب کی دہشت کسی تھانے دار کے رعب سے کم نہ تھی۔

بھوک کا خیال کسی کو نہ تھا۔ صمد کو وہاں سے ہٹانے کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس کے کانوں تک کھدائی کرنے کی آواز نہ پہنچے۔ تماشا دیکھنے والوں کو ادھر آنے سے وہ پہلے ہی روک چکے تھے۔ رہی سہی کسر پولیس کے آنے اور جانے سے پوری ہو گئی تھی۔ ہم پیش امام صاحب کے مہمان تھے اور تھانے دار بھی ہم سے مودبانہ انداز میں ہاتھ ملا کے گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم کتنے

www.paksociety.com

معلوم ہیں۔ اب کسی کی مجال تھی کہ ہمارے کام میں رخنہ اندازی کرے۔ ویسے بھی دوپہر سنسان ہوتی ہے اور اس گاؤں میں تو ایسا لگتا تھا کہ زمین کے اندر، اس کے اوپر اور فضا میں رہنے والے سب پرندے، حشرات الارض اور جانور تک سو گئے ہیں۔ خاموشی اتنی گہری تھی کہ ہماری باتیں کرنے کی آواز بھی پہاڑوں میں گونجتی محسوس ہوتی تھی۔

اگرچہ موسم گرما ابھی شروع نہیں ہوا تھا اور ہوا میں بہار کی خوشبو بھی ہوتی تھی مگر دوپہر کے سورج کی تپش سے پتھریلی زمین اور چٹانوں کا سینہ دہکنے لگا تھا۔ دو گھنٹوں میں خودرو پودوں اور گھاس کی افراط نے ہوا میں بخارات بھر دیے تھے۔ اس سے حبس پیدا ہو رہا تھا اور ہم سب کو پسینہ آ رہا تھا جو سائے میں کھڑے تھے اور قبر کی مٹی کھودنے والے کے جسم پر تو پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اس پسینے میں مٹی شامل ہو کے کیچڑ بن گئی تھی اور وہ بھوت نظر آنے لگا تھا۔

اس نے کئی بار رک کے اپنی گھڑونچی میں سے پانی پیا۔ محمد جب کھانا لے کر آیا تو میں نے اسے دور سے ہی فارغ کر دیا اور اس سے کہا کہ اگر وہ اپنے بھائی کے ساتھ جانا چاہے تو جا سکتا ہے۔ اب ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ محمد کے لیے بھی دوپہر کا وقت کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ کرنے کے لیے کوئی کام بھی نہ تھا۔ میری طرف سے اجازت ملی تو اس نے سکون ضمیر مسرت کے جذبات کو دبانے کی ناکام کوشش کی۔ کمائی پورے دن کی ہو گئی تھی اور چھٹی آدھے دن کی ڈیوٹی کر کے۔ اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی تھی۔

"کل صبح ہم کس وقت آجائیں جناب؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "تم آجانا مولوی صاحب کے گھر۔ صبح سات آٹھ بجے تک۔"

وہ مجھ سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو گئے۔ اگر انھوں نے قبرستان کی طرف سے آنے والی کھدائی کرنے کی آوازیں سنی تھیں تو اس پر کسی شک و شبے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جو کام ہم کر رہے تھے مولوی صاحب بھی دیکھ چکے تھے اور خود تھانے دار بھی مطمئن ہو کے لوٹ گیا تھا۔

فقیر کے لیے یہ مشقت بڑی سخت تھی۔ وہ سارا دن بیٹھ کے عبادت و ریاضت کا ڈراما کرنے اور حاجت مندوں کو باتوں سے چکر دینے کے سوا کچھ نہیں کرتا تھا۔ گاؤں والے نیا زمند تھے اور اس کو کھانے کے لیے بہت کچھ بھیجتے تھے۔ وہ خود بھی سوکھی کھاتے تھے مگر اس فقیر کے لیے چاول یا حلوا ضرور آجاتا تھا۔ وہ خود کو غلاموں کا غلام کہتا تھا کیونکہ اس کے جعلی پیر سید کرامت بادشاہ خود کو پیری امام کا غلام سمجھتے تھے۔

قبر اڑھائی تین فٹ تک کھودی جا چکی تھی۔ مٹی کا ڈھیر اس کے چاروں طرف جمع ہو گیا تھا۔ غلاموں کا غلام تھکن سے چور ہو رہا تھا اور کھانا کھانے کے بعد اس پر غنودگی طاری تھی۔

میں نے پیڈرو سے کہا "ابھی تک کچھ بھی نہیں ملا۔"

وہ خود بھی فکر مند تھا "شاید گہرا تھا ہم نے زیادہ کھودنے کے لیے وقت بھی نہیں تھا۔"

"تم جگہ تو نہیں بھول گئے؟"

پیڈرو نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ "قبر کھودنے والا خود ایک چشم دید گواہ ہے۔"

میں نے کہا "اچھا۔ اور ایک فٹ تک کھو دیتے ہیں۔"

غلاموں کے غلام کی حالت قابل رحم تھی مگر ہم نے اسے پھر کام پر لگا دیا۔ سوال یہ تک وقت اس کی زندگی کا اور کاروبار تھا۔ شاید انکار کر دیتا۔ وہ یہاں اپنی گدی جما چکا تھا اور خود بھی یہی چاہتا تھا کہ ہم کسی کو کچھ پتا چلنے سے پہلے رفع دفع ہو جائیں۔

اگلے دو گھنٹے میں قبر کی گہرائی چار فٹ سے زیادہ ہو گئی۔ قبر کھودنے والا خود مرنے کے قریب ہو گیا تو میں نے اسے روک دیا۔ وہ باہر نکل کے لیٹ گیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

میں نے کہا "پیڈرو۔ آخر یہ کیا چکر ہے؟"

"چکر خود میری سمجھ میں نہیں آیا" اس نے کہا۔

میں نے کہا "کیا تم چاہتے ہو کہ قبر مزید کھودی جائے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "کوئی فائدہ نہیں۔ ہم دو گھنٹے میں فارغ ہو گئے تھے ہمارے لیے چار فٹ کی گہرائی تک کھودنا بالکل ناممکن تھا۔"

"پھر؟ تم یہ بھی کہتے ہو کہ اندازے کی غلطی نہیں۔ اسی جگہ تم نے ڈبا دفن کیا تھا اور بہت کم گہرائی پر۔"

"کیا تم نے جھوٹ بولا تھا؟" نازو نے کہا۔

"نہیں۔ جھوٹ بولنے کے لیے میرا یہاں تک آنا ضروری نہیں تھا۔"

"ہم جیسے شخص سے کچھ بعید نہیں" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "شاید تمہارا خیال ہو گا کہ ہم صرف قبر تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ہم قبر کھودیں گے نہیں۔ فاتحہ پڑھ کے لوٹ جائیں گے۔"

وہ پریشانی اور خوف میں مبتلا ہو گیا "ایسی بات نہیں۔"

میں نے تلخی سے کہا "پھر کیا بات ہے۔ کہاں ہے میری امانت؟"

"میں کیا بتاؤں؟"

میں نے ریوالور نکال لیا "اور کون بتائے گا تمہارا باپ؟"

"سکندر۔ میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ یہی کیا کم ہے، تم خود سوچو کہ کسی فرضی قبر کی نشاندہی کیا ہوتی؟ میں ایسی جگہ کے بارے میں سوچ بھی سکتا تھا۔ یہاں کون آ سکتا ہے۔ لاہور سے یہاں تک راستے میں کتنے شہر ہیں۔ گوجرانوالہ، گجرات، وزیر آباد، لالہ موسیٰ، جہلم ہر شہر میں نہ جانے کتنے قبرستان ہوں گے۔ میں کو کہیں بھی لے جاتا اور کیا خود لاہور میں قبرستانوں کی کمی ہے؟"

آس پاس کے دیہات میں کسی سڑک کے قریب کوئی بھی قبر دکھا دیتا۔"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔ میرے نزدیک یہ سب تمہارا کوئی کھیل تھا۔ تمہارے شیطانی دماغ کی ایسی چال کو میں سمجھ نہیں سکا۔ مجھے شرافت سے بتا دو کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ سب کچھ بتا دیا تمہیں" وہ میرے لہجے سے ڈر گیا۔

میں نے ریوالور سے اس کے منہ پر وار کیا "میں نے کہا تھا کہ جھوٹ مت بولنا۔ پھر اتنا بڑا جھوٹ بولنے کی ہمت کیسے کی تم نے؟"

"اب میں کیسے یقین دلاؤں تمہیں" اس نے کراہ کے خون تھوکا "تم میری کسی قسم پر بھی اعتبار نہیں کرو گے۔"

"تم نے برا کھیل کھیلا تھا کہ تمہیں راستے میں ہی ہم سے نجات حاصل کرنے کا موقع مل جائے گا یا تم ہمارا اعتبار حاصل کر لو گے۔"

"یہ غلط ہے۔"

میں نے اس کے جبڑے پر ایک مکا رسید کیا "پھر ٹھیک کیا ہے؟ بولو۔"

وہ نیچے گرا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ "خدا کے لیے میری سنو۔ کچھ سمجھو میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں سکندر۔ مجھے راستے میں ایسے مواقع ملے تھے۔ کیا میں ابھی کچھ دیر پہلے تھانے دار کے سامنے نہیں بول سکتا تھا؟ کل میں سراج کو نہیں بتا سکتا تھا؟"

میں نے اسے گریبان تھام کے قبر میں دھکیل دیا۔ "میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ کھودو زمین اور اس وقت تک کھودتے رہو جب تک میری امانت مجھے نہ مل جائے۔ ورنہ میں تم کو اسی قبر میں زندہ گاڑ جاؤں گا۔"

پیڈرو قبر میں سجدہ حالت گیا "ٹھیک ہے سکندر، اٹھاؤ بیلچہ اور ڈالو مجھ پر مٹی۔ یا اس فقیر سے کہو کہ مجھے دفن کر دے۔ زندہ گاڑ دو یا ایک گولی مار کے میرا کام تمام کر دو۔ سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔"

غصے میں میرا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ مایوسی اور ناکامی کا یہ ردعمل بالکل فطری تھا۔ پیڈرو نے مجھے مزید مشتعل کرنے کے بجائے ایک نفسیاتی چال چلی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کامیاب رہا۔ جب اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کلمہ شہادت پڑھنے لگا تو میرا نشانہ لینے والا ہاتھ کانپنے لگا۔

فقیر کی نیندیں نہیں، ہوش بھی اڑ گئے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر ریوالور پر جم کے رہ گئی تھی اور شاید فائر کے انتظار میں اس کی سانس بھی رک گئی ہو گی۔

نازو نے میرے ہاتھ سے ریوالور لے لیا "یہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے سکندر۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"کیسی گڑبڑ؟" میں نے شکستہ لہجے میں کہا "گڑبڑ کا ذمے دار کون ہے۔ گڑبڑ میرے ساتھ ہی کیوں ہوتی ہے؟"

"ابھی پتا چل جائے گا۔ تم باہر تو آؤ پیڈرو" نازو نے کہا۔

پیڈرو بڑی مشکل سے باہر آیا۔ وحشت سے اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ شاید اسے یقین آ گیا تھا کہ نفرت، اشتعال اور انتقام کے جذبات کی شدت ایک ایسی انتہا تک پہنچ گئی ہے کہ میں اپنی عقل کا اختیار سے محروم ہو گیا ہوں اور اسے قتل کرنے کی دیرینہ آرزو آج ضرور پوری ہو گی۔ وہ بس ایک لمحہ تھا جب اس کو اپنی موت کے یقین نے آخری سانس شمار کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور اس نے اپنی خون آلودہ لاش کو اپنی قبر میں دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کی نفسیاتی چال نہیں تھی۔ آخری وقت میں اس نے کلمہ شہادت تک نفی کے ساتھ پڑھا تھا۔ وہ گناہ گار تھا اور مجرم تھا لیکن وہ کافر نہیں تھا۔

فقیر کی حالت سنبھلی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا "بہت اچھا کیا تم نے جو گولی نہیں چلائی۔"

میں نے بے خیالی میں کہا "نہیں۔ اچھا نہیں کیا میں نے۔"

"تم اسے قتل کر دیتے تو ہم سب پھنس جاتے۔"

میں نے کہا "افسوس کہ یہ بچ گیا۔"

نازو نے کہا "چلو تم یہ مٹی برابر کرو۔ ہم جا رہے ہیں۔ یہاں جو کچھ ہوا اس کے بارے میں نہ تم کسی کو بتاؤ گے نہ ہم بتائیں گے۔"

ریوالور نازو کے ہاتھ میں تھا اور اس نے فقیر کو اسی سے اشارہ کیا تھا۔ میں دل گرفتہ اور مایوس خالی قبر پر نظریں جمائے ساکت کھڑا ہوا تھا۔ قبر کھودتے وقت میرے جذبات کی کیفیت جدا تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب ان ہڈیوں کو اصل مدفن تک پہنچانے کے بعد میں ذہنی طور پر کچھ پرسکون ہو جاؤں گا۔ رزبر خان نے مجھ پر جو قرض چھوڑا تھا وہ کچھ تو ادا ہو گا۔ میں پوسٹ مارٹم رپورٹ لینے کے بعد رزبر خان نے مدفن پر نیا عہد کروں گا۔ اس کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا۔ اس کے خون کا بدلہ لینے کا۔ حق اور انصاف حاصل کرنے کا۔ اس کی برسی قریب تھی۔ میں اس کی مغفرت اور رانی کی کامیابی کے لیے دعا کروں گا۔

اچانک میرے سارے تصورات باطل ہو گئے تھے۔ یہاں تک آنا سراب تک رسائی کا لاحاصل سفر بن گیا تھا۔ میں سعی رائگاں کے گرداب میں مسلسل ناکامیوں کے تھپیڑے کھا رہا تھا اور ناامیدی کا اندھیرا مجھے نگلنے کے لیے بڑھ رہا تھا۔

اس وقت میں پیڈرو کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ نازو نے بھی شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ ایک غم زدہ اور شکست خوردہ شخص جو اپنی موت سے گلے مل کے اٹھا ہو اچانک اتنی ہمت کہاں سے لائے گا کہ پلک جھپکنے میں بساط ہی الٹ دے لیکن پیڈرو نے یہی کیا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو شاید میں بھی ایسا کرنا ضروری سمجھتا۔

اس نے ایک دم جست لگا کے نازو سے ریوالور چھین لیا۔

www.paksociety.com

نازو کا ہاتھ ساکت تھا۔ وہ پیڈرو کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ اس کے لیے دفاعی انداز اختیار کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ پیڈرو نے ریوالور یوں جھپٹ لیا جیسے بلندی سے پرواز کرنے والا عقاب اپنے شکار کو پنجوں میں دبوچ کے نکل جاتا ہے۔

پیڈرو اپنے ہی زور میں آگے جا گرا تھا مگر اس نے گرنے سے پہلے نازو کو گرا دیا تھا۔ وہ پتلی دبلی نازک سی لڑکی پیڈرو جیسے جسامت اور وزن کے مرد کی ٹکر کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ وہ قبر کی کھدی ہوئی مٹی کے ڈھیر پر کھڑی تھی، اگلے لمحے وہ قبر میں گر گئی۔

پیڈرو گرتے ہی تڑپ کے اٹھا اور اس نے ریوالور کا رخ میری طرف کر دیا۔ میں غوطہ مار کے زمین پر گر چکا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ اگر وہ مجھے گولی مارنے کا فیصلہ کر چکا ہو گا تو اس پر عمل درآمد میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرے گا۔ میرے لیے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ غوطہ مار کے میں پہلی گولی سے بچ سکتا تھا۔ دوسرا فائر وہ نشانہ لے کر کرتا۔ میں کھلی جگہ پر بہت واضح ہدف تھا اور پیڈرو کا نشانہ بہرحال برا نہیں تھا۔

وہ چند سیکنڈ انتہائی جان لیوا اور پُرعذاب تھے جب میں تقدیر کے فیصلے کا انتظار اسی طرح کر رہا تھا جیسے تختہ دار پر کھڑا ہوا مجرم جلاد کے اشارے کا منتظر ہوتا ہے۔ میں اوندھے منہ پڑا ہوا تھا اور بالکل بے حس و حرکت تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت میری معمولی سی جارحانہ کوشش میری جان لے سکتی ہے۔

بالآخر پیڈرو کی فراز نے مجھے مژدۂ حیات دیا "الحمد جاز سکندر اور خدا کا شکر ادا کرو کہ اس حالت میں بھی جذبات میرے کنٹرول میں ہیں ورنہ اب تک گولی تمہارے سر سے گزر چکی ہوتی۔ تم بھی باہر آجاؤ اس قبر سے مس نازو۔ کیسا لگا تمہیں اس میں گر کر جس میں کچھ دیر پہلے میں مر چکا تھا اور تم میری لاش کو اوپر سے دیکھ رہی تھیں۔"

آہستہ آہستہ میں اُٹھ کھڑا ہو گیا۔ نازو کو میں نے ہاتھ پکڑ کے اوپر کھینچا۔ اس کا چہرہ دہشت سے سفید پڑ گیا تھا۔ گورے رنگ میں لہو کا گلابی پن نہیں رہا تھا تو یہ سفیدی کورے لٹھے جیسی ہو گئی تھی۔ اس کا ہاتھ بھی لاش کی طرح سرد تھا۔

وقت آدمی کو ایسے ہی مات دیتا ہے۔ ساری فتح مندی کی چالوں کے جواب میں تقدیر کی صرف ایک چال سے آدمی جیتی ہوئی بازی ہار جاتا ہے۔ دو دن سے پیڈرو میری تحویل میں تھا اور میں نے ایک لمحے کے لیے نگرانی میں کوتاہی نہیں کی تھی۔ میرے عزائم بہت واضح تھے۔ میری ذہنی کیفیت میں کوئی انتشار نہیں تھا۔ میرا لائحہ عمل ایک ہی مقصد کے حصول کا آئینہ دار تھا اور میں ہر لحظہ مستعد اور چوکس تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پیڈرو کو متعدد مواقع ملے تھے جب وہ فائدہ اٹھانے کی کوشش ضرور کر سکتا تھا مگر اس کا نقصان پیڈرو کو زیادہ ہوتا۔ شاید وہ اپنی جان گنوا دیتا۔ بعد میں ہم جان کیسے بچاتے۔ یہ ہم نے پہلے بھی نہیں سوچا تھا لیکن ہم مشکل وقت میں اور آزمائش سے گزرنا جانتے تھے۔ زندگی کے ایسے تجربات کا شمار نہ تھا۔ جب موت نے زندگی کے سارے راستوں پر پہرے بٹھا دیے تھے مگر ہم خدا پر اور اپنی ہمت پر بھروسا کر کے سرنگ نکل گئے تھے اور موت ہمیں راستہ دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔

اس وقت صورت حال یکسر مختلف تھی۔ ہم پیڈرو کے رحم و کرم پر تھے اور درست قدرت نے پہلے سے طے کر دیا ہو تاکہ ہماری زندگی کو اس دور افتادہ مقام پر اپنے بدترین دشمن کے ہاتھوں میں تمام ہونا ہے تو پھر ہماری جرأت و ہمت اور خواہش یا کوشش سب بے کار تھی۔ موت خود آدمی کو وہاں کھینچ لاتی ہے جہاں خدا کی دی ہوئی گنتی کی آخری سانس کے بعد سفر حیات تمام ہوتا ہے اور اگلا لمحہ حیات ابدی کا ہوتا ہے۔ وجود اور عدم کے درمیان حائل پردہ حجاب اٹھتا ہے اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

میں نے نازو کو اپنے قریب کر لیا "تم اب کیا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ اب وقت آیا ہے تمہیں بتانے کا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اب تک تو وہی ہوا جو تم چاہتے تھے۔" پیڈرو کی صورت پر اب بھی وحشت اور جنون کے آثار عیاں تھے۔ "میں نے کوشش کی تمہارا اعتبار حاصل کرنے کی۔ صرف اس لیے کہ میں خود بھی جینا چاہتا تھا اور تمہیں بھی زندہ رہنے کے حق سے محروم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ وقت گزر گیا ہے جب تمہارے اور میرے درمیان کوئی رشتہ تھا تو عداوت کا۔ ہم ایک دوسرے کی جان کے ایک سے دشمن تھے۔ قسمت نے تمہیں بھی زندہ رکھا اور مجھے بھی اور حالات نے بالآخر ہمیں یکجا کر دیا۔ ایک ایسے موڑ پر جہاں ہم ایک دوسرے کی مدد کے بغیر چل ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ ہمارے مخالف زیادہ خطرناک اور مکار دشمن صف آرا تھا۔ افسوس کہ تم نے مجھے کسی رعایت کے قابل نہیں سمجھا حالانکہ تمہارے کسی بھی دوست سے زیادہ اس معاملے میں تمہارا مددگار میں تھا۔ اس کی وجہ بھی تم سمجھتے ہو۔ آج میں دلاور کا تم سے بڑا دشمن ہوں۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ پرانے تعلقات کا لحاظ کرے۔ میری خدمت میری وفاداری، دوستی اور جاں نثاری کا مجھے کیا صلہ دیا اس نے؟ فقط معاوضہ تو وہ سب کو دیتا تھا مگر کیا وہ جان کی قیمت تھی؟ جہاں اسے مرنے کا ڈر ہوتا تھا وہاں وہ کسی اور کی خدمات حاصل کر لیتا تھا یا مجھے بھیج دیتا تھا۔ میری زندگی اتنی کم قیمت تو نہیں تھی۔ کسی کی زندگی بھی اتنی سستی نہیں تھی لیکن وہ قیمت ادا کرتا تھا مجبوری کی۔ میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور تھا اور برسوں بعد میں یہ سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں میرے لیے قدر کے جذبات ہوں گے۔ میری حیثیت ان کرائے کے بدمعاشوں کے برابر نہیں ہوگی جن کو وہ مروا دیتا تھا۔ میں خود کو اس کا دوست، یار غار اور دست راست سمجھنے لگا تھا مگر اس کمینے اور خود غرض آدمی کی نظر میں میری قدر برسوں بعد بھی وہی تھی۔ وہ مجھ سے وہیں مروانا چاہتا تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اس سے الگ ہو کے میں اپنی زندگی کہیں بہت دور گزاروں گا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے ضرور مروا دیتا۔"

"چنانچہ تم شیخ نقار بن گئے اور کراچی چلے گئے؟"

"ہاں۔ میں نے وہ راستہ ہی چھوڑ دیا تھا جس پر دلاور سے پھر ملاقات ہونے کا امکان ہوتا لیکن تم نے وہاں پہنچ کے میری یہ کوشش بھی ناکام کر دی۔ دلاور نے مجھے بخش دیا تھا مگر تم نے نہیں۔ مجھے پھر سوچنا پڑا اور......"

"اور تم نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا فیصلہ کیا" میں نے اس کی بات کاٹ دی "تم نے مجھے دلاور کی خدمت میں پیش کر دیا تاکہ وہ تمہاری نمک حلالی اور دوستانہ خیرسگالی کے جذبات سے متاثر ہو جائے۔ وہ ہمیں مار دے اور تم اپنا دامن بچا کے زیادہ مطمئن زندگی گزارنے کے لیے کراچی لوٹ جاؤ۔ لیکن افسوس کہ تمہاری اسکیم کو ایک عورت کے جذبات نے ناکام کر دیا۔ اگر صرف دلاور کا معاملہ ہوتا تو تم یقیناً کامیاب ہو جاتے مگر اس کی بیوی بیچ میں آگئی اور اس نے ایک جذباتی بے وقوفی کی۔ اس نے دلاور کو مجبور کر دیا کہ ہمارا قرض اتار دے۔ احسان کا بدلہ چکا دے۔ دلاور جیسا شخص بھلا کہاں احسان مند ہوتا ہے مگر وہ عورت سے مار کھا گیا۔ ساری عمر وہ عورت کو کھلونا سمجھتا رہا مگر جس عورت نے اسے مغلوب کر لیا وہ اس کے جوان بیٹے کی معبود ماں تھی۔ وہ بیٹا دلاور کا مستقبل تھا جسے وہ گنوانا افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔"

پیڈرو نے دلاور کی بیوی کو ایک گالی دی "دلاور سے پہلے میں اس کو ایسا سبق دوں گا جو وہ یاد رکھے گی۔ میں اسے ماروں گا نہیں۔ اس کو بدشکل، اپاہج اور معذور کر دوں گا۔ وہ بدنما گوشت کا ایک لوتھڑا رہ جائے گی۔ میں دیکھوں گا کہ پھر دلاور اسے کتنی اہمیت دیتا ہے۔ اس کا جوان بیٹا کیا کرتا ہے۔ ابھی تو اس نے مجھے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور اس کی بات مان کے دلاور نے مجھے ایک آخری سبق سکھایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ پیڈرو! تم پھر میرے سامنے آگئے۔ میں نے بتا دیا تھا کہ میں اس دنیا میں تمہاری شکل پھر نہ دیکھوں۔ اب تمہیں اس دنیا سے جانا ہوگا۔ یہی فیصلہ صادر کیا تھا اس نے۔ اور وہاں جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا وہ تمہیں دہشت زدہ کرنے کے لیے تھا تاکہ تم یہ نہ سمجھو کہ دلاور کی فطرت بدل گئی ہے۔"

"یہ وقت باتوں میں ضائع کرنے کا نہیں ہے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اب میں جا رہا ہوں سکندر۔ مجھے افسوس ہے کہ میری محنت رائیگاں گئی۔ میں نے تم سے جھوٹ نہیں بولا تھا اور تمہیں دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ دھوکا میرے ساتھ بہت پہلے ہو چکا تھا۔ دلاور کسی پر اتنا بھروسا نہیں کرتا تھا کہ وہ اس کی کمزوری بن جائے یا اس کا رازدار سمجھنے لگے خود کو۔ شاید اس نے بعد میں تمہارے والد کی لاش یہاں سے بھی نکلوا دی ہوگی۔ جو میرے ساتھ یہاں آئے تھے ان میں سے کسی کو دلاور نے لالچ دے کر اور میری جگہ اپنا خاص نمبر بنانے کا وعدہ کر کے بھیجا ہوگا کہ جا کر لاش وہاں سے بھی غائب کر دو تاکہ کل پیڈرو مجھے بلیک میل نہ کر سکے۔ ان میں سے ایک خود کو دلاور کے سامنے نمایاں کرنے کی بہت کوشش کرتا تھا۔ یہ ثابت کرتا تھا کہ اس سے بڑھ کر وفادار جاں نثار کوئی نہیں۔ وہی اچانک غائب ہو گیا تھا۔ شاید جیسے پھر بھی جب اس نے دلاور کو اپنی اعلیٰ کارکردگی کی خفیہ رپورٹ دی ہوگی تو دلاور نے اس کی پیٹھ ٹھونکی ہوگی اور دوسرے ہاتھ سے کسی کو اشارہ کر دیا ہوگا کہ اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دے۔ بیچارہ جب بہت آگے بڑھ جائے اور دلاور کے اس خانے تک پہنچنے کی کوشش کرے جہاں وہ دور رہ سکتا ہے تو مارا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "غالباً تمہارا خیال درست ہی ہے۔ اب مجھے دلاور سے پوچھنا پڑے گا کہ وزیر خان کہاں دفن ہے؟"

"تمہارے دل میں اب میرے خلاف کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے پوری وضاحت کر دی ہے۔ سب بتا دیا ہے کہ وزیر خان کو کیسے قتل کیا گیا تھا اور کس نے قتل کیا تھا۔ ویسے تو میرے تمہارے سب کے دامن پر کسی قتل کا داغ ہے مگر تمہارے والد کی حد تک میرے تمہارے درمیان ذاتی دشمنی کا سبب کوئی نہیں رہا۔ تم ضد بھی کر لو گے۔ پھر تمہیں یقین آجائے گا کہ پیڈرو نے غلط نہیں کہا تھا۔ میرا یہاں تک آنا بھی بے مقصد نہیں تھا لیکن وہ مقصد حاصل نہیں ہوا تو اس میں میرا قصور نہیں۔ دیکھو میں تم کو تمہاری زندگی بخش کے جا رہا ہوں۔ کون ہے یہاں میرا راستہ روکنے والا۔ اس ریوالور میں تین گولیاں ہی نہیں اچھی گولیاں ہیں۔ تین پھر بھی بچ جائیں گی۔ کسی کے نازک کی آواز پر جہاں پہنچے اور تین لاشوں کو دیکھنے سے پہلے ہی میں بہت دور نکل جاتا۔ ان پہاڑی راستوں سے میں واقف تو نہیں لیکن چلتا رہتا تو کہیں ضرور پہنچ جاتا کسی اور سرے گاؤں میں یا کسی سڑک پر جہاں سے مجھے آگے جانے کی سواری مل جائے گی۔"

میں نے کہا "تمہارا شکریہ میں پھر بھی ادا نہیں کروں گا کیونکہ میرا عقیدہ اب بھی یہی ہے کہ زندگی میری ہو یا تمہاری۔ اس پر اختیار صرف اسی کا ہے جو زندگی دیتا ہے۔"

یعنی پیڈرو اس عرصے میں پتھر کا بت بنا بیٹھا رہا تھا۔ ہماری باتیں ابھی کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ ہم دوست یا ساتھی نہیں تھے۔ ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ شاید اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس معاملے میں مجرم پیڈرو ہے۔ اس کی صورت کی خباثت نے یا باتوں نے یہ راز فاش کر دیا تھا کہ وہ قاتل تھا اور قتل ہونے والا میرا باپ تھا۔ میرے ساتھ نازو تھی جس کو ہم نے اپنی بہن بنایا تھا اور اس سے بھی نفیرہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ ہم بہن بھائی اپنے باپ کا مدفن تلاش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے اور اس کا سراغ لگاتا تھا۔ وہ الٹا خود قاتل ہی تھا۔

www.paksociety.com

پیڈرو ایک قدم پیچھے ہٹا "میرا راستہ روکنے کی کوشش مت کرنا سکندر۔"

میں نے کہا "تمہارے لیے وہ وقت ابھی نہیں آیا پیڈرو جب سارے راستے خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔"

اچانک فقیر نے اپنا ہاتھ گھمایا اور میں نے پیڈرو کو سر پکڑ کے منہ کے بل گرتے دیکھا۔ ایک اچھے خاصے وزن کا پتھر اس کے سر پر توپ کے گولے کی طرح لگا تھا۔

میں پیڈرو سے بیس فٹ کے فاصلے پر تھا اور اتنی لمبی چھلانگ نہیں مار سکتا تھا۔ نازو کچھ قریب تھی مگر اس کے اور پیڈرو کے درمیان قبر کی مٹی کا ڈھیر حائل تھا۔ پھر مجھے اس فقیر کی احمقانہ جرأت نے حیران کر دیا تھا۔ اس کی یہ حرکت بے مقصد خودکشی کے مترادف تھی لیکن وہ پتھر مارتے ہی ایک دم اٹھا اور مخالف سمت میں دوڑا۔ اس نے بندر کی سی پھرتی کے ساتھ دیوار عبور کی اور غائب ہو گیا۔

پیڈرو نے سنبھلنے اور اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ "بھنبواسے قیبواسے۔ جو کسی نے میرے قریب آنے کی کوشش کی" وہ ایک دم گھوما اور اس نے پتھر مارنے والے کا نشانہ لینے کی کوشش کی مگر وہاں اب کوئی بھی نہیں تھا۔

پیڈرو قدم قدم پیچھے ہٹا اور دیوار تک گیا۔ اس کا رخ ہماری طرف تھا لیکن وہ مڑ مڑ کے پیچھے بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ شاید فقیر دیوار کے پیچھے کہیں چھپا ہوا تھا۔ کسی درخت کی آڑ میں یا چٹان کے عقب میں۔ پیڈرو کی نگاہیں اسے تلاش کر رہی تھیں اور وہ زیر لب اسے گالیاں دے رہا تھا۔

"قسمت اچھی تھی۔۔۔ کہ بھاگ گیا۔۔۔ ورنہ اسی قبر میں دفن کرتا جو خود اس نے کھودی تھی۔۔۔" پیڈرو غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔

ریوالور کا رخ ہماری طرف رکھتے ہوئے پیڈرو دوسری طرف آگیا۔ وہاں سے ایک راستہ نیچے جاتا تھا۔ یہ کچا راستہ تھا۔ وہ پگڈنڈی جو انسانوں کے نقش پا مسلسل ثبت ہونے سے بنی تھی۔ اس گاؤں کے وجود میں آنے یا اس سے بھی پہلے سے مسافروں نے اس کو متبادل علاقے سے گزرنے کا یہ آسان راستہ تلاش کر لیا تھا اور وہ آج بھی اسی پر رواں تھے۔

پیڈرو اس جگہ سے ہم پر بھی نظر رکھ سکتا تھا اور دوسری طرف اس فقیر پر بھی جو غائب ہو چکا تھا۔ وہ کسی بھی سمت سے نمودار ہو کے پھر حملہ کر سکتا تھا۔ اس نے پیڈرو کا سر پھاڑنے کی کوشش کر کے میری ہمدردی حاصل کر لی تھی۔ وہ خود اچھا تو نہیں تھا مگر اس بزنس میں چیک ڈیلنگ کرتے کرتے اسے اچھے برے انسانوں کی پہچان کرنا آگیا تھا۔ اس کی پیڈرو سے دشمنی کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ اس کے لیے ہم بھی برے تھے مگر انتخاب کا موقع ملا تو اس نے پیڈرو کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ شاید اس خیال سے کہ بعد میں ہم سے نمٹنے کی ذمہ داری جا سکتی تھی پیڈرو سے نہیں۔

"میرا پیچھا مت کرنا سکندر۔ ورنہ میں مجبور ہو جاؤں گا" وہ بولا "اور اب ویسے بھی تمہیں میری ضرورت نہیں۔ سب کچھ میں بتا چکا ہوں۔"

میں نے کہا "لیکن۔۔۔ ایک ڈائری ہے تمہارے پاس۔"

"ہاں۔ مگر وہ میری میز کی دراز میں مقفل ہے۔ کراچی میں" وہ بولا "میں تم کو اس کی نقل فراہم کروں گا۔"

"اصل کیوں نہیں؟"

"وہ اصل تو میری لائف انشورنس ہے۔ چوہدری دلاور کی جان ہے اس میں۔ جب تک وہ ڈائری میرے پاس ہے دلاور مجھ سے بچ نہیں سکتا۔ ابھی تو اس نے اپنی طرف سے پکا کام کیا تھا۔ وہ سمجھتا ہو گا کہ سکندر کے ہاتھوں پیڈرو یقیناً مارا جائے گا۔ اس کے بچ جانے کا ایک فیصد چانس ہے اور مارے جانے کا ننانوے فیصد یقین۔ لیکن دیکھو "قسمت" اس کو کہتے ہیں۔ ایک فیصد کے جوئے میں موت ہار گئی۔ جب میں دلاور کو بتاؤں گا کہ اس کی سازش ناکام ہو گئی۔ اس نے مجھ سے جان چھڑانے کی کوشش میں اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ سکندر رجنٹ ایک بااصول اور شریف دشمن ہے جو سامنے آکے وار کرتا ہے۔ پیڈرو بہت کمینہ اور خطرناک دشمن ہے۔ وہ تمہیں دھوکے سے شکار کرے گا۔ ہاں تم کو مارنے کا جو بھی اس کی سرملاؤ کا خیال بھی تمہارے دماغ میں نہیں ہو گا اور میں اس کو آسان موت نہیں ماروں گا۔ وہ پہلے عمر قید کاٹنے اور پھر پھانسی پانے والے مجرم کی طرح دہری سزا کاٹے گا۔ بیٹھے میں اس سے زندگی کی قیمت وصول کروں گا۔ سودا کروں گا کہ مجھ سے تحفظ کی ضمانت حاصل کر لے۔ وہ ڈائری مجھ سے خرید لے اور جب وہ قیمت ادا کر کے مطمئن ہو جائے گا تو۔۔۔"

فقیر کا سر پیڈرو کے پیچھے نمودار ہوا۔ وہ اتنی خاموشی سے آیا تھا کہ پیڈرو کے کان اس کے قدموں کی آواز نہ سن سکے حالانکہ وہاں زمین پر ایک پتا ٹوٹ کے گرنے کی آواز بھی سکوت کو منتشر کر سکتی تھی۔ بس نازو کے بے اختیار حیرانی کے رد عمل نے پیڈرو کو ہوشیار کر دیا۔ اس نے ایک دم پلٹ کے دیکھا اور اس کے لبوں سے گالی پہلے نکلی پھر اس نے گولی چلائی۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ فائر کی آواز ان پہاڑوں کی خاموشی میں کہاں تک پہنچے گی اور اس کی بازگشت کتنی بار آئے گی۔ درختوں میں اور پہاڑ کی بلندی سے نشیب میں وادی تک سارے پرندے ہراساں ہو کے چلاتے ہوئے اڑیں گے۔ گاؤں کے ہر فرد کے کان اس آواز کو سنیں گے۔ مرگ ناگہاں کی آواز ان سب آوازوں سے جدا جو زندگی کی علامت ہوتی ہیں۔ برتنوں کے چھنچھنانے، کسی بچے کی معصوم اور شوخ ہنسی۔ کسی کانچ کے برتن کے گر کر ٹوٹنے، کسی گائے بھینس کے ڈکرانے، کسی کے کسی کو پکارنے کی آواز۔ اور ہی کے کان سب سنتے ہیں۔ طلوع شب کے

پھیرے میں چوڑیوں کی مدھر جھنکار اور اقرار کی صدا۔ دکھ میں ڈوبی ہوئی فریاد۔ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والوں کی یاد میں بہنے والے آنسوؤں کا نوحہ۔ لیکن مرگ ناگہاں کی آواز سب سے بھیانک تھی جو پل بھر میں جیتے جاگتے انسان کے بے جان ہو جانے کا تصور دیتا وحشت زدہ کرتا ہے۔

شاید فقیر بھی چلایا تھا۔ اس نے چلا کے کیا کہا تھا، یہ مجھے معلوم نہیں مگر اس کے پاس مہلت ہی کتنی تھی کہ وہ سوچ سمجھ کے کچھ کہتا۔ اس ریوالور کی گولی اور فقیر کے دل میں مشکل سے دس قدم کی دوری تھی اور گولی یہ فاصلہ ایک سانس کے پورا ہونے سے پہلے طے کر گئی ہے۔

اچانک مجھے خاموشی کا احساس ہوا۔ وہ ایک لمحہ تھا جو گزر گیا۔ میں نے کوئی دعا کا لفظ سنا تھا۔ میرے کانوں میں ایک اور آواز آئی۔ یہ آواز بالکل مختلف تھی۔ مرگ ناگہاں کی پکار سے بالکل الگ۔ یہ شکست کی آواز تھی اور ناکامی کی آواز تھی۔ میں نے اس آواز کو پہچان لیا۔

جب نوکی کا ہاتھ ٹریگر کو دباتا ہے تو "کلک" کی ہلکی سی آواز ہوتی ہے جو فائر کے اس دھماکے میں دب جاتی ہے مگر میں نے صرف یہی آواز سنی تھی۔ ایک بار، پھر دوبارہ۔ پیڈرو کے ہاتھ کا ریوالور دغاباز ثابت ہوا تھا۔ دلاور سے زیادہ ناقابل اعتبار ثابت ہوا تھا حالانکہ پیڈرو نے اسی پر بھروسا کرتے ہوئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ اور وہ بازی ہار گیا تھا کیونکہ اس بے بسی اور بے چارگی کا نام تقدیر ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول بڑی عظیم آفاقی صداقت ہے "میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا۔"

پیڈرو نے بھی جان لیا ہو گا کہ صرف وہ نہیں۔ صرف اس کے ارادے ہی نہیں۔ صرف ریوالور ہی نہیں۔ خدا بھی ہے جس کی وفاداری مشکوک نہیں۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور میں نے اس کی صورت پر اس کی آنکھوں میں اور اس کے اطراف خوف اور بے یقینی کو دیکھا۔

وہ ایک دم بھاگا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا۔ نازو نے مجھے روکنے کی ناکام کوشش کی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا "رک جاؤ سکندر" مگر میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور چیخ کے کہا۔

"رک جاؤ پیڈرو۔"

پیڈرو نہیں رکا۔ وہ جانتا تھا کہ رک جانے کا نتیجہ کسی صورت میں اچھا نہیں ہو گا۔ شاید ہم اسے مار کے اس قبر میں گاڑ جاتے جس میں سے ایک بار وہ نکل آیا تھا۔ دوسری بار کا کوئی بھروسا نہیں۔ اگر ہم نے نہ مارا تب بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کریں گے۔ شاید اسے اپنی قید میں رکھیں گے۔ اس وقت تک جب تک کہ پیڈرو سب کچھ نہیں بتا دیتا جو اس کے دماغ میں ہے اور سب کچھ ہمارے حوالے نہیں کر دیتا جو اس کے پاس ہے اور جسے وہ اپنی لائف انشورنس کہتا ہے۔ وہ مسلسل قید اور مسلسل اذیت اور مسلسل ذلت سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اس کی قوت برداشت ختم ہو گئی تھی۔

وہ دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ وہ نشیب کی طرف رواں تھا۔ پتھروں پر لڑکھڑا کے سنبھلنے کی کوشش کرتا۔ جھاڑیوں کو پھلانگتا۔ چٹانوں کی آڑ لیتا۔ میں نے دو بار اس کا نشانہ لے کر پتھر پھینکے۔ ایک بار اس نے رک کے میرا نشانہ لیا اور فائر کرنے کی احمقانہ خواہش پر جھنجلا کے پھر بھاگا۔ ریوالور خراب ہو گیا تھا یا اس میں گولیاں ہی نہیں تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ خود میں اس بے مصرف چیز کو کتنے اعتماد کے ساتھ اپنی طاقت سمجھے ہوئے تھا۔

اچانک پیڈرو گر گیا۔ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ آگئی اور ناہموار راستے پر توازن برقرار رکھتے ہوئے بڑھتے رہنے کی جدوجہد ختم ہو گئی۔ وہ ایک چھوٹی سی چٹان تھی جو نہ جانے کب سے اسی طرح قائم تھی۔ اس ایک لمحے کے انتظار میں تھی جب اسلو پیڈرو ہائیلج کنارہ نام کا کوئی شخص اس پر دوڑتے ہوئے قدم رکھے تو وہ زمین سے الگ ہو جائے۔ چٹانیں، پہاڑ، بلند و بالا مینار اور سربفلک اسکائی اسکریپر۔ زمین اور چاند سورج اور یہ کائنات۔ سب توازن پر قائم ہیں۔ یہ توازن نہ رہے تو چٹان ٹوٹ جاتی ہے۔ اسکائی اسکریپر کھنڈر ہو جاتے ہیں۔ قیامت آجاتی ہے۔

پیڈرو چٹان کے ساتھ ہی گیا۔ ایک چٹان کے اکھڑ جانے سے جو زیادہ بڑی بھی نہیں تھی بہت سے پتھر بھی لڑھک گئے۔ یہ پتھر نشیب کے دوسرے پتھروں پر گرے۔ چٹان نے ایک اور چٹان کا حصہ توڑ دیا۔ پھر وہ حصہ بھی نیچے سیکڑوں پتھروں کے قافلے میں شامل ہو گیا۔ پیڈرو ان سب کے درمیان تھا۔ پتھر اور چٹانیں جو آپس میں ٹکرا رہے تھے، پیڈرو سے بھی ٹکرا رہے تھے۔ پتھر ٹوٹ کے بھی پتھر رہتا ہے۔ ہڈی ٹوٹ کے ہڈی نہیں رہتی۔

میں رک کر اس دہشت ناک منظر کو دیکھتا رہا۔ ان آوازوں کو سنتا رہا جو پتھروں اور چٹانوں اور پیڈرو کا ملا جلا شور تھا۔ سیکڑوں فٹ نیچے کہیں ہر پتھر کو ٹھہر جانا تھا۔ ہر چٹان کو رک جانا تھا۔ وہی پیڈرو کی منزل تھی۔ زندگی کے سفر کا آخری پڑاؤ جہاں اس کے انجام کو دیکھنے والا، اس کے شکستہ خون آلود اور پسے ہوئے جسم سے عبرت پکڑنے والا اور اس کی موت پر رونے والا کوئی نہیں تھا۔

بالآخر یہ بھیانک آوازوں کا وہ شور تھم گیا۔ آوازیں نیچے پہنچ کے مدھم پڑ گئی تھیں پھر خاموشی چھا گئی۔ میں دم بخود کھڑا رہا۔ بہت دیر بعد مجھے یہ کہنا یاد آیا کہ بے شک ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانے ہیں۔ اچھے برے، معصوم اور گنہگار، گورے کالے، عربی اور عجمی، دوست اور دشمن۔ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

پھر میں نے اپنے پیچھے اور دیکھا تو مجھے نازو اس لاش کی طرح

www.paksociety.com

تھی جو سنگ جانی کی پہاڑی پر استادہ تھی۔ نیلے سپاٹ آسمان کے پس منظر میں نازو کا ہیولا وسعت افلاک سے اُترنے والی کسی مخلوق جیسا لگتا تھا۔ وہ کسی حسین مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔

آہستہ آہستہ میں نے واپس اوپر چڑھنا شروع کیا۔ چیڈو مر گیا تھا یا مارا گیا تھا۔ اسے ہم نے نہیں مارا تھا۔ چوہدری ولاور نے نہیں مارا تھا۔ کسی عدالت نے سزائے موت نہیں دی تھی۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا اور زندگی کی طرف بھاگ رہا تھا۔ زندہ رہنے کی خاطر ہی وہ یہاں تک ہمارے ساتھ آیا تھا اور ہم سے پورا تعاون کر رہا تھا۔ خود کو وزیر خاں کے قتل سے بری الذمہ ثابت کر رہا تھا۔

میں نے نازو کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ ہاتھ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ایک دشمن کی موت پر اسے خوش ہونا چاہیے تھا مگر وہ سخت خوف زدہ تھی۔ دشمن مرے سے خوشی نہ کرے سجناں وی مر جانا۔

فقیرا اپنی جگہ پر موجود تھا۔ وہ مٹی کے ڈھیر کو دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا "تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

وہ بولا "کیا میں نے بُرا کیا تھا؟"

"یہ تم جانتے ہو یا خدا بہتر جانتا ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو وہ اچھا ہے یا بُرا ہے۔" میں نے کہا "فیصلہ وقت کرتا ہے۔ تم نے دیکھا کہ جو اپنی کوشش سے بچ گیا تھا اور تمہاری کوشش سے ہلاک نہیں ہوا تھا۔ وہ بغیر کوشش کے مر گیا۔"

اس نے کہا "کیا میں یہ مٹی برابر کر دوں؟"

میں نے کہا "ہم جا رہے ہیں۔ تم کچھ بھی کرو۔ اس قبر کو برابر کر کے پھر غلاف بچھا دو یا اپنی تسبیوں پر اور اپنے حلقے پر قائم رہو۔ سزا اور جزا ہم خدا پر چھوڑتے ہیں۔"

اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور بیلچہ اٹھا کے مٹی کو خالی قبر میں گرانے لگا۔ میں نازو کے ساتھ گاؤں کی طرف جانے والے راستے پر چل پڑا۔

منزل شب ہنوز دور تھی۔ آفتاب کی تابانی میں شام جھلکنے لگی تھی۔ جب میں اور نازو اُن مسافران درماندہ کی طرح لوٹے جو تمام دن سفر میں رہے مگر فریب راہ نے انہیں پھر وہیں پہنچا دیا جہاں سے وہ چلے تھے۔ پیش امام صاحب مسجد میں درس دے رہے تھے۔ میں ان کو سلام کرتا ہوا خاموشی سے غسل خانے میں چلا گیا۔ انہوں نے شفقت سے مسکرا کے جواب دیا۔ ان کے گھر میں نازو نے بھی غسل کے بعد واپسی کے سفر کی تیاری کی۔

"یہ کیا حضرت۔" پیش امام نے اجازت طلب کرنے پر کہا "اتنی عجلت کیسی۔ کیا آپ کی تحقیق مکمل ہو گئی؟"

میں نے کہا "تحقیق کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ ہمارا کام فی الحال رُک گیا ہے۔"

"خیریت تو ہے نا۔ آپ کے تیسرے ساتھی کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "ہمیں کچھ ایسی مشکلات کا سامنا ہوا کہ وہ جیالوجی میں کام آنے والے کچھ آلات لینے راولپنڈی چلے گئے۔ بعد میں ہمیں اندازہ ہوا کہ شاید اس کام کے لیے زیادہ وسائل، خصوصی ماہرین کی خدمات اور کافی وقت درکار ہے۔ ہم تین آدمی چند دن میں سروے بھی مکمل نہیں کر سکتے۔"

"تو آپ قیام کی مدت بڑھا لیں حضرت۔"

میں نے کہا "بات یہ ہے مولانا صاحب کہ یہ ہمارا پراجیکٹ نہیں تھا۔ ہمیں جتنا وقت اور بجٹ ملا تھا وہ ناکافی ہے۔ اس میں ہم اضافہ نہیں کر سکتے۔ ہم دوبارہ آئیں گے۔ زیادہ کارآمد آلات اور بڑی ٹیم کے ساتھ۔"

"انشاءاللہ۔" پیش امام نے کہا "آپ مجھے چشم براہ پائیں گے بشرطِ زندگی۔ لیکن صبح تک قیام فرمائیں۔"

میں نے کہا "اس مہربانی اور محبت کا بہت شکریہ۔ آٹھ دس میل ہی تو جانا ہے۔ رات ہونے سے پہلے پہنچ جائیں گے۔"

اس نے کہا "لیکن آپ جائیں گے کیسے۔ اس وقت کوئی بس نہیں ملے گی۔ نور پور شاہاں سے آنے والی بس کل ملے گی۔"

میں نے اس مسئلے پر غور بھی نہیں کیا تھا۔ شہری زندگی کے عادی افراد کا ذہن دیہی آبادی کے مسائل کی طرف کیسے جا سکتا ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ کہیں جانے کے لیے اپنی گاڑی نہیں تو ٹیکسی ہو گی، رکشا مل جائے گا۔

"کیا یہاں تانگا بھی نہیں ہے کسی کے پاس؟" میں نے کہا۔

"تانگے صبح شہر چلے جاتے ہیں۔ ان کا یہی ذریعۂ معاش ہے۔ صرف رات کو واپس آئیں گے نو دس بجے تک۔ بعض اوقات سینما کے آخری شو کی سواریاں اٹھاتے ہیں تو ایک بھی بج جاتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن اصل مسئلہ ہے قناعت کا۔ ان کا بس چلے تو یہ ساری رات تانگا چلائیں اور گھر بھی نہ آئیں۔ رات ایک بجے آئے، صبح منہ اندھیرے نکل جانا بھی کوئی زندگی ہے۔ بیوی تو راہ دیکھتی ہے۔ بچے ہفتوں باپ کی شکل نہیں دیکھتے۔"

میں نے کہا "کیا تانگے والا اور کیا صنعت کار۔ سب کا یہی حال ہے۔ وہ رات کو کارخانوں پر چھاپے مارتے ہیں کہ کام ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں۔ سارا دن کاروباری مصروفیت میں گزارتے ہیں اور فکریں نیند حرام کر دیتی ہیں۔ اعصابی امراض اور بیماریوں کے باعث دنیا کی ہر نعمت حرام ہو جاتی ہے۔ پیسہ ہمیشہ کم نظر آتا ہے۔ لاکھ ہوں تو کروڑ، کروڑ ہوں تو ارب اور ارب ہوں تو کھرب کی کبھی ختم نہ ہونے والا چکر چلتا رہتا ہے۔"

"شکر ہے آپ کچھ زیادہ ہی قناعت پسند ہیں۔ ابھی تک تجرد کی زندگی گزار رہے ہیں۔"

میں حیران رہ گیا کہ یہ بات انہیں کیسے معلوم ہوئی "جی جناب۔ کچھ ایسی ہی مصروفیت حائل رہی کہ گھر بسانے کی فرصت نہیں ملی۔"

"چلیے اللہ مسبب الاسباب ہے لیکن اپنی بہن کی وجہ سے وہ آپ کو فوراً سبکدوش ہو جانا چاہیے حضرت۔"

"نہیں اب یہی ارادہ ہے۔" میں نے وفائی انداز میں کہا "یہ چاہیے کہ تانگا نہ سہی۔ کسی کے پاس کوئی گاڑی ہو تو ہم معقول کرایہ ادا کر دیں گے۔"

وہ ہنسنے لگا "ان پہاڑوں پر گاڑی ہوتی کسی کے پاس حضرت تب بھی وہ کرایہ نہ لیتا آپ سے۔ ایک ریڑھا ہے البتہ۔ صبح دودھ لے کر شہر جاتا ہے۔ شام کو خالی ڈول واپس لاتا ہے۔ وہ لوٹ آیا ہو گا۔"

میں نے کہا "اگر وہ مان جائے۔ میری طرف سے گزارش کر دیجیے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ حضرت۔ آپ میرے مہمان ہیں تو سب کے مہمان ہیں۔ آپ گزارش نہیں حکم کریں۔"

یہ اپنی نوعیت کا انوکھا سفر تھا۔ میں اور نازو ریڑھے کے فرش پر ایسے بیٹھے جیسے ہم انسان نہیں دودھ کے ڈول ہیں۔ سوٹ کیس اتنا نازک بھی نہیں تھا کہ نازو کے بیٹھنے سے ٹوٹ جاتا مگر اس نے انکار کر دیا۔ پھر ہمارے آرام کے لیے ریڑھے میں گدا بچھانے کی تجویز پیش امام صاحب کے گھر میں سے پیش کی گئی اور ایک گدا ڈبل کر کے بچھا دیا گیا۔ اس سے صورت حال خاصی بہتر ہو گئی ورنہ مجھے یقین تھا کہ خستہ حال سڑک پر ریڑھا اچھلتا ہوا چلے گا تو تختے اور تختے کی ہر کیل پر ہمارے لیے تشریف کو رکھنے میں اتنی تکلیف ہو گی کہ ہم اکڑوں بیٹھنے پر مجبور ہوں گے۔

ریڑھے کا مالک محمود اینڈ مسعود کا ابا تھا اور وہ تمام راستے فی زمانہ ساری دنیا کی اولاد کے ناخلف ہونے کا رونا روتا رہا اور بار بار عرض کرتا رہا کہ محمود اور مسعود کو پولیس میں بھرتی کرا دیں فی سبیل اللہ۔ اور یہ مشکل ہے تو کسی بھی سرکاری محکمے میں افسر لگوا دیں۔ میں اس کو کچھ دیر تسلی دیتا رہا کہ فکر مت کرو۔ انشاءاللہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ پھر نازو نے اس سے کہا کہ بابا شہر تو پہنچنے دو یا ہمیں راستے میں انہیں بھرتی کرا دیں فی سبیل اللہ۔ جنگل میں افسر لگوا دیں۔

وہ خاموش ہوا تو میں نے نازو سے کہا "آپ نے تذکرہ فرمایا تھا تاحیات کے تاہال مجبور رہنے کا؟"

وہ ہنسی "بھائی وہاں تو عورتوں کے پاس اس کے سوا کوئی موضوع ہی نہیں۔ شادی کیوں نہیں ہوئی۔ منگنی ہوئی کہ نہیں۔ کوئی پیغام آیا۔ لڑکا کیا کرتا ہے۔ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ ذات کیا ہے۔ بہن بھائی کتنے ہیں۔ کتنوں کی شادی ہوئی ہے؟ کب اور کس کے کتنے بچے ہیں۔ توبہ۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں نے شروع میں ہی خاموش رہنے کا بہانہ تلاش کر لیا تھا۔ یہ ظاہر کرتی رہی کہ میرے لیے بات سمجھنا مشکل ہو رہا ہے مگر وہ سب اتنی ڈھیٹ تھیں کہ ایک ایک بات کو سو دفعہ دہراتی تھیں۔ تنگ آ کے مجھے کچھ ہوں ہاں کرنی پڑتی تھی اور اشاروں میں یا ایک آدھ لفظ یا ٹوٹے پھوٹے جملوں میں جواب دے کر انہیں مطمئن کرنا پڑتا تھا مگر اطمینان کیسا جناب۔ ہر جواب کے بعد ایک کے چار سوال۔"

ہم غروب آفتاب کے کچھ دیر بعد راولپنڈی پہنچے۔ محمود مسعود کے ابا نے ہمیں چوک بنی مائی ویر پر اتار کے مجبوری عرض کی۔ ہم نے پھر کوئی سوال جواب دیا اور شکریے کے ساتھ روپے پیش کیے۔ اس نے لالچی نظروں سے دیکھتے ہوئے پہلے واپسی سے تذبذب کا مظاہرہ کیا اور پھر "بسم اللہ" کہہ کے واسکٹ کی جیب میں ڈال لیے "آپ نے مولوی صاحب کو مت بتانا جناب" وہ رخصت ہوتے وقت ہاتھ ملا کے بولا "اور میری عرض۔"

میں نے سوٹ کیس اٹھا لیا اور ہم سڑک کے ساتھ ہی ایک ریسٹورنٹ کے باہر پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہوٹل کا فرنٹ رنگین بلبوں سے اور ٹیوب لائٹس سے جگمگا رہا تھا۔ اندر ہال بھی بھرا ہوا تھا اور باہر بھی خوش باش لوگ گپ لگانے میں مصروف تھے۔ ہم ذرا فاصلے پر نسبتاً تاریک حصے میں لوگوں کی نظروں سے کچھ محفوظ تھے مگر ہمارے کان چنگھاڑتے لاؤڈ اسپیکر پر بجنے والے فلمی گانوں سے محفوظ نہیں تھے۔

ہم نے اتفاق رائے سے لسی کو ترجیح دی۔ زیادہ تر لوگ لسی پی رہے تھے۔ جب لسی آئی تو اس کی مقبولیت کی وجہ جائز لگی۔

نازو نے کہا "لسی پی کے ہم کہاں جائیں گے... لاہور؟"

"اتفاق سے ہم دونوں ہی مجبور ہیں ورنہ سوئٹزرلینڈ چلے جاتے۔ مجھے رابعہ نہیں بخشے گی، تمہیں غالب چھوڑنے والا نہیں۔"

"جناب کے ساتھ میں سیدپور آ گئی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہنم میں بھی جا سکتی ہوں۔"

"نہیں، وہاں تم غالب کے ساتھ جانا۔" میں نے کہا "دونوں کا وقت ایسا ہی گزرے گا جیسا اس دنیا میں گزر رہا ہے، میرا مطلب ہے بہت اچھا۔"

"ہم ابھی سیدھے لاہور جائیں گے... اور کہیں نہیں۔ بس میں نے کر دیا فیصلہ۔" نازو بولی۔

"میں نے یہ فیصلہ مسترد کر دیا۔" میں نے کہا اور اپنے قریب لاوارث لاش کی طرح پڑا ہوا اخبار اٹھا لیا جس کو اب پڑھنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔

"یہاں اب کیا کام رہ گیا ہے۔ لاہور جانے کے لیے بس ویگن ہر وقت ملتی ہے۔" نازو نے کہا۔

میں نے صفحہ پلٹا اور میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ شہری خبروں کے نیچے تین کالمی دس انچ میں ایک اشتہار لگا ہوا تھا۔ یہ ملک خداداد عباسی فیملی کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس میں "تعزیت" ہمدرد و احباب اور تعزیت کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا گیا تھا جو ان کے غم میں شریک ہوئے۔ مرنے والے کے سوئم کی تاریخ اور جگہ کا اعلان تھا اور آخر میں اپیل تھی کہ اس حلقے سے ان کو منتخب

www.paksociety.com

کرانے والے ووٹر بالخصوص اپنے محبوب رہنما کے قاتلوں کا سراغ لگانے کے کارِ خیر میں شریک ہوں اور دیگر محبِ وطن پاکستانی بھی ان ملزمان کو کہیں دیکھیں تو فوراً پولیس کو اطلاع دیں۔ نیچے سوگوار فیملی کے ارکان کے نام اور فون نمبروں کی لائن تھی اور ایک طرف پولیس کی "ہاٹ لائن" یعنی وہ نمبر جس پر کوئی بھی کسی بھی وقت فون کر کے خصوصی تفتیشی ٹیم کے نگران ایس پی محمود بٹ سے براہِ راست بات کر سکتا تھا۔

اشتہار میں اوپر ایک باکس میں میری صورت کا خاکہ تھا جو چشم دید گواہوں کی مدد سے بنا کے لگایا گیا تھا۔ میں نے وہ اخبار نازو کے سامنے کر دیا۔

"یہ تو آپ کا نسخۂ بزرگوار ہے۔"

"ہے نہیں، تھا۔" میں نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ میرا جو اب وہ نہیں رہا ورنہ اب تک میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتا۔ گاؤں میں بھی ایک اخبار تو آ چکا ہی ہو گا۔"

"معاملہ کسی عام فوتی کا نہیں، ایک وزیر کا ہے۔"

"تم نے غور کیا۔ اس میں صرف محبوب اور منتخب رہنما لکھا گیا ہے۔ خبر میں بھی وزیر جنگلات نہیں لکھا گیا۔"

نازو نے ایک اور خبر تلاش کر لی "وہ ممبر ہوا تھا۔ ابھی حلف نہیں اٹھایا تھا' بے چارہ۔"

"فارسی میں کہتے ہیں۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ یعنی جو کام باپ نہ کر سکے وہ بیٹا پورا کرتا ہے۔ باپ کی جگہ بھائی کر لو لیکن عزیزہ' سب سے اہم سوال تم نے ابھی تک نہیں کیا۔"

"یہ کہ اس میں رابعہ یا غالب کا ذکر کیوں نہیں؟"

"نہیں۔ سوال یہ بھی اہم ہے لیکن اس کا جواب تم خود تلاش کر سکتی ہو کہ کسی ثبوت اور شہادت کے بغیر ایک مشہور وکیل اور ایک نامور صحافی کو ملوث کرنا خلافِ مصلحت سمجھا گیا۔"

"پھر کیا ہے سب سے اہم سوال؟"

"آخر پولیس سید پور کیسے پہنچ گئی۔ ان کو رابعہ کے اور مرزا غالب کے نام کس نے دیے؟"

"ہاں۔ یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔"

"ہم نے اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اتنے کم وقت میں سید پور تک اطلاع پہنچ جاتی۔ اے ایس آئی سراج کے باپ کو پتا نہیں تھا کہ ہم کدھر گئے ہوں گے۔ ہم نے حلیہ بھی بدل لیا تھا۔ خانہ سنگ جانی کے پاس جہاں ہم نے اس کی گاڑی چھوڑی تھی صرف ایک کانسٹیبل نے ہمیں دیکھا تھا اور اس نے ہمیں پشاور جانے والی گاڑی میں بٹھایا تھا۔ گاڑی والا چلا گیا تھا تربیلا ڈیم۔ اسے کیا معلوم ہم کون تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور عبدالرحمان کو جب گاڑی کی ڈکی سے نکالا گیا ہو گا۔ اس کے شور مچانے یا گاڑی کو مشکوک سمجھ کے تحویل میں لینے کے بعد۔ تو وہ بہت کچھ بتا سکتا تھا۔ میرے تمہارے حلیے کے بارے میں۔ تمہارے کامران ہوٹل میں ٹھہرنے کے بارے میں۔ لیکن اسے ڈر ہو گا کہ اس نے ساری بات بتائی تو ممکن ہے مجرم پکڑے جائیں مگر پکڑے جانے والے مجرم بھی تو بولیں گے۔ وہ عبدالرحمان۔ اے ایس آئی نامدار سکوحہ اور سراج کی گمشدگی کے کرتوت بیان کریں گے کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ ہمیں پکڑوا کے خود کہاں جاتے ہو۔ چنانچہ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس نے جھوٹ بول کے اپنی جان چھڑائی۔"

"کیسا جھوٹ؟"

"جھوٹ تو جھوٹ ہوتا ہے۔ ایسا ویسا کیسا کیا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کہتا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں وہ کون تھے۔ انہوں نے مجھ سے میری ٹیکسی چھین لی اور مجھے گاڑی میں ڈال کے لے گئے میں انہیں پہچان نہیں سکتا اور نہ ان کے حلیے ٹھیک طرح سے بیان کر سکتا ہوں۔ میں نے ان کو غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ میری کسی سے ذاتی دشمنی نہیں۔ وہ جان چھڑا کے گھر بھاگا ہو گا اور شاید اس نے خاموشی سے سراج کو اس عورت سے الگ کر کے روانہ کر دیا ہو گا کہ جلد اور اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے خانہ سنگ جانی سے اپنی گاڑی لے آؤ۔ ان سے سراج نے بھی یہی کہا ہو گا کہ میری گاڑی چھیننے والے دو مرد اور ایک عورت تھے مگر میں ان کو پہچانتا نہیں۔ اس نے ہمارا حلیہ بھی نہیں بتایا ہو گا۔"

"یہ تم اتنے یقین سے کہہ رہے ہو؟"

"اپنی عقل سے کام لو۔ اگر عبدالرحمان اور یا اے ایس آئی سراج کا کیس بھی پولیس کے پاس ہوتا تو تفتیش کا شاخسانہ کیسے کھلتا نہ۔ اور میری بات کی صداقت یوں بھی ظاہر ہے کہ میری صورت کا یہ خاکہ میری پرانی شکل سے ملتا ہے۔ اصلی صورت صرف عبدالرحمان نے اور سراج نے دیکھی تھی۔ وہ حلیہ بیان کرتے تو سکندر بخت کی تصویر شائع ہوتی مگر خاکے میں نظر آرہا ہے فرخ وکیل اور ماشاء اللہ سے مجھے تو پولیس نے جس مصور سے خاکہ بنوایا ہے وہ شاید پہلے جوتے بناتا ہو گا۔ تصویر میں میری شکل بابا کے زمانے کے پھٹے ہوئے جوتے جیسی نظر آرہی ہے اور مجھ سے کیا اس فرخ وکیل سے بھی بس اسی حد تک ملتی ہے کہ دونوں کے چہروں پر ایک ناک تھی۔ دو کان تھے اور دو آنکھیں۔ یہ سب ایک چہرے کے فریم میں فٹ تھے جس کے اوپر سر کے بال تھے۔ رہی سہی کسر طباعت و اشاعت کے نقص نے پوری کر دی ہے۔ یہ بھی دیکھو کہ اخبار میں اس واردات کا ذکر ہی نہیں۔ جو اے ایس آئی سراج اور عبدالرحمان کے ساتھ ہوئی۔"

"پھر سید پور کی پولیس کو کیسے خبر ملی؟"

"یہ سوال میں نے کیا تھا' جواب تم دو۔" میں نے کہا۔

نازو ہنسی "چلو سوال میں کرتی ہوں۔"

"جواب اس کا یہ ہے مس نازو! کہ چوہدری رلا وڑ ہمارے خلاف میں ہے۔" میں نے کہا۔

نازو مرعوب رہ گئی۔ "ہمارے خلاف میں ہے؟"

"ہاں۔ اسی نے ہمارے فرار کی اطلاع دی۔ گاڑی کی ملکیت اور نمبر پلیٹ کے بارے میں ایس پی کو بتایا اور ایس پی نے ملک خدا داد عباسی کو۔ وہ ہم سے بلی چوہے کا کھیل روائتی طریقے پر کھیل رہا ہے۔ اس نے ہمیں بھاگنے کی مہلت دی اور پھر ہمارے پیچھے لگ گیا۔"

"لیکن اس کا مقصد؟"

"بعض اوقات تم انتہائی فضول' بلکہ احمقانہ سوال کرتی ہو۔ بچھو مجبور ہے اپنی فطرت سے۔ اس نے بیوی کی بات بھی مان لی اور بیٹے کو بھی خفا نہیں کیا۔ اسے معلوم تھا کہ پیڈرو کے ساتھ ہم کہاں جائیں گے۔ اس نے پیڈرو کا ایک اعتراف جرم بھی ہمارے حوالے کر دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ جب ہم خود پیڈرو سے سب پوچھ گچھ کر لیں تو اپنے حاصل کردہ نتائج کا موازنہ اس کے دیے ہوئے کیسٹ سے کریں۔ اب ہمارے پاس کیسٹیں ہیں جو ہم اولین فرصت میں سن لیں گے لیکن اس میں مجھے کوئی شک نہیں کہ ہمارے سید پور پہنچنے کی اطلاع چوہدری رلا وڑ ہی دے سکتا تھا۔ وہ تو کچھ خاندانی وار بے وقوف اور بنا تھا۔ کچھ پیش امام صاحب کا سہارا ہوتا کام آیا اور ہم بچ گئے۔"

"تمہارا مطلب ہے۔ گاؤں میں کوئی تھا؟"

"نہیں نازو۔ رلا وڑ یہ بات سمجھتا تھا کہ پیڈرو ہمیں کہاں لے جائے گا۔ وہ راولپنڈی تک ہمارے ساتھ ہو گا۔ پنڈی میں ہم اسے چھوڑ کے گاؤں آئے۔ چوہدری رلا وڑ نے پنڈی میں سب دیکھا اور سنا ہو گا۔ جو ہم نے کیا اور شاید اس نے ہی عباسی کے بھائی کو ہمارے بارے میں بتا دیا ہو گا۔ عباسی کا بھائی کچھ تو پہلے سے جانتا تھا۔ رابعہ اور غالب بروقت فرار ہونے سے بچ گئے اور ہم قسمت سے۔ تم تو پھر بھی محفوظ ہو کہ تمہارا نام کسی نے نہیں لیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کل تک صورتِ حال کچھ اور خراب ہو جائے گی۔"

"بار بار مجھے مت ڈراؤ۔"

"تم بلاوجہ مت ڈرو۔" میں نے اسے ڈانٹا "کل میری اصل تصویر بھی شائع ہو سکتی ہے۔ اس وضاحت کے ساتھ کہ فرخ وکیل درحقیقت سکندر بخت تھا۔ میرے اصلی اور نقلی چہرے سامنے آ گئے تو کیا رابعہ اور وقار یوسف یا ظفر کے لیے مسائل پیدا نہیں ہوں گے۔ فرخ وکیل زیادہ وقت ان کے ساتھ ہی رہا تھا۔ وہ کیا بتائیں گے کہ انہوں نے اس پر کیسے اعتبار کر لیا تھا۔ خیر وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں یہ بات معلوم نہیں تھی اور کسی غیر ملکی وکیل کے شناختی کاغذات چیک کرنا ہمارا کام بھی نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی رابعہ دوسرے کیس میں بھی ملوث ہے۔ ملک خدا داد عباسی کے قتل کے وقت اسے اور غالب کو فرخ وکیل کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ یہ بات کسی ایف آئی آر میں بھی ہے یا نہیں۔ یہ ابھی ہم نہیں جانتے مگر رابعہ کس کس بات کی تردید کرے گی۔ کہاں کہاں انکار کرے گی۔ ملک خدا داد عباسی کا بھائی' اس کا قاتل بھائی' بہت کمینہ ہے۔ وہ اپنا جرم کسی کے سر تو منڈھے گا پھر وہ عام قربانی نہیں ہے۔ اس کے بھائی کا حلقہ اب اس کا حلقہ ہے۔ اسے خود کو ہر الزام سے بچانا ہے۔ اس کا اثر و رسوخ ہم سب کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا کر سکتا ہے۔ خصوصاً رابعہ اور غالب کے لیے۔ کوئی کتنا ہی بڑا وکیل یا صحافی کیوں نہ ہو۔ قانون سے بالاتر تو نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پولیس ان کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے نرمی برتے مگر ان کا نام ایف آئی آر میں آ جائے خصوصاً قتل جیسے سنگین جرم میں تو گرفتاری لازمی ہے۔ بعد میں ان کی ضمانت ہو جائے اور وہ خود کو جائے واردات سے دور ثابت کر دیں۔ وہ ایک الگ بات ہے۔"

نازو پریشان ہو گئی تھی۔ وہ میرے اندیشوں کی تردید نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے کہا "پھر تو ہمیں بالکل دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"مجھے ڈر ہے کہ راستے میں بسوں کے اڈوں پر اور ریلوے اسٹیشن پر چیکنگ نہ کی جا رہی ہو۔ پنڈی سے لاہور تک پولیس کو میری اصل تصویر بھی فراہم کر دی گئی ہو۔ فرخ وکیل کا خاکہ تو نہ جانے کتنے اخباروں کو جاری کیا گیا ہو گا۔ ہم پر الزام ہے کہ عباسی کو لوٹنے کے بعد قتل کیا یعنی بیک وقت ڈکیتی اور قتل کے دو سنگین جرم۔"

"کیا لوٹا تھا تم نے اس کا؟"

"لکھوانے والے کچھ بھی لکھوا سکتے ہیں۔ ایک لاکھ روپے نقد۔ دس ہزار ڈالر۔ ایک ہزار پاؤنڈ جیولری اور گھڑی۔ اور برآمد بھی کر سکتے ہیں اگر مجرم پکڑے جائیں۔" میں نے کہا۔

"دس ہزار ڈالر اور ایک ہزار پاؤنڈ برآمد کرنا اتنا آسان ہے؟"

میں نے کہا "بھولی لڑکی۔ یہ سارا کھیل کاغذی ہوتا ہے۔ کیس سوچ سمجھ کے بنائے جاتے ہیں۔ کسے ملوث کرنا ہے کسے نہیں۔ کیا بتانا ہے کیا چھپانا ہے۔ قتل تو ہو گیا اب اس سے کیا سیاسی فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ کس کی جذباتی ہمدردی حاصل کی جا سکتی ہے۔ تمام خبریں انہی مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جاری کی جاتی ہیں اور جو پکڑے جاتے ہیں ان سے منسوب سارے بیانات خواہ وہ اقبالی ہوں ایک خبر کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔ پولیس کانفرنس میں ایک ہزار پاؤنڈ اور ایک لاکھ ڈالر کیا صحافیوں کے سامنے توپیں اور ٹینک بھی پیش کیے جا سکتے ہیں کہ یہ ملزم کی تحویل میں تھے اور وہ ان سے حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ جب حکومت کسی پر کیس بنانا چاہے تو ثبوت کوئی مسئلہ نہیں ہوتے۔"

نازو نے اس وقت ایک عقلمندی کی بات کی "یہ جو ملک خدا داد عباسی تھا۔ یہ سرکاری پارٹی کا تھا۔ اپوزیشن کا یا آزاد

www.paksociety.com

امیدوار؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میں سیاسی خبروں سے قطعی لاتعلق ہوں مگر اس کا رزِ جنگلات نامزد ہونا اور حلف اٹھانے میں تاخیر کا مسئلہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے سودے بازی کی ہوگی اور آخری وقت تک کوئی بات تصفیہ طلب بھی کہ دیر ہوئی۔ پارٹی کے لوگوں کے ساتھ ایسا مسئلہ نہیں ہوتا۔ عام طور پر وزارت کی رشوت حریف جماعت کو یا کسی آزاد امیدوار کو دی جاتی ہے جس کا اپنے حلقے میں بہت زیادہ اثر و رسوخ ہو۔"

نازو نے اخبار دیکھتے دیکھتے اچانک کہا "یہ دیکھو۔ عباسی سے تعزیت کرنے والوں کے بیانات پڑھو غور سے۔"

"ان میں کہا ہے۔ وہی کہ ملک اور قوم کا ناقابلِ تلافی نقصان ہو گیا، عوام ایک عظیم محبِ وطن اور مخلص رہنما سے محروم ہو گئے۔"

"انہیں بھی ہم پڑھ لو تو سہی۔"

سرورق کی خبر کا بقیہ آخری صفحے کے آخری کالم میں تھا اور اس میں مختلف سیاسی راہنماؤں کے ساتھ اہم سماجی شخصیات اور کاغذی تنظیموں کے بہت سے نو ساختہ صدور کے بیانات تھے۔ ہر ایک نے بڑھ چڑھ کے تعاطی کی تھی اور یوں لگتا تھا کہ ان سے زیادہ عباسی کی مرگِ ناگہاں سے کوئی اور متاثر نہیں ہوا۔ سب سے زیادہ صدمہ انہی کو ہے اور عوام بھی رہائے غم میں غوطہ زن ہیں کیونکہ اس جیسا راہنما نہ تھا نہ ہوگا۔

چونکا دینے والا نام چوہدری دلاور کا تھا۔ اس نے ملک خداداد عباسی کے بھائی ملک نبی داد عباسی سے ملاقات کی تھی اور اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے کے بعد اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ قاتل بہت جلد گرفتار کر لیے جائیں گے۔

نازو بولی "چوہدری دلاور کا کیا تعلق عباسی سے؟"

"تعلق تو دلاور نے پیدا کر لیا ہوگا۔ آخر وہ بھی سیاست کے میدان میں کودنے پر کمربستہ ہے۔ ہم اس کی دال میں کالے نہ بھجاتے تو اب تک ملک اور قوم کا درد دل میں بسائے کسی پلیٹ فارم سے حب الوطنی کے جذبات سے چھلکتے بیانات دے رہا ہوتا۔"

نازو بولی "میرا خیال ہے کہ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا نبی داد سے ملاقات کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ہمارے بارے میں تفصیل سے وہ ساری باتیں بتا دے جو نبی داد نہیں جانتا۔ نبی داد کے لیے یہ معلومات بے حد کارآمد ثابت ہوں گی اور وہ چوہدری دلاور کے اس تعاون کا صلہ بعد میں ادا کرے گا۔"

"میں نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ پنڈی تک ہمارے پیچھے آیا تھا۔ اسی نے خداداد عباسی کو سب بتایا ہوگا لیکن دوسرے بہت سے لوگوں کے بیانات پڑھ کے اب میرا خیال بدل گیا ہے۔ زیادہ تر بیانات حزبِ اختلاف کے ہیں۔ وہ قتل کا ذمے دار حکومت کو ٹھہرانا چاہتے ہیں۔"

"مشکندر وہ جو پیر صاحب تھے جو تحریکِ بحالی کے کرتا دھرتا تھے۔ انہوں نے عباسی کے خلاف بیان دیا تھا۔"

"وہ سرکاری آدمی ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ جس نے بھائی کو حکومت کی مخالف پارٹی کی نامزدگی حاصل تھی۔ جب تک وہ حکومت کے خلاف آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہوگا اور حکومت کو بلیک میل نہیں کرے گا۔ فائدہ کیسے اٹھائے گا۔ اسے خریدنے اور اس کی آواز کو دبانے کے لیے پیش کش حکومت کی جانب سے ہی آئی ہے۔ حزبِ اختلاف کسی کو کیا دے گی سوا وعدوں کے۔" میں نے بڑا اسید کھیے میں کہا۔

"دردناں ہو گئے۔ ہمارا کسی سے رابطہ نہیں۔" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "چلو کہیں سے فون کر لیتے ہیں۔ آج رات یہاں کسی ہوٹل میں گزار کے صبح چلے جائیں گے۔"

"اگر تمہیں اندیشہ ہے کہ لاہور جانے والی بسوں میں ہم کو تلاش کیا جا رہا ہوگا تو ہم ٹرین سے چلے جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "اس وقت کوئی ٹرین لاہور نہیں جاتی۔ تیز چلنے کی رات روانگی بجے۔"

نازو نے کہا "میں یہاں ایک منٹ رکنا نہیں چاہتی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہیں بلانے ہم پر کوئی مصیبت نازل نہ ہو جائے۔ یہاں خطرہ زیادہ ہے۔ یہ عباسی قبیلے کا علاقہ اثر ہے۔ یہاں کی پولیس بھی زیادہ دباؤ میں ہوگی اور ویسے بھی سیاسی جوڑ توڑ اور سرگرمیوں کا یہی محور ہے۔ لاہور میں ہمارے محفوظ ٹھکانے ہیں۔"

"اگر ہم کراچی چلے جائیں میں اور رابعہ؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا "خیر لاہور جا کے ہی فیصلہ کریں گے۔ سب سے محفوظ جگہ کراچی ہے ہمارے لیے اور مجھے تو وہاں فوراً پہنچ جانا چاہیے۔"

"وہاں کیا ہے؟"

"یار تم اتنی جلدی بھول گئیں۔ بیٹرو نے کیا کہا تھا۔ ایک ڈائری ہے اس کے آفس میں اس کی میز کی دراز میں۔"

"وہ۔۔۔ دراصل میرا ذہن اس وقت دوسری الجھنوں میں گرفتار ہے۔ پہلے تو یہاں سے نکلو۔ پھر کراچی بھی چلے جانا۔ ہم ایسا کرتے ہیں کوئی گاڑی لے کر چلے جاتے ہیں۔"

"اس وقت میں کوئی شو روم کھلوا کے گاڑی کا سودا نہیں کر سکتا۔"

"میں گاڑی خریدنے کی بات نہیں کر رہی تھی۔ پرائیویٹ گاڑیاں کرائے پر مل جاتی ہیں۔ لاہور تک جانے کا کرایہ کتنا پانچ سات ہزار۔"

یہ آئیڈیا مجھے پسند آیا۔ نازو کی بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ سب سے پُرخطر جگہ راولپنڈی ہے جہاں ہزاروں آنکھیں عباسی کے قاتلوں کو تلاش کر رہی ہیں۔ یہ کیسی عجیب رسم ہے۔ قومی رہنما سمجھتی تھی کہ اس کو قتل کرنے والا اس کے بھائی کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ سب لوگ جو ان دونوں کے برادرانہ جذبات کے پیچھے سیاسی رقابت کی خاندانی روایات کو سمجھتے تھے اچھی طرح جانتے تھے کہ اب جب تک زندہ ہو جیا اس کا جانشین نہیں ہو سکتا اور بڑے بھائی کے ہوتے چھوٹا بھائی اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ خداداد عباسی بھی جانتا ہوگا کہ سیاست میں رشتوں کی جذباتی اہمیت کچھ نہیں ہوتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ سازشی عناصر کے حربے بدل رہے ہیں۔ رشوت اور دھاندلی کے ساتھ اب تشدد اور بلیک میلنگ کا عنصر بھی کامیابی کی منزل تک پہنچنے کا جائز وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ اس لیے بھائی کو ہر جگہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا کہ ایک طرف تو دنیا کے سامنے ان کے باہمی اعتماد و اتحاد کی مثال ہو لیکن درحقیقت یہ عدم اعتماد کا نتیجہ تھا کہ خداداد عباسی بھائی کو اکیلا چھوڑتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اس طرح بظاہر چھوٹا بھائی اپنے بڑے بھائی کا محافظ تھا مگر اصل معاملہ اس کے برعکس تھا کہ بڑا بھائی ہر وقت اپنے چھوٹے بھائی پر خود نظر رکھتا تھا۔

مجھے راولپنڈی کے عام راستوں سے واقفیت تھی۔ کسی اچھے ہوٹل میں جا کے ہم آسانی سے کرائے کی کار بھی لے سکتے تھے مگر نازو بجا طور پر آج رات یہاں رکنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ گزشتہ شب ہم نے تھوڑا بہت آرام کر لیا تھا۔ آج رات ہم سفر کے دوران بے فکری سے کار کی پچھلی سیٹ پر سو سکتے تھے جبکہ یہاں سے نکل جانے کے لیے ترجیحی رات کے بعد کا وقت ہر لحاظ سے موزوں تھا۔

بھاری سوٹ کیس اٹھا کے چلنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا اور ابھی تک مجھے کسی کار رینٹل سروس کا پتا نہیں چلا تھا۔ ایک ٹیکسی والے نے ہمیں صدر جانے کا مشورہ دیا اور خود ہی ہمیں صدر لے گیا۔ رات کے ساڑھے نو بجے تھے اور صدر بازار کی رونق ماند پڑ چکی تھی۔ اب صرف ہوٹل ریسٹورنٹ کھلے ہوئے تھے یا پان سگریٹ کی دکانیں۔ میرے ذہن میں ایک خیال مبک اپ سے جو اور حلیہ بدلنے کا بھی تھا۔ اتنی رات گئے کچھ ہو نہیں سکتا تھا لیکن خوا ہیں مسبب الاسباب ہے۔ اچانک میں نے ایک درزی کی دکان دیکھی جہاں سلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ کام زیادہ ہونے کی وجہ سے ٹیلر ماسٹر بھی مصروف تھا اور کاریگر بھی سر جھکائے سلائی کر رہے تھے۔

میں نے اندر داخل ہونے سے پہلے نازو سے مشورہ بھی نہیں کیا۔ وہ مجبوراً میرے پیچھے اندر آ گئی۔ ٹیلر ماسٹر نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے کہا "ماسٹر صاحب۔ شیروانی کتنے کی ہے؟"

اس نے خوش دلی سے کہا "سر ہم کپڑے بیچتے ہیں، بیچتے نہیں۔"

"میں نے بھی صرف قیمت پوچھی ہے۔ کسی دولہا کے کپڑے ہیں یہ سب؟" میں نے کہا "باہر کا کپڑا ہے؟"

"ہاں جی۔ کپڑا پاکستانی ملک ہے۔ سلائی ملا کے سوا چار ہزار میں سب تیار ہوا ہے۔"

میں نے آگے جھک کر کہا "اگر میں آپ کو دگنی قیمت دوں؟"

وہ بھونچکا رہ گیا "دگنی قیمت؟"

"بات قیمت کی نہیں، میری ضرورت کی ہے۔ فائدہ آپ اٹھا سکتے ہیں اگر یہ کپڑے فوراً یعنی کل پر حوالے کے نہیں ہیں تو آپ پھر تیار کر سکتے ہیں۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں دس ہزار تک دے سکتا ہوں۔"

وہ بوکھلا کے نازو کو دیکھنے لگا "اتنی جلدی ہے آپ کو۔ آج رات ہی شادی کا ارادہ ہے کیا؟"

میں نے ہنس کے کہا "نہیں۔ کل پرسوں میں کسی قیامت کے آنے کی امید کوئی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آج میری فلائٹ ہے کینیڈا کے لیے۔ شادی وہاں ہوگی اور میں چاہتا ہوں کہ اسی طرح ہو جیسے پاکستان میں ہوتی ہے۔ دلہا دلہن تو وہاں پاکستانی مل جاتے ہیں قاضی اور باراتی سب دستیاب ہیں۔ بس ایسے ملبوسات نہیں ملتے۔"

اس نے نازو کی طرف دیکھا "دلہن کے جوڑے خرید لیے ہیں آپ نے؟"

"بھائی وہ میں کیوں خریدوں گا۔" میں نے کہا "اس کے ماں باپ بلکہ ہر لڑکی کے ماں باپ بہت پہلے سے تیاری شروع کرتے ہیں۔ یہ تو میں ہی ہوں جس کے آگے پیچھے فکر کرنے والا کوئی نہیں تھا اور مجھے اپنی شادی کا پہلے سے کوئی تجربہ نہیں ہے نا۔"

وہ بولا "لیکن شیروانی۔۔۔ ایسے ہر ایک کو فٹ نہیں آتی۔"

میں نے کہا "تھوڑا بہت فرق چلے گا۔ تنگ ہوئی تو میں اپنا وزن پانچ دس پاؤنڈ کم کر لوں گا۔ ڈھیلی ہوئی تو اندر کچھ پہن لوں گا اضافی۔"

"ٹھیک ہے جی۔ ایسی بات ہے تو آپ لے جائیں۔ اس کی ڈیلیوری تین دن بعد تھی۔" اس نے لباس اتار کے پیک کرنا شروع کر دیا "آپ کی دلہن کو شاید یہ لباس زیادہ پسند نہیں آیا اس لیے خاموش ہیں۔"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ یہ بہن ہے میری اور خدا نہ کرے کہ ایسی فضول دلہن ہو میری یا کسی کی۔"

وہ ہنسنے لگا "آئی ایم سوری۔ لیکن ماشاءاللہ آپ کی بہن بھی لاکھوں میں ایک ہیں۔"

نازو نے اپنے سوٹ کیس میں سے دس ہزار روپے چاہے تو اس نے پورے سوا چار ہزار لیے "کمائی تو سارا سال کرتے ہیں سر۔ اس سودے میں کون سا نقصان ہوا ہے مجھے۔ محنت تو پوری مل گئی لیکن تھوڑی سی خوشی اضافی ملی جیسے کہ ہم نے باہر رہنے والے کسی پاکستانی بھائی کی شادی میں شرکت کر لی۔ اللہ مبارک کرے۔"

www.paksociety.com

ایسا اکثر ہوتا تھا۔ سب لوگ لالچی اور خود غرض اور جھوٹے نہیں تھے۔ ان سے کوئی بے ضرر سا جھوٹ بول کے بھی شرمندگی ہوتی تھی۔

نازو باہر آتے ہی بگڑ گئی "یعنی اب آپ دُلہابن کے جائیں گے؟ کیا خیال ہے رابعہ کو فون نہ کردوں؟ وہ بھی تیار رہے۔ قاضی کے ساتھ آپ کا استقبال کرے۔"

میں نے کہا "آئی ریلی ڈو۔ ہر دم تیار رہے گلے پڑنے کو۔ ہم ہی ٹالتے رہتے ہیں۔ مصیبت جتنی دیر سے آئے اچھا ہے۔"

"پھر یہ شوق کیسا۔؟"

"وہ جو کہا ہے نا غالب صاحب نے "تمہارے والے صحافی غالب نے نہیں۔ اصلی والے بڑے غالب نے ... نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی۔ ساری عمر لوگوں کی شادیوں میں نورے پلاؤ بھی کھاتے ہی رہے ہیں۔ ایک دن دُلہا کا لباس پہن لیا تو کیا ہوا۔"

"اور یہ لباس پہن کے آپ میرے ساتھ بیٹھیں گے؟ ہرگز نہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ تم میرے ساتھ بیٹھ جانا۔ یا آگے بیٹھ جاؤں گا میں۔ ورنہ ڈکی میں جگہ ہوگی تمہارے لیے۔ چلو اب غصہ تھوک دو تاکہ ہم کھانا کھالیں کہیں۔ پھر چلتے ہیں۔"

"مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔" نازو نے خفگی سے کہا۔

وہ واقعی بہت اپ سیٹ تھی۔ میری باتوں نے اسے غالب کی طرف سے متفکر کر دیا تھا۔ اسے رابعہ کی تشویش لاحق ہوگئی تھی۔ اس پر بیٹو کی موت کا اثر تھا اور وہ ولادر کے خیال سے پریشان تھی جس نے ہمارے ایک اور دشمن ملک نبی دار عباسی سے ملاقات کی تھی۔ اس کا خیال غلط نہیں تھا کہ ہم نے راولپنڈی تک کے چکر مارے۔ اصل مقصد حاصل نہیں ہوا۔ دشمن بلا وجہ بنا لیے۔

میں نے اسے سمجھایا "زیادہ تر جو تمہارے ذہن میں خیال آتا ہی ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جو ذہن میں آئے وہ سچ بھی ثابت ہوجائے۔ آخر رابعہ اور غالب بھی ماشاءاللہ سے عاقل و بالغ ہیں اور کسی چوہدری ولادر سے کم بھی نہیں۔ اپنے دفاع کے لیے کچھ انہوں نے بھی کیا ہوگا۔ یہ ساری باتیں معلوم ہوجانے کے بعد۔ چوہدری ولادر کا نبی دار سے ملنا صرف ایک سیاسی نوعیت کی رسمی ملاقات بھی ہوسکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ چٹے بٹے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔"

میری باتوں سے نازو کو کچھ قرار آیا۔ "اگر ایف آئی آر میں ان کا نام نہ ہو تو پولیس پھر بھی پکڑ سکتی ہے انہیں؟ شک میں۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا "شک میں تو وہ ہمیں ابھی اسی وقت پکڑ سکتے ہیں۔ ہم بہن بھائی نہیں۔ گھر سے بھاگے ہوئے عاشق معشوق لگتے ہیں۔ شریف آدمی اعتبار کرلیتا ہے۔ پولیس والے ثبوت مانگتے ہیں۔"

نازو نے مسکرا کے کہا "ابھی ایک لاکھ ثبوت والی ٹیپ سوٹ کیس میں۔"

"چلو اب تمہاری خفگی تو دور ہوگئی۔ کچھ کھالو۔"

"نہیں میں کافی پی لوں گی۔ سینڈوچ کھالوں گی۔"

"چلو وہ بھی کافی ہوں گے۔" میں نے کہا "کافی سے تو پیٹ نہیں بھرتا۔"

کھانے کے بعد میں نازو کو ائرپورٹ لے گیا۔ یہ سارا پروگرام میں نے باتوں کے دوران بنالیا تھا۔ پورٹر نے سوٹ کیس ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچا دیا تھا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم رات کی کسی فلائٹ سے جارہے ہوں گے۔ اسے میں خود دوسری طرف لے گیا جہاں۔ "مین الاقوامی آمد" کا بورڈ آویزاں تھا۔

میں نے نازو سے کہا "اب جیسا میں کہوں ویسا کرو۔ تم جلا کر یہ ٹائلٹ میں اور یہ سوٹ کیس ساتھ رکھو۔ اس میں جو لباس سب سے اچھا ہو وہ پہن لو۔ میں یہ لباس عروسی زیب تن فرماتا ہوں۔"

"سکندر۔ آخر اس کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے اسے ڈانٹا "بے وقوف لڑکی۔ یہ صرف دُلہا کا لباس نہیں۔ خاندانی نواب" زمیندار" پرانے وضع دار قسم کے رئیس آج بھی یہ لباس پہنتے ہیں۔ ہم ہیں خانزادہ اور تخریب عثمانی آف سابق حیدر آباد دکن۔ فرانس میں رہتے ہیں اور پاکستان میں اپنے کزن خانزادہ عالمگیر عثمانی کی شادی کے لیے تشریف لائے ہیں۔ تم بھی ہماری کزن ہو اور یہاں ہماری پروٹوکول افسر" گائیڈ" سیکرٹری اور پی آر او۔"

"ایک وقت چار عہدے" نازو ہنسی "اور جناب اورنگزیب کے کزن عالمگیر کی شادی کہاں ہے؟"

"یہاں سے ہم اوکاڑے جائیں گے۔ سابق ریاست دکن کے خاندان کے سب ہی افراد مختلف ممالک میں سیٹل ہو چکے ہیں بچے راجا صاحب محمود آباد کی فیملی کے کچھ لوگ آسٹریلیا میں بھیڑوں کے فارم کے مالک ہیں۔ ہمارا کزن اوکاڑہ میں زرعی فارم چلا رہا ہے۔ ہم نکلسن میں پیچ ہاؤس کے مالک ہیں۔ اگر ہم سب پاکستان میں ہوتے تو گڈو رہتے۔ گوالے اور سائیس وغیرہ کہلاتے۔"

چند منٹ بعد میں بڑی رئیسانہ شان کے ساتھ آف وائٹ چکن کی شیروانی۔ پاجامے اور طرح دار کلاہ سجائے کھڑا تھا اور نازو نے بڑی عقلمندی سے کام لیتے ہوئے زنانہ شلوار پر مردانہ قمیص پہن لی تھی اور بال کھلے چھوڑ دیے تھے۔ لاابالی پن اور بے نیازی کا یہ انداز بیک وقت فیشن اور اس کے یوتھ فیملی سے تعلق کی دلیل بن گیا تھا۔ احساس کمتری کے مارے ہوئے تنگ نظر لوگ بھی گھورتے رہے "ہماری بلا سے۔"

میں نے انگریزی میں "ویلکم تو پاکستان سر" بو رانٹ اے ٹیکسی" کہنے والے ٹیکسی ڈرائیور سے فرنچ میں بات کی تو وہ بوکھلا گیا۔

نازو ہنس پڑی "اور یہ خان نازو صاحب۔ دس انونات ہیں۔ یہاں فرنچ کوئی نہیں جانتا۔"

میں نے تمکنت سے کہا "سوری بھئی۔ اب تم ہی بات کرلو کزن۔"

اوکاڑے کا سُن کے ٹیکسی ڈرائیور شش و پنج میں مبتلا ہوگیا۔ اس کی بہت قیمتی کار تھی جسے وہ ٹھیکے پر چلاتا تھا۔ دن میں گاڑی مالک کے پاس رہتی تھی۔ رات کو وہ ائرپورٹ پر کسی مسافر کو بک کرلیتا تھا اور کسی ٹورسٹ سے بات ہوجاتی تھی تو مالک وہ چار دن بغیر گاڑی کے بھی گزار لیتا تھا۔

"سر آپ ایسا کیوں نہیں کرتے ابھی لاہور چلیں۔ چند گھنٹے کسی ہوٹل میں قیام فرمائیں۔ صبح آرام سے اوکاڑے پہنچادوں گا۔ صرف سفر ٹنگل سے بعد اُس سے۔"

"ہم جانتے ہیں انکل۔ ہمارا کزن خانزادہ عالمگیر عثمانی وہاں بہت بڑے زرعی فارم کا مالک ہے۔ مگر کیا رات کو لاہور شیرٹن میں جگہ مل جائے گی۔"

"شیرٹن۔۔۔ لاہور میں تو شیرٹن نہیں ہے سر۔"

نازو نے کہا "تو پھر کزن۔ لاہور میں سرشلوریں کے ہوٹے ہوٹل ہیں۔۔۔ اور چیف سیکرٹری بھی آپ کے والد کی سوتیلی خالہ کے نواسے ہیں۔ وہ خوش ہوں گے۔"

میں نے سوچ کے کہا "پھر لاہور چلو۔"

یہ ایکٹنگ ہمارے بہت کام آئی۔ راستے میں تین جگہ چیکنگ ہوئی۔ میں نے نازو کو روک دیا اور ڈرائیور سے کہا "ان کو بتاؤ ہم کون ہیں؟"

ڈرائیور پہلے ہی مرعوب تھا۔ اس نے کہا "یہ تو پیرس سے آئے ہیں ابھی ابھی۔ میں چک لالہ ائرپورٹ سے لایا ہوں۔ خانزادہ اورنگزیب عثمانی۔ اور ساتھ میں ان کی کزن۔ اوکاڑے میں ان کے کزن خانزادہ عالمگیر عثمانی کا زرعی فارم ہے۔"

پولیس والے نے بیزاری سے کہا "ارے بابا جاؤ خدا کے لیے اتنے لمبے لمبے نام۔"

ڈرائیور نے کہا "معاملہ کیا ہے سر جی!"

"ارے آدھی رات ڈال دیا ہے۔ یہ تمہارے خانزادہ جیسا نواب زادہ حرام زادہ۔ ملک خداداد عباسی قتل ہوگیا ہے۔ قتل تو ہوتا تھا اسے۔ اب آرڈر ہے کہ سڑک پر پنڈی لاہور آنے جانے لوگوں پر نظر رکھو۔ قاتل فرار نہ ہوجائے۔" پولیس والے نے اخبار اس کے سامنے کردیا "یہ بندہ کہیں دیکھا تو نہیں؟"

میرا دل بیٹھ گیا کیونکہ ٹیکسی ڈرائیور نے اخبار کو غور سے دیکھ کے میری طرف دیکھا تھا۔ یہ دوسرا اخبار تھا اگلے دن کا۔ اس میں دن اشتہار تھا مگر میں نے دو چوکھٹوں میں دو تصویریں دیکھ لی تھیں۔ جب ٹیکسی ڈرائیور نے نفی میں سر ہلایا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کا موڈ بدل گیا "سر آپ ہیں خانزادہ اورنگزیب عثمانی۔ پیرس سے آئے ہیں۔"

میں نے کہا "شک کی کیا بات ہے اس میں۔"

اس نے پلٹ کے کہا "تمہاری تصویریں دیکھی تھیں میں نے اخبار میں۔ تم سوسب بدلتے کے آ رہے ہو۔"

"پھر تم نے پولیس کو بتایا کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ پہلے میں کچھ اور کہہ چکا تھا۔ میں جھوٹ بول کے پھنس گیا تھا۔ وہ تمہارے ساتھ مجھے بھی گرفتار کرلیتے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ ایک وزیر کا قتل ہوا ہے۔"

"ابھی وہ وزیر بنا نہیں تھا۔ نامزد ہوا تھا۔"

"اسمبلی کا ممبر تو تھا۔ تم نے اسے لوٹا اور قتل کیا اور بیٹھ گئے میری گاڑی میں۔" وہ فریادی لہجے میں بولا "مجھے مروا دیا نا۔ چلو اب اتر جاؤ۔"

"کیا مطلب؟ یہاں جنگل میں اُتر جائیں۔" نازو نے کہا "پاگل ہوئے ہو۔"

"پاگل ہونا اچھا ہے تمہارے ساتھ جیل جانے سے۔"

"دیکھو اب تم واپس نہیں جاسکتے۔ پولیس تم سے پوچھے گی کہ خانزادہ اورنگزیب عثمانی کو اتنی جلدی اوکاڑہ پہنچا کے لوٹ آئے زرعی فارم تک۔"

"اُف میری تقدیر۔" اس نے سر پہ ہاتھ مارا۔

میں نے کہا "اب تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ اشارے کام لو۔ رات کا وقت ہے۔ کوئی بھی ہمارے چہرے غور سے نہیں دیکھ رہا ہے۔"

"نہیں جی۔ ایک جگہ میں بچ گیا۔ دوسری جگہ پکڑ۔" پھر؟"

میں نے کہا "حوصلہ رکھو گے تو نہیں پکڑے جاؤ گے اور صبح واپس آؤ گے تو تمہاری جیب میں پانچ ہزار ہوں گے۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں پانچ ہزار پہ۔"

"اب بچے جیسے مت ریکھنا" میں نے کہا "صرف ہاں یا نہ میں جواب چاہیے مجھے دس ہزار لو گے؟"

وہ خوف زدہ ہو گیا "آپ مجھے کیوں نہیں؟"

"انکار کی صورت میں ہم تمہیں زبردستی لے جائیں گے۔ خواہ تمہیں مار کے تمہاری لاش ڈکی میں ڈالنی پڑے۔" میں نے کہا "اگلی چیک پوسٹ سے پہلے ڈرائیونگ خاتون کے سپرد کردینا۔ خود ساتھ بیٹھ جانا۔ جہاں وضاحت کی ضرورت ہو وہی کہنا جو پہلے کہا تھا تاکہ تمہارے بیان میں فرق سے کوئی مشکل پیدا نہ ہو۔ تم نے بیان بدلا تو ہم بہرحال نکل جائیں گے۔ تم رہ جاؤ گے۔ دو جانیں گے اس پولیس مین کے ساتھ۔ پیچھا کرکے دیکھو لیں یا فائرنگ کرکے۔ یوں ہم کسی کے ہاتھ نہ آنے والے نہیں ہیں۔ لیکن مرنے سے بھی کون ڈرتا ہے۔"

اب اس کی حالت غیر ہوگئی۔ نہ جانے نازو نہ پائے ... قسمت۔

www.paksociety.com

وہ بُری طرح پھنس گیا تھا۔ پولیس کے سامنے اقرار کر کے بھی اور ہمیں انکار کر کے بھی۔ میرے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا مگر اس کو نفسیاتی خوف نے یقین دلا دیا کہ میرے پاس کوئی جان لیوا آتشیں اسلحہ ہے۔ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں پھول تو ہوتے نہیں۔

"دیکھو۔ اگر تمہارے ساتھ میں پکڑا جاؤں۔ تو خدا کے لیے مجھ پر رحم کرنا۔ یہ کہہ دینا کہ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں اور تم نے ہی مجھے جھوٹ بولنے پر مجبور کیا تھا۔ گن پوائنٹ پر۔ میرا جھوٹ چل جائے اور تم خیریت سے لاہور میں اتر جاؤ تو پھر مجھے انعام ضرور دینا۔"

"سے انعام کہنا غلط ہوگا۔ وہ معاوضہ کہلائے گا۔ اس رسک کا جو تم نے مجبوراً لیا۔ بلاوجہ ہم کسی سے زیادتی نہیں کرتے اس لیے دس ہزار بھی دے دیں گے حالانکہ تم نے تو ان پر لعنت بھیج دی تھی۔"

"تعمیر یہ غصے میں کہا تھا میں نے" وہ پچھتانے لگا۔

جہلم کے بعد دوسری بار ہمیں گوجرانوالہ سے کچھ پہلے روکا گیا۔ وہاں سڑک کے کنارے ایک ہی پولیس کی گاڑی تھی جس پر نیلی روشنی گھوم رہی تھی۔ مجھے پولیس کا یہ طریقہ پسند آیا کہ وہ بزدلوں کی طرح چھپ کے کارروائی نہیں کرتے۔ بہادروں کی طرح علی الاعلان کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مجرموں کو پہلے سے پتا چل جاتا ہے کہ خبردار ہم کھڑے ہیں یہاں۔ سوچ سمجھ کے آگے آنا۔ ملزم سمجھدار ہو تو راستہ کاٹ کے نکل جائے۔

میں نے کہا "گاڑی روکو۔ آگے پولیس کھڑی ہے۔"

"اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

میں نے اسے جھاڑ پلائی "تم سے اپنی عقل استعمال کرنے کو کس نے کہا ہے۔ تم صرف گاڑی چلاؤ۔ بلاوجہ زبان مت چلاؤ۔"

اس نے گاڑی روک لی۔ میں اتر کے ڈگی میں لیٹ گیا۔ اس سے نازو کے لیے بہت آسانی ہو گئی۔ پولیس نے گاڑی روک کے ٹارچ کی روشنی میں اندر دیکھا اور بنظر غائر ان ہر دو کی اشکال ملاحظہ فرمائیں۔

نازو نے روتے ہوئے لہجے میں کہا "اب اور دیر مت کرو۔ میری ماں کا آخری وقت ہے میو اسپتال میں۔ اس کی جان میرے انتظار میں اٹکی ہوئی ہے۔"

پولیس افسر اتنی حسین عورت کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ سکا اور خود بھی آبدیدہ ہو گیا۔ "سوری میڈم۔ ہم بھی مجبور ہیں لیکن آپ جائیں۔ ڈونٹ وری خدا تعالیٰ کے ہیں۔"

گاڑی آگے بڑھی اور پھر رک گئی۔ میں ڈگی سے نکل کے دوبارہ نازو کے ساتھ آ بیٹھا۔ دلہا کا لباس اسپیئر ٹائر، جیک اور آئل کے ڈبے پر لیٹنے سے داغدار ہو گیا تھا۔

نازو نے میری اس طرف توجہ دلائی "یہ تو بیکار ہو گیا۔"

"ہاں۔ میں نے سوچا تھا اپنی بیکاری۔۔۔ میرا مطلب ہے شادی خانہ آبادی پر چل جائے گا۔"

"اس کی فی الحال کوئی امید نہیں۔ زندگی کے دن ہی کتنے گئے ہیں تمہارے؟" نازو نے کہا۔

"چلو غالب پہن لے گا دھلوا کے۔ کچھ خرچہ بچ جائے گا۔ ویسے بھی ساری عمر لنڈے کے سیکنڈ ہینڈ کپڑے پہنتا رہا ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ بیوی بھی وہیں دیکھو۔ شاید کسی اسکرٹ میں سے کچھ بھی نکل آئے۔ ایک بار مجھے پرانے کوٹ میں سے دس ڈالر ملے تھے۔"

"مگر اسے کوئی بھوت کی بچی ہی چاہیے" نازو بولی۔

میں بے اختیار غصہ مارتے مارتے رہ گیا۔ کہاں وہ حال کہ غالب کے مذاق پر نازو چراغ پا ہو جاتی تھی اور اسی بات پر ان کی سال میں تین سو پینسٹھ بار لڑائی ہو چکی تھی۔ کہاں یہ کہ وہ خود غالب کی بات دُہرا رہی تھی۔ یہ غالباً ہجر کے جذبات کا ردعمل تھا۔ جب لڑنے والا بار دیا تو اس کی بات یاد آئی۔

شاہدرے کے پل پر مجھے تخت زریں چنگیز کا اندیشہ تھا مگر حنطل کے قریب پہنچ کے ڈرائیور کو دس ہزار کے نوٹوں کی خوشبو اپنی جیب سے آنے لگی تھی۔ اس میں غیر معمولی ہمت اور حاضر دماغی پیدا ہو گئی۔ نازو سے پہلے اس نے کہا۔ "سر جی۔ بڑا نازک معاملہ ہے۔ یہ اپنے وزیر اعلیٰ کے ڈی ایس پی شاہد علی کی بہن ہیں جو میو اسپتال پہنچنا ہے۔ ان کی بڑی بہن اللہ کرے زندہ مل جائیں۔ کینسر کا موذی مرض تھا۔ آخری وقت ہے۔"

پولیس افسر نے ٹارچ سے نازو کی رونی شکل دیکھی اور فوراً پیچھے ہٹ کے راستہ دے دیا "جاؤ جاؤ۔ اللہ خیر کرے۔"

بادشاہی مسجد اور مینار پاکستان والی سڑک پر آتے ہی میں پھر ڈگی سے نکل کے سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میرے کپڑوں پر ہر بک آئل بھی لگ گیا تھا۔

نازو نے کہا "اب تو دُلہا کا لباس چولہے میں جھونکنے کے قابل ہو گیا۔"

میں نے کہا "چلو غالب دوسری شادی میں پہن لے گا۔ میرا مطلب ہے۔ خدانخواستہ ایسا موقع آیا تو۔ ایسے خوش قسمت کم ہوتے ہیں مگر۔"

نازو نے غصے میں کہا "بار بار غالب کو کیوں بیچ میں لاتے ہو۔"

"اس لیے کہ تم نے پہلے ہی مجھے الرٹ کر دیا ہے کہ اب میرے دن تو پورے ہو گئے۔ ایک مرگ ناگہانی اور ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ یہ بتاؤ کہاں جانا ہے؟"

"وہیں جہاں سب کو جانا ہے۔ میرا مطلب ہے تمہیں اور مجھے۔ رابعہ اور غالب اس وقت کہاں ہوں گے۔"

"رفتار یوسف کے باسط کے گھر اور کہاں؟"

"کچھ پتا نہیں نازو۔ آج کل بھروسا کسی پر نہیں کرنا چاہیے" غالب کو کہا تھا کہ تم شاہ رکنِ عالم ہو جاؤ گی۔ وہ آزادی کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے خواب میں عیش کر رہا ہو۔"

نازو ہنس پڑی "تم خواب میں کیا کرتے ہو مہاراج؟"

ڈرائیور ہماری باتیں نہیں سن سکتا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے کان میں بولتے تھے اور انگریزی بول رہے تھے۔ اس نے دربار کے پاس گاڑی روک دی۔

"جی لاہور آ گیا۔ اب آگے جانے سے پہلے حساب صاف کر دو۔ یہ داتا صاحب کا مزار شریف ہے۔ یہاں معاملہ کھرا اور ایمانداری سے ہونا چاہیے۔"

"ہم کھرے اور ایماندار لوگ ہیں۔"

"نہیں جی۔ اِدھر تو داتا صاحب کی ضمانت ہے مجھے۔ آپ کا کیا ہے دس ہزار کے لیے گولی مار کے چلے جاؤ۔"

میں نے کہا "او بے وقوف پاگل خانے۔ خالی ہاتھوں سے گولی ماریں گے تو تم مرو گے نہیں۔ مگر ہمارے پاس تو گولی بھی نہیں ہے" میں نے کہا "بے شک تلاشی لے لو۔"

اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "اوئے پہلی دفعہ پر کانوں سے لگی تھی مجھ پر خیر۔ اب میں ننگے ایک گز نہیں جانے والا۔"

وہ گاڑی سے اُتر گیا تو ہم بھی اُتر گئے۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ اسے تھوڑا سا پریشان کرنے کے لیے ہاتھ ملا کے کہوں کہ "اچھا تو پھر رب راکھا۔" مگر نازو نے اسے دس ہزار سوٹ کیس میں سے نکال کے پکڑا دیے۔ اس نے نوٹوں کو چوم کے کہا "وار رب جی۔ تو سب کے کام بنانے والا ہے۔ اب خیر سے اپنا بھی جہیز بن جائے گا۔ جلد جلد" وہ پھر بیٹھتے ہوئے بولا۔

میں نے انکار کر دیا "تم نے بے عزتی کی ہے ہماری۔"

وہ ہنس پڑا "کیا بے عزتی کی ہے؟"

"تم نے ہمیں جھوٹا اور بے ایمان سمجھا۔ ہم تمہارے ساتھ نہیں جائیں گے۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے کہا "تو تم جاؤ۔ آگے بڑے لاسٹ دار مجھے بھی واپس جانا ہے۔"

وہ گاڑی کو نصف دائرے میں گھما کے خوشی سے گاڑی دوڑاتا ہوا نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے ہاتھ بھی ہلایا اور نازو کی طرف ایک ہوائی بوسہ بھی ارسال کیا۔ دس ہزار اس کے لیے بہت بڑی دولت تھی اور شاید اس کی شادی کا بجٹ اسی لیے نہیں بن رہا تھا کہ وہ اتنا خوش تھا۔ وہ بے حد خوش اور EXCITED تھا۔

میں بھی اس کو وقار یوسف یا منظر کے گھر تک لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے چار بجے تھے اور سحر خیز لوگ سڑکوں پر نظر آنے لگے تھے۔ تراویح اذان کے ساتھ ہی جیسے دن کے آغاز کا اعلان ہوا۔ داتا صاحب کی گلی سے ایک شخص بگل مارے نمودار ہوا۔ ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے "السلام علیکم" کے بعد پوچھا "کدھر جاؤ گے باؤ جی۔" میں نے گلبرگ کا کہا تو اس نے کہا "بس میں آیا ایک منٹ میں گڈی لے کے۔"

اس کی ٹیکسی شاید قریب ہی کہیں موجود تھی۔ ہم دس منٹ کھڑے رہے۔ اس دوران دو ٹیکسیاں گزر گئیں مگر ہم نے اس کے وعدے پر کسی کو بھی نہیں روکا۔ بالآخر وہ آ گیا۔ ابھی ہم ایک فرلانگ بھی نہیں گئے ہوں گے کہ پہلے وہ پٹرول ڈلوانے کے لیے رُکا۔ پھر اس نے ہوا بھروائی۔ وہاں سے چلتے ہی ایک ٹائر پنکچر ہو گیا اور ہر بار اس نے کہا "بس جی ایک منٹ" اپنے مخصوص لہجے میں وہ منٹ کو MINT کی طرح بولتا تھا اور یہ ایک منٹ دس پندرہ منٹ کا ہوتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پہیہ بدلنے کے لیے ڈگی سے اسٹپنی اور جیک رنچ نکال رہا ہوگا مگر وہ غائب ہو گیا۔ دیکھا تو وہ پنکچر شدہ اسٹپنی کو لڑھکاتا ہوا بہت دور جا چکا تھا۔ اسے لات مار کے پہیے کو سڑک پر رواں رکھنے میں خصوصی مہارت تھی۔ ہم اب ٹیکسی کو چھوڑ کے بھی نہیں جا سکتے تھے۔ وہ پنکچر لگوا کے لوٹا پھر اس نے ٹائر بدلا۔ اس وقت تک دن کا اُجالا ہر طرف پھیل چکا تھا۔

آدھے گھنٹے کا فاصلہ ہم نے ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا۔ اگر ہم تانگا پکڑ لیتے تو شاید بہت پہلے پہنچ جاتے۔ تمام منصوبہ سب کو جگا کے حیران کرنے کا مزہ جاتا رہا۔ غالب چھت پر کسی تھا الو کی طرح اداس بیٹھا تھا۔ اس نے ٹیکسی کو ادھر آتے دیکھ کر ہی سمجھ لیا تھا کہ مجنوں اور شیریں آ گئے۔ اس نے چلا کے لیلیٰ کو پکارا اور خود فرہاد کی طرح لپکا۔ اس شور سے نگی اور وقار یوسف کا بیدار ہونا لازمی تھا۔

میں نے رابعہ کو دیکھ کے مسرت کا اظہار کیا "بھئی ہم تو سمجھ رہے تھے کہ حوالات میں ملو گی۔ خود نازو کا اصرار تھا کہ سیدھے حوالات ہی جانے ہیں۔ غالب بھی ہوگا وہیں۔"

غالب نے کہا "تم چاہو تو حوالات کے اندر بھی جا سکتے ہو۔"

نگی نے خفگی سے کہا "بھئی۔ یہ کیا منحوس باتیں شروع کر دی ہیں تم نے ملتے ہی۔ نہ سلام دعا نہ خیریت۔"

میں نے کہا "سابقہ بہن نگی اور داماد مسز وقار۔ ہم بدنصیبوں کی فکر مت کرو۔ تم اپنا اخلاقی فرض مت بھولو۔ صبح دم تمہارے گھر میں رحمت کے فرشتے جیسے مہمان آئے ہیں۔ اللہ کا نام لے کر خاطر تواضع میں لگ جاؤ۔"

"اچھا ناشتا کر لو۔ پھر آج میں فیصلہ کرا کے چھوڑوں گی۔ آخر کب تک چلیں گی ایسی حرکتیں۔ اپنی جان عذاب میں دوسروں کی بھی۔"

"نو" وقار نے کہا "میری بات مت کرنا ظالم۔"

"کیوں۔ تمہاری جان کس عذاب میں ہے؟" وہ جاتے جاتے پلٹی۔

"وہ بس ایسے ہی تیر نکل گئی۔ خیال آ گیا اپنے شادی شدہ ہونے کا۔" وقار نے کہا۔

"میں ظالم ہوں۔ ظلم کرتی ہوں تم پہ۔"

"نہیں بھائی۔ تم تو وہی کرتی ہو جو سب بیویاں کرتی ہیں۔ ظلم نہ کہو اس کو۔ ستم کہہ لو۔ جو جی چاہے کہو کرم کہہ لو۔"

www.paksociety.com

انتقامی جذبات کی شدت کا بخوبی اندازہ تھا۔ اگر پیڈرو تعاون نہ کرتا تو یقیناً اس کی موت انتہائی اذیت ناک ہوتی۔ دلاور کو اس سے دو فائدے ہوتے۔ اس کا ایک گناہ جسے وہ دھتکارتا تھا مگر وہ بار بار لوٹ کے اس کے پاس آتا تھا ہمارے ہاتھوں ختم ہو جاتا شاید وہ خود اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے دوسرا فائدہ یہ ہوتا کہ پیڈرو کے خون سے انتقام کی اس آگ کے شعلے کچھ سرد پڑ جاتے جو میرے دل میں دہک رہی تھی۔ چوہدری دلاور کی صرف ایک توقع پوری ہوئی۔"

"کیا مطلب۔ تم نے پیڈرو کو مار دیا؟" غالب چونکا۔

"نہیں۔ اسے میں نے نہیں مارا۔"

"پھر کیا نازو نے؟" وقار بولا۔

"نہیں۔ اسے دست اجل نے مارا۔ بے شک وہ حادثاتی موت تھی لیکن ہم کسی طرح بھی اس کے ذمے دار نہیں تھے۔"

میں نے کہا "نہ ہم ایسا چاہتے تھے۔ پیڈرو کو آخر تک ہماری نیت پر شک رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو قتل کرنا ضروری نہیں رہا تھا۔ شاید اس کا زندہ رہنا ہمارے لیے زیادہ کارآمد ہوتا۔"

"پہیلیوں میں باتیں مت کرو۔"

میں نے کہا "ابھی سب بتاتا ہوں۔ نگی بھی آجائے۔"

"میں آگئی" نگی نے سب سے آخر میں اندر آئی "میرے کانوں نے کچھ ایسا سنا تھا جیسے پیڈرو کو مار دیا تم نے۔"

وقار نے کہا "آج کسی ای این ٹی اسپیشلسٹ کے پاس چلیں گے تمہارا گلا اور کان دیکھ لے گا۔"

"کیا ہوا ہے میرے گلے اور کان کو؟"

"کانوں سے تم جو الفاظ سنتی ہو وہ بدل جاتے ہیں 'مر گیا' تو تم نے 'مار دیا' سنا۔ خرابی زیادہ ہو گئی تو میں کہوں گا پیار کی بات تم سنو گی پیاز کا بھاؤ۔"

نگی خفا ہونے لگی "تم غلط نہیں سننے لگی۔ کل میں نے کہا تھا دروازہ بند کر دو۔ تم نے مجھے باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔"

"میں نے دروازہ ہی بند کیا تھا۔ اور یہی تمہارے گلے کی خرابی ہے کہ بات غلط نکل جاتی ہے یا ادھوری۔ تمہیں کہنا چاہیے تھا کہ باہر والا دروازہ بند کر دو جو پورچ میں کھلتا ہے۔ ابھی تو بات تم نے کی وہ غلط تھی۔ کسی اور کے سامنے نکلتی تو یہ بے چارے پکڑے جاتے۔"

"نگی۔ تم اتنی جلدی چائے کیسے بنا لائیں؟" میں نے کہا "کمال کر دیا تم نے تو۔ اور یہ سب لوازمات۔ واہ واہ کیا سلیقہ ہے بیوی ہو تو تم جیسی۔ ہم نے کل رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔"

وقار ہنسنے لگا "آخر لوگ دوسروں کی بیوی کے بارے میں ہی اتنی اچھی رائے کیوں رکھتے ہیں؟"

نگی نے کہا "شوہر قدر کرتے نہیں گھر کی مرغی دال برابر۔"

"شوہر جھوٹ نہیں بولتے بیوی سے" وقار نے کہا۔

"شوہر سب سے زیادہ جھوٹ بیوی سے بولتے ہیں" نگی نے

میں نے کہا "نگی۔ تم بھی صبر کرو۔ مقدر میں یہی لکھا تھا" میں نے وقار کی طرف اشارہ کیا "جاؤ، چائے بنا کے لاؤ۔ قبل اس کے کہ ہم اتنے لمبے سفر کے بعد سفر آخرت پر روانہ ہوں۔"

رابعہ نے مجھے ڈانٹا "کیوں تنگ کرتے ہو اسے۔ یہ بتاؤ اس وقت کیسے پہنچے؟ اس وقت تو کوئی ٹرین نہیں آتی۔"

"ہوائی جہاز سے آئے ہو؟" غالب نے کہا۔

"ابھی ساری بات تمہید اور ارادے کی ہے۔ آدمی آنا چاہے تو عرب سے بحری جہاز میں آسکتا ہے۔" میں نے کہا "افسوس ناک امر یہ ہے حضرات و خواتین کہ آپ لوگ ذرائع سفر کے بارے میں سوالات کر رہے ہیں۔ مسافروں کی خیریت کے بارے میں کسی نے کلمہ شکر ادا نہیں کیا کہ جیسے بھی پہنچے بخیریت پہنچ تو گئے۔"

نازو نے کہا "ویسے ہم اپنی گاڑی میں سفر کو ترجیح دیتے ہیں۔"

"کون سی گاڑی خرید لی۔ بڑے رئیس ہو" غالب نے کہا۔

میں نے کہا "یہ تو نازو نے نہیں کہا۔ کرائے کی گاڑی بھی تو اپنی ہی ہوتی ہے۔ جب تک فری اسے نہ چھوڑے۔"

نازو بولی "سکندر کا خیال تھا کہ رات پنڈی میں ہی رک جائیں مگر مجھے بہت فکر تھی۔"

"ہاں۔ بلکہ یقین تھا کہ یہاں رابعہ اور غالب دونوں بفضل خدا گرفتار ہو کے حوالات پہنچ چکے ہوں گے۔ آخر ایک وزیر کو قتل کر کے بھاگے تھے" میں نے کہا۔

"یہ میں نے کہا تھا؟"

"بالکل کہا تھا۔ تم بار بار ٹھنڈی سانس بھر کے کہتی رہیں کہ اس کیس میں رابعہ کا اور غالب کا بچنا مشکل ہے۔ آخر کیا بنے گا میرا اور تمہارا۔ تم اپنے مستقبل سے اتنی مایوس نہیں تھیں۔"

رابعہ نے کہا "چھوڑو انہیں نازو۔ آرام سے بیٹھو اور یہ بتاؤ کہ دوران میں کیا ہوا۔"

نازو نے نفی میں سر ہلایا "افسوس یہ کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔"

غالب بولا "پیڈرو نے کچھ نہیں بتایا؟"

"اس نے تمہارے سامنے ہی سب بتا دیا تھا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا جہاں وہ ہمیں لے کر گیا تھا۔" میں صوفے پر بیٹھ کے جوتے اتارنے لگا۔

"جھوٹ بولا تھا اس نے؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔"

غالب نے کہا "پھر کیا وہ راستہ بھول گیا تھا؟"

"نہیں یار۔ چوہدری دلاور نے اس کے ساتھ دھوکا کیا جو کوئی اپنے پالتو کتے کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔ خواہ اس کی افادیت ختم ہو جائے۔ اس نے پیڈرو کو اسی لیے ہمارے حوالے کیا تھا کہ ہم اسے جان سے مار دیں۔ دلاور کو یقین تھا کہ پیڈرو کچھ بتانے والا نہیں ہے۔ وہ مزاحمت کرے گا۔ جھوٹ بولے گا اور ہم سچ اگلوانے کے لیے اس کے جسم کو تختہ مشق بنائیں گے۔ دلاور کو میرے

سے پیچھا کر دیا۔ "کیوں اس نے تمہارے جھوٹ؟"

میں نے کہا "ایسا کرو فرصت میں بار بار کر کے لکھ لینا اور ہمارے سامنے چارج شیٹ پیش کر دینا۔"

نگی نے صرف چائے بنائی تھی۔ مکھن، ڈبل روٹی، جام اور پنیر اس نے فریج میں سے نکال لیے تھے۔ باقی لوگ ابھی ناشتے کے موڈ میں نہیں تھے۔ انہوں نے صرف چائے لی۔ میں نے سب صاف کر دیا۔ نازو نے تھوڑا بہت کھا لیا۔ اس دوران میں زبان بھی منہ کے ساتھ چلتی رہی اور میں نے راولپنڈی یاترا کا وہ قصہ بھی تفصیل سے سنا دیا جس میں میرے ساتھ صرف نازو شریک تھی۔

غالب نے میرے خیال سے اتفاق کیا "چوہدری دلاور یقیناً ہمارے پیچھے رہا ہوگا۔"

"اور آئندہ بھی رہے گا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ خطرناک شکاری ہو گیا ہے۔ شکار کرنے سے زیادہ شکار کا پیچھا کرنے میں اسے مزہ آتا ہے۔ یہ بھی کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اپنی دہشت قائم رکھنا۔ اپنے خوف کے احساس میں دوسروں کو مبتلا رکھنا اور یوں اپنی طاقت پر غرور میں مبتلا رہنا۔ غرور کا بھی نشہ ہوتا ہے جسے کوئی چھوڑنا نہیں چاہتا بلکہ اس کی خواہش اور طلب بھی بڑھتی جاتی ہے۔ بڑی دانائی کا نکتہ ہے یہ بھی" میں نے کہا "دلاور اذیت پسندی کا شکار ہے۔ وہ جب پیچھا کرتا ہے تو خاموشی سے بتا بتائے نہیں کرتا۔ وہ ہر جگہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ کوئی ثبوت چھوڑتا جاتا ہے۔ جس سے اس کے قریب ہونے کی خبر ملتی رہے۔ ہم مطمئن اور پرسکون نہ ہونے پائیں اور چین سے نہ بیٹھ سکیں۔ مڑ مڑ کے آگے پیچھے دیکھتے رہیں۔ خوف ہمارے اعصاب پر سوار رہے اور ہمارے ذہنوں میں بیٹھ جائے۔ جسمانی تھکن کے ساتھ یہ اعصابی خوف زدگی کو پاگل کر دیتا ہے۔ وہ اس سے لطف لیتا ہے ہماری حالت کا تصور کر کے۔"

رابعہ نے کہا "اس کا ملک نبی داد عباسی سے ملنا تو یہی ظاہر کرتا ہے اور اس کا یہ بیان کہ قاتل بہت جلد گرفتار ہو جائیں گے۔"

"اس کو یقین ہوگا کہ ہم اخبارات دیکھیں گے ہمیں پتا چل جائے گا کہ دلاور نے نبی داد سے ملاقات کی ہے اور اس کا یہ جملہ ہمیں چوکنا کر دے گا اور ایسا ہی ہوا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ چوہدری دلاور ہمارے بارے میں نبی داد کو یا قتل کا سراغ لگانے والوں کو ایسی باتیں بتا دے گا جو کسی اور کے علم میں نہیں اور اس طرح انہیں ہمارے پیچھے لگا دے گا" نازو بولی۔

"میں نے بہت عاقلانہ مشورہ دیا تھا کہ تم لوگ فرار ہو جاؤ اور لاہور میں اپنی موجودگی کے ثبوت اور گواہ پیدا کر لو" میں نے کہا۔

"معاف کرنا دوست۔ اس معاملے میں آپ کی رائے سن کے اس محاورے کا مطلب سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو" غالب بولا۔

"کیوں۔ تم وہاں ہوتے تو ضرور پکڑے جاتے۔ سیدھا پور جیسی جگہ پر پولیس کو تمہارا نام معلوم تھا۔"

"اسی لیے عرض کیا تھا حضرت کہ آپ کا مشورہ احمقانہ تھا۔"

وقار نے سوچ کے کہا "احمقانہ مت کہو۔ جاہلانہ کہو۔ احمق اور جاہل میں فرق ہے۔"

میں نے کہا "یار وقار۔ تم سے یہ امید نہ تھی۔"

"میں تو دفاع کر رہا ہوں تمہارا۔ علم کا نہ ہونا جہالت ہے۔ تمہیں قانون کا پتا نہیں اس لیے کہ قانون کے معاملے میں تم جاہل ہو ورنہ ایسا مشورہ نہ دیتے۔ تم بضد ہو خود کو احمق کہلوانے پر تو تمہاری مرضی" وقار بولا۔

"پکڑے ہم یہاں بھی جاتے" غالب نے کہا "وہ تو اللہ اس کا بھلا کرے۔ وہ دور بین کی بڑی عقلمندی اور دوراندیشی ہے۔"

نگی نے بات کاٹ کے کہا "کل اس کے بچوں کی ختم درود ہو گئی۔"

غالب نے اپنی بات جاری رکھی "عبدالودود مظفر کو خدا لمبی عمر اور سکندر کا حوصلہ دے۔"

میں نے کچھ احتجاج اور کچھ گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا "توبہ توبہ۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے۔ کیوں رابعہ؟"

غالب نے مجھے ڈانٹا "مجھ سے پوچھو۔ میں سکندر اعظم کا حوالہ دے رہا تھا۔ جوانی میں مر گیا تھا اس لیے مرزا غالب جتنی عمر کی دعا مانگی۔"

رابعہ مسکرا کے خاموش ہو گئی تھی اس نے کہا "اب دیکھ لو وقار۔ جاہل کے ساتھ احمق بھی ثابت کر دیا خود کو۔"

میں نے کہا "کچھ سترہ بچوں کے باپ کی عقلمندی اور دوراندیشی کا ذکر تھا۔"

"ہاں۔ اس نے کہا کہ حضرت اور خاتون۔ یہ کیا بوگس بات ہے۔ تم لاکھ خود کو لاہور یا ٹیکسلا میں ثابت کرو۔ پہلے تو پولیس پکڑے گی۔ بعد میں صفائی میں اور تاریخیں بھگتنے رہیں گے کیونکہ اب دونوں تو ہوں گے اندر۔ فوراً سے پیشتر ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کرو۔ ہم راولپنڈی سے لاہور پہنچے تو سیدھے کورٹ گئے تھے۔ پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ رابعہ نے خود ہی درخواست پیش کر دی جو ظاہر ہے کہ منظور ہو گئی۔"

"درخواست میں کیا لکھا تھا؟" میں نے کہا۔

"میری تو عقل کام نہیں کر رہی تھی" رابعہ بولی۔

"ہاں۔ ناقص چیز عین وقت پر دھوکا دے جاتی ہے۔ بڑا نقصان ہوتا ہے۔"

رابعہ نے تعجب سے کہا "جیسی بھی ہے ہے تو سہی۔"

میں نے اسے لوفروں کی طرح آنکھ ماری "میں بھی یہی کہتا ہوں سب کے سامنے کہ تمہاری تو ہے بھی نہیں۔ ہماری کو نظر مت لگانا۔ یہ تو بخت سے بہت ارزانی تھیں۔ شاید ساری آ گئی تھیں۔ یہ

www.paksociety.com

اسپیشل کو بہ کاف بالکاف سے آئی ہے۔"

رابعہ نے کچھ خوش اور کچھ خفا ہو کے کہا "تم بھی کہاں کی بات کہاں لے جاتے ہو اور رُکنا بھول جاتے ہو۔"

غالب بولا "میں عرض کرتا ہوں۔ منظر نے میری طرف سے درخواست لگائی تھی۔ دونوں میں ایک ہی بات لکھی گئی تھی۔ رابعہ نے لکھا تھا کہ میری ادبلی ایکارڈ گاڑی 'نمبر فلاں فلاں' چھن گئی تھی۔ اس وقت گاڑی کو مرزا غالب چلا رہے تھے جو بڑے نامور دنیا کے سب سے عظیم' سب سے ذہین 'لافانی' 'مدبر' خوبرو ادیب۔"

میں نے اسے ٹوکا "آپ جذبات کے پرنالے میں بہہ گئے ہیں۔"

"سوری۔ سچ خود بخود زبان پر آجاتا ہے۔" غالب نے معذرت کی "درخواست میں لکھا تھا کہ مرزا غالب سے گاڑی چھینی گئی اس وقت چھین لی گئی جب یہ میرے ساتھ کورٹ سے واپس گھر جا رہے تھے۔ میرے پاس اپنی پہلے والی گاڑی تھی۔ فاکس ویگن نمبر فلاں فلاں۔ طلبان جو تعداد میں تین تھے۔ گاڑی لے کر فرار ہوئے تو مرزا غالب نے جو کہ انتہائی بہادر' حوصلہ مند' حاضر دماغ اور اکیلو ہیں۔۔۔"

میں نے پھر اسے ٹوکا "اس بار آپ جذبات کے نالے میں بہہ گئے۔"

"معاف کرنا یار۔ قوی الجثہ بے ایمان کا۔ کبھی پرنالے میں بہہ جاتا ہے کبھی نالے میں۔ اس نے فوراً مس رابعہ کی بیوقوفی جیسی فاکس ویگن میں نا ہنجار طلبان کا تعاقب شروع کر دیا مگر گوجرانوالہ کے قریب ایک معمولی حادثہ پیش آگیا۔ ایک لینڈ روور جیپ نے فاکس ویگن کو سائیڈ سے ٹکر ماری جس میں ملک خداداد عباسی ایم این اے لاہور سے راولپنڈی جا رہے تھے۔ انہوں نے بڑی شرافت سے معذرت کی اور کہا کہ وہ گاڑی خود درست کرا کے دیں گے۔ اس لیے فائدہ اٹھا کے طلبان فرار ہو گئے۔ ہم واپس لاہور آ کے چوری کی رپورٹ لکھوانا چاہتے تھے مگر گاڑی کا تباہ شدہ فینڈر پہیے میں گھس گیا تھا۔ اسے عارضی طور پر ٹھیک کرانے میں کچھ وقت لگا۔ اس دوران میں رابعہ کے لاہور آفس میں ان کے لیے ایک پیغام چھوڑا گیا۔ کسی نے گمنام فون کر کے اطلاع دی تھی کہ کار چھیننے والے بھی ملک خداداد عباسی ایم این اے کے خاص لوگ تھے اور غالباً ٹکر بھی جان بوجھ کے ہمیں روکنے کے لیے ماری گئی ہوگی۔ مسٹر وقار یوسف ایڈووکیٹ نے یہ پیغام لکھا تھا۔ تصدیق اور وضاحت کے لیے ہم نے ذاتی طور پر ملک خداداد عباسی سے رابطہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ صبح معلوم کر لیں گے اور ہمیں رات کو اپنے گیسٹ ہاؤس واقع مری روڈ میں طعام کی دعوت دی۔ انہوں نے رات کو ہمیں ڈنر کے لیے بھی مدعو کیا تھا مگر بعد میں اطلاع ملی کہ غالباً انہیں وزیر بلدیات نامزد کیا گیا ہے اور انہیں حلف برداری کی تقریب کے لیے ایوان صدر بلایا گیا ہے۔ اس اطلاع کے مصدقہ ہونے کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن پھر ہم نے مزید قیام کو لاحاصل سمجھتے ہوئے واپس لاہور لوٹ آنا بہتر سمجھا۔ بدقسمتی سے اسی رات ملک خداداد عباسی کو قتل کر دیا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے ملازمین یا ماتحت عملے میں سے کسی کو مس رابعہ سے پرخاش تھی جس کا مس رابعہ کو بھی سبب نہیں معلوم اور ملک خداداد عباسی بھی نہیں جانتے تھے کہ ایسی مذموم حرکت کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ مرحوم ایک اصول پرست اور شریف النفس انسان تھے اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ صبح وہ طلبان کا پتا چلانے کے بعد انہیں سخت ترین سزا دیں گے۔ چونکہ طلبان کو مس رابعہ اور مرزا غالب کی اس ملاقات کا بھی علم ہوگا اور شاید انہیں ملک خداداد عباسی کی بات کا بھی پتا چل گیا ہوگا اس لیے خطرہ ہے کہ وہ بدمعاش اب موقع سے فائدہ اٹھائیں گے اور حالات و واقعات کی بنا پر مس رابعہ اور مرزا غالب کو اس قتل میں ملوث کرنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ مرزا غالب اور مس رابعہ اس واقعے سے قبل ملک خداداد عباسی کے نام سے بھی واقف نہیں تھے اور نہ ملک صاحب کا کبھی پیشہ ورانہ مسئلے پر ان سے واسطہ رہا تھا۔ یہ مس رابعہ قادری اور مرزا غالب کی پیشہ ورانہ نیک نامی اور شہرت کو نقصان پہنچانے کی سازش بھی ہو سکتی ہے چنانچہ استدعا ہے کہ اس کیس میں بلاجواز ملوث ہونے سے قبل ان کی ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست منظور کی جائے۔"

"ویری گڈ۔ یعنی ثابت ہوا کہ عبدالودود منظر کا جتنا بڑا پیٹ اور ظرف ہے اس سے بڑا دماغ ہے۔"

"معمولی رسمی کارروائی کے بعد ضمانت قبل از گرفتاری ہوگئی۔ ایک ہفتے کے لیے" رابعہ بولی "جج مجھے جانتا تھا اور غالب کی طرف سے خود اخبار کے مالک نے ضامن بننا قبول کیا۔ اخبار کے مالک بہت نامور صحافی تھے اور آج بھی ان کا رابطہ اعلیٰ ترین سطح پر صدر سے بھی رہتا ہے۔ شخصی ضمانت کے علاوہ صرف دس دس ہزار کے مچلکے بھرے گئے۔"

"اصل میں تو از روئے کام آزاد ہے" غالب بولا "ہماری گڈول نہ ہوتی تو زر ضمانت بھی ایک لاکھ سے کم نہ ہوتا اور ضمانت دو دن کے لیے ہوتی۔"

میں نے کہا "ایک ہفتے کے بعد کیا ہوگا؟"

"مگر ایف آئی آر میں نام نہ ہوا تو درخواست غیر مؤثر ہو جائے گی۔ نام ہوا تو ضمانت کی توثیق کی درخواست دائر کی جائے گی۔"

"جو منظور ہو جائے گی" وقار بولا "پھر جب تک مقدمہ خارج یا فیصلہ نہیں ہوتا یا پولیس خود ایف آئی آر میں سے نام خارج کرنے پر اصرار نہیں کرتی' یہ طلبان کہلائیں گے' ماشاءاللہ ہے۔"

"ایف آئی آر میں ہمارا نام نہیں ہے" رابعہ نے کہا "شام کو منظر کے پاس کسی کا فون آیا تھا پنڈی سے۔ اس نے بتایا تھا۔"

مرزا غالب نے کہا "ہماری ضمانت قبل از گرفتاری کی اطلاع پنڈی میں ملک نبی داد عباسی کو بھی ہو گئی۔"

"بڑے بھائی کے قاتل کو محافظ کو۔"

"مبینہ قاتل کہو" وقار بولا "اور قتل بھی اس نے بڑے بھائی کا نہیں کیا ہے۔ ایک ایم این اے کا کیا ہے۔ اس کی سیٹ حاصل کرنے کے لیے۔ وہ بدقسمتی سے اس کا بھائی تھا۔"

"ہماری تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ تخت و تاج کے لیے بھائی اور باپ کو راستے سے ہٹانے کے لیے انہیں مروا دیا' اندھا کرا دیا۔ قید خانے میں ڈال دیا۔ سیاست کے ضابطہ اخلاق میں پہلے بھی جائز سمجھا جاتا تھا اور آج بھی ہے۔"

غالب بولا "حیرت تو مجھے نبی داد کے فون پر ہوئی؟"

"اس نے فون بھی کیا تمہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ کل رات آفس میں فون آیا۔ بہت گلے شکوے اور ملامت کر رہا تھا کہ جناب ہم تو صحافیوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ خادم ہیں' نسب کے۔ یہ آپ نے کیا ظلم کیا کہ ہم کو مجرم بنا دیا۔ بھلا ہم آپ کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ خیر سے اتنا بڑا نام ہے آپ کا اور رابعہ خاتون کا۔"

"اس کا سیاسی کیریئر اب شروع ہو رہا ہے۔ ضمنی انتخاب میں اسے بھائی کی جگہ کھڑا ہونا ہے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اسی لیے اخبار والوں سے تو بالکل بگاڑ مول لینا نہیں چاہتا۔"

"مطلب یہ کہ چوہدری دلاور اسے ہمارے خلاف استعمال کرنے میں ناکام رہا اور منہ کی کھا کے واپس آیا" نازو بولی۔

"بظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔" میں نے کہا "لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے مقابل ہے چوہدری دلاور۔ وہ اپنی چالوں کا پتا نہیں چلنے دیتا اور اکثر بات وہ نہیں ہوتی جو ہم سمجھتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ملک نبی داد عباسی وہ سیاست داں ہے جس نے حال ہی میں ایک حریف پر سیاسی فتح حاصل کی ہے۔ حریف بھی اس کا بھائی تھا جو عمر اور تجربے میں اس سے بڑا تھا۔ وہ جذباتی آدمی ہوتا تو اس قتل کے رستے پر اپنے مقصد کو حاوی نہ ہونے دیتا مگر وہ صبر اور عقل و ہوش کے ساتھ انتظار کرنے اور صحیح وقت پر صحیح نشانہ لینے کا قائل تھا۔ یعنی ایک ایسا شکاری ہے جو ناکامی کے تمام اسباب کو ذہن میں رکھ کر کامیابی کا ہدف حاصل کرتا ہے۔"

"تم نے تو اس کی پوری شخصیت اور کردار کا پوسٹ مارٹم کر دیا۔ حالانکہ تم اس سے ایک دو بار ایسے ملے ہو کہ اسے ملنا بھی نہیں کہا جا سکتا۔" غالب بولا۔

میں نے کہا "نتائج خود مقصد کی عکاسی کرتے ہیں۔ نبی داد نے اگر دلاور کے بدنام خاندان کو سراہتے ہوئے اسے اپنا حلیف بنایا ہوگا تو اس سے کہا ہوگا کہ ٹھیک ہے دلاور۔ یہ سب اسلحہ جو تم نے مفید معلومات کی صورت میں فراہم کیا ہے میرے پاس محفوظ ہے اور اس وقت کام آئے گا جب شکار پوری طرح تصور ہوگا۔ ابھی خاموش رہو اور انتظار کرو۔ جیسے میں نے کیا تھا۔ میرے بڑے بھائی صاحب کی وفات حسرت آیات پر غم و اندوہ کے بحر بیکراں سے ساحل مراد تک تو پہنچ جاؤں۔ ضمنی انتخابات اور راہ وزارت میں کامیابی کے مرحلے آسان ہیں مگر منتخب ہونے تک مجھے آبدیدہ رہنا ہے۔ دکھی دل اور مغموم شکل بنا کے پھرنا ہے جہاں تک کہ حلف اٹھاتے وقت بھی میری آواز رقت سے بھرا جانی چاہیے اس کے بعد اپنی حکومت۔ لیکن۔"

رابعہ بولی "اب آگے بھی بولو۔ لیکن پر گاڑی کیوں رک گئی۔"

"لیکن اس کے برعکس۔ نبی داد عباسی ہمارا دوست اور چوہدری دلاور کا دشمن بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ پوچھو کیسے؟"

غالب نے کہا "وہ ایسے کہ منصب وزارت تک پہنچنے کی منصوبہ بندی اس کی اپنی تھی اور پہلے سے تھی مگر ابھی تو کامیابی کا وسیلہ ہم ہی بنے تھے۔ موقع اسے ہمارے طفیل ملا تھا۔ اس کے علاوہ چوہدری دلاور جیسے شخص سے اسے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ انتخابی مہم میں اور وزارت کی منزل تک پہنچنے کے لیے اسے پیسہ چاہیے۔ جیسا اس کے پاس بہت ہے۔ ووٹ چاہئیں' ووٹ بھی کم نہیں۔ 'نیک نامی چاہیے' نیک نام اس کا بھائی بھی نہیں تھا اور سیاست کے قومی افق پر چڑھتے ستارے کے نئے امیدوار سے طلوع ہونے کے فوائد لامحدود ہوتے ہیں۔ بھائی مقامی سیاست تک محدود رہا۔ وہ اپنا امیج ذرا مختلف بنا لے تو قومی لیڈر کی حیثیت بھی اختیار کر سکتا ہے اور اس کام میں دلاور اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ الٹا اسے دلاور جیسے لوگوں کی رفاقت سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کی چلتی اور سیاسی کیریئر کی گاڑی کو دھکا لگانے والے کون ہو سکتے ہیں۔ نمبر ون صحافی' نمبر دو وکیل اور اس کے بعد باقی لوگ۔ صحافی اس کے خلاف کچھ نہ لکھیں' اس کو حسب منشا کوریج دیں۔ اسے پروجیکٹ کریں۔ اس کی تقریریں' خواہ وہ اپنی جاہلانہ زبان میں کرے' مؤثر انداز میں رپورٹ کریں۔ بلکہ اسے لکھ کر بھی دیں۔ اس کی تصاویر' انٹرویو' اس کی بیانات پر واہ واہ کا کالم۔ یہ ہم لوگ ہی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ ملک نبی داد عباسی کسی بھی چوہدری دلاور کے اکسانے پر ہم سے پنگا نہیں لے گا۔ شاید اپنے چوہدری صاحب کو بھی یہ پنگا لینا مہنگا پڑے۔ اسی طرح وکیل اس کا خانہ خراب کر سکتے ہیں اگر اس کے خلاف قانونی محاذ کھول دیں۔ اس کے ہر بیان پر نوٹس یا کیس کا چکر چلا دیں۔ ممکن ہے دلاور ہارے ہوئے جواری کی طرح خالی ہاتھ لوٹا ہو۔ سب کچھ بتانے کا مقصد تھا فرینڈشپ کی دولت۔"

میں نے غالب کی پیٹھ ٹھونکی "ہونہار بروردار۔ ہم تاکل

www.paksociety.com

ہوئے تمہاری حماقت کے۔"

نازو نے قدرے مسرت سے کہا "ہم بچ گئے نا۔ کیا حماقت ہے اس میں؟"

میں نے کہا "اگر ہمارے کہنے سے یہ صرف دو لفظ بولتا۔ وہ کہتے... نوازش رحمت سے بچ جاتا۔ ہم کہہ دیتے یہ سب کچھ۔ ایک نکتہ اور بھی ہے ہمارے حق میں۔ سیاست نام ہے دوسرے کی کمزوری کو اپنی شہ زوری بنانے کا۔ نئی رار کو ہماری کمزوری کا پتا چل گیا۔ اب وہ بڑی عاجزی سے کہہ سکتا ہے کہ بھئی مٹی پاؤ پرانی باتوں پر۔ ہم آپ کی مدد کرتے ہیں۔ آپ ہماری مدد کریں۔ اور ہم مدد قبول کرنے سے کیسے انکار کر سکتے ہیں؟"

"بالفاظ دیگر اس کی مدد کرنے سے انکار نہیں کر سکتے؟" رابعہ نے کہا۔

"ہاں۔ رلاور کے بارے میں وہ پہلے سے ہی جانتا ہو گا۔ ورنہ کچھ جان لے گا اور کچھ معلوم کر لے گا۔ وہ رلاور کی حمایت پر آگے کیوں بڑھے۔ ایسے حلیف کو شکریہ کہنے سے کہیں بہتر ہے گٹ آؤٹ کہنا بہتر۔ رلاور نے بہت جلدی کی۔ نئی راو نئے حلیف سوچ سمجھ کے بنائے گا اور انتخاب ہمارے اور رلاور کے درمیان ہو تو وہ ہماری طرف ہاتھ بڑھائے گا۔ وہ پٹھانوں کی طرح خاندانی دشمنی کا قائل تو ہو نہیں سکتا کہ بھائی کے قاتل کو گولی مارے بنا چین سے نہ بیٹھے اور نسل در نسل دونوں طرف کے بھائی مرتے رہیں۔ وہ تو خود بھی یہی چاہتا تھا۔ اگر اسے سچ مچ قاتل کا پتا چل جائے۔"

غالب نے کہا "قطع کلامی معاف۔ اسے معلوم ہوگا کہ قاتل کون ہے؟"

نازو نے کہا "ڈی۔ ایس۔"

میں نے کہا "تم تو کری ڈی ایس پی۔ غالب کی مانا۔"

رابعہ نے بھی غالب کی تائید کی "غالب ٹھیک کہتا ہے۔ قتل خود اس نے کیا ہے یا اس کے ہی کسی کارندے نے۔ لیکن تمہارا خیال بھی ٹھیک ہے کہ وہ ہمارا نام لینے کی بے وقوفی نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "تم نے اچھا کیا کہ دونوں کو ٹھیک کہہ دیا ورنہ ابھی کشت و خون ہو جاتا۔"

"نئی رار کو نام لینا ہی ہو گا تو کسی سے پرانا حساب برابر کرنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ دشمن تو سب کے ہوتے ہیں۔ وہ نمبر ون پر انگلی رکھ دے گا جس کے بارے میں پہلے سے سب جانتے ہوں گے کہ اس کی اور مرحوم کی دشمنی میں کھلی جنگ تھی۔" غالب نے کہا۔

وقار ایسی باتوں میں بہت کم بولتا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ نگی نے اسے ٹھوکا دیا تو وہ لڑھک گیا۔

نگی نے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے سب کے بیچ میں۔"

وقار نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا "کہاں۔ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے ہو رہا کہانی نہیں سنا رہا جس پر نیند آتی تھی ہو۔" شب بسر سونے کی جگہ ہے؟"

"نہیں۔ سونے کی جگہ وہ ہوتی ہے جہاں نیند آ جائے۔ آج حضرت صبح ازرفت بیدار ہو گیا تھا۔"

غالب نے کہا "تم اکثر مست سوتے ہو اس کے بعد۔"

اب نگی کو سب کے لیے باقاعدہ ناشتا بنانے کے لیے جانا پڑا۔ وہ بڑی باکمال بیوی تھی۔ اگر وہ چاہتی تو ایک نہیں دس ملازم رکھ لیتی۔ اس کے ابا بڑی توپ چیز تھے اور اس کے لیے اچھا چھوڑ گئے تھے بلکہ بھیجتے رہتے تھے کہ وقار کی آمدنی اس کے سہرے بھی تھی مگر نگی نے صرف توصیح عیش نہیں کی تھی۔ زندگی میں محبت مانگ میں روایتی ظالم باپ کا رول کرنے والے نقوی صاحب مسیح کو بہر کچھ کے تماشے نہیں ملی ہوگی کہ نگی اب بھی وقار کی محبت میں اتنی ہی پاگل ہے جتنی شادی سے پہلے تھی۔ اس کا سارا کام خود کر کے خوش ہوتی ہے۔ خود نوکرانی بننے میں فخر محسوس کرتی ہے بے خوف لڑکی۔

پھر بہت مذاق اڑایا گیا۔ نازو نے کسی ڈرامہ کے ہیرو پر لباس کی خریداری اور سفر کے دوران چیکنگ سے بچنے کے لیے خانزادہ صاحب کے ٹرک میں گھس جانے کے واقعات کی افسوس ناک رپورٹنگ کی۔

میں نے احتجاج کیا "یہ تو عقلمندی پر دانت نکالنا آپ سب لوگوں کی کم عقلی ہے۔ اس وقت میں اور کیا کرتا۔ جب اپنے حلیے اور چہرے بدلنا۔"

غالب نے کہا "یار تم گھوڑے پر بھی بیٹھ جاتے۔"

وقار بولا "دس ہزار گاڑی کے دیے۔ ایک ہزار میں گھوڑا آ جاتا۔"

رابعہ نے بھی سمجھایا "لاہور تک فاصلہ بھی کتنا ہے۔ جی ٹی روڈ پر بگٹٹ گھوڑا دوڑاتے فجر کے وقت شہر میں داخل ہو جاتے۔"

غالب بولا "آدھی رات کو چور کیا کر گھوڑے پر اڑ بیٹھا ہے اور صبح کسی کو بتاتا تو لوگ کیا سمجھتے یہی کہ ملیشیا کر کے آیا ہے۔"

"اور پیچھے نازو کو دیکھ کے کیا کہتا؟"

غالب نے کہا "تم مجھ سے کہلوانا چاہتے ہو کہ جیسے نظر آتی ہے کی پچھلی۔ ہرگز نہیں۔ یہ گستاخی کر سکتا ہوں میں۔"

میں نے ٹھنڈا سانس مار کے کہا "چلو کوئی بات نہیں۔ جو کہنا تھا تم نے کہہ دیا۔"

نازو نے خفگی سے کہا "وہاں تو سب کے سامنے بہن اور بھیجو صاحب کہتے تھے بر ملا۔"

اٹھنے سے پہلے مظفر کا فون آیا "اب تو آ گیا زندہ سلامت بھوتنی کے۔ چبہ در قاتل۔ سالے جہاں جاتا ہے کسی کو ہارٹ فیل کر دیتا ہے۔"

"تمہاری باری بھی آ جائے گی کسی دن۔"

اس نے مجھے مزید گالیاں دیں "میں تو سوچ رہا ہوں کہ اس

روز روز کی مصیبت سے بہتر ہے کہ ایک دن تجھے خنجر گھونپ کے رضاکارانہ طور پر مرغوبہ کاٹنے جیل چلا جاؤں۔ زیادہ سکون سے رہوں گا وہاں۔"

"ہاں یار۔ تیری بھی کوئی زندگی ہے۔ اس گھر میں تو اب جگہ ہی نہیں رہی تیرے لیے۔"

وہ قہقہہ مار کے بولا "یار مبارک باد دے مجھے ایک اور بچے کا باپ بن گیا ہے۔"

میں نے کہا "ہمیں یقین کے ساتھ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمہاری بیوی ایک اور بچے کی ماں بن گئی۔"

"اف۔ میری غیرت کے منہ پر یہ طمانچہ۔ میری محبت کی یہ تذلیل۔ جی چاہتا ہے ٹیلی فون پر تجھے گولی مار دوں۔ اچھا میں اپنی بیوی کو بتا رہا ہوں۔ وہ خود نمٹ لے گی تجھ سے۔"

میں نے گھبرا کے کہا "یار خدا کے لیے یہ غضب مت کرنا۔ اس سے تو بہتر ہے تو خود گولی مار دے۔ اس کی زبان کی قینچی سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

وہ ہنسا "سالی نے پھر مایوس کیا مجھے۔ میں نے بہت شرمندہ کیا اسے کہ اتنا تجربہ ہو گیا۔ اسپیڈ اب بھی وہی ہے۔ تین چار نہ سہی کم سے کم دو تو ہوتے۔ ایسے تو مزید سات آٹھ سال لگ جائیں گے دو درجن ہونے میں۔ خیر تو بتا کیا کھٹ کے لے آیا؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں یار۔ الٹا پیدل ہو گیا اس بار تو۔"

"میں اچھل پڑا ہوں۔ تو نہیں دیکھ سکتا اس لیے بتا رہا ہوں۔ تو نے فضا میں فوت کر دیا اسے بھوتنی کے۔"

"نہیں۔ میں ابھی آ کے تفصیل خود عرض کرتا ہوں" میں نے کہا۔

"خالی ہاتھ مت آنا۔ مٹھائی کا ڈبا ضرور ساتھ لانا ورنہ زچہ بچہ برا مانیں گے۔ ابھی تک کسی سالے کو توفیق نہیں ہوئی حالانکہ کل تم پر بھی یہ وقت آئے گا۔ شادی اور اس کے بعد سالانہ خانہ آبادی۔ ہم بھی تو آئیں گے تمہارے گھر مٹھائی لے کے۔"

میں نے کہا "حق ہے۔ آج ہم تمہارے جنازے کو کندھا دیں گے تو کل تم ہمارے جنازے کو۔ ہم سب باجماعت آتے ہیں۔"

"تو بتا دینا سب کو کہ ہر شخص اپنا الگ مٹھائی کا ڈبا لائے۔ سب چندے سے ایک مت لے آنا۔ ایک سے کچھ نہیں بنتا بھائی۔"

ہم سب وقار کی گاڑی میں لد کے مظفر کے گھر پہنچے۔ اس نے ہمارے ڈبے کھول کے درمیان میں رکھ دیے "لو میرے پیارے بچو۔ تمہارے چاچے ماے خالائیں اور پھوپھیاں لائی ہیں۔ کھاؤ حرام کا مال سمجھ کے۔"

ذرا سی دیر میں وہ سب چٹ کر گئے۔ میں اور غالب تو اس کی بیوی کو دلی مبارک باد دے کر کھسک لیے۔ رابعہ، نگی اور نازو کو باقاعدہ سازش کر کے رہیں بیٹھنے پر مجبور کر دیا گیا۔ مظفر کی بیوی کے پاس موضوعات کی کمی نہیں تھی مگر اس نے شادی نہ کرنے پر انہیں ڈانٹنا شروع کیا تو ہمارا دل باغ باغ ہو گیا۔ وہ بے بسی سے سنتی رہیں۔ مظفر کی بیوی کسی کو کچھ کہنے کا موقع ہی کب دیتی تھی۔ نگی تک ہکا بکا بیٹھی رہی جو بولنے میں کسی سے کم نہ تھی۔ غالب نے کہا "کیوں نہ ہم گھر چھوڑ کے بھاگ جائیں۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ خواتین۔ آپس میں خوب بولتی رہیں۔"

پھر میں نے تجویز پیش کی "اپنے مولوی غلام حسین کے غریب خانے کی دوسری برانچ میں چلتے ہیں۔ وہاں سکون سے بات بھی کریں گے اور چائے بھی پئیں گے۔"

مولوی غلام حسین ہمیں دیکھ کے کھل اٹھا "آپ نے تو کمال کر دیا جی۔ بڑا مبارک دن ہے کہ سب تشریف لائے۔ سب ایک ساتھ۔"

مظفر نے کہا "سالے کچھ نہیں ہیں بھوتنی کے۔ خالی ہاتھ آئے ہیں سب۔"

اس نے بالکل برا نہیں مانا۔ وہ عادی ہو گیا تھا یا خوشی کے باعث مظفر کی گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔ اس نے فوراً بیوی کو خاطر مدارات کے انتظامات پر لگا دیا جو ہمیں دیکھ کے غلام حسین سے زیادہ خوش ہوئی تھی۔

"آپ خیر سے گھر لوٹ آئے جی۔ شام کو آئے ہوں گے؟"

غالب نے کہا "یہ تمہیں بد ہضمی کہہ رہا ہے سکندر۔ محاورے کی زبان میں۔"

غلام حسین نے اپنے منہ پر دونوں ہاتھوں سے تھپڑ مارتے ہوئے کہا "توبہ توبہ میری یہ مجال۔ غالب صاحب صرف جھگڑا کرانا چاہتے ہیں۔"

"یہ کیا تم نے پہلے ہم کو بد ہضمی کہا اور اب مجھے شرپسند کہہ دیا۔ اب مظفر کو ایسے ہی باتوں باتوں میں کچھ کہہ دے گا۔ دیکھنے میں ابوالسول، عملاً ابوالفول۔ بچے غول بابائی، بیوی انکیوبیٹر۔"

مظفر نے غلام حسین کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارا "مولوی یار ہے اپنا۔ جو چاہے کہے۔ اور یار یہ بھی کہی۔"

غلام حسین کراہنے لگا اور پھر کندھے کو اوپر نیچے ہلا کے ملتے ہوئے بولا "جی خرابی یہی ہے آپ میں مظفر صاحب کہ مذاق کرتے ہیں ہاتھ پاؤں کا۔"

میں نے کہا "کسی دن تم بھی جواب میں ایک سوئی چبھو دو اس کے پیٹ میں۔ غبارے کی طرح پھٹ جائے گا۔"

غالب نے چھت کی طرف دیکھا "لیکن یار دھماکے سے چھت گر گئی تو مولوی غلام حسین مرحوم و مغفور دفن ہو جائے گا۔ ابھی تو یہ کسی جنگجو کے بچے کا ابا بھی نہیں بنا۔"

میں نے کہا "ہاں یار یہ کیا مسئلہ ہے۔ شادیاں ایک چھوڑ دو کر لیں تم نے۔"

www.paksociety.com

"یہ تو اللہ کی دین ہے جی۔" وہ اُبھر کے بولا۔
منظر نے کہا "اب تو بھوتنی کے۔ خدا سے دعا مانگ کہ باپ بنا تیرے نصیب میں نہیں تو تیری کوئی بیوی ہی ماں بن جائے۔"
مولوی خادم حسین پھٹ پڑا "یہ۔۔۔ یہ کس قدر بے غیرتی کی بات ہے۔ منظر صاحب آپ نے گالی دی ہے مجھے۔ کوئی صحیح العقائد مرد ایسی لغو بات نہیں کر سکتا۔"
"یار تم نے کب کہا ہے کہ ہم صحیح العقائد ہیں۔"
خادم حسین کا رنگ اُڑ گیا۔ "یہ تو خیال فرمایئے کہ میری اہلیہ سُن لیں گی۔"
"وہ بے تو کیا طلاق کروے گی تجھے؟ اتنا احمق شوہر پھر کہاں ملے گا اسے۔" منظر نے کہا "مری بات ارلار کی تو آخر ہم بھی تیری ماشا کار کو سمجھتے ہیں۔ دوست وہ جو مصیبت میں کام آئے تو میری بیوی لے لے۔"
اسی وقت خادم حسین کی بیوی اندر آ گئی "منظر بھائی۔۔۔!"
خادم حسین بڑبڑا کے اٹھا اور پھر بیٹھ گیا "بیگم! یہ۔۔۔ فرماتے ہیں آپ بے اولادی کی انتہا۔۔۔ میرے مہمان نہ ہوتے تو یہ۔۔۔ تو میں۔۔۔"
"یعنی مہمان نہ ہوتے تو ہماری چیلنج کال قبول کر لیتے؟" منظر بولا۔
"میں آپ کے سر عزیز کو پاپوش قدیم سے زدوکوب کر کے آپ کو غریب خانے سے بے دخل کرتا۔" خادم حسین کا غصے سے بُرا حال تھا۔
"یار دیکھو اس مولوی کو۔ ابھی خود ہی کہہ رہا تھا کہ کوئی بچے دینے والی بیوی لا دو۔" منظر کہاں باز آنے والا تھا "میں گارنٹی کے ساتھ دے رہا ہوں تو اچھل رہا ہے بندر کی طرح۔"
خادم کی بیوی بھی ہم سب کے ساتھ ہنسنے لگی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سب خادم حسین کو چھیڑ کر لطف لے رہے ہیں۔ ابھی ہم چائے پی ہی رہے تھے کہ اس کی بیوی نے اشارے سے خادم حسین کو اندر بلا لیا۔ وہ گیا اور واپس آیا تو چیخ مار کے منظر سے لپٹ گیا اور اسے چومنے لگا۔
"ابے۔۔۔ ابے کیا ہو گیا۔ غالب، مولوی پاگل ہو گیا۔"
مولوی اسے چھوڑ کر سب کے بیچ میں ناچنے لگا اور اپنی بے سُری آواز میں گانے لگا "فرشتوں کا منہ کالا۔ میں ہوں ابا بننے والا۔"
میں سمجھ گیا کہ اس کی بیوی نے شوہر کی پوزیشن کو عین وقت پر مزید خراب ہونے سے بچا لیا اور بروقت وہ خوش خبری اسے دی جو عام طور پر بیویاں خلوت میں بڑے اہتمام سے دیتی ہیں۔ اس کی بیوی پھر ہمارے سامنے نہیں آئی۔ ہم سب کا پہلے ہی ہنستے ہنستے بُرا حال ہو رہا تھا۔ مولوی خادم حسین کے ناچنے گانے سے اور ہنسی آئی۔ ہم سب نے باری باری اسے گلے لگا کے اور خوب دبا دبا کے مبارک باد دی۔ منظر نے بھی خوب گُل فشانی کی مگر مولوی خادم حسین نے خوشی میں سب کچھ برداشت کیا۔
جب ماحول کچھ سنجیدہ ہوا تو میں نے منظر کو وہ سب بتایا جو دوسرے سب سُن چکے تھے۔ منظر نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا کہ ملک نبی داد عباسی کا چوہدری دلاور سے سیاسی اختلاف بھی مراسمت ممکن نہیں کیونکہ ماضی کا سایہ چوہدری دلاور کے پیچھے ہے جو ابھی تک اپنے سیاسی مستقبل کی جانب دیکھ ضرور رہا ہے مگر اس سمت میں کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی ہے۔ نبی داد پہلے سے سیاسی میدان میں ہے اور دلاور کے بہکانے میں آ کے ہمارے خلاف کوئی ایسا قدم اٹھانے پر ہرگز تیار نہیں ہو گا جس سے اس کو آغاز ہی میں پولیس کی مخالفت اور عدالتی چارہ جوئی کا رسک لینا پڑے۔
ہم نے استاد پیڈرو کا وہ اعتراف نامہ بھی سُنا جو تانو نے ریکارڈ کیا تھا۔ سوالات رابعہ کے تھے۔ دوسرے کیسٹ میں کوئی انٹرویو نہیں تھا اور نہ اس سے براہ راست کچھ پوچھا گیا تھا۔ یہ دلاور کی اور پیڈرو کی گفتگو تھی۔ دلاور کو معلوم تھا کہ اسے پیڈرو سے کیا اگلوانا ہے چنانچہ وہ بتاتا تھا۔ اس نے خود کوئی ایسی بات نہیں کی جس پر بعد میں گرفت ہو مگر پیڈرو نے بہت سی باتوں کا اقرار کر لیا اور بہت سے انکشافات بھی کیے۔ تاہم اس سے کوئی بھی نئی بات معلوم نہیں ہوئی جو کسی طرح بھی ہمارے کام آتی۔ پیڈرو کا قصہ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے خلاف سارے الزامات اور اس کے جرائم کی پوری فہرست بے مقصد ہو کے رہ گئی تھی لیکن اس نے جو کچھ ہمیں بتایا تھا وہ بجائے خود اہم تھا۔
منظر نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ چوہدری دلاور سے پیڈرو نے جو کچھ کہا ہے بقائمی ہوش و حواس نہیں کہا ہے وہ نشے میں تھا۔ اس کی آواز اور لہجے میں لکنت ہے۔
"چوہدری دلاور نے اسے خود پلائی ہو گی" غالب نے کہا۔
"یہ صرف شراب نہیں بول رہی تھی۔ اگر شراب کے ساتھ کوئی سکون آور دوا دی جائے تو اس کا اثر کتنا ہو جاتا ہے۔" منظر بولا۔
میں نے کہا "میرے والد کی برسی پرسوں ہے۔"
غالب نے کہا "پرسوں نہیں کل۔"
میں نے گھڑی میں تاریخ دیکھی تو مجھے خیال آیا کہ اپریل ۳۰ مہینہ نہیں دن کا ہوتا ہے اور میں نے رات کے بعد تاریخ کو آگے نہیں کیا تھا۔ اس میں اکتیس تاریخ آتی تھی جبکہ آج کم مئی تھی اور اسی لیے جمعتی تھی۔
میں نے تاریخ درست کر کے کیلنڈر آگے بڑھا دیا "ایک سال اور گزر گیا۔"
"اس مختصر عرصے میں کتنے لوگ نہیں رہے" غالب بولا "یہ فہرست واقعی بہت لمبی تھی۔ اس عرصے میں ہم سب ہی ہو گئے تھے۔ میرے والد کے بعد رابعہ کی ماں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ محسن کے والدین رضائے الٰہی سے اللہ کو پیارے ہوئے تھے پھر نازو کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ گُل بازو کا جو اس رفتار مشتی تھی! اکیوپنکچر اسپیشلسٹ ہلاک مار دیا گیا تھا۔ گُل کے ابا لغزی صاحب بھی پُراسرار حالات میں ہلاک ہوئے۔ ہمارے اپنے ساتھیوں میں محسن کی بیوی شہلا اور اس کا بیٹا۔ استاد پیڈرو، محسن کی بہن فوزیہ اور اس کا شوہر۔ یا میرے خدا! ہم کتنے رشتوں سے محروم ہو گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ دنیا خالی ہو گئی۔"
غالب نے کہا "افسردہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ یہ بری غلط باتوں کی نجیب کارن ہے ورنہ دعائے مغفرت آدمی ہر دن کر سکتا ہے۔"
"ہاں۔ بس ایسے ہی ایک خواہش تھی کہ اس برسی پر میں فاتحہ خوانی کے لیے جاؤں تو یہ خیال نہ ہو کہ میں خالی قبر کے سامنے کھڑا ہوں۔ محسن کہاں ہے؟"
میرے اچانک سوال سے غالب چونکا "اس کا کچھ پتا نہیں۔"
"پتا نہیں کا کیا مطلب؟"
"وہ اپنے گھر میں نہیں ہے۔ گُل بھی نہیں ہے اور دولی بھی۔"
"تم نے مالک مکان سے پوچھا؟"
منظر نے کہا "وہ پراپرٹی ہمارے دفتر میں ہے جس نے یہ ایک گھر کا مکان دلوایا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مکان خالی کر گئے۔"
"کب؟ اور خالی کر کے کہاں گئے؟" میں نے کہا۔
"یہ کسی کو خبر نہیں۔ دوستوں کے ہاں بھی نہیں گئے اور نہ اس کے بعد خود انہوں نے اپنے بارے میں کوئی اطلاع دی ہے۔ یہ تین دن پہلے کی بات ہے۔ زکار یوسف نے چپراسی کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ ادھر اُدھر کے لوگوں سے پوچھ کر آئے مگر وہ ناکام لوٹا۔"
میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ "کمال ہے۔ تم سب اتنے مطمئن بیٹھے ہو جیسے کوئی بات ہی نہیں۔"
"وہ اپنی مرضی سے گئے ہیں۔ جہاں بھی گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں دولی کی حفاظت کا خیال ہو۔ انہوں نے کوئی خطرہ محسوس کیا ہو تو خاموشی سے روپوش ہو جانا بہتر سمجھا ہو۔ وہ بچی کی خاطر سب کچھ کر سکتے ہیں۔"
میں نے کہا "خدا کرے کہ ایسا ہی ہو لیکن دولی کو اچانک کیا خطرہ لاحق ہو گیا؟"
"فرض کرو انہیں کوئی شخص مشتبہ محسوس ہوتا ہے یا ان کو دھمکی ملتی ہے" غالب نے کہا "ان کی جگہ میں بھی ہوتا تو کسی کو بتائے بغیر ایسے ہی غائب ہو جاتا۔ دولی ان کی زندگی ہے۔ وہ ہمارے بغیر رہ سکتے ہیں دولی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"
"ان بے وقوفوں نے ابھی تک کسی سے رابطہ نہیں کیا۔ تین دن ہو گئے۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ سب پریشان ہوں گے۔ یہی خیال آئے گا ہمارے دل میں کہ انہیں کسی نے اغوا تو نہیں کر لیا۔ ایک دفعہ چھوڑ جانے یا کہیں سے کسی کو بھی فون پر پیغام دینا کوئی مشکل تو نہیں تھا۔"
"ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔ اور مجھے شک ہے کہ وہ کراچی چلے گئے ہوں گے۔" منظر نے کہا "اکرام شیخ کا فون آیا تھا' اس کی بات تو نہیں ہوئی غالب سے۔ پیغام مل گیا تھا۔"
"میں یہاں ہوتا تو بات بھی ہو جاتی" غالب نے کہا۔
"پیغام کیا تھا؟"
"کوئی خاص نہیں۔ ہم سب کی خیریت پوچھی تھی۔ اور دولی کے بارے میں کہا تھا کہ لاہور میں خطرہ ہو تو اسے کراچی بھیج دو۔"
"مگر اس پیغام کا علم محسن کو کیسے ہوا؟"
"ہاں یہ بات ذرا عجیب لگتی ہے۔"
میں نے کہا "کراچی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کالج کے اسکول میں فون ہے گھر پر فون نہیں ہے۔"
"فون نمبر کس کے پاس ہے؟" غالب نے کہا۔
"رابعہ کے پاس ہو گا۔ اور کالج کا اسکول عام اسکول نہیں ہے۔ کافی شہرت ہے اس کی۔ انکوائری سے خود نمبر معلوم کر کے لائن مل سکتا ہے لیکن چھوڑو۔۔۔ میں خود کراچی جا رہا ہوں" میں نے کہا۔
"کیوں؟ اب کیا خارش ہو رہی ہے؟" منظر بولا۔
"مجھے شیخ عقار کی پراپرٹی سے اراضی حاصل کرنی ہے۔ ہر قیمت پر" میں نے کہا۔
مولوی خادم حسین کو سخت مایوسی ہوئی جب ہم نے دوپہر کے کھانے پر رکنے سے معذرت کر لی "ہم نے چائے پی لی۔ اتنا کافی ہے۔"
"اب تم لیٹ کرو اپنا بھوتنی کے" منظر نے پھر اس کے ہاتھ مار دیا "اس میں کھائیں گے خوب۔"
"دیکھو اب کیا ہے؟"
"اب یہ شادی کے بعد اور کیا موقع ہوتا ہے؟ جناب یہ شرعی مسئلہ ہے۔ رہنے کے بغیر اولاد جائز نہیں رہتی۔ تم حرامی ہو پھر تمہاری اولاد حرامی ہو گی تو۔"
"حرامی پن کی ساری نشانیاں تو آپ کی ذات میں مجتمع ہو گئی ہیں" مولوی خادم حسین چراغ پا ہو گیا "اپنے سرو نیچوں کو بھو جائیں تمہیں میرے بچے کو کچھ کہا تو۔"
"چلو۔۔۔ سوت نہ کپاس جلاہے سے لٹھم لٹھا۔ ابھی سے یہ بھوتنی کا باپ بن بیٹھا۔ ابے الو کا پٹھا ہو گا بیوی نے اولاد پیدا کرنا مردوں کا کام ہے۔ نونوں کا ٹھیں سالے پہلے چیک کرا۔ ایسے ہی زمانہ ہو۔ جب کچھ ہو گا تو پھر حرامی حلالی کا فیصلہ کریں گے۔"
"بس جی نرخ کے بعد آپ سے بات کرنے والا حرامی۔۔۔" وہ چلانے لگا "بخدا اشتعال میں کسی دن آپ کی جان میرے ہاتھوں جائے گی۔ مجھے بار رجہ پھانسی ہو گی۔"
"ان شاء اللہ اور آمین" منظر بولا "اب چا سکندر ہم' غالب اور رخسار سب نے سُنی ہے یہ مولوی خادم حسین کی بات۔ جو مجھ سے

www.paksociety.com

بات کرے وہ حرامی۔ جا کے اپنی بیوی بچوں کو بھی بتا دیتا ہوں۔"

ہم دو بجے کے قریب منظر کے گھر پہنچے تو ظاہر ہے خواتین رابعہ، نگی اور نازو سخت برہم تھیں۔ وہ بہت بڑی پھنسی تھیں۔ دو گھنٹے میں منظر کی بیوی ان تینوں کا دماغ چاٹ گئی تھی اور ابھی تک اس کی زبان اتنی ہی مستعدی اور برق رفتاری سے رواں تھی۔ رابعہ یوں ہی کم گو تھی۔ نازو سے زیادہ نگی نے اس کی بیوی کے نظریات اور خیالات سے عدم اتفاق کی ناکام کوشش کی تھی لیکن وہ سیلابی ریلے کو ریت کی دیوار سے روکنے کی کوشش ثابت ہوئی تھی۔ وہ سوائے نانبو کے اور ہوں ہاں کرنے کے کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ یک طرفہ گفتگو جسے مونولاگ کہتے ہیں آخر کتنی دیر جاری رہ سکتی ہے۔ بالآخر منظر کی بیوی کو احساس ہو گا کہ اکیلی وہی بول رہی ہے تو وہ تھک کے یا صوت میں چپ ہو جائے گی اور پھر ان کی بھی سنے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ منظر کی بیوی بلا تکان بولتی رہی اور اس کے پاس موضوعات کی کمی نہیں تھی اور فصاحت و بلاغت کی صلاحیت خداداد تھی اس لیے وہ بچوں اور شوہر کے اخلاق و عادات پر کنٹرول کرنے کے طریقوں سے خاندانی تنازعات "مہنگائی" فلموں میں بے حیائی اور سفلی عمل سے جنات کے وجود کو برحق ثابت کرنے تک ہر مسئلے پر بول چکی تھی اور جب ہم پہنچے تو یہ بتا رہی تھی کہ سولہ بچوں کے نام کیسے غلط رکھ دیے گئے تھے۔

اس کے دس چودہ بچے گھر میں یوں چیخ پکار اور مار دھاڑ میں مصروف تھے کہ لگتا تھا جیل میں بلوہ ہو گیا مگر منظر کی بیوی پر کوئی اثر نہ تھا۔ اس کا سولھواں لخت جگر فرش پر چت پڑا فریاد کناں تھا اور غالباً ہجوم کے پیروں میں فٹ بال بنا ہوا تھا۔

منظر نے فخریہ نظروں سے مجھے دیکھا "اسے کہتے ہیں گھر بیٹا۔ کتنی رونق ہے اور کتنا سکون ہے۔"

"بجا ارشاد۔ لیکن یہی سکون ہے تو ہم بے سکون بھلے۔"

"ابے بھوتنی کے "سکون ہوتا ہے دل کا۔ دیکھ میری بیوی ذرا بھی پریشان ہے یا میں....؟"

"پریشان تو دوسرے ہوں گے تمہارے ہمسائے۔ گھر آنے والے یار دوست" میں نے کہا "ہم چلتے ہیں اب۔"

"ابے نہیں یار۔ کھانا کھا کے جانا۔ میری گھر والی تو کچھ کر نہیں سکی۔ ان تینوں نے بھی اتنی دیر میں کچھ نہیں کیا۔ بس جیسی رہیں مہمان بن کے۔ خیر بازار سے منگوا لیتے ہیں کھانا۔ اب تو میرا ایک ملازم بھی جوان ہو گیا ہے۔ مجھے کل ہی پتا چلا۔"

غالب نے کہا "کیسے پتا چلا؟"

"وہ گھر میں آتی ہے نا ایک ملازمہ۔ آج کل اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لا رہی ہے۔ کل اس پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ باقاعدہ وعدہ کر رہا تھا کہ بھاگ چلو میرے ساتھ۔ بالکل میرے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ ہے بھی ہیرو باپ میری طرح۔"

ہم جان چھڑا کے بھاگے۔ رابعہ نے تو صرف اتنا ہی کہا کہ "تمہیں چھوڑ کے خود کہاں نکل گئے تھے مگر نگی اور نازو تو پیچھے پڑ گئیں۔ رقار ہوشیار اور تجربہ کار تھا اس نے دفاعی حکمت عملی اختیار کی اور الزام ہمارے سر ڈال کے مظلوم بن گیا۔

"تمہاری قسم۔ مجھے تو یہ لوگ لے گئے تھے۔"

"زبردستی لے گئے تھے؟ گن پوائنٹ پہ لے گئے تھے؟ بچے ہو تم؟"

"یار نگی۔ گاڑی میں چلا رہا تھا۔ ڈرائیور کیا کر سکتا ہے بے چارہ۔ ان کو چھوڑ کے بھی کیسے آ جاتا۔"

غالب کی نازو سے زبردست جنگ ہوئی۔ لڑنے کے لیے انہیں ویسے بھی کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت تو معقول وجہ تھی۔

"کیا ہو آخر تم میری۔ افسر حاکم اتالیق یا اماں۔ کہ مجھ سے ایسے پوچھ رہی ہو۔ میں کہیں بھی جاؤں جہنم میں جاؤں۔"

"میں بھی جاؤں گی اور تم ایسے مجھے بتائے بغیر نہیں جاؤ گے۔"

"میں جاؤں گا۔ تمہارا بھوت باپ مجھے منع نہیں کر سکتا۔"

"دیکھو باپ تک مت جاؤ۔ میں روک سکتی ہوں تمہیں لو پھر تم نے بھوت کہا میرے ابا کو۔"

"ہاں کہا۔ ان سے پوچھو نا کہ وہ بھوت کیوں بنے آخر۔ میں نے تو نہیں کہا تھا۔ ان کے اعمال ہی ایسے ہوں گے۔"

نازو نے اپنے آخری ہتھیار سے کام لیا اور رونے لگی "تم ہمیشہ انہیں ذلیل کرتے ہو خواہ مخواہ لڑائی..."

غالب بھول گیا "لڑائی۔ ہماری تو کوئی لڑائی نہیں تھی۔ ویسے میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

"کوئی ضرورت نہیں مجھ سے مذاق کرنے کی۔ بلکہ بات کرنے کی۔ ابھی سے یہ حال ہے تو بعد میں کیا کرو گے؟"

"بعد میں اس سے زیادہ کروں گا" غالب نے کہا۔

نازو نے رابعہ سے فریاد کی "دیکھا سنا آپ نے؟"

غالب بولا "یار میرا مطلب تھا زیادہ محبت کروں گا۔ اچھا تمہارے خالی سر کی قسم۔ آئندہ باتھ روم بھی جاؤں گا تو آپ سے پوچھ کے" اس نے دو انگلیاں کھڑی کر کے کہا "اور تمہارے ابا کو جن بھوت بد روح کچھ نہیں کہوں گا۔ بس اب رونا بند کرو۔"

"سچ کہہ رہے ہو" نازو نے فوراً آنسو پونچھ لیے۔

"ہاں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ آئندہ سچ نہیں بولوں گا۔"

غالب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ اس کے بعد دوسرا ہنگامہ کیسے شروع نہ ہوتا۔ ہم سب کی کوشش سلامتی کونسل کی قرارداد سے زیادہ موثر ثابت نہ ہوئی۔ کھانا ہم نے باہر کھایا۔ یوم مئی کے سلسلے میں بازار اور دفاتر بند تھے مگر ریسٹورنٹ زیادہ تر کھلے تھے۔

گھر پہنچ کے سب ہی تھوڑی دیر کے لیے سو گئے۔ شام کو مجھے رابعہ لان پر بیٹھی نظر آئی تو میں اس کے پاس جا بیٹھا۔

"تم بہت اچھی لگ رہی ہو" میں نے کہا۔

"مجھے پتا تھا کہ تم یہی کہو گے۔ کہنے کو جب کچھ نہیں ہوتا تو یہی بات رہ جاتی ہے۔"

میں نے سٹپٹا کے کہا "تم بہت اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہی ہو۔"

"مجھے لچھے دار باتیں کرنا نہیں آتا اور مجھے ایسی باتیں سننا بھی اچھا نہیں لگتا۔"

"تم لڑنا چاہتی ہو؟"

"لڑنے سے بھی کیا ہو گا۔ آخر ہار میری ہی ہو گی۔ تم وہی کرو گے جو تمہارا دل چاہے گا۔ میں نے تم کو روکا تھا عباسی کے گھر جانے سے اور اس کے گیسٹ ہاؤس میں قیام کرنے سے۔ تم نے مانی میری بات؟ اور دیکھ لو اس کے نتیجے میں کیا ہوا۔ اب تم کراچی جانا چاہتے ہو تو میرے منع کرنے سے مانو گے؟ تم ضرور جاؤ گے۔"

"یہ ضروری ہے رابعہ۔"

"سب کچھ ضروری ہے تمہارے لیے" وہ روہانسی ہو گئی۔

شاید وہ کہنا چاہتی تھی کہ شادی کے مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنے اور گھر بسانے کی فکر کرنے کے سوا تمہارے لیے دنیا کا ہر کام ضروری ہے مگر کسی وجہ سے اس نے الفاظ کو زبان تک آنے سے پہلے روک دیا۔ میں اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھتا تھا۔ میرا ساتھ دیتے دیتے اس کے صبر کا حوصلہ جواب دینے لگا تھا۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے وہ خود کو سمجھاتے سمجھاتے بھی تھک گئی تھی۔ اب تو مجھے اس کے سامنے کسی مجبوری کا عذر پیش کرتے یا اسے صبر یا مزید انتظار کرنے.... کے لیے کہتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔

نگی نے بروقت نمودار ہو کے میری مشکل آسان کی ورنہ شاید میں کچھ کہتا تو اس کا اثر الٹا ہوتا اور رابعہ رو پڑتی یا ہماری لڑائی ہو جاتی۔

نگی چائے کی ٹرے باہر ہی لے آئی تھی۔ چھوٹے سے لان میں بید کی چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور درمیان میں ایک ہی میز تھی۔

میں نے کہا "باقی لوگ ابھی تک سو رہے ہیں؟"

"رقار تو خراٹے لے رہے تھے ان کی کھال بہت موٹی ہے۔ کسی بات کا ان پر اثر نہیں ہوتا۔" نگی نے چائے بناتے ہوئے کہا "غالب اور نازو آ رہے ہیں۔ پہلے غالب اسے منا رہا تھا۔ پھر معاملہ الٹا ہو گیا۔ اب نازو منا رہی ہے اسے۔ خوب ہے ان کی دوستی بھی۔"

"یہ تو شادی کے دو چار یا پانچ دس سال بعد ہی پتا چلتا ہے۔"

"اچھا! ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہے ہو یا سنی سنائی" اس نے مجھے چائے پکڑاتے ہوئے کہا "دیکھو سکندر بھائی۔ میں آخری بار سمجھا رہی ہوں کہ بہت ہو چکی اب شادی کر لو۔"

میں نے کہا "ابھی پھر نہیں کہو گی؟"

"مذاق میں مت ٹالو۔"

"تمہارے آنے سے پہلے ہم بھی یہی سوچ رہے تھے۔ بلکہ اسی مسئلے پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے" میں نے کن انکھیوں سے رابعہ کو دیکھا۔

"جھوٹ۔ تم ہمیشہ کی طرح ٹالنے کے بہانے تلاش کر رہے تھے" رابعہ نے تلخی سے کہا۔

نگی نے مجھے غصے سے دیکھا "آج یہ مسئلہ طے ہو کے رہے گا۔ رات کو سب کے سامنے بات ہو گی۔ مجھے تاریخ چاہیے۔"

"تم تو بالکل دلہا کی اماں کی طرح بات کر رہی ہو۔ جیسے لڑکی والے ٹال رہے ہوں" میں نے کہا۔

"غالب کو بھی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ بلکہ فیصلہ میں کروں گی۔ میں منظر بھائی کو بھی بلا لوں گی۔ تمہارا کوئی بڑا نہیں ہے تو کیا تم بے مہار ہو گئے ہو۔ مزید مہلت نہیں دی جا سکتی تمہیں۔ ہم دو تین پرچیوں پر تاریخ لکھ کر رکھیں گے۔ تم ایک اٹھاؤ گے وہی تاریخ ہے۔"

نگی بڑے جلال میں تھی اور رابعہ کے موڈ کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی اس کی بات کو مذاق میں اڑانے کی ہمت نہیں کی۔ میرے ہاں یا نہ کرنے سے پہلے غالب نے کھڑکی میں سے چلا کے کہا "منظر کا فون ہے۔"

میں نے اندر جا کے ریسیور اٹھا لیا "کیا بات ہے؟"

"بات کے بچے۔ اس بھوتنی والے نے مجھے فون کیا تھا۔"

"کس نے؟"

"اپنے چوہدری دلاور نے۔ کہنے لگا کہ اپنے سکندر صاحب سے کہو کہ ذرا خیال کریں۔ لاہور میں ایسے مت پھریں جیسے لندن میں پھرتے تھے اور ان کو میری طرف سے کہنا کہ وہ غالب کی بیوی مبارک ہو۔"

میں نے بے اختیار گالی دے کر کہا "اس.... سے کہنا تھا کہ مجھ سے بات کرے۔"

"یہی کہا تھا میں نے اور یہ بھی کہ آئندہ سال میں تمہاری میعنہ اولاد کو ایسی ہی مبارک باد پیش کروں گا۔ انشاء اللہ۔ تو ہنسنے لگا کہ اپنے سبزی صاحب منظر کو سبزی کہہ رہا تھا۔ بات ذرا کی کرنی چاہیے۔ کل کا کسے پتا۔ ہیں جی۔ میں بات کر لیتا ہوں اپنے سکندر صاحب سے بھی۔"

میں نے کہا "اسے معلوم ہے.... کہ میں کہاں ہوں....؟"

"بھوتنی کے۔ تم بھی سو رہا سینہ پھرتے ہو؟ اب انتظار کرو اس کے فون کا۔ پھر مجھے بتانا اس نے کیا کہا؟" منظر نے فون رکھ دیا۔

میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بجنے لگی۔ میں نے آواز بدل کے کہا "ہیلو۔"

چوہدری دلاور بہت چالاک ثابت ہوا "زیادہ مت کرو اپنے سکندر صاحب۔ یہ تو ایسے ہی ہو ہے کیا کہتے ہیں اسے۔ انالوجی کال۔"

"مجھے مبارک باد دینے کے لیے؟"

www.paksociety.com

"اب میں کیا کہوں۔ میرے کہنے سے تم کب مانو گے۔ خیر! تمہاری مرضی ہے اسے جھوٹ سمجھو یا سچ! ہاں جی۔ مگر سید پور کا نام آج سنا ہے میں نے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس جگہ سے پیڈرو کا کوئی تعلق ہو۔ یا اس کے ساتھ جانے والوں میں سے کسی کا۔۔۔ مایوس ہونے کے لیے بڑی دور جانا پڑا تمہیں۔"

میں نے کہا "یہ جذبات کی باتیں ہیں۔ تم نہیں سمجھو گے۔ وہاں پہنچ کے مجھے احساس ہوا کہ اس سے میرے والد کی روح کو بالکل فرق نہیں پڑتا کہ جسد خاکی سپرد خاک ہوا تو کہاں ہوا۔ زمین کی مٹی کہیں کی ہو کیسی بھی ہو۔ ایک بے جان جسم کے لیے برابر ہے۔ فرق پڑ سکتا ہے پھولوں اور درختوں کو جب تک وہ زمین پر موجود ہیں۔ ورنہ ازل سے زمین نے لاکھوں بستیاں اور قبرستان نگل لیے جن کا کوئی سراغ نہیں۔"

"یار ہم جیسے ان پڑھ بندے ایسی کتابی باتیں کہاں سمجھتے ہیں' ہیں جی!"

میں نے کہا "بتانے کا مقصد یہی تھا کہ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ قرار آگیا جب وہاں جا کے میں نے اپنے والد کا مدفن دیکھ لیا۔ پھر میں نے وہ خیال ہی چھوڑ دیا۔ ہڈیوں کو پھر کھود کے نکالنے اور یہاں لا کے دفن کرنے کا۔ میں وہاں سے فاتحہ پڑھ کے لوٹ آیا تھا۔ اب تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے لیکن مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میں پہلے بھی اسی نیک نیتی اور خشوع و خضوع سے فاتحہ پڑھنے جاتا تھا۔ اب بھی ویسے ہی ان کے لیے دعائے مغفرت کروں گا۔ اس کے لیے وقت یا جگہ کی قید نہیں۔"

"ٹھیک جی۔ یہ تمہارے مسئلے مسائل ہیں۔۔۔ ہمیں کیا۔"

میں نے کہا "رہی تمہاری مرضی کی بات کہ تم نے مجھے مہلت دی تو یہ سمجھ لو کہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی میں نے تمہاری دی ہوئی مہلت نہیں سمجھا۔ تم میرے قدموں کے سراغ پر میرے تعاقب میں تھے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم مجھ سے فون پر بات کر رہے ہو۔ تم نے منظر کے گھر فون کیا تھا اور یہاں آکر پتا چلا لیا کہ میں یہاں ہوں۔ کسی اور دشمن کو یہ بات معلوم نہیں۔ تم تو یہ بھی جانتے ہو کہ میں کسی احتیاط کے بغیر کہاں کہاں گیا تھا۔ بس یہی غلطی ہو گئی تم سے۔"

"اجی اپنے سکندر اعظم صاحب۔ غلطیاں تو ہم کرتے رہیں گے۔ بندہ بشر جو ہوئے۔۔۔"

"میرا پہلے ارادہ تھا کل کراچی جانے کا۔ لیکن اب میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔"

وہ اپنی مایوسی کو چھپا نہیں سکا "کل برسی بھی نہیں کرو گے؟"

"میں ایسی دنیاوی رسموں کا قائل نہیں۔" میں نے کہا "آخرت میں ان کی مغفرت کے لیے دعا میں کہیں بھی کر سکتا ہوں اور کسی وقت بھی کر سکتا ہوں۔ تم میری تلاش میں یہاں آئے تو کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

"ہاں۔ ہم نے کہا کہ رسم دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے۔"

"تم اپنی خیر مناؤ دلاور۔"

"نہ۔۔۔ نہ سکندر صاحب۔ کل برسی ہے اس لیے ابھی میں بھی کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ ورنہ آج بہت کچھ ہو جاتا۔ دیکھو نا مجھے پتا ہے تم کس کے ساتھ کہاں کہاں گئے تھے اور اس وقت کہاں موجود ہو مگر وہ جو ایک بے رونقی کر رہا تھا میں تمہیں مہلت دینے کی۔ بیوی کی بات مان کے۔ تو میں نے کہا کہ چلو ایک دن اور سہی۔ ہیں جی! ایک اطلاع بھی دینا تھی تمہیں۔ تمہارے مطلب کی۔"

میں نے کہا "ایک اطلاع مجھے دینی تھی۔ پیڈرو جو تمہارا دست راست تھا مارا گیا۔"

وہ ہنسنے لگا "رفع کرو جی۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ مارا گیا تو ہم کیا سوگ کریں اس کا۔ تمہارے لیے چھوڑ دیا تھا میں نے وہ شکار۔ ہیں جی! خیر سے تم بھی اچھے شکاری ہو مگر وہ قابو آ گیا تھا میرے۔ میں نے کہا کہ اس پر تو اپنے سکندر اعظم کا حق بنتا ہے کیا ہوا خیر سے بعد میں پیڈرو نے کچھ بتایا؟"

"بہت کچھ بتایا جو تمہیں بھی معلوم نہیں مگر معلوم ہو جائے گا۔"

"یہ نہیں بتا سکا ہو گا وہ کہ تمہارے والد وزیر خان مرحوم کی ہڈیاں کہاں گئیں۔ اسے خود معلوم نہیں تھا۔ ہیں جی! کل برسی ہے تو میں نے سوچا کہ خود ہی تمہیں بتا دوں۔ وہ میں نے بعد میں اصل قبر میں دفن کرا دی تھیں۔ واپس منگوائی تھیں۔"

"تم میرے جذبات سے کھیل رہے ہو۔"

"توبہ توبہ۔ کیسی بات کرتے ہو جی اپنے سکندر صاحب۔ یقین نہ کرو تمہاری مرضی۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔ جب پوسٹ مارٹم والی بات ختم ہو گئی تھی تو میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ اب تمہارے والد وہیں دفن ہیں جہاں ان کی قبر ہے۔ ہیں جی! کل تک خطرے کی کوئی بات نہیں۔ تم تسلی سے جاؤ۔ فاتحہ پڑھو پرسوں۔۔۔ اچھا چھوڑو۔"

"کیا چھوڑوں؟"

"پرسوں کی بات۔ ابھی سے کیا کرنی۔۔۔ ہیں جی!"

میں نے کہا "دلاور۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں پیڈرو کو وہاں لے گیا تھا جہاں اس نے تمہارے کہنے پر میرے والد کی ہڈیوں کو دفن کیا تھا اور میں اس بات پر بہت حیران تھا کہ اس کے لیے بطور خاص وہی جگہ کیوں منتخب کی گئی تھی۔"

"کون سی جگہ؟"

میں نے دلاور کے اسٹائل میں قہقہہ مارا "تم کیا سمجھتے ہو مجھے معلوم نہیں کہ لاہور سے سید پور تک ہر لمحہ ہر قدم پر تم میرے تعاقب میں تھے۔ یہ بھی پتا ہے کہ کھیل تم کیوں کھیل رہے تھے یہ بھی میں نے سمجھ لیا ہے۔"

www.paksociety.com

"لیکن خود ہم۔"

"بابا! مجھے یا منظر کو وہ کچھ نہیں کہتے۔ آج تک ہم اسی لیے محفوظ ہیں کہ ان کی ہم سے کوئی دشمنی نہیں۔ ہم صرف وکالت کرتے ہیں۔"

وقار کی بات ٹھیک تھی مگر اس سے نگی کی پریشانی کم نہیں ہوئی۔ اچانک ہنگامی صورت حال کے اعلان نے سب کو PANIC میں مبتلا کر دیا تھا۔ غالب پرسکون تھا لیکن نازو نروس تھی۔

"ہم کیسے جائیں گے اور کدھر سے؟" غالب نے کہا۔

"آخر جانا کہاں ہے؟" رابعہ بولی۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی "تم نے سوٹ کیس پیک کر لیا ہے؟"

"ہاں۔ وقار کی گاڑی میں رکھوا دوں۔"

میں نے غالب سے کہا "سوٹ کیس لے کر چھت پر چلو۔ ہم سامنے سے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"پیچھے سے کون سا راستہ ہے؟"

"خالی پلاٹ ہے نا۔ اس پر اتر جائیں گے" میں نے کہا "کیا پتا وہ سڑک پر گھات میں بیٹھے ہوں۔ دلاور نے کہیں قریب سے ہی فون کیا ہو۔"

اپنی طرف سے میں نے ایک منٹ کی دیر نہیں کی تھی مگر مجھ سے ایک غلطی یہ ہوئی تھی کہ میں نے صرف ایک دشمن کے بارے میں سوچا تھا۔

ابھی غالب نے سوٹ کیس اٹھایا ہی تھا کہ باہر سڑک کی طرف سے پولیس کا سائرن سنائی دیا۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ کھڑے رہ گئے۔

"یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا" میں نے مایوسی سے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ میں اکیلا فرار ہو جاؤں۔ چھت سے کود کے۔"

رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "نہیں۔ چھت سے کودنے میں خطرہ ہے۔ تم زخمی ہو جاؤ گے۔ اور پولیس کے پاس فرار ہونے والے ملزم پر گولی مارنے کا جواز ہوتا ہے۔"

وہ چند سیکنڈ کا وقت تھا جب میں یہ جوا کھیل سکتا تھا کہ چھت پر چڑھ کے پیچھے چھلانگ لگا دوں۔ ٹانگ نہ ٹوٹے تو بھاگ جاؤں۔ پولیس مجھے چھت پر جاتا ہوا دیکھ سکتی تھی اور چھت پر آ کے بھی پیچھے سے فائر کر سکتی تھی۔ شاید رابعہ نے ٹھیک ہی کیا کہ مجھے روک لیا۔

یہ منظور بلعد کی کے چلانے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس والے اندر آ گئے۔ بالکل روایتی انداز میں انہوں نے ہر طرف سے یلغار کی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے اور ان کی قیادت کرنے والا ایک انسپکٹر تھا۔

انسپکٹر نے فلمی اسٹائل میں چلا کے کہا "خبردار! جو بھاگنے کی

اس کے فون بند کرنے سے پہلے میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میں اچانک تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ خطرہ مجھے ہر سمت سے یلغار کرتا محسوس ہو رہا تھا۔

غالب نے کہا "کیا ہوا۔؟"

میں نے کہا "کچھ بھی ہو سکتا ہے غالب۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"باہر جا کے پاپا کے نگی کو پریشان کر رہے ہیں۔ کوئی سیریس ہی نہیں۔ وہ شادی کی تاریخ مقرر کرنا چاہتی ہے۔"

میں نے باہر جا کے ہی کہا "رابعہ۔ اب میں یہاں ایک منٹ نہیں ٹھہر سکتا۔ تم چلو گی میرے ساتھ۔"

نگی چلائی "لیکن کہاں۔۔۔ اور اچانک کیا ہو گیا؟"

"نگی۔ تمہاری عقل شریف میں یہ بات نہیں آئی کہ جب دلاور کا فون یہاں آ گیا تو وہ خود بھی آ سکتا ہے۔"

"کیا اس نے دھمکی دی ہے؟"

"اس نے تو مہلت دی ہے اپنی طرف سے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ دھوکا ہے۔ حیرت مجھے منظر پر ہے۔ اس احمق کی عقل میں بھی یہ بات نہیں آئی۔ اس نے دلاور کو یہاں کا فون نمبر کیسے دے دیا؟"

"یہ دلاور کو پہلے سے معلوم ہے" وقار نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ منظر نے کیسے بتا دیا کہ سکندر بخت یہاں ملے گا۔ حد ہوتی ہے بے وقوفی کی بھی۔" میں نے کہا "دلاور نے کہا ہے کہ پرسوں تک اس کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے کیونکہ کل برسی ہے میرے والد کی۔ اگر دلاور جیسا جانی دشمن یہ بات کہے تو اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟ اتنا خیال کرے گا وہ ہمارے جذبات کا؟"

غالب نے کہا "بالکل ٹھیک سوچا ہے تم نے۔ وہ صرف معلوم کرنا چاہتا ہو گا کہ تم منظر کے گھر میں ہو یا یہاں؟"

"پھر اب کیا کریں؟" نازو نے گھبراہٹ میں سوال کیا۔

غالب نے گھڑی دیکھی "نوبج کر گئی کہ رہی ہے۔ کہاں گی اگر آج ہی کی تاریخ رکھ لی جائے تو شادی کتنی دیر میں ہو سکتی ہے۔ دراصل ٹائم کچھ کم ہے ہمارے پاس۔"

میں نے کہا "فضول باتیں چھوڑو۔ تم نکل جاؤ نازو کے ساتھ۔"

"نکل کے کہاں جائیں؟"

"کہیں بھی جاؤ۔ اس گھر میں مت رہو" میں نے رابعہ کو ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا "چلو جلدی کرو۔ وہ لوگ آنے ہی ہوں گے۔"

نگی پر بدحواسی طاری ہو گئی "وقار۔ تم بھی کچھ کرو۔"

وقار اسی طرح بیٹھا رہا "میں دعا کر رہا ہوں کہ انہیں نکل جانے کی کچھ مہلت مل جائے پھر ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ وہ آئیں اور دیکھ لیں کہ یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔"

کوشش کی۔ ہینڈز اپ۔"

ہم سب نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"سکندر بخت کون ہے؟" پولیس انسپکٹر نے کہا۔

"کیا تم پہچانتے نہیں" غالب نے کہا "میں ہوں سکندر۔"

انسپکٹر نے کہا "ہتھکڑی لگا دو اسے۔"

اس کے پیچھے آنے والے مسلح کانسٹیبل آگے بڑھے اور انہوں نے غالب کو ہتھکڑی پہنا دی۔ نازو کی حالت غیر ہو گئی مگر سب کو خاموش دیکھ کے اس نے ضبط سے کام لیا۔ نیا انسپکٹر شاید سکندر بخت کو پہچانتا نہیں تھا اور اس غلط فہمی سے فائدہ اٹھانے کا خیال مجھ سے پہلے غالب کے دماغ میں آیا تھا۔ کسی تذبذب کے بغیر اس نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جلد میں وہ آسانی سے رہا نہیں ہو گا مگر سکندر کے بجائے غالب کو پکڑ لانے والے انسپکٹر کی نوکری ضرور چلی جائے گی۔

انسپکٹر نے تحدیرے ... "میں رابعہ قادری کون ہے!"

اب نازو نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہاتھ بڑھا دیے "میں!"

وقار نے پیچھے سے کہا "تم نے ابھی تک مجھے وارنٹ نہیں دکھائے اور تم لیڈی پولیس کے بغیر میرے گھر میں داخل ہوئے ہو۔"

"وکیل صاحب۔ لیڈی پولیس گاڑی میں موجود ہے۔ ان کا ساتھ ہونا کافی ہے" انسپکٹر بولا "مفرور ملزمان کی گرفتاری کے لیے وارنٹ نہیں ہوتا۔ چھاپا مارا جاتا ہے ایسے ہی ورنہ ملزم نکل جاتا ہے۔"

"لیکن ان کا جرم کیا ہے۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے۔ میں ان کا وکیل ہوں" وقار نے بحث جاری رکھی۔

"وکیل صاحب۔ جرم بھی پتا چل جائے گا۔"

"نہیں۔ تم میرے گھر میں یہ لاقانونیت نہیں چلا سکتے انسپکٹر۔ میں ہرگز اس کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"وہ سپاہی تھانے۔ تیری اجازت کی ضرورت کسے ہے؟"

وقار اس کے انداز تخاطب پر چراغ پا ہو گیا "میں ابھی بات کرتا ہوں ایس پی فضل احمد سے جمالی صاحب سے۔"

نازو کو ہتھکڑی لگانے والا کانسٹیبل ہنس پڑا "ضرور کر دیکھو اگر ٹیلی فون زندہ ہو۔"

وقار نے پلٹ کے کہا "فون ڈیڈ ہے۔ تم نے لائن کاٹ دی ہے میرے فون کی۔"

"چھاپا ایسے ہی مارا جاتا ہے سرکار" دوسرا کانسٹیبل بولا۔

میں نے اسے بھی غور سے دیکھا۔ اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ وہ مجھے شکل سے نہیں پہچانتے تھے ورنہ میں اس وقت اپنے اصلی

چہرے کے ساتھ سامنے تھا اور انکار نہیں کر سکتا تھا کہ میں سکندر بخت نہیں ہوں۔ غالب پر اعانت مجرمانہ کا الزام عائد کر سکتے تھے۔ یہ کہہ سکتے تھے کہ اس نے اور نازو نے اصل مجرمان کے فرار میں مدد کی مگر وہ غالب کو سکندر کے جرم میں بند نہیں کر سکتے تھے۔

اس وقت جو بات میرے ذہن میں تھی وہی غالب بھی سوچ رہا تھا اور شاید وقار بھی۔ میں نے نظر بچا کے رابعہ کو اشارہ کیا مگر وہ نہیں سمجھی۔ نازو نے دیکھا اور سمجھ لیا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ وہ آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹی۔ پھر اس نے دوسرا قدم پیچھے ہٹایا۔

باہر سے نگی نے پھر چلانا شروع کیا۔ "آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ ۔۔۔ میرے گھر میں۔"

میرا شبہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ وہ مجھے اور رابعہ کو ملک خداداد عباسی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آئے تھے۔ بڑے عذاب سے چھوٹا عذاب یقیناً قابل ترجیح تھا لیکن باہر سے ملک نبی داد عباسی کی آواز سن کے میری ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ وہ اندر آتے ہی پہچان جائے گا کہ سکندر بخت کون ہے۔

پولیس نے غلط آدمی کو گرفتار کر لیا تھا۔ یہ ہمارے حق میں اچھی بات تھی مگر قسمت کی خرابی نے ہمیں فائدہ نہیں اٹھانے دیا تھا۔

اب میں شک کے باوجود اپنا پلان بدلنے پر مجبور تھا مگر مجھے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب نازو میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

پھر ملک نبی داد عباسی یعنی مسٹر مونچھ اندر آیا اور اس نے حیرانی سے اندر کا منظر دیکھا۔ میں نے نازو کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی آخری کوشش کی۔

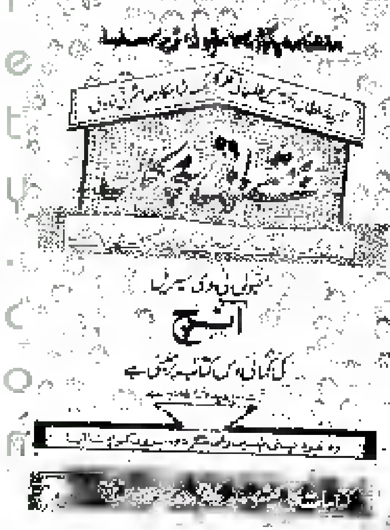

دونوں ہاتھ آگے بڑھائے "تمہارا نام بھی آ جائے خبروں میں۔"

"تم پتا نہیں خود کو کیا سمجھتے ہو" تھانے دار نے کہا "مشہور وکیل اور مشہور صحافی چوری کریں، ڈاکے ڈالیں، قتل کریں۔ کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں۔ ان کو گرفتار کوئی نہیں کر سکتا۔ چلو اوئے۔"

اس نے آخری الفاظ اپنے ماتحتوں کو مخاطب کر کے کہے تھے۔

اس دوران میں ملک خداداد عباسی خاموشی سے وہ کام کر رہا تھا یعنی زیرِ لب مسکرا رہا تھا اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔

تم نے ہنگامہ کیا تھا مگر بعد میں اسے وقار نے خاموش کر دیا تھا اور شاید کوئی خفیہ اشارہ بھی کیا ہو گا ورنہ وقار کے کہنے سے تم چپ ہونے والی نہیں تھی۔

میری طرح رابعہ بھی سارا کھیل سمجھ گئی تھی اور وقار نے بھی محض اس لیے ہنگامہ کیا تھا کہ انہیں شک نہ ہو وہ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہیں کہ ہم دھوکا کھا گئے حالانکہ ان کی جعلسازی کا پردہ بہت پہلے چاک ہو گیا تھا۔

سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ پولیس پارٹی کسی کی گرفتاری کے لیے چھاپا مارے اور خود انچارج تھانے دار کسی ملزم کو پہچانتا نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں تھا۔

ان کی دوسری غلطی یہ تھی کہ وہ گرفتاری کے وارنٹ اور لیڈی پولیس کے ساتھ نہیں آئے تھے بے شک... غریب اور لاوارث قسم کی بستیوں میں پولیس کی لاقانونیت کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ دندناتے کسی بھی گھر میں گھس کے کسی کو بھی اٹھا لیں۔ اس پر کوئی بھی الزام عائد کر دیں اور پھر رقم بٹور کے اسے چھوڑ دیں۔ یہ سب ہوتا رہتا ہے مگر وہ ہر جگہ ایسا نہیں کرتے۔ جہاں نوکری کے لالے پڑنے کا ڈر ہو وہاں وہ محتاط ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً کسی مشہور وکیل یا صحافی کے سامنے۔ یہاں تو معاملہ زیادہ سنگین تھا۔ گھر بھی ایک وکیل کا تھا اور انہیں گرفتار بھی ہائی کورٹ کی ایک نامور وکیل کو کرنا تھا۔ وہ اصلی پولیس والے ہوتے تو یہ غلطی کبھی نہ کرتے۔

ان کی تیسری فاش غلطی ٹیلی فون کے تار کاٹنا تھی۔ اصلی پولیس والے ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ چور ڈاکو یہ کرتے ہیں۔ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ کوئی پولیس کو فون نہ کر دے۔ کسی ملزم کی گرفتاری کے لیے چھاپا مارنے والوں کو کس کا ڈر۔

میں نے بہت جلد سمجھ لیا تھا کہ پولیس کی وردی میں آنے والے پولیس مین نہیں ہیں۔ ان کی اداکاری بھی اچھی نہیں تھی۔ غالب نے اور وقار نے بھی اس جعلسازی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ رابعہ وکیل تھی، صرف نازو اور وقار کی بیوی کنفیوژن کا شکار تھیں اور یہ سمجھ رہی تھیں کہ فی الحال ہم پولیس کو غلطی کرنے کا موقع فراہم کر رہے ہیں۔ بعد میں رابعہ اور سنجیدہ نکل جائیں گے اور پولیس والوں کو پتا چلے گا کہ انہوں نے عملاً اس

میرے لیے اس کو چلا کے خبردار کرنے کے سوا چارہ نہ تھا ورنہ وہ ہتھکڑی میں بندھے ہوئے دونوں ہاتھوں سے پولیس مین کو دن میں تارے دکھا دیتی۔ بلکہ رات کے وقت اسے سورج نظر آ جاتا۔

میں نے کہا "رابعہ، یہ کیا کر رہی ہو؟"

نازو کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔ میرے مقابل کھڑا ہوا تھانے دار چونکا اور اس نے فوراً اپنے ریوالور کا رخ بھی نازو کی طرف کر لیا۔ اس وقت میرے لیے تھانے دار صاحب کی تھانے داری کے غبارے سے ہوا نکال دینا بہت آسان تھا مگر میں نے جانتے بوجھتے ایسا نہیں کیا۔

میری آواز پر رابعہ بھی چونکی تھی مگر اس کے چونکنے کو نہ میں نے دیکھا تھا اور نہ غالب یا وقار نے۔ ہم سب محتاط تھے اور نازو کو دیکھ رہے تھے۔

نازو نے ہکلا کے کہا "میں... میں تو کچھ نہیں کر رہی ہوں۔"

تھانے دار نے اسے دھمکی دی "دیکھو۔ چالاکی دکھانا عدالت میں وکیل صاحبہ۔ ادھر مجھے اختیار ہے کہ مجرم فرار ہونے کی کوشش کرے تو..."

"ابھی تم زیادہ سے زیادہ ملزم کہہ سکتے ہو۔" وقار بولا۔

میں نے کہا "رابعہ۔ یہ قانون کے محافظ ہیں۔ ہم قانون سے نہیں لڑ سکتے۔ اور ہمیں لڑنا بھی نہیں چاہیے۔"

وقار نے میری تائید کی "یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کل تمہاری ضمانت ہو جائے گی۔"

تھانے دار بڑے زہریلے انداز میں مسکرایا "یار یار ضمانت کرانا آسان نہیں ہوتا وکیل صاحبہ۔"

میں نے کہا "جس لاقانونیت کا مظاہرہ تم نے کیا ہے اس کے خلاف میں پہلے صفحے پر لکھوں گا۔ تین کالم کی سرخی لگاؤں گا۔"

تھانے دار اکڑ کے بولا "اوئے یار تم ہیڈ لائن لگا دو۔ ہم کون سا غلط کام کر رہے ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔ تمہارے پاس وارنٹ نہیں، لیڈی پولیس نہیں اور تم ایک نامور وکیل کو گرفتار کر کے ہتھکڑیاں لگا کے لے جا رہے ہو۔ کوئی وجہ بتائے بغیر۔"

وہ بولا "ان پر ملک خداداد عباسی کو قتل کرنے کا الزام ہے۔"

وقار نے کہا "کیا ان کا نام ایف آئی آر میں ہے؟"

"ہاں ہے" وہ بولا "لیکن نہ ہو تب بھی ہم کسی کو تفتیش کے لیے شک میں گرفتار کر سکتے ہیں۔"

"ایف آئی آر کہاں ہے؟ مجھے اس کی نقل چاہیے۔"

"تھانے آؤ گے تو نقل بھی مل جائے گی" تھانے دار نے کہا۔

"کون سے تھانے؟"

"تھانہ انارکلی۔" اس نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

"شک کی بات ہے تو مجھے بھی گرفتار کرلو۔" میں نے اپنے

www.paksociety.com

جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد و مقبول سلسلہ
شکاری
بیسواں حصہ
www.paksociety.com

شکاری

معاشرے کے ان ناسوروں کی کہانی جو معاشرے میں پیوست ہوکر انسانی معاشرے میں اتر رہے تھے
ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز
موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلد دیجئے جنگجو
آس و یاس، خوف و ہراس، تلخ حقائق، شیریں جواب

نئی سوچ، نیا رنگ، نیا لہجہ، نیا آہنگ
احمد اقبال کے شہرۂ روشن قلم سے

اس نے افراز کو سہارا دیا "لیکن... میں تم کو وہاں کیسے لے جا سکتا ہوں۔ اگر دلاور نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ وہ ہمیں نہیں دیکھ سکے گا۔"

اس نے کہا "خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس نے کہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو وہ اپنی ایک جان بچانے کے لئے بیس کا خون بھی کر سکتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مایوسی اور غصے میں وہ تمہارے دوستوں کو مار ڈالے اور بھاگ جائے۔"

میں نے کہا "اب وہاں جا کے دلاور کو مطمئن کرنا اور اسے یقین دلانا کہ تم اس غلطی کا ازالہ کرو گے۔ یہ تمہارا کام ہے۔ تم اکیلے جاؤ گے اور اس سے کہو گے کہ غالب اور نازو کو چھوڑ دے۔ رابعہ اور سکندر موجود نہیں تھے اس لیے۔ جاہل پولیس والے غلط افراد کو پکڑ لائے۔ اصل مجرم اسے مل جائیں گے۔"

وہ انکار میں سر ہلانے لگا "میں یہ خطرہ مول نہیں لوں گا۔ میں کہیں بھی اکیلا نہیں جاتا۔ اگر اس نے تمہارے دوستوں کے بعد مجھے بھی مار دیا یا اپنے ساتھ لے گیا... اور مجھے قتل کر دیا۔"

"نہیں... وہ پاگل نہیں ہے دلاور۔ مجھے تو یہ بات ہی سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر مجھے یا رابعہ کو حاصل کرنے کے لیے اس نے تم سے کیوں بات کی۔ اس کے اپنے وسائل بہت ہیں اور آج تک ہم سے ہر معاملہ اس نے خود ہی طے کیا ہے۔ تمہیں بیچ میں لا کے اسے کیا ملے گا۔ پھر یہ کہ ہم لاپتا نہیں تھے۔ وہ ہر قدم پر سائے کی طرح ہمارے تعاقب میں تھا۔ وہ ہمیں کہیں بھی پکڑ سکتا تھا۔ ہم نہ تمہاری حویلی میں تھے اور نہ تمہاری حفاظتی پناہ میں۔ تم کسی مملکت کے سربراہ نہیں ہو کہ... مجرموں کو گرفتار کرنے سے پہلے تمہاری رضامندی ضروری ہو یا تمہاری مدد کے بغیر ان کا ہاتھ آنا محال ہو۔

"مزید یہ کہ ہمیں گرفتار کرا کے اسے کیا ملے گا۔ ہم پہلے بھی اس کی دسترس میں تھے۔ آئندہ بھی ہوں گے۔ ہمیں مارنا ہوتا تو وہ کب کا مار چکا ہوتا اور اسی طرح ہم بھی اسے ختم کر سکتے تھے۔ یہ کوئی اور کھیل ہے جو دلاور تمہارے ساتھ کھیل رہا ہے۔ تم نو وارد ہو اور وہ اس میدان کا پرانا شکاری ہے۔ تمہارا میدان سیاست ہے اور وہ اس میں قدم رکھنا چاہتا ہے۔ وہ بدمعاشی کا مرد میدان ہے اور تم اس کی چالوں کو نہیں سمجھ سکتے۔"

وہ سخت متفکر اور نروس ہو گیا۔ "شاید۔ تم ٹھیک کہتے ہو... پھر اب میں کیا کروں...؟"

"وہی جو میں نے کہا ہے۔ تم اس سے مل کے معذرت کرو اور اسے یقین دلاؤ کہ بہت جلد رابعہ اور سکندر اسے مل جائیں گے لیکن وہ غالب اور نازو کو چھوڑ دے۔ انہیں رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ الٹی پریشانی گلے پڑ جائے گی۔"

"وہ تمہاری بات مان جائے گا۔ کیونکہ وہ تم سے سیاسی اختیار کے نام پر کوئی ڈرامہ کرنا چاہتا ہے۔" رابعہ نے کہا "تم اسے یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ رابعہ اور سکندر کو شاید پتا چل گیا تھا۔ وہ عین وقت پر فرار ہو گئے اور پولیس غلط فہمی کی بنا پر غالب اور نازو کو پکڑ لائی۔ خیر بھاگ کے وہ کہاں جائیں گے۔ میں اپنے بھائی کے قاتلوں کو چھوڑوں گا نہیں خواہ وہ زمین میں چھپ جائیں یا آسمان پر چڑھ جائیں۔"

وہ بادل ناخواستہ اٹھا "اچھا۔ میں جاتا ہوں... لیکن..."

www.paksociety.com

"لیکن کیا؟" میں نے کہا۔
وہ بولا "ایک طریقہ اور بھی ہے۔"
"وہ کیا؟ جلدی سے بتادو۔"
"میں... تم کو وہ جگہ بتا رہا ہوں۔ جہاں چوہدری رلاور میرا انتظار کر رہا ہوگا۔" اس نے کسی مجرم کی طرح کہا جو بالآخر اعتراف پر مجبور ہو جائے۔
"یہ تم پہلے بھی بتا سکتے تھے۔ اتنا وقت کیوں ضائع کیا اپنا بھی اور ہمارا بھی۔" میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔
وہ رابعہ کے پیچھے ہو گیا "آخر تم میری مجبوری کیوں نہیں سمجھتے۔ میرا خیال تھا کہ تم بدمعاش نہیں ہو مگر تم تو بات بات پر مارپیٹ کرتے ہو۔ بلیک میل کرتے ہو۔ قتل کرنے کی دھمکی دیتے ہو۔ صرف اس لیے کہ یہاں میں اکیلا ہوں۔ تم کو سمجھنا چاہیے کہ خداداد عباسی معمولی آدمی تھا اور نہ میں کمزور ہوں۔ تم کو بھی میری حمایت سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ مخالفت سے نہیں۔ میرے پاس حکومتی ذرائع اور وسائل ہیں۔ رلاور کیا چیز ہے؟ ہمارے اثر رسوخ اور ہماری طاقت کے سامنے کسی پھنے خاں کی مجال نہیں... کہ ہم سے ٹکر لینے کی سوچے۔ جو ہماری ٹکر کے ہیں وہ ہم سے جھگڑا نہیں کرتے اور ہم ان سے۔ اپنے گھر میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ ایک بار مجھے چیلنج کر کے چھوڑ دو پھر دیکھو میں لوٹ کر آتا ہوں یا نہیں۔ پھر میں ایسے نہیں آؤں گا سکندر بخت جیسے آج آیا تھا۔ خالی ہاتھ اور اکیلا۔"
میں نے کہا "ارے ملک نبی دار۔ میں تمہارا چیلنج قبول کرتا ہوں اور تمہیں بھی چیلنج دیتا ہوں کہ جاؤ رلاور کے ساتھ مل کے....."
رابعہ نے میری بات کاٹ دی "ایسی جذباتی باتوں سے کیا فائدہ۔ غصے میں اپنا ہی نقصان کرنا کون سی عقلمندی ہے۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کا چیلنج قبول کرنا بے وقوفی ہے۔"
"تم زیادہ سمجھدار ہو۔ عورت ہونے کے باوجود۔ اس ہیرو کو کنٹرول کرو۔ نتھ ڈال کے رکھو اسے۔"
"جیسے بھائی نے تمہیں نتھ ڈال رکھا تھا۔ تم اس کے وفادار کتے تھے مگر وہ تمہارے کاٹنے سے مر گیا" رابعہ نے بے رخی سے کہا۔
"ملک خداداد عباسی اور ملک نبی دار عباسی کے خاندان کی سات پشتوں سے خاندان میں دہشت ہے۔ تم نے دوبارہ اس کے منہ پر تھپڑ مارا ہے۔ ٹھیک ہے کہ مجھے رلانا تمہارے سوا کوئی نہیں تھا مگر بھلانے والا میں بھی نہیں ہوں سکندر بخت۔ مناسب وقت پر تم کو اس تھپڑ کا جواب ملے گا۔ اپنی طرف انگلی اٹھانے والے کا ہاتھ کاٹ دیتا ہوں۔ کیا اتنی بے عزتی برداشت کر سکتا ہوں میں؟"
میں نے کہا "وقت وقت کی بات ہے۔ جنگل کا شیر چڑیا گھر میں یا سرکس میں بڑا مظلوم ہو جاتا ہے۔ لیکن میں ڈر کے پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم رلاور کے ساتھ مل کے کیا توپ چلاتے ہو۔ یہ نہ ہو کہ تم اس کے ساتھ بلا وجہ مارے جاؤ۔ اسے تو میں چھوڑنے والا نہیں ہوں۔"
اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا "شاہی قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ رہنا۔ جہاں پاکستان کی سرحد ہے۔ تمہیں برگد کا ایک بڑا سا درخت نظر آئے گا۔ وہاں ایک جھونپڑی سی بنی ہوئی ہے کسی فقیر کی۔ رلاور اسی کے اندر یا آس پاس ملے گا۔"
رابعہ بولی "کیا وہ اکیلا ہوگا؟"
"مجھے نہیں معلوم۔ آس پاس کہیں اس کے محافظ ہوں گے تو نظر کہاں آئیں گے۔ خود میں نے اکیلے یہاں آنے کی غلطی کا خمیازہ بھگت لیا ہے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوتا تو میں ایسی حماقت نہیں کرتا لیکن میں سمجھا تھا کہ یہ گھر ایک وکیل کا ہے۔"
"تم ٹھیک سمجھے تھے۔" میں نے اسے اپنی طرف کھینچ کے دوسری طرف پھینک دیا "لیکن ابھی تمہیں بہت کچھ سمجھنے کی ضرورت ہے جو وکیل صاحب تمہیں سمجھائیں گے۔ تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ تمہاری خاندانی دہشت سے قانون نہیں ڈرتا اور نہ ہم متاثر ہوتے ہیں۔"
وہ دیوار سے ٹکرا کے اٹھا "تم... تم کیا چاہتے ہو آخر؟"
"جو ہم معلوم کرنا چاہتے تھے وہ ہمیں معلوم ہو گیا۔" میں نے کہا "اب تم کو وہ باتیں معلوم ہوں گی جو تمہاری عقل اور تجربے میں اضافہ کریں گی۔ وقار فون کرو جمالی صاحب کو۔"
وقار نے ریسیور اٹھا لیا "کیا کہوں ان سے؟"
"ان سے کہو کہ کوئی بدمعاش میرے گھر میں پولیس کے ساتھ آیا تھا۔ میں اسے نہیں جانتا۔ وہ تھانہ انارکلی سے پولیس کو ساتھ لایا تھا اور ان کا مقصد رابعہ اور سکندر کو پکڑنا تھا۔ رابعہ اور سکندر نہ یہاں رہتے ہیں اور نہ کبھی یہاں آئے ہیں۔ ان کے پاس وارنٹ نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور سمجھانے کے باوجود وہ مرزا غالب نام کے ایک صحافی کو اور ایک خاتون کو رابعہ سمجھ کے زبردستی لے گئے۔"
رابعہ بولی "تم خود سمجھتے ہو کہ تمہیں کیا کہنا ہے؟"
نبی دار نے بہت ہنگامہ کیا مگر ہم نے اسے پکڑ کے غسل خانے میں بند کر دیا۔ نگی کچھ پریشان ہو گئی تھی مگر وقار کا ساتھ دے رہی تھی۔
وقار نے پھر فون اٹھایا ہی تھا کہ میں نے اسے روک دیا "تم وہ بات نہیں کرو گے جو نبی دار کے سامنے ہوئی تھی۔"
"پھر؟" وقار نے ریسیور تھام کے ہاتھ سے کریڈل دبائے رکھا۔
"غالب اور ماہ رو کی بالکل فکر مت کرو۔ غالب کی پوزیشن بہت مضبوط ہے اور ماہ رو اپنی حفاظت خود کرنا جانتی ہے۔" میں نے کہا "تم ایس پی سے کہو کہ تمہیں ایف آئی آر درج کرانی ہے۔ پولیس نے تمہارے گھر سے سکندر بخت کو بھی گرفتار کر لیا اور اس کے ساتھ رابعہ کو بھی۔"

"ایسے تو میں پھنس جاؤں گا۔"
"نہیں۔ تم کہنا کہ سکندر بخت گرفتاری دینا چاہتا تھا۔ وہ خود کو قانون کے حوالے کرنے کے لیے میرے گھر پہنچا ہی تھا کہ چوہدری رلاور نے اپنے کسی ذری نبی دار کو پولیس کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ مقتول ایم این اے خداداد عباسی کا بھائی ہے اور اس نے اپنے اثر رسوخ کا ناجائز استعمال کیا۔ پولیس کے پاس نہ وارنٹ تھا اور نہ ہی ان کے ساتھ لیڈی پولیس تھی۔ تم ان پر جو الزام چاہو عائد کرو۔ ایک الزام یہ بھی ہوگا کہ رابعہ نے ضمانت قبل از گرفتاری کا عدالتی حکم نامہ دکھایا تھا جو پولیس نے پھاڑ کے پھینک دیا۔"
"پھر ہم کیا کریں گے؟" رابعہ بولی۔
"ہم غائب ہو جائیں گے۔ نبی دار بتائے گا کہ پولیس کیسے آئی تھی۔ پولیس بتائے گی کہ رابعہ اور سکندر بخت کہاں ہیں؟ وہ انہیں گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اب انہیں عدالت میں پیش کرنا پولیس کی ذمے داری ہے۔ پولیس مشکل میں پڑ جائے گی۔ نبی دار کی بھی ایسی تیسی ہو جائے گی اور ہم کچھ عرصے کے لیے محفوظ ہو جائیں گے۔ ہم کراچی چلے جاتے ہیں فی الحال۔ وہاں مجھے ویسے بھی ایک ضروری کام سے جانا تھا۔"
وقار تذبذب میں پڑ گیا "پولیس میری بات کا اعتبار تو کرے گی مگر ثبوت گواہ کہاں سے آئیں گے۔"
میں نے کہا "آپ یار مظفر کو بلا لو۔ مولوی غلام حسین کو طلب کرو۔ اس کی ڈیوٹی ہے۔ تم ہو گئی ہے۔ اتنے لوگوں کے سامنے پولیس انہیں لے گئی۔ غالب اور ماہ رو کی رلاور کو بھی ضرورت نہیں۔ وہ خود ہی آجائیں گے شاید پہنچنے ہی والے ہوں گے۔"
رابعہ نے کہا "خدا کرے کہ پہنچ جائیں۔ مگر کیا اس شخص کو پولیس کے حوالے کرنا ٹھیک ہے؟"
"یہ انتہائی ضروری ہے۔ وہ رلاور کے علاوہ یہ بھی ہمارے لیے خطرہ بنے گا۔ پتا نہیں رلاور نے اس کو کیا پٹی پڑھائی ہے اور یہ ہمارے ساتھ کیا ڈبل گیم کھیل رہا ہے۔ رلاور چالاک آدمی ہے۔ یہ اس کے ہاتھوں میں کھیلے گا اور خود تو مشکل میں پڑے گا ہمارے لیے بھی مصیبت بن جائے گا۔ اس کا راستہ ہمیں بلاک کر دینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ یہ اپنے احمقانہ مذموم عزائم کی راہ پر قدم آگے بڑھائے ہمیں بلیک میل کرے یا ہم سے کوئی غلط کام لے۔ اس کو پہلا سبق ایسا ملے کہ یہ یاد رکھے اور رلاور کا دشمن ہو جائے۔"
"اگر رلاور نے غالب اور ماہ رو کو نہ چھوڑا... پھر؟"
میں نے کہا "اب تم باتیں چھوڑو۔ تیاری کرو۔"
"کیسی تیاری؟" رابعہ نے حیرانی سے کہا۔
"تمہیں میرے ساتھ جانا ہے... کراچی۔"
خلاف توقع رابعہ نے کوئی اور سوال نہیں کیا اور مجھے روکا بھی نہیں۔ اس نے شوہر کی فرماں بردار بیویوں کی طرح سر جھکا کے "اچھا" کہا اور اندر چلی گئی۔
وقار نے کہا "کراچی جانا ضروری ہے؟"
"ایک ضرورت تو تمہارے سامنے ہے" میں نے کہا "روپوشی کے لیے لاہور مناسب نہیں۔ پولیس کو مصیبت میں ڈال دو کہ سکندر کہاں ہے۔ رابعہ کو پولیس کہاں لے گئی اور کیسے لے گئی۔ ہائی کورٹ میں پولیس کے خلاف توہین عدالت کا کیس کر دو۔ ہائی کورٹ پولیس کو نوٹس جاری کرے گی تو نیچے والوں کے لیے مسئلہ کھڑا ہو جائے گا کہ آخر انہیں کون لے گیا۔ پولیس کی طرف سے ایڈووکیٹ جنرل کو حلف نامہ داخل کرنا پڑے گا کہ رابعہ یا سکندر ہماری تحویل میں نہیں ہیں۔ اس سے ہم بہت محفوظ ہو جائیں گے اور پولیس ہمیں نہیں تلاش کرے گی۔ انہیں پکڑے گی جن پر شک ہوگا ہمارے اغوا کا۔ سرفہرست چوہدری رلاور۔ اس کے بعد نبی دار۔"
"نبی دار پہلے گرفتار ہوگا۔ وہی لایا تھا پولیس کو اور صاحب پولیس والوں کو جیل کا راستہ نظر آیا تو وہ بیوی بچوں کے نوکری بچانے کے لیے کہیں گے کہ ہمیں تو ملک نبی دار عباسی نے ایسا کرنے کو کہا تھا۔ ہمیں کیا معلوم سکندر کون ہے اور غالب کون۔" وقار بولا۔
"مجھے ویسے ہی کراچی جانا تھا۔ بیورو کے آفس میں اس کی میز کی دراز سے وہ ڈائری حاصل کرنے کے لیے جس کا اس نے حوالہ دیا تھا۔ اس میں رلاور کے خلاف سارے ثبوت ہیں اور گواہوں کے نام پتے ہیں۔" میں نے کہا۔
"یہ کام کیسے ہوگا؟"
میں نے کہا "جیسے آج تک سارے کام ہوتے ہیں۔"
"خوا مخواہ خود کو وہاں کسی مشکل میں مت ڈالنا۔ تمہارے عام فہم الفاظ میں بلا وجہ پنگا مت لینا ایسا کہ..."
میں نے کہا "اسی لیے میں رابعہ کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل۔"
"لیکن تم ایسے ہی جاؤ گے۔ تو پہچانے جاؤ گے۔"
میں نے کہا "اب تو میں حلیے اور بھیس بدلنے کا ماہر ہو گیا ہوں۔ ہم اب تک ہوائی جہاز میں، کار میں سفر کرتے رہے ہیں۔ اب عام لوگوں کی طرح ٹرین سے جائیں گے۔ عوامی کلاس میں۔"
رابعہ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھائے نمودار ہوئی "چلو...."
میں حیران رہ گیا۔ "ابھی تیاری مکمل!"
"ہم کون سا حج کرنے جا رہے ہیں جس کے لیے لمبی چوڑی تیاری کی ضرورت ہو۔ دو چار دن ہی رہیں گے کراچی میں۔"
"یہ بھی معلوم ہے تمہیں... ویری گڈ" میں نے کہا "تم نے کپڑے بھی نہیں بدلے۔ میک اپ تک نہیں کیا۔"
"بس اب نکل چلو" رابعہ بولی "نبی دار کو زیادہ دیر قید میں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ وقار تم فوراً پولیس کو بلالو۔"
وہ بولا "پہلے مظفر اور مولوی غلام حسین تو آ جائیں۔"

www.paksociety.com

"ابھی ہم سیدھے مولوی غلام حسین کے گھر جا رہے تھے"
میں نے کہا "چلو اچھا ہے ان سے سستی چابیاں لے لیں گے۔"
رفتار نے کہا "اتنی جلدی مت کرو۔ غالب اور نازو نو واپس آ جائیں۔"
گل نے بھی اس کی تائید کی "مجھے تو بہت پریشانی لاحق ہو گئی ہے۔"
"تمہیں پریشانی کو پریشانی لاحق ہو گئی" رفتار بولا۔
"تم تو بس ایسی ہی باتیں کرتے رہتے ہو۔ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے" وہ بولی۔
"یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ تم کو پہلے سے کیسے پتا چل سکتا ہے" رفتار نے کہا۔
"وہ نی دار اتنا شور کر رہا ہے اندر۔"
"شور کرنے دو اسے۔ اور تم اس کے شور کو بالکل اہمیت نہ دو۔ یہ سمجھ لو کہ تم بہری ہو۔ تمہارے کان کوئی آواز ہی نہیں سن رہے ہیں سوائے میری آواز کے۔ نی دار تو مزید شور کرے گا جب پولیس اسے گرفتار کرے گی۔ سارے مجرم شور کرتے ہیں اور یہی کہتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہیں۔"
گل نے کہا "اچھا چلیں، آپ لوگ کھانا تو کھا لیں جانے سے پہلے۔"
میں نے کہا "کھانا اس وقت کھایا جاتا ہے جب بھوک ہو۔"
"جی نہیں۔ جب کھانا پک جائے تو کھانا ہوتا ہے۔" اس نے ہمیں ذہانت کے کہا "میں ایسے نہیں جانے دوں گی۔"
اس کے بعد واقعات تیزی سے ہوئے۔ رفتار نے منظر کو فون کیا اور اسے ساری صورتِ حال سمجھائی۔ اس کی تشویش حاصل ہونے سے رفتار کو کچھ تقویت ملی۔
"منظر صاحب فرماتے ہیں کہ بالکل ٹھیک کیا تم نے۔ کون ہے یہ نی دار بھوتنی کا۔ اس کی ذرا ایسی تیسی کر دو۔"
میں نے کہا "وہ آ رہا ہے گواہی دینے کے لیے یا نہیں؟"
"انہوں نے کہا ہے کہ وہ پندرہ منٹ میں پہنچ جائیں گے اور اپنے ساتھ غلام حسین اور اس کی بیوی کو بھی لے آئیں گے۔"
"پھر وہ پندرہ منٹ میں کیسے پہنچ جائے گا" رابعہ بولی۔
"ہاں۔ کم سے کم... آدھا گھنٹا اور تو چالیس منٹ لگیں گے"
میں نے کہا۔
"پولیس کو ان کے آنے کے بعد ہی بلایا جائے گا۔ امید ہے اس وقت تک غالب اور نازو بھی آ جائیں گے۔"
نی دار باتھ روم میں گالیاں بک رہا تھا اور دھمکیاں دے رہا تھا کہ وہ ایک ایک سے نمٹ لے گا۔ یہ کر دے گا اور وہ کر دے گا۔
میں نے رابعہ کے ساتھ مل کے باتھ روم کے سامنے ایک تالا لگا دیا۔

میں نے باہر سے دروازہ کھولا اور نی دار آگے آیا تو اسے پیچھے دھکا دے دیا "ابھی نہیں ملک صاحب۔ پولیس آ کے تمہیں رہائی دلائے گی۔ ان سے شکایت کرنا ہمارے ظلم کی۔"
وہ دیوار سے ٹکرا کے وہیں کھڑا ہو گیا۔ ہمیں خون آشام نظروں سے گھورنے لگا "تمہیں معلوم ہو جائے گا۔"
میں نے کہا "ہم تو جا رہے ہیں۔ ہمیں کچھ پتا نہیں چلے گا لیکن تم سے پولیس یہ ضرور پوچھے گی کہ غالب اور نازو کہاں ہیں۔ تم پولیس کو کیوں لائے تھے اور تمہیں کس نے بتایا تھا کہ سکندر بخت یا رابعہ کو گرفتار کرنے کے لیے یہاں چھاپا مارنے سے کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔"
"تم نے دھوکا کیا ہے میرے ساتھ...."
"ہم دھوکے بازوں کو دھوکا دینا ہمیں کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ اب پولیس یا تم اور دلاور کا باپ کوئی ہمارا سراغ نہیں لگا سکتا۔ اگر غالب اور نازو واپس نہ آئے تو سمجھو تم اندر۔ جب ایس پی نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ پولیس والے خود تمہارے خلاف بیان دیں گے جن کو تم بڑے فخر سے اپنے بندے کہہ رہے تھے۔"
"پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں صاف انکار کر دوں گا" وہ بولا "تمہارا کسی گواہی سے کچھ نہیں ہو گا۔"
"تم پاگل ہو۔ ہم نے کچھ معتبر گواہ اور منگوائے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتے مگر وہ کہیں گے کہ انہوں نے تمہیں پکڑ کے غسل خانے میں بند کیا تھا۔ پولیس کے حوالے کرنے کے لیے۔ وہ سب بہت بڑے وکیل ہیں۔ انہیں قانون کا تم سے زیادہ علم ہے۔ تم اس گھر میں کیا لاہور میں ہماری موجودگی ثابت نہیں کر سکتے نی دار۔ ہم کل پشاور میں ہوں گے۔"
"میری بات سنو۔ خدا کے لیے ایسا مت کرو۔" وہ چلایا۔
میں نے دروازہ پھر بند کر دیا "اب جو بھی کہنا ہے پولیس سے کہنا۔"
"دیکھو میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ تم مجھ سے سودا کر لو۔ پولیس کو مت بلاؤ۔ تم جیسا کہو گے میں ویسا کروں گا۔ مجھ پر جرمانہ لگا دو۔ جو لینا ہے مجھ سے لے لو۔ بس مجھے جانے دو خدا کے لیے۔" وہ اب منت سماجت کر رہا تھا۔
میں نے کہا "خدا حافظ۔ خدا کرے پھر کبھی تم سے ملاقات نہ ہو۔ ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے واپس لاہور آنے کا۔ لیکن ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ تم کس جیل میں ہو۔"
رفتار نے آواز بلند کہا "دیکھو خیال رکھنا اپنا۔ خدا حافظ۔"
پھر گل نے کہا "افسوس مت کرنا۔ خط لکھو رفتار کے آفس کے پتے پر۔ اطلاع دیتے رہنا کہ کہاں ہو۔"
"ہاں پشاور میں ہوں گے تو خط ڈال دیں گے۔ علاقہ غیر کی طرف نکل گئے تو رابطہ مشکل ہو گا" میں نے کہا۔
"علاقہ غیر میں خطرہ نہیں ہو گا؟"

میں نے زور سے کہا "ارے نہیں گل۔ وہاں خیبر ایجنسی میں سردار اورنگ زیب خان کا بیٹا میرا کلاس فیلو تھا۔ اس کے علاقے میں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ درندہ در نہیں مار سکتا اور چرندہ چرے۔ اچھا خدا حافظ۔"
یہ سب نی دار نے بھی سنا ہو گا۔ ہم نے دروازے تک جا کے پھر خدا حافظ کہا اور لوٹ کے اندر آ گئے۔ غالب اور نازو کے نہ آنے سے میری تشویش بھی پریشانی میں ڈھلنے لگی تھی مگر منظر کے پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ہی وہ ایک ٹیکسی سے اترے اور اندر آ گئے۔ رابعہ اور میں چھت پر خاموش بیٹھے تھے لیکن اوپر سے سب کچھ دیکھ اور سن سکتے تھے۔
رفتار نے دروازہ کھولتے ہی انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اوپر بھیج دیا۔ وہ کچھ حیران ہوئے مگر جب اوپر آئے تو ہمیں بت بنا دیکھ کے مزید حیران ہو گئے۔ میں نے انہیں اشارے سے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ یہ فولادی کرسیاں دن رات دھوپ اور بارش میں ایسے ہی چھت پر پڑی رہتی تھیں۔
غالب نے سرگوشی میں کہا "یہ کیا خاموشی کا ڈراما چل رہا ہے"
میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا "تم اغوا کیے جا چکے ہو اور ابھی تک واپس نہیں آئے ہو۔"
نازو نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے مگر تم دونوں کو کیا ہوا ہے؟"
"ہم بھی یہاں نہیں ہیں" رابعہ بولی "یہاں سے جا چکے ہیں۔"
"بلکہ ہم یہاں تھے ہی نہیں.... اس گھر میں کیا لاہور میں بھی نہیں تھے۔ کسی نے ہمیں عزت سے نہیں دیکھا۔"
"ہمیں نہیں مجھے کہو" رابعہ بولی "میں تو لاہور میں تھی اب پتا نہیں کہاں ہوں۔ مجھے پولیس پکڑ کے لے گئی تھی مرزا غالب کے ساتھ۔"
بالآخر ساری بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔
نازو نے کہا "یعنی اب میں جا رہی ہوں۔"
"بالکل جا رہی۔ منظر اور مولوی غلام حسین کے آتے ہی پولیس بھی پہنچ جائے گی۔"
"میں سخت کشمکش میں مبتلا ہوں۔ کس نے کیا دیکھا، کسے پکڑا.... کون وہاں تھا کون نہیں تھا۔ کون اغوا ہوا۔ کیا کہنا ہو گا مجھے؟" نازو بولی۔
"بے وقوف لڑکی" غالب نے اسے ڈانٹا "سیدھی سی بات ہے۔ یہاں میں اور تم تھے۔ رابعہ تھی، رفتار یوسف اور اس کی بیوی تھے۔"
"سکندر نہیں تھا" رابعہ نے کہا۔
"سکندر کا ہمیں کیا معلوم کہ کہاں ہے؟" غالب نے کہا "اچانک نی دار پولیس کے ساتھ آیا اور اس نے کہا کہ یہ ہے

سکندر بخت، اسے گرفتار کر لو۔ میرے انکار کے باوجود پولیس نے میری ایک نہیں سنی۔ پھر انہوں نے رابعہ کو بھی گرفتار کر لیا۔ حالانکہ رابعہ نے ان کو ضمانت قبل از گرفتاری کے احکامات دکھائے تھے۔"
"احکامات انہوں نے پھاڑ کر پھینک دیے اور کہا کہ ہم ہائی کورٹ کو نہیں جانتے" رابعہ نے کہا۔
"کوشش کرنا کہ جب تک تم سے کوئی سوال نہ پوچھا جائے تم کچھ نہ بولو۔ رفتار بات کرے گا یا منظر۔ ان کے بیان سے تمہیں سب معلوم ہو جائے گا کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے؟" میں نے کہا۔
غلام حسین اور اس کی بیوی جب منظر کی گاڑی سے اترے تو ہم نے اوپر سے دیکھا۔ حسبِ معمول غلام اور منظر کے درمیان بحث ہو رہی تھی۔ نازو فوراً نیچے چلی گئی۔ یہ منظر وہاں ہی رہ کے لیے اوپر آیا۔
"ابے بھوتنی کے۔ تو یہاں بیٹھا ہے۔"
میں نے کہا "آہستہ بول الو کے پٹھے۔ وہ تیرا باپ بھی سن لے گا۔"
منظر ہنسنے لگا "اس کی اب کون سنے گا۔ ماما کا سالا۔ گیدڑ کی اولاد۔ شامت آئی تھی کہ شہر کا رخ کیا۔"
"نی دار کو مروا ہی ڈالا دلاور نے۔"
"بڑی حرامی چیز ہے دلاور بھی۔ اپنی طرف سے اس نے اچھی چال چلی تھی لیکن پانسا پلٹ گیا۔" منظر نے کہا۔
منظر اور رفتار یوسف کے فون پر پولیس کا فوری حرکت میں آنا لازمی تھا۔ ایک ڈی ایس پی اپنی جیپ میں انسپکٹر اور چار مسلح پولیس والوں کے ساتھ پہنچا۔ رفتار نے پہلے سے طے شدہ بیان دیا اور منظر کے ساتھ غلام حسین نے بھی گواہی دی۔ نی دار نے بہت شور کیا کہ یہ سب جھوٹ ہے مگر ڈی ایس پی نے اسے خاموش کرا دیا۔
رابعہ اور میں اوپر خاموش بیٹھے نیچے سے آنے والی ہر آواز سن رہے تھے۔ ڈی ایس پی نے تھانہ اے ایس آئی کو فون کیا تو رفتار کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔
"مسٹر نی دار۔ پولیس آپ کے کہنے پر یہاں آئی تھی" ڈی ایس پی نے کہا "مگر سکندر بخت کے بجائے وہ ایک مشہور صحافی اور مرزا غالب کو گرفتار کر کے لے گئے۔"
"اس نے زور کہا تھا کہ وہ سکندر بخت ہے۔"
"یعنی آپ سکندر بخت کو نہیں پہچانتے تھے؟ پھر آپ کو کیا دلچسپی تھی اس کی گرفتاری سے؟ کس نے اطلاع دی تھی آپ کو کہ وہ یہاں ہو گا؟"
"وہ ایک مفرور مجرم ہے۔"
"آپ پنڈی سے لاہور صرف اسے گرفتار کرانے کے لیے آئے تھے؟"

www.paksociety.com

"مجھے شک ہے کہ اس نے میرے بڑے بھائی ملک خدادار عباسی کو قتل کیا تھا۔"

"جب آپ اسے پہچانتے ہی نہیں تو شک کس بنیاد پر؟ اور کیا شک کی بنیاد پر آپ نے پنڈی میں اس کا نام ایف آئی آر میں لکھوا دیا تھا؟"

"ایف آئی آر میں تو نہیں۔"

"پھر آپ اسے یہاں گرفتار کرنے کیسے آ گئے۔ کس نے آپ کو یہ اختیار دیا کہ آپ تھانہ انارکلی سے پولیس لے کر چھاپا ماریں۔ کسی وارنٹ کے بغیر۔" ڈی ایس پی نے گرج کے کہا "کیا سمجھتے ہو آخر تم خود کو۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہ ایک رکن کا گھر ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سر۔"

"سر کے بچے۔ تم نے مس رابعہ کو کیسے گرفتار کرا دیا؟ انہوں نے ہائی کورٹ سے ضمانت قبل از گرفتاری لے رکھی تھی۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ اس نے کہا تھا کہ یہ رابعہ ہے" نبی داد نے چیخ کر نادیہ کی طرف اشارہ کیا "خود گرفتاری پیش کی تھی۔"

شاید ڈی ایس پی نے اس کے تھپڑ مارا "بھونکنے کی ضرورت نہیں ہے میرے سامنے۔ تھانہ انارکلی کا سارا اسٹاف معطل ہو گیا ہے اور سارے گرفتار بھی ہو جائیں گے تھوڑی دیر میں۔ ہائی کورٹ کے احکامات کو پھاڑ کر پھینکنا بہت سنگین جرم ہے۔ تمہاری بدمعاشی بھی نکل جائے گی اگر غالب اور مس رابعہ نہ ملے۔"

"آپ پولیس سے پوچھ سکتے ہیں سر۔" نبی داد کی ساری اکڑفوں نکل چکی تھی اور وہ ایک عام مجرم کے سے عاجزانہ لہجے میں بات کر رہا تھا جیسے ارتکاب جرم کے وقت پکڑا گیا ہو۔

"تھانے والوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اوپر سے ملنے والے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اور حکم صرف یہ ملا تھا کہ ملک نبی داد کے ساتھ جاؤ اور وہ بندے اٹھا لو... ان کو معلوم نہ تھا کہ بندے کون ہیں، ان کا جرم کیا ہے اور وہ کہاں ملیں گے۔ ان کو تم یہاں لائے تھے۔ تھانے پہنچ کے جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے دونوں کو چھوڑ دیا... لیکن سب..."

منظر نے اس کی بات کاٹ دی "آخر یہ بھوتنی کا اوپر والا کون ہے ڈی ایس پی صاحب۔ یہ بھی تو پتا کریں۔"

"ایس پی غلام قادر ہے۔"

"پھر ذرا ایس پی صاحب سے بھی پوچھ لیں کہ انہوں نے پنگا لینے کی زحمت کس خوشی میں کی تھی" منظر بولا "اور نبی داد ان کا کیا لگتا ہے آخر؟"

"وہ افسر ہیں بڑے۔ میں ان سے نہیں پوچھ سکتا" ڈی ایس پی یقیناً منظر کے انداز گفتگو سے خوش نہیں تھا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ رفتار، ذرا تم پتا کرو کہ ایس پی صاحب کی شریف گھر پر رکھی ہوئی ہے یا کہیں اور۔ نمبر ہے نا اس کا تمہارے پاس؟"

رفتار نے کہا "میں شرط لگا سکتا ہوں کہ اس نے فون نہیں کیا ہوگا۔ ہو گئی سو سو روپے کی۔"

منظر ہنسنے لگا "یہ بے تکا جا رہا ہے مجھے۔ کون الّو کا پٹھا یہ مانے گا کہ اس نے غیر قانونی احکامات دیے تھے۔"

رفتار نے نمبر ملا کے ریسیور منظر کو تھما دیا "لیجئے سرکار۔" "اس جی آپ کا نمک حرام یار منظر بول رہا ہوں۔ یار تم نے جو کھانا کھلایا تھا اس میں نمک جان بوجھ کے زیادہ کر دیا تھا تاکہ میں زیادہ نمک حرامی کروں۔ خیر وہ تم سے ایک شرم ناک اور معیوب بات پوچھنی تھی۔ کوئی بھوتنی کا تمہارے ذہن یا رشتہ میں تو نہیں ہے یا تمہارا بیٹا یا باپ۔ گھر والی۔" پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں ہو ہو کر کے ہنسا "پوچھنا یہ تھا کہ آج تم نے تھانہ انارکلی کے انچارج کو فون کر کے دو بندے اٹھانے کے لیے بھیجا تھا؟ کون اور کہاں کی بات مت کرو۔ پہلے ہاں یا نہ میں جواب دو... دیکھو میرے ساتھ چکر بازی مت کرو۔ تم لوگ اٹھاتے رہتے ہو بندے ادھر ادھر سے۔ جرم کا کیا ہے کسی نے نہیں کیا ہو تو تھانے پہنچا کے تم اس کے کھانے میں کچھ بھی ڈال سکتے ہو۔ نہیں کیا کہا جا رہا ہے؟ خیر ہوا یہ کہ کسی بھوتنی والے نے تمہاری آواز بنا کے مروا دیا انارکلی تھانے والوں کو... انہوں نے میرے یار وقار یوسف کے گھر پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ چڑھائی کر دی۔ نہ وارنٹ نہ ساتھ کوئی مجسٹریٹ اور لیڈی سرچ۔ وقار یوسف بھی رکن ہے میرے ساتھ۔ ہاں رہ تھا ایک فرعون نائب تھانیدار۔ نام پتا نہیں کیا تھا۔ شکل سے اور لہجے سے پکا تھانیدار لگتا تھا اور اندر گھس کے انہوں نے بڑا حرامی پن مچایا۔ بڑی گالم گلوچ کی۔ وقار یوسف کی بیوی سے بھی بدتمیزی کی۔ اور پھر پکڑ کے لے گئے ایک بڑے حرامی صحافی کو۔ تم جانتے ہو گے اسے۔ مرزا غالب کہلاتا ہے۔ ہاں یار، جرم کوئی نہیں۔ پولیس کے ساتھ ایک پانے خان قسم کی چیز تھی۔ خود کو نبی داد کہتا ہے۔ اور ملک خدادار عباسی کا بھائی بتاتا ہے۔ ہاں وہی جس کا قتل پنڈی میں ہوا تھا۔ اس کی لاش بازار حسن میں پڑی ہوئی ملی تھی۔ اپنی گاڑی میں۔ ہاں نشے میں دھت تھا وہ بھی اور اس کا بھائی بھی۔ نہیں میں اسے نہیں پہچانتا۔ نبی داد نے کہا کہ یہ ہے سکندر بخت اور یہ ہے اس کی معشوق رابعہ۔ دونوں کو آج رات تھانے میں رکھو یا جیسے اور... نہیں جرم کوئی نہیں بتایا انہوں نے۔ رفتار نے کہا تھا مگر مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ انچارج خود نشے میں دھت ہوگا۔ یار اس نے عبوری ضمانت کے احکامات پھاڑ کے پھینک دیے۔ ہاں ہائی کورٹ نے دیے تھے۔ تم تو جانتے ہو مس رابعہ قادری کتنی ٹاپ رکن ہے۔ یہاں بیٹھ اس کیس میں تمہاری چھٹی اڑ جائے گی اگر یہ خبر شائع ہو گئی کہ تم نے پولیس کو احکامات دیے تھے۔ مجھے معلوم ہے تم پاگل نہیں ہو مگر بھائی پولیس کی وردی ہر جسم پر تو نوّے کا دماغ خراب ہونے لگتی ہے... نہ تم جو چاہو کرو نہیں میں کچھ نہیں کروں گا۔ کسی کو رپورٹ نہیں کر رہا ہوں

یار۔ تم سے پوچھنا تھا تم نے بتا دیا۔ تمہیں تھانے والے تو کہتے ہیں کہ انہوں نے چھوڑ دیا مگر نہ مرزا غالب کا پتا ہے نہ مس رابعہ کا۔ ہم رپورٹ لکھوا رہے ہیں۔ تم ذرا انچارج سے بھی کہہ دو کہ حرامی پن نہ کرے۔ رپورٹ لکھ لے جو ہم بتائیں اس کے مطابق۔ اچھا بھئی اللہ حافظ۔"

"یعنی میں شرط جیت گیا" رفتار بولا۔

"شرط کس الو کے پٹھے نے لگائی تھی۔" منظر بولا "سنیئے ڈی ایس پی صاحب۔ غلام قادر تو کہتا ہے کہ کیا میں پاگل ہوں کہ ایسا آرڈر دوں گا کسی کو۔ وہ خود بات کر رہا ہے ڈی آئی جی سے۔ مرزا غالب اور مس رابعہ کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت اغوا کیا گیا ہے۔ اب انہیں برآمد کرنا پولیس کا کام ہے۔ ہم تو پیٹ بھریں گے سب کا۔"

نبی داد نے قسم کھا کے کہا "ڈی ایس پی صاحب۔ خدا کی قسم پولیس اس عورت نادیہ کو لے گئی تھی۔ یہ جو اتنی معصوم بنی کھڑی ہے۔ اس سے پوچھیں کہ یہ کیسے واپس آ گئی؟"

ڈی ایس پی نے اسے مارا ہوگا کہ وہ چلانے لگا "میرے خلاف سازش ہے۔ میری بات سنیں سر۔ یقین کریں میں کوئی معمولی فرد نہیں ہوں۔ یہ آپ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔"

ڈی ایس پی نے دھاڑ کے کہا "لے جاؤ اس حرام زادے کو اور کسی اچھے سے تھانے میں رکھو فی الحال رات۔ صبح تک ذرا پیار و محبت سے پوچھو گے تو سب بک دے گا۔"

میں سمجھ گیا کہ "اچھا سا تھانہ" اور "پیار و محبت" سے اس کی مراد کیا تھی۔ نبی داد کو کسی شہرت یافتہ چنگیز خان ٹائپ تھانیدار کے حوالے کرنا تھا جو اس سے تشدد کے بدترین طریقے استعمال کر کے تمام معلومات حاصل کرے لیکن اس طرح کہ نبی داد کے جسم پر خراش تک نہ آئے اور وہ بعد میں پولیس کے خلاف شکایت بھی نہ کر سکے۔

پولیس والے چیختے چلاتے نبی داد کو مارتے ہوئے باہر لے گئے۔ میں نے اوپر سے دیکھا تو وہ نبی داد کو لاتیں گھونسے مار رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ یہ فرض شناسی کا بے مثل مظاہرہ افسر اعلیٰ کی خواہش کو سمجھتے ہوئے کیا جا رہا تھا۔ ڈی ایس پی نے رسمی طور پر سب کے بیانات لیے۔ بیان دینے والوں میں منظر کے ساتھ وقار نے تحریری بیان دیا۔ نادیہ، مولوی خادم حسین اور اس کی بیوی نے بطور گواہ اس پر دستخط کیے۔ ہم نے یہ اندازہ بھی باتوں سے ہی لگایا ورنہ ہم اوپر سے کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

جب ڈی ایس پی معذرت کر کے مجرموں کے خلاف سخت ترین قانونی کارروائی کا وعدہ کر کے اور اغوا کر کے اور اغوا ہونے والوں کی بازیابی کا یقین دلا کے چلا گیا تو میں اور رابعہ بھی نیچے آ گئے۔

"لو بھئی تم دونوں اغوا ہو چکے ہو۔ اب اپنی شکل گم کرو۔" منظر نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا "ہمیں رپورٹ لکھوانی ہے۔"

میں نے کہا "ہم جا رہے ہیں یار۔ اپنے رشتہ داروں کے تو مت نکالو گھر سے۔"

منظر بولا "آخر یہ بھوتنی کا دلاور چاہتا کیا تھا؟ کیوں مروا دیا اس نے نبی داد کو۔"

میں نے کہا "وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ نہ اسے سکندر بخت کی گرفتاری سے دلچسپی تھی اور نہ رابعہ کی۔ وہ نبی داد کا سیاسی مستقبل تباہ کرنا چاہتا تھا تاکہ میدان اس کے لیے صاف ہو جائے۔"

"یہ نبی داد اس کا سیاسی حریف کیسے ہو گیا جب کہ دلاور نے ابھی سیاست شروع ہی نہیں کی۔" منظر بولا۔

میں نے اسے بتایا "غالباً وہ سرکاری پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرنا چاہتا ہے اور پارٹی اسے راولپنڈی کے حلقے میں نبی داد سے لڑانا چاہتی ہے۔ نبی داد وہاں سے آزاد امیدوار ہوتا اور کامیاب بھی ہو جاتا کیونکہ وہ ان کی آبائی سیٹ ہے اور ابھی نبی داد کو اپنے مقتول بھائی کی وجہ سے ووٹرز کی جذباتی ہمدردی بھی حاصل ہے۔ اس کا مضبوط حریف ہے حق نواز۔ دلاور کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کبھی نہیں جیت سکتا مگر سیاست کے میدان میں قدم رکھنے کے لیے پہلی شکست بھی کم اہم نہیں ہوتی۔ اس سے فری کریڈیبلٹی ملتی ہے۔ وہ سامنے آ جاتا ہے اور اس کا نام نامانوس نہیں رہتا۔ دلاور نے نبی داد کو زبردست چکر دیا کہ تم میری مدد کرو اور میں تمہاری مدد کروں گا۔ وہ آ گیا اس کی باتوں میں اور مارا گیا۔ اب دلاور کو راجا حق نواز خود بلائے گا کیونکہ اسی کی سازش کے کامیاب ہونے سے حق نواز کی کامیابی یقینی ہو گئی ہے۔ پارٹی بھی اس کو ٹکٹ دے کر دلاور کو سرکاری قبولیت کی سند عطا کر دے گی اور اگلی بار شاید دلاور ہی منتخب ہوگا۔ چار سال میں حق نواز خود مر جائے گا۔ ورنہ دلاور کے ہاتھوں اسی طرح مارا جائے گا جیسے نبی داد مارا گیا۔ دلاور جیسے آدمی کے لیے چار سال بہت ہیں۔ دلاور کی ایک چال نے نبی داد کا خانہ خراب کر دیا۔"

منظر نے کہا "گویا اب اپنے چوہدری دلاور اسمبلی کے ممبر بھی ہوں گے اور وزیر بھی۔ خیر تم کیوں جھک مارتے پھر رہے ہو بھوتنی کے؟"

"دلاور جو چاہے سوچے اور کرے۔ ہم اپنے عہد پر قائم ہیں اور خدا نے چاہا تو اسمبلی میں بیٹھنے سے پہلے وہ تختہ دار پر پہنچ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔ لگے رہو تم اس کے پیچھے۔ رابعہ لگی ہے تمہارے پیچھے اور ہم ہیں تم دونوں کے پیچھے۔ ہو سب کا بھی نہ رکھو گھبرا نہیں گیا۔ مولوی... چل بھئی تم میرے ساتھ واپس۔ میں گاڑی میں گھر چھوڑ دوں گا۔"

خادم حسین جو ابھی تک چپ چاپ کھڑا تھا ایک دم [illegible] پڑا۔

www.paksociety.com

"اجی لعنت اس پر جو پھر آپ کے ساتھ کہیں جائے۔ قسم خدا کی جو اب میں اس گاڑی میں قدم بھی رکھوں۔"

میں سمجھ گیا کہ آتے وقت ان کے درمیان منظر کے کسی مذاق پر فساد ہوا ہوگا۔ منظر کے لیے مذاق کی کوئی حد نہیں تھی۔ خادم حسین میں برداشت نہیں تھی۔ ان کی ہر بات پر لڑائی ہو جاتی تھی مگر اس کے باوجود بات چیت بند نہیں ہوتی تھی۔ زبان سے خادم حسین کچھ بھی کہے۔ عملاً نہ وہ منظر پر لعنت بھیج سکتا تھا اور نہ اس کی گاڑی پر۔

اس کی بیوی نے کہا "چلو اب چھوڑو۔ وہ مذاق کی بات تھی۔"

"مذاق۔ یعنی تم بھی اس بے ہودگی کو مذاق کہتی ہو" خادم حسین اُچھلا "تم کو شرم آنی چاہیے بے شرمی کو مذاق کہتے ہوئے۔"

"بھوتنی کے۔ شرم تجھے نہیں آئی جھوٹی گواہی دیتے وقت۔ توبہ توبہ" اتنی بڑی داڑھی کے ساتھ اتنا بڑا جھوٹ۔"

"میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ اور نہ گواہی دی۔"

"پھر دستخط کیا نکاح نامے پر کیے تھے۔ میرے بیان کی تائید اور تصدیق کا آخر کیا مطلب تھا۔"

خادم حسین نے ڈھٹائی سے کہا "میں نے بیان پڑھا نہیں تھا۔ مجھے کیا معلوم تم نے اس میں کیا جھوٹ لکھا تھا۔ جھوٹ کا گناہ تمہارے سر۔"

منظر ہنسنے لگا "بے ایمان چکر باز مولوی، خیر پتا ہمیں کیا۔ جھوٹ سچ کا حساب ہوگا میدانِ حشر میں تو پتا چلے گا۔ میں آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ چلنا ہے میرے ساتھ تو چلو۔ میں سکندر کو رابعہ کے ساتھ تمہارے پاگل خانے لے جا رہا ہوں۔ یہ رات وہیں رہیں گے۔"

میں نے کہا "صبح ہم وہیں سے نکل جائیں گے۔"

"ہاں مگر رات بھر تو مولوی خادم حسین جیسا کوئی سخت پہرے دار ہونا چاہیے جو تمہارے اخلاق و کردار کی نگرانی کرے" منظر بولا "ورنہ تمہارا کیا ہے، دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔"

رابعہ نے کہا "منظر حد سے مت بڑھو۔ شرم کرو کچھ۔"

"اچھا بھائی۔ چلو بیٹھو گاڑی میں" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا "تم جو چاہو کرتے پھرو۔ بولنے والا مجرم۔ دیکھنے والا بے شرم۔"

میں نے بھی کہا "چلو خادم حسین۔ اتنا غصہ ٹھیک نہیں۔"

"اجی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کو کیا معلوم کہ میری اہلیہ کے سامنے انہوں نے کیسے کیسے کلماتِ نازیبا ادا کیے۔ توبہ توبہ۔"

"اچھا تم کرتے رہو توبہ توبہ۔ میں تمہاری چہیتی بیوی کو ورغلا کے لے جاتا ہوں۔" منظر بولا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" خادم حسین اکڑ گیا "کہ اپنے خداوندِ مجازی کی رضا کے بغیر وہ تمہارے ساتھ جائے۔"

"میں جا رہی ہوں" اس کی بیوی نے تنگ آ کے کہا "تم کو گاڑی میں نہیں جانا تو پھر پیدل آ جانا۔"

ہم سب کے بیٹھنے سے مولوی خادم حسین کی پوزیشن مزید خراب ہوئی "دیکھو مریم جب میں بتا چکا ہوں اور عہد کر چکا ہوں کہ اس گاڑی میں نہیں جاؤں گا تو تم کو میرا ساتھ دینا چاہیے۔ اخلاقاً اور شرعاً۔"

"شرع کی بات مت کرو" رابعہ نے کہا "یہ کوئی دینی معاملہ نہیں ہے۔"

"اور تمہاری بے وقوفی میں ساتھ دینا اس کا اخلاقی فریضہ بھی نہیں بنتا" میں نے کہا۔

ہم سب کے بیٹھنے کے بعد بھی مولوی وہیں کھڑا رہا "میں تو قسم کھا چکا ہوں۔"

اچانک مجھے ایک خیال آیا "تم نے گاڑی میں قدم نہ رکھنے کی قسم کھائی تھی؟"

"ہاں۔ مجھے پیدل جانا منظور ہے۔"

"چلو تم گاڑی میں قدم مت رکھو" میں نے کہا "مگر ہمارے ساتھ چلو۔"

"کیا کسی مچھر کی طرح اُڑ کے اندر چلا جاؤں۔ اور اندر اُڑتا رہوں۔" خادم حسین جل کے بولا۔

"نہیں۔ تم گاڑی میں مت بیٹھو۔ گاڑی کے اوپر بیٹھ جاؤ۔" منظر نے کہا "ڈگی میں.... مگر وہ بھی گاڑی کے اندر ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "تم چپ کرو بھوتنی کے۔ خادم حسین تمہاری قسم بھی نہیں ٹوٹے گی اگر تم چھت پر بیٹھ جاؤ۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "چھت کے اوپر۔ لیکن میں گر گیا پھر۔"

"اب ہم فضول چیزیں اٹھائے تو نہیں پھرتے۔ مگر تمہیں پھر اٹھا کے رکھ لیں گے" منظر نے کہا۔

میں نے کہا "تم آگے انجن پر بیٹھ جاؤ۔"

منظر بولا "ہاں۔ بالکل میری ناک کے سامنے تاکہ مجھے کچھ نظر نہ آئے اور میں گاڑی اتار دوں نہر میں یا کسی کھمبے پر چڑھا دوں۔"

بالآخر خادم حسین نے پیچھے ڈگی کے اوپر تشریف رکھنا منظور کیا اور اپنی قسم نہیں توڑی۔ رات کے وقت کسی نے یہ مزاحیہ سین نہیں دیکھا۔ سوائے دو چار گاڑیوں کے جو ہمارے پاس سے گزریں۔ بچے بعض اوقات تفریح کے لیے ایسی حرکت کرتے ہیں مگر ایک باریش عمر رسیدہ شخص کو ڈگی پر بیٹھا دیکھ کے کچھ لوگ حیران ہوئے۔ پھر شاید انہوں نے فرض کر لیا ہوگا کہ اندر جگہ کی کمی کے باعث ایک شخص کو مجبوری میں باہر لا دیا گیا ہے۔

دلچسپ صورتِ حال مال روڈ کراس کرتے وقت پیدا ہوئی جب ایک سارجنٹ نے پیچھے سے دیکھا اور موٹر سائیکل پر تعاقب کرتا ہوا آ گیا۔ اس نے سامنے آ کے گاڑی روک لی۔

اس نے منظر سے کہا "یہ بندہ پیچھے ڈگی پر کیوں رکھا ہوا ہے؟"

"وہ بندہ نہیں ہے" منظر نے کہا۔

"پھر کیا بندر ہے" انسپکٹر نے برہمی سے کہا "یا بلا ہے؟"

"وہ مولوی خادم حسین ہے۔ تمہیں ابھی معلوم نہیں" منظر نے عادت کے مطابق اسے الٹا کے مزید مشتعل کیا "اور ڈگی پر کیوں بیٹھا ہے یہ اس سے پوچھو۔ میں کیا بتاؤں؟"

میں نے کہا "جگہ تو ہے اندر۔ کیا پتا تازہ ہوا کھانے کے لیے بیٹھا ہو۔"

انسپکٹر نے ہمیں گھور کے دیکھا "تم سب نشے میں ہو" اور پھر پیچھے جا کے خادم حسین سے پوچھا "او بے صوفی۔ یہاں مرنے کے لیے بیٹھا ہے کیا؟ پتا نہیں یہ جرم ہے؟"

خادم حسین نے عاجزی سے کہا "یہ تو ٹھیک ہے سر۔ لیکن گناہ سے جرم بہتر ہے۔ دراصل میں نے غصے میں قسم کھائی تھی کہ گاڑی میں نہیں بیٹھوں گا اس لیے میں گاڑی پر بیٹھ گیا۔"

انسپکٹر کا شبہ مزید قوی ہو گیا "کون ہو تم لوگ۔ کہاں سے آ رہے ہو اس وقت اتنی پی کے۔ کسی کلب سے۔۔؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ انسپکٹر صاحب اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایک ذمے دار پولیس افسر کو ایسا مذموم الزام عائد نہیں کرنا چاہیے کسی بھی معزز شہری پر، جو مسلمان بھی ہو۔ یہ منظر صاحب ویسے تو بڑے ہی بدزبان اور بے شرم ہیں لیکن یہ بہت نامی گرامی وکیل ہیں۔ اور ان کے ساتھ جو خاتون ہیں مس رابعہ قادری ہیں۔ ہائی کورٹ کی مشہور وکیل۔ اور میں منشی ہوں ان کا۔"

انسپکٹر نے بے یقینی سے منظر کو دیکھا لیکن اس وقت تک غالب باہر آ چکا تھا۔ اس نے اپنے کارڈ کی نمائش کی اور انسپکٹر کو یقین دلا دیا کہ مولوی خادم حسین نے غلط نہیں کہا۔ وہ غلط کہتا تب بھی انسپکٹر کے لیے پریس کارڈ دیکھنے کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ خاموشی سے واپس لوٹ گیا۔

ہم کو خادم حسین کے گھر کے قریب گلی کے موڑ پر ڈراپ کرنے کے بعد منظر نے کہا "تم سے پھر کب ملاقات ہوگی؟"

میں نے کہا "پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ تم ذرا نبی داد کی خبر لیتے رہنا۔ صبح پوچھ لینا ڈی ایس پی سے۔"

"صبح کیوں۔ میں ابھی جا کے اسے فون کروں گا۔ وقار یوسف اس وقت تک ایف آئی آر درج کرا دے گا۔"

خادم حسین سوٹ کیس اٹھا کے رابعہ کے ساتھ گلی میں غائب ہو چکا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو سوا گیارہ بجے تھے۔ مجھے نبی داد کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ دلاور کی اس سے ملاقات کا وقت رات بارہ بجے طے ہے۔ میں منظر سے کہتے کہتے رک گیا کہ ہمیں اقبال پارک کے پاس چھوڑ دے۔ اسے مخالف سمت میں جانا تھا اور پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ شاید منظر میرے ارادے کی سخت مخالفت کرتا اور مجھے دلاور سے مل کے "قتل مجھے مار" والے محاورے پر ہرگز عمل نہ کرنے دیتا۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے گلی کے اندر دیکھا "مرزا جی۔"

غالب نے کہا "رابعہ کو بتائے بغیر چلیں؟"

میں نے حیرانی سے کہا "کہاں؟"

غالب ہنسا "اپنے چوہدری دلاور صاحب سے شرفِ ملاقات کے لیے اور کہاں؟"

"یار کمال ہے۔ تُو نے میرے دل کی بات جان لی۔ یہ تو خیر ٹھیک ہے کہ بارہ بجے چوہدری دلاور سے ملاقات کا امکان ہے مگر میں رابعہ کو نہیں بتانا چاہتا۔ یہ کیسے اندازہ کیا تُو نے؟"

"اگر تیری جگہ میں ہوتا پیارے اور عزیز" وہ آہ بھر کے بولا "تو میں بھی نازو کو نہ بتاتا۔ اس کا ردِعمل بھی وہی ہوتا جو رابعہ کا۔ وہ ہرگز مجھے اس کی اجازت نہ دیتی۔ میں بلا اجازت چلا جاتا۔ وہ ناراض ہو جاتی اور پھر اس کو منانے کا ڈراما کرنا پڑتا۔"

میں ہنس پڑا "یہ ڈراما تو مجھے بھی کرنا پڑے گا۔"

"رابعہ کی ناراضی بھی کوئی ناراضی ہے" غالب بولا "وہ تو جیسے رضا مند ہو جاتی ہے اور منتظر ہوتی ہے کہ تم ذرا اسے مناؤ اور وہ مان جائے۔ نازو تو آتش فشاں ہے۔ اسے ٹھنڈا کرنا کتنا مشکل کام ہے یہ ہم جانتے ہیں دوست۔"

ہم وہیں سے ایک گزرتے ہوئے رکشا میں سوار ہو گئے۔ رکشا والے نے بہت بُرا مانا "باؤجی، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آپ تو ایسے بیٹھ گئے ہو۔ جیسے ٹیلی فون کر کے گڈی بلائی تھی۔"

میں نے کہا "بلائی تو تھی۔ لیکن آئی نہیں۔"

غالب نے کہا "اور تمہارا یہ رکشا کیا کسی گاڑی سے کم ہے۔"

"او ہو۔ پر بندے کو پوچھ لینا چاہیے کہ کدھر جانا ہے۔"

میں نے کہا "چلو اب پوچھ لیتے ہیں۔"

"میں تو جا رہا ہوں داتا صاحب کے دربار" وہ بولا۔

"پھر تو تمہیں صرف ہمارے لیے بھیجا گیا ہے۔ ہم بھی تو وہیں جا رہے ہیں۔"

وہ بد مزاج اور بد تمیز شخص تھا مگر داتا دربار پہنچ کے میں نے اسے کرائے کی مد میں بیس روپے دینے چاہے تو اس نے انکار کر دیا۔ مجھے غصہ اس لیے آیا کہ بیس روپے کم نہیں تھے۔ میٹر کے حساب سے کرایہ شاید دس روپے ہی بنتا لیکن رات کے وقت دگنا کرایہ چارج کرنا ایک عام سی بات تھی۔ جھگڑے سے بچنے کے لیے میں نے پچاس کا نوٹ نکالا تو اس نے نوٹ لے کر واپس میری جیب میں رکھ دیا اور نرمی سے بولا "معاف کرنا باؤجی، داتا صاحب کی سواری سے میں پیسے نہیں لیتا۔ میرا باپ تانگا چلاتا تھا۔ وہ بھی نہیں لیتا تھا۔ ہماری روزی میں بڑی برکت ہے۔"

میں اور غالب اس کی بات پر شرمندہ اور حیران کھڑے رہ گئے۔ جب وہ گلی میں چلا گیا تو ہم نے تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کیا۔ میری گھڑی میں ساڑھے گیارہ سے کچھ اوپر کا ٹائم تھا۔ نبی داد کی بتائی ہوئی جگہ تک پہنچنے میں مزید پندرہ منٹ صرف ہوئے۔

www.paksociety.com

شاہی قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اکبری میدان میں بھی اندھیرا تھا۔ اندرون شہر جانے والی گلیوں میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اور دونوں جانب بنے ہوئے مکانوں کی تاریکی سے اندازہ ہوتا تھا کہ مکین سو چکے ہیں۔

قلعے کی سینکڑوں سال پرانی خستہ حال تاریخ سے سیاہ پڑ جانے والی اینٹوں کی دیوار کے ساتھ رات کی ویرانی میں ماضی کے کچھ آسیب سائے حرکت کرتے محسوس ہوتے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا اور اندازے سے اس جگہ کا تعین کرنے کی کوشش کی جہاں نیاز ولد نے کسی فقیر کے جھونپڑے کی نشاندہی کی تھی۔

اچانک غالب نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے۔ چوہدری دلاور آئے گا؟"

میں نے کہا "یقین تو مجھے بھی نہیں۔"

"اگر وہ نظر آیا تو ہم اس سے مل کے کیا کہیں گے۔ کیا کریں گے؟ یہ کہ اچھے دلاور صاحب تم نے یہ حرامی پن کیوں کیا؟"

"مجھے اس سے ملنے کا کوئی شوق نہیں۔"

"یہ ہو سکتا ہے مسٹر سکندر اعظم کہ تم اپنا اصلی چہرہ لے کر اس کے سامنے جاؤ اور وہ کہے کہ آؤ جی بسم اللہ۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ہی آؤ گے اور میں نے بتا بھی دیا تھا کہ اگلا راؤنڈ پھر دشمنی کا ہو گا۔"

میں نے کہا "ارے میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ نیاز ولد نے جھوٹ بولا تھا یا سچ۔"

"اس نے جھوٹ بولا تھا" غالب نے قطعی لہجے میں کہا۔

غالب کی بات ٹھیک تھی۔ خود میری عقل بھی کہتی تھی کہ دلاور جیسا شخص کسی سے ملنے کے لیے اس جگہ کا انتخاب نہیں کر سکتا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تک میں اور غالب کسی فقیر کے جھونپڑے کی تلاش نہ کر سکے۔

پھر ایک بجنے میں پانچ منٹ پر ہم خادم حسین کے گھر پہنچے تو رابعہ کے غصے کا سامنا کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے آپ دونوں؟ بتاؤ؟"

میں نے کہا "کیوں ہمیں جھوٹ بولنے پر مجبور کرتی ہو۔ سچ بتایا تو تمہارا غصہ اور بلڈ پریشر بڑھ جائے گا۔"

"تم دلاور سے ملنے گئے تھے؟"

میں نے کہا "جب جانتی ہو تو پھر پوچھتی کیوں ہو۔ وہ ملا نہیں تو واپس آ گئے۔"

وہ رات ہم نے مولوی خادم حسین کے پرسکون گھر میں سو کے گزاری۔ دو کمروں کے اس گھر کا ایک کمرا مستقل مہمان خانہ بن گیا تھا۔ مریم نے وہاں سے صوفے ہٹا کے پورے کمرے میں قالین لگا دیا تھا اور قالین کے نیچے فوم جیسا انڈرلے تھا۔ سفید بے داغ غلاف والے گاؤ تکیے اور کشن کے ساتھ یہ کمرا بہت آرام دہ محسوس ہوتا تھا۔ اس پر پاؤں پھیلا کے سونے یا چوکڑی مار کے بیٹھنے میں مزہ آتا تھا۔ فراغت اور آزادی کا احساس ہوتا تھا جو صوفہ یا بیڈ کے تکلف میں مٹتا تھا۔

صبح میں اور غالب دیر سے اٹھے۔ رابعہ ہم سے پہلے اٹھ کے نماز سے فارغ ہو چکی تھی اور مریم سے ماضی، حال اور مستقبل کے مسائل، اندیشوں اور امکانات پر ان کی زنانہ کانفرنس کچن میں ہو رہی تھی۔

میں نے لیٹے لیٹے تالی بجا کے کہا "کوئی ہے؟"

رابعہ نے کھڑکی سے جھانک کے کہا "کیا ہے؟ کیوں شور کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "بے ادب کنیز! ابدولت کے جلال میں آنے سے قبل ہی بیڈ ٹی حاضر کی جائے۔"

"یہ کوئی بیڈ ٹی کا وقت نہیں ہے۔ اٹھو اور ناشتا کرو ابدولت ملامت۔ ورنہ بعد میں یہ بھی نہیں ملے گا" رابعہ نے کہا اور غائب ہو گئی۔

میں نے اپنی خودی کو بلند رکھا ہوتے دیکھا غالب۔ گمراہی اور تقلید مغرب نے دختران وطن کو کس درجہ گستاخ، عاقبت نااندیش اور اخلاقی اقدار سے بیگانہ کر دیا ہے۔"

"میری بیوی ہوتی تو ایسے جواب پر میں اس کو دندان شکن جواب دیتا۔" غالب بولا۔

"تو جواب سے اس کے دانت توڑتا۔ وہ دست نازک سے تیرا سر توڑتی۔ کتنا قابل رشک ہے پیار کا یہ جذبہ۔ سبحان اللہ۔ بس ایک دوسرے کا دل نہیں توڑتے۔ گھر کے برتن ٹوٹ جائیں۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ جائیں۔ ہڈی پسلی ٹوٹ جائے۔"

مریم نے اندر آ کے کہا "آپ ہاتھ منہ دھو لیں۔ میں ناشتا لگاتی ہوں۔"

غالب بولا "مسٹر خادم حسین کہاں ہیں۔ ان کا دیدار نہیں ہوا۔"

مریم نے کہا "وہ گئے ہیں ذرا... کسی سے مشورہ کرنے۔"

"کس مسئلے پر؟"

"وہی۔ کل رات والی بات" مریم نے کہا "ان کے دل میں شک بیٹھ گیا تھا کہ زکوٰۃ پر بیٹھنے سے ان کی قسم ٹوٹ گئی ہے۔ بات الفاظ کی نہیں نیت کی تھی۔"

جب ہم ناشتا کر رہے تھے تو خادم حسین آ گیا۔ وہ بہت خفا تھا "دیکھیں جی۔ ہمسائے کا حق پہلے ہوتا ہے۔ جب مولوی صاحب نے فتویٰ دے دیا کہ قسم توڑنے کا کفارہ لازم ہے اور مجھے ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا ہو گا۔ تو کیا میں نے محلے والوں کو دعوت دے کر ان کی بے عزتی کی؟ ایک سرکاری افسر ہے "خوب حرام کھاتا ہے" کہنے لگا کہ مولوی کیا ہم تجھے خیرات کھانے والے لگتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ تم تو خیر حرام کھانے والے ہو۔ دوسرے نے پوچھا کہ کیا کھلاؤ گے؟ چکن کڑاہی ہو تو میں آ جاؤں گا۔ تیسرے نے پوچھا کہ کون سے ہوٹل میں ہو گا ڈنر۔ ساٹھ افراد کی دیگ کرا لو پھر بتانا۔ کوئی پوچھتا ہے سوئٹ ڈش کیا ہو گی؟ سلاد کیسا ہو گا؟"

ہم سب کو بہت ہنسی آئی۔ "پھر اب کیا سوچا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تک مسئلہ حل نہیں ہوا ہے جی" وہ بولا "ساٹھ فقیروں کے لیے ایک ٹھیکے دار سے بات ہوئی تھی۔ وہ کہنے لگا کہ بھائی کس دنیا میں ہو۔ آج کل فقیر کسی کے کھانا کھانے نہیں جاتے۔ اچھے سے اچھا کھانا کے ڈیرے پر لوٹتے ہیں۔ دھندا کھوٹا کر کے اتنی دور جائیں بھی تو کیا کھلاؤ گے تم؟ میں نے کہا کہ جو میں کھاتا ہوں۔ دال چاول، سبزی یا گوشت روٹی۔ تو وہ حساب لگا کے بولا کہ چلو تم پندرہ سو دے دو۔ پچیس روپے فی کس۔ ساٹھ فقیروں کا کھانا ہو جائے گا ویسا ہی جیسا تم کھاتے ہو۔ جیسا فقیر کھاتے ہیں وہ تو پچاس روپے کے حساب سے تین ہزار ہو جائیں گے۔ کیا زمانہ آ گیا ہے جی۔ خیر اللہ مالک ہے۔ ساٹھ بھوکے کنگلے لاؤں گا کہیں نہ کہیں سے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ دنیا پیٹ بھروں کی ہے۔ بھوک افلاس کہیں نہیں رہا۔"

میں نے کہا "تمہیں کچھ محسن بانگش کی خبر ہے؟"

"ہاں جی۔ رکار صاحب نے بھیجا تھا معلوم کرنے کے لیے مگر ان کے گھر میں پڑا ہوا تھا تالا۔ مالک مکان نے کہا کہ وہ خالی کر گئے۔"

"مگر خالی کر کے کہاں گئے۔ یہ بات تھی معلوم کرنے کی۔"

"وہ جی۔ ایک عجب خبر ہے" وہ چور نظروں سے مریم کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"جب تمہیں معلوم ہے تو عجب کہاں رہی" غالب نے کہا۔

"مریم نے کہا تھا... کسی کو بتانا نہیں۔ اس سے پوچھ لیں۔"

مریم نے اسے غصے سے گھورا "اب کیا رہ گیا ہے نہ بتانے کو خود ہی بتا دو نا۔"

"چلو اجازت مل گئی" میں نے کہا۔

"دراصل جناب۔ اپنے محسن صاحب کو کسی نے بتایا تھا کہ ایک بڑے پہنچے ہوئے ولی اللہ ہیں۔ کہیں وزیر آباد کے پاس کوئی مزار ہے وہاں جا کے لوگ چلہ کاٹتے ہیں۔"

"کس لیے؟" رابعہ بولی۔

"بس جی۔ ہر شخص اپنے دل کی مراد مانگتا ہے۔ اور کیا.... اب میری تو اللہ نے یہاں سن لی۔ دعا میں بہت مانگی تھیں میں نے مگر قبول اپنے وقت پر ہوئی جب مجھے مریم ملی اور الحمداللہ وہ امید سے ہوئی۔ اولاد نہ ہو تو شادی کے ارمان ختم ہو جاتے ہیں جی۔"

"تمہارا مطلب ہے... وہ اولاد کے لیے وہاں چلہ کاٹنے گئے ہیں؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

غالب نے بھی کہا "کمال ہے۔ محسن تو ایسا نہیں تھا۔"

"اولاد میں آدمی سب کچھ کرتا ہے جی۔ جادو ٹونا سفلی عمل اور پتا نہیں کیا کچھ۔ سب کچھ دینے والا تو وہی ہے۔ اس کی مرضی نہ ہو تو سب بے کار ہے۔ لیکن آدمی سارے تماشے کرتا پھرتا ہے۔ کسی سے سن لیا تھا انھوں نے۔ میرا مطلب ہے گل نے۔ محلے کی عورتوں کا بہت آنا جانا تھا۔ عورتیں ہر طرح کی باتیں کرتی ہیں۔ بس اس کے بعد گل نے بھی محسن سے کہا کہ چلو۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "یعنی گل کی خوشی کی خاطر اس نے یہ مشکل کام کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ چلو اچھا ہے اگر گل مطمئن ہو جائے۔ کسی طرح بھی۔"

غالب نے پوچھا "کب گئے آخر وہ؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ اسی ہفتے میں نکل گئے خاموشی سے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ہم سے ذکر کرتے تو ہم انھیں منع کرتے کہ ان فضولیات میں نہ پڑیں۔ اللہ پر بھروسا رکھیں۔"

"کیا وہ بولی کو بھی ساتھ لے گئے ہیں؟" غالب بولا۔

"ہاں جی۔ ساتھ ہی لے گئے ہوں گے۔"

"حد ہو گئی ہے حماقت کی۔" رابعہ نے غصے سے کہا "ساتھ اس بچے کو بھی خوار کریں گے۔ کیا ملے گا؟ اس ویرانے پر اگر کسی چیز کی ضرورت پڑ گئی۔ دوا کی یا ڈاکٹر کی۔ کھانے پینے کا سامان تک نہیں ہوتا۔"

"دوا پہلے ساتھ لے گئے ہوں گے سب کچھ" میں نے اسے تسلی دی "گل نے مجھے مایوس کیا۔ اس الو کے پٹھے محسن سے تو میں سمجھ لوں گا" میں نے کہا "بولی کیا ان کا بیٹا نہیں تھا۔ زبان سے کہتے تھے دل سے ایسا نہیں سمجھتے تھے اور نہ صبر شکر کے ساتھ تقدیر کے فیصلے کو قبول کرتے۔ واپس آ جائیں پھر ہم لے لیں گے بولی کو۔"

"گل نہیں دے گی مر کے بھی" رابعہ بولی۔

"کیوں۔ جب اسے اپنا ہی بیٹا چاہیے تو پھر پرایا چھوڑ دے۔"

رابعہ نے کہا "یہ بھی مجبوری ہے عورت کی۔ ماں بننا اور ماں کہلانا۔ دل ہو ماں اور ماں کی جگہ ہو۔ دونوں کام مشکل ہیں مگر وہ دونوں کرتی ہے۔ گل کے لیے غیر جذباتی انداز میں سوچنا ناممکن ہے اور جذبات سے سوچنا ایک ناگزیر ضرورت۔ تم اسے مت چھیڑو۔ چھوڑ دو اس کے حال پر۔ بولی بھی اس کا بیٹا رہے گا اور گل اس پر فرض سے زیادہ ممتا لٹاتی رہے گی۔"

"جب تک اس کا اپنا بچہ نہیں ہوتا" غالب نے کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو اس دور افتادہ نامعلوم پیر کے مزار پر چلہ کاٹنے سے کچھ ہو گا۔ نہیں۔ جو ہو گا خدا کے حکم سے ہو گا" میں نے کہا۔

غالب بولا "پھر ابھی سے بولی کے لیے کیوں پریشان ہو۔"

رابعہ نے کہا "پتا نہیں اس وقت وہ کہاں ہوں گے۔ کب واپس آئیں گے۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "مت سوچو ان کے بارے میں۔ بس اپنی فکر کرو۔ دس بج گئے باتوں باتوں میں۔ اب ہمیں نکل جانا چاہیے۔ لیکن مسٹر غالب 'واٹ اباؤٹ یو' تم کیا کرو گے؟"

"میں کچھ نہیں کروں گا۔ یہ بھی بہت مشکل کام ہے۔"

"تم کب تک روپوش رہو گے؟"

"تمہارے واپس آنے تک" غالب نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ پھر ہمارے ساتھ چلو۔ یہاں تمہیں کسی نے دیکھ لیا تو ہماری سازش کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ پتا چل جائے گا کہ رابعہ بھی یہیں روپوش ہے اور پولیس پر خواہ مخواہ کا الزام ہے۔ نبی داد صاف بچ جائے گا۔ ابھی ذرا نبی داد سے تفتیش ہونے دو۔ اور پولیس کو بھی تلاش میں مصروف رہنے دو۔" پھر میں نے سوچ کر کہا۔

"یہ نبی داد کیا واقعی اتنا بے وقوف ہے۔ دلاور کے کہنے پر وقار کے گھر پہنچ گیا۔ سکندر بخت کو گرفتار کرنے کے لیے۔ کیا اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ فرض کرو عین وقت پر نازو اور تم خود کو گرفتاری کے لیے پیش نہ کرتے تو کیا پولیس مجھے اور رابعہ کو پکڑ سکتی تھی۔ رابعہ تو شاید گرفتار ہونے سے پہلے ہی ضمانت قبل از گرفتاری کا پروانہ دکھا دیتی یا تھانے پہنچ کے منظر کو بلا لیتی۔ مگر میں' کیا میں گرفتار ہو جاتا؟ میں تو سب کو لمبا لٹا کے نکل جاتا۔ چار پولیس والے کیا چیز ہیں' پھر میں نبی داد کو بھی ساتھ لے جاتا۔"

"دلاور کو یقین ہو گا کہ نبی داد کا باپ بھی سکندر بخت پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ یا وہ مارا جائے گا یا خراب ہو گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ خیر اب اگلا مرحلہ ہو گا ہمارے منظر عام پر آنے کا۔ ہم کیا بیان دیں گے؟ پولیس نے ہمیں کہاں رکھا اور ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

میں نے کہا "ہمارا بیان بہت سادہ ہو گا۔ پولیس نے ہمیں چوہدری دلاور کے سپرد کر دیا تھا۔ پتا نہیں وہ ہمیں کہاں لے گئے تھے اور کہاں قید رکھا تھا۔ دلاور وہاں اکثر آتا تھا۔ ہم نے اس کی آواز سنی تھی۔ ہم تہ خانے میں تھے اور ہماری آنکھوں پر پٹی تھی' ہم دیکھ نہیں سکتے تھے۔ کوئی سنسنی خیز کہانی بنا لیں گے بعد میں۔ ابھی تو چلنے کی بات کرو۔"

"بات کیا کرنی ہے بس چلو" غالب نے کہا۔

"ایسے ہی روانہ ہو گئے تو کراچی نہیں کہیں اور پہنچ جائیں گے۔ پولیس ہم تینوں کو بڑی سرگرمی سے تلاش کر رہی ہو گی۔ بسوں کے اڈے' ریلوے اسٹیشن اور ائرپورٹ پر تو خاص نظر رکھی جاتی ہے۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا "یہ تو ہے۔ اس کے باوجود پولیس کی ناکابندی کا ڈراما ہمیشہ فیل ہو جاتا ہے۔ ملزم جل دے کر نکل جاتے ہیں۔"

"رائٹ۔ ہم بھی جل دے کر ہی نکل سکتے ہیں۔ حلیہ اور میک اپ بدل کے" میں نے کہا "میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔"

"ہم بھی روپوشی کے کھیل کو ایک منطقی انجام تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ پکڑے گئے تو بے عزتی الگ ہو گی۔ لوگ مذاق اڑائیں گے" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "آج میرے والد کی برسی ہے۔"

غالب نے سر ہلایا "کیا تمہارا خیال ہے قبرستان جا کے فاتحہ خوانی کا۔"

"کیا مجھے نہیں جانا چاہیے؟" میں نے اُلٹا سوال کر دیا۔

غالب نے نفی میں سر ہلایا "یہ بات چوہدری دلاور کو بھی معلوم ہے شاید پولیس کو بھی معلوم ہو گی۔"

میں نے افسردگی سے کہا "پولیس کو یقیناً معلوم ہو گا۔ خود دلاور نے بتایا ہو گا۔"

"اس کے فون کرنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس نے بڑا احسان کیا یہ بتا کے کہ تمہارے والد کی ہڈیاں اپنے اصل مدفن میں ہی ہیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ معلوم ہو جانے کے بعد تم جذباتی ہو کے برسی پر قبرستان ضرور جاؤ گے۔"

میں نے مضبوط لہجے میں کہا "میں نہیں جاؤں گا۔ برسی کوئی تقریب نہیں ہوتی۔"

مجھے علم نہیں تھا کہ رابعہ سب سن رہی ہے "ہاں۔ آج ہم سب مل کے ختم قرآن کریں گے اور ان کے لیے دعائے مغفرت" وہ بولی۔

"افسوس کہ غالب بھی وہاں نہیں جا سکتا' محسن بھی تیرا ہے۔"

مولوی خادم حسین نے رابعہ کے پاس آ کے کہا "میں ضرور جاؤں گا بی بی اپنے منظر صاحب کے ساتھ۔ انہیں تو معلوم ہو گا کہ قبر کہاں ہے۔ اور وقار صاحب کو بھی لے جاؤں گا۔ آج سب کو بلا لیتے ہیں قرآن خوانی کے لیے۔ آپ کل چلے جانا کراچی۔"

وہ دن بڑا سوگوار گزرا۔ غالب اور منظر یا رابعہ کے سوا کوئی بھی وزیر خان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ میں [illegible] یوسف' مولوی خادم حسین اور مریم سے پرانی باتیں کرتا رہا۔ اپنے بچپن کے قصے۔ پاکستان آنے کے' پاکستان میں اپنے والد کی جدوجہد کی کامیابی۔ ان کی خواہشات اور ناتمام حسرتوں کی باتیں۔ کیا بڑی عقیدت کے ساتھ نیاز کی دو دیگیں میاں میر صاحب کے مزار پر بھجوائیں۔ شام کو جب وقار' منظر اور مولوی خادم حسین قبرستان گئے تو میں نے خود کو بہت اکیلا اور بے بس محسوس کیا۔

"کتنے دکھ کی بات ہے کہ ایک بیٹا اپنے باپ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے بھی نہ جا سکے۔ ان کی روح کو کتنی تکلیف ہوئی" میں نے رابعہ سے کہا۔

"کیا فائدہ ایسی باتیں سوچ کے خود کو دکھی کرنے سے۔ کیا وہ تمہاری مجبوری کو سمجھتے نہیں ہوں گے۔ اگر تم جاتے اور گرفتار ہو جاتے تو کیا وزیر خان مرحوم کی روح کو تسکین ملتی؟ شاید اب ان کی روح زیادہ مطمئن ہو گی کہ تم نے جذبات کے بجائے عقل سے کام لیا اور اپنے دشمنوں کے عزائم کو ناکام بنا دیا۔" رابعہ مجھے تسلی دیتی رہی۔

مجھے قبرستان نہ جانے کا کچھ زیادہ ہی رنج تھا۔ شاید اس لیے کہ میری خواہش کی تکمیل کے راستے میں خوف کی دیوار کھڑی تھی اور مجھے اپنے بے بس و لاچار ہونے کا احساس تھا لیکن قبرستان سے واپسی پر مولوی خادم حسین نے جو کچھ مجھے بتایا اس کے بعد تاسف کی جگہ اطمینان نے لے لی۔

"بس جی اللہ کی مصلحت ہوتی ہے ہر کام میں" اس نے آتے ہی کہا "خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے دو نفل پڑھنے چاہئیں آپ کو۔"

"تم بہت گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو۔ خیریت ہے نا؟" میں نے کہا۔

"اجی خیریت کہاں۔ دھڑکا سا لگا ہوا ہے کہ میرے پیچھے پیچھے کوئی بھی یہاں تک نہ چلا آیا ہو۔ آ گیا تو بڑا گھمسان کا رن پڑے گا جی۔ دنادن گولیاں اور گولے چلیں گے۔ کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے اور آپ تو وہ چار کے مری پائے یا گردن اور جا نہیں تو ڈر کے نکل جاؤ گے اسی دیوار میں سے بھی۔ بس مریم اور اس کا اکلوتا شوہر یہاں پڑے رہ جائیں گے۔"

مریم نے اسے ٹوکا "کیا بولے جا رہے ہو۔ کچھ ہمیں بھی پتا چلے۔"

"میں کہتا ہوں جی کہ خطرہ ہو تو حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں پہلے سے بتا رہا ہوں کہ کوئی خبیث زادہ ولدیت نامعلوم ضرور میرے تعاقب میں ہو گا۔ اب نصیب دشمناں کوئی کنڈی بھی کھڑکائے تو تم ہرگز دروازے کی طرف مت دیکھنا۔ گھس جانا پلنگ کے نیچے اور سانس بھی روک لینا۔ میرا اللہ مالک ہے۔ میں ہاتھ میں لوٹا لے کر بیٹھ جاؤں گا۔ حملہ آور قاتل عموماً لیٹرین میں خون خرابا نہیں کرتے۔ سمجھ لیتے ہیں کہ اس حالت میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "اچھا طریقہ ہے۔ اس طرح کپڑے بھی خراب نہیں ہوتے اور بزدلی کا الزام بھی نہیں آتا۔ لیکن کون آ رہا ہے یہاں خون خرابا کرنے؟"

"وہی جی۔ نطفۂ نا تحقیق چوہدری دلاور۔ اس کے چیلے چانٹے وہاں پہلے سے موجود تھے۔"

مریم بولی "کہاں۔ قبرستان میں؟"

"اور کیا اس وقت میں عالم بالا سے واپس آیا ہوں" خادم حسین بولا "کاش وہ قبرستان میں زمین کے اوپر نہیں زمین کے نیچے ہوتے۔ مگر جناب انہوں نے تو ہر طرف ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ اپنے منظر صاحب کی نظر بہت تیز ہے اور کیوں نہ ہو' ولی را ولی می شناسد۔ بدمعاش کو بدمعاش ہی پہچان سکتا ہے۔ انہوں نے وقار کو اور مجھے بتایا کہ ادھر دیکھو۔ اور وہاں دیکھو' پھر تو جی میری نظر نے بھی دیکھ لیا۔ کوئی وزیر خان مرحوم کی قبر کے دائیں جانب کچھ فاصلے پر موجود ہے تو کوئی بائیں طرف کھڑا ہے۔ کسی قبر پر فاتحہ خوانی کا ڈراما کر رہے تھے سب لیکن نظر ہم پر تھی۔ اور نیت تو آدمی کی صورت پر نظر آ ہی جاتی ہے جی۔"

"کہیں وہ سادہ کپڑوں میں پولیس والے تو نہیں تھے؟"

"نہیں جی۔ پولیس کی چھاپ دوسری ہوتی ہے۔ ان کی شکل پر بدمعاشی کی چھاپ تھی۔ منظر صاحب نے تو کہا مجھ سے کہ خادم حسین کلمہ پڑھ کے لیٹ جاؤ اور شرافت سے مر جاؤ۔ ورنہ وہ گولی ماریں گے تو بہت اذیت سے مرو گے۔ اسلحہ صاف نظر آ رہا تھا ان کی جیب میں لیکن جناب ایسے بلاوجہ اپنی مرضی سے کون مر سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے یہ تمہارا وہم ہو؟"

وہ چمک کے بولا "وہم! کمال بات کرتے ہو جی آپ۔ کیا وہ سب مُردے تھے جو قبروں سے نکل کے ہمارے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے تھے؟"

"میرا مطلب ہے وہ عام لوگ ہوں جو تمہاری طرح فاتحہ خوانی کے لیے گئے ہوں؟"

خادم حسین نے پُرجوش انداز میں تردید کی "نہیں جی۔ وہ تو سب برابر فاصلے پر موجود تھے ہر طرف۔ آج کوئی جمعرات تو نہیں تھی۔ جمعرات کو زیادہ لوگ نظر آتے ہیں۔ اس طرف اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس لیے پہچانے گئے وہ لوگ کہ انہوں نے ایک ہی قبر کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا اور سو سو گز کا فاصلہ تھا ان کے درمیان۔ قبرستان میں بچے بوڑھے دھوتی شلوار والے' بالوں والے اور گنجے سب ہی آتے ہیں۔ وہ سب ایک جیسے جوان اور ہٹے کٹے تھے اور انہوں نے وہ پتلونیں چڑھا رکھی تھیں ٹانگوں پر جو آج کل چل رہی ہیں۔ ٹیڈی پتلون کہتے ہیں جی اسے۔ دونوں ٹانگیں یوں لگتی ہیں جیسے غلاف میں بندوق اور وہ بھی دو نالی۔"

"انہیں میرا انتظار ہو گا!"

"ہاں جی۔ میں تو پہچانتا ہوں اپنے دشمنوں کو صورت سے۔ سب دو ٹانگوں والے بھیڑیے ہیں۔ سگ جیسی تو دم ہے سب کی۔ ان کے ہاتھ لگ جاؤں میں تو وہ میری چٹنی بنا دیں گے جی مگر میں کہاں ہاتھ آتا ہوں ان کے۔ میں تو سرپٹ بھاگتا ہوا دو میل آگے جا کے دم لوں گا۔ وہ چار قدم دوڑ کے ہانپ جائیں گے۔ ان کے سوا میرا کوئی دشمن نہیں۔"

غالب نے ہنس کے کہا "کس کی بات کر رہے ہو تم؟"

"اپنے سالوں کی جناب۔ پہلی بیوی کے حرام الدہر بھائیوں کی۔ عقد ثانی پر سخت مشتعل ہیں وہ اور سارے پہلوان ہیں۔ اکھاڑے میں زور کرتے ہیں اور خصلت میں بھی اپنی ہمشیرہ جیسے ہیں۔ ابھی تک کسی نے جو بے کا بچہ تک پیدا نہیں کیا۔ اب کیا

www.paksociety.com

عرض کروں میں۔ سمجھ لیں کہ قصوروار ان کی منکوحات تھیں۔ اس لیے جناب میں نے مظفر صاحب سے کہا کہ آج میرا خون ہوگا آپ کی گردن پر۔ گناہ آپ کے جرم آپ کے اور دشمن بھی آپ کے مارا جائے گا اب کے ساتھ مولوی غلام حسین۔"

"چلو کچھ بھی نہیں ہوا۔ خدا کی مرضی نہ ہو تو کون کسی کو مار سکتا ہے؟"

غلام حسین نے ایک گال دبا کے کہا "مکا تو ماردیا جی اس نے۔ نواب زادہ ضرور ہل گئی ہے اپنی جگہ سے۔"

میں نے کہا "تمہارا جھگڑا ہوا تھا؟"

"بس جی۔ ہم چاہتے تو نہیں تھے مگر ہونے والی بات ہوجاتی ہے۔ رفتار صاحب اور مظفر صاحب نے تو بہت کہا تھا کہ ہمارے ساتھ چلو لیکن جناب مظفر صاحب کی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے مجھے قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنے کا خیال آگیا۔ وہاں قبرستان کے باہر گداگروں کی فوج بیٹھی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ فرض بھی ادا کردوں۔ بڑے خبیث ہیں جی وہ بھی۔ پوچھنے لگے کہ کیا کھلاؤ گے۔ میں نے کہا کہ جو میری مرضی۔ ایک بڈھا خوار خوار ساتھ فقیروں کا نمائندہ بن گیا اور بولا کہ کھانے والے ہم ہیں۔ ہماری مرضی چلے گی۔ ادھر بریانی والے سے بھی تم کو دس کا نوٹ دلادیں گے اور پائے والے سے بھی۔ قورمے والا اور مچھلی فرائی والا کوئی رعایت نہیں کرے۔ بس جی میں نے سوچا کہ آج یہ معاملہ ختم ہوجائے تو اچھا ہے ورنہ ساٹھ محتاج ایسے کہاں ملیں گے جو میری مرضی سے دال روٹی کھا کے بھی خدا کا شکر اور میرا شکریہ ادا کریں۔ میں نے کہا کہ چلو ساٹھ بندوں کے لیے بات کرلو۔ دس دس روپے کے حساب سے ادائیگی کرکے میں نے ہوٹل والے سے کہا کہ اب دیر کیا ہے۔ کھانا بھیجو۔ وہ فوراً ہنسنے لگا کہ صوفی صاحب ابھی ان کے لنچ کا ٹائم نہیں ہوا۔ ابھی پولیس کا ٹائم ہے۔ یہ رات دس بجے کھانا کھائیں گے۔ ویسے بھی پانچ بجے تو انہوں نے تیرہ والی قورمہ کھایا ہے۔ آپ جیسے تو سارا دن آتے رہتے ہیں۔ یہ ہر وقت تو نہیں کھا سکتے۔ پھر میں نے کہا کہ اچھا آرڈر کینسل کرو اور پیسے واپس۔ تمہارا کیا بھروسا میرے جانے کے بعد کسی دوسرے آدمی سے بھی رقم وصول کرلو گے۔ میں دس بجے رات تک نہیں رک سکتا۔ تو جناب ہوٹل والا کہنے لگا کہ آرڈر بک ہونے کے بعد کینسل نہیں ہوتا۔ وہ سامنے لکھا ہوا ہے۔ مجھے اور غصہ آیا مگر جناب میں نے دل میں کہا کہ اپنی نیک نیتی کے ساتھ میں نے کفارہ ادا کردیا۔ اب آگے کوئی بے ایمانی کرے تو مجھے کیا۔ میں دکان سے نکلا تو سامنے سے ایک مشٹنڈا بیل کی طرح ٹکرا گیا۔ اس نے جان بوجھ کے ٹکر ماری تھی مجھے۔ کہنے لگا کہ تمہاری نظر ہی نہیں دماغ بھی خراب ہے۔ یہ بریانی والا اور قورمے والا تو بھائی ہیں اور فقیروں سے ملے ہوئے ہیں۔ رات کو آدھی رقم انہیں دیں گے۔ آدھی خود رکھ لیں گے۔ روز نہ جانے کتنے تم جیسے آتے ہیں باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے۔ میں نے کہا کہ مرے تمہارا باپ' میرا باپ تو اس وقت بھی زلزلہ سے ہلی ہڈی اصلی دیسی گھی کی مٹھائی بیچ رہا ہوگا گوجرانوالہ میں۔ وہ بدمعاش دانت نکالنے لگا کہ پھر تم کس کی قبر پر گئے تھے۔ اب جناب میں نے اسے غور سے دیکھا تو پہچان گیا اسے۔ صورت کی خباثت سے۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا کہ وہ میرے ماموں کی قبر تھی۔ کہنے لگا کہ سکندر بخت کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آیا؟"

میں نے اور غالب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "عجیب؟"

"پھر کیا جی۔ میں نے کہا کہ ایک تو سکندر اعظم تھا ڈھائی ہزار سال پہلے' ایک میرے ماموں کا لڑکا ہے۔ درزی کا کام کرتا ہے۔ بس جی اس نے مجھے گالی دی کہ خصی۔ مجھ سے چالاکی مت کرو ورنہ داڑھی اکھاڑ کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ غصہ تو مجھے پہلے ہی آیا تھا۔ یہ بات گولی کی طرح لگی میرے دل میں جناب اور میں نے جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کے پیٹ میں مکا ماردیا۔ جواب میں اس نے بڑا ظالم مکا مارا جی۔ آپ"

مریم نے اسے تشویش سے دیکھا "کیا داڑھ نکلوانی پڑے گی؟"

میں نے کہا "کیا چاچا پوری بتیسی مل گئی ہو۔ آج کل مصنوعی بتیسی کے بجائے اصلی لگا دیتے ہیں۔ کسی کو مسوڑے کی۔ پتا بھی نہیں چلتا۔"

"کیسے پتا نہیں چلتا' مسوڑے کو؟" غالب بولا۔

غلام حسین نے خفگی سے کہا "آپ مہمان نہ ہوتے میرے تو میں بھی آپ کو دندان شکن جواب دیتا۔ لیکن میں مجبور ہوں پوری بات سنانے پر۔"

"جیسے ہم سننے پر مجبور ہیں۔"

غالب بولا "ابھی اس کے بعد بھی کچھ ہوا تھا؟ ایک مکا کھا کے تم لیٹے نہیں تھے؟ فوت بھی نہیں ہوئے تھے' بے ہوش بھی نہیں؟"

رابعہ نے اسے ڈانٹا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ غلام حسین تم مجھے بتاؤ۔"

غلام حسین دردناک لہجے میں بولا "وہ جی ... میں بے ہوش تو نہیں ہوا تھا مگر لیٹ گیا تھا فٹ پاتھ پر آنکھیں بند کرکے۔ اور جب دیکھا کہ لوگ جمع ہوگئے ہیں اور وہ بدمعاش بھاگ گیا ہے تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی کچھ دور ہی آیا تھا کہ پیچھے سے وہ پھر آگیا۔ وہی حرام الدہر۔ کہنے لگا کہ صوفی معاف کرنا۔ غصے میں قابو نہیں رہا مگر تم کو بھی اپنی جان کا خیال رکھنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ اب کیا جان لینے آئے ہو۔ اس نے کہا کہ میں تم کو خبردار کرنے آیا تھا۔ چودھری دلاور کے بندے تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ قبرستان میں موجود تھا اور سکندر بخت کی قسمت اچھی تھی کہ آیا نہیں ورنہ ہم اسے واپس نہ جانے دیتے۔ میں تو

جناب بھونچکا رہ گیا۔ میں نے کہا کہ تم بھی ان میں شامل تھے تو پھر مجھے کیوں بتارہے ہو اور وہ کون لوگ ہیں آخر جو تمہارے ساتھ تھے۔ وہ بولا کہ نام تو کسی کا نہیں بتا سکتا ورنہ میرا نام مٹادیں گے۔ لیکن میرے ساتھ بے ایمانی کی ہے انہوں نے اس لیے میں تم کو بتا رہا ہوں۔"

"کیا بے ایمان لوگ بھی بے ایمانی کرتے ہیں؟" غالب بولا۔

"اسے کہا گیا تھا کہ بندے کو اٹھاؤ گے تو ہزار روپے ملیں گے" غلام حسین نے کہا "وہ شکایت کررہا تھا کہ بندہ ہی نہ پہنچے وہاں تو میرا کیا قصور۔ میں تو گیا تھا۔ ہزار نہ سہی پانچ سو دے دیں آخر میرا ٹائم ضائع ہوا۔ اور سارا خطرہ بھی تو میں نے ہی مول لیا تھا۔ لیکن اس کی کسی نے نہیں سنی تھی چنانچہ وہ مشتعل تھا اور بدلہ اس نے یوں لیا کہ غلام حسین کو بتادیا۔"

"کیا یہ بات باقی لوگوں کو معلوم نہیں ہوگی؟"

"باقی لوگ مظفر صاحب اور رفتار کے پیچھے گئے تھے اس امید میں کہ وہ سکندر کے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔ اللہ کا ہزار شکر ہے جی کہ وہ میرے ساتھ نہیں آئے۔ قبرستان سے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ یہ بندہ میرے پیچھے رہا۔"

"تم نے اس کا نام بھی تو پوچھا ہوگا۔"

"اس نے کہاں بتایا تھا جی۔ لیکن میں نے اس کو پانچ سو روپے دے دیے تھے" غلام حسین بولا۔

"ارے غلام۔ جی چاہتا ہے تمہارا منہ چوم لوں۔ مگر رابعہ بیٹھی ہے سامنے۔ اور مریم بھی' یہ برا مانیں گی" میں نے کہا۔

"برا تو میں زیادہ مانوں گا جی" غلام حسین اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کے بولا "وہ آپ کے ہی دیے ہوئے پیسے تھے۔"

"ہم نے کب دیے تھے؟" رابعہ بولی۔

"آپ لوگ دیتے ہی رہتے ہو جی ورنہ میری اتنی اوقات کہاں؟"

"خیر تم نے بہت اچھا کیا۔ اسے ایک مکا مار کے دانت توڑنے کا انعام پانچ سو روپے دے دیا۔"

غلام ہنسنے لگا "دوسرا مکا مارتا تو میرے پاس ہزار نہیں تھے جناب پھر تو آپ کے ہزار خرچ ہوتے بتیسی بنوانے پر۔ اور آخری رسوم پر۔"

مریم نے گھبرا کے کہا "کیا واہی تباہی بکتے جارہے ہو۔"

غلام حسین نے کہا "نیک بخت۔ بندہ کچھ بھی کہے۔ رب کی رضا کے بغیر ایک چیونٹی کی موت ممکن نہیں' یہ مذاق تھا۔"

"ایسا مذاق بھی اچھا نہیں لگتا مجھے۔"

غالب نے کہا "منحوس شکل ہو پھر بھی منحوس بات نہیں کرنی چاہیے۔"

غلام حسین گرم ہوگیا "اپنی شکل دیکھ کے بات کرنی چاہیے تری کو۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "ڈری کی بات اور ہے۔ یہ تو غالب ہے۔ خیر تم اپنی بات سناؤ۔"

"بس جی۔ وہ پانچ سو لے کے اور میرے ہاتھ چوم کے چلا گیا۔ کہہ رہا تھا کہ بزرگو' بڑی بابرکت ذات ہے آپ کی۔ گستاخی کا بھی انعام دے دیا۔ پھر بھی حاضری دوں گا۔"

غالب بولا "ابھی جب پھر پانچ سو کی ضرورت ہوگی' مکا مار کے لے جاؤں گا۔"

"مرزا جی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی ذات میں بھی شرپسندی بڑھتی جارہی ہے اور یہ سب اثر ہے مظفر صاحب کی صحبت بد کا۔"

میں نے کہا "مولوی غلام حسین۔ تمہیں یقین ہے کہ کسی نے تمہارا یہاں تک پیچھا نہیں کیا۔ لیکن مظفر سے اور رفتار یوسف سے بھی پوچھ لیجیے۔"

"میں نے پوچھ لیا جناب۔ آنے سے پہلے میں نے ان کے گھر فون کیا تھا اور انہیں یہ بات بتادی تھی۔"

غالب نے پوچھا "مولوی غلام حسین' سچ بتانا۔ مظفر نے تمہاری بات سن کے کیا کہا؟"

غلام حسین کا چہرہ سرخ ہوگیا "انہوں نے۔ انہوں نے کہا کہ تم نے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا۔"

"ایسے نہیں' ان کے الفاظ کیا تھے؟"

"اجی ان کی زبان' اللہ انہیں معاف کرے۔ میں اپنی زبان کیوں گندی کروں؟"

"تمہیں مریم کی جان کی قسم" غالب پیچھے پڑگیا۔

"یہ زیادتی ہے" غلام نے احتجاج کیا اور بے بسی سے مریم کو اور پھر رابعہ کو دیکھا "خواتین کے سامنے۔ خیر' آپ ادھر آجائیے۔"

ایک کونے میں جاکے اس نے سرگوشی میں کہا "مظفر صاحب نے کہا تھا... کہ غلام حسین' تم لونڈیا ہوتے تو میں بھی تم سے شادی کرلیتا۔ توبہ توبہ... کس قدر خرافات کا شوق ہے مظفر صاحب کی زبان اور کتنی غلاظت بھری ہوئی ہے ان کے دماغ میں۔"

رابعہ اور مریم پہلے ہی غلام حسین کی بات پر ہنس رہی تھیں۔ اب ہم نے بھی قہقہے مارے تو شرمیلا مولوی غلام حسین دوسرے کمرے میں روپوش ہوگیا۔ وہ سخت جھینپ رہا تھا۔

غلام حسین کی بات نے مجھے متفکر کردیا تھا "اس کا مطلب یہ ہوا مرزا غالب کہ اپنے چودھری دلاور نے رستے کے بعد دوسرا راؤنڈ بڑے زور شور سے شروع کیا ہے۔"

"وہ ہمارا کھیل سمجھ گیا ہوگا۔ ہم نے اس کی چال ناکام بنادی۔ اگر وہ سکندر بخت کو اٹھالیتا تو ایک تیر سے دو نہیں تین شکار کرتا۔ وہ نبی داد کو رہا کرالیتا۔ پولیس کو الزام سے بچالیتا' اپنے دشمن سے نجات پالیتا اور خود بھی الزامات سے محفوظ ہوجاتا لیکن

www.paksociety.com

اب ہمیں کسی خوش فہمی میں بالکل نہیں رہنا چاہیے۔ دشمن کے عزائم کھل کر سامنے آگئے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"نہ دشمن نیا نہ اس کے عزائم نئے۔ ہمیں نہ پہلے خوش فہمی تھی اور نہ آئندہ ہوگی" میں نے کہا۔

"منظر صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ سکندر سے کہنا کہ یہاں سے فوراً چلا جائے اور جتنا عرصہ لاہور سے دور گزار سکے گزارے۔ ہم یہاں نئی واردات کرکے اور پولیس کو مصیبت میں ڈالے رہیں گے۔" مولوی خادم حسین دوبارہ خود ادھر ہوکر بولا۔

میں نے کہا "مولوی صاحب۔ اللہ کو حاضر و ناظر جان کے ایک بات کہنا۔ کیا منظر نے یہی کہا تھا؟"

"جی... بالکل... زبان ان کی اپنی ہوتی ہے۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں۔"

"منظر نے کہا ہوگا کہ اس بھرتی والے سے کہنا کہ دفع ہوجائے اپنی شکل گم کرے... یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کیا اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اکیلا جائے' رابعہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ کہ اسے کیسے ساتھ رکھوں؟"

"آپ کیا مطلب جی؟" خادم حسین چکرا گیا۔

"مطلب یہ کہ سیکریٹری بنا کے۔ شریک سفر... گرل فرینڈ یا نصف بہتر بنا کے؟"

رابعہ اٹھ کھڑی ہوئی "بدتمیزی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔"

"یہاں کون بدتمیزی کر رہا ہے؟ غالب... میں اس کو سمجھا رہا ہوں۔"

"یار لڑکیاں شرماتی ہیں" غالب بولا "ایسی باتیں سب کے سامنے نہیں کرنی چاہئیں۔"

"کبھی تم نے رابعہ اور نازو کی باتیں سنی ہیں۔ اللہ توبہ" میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔

"اور جو باتیں خادم حسین کرتا ہے اکیلے میں۔ اس پر مزید توبہ" غالب نے بھی کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"میں ایسی کیا بات کرتا ہوں جی؟" خادم حسین گرم ہوگیا۔

غالب معصوم بن گیا "مجھے کیا معلوم۔ میں کوئی چھپ چھپ کے تمہاری باتیں سنتا ہوں' مریم سے پوچھو۔"

"پھر تم کیسے کہہ رہے تھے؟"

"میں اپنا خیال ظاہر کر رہا تھا" غالب نے کہا "تم بھی میرے بارے میں جو چاہو کہو۔"

صبح ہم نے "فرار" کی منصوبہ بندی کی۔ یہ بات یقینی تھی کہ لاہور کی پولیس زبردستی کے الزام سے خود کو بچانے کے لیے ہماری تلاش میں لاہور کا چپہ چپہ چھان مارے گی اور اپنے سارے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے پیشہ ورانہ مستعدی کا شاندار مظاہرہ کرے گی جو وہ اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ دباؤ پڑا نہ ہو یا معاوضہ بڑا نہ ہو۔

میں نے تجویز پیش کی تھی کہ رابعہ مردانہ سوٹ بوٹ پہن لے اور بالوں کو کسی طرح ٹوپی میں نہ چھپا سکے تو وہ پگڑی سر پر رکھ لے جو چنڈی سے لاہور کے سفر میں میرے سر پر تھی۔ اس نے میری تجویز کو صاف مسترد کردیا۔ پھر میں نے زنانہ لباس پہننے کی تجویز سامنے رکھی تو اس کے ساتھ غالب نے بھی مجھے سخت شرمندہ کیا کہ چھ فٹ کی لڑکی سے زیادہ میں اپنی ظاہری صفات کے باعث تیسری جنس کا نمائندہ لگوں گا۔

مسئلے کا قابل عمل حل مولوی خادم حسین نے پیش کیا کہ رابعہ برقع میں رہے اور میں دیہاتی وضع کے پھٹے پرانے کپڑے پہنوں۔ یہ کپڑے فراہم کرنے میں بھی اس نے اہم کردار ادا کیا۔ میک اپ سے سب کچھ ہوسکتا تھا مگر اس کے لیے وقت نہیں تھا۔

خادم حسین نے اپنے کمرے کی ایک الماری میں سے دھا گرا ہوا پرانا ٹین کا بکس نکالا "یہ میرا خزانہ ہے جی۔"

میں نے حیرانی سے اس زنگ خوردہ بکس کو دیکھا "کیا ہے اس میں؟"

"میرا ماضی۔ اس کو میں ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔" وہ بولا "اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ میرے والدین کی چھوڑی ہوئیں۔"

"ابھی تم نے کہا تھا... اپنے والد کے بارے میں..."

"وہ جھوٹ بولا تھا میں نے اس سے۔ میرے والد مرحوم تو بڑے درویش تھے۔ آخری عمر میں صوفی ہوگئے۔ خدا سے ایسی لو لگائی کہ اپنا ہوش نہ رہا۔ لوگ تو پاگل ہی کہتے تھے جی۔ جب شادی ہوئی تھی تو اسکول ٹیچر تھے ترقی کرتے کرتے ہیڈ ماسٹر ہوئے اور انسپکٹر اسکول بن گئے۔ پھر کسی فقیر نے کایا کلپ کردی۔ فقیروں سے ان کو بڑی عقیدت تھی۔ نوکری چھوڑ دی۔ گھر بار چھوڑ دیا۔ قبرستانوں میں رات بھر چلے کاٹتے تھے۔ تن بدن کی فکر نہ رہی۔ دیوانوں کی طرح گلیوں بازاروں میں پھرتے تھے۔ کوئی سمجھاتا تھا تو کہتے تھے کہ میرا گھر ہے دو گز زمین کے اندر۔ اسی کو تلاش کر رہا ہوں۔ زبردستی گھر لاتے تھے تو اماں سے کہتے تھے کہ میرے ساتھ رہنا ہے تو میری دنیا میں چلو۔ ویسے وہ پاگل نہیں تھے۔ ہر علمی سوال کا جواب فوراً اور بڑی معقولیت سے دیتے تھے۔ اماں کی اسی صدمے نے جان لے لی۔ وہ خود ایک رات اماں کی قبر کے سرہانے بیٹھے نظر آئے تھے۔ جھوم جھوم کے تلاوت کر رہے تھے۔ اگلے دن ایسے غائب ہوئے کہ پھر نہیں ملے۔ یہ ان کی نشانیاں ہیں جو میں نے سنبھال کے رکھی ہیں جی۔ یہ دیکھیں' یہ ہے ان کی وہ تسبیح جو اماں نے خریدی تھی۔ بس یہی پہن کے پھرتے تھے۔"

تسبیح بہت پرانی اور میلی تھی۔ اس کے تار تار میں میل اور گرد ہوگی اور پسینہ ہوگا۔ ایک دیوانے باپ کی یہ نشانی اس بیٹے نے سنبھال کے رکھی ہوئی تھی جسے ہم دیوانہ ہی سمجھتے تھے۔

... وہ قبرستان میں اماں کی قبر پر نظر آئے تھے یہی تسبیح ہاتھ میں تھی۔ صبح اسے قبر پر پھینکا گیا تھا۔ اور یہ ان کا کرتہ ہے۔ آخری عید پر پہنا تھا۔ اس ٹوپی کے ساتھ۔ یہ ان کی عینک ہے جو وہ اسکول میں استعمال کرتے تھے۔"

میں نے' غالب نے اور رابعہ نے باری باری ہر چیز کو ایسے ہاتھ میں لیا جیسے وہ مقدس چیزیں ہیں۔ کسی عجائب خانے کے نوادرات کی طرح وہ انہیں بڑے فخر اور انکسار کے ساتھ پیش کر رہا تھا اور اس کی صورت پر طمانیت بھی تھی کہ دیکھنے والے حقیقی احترام اور دلچسپی کے ساتھ اس کے تاریخی سرمائے کو دیکھ رہے ہیں۔

میں نے کہا "کتنی پرانی ہیں یہ سب چیزیں؟"

وہ سوچ کے بولا "اماں کے انتقال کو سات سال ہوگئے ہیں۔ تسبیح اس سے پہلے کی ہے۔ سال بھر والد مرحوم نے استعمال کی ہوگی کیونکہ سال بھر بعد میں اماں کی برسی والے دن ابا غائب ہوگئے تھے۔ زندگی عجیب اتفاقات کا نام ہے جناب کہ بعض اوقات سچی بات بھی افسانہ لگتی ہے۔ اب یہی دیکھیں کہ جب برسی پر میں اماں کی قبر پر گیا تو وہاں ابا بیٹھے تلاوت کر رہے تھے۔ زور زور سے۔ اور جھوم رہے تھے۔ میری طرف انہوں نے بس ایک بار دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ سال بھر بعد نظر آئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اب آگئے ہیں تو پھر کہاں جائیں گے۔ میں ان کا خیال رکھوں گا اور انہیں ساتھ لے جاؤں گا لیکن وہ اسی رات ایسے غائب ہوئے کہ صبح مجھے قبر پر یہ تسبیح ایسے نظر آئی جیسے وہ پھولوں کی چادر ڈالی گئی ہو۔ میرے لیے تو وہی ان کی تاریخ وفات ہوگئی ہے۔ پہلے امید تھی کہ شاید پھر لوٹ آئیں' اب کوئی آس نہیں۔"

رابعہ نے کہا "اور یہ کرتہ...... عینک۔"

"عینک بارہ چودہ سال پہلے کی ہے۔ کرتہ بھی تسبیح کے ساتھ کا ہے۔ آخری عید کا۔ مہینہ دو مہینہ پہن کے قبرستانوں میں چکر لگاتے رہے۔ رات رات بھر وہیں رہتے تھے۔ چلہ کاٹ کے گھر آتے تو بری حالت تھی۔ اماں نے دھوکے ڈال دیا اور دوسرا دیا۔ وہ کچھ دن بعد ایسے گئے کہ گھر کو ہی بھول گئے۔ اماں کو کہیں نظر آجاتے تھے۔ مجذوب ہوگئے تھے۔ کچھ لوگ احترام کرتے تھے۔ کچھ مذاق اڑایا کرتے تھے اور دیوانہ کہتے تھے۔ اماں کے لیے بڑے سخت دن تھے۔ وہ دمے کی مریض تھیں۔ ابا کی نوکری پنشن ملنے سے پہلے ہی ختم ہوگئی تھی۔ جو تھوڑا بہت پیسہ ملا وہ انہی پر خرچ کردیا۔ بعد میں ہم نے بڑی تنگی جھیلی۔ میرا ایک بڑا بھائی تھا۔ وہ گھر سے بھاگ گیا۔ وہ خود غرض اور بزدل تھا۔ حالات کا مقابلہ نہ کرسکا ورنہ سارا بوجھ اسی پر تھا۔"

"اب وہ کہاں ہے؟"

"سنا ہے کراچی میں کہیں اس کا بہت بڑا بزنس ہے جی لیکن اس نے لوٹ کر ہماری خبر بھی نہیں لی تو پھر ہم اس سے کیا تعلق رکھتے۔"

"اس کے علاوہ کون تھا کوئی نہیں تھا؟"

"ہاں جی۔ ایک بہن تھی' شادی ہوکے دوبئی چلی گئی تھی۔ وہاں سے آگے نکل گئی۔ شاید امریکا۔ پتا نہیں" اور جناب یہ برقع ہے میری ماں کا۔ اسی کو سر پہ ڈال کے وہ ابا کی تلاش میں یا ان کے پیچھے پیچھے پھرتی تھیں۔ میری پہلی بیوی' اللہ اسے عقل دے۔ اسے کباڑ خانہ کہہ کے میرے جذبات کو مجروح کرتی تھی۔ کہتی تھی کہ کیا قبر میں اپنے ساتھ لے جاؤ گے اماں ابا کی نشانیاں لیکن ایسا ہی خزانہ مریم کے پاس بھی ہے۔ اسے قدر ہے ان چیزوں کی۔ سارا مسئلہ جذبات کا ہے جی۔ میرے لیے تو والدین کی وہ دعائیں ہی خیر و برکت کا باعث ہیں جو خوش ہو کے ان کی خدمت کرنے والی اس سے میرا بدبخت بھائی محروم رہا۔ مجھے یاد ہے کہ قبرستان میں ابا کو دیکھ کر میں حیران ہوا تھا اور میں نے پاس جاکے سلام کیا تھا تو ایک سیکنڈ کے لیے انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں اور کہا تھا "خوش رہو۔" پھر ہاتھ اوپر اٹھایا تھا اور میں نے سر جھکایا تو اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ کے دوبارہ کہا تھا "خوش رہو" یہ ان کے آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے لیکن یہ دل سے نکلی ہوئی دعا تھی۔ کسی دیوانے کی بات نہیں تھی اور دعا نہیں تھی۔ اب یہ ساری چیزیں آپ کے کام آئیں گی۔"

میں نے چونک کے کہا "یہ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے"

"کیوں جی۔ کیوں نہیں ہوسکتا۔ آپ نے ہی سب لانے کو کہا تھا۔"

غالب نے کہا "شکریہ... بہت قیمتی چیزیں ہیں تمہارے لیے۔"

"میں نے کہا جناب۔ قیمت تو جذبات کی ہے ورنہ انہیں دس روپے میں بھی کوئی نہ لے۔ میری خواہش ہے کہ یہ آپ استعمال کریں۔ بے شک بعد میں لوٹا دیں مجھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان سے صرف آپ کی ضرورت ہی پوری نہیں ہوگی بلکہ یہ آپ کے لیے بھی موجب خیر و برکت ہوں گی۔ آپ آفات سے محفوظ رہیں گے۔ یہ سب چیزیں مجھے واپس لوٹانے کے لیے لوٹ کر آئیں گے۔"

اس کے جذبات کی منطق کا جواب کوئی نہیں تھا۔ اسے انکار کرنا بھی مشکل تھا اور ان چیزوں کو استعمال کرتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے ہم کوئی جرم کر رہے ہیں۔ عجائب خانے کے نوادرات حفاظت کے لیے ہوتے ہیں' استعمال کے لیے نہیں۔ اگر میوزیم کا ڈائریکٹر یا کیوریٹر وہاں سے تاریخی تحفے لے جاکے اپنے ڈرائنگ روم میں آرائش کے لیے سجا دے تو وہ مجرم کہلائے گا۔

مولوی خادم حسین نے مریم سے کہا "تم بھی دکھاؤ نا اپنا خزانہ..."

وہ کچھ خفیف ہوئی "کیا ہے اس خزانے میں؟"

میں نے کہا "تمہارے جذبات ہوں گے تمہارے ماضی کے رشتے ہوں گے۔"

"صرف دکھ ہیں میرے ماضی میں... سارے رشتے دکھوں کے

www.paksociety.com

رشتے ہیں۔ انہیں دیکھ کے کیا کریں گے آپ؟" وہ بولی۔

لیکن پھر ہمارے اصرار پر ایک بیگ لے آئی۔ اس کے ماں باپ کرسچین تھے۔ باپ سیالکوٹ کی سڑکوں پر جھاڑو دیتا تھا اور کمیٹی میں اس کا نام خاکروب کی حیثیت سے لکھا ہوا تھا۔ ماں بھی یہی کام کرتی تھی۔ بعد کے حالات کا ہمیں علم تھا۔ اس کے پاس ماں کی ایک صلیب تھی جو خاندانی تھی۔ اسے اپنی ماں سے ملی تھی۔ سب سے عجیب چیز چند تنکے تھے جو مریم نے شفاف پلاسٹک کی ایک تھیلی میں محفوظ کر رکھے تھے۔ یہ اس جھاڑو کے تنکے تھے جو اس کے باپ کو کارپوریشن نے دی تھی۔ جس سے وہ شہر کی سڑکیں صاف رکھتا تھا اور خود اتنا گندا رہتا تھا کہ لوگ اس کے وجود سے گھن کھاتے تھے۔ وہ شودروں کی طرح تھے۔ انہیں کسی گھر سے چائے ملتی تھی تو وہ ٹوٹا ہوا مگ الگ پڑا رہتا تھا۔ ان کو پیاس لگتی تھی تو نیک دل لوگ لوٹے کی دھار ان کے ہاتھوں کی اوک میں ڈالتے تھے اور وہ پانی پی لیتے تھے تو لوٹے کو بھی دھو کے پاک کیا جاتا تھا۔

"آج آپ لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے میں سوچتی ہوں کہ خدا نے مجھے کتنی عزت دی۔ اتنے بڑے اور مشہور لوگ ہیں آپ سب۔ آپ سب کے خاندان اور گھرانے بڑے ہیں۔ نام بڑے ہیں۔ سب دولت مند ہیں۔ آپ نے مجھے اپنالیا۔ اپنے جیسا سمجھ لیا۔" وہ رونے لگی۔

میں نے کہا "بے وقوف لڑکی۔ جب رونے کا وقت تھا تو بہادری سے مقابلہ کیا حالات کا۔ اب یہ آنسو کیسے؟"

"یہ دکھ کے نہیں۔ خوشی کے آنسو ہیں۔"

میں اور رابعہ کراچی کے لئے روانہ ہوئے تو غالب نے ہمارے ساتھ جانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ لاہور میں ہی رہے گا اور ہفتہ دس دن آرام سے آفس میں ہی چھپا رہے گا۔ ہم نے اس کی بات مان لی۔

ناشتے کے بعد میں نے اور رابعہ نے اپنا حلیہ بدلا۔ ہم نے اپنے کپڑے اور سامانِ سفر کو سوٹ کیس سے ٹین کے اس پرانے صندوق میں منتقل کیا جو مولوی خادم حسین نے خالی کردیا تھا۔ مریم نے ہمیں راستے میں کھانے کے لیے قیمہ بھرے پراٹھوں کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ پھر خادم حسین ٹیکسی لینے چلا گیا اور ہم چند قدم چل کے گلی کے موڑ تک گئے۔ خادم حسین ہمیں ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے کا آرزومند تھا مگر ہم نے اسے روک دیا۔ اس حلیے میں ہماری شناخت کا امکان کم تھا لیکن ہمارے ساتھ کوئی دوست نظر آجاتا تو سب چوکنے ہوجاتے۔

تھرڈ کلاس کے مسافرخانے میں گھمسان کی جنگ لڑ کے میں نے کراچی کا ٹکٹ حاصل کیا اور پھر ایک قلی کو دس روپے دے کر اوپر والی دو برتھوں کی غیر قانونی ریزرویشن بھی حاصل کرلی۔ وہ ہمیں واشنگ لائن تک لے گیا اور وہاں ایک ڈبے میں سوار کرادیا۔ ہم اوپر جاکے لیٹ گئے۔ قبضہ رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ٹرین کے روانہ ہونے تک ہم جگہ نہ چھوڑیں۔

ٹرین کے روانہ ہونے میں ابھی پورا ایک گھنٹا تھا۔ ریلوے پولیس قلیوں کے ساتھ مل کے ہر ڈبے میں ہم جیسے مسافروں کو جگہ دلانے میں بڑی مستعد تھی۔ یہ سب خاص بندے تھے چنانچہ وہاں کسی نے بھی ہماری صورت پر غور نہیں کیا تھا تاہم دو پولیس والوں کی گفتگو سے میں نے اندازہ کرلیا کہ ریلوے اسٹیشن پر چیکنگ ہورہی ہے اور سی آئی ڈی والے دو بندے تلاش کررہے ہیں۔

جب ڈبے ٹرین میں جوڑے گئے اور ٹرین روانگی کے لیے پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہمیں تلاش کرنے والے کتنے مستعد ہیں۔ وہ ہر برتھ کے ہر مسافر کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ یہ سادہ کپڑوں والے ہر قلی سے بھی پوچھ گچھ کررہے تھے اور ہمارا حلیہ بیان کرکے یہ معلوم کرتے تھے کہ ان میں سے کسی نے ہمیں دیکھا ہو تو بتادے۔ ظاہر ہے وہ انکار کردیتے تھے۔ قلی جیسا معمولی حیثیت کا آدمی پولیس سے تعاون کی غلطی کرے تو اسے گواہی پیشی اور عدالتی کارروائی اور تھانے میں تفتیش کے سارے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ وقت، جان کے زیاں سے سب ڈرتے ہیں۔

حلیے اور لباس سے میں ایک عام غریب آدمی نظر آتا تھا۔ صرف رابعہ کا حسن آب و تاب سے دمکتا چہرہ کسی کو متوجہ اور دوبارہ نظر بھر کے دیکھنے پر مجبور کرسکتا تھا اور یہ بات میں نے اسے سمجھادی تھی۔ اس نے ٹرین میں بیٹھنے کے بعد نقاب اٹھایا تھا تو چہرہ دوسری طرف کرکے بیٹھی تھی۔

اوپر والی برتھ نسبتاً کم اجالے میں تھی۔ میں اسی سمت میں سر کیے لیٹا ہوا تھا جہاں سے میں آنے جانے والوں کو دیکھ سکتا تھا۔ اخبار کا مطالعہ بھی ایک غلطی ثابت ہوسکتا تھا چنانچہ میں نے ریلوے بک اسٹال سے ہیر وارث شاہ کا سستا سا ایڈیشن خرید لیا تھا اور اسے اپنی بے سُری آواز میں لہک لہک کر گاتے ہوئے رابعہ کو سنا رہا تھا۔ بالآخر برتھ کی مشترک دیوار کے دوسری طرف سے کسی نے مجھے ڈانٹ کے کہا "اوئے کیا ابھی سے ریڈیو اسٹیشن چلادیا ہے۔ اتنی اونچی آواز میں" اور دوسرے نے اس کی حمایت میں بیان دیا کہ ایسے تو سامعین منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی بہرے یا پاگل ہوجائیں گے تو میں نے آواز بہت کم کردی۔ پھر مجھے وہ پولیس والے نظر آئے جو ہر سیٹ کے مسافروں کو بیزاری سے ڈیوٹی پوری کرنے کے لیے دیکھتے جارہے تھے۔ میں نے ان کے قریب آنے پر آواز بڑھادی اور رابعہ کو مخاطب کرکے کہا "سُن بھلی لوکے وارث شاہ کی آکھدا ہے" ایک پولیس مین نے گزرتے ہوئے کہا "اوئے میراثی دے پتر۔ ہوراں دا وی خیال کر۔" تو میں نے گانا بند کردیا۔ قانون کے احترام کے اس مظاہرے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ مجھ پر دوسری نگاہ ڈالے بغیر گزر گئے۔ ان میں سے کسی نے میرے چہرے پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ میرے سامنے کتاب تھی اور انہوں نے صرف میرا سائیڈ پوز دیکھا تھا۔

ٹرین روانہ ہونے ہی والی تھی کہ سادہ کپڑوں میں دو خطرناک چہروں والے ڈبے میں داخل ہوئے۔ وہ خفیہ پولیس والے تھے مگر ان کی کوئی ادا خفیہ نہ تھی۔ ان کا چہرہ، ان کے تیور، انداز و اطوار سب ان کے پولیس مین ہونے کی گواہی دیتے تھے۔ میں نے پھر ہیر وارث شاہ شروع کی اور جب وہ قریب آگئے تو رابعہ نے میری ہدایات کے مطابق جھگڑا شروع کردیا کہ دماغ خراب کردیا ہے۔ جب گانا نہیں آتا تو چُپ کرکے بیٹھو۔"

میں نے کہا "تجھے تو میرے مقابلے میں کوے کی آواز اچھی لگتی ہے۔"

"ہوتی ہے اچھی" اس نے کہا۔

میں نے گرم ہوکے کہا "اور جو مجھ سے فرمائش کرکے سنتے ہیں۔ گاؤں کے مولوی صاحب اور ملک صاحب کیا وہ پاگل ہیں؟"

"وہ تمہیں پاگل بناتے ہیں۔ تم سمجھنے لگے ہو خود کو عنایت حسین بھٹی۔ کام کرتے ہو جوتے بیچنے کا۔ اس کا بھی بھٹا بٹھادیا ہے۔"

لوگ ہنسنے لگے۔ خفیہ پولیس والے گزر گئے تھے لیکن ٹرین چل پڑی تو وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ "چھاؤنی پر اتر جائیں گے" ان میں سے ایک نے کہا "ادھر تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"ہم ایسے ہی کھجل خوار ... ہورہے ہیں۔ وہ کیا ابھی تک ادھر بیٹھے ہوں گے" دوسرے نے بیزاری سے کہا "لا سگرٹ دے۔"

"افسروں کو سمجھا یہ بات۔ ان کا آرڈر ہے کہ ہر ٹرین میں دیکھو۔ سوچنے کی بات ہے کہ مجرم کیا ٹرین سے سفر کرتے ہیں اور پھر ایسے مجرم۔"

"ہاں۔ وہ شوں کرکے جہاز سے اُڑ گئے ہوں گے اور اس وقت بیٹھے ہوں گے ولایت میں۔"

ایک دلیر مسافر نے دخل در معقولات کرتے ہوئے تجسس کا اظہار کیا اور مذکورہ مطلوبان کے بارے میں پوچھا۔ لاہور کینٹ تک ٹرین دس منٹ میں پہنچی۔ اتنی دیر میں پولیس مین نے زیبِ داستان کے لیے کچھ بڑھا کے ہی سنادیا۔ اس نے کہا کہ ایک عورت ہے جو بہت بڑی وکیل اور بہت سوہنی ہے اور اس کا یار ہے بہت بڑا ڈاکو۔ کہتے ہیں اس کی ضمانت کا مقدمہ لڑتے لڑتے آنکھ لڑ گئی اور اس نے اپنے یار کو جیل سے فرار کرادیا۔ ہوگی جیل سے بھی یاری۔

مجھے پولیس کی کم علمی پر افسوس نہ ہوتا۔ ان کی غلط بیانی اور غیر ذمے دارانہ رویے پر افسوس ہوا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ ہمیں تفصیلات کا علم نہیں۔ ہم صرف اس حلیے کے ایک مرد اور ایک عورت کو تلاش کررہے ہیں لیکن انہوں نے عام لوگوں کو ایک سنسنی خیز کہانی صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے سنادی کہ وہ کتنے باخبر ہیں۔ بعد میں اس خبر پر جو تبصرے ہوئے وہ بھی مبنی بر جہالت تھے۔ دو عمر رسیدہ افراد نے اپنا زمانہ یاد کیا اور اس واقعے کو قربِ قیامت کی نشانی قرار دیا اور نوجوان ان کا تمسخر اڑانے لگے۔

"بابا جی۔ آپ کے زمانے میں کوئی محبت نہیں کرتا تھا؟"

بابے نے کہا "یہ کوئی محبت ہے۔ کدھر ایک وکیل کدھر ڈاکو۔"

دوسرے لڑکے نے کہا "عشق نہ پچھے ذات۔ بابا جی آپ جوان تھے تو صورت دیکھ کے مرتے تھے یا پہلے ڈگری دیکھتے تھے اور خاندان کا پیشہ۔"

پہلے لڑکے نے کہا "اس زمانے میں کوئی لڑکی گھر سے نہیں بھاگتی تھی؟"

"توبہ کرو۔" بابے نے کہا۔

"تو پھر یہ قصے کیسے بن گئے... ہیر رانجھا سسی پنوں اور سوہنی مہینوال کے۔ تھیٹر میں جو ڈرامے ہوتے تھے ان میں کیا درس دیتے تھے؟ ہیرو ہیروئن نہیں ہوتے تھے۔ داڑھی والے مذہبی مسئلے بیان کرتے تھے۔"

لڑکے قہقہہ مار کے ہنسے اور بابے گرم ہوگئے "یہ اپنے باپ سے پوچھنا۔ بے غیرت..."

"میرا باپ تو تمہیں بتاتا اسی طرح گری کہاتا ہے۔"

"میرے باپ نے تو خود یہی کیا تھا۔ میری ماں کو لے کر دوڑ گیا تھا گاؤں سے۔ بعد میں دھکے کھائے تھے اور واپس آکے جوتے بھی۔ لیکن پھر سب ٹھیک ہوگیا تھا۔ کوئی قیامت نہیں آئی تھی۔"

دوسرے بابے نے براہِ راست حملہ کیا "پتر آج تیری بہن کو لے جائے کوئی پھر میں پوچھوں گا۔"

وہ پھر ہنس پڑا "میری بہن ہی نہیں تو لے جانے کا سوال..."

اب دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے۔ اوپر میں اور رابعہ بھی مسکراتے ہوئے سب سُن رہے تھے۔ موضوعِ سخن ہم سے آغاز ہوا تھا مگر موضوع انتہائی پرانا تھا جتنی انسانیت کی تاریخ۔ اس تاریخ کی ابتدا محبت تھی۔ پہلی کہانی کا حرفِ اول محبت تھا۔ آج بھی نہ محبت کا انداز بدلا تھا نہ محبت کرنے والوں کے جذبات بدلے تھے۔ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد۔ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا۔ غالب کو ڈر تھا کہ کل کہیں وہ عشق میں مجنوں نہ ہوجائیں۔ پھر آج پتھر اٹھانے والے کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی تو گنہگار ہیں۔

چھاؤنی کے اسٹیشن پر ٹرین کا اسٹاپ پانچ منٹ کا تھا۔ پولیس والے اتر گئے۔ نئی اور پرانی نسل کے درمیان جنریشن گیپ کا مسئلہ بھی کچھ کم ہوگیا اور جب نوجوانوں نے بزرگوں کی خدمت گزاری میں مستعدی کا مظاہرہ کیا تو قربِ قیامت کی نشانیاں بھی نہ رہیں۔

میں نے رابعہ سے کہا کہ اب چاند کو بدلی سے نکل آنا چاہیے۔ میں نے عینک اتاری اور اس نے برقع اتار کے رکھ دیا۔

"کیسا اُجالا ہوگیا ہے اچانک" میں نے آنکھیں مل کے کہا۔

"عینک کے شیشے سیاہ تو نہیں تھے" رابعہ مسکرائی۔

میں نے کہا "اس سے تو بقول شاعر۔ دنیا کا ہر اک نقشہ اُلٹا نظر آتا ہے۔ مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے۔ روشنی تمہارے

www.paksociety.com

آفتاب حسن کے طلوع ہونے سے پہلے کی ہے۔"

"کبھی آفتاب حسن کہتے ہو کبھی چاند" رابعہ ہنسی "طے کرلو ایک بار اور پھر بتاؤ۔"

"دراصل مجھے دونوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ سورج اور چاند دونوں میں سے کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے" میں نے کہا۔

"ڈاکو ہو کے ایسی گفتگو کرتے ہو" رابعہ بولی۔

"ڈاکو کا پچھا۔ کیسی روانی سے ایک اسٹوری سنا گیا۔ وہ خاک ڈاکو ہوا جس کو ایک وکیل اور وہ بھی عورت جیل پر ڈاکا ڈال کے نکال لے گئی۔"

"فلمی کہانی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "کل ہم گھر سے نہیں نکلے بہت اچھا کیا۔ آج تو تیسرا دن ہے بات مجھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ ہر شخص جو ہمیں تلاش کرتا پھر رہا ہے کسی کو کچھ بتا ہو گا کسی کو کچھ۔ اور آگے پھیلانے والے کی مرضی۔ رنگی کو نارنگی کہیں اور بیٹھے دودھ کو کھویا۔ عاشق کو ڈاکو کہیں دیکھ کیسر خان سوار۔"

"حلیہ سب کے ذہن میں بالکل ٹھیک ہے۔ پولیس پر جھوٹا الزام آیا ہے تو اب اپنی عزت بچانے کے لیے بھاگے پھر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "دلاور سمجھ جائے گا کہ ہم نے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک دی اور خود نکل گئے۔ وہ بہت تلملائے گا کہ اس نے جو وار کیا تھا الٹا خود اس کا نشانہ بن گیا۔ BOOMIRANG کی طرح وہ اپنی سازش کے ہتھیار سے خود شکار ہو گیا۔ نیا دار کا سیاسی مستقبل تباہ ہو گیا تو وہ دلاور کو تباہ کر دے گا۔"

"دلاور اس کا بھی بدلہ لے گا۔ پولیس تھک ہار کے بیٹھ جائے گی مگر دلاور ہار ماننے والوں میں نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کراچی میں ہمارے پیچھے لگا رہے۔ اسے معلوم ہے کہ لاہور کے بعد ہمارا کوئی ٹھکانا ہے تو کراچی۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا "تمہاری بات میں تھوڑی بہت گہرائی ضرور ہے۔ اتفاق سے تم عقلمندی کی بات بھی کر جاتی ہو۔ اس پر میں کھلے دل سے غور کروں گا۔"

"ہم کراچی میں بھی غیر محفوظ ہوں گے کیا یہ غلط ہے؟"

"ہم ماؤنٹ ایورسٹ پر بھی غیر محفوظ ہوں گے۔ پیر پھسل جانے کا ڈر ہو گا اور یہ خطرہ بھی کہ کہیں ہم سے پہلے دلاور وہاں نہ پہنچ جائے ہمارے قاتلانہ استقبال کے لیے۔ اس لیے ڈرنا چھوڑ دو وکیل صاحبہ۔"

"میں اب وکیل نہیں رہی، وکالت چھوڑ دی میں نے۔"

"پھر اب کیا کرو گی؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا "بے روزگار رہو گی۔"

"صرف محبت۔ یہ وکالت اور محبت ایک ساتھ چلانا میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا فیصلہ ہے۔ بعد میں گھر بھی چلانا پڑا تو ناممکن حد تک ناممکن ہو جائے گا۔"

"وکالت فل ٹائم جاب ہے۔ پوری توجہ مانگتی ہے۔"

"محبت بھی فل ٹائم جاب ہے۔" میں نے کہا۔

"پوری توجہ نہ دینے سے پریکٹس نہیں چلتی۔ گڈول ختم ہو جاتی ہے۔ یہ تو وقار یوسف کی شرافت اور وفاداری ہے کہ وہ کمپنی چلا رہا ہے اور اسی طرح کام کر رہا ہے۔ مجھے اب کون کا تخت بچھانا ہے۔ مدت سے نہ میں نے کوئی کیس لیا، نہ مقدمہ لڑا، نہ کسی عدالت میں پیش ہوئی کسی کی طرف سے۔ گڈول اب وقار یوسف کی بن رہی ہے۔ مؤکل اسے جانتے ہیں۔ وہ چاہے تو آج الگ ہو جائے اور اپنی دکان چلائے۔ میرا کام تمام منظر سینئر ہے اس لیے تھوڑی سی راہنمائی کر دیتا ہے مگر اب وقار یوسف کا تجربہ اتنا ہے کہ اسے کسی کی راہنمائی کی ضرورت نہیں۔"

"مخلص آدمی...... دوستی نبھا رہا ہے۔"

"کب تک نبھائے گا دوستی۔ ہر وکیل اپنی ساکھ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کامیابی ساکھ سے ملتی ہے اور پیسہ بھی ساکھ سے آتا ہے۔ بڑے مؤکل متوجہ ہوتے ہیں تو بڑی فیس ملتی ہے اور بڑے مقدمات سے بڑی پبلسٹی ملتی ہے۔ اسے فی الحال کچھ بھی نہیں مل رہا ہے۔ جب اس نے وکالت شروع کی تھی تو اس کے پیش نظر ہرگز یہ مقصد نہیں ہو گا کہ ساری عمر کسی فرم میں اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتا رہے اور خود اس کا نام نہ ہو۔ جیسے کسی کو اسے ضرورت نہیں۔ اس کی بیوی کے پاس بہت پیسہ ہے مگر کیا کوئی مرد بیوی کے پیسے کو اپنا سمجھتا ہے؟ اور یہ نہیں چاہتا کہ وہ خود بیوی سے زیادہ دولت مند ہو؟"

"میں تمہاری رائے سے سو فیصد متفق ہوں مگر یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم میری خاطر اپنی برسوں کی ساکھ کو قربان کرو۔ آخر تمہاری بھی ایک شناخت ہے۔ تم کو صرف مسز سکندر بخت بنا کے مجھے شرمندگی ہو گی۔ اپنی خود غرضی پر۔ تم کوئی عام عورت نہیں ہو۔"

"عورت صرف عورت ہوتی ہے۔ عام یا خاص نہیں۔ بہت کرلی پریکٹس اور بہت نام اور پیسہ کما لیا۔ اب میں صرف مسز سکندر بخت بن کے گھر میں رہنا چاہتی ہوں۔ صرف محبت کرنا چاہتی ہوں، تم سے، اپنے گھر سے۔"

"اور اپنے بچوں سے......" میں نے اس کے دل کی وہ بات کہہ دی جو اس کے لبوں تک نہیں آئی تھی۔

"میرے لیے سکون، راحت اور خوشی اسی میں ہے۔"

"لیکن اس معزز پیشے سے مکمل دستبرداری بھی ضروری نہیں۔ گھر شوہر اور بچوں سے محبت کی راہ میں وکالت کہاں سے حائل ہوتی ہے۔ گھر میں ذکر چاکر سب ہوں گے۔"

"ابھی تم نے کہا تھا کہ محبت فل ٹائم جاب ہے۔ کہا تھا نا۔ محبت کے لیے اس عورت کے پاس کہاں وقت ہو گا جو صبح ہوتے ہی کورٹ چلی جائے وہاں دماغ سوزی کر کے مشکل سے اپنے چیمبر میں پہنچ کے لنچ کرے اور پھر اگلے دن کے کیس دیکھے۔ مؤکلوں سے معاملات طے کرے۔ اپیلیں تیار کرے۔ پی ایل ڈی اور دنیا بھر کی اعلیٰ عدالتوں کے فیصلے کھنگالے اور پھر رات کو تھکی ہاری گھر پہنچے کتنا وقت ہو گا اس کے پاس بچوں کے لیے اور شوہر کے لیے۔ کتنی دیر ان سے باتیں کر سکتی ہے وہ؟ اسے تو پھر صبح کی فکر لاحق ہو گی۔ اس کے لیے سیر و تفریح جیسی مذاق سب ناممکن ہو گا۔ اسے خاک علم ہو گا کہ بچے کیا پڑھ رہے ہیں اور ان کی تعلیمی حالت کیسی ہے۔ ان کی تربیت کون کرے گا جب ماں سارا دن گھر سے باہر گزارے گی۔ اور پھر شوہر صاحب، ابھی معاملہ مختلف ہے بعد میں انہی کا منہ سوجا ہوا نظر آئے گا کہ ہمیں تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ "تم عجیب چیز ہو۔ بہت دور کا سوچا ہے تم نے۔ اور میں مانتا ہوں کہ بالکل ٹھیک سوچا ہے۔ تمہاری کسی بات سے اختلاف کیا ہی نہیں جا سکتا۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں بہت خوش قسمت ہوں۔ شاید دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی کہ دنیا میں رابعہ ایک ہی تھی اور وہ مجھے مل گئی۔"

"یہ تم پہلے بھی کہہ چکے ہو۔"

"سچ میں جب بھی بولوں گا ایک ہی ہو گا۔ اس میں غلط کیا ہے۔ تم جتنی دیکھنے میں خوب صورت ہو اس سے کہیں زیادہ تمہاری خوب صورتی ایک احساس ہے۔ ایک طاقت ہے جس نے مجھے تسخیر کر لیا ہے۔"

"باتیں... باتیں... باتیں... کب سے سن رہی ہوں میں تمہاری باتیں اور کھنچی جا رہی ہوں۔"

میں نے کہا "کیا تمہیں اعتبار نہیں رہا باتوں پر؟"

"اعتبار نہ ہوتا تو میں تمہیں چھوڑ دیتی، وکالت نہ چھوڑتی۔"

"تمہارا مطلب ہے۔ میرا کل کچھ نہیں۔ تم تنگ آ گئی ہو انتظار سے؟"

"نہیں۔ یہ بات بھی نہیں۔ بڑا حوصلہ ہے مجھ میں صبر کا اور انتظار کا۔ لیکن ایک وقت تمہارے ساتھ اور تم سے دور رہنا اب ناممکن ہو گیا تھا۔ میں اب تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔ جہاں تم جاؤ گے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ ہر وقت، ہر جگہ۔"

"اگر میں جیل گیا؟"

"تو میں بھی جیل پہنچ جاؤں گی۔"

میں نے ہنس کے کہا "جیل میں تم میرے ساتھ نہیں رہو گی۔ مردانہ زنانہ جیلیں الگ ہوتی ہیں۔"

رابعہ نے خفت سے کہا "میرا مطلب تھا۔ تم سے ملنے اب یہ مت کہنا کہ میں تختہ دار پر پہنچ گیا پھر۔ یہ ناممکن ہے میرے جیتے جی۔ اس سے پہلے ہی میں مر جاؤں گی۔ مار ڈالوں گی تمہارے ایک دشمن کو۔"

میں نے کہا "آج تم خطرناک حد تک جذباتی ہو رہی ہو۔"

"میں نے اپنی کشتیاں جلا دی ہیں سکندر......"

میں نے گھبرا کے کہا "خدا کے لیے نام تو مت لو میرا۔ مانا کہ ٹرین کے شور میں ہماری باتیں کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکی ہوں گی لیکن نام تو کوئی بھی سن سکتا ہے اور یاد رکھ سکتا ہے۔ ویسے بھی اب تم نے وکیل کے بجائے ایک مشرقی گھریلو بیوی کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو فی الحال 'ابّی' 'ابّی' کہتی ہیں۔ ایسے کام چلاؤ۔ بعد میں بچے کے ابا وغیرہ کہہ کے بلا سکتی ہو۔ نام لینا تو سخت بے شرمی کی بات ہے۔ بڑی بوڑھیاں تو کہتی تھیں کہ اس سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔"

رابعہ نے آنکھیں کھول کے کہا "معاف کرنا۔ مجھے ذرا جھپکی آ گئی تھی تم کچھ کہہ رہے تھے؟"

میں نے کہا "بالکل نہیں۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔"

کراچی تک کا سفر بڑا سخت مرحلہ تھا۔ گرمی گھٹن اور بو سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا اور مسافر تھے کہ مسلسل یلغار کر رہے تھے۔ رات تک فرش کے ایک ایک انچ پر دیہاتی عورتیں اور مرد اور بچے قابض ہو گئے تھے اور انہوں نے باہر نکلنے یا باتھ روم تک جانے کے راستے بھی بند کر لیے تھے۔ کچھ نوجوان دروازے میں اور درمیانی کاریڈور میں بھی کھڑے سگریٹ پی رہے تھے اور ہم سونے سے پہلے آخری بار باتھ روم ہو کے آئے تو مجھے اپنی برتھ پر ایک شخص قابض نظر آیا۔ شرافت اور مروت کے اصول ایسے سفر میں کام نہیں آتے۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور سیٹ خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ "تو نے ریزرو کرائی ہے برتھ؟"

میں نے اسے وارننگ دی "ریزرو تو نے بھی نہیں کرائی مگر ہم لاہور سے آ رہے ہیں۔ رشوت دے کے جگہ لی تھی۔ اب تو میری بیوی کی جگہ خالی کرتا ہے یا میں تجھے نیچے گراؤں۔"

اس نے حسب توقع انکار کیا "ہمت ہے تو......"

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کے ایک جھٹکا دیا اور وہ ہاتھ پیر سنبھال کے دوسری خالی برتھ پر چھینک دیا۔ اس کی مزاحمت رائیگاں گئی اور وہ دوسری برتھ پر گرنے کے بعد شاید کچھ دیر غور کرتا رہا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ اس کا سر بھی تختے سے ٹکرایا تھا اور اسے کافی چوٹ آئی تھی۔

"چلو بھئی جگہ بناؤ۔ بعد میں مت کہنا بندہ گر گیا تھا ہمارے اوپر" میں نے اکڑوں بیٹھے ہوئے اور فرش پر نیم دراز لوگوں سے کہا "چلو ہٹ جاؤ سارے۔"

لیکن میرے مزید کچھ کرنے سے پہلے ہی برتھ پر لیٹا ہوا شخص اٹھ بیٹھا "او یار۔ بڑا غصہ ہے تیرا۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔" اس نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا اور نیچے اتر گیا۔

رابعہ نے اوپر قدم رنجہ فرماتے ہی مجھے ڈانٹا "تم باز نہیں

www.paksociety.com

آگے ہر جگہ وہ تعاقب کرتا ہے؟"

میں نے کہا "بکواس بند۔ ہم ایک سیٹ پر نہیں سو سکتے۔ ہم میں سے کوئی نیچے رات بھر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے نیچے۔ اس نے مجبور کر دیا تھا مجھے اور روپے بھی اس کلاس میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ کوئی مجھے غلط نہیں سمجھ رہا ہے۔ چلو اب سو جاؤ۔"

"اس تختے پر تو مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

"اچھا تو پھر شب بخیر" میں نے کہنی سر کے نیچے رکھی اور سو گیا۔

کراچی تک سفر میں خیر و عافیت رہی۔ ریلوے کی شاندار روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ٹرین ڈھائی گھنٹے کی تاخیر سے کراچی کینٹ ریلوے اسٹیشن پہنچی تو تھکن سے ہمارا حال خراب تھا۔ رات سندھ کے میدانوں اور ریگ زاروں میں گزری تھی اور ہر مسافر کی طرح ہمارے چہرے اور بال گرد و غبار سے خاکستری ہو چکے تھے۔ ہمارے ٹین کے ٹرنک اور بکس کو اٹھانے میں کسی قلی نے دلچسپی کا اظہار تک نہیں کیا۔

رابعہ پھر قدیم خیمہ نما برقع میں روپوش ہو گئی تو میں نے بکس کو سر پر اٹھا لیا۔ رابعہ نے بہت برا مانا "یہ کیا طریقہ ہے؟"

میں نے کہا "یہی ایک طریقہ ہے اسے اٹھانے کا۔ اس میں جنجال نہیں ہے۔"

"لاہور میں تو تھا۔"

"ہاں مگر وہ کراچی میں داغ مفارقت دے گیا اور اس وقت میری جیب میں ہے۔ تم فرض کر لو کہ تمہارا سامان ایک قلی نے اٹھا رکھا ہے اور تم ابھی ابھی فرسٹ کلاس اے سی سلیپر سے اتری ہو۔ یہ ٹین کا صندوق نہیں ہے، سیمسونائٹ کا اسپورٹ سوٹ کیس ہے، ایسے تصورات سے تمہارا دل خوش رہے گا۔ میری طرف مت دیکھو۔"

وہ میرے پیچھے چلتی آ رہی تھی۔ ہم نے ریلوے لائنوں کے اوپر سے پل کو عبور کیا اور مسافروں، ان کو وصول کرنے والوں اور قلیوں کے بے ہنگام ہجوم میں دھکے کھاتے باہر جانے والے گیٹ کی طرف بڑھے۔ نہ جانے کب رابعہ بہت پیچھے رہ گئی اور میرے پیچھے دوسری عورت آ گئی۔

میں نے پلٹ کے کہا "جیسی میرے پیچھے لگی رہو ملا کی طرح۔ چہرے سے نقاب اٹھا کے لائٹ مت مارنا۔"

عورت نے چلا کے کہا "ہائے ہائے گندڑے آیا۔ دیکھو اسے مینوں آکھدا اے کہ میرے نال چل۔"

گندو کا ابا بھی رابعہ کی طرح کہیں پیچھے رہ گیا تھا چنانچہ اس نے اپنی مدد کی فریاد نہیں کی۔ میں نے گھبرا کے کہا "معاف کرنا بہن۔ میری گھر والی میرے ساتھ تھی۔ کہیں پیچھے رہ گئی" اور وہیں رک گیا اور رابعہ ٹاپ برقع والی عورت کو ہجوم کے باعث ڈھکے

بڑھتا پڑا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ ایک مونچھوں والے شخص کو گھور رہی ہے۔ وہ شخص صرف پلٹ کر دیکھ سکتا تھا۔ ہجوم کے مخالف ریلے کو چیر کر مجھ سے لڑنے نہیں آ سکتا تھا۔

رابعہ نے کہا "چلو نا۔ یہاں کیوں کھڑے ہو تماشا بنے۔"

میں نے کہا "تماشا تو ہوتے ہوتے رہ گیا ورنہ تم کو میری سربام رسوائی کا دلچسپ منظر بجلی بادل بجنے کا موقع ملتا۔"

"کیا ہوا تھا۔ پھر کوئی حرکت کی تھی۔"

"حرکت تو تم بھی کر رہی ہو۔ کون ہے جو حرکت میں نہیں ہے مگر میں نے ایک بہت بری بات کی تھی۔ میں نے ایک شخص کی تم سے بھی زیادہ حسین بیوی کو ورغلانے کے لیے اس سے کہا تھا کہ میرے ساتھ چلو۔ اس نے اتنی اچھی پیشکش کو مسترد کر دیا اور شور مچا دیا۔ اس کا برقع بالکل ایسا ہی تھا۔"

رابعہ برقع کے اندر گڑگڑائی "پھر اس کا دیدارِ حسن کیسے کر لیا؟"

"چشم تصور سے اور کیسے؟" میں نے ڈانٹ کے کہا "اور تم کس کے ساتھ چل پڑی تھیں ساتھ چھوڑ کے۔ تمہارے ساتھ وہ مہندی رنگ کی داڑھی والا کون تھا؟"

باہر نکل کے میں نے سکون کا سانس لیا اور ٹین کے صندوق کو نیچے رکھ دیا۔ ریلوے اسٹیشن پر پولیس بھی بہت تھی اور رش بھی کم نہیں تھا۔ اگر یہاں بھی کوئی ہمیں تلاش کرنے والا موجود تھا تو پھر کلاس مسافروں کے ہجوم کی یلغار میں ہمیں آسانی سے شناخت نہیں کر سکتا تھا تاہم بہت کچھ قسمت کی بات تھی۔ اگر ہم لاہور میں پکڑے جاتے تو۔ اترنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ والا شعر صادق آتا اور کراچی میں ... دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا۔ والا۔

"تمہیں معلوم ہے اب میں کیا سوال کرنے والا ہوں؟" میں نے کہا۔

رابعہ بولی "ہاں۔ یہی کہ اب ہم کہاں جائیں۔"

"یہاں سے کہاں جائیں گے۔ آگے سمندر ہے۔ میں سوال یہ کرنے والا تھا کہ کیا مجھے برقع کے اندر گھسنے کی اجازت ہے؟ یعنی کس..."

"بکواس مت۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"یعنی یہ انگریزی کا KISS نہیں تھا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ یہاں کسی کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ میاں بیوی ایک ساتھ یا موٹر سائیکل پر سفر کریں یا ایک برقع میں... خیر اب میں تمہاری مرضی کا سوال کرتا ہوں۔ ہم کہاں جائیں؟ یہاں اپنے ذیل اللہ آتی اکرام شیخ کا دولت خانہ بھی ہے مگر وہاں مہمان بننے میں خطرہ ہے۔ سراغ لگانے والے شاید پہلے سے جانتے ہوں گے کہ وہ میرا ناوک کا بھائی ہے۔ خالی ہاتھ ہم کوئی کمرہ بھی بک کرانے پر چلے جائیں تو مشکوک سمجھے جائیں گے۔ اب رہا سوال ہوٹل کا تو ان

میں ہم کسی اچھے ہوٹل میں داخل بھی نہیں ہو سکتے۔ تیسرے درجے کے مسافر خانے تم دیکھ رہی ہو۔ یہاں بھی قیام ممکن نہیں ہے۔"

"اف۔ باتیں مت کرو۔ جہاں چلنا ہے چلو ورنہ میں بے ہوش ہو کے گر جاؤں گی۔"

میں نے کہا "خوب یاد دلایا۔ بے ہوش تو میں بھی ہونے والا تھا بھوک سے مگر لیڈیز فرسٹ۔"

صدر کے ایک معمولی سے ہوٹل میں ہمیں ایک اچھا کمرا مل گیا۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ہوٹل کا مالک یا منیجر پنجاب کا رہنے والا ہے اور انگریزی، اردو، فرنچ کے بعد پنجابی واحد زبان تھی جو میرے کام آ سکتی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم میاں بیوی اوڈی جا رہے ہیں۔

اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "اچھا۔ کام کیا کرتے ہو؟"

میں نے کہا "مستری ہوں، موٹریں ٹھیک کرتا ہوں۔"

"موٹروں کا پیزا مل گیا ہے نا؟"

"مل جائے گا۔ ادھر ہے ایک بندہ" میں نے کہا "اپنے گجرات کا ہے۔"

"او میاں۔ ادھر کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ خیال کرنا کوئی نوسرباز لوٹ ہی نہ لے۔ کتنے میں بات ہوئی ہے؟"

"بیس ہزار میں۔ جلدی ویزا لینے کے پانچ دس اور بھی دینے پڑیں گے۔"

میں نے ایک ویٹر کو سنانے کے لیے کہا جو میری باتیں غیر معمولی دلچسپی کے ساتھ سن رہا تھا "اوئے تو کیا دیکھ رہا ہے۔ سامان اٹھا اور لے چل کمرے میں۔"

اس نے برا سا منہ بنایا اور ٹین کا صندوق اٹھا کے طنز سے بولا "چلو جی بیگم صاحب۔ آپ بھی آئیں۔ سنگل چار سو میں۔"

"ارے یہ کیا بکواس ہے۔ چار سو میں کس کو کہا ہے" میں گرم ہو گیا۔

وہ دانت نکالنے لگا "آپ کے کمرے کا نمبر ہے چار سو تین۔" اور پھر سیڑھیوں پر آگے آگے چل پڑا "بڑا مبارک نمبر ہے۔ ادھر ایک فراڈ ٹھہرا تھا۔ کل پولیس پکڑ کے لے گئی۔ اس سے پہلے۔"

میں نے کہا "ایک بندہ تھا۔ اس نے چوتھی منزل سے چھلانگ مار کے خودکشی کر لی۔ ایک اور بندہ تھا اس کی زنانی بھاگ گئی ایک ویٹر کے ساتھ۔ ایک بندے کا قتل ہو گیا تھا۔ وہ کسی کی بیوی کو بھگا لایا تھا۔ سب معلوم ہے مجھے۔"

اس نے شرمندہ ہونے کے بجائے ڈھٹائی سے کہا "کیسے معلوم ہے؟"

میں نے رازداری سے کہا "قتل میں نے ہی کیا تھا۔ مگر اب میں قتل ہونے آیا ہوں۔ میرے ساتھ بھی کسی اور کی بیوی ہے۔"
ظاہر ہے اس کے بعد ویٹر سے میرے تعلقات اتنے کشیدہ

ہو گئے کہ اسے ٹپ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ لمبا تڑنگا اور صورت سے چالاک نظر آتا تھا۔ اس وقت ہم اتنے تھکے ہوئے تھے کہ نہا دھو کے اور کپڑے بدل کے ہم کھانا کھانے ہی سو گئے تھے اور پھر آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ میں نے اٹھ کر لائٹ جلائی اور گھڑی دیکھی تو رابعہ بھی جاگ گئی۔

"کیا ٹائم ہوا ہے؟"

"تمہارے جاگنے اور فتنۂ محشر جگانے کا۔ آٹھ بج کر سات منٹ۔"

وہ اٹھ بیٹھی "یعنی نو بجے ہیں۔ چلو اکرام شیخ سے مل آئیں۔ یہ بہت مناسب وقت ہے۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا" میں نے کہا۔

وہ بولی "کہیں سے مظفر کے گھر فون پر بات کر کے خیریت بھی معلوم کر لیں گے۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا۔"

"اکرام شیخ کے گھر گئے تو پھر کئی باتیں ہوں گی اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب اسے ہمارے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ کیوں نہ بس گھومتے پھریں، سمندر کے کنارے۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا۔"

اس نے مجھ پر تکیہ کھینچ مارا "تم کے بولو۔ اور کیا کہنے والے تھے تم؟"

میں نے تکیے کو کیچ کر کے سینے سے لگایا "کہہ تو دوں مگر تم ناراض ہو جاؤ گی اور گالیاں دینے لگو گی۔"

"میں گالیاں بکتی ہوں، خدا کا خوف کرو" وہ چیخنے لگی۔

"کمینہ۔ بے شرم۔ بدتمیز۔ بدمعاش۔ یہ کیا میرے سرکاری خطابات ہیں۔ جو تم ایسی ہی باتوں پر دیتی ہو۔"

"کیسی باتوں پر؟"

"جو اب میں کہنے والا ہوں" میں نے اسے آنکھ ماری۔

"ہائے جانی مار ڈالا۔"

"توبہ ہے سکندر۔ ایک دم لوفر بن جاتے ہو تم ایسی گھٹیا حرکت کرتے ہو۔"

"دیکھا۔ لوفر بھی کہہ دیا نا۔ پھر کہتی ہو میں کب گالیاں دیتی ہوں۔ ایسی کون سی غیر اخلاقی بات کی تھی میں نے۔ آنکھ میں ایک مکھی نے پر مار دیا تھا اس لیے جھپک گئی تھی۔ آخری جملہ میں نے مکھی کو مخاطب کر کے کہا تھا اور اس میں بھی سارے الفاظ شریفانہ تھے۔"

کراچی کے راستوں کا ہمیں زیادہ علم نہیں تھا لیکن ڈرائیونگ کا مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بات کی جو ہوٹل کے باہر کھڑا اپنی پرانی کھٹارا ٹیکسی کو چمکانے میں مصروف تھا اور کسی ہم جیسے ہی مسافر کا انتظار کر رہا تھا۔ ہم اب پہلے کی نسبت بہت بہتر حلیے میں تھے جس کو ہوٹل کے مالک اور منیجر نے بھی حیرت سے

www.paksociety.com

دیکھا۔ رابعہ کا نشل کاک بر فیع اُڑ گیا تھا اور میں سمجھ نہ ہوتا تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتا کہ کوہ قاف کی پری سعدی ہوٹل کی چھت پر اتری اور اب سیڑھیوں سے اتر کے باہر جا رہی ہے ورنہ اتنی حسین لڑکی اس ہوٹل میں کہاں سے آئی۔ میں پینٹ شرٹ میں تھا اور تعصبات کا یہ ظاہری انقلاب یقیناً شکوک پیدا کر سکتا تھا۔ ریٹر کی آنکھوں میں تو شک کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ شاید وہ سوچ رہا ہو گا کہ آخر یہ چکر کیا ہے۔ سفر میں ہر شریف آدمی کا حلیہ بگڑ جاتا ہے مگر بدلتا نہیں۔ ہم جو اپنے ٹین کے صندوق اور لباس سے اسٹے پینڈو لگتے تھے اچانک شہری کیسے بن گئے اور کیوں بن گئے۔ کیوں کا مسئلہ زیادہ غور طلب تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور جب یہ ثابت کر چکا کہ اس کی ٹیکسی سے اچھی کار اس وقت کراچی تو کیا پاکستان میں بھی شاید نہیں ہوگی اور اس سے زیادہ ایماندار ڈرائیور کا ملنا بھی محال ہے تو میں نے فی گھنٹہ کرائے کا مسئلہ اٹھایا اور بقول شاعر۔ ادھر سے تم چلے اور ہم ادھر سے۔ انگریزی محاورے کے مطابق ہم آدھے راستے میں ملے۔ اس نے پچاس روپے گھنٹہ طلب کیے تو میں نے دس روپے پر آمادگی ظاہر کی اور گھٹتے بڑھتے تیس روپے پر معاہدہ ہو گیا۔

وہ باتونی لیکن جاہل شخص تھا اور اس نے ہمیں ٹورسٹ اور خود کو گائیڈ فرض کرتے ہوئے کراچی کی تاریخ جغرافیے کے بارے میں غلط معلومات فراہم کرنا جاری رکھا۔ "اب یہ جو بندر روڈ ہے یہاں کیا تھا پہلے؟ بندر ہی بندر۔ ہزاروں لاکھوں۔ پھر انگریزوں نے ان سب کو مار مار کے ایک جگہ کر دیا۔ وہ بندرگاہ ہو گئی۔ ان بندروں کو بحری جہاز میں بھر بھر کے افریقہ لے جاتے تھے۔ وہاں قیمہ قیمہ کر کے بندر بھی کھا لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "جیسے بریانی نہ ملے تو آدمی چاول کا خشکہ کھا لیتا ہے۔"

"بالکل۔ پھر وہاں سے جہاز آنے لگے تو پورٹ بن گئی۔ اور یہ کلفٹن.... یہ شہزادی گلبدن کی سیرگاہ تھی۔ جیسے انگریزوں نے سکندر کو الگزینڈر کر دیا ایسے ہی گلبدن کو کلفٹن بنا دیا۔ سنا ہے شیکسپیئر بھی شیخ پیر تھا اور..."

"...تم جانتے ہو شیکسپیئر کو؟"

"کیوں نہیں جی۔ آٹھویں جماعت پاس ہوں۔ وہ امریکی صدر تھا۔ اسی نے ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی تھی۔ سن ستاون میں اپنے سرسید خاں کے ہاتھوں جہنم رسید ہوا۔"

اس سے زیادہ کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ میں نے کہا "خدا کے لیے اس علم کے دریا کی روانی روکو ورنہ ہم اس میں غرق ہو کے ڈوب کے مر جائیں گے۔"

اس کی سمجھ میں میری بات نہیں آئی لیکن وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے یہی سمجھا ہو گا کہ ہم جیسے جاہل ایسی عالمانہ باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ساحلِ سمندر پر ٹیکسی روک کے وہ اترا نہیں اور ٹیکسی ہی میں رہا ورنہ وہ ہمارے ساتھ چلتا اور انہیں یہ بتاتا کہ پہلے کراچی میں کوئی سمندر نہیں تھا مگر انگریز آئے اور انہیں بندرگاہ کی ضرورت پڑی۔ بندر ایکسپورٹ کرنے کے لیے۔ تو انہوں نے بحر اوقیانوس کا رخ موڑ دیا اور پانی ادھر لے آئے۔

اور کلفٹن کے ساحل پر تفریح کرنے والے وہی تھے جو اپنی اپنی گاڑی میں فیملی کے ساتھ آئے تھے۔ مجمع عام نہ ہونے کے باعث یہاں ایک دوسرے کی پرائیویسی کے احترام باہمی کی فضا تھی۔ ہم بھی ٹہلتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ یہاں کی ایسی فضا میں بے خوفی نے تھوڑا سا اعتماد پیدا کر دیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ہم خطرات اور اندیشوں کی دنیا سے کسی اور دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔

آزادی سے گھومتے پھرنے اور فرصت کے ساتھ خلوت میسر آنے سے رابعہ کا موڈ بھی بہت اچھا ہو گیا تھا۔ وہ کھل کے باتیں کر رہی تھی اور ہنس رہی تھی۔ اس کے لہجے میں شوخی آ گئی تھی اور ہم وہ سب باتیں کر رہے تھے جو مدت سے بھولے ہوئے تھے۔

واپسی پر ہم نے کلفٹن کے ایک کشادہ چوک کے گرد بنے ہوئے جدید شاپنگ سینٹر کو دیکھا لیکن سردست ہمیں کچھ خریدنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر بھی رابعہ نے میرے لیے ایک شرٹ لی تو میں نے اس کے لیے ایک پسندیدہ پرفیوم خرید لی۔ پھر ہم نے ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں صرف سی فوڈ نوش فرمایا۔ رابعہ نے کریب سوپ پر خاصا منہ بنایا لیکن میرے اصرار پر لے لیا۔ فرائیڈ پران اور فش سوپ اور ڈش کریم سب ذہب تھے۔ بل بھی خوب تھا۔

ہم نصف شب کے قریب لوٹے تو ٹیکسی ڈرائیور سو کا نوٹ لے کر بھی ٹپ کا انتظار کرتا رہا۔ میں نے حساب لگا کے کہا "تیس روپے فی گھنٹہ کے حساب سے دو گھنٹے چالیس منٹ کے ہوئے پورے اسی روپے۔ بیس روپے واپس کرو۔"

اس نے بڑی ناگواری سے بیس روپے میرے حوالے کیے اور بولا "اچھی طرح گن لو۔"

میں نے بیس روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے "اب تم خود گن لینا۔ یہ تمہاری ٹپ۔ آ گئی بات سمجھ میں؟"

اس وقت اچانک مجھے یوں لگا جیسے کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ بظاہر سب ٹھیک تھا۔ وہ بارونق جگہ تھی۔ ہوٹل کے گیٹ پر بندوق والا باوردی چوکیدار پوری طرح مستعد تھا۔ سب کمروں کے باہر گیلری میں لائٹس سے عمارت میں چراغاں محسوس ہوتا تھا۔ پورچ اور لان میں رنگین روشنیاں بکھری تھیں۔ میں نے رابعہ کے ساتھ اندر جاتے ہوئے سوچا کہ آخر میں نے کون سی غیر معمولی بات دیکھی تھی۔

جواب یوں میرے ذہن میں آیا جیسے تاریک سنیما ہال کے پردے پر کوئی تصویر روشن ہوتی ہے۔ اس تصویر میں کوئی گڑبڑ تھی۔ میں نے اوپر سے کسی کو باہر جھانکتے دیکھا تھا۔ پھر کھڑکی بند ہو گئی

تھی اور میں جھانکنے والے کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا لیکن یہ کمرا نمبر چار سو بیس کی کھڑکی تھی۔ چوتھے فلور کا کمرا نمبر بیس۔ میں نے اس کھڑکی سے باہر دیکھا تھا تو مجھے اس کے عین مقابل اسٹریٹ لائٹ کا مرکری بلب نظر آیا تھا اور کھڑکی کے ایک پٹ کا سب سے نیچے والا شیشہ بھی غائب تھا۔ ایک قطار میں پانچ کھڑکیاں پانچ کمروں کی تھیں اور ابھی ابھی میں نے جو کھڑکی بند ہوتے دیکھی تھی اس کا ایک شیشہ نہیں تھا۔ باقی سب کے شیشے پورے تھے۔

میں نے اندر داخل ہونے کے بعد بھی رابعہ سے کچھ نہیں کہا لیکن سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے خبردار کر دیا "رابعہ۔ دال میں کچھ کالا ہے۔"

وہ میرے لہجے سے ڈر گئی "کیا... یہاں بھی۔؟"

میں نے اسے تسلی دی "ابھی صرف میرا شک ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے کمرے میں کوئی ہے جو اوپر سے دیکھ رہا تھا۔ شاید ہماری واپسی کا منتظر تھا۔"

اس نے میرا بازو پکڑ لیا "پھر کیا ضرورت ہے اوپر جانے کی؟"

میں نے کہا "کیا یہیں سے واپس لوٹ جائیں؟"

"منیجر کو بتا دو۔ وہ پولیس کو بلا لے گا۔"

میں نے کہا "پولیس سب سے پہلے ہمیں پکڑے گی۔"

"کیوں پکڑے گی۔ ہر پولیس مین تو ہمیں نہیں جانتا۔ سارے پاکستان کی پولیس ہمیں نہیں پہچانتی۔"

میں نے چڑ کے کہا "رابعہ جب معاملہ پولیس کے پاس جاتا ہے تو تفتیش ہوتی ہے اور تفتیش میں بہت کچھ سامنے آ جاتا ہے۔ جو پہلے سامنے نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ منیجر بھی پولیس کو نہیں بلائے گا۔ وہ بھی پہلے ہمارے ساتھ جا کے دیکھے گا۔"

"تو اسے ساتھ لے لو۔"

"وہ کیا مدد کرے گا میری" میں نے کہا "تم باہر رہنا۔ تم ریوالور لائی تھیں؟"

"ہاں۔ لیکن وہ تو ٹرنک میں ہے۔"

"چلو کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

میں نے اطمینان سے اوپر جا کے دروازے میں چابی لگائی اور ایک دم دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ کسی نے اندھیرے میں کہا "تم مجھے نہیں دیکھ سکتے مگر میں دیکھ سکتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں ریوالور ہے۔"

میں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے "کیا چاہتے ہو تم؟"

اس نے کہا "اپنی ساتھی کو بھی اندر بلا لو۔"

میں نے رابعہ سے کہا "تم بھی آ جاؤ اندر۔ ہم مقابلہ نہیں کریں گے۔"

مجھے یقین تھا کہ رابعہ نے ساری گفتگو سنی ہوگی۔ وہ اندر آ گئی۔

"دروازہ خاموشی سے بند کر دو" اس نے حکم دیا۔

رابعہ نے تعمیل کی۔ دروازہ بند ہوتے ہی کمرا روشن ہو گیا اور میں نے اپنے مقابل اسی ریٹر کو دیکھا جس نے ہمارا ٹین کا صندوق اوپر پہنچایا تھا۔

میں نے کہا "میں نے تم کو آواز سے پہچان لیا تھا۔"

رابعہ نے کمرے میں بکھرے ہوئے سامان کو دیکھا۔ اس نے ہمارے ٹرنک کو الٹ کر خالی کر دیا تھا اور اب اس کے ہاتھ میں ہمارا ہی ریوالور تھا۔

میں نے کہا "جس چیز کی تلاش تھی تمہیں وہ مل گئی۔"

اس نے مجھے گھورنا جاری رکھا "ادھر سے مل گئی۔ تم بہت چالاک ہو۔"

میں نے جلدی سے کہا "ہم اتنے بے وقوف بہرحال نہیں ہیں جتنے نظر آتے ہیں۔ یا جتنا تم نے سمجھ لیا تھا۔"

اس نے میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی کہا "سیدھی طرح بتا دو کہ پیسہ کہاں چھپا کے رکھا ہے؟"

میں نے کہا "کیا ہم پیسے والے لگتے ہیں تم کو؟"

"ارے جلدی کرو۔ مجھے پتا ہے کہ تم دبئی جا رہے ہو۔ تیس ہزار ایجنٹ کو دینے کی بات کر رہے تھے۔ پانچ دس اوپر دینے پر راضی تھے۔"

میں نے سمجھایا "میں نے اسی وقت تمہاری دلچسپی میں بدنیتی دیکھ لی تھی مگر افسوس کہ وہ سب جھوٹ تھا۔"

"بکواس کرتے ہو تم۔ جھوٹ اب بول رہے ہو۔"

"دبئی جا کے ہم کیا کریں گے۔ ہمارے پاس تو ابھی پاسپورٹ تک نہیں ہیں۔ ہم نے ذرا مالک پر رعب ڈالنے کے لیے بات کی تھی۔"

"پاسپورٹ تمہاری زنانی کے بیگ میں ہوں گے اور پیسہ بھی۔ ادھر لاؤ اپنا بیگ" اس نے رابعہ کو حکم دیا۔

رابعہ نے کہا "نہیں۔ بیگ میں نہیں دوں گی۔"

"میں گولی مار دوں گا اسے۔" اس نے مشتعل ہو کے میری طرف اشارہ کیا۔

میں نے محسوس کیا کہ تاخیر کی وجہ سے اس پر گھبراہٹ طاری ہو رہی ہے اور اسے ڈر ہے کہ کوئی آ نہ جائے۔ ایسے شخص سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ سچ مچ گولی چلا دے یا اس سے گولی چل جائے۔

میں نے رابعہ سے کہا "بیگ اسے دے دو ڈیئر۔ یہ نہیں چالیس ہزار کی خاطر کسی ذی روح کی جان لے سکتا ہے اور خود بھی پھانسی چڑھ سکتا ہے لیکن ہماری زندگی اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے۔"

رابعہ نے بڑی عقلمندی سے کام لیا اور بیگ اس کی طرف پھینک دیا لیکن اس کی طرف ٹھیک نہیں اچھالا۔ بیگ اس سے دو تین فٹ کے فاصلے پر گر گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ آگے جھک کر بیگ اٹھائے گا مگر اس نے چالاکی سے کام لیا اور مجھے ریوالور سے اشارہ

www.paksociety.com

کہا "راستہ چھوڑ دو میرا۔"

راستے میں رابعہ تھی۔ وہ میرے پیچھے آگئی۔ اس نے بیگ کو فٹ بال کی طرح ٹھوکر مار کے آگے کھسکایا اور خود میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کے ریوالور کا رخ ابھی میری طرف رہا اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی میری طرف سے غافل نہیں ہوا۔ ٹھوکر مار کے بیگ کو دروازے کی طرف لے گیا۔ میں نے صبر اور سکون سے کام لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ آگے بھی اسے بہت سے مرحلے درپیش ہوں گے۔ وہ دروازہ کھولے گا اور باہر جاتے ہوئے دروازہ بند کرے گا تو اسے احساس ہو گا کہ دروازے کو مقفل نہیں کیا جا سکتا۔ باہر کوئی کنڈی نہیں تھی۔ چابی کے بغیر دروازہ اندر سے تو لاک ہو سکتا تھا۔ باہر سے نہیں۔ ابھی تک اسے چابی مانگنے کا خیال نہیں آیا تھا جو میری جیب میں تھی۔ پھر شاید وہ دوڑ لگائے گا اور میں اسے جا لوں گا۔ چوتھی منزل سے نیچے تک جاتے ہوئے اس کو زینے کے آٹھ موڑ کاٹنے پڑیں گے۔ میں اوپر سے چیخ پکار مچا سکتا ہوں تاکہ نیچے کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا منیجر یا کوئی ویٹر تن لے اور گن مین کو ہوشیار کر دے۔ رابعہ فون اٹھا کے گراؤنڈ فلور پر ٹیلی فون آپریٹر کو بتا سکتی تھی۔

میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ کمرے سے باہر جا کے اس کو خیال آیا کہ اس کے پاس چابی نہیں ہے لیکن اس وقت تک وہ دروازہ بند کر چکا تھا اور میں دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے دوبارہ اندر آ کے مجھ سے چابی مانگنے کے لیے دروازہ کھولنا چاہا مگر میں نے دروازے کے لاک کا بٹن دبا کے یہ کوشش ناکام بنا دی۔ پھر وہ بھاگا۔

میں نے ایک دم دروازہ کھولا اور اس کے پیچھے دوڑا۔ رابعہ نے چلا کے مجھے روکنا چاہا مگر میں نے جواب میں چلا کے کہا "تم فون کرو نیچے۔"

وہ زینے سے اتر چکا تھا اور تیسرے فلور پر تھا جب میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی۔ خود کو محفوظ رکھتے ہوئے میں نے چیخ کے کہا "چور۔ ڈاکو۔ روکو اسے۔"

میں چاہتا تھا کہ وہ نروس ہو کے فائر کرے اور فائر کی آواز سے ہوٹل میں موجود ہر شخص کو ہنگامی صورت حال کی اطلاع مل جائے۔ شاید اس ڈر سے خود اس نے بھی پلٹ کر مجھ پر گولی نہیں چلائی۔ آدھی رات کے وقت سارے کاریڈور خالی تھے اور میں اس کے بھاری قدموں کی آواز صاف سن سکتا تھا۔

اچانک یہ آواز ختم ہو گئی تھی۔ میں تیسرے فلور سے دوسرے فلور پر پہنچا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہوا میں تحلیل ہو گیا یا جن بھوت کی طرح دیوار میں سے گزر گیا۔ بات فوراً میری سمجھ میں آگئی۔ وہ سیکنڈ فلور کے کسی کمرے میں گھس گیا تھا۔ اس نے واردات کی صحیح منصوبہ بندی پہلے سے کر لی تھی لیکن اس طرح میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ میں نے اسی طرح چلاتے ہوئے پھر دوڑنا شروع کیا "ارے کوئی پکڑو اسے۔ میں برباد ہو گیا۔ لٹ گیا میرا سب

کچھ۔"

مجھے میرے شور نے سب کو متوجہ کر لیا تھا۔ ادھیڑ عمر منیجر نے چلا کے چوکیدار کو آواز دی۔ پھر اندر کچن کی طرف سے کوئی آیا۔ ایک ویٹر ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ وہ لاؤنج میں پڑے صوفے پر سو رہا تھا۔

منیجر نے مجھ سے کہا "کیا ہوا سر۔ کس نے لوٹ لیا؟"

میں نے اس کے قریب جا کے سکون سے کہا "تمہارے ہوٹل کے ایک ویٹر نے۔"

اس نے سوچے سمجھے بغیر کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے ذرا جھک کر اس کی ناک سے ناک ملا کے کہا "یہ ہوا ہے اور میں ابھی ملزم کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

اس نے کہا "ملزم۔ کون ملزم۔ کہاں ہے ملزم؟"

میں نے کہا "ملزم سیکنڈ فلور کے کسی کمرے میں چھپا ہوا ہے۔ شاید وردی بدل رہا ہے اور وہ رقم چھپا رہا ہے۔"

"رقم کتنی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ چالیس پچاس ہزار سے زیادہ ہی ہو گی۔"

"سر جی آپ کو تو معلوم ہے نقد رقم اور قیمتی چیزیں انتظامیہ کے حوالے کر کے رسید لینی چاہئے۔ بعد میں چوری ہو جائے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ یہاں تو چوری کا ڈراما کرنے والے بھی تھیلے آتے ہیں۔"

"مگر میں ڈراما نہیں کر رہا ہوں۔ میں ملزم کو پکڑنا چاہتا ہوں۔ وہ خود تمہارے سامنے اقبال جرم کرے گا۔"

ٹیلی فون آپریٹر دوڑتا ہوا آیا "سر جی۔ اوپر سے میڈم چار سو تیس نے فون کیا ہے۔ ڈاکا پڑ گیا ہے جی۔ وہ اپنا میر زمان.."

میں نے کہا "اب تم بتاؤ۔ کیا میں باہر جا کے ہنگامہ کروں۔ پولیس کو بلاؤں؟"

"نہیں سر... پولیس کیا کرے گی... آپ کو پتا ہے وہ ہمارے ہوٹل کا ویٹر تھا؟"

میں نے کہا "ہاں ویٹر جو دوپہر کے وقت میرا لنچ کا آرڈر لے کے اوپر لے گیا تھا۔ تم یہ بتاؤ کہ سیکنڈ فلور پر کتنے کمرے خالی ہیں۔"

اس نے رجسٹر دیکھے بغیر کہا "صرف ایک... لیکن میر زمان..."

"کوئی راستہ ہے پچھلی طرف۔ کیا وہ کھڑکی سے باہر اتر سکتا ہے؟"

منیجر نے نفی میں سر ہلایا "ہر کھڑکی میں گرل لگی ہوئی ہے۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ دن میں ہی اس نے گرل ڈھیلی کر کے چھوڑ دی ہو۔ خیر یہ بتاؤ کہ نمبر کیا ہے خالی کمرے کا؟"

"دو سو نو تھو" وہ بولا "اس کی کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی ہے۔ ادھر سے وہ دکانوں کے چھجے پر اتر سکتا ہے لیکن سامنے جو

بڑے سائن بورڈ ہیں۔ کوئی اسے ضرور دیکھ لے گا۔"

"چلو میرے ساتھ اوپر۔ کسی ویٹر سے کہو کہ اسے آواز دے کر باہر سے دروازہ کھلوائے۔ اس کے پاس ریوالور ہے۔ وہ میرے یا تمہارے حکم دینے سے باہر نہیں آئے گا۔"

جو ویٹر صوفے سے اٹھا تھا وہی کلمۂ شہادت پڑھتا ہوا آگیا۔ اسے یقین تھا کہ ملزم اسے گولی مار دے گا۔ "نوکری میں جان دینا تو ویٹر کا فرض نہیں ہوتا۔ آخر چوکیدار کس لیے ہے..."

منیجر نے کہا "بکواس مت کر۔ میر زمان کو آواز دے کے کہنا کہ نیچے جانا ہے نہیں۔" اس سے کہنا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ میں بھی سونا چاہتا ہوں۔"

"کیا اس کمرے میں ویٹر سوتے ہیں؟"

"جو کمرا خالی ہو ویٹر اس میں سو جاتے ہیں۔" منیجر بولا۔

ہماری چال کامیاب رہی۔ میر زمان نے یہ ظاہر کیا جیسے وہ سوتے سے اٹھا ہے۔ اس نے خوابیدہ لہجے میں کہا "کیا مصیبت ہے یار۔ ابھی نیند آئی تھی۔"

"میر زمان۔ میری حالت خراب ہو رہی ہے۔"

دوسرے ویٹر کا بیان سو فیصد درست تھا۔ خراب کیا اس کی حالت غیر ہو رہی تھی مگر اندر پہنچنے کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا ہو گا کہ محاذ جنگ پر افسر کے حکم سے ننگے جانے والے سپاہی کی طرح اسے پہلے شہید نہیں ہونا پڑا۔ ٹیلی فون آپریٹر سب سے پیچھے رہا۔

اس سے پہلے کہ دروازہ پھر بند ہوتا میں اندر پہنچ گیا۔ دروازے کو دھکا لگا تو میر زمان لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا اور اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی جیب کی طرف گیا۔ اب اس نے کپڑے بدل لیے تھے اور اپنی ہوٹل کی وردی پہن لی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ رقم بھی اس نے کمرے ہی میں چھپائی ہو گی۔

اس کے ریوالور نکالنے سے پہلے میں نے لات گھما کے اس کے پیٹ پر ماری۔ وہ ضرب کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ ریوالور نکالنے کے بجائے دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبا کے دہرا ہو گیا۔ پھر میں نے اس کو دوسری لات ماری جو اس کے شانے پر لگی اور وہ سائڈ کی دیوار سے ٹکرا کے گر گیا۔

میں نے جھک کے اس کی جیب سے ریوالور برآمد کیا اور پھر اسے کھینچ کے سیدھا کھڑا کر دیا۔ منیجر اور دوسرا ہیرا دم بخود کھڑے تھے۔ میں نے گھونسے مار کے میر زمان کا چہرہ بگاڑ دیا۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں وہ چلانے لگا "ارے کوئی معاف کرا دو مجھے۔ نہ۔ ارے مت مارو غریب کو۔ ہائے ارے میرا بابا۔"

جب وہ بے ہوش ہو گیا تو میں نے اس کی ساری جیبوں کی تلاشی لی مگر حسب توقع اس کے پاس سے کچھ نہیں ملا۔ میں نے

منیجر سے کہا "اوپر جا کے بیگم صاحبہ کو بلا لاؤ۔ اور سنو" ان کا نام میڈم چار سو تیس نہیں ہے۔"

نیچے کھڑے ہوئے ٹیلی فون آپریٹر نے شرمندگی سے کہا "وہ... سر جی ہم تو نمبر سے ہی سب کو بلاتے ہیں۔ غلطی معاف۔"

میں نے منیجر سے کہا "کمرے کی اچھی طرح تلاشی لو۔ باتھ روم میں خاص طور پر فلش ٹینک میں دیکھو۔"

رابعہ کے آنے سے پہلے ہی ویٹر نے فلش ٹینک کے پانی میں سے وہ پلاسٹک شیٹ کا پیکٹ نکال لیا جس میں ساری رقم تھی۔ اس نے مال مسروقہ کسی کامیاب سراغ رساں کی طرح منیجر کے سامنے پیش کیا۔

رابعہ نے اندر آ کے کمرے کا نقشہ دیکھا تو صورت حال کو سمجھ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا "کتنی رقم تھی تمہارے پاس؟"

"تقریباً بیس ہزار... سات آٹھ سو اوپر ہوں گے۔"

منیجر نے پیکٹ کھولا اور رقم شمار کیے بغیر میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے کہا "نہیں۔ اسے گن کر دیکھو تاکہ تمہیں یقین ہو جائے کہ ہم ڈراما نہیں کر رہے تھے۔"

"وہ تو سر میں نے آپ کو نہیں کہا تھا۔"

میں نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ میری عقلمند بیوی نے جیب ہوٹل کے کمرے میں نہیں چھوڑا تھا ورنہ واپسی پر ہمیں خالی صندوق ملتا۔ ہمارے پاس کمرے کا کرایہ ادا کرنے کے پیسے بھی نہ ہوتے اور تم ہمیں پولیس کے حوالے کر دیتے اگر ہم چوری کی بات کرتے۔ کون اعتبار کرتا کہ اس ٹین کے پرانے صندوق میں بیس ہزار روپے تھے۔"

رابعہ نے کہا "چلو اب پولیس کو بلا کر رپورٹ لکھواؤ۔"

منیجر نے عاجزی سے کہا "میڈم کوئی فائدہ نہیں۔"

"فائدہ اور نقصان تم رہنے دو۔ ایک جرم ہوا ہے اور اس کی رپورٹ کرنا ہمارا فرض ہے۔" رابعہ نے تیز ہو کے کہا۔

"سر آپ سمجھائیں میڈم کو۔ اس حرامی کو میں نے ابھی ایک ہفتے پہلے ہی رکھا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ بدمعاش ڈاکو ہے۔ میں اس کو پولیس کے حوالے ضرور کروں گا لیکن رپورٹ کی ضرورت نہیں۔ وہ اس پر یہ الزام لگا کے اس کی ایسی چھترول کریں گے کہ یہ روئے گا اس دن کو جب یہ پیدا ہوا تھا۔ پھر اس کو جیل بھی وہ خود ہی بھجوا دیں گے۔"

میں نے گرج کر کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تم اسے بچانا چاہتے ہو؟ تم بھی شریک جرم ہو۔ ہوٹل میں سب چوروں کو یہاں کی وردی پہنا رکھی ہے۔"

"معاف سر! یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ" وہ گھبرا گیا "پولیس کو بلانے سے بدنامی ہوتی ہے۔ آپ یقین کریں ایسی واردات یہاں پہلے کبھی نہیں ہوئی۔"

"ہاں ہوٹل تو مسافر چھوڑ کر نہیں سکے۔ وہ کسی کو رنگے ہاتھوں نہیں

www.paksociety.com
www.paksociety.com

کچھ سکا اور تم نے معاملے کو دبا دیا... آخر ہم ایسا کیوں کریں؟"

"تعاون... صرف تعاون سر۔ اور اس کے بدلے میں ہم بھی بہت کچھ کریں گے آپ کے لئے" اس نے پلٹ کے ویٹر سے کہا "صاحب کا سامان شفٹ کرادو وی آئی پی سوئٹ میں۔ آپ جتنا عرصہ چاہیں رہیں سر۔ نو چارجز۔ کسی بھی سروس کے چارجز نہیں۔ فون کالز کا سب کمپلی مینٹری..."

میں نے کہا "اچھا۔ تمہاری شرافت نے ہمیں متاثر کیا ہے منیجر! اس لیے ہم تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں۔"

"میں مالک ہوں سر" وہ بولا "آپ نے کہا تھا کہ دوسری جانب کا خیال ہے تو سر ہوٹل میں ایک ایجنٹ آتا ہے۔ وہ بھوت کا آدمی ہے اسی لیے ہم نے داخلے کی اجازت دے رکھی ہے... وہ آپ کا ہر کام کر سکتا ہے اور بہت مناسب۔ انتہائی کم معاوضے پر۔"

میں نے غور کرتے ہوئے کہا "ہوں۔ صبح اسے بھیج دینا اگر وہ آئے۔"

واپس اپنے کمرے میں آ کے رابعہ نے کہا "اُف!" اور دھڑام سے بیڈ پر گر گئی "آخر ہر جگہ ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "ایسا کیا۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ اب دیکھو بیٹھے بٹھائے رہائش کا مستقل بندوبست ہو گیا۔ کھانا پینا سب فری۔ کیا شاندار سوئٹ ہے۔ میں تو واقعی خود کو وی آئی پی محسوس کر رہا ہوں۔"

"ساری تفریح کا لطف غارت ہو گیا۔"

میں نے کہا "اس وقت میں صدقِ دل اور فرطِ جذبات سے یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ تم کو ناقص العقل سمجھنا میری دوراندیشی... میرا مطلب ہے کوتاہ اندیشی تھی۔ آخر تمہیں کیسے خیال آیا کہ رقم ساتھ ہونی چاہیے۔"

"عقل تمہارے پاس ہوتی تو تم بھی اتنا پیسہ ہوٹل میں چھوڑ کے نہ جاتے... واقعی کیا ثبوت ہوتا ہمارے پاس بعد میں۔"

"آدمی کی نیت خراب ہوتے دیر نہیں لگتی" میں نے اپنا بستر قالین پر بچھاتے ہوئے کہا "ڈرتا ہوں کسی دن میری نیت خراب نہ ہو جائے۔"

رابعہ مسکرانے لگی "ریوالور رکھ کے سوتی ہوں میں تکیے کے نیچے۔"

میں نے لائٹ بجھا کے کہا "اگر استعمال کرنا پڑے تو دل کا نشانہ مت لینا۔ خرابی دماغ کی ہو گی۔ دل کا تو پہلے ہی خانہ خراب ہے۔"

صبح میں منظر یا وقار سے فون پر بات کرنا چاہتا تھا مگر رابعہ نے روک دیا کہ کیا پتا ان کے فون آبزرویشن پر ہوں۔ پولیس ہمارا سراغ لگانے کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ انہیں یقین ہو گا کہ ہم جہاں بھی ہوں گے اپنے دوستوں سے رابطے کی کوشش ضرور کریں گے۔"

"اچھا پھر تم اپنے بار روم کے فون پر اس بھرتی والے سے بات کر لینا۔ اگر گھومنا پھرنا چاہو تو ہوٹل کی کار تمہارے ڈسپوزل پر ہے۔ فری آف چارج۔"

"کیوں تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں ایک مردانہ کام سے جا رہا ہوں" میں نے کہا "شام سے پہلے..."

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے بتا دیا تھا کہ اب جہاں تم وہاں میں۔ تم اکیلے نہیں جا سکتے۔ میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

"وہ دراصل... میں ایک بہت عزیز گرل فرینڈ سے ملنے جا رہا ہوں۔ بلاوجہ کباب میں ہڈی مت بنو۔"

"میرے کانوں میں روئی ٹھونس دو اور آنکھوں پر پٹی باندھ دو۔ میں کچھ نہیں سنوں گی اور کچھ نہیں دیکھوں گی لیکن ساتھ ضرور رہوں گی۔"

میں نے جھلا کے کہا "میں چھمیا جان کے کوٹھے پر جا رہا ہوں۔ ہیرا منڈی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی چلوں گی" رابعہ نے قطعی لہجے میں کہا۔

"چلو بابا۔ تم ہاریں میں جیتا" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"سکندرِ اعظم ہو ہونہہ۔ ہار کیسے سکتے ہو؟" وہ فاتحانہ انداز میں بولی۔

ہم نے نکلنے سے پہلے فون پر اکرام شیخ سے بات کی۔ اس نے اسکول میں فون ریسیو کیا "کون؟"

میں نے کہا "ابے تو کون۔ کیا سمجھتا ہے خود کو ڈبل ایس آئی کے بچے؟"

وہ چلانے لگا اور ہنسنے لگا "پھر آ گیا تو خانہ خراب خانہ بدوش۔ لاوارث۔"

میں نے کہا "لاوارث کیوں۔ لواحقین ساتھ موجود ہیں۔ مستقبل قریب کی مسز سکندر بخت۔"

"قریب اور دور کا فرق بھول گیا ہے تو۔ دکھاتا رہ اسے سبز باغ اور لارے دیتا رہ الو کے پٹھے۔ وکیل ہے تو کیا لڑکی ہے آخر۔ جذبات کے معاملے میں عقل سے پیدل۔"

میں نے کہا "تیری ٹھکائی مجھ پر واجب ہو گئی۔ کہاں پٹنا پسند کرے گا تو؟ اپنے گھر میں جورو کے سامنے یا سرِ عام۔ کالج کہاں ہے؟"

"کلاس میں۔ آخر تم ہو کہاں؟"

"ایک سکس اسٹار ہوٹل کے وی آئی پی سوئٹ میں۔ یقین نہیں تو آ کے دیکھ لے۔ آج شام۔"

"ہم آ رہے ہیں ہوٹل۔ تم لوگ سامان اٹھا کے آ جاؤ۔"

"تمہارے غریب خانے پر؟ لاحول ولا قوۃ۔ ہم کیا پاگل ہیں۔ مطلب یہ کہ پاگل تو ہیں مگر اتنے بھی نہیں۔ شام ٹھیک چھ بجے۔ او کے" میں نے فون رکھ دیا۔ ساڑھے تک میں رابعہ کی صورت پر بھی اشتیاق کے جذبات موجزن دیکھ رہا تھا اور وہ بھی فوراً کالج سے

ملنا چاہتی تھی۔

میں نے کہا "کالج کلاس روم میں تھی۔"

"تم نے اچھا کیا انہیں بلا لیا۔ رسمی ملاقات ہی تو ہے۔ تمہارا چھیلا بہنوئی ان سے ملنا انہیں خاصا مہنگا پڑا تھا۔"

میں نے چابیاں مالک کے حوالے کرتے ہوئے کہا "گاڑی کہاں ہے؟" وہ دونوں کے قریب ہی کھڑا تھا۔

"باہر موجود ہے سر۔ شوفر کے ساتھ" اس نے مؤدبانہ عرض کی۔

"گڈ۔ اور وہ جو ایک ریکروٹنگ ایجنٹ ہے؟"

"مشتاق صاحب۔ وہ آئیں گے تو میں بتا دوں گا۔ بلکہ میں ان کو فون کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا "رات دس بجے کا ٹائم دے دو۔"

میں نے شوفر کو میئو ہسپتال چلنے کا حکم دیا۔ ایک وی آئی پی کے رول کو رابعہ نے اوور ایکٹنگ قرار دیا مگر میں نے کہا کہ وی آئی پی اگر ایسا نہ کرے تو وہ عام آدمی نظر آنے لگتا ہے۔

گاڑی کو میں نے پیلس سینما کی سائڈ پر روک کے شوفر کو انتظار کرنے کا حکم دیا اور خود رابعہ کے ساتھ نوادرات یعنی ANTIQUE شاپ میں داخل ہو گیا۔ وہاں سے نکلا تو دکانیں جھانکتا گھومتا ہم سروسز کلب کی سائڈ پر اس آفس کے سامنے پہنچ گیا جہاں شیخ مختار کے نام سے استاد پیڈرو نے اپنا آفس بنا رکھا تھا۔ رابعہ کو میں نے اس کا رول سمجھا دیا تھا اور وہ نہ ماننے کے باوجود مان گئی تھی۔

شیخ مختار کا پارٹنر اپنے شیشے کے کیبن میں سر جھکائے کوئی فائل پڑھنے میں اتنا مصروف تھا کہ اس نے ہماری طرف بھی سر اٹھا کے نہیں دیکھا اور بولا "بیٹھو۔" اس کی انگلیاں پنسل سے ایک کاغذ پر اعداد لکھتی جا رہی تھیں۔ اس کے آفس میں سب ہی کام کرنے والے سو فیصد کلرک تھے۔ اداس اور بیزار۔ خاموش اور جذبات سے عاری سپاٹ چہروں والے۔ جو ایک دوسرے کی طرف دیکھتے بھی تھے تو ڈرتے ڈرتے۔ بات ایسے کرتے تھے جیسے جھوٹ بول رہے ہوں۔

جب اس نے نظر اٹھا کے ہمیں دیکھا تو چونکا "تم... اپن سمجھا... خیر چھوڑو اپن کیا سمجھا۔"

میں نے رونی صورت بنا کے کہا "میں شیخ مختار کا بڑا بھائی ہوں۔ شیخ بخت یار۔ اسلام آباد سے آیا ہوں۔"

"اوہ... نائس میٹنگ یو" اس نے خوش اخلاقی سے اٹھ کے ہاتھ ملایا "کیا حال ہے اپنے شیخ مختار کا۔ اتنا دن ہو گیا۔ دھندا اپن سنبھالتا ہے لیکن ابھی ڈبل ڈیوٹی بہت مشکل ہے۔ کب آئیں گا وہ۔"

میں نے رقت زدہ لہجہ بنا لیا "وہ اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔"

"کیا؟ نہیں آئیں گا۔ ایسا تو بزنس میں نہیں چلتا۔ ایک دم پارٹنرشپ خلاص کر کے بیٹھ گیا۔ الگ ہونے کو تھا تو پہلے بولتا۔"

میں نے تقریباً رو کے کہا "وہ چلا گیا۔ اوپر" میں نے انگلی کو آسمان کی طرف اٹھایا "ادھر سے آج تک کون لوٹ کر آیا ہے۔"

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پیچھے ٹیک لگا کے بہت دیر تک گھورتا رہا "تم کیا بات کرتا ہے۔ تم بولتا وہ مر گیا؟"

"بالکل مر گیا۔ ذرا بھی نہیں بچا۔ سو فیصد مر گیا۔"

"دیکھو ابھی اپن کا پاس مذاق کا ٹائم نہیں ہے۔ اپن کو بولو تم کون ہے؟"

میں نے کہا "اس کا بھائی..."

"شٹ اپ مین۔ تم کوئی فراڈ ہے" وہ بولا۔

"تمہیں یقین نہیں آتا۔ اس سے پوچھو۔ یہ اس کی بیوہ ہے۔"

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور شاید کسی کو بلانا چاہتا تھا مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا "دیکھو۔ شیخ مختار ہم کو کل فون کیا۔"

میں تقریباً اچھل پڑا "تمہیں فون کیا تھا اس نے؟ کہاں سے؟"

"راولپنڈی سے۔ ادھر کسی اسپتال سے" اس نے بولا کہ وہ زخمی ہے۔ ایکسی ڈنٹ ہوا اس کا۔ بس ایک ٹانگ والا چلی ٹوٹا۔ باقی سب بچ گیا۔ تم بولتا ہے وہ مر گیا۔ اس نے خود بولا کہ بہت جلدی آئیں گا۔ تم بولتا کبھی نہیں آئیں گا۔ اس نے شادی نہیں بنایا۔ تم بولتا یہ اس کا وڈو..."

میں نے ریوالور نکال لیا "کیا اب بھی تمہارا خیال ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

اس کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا "نہیں... نہیں بابا۔ تم سچا ہم جھوٹا۔ تم اس کا بھائی، اس کا باپ..."

میں نے کہا "مجھے اس کی دراز میں سے صرف ایک ڈائری چاہیے۔ میں کسی کی جان یا تجوری سے پیسہ لینے نہیں آیا ہوں۔"

"ڈائری... کیسا ڈائری... ہم کیسے دیوے۔"

"تم مت دو۔ ہم خود لے لیں گے" میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ بھی ہٹا دیا "اس ڈائری کا تمہارے بزنس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم ہمارے ساتھ اس کے آفس میں چلو اور خود دیکھ لو کہ ہماری بات میں کتنا سچ ہے۔ تم ڈائری بھی دیکھ سکتے ہو۔"

"اچھا۔ اچھا" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "اپن کا ہارٹ ایک دم کنڈم ہو گیا ہے۔ بہت اولڈ ماڈل کا مشین ہے۔ گن کو ہٹا لو سامنے سے ورنہ ہم بغیر گولی کے ڈیڈ ہو جائے گا۔"

وہ بزدلی کی حد تک صلح پسند شخص تھا چنانچہ ڈائری کے حصول میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ وہ ہمیں پیڈرو کے آفس میں لے گیا۔ اس نے کسی پر کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اندر جا کے اس نے دراز کی چابیاں رابعہ کے حوالے کر دیں اور خود میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ عملے کے تینوں بے حس اور منجمد ارکان کی

www.paksociety.com

طرف اس کی پشت تھی جو سر جھکائے جمع تفریق میں مصروف تھے اور اپنے حصے کے روپے کا فرق نوٹ ہی نہیں کر سکتے تھے۔

بہت سے کاغذات کھنگالنے اور ساری دراز یں دیکھنے کے بعد رابعہ نے ڈائری جیسی قیمتی چیزیں برآمد کر لیں۔ ایک نوٹ بک سائز کی نیلی البم تھی جس کی تالی تو ڑ کر شرمناک تصاویر کا حیرت ناک انتخاب۔ میں نے بادلِ ناخواستہ اسے سرسری نظر سے دیکھ کے ایک طرف ڈال دیا۔ دوسری میں روز مرہ کے کاروباری اخراجات تھے جیسی اول تا آخر سادہ تھی۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔

کیا چیڈو نے جھوٹ بولا تھا؟ حرام زادہ۔ مر جاتا تو جان چھوٹ جاتی مگر ایسا لگتا ہے کہ زیادہ ذلت اٹھا کے مارا جانا اس کا مقدر ہے۔ پھر اچانک رابعہ نے درمیانی جگہ میں بہت کم گہرائی والی دراز باہر کھینچی اور اس میں سے اصل ڈائری برآمد کر لی۔ اس میں نقد رقم بھی کافی تھی اور دیگر کاغذات بھی خفیہ نوعیت کے ہی ہوں گے مگر ہم وعدہ کر چکے تھے کہ ڈائری کے سوا کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔

میں نے ڈائری کے چند اوراق ملاحظہ فرماتے ہی نعرہ لگایا "اصل گیا گوہر مطلوب۔"

سیٹھ بھونچکا رہ گیا "یہ اپنا مطلوب صاب تو کدھر گیا ہی نہیں۔ ہم کو کیسے ملا اور گوہر کون ہے۔ اس کا را کف؟"

میں نے کہا "سیٹھ تم نے اس خبر سے ہمیں بہت دکھ پہنچایا ہے کہ استاد چیڈو ابھی تک زندہ ہے۔"

وہ بولا "دیکھو اپن قسم کھا سکتا ہے کہ ایسا بات نہیں بولا...."

میں نے اپنی بات جاری رکھی "اس کے باوجود تم نے تمہیں گولی نہیں ماری؟ نہیں ماری نا؟"

اس نے سر ہلایا "ایک دم نہیں ماری" ابھی تک۔"

"اور اگر دراز میں کتنا رکھا ہے۔ اپن اس کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اپن کے کام کا یہ چیز تھا۔ اس کے سوا ہم نے کچھ نہیں لیا۔ نہیں لیا نا؟"

اس نے پھر سر ہلایا "یہ دے۔ تم شریف لوگ ہے۔"

"اب ہم جاتے ہیں" میں نے کہا "ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم آج کے واقعات کو بھول جاؤ۔ یہ سمجھو کہ کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔"

"سمجھ لیا۔ ایک دم سمجھ لیا بابا۔"

"تم نے ہمیں دیکھا ہی نہیں۔ اس دنیا میں تم ہمیں پہچاننے کی غلطی کرو گے تو دوسری دنیا میں پہنچ جاؤ گے۔ تم جا کے اپنے آفس میں بیٹھ جاؤ اور اسی طرح کام شروع کرو جیسے ہمارے آنے سے پہلے کر رہے تھے۔ تم نے ہمارے پیچھے آ کے سڑک پر گدھے کا مالک چلانا شروع کیا، پولیس، پولیس تو جواب میں دو گولی آئے گا۔ ایک دل کے لیے، دوسری دماغ کے لیے۔"

"دل کے لیے کیوں۔ ہم ابھی دل کا مریض ہے، بائی پاس کرایا۔"

"چلو دوسری بھی دماغ کے لیے۔ باہر ہمارے دو آدمی کھڑے ہیں۔ بلکہ ایک کھڑا ہے دوسرا گاڑی میں بیٹھا ہے۔ دو گولیاں چلا کے وہ رخصت ہو جائیں گے اور ظاہر ہے تم بھی دنیا سے رخصت ہو جاؤ گے۔ اس لیے باہر نکل کے دوستانہ طریقے سے ہاتھ ملاؤ تاکہ گوہر مطلوب صاحب بھی دیکھے کہ ہم کاروباری کام سے آئے تھے اور یہ غلط بھی نہیں۔"

اس نے میرے ریوالور کو دیکھا "غلط کیسے ہو سکتا ہے تمہارا بات۔ لیکن اپن کو ایک بات بتاؤ ورنہ اپن کا دل میں وہ رہے گا کھلش۔"

رابعہ نے کہا "سیٹھ کا مطلب ہے خلش۔"

"دیکھا بس یہ ہوگی کہ آخر شیخ مختار کے ساتھ میرا کیا تعلق تھا؟ تو سمجھو غور سے سنو۔ وہ میرا بھائی نہیں، رقیب ہے اور دشمن۔ اس نے میری بیوی کو اغوا کیا تھا۔"

سیٹھ نے رابعہ کو دیکھا "یہ نمبر لو ہے؟"

میں نے کہا "یہ نمبر تین ہے۔ دس نمبری۔ نو سال میں اس نے میری نو بیویاں اغوا کر لیں۔ سوچو ذرا یہ کتنا نقصان ہے۔ نئی بیوی کیا آسانی سے مل جاتی ہے اور پھر خرچ ہر سال کا۔ انکم ٹیکس والے لے جاتیں تو آدمی مصیبت کے صبر کر لیتا ہے مگر ہر سال دس لوگ شادی میں پلاؤ زردہ کھا کے اڑا دیں۔ یہ بڑے صدمے کی بات ہے۔ پھر میرے گھر میں جہیز جمع ہو جاتا ہے۔ فرنیچر شاپ کھول لی ہے میں نے۔ اس کے باوجود گھر میں جگہ نہیں رہی۔ اس ڈائری میں سب لکھا ہوا ہے کہ شیخ مختار نے میری کس بیوی کو کہاں رکھا ہے۔"

"یہ شیخ لوگ بہت شادیاں کرتا ہے۔ اس کو بولو میرا والا بھی لے جائے۔"

میں نے کہا "میں بھی تو یہی چاہتا ہوں ساری بیویاں برآمد کرنے۔ جب تمام بیویاں مل جائیں گی تو پھر مجھے ایک اور مشکل ہوگی کہ کون سی بیوی رکھوں۔ کم سے کم جو کی گنتی کرنی پڑے گی دشمن تم لے لو۔"

اب وہ سمجھ گیا کہ میں سیریس نہیں ہوں "ہم کو ابھی معاف کرو بابا۔"

مجھے یہ اطمینان تھا کہ وہ جان بچ جانے پر خدا کا ہزار بار شکر ادا کرے گا اور شور بالکل نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود باہر نکلنے کے بعد میں نے انتظار کیا۔ اگر وہ باہر آتا تو سب سے پہلے اسے میری شکل اور پھر ریوالور کی نال دکھائی دیتی۔ وہ فوراً واپس اندر چلا جاتا۔

ایک منٹ بعد میں نے رابعہ سے کہا "منبر تین۔ بھاگو۔"

رابعہ نے کہا "میڈم چار سو بیس۔ دس نمبری۔ مبارک مبارک نام کیا میرے لیے ہی رہ گئے ہیں۔ تم ہو شریف لوگ۔"

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا "ابھی اپنے

دل میں بہت کھالش ہے سالا۔ یہ چیڈو مرا نہیں۔"

"بے غیرت مشکل سے مرتے ہیں۔"

"چیلا ایسی ہی راستہ وہ ہمارے لیے رکھتا ہوگا۔ خیر افسوس ناک یہ بات بھی ہے کہ اس کی صرف ایک ٹانگ ٹوٹی اور دو پسلیاں۔ سر گردن اور دھڑ کی ہڈی سب بچ گئے۔ سوچو سال وہ خود مل جانا۔ ایک ٹانگ پر شطرنج کے ساتھ بیٹھا ہوتا۔ ہاتھ منہ سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور اس نے میز پر کوئی مشین گن لگا کے رخ رکھا ہوگا دروازے کی طرف۔"

شوفر نے کہا "سر۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟"

میں نے چونک کے کہا "ارے۔ تمہیں تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

ہم دو دن اکرام شیخ اور کامل کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے مگر اپنی اصل صورت کے ساتھ کسی کے پاس جانا اسے مشکل میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ ٹی وی اسٹیشن کے ایک میک اپ مین سے میری شناسائی تھی جس نے مجھے فرنچ رکیل کالا جواب گیٹ اپ دیا تھا۔ میں نے اسی سے رابطے کی کوشش کی مگر وہ مصروف تھا اور شام سے پہلے نہیں مل سکتا تھا۔ رابعہ نے کہا کہ اسے دن دہاڑے آزادانہ گھومتے پھرنے ڈر لگتا ہے۔ میں نے شوفر سے واپس ہوٹل چلنے کو کہہ دیا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کیونکہ وہاں ایک عقابی آنکھوں، طوطے جیسی ناک والا چغد صورت شخص ہمارا انتظار کر رہا تھا اور ہوٹل کے مالک کے حکم پر انتظار کی کٹھن گھڑیاں، گھڑی دیکھ دیکھ کے، ناخن چبا کے اور پان چبا کے کاٹ رہا تھا۔

منیجر کی نظر کے اشارے پر وہ دوڑتا ہوا آیا۔ "آپ آ گئے اللہ تیرا شکر ہے۔" اس نے ہاتھ جوڑ کے اوپر کیا اور پھر مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد رابعہ سے ہاتھ ملانے کی ناکام کوشش پر شرمندہ ہوا "میرا نام غلام نبی چرخ ہے۔ چرخ ایک تو جانور ہوتا ہے۔ چڑیا گھر میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں آپ۔ دوسرا چرخ نیلی فام 'آسمان'۔"

میں نے کہا "آپ کیا ہیں؟ آسمان یا جانور؟"

وہ "کھی کھی" کر کے یوں ہنسا کہ ہنسنے کی آواز تک نہیں آئی "میں خدمتِ خلق کرتا ہوں۔ سب کا خادم ہوں۔ غالباً آپ کو کچھ مسئلہ درپیش ہے پاسپورٹ وغیرہ کا۔"

میں اسے اوپر اپنے ڈی آئی پی سوئٹ میں لے گیا۔

"چرخ صاحب۔ میرے مسائل تو اتنے ہیں کہ سنانے لگوں تو گوہر عمر بھی ناکافی ہو" میں نے عرض کیا "آپ صرف پاسپورٹ اور ویزا کا مسئلہ حل کر دیں۔"

"تو آپ کے پاسپورٹ کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "پاسپورٹ ہوتا تو پھر مسئلہ ہی کیا تھا۔"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ گویا پہلے پاسپورٹ بنوانے ہیں۔" اس نے ایک ڈائری کھول لی "اپنا نام ولدیت بتاتا چلے۔ پھر اپنی نصف بہتر کا۔"

"یہ بہتر ہیں؟" میں نے ذرا ابھر کے کہا "تمہیرا اپنی اپنی قسمت ہے۔ تو آپ لکھئے۔ سیف نصیر حسین ولد تکبیر حسین۔ حیران مت ہوں۔ ان کا نام ٹھیک ہو تا تو مجھے تکبیر کا نصیر نہ کہا جاتا۔ جب ہارس خان اور لال بیگ جیسے نام ہو سکتے ہیں۔"

"کیا میں نے لکھ لیا اب خاتون محترمہ کا نام نامی" چرخ بولا۔

"مرغیہ زوجہ نصیر حسین" میں نے کہا "پتا وہی ہو نصیر کے ڈیرے کا۔"

"آپ کو جانا ہے سعودی؟"

"لاحول ولا قوة۔ چرخ صاحب سعودی بھی کوئی جانے کی جگہ ہے۔ ہم لندن جائیں گے۔ کیوں رضیہ۔ وہ ہمارے ماموں بھی تو رہتے ہیں جو بال بھی کاٹتے ہیں اور نو مولود کے... میرا مطلب ہے کفار کی سرزمین پر وارد ہونے والی اولاد ملت بیضہ کو مشرف بہ اسلام کرتے ہیں۔ جزاک اللہ۔"

چرخ صاحب نے ایک شعر سنانے کے بعد حساب لگا کے بتایا "آپ کے صرف چار ہزار خرچ ہوں گے۔ چار چار تصویریں لا دیجئے۔"

میں نے کہا "چرخ صاحب۔ ایک بات اور بھی ہے۔ ذرا کان ادھر لائیے۔"

اس نے کان کو میری ناک سے لگا دیا "بہت راز کی بات ہے" میں نے کہا۔

وہ بولا "فکر نہ کریں۔ میرا دل رازداری کا قبرستان ہے۔"

میں نے کہا "ہم ملک سے فرار ہو رہے ہیں۔ میں کسی کی بیوی کے ساتھ فرار ہو رہا ہوں۔ بڑا خطرناک ٹوپی ہے لیکن نام ہے رحم دل خان۔ وہ ایئرپورٹ پر توپ لے کے بیٹھا ہوگا بقلم خود۔"

"ایئرپورٹ پہ۔ خوب۔ یا!"

"کراچی میں تو ضرور ہوگا کیونکہ ہوا یا پانی۔ دوسری راستے ہیں فرار کے۔ نشن پر تو صرف رحم دل خان ہے اور اس کی توپ۔ چنانچہ میں جو تصویریں فراہم کروں گا۔ ان میں میری شکل آپ سے ملتی جلتی ہوگی۔"

چرخ نے چرخ جیسی آواز نکالی "سمجھ گیا۔ مجھے مروانا چاہتے ہیں آپ۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا کہ بدلی ہوئی ہوگی۔ بلکہ بہت زیادہ بدلی ہوئی ہوگی اور تصویر بھی پھر اس چہرے کی نہیں ہوگی۔"

چرخ نے غور فرما کے کہا "ایسی صورت میں..."

میں نے کہا "معاوضہ دس ہزار۔ مجھے منظور ہے۔ بس کام جلد از جلد، میری تاریخ روانگی سے قبل ہو جائے۔ لندن کے دو ٹکٹ حاصل کرنا بھی آپ کی ذمہ داری اور سیٹ کنفرم کرانا بھی۔ یہ بتا دیجئے میں کب آ سکتا ہوں۔"

اس نے پھر غور کیا اور بولا "تریسٹھ چار دن لگتے ہیں.... دو

www.paksociety.com

منگل بدھ جمعرات۔ ہزار روپے یومیہ پر دن کم ہو جاتے ہیں۔"
میں نے دو ہزار بڑھا کے کہا "پرسوں رات کوئی فلائٹ ممکن ہے؟"
"بالکل ممکن ہے۔ بس موسم ٹھیک رہے" وہ بولا "اور آپ فوت نہ ہوں۔"
اس کے جاتے ہی رابعہ نے مجھ سے لڑنا شروع کیا "وہ تو خیر تھا ہی جسٹی۔ تم کیا اوٹ پٹانگ بولتے رہے۔"
میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا "تمہارے ذہن نارسا اور کج فہم ذہن کے لیے عقل و دانش کا ہر نکتہ فکر اوٹ پٹانگ ہے۔ میڈم چار سو بیس۔"
"یہ اچانک لندن کی کیوں سوجھ گئی؟"
میں نے اوپر دیکھ کے کہا "آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں۔"
"سیدھی طرح بات کرو ورنہ۔"
"ورنہ کیا بیگم۔ پھر وہی میکے جانے کی دھمکی" میں نے ڈر کے کہا "اچھا سنو۔ دراصل پہلے میرا پروگرام کراچی میں اکیلے ہی آنے کا تھا لیکن تم زبردستی چپٹ گئیں مجھ سے۔ محاورتاً۔ عملاً نہیں' ویسے ہمارے نصیب کہاں؟ اس کے بعد مجھے لندن ہی جانا تھا۔ الزبتھ کی یاد بہت دل کو تڑپا رہی تھی۔ ملکہ الزبتھ یا الزبتھ ٹیلر نہیں۔ یہ ایسی چیز ہے کہ تم دیکھو گی تو جل کے کوئلہ ہو جاؤ گی۔ بہانہ میں نے کیا تھا اس کیلئے جارج سے جیل میں ملنے کا۔ لیکن اب تم نے قسم کھائی ہے کہ قبر میں بھی میرے ساتھ ہی جاؤ گی تو میں کیا کروں؟"
رابعہ ہنسنے لگی "بدمعاش ہو گئے ہو تم بہت۔"
"بدمعاش کی مونث بدمعاشی۔ ہاہا!" میں نے مصنوعی قہقہہ لگایا "بات یہ ہے رئیسہ زوجہ فقیر۔ کہ ابھی میں کچھ عرصہ روپوش رہنے ہی میں عافیت سمجھتا ہوں۔ تم بھی جتنا عرصہ منظر سے غائب رہو پولیس والوں کے لیے عذاب اتنا ہی طویل۔ منظر ان کی جان کھائے گا۔ وکیل ہنگامہ برپا کریں گے اور اخبارات خوب شور مچائیں گے۔ مشہور وکیل مس رابعہ قادری کے اغوا کا چوتھا دن۔ پانچواں دن' دسواں دن' عدالت میں آئی جی کی طلبی۔ ایڈووکیٹ جنرل کا حلف نامہ جھوٹا ہے۔ استغاثہ کا موقف۔ کیوں نہ یہ دس دن ہم لندن میں گزار آئیں۔ میں تم کو بہت سی۔ میرا مطلب ہے بہت سے دوستوں سے ملواؤں گا۔"
"بہت سی دوستوں سے ملنے میں کیا حرج ہے۔ شرم آتی ہے؟"
میں نے شرما کے کہا "ہاں۔ وہ تمہیں دیکھ کے کیا کہیں گی۔ آخر تھا نا بلڈی کالا آدمی۔ ہیروں کی دکان سے گیا کوئلوں کی کان میں اور کیا چیز لے کر آیا؟"
رابعہ خفا ہو گئی "اگر میں اتنی ہی بری ہوں تو پھر مت ملوانا مجھے کسی سے خود مل لیں آپ سب سے۔"
"یعنی الٹا مطلب نکال کے لڑنا تمہاری عادت ہے بیگم۔ کوئلوں کی کان میں گیا کوہِ نور ہیرا نکالا میں نے۔ یہ دیکھ کے وہ سب کوئلہ ہو جائیں گی۔ سمجھا کرو بات کو۔ میں اور محسن کہاں رہتے تھے کہاں کہاں جاتے تھے اور کیا کرتے تھے؟ میری زندگی کے دو چار برس" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی۔"
رابعہ مسکرانے لگی "بڑے میاں۔ جوانی کیا تمہارا تو بڑھاپا بھی دیوانہ ہے۔"
"دیوانہ بنا کے کہتی ہو دیوانہ ہے" میں نے کہا "اسی کو کہتے ہیں جنگل میں مور ناچا سب نے دیکھا۔ ناٹا غلط محاورہ بولا میں نے اردو بھی غلط وقت پر۔"
شام کو میں نے میک اپ مین سے ملاقات کی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا اور جب میں نے اردو بولی تو بھونچکا رہ گیا "تم فرنچ نہیں ہو؟"
میں نے کہا "فرنچ ایک زبان ہے جو فرانس میں بولی جاتی ہے اور میں زبان نہیں انسان ہوں۔"
وہ ہنسا "اب کیا بننا چاہتے ہیں آپ؟"
میں نے رابعہ کی طرف دیکھا "ان کا شوہر۔ میرا مطلب ہے فقیر حسین۔ یہ جو سامنے فٹ پاتھ پر فقیر بیٹھا ہے۔"
اس نے رازداری سے کہا "یہ سی آئی اے کا آدمی ہے۔"
"اسی لیے سی آئی اے کی یہ حالت ہے۔ خیر تم اس کی صورت بنا دو یا جسے تم پسند ہو۔ بس یہ اصلی چہرہ کسی کا باپ نہ پہچان سکے۔"
"آخر آپ بار بار بھیس کیوں بدلتے ہیں؟"
"فکر مت کرو۔ نہ میں مجرم ہوں اور نہ مفرور" میں نے اسے پانچ ہزار تھماتے ہوئے کہا "تمہارے اطمینان کے لیے یہ کافی ہونے چاہئیں۔"
وہ مطمئن کیسے نہ ہوتا۔ اس نے مجھے رات کے وقت اپنے گھر آنے کی تاکید کی۔ شام ہو چکی تھی۔ باقی وقت ہم نے اکرام شیخ اور کاجل کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے بظاہر بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا اور رات کے کھانے تک روکا مگر اندر جو کچھ کاجل نے اکرام شیخ سے دبے دبے لہجے میں کہا وہ میں نے سن لیا اور شاید اس کا مقصد بھی مجھے سنانا ہو گا۔ مجھے احساس ہوا کہ یہاں آ کے میں نے غلطی کی تھی۔ وہ کاجل جسے ہم مشرقی پاکستان سے بچا کے لائے تھے اور اس وقت سہارا دیا تھا جب دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ بالکل بدل گئی تھی۔ اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات یہ تھی کہ ہمارا دوست اکرام شیخ۔ سابق ایس آئی۔ سابق ٹیکسی ڈرائیور۔ دولت مند ہوتا تو سارے رشتوں کو فراموش کر چکا تھا۔ بیوی اس پر حاوی تھی۔ سالا جورو کا غلام۔ میں نے دل

ہی دل میں کہا اور آئندہ کبھی وہاں نہ آنے کا عہد کیا۔ خود رابعہ کے لیے یہ صدمے کی بات تھی۔
میں نے اسے ہوٹل میں چھوڑ کے میک اپ مین کے گھر کا رخ کیا۔ اس کے لیے میں نے ٹیکسی استعمال کی تھی۔ میں نے رابعہ کو تاکید کر دی تھی کہ وہ رات کو ہوٹل چھوڑ دے اور جہاں میں کہوں وہاں آ جائے۔
رات دس بجے میں نے اسے فون کیا تو وہ گھبرائی ہوئی تھی "سکندر۔ یہاں تو بڑی مصیبت میں ہوں میں۔ نیچے وہ بیٹھا ہے۔"
میں نے کہا "کون بیٹھا ہے؟"
"چوہدری دلاور۔ وہ ہم سے ملنے آیا تھا۔ منیجر نے کہا کہ اس نام سے تو یہاں کوئی بھی ٹھہرا ہوا نہیں ہے تو وہ ہال میں بیٹھ گیا۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"
مجھے یقین تھا کہ رابعہ کو غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔
میں نے صورت حال پر غور فرما کے کہا "رابعہ کیا تم نے دلاور کو دیکھا ہے؟"
رابعہ نے خفگی سے کہا "مذاق کا یہ کون سا وقت ہے۔"
"لاحول مذاق کرنے والے پہ۔ جواب دو میری بات کا۔"
"یعنی دیکھا کیوں نہیں' ہزار بار دیکھا ہے۔ کل کو تم پوچھو گے۔ سکندر کو دیکھا ہے؟"
میں نے اپنے سر پہ ہاتھ مارا "نیک بخت' جس دن میرا دماغ اتنا خراب ہوا اس دن میں پاگل خانے کے اندر نظر آؤں گا۔ ابھی تو میں نے پوچھا تھا کہ آج ابھی اور اسی وقت تم نے دلاور کو دیکھا ہے۔ بقلم خود۔ بقائمی ہوش و حواس؟"
"نہیں۔ نہیں... ابھی کیسے دیکھ سکتی تھی میں۔"
"یعنی تم نے سن کر یقین کر لیا۔ کس سے سنا یہ تم نے کہ دلاور ہمیں ہی پوچھ رہا تھا۔"
"خود منیجر سے۔"
"اس نے کسی کو بھیجا تھا یا بقلم خود کہا تھا۔"
"کیا بقلم خود بقلم خود لگا رکھی ہے۔ اس نے فون کیا تھا مجھے۔"
میں نے کہا "اور تمہیں یقین ہے کہ وہ آواز منیجر کی تھی؟"
وہ بولی "اور کس کی ہو سکتی تھی۔ کمرے میں ڈائریکٹ لائن تو ہے نہیں کہ کوئی باہر سے مجھے فون کر سکے۔ ویسے مجھے شک بھی نہیں۔ وہ منیجر ہی تھا۔"
میں نے کہا "اس بدتمیز' بدعقل' بدصورت شخص کو تم نے جھاڑ نہیں پلائی اس گستاخی پر کہ آخر اس نے تمہیں فون کر کے یہ کیوں پوچھا؟"
"میں نے کہا تھا کہ جب تمہیں میرا نام معلوم ہے تو پھر مجھ سے یہ احمقانہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟ اس نے بڑی معذرت کی اور بولا کہ بعض اوقات لوگوں کے دو نام ہوتے ہیں۔ خود میری بیوی حیدر آباد دکن کی ہے اور اس کے دو نام ہیں۔ ایک ننھیال کا دوسرا ددھیال کا۔ اور بھی بہت سے کیس دیکھے ہیں میں نے جہاں گھر کا نام کچھ اور تھا' اسکول سرٹیفکیٹ اور دستاویزات کا نام کچھ اور۔"
"لیکن خاص طور پر اس نے صرف تم سے کیوں پوچھا؟"
"یعنی اس نے سب سے پوچھا۔ ہر کمرے میں جہاں کوئی عورت کسی کے ساتھ تھی۔ اس نے معلوم کیا۔ جھاڑ کھائی اور بکی وضاحت پیش کی۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ خفا ہونے والی آپ تیسری خاتون ہیں۔ ابھی دو باقی ہیں۔ لیکن ہم کیا کریں کسی کا معاملہ آئے دور سے اور ہم اس کی اتنی مدد بھی نہ کریں۔"
"اچھا اب تم ایکشن کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں اس وقت تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اگر میں نے یہ رسک لیا تو بہت زبردست مار دھاڑ اور خون خرابہ ہو گا۔ سکندر کے پیچھے لگ جائیں گے۔ اس کے بعد میں تم کو دشمنوں کے نرغے سے نکال لاؤں گا۔ انشاء اللہ۔"
"مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟"
"تم پہلے نیچے جا کے دیکھو۔ کیا وہ واقعی دلاور ہے۔"
"اور کون ہو سکتا ہے؟"
"کوئی دلاور کا نام لے کر تمہیں یا مجھے ہراساں کر سکتا ہے۔"
"ایسا کون ہو گا۔ اور ہو گا تو وہ ہمارا دوست نہیں دشمن ہی ہو گا جس نے ہمیں پہچان لیا اور ہمارا تعاقب کرتا ہوا اس جگہ تک پہنچ گیا جہاں ہم خود کو بہت محفوظ سمجھ رہے تھے۔"
میں نے ڈانٹ کر کہا "کل تم بے پردہ گھوم رہی تھیں۔ آج بھی میرے ساتھ تھیں اور یہ سارا قصور ہے تمہارے ہزار واٹ سے زیادہ روشن نگاہوں کو خیرہ کر دینے والے حسن کا۔ جو ایک بار دیکھ لیتا ہے وہ بھلا نہیں سکتا۔"
"تم خود بھی تو بڑی بے وقوفی سے دندناتے پھر رہے تھے سارے شہر میں۔" رابعہ نے کہا "کیا تمہیں کوئی نہیں پہچان سکتا۔"
"خیر غلطی کسی کی نہیں۔ یہ کھیل ہے تقدیر کا۔ اب تم کسی طرح نیچے تک جا کے دیکھو۔ کیا لاؤنج میں واقعی وہ حرام زادہ بیٹھا ہے؟"
"اور بیٹھا ہو تو کیا کروں؟"
"یعنی یا تو اس سے مل لو اور پھر جو اللہ کو منظور" میں نے آہ بھر کے کہا "یا پھر کسی طرح اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل آؤ۔ غائب ہو جاؤ وہاں سے ایسے... جیسے کبھی وہاں تھیں ہی نہیں۔"
"مجھے جادو نہیں آتا۔ اور میں کھڑکی سے سیدھا سڑک پر بھی نہیں کود سکتی۔"
میں نے کہا "کوشش تو کرو۔ زیادہ سے زیادہ فوت ہو جاؤ گی تم۔

www.paksociety.com

شیپ رفا کملازی درت ایک تیرہ تانگ نوٹے گی تو لنگڑی محبوب۔"

"سکندر۔ خدا کے لیے مجھے پریشان مت کرو۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔"

میں نے کہا "کیا خوب فرمایا ہے اس موقع کے لیے کسی شاعر نے کہ۔ مجھ کو اس رات کی تنہائی میں آواز نہ دو۔ میں پریشان ہوں مجھے اور پریشان نہ کرو۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے مس رابعہ کہ تم برقع میں روپوش ہو کے نکل آؤ۔"

"یہ اتنا آسان کام ہوتا تو میں تم سے کہتی۔ سب سے پہلے تو مجھے منیجر سے کہنا پڑے گا کہ میرا بل بھیج دو۔ میں جا رہی ہوں۔ اس کے بعد میں نکل برقع میں تو کیا اسے شک نہیں ہو گا؟ میں آئی تھی برقع میں۔ پھر تمہارے ساتھ بے پردہ پھرتی رہی اور اب کوئی پوچھ رہا ہے تو میں فوراً ہوٹل چھوڑ کے جا رہی ہوں۔ پھر برقع میں۔"

"اتنا رسک تو تمہیں لینا پڑے گا۔ بس تم باہر نہ جاؤ۔ پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ میں تمہیں یوں لے جاؤں گا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"نہیں سکندر۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ دلاور میرے پیچھے لگ جائے گا اور اس نے مجھے قابو کر لیا تو میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔ تو تم بھی کچھ نہیں کر سکو گے۔"

میں نے کہا "یہ بات واقعی قابلِ غور ہے۔ تم کسی ویٹر سے مدد لے سکتی ہو۔ اس کے ہاتھ پر رکھو پانچ سو ہزار روپے اور اس سے کہو کہ اپنی وردی دے دو۔"

"اپنا مردانہ جوڑا بھی دے دو۔"

میں نے کہا "پھر رہی ہزار واٹ کے بلب جیسے لگتا ہوں کو خیرہ کرنے والے چہرے کا مسئلہ۔ تم کسی سے پوچھو کہ باہر جانے کا کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟ اگر وہ تمہیں اس عقب چور دروازے سے عقبی گلی میں نکال دے۔"

"سکندر یہ ناممکن ہے۔ ہوٹل والے خود ایسے راستے نہیں رکھتے ورنہ مسافر بل ادا کیے بغیر فرار ہو جائیں۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اچھا۔ پھر میں تمہاری فریاد پر لبیک کہتا ہوں اور جیسے محمد بن قاسم فاتح سندھ پر حملہ آور ہوا تھا ایسے ہی ہوٹل پر حملہ کرتا ہوں یا جیسی۔ ویسے تو میری شکل مبارک بہت بدل چکی ہے اور میں تم کو بھی نہیں چھپوں گا تو تم چلانے لگو گی کہ چل حرامی' مال' بہن تمہیں اپنی ٹھکری۔ لیکن دلاور کی آنکھوں میں سکندر بخت کو پہچاننے کے لیے خصوصی لینز فٹ ہیں یا وہ میرے اتنے بہروپ دیکھ چکا ہے کہ اب ہر بہروپ میں مجھے شناخت کر سکتا ہے۔ تم جہاں ہو وہیں میرا انتظار کرو۔"

"کتنی دیر میں آرہے ہو تم؟"

"یہ بتانا مشکل ہے لیکن ایک نہ ایک دن میں ضرور آؤں گا۔ بینڈ باجے کے ساتھ۔ گھوڑے پہ سہرا ڈالے گھوڑے پر سوار۔ پھر یہ ظالم سماج میری راہ میں دیوار نہیں بن سکے گا۔ زندگی طوفان اور بجلیاں میرا راستہ نہیں روک سکیں گے۔"

یہ سب باتیں میں نے رابعہ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کی تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے مجھے اپنی کم ہمتی سے مایوس کیا تھا۔ اگر اس وقت میں غلطی سے بھی کہہ دیتا کہ تم بس عدالت میں قانونی وکیلوں کی جنگ لڑ سکتی ہو۔ نادر ہوتی تو سارے ہوٹل کو تباہ کر کے نکل آتی۔ تو رابعہ اتنی خفا ہوتی کہ بعد میں اسے منانا مشکل ہوتا۔ زیادہ بہت بھی عورت کی ضد کا کیا علاج۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میرا ساتھ نہیں چھوڑے گی خواہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔

میں ہوٹل سے کچھ فاصلے پر رک گیا اور صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے کیا تو میں رات کے وقت بھی چوہدری دلاور ہال میں بیٹھا ہو گا بے شک وہ دعوت تو کی ہے مگر ہوٹل والے بھی ڈائننگ ہال رات بھر کھلا نہیں رکھتے اور کسی کو ساری رات لاؤنج میں بیٹھنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔ کچھ دیر میں بارہ بج جائیں گے تو لاؤنج کی لائٹس بھی آف ہو جائیں گی۔ صرف باہر پورچ کی روشنی رہ جائے گی جہاں چوکیدار بندوق لیے کرسی پر بیٹھا رہتا ہے یا پھر کاؤنٹر کے پیچھے کرسی پر سونے والے منیجر کے لیے ایک لائٹ جلتی رہتی ہے۔

یہ سوال اپنی جگہ میرے ذہن میں موجود تھا کہ آخر چوہدری دلاور یہاں پہنچا کیسے؟ اب اس کا سب سے آسان جواب یہی تھا کہ اس نے اندازے کی بنیاد پر کراچی کا رخ کیا کہ ہم کہیں اور نہیں جا سکتے۔ ہم اس کی توقعات کے عین مطابق اتنے ہی احمق ثابت ہوئے جتنا اس نے سمجھا تھا اور یہ ہماری بدقسمتی یا اس کی خوش قسمتی کہ اتنے بڑے شہر میں اس نے گل و بلبل کی جوڑی کو دیکھ لیا۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ کہیں وہ اکرام شیخ کے گھر تو نہیں پہنچا تھا؟ ممکن ہے اس نے اکرام شیخ یا کاجل کو فون کیا ہو۔ اکرام شیخ تو سب کی آواز شاید اب بھی فون پر سنتے تو پہچان لے مگر کاجل کیسے سمجھ سکتی ہے کہ فون کرنے والا منظری ہے یا قاری یوسف ہی ہے۔ منظری اسٹائل کو کاپی کرنا تو بہت آسان ہو گا۔ بھئی کاجل' کہاں ہے وہ بھوتنی کا سکندر اعظم کی اولاد۔ تمہارے ذلیل ایس آئی شیخ شوہر کو ضرور معلوم ہو گا کہ لیلیٰ مجنوں کہاں ٹھہرے ہیں۔ تمہارے در پر بھی آئے ہوں گے صدا لگانے اور کاجل ضرور بتا دے گی۔

نہ جانے کیوں مجھے یقین آگیا کہ ایسا ہی ہوا ہو گا۔ اکرام شیخ اور کاجل کی بے وقوفی دیکھنے کے بعد یہ بعید از قیاس بھی نہیں لگتا تھا کہ خود کو دلاور کے عتاب سے بچانے کے لیے انہوں نے اسے ہمارے ہوٹل کا پتا دے دیا ہو۔ وہ اب ہمارے معاملات میں پڑنا تو دور کی بات ہے شاید ہم سے ملنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ پڑتا ہے رنگ انساں کیسے کیسے۔

رابعہ تک پہنچنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں سیدھا اندر چلا جاؤں اور اپنے کسی نئے نام سے کوئی کمرا حاصل کر لوں۔ اس طرح میں یہ بھی دیکھ سکتا تھا کہ چوہدری دلاور ابھی تک میری راہ میں کی راہ دیکھ

بیٹھا ہے یا نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خود اس نے کسی فرضی نام سے ہوٹل میں کمرا لے کر اپنا ڈیرا جما لیا ہو۔ کمرا خالی ہو گا تو اسے بھی مل گیا ہو گا اور مجھے بھی مل جائے گا۔

اچانک اوپر والی وہی کھڑکی کھلی جس سے گزشتہ شب میں نے ایک چور دروازے کو جھانکتے دیکھا تھا۔ مجھے رابعہ کے بدحواس چہرے کی ایک جھلک نظر آئی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اسے اشارہ کر کے کنایہ وفورِ بیٹھ جانے کی خوش خبری دیتا وہ کھڑکی بند ہو گئی۔

یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ورنہ میں اشارہ اسے کرتا اور دیکھ لیتا چوہدری دلاور تو زیادہ خرابی ہوتی۔ اب میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ ہوٹل کے اندر قدم رنجہ فرما کے منیجر سے کوئی کمرا حاصل کرنے کی درخواست کروں۔ میں اس سے براہِ راست یہ سوال تو نہیں کر سکتا تھا کہ ابھی کوئی چوہدری دلاور نام کا شخص آیا تھا جو سکندر بخت یا رابعہ کا پتا پوچھ رہا تھا؟ الٹا وہ مجھ سے سوال کرتا کہ آپ کو کیسے الہام ہوا جناب۔ پھر میرے لیے بغلیں جھانکنا ضروری ہو تا۔

میں نے لاؤنج میں داخل ہو کے دیکھا تو وہاں کا منظر بدل چکا تھا۔ تمام لائٹس آف تھیں۔ ایک بینچ پر ویٹر محوِ خواب تھا اور کاؤنٹر کے پیچھے مالک اونگھ رہا تھا۔ وہاں کسی چوہدری دلاور کا وجود نہیں تھا۔ یہ بات بھی مجھے عجیب سی لگی کہ ہوٹل کا مالک رات کو خود موجود ہوتا تھا اور دن میں اس کا ملازم منیجر۔ رات کو صرف الو' چور' چوکیدار اور اخبار والے جاگتے ہیں۔

میری بات پر اس نے کہا "کمرے تو بہت ہیں جی۔ بس خالی کوئی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے فون کیا تھا میں نے۔ اس وقت خالی تھا ایک کمرا؟"

"اس وقت دو کمرے خالی تھے" وہ بولا "آپ ان سے پہلے پہنچ جاتے تو۔ خیر اب آپ جا سکتے ہیں مولانا۔"

میں نے جاتے جاتے رک کے کہا "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ آپ ہی اس ہوٹل کے مالک ہیں جو رات کی ڈیوٹی دیتے ہیں۔"

اس نے چونک کے کہا "بات تو سولہ آنے ٹھیک ہے مولوی صاحب۔"

میں نے کہا "کوئی سال بھر پہلے میں نے قیام کیا تھا۔ کمرا نمبر چار سو تین میں۔ اور یہ بات پوچھی تھی تو آپ ناراض ہو گئے تھے کہ کیا آپ صحافی تھے؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اب سن لو جناب۔ اپنی جو گھر والی ہے نا۔ وہ ہے صحافی۔ اس کی ڈیوٹی ہوتی ہے رات کو۔ تو ہم نے کہا کہ اب ہم سوئیں رات کو اور تم سوؤ دن بھر۔ ایسے تو نکاح ٹوٹ جائے گا۔ زندگی کی گاڑی کا ایک پہیہ۔ ان میں چلے ایک رات کو۔ تو خانہ آبادی کیسے بڑھے گی۔ اب یا تو تم چھوڑو صحافت کو یا میں چھوڑوں ہوٹل کو۔ مجھے بھی نوکری دلا دو اخبار میں یا پھر ہم دونوں

شفٹوں کا اتحاد ہو۔ کسی اور سے۔ یہ سب ناممکن تھا۔ ہم جاہل اجڈ میں صرف چپراسی ہو سکتے تھے اس میں بیوی کی بے عزتی خراب ہوتی۔ وہ صحافت نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ شادی سے پہلے ہی شرط منظور کر لی تھی میں نے۔ میں ہوٹل بیچ دیتا تو ساری عیاشی ختم ہو جاتی۔ اصل آمدنی ہوٹل سے ہے۔ صحافت سے نہیں۔ اور وہ تو بالکل ہی ناممکن تھا۔ ایک دوسرے کو چھوڑنا۔ چنانچہ جناب میں نے اس کا یہ حل نکالا کہ اب خود بھی رات کو جاگتا ہوں۔ دن میں ہم ایک ساتھ سوتے ہیں۔ ہمارے لیے وہ رات ہے جو دنیا کے لیے دن ہے۔"

میں نے کہا "جرأت نہ ہو تو ایک سوال ہے۔"

"یہی نا کہ کیا میری مت ماری گئی تھی۔ تو جواب یہ ہے کہ ہاں۔ ہر بندے کی مت ماری جاتی ہے تو وہ ایسا ہی کرتا ہے۔ وہ تو مجھے تھا بڑی بلندی۔ مسٹر لاہور بننے کا شوق تھا۔ بس ایک دن اس نے میرا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کیا لیا سب کچھ لے لیا۔ وہ میری باڈی پر عاشق ہو گئی تھی' میں اس کی باڈی پر۔ صورت میری بھی ایسی ہی تھی اور اس کی بھی مگر رب نے ملائی جوڑی" اس نے اوپر آسمان کی طرف انگلی اٹھائی "آپ اس گلی میں دوسرے ہوٹل دیکھ لو۔ کسی نہ کسی جگہ مل جائے گی مولانا صاحب۔"

میں نے اس کے قیمتی مشورے کو گرہ میں باندھ لیا اور پھر باہر آگیا۔ اب مجھے رابعہ کی طرف سے باقاعدہ تشویش لاحق ہو رہی تھی۔ وہ میرے انتظار میں صرف پریشان ہو سکتی تھی اور پریشان آدمی سے کوئی بھی حماقت سرزد ہو سکتی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ پھر فون کر کے بلا لے یا نام آ جائے اور روشن دیکھ رہا ہو تو میں اسے فوراً اشارے سے سمجھا دوں کہ ہیرو آگیا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں مگر میں سڑک پر منہ اوپر اٹھائے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔

میں نے اسے دوبارہ فون کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اسے قیامت تک انتظار کرنے والا شعر سناؤں مگر مشکل یہ تھی کہ ادھر ادھر کی ساری دکانیں ہوٹل' بازار سب بند ہو گئے تھے۔ آگے ایک ہوٹل میں مجھے بتا دیا گیا کہ فون خراب ہے۔ دوسرے ہوٹل میں فون واقعی خراب تھا۔ میں جھنجلاہٹ میں باہر آیا ہی تھا کہ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ لائٹ چلی گئی تھی اور سڑکوں پر روشنی تک بجھ گئی تھی۔ دو ہوٹلوں نے اپنے جنریٹر اسٹارٹ کیے مگر باقی سڑک پر تمام عمارات تاریکی میں ڈوبی رہیں۔ ایک شخص اوپر والے فلیٹ کے زینے سے اترا اور تھڑے پر بیٹھ کے سگریٹ پیتے ہوئے اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "زندگی عذاب کر دی ہے سب نے مل کے۔ فون ٹھیک ہوا تو بجلی خراب۔ دو دن سے پانی نہیں آیا۔ جس کا بیٹری نہیں بل ایک مہینے نہ دو تو فوراً کاٹ دیتے ہیں۔ دن بھر کام کرو گدھے کی طرح رات کو سونا مشکل۔" وہ دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا چنانچہ ہر جملے میں مختلف محکموں سمیت حکومت کے لیے بھی ناپسندیدہ گالیوں سے ہر جملے میں موتی پرو رہا تھا۔

میں نے بھی دردناک لہجے میں کہا "ہم غریبوں کی بھی کوئی

www.paksociety.com

ڈونگی ہے۔ ادھی رات سے بیوی تڑپ رہی ہے۔ میں فون کرنے کے لیے بھٹک رہا ہوں کسی ڈاکٹر کو بلانا تھا۔"
وہ ایک دم موم ہو گیا۔ "فون کرنا ہے۔ ارے تو بتاؤ کیا ہوا ہے بیوی کو؟"
میں نے آواز میں مزید رقت پیدا کی "اللہ ہی جانے۔ کمزور ہو رہی ہے۔"
"پہلے بھی ایسا ہوا ہے کبھی؟"
"ہاں۔ میری ساس کے ساتھ ہوا تھا۔ صبح تک اوپر چلی گئی تھیں۔ ڈاکٹر کے آنے میں دیر ہو گئی تھی۔"
"صوفی صاحب۔ میرا مطلب تھا بیوی کے ساتھ؟"
"نہیں۔ اسی لیے تو ڈر رہا ہوں بھائی کہ تاریخ اپنے آپ کو نہ دہرا دے؟"
وہ شریف اور رقیق القلب آدمی تھا۔ اس نے مجھے فون کے سامنے بٹھا دیا اور خود کھڑکیاں کھولنے لگا۔ مختصر سے فلیٹ میں سخت گھٹن تھی اور کھڑکیاں کھولنے کے باوجود اس میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس نے کہا "ہوا آ کدھر سے آئے گی۔ ہر طرف تو پیاؤ کھڑے کر دیے ہیں۔ عمارت سے عمارت جوڑ دی ہے۔"
مجھے اتنی دیر میں کمرا نمبر چار سو بیس مانگنے کا موقع مل گیا تھا۔ ورنہ وہ نہ جانے کیا سمجھتا "رابعہ۔ ہاں ارے کچھ فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں آ رہا ہوں ابھی۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔ نہیں تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔ نہیں، وہ تو نہیں ملا۔ کیا معلوم، ممکن ہے وہ وہیں ہو کسی کمرے میں۔ گھبراؤ مت۔"
فلیٹ میں رہنے والے نے مجھے غور سے دیکھا "تم نے اپنے گھر فون کیا تھا؟"
میں نے کہا "ہاں۔ اپنی بیوی کو۔"
"پھر اپنے گھر سے ڈاکٹر کو فون کیوں نہیں کیا تھا صوفی صاحب!"
میں نے کہا "فون خراب ہے۔ کال آ رہی ہے۔ نمبر ڈائل نہیں ہوتا۔"
"اچھا اچھا۔ ایک بار میرا فون بھی دس دن ایسے ہو گیا تھا۔ بس جی خرابی ہی خرابی ہے۔ وہ بھی ہماری قسمت میں۔"
میں نے کہا "کیا بات ہے۔ اس فلیٹ میں نہ سامان ہے نہ کوئی اور؟"
"فلیٹ خالی کر دیا ہے میں نے۔ یہاں کوئی رہ سکتا ہے؟ بیوی بچوں کو کرائے کے مکان میں شفٹ کر دیا ہے۔ خود یہاں آ جاتا ہوں کبھی کبھی۔ جب تک فلیٹ بک نہیں جاتا۔"
میں نے سوچ کے کہا "بات ہوئی ہے کسی سے؟"
"ہاں۔ خریدار تو مفت لینا چاہتے ہیں۔ میں بائیس ہزار سے ایک دھیلا پائی کم نہیں لوں گا۔"
میں نے کہا "دیکھو۔ میں میں بات کرتے ہو تو ابھی بیعانہ لو۔

صبح پوری فوری ادائیگی۔ بولو منظور ہے؟"
وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ذرا سی بات کے وقت بجلی چلی جانے کی اور ایک گاہک آ جائے گا۔ "منظور!" اس نے یوں کہا جیسے ڈر رہا ہو کہ سامنے والا شخص دھواں بن کے فضا میں تحلیل ہو جائے گا۔ یہ ناقابل یقین سی بات تھی کہ ایک فون کال کرنے والا فلیٹ مع فون خرید لے۔ خود میں کب سوچ سکتا تھا کہ اگلے لمحے میں اتنا بڑا فیصلہ کر لوں گا لیکن اس وقت مجھے یہ سب کچھ اتنا حیران کن نہیں بلکہ انتظام غیب لگا۔ بجلی کا جانا دو ضرورت مندوں کی ضرورت پوری ہونے کا بہانہ تھا۔
میری جیب میں چند سو روپے تھے۔ اسے میں نے ایک ہزار پیش کر دیے جو اس نے بڑی خوشی خوشی قبول کر لیے۔ میں نے اس سے رسید بھی نہیں مانگی۔
"صوفی صاحب باقی کب؟ بینک کھلنے کے بعد؟"
"تم بینک کھلنے سے پہلے لو یار" میں نے بے تکلفی سے کہا۔
"سیل ڈیڈ ہوا رکے پاس۔"
میں نے کہا "صبح سب ہو جائے گا۔ میں نو بجے آؤں گا بیوی کے ساتھ۔"
نیچے اتر کے میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ چلو ایسا مکان تو ہوا جس کا پتا دلاور کے باپ کو نہیں۔ اب یہاں میں ایک سال بھی گزار لوں تو کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ رابعہ تو یہ تہ میں محفوظ ہے اور میرا یہ نیا ٹھیہ سب سے بہتر ہے۔ اس چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے والوں پر شک بھی کون کر سکتا ہے۔ مسئلہ صرف رابعہ کو دلاور کی نظر سے بچا کے یہاں لانے کا تھا۔
میں نیچے اتر کے آیا تو ابھی تک بجلی کا بریک ڈاؤن چل رہا تھا۔ مجھے بجلی کمپنی کی ایک گاڑی نظر آئی جس کا ڈرائیور نیچے کھڑا ہوا تھا۔ ایک الیکٹریشن ٹرک کے پچھلے حصے میں نصب بلند ہو جانے والی سیڑھی پر چڑھا ہوا کھمبے کے تاروں کو دیکھ رہا تھا اور ایک پی ایم ٹی کو چیک کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کے میرے ذہن میں ایک ایسا خیال آیا جو بادی النظر میں قابل عمل نہیں لگتا تھا مگر کسی بھی کام میں ہاتھ ڈالتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس کے دو نتائج ممکن ہیں۔ کامیابی یا ناکامی۔ کامیابی کا تناسب زیادہ ہونے کی صورت میں کوشش نہ کرنے سے کوشش کرنا بہرحال بہتر ہوتا ہے۔
ڈرائیور منہ اٹھائے اوپر دیکھ رہا تھا۔ "ابے کیا ہو گیا۔ اتنی دیر لگا دی۔"
اوپر سے الیکٹریشن نے جواب دیا "تجھے بہت جلدی ہے گھر جانے کی تو جا۔ میں خود ہی گاڑی چلا لوں گا۔"
"جیسے پہلے چلائی تھی" ڈرائیور نے بڑی ہی بے زاری سے کہا اور ایک گالی دی۔
الیکٹریشن نیچے اتر آیا "بس یار ہونے والی بات ہو جاتی ہے ورنہ میں بھی ڈرائیوری کر لیتا ہوں۔ تو جانتا ہے کہ بجلی کمپنی کی نوکری تو پارٹ ٹائم ہے۔"

"وہ سب معلوم ہے مجھے لیکن اب ایسے نہیں چلے گا۔ میری آدھی تنخواہ کٹ جاتی ہے اور تو نے اس مہینے پھر کچھ نہیں دیا ہے۔"
"اردلی کا باپ۔"
"اس کی تھی میں گئی باری۔ میرے گھر میں فاقے پڑ رہے ہیں۔"
الیکٹریشن منت کرنے لگا "بس اوور ٹائم مل جائے اس مہینے کا۔"
"پچھلے مہینے بھی تو نے یہی کہا تھا لیکن اوور ٹائم وصول کر کے ہی نکل گیا تھا۔"
"یار تو میرے حالات سے واقف ہے۔ پھر بھی ایسی بات کرتا ہے۔" الیکٹریشن بھی غصے میں آ گیا۔
"میرے حالات تو خراب تھے، خانہ خراب ہو گیا میرا۔"
بات بڑھ گئی اور میں دخل اندازی نہ کرتا تو اشتعال کی کیفیت میں کچھ بھی ہو جاتا۔ وہ ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑ دیتے یا سر پھوڑ دیتے۔ میں حلیے سے سخت پابند شرع قسم کا پکا مولوی نظر آتا تھا۔ میری داڑھی بالشت بھر لمبی تھی اور سر پر وہ پگڑی جو عموماً دینی مدارس کے طلبا یا اساتذہ باندھتے ہیں۔ میری شلوار بھی ٹخنوں سے اوپر تھی اور میں نے ٹخنے کا بند گلے والا کرتہ پہن رکھا تھا۔ جو عینک میں نے لگا رکھی تھی اس کا کوئی نمبر نہیں تھا مگر سیاہ فریم سے ایسا لگتا تھا کہ میری نظر خاصی کمزور ہے۔
میں نے بیچ میں پڑتے ہوئے کہا "کیا بات ہے۔ تو ہی رات کے وقت گلی میں کتے لڑتے ہیں۔ تم انسان ہو۔"
ڈرائیور نے کہا "آپ اپنا کام کریں مولوی صاحب۔ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔" الیکٹریشن نے مجھے امداد طلب نظروں سے دیکھا مگر بولا نہیں۔
میں نے کہا "حکم ہے کہ دو مومن بھائی آمادہ فساد ہوں تو ان کے درمیان صلح کرا دو۔"
الیکٹریشن نے کہا "آپ اسے سمجھائیں۔"
ڈرائیور گرم ہو گیا "اس میں مجھے سمجھانے والی کون سی بات ہے۔ تو ماں کا زیور بیچتا یا بیوی کا۔ مجھے میرے پیسے چاہئیں۔"
"تیرے پیسے!" الیکٹریشن نے تلخی سے کہا "ادھار دیا تھا تو نے مجھے۔ انکار کر دوں میں تو کیا کرے گا تو۔ بول، تھانے جائے گا؟ کیس کرے گا مجھ پر؟"
ڈرائیور نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی "بتاؤں میں کیا کروں گا۔ تیری تو۔"
میں نے الیکٹریشن کو بچایا "دیکھو یہ مسئلے کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے سے یا کسی کی جان لینے سے حل نہیں ہوتے۔ اس طرح مسائل بڑھ جاتے ہیں۔ تم مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔ رہے تو سب کا مشکل کشا ہی ایک اللہ ہے۔"
الیکٹریشن نے کہا "مولوی صاحب۔ یہ بھی شرافت ہے۔ ورنہ۔"
ڈرائیور نے کہا "ورنہ کیا۔۔۔ بتا میں قبر تک پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ دیکھو جی مولوی صاحب، میں غریب آدمی ہوں۔ کمپنی میں ڈرائیوری کرتا ہوں۔ تنخواہ بہت کم ہے گزارے کے لیے۔ تھوڑی بہت اوپر کی آمدنی نہ ہو تو گزارا مشکل کیا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے اوور ٹائم کرتے ہیں۔ آپ دیکھو تو کہ اس وقت بھی کام کر رہے ہیں۔ اللہ معاف کرے ہم مجبور لوگ ہیں مگر افسر بھی حصہ وصول کیے بغیر چھوڑتے نہیں۔ ہیرا پھیری سے سو روپے ملتے ہیں تو ہمارے حصے میں پچاس ہی آتے ہیں۔"
الیکٹریشن نے تائید میں سر ہلایا "اوپر والے کچھ کیے بغیر آدھے لے جاتے ہیں۔ نگران کی مرضی کے بغیر کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔"
میں نے کہا "تم محنت سے اوور ٹائم کما رہے ہو۔ اس میں افسران کون ہوتے ہیں حصہ مانگنے والے۔"
الیکٹریشن نے کہا "آپ نہیں جانتے مولوی صاحب۔ ایسے دھندے میں سب کو شامل کرنا پڑتا ہے۔ اوور ٹائم بنتا نہیں۔ بنایا جاتا ہے۔ ہر انجینئر کا اپنا علاقہ ہے۔ تھانے دار کی طرح وہ بھی ماہانہ بھتہ وصول کرتا ہے۔"
میں نے حیرانی سے کہا "کس بات کا بھتا؟"
"بجلی سپلائی کرنے کا۔"
میں نے کہا "اس کا تو بل آتا ہے۔"
"بھولے شہنشاہ گھر میں بجلی چلی جائے تو نیند حرام ہو جاتی ہے۔ ریڈیو ٹی وی فریج سب بند ہو جاتے ہیں۔ کاروباری آدمی کا تو بڑا فرق ہو جاتا ہے اگر بجلی دو گھنٹے بند رہے۔ ہم بجلی بند نہ کرنے کا بھتا لیتے ہیں۔ گارنٹی رہتی ہے کہ بریک ڈاؤن نہیں ہوگا اور کارخانہ چلتا رہے گا۔ چھوٹے کارخانے دار کا نقصان سیکڑوں میں ہوتا ہے تو بڑی فیکٹری کے مالک کا ہزاروں میں۔ ہم ان کو نقصان سے بچاتے ہیں۔"
ڈرائیور نے کہا "جتنا نذرانہ وہ ہمیں دیتے ہیں وہ ان کے نقصان کی زکوۃ سے بھی کم ہوتا ہے۔ اب تو ہر علاقے کا معاملہ سیٹ ہے۔ مقررہ تاریخ پر کارخانے والے اور دکان دار خود ہی رقم اکٹھی کر کے پہنچا دیتے ہیں۔"
"اور نہ پہنچائیں تو؟" میں نے کہا۔
"تو اگلے دن بریک ڈاؤن۔ جو ایک گھنٹے کا بھی ہو سکتا ہے اور پورے دن کا بھی۔ وہ کرنے والے نیچے سے اوپر تک رپورٹ خرابی کا تو نہیں پتا ہوتا ہے اور ٹھیک بھی ہم ہی کر سکتے ہیں۔ دوسرے علاقے کی گاڑی تو آ نہیں سکتی۔"
میں نے کہا "یعنی اس وقت جو ہر طرف اندھیرا ہے اس کے ذمے دار تم ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ خرابی کہاں ہے مگر تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو؟"
"نہیں مولوی صاحب۔ اس وقت تو واقعی بریک ڈاؤن ہوا ہے اور اسی لیے ہم خوار ہو رہے ہیں۔ ورنہ ہم سیدھے یہاں جانے

www.paksociety.com

ہیں جہاں کوئی تار اس سے ٹکتا ہوتا ہے یا کھڑا ہوتا ہے۔ وہ وقت میں خرابی دور کر کے گھر جاتے ہیں اور لمبی تان کے سو جاتے ہیں۔" زرا نیور نے کہا۔

الیکٹریشن بولا "زرکھو جی خرابی میں دیکھ بھال کے خود پیدا کرتا ہوں۔ ٹھیک بھی میں کرتا ہوں۔ جان کا خطرہ بھی ہے تو میرے لیے۔"

"فضول باتیں مت بنا۔ مولوی صاحب کے بجائے کسی افسر کے سامنے یہ کہنے کی ہمت ہے؟ میں گاڑی نہ چلاؤں تو سالا سائیکل پر آئے گا تو؟ اور افسروں کو پیسہ نہ ملے تو کیا وہ رات بارہ بجے تک بیٹھے رہیں گے ہمیں۔ تو بھی دن میں ایک کمپنی کا ٹرک چلاتا ہے اور میں حاضری لگا کے ایک بنگلے پر چوکیداری کرنے چلا جاتا ہوں۔ افسروں کی مرضی کے بغیر یہ ہو سکتا ہے۔"

"تم لوگ دن میں دوسری نوکری کرتے ہو؟ تنخواہ بھی کمپنی سے صرف حاضری لگانے کی لیتے ہو۔" میں نے پُرملامت لہجے میں کہا "مگر قصور تمہارا نہیں۔ حکومت نے مہنگائی کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ غریب فری کا جینا مشکل کر دیا ہے۔"

"اللہ خوش رکھے" زرا نیور بولا "ہم مجبوری میں حرام کھاتے ہیں۔ دن میں خرابی کی رپورٹ آتی ہے مگر ہم ٹھیک کرنے نکلتے ہیں رات بارہ بجے۔ اس سے پہلے ڈیوٹی اور دوسرا کام نہیں بنتا۔ دن میں فرضی شکایات دور کرتے ہیں۔ شکایات کے رجسٹر میں رپورٹ لکھنے والے کو بھی حصہ ملتا ہے۔ وہ دن بھر میں دس اصلی رپورٹ میں لکھتا ہے تو نوے جعلی۔ نوے فرضی خرابیاں دور کرنے کے لیے ہم دن بھر گاڑی لے کر پھرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ گاڑی کام آتی ہے افسروں کے ذاتی کام کے لیے اور ہم کرتے ہیں دوسری نوکری۔ اصل خرابی تو گھنٹے دو گھنٹے میں ٹھیک ہو جاتی ہے۔ پھر گھر جا کے سو جاتے ہیں۔"

"کبھی زیادہ ٹائم بھی لگ جاتا ہے۔" الیکٹریشن نے کہا۔

"ہاں۔ بارش کے موسم میں یا آندھی طوفان آنے کے بعد۔"

میں نے کہا "کیا یہ دکان دار اور کارخانے والے احتجاج نہیں کرتے؟"

"کرتے ہیں مگر اس سے بریک ڈاؤن تو ٹھیک نہیں ہوتا" الیکٹریشن ہنسا "کبھی کبھی اخبار میں بیان دے دیتے ہیں مگر دو چار دن بعد بھگت لیتے ہیں۔ اب بیٹھے رہیں ہاتھ پر ہاتھ رکھے۔ کسی کا باپ نہیں جان سکتا کہ خرابی کیا ہے اور کہاں ہے۔ پی ایم ٹی میں سب اسٹیشن میں فیڈر میں یا گرڈ اسٹیشن پر۔ ہم جانتے ہیں اس لیے یوں ٹھیک کر دیتے ہیں چٹکی بجاتے میں۔"

زرا نیور نے کہا "مجھے کل پیسے چاہئیں۔"

"کل؟ تیرا دماغ خراب ہے۔"

میں نے کہا "بھئی یہ جھگڑا کیا ہے آخر۔"

زرا نیور نے کہا "اجی مولوی صاحب! اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ یہ بیوی کو گھمانے لے جاتا تھا اس گاڑی میں۔ رات کو گاڑی اپنے پاس رکھتا تھا۔ خرابی ٹھیک کرنے بھی خود ہی چلا جاتا تھا۔ سامنے سے مستی میں گاڑی ٹھوک دی ایک کھمبے میں۔"

"مستی کیا۔ غلطی ہو گئی۔ ورنہ میں پکا ڈرائیور ہوں۔"

"بکواس مت کر۔ تو نے بتایا تھا کہ گاڑی چلاتے ہوئے تو نے بیوی سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش کی تھی۔ گاڑی کا بیڑا غرق ہوا۔ کھمبا گر گیا اور تاریں ٹوٹ گئیں۔ انکوائری ہوئی تو الزام مجھ پر آ گیا۔ میں کیسے کہتا کہ گاڑی کوئی اور چلا رہا تھا۔ گاڑی میرے چارج پر ہے اور وہ رفت تھا اور ٹائم ڈیوٹی کا۔ اس حرامی سے پوچھو کہ رات بارہ بجے کے بعد کام کے ٹائم پر بیوی کا کیا کام؟"

الیکٹریشن نے خفت سے سر کھجایا "میں نے بتایا تھا تجھے کہ ہم آخری شو دیکھ کے نکلے تھے۔ سوچا وہ چار فالٹ ہیں۔ وہ دور کر کے ہی گھر جائیں گے۔"

"زور قلم رکھ کے کچھ زیادہ ہی دماغ خراب ہو گیا تھا۔ سارا نقصان میرے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ نوکری بچ گئی۔ میں نے جھوٹ بول دیا تھا کہ ایک سائیکل والے کو بچانے کی کوشش میں حادثہ ہو گیا مگر گواہ ثبوت کوئی نہیں تھا اور ادھر یاں کوئی فالٹ رپورٹ بھی نہیں تھی۔ دس ہزار کا نقصان مجھے ایک ... میں پورا کرنا ہے۔ ہزار روپے ہر مہینے دیتا ہوں تو بجلی کمپنی سے کچھ بھی نہیں ملتا۔ صرف چوکیداری کی تنخواہ میں گھر نہیں چلتا۔ نقصان اس نے کیا تھا۔ یہ پورا کرے۔ میں نے اس کے ساتھ بھلائی کی تھی۔"

"میں کب انکار کرتا ہوں مگر میں ہزار کہاں سے لاؤں ہر مہینے۔ بیوی الگ بیمار ہے۔"

"خاک بیمار ہے۔ تو نے بیمار کیا ہے اسے۔ بچہ جنے گی تو خرچہ کمپنی دے گی۔" ڈرائیور بولا "تم ابھی دو ہو۔ میرے تو پانچ بچے ہیں لیکن تمہیں سیر سپاٹے سوجھتے ہیں..."

"تو مجھ سے تو میں نے دے دیے۔ اور کیا چاہیے۔"

"ہاں تو مجھے کیا تیرا باپ دے گا؟"

"باپ تک مت جا۔ میں نہیں دیتا۔ جو کرنا ہے کر لے۔"

میں نے پھر انہیں روکا "دیکھو۔ صرف پانچ ہزار کی بات ہے نا۔ چلو میں ادا کر دیتا ہوں۔ پیچ مجھ سے لے لینا اور کمپنی میں جمع کرا دینا اکٹھے۔ ادھر قرض اتر جاتا۔"

وہ ایک دم خاموش ہو کے میری صورت دیکھنے لگے "آپ دو گے پانچ ہزار۔ آخر کیوں؟"

"جب اللہ نے مجھے توفیق دی ہے تو اچھا ہے تمہاری مشکل آسان ہو جائے اور تم خون خرابے سے بچ جاؤ۔"

الیکٹریشن بولا "توفیق تو خدا نے ہر ایک کو دی ہے۔"

ڈرائیور بولا "آخر آپ کون ہو؟ کیا کرتے ہو مولوی صاحب! کسی مسجد کا چندہ دے رہے ہو؟"

میں نے کہا "لعنت ہزار بار مسجد کے نام پر چندے کھانے والوں پر۔ یہ میرا پیسہ ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں بھی تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا ہوں۔ تم نے مجھے سچ بتایا تو میرا بھی فرض بنتا ہے کہ تم سے کچھ نہ چھپاؤں۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر الیکٹریشن بولا "کوئی ایسا ویسا کام ہے مولانا صاحب؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ ایسے ویسے کام سے تمہاری کیا مراد ہے؟ خدانخواستہ میں تم سے کسی کا قتل کراؤں گا یا تم سے چرس اسمگل کرنے کو کہوں گا۔"

"پھر پانچ ہزار کس لیے دے رہے ہو؟"

"اس لیے کہ تمہارے سوا میری مدد کوئی نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا "مجھے تمہاری یہ سیڑھی چاہیے جو اوپر نیچے ہو جاتی ہے۔ مجھے ایک عمارت کی چوتھی منزل تک پہنچنا ہے۔"

"یہ چوتھی منزل تک نہیں جا سکتی۔ زیادہ کی اونچائی دوسری منزل تک ہے۔" زرا نیور نے کہا "اور چوتھی منزل تک جانے کے لیے زینہ نہیں ہے کیا؟"

"زینہ تو ہے..."

الیکٹریشن کو پانچ ہزار لینے کی جلدی تھی "یار بند ہو گا زینہ یا ٹوٹ گیا ہو گا۔"

"عمارت کہاں ہے؟" زرا نیور بولا۔

میں نے کہا "اسی گلی میں ذرا آگے۔ ایک ہوٹل ہے۔"

"ہوٹل..." زرا نیور چونک پڑا "مولوی صاحب کیوں مروانے اور مرنے کا کام کرتے ہو۔ ہوٹل میں ہر وقت لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ گیٹ پر چوکیدار بندوق لیے بیٹھا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "تم مجھے ہوٹل کے ساتھ والی بلڈنگ پر پہنچا دو۔"

"اس میں بھی لوگ رہتے ہیں۔"

"لوگ اس وقت سو رہے ہیں" میں نے کہا۔

"کسی فلیٹ کی کھڑکی کھلی ہو گی۔ سچ بتاؤ کہ مولوی کے بھیس میں تم چور ڈاکو تو نہیں ہو یا کسی کو قتل کرنے کا ارادہ تو نہیں ہے تمہارا؟"

"توبہ توبہ" میں نے دونوں کان پکڑے "تم کہو تو میں قرآن پر ہاتھ رکھ کے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرا ارادہ بالکل مجرمانہ نہیں ہے۔ مجھے تو وہاں سے ایک مصیبت زدہ کو نکالنا ہے۔"

"کون ہے وہ مصیبت زدہ؟" زرا نیور بولا۔

"ایک عورت ہے۔"

وہ اچھل پڑے "عورت!"

میں نے کہا "عورت میری بیوی ہے۔"

"کیا ثبوت ہے کہ تم کسی اور کی بیوی کو اغوا نہیں کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "اغوا ہوتا ہے زور زبردستی سے۔ وہ عورت خود آئے گی پھر تو تمہیں یقین آ جائے گا۔"

"نہیں مگر یہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ کیا پتا یہ ہوٹل کا بل دیے بغیر بھاگ رہی ہو۔ کوئی ایسی ویسی عورت ہو۔ کسی گاہک کا خون کر کے اس کا مال سمیٹ کر فرار ہونا چاہتی ہو۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ میں حلف اٹھانے کو تیار ہوں اور تم کو میری بات کا پھر بھی اعتبار نہیں۔ کیسے مسلمان ہو تم۔ وہ عورت سخت مصیبت میں ہے۔ اس کی مدد کرنا عین کارِ ثواب ہے۔ ہوٹل میں ایک بدکردار شخص موجود ہے جو اس کو قتل کر دے گا۔ وہ سیدھے راستے سے نہیں نکل سکتی۔"

"نہیں مولوی صاحب۔ مجھے تو معاف رکھو" زرا نیور بولا "تمہاری بات سچ ہے تو پولیس کے پاس جاؤ۔"

"پولیس... تاکہ سارے زمانے کو پتا چل جائے۔ وہ عورت کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ تفتیش کے نام پر پولیس مجھے بھی دھر لے اور اسے بھی۔ ثبوت مانگے اور پھر ارادۂ قتل رکھنے والا ملزم تو نکل جائے اور بے گناہ پھنس جائیں۔ پولیس شرافت سے کسی شریف آدمی کی مدد کرتی ہے؟ بیچ سے تحقیق کر کے رسوائی مول لینی ہوتی تو میں ضرور پولیس کے پاس جاتا۔"

"مولوی صاحب کی بات دل کو لگتی ہے" الیکٹریشن بولا۔

"پانچ ہزار کی بات ہے نا۔ تیرے دل کو کیسے نہیں لگے گی مگر مجھے کیا ضرورت ہے ایسے چکر والے کام میں پڑنے کی۔ ساری رقم قرض میں چلی جائے گی۔ تیرا بوجھ اتر جائے گا۔ مجھے کیا ملے گا۔"

زرا نیور کی بات میرے دل کو لگی۔ "تم نے ٹھیک کہا۔ تمہیں کیا ملے گا۔ چلو میں پانچ کے دس کر دیتا ہوں۔ پانچ پانچ بانٹ لینا۔ وہ تم لوگ آدھے کر لینا۔"

زرا نیور کا لالچ بھاری تھا۔ وہ اڑ گیا کہ صرف ڈھائی ہزار کے لیے وہ ایسا کوئی کام نہیں کرے گا کہ نوکری بھی جائے اور بندہ تھانے بھی جائے۔ الیکٹریشن پانچ ہزار کو اس لیے غنیمت سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنی مجرمانہ غلطی کا قرض بے باق کرتے کرتے پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے پاس نئی نویلی بیوی پر خرچ کرنے کے لیے پیسہ نہیں بچتا تھا اور ڈرائیور اس پر واضح کر چکا تھا کہ کمپنی کا جرمانہ تو اسے مر کے بھی ادا کرنا پڑے گا۔ میری پیش کش میں اسے اپنے سارے مسائل کا حل نظر آ رہا تھا۔ وہ نوجوان تھا اور ابھی اس کے بچے بھی نہیں تھے۔ وہ رسک لینے پر تیار تھا۔ مزاحمت تو زرا نیور کی بھی کمزور پڑ گئی تھی اور وہ پہلے کی نسبت کم مخالفت کر رہا تھا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ میرے پاس جو کچھ تھا سب تمہیں پیش کر دیا۔ اس سے زیادہ ہوتا تو ضرور دیتا۔ آگے تمہاری مرضی۔ میں شریف آدمی ہوں اور اسی گلی میں رہتا ہوں۔ ادھر اوپر میرا فلیٹ ہے۔ یقین نہیں تو چل کے دیکھ لو۔ یہ دس ہزار کمانے کا موقع گنواؤ تو پھر مصیبت میں پڑے رہو گے اور ایک دوسرے کو پانچ ہزار کی دشمنی میں قتل کر دو گے کسی دن۔ خطرہ تو زندگی میں ہر قدم پر آدمی کے ساتھ ہے۔ سڑک پر چلنے میں حادثے کا خطرہ ہے۔ پھر کیا آدمی گھر سے نہ نکلے۔ خطرہ تو سانس لینے میں بھی ہے کہ نہ جانے کب کسی مہلک بیماری کے جراثیم جسم میں داخل ہو جائیں۔ رسک تو لینا ہی پڑتا ہے کامیابی کے لیے۔ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کے خبط میں سیکڑوں مر گئے۔ مگر علی کے بخت سے [illegible]

www.paksociety.com

جانے کتنے باکسر مرگئے سر کی چوٹ سے یا مفلوج ہوگئے۔ کھیل میں بھی خطرہ ہے۔"

انسپکٹر بٹن میری عالمانہ تقریر سے سخت متاثر تھا "چلو جی مولوی صاحب۔"

ڈرائیور نے کہا "پہلے ہم دیکھیں گے کام ہوسکتا ہے یا نہیں اور اس کے بعد بھی میری ایک شرط ہے۔ پانچ ہزار میں سے چار میرے۔"

"یہ بڑی ناانصافی ہے۔"

"کیوں ناانصافی ہے جب تجھے مل رہے ہیں ایک ہزار۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس میں سے تو اپنی غلطی سے ہونے والے نقصان کے پانچ ہزار ادا کرے گا۔ غلطی نہ کرنا تو سارے تیرے ہوگئے۔"

انسپکٹر بٹن نے ایک آہ بھری "اچھا یار۔ اللہ کرے تیری جان نکل جائے تیرے جیسے کمینے۔ دو نفل شکرانے کے پڑھوں گا۔"

"یہ بھی عہد کرنا کہ آئندہ کبھی گاڑی چلاتے ہوئے ایسی بے ہودہ حرکت نہیں کروگے جس سے بلکہ کسی کی گاڑی تباہ ہو۔ کھیل کرتے تمہارا سر ٹوٹ جائے یا تمہارا گھر۔" میں نے کہا۔

"اتنی بڑی سزا کے بعد میرے باپ کی توبہ، چلو مولوی صاحب۔"

ڈرائیور پھر مشکل دیکھ میں پڑ گیا "اب پھر سوچ لے ایسا نہ ہو بعد میں اسی طرح توبہ کرنا پڑے۔"

میں نے کہا "دیکھو بھائی تم کو پوچھنے والا کون ہے۔ تم جہاں چاہو گاڑی کھڑی کرکے جس کھمبے پر چاہو چڑھو۔ لوگ یہی سمجھیں گے کہ بجلی ٹھیک کررہے ہو۔ کھمبے باقاعدہ فلیٹوں کے اور کمروں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ تم پر کون شک کرسکتا ہے کہ تم اوپر کسی کھڑکی کے راستے اندر جارہے ہو یا کسی کو برآمد کررہے ہو۔ ویسے بھی آدھی رات کے وقت دیکھنے والا کوئی نہیں اور یہ اندھیرا تو ایک طرح سے تمہارا معاون و مددگار ہے۔"

ڈرائیور مان گیا مگر عین ہوٹل کے سامنے گاڑی روکنے کے بعد اس کی ہمت پھر جواب دے گئی۔

اس نے انسپکٹر بٹن سے کہا "یار تو اپنے رسک پر یہ کام کر۔ میں پکڑا گیا تو بیوی بچوں کے لیے نوکری کا آسرا بھی نہیں رہے گا۔"

جوشیلا اور نوجوان انسپکٹر بٹن اس ایڈونچر میں پوری طرح شریک ہوگیا تھا۔ اس نے کہا "اچھا تو چلا جا یہاں سے۔ اپن تو جوا کھیلنے کا عادی۔ ہار ہو یا جیت۔"

میں ان دونوں کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہوٹل کے سامنے پہنچ کے میں نے وہ کھمبے دیکھے جو سیکنڈ فلور کی گیلری سے چند فٹ دور تھے۔ ان میں سے ایک پر ٹرانسفارمر بھی نصب تھا مگر اس کا پلیٹ فارم پہلی اور دوسری منزل کے درمیان تھا۔ اگر میں براہ راست سیکنڈ فلور کے چھجے پر اترتا اور پھر ہر کمرے کی کھڑکی میں جھانکتا تو یہ ہوسکتا تھا کہ کوئی مجھے مقابل کی کسی عمارت کے اندر سے یا سڑک پر سے دیکھ لے۔ میں براہ راست کسی گیلری میں کود جاتا تو مجھے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر کسی مہمان کو جگانا پڑتا اور پھر اسے آواز نکالنے سے پہلے ہی ناک آؤٹ کرنا پڑتا۔ پہلی قطار کے کمروں سے گزرے بغیر میں اس کاریڈور میں نہیں پہنچ سکتا تھا جس کے دوسری طرف بھی دس کمروں کے دروازے تھے۔ ہر منزل پر پہلی قطار میں کمرا نمبر ایک تھا اور اس کے مقابل کمرا نمبر دو۔ اسی طرح کمرا نمبر انیس سڑک کی جانب تھا اور بیس پیچھے۔

میں نے نقشہ ذہن میں رکھتے ہوئے وہ راستہ اختیار کیا جس میں خطرہ کم تھا۔ انسپکٹر بٹن نے گاڑی روکی تو چوکیدار باہر آگیا۔

"ایک گھنٹا ہوگیا بریک ڈاؤن کو۔"

"ایک گھنٹا دس منٹ" انسپکٹر بٹن سیڑھی پر چڑھ کے بولا۔

"اب آنے کی فرصت ملی؟"

"جب خرابی دور ہوگی۔ خرابی کب دور ہوگی۔ اس سوال کا جواب ہمارا چیف انجینئر بھی نہیں دے سکتا۔ ہم کوشش کرتے ہیں ٹھیک کرنے کی۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔ ہمارا دماغ خراب مت کرو۔"

اس کے بعد چوکیدار کے لیے وہاں کھڑے رہنا بے عزتی کی بات تھی۔ وہ پھر اپنی کرسی پر جا بیٹھا تو میں گاڑی سے اترا اور پچھلے حصے میں پہنچ گیا۔

انسپکٹر بٹن کچھ نروس تھا۔ "اب بولو کدھر لگاؤں سیڑھی یار؟"

میں نے کہا "یہ جو ٹرانسفارمر ہے۔ اس کے پیچھے۔"

"جانا کہاں ہے؟"

میں نے کہا "ان دکانوں کے اوپر والے چھجے پر۔"

"واپسی کتنی دیر میں ہوگی؟"

"دس منٹ تو لگ جائیں گے۔"

"میں یہاں ٹرانسفارمر کے کٹ آؤٹ دیکھتا ہوں۔ دیر ہوئی تو پیچھے والے کھمبے کے ساتھ سیڑھی لگا کے اوپر چڑھوں گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ ادھر بھی گیلری ہے۔ اب یہ واپسی کا راستہ کدھر سے ملتا ہے۔"

میں سیڑھی پر چڑھا۔ انسپکٹر بٹن نے اسے لیور گھما کے اونچا کیا اور پھر تھوڑا سا جھکایا تو میں بہ آسانی گیلری میں اتر گیا۔ اس نے سیڑھی ہٹا کے مزید بلند کی اور خود اس پر چڑھ گیا۔

اب میں انسپکٹر مارکیٹ کی بڑی بڑی دکانوں کے دو تین منزلہ اور بلند و بالا سائن بورڈ کے پیچھے تھا جو میرے سامنے کسی دیوار کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ عام حالات میں اس چھجے پر چلنا خطرناک کام تھا کیونکہ یہاں نیون سائن کے تاروں کا جال بھی بچھا ہوا تھا۔ بجلی ہوتی تو احتیاط کے باوجود میرا ہاتھ یا پیر کسی ننگے تار کے جوڑ کو چھو سکتا تھا۔ نیون سائن میں پانی ہوتا ہے رنگین جلتی بجھتی روشنیوں کا کھیل جاتا ہے۔ شیشے کی نلکی غائب ہونے سے تار خالی ہوگئے۔ نلکی کی ہر طرف اور متحرک نظر آنے والی ہر شبیہ اس وقت خاموش تھی۔ ورنہ ان میں سنسناتی بجلی کی آواز صاف سنائی دیتی۔

میں تاروں کے جال سے بچتا سر جھکائے آگے بڑھا اور پہلی گیلری کا کنارہ پکڑ کے اوپر چڑھ گیا۔ یہ گیلری شاید سو فٹ لمبی ہوگی اور اس میں سڑک کی سمت واقع تمام کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ اس گیلری کا مقصد مہمانوں کو بازار کی رونق کے نظارے سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرنا تھا۔ اس وقت مہمان سوئے پڑے تھے اور میرے لیے تاریکی میں کسی کھڑکی یا دروازے کے شیشے سے اندر جھانک کر یہ دیکھنا مشکل تھا کہ کون سا کمرا خالی ہے اور کس میں کوئی مسافر ہے لیکن قدرت شاید میری مدد پر آمادہ تھی کہ مجھے دو کمروں کی کھڑکیاں کھلی ہوئی نظر آگئیں۔ میں جھک کر گیلری میں کسی جانور کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں پر چلتا ہوا پہلی کھڑکی تک گیا اور آہستہ آہستہ اپنا سر اٹھا کے اندر جھانکا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ میرا یوں چوروں کی طرح اندر دیکھنا قانونی جرم ہی نہیں تھا اخلاقی اعتبار سے بھی غلط حرکت تھی۔ اس کا احساس مجھے کمرے میں ایک نظر ڈالتے ہی ہوگیا۔ میں نے ایک انتہائی ہیجان انگیز منظر دیکھ لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس منظر کے دونوں کرداروں کی ساری توجہ ایک دوسرے پر تھی۔ کہیں غلطی سے بھی عورت کی نگاہ کھڑکی پر ہوتی تو وہ چیخ مارتی اور میرا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیتی۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے ماتھے کا پسینہ پگڑی کے پلو سے صاف کرکے آگے بڑھا۔ دوسری کھڑکی میں جھانکنے سے پہلے میں نے اپنے اعصاب پر قابو پالیا تھا۔ ہوٹل کے کمروں کی خلوت کے مناظر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں نے خود سے کہا۔ اور ہوٹل میں صرف مسافر ہی نہیں ہوتے۔

دوسرے کمرے میں صرف ایک شخص تھا جو گہری نیند میں خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے کروٹ لے کر اپنا منہ دیوار کی طرف کرلیا تھا۔ اس سے مجھے مزید تقویت ملی اور میں دبے پاؤں کھڑکی سے کمرے میں اتر گیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور میں اس خیال سے خوف زدہ تھا کہ اگر اس کی نیند کچی ہوئی یا میری کسی غلطی سے وہ جاگ اٹھا تو پھر میری خیر نہیں۔ وہ چور چور چلانے لگے گا اور جب سارا ہوٹل جاگ جائے گا تو چوہدری بولا اور بھی کسی کمرے سے نکل آئے گا۔ اس طرح کسی ہوٹل کے کمرے میں چور کا داخل ہونا بڑی غیر معمولی بات ہے۔ چور ہوٹل کے اندر ہوسکتا ہے مگر باہر سے براہ راست فرسٹ فلور پر کیسے پہنچ سکتا ہے۔ زینہ یا لفٹ استعمال کیے بغیر۔

میں دبے پاؤں سوتے ہوئے شخص کے پاس سے گزرا اور احتیاط سے اپنا ہاتھ کنڈی کی طرف بڑھایا جو اس نے اندر سے لگا رکھی تھی۔ کنڈی اضافی تھی ورنہ کمرے کو اندر ڈور لاک کا بٹن دبا کے بھی بند کیا جاسکتا تھا۔ پہلا مرحلہ کسی دشواری کے بغیر سر ہوگیا۔ کنڈی آہستہ آہستہ کسی آواز کے بغیر کھولنے میں مجھے دو تین منٹ لگے ہوں گے مگر یہ میرے لیے دو تین گھنٹے کے برابر تھے۔ میری نظر ہر لحظہ سوتے ہوئے شخص پر تھی۔ وہ کسی وقت بھی کروٹ لے کر آنکھیں کھول سکتا تھا یا اچانک اٹھ کے باتھ روم کا رخ کرسکتا تھا۔ پھر میرے لیے اسے فوراً خاموش کرنا ضروری ہوجاتا۔

ڈور لاک کھولنا زیادہ خطرناک کام تھا۔ بیشتر ڈور لاک کھٹکا کرتے ہیں۔ یہ تو جیسا ڈور لاک تھا۔ میں نے اسے مضبوطی سے پکڑا اور آہستہ آہستہ گھمایا۔ خوابیدہ شخص اس وقت خراٹے لے رہا تھا۔ ہلکا سا کھٹکا ہوا تو میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ میں بلاوجہ کی ہنگامہ آرائی نہیں چاہتا تھا ورنہ اس شخص سے ڈرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

جب میں نے دروازہ کھولا تو اس کے قبضے بھی چرچرائے مگر خراٹوں میں یہ آواز دب گئی۔ میں نے باہر آکے سکون کا سانس لیا اور دروازے کو اپنی طرف کھینچ کے دونوں پٹ آپس میں ملا دیے۔ اس طرح کہ دروازہ کھلا نظر نہ آئے لیکن لاک بھی نہ ہو۔ ابھی مجھے رابعہ کے ساتھ اسی راستے سے واپس بھی جانا تھا۔

کاریڈور میں پہنچ کے میں کچھ پُرسکون ہوگیا اور میں نے اطمینان کے ساتھ زینے کے راستے فورتھ فلور کا فاصلہ طے کیا۔ میں بہت محتاط تھا اور پوری کوشش کررہا تھا کہ میرے قدموں کی آہٹ بھی کوئی نہ سنے۔ نیچے سے اوپر تک دو کمروں میں روشنی تھی۔ وہاں کوئی جاگ رہا تھا یا لائٹ جلا کے سونے کا عادی تھا۔

کمرا نمبر فورٹی فور کی درز سے بھی لائٹ جھانک رہی تھی۔ میں نے انگلی سے دروازہ بجا کے دبی دبی آواز میں رابعہ کو آواز دی۔ اس نے قریب آکے خوف زدہ لہجے میں پوچھا "کون ہے؟"

میں نے کہا "کوئی نہیں ہے۔"

اس نے دروازہ کھول دیا اور مجھے دیکھ کے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"سکندر۔ یہ تم ہو یا میرے خدا۔" اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "یہ کیا حلیہ بنا کے آئے ہو۔"

میں نے کہا "خاتون محترم۔ جس فرنچ وکیل کے ساتھ آپ اتنا عرصہ رہیں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ناچیز کو مولانا نصیر الدین قدوسی کہتے ہیں۔"

"مولانا ناچیز۔ آخر آپ آئے کدھر سے؟"

میں نے کہا "یہ مت پوچھو۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔ جب میرے ساتھ چلو گی تو خود ہی پتا چل جائے گا۔"

"دلاور نے تمہیں دیکھا تو ہوگا!"

"مجھے تو اس کا سایہ بھی دکھائی نہیں دیا۔ لیکن ہوٹل میں دو کمرے بک ہوتے ہیں۔ ایک میں دلاور ہوسکتا ہے۔"

"وہ کمرے میں دروازے بند کرکے سوتے نہیں آیا ہوگا۔ کسی نہ کسی نے تو تمہیں ضرور دیکھا ہوگا۔ تمہارے ملنے سے دھوکا کھا جانے تو اور بات ہے۔"

"چھوڑو یہ ساری باتیں" میں نے کہا "ہم نے بل ادا کردیا ہے؟"

"ہاں۔ لیکن منیجر نے کہا کہ چارجز کل صبح بارہ بجے تک کے

www.paksociety.com

ہوں گے کہ آپ ابھی خالی کریں یا صبح۔ آپ کی مرضی۔ پھر میں نے کہہ دیا کہ اب ہم صبح ہی جائیں گے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔" میں نے کہا "میں ٹین کا یہ صندوق اٹھاتا ہوں۔ تم میرے پیچھے آؤ۔ کاش ہم اس ٹین کے صندوق کو یہاں چھوڑ سکتے۔"

"یہ مولوی غلام حسین کے لیے ایک جذباتی نشانی ہے۔"

"یہی تو مصیبت ہے" میں نے کہا۔

"کیا میں برقع اوڑھ لوں؟"

"نہیں۔ اب جو میں کہہ رہا ہوں غور سے سنو۔ سوال کوئی مت کرنا۔ میرے پاس جواب دینے کے لیے وقت نہیں ہے۔ پہلے میں جاتا ہوں۔ پانچ منٹ بعد تم اندر لائٹ جلتی چھوڑ کے نکلو۔ دروازہ بند کر دو۔ فرسٹ فلور تک ایسے دوڑو کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ زینے سے اترو گی تو پہلا کمرا جو تمہارے سامنے ہوگا اس کا نمبر ہے ایک سو انیس۔ کمرا نمبر ایک سو تیس کا دروازہ کھلا ہوگا۔ چوتھا دروازہ۔"

"چوتھا دروازہ۔ ٹھیک ہے۔ تم ملو گے وہاں؟" رابعہ بولی۔

"نہیں۔ وہ میرا کمرا نہیں ہے۔"

"پھر کس کا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔ میں تو خود اس میں سے گزر کے آیا تھا۔"

"تو! اسے کھولا کہ خالی ہے" رابعہ کچھ مطمئن ہو گئی۔

"خالی نہیں ہے۔ کوئی شخص کھڑکی کھول کے سو رہا تھا۔ میں سڑک کی طرف والی گیلری سے اندر داخل ہوا تو اسے پتا ہی نہیں چلا۔"

رابعہ کی حالت خوف سے غیر ہو گئی "تم ادھر کیسے پہنچے۔ چوکیدار نے روکا نہیں؟"

میں نے کہا "سوال پر سوال کیے جا رہی ہو۔ میں سیڑھی لگا کے اوپر آیا تھا۔ واپسی بھی اسی طرح ہوگی۔ اور کوئی صورت نہیں ہے ہمارے خاموشی سے نکل جانے کی۔ ورنہ تو سیڑھی ہٹ جائے گی۔ چلو۔"

رابعہ نے کہا "لیکن۔۔۔ اس طرح کسی کے کمرے میں داخل ہونا۔"

میں نے کہا "تمہیں وہاں سے رہنے اوپر گزرنا ہے اور کھڑکی تک پہنچنے کے لیے دس بارہ فٹ کا فاصلہ طے کرنا ہے۔ کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ تم گیلری میں پہنچ جاؤ۔ اس کے بعد کوئی مسئلہ نہیں۔ وہاں میں تمہارا انتظار کروں گا۔ راستہ ذرا خیال رکھنا۔ گھبراہٹ میں کسی چیز سے مت ٹکرا جانا۔ کچھ گرا مت دینا۔ ویسے اندھیرا نہیں ہے کمرے میں۔ باہر سے روشنی آ رہی ہے۔ تھوڑی بہت ہوٹل میں تو جنریٹر چل رہا ہے ورنہ بجلی کا بریک ڈاؤن ہے اور یہ ہمارے لیے بہترین موقع ہے۔"

رابعہ نے کانپتی آواز میں کہا "اگر وہ شخص جاگ اٹھا۔ یا اس نے مجھے چور سمجھ کے شور مچا دیا۔ پھر؟"

"رابعہ۔ یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ اگر ایسا ہوا تو پھر دیکھا جائے گا۔ تمہیں کمرے سے گزرنے میں دس سیکنڈ بھی نہیں لگیں گے اور وہ شخص گہری نیند میں ہے۔"

میں صندوق اٹھا کے باہر نکلا۔ کاریڈور کی لائٹس آف تھیں۔ جنریٹر پر کم سے کم لوڈ رکھنے کے لیے ہوٹل کی انتظامیہ نے ضروری لائٹس آن کی تھیں۔ وہ مہمانوں کو لائٹ جلانے یا پنکھا چلانے سے منع نہیں کر سکتے تھے۔ بنیادی طور پر یہ سہولت انہی کے آرام کی خاطر فراہم کی گئی تھی۔ انہوں نے زیرو بلب لائٹس جلا دی تھیں جو پوسٹ میں تھیں اور ہر کمرے کی گیلری میں اور ہال میں تھیں۔ سائن بورڈ کو روشن کرتی تھیں اور ہوٹل کے نام کو نمایاں کرنے والے ٹیوب سے نیون سائن کی۔

اندھیرے کی وجہ سے ویرانی کا تاثر گہرا ہوتا تھا۔ آخری رات گئے اوپر کی منزلوں پر آمد و رفت بھی نہیں تھی اور نہ کوئی روم سروس کو آرڈر دینے کے لیے جاگ رہا تھا۔ میری کسی کی دو فرسے ملاقات نہیں ہوئی اور فرسٹ فلور تک میں دو منٹ میں پہنچ گیا۔

روم نمبر ایک سو تیس کا دروازہ اسی طرح بند تھا اور کھلا ہوا بھی تھا۔ ٹین کا بکس اٹھانا بھی میرے لیے ایک عذاب تھا۔ اس کے ساتھ میں زیادہ مضحکہ خیز لگتا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ میرا ایک ہاتھ بے مصرف ہو گیا تھا۔ دوسرا ہاتھ بھی میں اس وقت تک استعمال نہیں کر سکتا تھا جب تک ٹین کے صندوق کو نیچے نہ رکھ دوں۔ اسے اچانک چھوڑنے کی صورت میں وہ دھماکا ہوتا جو سارے ہوٹل میں سنا جاتا۔

احتیاطاً میں نے صندوق کو دروازے کے قریب رکھ دیا اور اندر داخل ہونے سے پہلے یہ دیکھنا بہتر سمجھا کہ اس میں رہنے والے کو دیکھ لوں۔ اگر وہ اسی طرح بے خبر سو رہا ہوتا تو میں رابعہ کے لیے کھلا چھوڑ کے گزر جاتا اور خدانخواستہ اس نے کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھ لیا تو پھر اس کی آواز کے الارم کو بجنے سے پہلے بند کرنا ضروری ہوگا۔ اس کے لیے میرے دونوں ہاتھ آزاد ہونے چاہئیں۔

ایک احتیاط دس پریشانیوں سے بچاتی ہے۔ اس بات کی صداقت پر یقین نے مجھے بچا لیا۔ میں نے دروازے کو تھوڑا سا دھکیلا تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی دروازے کے پیچھے کھڑا تھا جو ایکدم اس کے پیچھے غائب ہو گیا ہے۔ اندھیرے میں مجھے ایک سایہ سا متحرک نظر آیا تھا یا شاید وہ میرا وہم تھا۔

میں نے چند سیکنڈ انتظار کیا اور پھر ایکدم اندر داخل ہوتے ہی پلٹا۔ میری یہ حرکت دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہونے والے کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جو وہ جھپٹ کر میرے سر پر مارتا مگر اسے موقع ہی نہیں ملا۔ اس سے پہلے ہی میرا ہاتھ بجلی کی طرح حرکت میں آیا اور اس کی کلائی پر لگا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے اچھلا تو اس کے منہ سے نکلا۔ میں نے اسے دبوچنے کی کوشش کی مگر وہ پھسلتا اور طاقتور تھا۔ اس

نے خود مار کے میرے پیٹ میں اپنے سر سے بیل کی طرح ٹکر ماری اور میں لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا تو وہ دروازے کی طرف لپکا مگر میں نے اسے اڑنگی ماری یعنی اس کے پیروں میں اپنا پیر اڑا دیا۔ وہ دھڑام سے منہ کے بل گرا مگر گرتے ہی اس کے ہاتھ نے پھر فرش پر پڑا ہوا ریوالور اٹھا لیا۔ ایک دم پلٹ کے اس نے مجھ پر گولی چلانے کی کوشش کی مگر اس وقت تک میں بھی اس کے اوپر پہنچ چکا تھا۔ اس بار میں نے ٹھوکر مار کے اس کا ہاتھ ناکارہ کر دیا اور وہ درد سے بلبلایا۔

میں نے اس کی گردن کو ہاتھوں کے شکنجے میں کس لیا۔ اب اس شخص کی صورت میرے سامنے تھی اور کمرے کے اندھیرے سے مانوس ہو جانے کے بعد میری آنکھیں بھی اسے صاف طور پر دیکھ سکتی تھیں۔ "کون ہو تم۔ آواز نکالی تو گلا گھونٹ دوں گا۔"

وہ ہانپنے لگا "مگر جواب دوں گا تو۔۔۔ آواز نکلے گی۔"

اسی وقت رابعہ اندر آ گئی۔ اس کے قدم رک گئے اور وہ خوف سے سہمی کھڑی رہ گئی۔

میں نے اسے اشارہ کیا "جاؤ۔ ادھر سے نکل جاؤ۔"

نیچے پڑے ہوئے شخص نے کہا "جاؤ۔ خدا کے لیے جاؤ۔ ورنہ تمہارے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔ ایسا نہ ہو لائٹ آ جائے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "لائٹ آنے سے کیا ہوگا۔ جھوٹ بولا تو ایک جھٹکے سے گردن توڑ دوں گا۔"

"وہ سب دیکھ لے گا۔ دیکھ لے گا۔"

"کون۔ چوہدری دلاور؟"

اس نے پھر اقرار میں سر ہلایا "یہاں مائک ہیں اور خفیہ کیمرا بھی۔ ہر کمرے میں۔۔۔"

"ہر کمرے میں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"فضول باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔ سب ہو جاتا ہے دنیا میں اگر پیسہ ہو۔ اچھا مجھے چھوڑ دو۔ اس کمرے سے نکلو۔ چلو میں بتاتا ہوں۔"

میں نے رابعہ سے کہا "چلو کھڑکی کے راستے باہر۔ میں بھی آتا ہوں۔"

رابعہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی اور کھڑکی پر چڑھ کے باہر اتر گئی۔ میں نے اس شخص کو اٹھنے کا موقع دیا مگر اس کا ریوالور اپنے ہاتھ میں رکھا۔ میں اس لیے مطمئن تھا کہ جب تک الیکٹریشن میرے ساتھ تھا لائٹ کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیبل کی تار ٹھیک کرنے والی گاڑی تو دس ہزار روپے کے عوض اپنے کام کے لیے حاصل کر لی تھی۔ اس شخص نے ٹھیک کہا تھا۔ پیسہ ہو تو سب ہو جاتا ہے۔

میں نے ٹین کا صندوق رابعہ کو پکڑا دیا "جلدی بولو۔ تم اگر دلاور کے آدمی ہو تو مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو۔"

"اس لیے کہ دلاور کو معلوم ہوگا تو وہ مجھے مار ڈالے گا۔" وہ اچھا خاصا صحت مند آدمی خوف سے کانپ رہا تھا "نہ بتاتا تو تم مجھے مار ڈالتے۔ میں نے تمہیں نکل جانے کا موقع دیا۔ اب تو تم مجھے نہیں مارو گے۔"

میں نے کہا "نہیں ماروں گا۔ مگر تمہارا کیا تعلق ہے دلاور سے؟"

"کوئی تعلق نہیں۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ اس کمرے میں موجود رہوں اور جاگتا رہوں۔ میں اسی ہوٹل میں ملازم ہوں۔ چوہدری دلاور نے مجھے خفیہ مائک دیے تھے کہ ہر کمرے میں لگا دوں۔ یہ ریوالور بھی دیا تھا۔"

"کیا تم یہ کام جانتے ہو؟"

اس نے کہا "میں ہوٹل کا الیکٹریشن ہوں۔ لائٹ سے لے کر ائیر کنڈیشن تک سب میں ٹھیک کرتا ہوں۔ میں نے باری باری ہر کمرے کی لائٹ اس کا کٹ آؤٹ نکال کے بند کی اور پھر لائٹ چیک کرنے کے بہانے اندر پہنچ گیا۔"

"خفیہ مائک کہاں لگائے تھے تم نے؟"

"ہر بیڈ کے نیچے سرہانے کی طرف پاور ساکٹ ہے جو کوئی بھی استعمال نہیں کرتا اور سامنے چادر ہونے کی وجہ سے نظر بھی نہیں آتا۔ مائک اسی سے پلگ کر دیے تھے۔"

"اور خفیہ کیمرے؟"

"کیمرے صرف دو ہیں۔ ایک باہر کے گیٹ پر فوکس ہے اور آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ دوسرا پہلے زینے کے موڑ پر ہے۔ ظاہر ہے جو بھی اندر آئے گا یا اوپر جائے گا وہ نظر آ جائے گا۔"

"اور کیمرے کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ کہاں نظر آتا ہے؟"

"کمرا نمبر تین سو تین۔ اور چوہدری دلاور کے کمرے میں۔ یہ دو کمرے خالی تھے جو دلاور نے لے لیے تھے۔ اس نے منیجر سے کہا تھا کہ اب جو کمرا خالی ہو اس کے لیے بک کر لیا جائے۔ کل پرسوں تک ہر کمرے میں اس کے آدمی آ جاتے۔ اب تم جاؤ۔"

"ایک آخری سوال۔ تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

"اس لیے کہ میں سو گیا تھا۔ دلاور نے مجھے سونے کے لیے پانچ ہزار نہیں دیے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ سو گئے تو ہمیشہ کے لیے سلا دوں گا۔ میرا کام تھا ہیڈ فون پر ہر آواز سننا اور مانیٹر پر نظر رکھنا۔ ہر کمرے میں ہونے والی گفتگو سننا اور اگر کسی کمرے میں کوئی رابعہ یا سکندر بخت یا کبیر خان کا لفظ استعمال کرے تو اس کمرے کے نمبر سے چوہدری دلاور کو مطلع کرنا۔ پھر میں نے خود اسے کیمرے کو زینے کے پہلے موڑ سے ہٹا کے ایسے نصب کر دیا تھا کہ وہ کمرا فوکس میں رہے۔ خدا کے لیے اب جاؤ۔ لائٹ آ جائے گی۔"

میں نے کہا "لائٹ نہیں آ سکتی میری اجازت کے بغیر۔ چوہدری دلاور یہ سب کر سکتا ہے تو میں اس کا باپ ہوں۔ میں اس سے بہت آگے جا سکتا ہوں۔ اگر لائٹ ہوتی تب بھی کوئی کیمرا مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نہ دروازے سے داخل ہوا تھا اور نہ زینے سے اوپر آیا تھا۔ بجلی خود میں نے بند کرائی ہے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے

www.paksociety.com

www.paksociety.com

کیونکہ مجھے آنے اور جانے کے لیے اندھیرے کی ضرورت تھی۔"
"آخر۔ تم لوگ یہ سب کیوں کر رہے ہو؟"
"چوہدری دلاور نے کچھ نہیں بتایا تھا؟"
"نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ سوال کوئی نہیں کرنا ہے" وہ بولا۔
میں نے کہا "بس یہ سمجھ لو کہ ہم دونوں شکاری ہیں۔ ایک دوسرے کی جان لینا چاہتے ہیں۔ بالآخر ہم میں سے ایک مارا جائے گا۔ بہت سے بے گناہ ہماری لڑائی میں مارے جا چکے ہیں۔ وہ تمہاری طرح بیچ میں آگئے تھے جیسے سانڈوں کی لڑائی میں مینڈک پس جاتے ہیں۔ تم اپنی جان بچاؤ۔ اور یہ لو اپنا ریوالور ورنہ دلاور تم سے پوچھے گا تو کیا جواب دو گے۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ ریوالور سے مجھ پر کوئی مت چلانا۔ میں مارا گیا تو بدلہ لینے والے بہت ہیں۔ وہ تمہارے سارے خاندان کو مار دیں گے۔ چُن چُن کے۔ خواہ تم کہیں بھی چلے جاؤ۔ زمین کے اندر گھس جاؤ یا ہمالیہ کی چوٹی پر جا بیٹھو۔"
اس نے ریوالور لے لیا "میں لالچ میں پھنس گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ اتنا خطرناک کھیل ہے۔ میں کوئی لیے چلا سکتا ہوں۔ میری تم سے کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔ پھر میں اپنی گردن پھانسی کے پھندے میں کیوں ڈالوں۔ میری نوکری بھی جائے اور زندگی بھی۔ میرا تو خیال تھا کہ ماسک لگانے اور کیمرے فٹ کرنے کے پانچ ہزار بہت ہیں اور اس میں خطرہ بھی کوئی نہیں ہے۔ میرے تو باپ کی توبہ۔"
"تم نے مجھ پر حملہ کیوں کیا تھا؟"
"اور کیا کرتا میں۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں سو نا رہ گیا تھا اور تم میرے کمرے میں سے گزر گئے ورنہ اندر سے کنڈی کون کھول سکتا تھا۔ جب تم پھر آئے تو میں سمجھ گیا کہ تم ہی سکندر بخت یا کبیر خان ہو۔ چند سیکنڈ پہلے ہی میری آنکھ کھلی تھی دروازہ کھلنے سے۔ مجھے شک ہو گیا۔"
"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"
"میں نے بدحواسی میں غلطی کی تھی۔ میں شور مچاتا تو چوہدری دلاور کے علاوہ ہوٹل کے سب لوگ آجاتے۔ میں نے سوچا کہ تمہیں ناک آؤٹ کر کے دلاور کو بتاؤں۔"
"ویری گڈ۔ تم ناک آؤٹ کا مطلب بھی سمجھتے ہو۔" میں نے کہا اور ایک دم ہاتھ مار کے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ ہاتھ اس کی کنپٹی پر لگا تھا اور وہ وہیں گر گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اسے ایک گھنٹے میں ہوش آجانے کا تو وہ اندر سے کنڈی لگا کے کھڑکی دروازہ سب بند کر لے گا۔ اتنی جرح کرنے کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے اس شخص کی باتوں پر اعتبار نہیں آیا تھا۔ اس کی باتوں میں ذرا سے زیادہ چالاکی تھی۔ اس نے پانچ ہزار میں چوہدری دلاور کا نمک خوار اور خدمت گار بننا منظور کیا تھا مگر شرطیہ پوری کرنے سے قاصر رہا تھا۔ اس نے ادائے فرض میں کوتاہی کی تھی۔ پھر خود کو تاڑ دان سمجھتے ہوئے مجھے زیر کرنا چاہا تھا اور مقابلے پر زیادہ طاقتور حریف کو دیکھتے ہوئے فوراً اپنی جان بچانے کے لیے دلاور کا راز فاش کر دیا تھا۔ ایسے شخص پر میں کیسے اعتبار کرتا۔ میرے ساتھ رابعہ نہ ہوتی تو میں اس کو جل دے کر بندر کی طرح چھلانگیں مارتا ہوا غائب ہو جاتا۔ میں دکانوں کے پیچھے سے کود جاتا یا بجلی کے کھمبے سے گزر کے نکل جاتا مگر یہ سب رابعہ کے بس کی بات نہیں تھی اور اس کے ساتھ ایک مقدس صندوق کی حفاظت بھی مجھ پر لازم تھی۔
رابعہ گیلری میں یوں کھڑی تھی کہ لگتا تھا ہاتھ لگانے ہی گر پڑے گی یا پھر گر کے بے ہوش ہو جائے گی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اس گیلری سے فرار ہونے کے لیے ہم خود پرواز کریں گے یا ہمیں لینے کے لیے کوئی ہیلی کوپٹر آئے گا۔ مجھ سے زیادہ یہ تھا کہ میں اس کا ہاتھ تھام کے کھول کر دیکھوں گی۔ اب ہم سڑک پر کودیں گے تو خودکشی ہوگی۔ چنانچہ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔
نیچے بجلی کمپنی کا انجینئر بھی سخت غصے میں بھرا ہوا تھا۔ وہ رسی کے بجائے ہیں منت لگا رہے تھے اور وہ مجبور تھا کہ بار بار ٹرانسفارمر کو چھیڑ رہا ہے اور بجلی ٹھیک کرنے میں مصروف نظر آئے۔ جب میں نے اسے اوپر سے اشارہ کیا تو اس نے ہنڈولے جیسی چیز کو گیلری سے لگا دیا۔ میں نے اس میں قدم رکھا اور پھر رابعہ سے کہا "چلو آؤ۔ میری شکل مت دیکھو۔"
اس وقت وہ کیا بولتی۔ وہ سارا غصہ پی گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ موقع ملتے ہی ذہنی تناؤ سے کا تو کتنا ادھار نکلے گا۔ اس نے گیلری کے اوپر سے سیڑھی پر قدم رکھا۔ سیڑھی اس کے وزن سے تھوڑا سا جھولی۔
میں نے کہا "مضبوطی سے قدم جماؤ۔ مضبوطی سے سیڑھی پکڑو۔ اور خدا پر یقین کی مضبوطی کے سہارے نیچے اتر جاؤ۔"
اس کے ساتھ ہی میں بھی سیڑھی پر پہنچ گیا۔ رابعہ مجھ سے ایک سٹیپ نیچے تھی۔ میرے وزن نے فضا میں بلند سیڑھی کو ایک جھکولا دیا۔ معلوم نہیں اس وقت رابعہ میں اتنی قوت برداشت پیدا ہو گئی ورنہ وہ دل کے پھٹ جانے میں حق بجانب ہوتی۔
جب ہم نیچے اتر گئے تو انجینئر نے فوراً سیڑھی کو فولڈ کیا۔ سیڑھی سمٹ کر ٹرک پر رہ گئی۔
"آپ نے حد کر دی جناب۔ میری نوکری کا بھی خیال نہیں کیا۔ وہ ڈرائیور الگ مجھ پر گرم ہو رہا ہے۔ انجینئر صاحب مسلسل وائرلیس پر پوچھ رہے ہیں کہ تم کہاں ہو۔ ابھی تک روشنی کیوں نہیں ہوئی۔ لوگ فون کر رہے ہیں۔ میں جھوٹ بول رہا ہوں کہ جناب یہاں ہوں اب وہاں جا رہا ہوں۔ آپ نے ایک پی ایم ٹی پر لگا ہوا تھا۔ خود آجانے انجینئر صاحب تو جانتے یہ خرابی تو اصلی ہے۔ پتا چلانا پڑے گا کہ فالٹ کہاں ہے ورنہ ہم سیدھے وہاں جاتے جہاں خرابی پیدا کی تھی اور وہ بھی کٹ آؤٹ لگا رہے۔"
ڈرائیور نے گاڑی چلا دی تھی۔ رابعہ اور میں ٹرک کے ڈالے میں سر جھکائے انجینئر کی نظروں سے چھپ رہے تھے۔ میں ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ رابعہ گھٹنوں کو ہاتھوں میں سمیٹے اور نگاہ سفرت سب کچھ پڑھ رہی تھی۔ دعائے قنوت یا آیت الکرسی۔ یہ فرض کرنا محال تھا کہ وہ مجھے گالیاں دے رہی ہوگی۔

گلی سے نکل کے بزنس روڈ پر آتے ہی میں نے کہا "بس اب گاڑی روکو اور اپنی زبان۔ دونوں کو روک دو۔ تم نے میری مدد کی اس کے لیے شکریہ۔ یہ لو اپنا معاوضہ اور میرا شکریہ ادا کرو۔"
دس ہزار کے نوٹ دیکھتے ہی اس کی زبان کو فل اسٹاپ لگ گیا "مہربانی ہے جناب آپ کی۔ ہم غریب لوگ ہیں۔"
میں نے کہا "پھر تو میری دعا ہے کہ دنیا میں سب تم جیسے غریب ہو جائیں۔"
ڈرائیور نے آگے سے سر نکال کے کہا "مولوی صاحب تم ہو کوئی ڈرامہ؟ کسی عورت کو بھگا کے لائے ہو۔"
میں نے کہا "غور سے دیکھ لو۔ تمہاری عورت تو نہیں ہے۔"
اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا "پکڑے جاؤ تو اللہ رسول کا واسطہ ہمارا نام مت لینا۔"
"مجھے تمہارا نام معلوم ہی نہیں۔ تم بھی اس واقعے کو بھول جانا۔"
جب گاڑی چلی گئی تو میرا جی چاہا کہ میں ایک فلک شگاف نعرہ لگاؤں۔ "دہ مارا بازی لے کے" جیسے کہ میں اور محسن ہاتھ پر ہاتھ مار کے لگاتے تھے۔ لیکن وقت جگہ اور رابعہ کا موڈ دیکھتے ہوئے میں نے کہا "دلاور کی دلالی میں تو ... کر سے گئی دم"
"سکندر! خدا کے لیے کہیں چلو۔ مجھے سخت وحشت ہو رہی ہے۔ تم نہیں جانتے وہ گھنٹے میں نے کیسے گزارے اس ہوٹل میں۔ اور جس طرح تم نے مجھے نکالا ہے۔ اُف یہ سوچ کے ہی میرا تو ہارٹ فیل ہونے لگتا ہے کہ اگر کوئی دیکھ لیتا۔ چوہدری دلاور کو پتا چل جاتا تو کیا ہوتا؟"
میں نے ٹین کا صندوق اٹھا لیا۔ "چلو۔ ہم اپنے گھر چلتے ہیں۔ وہاں میں تم کو پہلے ٹھنڈا سوڈا پلاؤں گا۔ پھر خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا کھلاؤں گا۔ اس کے بعد گلوکوز پلاؤں گا۔ پھر تم میرے لیے کچھ کرنا۔ ایسا ہی کوئی روح کو تسکین اور قلب و جگر کو سرور عطا کرنے والا جام دینا۔ جس میں لسی کا مزہ ہو، روح افزا کی ٹھنڈک اور کافی کی حرارت، کوکا کولا کی گیس اور ماحضر سے کاری نبض میچ کی تیزی ہو۔"
رابعہ پہلے مسکرانے پر مجبور ہوئی اور پھر ہنس پڑی "ایک ہی جام میں یہ سب چاہیے۔ تو پھر سوری ایسا کوئی ڈرنک نہیں میرے پاس۔"
"ہے اور اس کے بارے میں شاعر فرماتا ہے۔ اسے تیرے لبِ ایسا تجھے لبیب۔"
"انسان بنو انسان" رابعہ نے کچھ شرما کے کچھ مسکرا کے اور کچھ غصے کی ادا سے کہا "بس بولے چلے جا رہے ہو۔ یہ معلوم نہیں کہ کدھر جا رہے ہو۔"
"میں بھی بتا دیتا ہوں کہ اپنے گھر جا رہے ہیں۔ اپنے ذاتی فلیٹ میں جو میں نے تھوڑے دن پہلے بیس ہزار میں خرید لیا تھا۔ بس ایسے ہی سوچ گیا خریداری کا۔ تم تو جانتی ہو ہم رئیسوں کی عادت۔"
"سکندر۔ تم نے پی رکھی ہے کیا؟ پاگل ہو گئے ہو؟"
میں نے جھوم کے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا "ہاں ہوٹل میں۔ میں نے پی رکھی ہے ان آنکھوں کے پیمانے سے۔ اس کے میخانے سے۔ جس رابعہ کے حسن کے شراب خانے سے ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔ مگر میں ہوش میں ہوں بلبل بند او۔ میں نے واقعی ایک فلیٹ خریدا ہے کچھ دن پہلے۔ تمہارے لیے بس تھوڑی دور ہے اس موڑ کے بعد۔"
رابعہ مجھ پر یقین کیسے کر سکتی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے خیال میں مجھ سے سنجیدگی کی توقع رکھنا لاحاصل تھا۔ میں اپنا چلتا رہا تھا اور وہ سڑک پر چلتے ہوئے مجھ سے لڑ بھی نہیں سکتی تھی۔ جب بالآخر میں نے ایک جگہ رک کر اوپر جانے والے تنگ سے زینے پر قدم رکھا تو اس سے برداشت نہ ہوا۔
"یہ کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟"
"تم یہ سوال کرنے کا حق کھو چکی ہو مس رابعہ" میں نے کہا "یہ الفاظ یاد کرو جو تم نے کہا تھا کہ اب جہاں تم وہاں میں" میں نے اوپر چڑھتے ہوئے کہا "اب خاموشی سے میرے پیچھے چلتی رہو۔"
وہ پیچھے نہ آتی تو کہاں جاتی۔ شاید اسے یقین آگیا تھا کہ میں نے فلیٹ خرید لیا ہوگا۔ سوچے سمجھے بغیر ایسے فیصلے کرنا میرے مزاج اور میری فطرت کے خلاف نہیں تھا۔ اسے یہ اطمینان بہرحال تھا کہ یہ فیصلے احمقانہ نہیں ہوتے۔
میں نے دروازے پر دستک دی۔ زینے پر آمنے سامنے دو دروازے تھے۔ دو بیچ الگ الگ فلیٹس میں داخل ہونے کا راستہ تھا۔ زینہ گھوم کے اوپر جا رہا تھا اور میرے اندازے کے مطابق ایسے ہی دو فلیٹس اوپر کی ہر منزل پر تھے یعنی عمارت کے اس حصے میں آٹھ فلیٹ تھے جن کے مکین ایک ہی زینے کو استعمال کرتے تھے۔ ہر موڑ پر چھت میں بلب ہولڈر ضرور تھا مگر اس میں لگا ہوا بلب فیوز ہو گیا تھا تو بدلا نہیں گیا تھا۔
وہی تنگ دل شخص پھر دروازے میں نمودار ہوا جس نے کچھ دیر پہلے مجھے ایک فون کال کی اجازت دی تھی اور فلیٹ کی ملکیت سے دستبردار ہو گیا تھا۔ یہ عرب کے اونٹ والا کیس تھا کہ میں فون کرنے آیا تھا اور فلیٹ کا مالک بن بیٹھا۔ تاہم اس میں مالک کی بھی بے دخلی کا ناخوش گوار پہلو نہیں تھا۔ وہ نو ہزار روپے وصول کر کے میرے مقابلے میں ہزار گنا خوش تھا۔
مجھے دوبارہ دیکھ کے پہلے اس کا چہرہ اتر گیا۔ شاید وہ سمجھا کہ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے اور جلدی میں ہونے والے فیصلے کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ اس نے کہا "خیر ہے صوفی صاحب؟"
میں نے کہا "بالکل خیر ہے الحمد للہ۔ یہ اپنی زوجہ میرے پیچھے رہ گئی ہیں۔"
اس کا چہرہ مزید اتر گیا "تو کیوں جی۔ سودا تو اب ہو گیا اور ...

کی آپ نے۔ اچھا تھا صبح گھر والی کو بھی فلیٹ دکھاتے۔ آخر انہوں نے ہی رہنا ہوتا ہے گھر میں۔ ان کی مرضی ہوتی تو بیعانہ دیتے۔"

میں نے کہا "آپ نے ٹھیک کہا مگر۔"

"اگر مگر کچھ نہیں صوفی صاحب۔ بیعانہ اب واپس نہیں ہو سکتا۔ فلیٹ لوٹ لو۔" وہ بولا "جب بیوی کی مرضی کے بغیر کچھ کر نہیں سکتے تو پھر۔"

میں نے کہا "او یار! میری بھی سُن لو۔ میری گھر والی تو اتنی خوش ہوئی کہ میرے سر ہو گئی کہ مجھے ابھی لے کر چلو۔ زندگی گزر گئی جھگیوں میں اور کچے مکانوں میں۔ صدر بازار میں فلیٹ تو اس کے لیے تاج محل ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ مقبرہ ہے اس کا۔"

وہ خوشی سے کھُل اٹھا "اچھا اچھا۔ آؤ جی بھائی صاحب" اندر آؤ۔ آپ کا گھر آپ کو مبارک۔ میں نے تو صوفی صاحب کی شرافت دیکھی اور بس کوڑے کھڑے کمرہ دیا کہ فلیٹ آپ کا۔"

وہ ایسے ظاہر کر رہا تھا جیسے اس نے بیعانہ لیا نہ قیمت ملے گی۔ بس میری شرافت پر اپنا ٹھکانا قربان کر دیا۔ اندر ایک خاصی بڑی موم بتی جل رہی تھی مگر پھر بھی اجالا برائے نام تھا۔ رابعہ بہت سنجیدہ اور خاموش تھی۔ سامان سے عاری فلیٹ میں خانہ ویراں کا تاثر بہت نمایاں تھا مگر مالک نے لاتعلق جا کے فلیٹ کی ایک ایک خوبی پر روشنی ڈالی۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو اس لیے یہاں سے منتقل کر چکا تھا کہ یہ فلیٹ کسی طرح بھی انسانوں کے رہنے کی جگہ نہیں تھی۔ اب اس کے سارے نقائص اس کی خوبیاں بن گئے تھے۔

میں نے کہا "کیا تم اسی وقت قبضہ دے سکتے ہو؟"

وہ بھونچکا رہ گیا "اسی وقت۔ تم پوری ادائیگی کرو گے؟"

میں نے کہا "ہاں لیکن کاغذات کا کیا ہوگا؟"

"ابھی تو رسید لکھ کے دے سکتا ہوں۔ اپنے ہاتھ سے۔ باقی کاغذات تو صبح لے کر آؤں گا۔ اگر تمہیں اعتبار نہیں تو سامنے والوں سے پوچھ لو۔ وہ چار سال سے ہمارے پڑوسی ہیں۔ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ ساری بلڈنگ والے جانتے ہیں۔ میں پیسے لے کر بھی بھاگنے والا نوسر نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "میں بھی ایک ہزار بیعانہ دے کر فلیٹ پر قبضہ کرنا نہیں چاہتا۔ تم پوری قیمت لو اور ہاتھ سے رسید بنا دو۔ باقی معاملات صبح طے ہو جائیں گے۔ صبح ہونے میں اب دیر ہی کتنی ہے۔ وہ دیکھو صبح ہو گئی ہے۔"

اس نے باقی انیس ہزار ایسے وصول کیے جیسے اس کے لیے خواب اور حقیقت میں فرق کرنا دشوار ثابت ہو رہا ہے۔ آدھی رات کے وقت بیعانہ' ایک گھنٹے بعد پوری رقم کی وصولیابی' بیس ہزار کے نوٹ اصلی تھے لیکن رابعہ نے جس ٹین کے صندوق سے نکالے تھے اس کی خستہ حالی اور قدامت دیکھ کے وہ سخت حیرانی میں مبتلا تھا۔ اس سے زیادہ وہ رابعہ کے حسن کی تابانی سے پریشان تھا۔ میرے جیسے مشکوک خیز حلیے والے مولوی کے ساتھ ایک بے پردہ قیامت خیز حسینہ تھی جسے میں علی الاعلان اپنی منکوحہ بتا رہا تھا۔ اس

کی عقل خبط کیسے نہ ہوتی مگر شک کی گنجائش نہ تھی۔ وہ شک کر کے اپنا سودا خراب کرتا۔

اس نے کہا "کیا اب آپ یہاں سوئیں گے؟ فلیٹ تو آپ کا ہو گیا۔"

میں نے کہا "ہم بہت دور سے آئے ہیں۔ واپس جانے کے لیے سواری بھی نہیں ملے گی۔"

"مطلب یہ کہ میں جاؤں۔ اسی وقت؟"

میں نے کہا "یہ ضروری نہیں۔ ہم دوسرے کمرے میں سو جاتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ میں چلا ہی جاؤں۔ یہاں تو ایک چارپائی ہے اور ایک دری۔ تم اپنا سامان کب لاؤ گے؟"

"ظاہر ہے کل ہی لائیں گے۔ تم اس وقت کیسے جاؤ گے؟"

"میری موٹر سائیکل کھڑی ہے نیچے۔ میں دس منٹ میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ تم کو سوتا ہی ہے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو سامنے والوں سے مانگ لینا۔ اچھے لوگ ہیں۔ باتھ روم ہے اور ٹنکی ہے جو ابھی پوری بھری ہوئی ہے۔ صبح آٹھ نو بجے دو گھنٹے کے لیے پانی آتا ہے تو سب اپنا کام کر لیتے ہیں اور ٹنکی بھر لیتے ہیں۔ بجلی' گیس' ٹیلی فون کے کوئی بل باقی نہیں۔ صبح میں کاغذات کے ہمراہ لے آؤں گا۔"

وہ بات مجھ سے کر رہا تھا لیکن اس کی نظر رابعہ پر تھی۔ اسے یہ جوڑی ہی عجیب لگ رہی ہوگی پھر ہمارا آدھی رات کے بعد آکر اچانک فلیٹ خریدنا اور اس میں منتقل ہو جانا بھی شکوک پیدا کر رہا تھا۔ ہم نے کہا تھا کہ سامان صبح لائیں گے مگر اس ٹین کے صندوق میں رابعہ کے اور میرے کپڑے بھرے ہوئے تھے تو وہ بھی کم نہیں تھی۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی سمجھتا کہ معاملہ گڑبڑ ہے یا تو میرے پاس نقش اعظم وغیرہ ہے جس کی مدد سے میں اس پری کو شیشے میں اُتار کے اپنا بنا لایا ہے اور وہ میرے ساتھ گھر سے بھاگ آئی ہے۔ رابعہ صورت کے علاوہ مہذب اطوار اور باوقار انداز سے معزز اور اچھے گھر کی لڑکی نظر آتی تھی اور میرے حلیے کے ساتھ یہ فرق زیادہ نمایاں ہو گیا تھا تو مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگتا تھا۔ دیکھنے والے اس سے زیادہ بھی سمجھ سکتے تھے' جو میری سمجھ نہیں بس میں اس کے حسن کی دکان کا سیلز مین ہوں یا ہم مل کے بے وقوف دولت مندوں کو لوٹتے ہیں۔

میں نے کہا "ہمارے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ رات گزار لیں گے۔ یہاں نیچے پورا صدر بازار ہے۔ ہر چیز ملتی ہے۔"

اس نے کہا "تم اکیلے ہو۔ میرا مطلب ہے کوئی اور نہیں ہے۔ ماں باپ یا بھائی بہن۔ بچے۔"

میں نے کہا "اب کیا بتاؤں بھائی صاحب۔ شادی کر چکا تو ہوئے تھے کہ گھر میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ بڑے بھائی کا گھر کمرے کم نہیں تھے' ماں باپ بھی اس کے ساتھ رہتے تھے۔

دارے۔ لیے اس کے دل میں جگہ نہیں رہی تھی۔ وہ پیسے والا آدمی ہے۔ یہ بھی حق حلال کی کمائی کا نہیں۔ میں ذرا دوسری قسم کا مولوی ہوں۔ شادی سے پہلے بھی اس کے ساتھ نہیں بنتی تھی۔ اسے میری ہی باتیں کڑوی لگتی تھیں۔ شادی کے بعد اس کی بیوی کی زبان زیادہ کھل گئی۔ دن رات کا فساد عذاب ہو گیا۔ یہ بے چاری کہاں تک برداشت کرتی۔ ہم الگ ہونے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ اتفاق سے یہ فلیٹ مل گیا۔ میں گھر پہنچا تو وہاں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ سارا محلہ سُن رہا تھا اور یہ رو رہی تھی۔ زاور ظاہر ماں باپ بھی بس اس لیے سو تیلے بن گئے کہ میں غریب ہوں اور میں نے شادی کے وقت جہیز لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ بس میں نے اپنا یہ صندوق اٹھایا۔ چند کپڑے لیے اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کے نکل آیا۔ سب دیکھتے رہ گئے۔ آج رات فرش پر سو جائیں گے مگر سکون سے سوئیں گے اپنے گھر میں۔ کل باقی ضرورت کا سامان خرید لیں گے۔ تم کو ضرور عجیب لگا ہوگا ہمارا اس وقت آنا اور وہ بھی خالی ہاتھ اس لیے تمہیں بتا دیا ورنہ گھر کی بات تھی۔"

میری بات کا بڑا اچھا اثر ہوا۔ اس کا شک رفع ہو گیا اور اس نے مجھ سے بہت ہمدردی کا اظہار کیا "چلو اللہ مبارک کرے نئی زندگی کا سفر نئے گھر میں۔ اصل چیز خوشی ہے۔ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے۔ بس دلوں میں میل نہ آئے۔"

میں نے کہا "ہم تو اپنے شہر میں اپنوں کے ہوتے اجنبی بن گئے ہیں۔"

وہ بولا "کاغذ قلم ہے تمہارے پاس۔ میں رسید لکھ دوں۔"

میں نے کہا "چلو چھوڑو۔ صبح سب کاغذات لے آنا۔"

رابعہ نے مجھے تنبیہہ کے انداز میں گھورا کہ ایسے بیس ہزار دے کر رسید بھی نہ لینا بے وقوفی کی بات ہے۔ "آپ سامنے والوں سے کاغذ اور قلم مانگ لیں۔" رابعہ نے آہستہ سے کہا "انہیں تکلیف تو ہوگی۔ وہ سو رہے ہوں گے کب کے۔"

"نہیں' تکلیف کی کیا بات ہے۔ ہمسائے کا حق تو بہت زیادہ ہوتا ہے۔ میں انہیں جگا کے کہوں کہ مجھے گھر چھوڑ آؤ تو وہ انکار نہیں کریں گے۔"

وہ بولا اور دروازے سے باہر جا کے متقابل کے فلیٹ کی کال بیل بجانے لگا۔ اسی وقت لائٹ آ گئی تھی اور فلیٹ میں بھی بلب روشن ہو گیا تھا۔

رابعہ نے کہا "کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو۔"

میں نے کہا "کہاں چرنے چلی گئی تھی۔ اچھا ہوا تم ہانک کے واپس لے آئیں۔"

"جب جھوٹ بولتے ہو اتنی روانی سے۔ اس وقت عقل خوب ساتھ دیتی ہے۔" رابعہ نے کہا "آخر کون ہے وہ جس سے تین مہینے پہلے شادی ہوئی تھی۔ ماں باپ بھائی بہن' سارے رشتے کھڑ لیے جھوٹے ایک نمبر کے۔"

میں نے کہا "واہ نہیں ہوگی کہ میں نے کیسی زبردست اسٹوری

گھڑ کے اسے قائل کر لیا ورنہ دیکھا نہیں۔ شک کی قینچی سے اس کے پیٹ میں مروڑ اُٹھ رہے تھے۔ حسد کا لیلیا بخار الگ چڑھ رہا تھا۔"

"حسد کیسا؟"

"جلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت۔ یہ دیکھ کے تو میں بھی رشک اور حسد سے مر جاتا۔"

وہ اندر آ کے بولا "عجیب اتفاق ہے۔ وہ گھر میں نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اپنے سسرال میں رُک گئے۔ ان کی ساس بیمار ہیں۔ شاید دل کا دورہ پڑا تھا۔ اللہ خیر کرے۔ آپ ایسا کیوں نہیں کرتے۔ بھائی صاحب کو یہاں چھوڑو اور موٹر سائیکل پر میرے ساتھ چلو۔ رسید کیا سارے اصل کاغذات ابھی لے لو۔ میں واپس چھوڑ جاؤں گا تمہیں۔"

رابعہ کا رنگ اُڑ گیا تھا لیکن مجھے بڑی حیرت ہوئی جب اس نے کہا "ہاں کیا حرج ہے' میں اندر سے کنڈی لگا کے بیٹھ جاتی ہوں۔"

"ابھی تو بیس منٹ میں آ جائیں گے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں' اوپر نیچے سب ہی شریف فیملی والے لوگ رہتے ہیں۔"

رابعہ کا ذہن کسی وکیل کی طرح سوچ رہا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ میں نے بیس ہزار روپے دیے تو فلیٹ کی خرید کا ثبوت میرے پاس ضرور ہونا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ صبح وہ انکار کر دے کہ میں تو انہیں نہیں جانتا۔ پتا نہیں یہ کون ہیں جو میرے فلیٹ میں گھس کے بیٹھ گئے ہیں۔ وہ ایسا لگتا نہیں تھا اور اگر چار سال سے اس فلیٹ میں مقیم تھا تو کوئی لاوارث شخص نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر وہ پولیس کو ساتھ لے آتا تو ہمارا ساتھ کون دیتا۔ رابعہ کی احتیاط پسندی سو فیصد جائز تھی۔ جب میں اس کی موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھا ہوا تھا تو مجھے گزرے ہوئے تین گھنٹوں میں پیش آنے والے واقعات کسی خواب کا حصہ لگنے لگے تھے۔ تین گھنٹے پہلے میں سکندر بخت تھا اور بجلی اور اصلی حالت میں پھر میں نے یہ صوفیانہ وضع قطع اختیار کی اور جب رابعہ کو ہوٹل فون کیا تو گویا دھماکا ہو گیا۔ چودھری دلاور کی بہار' سوجودگی کسی بلانے ناگہانی کے نزول سے کم نہ تھی مگر پھر جس طرح میں نے رابعہ کو وہاں سے نکالا وہ بھی حسب مردان مدد خدا کی الوکھی مثال تھی۔

اب میں بہت پُر سکون تھا۔ میری گاڑی کا پچھلا حصہ سامنے سے آنے والی ہوا میں پیچھے اُڑ رہا تھا اور پرانی موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ رات کی خاموشی میں خالی سڑک پر زیادہ گونج پیدا کر رہی تھی۔ اسے چلانے والے نے چلا کے مجھ سے کوئی سوال بھی کیا تھا مگر مجھے الفاظ صاف سنائی نہیں دے رہے تھے تو میں جواب کیا دیتا۔ اب وہ بھی خاموش تھا اور میں کراچی کے شہر کی روشنیوں میں خوابیدہ شہر کی سڑکوں کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

موٹر سائیکل نے ریلوے کے اوور ہیڈ برج کو عبور کیا اور پھر ایک ایسی آبادی میں داخل ہو گئی جہاں کی گلیاں' کچے پکے' ٹین کی

www.paksociety.com

اور ایسبسٹاس... کی چھتوں والے چھوٹے چھوٹے بے ترتیب اور بدوضع گھر خود اس بستی کے مکینوں کی غربت کا اعتراف کرتے تھے یہاں کی دکانیں بھی چھوٹی تھیں اور غلاظت بھی بہت تھی۔ گلیوں میں آوارہ کتے پھر رہے تھے اور جگہ جگہ نالیوں کا پانی بہہ رہا تھا۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ یہ اختر کالونی کا علاقہ تھا اور یہاں اسے دو سو گز زمین پر قبضہ کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس کے صرف دو سو روپے خرچ ہوئے تھے۔ اس نے یہاں چار دیواری کھینچ کے ایک کمرا بنا لیا اور فیملی کو شفٹ کر دیا۔

"سال دو سال کی تکلیف ہے پھر گیس بھی آ جائے گی۔ بجلی ہے" اس نے اوپر تاروں سے لیے گئے وائرنگ کنکشن کی طرف اشارہ کیا۔ "پانی خریدنا پڑتا ہے لیکن اب میں پائپ لے لوں گا گھر میں۔ اس رقم سے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ کہاں وہ ڈربے جیسا فلیٹ کہاں یہ دو سو گز کا مکان۔"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ایسی زمین پر قبضہ کر کے مکان بنانا۔ پھر اس کی لیز حاصل کرنا بجلی پانی گیس لگوا کے اس کو سو دو سو گنا منافع پر بیچنا اور خود پھر کہیں ناجائز طور پر زمین پکڑنا کچھ لوگوں کا پیشہ ہے وہ مسلسل خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے ہیں اور ہر دو چار سال بعد پیسہ خوب کما لیتے ہیں مگر آرام سے کبھی نہیں رہتے۔ اس ناجائز کاروبار میں پولیس بھی ان کی مدد کرتی ہے اور شہری انتظامیہ کے بدعنوان اہلکار بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس شہر کی آدھی آبادی اسی طرح ناجائز طور پر وجود میں آنے والی کچی آبادیوں میں رہتی ہے جہاں بنیادی سہولتوں کا فقدان ہے۔

یہ ساری معلومات مجھے واپسی کے سفر میں حاصل ہوئیں۔ میں موٹر سائیکل کے پیچھے فلیٹ کے کاغذات کی فائل بغل میں دبائے بیٹھا تھا اور اس شخص پر حیران تھا جس نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ فلیٹ بھی کوئی انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ اب وہ جہاں اپنی فیملی کو لے گیا تھا وہ شاید جانوروں کے رہنے کے لائق جگہ بھی نہیں تھی۔ خیر اپنی اپنی زندگی گزارنے کا انداز ہے۔ میرے خیال میں وہ چھوٹا سا فلیٹ اس دو سو گز کے مکان سے لاکھ درجے بہتر تھا۔

رات کے تین بجے وہ مجھے بیچ ہی اتار کے رخصت ہو گیا۔ رابعہ نے دروازہ کھولا تو میں نے فائل اسے تھما دی۔ "دیکھا ہم جھوٹ نہیں بولتے۔ یہ گھر ہمارا ہے۔"

رابعہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ "سکندر۔ مجھے لگتا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

میں فرش پر بچھی ہوئی دری پر لیٹ گیا "کچھ لوگ اپنے آپ سے بھی کتنے بے خبر ہوتے ہیں۔ آپ پاگل ہو چکی ہیں خاتون... بہت پہلے۔"

"تم نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ رابعہ۔ تم نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔"

"یہ زنانہ سوال ہے جو بیویاں شوہروں سے کرتی ہیں۔ جب وہ تھک ہار کے گھر لوٹتے ہیں۔"

"بجا ارشاد۔ آپ کا گھر ہو گا تو آپ کی بیوی ضرور پوچھے گی۔"

میں نے کہا "بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔ اب دماغ کو ذرا سکون ملا ہے تو معدے کی فریاد سنی ہے۔ مگر اس وقت کھانے کو اور کہاں ملے گا۔"

"ابھی تم باہر گئے تھے کیا کہیں کوئی ہوٹل کھلا نظر نہیں آیا تھا؟"

میں اٹھ بیٹھا "ایک ایرانی ہوٹل ہے پیراڈائز سینما کے سامنے۔ کھانا تو شاید نہ ملے چائے ضرور ملے گی میں ابھی آیا۔"

ایرانی ہوٹل میں اس وقت بھی لوگ لکڑی کی کرسیوں پر بیٹھے اور میز پر رکھے اکڑوں بیٹھے سڑپ سڑپ کر کے ابلتی ہوئی چائے پی رہے تھے اور سیاست پر بحث کر رہے تھے جبکہ ان کی نظروں کے سامنے حسب ہدایات منجانب انتظامیہ واضح حروف میں تحریر تھا کہ یہاں سیاسی گفتگو کرنا منع ہے (؟)

کاؤنٹر ایک لمبا سا شوکیس تھا جس میں دن بھر کی بچی ہوئی چیزیں ملبے جیسے سے زیادہ باسی نظر آتی تھیں۔ خشک پنجابیاں ٹھنڈے سخت آلو بھرے سموسے۔ جمے ہوئے شیرے والی جلیبیاں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ بسکٹوں کا ڈبا لے لوں۔ چائے دو قسم کی تھی عام چائے اور اسپیشل۔ اسپیشل کو عرف عام میں دودھ پتی بھی کہا جاتا تھا کیونکہ اس میں پانی کی جگہ دودھ استعمال ہوتا تھا۔ اب دودھ زیادہ تر ڈبے کا دودھ ہوتا تھا۔ یہ شاید دودھ دینے والے جانوروں کو بھی پتا نہیں ہو گا۔

میں نے چار کپ اسپیشل کی فرمائش کی "میں برتن ساتھ لے جاؤں گا۔"

"لے جاؤ بابا۔ پچاس روپیہ ادھر چھوڑ جاؤ" مالک نے کمال محبت سے کہا۔

یہ گاڑھا میٹھا شربت جیسا مشروب ہمیں اس وقت بہت مزے دار اور فرحت بخش لگا جس میں پہلے دودھ کو تھوڑا چائے کے ساتھ خوب ابالا گیا تھا پھر اس میں خوب چینی ملا کے خوب پکایا گیا تھا۔ میں نے رابعہ کے ساتھ مل کے بسکٹوں کا پیکٹ ختم کر دیا تو دو کپ چائے پی کے رابعہ پرسکون ہو گئی اور اس کا موڈ بھی اچھا ہو گیا۔

"آج تو تم نے کمال کر دیا۔"

میں نے کہا "جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں۔"

"تو تم نے بجلی کمپنی کی سیڑھی استعمال کرنے کا خیال تمہارے دماغ میں کیسے آیا" وہ بولی۔

میں نے پھر شعر پڑھا "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں۔"

"بجلی کمپنی کے ڈرائیور کو کیسے راضی کیا تم نے؟ کیا استوری سنائی؟"

"بڑی دردناک کہانی تھی۔ سنو گی تو تمہاری آنکھوں سے سیلاب اٹک جائے گا" میں نے رقت بھرے لہجے میں کہا "میں نے بتایا کہ اے رحم دل، نیک صورت، فرشتہ سیرت شخص۔ اس رفت میری اکلوتی محبوبہ رلوا کر ایک رقیب روسیاہ کے قبضے میں ہے جس نے اسے ایک قرم طور شہر کے ساتھ والے کمرے میں بند کر رکھا ہے اور اس سے پوچھ رہا ہے کہ بولو کس کا لقمہ تر ہو گی۔ آدم کا یا آدم خور پیر کا؟ اس نے پوچھا کہ کیا وہ اتنی بار مان گئی ہے کہ برضا و رغبت شیر کے پیٹ میں جانے کو ترجیح دے گی۔ میں نے کہا کہ ہاں تو وہ ہنسنے لگا کہ ایسی بے وقوف لڑکی کے لیے اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے لڑکی اور بس ہاتھ سے نکل جائے تو رونے کے بجائے دوسری کا انتظار کرو۔"

"پھر تم نے مانی کیوں نہیں اس کی بات؟" رابعہ مسکرائی۔

میں نے کہا "کیسے مان لیتا۔ لڑکی نہیں تم رابعہ ہو۔ جو صرف ایک ہے اور میری ہے۔"

"یا اللہ توبہ!"

میں نے کہا "کیا میں صرف باتیں کرتا ہوں؟ دیکھو تمہیں کیسے نکال رہا ہے۔ دودھ کا دودھ ہو گیا... نہیں۔ یہ محاورہ نہیں چلے گا۔ مجھے چور دھوکوں سے کاجل چرا لیتے ہیں اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا۔ جیسے تم نے میرا دل چرا لیا تھا۔"

"اور تمہیں پتا نہیں چلا تھا؟ خیر میں مان گئی کہ تم واقعی سکندر اعظم ہو۔ تمہیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔"

"تقدیر کے سوا" میں نے کہا "کچھ کاغذ پر اپنے ہاتھ سے لکھ دو یہ بات کہ سکندر ہے اور بوقت ضرورت کام آوے۔"

"صبح چودھری دلاور کی عقل خبط ہو جائے گی جب دیکھے گا کہ اس نے تو ہر طرف بڑا مضبوط جال پھیلایا تھا۔ یہ دونوں پنچھی پھر سے کیسے اڑ گئے کہ کسی نے دیکھا بھی نہیں۔ نہ انسان کی آنکھ نے نہ کیمرے نے۔"

"تمہیں کیمرے کے بارے میں کس نے بتایا؟"

"میں گیلری میں کھڑی تمہاری باتیں سن رہی تھی۔"

میں نے کہا "کیا وہ تمہارے کمرے میں بھی لائٹ ٹھیک کرنے آیا تھا۔"

"آیا تو تھا لیکن مجھے کچھ شک ہو گیا تھا کہ خرابی کوئی نہیں تو یہ کیا اپنا سر ٹھیک کرنے آیا ہے۔ اس نے جہاں کارگزاری دکھائی تھی وہاں میں نے اس کے جانے کے بعد ہی یہ دیکھ لیا" رابعہ نے بیگ میں سے پلگ جیسی دو ٹانگوں والا آلہ نکال کر دکھایا۔

"آفرین ہے تم پر سکندر کی سکندری" میں نے مانیٹر دیکھ کے کہا "خاصی مہنگی چیز ہے یہ۔ غالباً اندر ٹرانسمیٹر بھی ہو گا۔ دو سو میٹر دولت کو چھپا بادہ دولت میں تبدیل کرنے والا۔ اسے سنبھال کے رکھو 'وائنڈ آپ کار'۔"

"کیا؟" رابعہ نے وائنڈ کے لفظ پر مجھے گھورا۔

"اس کے دو مطلب ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ وائنڈ کارمیں آتی ہے۔ اصل یہ کہ رکھی ہوئی چیز کام آ جاتی ہے۔"

"آخر اپنے چودھری صاحب وہاں پہنچے کیسے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس نے اکرام شیخ سے معلوم کیا۔ پہلے بھی جانتے ہوں گے اکرام شیخ پر مصیبت ٹوٹی تھی۔"

"ہم کیا سمجھو انہوں نے دلاور کو ہمارا پتا کے اپنی جان بچائی۔" رابعہ بولی۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے" میں نے بے خیالی میں کہا "لیکن بقول شاعر۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیا کسی کا گلہ کرے کوئی"

"تم فون کر کے پوچھ کیوں نہیں لیتے؟"

"کیوں نہ پہلے اپنے چودھری صاحب سے ان کا حال پوچھ لو۔ اب تو وہاں بھی روشنی ہو گی۔ چودہ طبق روشن ہو گئے ہوں گے۔"

رابعہ نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا "کوئی ضرورت نہیں اس چھیڑ خانی کی۔"

میں نے کہا "بعض اوقات پنگا لینا ضروری ہوتا ہے رابعہ۔ تم ذرا دیکھو۔"

اس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ میں نے ہوٹل کا فون نمبر ڈائل کیا تو آپریٹر نے سوتے سے جاگ کے کہا "جی صاحب۔"

میں نے کہا "اپنے چودھری دلاور صاحب کے کمرے کا نمبر ملاؤ۔"

"کون چودھری دلاور سر؟ یہاں نہیں۔"

میں نے بات کاٹ دی "روم نمبر تھری زیرو تھری۔"

"اس میں تو ریٹائرڈ میجر معین الدین ہیں۔"

میں نے کہا "گھر میں ان کا نام دلاور ہے۔ تم نمبر دو۔"

وہ تذبذب میں پڑ گیا "وہ سو رہے ہوں گے سر کیا بتاؤں؟"

"کہو کرنل کبیر خان بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں والد ہوں میجر معین کا۔"

حسب توقع چودھری دلاور نے ریسیور فوراً اٹھا لیا "وہ جاگ رہا تھا۔

"خیر سے اب تم کرنل ہو گئے ہو اپنے سکندر اعظم صاحب۔"

میں نے کہا "تم بھی کم تو نہیں ہو۔ میجر اور کرنل میں ایک ہی عہدے کا فرق ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "اتنا کم فرق تو نہیں تھا ہمارے درمیان۔ ہیں جی؟ ہم تو ہیں غدار تم ہو وہ... کیا کہتے ہیں اسے محب وطن۔"

میں نے کہا "تمہیں افسوس تو ہو گا کہ اس بار تم نے بڑا مضبوط جال بچھایا تھا۔ خفیہ کیمرے اور خفیہ ٹیلی فون..."

"خفیہ کیمرے اور مائک... خیر سے طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔ یہ بات مجھے اپنے پلے نہیں پڑی۔ رہنے دو۔"

میں نے کہا "ہوٹل کے اندر بھی تمہیں ایک فدوی مل گیا اپنے مطلب کا۔"

وہ متاثر ہوئے بغیر بولا "ہوٹل والے تو ایسے انتظامات کرتے ہی ہیں فرج کل۔ ہیں جی۔ حفاظت کے لیے تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "ایک نمونہ میں بھی لے آیا ہوں تمہاری کارگزاری کے ثبوت کے طور پر۔ افسوس یہ ہے کہ کیمرا نہیں لا سکا۔"

www.paksociety.com

"تم کچھ بہکی بہکی سی باتیں کر رہے ہو اپنے سکندر اعظم صاحب۔ خیر سے کوئی چوٹ تو نہیں آئی تھی لڑائی میں۔"
"میری کسی سے لڑائی نہیں سوائے تمہارے۔؟"
"میں نے کہا شاید اس بندے نے سر پر کچھ مار دیا ہو۔" بیری جس کو مار کے تم نکل گئے اپنی رالعہ کے ساتھ۔"
"تم مجھے بتانا چاہتے ہو کہ تم نے اس کو مار دیا؟" میں نے کہا "اپنے پانچ ہزار بھی بچالیے ہیں ایک نوری کی جان لے کے؟"
"میں نے؟" وہ ہنسنے لگا "وہ تو جب تم نے اس پر اسی کے ریوالور سے گولی چلائی تو سارا ہوٹل جاگ گیا تھا۔ بی بی اور سارے ہی پہنچ گئے تھے کمرا نمبر ایک سو نیرہ میں جہاں اس بے چارے کی لاش پڑی تھی۔ خون میں لت پت' آلۂ قتل کے ساتھ۔"

مجھے اچانک احساس ہوا کہ دلاور مجھے باتوں میں الجھا رہا ہے۔ میں نے ریوالور اس انسپکٹر جیمز کو واپس دیتے ہوئے ایک بڑی فاش غلطی کی تھی۔ میں نے اس کو صاف نہیں کیا تھا۔ اس پر پولیس کو میرے فنگر پرنٹس آسانی سے مل جائیں گے۔ دلاور نے پہلے انسپکٹر جیمز سے سب اگلوالیا ہوگا اور پھر اس کے عیار ذہن میں ایک تیر سے دو شکار کرنے کا خیال آیا ہوگا۔ اس نے انسپکٹر جیمز کو گولی ماردی اور وہ ریوالور وہیں چھوڑ کے پچھلی طرف کی گیلری سے اپنے کمرے میں جا پہنچا۔ پھر وہ کوریڈور میں کھلنے والے دروازے سے نکل کر قدرے تاخیر سے جائے واردات پر پہنچا ہوگا جب دوسرے لوگ وہاں پہلے سے جمع ہوں گے۔
میں نے کہا "تم کس ہوٹل سے بات کر رہے ہو؟"
وہ ہنسنے لگا "اپنے سکندر اعظم صاحب" آپ نے خیر سے کہاں فون کیا تھا؟ تمہاری میڈم چار سو بیس کو تصویر دیکھ کے شناخت کرلیا تھا یہاں لوگوں نے۔ بس جی 'حرامی منیجر' ذکر کیا کہ ایسے میں کسی کو بھی اجازت نہیں دے سکتا کمرے میں جانے کی۔ ابھی عورت اکیلی ہے جب آپ کا بندہ آئے تو آپ انہیں باہر گرفتار کریں۔ ہوٹل میں ہم نے پولیس کو آج تک نہیں آنے دیا ہے۔ بے شک وارنٹ ہو ان کے پاس۔ کوئی مجرم ہو پھر بھی کب تک کمرے میں چھپ کر بیٹھے گا۔" میں نے کہا "اور تم کب تک سائے کی طرح میرا تعاقب کروگے؟" سایہ ہمیشہ پیچھے ہی رہتا ہے۔"
"ہاں جی' اگر روشنی سامنے ہو۔ مگر بندہ پلٹ کے دیکھے تو سایہ سامنے آجاتا ہے۔"
میں نے کہا "ہاتھ پھر بھی نہیں آتا۔ اب تم مجھ کو لوکے کتنے پاپڑ بیلے تم نے۔ ہر جگہ میرا تعاقب کیا۔ چنڈی میں مجھے پھنسانے کی کوشش کی۔ غدار اور قتل کرنے کے الزام میں۔ پھر لاہور میں نبی دار کو پھنسوا دیا۔ کراچی پہنچے کیا ملا تمہیں ناکامی کے سوا؟ اب لوٹ کے لاہور آجاؤ۔"
"یعنی تم اس وقت لاہور سے بول رہے ہو۔ یہ بی جی' خیر سے فوراً ہی جہاز میں سیٹ مل گئی تمہیں یا اپنی اور رابعہ کی سیٹ کنفرم کرا کے گئے تھے۔ چلو جی ہم مان لیتے ہیں کہ تم کراچی سے نہیں بول رہے ہو۔"
میں نے کہا "میں ڈرتا نہیں کہ جھوٹ بولوں۔ کہنے کو تو پیلڈر بھی کہہ سکتا تھا۔"
"اپنے سکندر اعظم صاحب۔ ماننا پڑتا ہے کہ تم نے جادو کمال دکھایا۔ رابعہ کو ایسے نکال کر لے گئے۔"
میں نے کہا "تعاقب اور رابعہ کو پولیس برآمد کرلے گی دلاور' نبی دار سب اگل دے گا۔"
"نبی دار!" دلاور ہنسنے لگا "لگتا ہے تم نے اخبار نہیں دیکھا آج۔ ہیں جی' وہ بے چارہ اب اس دنیا میں کہاں؟"
مجھے ایک دھچکا سا لگا "اسے بھی مار دیا؟"
"نہیں۔ مارا اسے کسی نے نہیں۔ بس وقت آگیا تھا اس کا۔ چوہدری دلاور نے ایک آہ بھری "اس کو حوالات میں ہارٹ اٹیک ہوا۔ اس نے کہا کہ میں ایک بیان دینا چاہتا ہوں۔ مجسٹریٹ کے سامنے 'تب جی' مگر اجل نے مہلت نہیں دی۔ کہا ہے نہ عمر کا اپنی رفتار سے کوئی بندہ بڑا نہیں۔ اور اپنے سکندر صاحب سامان سو سال کا ہے لیکن کل کی خبر نہیں۔ مجھے ایسا ہی ہے۔ ہم ان پڑھ بندے" زیادہ شعر شاعری نہیں جانتے۔ غلط پڑھا ہو شعر تو معاف کرنا۔ نبی دار کی بات تھی۔ بھائی کی جگہ بننا چاہتا تھا ایم این اے شاید ایم این اے۔ اقتدار کی ہوس تیز ہی اتنی ہے۔ جھنڈے والی گاڑی کا ارمان دل میں ہی رہ گیا۔ خاندانی سیٹ بھی گئی بھائی بھی گیا۔"
میں نے مشتعل ہوکے کہا "شیطان کی نافلف اولاد! اپنے بارے میں بھی ایسا سوچا ہے؟ تو شاید کفن بھی نہ ملے بوٹی بوٹی میں۔"
"تم بھی ایک بات گرہ میں باندھ لو سکندر اعظم۔ میں نے بہت رعایت دی تمہیں۔ بہت مہلت دی سوچنے کی۔ یہ کھیل اب ختم ہوجانا چاہیے۔"
میں رابعہ کے ساتھ دلاور کے شکنجے سے تو نکل آیا تھا مگر کھیل میں میری چال غلط ہونے سے دو مہرے پٹ گئے تھے اور بازی ہنوز جاری تھی۔ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ رفتہ رفتہ میرے لیے بھی زندگی اور موت کے اس مقابلے میں انسانوں کا مرنا کوئی اب اندوہ ناک سانحہ یا دکھ کی بات نہیں رہی تھی۔ نبی دار بڑا ارذل تھا وہ انسپکٹر جیمز بھی خطاکار تھا مگر ان کو مارنے والے ان سے بڑے مجرم تھے اور کسی انسان کی زندگی بھی اتنی بے وقعت نہیں تھی جتنی شطرنج کی بساط پر پیادے کی۔ شاطر کو بازی مات ہوجانے کے بعد پھر شروع ہوجاتی ہے مگر زندگی کی بازی آدمی صرف ایک ہی بار کھیلتا ہے۔
"تم نے ٹھیک کہا۔ کیا ہم میں سے ایک کو میدان چھوڑ دینا چاہیے؟ اگر ہم اس دنیا میں ایک ساتھ زندہ نہیں رہ سکتے تو دونوں کو مرجانا چاہیے۔"
"اب تم سوچتے ہو۔" دلاور بولا "میں نے ہمیشہ صلح اور مفاہمت کے دروازے کھلے رکھے... ہیں جی۔"
"شیر و شکر کے درمیان مفاہمت کیسی" میں نے کہا "تم کو احساس نہیں ہے دلاور کہ موت کا گھیرا تمہارے گرد تنگ ہوتا جارہا ہے۔ تمہارے خلاف پیڈرو نے بڑے ٹھوس ثبوت فراہم کیے ہیں۔ اس کی ڈائری میرے پاس ہے۔ میں نے منظر کے حوالے کردی ہے اور اس کی اصل کاپی صبح کسی بینک کے لاکر میں رکھوا دے گا۔ اس کی نقل وقت آنے پر عدالت میں بھی پیش کردی جائے گی اور تمہارے خلاف وعدہ معاف گواہ خود پیڈرو ہوگا۔"
"میں نے سنا ہے کہ تم ڈرامے سے بھی ایک گوارا صورت کر رہے ہو" اس نے میرا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا "چوہدری دلاور نے بھی گولیاں نہیں کھیلی ہیں اپنے سکندر اعظم صاحب۔ میں تم کو نہیں بتاؤں گا کہ میرے پلان کیا ہیں۔ وقت آنے پر تم خود دیکھ لوگے کہ تمہاری ساری جدوجہد لاحاصل تھی۔ ثبوت شہادت' گواہی' مقدمات اور تعزیرات' قانون اور عدالتی انصاف' ان سب سے عام نوری ڈرتا ہے۔ ہیں جی' اور چوہدری دلاور عام آدمی ہوتا تو اپنے سکندر صاحب' تمہاری ایم تھرا ایس کب کا اسے تختہ دار پہ چڑھا چکی۔ مگر یہ تو آج بھی حسرت ہی ہے تمہاری۔"
میں نے کہا "کمینے کی اولاد۔ اپنی ماں سے کہنا کہ تجھے حسابی سے بچا کے رکھے کیا تجھے خواب میں چھری ہی دکھائی نہیں دیتی؟"
رابعہ نے کمبل ہٹا کے لائٹ آن کردی "یہ کیا کر رہے ہو۔ ٹیلی فون پر گالیاں دینا کہاں کی شرافت ہے۔"
"میں کسی شریف آدمی سے بات نہیں کر رہا تھا۔"
"مقابلے پر کتا بھونک رہا ہوگا تو تم بھی بھونکنے لگو گے" رابعہ نے کہا۔
میں نے ریسیور اسے دے دیا اور اس نے کریڈل پر رکھ دیا "آئی ایم سوری... بس مجھے جذبات پر قابو نہیں رہا۔"
"میرا خیال ہے کہ تمہارے اعصاب اس سے زیادہ دباؤ برداشت نہیں کرسکتے۔ تم تھک گئے ہو۔" رابعہ نے کہا "ابھی اور کچھ مت سوچو۔ بس سوجاؤ۔"
میں نے کسی بچے کی طرح تعمیل کی اور لیٹ گیا مگر اس کے باوجود نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔ خالی طبیعت کی خانہ ویرانی سے رابعہ پہلے ہی خوف زدہ تھی۔ میں لائٹ بجھاتا تو اسے اندھیرے میں آسیب نظر آنے لگتا۔ گرمی اور مچھروں کے خیال سے بھی میں نے لائٹ جلتی چھوڑ دی۔ یہ عجب مسافرت کا عالم تھا اور عجب دربدری تھی کہ سب کچھ ہونے کے باوجود ہم زندگی کی ہر مسرت سے اور راحت سے محروم تھے اور اس بے سروسامانی میں سب سے منہ چھپائے پڑے تھے۔ قدرت نے ہمیں زندگی کی ہر نعمت سے سرفراز کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور ہم اپنی تقدیر پر ناز کرسکتے تھے۔ رابعہ ایک ہمہ صفت مجموعۂ خوبی و محبوبی تھی۔ ایک کامیاب مکمل تھی اور اس کے پاس جتنی فراوانی دولت کی تھی اس سے زیادہ دولت حسن و شباب کے خزانے کی مالک تھی۔ مجھے بھی یہ خوش بختی ورثے میں ہی ملی تھی۔ آج بھی وزیر خان مرحوم کا آبائی گھر' جسے رابعہ نے دوبارہ خرید کے میرے نام کردیا تھا۔ لاکھوں کی مالیت رکھتا تھا۔ مجھے انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھیجا تھا۔ ایک ایسے ملک سے اور ایسے دور میں جب آبادی کی اکثریت کو پرائمری تعلیم کی سہولت میسر نہ تھی پھر مجھے رابعہ جیسی ہستی کی بے حد و حساب محبت ملی تھی اور دوستوں کے خلوص کا۔ رفاقت اور رفاقت کا بحر بیکراں۔
واقعی یہ ذہنی و جسمانی تھکن کی فرسٹریشن تھی کہ میں ایسی باتیں سوچ رہا تھا اور جذبات کا تند و تیز دھارا مجھے کسی حقیر تنکے کی طرح بہانے لیے جارہا تھا۔ صبح جب میں سوکے اٹھا تو میری ہمت اور توانائی عود کر آئی تھی۔ مایوسی اور کم ہمتی کے بادل سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی چھٹ چکے تھے اور میں نئے عزم کی روشنی میں زندگی کی جدوجہد کے معمول سے نبرد آزما ہونے کے لیے تازہ دم تھا۔

میں شاید چار بجے سویا تھا۔ چھ گھنٹے بعد کال بیل پر میری آنکھ کھلی تو میں گھڑی میں وقت دیکھ کے حیران ہوا۔ میں سحرخیز نوبی تھا اور ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ میری آنکھ صبح کی روشنی سے نہ کھلے۔ جہاں ہر طرف کی کھڑکیوں کے شیشوں سے دھوپ براہ راست مجھ پر پڑ رہی تھی اور میں پھر بھی سوتا رہا۔ خود رابعہ کال بیل کی کرخت آواز پر جاگی۔
"یہ مالک مکان ہوں گے" میں نے کہا۔
"آج تو حد ہوگئی۔" رابعہ نے کہا۔
اتنی دیر میں گھنٹی پھر بجی تو میں دروازے کی طرف لپکا۔ کریم الدین صاحب بے صبرے آدمی لگتے تھے ورنہ انہیں ہم سے بہتر علم ہوگا کہ وہ گھنٹی نہیں گھٹنا ہے جس سے مردے جاگ جائیں۔ ہماری صورت دیکھ کے ان کی صورت پر مایوسی کے آثار نمودار ہوئے۔
"میں تو سمجھا تھا کہ مجھے دیر ہوگئی۔ آپ لوگ منتظر ہوں گے۔"
میں نے کہا "کیا آپ سیل ڈیڈ وغیرہ بنوا کے لائے ہیں؟"
"نہیں' لیکن میرا خیال ہے کہ اب ہم اول۔ یہ ٹھیک ہے جتنی دیر میں یہ کاغذی کارروائی پوری ہو۔ آپ بھی تیار ہوکے سیدھے رجسٹرار کے دفتر پہنچ جائیں۔"
"یہ آفس کہاں ہے؟" میں نے کہا۔
"ڈی ایس نمبر ۱۸ لوکیٹ پر بینک والی گلی میں ہے۔ آسان جگہ ہے آپ رکشا ٹیکسی میں پہنچ سکتے ہیں۔"
"میں پہنچ جاؤں گا" میں نے کہا۔
"پتا نام وغیرہ لکھ دیں کسی کاغذ پر۔"
میں نے کہا "آپ لکھیں۔ وقار یوسف ولد یوسف علی خاں مرحوم ایڈووکیٹ۔"
وہ لکھتے لکھتے چونکا "کون ہے یہ وقار یوسف ایڈووکیٹ؟"

www.paksociety.com

میں نے کہا "ظاہر ہے کہ میں..."
"تو پھر... ایڈووکیٹ... اچھا پتا لکھوائیں۔"
میں نے رفتار یوسف کا پتا لکھوایا تو وہ چونکا "یہاں کا پتا؟ آپ کہاں نہیں رہتے؟ یہ لاہور میں کس کا پتا ہے۔"
میں نے کہا "آپ اس سلسلے میں پریشان نہ ہوں۔ کیا لاہور کا رہنے والا کراچی میں پراپرٹی نہیں خرید سکتا۔"
"بالکل خرید سکتا ہے۔ مگر آپ نے ماں باپ اور بھائی کا ذکر کیا تھا اس لیے میں نے پوچھا تھا۔"
"میں اس گھر سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ یہ میری بیوی کے گھر کا پتا ہے۔ میری سالی رہتی ہے یہاں۔"
اس نے سر ہلایا اور مجھ سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا۔ میں سیڑھیاں اتر کے نیچے گیا اور ٹیکسی والے سامان لے کر لوٹا۔ نہا دھو کے پھر گیا تو رات کے برتن واپس کیے اور ناشتا لے کر آیا۔ میرے واپس آنے تک رابعہ بھی منہ دھو چکی تھی۔ اس نے مجھے ایک فہرست دی "واپسی میں یہ سامان لیتے آنا۔"
"یہ کیا؟ جھاڑو، چولہا، بجلی، چائے کے برتن، تم کیا اس فلیٹ کو آباد کرنے کا سوچ رہی ہو؟"
"جب تک ہم یہاں ہیں...؟"
میں نے کہا "ایک دو دن کے لیے یہ سب غیر ضروری ہے۔ پاسپورٹ اور ویزا ملتے ہی ہم اُڑ جائیں گے لندن کی طرف۔"
"اس میں زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔ اس گندے فلیٹ میں پڑے رہیں گے ہم اور بازار سے لائیں گے کھانے پینے کی ہر چیز۔"
میں نے کہا "دو گھنٹے بعد میں تمہاری آزادی کا پروانہ لے کر لوٹوں گا۔ پھر یہ شہر ہوگا اور ہم۔ دو دن گلیوں بازاروں میں گھومتے صبح سے رات تک سیر کریں گے۔ اور گھر میں کیوں بیٹھیں گے۔"
ساڑھے گیارہ بجے میں رجسٹرار کے آفس پہنچا تو کریم الدین باہر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔
"میں نے وکیل سے بھی بات کر لی ہے" اس نے کالے کوٹ میں اسٹول پر بیٹھے اونگھنے والے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔ "پچاس روپے لے گا۔ سارا کام کرا دے گا۔"
وکیل کی حالت افسوس ناک تھی۔ اس کا میلا کوٹ برسوں پرانا تھا۔ شاید بیس سال پہلے جب وہ جوان اور صحت مند ہوگا تو یہ کوٹ اسے فٹ ہوگا۔ اس وقت وہ بھی خواب دیکھتا ہوگا کہ وہ قائد اعظم محمد علی کی طرح کبھی عدالت میں زورِ خطابت سے تسلط جمائے گا اور اس کا نام صفِ اول کے قانون دانوں میں ہوگا مگر ہر آدمی کا ہر خواب پورا ہونے لگے تو یہی دنیا جنت کا بدل ہو جائے۔ سارے سائنس پڑھنے والے آئن اسٹائن نہیں بنتے۔ سارے شاعر فیض نہیں ہوتے۔ ایسے ہی سارے وکیل اے کے بروہی یا کارنیلیس نہیں ہوتے۔ این سعادت بزورِ بازو نیست۔
ہر عدالت کے باہر ایسے ناکام وکیل منڈلاتے نظر آتے ہیں جن کی آمدنی کا انحصار صرف دستاویزات کی تصدیق اور کاغذی خانہ پری پر ہوتا ہے اور جو کبھی کسی عدالت میں دلائل کی قانونی جنگ نہیں لڑتے۔ شاید ان میں اس کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی یا وہ اپنی صلاحیت سے خود بے خبر ہوتے ہیں اور چند کمیشنوں پر قناعت کر کے بیٹھ جاتے ہیں ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے۔
پھٹے کالروں والی قمیص اور بوسیدہ پتلون والے بوڑھے وکیل نے مجھے پرانی عینک کے دھندلے شیشوں سے دیکھا پھر کاغذ کو۔ "رفتار یوسف تمہارا ہی نام ہے؟ ولد یوسف علی... ایڈووکیٹ" "ہم... وکیل تو نظر نہیں آتے۔"
میں نے کہا "وکیل کیسے نظر آتے ہیں؟ کیا ہر کالے کوٹ والا وکیل ہوتا ہے۔ داڑھی پگڑی والا وکیل کیوں نہیں ہو سکتا اور کالے کوٹ والا مولوی کیوں نہیں ہو سکتا۔"
اس نے سر ہلایا "وکیل سے وکیل لگتے ہو۔"
اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے تمہاری صورت کے بارے میں اپنا موقف تبدیل نہیں کیا۔ بدقسمتی سے یہ خیال درست بھی تھا۔ یہ اس کی قیافہ شناسی کا کمال نہیں تھا۔ ہم لوگوں سے ان کے لباس کی شناخت کے مطابق رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسا شیخ سعدی کے ساتھ بھی ہوا تھا جب یہ فقیرانہ حلیے میں کسی امیر کی دعوت میں پہنچے تو انہیں روک دیا گیا تھا۔ وہ لباسِ فاخرہ میں گئے تو ان کی پذیرائی ہوئی چنانچہ انہوں نے کھانا کپڑوں پر ڈالنا شروع کر دیا کہ مہمان تو یہ لباس ہے، میں نہیں۔
اپنی فیس وصول کرنے کے بعد وکیل نے سب کچھ تحریر کیا۔ اس نے مہریں لگائیں اور مجھے انگلی رکھ کے بتایا کہ دستخط کہاں کرنے ہیں۔ پھر اس نے میری شناخت کی تصدیق کی اور مجھے رجسٹرار کے سامنے پیش کر دیا۔
رجسٹرار بڑے طمطراق سے میز پر بیٹھا اونگھ رہا تھا جیسے وہ کلرک نہیں وزیر باتدبیر ہے۔ شاید آمدنی اور اختیارات کے ناجائز استعمال میں وہ کسی وزیر سے کم نہ ہو۔ اس نے پھر مجھ سے ولدیت کا نام اور پتا پوچھا۔ پھر ایک رجسٹر میں ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کے پرنٹ لیے۔ اپنے سامنے دستخط کروائے اور مجھے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے دی۔
وکیل نے مجھ سے سرگوشی میں کہا "کاغذات جلدی بھی مل سکتے ہیں۔ میں بات کروں رجسٹرار صاحب سے؟"
میں نے بات کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا "بزرگ فرما گئے ہیں کہ عجلت کارِ شیطان۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ حرام کھانے والوں اور کھلانے والوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔"
یہ بات میں نے ذرا آواز بلند کر کے کہی تھی۔ وکیل نے اور رجسٹرار نے ویسا ہی منہ بنایا جیسا کسی کڑواہٹ کو نگلنے والا بناتا ہے۔ شاید ان کے نزدیک میں شیخ چلی کا کردار ادا کر رہا تھا۔ ایک تو وکیل پھر ملا۔ دنیا کا قانون اور دین کا علم رکھنے والا۔ انہوں نے خاموشی میں عافیت جانی۔
میں ٹہلتا ہوا واپس چلنے لگا۔ لالوکھیت کے بازار میں پہنچا تو کاروبار کی گہما گہمی عروج پر تھی۔ یہ ان غریب اور غیور لوگوں کی بستی تھی جس کو شہید ملت لیاقت علی خان کا نام ملا تو یہاں کا بچہ بچہ لیاقت علی خان بن گیا اور لیاقت آباد کی شہرت کا ڈنکا بی بی سی اور وائس آف امریکا سے بھی بجنے لگا۔ یہ ظالم و جابر حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کے ڈٹ جانے والوں کی بستی تھی اور اس نے ایوب خان جیسے فوجی آمر کی حکومت کا تختہ الٹنے میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا۔ شاید غریب آدمی ہی غیرت اور حب الوطنی، حق و صداقت اور ہمت و جرأت کے جذبات رکھتا ہے۔ دولت آتی ہے تو بزدلی ساتھ لاتی ہے اور عیاش آدمی اخلاقی، قانونی اور مذہبی اصولوں کی دیوار میں مفاہمت کے رخنے تلاش کر لیتا ہے۔ عذرِ گناہ پیدا کر لیتا ہے۔ دانستہ غلطی پر خطائے بشر کا جواز لے آتا ہے۔
لالوکھیت سے میں نے رابعہ کے قد و قامت کے مطابق جدید وضع کا سیاہ برقع خریدا اور پاسپورٹ کے لیے اپنی دو ارجنٹ تصاویر بنوائیں۔ مجھے پھر خیال آیا کہ میں یہ شرعی لباس اور داڑھی چھوڑ کے پتلون قمیص پہن لوں اور سر پر ٹوپی رکھ لوں مگر میں نے پھر خود کو سمجھایا کہ جب تک خطرہ ہے مجھے پرانی وضع قطع بھی اختیار کرنے سے گریز لازمی ہے۔ یوں تو خطرہ ہی میری زندگی تھا لیکن اچانک خطرہ اتنا بڑھ گیا تھا جیسے معمول پر بہنے والے دریا میں سیلاب کا طوفانی ریلا آ جائے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اپنی ناکامی پر رلاور کی مایوسی، جھنجلاہٹ، اشتعال اور شرمندگی کے جذبات کا ردعمل کتنا شدید ہوگا۔
گزشتہ شب اپنے فلیٹ سے رلاور کو فون کرنا اس لیے غلطی نہیں سمجھا جا سکتا تھا کہ رلاور کے لیے کال ٹریس کرنا ناممکن تھا۔ وہ ہوٹل کا فون نمبر تھا اور کال غیر متوقع تھی۔ میں اکرام شیخ سے تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ کیا اس نے رلاور کو اس ہوٹل کا پتا بتایا تھا جہاں میں رابعہ کے ساتھ مقیم تھا۔ میں اب اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنے فلیٹ سے فون کرنے کا رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔ ایک پبلک کال آفس کو دیکھ کے میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت وہ اپنے اسکول کے شاندار آفس میں ایڈمنسٹریٹر بنا بیٹھا ہوگا اور ویسے ہی دوسرے شاندار آفس میں کاجل پرنسپل بنی ہوئی اپنے اسٹاف کے ساتھ موجود ہوگی۔
ریسیور خود اکرام شیخ نے ہی اٹھایا "ہیلو۔"
میں نے کہا "میری آواز پہچان سکتے ہو؟"
اس نے کہا "سکندر صاحب! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔"
میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم آئندہ میری آواز کو بھی نہ پہچانو اور نہ صورت کو۔"
وہ میرے طنز کو سمجھ گیا "ایسی کیا خطا ہو گئی ہے یار...؟"
"مجبوری یہ کہ تم آئندہ مجھے یار بھی مت کہو۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ یاری نبھانا اب تمہارے بس کا نہیں رہا۔"
وہ کچھ دیر خاموش رہا "میں تمہاری خفگی کی وجہ سمجھتا ہوں۔"
"مگر تم مجبور ہو" میں نے کہا "اب تم دوست یاری کے نام پر کچھ نہیں کر سکتے۔ میں تمہاری اس مجبوری پر رحم کھاتے ہوئے تمہیں معاف کرتا ہوں اور پرانے حوالوں سے اور دوستوں کی ذمے داری سے سبکدوش کرتا ہوں۔"
اکرم نے کہا "میں تم سے ملنا چاہتا ہوں کہیں..."
"لیکن میں تم سے پھر کبھی بھی نہیں ملنا چاہتا۔ کل اگر میں تم سے نہ ملا ہوتا تو وہ حرام زادہ چوہدری رلاور سیدھا اس ہوٹل میں ہرگز نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ رابعہ کی اور میری قسمت تھی کہ اکرام شیخ صاحب کہ ہم اس کے اپنے ہوشیاری سے بچھائے ہوئے جال میں گرفتار نہیں ہوئے۔ میں تم سے پھر ملا تو تمہیں پھر پتا چل جائے گا کہ میں اب کون ہوں اور کیا ہوں۔ مجھے اپنا چہرہ بار بار بدلنا پڑتا ہے اسی لیے کہ کبھی خود اپنی غلطی سے تو کبھی دوستوں کی کمزوری سے میرا راز فاش ہو جاتا ہے۔ کمزوری ہی مجبوری بنتی ہے۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں اپنی کمزوری کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں پہلے کمزور نہیں تھا تو مجبور بھی نہیں تھا۔ پہلے میں اکیلا تھا۔ اب کاجل ہے۔ میرا بچہ ہے اور وہ سینکڑوں بچے ہیں جو ہمارے اسکول میں پڑھتے ہیں۔ وہ بھی ہماری ذمے داری ہیں جو دوسرے والدین نے ہمیں سونپ رکھی ہے۔ چوہدری رلاور جیسے لوگ تو ایسی ہر کمزوری کو اپنی شہ زوری بناتے ہیں۔"
"کیا اس نے تمہیں دھمکی دی تھی؟"
"وہ کاجل کے اسکول پہنچ گیا تھا۔ اس نے کہا کہ پرنسپل صاحبہ۔ آپ انتخاب کر لیں۔ ایک طرف آپ کے شوہر کا یار ہے مگر بدنام زمانہ۔ مجرم اور مجسم معصیت سکندر بخت ہے۔ دوسری طرف یہ عزت شہرت اور دولت کی زندگی ہے۔ اگر ان بچوں کے والدین کو یہ احساس ہو جائے کہ ان کے بچے یہاں محفوظ نہیں۔ یہاں کا ماحول غیر اخلاقی ہے۔ وہ پرنسپل کی کچھ تصاویر دیکھ لیں تو کیا اعتراض ختم کریں۔ باہر کی دیواروں پر اسکول کے خلاف راتوں رات نعرے لکھوا دیے جائیں... کاجل ڈر گئی۔ اس نے رلاور کی ہر بات مان لی۔"
"مثلاً...؟"
"اس نے پوچھا کہ وہ کہاں ہیں۔ آج کل سکندر بخت کا حلیہ کیا ہے؟ وہ پھر کب آئے گا۔"
میں نے کہا "اس لیے اب میرا تم سے ملنا کسی طرح بھی تمہارے یا میرے حق میں ٹھیک نہیں۔ میں تمہیں یا کاجل کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالوں گا اور نہ مجھے یہ منظور ہوگا کہ چوہدری رلاور جیسا بدمعاش تمہاری ساری محنت اور کیے کرائے کو خاک میں ملا دے۔ تمہیں ہم سے دوستی کی اتنی بڑی سزا نہ ملے۔ وقت بہت بدل گیا ہے۔ حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔"
"حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔"
"ہاں۔ اسی امید پر تو جی رہے ہیں ہم۔ کیا رلاور نے یہ بھی مطالبہ کیا تھا کہ تم آئندہ بھی اسے ہمارے بارے میں اطلاع دیتے رہو گے۔"

www.paksociety.com

"ہاں۔"

"ممکن ہے تمہارے گھر کے دروازے پر اس کے آدمی نظر رکھتے ہوں۔"

"ممکن تو ہے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت تمہارا یہ فون ٹیپ کیا جا رہا ہو۔"

"یہ ہو سکتا تھا۔ مگر میں نے پہلے سے اس کا انتظام کر لیا۔ تم جانتے ہو ہمارے اسکول میں بڑے لوگوں کے بچے بھی ہیں۔ اسی لیے اچھے خاصے تعلقات ہیں ہمارے۔ میں نے ڈویژنل انجینئر سے کہا تھا کہ مجھے شک ہے کوئی ہمارے فون ٹیپ کر رہا ہے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی ایکسچینج میں سخت ہدایات جاری کر رہا ہوں کہ آئندہ بھی نہ ہونے پائے۔ لاقانونیت کا علاج کوئی نہیں۔ دلاور کی دھمکی زبانی تھی۔ ہم اس کے خلاف پولیس کے آئی جی سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پولیس جو ہمیں سمجھتے ہماری۔ اسکول کی اور ہر بچے کی حفاظت کیسے کر سکتی ہے۔"

میں نے کہا "اپنے گھر کے فون کی شکایت مت کرنا۔"

"کیوں؟"

"ہم کبھی کبھی تم سے بات کرتے رہیں گے۔ تاکہ دلاور کو شک نہ ہو اور تمہاری پوزیشن محفوظ رہے۔ اسے قطع تعلق کا شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ پھر ہم جو باتیں کریں گے وہ خود اس تک پہنچ جائیں گی۔ کچھ باتیں ہم خود اس تک پہنچانا چاہیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"کابل سے بھی کہہ دینا کہ ہمیں اس سے کوئی گلہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے سکندر۔ تم عظیم ہو۔"

"نہیں، میں اعظم ہوں۔ سکندر اعظم جس نے کہا "چوہدری دلاور نے دیا ہے مجھے یہ نام۔"

"تم کب تک ہو کراچی میں؟"

میں نے کہا "اس وقت میں لاہور میں ہوں۔ یہ پوچھو کہ لاہور میں کب تک ہوں تو میں کہوں گا کہ جب تک تقدیر کہیں کھینچ کر نہیں لے جاتی۔ یار کھانے کے لیے دوسری جگہ نہیں ملتی۔"

"بات کہاں سے کر رہے ہو؟"

"رابعہ کے آفس سے۔ وہ موجود ہے یہاں مگر اس کے جذبات کی نوعیت ذرا مختلف ہے۔ وہ تم سے بات نہیں کرے گی۔ تم ایک کام کرو۔ اس میں تمہارے لیے عافیت ہے۔ چوہدری دلاور شاید تمہیں اسی ہوٹل میں مل جائے۔ میں نے منظر کے گھر سے اس کو فون کیا تھا۔ تم اسے فون کر کے بتاؤ کہ سکندر نے لاہور سے فون کیا تھا اور اس نے مجھے بہت گالیاں دی ہیں۔ یہ کہا کہ تم نے دوستی میں دغا کی ہے۔ اب ہم سے وفا کی امید مت رکھنا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"تمہارا اعتبار قائم رہے گا۔ تم محفوظ رہو گے۔ دلاور یہ سمجھے گا کہ تم نے اس کے ڈر کی وجہ سے یہ اطلاع دی ہے۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں سکندر۔"

"تمہاری شرمندگی ہمارے کس کام کی۔ خوش رہو بیٹا اور بھول جاؤ سب رشتوں کو۔ یہ بھی کہ تمہاری ایک بہن ہے اور بھائی بھی تھا جو باپ کی جگہ ہوتا ہے۔ شادی کر کے گل اور محسن نے بھی یہی کیا۔ تیرے نقش قدم پر چلتے ہوئے انہوں نے اپنی زندگی کی راہ الگ کر لی۔ کیا پتا کسی دن مجبوری میں غالب اور نازو بھی شادی کر کے تیرے پاس پہنچ جائیں۔ کسی نے بھی اپنی زندگی میرے پاس گروی تو نہیں رکھی ہے نا۔"

"میں نازو کو تم سے بہتر طور پر جانتا ہوں۔ وہ غالب کو چھوڑ دے گی اگر غالب نے کمزوری دکھائی۔ کاش میں بھی اتنی بہادر ہوتا۔ اور وہ مجھ پر فخر کر سکتی۔"

"فکر مت کرو" میں نے کہا "میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

اکرام شیخ سے بات کرنے کے بعد میرے دل میں اس کے خلاف پہلے جتنا غصہ نہیں رہا۔ اس کی مجبوری جنونی تھی۔ اپنے کاروبار یا نوکری کی قربانی دی جا سکتی ہے۔ اپنے جان و مال کی دی جا سکتی ہے۔ سیکڑوں معصوم بچوں کی نہیں جو بھروسے اور اچھے روشن مستقبل کے تابناک خوابوں کی راہ پر چلتے ہوئے والدین کی امیدوں پر پورا اترنے کے یقین کے ساتھ۔ بڑا آدمی بننے کے لیے یہاں علم کی روشنی حاصل کرنے آئے تھے۔

رابعہ نے برقع کو پہن کر دیکھتے ہوئے مجھ سے اتفاق کیا "تو صرف عورتیں پہن سکتی ہیں۔"

"اپنے شوہروں کی۔" میں نے کہا "کابل اور گل کی طرح۔"

"تم ٹھیلا کو بھول گئے" اس نے مجھے ملامت بھری نظروں سے دیکھا "تم یہ بتاؤ کہ میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

"میرے اسٹاک میں بہت پرانی مثالیں ہیں۔ جو فٹ ہو جیسی۔ اصولاً تمہیں یہ پوچھنا چاہیے کہ کیا میری وجہ سے کپڑے اچھے لگ رہے ہیں۔ اب یہ کپڑے اگر میں پہن لوں یا مولانا غلام حسین کی اوکین زوجہ پہنے تو افسوس ناک لگیں گے۔ رونق گل سے ہے گلشن کچھ نہیں۔ چلو اب تم فرزانہ ہو۔"

"مولانا کیا اب تک میں قید میں تھی" وہ بولی "کیا سمائی ہے؟"

میں نے کہا "وکالت چھوڑ کے شاعری شروع کر دی۔ خیر لگا کیا۔ وہ ذرا مشکل کام تھا۔ دماغ کے بغیر ہو نہیں سکتا تھا۔"

ہم باہر نکلے تو سامنے والے فلیٹ کا قفل کھولنے والے نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اس کی جسامت اور چوڑائی دیکھ کے میں نے سوچا کہ دروازہ کھول کے بھی یہ اس میں سے اندر کیسے جائے گا۔ اس کی آنکھوں میں سوالیہ نشان دیکھ کے مجھے اپنا تعارف کرانا پڑا۔

"میں آپ کا نیا ہمسایہ ہوں" میں نے اس سے ہاتھ ملایا "فلیٹ خرید لیا ہے میں نے۔ انیس ہزار میں۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "آپ جیسا ہی کوئی شخص یہ کام کر سکتا تھا۔"

"آپ کا مطلب ہے میرے جیسا احمق۔"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔ کریم الدین صاحب بڑی کوشش کر رہے تھے بہت لوگ آئے اور قیمت سن کے چلے گئے۔ میں نے شرط لگائی تھی اس سے۔ جو شاید میں ہار گیا۔ ایک ہزار کی۔"

"شرط کیا تھی؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ فلیٹ کے بیس ہزار اسے ایک سال میں بھی نہیں ملیں گے لیکن اس نے کہا کہ پانچ ہزار کی خاطر پانچ مہینے انتظار کروں گا۔ کیا سو میں سے سو احمق ہی آئیں گے۔ ایک خریدار بھی تو ضرور آئے گا۔"

میں نے خفت سے رابعہ کی طرف دیکھا جو برقع کے اندر بیٹھی مسکرا رہی ہوگی۔ اس نے دوبارہ مجھے بے وقوف کہے بغیر بے وقوف ثابت کر دیا تھا۔

میں نے کہا "مجھے تو فلیٹ ملا۔ آپ کو ہزار گنوا کے کیا ملا؟"

"سبق۔" وہ بولا "قیمت سنتے ہی کو لوگ بھاگ جاتے تھے یا میں انہیں اشارہ کر کے بھگا دیتا تھا۔ مجھے تو مروا دیا سائیں نے۔ اور آپ نے اس نے مرنے میں جلدی کی۔ آپ نے فلیٹ خریدنے میں۔ میں ہوتا یہاں نا۔" اس نے پھر آہ بھری۔

"شکریہ۔ اللہ آپ کو صبر دے اور ایک نئی سانس دے۔" میں نے کہا اور رابعہ کے ساتھ نیچے چل پڑا۔ بعد میں رابعہ نے جو کچھ مجھ سے اس ناعاقبت اندیشانہ اور جاہلانہ فیصلے کے بارے میں کہا وہ میں نے تحمل سے سنا اور اپنی خودی کو بلند رکھا۔ دنیا میں شریف آدمی ہی تختے ہیں۔

پاسپورٹ آفس وہاں سے بہت قریب تھا۔ میں نے کہا "مجھے تو اس ایجنٹ کا نام بھی یاد نہیں۔ اور ہوٹل ہم جا نہیں سکتے۔"

"حلیہ یاد ہے یا وہ بھی بھول گئے" رابعہ نے کہا "یہاں اچھے لوگ پھرتے ہیں۔ مجھے تو سارے ہی ایجنٹ لگتے ہیں۔"

رابعہ کی بات کسی حد تک درست تھی۔ متعدد افراد نے مجھ سے گزرتے گزرتے پراسرار انداز میں سوال کیا "مولانا صاحب پاسپورٹ ارجنٹ لے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلانے کے ساتھ اس شخص کی تلاش جاری رکھی۔ بالآخر مجھے ایک کینٹین سے نکلتا ہوا مل گیا۔

وہ میرا بدلا ہوا حلیہ دیکھ کے بھونچکا رہ گیا "آپ۔"

میں نے کہا "میرے کام کا کیا ہوا۔ میں نے کہا تھا کہ تم سوال کوئی نہیں کرو گے؟"

"آجا فت۔ تصویر لائے ہیں۔"

میں نے چار تصویریں اس کے حوالے کر دیں "میری بیوی کا فوٹو نہیں ہوگا۔ اب یہ بتاؤ کہ میں کب آؤں اور تم کہاں ملو گے؟"

اس نے کہا "پاسپورٹ کل لے لو۔ لیکن لندن کا ویزا۔ یہ میں تم کو کل بتاؤں گا ہوٹل میں۔"

میں نے کہا "ہم وہ ہوٹل چھوڑ چکے ہیں۔ ہماری جان سخت خطرے میں تھی۔ ہمارے دشمن پہنچ گئے تھے وہاں۔ ہمیں وہاں سے فرار ہونا پڑا۔ میں یہ حلیہ بدل کے بھی خود کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ میرا اس ملک سے فرار ہونا ضروری ہے۔"

اس نے سوچ کے کہا "ایک طریقہ ہے۔ تم سیلون جاؤ۔ سیلون کا ٹورسٹ ویزا آسانی سے ملتا ہے۔ پھر وہاں برٹش ایمبیسی سے لندن کا ویزا لگوا لو۔"

میں نے کہا "تم کوشش کرو۔ ورنہ پھر ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ کل میں کس وقت آؤں۔ اور کہاں؟"

"ادھر آؤ۔ ایک بجے کے بعد" وہ بولا "ہم ادھر ہی ملے گا کسی جگہ۔"

دن کا باقی حصہ ہم نے گھوم پھر کے گزارا۔ رابعہ کو برقع میں گھومنے پھرنے سے کوئی الجھن محسوس نہیں ہو رہی تھی مگر وہ میرے حلیے پر سخت معترض تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ جھاڑ جھنکار داڑھی بالکل ضروری نہیں اور نہ یہ پگڑی اور اونچی شلوار قمیص۔

میں نے اسے سمجھایا "اتنا عرصہ میں فرنچ کٹ کا حلیہ بنائے پھرتا رہا ہوں۔ اب داڑھی کو تراش خراش کے باقاعدہ کیا اور قمیص پتلون پہن لی تو میرا حلیہ کافی حد تک وہی پرانا حلیہ بن جائے گا۔ چوہدری دلاور ابھی اسی شہر میں ہے اور نہ جانے اس کے کتنے مخبر ہوں گے جو مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ دلاور کی نظر کو جانتی ہو تم۔ اگر اسے شک ہو گیا تو وہ چشم تصور سے داڑھی تھوڑا سا بڑھا کے غور کرے گا اور چہرے سے ملائے گا تو مجھے پہچان لے گا۔ میں ابھی سو فیصد مختلف نظر آنا چاہتا ہوں۔ میرے جیسے شخص کی طرف وہ متوجہ بھی نہیں ہوگا۔"

"مگر ہم لندن پہنچ گئے؟"

"مگر کا کیا سوال۔ اب لندن پہنچنا بے حد ضروری ہے" میں نے کہا "خواہ کولمبو کے راستے جانا پڑے۔ وہاں پہنچ کے تم یہ برقع اتار سکتی ہو۔ میں یہ پگڑی ہٹا سکتا ہوں۔ سوٹ پہن سکتا ہوں۔"

"کیا دلاور لندن نہیں پہنچ سکتا؟ میرا تو خیال ہے کہ ان حالات میں وہ خود بھی لندن کا رخ کرے گا۔ وہاں بھی اس سے تمہاری ملاقات ہو سکتی ہے۔ وہ تمہاری عقل سے سوچنے کی کوشش کرتا ہے اور ابھی تک صحیح سمت میں جا رہا ہے۔ تمہارے ساتھ ہے وہ ہر جگہ۔ تم پنڈی میں تھے تو وہیں تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ تم پیڈرو کو کہاں لے جاؤ گے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ناکامی کے بعد تم واپس آؤ گے تو کیا کرو گے؟ وہ بری پر تمہارے والد کی قبر پر بھی تمہیں نظر آیا تھا مگر ہم نے تمہیں روک لیا تھا۔ اب وہ کراچی میں ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ تم اس کے خلاف ثبوت جمع کر رہے ہو۔ پیڈرو کی ڈائری تمہیں مل گئی ہے۔ اس خبر نے دلاور کی پریشانی میں اضافہ کیا ہوگا۔ اس کے بعد تم کیا کر سکتے ہو...؟ تم لندن جاکے اس چشم دید گواہ سے ملو گے جس نے دلاور کو زہرہ کے قتل کی واردات کا ارتکاب کرتے دیکھا تھا۔ اور اسے گواہی کے لیے پاکستان لانے کی کوشش کرو گے۔ دلاور کو معلوم ہے کہ لندن میں تمہاری شناسائی کا حلقہ خاصا وسیع ہے اور موثر بھی۔"

www.paksociety.com

میں نے کلفٹن کے ساحل پر ٹہلتے ہوئے رابعہ کا ہاتھ پکڑ کے جذباتی لہجے میں کہا "اگر آئندہ میں نے تمہیں ناقص العقل کہا تو مجھے لمبا کر کے میرا دماغ چل گیا ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "مولانا صاحب۔ آپ سرِعام اتنے رومانٹک نہ ہوں۔ لوگ سمجھیں گے تو نہیں کچھ۔"

"اگر تم نقاب ہٹا دو تو وہ نہیں کہ اپنی تقدیر کو حسد کریں گے مجھ سے۔ مگر۔ ابھی کیا کہا تھا تم نے؟" میں ۔۔۔ رک گیا "ہاں حلفاً اڑی بات کی تھی۔ یہ تو میں واقعی بھولا ہوا تھا۔"

"ایک بات اور بھولے ہوئے ہو تم؟"

"وہ کیا؟"

"تم کو لندن سے ڈی پورٹ کیا گیا تھا۔ جبری بے دخلی بحکم سرکار۔"

"وہ میں نہیں تھا۔ سکندر بخت تھا" میں نے چٹکی بجا کے کہا "جعلی نام سے مجھے لندن جانے سے کون روک سکتا ہے۔ کیا ٹائم ہوا ہے اس وقت؟ چھ بجے ہیں شام کے۔ گویا لندن میں دوپہر کا ایک بجا ہے۔ ربی گڈ۔ یہ بہت مناسب وقت ہے فون کرنے کے لیے۔ چلو پہلے کہیں چائے کافی پیتے ہیں۔ پھر اپنے فلیٹ سے کال بک کرائیں گے۔"

"کسے فون کرو گے؟ نمبر یاد ہے؟"

"نمبر معلوم کرنا پڑے گا۔ مجھے تو پہلے والا نمبر بھی یاد نہیں ہے مگر وہ ہے ایک لارڈ کی بیٹی۔ کسی لارڈ کو برطانیہ میں دریافت کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا پاکستان میں کسی ایم این اے کو۔ صرف نام کافی ہے اس کے باپ کا۔"

"الزبتھ کے باپ کا؟" رابعہ نے کہا۔

"الزبتھ؟ زباں پہ بارِ خدا یہ کس کا نام آیا" میں نے کہا۔

"ایسے نام کم تو نہیں ہوں گے" رابعہ نے شوخی سے کہا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی "ہاں۔ نام ہی بہت تھے۔ کام بھی بہت تھے مگر یہ قصہ ہے تب کا جب آتش جواں تھا۔"

"اور اب کیا ہے؟"

"اب!" میں نے کہا "جد عمر گھٹتا ہوں ادھر عمر تو نئی ہے۔"

"بہت چالاک ہو۔"

میں نے کہا "تم سے کیا چالاکی۔ بتایا تو ہے کہ ولایت میں چار سال رہے تھے میں اور محسن۔ گئے تھے پڑھنے مگر یہ مقصد ثانوی حیثیت اختیار کر گیا۔ کچھ عمر ایسی تھی کچھ حالات تھے کہ ایک ہتھیلی پر دل اور دوسری پر جان لیے پھرتے تھے۔ مقصد اس وقت بھی بہت عظیم تھا کہ انگریزوں سے دو سو سال کی غلامی کا بدلہ لینا ہے۔ توپ تلوار تو چلا نہیں سکتے تھے۔ مغرور اور متعصب انگریزوں کی ناک کاٹتے رہے۔ ان کی دختران عزیز پر ڈورے ڈالتے تھے اور جلد ہی عشق کرتے تھے۔ چونکہ رقیب اکثریت میں تھے اور ہم چند تھے اس لیے میں نے باقاعدہ مارشل آرٹ سیکھا۔ پہلے پٹتے تھے بعد میں للکارتے پھرتے تھے کہ ہم سا ہو تو سامنے آئے۔

محسن کی لڑائی بھی مجھے لڑنی پڑتی تھی۔ البتہ الزبتھ کا معاملہ سنگین ہو گیا تھا۔ اور یوں سمجھو کہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس جرم میں برطانیہ سے ہی نکال دیا گیا۔"

"سبحان اللہ۔ اسے آپ میری خوش قسمتی قرار دے رہے ہیں۔"

"اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ میری خوش قسمتی سمجھو اسے۔ پھنس رہے تھے پر خاک نجھاں کا ہیر تھا۔ الزبتھ کا باپ بڑی توپ چیز تھا۔ اس کے دل میں ہم کالے لوگوں کے خلاف نفرت کے جذبات کی کوئی انتہا نہیں تھی مگر بیٹی اس کے نسلی غرور کو شکست دینے پر تل گئی تو اس توپ نے مجھے کوڑے کی طرح واپس پھنکوا دیا۔ وضعداری اور شرافت اپنی جگہ رہی۔ خبیث اپنی بیٹی کے ساتھ مجھے الوداع کہنے بھی آیا تھا۔"

"بڑا رقت انگیز منظر ہو گا۔ الزبتھ نے صرف آنسو بہائے سمندر میں چھلانگ مارنے کی کوشش تک نہیں کی۔"

میں نے کہا "تم ایک مشرقی لڑکی ہو۔ ابھی تک تم نے ایسا نہیں کیا حالانکہ موقع تھا۔ پھر وہ کیوں کرتی۔ وہاں تو جذبات بھی عقل کے تابع رہتے ہیں خصوصاً ان خاندانی قسم کے نجیب الطرفین لوگوں کے۔ الزبتھ قدرے مختلف تھی مگر خاندانی احساس برتری اور غرور اس میں بھی تھا۔ بعد میں کر لی ہو گی کسی لارڈ زادے سے شادی۔"

"کیا پتا ابھی تک تمہاری یاد کو دل میں بسائے اور تمہاری تصویر کو سینے سے لگائے بیٹھی ہو۔ رنجیدہ دل ہو راہِ عشق میں جوگن بنی بیٹھی ہو۔ یا اس غم میں گھل گھل کے مر گئی ہو اور اس کی لوحِ مزار پر لکھا ہو۔ وہ رہنا جسے سکندر اعظم نے فتح کر کے چھوڑ دیا۔"

"ایک اچھی رومانٹک فلم کا آخری المیہ سین۔ مگر ایسی فلمیں صرف یہاں بنتی ہیں خاتون۔ حقیقت اس کے برعکس ہو گی۔"

الزبتھ سے رابطہ کرنے سے پہلے مجھے کئی معرکے سر کرنے پڑے۔ میں نے اپنے فلیٹ سے لندن کی کال بک کرنے والے آپریٹر کو الزبتھ کے باپ کا نام بتایا تو اس نے کہا "نام نہیں نمبر بتائیں سر؟"

میں نے کہا "تم لندن انکوائری کو نام بتاؤ گے تو وہ خود ہی ملا دے گا۔"

"اس نام کے نہ جانے کتنے ہوں گے لندن میں سر۔"

"لیکن وہ لارڈ ہے۔ عام تو نہیں ہے۔"

"سوری سر۔ کال نمبر سے بک ہوتی ہے۔ نام سے نہیں۔"

مجھے سخت غصہ آیا مگر میں اس آپریٹر کے ساتھ گستاخی سے پیش آتا تو شاید میرا فون ہی بند ہو جاتا۔ میں کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا اور ان طریقوں پر عمل کرنا چاہا جو کتابوں میں غصے پر قابو پانے کے لیے ملتے ہیں۔ ایک سے سو تک گنتی گنو۔ کسی اور موضوع پر سوچو۔ کوئی اچھا سا گانا سنو۔ پانچ منٹ تک کوئی کتاب پڑھو بار کلٹی ضرور لیں دیکھو۔ یہ سب طریقے اس لیے بھی ناکام ہوئے کہ رابعہ مسلسل اشتعال انگیزی پر آمادہ تھی اور مجھے الزبتھ کے نام سے چھیڑ رہی تھی۔

میں نے ایک اور کوشش کی۔ اس بار آپریٹر بھی دوسرا تھا۔ میں نے اس سے برٹش ہوم منسٹری کا نمبر مانگا اور اس نے میرا نمبر پوچھ کے کہا "یس سر!" میں بہت خوش ہوا کہ کام بن گیا۔ پھر دیر بعد گھنٹی بجی تو کسی خالص سیکریٹری ٹائپ عورت نے بڑی شائستگی سے کہا "آپ کس سے بات کریں گے؟"

میں نے سوچ کے کہا "کسی بھی انڈر سیکریٹری یا سیکریٹری سے۔"

اس نے پوچھا "کیا آپ کی کال آفیشل ہے؟"

"وہ آفیشل۔۔۔ نہیں۔۔۔ لیکن میں۔۔۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "پھر آپ اپنا نام اور نمبر بتا دیں۔ وہ خود آپ کو رنگ بیک کریں گے آپ کے ہائی کمشنر سے بات کرنے کے بعد۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ اتنا آسان بھی نہیں تھا کہ کسی جان پہچان یا کام کے بغیر آپ حکومت برطانیہ کے کسی انڈر سیکریٹری یا سیکریٹری سے آفس میں بات کر لیں جس کے نام سے آپ خود بھی واقف نہ ہوں۔

رابعہ نے کہا "وہ کیا شعر ہے۔ کوئی امید بر نہیں آتی۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

میں نے کہا "یہ تم بول رہی ہو تمہارے اندر کی حاسد عورت بول رہی ہے۔ لیکن انشاءاللہ دونوں کام ہوں گے۔ امید بھی بر آئے گی اور صورت بھی نظر آئے گی۔"

کریم الدین خالی فلیٹ میں ٹیلی فون ڈائریکٹری بھی نہیں چھوڑ کے گیا تھا۔ میں اتر کے نیچے گیا اور دو جگہ سے انکار سننے کے بعد تیسری جگہ ڈائریکٹری حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ میں نے برٹش لائبریری کا نمبر دیکھا۔ لیکن لائبریری اس وقت بند تھی۔ پھر مجھے برٹش قونصلیٹ کا نمبر مل گیا۔ میں نے اس کے گھر کا نمبر لکھ لیا۔ واپس اپنے فلیٹ میں پہنچ کے میں نے وہ کاغذ کا پرزہ رابعہ کی ناک کے سامنے لہرایا جس پر نمبر لکھا ہوا تھا۔ "یہ دیکھو۔ یہ ہے کامیابی جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔"

نمبر ملاتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ یا اللہ میری لاج رکھ لے۔ یہ دعا نہ جانے کیسے قبول ہو گئی۔ کسی شریر بچے نے کہا "اپنا نام بتاؤ" ابھی وہ ممی سے جھگڑ رہے تھے۔ فوراً آ جائیں گے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "وقار یوسف۔ ایڈووکیٹ۔ تمہیں یاد رہے گا۔"

"اس سے زیادہ مشکل نام والے لوگ فون کرتے ہیں ڈیڈی کو" وہ بولا اور ریسیور رکھ کے چلا گیا۔

چند منٹ انتظار میں گزرے پھر خود قونصلیٹ نے کہا "یس مسٹر وائی کار یو سی۔"

واضح یا مدافعت نے تصریح بنچ سے کی تھی اور میرے نام کو ایک سوال بنا دیا تھا۔

(WHY CAR YOU SEE) کہ آپ کار کیوں دیکھتے ہیں؟

میں نے کہا "اصل نام ہے وقار یوسف اور میں ایڈووکیٹ ہوں۔"

"میرے بیٹے نے کہا تھا۔ ایڈوائس کیٹ (اور ایک بلی) خیر بتائیں میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

میں نے کہا "مجھے لندن کا ایک ٹیلی فون نمبر درکار ہے جو مجھ سے گم ہو گیا ہے۔"

پھر میں نے اسے ایک کہانی سنائی کہ دوران تعلیم میرے ایک فیملی سے اچھے مراسم تھے مگر یہاں آنے کے بعد رابطہ نہیں رہا لیکن آج میری عدم موجودگی میں ایک فون کال ریسیو ہوئی اور پیغام یہ ملا کہ میں فوراً ان کو فون کروں۔ کیا آپ ان کا فون نمبر معلوم کرنے میں میری مدد کر سکتے ہیں؟

"آف کورس مسٹر یوسف" اس نے کہا اور مجھے ایک نمبر دے دیا "اس طرح آپ براہ راست کوئی بھی نمبر حاصل کر سکتے ہیں اگر آپ صحیح نام بتا دیں۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور تیسری بار کال بک کرائی۔ یہ بھی ارجنٹ کال تھی مگر اس کے لیے مجھے ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑا اور دوبارہ یاد دہانی کرانی پڑی۔ بالآخر گھنٹی بجی اور مجھے مطلوبہ نمبر مل گیا۔ پھر کسی آپریٹر کی شیریں آواز نے بات کی مگر میں نے اس لارڈ کا نام لیا ہی تھا کہ شیرینی میں تھوڑا سا نمک آ گیا۔

"اگر آپ مذاق کر رہے ہیں مسٹر یوسف تو یہ بہت برا مذاق ہے۔"

میں نے کہا "اتنی دور سے ایک ٹرنک کال بک کرا کے میں آپ سے مذاق کروں گا جسے میں جانتا تک نہیں۔"

"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ان کا انتقال ہوئے کئی مہینے ہو گئے۔"

میں نے کہا "بالکل معلوم ہے لیکن مجھے یہ خبر دیر سے ملی۔ میں ان کی فیملی سے اظہار تعزیت کرنا چاہتا تھا۔ اگر اب بھی آپ کا خیال ہے کہ میں مذاق کر رہا ہوں تو کسی اور کو بلائیں جو سنجیدہ بات میں مذاق کا پہلو تلاش نہ کرتا ہو۔"

"آئی ایم سوری۔" آپریٹر کا رویہ ایک دم معذرت خواہانہ ہو گیا اور اس نے مجھے نمبر دے دیا۔

اس کے باوجود کامیابی ادھوری رہی۔ نمبر معلوم کرنے کے دشوار مراحل میں تین گھنٹے سے زیادہ صرف ہو گئے تھے۔ رات دس بجے میں نے آخری بار لندن کی کال بک کرانے کے لیے کہا تو بہت دیر ہو گئی۔ لندن میں شام کے پانچ بجے تھے۔ نمبر ملنے میں مزید ایک گھنٹا صرف ہوا اور جب بالآخر گھنٹی بجی تو کسی بارعب مرد نے مجھے متوحشانہ مطلع کیا کہ لیڈی الزبتھ کو ملنا چند منٹ پہلے رخصت ہو چکی ہیں۔

www.paksociety.com

کسی تقریب میں گئی ہیں اور ڈنر کے بعد دیر سے واپس آئیں گی۔
میں نے کہا "اچھا پھر میرا نام اور ٹیلی فون نمبر لکھ لو۔ وہ آئیں تو انہیں کہنا کہ فوراً مجھے فون کریں۔"

رابعہ نے میری صورت کی مایوسی دیکھ کے کہا "کیا ہوا۔ اس نے بات کرنے سے انکار کر دیا؟ بہانہ کر دیا۔"

"ہاں۔ اس کا تو پہر تھا۔ خبیث" میں نے روتی آواز میں کہا "وہ اب لیڈی الزبتھ گورڈن ہے۔ یہ گورڈن بھی ہوگا کوئی 'ارل' کاؤنٹ یا لارڈ۔"

رابعہ نے افسوس اور ہمدردی سے کہا "تم اگر خود کو پرنس سکندر بخت آف کاموسکے منڈی یا نواب آف ڈیرہ کانہ کہتے تو شاید اسے بے آبرو ہو کے اس کے کوچے سے نہ نکلتے۔"

میں نے کہا "غم غلط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تم مجھے کسی اچھی سی جگہ لے جا کے اچھا کھانا کھلاؤ۔ ماضی کے زخموں پر نمک پاشی مت کرو۔ نمک ضائع ہوگا۔ زخم مندمل ہو چکے ہیں۔"

"تم نے آج کے دن کچھ نہیں کیا۔ میں نے کہا تھا کہ تھوڑا بہت سامان لے لو۔ یہاں کچھ دن گزارنے ہیں۔ کیا بار بار کھانے اور چائے پینے کے لیے باہر جائیں گے۔ موڈ ہو تو ہو۔" رابعہ نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔

میں نے کہا "اب دو چار دن کے لیے گھرداری سے فائدہ؟"

ہم آدھی رات سے کچھ پہلے کھانا کھا کے لوٹے تو خلافِ معمول رابعہ کچھ سنجیدہ اور متفکر تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا "سکندر۔ ہمیں کسی ہوٹل میں رہنا چاہیے۔ الگ الگ کمروں میں۔"

میں نے برہمی سے کہا "کیوں۔ یہاں کیا ہے؟ تمہیں ڈر لگتا ہے مجھ سے؟"

وہ ایک دم بھڑک اٹھی "ہاں مجھے ڈر لگتا ہے تم سے کیونکہ تم بہرحال ایک مرد ہو اور میں عورت ہوں۔ کون سا رشتہ ہے ہمارے درمیان جو ہم یہاں ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں؟ دوستی کا اور خلوص کا؟ یہی کہو گے نا تم؟"

"کیا یہ غلط ہے؟"

"ہاں یہ بالکل غلط ہے۔ ہمارے مذہب میں ہمارے معاشرے میں ہمارے اس اخلاقی نظام میں ایک غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے درمیان دوستی کا کوئی تصور نہیں۔ اور یہ بالکل ٹھیک ہے۔ آگ اور پانی کی کیا دوستی۔ جب تک شیطان کا وجود ہے۔ اعتبار اور اعتماد، نیک نیتی اور شرافت کے سارے حصار کمزور ہیں۔"

"ابھی تک اس میں کوئی رخنہ نہیں آیا رابعہ۔"

"جب زلزلہ آتا ہے سکندر تو مضبوط ترین بنیادوں والی برسوں پرانی عمارتیں چند سیکنڈ میں زمیں بوس ہو جاتی ہیں۔ دریا برسوں اپنے دامن میں سرسبز بستیوں کو پناہ دیے رہتے ہیں اور پھر اچانک خاکستر کر دیتے ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے اس ایک لمحے سے۔ جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ جس نے آدم کو اس کی جنت سے بے دخل کرا دیا تھا۔ ہم بھی اولادِ آدم ہیں۔ خطا کا پتلا ہیں 'فرشتے نہیں ہیں۔'"

میں خاموش ہو گیا۔ میں رابعہ کی کسی بات کی تردید یا نفی نہیں کر سکتا تھا۔ رابعہ کو خود ہی احساس ہو گیا کہ اس کے لہجے کی تلخی نے مجھے احساسِ جرم میں مبتلا کر دیا ہے۔

اس نے کچھ دیر بعد نرمی سے کہا "دیکھو سکندر۔ محبت بڑا عظیم جذبہ ہے مگر اس کو رسوا ہم خود کر رہے ہیں۔ چلو نام نہاد باتیں کرنے والوں کی پروا نہیں کرتے۔ ہماری نیت اور ہمارے قول و فعل کو خدا سے بہتر کون جانتا ہے۔ جو ہمیں نہیں جانتے وہ بھلا کچھ بھی نہیں کہتے۔ چوہدری دلاور جیسے بدخواہ بھلا باتوں سے ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ یہ بھی مانا کہ ہمارے اپنے دوست احباب ہمارے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں لیکن ہم کو کسی کے دل کی کیا خبر۔ گل اور محسن نے شادی کر لی۔ اکرام شیخ اور کاجل سب سے پہلے الگ ہو گئے تھے۔ مولوی خادم حسین نے بھی مائیکل کو مسلمان کیا اور پھر نکاح پڑھوا لیا۔"

میں نے غصے سے کہا "پھر میں کیا کروں۔ ابھی شادی کر لوں؟ اسی وقت چلیں ہم کسی نکاح خواں کے پاس؟"

"میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہی ہوں۔" رابعہ نے بھی گرم ہو کے کہا "تم کو کیا معلوم کہ جنید جیسے کون ہمارے بارے میں کیا کہتا ہے۔ یا ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔ کم از کم مجھے ان کی بھی پروا نہیں۔ منظر بھی لحاظ کرتا ہے حالانکہ وہ بہت منہ پھٹ ہے۔ وقار یوسف تو بول ہی نہیں سکتا لیکن کیا کبھی ان کے دل میں بھی خیال نہیں آتا ہوگا کہ آخر یہ لوگ کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ رابعہ اور سکندر رنگا رنگ اور نازو۔ ہر جگہ ہر وقت ایک ساتھ رہتے ہیں تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ کیا فرق ہے ان کی اور کسی شادی شدہ جوڑے کے جذبات میں اور معمولات میں۔ مجھے شرم آنے لگی ہے لوگوں سے نظر ملاتے ہوئے بھی۔ اگر ہم الگ رہیں۔ صرف کام سے ملیں اور سب کے سامنے تو اور بات ہے مگر تم دیکھو ہم کیسے رہتے ہیں۔ کیا کسی کے دل میں غلط خیال نہیں آئے گا اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کراچی میں ہمارے پاس ایک ہی کمرا تھا۔ ہوٹل میں بھی۔ ادھر ہم نے ایک فلیٹ لے لیا تھا۔ پھر ہم لندن چلے گئے۔"

میں نے اسے بولنے دیا مگر جب وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی تو میں نے کہا "تم ٹھیک کہتی ہو رابعہ۔ ابھی کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں لیکن صبح ہم نکاح پڑھوا لیں گے۔ اس کے لیے دو گواہوں کے سوا کسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اکرام شیخ اتنا تو کر سکتا ہے کہ کاجل کو بتائے بغیر نکاح کا گواہ بننے آ جائے کسی مسجد میں۔ اور اپنے ساتھ کسی کو بھی لے آئے۔"

رابعہ نے انکار میں سر ہلایا "میں ایسے شادی نہیں کروں گی جیسے میں گھر سے بھاگ کے آئی ہوں۔"

"یہ نکاح ہوگا کسی گناہ کے امکانات سے بچنے کے لیے۔ ہم اسی طرح رہیں گے جب تک نکاح کا اعلان نہیں کرتے اور تمہاری رخصتی نہیں ہوتی۔ بالکل اسی طرح جیسے تم چاہتی ہو۔ محض ایک اخلاقی قانونی اور مذہبی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہم نکاح کر لیتے ہیں۔ ازدواجی زندگی کا آغاز ہم اپنے گھر میں آباد ہو کے کریں گے۔"

"بڑا سمانا سکندر۔ یہ ہو سکتا ہے لیکن......"

"لیکن کیا۔ اب کیا اعتراض ہے؟"

"اس کے بعد تمہارے ذہن کو بہانے کی تلاش ہوگی۔ کوئی ایسی دیوار نہیں ہوگی جو گرائی نہ جا سکے، جو تمہیں روک سکے یا جس کے وجود کو تسلیم کرنا ضروری ہو۔ رابعہ کی بات اور ہے۔ تمہاری بیوی کیا کرے گی" اس نے نظر جھکا کے بڑی مشکل سے کہا۔

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا "آخر کیا چاہتی ہو تم؟"

"صرف یقین۔ کہ تم سے میری شادی ایسے ہوگی جیسے سب لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ اس میں میرے لیے صرف خوشی کے احساس کی تکمیل ہوگی۔ یہ خیال نہیں ہوگا کہ شادی ایک رسمی کارروائی ہے۔ خانہ پری ہے اور لوگوں کے لیے ایک دلچسپ تماشا ہے۔ ذرا سا بھی کوئی یہ نہ کہے اور سمجھے کہ ہم نے مصلحت کے تحت یا خوف سے شادی کی۔ ہم مجبور ہو گئے تھے... خدانخواستہ افشائے راز کے ڈر سے۔ نہیں سب کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ ہم نے اپنی مرضی اور خوشی سے محبت کی اور عزت آبرو کے ساتھ بالکل صحیح وقت پر شادی کی۔ جب حالات سازگار ہوئے اور ہم نے محسوس کیا کہ اب گھر بسانا چاہیے۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "میں تم سے سو فیصد متفق ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔ میں کیا کروں؟"

"تم کچھ مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے دل میں میری محبت کا جذبہ کتنا پاک صاف ہے۔ تم کو میری عزت اتنی ہی عزیز ہے جتنی خود مجھے۔ اور اسی لیے میں تمہاری بہت عزت کرتی ہوں۔ ان دو چار دنوں کی کوئی بات نہیں لیکن ایک تو کسی کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے کہ ہم ہوٹل میں تھے تو ایک کمرے میں تھے اور پھر یہاں اس فلیٹ میں ساتھ تھے۔ ہم آئندہ ایسی صورتِ حال سے بچیں گے۔ ہم الگ رہیں گے ہر وقت ساتھ رہنے کے باوجود۔ ہوٹل میں ہوں گے تو ہمارے کمرے الگ ہوں گے۔ لندن میں بھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تمہاری نکاح والی تجویز مسترد کر رہی ہوں۔ اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے نکاح صرف ایجاب و قبول ہے۔ قانونی طور پر اس کی رجسٹریشن ضروری ہے۔ ہم اس نکاح کی حیثیت کو اپنی ذات تک محدود رکھیں گے۔ پھر جب ہم شادی کریں گے تو اعلانیہ نکاح ہوگا۔ سب دوست احباب کے سامنے۔ دوبارہ نکاح پڑھوانا کوئی گناہ نہیں۔"

میں نے دری پر لیٹ کر چھت کو گھورتے ہوئے کہا "تمہاری مرضی۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری خوشی کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"تھینک یو سکندر۔" اس نے سکون کی گہری سانس لی اور مسکرائی "یہ بات کہتے ہوئے میں بڑا ڈر رہی تھی۔"

"تم پاگل ہو" میں نے کہا اور کروٹ بدل کے سو گیا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی پر میں ہڑبڑا کے اٹھا۔ ریسیور اٹھاتے ہوئے میں نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی تو صبح کے چار بجے تھے۔ لندن میں رات کے گیارہ۔ آپریٹر نے کہا "مسٹر سکندر بخت۔"

میں نے کہا "یس۔ اسپیکنگ۔"

"ہولڈ آن کریں۔ آپ کی کال ہے لندن سے۔"

اب رابعہ بھی آنکھیں کھول کے مسکرا رہی تھی۔ میں نے اسے ڈانٹ ماری "اب ذرا سننا جذباتی مکالمے۔ تمہارا دل کباب ہو جائے گا۔"

رابعہ کے بولنے سے پہلے الزبتھ کی آواز آئی "ہیلو!"

میں نے کہا "الزبتھ!"

"آئی ڈونٹ بلیو۔ سکندر؟" الزبتھ نے کہا "مجھے یقین نہیں آتا۔"

میں نے کہا "آ جانا چاہیے۔ یہ میری روح کی آواز نہیں ہے۔ میں اسی دنیا میں ہوں اور زندہ ہوں۔ تم سے بچھڑنے کے باوجود۔ اصولاً تو مجھے مر جانا چاہیے تھا۔"

وہ ہنسی "تم ذرا بھی نہیں بدلے۔ مجھے تمہارا پیغام اور فون نمبر ابھی واپسی پر ملا۔"

"ہاں۔ تم ڈنر پارٹی میں مدعو تھیں لیڈی الزبتھ گورڈن۔ مبارک ہو تم نے شادی کر لی۔ بے وفا۔"

"تھینک یو۔" وہ ہنسی "اور تم نے؟"

"مرد تو ہوتے ہی بے وفا ہیں" میں نے کہا "کیا وہ بہت ہینڈسم ہے۔ مجھ سے بھی زیادہ؟"

"ہاں۔ اور تمہاری بیوی؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے؟"

"کیا سورج سے بڑھ کر کوئی روشن ہو سکتا ہے۔ خیر تم خود فیصلہ کر لینا دیکھنے کے بعد کہ یہ کس حد تک سچ ہے" میں نے کہا۔

"اوہ۔ کیا تم لندن آ رہے ہو۔ یو راسکل" وہ چلائی۔

میں نے کہا "یہی بتانے کے لیے میں نے تمہیں فون کیا تھا۔"

"ویلکم سکندر بخت۔"

میں نے کہا "ہاں۔ قانونی طور پر میں حکومت سے کلیرنس لیے بغیر تمہاری مقدس سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتا۔"

"میں تم کو این او سی دلوانے کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔"

"کچھ نہیں" میں نے کہا "برطانوی حکومت پہلے میری حکومت کو لکھے گی اور یہ بڑا لمبا چکر ہے۔ میں دوسرے نام سے آؤں گا۔"

"دوسرے نام سے۔ جعلی پاسپورٹ پر؟"

"نہیں۔ پاسپورٹ اصل ہوگا۔ بس اپنا نام بدل لیا ہے میں نے۔"

www.paksociety.com

"چلو ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گی۔"
میں نے کہا "الزبتھ۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر تم کسی سے برٹش قونصلیٹ کو فون کرا دو کہ مسٹر وقار یوسف ایڈووکیٹ کو ٹورسٹ ویزا دے دیا جائے تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔"
"وقار یوسف۔ یہ تمہارا نیا نام ہے۔ آفیشل۔"
"سو فیصد آفیشل۔ پاسپورٹ پر میرا یہی نام ہے۔ دراصل تمہارے نسل پرست گورے سفارتی ارکان آج بھی پسند نہیں کرتے کہ بلاوجہ کوئی میرے جیسا کالا برطانیہ گھومنے جائے خواہ اس کی جان تمنا آج بھی الزبتھ جیسی لڑکی ہو جس کی حسرت دیدے۔"
وہ ہنسی "اوکے اوکے۔ زیادہ بدمعاشی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے شوہر سے کہہ دوں گی۔ کل کسی وقت تم برٹش قونصلیٹ سے مل لو۔"
میں نے کہا "تھینک یو ڈارلنگ۔ باقی ملاقات پر۔"
"تم اور تمہاری بیوی میرے مہمان رہو گے۔ گاڑی تمہیں ہیتھرو سے پک کرے گی۔ ہمارا شوفر وہی ہے" تم اسے پہچان لو گے۔"
"مگر تمہارا شوہر۔ وہ مجھے قتل تو نہیں کر دے گا۔"
"اتنا مجھے ڈر ہے کہ تم اسے قتل کر دو گے۔ پھر بھی میں رسک لے رہی ہوں۔ وہ بے چارہ تو ذرا بھی جوڈو کراٹے نہیں جانتا۔ تم اپنی بیوی سے بات نہیں کراؤ گے۔"
"وہ جاہل ہے۔ انگریزی کا ایک لفظ نہیں بول سکتی" میں نے کہا۔
"او ڈیئر" اس نے ترس کھا کے کہا "یہی تو المیہ ہے تم لوگوں کا۔ ارینج میرج کر لیتے ہو اور بس شکل دیکھتے ہو یا جہیز۔ کیا تمہیں یہاں رہ کے بھی فرق نہیں پڑا کہ خود پسند کرتے کسی کو۔"
"کیا کریں الزبتھ۔ ہم جاہل دقیانوسی سوچ والے معاشرے کے قیدی ہیں۔ ویری بیک ورڈ۔ اچھا تھینکس اگین اینڈ بائی۔"
میں نے ریسیور رکھ دیا۔
"چکر باز!" رابعہ نے کہا۔
میں نے کہا "صدمے سے بے ہوش ہو جائے گی تمہیں دیکھ کے۔ پاکستانی لڑکی کے بارے میں سارے تصورات باطل ہو جائیں گے۔ ایڈووکیٹ سپریم کورٹ" او مائی گاڈ۔ موروثی دولت مندی سے پرنس یا پرنسس بن جانا تو تقدیر کے کھیل ہیں۔ صلاحیت یا قسمت سے عزت پانا معیار ہو تو تمہارا مقابلہ کوئی الزبتھ نہیں کر سکتی۔ یہ الزبتھ کیا چیز ہے۔"
"میں۔ اور یہ میرا بکنگھم پیلس۔ کیا بات ہے اس کی۔" رابعہ بولی "پانچ ہزار روپے کے خریدا ہے ہم نے۔"
اس کے بعد سونا مشکل تھا۔ آدھے گھنٹے بعد صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ میں رابعہ کو الزبتھ کے بارے میں بتاتا رہا اور اس کے باپ کے بارے میں۔
"اچھا ہوا مر گیا ورنہ میرا نام سنتے ہی وہ برطانوی بحریہ فضائیہ سب کو الرٹ کر دیتا کہ ہوشیار خبردار۔ جس خطرناک شخص کو سلطنت برطانیہ کی حدود سے بے دخل کر دیا گیا تھا وہ بھیس بدل کے پھر لندن آ رہا ہے۔ ضرور ہمارا تہذیبی ورثہ برباد کرنے یا چرا کر لے جانے کی نیت ہے۔ ایسا نہ ہو وہ بگ بین اٹھا لے جائے یا دریائے ٹیمز چرا کر نکل جائے۔ اس کالے آدمی کو دیکھتے ہی گولی بلکہ گولا مار دو۔ اب پتا نہیں الزبتھ کا شوہر کیا چیز ہے۔ اگر اسے میں نے خود پسند کیا ہوگا تو ویسا ہی ہوگا۔"
"الزبتھ نے تمہیں پسند کیا تھا تو دوسرا بھی تم جیسا ضرور رہا ہوگا۔"
میں نے کہا "خاتون۔ اس ناچیز کا ثانی زمانے میں نہیں۔ ایک اوریجنل پیس آف آرٹ تھا جو اب آپ کی ملکیت ہے۔"
ناشتا کرنے کے لیے ہمیں تیار ہو کے صبح سات بجے پھر فلیٹ سے نکلنا پڑا۔ اور کچھ نہ سہی اگر میں نے چائے بنانے کا انتظام ہی کر لیا ہوتا تو ہم صبح پانچ بجے سے سات بجے تک چائے کی حسرت دل میں لیے نہ پڑے رہتے۔ باہر جانے سے پہلے مجھے خیال آیا تھا کہ اکرام شیخ سے اس کے گھر پر ہی بات کر لوں۔ وہ میاں بیوی آٹھ بجے اسکول پہنچتے ہوں گے تو سات بجے یقیناً جاگ جاتے ہوں گے اور گھر سے شاید ساڑھے سات بجے نکلتے ہوں گے لیکن نہ جانے کیوں اب میں اکرام شیخ پر بھروسا کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اصل خطرہ اس کی ذات کو مجھ سے تھا۔ سب سے اچھا یہی تھا کہ اسے ہمارے بارے میں کچھ علم ہی نہ ہو۔ پھر لاور کو بتانے کے لیے اس کے پاس کیا ہوگا۔
صبح سویرے تمام اچھے ریسٹورنٹ بند تھے لیکن ایرانی ہوٹل بھرے ہوئے تھے۔ یہ سب دفتروں، کارخانوں میں کام کرنے والے یا مزدور پیشہ لوگ تھے۔ ہم نے ایک فیملی کیبن میں بیٹھ کے پوری چھولے کھائے اور چائے پی۔ اب میں بھی خاموش تھا۔ رابعہ بھی خاموش تھی لیکن ہمارے ذہن ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ ذرا بھی نہ ہونے کے باوجود میرے اور رابعہ کے لیے زندگی کے اہم ترین فیصلے کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ مستقبل کے خوابوں کے محل کا خشت اول تھی۔ جب بنیاد رکھ دی تو پھر محل بھی کھڑا ہو جائے گا۔
قدرتی طور پر میں جذباتی تھا اور قدرے رنجیدہ۔ مجھے اپنے والد کا خیال آیا اور اپنے دوست یاد آئے۔ یہ کس نے سوچا تھا کہ یہ تقریب کسی اہتمام اور انتظام کے بغیر ایسے اچانک ہو جائے گی کہ ہمارے سوا کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ یہ ایسی بات نہ تھی جس کو راز رکھا جاتا۔ یہ سارے زمانے کو ڈنکے کی چوٹ پر سنائے جانے کے قابل خوشخبری تھی مگر ہم حالات کے سامنے سر تسلیم خم کر کے خاموش رہنے پر مجبور تھے۔ شاید ایسے ہی جذبات رابعہ کے تھے۔ عورتیں یوں بھی زیادہ حساس ہوتی ہیں اور خوشی ہو یا غم آنسو ہی ان کے جذبات کی غمازی کرتے ہیں۔
میں نے کہا "تم نے کچھ کہا یا نہیں؟"

"ہم نے کب کہا ہے" رابعہ نے نظر اٹھائے بغیر کہا۔
میں نے کہا "رابعہ۔ میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا تمہاری آنکھوں میں۔"
اس نے آنکھوں میں اتر آنے والی نمی پر شرمیلی اداس مسکراہٹ کا پردہ ڈال دیا "رونے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔"
"ہاں۔ اور میں نے یہ طے کیا ہے کہ ہم اس معاملے میں اکرام شیخ کو بھی شریک راز نہیں کریں گے" میں نے کہا۔
"یہاں اور کون ہے ہمارا؟" رابعہ آہستہ سے بولی۔
میں نے کہا "ہم مسجد چلتے ہیں۔ کسی بھی مسجد میں۔ ہم عاقل بالغ ہیں۔ یہ مولوی صاحب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہم حلفیہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنی مرضی سے شادی کر رہے ہیں۔ شرعاً یہ نہ گناہ ہے نہ معیوب ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم پر اعتبار نہ کیا جائے اور ہمیں دو گواہ نہ مل جائیں۔"
رابعہ نے اپنی رضامندی کا اظہار صرف سر ہلا کے کیا۔ ساری ذمے داری اس نے مجھ پر چھوڑ دی تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ قانون کو سمجھتی تھی مگر یہ معاملہ کسی عدالت کا نہیں تھا۔ میں کچھ نروس ہونے لگا۔ مسجدیں بہت تھیں اور ان میں مؤذن، پیش امام درس دینے والے اور لینے والے سب تھے۔ محلے کی چھوٹی چھوٹی مسجدوں سے وسیع و عالی شان مساجد تک جن کے احاطے میں دارالعلوم میں سیکڑوں طلبا تھے۔ ان میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے والے تفرقہ باز ملا بھی تھے اور واجب الاحترام جید علما بھی۔ فیصلہ صرف یہ تھا کہ ہم کس کا انتخاب کریں جہاں ہم پر اعتبار کیا جائے اور کوئی قانونی مسئلہ نہ اٹھائے۔ شک کوئی نہ کرے اور آسان کام کو مشکل نہ بنائے۔
میں رابعہ کے ساتھ پھرتا رہا۔ آدھے گھنٹے میں ہم تین مسجدوں کے پاس سے گزرے مگر خود میری ہمت نہ پڑی کہ اندر قدم رکھوں۔ پھر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ جب میں نیک نیتی کے ساتھ ایک کام کرنے جا رہا ہوں اور میری نیت کو خود میرا رب بہتر جانتا ہے تو مجھے اس کی تائید و حمایت پر بھی بھروسا کرنا چاہیے۔
وہ جیکب لائن کے علاقے کی ایک مسجد تھی جس کے صحن میں چھ بچے قرآن پڑھ رہے تھے۔ اندر چند افراد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ میں نے رابعہ کو باہر ہی روکا اور خود اندر چلا گیا۔ درس دینے والا جوان آدمی تھا۔ درس لینے والوں میں عمر رسیدہ افراد شامل تھے۔ ان سب نے ایک ساتھ میرے سلام کا جواب دیا۔
میں نے کہا "مولوی صاحب! میرا نام سکندر بخت ہے۔ میرے والد وزیر خان مرحوم تھے۔ اس وقت دنیا میں میرا حقیقی رشتے دار کوئی بھی نہیں۔ میں حال ہی میں کراچی آیا ہوں اور صدر میں رہتا ہوں۔ یہ فلیٹ میں نے کل خریدا ہے۔"
کسی نے فائل دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ان کی آنکھوں میں دوسرے سوالات تھے۔ "آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟" درس دینے والے نے شائستگی سے کہا۔
میں نے کہا "میں تخلیے میں عرض کروں گا۔"
وہ اٹھ کھڑا ہوا "آپ لوگ تشریف رکھیں۔ میں ان کی بات سن لوں۔"
وہ مجھے مسجد کے صحن سے ملحق اپنے دو کمروں والے گھر میں لے گیا۔ وہاں میں نے اسے بتایا "میں ایک لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ ہم الحمدللہ مسلمان ہیں اور بالغ ہیں۔ لڑکی کا بھی کوئی والی وارث نہیں مگر وہ تعلیم یافتہ اور باشعور ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کے حلفیہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کسی لالچ، ڈر یا دباؤ کے بغیر برضا و رغبت نکاح کرنا چاہتے ہیں اور اس میں کوئی بات خلاف شرع بھی نہیں ہے اور خلاف قانون بھی۔ ویسے تو کسی مسلمان کے لیے حلف اٹھا کے بیان دینا بھی کافی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی آپ اپنی تشفی کے لیے...."
"نعوذ باللہ" اس نے شفقت سے کہا "اس کے بعد یقین نہ کرنے والا خود مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں۔ آپ خود پابند شرع اور دین دار ہیں۔ آپ کا انداز گفتگو خود آپ کی شرافت اور صداقت کی دلیل ہے۔ لڑکی کہاں ہے؟"
میں نے کہا "وہ میرے ہمراہ آئی ہے۔"
"اسے اندر بلا لیجیے۔ ادھر سے" اس نے دوسرے دروازے کی طرف اشارہ کیا "میں آپ کی موجودگی میں اس سے چند سوالات کر لوں گا۔"
میں نے رابعہ کو بلا لیا۔ مولانا نے اس سے صرف وہی پوچھا جو ضروری تھا۔ "بی بی! آپ مسلمان ہیں۔ بالغ ہیں۔ آپ کی پہلے تو شادی نہیں ہوئی؟ یہ شادی آپ اپنی مرضی سے کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر کر رہی ہیں۔ آپ خدا کو حاضر و ناظر جان کے کہیں کہ جو کچھ آپ نے بتایا سب سچ ہے۔"
رابعہ نے نقاب ہٹائے بغیر سب کہہ دیا پھر رابعہ پردے کے پیچھے چلی گئی جہاں اس کی بیوی موجود تھی۔ مولانا صاحب پھر مسجد کی طرف گئے جہاں وہ اپنا درس نامکمل چھوڑ آئے تھے۔ میں اس مختصر سے کمرے میں اکیلا رہ گیا جو شاید آٹھ فٹ چوڑا اور دس بارہ فٹ لمبا تھا۔ اس میں ایک دری بچھی ہوئی تھی اور دیواری الماریوں میں شیشوں والے پٹوں کے پیچھے دینی کتب اور رسائل بھرے ہوئے تھے۔ دیواروں پر آیات قرآنی اور خطاطی کے نمونے خانہ کعبہ اور مقامات مقدسہ کی تصاویر آویزاں تھیں۔
مولانا صاحب تقریباً آدھے گھنٹے بعد پھر آئے تو ان کے ساتھ چار آدمی تھے۔ غالباً وہ چاروں ہی درس میں شریک تھے۔ انہوں نے باری باری مجھے سب سے متعارف کرایا۔ وہ سب تبلیغی جماعت کے کارکن تھے۔ انہوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ مصافحہ کیا۔ وہ سب میرے ظاہری حلیے سے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ مجھے اپنی جماعت میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیں گے۔
نکاح کی رسم بڑی سادگی سے اور چند منٹ میں سرانجام پائی۔ مولانا خود دلہن کے وکیل ہوئے۔ حاضرین میں سے دو

www.paksociety.com

بجائے حق مہر کے مسئلے کو میں نے رابعہ پر چھوڑا تھا۔ اس نے مجھ پر چھوڑا تو خود مولانا نے مجھ سے پوچھ کے شرعی حق مہر مبلغ بتیس روپے آٹھ آنے طے کردیا۔ نہ اس وقت میں نے سوال کیا اور نہ بعد میں کسی سے پوچھا کہ آخر اس کی سند کیا ہے اور اس رقم کا تعین کس بنیاد پر کیا گیا ہے؟

مولانا رجسٹرڈ نکاح خواں بھی تھے چنانچہ انہوں نے کاغذی خانہ پری کی اور مجھے فائل میں دیکھ کے اپنا پتا بھی لکھوانا پڑا۔ جب سب لوگ دستخط کرچکے تو انہوں نے دعائے خیر کے لیے ہاتھ اٹھائے اور مجھے مبارک باد دی۔ میری ذہنی کیفیت اس وقت بہت عجیب تھی۔ اس نکاح میں کوئی غیر اخلاقی پہلو نہیں تھا مگر اس کے باوجود میرے ذہن میں ایک خلش سی تھی کہ کسی معاملے میں جھوٹ نہ بولنے اور نیک نیتی سے سب کچھ بتانے کے باوجود میں نے یہ کام ان کے باعث چوری چھپے کیا تھا اور ظاہری صداقت کچھ اور تھی جو اصل حقیقت سے مختلف تھی۔ مقدر بخت وہ نہیں تھا جو نظر آرہا تھا۔ ڈر یہ نہیں تھا کہ کوئی اس شادی میں حارج ہوگا یا آج نہ ہوئی تو یہ شادی کبھی نہیں ہوگی۔ ڈر مجھے اپنی جان کا تھا جس کی وجہ سے میں حلیہ بدل کے آیا تھا مگر یہ بات میں نے چھپائی تھی۔ ڈر مجھے ! رابعہ کو خود اپنی بشری کمزوری کے باعث کوئی خطا ہوجانے کا تھا مگر یہ بات بھی بتائی نہیں جاسکتی تھی۔ کوئی جرم نہ کرنے کے باوجود میں خود کو مجرم محسوس کررہا تھا۔ اب میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا اگر مجھے اور جھوٹ نہ بولنا پڑے۔

وہ سب شریف النفس پاکیزہ کردار والے دین دار لوگ تھے اور شاید اسی لیے میں ان کے درمیان خود کو اجنبی اور گناہ گار محسوس کررہا تھا۔ ان کے اعتبار اور اعتماد نے مجھے شرمندہ کردیا تھا۔ مجھے مزید شرمندگی اس وقت ہوئی جب اندر سے چائے کے ساتھ مٹھائی آئی۔ اس سے باتوں کا سلسلہ لمبا ہوا اور انہوں نے میری زندگی کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ کراچی آنے سے پہلے میں کہاں تھا۔ کیا کرتا تھا۔ اب کیا ارادہ ہے۔ میں کسی طرح بچ کر گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے بہت سے بے ضرر جھوٹ بولنے پڑے۔ انہوں نے مجھے تبلیغی جماعت میں شمولیت کی درخواست کی جو میں رد نہ کرسکا۔ ایک گھنٹے بعد جب انہوں نے مجھے رخصت ہونے کی اجازت دی تو مولانا نے کہا کہ نکاح نامے کی مصدقہ نقول مجھے دو ہفتے بعد مل جائیں گی۔

میں رابعہ کے ساتھ باہر آیا تو مجھے ساری دنیا بدلی ہوئی لگی۔ جب رابعہ میرے ساتھ چل رہی تھی تو میں یوں محسوس کررہا تھا جیسے میں فضا میں پرواز کررہا ہوں۔ اچانک میں اور وہ میاں بیوی ہوگئے تھے۔ ایسا بالآخر ہونا تھا لیکن یہ سب یوں ہوگا ایسا کس نے سوچا تھا۔ یہ سب غلط نہ ہونے کے باوجود غلط لگتا کہ ہر ذاتی فیصلہ انفرادی بھی نہیں ہوتا کہ اس میں دوست احباب کو بھی شریک نہ کیا جائے۔ اگر یہ بات منظر اور غالب، محسن یا وقار یوسف کو معلوم ہوجائے تو انہیں صدمہ ہوگا۔ یہ سب ہم ان کے سامنے بھی کرسکتے تھے۔ ان کو بتا کے بھی کرسکتے تھے۔ اس کے لیے ہمیں بہت مہلت ملی تھی اور ہم آزاد تھے کہ جب چاہیں جہاں چاہیں نکاح کرلیں۔ اس کے باوجود ہم نے یہ کام چھپ کے اور انہیں بتائے بغیر کیا تھا اس کے لیے مجھے رابعہ نے مجبور کیا تھا اور غلط نہیں کہا تھا۔

اب وہ میرے ساتھ چپ چاپ چل رہی تھی اور میں اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ بالآخر میں نے کہا "رابعہ۔ کیا سوچ رہی ہو؟"

وہ چونکی "کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "تم خوش ہو نا؟"

"کیوں نہیں۔ کیا تم خوش نہیں ہو؟" وہ بولی۔

"میں بہت مطمئن ہوں کہ ہم نے کسی خرابی سے پہلے اس کے امکان کو ختم کردیا لیکن ایک احساس ہے کہ یہ سب کچھ ویسے ہی ہوتا جیسے سب چاہتے تھے تو اچھا ہوتا۔ خیر یہ ہم طے کرچکے تھے کہ جب وقت آئے گا تو۔"

"ہاں۔ ابھی یہ بات صرف ہم جانتے ہیں۔"

"میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ عملاً اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن اب میں تم کو اپنی شریک حیات کہوں گا تو جھوٹ نہیں ہوگا۔"

الزبتھ سے بات کرلینے کے بعد مجھے قوی امید تھی کہ اب لندن کا ویزا لینے کی راہ میں کوئی دشواری حائل نہیں ہوگی لیکن ابھی دس بجے تھے۔ ویزا کی درخواست دینے سے پہلے پاسپورٹ کا حصول ضروری تھا اور ایجنٹ نے مجھے دوپہر بعد کا وقت دیا تھا۔ ابھی صبح کے دس بجے تھے اور بازار بھی پوری طرح کھلے نہیں تھے بیشتر دکانیں کھل گئی تھیں۔

وقت گزارنے کے لیے اور توجہ بٹانے کے لیے میں رابعہ کو بوہری بازار لے گیا۔ ہمارا کل سرمایہ اب گھٹ کر نصف رہ گیا تھا مگر یہ چالیس ہزار کی رقم بھی کم نہیں تھی۔ رابعہ نے سفر کے درمیانے سائز کا ایک اچھا سوٹ کیس خریدا۔ وہ بضد ہوئی کہ میں اپنے لیے کچھ شرٹ پینٹ اور ٹائیاں خرید لوں کیونکہ لندن میں یہ چیزیں مہنگے دام میں ملیں گی۔ پھر میں نے کہا کہ وہ بھی چند ساڑیاں خرید لے مگر اس نے شلوار قمیص کے ریڈی میڈ سوٹ خریدے۔

"میری تو خواہش تھی کہ تم لندن میں آ کر تو [illegible] اپنی ماڈرن ہوتی ہوئی پاکستانی لڑکی۔" میں نے کہا "ٹی شرٹ اور جینز میں۔"

"اپنی خواہش کو اپنے پاس رکھو۔ نہ پاکستانی لڑکی ایسی ہوتی ہے اور نہ مجھے ماڈرن کہلانے کا شوق ہے۔" وہ بولی "ہماری ثقافت [illegible] کیا لباس کرتا ہے۔"

"پھر میرے لباس میں کیا خرابی ہے؟"

"خرابی کوئی نہیں مگر ہمارے ملک میں پڑھا لکھا طبقہ بھی قمیص کو ترجیح دیتا ہے اور خود تم بھی یہی لباس پہنتے رہے ہو۔" پھر بولی "قمیص پتلون تو تقریباً یونیفارم ہے۔ کیونکہ [illegible]

اور عرب ملک سے افریقہ تک ہر جگہ کے مرد بلا تفریق پہنتے ہیں۔"

کچھ وقت ہم نے الفنسٹن اسٹریٹ میں جوتے دیکھتے گزارا اور پھر کھانا کھانے چلے گئے۔ رابعہ پر بھی جذباتی دباؤ کم ہوگیا تھا اور وہ اب پہلے سے زیادہ پراعتماد اور خوش نظر آرہی تھی۔ یہ عہد کرنے کے باوجود کہ ہم نکاح کے بعد بھی پہلے کی طرح رہیں گے ایک لاشعوری فرق ہمارے رویوں میں نمودار ہوگیا تھا۔ خریداری کرتے وقت وہ ایک اچھی بیوی کی طرح میری ضروریات اور میری پسند کے معاملے میں اپنی مرضی چلا رہی تھی اور شاید ایسا پہلے بھی ہوتا تھا مگر مجھے احساس نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میری ذمہ داریاں اس نے سنبھال لی ہیں اور اب مجھے اپنے معاملات کی فکروں سے کلی طور پر دستبردار ہوجانا چاہیے۔ نہ جانے بیویاں گھریلو معاملات میں اس قسم کی مداخلت سے خوش کیوں ہوتی ہیں۔ شادی سے پہلے بہت بے مہار پھر لیے۔ اب سیدھے ہوجاؤ۔ کتے کی دُم سیدھی نہ ہوتی نہیں مگر بیویوں کو شوق ہوتا ہے اسے نلکی میں ڈال کے رکھنے کا۔ دال پکے یا انڈے لگاؤ۔ یہ گھر ہے ہوٹل نہیں۔ کسی کو زیادہ تو کسی کو کم مگر بیویوں کی خواہش ضرور ہوتی ہے کہ ہر معاملے میں ان کی چلے خواہ ان کی زبان کچھ کہتی رہے کہ جیسی آپ کی مرضی۔

دو بجے کھانا کھا کے ہم سیدھے پاسپورٹ آفس پہنچے تو ایجنٹ مجھے کینٹین میں بیٹھا ہوا نظر آگیا۔ اس نے دوسری پارٹی پھنسا رکھی تھی اور ان سے سعودی عرب کا ویزا لگوانے کا سودا کررہا تھا۔ مجھے دیکھ کے اس کا چہرہ کھل اٹھا تو میں سمجھ گیا کہ میرا کام ہوگیا ہے۔

"آئیے مولانا صاحب۔ یہ لو اپنا پاسپورٹ۔" اس نے اپنے تھیلے میں سے دو پاسپورٹ نکال کے میرے حوالے کیے "بی بی کو دالیے کہنا کہ یہاں دستخط کردے۔"

میں نے کہا "تم نے تو کہا تھا کہ افسر کے سامنے جاکے دستخط کرنے پڑیں گے؟"

"ہونا تو ایسا ہی ہے مگر میں نے کہا کہ اپنے بندے ہیں۔ میں جانتا ہوں۔" وہ بولا اور پھر دوسری پارٹی سے مخاطب ہوگیا "حاجی اب آپ کے سامنے ہیں یہ مولانا صاحب۔ ان سے پوچھ لو ان کا ارجنٹ کام تھا۔ ارجنٹ ہوا یا نہیں؟"

میں نے کہا "اگر میں تمہارے حق میں گواہی دوں تو تم مجھے کتنی رعایت دو گے؟"

"حاجی اب اتنی بڑی داڑھی کے ساتھ آپ جھوٹ تو نہیں بولو گے۔"

میں نے کہا "میرے ساتھ واقعی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ خدا کرے کہ یہ پاسپورٹ جعلی نہ ہوں۔"

وہ چونک کے بولا "لعنت جعلسازی کرنے والے پر۔ ابھی جاکے کسی کو بھی چیک کرالو۔ میری قمیص بعد میں دینا۔"

میں نے کہا "میاں، خفا کیوں ہوتے ہو۔ اصل پہچان تو ائیرپورٹ پر ہوگی۔"

وہ بہت تیز طرار نوجوان تھا۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ وہ اپنا لہجہ ہر موقع پر بدل لیتا تھا اور سامنے والے سے اسی کے لہجے میں بات کرتا تھا۔ پنجاب کا رہنے والا ہو تو لاہوری اردو۔ پٹھان ہو تو پشاوری اردو۔ ہر کاروبار کے اپنے تقاضے ہیں اور یہ تو ایک فطری بات ہے کہ ایک شخص سندھ کے دیہی لب و لہجے میں اردو بول رہا ہو تو دوسرا ٹھیٹ لکھنؤی زبان استعمال نہیں کرتا۔ وہ جناب عالی یا بادشاہو کے بجائے سائیں کہہ کے مخاطب کرتا ہے۔

رابعہ نے پاسپورٹ پر اپنے دستخط ثبت کیے۔ ہم نے وہیں سے اپنے اپنے پاسپورٹ کی فوٹو کاپیاں بنوا کے نوٹری پبلک سے تصدیق کرائی۔ وہیں سے ریڈی میڈ فولڈر بھی مل گئے۔ ایجنٹ نے مجھے ایک ٹریول ایجنسی کا پتا بتایا تھا کہ وہاں سے ٹکٹ بھی مل جائیں گے اور کسی جہاز پر سیٹ بھی کنفرم ہوجائے گی لیکن یہ مسئلہ ثانوی تھا۔ پہلے مجھے ویزا حاصل کرنا تھا۔

برٹش قونصلیٹ کو الزبتھ کے شوہر کا فون موصول ہوگیا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مسٹر گوردن برطانوی سیکرٹ سروس کے بہت اہم رکن تھے اور مستند تھا ان کا فرمایا ہوا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ الزبتھ جیسی بیوی کی بات نہیں ٹال سکتے تھے قونصلیٹ ان کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ ہمیں براہ راست اس کے کمرے میں پہنچادیا گیا۔

وہ میرا حلیہ دیکھ کے کچھ مایوس ہوا۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ ایسے اصلی اور نسلی خاندان کے میرے جیسے مولوی سے اتنے قریبی مراسم ہوں گے۔

"مسٹر وقار یوسف!" اس نے مجھ سے مصافحہ کرکے برقع پوش رابعہ کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا "کل آپ نے مجھے فون کیا تھا۔"

میں نے کہا "وائی کار یوسف۔ ایڈووکیٹ۔" میں نے کہا

"وقار یوسف ایڈووکیٹ اور میری وائف۔ شی از این ایڈووکیٹ ٹو۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "ریئلی؟ انہوں نے لا کا امتحان پاس کیا ہے؟"

میں نے کہا "یہ پریکٹس کرتی ہیں ہائیکورٹ میں۔"

"اس برقع کے ساتھ!" اسے یقین نہ آیا۔

"آف کورس" میں نے کہا "پردہ ہماری معاشرتی ضرورت ہے۔"

اس نے سر ہلایا "آپ کو درست ہونا چاہیے۔ مجھے آج صبح ہی لندن سے مسٹر گوردن کا فون موصول ہوا تھا کہ آپ کو ارجنٹ ویزا جاری کردیا جائے۔ آپ کے پاسپورٹ کہاں ہیں؟"

رابعہ نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے نکال کے دونوں پاسپورٹ اسے پیش کردیے۔

اس نے میرے پاسپورٹ کو غور سے دیکھا "مسٹر یوسف۔ یہ پاسپورٹ آج ہی جاری ہوا ہے؟"

میں نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے ہی لیا ہے میں نے۔"

www.paksociety.com

"آپ لیڈی الزبتھ گورڈن کے کلاس میٹ تھے؟"
میں نے کہا "نہیں۔ پرانی بات ہے۔"
"کتنی پرانی؟"
میں نے کہا "کم سے کم پانچ سال ہو گئے۔ جب میں اور وہ ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ انیس سو چھیاسی کے بعد۔"
"کہاں؟" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
"یونیورسٹی کالج' وہاں میں نے چار سال گزارے۔"
"اور کس مضمون میں ڈگری لی تھی آپ نے؟"
"بدقسمتی سے تعلیم مکمل نہیں کر سکا تھا۔"
"کیا تعلیم کے لیے جانے سے پہلے بھی آپ وکیل تھے؟"
میں اس کی جرح سے پریشان ہونے لگا تھا "نہیں۔ واپس آنے کے بعد میں نے وکالت کا امتحان پاس کیا۔"
"یہ بھی حال کی بات ہوگی" وہ بولا "انیس سو سڑسٹھ تک آپ لندن میں تھے۔ لیڈی الزبتھ گورڈن کے مضامین۔۔۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہسٹری اینڈ آرکیولوجی تھے۔"
میں نے محتاط لہجے میں کہا "آپ کو کیسے یاد پڑتا ہے؟"
وہ مسکرایا "اس لیے کہ میں خود بھی لیڈی الزبتھ گورڈن کا کلاس میٹ تھا۔"
میں نے اسے غور سے دیکھا "عجیب بات ہے کہ مجھے آپ کی صورت یاد نہیں آرہی۔"
"نہیں۔ ایسا ہی میرے ساتھ ہے۔" وہ بولا "آپ سکندر بخت کو جانتے ہیں؟"
میں نے بڑی مشکل سے اپنے ردعمل کو کنٹرول کیا "نہیں۔ وہ بھی پاکستان سے آیا تھا۔"
"اور وہ بھی تعلیم مکمل نہیں کر سکا تھا۔"
"اس کا مجھے علم نہیں ہے۔"
"مجھے معلوم ہے۔۔۔ وہ برطانیہ سے نکالا گیا تھا۔ ڈی پورٹ کیا گیا تھا کیونکہ وہ سنگین جرائم میں ملوث تھا" وہ سوچتے ہوئے بولا۔
میں یہ کہتے کہتے رک گیا کہ وہ ملوث کر دیا گیا تھا اور میرا خیال ہے کہ اس نے بھی مصلحت یا کسی اور وجہ سے بہت کچھ نہیں کہا جو وہ جانتا تھا۔ غالباً اسے یہ بھی علم ہوگا کہ سکندر بخت کو نکلوانے میں الزبتھ کے باپ کا بہت ہاتھ تھا۔ وہ ان باتوں سے بے خبر نہیں ہوگا جو میرے اور الزبتھ کے تعلق کے بارے میں مشہور تھیں۔ اگر وہ واقعی میرا اور الزبتھ کا کلاس فیلو رہا تھا۔ تو وہ جانتا ہوگا کہ یہ باتیں بھی بے بنیاد نہیں تھیں مگر اب وہ لیڈی الزبتھ گورڈن اور اس کے ماضی کا کوئی نامناسب حوالہ دیتا ایک غیر ذمے دارانہ "معیوب اور غلط حرکت ہوتی۔"
میں اسے پہچاننے کی کوشش میں ناکام تھا۔ میں اور محسن کلاس کے جینٹس سفید فام لڑکوں سے مجاہدانہ رقابت مول لے چکے تھے۔ ان کی گرل فرینڈز کو ورغلانا ہمارے نزدیک ایک جہاد تھا۔ اس کے نتیجے میں اکثر ہمارے ڈوئل ہو جاتے تھے یا ہم اجتماعی گوشمالی کا شکار ہوتے تھے۔ کامیابی کی صورت میں بھی اور ناکامی کی صورت میں بھی۔ بہت سے سرمنڈے گورے لڑکے ایک سے پٹ چکے تھے اور کیا پتا یہ بھی انہی میں سے ایک ہو۔ میں نے اس کی گرل فرینڈ کو ہتھیا لیا ہو اور اس نے مشتعل ہو کے مجھ سے مار کھائی ہو! گرل فرینڈ نے اس سے میری شکایت کر دی ہو تو اس نے انگریز تیجے کے سپوتوں کو ساتھ ملا کے میری پڑی پسلی ایک کر دی ہو۔ شاید یہ بھی میرے چہرے کو داڑھی کے بغیر چشم تصور سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔
ایک مؤدب بیرا چائے رکھ کے چلا گیا تو میں نے کہا "بہت کوشش کے باوجود میں آپ کی پانچ سال پہلے کی صورت کا تصور نہیں کر سکتا۔"
وہ مسکرایا "کچھ ایسا ہی مسئلہ میرا ہے۔ یہ داڑھی اس وقت یقیناً نہیں ہوگی ورنہ آپ کلاس میں منفرد اور نمایاں ہوتے۔"
"دراصل ہماری کچھ کلاسز کامن ہوتی تھیں اور الگ۔۔۔"
"وہ تو ہوتا ہے لیکن مسٹر یوسف۔۔۔ ایک لڑکا اور تھا جو سکندر بخت کا بہت گہرا دوست تھا۔ کچھ حسن تھیر۔۔۔ ایسا ہی نام تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے ساتھ رہتے تھے اور ساتھ ہی واپس بھی گئے۔"
میں نے کہا "لیکن وہ سائنس اسٹوڈنٹ تھا۔ غالباً آپ محسن خان شیروانی کی بات کر رہے ہیں۔"
اس نے چٹکی بجائی "رائٹ از اٹ۔ یہ دونوں کہاں ہیں آج کل؟"
میں نے کہا "مجھے کچھ معلوم نہیں۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ حیران ہو کے بولا "سکندر بخت کا نام تو یہاں بھی خبروں میں بہت آیا ہے۔ اس کا اچھا خاصا کرمنل ریکارڈ ہے۔ پاکستان پہنچ کے بھی اس نے وہی کام جاری رکھا جو لندن میں کر رہا تھا بلکہ یہاں تو اس نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔"
میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا "دراصل میں باقاعدگی سے اخبار نہیں پڑھتا اور خصوصاً جرائم کی خبریں۔"
"وکیل ہو کے جرائم سے لاتعلق رہنا عجیب سی بات ہے۔ خیر آپ کا پرانا پاسپورٹ کہاں ہے مسٹر یوسف!"
"پرانا پاسپورٹ!"
"ہاں۔ جب آپ پانچ سال پہلے لندن گئے تھے تو آپ نے پاسپورٹ لیا ہوگا" آپ نے اس کی تجدید کیوں نہیں کرائی۔ نیا پاسپورٹ کیوں حاصل کیا؟"
"دراصل۔۔۔ وہ پاسپورٹ کھو گیا تھا۔ اس طرح کہ مجھے بھی پتا نہیں چلا۔ میرے صندوق میں سے غائب ہو گیا تھا۔ میرا ایک ملازم تھا۔ وہ نکال کر لے گیا بعد میں اس نے کسی جعلساز کے ساتھ مل کے اس پر اپنا فوٹو لگا لیا۔"
"ہوں تو بیچ یونٹ سے ایسا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا نام ولدیت رہائش سب وہی رہے ہوں گے کیا اس نے برطانیہ میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی یا ہوگی تو پکڑا گیا ہوگا۔"
"ہاں۔ وہ پکڑا گیا تھا۔"
"پھر کیا اسے جیل ہو گئی تھی۔" وہ بال کی کھال نکالنے پر آمادہ تھا۔
"غالباً نہیں۔ رشوت دے دلا کے نکل گیا ہوگا۔ کیونکہ بعد میں کوئی مجھ سے پوچھ گچھ کے لیے نہیں آیا۔ یہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔"
"آپ نے چوری کی رپورٹ تو لکھوائی ہوگی۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا "وہ بہت لمبا چکر تھا۔ میں نے بھی اپنی جان چھڑائی کیونکہ میں کراچی آ گیا تھا۔ نیا پاسپورٹ بنوانا زیادہ آسان تھا۔"
وہ مسکرانے لگا "آپ کے ملک میں لوگ شارٹ کٹ کے عادی ہیں خواہ وہ غلط ہوں اور قانون کو نظر انداز کرتے ہوں۔ خیر مجھے کیا میں لیڈی الزبتھ گورڈن کی خواہش کے احترام میں آپ کو ویزا دینے پر مجبور ہوں۔ آپ رسمی کارروائی کے بعد جب چاہیں چلے جائیں۔"
"کیا آج ہی ویزا جاری نہیں ہو سکتا؟"
"آج تو مشکل ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ بہرحال میں کوشش کرتا ہوں" آپ نیچے چلے جائیں۔" اس نے انٹر کام پر کسی سے بات کی اور اسے میرا مسئلہ حل کرنے کے لیے کہا۔
میں پاسپورٹ لے کے باہر نکلا تو رابعہ نے کہا "سکندر۔۔۔ کیا یہ تمہیں پہچان گیا ہے؟"
میں نے کہا "نہیں لیکن شک میں ضرور پڑ گیا ہے۔"
"ایسا نہ ہو یہ تصدیق کا مسئلہ کھڑا کر دے کہ کیا واقعی یوسف نام کا کوئی اسٹوڈنٹ محسن اور سکندر بخت کے ساتھ تھا۔ وہ کالج سے پوچھ سکتا ہے اور اس کے بارے میں دیگر تفصیلات مانگ سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ نام کالج کے ریکارڈ پر نہیں ہوگا تو وہ کیا بتائیں گے پھر وہ مقامی طور پر رفتار یوسف ایڈووکیٹ کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتا ہے۔"
میں نے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا رابعہ۔"
"ابھی وقت ہے۔ پاسپورٹ ہمارے پاس ہیں۔"
"تمہارا مطلب ہے کہ ہم ویزا لیے بغیر راک آؤٹ کر جائیں۔ بھاگ جائیں" میں نے کہا۔
"ایک بار ثبوت اس کے ہاتھ میں چلا گیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔"
میں نے کہا "بات تو ٹھیک ہے تمہاری لیکن۔۔۔"
"لیکن کیا۔۔۔ تمہاری وہ الزبتھ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گی یہاں۔ چلو" رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔
ہم اس وقت لاؤنج میں تھے اور باہر جانے والا راستہ ہمارے دائیں ہاتھ پر تھا۔ ماتحت عملے کے دفاتر بائیں طرف نظر آ رہے تھے۔
"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم لندن نہیں جا سکتے" میں نے مایوسی سے کہا۔
"نہیں۔ لندن جانے کی کوشش کی تو جیل پہنچ جائیں گے ہم دونوں۔ اگر یہاں نہ پکڑے گئے تو لندن کے ائرپورٹ پر دھر لیے جائیں گے اور وہاں اسکاٹ لینڈ یارڈ والے پاکستان کی طرح تفتیش نہیں کرتے۔ وہ دو منٹ میں تمہاری داڑھی اتار کے ہاتھ میں پکڑا دیں گے اور جب اب اتار کے تم کو سکندر بخت ثابت کر دیں گے تو وہاں سے واپسی زیر حراست اور لوٹ کے یہاں گرفتاری۔"
"اس کو کہتے ہیں قسمت کی خرابی" میں نے رابعہ کے ساتھ باہر آتے ہوئے سخت جھنجلاہٹ اور کوفت محسوس کی۔
"تم خرابی کہتے ہو اسے۔ میں کہتی ہوں کہ خوش قسمتی ہے ہماری۔ اگر وہ پاسپورٹ تمہیں نہ دیتا بلکہ چپراسی کے ہاتھ نیچے بھجوا دیتا۔ پھر ہم پھنس جاتے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ بال بال بچے۔"
میں نے بدمزگی اور تلخی سے کہا "یہ اُلو کا پٹھا کہاں سے الزبتھ کا کلاس فیلو نکل آیا۔ مجھے تو یاد نہیں آتا۔"
"رفتار یوسف اس کا کوئی کلاس فیلو نہیں تھا۔ یہ بات اسے بہرحال یاد ہے۔"
"ہونی بھی چاہیے۔ کلاس میں پاکستانی لڑکے دو ہی تھے۔ اور ان دو نے بھی بڑا نام روشن کیا تھا اپنے ملک کا۔ چار ہندو لڑکے تھے۔ باقی سب گورے تھے۔"
"پھر تمہیں اس کی صورت کیوں بھول گئی؟"
"کیا تمہیں حیرت ہے؟"
"حیرت کی کوئی بات نہیں۔ آپ صرف لڑکیوں کی صورت پر غور فرماتے تھے۔ وہ سب صورتیں دل پر نقش ہوں گی۔"
ناکامی اور احساس شکست نے مجھے مایوس اور افسردہ کر دیا تھا۔ "قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
"میں تو اس کی جرح سے گھبرا گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی فون اٹھائے گا اور ہمیں اپنے سیکیورٹی والوں کے حوالے کر دے گا کہ ان جعلسازوں کو اس وقت تک روکے رکھو جب تک پولیس نہ آ جائے۔"
"یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ سارا پروگرام چوپٹ ہو گیا۔"
"کیسی باتیں کرتے ہو۔ ہم مشکل میں پڑنے سے بچ گئے۔"
میں نے کہا "اس شخص نے لیڈی الزبتھ گورڈن کا بھی لحاظ نہیں کیا۔"
"وہ کوئین الزبتھ کی پروا بھی نہیں کرے گا اگر اسے حقیقت معلوم ہو جائے اور نہ کوئین الزبتھ اسے کچھ کہے گی۔ اس کی فرض شناسی کو سراہا جائے گا۔ تمہاری الزبتھ کی سفارش اس کے لیے قانون سے بالاتر نہیں ہو سکتی۔"
"تم نے ٹھیک کہا۔ یہ پاکستانی سفارت خانے کا افسر ہوتا تو کسی وزیر کی سفارش پر آنکھ بند کر کے ربڑ لگا دیتا۔ خواہ اس کے سامنے

www.paksociety.com

کوئی اشتہاری مجرم ہو۔ خیر سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے۔"

"کچھ نہیں۔ چلو کہیں بیٹھ کے چائے پیتے ہیں۔ سکون سے سوچیں گے۔" رابعہ نے کہا۔

"یہ دوسری بار نقصان ہو گیا۔ پانچ ہزار ٹکٹ بیچنے والے نے ٹھگ لیے۔ اب یہ پاسپورٹ ہے کا رہو گئے پیسہ ضائع ہوا۔"

"ضائع کیوں ہوا" رابعہ نے کہا "تمہیں بار بار ایجنٹ نے ایک بات کہی تھی کہ یہاں سے ویزا ملنا مشکل ہے۔"

"اب تو ناممکن ہے۔"

"مگر اس نے کہا تھا کہ کولمبو چلے جاؤ" رابعہ بولی "وہاں آسانی سے مل جائے گا۔"

میں چلتے چلتے رک گیا "ارہ رابعہ۔ رابعہ دل جلتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "آرام سے چلتے جاؤ۔ چارہ نہیں اور اپنے دل کو قابو میں رکھو۔ تاکہ تمہارا دماغ ٹھکانے رہے۔"

رابعہ کی بات نے مجھے اچانک مایوسی کے گھپ اندھیرے میں روشنی دے دی تھی اور قونصلیٹ آفس سے دور آجانے کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ کیا یہ اتفاق بھی دست قدرت کی تائید کا اور بدترین خباثت کا ایک نمونہ نہیں تھا کہ اپنے دل میں بغض و کینہ اور حسد و رقابت کے جذبات رکھنے والے ایک شخص کی سکندر بخت سے نفرت نے مجھے بچالیا تھا۔ اگر وہ زبان سے کچھ نہ کہتا مگر مجھے لندن روانہ کرنے کے بعد وزارت داخلہ کے کسی ذمے دار افسر کو فون کر دیتا کہ مسٹر و قار یوسف اور ان کی بیوی پر خاص نظر رکھی جائے کیونکہ لیڈی الزبتھ گورڈان سے مراسم کی نوعیت اور ان کی مصروفیات پر نظر رکھی جائے کیونکہ ظاہری حقائق کی اصل صورت سے مطابقت محسوس نہیں ہوتی۔ پھر لندن پولیس سب معلوم کر لیتی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ الزبتھ میری کوئی مدد نہ کر پاتی۔ وہ اب پہلے والی جذباتی اور غیر ذمے دار لڑکی نہیں تھی۔ اس کی اور اس کے شوہر مسٹر گورڈان کی ایک سماجی حیثیت تھی اور ایک بیوی کا یہ فرض بنتا تھا کہ وہ اپنے شوہر کی عزت کو اسکینڈل سے محفوظ رکھے۔

ہم نے میلوڈی ہوٹل کے مقابل ایک ریسٹورنٹ میں چائے پی تو میرا ذہن پرسکون ہو گیا۔ "خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "سچ بتاؤ تم اسے پہچانے نہیں تھے؟"

میں نے کہا "پہچان لیتا تو دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی لوٹ آتا۔ مجھے اب بھی شک ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا..."

"وہ تمہارے اور محسن کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔"

میں نے کہا "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی اسے یہ سب کچھ بتایا گیا ہو؟"

رابعہ نے حیرانی سے کہا "بتانے والا کون ہو سکتا ہے؟"

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے خود مسٹر گورڈان نے اس کے کان میں یہ بات ڈال دی ہو۔"

"مسٹر گورڈان نے؟ خود الزبتھ کے شوہر نے؟"

"ہاں۔ فرض کرو یہ مسٹر گورڈان ہی اصل کلاس فیلو تھے مجھے آج سب لڑکوں کے نام یاد نہیں جو میرے یا الزبتھ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس پر مرنے والے تو بہت تھے۔ ایک وجہ تو یہی تھی کہ وہ خاندانی اور دولت مند باپ کی بیٹی تھی۔"

"اور دوسرے یہ کہ کلاس کی سب سے حسین لڑکی تھی۔" رابعہ بولی۔

"کم سے کم میں ایسا ہی سمجھتا تھا۔ ممکن ہے کسی اور کو دوسری لڑکی نمبر ون لگتی ہو۔ وہ واحد حسین لڑکی بہرحال نہیں تھی۔"

"لیکن الزبتھ کی نظر میں ہیرو صرف ایک تھا۔ باقی سب زیرو تھے۔"

میں نے کہا "کم سے کم اس معاملے میں لیڈی الزبتھ گورڈان اور ایڈووکیٹ رابعہ وقار کے درمیان مکمل اتفاق رائے پایا جاتا ہے" میں نے کہا "جب ہیرو کو بیک بینی و دو گوش سلطنت برطانیہ کی حدود سے نکال باہر کیا گیا تو جتنے زیرو تھے وہ خود بخود ہیرو بن گئے ہوں گے اور ان میں سے باقی تو ایک نے سکندر بخت کے جانشین کی جگہ اعظم عشق میں اپنی نصرت کے ڈنکے بجائے ہوں گے اور الزبتھ کے دل پر فتح حاصل کی ہو گی۔ کلاس میں اعلیٰ خاندانوں کے ایسے بہت سے چشم و چراغ تھے جو الزبتھ کے متعصب اور نسل پرست باپ کے معیار انتخاب پر پورے اترتے تھے۔ اس نے فوراً کسی عالی نسب پرستار کو اپنی فرزندی میں قبول کر لیا تاکہ الزبتھ اس الو کے پٹھے کو بار بھی نہ رکھے جس کا نام سکندر بخت تھا۔"

رابعہ نے افسوس سے سر ہلایا۔ "بڑی بے وفا نکلی۔ اتنی جلدی بھول گئی تھی۔ بڑی سطحی قسم کی محبت تھی۔ غالباً بعد میں جب اسے عقل آئی ہو گی تو احساس ہوا ہو گا کہ جذبات کی رو میں بہہ کے وہ اندھے کنوئیں میں کودنے والی تھی۔"

"تم اب کچھ بھی کہہ سکتی ہو" میں نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا "مگر ایسا ہوتا تو وہ میرے فون پر اتنی بے قرار نہ ہوتی۔ رکھائی سے معذرت کر لیتی۔"

"اس نے بداخلاقی کا مظاہرہ کرنا لاحاصل سمجھا۔ شوہر سے یہ کام کرایا جو خود کرنا نہیں چاہتی تھی۔"

میں نے کہا "نہیں۔ الزبتھ ایسی لڑکی نہیں تھی۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ صاف انکار کر دیتی۔ یہ کہہ دیتی کہ اب میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ یہ مسٹر گورڈان نے کیا ہو گا۔ اسے سب یاد ہو گا اور اس نے قونصلیٹ کو بریف کیا ہو گا کہ ذرا خیال رکھنا۔ میرا ایک پاکستانی کلاس میٹ تھا جسے دہشت گرد قرار دے کر برطانیہ بدر کیا گیا تھا۔ کہیں وہ پھر کسی اور نام سے یہاں نہ آجائے۔ پاکستانی برطانیہ میں داخل ہونے کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ اس نے میری بیوی کا سہارا کیوں لیا ہے آخر؟ وہ لیڈی الزبتھ کو کیسے جانتا ہے؟ قونصلیٹ کے وار ٹوبی تھا۔ اس نے ایک اچھے ڈپلومیٹ کی طرح صورت حال سنبھال لیا۔ یعنی ممکن ہے کہ اس نے خود ہی مجھے ایک موقع دیا ہو کہ سوچ لو اب بھی لندن جانا ہے یا نہیں۔"

رابعہ قائل ہو گئی "چلو جو بھی ہوا ٹھیک ہوا۔"

"ہاں آنے والے ہم بھی نہیں ہیں اور اس پر ہمارا یقین ہے کہ بندہ اپنے ہی ٹھکانے پر آتا ہے، جو خدا منظور کرتا ہے تو خدا سور رکھوتا ہے۔"

رابعہ بولی "مقصد اگر کچھ عرصہ روپوش رہنا ہے۔ تو ہم کولمبو میں لندن سے زیادہ محفوظ ہوں گے۔"

"پھر کولمبو ہی کیوں۔ ساری دنیا پڑی ہے" میں نے کہا "لیکن مجھے ایک کام بھی ہے۔ اب میں الزبتھ کو بھی پتا نہیں چلنے دوں گا کہ میں لندن میں ہوں۔"

"اس کا شور ہوا چلا ہے گا۔"

"مگر کیسے؟ اول تو قونصلیٹ اسے بتا رے گا کہ غالباً وہ خود سکندر بخت ہی تھا جو بھیس بدل کے آیا لیکن میری جرح سے گھبرا کے بھاگ گیا۔ میں نے اسے جانے دیا۔ کیا فائدہ کسی جھگڑے میں پڑنے کا۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ اس سے لیڈی الزبتھ کے ماضی کا کوئی سلسلہ ہو۔ مجھے امید نہیں کہ اب وہ لندن کا رخ بھی کرے۔ اس سے مسٹر گورڈان مطمئن ہو جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ وہ لندن پولیس کو ائیرپورٹ پر الرٹ کر سکتے ہیں کہ پاکستان سے آنے والی کسی فلائٹ میں وقار یوسف نام کا کوئی مسافر ہو تو اسے چیک کیا جائے۔"

"اس کے باوجود تم لندن جانے کا رسک لو گے؟"

"نہیں۔ میں لندن نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمہاری عقل میں کوئی بات آئی۔"

"میں براہ راست لندن نہیں جاؤں گا" میں نے کہا "پچھلے دروازے سے جاؤں گا۔ ہر سال سیکڑوں لوگ ہر ملک میں ناجائز طریقے سے داخل ہوتے ہیں۔"

"مگر تم ایسا نہیں کر سکتے" رابعہ نے برہمی سے کہا۔

"کہ کر میں کیا نہیں کر سکتا۔ میں یہاں کراچی کے ساحل سے مچھوا عرب میں غوطہ لگاؤں تو تیرتا ہوا برطانیہ کے کسی بھی ساحل پر جا نکلوں لیکن ظاہر ہے کہ میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں یہاں سے جاؤں گا پیرس۔ فرنچ میں ایسے بولتا ہوں کہ خود فرانس والے نہیں بول سکتے۔"

رابعہ بولی "اور فرانس والے کچھ بھی نہیں سکتے۔ یہاں تو سب کو مرعوب کر لیتے ہو۔"

میں نے کہا "زبان کے معاملے میں بہت ہی یورپی اقوام انتہائی متعصب ہیں۔ فرنچ بھی کسی سے فرانسیسی کے سوا کسی زبان میں بات کرنا اپنی ذاتی اور قومی توہین سمجھتے ہیں۔ انگریزی سے انہیں خاص چڑ ہے۔ معقول فرنچ بھی جانتے بوجھتے خاموش رہتا، سر ہلا کے لاعلمی کا اظہار کرتا یا ایک جملہ "سوری نو انگلش" کہہ کے ٹال دیتا ہے خواہ اس کی ماں انگریز ہو اور انگریزی اس کی مادری زبان۔ انگریزی جاننے والا بھی فرنچ ہی بولے گا۔"

"زبان سے یہ تعصب کیوں؟"

"بڑا اچھا سوال کیا آپ نے بی بی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جیسے کتے کو شاید دوسرے کتے کی بولی اچھی لگتی ہے جسے ہم بھونکنا کہتے ہیں۔ ایسے ہی ہر جاندار اپنی جنس کے دوسرے جانور کی بولی سمجھتا ہے۔ یہ معاشرتی حیوان عرف حضرت انسان بھی اپنی سرشت میں حیوان ناطق ہونے کے باوجود ایک ایسے ہی جانور ہیں۔ دنیا بھر میں زبان کا رشتہ دو اجنبیوں کو ایک کر دیتا ہے۔ برطانیہ میں انگریزی بولتے بولتے جب ذرا اردو کرنے لگتے ہیں تو انڈین اور پاکستانی ایک دوسرے سے اردو بول کے بہت خوش ہوتے ہیں اور اپنی مذہبی یا سیاسی دشمنی کو بھول کر شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ عرب خود کو ایک قوم کہتے ہیں۔ سارا مڈل ایسٹ عربی زبان کے رشتے سے ایک ہے۔ بس کچھ ایسا ہی مسئلہ ہے کہ فرنچ ہو جرمن ہو یا برطانوی۔ اپنی قومی شناخت کو انہوں نے انا کا مسئلہ بنا لیا ہے حالانکہ زبان صرف ذریعہ اظہار ہے۔ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے اور دوسرے کی بات سمجھنے کا وسیلہ۔ گونگے بہروں کی بھی بین الاقوامی زبان ہے۔ موسیقی کی تحریر تک ساری دنیا میں ایک ہے۔"

"یہ تعصب کسی حد تک ہمارے اپنے وطن میں بھی ہے۔ قومی زبان اردو ہے جو کراچی سے کشمیر تک سب سمجھتے ہیں مگر جہاں آپ نے کسی صوبے کی زبان بولی مخالف فوراً آپ کا ہم زبان ہو جائے گا اور اجنبیت ختم ہو جائے گی۔" رابعہ نے کہا۔

"تو اسی طرح فرنچ فرانس میں بھی اجنبیت کو ختم کرے گی۔ پیرس اور لندن سے لوگ ویک اینڈ پہ بائی روڈ ادھر سے ادھر آتے جاتے ہیں۔ درمیان میں انگلش چینل ہے۔ اس پر فیری سروس ہے یعنی آپ کار میں بیٹھے رہیں اور کار کو سڑک کے ختم ہوتے ہی سیدھا بحری جہاز کے عرشے پر لے جائیں۔ جہاز آپ کو دوسری طرف اتار دے گا۔ گاڑی چلائیں اور پھر سڑک پر۔ کار میں آنے جانے والی فیملی کو سرحدی حکام چیک بھی نہیں کرتے۔ یوں مجھ کو کہ ریڈا کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جب تک کہ شک نہ ہو کوئی۔ پاسپورٹ بھی کوئی طلب نہیں کرتا۔ ہم پیرس میں کار لے لیں گے جو وہاں آسانی سے کرائے پر مل جاتی ہے۔ دو گھنٹے میں لندن۔"

"وہ کاروں کے نمبر نوٹ کرتے ہوں گے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ ایک مسئلہ ہے۔ وہ ریکارڈ رکھتے ہیں کہ سرحد پار سے کتنی کاریں آئیں اور ان میں سے کتنی واپس گئیں۔ جو واپس نہ جائیں وہ انہیں تلاش کر لیتے ہیں لیکن اس مسئلے کا بھی ایک حل ہے۔ ہم جو کار پیرس میں کرائے پر لیں گے وہ ان کی لندن والی ایجنسی کو واپس کر دیں گے۔ نوے فیصد چانس ہے کہ وہ کار اسی روز کوئی اور واپس لے جائے گا۔ ٹورسٹ ایسا ہی کرتے ہیں۔ کرائے پر کار دینے والی کمپنی کی ایجنسی یورپ کے ہر شہر میں ہوتی ہے۔ آپ ایک جگہ سے کار لیں اور سفر کے بعد دوسری جگہ واپس کر دیں۔ جب ہم لندن سے پیرس آئیں گے تو دوسری کار لے لیں گے اور وہ پیرس میں واپس کر کے خود بھی واپس۔ میں سمجھتا ہوں ہمارا کام دو تین دن سے زیادہ کا نہیں ہے۔"

"تم سمجھتے ہو اس میں کوئی خطرہ نہیں؟"

www.paksociety.com

"تمہارا نہ خطرے کو اور مجھے لازم و ملزوم سمجھو۔ یہ میں نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا حسین کہ اور کہیں میں سرحد سے دور شاید لگتا ہے تو یہاں اپنے فلیٹ میں آرام سے بیٹھو اور میرے واپس آنے کا انتظار کرو۔ یہاں تم بالکل محفوظ رہو گی۔ ضرورت کا سامان میں جانے سے پہلے فراہم کر جاؤں گا ورنہ تم خود بھی برقع پہن کے کراچی میں گھوم پھر لو۔ کوئی خطرے کی بات نہیں ہو گی۔"

"تم خفا ہو گئے۔"

"اُف۔ اب یہ عورتوں کے مخصوص حربے مت استعمال کرنا۔ رونا مت شروع کر دینا۔ میں کیا خفا ہونے کا حق نہیں رکھتا۔ تم بھی تو خفا ہو جاتی ہو۔ بلکہ اکثر باتوں پر خفا ہوتی ہو۔"

"تم یہ طعنہ کیوں دیتے ہو کہ میں ڈر رہی ہوں۔ کہاں ساتھ نہیں دیا میں نے تمہارا تو خیر۔" اس نے رونے کے بجائے لڑنا شروع کر دیا۔

"یہ میں نے کب کہا ہے کہ تم نے ساتھ نہیں دیا۔"

وہ بولی "بس میں احتیاط سے کام لینے کو کہتی ہوں۔ اس لیے کہ تم کو مزید مشکلات کا سامنا نہ ہو۔"

"مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔ اب مشکلات سے میں ڈرتا نہیں اور مشکل میں پڑے بغیر تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہو گا۔"

"اچھا بابا جو تمہارا دل چاہے کرو۔"

"پھر بابا کہہ دیا تم نے مجھے فارسی یا پشتو میں کہا ہے تو غالباً نکاح پھر ہو گا۔ اردو میں کہا ہے تو میری سخت توہین ہے۔ یہ تفصیر ہے کہا جاتا ہے کہ معاف کرو بابا۔"

"طعنہ تو ایسا ہی ہے کہ سڑک کے کنارے کٹورا رکھ کے بیٹھ جاؤ اور صدا لگاؤ تو کمائی ہی کمائی۔ اکبر تو پیدائشی ہو۔"

ٹاک کو دوسری طرف سے پکڑنے کے لیے میں نے اسلام آباد کو ترجیح دی۔ سری لنکا کا سفارت خانہ وہیں تھا اور وہاں ویزا ملنا نسبتاً آسان تھا۔ وہ ایک ایسا ملک تھا جہاں سے بھی ٹورسٹ سیاحی دورے کرنے والے شہ تجارتی اور ثقافتی وفود، سفارتی عملے کے ارکان اور ایسے ہی شک و شبہ سے بالا تر معززین آتے جاتے رہتے تھے۔ کراچی کاروباری شہر تھا اور جتنے لوگ وہاں جائز کاروبار کے سلسلے میں پاکستان سے باہر جاتے تھے شاید اس سے زیادہ ناجائز کاروبار کے چکر میں آتے جاتے رہتے تھے۔ سنگاپور، تھائی لینڈ یا ہانگ کانگ کے راستے خوب اسمگلنگ ہوتی تھی اور اس کاروبار کو منظم طور پر چلانے والوں کو ہمیشہ نئے لوگوں کی تلاش رہتی تھی جو ٹورسٹ ویزا پر جاتے ہوئے کچھ سامان ساتھ لے جائیں اور واپسی میں بھی ان کے ایجنٹ سے سامان لے آئیں۔ وہاں کے امیگریشن حکام بھی زیادہ مستعد تھے۔

ہم نے بادلِ ناخواستہ مولوی غلام حسین کی خاندانی نشانیوں کو اپنے فلیٹ میں بحفاظت چھوڑا اور نئے سوٹ کیس کے ساتھ نائٹ کوچ سے اسلام آباد روانہ ہو گئے۔ رات دو بجے چکلالہ ایئرپورٹ سے راولپنڈی جانے سے بہتر تھا کہ ہم ایئرپورٹ ہوٹل میں ہی قیام کریں۔ وہاں جگہ کا ہمیشہ مسئلہ رہتا تھا مگر اتفاق سے کچھ دیر پہلے ہی کسی مسافر نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اس کا حساب فوراً کیا جائے۔ اس کی فلائٹ دو گھنٹے بعد تھی۔ ہم لاؤنج سے اٹھ کر ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ انتظار کرنے اور نیند بھگانے کے لیے چائے سے بہتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی۔

تو گھنٹے میں پورٹر نے ہمارا سوٹ کیس کمرے میں پہنچایا۔ میں نے روم سروس کو مطلع کیا کہ مجھے آٹھ بجے بیڈ ٹی چاہیے اور ساڑھے آٹھ بجے ناشتا۔ سونے کے لیے ساڑھے چار گھنٹے بہت تھے۔

صبح باہر نکلنے سے پہلے میں نے اپنا حلیہ تبدیل کر دیا۔ میں نے ہوٹل کے ہیئر ڈریسر سے داڑھی کو تراش کے چھوٹا کر کے فرنچ کٹ کے مطابق بنانے کو کہا۔ اپنی پگڑی میں نے کراچی میں ہی چھوڑ دی تھی۔ اب میں نے شلوار قمیص کی جگہ قمیص پتلون پہن لیا کیونکہ شک نہیں ہوا۔ نائٹ کوچ سے سفر کرنے والے کاروباری لوگ بھی شلوار قمیص پہن کے پہنچتے تھے اور صبح سوٹ پہن کے ہوٹل سے نکلتے تھے۔ رابعہ نے اپنا برقع کراچی سے ہوائی جہاز کے پرواز کرتے ہی اتار دیا تھا۔

ہم پنڈی شہر سے بچتے ہوئے براہِ راست اسلام آباد گئے جہاں سفارت خانے ایک ہی جگہ تھے چنانچہ سری لنکا کا جھنڈا دیکھ کے میں ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔ وہاں نہ رش تھا نہ کوئی ایجنٹ ویزا لینے والے لوگ برائے نام تھے اور جو تھے وہ بھی بڑے دوستانہ ماحول میں کام کرنے والے عملے سے گپ شپ کر رہے تھے۔ بھارت دشمنی کے باعث سری لنکا اور پاکستان کی حکومتوں کے اور عوام کے مراسم بہت اچھے تھے۔

کسی دشواری کے بغیر تمام کاغذی کارروائی مکمل ہو گئی اور دو گھنٹے بعد ہمیں کولمبو کا ویزا مل گیا۔ ہم نے "ائر لنکا" یا "ایئر لائن" کی مصلحت کے تحت ترجیح دی مگر اس کے لیے واپس کراچی جانا ضروری تھا۔ میں نے ایک ٹریول ایجنسی سے ٹکٹ خریدا اور ہمیں کولمبو کے لیے براستہ کراچی ایک فلائٹ بھی مل گئی۔ اب ہماری مرضی تھی کہ کراچی پہنچ کے ایک گھنٹا جہاز میں بیٹھے رہیں یا کراچی میں رک جائیں اور کسی اگلی فلائٹ سے پھر سفر کا آغاز کریں۔ ظاہر ہے ہم نے ایک گھنٹا انتظار کرنے کو ترجیح دی۔ کسی اور ملک میں ہوتے تو ساڑھے آٹھ بھی نہیں نکلتے تھے گھومنے پھرنے پر وطن میں کوئی پابندی نہیں تھی۔

اب حالات موافق تھے تو ٹکٹ ملنے کے تین گھنٹے بعد ہم کراچی کی فلائٹ بھی مل گئی اور چھ گھنٹے بعد جہاز میں گزارنے کے بعد ہم رات دس بجے کولمبو کے بین الاقوامی ایئرپورٹ پر اتر گئے۔ ایک اجنبی دنیا تھی مگر وہاں ہمارے ہم زبان بہت تھے۔ ایئرپورٹ پر ہی کرنسی تبدیل ہو گئی اور پھر ایک مہذب سے سٹور پلیشن افسر نے ہمیں ضروری ہدایات دیں۔ "آپ ٹورسٹ ہیں۔ یہاں کریں۔ لیکن باہر آپ کو ہوٹل کے ایجنٹ بہت ملیں گے جس کا بیڈ لے لیں گے۔" اس نے مجھے ایک بروشر دیا جس میں مختلف ہوٹلوں کے نام پتے اور کمروں کے کرائے تک لکھے ہوئے تھے۔ شہر کے مختلف مقامات کے فاصلے دیے ہوئے تھے تاکہ ہم خود کو ٹیکسی والوں کے ہاتھوں سے بچا سکیں۔ تفریح کے قابل دید مقامات کے ساتھ ہی پسندیدہ مقامات کا حوالہ بھی تھا کہ وہاں ٹورسٹ کی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں۔ اگر ناگزیر ہو تو مقامی پولیس کو ضرور مطلع کر کے جائیں۔

مجھے حیرانی بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا کہ ہمارے اتنے بڑے بڑے ہوائی اڈوں پر باہر سے آنے والوں کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا اور نہ محکمۂ سیاحت کسی ایئرپورٹ پر ایسی سہولت فراہم کرتا ہے جس کے بغیر کوئی بھی اجنبی باہر نکلتے ہی ٹیکسی والوں، ہوٹل کے ایجنٹوں اور پولیس والوں میں گھر جاتا ہے جو شکار سمجھ کے اس پر گدھ کی طرح جھپٹتے ہیں۔

ہم نے درمیانے درجے کے ایک ہوٹل کا انتخاب کیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے سوٹ کیس رکھنے کے بعد جو کرایہ بتایا وہ اصل کرائے سے تقریباً تین گنا تھا۔ میں نے اسے بروشر دکھایا تو وہ نصف پر آگیا اور پھر اصل قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مجھے فاصلے کا علم نہ ہوتا تو وہ مجھ سے کچھ بھی لے سکتا تھا۔ ٹیکسی والوں پر ٹریفک پولیس اور ایئرپورٹ حکام کا پورا کنٹرول تھا اور وہ ملی بھگت سے من مانی نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم اس کی کوشش ضرور کرتے تھے۔

سری لنکا اتنا خوب صورت ملک تھا کہ اسے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ کام کا خیال نہ ہوتا تو میں وہاں کے قیام کو ایک ہفتے تک بڑھا دیتا۔ مجھے واپسی کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ ہمارا اصل مقصد تو زیادہ سے زیادہ عرصہ روپوش رہنا تھا اور وقت کہیں بھی گزارا جا سکتا تھا مگر مجھے لندن پہنچ کے جارج سے ملنا تھا۔

کراچی یا اسلام آباد کے مقابلے میں کولمبو سے لندن، پیرس یا دنیا بھر میں کہیں بھی جانا آسان تھا۔ ہم معروف طور پر ٹورسٹ تھے اور سری لنکا ٹورسٹوں کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے۔ جب میں رابعہ کے ساتھ فرانس کے سفارت خانے گیا تو وہاں بھی مجھے دنیا کے ہر گوشے سے آنے والے سیاح ملے۔ ان میں سے کسی کی اگلی منزل دہلی تھی تو کسی کی لاہور۔ کوئی ٹوکیو جانا چاہتا تھا تو کوئی برازیل۔ وہاں بر اعظم کے ہر رنگ اور نسل کے لوگ تھے۔ سیاحت دنیا بھر میں ایک انڈسٹری تسلیم کی جاتی ہے اور دنیا کے بیشتر ممالک سیاحوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

کراچی میں ویزا کے خواستگار بیشتر پاکستانی ہی ہوتے تھے اور ان کا زیادہ رش چند مخصوص ممالک کے سفارت خانوں میں رہتا تھا۔ عمرہ کرنے والے یا مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کرنے والے سعودی عرب، ایران یا عراق جاتے تھے لیکن سب سے بڑی تعداد کاروباری مقاصد کے لیے دبئی، ہانگ کانگ، سنگاپور یا بنکاک کا ویزا مانگتی تھی اور یہ سب ٹورسٹ بن کے ہی جاتے تھے چنانچہ ویزا دینے والے خوب چھان بین کرتے تھے۔ کوئی ملک یہ نہیں چاہتا کہ سیاحوں کے بھیس میں غیر اخلاقی یا غیر قانونی دھندے کرنے والے پہنچ جائیں۔

کولمبو میں پیرس کا ویزا مجھے آسانی سے مل گیا۔ سفارت خانے والے سب سے زیادہ میری فرنچ سے متاثر ہوئے۔ فرسٹ سیکریٹری نے اعتراف کیا کہ اتنی روانی اور اتنے صحیح لب و لہجے میں فرنچ بولنے والے کسی پاکستانی سے پہلے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ میرے حلیے سے بھی متاثر تھا اور میرے فرنچ کٹ کے پیچھے سے بھی۔

"آپ سیر و سیاحت کے لیے نکلے ہیں؟"

میں نے کہا "سچی بات تو یہ ہے کہ ہم شادی کے بعد ہنی مون کے لیے نکلے ہیں اور میری بیوی کو پیرس کے نام سے عشق ہے۔"

وہ خوش ہو کے ہنسا "آپ کی حسین بیوی کو پیرس دنیا کا سب سے حسین شہر لگے گا۔ یہ حقیقت بھی ہے۔ زبان کا مسئلہ بھی نہیں ہو گا آپ کی رہبر سے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ میں بیک وقت شوہر اور مترجم کے فرائض سر انجام دینے کا اہل ہوں۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اتنی اچھی فرنچ آپ نے کہاں سے سیکھی؟"

میں نے کہا "آپ کے ثقافتی مرکز سے۔ کراچی میں الائنس فرانسیز نے میری بہت مدد کی۔ باقی میرا شوق تھا یا زبان سیکھنے کی ایک خداداد صلاحیت تھی۔ اب تو میں خود وہاں دوسروں کو سکھاتا ہوں۔"

"کہاں۔ الائنس فرانسیز میں؟"

میں نے کہا "جی نہیں۔ لاہور میں فرنچ سیکھنے کے شوقین بہت ہیں۔"

"پیرس میں آپ کو کسی قسم کی مدد درکار ہو تو وزارتِ سیاحت سے ضرور رابطہ کریں۔" اس نے پاسپورٹ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

باہر آ کے میں نے کہا "تم کو اب سنجیدگی سے میری شاگردی اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں آپ کو استاد ماننے کی۔"

"مت مانو۔ تمہارا ہی نقصان ہے۔ فرنچ سیکھ لو گی تو بہت کام آئے گی۔" میں نے کہا "ورنہ اسی طرح بے وقوفوں کی طرح ہکا بکا جیسی رہو گی جیسے ابھی بیٹھی تھیں۔"

"مجھے زندگی فرانس میں نہیں گزارنی ہے۔"

"اچھا جوڈو کراٹے تو سیکھ لو۔ پاکستان میں خواتین کے لیے اس کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے اور تمہارا تو واسطہ بھی جرائم پیشہ افراد سے رہتا ہے۔"

اس نے پھر دو ٹوک جواب دیا "میرا واسطہ صرف ایک شخص سے پڑے گا اور اسے میں سیدھا کر لوں گی۔ جوڈو کراٹے کے بغیر ہی اس کے دماغ کی خرابی دور ہو جائے گی۔"

ظاہر ہے اس کے بعد میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

www.paksociety.com

جو کچھ سیکھنے پر آمادہ ہی نہ ہو۔ اُلٹا استاد کو چیلنج کرے۔" اسے زبردستی شاگرد بنانے میں بھی خطرہ استاد کی استادی کے لیے تھا۔

پیرس کے لیے پہلی فلائٹ آدھی رات کے بعد تھی اور ابھی صبح کے گیارہ بجے تھے۔ رابعہ کے ساتھ گھومتے پھرتے مجھے خیال آیا کہ پیرس جانے سے پہلے ہم لاہور میں کسی سے بات کرلیں۔

رابعہ نے کہا "میں تو خود بھی چاہتی تھی۔ آج کتنے دن ہو گئے نہ انہیں ہماری خبر ہے نہ ہمیں ان کی۔"

میں نے کہا "خیال تو مجھے بار بار آیا مگر کسی کے گھر فون کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ تمہارے آفس کا فون بھی آبزرویشن پر ہوگا۔"

رابعہ بولی "تم بار روم کے فون پر منظر یا وقار یوسف سے بات کرلو۔ وہاں سے تو کال بھی آسانی سے مل جائے گی۔"

رابعہ کی بات ٹھیک تھی۔ میں نے ہوٹل پہنچ کے آپریٹر کو نمبر بتایا۔ یہ نمبر مجھے رابعہ نے دیا تھا۔ دس منٹ کے بعد گھنٹی بجی تو کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔ پس منظر میں شور سے میں سمجھ گیا کہ یہ بار روم ہی ہوگا۔

"عبدالودود منظر صاحب۔ وہ تو نظر نہیں آرہے ہیں مجھے۔ نہ ان کی آواز سنائی دے رہی ہے۔" ریسیور اٹھانے والے نے کہا۔

میں نے کہا "وقار یوسف صاحب۔"

"وہ بھی نہیں ہیں۔ ہوں گے کسی کورٹ میں۔ آپ کا نام؟"

میں نے کہا "اکرام شیخ میں کولمبو سے بول رہا ہوں۔"

"اوہ۔ اچھا رکیے میں ان کو بلواتا ہوں۔ ذرا تلاش کرکے لانا پڑے گا۔ اگر آپ آدھے گھنٹے بعد پھر فون کرلیں..."

میں نے کہا "ٹھیک ہے آدھے گھنٹے میں دوبارہ فون کروں گا۔ ان میں سے جو بھی ملے اسے بتا دیں کہ بہت ضروری بات کرنی ہے مجھے۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔ کولمبو سے کوئی گپ شپ کے لیے فون نہیں کرتا۔" وہ بولا "بارہ بجے کوئی ضرور موجود ہوگا یہاں۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور فون رکھ کے آپریٹر سے دوبارہ آدھے گھنٹے بعد یہی نمبر ملانے کے لیے کہا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اکرام شیخ کا نام سن کے منظر اور وقار یوسف فوراً سمجھ لیں گے کہ فون کرنے والا میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ اکرام شیخ کراچی میں تھا۔ کولمبو میں نہیں اور اس کا نام استعمال کرنے کا مقصد یہی تھا کہ میں اپنا نام بتانا نہیں چاہتا تھا۔

ٹھیک بارہ بجے پھر گھنٹی بجی اور آپریٹر نے کہا "بات کریں سر۔"

میں نے کہا "ہاں میں منظر ایڈووکیٹ سے..."

میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ریسیور اٹھانے والا چلا کے بولا "منظر صاحب۔ جلدی آئیے، آپ کا فون آگیا۔"

چند سیکنڈ بعد منظر بولا "یہ کون بھوتنی کا اکرام شیخ پیدا ہو گیا کولمبو میں۔"

میں نے کہا "سر، السلام علیکم۔ اکرام شیخ کی اس میں کیا غلطی ہے۔ ذرا آپ بھی تو پیدا ہوئے تھے بلاوجہ۔ اس دنیا کو آپ کی غلطی ضرورت نہیں تھی۔"

"میں سمجھ گیا تھا کہ یہ بری ہو سکتا ہے جو گیا تھا مغرب کی طرف کے اور چلا گیا جنوب کی طرف۔ گدھے کے ساتھ دُم ہے یا اسے بھی کہیں چھوڑ دیا؟"

میں نے کہا "گدھا رہ سکتا ہے دُم کے بغیر۔ آدمی کے لیے اس کی ناک کتنی اہم ہے۔ ناک کٹ جانے کے بعد ناک والوں کی کتنی قسمیں ہیں۔"

"چھوڑ یہ باتیں۔ اس سے زیادہ دردناک واقعہ بھی آدمی کے ہوش سنبھالنے سے پہلے پیش آتا ہے جب سالا بالا بھی نہیں ہوتا۔ منظر کی تلوار کی طرح اس کا سر اڑایا جاتا ہے۔" منظر بولا "ہوا جو تمہیں کسی الو کے پٹھے کا خیال آیا۔"

میں نے کہا "ہم بس قدرت کے انتظام غیب سے بچ ہو کے یہاں پہنچ گئے یار۔ ہم ایسا چاہتے نہیں تھے۔ جیسے تم چاہتا تھا کہ سترہ بچوں کا باپ ہو۔"

اس نے شور مچایا "یہ کون بھوتنی کا کہتا ہے۔ میری مرضی اور نیت نہ ہوتی تو میری گھر والی کو کسی کا باپ سترہ بچے پیدا نہیں کر سکتا تھا۔"

"معاف کرنا مثال غلط ہو گئی۔ ہم نے سوچا کہ اپنا نیٹ ورک اور جانے رقیب سے اکٹھا کرلیں۔ آج رات ہم یہاں سے بھی جائیں گے اور خود سمجھ لو کہ کہاں جائیں گے۔ وہاں سب خیریت ہے نا۔"

"خیریت کہاں ہے۔ کیا چیز ہوتی ہے خیریت۔ کیسی ہوتی ہے؟" وہ خفا ہونے لگا "سالے جب سے تم فرار ہوئے ہو ہم اور ہمارے ساتھ بہت سے خیریت کا مطلب بھول گئے۔ تمہارے اعمال کی بھگت رہے ہیں ہم زندگی کے نام پر۔"

"ایسی کیا خطا ہو گئی ہم سے سرکار۔"

"خطا۔ اب تم خطا کار گناہ گار بدکار کیا نہیں ہو۔ ٹھیک ہے خود بھی نہیں کیا اور اس کو بھی کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ نہ اِدھر کی رہی نہ اُدھر کی۔ پھر رہی ہے تمہارے ساتھ خوار۔ جہاں سب مصیبت پڑی ہوئی ہے۔ اخباروں میں شور مچا ہوا ہے اور یہ شور کس کی شہ پر مچ رہا ہے۔ اپنے اسد اللہ خان ہیں اس کے پیچھے۔"

میں سمجھ گیا کہ اسد اللہ خان سے اس کی مراد غالب ہے۔ "اسی مسئلے پر؟"

"ہاں بھائی اتنا بڑا صحافی اور ایک اتنا بڑا وکیل نہ ہو تو ملک کیسے چلے گا۔ سمجھ لو قیامت آگئی ہے۔ پولیس کا سارا عملہ اِدھر سے اُدھر بھاگا پھر رہا ہے۔ وکیلوں نے شور مچا رکھا ہے۔ احتجاجی جلسے اور جلوس، بیان بازی اور خبریں۔"

"میں نے سنا ہے کہ اصل بندہ بیان دینے سے پہلے ہی بیمار ہو گیا۔"

"ہاں۔ ٹھیک سنا تم نے۔" منظر بولا "وہ اسمبلی پہنچنے سے پہلے

اور مزید حرامیوں کی اسمبلی میں پہنچ گیا۔ جہنم کہتے ہیں اسے لیکن ہم بھی کم نہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ میں اس سے ملنے گیا تھا۔ حالانکہ وہ خاص سرکاری مہمان تھا جس سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں تھی لیکن تھانے دار آگیا میرے قابو میں۔ ان سالوں کی زخمی رگ ہوتی ہے ہمارے ہاتھ میں۔ اس سے بھی بس ایک بات کی میں نے اور وہ الف کی طرح سیدھا ہو گیا۔ میں نے اسے ایک کاغذ اور قلم دیا کہ اس پر اپنا بیان لکھو ورنہ یہ سمجھ لو کہ تم یہاں سے زندہ نہیں نکلو گے۔ چودھری نے پھانسی کا پھندا تمہاری گردن میں ڈال دیا ہے۔ تم اس کی گردن میں ڈال دو۔ یہی ایک صورت ہے تمہارے بچنے کی اور تمہیں خدا کے بعد میں ہی بچا سکتا ہوں۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ اسے پھنسایا گیا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اس نے لکھ دیا۔ سارا الزام چودھری پر رکھ دیا کہ اس نے یہ کیا تھا اور وہ کیا تھا۔ حالانکہ اس سے فرق زیادہ نہیں پڑتا۔ بھوتنی کے تیری اپنی عقل ماری گئی تھی کہ تو چودھری کی بات مانتا رہا۔ تو اس کے حکم کا غلام ہے؟ لیکن اس بیان سے بڑی مدد ملے گی ہمیں۔"

"یار منظر بڑی حرامی چیز ہے تو بھی۔ یہاں اس گالی کو میں تعریف اور خراج تحسین کے لیے استعمال کرنے پر مجبور ہوں۔ تو نے واقعی کمال کردیا۔ تھانے دار نے اعتراض نہیں کیا؟"

"وہ سامنے نہیں تھا۔ حوالات میں چار چھ بندے اور بے حد ڈرے ہوئے تھے۔ خاطر تواضع کے بعد۔ تھانے دار آیا وہ مرتبہ تو میں باتیں کرنے لگا اور اس نے قلم کاغذ چھپا لیا۔"

"حوالات کے باہر بھی تو ایک بندوق والا ہوتا ہے۔"

"وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیب میں سو کا نوٹ تھا۔" منظر نے قہقہہ مارا "اب اس کو تو مرنا ہی تھا۔ اگلے دن اس کی خودکشی کروانی تھی لیکن وہ تحریر ہے میرے پاس۔"

"وہ تھانے دار مارا جائے گا۔ اس کی نوکری تو گئی۔"

"اب نوکری خاک کرتے ہیں یہ لوگ۔ بادشاہی کرتے ہیں۔ بہت کمایا ہوگا۔ اتنا کہ اس کی سات حرامی نسلیں گھر بیٹھ کے کھا سکتی ہیں۔ اس سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں۔"

میں نے کہا "یار معلوم ہے ہمیں کیوں آنا پڑا کولمبو! وہ حرام زادہ یہاں پہنچ گیا تھا۔ ہمارے پیچھے پیچھے۔"

منظر نے حیرانی سے کہا "لیکن اسے کیسے معلوم ہوا؟"

"اکرام شیخ سے ملنے کی غلطی کی تھی ہم نے۔"

"پھر؟ جان کیسے چھڑائی اس سے؟"

میں نے کہا "یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ بس یوں سمجھ لے کہ اللہ نے بچالیا اور ہم اسے دھوکا دے کر نکل آئے۔"

"تجھے یقین ہے کہ وہ بھوت اب تیرے تعاقب میں نہیں ہے؟"

میں نے کہا "اس کا مجھے سو فیصد یقین ہے اور اسی لیے ہم اب جا رہے ہیں پیرس۔ ناک کو سیدھا پکڑنے میں خطرہ تھا۔ پیرس سے انگلینڈ بائی روڈ۔"

"میں سمجھ گیا۔ اور تو نے بھی عقلمندی کی کہ کسی کے گھر فون نہیں کیا۔ سب کے فون پر آبزرویشن لگی ہوئی ہے۔ بلکہ مجھے تو شک ہے میرا اور وقار کا تو باقاعدہ تعاقب کیا جاتا ہے۔ وقار کو میں نے اپنے گھر بلالیا ہے لیکن باہر جھانکنے سے بھی منع کردیا ہے۔ ہم آفس میں بھی کوئی بات کرتے ہیں تو سوچ سمجھ کے۔ کل میں نے وقار کو فون کرکے پوچھا تھا کہ رابعہ اور غالب کا کچھ پتا چلا۔ پھر ہم آدھے گھنٹے تک پریشان رہے۔ دفتر میں بھی باقاعدہ پریشانی کی گفتگو ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "ایک بات میری بھی دھیان میں رکھ۔ اکرام شیخ کو فون مت کرنا اور نہ اس پر اعتبار کرنا۔"

"اچھا! کیا حرامی پن کیا ہے اس نے؟"

"چھوڑ یار منظر۔ دنیا بہت بدل گئی ہے۔ لوگوں کی نظریں، جذبات اور رشتے سب وہ نہیں رہے۔"

منظر نے کہا "اچھا اس سے بھی نمٹ لیں گے بعد میں۔"

میں نے کہا "نگی اور محسن کا کچھ پتا چلا۔"

"ہاں۔ پاگل تو وہ پہلے بھی ہوا تھا صدمے سے۔ اس مرتبہ صدمے کا نام بدل گیا ہے۔ نگی کو بڑا صدمہ تھا اولاد کے نہ ہونے کا۔ بے بی کو دیکھ کے اس کے اندر جو ممتا کا جذبہ تھا وہ اسے خون کے آنسو رلاتا تھا۔ نہ جانے کس نے اسے بتا دیا کہ تم ماں بن سکتی ہو۔ اور محسن نے اس کا دل رکھنے کے لیے اس کی بات مان لی۔ یہ سب کھواب تھا۔ کمال یہ ہے کہ وہ بے بی کو بھی چھوڑنے پر تیار نہیں۔ اس کے لیے بھی پاگل رہتی ہے۔"

میں نے کہا "میں ایک ڈائری بھیج رہا ہوں تجھے۔ اس کو حفاظت سے رکھوا دینا۔ دس تقسیم ہونے کے بعد۔"

"ٹھیک ہے۔ تو بھی دو تین فون نمبر لکھ لے۔ یہ میرے کلائنٹ تھے جن کو میں نے پھانسی ہونے سے بچالیا تھا۔ اب وہ میری خاطر سب کچھ کرسکتے ہیں۔ ان کو جو پیغام دے گا وہ مجھے مل جائے گا۔ وقت طے کرکے بات بھی ہو جائے گی۔ اچھا یار یہ بار روم کا فون زیادہ دیر استعمال نہیں ہو سکتا۔ کم سے کم ایک درجن وکیل گالیاں دے رہے ہیں مجھے۔"

میں نے کہا "صرف ایک درجن۔"

"اتنے ہی فون ملانے والے بھی ہوں گے جن کو نمبر انگیج مل رہا ہوگا۔ اس لیے خدا حافظ۔ اور ہاں اس کو میری طرف سے پیار کرلینا۔ رو بابہ۔"

منظر کا یہ پیغام میں نے فوراً رابعہ تک پہنچا دیا۔

اس نے سخت خفگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے دھکیل دیا "یہ کیا بدتمیزی ہے۔"

"مجھ سے منظر نے کہا تھا۔ ورنہ میں بہت تمیزدار بچہ ہوں۔"

دن کا باقی حصہ ہم نے پھر گھومتے پھرتے گزارا۔ میں نے بیڈ ملہ کی ڈائری ایک کوریئر سروس سے ایک لاکھ روپے کی انشورنس کرا کے منظر کو ارسال کی۔ اس ڈائری کی اصل قیمت بہت زیادہ تھی مگر کوریئر سروس والوں کے لیے وہ صرف دستاویز کی اہمیت رکھتی

www.paksociety.com

اتنی بھی بات نہیں تھی۔ وہ تو بس چیزوں کو حفاظت کے ساتھ صحیح آدمی کے حوالے کرنا جانتے تھے اور اسی کام کے پیسے لیتے تھے۔

رات کو جب ہم پیرس روانہ ہوئے تو میں بہت پُرسکون تھا۔ ان تمام خرابیوں کے باوجود جو چوہدری دلاور کی ذات سے منسوب تھیں۔ ہم ابھی تک محفوظ تھے اور اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ طویل سفر کا بیشتر حصہ ہم نے سو کے گزارا۔

چارلس ڈیگال ایئرپورٹ آنے سے پہلے ہی مسافروں سے سیٹ بیلٹ باندھنے کو کہا گیا۔ ہم ناشتے اور کافی کے ساتھ اسنیک بھی لے چکے تھے اور تھکن کے علاوہ رابعہ کا متلی اور قے سے حال خراب ہو گیا تھا۔ وہ بہت پژمردہ اور نڈھال تھی۔

میں نے کہا "چلو اب تھوڑی دیر میں ہوٹل پہنچ کے آرام کرنا۔"

وہ مسکرائی "تمہیں بھی پریشان کیا میں نے۔ دراصل اتنا لمبا ہوائی سفر کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔"

امیگریشن کاؤنٹر تک پہنچنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ فرانسیسی حکام کا شائستہ رویہ انتہائی مددگار ثابت ہوا۔ لیکن اس سے زیادہ میری فرنچ کا جادو ان کے سر چڑھ کے بولا۔ وہ کسی پاکستانی کو اتنی روانی سے فرانسیسی میں بات کرتا دیکھ کے اتنے ہی خوش ہوئے تھے جتنا کہ پاکستانی انھیں مقامی زبان میں بات کرتا دیکھ کے خوش ہوتا۔

میں ایک کاؤنٹر پر ہوٹل ریزرویشن کا مسئلہ طے کر رہا تھا جب کسی نے میرے بہت قریب آ کے کہا "آخر کار اپنے سکندرِ اعظم صاحب خیر سے ہم نے سوچا آپ کو لینے ایئرپورٹ آ جائیں۔"

میں ایک دم پلٹا۔ یہ الفاظ بم کا دھماکا تھے۔

اپنے سامنے محسن اور گل کو دیکھ کے میں بھونچکا رہ گیا۔ ان کا وہاں نظر آنا میرے لیے اتنا ہی ناقابلِ یقین تھا جتنا فرانسیسی صدر کا میرے استقبال کے لیے پھولوں کا گلدستہ لیے موجود ہونا۔ اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ بنصیبِ دشمناں وہ اس دارِفانی سے کوچ کر چکے ہیں تو میں سمجھتا کہ ان کی روحیں پیرس کے ایئرپورٹ پر صرف مجھے نظر آ رہی ہیں۔

جب میں نے اس سے کہا "اُلو کے پٹھے" اور جواب میں اس نے مجھ سے کہا کہ "سؤر کے بچے" پھر مزید نادری زبان کی شریفانہ گالیوں کے ساتھ ہم نے ایک دوسرے کو گلے مارے۔ رابعہ نے گل کو دیکھ کے چیخ ماری اور گل نے زیادہ بلند چیخ مار کے رابعہ کا نام لیا تو ہمارے ساتھ کھڑے ہوئے بہت سے غیر ملکی چلتے چلتے رک گئے اور جو کھڑے تھے وہ بے اختیار ایک قدم دور ہو گئے۔

ایک پولیس مین اسے خانہ جنگی سمجھ کے دوڑتا ہوا آیا اور ہمیں سمجھانے لگا "موسیو، موسیو، یہ کیا ہو رہا ہے؟ آخر معاملہ کیا ہے؟"

میں اور محسن ایک ساتھ ہنسنے لگے پھر میں نے بہترین فرنچ بولنے کا مظاہرہ کیا "معاف کرنا۔ ہم ایک ایسے قبیلے سے تعلق

رکھتے ہیں جو محبت کا اظہار اسی طرح کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے لڑ کر۔"

"اور نفرت کا اظہار ایسے کرتے ہیں جیسے آپ لوگ محبت کرتے ہیں۔" محسن بولا۔

پولیس والے کو اس قبائلی رسم پر اتنی حیرت نہیں ہوئی تھی جتنی میری اور محسن کی صحیح لب و لہجے کے ساتھ فرنچ سن کے ہوئی۔ اگر اس کے سامنے کوئی بچہ کھلونا پستول سے گولی چلا دیتا یا بھیڑ کی کھال میں سے اصلی بھیڑیا برآمد ہو کے سوال کرتا کہ بولو اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے تو بھی وہ اتنا پریشان نہ ہوتا۔

اس نے خالص فرنچ اسٹائل میں کندھے اچکائے جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ لڑائی نہیں صرف ایک قبائلی رسم ہے تو جائز ہے۔ اخلاقی فرض پورا کرنے کے لیے اس نے معذرت کے چند الفاظ کہے اور واپس چلا گیا۔

میں نے کہا "شیردانی صاحب، یہ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا میں پاگل ہو گیا ہوں۔"

اس نے کہا۔ "بگیر خان صاحب! دونوں باتیں سچ ہیں۔ آخر پاگل بھی تو خواب دیکھتے ہیں۔"

میں نے کہا "تو یہاں... پیرس میں!"

اس نے کہا "اور تو خود کہاں ہے؟"

میں نے کہا "شکر یار تو کسی پیر فقیر سے تعویذ لینے گیا تھا یا کسی چوٹی پر کسی سو سالہ شیاسی بابا سے ملنے جو وہاں نجانے کب سے جڑی بوٹیاں تلاش کر رہا ہے۔"

محسن نے قہقہہ مارا "تو بھی کراچی گیا تھا اور پھر تجھے لندن جانا تھا۔ کیا جہاز راستہ بھول گیا۔"

"یار، مجھے اب بھی یقین نہیں آتا۔ تم سب کی تصویر اور آواز اتنی صاف آ رہی ہے کہ تم لوگ بالکل حقیقی لگتے ہو۔"

ہم سے چند قدم کے فاصلے پر دوسرا جذباتی سین چل رہا تھا۔ چیخ مارنے اور گلے ملنے کے بعد رابعہ اور گل پہلے ہنسی تھیں اور پھر روئی تھیں۔ پھر ان کے درمیان بھی حیرت اور خوشی سے بھرپور مکالمے اور سوال و جواب یوں شروع ہو گئے تھے کہ دونوں کی زبان نان اسٹاپ چل رہی تھی۔ حجام کی قینچی کی طرح۔ اپنے سوال کا جواب سننے کی نہ کسی کو فرصت تھی اور نہ ضرورت۔ گفتگو کے فن میں یہ کمال غالباً خواتین ہی کو حاصل ہے کہ وہ بیک وقت بول بھی سکتی ہیں... اور سمجھ بھی لیتی ہیں۔

مغربی اقوام میں اور ہم میں یہ جذباتی تفاوت بہت نمایاں ہے۔ وہاں برسوں کے بچھڑے ہوئے ایک دوسرے کو ہاتھ ہلا کے "ہائے" کہہ کے گزر جاتے ہیں۔ ہینڈ شیک اسٹائل میں مصافحہ کرنے، بغلگیر ہونے کے بجائے ایک دوسرے کو چھوڑنے کے بعد بھی خالہ سے لے کر بہن بھائیوں تک کی خیر و عافیت پوچھنے کی فرصت کسی کے پاس نہیں۔ ناخلف بیٹا (خلف بیٹے وہاں نہیں ہوتے) کسی لڑکی کو اچانک لا کے نئی سرمایہ کی بہو کے طور پر متعارف کرا

ماں چیخنے پر دو چیتر مار کے پٹ سے بے ہوش نہیں ہوتی بلکہ مسکرا کے کہتی ہے ہیلو، ان سے ملو یہ ہیں میرے اس سال کے شوہر۔ اور خاندان کی ناک کاٹنے پر جنونی باپ اسے عاق کرنے یا خود کو گولی مارنے کی دھمکی تک نہیں دیتا بلکہ الٹا پیٹھ تھپک کے کہتا ہے کہ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند... شاباش!

جب ہم بالآخر شانت ہوئے تو رابعہ نے کہا "کیا خیال ہے اب باہر چلیں؟"

میں نے کہا "بھئی خوب یاد دلایا۔ میں تو واقعی بھول گیا تھا کہ ہمیں باہر بھی جانا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کہاں؟"

محسن نے کہا "یار تم واقف ہو پیرس سے۔ یہاں بہت ٹھکانے ہیں بے گھر لوگوں کے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ہم جب لندن سے آئے تھے تو پیسے بچانے کے لیے وہیں جاتے تھے کھانا، رہنا سب مفت۔"

"اور کیسے کیسے کردار ملتے تھے وہاں" محسن نے ہمارا سوٹ کیس اٹھایا "اچھے خاصے دولت مندوں کی اولادیں۔ لڑکے لڑکیاں، اچھے کام چور نوجوان۔ چرسی اور بھنگ پینے والے آرٹسٹ۔ بوہیمین، دانشور اور آوارہ گرد۔"

"اور فقیر۔ جن کی خودی بہت بلند تھی..."

"توبہ توبہ۔ ایسے لوگوں کے ساتھ رہتے تھے اور کھاتے تھے" گل نے ناک بھوں چڑھا کے کہا۔

"تم ایک دن رہ کے دیکھو وہاں۔ پھر پتا چلے گا کہ بے فکری کسے کہتے ہیں اور سکون کیا چیز ہے" محسن نے کہا "وہ کوئی کام نہیں کرتے۔ کھاتے پیتے ہیں۔ سوتے ہیں لمبی تان کے اور دنیا کو جوتی کی نوک پر رکھتے ہیں۔ جس کا جو دل چاہے کرے۔"

میں نے کہا "یار ان لڑکیوں کے لیے کوئی بندوبست ہو جائے تو اچھا ہے۔ ہم پرانے ٹھکانے پر چلے جائیں گے۔"

رابعہ نے کہا "کیوں؟ ہوٹل نہیں ہوتے پیرس میں۔"

محسن بولا "ہوتے ہیں۔ امیروں کے لیے۔ پیرس کو لا ہور سمجھ کر ایک سو بیس بستر والے ہوٹل میں رات گزاری اور صبح سڑک کے کنارے نلکے پر منہ دھو لیا اور ایک گلاس لسی پی کے ڈکار لی، کام ہو گیا۔"

میں نے کہا "یار فضول خرچی سے کیا حاصل۔ آخر لڑکیاں بھی تو ہوتی ہیں وہاں۔ یہ کیا شہزادیاں اور پریاں ہیں؟"

"ان کے مقابلے میں تو وہ پریاں اور شہزادیاں لگیں گی۔ سچ تو یہ ہے اب ان کا دل رکھنے کے لیے ہم جھوٹ بولیں؟"

میں نے کہا "کیا حرج ہے یار اگر جھوٹ سے کوئی خوش ہو جائے۔"

رابعہ اور گل اب ہم سے چند قدم پیچھے تھیں اور ان کی باتوں کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع ہو گیا تھا جہاں سے ٹوٹا تھا چنانچہ انہوں نے اپنے بارے میں ہمارے ریمارکس سنے ہی نہیں تھے۔

محسن بولا "یار تیری اور میری مشترکہ خوش قسمتی ہے کہ یہاں عارضی طور پر قیام کا بندوبست ہو گیا ہے مگر ایک خرابی ہے۔"

"کیا کرایہ بہت ہے؟"

"نہیں۔ کھانے پینے کا اور رہنے کا خرچہ تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ میرا مطلب ہے پیرس کے ہوٹلوں کے مقابلے میں۔"

"پھر کیا خرابی ہے؟"

"خرابی اخلاقی نوعیت کی ہے۔ ہم تو یہاں کی مادر پدر آزاد دنیا میں کافی وقت گزار چکے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہاں دوسرے کی آزادی کا احترام صرف اپنی آزادی کا تحفظ ہے...... آپ خود ہو جائیں کریں۔ رابعہ اور گل کو شاید وہ جگہ سخت ناپسند ہو گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہمیں یہاں عمر نہیں گزارنی ہے۔ دو چار دن میں وہ بھی عادی ہو جائیں گی جب یہاں ہر قدم پر بے شرمی کے مظاہرے دیکھیں گی۔ ہوٹل میں تو دیوالیہ نکل جائے گا، یہ کیا جگہ ہے؟"

"بس ایک مشترکہ رہائش گاہ ہے۔ ہوسٹل جیسی۔ ایک کمرے میں دو رہ سکتے ہیں۔"

"بلا لحاظ جنس و عمر، رنگ و نسل!"

"ہاں۔ اور ان کا شادی شدہ ہونا بھی ضروری نہیں، باہمی رضامندی کافی ہے۔"

میں نے کہا "وہ تو ہے لیکن ہم اچھا ہیں۔"

"اسی لیے میں نے مشترکہ خوش قسمتی کا حوالہ دیا۔ کمرے بھی دو ہیں۔ کم سے کم ایک ہفتہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جن کے کمرے ہیں وہ ہنی مون منانے گئے ہوئے ہیں۔ میں نے انھیں ایک ہفتے کا کرایہ ادا کر دیا تھا۔"

"تجھے کیا الہام ہوا تھا کہ ہم وارد ہونے والے ہیں۔"

"تو بھول گیا کہ میری چھٹی حس اور تیری ساتویں حس ایک ہیں۔ ہمارے ذہن میں خیالات یوں آتے ہیں جیسے دو ٹی وی سیٹ پر ایک ہی چینل کے پروگرام۔"

"آپ بکواس فرماتے ہیں۔"

محسن نے افسوس سے سر ہلایا "کیا تو ٹیلی پیتھی کا قائل نہیں رہا۔"

"ٹیلی پیتھی سے فلائٹ نمبر اور ٹائم معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ سچ بتا تجھے کیسے پتا چلا..."

محسن نے اچانک رک کے ایک گاڑی کا دروازہ کھولا "سچ جاننے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟"

میں نے کہا "یہ کار کرائے کی ہے؟"

"یہ کار میری ہے، اسے آپ اپنی ہی سمجھئے۔"

میں نے کہا "پھر جھوٹ۔"

"یہ بھی ایک ہفتے تک اپنی ہے" اس نے رابعہ اور گل کے لیے پچھلا دروازہ کھولا "تشریف رکھئے معزز خواتین۔"

رابعہ نے حیرت سے کہا "محسن، یہ کیا چکر ہے؟"

"اسے یہاں کار کہتے ہیں خاتون۔" محسن بولا "اور کیا

www.paksociety.com

گاڑی پاکستانی معیار سے اچھی تھی مگر پیرس کی شیشے جیسی ہموار سڑکوں پر وہ اپنی بیک جو کسی جدید ترین ماڈل کی پورٹ کار کے مقابلے میں چھتیس کتارا کا لقب پانے کی مستحق تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کا ریلا بہہ رہا تھا لیکن نظم و ضبط کا یہ عالم تھا کہ لگتا تھا ساری کاروں کو ایک ہی نظر نہ آنے والا ہاتھ کنٹرول کر رہا ہے۔ ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک جگہ کسی وجہ کے بغیر ساری کاریں رک گئیں تو رابعہ نے پوچھا "کیا ہوا؟ یہاں کوئی سگنل تو نظر نہیں آ رہا ہے۔"

محسن بولا "ایک بڑی بی اپنے باکٹ سائز کتے کے ساتھ زیبرا کراسنگ پر سے گزر رہی ہیں۔ جب تک وہ سڑک پار نہیں کر لیتیں گی سب انتظار کریں گے۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ بڑی بی نے اطمینان سے سڑک پار کی۔ کسی نے بھی ہارن بجا کے بڑی بی کو گالیاں دے کے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ گل نے گزشتہ تین دنوں میں بہت کچھ دیکھ لیا تھا اس لیے وہ کم حیران تھی۔ رابعہ نے اس نقشہ انقلاب شہر کے بارے میں جو سنا یا پڑھا تھا اس سے کہیں زیادہ دیکھ کے شاید اسے بے درد منہ دل رکھنے والے پاکستانی کی طرح یہی خیال رکھ رہے تھا کہ آخر یہ سب دیکھ کر کراچی یا لاہور میں کیوں نہیں ہوتا۔ سڑکیں جیسی بھی ہیں ان کو صاف تو رکھا جا سکتا ہے۔ پھول اگانے اور درخت لگانے میں تو کوئی خزانے پر کون سا بار پڑتا ہے۔ ایک پاکستانی ایک پودا لگائے اور اسے پروان چڑھائے تو کروڑوں پودوں کی ہریالی سے اور ان میں کھلنے والے پھولوں سے پورا ملک ایک چمن بن سکتا ہے۔ اصولوں کی پابندی، نظم و ضبط اور تحمل مزاجی TOLERANCE کی صفات کو ہم اپنا کیوں نہیں رہے۔ لیکن ان سوالوں کا جواب تو علامہ اقبال نے بہت پہلے دے دیا تھا۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

جان گئے بعد رابعہ کا حوصلہ جواب دے گیا "آخر کب ختم ہوگا یہ سفر؟"

محسن نے کہا "بس گل۔ اپنے لور سے آنے والی اس جیند خاتون کو سمجھاؤ کہ یہ پیرس ہے۔"

گل نے کہا "بس ذرا صبر کرنے میں ہم پہنچ جائیں گے۔"

"مزید ذرا کتنا؟"

میں نے کہا "اب تو کراچی بھی اتنا پھیل گیا ہے کہ کسی بھی سمت میں بیس پچیس میل کا فاصلہ عام بات ہے اور شہر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک چالیس پچاس میل ہو جانے ہیں خلاسا تو کی ہے اور گلی سیاہ اور خود کراچی سے کلفٹن۔"

"یہاں سڑاسی کلو میٹر عام فاصلہ ہے۔ مضافات سو کلو میٹر کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ حسن اتفاق سے ہم مضافات میں ہی قیام فرما ہیں کیونکہ شہر کے مرکزی علاقوں میں ہم جیسے پھکڑ لوگ نہیں رہتے۔"

"ایک اور دن کی بات تھی۔ اب ہم ایسے گئے گزرے بھی نہیں ہیں کہ پیرس کا کوئی بھی ہوٹل افورڈ نہیں کر سکتے۔"

میں نے کہا "بات صرف استطاعت کی نہیں ہے۔ سیکیورٹی بھی اہم ہے۔ ہوٹل میں ہمارے ناموں کا اندراج ہوگا۔"

"ہم غیر قانونی طور پر تو نہیں آئے ہیں۔" رابعہ بولی۔

"مگر چھپ کے ضرور آئے ہیں۔ اپنا سراغ کہیں چھوڑنا نہیں چاہتے۔ لندن کے دروازے ہم پر بند ہیں۔ ہم وہاں چور دروازے سے داخل ہوں گے۔"

محسن نے کہا "دیکھا بیوی، میرا اندازہ کتنا صحیح تھا۔"

گل نے کہا "ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو نا۔"

"چٹے بٹے کیا کریں۔ جب کوئی شرافت سے دروازہ نہیں کھولے گا تو مہمان کیا واپس لوٹ جائے گا۔ وہ بھی ہم جیسا مہمان۔ ہم دیوار پھاند کر اندر جائیں گے یا نقب لگا کے گھر جائیں گے ضرور۔"

"ہاں۔ یہ ہماری نہیں پوری پاکستانی قوم کی عزت کا سوال ہے۔ یہ گوری چمڑی والے اب ہمارے حاکم نہیں ہیں۔" میں نے کہا "ہمارے ارادے نیک ہیں۔"

"ہم خود نیک ہیں اور ہماری نیک نیتی کا حال خدا جانتا ہے۔" محسن نے فراری لہجے میں کہا۔

رابعہ بولی "لیکن نیک اور شریف کہلانے کی سند نہیں ہے تمہارے پاس۔"

میں نے کہا "ہمیں کسی کی سند کی ضرورت بھی نہیں۔ ہم کون سا لندن برج اڑانے یا پارلیمنٹ ہاؤس چرانے آئے ہیں۔ ایک قانونی ضرورت نے ہمیں مجبور کر دیا ورنہ اس شہر پر لعنت بھیجتے ہیں ہم اپنا لاہور ٹھیک ہے۔"

"تم یہاں سے نئی پورٹ کیے جا سکتے ہو اس لیے اب لعنت بھیجنے کے سوا کیا کر سکتے ہو۔ انگور کھٹے ہیں" گل نے کہا۔

"مجھے کشمیری سیب پسند ہیں۔ تمہارے گالوں جیسے" محسن بولا۔

میں نے کہا "اور مجھے رس کے بھرے نرم اور لال شفتوت جیسے لب..."

رابعہ یوں باہر دیکھتی رہی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

شہر کا گنجان آباد مرکزی علاقہ ختم ہونے کے بعد رہائشی علاقہ شروع ہوا جہاں متمول لوگوں کی محل جیسی کوٹھیاں تھیں۔ زمین پر حد نگاہ تک سبزہ وگل کا شوخ رنگ تھا۔ درختوں کی بھرپور ہریالی تھی اور اوپر آسمان کی نیلاہٹ۔ یوں لگتا تھا جیسے کائنات انہی دو رنگوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ ان کے درمیان قدیم مدمن اور گوتھک طرز کے سفید شالے (CHALET) نظر آتے تھے۔ جدید رنگوں کے حسن آفریں امتزاج کا نمونہ نئی تعمیرات تھیں۔ ایبار ٹمنٹس تھے اور ٹاؤن ہاؤس تھے جن کو دیکھ کر غالب کا شعر یاد آتا تھا کہ "اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب"۔ چھت کی ہر منڈیر پر ہر کھڑکی دروازے

کے ملک میں اسے چلا سکتے ہیں؟"

گل نے بولی کو درمیان میں جھٹالیا "ان کے چکروں سے خدا بچائے۔"

میں نے کہا "تم خود بچنا نہیں چاہتی تھیں۔ ہم نے تو سمجھایا تھا۔"

گل نے میری بات کو نظرانداز کر دیا "دو دن میں مجھے ان کے سارے چکروں کا پتا چل گیا ہے جو انہوں نے یہاں چلا رکھے تھے۔"

محسن نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "بات تو ایسے کر رہی ہو جیسے تم شرلاک ہومز سے بڑی سراغ رساں ہو کہ دو دن میں سب معلوم کر لیا۔ تمہارے تو باپ کو بھی کچھ پتا نہ چلتا اگر میں خود نہ بتاتا۔"

"باپ تک کیوں جاتے ہو؟"

"اور کہ تمہارے دادا کو پردادا کو پتا نہ چلتا۔ کیا اور آگے جاؤں؟"

رابعہ بولی "مذاق چھوڑو یہ بتاؤ۔"

"رانسوں... ابھی تم پیرس کو دیکھو۔ یہ دنیا کا سب سے حسین شہر ہے بقول شاعر رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے ہم بھی... میں اور محسن نے اپنی جوانی کے حسین ترین شب و روز یہاں ایسے گزارے جیسے تم نے لاہور کی گوالمنڈی میں یا دھرمپورے میں" میں نے کہا۔

محسن نے ایک آہ بھری "پیرس کے گلی کوچے اوراق مصور تھے۔"

"اور اسی لیے تجھے تھے مرغوں کے لیے ہم مصوری۔"

"اور اسی لیے جو بے آبرو ہو کے تیرے کوچے سے ہم نکلے شرافت سے رہتے تو نکالے کیوں جاتے۔" رابعہ بولی۔

گل نے کہا "اور اب چوروں کی طرح چھپ کے کیوں آتے۔ ورنہ بھی ہمارے ساتھ آنے سے شریف اور عزت دار ہو گئے ورنہ..."

محسن نے قہقہہ مارا "یہاں عزت اور شرافت کا معیار کچھ اور ہے بے وقوف لڑکی۔ شادی شدہ ہی زیادہ بدمعاش ہوتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں۔ کنوارے... میرا مطلب ہے غیر شادی شدہ لڑکے یا لڑکی کا کردار کوئی نہیں پرکھتا۔"

"خیر یہ بحث چھوڑو" میں نے کہا "تمہیں میرے جیسے ماہر اور قابل گائیڈ کی خدمات حاصل ہیں بلا معاوضہ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہم کہاں سے گزر رہے ہیں۔ ان مجسموں کو دیکھ کے شرم سے پانی پانی ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں یہ آرٹ کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔"

"لیکن یہ جو مجسم تصویر عشق۔ یک جان دو قالب ہوئے بیٹھے ہیں۔ یہ مجسمہ نہیں جیتے جاگتے انسان ہیں۔ یہ دنیا کو نہیں دیکھ رہے ہیں۔ دنیا انہیں نہیں دیکھ رہی ہے۔ تم بھی مت دیکھو" محسن بولا۔

گل نے کہا "حد ہے بے شرمی کی بھی۔"

محسن بولا "حد ہے مبہم۔ اس حد سے آگے جانے والے کو جیل جانا پڑتا ہے۔ لباس چاہے چار گرہ کپڑے کا ہی ہو کر زینت جسم ہو جائے مگر ہونا ضرور چاہیے۔"

گل نے کہا "شروع میں تو بڑی وحشت ہوئی تھی۔"

محسن بولا "چار دن میں رابعہ باجی بھی عادی ہو جائیں گی۔"

رابعہ نے کہا "چار دن ہو گئے ہیں تمہیں یہاں؟"

گل نے کہا "آج چوتھا دن ہے۔"

میں نے کہا "جب رہنا مجبوری ہو تو ذہن ہر ماحول کو قبول کر لیتا ہے جیسے ہر طرف کھارا سمندر ہو تو میٹھے پانی کی تلاش کا کسی کو بھی خیال نہیں آتا۔"

میں نے کہا "سبزہ وگل کی خوش نمائی پر نظر رکھو۔ یہ موسم بہار نہیں مگر پھر بھی پھولوں کی فراوانی ہے۔ رنگ ہی رنگ ہیں اور خوشبو ہے۔ دنیا کا کوئی بھی شہر نفاست اور خوش ذوقی میں پیرس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پھر انفرادی آزادی کا جتنا حقیقی احترام فرانس میں ہے دنیا میں کہیں نہیں۔ لینن، چو این لائی اور ہوچی منہ سب کے انقلابی نظریات کو فرانس میں تحفظ ملا کیونکہ یہاں سوچ پر قدغن نہیں۔ بعد میں ان سب نے اپنے اپنے ملک جاکے انقلاب کی قیادت کی اور تاریخ کا رخ بدل دیا۔ ایرانی انقلاب کے قائد بنی صدر اور آیت اللہ خمینی بھی چند سال فرانس میں جلاوطن رہے لیکن یہ بعد کی بات ہے۔)"

رابعہ بولی "آپ سیاسی تاریخ پر لیکچر مت دیں۔ مجھے سب معلوم ہے۔"

میں نے کہا "ہاں تم تو آتی جاتی رہی ہو پیرس۔"

"میں نے نوٹرے ڈیم نہیں دیکھا۔ نہ لوور دیکھی لیکن ان کے بارے میں کون نہیں جانتا۔ مشہور ناول نگار وکٹر ہیوگو کا ناول ہے ہنچ بیک آف نوٹرے ڈیم" رابعہ نے کہا۔

"اور تھری کوائن ان اے فاؤنٹین" میں نے کہا "آخر خود جاکے نوٹرے ڈیم کو دیکھنے اور محسوس کرنے میں وہی فرق ہے جو دسترخوان میں بریانی پکانے کی ترکیب پڑھنے اور بریانی کھانے میں ہے۔"

رابعہ باہر دیکھ رہی تھی اور میری بات نہیں سن رہی تھی: "کون سی جگہ ہے یہ؟"

میں نے کہا "یہ لوور ہے۔ پیرس کا کیا دنیا کا سب سے بڑا آرٹ میوزیم۔ فن تعمیر کا شاہکار۔"

گل نے خفگی سے کہا "محسن تو کہہ رہا تھا کہ نپولین کا مزار ہے۔"

محسن نے دانت نکالتے ہوئے کہا "جہانگیر کے مقبرے اور قائداعظم کے مزار کی باتیں سمجھنے والی لڑکی سے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔"

رابعہ نے کہا "ہاں تو گے نہیں کہ خود تمہیں معلوم نہیں تھا۔"

www.paksociety.com

کے چھجے پر ہر ستون اور محراب پر گملے رکھے ہوئے تھے یا تو یہاں تھے اور بیلیں چڑھادی گئی تھیں۔ رنگ، خوشبو، فیشن اور آرٹ شاید فرانس سے زیادہ احساسِ جمال کی فراوانی کسی قوم کے مزاج میں نہیں۔

بالآخر منزل آگئی۔ محسن نے ایک سہ منزلہ عمارت کے احاطے میں داخل ہو کے گاڑی کو وہیں کھڑا کیا جہاں کوئی اور گاڑی پارک نہیں کی جاسکتی تھی۔ ہر مکین کے لیے کار کی جگہ مخصوص تھی جس کا کرایہ وہ الگ دیتا تھا۔ مجھے چاروں طرف ایک ہی رخ میں برابر فاصلے پر کھڑی ہوئی دو درجن سے زائد کاریں نظر آئیں لیکن ان کے درمیان اس سے زیادہ جگہ خالی پڑی تھی۔ بیشتر لوگ باہر گئے ہوئے تھے مگر ان کو یہ اطمینان تھا کہ واپسی پر انہیں اپنی گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ پر دوسری گاڑی نظر نہیں آئے گی۔ تمام بڑے شہروں میں جگہ کی قلت نے سنگین مسائل پیدا کردیے ہیں۔ انسانوں کے لیے بھی اور کاروں کے لیے بھی۔

"تو یہ ہے جناب ہمارا مشترکہ غریب خانہ!" محسن بولا "مگر اس میں صرف غریب نہیں رہتے۔"

رابعہ نے کہا "امیر کا اندازہ تو کاریں دیکھ کر ہو رہا ہے۔"

"کار تو یہاں سائیکل کی طرح ہے۔ قلی اور مزدور بھی گاڑی کے بغیر ڈیوٹی پر حاضر نہیں ہوسکتا۔"

"وقت پر حاضر نہیں ہوسکتا" میں نے تصحیح کی۔

محسن نے ہمارا سوٹ کیس نکال لیا "لیٹ آنے کا یہاں کوئی تصور نہیں۔ آپ عین مرکزِ شہر میں رہتے ہوں یا سو کلومیٹر دور، وقت پر پہنچنا ہر شخص کی ذاتی ذمے داری ہے۔ اس کے لیے وہ اپنے وقت کا حساب خود رکھے کہ کتنی دیر گاڑی میں بس یا انڈر گراؤنڈ ریلوے میں لگے گی۔ بس یا ٹرین لیٹ نہیں ہوسکتی۔ نانی کے مرجانے یا بیوی کی بیماری کا عذر یہاں نہیں چلتا۔"

"کوئی چلاتا بھی نہیں۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہاں منافقت نہیں ملتی۔ آپ کی غلطی ہوئی تو منہ پر کہہ دیں گے۔ اپنی ہوئی تو اعتراف کرلیں گے اور معذرت۔ جھوٹی انا کوئی چیز نہیں۔" محسن بولا۔

"بس کرو محسن۔ تمہاری باتوں سے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہاں صرف فرشتے بستے ہیں۔ یہ جو اتنے اخلاقی اور قانونی جرائم ہوتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"بھئی میرا مطلب تھا عام طور پر۔۔۔ جیسی منافقت ہمارے قومی مزاج میں شامل ہے ایسا یہاں نہیں ہے۔ معاشرتی برائیاں اور جرائم یہاں بھی ہیں ورنہ پولیس اور عدالتی نظام کیوں ہوتا" محسن نے پارکنگ ایریا کے میدان سے گزرتے ہوئے اوپر جانے والی سیڑھیوں کا رخ کیا۔

آتے جاتے ہمیں بہت سے لوگ ملے مگر کسی نے ہماری طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ ایک اچھی خاصی حسین اور جوان لڑکی خاصی قابلِ اعتراض حالت میں عین اس جگہ لیٹی ہوئی تھی

جہاں سے زینہ شروع ہوتا تھا۔ وہ چرس یا پھر ایل ایس ڈی کے نشے میں تھی۔ اس کی طرف بھی کوئی متوجہ نہیں تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے کی عادت کا ایک خطرناک نمونہ میں نے لندن میں دیکھا تھا جب میں اور محسن ایک بک شاپ میں تھے۔ اونچے شیلفوں والی دکان میں کتابیں دیکھتے دیکھتے ایک شخص ہارٹ فیل ہو جانے سے مرگیا تھا۔ باقی لوگ "ایکس کیوز می" کہہ کے اسے پھلانگ جاتے تھے یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ جو مرچکا ہے اس سے معذرت کیا سود ہے۔ جب میں نے اور محسن نے کاؤنٹر پر بتایا تو ہمارا خیال تھا کہ سننے والا اچھل پڑے گا یا خوف سے بیہوش ہوجائے گا مگر اس نے [illegible] لوٹاتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ اچھا میں پولیس کو بتاتا ہوں۔ [illegible] ٹرین میں کوئی مرجائے تو کسی پر ذرا اثر نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں جب بس یا ٹرین اپنے ٹرمینل پر پہنچے گی تو مسافروں کے چھوڑے ہوئے اخبارات اور دیگر چیزوں کے ساتھ لاش کو بھی اٹھالیا جائے گا۔

گیٹ پر کھڑا ہوا چوکیدار یا JANITOR بظاہر بے نیاز نظر آتا لیکن ادائے فرض کے معاملے میں پوری طرح مستعد تھا۔ اس نے ایک شخص کو روک کے کہا "آپ نے کمرے کی چابی کاؤنٹر پر دی ہے" اور اس شخص نے سرہلا کے کہا "میں بھول گیا تھا"۔ ہم نے بھی کمرے کی چابی کاؤنٹر سے ہی لی تھی جہاں ایک [illegible] میں مصروف تھی۔ وہ بھینس کے رنگ اور وزن کی عورت تھی۔ اسٹول پر بیٹھی چیونگم کو دانت پیسنے کے انداز میں چبا رہی تھی۔

"یہ داڑھی والا اور یہ لڑکی کون ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"میاں بیوی۔ اور میرے مہمان۔ کوئی اعتراض؟" محسن بولا۔

"تم خود مہمان تھے۔ اب تمہارے مہمان آگئے پھر ان کے مہمان آجائیں گے تو ذمے دار کون ہوگا؟"

"وہی جس نے ہماری ذمے داری قبول کی ہے۔ کس [illegible] رو سے مہمان پر یہ پابندی ہے کہ وہ مہمان نہ لائے۔"

"قانون کی بات مت کرو۔ جہنم میں جاؤ" اس نے چابی دیتے ہوئے کہا۔

"وہاں تو ہم سب پہلے ہی ہیں" محسن نے کہا۔

میں نے فرنچ میں کہا "تمہیں یا کسی اور کو ہم سے شکایت نہ ہوگی۔"

اس نے غرا کے کہا "میں تو مجبور ہوں۔ تمہیں فرنچ بولنے کی کون سی مجبوری لاحق ہے؟"

"مجبوری یہ ہے کہ میں فرانس میں ہوں اور مجھے بتایا گیا تھا کہ اس خطے کی زبان تمہیں آتی ہے۔ شاید تمہاری مادری زبان۔"

محسن نے مجھے کھینچ لیا "چھوڑو اس کالی بلا کو۔ چپ رہو ورنہ جان نہیں چھوڑے گی۔ اس سے خوش اخلاقی کا سلوک [illegible] ہے۔"

اوپر فرسٹ فلور تک جاتے ہوئے ہمارے پاس سے ایک [illegible] گزرا جس کے جسم سے کوڑے کرکٹ اور مینگنیوں سے جمع ہونے والے جیل کی بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ پھر ایک بے ہنگم جوڑا ملا۔ غالباً انہوں نے ایک دوسرے کے کپڑے پہن لیے تھے۔ قربِ جذبات میں وہ ہر زینے پر رک کر ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ رابعہ اور گل کو سخت وحشت ہو رہی تھی۔

"محسن یہ تم کہاں لے آئے ہو ہمیں۔ اتنی بے ہودہ جگہ ہے" رابعہ نے کہا۔

محسن نے فوراً تردید کی "تمہیں کیا معلوم۔ اس جگہ کی ساکھ اچھی ہے۔ یہ جگہ شریفانہ سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کی انتظامیہ سخت ہے۔ یہاں جھگڑا نہیں ہوتا۔ کوئی لڑتا نہیں۔ کبھی ہنگامہ نہیں ہوتا یعنی ایسا کہ پولیس آئے۔ کرائے معقول ہیں اور انتظام اچھا ہے اور کیا چاہیے؟"

اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور ہمیں اندر تشریف لے جانے کی دعوت دی "پہلے آپ۔"

کمرے کی لمبائی دس فٹ اور چوڑائی بارہ فٹ ہوگی۔ لمبائی کے رخ اس میں اوپر تلے دو بیڈ بنے ہوئے تھے جن کو BUNKERS کہا جاتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر تختے اوپر نیچے کر کے تیسرا بیڈ بھی فٹ کیا جاسکتا تھا لیکن ایک دیوار پر لکھے ہوئے ضوابط کی رو سے یہاں تیسرے شخص کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں کھانا پکانے کے لیے ہیٹر یا کسی قسم کا چولہا جلانا منع تھا۔ کپڑے استری کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جوا کھلانا، شراب پی کے ہنگامہ کرنا۔ رات گیارہ بجے کے بعد شور کرنا یا اونچی آواز میں گانے سننا منع تھا۔ آخری تنبیہ تھی کہ "خیال رکھیے۔ یہاں صرف آپ ہی نہیں رہتے" یا بالفاظِ دیگر کمرے کے اندر آپ سب کچھ کرنے کے لیے آزاد ہیں بشرطیکہ دوسروں کی آزادی میں مخل نہ ہوں۔

ہر بیڈ کے سرہانے کی طرف تین فٹ چوڑا اور دو فٹ اونچا سلائڈنگ دروازے والا خانہ سا تھا جس میں آپ باآسانی اپنا سامان رکھ سکتے تھے کپڑے جوتے اور بریف کیس یا چھوٹا سوٹ کیس۔ اس کے اوپر دو فٹ لمبی ٹیوب لائٹ تھی جس کی روشنی صرف نیچے لیٹے ہوئے شخص تک محدود رہتی تھی کہ وہ سونے سے پہلے کتاب، رسالہ پڑھنے کے مرض میں مبتلا ہو تو دوسروں کو نہ جگائے۔

نو فٹ بائی نو فٹ کی خالی جگہ کو بھی بڑے سلیقے سے استعمال کیا گیا تھا۔ اس میں قالین کے ساتھ کونے میں دو دیواروں سے ملا ہوا صوفہ سیٹ تھا جس پر چھ افراد بیٹھ سکتے تھے۔ دوسرے کونے میں باتھ روم کا دروازہ تھا۔ بیڈ اور صوفے کے مقابل کی دیواروں پر ہونے والے فریم تھے۔ مجموعی طور پر یہ آرام دہ کمرا تھا۔ باتھ روم چھوٹا ضرور تھا مگر صاف ستھرا تھا۔

بیڈ روم کی سائڈ پر ایک چھوٹا سا ٹی وی موجود تھا اور اس پر مجھے کتاب کی طرح کھلے ہوئے فریم میں دو تصویریں نظر آئیں۔ ایک عمر رسیدہ شخص کی جس نے خاصا پرانا ڈھیلا ڈھالا سوٹ پہن رکھا تھا اور جوان عورت کی۔ جس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ کم سے کم لباس میں زیادہ سے زیادہ خود نمائی کے باوجود اسے کچھ ملال ہے کہ وہ معاشرتی حیوان کیوں ہے۔ صرف حیوان کیوں نہیں۔

چند اور چیزوں سے میں نے اندازہ کیا کہ اس کمرے میں زیادہ اسباب انہی کا ہے جو بظاہر ہنی مون منا رہے تھے۔ میں نے محسن سے پوچھا "کیا یہی ہے وہ بوڑھا جوڑا۔"

"ہاں۔ عمر کے فرق کو نظر انداز کردو۔"

میں نے کہا "سارا کھیل جذبات کا ہے۔"

محسن بولا "جی نہیں۔ سارا کھیل پیسے کا ہے۔"

رابعہ نے کہا "ہم چار افراد اس ایک کمرے میں نہیں رہ سکتے۔"

"چالاک لوگ سب کچھ کرتے ہیں مگر انتظامیہ بھی سارے ہتھکنڈوں سے واقف ہے۔ ایک دو دن تو گزر ہی جاتے ہیں پھر اچانک پولیس وارنٹ کے ساتھ چھاپا مارتی ہے اور کسی کمرے سے دو کے بجائے تین چار کو برآمد کرلیتی ہے۔ دراصل یہاں ہر آدمی کے لیے کم سے کم جگہ مقرر ہے اور یہ کمرا دو افراد کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ تین ہوں تو قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس پر جرمانہ ہوتا ہے ورنہ جیل۔ کچھ لوگ کسی مسافر کو سستی جگہ فراہم کرنے کے بہانے ساتھ لے آتے ہیں۔"

"جیسے تم ہمیں لے آئے ہو" میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ ایک کمرا اور ہے" محسن بولا "یہ خاتون پہلے اس میں رہتی تھیں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ۔"

"پھر کیا ان کا جھگڑا ہوگیا؟"

"نہیں۔ جھگڑا ہوا تھا بڑی بی کا اور بڑے میاں کا۔ سب بچوں کی شادیاں کرچکے تھے اور خود لاوارث ہوگئے تھے۔ تیس سال بعد طلاق ہوگئی۔ بڑے میاں نے ایک سال کے لیے لڑکی سے شادی کرلی اور بڑی بی نے اس کے بوائے فرینڈ سے۔ باقاعدہ معاہدے کے تحت۔"

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا "ایک سال کا معاہدہ یہ کیا بات ہوئی؟"

"بات کچھ یوں ہے کہ نوجوان لڑکی اور اس کا بوائے فرینڈ مالی پریشانی کا شکار تھے۔ آمدنی کم تھی اس لیے نہ گھر بنا سکتے تھے اور نہ شادی کرسکتے تھے۔ باہمی رضامندی سے ایک ساتھ رہتے تھے مگر ان حالات میں بچوں کا روگ پالنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ان کو حالات نے ایک موقع فراہم کردیا۔ بڈھے بڑھیا کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ کی مرضی سے خود بڈھے کو پیشکش کی کہ وہ چاہے تو ایک معاہدے کے تحت سال بھر کے لیے وہ اس کی بیوی بن سکتی ہے۔ بڈھے نے تمام شرائط قبول کرلیں۔ وہ نئی بیوی کے تمام اخراجات کا ذمے دار ہوگیا اور اسے ایک معقول سی بندھی رقم ہر ماہ ادا کرنے لگا۔ پیسہ اس کے پاس بہت تھا۔

www.paksociety.com

ایسی ہی بے کشش، دل شکستہ اور غم زدہ بڑی بی کو لڑکے کی طرف سے ہوئی تو انہوں نے بھی تو دُ معاہدہ کر لیا۔"

"یعنی اس لڑکے نے اپنی ماں کے برابر عمری لڑکی سے شادی کرلی۔"

"بڑھے نے بھی تو بیٹی کی عمری لڑکی سے شادی کی تھی۔" محسن بولا "معاہدے کی شرائط تقریباً یکساں تھیں۔ بولی بند ھی رقم نوجوان لڑکے اور لڑکی کو ملے گی اسے وہ ایک مشترکہ اکاؤنٹ میں جمع کریں گے اور انہیں امید ہے کہ سال بھر بعد ان کے سب دلدر دور ہو جائیں گے۔ وہ ایک کمرے کا اپارٹمنٹ خرید لیں گے تو پھر ایک دوسرے سے شادی بھی کرلیں گے۔"

"اور اگر سال بھر کی یہی امدادی ہوئی رقم کم پڑ گئی؟"

"تو معاہدے میں مزید چھ مہینے سال کی توسیع ہو جائے گی۔ دو سال میں جوانی کی ٹرین تو نہیں نکل جا رہی ہے۔"

رابعہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا "حد ہے بے غیرتی کی۔"

"یہاں غیرت کا تصور ذرا مختلف ہے خاتون۔ یہ بغیر جذباتی انداز میں محبت کرنا بھی جانتے ہیں اور نفرت کرنا بھی۔ اس معاہدے سے چاروں خوش ہیں تو کسی اور کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ معاہدے کے ختم ہونے کے بعد بڑھا بڑھیا پھر ایک ہو جائیں۔"

گل نے اپنا سر پکڑ لیا "اور ان کے بچے۔"

"وہ کہیں گے کہ بھئی ابا اماں کی اپنی زندگی ہے۔ جیسے چاہیں جہاں چاہیں خوش رہیں۔ کیا بھروسا ہے زندگانی کا۔"

میں نے کہا "ایسی باتوں سے خواتین کو ذہنی صورا لازمت کرنا ہے تاکہ یہاں کھانے پینے کا بھی کوئی بندوبست ہے یا نہیں۔"

"گراؤنڈ فلور پر کیفے ہے۔ باہر کے مقابلے میں سستا ہے۔ بلڈنگ کا مالک کرائے پر اکتفا کرتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں لاگت پر فراہم کرتا ہے۔ نہ نفع نہ نقصان۔"

"اور معیار؟" رابعہ نے کہا۔

"معیار تو زرا رت خوراک اور روزا رت صحت مقرر کرتا ہے ناقص ہو ہی نہیں سکتا۔ باقی آپ کی جیب پر منحصر ہے کہ آپ کیا کھاتے ہیں۔ ہر گھر جہاں بھی ملتا ہے "میکڈونلڈ" میں بھی۔ پیرس میں دنیا بھر کے کھانے ملتے ہیں۔ روڈ سائڈ کیفے سے فائیو اسٹار ہوٹل تک ہر جگہ ملنے والی چیز کی قیمت الگ ہے۔ آپ فون کر کے اٹالین پیزا منگوا سکتے ہیں یہاں۔ ڈسکاؤنٹ کی نیچے۔"

"مجھا یار ابھی تو نیچے جا کے ہی کچھ کھا پی آئیں۔"

"پہلے تیار ہو کے فریش ہو جاؤ۔" محسن نے مشورہ دیا "گل تم لے جاؤ رابعہ کو دوسرے کمرے میں۔"

"کہاں ہے یہ دوسرا کمرا؟" رابعہ نے کہا۔

"سامنے ہی ہے۔ زیادہ نہیں" گل نے کہا "آؤ میرے ساتھ۔"

پیرس سے رابعہ اور گل کے ابتدائی تعارف کا یہ تجربہ اس

اعتبار سے خوش گوار نہیں تھا کہ وہ اپنی اخلاقی سوچ کے معیار پر مبنی فیصلہ تھیں لیکن بعد میں انہوں نے دیکھا اور سمجھا کہ ان اخلاقی قدروں سے قطع نظر اس قوم کے مزاج اور کردار میں تقلید کے قابل رشک پہلو ہیں۔ اور من حیث القوم یہ وہ قدریں ہیں کے اخلاص، ایمان اور یقین محکم کے فلسفے پر ہم سے زیادہ عمل پیرا ہیں۔

دوسرا کمرا سامنے والی قطار میں تھوڑا سا دائیں جانب تھا رابعہ اور گل نے وہاں ڈیرا جمالیا۔ ان کے ساتھ بیٹھی گپ شپ کرتے اسے نیچے والے بیکری میں ہلکے پھلکے سینڈوچ کھا کے لوٹ آنے کا فیصلہ کیا۔

جب میں اور محسن اکیلے ہوئے تو میں نے کہا "اپنے محسن صاحب یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم پیرس میں ہیں رات کے صرف دس بجے ہیں اور ہم اس کمرے میں بند ہو گئے ہیں سونے کے لیے۔ ایسا تو لاہور میں بھی نہیں ہوا تھا۔ یا پیرس کا شباب بجھ گئی ہے۔"

محسن بولا "پیرس کی جوانی رات ہی کو انگڑائی لے کے بیدار ہوتی ہے۔ اس کے دن جذبات سے عاری مشقت اور بے زاری میں گزرتے ہیں۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور پیرس خان میں ہوں۔" میں نے کہا "جب ہم لندن سے پیرس نکلے تھے سونے کے لیے؟"

محسن نے آہ بھری "اس وقت کو یاد کرا کے دل مت جلاؤ خان۔"

میں نے کہا "یہ ابھی کل کی بات لگتی ہے۔ مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا۔ کوئی ہمارے بچپن کی بات نہیں ہے اور ہم بچپن میں نہیں ہیں۔"

"پھر کیا خیال ہے۔ سٹک جائیں۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "چل یار۔ سونا تو ہمیں یہاں بھی ہے باقی باہر گھومتے پھرنے کی جا سکتی ہیں۔"

"کیا خیال ہے انہیں بتا کے جائیں؟"

"نہیں یار۔ وہ کہیں گی ہم بھی چلتے ہیں لیکن ہم تو اپنی عادی آوارہ گرد ہیں۔ وہ ہمارا ساتھ نہیں دے پائیں گی تو جائیں گی تو ہماری تفریح بھی ادھوری رہ جائے گی۔ اس کے علاوہ ان نیک بیبیوں کا ہر جگہ جانا ٹھیک نہیں۔"

محسن ہنسا اور ہم دروازے کو مقفل کر کے نکل گئے۔ میں اس وقت بھی ایک خاتون تشریف فرما تھیں۔ کمرے کی لیتے ہوئے اس نے ہماری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ وہ ناول پڑھنے میں مصروف تھی۔ وہ جوان ضرور تھی لیکن نسوانی حسن سے محروم تھی۔ شاید نسوانی جذبات سے بھی محروم تھی۔ وہ خدوخال کے باعث وہ کچھ درمیان کی چیز لگتی تھی۔

محسن نے گاڑی نکالی اور ہم ایک بار پھر پیرس کی سڑکوں پر

پھیلی ہوئی مہک رنگوں میں ڈوبی ہوئی خوشبو سے مشکبو اور مدہوش فضاؤں سے لطف اندوز ہونے لگے۔ رات کے ساتھ جوانی یادیں تازہ کرنے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ رات بھر آباد رہنے والے زندگی کے ہنگاموں سے معمور اور پُر رونق سے خائف گنبد اور نائٹ کلب سب ہی سے بچے بھاگتے تھے۔ آج ہم اپنے آپ سے بھی شرمندہ نہیں ہو سکے تھے۔ کہ لندن یا پیرس کے کسی ہنگامے میں دوست احباب کے ساتھ جانا پڑا تو ہم نے ہر ترغیب کے خلاف مزاحمت میں کامیابی حاصل کی۔ نہ ہم دوستوں کے اصرار سے مجبور ہوئے، نہ کسی محبوبہ دلنواز کی چیزیں کا فرار کسی زہد شکن رنگین خیالی کی خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ غیر مہذب، رنگ باتوں اور قابلِ رحم حد تک بے ذوق کہلائے۔ بعض اوقات کسی شرطِ وصل ٹھہری تو ہم نے بصد حسرت دامانِ اعتنائی منظور کر لیا لیکن ہمارا ہاتھ جام کی طرف نہ بڑھا۔ جوانی بے سب عمری رنگینی اور ماحول کی بے خود کرنے والی فضا کا نتیجہ تھا کہ ہم دامنِ پارسائی کو بے داغ رکھنے میں ناکام رہے۔ ہم بہرحال فرشتے نہیں تھے۔

اس رات ہم نے کچھ وقت ایک نائٹ کلب کی ہیجان خیز فضا میں گزارا۔ پھر لیٹن کوارٹرز کے ایک مشہور کافی ہاؤس میں گئے۔ صبح تک ہم نے تین جگہ کافی پی۔ ہر جگہ کسی نہ کسی پہلو سے یادگار تھی۔ باقی وقت ہم سڑکوں پر گاڑی میں خراماں پھرتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔

پہلے میں نے اسے پیرس پہنچنے کی وجہ بتائی اور وہ سب واقعات اسے تفصیل سے سنائے جو اس فیصلے کا سبب بنے تھے۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ میں نے رابعہ سے نکاح پڑھوا لیا تھا۔

وہ ہم بخور رہ گیا "تم نے نکاح کر لیا خاموشی سے۔ کسی کو بتائے بغیر اچانک۔"

میں نے کہا "ابھی تک تیرے سوا یہ بات کوئی بھی نہیں جانتا۔"

"مجھے بھی بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ آخر ایسی کیا آفت آگئی تھی۔"

میں نے کہا "آفت آ سکتی تھی۔ میں رابعہ کے ساتھ دو دن ایک ہوٹل میں رہا۔ پھر دو راتیں ایک فلیٹ میں گزریں۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے شیطان نے ورغلایا نہیں مگر جب رابعہ نے خود کہا کہ ہمارا ایسے ساتھ رہنا اخلاقی اور شرعی اعتبار سے غلط ہے اور خطرناک بھی۔ تو میں نے یہی بہتر سمجھا کہ اسے احساسِ جرم کی عاقبت سے نجات دلا دوں۔"

"اتنا عرصہ ساتھ گزارنے کے باوجود اسے تجھ پر بھروسا نہیں تھا؟"

میں نے کہا "بھروسا نہ ہوتا تو وہ میرے ساتھ کیوں آتی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے بعد مجھے اپنے جذبات پر کنٹرول رکھنا آ گیا ہے۔ میں نے اس فطری بشری کمزوری پر قابو پالیا تھا۔ یعنی مثل مجنوں کے اس کیشیئر کی ہے جو سارا دن لاکھوں

گنتا، وصول کرتا ہے اور بانٹتا ہے۔ اس کی دراز میں نوٹوں سے بھری رہتی ہیں لیکن اس دولت کو وہ اپنا نہیں سمجھتا۔ اسے خیال بھی نہیں آتا کہ اس میں سے کچھ خرچ کرے۔ خواہشات تو اس کی بھی لامحدود ہوتی ہیں۔ بعض اوقات مالی پریشانی بھی ہوتی ہے اور یہ خیال بھی آتا ہے کہ اتنی دولت ہو تو وہ عیش کر سکتا ہے لیکن وہ ایسا کرتا نہیں۔ وہ جتنی رقم گھر سے جیب میں رکھ کے لاتا ہے اس سے زیادہ خرچ نہیں کرتا۔ ایک عادت سی ہو جاتی ہے اسے نوٹوں کو کاغذ کے پُرزے سمجھنے کی مگر اس کو کہیں سے لاکھوں مل جائیں تو جو اس کے اپنے ہوں تو پھر وہ دل کھول کے خرچ کرتا ہے۔ کچھ ایسی ہی بات رابعہ کے ساتھ تھی۔ ابھی تک میں اسے اپنا نہیں سمجھتا۔ وہ ایک امانت ہے جس میں خیانت کا مرتکب ہونے کا مجھے خیال بھی نہیں، نہ مگر یار آتری کو بڑا بول نہیں بولنا چاہیے۔ عورت، مرد کا ساتھ بجلی کے دو تاروں جیسا ہے اور ان کے جذبات پٹرول ٹینک کی طرح۔ حادثاتی طور پر شارٹ سرکٹ ہو جانے کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اسپارک سے وہ آگ بھڑک سکتی ہے جو سب کچھ جلا کے خاکستر کر دے۔"

"یہ رسک تو ہر وقت اور ہر جگہ تھا۔"

"ہاں۔ مگر ایک وقت آیا کہ رابعہ کے لیے رسک بڑھ گیا۔ اس نے ایک حفاظتی یا احتیاطی تدبیر کی تو کیا غلط کیا۔"

"یار فرض کر تجھ سے کوئی لغزش ہو جاتی تو کیا رابعہ تجھے معاف نہ کرتی؟"

"معاف نہ کرنے کا کیا سوال۔ میں فرشتہ ہوں یا شیطان۔ اسے اپنی زندگی میرے ہی ساتھ گزارنی ہے۔ وہ سب سمجھتی ہے کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی تو اس غلطی کا کفارہ بھی ہم ادا کر لیتے۔ ہم شادی کر لیتے لیکن کیا تمام عمر احساسِ گناہ کی خلش کو دل سے نکال پاتے۔ اب رابعہ کا اعتماد مجھ پر پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے کیونکہ نکاح کے بعد بھی میرا رویہ بدلا نہیں ہے۔ ہماری حقیقی ازدواجی زندگی اسی دن شروع ہوگی جس دن میں سب کے سامنے اس سے شادی کروں گا اور وہ دلہن بن کے میرے ساتھ میرے گھر جائے گی۔ اس دن کے انتظار میں ہم خوابوں کی راہ گزر پر چل رہے ہیں۔ نہ میں انتظار کی لذت سے محروم ہونا چاہتا ہوں اور نہ تعبیرِ خواب کی مسرت سے۔ تجھ سے میں نے آج تک کچھ نہیں چھپایا۔ پھر یہ بات کیسے چھپاتا لیکن رابعہ کو معلوم ہوگا تو اسے مایوسی ہوگی۔"

"مایوسی تو سب کو ہوگی۔"

"ہاں۔ اس لیے کسی کو کچھ نہ بتانا ہی بہتر ہے۔ یہ نکاح تو خود حفاظتی کے لیے ہے۔ اس ریوالور کی طرح جو ہم ساتھ لیے پھرتے ہیں مگر چلاتے نہیں۔"

"چل ٹھیک ہے یار۔ جب میاں بیوی راضی تو کیا کریں گے قاضی اور براتی۔" محسن نے کہا اور گاڑی روک لی۔

نیبر اکراسنگ پر سے ایک نوجوان جوڑا گزر رہا تھا۔ ان کے

www.paksociety.com

لڑکھڑاتے قدم بتاتے تھے کہ نشے نے محسن کو ٹھا پسے نے روچند کردیا ہے۔ عین سڑک کے وسط میں وہ ک کے وہ ایسے لپٹے جیسے ایک دوسرے سے پھر کبھی نہیں ملیں گے۔۔۔ محسن نے گاڑی کو ان کے پیچھے سے نکال لیا۔ رات کے دو بجے ہم پیرس کے ایک اور مشہور کیفے میں جا بیٹھے۔ الہ دین کے جادوئی چراغ والے غار کی طرح اس کیفے کا ماحول بھی طلسماتی تھا اور مصنوعی ہونے کے باوجود اندر کی دیواروں کو اور چھت کو دیکھ کے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اصلی چٹانیں نہیں ہیں۔ اس کا نام بھی THE CAVE تھا۔ ویٹریس بھی زمانہ قبل از تاریخ کی جنگلی لڑکی نظر آتی تھی۔ اس نے جس کپڑے کو بدن پر لپیٹ رکھا تھا وہ کسی جانور کی کھال جیسا تھا۔ ممکن ہے وہ اصلی کھال ہی ہو لیکن جانور بہت چھوٹا تھا۔ کھال نے بڑی مشکل سے نصف سینے سے کولہوں تک اس کے جسم کو جتنا چھپایا تھا اس سے زیادہ عیاں کردیا تھا۔ یہ کم لباسی کا آرٹ تھا جو دیکھنے والے کے شعور کو بیدار کرتا تھا کہ وہ اصل کو مکمل دیکھے اور مستور کو غیر مستور۔

کافی منگوانے کے بعد میں نے کہا "تمہاری اور گل کی پیرس اور پوسٹ پر موجودگی کے بارے میں ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔"

"میں عرض کرچکا ہوں کہ اسے آپ تیلی پیتھی کا اعجاز سمجھیں۔ جس انداز غیب نے آپ سے کہا کہ لندن براستہ پیرس جا۔ اس نے مجھ سے چند دن پہلے کہا کہ پیرس پہنچ کے اپنے یار کا انتظار کر۔"

میں نے کہا "آپ بکواس فرماتے ہیں۔ لاہور میں کچھ اور کہانی مشہور ہے۔"

محسن نے کہا "وہ بھی سچ ہے۔"

"یہ بھی سچ ہے وہ بھی سچ ہے۔۔۔؟"

محسن بولا "اس گلاس کی مثال سامنے رکھو۔ یہ آدھا بھرا ہوا ہے یہ سچ ہے۔ یہ آدھا خالی ہے۔ یہ بھی سچ ہے۔"

میں نے کہا "کیا واقعی گل کو بچے کی اتنی ہی خواہش ہے۔"

"خواہش پر کس کو اختیار ہے اور عورت کے خمیر میں اسی طرح شامل ہے جیسے اس کافی میں چینی۔ اس کے بغیر یہ سیاہ تلخ مشروب کون پی سکتا ہے؟"

"میں۔۔۔ اور بہت سے لوگ بلیک کافی پیتے ہیں شکر کے بغیر۔"

"رائٹ۔ گل بھی پی رہی ہے۔" محسن بولا "اس نے ایک تلخ حقیقت کو اسی طرح قبول کرلیا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اب خواہش لاحاصل ہے۔"

"پھر یہ کیا ہے۔ سنا بات پھیلی ہوئی ہے کہ تم گل کے ساتھ کسی پیر فقیر کی خدمت میں حاضر ہونے اور کوئی جادو اثر عمل یا تعویذ لینے گئے ہو۔"

"مصلحت کا تقاضا تھا کہ ایسی بات مشہور کی جائے۔ اصل بات کا علم خود گل کو بھی نہیں۔"

میں چوکنا ہوگیا "وہ کیا بات ہے؟"

"چوہدری رلاور کے گرگوں نے میرے ٹھکانے کا سراغ لگا لیا تھا۔ بیوی اور گل کی سلامتی کے خیال سے میں انتہائی محتاط ہو کر آنے جانے میں ہر طرف دیکھتا تھا کہ کوئی میرے تعاقب میں تو نہیں ہے۔ میں راستے بدل لیتا تھا اور کبھی ایک ہی وقت پر گھر سے نہیں نکلتا تھا۔ میں بزدل اور خود غرض ہو گیا تھا۔ دراصل ایک بار بیوی اور بچے کو قربان کردینے کے بعد میں دیوانگی کی سرحد سے لوٹ آیا تھا۔ خدانخواستہ ایسا دوسری بار ہوجاتا تو میں موت کی سرحد عبور کرجاتا۔ گل نے مجھے دوسری زندگی دی تھی اور بیوی نے کوئی زندہ رہنے کی خواہش کا جواز فراہم کیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس نے کہاں سے میرا پیچھا کیا۔ میں ایک دن گھر سے نکلا اور روڈ تک پہنچا ہی تھا کہ ایک ٹیکسی آئی اور اس نے مجھے بٹھانے سے انکار بھی نہیں کیا۔ اس سے مجھے کیسے شک ہو سکتا تھا۔ ٹریفک جیسی ڈرائیور بھی ہوتے ہیں جو ہر وقت ہر جگہ جانے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ ٹیکسی نے مشکل سے سو گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک جھٹکے سے انجن بند ہوگیا۔ میرا خیال ہے کہ ڈرائیور نے بریک لگا کے کلچ چھوڑ دیا تھا۔ میں آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جھٹکے سے میرا سر ڈیش بورڈ پر لگا مگر میں نے خود کو بچالیا۔ اسی وقت پیچھے کا دروازہ کھول کے دو آدمی بیٹھ گئے اور انہوں نے ریوالور نکال کے کہا کہ "چپ کیا ہے۔ آگے دیکھو" ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کی تو میں نے سوچا کہ دروازہ کھول کے چلتی گاڑی سے باہر لڑھک جاؤں۔ رسک اس میں بھی تھا۔ میری گردن ٹوٹ جاتی یا پیچھے آنے والی کوئی گاڑی میرے اوپر سے گزر جاتی۔ پھر بھی بلا مقابلہ شکست تسلیم کرنے سے بہتر تھا لیکن افسوس کی بات یہ کہ پیر خان کہ اس دروازے کو اندر سے نہیں کھولا جاسکتا تھا۔"

میں نے کہا "وہ پورا انتظام کرکے آئے تھے"

"ہاں" اور نہ جانے کب سے میرے لیے جہنم بنا رہے تھے۔"

"مگر تم پیچھے بیٹھ جاتا پھر؟"

"پھر کیا۔ دروازے کھولنے والے ہینڈل پیچھے بھی نہیں تھے۔ اندر بیٹھ جانے والے اس وقت تک باہر نہیں نکل سکتے تھے جب تک خود ڈرائیور پیچھے اتر کے ان کے لیے دروازے کو باہر سے نہ کھولے۔ میں نے ان سے کہا کہ "بہت خوب" میں نے مان لیا کہ ریوالور اصلی ہیں اور لوڈڈ ہیں۔ تم ان کا استعمال بھی جانتے ہو لیکن سوال یہ ہے کہ تم چاہتے کیا ہو؟" ان میں سے ایک نے کہا "مجھے تمہاری بیوی چاہیے۔ میرا اس پر دل آگیا ہے" دوسرے نے کہا "مجھے وہ بچہ چاہیے جس میں تمہاری جان ہے۔" وہ مجھے اشتعال دلانا چاہتے تھے تاکہ انہیں مجھ پر حملہ کرنے کا موقع مل جائے۔ میں نے کہا "بچہ میرا نہیں ہے۔ اس کی خاطر میں جان نہیں دے سکتا۔ بیوی کا معاملہ ذرا مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔ پہلا ایک بیوی سے میں اتنی ہی محبت کرتا تھا مگر وہ مرگئی تو مجھے دوسری مل گئی۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ تیسری بھی دے دے گا۔"

... سر کے پچھلے حصے پر ریوالور مار دیا۔ میرا جواب ... پھر بھی ہونا اس نے کرنا ہی تھا۔"

"پھر انہوں نے دھوکے سے راہ کیا اور وہ بھی بچے تھے۔" میں نے افسوس سے سرہلایا "آپ ہنسے بھی ہوں گے۔"

"میرے پاس تو بہ ہوئی ... لکھے چلا تا۔ بس اس کے بعد دنیا میری نظروں میں اندھیر ہوگئی۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی یہ اندھیرا باقی رہا تو مجھے شک ہوا کہ شاید میں سر کی چوٹ سے اندھا ہوگیا ہوں۔ گھپ اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ جب میں اس قابل ہوا کہ اٹھ سکوں تو میں نے اندھوں کی طرح ہاتھ بڑھا کے اس جگہ کا جائزہ لیا اور ٹٹول ٹٹول کے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ قدم آگے بڑھانے سے پہلے میں فرش کو بھی محسوس کرتا تھا کہ میری راہ میں کوئی چیز تو حائل نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں اچانک کسی گڑھے میں گر جاؤں یا چوہے دان جیسے شکنجے میں پاؤں پھنسالوں۔ یہ تو میں سمجھ گیا تھا کہ چوہدری رلاور کے سوا مجھے کوئی اور نہیں اٹھوا سکتا۔ شکاری رلاور جیسا ہو اور شکار میرے جیسا تو ذہن میں ہر قسم کے خدشات جنم لیتے ہیں۔ بہت جلد میں نے دریافت کرلیا کہ چاروں دیواریں ہر طرف سے سپاٹ ہیں اور دروازہ صرف ایک ہے جو باہر سے مقفل ہے اور انتہائی مضبوط ہے۔ کمرے میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ ایک میز کرسی اور چند کتابوں کے ساتھ رکھا ہوا تیل لیمپ یہ ثابت کرتے تھے کہ وہاں کوئی بجلی کی روشنی میں پڑھتا ہے۔ لیمپ کا پلگ ایک ساکٹ میں میز کے قریب ہی لگا ہوا تھا اور وہ کسی طرح بھی روشن نہیں ہوا۔ بجلی بند کردی گئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ کمرا تہہ خانہ ہے۔ لاہور کے پرانے شہر میں تہ خانے عام ہیں۔ تصدیق کے لیے میں نے کرسی پر چڑھ کے دیواروں پر ہاتھ پھیرا اور کسی روشندان کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ ایک دیوار کے اوپر والے حصے میں دو روشندان تھے۔ میں نے تیل لیمپ کو الگ کیا اور میز کو کھینچ کر عین روشندان کے نیچے لے گیا۔ پھر میں نے لیمپ کی مدد سے روشندان کے وہ تختے توڑ دیے جو شیشوں کی جگہ لگائے گئے تھے۔ روشندان میں لمبائی کے رخ بہت موٹی لوہے کی سلاخیں نہ ہوتیں تو میں بہ آسانی اس میں سے گزر جاتا۔ باہر ایک وسیع احاطہ تھا جس میں پرانی گاڑیوں کا اسکریپ ڈھیر کی صورت میں پڑا تھا۔ احاطے میں بھی رات کا اندھیرا تھا۔"

میں نے کہا "قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو اغوا کس وقت کیا گیا تھا؟"

محسن بولا "شام پانچ چھ بجے کا وقت تھا اور میں رابعہ کے آفس جانے کے لیے نکلا تھا۔"

"اور جب آپ نے باہر جھانک کے دنیا کو دیکھا تو۔۔۔"

"رات کے نو بجے تھے۔" محسن نے کہا "احاطے کی دیوار کے بعد آبادی تھی اور میں اسٹریٹ لائٹس کے علاوہ گھروں کی روشن کھڑکیاں دیکھ سکتا تھا۔ تھوڑی سی روشنی احاطے میں بھی پہنچ رہی تھی اور جب روشندان میں تختے نہ رہے تو تھوڑے سے اجالے کی زکوٰۃ کے برابر روشنی کمرے میں بھی آگئی۔ اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ میں اندھا نہیں رہا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے مجھے کمرے کی دیواریں نظر آنے لگیں۔ پھر میں نے دوسرے روشندان کے تختے بھی اکھاڑ دیے۔ پلائی ووڈ کے تختے زیادہ مضبوط نہیں تھے۔"

"تیل لیمپ لکڑی کا تھا یا پیتل کا؟"

"پیتل کا ہوتا تو میں دروازہ بھی توڑ دیتا۔ دوسرا روشندان توڑتے ہوئے لوہے کی سلاخ پر لگنے سے تیل لیمپ کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ احاطے میں کوئی ہوتا تو اسے شور ضرور سنائی دیتا۔ میں نے روشندان میں منہ ڈال کے آوازیں بھی دیں کہ کوئی ہے۔ ایکسیڈنٹ میں یا طبعی عمر کو پہنچ کے مرجانے والی کاروں کے ڈھانچے، دروازے اور بونٹ۔ جھکی ہوئی سیٹیں اور پچکے ہوئے پرانے ٹائروں کے انبار کسی کباڑی کی ملکیت تھے اور وہ جانتا تھا کہ ان کی حفاظت کے لیے چوکیدار رکھنا فضول خرچی ہے۔ میری آواز اتنی پاٹ دار بھی نہیں تھی کہ احاطے کے باہر بنے ہوئے مکانوں کی دیواروں سے گزر کے مکینوں کے کانوں تک پہنچ جاتی۔ میرا چیخنا چلانا رائیگاں گیا۔ پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور پہلے کرسی اٹھاکے دروازے پر مارتا رہا یہاں تک کہ کرسی کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔"

"پھر آپ نے میز اٹھاکے ماری؟"

"نہیں۔ میں نے میز کا پایہ توڑنے کی کوشش کی پھر تخت کا پایہ الگ کرنے کے لیے زور آزمائی کی۔ اگر کوئی مجھے دیکھتا تو پاگل سمجھتا۔ اس کمرے میں اور کچھ بھی نہیں تھا۔ دراصل وہ تہ خانہ نہیں اوور گراؤنڈ واٹر ٹینک تھا۔ اتنے بڑے پلاٹ پر کوئی کوٹھی بنانا تو یہاں پانی ذخیرہ کرتا مگر کباڑ خانہ بنا تو پانی کی ضرورت نہ رہی اور کباڑیے نے اسے معمولی رد و بدل کے ساتھ اپنا آفس بنالیا۔ میز پر کتابیں نہیں اس کی نوٹ بکس اور روزنامچے تھیں جن میں اس کا سارا حساب کتاب درج تھا۔ میں نے روشندان کے رخ کرکے نوٹ بکس رکھ دی تھیں۔ میز کی ایک دراز میں اسکریپ میں خریدی جانے والی گاڑیوں کے کاغذات بھرے ہوئے تھے لیکن پچھلی دونوں درازوں میں نوٹ تھے۔ اس وقت نوٹ میرے لیے بے کار تھے۔ مجھے یقین تھا کہ رلاور اپنی کمینگی کا کوئی نمائندہ یا خود رلاور یہاں ضرور آئے گا۔ شاید وہ مجھ سے کچھ معلوم کریں گے۔ جو بات مجھے معلوم نہیں وہ میں بتا نہیں سکتا مگر جو معلوم ہے وہ بھی کہاں بتاؤں گا۔ پھر وہ تشدد کے حربے آزمائیں گے۔ چوہدری رلاور سوچے سمجھے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مجھے اس تہ خانے میں ڈال کے اسی طرح بھول جائے جیسے ہم اسے بھول گئے تھے۔ شاید یہ جگہ بھی اسی کے کسی نوکر کی ہو۔"

"تم نے کباڑی کی کسی نوٹ بک میں کیا لکھا تھا؟"

"میرا سر دیکھا تھا۔ اس گھپ اندھیرے میں کسی کباڑی کے ہاتھ کی تحریریں کیسے پڑھتا۔ بس ایسے ہی ورق الٹ کے دیکھا تھا تو

www.paksociety.com

کچھ امداد و شمار نظر آئے تھے۔ مجھے تو فکر تھی یہاں سے نکلنے کی۔ میرا خیال تھا کہ ابھی تو صرف نو بجے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آدھی رات کے بعد کوئی آئے۔ میں نے دروازے پر مکے مارے اور لاتیں ماریں اور چیخا چلایا اور پھر مایوس ہو کے تخت پر لیٹ گیا۔ اپنی ساری جسمانی توانائی ضائع کر کے بھی مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ میں پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ میرا حلق پیاس سے خشک ہو رہا تھا۔ ایسے وقت میں آدمی کو سب سے زیادہ پریشان اس کے خیالات کرتے ہیں۔ بے ہوشی میں تین گھنٹے گزر جانے کا پتا نہیں چلا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد آدھا گھنٹا آدھے دن کے برابر ہو گیا تھا۔ میں نے بڑے دکھ سے گل اور ببلی کے بارے میں اور تم سب کے بارے میں سوچا۔ کتنی آسانی سے دلاور نے مجھے شکار کر لیا تھا۔ کیا پتا میرے بعد اس نے گل کو بھی اٹھا لیا ہو۔ اور ببلی کو بھی۔ اکیلا آدمی مرنے سے نہیں ڈرتا مگر اس کی نظروں کے سامنے اس کے بچے کو یا بیوی کو عذاب دیا جائے تو وہ ان کا درد سے تڑپنا اور اذیت سے چلانا برداشت نہیں کر پاتا۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری اس کا بچہ ہوتی ہے تو مرد کے لیے عورت کی عزت۔ اگر گل کے سامنے ببلی کو مارا، کاٹا یا جلایا جاتا تو کیا وہ اسے بچانے کے لیے ان کی ہر شرط تسلیم نہ کرتی۔ اور اگر میرے سامنے گل کی آبرو کو حیوانوں اور شیطانوں کی سفاک شہوانیت کا نشانہ بنایا جاتا تو میں کتے کی طرح چوہدری دلاور کے قدموں میں نہ لوٹنے لگتا۔ ایسی ہی باتیں سوچ سوچ کے میں پاگل ہونے کے قریب تھا کہ اچانک ایک دھماکا ہوا جس سے تہ خانے کی دیواریں لرز گئیں۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا اور میں نے دل خراش انسانی چیخوں کی آوازیں سنیں۔ پھر کئی دھماکے ہوئے جو کم شدید تھے اور تہ خانہ روشن ہونے لگا۔ یہ دھماکے ساتھ والی عمارت میں ہوئے تھے اور یہ روشنی آگ کے شعلوں کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ بس اب کسی بھی دھماکے کے ساتھ تہ خانے کی چھت بیٹھ جائے گی اور میں اسی گمنام قبر میں دفن ہو جاؤں گا جہاں یوم حشر سے پہلے میرا سراغ بھی نہیں ملے گا یا آگ یہاں تک پہنچے گی تو میں جل کے کوئلہ ہو جاؤں گا۔ لیکن جیسا کہ میں نے بتایا، وہ انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک تھا جو پانی کا دباؤ برداشت کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس میں کافی سریا اور سیمنٹ تھا۔ اسے کچھ نہیں ہوا مگر اس کے اوپر روف اونچی دیوار کھڑی کر کے روشن دان لگائے گئے تھے۔ اس دیوار کا ایک کونہ ہل گیا اور اینٹیں اندر آگریں۔ میں تو ویسے ہی تخت پر بیٹھا کلمۂ شہادت پڑھ رہا تھا اور مجھے اپنی موت کا یقین بھی آ چکا تھا۔ وہ زیر زمین ٹینک سلامت رہتا تب بھی ساتھ والی عمارت کا ملبہ اس پر گرنے سے روشن دان بند ہو جاتے تو ہوا کا راستہ نہ رہتا یا پوری عمارت میں بھڑکنے والے شعلوں کی حدت اس کو تنور بنا دیتی جس میں شیروانی صاحب دستیم روسٹ ہو جاتے۔ اینٹوں کے اندر گرنے سے دھماکا ہوا تو میں چھلانگ مار کے دوسرے کونے میں جا کھڑا ہوا۔ مگر پھر مجھے اوپر کے شگاف سے باہر کا اجالا نظر آیا اور میں نے الاؤ کی طرح جلتی آگ کی ایک جھلک دیکھی۔

میں نے ہمت کی اور میز کو گھسیٹ کر اس شگاف کے قریب [illegible] اس کے اوپر کرسی رکھی تو میرا سر شگاف تک پہنچ گیا۔ احاطے کے ساتھ دونوں طرف بلند عمارات تھیں اور دھماکے دائیں جانب والی تین منزلہ بلڈنگ کے نچلے حصے میں ہوئے تھے۔ جیسا کہ [illegible] بعد میں پتا چلا، وہاں آتش بازی کا سامان بنتا تھا اور ایسی کسی دھماکے کے لیے ایک معمولی چنگاری بھی بہت ہوتی ہے۔ [illegible] انتظامات کے معاملے میں تو بڑے بڑے اداروں کی کارکردگی کا دیکھ کے افسوس ہوتا ہے۔ آتش بازی بنانے والے بھی [illegible] ضرور کرتے ہیں مگر عموماً وہ شارٹ سرکٹ کے امکانات کو [illegible] جاتے ہیں۔"

"ہاں۔ ایسے کئی حادثات ہو چکے ہیں۔ پھر بھی یہ کام [illegible] شہر میں بھی رہائشی علاقے میں جاری ہے۔"

دھماکوں سے عمارت کا ایک حصہ گرا تھا اور باقی جسے آگ لپیٹ میں آ گئے تھے۔ درمیان میں کباڑی کے احاطے کی موجودگی نے دوسری طرف کے مکانات کو محفوظ کر دیا تھا مگر اس بلڈنگ سے متصل عمارتوں کو بہرحال خطرہ لاحق تھا۔ میں لوگوں کا شور سن رہا تھا اور تصور بھی کر سکتا تھا کہ افراتفری میں کیا منظر ہوگا۔ کچھ بچا کے نکل رہے ہوں گے تو کچھ سامان نکال رہے ہوں گے اور [illegible] جی دار ملبے میں سے لوگوں کو نکالنے یا آگ بجھانے کی کوشش [illegible] اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ [illegible] بریگیڈ آئے گا اور ایمبولینس پہنچے گی اور صبح بس ایک خبر [illegible] اس حادثے میں اتنے ہلاک اور اتنے زخمی ہوئے۔ اخبارات [illegible] لے دے کریں گے کہ انتظامیہ کو اس خطرناک کاروبار پر [illegible] لگانی چاہیے۔ ہوگا کچھ نہیں۔ خود میں اس وقت کسی اور [illegible] بارے میں نہیں صرف اپنی جان بچا کے فرار ہونے کی فکر میں تو یہ تقدیر کی ستم ظریفی ہے یا زندگی اور موت کا فنا اور بقا کا کبھی نہ ٹوٹنے والا کھیل۔ کسی کی قضا کسی اور کے لیے حیات نو کا [illegible] جاتی ہے۔ جب آدمی کی اپنی جان پہ بن جائے تو وہ کتنا خود غرض [illegible] کمینہ ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ عام حالات میں نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے دیکھا تو نہیں سنا اور پڑھا ہے کہ قحط اور خشک سالی [illegible] مٹھی چاول کے لیے عورتوں نے اپنی عصمت بیچ دی اور مائیں [illegible] دی۔ انسان ایک آدم خور حیوان بن گیا۔ میں بھی وہاں سے [illegible] مجھے بالکل خیال نہیں آیا کہ میں مدد کرنے والوں میں [illegible] ہو جاؤں۔ میں عمارت کے عقبی حصے میں تھا اور چیخ و پکار [illegible] طرف تھی۔ اگر میں چاہتا تو گھوم کے ادھر بھی جا سکتا تھا مگر [illegible] ہے میں نے کیا کیا؟"

"تو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جو تجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے وہ [illegible] ہوں گے تماشا دیکھنے والوں کی بھیڑ کام کرنے والوں کے [illegible] مشکلات پیدا کرتی ہے۔"

"مگر میں نے یہ بھی نہیں سوچا۔ مجھے خیال آیا کہ میز کی [illegible] میں جو نوٹ بھرے ہوئے ہیں وہ نکال لوں۔ ورنہ بعد میں [illegible]

لیں گے یا انہیں کوئی اور لے جائے گا۔ اب یہ لالچ میں [illegible] جان کی بازی لگانے والی بات تھی۔ میں پھر اندر اتر گیا اور میں نے بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں اپنی جیبوں میں ٹھونس لیں۔ قمیص کے نیچے کھول کے پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیں اور پانچ منٹ میں پھر باہر آ گیا۔ یہ کتنا خطرناک کام تھا۔ فرض کرو اتنی دیر میں کوئی دیوار نہ گرتی، گول کے نیچے آ جاتا تو شاید مجھے کوئی مار دیتا یا اس شگاف پر ملبہ آ گرتا۔ میں مارا جاتا اور یہ خودکشی ہوتی۔"

"تو نے واقعی بڑی حماقت کی تھی۔ گل اور ببلی کے لیے یا ہمارے لیے تیری جان کا بدل وہ پیسہ ہو سکتا ہے، الو کے پٹھے۔"

"میں نے کمایا۔ بڑی کینگنی کا ثبوت دیا تھا میں نے۔ مجھے یہ خیال تھا کہ چوہدری دلاور کا مال ہے۔ اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔"

"تیرا خیال غلط بھی ہو سکتا تھا۔"

"مگر میرا خیال بعد میں درست ثابت ہوا۔ وہ احاطہ اور اسکریپ چوہدری دلاور ہی کا تھا۔"

"وہ کباڑی کب سے بن گیا؟" میں نے کہا۔

"اب اگر تو شپ بریکر کو کباڑی کہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ایسے تو بابا بھی سوچی کہلائے گا۔ لاکھوں کا بزنس ہے اسکریپ کا۔"

"کتنا مال غنیمت لے گیا تو اپنے ساتھ؟"

"سو سو کے نوٹوں کی آٹھ گڈیاں تھیں۔ اسی ہزار، سب پرانے نوٹ تھے۔ پتا نہیں وہاں کیوں رکھے تھے؟"

"وہ محفوظ جگہ تھی۔ لوگ اپنا پیسہ گھر کی تجوریوں میں رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ممکن ہے وہ رقم کسی کو ادا کرنی ہو یا کسی نے ادا کی ہو۔ بینک تو ایک بجے ہی بند ہو جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"خیر میں اس کے بعد وہاں سے بھاگا تو پلٹ کے نہیں دیکھا۔ کسی دشواری کے بغیر میں احاطے کی دیوار پر سے دوسری جانب سڑک پر پہنچ گیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بادامی باغ کا علاقہ تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور دس بجے گھر پہنچ گیا۔ میری حالت دیکھ کے گل پریشان ہو گئی لیکن میں نے اسے صرف اتنا بتایا کہ کچھ دیر پہلے میں نے چوہدری دلاور کو اس گلی سے نکلتے دیکھا ہے چنانچہ اب ہمیں ایک منٹ ضائع کیے بغیر یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے پاس ایک گھنٹے کی مہلت ضرور ہے۔ چوہدری دلاور کو اتنی جلدی حادثے کی خبر نہیں مل سکتی اور مل جائے تو اسے یہ خیال نہیں آ سکتا کہ اس حادثے کے باعث مجھے وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا ہے۔ میں بے ہوش پڑا تھا اور ہوش میں آنے کے بعد بھی اس ناقابل شکست دیواروں والے تہ خانے سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ وہاں اتنا مضبوط دروازہ کیوں لگایا گیا تھا اور اتنی سوئی سلاخ سے روشن دان کا راستہ کیوں بند کیا گیا تھا۔ وہ جگہ چوہدری دلاور کی انڈر گراؤنڈ ٹریژری تھی جہاں وہ کالے دھندوں کا کالا دھن چھپا کے رکھتا تھا اور کالا دھن بھی آتا جاتا رہتا ہے۔ جتنا میرے نصیب میں تھا مجھے مل گیا۔ جتنا عذاب جھیلا

اس کے مقابلے میں تو کچھ نہیں مگر پھر بھی قدرت نے تھوڑا بہت ازالہ کر دیا۔ مجھے بچانے والا تو وہی ہاتھ تھا جو مارنے والے سے زبردست ہے مگر دلاور کو اسی ہزار کا نقصان پہنچانے کی خوشی اب محسوس ہوتی ہے۔ بعد میں اس کو کتنا شاک لگا ہوگا کہ بندہ بھی گیا اور جاتے ہوئے اسی ہزار کا نقصان بھی دے گیا۔"

میں نے کہا "تجھے شرم آنی چاہیے۔ اتنا مالدار ہو کے بھی پاس غریب خانے میں ڈال رکھا ہے بیوی بچوں کو۔ دلاور کے مال پر عیش کیوں نہیں کرتا۔"

محسن ہنسا "تو عیش ور آؤٹ کیش۔ یہ تو سچ ہے کہ میں گیدڑ کی طرح شہر کا رخ کرنے سے ڈرتا ہوں۔ جب ہم گھر سے فرار ہوئے تو میں نے گھر چھوڑا نہیں تھا۔ اس بلڈنگ میں ایک جاہل عورت تھی جس کے شاید شادی کے دس بارہ سال بعد اولاد ہوئی تھی۔ شوہر کا پیروں فقیروں اور تعویذ گنڈے پر اعتقاد نہیں تھا۔ اس نے علاج پر بہت پیسہ خرچ کیا تھا۔ بیوی ہر اوٹ پٹانگ پیر فقیر جوگی، مجذوب کے پاس بھی جاتی تھی اور جھاڑ پھونک سے وظیفے اور عمل تک سب کچھ کرتی تھی۔ اب یہ دوا سے ہوا یا دعا سے۔ اللہ جانے، لیکن اس عورت کو پورا یقین تھا کہ یہ ایک بڑے پہنچے ہوئے ملنگ بابا کی کرامت ہے جو کہیں منگورہ میں ایک لنگوٹ باندھے بیٹھے رہتے ہیں خواہ برف باری ہو رہی ہو۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے گل کو اس عورت کے پاس بھیجا اور گل نے میری ہدایات کے مطابق اس سے کہا کہ بہن مجھے ذرا منگورہ والے بابا کا پتا پھر سمجھاؤ۔ میں بھی جا رہی ہوں ان کے پاس من کی مراد پانے۔ گل بہت خفا تھی کہ یہ کیا خرافات ہے مگر میں نے کہا کہ نیک بخت یہ ہماری دفاعی حکمت عملی ہے۔ یہ عورت سب میں پھیلا دے گی کہ دیکھو میرے کہنے سے اس گھر میں رہنے والی منگورہ والے بابا کے آستانے پر گئی ہے۔ لوٹ کے آئے گی تو دیکھ لینا، سال بھر میں ماں بن جائے گی اور اس جیسے جاہل یقین بھی کریں گے۔ حقیقت کیا ہے۔ یہ خدا جانتا ہے یا اس عورت کو معلوم ہوگا مگر میں نے تو ایک شخص کو اسے گالیاں دیتے بھی سنا ہے کہ اولاد کو شوہر کے سر منڈھ دیا۔ کون نہیں جانتا کہ اس کا باپ کون ہے۔ ولدیت کے خانے میں دو تین نام لکھے جا سکتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ہم تو آدھے گھنٹے میں سب کچھ وہیں چھوڑ کے خالی ہاتھ نکل آئے۔ دروازے کو تالا لگا کے چابی اس پڑوسن کو دے دی کہ خیال رکھے۔"

"اور خود ٹرین میں بیٹھ کے کراچی روانہ ہو گئے۔"

"اس سوال میں دو احمقانہ نکات ہیں" محسن بولا "ایک یہ کہ رات دس بجے کے بعد کون سی ٹرین کراچی جاتی ہے۔ دوسری یہ، دولت مند لوگ ٹرین میں رنگ رنگ کے سفر نہیں کرتے۔ ہم سیدھے ائرپورٹ اور ہائٹ کوچ پکڑنے کی کوشش کی۔ فلائٹ اسلام آباد سے آ رہی تھی۔ ہمیں چانس پر سیٹ کا انتظار کرنا پڑا۔ ان اللہ مع الصابرین۔ رات ساڑھے گیارہ بجے لاہور سے روانہ ہونے والے جہاز میں ہی جگہ مل گئی اور ڈیڑھ بجے ہم کراچی ائرپورٹ پر اترے تو

www.paksociety.com

طور مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ صرف چار گھنٹے پہلے مجھے ہوش آیا تو میں کہاں تھا۔ تمام راستے میرے تصور میں وہ جگہ رہی جہاں رہا کا ہوا تھا اور میں قدرت کی کرم نوازی پر حیران ہوتا رہا۔ ظاہر ہے اس وقت تک چوہدری دلاور کو بھی خبر مل گئی ہوگی کہ پنچھی پنجرے کے پیچھی اڑ گیا مگر پنچھی اڑ کے کراچی چلا گیا۔ یہ خیال اسے ذرا دیر سے ہی آیا ہوگا۔ اس نے پہلے تو بند دروازے ہوں گے میرے گھر کی طرف اور وہاں ناکام رہنے کے بعد دوسرے ٹھکانے دیکھے ہوں گے۔ کوئی سیدھا راستہ رابطہ منظر کے گھر میں تو گھس نہیں سکتا تھا۔ نہ رابعہ کے آفس جا سکتا تھا اور نہ کسی کو مولوی غلام حسین کے گھر کا پتا معلوم تھا۔"

"اب بھی یہ خوش فہمی ہے آپ کو شیرانی صاحب کہ انہیں کسی کا پتا ٹھکانا معلوم نہیں ہو سکتا؟"

"اس کی وجہ ہے۔ میرا سراغ لگانے کے لیے انہوں نے دن رات ایک کر دیے ہوں گے۔ سکندر بخت اور محسن کے درمیان جذباتی کمزوریوں کی ایک زنجیر ہے۔ حلف در حلف۔ سکندر، محسن، گل اور پولی۔ پتا نہیں کیوں انہوں نے آخری سرے کو نہیں پکڑا۔ اگر پولی کو لے جاتے تو ہم سب دست بستہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے پر مجبور ہو جاتے۔ شاید چوہدری دلاور نے یہی سوچا کہ پہلے محسن کو پکڑتے ہیں اور اسے دھمکاتے ہیں کہ اب گل کی باری ہے اور پھر پولی کی۔"

"آخر دلاور نے یہ انتہائی قدم کیوں اٹھایا؟"

"میرا خیال ہے کہ اب وہ مایوس بلکہ DESPERATE ہے۔ اسے معلوم ہے کہ تو نے پیڈرو کا اعتراف جرم حاصل کر لیا ہے۔"

"پیڈرو کے اعتراف جرم پر مبنی کیسٹ تو خود اس نے میرے حوالے کر دیا تھا" میں نے کہا "پھر خود ہم نے اس کا اقبالی بیان ریکارڈ کیا تھا۔"

محسن بولا "دونوں میں کیا فرق ہے؟"

"بہت فرق ہے۔ پیڈرو نے ساری وارداتیں چوہدری دلاور کی رضامندی سے اور اسے ہی قاتل ٹھہرایا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ چوہدری دلاور کے خلاف جرائم کے بہت سے ثبوت اس کی ایک ڈائری میں درج ہیں۔"

"کیا یہ ڈائری والی بات دلاور کے علم میں تھی؟" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "یہ تو سیاست کا ایک مسلمہ طریق کار ہے کہ اپنے حریف کی دکھتی رگ ہاتھ میں رکھو۔ وہ ٹیبل لیڈر ہوں، سربراہان مملکت یا وزیر۔ خاموشی سے ایک دوسرے کے خلاف اختیارات کے ناجائز استعمال کے وہ ثبوت جمع کرتے رہتے ہیں جو قابل مواخذہ ہوں اور قابل تعزیر۔ تاکہ کل جب ان کے حریف یا حلیف برسر اقتدار آئیں تو ان پر کوئی فرد جرم نہ عائد کر سکیں۔ مجرم سب ہوں تو پھر کون کس کا احتساب کرتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ان کی اپنی

غلطیوں اور بداعمالیوں کا سارا حساب کسی نہ کسی کے پاس ہے اور ایک کو پکڑا تو باقی سب یہ حساب لے کر سامنے آ جائیں گے۔ پیڈرو کا کہنا تھا کہ وہ اسی لیے اب تک بچا ہوا ہے کہ اس کے پاس چوہدری دلاور کی ایسی تیسی کرنے کے لیے بہت مواد ہے اور یہ بات دلاور کو معلوم ہوگی۔"

"پھر اس نے خود پیڈرو سے یہ مواد حاصل کیوں نہیں کیا؟"

"بے وقوف آدمی! اپنے حفاظتی نظام تک کون اتنی آسانی سے رسائی حاصل کرنے دیتا ہے۔ یہ سسٹم اسی صورت میں کامیاب ہوتا ہے جب فول پروف ہو یعنی اس میں خامی کوئی نہ ہو۔ اگر دلاور کے لیے یہ اتنا آسان ہوتا کہ پیڈرو کو جب چاہے جبڑے کے شکنجے میں دبا کے اس سے کہے کہ بتا تو نے میرے خلاف کیا گولہ بارود اکٹھا کر رکھا ہے اور کہاں چھپا کے رکھا ہے تو پیڈرو ہر وقت حاضر تھا لیکن اس نے بھی استادوں سے استادی سیکھی تھی۔ دلاور سے ملاقات کرتا تو دور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہتا کہ اپنے چوہدری صاحب! ذرا خیال سے۔ اگر مجھے کچھ ہوا تو آپ کی بھی خیر نہیں۔ میں نے بڑا پکا بندوبست کر لیا ہے خیر سے۔ اتنا عرصہ آپ کے ساتھ رہ کے جھک نہیں ماری۔"

"چنانچہ اس نے پیڈرو کو تمہارے حوالے کر دیا اور پھر وہ تمہارے پیچھے لگ گیا" محسن بولا۔

"ہاں۔ وہ سائے کی طرح ہمارے تعاقب میں تھا۔ جب اسے پتا چلا ہوگا کہ پیڈرو نے ہمارے ساتھ مل کے گانا گایا ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے دلاور کو مروانے کی تحریک میں شامل ہو گیا ہے اور دلاور کے خلاف کامیابی سے استعمال ہونے والا سارا اسلحہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے تو وہ گھبرا گیا۔ PANIC کا شکار ہو گیا۔ جب تک میں فریج اور کیل کے چلنے میں تھا اسے پتا نہیں چلا۔ جب پتا چلا تو فریج وکیل غائب ہو گیا۔ اس نے مجھے جذبی میں ملک خداداد کے قتل میں پھنسوانے کی کوشش کی۔ پھر اس کے بھائی ملک نبی داد کے ذریعے ڈاکٹر یوسف کے گھر سے اغوا کرانا چاہا مگر معاملہ الٹا ہو گیا۔ وہ چاہتا ہوگا کہ پیڈرو کے اصل اعتراف جرم کا کیسٹ اور اس کی ڈائری مل جائے۔"

"اسے ڈائری کے بارے میں کیا معلوم تھا؟ اور کیسے؟"

"ڈائری سے میری مراد ہے وہ مواد جو پیڈرو نے ہمارے حوالے کر دیا تھا۔ دلاور نے دیکھ لیا ہوگا کہ پیڈرو کس طرح ہم سے تعاون کر رہا ہے۔"

"اور جب پیڈرو ایک حادثے کی وجہ سے مارا گیا۔ تو نے مانا ہی کہا جائے گا۔"

میں نے کہا "شیرانی صاحب! پیڈرو زندہ ہے۔"

محسن اچھل پڑا "پیڈرو زندہ ہے!"

"ہاں۔ وہ حرام زادہ بچ گیا تھا۔ زخمی ہو کے کسی اسپتال میں پڑا تھا اور وہاں سے اس نے مجھے شیخ نثار سے... کراچی فون کیا تھا۔"

"تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"میں گیا تھا وہ ڈائری لینے جو پیڈرو کے آفس میں تھی۔ اس کی تجوری کے راز میں" میں نے کہا "ڈائری کو چھپا کے لانا ناممکن تھا۔ میں نے اور رابعہ نے تھوڑا سا جذباتی ڈراما کیا تھا اور شیخ نثار کے پارٹنر کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ قضائے الٰہی سے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ پارٹنر کے پاس پیڈرو کا فون پہلے ہی آ چکا تھا اسپتال سے چنانچہ ذرا گڑبڑ ہو گیا اور بالآخر ہمیں وہی کرنا پڑا جو ہم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے گن پوائنٹ پر سیٹھ کو مجبور کیا کہ وہ خاموشی سے ڈائری نکال کے ہمارے حوالے کر دے اور پھر خاموش بیٹھ جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔"

"اب وہ ڈائری کہاں ہے؟"

"منظر کے پاس ہے۔ میں نے منظر کو بتا دیا تھا کہ ہم ڈائری اسے بھیج رہے ہیں۔"

محسن بولا "اس کی کوئی نقل اپنے پاس رکھی تھی یا نہیں؟"

میں نے کہا "ہاں ایک نقل میرے پاس ہے۔ بس مجھے ڈر تھا کہ وہ ڈاک میں پُراسرار طور پر گم نہ ہو جائے۔ میں نے اسے ایک کوریئر سروس سے بھیجا تھا اور وہ بھی ایک لاکھ کی انشورنس کرا کے۔"

محسن بولا "چوہدری دلاور اسی لیے تمہارے پیچھے کراچی پہنچ گیا تھا؟"

"ہاں۔ ایک ساتھ اسے بہت سی غیر متوقع ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے میں غائب ہو گیا پھر پیڈرو۔ اس کے بعد تو نکل آیا اور جس مقصد کے لیے وہ ساری تگ و دو کر رہا تھا وہ پھر بھی حاصل نہیں ہوا۔ ویسے تو کہتے ہیں کہ عجلت کار شیطان ہے مگر ہم نے بڑی عجلت میں فیصلے کیے اور بڑی عجلت میں ان پر عمل کیا اس لیے بچ گئے۔ تو چند گھنٹوں میں لاہور سے فرار ہو کے کراچی پہنچ گیا۔ میں چند گھنٹوں میں ہوٹل سے غائب ہو کے قصبے میں پہنچ گیا اور وہاں سے کولمبو چلا گیا۔ چوہدری دلاور نے ہمارے ذہن سے سوچتے ہوئے فرض کیا ہوگا کہ اب ہم لندن جائیں گے۔ اس کے خلاف ایک اہم گواہ لندن جیل میں ہے۔ ہم اس سے ملیں گے اور اسے بتائیں گے کہ اسے رہائی مل سکتی ہے۔ وہ اسی ٹریک پر ہمارا تعاقب کرتا ہوا لندن بھی پہنچے گا۔ جو بات کوئی اور نہیں سمجھتا وہ دلاور جانتا ہے اسے یقین ہوگا کہ نہ رابعہ کو پولیس نے اغوا کیا ہے نہ غالب کو۔ وہ دونوں سکندر بخت کے ساتھ روپوش ہیں اور اس مہم میں سکندر کی مدد کرنے کے لیے ہر جگہ اس کے ساتھ ہی ہوں گے۔ پولیس غالب اور رابعہ کے اغوا کے کیس میں پھنسی ہوئی ہے۔ نبی داد کے حوالات میں ہلاک ہونے کے بعد صورت حال مزید پیچیدہ ہو چکی ہے لیکن یہ خیال صرف دلاور کو آ سکتا ہے کہ اغوا کی کہانی جھوٹی ہے۔ دراصل ہم چھپ کے ملک سے ہی نکل چکے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ سکندر اور محسن اصل نام سے ولایت کی سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتے۔"

"یعنی اب وہ خود بھی کسی فرضی نام سے لندن میں ہمارے لیے چشم براہ ہوگا۔" محسن نے کہا "ہر فلائٹ دیکھ رہا ہوگا۔"

"ہاں اور اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ لندن پہنچ کے ہم کیا کریں گے۔ کس سے ملیں گے۔ وہ خود بھی تو مفرور اور روپوش ہے۔"

"اور ہم اس کی توقعات پر پورا اترتے ہوئے لندن جا کے سیدھے اس کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اگر وہ ایسا سمجھتا ہے تو پھر اس کے برے دن آ گئے ہیں۔ جب عقل ساتھ چھوڑ جائے تو وہ نہیں ہوتا جو فرد چاہتا ہے یا سمجھتا ہے کہ ہوگا۔ مثلاً اس وقت ہم لندن میں نہیں پیرس میں ہیں۔" محسن بولا۔

میں نے کہا "تیرا پیرس آنا برحق لیکن یہ بتا کہ تو انہیں ریسیو کرنے ائرپورٹ پر کیسے پہنچ گیا تھا۔"

"وہ ایسا ہے کہ تعلق نہ ہونے کے باوجود میں تیری طرف سے بے خبر نہیں تھا۔ مجھے کچھ رفتار سے اور منظر سے پتا چل جاتا تھا۔ کچھ اخبارات میں آپ کے کارنامے نظر آ جاتے تھے۔ مثال کے طور پر جو گل آپ نے راولپنڈی میں کھلایا۔ جہاں آپ پیڈرو کے ساتھ گئے تھے مرحوم وزیر خان کا مدفن دیکھنے پھر پتا چلا کہ اپنے چوہدری صاحب کو بڑی مایوسی ہوئی جب تو بری پر قبرستان نہیں گیا۔ حالانکہ وہ اطلاع بھی دے چکے تھے کہ وہ باوزیر خان مرحوم کی ہڈیاں وہ نہیں دفن کر دی گئی ہیں جہاں سے نکالی گئی تھیں پھر مجھے پتا چلا کہ ایک بڑا نامی گرامی صحافی اور ایک بڑی نامور وکیل خاتون کو پولیس مفرور تار کے گھر سے گرفتار کیا تھا مگر اب ان کا پتا نہیں چل رہا ہے۔ اخباروں میں بڑی لے دے ہو رہی تھی پولیس کے کردار پر اور ان کی نااہلی پر۔ کراچی سے میں نے منظر کو فون کیا تھا تو اس نے اشاروں اشاروں میں بتایا کہ تم پہلے کراچی میں تھے اور اب کولمبو میں ہو۔ اس نے کہا کہ اکرام شیخ نے کولمبو سے فون کیا تھا تو میں چکرا گیا تھا لیکن بعد میں سمجھ گیا کہ یہ نام تم نے استعمال کیا ہوگا۔ کولمبو والی بات بھی مجھے غلط لگی تھی۔ میں سمجھا کہ تم نے کراچی سے فون کیا ہوگا اور کولمبو کہہ دیا ہوگا۔"

"ہم واقعی کولمبو میں تھے۔ کراچی سے ویزا لینے کی کوشش ناکام ہو گئی تھی ہم بال بال بچے تھے۔"

"ہاں تو نے بتایا تھا کہ غالباً الزبتھ کے شوہر نے قونصلیٹ کو بریف کر دیا تھا کہ خیال رکھنا یہ الزبتھ کا پرانا عاشق زار نہ ہو۔"

"یہ ایک سابق رقیب ہے جو شوہر کے مرتبے پر فائز ہوا اور اس کی فتح مندی! میری شکست کی ذمے دار وہی تنگ نظر متعصب اور مغرور بیوروکریسی کا سازشی ذہن تھا جس کا اب وہ خود ایک نمائندہ ہے۔ پاکستان سے اپنی بیوی کے نام موصول ہونے والے کسی سابق کلاس فیلو کے فون اور اس کی آمد کی اطلاع سے اس کے شوہرانہ حسد اور رقابت کے جذبات پھر جاگ اٹھے ہوں گے۔ اس نے الزبتھ کو بتائے بغیر پورا بندوبست کر لیا ہوگا کہ ذلت کے ساتھ واپس وطن ارسال کیے جانے والے رقیب روسیاہ کے ناپسندیدہ خیال کا بھی اس کی پیاری بیوی کے دل سے گزر نہ ہو۔ اس کا

www.paksociety.com

نا پاک سایہ بھی لندن کی زمین پر نہ پڑے۔"

"مستقر کی بات کا غلط مطلب نکالتے ہوئے میں یہ سمجھا کہ تو بھی کہیں کراچی میں ہے۔" محسن نے کہا "اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی کراچی نہ پہنچے اور اکرام شیخ سے نہ ملے۔"

میں نے کہا "اس الو کے پٹھے کا نام مت لے میرے سامنے۔ سالا جورو کا غلام۔ بہت بدل گیا ہے۔ خون سفید ہو گیا ہے اس کا۔ تو ملا تھا اس سے؟"

"ہاں۔۔۔ اور میں نے تو بالکل لحاظ نہیں کیا۔ خوب کھری کھری سنائیں اسے بھی اور اس کی کابل بیگم کو بھی۔ دولت اور شہرت کے ساتھ عزت بھی مل گئی ہے انہیں۔ ہم جیسے لوگوں سے ملتے ہوئے گھبراتے ہیں۔"

"گھبرانے کی بات تو ہے یار۔ انہیں دلاور سے خطرہ رہتا ہے کہ کہیں اسکول میں بدمعاشی کا چکر نہ چلا دے۔"

"کابل بیگم کہہ رہی تھی کہ ہماری پوزیشن بہت نازک ہے۔ تمہاری وجہ سے انہوں نے بچوں کو اغوا کرایا۔ اسکول میں بم کا دھماکا کرا دیا یا دیواروں پر ہمارے خلاف کچھ لکھوا دیا تو ہماری گڈول ہی نہیں اسکول بھی ختم ہو جائیں گے جو ہم نے اتنی محنت سے بنائے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم بھی تمہارے دشمن تو نہیں ہیں لیکن تمہارا رویہ بدلا ہوا ہے۔ تمہاری نظریں بدل گئی ہیں۔ صاف نظر آتا ہے کہ تم کو ہمارا آنا اچھا نہیں لگا۔ تم نے سکندر کی کوئی مدد نہیں کی حالانکہ کابل آج جہاں ہے اور جس مقام پر ہے سکندر کی وجہ سے ہے۔ سکندر نہ لاتا تو وہ پڑی ہوتی بیماریوں کے کیمپ میں۔ کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا وہاں۔ اس جیسی لڑکیاں وہاں کیا کرتی ہیں جسم فروشی کے سوا۔ بس اس پر وہ چراغ پا ہو گئی اور اکرام شیخ بھی اس کی حمایت میں بولنے لگا اور اس نے گل کے بارے میں کہا کہ یہ گل بانو بھی تو ناگ جیسی تھی اور آج بھی پولیس ریکارڈ پر اس کے سب کارنامے ہیں۔ میں نے کہا کہ پولیس ریکارڈ پر تو شاید تمہاری بہن کے کارنامے بھی ہوں گے۔ نازو کو پکڑوا دو۔ مردانگی کی سند مل جائے گی۔ بس اس کے بعد گل نے کہا کہ چلو اور ہم کھانا چھوڑ کے آگئے حالانکہ اکرام نے دعوت کی تھی۔ اس کے بعد گنجائش کہاں رہی تھی کہ ہم رکتے۔ اس نے روکنے کی کوشش کی تو کابل نے کہا کہ جانے دو اور ان سے کہہ دو کہ پھر ادھر نہ آئیں تو ان کی بڑی مہربانی۔"

"اس حد تک بات بڑھ گئی تھی؟"

"میں تو غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ابھی جا کے اس کے اسکول کو آگ لگا دوں۔ جو کام دلاور نے نہیں کیا وہ میں کر دوں۔ جس چیز نے اتنا دماغ خراب کیا ہے اس کا ذریعہ نہ رہے تو دماغ درست ہو جائے گا مگر گل نے میرا غصہ ٹھنڈا کیا۔ ہم نے تمہیں ہوٹل میں جا کے دیکھا تو عجیب کہانی سنی کہ نہ کسی نے اندر جاتے دیکھا نہ باہر آتے مگر تم دونوں غائب ہو گئے۔ بس اس کے بعد ہم نے تلاش چھوڑ دی اور میں نے گل سے کہا کہ اب وہ ملیں گے لندن میں۔ براہ راست لندن آنا مشکل تھا۔ میں نے پیرس کا پتا کیا۔ مجھے یقین تھا کہ تو بھی ایسا ہی کرے گا۔ روز فون کر کے پاکستان سے آنے والی ہر فلائٹ کو چیک کرتا تھا۔ پیشتر اخبار بیچنے والے ہر فلائٹ کے مسافروں کی لسٹ دیکھ کے نام بتا دیتے تھے کہ کراچی سے یہ مسافر سوار ہوئے ہیں۔"

"مگر ہم تو کولمبو سے آئے ہیں۔"

"مجھے کراچی کی فلائٹس چیک کرتے ہوئے تین دن ہو گئے تھے۔ گل خیال آیا کہ کہیں کولمبو والی بات سچی نہ ہو۔ لندن وایا کولمبو اور پیرس۔ یہ بھی ناممکن تو نہیں بلکہ دیکھا جائے تو کراچی سے پیرس کے راستے لندن جانے کا خیال کسی کو بھی آسکتا ہے کولمبو کی کون سوچتا ہے حالانکہ وہ زیادہ آسان ہے اور زیادہ محفوظ ہے۔ گل تو میرا مذاق اڑاتی تھی کہ تمہیں الہام تو نہیں ہوا ہو گا ہیں باقاعدگی سے فلائٹ چیک کرتے ہو۔ میں اسے کہتا تھا کہ یہ الہام سے کم نہیں کہ میری چھٹی حس اور تیری ساتویں حس۔"

"میری چھٹی حس اور تیری ساتویں حس" میں نے تصحیح کی۔

"کل سے میں کولمبو کی پروازیں بھی دیکھ رہا تھا۔ آج انکوائری نے ایک نام لیا وقار یوسف ایڈووکیٹ تو میں اچھل پڑا اور میں نے گل کا ہاتھ پکڑا اور چلا کے کہا کہ "تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آگیا۔۔۔ آگیا۔۔۔ آگیا آپ کے شہر پیرس میں۔" گل سمجھی میں پاگل ہو گیا ہوں۔"

"مجھے یاد ہے بچپن کی بات۔ لاہور میں آنکھوں پر پٹی کا اشتہار اسی طرح دیا جاتا تھا۔ تانگے کے تین طرف پوسٹر لگائے جاتے تھے بڑے بڑے۔ اندر بیٹھا ہوا ایک شخص اشتہار پھینکا جاتا تھا جس پر فلم کی ریلیز کی دھماکا خیز تاریخ کے علاوہ دیگر سنسنی خیز تفصیلات اور بعض اوقات ہاتھ سے بنائی ہوئی ہیجان انگیز تصویریں بنی ہوتی تھیں۔ بچے اشتہار دیکھنے کے لیے پیچھے دوڑتے تھے اور اندر بیٹھا ہوا کوئی دوسرا شخص لاؤڈ اسپیکر پر یہی اعلان کرتا تھا "آگیا۔۔۔ آگیا۔۔۔ دلیپ کمار، نرگس، نمی اور اشوک کمار کا شاہکار۔۔۔ میلہ۔۔۔ جمعتہ المبارک کو شاندار افتتاح۔"

"گل تو قائل ہو گئی" محسن ہنسا۔ "میں نے کہا کہ یہ معاملات دل کے نہیں دماغ کے ہیں تم نہیں سمجھو گی۔ پیدائش سے اب تک ساتھ رہنے سے ہمارے دماغ ایک ہی انداز میں سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہماری مینٹل فریکوئنسی ایک ہو گئی ہے۔ اسے ٹیلی پیتھی کہو یا خیال خوانی۔ میں جانتا ہوں کہ مخصوص حالات میں سکندر کیا سوچے گا اور اس کا ذہنی ردعمل کیا ہو گا۔ وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "فرض کرو وقار یوسف کوئی اور ہوتا؟"

"تو دوسری رابعہ کہاں سے لاتا" محسن بولا "تجھے تو میں نے نہیں پہچانا اس گھنی داڑھی میں لیکن گل نے رابعہ کو تجھ سے پہلے ہی دیکھ کے چیخ مار دی تھی۔"

میں نے کہا "تو نے بھی کراچی سے پاسپورٹ بنوایا؟"

"بالکل۔ نقد مال لگایا۔"

"ویزا آسانی سے مل گیا تھا؟"

"ہاں۔ اپنی فرینچ نے وہ کام کیا جو پیسے سے نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک خاتون تھیں بڑی طرح دار۔ میں نے کچھ زیادہ ہی فرینچ دانی کی۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور بہت ہنسیں کہ تم دلچسپ آدمی ہو۔ الیرس ہے؟ درست کہ ہم اب وہ نہیں رہے جب کوئی عورت ہے کے دیکھ کر بن گئی ہے۔ اب یہ مرد کا کام ہے کہ وہ پیش قدمی کرے۔ گل بہت جل بھن رہی تھی کیونکہ کبھی تو اس کی کچھ بھی نہیں ہوتا تھا مگر ایک تو اسے جسم کے لباس پر اعتراض تھا دوسرا اس سے میری بے تکلفی پر۔"

میں نے کہا "انسان کا کیا بھروسا جب بہک جاتا ہے پھسل جاتا ہے۔"

"کیا خیال ہے؟ واپس چلیں؟"

میں نے گھڑی دیکھی "ساڑھے چار۔ کیا تجھے نیند آرہی ہے؟"

"نہیں لیکن ہماری بیویاں پھر کوئی شست لگا رہی ہوں گی۔"

"وہ بھی دیر تک باتیں کرتی رہی ہوں گی اور دیر سے اٹھیں گی۔ چل کہیں اور چلتے ہیں۔ پیرس۔۔۔ کی یہ رات پھر آئے نہ آئے۔"

"ہم واپس بھی ادھر ہی آسکتے ہیں اور جب تک ٹھہرنا چاہیں۔"

میں نے کہا "نہیں دوست۔ وقت کم ہے اور سفر طویل۔ ہم خود بھی نہیں جانتے کہ ہماری اگلی منزل کہاں ہے۔ تقدیر ہمیں کہیں بھی لے جا سکتی ہے ہمارے ارادے کچھ کام نہیں آتے۔"

"تو بلاوجہ قنوطی ہو رہا ہے۔" محسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

صبح کا اجالا افق پر نمودار ہونے لگا اور اسٹریٹ لائٹس ابھی روشن تھیں۔ ہم نے نمبری جگہ کلٹی لی اور واپس ہوئے۔ اب گاڑی محسن چلا رہا تھا۔ انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس ہم دونوں میں سے کسی کے پاس بھی نہیں تھا اور اگر کوئی پولیس مین چیک کرتا تو اپنے پاکستان کی طرح ہم رشوت دے کر نہیں چھوٹ سکتے تھے لیکن پیرس میں یا لندن میں پولیس مین اس وقت تک کسی سے تعرض نہیں کرتا جب تک کوئی غلطی نہ کرے۔ راہ چلتے لوگوں کو بلاوجہ روک کے پوچھ گچھ کرنے کا وہاں کوئی تصور نہیں۔ میں پیرس کے ٹریفک روٹس سے واقف تھا اور محسن کی نظر ہر ٹریفک سائن کو دیکھ رہی تھی۔ خطرہ صرف یہ تھا کہ ہم ون وے ٹریفک کے خلاف نہ نکل جائیں۔

ہم ہوٹل کے قریب تھے جب محسن نے ایک دلچسپ تجویز پیش کی۔ اس نے ایک جگہ سے گہری سرخ اور نفیس گلابی لپ اسٹک خریدی۔ ایک لپ اسٹک سے میں نے اپنے ہونٹ لال کیے دوسری سے محسن نے گلابی پھر ہم نے باری باری ایک دوسرے کی قمیص کے کالر اور کوٹ کے شولڈر پر لبوں کے نشانات ثبت کیے پھر ہونٹ یوں صاف کیے کہ خفیف سی سرخی اور گلابی رنگ کی جھلک باقی رہے۔ یوں جیسے یہ کسی اور کے لبوں کا رنگ ہے جو ہمارے ہونٹوں پر آ گیا۔ لپ اسٹک ہم نے کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔

ہوٹل میں کار پارک کرتے ہوئے مجھے خیال آیا "منیجر والی صاحب" یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں کہ میں وقار یوسف ہوں تو آپ کیا ہیں؟"

"سنا چیز کو عباس علی شاد کہتے ہیں۔ اے اے شاد۔ گل نے مجھے شاد جی کہنا شروع کر دیا ہے۔ رابعہ کیا کہتی ہے تجھے۔"

"اب وہ نام نہیں لیتی میرا۔ کہتی ہے نکاح ٹوٹ جائے گا۔"

"پھر تو بڑا مسئلہ ہو گا۔ منے کے ابا بھی نہیں کہہ سکتی" محسن ہنسا۔

محسن نے کاؤنٹر سے چابی لی تو اس مردنما عورت نے غور سے اس کے اور میرے لبوں کی رنگینی کو دیکھا "کون بدتمیز لڑکی تھی تمہارے ساتھ؟"

محسن نے اشارے سے کہا "شش۔۔۔ یہ بدتمیزی میں نے کی تھی" اس نے جیب سے نکال کے لپ اسٹک دکھائی اور خاتون کو حیران چھوڑ کے چل پڑا۔ یہ مسئلہ بات اس کی سمجھ میں ابھی نہیں آ سکتی تھی۔

ابھی محسن نے دروازے میں چابی لگائی ہی تھی کہ سامنے والے کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ میں اور محسن یوں چونک کر پلٹے جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔ رابعہ کے پیچھے مجھے گل کا چہرہ نظر آیا۔ ان کا طرز تبسم ان کے جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔

محسن نے دانت نکال کے کہا "ابھی جاگ رہی ہو تم لوگ۔"

میں نے مجرم لہجے میں کہا "خیر ہم آگئے۔"

وہ ہمارے کمرے میں آگئیں۔ ان کے تیور بھی جارحانہ تھے۔

گل نے کہا "شاد جی۔ کہاں سے آرہی ہے سواری؟"

محسن نے جانتے بوجھتے ہکلا کے کہا "کہیں سے نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے بس ایسے ہی۔ نیچے گئے تھے۔"

میں نے کہا "ہاں نیچے گئے تھے۔ ہم اوپر بھی جا سکتے تھے مگر وہ نیچے تھی۔"

"ہاں۔۔۔ اس کا مطلب ہے چائے۔۔۔ چائے پینے میں۔"

رابعہ نے مجھے گھور کے کہا "چائے لال چائے تھی؟"

میں نے کہا "ہاں۔۔۔ لال ہوتی ہے نا چائے۔ کشمیری چائے لال ہوتی ہے۔"

گل نے کہا "اور تم نے کون سی چائے پی بنگالی تھی؟"

"بنگالی چائے۔۔۔ تم مذاق کر رہی ہو" محسن خفت سے بولا "البتہ پان کھایا تھا۔ ہونٹ لال ہو رہے ہیں نا؟"

گل نے بگڑ کے کہا "میاں پیرس میں پان" شاد جی! کچھ شرم کرو۔ کہاں کہاں گلابی رنگ چغلی کھا رہا ہے۔"

www.paksociety.com

رابعہ بولی "تمہاری لالی جانے کبھی ادھر کو عرب بست چھلکی ہے' کون تھی یہ لال پری؟"

'لالی پری کا ہلال والا فون۔" میں نے کہا "کیا سمجھ رہی ہو تم آخر؟"

"وہی جو مجھے نظر آ رہا ہے۔" رابعہ نے بے رخی سے کہا "اس لیے تو تجھے بے پری!"

گل نے بھی ہنگامہ کیا "سچ سچ بتاؤ کس کے ساتھ رہے رات بھر۔"

میں اور محسن شکست خوردہ اور شرمسار چہرے بنا کے بیٹھ گئے اور ایک دوسرے سے لڑنے لگے "تو نے کہا تھا۔ میں نے کہا تھا۔"

"تو نے خاک کہا تھا۔ فون کس نے کیا تھا؟"

"تو نے کہا تھا کہ پتا نہیں چلے گا۔ وہ تو مری پڑی ہیں۔"

گل تو ڈک بکولا ہو گئی "ہم مرے پڑے تھے۔ منا دی' میں مار ڈالوں گی تمہیں۔ کس کو بلایا تھا فون کر کے۔ میرے ساتھ یہ سب نہیں چلے گا۔ بھول جاؤ پرانے کرتوت۔"

رابعہ سیریس ہو گئی "چھوڑو گل۔ ابھی تو پیرس پہنچے ہیں۔ لندن جا کے کیا ہو گا جہاں چار سال انہوں نے ایسے ہی گزارے تھے۔"

"تمہیں کچھ فراخ دلی کا مظاہرہ کرنا چاہیے گل۔ ہم پاکستان میں تو نہیں ہیں۔" محسن بولا "یہاں سب چلتا ہے۔"

میں نے اسے ڈانٹا "بکواس مت کر۔ تو بہک رہا ہے۔ اتنی کیوں پی تھی؟"

"پی کہاں۔ اتنی سی پی تھی۔ تھوڑی سی۔" محسن نے دو انگلیوں اور ایک انگوٹھے سے چھوٹے پیگ کی وضاحت کی۔

"عادت نہ ہو تو تھوڑی بھی بہت ہوتی ہے۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔ جتنی تو نے پی۔ اس سے ایک۔ نہیں دو پیگ زیادہ میں نے پی' اس نے پلا دی۔"

"کس نے پلا دی....؟" میں نے بوکھلا کے کہا۔

رابعہ اور گل دم بخود کھڑی تھیں اور سناٹے میں آ گئی تھیں۔ ہم نشے کی اوور ایکٹنگ کرتے تو وہ سمجھ جاتیں مگر ہم ہوش میں رہ کے بات کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ سچ بلا ارادہ ہماری زبان سے نکل گیا ہے۔ مشہور ہے کہ آدمی نشے میں ہو تو سچ بولنے لگتا ہے۔

گل ایک دم محسن پر پل پڑی "ہم نے۔ شراب بھی پی لی۔ یہاں آتے ہی حرام چیز کو منہ لگا لیا۔ ذلیل' کمینے' بے شرم۔" وہ محسن کا منہ نوچ لیتی اگر اسے رابعہ نہ پکڑتی۔ رابعہ کا ردعمل قطعی مختلف تھا۔ وہ رو رہی تھی۔

جب محسن نے ہنسنا شروع کیا اور میں نے بھی رابعہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کے قہقہے لگائے تو پہلے انہیں شک ہوا کہ یہ بھی نشے کا اثر ہے پھر محسن نے اور میں نے جیب سے لپ اسٹک نکال کے دکھائی تو انہیں اندازہ ہوا کہ یہ مذاق تھا۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد گل اور محسن کی خوب لڑائی ہوئی۔

محسن نے کہا "تف ہے تم پہ۔ ایسا سمجھتی ہو تم مجھے۔"

"ایسا بے ہودہ مذاق کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔"

"کیا بے ہودگی ہے اس میں۔ اگر ہم نے لپ اسٹک نکالی۔"

رابعہ نے آنسو پونچھ کے صرف اتنا کہا "آئی ایم سوری۔"

میں نے محسن اور گل کی موجودگی کا خیال کیے بغیر اسے بھینچ لیا۔ اس کی ڈھکوں کو' پھر گلے لگا لیا...... اس کی ساری مزاحمت رائگاں گئی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ گل اور محسن اپنی لڑائی بھول گئے اور ہمیں دیکھنے لگے۔ رابعہ خود کو مجھ سے چھڑا کے بھاگ گئی' اب وہ سخت خفا تھی۔

میں نے کہا "یہ پیرس ہے۔ یہاں سب چلتا ہے۔"

محسن نے کہا "اچھا' میں تو بھول ہی گیا تھا" لیکن گل نے اسے دھکا دے کر صوفے پر گرا لیا اور ہنستی ہوئی رابعہ کے پیچھے بھاگ گئی۔ اب ہم نے سونے کی فضول کوشش بھی ترک کر دی۔ بہت دیر ہو گئی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اب رابعہ اور گل سوئیں گی اور ہمارا سونا محال کر دیں گی۔

میں نے ناشتے سے پہلے بڑی مشکل سے رابعہ کو منایا "مجھ سے غلطی ہو گئی۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کے میں جذباتی ہو گیا تھا۔ اس بار معاف کر دو۔"

رابعہ نے کہا "آئندہ یہ سمجھنا کہ ہم پاکستان میں ہی ہیں۔ پیرس کا بہانہ کر کے کوئی ایسی حرکت کی نا۔ جسے یہاں معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ تو میں وہیں تھپڑ مار دوں گی منہ پر۔"

"چلو ایک تھپڑ کی کوئی بات نہیں' تم ایڈوانس مار لو۔" میں نے کہا تو مجھے بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ ایسا کر سکتی ہے کر نہیں سکتی۔

ایک پورا دن ہم نے پیرس میں تفریح کی نذر کر دیا۔ ہم سب ہی ایک لاشعوری خوف کے دباؤ میں تھے حالانکہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ نہ ہمارے پاسپورٹ جعلی تھے اور نہ ہم بغیر ویزا کے یہاں قانونی طور پر یہاں آئے تھے۔ صرف ہمارے نام بے شک غلط تھے مگر اس کو چیلنج کرنے والا کون تھا۔ پیرس میں کسی آشنا کے مل جانے کا امکان ہی نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں ایک ایڈوانٹیج یہ حاصل تھا کہ میں اور محسن فرنچ جانتے تھے۔ مزید یہ کہ میرا پیشہ وکیل تھا تو محسن صحافی' اور پاکستان کی طرح فرانس میں بھی یہ دونوں جیسے شمار ہوتے تھے۔ میں نے اور مجھ سے پہلے محسن نے ایئرپورٹ ہی کرنسی ایکسچینج کرائی تھی۔ جتنی رقم میرے پاس بچی تھی وہ دن قیام کے بعد واپسی کے لیے کافی تھی مگر محسن کے مل جانے سے مجموعی مالی صورت حال بہت بہتر ہو گئی تھی اور اب ہم تھوڑی سی عیاشی کے بھی متحمل ہو سکتے تھے۔

اس رات میں نے اور محسن نے سنجیدگی سے لندن پہنچنے کی راہ میں حائل عملی دشواریوں کا جائزہ لیا "بائی روڈ جانے میں قباحت نہیں۔" محسن بولا۔

"فرانس کے شہریوں کے لیے واقعی کوئی قباحت نہیں۔ یہاں والے بھی ادھر آ جاتے ہیں۔ دونوں ملک قوم نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔"

شیپانی اپنے رنگ سے پہچانے جاتے ہیں۔" میں نے کہا "ہمیں پاؤنڈ پر روک لیا جائے گا۔" محسن بولا "ہمارے فرنچ ہونے سے امیگریشن والے قانونی پابندی میں نرمی نہیں کریں گے' بغیر ویزا کے آنے جانے کی سہولت ویک اینڈ پر کام کے لوگوں کو حاصل نہیں ہے۔"

"پھر تم یاور ویزا حاصل کریں؟"

"تمہیں نے بات کرنی ہے۔" محسن بولا "ویزا کی پرابلم نہیں ہو گی مگر میرا اور تیرا نام ریکارڈ پر آ جائے گا۔ میں تو کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا مگر کراچی سے اپنی سابقہ محبوبہ دلنواز کو فون کر کے تو نے جو جذباتی حماقت فرمائی تھی اس کے بعد آپ کی پوزیشن محفوظ نہیں ہے۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کا شوہر اتنا حاسد ہو گا اور سابقہ رقیب بھی۔ تجنی کڑوا کریلا اور نیم چڑھا۔ مزید بدقسمتی یہ کہ قونصلیٹ بھی کلاس میٹ نکلا۔"

"آپ فرض کر کہ کراچی کے قونصلیٹ نے دوبارہ فون کرنے پر اس کر لیے کو یہ بتایا ہو کہ ناصر اور سکندر بخت ہی تھا جو دارِ یوسف ایڈورڈ کینٹ بن کے دوبارہ لیٹ آیا تھا۔ اس نے خود کو لیڈی الزبتھ کا کلاس فیلو بتایا مگر میں بھی بھولا نہیں ہوں سکندر بخت کو اور یہ بھی کہ ہمارے ساتھ کتنے پاکستانی لڑکے تھے۔ میں نے تھوڑی سی جرح کی تو وہ نکل گیا۔ پلٹ کے ہی نہیں آیا۔ اس سے میرے شبہات کی تصدیق ہوتی ہے۔ بس مجھ سے تھوڑی سی غلطی یہ ہو گئی کہ اسے فوراً گرفتار نہیں کرایا۔ میں نے سوچا کہ اسے لندن ایئرپورٹ پر گرفتار کر کے پہلے کی طرح واپس کیا جائے گا تو باقی معاملات سے مقامی پولیس خود نمٹ لے گی۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔ غالباً اس کی داڑھی بھی نقلی ہو گی۔ وہ گھبرا کے بھاگ گیا۔ اب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور طرف سے لندن میں داخل ہونے کی کوشش کرے۔ جرمنی' فرانس اور سوئٹزرلینڈ یا ڈنمارک سے بہت سیاح آتے ہیں مگر آسان ترین راستہ یہی ہے۔ پیرس سے لندن گیا تو مسٹر گورڈن نے امیگریشن والوں کو پہلے ہی دارِ یوسف ایڈورڈ کینٹ کا نام دے رکھا ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "میرے نام کو ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ مسٹر گورڈن کے علاوہ بھی کم سے کم دو درجن افراد ضرور ایسے ہوں گے جن کو میری رقابت کا شرف حاصل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انہیں علم نہیں ورنہ سب باری باری مجھے قتل کرنے آ جاتے۔"

محسن ہنسا "اب کیا معلوم کون کہاں ہے کس حال میں ہے۔ کون کتنے بچوں کی ماں ہے اور کس کی بیوی ہے یا محبوبہ ہے؟"

"ایسا کرتے ہیں۔ اخبار میں اشتہار دیتے ہیں کہ ہم جو فلاں فلاں سے فلاں دور میں مراسم رکھتے تھے پھر آ گئے ہیں۔ صلائے عام ہے' جس کا جی چاہے پھر دل لگا لے۔ اگر کسی نے دل نہ لگایا ہو اور کوئی رقابت یا عداوت کے ارمان نکالنا چاہے تو فنجانے مقابلے پہ۔"

محسن نے کہا "کتنا مزہ آتا اگر ہم دونوں ہی آتے۔ ان سب سے مل کر دیکھتے کہ اب ان کا جذباتی ہوٹل کیا ہوتا ہے؟"

"جذباتی ہوٹل سے آپ کو مایوسی ہو گی۔ انکھ او جھل پہاڑ او جھل اور یہ لڑکیاں دیارِ مغرب کی۔ شاید وہ ہمیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیں۔ ایسے عشق کا روگ تو صرف فلمی ہیروئن پالتی ہیں کہ... جنھی نرمی یاد کو سینے سے لگائے وہ جو علامہ صاحب نے فرمایا ہے کہ۔

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

یہ تصور کی حد تک ٹھیک ہے۔ ورنہ وقت جو گزر گیا سو گزر گیا۔"

محسن نے کہا "ایک طریقہ اور بھی ہے۔ دراصل یہ ہوسٹل ایک یونیورسل قسم کی جگہ ہے جہاں دنیا کے ہر حصے کا سیاح بھی آتا ہے اور فرانس کا رہنے والا بھی اس سرائے کو عارضی قیام کے لیے برا نہیں سمجھتا۔ مستقل ٹھکانا کسی کا بھی نہیں۔ فرنچ بولنے کی وجہ سے میری ملاقات ایک ٹرک ڈرائیور سے ہو گئی۔ وہ لندن اور پیرس کے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز میں گروسری سپلائر ہے لیکن اس نے مجھے بتایا کہ اب اس نے شادی کر لی ہے تو اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ وضاحت بھی اس نے خود ہی کر دی کہ اخراجات سے اس کی مراد ہے عیاشی کے اخراجات۔ جب تو ہی لندن اور پیرس کے درمیان ٹرک میں آتا جاتا) ہو تو کیا نیت سے آتا جاتا ہے اور اسے کچھ تفریح کی ضرورت پڑتی ہے جو پیرس میں بہت ہے مگر مہنگی ہے۔ اب وہ گروسری کے ساتھ کچھ اور سامان بھی ادھر سے ادھر پہنچاتا ہے تو عیاشی کے لیے رقم نکل آتی ہے۔ اس نے کہا کہ کوئی لندن میں اپنے بیوی بچوں کو تنگی میں نہیں دیکھ سکتا اور دراصل ذہنی عیاشی نہیں سکتا۔ ذہنی پر ان کا حق ہے۔"

میں نے کہا "برا خیال ہے نیکی کا بدمعاش ہے۔"

"جب اس نے اضافی آمدنی کا ذکر کیا تھا تو میں سمجھ گیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اس نے مجھے آنکھ مار کے اور واضح کر دیا کہ جو مال وہ ادھر سے ادھر لے جاتا ہے وہ آسانی سے اور قانونی طریقے سے سرحد پار نہیں کر سکتا۔ عرفِ عام میں اسے اسمگلنگ کہتے ہیں۔ اس کی نرائی کنڈول ہے اور کمپنی کی بھی چنانچہ اس کے ٹرک کو کبھی کوئی نہیں روکتا۔ کیا خیال ہے اگر اس سے بات کی جائے؟"

میں نے کہا "کیسی بات؟ یعنی وہ ہمیں ٹرک میں اسمگل کر دے؟"

"یہ ٹرک کوئی عام ٹرک نہیں ہے۔ چالیس فٹ لمبا کنٹینر ہے جس میں وہ ہر ہفتے سامان لاتا اور لے جاتا ہے۔ ایک ویک اینڈ سے پہلے لندن پہنچتا ہے اور ڈلیوری دیتا ہے۔ پھر دو دن چھٹی کے مل جاتے ہیں۔ اگلے دو تین دن دوبارہ لوڈنگ ہوتی ہے اور اگلا ویک

www.paksociety.com

ایجنڈ پیرس میں گزر رہا ہے۔"

"ہم اس کنٹینر میں بیٹھ جائیں۔ آلو گوبھی اور ٹماٹر کے کسی کریٹ میں گھس جائیں اور وہ ہمیں لندن کی سڑک پر اُتار کے بری الذمہ ہو جائے۔"

"ہاں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

"ایسے ہی ہوا ایسی بھی ہوگی؟"

"اگر ہم تین دن میں اپنا کام ختم کر لیتے ہیں تو ایڈی کو ہمیں واپس لانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"ایڈی اس ڈرائیور کا نام ہے۔ پورا نام ایڈورڈ ہوگا؟"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "خطرہ اس کے لیے ہے نہ ہمارے لیے۔ اسے صرف معاوضے سے سروکار ہے جو ہم یہاں طے کر سکتے ہیں۔"

"کیا وہ اس حد تک بھروسے کے قابل ہے؟ سامان کی بات اور ہے۔ ہم پاکستانیوں کو برطانیہ والے زیادہ پسند نہیں کرتے۔"

"ناپسند کرتے ہیں۔" محسن بولا "لیکن ایڈی نسلی تعصب کے خلاف ہے۔ فخریہ بتاتا ہے کہ اس کی بیوی کالی ہے اور وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ مجھے اس کی تصویر بھی دکھائی تھی۔ میں نے کہا یہ نیگرو ہے تو وہ بہت ہنسا۔ کہنے لگا کہ تم لوگ گورے رنگ پر مرتے ہو۔ گوری لڑکیاں نیگروز کے پیچھے پھرتی ہیں۔ مخالف جنس کے مخالف رنگ میں کشش ہوتی ہے شاید۔"

"وہ پوچھے گا نہیں کہ تم لوگ ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

"اس سے صاف بات کی جا سکتی ہے کہ آخر ہم معقول معاوضہ کس بات کا دے رہے ہیں۔ وہ فضول سوال نہ کرے۔ ہم قانونی طور پر آ جا سکتے تو پھر مسئلہ ہی کیا تھا۔ معقول معاوضہ اگر بہت معقول ہوگا تو اس کا معقول کا منہ بند کر دے گا۔"

میں نے کہا "اگر آپ کے ارادے غلط ہوئے۔ اس نے رقم وصول کر لی اور آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا پھر۔ جو شخص نسلی تعصب نہ رکھتا ہو۔ ضروری نہیں کہ وہ محب وطن بھی نہ ہو اور غلط قسم کے افراد کو برطانیہ اسمگل کرنے پر راضی ہو جائے۔"

"اسے قائل کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے عزائم غلط نہیں۔ کچھ مجبوریاں ہیں ایسی کہ ہم براہ راست لندن نہیں جا سکتے۔ فرض کرو ہم اسے بتا دیں کہ ہمیں لیڈی الزبتھ کے متعصب باپ نے ڈی پورٹ کرا دیا تھا اور اب اس کا شوہر مسٹر گورڈن بھی اس نسلی تعصب کے جذبات کے باعث یہ نہیں چاہتا کہ ہم برطانیہ میں داخل ہوں۔ ہم نے لیڈی الزبتھ کو اعتماد میں لینے کی غلطی کی تھی ورنہ کسی کو پتا بھی نہ چلتا اور ہم اپنا کام کر کے چلے جاتے۔ کام بہت اہم ہے۔ اس پر کسی کی زندگی کا انحصار ہے۔ ایک ٹرک ڈرائیور تو مان جائے گا کہ پاکستان سے ایک وکیل اور ایک صحافی مجرمانہ عزائم کے ساتھ لندن نہیں نکلتے۔ ہم اسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ چاہے تو لیڈی الزبتھ کے شوہر مسٹر گورڈن سے فون پر بات کر کے تصدیق کر لے۔ رفتار یوسف ایڈووکیٹ کے نام پر وہ مشتعل ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "او کے۔ یہ اسکیم قابل عمل ہے لیکن وہاں کیا ہوگا۔ وہ راضی ہو جائیں گی سبزی کی طرح جانے پر۔ اس کے علاوہ ایک مسئلہ ہوگا واپسی کا۔"

"میری تجویز یہ ہے کہ خواتین اسی ہوٹل میں قیام فرمائیں۔ لندن جانے کی زحمت نہ کریں۔ وہاں ان کا کوئی کام نہیں ہے الٹا ہمارے لیے مسائل پیدا کریں گی۔ ہمارا کیا ہے۔"

"شیرانی صاحب۔ وہ ہمیں اکیلا ہرگز نہیں جانے دیں گی۔ ہمارا سابقہ ریکارڈ اچھا نہیں اور گزشتہ رات آوارہ گردی [illegible] نے اپنے کردار کو مزید ناقابل اعتبار ثابت کر دیا ہے۔"

محسن نے چٹکی بجا کے کہا "اس کا بھی ایک طریقہ ہے۔ [illegible] کے لیے پیغام چھوڑ کے نکل جائیں گے۔"

"یعنی چپکے سے فرار ہو جائیں گے" میں نے کہا۔

"بالکل۔ وہ کیا کریں گی۔ ہمارے لوٹ کر آنے تک ایک دوسرے کو تسلیاں دیتی رہیں گی کہ فکر کی کوئی بات نہیں یا غصے میں [illegible] رہیں گی۔ جھلاہٹ اور بے بسی میں برا بھلا کہیں گی اور جب ہم گھر کو لوٹ کر آئیں گے تو بڑی زبردست لڑائی بھی ہوگی۔ لڑائی تو ہوتی رہتی ہے۔ انہیں خفا ہونا آتا ہے تو ہمیں منانا آتا ہے۔ آج تک تو نے بھی تو منا ہی لیا تھا۔" محسن نے قہقہہ مارا۔

"لندن میں تین دن کہاں رہیں گے؟"

"سو سال پہلے غالب نے پوچھا تھا۔ ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟ حالانکہ دلی میں رہنے والے اس وقت بھی کچھ نہ کچھ ضرور کھا رہے ہوں گے۔ اب آپ نے اپنے [illegible] سوال کیا ہے تو جناب کیا لندن میں جو دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ ہم دو افراد کے لیے جگہ نہیں ہوگی۔ کیا [illegible] جگہ نہیں ملے گی وہاں...."

"میرا مطلب تھا کس کے ساتھ۔ ہوٹل میں گئے تو پاسپورٹ دیکھیں گے اور اس میں کوئی اندراج نہیں ہے۔"

"بھائی بریڈ فورڈ میں لاکھوں پاکستانی اور بھارتی رہتے ہیں۔ یہ گورے بڑے [illegible] کام لیتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ [illegible] مزدوروں میں فرق کیا ہے۔ سارے خود ایک کے [illegible] ملک [illegible] تھے۔ بریڈ فورڈ کو منی پاکستان بھی کہتے ہیں۔ [illegible] ہوں گی۔ وہاں غیر قانونی تارکین وطن سے لے کر [illegible] بھی ہیں جو بھول گئے ہیں کہ وہ پاکستانی ہیں۔ ان کے [illegible] نقل وطن کر کے آئے تھے مگر وہ پیدا بھی وہیں ہوئے [illegible] گے۔ ہمارے بہت جاننے والے تھے وہاں۔"

"اب صورت حال کچھ اور ہے۔ ان سب کو علم ہے کہ [illegible] کو برطانوی حکومت نے پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ [illegible] کیا تھا۔ جو ہمیں جانتے تھے وہ سب یہ بات جانتے ہیں [illegible] ہو تو سارا لندن اپنا تھا۔"

"تو فکر مت کر۔ ایسے ہم وطن بہت ہیں جو ہماری مدد [illegible] گے اور ہمدرد ہوں گے ہمارے۔"

"ہیں۔ ان کے ماتھے پر لکھا ہوگا کہ وہ ہمدرد ہیں یا ہم خود ان سے معلوم کریں گے کہ بھائی صاحب آپ ہماری مدد کریں گے یا جوتوں کی؟"

"ایک ہستی ہے میں واقف ہوں۔ جس کے بارے میں دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ ہر محب وطن پاکستانی کے لیے اس کے گھر اور دل کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ [illegible] روشنی میں سرفہرست گورے ہیں۔ اس معاملے میں ان کے اور ہمارے رہنماؤں (انگریز پرستی) واحد قدر مشترک سمجھی جا سکتی ہے۔ بقول ان کے وہ گوروں کے ملک میں صرف اس لیے رہتے ہیں کہ گوروں کو بیچی کریں کیونکہ یہ ڈیڑھ سو سال ہمارے ملک میں ایسا ہی کرتے رہے تھے۔"

میں نے ہنس کے کہا "جتنی دیر وہ ہم میں رہے گئے گر [illegible] ہی بار رکھے تھے کیا معلوم وہ اس صلیبی جنگ میں جام شہادت نوش کر چکے ہوں۔"

"ان کا کوئی گوری نسٹین ضرور ہوگا۔ ان کا ایک حلقہ یاراں تھا جس میں سب انہی جیسے اسکیک تھے۔ روشنی میں وہ دوسرے نمبر پر بھاجت کو رکھتے ہیں۔ بلکہ ایک زمانے میں تو انہوں نے دروازے پر تختی لگا دی تھی کہ "گورے، کتے اور بھارتی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں" اس پر کسی نے مقدمہ کر دیا اور غالباً ان کی متعدد بار گوشمالی ہوئی۔ عدالت میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ آخر برطانیہ میں بھی ہوٹلوں کے باہر یہ لکھا جاتا تھا کہ کتے اور کالے کو اندر آنے کی اجازت نہیں۔ وہ ایک پبلک پلیس تھا جہاں کسی کو روکا نہیں جا سکتا۔ میں کیا اپنے گھر کے دروازے سب کے لیے کھول دوں؟ سنا ہے ان کے موقف کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔"

میں نے کہا "کون ہے یہ ہستی؟ آخر میں ان کو کیوں نہیں جانتا؟"

"وہ تجھے ضرور جانتے ہوں گے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں۔ کیونکہ تو نے جو کارنامہ سرانجام دیا ہے۔"

"ہم دونوں نے جو کارنامہ سرانجام دیے" میں نے تصحیح کی۔

"مگر یار کام تو یہ سالار کا ہی ہوتا ہے نا۔ تجھے وہ مجاہد اعظم تسلیم کرتے ہوں گے۔ یہاں اپنے پاکستان کے پہلے تو بہت لوگ ملتے تھے جو ہمارے قدر دان مہربان ہوتے تھے۔ اب یہ اتفاق ہے کہ تو ان سے نہیں ملا جیسے میں ابھی تک امریکی صدر سے نہیں ملا اور اس شخص سے بھی نہیں ملا جس نے چاند پر قدم رکھا تھا اور بہت اچھا کیا تھا کہ وہ تو نہایت فضول سی چیز ہے۔ دور کے ڈھول سہانے کی طرح دور سے دیکھتے رہو تو اچھا لگتا ہے۔ اس لیے پھر کوئی وہاں نہیں گیا۔"

"فضول باتیں چھوڑ۔ یہ بتا کہ تو نے کس کا ذکر کیا تھا۔ نام کیا ہے اس شخص کا۔"

"اس کا نام ہے حاجی عظیم بن طوطی۔ ایک اخبار بھی نکالتے ہیں جو غالباً ہفت روزہ ہے یا پندرہ روزہ۔ اخبار کا نام بھی طوطی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیا نام ہوا۔"

"اس کی لوح پر لکھا ہوتا ہے۔ کفر کے نقار خانے میں طوطی کی آواز حق۔ اپنا تخلص بھی انہوں نے اسی لیے طوطی کیا کہ ملک افرنگ میں جہاں کفر کا نقارہ بج رہا ہے طوطی کی آواز حق شہریوں کے لوگوں کے دل میں اتر جائے۔ اپنے اشعار خود فریم کرا کے رکھتے تھے کہ پان کی دکانوں پر اور ہوٹلوں میں طغروں کی طرح آویزاں کیے جائیں مگر قدرداں کاروبار کے نقصان سے ڈرتے تھے۔"

میں نے کہا "ان کا کوئی شعر یاد ہے؟"

محسن سوچ کے بولا "ہاں۔ کچھ یاد ہے ایک قطعہ"

جب منی اسکرٹ سے ٹانگیں دکھائیں میم نے
ہم نے تہبند باندھے مسلم دکھا کے یوں کہا
پہن لے شلوار قمیص ورنہ ادھر سے دور جا
اڑنے کھونٹی کیا سمجھ رکھا ہے طوطی کو گدھا"

"واہ واہ۔ کمال کر دیا۔ کھونٹی کے ساتھ گدھا۔ کیا رعایت لفظی ہے۔ شیرانی صاحب اور تہبند باندھے مسلم۔ سبحان اللہ۔ بانو لوٹ گئیں" "میرا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔" "یار تو بھی ان کے اشعار اٹھا لایا نہیں ورنہ ہم اپنے کمرے کی دیواروں کو بھی سجاتے۔"

"بس اتفاق ہے یا بدقسمتی ہے تیری" محسن بولا۔

"اگر وہ ابھی تک شہادت کے رتبے پر فائز نہیں ہوئے تو پھر سیدھے انہی کے پاس چلتے ہیں۔" میں نے کہا "یہ طے ہو گیا۔ اب تو ایڈی سے بات کر لے۔ وہ کب آئے گا۔"

"وہ آیا ہوا ہے۔ آج بدھ ہے نا۔ کل شام کو یا پرسوں صبح جائے گا۔"

میں نے کہا "اس میں بس ایک خرابی ہے۔"

"ذرا وضاحت فرمایئے۔"

"ہمارے دو دن ضائع ہو جائیں گے۔ سنیچر اتوار۔" میں نے کہا۔

"ابے گدھے یہ دو دن تو ضائع نہیں ہوں گے۔ باقی تو ہم نے گویا عمر ضائع کر دی اپنے ساتھ انہیں لا کے۔ یہ جو بلائیں چمٹ گئی ہیں ہمیں۔"

میں نے کہا "تمہیں نے چغل خوری کر دی تو مارا جائے گا بھوتنی کے۔"

"یہ عشق اپنی جگہ برقرار رہے گا اور پکا عشق ہے مگر اب تو کوئی لندن میں دو دن بھی نہ گزار سکے اور یہی ہی میں بھی۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "ہم اب شوہر ہیں۔ ذرا کی بات مت کر۔"

ایڈی سے صبح ملاقات ہوئی۔ میری توقعات کے برعکس وہ دبلا پتلا اور مختصر سا شخص تھا۔ میرا خیال تھا کہ جو شخص چالیس فٹ کا ٹرالر لے جاتا ہے اور رعایتی کی بات کرتا ہے وہ ہوگا کوئی لمبا تڑنگا

www.paksociety.com

جاندار شخص۔ تاہم اس کے مختصر وجود میں بجلی بلکہ اچھی توانائی بھری ہوئی تھی۔ محسن اسے ہمارے کمرے میں ہی لے آیا تھا۔ خواتین نے بوجوہ احتجاجی واک آؤٹ کیا۔ ایک تو وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔ بوتل ساتھ لایا تھا جس سے وہ منہ لگا کے پی رہا تھا پھر ہم فرنچ میں فصاحت وبلاغت کے دریا بہا رہے تھے جو رابعہ یا گل کے پلے ایک لفظ نہیں پڑ رہا تھا۔

"یہ تمہاری گرل فرینڈز کیوں اٹھ کے چلی گئیں؟" انڈی نے کہا۔

"یہ ہماری بیویاں تھیں۔"

"بیویاں!" اس نے بے یقینی سے کہا "تم جہاں جاتے ہو بیویوں کو ساتھ رکھتے ہو۔ بڑا حوصلہ ہے تمہارا۔ یہ دیکھو میری بیوی۔"

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ جو تصویر مجھے انڈی نے دکھائی تھی اس میں چھ فٹ لمبی اور تین فٹ قطر کی ذرکولی کے ڈرم جیسی سیاہ فام حسینہ انڈی کو اپنی بھیانک بغل میں دبوچے کھڑی تھی اور انڈی پھر بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کا بھی بڑا حوصلہ تھا۔

میں نے محسن سے کہا "یار تو نے وہ لطیفہ سنا ہے۔ کسی شخص نے ایک چوہے سے بیاہ کر لیا تھا۔"

محسن کی ہنسی چھوٹ گئی "سنا ہے انگریزی سے مت سنانا۔"

انڈی بھی ہنسنے لگا "مجھے معلوم ہے تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہی کہ اتنی بڑی اور بھاری بھرکم چیز کو میں کیسے ہینڈل کرتا ہوں۔ مگر میں تو چالیس فٹ لمبے ٹرالر کو بھی آسانی سے ہینڈل کر لیتا ہوں۔ بس اسٹیرنگ ٹھیک ہونا چاہیے اور ڈرائیو رہا ہو۔" پھر وہ اپنی مثال ..... پر خود ہی ہنسا۔

میں نے کہا "ہم نے برا نہیں مانا۔ ہم واقعی یہی کہہ رہے تھے۔"

"برا ماننے کی کیا بات ہے اس میں۔ اپنی اپنی پسند ہے کوئی موٹر سائیکل چلاتا ہے کوئی کار اور کوئی ٹرک۔" وہ پھر اچھل اچھل کے ہنسنے لگا۔

محسن نے اس سے کام کی بات کی تو وہ سیریس ہو گیا۔ اس نے پوری بات بڑی توجہ سے سنی اور پھر بولا "تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو نا؟"

میں نے کہا "ہم جھوٹ بولنے والے ہوتے تو تمہیں نہ بتاتے کہ تمہاری بیوی کے بارے میں کیا بات کی تھی۔ ہم کہہ دیتے کہ تعریف کر رہے تھے۔"

"دیکھو۔ میرا کام تم کو لندن پہنچانا ہے۔ اب لندن جا کے تم کیا کرتے ہو۔ اس کی فکر میں کیوں کروں؟"

میں نے کہا۔ "رائٹ۔ تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

وہ بولا "مگر تم نے کسی کو قتل کیا تو جیل بھی خود جاؤ گے۔ اگر پکڑے گئے تو پھر پوچھا جائے گا کہ لندن کیسے پہنچے؟"

"ہم تمہارا نام نہیں لیں گے۔"

"نام لینے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی نہیں تمہاری بات۔ میں صاف انکار کر دوں گا۔ یہ ضرور تسلیم کروں گا کہ پیرس کے ایک ہوٹل میں ان کو دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "یار ہم کسی کو قتل نہیں کر سکتے۔ بہت بزدل ہیں ہم لوگ۔"

"ایک بات بتاؤں؟ بزدل ہی قتل کرتے ہیں۔" اس نے بہت اہم انکشاف کرتے ہوئے کہا "بہادر نظر انداز کر دیتے ہیں یا معاف کر دیتے ہیں۔"

"تم تو کیا ہو؟"

"میں بہت بزدل ہوں۔" اس نے اعتراف کیا "اگر کوئی میری بیوی کو ورغلائے تو میں اسے شوٹ کر دوں گا۔"

میں نے کہا "ایسا پاگل کون ہوگا دنیا میں؟"

وہ ہنسنے لگا "اچھا اب بات کرو پیسے کی۔"

"تم خود بتاؤ۔"

اس نے سوچ کے کہا "تم دونوں پانچ ہزار فرانک دے دینا۔ آنے جانے کے۔"

وہ چونکا "ابھی واپسی کی بات نہیں کی تم نے۔"

محسن بولا "فرض کرو ہم تین دن بعد واپس آنا چاہیں۔ تمہارا ریٹرن ٹرپ ہوگا۔ اس میں جگہ ہوگی۔"

وہ دانت نکال کے بولا "پانچ ہزار فرانک ہوں تو میں اپنے تابوت میں تمہارے لیے جگہ نکال سکتا ہوں۔"

"اوکے۔ ابھی ہم پانچ ہزار فرانک دے دیں گے۔ تم کب جاؤ گے؟"

"جمعہ کی صبح۔ شام کو لندن۔ ایڈوانس نکالو۔"

محسن نے کہا "بیوی سے لا کے دیتا ہوں۔"

وہ پھر حیران ہوا "تمہارے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے۔ بڑی قابل رحم ہے تمہاری زندگی۔"

محسن نے اسے پانچ ہزار فرانک پورے ادا کر دیے "اب بتاؤ کہ ہم کیسے جائیں گے؟"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تمہیں معلوم ہے میرا ٹرالر کہاں کھڑا ہے؟"

محسن نے سر ہلایا "میرا دوست ڈر رہا تھا کہ تم اسے کسی تابوت میں بند کر کے لے جاؤ گے۔"

"بالکل ٹھیک ڈر رہا تھا۔ حالانکہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ڈبوں کے درمیان کافی جگہ ہوگی۔ سانس لینا کوئی مسئلہ نہیں۔ تم کو ذرا جم کے بیٹھنا پڑے گا پانچ چھ گھنٹے۔"

"پانچ چھ گھنٹے۔ اتنا وقت لگتا ہے پیرس سے لندن پہنچنے میں؟" میں نے لرز کے کہا۔

"ٹرالر آہستہ چلتے ہیں۔ ان کی حد رفتار مقرر ہے۔ وہ تیز نہیں ہوتے۔" اس نے پانچ ہزار فرانک جیب میں ٹھونس لیے "خدا نے میرا مسئلہ بھی حل کر دیا۔ خدا سب کا حل کرتا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارا کیا مسئلہ تھا؟"

"دو ہزار فرانک کا ایک نیکلس۔ اس کے ہیرے نقلی ہیں۔"

"بیوی کے لیے!"

"نہیں" اس نے مختصراً کہا اور خالی بوتل وہیں چھوڑ کے چلا گیا۔

انگریزی محاورے کے مطابق گیند اب ہمارے کورٹ میں تھی اور کھیل شروع ہو چکا تھا۔

میں نے انڈی کے جانے کے بعد کہا "مسٹر محسن۔ ذہن میں کوئی کنفیوژن تو نہیں ہے۔"

"کنفیوژن کیسا؟"

میں نے کہا "ہر معاملے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ روشن اور تاریک۔ کیا اس فیصلے کے روشن پہلو زیادہ ہیں۔ تاریک پہلو زیادہ قابل توجہ ہوتے ہیں۔"

"جوا کھیلنے والا کیا دیکھتا ہے؟ صرف جیت۔ اگر وہ ہار پر نظر رکھے تو جوا کبھی نہ کھیلے اور جوئے خانے سنسان ہو جائیں۔ ہار جیت تدبیر کا نہیں تقدیر کا مسئلہ ہے۔ یہ کوئی نفع نقصان کے فارمولے سے حل ہونے والا سوال ہی نہیں۔ نو رسک نو گیم۔ آپ نوے فیصد کامیابی کے یقین پر بھی ہار جاتے ہیں کیونکہ دس فیصد امکانات پر آپ اختیار نہیں رکھتے پھر کیا کریں۔ ان دس فیصد امکانات سے ڈرتے ہوئے کچھ بھی نہ کریں۔ جدوجہد چھوڑ دیں۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ اب یہ فرمائیں کہ آپ کی ذاتی عقل کیا کہتی ہے۔ اس طرح لندن جا کے خیر و عافیت کے ساتھ لوٹ آنے کے امکانات کیا ہیں؟ دس فیصد، بیس فیصد یا ففٹی ففٹی؟"

"میرا خیال ہے 'انڈی حرامی پن نہ کرے تو رسک دس فیصد ہے۔ صرف لندن جا کے آنا ہوتا تو کوئی رسک نہیں تھا مگر ہمیں وہاں کاؤنٹی جیل میں جا کے ایک مجرم سے ملاقات بھی کرنی ہے اور وہ عام مجرم نہیں ہے۔ اس کا تعلق ہے چوہدری دلاور کے کیس سے۔ چوہدری دلاور اس سے بے خبر نہیں ہے اور شاید پہلے سے لندن میں موجود ہے۔ کسی اور نام سے۔ کسی اور حلیے میں۔ وہ تاک میں ہوگا کہ کاؤنٹی جیل میں کون جارج سے ملاقات کرتا ہے۔ اگر معاملہ پاکستانی جیل کا ہوتا تو اب تک وہ رشوت دے کر جارج کو ہلاک کرا چکا ہوتا۔ ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس میں نئی شہادت سامنے آنے کے بعد اس کی نگرانی بھی سخت کر دی گئی ہوگی اور جیل حکام بھی زیادہ محتاط ہوں گے۔ ہمارا بھی اس سے ملنا آسان نہیں ہوگا اور یہ بھی امکان نہیں کہ اس ملاقات کی خبر چوہدری دلاور کو مل جائے۔ اب ترتیب وار اس مسئلے کے ہر مرحلے کو دیکھا جائے تو کتنے پیچ در پیچ ہیں۔ نمبر ون خفیہ طور پر لندن جانا اور قیام کرنا۔ نمبر ٹو لندن کاؤنٹی جیل میں جارج سے رابطے کا خفیہ ذریعہ پیدا کرنا۔ نمبر تین خفیہ طور پر جارج سے قتل کے تمام معلومات حاصل کرنا اور ان سے ریف کرنا۔ نمبر چار ممکن ہو تو دلاور کا سراغ لگانا ورنہ..... خفیہ طریقے سے واپس آنا۔ یہ ہے پورے آپریشن جارج کی حکمت عملی۔"

میں نے کہا "ویری سائنٹیفک۔ اتنے جامع تجزیے اور مکمل پلان پر میں تیری عقل و دانش کی ضرور تعریف کرتا لیکن یہ سب تو نے مجھ سے میری صحبت میں سیکھا ہے تو پھر اپنی تعریف کیا کروں۔"

"کبیر داس۔ پانچ ہزار فرانک تو بڑی دریا دلی سے پھینک دیے مگر اب مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس سے۔ پکڑے جانے سے؟"

"نہیں۔ گل سے" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا "بعد میں کیا ہوگا!"

"وہ میرا ہوگا بچے" میں ہوں۔ تیرے اسلاف کی روحیں شرمندہ ہوں گی۔ تو بیوی سے ڈرتا ہے؟"

"میرے اسلاف بھی خاندانی شرفا تھے۔ خدا کے بعد صرف بیوی سے ڈرتے تھے۔ نجیب الطرفین لوگ تھے۔"

"تو خاندانی نجیب الطرفین ضرور ہے مگر اب تیری اولاد بہرحال خبیث الطرفین ہوگی۔ جتنا حرامی پن چاہے کر۔ بیوی اپنے نصیب کو رو پیٹ کے صبر کر لے گی۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔ یہ بیویاں روٹھنے اور خفا ہونے کا ڈراما زیادہ کرتی ہیں۔ بندہ ذرا رعب سے اور اچھا اکھڑ تو فوراً کان پکڑ کے مرغا بن جائے۔ بس اس کے بعد کہاں کی ناراضی اور کیسی خفگی۔"

"یہ ہوئی نا بات۔ کامیاب ازدواجی زندگی کے اصول یہی ہیں۔ بیوی کو بے وقوف بناتے رہو اور من مانی کرتے رہو۔"

"مطلب یہ کہ بے وقوف تو عورت ہے۔ اسے مزید بے وقوف بناؤ اور عیش کرو۔" محسن نے خالی بوتل اٹھا کے کہا۔

اب یہ ایک افسوسناک اتفاق تھا یا ہماری کوتاہی تھی کہ ہم اپنی باتوں میں اتنے مگن ہو گئے تھے کہ ہمیں رابعہ اور گل کے اندر آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ میری آخری بات بھی رابعہ نے سنی اور گل نے تو محسن کو بوتل لہرا کے کسی شرابی کی طرح للکارتے سنا۔

وہ ایک دم پھٹ پڑی "بہت خوب۔ بڑے اعلیٰ و ارفع خیالات ہیں آپ کے۔"

"آپ دونوں کے" رابعہ نے کہا۔

محسن نے بوکھلا کے کہا "تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"تم ابھی کیا کہہ رہے تھے؟" گل نے چراغ پا ہو کے کہا۔

"بس..... وہ تو کسی اور کی بات بتا رہا تھا انہیں سکندر۔"

میں نے سہارا دیا "ہاں۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ ہم انہی کی بات کر رہے تھے۔ جو ایسا سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے ہم ایسے نہیں ہیں۔"

"کل میں ایک دوست کی مثال دے رہا تھا۔ بہت غلط آدمی ہے۔"

"بہت ہی غلط بات ہے۔ بھلا ہم ایسا سوچ سکتے ہیں۔ یا کر سکتے ہیں۔ تم ایسی توقع رکھ سکتی ہو ہم سے؟"

www.paksociety.com

محسن ہنسنے لگا "جناب ہم کیا نہیں کر سکتے۔ تم بتاؤ کہ ہمارے بغیر کیا کر سکتی ہو۔ فرض کرو پیرس میں راستہ بھول جاؤ۔"

"تو ہم کوئی بچے ہیں۔ آجائیں گے یہاں۔"

"اتنی خوش فہمی۔ یہاں اردو پنجابی کوئی نہیں سمجھتا۔ بھٹکتی پھرو گی شہر میں اور کوئی راستہ بتانے والا نہیں ملے گا۔"

"ہمارا ساتھ نہ ہو تو تم دونوں یہاں اکیلے نہیں رہ سکتیں۔"

رابعہ نے کہا "خیال ہے آپ کا۔ بلکہ غلط فہمی ہے آپ کی۔ رہ نہیں رہ سکتی ہو۔ چلو شرط لگالو۔ چوک میں بیٹھ کے رونا شروع کر دوگی۔ مجمع لگ جائے گا۔ پولیس آجائے گی۔"

رابعہ نے کہا "جی نہیں۔ ہم انگریزی بھی بول لیتے ہیں۔"

"انگریزی سن کے تو فرانسیسی بہرا گونگا بن جاتا ہے۔ اور اس شہر کے راستے۔ توبہ۔" محسن نے کہا۔

رابعہ بولی "شہر کے راستوں کا نقشہ بھی ملتا ہے۔ انگریزی جاننے والے بھی نایاب نہیں ہیں۔ اپنے پاکستانی یا بھارتی نظر آجاتے ہیں۔"

"پھر یہاں خطرہ نمبر ہے اکیلی عورت کو۔" گل نے کہا۔

محسن بولا "ہم بار بار کہہ رہے ہیں کہ اب دونوں کو کہ اکیلی رہ سکتی ہیں۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ بڑی حوصلہ مند اور بہادر ہیں دونوں۔"

رابعہ اور گل کے ذہن میں یہ خیال کیسے آسکتا تھا کہ ہم نے جو کہا ہے وہ کر کے بھی دکھا سکتے ہیں۔ یہ تو بات برائے بات تھی لیکن ہم نے باتوں باتوں میں بعد کے حالات کا قابل قبول جواز پیدا کر لیا تھا۔ اب ہم دو تین دن کے لیے غائب ہونے سے پہلے یہ کہہ سکتے تھے کہ اچھا ہم چیلنج دے رہے ہیں۔ یہ تمہاری غلط فہمی تھی تو اب دو تین دن اکیلے رہ کے دکھاؤ۔ ظاہر ہے یہ مشکل نہیں تھا مگر جذباتی طور پر رابعہ یا گل کے لیے ناقابل تصور۔

ہم نے ایک اور دن سیر سپاٹے میں گزارا اور خاموشی سے اپنے منصوبے پر بھی کام کرتے رہے۔ ابھی سب نیا نیا تھا۔ بے فکری اور آزادی کے چند دن بہت پرلطف تھے اور ہم نے بھی کہہ دیا تھا کہ مسئلے مسائل کی بات کوئی نہیں کرے گا۔ جو ہونا ہے اپنے وقت پر ہوگا۔ اس کے بارے میں سوچ کے پریشان ہونے اور تفریح کا مزہ کرکرا کرنے سے کیا فائدہ۔ پیرس کی رنگینی اور چکاچوند نے رابعہ اور گل کو بھی سب کچھ بھلا رکھا تھا۔ انہیں نہ گھر کی یاد تنگ کر رہی تھی نہ وطن کی اور نہ ابھی وہ وقت آیا تھا کہ وہ بور ہو کے HOMESICK محسوس کریں۔ وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ رہتی تھیں مگر بعض اوقات ہم انہیں تنہا بھی چھوڑ کر نکل جاتے تھے خصوصاً رات کے وقت۔ انہوں نے بھی برا ماننا چھوڑ دیا تھا کہ چلو دو چار دن آزادی کے نام پر یہ آوارہ گردی بھی برداشت کرلو۔ واپس جا کے تو پھر وہی ہوں گے۔ وہی شب و روز ہوں گے۔ وہی ان کی چاہت کے انداز۔

رابعہ اور گل کو شاید یہ خیال تھا کہ پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے ہم پرانے دوستوں سے ملتے ہیں اور ان دوستوں میں بھی انہیں تلاش کرتے ہیں جن کے ساتھ بقول شاعر دل لگایا تھا دل لگی کے لیے۔ افروزہ جیسی یہاں بھی ہوں گی جن سے ہم نے فلرٹ کیا تھا۔ یہاں کی روایات اور معاشرتی قدریں ایسی تھیں کہ سرِ راہ گزر کسی سے پھر ملاقات ہو جائے جو کبھی جانِ آرزو اور حاصلِ تمنا تھی اور جس نے کبھی وفا کے ساتھ عمر بھر ساتھ نبھانے کی قسم کھائی تھی تو وہ فطری حیرت اور خوشی کے جذبات کا اظہار کرتی ہوئی یوں بے اختیار گلے ملے گی جیسے ہماری رومانی فلموں کی بچھڑی ہوئی پیار لوٹ آنے والے ہیروئن شوہری بابو سے بھی نہیں مل سکتی۔ ہنستے ہوئے اپنے شوہر سے بھی ملوائے گی کہ ڈارلنگ یہ ہے وہ شخص جس کے بغیر میرا خیال تھا کہ میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہ بھی مرتا تھا مجھ پر۔ اور قہقہہ لگا کے شوہر بھی ہاتھ ملائے گا۔ جوانی میں ہم سب ایسے ہی ہوتے ہیں پھر وہ اخلاقاً کہیں گے کہ کسی دن آؤ۔

ہم ایسے نہیں تھے اور نہ پیرس میں ہم نے کسی سے دل لگایا تھا دل لگی کے لیے۔ ہم ایڈی سے ملتے تھے اور فرار کی راہ میں حائل دشواریوں پر غور بھی کرتے تھے لیکن ہمارا زیادہ وقت ایڈی سے لندن کے بارے میں معلومات حاصل کرتے گزرتا تھا۔ ہم نے اسے بتادیا تھا کہ لندن جانے کا مقصد جیل میں بند ایک بے گناہ شخص سے ملاقات کرنا ہے جو ناکردہ گناہ کی پاداش میں عمر قید کاٹ رہا ہے۔ خوش قسمتی ہے کہ الیکٹرک چیئر پر نہیں بٹھایا گیا تھا ورنہ ہم اس کافر کے لیے تو دعائے مغفرت بھی نہ کر سکتے۔ ہمارے پاس کچھ ایسے شواہد تھے جن کی بنا پر ہم اسے بری کرا سکتے تھے۔ وہ کون ہے؟ اس کا نام کیا ہے۔ جرم کیا تھا؟ یہ سب بتانے سے ہم نے معذرت کرلی تھی اور ایڈی نے بھی اصرار نہیں کیا تھا۔ جو بات پرائیویٹ ہے! افشائے راز میں خرابی کا اندیشہ ہے اس کو جاننے پر اصرار کرنا بھی نہیں چاہیے۔ یہ ایک [illegible] کا ایمانی رویہ تھا۔ اس نے ہمیں خاصی مفید معلومات فراہم کردیں اور ہم پر اتنا اعتماد کرنے لگا کہ اس نے اپنے گھر کا پتا اور فون نمبر بھی دے دیا۔

"ضرورت پڑے تو تم کال کر سکتے ہو۔ میری بیوی تمہاری بہت مدد کرے گی۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"یعنی تم اپنی بیوی کو بتاؤ گے ہمارے بارے میں؟"

"آف کورس۔ اس سے میں کچھ نہیں چھپاتا۔ آخر وہ شریکِ حیات ہے۔"

"لیکن ایک عورت ہے۔"

"پھر کیا ہوا۔ شریکِ حیات مرد تو نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا۔ عورتیں ذرا پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "وہ ایسی نہیں ہے۔"

"کیا خوش قسمتی ہے مرد اور تمہاری شوہروں کو۔"

"ایسی بات نہیں۔ اسے میں جانتا ہوں۔ مجھ میں اور اس میں کوئی فرق مت سمجھو۔"

"ترقی کی بات نہیں۔ تم ایسے ہی ہو۔ دونوں ایک سے بڑھ کر ایک چکر باز۔ اس وقت بھی اور کیا کر رہے ہو۔ بے وقوف بنا رہے ہو ہمیں دوست کی مثال دے کر۔"

رابعہ نے طنز سے کہا "دونوں ایک دوسرے کی مثال دے رہے ہیں گل۔ ایک سکندر کا دوست۔ دوسرا محسن کا۔ بے وقوف ان کی بیویاں جن کو یہ مزے سے بے وقوف بنا کے من مانی کرتے پھرتے ہیں۔"

محسن نے افسوس سے سر ہلایا "اتنا عدم اعتماد۔ وہ بھی اپنے اکلوتے خاوند مجازی پر۔ توبہ توبہ۔"

میں نے کہا "صریحاً کفر کے زمرے میں آتا ہے۔ بلکہ مجھے تو علما سے رجوع کرنا پڑے گا فتوے کے لیے کہ کیا حکم ہے اس عورت کے لیے جو جاتی ہوئی رو اس اپنے نیک چلن پاکباز، معصوم اور مومن شوہر کو وہ بالغ گواہان کی موجودگی میں جھوٹا، فریبی، بدکردار کہے۔"

"ارے ہو۔ نیک چلن اور پاکباز..." گل نے طنز سے کہا۔

"معصوم اور مومن اور بھولے لوگ ایسے ہوتے ہیں؟" رابعہ نے کہا۔

محسن بولا "خاصا سنگین شرعی مسئلہ ہے یار۔ شاید یہ صدقِ دل سے معافی مانگ لیں اور اللہ سے توبہ کرلیں تو ایک بار کہنے سے نکاح نہ ٹوٹتا ہو۔"

"ورنہ کیا تو جانا ہوگا اس میں۔" میں نے دونوں سے کہا۔

"چلو زیادہ ڈراما مت کرو۔ نکاح کوئی ریت کی دیوار نہیں ہے کہ بات بات پر ٹوٹ جائے گی۔"

"ہاں۔ آر سی سی اسٹرکچر ہے۔ ٹکریں مارتے رہو۔ اپنا ہی سر پھوٹے گا۔" رابعہ بولی "قسم کھا کے کہو کیا بات کر رہے تھے؟"

"قسم کھاتے ہیں جھوٹے لوگ۔" محسن بولا۔

میں نے بھی کہا "ہاں۔ ہم کیوں کھائیں اور تم کیا ہو آخر؟ عدالت والے جس کے سامنے حلفیہ بیان دینا پڑے۔ ہم ملزم ہیں؟"

محسن نے کہا "تمہیں ہماری قسم ہے جو اپنی قسم دے کے سچ بولنے کو کہا۔"

میں نے قہقہہ مار کے ہاتھ ملایا "کیا زبردست کا تیر پھینکا ہے یار۔ لاجواب کردیا دونوں کو۔"

محسن نے کہا "اس کے بعد یہی ہونا تھا۔ مجھے معلوم ہے۔"

گل نے چڑ کر کہا "دیکھا رابعہ۔ سچ بولنا نہیں چاہتے۔ الٹا ہمیں قسم کا پابند کردیا۔"

"بہت چالاک لوگ ہیں۔ خیر پتا چل گیا کہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ خود ہی مان لیا کہ ہم سے سچ مت پوچھنا۔"

میں نے کہا "رابعہ تمہیں پیرس کیسا لگا۔ بے مقصد گھومتے پھرنے کی جگہ۔"

گل نے کہا "بڑی بدل رہے ہو۔"

میں نے کہا "چلو یہی سمجھو کہ اس شہر کا رازفی جواب نہیں۔ ایک ہفتے میں تو کوئی گھوم سکتا ہے۔ دیکھ نہیں سکتا۔"

رابعہ نے کہا "یہ تو ہے ایک بالکل نئی دنیا ہے۔"

گل نے کہا "بالکل خواب کی طرح لگتی ہے۔ مجھ جیسی عورت خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ کبھی میری زندگی میں ایسا دن بھی آئے گا کہ میں جہاز میں بیٹھ کے ولایت پہنچ جاؤں گی۔ سات سمندر پار۔ سوچتی بھی کیسے۔ دو زندگی ہی اور تھی۔ لاہور، کراچی یا راولپنڈی بھی میرے لیے دوسری دنیا کے شہر تھے۔ اللہ کتنا مہربان اور غفور الرحیم ہے۔ اس نے تاک مٹی کو گل بنا دیا۔ ایک گھر دے دیا۔ تحفظ دے دیا۔ اس کو پیرس پہنچا دیا۔"

رابعہ بھی جذباتی ہو گئی "سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا۔ ایک فضول بے رنگ اور یکسانیت سے بیزار کر دینے والی معمولی زندگی تھی۔"

میں نے محسن کو دیکھ کر آنکھ ماری "خیر اب اس وقت کو یاد کرنا۔ ہم کیا کم خوش قسمت ہیں۔"

محسن نے جذباتی لہجے میں کہا "اور میں کیا کہوں۔ مجھے دوسری زندگی ہی گل کی دعاؤں کے طفیل ملی ہے۔ ورنہ میری تو کئی بار تو مایوسی اور دیوانگی کے بے کراں سمندر میں حالات کے رحم تھپیڑوں میں ڈول رہی تھی۔ اپنا سب کچھ کھو دینے کا احساس اتنا حوصلہ شکن تھا کہ میں خودکشی کرکے اس بے مصرف زندگی کا خاتمہ کرلیتا لیکن گل تمہاری محبت نے مجھے ایسے سنبھالا۔"

میں نے دل ہی دل میں اس جذباتی تقریر پر محسن کو داد تحسین پیش کیا۔ خواتین کا موڈ بدل گیا تھا۔ "جیسے کوئی پاگل کتے کے گلے میں پٹا ڈال دے اور اس کی زنجیر اپنے ہاتھ میں لے لے۔" میں نے رومانٹک لہجے میں کہا۔

گل ہنس پڑی "کیسی مثال دی۔"

محسن بولا "یار تجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ اتنی جلدی بول پڑے۔ میں کیا زبردست ڈائیلاگ بول رہا تھا ابھی۔"

"بار ان پر رقت طاری ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہیں ڈوب نہ جائیں فرطِ جذبات میں۔ یہ کون سی فلم کے سین کے ڈائیلاگ تھے؟"

"اس فلم کے جو میں بناؤں گا۔ کہانی، منظرنامہ، مکالمے، ڈائریکشن۔ سب میری۔ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی طرح یہ صدی کی عظیم ترین رومانی فلم ہوگی۔ شیروانی ناک مٹی امانت عشق کی لافانی داستان۔"

گل ہنسنے لگی "ہم تو ہیرو بھی بن جاتا۔"

"ڈبل رول بھی کر سکتے ہو تم بالکل نیا آئیڈیا ہوگا۔ ہیرو اور..." میں نے کہا۔

"ولن کا بھی" گل نے کہا۔

"نہیں بھئی۔ بیک وقت ہیرو اور ہیروئن کا۔ ماشاء اللہ خوبصورت ہے۔ صفات بھی دونوں کی ہیں۔"

رابعہ بولی "اور ایک دفعہ کر بھی چکے ہیں زنانہ رول۔"

www.paksociety.com

مقصور میں تو بہت فرق نظر آتا ہے۔ خصوصاً وزن اور رنگ میں۔"

ایڈی ہنسنے لگا "اور جنس میں فرق نظر نہیں آتا؟"

میں نے کہا "خیر اس چیئر مین کا شکریہ۔ اب یہ بتاؤ کہ روانگی کیسے اور کب ہوگی؟"

اس نے کہا "تم صبح میرے ساتھ چلو۔ میں تم کو لوڈر کی حیثیت سے لے جاؤں گا۔ تم سامان لوڈ کرانے میں مدد کرو گے؟"

میں نے کہا "اب تم مزدوری کراؤ گے ہم سے۔ کیا صورت سے اور حلیے سے ہم لوڈر لگتے ہیں؟"

"صورت سے چارلس کب شہزادہ لگتا ہے" وہ بولا "رہا حلیہ تو کیا تم ایسے حلیے میں جاؤ گے؟ تمہارے سوٹ ٹائی اور کپڑوں کا ستیاناس ہو جائے گا۔ میں تم کو ڈانگری دوں گا اوور آل۔"

"لندن میں ہم ڈانگری پہن کے وارد ہوں گے" محسن رونی شکل بنا کے بولا۔

"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ دن میں جب کام کا وقت ہوتا ہے تو ڈرائیور سے لے کر کمپنی کا چیف انجینئر تک ڈانگری پہنتے ہیں اور ڈانگری صرف لوڈر کا لباس نہیں۔ مکینک الیکٹریشن سے لے کر خلائی اداروں کے انجینئر اور نیوکلیئر پاور پلانٹ کے چیف تک سب کے لیے کام کا ایک ہی لباس ہے۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک کہتے ہو تم۔ اچھے اور معقول کپڑے ہم ساتھ رکھ لیں گے ایک الگ سوٹ کیس میں۔"

"وہ تمہاری مرضی۔ اتنے بڑے کنٹینر میں بہت جگہ ہے ورنہ لندن جیسے شہر میں تو کسی عام ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں سستی خریداری کرے یا ہیروڈز HARRODS میں گھس جائے۔ دس منٹ بعد جوتے سے ٹائی تک بدل کے باہر آ سکتا ہے۔"

رات کو رابعہ پر یادِ وطن کا پہلا دورہ پڑا "تین دن ہو گئے ہیں یہاں۔"

میں نے کہا "تین دن دس گھنٹے... اٹھارہ منٹ۔"

محسن بولا "نہیں ہو گئے چھ دن۔ سترہ گھنٹے انیس منٹ۔"

"بس اب چلو آ گئے۔" رابعہ بولی۔

"سوائے جہنم کے۔ ہر جگہ ہم ہی آ گئے ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں لیڈیز فرسٹ کے اصول پر عمل کرنے والے انگریز شوہر بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور کریں گے۔"

"ہر بات مذاق میں ٹالنے کی نہیں ہوتی" رابعہ بگڑ گئی "ہم یورپ کے تفریحی دورے پر نہیں آئے ہیں۔"

محسن نے کہا "جس کو انگریزی میں ہنی مون کہتے ہیں۔ بالکل ٹھیک" آگے بولو۔"

"جس کام سے آئے ہیں وہ کرو اور چلو واپس۔" رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا "کیوں دل نہیں لگا یہاں؟"

"یہاں دل لگانے نہیں آئے تھے ہم اور کوئی ضرورت بھی نہیں اس کی۔"

میں نے کہا "سوچو کہ لوگ کتنے جتن کرتے ہیں یہاں آنے کے لیے اور کتنی مشکل سے انھیں سیٹل ہونے کا موقع ملتا ہے ایک تم ہو کہ خوش قسمتی کو ٹھکرا رہی ہو۔ کفرانِ نعمت۔"

"میرے لیے میرا وطن ہی نعمت ہے اور وہی زندگی اچھی ہے جو اپنوں کے درمیان گزرے" رابعہ نے کہا۔

"بھئی ہم کیا غیر ہیں۔ دائیں طرف میں۔ سامنے محسن، بائیں جانب گل" پیچھے بولی۔ "تم واقعی اپنوں کے درمیان ہو" میں نے کہا "بس اپنے چوہدری دلاور صاحب نہیں ہیں تو تمہیں پیرس بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ نمک کے بغیر قورمہ بریانی پھیکا سا۔"

"بھاڑ میں جائے چوہدری دلاور۔"

"واہ۔ کیا جاہل عورتوں والا جملہ کہا ہے۔ وہ چاہتا ہے ہم بھاڑ میں جائیں۔ بھاڑ ایک ہے لیکن انشاء اللہ تمہاری خواہش پوری ہوگی۔"

"لندن میں کتنے دن لگیں گے؟" گل نے کہا۔

"میں نے وہ لوگ بھی دیکھے ہیں جن کو لندن میں برسوں لگ گئے" محسن نے کہا "محاورہ تھا کہ ساری عمر دلی میں رہے کیا بھاڑ جھونکا۔ تو لندن میں ساری عمر بھاڑ جھونکنے والے نہیں ہیں۔"

رابعہ نے اٹھتے ہوئے کہا "چلو گل۔ یہ لوگ اس وقت سیریس نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "کیا واپس پاکستان جا رہی ہو۔ اچھا بھئی خدا حافظ۔ رات نہ ہوتی تو تمہیں ائیرپورٹ چھوڑنے بھی جاتے مگر ابھی تو نیند آ رہی ہے۔"

"سیریس تو ہم سوتے میں بھی نہیں ہوتے۔ بڑے مزاحیہ خواب دیکھتے ہیں۔ جیری لوئیس اور اپنے رنگیلا کی فلموں کے لوٹے۔"

"ٹوٹے تو میں تمہارے کروں گی کسی دن۔" گل نے ہاتھ سے قیمہ بنانے کا تصور پیش کیا۔

محسن نے قہقہہ مارا "ہم بیسے نہیں۔ بکرے مار کے کھو۔ اوئے شیردائی ہمیں تیرے ٹوٹے کر کے کوٹ بنا رہیاں گی۔ ہائے آئے۔"

"تم سلطان راہی کا زنانہ ایڈیشن بن سکتی ہو" میں نے کہا "بس گنڈاسا ذرا بھاری ہوتا ہے۔ وہ چھری لہرا دینا جس سے شوہروں کا چارا کاٹتی ہو کچن میں۔ کدو کریلے بھنڈے بینگن وغیرہ۔"

وہ پھر بیٹھ گئیں "اچھا اب تو ہم بھی فیصلہ کر کے ہی جائیں گے۔"

"تم اتنے ڈھیٹ ہو گئے ہو۔"

محسن نے اس کی بات کاٹی "ہم بڑے پرانے ڈھیٹ ہیں خاتون۔ جیسے خاندانی رئیس ہوتے ہیں نا ویسے ہی۔"

میں نے کہا "تو کے سویٹ ہارٹ۔ ہم کل جائیں گے لندن۔"

محسن نے بھی سر ہلایا "چلو ٹھیک ہے۔ فیصلہ ہو گیا اب جاؤ۔"

"پھر ٹال رہے ہو" رابعہ بولی "قسم کھاؤ۔"

"لے آؤ ایک پلیٹ میں رکھ کے۔ بڑی بھوک لگی ہے" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "یار یہ رو پڑے گی تو پھر ناک رگڑتے نظر آؤ گے زمین پر۔"

رابعہ کی صورت رونے والی ہو رہی تھی "میری قسم کھا کے کہو۔"

میں نے کہا "جان۔ تمہاری قسم۔ تمہارے پیر و رخِ صبح روشن، لبِ لعلیں کی قسم۔ تمہارے عارض و گیسو کی قسم۔ کل ہم جا رہے ہیں صبح صبح۔"

محسن چکر میں پڑ گیا "ساری قسمیں تو کھا گیا۔ میں کیا کھاؤں اب؟ خیر گل۔ تمہارے ٹخنوں کی قسم۔ ٹخنوں کی قسم، تمہاری بھی ناک کی قسم اور تمہارے سر کی جوؤں کی قسم۔ ہم صبح لندن جائیں گے۔"

"خواہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے یعنی لندن کی جگہ آ جائے لاہور اور سور کی جگہ چلا جائے لندن۔ آندھی طوفان زلزلہ سیلاب کوئی ہمارا راستہ نہیں روک سکے گا۔"

وہ مسکراتی ہوئی اٹھ گئیں اور سونے چلی گئیں تو میں نے محسن سے ہاتھ ملایا "کیسی گولی دی ہے دونوں کو۔"

"جھوٹی قسم بھی نہیں کھائی۔"

رابعہ اور گل ایک دم اندر گئیں۔ وہ باہر نکل کے دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ دھماکے سے میں اور محسن اچھل پڑے۔

"تو گولی دی ہے آپ نے" گل نے دانت پیس کے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ جب قسم کھا لی تمہاری پھر بھی اعتبار نہیں" میں نے اپنے حواس بحال رکھے۔

رابعہ بولی "پھر وہ دونوں کون ہیں جن کو گولی دے کے بڑے خوش تھے۔"

"یار، تم تو بچے جھاڑ کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ اب اور کیا کہیں ہم۔"

"صبح دیکھ لینا۔ جو کہا ہے وہ کر کے دکھائیں گے۔" محسن بولا "چلو اب نکلو یہاں سے۔ ہمیں بہت نیند آ رہی ہے۔"

"بلکہ مجھے تو آ گئی ہے" میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور خراٹے لینے لگا۔

رابعہ اور گل مطمئن کیسے ہو سکتی تھیں مگر گل کو بوبی کی فکر لاحق تھی۔ جو کمرے میں اکیلا سو رہا تھا۔ وہ رابعہ کو بھی لے گئی "ٹھیک ہے کل دیکھوں گی میں کہ تم کیسے نہیں جاتے لندن۔"

رابعہ نے بھی کہا "ہاں۔ اگر کل بہانہ کیا تو ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"افوہ رابعہ بی بی۔ کیا لکھ کے دے دوں کہ ہم صبح لندن جائیں گے؟ یہ بڑی سخت توہین ہے کہ ہمارے زبان پر اعتبار نہ کیا جائے۔ آج تک میں نے کسی کے ٹخنوں گوڈوں کی قسم نہیں کھائی اور بھگا ذالی ہو اں پھر بھی نہیں مانتی۔ تف ہے میری اوقات پر۔"

"اور گل کے سر کی جوؤں پر۔ ان کی قسم بھی کھائی تھی تو نے۔" میں نے سوتے میں بڑبڑا کے کہا۔

اندر سے کنڈی لگا کے اور لائٹ بجھا کے محسن بھی لیٹ گیا تو میں نے کہا "اب آہستہ بولنا" کہیں وہ پھر نہ کھڑی ہوں دروازے سے کان لگا کے۔"

"کھڑی رہیں۔ ہم فریج میں بات کریں گے۔"

"ایڈی تو شاید دیر سے اٹھے گا اور دیر سے جائے گا" میں نے کہا۔

"جس دن روانگی ہو وہ سات بجے لوڈنگ شروع کر دیتا ہے۔"

"یعنی ہم چھ بجے نکل سکتے ہیں۔"

"چھ سوا چھ بجے۔ پانچ گھنٹے بعد" محسن بولا "گل تو آٹھ نو بجے سے پہلے اٹھنے والی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "رابعہ اٹھے گی اپنے ٹائم پر نماز پڑھنے کے لیے۔"

"نماز پڑھ کے پھر سو جائے گی۔ صبح ناشتے سے پہلے باہر نہیں آئے گی ہمیں جگانے کے لیے۔"

میں نے کہا "تو نے بھی جھوٹی قسم کھائی۔ میرے ساتھ۔"

"لفظی اعتبار سے وہ جھوٹ نہیں تھا۔ معنوی اعتبار سے بھی میں اسے غلطی نہیں سمجھتا۔ رابعہ یا گل نے غلط سمجھا تو میرا کیا قصور۔ ہم کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ ہم دونوں کے لیے۔ انہوں نے ہم کا مطلب نکالا ہم سب۔"

میں نے کہا "اللہ میاں نیت کو سمجھتے ہیں۔ یا محبت کو لفظوں کی ہیرا پھیری سے کام نہیں چلے گا۔"

"ہم نے کون سی اللہ میاں کی قسم کھائی تھی یار۔ جو قسمیں ہم نے کھائی تھیں ان کو توڑنے کا کفارہ بھی نہیں ہوگا۔"

"کفارہ تو واپس آ کے ادا کرنا پڑے گا جوتی کے۔ آتش فشاں بنی ہوئی ملیں گی دونوں۔"

"اللہ ہمیں اپنی امان میں رکھے۔ شب بخیر" محسن بولا اور کروٹ بدل کے سو گیا۔

صبح چھ بجے میں نے ایک رقعہ لکھا۔

"اپنی قسم پوری کرنے کے لیے "ہم" جا رہے ہیں۔ لندن میں دو تین دن لگ جائیں گے۔ گھبرانا اور رونا نہیں۔ بس اللہ سے دعا کرنا کہ تمہارا سہاگ سلامت رہے تاکہ دودھوں نہانے اور پوتوں پھلنے کی دعا لا حاصل نہ رہے۔ ایک چیلنج تم نے بھی دیا تھا کہ ہمارے بغیر یہاں اکیلی رہ سکتی ہو۔ ہم یہ پورا کرنے کا موقع فراہم کر رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ لندن میں کوئی زنانہ کام نہیں اور ہم تمہیں یہاں بوبی کے ساتھ زیادہ محفوظ تصور کرتے ہیں۔ ہمارے لیے تم جیسا نہ ہے اور نہ ہوگا۔ نہ لندن میں نہ کوہ قاف پر۔ پھر بھی عام بیویوں کی طرح تم شک اور حسد میں اپنا فرض ... کرنا چاہو کہ ہم جنت کے میوے چھوڑ کے سبزی منڈی میں گوبھی گاجر (جاری ہے)

www.paksociety.com

بیگمیں) پر منہ مارتے پھریں گے تو تمہاری مرضی۔ چلتے پھرتے اپنا وقت گزارو یا جتنے کھیلتے۔ کام ختم ہوتے ہی ہم ہنستاتے ہوئے اصطبل کی طرف دوڑیں گے۔

تمہارے گھوڑے گدھے۔"

یہ رقعہ ہم نے لفافے میں بند کیے بغیر ایڈی کو دیا کہ وہ نیچے استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی خوفناک حسینہ کے سپرد کرے اور اسے تاکید کرے کہ ٹھیک دس بجے رابعہ اور گل کے کمرے میں پہنچا دے۔ ایڈی کے اس سے دوستانہ بلکہ غائبانہ تعلقات تھے۔ اس کے غائب ہونے کا تعلق ایڈی سے ہوتا تھا۔ محسن کو بجا طور پر اعتراض تھا کہ آخر ایسی ڈراؤنی چیز استقبالیہ پر کیوں رکھ دی گئی ہے۔

میں نے کہا "اس کرائے میں آپ کا استقبال حسینۂ عالم نہیں کر سکتی۔"

"پھر وہ خود کو ایسا سمجھتی کیوں ہے؟"

ایڈی نے کہا "یہ اس کا اور ہر عورت کا پیدائشی حق ہے۔"

"وہ استقبال نہیں کرتی دہشت زدہ کرنے پر مامور ہے۔ مسکراتی تک نہیں۔"

میں نے کہا "اس کرائے میں یہی ہو سکتا ہے۔"

ایڈی نے کہا "وہ میرے لیے مسکراتی ہے سو فرانک میں۔"

"نہیں بھیانک لگتی ہوگی" محسن پُرخیال لہجے میں بولا "پتا نہیں تم اسے کیسے قبول کر لیتے ہو۔"

"میں وسیع القلب شخص ہوں۔ صرف یہ دیکھتا ہوں کہ نبض چل رہی ہے یا نہیں" ایڈی نے اپنے فلسفۂ حیات کا نچوڑ پیش کر دیا "اس کے علاوہ صرف صورت کے نقوش کو دیکھ کر سالم عورت کو مسترد کر دینا ایسا ہی ہے جیسے عنوان پسند نہ آنے پر ناول پڑھے بغیر چھوڑ دینا۔"

میں اس کی فراخ دلی کا قائل ہو گیا۔ ظاہر ہے اس خوش قسمت شخص کے لیے دنیا کی ہر عورت میں حُسن تھا اور اسے بدصورتی دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ وہ خوش رہنے کا سلیقہ جانتا تھا اور خوش رکھنے کا بھی۔

ناشتا کرتے ہوئے میں نے ڈرتے ڈرتے وہ سوال کیا جس کا خیال مجھے دہلا تا تھا۔ "کیا تم یہ گروسری آئٹم باکس میں لے جاتے ہو۔"

"جیب میں بھر کے تو نہیں لے جا سکتا۔"

"میرا مطلب تھا۔ کیسے باکس ہوتے ہیں وہ؟"

"بالکل تابوت جیسے۔ ذرا بڑے سمجھ لو۔ آٹھ فٹ لمبے چار فٹ چوڑے اور چار فٹ اونچے۔"

محسن بولا "بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ مقفل بھی کرتے ہو تم؟"

"میں نہیں کرتا۔ جو یہاں سے مال بھیجتے ہیں وہ خود قفل لگا کے اپنی سیل لگا دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "چار فٹ اونچے تابوت میں تو مُردہ۔ میرا مطلب ہے [illegible] بھی نہیں سکتے۔"

"نہیں۔" اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے مختصراً کہا۔

میں نے کہا "گویا تم پہلے ٹماٹر پیاز گوبھی پالک بھر کے ہمیں اوپر سیدھا لٹا دو گے اور ڈھکنا بند کر دو گے۔"

"پاگل ہوئے ہو" وہ بولا "ایسے تو سب چیزیں تباہ ہو جائیں گی۔ پالک چرمر ہو جائے گی۔ ٹماٹروں کا بھرکس نکل جائے گا۔ یہ سب چیزیں اوپر ہوں گی۔"

میرے حلق سے ایک کراہ نکلی "یعنی مُردہ۔ میرا مطلب ہے میں ٹماٹروں میں دفن کر دیا جاؤں گا۔"

"اور مشٹنڈوں میں" محسن دہل کے بولا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا "اب بھی وقت ہے کہ ہم اس پروگرام کو ملتوی کر دیں۔"

"یعنی جاسوں سے ملتے آئے ہیں۔ جاسوں سے ملے بغیر چلے جائیں۔"

"نہیں یار۔ کوئی شریفانہ اور باعزت راستہ تلاش کریں۔" میں نے کہا۔

محسن بولا "راستے تو کھلے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہم حکام کے نزدیک شریف اور عزت دار نہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے سہلایا "پانچ ہزار فرانک بھی دے چکے ہیں۔ فرانک پر مجھے یاد آیا کہ تیرے پاس مال ہے؟"

"ہاں۔ کل میں نے پانچ سو پاؤنڈ تبدیل کر لیے تھے۔ مانگتا تو کل پہلے بولتی کیوں اور میرے جواب سے ہرگز مطمئن نہ ہوتی۔"

"بیویوں کو یہ خطرہ ہر وقت لاحق رہتا ہے کہ شوہر نام کا جانور رسی تڑا کے نہ بھاگ جائے۔ حالانکہ کولہو کا بیل اگر آزاد کر دیا جائے پھر بھی اسی دائرے میں گھومتا رہے گا۔ وہ اپنی مرضی سے اور سیدھا چلنا بھول چکا ہوتا ہے۔"

ایڈی نے کہا "تم لوگ اپنی زبان میں کیا کہہ رہے ہو؟ اب تم جاؤ یا نہ جاؤ۔ میں پانچ ہزار فرانک تو خرچ کر چکا۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ مایہ آنی جانی ہے۔"

"کون مایہ؟ اس کے لیے سب ہی آنی جانی ہیں۔ مایا ڈیوی۔ مارگریٹ یا رضیہ۔"

میں نے کہا "اندازاً ہمارے اوپر کتنا وزن ہوگا۔"

ایڈی بولا "ٹماٹر ہوں تو سمجھو نہیں پچیس کلو۔ آلو ذرا وزنی ہوتے ہیں۔"

میرے حلق سے پھر وہی دردناک صدا نکلی "مجھے تم پالک کے نیچے رکھنا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ اس میں سے پانی بہت رستا ہے۔ تم خود کو کسی فش فریزر میں محسوس کرو گے۔ میرا مشورہ ہے کہ لہسن کے نیچے رہو۔ وزن کم ہوگا۔"

"مگر بدبو بہت ہوگی۔ تم رہو ناں [illegible] صاحب۔"

محسن نے پوچھا "ہم سانس تو لے سکیں گے نا۔"

"کیوں نہیں۔ باکس ایئرٹائٹ نہیں ہوتا اور اندر کافی آکسیجن

ہوتی ہے۔ راستے میں کہیں رکو گے تم۔ آئل یا فیول کے لیے۔ جہاں ہم باہر نکل کے کھانا کھا لیں۔"

"ہم سب کچھ ڈرائیونگ کے دوران ہی کرتا ہوں۔ تم کچھ کھانے پینے کا سامان رکھ لینا اپنے ساتھ۔ ورنہ تم نیچے والے ٹماٹر کھا سکتے ہو۔ صحت افزا چیز ہے۔ بھوک پیاس نہیں لگے گی۔ تم باہر کیسے نکل سکتے ہو۔"

محسن ادو میں بولا "میں نے بھی لیٹے لیٹے پیشاب نہ کیا تو محسن نام نہیں۔ سالے کافر کھائیں گے انہی آلو ٹماٹروں کو۔"

"ڈرا پانی تک دھو کے بیچتے ہیں۔"

"حالانکہ تو پھر بھی رہیں گے لیکن یار یہ بڑا پرتشدد طریقہ ہے سفر کا۔"

میں نے کہا "ایک زبردست آئیڈیا ہے۔ اگر ایک باکس خالی ہو تو میں اور محسن اس میں ایسے لیٹ جائیں گے۔ جیسے باٹا کے ڈبے میں جوتے رکھے جاتے ہیں۔ ایک کا سر اور دوسرے کی لات۔"

ایڈی نے نفی میں سر ہلایا "خالی باکس کی گنجائش نہیں ہے۔"

محسن بولا "یار کتنے کے ہوتے ہیں ٹماٹر۔ جو سبزی کم لاگت کی ہو وہ ساتھ لے جاؤ۔ اس کے پیسے ہم سے لے لو۔"

ایڈی نے پھر انکار کر دیا "یہ ناممکن ہے۔ ہر ہفتے مجھے مقررہ مقدار میں سب کچھ لے جانا پڑتا ہے۔ پالک نہیں ملی تو اسٹور والے آلوؤں کو پالک کی جگہ کیا دیں گے؟" اس نے سوال کا خود ہی جواب دیتے ہوئے ایک غلط اور ناقابلِ اشاعت چیز کا نام لیا۔

اب ہم مجبور تھے اور ایڈی کے رحم و کرم پر تھے۔ ہم اس کے ساتھ چل کے یوں ٹرالر تک گئے جیسے رضاکارانہ طور پر اعترافِ جرم کرنے کے لیے تھانے جا رہے ہوں۔ ایڈی نے کسی سناک تھانے دار کا روزنیہ دکھایا۔ اس نے ہم سے کریٹ اٹھوائے اور یہ بلے بڑے تابوت نما باکس اٹھا کے ٹرالر تک لے جاتے اور ٹرالر پر چڑھاتے ہوئے میرا اور محسن کا حال پتلا ہو گیا۔ ہمارے ساتھ آٹھ دس لوڈر اور بھی تھے مگر وہ اس مشقت کے عادی تھے۔ ان کا یہی کام تھا۔

ایڈی نے کہا "فکر مت کرو۔ تمہیں بھی مزدوری ملے گی سو سو فرانک۔"

"لعنت سو فرانک پر۔ میری کمر دوہری ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا سارا جسم درد کر رہا ہے" محسن بولا۔

"جب تم لیٹو گے تو تمہیں بہت آرام ملے گا۔ اچھی نیند آئے گی اگر تم سونا چاہو" ایڈی نے کہا۔

کچھ دیر بعد ہمیں معلوم ہوا کہ یہ سب ایڈی کا ظالمانہ مذاق تھا۔ جب لوڈنگ ختم ہو گئی تو اس نے کہا "ہاں اب تم اندر گھس جاؤ۔ کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "یعنی۔۔۔ ٹرالر میں ایسے ہی بیٹھ جائیں۔"

"بیٹھو یا لیٹو۔ گھومو پھرو تمہاری مرضی۔ باکس کی دیواروں کے درمیان بہت جگہ ہے۔ گلیاں بنی ہوئی ہیں۔ کار ہوتی تو تم اندر ہی ڈرائیونگ بھی کر سکتے تھے اور اگر تمہاری گرل فرینڈز ساتھ ہوتیں تو منہ دونہ پھاڑ کے ہنسا۔

میں نے جز بز ہو کے کہا "تم ہمیں دہشت میں مبتلا کر رہے تھے۔"

"میں ذرا انجوائے کر رہا تھا۔ ہر دو گھنٹے کے بعد ہم رک کر کچھ لنڈر گے پیئیں گے۔ اپنے اپنے خرچ پر۔ سو سو فرانک بھی تو کمائے ہیں تم نے۔ تم بھی سفر کو بہت انجوائے کرو گے۔"

انجوائے کی اولاد۔ میں نے دل ہی دل میں اسے ایک سو ایک گالیاں دیں مگر وہ ہنستا ہوا ٹرالر میں سوار ہو گیا "بڑی حرامی چیز ہے یہ ایڈی۔"

محسن بولا "وہ گرل فرینڈز کے ساتھ ہونے والی بات تو ٹھیک ہی تھی۔ ایک گلی میں ہم ہوتے دوسری میں تم۔ خاصی پرائیویسی ہے۔"

محسن نے ٹھیک کہا تھا۔ اندر اتنی پرائیویسی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو بھی نہیں دیکھ سکتے تھے اور ٹرالر کے بیرونی گیٹ کے بند ہوتے ہی اندر گھپ اندھیرا ہو گیا۔

محسن چلا کے بولا "کیپر خاں! کیا میں اندھا ہو گیا۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ ایک دم رات ہو گئی ہے شاید۔ تو نے ایک سردار جی کا لطیفہ نہیں سنا ہوگا۔"

"میں نے سنا ہے" محسن نے فریاد کی۔

"نہیں سُنا" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "انہوں نے سکھ یاتریوں کی ایک جماعت کے ساتھ پنجہ صاحب حسن ابدال کا دورہ کیا۔ پہلی بار پنڈی میں ایک ڈرائی فروٹ دیکھا جسے "ملوک" کہتے ہیں۔ واپس جانے کے لیے پنڈی سے لاہور والی ٹرین میں سوار ہوئے تو کسی نے ایک تھیلی بھر کے دی کہ راستے میں کھاتے جانا۔ ان کو کہیں جہلم کے پاس خیال آیا کہ چکھ کر تو دیکھا جائے۔ ابھی ایک دانہ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ گاڑی سرنگ میں داخل ہو گئی۔ سردار جی چلانے لگے۔ اوئے بیڑا غرق ہو ان مسلوں کا۔ جھوٹ بول کے مروا دیا خالصہ کو۔ اسے تو کھاتے ہی میری بینائی چلی گئی۔"

محسن کو ہنسی پڑا "ہم تو کچھ بھی نہیں کر سکتے اس اندھیرے میں۔"

میں نے کہا "باتیں کر سکتے ہیں۔ لطیفے سنانے پر پابندی نہیں ہے۔ گانے کی بھی اجازت ہے۔ چونکہ میری آواز میں قدرتی سوز و گداز ہے۔"

"اس لیے آپ بعد میں۔ پہلے میں ہیر وارث شاہ سناتا ہوں" محسن نے کان پر ہاتھ رکھ کے گانا شروع کیا۔

"ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر
اندر چیکاں تے لال بیگ وے بابلا۔"

www.paksociety.com

ٹرک رُک گیا اور ایڈی نے دروازہ کھول کے جھانکا "کیا ہوا؟"

میں نے کہا "کہاں کیا ہوا؟"

"وہ اتنے زور زور سے رو رہا تھا۔ کیا تکلیف ہے۔"

"میرے ساتھی کو اپنی ساس یاد آرہی ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

دو گھنٹے بعد جو ہمارے لیے دوزن کی قید کے برابر تھے ٹرک پھر رُکا اور ایڈی نے ہمیں ایک بار میں مدعو کیا۔ "پہلا ڈرنک میری طرف سے۔"

میں نے کہا "تم جانتے نہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ شراب نہیں پیتے۔"

وہ بولا "باقی سب بڑے کام تو کرتے ہو۔ سود، رشوت، مردوں کا سونا پہننا، عورت کی بے پردگی۔ یہ سب بھی تو حرام ہیں تمہارے مذہب میں۔"

مجھے یوں لگا جیسے اس نے مذاق کے جواب میں میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو "یہ تم کیسے جانتے ہو؟"

"میری بیوی مسلمان ہے۔" وہ بولا "انجیلا کی رہنے والی ہے۔ اس نے بتایا تھا۔ مسلمان کا قتل، چوری، ڈکیتی، زنا، یہ سب وہاں بھی حرام ہے مگر مسلمان کرتے ہیں۔ بس ایک شراب اور سور کا گوشت نہ کھا کے خوش رہتے ہیں کہ حرام سے بچ گئے اور مسلمان رہے۔"

میں نے کہا "میں مذہبی معاملات میں بحث پسند نہیں کرتا۔"

"ڈرنک سے تمہاری مراد ہو کافی تو منظور ہے" محسن نے کہا۔

"کیوں نہیں، میرے تو پیسے بچیں گے۔ مگر اگلی باری تمہاری ہوگی تو میں کافی نہیں پیوں گا۔ تمہارا وقت کیسا گزر رہا ہے اندر۔"

"وقت نہیں گزر رہا ہے" میں نے کہا۔

"یا گزر رہا ہے تو ایسے جیسے کہ مُردے کا قبر میں گزر رہا ہوگا۔" محسن بولا۔

"تم کو واقعی اتنی محبت ہے اپنی ساس سے؟"

محسن بولا "نہیں۔ میں اس لیے رو رہا تھا کہ وہ پیدا ہی کیوں ہوئی تھی۔"

ایڈی ہنسنے لگا "پھر تم شادی کیسے کرتے اس لڑکی سے۔۔۔"

محسن نے کہا "پھر میں پرنسس مارگریٹ سے شادی کرتا ڈیئر ایڈی۔ کیا یہ رونے کی بات نہیں ہے۔"

واپسی پر ہماری آنکھیں کچھ دیر بعد اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ محسن نے اسے ڈارون کی تھیوری کے مطابق قرار دیا۔ "اگر ہم مستقل اندھیرے میں رہیں تو ہماری آنکھیں الو جیسی ہو جائیں گی۔ ہم اندھیرے میں دیکھنے لگیں گے۔"

میں نے کہا "اس کنٹینر کی فولادی دیواروں میں کوئی جھری ہوتی یا کوئی سوراخ ہو تا تو ہم باہر کے نظارے دیکھتے جاتے۔"

محسن نے چالیس فٹ لمبی جگہ میں چہل قدمی شروع کی "میں ایک بہت بڑا چیتا پھرتا ذو محسوس کرتا ہوں خود کو۔"

"ذہن سے بولو۔ کسی نے سُن لیا تو غیرے چھپیا بتا سے ۔۔۔ نے کریٹوں کی ایک دیوار کے پیچھے دوسری گلی میں چلتے ہوئے۔۔۔

"رابعہ اور گل تو فرض کریں گی کہ ہم کسی مہم کے ساتھ ہوں گے۔ وہ کیسے سمجھ سکتی ہیں کہ ہمارے ساتھ گزر رہی ہے۔۔۔ اور جنگلی جیسا سلوک ہو رہا ہے۔ ہم پیرس سے لندن کی طرف سے جارہے ہیں۔"

"ڈاڑھی مجھ پر ایسے بج رہی ہے جیسے گاندھی کو ۔۔۔ تھی۔ یا تجھے یہ ۔۔۔ ایڈوینڈرا ڈاڑھی بج رہی ہے۔ اس کا حلیہ کافی بدل گیا ہے کہ تجھے چہرہ بدلنے کے لیے بھی کچھ کرنا ۔۔۔ ورنہ میری وجہ سے تیرے پکڑے جانے کے امکانات ۔۔۔ گے۔ جو تجھے بچانے تھے وہ مجھے بھی بچائیں گے اور یہ ۔۔۔ کہ سوچا ہے تو ساتھ یا نبھی بھی ہوگا میسر نہیں ہو سکتا۔"

"اب لندن میں اُترتے ہی تو کوئی پکڑنے سے ۔۔۔ بدل لینا ضروری ہے۔ کسی سے میک اپ کرکے چہرہ بدلوا لو ۔۔۔ ہر قسم کی وگ ملتی ہے جو اصل بالوں کی جگہ لگائی جاتی ہے۔ کنٹیکٹ لینز ہیں جن سے تو اپنی آنکھوں کی ۔۔۔ اور جنگلی آنکھیں ۔۔۔ صورت اور رنگین بنا سکتا ہے۔ کیا پتا کوئی داڑھی مل جائے تیرے چہرے پر اصل لگے۔"

باہر سے ٹریفک بھی گزر رہی ہوگی مگر اندر کوئی آواز نہیں آتی تھی۔ دو بار ٹریفک پولیس کا سائرن سُن کے مجھے شک ہوا ہمارے تعاقب میں آئے ہوں گے۔ کوئی مخبری کرے یا خود ۔۔۔ حرامی پتا کر جائے۔ پانچ ہزار فرانک وصول کرنے کا ۔۔۔ گوارا۔ اتنا بیان راخ رہے کہ یہ بکھم پیلس پر میرے ۔۔۔ چاہتے تھے۔ تو مانی اسی کی جائے گی۔

جب سرِ شام ایڈی نے ہمیں دروازہ کھول کے باہر آنے دیا اور ہم نے لندن کی سڑک پر رواں ٹریفک کو دیکھا تو مجھے اتنی خوشی ہوئی جتنی کولمبس کو بے سمت بحری سفر کے بعد امریکا کو دیکھ کے ہوئی ہوگی۔ میں اور محسن ذرا باہر کود گئے۔ ۔۔۔ مخصوص انداز میں ٹہلنے والے ایک پولیس مین نے ہماری حرکت کا بالکل بُرا نہیں منایا۔ لندن کے پولیس مین کو ۔۔۔ کہا جاتا ہے۔ کتنی ناقابلِ یقین بات لگتی ہے کہ لوگ پولیس ۔۔۔ پیار کرتے ہیں۔ وہ دوست کہلاتا ہے۔ اور ہوتا ہے۔ وہ ۔۔۔ نے مسکرایا اور گزر گیا۔

"اب تم آزاد ہو میری طرف سے" ایڈی بولا "ہفتہ میں اپنے گھر میں گزاروں گا یا گھر والی کے ساتھ۔ میرا ۔۔۔ نمبر سنبھال کے رکھنا۔ جمعرات کی شام کو معلوم کر لینا کہ ۔۔۔ کتنے بجے ہوگی۔"

"تمہیں بھی ضرورت پڑے تو بلا تکلف آ جانا۔ ہم ۔۔۔ میں قیام پذیر ہوں گے رائل گیسٹ" محسن بولا۔

جب ٹرک چلا گیا تو میں نے کہا "اب کہاں چلیں ۔۔۔ برطانیہ کو شرفِ ملاقات عطا کریں یا جناب طوطی کو۔"

۔۔۔ کے قمار خانے میں طوطی کی صدا پہلے سنی جا چکی ہے۔ تمام ۔۔۔ کا بندوبست ہو جائے تو پھر نقے کی سوچیں گے۔" محسن نے کہا۔

لندن کے سارے راستے ہمارے اسی طرح دیکھے بھالے تھے جیسے اپنے شہر خوباں کے کوچہ و بازار۔ ہم کچھ دور پیدل چلے پھر ۔۔۔ بس میں اوپر چڑھ گئے جہاں سے لندن شہر کا نظارہ بہتر طور پر کیا جا سکتا تھا۔ ہم یہ ۔۔۔ ٹیکسی میں بھی جا سکتے تھے مگر ہمیں جلدی نہیں تھی۔ ہر دل میں ایک بار پھر لندن کی جانی پہچانی سڑکوں کو اطمینان سے دیکھنے کی تمنا بھی تھی۔ حسبِ عادت انگریز بس میں بھی یوں ایک دوسرے سے بے نیاز، بیزار اور خاموش بیٹھے تھے جیسے سب کے درمیان ۔۔۔ نہیں ہو گئے ہیں۔ وہاں کسی اجنبی سے گفتگو کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا۔ یہ لوگ تو اسے باقاعدہ معیوب اور غیر اخلاقی حرکت سمجھتے ہیں۔ ان کے درمیان اگر بہت خوش اخلاقی اور شائستگی برتی جائے تو گفتگو کچھ یوں ہوتی ہے کہ "آج موسم بہت اچھا ہے" اور دوسرا مسکرا کے سر ہلا سکتا ہے کہ "ہمیں ۔۔۔ یقیناً" "اور یہ"۔

میں نے محسن سے کہا "ابھی تک کچھ نہیں بدلا یہاں۔"

محسن نے سر ہلایا "ہمیں بھی تو کسی دیکھ ماہر ہوں درست ہر چیز پرانی ہے۔"

"یہ پرانی چیز کو پرانا رکھنا ہی پسند کرتے ہیں۔ عمارات ہوں یا روایات۔ نیا پن کہاں سے آئے گا" میں نے کہا "ان کے دیے تک تخت و قدامت پسند ہیں۔" میں نے کہا۔

محسن نے اپنے ساتھ بیٹھے اخبار کے مطالعے میں غرق شخص سے پنگا لینے کی خاطر کہا "تمہارا کیا خیال ہے۔ بادشاہت اور کتنے دن۔۔۔ میرا مطلب کتنے سال چلے گی برطانیہ میں۔ کیا اکیسویں صدی میں بادشاہ کی جگہ صدر ہوگا؟"

صدمے اور غصے سے اس شخص کا بُرا حال ہو گیا مگر اس نے ضبط کرتے ہوئے خفگی بھرے جذباتی لہجے میں کہا "میں جاننا نہیں چاہتا۔"

محسن نے کہا "ٹرلی۔ میں بھی نہیں بتانا چاہتا۔ اگر ایسا ہوا تو صدر تم ہو گے نہ میں پھر ہمیں کیا۔"

چند اور سر ہماری طرف اجتجاجاً گھومے مگر کسی نے ہم سے تخت و تاج کے مستقبل اور سیاسی امکانات پر بحث شروع نہیں کی۔ انہوں نے بھی خاموشی سے گھورا اور پھر سامنے دیکھنے لگے لیکن ہم بس سے اترے تو ایک بچے کے نوجوان نے پیچھے سے میرے کندھے پر تھپکی دی۔

"میں نے سُنا تھا جو تم کہہ رہے تھے" وہ خندہ تاپ لڑکا ۔۔۔ میں نے کہا "ہم کبھی جانا چاہتا تھا امریکا بلیک سوان۔ تم نے ملک کی توہین کی تھی۔"

میں نے کہا "بیٹ لوسٹ۔ تم نے انڈیا میں ہمارے شہنشاہ کے ساتھ کیا کیا تھا۔ میں اس سے بُرا سلوک تمہارے ساتھ کروں گا۔"

اس نے سر منڈوا رکھا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ وہ نسلی منافرت کے علمبردار "اسکن ہیڈز" میں شامل تھا جو عام طور پر گروہوں کی شکل میں ایشیائی باشندوں کو گھیر لیتے تھے اور مار پیٹ کرتے تھے۔ انہیں لوٹ لیتے تھے اور ان کی املاک کو نقصان پہنچا کر بھاگ جاتے تھے۔ میں کسی جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن ایک بے ضرر سے مذاق کو بہانہ بنا کے وہ نوجوان خود یہ دعوت دے رہا تھا کہ آ بیل مجھے مار۔

اس نے مجھے بیل کی طرح ٹکر مارنے کی کوشش کی جس کے لیے میں پہلے سے تیار تھا۔ میں نے اپنا گھٹنا اوپر اٹھا کے اسے روکا۔ گھٹنا اس کے ماتھے اور ناک پر لگا۔ وہ کراہ کے پیچھے ہٹا اور اس نے اپنی ناک سے خون ٹپکتا دیکھا تو پھر حملہ آور ہوا۔ میں نے قصہ مختصر کرنے کے لیے اسے اٹھایا اور ہوا میں اچھال دیا۔ وہ ایک دکان کے شو کیس کا شیشہ توڑتا ہوا سیدھا اندر گیا جہاں لکڑی کے دو زنانہ مجسمے استادہ تھے۔ دونوں اس کے اوپر گرے۔

میں اور محسن بھاگے۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آس پاس کوئی پولیس والا نہیں تھا اور گلی کا موڑ چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ گلی کا موڑ کاٹتے ہی ہم رک گئے۔ چند قدم سکون سے چل کے ہم نے ایک ٹیکسی کو روک لیا۔ اس گلی میں کسی کو علم نہ تھا کہ ہم کیا کارنامہ سرانجام دے کے آئے ہیں۔

"مسجد لے چلو" میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"لیس سر" اس نے عادتاً کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

میں نے کہا "خواہ مخواہ گلے پڑ گیا وہ کمبخت۔"

محسن نے خفگی سے کہا "تو معافی مانگ لیتا تو بات ٹل جاتی۔ یہ لوگ بادشاہ کے معاملے میں جذباتی ہوتے ہیں۔"

"وہ معافی پر ٹلنے والا نہیں تھا۔ پرانے اور بوڑھے لوگ مہذب ہوتے ہیں کہ سوری کے جواب میں کہہ دیں کہ چلو کوئی بات نہیں۔"

"ہمیں پولیس پیچھے نہ آئے پکڑے گئے تو چھڑانے والا کوئی نہیں ہوگا" محسن نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایات دینی شروع کیں۔ دائیں، پھر دائیں۔۔۔ بائیں۔۔۔ پھر بائیں۔ وہ اصل مقصد سمجھے بغیر تعمیل کرتا رہا۔ جھنجھلانا ان کی عادت اور مزاج میں شامل نہیں۔ دل ہی دل میں وہ کہتا ہوگا کہ میری بلا سے سارا دن ایک دائرے میں گھومتے رہو۔ مجھے کرائے سے غرض ہے لیکن زبان سے اس نے سوال ہی نہیں کیا کہ آخر جانا کہاں ہے۔

بالآخر محسن نے اسے طوطی صاحب کے آفس پہنچنے کو کہا۔ وہ پھر بھی نہیں بولا کہ بے وقوفو پہلے کہہ دیتے تو اپنا پیسہ اور وقت بچا لیتے۔ میں سیدھا وہاں لے جاتا۔ اس نے ہمیں اتار کے کرایہ وصول کیا۔ ٹپ لے کر تھینک یو کہا اور سیدھا نکل گیا۔

ایسٹ اینڈ کا یہ علاقہ ہم نے جیسا پہلے دیکھا تھا ویسا ہی تھا۔ ہر طرف اردو بولنے والوں کی ریل پیل تھی جو ہو ٹلوں، ۔۔۔

www.paksociety.com

انڈین اور پاکستانی گانے سن کے سر دھن رہے تھے۔ پان والوں کی دکان سے میٹھا پان بارہ مسالے والا۔ جوڑے کے کھارے تھے۔ گلے مل رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے جیسے علامہ اقبال نے کہا تھا۔ سواد رومتہ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے وہی عبرت وہی عظمت وہی شان دل آویز۔ سو یہ لاہور تو نہیں تھا لیکن ایسٹ اینڈ اس کا ہمسر نہیں ہو سکتا تھا۔

محسن کے ساتھ میں نے اس علاقے میں بہت سی مانوس صورتوں کو دیکھا۔ لسی ربڑی والے حاجی صاحب جن کا دعویٰ تھا کہ وہی حیدر آباد کے اصل حاجی ربڑی والے ہیں۔ ایک انڈین حلوائی کی دکان جہاں پوری کچوری لاجواب ہوتی تھی۔ اب ہمیں پہچاننے والا کوئی نہ تھا مگر ہم نے ہر جگہ اور ہر شخص کو پہچانا۔

بالآخر محسن ایک عمارت کے سامنے رک گیا جس کے سامنے والے رخ پر آٹھ فٹ اونچا اور چوڑا سائن بورڈ اعلان کر رہا تھا۔ "کفر کے نقار خانے میں طوطی کی آواز" ہفت روزہ "طوطی" مالک اور مدیر اعلیٰ جناب علم دین طوطی آف ساندہ کلاں لاہور شریف پاکستان۔"

گھنٹی بجانے پر ایک کارٹون برآمد ہوا۔ اس کا خلعت فاخرہ ٹائپ لباس ایسا تھا جیسا شاہان مغلیہ کا تاریخی تصاویر میں نظر آتا ہے۔ اگر وہ گلاب کا پھول بھی سونگھ رہا ہوتا تو شہزادہ سلیم عرف جہانگیر آف انار کلی فیم نظر آتا۔

جب اس نے ذرا شاہی لہجے میں کہا "تم ہو فریادی؟ ہمارے انصاف کو تم نے پکارا ہے۔ تمہارے ہاتھوں نے زنجیر عدل تھام کے گھنٹا بجایا تھا۔"

"گھنٹی ضرور بجائی تھی ہم نے" میں نے کہا اور محسن کی طرف دیکھا تو اس نے سرہلا کے گویا میرے شبہات کی تصدیق کی۔ وہ ایکٹر تھا یا پھر پاگل۔

محسن نے کہا "حاجی صاحب کے فرزند ہو تم؟"

"ہاں۔ ہم ہی عظیم شہنشاہ ہند کے جانشین ہیں۔ اپنی عرض داشت پیش کرو۔ تم کیا چاہتے ہو فریادی؟"

"او بھائی۔ میرا نام محسن ہے۔ فریادی نہیں۔"

میں نے کہا "ویسے تو میں بھی سکندر اعظم ہوں۔ جس نے پورس کو شکست دی تھی۔"

اندر سے کسی نے کہا "او حرامی پھر ڈراما شروع کر دیا۔ کون آیا ہے۔ آ کے بتاتا کیوں نہیں۔"

"آیا ابا جی" وہ بوکھلا کے بولا "سکندر اعظم اور پورس آئے ہیں۔ آ جاؤ جی اندر۔ آفس ادھر ہے حاجی صاحب کا۔"

ایک شاندار کباڑ خانے جیسے آفس میں شاندار کباڑی نظر آنے والے طوطی صاحب بڑے طمطراق کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ان کے سامنے پھیلی ہوئی میز کے مقابل دو کرسیاں تھیں۔ ان پر بیٹھنے والا ان ہی سامنے وہ چٹل کی جھلکاتی تختی دیکھ سکتا تھا جس پر حاجی صاحب کا پورا نام مع تخلص علی رسم الخط میں کندہ تھا لیکن اس کے نیچے ایڈیٹر کے حروف انگریزی کے تھے۔ یہ اہتمام

غالباً ان جاہلوں کے لیے تھا جن میں فرنگی بھی شامل ہوں۔ اگر وہ ان کا نام نہ پڑھ سکیں تو جان لیں کہ وہ کسی عام آدمی سے نہیں ایڈیٹر سے مخاطب ہیں۔ ہوشیار خبردار! پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ تھی منہ سے غلط بات نکلی اور خبر بنی۔

میز پر بہت خوب صورت اور قیمتی رائٹنگ سیٹ تھا اور اس کے چاروں طرف کاغذات' خطوط' اخباروں کے تراشے وغیرہ اور تصویریں کا وہ ڈھیر جس کے بغیر ایڈیٹر کی میز کی تزئین اور آرائش میں حسن نہیں آتا۔ دائیں جانب روایتی انداز میں تخت پر ایک کاتب رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک گھٹنے پر زرد رنگ کے کاغذ پر خوش نویسی کے مظاہرے میں مصروف تھا اور غالباً اس کی عمر اسی کی خدمت کرتے گزری تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اسی پوزیشن میں منجمد ہو چکا ہے۔ سر جھکا ہوا' ایک پاؤں گھٹنا اوپر رکھنے کے لیے اوپر بلند سے آٹھ کی طرح اٹھا ہوا تو دوسرا سات کے عدد کی طرح اوپر جما ہوا۔ نظریں تحریر پر جمائے رکھنے سے اس کی آنکھیں بھی چندھیا گئی تھیں۔ اس نے ہمیں نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔

خود طوطی صاحب ایڈیٹر سے زیادہ پہلوان نظر آتے تھے۔ حاجی ہونے اور عمر کی گولڈن جوبلی کے قریب پہنچنے کے باوجود کلین شیو تھے اور اپنے حلیے سے کسی حد تک (مرحوم) میر عبدالرب نشتر لگتے تھے۔ کلف لگی طرہ والی کلاہ' گھڑی کی سوئی کی طرح نوکیلی سوا نو بجاتی مونچھیں۔ کوٹ کے ساتھ سفید قمیص سبز ٹائی جس پر چاند تارا چمک رہا تھا۔ قرن کشیدہ کارنس میں کسی کے ہاتھوں نے یہ نقش کاڑھا تھا جو بالکل پرنٹ لگتا تھا۔ اب

"السلام علیکم" کے جواب میں حاجی صاحب بڑی گرمجوشی سے اٹھے "وعلیکم السلام۔ آؤ جی بسم اللہ" انہوں نے پرجوش مصافحہ کے بعد ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا "تشریف رکھوائے پاکستانی بھائی۔"

میں نے کہا "طوطی صاحب۔ آپ نے کیسے جان لیا کہ ہم پاکستانی ہیں؟"

طوطی صاحب نے بڑی گھن گرج سے قہقہہ لگایا "سرکار' یہ دو آنکھیں دیکھ رہے ہو آپ' یہ ایڈیٹر کی آنکھیں ہیں اندر تک دیکھنے والی۔ کیا فرمایا ہے اپنے شاعر مشرق نے کہ مضموں بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔ سنے آئے ہو؟"

میں نے اس شعر کو علامہ اقبال سے منسوب کرنے پر ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا مناسب نہ سمجھا۔

محسن نے کہا "آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا۔"

"جب آپ نے السلام علیکم کہا اور حاجی صاحب کہا تو سرکار' سب واضح ہو گیا۔ بھارتی اور فرنگی اور صرف انجانا آتے ہیں۔ بھارتی مسلمان ہو تو آداب عرض ہے کہتا ہے اور کبھی اتنی قرات کے ساتھ نہیں کرتا اور طوطی کو حاجی صاحب نہیں کہتا۔ نئے آنے والے ہی ایسے مخاطب کرتے ہیں۔"

"آپ سے تعارف بہت پرانا ہے اور ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے مجھے۔ کچھ عرصہ پہلے ہی میں چار سال لندن میں

"محسن بولا "مجھے آپ کے بہت زبردست شعر یاد تھے۔ آپ نے بہت خوب صورت فریم میں لکھوا کے اپنے ایک قطعہ کے ساتھ مجھے پیش کیا تھا۔ وہ میرے کمرے میں آویزاں رہتا۔"

حاجی صاحب کا چہرہ کھل اٹھا "اچھا میرے پاکستانی بھائی' کیا قطعہ تھا؟"

محسن نے انہیں وہی قطعہ سنا دیا جو مجھے سنایا تھا۔ شاید اس کے سوا اسے کچھ یاد بھی نہیں تھا مگر ہر شاعر کی کمزوری یہی ہوتی ہے کہ اسے سامع اور قدر دان ملتے نہیں اور مل جائیں تو پھر بقول شاعر بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ساتھ۔ محسن کے قطعے نے وہ کام کیا جو کسی کا سفارشی خط بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"واہ واہ۔ کیا ذوق سلیم پایا ہے میری سرکار۔ اب تو طوطی کی صدا لندن سے باہر فرانس' جرمنی اور سوئٹزر لینڈ تک پہنچ گئی ہے۔ تبلیغ دین اسلام اور خدمت اسلامی جمہوریہ پاکستان۔ طوطی کی زندگی انہی دو مقاصد کے لیے وقف ہے بس آخری سانس تک لبوں سے کلمہ اور نعرہ پاکستان نکلے۔ آمین" پھر وہ میری طرف روئے سخن کر کے بولے "آپ بھی کچھ عرض کرو میرے پاکستانی بھائی۔"

میں نے کہا "ناچیز کو سکندر بخت کہتے ہیں۔"

"اچھا اچھا۔ اسی لیے وہ حرامی کہہ رہا تھا کہ سکندر اعظم اور پورس آئے ہیں۔ برباد کر دیا اس ناخلف کو فیلموں نے۔"

میں نے کہا "وہ شہزادہ سلیم میں تو سمجھا تھا خدا نخواستہ۔"

"وہ میری پہلی بیوی کا پہلا بچہ ہے۔ ذرا سے بازے۔"

"ماشاء اللہ۔ خیر سے کتنی بیویاں ہیں آپ کی؟" میں نے مؤدبانہ پوچھا۔

"صرف دو۔ ایک اپنے پیارے پاکستان کی سوغات۔ اگر میں صدر ہوں تو اسے وزیر اعظم کا مقام حاصل ہے۔ دوسری یہاں کفار کے منہ پر طمانچہ مارنے اور ان کی غیرت کا جلوس نکالنے کے لیے کی تھی۔ خالص انگریز اور کرستان تھی جسے مشرف بہ اسلام کرنے کے بعد اس سے نکاح کر لیا۔ بہت تلملائے فرنگی میری سرکار۔ میں نے تو وہ کالی سرخی کے ساتھ قطعہ بھی چھاپ دیا تھا۔ اس سے بھی پانچ اولادیں ہیں۔ زوجگان کے درمیان عدل و انصاف کی شرط ہے۔"

"یعنی جب تک پہلی کے چھٹا بچہ نہیں ہو گا دوسری کے بھی نہیں ہو گا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" انہوں نے میز پر ہاتھ مارا "پہلا حق بھی اسی کا بنتا ہے۔ اچھا جی اب فرماؤ کیا حکم ہے میرے لیے۔"

میں نے کہا "میں نے بھی لندن میں چار سال گزارے تھے۔ پھر یہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ ان گوروں نے سازش کی تھی میرے خلاف۔"

"او بھائی۔ کیا اب آپ غیر قانونی طور پر یہاں آئے ہو اپنے پاکستانی بھائی۔"

"کیا سمجھ لیں۔ ہم پہلے پیرس گئے۔ وہاں سے سڑک کے راستے لندن میں داخل ہو گئے براہ راست آنے کا ویزا مل جاتا لیکن ایک خبیث نسل پرست انگریز نے ٹانگ اڑا دی۔ پاکستانی تو نسیت کو منع کر دیا۔ ہم بھی آپ کے پیروکار ہیں طوطی صاحب۔ جب تک لندن میں تھے انگریز ہم سے عاجز تھے سب کے چھکے چھڑا دیے تھے ہم نے۔ میں اور محسن مل کے جہاد کرتے تھے انگریز اور بھارتی قوم کے خلاف۔ اب آپ سے کیا پردہ۔ ان کی لڑکیاں خود ہم پر مرتی تھیں تو ہم کیا کرتے۔ شادی تو اپنے پاکستان جا کے والدین کی مرضی سے ہی کرنی تھی لیکن ہم نے کسی کو نظر اٹھا کے بات کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ ان کی عزت کو ذلت میں بدلنا ہمارا مشن تھا اور یہی ہمارا جرم بن گیا بعد میں۔ انگریزوں نے ہمیں اس طرح جلاوطن کر کے چھوڑا جیسے تحریک آزادی کے مجاہدوں کو کالا پانی بھیجتے تھے۔ ہم تو پھر سے اپنے وطن ہی گئے تھے۔"

"اور اب پھر لوٹ آئے ہیں" محسن بولا۔

طوطی صاحب نے کہا "آفرین ہے تم پہ میرے پاکستانی بھائی۔ کیا پھر وہی جہاد شروع کرنے کا ارادہ ہے؟"

میں نے کہا "نہیں جناب۔ اب تو ہم شادیاں بھی کر چکے ہیں۔ ہم ایک اور کام سے آئے ہیں جس میں آپ ہی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔"

محسن نے کہا "ہم نے بہت سوچا لیکن آپ کے سوا ہمارے ذہن میں کسی کا نام نہ آیا۔ کہنے کو یہاں دوست بہت اور پاکستانی بھی اپنے ہم وطن ہیں۔ اگر صرف رہائش کا یا نوکری کا مسئلہ ہوتا تو سب مل کے کچھ کر سکتے تھے۔"

میں نے گرہ لگائی "لیکن ہمارا کام مشکل ہے۔ وہی ہمارا ساتھ دے گا جو حق و صداقت اور عدل و انصاف کا علم بردار ہو۔ مومن ہو اور پاکستانی ہو۔"

محسن نے کہا "انسانیت اور شرافت کا عملی نمونہ ہو۔"

میں نے کہا "بے باک اور نڈر ہو۔ جیسا کہ فرمایا ہے شاعر مشرق نے۔

گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

محسن نے کہا "اور چار سال یہاں رہ کے ہم نے آپ کی جو شہرت دیکھی تھی اور جس سے سارا عالم واقف ہے۔ وہ ایسی تھی کہ ہم سیدھے آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ خدا کے بعد یہاں آپ کا آسرا ہے۔"

خوشامد ایک بشری کمزوری ہے اور طوطی صاحب اس معاملے میں زیادہ ہی کمزور ثابت ہوئے۔ ہماری مبالغہ آمیز تعریف کو انہوں نے بھی بر حقیقت خراج تحسین کے طور پر وصول کیا۔ غرور سے ان کا سر اونچا ہو گیا۔ فخر سے مونچھیں پھڑکنے لگیں اور خوشی سے آنکھیں چمک اٹھیں۔

"دیکھو برخوردارو۔ میرے پاکستانی بھائیو!" انہوں نے کہا "کر

www.paksociety.com

مزید بھائے اور تالی کی بات کو پا کے کہا "تعریف کے لائق بس خدا کی ذات ہے۔ طوطی کیا چیز ہے۔ اس نے توفیق دی تو سب ہوا۔ میں یہاں جو کچھ کرتا ہوں اللہ رسولؐ کی خوشنودی اور اپنے پیارے پاکستان کی خاطر کرتا ہوں۔ یہ انگریز اور بھارتی میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ طوطی نے جان ہتھیلی پر رکھی ہے اور کفن پہلے خرید لیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم ٹھہرے کہاں ہو؟"

میں نے کہا "ابھی تک تو چل ہی رہے ہیں۔ سفر ختم نہیں ہوا۔"

"یعنی فیصلہ نہیں کیا ابھی کہ کہاں قیام ہوگا۔ خیر یہ بولو میری سرکار کہ آخر تمہارے ارادے کیا ہیں۔ تم کس کس کو قتل کرنے آئے ہو اور کیسے کرو گے یہ کام؟ کوئی بم وغیرہ مارو گے یا۔" طوطی صاحب کا رنگ اڑنے لگا۔

میں نے کہا "توبہ طوطی صاحب۔ ہم تو اس معاملے میں شرمناک حد تک بزدل ہیں۔ ریوالور دیکھا ہے چلایا نہیں۔ عید پر بکرے کے گلے پر چھری پھیرتے ہیں تو ہاتھ کانپتا ہے اور لگتا ہے بکرے کے ساتھ دم نکل جائے گا۔ انسان کو قتل کرنا خواہ وہ فرنگی ہو یا بھارتی، ہمارے بس کی بات نہیں۔"

"میں سمجھا تم انتقام لینے آئے ہو ان سے جن کا تم نے بینڈ بجایا تھا اور جنہوں نے سازش کر کے تمہیں نکلوا دیا تھا۔" طوطی صاحب نے اطمینان کی سانس لی۔

"ہم تو بڑے نیک ارادے سے آئے ہیں۔ کار خیر کے لیے۔"

"کسی بے گناہ کی جان بچانا ثواب کا کام ہے۔" محسن بولا۔

"بے شک میرے پاکستانی بھائی لیکن اسٹوری کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔"

میں نے کہا "اسٹوری لمبی ہے اور بڑی دردناک۔ جذبۂ حب الوطنی اور جوش ایمانی سے بھرپور۔ ایک سچے پاکستانی مسلمان کے لیے باعث فخر۔"

"اچھا! پھر ایسا کرو صبح آجاؤ میرے پاس۔"

"لیکن ہم آپ کے پاس سے کہیں جائیں گے تو صبح آئیں گے۔ بقول فلمی شاعر۔ نکل کے تیری محفل سے یہ دیوانے کہاں جائیں؟"

"کیا مطلب میری سرکار۔!"

"مطلب صاف ہے طوطی صاحب۔ اگر ہم ہوٹل میں گئے تو وہاں اپنا پاسپورٹ دکھانا پڑے گا۔"

"پاسپورٹ جعلی ہے! ہے ہی نہیں؟"

"اصل پاسپورٹ ہیں ہمارے پاس۔" میں نے کہا "لیکن کسی ہوٹل کے رجسٹر میں ہمارے نام کا اندراج ہوا تو یہ کافر انگریز جو ہمارے دشمن ہو رہے ہیں ہمیں تلاش کرلیں گے اور پھر برطانیہ بدر کردیں گے یا جیل میں ڈال دیں گے۔ ہم ان کی مرضی کے خلاف زبردستی یہاں آئے ہیں۔ جس حبیب الرحمان نے برطانوی قومیت ... یا تھا کہ ہمیں ویزا نہ جاری کرے اس نے امیگریشن والوں کو بھی ہوشیار کردیا ہوگا اور عین ممکن ہے لندن کی پولیس... ہمارے نام اور حلیے فراہم کردیے ہوں۔ ہم اتنی دور آکے ناکام ... جائیں آپ کے ہوتے ہوئے۔"

"نہیں میرے پاکستانی بھائی۔ طوطی ایسا نہیں ہونے دے گا۔ یہاں ہزاروں پاکستانی بھائی کسی ویزا پاسپورٹ کے بغیر رہتے ہیں۔ سب ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ خود بھی چھپ کر رہتے ہیں اور جاب بھی کرتے ہیں۔ دوسروں کو بھی چھپا کے رکھتے ہیں اور نوکریاں دلاتے ہیں۔ ان کے عزیز واقارب کو پاکستان سے بلاتے ہیں اور یہاں آباد ہونے میں مدد کرتے ہیں۔ کوئی پکڑا جائے تو اس کے وکیل کرتے ہیں اور مقدمے کے اخراجات شیئر کرتے ہیں۔ طوطی ان سب کا ساتھ دیتا ہے۔ ان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے اور ان کو انگریزوں کے ظلم اور زیادتی سے بچاتا ہے۔"

میں نے کہا "اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔"

طوطی صاحب نے جوش سے کہا "میرے پاکستانی بھائی! یہ ایک جہاد ہے۔ ایک قومی جدوجہد ہے۔ جتنے زیادہ پاکستانی یہاں آباد ہوں گے اتنی ان کی قوت بڑھے گی۔ ان کی منظم طاقت انگریز کو نیچا کردے گی۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ محبت ہے ہم مسلمان پاکستانی بھائیوں سے اور جنگ ہے ہماری کافروں، انگریزوں سے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ آؤ گروہ کی صورت میں، اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام کے آؤ۔ سمندر کے راستے، خشکی کے راستے، ہوائی جہاز سے۔ اپنے خاندانوں کے ساتھ یا اکیلے یہاں میموں سے شادی کرو۔ ان کی اولادوں سے شادی کرو۔ انہیں مشرف بہ اسلام کرو۔ اپنی طاقت بڑھاؤ۔ بغیر پاسپورٹ کے، جعلی پاسپورٹ پر آؤ۔ اگر اسلامی اخوت کا یہ جذبہ سب میں ... میری سرکار تو ایک دن یہاں پاکستانی قوم آباد ہوگی۔ یہ بھی ایک پاکستان بن جائے گا۔ آج ہم دو فیصد ہیں یا پانچ فیصد تو کل دس فیصد ہوں گے۔ پھر بیس فیصد یہاں تک کہ ایک دن پچاس فیصد ... انگریزوں سے بڑھ جائیں گے کیونکہ یہ خنزیر کھانے والے ... کنٹرول کرتے ہیں۔ ہم تو مہم چلا رہے ہیں کہ مسلمان بچے خوب پیدا کرو۔ دن رات ایک کردو اس مقصد کے لیے۔ انگریزوں کے ... میں پیدا ہونے والے مسلمان پاکستانی بچے کل کے مجاہد ہیں۔ اگر ... وہ بچے پیدا کریں تو تم دس کرو۔ جیسے کہ میں نے کیے۔ پھر دیکھو ... ہماری زندگی میں ہی انگلستان کا نام پاکستان رکھا جائے گا۔ ... اکثریت میں ہوں گے۔ پارلیمنٹ میں اکثریت ہماری ہوگی اور ... وزیراعظم بھی اپنا مسلمان پاکستانی بھائی ہوگا۔"

میں طوطی کی احمقانہ جذباتی سوچ اور منطق پر دم بخود رہ گیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا پورے یقین کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ وہ سمجھتا ... کہ ایسا ہو سکتا ہے اور ہوگا۔ یہ اس کے ذہنی طور پر دیوالیہ پن ... کی دلیل تھی مگر جنون اسی کا نام ہے۔ ہم اسے قائل نہیں کر سکتے تھے کہ یہ دیوانگی ہے۔ وہ ہمیں بڑے جوش و خروش سے قائل کر ... تھا کہ زیادہ مسلمان بچے ہوں اور پاکستان کی قومی آبادی ...

پہنچ جائے تو اس ملک پر پاکستان کا جھنڈا لہرایا جائے طوطی برطانیہ ... دیا جائے گا۔

شمر کے نقار خانے میں طوطی کی صدا!

محسن نے مجھے میز کے نیچے سے ٹھوکر ماری اور میں نے اسے ... ایک دوسرے کو خبردار کیا کہ تردید نہیں کرنی۔ بحث نہیں ... طوطی کی بھرپور حمایت حاصل کرنے کے لیے اس کے موقف اور نظریات سے مکمل اتفاق کرنا ضروری ہے۔ یہ کام ہم نے بڑی شدومد کے ساتھ کیا اور طوطی صاحب کے اس عظیم مقصد کی خاطر جہاد میں انگریز کافروں کی شکست کا یقین دلایا۔ انہوں نے تو صرف ڈیڑھ سو سال حکومت کی۔ ہم یہاں ڈیڑھ ہزار سال رہیں گے، ڈیڑھ لاکھ سال رہیں گے۔ انہیں غلام بنائیں گے اور میموں کو بیویاں۔ اس سے پہلے یوم جزا آگیا تو پھر جنت کے مزے اور حور و غلمان۔ مسلمان کے لیے دونوں جہاں میں سرفرازی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت وہ دنیا میں نفاق و انتشار کے باعث خوار و زبوں ہیں۔

طوطی صاحب نے ایک شب کے لیے ہمیں اپنے نقار خانے کی چھت پر سونے کی جگہ اور اجازت مرحمت فرمائی۔ نقار خانہ ان کے گھر کا نام تھا۔ اس پر وہ سائن بورڈ آج کل نہیں تھا جس پر انگریزی حروف میں لکھا گیا تھا کہ "یہاں کتوں، انگریزوں اور بھارتیوں کا داخلہ منع ہے۔" اس معاملے میں قانونی جنگ جاری تھی جس میں کبھی کسی بہانے طوطی صاحب جیت جاتے تھے تو فوراً بورڈ آویزاں کردیتے تھے۔ کبھی دشمنوں کو اسے ہٹوانے کا موقع مل جاتا تھا۔ طوطی صاحب کو یقین کامل تھا کہ ایک دن یہ بورڈ لندن کیا پورے انگلستان کی بیشتر عمارتوں پر نظر آئے گا۔ ان شاء اللہ!

میں اور محسن اب بہت مطمئن تھے۔ ہم طوطی صاحب کو شیشے میں اتار چکے تھے۔ وہ بااثر آدمی تھے۔ اکثر جذباتی مسلمان اور پاکستانی ان کے حامی تھے اور اس جہاد میں بالواسطہ طور پر شریک ہو کے ان کی مدد کرتے تھے۔ براہ راست مدد کرنے والے کم تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ایم آر ایس کی ولولہ انگیز داستان شجاعت سے اور سکندر بخت کے ایمان افروز کارناموں سے وہ پہلے بھی واقف ہوں گے اور جب انہیں علم ہوگا کہ میں وہی پاکستانی جانباز ہوں تو وہ میری مدد ایک مقدس فریضہ سمجھ کے کریں گے۔

نقار خانے کے نچلے حصے میں رات گئے تک شور مچا رہا۔ ایک ٹی وی پر انگلش فلم بڑی اونچی آواز میں چل رہی تھی۔ دوسری طرف ڈیک پر پاکستانی پنجابی فلموں کے گانے بجائے جا رہے تھے۔ مقابلہ دونوں بیگمات کے درمیان تھا کہ کون کس کی آواز کو دبا سکتا ہے۔ درمیان میں طوطی صاحب بحیثیت مشترکہ شوہر یوں عدل و مساوات کی مثال قائم کرتے تھے کہ دونوں کو ایک ہی لہجے میں ایک جیسی گالیوں سے نواز کے سیز فائر کراتے تھے اور ٹی وی اور ڈیک بند کرا دیتے تھے مگر ان کے آفس لوٹتے ہی حالات پھر معمول پر آجاتے تھے۔ دس میں سے چار بچے مستقل لڑتے یا روتے تھے۔ نمبردار جو ڈرامے کرنے کا شوقین تھا بدستور شہزادہ سلیم بنا پھرتا رہا اور ہمیں اس ڈرامے کے مکالموں سے مستفید کرتا رہا جو عنقریب کسی اسٹیج پر پیش کیا جانے والا تھا۔ اس نے رازداری سے انکشاف کیا کہ انارکلی کا رول کرنے والی اس کی گرل فرینڈ ہے جس سے شادی کرنے کے لیے وہ اپنا مذہب تک چھوڑ دے گا۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ آزر کے گھر میں ابراہیمؑ کے پیدا ہونے کی مثال یہاں الٹی ہو رہی تھی۔

یہ اتفاق تھا کہ اس رات ہفت روزہ "طوطی" کی آخری کاپی پریس میں جانی ضروری تھی چنانچہ حاجی صاحب (جو کہ مدیر کی اعلیٰ حیثیت رکھنے کے ساتھ ساتھ پبلشر، کاپی پیسٹر، قلم میکر، سرکولیشن منیجر، بزنس منیجر یہاں تک کہ وقت ضرورت چائے بنانے سے دفتر میں جھاڑو دینے تک کے جملہ امور بھی سنبھالتے تھے) مصروف تھے۔ "طوطی" پہلے دو ہفتے میں ایک بار شائع ہوتا تھا اور اس کی ضخامت بھی کم تھی مگر آہستہ آہستہ اس نے پاکستانیوں میں قارئین کا ایک جوشیلا حلقہ پیدا کرلیا تھا جو دامے درمے سخنے امداد بھی کرتے تھے اور معرکۂ کفر و اسلام میں طوطی کے ہمنوا تھے۔ اب یہ ہر ہفتے باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا۔ اس کی ضخامت دگنی ہو گئی تھی تو غالباً اشاعت دس گنا۔ اس سے اشتہارات بڑھے تھے اور پرچا زیادہ آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا تھا۔ اس کا سرورق بالکل پاکستانی جھنڈا تھا۔ اوپر سفید پٹی باقی سبز۔ اس میں مقامی پاکستانیوں کے علاوہ وطن سے موصول ہونے والی نگارشات، ایمان پرور قصے، حب الوطنی کے جذبات سے چھلکتی نظمیں، خون گرمانے والے قومی نعرے اور کچھ اشتعال انگیز مواد بھی ہوتا تھا جس سے کفار کے سینے چھلنی ہو جائیں۔ حکمران کے سینوں پر مونگ دلنا اور پھر قانونی اور غیر قانونی جنگ میں الجھنا طوطی صاحب کی زندگی کا مقصد تھا۔

نصف شب کے قریب شہزادہ سلیم اچانک نمودار ہوا جب ہم سونے کی کوشش میں مصروف تھے۔ "انارکلی رونما ہوا چاہتی ہے۔" اس نے اعلان کیا۔

میں نے کہا "یہاں؟ اس وقت؟"

"ہاں۔ یہی وقت ہے اور یہی جگہ ہے سلیم اور انارکلی کے ملنے کی جہاں آج تم نے دو محبت کے متوالوں کی خلوت میں دخل اندازی کی گستاخی کی ہے۔ دل آرام۔"

میں نے کہا "تم بتا رہے تھے کہ انارکلی انگریز اور کرسچن ہے پھر وہ اردو کے ایسے مشکل ڈائیلاگ کیسے بولے گی؟"

"اس کی ڈبنگ چلے گی۔" وہ بولا "طوطی اپنے پنجرے میں قید ہے۔ کیا تم آنکھیں بند کر کے سو نہیں سکتے۔ یا گھومنے پھرنے نہیں جا سکتے۔"

محسن نے کہا "دیکھو مسٹر سلیم ہم سونا چاہتے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم خود چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ میں تمہارے ابا جان کو تمہارے عزائم سے آگاہ کردوں گا اور تمہارے خیالات سے بھی۔"

"کردو۔ ظالم سماج کے متقدل نمائندے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ محبت کرنے والے جان کیسے دیتے ہیں۔ جیسے شمع پر پروانہ۔"

www.paksociety.com

اس پر ڈراموں کا اثر بہت زیادہ تھا۔

"تم زیادہ مشکل سے جان دو گے انارکلی کی جگہ تمہیں دیوار میں زندہ چنوا [illegible] گا تمہارا باپ۔"

"باپ... تمہارا باپ! جس کے سینے میں پتھر ہے۔ وہ ہر رومانس میں ایسا کیوں کرتا ہے۔ کیا [illegible] کافی نہیں؟ وہ محبت کرنے والوں کے بیچ میں دیوار کیوں بن جاتا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ عشق کے طوفان کو بے بسی کی دیوار نہیں روک سکتی۔"

اس وقت طوطی صاحب نمودار ہوئے "اوئے تو... اس وقت یہاں بھی ڈراما؟" انہوں نے پاؤں میں سے جوتی اتار لی۔

شہزادہ سلیم بدحواس ہو کے دوڑے۔ اکبر اعظم نے پیچھے سے جوتی کو میزائل کی طرح داغا۔ ان کا نشانہ پاکستانی توپخانے (توپ خانے) کے اس ماہر توپچی جیسا تھا جس نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں لاہور کی مشہور توپ "شیرنی" چلائی تھی یا "رانی"۔ شہزادہ سلیم نے چلا کے کہا "ہائے ابا جی!" اور نیچے چلے گئے جوتی سمیت۔

طوطی صاحب ایک جوتی میں ہمارے پاس آ بیٹھے "ہاں بھئی اپنے پاکستان بھائی۔ اب فراغت ہے ہمیں۔ ذرا ہم بھی سنیں کیا اسٹوری ہے تمہاری۔ میں نے بقراط سے کہہ دیا ہے کہ ہر گھنٹے بعد چائے آنی چاہیے۔"

"بقراط کون؟"

"اپنا کاتب میری سرکار۔ اس کی باتیں کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس لیے بقراط کہتے ہیں۔ وقت کا بڑا پابند تھا۔ میں نے کہا کہ خبردار جو انگریزوں کی کوئی عادت اپنائی۔ ہم کفار کی تقلید کیوں کریں۔ وقت ہمارا غلام ہے جی کہ ہم غلام ہیں وقت کے۔"

"کیا ہر ایک گھنٹے بعد چائے لانے کے لیے وقت کی پابندی نہیں کرنی پڑے گی؟" محسن بولا۔

"وہ آئے گا سوا گھنٹے یا ڈیڑھ گھنٹے میں۔ آپ فرمت کرو میرے پاکستانی بھائی شروع ہو جاؤ۔"

میں اور محسن مجبوراً اٹھ بیٹھے۔ ہمارے سونے کے لیے فرش پر ہی بستر بچھا دیے گئے تھے۔ موسم بہت خوش گوار بلکہ قدرے خنک تھا اور ہم جس چھت پر فروکش تھے اس کے اردگرد اونچے مکان تھے۔ طوطی صاحب نے مجھے مطلع کیا کہ دائیں بائیں تو اپنے پاکستانی بھائی کا قبضہ ہو چکا ہے مگر پچھلی طرف بڑا بے حیا اور خبیث انگریز خاندان ہے۔ کسی قیمت پر مکان دینے کو تیار نہیں۔ انہوں نے اس کی ایک لڑکی کے بارے میں نازیبا کلمات بھی کہے جس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہی شہزادہ سلیم کی انارکلی ہوگی جو خالص دیسی اسٹائل میں "کوٹھے پہ" کے آئی ہوگی۔ آج کا ظالم سماج مع سنگدل باپ کے موجود تھا تو ملاقات کا کوئی امکان نہیں تھا۔

ہر گھنٹے بعد تو ملائی بخش خالص دودھ ملائی والی چائے پینے کی سزا سے بچنے کے لیے میں نے اپنی روداد میں اختصار کے جوہر سے کام لیا۔ [illegible] دریا کو کوزے میں بند کرنے کی پوری کوشش کی مگر طوطی [illegible] نے [illegible] ناکام کر دیا۔

روداد ایم آر ایس کے سارے کارناموں سے واقف تھے اور یہ بھی انہیں علم ہوا کہ میں وہی سکندر بخت ہوں جو ایم آر ایس کا [illegible] کے تو تھا اور محسن میرا دوست راست تو انہوں نے فرط جذبات [illegible] نعرہ لگا کے پہلے مجھے دبوچ کر اپنی آغوش میں خوب بھینچا۔ پھر [illegible] کو مزاحمت کی بالکل گنجائش نہ تھی۔ طوطی صاحب پہلوانی کا [illegible] رکھتے تھے چنانچہ میں اور محسن خاصے پریشان ہو گئے۔ پھر اس کہانی [illegible] دوران جہاں کوئی ولولہ انگیز مرحلہ آتا تھا وہ "مرحبا۔ آفرین [illegible] شاباش" جیسے نعرے لگا کے مجھے گلے لگا لیتے تھے۔ کبھی ستائش کی [illegible] میں میرے کندھے پر ہاتھ مارتے تھے اور چلاتے تھے "کمال کیا میرے پاکستانی بھائی" یا فرط مسرت سے بے قابو ہو کے نعرہ [illegible] "بھئی واہ، جوان!" ہر بار میں اچھل پڑتا تھا۔ اپنا کندھا [illegible] سہلاتا رہ جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ اس معرکہ آرائی کی داستان [illegible] شجاعت کو مزید مختصر کر دوں مگر طوطی صاحب ہر بار فراخ [illegible] فلک شگاف بلند کرنے کے بعد سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں دشمنان پاکستان کی ہر شکست کا منظر یوں بیان کروں [illegible] الفاظ میں تصویر عبرت نظر آئے مگر میں نے معذرت کر لی کہ جناب آپ جیسا زور بیان میں کہاں سے لاؤں۔

اس کے باوجود مجھے اور محسن کو بقراط کی تیار کردہ [illegible] بار نوش فرمانا پڑی۔ وہ اچھی خوراک اور اچھی صحت کے بارے میں [illegible] پہلوانوں کے فلسفے پر یقین رکھتے تھے کہ زیادہ کھاؤ اور [illegible] کھاؤ۔ اچھا وہ جو دیسی ہو۔ دیسی گھی، دیسی مکھن، دیسی مرغی [illegible] دیسی انڈا۔ ولایتی انڈا جس کو اپنے پاکستانی بھائی بی آئی اے [illegible] کہتے ہیں۔ وہ تو ہوتا ہے نامرد انڈا۔ اس سے چوزہ پیدا نہیں ہوتا [illegible] پھر وہ کیا ہوا؟ اور جو اسے کھائے وہ کیا ہوگا۔ میں نے ایک [illegible] ڈرتے ڈرتے کافی کا سوال کیا تو انہوں نے مجھے ملامت [illegible] پاکستانی بھائی۔ اس عمر میں کافی؟ زہر ہے زہر۔ اندر سے جلا [illegible] ہے گرم اور خشک ہوتی ہے۔ جوانی ہوتی ہے دودھ ملائی [illegible] جان بنانے کے لیے۔ آج بھی میری سرکار خوراک ہے [illegible] گوشت بھنا ہوا۔ دو کلو بھینس کا تازہ دودھ۔ صبح بادام [illegible] اور شام کو چھ انڈے ڈال کے ہزار ڈنڈ بیٹھک تو ایک سانس [illegible] پورے کر لیتا ہوں۔"

ان کی شاندار توند کو دیکھتے ہوئے یہ سب غلط بھی نہیں [illegible] تھا۔ وہ میڈیکل سائنس کے جدید نظریات سے یکسر منکر تھے [illegible] اہالیان مغرب نے طب مشرق سے لے کر اب اسی کو [illegible] ہوئے تھے۔ ان کو میں کیسے سمجھاتا کہ طب مشرق کو [illegible] اور فنا کی منزل کے قریب پہنچانے والے تو خود وہ [illegible] دیواری حکیم تھے جو تحقیق کے نام سے ناآشنا تھے اور [illegible] پرانے نظریات اور مجربات کے مطابق عوارض و عواقب جانے [illegible] قدیم یونانی روایات سے "ہوالشافی" لکھ کے ہر مرض کا علاج [illegible] کر رہے تھے۔ صدیوں پرانے نسخوں کو ایک خود غرضانہ رویے کے [illegible] قبر میں لے جا رہے تھے۔

صبح ہونے میں ابھی [illegible] اور محسن ایم آر ایس کی جد و جہد اور اپنے [illegible] داستان کا آخری باب ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور [illegible] طوطی صاحب کے پاس بھی مزید فضول سوالات ختم ہو گئے تو انہوں [illegible] صورت بچوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا "ہوں" اور پھر [illegible] پانچ منٹ تک خلا میں گھورنے اور [illegible] "آباد" کو اور بھی آباد کرنے کے بعد [illegible] کہا "ہاں" اور جب تیسری بار وہ اپنے فکر میں غوطہ [illegible] محسن اونگھ رہے تھے۔

طوطی صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا "سمجھ لو کہ [illegible] سب مسائل حل ہو گئے میرے پاکستانی بھائی۔"

میں نے مضطرب ہو کے کہا "کس چیز میں حل ہو گئے؟"

ان کے قہقہے پر محسن ہڑبڑا کے سیدھا ہو گیا "حل... کیسا حل... آپ کیسے ہیں۔"

طوطی صاحب نے کمال شفقت سے فرمایا "جو اب تم نیچے [illegible] جا کے سو جاؤ۔ وہیں بقراط بھی ہوگا مگر تمہارے لیے جگہ [illegible] آپ کی میری سرکار میں آج "طوطی" کی ضمانت میں [illegible] موقوف ہوں گا مگر تمہارے معاملات بھی زیر غور رہیں گے۔ شام [illegible] سب بندوبست ہو جائے گا۔ ان حالات میں تمہارا باہر نکلنا بھی [illegible] طوطی کے مخالف بہت ہیں۔"

بقراط سونے کی کوشش میں آنکھیں کھولے چھت کو گھورتا رہا [illegible] اس نے کہا "قیامت یوں بھی تو آ سکتی ہے کہ آسمان و اجرام [illegible] گر جائے۔ یہ گنبد نیلگوں بے ستون ہے۔ اور زمین خلا [illegible] معلق ہے۔ اگر یہ مزید نیچے گر گئی لاکھوں میل تو سورج سے [illegible] ایک بار لاوا بہہ جائے گا۔ شجر حجر چرند پرند درند۔ انسان حیوان سب [illegible] جل جائیں گے سرائی سے۔ برف کی طرح پگھل جائیں گے۔"

[illegible] قیامت آنے کے مختلف امکانات پر بہ آواز بلند غور و خوض [illegible] تھا۔ بلاشبہ وہ بقراط تھا اور اس کی باتیں ناقابل فہم تھیں [illegible] اور محسن کے کانوں میں خنجر آتے تک اس کی آواز آتی [illegible] خواب بھی میں نے ایسے ہی دیکھے کہ چودھری دلاور زمین کے [illegible] گہرائی سے زنجیر کے ذریعے کرۂ ارض کو نیچے کھینچ رہا ہے [illegible] کے غبارے کو [illegible] پکڑ کے اتار لیا جائے۔ اور قہقہے لگا رہا [illegible]

"[illegible] اب بولو" اپنے سکندر اعظم صاحب "ابھی تم کو برف کا بنا [illegible] مجسمہ۔ بڑی مضبوط زنجیر ہے اور [illegible] دوسرے کنارے پر میں باندھ رہا ہوں مریخ کو۔ اس کا [illegible] بہت زیادہ ہے۔ اتنی [illegible] جائے گی تمہاری دنیا کہ سورج تم کو [illegible] قطب ستارے کی طرح نظر آئے گا۔"

[illegible] کسی نے صور اسرافیل پھونکا اور میں فوراً مردے [illegible] کی طرح قبر سے اٹھ کے میدان حشر کی جانب دوڑنے کے لیے اٹھا [illegible] الارم کی آواز [illegible] میں نے بتا کے گھڑی [illegible] الارم [illegible] اس میں چھ بجے کا وقت سیٹ تھا لیکن

گھڑی نو بجا رہی تھی۔ غالباً پابندی وقت کی عادت اسے بھی پسند نہیں تھی۔ اس کا مزاج طوطی صاحب کی صحبت میں پاکستانی ہو گیا تھا۔

صرف چار گھنٹے کی نیند ناکافی تھی مگر اب دوبارہ سونا بھی مشکل تھا۔ بقراط کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ وہ اٹھے گا یا نہیں اور اٹھا تو خود اٹھے گا یا اسے چار آدمی اٹھائیں گے۔ ہمارا سوٹ کیس وہیں موجود تھا اور مجھے آفس سے ملحق باتھ روم بھی نظر آ رہا تھا۔ نہا دھو کے تیار ہونے کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ اب ہم کیا کریں؟ طوطی صاحب کی ممانعت کے باوجود ہم باہر گئے اور ایک پاکستانی بھائی کے ہوٹل سے پراٹھے پائے کا ناشتا کر کے اور دوسری جگہ لاجواب کافی پی کے لوٹے تو صورت حال جوں کی توں تھی۔ دفتر خالی تھا اور بقراط ساکت لیٹا ہوا تھا۔ طوطی صاحب کا شہزادہ سلیم نہ جانے کہاں تھا۔ اندر زنان خانے میں بھی کوئی صدا نہ تھی۔

میں نے ایڈیٹر کی کرسی پر براجمان ہو کے کہا "شیروانی صاحب۔ دل بہت اداس ہے۔ بچوں کے تصور سے۔"

محسن پر رقت طاری ہو گئی "وہاں وہ ہمیں یاد کر رہی ہوں گی۔"

"بالکل اسی طرح جیسے ہم سب چودھری دلاور کو یاد کرتے ہیں۔ جذبات کچھ ایسے ہی ہوں گے۔"

"کیوں نہ ہم ان سے فون پر وہ گالیاں کوسنے وغیرہ سن لیں جو واپسی پر ملنے ہیں۔" محسن بولا۔

میں نے کہا "آتش فشاں کو خود چھیڑنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ وہ اپنے وقت پر پھٹے گا تو بھگت لیں گے۔ ہاں یہ ٹیلی فون دیکھ کے مجھے بڑی ترغیب ہو رہی ہے۔"

میں نے فون اپنی طرف کھسکا لیا اور الزبتھ کا نمبر ملایا۔ ریسیور غالباً کسی ہاؤس میڈ یا کیئر ٹیکر نے اٹھایا۔ میں نے کہا "سکندر بخت فرام پاکستان۔ مجھے لیڈی الزبتھ سے بات کرنی ہے۔"

"یس سر۔ پلیز ہولڈ آن" اس نے مؤدبانہ کہا اور چند سیکنڈ بعد میں نے الزبتھ کی آواز سنی۔

"تم پاکستان میں ہو ابھی تک۔"

میں نے کہا "ہاں اور آزاد بھی ہوں۔ جیل خانے سے نہیں [illegible] رہا ہوں۔"

"[illegible] تمہاری آمد کی منتظر رہی۔"

"وہاں کی پولیس بھی منتظر رہی ہوگی" میں نے [illegible] "سچ بتاؤ الزبتھ۔ کیا تمہارا یہ شوہر بھی تمہارے باپ کی طرح متعصب اور کینہ پرور ہے؟"

"شٹ اپ۔ کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔ کیسے بات کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "اس نے پکا بندوبست کیا تھا کہ میں پکڑا جاؤں۔ کراچی سے لندن پہنچ کے پھر ڈی پورٹ کیا جاؤں۔ اس نے برٹش قونصلیٹ کو میرے خلاف بریف کیا۔ اتنا حسد کرتا ہے وہ اب تک مجھ سے۔ اب تو میں اس کا رقیب نہیں تھا اور میں نے تم سے راز داری کی بات کی تھی۔ تم نے اسے سب کچھ بتا دیا۔"

www.paksociety.com

الزبتھ پھٹ پڑی "کیوں نہ بتاؤں اسے۔ آخر وہ شوہر ہے میرا۔ تم کیا ہو؟ ایک ہرجائی پلے بوائے۔ کتنی لڑکیوں سے انتقام لیا تھا تم نے دور غلامی کا۔ ان میں ایک میں بھی تھی۔ کیا اس سے زیادہ کمینگی ممکن تھی؟ پھر میں کیسے معاف کرتی تمہیں۔ تم نے شادی کر لی۔ مجھے معلوم ہے تمہاری بیوی بہت خوب صورت ہے اور بہت مشہور وکیل ہے۔ تم نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔"

"اس کا مطلب ہے تم میری جاسوسی کرتی رہی تھیں۔"

"یہی سمجھ لو۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ تم... تم کیا کر رہے ہو۔ میرے بغیر تمہارا کیا حال ہے۔ تم نے بھلا دیا تھا مجھے۔"

"میں مجبور تھا۔ تمہارے باپ نے اتنی ذلت کے ساتھ نکلوایا تھا مجھے۔"

"ذلت تو میں نے برداشت کی تھی۔ تم سے دل لگا کے بھی۔ طعنے سنے تھے کہ میں نے اپنے خاندانی وقار کو خاک میں ملا دیا۔ ایک کالے آدمی پر عاشق ہو گئی، باپ کی عزت کا جنازہ نکال دیا۔ اور تمہارے جانے کے بعد بھی ذلیل ہوئی جب مجھے تمہاری فتوحات کا علم ہوا۔ انکار مت کرنا۔ میں خود ان سے ملی ہوں۔ جو تمہاری مفتوحہ تھیں۔ ایک... دو... تین... حد ہوتی ہے بے شرمی کی۔ اس کے بعد میں نے واقعی جاسوسی کی۔ ایک ایک کو تلاش کیا... پھر انڈیا..."

"تو چلو وہ انڈیا۔ دس از پاکستان۔"

"میرے لیے برابر ہے۔ وہاں بھی ایک منگیتر تھی تمہاری۔ تم نے اسے بھی چھوڑا۔ جو تمہاری واپسی کی آس میں سالوں بیٹھی رہی تھی۔ پور گرل۔ تم نے ایک دولت مند وکیل کو پھانس لیا۔"

"شٹ اپ!"

"یو شٹ اپ۔ کیا غلط ہے اس میں؟ وہ ایک مطلقہ عورت تھی۔ پہلے شوہر نے اسے چھوڑ دیا تھا پھر بھی تم نے اس کے ساتھ محبت کا ڈراما کیا اور پھر اسے ساتھ لے کر پھرتے رہے۔ اس کا گھر بار تباہ کر دیا۔ لیکن ابھی تک تم نے شادی نہیں کی۔ اب اس سے۔ کیا اب کسی اور پر نظر ہے۔"

"بس کرو الزبتھ ورنہ میں لندن آ کے تمہارے گھر میں گھس کے تمہیں ماروں گا۔ تم بہت گھٹیا بازاری باتیں کر رہی ہو۔"

"تم ہو ایک ایسے آدمی جو بازاری عورتوں کے لائق تھا۔ میرے جیسی شائستہ لڑکی کے لیے نہیں... اور لندن آ کے تو دیکھو، پولیس تمہاری بوٹی بوٹی چھوڑ رہی ہے۔ میرے گھر میں تم کیا گھسو گے۔ میرے کتے تمہیں تکا بوٹی کر کے کھا جائیں گے اور میرا شوہر۔"

"تمہارے شوہر کی ایسی کی تیسی اور میں ضرور آؤں گا لندن۔ بہت جلد، اور تمہیں اپنی بیوی سے ملواؤں گا۔ اسی وکیل سے۔ یہ بتادوں تمہیں کہ وہ تم سے بہت زیادہ حسین ہے۔ تم اس کی خاک پا بھی نہیں ہو اور نہ تمہاری محبت اس کے عشق کا مقابلہ کر سکتی

"رہنے دو سکندر بخت۔ تم کو ایسے آنا ہوتا تو آ جاتے؟ آ گئے۔ تمہارا عشق سچا ہوتا تو کون تمہارا راستہ روک لیتا۔ اب بھی تو آ ہی رہے تھے تم مگر اس وقت تم خود کو... مجھ سے جان بھی چھوٹ رہی تھی اور تمہیں اپنے باپ... اپنے کاروبار کی فکر تھی۔ جائیداد کی فکر تھی۔ الزبتھ ایک بے وقوف لڑکی تھی جو تمہارے ساتھ انڈیا بھی آ جاتی۔"

"پھر انڈیا۔ میرا وطن پاکستان ہے لیکن الزبتھ کس نے بتایا تھا۔ میرے خاندانی معاملات کے بارے میں؟"

"تھا کوئی میرا ہمدرد۔ اس نے فون کر کے مجھے مطلع کیا۔ مجھے معلوم ہے تمہارے باپ کی موت تمہارے آنے سے پہلے ہو گئی تھی۔ پھر تم نے اس کے قاتل کو مار ڈالا۔ ورنہ پھانسی ہو جاتی تمہیں مگر اس وکیل نے تمہیں بچا لیا۔ تم نے ایک گروہ بنا لیا تھا۔ دہشت گردی شروع کر دی تھی۔ میں اور بنگلہ دیش میں تم تخریبی کارروائیاں کرتے رہے۔ تمہارے اس گروہ کا... نام 'ایم آر ایس' مارز... سوسائٹی۔"

میں نے کہا "تمہارے اس ہمدرد کا نام کیا تھا؟"

اس کی ایک لمحے کی خاموشی نے مجھے بتا دیا کہ وہ مجھ سے چھپانا چاہتی ہے "وہ... کوئی بھی ہو۔"

"وہ اکثر فون کرتا ہو گا تمہیں۔ تمہاری معلومات کے لیے؟"

اس نے حال ہی میں رابطہ کیا تھا۔

"چھوڑو یہ ساری باتیں سکندر۔ آئندہ مجھے... مت سمجھنا۔ تم نے انگریزوں سے دور غلامی کا بدلہ لیا... میں تمہاری فتوحات کا بدلہ ضرور لوں گی۔ اگر... اس بار تو تم قسمت سے بچ گئے۔"

"میں ضرور آؤں گا الزبتھ۔ مزید توقعات کے ساتھ... ملکہ لوزانی ہو یا میں الزبتھ ٹیلر سے..."

میں نے فون رکھ دیا اور دھاڑ کے کہا "الو کی پٹھی۔"

بقراط ایک دم اٹھ بیٹھا "وعلیکم السلام۔ کیا ہوا؟ آج بھی سورج نکلا ہے اور مشرق سے ہی نکلا ہے۔ ... چار گھنٹے ستائیس منٹ ہو چکے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "یہ گھڑی دیکھے بغیر تم نے کیسے بتا دیا؟"

"جب میری آنکھ کھلتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"یعنی اتنے پابند ہو تم وقت کے؟ یہ انگریزوں کی عادت تم نے کیسے اختیار کر لی۔ طوطی صاحب کے ارشادات کی خلاف ورزی ہے۔"

"مگر آج تو دیر سے اٹھا ہوں میں۔ کل چار بجے... ہو چکے تھے سورج نکلے ہوئے۔ کیا تم سورج کو روز دیکھتے ہو؟"

میں نے اپنی کم علمی کا اعتراف کیا "نہیں۔ مگر... کر جاؤں گا اور دیکھوں گا۔"

"...جہاں مت جانا۔ ایک لمبا سا بانس لے کر اس کے اوپر... باندھ لینا اور صبح صبح دیکھ لینا۔ اس وقت سورج بہت نیچا... بیٹھا تھکا ہوا تھا مگر خطرناک بالکل نہیں تھا۔ طوطی صاحب کی باتیں کیسے آ سکتی تھیں۔ وہ بقراط تھا۔"

محسن نے بڑے غور سے میرے یک طرفہ مکالمے سنے تھے اور لہجے سے اندازہ کر لیا تھا کہ دونوں طرف سے آگ برابر لگی ہے۔ محبت کی نہیں نفرت اور حسد و رقابت کی آگ تھی۔ سب سن لینے کے بعد اسے مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بقراط اس کائنات کے کسی عمیق نکتے میں ہی الجھا ہوا تھا کہ طوطی صاحب وارد ہوئے۔ میں نے فوراً ان کی کرسی خالی کر دی۔ انہوں نے بیٹھتے ہی فرمایا "محترمی اپنے پاکستانی بھائیو! تمہارا کام ہو گیا۔ میں نے سارا انتظام کر دیا۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی "با محاورہ گفتگو سے میں ڈر گیا تھا۔"

انہوں نے میز پر ہاتھ مارا "ڈرتے نہیں دنیا میں مسلمان کسی سے۔ شاعر مشرق کا یہ شعر یاد رکھو۔ ڈرو صرف اللہ سے۔"

وہ ہر لکھنے والے ہر شعر کو علامہ اقبال سے منسوب کر دیتے تھے۔ ان کی شاعر مشرق سے عقیدت کی انتہا تھی "اوئے بقراط اب اٹھ جا نہیں تو ڈنڈا مارتا ہوں تیرے سر پر۔ دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔ ہر چیز کو دیکھ کر چپ رہا ہے ٹھیک ہے یا نہیں۔ ہوشیار بیٹا تو دیکھ رہا ہو گا اس حرافہ کو جو آفس میں بیٹھی ہے تو دیکھنے کی چیز مگر اس پر واجب ہے کہ پہلے دعوت اسلام دے۔ پھر عشق کرے۔ جیسا کہ ہمارا قاعدہ تھا۔"

میں نے انہیں یاد دلایا "آپ ہمارے کام کی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں۔ خوب یاد دلایا میری سرکار۔ کاؤنٹی جیل کے اندر تو... گارڈ ہیں باہر کے اسٹاف میں اپنا ایک پاکستانی بھائی ہے۔ اس نے... رشوت اور... بڑی خرابی ہے ان کافر ملکوں میں کہ رشوت بہت کم کھاتے ہیں۔ آگے میں شک کے... ایسے لوگ۔ اپنے وطن میں تو ماشاء اللہ شک میں آئے... بغیر رشوت لیے کر خدمت خلق کرنے والے۔ ایک راستہ نکل آیا ہے۔ ایک وعظ ہے 'واش ود مین' وہ اندر ہی کام کرتی ہے اور اس کے ناجائز مراسم سب سے ہیں۔ قیدی سے جیلر تک... ذلیل کی اولاد مشترکہ ہے وہ میری سرکار۔ وہی کرے گی اپنا کام... اور جب سے بولی شروع ہو گی۔"

"...ہم اسے کسی قیمت پر خریدنا نہیں چاہتے۔ مفت ملے تو سب کچھ۔"

طوطی صاحب نے "کام کی بولی۔ اپنا پاکستانی بھائی اسے... کے گارڈ کی جاسوس سے ملوا دے۔ وہ بے گناہ جیل کاٹ رہا ہے۔ اگر... کی جان بچ جائے اور تمہیں ثواب کے ساتھ سو پونڈ بھی ملیں تو

اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے۔ امید ہے دو سو پونڈ میں کام ہو جائے گا۔ میں دو سو پونڈ دے آیا کہ بسم اللہ کرو۔"

رشوت دینے کے لیے بسم اللہ! مجھے افسوس بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی مگر میں طوطی صاحب سے کچھ کہتا تو ان کا جواب یہی ہوتا کہ میری سرکار۔ جو کام بھی خدا کا نام لے کر شروع کیا جائے اس میں برکت ہوتی ہے۔

محسن نے دو سو پونڈ انہیں پیش کیے جو انہوں نے فوراً اچک لیے اور میز کی دراز میں ڈال کے پھر تالا لگا دیا "اس نے کہا تھا کہ وہ سہ پہر تک فون کر کے مجھے بتائے گا۔"

"کیا بتائے گا؟"

"یہی کہ جارج سے کب کیسے اور کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ تم خود اندر پہنچ جاؤ۔ کوئی چھوٹا موٹا جرم کر کے۔ جب جرمانہ ہو تو خالی جیب دکھا دینا۔ وہ تمہیں دو چار دن یا ہفتے بھر کے لیے جیل میں ڈال دیں گے۔ وہاں اطمینان سے ملاقات کرنا۔"

"طوطی صاحب یہ کیا فرما رہے ہیں آپ؟ میں یہاں سزا یافتہ کہلاؤں۔ واپس پاکستان جاؤں یہ داغ رسوائی لے کر کہ میں کافر انگریزوں کی جیل میں رہا تھا۔ اور یہ چھوٹا موٹا جرم کیا ہوتا ہے جس کی سزا دو چار دن کی جیل ہو۔"

طوطی صاحب نے غور فرما کے کہا "یہی... پتھر مار کے کسی گاڑی کی لائٹ توڑ دو۔ کسی میم کے گال پہ تھپڑ مار دو۔ ٹریفک سگنل پر چڑھ کے بیٹھ جاؤ۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ویزا کے بغیر داخلہ زیادہ بڑا جرم بن جائے گا۔"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ سمجھ گئے" میں نے کہا۔

طوطی صاحب نے کہا "اس میں بھی کیا حرج ہے۔ تمہیں دوبارہ ڈی پورٹ کریں گے۔ واپس پاکستان ہی جاؤ گے نا میری سرکار۔ کوئی کالے پانی تو نہیں۔ خرچہ بچے گا واپسی کا۔ کچھ دن یہاں بھی جیل میں رکھیں گے... جیل یہاں کی اپنے پیارے پاکستان جیسی نہیں ہوتی... اچھا ماحول ہوتا ہے اور کھانا بھی۔"

میں نے سر پکڑ کے کہا "طوطی صاحب۔ واپسی پر تو پاکستان کی جیل ہی جانا پڑے گا۔ آپ کیوں مجھے اندر کرانا چاہتے ہیں۔"

"نہیں میرے بھائی۔ میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔"

"شاعر مشرق نے فرمایا ہے یہ بھی؟" میں نے طنز سے کہا۔

"اور کون فرما سکتا ہے۔ تم نے تو رازمی لگالی۔ اچھا کیا، لیکن شیروانی صاحب بالکل اور پکڑ جھولے پھر رہے ہیں۔ یہ تشویش کی بات ہے۔"

"اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ محسن بھی میک اپ سے چہرہ بدل لے" میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ طوطی صاحب تائید یا تردید کرتے اور محسن کی شکل بدلنے کے امکانات پر لائٹ ڈالتے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے

www.paksociety.com

گئی۔

ریسیور اٹھا کے انہوں نے آغا حشر اسٹائل میں کہا "طوطی بول رہا ہے۔" پھر ریسیور پر ہاتھ رکھ کے ہمیں مطلع کیا "ریٹی ہے۔ اپنا پاکستانی بھائی۔ ہاں میری سرکار۔" کہا "ہاں! بالکل جانتا ہوں اس خر دلر کو۔ یہ کیا کہہ رہے ہو۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تم سے جھوٹ تو نہیں بولا اس انٹرنیشنل معشوق نے۔ اچھا... ہاں... میں سمجھ گیا... ٹھیک ہے۔"

جب انہوں نے ریسیور رکھا تو ان کے چہرے پر شکنوں والے بارہ بجے ہوئے تھے۔ "گڑبڑ ہو گئی اپنے پاکستانی بھائی۔ وہ غضب زادہ تم سے پہلے اپنا کام کر گیا۔"

"کون... چوہدری بدکار؟" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ کہا۔

طوطی صاحب نے اوپر نیچے سر ہلا کے افسوس سے دائیں بائیں ہلایا "وہ کسی طرح جیل کے اندر پہنچ گیا تھا۔ جارج سے ملا اور اس کو چھوڑ گیا۔ کھانے پینے کی کوئی چیز ہو گی۔ چاکلیٹ چیونگم وغیرہ۔ بعد میں اس کی حالت بگڑ گئی۔"

صدمے سے میں اور محسن سن بیٹھے رہے۔ "آگے بتایئے کیا وہ مر گیا یا زندہ ہے؟"

طوطی صاحب نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لے کر اوپر دیکھا۔

"زندہ ہے میرے پاکستانی بھائی۔ خیر اللہ تمہیں صبر جمیل عطا کرے۔"

میں نے کہا "یہ تو اچھی خبر ہے۔"

طوطی صاحب نے مجھے اشارہ کیا "یہ اچھی خبر ہے؟ ذرا اپنا کھڑا ادھر کرو... اور منہ قریب کرو۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے چہرہ آگے کیا تو انہوں نے میری داڑھی پکڑلی "یہ... کیا کر رہے ہیں آپ طوطی صاحب... نقلی داڑھی ہے۔"

انہوں نے داڑھی ہٹا کے میرا منہ سونگھا اور ناک سے سوں سوں کی ایسی آواز نکالی جو اسٹیم انجن روانگی سے پہلے نکالتا ہے۔ "الحمد اللہ۔ تمہاری بات سے مجھے شک پیدا ہو چلا تھا کہ تمہارے ذہن میں ام الخبائث کا نشہ غالب ہے۔ ویسے داڑھی ملائم اور ریشمی ہے۔ واش اینڈ ویئر۔ غالباً میڈ ان جاپان ہو گی۔ اور نیچرل لگتی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے کہا "جی سو فیصد خالص ملکی چیز ہے۔ ساختہ اسلامی جمہوریہ پاکستان۔ مگر یہ آپ نے کیا نامعقول حرکت فرمائی تھی۔ کیسے فرض کر لیا آپ نے کہ حرام شے میرے حلق سے اتر کے دماغ تک چڑھ گئی ہے۔"

انہوں نے دوستانہ انداز میں اپنا پہلوانی کے داؤ والا ہاتھ میرے شانے پر مارا "برا ماننے کی بات نہیں۔ اپنے بہت سے پاکستانی بھائی ولایت کا رخ آخر کس لیے کرتے ہیں؟ ولایتی شراب و شباب۔ جس کو منہ لگاتے ہی وہ جاتے سے باہر ہو جاتے ہیں یا دلاتی شباب کے لیے جو منہ لگانے سے پہلے ہی جانے سے باہر... تم نے بات ہی ایسی کی تھی۔"

میں نے کہا "ایسی کون سی غلط بات کی تھی میں نے..."

محسن بھی بولا "ہمارا کون اللہ کو پیارا ہوا تھا کہ... جمیل کی دعا کی تھی؟"

انہوں نے سر ہلایا "دعا برحق تھی۔ آخر تمہارے... کی خطیر رقم نے انتقال کیا۔ تمہاری جیب سے نکل گئی... اس انٹرنیشنل معشوق کے حساب میں۔ چار دن کا... خدا ہی ملائے وصال صنم ہے۔"

میں نے کہا "وہ سوپاؤنڈ پر لعنت۔ خدا کا شکر... انتقال نہیں ہوا۔ ورنہ ہمارے یہاں تک پہنچنے تک... ہو جاتا۔"

محسن بولا "واپس جا کے کیا منہ دکھانے اپنا منصوبہ... خود جرم عائد کرنے میں دیر نہ لگتی کہ جارج کا قتل... ایک شرمناک مقصد کے ساتھ کیا اور لندن سے لوٹے... مخبران کو مطمئن کرنا اتنا سنگین مسئلہ نہیں تھا۔ ... کوئی جارج پکڑ لیتے۔ اپنے پاکستان میں کیا کم جارج ہیں... اپنے مولوی غلام حسین کی گلی میں آتا ہے روز... کے ساتھ ... بکل کے کبھی بیٹھ کے آتی ہے۔"

طوطی صاحب نے ہمیں پر ملامت نظروں سے دیکھا... "تمہاری سوداگی پر اپنے پاکستانی بھائیو! ہو... پاس کی عقل نہیں اسے دوزرل ہے۔"

میں نے کہا "کوشش کی تھی مگر انہوں نے... اناولی۔ خیر اب فرمایئے کہ یہ مسئلہ آخر کیسے حل ہو گا... کہاں ہے؟"

"ظاہر ہے کہ وہ اسپتال میں ہے۔"

"اور اس کی حالت کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟"

بولا۔

طوطی صاحب نے کہا "بھئی ابھی تمہارے سامنے... اطلاع ملی ہے مجھے بھی۔ اب نئے سرے سے جاسوسی... اور اپنے چیف رپورٹر کو روانہ کرتا ہوں اسپتال... تفصیلی خبر لانے کو۔"

میں نے کہا "کون ہے آپ کا چیف رپورٹر؟"

"بھئی تم مل چکے ہو اس سے۔ ماشاء اللہ بڑا ہوشیار ہے... جگہ پہنچ جاتا ہے اور اندر ایسے گھس جاتا ہے... میں دھول جھونک کے۔" انہوں نے مسکرا کے ... ہاتھ مارنے کی ناکام کوشش کی۔

میں فوراً پیچھے ہو گیا "ہماری اس سے کب ملاقات..."

"کل کئی بار تم نے دیکھا اسے میرے پاکستانی... طلبہ بھی اوجھل نہ تھا اور اس کے کرتوت بھی دیکھے... ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہماری ناظمہ...

...سے کام کر لیتا ہے۔ اللہ نے بڑی صلاحیت عطا کی ہے... ایک بار ہم نے ذاتی پاپولی مبارک کے ذریعے اس کو... مجبور کر دیا تھا تو... سنسنی خیز انکشاف ہوا تھا کہ وہ... اعتراف جرم... خزانہ کفار کے بیچ عشق میں ہوا... کر دیا ہے۔"

"...سب سے چالاک شخص تھا اسے؟" محسن نے طنز یہ کہا۔

"الحمد اللہ۔ جھوٹ سے اس کو بھی نفرت ہے ہماری طرح... کر کے چھوڑ دیا کہ چار سے نجاروں کی ہم اجازت... شرع کی حد ہے جس پر ہم بھی کاربند ہیں۔ اس... کسی ایک سے بھی ممکن نہیں کی ہمارے بھتیجی... تک اختر پاحیا اور شہناز اسلامی کی... قبول ہیں لیکن زمانے کی ریسرسل بھی تو... کے مطابق ہونی چاہیے۔ اس نے فرمہ اندازی سے دو کو... نصاب کیا اور اتنا سعادت مند ہے کہ پھر جب بھی دریافت... بلکہ چار کے نام تک بتاتا ہے شرماتے... ہوئے۔"

...نے کہا "ایک ایسی ہی سے رات بھی ملاقات ملے تھی... نہ ہو سکی۔"

انہوں نے فخریہ راز داری سے بتایا "اسی لیے میں نے اس کو چیف رپورٹر بنایا کہ خدائی فیصلہ ہے اور روزنامے باز بھی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ہم نے تو سنا ہے اس کے پاس گیدڑ سنگی ہے... ہم تلاش کرتے رہے ساری عمر۔ ہمیں تو اصلی نہیں ملی 'پتہ نہ جانے کہاں سے لے آیا۔ یہی راز ہے اس کی فتوحات کا میرے پاکستانی بھائی۔ نجری کے قریب پہنچ گیا ہے۔ ہم نے بھی بڑی دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے اس کی عاشقانہ صلاحیت کا رخ موڑ دیا 'صحافتی کام کی طرف۔ اب ہر جگہ سے اندر کی خبر وہ ایسے ہی لاتا ہے کہ اپنی گیدڑ سنگی سے کسی پر جادو چلا دیتا ہے۔ کہیں کوئی باڈی گارڈ ہو، خادمہ ہو 'نرس یا نجیر ہو۔ یوں اس کی گرل فرینڈ بن جاتی ہیں۔"

انہوں نے چٹکی بجا کے داد طلب انداز میں کہا "اس معاملے میں جتنا خوش قسمت اور باصلاحیت ہے اتنا ہی پرکشش بھی ہے خیر سے۔ نہ رنگ دیکھتا ہے نہ عمر نہ صورت نہ سیرت۔ بس کوئی بھری یا اندھی نہ ... انجن چل رہی ہو۔ یہ تو رستور ہے یہاں کا 'ساٹھ سال کی بھی گرل فرینڈ ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "آپ نے واقعی کمال دانش مندی کا ثبوت دیا ہے اسے چیف رپورٹر بنا کے۔ موروثی صلاحیت اور ذہانت کے ساتھ گیدڑ سنگی ہے۔"

ان کا سر فخر سے بلند ہو گیا "کیا فرمایا ہے اپنے علامہ صاحب نے کہ ہے ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ بالکل اسی پر عمل کرتا ہے۔ اسکول کے امتحان تو میں پاس کرتا ہوں سفارش سے۔ اپنے ایک پاکستانی بھائی کا اسکول ہے۔ ان کو فون کرنا ہوتا ہے۔ کسی امتحان کی بھی کیا ضرورت پڑتی ہے غلط خبر لگانے کی۔ مگر وہ اپنے نمبروں سے پاس کرتا ہے تھے۔"

محسن نے کہا "گویا پڑھ لکھ کے عالم فاضل بھی ہو گیا آپ کی رہا ہے۔ عشق کے امتحان میں خود پاس ہوتا ہے۔"

"اپنے نمبروں سے" میں نے اضافہ کیا "چیف رپورٹر ایسے ہی نوشیں بن گیا "طوطی" کا۔"

ان کا سر فخر سے مزید بلند ہو گیا "اور بھی بہت کچھ کر لیتا ہے وہ میرے بھائی! سرکولیشن کا بھی مسئلہ نہیں۔ ٹی وی اخبار بھی پہنچا سکتا ہے ہر جگہ۔ اشتہار لے آتا ہے تو کیا خاک۔ حقہ بھرنا خود میں نے سکھایا۔ پراٹھے وار دال خوب بناتا ہے اور کریلے قیمہ تو ایسا پکاتا ہے۔"

میں نے کہا "بس تو پھر آپ اس کو بلیے۔ میرا مطلب ہے اپنے چیف رپورٹر کو فوراً روانہ کریں اسپتال۔"

طوطی صاحب نے روئے سخن مخالف سمت میں کر کے ہانک لگائی "ارے میرے پیر زور دین... نور دین۔" ان کی آواز میں جو غرور آمیز شفقت تھی وہ جواب موصول نہ ہونے پر فطری ناراضگی میں بدل گئی "ارے غرائی... سور کے بچے نور دین..."

دروازے کی اوٹ سے ان کے دوسرے برخوردار نے کہا "نہیں ہیں ابا جی۔" اور پھر صرف قمیص میں نمودار ہوا جس سے وہ ناک بھی صاف کر رہا تھا۔

طوطی صاحب نے خاصی شرمندگی کا اظہار کیا "وہ گیا۔ عمر تو اتنی نہیں ہے اس کی۔ سات سال کا ہے مگر لگتا ہے پورا کھوتا۔ سارا قصور ہے اس اپنے پاکستانی بھائی لال خان جراح کا۔ سالکوٹ کا ہر ہفتے کہتا ہے جی بس اب کے جئے اور پھر غائب... کسی اور پہ بھروسا نہیں۔"

میں نے زیادہ اہم امور کی جانب متوجہ کرنے کے لیے کہا "کیا حرج ہے اگر ہم خود اسپتال چلے جائیں۔"

"جاؤ، جاؤ۔ شوق سے جاؤ۔ پولیس سے طوا دوں گا تم کون ہو اور کس لیے تشریف لائے ہو۔ لندن کی پولیس کے بارے میں سنا ہی ہو گا آپ نے کہ بڑی خوش اخلاق ہے اور ملنسار ہے۔ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور جارج کو اسی وقت ٹھیک ٹھاک کر کے آپ کے ساتھ کریں گے کہ لوجی 'جاؤ سی بخراب میرے حوالے کیا؟ تنگ بھی رہیں اور آپ کو چھوڑنے بھی جائیں ایئرپورٹ تک۔"

میں نے کہا "آپ تو خفا ہو گئے۔"

"ارے نہیں بھائی... دور کے ڈھول سہانے۔ یہاں کی جو پولیس ہے تا وہ بس گوری چمڑی والوں کی یار ہے۔ کالا رنگ دیکھ کے تو ان کا خون سفید ہو جاتا ہے۔ اور دوستی کی بات محدود ہے شرفا تک۔ جہاں تک میرا خیال ہے تم کو وہ شرفا نہیں سمجھیں گے۔ یہی کیا کم قصور ہے تمہارا کہ تم پاکستانی ہو میرے بھائی 'اور پھر خیر سے مشہوری بھی ہے تمہاری۔ مطلوب مجرم دہشت گرد جیسے خطابات کے ساتھ تشریف لائے ہو۔ وہ بھی بلا اجازت۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "یہ سب تو ٹھیک فرمایا آپ نے۔"
"مگر ہمارے فرمانے سے پہلے جو آپ نے فرمایا تھا بھولے بادشاہ اس پر بھی غور کرو۔ تم گئے تو پھر سمجھو گئے کام سے۔ واپس کیسے آؤ گے؟"
محسن نے بات مختصر کی "اچھا پھر آپ خود فون کر کے معلوم کرلیں۔"
"میں کہاں فون کروں؟"
"اسپتال۔ جہاں جارج کو رکھا گیا ہوگا۔۔۔ آخر آپ ایڈیٹر ہیں۔ کفر کے نقار خانے میں طوطی کی صدا سب سن چکے ہیں۔ ذرا رعب والی آواز نکال کے انگریزی میں پوچھیں کہ آج صبح کاؤنٹی جیل میں جس نیگرو قیدی کو زہر دیا تھا تم لوگوں نے 'وہ زندہ ہے کہ مرگیا؟' پھر دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں۔"
ان کی آنکھیں چمکنے لگیں "یہ بات تو سولہ آنے ٹھیک ہے کہ اس بندۂ ناچیز حاجی علم دین آف سانده کلاں لاہور شریف کو اس مولا کریم نے ولایت پہنچایا اور عزت دے کے ایڈیٹر بنایا۔ جس کے نام سے آج یہ گورے ایسے وحشت زدہ ہو کے کانپتے ہیں جیسے کبھی انگریز ڈپٹی کلکٹر کے سامنے بڑے بڑے رائے بہادروں کی دھوتی گیلی ہوتی تھی۔ لیکن بڑی خرابی یہ ہے کہ اس لحم خنزیر کھانے والی قوم میں کہ یہ بے مروت ہوتے ہیں۔ اگر معاملہ قانون کا اور فرض کا ہو۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ایڈیٹر ہو یا لندن کا لارڈ میئر یہ کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کرتے۔ دخل اندازی کرتا جو کوئی نہیں۔ اپنا پیارا پاکستان ہوتا تو ہم ایڈیٹر کی حیثیت سے کسی وزیر کے مشیر کے سیکرٹری کے چپڑاسی کو فون کر دیتے تو اب تک بندہ گھر پہنچ چکا ہوتا اور اسے پکڑنے والا پکڑا گیا ہوتا۔" انہوں نے ایک آہ بھری "ادھر تو وٹ بھی نہیں چلتے میرے پاکستانی بھائی، فون کیا تو میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ادھر پہنچ جائے گا کوئی منکر نکیر سوال کرنے کہ تم کو کس نے بتایا اور تم نے کیوں پوچھا۔"
"پھر کیا کریں ہم۔ ایسے ہی ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں۔ مجھے تو بڑی پریشانی ہو رہی ہے۔"
طوطی صاحب نے فوراً اپنی میز کی دراز میں سے ایک ڈبیا برآمد کی "یہ لو خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا۔ خاص چیز ہے اور گجرات کے ایک حکیم ہیں ادھر بڑی محبت سے اور محنت سے تیار کرتے ہیں میرے لیے۔ دل کو بڑا قرار ملتا ہے ایک ہی خوراک میں۔ میں تو ان کفار کی ولایتی دواؤں سے اتنا ہی دور رہتا ہوں جتنا کہ ہر سچے پاکستانی کو رہنا چاہیے۔ اللہ جانتا ہے بس کہ کیا ڈالتے ہیں یہ ان میں۔ مجھے حکیم صاحب نے خود بتایا علقیہ کہ نجس جانوروں کے تمام اخراج ۔۔۔۔"
شہزادہ سلیم تغلق ہولے ہولے چلتے میں نمودار ہوئے۔ اس وقت وہ جینز، جوگرز اور جیکٹ میں انسان کا بچہ نظر آ رہا تھا اور خاصا اسمارٹ بھی لگ رہا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال شانوں سے ذرا اوپر جھول رہے تھے اور اس نے بڑے بڑے شیشوں والی دھوپ کی عینک لگا رکھی تھی۔
"تم نے مجھے بلایا ڈیڈ!" اس نے [illegible]
"ڈیڈ وا چز!" طوطی صاحب آگ بگولا ہو کے [illegible] "ملعون کافروں والا حلیہ۔ لباس بدلتے ہی لہجہ بدل گیا … گمراہ۔"
نور دین اور وہ کے میز کی دوسری طرف نہ پہنچتا تو … پاؤں کی جوتی ہاتھ میں پکڑ چکے تھے اس کی سرزنش کو …
"ابا جی غلطی ہو گئی۔ آپ میری بات تو سنیں۔" قوطی مار کے خود کو فلائنگ جوتی کی ضرب سے … "میں جا رہا تھا کسی سے ملنے۔ ایک ضروری کام سے۔"
طوطی صاحب پھر ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھ گئے "تھی۔۔۔ بولو؟"
"ابا جی اس نے کہا تھا کہ کارٹون بن کے مت آؤ …" شرما کے بولا۔
"کیا مطلب! مجھے تو اس وقت کارٹون لگ رہا ہے …"
"جب میں شلوار قمیص شیروانی اور جناح کیپ پہن کے … ہوں تو سوسن کہتی ہے کہ۔۔۔"
"اور تو ہمارے قومی لباس کی توہین برداشت کرتا ہے؟" مشتعل ہو کے اٹھے "بے غیرت۔"
نور دین نے فوراً ہمارے پیچھے پناہ لی "ابا جی آپ … کہ سوسن سے وہ سب معلوم ہو سکتا ہے جو پولیس چھپا رہی …"
ابا جی سوچ میں پڑ گئے "یہ کس کیس کا حوالہ ہے؟"
چیف رپورٹر کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے ایڈیٹر صاحب میں کچھ کہا۔ اس کا چہرہ حیا سے یوں لال ہو گیا تھا جیسے … زادیوں کا اپنے منگیتر کے ذکر پر ہو جاتا ہے۔ حاجی صاحب … سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی گردن پر جھانپڑ رسید کیا … ہے۔ مگر یہ سوسن۔۔۔۔ ایک منٹ ٹھہرو۔۔۔ میں ڈائری دیکھتا ہوں … پہلے تو اس کا نام نہیں تھا۔"
پھر نور دین نے اپنی ٹھوڑی کو بلند رکھا "یہ عارضی ہے … ایک گرل فرینڈ ہے۔"
ابا جی نے ڈائری ملاحظہ فرما کے کہا "ڈیڈ یا کے؟ جب مجھے … کہہ دیا کہ ایک وقت میں چار سے زیادہ نہیں تو پھر … نام کاٹوں؟"
نور دین نے منہ بسور کے ٹھنڈی سانس لی "ابا جی … جب کاٹ دیں جون کا نام۔ سوسن کا لکھ دیں۔"
حاجی علم دین نے ترمیم فرما کے ڈائری جیب میں رکھی … "بہت ہو گئی چیز۔ اب میں تیری ایک شادی کر دوں گا …"
"نہیں ابا جی۔ میں نے نہیں کرنی شادی۔"
"چپ حرامی! تیرا تو باپ بھی کرے گا" طوطی صاحب گرج کے کہا۔
"ہاں، آپ بے شک کرلیں۔"
"اچھا کو اس مت کہ ادھر جا رہا ہے تو اپنے لال خان … سے بھی کہنا کہ ابا جی نے یاد کیا ہے۔ جیسے … ایسے تو لڑکا ہو جائے گا عاقل و بالغ … حکیم صاحب کا اپنا ہاتھ بھی کانپنے لگے گا … نظر کمزور ہو جائے گی۔ تیری بھی ختنہ کروائی ہے بہتر … ہو رہا ہے تو۔"
"میں نے نہیں کروانی ابا جی۔" نور دین نے احتجاج کیا۔
"چپ حرامی! تیرا تو باپ بھی کرائے گا" طوطی صاحب پھر …
"ہاں آپ بے شک کرالیں۔ ویسے بھی اب کیا بچا ہے سر …"
طوطی صاحب نے اس کو فرار کا موقع نہیں دیا "او بے غیرت بدبخت … سر کے اندر ہوتا ہے۔ سر کے اوپر کچھ نہیں ہوتا۔ آئی سمجھ میں؟ یہ جو گھاس پھوس ہے نا تیرے سر پہ۔ تیری یہ … ایسی تو اپنے پیارے پاکستان میں … رکھتے ہیں۔ آنی جانے والے مبارک باراں گانے والے۔ میں جو ایڈیٹر ہوں نا۔۔۔ تو … جو سر کے اندر ہے۔ آئی بات سمجھ میں۔"
"آئی۔ آئی ابا جی، میرا کان اکھڑ جائے گا۔"
ابا جی نے اس کان کو چھوڑ کے دوسرا پکڑ لیا "دیکھ آج کاؤنٹی جیل میں کسی نے ایک نیگرو کو زہر دینے کی کوشش کی۔ کوئی ملاقاتی … اس کا نام معلوم کرنا ہے۔ ہو سکے تو حلیہ بھی۔ قیدی ہو گا … اسپتال میں۔ اس پر دوہرے قتل کا جرم ثابت ہوا تھا۔"
"کون سا جیل … اور قیدی کا نام پتا نہیں ابا جی۔"
"قیدی کا نام تھا جارج۔ ذرا پتا کر وہ کس حال میں ہے۔ بچے گا کہ مر جائے گا۔ اور زندہ ہے تو معلوم کر کہ زہر کیا تھا، کیسے دیا … خبردار اس قیدی سے مت پوچھنا اور پولیس سے بھی نہیں … تجھے پکڑ لیں گے کہ تو ہی مجرم ہے۔ شکل سے مشکوک نظر آتا ہے … تیری طرح۔۔۔ اب دفع ہو جا اور جیسے ہی کوئی کام کی بات معلوم ہو مجھے فون کر کے بتا۔"
"ابا جی!" چیف رپورٹر نے دونوں کان ایک ساتھ ہلا کر دیکھے "ابا جی۔ وہ نرس ہے، جس کا نام کاٹ دیا تھا آپ نے۔۔۔ جون۔ جب مجھے اسپتال میں وہی لے جا سکتی تھی۔ اس کے مراسم ہیں ڈاکٹروں … سے۔"
طوطی صاحب نے میری طرف شکایتی نظروں سے دیکھا "ملاحظہ کرو آپ بھی میرے پاکستانی بھائی، کہتا ہے مراسم۔ اوئے … یاری کیوں نہیں کہتا بے غیرت۔ ناجائز تعلقات کیوں نہیں کہتا۔ مراسم ہوتے ہیں شرفا کے درمیان۔ یہی خرابی ہے اس مغربی تہذیب کی۔ ہمارے آبا و اجداد کی اخلاقی قدروں کا جلوس نکال دیا ہے اس ناہنجار نے۔"
میں نے کہا "طوطی صاحب! مشرق سے مغرب کا سفر آپ نے کیا تھا؟ اپنی مرضی سے۔ اپنے لہور شریف کے سانده کلاں کی تہذیب سے منہ موڑ کے آپ آخر لندن کیوں آ گئے تھے۔"
نور دین بہت خوش ہوا "بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔ ابا جی تکے بیچنے بھی تو جا سکتے تھے۔"
محسن نے کہا "اب نئی پود کو الزام دینے سے کیا فائدہ۔ انہوں نے تو آنکھ ہی اس معاشرے میں کھولی جہاں بقول آپ کے۔۔۔ بے حیائی اور بے غیرتی کے سوا کچھ نہیں ہے۔"
طوطی صاحب جلال میں آ گئے "اجی آپ کیا سمجھتے ہو کہ ہم یہاں اس معاشرے میں اپنی خواہشات نفسانی سے مغلوب ہو کے آئے تھے؟ ایسا ہوتا تو ایک بھی عقد شرعی نہ کرتے۔ ہر روز ایک میم پکڑ لاتے بازار سے۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتی ہیں۔ اپنے پیارے پاکستان سے بڑے بڑے گھروں کے لڑکے رئیس زادے آتے ہیں جی حصول علم کے لیے اور جاتے ہیں تو ہاتھ میں سند چاہے نہ ہو بغل میں فرنگی میم ضرور ہوتی ہے۔ ہم تو آئے تھے ایک عظیم مقصد لے کر۔ اس کافر اور گمراہ معاشرے کی اصلاح کے لیے۔ بے حیائی اور کفر کے خلاف جہاد ایک مقدس فریضہ ہے میرے پاکستانی بھائی۔ کیا تاریخ نہیں پڑھی آپ نے۔ کیسے کیسے بزرگان دین اللہ کے حکم سے ہندوستان پہنچے جو خالص کفرستان تھا اور وہاں اسلام کا پرچم بلند کیا۔ اور اپنے محمود غزنوی جیسے بادشاہوں نے سترہ حملے کیے کفار کے بت پاش پاش کرنے کے لیے۔ تو ایسے ہی ہم آئے تھے۔"
نور دین نے متاثر ہو کے سوال کیا "آپ بادشاہ تھے یا بزرگان دین؟"
حاجی صاحب چراغ پا ہو کے اٹھے "او بے حرامی! تو ابھی تک کھڑا ہے ادھر سے دفع نہیں ہوا۔"
نور دین دروازے کی طرف لپکا مگر اس کے والد ماجد کو فلائنگ جوتی سے نشانہ لینے کی بڑی مشق تھی۔ اس بار بھی ان کا نشانہ خطا نہیں ہوا اور جوتی (اصلی پشاوری چپل ٹائر سول والی) چیف نور دین کی کمر کے ذرا نیچے پر اس جگہ لگی جہاں سے اس کی ٹانگیں شروع ہوتی تھیں۔ عادتاً اس نے کہا "ہائے ابا جی!" اور پھر جوتی اٹھا کے فرار ہو گیا۔ ابا جی شور مچاتے رہ گئے۔ پھر وہ ایک پاؤں میں چپل پہن کے لنگڑاتے ہوئے زنان خانے میں تشریف لے گئے اور جب واپس آئے تو تازی جانے والی چپل پھر ان کے پیر میں تھی۔ انہوں نے خاصی خوش دلی سے کہا "خبیث باز نہیں آتا۔ روز جوتی اٹھا کے لے جاتا ہے۔"
"روز لے کے کہاں جاتا ہے؟" میں نے کہا۔
"اجی اس کے پاس اور کہاں۔۔۔ ادھر جا کے جھوٹ بکواس کرتا ہے کہ ابا جی نے اس جوتی سے مار مار کے چمڑی اتار دی۔ لونڈی پھر ان کا نیپ نکل پڑتا ہے کہ زمانہ بدل گیا تم نہیں بدلے کوئی اس طرح ذلیل کرتا ہے جوان اولاد کو۔ آپ ہی بتاؤ میرے بھائی، زمانہ بدل گیا ہے تو کیا بیٹا ہمارا باپ ہو گیا ہے۔ یہ جو عزت آج ہمیں ملی ہے یہ اس باپ کی جوتیاں کھا کے اور اٹھا کے ملی ہے۔ آخر والدین کے بھی حقوق ہیں۔ میرے ابا جی اللہ ان کو کروٹ کروٹ

www.paksociety.com

جنت نصیب کرے۔ اس گھر والی کے سامنے پھول فرماتے تھے ہماری۔ ہمارا فرض تھا کہ اف نہ کریں۔"

حقوق و فرائض کی اس بحث سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اپنے معاملات کی باگ ڈور طوطی صاحب کے ہاتھوں میں دینے کے بعد ہم بالکل بے کار اور بیزار ہو گئے ہیں۔ بلاشبہ ان کی پناہ میں ہم بہت محفوظ تھے اور ہمیں کوئی کام خود کرنے کوئی خطرہ مول لینے کی ضرورت بھی نہیں تھی مگر یہ تحفظ بے عملی ہمارے مزاج اور ہماری عادت کے خلاف تھی۔

طوطی صاحب کا کام کرنے کا اپنا ہی انداز تھا۔ وہ بیک وقت صحافتی مسائل سے نمٹتے تھے۔ زوجگان کے درمیان امن اور عدل رکھنے کے لیے خانگی معاملات کو زور بازوئے مسلم دکھا کے حل فرماتے تھے اور ان کی بطور پیداوار کے اکلوتے والد کی حیثیت سے ہر عمر اور جنس کے بچوں کے اخلاق و کردار کو لندن میں رہ کے ساتھ کلاں کی تہذیبی روایات کا قابل رشک نمونہ بنانے کی سعی ناکام میں بھی لگے رہتے تھے۔ لندن کے ہر پاکستانی بھائی کو تہذیب مغرب کے تباہ کن اثرات سے بچانا اور انہیں اپنے جہاد میں شامل ہونے کے لیے تیار کرنا جس کے نتیجے میں بالآخر انگلستان میں مسلم اکثریت کا پاکستان قائم ہونا تھا۔ سب سے مشکل کام تھا مگر وہ اپنے ہفت روزہ "طوطی" کے ذریعے تبلیغ کا یہ فریضہ بڑے جوش و خروش سے سرانجام دے رہے تھے۔ اسلامی اور پاکستانی جذبات سے چھلکتی شاعری بھی ایک مصروفیت تھی اور اس بامقصد شاعری کے نمونے فریم کرا کے نمایاں مقامات پر آویزاں کرنے کے لیے مفت تقسیم کرنا تاکہ ان کے کلام کی تاثیر زیادہ سے زیادہ پاکستانی بھائیوں کے دلوں پر اثر کرے۔ پاکستان کے اخبارات سے ہفتے بھر کی چیدہ چیدہ خبریں نکالنا۔ اداریہ تحریر کرتے ہوئے جذبات کے دریا کو کوزے میں بند کرنا۔ مقامی طور پر انگریز قوم کی ناک کاٹنے والی یا بھارت کی ایسی تیسی کرنے والی خبروں کا حصول۔ پاکستان دشمن عناصر کے دانت کھٹے کرنا اور مقدمے بازی۔ یہ سب کام طوطی صاحب اس عمر میں بھی اسی انہماک سے کر رہے تھے جیسے جوانی میں کرتے تھے بقول ان کا ہم عصر ساتھی اور دست راست تھا۔ چیف رپورٹر ان کا ورائے باز عاشق جانباز اور عدو رچ سعادت مند ولی محمد تھا۔ رپورٹر ہر علاقے میں اعزازی خدمات سرانجام دیتے تھے اور وہ پاکستانی بھائی تھے جو حاجی علم دین طوطی کے ہمنوا تھے۔ اندر کی ہر خبر جس سے انگریز قوم کے منہ پر جوتا مارا جا سکے یا بھارت کے رہنے والوں کو نیچا دکھایا جا سکے انہیں ثبوت اور تصاویر کے ساتھ فوری مل جاتی تھیں۔ اسی طرح پاکستان کے بارے میں کوئی خبر یا تبصرہ کسی بھی ریڈیو یا ٹی وی اسٹیشن سے نشر ہو اس کی تفصیل بھی کوئی انہیں فون پر بتاتا تھا۔ "حاجی صاحب! آپ نے سنا، آج بی بی سی نے کیا بکواس کی؟" یا "وائس آف امریکا نے کیا بھونکا؟" اگلے شمارے میں ان دونوں کا خانہ خراب۔ طوطی کا اداریہ ہمارا فیچر قطعہ۔

جب حاجی علم دین طوطی اپنے معمولات میں غرق ہو گئے تو میرے لیے اور محسن کے لیے جاسوس کے بارے میں [illegible] کرنے کے سوا کوئی کام نہ رہا۔ ہم نے کچھ [illegible] "طوطی" کے پرانے شمارے ملاحظہ کیے اور وہ [illegible] اعتراض تصاویر دیکھیں جو ناقابل اشاعت ہونے کے [illegible] صاحب نے سنبھال کے ایک طرف رکھ دی تھیں۔

اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے مجھے اور [illegible] ہی وقت میں الگ الگ راستوں سے لندن پہنچا دیا تھا [illegible] ہماری پوزیشن ایک جیسی تھی۔ ہم پر [illegible] برقرار تھی۔ ہمارے عازم لندن ہونے سے [illegible] علم ہمارے دشمنوں کو ہو گیا تھا اور ہر دشمن نے [illegible] حوصلے پست کرنے کے لیے مخالفانہ کارروائی سے [illegible] مشکلات بھی پیدا کی تھیں مگر ہم سب رکاوٹوں کو [illegible] سازش کرنے والوں سے بچتے بچاتے لندن میں [illegible] تھے لیکن ہماری تقدیر بھی کم ستم ظریف نہ [illegible] ہمارے دشمن نمبر ایک چوہدری دلاور نے لندن پہنچ کے [illegible] کر لی تھی۔ بس اسے ایئرپورٹ پر ہمارے استقبال کی [illegible] نہ ہو سکی۔ ہم سے ملاقات کا اشتیاق اسے یقیناً [illegible] ذرائع استعمال کرتے ہوئے وہ بھی ہمیں تلاش کر رہا ہو [illegible] چہرے کے ساتھ وہ بھی نہیں آیا ہوگا اور خوف [illegible] جانے کب کہاں کون مل جائے جو اسے پہچان لے۔

مجھ سے ملاقات کا انتہائی شدت سے الرتھ کو [illegible] ہوگا۔ میں نے اسے چیلنج کیا تھا اور اس نے بھی [illegible] کہ پرانی محبت کی چوٹ لگی ہے۔ اب تو نفرت اور انتقام [illegible] دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ اس نے ایک [illegible] کی شکست سے دوچار محبت کے نام پر ہوس کے [illegible] میں پھنس جانے والی عورت کے زہریلے [illegible] غداری کی تھی اور اپنی طرف سے مجھ پر واضح کر دیا [illegible] تذلیل کا بدلہ لینے کے لیے مجھے اب اتنا ذلیل کرے گی کہ [illegible] کے لفظ کا مطلب بھول جاؤں گا۔ اب اس بے وقوف [illegible] ناقص العقل عورت بن جانے والی لیڈی الرتھ کو [illegible] بتایا سمجھایا اور ثابت کیا جا سکتا ہے کہ سکندر بخت نے [illegible] محبت صرف ایک بار کی تھی اور اس کے سوا کسی سے [illegible] یہ الزام قبول کرنے سے مجھے انکار نہیں تھا کہ میں [illegible] نے سابق انگریز حاکموں کے مظالم کا بدلہ ان کی اولاد [illegible] لیے مجاہدانہ جذبے سے کام لیا تھا اور زیادہ سے زیادہ [illegible] بنا کے چھوڑ دینا ہمارا محبوب مشغلہ تھا۔ محبت کا [illegible] لڑکیاں تو کچھ دن رو دھو کے صبر کر لیتی تھیں اور [illegible] بھی مل جاتا تھا مگر زیادہ نقصان ہمیں ان رقیبان [illegible] تھا جن کی کوئی گرل فرینڈ ہم نے سازش کر کے اس [illegible] حاصل کر لیا تھا جیسے انگریزوں نے ہندوستان پر [illegible] قبضہ کیا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا [illegible] جذبات کا [illegible] عمل تھا۔ غلامی کے [illegible] دبے ہوئے جذبات [illegible] کا حصہ تھا۔ اسے بھلا ہم کیسے [illegible] بلکہ اگلی نسل کی جوان لڑکیوں کے جذبات سے کھیل کر جو شاید اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں جب انگریز وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

الرتھ بہرحال ان لڑکیوں میں شامل نہیں تھی اور اس کے لیے میرے دل میں محبت کے جذبات ایسے ہی تھے جیسے محبت کے جذبات ہونے چاہئیں۔ ہر جگہ 'ہر زمانے میں' ہر دور میں۔ ہر مرد جب کسی عورت کو چاہتا ہے تو پھر اس کی چاہت میں اور سیکڑوں سال پہلے کے ہزاروں میل دور کے کسی مرد کے جذبات کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مگر یہ بات الرتھ کو آج نہیں سمجھائی جا سکتی تھی۔ ایک چور جب سو گھروں میں چوری کے جرم کا ارتکاب اور اعتراف کر چکا ہو تو کسی ایک گھر کے بارے میں کس منہ سے کہے گا کہ وہاں وہ نیک نیتی سے گیا تھا۔

اس بات نے الرتھ کو مزید مشتعل کیا تھا کہ میں نے اس سے زیادہ حسین لڑکی تلاش کر لی تھی جو قابلیت میں بھی اس سے بدرجہا بہتر تھی۔ قابلیت والی بات پر شاید وہ چراغ پا نہ ہوتی اور حسد سے کباب نہ ہوتی مگر یہ کہ وہ زیادہ حسین ہے جب عام لڑکی بڑی مشکل سے مانتی ہے کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر بھی حسین کوئی ہو سکتا ہے تو الرتھ پھر الرتھ تھی۔ خالص ولایتی نسل کی سفید چمڑی والی عالی نسب نژاد تھی۔ ہر روز ایک سو ایک مستند یقین دلاتے ہوں گے کہ مس یونیورس وغیرہ تو محض ایک فراڈ [illegible] ہے ورنہ اس کرۂ ارض پر کوہ قاف سمیت اس جیسی پری وش مہ جبین زہرہ جمال نہ کبھی تھی نہ ہے اور نہ ہوگی۔ سب چاہت کے شیدائی یہی تکنیک استعمال کرتے آئے ہیں اور میں نے بھی کی تھی۔ آج میرا یہ کہنا کہ رابعہ اس سے زیادہ حسین ہے اس کے لیے کسی گالی سے کم نہ تھا۔ رابعہ کا مجھ سے ملنا زندگی کے تسلسل میں معمول کے حالات اور واقعات کا کرشمہ تھا۔ نہ اس میں میری خواہش کو دخل تھا۔ نہ کوشش کو اور نہ سازش کو۔ ایسا ہونا تھا سو ہوا مگر الرتھ یہ ماننے پر تیار نہ تھی۔ خبیث! یا تمہارے فیلسوف سے بڑا ہمارا غالب تھا جس نے یہ فرمایا کہ

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

الرتھ بھی نوشتہ تقدیر کو قبول کر چکی تھی اور مجھ سے محبت یا نفرت کو بھی بھول چکی تھی کہ میں نے بقلم خود [illegible] لیا اور اسے فون کر کے اپنی تشریف آوری کے پروگرام سے مطلع کیا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ آغاز شباب کی جذباتی نادانی کا دور تمام ہوا۔ نہ ہم برباد ہوئے نہ تم۔ خانہ آبادی ہو گئی۔ دونوں نارمل لوگوں کی طرح پرانے تعلق کی بنا پر مل تو سکتے ہیں دوستوں کی طرح۔ مگر اس نے سمجھا کہ میں اس کی تذلیل کے زخموں پر نمک پاشی کر رہا ہوں یا پھر اس کا جذباتی استحصال کرنے کے موڈ میں ہوں۔ برسوں کا سویا ہوا آتش فشاں جیسے کسی بہانے کا منتظر تھا اور چنگاری مارتے ہی پھٹ گیا۔ اس نے خود کچھ نہیں کیا۔ میرے جانی دشمنوں کو خبردار کر دیا۔

جانی دشمنوں میں سرفہرست اس کا شوہر نامدار تھا جس کے دل میں میرے خلاف رقابت کے جذبات کم شدید نہ تھے۔ وہ اپنی کامیابی اور فتح پر نازاں 'خوش اور مطمئن تھا کہ سالا کالا بڑا اتراتا تھا۔ جوتے مار کے نکالا گیا اور الرتھ جیسی چیز بالآخر اسی کو ملی جو اس کا سب سے زیادہ مستحق تھا۔ میری آمد کی اطلاع نے اس کے غرور اور اطمینان کے جذبات کی بنیادیں ہلا دیں اور اپنے پورے انتقامی جذبات اور اختیارات کی طاقت کے ساتھ اس نے لندن میں میرا وہ حشر کرنے کا فیصلہ کیا جس سے تمام کالے اور کم نسل عاشقوں کو عبرت ہو جو الرتھ جیسی لڑکیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ اس نے میرے تمام رقیبوں کو بھی خبر کر دی۔ ان میں سے ایک کراچی میں دستیاب تھا' باقی لندن میں کار ثواب سمجھ کے اجتماعی طور پر اور انفرادی طور پر گن گن کے پرانے بدلے لیتے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

ہم تو سمجھے تھے کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

وہ سب میرے دشمن جاں دلوں میں خون آشام جذبات' زبان پر خالص ولایتی گالیاں اور ہاتھوں میں راکٹ توپ وغیرہ لیے پھر رہے ہوں گے کہ کہیں نظر آئے سکندر بخت تو اسے بدبخت و مرحوم کریں۔ لندن کے سارے پولیس والے ان عالی نسب [illegible] تمام تر کیسے لڑکوں کی پشت پناہی کے لیے قانون کا ڈنڈا لیے موجود تھے۔ سب سکندر بخت کو جانتے اور پہچانتے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ کب آئے گا کدھر سے آئے گا اور کہاں جائے گا۔ کیا کرے گا اور کیسے کرے گا؟

اب وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں گے اور خود بھی حیران ہوں گے کہ کیا ہوا؟ سکندر بخت کیوں نہیں آیا؟ آ کر تو چلا جاتا۔ ہر جگہ لوگ الرٹ تھے۔ WHAT HAPPENED? اور مسز گورڈن نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا ہوگا کہ وہ سلپ کر گیا۔ وہ ڈیم فول۔۔۔ کراچی میں ہمارے قونصلیٹ کا آفس۔ انہوں نے اسے نکل جانے کا موقع دیا۔ وہ پہنچا تھا داڑھی لگا کے اور نام بدل کے۔ ایک برقع پوش عورت کے ساتھ۔ اسے وہیں پکڑ لینا چاہیے تھا۔ اس نے حج کر کے غلطی کی اور پھر پاسپورٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ دوسری غلطی۔۔۔ وہ باسٹرڈ بھاگ گیا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ وہ آ گیا ہے۔ آ گیا ہے؟ کیسے؟ کس وقت؟ کدھر سے؟ اور آ گیا ہے تو پھر کہاں ہے۔ کسی نے دیکھا اسے۔ کیا حلیہ ہے اس کا؟ پولیس کیا کر رہی ہے؟ وہ لندن میں ہے اور ہم بے خبر ہیں۔ او مائی لارڈ! مجھے نظر آ جائے تو میں اسے گولی مار دوں۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کو اس کے پیچھے لگا دو۔۔۔ وہ اور کچھ۔۔۔ مارو۔

یہ سب دل باغ باغ کرنے والے خیالات تھے کہ میں یہاں

www.paksociety.com

محفوظ بیٹھا ہوں اور چیلنج دینے کے باوجود ابھی تک دشمن اور رقیب جھک مارتے پھر رہے ہیں۔ دوبارہ لیڈی الزبتھ کو فون کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے دولت مند، مشکل پسند اور ہنرمند شوہر نے ہر فون پر آبزرویشن لگوا دی ہوگی۔ الزبتھ ڈارلنگ، وہ پھر فون کرے تو اسے دل بستگی کی باتوں میں لگانا۔ یہ ظاہر کرنا جیسے تم نادم ہو اپنے رویے پر اور محبت کے پرانے جذبات پھر عود کر آئے ہیں اچانک۔ اسے دم کرنا کہیں۔ ہم اٹھا لیں گے اسے۔ اور کہاں کہاں فون کر سکتا ہے وہ۔ اس کی سوئٹ ہارٹ اور کون تھی؟ سب کے نام بتاؤ۔ چلو دو چار ہی۔ ہر نام تمہیں یاد نہیں، دو چار لکھوا دو۔

محسن نے میری پسلی میں کہنی ماری "تیرا دماغ چل گیا ہے۔ کب سے دیکھ رہا ہوں میں۔ اکیلا بیٹھا مسکرا رہا ہے۔"

میں نے پسلی کو دبا کے کہا "کیا یہ ایسا جرم ہے جس کی پاداش میں میری پسلیاں توڑی جائیں۔ پسلیوں کے اندر دل ہوتا ہے۔ وہ بھی ٹوٹ سکتا ہے شیروانی صاحب۔"

"وہ اتنی بار ٹوٹا ہے اور اتنی بار جوڑا گیا ہے کہ اب کوئی مسئلہ نہیں۔ چل کہیں باہر چلتے ہیں۔"

"طوطی صاحب کہاں ہیں؟" میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔

"مدر کسی زوجہ کی گوشمالی فرمانے گئے ہیں۔ بے حیا بہ آواز بلند ایک بھارتی گانا گا رہی تھی۔ وہ بھی عشقیہ۔ انہیں دیر لگے گی۔" محسن نے بتایا۔

"ہاں ازروئے انصاف گوشمالی دو چاروں کی فرمائیں گے۔ لیکن یار وہ اپنے چیف رپورٹر کا فون بھی تو آنے والا ہے۔"

"میں تو تھک گیا ہوں جمائیاں لے لے کر۔ یہاں مکھیاں بھی تو نہیں ہیں مارنے کے لیے۔" محسن بولا۔

"یہ چیف رپورٹر کہاں جا کے مر گیا۔" میں نے گھڑی دیکھی "دوپہر ہونے کو ہے۔ ہمارا تو سارا دن ضائع ہو گیا۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں خود ضائع ہو رہا ہوں۔ چل یار اس طوطی کے پنجرے سے نکلتے ہیں۔ باہر۔"

میں نے کہا "باہر سے فون کریں گے الزبتھ کو یا اس کے شوہر کو۔"

محسن بہت خوش ہوا "ایمان سے میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ کل سے ہمارے قاتل خنجر بکف پھر رہے ہیں۔ منتظر ہیں کہ ہمارا سراغ ملے۔ خبر تو پہنچ گئی ہوگی کہ ہم لندن آ گئے۔ وہ ہم سے زیادہ مایوس اور پریشان ہوں گے خصوصاً اپنے چوہدری دلاور صاحب ہیں جی۔ ان کو ہر گھڑی یہ خطرہ لاحق ہو گا کہ..."

اس کی بات ٹیلی فون کی گھنٹی کے باعث ادھوری رہ گئی۔ میرا خیال تھا کہ ریسیور بقراط اٹھائے گا جو اس وقت انتظامیہ کا واحد حاضر رکن تھا مگر اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ وہ اسی طرح گھٹنے پر جھکا ہوا کتابت میں مصروف رہا۔

میں نے کہا "بقراط صاحب۔ فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔"

"ہاں" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا مگر اس کے انہماک میں فرق نہیں آیا۔ اس کیفیت میں اس کو بتایا جاتا کہ بقراط تمہارے سامنے آدم خور شیر کھڑا دھاڑ رہا ہے تو وہ یہی جواب دیتا اور پھر مطلع کیا جاتا کہ شیر آپ کو کھانا چاہتا ہے تو وہ کہتا اچھا تو اسی پوز میں کھایا جاتا۔ شاید شیر کے پیٹ میں پہنچ کے بھی وہ اسی استغراق کے عالم میں کتابت کرتا رہتا۔

مجبوراً میں نے ریسیور اٹھایا اور کہا "طوطی کے خار زار سے آداب عرض۔"

"تم کون ہو؟" یہ چیف رپورٹر کی آواز تھی۔

"وہی جس کی بالائے بام موجودگی نے سلیم کو آوارگی کا [illegible] ملنے دیا۔"

"اچھا اچھا۔ آپ ہو۔ ابا جی کہاں ہیں؟"

میں نے رقت انگیز لہجے میں کہا "نہیں تو فوت ہوئے زمانہ ہو گیا۔"

"اوہ جی میں آپ کے نہیں، اپنے ابا جی کی بات کر رہا ہوں۔ ہماری ایسی قسمت کہاں؟" اس نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔

"وہ زنان خانے میں کچھ مصروف ہیں۔ تم مجھے بتاؤ کہ اس کا کیا بنا جس کے لیے تم کو کرنل فرینڈ نمبر ٹو کی اساسی [illegible] بلیاردوں پر پڑ کرنے کی خصوصی اجازت ملی تھی۔ کیا نام تھا اس نرس کا... جون!"

"جون میری بغل میں ہے" اس نے بڑی مسرت سے بتایا "بلکہ سچ تو یہ ہے جی کہ میں اس کی بغل عظیم میں ہوں۔ جی جھانکنا کسے کہتے ہیں۔"

"اسی کو جو تم کر رہے ہو۔ لیکن تم کو اسپتال بھیجا گیا تھا۔ تم ابھی تک بغلیں جھانک رہے ہو؟"

"میں اسپتال سے ہی بول رہا ہوں جی۔ یہ کام میرے بس کا نہیں۔ پولیس والے مجھے گھاس نہیں ڈالتے۔ انتظامیہ نے [illegible] کر لیا ہے کہ وہ تیسرا نہیں ہے۔ اسے الگ کمرے میں رکھا ہے جہاں پولیس کا سخت پہرا ہے۔ ابا جی سے کہنا خود آئیں اور اپنے ساتھ وکیل کو بھی لائیں ورنہ کچھ نہیں پتا چلے گا۔ اسپتال والے کہتے ہیں پولیس سے پوچھو اور پولیس والے کہتے ہیں کہ تم کیوں پوچھ رہے ہو... آہ۔"

"یہ کیا ہوا؟ چیخ کیوں ماری تھی تم نے؟"

"وہ پرائیویٹ بات ہے۔ معمولی سا حادثہ [illegible] ہو گیا تھا۔"

"کون سی بغل میں... میرا مطلب ہے کہاں؟"

"کاؤنٹی جیل کے اسپتال میں۔ ہو سکتا ہے کسی بیڈ پر [illegible] لیٹا ہوا نظر آ جائے۔ آپ ابھی تو کال آفس میں ہوں۔ اسے..." اس آخری بلکہ خراش صدا کے ساتھ ہی فون لائن منقطع ہو گئی۔

"چیف رپورٹر پر تشدد ہو رہا ہے" میں نے تشویش سے کہا۔

"کیا اسے پکڑ لیا ہے پولیس نے؟"

"نہیں۔ وہ اپنی نرس محبوبہ جون کی آغوش محبت میں ہے اور میں تصور کر سکتا ہوں کہ بلی نے چوہے کو دبوچ لیا ہے وہ یقیناً کوئی بابا منتا کی پوجن یا ڈریکولا ٹائپ عورت ہے۔"

"جامن کی کوئی خبر نہیں؟"

"جامن زندہ ہے مگر پولیس کے سخت پہرے میں۔"

"یعنی محفوظ بھی ہے" محسن نے اطمینان کا سانس لیا "یہاں پولیس کی تحویل میں کسی کی ہلاکت نہیں ہو سکتی۔"

"ہلاکی خود کشی نہیں کر سکتا" میں نے تصحیح کی "پولیس بڑی بے مروت ہے یہاں کی۔ ہماری پولیس کی طرح تعاون نہیں کرتی کہ قیدی کو خودکشی کی سہولت بھی فراہم کرے۔ شلوار کا ازار بند ہی استعمال کرنے دے۔"

بقراط نے سر اٹھا کے قلم کو منہ میں دبایا اور خلا میں دیکھتے ہوئے بولا "غور کرنے کے قابل نکتہ یہ ہے کہ آدمی کے وجود میں روح کہاں رہتی ہے؟ اعضائے رئیسہ میں گردے پھیپھڑے سے زیادہ اہم ہے دل۔ تو دل کے کون سے حصے میں روح کی جگہ ہے؟ کیا روح کوئی گیس ہے؟ گیس ہے تو اس میں رنگ و بو ہے یا یہ آکسیجن کی طرح ہے۔ پھر یہ کہ اس کی کتنی مقدار ہوتی ہے۔ وزن اور حجم کے اعتبار سے؟ آدمی کے جسم میں کتنے سوراخ ہیں؟ اور آخر روح کس سوراخ سے نکلتی ہے۔"

اس کی عالمانہ سائنسی تحقیق پر مبنی پرتجسس سوالات کا یہ سلسلہ طوطی صاحب کے آ جانے سے منقطع ہوا "ارے بقراط۔ کام کر اپنا۔ ہم یہ سب ملک الموت سے پوچھ لیں گے جب وہ تیری روح قبض کرنے آئے گا۔"

اس نے سر ہلا کے کہا "اچھا" اور پھر کتابت کرنے لگا۔

میں نے طوطی صاحب کو چیف رپورٹر کی رپورٹ کا خلاصہ پیش کیا جس میں بغلیں جھانکنے کا ذکر بھی نہیں تھا اور کسی پر تشدد [illegible] حادثے کا بھی۔

حاجی صاحب نماز سے بھی فارغ ہو کر آئے تھے "بس تو پھر چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "چلیے۔ کوئی وکیل ہے آپ کے ذہن میں؟"

انہوں نے تبسم فرمایا "وکیل ذہن میں نہیں، اپنے آفس میں ہوتا ہے۔ یہ ذہن ہے ایک ایڈیٹر کا۔ یہاں صرف صحافت رہتی ہے لیکن میرے پاکستانی بھائی! عجلت کار شیطان ہے۔ اور ویسے بھی یہ وقت ہے دوپہر کے طعام کا۔ عقلمند کہتے ہیں اول طعام پھر کلام۔ [illegible]..."

ان کی آخری بات زنان خانے کی طرف منہ کر کے کہی گئی تھی مگر اس کے نتیجے میں مختلف سائز، قد، وزن اور حلیے کے بچوں کی ایک قطار نمودار ہوئی۔ سب سے چھوٹا بچہ تیس پاؤنڈ کا ہو گا اور سب سے بڑا سو پاؤنڈ کے لگ بھگ۔ ہر بچے کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ تھا۔ جگ، گلاس، ڈونگے، پلیٹ، چمچ۔ حیرت انگیز ڈسپلن کے ساتھ انہوں نے ایڈیٹر کی میز صاف کر کے ہر چیز رکھ دی اور پھر ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ یہ نظم و ضبط مسلسل مشق اور سخت تربیت کے بغیر نہیں آ سکتا تھا۔

اس ٹیم کے بارہ ارکان میں طوطی صاحب کی ہر منکوحہ کو مساوی نمائندگی دی گئی تھی۔ سالن بھی چار تھے۔ معلوم ہوا کہ طوطی صاحب مینو خود منتخب فرماتے تھے اور عدل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک شیڈول کے مطابق ہر بیوی کو مساوی مواقع فراہم کرتے تھے۔ مرغی، مچھلی، قورمہ، بریانی۔ سب باری باری پکاتی تھیں۔ زنانہ مسابقت یا رقابت کے جذبات کا پورا فائدہ طوطی صاحب کو حاصل ہوتا تھا۔ جو درحقیقت نقصان تھا کیونکہ مسلسل پُرلطف اور مرغن غذاؤں سے ان کا پیٹ کسی غبارے کی طرح پھولتا جا رہا تھا اور طے شدہ طور پر ان کے خون میں کولیسٹرول اور ان کا بلڈ پریشر بھی بڑھ رہا ہو گا مگر فرنگی ڈاکٹروں کے کافرانہ طریقۂ علاج پر یقین ان کے لیے اتنا ہی محال اور ناقابل قبول تھا جتنا کسی خالص انگریز کے لیے گجرات کے حکیم صاحب کا تیار کردہ خمیرہ گاؤزبان عنبری جواہر والا۔ ان کی خوش خوراکی نے بھی مجھے اور محسن کو حیران کیا۔ یہ رزق دینے والے کی فراخ دلی تھی کہ وہ دنیا میں اپنے رزق کا کوٹا برسوں پہلے ختم کر دینے کے باوجود زندہ تھے اور اپنے شکم کے اسٹور میں مسلسل قورمے، بریانی، زردے، پلاؤ اور حلوے کی دیگ پر دیگ انڈیلتے جا رہے تھے۔

بالآخر شکرانے کے... جس کو ملعون گورے لنچ کہتے ہیں سارے مراحل مکمل ہوئے اور ہماری بے تابی سے زیادہ اپنے لختِ جگر نیم روز یعنی چیف رپورٹر کی سلامتی کو مدنظر رکھتے ہوئے حاجی صاحب نے بادلِ ناخواستہ قیلولہ منسوخ فرمایا اور اپنی وہ گاڑی نکالی جو ان کے کہنے کے مطابق پاکستانی تھی۔ یہ سبز اسلامی رنگ والی گاڑی تھی..... جس کی چھت پر انہوں نے فراخی سفید رنگ کرا کے کار کو بھی پاکستان کا جھنڈا بنا دیا تھا۔ کسر صرف چاند تارے کی رہ گئی تھی۔

"طوطی یہ گاڑی اپنے پیارے پاکستان سے لانا مجھے بہت مہنگا پڑا" انہوں نے راستے میں بتایا "لیکن ان گوروں کی چھاتی پر مونگ دلتا ہوں جب اسے سڑک پر دوڑاتا ہوں۔ جہاں موقع ملتا ہے ٹریفک کے قانون کی ایسی تیسی بھی کر دیتا ہوں، نظر بچا کے۔ دیکھو نا میرے پاکستانی بھائی! ان کے قانون کی ہم کیوں پابندی کریں؟ مجبوری کی بات الگ ہے۔ بڑا ناز ہے ان کو اپنی رولز رائس پر۔ میں نے ایک انگریزی اخبار کے ایڈیٹر کے سامنے ایک رولز رائس کو لات مار کے اس پر تھوک دیا اور اسے گدھا گاڑی بھی کہا تو وہ بڑا چراغ پا ہوا۔ دراصل وہ تھی شاہی محل کی گاڑی۔ کیس کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ میں نے کہا کہ چلو اسے گھوڑا گاڑی سمجھ لو۔ آخر انجن میں ہارس پاور ہوتی ہے۔ ڈنکی پاور نہ سہی۔ مزا اس خالص پاکستانی کار کی سواری میں ہے۔"

میں نے کہا "طوطی صاحب یہ گاڑی..... بھی جاپانی... ہے۔"

"طوطی! ایسی بات تم کرو گے تو یہ لعنتی گورے کیوں نہ بولیں

www.paksociety.com

گے کیسے نہیں ہے یہ پاکستانی کار۔ اس کا نام رکھو، اس کے بڑے پاکستان میں سیٹھ باڑی اپنے پاکستانی کاریگروں سے بنائی۔ نام پاکستانی جنرل کے۔ بے شک۔۔۔۔ کمپنی جاپان کی ہے مگر جاپانی بھی ان گوروں کے دشمن ہیں تو اپنے کیا ہوئے؟ دشمن کا دشمن ہوتا ہے دوست۔ میں تو پاکستان کا پرچم لہراتا پھرتا تھا مگر بھائی جب اپنے ہی مخالف ہوں تو طوطی کیا کرے۔ خود ہمارے سفارت خانے والوں نے اعتراض کر دیا۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

باقی راستہ انہوں نے بے حیا عورتوں کی ٹانگوں اور سبز بونٹی میں کفایت شعاری کی انتہا۔ سرعام نظر آنے والے جذباتی بے صبری کے افسوس ناک مظاہروں، بے ہودہ فلموں اور ان سب سے متاثر ہونے والے پاکستانی بھائیوں کی اخلاقی پستی پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا۔ میں نے اور محسن نے کان ان کی طرف رکھے مگر آنکھیں باہر کے دلچسپ مناظر پر رکھیں۔ بالآخر بیچاری پاکستانی کار رک گئی اور ہم ایک عمارت میں داخل ہوئے جو بیک وقت رہائشی اور کاروباری مقاصد کے لیے استعمال ہو رہی تھی۔ اس علاقے میں پاکستانی اکثریت میں تھے اور وہ قانون کو نچا دینے کی مکمل تربیت اپنے وطن مالوف سے لے کر آئے تھے۔ ان میں سے کچھ دن میں کام کرتے تھے۔ ان کے چاچے ماما 'چڑیا' سالے کے جیوتی، جو ناجائز طور سلطنت برطانیہ کی حدود میں داخل ہونے کا کارنامہ سرانجام دے چکے تھے 'دن میں روپوش رہنے کے لیے آرام کرتے تھے۔ ان کے لیے پاکستانی برادری رات کی شفٹ کے کام تلاش کر لیتی تھی اور انہیں رہائش کی سہولت کے علاوہ تحفظ بھی حاصل رہتا تھا۔ ان کے لیے ہدایت صرف یہ تھی کہ کوئی ایسا کام مت کرو جس میں پولیس سے واسطہ پڑے اور وہ تم سے کاغذات مانگے یا شناخت پوچھے۔ کہیں کوئی واردات ہو تو پنگا مت لو۔ فوراً بھاگ جاؤ وہاں سے ورنہ تماشائی بھی بنے تو پولیس گواہ بنا لے گی اور پھر وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔

طوطی صاحب نے ایک دروازے پر دستک دینے سے پہلے ہی ہمیں بتایا "یہ بندہ یہاں کے قانونی معاملات کو ایسے سمجھتا ہے جیسے پاکستانی بھائی اپنے وطن میں چور، ڈاکو اور سیاسی لیڈر سمجھتے ہیں۔ جیل بھی ہو آیا ہے ایک بار عملی تجربے کی خاطر۔"

بے بال دبلا وکیل ایک ادھیڑ عمر اور بنیان میں نمودار ہوا۔ بنیان پر پہلے مجھے شبہ ہوا کہ زنانہ استعمال کی چیز ہے جو اس نے جلدی میں پہن لی۔ وہ سوتے سے اٹھ کے آیا تھا مگر پھر غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ قصور اس کی توند کا تھا۔ بنیان اس کے جسم اور حدود اربعہ کو مستور کرنے میں ناکام تھا۔

"واہ جی واہ سردار جی، آج تو بڑی شان سے توند شریف کی۔ کیا بھرا ہے اس دوزخ میں" طوطی صاحب نے ان کے پیٹ میں انگلی کو تجوری کی طرح گھونپا۔

"او بتا اچھا طوطی صاحب۔۔۔ بابا کیا کرتے ہو۔ ذرا اپنا حال تو دکھا کے بتائیں۔"

"سردار جی! یہ اپنے دو پاکستانی بھائی ہیں۔ مصیبت زدہ۔"

"بابا دو! میں ان کی اور تمہاری شکل دیکھ کے ہی سمجھ گیا تھا۔"

اس وکیل نے کہا جو کسی زاویے سے سکھ نہیں لگتا تھا سوائے کاٹھے کے۔

طوطی صاحب نے ہمیں قابل تعریف نظروں سے دیکھا "تجربہ کار ہے، اور یہ ساتا بندہ صورت دیکھ کے سمجھ گیا۔"

میں نے کہا "کیا ہم واقعی اتنے مظلوم اور دکھی نظر آتے ہیں؟"

سردار جی نے ہمیں ایک آفس میں بٹھایا "اس کے سوا اور کون آ سکتا ہے یہاں؟ سارے چور، اچکے، لفنگے، اخلاقی کرپشن یہاں قانون کے چکر میں آ جائیں یا پکڑے جائیں اپنے خاندان ہیں۔"

طوطی صاحب نے میز پر اپنی چھڑی بجا کے کہا "مگر اس بار ان کا معاملہ کچھ اور ہے۔ یہ مجاہدین ہیں۔"

وکیل نے مجھے اور محسن میں مجاہدانہ شان تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی اور پھر بولا "اچھا میں ابھی آیا" اور اندر غائب ہو گیا۔

موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے کہا "طوطی صاحب بڑے افسوس کی بات ہے۔ رب نے تو آپ کفار کے دشمن سمجھے ہیں۔ ہمیں لے آئے ہیں ایک سکھ کے پاس۔"

محسن نے کہا "یہ بھارتی بھی ہوگا۔"

طوطی صاحب نے ایک قہقہہ مار کے محسن کی ران پر زور سے ہاتھ مارا "یہی ہوتا ہے میرے بھائی، ایسا ہی ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "یعنی قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے۔۔۔ یہ کوئی ... نہیں۔"

"نہیں۔ لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں جب میں کسی کو وکیل بتاتا ہوں۔ اس کا نام ہے سردار ملک۔ سچا اور کھرا پاکستانی ہے، لاڑکانہ شریف کا۔ میں تو محبت سے سردار جی کہتا ہوں۔ سکھ ہوتا تو اس کی کرپان سے میں اس کا پیٹ پھاڑ کے جیل چلا جاتا اگر اس کا آفس نہ آتا۔"

سردار جی واپس لوٹے تو جج کے وکیل لگ رہے تھے "تو ہم بھی باہر بیٹھے ہیں سائیں، بیٹھے کام کی بات کرو۔"

میں نے انتہائی اختصار سے کام لیا اور اسے صرف وہ باتیں بتائیں جن میں اس کی قانونی مدد ہمارے مسائل حل کر سکتی تھی۔ ہم نے اپنے لندن آنے کے غیر قانونی طریقے کا ذکر نہیں کیا۔ شریف آوری کا مقصد نہیں بتایا اور چوہدری دلاور کے خلاف اپنی مجاہدانہ صف آرائی کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ طوطی صاحب نے دخل در معقولات نہ کر کے مجھے حیران کیا۔ وہ تمام گفتگو کے لیے ایک کاغذ پنسل سنبھال کے فکر سخن میں گم ہو گئے تھے۔

سردار جی نے ساری بات سن کے کہا "اس میں کوئی ... ہی بھرتی ہوں گے تمہارے۔"

طوطی صاحب نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "چار سو پاؤنڈ۔"

سردار جی نے فریاد کی "سو پاؤنڈ میری فیس ہے۔"

"چار سو پاؤنڈ" طوطی صاحب نے کہا۔

"طوطی صاحب، بڑا مشکل معاملہ ہے۔ معمولی محنت نہیں چاہیے۔"

"چار سو پاؤنڈ" طوطی صاحب نے تیسری بار اسی لہجے میں کہا۔

"طوطی صاحب، بس آپ کی زبان سے اور کچھ نہیں نکلے گا۔" اس نے شکست تسلیم کر لی "دو سو پاؤنڈ دے جاؤ اور کل آ کے... ٹھیک ہے میں فون کر کے بتا دوں گا۔"

میں نے محسن کو اشارہ کیا اور اس نے دو سو پاؤنڈ سردار جی کے سامنے رکھ دیے "کیسے ہو گی ہماری اور اس کی ملاقات؟"

"بابا کیسے کی بات مت کرو۔ ابھی راستہ نکالنا ہمارا کام ہے۔ میں اس کے پرانے وکیل کو تلاش کروں گا۔ جس نے پہلے اس کا کیس لیا تھا۔ اسے بتاؤں گا کہ جیل والوں نے اس کے موکل کو زہر دے دیا ہے۔ وہ کیوں اٹھایا گیا؟"

میں نے اور محسن نے ایک ساتھ لہجے میں سوال کے کہا "پھر؟"

"تو ہو گا کیا، حملہ کرے گا جیل پر اور پولیس کا بیڑا غرق کرے گا۔ یہ کالے اپنے حقوق کے معاملے میں بڑے متحد ہیں اور ان کے ساتھ قانون ذرا سی زیادتی کرے تو ان کے لیڈر شور مچاتے ہیں۔ اخباروں میں بیان اور خبریں۔ مظاہرے اور ہنگامے کراتے ہیں۔"

طوطی صاحب نے سراہا "خود معترف ہیں۔ کوئی کام قانونی نہیں کرتے۔ غلطی سے بھی۔ لوٹ مار، زنانیوں کے بیگ چھیننا اور ڈاکا، کسی کی جیب خالی کرا لی۔ دکانوں سے چیزیں اٹھا لیں۔"

سردار جی نے کہا "... کیا۔ اچھا ہے یہ کالے بھی ہمارے ساتھ مل کے اس ملک کو خراب کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "مگر اگر وکیل ہوا پھر؟"

"پھر بھی اسے جانا پڑے گا اسپتال اپنے موکل کو دیکھنے کے لیے۔ وہ اخلاقی اور قانونی طور پر اس کا پابند ہے کہ اپنے موکل کا خیال رکھے۔ اسے سزا ہو جانے کے بعد بھی۔ اگر جیل میں اس کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک نہیں ہوتا تو وہی وکیل جج کو رپورٹ کرتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ قانونی مسئلہ بن گیا تو ہمیں زیادہ پریشانی ہوگی۔"

میری بات میں پنہاں مطلب کو محسن نے سمجھ لیا "ہاں۔ تم پہلے ہمیں ملواؤ کسی طرح اس کے وکیل سے بعد میں بات کرنا۔"

"حوصلہ رکھو۔ تسلی رکھو بابا" سردار جی نے کہا "اللہ نے چاہا تو آج ہی تمہاری ملاقات ہو گی۔ رات کو بھی ہو سکتی ہے۔ بس تم تیار رہنا، ابھی میں وکیل کا پتا کرنے کے لیے اسپتال جاتا ہوں۔"

"پولیس تم کو نہیں روکے گی۔"

"کیسے روکے گی بابا۔ کیا میں وکیل نہیں ہوں۔ اور میں بولوں گا کہ جارج میرا موکل تھا۔ پھر تو روکنے والا خود مجرم بن جائے گا۔ جارج سے وکیل کا نام پتا معلوم ہو جائے گا تو میں جاؤں گا اس وکیل کے پاس اور اس کو ساری اسٹوری سناؤں گا۔ ابھی وہ کچھ نہیں کرے گا۔ نوٹس دے گا صبح لیکن میرے کہنے سے فون ضرور کرے گا۔ پولیس کمشنر کو بھی اور جیل سپرنٹنڈنٹ کو بھی۔ ابھی تک یہ بات کسی کو معلوم نہیں۔ ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے سائیں۔ درمیان میں جاؤں گا رات کو اور پولیس کے کسی چھوٹے افسر سے بات کروں گا کہ معاملہ ختم ہو سکتا ہے اگر جارج کہہ دے کہ اس کو کسی نے زہر نہیں دیا۔ اس کی طبیعت ویسے ہی خراب ہو گئی تھی۔ اگر اس نے اپنے وکیل کے ذریعے جیل والوں پر کیس کر دیا کہ انہوں نے غفلت برتی اور مجھے قتل کرانے کی سازش میں بالواسطہ طور پر شریک ہوئے تو پھر انکوائری ہو گی اور معاملہ بہت بڑھ جائے گا۔ اخباروں میں تو جائے گا تو کتنا ہنگامہ ہو گا۔ یہ تم جانتے ہو۔ کالے جیسی رائی کا پہاڑ بنانا جانتے ہیں۔ پولیس بھی چاہے گی کہ جارج ان کے لیے مشکل پیدا نہ کرے۔ کوئی سیدھا سادا بیان دے کر معاملہ ختم کر دے۔ پھر میں شرط عائد کروں گا کہ جارج کو اسپتال کے کسی کمرے میں طوطی صاحب سے اور تم سے ملاقات کا موقع فراہم کیا جائے۔ اس ملاقات کے بعد جارج ان کی پسند کا بیان دے گا ورنہ نہیں۔"

"دیکھا میرے پاکستانی بھائی، کیسا سیانا بندہ ہے سردار ملک سنگھ" طوطی صاحب بولے۔

"اور اگر کسی نے تعاون نہ کیا۔ کوئی اڑ گیا۔۔۔؟" میں نے کہا۔

"بابا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" سردار ملک نے میز پر ہاتھ مارا اور پھر درد سے چلاتے ہوئے ہاتھ ہلانے لگا "ارے مر گیا سائیں۔ اف۔"

میں نے گھبرا کے میز کو دیکھا "کیا چوٹ آ گئی۔ میز میں کوئی کیل تھی؟"

"نہیں بابا۔ میں بھول گیا تھا کہ ہاتھ میں پہلے ہی چوٹ ہے۔ ہاتھ آ گیا تھا اپنا دروازے میں۔"

طوطی صاحب نے اسے پرملامت اور ہمیں عبرت آمیز نظروں سے دیکھا "یہ حال ہوتا ہے تہذیب مغرب کی تقلید میں اپنی روایات کو بھول جانے کا۔ سردار جی نے ایک میم پال لی ہے نئی مصیبت میں تو کہتا ہوں کہ جیل چلا جا زیادہ سکھی رہے گا۔ یہ دیر سے آئے تو دروازہ نہیں کھولتی۔ یہ زور لگاتا ہے باہر سے تو اندر سے وہ ہاتھ پر مارتی ہے زور سے۔ ایک بار پارس اڑا دیا تھا تو نتیجہ تو دیکھا تھا کیل وہاں مار کے بے غیرت سے برتن دھلوائی ہے۔"

"ذرا شرم ہے طوطی صاحب۔"

"اور جھاڑو لگواتی ہے۔۔۔ روتے باتیں کرتا ہے اس کے۔"

سردار جی نے کہا "بابا، اچھی نسل کی کتیا ہو یا گھوڑی۔۔۔"

www.paksociety.com

سرخ ہو یا عورت۔ اس کے ناز نخرے تو اٹھانے پڑتے ہیں۔ خیر ابھی تم جاؤ۔"

"اور وہ چائے والی بات کیا بھول گئے سردار جی۔ ہم ایسے گئے گزرے بھی نہیں ہیں۔ آخر ایڈیٹر ہیں۔ ملک کے پی ایم بھی جائیں تو کھڑی ہو جاتی ہے سلام کرنے اور چائے خود بنا کے پلاتی ہے۔"

"میں ملک نہیں ہوں ملک ہوں" وہ آہ بھر کے بولا "یہ لو ایک پاؤنڈ۔ میری طرف سے باہر جا کے پی لینا۔ بیوی سے کہا تو وہ میرا سوپ بنانے کی فکر چائے نہیں بنائے گی۔"

"رکھ لے یہ ایک پاؤنڈ اور کہیں سے نیلا تھوتھا لا کے خود کھا لے یا اسے کھلا دے" طوطی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بقایا دو سو پاؤنڈ کب ملیں گے؟"

"اگر کام ہو گیا تو فوراً۔ ورنہ تیرے کفن دفن میں خرچ ہوں گے سردار۔ کل اسی وقت ہم تجھے قتل کر دیں گے۔ ہاں خوب یاد آیا میں نے اپنے چیف رپورٹر کو بھیجا تھا اسپتال۔ اس نے شکایت کی ہے کہ پولیس نے اسے گھاس نہیں ڈالی۔"

"میں ان سے کہہ دوں گا سائیں۔ چیف رپورٹر کو اصطبل میں باندھ کے اچھی گھاس ڈالیں۔ وہی خرذاد ہے نا۔ تمہارا میٹر چر کو دوڑیا!"

"ہاں" طوطی صاحب نے مجرا ادا کیے بغیر کہا اور مصافحہ کر کے نیچے اتر گئے۔

دن کا باقی وقت طوطی صاحب کی صحبت میں ان کے ارشاداتِ عالیہ سنتے ہوئے گزارنا مشکل کام تھا۔ میں نے ان سے کہا "اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"یہ وقت ہے دربارِ عام کا" انہوں نے گھڑی دیکھی "ملاقاتی اور فریادی شام چار سے سات بجے تک حاضر ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "پھر آپ جائیں۔ ہم سات بجے تک کچھ سیر سپاٹا' کھیل تماشا' آنکھ مٹکا وغیرہ کر لیں۔"

حسبِ توقع طوطی صاحب خفا ہوئے "سیر سپاٹے کی خیر ہے مگر میرے پاکستانی بھائی' یہ کھیل تماشا اور آنکھ مٹکا۔ تم جیسے مجاہدینِ وطن اور نوجوانانِ اسلام کو اس سے بچنا چاہیے۔ کفار نے بے حیا میموں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ تم جیسے بھولے بھالے مومن جوانوں کو ترغیبِ گناہ دیتی پھرتی ہیں۔ مسلمانوں کو دنیا و عاقبت میں رسوا کرنے کی صیہونی سازش ہے۔"

میں نے کہا "آپ فکر مت کریں۔ ہم اپنا ایمان اور کردار ایسے ہی بے داغ اور سلامت لے آئیں گے۔"

انہوں نے بادلِ ناخواستہ ہمیں چند مفید مشوروں سے نوازا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے تاکہ ہم پولیس' شکاری میموں اور بھارتی ایجنٹوں کے جال میں گرفتار نہ ہوں۔ پھر وہ اپنی پاکستانی کار کو اس طرح دوڑاتے ہوئے نکل گئے جیسے اپنے لاہور شریف کے رکشے والے بھائی لوہاری سے "بچ او ئے" کی صدا لگاتے گزر جاتے ہیں۔ بچے تو بچے' راہ گیر کی مرضی اور تقدیر۔ یا اپنی کراچی شریف کے رکشا والے مجمع عام میں سے رکشا نکال لے جاتے ہیں کہ اونٹ کو سوئی کے ناکے سے گزرنا آسان لگتا ہے۔

میں نے سکون کا سانس لے کر کہا "لیجیے شیروانی صاحب! آدھا دن ضائع نہیں ہوا اور ہم بھی بچ گئے۔"

"ان دو تین گھنٹوں میں ہم کیا کارہائے نمایاں سرانجام دے سکتے ہیں جن سے سلطنتِ برطانیہ غروب ہو جائے۔ اس کا سورج تو بہت پہلے غروب ہو چکا ہے" محسن بولا۔

"جارج سے ملاقات تو میری توقع سے زیادہ آسان ثابت ہوا۔ میرا خیال تھا کہ ایک قاتلانہ حملے کے بعد جارج کی حفاظتی انتظامات زیادہ سخت ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"انتظامات واقعی سخت ہونے چاہئیں۔ ایسے رواج رشوت دے کر ہر ٹام ڈک یا ہیری اس سے ملنے پہنچ گئے۔"

"یہ صرف رشوت کی بات نہیں ہے۔ ہمیں ایڈیٹر 'غضنفر طوطی' کی حمایت حاصل ہے اور ہم ایک وکیل کی معرفت یہاں سے ملیں گے ورنہ طوطی کا چیف رپورٹر ایک ترس کی درخواست کر کے بھی ناکام رہا تھا۔ میرا اپنا بھی یہ خیال ہے کہ طوطی صاحب کو اس معاملے میں ایک فریق بنایا جائے۔"

"کس معاملے میں؟"

"جارج کو یہاں سے پاکستان لے جانا کوئی آسان کام نہیں۔ اگر وہاں سے کوئی درخواست آئے گی تو دونوں ممالک کی وزارتِ خارجہ اور وزارتِ داخلہ کے حکام کی معرفت وزارتِ انصاف و قانون تک پہنچے گی۔ اس میں خاصا وقت صرف ہو گا۔ سرکاری سرخ فیتے کا چکر آئے گا اور قانونی رکاوٹیں حائل ہوں گی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ حاجی صاحب خود جارج کی طرف سے وکیل کر کے درخواست دائر کریں کہ اس کیس میں کچھ نئی شہادت سامنے آئی ہے اور ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس میں یہ ثبوت ملا ہے کہ وہ قتل جس جرم میں جارج عمر قید کاٹ رہا ہے وہ چوہدری دلاور نام کے ایک شخص نے کیا تھا۔ یہی ڈاکٹر شیلی کا قاتل بھی ہے۔ خود جارج نے بھی اپنے مقدمے کی سماعت کے دوران بار بار کہا تھا کہ قاتل ایک ایشیائی ہے اور اس نے قاتل کا حلیہ بھی بیان کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ قاتل فوراً جائے واردات سے فرار ہو گیا تھا مگر سامنے آنے پر اس کو آسانی سے پہچان سکتا ہے۔ ڈاکٹر شیلی کا قتل لاہور میں ہوا اور یہ کیس وہیں زیرِ سماعت ہے۔ چونکہ عدالت کو مدعا علیہ اور گواہوں سمیت لندن نہیں لایا جا سکتا اس لیے جارج کو لاہور کی عدالت میں پیش ہونے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اس شخص چوہدری دلاور کو دیکھ سکے اور عدالت کے روبرو شناخت کر سکے جس نے ڈاکٹر شیلی کی ماں اور اس کے شوہر جارج کی گرل فرینڈ کا قتل کیا تھا۔ دلاور نے گرل فرینڈ کو غلطی سے ڈاکٹر شیلی سمجھ لیا تھا کیونکہ اس نے پہلے شیلی کو دیکھا نہیں تھا۔ وہ خود تو اس وقت موجود نہیں تھی۔ یہ شہادت ریکارڈ پر ہے کہ ڈاکٹر شیلی کی ماں دلاور کے باپ کی دوسری بیوی تھی اور اس طرح ڈاکٹر شیلی رشتے میں چوہدری دلاور کی سوتیلی بہن تھی۔ شیلی اور دلاور کے باپ کی موت کے بعد اس کی بیوہ نے نکمے جارج سے شادی کی محض اس کی دولت کے لیے ورنہ وہ عمر میں جارج کی بھی ماں کے برابر تھی۔"

محسن نے کہا "اس طرح تو یہ نکما جارج چوہدری دلاور کا بھی سوتیلا باپ ہی ہوا۔ اور شیلی کا بھی۔"

"الٹی بات" میں نے کہا "شیلی اور دلاور کا باپ ایک ہی تھا۔ ماں دونوں کی الگ تھیں۔ باپ کی موت کے بعد ماں جس سے بھی شادی کرے وہ رشتے کے اعتبار سے سوتیلا باپ ہی کہلائے گا۔ دلاور کا رشتہ ازلی سوتیلا ہو جاتا ہے یعنی سوتیلی ماں کا دوسرا شوہر جارج ہے۔"

"پھر بھی تعلق تو واضح ہے" محسن بولا۔

"وہ سب یہاں عدالتی ریکارڈ پر پہلے سے ہے" میں نے کہا "اب یہاں درخواست دی جائے کہ وہ دلاور جو لندن میں ڈاکٹر شیلی کو قتل کرنے کی نیت سے آیا تھا اور غلط فہمی کے باعث کسی اور کو مار کے فرار ہو گیا تھا۔ اب اسی دلاور پر الزام ہے کہ اس نے اپنی سوتیلی بہن ڈاکٹر شیلی کو لاہور بلایا اور قتل کروا دیا اور اس قتل کے کیس میں فردِ جرم اس پر عائد ہو چکی ہے مگر وہ مفرور ہے۔ تاہم اس کیس کا جارج کے کیس سے گہرا تعلق ہے۔ دلاور یہاں ناکام ہو گیا تھا مگر لاہور میں کامیاب رہا۔ قاتل وہی ہے مقتول وہی ہے۔ یہ اس کا تیسرا قتل ہے۔ پہلے دو کا چشم دید گواہ جارج ہے جو اسے شناخت کر سکتا ہے۔ ایک بے گناہ کی بقیہ سزا ختم کرانے کے لیے اسے لاہور بھیجنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اسے یہاں سے پاکستان کا ریمانڈ دیا جا سکتا ہے اور وہ کورٹ آرڈر پر پولیس کی تحویل میں لاہور جا سکتا ہے۔ وہاں اس کو صرف ایک بار عدالت میں حاضر ہونا ہے جب ملزم چوہدری دلاور پیش ہو۔"

"وہ کب پیش ہو گا؟" محسن مایوسی سے بولا۔

"جب تک پیش نہیں ہو گا۔ چوہدری دلاور جیسے ملزم کے لیے خاندان اور کاروبار سب کچھ چھوڑ کے بقیہ زندگی جلاوطنی اور گمنامی میں گزارنا عملاً ناممکن ہے۔ اسے اپنے نامی گرامی وکیلوں کے چیمبر پر بہت بھروسا ہے۔ یہ یقین ہے کہ وہ سپریم کورٹ تک جا سکتا ہے اور یہ بھی خیال ہے کہ پولیس اس کے ساتھ ہے۔ وہ گواہ' ثبوت اور واقعاتی شہادتوں کو بدل سکتی ہے۔"

"ابھی تو وہ لندن میں ہے اور اسے بھی یقیناً پتا چل گیا ہو گا کہ اس کی ایک کوشش ناکام ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "شاید زہر وہ پاکستان سے لایا ہو گا۔"

"یہ کیسے پتا چلا لیا آپ نے؟"

"ملاوٹ والی چیزیں وہیں ملتی ہیں۔ زہر بھی خالص نہیں ہو گا۔ اگلی مرتبہ وہ یہیں کا خالص زہر استعمال کرے گا۔ میڈ اِن انگلینڈ کے لیبل والا۔"

"شاید اسے دوسرا چانس نہ ملے" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "چوہدری دلاور ایک ناکامی سے ہمت ہارنے والا نہیں ہے۔ وہ انتظار کر سکتا ہے۔ غیر معینہ مدت تک۔ بالآخر یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا اور حالات معمول پر آ جائیں گے۔ اس کے بعد دوسری کوشش زیادہ تیاری کے ساتھ۔ چانس کا مسئلہ کوئی نہیں۔ دنیا کی گاڑی پیسے کے پہیے پر چل رہی ہے۔ دو سو پاؤنڈ کی جگہ دو ہزار پاؤنڈ کی طاقت ہو تو جام پہیہ بھی دوڑنے لگتا ہے۔ جارج کا کام تمام کیے بغیر چوہدری دلاور کے واپس پاکستان جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مفرور مجرم تو وہ بن چکا۔ اب کیا فرق پڑتا ہے اسے اگر وہ دو ماہ مفرور رہے یا دو سال۔ پاکستان میں تو وہ ساری عمر روپوش رہ سکتا تھا مگر لندن میں یہ آسان نہیں ہو گا۔ جیسے جیسے وقت گزارے گا اس کی مشکلات بڑھتی جائیں گی۔ لیکن اس کے لیے جارج کے وجود کو ختم کرنا اپنے آپ کو پھانسی کے پھندے سے بچانے کے لیے ضروری ہے۔ ڈاکٹر شیلی کیس میں وہ شاید خود کو سرنڈر کر کے یا قانونی موشگافی سے شک کا فائدہ حاصل کرتے ہوئے بچ سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے سزائے موت سے۔ عمر قید یا سات سال کے لیے جیل جانا تو وہاں بھی لازمی ہے مگر یہاں جارج کو چھوڑ کے اسے پکڑ لیا گیا تو گورے اسے فوراً الیکٹرک چیئر پر موت کے لیے بٹھا دیں گے۔ جس دن بھی وہ جارج کو قتل کرانے میں کامیاب ہو گیا اس کے سر سے یقینی موت کا خطرہ ٹل جائے گا۔ پھر وہ خود ہی عدالت میں پیش ہو جائے گا اور ظاہر ہے ضمانت بھی حاصل کر لے گا۔"

"ان حالات میں طوطی کی صدا موثر ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ خود جیسے بھی لیڈر ہیں مگر ایڈیٹر ہیں اور ان کے تعلقات دوسرے اخبارات کے مدیروں سے بھی ہوں گے۔ وہ جارج کے کیس کو دوبارہ زندہ کر سکتے ہیں اور اچھال سکتے ہیں۔ مقامی سیاہ فام لیڈروں اور تنظیموں کو جارج کے لیے انصاف حاصل کرنے پر اکسانا کوئی مسئلہ نہیں۔ اس طرح برطانوی وزارتِ قانون و انصاف پر دباؤ بڑھ جائے گا کہ جارج کی حفاظت کے خصوصی انتظامات کیے جائیں۔ چوہدری دلاور کے لیے اس کو قتل کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بنا دیا جائے۔ ہم اس کی یادداشت کو تازہ کرنے کے لیے اسے چوہدری دلاور کی تصویر دکھا دیں گے۔ دلاور کو اس نے بہت پہلے دیکھا تھا۔"

"کیا ابھی نہیں دیکھا ہو گا؟"

"آپ گھاس کھا گئے ہیں؟ کیا دلاور نے اس کے سامنے جا کے خود زہر پیش کیا ہو گا؟ کہ لیجیے نوش فرمائیے۔ جارج تو اسے دیکھتے ہی قاتل قاتل چلانے لگتا۔ یہ کام اس کے لیے کسی اور نے کیا ہو گا۔ جب تفتیش ہو گی تو سب معلوم ہو جائے گا کہ زہر اسے کس نے دیا اور کیسے دیا؟"

"مگر اس سے تو وعدہ لیا جا چکا کہ وہ ایسی کوئی بات نہیں کرے گا۔"

میں نے کہا "ہماری ملاقات اسی بیان سے مشروط ہے۔"

www.paksociety.com

"کسی کی جیسی وعدے کی اور شرط کی۔ یہ کوئی شریفانہ کاروبار یا سودا ہے جس میں آدمی کی ساکھ اس کی زبان سے قائم رہتی ہے۔ یہ بدمعاشی، لاقانونیت اور سنگین مجرمانہ عزائم کا مظاہرہ کرنے والے چوہدری دلاور کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کی بات ہے۔ اس میں شرافت اور ایفائے عہد کی ساکھ کا کیا سوال۔ جارج کے ساتھ کتنا ظلم ہوا۔ وہ بے سبب جیل میں اپنی جوانی لٹا رہا ہے۔ کتنا خون جلتا ہوگا اس کا یہ سوچ کر کہ وہ ایسے جرم کی سزا کاٹ رہا ہے جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ اب وہ اصل مجرم کے معاملے میں وعدے پر قائم رہے؟ آج وہ ہم سے ملاقات کے بعد کل اپنا بیان بدل دے گا تو کوئی اس کا کیا بگاڑ لے گا۔ طوطی صاحب پر یا ہم پر کوئی الزام نہیں آسکتا۔ یہ ایک اور جرم بن جائے گا پولیس کا اگر وہ کہیں کہ اس شرط پر جارج کی ملاقات کرائی گئی تھی کہ وہ جیل حکام پر زہر دینے کا یا غفلت برتنے کا الزام عائد نہیں کرے گا۔ رشوت لے کر کسی قانونی اختیار کے بغیر ایک مجرم کو کسی سے خصوصی طور پر خلوت میں ملاقات کا موقع فراہم کرنا خود پولیس کے جرم کا ثبوت ہوگا۔"

ہم باتیں کرتے گئے اور چلتے گئے۔ لندن کے شہر کی قدامت میں کوئی ایسی بات ہے کہ ہم جیسے اس کی فضا میں اجنبیت ضرور محسوس کرتے ہیں لیکن صرف اس حد تک جیسے ٹنڈو آدم کا رہنے والا پشاور میں یا ٹنڈ جھمرو کا باسی کراچی میں محسوس کر سکتا ہے۔ ہمارے ہر طرف انگریزی بولنے والے لوگ تھے اور انگریزی کسی حد تک ہماری بھی ثانوی قومی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ ہم سائن بورڈ پڑھ سکتے تھے اور یہ سمجھ سکتے تھے کہ آس پاس لوگ ایک دوسرے سے کیا کہہ رہے ہیں۔ انگریز ویسے بھی وضع دار اور بے تکلف نہ ہونے والی قوم ہے۔ برعکس ان لوگوں کے جو تکلف کو سراسر تکلیف سمجھتے ہیں۔ یہاں اردو یا پنجابی بنگالی یا مدراسی بولنے والے بھی مل جاتے تھے تو تعجب نہیں ہوتا تھا۔ میں اور محسن فرنچ جانتے تھے اس لیے فرانس میں بھی ہمارا گزارا ہو جاتا تھا ورنہ عام آدمی تو برطانیہ، امریکا اور چند انگریزی بولنے والے ممالک کو چھوڑ کے ہر جگہ خود کو تنہا اور وحشی محسوس کرتا ہے جب اسے راستہ بتانے والا یا بازار میں کسی چیز کی قیمت بتانے والا بھی نہیں ملتا۔ وہ بس اشارے پر ٹیکسی ڈرائیور کو یا دکان میں کچھ کہنا چاہے تو تماشا بن جاتا ہے اور ہر طرف سمجھ میں نہ آنے والی زبان میں باتیں کرنے والوں کو دیکھ کے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ زمین سے کسی اور سیارے پر اتر گیا ہے۔

ایک بار چائے اور پھر کافی پینے کے بعد مجھے رابعہ کا خیال آیا "یار اپنے شیروانی صاحب، وہ کیا ہے کہ شام بڑی اداس ہے، نہیں گی؟"

"ہاں جی۔ ایسا ہی لگتا ہے کچھ اپنے سکندر اعظم صاحب۔"

"رابعہ اداس ہے غالباً" میں نے کہا "میں جا کیسے ہوں کہ اسے چھوڑ کے بھاگ آیا۔ وہ ضرور روتی رہی ہوگی۔"

"گل تو اس وقت بھی آنسو بہا رہی ہے۔ میں اس کے چہرے کو چشم تصور سے دیکھ سکتا ہوں۔ کیا خیال ہے کیسی تصویر کا عنوان ہوگا جو اس وقت اتاری جائے۔"

"رابعہ کی چشم گہربار کے خیال سے مجھ پر رقت طاری ہے۔"

"اور گل کو یاد کر کے میری آنکھیں نم ہو رہی ہیں یہ دیکھ سکتے ہیں" محسن بولا۔

"بکواس فرماتے ہیں آپ۔ اس وقت آپ کی آنکھیں اتنی بھی نمی نہیں جتنی صحرائے گوبی کی ہوا میں ہوتی ہے۔"

"اور آپ بھی کم جھوٹے نہیں ہیں۔ رقت طاری ہو رہی ہے۔ آپ ندیدوں کی طرح ہر شرمناک منظر کو گہری نظر سے مطالعہ فرما رہے ہیں اور ہر اچھی صورت پر نظریں گاڑ دیتے ہیں آپ" محسن نے جواب دیا۔

"کافی شرم آنی چاہیے تمہیں۔ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے قابل اعتراض خیالات سے اور نیلے خوابوں سے بھی گریز کرنا چاہیے۔"

محسن نے قہقہہ مارا "حضرت۔ بھول گئے آپ کہ اب تو بیوی والے ہیں آپ بھی۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "وہ خاک بیوی ہے شیروانی صاحب۔ ابھی تک محبوبہ کا لیبل لگا ہوا ہے اس لیے یار ابھی تو خانہ آبادی کے احساس سے خوشی بھی نہیں ہو رہی ہے۔"

"یہ سچ کہا۔ میں خاصا بڑا بجا کا محسوس کر رہا ہوں۔ یہ کیا فرق پڑا؟ بے شادی کے بعد۔ پہلے جس کے خیال اور تصور میں روز و شب خواب کی صورت بسر ہوتے ہیں وہ ایک نئے انداز کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے۔ گل کے یاد آنے کی وجہ تو کچھ اور ہے۔"

اتفاق رائے سے ہم نے ایک پبلک کال آفس کا رخ کیا اپنے پیارے پاکستان کے ڈاک خانے والے تیل فون بوتھ سے بہت مختلف تھا جہاں نیم تاریک، نیم روشن چلی دیواروں اور کاؤنٹر کے پیچھے کوئی نرم بیزار اور تھکے خان کاسنے خان بیٹھے ہوں۔ کریں تو پھر انتظار شروع ہوتا ہے اور جس خوش نصیب کی قسمت فون والے ملا دیں اسے ایک کابک میں بھیج دیا جاتا ہے۔ یہاں مکمل از تاریخ کا کوئی فون پڑا ہوتا ہے اور کیبن کی دیواروں پر کتنا تصاویر سے مرواتہ عبارات و اشتہارات تک سب سامنے رہتا ہے۔ یہاں ایک اسمارٹ خوش ادا و خوش لباس مزاج لڑکی نے حیرت سے کہا "پے کارڈ نہیں ہے آپ کے پاس؟"

"ہوتا تو آپ کے دیدار حسن کا یہ حسین اتفاق کیسے آتا؟"

وہ ہنسی "ٹھیک ہے آپ لے لیں۔ دس پاؤنڈ کا دوں یا پانچ والا؟"

میں نے سوچا کہ وا شتہ آید بکار۔ ابھی لندن میں دو دن نہ جانے کہاں فون کرنے کی ضرورت پڑے۔ پانچ پاؤنڈ کا فون کارڈ جیب میں ہوگا تو کہیں سے بھی کال ہو جائے گی۔ ویسے بھی یورپ کی کال کوئی لوکل کال نہیں ہے۔ دس پاؤنڈ میں سے کچھ رقم بچے گی تو کہیں کام آجائے گی ورنہ غیر استعمال شدہ رقم کا کارڈ ہم طوطی صاحب کو گفٹ کر جائیں گے۔

دس پاؤنڈ والے کارڈ کے ساتھ ہم نے ایک ائرکنڈیشنڈ بوتھ کا نمبر ملایا۔ ریسیور اٹھانے والی خاتون نے مردانہ آواز سے ہیلو کہا تو میں سمجھ گیا کہ یہ رانگ نمبر نہیں ہے۔ یہ وہی ہم مردانہ نیم زنانہ چیخ تھی جسے ہم کاؤنٹر کے پیچھے رکھا ہوا دیکھتے تھے۔ میں نے اسے ہوسٹل کے کمرے کا نمبر دیا اور کہا کہ کسی بھی خاتون کو بلایا جائے۔ رابعہ یا گل۔ اس نے اپنے تلفظ میں دونوں نام دہرائے "رابے آہ۔ اور حس گل۔۔۔ پانچ منٹ بعد پھر فون کرنا۔"

پانچ منٹ میں ہم نے دس بار گھڑی دیکھی۔ بہت کم لباس اور بہت زیادہ خوشبو پہنے ہوئے (انگریزی میں خوشبو لگاتا نہیں، خوشبو پہنا کہا جاتا ہے) دو لڑکیوں کو مسکرا کے دیکھنے کی غلطی کی۔ وہ کالی گرو تھیں اور غالباً کسی سے ان کی ڈیٹ منسوخ ہو گئی تھی۔ وہ فوراً ہمارے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

"ہائے ہینڈسم۔ آج رات تم کیا کر رہے ہو؟"

میں نے شرما کے کہا "یہ تمہیں کیسے بتا دیں ڈیئر سسٹر۔"

محسن نے بے وقوفوں کی طرح کہا "ہماری بیویوں سے پوچھ لینا۔ وہ آنے ہی والی ہیں سسٹر۔"

وہ بڑا سا منہ بنا کے اٹھ گئیں تو میں نے ڈیسک پر طبلہ بجانا شروع کیا اور محسن گانے لگا "تیرے لونگ دا پیا لشکارا۔"

دوسری طرف سے فون کرنے والی ایک بڑی بی نے ڈانٹ کے کہا "ول یو پلیز شٹ اپ۔"

"بدذوق ہے" محسن نے خوش دلی سے کہا۔

میں نے پھر نمبر ملاتے ہوئے کہا "نہیں۔ موسیقی کو سمجھتی ہے۔"

فون میں ریسیور اٹھانے والی خاتون نے کہا "رابے آہ نے ایک بڑا دلچسپ جواب دیا ہے۔ سنو گے؟ اس نے کہا ہے جہنم میں جاؤ سالے۔"

"وہ خود نہیں آئی؟" میں نے مایوسی سے کہا "اور گل۔۔۔؟"

"ہاں۔ گل نے زیادہ مفید بات کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ واپس آنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہارے بغیر زیادہ خوش ہیں۔"

لائن کٹ گئی تو میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "ان کا دماغ درست کریں گے واپس جا کے" محسن نے نفرت سے کہا۔

"انشاء اللہ۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس وقت کیا کریں؟" میں نے کہا۔

"بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" محسن اٹھ کھڑا ہوا۔

"بڑی بے عزتی خراب ہو گئی دوست۔ وہ سخت خفا ہیں۔"

"ہمارے اعمال ہی ایسے ہیں۔ کون بیوی خوش رہ سکتی ہے ہم جیسے رنگ باز، چکر باز، چالباز شوہروں کے ساتھ۔"

"رابعہ اور گل تھیں" میں نے کہا "کیا پھر کوشش کریں؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا "بے کار ہے۔ اس بار ان کی طرف سے وہ ورڈز ورتھ کی حسینہ خود اپنا دندان شکن جواب دے گی کہ تمہاری بتیسی باہر آگرے گی۔"

"دندان شکن جواب کے لیے ہم لندن میں ہی ایک رقیب سے رجوع کر سکتے ہیں" میں نے کہا "چھیڑ خوباں سے نہ سہی اس کے شوہر سے سہی۔"

ہم واپس ہوئے اور الزبتھ کے گھر کا نمبر ملایا۔ حسب توقع اس کی ہاؤس میڈ نے ریسیور اٹھایا "آپ نام بتائیں گے اپنا۔"

"الیگزینڈر دی گریٹ" میں نے کہا "تاریخ عالم۔ وہ سمجھ جائے گی۔"

کچھ دیر بعد الزبتھ نے کہا "اوہ سکندر! میں تو سمجھی تھی کہ اب تم کبھی مجھ سے بات نہیں کرو گے۔"

"بات کرنی تو بے حد ضروری تھی" میں نے کہا "ورنہ تمہاری محنت۔۔۔ سوری، الزبتھ کے ٹیلر کی محنت رائیگاں جاتی۔"

انگریزی میں اس کے شوہر کو ELIZABETH'S TAILOR کہنا آسان تھا۔ اس طرح کہ وہ سمجھے میں اسے الزبتھ ٹیلر کہہ رہا ہوں لیکن وہ سمجھ گئی۔

"کیسی محنت؟" اس کا لہجہ بدل گیا۔

"جو اس نے فون پر آبزرویشن لگوا کے کی ہے۔ اب تم میری آواز کا ٹیپ منگوا کے دن میں دس بار سن سکتی ہو۔"

"تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"اپنے منہ سے۔۔۔ ہاہا!" میں نے اپنے مذاق پر مصنوعی قہقہہ لگایا "تین منٹ میں کوئی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا الزبتھ اور میں دو منٹ انسٹھ سیکنڈ بات کر کے فون بند کر دوں گا۔ یہ پی سی او ہے اور آئندہ بھی میں ایسے ہی فون کروں گا۔"

"سکندر! آئی ایم سوری۔"

"مجھے بھی بہت افسوس ہے۔۔۔ کہ میں تم سے ملا اور تم سے محبت کی۔ اچھا ہوتا اگر تمہارا نام بھی میں ان ہی لڑکیوں میں لکھ کے بھول جاتا جن کو آج بھی افسوس ہوگا کہ وہ اتنی CHEAP اور آسان حاصل کیوں تھیں۔ تمہیں تو میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ یہ محبت نہ ہوتی تو تم کیسے SAFE رہ سکتی تھیں خاتون محترم، غور کرنا اس سوال پر۔"

"میں ملنا چاہتی ہوں تم سے۔۔۔"

"سکندر سب کچھ ہے لیڈی، بیوقوف نہیں۔ کالا اور کم نسل مگر وہ احمق نہیں ہے لیڈی۔ اب میری ملاقات ہوئی تمہارے اس لارڈ سے اور اسے اندازہ ہوگا کہ ایم آر ایس کیا کر سکتی ہے جواب

www.paksociety.com

گیں۔"

الزبتھ نے دہشت زدہ ہو کے چیخ ماری "پلیز سکندر!"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور ہم فوراً وہاں سے نکل آئے۔ کچھ فاصلے پر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کے ہم نے پھر چائے کا آرڈر دیا اور بڑے بڑے شیشوں سے باہر دیکھتے رہے۔ ایک پولیس کار دو منٹ بعد وہاں پہنچی اور اس میں سے شرلاک ہومز جیسے حلیے میں ایک شخص اترا۔ اس نے مشکوک نظروں سے ادھر اُدھر نگاہ ڈالی اور ایک لمحے کے لیے اس کی نظر ریسٹورنٹ پر بھی رکی تو مجھے یوں لگا جیسے اس نے "مجرموں" کی جائے پناہ تاڑلی ہے۔ میرے ذہن میں اپنے وطن کی پولیس کے ذہنی معیار اور سراغ رسی کی صلاحیت کے بارے میں اچھا تاثر نہیں تھا مگر فلموں اور جاسوسی ادب کی کہانیوں نے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغ رسانوں کو بڑی مافوق الفطرت قسم کی چیز بنا دیا تھا کہ ارتکاب کے بعد تو خیر وہ مجرم کو چٹکی بجاتے ہی دھر لیتے ہیں لیکن مقابلے پر چھلاوا قسم کا مجرم ہو جو زمانے بھر کی آنکھوں میں دھول جھونک کے غائب ہو جائے تو وہ بھی بھوت کی طرح اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور ہمالیہ کی چوٹی پر قتل ہو تو وہ لاش قطب شمالی سے، آلۂ قتل قطب جنوبی سے اور قاتل کو بحرالکاہل کی تہ سے نکال سکتے ہیں۔ لیکن ایسا کمال بھی دکھا سکتے ہیں کہ ابھی جرم کرنے کا خیال کسی مجرم کے ذہن میں آیا ہو یا اس نے منصوبہ ہی بنایا ہو کہ ان پر الہام ہوتا ہے اور وہ مجرم سے پہلے جائے واردات پر پہنچ جاتے ہیں اور بڑے ڈرامائی طریقے پر جہاں مجرم نے قتل کی نیت سے ریوالور نکالا انہوں نے نشانہ لے کر فائر کیا اور مجرم کا ریوالور اس کے ہاتھ سے غائب اور بس اس کے بعد ہینڈز اپ۔

ایسی ہی افسانوی باتوں نے ہماری پولیس کو بہت بدنام کیا ہے اور اس کے برعکس ترقی یافتہ ممالک کے مجرموں کو احمق ثابت کیا ہے جو کسی نہ کسی غلطی سے پکڑے ضرور جاتے ہیں۔ لوگ ہماری اور برطانوی پولیس کا موازنہ کرتے وقت بھول جاتے ہیں کہ وہاں عام پولیس مین کو ایک ڈاکٹر کے برابر تنخواہ ملتی ہے اور ان کے پاس جدید ترین وسائل ہیں۔ اس کے باوجود وہاں بھی جرائم کے سراغ لگانے کا تناسب سو فیصد نہیں اور ہماری پولیس کا ریکارڈ بھی اتنا بُرا نہیں ہے۔

جب پولیس کار سے اترنے والا پبلک کال آفس میں گیا ہوا تھا تو صرف ایک ڈرائیور ہی کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس بالکل نئے ماڈل کی کار تھی اور کار کا وائرلیس ایریل یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس کا اپنے ہیڈ آفس سے بھی مسلسل رابطہ ہے۔ مجھے اپنے وطن کی پولیس کی بے سروسامانی یاد آئی جہاں واردات کی اطلاع ملے تو عموماً گاڑی نہیں ہوتی اور انہیں کہیں پہنچنا ہو تو وہ مجبور ہوتے ہیں کہ کسی گاڑی کو بیگار میں پکڑ لیں یا زبردستی ٹیکسی میں فٹ ہو جائیں۔ بعض اوقات تو انہیں پیدل یا سائیکل پر بھی جانا پڑتا ہے۔ اپنی گوروں کے وقت کی دقیانوسی رائفل کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔

میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ دوسری کار میں پولیس کی گاڑی کے پیچھے آ کے رکی اور اس میں سے جو شخص برآمد ہوا اسے دیکھ کے میں اور محسن چونکے بغیر نہ رہ سکے۔

محسن نے کہا "یار، یہ تو کارٹون ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "بالکل وہی ہے۔"

"تو یہ مسٹر گورڈن ہیں" الزبتھ کے مجازی خدا۔ ہیں جی۔"

"ہاں جی۔ تقدیر کے کھیل نرالے ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر گرم چائے کو حلق سے اتار لیا "یہ کتنا بزدل اور احمق لڑکا ہوا کرتا تھا۔"

محسن نے سر ہلایا "لڑکیوں کی طرح شرمانے والا اور کسی حد تک احساس کمتری کا مارا ہوا۔ ہم سے تو خیر کتراتا تھا مگر کلاس کی شریر لڑکیاں اسے کتنا پریشان کرتی تھیں۔ یہ کونوں کھدروں میں منہ چھپاتا پھرتا تھا۔"

"اور اسی لیے ہم نے اسے کارٹون کے خطاب سے نوازا تھا جو اس کے نام سے زیادہ مقبول ہوا تھا" میں نے کہا "اب میں کہہ سکتا ہوں شیروانی صاحب کہ الزبتھ کے فرسٹریشن کے اسباب کیا ہیں۔ اگر اسے کوئی میرے جیسا خوبرو جوان دستیاب ہو جاتا، ارجنٹ نوٹس نائب، تو الزبتھ مجھے بھول چکی ہوتی اور اب میرا نام سن کے یا رابعہ کی تعریف سن کے اتنی مشتعل نہ ہوتی۔ نوجوانی کے جذباتی رومانوی دور کے بعد عملی زندگی کی حقیقت سے سب ہی سمجھوتا کر لیتے ہیں اور سب رو رو کے فریاد نہیں کرتے کہ ۔۔۔ یاد ماضی عذاب ہے یارب۔ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔"

اچانک محسن نے کہا "اب اُدھر دیکھ۔"

میں نے دیکھا تو مسٹر گورڈن کی کار کے پیچھے ایک ٹیکسی آ رکی تھی۔ اس میں سے اترنے والا حلیے سے کسی ریاست کا راجا لگتا تھا۔ روایتی انداز میں اس نے سلیم شاہی جوتے، تنگ پاجامہ اور سلک کی شیروانی زیب تن کی تھی اور اس کے سر پر راجے مہاراجوں جیسی پگڑی بھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کے منہ والی چھڑی بھی نظر آ رہی تھی۔ ایسے حلیے کے راجے اب یا تو قدیم تصاویر میں نظر آتے ہیں یا ان بلیک اینڈ وائٹ دور کی فلموں میں جن کی کہانیاں کسی فرضی ریاست کے محلات میں چلتی ہیں لیکن انگریز کے ملک میں ایسے حلیے کو آج بھی احترام آمیز دلچسپی سے دیکھا جاتا ہے۔

"مہاراجا صاحب ٹیکسی میں! کیا زمانہ آ گیا ہے؟" محسن بولا۔

"یہ ریاست قلاش پور کے مہاراجا کنگال رائے آنجہانی ہیں؟" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "اپنی شکل ادھر کرے تو میں بتاؤں۔ ویسے مجھے اپنے طوطی صاحب کا اِرادے باز فرزند لگتا ہے۔"

میں نے کہا "وہ تو یار شہزادہ سلیم کا رول کر رہا ہے کسی مغل اعظم ٹائپ ڈرامے میں۔ وہ قد میں چھوٹا ہے اور اتنا موٹا نہیں

محسن نے ایک دم میز پر ہاتھ مارا "وہ مارا پاپڑ والے کو۔" ادھر اُدھر بیٹھے ہوئے حضرات و خواتین نے بدتمیزی کے اس مظاہرے پر ناک بھوں چڑھائی۔ ویٹر نے فوراً نمودار ہو کے کہا "سر! آپ کو واقعی نہیں پینی چاہیے۔"

میں نے کہا "ابھی تو ہم اور پئیں گے۔"

محسن بولا "ہمیں دو کپ اور لا دو۔ ہم مسلمان شراب تو چھوڑ نہیں، چائے پی کر بھی ہمیں نشہ ہو جاتا ہے۔"

وہ ہمیں عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا تو میں نے کہا "پاپڑ والا کون تھا؟"

"یار، اپنے چوہدری دلاور صاحب اور کون!" محسن بولا "قلاش پور کے مہاراجا کنگال رائے کے روپ میں آپ کے سامنے ہیں۔"

"ارے، کیا میں اچھل پڑوں؟" میں نے کہا "خوب پہچانا تو نے۔ مجھے حسد محسوس ہو رہا ہے تیری ذہانت سے۔"

"ہی فرزانوں نے لیڈی الزبتھ کو آپ سے برگشتہ کرنے کے لیے آپ کے نجی معاملات کی پوری رپورٹ پہلے سے پہنچائی تھی۔ اس کو علم تھا کہ الزبتھ سے بھی آپ کو اتنا ہی عشق تھا جتنا آج کل رابعہ سے ہے۔ کل خدا جانے کس سے ہو گا؟"

میں نے میز پر مکا مار کے کہا "کل بھی رابعہ سے ہی ہو گا" پر سوال بھی کیا۔"

جن لوگوں نے پہلے ناک بھوں چڑھائی تھی انہوں نے پھر ہمیں گھور کے ناپسندیدگی کے جذبات کا اظہار کیا مگر اب ان کی شدت کم تھی۔ غالباً انہوں نے فرض کر لیا اور بادلِ ناخواستہ تسلیم بھی کر لیا تھا کہ ہم کسی جوشیلی گفتگو کرنے والی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔

"اس نے بالکل ٹھیک سمجھا تھا کہ جب آپ عشقِ نازو جاپرچ سے ملنے آئیں گے تو یہ ناممکن ہے کہ پرانے عشق کا کیڑا آپ کے دماغ میں نہ کلبلائے اور آپ سابق محبوبہ دلنواز کا دیدار کیے بغیر لوٹ جائیں۔ ایسا تو ممکن ہی نہیں۔ اس نے الزبتھ کے دل میں آتشِ غضب روشن کرنے کے بعد آس پاس رہتے ہوئے آپ کا انتظار کیا۔ ویسے تو شاید اس حلیے میں دلاور کا باپ بھی آپ کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ سارے لندن میں آپ کو کہاں تلاش کرتا۔ بس ایک جگہ مورچا بند ہو گیا۔ جیسے شکاری بیٹھ جاتے ہیں مچان باندھ کے اور بکری کے بچے باندھ دیتے ہیں کہ آ کر شیر اس راستے سے ضرور گزرے گا اور پھر بکرے کی خوشبو یا آواز پر آئے گا مرنے کے لیے مچان ہی کی بیچ کے نیچے۔"

میں نے سر ہلایا "یعنی اس کہانی میں شیر ہوں میں، بکری ہے لیڈی الزبتھ گورڈن اور شکاری اپنے چوہدری دلاور صاحب۔ میرا راستہ گزرتا ہے کوئے یار میں در جاناں کے سامنے سے۔ کیا غضب کی اسٹوری ہے شیروانی صاحب! اب اس کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ شیر احمق نہیں ہے۔ اسے معلوم بھی ہو گیا ہے کہ پیڑ پر شکاری بندوق لیے بیٹھا ہے۔ وہ بکری کی اشتہا انگیز خوشبو اور پرکشش آواز کو نظرانداز کرتے ہوئے پیچھے سے جاتا ہے اور درخت پر چڑھ کے شکاری کو کھا لیتا ہے، بندوق سمیت۔"

"ابھی تک چوہدری صاحب نے ہمارا حلیہ ملاحظہ نہیں فرمایا ہے۔"

میں نے کہا "بدلا ہوا حلیہ صرف میرا ہے۔ تجھے تو وہ دیکھتے ہی گلے لگا لے گا کہ میرے پاکستانی بھائی! تم یہاں کہاں؟"

"میں طوطی صاحب کے ارادے باز فرزند سے کہوں گا کہ مجھے بھی شہزادہ سلیم بنا دے۔ اس کے پاس میک اپ کا سامان ہو گا۔"

میں نے کہا "یہ انتہائی ضروری ہے ورنہ کسی دن ہو جائے گا آمنا سامنا۔ ویسے تو لندن جیسے شہر میں کسی کو پہچان کے بغیر نام سے تلاش کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنا۔ سوئی اگر گھاس کے رنگ کی ہو تو مزید ناممکن۔"

"لیکن اپنے چوہدری صاحب تو خود ہی سامنے آ گئے۔ اب ہم کیا کریں گے؟" محسن بولا۔

"کچھ نہیں۔ ہم یہاں بیٹھ کے ناکام ڈرامے کا اختتام دیکھتے ہیں۔ قلاش پور کے راجا کنگال رائے اور سر رچرڈ گورڈن ابھی جھک مار کے واپس چلے جائیں گے۔ یار زندہ صحبت باقی۔"

محسن نے کہا "کیا ہمیں چوہدری دلاور کا تعاقب نہیں کرنا چاہیے؟"

"کرنا تو چاہیے" میں نے کہا "آخر یہ ایک ایکشن، رومانس اور سسپنس سے بھرپور اسٹوری ہے۔"

"ہوشیار! شیر نے نا سمجھ شکاری کو کھانے کا فیصلہ بھی کیا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ شیر نے کہا تو تھا مگر شیر اس وقت چائے پی رہا ہے اور اس کا ڈنر ٹائم بھی نہیں ہوا۔"

اسی وقت شرلاک ہومز ٹائپ شخص اوورکوٹ لہراتا اور فلیٹ ہیٹ کو سر پر جماتا نمودار ہوا۔ اس نے برآمدے جیسی کھلی جگہ پر کھڑے ہو کر دوبارہ اپنی دو آنکھوں کے دو کیمرے گرد و پیش کی منظر کشی کے لیے گھمائے اور مجرمان کو ٹریس کرنے کی کوشش کی کہ شاید وہ نا مجرمان بنے کہیں قریب ہی کسی کھمبے سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہے ہوں یا کسی بینچ پر اخبار سے چہرہ چھپائے بیٹھے ہوں۔ اسے مجرمان سے ملتا جلتا کوئی چہرہ نظر آتا تو شاید وہ کچھ کرتا مگر وہاں سے صرف کاریں گزر رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر ایک بڑھیا اپنے پالتو شوہر اور کتے کے ساتھ سڑک پار کرنے کا انتظار کر رہی تھی اور ایک عشوہ طراز حسینہ کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے مایوسی سے تنہا میں سر ہلایا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہو گیا۔

"کاش میرے پاس رابعہ کی گاڑی ہوتی" میں نے کہا "مگر اس میں رابعہ نہ ہوتی۔ پیدل تو میں صرف اسی کا تعاقب کر سکتا ہوں۔"

محسن نے فٹ پاتھ پر محوِ انتظار لڑکی کو دیکھا۔ "وہ میں کر لوں گا۔ تو جا اپنے چوہدری دلاور کے پیچھے۔"

www.paksociety.com

"کچھی ہمدردی ہے۔ میرے منہ میں جاؤں... اور اس کے پیچھے میں کیسے جاؤں۔ فوراً دوڑ لگا کے ٹیکسی کے پیچھے۔"

"ایک ٹیکسی کا پیچھا دوسری ٹیکسی میں کیا جا سکتا ہے۔"

"رائٹ" میں نے میز پر ہاتھ مار کے کہا جس سے برتن اچھلے اور ایک کپ نیچے گر کے ٹوٹ گیا۔ حضرات اور خواتین نے بدتمیزی کے اس مظاہرے پر شدید دلی صدمہ محسوس کیا۔ سلطنت برطانیہ کی حدود میں کیسے کیسے لوگ داخل ہو جاتے ہیں۔ کالے پیلے سانولے بھورے۔ حرام خور سے نوم خور اقوام تک۔ جن کو شرفا کے ریسٹورنٹ میں بیٹھنا بھی نہیں آتا۔

میں دروازے تک پہنچ کے پلٹا اور چلا کے محسن سے کہا "کپ کی قیمت ادا کر دینا۔ کپ توڑنا کوئی جرم نہیں ہے۔"

اس نے چیخ کے جواب دیا "جو کپ کی قیمت مانگے گا میں اس کا سر توڑ دوں گا تاریل کی طرح۔"

دروازے کے پاس ایک بوڑھی میم بیٹھی تھی جس کو دیکھ کے لال لگام والا گھوڑا یاد آتا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے اپنے نوجوان ساتھی سے پوچھا "یہ داڑھی والا تو مجھے دہشت گرد لگتا ہے۔ کیا دھمکی دے رہا تھا ڈارلنگ۔"

نوجوان ڈارلنگ سیلولی بادہ اسی تھا۔ اس نے کہا "ابھی اس کا ساتھی ریٹر کا سر توڑے گا سویٹ ہارٹ۔ بڑا مزہ آئے گا۔ ہمارے ملک میں ناریل بہت توڑے جاتے ہیں۔ میں بھی توڑتا تھا۔"

فٹ پاتھ پر قدم رنجہ فرماتے ہی میں نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روک لیا۔ اسے ایک سکھ چلا رہا تھا۔ "واہگورو کا خالصہ۔ کتھے جانا ہے سردار!"

میں نے خفگی سے کہا "چل پھٹ ادھر سے پاگل سکھ۔ ہر داڑھی والا سکھ نہیں ہوتا۔ ہم ہیں مولانا۔"

مگر میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ ہوا ہو گیا تھا۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہوا کیونکہ دوسری ٹیکسی مجھے فوراً نہیں ملی۔ میری نظر کے سامنے پوسٹ آفس کی عمارت سے کاکروچ برآمد ہوا۔ دور ہی سے مجھ پر اپنے اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مایوسی سے ادھر ادھر دیکھتا رہا اور اپنی جھینگر جیسی مونچھیں ہلاتا رہا۔ اس کی گاڑی سڑک کے دوسرے کنارے پر درجن بھر دوسری گاڑیوں کے درمیان کھڑی تھی۔ مقبوب شوفر نے اس کے لیے پیچھے کا دروازہ کھول کے تھام رکھا تھا۔ اس کے ساتھ چوہدری دلاور کو دیکھ کے مجھے بھی کچھ مایوسی ہوئی تھی۔ جس ٹیکسی میں وہ آیا تھا وہ بھی مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

دھماکا اچانک ہوا۔ میری نظر سڑک پر تھی چنانچہ میں پہلے تو اچھل پڑا اور پھر ایک دم زمین پر لیٹ گیا۔ آس پاس بھگدڑ مچ گئی تھی۔ دونوں جانب سے آنے والی کاریں رک گئی تھیں اور کچھ عورتیں چیختی ہوئی اپنی کانوں کی طرف دوڑ رہی تھیں۔ میں نے ایک عورت کے چہرے پر خون بہتا دیکھا۔ جس ریسٹورنٹ سے میں نکلا تھا اس کے شیشے بکھر گئے تھے اور اندر تاریکی پھیل گئی تھی کیونکہ شاید دھماکے سے بجلی کا تار بھی ٹوٹا تھا۔

محسن دوڑتا ہوا میرے پاس آیا "یہاں کیوں مرا پڑا ہے چل اٹھ۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "بھاگنا بزدلی ہے ہم شہری ہیں۔"

اس نے مجھے کھینچ لیا "ابھی پولیس آجائے گی شیر خان۔ ہر پاس ہر مشکوک شخص کو پکڑے گی یا گواہی میں نام لکھ لے گی۔"

دھماکا سر جینڈ گورڈن کی گاڑی میں ہوا تھا اور یقیناً بم کے ذریعے کیا گیا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ میں اور محسن سست روی سے فٹ پاتھ پر چلتے گئے۔ ابھی تک پوسٹ آفس میں سے فلاش پور کے مہاراجا کنگال واپس نہیں ہوئے تھے۔ سر جینڈ گورڈن عرف کاکروچ کی گاڑی میں آگ لگی ہوئی تھی اور وہ خود جہاں کھڑا ہوا تھا وہیں لمبا لیٹ گیا تھا۔ اس کا ڈرائیور حیرت انگیز طور پر صاف بچ گیا تھا یا اسے معمولی زخم آئے تھے۔ وہ دوڑتا ہوا اپنے آقا کی جانب جا رہا تھا اور چلا رہا تھا۔

"سر... سر آپ زندہ ہیں؟" نہ جانے کیوں مجھے اس کی آواز میں امید سے زیادہ افسوس کا تاثر محسوس ہوا۔

"ایڈیٹ۔ پہلے مجھے اٹھاؤ اور پھر پوچھو۔" کاکروچ نے کہا۔

ایک شخص نے ڈرائیور کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اس کے کندھے پر تھپکی دی "اگر یہ جواب دے رہا ہے تو یقیناً زندہ ہے۔"

ہمارے سامنے مخالف سمت سے آنے والے ایک شرابی نے مجھ سے سوال کیا "یہ کیسا دھماکا تھا؟"

میں نے کہا "دھماکا! کیسا دھماکا؟ میں نے تو کچھ نہیں سنا۔"

اس نے ہیٹ اتار کے سر جھکایا "اس اطلاع کے لیے بہت شکریہ۔"

محسن نے کہا "کیا ہم اندر جائیں؟"

"اگر ہم اندر گئے تو اندر ہو جائیں گے۔ طوطی صاحب کی ہدایات بھول گیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ نہ واردات کرنا نہ دیکھو۔"

"یہ اس کی کارستانی تھی۔" میں نے چلتے ہوئے کہا "مگر وہ ابھی تک اندر ہے۔ فرار کیوں نہیں ہوا؟"

محسن نے کہا "وہ نکل گیا ہوگا۔ ہم نے دیکھا نہیں۔"

"کب نکل گیا ہوگا؟"

"دھماکے سے پہلے۔ مجھے وہ کہیں نظر نہیں آئی تھی جس میں وہ کاکروچ کے پیچھے آیا تھا۔"

"اس نے یہاں بھی ہمارے خلاف چکر چلا دیا ہے۔ کاش میری ساجدہ محبوبہ کھل کے مجھ پر شک کا اظہار کرے گی۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔"

محسن نے کہا "کتنا بے لذت۔ کاکروچ مارا جاتا کم سے کم۔"

میں نے تنفی میں سر ہلایا "دلاور کا یہ منشا اور مقصد نہ تھا ورنہ دھماکا اسی وقت ہو جاتا جب کاکروچ گاڑی میں بیٹھا ہوتا۔ ایک عورت ہے۔ وہ ہمارے خلاف زبان سے زہر اگل گئی ہے۔"

اصل خطرناک تو محسن تو اس کا کیا شوہر ہے۔ رقابت کے جذبات پہلے ہی مضطرب تھا اٹھتے ہیں اور یا نس پر چڑھائی ہے۔"

محسن بولا "وہ تو اب ہنگامہ کھڑا کر دے گا کہ میری زندگی کو سکندر بخت سے خطرہ لاحق ہے۔ وہ میری آواز کا ایک بٹ کرے گا کہ سکندر بخت ناجائز طور پر لندن میں موجود ہے۔ اس کا سرکاری اثر و رسوخ پولیس کے سراغ رسانوں کو مزید بیچ پیش کر دے گا۔ بہتر ہے کہ ہم انہیں کچھ نہ بتائیں۔ اپنے طوطی صاحب کو۔"

میں نے کہا "سر جینڈ گورڈن پر قاتلانہ حملے کی خبر پالیسی سے نشر ہونے کی رات ہوگی اور صبح کے سب اخباروں میں یہ خبر تصویروں کے ساتھ آئے گی۔ لیڈی ایرتھ کا بیان ہوگا۔ کاکروچ کے ڈرائیور کا بیان ہوگا۔ ہم طوطی صاحب کو بتائیں نہ بتائیں۔"

محسن بولا "میرا مطلب تھا یہ نہ بتائیں کہ جب دھماکا ہوا تو ہم بھی وہیں موجود تھے اور ہم نے فلاش پور کے مہاراجا کنگال راجے کو ٹیکسی میں سے برآمد ہو کے اندر جاتے بھی دیکھا تھا اور اسے چپکے بھی ملے گئے تھے کیا پتا وہ کون تھا جسے ہم نے دلاور فرض کر لیا تھا۔"

"حج کا صیغہ مت استعمال کریں شیرانی صاحب! آپ نے زخمی کیا تھا۔"

محسن نے کہا "توری کی تقریر موکا بھی کیا جاتی ہے۔"

"آپ زری نہیں شیرانی ہیں۔"

"آپ بتا رہے ہیں" محسن نے کہا اور ایک ٹیکسی کو روک لیا۔

ہم طوطی صاحب کے آفس اور گھر کے نزدیک ہی واقع ایک پاکستانی ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ وہاں ہندوستانی پاکستانی سارے سیاسی اور مذہبی اختلافات بھلا کے دال چاول اپنے اپنے انداز سے نوش فرما رہے تھے۔ کچھ چھری کانٹے استعمال کر رہے تھے۔ کچھ نوابزادے انگلیاں۔ ایک چینی یا کوریائی جوڑا تیلیوں سے چاول کو منہ کے دہانے میں اچھال رہا تھا۔ ایک میز پر مدراسی دال چاول سے انصاف کرنے اور ہاتھ ہی سے لے رہا۔ بیٹھے اور اپنے اپنے منہ میں ڈالتے جا رہے تھے۔ محسن کا خیال تھا کہ یہ گورے وہ ہیں جو سامنے بیٹھ کے ایک دو سرخ منہ میں بھی پھونک سکتے ہیں۔

"اپنوں کے ساتھ ہم بھی اپنی اسلامی خوراک کو بھول گئے ہیں سب پاکستانی بھائی" میں نے افسوس سے کہا۔

"آپ کے لیے کھجوریں اور تنگی کا دودھ یا شتر مرغ کے انڈے کا آملیٹ منگوا دوں؟" محسن بولا۔

اچانک ایک شخص ہماری میز پر آ بیٹھا۔ وہ ریسٹورنٹ کا مالک تھا جسے ہم کاؤنٹر کے پیچھے دیکھتے تھے "معاف کرنا سر جی۔ آپ شیرانی محسن صاحب؟"

محسن کو شاک سا لگا مگر وہ ہندوستانی جذبات کے اس مظاہرے کا جواب بے مروتی سے نہیں دے سکتا تھا۔

"ہاں۔ تم نے کیسے پہچانا... تم کون ہو؟"

اس نے بڑی محبت سے نعین اور محسن کو گلے لگایا "سر جی میں عبدل ہوں۔ ہوسٹل میں ویٹر تھا۔ اب خیر سے یہ ہوٹل کھول لیا ہے۔"

پہچانا تو اسے میں نے بھی تھا مگر محسن نے سخت حیرت اور مسرت کا اظہار کیا "اچھا۔ تم عبدل ہو۔ بھئی بہت بدل گئے ہو اور بڑی ترقی کی ہے تم نے تو۔"

عبدل نے کہا "دو جی۔ یہ کون ہیں۔ آپ کے والد ہیں؟"

میں نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہا "نعوذ باللہ۔ ایسی ناخلف اولاد سے...."

محسن نے فوراً کہا "یار میرے والد شریف قری ہیں۔ یہ تو بس ایک دوست ہیں۔"

اس نے مجھ سے مصافحہ کر کے ہاتھ سینے پر رکھا "محسن صاحب! آپ کا ایک جوڑی دار ہوتا تھا۔ اس کی آپ کی دوستی بڑی پکی تھی۔ سکندر نام تھا اس کا؟"

محسن نے سوچ کے کہا "ہاں تھا تو سہی۔"

"بڑا زندہ دل تھا جی۔ اس کے پاس کوئی جادو تھا سر جی۔ یہ انگریز لڑکیاں اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی تھیں۔ ہنسی تو پھنسی اور مسکرائی تو گئی۔"

محسن نے کہا "ہاں.... مگر یار ہم بھی کیا کم تھے۔"

"مجھے یاد ہے۔ آپ دونوں کی انگریزوں سے خوب مارا ماری ہوئی تھی۔ اور وہ آپ کا دوست تو سر جی شیر تھا شیر۔"

محسن بولا "شیر ایک جانور ہوتا ہے عبدل! جیسے گدھا۔"

"لیکن جنگل کا بادشاہ تو شیر ہی ہوتا ہے۔ آپ کے دوست کا ایک بڑا احسان ہے مجھ پر۔"

میں نے بے اختیار کہہ دیا "وہ کیا عبدل!"

محسن نے مجھے گھور کے دیکھا "صوفی صاحب بھی سکندر کے دوست ہیں۔ اسی لیے پوچھ رہے ہیں۔"

"سر جی! انہوں نے میری جان بچائی تھی۔ کچھ بڑے حرامی لونڈے تھے۔ ان کو مجھ پر شک تھا کہ میں پیغام رسانی کرتا ہوں اور پاکستانی لڑکوں کے ساتھ مل کے ان کی گرل فرینڈز کو خراب کرتا ہوں۔ وہ مجھے اٹھا کے لے جا رہے تھے قتل کرنے کے لیے۔ اگر سکندر صاحب نہ آجاتے تو سر جی اس دن اپنا معاملہ خلاص تھا۔ ان کا پروگرام تھا کہ مار کے گٹر میں ڈال دیں۔ سکندر صاحب نے ان کو روک کر پوچھا کہ یہ کون ہے اور اسے کہاں لے جا رہے ہو۔ انہوں نے میرا منہ ٹیپ سے بند کر رکھا تھا۔ اور میرے بازو دونوں طرف سے پکڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی میں نے لاتیں چلائیں تو سکندر صاحب نے ان کو للکارا۔ وہ چار تھے مگر اکیلے سکندر صاحب نے ان کی تو ایسی تیسی کر دی۔ اس کے بعد چاروں پہنچ گئے پرنسپل کے گھر شکایت کرنے کہ ہمیں سکندر نے مارا ہے۔ لو جی الٹا بات کی انہوں نے کہ سکندر ایک ویٹر کو مار رہا تھا۔ ہم نے اسے بچانا چاہا تو

www.paksociety.com

سکندر نے انہیں بھی مارا۔ سکندر کی پولیس میں رپورٹ لکھوا دی گئی لیکن سرجی۔ میرے بیان نے ان کی تو اسٹوری ہی غلط کر دی۔ پرنسپل نے ان کو وارننگ دی اور پولیس نے چاروں کے والدین کو تنبیہہ کی کہ لڑکوں کو نتھ ڈال کے رکھیں۔ اس دن کے بعد وہ چاروں میرے بھی دشمن بن گئے تھے۔ بس سکندر صاحب کی وجہ سے میں بچا ہوا تھا۔"

محسن نے سوچ کے کہا "ہوں۔"

"آپ کو پھر دیکھ کے بڑی خوشی ہوئی سرجی۔ یہ آپ کا ہی ہوٹل ہے۔ کبھی سکندر صاحب سے ملاقات ہو تو میرا سلام دیجئے۔ بے شک زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن اس دن سکندر صاحب نہ آتے تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ قتل نہ کرتے ہاتھ پاؤں توڑ دیتے تو معذور ہو جاتا میں ساری زندگی کے لیے۔ آج اپنے ہوٹل میں شان سے بیٹھا ہوں..... میرے لیے کوئی خدمت ہو تو فرمائیے۔"

"مسٹر عبدل۔ ہم یہاں کتنی دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"یہی کوئی آدھے گھنٹے سے۔"

"کیا تم ضرورت پڑنے پر کہہ سکتے ہو کہ ہم ایک گھنٹے سے یہاں تھے۔"

اس کا رنگ کچھ بدلا پھر بولا "خیر تو ہے سرجی۔ کیا کوئی قتل وغیرہ کا معاملہ ہے؟"

"نہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہم پوسٹ آفس گئے تھے فون کرنے۔ وہاں کسی نے ایک کار پر بم پھینک دیا۔"

"کس کی کار پر سرجی؟"

"ہمیں کیا معلوم یار۔" محسن بولا "ہم نے وہاں ایک منٹ رکنا مناسب نہیں سمجھا ورنہ گواہی کا چکر ضرور پڑ جاتا۔ یہ تو کل پتا چلے گا کہ یہ کس کی حرکت تھی۔"

"آپ فکر ہی مت کرو سرجی۔ یہاں کی پولیس ایسی نہیں ہے کہ زبردستی بیان لے۔ میں کہہ دوں گا۔"

"پولیس شاید نہ پوچھے مگر طوطی صاحب سے خطرہ ہے۔ اپنے حاجی علم دین..."

"وہ تو میں سمجھ گیا سرجی۔ انہیں کون نہیں جانتا۔ لیکن وہ کیوں پوچھیں گے آپ کے بارے میں۔"

"مسٹر عبدل۔ کیا تم جانتے ہو کہ ہر سال کتنے غیر ملکی جائز طور پر یہاں آتے ہیں اور کتنے حرامی طریقے سے آتے ہیں؟"

عبدل دم بخود رہ گیا "حرامی طریقے سے! آپ کا مطلب ہے پیدا ہوتے ہیں... ناجائز تعلقات کے نتیجے میں۔"

"نہیں یار! میرا مطلب تھا ناجائز طریقے سے برطانیہ آتے ہیں۔"

اس نے سر کھجایا "ہزاروں آتے ہوں گے۔"

"اس سال ان کی تعداد میں دو کا اضافہ ہوا ہے۔ میں اور یہ صوفی صاحب پاسپورٹ ویزا کے بغیر یہاں آگئے تھے۔ طوطی صاحب کے پاس قیام ہے ابھی۔ امید یہ تھی کہ وہ کچھ مدد کریں گے مگر انہوں نے کہا کہ اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔ شاید ہم کو پاکستان جانا پڑے گا۔ انہوں نے سمجھایا تھا کہ کسی قانونی معاملے میں بالکل مت پڑنا۔ گواہی کا معاملہ بھی [illegible] ہے۔ اب ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہاں دھماکا ہونے والا ہے۔"

"تو کیا آپ کا نام لکھا گیا ہے گواہی میں؟"

"نہیں۔ ہم تو بھاگ آئے تھے لیکن کیا پتا کسی نے [illegible] ہوئے دیکھ لیا ہو۔"

عبدل نے کہا "پھر تو آپ فکر ہی مت کرو جی۔ میں [illegible] کہ آپ ایک گھنٹے سے ادھر ہو تو پولیس کی بھی مجال نہیں [illegible] بیان کو چیلنج کرے۔ ادھر پیریڈ جینٹلمین بیان [illegible] کا دستور [illegible] سرجی۔"

محسن نے کہا "اچھا تو پھر ہم چلتے ہیں۔ حاجی صاحب فکر [illegible] گے۔"

عبدل نے کہا "سرجی وہ آگیا حاجی صاحب کا [illegible]"

محسن نے اور میں نے باہر دیکھا تو وہ سیدھا ریسٹورنٹ کی طرف آرہا تھا۔ شہزادہ سلیم اور چیف رپورٹر ہفت روزہ طوطی۔ اس نے اندر آتے ہی کہا "آپ یہاں بیٹھے ہیں جی [illegible] اباجی انتظار کر رہے ہیں آپ کا۔"

"تمہیں کس نے بتایا کہ ہم یہاں ملیں گے۔"

"کسی نے بھی نہیں۔ مجھے تو اباجی نے کہا کہ جاؤ انہیں [illegible] سے بھی تلاش کر کے لاؤ تو میں نے کہا کہ اچھا جاتا ہوں۔ اب [illegible] اباجی کو یہ مت بتانا کہ آپ کو میں نے بھیجا تھا۔"

"اس میں کیا خرابی ہے؟"

"اس میں اچھائی یہ ہے کہ میں آوارہ گردی کا ایک گھنٹا بعد [illegible] سے مل کے۔ واپس جاؤں گا تو کہہ دوں گا کہ سارا لندن چھان مارا [illegible] نہیں ملے۔" اس نے ہمیں آنکھ ماری۔

"ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ تم چاہو تو دو گھنٹے بعد [illegible] اس کے بعد تمہیں بھی ہمارا ایک کام کرنا ہوگا۔ تمہارے لیے [illegible] معمولی کام ہے۔"

"کیا کام ہے؟" اس نے کہا۔

"واپس آؤ گے تو ہم بتائیں گے۔" محسن بولا "جاؤ عیش کرو [illegible] کیونکہ اللہ نے مقدر میں عیش لکھ دیا ہے۔ جوانی بھی اللہ [illegible] ہے تم پر۔ جوان ہوتے پنڈ دادن خان میں تو ہل چلاتے اور [illegible] چراتے۔ تمہاری اور بیل کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہ ہوتا۔"

اس نے کہا "اباجی کی کم بختی ہے اس عمر میں بھی [illegible] پاکستانی بھائی!"

وہ بد معاشی سے ہنسا اور عبدل سے سو پاؤنڈ لے کر چلا گیا۔

ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا عبدل سے حساب [illegible] عبدل کے ہوٹل کا اشتہار اس کی تصویر کے ساتھ "مفت" [illegible] کرتا تھا۔

حاجی علم دین طوطی اپنے کمرے میں اسی طرح [illegible] جیسے طوطا پنجرے میں پھڑکتا ہے۔ "کہاں گم ہو گئے تھے میری مراد۔ میں نے تو ہر طرف خیال کے گھوڑے دوڑائے اور پھر نوردین سے کہا کہ عبدل کے ہوٹل پر دیکھو... وہ ملا تمہیں؟"

محسن نے کہا "نہیں۔ ویسے تو ہم وہیں تھے گھنٹے بھر عبدل سے گپ شپ کر رہے تھے جب ہم لندن میں پڑھتے تھے تب سے عبدل ہوسٹل میں ہوتا تھا۔"

"عبدل کا ہوٹل مرکز اطلاعات ہے۔" حاجی صاحب بولے "جس کو کوئی پیغام دینا یا فون نمبر ہو ان کے پیغامات وہیں موصول ہوتے ہیں۔ کوئی آتے جاتے اسے بتاتا ہے۔ خیر تم فوراً جا کے ملو ریکل سے۔ اس نے سارا بندوبست کر لیا ہے۔ دو بار فون آچکا ہے اس کا میرے پاکستانی بھائی۔"

"کہاں جائیں ہم؟ اس کے گھر یا اسپتال؟"

"اسپتال جاؤ۔ وہ تم کو نرسنگ کوارٹرز کی کینٹین میں ملے گا۔ کینٹین میں نہ ہو تو وہاں ایک ویٹرس ہے سوفی۔ اپنے پیارے پاکستان کی سوہنی نہیں 'کورین' ہے چپٹی ناک اور پیلے رنگ والی۔ فیس بورڈ اور قافت پہنچ جاؤ۔ وہ حرامی نوردین کہاں گیا؟ اگر تمہیں نہیں ملا۔"

میں نے کہا "کیا پتا وہ بعد میں پہنچا ہو۔ بے چارہ ہمیں تلاش کرتا پھر رہا ہوگا۔ بڑا نیک اور سعادت مند بچہ ہے۔ آپ کے حکم کی تعمیل۔"

حاجی صاحب نے سر ہلایا "چھوڑو یہ بات میرے پاکستانی بھائی۔ میں جانتا ہوں وہ کتنا نیک اور کتنا سعادت مند ہے۔ آخر باپ ہوں اس کا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس بہانے وہ دل کے [illegible] ہے۔ آپ کو تو ابھی دو منٹ میں [illegible] پیچھے والے مکان سے؟"

میں نے کہا "اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہم جاتے ہیں۔"

"جاتے ہوئے دو سو پاؤنڈ ضرور لے جانا۔ بقایا ادا کرو گے تو وہ پھوڑی پائی کام کرے گا۔"

ہم ساڑھے نو بجے اسپتال کے دروازے پر اترے تو ایک چوکیدار ٹائپ شخص نے ہمیں روک لیا "اسپتال آنے جانے والوں کے لیے یہ راستہ نو بجے تک کھلا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "نو بجے کے بعد کوئی بیمار نہیں ہو سکتا۔ کسی کو حادثہ پیش آجائے پھر؟"

"پھر وہ میری طرف سے جائے جہنم میں۔ تم کو اندر جانا ہے تو پیچھے والا گیٹ ہے اسٹاف کے لیے۔"

وکیل ہمیں کینٹین کے اندر بڑی افسوس ناک حالت میں ملا۔ وہاں بیٹھے رہنے کے لیے اور اپنی کورین سوہنی کے دست نازک سے پینے کے لیے وہ چائے کی سات پیالیاں حلق سے اتار چکا تھا اور آٹھویں اپنے لیے بیٹھا تھا جیسے اس پر نیاز دے رہا ہو۔ اس کے بیان کے مطابق چھ پیالیاں اس کی تواضع میں شامل ہو کے خارج [illegible] آٹھویں پیالی محسن نے اور نویں میں نے نوش فرمائی اور کورین سوہنی کے دیدار سے بھی فیضیاب ہوئے۔ طوطی صاحب نے اس کے بیان حسن میں خاصی کنجوسی برتی تھی۔ وہ واقعی اتنی حسین اور دلکش جسم کی مالک تھی کہ کوئی بھی اس کی خاطر زہر پیالی چائے کیا، جوشاندے کی بھی پی سکتا تھا۔

"میں گیا تھا حبشی کے گورے وکیل کے پاس۔ الفریڈ نام ہے اس کا۔ اتفاق سے وہ مل گیا اور اتفاق سے شریف آدمی بھی ثابت ہوا۔ اتفاق سے وہ فارغ تھا۔ اتفاق سے اس کو جارج یاد تھا۔"

میں نے کہا "چنانچہ اس نے تمہارے موقف سے اتفاق کیا۔"

"ہاں۔ اس نے فوراً ٹیلی فون اٹھا کے جیل کے کسی افسر کا فون نمبر ملایا اور اسے بہت سخت سست کہا اور بڑی دھمکیاں دیں کہ ایک قیدی کو قتل کرنے کی کوشش کا خمیازہ انہیں بھگتنا پڑے گا۔ اس نے کہا کہ میں ابھی سیاہ فام قیدیوں کے حقوق کی انجمن اور ہیومن رائٹس والوں سے اور اخبار والوں سے رابطہ کرتا ہوں۔ جیل والے بضد تھے کہ ایسی کسی واردات میں ان کے عملے کا کوئی فرد ملوث نہیں۔ یہ سیکیورٹی والوں کی کوتاہی تھی کہ دلاور نام کا کوئی شخص جارج سے ملنے پہنچ گیا اور اس نے جارج کو ایک سگریٹ کا پیکٹ دیا۔"

"جارج نے بتایا ہے کہ ملاقاتی کا نام دلاور تھا؟"

"ہاں۔ اور کون بتا سکتا ہے؟"

میں نے کہا "یہ نام وزیٹرز بک میں بھی تو ہوگا۔ جو لوگ کسی قیدی سے ملاقات کرنے جاتے ہیں ان کا نام پتا اور قیدی سے رشتہ وغیرہ کسی رجسٹر میں لکھا جاتا ہوگا؟"

محسن بولا "کیا یہاں ملاقات کا شیڈول نہیں ہوتا۔ کوئی کسی بھی وقت جیل جا کے قیدی سے مل سکتا ہے۔"

"آف کورس ایسا نہیں ہے" وکیل نے کہا "خصوصی ملاقات ہو تو اس کی وجہ کا بھی اندراج ہوتا ہے۔ خصوصی اجازت یا تو عدالت دیتی ہے یا پھر جیلر دے سکتا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ رجسٹر میں دلاور کا نام ہی نہیں ہے۔"

"پھر کس کا نام ہے؟"

"جارج کے ملاقاتی کا نام سکندر بخت درج ہے۔"

میں اور محسن اس انکشاف پر نہ اچھلتے تو کیا کرتے۔ میں نے سخت احتجاج کرتے ہوئے کہا "یہ کیا بات ہوئی؟"

محسن نے کہا "جس کا دل چاہے..... وہ کچھ بھی نام لکھوا دے۔ تمہارا نام لکھوا دے کسی ثبوت کے بغیر؟"

وکیل نے کہا "تم جذباتی ہو رہے ہو۔ اگر تم کسی کو اپنا نام بتاتے ہو تو کیا وہ پوچھتا ہے کہ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس۔ ایسے تو بڑا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے کہ دو اجنبی ہاتھ ملا کے ایک دوسرے سے اپنا تعارف کرائیں تو یہ نہ کہیں کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی' یہ کہیں کہ تصدیق کے کاغذات ملاحظہ فرمایئے۔"

میں نے کہا "اس کو اجازت کس نے دی تھی آخر؟"

www.paksociety.com

"جیلر نے یہ بات وہ تسلیم کرتا ہے۔ اسے سر جیرڈ گورڈن نے فون پر کہا تھا کہ جارج سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔ میری واقف کا پرانا کلاس میٹ ہے وہ اور اس کا نام ہے سکندر بخت۔ یہی وجہ ہے کہ جیل کے آفس میں پہنچ کے جب کسی نے کہا کہ میں سکندر بخت ہوں اور مجھے جارج سے ملنا ہے۔ جیل میں ہوں گے درجنوں جارج۔ اس نے پورا نام اور حوالہ نمبر بھی بتایا ہوگا۔ پھر کون شک کر سکتا تھا۔ اسے اندر بھیج دیا گیا تھا۔ یہ تو بعد میں جارج نے شور کیا کہ چوہدری دلاور کو میرے پاس کس نے بھیجا تھا اور کیوں؟ اس نے شریفانہ زبان میں یہ سوال نہیں کیا تھا۔ کیا تم اس کے اصل الفاظ سنو گے؟"

"نہیں۔ کیا رجسٹر میں اندراج خود دلاور نے کیا تھا؟"

"اندراج تو آفس کے کسی کلرک نے کیا ہوگا مگر ملاقاتی کو اپنے دستخط کرنے پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے دلاور نے غلط دستخط کیے ہوں گے۔ نام ایسے لکھ دیا ہوگا کہ سکندر بخت پڑھا جائے۔"

دلاور کا سازشی ذہن لندن پہنچتے ہی مصروف کار ہو گیا تھا۔ اس نے سکندر بخت کے نام کو گمنامی میں نہیں رہنے دیا تھا۔ الزبتھ اور اس کے حاسد و کم ظرف شوہر کو پہلے سے معلوم ہو گیا تھا کہ سکندر بخت لندن میں وارد ہو چکا ہے۔ میرے استقبال کی تیاریاں مکمل تھیں اور الزبتھ کسی آتش فشاں کی طرح نفرت کا سارا لاوا مجھ پر اور رابعہ پر اگلنے کی دلی خواہش مند تھی۔ اس کے کاکروچ شوہر کا انتقامی جذبہ زیادہ شدید اور خطرناک انداز میں سامنے آ چکا تھا لیکن چوہدری دلاور ان سب پر بازی لے گیا۔ اس نے میرے نام کو وہ پبلسٹی دے دی جس سے میں گریزاں تھا۔ میرا نام اب جیل کے رجسٹر میں لکھا ہوا تھا۔ جارج جتنا چاہے چیختے چلائے۔ اس کی [illegible] کس نے سنی تھی کہ اصل قاتل چوہدری دلاور ہے۔ حالات کی گواہی پھر اس کے خلاف جائے گی۔ یہ ثابت ہو جائے گا کہ سکندر بخت چوری چھپے لندن جا کے جارج سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے وقار یوسف کے نام سے جعلی پاسپورٹ بنوا کے قونصلیٹ سے ویزا حاصل کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی اور پھر کسی نہ کسی طرح لندن پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ہزاروں لوگ ہر سال پولیس اور کسٹم حکام کو جل دے کر اور بقول محسن کے حرامی طریقے سے لندن پہنچ بھی جاتے ہیں۔ چوہدری دلاور نے سر جیرڈ گورڈن کو بچاتے ہوئے اس کی کار میں بم کا دھماکا بھی کرا دیا تھا اور اب یہ لازمی بات تھی کہ مرحوم ہونے کے بعد کاکروچ کی زبان پر میرے سوا کسی کا نام نہیں آئے گا۔ وہ صاف کہے گا کہ یہ کارستانی سکندر بخت کی تھی۔ اس نے میری بیوی کو فون کر کے دھمکی بھی دی تھی۔ میرا فون آنسرنگ مشین پر تھا۔ ٹیپ میں اس کی آواز موجود ہے۔

غصے سے میرا خون کھول رہا تھا مگر میں بے بس تھا۔ چوہدری دلاور مجھ سے بہت آگے جا رہا تھا اور میں اس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنسا چلا جا رہا تھا۔ ان حالات میں میرا بہت زیادہ عرصہ لندن میں روپوش رہنا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ جب اخبارات کی سرخیاں دھماکے اور سر جیرڈ گورڈن کے بیانات سے بھری ہوئی ہوں گی، لندن کی پولیس سکندر بخت کو پکڑنے کے لیے لندن کو چھان مارے گی۔ وہ خاک بھی چھانتے ہیں تو ذرا ذرا سونگھ کر لیتے ہیں۔ عام حالات میں کوئی پاکستانی یا غیر ملکی اپنے ہم وطنوں کی مدد سے روپوش رہنا چاہے تو پولیس بھی زیادہ تردد نہیں کرتی مگر معاملہ ہو قتل کا تو پھر سراغ رسانی کے ماہرین اور اسکاٹ لینڈ یارڈ والے سرگرم ہو جاتے ہیں اور کوئی آنجہانی ہو جائے تو اس کے جسم کو قبر سے اور روح کو عالم بالا سے عدالت میں حاضر کر دیتے ہیں۔

میرے لیے حالات بڑی تیزی سے پُرتشویش اور پیچیدہ ہو رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ ابھی صرف ایک دن گزرا تھا اور ہم جارج سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ چوہدری دلاور نے جہاں ہمارے لیے مشکلات پیدا کی تھیں، اس کی ایک معمولی سی ناکامی نے ہماری کامیابی کی منزل کو آسان کر دیا تھا۔ جیل کے اندر شاید جارج سے ملنا دشوار ہوتا مگر اسپتال میں یہ کام بہتر طور پر بہت کم وقت میں ہو گیا تھا۔

وکیل کی کارگزاری یقیناً قابل داد تھی۔ چار سو پاؤنڈ اس کے لیے ایک خطیر رقم تھی مگر ہمارے لیے یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اس کے لیے ہم ہر قیمت ادا کر سکتے تھے۔ سارا کمال وکیل کے ذہن کا تھا جس نے حصول مقصد کی خاطر دھن، دھونس اور دھاندلی کے سب حربے آزمائے اور اچھی منصوبہ بندی کی۔ اس نے نئے راستے تلاش کیے۔ وقت سے فائدہ اٹھایا، کسی کو قائل کیا اور کسی کو بلیک میل کیا۔ جھوٹ سے اور چالاکی سے کام لیا جس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ یہ شرافت اور قاعدے قانون کے مطابق ہونے والا کام نہیں تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ چار سو پاؤنڈ سارے اسی کی جیب میں گئے ہوں گے۔ اس نے رشوت کسی کو بھی نہیں دی ہوگی لیکن مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ چار سو پاؤنڈ کہاں اور کیسے خرچ ہوتے ہیں۔

وکیل نے گھڑی دیکھ کے کہا "دس تو بج گئے۔"

محسن نے پوچھا "ملاقات کے لیے کیا وقت طے ہوا ہے؟"

"بارہ بجے شفٹ بدلے گی۔ اسپتال کا اسٹاف اور دروازے کے باہر پولیس والے بھی تبدیل ہوں گے۔ یہ لوگ صبح آٹھ بجے سے ڈیوٹی دیں گے۔ انہی سے بات ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "یعنی ابھی دو گھنٹے اور گزارنے ہیں۔ ہم یہاں آنے میں بڑی جلدی کی تھی۔ طوطی صاحب سخت پریشان تھے۔ تمہارا فون پر فون آ رہا تھا تو ہمارا کچھ پتا نہیں تھا۔"

"میں نے صرف ایک بار فون کر کے کہا تھا کہ انہیں میرے پاس بھیج دیں۔ مجھے تم سے بات تو کرنی تھی۔ تم وکیل ہو نا۔"

"ہاں۔ پاسپورٹ میں میرا نام وقار یوسف ایڈووکیٹ ہے۔"

"اور تم۔۔؟" وہ محسن سے مخاطب ہوا۔

"میں جرنلسٹ ہوں۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "پھر تم جارج سے نہیں مل سکو گے مسٹر۔"

محسن نے کہا "کوئی بات نہیں۔ کیا صرف وکیل کو ملاقات کی اجازت دی گئی ہے؟"

"اجازت کیا۔ سودا ہوا ہے۔" وکیل نے کہا "الفریڈ نے جیل کے بعد پولیس کمشنر سے بات کرنی چاہی مگر وہ ملا نہیں۔ شام کو بھی شاید بات نہ بنتی۔ وہ بڑا خود دماغ ہے۔ اخبار والوں سے بھی لڑ پڑتا ہے۔ بیشتر جرنلسٹ اس سے سخت خفا ہیں اور اس کا امیج خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ الفریڈ کہتا ہے کہ میرے بارے میں جو بکواس کرنا ہے کرے، میرا کچھ نہیں بگڑتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ اخبار والے جس کے پیچھے پڑ جائیں اس کا ستیاناس کر کے چھوڑتے ہیں۔ خیر اس کے ڈپٹی نے الفریڈ کو یقین دلایا کہ وہ ہر طرح سے تعاون کرنے کو تیار ہے۔ اگر غلطی پولیس کی ہوگی تو اسے چھپایا نہیں جائے گا۔ وکیل خود جائے گا مگر اس نے الفریڈ کو اجازت دے دی ہے کہ جارج سے ملاقات کر لے۔"

"کیا وہ اجازت دے سکتا ہے؟"

"قانونی طور پر تو نہیں۔ اور یہی ہمارے حق میں اچھا ہوا۔ ہم کورٹ سے اجازت لیتے یا جیلر سے تو آسان نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ اجازت ریکارڈ پر آ جاتی۔ اب پولیس چیف کی طرف سے اگر اس کا ڈپٹی کسی سے کوئی درخواست کرے تو وہ مان ہی جاتا ہے۔ خصوصاً ان حالات میں کہ معاملہ نازک ہو اور افسران و تنظیم سے کوتاہی ثابت ہو جانے کا امکان نظر آئے۔ پولیس کمشنر کے ڈپٹی نے جیلر سے پوچھا کہ اس کم بخت کو زہر دینے کا جو واقعہ پیش آیا تھا ابھی تک اس کی خبر باہر تو نہیں پہنچی؟ جیلر نے کہا کہ ہم خود کیوں بتائیں گے لیکن جارج کا وکیل اس سے ملے گا تو خاموش نہیں بیٹھے گا۔ ہنگامہ کرنا اس کا حق ہے اور اس کے مفاد میں ہے۔ ڈپٹی چیف نے کہا کہ جارج کے وکیل نے مجھ سے بات کی تھی۔ اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا کہ غلطی اور کوتاہی جیل کے عملے کی تھی یا حفاظتی عملے کی لیکن اس کیس میں ایک اور بھی پیچیدگی ہے۔ ملاقاتی کا نام جیل کے ریکارڈ پر کچھ اور ہے، جارج اس کا نام کچھ اور بتاتا ہے۔ جیلر نے کہا کہ وہ تو حرامی ہے، فائدہ اٹھانا چاہتا ہے صورت حال سے۔ کہہ رہا تھا کہ اس کا ملاقاتی وہی تھا جو اصل قاتل تھا جس نے دہرے قتل کی واردات کی تھی مگر پکڑا میں گیا تھا۔ اسے نام بھی یاد تھا۔ وہ اس بنیاد پر ہمارے لیے مصیبت پیدا کر سکتا ہے کہ ایک تو اس کو ناکردہ گناہ پر جیل کاٹنی پڑی، ہم نے اصل قاتل کو بچایا اور اب ہم چاہتے ہیں کہ جارج کو جیل میں ہی ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اس کا قاتل آخر اس سے ملنے کیسے پہنچا اور جیل حکام نے اسے کیسے اندر جانے دیا کہ وہ جارج کو بھی مار دے۔ تب پولیس کے ڈپٹی چیف نے کہا کہ جارج کا وکیل اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ یہ جارج کا ذرا سا بھی ثابت ہوا تو وہ قانون کی مدد کرے گا اور جارج کو بھی سمجھائے گا کہ جیل میں اپنے لیے مسائل پیدا نہ کرے۔ اچھے رویے کے باعث اسے جو رعایت مل سکتی ہے وہ ضائع ہو جائے گی اور اس کی جلدی پر رہائی کے امکانات بالکل معدوم ہو جائیں گے۔ جیلر نے کہا کہ یہ ملاقات میں تمہاری ضمانت اور یقین دہانی پر کرا سکتا ہوں۔ ذمے دار ہوگا تمہارا حفاظتی عملہ۔ اگر اس غیر سرکاری ملاقات کی خبر باہر پہنچی۔ پولیس کے ڈپٹی چیف نے یہ ذمے داری قبول کی اور کہا کہ جارج کو اپنے وکیل سے ملنے دو۔ اس ملاقات کے نتیجے میں کوئی اچھی بات معلوم ہوتی ہے جس سے پولیس اور جیل حکام دونوں کی پوزیشن خراب ہونے سے بچ جائے تو یہ چانس لیا جا سکتا ہے۔ بس وکیل کی اچھی طرح تلاشی لی جائے۔ وہ اپنے ساتھ کوئی غلط چیز نہ لے جائے مثلاً ٹیپ ریکارڈر وغیرہ۔ جیلر مان گیا اور یوں ایک خفیہ اور غیر سرکاری ملاقات کا بندوبست ممکن ہوا۔"

"کیا جیلر نے جارج کے وکیل کا نام نہیں پوچھا تھا؟"

"پوچھا تھا۔ جب بعد میں میری الفریڈ سے دوبارہ بات ہوئی تو اس نے کہا کہ فکر مت کرو۔ میں صبح جارج سے ملوں گا۔ میں نے کہا کہ سر! آپ کیوں اپنی پوزیشن خراب کرتے ہیں۔ آپ اتنے مشہور وکیل ہیں۔ کسی نے آپ کو وہاں دیکھ لیا تو خواہ مخواہ بات پھیلے گی اور آپ کی بدنامی ہوگی۔ میں مل لیتا ہوں اس سے اور جارج سے دوستانہ طریقے پر بات کر کے دیکھتا ہوں۔ میں اس کا ہم وطن تو نہیں مگر کالا ضرور ہوں۔ شاید وہ مجھ پر اعتماد کرے اور سچ بتا دے۔ الفریڈ نے کہا کہ کوئی حرج نہیں تمہارے ملنے میں بھی۔ مجھے بتانا کہ جارج کیا کہتا ہے۔ اس کے بعد میں صبح جارج سے ملوں گا۔ میں نے کہا کہ پھر آپ پولیس کے چیف کو بتا دیں کہ ایک NATIVE وکیل اگر جارج سے ملنا چاہے تو اسے نہ روکا جائے۔"

میں نے کہا "تم بہت چالاک ہو۔"

"میرا پیشہ ہی تو اس چیز کا ہے کیونکہ واسطہ بھی شریف لوگوں سے نہیں پڑتا" وہ بولا "پولیس کے ڈپٹی چیف نے وعدہ کیا کہ وہ رات کی گارڈ ڈیوٹی والوں کو سمجھا دے گا کہ یہ آپس کے اعتماد کا معاملہ ہے۔ اس کی پوزیشن خراب نہیں ہونی چاہیے۔ اخبار والوں کو ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے۔ ہم معاملے کو سلجھانے کے لیے یہ قدم اٹھا رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ معاملہ اور الجھ جائے۔ اور الفریڈ نے کہا کہ فکر مت کرو۔ ایسا ہی ہوگا جیسا تم چاہتے ہو۔ دراصل خود الفریڈ بھی پریشانی سے اور مفت کی مقدمے بازی سے بچنا چاہتا ہے۔ جارج خاموش رہے تو وہ بھی اپنا کام کرتا رہے گا ورنہ اسے جارج کی طرف سے قانون کے مطابق کارروائی کرنی پڑے گی اور جارج کوئی اس کا باپ یا بھائی نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے وقت ضائع کرے تو اسے اپنی اخلاقی ذمے داری سمجھے۔"

"اگر جارج کی جگہ سفید چمڑی والا ہوتا پھر؟"

"پھر کچھ نہیں۔ قانونی پوزیشن تو بدل نہیں سکتی۔ الفریڈ کے جذبات اور نسلی تعصب کے معاملے میں اس کے نظریات کچھ بھی ہوں، ایک وکیل کی حیثیت سے موکل کی ہر ممکن قانونی مدد اس کا فرض ہے۔ کیا حرج ہے اگر ہم کھانا کھا لیں؟"

سوال اس نے سوالی میں کیا تھا چنانچہ کچھ دیر تو ... اور

www.paksociety.com

محسن ایسے ہی بیٹھے رہے۔ پھر میں نے کہا "کھانا؟۔۔۔ رافعی! خوب یاد دلایا۔"

محسن نے کہا "تم نے رس اور ہم نے غین غین کب جانے خواہ مخواہ پی۔ سوئی کی وجہ سے۔"

وہ بولا "آف کورس سوئی کی وجہ سے۔ کھانا بھی آ ہی وہی کھلائے گی۔"

"بڑے پیارے پیارے نازک ہاتھوں سے" محسن بولا۔

میں نے کہا "سوال یہ ہے کہ کیا کھلائے گی؟"

وکیل نے کہا "جو اسے پسند ہوگا۔"

میں نے کہا "کوریا کے لوگ کتے بہت شوق سے کھاتے ہیں۔"

اس نے رکھ بڑا ما "مگر وہ لندن میں ہے۔"

"لندن میں تم خنزیر بھی تو ملتا ہے۔۔۔ اور یہ کافر بہت سے کھانوں میں وہ بھی ڈالتے ہیں ذائقے کے لیے۔۔۔ ام الخبائث۔"

رکیل نے سوچ کے کہا "یہ کیا چیز ہے؟ کوئی ساس یا چٹنی؟ مسالے میں شامل۔"

میں نے کہا "منے ناپ۔۔۔ یاد نگر بگ۔"

"اردو میں بتا بھائی!" وہ چکرا گیا۔

محسن نے کہا "مونس سیال۔۔۔ انگور کی بیٹی۔"

وہ مسکرانے لگا "نہیں۔ سوئی جانتی ہے کہ میں مسلمان ہوں اور یہاں کوئی لمبا چوڑا مشکل مینو بھی نہیں ہوتا۔"

سوئی نے مجھے اور محسن کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ آس پاس جتنے لوگ اسٹیک برگر اور ہاٹ ڈاگ اتنے ذوق و شوق سے کھا رہے ہیں اس میں بکرے کا خالص گوشت ہے اور اس میں سفید یا لال شراب کا ذکا بھی نہیں لگایا گیا۔ مگر اگلا مرحلہ زیادہ نازک تھا جو سوئی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بکرا کیسے کاٹا گیا تھا؟ اس کو قتل کیا گیا تھا یا ذبح؟ وہ خاصی حیران ہوئی کیونکہ اس کے خیال میں مرغی ہو بکرا یا بیل، اسے انسانی خوراک میں شامل ہونے سے پہلے مرنا تو پڑتا ہی ہے۔ آج تک فوت کیے جانے والے جانوروں کے بارے میں کوئی تحفظ اعتراض موصول نہیں ہوا کہ ان کی موت کیسے واقع ہوئی؟ انسانوں کو پہلے سولی پر لٹکایا جاتا تھا پھر پھانسی دینے لگے۔ اس کے بعد الیکٹرک چیئر پھر گیس چیمبر استعمال ہونے اور آج کل تو ایک انجکشن لگا کے سزائے موت دی جاتی ہے مگر۔۔۔!

میں نے اس کی تقریر دل پذیر میں مداخلت کی "مس سوئی! ہم کو شربت کھا سکتے ہیں۔ کوئی بات سمجھ میں؟"

وہ فوراً سمجھ گئی "اوہ۔۔۔ تم ہوری ہو۔ تمہارا دوست مسلمان ہے، تمہیں تو دشمن ہونا چاہیے۔ خیر ہم کو شربت استعمال نہیں کرتے۔ تم اور کچھ کھاؤ۔۔۔ مثلاً۔۔۔" اس نے کہا اور پھر سوچ میں پڑ گئی کہ اب کیا متبادل خوراک کیا تجویز کرے۔

میں نے کہا "ہم مچھلی کھا سکتے ہیں ورنہ دال سبزی۔۔۔ یہ بھی نہیں تو مس سوئی! ہم فرض کر سکتے ہیں کہ کھانا کھا لیا۔"

اس کے جانے والے رکیل نے کہا "تم میرے لیے اسنیکس لاؤ۔ ان کو آملیٹ لا دو۔ فرض کر لو کہ یہ ناشتا کریں گے اور میں کھاؤں گا۔"

رات کے پونے بارہ بجے ہم نے اختلاط کا قائل ایدا اور اس کو ایک بار نظر آ رہی جو ہمارے خیال میں بہت معقول تھی کہ وہ نے باہر آ کے ہمیں اس کجوسی کے مظاہرے پر شرمندہ کرنے کی کوشش کی "وہ کیا مجھے کی پانچ پاؤنڈ تو رہنے۔"

"اگر ہمیں اس سے اتنی ہی اچھا نہ محبت ہوئی جتنی تم کو ہے تو ہم اسے پانچ پاؤنڈ دے کے ذلیل نہ کرتے۔ وہ تو ایسی چیز ہے کہ اس پر نقد جاں نثار کرنا بھی کم ہے۔ متاع حیات لٹا دینا بھی جائز ہے۔ سرمایہ ہوش و خرد نذر کرنا بھی روا ہے۔ دولت دل کا ہے۔"

رکیل نے اپنا سر پکڑ لیا "یار یہ گھر کے ذکور ... کیا کرے گی؟ پانچ پاؤنڈ تو نکالے نہیں ... بات کرتے ہو۔ لو یہ رکھ لو" اس نے اپنا کالا کوٹ اتار کے دیا۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ تمہارا یہ تحفہ خلوص ہے۔"

"میں واپس پر تم سے لے لوں گا" اس نے خفگی سے کہا۔

میں نے کہا "تمہاری یہ پتلون۔۔۔"

"پتلون کیا قمیص بھی اتار دوں؟ خود سوئی میں بنیان اور انڈر ویئر پہنے کھڑا کانپتا رہوں۔ لاؤ اپنا کوٹ مجھے دو۔"

میں نے اپنا کوٹ اسے دے دیا۔ "اس کی جیب میں سے کچھ مت نکالنا۔ میں بھی کسی جیب میں ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔"

"بہت لمبی بات مت کرنا۔ میں اور محسن وہیں جا کے بیٹھیں۔ ہاں وہ دو سو پاؤنڈ تو نکالو!"

محسن نے کہا "وہ میں دیتا ہوں۔ چلو وقت گزاری کے لیے کبھی سوئی پر ذرو ہے ڈالتا ہوں، برا مت ماننا۔"

"تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔"

"کیوں۔ وہ تمہاری بیوی تو نہیں ہے۔" محسن بولا۔

"تم میری بیوی پر ڈورے ڈالو تو مجھے خوشی ہوتی۔ ابھی تک کسی نے ہمت نہیں کی۔ کیا پتا تم اسے ورغلانے میں کامیاب ہو جاؤ اور میری گلو خلاصی ہو جائے" رکیل نے کہا اور وہ مجھے ایک کاریڈور تک پہنچا کے رخصت ہو گئے۔

کاریڈور میں سناٹا تھا اور رات ہو چکی تھی۔ بیشتر لائٹس آف کر دی گئی تھیں۔ صرف ضروری لائٹس جل رہی تھیں۔ مجھے صرف ایک بند دروازے کے باہر وردی والا پولیس مین استادہ نظر آتا تھا۔ میں پچھلی طرف کے اس راستے سے گیا تھا جو اسٹاف کے لیے وقف تھا مگر چلتے سے ہی میں وکیل نظر آتا تھا۔ ایک نرس نے مجھے ٹوکا "تم یہاں کیا کر رہے ہو اس وقت؟"

میں نے کہا "سچ بتاؤں، ایک حسین نرس کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"

اس نے متانت سے کہا "بہتر ہے چلے جاؤ۔"

میں نے کہا "تم نے ہی مجھے روکا ورنہ میں تو چلا جاتا ... آگیں۔"

"رک جاؤ ورنہ میں سیکیورٹی اسٹاف کو بلا لوں گی۔"

میں نے کہا "بے بی۔ میں پولیس کمشنر اور جیلر کی اجازت سے ملاقات کے لیے۔ تم سے ملاقات قسمت کا حسین تحفہ تھا جانتی ہو اتفاق ہے۔"

"کون جارج؟۔۔۔ وہ قیدی۔۔۔؟" اس کا لہجہ بھی بدل گیا اور وہ مسکرانے پر بھی مجبور ہو گئی۔ خوشامد اور تعریف کا اسلحہ طریقے سے استعمال کیا جائے تو کسی یونیورس کو بھی تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ کم سے کم کوشش ضرور کی جا سکتی ہے کیونکہ نتیجہ بہر صورت ایک رہتا ہے، یعنی ناکامی۔

میں نے کہا "ہاں وہ بد قسمت قانون کا قیدی ہے اور میں۔۔۔"

"تم بھی قیدی ہو!" وہ ہنس پڑی۔

"ہاں۔ ابھی ابھی قیدی بنا ہوں کسی کے حسن و جمال سے" میں نے کہا "اب اجازت ملے تو آگے جاؤں؟"

"اجازت ہے مسٹر آوی۔" وہ بولی اور ہنستی ہوئی آگے چلی گئی۔ اگر وہ اصرار کرتی کہ پولیس یا جیل حکام کا اجازت نامہ کہاں ہے تو کیا دکھاتا۔ میں نے اسے کیا دکھانا تھا۔ بچت ہوئی اور میں اس کے اعتبار کو چیلنج کرتا۔ وہ سیکیورٹی اسٹاف کو بلاتی۔ وہ پولیس سے تصدیق کرتے اور مجھے کاغذات پیش کرنے پڑتے۔ رقار یوسف کی جارج سے ملاقات کے گواہ پیدا ہو جاتے۔

دور سے دیکھنے والے پولیس مین نے فرض کیا کہ اسٹاف نے مجھے شناخت کر لیا ہے۔ ان کا واسطہ پولیس سے بھی رہتا تھا اور وکیلوں سے بھی۔ یہ سب کچھ لینگل کیس را روز تھا۔

میں نے پولیس مین سے ہاتھ ملایا۔ "مجھے امید ہے کہ تم کو میرے بارے میں بتا دیا گیا ہوگا۔"

اس نے سر ہلایا "تم اندر جا سکتے ہو۔ تمہارے پاس کوئی خطرناک چیز ہے تو مجھے دے دو۔"

میں نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے "تم اپنا اطمینان کر لو۔ میں شب دیگ مند و قہوہ تک بھی نہیں لے جا رہا ہوں۔"

"اتنا زور کے۔ مجھے اعتبار ہے۔"

"ایک بات تم بھی بتا دو۔ مگر۔۔۔ کوئی بگ تو نہیں کیا گیا ہے؟"

اس نے ہاتھ ہلائے اور شانے ہلا کے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ جارج سے کوئی ملنے آ رہا ہے۔"

میں نے مسکرا کے کہا "اس سے ملنے کے لیے کوئی آیا بھی نہیں" اور اندر داخل ہو گیا۔

مجھے سفید بستر پر ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام نظر آیا جو آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا اور صورت سے ہی بیمار لگتا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور داڑھی کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس نے سر کے بال خود ہی صاف کرا دیے تھے۔ سیاہی عمر کی غربت نے اس کی صورت پر تلخی حالات کی تحریر کو اتنا عیاں کر دیا تھا کہ چہرے کی شکنوں میں کوئی بھی اس کی زندگی کی کہانی پڑھ سکتا تھا۔

میں نے کھنکھار کے گلا صاف کیا اور کہا "ہیلو جارج!"

اس نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور نا آشنائی کے احساس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا "کون ہو تم!" اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"ڈرو نہیں۔ میں تمہارا دوست ہوں جارج!" میں نے نرمی سے کہا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔ جھوٹ بولتے ہو تم۔ دنیا میں جارج کا دوست کوئی نہیں رہا" اس نے نفرت اور بے زاری سے کہا "جاؤ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

میں کرسی پر بیٹھ گیا "میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر میں کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے میرے حال پر رہنے دو۔" جارج نے کہا۔

میں نے کہا "جارج میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ اس کرنے ہو تم بھی۔ ایسی ہی باتیں وہ بھی کرتا رہا تھا۔"

"تم ولارڈ کی بات کر رہے ہو نا؟"

وہ چونکا "میرا شک ٹھیک تھا۔ تم جانتے ہو اسے کیونکہ تم بھی اس کے آدمی ہو۔ تم بھی مجھے مارنا چاہتے ہو۔۔۔" وہ گھبرا کے چلانے لگا۔

"ٹیک اٹ ایزی جارج۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں ولارڈ کا ساتھی نہیں، اس کا دشمن ہوں" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "ہاتھ مت لگاؤ مجھے۔ تم مجھے زہر میں ڈوبی ہوئی سوئی چبھو جاؤ گے، خنجر گھونپ دو گے۔"

میں نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا "پلیز جارج۔ سب کو ایک جیسا مت سمجھو۔ میں جانتا ہوں تمہارے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ تم اس جرم کی سزا کاٹ رہے ہو جس کے تم عینی شاہد تھے۔ جرم کرنے والا چوہدری ولارڈ تھا۔ تم صرف دیکھ رہے تھے مگر وہ بھاگ گیا تھا اور تم پکڑے گئے تھے۔۔۔ یہی بات ہے نا؟"

وہ تھوڑا سا پُرسکون ہوا "مگر یہ ماننا کون ہے۔"

میں نے کہا "میں مانتا ہوں۔ اور بہت سے لوگ ہیں ایسے۔"

"کہاں ہیں وہ لوگ؟" اس نے برہمی سے کہا "اس وقت کہاں تھے وہ جب جارج پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ اسے قاتل قرار دیا گیا تھا۔ جارج نے ساری زندگی میں ایک چوزے کی جان بھی اپنے ہاتھوں سے نہیں لی تھی۔ وہ شریف نہیں تھا مگر بزدل تھا لیکن اس کی کسی نے ایک نہیں سنی تھی۔ آج تم اچانک آ کے مجھے بتاتے ہو کہ تم کو اعتبار ہے اور تم جانتے ہو کہ میں سچ بول رہا تھا۔"

میں نے اسے بولنے دیا۔ "تقدیر کے بہت سے فیصلے انسان کی سمجھ میں نہیں آتے۔"

"ہاں۔ ایسے فیصلے صرف غریب آدمی کی تقدیر میں کیوں لکھے جاتے ہیں۔ سب اپنے اپنے اسوسائٹی اور اس ملک کا قانون۔ سب مل کے غریب کے خلاف ایک ہو جاتیں، ظلم کرنے کے لیے۔ اس کو مجرم قرار دینے کے لیے۔ اس سے سب رکھ چھین لینے کے

www.paksociety.com

لیے۔ تو اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس کی مصلحت کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ وہ ظالم کی رسی دراز کرتا ہے" وہ تلخی سے ہنسا "اتنی دراز کرتا ہے کہ وہ رسی ہر غریب کے گلے کا پھندا بن جاتی ہے۔ کیا وہ غریب کا خدا نہیں ہے؟ یہ دنیا تو امیروں کی ہے۔ یہاں انہی کا نظام اور حکم چلتا ہے۔ قانون بھی ان کا ہے اور عدالت بھی ان کی ہے۔ لیکن خدا کی......"

سارجنٹ نے دروازے کے اندر جھانک کے کہا "یو بلڈی مین۔ اپنے حلق کے لاؤڈ اسپیکر کا والیوم کم کرو۔"

جارج خاموش ہو گیا۔ اس کی صورت پر بے بسی اور مظلومیت کا تاثر گہرا ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے کہا "دیکھو جارج۔ انتہائے مایوسی میں آدمی کا ذہن بھٹک جاتا ہے اور وہ کفر بکنے لگتا ہے۔ تمہاری طرح خدا کی رحمت پر سے اس کا یقین اٹھ جاتا ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور مجھے بڑی مشکل سے پولیس نے صرف ایک گھنٹے کی مہلت دی ہے۔"

وہ چھت کو گھورنے لگا "دلاور کو بھی پولیس نے بھیجا تھا۔"

"فار گاڈ سیک۔ جو ہوا اسے تھوڑی دیر کے لیے بھول جاؤ۔ ہر شخص دلاور نہیں ہو سکتا۔ میری طرف دیکھو کیا میں صورت سے تم کو ایسا لگتا ہوں؟"

"کیا صورت سے میں قاتل لگتا ہوں؟"

"ہاں۔ تم صورت سے مظلوم لگتے ہو۔ ظالم نہیں" میں نے کہا "تمہارے پاس میں بہت دور سے آیا ہوں۔ میں دلاور کا ہم وطن ہوں مگر اس نے مجھ پر اتنا ظلم کیا تھا کہ تم سنو گے تو مجھ سے ہمدردی کرو گے۔ اس نے میرے باپ کو اذیت دے کر قتل کر دیا۔ اس سے سب کچھ چھین لیا۔ وہ ایک انتہائی شریف اور ایماندار آدمی تھا اور اپنی محنت سے اس نے اتنی دولت کمائی تھی کہ اس نے مجھے پاکستان سے پڑھنے کے لیے یہاں بھیجا۔ اس وقت میں یہاں تھا جب دلاور نے میرے باپ پر ظلم کے پہاڑ توڑے۔ میرے سوا دنیا میں اس کا کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ بیوی اور نہ بچے۔ میں واپس گیا تو مجھے اس کی قبر ملی۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس کا قاتل دلاور ہے۔ دلاور نے اس کی ساری جائداد پر بھی قبضہ کر لیا تھا جس پر میرا اور صرف میرا حق تھا۔ پھر اس نے مجھے ایک قتل کے کیس میں مجرم بنا دیا اور مجھے اپنی جان بچانے کے لیے فرار ہونا پڑا۔ حالات کی شہادت نے مجھے بھی اسی طرح مجرم بنا دیا تھا جیسے تم کو بنا دیا۔ اگر میں پکڑا جاتا تو میرے ساتھ زیادہ برا ہوتا۔ آج میں بھی پھانسی پانے کے بعد کسی نامعلوم قبر میں دفنا دیا گیا ہوتا مگر میں نے زندگی کے لیے اپنے حق اور انصاف کے لیے جدوجہد ترک نہیں کی۔ میں چوہدری دلاور کے پیچھے لگ گیا۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ...... دلاور کو قانون کی عدالت میں مجرم ثابت کر کے اپنی بے گناہی کا سرٹیفکیٹ حاصل کروں گا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ اس سرٹیفکیٹ سے کیا فرق پڑتا ہے۔

اگر آدمی بے گناہ ہے تو وہ بے گناہ ہے اور یہ یقین اسے مطمئن رکھنے کے لیے کافی ہے۔ خدا بھی جانتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے مگر جارج یہ گناہ ثواب کا نہیں جرم و سزا کا مسئلہ تھا۔ اگر میں انتظار کرتا تو خدا بھی میری مدد کیسے کرتا۔ وہ دنیا کی عدالت میں آکر تو فیصلہ نہیں سنا سکتا تھا۔ اس کا آخری فیصلہ ہوگا یوم حساب ... میں۔ دنیا کی جنگ ہم خود لڑتے ہیں۔ تم نے بھی لڑی تھی مگر تم ہار گئے تھے۔ میں نے ابھی تک ہار تسلیم نہیں کی ہے ... میرا جذبہ، یہ حوصلہ، یہ یقین خدا کو پسند آیا ہے کہ اب وہ میری حفاظت کرتا ہے اور مجھے تائید غیبی حاصل ہے۔ شاید کوئی اور اس بات کو مضحکہ خیز قرار دے مگر میرا ایمان آج پہلے سے زیادہ کامل ہے ... اپنی جدوجہد میں تقریباً کامیاب ہو گیا ہوں۔ اب دلاور ... ہے۔ قانون کے لمبے ہاتھوں کی پہنچ ...... سے نہیں بچنے کے لیے ... ماننا پڑے گا جارج کہ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ پھانسی کا پھندا جو میری گردن میں پڑ سکتا تھا وہ اب چوہدری دلاور کی گردن کے بہت قریب ہے۔ میری جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔ مجھے حق مل جائے گا اور انصاف بھی۔"

جارج رفتہ رفتہ میری باتوں میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوا تھا اور اب متاثر نظر آ رہا تھا "مجھے تمہاری بات پر اعتبار آنے لگا ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو جارج۔ نہ تم میرے دوست ہو اور نہ رشتے دار۔ مگر میرے اور تمہارے درمیان ایک تعلق ہے۔ وہ تعلق جو دنیا بھر کے مظلوم انسانوں کے درمیان ہوتا ہے جو اگر جو ہو جائیں۔ جیسے فلسطینی ہوئے یا جنوبی افریقہ میں سیاہ فام ہوئے یاسر عرفات اور نیلسن منڈیلا میں بھی مشترک مقصد کا رشتہ ہے۔ انصاف اور حقوق کے حصول کے لیے ان کی جدوجہد کا نظریہ، فلسفہ ایک ہی ہے۔ اب فرض کر لو کہ میں ہوں یاسر عرفات اور تم ہو نیلسن منڈیلا اور ہم لڑ رہے ہیں جو استبداد کی استحصالی قوت ہے۔ تو کیا ہم ایک دوسرے کے دشمن ہو سکتے ہیں؟"

وہ مسکرانے لگا "نہیں۔ دوست شاید ہو سکتے ہیں۔"

"شاید نہیں، یقیناً ہوں گے ہم" میں نے کہا "میرا تم سے ملاقات کے لیے آنا بھی میری جدوجہد کا ایک حصہ ہے۔ مجھے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے تسلیم کر لینا چاہیے کہ یہ جدوجہد میں اپنے لیے کر رہا تھا۔ تمہاری بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اور تمہیں رہائی دلانے کے لیے نہیں مگر میری کامیابی کے نتیجے میں تمہارے ساتھ بھی انصاف ہوگا۔ اس کا فائدہ تمہیں بھی ملے گا۔ اصلی مجرم پکڑا جائے گا تو تم رہا ہو جاؤ گے۔"

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھتا رہا "کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ میں نے ہر امید چھوڑ دی تھی۔ مجھے اپنے بارے میں اور بتاؤ۔"

"میرا اصلی نام سکندر بخت ہے جارج۔ لیکن یہاں میں آیا ہوں ...... سے....."

"تم سکندر بخت ہو۔" وہ ایک دم اٹھ کے بیٹھ گیا۔

میں نے مسکرا کے کہا "ہاں۔ دیکھ لو مجھے۔ میرا نام استعمال ... خدانخواستہ وہ تمہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جاتا اور میں واقعی پکڑا جاتا۔ اللہ نے تم پر ... کیا کہ تمہیں بچا لیا۔ یہ انکشاف کرنے کے لیے کہ ... کی کوشش کرنے والا چوہدری دلاور تھا، سکندر بخت نہیں ... تم دنیا کے سامنے اس کے دھوکے اور جعلسازی کا پردہ چاک کرنے کے لیے تم زندہ رہے۔ مارنے والے سے بچانے والے کا ہاتھ زیادہ طاقتور ہے جارج۔ اگر تم مر جاتے تو یہ کون بتاتا۔"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "تم اچھے آدمی لگتے ہو سکندر بخت۔"

"میں تم سے جھوٹ بالکل نہیں بولوں گا" میں نے کہا "یہاں میں ... یوسف کے نام سے آیا ہوں۔"

"... یوسف" اس نے دہرایا۔

"ہاں اور تم دیکھ رہے ہو کہ میں نے یہ کالا کوٹ پہن رکھا ہے ... یہ بھی ایک مجبوری تھی" میں نے اسے اپنا پاسپورٹ پیش کیا "دیکھ لو اس پر میری تصویر اور میرا نام ہے۔"

اس نے پاسپورٹ کو غور سے پڑھا "یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تم کو ایسی کیا مجبوری تھی نام بدلنے کی؟"

میں نے کہا "اگر سکندر بخت یہاں آتا تو ... نہیں۔ سکندر بخت کے نام سے تو میں یہاں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے برطانیہ میں داخلے پر پابندی عائد ہے لیکن یہ الگ کہانی ہے۔ میں پیرس پہنچا۔ وہاں سے خفیہ طریقے پر لندن میں داخل ہوا۔ سکندر بخت کو یہاں پولیس تلاش کر رہی ہے۔ چوہدری دلاور کے ذریعے انہیں بھی اطلاع دی گئی ہے کہ میں ایک مفرور مجرم ہوں۔ خود دلاور بھی یہاں ہے مگر اپنے حلیے اور نام کی وجہ سے میں محفوظ ہوں ورنہ وہ تم سے پہلے مجھے قتل کرا دیتا۔"

"کیا وہ بھی GANGSTER ہے؟"

"اس سے بھی زیادہ" میں نے کہا "لیکن میں نے اس کی ... دی ہے۔ میں نے یہ مصنوعی داڑھی لگا رکھی ہے اور یہ سب کچھ مجھے صرف اس لیے کرنا پڑا کہ میرا تم سے ملنا از حد ضروری تھا۔"

"میں کس طرح تمہارے کام آ سکتا ہوں؟"

"تم چوہدری دلاور کو شناخت کر سکتے ہو؟" میں نے کہا "واردات کے بعد وہ بھاگ گیا تھا اور تم نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا۔ کسی نے تمہاری بات کا یقین نہیں کیا کہ چوہدری دلاور کوئی شخص ... سب اسے جھوٹ اور تمہارے ذہن کی اختراع سمجھتے ... پھر بھی برطانیہ میں نظر نہیں آیا مگر جیل میں وہ پھر ... تم نے اسے پہچان لیا تھا۔ آخر کیسے؟ جہاں تک مجھے معلوم ہے ... میری طرح بھیس بدل کے پھر رہا ہے۔ آج شام میں ... جیسے لباس میں تھا۔"

"... پاس بھی وہی بھیس بدل کے آیا تھا۔ مگر اس کی صورت ... میرے ذہن میں محفوظ تھے ... بدل سکتا تھا میں اس کا چہرہ" جارج نے کہا۔

"جب تمہیں جیل کے حکام نے بتایا تھا کہ سکندر بخت تم سے ملنا چاہتا ہے تو تم نے کیوں ملنا قبول کیا تھا؟ تم اس نام سے آشنا تھے؟"

اس نے ٹھنڈی سانس لی "بس میری بے وقوفی۔ میں کسی سکندر بخت کو نہیں جانتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ مل لینے میں کیا حرج ہے۔ میں کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ دو سال بعد کوئی مجھے قتل کرنے کے لیے بھی آ سکتا ہے اور وہ بھی جیل کے اندر۔ تم کبھی جیل میں رہے ہو؟"

میں اس غیر متوقع سوال پر چونکا "ہاں۔ مگر بہت مختصر عرصے کے لیے۔"

"کس جرم پر سزا ہوئی تھی تمہیں؟"

میں نے وضاحت کی "جرم میں نے کوئی نہیں کیا تھا اور نہ مجھے سزا ہوئی تھی۔ یوں سمجھ لو کہ پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا اور میں پولیس اسٹیشن کی جیل میں رہا۔ پولیس کی تحویل میں۔ اسے ہماری زبان میں حوالات کہتے ہیں۔ پھر میری ضمانت ہو گئی اور مجھے رہائی مل گئی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ دوسری بات ہے۔ میں اس جیل کی بات کر رہا تھا جہاں عدالت سے سزا پانے کے بعد کچھ وقت گزارنا پڑے۔ چھ مہینے، سال یا لمبی مدت۔ وہ بڑا خوفناک تجربہ ہوتا ہے۔ شروع شروع میں آپ کے دوست اور خاندان والے بڑی بھاگ دوڑ کرتے ہیں اور قانونی جنگ لڑنے میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔ آپ کا حوصلہ بلند رکھنے میں بھی بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں مگر ایک دفعہ یہ جنگ ختم ہو جائے۔ آپ سب سے کٹ کر جیل کی دنیا میں اکیلے رہنے کے لیے پہنچ جائیں تو بہت سی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ انسان کی فطرت سے زیادہ لوگوں کے رویے میں۔ پہلے باقاعدگی سے آنے والے کبھی کبھی ناغہ کر جاتے ہیں اور بڑے اچھے عذر پیش کرتے ہیں۔ پھر ملاقات کا وقفہ طویل ہو جاتا ہے اور عذر بھی یہی رہ جاتا ہے کہ وقت نہیں ملتا۔ واقعی دنیا میں ہر شخص کو جتنا وقت ملا ہے وہ اس کی اپنی زندگی، اس کے مسائل، اس میں کامیابی کی جدوجہد کے لیے ہوتا ہے اور اپنے خاندان کے لیے ہوتا ہے لیکن سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ خود اپنے خاندان والے بھی آہستہ آہستہ گھر میں آپ کے خلا کو محسوس کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ کھانے کی میز پر آپ کی کرسی پر کوئی اور بیٹھنے لگتا ہے۔ مثلاً آپ کا بچہ یا خود آپ کی بیوی۔ وہ جگہ جو ٹی وی دیکھنے کے لیے مخصوص تھی، بیڈ روم میں آپ کے بیڈ پر سے ایک تکیہ ہٹا دیا جاتا ہے۔ آپ کے کپڑے بند کر دیے جاتے ہیں اور ذاتی سامان اٹھا کے ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے۔ بالکل ایسے... جیسے آپ مر گئے ہوں۔ اور یہ عارضی موت ہی ہوتی ہے جیسے اس دنیا سے کوئی واپس نہیں آ سکتا ایسے ہی جیل سے گھر نہیں آ سکتا۔ اگر چھ مہینے سال کی بات ہو پھر تو زیادہ فرق ...

www.paksociety.com

پڑتا تھا۔ جو عمر قید کاٹنے گیا ہو وہ ٹوٹ گیا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ محبت کے سارے رشتے اور دعوے اتنے کھوکھلے اور جھوٹے اتنے منافقانہ ہوتے ہیں۔" میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور مجھے اس پر جتنا ترس آیا اس سے زیادہ خوف جیل سے محسوس ہوا۔

میں نے اسے تسلی دی "خیر اب تمہارے لیے یہ عذاب کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔"

اس نے اپنے آنسو صاف کیے "خدا کرے۔ خدا کرے۔ آمین" اس نے دوبارہ دعائیہ انداز میں دہرایا اور پھر سینے پر صلیب بنائی "معلوم ہے میرے ساتھ کیا ہوا؟"

میں نے کہا "مجھے شروع سے بتاؤ۔ تم نے اس عورت سے شادی کیوں کی تھی جو عمر میں تمہاری ماں کے برابر، بہت زیادہ تھی۔"

وہ شرمندہ نظر آنے لگا "ہاں سچ۔ میں نے دولت کے لیے اس کو بیوی بنالیا تھا۔ بڑے ذلیل خیالات تھے میرے۔ میں نے خود سے کہا کہ عورت تو وہ بھی ہے اور بوڑھی بھی نہیں ہوئی۔ اس کی بدمزاجی یا عادات و اطوار کا مجھے زیادہ علم نہیں تھا۔ بس اس نے مجھے پسند کرلیا تھا۔ میں جوان اور صحت مند تھا۔ دو سال تک میری باڑی کچھ بھی نہیں ہوئی۔ ورنہ بڑی پرکشش باڑی تھی میری، عورتوں کے لیے... وہ مجھ پر ریجھ گئی تھی اور اس کے پاس پہلے شوہر کی چھوڑی ہوئی دولت بہت تھی۔"

"اس کا پہلا شوہر... ڈاکٹر شیلی کا باپ تھا؟"

"نہیں۔ یہ مجھے معلوم تھا، وہ مجھے سخت ناپسند کرتی تھی اور اپنی ماں سے بہت لڑتی تھی۔"

"وہ چوہدری دلاور کا بھی باپ تھا" میں نے کہا۔

وہ چونکا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں تھی؟ مجھے حیرت ہے۔"

"میں نہیں مان سکتا۔" وہ مجھے دیکھتے ہوئے غور سے بات کررہا تھا "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

میں نے کہا "ڈیئر جانسن۔ اگر کوئی بات کسی کے علم میں نہ ہو تو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ غلط بھی ہوگی۔ اگر آج تم یہ نہ مانو کہ چاند ایک فضول بنجر اور بے ہنگم زمین جیسی سطح والی بدصورت جگہ ہے تو کیا فرق پڑے گا اس سے۔ حقیقت اپنی جگہ رہے گی جسے دنیا تسلیم کرتی ہے۔"

"شی واز اے رئیل بچ!" اس نے دانت پیس کے کہا "اس نے مجھے کبھی نہیں بتایا... آخر میں اس کا شوہر تھا، جیسا بھی تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑجاتا؟"

اس نے بے وقوفوں کی طرح دیدے گھمائے "شاید کچھ نہیں۔ اس کے دو بچے ہوتے یا دس۔ ڈاکٹر شیلی نے بھی مجھے نہیں بتایا۔ میری شادی اور میرے جیل پہنچ جانے کے بارے میں..."

میں نے کہا "اس کی ایک معقول وجہ ہے۔ وہ [illegible] تھی۔"

"وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی۔ وہ یقیناً [illegible] الیکٹرک چیئر پر بیٹھ جاؤں۔ غصہ اس کو [illegible] سے شادی کی۔ میں اچھا شوہر نہیں بن سکتا تھا۔ [illegible] بھی محسوس کرسکتا تھا اور ڈاکٹر شیلی نے [illegible] اس کی ماں ایک بڑی کنجوس تھی۔ [illegible] جیسا مرد اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے [illegible] چکن خواہ وہ کوڑے کے ڈھیر پر پھینک کے [illegible] میں نے جو سوچا تھا وہی بعد میں کیا۔ میں نے خوب [illegible] کے لیے کیش اپنی بیوی کا استعمال کیا۔ یہ بات [illegible] ہوتی۔ شروع شروع میں وہ برا مان کے خاموش رہتی [illegible] لیے یہ اطمینان کافی تھا کہ میں اس کی ملکیت [illegible] کرلیتی تھی۔ خیرات کے طور پر دوسروں کو بھی [illegible] دینے سے اس کو فرق نہیں پڑتا تھا۔ بعد میں وہ [illegible] حسد کے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور مجھ سے [illegible] ذہنیت ہوگیا۔ شراب پہلے میں پیتا تھا پھر وہ بھی پینے [illegible] میں ہم دونوں لڑنے لگے۔ وہ یہ [illegible] کرنے کے مترادف تھا۔ میں شروع سے ایک عورت [illegible] کرنے والا مرد نہیں تھا۔ عورتیں خود مجھ پر [illegible] جیسے مکھیاں شیرے سے چمٹتی ہیں۔ شادی کے بعد [illegible] پارسا، ذمے دار اور وفادار شوہر بن جاتا۔ میں [illegible] ساتھ گھر چلا جاتا تھا اور... یہ بڑی بے شرمی اور بے [illegible] تھی۔ ڈاکٹر شیلی اپنے کمرے میں بند ہوجاتی تھی۔ [illegible] تھی کہ کسی دن وہ زہر کھالے گی یا اسے مار دے [illegible] بالواسطہ وہ مجھے دیتی تھی۔ وہ کبھی مجھ سے بات نہیں کرتی [illegible]

میں نے کہا "اس کے علم میں تھا کہ چوہدری دلاور [illegible] بھائی ہے؟"

"کیا چوہدری دلاور کا اپنی ماں سے رابطہ تھا؟"

"شاید نہیں۔ وہ اپنے پہلے شوہر کی زندگی میں بھی [illegible] سے الگ تھی۔ چوہدری دلاور کی ماں پشاور کے قریب [illegible] تھی۔ اسے مرے زمانہ ہوا۔ دلاور کا باپ وہاں سے [illegible] لندن پہنچا تھا۔ کسی کو علم نہیں کہ وہ فرار ہونے پر [illegible] تھا۔ لندن میں اس نے ایک اور شادی کرلی تھی اور [illegible] تھا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ بعد میں اس نے اپنے بیٹے سے [illegible] اور دلاور کو یہ معلوم ہو کہ اس کا باپ لندن میں ہے [illegible] شادی کرلی ہے اور اس کی ایک بیٹی ہے۔ جب باپ [illegible] طور پر دلاور کو خیال آیا کہ اس کا وارث وہ خود [illegible] ہے اور اگر ڈاکٹر شیلی نہ رہے اور اس کی ماں نہ رہے [illegible] میں اپنے باپ کی ساری دولت اور جائیداد کا مالک [illegible] ہوجائے گا۔ یہی سوچ کے اس نے ان دونوں کو [illegible]

[illegible] اس نے تمہاری گرل فرینڈ کو ڈاکٹر شیلی [illegible] خرابی یہ ہوئی کہ اس نے [illegible] کو مارنے کے بعد اس نے ایک لڑکی کو دیکھا [illegible] اس نے فرض کرلیا کہ وہی ڈاکٹر شیلی ہوگی اس نے [illegible] کو قتل کیا اور فرار ہوگیا۔ یہ سب تم نے دیکھا تھا [illegible] اپنی جان بچائی تھی ورنہ شاید دلاور تمہیں بھی ختم [illegible] کسی بھی چشم دید گواہ کو زندہ چھوڑنے کا رسک نہیں لے [illegible] تمہارا موجود ہونا ہی تمہارے مجرم ہونے کا [illegible] مجھے ایک بار پھر بتاؤ کہ یہ سب کیسے ہوا تھا؟ عدالت [illegible] تفصیل سے سب بتایا ہوگا مگر مجھے معلوم نہیں۔"

"[illegible] کا فائدہ کچھ نہیں ہوا۔ کسی نے بھی یقین نہیں کیا۔ سچ [illegible] ایک بنائی ہوئی کہانی یعنی (CONCOCTED STORY) [illegible] سوچنے کی بات ہے کہ میرے جیسا آدمی [illegible] اور غیر تخلیقی [illegible] والا اتنی اچھی کہانی کیسے بنا سکتا تھا۔ میں کوئی رائٹر یا ڈراما نگار نہیں تھا۔ بس انہوں نے کہا کہ تم جھوٹ بکتے ہو۔ قتل تم نے کیا ہے اور مجھے سزا [illegible] مجھے چوہدری دلاور کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ میں [illegible] لڑکی کے ساتھ پھر رہا تھا۔ وہ بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتی [illegible] آخر یہ لڑکیاں شادی کے لیے ہاتھ دھو کے کیوں پیچھے پڑ جاتی [illegible] ہی سوچا تھا۔"

"وہ غلط نہیں سوچتی ہیں۔ ایسا نہ سوچیں تو مرد ان کو کھلونا [illegible] بنالیں۔" میں نے کہا۔

"میں نے اس سے کہا کہ شادی کا کیا سوال۔ میں شادی شدہ [illegible] اس نے میری بات نہیں مانی اور کہنے لگی کہ اچھا مجھے اپنی [illegible] بیوی سے ملاؤ ورنہ میں سمجھوں گی کہ تم ٹال رہے ہو۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا کہ چلو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ دیکھ لو میرا گھر اور میری بیوی۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ وہ اچھی لڑکی تھی۔ عقل [illegible] ڈاکٹر شیلی کی ماں کو چھوڑ کے میں اس سے شادی کرلیتا۔ [illegible] بے چاری خواہ مخواہ ماری گئی۔ جب میں اسے گھر لے گیا تو میری [illegible] ڈاکٹر شیلی وہاں نہیں تھی۔ وہ ہوسٹل میں رہنے لگی تھی۔ اس کا [illegible] خیال تھا کہ گھر کا ماحول اس قابل نہیں رہا، مگر اب گھر نہیں رہا، [illegible] ثابت ہوگیا ہے۔ ٹھیک ہی سمجھتی تھی وہ۔ خیر میری بیوی نے [illegible] میرے ساتھ ایک جوان اور پرشباب لڑکی کو دیکھا تو اس کا پارا چڑھ گیا اور اس نے مجھے بے نقط سنانی شروع کردیں۔ نشے میں تھی [illegible] کہا کہ اب وہ بھی ہر روز مردوں کو پھانس کر لائے گی۔ میں [illegible] ان کو مارا۔ یہ ایک معمول سا بن چکا تھا۔ پڑوس میں رہنے [illegible] عادی تھے اور ظاہر ہے نہ دخل دیتے تھے اور نہ [illegible] کرتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ کسی دن ہم میں سے [illegible] ایک دوسرے کو مار ڈالے تو یہ شور ہنگامہ... ختم ہوجائے۔ وہ [illegible] تھی اور وہاں سے جانا چاہتی تھی۔ اچانک کسی نے [illegible] کی گھنٹی بجائی اور میں نے جا کے دیکھا تو ایک اجنبی کھڑا [illegible] میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس سے ملنا چاہتا ہے۔ اس نے

ذرا اپنے جیب سے پستول نکال لی اور بولا کہ زبان بند رکھنا اپنی کالے [illegible] پھر وہ مجھے دھکیل کر اندر لے گیا۔ سب سے پہلے اس کے سامنے میری بیوی آئی۔ اس نے بلا توقف اس کے سر کا نشانہ لے کر گولی چلادی۔ میرا خیال ہے کہ وہ دلاور کو پہچانتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی اور اس نے چلا کے کہا بھی تھا کہ یہ تم کیا کررہے ہو؟"

"کیا اس نے دلاور کا نام لے کر اسے مخاطب کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے سوچ کے کہا "مجھے یاد نہیں ہے۔"

"پھر تم کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ دلاور ہے۔ تم نے اسے پہلے دیکھا بھی نہیں تھا اور اس کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے تھے۔"

"بیوی کو گولی مارنے کے بعد اس نے میری گرل فرینڈ کی طرف دیکھا جو خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ چیخ بھی نہ سکی۔ یقیناً وہ ڈرتی ہوگی کہ اس نے آواز نکالی تو قاتل اس کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ وہ ایک کونے میں گم صم اور بے حس و حرکت کھڑی تھی اور اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری بیوی کو دم توڑتا دیکھ رہی تھی۔ بے شک اسے میری بیوی سے رقابت تھی اور حسد بھی ہوگا۔ اس کی کوئی جذباتی ہمدردی میری بیوی کے ساتھ نہیں ہوسکتی تھی مگر اسے اچانک گولی لگنے کے بعد خاک و خون میں غلطاں دیکھنا اس کے لیے ایک بھیانک تجربہ تھا۔ ویسے کوئی پاگل کتے یا معذور گھوڑے کو بھی گولی مارے تو دکھ ہوتا ہے۔ تاہم اسے یقین ہوگا کہ یہ اجنبی قاتل جس نے میری بیوی کو قتل کیا تھا اس کی ذاتی رنجش رکھتا ہوگا اور ان کے درمیان اختلاف یا عداوت کی کوئی ایسی صورت حال ہوگی جس میں وہ شخص پاگل ہوگیا تھا اور گولی مارنے پر مجبور تھا۔ وہ اس اختلافی مسئلے کو عقل، ٹھنڈے دماغ اور بات چیت سے حل کرنے کی کوشش میں ناکام رہے ہوں گے اور قطع نظر اس سے کہ غلطی کس کی تھی اور زیادتی کس نے کی تھی۔ قصور وار کون تھا اور سزا غلط تھی یا صحیح۔ میری گرل فرینڈ کے ذہن میں یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ کوئی اسے بھی بلاوجہ قتل کرسکتا ہے۔ بے شک عینی گواہ ہونا بھی کم سنگین جرم نہیں ہوتا اور ہر قاتل کسی گواہ کو زندہ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیتے مگر اس وقت وہ یہی سمجھی ہوگی کہ وہ محفوظ ہے اور قاتل اپنا کام کرکے چلا جائے گا۔ چنانچہ وہ خاموش اور ساکت کھڑی رہی۔"

میں نے کہا "اور تم... تم اس وقت کہاں تھے؟"

"میں دلاور کے پیچھے ایک صوفے کی اوٹ میں دبکا ہوا تھا۔ جہاں سے اسے دیکھ سکتا تھا اور اپنی گرل فرینڈ کو بھی۔"

"تم نے اسے... اپنی بیوی کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا؟"

"مجھے وقت کہاں ملا؟"

میں نے کہا "تمہیں خیال بھی نہیں آیا تھا کہ تمہیں کچھ کرنا چاہیے؟ آخر وہ تمہاری بیوی تھی۔"

www.paksociety.com

"سچ پوچھو تو... مجھے خیال آیا تھا۔ دیر سے ہی سہی۔ اس وقت جب دلاور نے مجھے ایک طرف دھکیل کر میری بیوی کا پوچھا۔ نام لے کر اور گالی دے کر کہا کہ وہ... کہاں ہے۔ تب بھی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا کرنے والا ہے۔ مگر اس نے ریوالور نکالا تو میں حیرت، صدمے اور خوف سے سن ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا تھا، شور مچانے کا یا اس پر کوئی چیز کھینچ مارنے کا... اور اسے روکنے کا۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ... کیا ضرورت ہے؟ میرا کام کوئی اور آسان کر رہا ہے۔ میری جان چھوٹ جائے گی اس کتیا سے اور مجھے اس کی دولت جائداد میں سے اپنا حصہ بھی مل جائے گا۔ سارا نہ سہی، آدھا بھی مجھے بہت تھا۔ میں نے ہیرو جیسی بہادری سے کام لینے کا ارادہ ترک کر دیا اور پھر سب کچھ اتنی سرعت کے ساتھ ہوا کہ میں جنبش بھی نہ کر سکا۔ اندر داخل ہونے کے پانچ سیکنڈ بعد وہ فائر کر چکا تھا۔ اس نے اپنی سوتیلی ماں سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اسے کوئی وجہ نہیں بتائی اور صفائی کا موقع دینے میں بالکل وقت ضائع نہیں کیا۔ بس نشانہ لیا، اس کے سامنے آتے ہی اور پیشانی میں سوراخ کر دیا۔ اس کا نشانہ یقیناً بہت اچھا تھا۔"

"کیا فائر کی آواز باہر گئی تھی؟"

"گئی ہو گی مگر بہت کم۔ دروازے کھڑکیاں سب بند تھے اور وہ فلیٹ بھی آخری گوشے میں تھا۔ اس کے سامنے والا فلیٹ خالی تھا۔ دائیں طرف والے میں جو فیملی رہتی تھی وہ دن بھر ملازمت کے سلسلے میں باہر رہتے تھے۔ شام کو ذرا سی دیر کے لیے گھر آتے تھے اور پھر اکٹھے گھومنے پھرنے نکل جاتے تو رات گئے لوٹتے تھے۔ دوسری طرف دن میں ایک بڑھیا رہتی ہے جس کو ٹھیک سنائی نہیں دیتا۔ وہ آلۂ سماعت استعمال کرتی تھی مگر اس وقت جب بیٹا اور بہو اصرار کریں اور ہنگامہ کریں کہ آخر وہ خریدا کس لیے گیا ہے۔ دن میں بیٹا بہو باہر ہوتے تھے اور بچے اسکول میں تو بڑھیا بہری ہی رہنا پسند کرتی تھی۔ اس کے علاوہ آس پاس شور بہت ہوتا تھا۔ ایک فائر کی آواز پر لوگ اچھل نہیں پڑتے۔ یہ خیال آتا ہے کہ کسی کار کا بیک فائر ہوگا۔ کوئی ٹائر برسٹ ہوا ہوگا۔ ممکن ہے ٹی وی پر جرائم کا کوئی سیریل چل رہا ہو۔ کسی نے آواز اونچی کر دی ہو۔ ایک مضافاتی مکان میں یا گاؤں میں یقیناً فائر کی آواز پر درختوں سے پرندے اڑ جاتے اور گھروں سے لوگ نکل آتے مگر شہر میں ایسا نہیں ہوتا۔ فرض کریں کسی کو شک ہوتا کہ یہ ریوالور کا فائر تھا تو اسے ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ کام چھوڑ کے یا تفریح میں خلل ڈال کے تحقیق کرنے نکلے اور خواہ مخواہ گواہی کے جھمیلے میں پڑے۔ کسی مسلح قاتل یا ڈاکو سے مقابلے کا تو سوال ہی نہیں۔ میری بیوی کو قتل کرنے کے بعد جب اس نے مرتی ہوئی عورت سے پوچھا کہ تمہاری بیٹی کہاں ہے؟ اور پھر اسے ٹھوکر مار کے بولا ہیولی تتلی کہاں ہے؟" تو مرتے مرتے بھی میری بیوی نے سر اٹھا کے کہا تھا "... لیے دلاور۔ اسے چھوڑ دو۔" اور پھر مر گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی بات نے غلط فہمی پیدا کی۔ دلاور کو لڑکی تتلی ہے جو گھر میں موجود ہے۔ اگر وہ کہہ... ہے تو شاید دلاور ایسے ہی نکل جاتا۔ مگر مرنے والی کا اشارہ میری گرل فرینڈ کی طرف تھا۔ اس نے جانتے بوجھتے... اسے معلوم ہوگا کہ دلاور نے تتلی کو کبھی نہیں دیکھا... لڑکی کو مارے گا تو تتلی بچ جائے گی اور اس عورت کا انتقام... ہو جائے گا جس نے اس کے شوہر کو ورغلا کے... تھا اور اس سے شادی کے چکر میں تھی۔ اس نے ایک... شکار کیے۔ اپنی بیٹی کو بچا لیا، اپنی دشمن کو مروا دیا... دلوا دی۔ دلاور نے ریوالور اٹھا کے اس لڑکی کا نشانہ لیا... گی۔ مجھے مت مارو۔ مجھے مت مارو۔ میں کسی کو... کی۔

"اگر وہ کہتی کہ میں تتلی نہیں ہوں۔ تو شاید... نے سمجھا کہ دلاور اسے چشم دید گواہ ہونے کی وجہ سے... دلاور نے اس کی بھی پیشانی میں سوراخ کیا۔ بلاشبہ غضب کا تھا اس کا۔ اور یقین کرو اس وقت میں نے سمجھ لیا تھا کہ... باری ہے۔ موت کو اتنے قریب پا کے خوف سے میرا... ہو گیا تھا۔ میرا بدن ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور میں پتھر کا ہو گیا تھا... وقت آسانی سے مجھے گولی مار سکتا تھا مگر اچانک وہ پلٹا اور... ماں کے جسم کو پھلانگ کے دروازے سے نکل گیا۔ ظاہر... کرنے کے بعد اسے ڈر تھا کہ اب لوگ آ جائیں گے... ریوالور وہیں پھینک دیا تھا جہاں اس کی سوتیلی ماں... تھی۔ مگر مجھے پتا نہیں تھا۔ وہ نکل گیا تو میں پھلانگ مار کے... کے پیچھے سے نکلا۔"

میں نے زور سے کہا "BRAVO" جس کا مطلب شاباش ہی ہے۔

جارج کی آنکھوں سے آنسو ٹپک گئے۔ "وہ بھی... خون اس کی دونوں خوبصورت آنکھوں کے درمیان سے... اور فرش پر جمع ہو رہا تھا۔ بالکل یہی پوزیشن دوسری لڑکی... بھی اوندھی پڑی تھی اور اس کے سر سے بھی خون بہہ رہا تھا... تھی۔ اچانک میری نظر ریوالور پر پڑی اور میں نے اسے... اصولاً مجھے اس کو چھونا بھی نہیں چاہیے تھا مگر میرا... کہاں تھا۔ مجھ میں اور ایک پاگل میں کوئی فرق نہیں تھا... میری بیوی کا خون تھا۔ تازہ، سرخ اور ہاتھ کی انگلیاں... والا۔ وہاں تازہ خون کی باس تھی اور میں دو لاشوں کے... کھڑا تھا جن کی پیشانی میں سوراخ تھے۔ ایک میری... ایک محبوب۔ نہ جانے مجھے ان کی کھلی آنکھیں دیکھ کے... میں نے وہی ریوالور اپنی پیشانی پر رکھا مگر میں گولی... چکر سا آیا اور سکتے سے میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔ میرا... اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ مگر... پھر جب مجھے ہوش آیا تو میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں...

...برا ہوا تھا۔"

... میں ہو گیا مگر اس کی نظریں چھت کو یوں تکتی رہیں جیسی وہ... وہ سکرین ہے اور اس پر وہی خونی منظر ابھی تک ٹھہرا... سلائیڈ پروجیکٹر میں آخری تصویر اپنی ساری... کے ساتھ رک گئی ہے۔

میں نے کہا "گویا دلاور کا نام تم نے صرف ایک بار ہی سنا تھا۔"

"ہاں۔ اس وقت جب میری بیوی نے کہا تھا کہ دلاور۔ خدا کے لیے اسے چھوڑ دو۔"

"اور تمہیں یہ نام یاد رہا؟"

"یاد کیسے نہ رہتا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر یہ شخص کون ہے اور اس نے دو قتل کیوں کیے۔ یہی یاد رکھنے والی سب سے اہم بات تھی۔"

"تم نے اسے غور سے دیکھا تھا؟"

"اسے دیکھنے کے سوا میں نے کیا ہی کیا تھا۔ میں اس کی صورت کے ایک ایک نقش کو ذہن میں بٹھاتا رہا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ میں اس کے چہرے، اس کے بالوں اور آنکھوں کا رنگ، قد و قامت، وزن، لباس اور بات چیت کے انداز سب کا مشاہدہ کرتا رہا تھا۔ اس لیے کہ ضرورت پڑے تو میں تفصیل سے سب بتا سکوں اور اسے پھر دیکھوں تو شک و شبے کے بغیر پہچان لوں۔ کیا وجہ ہے کہ وہ سال بعد۔ دو سال تین ماہ، سات دن بعد۔ جب وہ میرے سامنے آیا تو میں نے پہلے ہی اس سے کہا دلاور۔"

"کیا اس پر وہ حیران ہوا تھا؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟ وہ اصل میں نہیں تھا۔ اسے حیران ہونا چاہیے تھا۔"

جارج نے کہا "پتا نہیں۔ اس نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ممکن ہے اس نے اپنی حیرانی کے جذبات اور ردعمل پر قابو پا لیا ہوگا۔"

میں نے کہا "وہ بڑا حرامی ایکٹر ہے۔ خیر۔ تمہارے لبوں سے اپنا نام سن کے اس نے کیا کہا؟"

"اس نے کہا کہ ہاں۔ میں دلاور ہی ہوں۔" جارج بولا "میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب اس... کو کیا کہوں؟ غلطی میری اپنی تھی کہ اس سے ملنے چلا گیا تھا۔ میں نے کہا کہ تم نے کچھ اور نام استعمال کیا تھا۔ اس نے حیرانی سے کہا نہیں۔ نام بدلنے کی کیا ضرورت تھی مجھے۔ میں نے کہا۔ مجھے بتانے والے نے دلاور نام غلط بتایا ہوگا۔ وہ بولا، غلط بتایا۔ سمجھا ہوگا اس نے۔ میں نے کہا کہ... بتاؤ کہ اب کیوں آئے ہو؟ یہ دیکھنے کے لیے کہ تمہارے... مجھے بہت ہمدردی ہے تم سے۔ میں یہ بات سن کے میرے دماغ کا... میں نے اسے گالیاں دیں کہ ایسی کی تیسی تمہاری ہمدردی کی... ہمدردی ہے کہ تم نے دو قتل کیے۔ میری بیوی کو مار ڈالا اور میری گرل فرینڈ کو۔ اور مجھے بے گناہ کو قاتل بنا دیا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ میں شکل نہیں دیکھنا چاہتا تمہاری۔ کاش یہ میرے اختیار میں ہوتا کہ تمہیں قتل کر سکوں۔ اس پر وہ بولا "جارج۔ میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں اور اپنا قصور مانتا ہوں تم واقعی بے گناہ تھے اور سزا مجھے ملنی چاہیے۔ میں نے دو سال بڑی اذیت میں گزارے۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہا۔ میں اعصابی اور ذہنی مریض ہو گیا تھا۔ میں رات کو سو نہیں سکتا تھا اور سوتا تھا تو مجھے ڈراؤنے خواب آتے تھے۔ میں تقریباً پاگل ہو گیا تھا۔ میں اپنا علاج بھی کراتا رہا مگر ماہرین نفسیات نے کہا کہ تمہارے دل پر جو بوجھ ہے احساس جرم و گناہ کا۔ جب تک تم اس سے نجات حاصل نہیں کرو گے تم ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ بس اس کے بعد میں نے بہت سوچا اور بالآخر تمہارے پاس آ گیا۔" میں نے کہا "میرے پاس آ کے اقرار جرم کرنے سے یا کسی پادری کے سامنے ایسا کرنے سے کیا فائدہ۔ جاؤ پولیس کو بتاؤ۔ عدالت میں حاضر ہو کے بیان دو۔" اس نے کہا "جارج۔ میں یہی کروں گا۔ تم کو پہلے اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم کچھ اور مت سمجھنا۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں تھا اور نہ کوئی مجھے پکڑ سکتا تھا۔ میں اپنی مرضی سے اپنی سزا قبول کرنا چاہتا ہوں۔ میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میری وجہ سے تم نے دو سال جیل میں کاٹے۔" اس کی بات نے مجھے حیران کر دیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ دلاور۔ کیا واقعی تم اعتراف جرم کر لو گے؟ اور اس نے کہا "ہاں اب اس کے سوا چارہ نہیں۔" پھر اس نے مجھے سگریٹ کا ایک پیکٹ دیا "سگریٹ پیو" اس نے کہا اور اس پیکٹ میں سے اپنے لیے بھی ایک سگریٹ نکال کے جلائی۔ میرا خیال ہے کہ اس میں دو چار زہریلے سگریٹ ہوں گے۔ میں نے ایک سگریٹ جلائی اور پیکٹ جیب میں چھپا لیا۔ یہ بات یقینی تھی کہ باقی سگریٹ میں اکیلا جیل کی کوٹھری میں چھپ کے پیوں گا۔ جیل میں سگریٹ بڑی نعمت ہوتی ہے۔ آزاد دنیا کی ہر چیز لعنت ہوتی ہے جو آدمی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرتا۔ وہ خود غرض اور کمینہ ہو جاتا ہے۔ لیکن دیکھو کبھی آدمی کا کمینہ پن کیسے اس کے کام آتا ہے۔ اس کی بدی کا نتیجہ اچھا نکلتا ہے۔ اگر میں فراخدلی اور دوستانہ جذبات کا مظاہرہ کرتا اور سگریٹ کا وہ پیکٹ سب میں بانٹ دیتا کہ لو عیش کرو۔ آج باہر کی دنیا سے ایک تحفہ ملا ہے۔ اتنے قیمتی سگریٹ سب مل کے پیتے اور پتا نہیں کیا ہوتا۔ سب مر جاتے یا دو چار مرتے۔ میں بچ جاتا یا مر جاتا۔"

میں نے کہا "سگریٹ کا وہ پیکٹ اب کہاں ہے؟"

اس نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ میں دلاور سے آدھا گھنٹا باتیں کرتا رہا۔ میں نے اس سے کہا کہ چلو کوئی بات نہیں۔ دیر آید درست آید۔ آخر تم کو زیادتی کا احساس ہو گیا۔"

میں نے کہا "کیا اس وقت بھی تم نے اس سے نہیں پوچھا تھا کہ آخر... قتل اس نے کیوں کیے تھے؟"

"میں نے پوچھا تھا مگر اس نے اداس صورت بنا کے کہا کہ

www.paksociety.com

اب وجہ جان کے کیا کرو گے۔ تمہیں زیادہ صدمہ ہوگا۔ بس تھی ایسی ہی کوئی بات کہ میں قتل کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ معمولی بات پہ کون قتل کرتا ہے۔"

"یہ بتایا اس نے کہ تمہاری بیوی کے بعد تمہاری گرل فرینڈ کو کیوں مار دیا تھا اس نے؟"

"اس نے کہا کہ وہ چشم دید گواہ تھی۔"

میں نے کہا "لیکن چشم دید گواہ تو تم بھی تھے۔"

"تم واقعی وکیل ہو" جارج بولا "مجھے خیال نہیں آیا تھا یہ بات پوچھنے کا۔ لیکن میں سوال کرتا تو وہ کہہ دیتا کہ مجھے جلدی تھی۔ یا وہ کہتا کہ تم سامنے نہیں آئے۔ میں سمجھا تم بھاگ گئے ہو۔ تم کو تلاش کرنے کے لیے میں رک نہیں سکتا تھا۔"

میں نے سرہلایا "ہاں۔ ایسے ہی کسی جواب سے وہ تم کو مطمئن کر دیتا۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ اتنا عیار کہ تم تصور نہیں کر سکتے۔"

"ہاں۔ اس نے دوسری بار مجھے بے وقوف بنا کے قتل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور دیکھو۔ میں اس کی باتوں میں آگیا۔ میں نے اس پر یقین کر لیا۔ حالانکہ ایسا کون کرتا ہے۔ یہ ضمیر وغیرہ کہاں ہوتا ہے دلاور جیسے لوگوں کا۔ اور ہو تو ان کو اتنا تنگ کیسے کر سکتا ہے کہ وہ رضاکارانہ طور پر سزا قبول کر لیں۔ وہ بھی دو سال بعد....." وہ تلخی سے ہنسا۔

"ایک بات اور ہے جارج" میں نے کہا "تمہارے سامنے اس نے تمہاری بیوی سے پوچھا تھا کہ شبلی کہاں ہے؟"

"ہاں اور جواب میں مرتے مرتے بھی اس نے کہا تھا کہ خدا کے لیے دلاور۔ اس کو چھوڑ دو۔"

میں نے کہا "اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟"

"کیا ثابت ہوتا ہے؟"

"یہی کہ اس معاملے سے شبلی کا بھی کوئی تعلق تھا۔ اس کی ماں نے ایک سیدھے سادے سوال کے نتیجے میں کیوں فرض کر لیا تھا کہ وہ شبلی کو بھی مار دے گا؟ جب کوئی تم سے کسی کے بارے میں معلوم کرے کہ وہ کہاں ہے تو تمہارا یا کسی عام آدمی کا جواب یہ ہوگا کہ مجھے نہیں معلوم۔ یا یہ کہ وہ فلاں جگہ ہے یا آنے والی ہے۔ لیکن شبلی کی ماں نے سوال سنتے ہی اس کی نیت کا اندازہ کر لیا تھا۔"

اس نے سوچ کے سرہلایا "یو آر ویری رائٹ۔"

"تمہارے مقدمے اور اپیل کے کیس میں تمہارے وکیل نے تم سے سارے واقعات سنے ہوں گے۔ پولیس نے بھی بیان لیا ہوگا۔ زبانی۔ پھر تحریری۔ تم پر جرح ہوئی ہوگی تاکہ تمہارے بیان میں جھوٹ ہو تو پکڑا جائے۔"

"میرے بیان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں نے وہی بتایا جو سچ تھا۔ جو میں نے سنا اور دیکھا تھا لیکن میری بات پر یقین کسی نے نہیں کیا۔"

"وہ ایک الگ بات ہے۔ کیا تمہارے وکیل نے یا مخالف وکیل نے تم سے یہ سوالات نہیں پوچھے تھے۔ [illegible] ہوں؟"

"پوچھے تھے۔"

"پھر تم نے کیا بتایا تھا؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ جب میں نے دلاور کو پہلے کبھی [illegible] کیا تھا اس کو کہ اسے میری بیوی سے کیا دشمنی تھی کہ [illegible] شبلی کو کیوں مارنا چاہتا تھا اور اس کی ماں نے کیوں کہا تھا کہ [illegible] لیے اسے چھوڑ دو۔ انہوں نے میرے جواب کا نتیجہ یہی نکالا [illegible] نے جان بچانے کے لیے ایک کردار وضع کر لیا ہے اور [illegible] دلاور رکھ دیا ہے۔"

"تم سے دلاور کا حلیہ بھی پوچھا گیا ہوگا؟"

"بار بار۔ اور ہر بار میں نے ایک ہی چہرہ اور حلیہ بتایا [illegible] وکیل نے دلاور کی تلاش میں ناکامی کا ذمہ دار پولیس کو ٹھہرایا [illegible] کہا کہ انہیں جو آسانی سے مل گیا اسے وہ ملزم بنا کے مطمئن [illegible] ہیں خواہ اس اطمینان کے نتیجے میں ایک بے گناہ کو سزا [illegible] ہو جائے لیکن پولیس نے اس الزام کی تردید کی۔ انہوں نے [illegible] اس نام کے تین ایشیائی تلاش کر لیے گئے تھے۔ عدالت نے [illegible] انہیں پیش کیا گیا اور مجھے شناخت کے لیے بلایا گیا مگر ان میں [illegible] قاتل نہیں تھا۔ میں نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔"

میں نے کہا "جارج۔ کسی ملزم کو تلاش کرنے کے لیے [illegible] ایک اور طریقہ بھی استعمال کرتی ہے [illegible] IDENTIFICATION-KIT استعمال کرتے ہیں [illegible] بتایا جائے اس کے مطابق آنکھیں، ناک، کان اور چہرے [illegible] مختلف حصے جوڑ کر نئی چہرے بنا لیتے ہیں اور جو بیان کرنے [illegible] نزدیک ہو اسے مشتہر کرایا جاتا ہے۔ یا اس کام میں کوئی آرٹسٹ [illegible] کرتا ہے جو ملزم کا چہرہ تصور کی مدد سے بناتا ہے۔ یعنی جیسا بتایا جائے اس کے مطابق ہو۔ پھر اس میں ملزم کو شناخت کرنے [illegible] کی مدد سے تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ وہ [illegible] والا جیسا محسوس کرتا ہے ویسا ہی رد و بدل کرتے جاتے [illegible] کہ آنکھیں دیکھو۔ تھوڑی لمبی یا چھوٹی۔ ناک [illegible] پتلی یا پھیلی ہوئی۔ ایک جگہ شناخت کرنے والا کہتا ہے کہ [illegible] رائٹ۔ بالکل یہی ناک تھی۔ پھر آنکھیں۔ ہونٹ [illegible] ٹھوڑی۔ مٹاتے ہوئے بناتے بالآخر ایک ایسا چہرہ بن جاتا [illegible] نوے فیصد سے زائد مشابہت رکھتا ہے۔"

اس نے قدرے حیرانی سے کہا "ہاں میں نے سنا تو ہے [illegible] کسی نے بھی میری اس طرح مدد نہیں کی۔"

"یہ تمہارے وکیل کا کام تھا۔ وہ آرٹسٹ یا کٹ [illegible] دلاور کا چہرہ بنواتا اور پھر اسے مشتہر کیا جاتا۔ تم نے [illegible] بہت غور سے دیکھا تھا اور تمہیں تفصیلات اچھی طرح [illegible] سے غلطی نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر دلاور کی صورت [illegible] اسے اخبارات میں شائع کرا دیا جا سکتا تھا اور ٹی وی [illegible]

[illegible] تلخ لہجے میں کہا "شاید ایسا ہو سکتا تھا لیکن میرے لیے [illegible] کالا بھی تھا۔ اتنا امیر نہیں تھا کہ وکیل کی فیس [illegible] آرٹسٹ کو افورڈ کرتا اور پبلسٹی کے اخراجات۔ اخبار [illegible] علی کا سوال آج بھی نہیں۔ جب وہ حلیہ بدل کے آیا تب [illegible] پہچان لیا تھا میں نے کیونکہ اس کے پھیپھڑے تھے۔ اس کے [illegible] جانے کے بعد میں نے رات کو دو سگریٹ پیئے۔ پہلے سگریٹ کا مجھے [illegible] لطف آیا۔ دوسرے نے مجھے ناک آؤٹ کر دیا۔ میں نے اس کا [illegible] صرف ایک ہی کش لیا تھا۔"

"سگریٹ جیل حکام کو ملا ہوگا۔"

"ملا ہوگا لیکن انہوں نے اس کو غائب کر دیا۔ وہ ایسا نہ کرتے تو مشکل میں پڑ جاتے۔"

میں نے کہا "اور باقی پیکٹ؟"

"میں نے بتایا۔ مجھے نہیں معلوم۔ جب میں نے ایک کش [illegible] دوسرے کش سے تو میرے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔ یا شاید دل [illegible] بس وہ ایک سیکنڈ کی بات تھی۔"

"اس کا ذائقہ۔ یا جو تم کو کچھ یاد ہو۔"

جارج نے نفی میں سرہلایا "کچھ عجیب سی بو تھی۔"

میں نے کہا "جیسی کڑوے باداموں سے آتی ہے۔"

وہ چونک پڑا "رائٹ..... رائٹ۔ اب تم نے احساس دلایا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ وہ ایسی ہی بو تھی۔ تم نے کیسے جانا....."

"اس میں سائنائیڈ تھا۔ جو گیس کی صورت میں تمہارے سانس کے ذریعے پھیپھڑوں میں پہنچا اور خون میں شامل ہوا۔"

"سائنائیڈ! وہ کیا ہوتا ہے؟"

"ایک انتہائی مہلک اور قاتل زہر۔ گیس چیمبر میں سزائے موت کیسے دیتے ہیں۔ کیا تم جانتے ہو؟ ملزم کو اندر بند کرنے کے بعد سلفیورک ایسڈ میں سائنائیڈ کے دو چار کیپسول گرا دیے جاتے ہیں۔ اس سے سائنائیڈ گیس پیدا ہوتی ہے جو [illegible] کے سانس میں جاتی ہے اور فوراً ملزم کا خاتمہ کر دیتی ہے۔"

"پھر میں کیسے بچ گیا تھا؟" وہ سہم کے بولا۔

"سب سے اہم بات تو یہی ہے کہ خدا کو تمہیں زندہ رکھنا منظور تھا اور اس کی مرضی کے بغیر تمہاری جان کون لے سکتا تھا۔ تم اسے معجزہ کہہ سکتے ہو یا اپنی خوش قسمتی۔ تم نے ہلکا کش لیا یا پھر بہت کم مقدار میں گیس تمہارے پھیپھڑوں تک پہنچی۔ وہ کھلی جگہ [illegible] تم نے اسے ناک یا منہ کے راستے خارج کر دیا۔ وہ بہت [illegible] اس سے تم مرتے مرتے بچ گئے۔ یہ پکی بات ہے [illegible] لمبا گہرا کش لیتے تو وہ تمہاری آخری سانس ہوتی۔ چونکہ [illegible] تم پہلے [illegible] کر چکے تھے اس لیے تم نے دوسرے [illegible] سے لمبا کش نہیں لیا۔ جیسا پہلا سگریٹ جلا کے لیا ہوگا۔ [illegible] مفروضے پر بات کر سکتا ہوں۔ کیا وکیل نے تم سے یہ بھی [illegible] پوچھا تھا؟"

"کیا؟" جارج نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"سگریٹ کے کش کی بو کے بارے میں۔"

"پوچھا تھا۔ مگر کڑوے باداموں کی بو والی بات اس کے ذہن میں نہیں آئی۔ یا اسے معلوم نہیں تھی۔"

"چلو اللہ نے تمہیں بچایا۔ اب غور سے دیکھو۔ یہ دلاور کی تصویر ہے۔" میں نے ایک تصویر جیب سے نکالی۔ "دو سال پہلے بھی اس کی صورت یہی ہوگی۔"

"ہاں۔ بالکل یہی تھی۔" اس نے تصویر مجھ سے لے لی۔ "کیا اسے میں رکھ لوں؟"

"ہاں۔ یہ میں تمہارے لیے لایا تھا جارج" میں نے کہا "کل تمہارا وکیل آئے گا۔ وہی جس نے تمہاری پیروی کی تھی۔"

"اب وہ کیا کرے گا؟"

"وہ جیل حکام اور پولیس پر کیس کرے گا تمہاری طرف سے کہ ان کی غفلت کے باعث دلاور تم کو قتل کرنے کے لیے جیل میں پہنچ گیا تھا۔ اپنی بات پر قائم رہنا۔ جو سچ ہے وہی بتانا۔ میرے یہاں آنے کا کسی سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں لیکن یہ تصویر اس وکیل کو ضرور دے دینا کہ دیکھو۔ یہ ہے چوہدری دلاور۔ اس کی اصل تصویر۔"

باہر کھڑے ہوئے سارجنٹ نے ایک بار پھر اندر آ کے کہا "کیا تم دونوں یہاں ساری رات باتیں کرو گے؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "کیا تمہارے افسران بالا نے ملاقات کے وقت کی کوئی حد مقرر کی تھی؟"

وہ اس براہ راست سوال کے لیے تیار نہ تھا "حد..... مقرر کرنے کا کیا سوال۔ تم کو خود ہی خیال رکھنا چاہیے۔"

میں نے کہا "میں جس حد تک خیال رکھ سکتا تھا میں نے رکھا۔ اس سے زیادہ کی مجھے استطاعت نہیں تھی۔ استطاعت کا مطلب سمجھتے ہو نا تم..... اور تمہارے افسران نے اجازت نامہ مرحمت فرماتے وقت صرف رازداری پر زور دیا تھا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ شارٹ ہینڈ میں بات کرنا۔"

اس نے برا سا منہ بنایا اور واپس چلا گیا "میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔"

یہ اس کے لاجواب ہونے اور منہ کی کھانے کی دلیل تھی۔

جارج نے اسے گالی دی "تم نے دماغ درست کر دیا اس کا۔"

میں نے کہا "تم میری بات دھیان سے سنو۔ دلاور کی تصویر کی ایک نقل جاتے وقت میں تمہارے وکیل کو دے جاؤں گا۔ دلاور کا یہاں گرفتار ہونا محض اتفاق پر منحصر ہے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ وہ پھر بھیس بدل لے گا لیکن ابھی لندن میں ہی رہے گا۔ صبح جب وکیل تم سے ملنے آئے تو تم اسے تصویر دینا اور بتانا کہ یہ ہے وہ شخص جس کے جرم کی سزا میں کاٹ رہا ہوں۔ یہ کوئی فرضی شخص نہیں ہے۔ یہ لاہور میں رہتا ہے۔ اس کا ایک خاندان ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں اور کاروبار ہے۔ اس کے سب سے بڑے بیٹے

www.paksociety.com

فیصل ہے۔"

"لیکن ۔۔۔ وکیل پوچھے گا کہ تصویر کہاں سے آئی ۔۔۔ اور تم کو یہ ساری معلومات کس نے فراہم کردیں؟"

"جواب آسان ہے۔ ایک ہمدرد نے۔ میں اسے نہیں جانتا لیکن یہ ساری باتیں غلط نہیں اور کوئی غلط سمجھتا ہے تو تصدیق نہیں کرسکتا ہے یا کرا سکتا ہے۔ چوہدری دلاور نے یہاں آکے اپنی سوتیلی ماں کو قتل کیا۔ شیلی کے دھوکے میں تمہاری گرل فرینڈ کو مار دیا اور بھاگ گیا لیکن اس نے شیلی کے قتل کا ارادہ ترک نہیں کیا تھا۔ ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اپنی سوتیلی بہن کو دھوکے سے لاہور بلایا۔ ظاہر یہ کیا کہ سوتیلا ہونے کے باوجود وہ اس کا بڑا بھائی ہے اور اس کی خواہش ہے کہ ماں باپ دونوں کے مرجانے کے بعد وہ لندن میں اکیلی نہ رہے بلکہ لاہور میں اس کے ساتھ رہے۔ وہاں پریکٹس کرے ۔۔۔ وہ ڈاکٹر ہے تو اسے ایک اسپتال کا مالک اور نگراں بنایا جاسکتا ہے۔"

"کیا اس نے ایسا ہی کیا تھا؟"

"میں تمہیں کسی فلم کی کہانی نہیں سنا رہا ہوں۔" میں نے برہمی سے کہا "یہ سب حقائق ہیں۔ وہ واقعات جو پیش آچکے ہیں۔ تمہیں سب یاد رہے گا یا میں لکھ کر دے دوں۔"

"نہیں ۔۔۔ میں یہ سب کیسے بھول سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "جارج۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں صرف ایک کام کرنا ہے۔ تمہیں صرف دلاور کو عدالت میں شناخت کرنا ہوگا۔ سب کے سامنے۔"

"کون سی عدالت میں؟"

میں نے کہا "یہاں نہیں ۔۔۔ تم کو بہت دور جانا پڑے گا۔ پاکستان ۔۔۔ اس کا ایک شہر ہے لاہور۔"

"مگر میں لاہور کیسے جاؤں گا۔"

"تمہیں بلایا جائے گا۔" میں نے کہا "عدالتی حکم پر ۔۔۔ اس کے اخراجات بھی تم ادا نہیں کرو گے لیکن یہ سمجھ لو کہ اس پر تمہاری زندگی اور موت کا انحصار ہے۔ تم نے دلاور کو شناخت کرلیا تو تمہاری صداقت ثابت ہوجائے گی۔ یہ مان لیا جائے گا کہ تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔"

"جب دلاور یہاں ہے ۔۔۔ اور میں اسے یہاں شناخت کرسکتا ہوں۔"

میں نے انکار میں سر ہلایا "وہ پاکستان سے بھاگ کے یہاں آیا ہے۔ وہ فرار نہ ہوتا تو گرفتار ہوجاتا۔ پہلے بھی وہ پولیس کی حراست سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اب پکڑا گیا تو شاید اس کی ضمانت بھی منظور نہیں ہوگی۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ اس پر ایک نہیں کئی سنگین نوعیت کے مقدمات ہیں۔"

"کیا ان میں میرا مقدمہ بھی شامل ہے؟"

"ہے۔ ابھی تک نہیں ہے لیکن ہوجائے گا۔" میں نے کہا "۔۔۔ پر ایک کیس ہے۔ ڈاکٹر شیلی کے قتل کا۔"

"شیلی کا قتل؟"

"ہاں۔ اس نے شیلی کو دھوکے سے لاہور بلایا مگر شیلی نے اسے قریب سے دیکھا تو اسے دلاور سے نفرت ہوگئی۔ یہ چوہدری دلاور میرے باپ کا قاتل بھی ہے ۔۔۔ اور میرا ... نے بتایا اس نے میرے باپ سے اس کا سب ... مقدمہ الگ ہے۔ دلاور نے شیلی کو لندن سے بلایا تو میرا اور ... جھگڑا چل رہا تھا۔ میرا اور دلاور کا۔ دلاور نے شیلی کو مجھ سے ... کرنے کی پوری کوشش کی مگر ہوا یہ کہ شیلی کو حقائق کا علم ... اسے یہ پتا چل گیا کہ میرے والد کو قتل کرنے یا کرانے کے ... نے دوسرا قتل اپنے کاروبار میں شریک میر شرافت علی کا کرایا ... میرے والد ایک پارٹنر تھے۔ دلاور دوسرا اور میر شرافت علی ... جب دو قتل ہوگئے تو سارا کاروبار جائداد اور اثاثے چوہدری دلاور کے قبضے میں چلے گئے۔ میر شرافت علی کا وارث ... اپنے والد کا میں ایک ہی بیٹا تھا۔ مجھے راستے سے ... ہی ... سکتا تھا۔ اس نے بڑی چالاکی سے میر شرافت علی کے قتل میں مجھے ملوث کرایا۔ اس خیال سے کہ مجھے پھانسی ہوجائے گی ... کا راستہ صاف ہوجائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں نے ... بے گناہ ثابت کرنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو میں کرسکتا تھا۔ ... اور غیر قانونی سب حربے استعمال کیے۔ جب مسئلہ زندگی ... اتنی آسانی سے کوئی بھی سازش کا شکار ہو کے جان دینے ... نہیں ہوسکتا۔ اس نے میرے والد کو پھر ان کے پارٹنر کو قتل ... اچھے خاصے دولت مند تھے۔ انھیں قلاش کردیا اور اب ... کہ مجھے بھی ہلاک کرادے۔ میں مقابلہ کیوں نہ کرتا۔ ... میرے اور اس کے درمیان دشمنی کا آغاز ہوا۔ وہ ایک چالاک ... بے ضمیر آدمی ہے جب اس نے بہت سے ناجائز کاروبار اپنے ... شروع کردیے تھے جو سو فی صد غیر قانونی تھے اور وہ ... زمرے میں آتے تھے۔ اسی کی وجہ سے لندن میں میری ... آخری اسٹیج پر نامکمل رہ گئی تھی۔ اب میں کہاں تک ... میرے ساتھ دشمنی میں اس نے میرے دوستوں کو نہیں ... ان کے خاندان کو ختم کرادیا۔ میرے ایک دوست کی ... اس کے ہاتھوں جس بے رحمانہ طریقے پر ہلاک ہوئے ... ایک سابقہ منگیتر تھی۔ وہ اور اس کا شوہر مارے گئے ... ہراساں کرنے اور مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے تھا کہ میں ... خلاف اپنی جنگ ختم کردوں۔ اپنے حق سے دستبردار ... کبھی ایسا ہوسکتا تھا؟ اس نے مجھے خریدنے کے لیے ... پیش کی تھی کہ میں اس کا پیچھا چھوڑ دوں۔ ... ہوجاؤں یا اس کا پارٹنر بن جاؤں۔ لیکن دلاور جیسے ... چھوڑنا شیطان کو بخشنے سے زیادہ سنگین جرم ہوتا۔ جب ... ساری باتیں معلوم ہوگئیں تو اس نے اپنے سوتیلے بھائی کو ... اور مجھ سے مل گئی۔ کچھ حالات ایسے ہوگئے کہ اسے دلاور ... محسوس ہوا اور میں نے اس کی مدد کی مگر میری مدد اسے بچا نہ ...

دلاور نے اسے اس طرح مروا دیا کہ بظاہر وہ حادثہ معلوم ہو مگر مجھ سے پہلے میرے بہت سے دوست وکیل عدالت سے لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے کے احکامات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ لاش دوبارہ کھود کے نکالی گئی۔ دلاور نے کوشش کی تھی کہ لاش کو پہلے ہی قبر سے غائب کرادے۔ اس نے اسپتال کے مردہ خانے سے بھی لاش لے جانی چاہی تھی لیکن ہمیں اندازہ تھا کہ وہ کس انتہا تک جاسکتا ہے۔ ہم نے پہلے ہی اس کے خلاف پوری منصوبہ بندی کرلی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے اس کا جرم ثابت ہوگیا اور وہ پکڑا گیا لیکن پھر وہ کسی طرح فرار ہوگیا۔ اس عرصے میں ہمیں یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ لندن میں اس نے دو قتل کیے تھے جن کے عینی شاہد کو بھی یعنی تمہیں مجرم بنا کے عمر قید کی سزا دے دی گئی ہے۔ ہم نے تمہارا سراغ لگانے اور تمہیں دلاور کو شناخت کرنے کا موقع دلانے کا فیصلہ کیا۔ یہی سچ ہے جارج۔ تم یقین کرو ہو۔ باقی جتنے قتل دلاور نے کیے ہیں یا کرائے ہیں ان کا چشم دید گواہ کوئی نہیں ہے۔ صرف واقعاتی یا حالات کی شہادت اسے مجرم ثابت کرتی ہے۔ اس کے خلاف بڑے ٹھوس ثبوت ہیں اور جب وہ پکڑا جائے گا۔"

جارج نے مایوسی سے کہا "وہ کہاں پکڑا جائے گا۔"

"نہیں جارج۔ اب اس شخص کو ہر طرف موت کا جال نظر آرہا ہے۔ جو کبھی خود کو موت کا شکاری کہتا اور سمجھتا تھا۔ اس کے لیے فرار کے راستے بھی بند ہوتے جارہے ہیں۔ یہ صرف وقت کی بات ہے۔ قضا کو دھوکا کون دے سکتا ہے۔ اب جو کچھ وہ کررہا ہے وہ مایوسی اور دیوانگی کی انتہا کو پہنچ کر سوچے سمجھے بغیر کررہا ہے۔ دلاور کو پتا چل گیا تھا کہ ہم تمہیں پھر عدالت میں اسے شناخت کرانے کے لیے پیش کرنے کے چکر میں ہیں۔ وہ ہم سے پہلے یہاں پہنچا اور اس نے تمہیں بے وقوف بنا کے قتل کرنے کی کوشش کی لیکن جارج۔ جب بُرا وقت آتا ہے تو سیدھا کام بھی اُلٹا ہوجاتا ہے اور انسان کی کوئی تدبیر نہیں چلتی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم نے اسے پہچان لیا حالاں کہ اپنی طرف سے وہ بھیس بدل کے آیا تھا۔ جب یہ چال ناکام ہوگئی تو اس نے فوراً ایک کہانی گھڑلی۔ وہ بلاشبہ ذہین آدمی ہے۔"

"شیطان کی طرح ذہین ہے۔"

"ہاں۔ اس نے تمہیں قائل کرلیا کہ وہ ضمیر کی خلش سے پریشان ہو کر خود کو قانون کے حوالے کرنا چاہتا ہے حالاں کہ ضمیر نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کہتا تو تم اس کے ساتھ دشمنی کا رویّہ رکھتے۔ وہ سگریٹ پیش کرتا تو تم اس کے منہ پر مار دیتے۔ اس کی ذہانت کا یوں اندازہ کرو کہ جب وہ تم سے ملنے پہنچا ہوگا تو اس کے پاس تم سے دوستانہ سلوک کے لیے دوسری کہانی ہوگی۔ جب غیر متوقع طور پر تم اسے پہچان گئے تو اس کو نئی کہانی بنانے میں کوئی دیر نہیں لگی اور وہ تم کو قائل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے نزدیک سب سے خطرناک دشمن تم ہو لیکن یہ دیکھو کہ اب دلاور کی تقدیر اسے کس طرح دھوکا دے رہی ہے۔ تم اس کا دیا ہوا زہریلا سگریٹ پینے کے باوجود زندہ ہو اور میں تم سے مل کر یہ سب کچھ بتانے یہاں پہنچ گیا ہوں۔ حالاں کہ جب میں لندن آیا تھا تو مجھے یہ کام بہت مشکل دکھائی دیتا تھا۔ اگر تم جیل میں ہوتے تو یقیناً تم سے مل کر اتنی باتیں کرنا آسان نہ ہوتا مگر قدرت نے اسباب پیدا کردیے۔ دشمنی کی آگ میں دلاور نے دباؤ میں آ کے جیل کے حکام اور پولیس والے۔ انھیں خود کو بچانے کے لیے اس ملاقات کی اجازت دینی پڑی۔ اب وہ تم سے کہیں گے کہ تم ان کے خلاف کوئی بیان مت دو۔"

"پھر کیا کروں؟"

"صبح جب تمہارا وکیل آئے تو تم وکیل سے کہو کہ جیل حکام نے رشوت لی ورنہ حفاظتی انتظامات اتنے سخت ہونے کے باوجود دلاور کیسے جیل کے اندر پہنچ گیا۔ جیل حکام پر میرے قتل کی سازش میں شریک ہونے کا جرم ثابت ہوتا ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ مجھے مروا دیا جائے گا۔ یہی خطرہ مجھے پولیس سے ہے۔ میرے ساتھ نسلی تعصب کی بنا پر پہلے بھی انصاف نہیں ہوا تھا اور اب پھر مجھے جیل کے اندر ہی ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی۔ پولیس اور جیل کے حکام اصل قاتل کو بچارہے ہیں۔ تمہارا بیان اخباروں میں آجائے گا اور جو کالے لوگوں کی جیل میں بند قیدیوں کی فلاح کی اور انسانی حقوق کی تنظیمیں ہیں وہ سب تمہارا کیس خوب اُچھالیں گی۔ ہنگامے اور مظاہرے کرادیں گی۔ اس کا مقصد صرف یہ ہوگا کہ تمہاری حفاظت اور نگرانی کے معاملے میں وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہوجائیں۔ دلاور کسی اور طریقے سے تم کو ہلاک نہ کراسکے۔ تمہیں تو زندہ رکھنا جیل والوں کی ذمے داری ہوجائے گی۔ تمہارا زندہ رہنا ہی اہم ہے۔ لاہور کی عدالت میں ہم خود تمہیں بلوالیں گے۔ یہ کام تمہارا وکیل کرے گا لیکن یہاں تمہارا ایک اور اہم مددگار ہے حاجی علم دین۔ وہ ایک اخبار کا ایڈیٹر ہے۔"

"اخبار کا ایڈیٹر؟ کیا نام بتایا ہے تم نے؟"

"حاجی علم دین۔ اس کے اخبار کا نام ہے طوطی۔"

"طوطی ۔۔۔؟" اس نے حیرانی سے دُہرایا "کبھی سنا نہیں۔ واٹ اے فنی نیم۔" اس نے پھر حاجی کا نام دُہرایا "وہ کیوں میرا دوست ہے؟"

"اس لیے کہ وہ میرا دوست ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ میرے لیے کیا کرے گا؟"

"وہ تم سے پاور آف اٹارنی لے گا۔ تمہارے دستخط حاصل کرے گا تاکہ اسے قانونی طور پر تمہاری طرف سے کوئی درخواست دائر کرنے کا حق حاصل ہوجائے۔ پھر وہ عدالت میں درخواست دے گا کہ تمہیں لاہور بھیجا جائے جہاں ایک عدالت میں چوہدری دلاور کے خلاف قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔ وہ اپنے اخبار کے ذریعے ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس کی ساری روداد عام کردے گا اور تمہارے حق میں مہم چلائے گا۔ جیسے ہی چوہدری دلاور پکڑا گیا ...

www.paksociety.com

بھی شناخت کے لیے لاہور بھیجنے کا انتظام کیا جائے گا۔ تم جانتے ہو شناخت کیسے کرائی جاتی ہے؟ دلاور کو چار پانچ دوسرے لوگوں کے درمیان کھڑا کردیا جائے گا اور تم سے کہا جائے گا کہ اب بتاؤ دلاور کون ہے؟ تم نے تصویر دیکھی اب یہ مجھے واپس کردو تاکہ تمہاری پوزیشن ٹھیک رہے۔ یہ نہ کہا جائے کہ تم کو شناخت کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ تمہاری نظر اور یادداشت قابل تعریف ہے کہ تم نے چوہدری دلاور کو حلیہ بدلنے کے باوجود پہچان لیا تھا۔ آئندہ بھی تم اسے پہچان لوگے یہاں حاجی علم دین تمہارے وکیل کو......"

سارجنٹ نے اچانک اندر آتے ہوئے کہا "یو فول۔ تم نے میری بات نہیں مانی اپنے ساتھ مجھے بھی مشکل میں ڈالا۔"

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

مگر اس کے جواب دینے سے پہلے تین افراد اندر آگئے۔ ان میں ایک کوئی پولیس افسر تھا۔ دوسرا اسپتال کی سیکیورٹی کے عملے کا رکن نظر آتا تھا۔ تیسرا ڈاکٹر بھی ہوسکتا تھا اور اسکاٹ لینڈ کا سراغ رساں بھی۔

تیسرے شخص نے مجھ سے کچھ فاصلے پر رک کے مجھے غور سے دیکھا "تم وقار یوسف ایڈووکیٹ ہو؟"

میرے لیے اقرار کرنا لازمی ہوگیا "ہاں۔ مگر۔"

"اگر مگر مت کرو۔ تم نے لیڈی الزبتھ گورڈن کو فون کیا تھا؟ ایک پبلک کال آفس سے...... میں پولیس کا سراغ رساں ہوں۔"

اس نے اپنے شناختی کارڈ کی جھلک دکھائی۔

"کیا انہیں فون کرنا جرم ہے۔"

"نہیں۔" سر رچرڈ گورڈن کی کار میں بم رکھنا بھی جرم نہیں۔ لیکن سکندر بخت کا وقار یوسف بن کے ویزا کے بغیر لندن آنا بہت سنگین جرم ہے۔ باقی جرائم کا مسئلہ اس کے بعد......"

میں نے بہت دیر کردی تھی اور دشمنوں کو میرا سراغ لگا کے مجھ تک پہنچنے کا موقع مل گیا تھا۔ اب میں بے بس اور مجبور تھا۔ سراغ رساں کے پیچھے پولیس افسر اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے کھڑا تھا اور اتنے کم فاصلے سے اس کا نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی مجھے مار دینا میری گرفتاری سے زیادہ فائدہ مند تھا۔ یہ کہا جاسکتا تھا کہ میں نے مقابلہ کرکے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ پولیس کے لیے قانونی اور عدالتی مسائل یہیں ختم ہوجاتے تھے۔ شاید میرے رقیب اور دشمن گورڈن کی دلی خواہش بھی یہی ہوگی۔ ممکن ہے درپردہ اس نے پولیس کو ہدایت بھی کی ہو کہ موقع ہے تو۔ کِل دیٹ باسٹرڈ۔ برطانوی پولیس اور حکومت کے لیے میں انتہائی ناپسندیدہ شخص پہلے سے تھا۔

میں نے کہا "آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟"

"پہلے تو اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔" سراغ رساں ٹائپ شخص بولا۔

"وہ کیوں؟" میں نے معصومیت سے سوال کیا۔

"تاکہ ہم تمہاری تلاشی لے سکیں۔"

"ہم یعنی تم سب باری باری ایک شریف آدمی کی تلاشی لوگے؟ تم نے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔"

"صرف میں تلاشی لوں گا۔" پولیس افسر ٹائپ شخص غرایا۔

"اور تم کوئی شریف آدمی نہیں ہو۔"

"کون شریف ہے اور کون نہیں ہے؟ اس کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔ میرے پاس ڈیوک آف ایڈنبرا..."

"شٹ اپ۔ ہاتھ اٹھاؤ اپنے ورنہ......"

میں نے کہا "ورنہ تم اسپتال کے ایک کمرے میں فائر کرکے ایک غیر ملکی کو قتل کردوگے؟ اتنے گواہوں کی موجودگی میں؟ غیر ملکی کوئی عام آدمی نہیں بلکہ قانون کو جاننے اور سمجھنے والا وکیل ہے۔"

سراغ رساں بولا "تم بکواس کرتے ہو۔ تم وکیل نہیں ہو۔"

"تم میرا پاسپورٹ دیکھ سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"وہ جعلی ہے۔"

میں نے کہا "اس کو جعلی کہنے سے حکومت پاکستان پر الزام آتا ہے کہ وہ جعلی پاسپورٹ بھی جاری کرتی ہے۔ اس سے دونوں ممالک کے تعلقات متاثر ہوسکتے ہیں۔ آخر ہم دولت مشترکہ میں شامل ہیں۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" سراغ رساں بولا۔

میرا مقصد انہیں باتوں میں لگا کے سوچنے کی مہلت حاصل کرنا اور کچھ کرنے کا موقع تلاش کرنا تھا — میرے اعتماد نے انہیں تذبذب میں مبتلا کردیا۔

"میں نے سنا تھا کہ برطانیہ میں جمہوریت ہے۔ قانون کے تحت ہر ملزم کو گرفتاری سے پہلے اس کے حقوق سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے اور قانون میں نسلی تعصب کی گنجائش نہیں ہے؟"

سراغ رساں بولا "اس میں کیا غلط ہے؟"

میں نے کہا "یہ جو کچھ تم کررہے ہو یہ دھاندلی ہے، لاقانونیت ہے اور غنڈا گردی ہے۔ چونکہ میں اور میرا موکل سفید فام نہیں ہیں۔"

"مسٹر! تم کو جو کچھ کہنا ہے پولیس اسٹیشن جاکے کہنا۔"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ جب تک مجھے معلوم نہیں ہوگا مجھے کیوں اور کس قانونی اختیار کے تحت گرفتار کیا جارہا ہے میں گرفتاری نہیں دوں گا بلکہ مزاحمت کروں گا۔ جارحیت کے خلاف... دفاع ہر شہری کا اور ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں میں مارشل آرٹ میں بلیک بیلٹ ہولڈر ہوں۔ مجھے پکڑنے کے لیے تمہیں مجھ پر گولی چلانی پڑے گی کیونکہ ایک جو میرے دل میں یا سر میں لگے۔ ہاتھ ٹانگ کے زخم سے معذور ہونے والا نہیں۔ مجھ سے دور رہو، مجھے اور پہلے مجھے بتاؤ تم کون ہو؟"

سراغ رساں نے پریشانی سے کہا "میں نے ابھی اپنا شناختی کارڈ تم کو دکھایا تھا۔"

"اتنی دور سے کوئی دوربین لگائے بغیر کیسے دیکھ سکتا ہے کہ اس پر تمہارا نام ہے اور تمہاری تصویر ہے......"

اس نے پھر کارڈ نکالا اور میری ناک کے سامنے کردیا۔ "پھر دیکھو... میں لیفٹیننٹ تھامس ہوں۔"

"رائٹ۔ میں نے دیکھ لیا۔" میں نے کہا "اب یہ دوسرا کون ہے جو یہ توپ اٹھائے کیوں کھڑا ہے؟"

"یہ پولیس سارجنٹ ایبرے ہے۔" تھامس بولا۔

"کیا تم اس کے وکیل ہو؟" میں نے کہا "یا یہ کالے لوگوں کے سامنے اپنی قانونی پوزیشن کی وضاحت کرنے کو توہین خیال کرتا ہے؟"

اب سارجنٹ نے اپنا شناختی کارڈ نکالا۔ زیر لب کچھ کہتے ہوئے اس نے کارڈ میرے سامنے کیا۔ "پڑھ لو، اچھی طرح دیکھ لو۔"

"دیکھ لیا۔ مگر تم نے مجھے گالی کیوں دی؟"

"کون کہتا ہے؟"

"میں نے خود سنا۔ تم نے مجھے گالی دی ہے۔ میں اس کی رپورٹ اپنے ہائی کمشنر کو اور تمہارے پولیس کمشنر کو کروں گا۔"

"تم اس کی رپورٹ کوئین کو کرو......"

"یہ جملہ بھی میں ضرور لکھوں گا...... جارج تم گواہ رہنا۔" میں نے کہا۔

جارج نے کہا "میں سب دیکھ اور سن رہا ہوں۔"

میں نے کہا "اب میری گرفتاری کی وجہ بتاؤ۔"

"تم غلط نام سے برطانیہ میں داخل ہوئے ہو۔" تھامس بولا۔

"پہلے تم نے پاسپورٹ کو جعلی کہا، اب میرے نام کو۔ جارج تم گواہ رہنا۔"

جارج نے کہا "میں سب دیکھ اور سن رہا ہوں۔"

"سکندر بخت کے برطانیہ میں داخلے پر پابندی ہے" تھامس بولا۔ "پولیس ریکارڈ کے مطابق سکندر بخت کو یہاں سے جبراً ڈی پورٹ کیا گیا تھا... ناپسندیدہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے باعث۔"

میں نے برہمی سے کہا "آخر یہ سکندر بخت کون ہے جس کا نام بار بار لیا جارہا ہے میرے سامنے۔"

"تم ہو سکندر بخت۔" تھامس نے میرے سینے پر انگلی رکھی۔

"تم نے مجھے دھکا دیا! اسپتال میں... جارج گواہ رہنا۔"

جارج نے کہا "میں سب دیکھ اور سن رہا ہوں۔"

"کیا تم سکندر بخت ہونے سے انکار کرتے ہو؟" تھامس نے کہا۔

"آف کورس۔ میں لارڈ آف لندن یا ڈیوک آف ایڈنبرا ہونے سے بھی انکار کرسکتا ہوں کیونکہ میں وقار یوسف ایڈووکیٹ ہوں۔"

"یہ ثابت ہوجائے گا پولیس اسٹیشن جاکے......" تھامس نے کہا۔

میں نے کہا "اگر مجھے اختیار ہو تمہیں اپنے ملک کے پولیس اسٹیشن لے جانے کا تو یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ تم لیفٹیننٹ تھامس نہیں، بھوت ہو۔"

"تم وقت ضائع کررہے ہو۔ ہمیں زبردستی پر مجبور مت کرو۔" سارجنٹ ایبرے نے غرا کے کہا۔

"زبردستی کی دھمکی مت دو۔ تمہیں بڑی گھمسان کی جنگ لڑنی پڑے گی مجھے قابو کرنے کے لیے۔" میں نے سنبھل کے کہا "اس بات کے امکانات بہت روشن ہیں کہ تم میں سے دو تہائی اس کوشش میں معذور ہوجائیں۔ میں ان کی ٹانگیں توڑ دوں گا، سر پھاڑ دوں گا، کپڑے پھاڑ دوں گا۔ پیٹ پھاڑ دوں گا۔"

"مزاحمت کی صورت میں ہمیں گولی مارنے کا پورا قانونی اختیار حاصل ہے۔" سارجنٹ آگے بڑھا۔

"تمہیں مریض کو بھی گولی مارنی پڑے گی۔ ورنہ یہ تمہارے خلاف گواہی دے گا۔ تم اسپتال میں دو قتل نہیں کرسکتے۔ سیاہ فام جارج کے حق میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ شدید ہوجائیں گے لیکن اس کے بعد پاکستان کے وکیل عالمی عدالت انصاف میں احتجاج کریں گے۔ اقوام متحدہ کے سامنے دھرنا دیں گے...... ممکن ہے دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ جائے......"

ابھی تک مجھے اتنی بکواس کرکے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ مستعد ہوگئے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میں باتوں میں وقت ضائع کرکے مہلت حاصل کررہا ہوں۔ سارجنٹ ایبرے کے تیور بتارہے تھے کہ وہ میری دھمکیوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا اور ضرورت پڑنے پر مجھے گولی مارنے میں ذرا تامل نہیں کرے گا۔

گرفتاری میرے سارے منصوبے کی تباہی اور میری بربادی کے مترادف تھی اور سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم اٹھانا بہت خطرناک ہوا تھا جس میں میری جان جاسکتی تھی اور میں نے اتنا طویل سفر اتنی مشکلات سے نبرد آزما ہوکے اور خطرات مول لے کے اس لیے نہیں کیا تھا کہ لندن میں ایک سارجنٹ مجھے اس طرح گولی مار دے جیسے وہ کسی تھرڈ کلاس اخلاقی مجرم کو چوری ڈکیتی کے بعد فرار ہونے پر مارتا ہے۔

"اب میں تین تک گنوں گا۔" سارجنٹ نے کہا۔

"کیا اس کے بعد تمہیں گنتی نہیں آتی؟"

اس نے کہا "ون...... ٹو......"

"اوکے... اوکے، میں ہاتھ اوپر اٹھا رہا ہوں۔" میں نے کہا اور ہاتھ اٹھالیے۔

وہ بولا "ہاتھ اوپر اٹھا کے گھوم جاؤ۔ اپنا منہ دیوار کی طرف کرلو۔"

میں نے کہا "اُدھر دیوار نہیں کھڑکی ہے۔"

اس وقت وہ ہوا جو غیر متوقع تھا مگر مجھے اسی غیر متوقع کا انتظار

www.paksociety.com

تھا اور اسی غیر متوقع لمحے پر میری بقا کا انحصار تھا۔ اسی غیر متوقع اتفاق سے میری تمام امیدیں وابستہ تھیں۔

جارج نے بیڈ سائڈ پر سے ایک بار شیشی میں سے کوئی گولی نکال کے استعمال کی تھی۔ دوسری بار اس نے پانی پیا تھا۔ تیسری بار اس نے یہ ظاہر کیا جیسے اس کو پیشاب کی حاجت ہے۔ اس نے بیڈ کے نیچے سے پین PAN اٹھایا۔ یہ پین ہر بیڈ کے نیچے موجود تھے لیکن ہر مریض کے لیے ان کا استعمال لازمی نہیں تھا۔ جو صحت مند تھے اور اٹھ کے باتھ روم تک جا سکتے تھے وہ ایسا ہی کرتے تھے۔ جارج کی حالت ہرگز اتنی خراب نہیں تھی کہ وہ اٹھ بھی نہ سکے مگر پولیس کے آتے ہی وہ صد درجے بیمار اور معذور بن گیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا کراہتا رہا تھا اور یہ ظاہر کرتا رہا تھا جیسے وہ سخت اذیت میں ہے۔

جب وہ بیڈ پین اٹھانے کے لیے جھکا تو کسی نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے نزدیک یہ مریض کا بنیادی حق تھا مگر جارج نے اس کا غلط استعمال کیا۔ وہ کراہتا ہوا سیدھا ہونے کی کوشش میں بستر سے گر گیا۔ اس سے دھماکا ہوا اور کمرے میں موجود دو حملہ آوروں کی توجہ اس کی طرف ہو گئی۔ تیسرا خود سارجنٹ تھا جو ایسے مواقع کی نزاکت کو سمجھتا تھا۔ اس کی نیت اور پوز میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ بدستور مجھ پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔

جارج صرف چند سیکنڈ بے حس و حرکت رہا پھر اس نے بیڈ کے ساتھ ہی سرہانے کی طرف رکھا ہوا لوہے کا صلیب جیسا اسٹینڈ پکڑ لیا۔ اس کے نچلے حصے میں فرش پر چار پائے تھے مگر اس چوپائے میں رولر لگا دیے گئے تھے تاکہ اسے اشارے پر ہر جگہ چلا کے لے جایا جا سکے۔ اوپر چھ فٹ کا چپٹا ڈنڈا تھا اور سب سے اوپر دو بازو سے چپکے ہوئے تھے۔ ان بازوؤں کے آخر میں ہک تھے جو خون اور گلوکوز کی بوتلیں لٹکانے کے کام آتے تھے۔

جارج نے اسٹینڈ کو بڑی محنت اور مہارت سے اور نشانہ لے کر گرایا بلکہ سارجنٹ کے اس ہاتھ پر مارا جس میں ریوالور تھا۔ لوہے کا ڈنڈا اچھی خاصی قوت کے ساتھ سارجنٹ کی کلائی پر لگا تو اس نے چلا کے کہا "یو باسٹرڈ" اور ہاتھ کو تکلیف سے جھٹکا۔ اس کا چہرہ بھی چوٹ کی تکلیف سے بگڑ گیا تھا۔ ریوالور خود ہی اس کے ہاتھ سے نکل کے دیوار پر لگا اور اس سے پہلے کہ لیفٹیننٹ تھامس سنبھلتا، صورت حال کو سمجھتا اور کچھ کرتا، جارج نے بڑی پھرتی سے ریوالور اٹھا لیا۔

"بس... سیدھے کھڑے رہو سب۔" اس نے پرسکون مگر خطرناک لہجے میں کہا "مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں پہلے ہی عمر قید کاٹ رہا ہوں۔"

تھامس نے کہا "کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟"

"ہاں۔ پاگل بہت پہلے ہو گیا تھا۔ جب تمہارے قانون اور تمہاری انصاف دلانے کی دعوے دار عدالتوں نے مجھے ناکردہ جرم کی عمر قید کی سزا دی تھی۔ میری جگہ تم ہوتے لیفٹیننٹ تھامس تو اپنی بے بسی کا اور مظلومیت کا احساس تم کو بھی پاگل کر دیتا۔ اگر [illegible] سے زیادہ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"تم کیوں الیکٹرک چیئر پر بیٹھنا چاہتے ہو؟" میں بولا۔

"تم جیسے دو ٹکے کے مارے میں بڑی خوشی سے کہیں بھی [illegible] ہوں۔ الیکٹرک چیئر ہو یا گیس چیمبر۔ تم اپنے بیوی بچوں، خاندان کے بارے میں، اس دنیا کے بارے میں اور اپنے بارے میں سوچو اور زندہ رہنا چاہتے ہو تو [illegible] دو۔ بالکل خاموشی سے کھڑے رہو۔ ذرا غلط حرکت کی تو [illegible] پاگل کے مقابلے میں اپنی عقل اور چالاکی پر ناز کیا یا بہادری کے جذبات کا مظاہرہ کیا تو سب چھوٹ جائے گا۔ دنیا کا عیش و آرام اور خاندان، یہ عہدہ اور اس کا اختیار۔ ایک منٹ ہو گا تم لیفٹیننٹ وغیرہ کہلاؤ گے اور جہنم میں اپنے پردادا کو اپنی بچپن سے بھری واردات کی کہانی سنا رہے ہو گے۔"

اسپتال کا سیکیورٹی کا بندہ ابھی تک غیر جانبدار مبصر کا رول ادا کر رہا تھا۔ اسے قطعی دلچسپی نہ تھی کہ کون کس کے ساتھ پیش آتا ہے اور کیا کرتا ہے؟ وہ خانہ پری کے لیے انتظامیہ کی نمائندگی کرنے پولیس کے ساتھ گیا تھا۔ پولیس کا کام ہے بکنا وہ جانیں یا جوزف۔ مگر میری اور پولیس کی مکالمے بازی شروع ہوئی تو اس کو کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ پھر صورت حال مرنے مارنے تک پہنچ گئی تو وہ نروس نظر آنے لگا۔ پولیس کا اور مجرموں کا قانون [illegible] میں ایک دوسرے کے ہاتھوں موت ہونا برحق۔ وہ کیوں اس کی [illegible] کی طرح مارا جائے جو بڑے شوق سے سانڈوں کی لڑائی دیکھنے کے لیے تالاب سے نکلا ہو۔

اس موٹے والے نے کہا "جارج، زندگی ہم سب کے لیے ایک نعمت ہے۔"

"تمہارے لیے ہو گی۔ میری جگہ جیل میں آ کے گزارو تو تمہارے نظریات بھی بدل جائیں گے۔ میں نے ساری زندگی میں کبھی اسپرے نہیں کیا تھا کہ مجھ پر جراثیم کو ہلاک کرنے کا [illegible] کوڑے مارنے کا الزام آتا مگر مجھے سزا ہوئی، دوہرے قتل کے کیس میں۔ مجرم تو ان کے ہاتھ آیا نہیں، انہوں نے مجھے ساری عمر [illegible] میں گزارنے کے لیے بند کر دیا۔ کیا تم ایسی زندگی کو پسند کرو گے؟"

اس نے مجھ سے کہا "مسٹر جوزف، اسے سمجھاؤ، ہم سب [illegible] خطرناک صورت حال سے بچ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "جارج، یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

اس نے کہا "گیٹ آؤٹ۔ جاؤ نکل جاؤ۔ مجھے معلوم ہے کیا کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا "میں نکل جاؤں... اور تم؟"

"میں نکل کے کہاں جا سکتا ہوں" وہ بولا "[illegible] میں ہوں۔ تم نے میرے لیے بہت رسک لیا تھا۔ تم یہاں رہائی کی امید لے کر آئے تھے۔ تم کو گرفتار نہیں ہونا چاہیے ورنہ میری رہائی ممکن نہیں ہو گی۔"

"[illegible] لیکن میرے لیے تھیں۔"

"[illegible] جلدی کرو ورنہ کسی کی غلطی سے صورت حال [illegible] ہو جائے گی۔ میں کسی کو قتل کرنا نہیں چاہتا مگر کر سکتا [illegible] جانتا ہوں کہ یہ جرم ہے۔ میں نے قانون کو ادا کے قرض [illegible] ایک مجرم کی مدد کی۔ سوری! ملزم کی۔ پولیس پر حملہ کیا، [illegible] سزا ہو گی آفیسر!"

"[illegible] دو سال کی جیل بھی ہو سکتی ہے۔"

"دو سال۔ اس سے زیادہ وقت تو میں نے کچھ کیے بغیر گزار دیا۔ اب یہ اطمینان تو ہو گا کہ میں نے کسی کے لیے ایک نیک کام، ایک مقصد کی خاطر دو سال کی جیل میں کاٹ لیں گا۔ اگر باقی سب ویسا ہی رہا جیسا تم نے بتایا [illegible] قتل کا الزام تو نہیں رہے گا نا۔ مجھے رہائی تمہاری [illegible] تمہارا یہ بہت بڑا احسان ہے اور اس کے [illegible] بھی کر سکتا ہوں۔"

میں اس کی منطقی سوچ کا قائل ہو گیا "اوکے جارج۔ میں جا تا [illegible] تمہیں سمجھاری ہے۔ مسٹر الفریڈ تم سے [illegible] میں ابھی ان کو ساری صورت حال کی [illegible] تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔"

"[illegible] خود مجرم ہیں۔ پولیس نے جیل حکام سے مل کے مجھے زہر [illegible] مسٹر الفریڈ کو سب معلوم ہے" جارج بولا "میں [illegible] کا کیس بعد میں کروں گا جب مجھے رہائی مل گی۔ مزید [illegible] اب تم جاؤ۔"

اسپتال کا نمائندہ، سارجنٹ امیر اور لیفٹیننٹ تھامس بے وقوفوں کی طرح انتہائی بے بسی کے عالم میں کھڑے ایک قابل نفرت [illegible] رہے تھے۔ ایک مجرم کے فرار میں معاون ثابت [illegible] کیا فرق پڑتا تھا جو پہلے ہی زیر حراست ہو۔ وہ اسپتال [illegible] بھی نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے کہا "دیکھو، کوئی مت چلانا جارج۔ تمہیں زندہ رہنا ہے۔"

جارج نے سر ہلایا اور اسپتال کے نمائندے سے کہا "اپنے کپڑے اتارو۔"

اسپتال کے نمائندے کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا "کیا؟"

"کپڑے اتارو اپنے۔ ٹھیک سنا ہے تم نے" جارج بولا "[illegible] نہیں آ رہا چاہتے تو باتھ روم میں جا کے اتارو۔ وکار [illegible] تم جاؤ اور اس کے کپڑے پہن لو۔ اپنے کپڑے ساتھ لے جاؤ ورنہ [illegible] کو سونگھ کے تمہارے پیچھے لگا دیں گے۔"

اسپتال کے نمائندے نے فریاد کی "اور میں کیا پہنوں گا؟"

"جب تم دنیا میں آئے تھے تو کیا پہن رکھا تھا؟" جارج نے [illegible] سے کہا "نہیں معلوم تو اپنی ماں سے پوچھ لینا بعد میں۔ کبھی تم کو افسوس ہوا پہلے کہ آخر تم اس دنیا میں ننگا کیوں آئے تھے؟ اگر یہاں بھی نہ آتے اس وقت تو کیا فرق پڑتا۔ اب آئے ہو تو بھگتو۔"

"اندر... باتھ روم میں۔ کافی سردی ہو گی۔"

جارج نے کہا "اگر یہاں کی تولیے کھول کے بیٹھ جانا۔ جب تک دوسرے کپڑوں کا بندوبست ہو گا تم غسل کر لو گے۔ مسٹر جوزف ایڈووکیٹ، تم اس کو سنبھال لو گے نا باتھ روم میں، تم نے ابھی بتایا تھا۔"

"ہاں میں بلیک بیلٹ ہوں، مجھے یاد ہے" میں نے کہا "شاید ان لوگوں کا خیال ہو گا کہ میں گپ مار رہا ہوں۔ کوئی اپنی گردن پیش کرے تو میں ایسے توڑ کے دکھا سکتا ہوں۔ جیسے خستہ بسکٹ۔"

جارج نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا "یہ لوگ بزدل ہیں۔ تم اس کرسی کے بازو کو لیفٹیننٹ تھامس کے ماموں کی گردن سمجھ لو۔"

"کسی سور کی گردن اتنی پکی نہیں ہو سکتی۔ مگر خیر۔" میں نے کہا اور ایک نپا تلا ہاتھ مار کے دو انچ موٹی لکڑی کے بازو کو درمیان سے توڑ دیا۔

"یہ نقصان اسپتال کا ہوا" جارج نے تاسف سے سر ہلایا "آج تم اس کرسی پر بیٹھے تھے کل کوئی آرام سے نہیں بیٹھے گا۔"

میں نے جیب میں سے ایک بڑا نوٹ نکال کے جارج کو دیا "یہ میری طرف سے اسپتال والوں کو پیش کر دینا۔ معذرت کے ساتھ۔"

اسپتال کی سیکیورٹی کا نمائندہ غیر مسلح تھا اور اس کی یونیفارم بھی پولیس سے بالکل مختلف رنگ کی تھی۔ وہ ایک شریف النفس اور صلح جو شخص تھا اور اس پر رقت طاری ہونے لگی تھی۔

میں نے کہا "تم اپنی سب چیزیں نکال لو۔ مجھے صرف وردی چاہیے۔"

اس نے جارج کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا اور پھر جیب خالی کر کے بولا "ٹھیک ہے۔" اس نے اپنا پرس، رومال اور تاش کا ایک پیکٹ نکال کے میز پر رکھ دیا تھا۔ تاش کے باون پتوں کے پیچھے باون قابل دید تصاویر تھیں۔ یہ ہاتھی کے دانتوں کی طرح کھانے کے نہیں، دیکھنے کے تاش تھے جن پر وہ خاصا نادم نظر آتا تھا۔ تاہم میں نے اس کے بارے میں اپنی رائے نہیں بدلی۔ ایسی چیزیں شرفا کے پاس سے ہی برآمد ہوتی ہیں۔

"تم یہ کمبل بھی لے سکتے ہو" میں نے کہا "غسل نہ کرنا چاہو تو اوڑھ کے بیٹھ سکتے ہو۔"

وہ پھر بولا "ٹھیک ہے۔ مگر کیا تمہارا میرے ساتھ جانا ضروری ہے؟"

"ہاں۔ مجھے کیا معلوم کہ باتھ روم میں کوئی کھڑکی یا روشن دان ہے اور اندر بند ہو جانے کے بعد تم کتنی بلند آواز میں کس کو بلاؤ گے؟"

وہ سر جھکا کے میرے ساتھ چل پڑا "تم اپنا منہ بھی دوسری طرف نہیں رکھو گے؟"

www.paksociety.com

"نہیں، بیٹھے بیٹھے تم نہ جانے کیا کرو؟" میں نے کہا۔
اس نے نظریں نیچی رکھتے ہوئے اپنی وردی اتار کے میرے حوالے کی "مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ جان بچانے کے لیے میں بھی ایسا ہی کرتا۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا۔"
میں نے کہا "اب برائے مہربانی تم اپنا منہ موڑ لو۔ میں زیادہ شرمیلا ہوں۔"
اس نے آہ بھری "تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو کیونکہ تم طاقتور ہو۔"
باتھ روم سے باہر آکے میں نے جارج سے کہا "..... جارج۔ جو کچھ تم نے میرے لیے کیا، اللہ تمہیں اس کی جزا دے۔"
اس نے کہا "میں مزید پندرہ بیس منٹ ان کو الجھا رکھوں گا۔"
میں نے کہا "ہتھیار ان کے سامنے مت ڈالنا۔ اسپتال کے ڈاکٹر کو یا نرس کو ضرور بلا لینا۔ ورنہ یہ تم کو گرفتار نہیں کریں گے۔"
"کیونکہ میں پہلے سے گرفتار ہوں" جارج ہنسا۔
"ہاں۔ یہ تمہیں گولی ماردیں گے اور پھر یہ کچھ بھی کہیں۔ ان کی بات کو جھٹلانے والا کون ہوگا؟"
"یہ بڑا مفید مشورہ دیا ہے تم نے۔ تھینکس جوزف" اس نے فون اپنے قریب کرلیا۔
میں اپنے کپڑوں کی پوٹلی بغل میں دبائے نکلا اور کاریڈور میں چل پڑا۔ اگر میں چوروں کی طرح پہلے باہر جھانک کے دیکھتا کہ میدان خالی ہے یا نہیں تو وہ سارجنٹ شک میں پڑجاتا جو وہاں کچھ نہ کرنے پر مامور تھا۔ جارج قیدی زیر علاج اندر آرام سے لیٹا رہے تو وہ آرام سے باہر بیٹھا رہے۔ وہ فرار ہونے کی کوشش کرے تو اس کو ناکام بنادے مگر جارج کے ایسے عزائم سرے سے نہ تھے چنانچہ سارجنٹ کے لیے کچھ نہ کرنا اور آرام سے بیٹھنا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ اسے سگریٹ پینے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ یہ اسپتال تھا۔ اسے جمائیاں لینے کی، گنگنانے کی یا گانے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ یہ اسپتال تھا۔ اسے اپنی گرل فرینڈ کو بلا کے دل جوئی کرنے، کسی دوست کے ساتھ ہم پیالہ ہونے کے لیے گپ شپ، یہاں تک کہ کسی نرس سے عشق لڑانے کی کوشش کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی کیونکہ یہ اسپتال تھا۔ ظاہر ہے وہ اپنے آپ سے اور دنیا سے بیزار تھا اور برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ یہ بھی اس لیے کہ ایک اعلیٰ اختیاراتی وفد اندر مذاکرات میں مصروف تھا۔ وہ بند دروازے کے باہر کرسی پر بیٹھے بیٹھے اکڑ گیا تھا اور آتے جاتے اسٹاف کے لوگوں کو دیکھتے دیکھتے بھی تھک گیا تھا جو اسے اسی طرح نظرانداز کرکے گزر جاتے تھے جیسے وہ بھی کرسی ہے۔ کرسی پر بیٹھا ہوا انسان نہیں ہے۔
اب وہ کسی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا سوائے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کے۔ جب میں نکلا تو اس کا چہرہ بھی ادھر ہی تھا جدھر میرا رخ تھا چنانچہ اس نے مجھے کمرے سے برآمد ہوتے بھی نہیں دیکھا اور جب تیز تیز قدموں سے میں نے اسے پار کیا تب بھی وہ متوجہ نہیں ہوا۔ پھر وہ پلٹ گیا اور اس راہداری کو قدموں سے ناپنے لگا جو دروازے سے بیس قدم ایک طرف اور بیس قدم دوسری طرف ہوگا۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ٹہل رہا تھا۔
میں ابھی کاریڈور میں ہی تھا کہ جارج کے کمرے سے شور بلند ہوا اور بیزار پھرنے والا سارجنٹ ایک دم چونکا۔ اس کی چھٹی حس نے فوراً اسے شور کی طرف متوجہ کرکے خطرے کی اطلاع دی اور وہ ریوالور نکال کے دوڑا۔
جارج کے ساتھ والے کمرے سے ایک شخص برآمد ہوکے چلانے لگا۔ "کیا مصیبت ہے یہ اسپتال ہے یا اصطبل۔ ساتھ والے باتھ روم میں کون گھوڑے کی طرح ہنہنا رہا ہے۔ کیا یہاں گھوڑے بھی داخل کیے جاتے ہیں؟ وہ یہاں آگیا۔"
میں نے سمجھ لیا کہ وہ کیوں ناراض تھا۔ دراصل دو کمروں کے درمیان چھ فٹ لمبی پٹی تھی جسے دو حصوں میں تقسیم کرکے دونوں کمروں کے ساتھ باتھ روم بنا دیے گئے تھے۔ یہ واقعہ اس باتھ روم میں ہوا تھا جو جارج کے کمرے سے ملحق تھا اور جو سلوک سیکیورٹی کے اس شریف النفس شخص نے کیا تھا وہ لباس میرے تن پر تھا۔ وہ کمبل اوڑھے باتھ روم میں بیٹھا رہا ہوگا۔ اچانک اسے میری بات یاد آئی ہوگی اور اس نے دروازہ اندر سے بند کرکے چلانا شروع کردیا ہوگا۔ اس کی چنگھاڑ اور اس کی چیخ پکار دوسرے باتھ روم کے راستے ساتھ والے کمرے تک پہنچی ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان دونوں باتھ رومز کو الگ کرنے والی دیوار میں اوپر کوئی مشترک روشن دان ہو۔ بعض اوقات ہوا کی نکاسی کے لیے یا کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے درمیان میں ایک لائٹ لگانے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔ ساتھ والے باتھ روم کے پڑوسی نے لائٹ جلائی ہوگی تو قیدی نے محسوس کیا ہوگا کہ اب ایس او ایس دیا جاسکتا ہے۔ دروازہ بند کرتے ہی وہ گلا پھاڑ کے چلایا ہوگا کہ بھائی پہلے ضروری سے بعد میں فارغ ہونا۔ پہلے مجھ غریب کی مدد کرو۔ کمبل پوش قیدی کی فریاد کو گھوڑے کے ہنہنانے سے تشبیہ دینا بڑی زیادتی کی بات تھی۔
میں سارجنٹ کے دوڑنے سے پہلے ہی موڑ کاٹ کے غائب ہوگیا تھا۔ میں تصور کرسکتا تھا کہ جب سارجنٹ اندر پہنچا ہوگا تو کیا ہوا ہوگا۔ وہ سراغ رساں اور اپنے ہم پیشہ سارجنٹ کے ساتھ کمرہ خالی کروا گیا ہوگا۔ اس نے بھی جارج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہوں گے اور اب اس کمرے میں وہ تین مشتعل افراد قائم بھی تھے اور قانون کے محافظ بھی "اس" کے سامنے بے بس ہوں گے جو مجرم بھی تھا اور مریض بھی۔ لیکن صورت حال کو وہی کنٹرول کررہا تھا۔ ماسٹر آف دی گیم۔ یہ مذاق زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔ کمبل پوش قیدی کی وہ بھری پکار اور ساتھ والے کمرے سے اٹھنے والا احتجاج مزید لوگوں کو متوجہ کرے گا اور ظاہر ہے بالآخر وہاں ایک مجمع ہوگا اور جب ڈاکٹرز، نرس اور دوسرے لوگ کمرے میں پہنچ جائیں گے تو جارج وقار اور متانت سے مسکراتے ہوئے ریوالور پھینک دے گا اور کوئی شاندار جھوٹ بول دے گا۔ شاید کہا ہو کہ اس پر جیل میں فرار نے دوسرا قاتلانہ حملہ کیا تھا اور جیل حکام کی ملی بھگت کے باعث اسے جیل خانے سے یہاں لایا گیا تھا مگر یہاں تو یہ لیفٹیننٹ تھامس اور سارجنٹ امبر مجھے گولی مار دیتے اگر میں مزاحمت نہ کرتا اور ان کا ریوالور چھین نہ لیتا۔ اسپتال کے ایک ملازم کو انہوں نے مداخلت کرنے اور جارج کو بچانے کے جرم میں یہ سزا دی تھی کہ اس کے کپڑے اتار کے اسے باتھ روم میں بند کردیا تھا۔ اس کے کپڑے کہاں گئے؟ یہ اطلاع انہی سے پوچھو۔ وکار جوزف۔ یہ کس بلا کا نام ہے اور یہ کون ساتھی ہے؟ ایک تو انگریز حیدر روی کرنٹ ... انگریز جیولر...!!
اب مجمع عام کے سامنے اسپتال میں جارج کو گولی تو کیا مارتے، تشدد بھی نہیں کرسکتے تھے۔ ممکن تھا کہ یہ کیا ہو کہ اس انکار کی ہے۔ ڈاکٹرز کسی مریض پر تشدد ہرگز نہیں ہونے دیں گے "ٹھیک ہے لیفٹیننٹ۔ تم اس کے خلاف جو قانونی کارروائی کرنا چاہو کرو لیکن یہاں تم اس کا بیان بھی ہماری اجازت کے بغیر نہیں لے سکتے۔ ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ مریض کی حالت کیا ہے اور اس کے بیان کا سبب کیا تھا۔ تم بعد میں جھوٹ سچ کا پتا چلاتے رہنا۔ ہم عدالت کے معاملات میں نہیں بولیں گے اور بلایا گیا تو جتنا دکھا دیں گے بتا دیں گے۔"
میں باہر پہنچا تو محسن اور وکیل مجھے دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ وہ اس وقت بھی کوریائی دوشیزہ سوفی کے ساتھ بیٹھے پی رہے تھے۔ محسن کے سامنے ٹھنڈی کافی تھی۔ کوریائی حسینہ اور اس کا پرستار وکیل کوئی مدہوش کردینے والا مشروب پی کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے اور جام ہو گئے تھے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تک جام ہو گئی تھی۔ کینٹین خالی پڑی تھی چنانچہ سوفی وقت گزار رہی تھی۔ غالباً فراغت میں اس کی ڈیوٹی اور وہ یہ آمدنی کما رہی تھی۔
محسن نے پہلے کہا "یہ... یہ کیا..." اور اٹھ کے کھڑا ہوگیا۔
میں نے کہا "یہ میرے کپڑے ہیں تو لے جا۔ میں نے اس اسپتال کی نوکری کرلی ہے اور وردی بھی پہن لی ہے۔"
سوفی آف کوریا نے کہا "ویری گڈ" اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔
وکیل نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "میں نے اتنی تو نہیں پی۔ پھر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم وکار یوسف ہو۔"
میں نے اس سے کہا "ہوش میں آجاؤ اور فوراً یہاں سے غائب ہوجاؤ۔ صورت حال ہنگامی ہوگئی ہے بیٹے۔"
"ہنگامی تم نے کی ہوگی" وہ خفا ہو کے بولا "ورنہ سہانی تھی۔"
"ہم تو یہاں سوفی آف کوریا کو بھی ورغلانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے" میں نے افسوس سے کہا۔
"اسے تم سوفی آف کوریا مت کہو" وہ جذباتی ہوگیا۔
"سوفی آف جاپان اصل چیز ہے۔ کوریا والے نقل کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ جاپانیوں کا بزنس خراب کرنے پر آمادہ ہیں۔" میں نے کہا "کیا ہم جائیں؟"
"ایسے کیسے جائیں، پہلے بل ادا کرو۔ سوفی کو ٹپ دو۔"
محسن نے بل ادا کیا اور وکیل نے آخری بار سوفی کو چوم کے الوداع کہا۔ وہ اس کی عادی تھی۔ ٹپ سے اسے اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہوگی۔ یہ وہی وکیل جیسے عشاق کو لوٹنے کی شائق معلوم ہوتی تھی۔
وکیل کی کار میں بیٹھتے ہی محسن نے کہا "وہاں تو موقع نہیں تھا کچھ بھی پوچھنے کا۔ وقت ضائع ہوتا۔ اب فرمائیے یہ ماجرا کیا ہے؟"
"اتنا عرصہ میرے ساتھ گزارنے کے بعد آپ کو خود سمجھ لینا چاہیے۔"
"سمجھ تو میں گیا" محسن بولا "مگر یہ کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ جارج ٹھیک ہے؟"
"ہاں۔ جارج بالکل خیریت سے ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے مگر عزیز دوست کیا کہا ہے اپنے فلمی شاعر نے اور کیا خوب گایا تھا سائیں اختر نے کہ دل دیتا ہے رو رو دہائی کسی سے کوئی پیار نہ کرے۔"
محسن نے ایک منطقی سوال کیا "پھر کیا کریں۔"
میں نے کہا "شعر میں ترمیم۔ کسی سے کوئی سچا پیار نہ کرے۔ جھوٹے کی البتہ اجازت ہے۔ جیسا کہ ہم دوران تعلیم دل لگی کرتے رہے تھے۔ سچا پیار کیا تھا ایک سے تو بھیا آج اسی نے پہنچا دیا تھا تھانے۔ یاد ہے ہم بھی یہی سوال کرتے تھے سب سے کہ لفٹ دی ہے یا تھانے جانا ہے۔"
محسن بولا "الزبتھ سے بھی کیا ہوگا؟"
"نہیں یار۔ اس سے تو پوچھا تھا کہ دل میں رہنا ہے اور ساتھ نبھانا ہے اور ایسا ہی بیان حلفی اس نے مجھ سے لیا تھا لیکن..." میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
وکیل نے کہا "یہ الزبتھ کون ہے؟ الزبتھ ٹیلر؟"
"نہیں۔ ہمارے ٹیلر کا نام تھا ماسٹر میاں جان دین آف میاں چنوں۔ جینٹس اینڈ لنگوٹی اسپیشلسٹ... قمیص تو ایسی سیتے تھے کہ پاجامے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ جب چاہو اوپر سے نیچے پہن لو۔ آستینوں میں ٹانگیں ڈال کے۔"
وہ حیران ہوکے بولا "تم نے الزبتھ کا نام لیا تھا۔"
میں نے حیرانی سے کہا "اچھا... ؟ تم نے سنا؟"
محسن بولا "میں نے تو نہیں سنا۔ دراصل میں نے صرف چائے پی تھی۔"

www.paksociety.com

اس کے بعد ہم نے وہ زبان بولنی شروع کردی جو وکیل کا باپ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا اور اس میں الزبتھ کا نام لینے سے احتراز کیا۔ میں نے محسن کو فرنچ میں اپنی ساری بات سمجھائی تو اس پر بھی رقت طاری ہونے لگی۔

"واقعی۔ عورت ذات ہے نا۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "میں غیرت مردانہ جذبات کی مشروط حمایت کرتا ہوں۔"

"مشروط کیوں؟ تیرے ساتھ جو بھی ہوا سخت قابل مذمت ہے۔"

میں نے کہا "مگر اس قرارداد کو اس وقت پیش کیا جائے جب کم سے کم دو عورتیں بھی موجود ہوں۔"

"… تو انہی عورتوں کا حوالہ دے رہا ہے جو میں سمجھا ہوں تو پھر قرارداد پاس نہیں ہوگی۔"

"ہم کرالیں گے یار۔ زور بازو سے مسلم دکھا کے۔ آخر یہ مردوں کی دنیا ہے خود خواتین تسلیم کرتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا لندن میں ہمارا کام ختم ہو گیا؟"

"حالات معمول پر آنے کے بعد ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں اس کا جائزہ لینے کے امکانات پر غور کرنے کا مسئلہ ایجنڈے میں شامل کرنے کی سفارش بھی کی جاسکتی ہے۔" میں نے اسے یقین دلایا "ابھی تو ہم فرار ہو رہے ہیں۔"

محسن بولا "فرار تو ہم پتا نہیں کب سے ہو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب لندن میں مزید قیام فرمانا بالکل ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔"

"کس کے لیے حکومت برطانیہ کے لیے؟"

"نہیں میرے لیے" محسن بولا "مجھے کل کی یاد آرہی ہے۔"

"معلمت کی چیز ہے۔ آنے دے۔ تیرا کیا جاتا ہے۔" میں نے کہا "ایک وقت آئے گا میرے عزیز جب فرصت اور آزادی کے کیا دن تجھے یاد آئیں گے۔ ذرا سوچ ہم جیسے خوش نصیب کتنے ہوتے ہیں جن کو اپنی عمر گزشتہ کا کوئی اچھا حصہ۔ خواہ وہ چند روز ہوں، دوبارہ جینے کے لیے مل جائے۔ کل تیرا مستقبل ہے، تجھے کسی خواب کے سفر میں ملی تھی۔ اس کا اور تیرا ساتھ تو ایسا ہی ہوگا جیسے دن کے ساتھ صبح و شام کا۔ جو ازل سے ابد تک ہے اور رہے گا۔ یہاں کل کو یاد کرنے سے کیا حاصل۔"

محسن نے چونک کے کہا "کچھ فرما رہے تھے آپ؟ معاف کیجئے گا مجھے ذرا جھپکی آگئی تھی مکرر ارشاد۔"

میں نے ایک آہ بھر کے کہا "میں کہہ رہا تھا کہ مجھے بھی رابعہ اتنی ہی یاد آرہی ہے مگر درمیان میں ابھی ایک دن اور ہے جدائی کا۔ کل بے آلو ٹماٹر پیاز کے ساتھ لندن کی منڈی رہنا تھا اور شاید لحیات کے ساتھ واپس جاؤں گا۔ یہاں سے مٹن اور بیف کے علاوہ گم تفریح بھی جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا تھا ہمیں درآمد کرنے والے نے۔"

"وہ پرسوں روانہ ہوگا" محسن نے کہا "کل کا دن کیسے گزرے گا؟"

"مزے سے اچھا گزرے گا۔ آپا کہتے تھے کہ گزشتہ سے… آنے والے دن کی سلامتی اور زندگی کے سوا نہیں چاہیے۔ اس سے زیادہ کی آدمی کو ضرورت ہی نہیں ہونی۔"

"تیرے آپا بھی فلاسفر تھے؟"

میں نے عاجزی سے کہا "تھی یار۔ میری طرح کے ویسے ہر کل میری اولاد اسی طرح ناز کرے گی۔"

"اچھا بعد" محسن بولا "آپ تو یقین ہے کہ ولی ہوں گی؟"

میں نے کہا "اس اشتعال انگیزی پر میں غصے میں نہ رہا ہوں۔ میرے پاس ہوتا کوئی آلہ قتل تو ابھی تجھ کو قتل کر دیتا۔"

محسن بولا "یار اس وکیل کو ساری بات سمجھا دی ہے یہ کہ وکیل سے اور ڈاکٹر سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے ورنہ خراب ہو جاتا ہے۔"

"پہلے معاوضہ ہوگا۔ وائی سے اور عدالت سے گریز چاہیے۔ ڈاکٹر اور وکیل کہاں ہوتے تھے… سب کچھ دوبارہ بتانے کی تو میرا خیال ہے کہ ابھی اس نے… نہیں۔ اسے پوچھے حال کیا ہے تو یہ سوال کرے گا۔ اب سمجھا ہاں! آپ کا ہاں… میرے کی بات کر رہے ہو تو مجھے لگا۔ یہ تو میں صرف سوئی ڈف کو یاد کی… تصور میں اسی کو دیکھ رہا ہوں گا۔"

محسن نے کہا "سالے نے اپنے عشق نامراد پر… پاؤنڈ خرچ کرائے ہے۔ دو گیلن چائے پی گیا۔ ایک گیلن… تیرے خرچ پر تیرے سامنے اسے پوچھتا ہی رہا۔"

"یار اناڑی ہے اترتا پھرا۔ بلکہ احمق ہے" محسن بولا "اسے الو بنا رہی تھی۔ ٹوٹنے پر کر رہی تھی۔ میں تو… وقت میں سوئی کے جذبات میں آگ لگا رہا تھا۔ الٹا اس… لے کے واپس جانا۔ اس کے گھر سے اپنے گھر۔"

میں نے کہا "بڑا افسوس ہے تمہاری سالی صاحب کو آپ گھر جانے؟ حضرت میں ہوتا تو اسے اپنے ساتھ لے جاتا۔ وقت وہ مجھے سو پاؤنڈ دے کر پوچھتی کہ پھر کب ملو گے؟… گدھا کہہ رہے ہیں خود مجھے بھی۔"

وکیل نے ایک دم گاڑی روک لی "اور رحم کیا ہو… کے گھوڑے۔ میں کہتا ہوں نیچے اترو۔ میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

مجھ پر اور محسن پر حیرت صدمے اور شرمندگی کا… صورت حال بیک وقت مضحکہ خیز اور سنگین تھی۔… اور کو سنانے تو ہنسی ہنسی کے بے حال ہونے مگر یہ وقت… تھا۔ میرے اور محسن کی شکل پر بارہ بج گئے تھے ادھر وہ… تھا کہ دروازہ کھولے باہر کھڑا تھا اور غصے میں… تھا۔ آخر میں نے کہا "سڑک پر تماشا کیوں بناتے ہو میرے پاکستانی بھائی۔"

اس نے ناقابلِ اشاعت نثر میں کہا۔ "بھائی گیا …… چلو تم باہر نکلو۔"

محسن بولا "اور تم چاہو تو بدلہ لے سکتے ہو ہم سے۔ ہمیں گدھا اور احمق کہہ کے۔"

میں نے کہا "یہ گدھا ہیں احمق۔"

"تم نے مجھے اناڑی اور الو کا پٹھا بھی کہا۔ باہر نکلو۔"

"میرے پاکستانی بھائی۔ ہم لوگ دوستی اور بے تکلفی میں اس سے کہیں زیادہ کہہ جاتے ہیں ایک دوسرے کو" میں نے اسے سمجھایا۔

"میری تم سے دوستی؟ ناممکن۔ یہ ایک کاروباری تعلق تھا۔"

"او کے۔ ڈیئر جیو، ہم کاروباری معاملات پر بات کریں گے۔ ضروری بات۔"

محسن نے کہا "ہاں۔ پہلے میرے دس پاؤنڈ واپس کرو۔ ہم ٹیکسی لے کر چلے جائیں گے۔"

"کیسے دس پاؤنڈ؟" وہ چلانے لگا۔

ایک پولیس مین ٹہلتا ہوا ہماری طرف بڑھا "یہ کیا شور ہے۔ دی ہاوٹو بات ہے تو تم آرام سے بھی کر سکتے ہو اندر بیٹھ کے۔"

میں نے مسکرا کے کہا "یہی ہم بھی سمجھا رہے تھے اپنے دوست کو۔"

محسن نے کہا "اس کا غصہ ذرا تیز ہے لیکن ہم برا نہیں مانتے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

وکیل فوراً گاڑی میں بیٹھ کے مسکرانے لگا "دراصل مجھے بلڈ پریشر ہے۔"

اور فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں پولیس مین اس کا منہ سونگھنے کا مطالبہ نہ کر دے۔

"دیکھا ہم نے تمہیں بچا لیا" میں نے کہا۔

محسن بولا "ہم تمہاری شکایت بھی کر سکتے تھے کہ تم نشے میں ہو۔ اگر پہلے برائی کی تھی تمہارے ساتھ تو اب اچھائی سے حساب برابر ہے۔"

اس نے سوچ کے کہا "تم بہت چالاک ہو۔ میں نے تم سے گالیاں کھائیں پہلے، پھر تمہارا احسان ہو گیا مجھ پر اور تم نے حساب بھی برابر کر لیا۔"

"جو کچھ ہوا غلط فہمی کے باعث ہوا۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ تم فرنچ سمجھتے ہو تو ہم ہرگز کچھ نہ بولتے" میں نے کہا۔

محسن نے جلدی سے کہا "خیر اس کا فائدہ بھی ہوا۔ تم نے سب سن لیا کہ اسپتال میں کیا ہوا تھا ورنہ شاید یہ سب بتانا پڑتا۔"

میں نے کہا "ان حالات میں تم خود بہتر سمجھتے ہو کہ ہمیں کیا

کرنا چاہیے۔"

وہ بدستور خفا رہا "میں تمہارے لیے مزید کچھ نہیں کروں گا۔"

محسن نے کہا "ہم نے کب کہا ہے کہ ہمارے لیے کچھ کرو۔ ہم ویسے بھی یہ نہیں چاہتے کیونکہ جو کچھ تم کرو گے اس سے ہمیں فائدہ نہیں نقصان ہوگا۔"

"لیکن تم جارج کے لیے دن ہوا ت ایک کر دو" میں نے کہا "ایک تو تم اس کار خیر کا معاوضہ وصول فرما چکے ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تم بعد میں اپنے حاجی علم دین طوطی کو جواب دہ ہو گے۔ تم نے کوتاہی اور نالائقی کا ثبوت دیا، میرے پاکستانی بھائی تو وہ تمہارا جھنڈا بجا دیں گے ۲ بجے اخبار میں۔"

"یا تمہاری شان میں کوئی قطعہ لکھ کے ہر جگہ پھیلا دیں گے جس میں سوئی آف کوریا کا بھی ذکر ہوگا" محسن نے کہا۔

وہ آبدیدہ ہو گیا "دیکھو اب تم مجھے بلیک میل بھی کر رہے ہو۔"

میں نے اسے تسلی دی "یار دنیا میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ ہر شخص مجبور ہے اور کبھی نہ کبھی دوسرے کی مجبوری سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔"

اس نے ہمیں حاجی علم دین طوطی صاحب کے طوطی خانے سے کچھ فاصلے پر ڈراپ کیا اور رخصت ہوتے وقت ہم سے گلے ملا۔ "تمہارا دل بہت بڑا ہے۔ تم نے ایک کالے حبشی کو بچانے کے لیے چار سو پیس پاؤنڈ خرچ کر دیے۔ تمہارا حوصلہ بہت بڑا ہے۔ تم نے گوروں کی…… دی۔ تم سچے مجاہد ہو۔ بڑے بہادر ہو۔ تمہارا قد بھی مجھ سے بڑا ہے۔ تم واقعی بڑے آدمی ہو میں تمہارے مقابلے میں ایک دیکی بڑا ہوں… بلکہ دیکی چھوٹا ہوں۔"

"ابھی تک رنگ میں بول رہا ہے" محسن نے اس کے جانے کے بعد ہنس کے کہا۔

میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "وہ ایک بہت اہم بات اس سے پوچھنی رہ گئی۔"

محسن نے کہا "وہ کیا؟"

"یار یہ سوئی کہاں کی تھی۔ کمالی کوریا کی یا منگولیا کی؟"

"ابھی کل کا دن ہے ہمارے پاس۔ خود چل کے اس سے پوچھ لیں گے" محسن نے میری کمر میں ایک مکا رسید کیا اور میں نے چلا کے کہا "ہائے"

جن کی طرح ایک پولیس مین نمودار ہو گیا۔ ایسا لندن میں ہی ہوتا ہے کہ کہیں نظر نہ آنے والا پولیس مین معمولی سے حادثے یا جھگڑے کی صورت میں فوراً ٹپک پڑتا ہے۔ "کیوں مار رہے ہو تم ایک دوسرے کو؟"

"… نے مارا ہے۔ اگر دوسرا مار کھا کے ہنستا رہے تو… کیا اعتراض ہے" میں نے کہا۔

"مجھے شک ہے کہ تم دونوں نشے میں ہو" وہ بولا۔

میں نے بڑی سے کہا "ہم مسلمان ہیں اور شراب کو چھوتا

www.paksociety.com

بھی حرام سمجھتے ہیں۔"

"کیا تم جانتے ہو کہ یہ غلط ہے؟" وہ اپنی بات پر قائم رہا۔ "یہاں سب مسلمان پیتے ہیں' میں جانتا ہوں۔"

"سب کا لفظ غلط ہے" میں نے کہا "کچھ پیتے ہیں' اکثر نہیں پیتے۔"

"اور تمہارا دعویٰ ہے کہ تم اکثریت میں ہو جو نہیں پیتے' مگر میرا خیال ہے کہ تم کچھ میں شامل ہو' اپنا منہ اِدھر لاؤ۔"

اس سے اختلافات بڑھانے کا فائدہ کچھ نہیں تھا۔ اس کو قانون نے یہ اختیار دے رکھا تھا کہ وہ شراب پی کے ڈرائیو تک کرنے یا ہنگامہ کرنے والوں کے بارے میں فوری تصدیق کے لیے ان کا منہ سونگھے۔ یہ ٹیسٹ لے کر بھی وہ مطمئن نہ ہو تو چاک سے سڑک پر لکیر کھینچ کے مطالبہ کر سکتا ہے کہ اس پر سیدھا چل کے دکھاؤ۔ تاہم اس اختیار کو کیش کرانے کا وہاں کوئی تصور نہیں۔

جب وہ منہ سونگھ کے مطمئن ہو گیا کہ واقعی ہم نے شراب نہیں پی رکھی ہے تو اس نے شائستگی سے "سوری" کہا اور پھر شب بخیر کہہ کے گشت پر روانہ ہو گیا۔

رات کے ایک بجے ہم ہفت روزہ "طوطی" کے نقار خانے پہنچے تو اندر سے تشویشناک آوازوں کا شور سنائی دے رہا تھا جس میں طوطی صاحب کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ ہم نے ان کے فرزند ارجمند مسٹر نوردین کی فریاد بھی سنی۔ چند بچے کھلکھلا کے ہنسے۔ ایک عورت نے چیخ ماری۔ پھر ایک چیخی کری اور کوئی شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔

ہم دبے پاؤں آفس میں پہنچ گئے جہاں بقراط کتابت نہ کرنے کے باوجود کتابت کرنے کے پوز میں منجمد رکھا ہوا تھا اور دیوار کو ایسے گھور رہا تھا جیسے اس کے پیچھے ہونے والے ڈرامے کا ہدایت کار وہی ہے۔

میں نے کہا "بقراط' یہ کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے مجھے پُر ملامت نظروں سے دیکھا "یہ ایک غیر منطقی اور لایعنی سوال ہے۔ کہاں کیا ہو رہا ہے؟ میں تم کو دیکھ رہا ہوں۔ تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ میری زبان سے ادا ہونے والے الفاظ تمہاری سماعت تک کانوں کے راستے پہنچ رہے ہیں۔ ہمارے دل دھڑک رہے ہیں۔ نبض چل رہی ہے۔ زمین چاند ستارے سب چل رہے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ کیوں چل رہے ہیں۔ چاند گھوم رہا ہے زمین کے گرد لیکن کسی دن راہ میں کوئی سیارہ حائل ہو گیا تو چاند ٹھوکر کھا کے دھڑام سے گرے گا زمین پر۔ یا زمین کے مدار پر چاند سے اس کا تصادم ہو گیا تو زمین سیدھی جائے گی سورج کے آتشیں جہنم میں۔۔۔ اور تمت بالخیر۔"

میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "بقراط۔ اندر حاجی صاحب کے گھر میں یہ کیسا شور ہے؟"

اس نے تیور بھر کے کہا "اگر تمہاری بھی اتنی ہی بیویاں اور ان کے اتنے ہی بچے ہوں گے اور تم لندن کو سادہ گاؤں سمجھتے رہو گے تو ایسا ہی تمہارے گھر میں بھی ہو گا۔ یہ تم خود ملاحظہ کر سکتے ہو گے۔"

میں نے ایک دروازے کو ایک انچ کے قریب کھول کے اندر جھانکا۔ محسن میرے پیچھے سے گردن لمبی کر کے دیکھنے لگا۔ سب سے پہلے مجھے ایک اجنبی نظر آیا جس کا سراپا سوا سو سال پرانے [illegible] سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے سر کے بال بالکل سفید تھے اور شانوں تک پہنچتے تھے۔ یہ غالباً وگ تھی۔ جو اس کی داڑھی کے سفید رنگ سے میچ کرتی تھی۔ اس عمر میں اتنے بال میں نے کسی کے سر پر پہلے نہیں دیکھے تھے۔ اس کی گھنی مونچھیں بھی سفید تھیں چنانچہ اس کے منہ کا دہانہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ چار خانے والی لنگی اور لال کرتے میں ایک طرف کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ یہ خوف کا اثر نہیں تھا۔ اس کو عمر کے باعث رعشے کا مرض لاحق تھا۔ اس کے ہاتھ میں قینچی استرا دیکھ کے میں سمجھ گیا کہ یہ طوطی صاحب کے خاندانی جراح سیالکوٹ والے ہیں۔

محسن جیسی چک میں آلو جیسی رنگت کے صاف سروں والے بچے خاصی تعداد میں موجود تھے۔ ان کے سر بڑی صفائی سے مونڈ کر چمکا دیے گئے تھے اور یہ کارنامہ خلیفہ سیالکوٹی کے رعشہ زدہ ہاتھوں نے سرانجام دیا تھا چنانچہ ہر بچے کی کھوپڑی پر جہاں بال کی کھال بھی کٹ گئی تھی وہاں لہو کا سراغ مٹانے کے لیے پاؤڈر تھوپ دیا گیا تھا۔ سانولی گندمی اور کالی ٹنڈوں پر یہ سفید سفید داغ یوں لگ رہے تھے جیسے قبر کی مٹی پر پڑے ہوئے چنبیلی کے پھول۔ ان مظلوم بچوں کی فریاد بلب مائیں دروازوں میں کھڑی طوطی صاحب کو کنٹرول کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھیں۔

طوطی صاحب ہانپتے ہوئے ایک تخت کے تین طرف گھوم رہے تھے۔ چوتھی سمت میں تخت دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اب ان کے ہاتھ میں ایک لوٹا تھا اور وہ ہانپتے ہوئے لوٹے کو تخت کے نیچے پھینکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کدھر گیا حرامی۔۔۔ باہر کیسے نہیں نکلے گا۔۔۔ تیرا تو۔۔۔ باپ بھی باہر آئے گا۔" انہوں نے لوٹا ہاتھ گھما کے نیچے پھینکا۔

نیچے سے ان کے ولی عہد اور چیف ریبل نے چلا کے کہا "ہائے' ہائے میں مر گیا آپا جی۔"

اس کی ماں نے چیخ ماری "ہائے خدا کا خوف کرو حاجی صاحب سر پھاڑ دیا منڈے کا۔"

نیچے سے ایک قہقہہ برآمد ہوا۔ "فکر مت کرو ماں۔ [illegible] کرایا تھا میں نے۔"

حاجی صاحب آگ بگولا ہو کے دوڑے "تیرا تو ذرا بھی باپ... ابھی باہر نکالتا ہوں اس خرزادے کو۔ خلیفہ' ساری چیزیں نیچے جمع کر رہا ہے۔۔۔ جیسے اپنی اماں کا جہیز ہے۔"

اس کی ماں نے دہائی دی "ٹھیک تو ہے۔ میرے جہیز کا لوٹا تھا اور چنگیر بھی میرے جہیز کی تھی۔"

"چپ کر نابکار" حاجی صاحب دہاڑے۔ "اس نے نیچے سے

بھی عصا پکڑ کے کھینچ لیا۔"

خلیفہ نے کپکپاتی آواز میں کہا "حاجی صاحب۔ چلو چھوڑو۔ خیر ہے بر بھی سمجھا' ابھی منڈے کا دل نہیں کرتا۔"

"آپ فلسوفی۔ اس کے دل کی تو۔۔۔ میں ابھی بانس لے کر آتا ہوں' اسے۔ تین مہینے سے بلاتے رہے آپ کو تو آج آئے ہو۔ پھر آپ آ گئے۔ بانس سے بچ کے کہاں جائے گا گھر سے دا پتر۔"

کھولتے رہے چڑتے بچے سے کہا "او ظالم باپ۔ جان لے کر بھی تو میرے سر کے چمن کو ویران نہیں کر سکتا اور اے تحریک خلیفہ تو میرے حلق پر استرا چلا سکتا ہے لیکن میرے سر کو نہیں۔ میری رگوں میں بھی اسلاف کا حق پرست لہو ہے۔ چنگیز خان اور ہلاکو بھی مقابل ہوں تو سر کٹ سکتا ہے جھک نہیں سکتا۔ جھکے گا تو خدا کے سامنے۔ تیرے سامنے نہیں بالکٹ کے مردود نائی۔ کیا تجھے فرشتۂ اجل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی نہیں دیتی۔"

"بانس' ارے کدھر ہے بانس" طوطی صاحب چلانے لگے "اس حرام الدہر کے حلق میں ڈالتا ہوں۔"

پھر نوردین نے خلیفہ صاحب کی شان میں ایک ناقابل اشاعت بات کی۔

طوطی صاحب کا پارا چڑھ گیا "سر تو منڈانا ہے میں نے تیرا حرامی۔ ابھی اسپرے کرتا ہوں پیچھے۔ خود باہر آئے گا۔ کدھر ہے وہ کھٹمل مار دوا۔"

اس دلچسپ تماشے کا اختتام یوں ہوا کہ خلیفہ صاحب نے اپنی کانپتی آواز میں خود اعلان کر دیا کہ وہ اپنی زندگی کا قیمتی وقت (جو اب برائے نام ہی رہ گیا تھا) اس بدتمیزی کے مظاہرے میں ضائع نہیں کر سکتے۔ انہوں نے حاجی صاحب کو بھی مطعون کیا جن کی غلط تربیت کے اصولوں نے اولاد کو سرکش اور [illegible] کو بے حیا بنا دیا تھا اور ان کو کنٹرول کرنے میں اس ناکامی کے بعد اصولاً انہیں دریائے ٹیمز میں ڈوب مرنا چاہیے۔ پھر وہ واک آؤٹ کر گئے۔

برخوردار نوردین تخت کے نیچے حفاظت اور سلامتی کے ساتھ روپوش رہا۔ تخت بہت بڑا تھا اور غالباً دیوار کے ساتھ ملا ہوا تھا کہ ہلایا نہیں جا سکتا تھا۔

میں اور محسن اس وقت ہنسی ضبط کر سکے جب خلیفہ کے ساتھ ہی نوردین نیچے سے نکلا اور دروازے کی طرف دوڑا۔ طوطی صاحب کے ہاتھ میں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے چلا کے کہا "پکڑو جانے نہ دے پتر" اور پھر پاؤں کی جوتی عادت کے مطابق میزائل کی طرح داغی۔ سور دا پتر اس وقت آگے نکل گیا تھا۔ جوتی خلیفہ کی کمر میں لگی۔ اس نے ایک پُر درد آواز نکالی۔ ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے اور زمین پر لیٹ گیا۔

میں اور محسن دروازہ بند کر کے پلٹے تو ہنستے ہنستے ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہنسی ضبط کرنے سے میرے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔ ہم میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ بقراط ہمیں افسوس ناک نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ ہمہ وقت کائنات کے سیاروں' ستاروں اور زمین و آسمان کے درمیان پیش آنے والے قیامت خیز حادثات کے امکانات پر رنجیدگی سے غور کرتا رہتا تھا اور ہمیں یا کسی کو بھی ہنستا ہوا دیکھ کے اسے دکھ ہوتا تھا۔

"یار' میرا تو خیال ہے طوطی صاحب نے خلیفہ کو مقتول کر دیا" محسن بولا۔

میں نے کہا "بے شک یہ ایک غیر ارادی فعل تھا۔ مگر قتل تو قتل ہے۔ خلیفہ کا بھی دمِ واپسیں پر برا حال تھا۔ کوئی بھی بات بہانہ بن سکتی تھی۔"

"طوطی صاحب کی ضربِ مجاہد کا صدمہ الگ تھا۔ خلیفہ کی کمر ٹوٹ گئی ہو گی۔ ذلت کا صدمہ الگ۔"

"یار۔ خلیفہ کے نصیب میں جوتے کھا کے مرنا تھا۔"

"جوتی آلۂ قتل کے طور پر پولیس اپنے قبضے میں کرے گی۔"

حاجی علم دین طوطی نمودار ہوئے تو ہم ایسی ہی فضول باتوں پر زاروقطار ہنس رہے تھے۔ انہوں نے بڑی متانت سے مجھے دیکھا اور ایک انگلی سے اٹھنے کا اشارہ کیا "یہ ایڈیٹر کی کرسی ہے میرے پاکستانی بھائی' ہر ایرا غیرا نتھو خیرا اس پر بیٹھنے لگا تو۔۔۔"

"ویسے ہی تو بیٹھے ہیں۔" میں نے زیرِ لب کہا اور کھڑا ہو گیا۔

"کیا فرمایا میری سرکار۔" حاجی صاحب پاؤں سمیت کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"کچھ نہیں۔ میں ندامت کا اظہار کر رہا تھا۔"

وہ مجھے اور محسن کو شکی نظروں سے دیکھتے رہے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ اس وقت وہ کس بات پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ معزز سفید ریش خلیفہ صاحب کی پشت مبارک پر جوتا مارنے پر۔ اولاد نرینہ کی نافرمانی کے مظاہرے پر۔ اپنی والدانہ اور شوہرانہ ناکامی پر یا قومی اور عالمی مسائل پر۔

"خیر سے آپ لوگ کس پر خندہ زن تھے؟" انہوں نے مشکوک لہجے میں کہا "تمہاری موسلادھار ہنسی بے سبب نہیں ہو سکتی۔ کہیں ایسا تو نہیں میرے پاکستانی بھائی کہ تم چوری چھپے اس دروازے کی اوٹ سے میرے خاندانی اور نجی معاملات کا نظارہ کر رہے تھے۔"

میں نے فوراً کہا "طوطی صاحب۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔"

"افسوس کی بات ہے میرے بھائی اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔ یہ کسی تعلیم یافتہ مہذب مسلمان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ پردہ دار خانے پر نگاہ بھی ڈالے۔"

محسن نے کہا "کیا آپ ہمیں ایسا سمجھتے ہیں؟ یہ سب سے زیادہ افسوس کی بات ہے۔"

میں نے بھی کہا "ہم تو ان واقعات پر ہنس رہے تھے جو آج رات پیش آئے۔"

www.paksociety.com

حاجی صاحب نے سکون کا سانس لیا "معاف کرنا۔ میں کافی دیر سے خانگی مسائل میں اُلجھا ہوا تھا۔ دراصل آج اپنے سیالکوٹ کے خلیفہ صاحب تشریف لائے تھے۔ وہ بھی بے حد مصروف رہتے ہیں۔ لوگی من بینشے کی جنگ چل رہی تھی جب آخری نومولود کو مسلمان کیا تھا۔ الحمدللہ آج تین کا دینی فریضہ پورا کیا۔ جتنی آپ کی عمر ہے نا میرے پاکستانی بھائی! اس سے دگنا ان کا تجربہ ہے۔ اللہ نے بڑی صفائی دی ہے ان کے ہاتھ میں۔ چار برخورداروں کے سر بھی صاف کرائے۔"

میں نے سرسری لہجے میں کہا "نوردین نے بھی بال صاف کروالیے؟"

حاجی صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہی تو افسوس ہے کہ ولایت کی آب و ہوا نے اس ناخلف کو باغی و سرکش کردیا ہے۔ اس نے چھیلے جیسے بالوں کے لیے والدین کی نافرمانی کا گناہ کیا۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ آپ ہوتے تو کس کی خوشی کو عزیز رکھتے۔ ان بے حیا اور مادر پدر آزاد لڑکیوں کی جن کو وہ اپنی گرل فرینڈز کہتا ہے یا والدین کی۔"

میں نے کہا "والدین کی رضا مقدم ہے۔"

محسن بولا "کیا اس نے سر منڈوانے سے انکار کردیا؟"

"دراصل ماں کی شہ پر وہ روسیاہ ابھی تو روپوش ہونے میں کامیاب ہوا لیکن جن بالوں پر وہ ناز کرتا ہے بلکہ غرور۔"

میں نے کہا "غرور کرنا بھی تو چاہیے۔ علامہ اقبال صاحب نے آخر کس کو مخاطب کیا ہے۔ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر۔ یہ تو فرض نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے مسلمان لڑکیوں سے کہا ہوگا یا مسلم خواتین سے۔"

طوطی صاحب کے لیے علامہ صاحب کا فرمایا ہوا سند تھا۔ انھوں نے غور فرماتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "ہاں... وہ تو خیر ٹھیک ہے میرے پاکستانی بھائی! خیر۔ آپ فرمائیں کہ حصولِ مقصد میں کس حد تک کامیاب رہے۔"

میں نے کہا "آپ کی مدد اور تائیدِ ایزدی سے ہم نے دشمنوں کی سازش کو ناکام کردیا اور جارج سے ملاقات بھی ہوئی۔ بڑی تفصیل ہے لیکن تفصیل سے بتائیں گے تو رات سے صبح ہوجائے گی۔"

طوطی صاحب پھڑک کر بولے "یہ کیا کہہ دیا میری سرکار۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ عمر یونہی تمام ہوتی ہے۔ ہر رات کے بعد صبح کا ہونا مبارک اور برحق ہے اور برخوردار! وہ کیا فرمایا ہے اپنے علامہ صاحب نے کہ 'غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی...'"

"اُف!" میں نے کہا "یہ بھی علامہ صاحب نے فرمایا تھا۔"

انھوں نے حیرانی سے کہا "بھئی اور کون فرما سکتا ہے۔ لو دیکھو اس گھڑیال کی جانب جو تمھاری کلائی پر موجود ہے۔ صبح تو ہوگئی۔ اس کے بعد رات ہوگی اور پھر کل کی صبح تو آج کا کام کل پر کیوں چھوڑا جائے۔"

ان سے اتفاق نہ کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ مگر جارج سے ملاقات کا احوال واقعی ان کے گوش گزار کرنا تھا جس میں وہ سب غیر شرعی اور رومانٹک مناظر نکال ... شراب و شباب یعنی سونی آف کردیا اور اپنے پاکستانی ... شیر دل ثابت ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اسپتال کی منظرکشی انھیں تشویش میں مبتلا کردے گی مگر طوطی صاحب بڑے مسرور ہوئے۔

"تم نے تو کمال کردیا میرے پاکستانی بھائی۔ ان کمبختوں کی ان گوری چمڑی والے کافر حملہ آوروں کو بڑا ناز ہے اپنی پولیس کی ذہانت پر اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے جاسوسوں کی کارکردگی پر۔ سب کی بولتی بند کردی تم نے۔ ناکوں چنے چبوا دیے۔ واللہ" اٹھے اور مجھے گلے لگا کے بڑی محبت سے بھینچ لیا "اللہ تمھیں نظرِ بد سے بچائے میرے پاکستانی بھائی۔"

پہلے میرا خیال تھا کہ ان کو اس بم دھماکے کے بارے میں بھی نہ بتایا جائے جس میں سر جیمز گورڈن کی مدد درکار تھی مگر ریاست قلات پور کے راجا گوکال رائے یعنی چوہدری ... تذکرہ کسی اور حوالے سے ممکن نہیں تھا اور ان کا ردعمل دیکھ کے میرا یہ خوف بھی دور ہوگیا تھا کہ وہ ہر جگہ ہماری ... کا اظہار کریں گے۔

ساری بات سن کے انھوں نے سر ہلایا "لو بھئی ساری بات ہماری سمجھ شریف میں آگئی ہے۔ اب یہ سارا مسئلہ تم نے ڈال دیا ہے اس قابلِ ذکر پاکستانی دماغ کے کمپیوٹر میں۔ رات بھر کمپیوٹر کام کرے گا اور صبح اس کا حل ایسے نکالے گا جیسے خالص مکھن۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "خالص مکھن؟"

"ہاں میرے بھولے بادشاہ۔ یہ باتیں تم کیسے سمجھ سکتے ہو۔ تم میں سے بیشتر انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھے۔ ابھی دودھ کے دانت نہیں ٹوٹے تھے کہ چائے پینے لگے اور ... کبھی گاؤں میں دیکھا ہوتا۔"

میں نے کہا "گاؤں تو بہت دیکھے ہیں۔"

"خاک دیکھے ہیں۔ ٹرین میں بیٹھ کے یا لاری کی کھڑکی سے تو بندہ سب کچھ دیکھتا ہے مگر ادھر ایک دن رہو تو پتا چلے کہ صبح کیسے ہوتی ہے۔ جب گھر والی یا کوئی مٹیار۔ مٹیار سمجھتے ہو؟"

میں نے عرض کی "جی پنجابی فلموں نے اس کا مطلب خوب سمجھادیا ہے۔"

"تو میرے پاکستانی بھائی! جب چاٹی میں چوڑیوں کی جھنکار کے ساتھ کوئی مٹیار لسی کو رڑکتی ہے۔ خوب رڑکتی ہے ونی تو پھر جاکے اس میں سے نکلتا ہے خالص مکھن کا پیڑا۔ ہاں! رڑکنا..."

میں نے کہا "سمجھ میں آگیا۔ طوطی صاحب یہ مت بھولیں کہ میں یونان کا سکندرِ اعظم نہیں، لاہور کا سکندر بخت ہوں۔"

"بس تو پھر سو جاؤ لمبی تان کے میری سرکار اور دیکھو کہ ہمارے دماغ کے کمپیوٹر سے کیا برآمد ہوتا ہے۔"

محسن بولا "ابھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ صبح ہوگئی۔"

"ہاں بھئی کہنے کو ہوگئی مگر تم بھی تو غور فرماؤ کہ جب بندہ سو کے اٹھتا ہے تو صبح ہوتی ہے اور جب سوتا ہے تو رات ہوتی ہے۔"

بقراط نے نیند میں کہا "جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔"

طوطی صاحب نے شفقانہ لہجے میں کہا "دیکھو اس کھوتے کو ذرا بھی تو سوچا ہے مگر اس کا دماغ چل گیا ہے اور خرابی یہ ہوگئی ہے کہ دماغ کے پرزے ڈھیلے ہوچکے ہیں۔ سوتے جاگتے یہ خود اُدھر بیٹھا بڑبڑایا کرتا ہے۔ اس کا دماغ چلتا رہتا ہے۔ وہ کیا فرمایا ہے اپنے علامہ صاحب نے ہاتھ باگ پہ ہے نہ پا ہے رکاب میں۔"

میں نے احتجاج کیا "یہ تو غالب کا شعر ہے۔"

"ارے رواجِ اسد اللہ تھا۔ اللہ کا شیر۔ مرد مومن۔ اس دور میں تو اپنا پاکستانی شاعر ہی ہوتا اور علامہ صاحب سے کم وہ بھی نہیں ہے۔" انھوں نے کمال ذہانت سے اپنے مؤقف کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جہالت کو چھپالیا اور سونے کے لیے تشریف لے گئے۔

مجھے اور محسن کو پھر کھلی چھت پر جانا پڑتا مگر بارش جو وقفے وقفے سے سارا دن جاری رہی تھی، اس وقت بھی برس رہی تھی۔ گزشتہ رات لندن کی اُن بہت کم راتوں میں سے ایک تھی جب آسمان تاروں سے روشن تھا۔ شاید اسی لیے شہزادہ سلیم نے انارکلی کو بالائے بام طلب فرمایا تھا لیکن ایک رومان پرور فضا کو اس کے نام آنے اور ہم نے اپنی موجودگی سے اس طرح برباد کیا تھا جیسے محفلِ شعر و سخن میں تالیاں اور ڈھولک بجاتے ہیجڑے گھس جاتے ہیں۔

مجبوراً ہم نے اسی دفتر میں رات گزاری جہاں بستر تک نہیں تھا۔ بقراط اس تخت پر اسی پوز میں آڑا پڑا ہوا تھا جس پوز میں وہ دن بھر بیٹھا نظر آتا تھا۔ وہ چاہتا تو اس پر فراغت سے پاؤں پھیلا کے بھی سوسکتا تھا مگر اس کو کتابت کے فن نے الف سے ی بنادیا تھا اور کوزی سے بقراط۔

میں نے ایڈیٹر کی میز پر اپنے لیے جگہ بنائی۔ بہت سی چیزوں کو ٹھوکیں لات مار کے فرش پر گرادیا۔ ٹوٹنے والی چیزیں محسن نے پہلے ہی اُٹھا کے نیچے رکھ دی تھیں۔ تکیے کے طور پر میں نے ہفت روزہ طوطی کی جلد اوّل استعمال کی۔ محسن نے خود غرضانہ رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے صوفے پر غاصبانہ قبضے کا اعلان کیا تو میں نے فراخدلی سے کام لیتے ہوئے اس کو چیلنج نہیں کیا۔ اگر اس مسئلے پر کھلا جنگ ہوتی تو بقراط مارا جاتا... مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب۔ بقراط تو پہلے ہی قریب الاختتام تھا۔

ہفت روزہ طوطی کی جلد دوم کو سر کے نیچے رکھتے ہوئے محسن نے کہا "واہ کیا نرم اور پُرتکلف بستر ہے۔ میں تو خواب میں الزبتھ کو بھی دیکھ سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "اس حرکت پر میں بھی تجھے خواب میں سنگسار کروں گا۔ آخر تو ایک شادی شدہ حیوانِ ناطق ہے۔"

"تجھے بہت تکلیف ہوگی یار اس تختے پر۔ مُردے کو قبر کی زمین پر ایسا ہی لگتا ہوگا۔" محسن بولا۔

"تو اپنے لیے وہاں بھی قوم کے گدے لگوالینا۔" میں نے جل کے کہا۔

"مجھے تو بڑی راحت محسوس ہورہی ہے۔ مجھ پر غنودگی طاری ہورہی ہے۔ واہ... کیسی پُرسکون نیند آئے گی... صبح تر و تازہ اٹھوں گا۔ تیری تو کمر اکڑ چکی ہوگی۔" اس نے اچانک کہا "اُف۔"

میں نے کہا "کیا ہارٹ اٹیک ہوگیا؟"

"یار کسی چیز نے کاٹا ہے۔ کھٹمل اتنے زور سے تو نہیں کاٹتا۔"

میں نے کہا "کالا بچھو ہوگا۔ سخت مہلک ڈنک ہوتا ہے اس کا۔"

محسن اُٹھ بیٹھا "ابے یار لندن میں کھٹمل؟ یقین نہیں آتا۔"

میں نے کہا "امپورٹڈ ہوں گے اپنے پیارے پاکستان کی سوغات لایا ہوگا کوئی۔"

اس نے ایک کو مارتے ہوئے کہا "اُف... یہ دوسرا... خون پی پی کے کالا سرخ ہورہا ہے۔"

"اس نے پیا ہوگا کسی شرابی گورے کا سفید خون۔ کالے آدمی کا خون پئے گا تو بدہضمی سے مرجائے گا۔"

محسن سونے لیٹا اور پھر اٹھا "یار میں تو مارا گیا۔ ایک پتلون کے پائنچے سے اندر چلا گیا ہے۔"

"چل جانے دے یار۔ بے زبان جانور ہے اور سوجا سکون سے۔ خواب میں الزبتھ کو بلانا چاہے تو بلالینا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں" میں نے قہقہہ مارا "شب بخیر۔ اور دیکھ ڈانس مت کر۔ کھٹمل مارنے سے تو بھی کھیل رہی ہے۔ میری نیند میں خلل پڑتا ہے۔"

علی الصباح آٹھ بجے اُٹھائے جانے پر مجھے سخت تاؤ آیا۔ رات ہم تین بجے سوئے تھے اور میرا دس بجے سے پہلے جاگنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا مگر جگانے والا چراغ نوردین تھا۔ وہ سخت بدحواس اور پریشان کھڑا تھا۔ مجھے جگانے کے لیے اس نے میرے پیر کے تلوے پر برش پھیرا تھا۔ شاید اس کے نزدیک جھنجوڑ کر جگانے کے مقابلے میں یہ نرمی اور شرافت سے بیدار کرنے کا مناسب طریقہ تھا مگر مجھے ایسا لگا جیسے میرے پاؤں پر کاکروچ یا بچھو چڑھ گیا ہے۔ میں نے ہڑبڑا کے لات چلائی تو وہ شہزادہ سلیم کے چہرۂ مبارک پر لگی۔ وہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ لات کھا کے وہ گھوما اور بقراط پر جاگرا۔

بقراط اچھل کے کھڑا ہوگیا "یہ... کون سا بم گرا تھا مجھ پہ۔"

نوردین نے جبڑا ہلاتے اور سہلاتے ہوئے کہا "او دے پاگل دے پتر۔ میں تجھے بم لگتا ہوں، شور مت کر۔"

بقراط نے آسمان کی طرف دیکھا "اللہ کا شکر ہے۔ ویسے کیا تم

www.paksociety.com

جانتے ہو کہ تم کو خلا میں راکٹ کی مدد سے چھوڑ دیا جائے تو تم بھی سیارے کی طرح ہمیشہ اسی مدار پر گردش کرتے رہو گے۔ خلا میں ہوا نہیں ہے چنانچہ جسم سے روح جدا ہونے پر بھی تم وہاں ہی رہتا ہے۔ نیوٹن کے قانون حرکت کے مطابق۔ خیر، تم نہیں سمجھ سکو گے؟" وہ پھر لیٹ کے سو گیا۔

"توبہ توبہ! کیسی بھیانک باتیں کرتا ہے بقراط۔ یعنی لاش خلا میں گھومتی رہے گی۔" نورودین ابھی تک وحشت زدہ تھا۔

"یہ تو بقراط ٹھیک ہی کہتا تھا" میں نے کہا "مگر تم بتاؤ کہ میرے ساتھ یہ کیا نامعقولیت کر رہے تھے تم۔"

"معافی۔ آپ نے تو دولتی جھاڑی ایسی کہ میرا منہ ٹیڑھا کر دیا۔ میں آپ کو جگا رہا تھا شرافت سے۔"

"یہ شریفانہ طریقہ تھا؟" میں نے کہا۔

"آپاجی تو بستی الٹ دیتے ہیں یا غسل خانے کا لوٹا بھر کے پانی سر پر ڈال دیتے ہیں۔" اس نے ذرا جھینپ کے کہا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا "یہ ایسے ہی اٹھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم ہی اخبار منگوا لے آؤ۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "آپاجی نے دیکھا کہ صوفہ گیلا ہے تو سمجھیں گے نیند میں وہ خطا ہو گیا۔" اس نے ایک چھوٹی انگلی دکھا کے کہا۔

میں نے کہا "چلو صوفہ الٹ دو۔"

"یہ ماریں گے جی مجھے۔ آپ سے کام تھا ویسے بھی۔"

"نہیں ماریں گے" میں نے کہا "تم کہہ دینا کہ میرا حکم تھا۔ تمہارا کام بعد میں، پہلے یہ کام کرو۔"

نورودین نے سر ہلایا اور زور لگا کے صوفہ الٹ دیا۔ محسن لڑھک کر فرش پر گرا اور لال پیلا ہو کے اٹھا "الو کے پٹھے" اس نے مجھے خون آشام نظروں سے گھورا۔ پھر اس کی نگاہ نے اصل مجرم کو دیکھ لیا "تم....!"

نورودین فوراً میرے پیچھے آ گیا "مجھ سے انہوں نے کہا تھا۔"

"یہ نہیں کہ جاتے ابا جی کی چارپائی الٹ دو' تو الٹ دو گے؟ اتنی مشکل سے نیند آئی تھی" محسن غرا کے بولا۔

"آپ مہربانی فرما کے میری فریاد سن لیں" نورودین نے ہاتھ جوڑ کے کہا "آپاجی آ گئے تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ خدا کے لیے میری مدد کریں۔ میرے سر کو استرے سے بچائیں۔ ابا جی میری ٹنڈ کرانے پر تل گئے ہیں۔ اتنی محنت سے اور محبت سے میں نے یہ ہیر اسٹائل بنایا تھا۔"

"واقعی!" محسن نے منہ پھاڑ کے جماہی لی "دلیپ کمار دیکھے تو اپنا ہیر اسٹائل بدل دے۔"

میں نے اسے تسلی دی "دیکھو مسٹر لائٹ آف دین۔ تمہارے بالوں کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ یہ ہماری ذمے داری ہے مگر اس کے بدلے میں تم ہمارے لیے کیا کرو گے.... بولو۔"

"آپاجی کہتے ہیں" اس نے سوچ کے کہا "میں تو بالکل ہی نکما ہوں جی۔ میں کیا کر سکتا ہوں اس دنیا میں۔ سوائے عشق کے۔ تو وہ کیا نہیں جاتا ہو جاتا ہے خود بخود۔ آپا بھی کہتی ہیں کہ انہیں تو جہاں عشق ہوا شادی کر لیتے ہیں۔"

محسن بولا "تم بھی کر لو تو وہ بہت خوش ہوں گے کہ تم ان کے نقش قدم پر چل رہے ہو۔"

"توبہ کریں جی۔ وہ تو مانتے ہیں اسلامی لشکر۔ کہتے ہیں کہ مسلمانان برطانیہ میں کرے چار شادیاں اور ہر شادی سے ہوں نو بچے۔ ان چھپن بچوں کے جوان ہونے تک وہ بوڑھا نہیں ہوا ان سب کی شادیاں خود کرائے، میڈیکل چیک اپ کے بعد۔"

"کس بات کا میڈیکل چیک اپ؟"

"یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدانخواستہ لڑکی بانجھ تو نہیں ہے۔ اس طرح چھپن بیٹوں کے بھی چودہ چودہ بچے ہوں تو سوچو دادا ہی پوتوں کا دادا ہو گا۔ دادا دادی کو شامل کر کے ساتھ چھیاسی۔ بسم اللہ کے اعداد' یہ کتنا مبارک آغاز ہو گا۔"

میں نے کہا "یہ ان کا انگلستان کو بالآخر پاکستان بنانے کا منصوبہ ہے۔ تم کو اس عظیم کام میں ان سے یقیناً تعاون کرنا چاہیے۔"

محسن بولا "مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ہر بیوی کے چودہ بچے لڑکے ہوں اور پھر وہ سب بھی برطانیہ میں مسلمانوں کی آبادی بڑھانے کے اس کارخیر میں برابر کے شریک ہوں۔"

نورودین رونی شکل بنا کے بولا "میں نے بھی یہی کہا تھا ایک کہ آخر لڑکی کیا کرے گی تو انہوں نے میرے ایک جھانپڑ مارا۔ شاہجہاں کی بیوی تھی ممتاز محل' وہ بھی لڑکی تھی مگر اس نے جنے تھے چودہ بچے اور اس کا انتقال بھی چودھویں بچے کی پیدائش کے وقت ہوا تھا۔ دیکھو اس کے لیے تاج محل بنایا گیا تھا۔ مگر چار شادیاں کرنے سے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ شادی ہی نہ کروں۔ آپ سب کو اپنی بیوی سمجھتا رہوں۔"

میں نے کہا "تم بڑے ناخلف گستاخ اور گنہگار ہو۔ خیر! خیالات پر دنیا میں تمہارے اباجی اور آخرت میں اللہ میاں تم کو سزا دیں گے.... جس کے تم مستحق ہو۔ ابھی تو ہم سے مطلب بات کرو۔ اس شکل کو ملاحظہ فرمائیے۔"

اس نے محسن کی طرف دیکھا۔ "اس میں کیا ہے؟ ملاحظہ فرمانے کو؟"

میں نے کہا "کیسا ہے یہ چوکھٹا۔"

"بس اچھا ہے۔ میرے جیسا حسین چہرہ تو بہت کم ہو گا۔"

محسن نے کہا "ٹھیک ہی سلوک کرتے ہیں حاجی صاحب تمہارے ساتھ۔ اس چپل کباب جیسی شکل پر اتنا ناز ہے۔"

وہ مسکرا ہان کے بولا "ہوگی۔ ہر ہفتے میں ایک دن چھوٹی لڑکی فریفتہ ہو جاتی ہے مجھ پر۔ پچھلے سال ایک سو چھپن تھیں میں سے چالیس۔"

محسن نے کہا "ایسی لڑکیوں کی بات مت کرو جو شکل دیکھ کے یا جیب دیکھ کے عاشق ہوتی ہیں۔ اصلی چیز تمہارا ہاں ہے نہیں اس لیے اور دوسری مشکل تم باپ کا بال ترشوانے کے لیے نہیں کرتے ہو۔ ممکن ہے چوری ڈکیتی بھی کرتے ہو۔"

میں نے فوراً حالات کو مزید خراب ہونے سے بچا لیا "تم ڈرامے کرتے ہو نا' ایک ڈراما ہم بھی کرنا چاہتے ہیں۔"

"بھائی۔ مجھے چانس دیں گے آپ؟" وہ خوش ہو گیا "آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے؟ میں بالکل پیدائشی ہیرو ہوں میں۔ میری شکل کچھ کیری کوپر سے..."

"اور کچھ ناردن کی محبوبہ سے ملتی ہے" محسن بولا۔

میں نے کہا "تم میری طرف دیکھو اور دھیان دو صرف میری بات پر۔"

"بہت ڈرامے کر چکا ہوں میں۔"

"وہ تم دیکھ رہے ہو۔ ایک نیا ڈراما تو ہر روز تمہارے اپنے گھر میں ہوتا ہے جس میں ولن ہوتے ہیں تمہارے والد ماجد۔" محسن بولا۔

میں نے محسن کو ڈانٹا "یار' تجھے رات بھر کھٹمل کاٹتے رہے یا کسی اور کا کیا قصور جو تم کاٹنے کو دوڑ رہا ہے۔ نورودین ہم جس ڈرامے کی بات کر رہے ہیں اس کا تعلق ہے اصل زندگی سے۔ اس میں تم ہمارا ساتھ دو گے تو ہم تمہیں اس کا معاوضہ دیں گے۔"

"معاوضہ دیں گے؟" اس کا چہرہ چمکنے لگا "کتنا؟"

میں نے متانت سے کہا "جتنا بڑے بڑے ہدایت کار دلیپ کمار کو دیتے تھے۔"

محسن بولا "انیس سو چھیالیس میں۔"

"سب بڑے فنکاروں نے پہلے ذلت اٹھائی تھی" میں نے کہا۔ "اور بہت پاپڑ بیلے تھے۔"

محسن بولا "ہمارے ساتھ تم بھی پاپڑ کی طرح بیلے جاؤ گے' تمنا ہو..."

"تمہارے خوب صورت ہیرو ٹائپ ہیر اسٹائل کے مستقبل کی ضمانت ہم دیں گے۔ اس کے علاوہ تم کو دس پاؤنڈ یومیہ۔ علاوہ اخراجات آمدورفت اور خرچہ کھانے پینے کا۔"

"پینے کا خرچ بھی۔"

میں نے کہا "تم عبدل کے ریسٹورنٹ سے چائے جتنی بار چاہو پی سکتے ہو اور کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم مزید مذاکرات ناشتے کی میز پر کریں۔ ناشتہ ہم مسٹر عبدل کے دھابے اسٹار ریسٹورنٹ میں کر سکتے ہیں۔ یہاں ویسے بھی تمہارے خطرناک آباجی کی دخل اندازی کا خطرہ ہے۔ سر پر تلوار کی طرح موجود ہے۔"

"تلوار یہ تو زنگ خوردہ ہے۔ ہماری گردن نہیں کٹ سکتی مگر زخمی ہو جائے گی۔" محسن بولا "اس وقت کیا صورت حال ہے۔ تلوار کہاں ہے؟"

"تلوار تو حاجی صاحب کہتے ہیں اپنی بیویوں کو" وہ دانت نکال کے بولا "کہتے ہیں کہ دیکھ لو ایک نیام میں دو تلواریں کیسے رہ سکتی ہیں۔ حاجی علم دین چار رکھ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا وہ ابھی تک خواب خرگوش میں گھوڑے بیچ کے سو رہے ہیں۔"

"وہ نماز پڑھنے کے لیے اٹھتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں۔"

"انٹرول کے بعد خواب کی باقی فلم دیکھتے ہوں گے۔ خیر' اللہ انہیں کروٹ کروٹ آرام و سکون عطا کرے" میں نے ان کے برخوردار کے سامنے ایسا کہنا مناسب نہ سمجھا کہ طوطی صاحب کے لیے ایک سے زیادہ بیویوں کے باعث ناممکن ہے۔

عبدل کا چہرہ خلاف توقع ہمیں دیکھتے ہی اتر گیا جیسے ہم اس کے قرض خواہ ہیں۔ اس پر جو احسان قرض تھا وہ پرانی بات تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کے کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا اور یہ کہنے کی غلطی کر بیٹھا تھا کہ ہم جب تک لندن میں ہیں اس کے ہوٹل کو اپنا ہی ہوٹل سمجھیں۔

میں نے کہا "بھئی عبدل۔ ہم تو جا رہے تھے انگلش بریک فاسٹ کے لیے کسی بہت اچھے ریسٹورنٹ میں۔"

"ضرور جانا چاہیے بندے کو۔ لندن میں بھی وہی کھانا جو بھاٹی گیٹ میں ملتا ہے تو پھر آنے اور آنے کا فائدہ؟" وہ بولا۔

"لیکن ہم خلوص اور محبت کی قدر انگلش بریک فاسٹ سے زیادہ کرتے ہیں۔ تم لاؤ جو بھی ہے۔ پوری حلوہ اور پائے پراٹھے۔"

"اور تین ہاف بوائل انڈے۔ کافی' ابھی جب تم نے کہہ دیا ہے کہ اسے اپنا ہی ہوٹل سمجھیں تو پھر تکلف کیسا؟"

"میرے لیے دو انڈوں کا آملیٹ سلائس اور چائے میں مکھن کی ٹکیا ملائی کے ساتھ" نورودین بولا "ان کے حساب میں۔"

"ہمارا ان کا کوئی حساب نہیں نورودین۔ عبدل تو ساری عمر اپنا قرض نہیں اتار سکتا۔ یہ خود اس کا خیال ہے۔"

"ہم نے احسان جو کیا تھا اس کی زندگی بچا کے۔ ہم نے تو خیر اپنا انسانی فرض ادا کیا تھا۔ مگر عبدل کہتا ہے کہ ہم نے اس کی جان نہ بچائی ہوتی تو آج یہ کاؤنٹر پر اس شان سے نہ بیٹھا نظر آتا۔ خود اپنے ذاتی ہوٹل میں۔ یہ اپنی ذاتی قبر میں دھا تنہا پڑا ہوتا' ہے نا عبدل؟"

اس نے خون کے گھونٹ پی کے مسکرانے کی کوشش کی اور سر ہلا کے کہا "ہاں جی۔ اس میں کیا شک ہے مگر یہ نورودین سو روا چرب ہے۔ اسے تو میں سنکھیا اور دھتورا دوں گا ناشتے میں' نیلے تھوتھے کے ساتھ۔"

میں نے کہا "عبدل۔ یہ ہمارا مہمان ہے۔ یہ ہمارا چھوٹا بھائی ہے اور مستقبل کا عظیم ایکٹر ہے۔ دیکھ لینا ایک دن وحید مراد اس کے سامنے اپنے قدم جھاڑو دیتا نظر آئے گا۔ محمد علی اس کی جوتیاں اٹھائے گا اور ندیم اس کو سر پر بٹھائے گا۔"

www.paksociety.com

وہ نوردین کو گھور کے بولا "ایسا ہوا تو جناب لکھ لیں میری بات بھی' وحید مراد اس کی صورت پر جھاڑو مارے گا۔ محمد علی ہو تیوں اور ندیم اسے اُٹھا کے پھینکے گا گٹر میں یا کسی پہاڑ سے نیچے؟"

نوردین بڑا وسیع القلب تھا۔ اس نے تحمل اور بردباری کا بے مثل مظاہرہ کرتے ہوئے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور بقول اس کے ملت کا "بمباٹ" ناشتا کر کے اسے روحانی مسرت حاصل ہوئی۔

"بات یہ ہے مسٹر نوردین!" میں نے بالآخر مطلب کی بات کی "تم ہر قسم کا رول کرسکتے ہو۔ ظاہر ہے ہر طرح کا حلیہ بنا سکتے ہو۔ میک اپ سے چہرہ بدلنا تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"باجی تو بہت گالیاں دیتے ہیں کہ ہر کام اُلٹے ہاتھ سے کرتا ہے کمبخت' اسی لیے سیدھا کام بھی اُلٹا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہی نہیں کہ میں پیدائشی لیفٹ ہینڈر ہوں۔"

میں نے کہا "سمجھ جائیں گے ایک دن۔ یہ بتاؤ کہ تم محسن کو کیا بنا سکتے ہو۔ اُلو بنانے کے علاوہ؟"

محسن نے سہلایا "میں تمہارا ہم شکل نظر آنا بھی نہیں چاہتا۔"

"تم اسے میک اپ کرکے یا کرا کے اتنا بدل دو کہ یہ پہچانا نہ جائے۔ تم اسے جوگی فقیر' پوسٹ مین یا وردی والا بس کنڈیکٹر' بوڑھی میم یا مس افریقہ' نہ جانا ہو ہمارا۔ اور خود بھی ایسا بھیس بدلو کہ تمہارا باپ بھی تم کو نہ پہچان سکے۔"

"اسی میں تمہاری سلامتی ہے" محسن بولا "پہچان لیا تو وہ تمہیں گنجا کردے گا۔"

میں نے اسے خبردار کیا "بلاوجہ نوردین کو دہشت زدہ مت کرو۔ اس کے سر کی زلفوں کو پورا تحفظ حاصل ہے۔ میں خود بھی جیسا نظر آرہا ہوں۔ ایسا نظر نہیں آنا چاہتا۔"

نوردین نے ڈکار لے کر کہا "یہ کوئی مشکل کام نہیں مگر مجھے ابھی تک تم نے ڈرامے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میرا مطلب ہے اسکرپٹ وغیرہ۔"

میں نے کہا "اسکرپٹ ہوتا ہے اسٹیج ڈرامے کا اور یہ ہے حقیقی زندگی کا ڈراما۔ میں تم کو بتا رہا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہوگا۔ تمہاری اصل ذمے داری ہے اپنا اور ہمارا میک اپ سے چہرہ بدلنا اور حلیہ تبدیل کرنا۔"

"یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔ میں تم کو اس دُکان پر لے چلتا ہوں جو تھیٹر گروپس کو اور آرٹسٹوں کو ان کے رول کے لیے کرائے پر چیزیں دیتا ہے۔ داڑھی مونچھیں' وگ اور ماسک۔ کاسٹیوم وغیرہ۔"

میں نے کہا "آگے بولو مسٹر نوردین۔"

نوردین نے منمنا کے کہا "وہ یہودی ہے۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ ہم اس سے فلسطین کے مسئلے پر کوئی بات نہیں کریں گے۔"

محسن بولا "اسے قتل بھی نہیں کریں گے۔ حالانکہ ثواب ہوگا۔"

"یہ بات نہیں۔ وہ تو مجھے پکڑ لے گا۔" نوردین نے کہا۔

"آخر کیوں؟ تم کوئی پکڑنے والی چیز ہو؟" میں نے کہا۔

محسن بولا "ہاں۔ لوگ خرگوش... چیتے اور بھالو پکڑتے ہیں اور تتلیاں یا رنگین طوطے۔ بے شک اُلو بھی پکڑتے ہیں۔"

"دراصل... میں مقروض ہوں اس کا۔ اس سال کرسمس میں نے اس سے سانتا کلاز کا ڈریس لیا تھا۔ ایک ہاتھ کی داڑھی' سفید بالوں اور مونچھوں کا سیٹ تھا۔ داڑھی میں آگ لگ گئی تھی۔ پورا سیٹ برباد ہو گیا تھا۔ وہ دس پاؤنڈ مانگتا ہے۔"

"آگ کیسے لگی تھی؟" محسن نے کہا۔

"وہ جی۔ آج کل کے بچے تو آپ جانتے ہیں کتنے تیز ہو گئے ہیں۔"

محسن نے سہلایا "تمہارے والد کی اس بات سے ہم اس طرح اتفاق کرتے ہیں' تم کو دیکھتے ہوئے۔"

وہ بولا "میں کرسمس پر ایک بچے کو کھلونے اور گفٹ دے رہا تھا جس کا آرڈر اس کے ماں باپ دے کر آئے تھے۔ کرسمس پر شاپس کمیشن کی بنیاد پر سانتا کلاز رکھ لیتی ہیں۔ میں نے بھی پارٹ ٹائم جاب کرلیا تھا۔ وہ بچہ ہوگا سات آٹھ سال کا مگر مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا کہ "اُلو بنانے آئے ہو مجھے؟ یہ دیکھو رسید ڈیڈی نے یہ گفٹ خریدے ہیں۔ تم فلاں شاپ سے آئے ہو نا؟ نہیں جانتا تمہیں کہ یہ فضول کھلونے۔" میں نے سانتا کلاز کا روپ دکھایا وہ مجھے زخمانے پر آمادہ ہیں۔" میں نے سانتا کلاز کی طرح کہا "اچھے بچے ایسی باتیں نہیں کرتے" تو اس نے کہا کہ "ایکٹنگ مت کرو۔ میں تو ویسے ہی بہت حرامی ہوں اور بہت بگڑے ہوئے ہوں۔" اس نے لائٹر نکال کے میری داڑھی جلا دی اور مجھ پر اچھا پرفیوم گرا۔ میں نے ایک دم داڑھی مونچھیں اور وگ اُتار دی ورنہ چہرہ جل جاتا۔"

میں نے کہا "چلو دس پاؤنڈ ہم ادا کر دیں گے۔"

"اب پندرہ پاؤنڈ ہو گئے ہیں۔ ایک پاؤنڈ ماہانہ سود والا۔"

"چلو چنتے بھی ہیں۔" میں نے کہا "سامان تو سب مل جاتا ہے؟"

"ہاں' سامان تو اچھا ہے اس کے پاس لیکن۔"

"پھر لیکن..." محسن نے میز پر مُکا مارا۔

صبل لیک کر آیا "سری ایبل کی کوئی بات نہیں چلی تو مفت میں مت توڑیے۔"

میں نے کہا "صبل کیا تمہیں یاد ہے ہم نے ان کا کیا حال کیا تھا جو تمہیں قتل کرنے والے تھے۔"

اس نے نفرت سے کہا "یاد ہے جی۔"

ہفتے میں ہم کالوں کا بھی یہی حشر کرتے ہیں بلکہ رنگ دیکھتے ہی نہیں' جو سامنے آجائے اسی کا آملیٹ بنا دیتے ہیں۔"

وہ فوراً سامنے سے ہٹ گیا۔ ریسٹوران میں اس وقت چار لوگ بھی تھے اور دو کالے بھی۔

محسن نے کہا "اگلا میں دوسرا انکار مار کے پوچھوں' لیکن کیا؟"

نوردین نے کہا "اس کی ایک لڑکی ہے' بہت خوب صورت۔"

میں نے کہا "سوری۔ ہم تمہاری اس سے شادی نہیں کرا سکتے۔"

"یہ بات نہیں ہے جی... دعا کریں وہ دکان پر نہ ملے۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے "اے خدا۔ ہمیں اس یہودی کی بیٹی کے دیدار حسن سے بچا۔"

نوردین نے سر جھکا کے کہا "آمین۔ دراصل میں اس کا بھی مقروض ہوں۔ ایک بار وہ ڈیٹ پر میرے ساتھ گئی۔ ڈنر کے بعد چلی گئی ایک گورے لیجے حبشی کے ساتھ۔ دوسری بار میں نے بدلہ لے لیا۔ اس کو ساتھ لے گیا اور ڈنر کے بعد خود فرار ہو گیا۔ بل اسے دینا پڑا تھا ستر پاؤنڈ۔"

محسن نے کہا "چر نوردین۔ تمہارے یاروں کی انشورنس پالیسی ہمیں بہت مہنگی پڑ رہی ہے۔ تم چھوڑو ذرا یہ کا چکر' سیدھے ہو جاؤ۔"

میں نے کہا "ان۔ فرض کرو یہ ستر پاؤنڈ بھی ہم ادا کردیں تو تم پھر لیکن کا چکر چلا دو گے۔"

"نہیں جی اور کوئی لیکن نہیں... دراصل اس یہودی کے سوا میں کسی کو جانتا بھی نہیں۔ جس کے پاس آپ کی ضرورت کا سامان ہے۔ ویسے تو لندن میں بہت ہوں گے مگر سب ضمانت مانگتے ہیں۔"

"او کے۔ پینتیس پاؤنڈ میں ہم تمہیں یہودی سے اور یہودی کی بیٹی کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچالیں گے لیکن۔"

"مجھے دس پاؤنڈ نہیں دیں گے؟" نوردین منمنا کے بولا۔

"تمہیں بھی مل جائیں گے دس پاؤنڈ..." میں نے اس کے اطمینان کے لیے کہا "لیکن پھر تم ہمارے ساتھ رہو گے اور جیسا ہم کہیں گے وہی کرو گے۔ تمہارے والد ماجد کو کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔"

"ان کو ضرور پتا چل جائے گا۔ ہر بات معلوم ہو جاتی ہے ان کو۔ فرشتے ہیں یا جنات جو ان کو خبر کر دیتے ہیں..." وہ مایوسی سے بولا۔

"ہم اسلوٹ کے گھر نہیں جائیں گے ابھی" میں نے کہا۔

"ابا جی تو قتل کر دیں گے مجھے۔ وہ سمجھیں گے کہ میں رات بھر غائب رہا۔"

میں نے کہا "ہم بتا دیں گے انہیں کہ تم ہمارے ساتھ تھے ہم تمہارے ساتھ لندن گھومنے نکل گئے تھے۔ ایک بڑے بھائی کی طرح ہم نے تمہارے اخلاق و کردار کی نگرانی کی۔ کسی سے آنکھ تک نہیں لڑانے دی۔"

یہودی کی دُکان ایک میوزیم تھی۔ اس میں فرش سے چھت تک اور تمام دیواروں پر الماریوں میں اور جہاں بھی جگہ تھی کچھ نہ کچھ رکھا ہوا تھا یا لٹکا ہوا تھا۔ ہر قسم کے سائز' ہر رنگ کی وگ' ہر سائز کی داڑھی' مصنوعی ناک اور کان۔ چہرے کے ماسک جن سے آدمی' جن' بھوت' شیطان کچھ بھی نظر آسکتا تھا۔ ہر طرح کے ڈریس' چودھویں صدی سے اکیسویں صدی تک استعمال ہونے والے' ولیم شیکسپیئر' جولیس سیزر سے ریڈ انڈین اور خلائی مخلوق تک کے ملبوسات۔ گدھے سے شیر تک کے منہ اور کھال سمیت۔ قدیم تلواروں سے جدید ترین نقلی مشین گن تک۔ وہاں اتنا سامان تھا کہ اسٹیج ڈراما کیا اس سے ایک فلم یونٹ کی ضروریات پوری ہو سکتی تھیں۔ ایسی دکان کا ابھی اپنے پاکستان کے کسی شہر میں تصور نہیں تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہودی چیزیں گروی بھی رکھتا تھا یعنی یہ PAWN شاپ بھی تھی۔ وہ نوادرات بھی خرید لیتا تھا اور چوری کا مال بھی۔

بلاشبہ وہ بدصورت ہی نہیں بدنیت اور بدباطن بھی تھا۔ نوردین کو دیکھتے ہی وہ چلانے لگا "تم پھر آگئے دغا باز۔ بندر کی شکل والے۔"

نوردین نے مسکراتے ہوئے کہا "آج تمہارے حلق سے پوری آواز نہیں نکل رہی ہے۔ تمہیں گلے کا کینسر تو نہیں ہو گیا؟"

وہ اُچھلا "کینسر ہو تمہارے باپ کو۔ میں کہتا ہوں کیوں قتل ہونے آئے ہو یہاں۔ میرے پاس اصلی بندوق بھی ہے۔"

"اس کا کتنا کرایہ لیتے ہو تم؟" نوردین نے جیب میں سے پندرہ پاؤنڈ نکالے اور اس کی طرف پھینک دیے "یہ تمہارے واجبات۔"

اس نے نوٹ گنے اور ایک رجسٹر کھول لیا "بال بال بچ گئے آج تم۔ ذرا میں حساب دیکھ لوں... یہ تو کم ہیں۔ ایک پاؤنڈ دس شلنگ اور چھ پنس۔"

"یہ کس بات کے؟" نوردین نے کہا۔

"میں تمہارے گھر گیا تھا۔ تمہارے باپ سے قرضہ وصول کرنے۔ دس شلنگ اور چھ پنس کرائے میں خرچ ہوئے تھے۔"

"تم... ابا جی سے ملے تھے؟"

"ہاں اور اس کینہ پرور بڈھے نے مجھ پر حملہ کیا۔ پہلے گالیاں دیں کہ میں یہودی ہوں۔ میں نے اس کے آفس میں قدم رکھا تو اسے ناپاک کیا۔ جیسے میں انسان نہیں سؤر ہوں۔ اس نے مجھ پر چیزیں پھینک کے ماریں۔ ایک پیپر ویٹ میرے سر میں لگا۔ اس سے میرا سر تو بچ گیا مگر چشمہ ٹوٹ گیا۔ ایک پاؤنڈ میں بنا۔"

نوردین نے قہقہہ مارا "کیا تم نے اسے بتایا تھا؟"

"بتایا خاک۔ اس نے میری بات کب سنی" یہودی غرا کے بولا۔

www.paksociety.com

"پھر تو میں نے تمہارے واجبات ادا کر کے غلطی کی۔ یہ ایک پاؤنڈ دس شلنگ چھ پنس تم میرے باپ سے وصول کر سکتے ہو تو کر لینا۔ تم اپنے رنگ پر گئے تھے نہ جاتے۔"

"میں تمہاری وجہ سے گیا تھا اور ہاں 'نادیا!'" اس نے اندر دیکھتے ہوئے آواز لگائی "کیا وہ حرام زادہ جس کے ساتھ تمہیں جانے سے میں نے منع کیا تھا۔ تم کیسے بڑی مشکل سے گھر آئی تھیں۔"

نادیہ اندر سے یوں نمودار ہوئی کہ میں اور محسن دم بخود رہ گئے۔ نوردین نے اسے حسین قرار دیا تھا۔ اس سے نوردین کے کم عقل ہونے کا ہی نہیں بلکہ اس کی نظر کے تور کا بھی پتا چلتا تھا۔ وہ بانا عدہ بدصورت تھی۔ اس کی عمر بھی نوردین کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی اور وزن میں شاید اس سے دگنی۔

اس نے نوردین کو دیکھتے ہی چیخ ماری "ہاں پاپا۔ یہی ہے وہ جس کی وجہ سے مجھے اپنے نائٹ کلب چھوڑ کے آنا پڑا تھا۔ صرف ستائیس پاؤنڈ کے لیے۔ اس کو مارڈالو پاپا' تلوار سے یا بندوق سے۔"

"اگر یہ ستائیس پاؤنڈ ادا کر دے تو... کیا ضرورت ہے اتنی زحمت اٹھانے کی" پاپا نے لالچی نظروں سے ان نوٹوں کو دیکھا جو نوردین بڑی رئیسانہ شان سے گن رہا تھا۔

"یہ لو ستائیس پاؤنڈ۔ ویسے مجھے یقین نہیں کہ نادیہ نے وہاں اپنے نائٹ چھوڑے ہوں گے۔ میں جانتا ہوں اس ہوٹل کے منیجر کو۔ اسے موٹی بھینس جیسی لڑکیاں بہت مرغوب ہیں۔ آخر یہ صبح تک....."

پاپا نے کہا "اس نے دو پاؤنڈ ٹیکسی ڈرائیور کو بھی دیے تھے۔"

"اس کا باپ آج تک ٹیکسی میں نہیں گیا۔ یہ لفٹ لے کر آئی ہوگی یا پیدل۔ مجھے ٹھگنے کی کوشش مت کرو۔ میں کچھ اور سامان لینا چاہتا ہوں۔ بدمعاشی کرو گے تو کہیں اور چلا جاؤں گا۔" نوردین بڑا کائیاں ثابت ہو رہا تھا۔

یہودی کا موڈ ایک دم بدل گیا "ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ کون ہیں تمہارے ساتھ؟"

"یہ بڑے مشہور رائٹر اور ڈائریکٹر ہیں۔ ڈرامے کے لیے نئے ایکٹر لینا چاہتے ہیں۔ رائل کے لیے کچھ سامان چاہیے۔"

"اگر تم اس کے ہیرو کا پارٹ کرو تو نادیہ کا خیال رکھنا۔ اس کی بڑی اچھی جوڑی بنے گی تمہارے ساتھ۔" وہ گنجے سر پر ہاتھ پھیر کے بولا۔

نادیہ نے آگے جھک کے کہا "پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ میں پھر ڈنر پر جا سکتی ہوں تمہارے ساتھ۔"

احمق نوردین پھر چڑی سے اترنے لگا "اچھا..... واقعی..... تم چلو گی!"

میں نے اسے ٹھوکا دیا "خبردار۔ تم پھر اس یہودی کی بیٹی کے جال میں پھنس رہے ہو۔ کیا ستائیس پاؤنڈ کا جرمانہ ادا کر کے بھی

تمہیں عقل نہیں آئی؟"

محسن نے کہا "بس سامان لو اس سے اور چلو۔"

میں نے اپنے لیے ایک پادری کا لباس منتخب کیا۔ اس کے ساتھ لمبا کالا کوٹ اور اونچا پادا ہیٹ۔ گول شیشوں اور نمبر والا چشمہ۔ لانگ بوٹ اور سیاہ پتلون پہن کے ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں بائبل جیسی کتاب تھام کے میں کیتھولک چرچ کا فادر ..... بن سکتا تھا۔ محسن ایک بدھ بھکشو بننا چاہتا تھا مگر یہ مشکل کام تھا۔ گیروے رنگ کی دھوتی اور چادر جو بھکشو نیچے سے اوپر تک بس لپیٹ لیتے ہیں مگر وہ سر منڈاتے ہیں اور ننگے پاؤں پھرتے ہیں۔ تاہم یہودی نے حوصلہ افزائی کی اور مدد بھی۔ یہودی کی بیٹی اس لحاظ سے بیکی مین (لادر من) تھی کہ اسے تھیٹر کے اداکاروں کے لیے میک اپ کا تجربہ تھا۔ وہ کرداروں کے مطابق ان کے چہرے ..... بنا دیتی تھی۔ میں نے اسے فراخ دلی سے معقول معاوضے کی پیشکش کی۔ اس نے میرا اور محسن کا چہرہ اور حلیہ بالکل بدل دیا۔

"تم تو بڑی کمال کی چیز ہو" میں نے خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ شرمانے لگی "میں دن رات آپ کے کام آ سکتی ہوں۔" نوردین نے گھڑے جیسا سر ہلایا "جیسے سب کے کام آتی ہے۔"

محسن نے کہا "اللہ اسے خدمتِ خلق کی جزا دے۔ خیرات اسے افورڈ نہیں کر سکتے۔ معاشی طور پر بھی اور اخلاقی طور پر بھی۔" یہودی کی بیٹی نے کہا "نوردین۔ تمہارا کیا رول ہے ڈرامے میں؟ آج تک کسی نے تمہیں اچھا رول نہیں دیا۔"

نوردین نے اپنی ٹھوڑی کو بلند رکھا "بڑے لوگوں، فنکاروں، سائنس دانوں کو دنیا نے بڑی دیر میں پہچانا۔"

میں نے کہا "اکثر تو ان کی صلاحیت کو ان کی زندگی میں تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔ ان کو مرنے کے بعد عزت ملی لیکن تم کو مرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے لیے ایک رول ہاتھ آیا ہے، ایک فقیر کا۔"

"دونوں تم اپنی فطری صلاحیت اور عادات و اطوار کے باعث آسانی سے کر لو گے۔" محسن نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ اس سے پہلے ہی مجھے پولیس پکڑ لے گی۔" نوردین بولا۔

نوردین بالآخر سب سے آسان حلیہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ اپنے اصلی لمبے بالوں کے ساتھ میچ کرنے والی داڑھی مونچھیں لگا کے مولانا بن گیا۔ اس نے پتلون پر ایک چھالی جیسی لائننگ وغیرہ میں پہنی جاتی ہے..... کچھ زنانہ ٹائپ چیز تھی۔ چار خانے والے کپڑے کو گول کر کے سر پر اوپر سے کمر پر آزادانہ سے باندھا جا سکتا تھا مگر نوردین کا لا مذہب تھا۔ اس نے زیرو نمبر کے شیشوں والی عینک بھی لگائی

یہودی کی بیٹی نے کوئی لوشن لگا کے ہمارے چہروں کا رنگ بھی بدل دیا۔ نوردین کو ہم نے سیاہ فام نظر آنے کے لیے جاپانی کا تاثر دیا۔ محسن کا رنگ جاپانیوں جیسا زردی مائل کر دیا۔ میرا اندازی رنگ اتنا صاف ہو گیا کہ میں گورا پادری نظر آنے لگا۔ یہودی کی بیٹی نے اپنی خدمات کا معاوضہ دس پاؤنڈ وصول کیا اور اس کے باپ نے دس پاؤنڈ کرایہ ایڈوانس وصول کرنے کے علاوہ پچاس پاؤنڈ بطور ضمانت رکھے۔

"مجھے کیا معلوم کہ تم لوٹ کر آؤ گے یا نہیں" اس نے کہا۔

نوردین بہت خفا ہوا "اب کیا فرق پڑتا ہے اگر ہم واپس نہ آئیں۔ جتنی مالیت کا یہ سامان ہے اس سے دس گنا تم نے کرائے کی صورت میں وصول کر لیا ہوگا۔"

وہ بولا "میں اسے کافی نہیں سمجھتا۔ اتنا ہی اور کیوں نہ وصول کر لیا جائے۔"

"اس کے علاوہ۔ کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔"

"نہیں۔"

"تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔" نوردین چلا کے بولا۔

"جانتا ہوں اسی لیے تو اعتبار نہیں کر سکتا۔ اب باہر نکل کے تم کیا فراڈ کرتے ہو۔ اس کا تو بے دار بھی میں نہیں۔ نہ میں کوئی دیکھ رہا ہوں اور نہ اس لباس میں میری دکان کی مہر ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس طرح بھیس بدل کے تم کہیں ڈاکہ ڈالو یا قتل کر دو کسی کا اور پھر پکڑے جاؤ تو میں تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کر دوں گا۔"

میں نے حتمی طور پر یہ بحث ختم کی "فکر مت کرو۔ اگر ہم پکڑے گئے تو تم صرف سچ اور سچ کے سوا کچھ نہیں بولو گے" میں نے اپنے سینے پر صلیب بنائی "خداوند یسوع مسیح تم پر اور نادیہ پر رحم کرے۔"

ہم دکان سے باہر نکلے تو کچھ لوگوں نے ہمیں دلچسپی سے دیکھا۔ ہم تینوں مختلف مذاہب کی نمائندگی کر رہے تھے۔ عیسائی، بدھ اور مسلمان ہونے کے ساتھ ہمارا تعلق تین مختلف ممالک سے نظر آتا تھا۔ سڑک کے کنارے بینچ پر بیٹھے ہوئے ایک شرابی نے اٹھ کر ہیٹ اتارا اور مرجھا کے ہمیں تعظیم دی "تم سب میرے پیچھے مذہبی گروہوں کے مقدس باپ ہو۔ پھر بھی میں لا مذہب ہوں۔"

نوردین بولا "کیا ڈراما شروع ہو گیا ہے؟"

محسن نے کہا "تمہارے خیال میں یہ سب کیا ہے جو ہم کر رہے ہیں؟"

"او گاڈ ایسی بات!" "اس میں تو نہ ایکشن ہے نہ سسپنس۔" محسن نے کہا "سب آنے کا ہے۔ تم ذرا سا انتظار کرو۔ تم کہاں دوڑ جاؤ گے۔ ڈرامے میں گولیاں چلیں گی اور خوب بھاگ دوڑ ہوگی۔ اگر تمہیں کوئی لگ جائے اور تم ہلاک ہو جاؤ تو برا مت ماننا۔" محسن نے کہا۔

وہ گھبرا کے بولا "کون چلائے گا مجھ پر گولیاں؟"

"ابھی سے کیا کہہ سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہاتھ چلا جائے یا پولیس چلائے اور کیا معلوم وہ ریوالور استعمال کریں گے یا اسٹین گن۔"

نوردین بولا "تم مذاق کر رہے ہو۔ مجھے اتنا تو بتا دو کہ آخر ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے کہا "تم اسے تاریخ کا سب سے سنگین مذاق کہہ سکتے ہو نوردین۔ کوہِ نور ہیرا ہماری ملکیت تھا۔ اسے بہادر شاہ ظفر سے چھین کر....."

"یہ بہادر شاہ ظفر کون تھا؟ کوئی جیولر؟"

میں نے کہا "ایسا سوال تم نے اپنے والد سے کیا ہوتا تو مناسب جواب وہ تم کو ہنٹر یا بوٹ دے کے خبیث، حرام الدہر کھوتے دے پتر تو آخری مغل تاجدار کو نہیں جانتا۔"

"تم کیوں گالیاں دے رہے ہو مجھے؟"

میں نے کہا "میں بتا رہا تھا کہ تمہارے ابا نے کہتے۔ مجھے کیا ضرورت ہے گالیاں دینے کی۔"

"اچھا کوہِ نور ہیرا مسٹر بہادر شاہ صفر سے کس نے چھینا تھا؟"

"صفر نہیں، ظفر۔ بے شک اسے انگریزوں نے بعد میں صفر کر دیا تھا مگر ہم اس کا نام نہیں بدل سکتے۔ انگریز اس سے کوہِ نور ہیرا چھین لائے تھے اور اپنی ملکہ وکٹوریہ کے تاج میں لگوا دیا تھا۔ وہ تاج اب ملکہ الزبتھ کے سر پر ہے۔ ہم اسے واپس حاصل کرنے جا رہے ہیں۔"

نوردین نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "وہ کیسے؟"

"ہم بکنگھم پیلس میں جا کے پہلے شرافت سے کہیں گے کہ ہمارا تاریخی ورثہ ہمیں لوٹا دو۔ ہم واپس چلے جائیں گے۔ کوئن الزبتھ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دنیا کی سب سے زیادہ دولت مند خاتون ہے اور اس کے پاس ہیرے جواہرات کا انبار ہے جو اسے بے حد عزیز ہے۔ ظاہر ہے کوئی عورت اپنی خوشی سے ایک چھلا بھی نہیں دیتی۔ وہ انکار کرے گی پھر ہمیں زور بازوئے مسلم سے کوہِ نور ہیرا حاصل کرنا پڑے گا۔"

محسن نے کہا "تاج اس کے سر پر ہے۔ ہم تاج لے جائیں گے اور اس نے مزاحمت کی تو سر کاٹ کے لے جائیں گے۔ تاج سمیت، جیسے بہادر شاہ ظفر کو اس کے بیٹے کا سر کاٹ کے اور طشت میں رکھ کے پیش کیا تھا انہی انگریزوں نے۔"

نوردین کا رنگ فق ہو گیا "تم پاگل ہو۔ تمہیں کوئی بکنگھم پیلس کے نزدیک نہیں پھٹکنے دے گا۔ تم اس کی ایک اینٹ نہیں لے جا سکتے۔"

"پھر ہم اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کے لوٹ آئیں گے" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "بہتر نوردین۔ لندن میں ہر شخص سے بڑا اناڑی ہوتی ہے۔"

"ہر معزز شخص کے پاس" میں نے تصحیح کی۔

"تم پیدا ایماں ہوئے پھر بھی پیدل ہو۔ تمہاری وجہ سے ہم

www.paksociety.com

سیدل ہیں۔"

نوردین دکھی ہو گیا "گاڑی کو آباجی ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ کسی دن میں اسے آگ لگادوں گا۔ میری بہت بے عزتی خراب ہوتی ہے ہر جگہ۔ کسی اخبار کا چیف رپورٹر بس یا ٹرام میں سفر نہیں کرتا۔"

"تم گاڑی صرف آنے جانے کے لیے استعمال نہیں کرتے ہو۔ اپنی عاشقانہ مہم جوئی اور قابل اعتراض حرکات و سکنات کا ذریعہ بناتے ہو۔ ان کی پاکباز گاڑی میں شراب اور لحم خنزیر استعمال کرنے والی کافر لڑکیوں کو بٹھاتے ہو۔"

"بٹھاؤں نہ تو کیا کھڑا رکھوں؟" نوردین بولا "اور گرل فرینڈ کو ساتھ لے کر نہ پھروں تو کیا آباجی جیسے داڑھی والے مولویوں کو لے کر پھروں؟"

"تم اپنی گاڑی کیوں نہیں خرید لیتے۔ اپنی غیر شرعی اور قبیح افعال اور مردانہ مصروفیات کے لیے" محسن بولا۔

"خرید لوں گا بہت جلد۔ اصل مسئلہ ہو گا اسے اپنے پاس رکھنے کا۔ وہ تو میری بیوی کو بھی اپنے حرم میں داخل کر لیں گے۔"

"کیا بکتے ہو، تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"میرا مطلب تھا آباجی سوچا کے اسے پردے میں بٹھا دیں گے۔ گاڑی بھی مجھے ان کی اجازت سے استعمال کے لیے ملے گی اور بیوی بھی۔ میں کتنا بدنصیب بیٹا ہوں" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "سنا ہے پاکستان میں لڑکے گھر سے بھاگ جاتے ہیں۔ یہاں تو اگلے دن پولیس مجھے پکڑ لے گی۔"

"کیوں۔ تم بالغ نہیں ہوئے ابھی تک؟"

اس نے افسوس سے سرہلایا "میں تو ہو گیا، آباجی بھی عاقل و بالغ ہو جائے تو اچھا تھا۔"

میں نے کہا "ہم تمہارے نیک خیالات سے حاجی صاحب کو ضرور آگاہ کریں گے۔ ممکن ہے وہ سدھر جائیں۔"

یہودی کی دکان سے اس اسپتال تک زیادہ فاصلہ نہیں تھا جہاں جارج کو جیل سے علاج کے لیے لایا گیا تھا۔ گزشتہ شب اس نے ایک مجرم کے فرار میں مدد دی اور قانون کے محافظوں پر حملہ کیا۔ اس طرح جارج نے دو سنگین جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب اس سے تفتیش ہوگی اور اس سے پوچھا جائے گا کہ وقار یوسف کون تھا کہاں سے آیا تھا اور تم سے کیوں ملا تھا۔ وہ کہاں چھپا ہوا ہے اور اس کا اصل نام کیا ہے۔ پاکستان کا معاملہ ہوتا تو پولیس ایک رات میں سب اگلوا لیتی مگر جارج سے تشدد کے ذریعے کچھ قبول کرانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ قیدی ہونے کے باوجود وہ اپنے قانونی حقوق رکھتا تھا اور یہ اس کا بنیادی حق تھا کہ اپنے وکیل سے مشورے کے بغیر کوئی بیان نہ دے۔ اس کا وکیل الفریڈ تھا جس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ مگر اس نے دوہرے قتل کے کیس میں جارج کا دفاع کیا تھا اور اس کی خدمات بھی کالوں کے حقوق کی کسی تنظیم نے حاصل کی تھیں۔ گورا ہونے کے باوجود

وہ جارج کا وکیل بنا تھا تو اس کی دو معقول وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ اچھی شہرت کا حامل تھا اور دوسرے یہ کہ وہ متعصب نہیں تھا ورنہ کالے اس پر اعتبار نہ کرتے۔

اسپتال پہنچ کے نوردین کے دل کو کچھ قرار آیا "جارج سے ملنے کے لیے یہ سب اہتمام کیا ہے تم نے۔ وہ کوہ نور والی کہانی ایسے ہی مجھے ڈرانے کے لیے سنائی تھی۔ بہادر شاہ ظفر"

"تم نے گھبرا کے سفر کیا تو میں تم کو زندہ دفن کروں گا" محسن بولا۔

اسپتال میں حالات معمول کے مطابق تھے۔ کسی قسم کی افراتفری یا غیر معمولی حفاظتی انتظامات اور پکڑ دھکڑ کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے ملک میں اس قسم کا سنگین واقعہ پیش آتا تو پولیس کی ساری فورس اسپتال پر چڑھائی کر دیتی اور ہر طرف سے اسپتال کو محاصرے میں لے کر شدید انتقامی جذبات کے ساتھ تفتیشی عمل کا آغاز ایسے ہوتا کہ سب کو عبرت ہو۔ پولیس جسے چاہے قصوروار بتائے یا پکڑ لے۔ وارنٹ کے بغیر گرفتار کر لے۔ کوئی بھی الزام کسی پر بھی عائد کر دے اور پھر اعتراف جرم کے لیے تشدد جو چاہے کرے مگر عام آدمی مشتعل ہو کے پولیس کو گالی دے یا اس کے ہاتھ مار دے تو یہ جرم ناقابل معافی۔ اب تک اسپتال میں سب کی شامت آ جاتی۔ کیا نرسیں اور کیا ڈاکٹر۔ مریض اور ان کی عیادت کرنے والے اور علاج کے لیے آنے والے سب تھر تھر کانپتے اور سب کو پوچھ گچھ کے بہانے پریشان اور ہراساں کرنے کا سلسلہ چل رہا ہوتا مگر یہاں اسپتال محفوظ و مامون تھے اور عبادت گاہوں کی طرح ان کے تقدس کو پامال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس واقعے کی انکوائری بھی قاعدے قانون کے مطابق جارج کے کمرے تک محدود رہی ہوگی اور رسمی کارروائی کے بعد کیس تفتیش کے لیے متعلقہ اداروں کے سپرد کر دیا گیا ہوگا۔

باہر دروازے پر مجھے پولیس کا ایک سارجنٹ نظر آیا جو پہلے نہیں تھا۔ یہ اضافی بندوبست، مخصوص انتظام کا حصہ سمجھا جا سکتا تھا۔ سارجنٹ صرف اندر سے باہر جانے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی بھی اتنی ہی تھی کہ جارج کو اسپتال سے فرار نہ ہونے دے۔ بفرض محال وہ اپنے کمرے کے باہر موجود پولیس گارڈ کو دھوکا دے کر نکل آنے میں کامیاب ہو جائے تو مین گیٹ پر پکڑا جائے۔ ممکن ہے وہ آنے والوں پر بھی نظر رکھے ہوئے ہو مگر وہ کسی سے تعرض نہیں کر رہا تھا۔ مریض اور دوسرے لوگ اس کی موجودگی سے بے نیاز آ جا رہے تھے۔ ہم تینوں کو بھی اس نے بس ایک نظر دیکھا اور پھر دوسری طرف متوجہ ہو گیا حالانکہ ہم دیکھنے میں مختلف مذاہب، نسلوں اور قوموں کے نمائندے تھے جو عام طور پر ایک ساتھ نظر نہیں آتے۔

نوردین نے ہم کو ویٹنگ روم میں چھوڑ دیا۔ ایک تو وہ دیکھنے میں ہی مسلمان لگتا تھا اور انگریز یا یہودی اگر کسی سیل اللہ کو مذہب کی بنیاد پر متعارف رکھتے ہیں تو وہ مسلمان ہیں۔ پھر وہ ہو گیا تھا۔ اس سے کسی منافقت کی توقع بھی کی جا سکتی تھی۔

آپریشن خراب کر دے۔ میں نے اور محسن نے اس برآمدے کی طرف مڑتے ہی جس کے آخر میں جارج کا کمرا تھا پہلے دروازے پر دستک دی اور اجازت ملتے ہی اندر چلے گئے۔ اس کمرے میں ایک بہت بوڑھی عورت اکیلی لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے اشارے سے لیٹے رہنے کو کہا۔

اس نے میرے ہاتھ پکڑ کے کہا "ہولی فادر، میرے لیے دعا کرو کہ میں اس معذور زندگی کے جنجال سے چھوٹ جاؤں۔"

میں نے لہجہ بنا کے کہا "زندگی ہر حال میں خدا کی عطا کردہ نعمت ہے۔ بہرحال ہم تمہارے لیے اجتماعی دعا کریں گے۔"

"اجتماعی دعا؟" اس نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ یہاں تمام مذاہب کا روحانی اجتماع ہو رہا ہے۔ آج ہم سارے اسپتالوں میں جائیں گے۔ ہر مذہب کے پیروکار اپنے عقیدے کے مطابق مریضوں کی صحت یابی کے لیے دعا کریں گے۔ اور تم بھی کر سکتی ہو۔ دعا کسی بھی زبان میں مانگی جائے اور کوئی بھی مانگے۔"

میں نے اس کے ایک طرف اور محسن نے دوسری طرف کھڑے ہو کر دعا کی۔ میرے الفاظ بڑھیا کی سمجھ میں آ رہے تھے۔ محسن بہ آواز بلند سورہ فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور ہم باہر نکل آئے۔ میں نے دوسرے دروازے پر ناک کرتے ہوئے کن انکھیوں سے دیکھا۔ جارج کے کمرے کے باہر موجود سارجنٹ ہمیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں ایک خر دماغ انگریز تھا۔ اس نے بادل ناخواستہ مجھے دعا کی اجازت دی مگر محسن کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ پھر میں نے اسے اپنی اجتماعی دعا کی وصیت سے قائل کر لیا اور اس نے کہا "اوکے۔ جو تمہارا جی چاہے کرو" اور سر پر کمبل تان کے سو گیا۔

تیسرے کمرے میں ایک قبطی قسم کا فلاسفر تھا جو ہم سے روحانیات کے فلسفے، اجتماعی دعا اور عقائد پر بحث کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔ وہ لادین شخص تھا اور ان سب چیزوں کو ڈھکوسلے قرار دیتا تھا۔ "خیر یہ تمہارا پیشہ ہے اور تمہیں پیشہ ورانہ سرگرمیاں جاری رکھنے کا قانونی و آئینی حق حاصل ہے۔ اگر تمہیں دعا کر کے تسکین ملتی ہے تو مجھے بھی کوئی تکلیف نہیں۔ بس یہاں آ کے کوئی شور نہ کرے جس سے مجھے ذہنی اذیت ہو۔"

چوتھے کمرے میں اس کے برعکس کٹر مذہب پرست مریض تھے بڑی مشکل سے ہماری جان چھوٹی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اس کے لیے کم سے کم آدھا گھنٹہ تو دعا کریں۔ اس نے محسن کی دعا کا مطلب بھی پوچھا اور اس کے ہاتھ بھی چومے۔ ہر کمرے میں ہمارا یہ تجربہ مختلف اور دلچسپ رہا لیکن ہم نے جس مقصد کے حصول کی خاطر یہ ڈراما کیا تھا وہ کامیاب رہا۔

جیسے ہم جارج کے کمرے کے دروازے پر پہنچے تو سارجنٹ نے روکا "سوری فادر۔ یہاں ایک قیدی ہے۔"

میں نے کہا "قیدی! کیا یہ اسپتال نہیں ہے؟"

"اسپتال میں قیدی مریض لائے جاتے ہیں" وہ بولا۔

"اور انہیں دعا کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے" میں نے کہا "ان کے جرائم کی زندگی اور ان کے گناہوں کے لیے۔ زیادہ قابل رحم ہیں ایسے لوگ آفیسر جو خدا سے بھی دور ہیں اور اس کے بندوں سے بھی۔ اللہ تم پر رحم کرے اور تمہارے ساتھ بھی ایسا ہو۔ اللہ رحم کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

اس نے سرہلا کے کہا "یس فادر لیکن آپ کچھ دیر ٹھہر جائیں۔ اس وقت قیدی کے پاس اس کا وکیل بیٹھا ہوا ہے۔"

"ہم دنیاوی قانون سے سروکار نہیں رکھتے۔ ہم آخرت کے وکیل ہیں" میں نے فلسفیانہ تدبر کے ساتھ کہا "ہمارے پاس وقت کم ہے اور دیکھا جائے تو ہم سب کے پاس وقت کم ہے۔ بس ہم سمجھتے ہیں کہ ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ ہم نجات کی فکر نہیں کرتے۔"

اس نے سوچ کے کہا "میں وکیل سے پوچھ لیتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ اندر جاتا۔ دروازہ کھلا اور وکیل باہر آ گیا۔ وہ سفید فام وکیل ساٹھ سال کے قریب تھا مگر اس کی صحت اچھی تھی۔ اس کی شکل بھی مجھے بری نہیں لگی۔ شاید اس لیے کہ اس پر نفرت تعصب یا غرور کے جذبات کا کینہ پن نہیں پایا جاتا تھا۔

اس نے سارجنٹ سے کہا "ٹھیک ہے آفیسر۔ لیکن میں تم کو پھر جارج کے قانونی حقوق یاد دلا دوں۔ اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی دوبارہ ہوگی تو میں ہرجانے کا سوٹ فائل کر دوں گا۔ ابھی تو میرے موکل نے مجھے روک دیا ہے۔"

"یس سر!" سارجنٹ نے غراتا کہا "میں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا۔ دوسروں کی ذمے داری نہیں لوں گا۔"

وکیل نے بڑا سا منہ بنایا "تم سب ایک جیسی بات کرتے ہو۔ یہ کون مسخرے ہیں؟" اس نے مجھے اور محسن کو دیکھا۔

میں نے کہا "ہم برا نہیں مانتے تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔"

"یہ جارج کے لیے دعا کرنے آئے ہیں۔"

"کیا جارج نے کہا تھا؟" وکیل چونکا۔

"ہم سب کے لیے دعا کرتے ہیں" میں نے کہا "ہر اسپتال میں، قید خانوں میں اور پاگل خانوں میں۔ جہاں بھی انسان مصیبت اور دکھ میں ہو۔ ہم ان کے لیے خدا کی رحمت طلب کرتے ہیں۔"

"یہ کام وہ خود بھی کر سکتے ہیں" وکیل پر تمسخر لہجے میں بولا۔

"مگر کرتے نہیں" میں نے کہا "ہم یہاں روحانیت کے عالمی اجتماع میں شریک ہیں جس میں ساری دنیا سے ہر مذہب کے پیروکار آئے ہیں اور ہم اپنے اپنے عقیدے کے مطابق دعا مانگتے ہیں۔ مقصد ایک ہوتا ہے۔ الفاظ یا طریقہ الگ ہونے سے خدا کو فرق نہیں پڑتا۔"

"جس کے لیے تم دعا مانگتے ہو اسے کیا فرق پڑتا ہے" وہ بولا "کیا ڈھونگ رچاتے ہیں لوگ مذہب کے نام پر۔ مذہب بھی بیشہ

www.paksociety.com

ہو گیا ہے۔"

میں نے اس کی اشتعال انگیزی کو نظر انداز کر دینا مناسب سمجھا اور جب وہ چلا گیا تو سارجنٹ سے کہا "خداوند یسوع مسیح فرماتا ہے "اے خدا! ان کو معاف کر دے کیونکہ یہ نہیں جانتے یہ کیا کر رہے ہیں؟" اور اپنے سینے پر صلیب بنا کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

جارج کو دیکھ کے مجھے شاک لگا۔ اس کے سر پر سفید پٹی تھی اور آنکھوں کے نیچے ایک نیل بھی نظر آ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ میرے جانے کے بعد پولیس نے اس کی گوشمالی کی تھی۔ ڈاکٹروں کے آنے تک اور دوسرے لوگوں کے پہنچنے تک ان کے لیے چند منٹ بھی بہت تھے۔ انہوں نے اپنا غصہ ضرور اتارا ہو گا۔

جارج نے حیرانی سے مجھے اور محسن کو دیکھا "کون ہو تم! کیا چاہتے ہو۔ اندر کیسے آئے؟"

میں نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے خاموش کیا "ڈرو نہیں جارج، ہم تمہارے لیے دعا کرنے آئے ہیں۔"

شاید میری آواز نے اسے کشمکش میں ڈال دیا "سارجنٹ نے تم کو کیسے اندر آنے دیا؟"

"ہم بے ضرر لوگ ہیں جارج۔ ابھی الفریڈ آیا تھا؟"

جارج کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "تم....؟"

"نام مت لینا میرا۔" میں نے سرگوشی میں کہا "سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ سب ٹھیک ہے۔ میں نے پولیس کو اپنا بیان لکھوا دیا ہے۔ ویسے ہی جیسے تم چاہتے تھے، وکیل کو بھی سمجھا دیا ہے۔"

"ویری گڈ! اب طوطی صاحب تمہاری طرف سے کیس کریں گے۔ الفریڈ سے کہنا ان سے مل لے۔ ڈاکٹر شکیل مرڈر کیس کو تمہارے کیس سے الگ نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب دلاور کو سزا ہو گی تو تمہاری سزا ختم ہو جائے گی اور اس کو صرف تمہاری گواہی پھانسی کے تختے تک پہنچا دے گی۔ طوطی صاحب تمہاری طرف سے درخواست دائر کریں گے کہ تمہیں لاہور بھیجا جائے۔ تمہیں لاہور بھیجنے کے لیے ہم وہاں کی عدالت سے احکامات لے کر یہاں بھجوا دیں گے۔ ہماری وزارتِ قانون تمہاری وزارتِ انصاف سے رابطہ کرے گی اور جیسا کہ میں نے بتایا تھا۔ طوطی صاحب اس معاملے کو اخبارات میں خوب اچھالیں گے۔ اس کے لیے جتنا پیسہ بھی خرچ ہو گا ہم دیں گے۔"

"تھینک یو.... تم نے میری زندگی بچانے کے لیے بہت محنت کی اور بہت خطرہ مول لیا۔"

"یہ ہم سب کے باہمی مفاد میں تھا" میں نے کہا۔

"اچھا اب تم جاؤ۔" وہ بولا "پولیس نے یہاں کچھ خصوصی انتظامات کیے ہیں۔ سادہ کپڑوں میں سراغ رساں موجود ہیں ہر جگہ اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے یہاں خفیہ مائک بھی لگائے تھے۔"

"خفیہ مائک" میں نے چلا کے کہا "تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟"

"تم نے تو ہمیں مروا دیا۔" محسن بولا "ہماری یہ گفتگو ریکارڈ کرلی گئی ہو گی اور کیا پتا باہر نکلتے ہی ہم دھر لیے جائیں۔"

میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ باہر سے مقفل تھا۔ میں نے سارجنٹ کی آواز سنی۔ وہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا "کون سر؟ نہیں سر.... کوئی نہیں.... ایک پادری اور ایک بدھ مذہب کا راہب اندر گئے ہیں۔ نو سر.... وہ ہر کمرے میں جا سکتے ہیں.... لیں سر۔ میں نے دروازہ تو بند کر دیا ہے لیکن سر.... وہ عالمی مذاہب کے روحانی اجتماع میں شامل ہیں، سر....؟"

میں نے محسن کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور ہم باتھ روم میں گھس گئے۔ یہ پانچ فٹ چھ فٹ کا باتھ روم تھا اور درمیانی دیوار اسے دوسرے باتھ روم سے جدا کرتی تھی جو ساتھ والے کمرے سے ملحق تھا۔ اوپر چھت کے ساتھ ان دونوں کے درمیان روشن دان سا تھا جو تقریباً ایک فٹ چوڑا اور دو فٹ لمبا تھا۔ اس کے ہوا والا روشن دان اس باتھ روم میں تھا جس میں ہم موجود تھے اور اس میں ہوا باہر پھینکنے والا پنکھا لگا ہوا تھا۔ اس طرح دونوں باتھ روموں کی ہوا باہر نکلتی رہتی تھی۔

میں نے محسن سے کہا "مہاتما بدھ کے چیلے۔ یہ روشن دان ہماری امید کا واحد سہارا ہے۔ اگر ہم اس میں سے گزر گئے تو شاید....."

محسن نے کہا "باتیں کم کام زیادہ۔ چل پہلے تو۔" وہ دیوار سے لگ کے کھڑا ہو گیا اور پھر رکوع کی حالت میں چلا گیا۔

میں اس کی کمر پر پاؤں رکھ کے روشن دان تک پہنچا اور پنکھا اس میں سے گزار کے دوسری طرف لٹک گیا۔ میرے پنجوں کے بل چٹخنی کے سب سے نچلے حصے کو محسن کے ہاتھوں نے پکڑ لیا تھا۔ میں نے اپنا دھڑ روشن دان میں سے گزارا تو اپنے ہاتھ نیچے کی طرف پھیلا دیے۔ میرے جسم کا سارا بوجھ آگے چلا گیا اور میں دوسرے باتھ روم میں لٹک گیا۔ محسن کسی زنجیر کی دوسری کڑی کی طرح مجھ سے منسلک تھا۔ میں نے اچانک ایک جھٹکا محسوس کیا۔ دوسری طرف کے باتھ روم میں محسن اچھلا تھا۔ میں ایک دم نیچے گیا اور میرے ہاتھ فرش سے جا لگے۔

میں نے سر گھما کے دیکھا۔ اوپر روشن دان سے میرے پیر باہر آ گئے تھے اور ان کے ساتھ ہی محسن کے ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ فرش پر ہاتھ جما کے میں نے ٹانگوں کا زور لگایا تو محسن اوپر آیا۔ میں نے اس کے سر کو روشن دان میں سے باہر آتے دیکھا۔ میں آگے بڑھا۔ وہ میرے پاؤں چھوڑتا تو واپس نیچے جا گرتا۔ میں پوری طاقت سے اس کو کھینچتا رہا یہاں تک کہ اس کا اوپری دھڑ روشن دان میں سے نکل آیا۔ اب محسن نے میرے پاؤں چھوڑ دیے۔ وہ آدھا ایک طرف تھا اور آدھا دوسری طرف۔ میں نے پیروں پر کھڑے ہوتے ہی اپنے ہاتھ اوپر بڑھائے اور اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ اب اسے کھینچنا آسان تھا۔ میرے لیے اپنے لبادے کو اور کوٹ کو سنبھالنا زیادہ مشکل کام تھا۔ بیلٹ تو پہلے ہی فرش پر گر گیا تھا۔ کوٹ میں نے بعد میں اتار پھینکا۔ میرے مقابلے محسن کا لباس سادہ تھا۔ تاہم اس روشن دان میں سے گزرتے ہوئے محسن کی لنگی پھٹ گئی۔ اس کے جسم پر بھی معمولی خراشیں آ گئیں۔

باتھ روم میں قدم رکھتے ہی محسن نے دروازے سے کان لگا دیے۔ اندر وہی مریض ہوتا جس نے گزشتہ رات اسپتال کو اطلاع دی تھی اور سوال کیا تھا کہ کیا میں مر رہا ہوں.... تو باتھ روم میں ہمارے لینڈ کرنے کی آوازوں پر متوجہ ہو کے فوراً اندر آ جاتا مگر کمرے میں خاموشی تھی۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ کھول کے دیکھا اور ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔

اس کمرے میں بیڈ پر کوئی لاش لیٹی ہوئی تھی۔ یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ کوئی سر سے پیر تک چادر اوڑھے سو رہا ہے۔ سونے والا اتنا سیدھا تھا، ساکت اور منجمد نظر نہیں آتا۔ وہ جو بھی تھا مر چکا تھا اور بیڈ پر اس کی لاش غالباً لواحقین کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ آئیں اور اسے سپردِ خاک کرنے کے لیے لے جائیں۔

میں نے محسن سے کہا "یار.... یہ زندہ تو نہیں ہو سکتا۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا "شاید اسے مرے زیادہ دیر نہیں ہوئی ورنہ اس کو مُردہ خانے میں شفٹ کر دیا جاتا۔"

اس وقت ہم دونوں کے ذہن میں ایک سا ہی خیال آیا۔ ہم اس مہلت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ محسن نے پہلے اپنے پیچھے باتھ روم کا دروازہ لاک کیا۔ پھر باہر والے دروازے کو۔ چند منٹ میں ہم نے لاش کے کپڑے اتارے۔ محسن نے اسے میرے کپڑے پہنائے اور میں نے مرنے والے کے کپڑے پہن لیے۔ پھر میں اس کی جگہ بیڈ پر لیٹ گیا اور محسن نے لاش کو باتھ روم میں پہنچا دیا۔ یہ سب انتہائی ناپسندیدہ اور غیر انسانی تھا مگر اس کے لیے ایک لاش سے معذرت کرنا بھی بے سود تھا۔ معافی ایک انسان سے مانگی جا سکتی تھی۔ اس لاش کو یہ دنیا چھوڑ دینے کے بعد کسی بات سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ اسے کیسے اٹھایا جاتا ہے اور کیسے جلایا جاتا ہے یا دفن کیا جاتا ہے۔ ہمیں اپنی زندگی کے لیے یہ جدوجہد ہر صورت جاری رکھنی تھی۔

وقت کا ہر لمحہ ہمارے اعصاب پر سوار ہو کے گزر رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں کسی بھی وقت ہنگامہ بپا ہو سکتا تھا۔ سارجنٹ یہ فرض نہیں کر سکتا تھا کہ پادری اور بھکشو بھوت یا چھلاوے تھے جو دیوار میں سے گزر گئے یا غائب ہو گئے۔ اس کا دھیان باتھ روم کی طرف جانا لازمی تھا اور درمیانی خلا کو دیکھتے ہی وہ سمجھ جاتا کہ ہم دوسرے کمرے میں پہنچ چکے ہیں۔

محسن کی سخت بدحواسی طاری تھی۔ "یار۔ اب کیا ہو گا۔ کیا بات ہے کہ ابھی تک لاش.... میرا مطلب ہے لاش لینے نہیں آیا۔"

میں نے کہا "لاوارث لوگ بھی تو اسپتال میں مر جاتے ہیں اور کیا پتا ابھی تک وارثوں کو اطلاع ہی نہ ملی ہو۔ یا اطلاع ملی ہو تو لواحقین کو فرصت نہ ملی ہو۔"

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہے۔" محسن بولا "لواحقین نہ ہوئے تو تجھے سیدھا مُردہ خانے لے جائیں گے اور یہاں کے مُردہ خانے بھی کولڈ اسٹوریج ہوتے ہیں۔"

"میں نے فلموں میں دیکھا ہے۔ دیوار میں خانے سے بنے ہوتے ہیں۔ ہر خانے میں ایک لاش ڈال دیتے ہیں۔ وہ خانہ نہیں برف خانہ ہوتا ہے۔"

"ارے ہو.... بڑی سردی ہو گی اندر.... تو جم جائے گا۔"

میں نے کہا "پاگل ہوا ہے مجھے فریز کرنے سے پہلے شناخت کی کارروائی ہو گی ایسے ہی ٹیگ نہیں لگا دیا جائے گا۔ مُردہ خانے پہنچنے سے پہلے ہی مُردہ بھاگ جائے گا تو فکر مت کر۔"

"کیا مُردے کو اسپتال کے اندر کے راستے معلوم ہیں؟ فرار ہونا اتنا آسان نہیں ہو گا میرے پاکستانی بھائی۔ قدم قدم پر سادے کپڑوں والے پولیس میں موجود ہیں۔ جارج نے بتایا تھا۔"

"مجھے تو نظر نہیں آئے۔ یہ جارج کا وہم یا خوف بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن بہتر ہے کہ آپ میرے لیے نہیں اپنے لیے پریشان ہوں۔ آپ یہاں سے کیسے باہر نکلیں گے بھکشو مہاراج۔ آپ تو فوراً دھر لیے جائیں گے۔"

"یہ بھی سچ کہا آپ نے۔ پھر میں کیا کروں؟"

"میرا خیال ہے تو مر جا" میں نے چادر ہٹا کے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بات تو ایک ہی ہے۔" محسن نے کہا۔

"ایک بات نہیں ہے۔" میں نے کہا "میں اپنا راستہ بنا سکتا ہوں۔ دو چار میری راہ میں حائل ہوں تو ان کو لٹا کے بھی نکل سکتا ہوں۔"

محسن میری جگہ لیٹ گیا "یار یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مجھے سیدھا کسی ایمبولینس میں لے جائیں۔ لواحقین پہنچ چکے ہوں۔ یا پہنچنے والے ہوں۔"

"ایسی صورت میں ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔" میں نے کہا اور کمرے کا لاک اندر سے کھول کے دیوار کے ساتھ لگ گیا۔

"آخر مرحوم کو عارضہ کیا لاحق تھا؟" محسن بولا۔

"ٹرکی.... دل کا روگ ہو گا" میں نے کہا "رات کو تو بھلا چنگا تھا لیکن جیسے وہ چلا رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے بلڈ پریشر کا مرض تھا۔"

"مریضِ دل کے ساتھ عموماً کوئی تیمار دار بھی ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "اچھے پاکستان میں، یہاں اتنی فرصت کسے...."

میری بات پوری ہونے سے پہلے کسی نے باہر سے لاک کا ہینڈل گھمایا اور دروازے کو دھکیلا۔ میں نے سانس روک لیا۔ محسن بھی چادر اپنے سر تک کھینچ کے لاش کی طرح اکڑ گیا۔ اسٹریچر لانے والا اسپتال ہی کا کوئی ملازم تھا۔ اس کی وردی سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ میں نے اسے اندر داخل ہوتے ہی پیچھے سے دبوچ لیا اور

www.paksociety.com

لات مار کے دروازے کو بند کر دیا۔ وہ میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے تڑپا اور اس نے سر گھما کے مجھے دیکھنے کی کوشش کی مگر میں نے بائیں ہاتھ سے اس کا منہ دبا کے اسے اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ دوسرے لمحے میرا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور نپے تلے وار نے اس شخص کو فوراً بے حس و حرکت کر دیا۔

"آفرین" محسن بیڈ پر سے اٹھ کے میری طرف لپکا "کیا اب میں اسٹریچر پر لیٹ جاؤں؟"

میں نے کہا "ابھی نہیں بھاگ کے بیٹے۔ مرنے والے کے جسم پر یہ لباس ہوتا ہے جو مریضوں کو اسپتال کی طرف سے ملتا ہے۔"

سوچنے سمجھنے میں وقت ضائع کرنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ محسن نے گیروے رنگ کا لباس اتار کے وہ کپڑے پہن لیے جو کچھ دیر پہلے میں نے مرنے والے کے جسم پر سے اتارے تھے۔ محسن نے اتنی دیر میں اسپتال کے ملازم کی وردی اتاری اور اسے [illegible] کے نیچے کر دیا تاکہ کسی اندر آنے والے کی نظر سیدھی اس [illegible] جائے۔

میں نے ملازم کی یونیفارم اپنے جسم پر چڑھالی۔ پتلون اور شرٹ دونوں مجھے کچھ ڈھیلے تھے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وردی تنگ ہوتی تو میں اسے پہن ہی نہیں سکتا تھا۔ اسٹریچر لانے والا خاصا بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا۔ اسپتال کے مریضوں کو دیے جانے والے کپڑے تو ویسے بھی ڈھیلے ڈھالے ہوتے ہیں۔

محسن اسٹریچر پر سیدھا لیٹ گیا تو میں نے اس پر چادر ڈال دی اور اسٹریچر کو دھکیلتا ہوا باہر آیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے میں نے لاک کا بٹن اندر سے دبا دیا۔ اب دروازہ اندر سے کھولا جا سکتا تھا یا پھر باہر سے چابی لگا کے۔

ساتھ والے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے سارجنٹ نے چند منٹ پہلے اسٹریچر کے ساتھ اسپتال کے ایک ملازم کو اندر جاتے دیکھا تھا۔ اسٹریچر پر لاش دیکھ کے اس کو دال میں کالا کیسے نظر آ سکتا تھا۔

وہ ٹیلی فون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھا "یس سر۔ وہ اندر ہی ہیں۔ نو سر، میں ان کو نہیں نکلنے دوں گا۔ میں شوٹ کر دوں گا انہیں۔ وہ یقیناً دھوکے باز تھے، اتنی دیر ہو گئی۔ ابھی تک انہوں نے باہر آنے کی کوشش نہیں کی۔ یس سر، میں انتظار کر رہا ہوں۔ میں اکیلا اندر جانے کا رسک نہیں لوں گا۔"

میں نے پوری کوشش کی کہ میرا چہرہ سارجنٹ کی طرف نہ ہو۔ وردی سے وہ دھوکا کھا گیا تھا مگر چہرے کے نقوش دیکھ کے وہ شک میں پڑ سکتا تھا اور کچھ دیر پہلے کے پادری کی صورت کو پہچان بھی سکتا تھا۔ میں اسٹریچر کو آہستہ آہستہ دھکیلتا ہوا مخالف سمت میں بڑھتا گیا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ مجھے کدھر جانا ہے۔ جس راستے سے ہم اندر آئے تھے وہاں پولیس موجود تھی اور ایک وردی والے [illegible] کے علاوہ نہ جانے کتنے لوگ سادہ کپڑوں میں آتے جاتے

لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس راستے سے اسٹریچر لے جانے [illegible] کوئی ریمپ "RAMP" یعنی سڑک سے اسپتال کے فرش تک [illegible] کی ڈھلوان سطح بھی نہیں تھی۔

میں نے کوریڈور میں لگے ہوئے نشانات پر نظر رکھی جو اسپتال کے مختلف شعبوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ ان میں کسی [illegible] کا نام نہیں تھا۔ میں دائیں طرف مڑنے کا تھا جب مخالف سمت سے تین مسلح پولیس مین اندر آئے۔ وہ بڑی عجلت میں تھے۔ [illegible] ایک سائن بورڈ پر روک کے میں ویٹنگ ہال تک رہ گیا۔ اسپتال [illegible] کے کسی فرد کو دوڑ لگاتے دیکھ کر کوئی حیران یا پریشان نہیں ہوتا [illegible] ایمرجنسی میں ایسا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

نورالدین وہیں موجود تھا جہاں ہم نے اسے انتظار کرنے [illegible] تھا۔ جب اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اسے [illegible] "نورالدین۔ باہر نکل جاؤ فوراً۔ کیا تمہیں اس اسپتال کے [illegible] معلوم ہیں۔"

"بہت اچھی طرح" وہ پہلے چونکا اور پھر کھڑا ہو گیا۔

"چلو میرے ساتھ چلو۔ تمہارے ماموں فوت ہو گئے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو جی، میرا تو کوئی ماموں ہی نہیں" وہ بولا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا "ڈرامہ شروع ہو گیا ہے۔ اب پتا چلے گا کہ تم کتنے اچھے ایکٹر ہو۔ فرض کر لو کہ تمہارا ماموں تھا جو ابھی ابھی فوت ہوا ہے۔ اب تم کو اس کی لاش [illegible] جانی ہے۔"

وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا "کہاں لے جانی ہے؟"

"پاگل دے پتر، سوال کیے جا رہے ہو۔ رونا دھونا شروع [illegible] اور میرے ساتھ رہو۔ وہ دیکھو اسٹریچر پر لاش پڑی ہے [illegible] تمہارے ماموں" میں نے کہا۔

خلاف توقع نورالدین نے صورت حال کی نزاکت کو سمجھا [illegible] سر پر ہاتھ مار کے چلانے لگا "ماموں۔ ہائے میرے ماموں مر گئے۔"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "شاباش۔ آواز کم [illegible] آواز میں درد اور سوز و گداز پیدا کرو۔"

وہ بھوں بھوں رونے لگا "سوز و گداز۔ وہ کیا ہوتا ہے جی؟"

میں نے اسٹریچر کے قریب جا کے چادر ہٹائی اور اس کو دیدار کرا دیا "اب ذرا دلخراش چیخ مارو، غم کے جذبات [illegible] جاؤ۔"

اس نے چیخ ماری "یہاں کسی کو ماموں کی موت پر افسوس [illegible] ہوگا۔"

"تو فرض کر لو کہ یہ والد صاحب ہیں تمہارے" میں نے کہا اور اسے تسلی دینے لگا۔

"ان کے لیے تو میرے جذبات۔۔۔ خیر مجھے اداکاری [illegible] ہے" وہ سینے پر ہاتھ مار کے رونے لگا۔ اس نے انگریزی [illegible] ماتمی کلمات ادا کیے۔

میں نے اسٹریچر کو آگے دھکیلا۔ "اب کدھر جانا ہے؟"

"آگے سے الٹے ہاتھ۔ مردہ خانے جانا ہے نا۔" وہ ایسے بولا کہ لگتا تھا یہ بھی دکھ بھرے جذبات میں ڈوبے ہوئے الفاظ ہیں۔

"تم ایک ایسے گدھے ہو جس کی ذہانت کا معیار صفر ہے" میں نے کہا "جب جانتا ساتھ ہو تو کیا لاش مردہ خانے میں رکھی جانے کی ہے یا باہر لے جانا ہے۔ جہاں ایمبولینس مل جائے۔"

"اچھا جی" وہ روتے روتے چلایا "آگے سے سیدھے ہاتھ۔"

قریب سے گزرنے والے لاش پر افسوس ناک نظر ڈالتے تھے نورالدین کی حالت پر بھی افسوس کا اظہار کرتے تھے۔ کسی کی موت پر اتنا واویلا کرنا ہی انگریز قوم کے مزاج کے خلاف ہے۔ اسپتال میں رونا دھونا شور مچانے کے مترادف تھا۔ تاہم وہ دیکھ رہے تھے کہ اتنے معیوب اور غیر مہذب طریقے پر موت کا ماتم کرنے والا ان کا ہم قوم نہیں بلکہ ایک سیاہ فام داڑھی والا ہے۔ ایک ڈاکٹر نے قریب سے گزرتے ہوئے چادر ہٹا کے مرنے والے کا چہرہ دیکھا اور پھر ڈھک دیا۔ ایک بڑھیا نے انگلی سے سینے پر صلیب بناتے ہوئے اپنے ساتھی نوجوان لڑکے سے کہا "جب تمہارا باپ مرا تھا تم بھی اتنی ہی غم زدہ تھیں۔"

ناخلف لڑکے نے کہا "ماما، کیوں جھوٹ بولتی ہو بلاوجہ۔"

"اب باہر جانے کا راستہ کتنی دور ہے؟" میں نے کہا۔

نورالدین نے دہاڑیں مارتے ہوئے کہا "بس آگے جا کے بائیں طرف مڑتے ہی مردہ خانے کا راستہ آ جائے گا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ پھر مردہ خانہ۔"

"ایمبولینس وہیں ہوتی ہے" نورالدین نے وضاحت کی۔

"وہ کاغذات مانگیں گے۔ ڈسچارج سلپ اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ، ایمبولینس لے جانے کا اجازت نامہ۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ہے" نورالدین روتے روتے بولا۔

کسی نے کہا "صبر کر پتر نورالدین۔ کہیں زیادہ غم سے تیرا دل نہ پھٹ جائے۔"

میں نے کہا "چپ کر کے چل مردود۔ اپنے ساتھ ہمیں بھی مروائے گا۔"

کسی نے مجھے چٹکی ماری۔ میں نے فوراً دوسری چٹکی ماری۔ سامنے سے آنے والی ایک سیاہ فام جینز کے قبیلے کی حسینہ نے دل کے آگے بے پناہ سینے پر ہاتھ رکھا "اوہ مجھے ایسا لگا جیسے لاش نے چٹکی ماری۔"

میں نے کہا "مرحوم کا انتقال زکام سے نہیں ہوا تھا۔"

ڈھلوان فرش اچانک سامنے آ گیا۔ میں نے پہیوں والے اسٹریچر کو اپنی طرف کھینچ کے رکھا اور آہستہ آہستہ نیچے اتارا مگر نورالدین کا پاؤں اس کی چکنی سطح پر پھسل گیا۔ وہ دھڑ سے گرا تو اس کا ہاتھ میرے [illegible] میں نے خود کو منہ کے بل گرنے سے بچا تو لیا لیکن اسٹریچر میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ ڈھلوان سطح پر اس کی رفتار بڑھ گئی۔ میں اس کے پیچھے دوڑا اور

عین اس وقت پھر ہینڈل پکڑنے میں کامیاب ہو گیا جب اسٹریچر ایک نرس سے ٹکرانے والا تھا۔ وہ بڑی نزاکت سے چلتی اسی سمت میں جا رہی تھی۔ جب میرے قدموں کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا تو میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ گوا کی سونی تھی۔

میں نے کہا "بس سونی۔ ابھی ایک مردہ تمہیں ناک آؤٹ کر دیتا۔"

نورالدین روتا دھوتا آگے آیا "تم نے مجھے اٹھایا بھی نہیں۔"

غصے سے میرا برا حال ہو گیا "الو کے پٹھے۔ اپنے ساتھ تم مجھے بھی گرا رہے تھے۔ تم کو کیا ضرورت تھی سیڑھیاں چھوڑ کے اس راستے سے اترنے کی۔"

"وہ دراصل جوتوں کے سول بہت گھس گئے ہیں۔"

سونی آف گوا نے کہا "میں نے تمہیں پہلے نہیں دیکھا۔"

میں نے کہا "میں نے دیکھا ہے تمہیں۔ تم کینٹین میں کام کرتی ہو نا۔ میرا نام اپنے چاہنے والوں کی فہرست کے آخر میں لکھ لو۔ میں انتظار کر سکتا ہوں۔"

وہ مسکرائی "یہ داڑھی والا حبشی کیوں رو رہا ہے؟"

"یہ اس کے ماموں کی لاش ہے۔ اس کی شادی ماموں کی لڑکی سے ہونے والی تھی۔ اب ایک سال تک نہیں ہو گی۔ اسی لیے رو رہا ہے۔"

"ایک سال تک کیوں؟ یہ کل شادی کر سکتے ہیں تدفین کے بعد۔"

میں نے کہا "ان کے قبیلے میں ایسا نہیں ہوتا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے والے کی روح پہلی برسی کے بعد گھر سے جاتی ہے۔ اسے ایک ایمبولینس چاہیے۔"

"یہ کیا مسئلہ ہے۔ اتنی کھڑی ہیں۔ کوئی بھی لے جائے" اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا اور پھر اپنی مسحور کن کیٹ واک کے دلکش مظاہرے سے نظروں کا خراج تحسین لیتی روانہ ہو گئی۔

میں نے اس کے اشارے سے سمجھ لیا تھا کہ ایمبولینس کہاں ملے گی۔ نورالدین نے کہا "یہ تمہاری گرل فرینڈ بہت خوب صورت تھی۔"

میں نے اسے ڈانٹا "بے وقوف۔ تم نظر بازی کر رہے ہو۔ اپنے ماموں کی وفات کا صدمہ اتنی جلدی بھول گئے۔"

اس نے پھر سینے پر ہاتھ مارا اور چلایا "ہائے ماموں۔"

ماموں نے ایک آہ بھر کے کہا "سونی۔ کاش میں گوا میں پیدا ہوتا۔ نہیں تم پاکستانی ہوتیں۔"

میں نے پھر اسے ڈانٹا "اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ ہمارے نصیب میں وہی تھیں جو تمہیں ملیں۔ خاموش پڑے رہو ابھی خطرہ ٹلا نہیں ہے۔"

ایک ایمبولینس کے قریب جا کے میں نے اس کا پیچھے والا دروازہ کھولا اور اسٹریچر کو اندر دھکیل دیا۔ "نورالدین۔ تم اندر جاؤ۔ لاش کو اسٹریچر سے ایمبولینس کی سیٹ پر منتقل کرو اور ساتھ والی سیٹ پر خود بیٹھ جاؤ۔"

www.paksociety.com

نورین نے پُردرد صدا بلند کی "ہائے ماموں۔ تمہیں کیا ضرورت تھی مرنے کی۔"

ایمبولینس ڈرائیور نے افسوس سے سرہلایا "بیگ مین۔ یہ ضرورت کی بات نہیں' وقت کی بات ہے۔ جب تمہارا وقت آئے گا تو تمہیں بھی مرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "مرحوم نے خودکشی فرمائی تھی۔ عشق میں مبتلا ہو کے۔"

"مطلب یہ کہ مرحوم بھی بے وقوف تھے۔ خیر' کاغذات کہاں ہیں؟"

میں نے دروازہ بند کر کے کہا "میرے پاس ہیں' چلو میں دیتا ہوں۔"

وہ کچھ حیران ہوا "کیا تم بھی ساتھ چلو گے؟"

اس وقت تک میں ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ ڈرائیور نے اپنا سوال دُہرایا تو میں نے کہا "ہاں۔ دراصل میری ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے مجھے راستے میں ڈراپ کر دینا۔"

ڈرائیور نے نفی میں سرہلایا "تم ایمبولینس میں نہیں جا سکتے۔ تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے۔"

میں نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن درحقیقت میں صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایمبولینس قطار کے آخر میں تھی۔ اس کے بعد دیوار تھی اور درمیان میں پیدل چلنے والوں کے لیے راستہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس طرف سے کوئی بھی نہیں گزر رہا تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے وار کیا اور حیرت زدہ ڈرائیور آواز نکالے بغیر سیٹ پر لڑھک گیا۔

میں پھر نیچے اُترا اور دوسری طرف گیا۔ میں نے بے ہوش ڈرائیور کو آگے دھکیل کر اپنے لیے جگہ بنائی اور خود اس کی جگہ بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے چابی ایمبولینس کے سوئچ میں لگا دی تھی۔ میں نے اسے اسٹارٹ کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

مین گیٹ سے باہر آنے سے پہلے میں نے سڑک پر ٹریفک کے بہاؤ کا رخ دیکھ لیا تھا۔ سب ٹریفک بائیں طرف سے آ رہی تھی اور دائیں طرف جا رہی تھی۔ یہ ون وے اسٹریٹ تھی۔ اگر میں احتیاط نہ کرتا اور غلط سمت میں مڑ جاتا تو یہ ذرا سی غلطی ہماری کامیابی کو ناکامی میں بدل دیتی۔

ایمبولینس ڈرائیور اب سیٹ سے نیچے گر گیا تھا۔ یہ بڑی ایمبولینس تھی۔ فاکس ویگن کی مائیکرو بس جس میں آگے والی... سیٹ پر تین افراد بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ میں نے اس کے ڈیش بورڈ پر غور کیا تو مجھے ایک نیلے رنگ کا اضافی سوئچ نظر آیا۔ یہ یقیناً ایمبولینس کا سائرن آن کرنے کے کام آتا ہو گا۔ میں نے سوچا اور اسے باہر کھینچ لیا۔ ایک دم مائیکرو بس کی چھت پر لگا ہوا سائرن چلّا کے راستہ مانگنے لگا اور ایمرجنسی لائٹ بھی گھومنے لگی۔ سڑک پر ساری ٹریفک ایک طرف ہوتی یا رک گئی۔ مجھے پھر اپنا ملک یاد آیا جہاں اکثر ایمبولینس گاڑیاں ٹریفک جام میں پھنسی سائرن بجاتی رہتی ہیں اور کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ خود ٹریفک پولیس والے بے حسی کے ساتھ کھڑے رہتے ہیں۔ کوئی نہیں سوچتا کہ ایمبولینس کے سائرن کی آواز موت کی پکار ہوتی ہے۔ زندگی کی فریاد ہوتی ہے۔ خدا کے لیے راستہ دو' ہر لمحہ قیمتی ہے۔ مریض کا آخری سانس ثابت ہو سکتی ہے۔ تم جیسا ہی ایک زندہ انسان زندگی کی بھیک مانگتا ہے۔ اسے اسپتال پہنچنے دو مگر کسی کے دل میں انسانی رشتوں کے ناتے رحم اور خدا ترسی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ خود بھی ٹریفک جام میں بے بس ہوتا ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ اس طرح راستے میں ہی دم توڑ دیتے ہوں گے۔

یہاں سائرن کی آواز پر راستہ خود بخود صاف ہو گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ اصل مقصد تو یہ تھا کہ میں اسپتال سے دور جا رہا تھا۔ مگر مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ اب تک ہمارے فرار کا راز فاش ہو چکا ہو گا' بہت جلد وائرلیس پر اس ایمبولینس کا نمبر نشر ہو جائے گا جو فرار میں استعمال ہوئی تھی۔ سڑک پر موجود تمام پولیس ٹریفک سارجنٹ چوکنے اور مستعد ہو جائیں گے۔ ان سے بچ کے فرار ہونے کا سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ بچت کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ ہم جلد از جلد اس ایمبولینس کو کہیں چھوڑ دیں اور فرار ہو جائیں۔ لیکن یہ آسان بہرحال نہیں تھا۔ ایک ٹیکسی یا کار کے مقابلے میں ایمبولینس کہیں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ کوئی خالی سڑک ملے۔ میں لندن کے راستوں سے ضرور واقف تھا مگر اس وقت مجھے بہت سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ ہم کہاں ہیں اور یہ سڑک کہاں جا کے ختم ہو گی۔

میں نے محسوس کیا کہ سائرن بجانا میری غلطی تھا۔ اس سے بہت زیادہ لوگ متوجہ ہوتے تھے۔ اگلے موڑ پر میں نے سائرن آف کر دیا اور چند منٹ بعد ہی میں نے خود کو ہارلے اسٹریٹ کے علاقے میں پایا تو مجھے راستوں کا جغرافیہ یاد آ گیا۔ آگے جا کے میں بائیں طرف مڑ گیا۔ یہ موڑ MORTIMER اسٹریٹ کا تھا۔ وگ مور ہال سے وگ مور اسٹریٹ بن جاتی تھی۔ مزید آگے جا کے اس کا نام سیمور اسٹریٹ تھا۔ وہاں سے پھر بائیں ہاتھ گھوم کے میں نے پورٹ مین اسٹریٹ کے راستے ایجور روڈ پر ماربل آرچ پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ آکسفورڈ اسٹریٹ کے قریب پارکنگ کے لیے ایمبولینس کو چھوڑنا اور ماربل آرچ سے زیرِ زمین چلنے والی ٹیوب کے عام مسافروں میں شامل ہو جانا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

میری یہ پلاننگ کامیاب رہی۔ آکسفورڈ اسٹریٹ ایریا میں سیکڑوں گاڑیاں صف بستہ کھڑی تھیں تو وہاں ... تھیں۔ میں نے ایمبولینس کو قطار کے آخری حصے میں ایک جگہ روکا جہاں اس کے سامنے دوسری گاڑی نہیں تھی۔ پیچھے ... نے دروازے کو لاک کیا اور پیچھے والے گیٹ پر دستک دی۔ محسن اور پھر نورین محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے باہر آئے۔ اس وقت بھی یقیناً کچھ لوگوں نے انہیں دیکھا ہو گا مگر

کسی کی طرف دیکھے بغیر چلنا شروع کر دیا۔ محسن نے دھاری دار کپڑے کا جو لباس پہن رکھا تھا وہ اسپتال کے مریضوں کا بھی ہو سکتا تھا اور نائٹ سوٹ بھی۔ بہرصورت یہ انگریز قوم کے مزاج پر گراں گزرنے والی بات تھی جو گھر سے نکلتے وقت کوٹ پتلون اور ٹائی کے ساتھ ہیٹ تک لگانا ضروری سمجھتے ہیں مگر ہم انگریز نہیں تھے اور لندن کے رہنے والوں نے اب ان لاکھوں ایشیائیوں کو بھی گوارا کر لیا ہے جو ان کی تہذیب و معاشرت کے آداب کی پروا نہیں کرنے کے لیے وہاں مستقل آباد ہیں۔

محسن نے سوچ کے کہا "یہ آکسفورڈ اسٹریٹ ہے؟"

نورین نے مجھ سے پہلے سرہلایا "ہاں جی۔ آپ کو کیسے پتا چلا؟"

محسن مسکرایا "ہمیں تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارا نام نورین اور تمہارے باپ کا علم دین ہے۔ مگر نہ اس کے پاس علم کی روشنی ہے اور نہ تمہارے پاس نور کی کرن۔ تم دونوں کو اپنے نام سے پہلے بے لگانا چاہیے۔"

"بے لگانا چاہیے..." نورین نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے دماغ لڑایا "یعنی بے علم دین اور بے نور دین۔ یہ تو بڑی زیادتی ہے جناب۔ آخر ابا جی اتنے بڑے اور مشہور ایڈیٹر ہیں۔ ایڈیٹر جاہل لوگ بن سکتے ہیں۔"

"چلو ابا جی کو گولی مار دو۔ یہ تمہارا وعدہ ہے' آج تج میرے کہنے پر خود کو [illegible] کر لیا" محسن نے کہا "تم اپنا نام تو بدل سکتے ہو؟"

"بہت مشکل ہے پھر ابا جی مجھے گولی مار دیں گے۔ میرا نام انہوں نے دادا کے نام پر رکھا تھا۔ میرے ابا کے ابا جی سبھے نور ... مجھے بچپنا میں آنکھیں ضائع ہو گئی تھیں۔ وہ نگل تھی ان کو ڈولب نہیں ہو گیا۔ بڑا مشکل سا نام ہے۔"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "مسز نورین۔ کیسا رہا یہ ڈراما؟"

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آئی۔ نہ کچھ کرنا پڑا۔ ادھر بیٹھا رہا ویٹنگ روم میں" اس نے کہا "آپ لوگ جارج سے ملنے گئے تھے' کیا ہوا وہاں؟"

محسن نے کہا "کچھ نہیں ہوا۔ جارج بالکل خیریت سے تھا۔ تمہیں سلام کہہ رہا تھا۔"

"کچھ ہوا ضرور تھا۔ ورنہ آپ کو لاش بن کے باہر جانے کی کیا ضرورت تھی۔"

میں نے کہا "نورین۔ تم نے تو ثابت کر دیا کہ تم بڑی اچھی ایکٹریس ہو۔ کیا جذباتی المیہ اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا تم نے اور وہ بھی فرضی ماموں کی موت پر۔ میں تو قائل ہو گیا۔"

"اور میں تو آبدیدہ ہو گیا تھا۔ سچ مچ ایسے زار و قطار رونے والا جانتا ہوا میرا تو میں اپنی موت پر رشک کرتا۔"

میں نے کہا "اگر یہ سین فلم بند کیا جاتا تو فلم دیکھنے والے بار بار کے روتے۔"

"اور جب اس اداکاری پر آسکر ایوارڈ دیا جاتا تو ایوارڈ دینے والے بھی اتفاق رائے سے روتے" محسن نے کہا "کاش میں پالی ووڈ کا کوئی ڈائریکٹر ہوتا نورین۔"

نورین کا چہرہ کھل اٹھا "آپ سچ کہتے ہوں گی؟ مجھے بے وقوف بنا رہے ہو؟"

"اس کی کیا ضرورت ہے' تم ریڈی میڈ ہو" میں نے کہا۔

"تمہاری اداکاری واقعی اچھی تھی" محسن نے اسے یقین دلایا "اور تم نے ثابت کر دیا کہ تم بزدل بھی نہیں ہو۔"

میں نے کہا "شیروانی صاحب۔ رقم کتنی ہے آپ کی جیب میں؟"

محسن بولا "ہوں گے ابھی سو ڈیڑھ سو پاؤنڈ۔ اچھا ہوا میں نے لباس بدلتے ہوئے اپنی کوئی چیز نہیں چھوڑی۔"

"میں نے تو دوسروں کی بھی نکال لی" میں نے کہا "اس بندے کی جیب میں خاصی رقم تھی۔ میرا خیال ہے سو پاؤنڈ سے زیادہ ہی ہوں گے اور ڈرائیور کی جیب میں سے ستر پاؤنڈ ملے ہیں۔"

محسن نے کہا "آپ کو شرم آنی چاہیے۔"

میں نے کہا "اب آ رہی ہے لیکن دوست' ہم کوئی پیشہ ور جیب کترے یا چور نہیں ہیں' مجبوری سب کراتی ہے۔"

"ہر مجرم یہی کہتا ہے۔ اس وقت کوئی مجبوری نہیں تھی۔"

میں نے کہا "دراصل رقم کپڑوں کے ساتھ ہی آ گئی تھی۔ جو کپڑے تو نے پہن رکھے ہیں وہ پہلے میں نے پہنے تھے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کے دیکھو۔"

محسن نے سائیڈ پاکٹ دیکھا "اس میں تو دوسرے کاغذات بھی ہیں۔ یہ رقم مرحوم کے لواحقین کو ارسال کی جا سکتی ہے۔"

"اس وردی کی جیب میں بھی ایمبولینس ڈرائیور کا شناختی کارڈ ہے۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ اسے کچھ دیر میں ہوش آ جائے گا یا کوئی اسے دیکھ لے گا۔ ہم بعد میں فون کر کے اس سے معذرت کر لیں گے اور اسے رقم بھجوا دیں گے۔"

ہم دس منٹ میں ایجور روڈ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچ گئے۔ ماربل آرچ کے اسٹیشن سے لندن کے کسی بھی علاقے میں پہنچنا آسان تھا۔ آدھے گھنٹے میں ہم جائے واردات سے بہت دور پہنچ چکے تھے مگر پھر بھی خود کو محفوظ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ہم نے اپنے پیچھے بہت سراغ چھوڑے تھے اور اگر قسمت ساتھ نہ دیتی تو شاید ہم راستے میں ہی گرفتار ہو جاتے۔ لندن پولیس کی کارکردگی کے بارے میں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ ہم نے جو باتیں جارج کے کمرے میں کی تھیں وہ ریکارڈ ہو گئی تھیں۔ پولیس کے پاس ایک ٹیپ اس فون کال کا بھی تھا جو میں نے انرتھ کو کی تھی۔ ہم نے پادری کے اور بھکشو کے کپڑے بھی اسپتال میں چھوڑ دیے تھے اور ہمارے فنگر پرنٹس تو ہر جگہ تھے۔ ان کے بغیر ہی پولیس کو معلوم تھا کہ وہ سکندر بخت اور محسن لندن میں ہیں جن کو برطانیہ بدر کر دیا گیا تھا۔ ہمارا جارج سے تعلق بھی ثابت تھا۔ پولیس کے پاس

www.paksociety.com

کہ ہم نے پہلے قانونی طریقے سے لندن میں داخل ہونے کی ناکام کوشش کی تھی اور پھر غیر قانونی طریقے سے لندن پہنچ گئے تھے۔ محسن کے بارے میں ان کو یہ علم نہیں تھا کہ وہ کس نام سے لندن میں پایا جاتا ہے مگر سکندر بخت کی دستاویز یوسف ایڈورڈ کے نام اور پاسپورٹ سے لندن میں موجودگی پولیس کے لیے ایک چیلنج بن گئی تھی۔ وہ اسپتال میں جارج کے کمرے سے فرار ہو گیا تھا اور بے شک اس میں سکندر بخت کا کوئی کمال نہیں تھا۔ قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور جارج نے اس کی مدد کی تھی۔ لیکن آج کا دوسرا واقعہ پولیس کو زیادہ پریشان اور مشتعل کرے گا۔ سمجھنے والے فوراً سمجھ جائیں گے کہ پادری اور بھگوڑے درحقیقت سکندر بخت اور محسن تھے مگر ان کا دوبارہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کے اس دیدہ دلیری سے نکل جانا لندن کی نیب نام پولیس کے منہ پر بے عزتی کا دوسرا طمانچہ تھا۔

یہ لندن میں ہمارے قیام کا آخری دن تھا جو آدھا گزر چکا تھا۔ باقی آدھا خیر و عافیت اور سکون کے ساتھ گزر جاتا تو اگلی صبح ہم ایڈی کے ٹرک میں چھپ کے برطانیہ سے فرانس پہنچ سکتے تھے۔ پیرس سے کراچی تک بدعو کے تجربے گھر لوٹ آنے کا سفر آسان اور بے خطر تھا۔

لنچ کا وقت گزر گیا تھا۔ ہم نے مفت کے ناشتے کے بعد سے اب تک صرف دھکے کھائے تھے۔ ہم سب کے پیٹ خالی تھے اور بھنت روزہ طوطی کے چیف رپورٹر کی فاقہ زدہ مظلوم صورت دیکھ کر لگتا تھا کہ کسی ریسٹورنٹ تک وہ زندہ پہنچ گیا تو کھانا آنے سے پہلے میز پر ہی دم توڑ دے گا لیکن اپنے رنگ برنگے حلیے میں ہم تینوں کا کسی ریسٹورنٹ میں قدم رنجہ فرمانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہمارا حلیہ مشتہر ہو گیا ہو اور پولیس ہمیں سرکاری مہمان بنا کے لے جائے تو سارا کھایا پیا نکال دے۔

نورو دین کے ساتھ ہم انڈر گراؤنڈ ریلوے میں ہینک اسٹیشن پر اترے تھے جو لیور پول اسٹریٹ سے پہلے پڑتا ہے اور وہاں سے دوسری ٹرین میں سوار ہو کے لندن برج پر اترے تو سہ پہر کے تین بجنے والے تھے۔ باہر آنے کے بعد نورو دین نے پھر ہمیں یاد دلایا کہ لنچ کتنا ضروری ہے اور ہم نے پھر اسے تسلی دی کہ بس اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں مگر وہ ہمیں یقین دلانے میں مصروف رہا کہ وہ خود ختم ہونے والا ہے۔ محسن نے اسے ڈانٹا۔

"مرنا ہوتا تو اب تک مر جاتے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ کل تک تمہیں کچھ بھی کھانے کو نہ ملے تب بھی تم زندہ رہو گے۔"

"جو شخص فوت ہونے والا ہو وہ کیسے شرط لگا سکتا ہے؟" میں نے کہا "نورو دین کی حالت دیکھو۔ اس کی صورت سے تو لگتا ہے کہ ایک ہفتے سے اس نے کچھ نہیں کھایا۔ سوائے حاجی صاحب کی جوتیوں کے اور گالیوں کے۔"

محسن بولا "اس کی شکل ہی ایسی ہے۔ ہم تینوں کے حصے کا نیلا تھوتھا بھی کھا لے تب بھی یہ ایسا ہی رہے گا۔"

میں نے کہا "یار نورو دین، مجاہد بنو۔ جہاد کرو اپنے نفس کا جو بھوک ہے اور جسم کی طلب ہے۔"

"یہ تو آپ اباجی کی طرح بول رہے ہیں۔ وہ بھی یہی دوسروں کو تلقین کرتے ہیں۔ خود کچھ نہیں کرتے۔"

"اب تم کہیں سے کپڑوں کا بندوبست کرو۔ میرا مطلب ہے کچھ معقول قسم کا لباس ہو۔"

"مجھے تو معاف کریں جی۔ اچھا بھلا پچاس پاؤنڈ ضمانت کے لیے تھے اس یہودی نے وہ بھی ورنہ میں پکڑا جاتا۔"

"یہودی نے کھانے کا سودا نہیں کیا تھا۔ وہ کپڑے دو پاؤنڈ کے بھی نہیں تھے" میں نے کہا "اب کیوں پکڑے گا وہ تمہیں؟"

محسن نے کہا "اسے خود شوق ہے پکڑے جانے کا۔ اور یہودی کی بیٹی میں ایسی کیا بات ہے، اگر آدمی عقل سے کام لے۔"

نورو دین آہ بھر کے بولا "یہ دل کا معاملہ ہے جی۔"

بہت جلد ہمیں ایک ڈیپارٹمنٹ اسٹور نظر آ گیا اور ہم نے الگ الگ داخل ہو کے وہاں سے اپنے لیے کپڑے خریدے۔ ہم نے صرف مختلف نظر آنے کے لیے بر موقع شارٹ کے ساتھ افریقن پرنٹ کی ڈھیلی شرٹ خریدی جس کے شوخ لال پیلے رنگ آنکھوں میں چبھتے تھے لیکن یہ سیاہ فاموں میں مقبول تھے۔ ان کی تقلید میں بطور فیشن سب ہی استعمال کرنے لگے تھے۔ سب سے میری مراد غیر سنجیدہ اور انگریز قوم کے معیار پر غیر مہذب لوگ تھے۔ محسن جب باہر آیا تو ہمیں یہ دیکھ کے حیران رہ گیا کہ اس نے بھی میرے جیسے ہی کپڑے پہن رکھے ہیں۔ کپڑوں کے رنگ کا فرق ضرور تھا مگر ڈیزائن اور اسٹائل ایک ہی تھا۔ ہم نے لباس کے انتخاب کے مسئلے پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا۔ ہماری ایک جیسی سوچ کا نتیجہ، یہ لباس زیادہ مہنگا بھی نہیں تھا۔ ہم معزز نظر آنے کے لیے سوٹ خریدتے تو ہمارا تمام سرمایہ ناکافی ہوتا۔

نورو دین کافی دیر سے برآمد ہوا۔ بہترین سوٹ شرٹ اور ٹائی خریدنے میں اس نے ہماری ساری بچت برابر کر دی تھی مگر اتنا خوش تھا کہ میں نے محسن کو بھی منع کر دیا اور خود بھی اسے مال دل بے رحم کے حوالے سے شرمندہ نہیں کیا۔

"تم بہت شاندار لگ رہے ہو اس سوٹ میں۔" میں نے کہا۔

وہ اور خوش ہوا "کیا واقعی؟ میری شخصیت بھی ایسی ہے؟ سوٹ بھی شاندار ہے۔"

محسن نے طنز سے کہا "سوٹ واقعی شاندار ہے۔"

"بس میرا کالا رنگ خرابی پیدا کر رہا ہے، منہ دھو لوں تو صاف ہو جائے گا۔"

"ابھی یہ رنگ چلنے دو" میں نے کہا "کھانے کے بعد تمہاری اداکارانہ صلاحیت کی مزید آزمائش ہے۔"

"اچھا جی۔ اب کیا کرنا ہو گا مجھے" وہ متفکر ہو گیا۔

"مشکل یہاں تم نے نبھا دیا۔ اب آسان کام ہے" میں نے کہا "لنچ کہاں کرو گے؟ آج تم مہمان ہو ہمارے۔ تمہاری اپنی پسند کا۔"

پہلے محسن نے مجھے دیکھا۔ "مہمان کو پاکٹ کے تابع رہنا چاہیے۔"

نورو دین نے ایک انڈین ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا جہاں پر ہماری بھی رسائی تھی۔ اس کی پیدائش اور پرورش لندن میں ہوئی تھی مگر اسے گھر کے ولایتی کھانوں سے زیادہ مرغن اور چٹپٹے دیسی کھانے مرغوب تھے۔

میں نے کہا "کھانے تو انڈین اور پاکستانی ایک ہیں مگر تمہارا یہاں آنا شاید تمہارے والد صاحب کی قومی حمیت کو گوارا نہ ہو۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے کہ ان کو انڈین کے لفظ سے چڑ ہے مگر اب مجھے بتا دیں کہ میرا کیا قصور ہے۔ مجھے انڈیا پاکستان میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ دونوں کی زبان لباس عادات اور خوراک ایک ہیں۔"

میں نے کہا "بنیادی فرق ہمارے ان کے مذہبی عقائد کا ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے مگر یہاں آ کے کھانا کھانے سے میرا عقیدہ تو نہیں بدل جائے گا۔ مسلمان کا بچہ تو مسلمان ہی رہے گا۔ وہ ٹخنوں تک دھوتی یا شلوار۔ ہر گھر کھائے بریانی یا ڈوسا۔ ہمارے پاکستانی ریسٹورنٹ بھی ہیں۔ جیسے مغل کا... وہاں ہندو، عیسائی سب آتے ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔ انڈیا پاکستان کا آپس میں مقابلہ ہو، ہاکی یا کرکٹ میچ ہو۔ اس وقت یہاں ہندوستان پاکستان الگ ہو جاتے ہیں لیکن یہاں پاکستان کی ٹیم آئے یا بھارت کی اور مقابلہ ہو انگلینڈ کی ٹیم سے تو سب ایشیائی ایک طرف ہو جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "نورو دین، یہ سارا معاملہ جذبات کا ہے۔"

"ہاں جی۔ اب میرے وہ جذبات کیسے ہو سکتے ہیں جو اباجی کے ہیں۔ انہوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ پاکستان بنایا اور پھر پاکستان چھوڑ کے یہاں آ گئے۔ ہم نے پاکستان اسی طرح دیکھا ہے جیسے کوئی اور ملک... جرمنی یا جاپان۔ ہم وہاں رہتے، ہمارے دوست ہوتے وہاں اور ہم وہاں تعلیم پاتے، وہیں بڑے ہوتے، وہاں ہمارے چاچے مامے اور ان کے بچے ہمارے کزن ہوتے، دادا دادی ہوتے، کوئی اپنا گھر ہوتا، پھر ہم ان جیسے پاکستانی ہوتے مگر یہاں ہم ختم ہو گئے ہیں جی۔ انگریز دونوں کو انڈین سمجھتے ہیں یا ایشیائی۔ نہ ہم دل سے سچے پاکستانی ہیں اور نہ خود کو انڈین کہہ سکتے۔ جذباتی طور پر۔ وہ سب بچے جو یہاں کے ماحول میں پل کے بڑے ہوئے ہیں پاکستانی کیسے ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر ان کے بچے جو خود بھی یہاں کی تہذیب اختیار کر چکے ہیں۔"

میں اور محسن اس کی بات غور سے سن رہے تھے۔ وہ بے وقوف نظر آتا تھا اور بے وقوفی کی باتیں کرنے کے باوجود عقل و شعور رکھتا تھا۔ اس کے احساس اور مشاہدے کو غلط نہیں کہا جا سکتا تھا۔

قصوروار اس نسل کے بڑے لوگ تھے جنہوں نے پاکستان بنانے کے بعد سمجھ لیا کہ ہم نے منزل پالی۔ انہوں نے اگلی نسل کے ذہن میں پاکستانی قومیت کا تصور اجاگر کرنے کے لیے باتوں کے سوا کچھ نہیں کیا۔ ان کی باتوں میں جو دوغلا پن تھا اس نے مزید ابہام پیدا کیا اور نوجوان جو مستقبل کے امین تھے اپنی ذمے داریوں کو سمجھ ہی نہ سکے۔

نورو دین کو اپنے اباجی کی طرف سے سخت تشویش لاحق تھی کہ اب تک وہ نہ جانے کہاں کہاں اپنے لخت جگر کی پراسرار گمشدگی کی اطلاع کر چکے ہوں گے۔

"اچھا ہوتا اگر ہم کوئی پیغام چھوڑ آتے۔" محسن بولا۔

"یا انہیں فون پر اطلاع دے کر مطمئن کر دیتے۔" میں نے کہا۔

"یہ کام تو اس وقت بھی ہو سکتا ہے۔" محسن بولا۔

میں نے کہا "اچھا تم لوگ بل منگواؤ۔ میں فون پر حاجی صاحب سے بات کرتا ہوں۔"

طوطی صاحب کسی شیر کی طرح گرج رہے تھے۔ "وہ کھوتے دا پتر صبح سے غائب ہے۔ مجھے تو شک ہے کہ اسے کسی میم نے اغوا کرا لیا۔ اس سے کچھ بعید بھی نہیں کہ گوری چمڑی کے لیے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ دے۔ ماں باپ کو عاق کر دے۔"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "حاجی صاحب، میری بات تو سن لیں۔"

"اجی بات کیا سنوں۔ اپنی اولاد کو میں آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ وہ بھی وہی کریں گے جو ہم نے کیا تھا۔ آج سمجھ آئی ہے میرے پاکستانی بھائی کو کیا مطلب ہے اس بات کا کہ جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔ تخم تو ہمارا ہے نا جی۔ پھل بھی ہم جیسا ہو گا۔"

میں نے کہا "گویا آپ اعتراف کرتے ہیں اپنے ناخلف اور باغی ہونے کا بلکہ آپ کے اپنے الفاظ میں 'حرام الدہر' ہونے کا۔"

خلاف توقع حاجی صاحب خفا نہیں ہوئے "اعتراف تو کرنا پڑے گا جی۔ کسی اور سے نہ سہی اپنے آپ سے بندہ کیسے جھوٹ بول سکتا ہے۔ ہم نے سب کو چھوڑ دیا تھا ولایت کے چکر میں۔ ہمارے اباجی سمجھاتے تھے کہ حرامی چھوڑ کے مت جا، گھر اپنی زمین کے لیے بد ہے گا بد بخت... تیری اولاد بھی تیری نہیں ہو گی۔ کوئی تیرا نہیں ہو گا وہاں۔ سچ فرماتے تھے اباجی جو آج ہمارے سامنے آ رہا ہے۔"

میں نے کہا "طوطی صاحب۔ ایسا نہیں ہے۔ آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ نورو دین آپ کے نقش قدم پر نہیں چل رہا ہے۔"

"یہ آپ کو کیا معلوم جی؟"

"وہ اس وقت ہمارے ساتھ ہے۔ ہمیں لندن کی سیر کرا رہا ہے اور ہمیں اس سے بات کر کے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قصوروار آپ کو ضرور سمجھتا ہے مگر وہ آپ کو چھوڑنے کا یا آپ کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا....."

www.paksociety.com

"وہ ہم لوگوں کو کس طرح قصور وار سمجھتا ہے بھئی؟"

"آپ نے اس سے وطن چھینا۔ اسے پاکستانی بننے ہی نہیں دیا۔ یہاں ولایت میں رہ کے آپ کی باتوں سے تو وہ کیا پاکستانی نہیں بن سکتا۔ گستاخی معاف۔ پکے اور سچے پاکستانی تو آپ بھی نہیں تھے ورنہ ترکِ وطن کیوں کرتے۔"

"اللہ معاف کرے، اس وقت ہم یہی سمجھتے تھے کہ اس میں بھلائی ہے لیکن اس میں صرف خرابی تھی۔ آج پاکستان ہمارا نہیں رہا۔ ہم پاکستان کے نہیں رہے۔ تم نے ٹھیک کہا۔ ہم صرف باتیں کرتے ہیں۔ گفتار کے غازی ہیں۔"

میں نے کہا "خیر اس وقت آپ کو یہ اطلاع دینی مقصود تھی کہ نوردین کی طرف سے تشویش میں مبتلا نہ ہوں اور ہاں.... خدا نخواستہ پولیس آپ سے پوچھتی ہوئی آئے تو کہہ دیجیے گا کہ ہم تین بجے تک گھر میں ہی تھے۔"

"کیوں؟ تم نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی ہے تو مجھے بتادو۔"

"نہ ایسی نہ ویسی.... ہم نے کوئی غلط حرکت نہیں کی۔ بس یہ کی ہے مگر آپ جانتے ہیں پولیس کل رات سے ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔"

"اس کی تم فکر مت کرو۔ طوطی کے ہوتے ہوئے پولیس تم پر بلاوجہ ہاتھ کیسے ڈال سکتی ہے۔"

میں نے کہا "وجہ تو ہے۔"

"ایسی کوئی ناموزوں وجہ کہ بس موج کرو میرے پاکستانی بھائی۔ بندے کی نیت ٹھیک ہے تو سب ٹھیک ہے۔ اللہ تمہیں اپنے نیک مقصد میں کامیاب کرے اور تم خیر و عافیت کے ساتھ واپس جاؤ۔ کوئی غلط کام کرتے تم یا تمہارا مقصد غلط ہوتا تو ہم تمہارا ساتھ کیوں دیتے۔ ان گوروں کی تو...."

حاجی صاحب کی طرف سے اس یقین دہانی کے بعد میرا..... حوصلہ بہت بڑھ گیا۔ میں ہوٹل پر واپس آیا تو محسن بل ادا کرچکا تھا۔

نوردین نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا "آپا جی بہت گرم ہوں گے۔"

میں نے کہا "اتنے گرم کہ فون میں سے گرم ہوا آرہی تھی۔ اژدہے کی طرح پھنکار رہے تھے۔"

"پھر آپ نے کیا کہا؟"

"میری کہانی سنی انہوں نے تو کہنے لگے کہ جھوٹ مت بولو۔ مجھے پتا ہے وہ کل رات سے غائب ہے اور کہاں ہے۔ دراصل انہوں نے تمہاری سب گرل فرینڈز کو فون کیے تھے۔ نہ جانے کس نے کہہ دیا کہ ہاں وہ میری بغل میں ہے۔ کل رات سے میرے ساتھ ہے کیونکہ وہ میرا شوہر ہے۔ اس نے شادی کرلی ہے مجھ سے، پاگل بڈھے ہمت ہے تو لے جا چھین کے۔"

نوردین کی حالت غیر ہوگئی "اف.... مروا دیا مجھے اس لڑکی نے۔ اس نے یہ سب کہہ دیا؟"

"ہاں مگر وہ ہے کون؟"

نوردین پر رقت طاری ہونے لگی "ہے ایک لڑکی۔ ... پیار ہے ہمارا۔"

"تمہارا ہر عشق سچا ہوتا ہے!" محسن بولا۔

"وہ اکثر دھمکی دیتی تھی کہ تمہارے باپ نے کیا سمجھ رکھا ہے مجھے۔ کیوں فون کر کے مجھ سے اُلٹے سیدھے سوالات کرتا ہے۔ کسی دن میں دماغ درست کروں گی اس پاگل بڈھے کا۔ لیکن ... خیر نہیں، آپا جی میری شادی کر کے چھوڑیں گے۔ ان کے خیال میں میرا یہی علاج ہے۔"

"پرانے لوگ ایسا ہی سمجھتے تھے۔ آوارگی کے مرض کا ... مشکل ہوتا ہے" میں نے کہا "خصوصاً یہاں کے ماحول میں۔"

محسن بولا "تم انکار بھی کرسکتے ہو شادی سے۔ اگر تمہیں ... پسند نہیں۔ گھر سے بھاگ سکتے ہو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "بڑا مشکل ہے جی۔ والدین ... ہے۔ میں کب تک ناں کروں گا۔ لڑکی جیسی بھی ہو مجھے شادی کرنا ... گی مگر شادی کے بعد میں گرل فرینڈز کو چھوڑ دوں گا، یہ ناممکن ہے۔"

میں نے کہا "مبارک ہو چچا نوردین۔ ایسی کوئی بات نہیں ... نے جھوٹ بولا تھا۔ آپا جی کو مطمئن کردیا ہے میں نے کہ نوردین ہمارے ساتھ ہے اور ہم لندن میں گھوم رہے ہیں۔ میرا پیارا ... ہیں۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ میرا پتا ناک کررہے ہیں ہم ... پھر رہے ہیں۔" وہ بولا "آپ کہتے تو ایسی ایسی جگہ لے جاتا ... آنکھیں کھل جاتیں آپ کی۔"

میں نے کہا "ہماری آنکھیں تم سے بہت پہلے کھل چکی ... بیٹھے۔"

محسن نے کہا "کیا حرج ہے اگر شام سے رات تک ہم نوردین کو موقع فراہم کریں۔ تفریح بھی تو ضروری ہوتی ہے کام کے ساتھ۔"

میں نے کہا "کام ابھی ختم نہیں ہوا۔"

"اب کیا سوجھی ہے آپ کو؟" محسن بولا۔

"نئی نہیں سوجھی۔ میں نے والرتھ سے کہا تھا کہ میں آؤں گا ... کہ نہیں، میں نے کہا تھا کہ تمہارے شوہر کو گھر میں گھس کے ماروں گا۔"

"اور تو سچ مچ ایسا کرنا چاہتا ہے۔"

"ہیں۔ ایک تو ہم پٹھان، پھر مرد.... اور مجاہد۔ جو بات منہ سے نکلی وہ پتھر پر لکیر ہوگئی۔"

"کیسے ہوگا یہ کام؟ قسمت ایک حد تک ساتھ دیتی ہے۔ آپ بھوکے شیر کے منہ میں سر ڈالیں گے تو قسمت کی خوبی ... کی امید نہیں کرسکتے۔"

میں نے کہا "اسی لیے تو مشورے، حمایت اور مدد کے لیے آپ کو اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ آپ فرمائیں۔"

"میرے فرمانے سے کچھ نہیں ہوگا اور نہ میرے مشورے کی ... اہمیت ہے" محسن نے خفگی سے کہا "تو وہی کرے گا جو تیرا دل ... چاہے گا۔"

... نے کہا "یہ والرتھ ہمیشہ جیلوں میں نہیں رہتی۔ اس کا گھر بلاضرورت مگر کوئی قلعہ نہیں ہے۔"

"لیکن کل اس کے شوہر پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ اس کے بعد حفاظتی انتظامات سخت کر دیے گئے ہوں گے۔"

"حفاظتی انتظامات ہارج کے لیے بھی بہت سخت تھے مگر ہم پھر بھی گھس گئے اور نکل آئے۔"

"یار خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اسے بہانہ نہیں بنانا چاہیے نئی حماقت کا۔ ایک بار خدا نے بچا لیا۔ ہم جس کام کے لیے آئے تھے وہ ہوگیا۔ اب واپسی کی فکر کرنی چاہیے۔ خواہ مخواہ مصیبت کو دعوت دینے سے کیا حاصل۔ والرتھ سے جو بات کہی تھی اس پر عمل نہ کیا تو کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ تم نے کوئی قسم کھا کے عہد کرکے اور پورا نہ کرنے پر کفارہ ادا کرنا ہے۔ کیا یہ اس سے بھی زیادہ ... ہے کہ ادھر ہیں رابعہ اور گل ہماری واپسی کی منتظر ہیں۔ یہاں پولیس ہماری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔ خدا کے لیے ابھی یہ خیال چھوڑ دے۔" محسن ایک دم پھٹ پڑا "میں ہرگز اس احمقانہ ... میں تیرا ساتھ خوشی سے نہیں دے سکتا جس میں اپنے ساتھ سب کے لیے خانہ خرابی اور تباہی کے اسباب سامنے نظر آتے ہیں۔ آدمی رسک لیتا ہے یا نقصان بھی اٹھاتا ہے کسی مقصد کے حصول کے لیے۔ مال، ... فائدہ بھی۔ اصولی بات ہو تب بھی جائز ہے مگر یہ کیا بات ہوئی کہ آپ نے غصے میں یا مذاق میں زبان سے کچھ فرمادیا اور اب اس پر اپنی جان قربان ہو یا کسی اور کی۔ آپ کی انا زیادہ اہم ہے۔"

میرے پاس محسن کی دلیل کے جواب میں شرمساری کے سوا کچھ نہیں تھا چنانچہ میں سنتا رہا اور نوردین حیرانی سے مجھے دیکھتا رہا۔

جب محسن خاموش ہوا تو میں نے کہا "پھر کیا خیال ہے ...؟"

نوردین نے پہلے مجھے اور پھر محسن کو دیکھا "کہاں چلیں؟"

"جہاں سے آئے تھے" میں نے کہا "تم اپنے گھر.... ہم اپنے گھر۔"

نوردین بولا "کیا آپ نے ارادہ بدل دیا؟ ویری گڈ!"

میں نے سوچ کے کہا "بدلا تو نہیں۔"

"پھر؟" نوردین نے کہا۔

"ملتوی کردیا ہے فی الحال" میں نے کہا "ہم اپنے الفاظ پر قائم ہیں۔ ہم والرتھ کے سرتاج عزیز کو اسی کے گھر میں گھس کے ... لگا کے، لیکن وقت اور تاریخ کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔"

"اچھا ہوا۔ ہم نے اپنے منہ سے ایسی کوئی بات نہیں نکالی تھی کہ ہم فلاں دن اتنے بج کر اتنے منٹ پر سر رچرڈ گورڈن کی گوشمالی فرمانے کے لیے بنفس نفیس تشریف لائیں گے۔ ہماری بات ہوتی ہے پتھر پر لکیر پھر ہمیں جانا پڑتا سر ہتھیلی پر رکھ کے۔ آپ گاڑی ... آئی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یار زندہ صحبت باقی۔ ہم اس نیک کام کے لیے پھر حاضری دیں گے لیکن...."

"لیکن کیا....؟" محسن بولا۔

"میں چوہدری دلاور سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کہاں ہوگی اس سے ملاقات؟ یہ بھی بتادیں۔ اس نے آپ کو مدعو کیا ہے تو پتا بھی بتایا ہوگا" محسن نے کہا۔

"چلیں نہ ہم عزت سے اٹھ جائیں" میں نے کہا "کھانے کے بعد اور بل ادا کرنے کے بعد ریسٹورنٹ کی میز پر قبضہ جمائے رکھنا...!"

میری بات پوری ہونے سے پہلے جوان مگر سانولی مدراس کے لہجے میں بات کرنے والی ویٹرس نے سوال کیا "لئی یو۔ آپ کو کچھ اور منگانا ہے؟"

"منگانا ہے" میں نے اسی کے لہجے میں کہا "اجازت مانگنا ہے آپ سے جانے کا واسطے۔ آپ اجازت نہیں دیتا تو ہم نہیں جاسکتا۔ آپ کا دل ہم نہیں توڑ سکتا جی۔"

اس نے مسکرا کے اور ہاتھ جوڑ کے کہا "دھنیم" جس کا مطلب کچھ سلام جیسا ہی ہوتا ہے۔ یہ ہندوستانی ریسٹورنٹ نہ ہوتا تو ہم سے بہت پہلے دو ٹوک لہجے میں میز خالی کرنے کے لیے کہہ دیا جاتا مگر ایک تو یہ رش کا وقت نہیں تھا اور بیشتر میزیں خالی پڑی تھیں، دوسرے انڈین ویٹرس جانتی تھی کہ انڈیا پاکستان میں لوگ ریسٹورنٹ میں گپ لگانے اور وقت گزارنے جاتے ہیں۔ ایک کپ چائے پی کے گھنٹا بھر بیٹھتے ہیں۔ بڑی اپنائیت سے جوتے اتار کے اور پاؤں کرسی پر سمیٹ کر سگریٹیں پھونکتے ہیں اور ٹوٹے چائے کی پیالی میں بجھاتے ہیں اور پیک تھوکتے ہیں۔

ہم باہر آئے تو میں نے کہا "جناب محسن شیروانی صاحب۔ آپ کی وجہ سے آج میرا وہ رقیب روسیاہ، سوری.... روسفید بچ گیا لیکن میری دلی خواہش ہے کہ میں کوئے جاناں سے گزر کر دیکھوں۔"

"کیا دیکھیں گے وہاں.... در جاناں پر کھڑے دربان کو؟"

"اگر تھوڑی سی سراغرسانی کی جائے تو پتا چل سکتا ہے کہ چوہدری دلاور کا ٹھکانا کہاں ہے۔ وہ والرتھ کے گھر کے آس پاس ہی موجود نہ ہوتا تو رچرڈ گورڈن کے پیچھے کیسے آتا۔ وہاں وہ ہمارا انتظار کررہا تھا۔"

"ہمارا نہیں، میرا کہیے۔"

میں نے کہا "او کے۔ میرا انتظار کررہا تھا۔"

"ہمارا خیال غلط نکلا۔ راستے میں ریاست قلاتی پولیس ... مشغول رہا تھا اور جیسے ہی رچرڈ کی رولز رائس کو روانہ ہوتے دیکھا، فوراً ہی ٹیکسی میں بیٹھ کے پیچھے چل پڑا۔ راستے ہمارا ... میں وہ تماشا نہیں بنا۔ کسی نے اس کے بے مقصد گھومنے...

www.paksociety.com

اعتراض نہیں کیا اسے فوراً ٹیکسی بھی مل گئی۔"
میں نے کہا "یہی تو حیرانی کی بات ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"
"پھر کیا ہو سکتا ہے؟"
"یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے اس گھر کے سامنے یا دائیں بائیں اپنا مورچہ قائم کر رکھا ہو۔ جہاں سے ہر آنے جانے والے پر نظر رکھی جا سکے مگر وہ خود سب کی نظروں سے اوجھل رہے۔ رہی ٹیکسی کی بات تو میرے پاکستانی بھائی... لندن میں بھی بے شمار پاکستانی اور انڈین ٹیکسی چلا رہے ہیں۔ وہ کسی کی ٹیکسی کنٹریکٹ پر بک کر سکتا ہے جو چوبیس گھنٹے اس کی تحویل میں رہے۔ ڈرائیور کو معاوضے سے غرض ہے۔ دلاور کی جگہ ہم بھی ہوتے تو دگنا معاوضہ پیش کر کے کسی بھی ڈرائیور کی خدمات حاصل کر لیتے۔"
"اور تیرا خیال ہے کہ وہ ابھی تک وہیں چشم براہ ہو گا ہمارے لیے۔"
"ہاں۔ خصوصاً اس دھمکی کے بعد جو میں نے الرتھ کو دی تھی" میں نے کہا۔
"اس کا دلاور کو کیسے پتا چل سکتا ہے؟"
"جب وہ رچرڈ کی گاڑی میں بم نصب کر سکتا ہے اس کو ٹھیک جگہ پر اڑا سکتا ہے۔ ظاہر ہے بم خود نہیں پھٹا تھا۔ اس میں ریموٹ کنٹرول فیوز تھا۔ دلاور نے خود وہاں پہنچ کے دھماکا کیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں ہماری موجودگی کا سراغ پولیس نے لگا لیا تھا۔ پولیس وہاں پہنچ گئی تھی۔ چند منٹ پہلے ہم نے الرتھ کو دھمکی دی تھی۔ چند منٹ بعد دھماکا ہوا تو الزام خود بخود ہم پر آ گیا۔ دلاور کو سب اطلاعات مل رہی ہوں گی کہ ہم نے کس طرح جارج سے ملاقات کی، وہاں سے نکلنے میں کیسے کامیاب ہوئے۔ ہم نے تو نہیں پڑھے مگر آج کے اخبارات میں یہ اسٹوری ہو گی۔"
نوردین نے سر ہلایا "میں نے پڑھی تھی۔"
"اچھا اور کیا تھا اس میں؟" میں نے کہا۔
"پولیس کا اعلان تھا کہ سکندر بخت اور محسن شیروانی نام کے دو افراد غیر قانونی سرگرمیوں کی بنا پر برطانیہ سے نکال دیے گئے تھے ناجائز طریقے سے لندن پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اعلان میں تمہارا حلیہ بھی تھا اور محسن کا بھی اور یہ کہ تم ردفاد یوسف ایڈووکیٹ کا فرضی نام استعمال کر رہے ہو۔"
میں نے کہا "میری کوئی تصویر نہیں تھی؟"
"نہیں۔ شاید اب آ جائے گی" نوردین بولا۔
"ان کے پاس وہی پرانی تصویر ہو گی" میں نے کہا "جو ان کے ریکارڈ پر ہے۔"
"... ہم ایک زیر حراست قیدی جارج کو چوہدری دلاور کی آدھ تصویر فراہم کر سکتے ہیں تو لندن پولیس اپنے لامحدود وسائل کے ساتھ ہماری تصاویر کیوں حاصل نہیں کر سکتی۔ خود چوہدری دلاور ... سب سے بڑا نادانستہ معاون اور مددگار ثابت ہو گا۔ وہ ... نے ہماری تصاویر فراہم کر دی ہوں گی ... کو دان

پر قاتلانہ حملے کے ملزم ہو۔"
میں نے محسن کی بات سے اتفاق کیا "کل صبح کے اخبار میں جو خبر آئے گی وہ زیادہ سنسنی خیز ہو گی کہ ایک پادری اور بدھ بھکشو نے اسپتال میں کتنی گڑبڑ پھیلائی۔ ہمیں بہت سوں نے دیکھا تھا۔ بہت سے نامعلوم مریضوں نے جن کے لیے اجتماعی دعا کی تھی" محسن نے گویا یاد دلایا۔
مجھے ہنسی آ گئی "دروازے پر کھڑے سارجنٹ نے ... کو ریاض اور ایمبولینس ڈرائیور نے۔"
"اچھا ہوا کہ نوردین ہمارے ساتھ نہیں تھا۔"
نوردین نے کہا "ساتھ تو تھا جی۔ میں ہی تو اپنے ماموں ... تھا۔"
میں نے کہا "نوردین۔ کیا وہ یہودی پولیس کو مطلع نہیں کرے گا کہ وہ پادری اور بدھ بھکشو کون تھے اور کس کے ساتھ آئے؟ کل ہماری اصلی اور حالیہ تصاویر بھی شائع ہوں گی۔"
نوردین نے کہا "وہ پولیس کے چکر میں نہیں پڑے گا۔ ... اسے بھی شریک جرم سمجھے گی۔"
"وہ تمہیں بلیک میل تو کر سکتا ہے۔"
"پھر میں بھی اسے بلیک میل کر سکتا ہوں" نوردین ... میں ایک اخبار کا چیف رپورٹر ہوں۔ اس پیشے میں جھک نہیں مارتے۔"
میں نے اسے تھپکی دی "شاباش چیتے نوردین۔ کیا ہے تمہارے پاس اس یہودی کا منہ بند رکھنے کے لیے؟"
"یہودی کی بیٹی۔ اس کی رنگین راتوں کی دلچسپ کہانیاں۔"
میں نے پوچھا "باتصویر کہانیاں؟"
"ہاں۔ کچھ باتصویر بھی ہیں۔ میں ایک بار بلیک میل ہو ... اس کے بعد میں نے خود کو بچانے کے لیے اس کے خلاف ... اکٹھا کیا۔ اس کا کچا چٹھا اس کے سچے عاشقوں سے ملا اور ... انہوں نے بتایا وہ ٹیپ پر ریکارڈ کیا۔"
"تم بھی تو اس کے سچے عشق میں مبتلا ہو؟" محسن نے ...
"یہاں سچا عشق ایسے ہی ہوتا ہے جی۔" نوردین بولا "... لندن میں رہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ میں ... تو لندن میں نہ جانے کتنے بچوں کی ولدیت کے خانے میں ... میرا نام آ جاتا۔ اس کے بعد ابا جی کے جذبات کیا ہوتے۔"
میں نے کہا "وہی جو ایک قصاب کے دل میں قربانی ... کے لیے ہو سکتے ہیں۔"
"اس سے بھی بدتر۔ وہ جو ایک تھانے دار کے دل میں ... چور کے لیے ہو سکتے ہیں جو اس کے گھر میں چوری کرتے پکڑا ... یا اس کی بیوی کی عزت لوٹے" محسن نے کہا۔
نوردین نے محسن کی مثال کو زیادہ حقیقت پسندانہ ...
"میں تو جان ہتھیلی پر رکھ کے عشق کرتا ہوں ہر بار ... رہیے... کا قائل ہوں۔ یہ بات لڑکیوں کو بعد میں پتا ...

"نوازش ہے تم پر میرے پاکستانی بھائی۔ یہ بتاؤ کہ اب تم اس بوڑھے کیا کہو گے۔ کل جب وہ اخبار میں سب پڑھ لے گا۔"
نوردین نے کہا "اس کی تو مجھے فکر نہیں۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جھوٹ بول سکتا ہوں کہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں کل کس کے ساتھ آیا تھا؟ میں تو پرسوں رات کو لیورپول چلا گیا تھا، سارا دن وہاں رہا۔ گواہی دینے والے بہت ہیں وہ خود رسید جاری کرتا ہے نہ، محفوظ لیتا ہے۔ کیسے ثابت کرے گا کہ ہم نے وہاں سے پادری کا اور بھکشو کا لباس لیا تھا۔ وہ اپنی آمدنی بھی چھپاتا ہے اور خود کو ایسے چکروں سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ اس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کیا چیز ہوں۔ وہ مجھ سے بگاڑ مول نہیں لے گا۔"
"اصل مسئلہ ہے حاجی علم دین طوطی کا میرے پاکستانی بھائی۔ ان کے جلال سے اللہ تمہیں بچائے" میں نے کہا۔
"اور ان کی جو آنکاری ہے" محسن بولا "میرا تو خیال ہے کہ اب ہمیں بھی ان سے دور رہنا چاہیے۔ پولیس وہاں ضرور پہنچ جائے گی۔"
میں نے کہا "ہاں۔ انہوں نے ہماری بہت مدد کی۔ ہم ان کے لیے کیوں پریشانی کے اسباب پیدا کریں۔ نوردین تم اب شرافت سے اچھے بچوں کی طرح گھر جاؤ۔ حاجی صاحب تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ ہماری وجہ سے۔"
"اور آپ لوگ کہاں جاؤ گے؟"
میں نے اسے اپڈیٹ کا اور فون نمبر بتایا "کل صبح ہمیں لندن سے واپس جانا ہے۔ ہم طوطی صاحب سے بھی بات کر لیں گے۔ تم ہمارے بیگ کسی طرح اپڈیٹ کے گھر پہنچا دو گے؟ اس میں ہمارے پاسپورٹ نہ ہوتے تو ہم پروا نہ کرتے مگر یہیں سے ہم واپس کولمبو جائیں گے یا پیرس ..."
نوردین نے کہا "... پہنچا دوں گا۔ آپ فکر ہی مت کرو لیکن ابھی تو بہت وقت ہے، کچھ شغل میلہ کر لے۔"
میں نے کہا "اس کے لیے تمہارے پاس زندگی پڑی ہے۔ ہمیں کیوں گنہگار کرتے ہو اپنے ساتھ۔"
نوردین رخصت ہوتے وقت خاصا جذباتی تھا "آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے میں نے۔ میں آپ جیسا بننا چاہتا ہوں۔ کاش آپ میرے ابا جی ہوتے۔"
میں نے کہا "شاید تمہاری والدہ کو اس سے اتفاق نہ ہو۔ تم کو ایسا بیان جاری نہیں کرنا چاہیے۔"
جب وہ چلا گیا تو میں نے حاجی صاحب کو فون کیا اور انہیں مختصراً آج کے دن کی ساری روداد سنا دی "نوردین نے کچھ نہیں کیا۔ آپ اسے کچھ نہ کہیں۔ اس نے بس ہمارا ساتھ دیا اور خوب دیا۔ ماشاء اللہ سے چالاک ہے اور سمجھدار ہے۔"
"اچھا جی۔ آپ اس کھوتے دے پتر کی تعریف کرنے والے پہلے بندے ہو میرے پاکستانی بھائی!" حاجی صاحب نے خوش ہو کے کہا "پولیس سے تو میں نمٹ لوں گا، تم آ جاؤ۔"
میں نے کہا "نہیں طوطی صاحب! ہمارا کام ہو گیا۔ آپ کا بڑا احسان ہے ہم پر۔ آپ نہ ہوتے تو شاید..."
"ایسا مت کہو۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہے۔ اس سے پہلے تم نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ کفار کے دانت کھٹے کیے اور حق کا بول بالا کیا۔ وہ سب تائید ایزدی سے تھا۔"
میں نے کہا "جارج کا معاملہ اب آپ کے سپرد۔ ہم پاکستان جا کے اسے قانونی طور پر گواہ کی حیثیت سے بلوانے کی پوری کوشش کریں گے۔"
"یہاں کے معاملات میں سنبھال لوں گا۔"
میں نے کہا "جارج کو زندہ رہنا چاہیے۔ اس کی گواہی بہت اہم ہے۔"
"زندگی اور موت پر تو میرا اختیار نہیں میرے پاکستانی بھائی مگر جارج کے لیے 'طوطی' کی صدا اس قید خانے میں جس کو والایت کہتے ہیں۔ ایسے سنی جائے گی جیسے جنگل میں شیر کی دہاڑ۔ اس کی بے گناہی کا نتیجہ میں ایسے بتاؤں گا کہ انگریزوں کا اندھا بہرا قانون بھی مجبور ہو گا۔ اس کی قانونی اور اخلاقی مدد کے لیے میں جمار کروں گا تو میرا ساتھ دینے والے بھی کم نہیں ہوں گے۔ انشاء اللہ تمہارے اور پاکستان کے دشمن چوہدری دلاور ملعون کا انجام عبرت ناک ہو گا۔"
ان کی باتوں نے مجھے بڑی امید دی اور میرا حوصلہ بڑھایا۔ ابھی شام کے چند گھنٹے باقی تھے۔ تماشائی میرو تفریح میں گزارے جا سکتے تھے مگر محسن کوئی رسک لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کے مشورے پر میں نے داڑھی سے بھی نجات حاصل کر لی تھی کہ میرا حلیہ پولیس کے جاری کردہ حلیے سے مختلف نظر آئے۔ ہم نے رات کا اندھیرا پھیلنے تک دو گھنٹے مختلف مقامات پر گزارے۔ ایک جگہ کافی پی اور پھر پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے تین خاصے بدنام قسم کے نائٹ کلبوں میں گئے۔ آج وہ پہلے سے زیادہ بدنام تھے اور مشہور تھے مگر وہاں جو کچھ ہو رہا تھا ہمارے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ شاید اس لیے کہ وقت بدل گیا تھا اور ہمارے جذبات بدل گئے تھے۔ ہم وہاں سے بدمزہ ہو کے نکل آئے۔
میں نے کہا "یار محسن۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم بوڑھے ہو گئے ہیں۔"
محسن نے آہ بھری "واقعی۔ ورنہ کتنی ہیجان انگیز محسوس ہوتی تھی یہاں کی فضا۔ رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو جاتی تھی۔"
"تو نے انہیں دیکھا۔ جو آج وہاں رقص کر رہے تھے یا دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے تو جذبات سے تمتما رہے تھے۔ ہم اپنی عمر کے اس دور سے بہت عجلت میں گزر گئے۔ وقت تو بہت تھا ہمارے پاس۔"
"لیکن وقت پر ہمارا اختیار باقی نہیں رہا تھا" محسن نے کہا "ہم وقت سے پہلے جوان ہو گئے تھے۔ وقت سے پہلے بڑھاپا بھی آ ...

www.paksociety.com

تھا۔"

"بڑھاپا جسمانی عمر کا نام نہیں ہوتا۔ زندگی کے تجربات اور حادثات سے حاصل ہونے والی عقل کی پختگی سے سنجیدگی آتی ہے۔ ذمے داری کا شعور آتا ہے۔ کچھ لوگ ساری عمر گزار کے بھی بچے ہی رہتے ہیں۔ ذہنی طور پر... اور کچھ ہماری طرح پچاس سال کے تجربات سے پانچ سال میں گزر جاتے ہیں۔"

اس رات ڈنر کے لیے ہم ٹیکسی میں ٹیمز کے کنارے وکٹوریہ نادر گارڈن گئے۔ کھانے سے پہلے ہم دریا کے کنارے کھڑے آتی جاتی کشتیوں اور لانچوں کو دیکھتے رہے۔ ان میں کچھ بحری جہازوں سے کم نہ تھیں۔ مسافر بردار لانچوں میں ایک سطح آب پر رواں ریسٹورنٹ بھی تھا جس کی رنگین جھلمل کرتی روشنیوں کے ساتھ موسیقی کی اور تفریح کرنے والوں کے قہقہوں کی آواز احساس دلاتی تھی کہ زندگی کتنی حسین ہے۔

آسمان پر چاند وقفے وقفے سے بادلوں کو چیر کے کچھ دیر فضا کو روشن رکھتا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے زمین کے اجالے ماند پڑ گئے ہیں۔ پھر کوئی بادل کا ٹکڑا چاند کو ڈھانپ لیتا تھا اور آسمان کے تاریک پس منظر میں شہر کے چراغ زیادہ روشن محسوس ہوتے تھے۔ بادل رفتہ رفتہ گہرے ہوتے جا رہے تھے اور کچھ دیر میں بارش شروع ہو سکتی تھی۔

میں نے ٹیمز کے پانی میں لرزاں اجالوں کے عکس کو دیکھتے ہوئے کہا "کتنا اچھا ہوتا اگر یہاں میرے ساتھ رابعہ ہوتی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ آپ کی جگہ گل کھڑی ہوتی تو یہی منظر کتنا زیادہ حسین ہو جاتا" محسن بولا۔

"وہ اس وقت کیا کر رہی ہوں گی؟" میں نے کہا۔

"بظاہر ہماری غیر حاضری کو نظرانداز کرتے ہوئے خوش و خرم نظر آنے کی اداکاری کر رہی ہوں گی۔ جس کھیل رہی ہوں گی ہولی کے ساتھ" محسن بولا۔

"لیکن اندر سے اداس ہوں گی۔ انتظار کر رہی ہوں گی ہمارے واپس لوٹنے کا اور پریشان ہوں گی ہماری کوئی اطلاع موصول نہ ہونے پر۔"

"گل ضرور رو رہی ہو گی" محسن نے کہا۔

"رابعہ رات کو روتی ہو گی تکیے میں منہ چھپا کے" میں نے کہا۔

پھر ہم دونوں ہنس پڑے اور پلٹ کے ریسٹورنٹ کے ٹیرس پر کھلی جگہ میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہمارے ساتھ والی میزوں پر ہر عمر کے لوگ تھے مگر اکثریت نوجوان جوڑوں کی تھی جن کے دلوں میں جذبات کے سمندر موجزن تھے۔ باہر کا ماحول انہیں بے خود کیے دے رہا تھا اور وہ سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی اپنی خلوت میں صرف ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ کسی کو پروا بھی نہیں تھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔ حسن و عشق کے ناز و نیاز کا یہ تماشا وہاں کے معاشرتی ماحول کا حصہ تھا۔

آرڈر دینے کے بعد میں نے تجویز پیش کی "کیوں نہ ہم انہیں اپنی واپسی کی اطلاع کر دیں فون کر کے۔"

"اس سے کچھ حاصل نہیں۔ وہ نہیں آئیں گی فون پر بات کرنے۔"

میں نے کہا "چلو شرط لگا لو، وہ آئیں گی۔"

"تو ہار جائے گا۔ وہ پہلے بھی نہیں آئی تھیں۔" محسن بولا۔

"پہلے کی بات اور تھی۔ پہلا دن تھا اس لیے غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔ تین دن میں غصے کے سب بخارات نکل گئے ہوں گے۔ اب تو آہٹ پر کان لگائے بیٹھی ہوں گی۔ فون کی اطلاع پر ہی دوڑی آئیں گی۔"

"چلو لگا شرط۔ کیا کرے گا ہارنے والا؟"

میں نے سوچ کے کہا "وہ سارے کپڑے اتار کے صرف ایک انڈرویئر میں ایک گھنٹے تک سیدھا کھڑا رہے گا۔"

"یہ بھی کوئی شرط ہے؟" محسن بولا۔

"باقی سب لوگ اس کے جسم پر اپنے پسندیدہ رنگ سے جو چاہیں کچھ بھی لکھنے کے لیے آزاد ہوں گے۔"

محسن نے غور کر کے کہا "مستقل رنگ..."

"ہاں۔ وہ تارکول بھی ہو سکتا ہے۔ اینمل بھی۔ کاربن پینٹ بھی جو آسانی سے دھویا نہیں جا سکتا۔ پھر وہ اسی حالت میں ایک رات پورے ہوسٹل کا چکر لگائے گا۔"

محسن نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا "منظور ہے۔ چل پہلے فون کر لیں۔"

"پہلے طعام۔ ویٹرس پریشان ہو گی کہ آرڈر دے کر کہاں چلے گئے۔ لو وہ آ گئی" میں نے کہا۔

ہم سی فوڈ پر ہمیشہ اتفاق کرتے تھے۔ یہ ہمیں پسند بھی تھا اور اس میں حرام حلال کا خدشہ بھی نہیں تھا۔ اس ریسٹورنٹ کی خصوصیت بھی اسپیشلٹی تھی اور اتنے عرصے بعد ہم نے اسے بہتر پایا۔ کسی بھی کاروبار میں کنٹرول بنانا مشکل ہوتا ہے مگر کوالٹی برقرار رکھنا زیادہ مشکل ثابت ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب نام کی شہرت سے دولت کمانا آسان ہو جاتا ہے۔

کھانے کے بعد آئس کریم کی باری آئی تو محسن نے وہ جگہ تجویز کی جو زیادہ دور نہیں تھی۔ اس آئس کریم پارلر کو لندن کے دور طالب علمی میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں ہم نے سب سے زیادہ ملاقاتیں کی تھیں، عشق کیے تھے اور ... کی تھیں۔ اس علاقے میں یہ محبت کرنے والے نوجوانوں کی پسندیدہ جگہ تھی جو دریا کے کنارے ٹہلتے رہتے تھے یا ... میں بینچوں پر بیٹھے نظر آتے تھے۔ یک جان دو قالب ہو کے ... سے دل ملے ہوتے۔ ہاتھوں سے ہاتھ اور کبھی لب سے لب۔ آئس کریم سستی تھی اور اچھی تھی مگر اس سے بھی اچھی بات یہ تھی کہ آئس کریم کھا لینے کے بعد بھی کوئی یہ نہیں پوچھتا تھا کہ آپ بل ادا کر کے تشریف کیوں نہیں لے جاتے۔

میں نے اور محسن نے وہاں خود کو اجنبی محسوس کیا کیونکہ ہمارے دور والا کوئی مروت ہونا نہیں تھا۔ ہر موڑ کے ساتھ کم ... بھی اسٹیبلشمنٹ کی طرح نہیں تھی کہ اپنی ... تو آ گئے۔ عموماً یہ رنگ میں بھنگ ڈالنے والی کسی لڑکی کی سہیلی ہوتی تھی یا پھر رقیب۔

فون کرنے سے پہلے میں نے ایڈی کا نمبر ملایا "پہلے اس کا پروگرام تو پتا چلے، وہ کب جائے گا۔ شیڈول کے مطابق اسے کل ہی جانا ہو گا۔ صبح کسی وقت۔"

ریسیور اٹھانے والی عورت نے بڑی نرمی سے کہا "ہیلو۔"

میں نے کہا "کیا ایڈی گھر پر ہے۔ میں اس کا دوست ہوں۔"

"نہیں... وہ گھر پر نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کہاں گیا ہے اور کب آئے گا؟ تم اس کی بیوی ہو؟"

"ہاں اور تم وہ تو نہیں... جو پیرس سے اس کے ساتھ آئے تھے؟"

"بالکل صحیح ہے تمہارا اندازہ..."

"ایڈی آج صبح پیرس چلا گیا۔ وہ تمہارے فون کا انتظار کرتا رہا تھا۔"

میں نے کہا "وہ چلا گیا مگر اس کو کل صبح جانا تھا۔ اس نے ہمیں یہی بتایا تھا۔"

"بعض اوقات ایمرجنسی میں اسے بریک نہیں ملتا۔ اس کا یہ ہفتہ ایسے ہی گزرے گا۔ وہ کل شام واپس آئے گا۔ پرسوں کا دن لانگ میں گزرے گا اور اگلے دن اسے پھر جانا پڑے گا۔"

میں نے پریشانی سے کہا "یہ تو بڑی پرابلم ہو گئی ہمارے لیے۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں تمہارے لیے۔ ایڈی نے کہا تھا کہ جو کچھ میں کر سکتی ہوں ضرور کروں۔ ہاں اس نے ایک ٹیلی فون نمبر بھی دیا تھا۔ اس کا کوئی دوست ہے جو یہی کام کرتا ہے۔ وہ کل شام کو جائے گا۔ اسی کمپنی میں ہے اور تم اس پر بھروسا کر سکتے ہو۔"

"کیا ہم تمہارے گھر آ سکتے ہیں اس وقت" میں نے کہا "دراصل ہم کچھ مجبور ہیں۔ لندن میں مزید قیام ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور یہاں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں ہم چھپ کے دو دن گزار سکیں۔"

"تم کسی وقت بھی آ سکتے ہو لیکن ہمارا یہ گھر بہت چھوٹا ہے۔ تم کو لیونگ روم میں سونا پڑے گا۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کے علاوہ... ہم اس شخص سے بھی ملنا چاہتے ہیں جو ایڈی کا دوست ہے۔ ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے۔ ہم پہلے دیکھیں گے کہ کیا وہ بھی ایڈی کی طرح اعتبار کے قابل ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم یہاں اس سے ملاقات کر سکتے ہو۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی" میں نے کہا "ایڈی کا یہ دوست ہماری خاطر مشکل میں کیوں پڑے گا۔ ایڈی نے تو معاوضہ وصول کیا تھا۔"

محسن بولا "کیا پتا ایڈی نے اسے بھی معاوضے میں سے کچھ دے دیا ہو۔ خیر تو گرلز ہوسٹل کا نمبر ملا۔"

میں نے نمبر ملایا اور حسب توقع وہی نیم مردانہ نیم زنانہ اکھڑ لہجے والی آواز سنی "کیا نمبر بتایا تم نے؟"

میں نے پھر کمرے کا نمبر بتایا "دو لڑکیاں ہیں وہاں۔ ایک بچے کے ساتھ۔ ایک کا نام رابعہ، دوسری کا گل۔"

"سوری۔ وہ اس کمرے میں نہیں ہیں۔" اس نے فون رکھ دیا۔

میں نے دوبارہ نمبر ملایا "اس کمرے میں نہیں ہیں کا کیا مطلب ہے آخر؟ کیا وہ کسی دوسرے کمرے میں شفٹ کر گئی ہیں؟"

"انہوں نے وہ کمرا چھوڑ دیا ہے۔"

"کمرا چھوڑ دیا ہے؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہی جو تم نے سنا۔ اس کمرے میں ایک سیاہ فام جوڑا ہے اب۔"

میں نے کہا "دیکھو۔ وہ اپنا کمرا چھوڑ کے نہیں جائیں گی جب تک ہم ان کے ساتھ نہ ہوں۔"

"شاید تمہیں خوش فہمی تھی۔ جو اب دور ہو جانی چاہیے۔ کل وہ کسی اور کے ساتھ چلی گئی ہیں۔"

میں نے اپنے غصے کو ضبط کیا "کیا جاتے وقت انہوں نے کچھ بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہیں۔ کوئی پتا چھوڑا تھا؟"

"نہیں۔ کم سے کم مجھے نہیں معلوم۔ پتا چھوڑا ہوتا تو رجسٹر میں بھی لکھا ہوتا۔ یہاں صرف یہ لکھا ہے کہ انہوں نے کتنی رقم ادا کی اور کمرا کس وقت خالی کیا۔" اس نے پھر فون بند کر دیا۔

میں نے محسن کی طرف پریشانی سے دیکھا "یہ کیا چکر ہے یار۔ وہ کہاں جا سکتی ہیں پیرس میں؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا "کہیں نہیں۔"

اسی وقت میری نظر دروازے کی طرف گئی۔ دو دروازوں سے چار پولیس مین بڑے جارحانہ انداز میں داخل ہو کے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے ہر سمت سے یلغار کی تھی اور ان کی طرف سے فرار کے راستے بھی نہیں چھوڑے تھے۔ کوئی ایسی کوشش کرتا تو وہ اسے ہر طرف سے دبوچ لیتے۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور بھی تھے۔

میں نے بدحواسی کے مظاہرے سے اجتناب کرتے ہوئے اللہ کو یاد کیا کہ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے اور بے نیاز ہے۔ بندہ اسے صرف مصیبت میں یاد کرتا ہے اور وہ پھر بھی اس کی سن لیتا ہے۔

میں نے محسن سے کہا "ایسی شکل مت بنا جو پولیس کو خود متوجہ کرے۔"

محسن نے کہا "میری صورت تو ایسی ہے کہ یوم حساب فرشتے بھی کہیں گے کہ جانے دو اسے جنت میں۔ گنہگار ہوتا تو صورت سے معصومیت ایسے نہ ٹپکتی جیسے چھتے سے شہد ٹپکتا ہے۔"

"سب غلط فہمی ہے۔ یہ ولایتی پولیس والے دور کر دیں گے۔"

www.paksociety.com

پاکستانی بھائی۔ ابھی وقت ہے' آیت الکرسی یا دعائے قنوت کچھ پڑھو۔"

پولیس والے ایک ایک میز پر جا کے کچھ پوچھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے ہمارے ساتھ والی میز پر آ کے کہا "ایکسکیوز می سر' کیا آپ نے اسے کہیں دیکھا ہے آج؟" اس نے ایک تصویر میز پر ڈال دی۔ میز پر بیٹھے ہوئے جوڑے میں ایک خمیدہ ناک اور گنجی آنکھوں والا مجنوں ٹائپ لڑکا تھا۔ اس کی لیلیٰ سیاہ فام تھی اور سوائے عمر کے ساتھ آنے والی جوانی کے' جس کا طوفانی ریلا لباس کے ہر بند کو ہر سمت سے توڑ کر بہنے پر آمادہ تھا۔ اس میں حسن تلاش کرنا ایسا ہی تھا جیسے شادی کے پچیس سال بعد اپنی بیوی میں اس محبوبہ کو دیکھنا جس کے عشق نے بقول شاعر اس دل کو بری طرح بیمار رکھا تھا۔ مگر کہنے والے غلط نہیں کہتے کہ حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔

خمیدہ ناک اور گنجی آنکھوں والا اور اس کی سیاہ فام دلربا۔ جو اس لمحے اس کے لیے سارے زمانے سے حسین تھی' آئس کریم منگوانے کے بعد اسے کھانا بھولے ہوئے تھے۔ پگھل کے شربت ہو جانے والی آئس کریم شاید ان کی آتش شوق کی حدت سے گرم ہو کے ابلنے والی ہوگی کہ پولیس نے ان کے رومانی جذبات کی دنیا میں یوں رخنہ اندازی کی جیسے انگریزی محاورے کے مطابق چینی کے برتنوں کی دکان میں بیل۔

دوسری بار پوچھنے پر مجنوں کو ہوش آیا "کیا بات ہے۔ تم اتنا چلا کے کیوں بات کر رہے ہو؟ اور ایسے میز پر مکے بجانے کی کیا ضرورت تھی؟"

پولیس مین نے تحمل سے کام لیا "اب بھی تم متوجہ نہ ہوتے تو میں یہ آئس کریم کا کپ تمہارے سر پر انڈیل دیتا' اس لڑکی کو دیکھو۔"

"کیوں دیکھوں میں اس لڑکی کو۔ جب کہ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی میرے سامنے موجود ہے۔"

سیاہ فام حسینہ نے خوشی سے جھوم کے کہا "او ڈارلنگ۔ جو بھی مجھ سے سچا پیار کرتا ہے' ایسا ہی کہتا ہے۔"

"کیا تم نے یہاں اس لڑکی کو دیکھا ہے' آس پاس کہیں؟" پولیس مین بولا۔

لڑکے نے بدمزگی سے کہا "نہیں' اور دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔"

پولیس والا سیاہ فام حسینہ کی طرف متوجہ ہو گیا "اور آپ نے مس؟"

"وہ مس پچی مکون ہے یہ۔ تمہاری محبوبہ۔۔۔ بھاگ گئی ہے کسی کے ساتھ؟"

"شٹ اَپ۔ جواب دو ہاں یا نہیں؟"

"نہیں" لڑکی ڈر کے بولی۔

پولیس مین دوسرے ٹیبل پر چلا گیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے جوڑے میں لڑکا اور لڑکی دونوں نابالغ تھے۔ دس بارہ سال کا لڑکا بھی اس معاشرے میں اگر اپنی گرل فرینڈ کو ڈیٹ پر لے جاتا ہے تو یہ برا نہیں سمجھا جاتا۔ وہ دونوں کم عمر بھی نہیں تھے۔ لڑکا سولہ سترہ کا ہوگا۔ لڑکی شاید دو سال کم کی ہوگی سو وہ پہلے ہی ہنس ہنس کے بے حال ہو رہے تھے۔ نوجوان عاشق اپنی نو عمر محبوبہ کو کھلکھلاتے دیکھنے کے لیے بزرگوں کی احمقانہ سوچ اور بدحواسیوں کے قصے سنا رہا تھا اور وہ اس لیے ہنس رہی تھی کہ ہر بے ہودہ لطیفے پر اس کا پرستار کہتا تھا "جب تم ہنستی ہو تو لگتا ہے پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔" معلوم نہیں یہ جملہ اس نے کہاں سے یاد کیا تھا۔ کسی فلم سے یا رومانی افسانے سے۔

"او یس' میں نے دیکھا ہے اسے۔۔۔" وہ تصویر دیکھ کے بولا۔ پولیس آفیسر پرامید ہو گیا "دیکھا ہے۔۔۔ کہاں۔۔۔ کب؟"

"اپنے خوابوں میں۔ اس جل پری کے ملنے سے پہلے۔"

جل پری نے پھر پھولوں کی بارش کی مگر پولیس آفیسر کو نہ یہ مذاق پسند آیا اور نہ ہنسی' اس نے غرا کے کہا "تم نے پی ہے؟ کیا عمر ہے تمہاری؟"

"میں۔۔۔ بالغ ہوں" نوجوان ساری شوخی بھول گیا۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟" اس نے چٹکی بجائی "مزا وی پیپرز۔"

"سوری سر۔ ایسے تو کوئی کاغذات نہیں ہیں۔۔۔ اس وقت۔"

نوعمر محبوبہ نے فوراً حواس باختہ عاشق کی مدد کی "پلیز انسپکٹر' اس نے پی کہاں ہے جو تم بالغ ہونے کا ثبوت مانگ رہے ہو؟"

اس نے لڑکی کو دیکھا "ٹھیک ہے مس! پھر یہ ابھی بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ جاگتے ہوئے خواب کی بات کرتا ہے۔ اگر یہ پسند کرتا ہے تو خواب میں ایسی خطرناک مجرم عورتوں کو دیکھے تو مطلب ہے' تم کو محتاط رہنا چاہیے۔"

پولیس مین آگے بڑھ گیا۔ اس کا مقصد انہیں پریشان یا ہراساں کرنا نہیں تھا۔ وہ خواب میں قلوپطرہ کو دیکھے یا مونا لیزا کو' اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر اسے سنجیدگی سے کیے جانے والے سوال کا غیر سنجیدہ جواب قانون سے مذاق کے مترادف لگا تھا اور اس نے فوراً واضح کر دیا تھا کہ اس کا نتیجہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے پاس قانونی اختیار تھا کہ وہ کسی نابالغ کو شراب پیتے دیکھے تو اسے گرفتار کر لے۔ یہ اس نظام کی خوبی تھی کہ پولیس اختیار کا جائز استعمال کرتی ہے۔ اگر اس لڑکے نے واقعی پی ہوتی تو اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ پہلے اس کو شراب دینے والا لپیٹ میں آتے' پھر اس کے ماں باپ کی شامت آتی۔ گھر ہو' دعوت میں یا باہر' جو نابالغ ہے اسے شراب نہیں ملتی اور یہ صرف قانون کی ذمے داری نہیں' معاشرہ بھی یہ ذمے داری قبول کرتا ہے۔ چنانچہ بار میں بھی کسی سے عمر کا ثبوت طلب کیا جا سکتا ہے۔ ثبوت نہ ہو تو کم عمر نظر آنے والے کو شراب نہیں ملتی۔ اس کے برعکس اپنا ملک بھی ہے جہاں بحیثیت مسلمان ہم پر پہلے ہی حرام ہے مگر حکومت کو امتناع شراب کا قانون نافذ کرنا پڑا۔

اس کے باوجود یہ حرام شے اتنی دستیاب ہے جس کے پاس قوت خرید ہے۔ جائز ناجائز طور پر تیار کردہ زہریلی شراب سے لے کر امپورٹڈ یعنی اسمگل کی ہوئی اعلیٰ ولایتی شراب تک اپنے وطن میں سب کچھ بکتا ہے۔

میں اور محسن اب خاصے مطمئن تھے کہ معاملہ ہماری گرفتاری کا نہیں' پولیس کو کسی مجرم کی تلاش ہے۔ پھر بھی دل میں ایک چور تھا جو خوف کا لبادہ اوڑھے بیٹھا تھا کہ کہیں پولیس کے ساتھ بھی وہ معاملہ نہ ہو کہ اونٹ لینے کو جائیں بکری مل جائے۔ مجرم کا سراغ نہ ملے گروہ والے کراچی دہشت گرد ہاتھ آ جائیں۔ خیر سے دو دن میں ہم نے اپنا نام بہت روشن کیا تھا کچھ تو ہم خود بھی اپنے مصائب کے ذمے دار تھے۔ ناجائز طور پر چور دروازے سے برطانیہ کی حدود میں داخل ہونا بھی کم سنگین جرم نہ تھا۔ حکومت جو ہماری صورت دیکھنے کی روادار نہ تھی بہت پہلے کہہ چکی تھی کہ جاؤ اپنی شکل گم کرو اور ہم نے بار بار جو پھر ادھر کا رخ کیا۔ پھر تھوڑا سا ہنگامہ چارج سے ملاقات کے چکر میں ہو گیا تھا۔ اس میں ہمارے ارادے کو دخل نہیں تھا مگر لیڈی ایرینھ کو فون پر دھمکی دینے کی حماقت ہم نے ضرور فرمائی تھی۔ رہی سہی کسر چودھری دلاور نے پوری کردی تھی کہ سر جھنڈ کروان کی گاڑی میں بم کا دھماکا کرا کے ہمارے نام سے منسوب کروا دیا تھا چنانچہ اب ہم مستند اور مسلمہ دہشت گرد تھے۔ پولیس کہیں بھی اور کسی بھی جگہ ہمیں شناخت کر سکتی تھی۔

پولیس آفیسر نے ہماری میز پر آ کے کہا "ہیلو۔ تم نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ غور سے دیکھ کے بتاؤ۔"

میں نے نمبر کی مونچھوں پر رواں روشن سیخے کو دیکھا "ایسا تو نہیں' لیکن ایکسکیوزمی' اس سے ہزار درجے خوب صورت فارنگ دلفورنٹ ہے۔"

اس نے تصویر کو میرے سامنے لہرایا "میں اس عورت کی بات کر رہا تھا۔"

میں نے تصویر لے کر تیس سال سے زائد عمر کی اس عورت کا چہرہ دیکھا جو واقعی حسین تھی کہ میں مبہوت رہ گیا۔ اس کی مسکراہٹ میں ساحرانہ دلکشی تھی اور اس کی حیرت خیز معصوم آنکھوں میں ایک سوال سا محسوس ہوتا تھا کہ "دیکھو کیا میں خطرناک مجرم ہو سکتی ہوں؟" مگر پولیس ایسا سمجھتی تھی تو ایسا ہی تھا۔

ایک آہ بھر کے میں نے تصویر واپس کردی "کاش میری آنکھوں نے اسے دیکھا ہوتا۔ پھر میں اسے کیسے بھلا سکتا تھا' میں تو فوراً اس پر فریفتہ ہو جاتا۔"

اب محسن نے تصویر ملاحظہ کی اور ماتھے پر شکن ڈال کے بولا "یہ صوفی نہیں ہے؟۔۔۔ وہی۔۔۔؟"

میں نے کہا "کون سی صوفی؟" اور پولیس آفیسر نے سر ہلا کے میرے سوال کی تائید کی۔ یعنی وضاحت فرمائیے۔

"وہ اپنا مارلن منرو۔۔۔ نہیں صوفیہ لارین۔۔۔ جو ہر فلاور میں گیلے اور نوکر کتنا مگر سادہ تھی اور یہ صوفیہ۔"

پولیس آفیسر نے تصویر اس سے چھین لی اور ہمیں گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ "کیا سارے لندن کے احمق' پاگل اور مسخرے یہاں جمع ہو گئے ہیں" وہ بولا۔

میں نے اور محسن نے فرنچ میں احتجاج کیا "کیا لندن ہم اس لیے آئے ہیں کہ یہاں پولیس ہمیں احمق' پاگل اور مسخرا کہے۔ پیرس میں ایسا ہوتا۔۔۔"

پولیس آفیسر رک گیا اور ہمیں دیکھنے لگا۔ ایک ویٹر پولیس نے اسے انگلش میں سمجھایا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں تو اس نے برا سا منہ بنایا "ابھی یہ مجھ سے انگلش بول رہے تھے۔ انہیں کسی مترجم کی ضرورت نہیں تھی۔ خیر' انہیں بتا دو کہ اتنے سیریس نہ ہوں۔ انہوں نے مذاق کیا تھا مجھ سے۔ کیا میں ان کو یہ کہہ بھی نہ کہوں؟"

میں نے محسن سے ہاتھ ملایا "مبارک ہو۔ تو گرفتار ہونے سے بچ گیا۔"

محسن نے آہ بھر کے نفی میں سر ہلایا "نہیں دوست۔ میں گرفتار ہو گیا۔ اس کے دامِ حسن میں۔ قسم اللہ کی کیا جادو تھا اس کی آنکھوں میں۔ اس کی مسکراہٹ میں اور کے لب و رخسار میں۔"

"واللہ کیا ملک ہے" میں نے کہا "ہر ولایتی چیز کی اسی لیے تو مانگ ہے دنیا میں۔ مجرم بھی کیا طرح دار ہے۔"

"جی چاہتا ہے اس کے ساتھ میں بھی پکڑا جاؤں" محسن نے میری بات کاٹ کے کہا "اور جیل میں ساری عمر اس کے ساتھ شاد و آباد رہوں۔"

میں نے کہا "معلوم نہیں کیا جرم کیا تھا اس کافر نے۔ ڈاکا ڈالا تھا کسی کی تجوری پر! کسی کا دل و ہوش پر! قتل کیا تھا کوئی۔"

محسن بولا "قتل تو اس نے بہت کیے ہوں گے بقول شاعر ناوک انداز جدھر دیدہ جاناں ہوں گے نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے۔"

میں نے کہا "بکواس بند کر اپنی ورنہ میں تجھے قتل کر کے جیل چلا جاؤں گا اس کے ساتھ۔ اور یہ بھی مت بھول کہ صرف ایک پولیس مین کی نظر چوک گئی۔ اس کے ساتھ تین اور بھی ہیں۔ جن کی چھ آنکھیں باقی ہیں۔"

"آٹھ آنکھیں" محسن نے میری تصحیح کی "ایک عینک والا ہے۔ مگر میں آپ سے متفق ہوں' ہمیں یہاں سے دوڑ جانا چاہیے۔"

"دوڑ کے ہم کہاں جا سکتے ہیں" میں نے کہا "ملاطی کے قمار خانے کا رخ کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ آج رات پولیس وہاں پہنچ سکتی ہے۔"

"ہم لیڈی کے گھر جا سکتے ہیں" محسن نے کہا "بل ادا کرنے کے بعد۔"

ایک نو عمر دبلی پتلی اسکول گرل ٹائپ لڑکی نے بل پیش کیا۔ مجھے اس کی مظلوم صورت دیکھ کے ہمدردی سی محسوس ہوئی "تم یہاں مجبوراً کام کرتی ہو یا شوقیہ؟" میں نے وہ سوال کیا جو ہر بندہ۔۔۔

www.paksociety.com

تماش بین طوائف سے بھی کرتا ہے۔

"اس سے کوئی فرق تو نہیں پڑتا" وہ بولی "دنیا میں کوئی کام واقعی ایسا ہے جو آدمی شوق سے کرتا ہو۔ میرا مطلب کام سے ہے۔ شغل یا شوق سے نہیں اور پھر ایسا کام۔ ہر شخص مجھے مدعو کرتا ہے کہ جب فراغت ہو تو میرے ساتھ چلو میں کس کس کو بتاؤں کہ رات کو واپس جا کے مجھے کتنے کام ہوتے ہیں۔ میں باپ کے لیے شراب لے کر جاتی ہوں 'بچی کھچی'۔۔۔ اور کچھ چوری کی۔ ماں کے لیے دوائیں۔ وہ بھی بہت بیچتی تھی غالباً اسے جگر کا سرطان ہو چکا ہے۔ پہلے وہ مر جائے گی پھر اسی طرح باپ دنیا سے رخصت ہو گا۔ اس کے بعد مجھ پر کوئی ذمے داری نہیں ہو گی۔"

میں نے مزید ہمدردی کے ساتھ کہا "آئی ایم سوری۔ تمہاری یہ عمر اور اتنی ذمے داریاں۔ کیا بھائی نہیں ہیں تمہارے؟"

وہ تلخی سے مسکرائی "ہیں' جیل میں۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ مرنے دو ماں باپ کو' تم کیوں مرتی ہو ان کے لیے۔ کاش میں ان کی طرح سوچنے کے قابل ہوتی۔ صبح مجھے اسکول جانا ہوتا ہے۔ شام سے آدھی رات تک یہاں سے جو ملتا ہے اسی سے سارے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔"

میں نے اسے دس پاؤنڈ کا نوٹ دیا تھا اور آئس کریم کا بل ایک پاؤنڈ بھی نہیں تھا مگر اس لڑکی نے محسن کو بھی اتنا جذباتی کر دیا تھا کہ اس نے میری طرف سے کہہ دیا "باقی رقم رکھو۔ تمہارے کام آئے گی ڈیئر گرل۔"

اس کی آنکھوں میں حیرانی نمودار ہوئی "تو یا وعدہ..."

میں نے کہا "ورنہ ہم یہ بھی نہیں کہیں گے کہ یہاں سے فارغ ہو کے ہمارے ساتھ چلو۔ ہم جا رہے ہیں اور پھر کبھی یہاں نہیں آئیں گے گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ سر" اس نے احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کے کہا۔

صدمہ مجھے اس وقت ہوا جب ساتھ والی میز پر سے کسی نے پنجابی میں کہا "اوئے بھولے بادشاہو۔ لندن وچ رہ کے وی اکل نئیں آئی۔"

میں نے ایک خوش شکل' خوش لباس سردار جی کو دیکھا جن کے ساتھ غالباً ان کی دھرم پتنی تھی۔ میں نے کہا "کوئی غلطی کی ہم نے؟"

وہ ہنسے "دس پاؤنڈ دے دیے مفت میں اور پوچھتے ہو غلطی کی؟ یہ کہانی تو ہر روز سناتی ہے یہ لڑکی۔ کوئی نہ کوئی تم جیسا بے وقوف ایسا ہی سوال کر بیٹھتا ہے۔ ہم لوگ جذبات سے مار کھاتے ہیں۔ وہ بڑی اچھی ایکٹنگ کرتی ہے اور ہم اسے سچ سمجھ لیتے ہیں۔ اور یہاں تو ہر لڑکی کام کرتی ہے۔ اسکول کی ہو یا کالج کی۔ اپنا خرچ نکالتی ہے اور ان کے لیے جائز ناجائز کام کا کوئی مسئلہ نہیں۔"

میں نے نفرت سے کہا "یعنی یہ سب جھوٹ تھا۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

سردار جی نے اپنی گھر والی کو دیکھا "بول نا بے وقوفوں کی بی بی۔"

سردارنی نے نظر جھکا کے کہا "میں نے اس کو سو پاؤنڈ دے دیے تھے۔"

"پچھلے حرام کی کمائی ہو میری!" سردار جی بولے "اگلے دن میں اکیلا ادھر آیا۔ وہی سوال کیا جو تم نے کیا تھا۔ اور اس نے یہی اسٹوری سنائی تو میں نے کہا کہ کل تو سو پاؤنڈ ٹھگ لیے تھے میری گھر والی سے۔ آج سو تھپڑ ماروں گا۔ اگر کوئی اس کی سب سچا ہے تو تیرا۔"

میں نے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ مجھ سے بہت دور ایک ٹیبل سرو کر رہی تھی۔ شاید کسی اور ہمدرد سے اپنی مظلومیت کا ٹیکس وصول کر رہی تھی۔ اس سے نو پاؤنڈز واپس لینا یا اسے جھوٹا شرمندہ کرنے کی کوشش میں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

سردار جی نے کہا "چلو دفع کرو جی۔ آؤ بیٹھو ادھر ہمارے ساتھ۔ آئس کریم کھاؤ تے غم بھلاؤ۔"

میں نے کہا "شکریہ۔ ہم کھا چکے ہیں۔ آئس کریم اور دھوکا۔"

"اک ہور سہی" انہوں نے ہمارا ہاتھ پکڑ کے بٹھا لیا "تم مجھے اپنے لہور کے لگدے ہو۔"

میں بیٹھ گیا "آپ صورت دیکھ کے بتا دیتے ہو؟"

محسن نے کہا "اور مجھے لگتا ہے کہ آپ لہور سے بچھڑے ہوئے ہو۔"

سردار جی نے ایک آہ بھری "ہاں بھولے بادشاہو۔ اپنا لاہور پرایا ہو گیا۔ ایک بار میچ دیکھنے کے بہانے گیا تھا۔ اپنی چندر کور کو بھی ساتھ ہی لے گیا تھا۔ کنٹرب کے آ جاتی تھی۔"

سردارنی نے شرما کے کہا "اب ان کو بھی بتاؤ گے سب باتیں؟"

ہماری ساری گفتگو پنجابی میں چل رہی تھی۔ سردار جی نے قہقہہ مارا "او نیک بختے۔ ان کو کیا' ساری دنیا کو سناؤں گا۔"

میں نے معذرت کی "سردار جی! ہم ضرور سنتے آپ کی اسٹوری مگر ہمیں جانا ہے واپس لہور۔"

"آج ہی؟ آج تو بڑا مشکل ہے۔ لو پہلے تماشا دیکھو۔ وہ آ رہی ہے ادھر۔"

لڑکی ہماری میز پر آ کے ٹھٹکی "آپ کو کچھ اور چاہیے؟"

سردار جی نے کہا "ہاں۔ چار آئس کریم۔ اور نو پاؤنڈ واپس۔"

اس نے بات سمجھے میں کہا "نو پاؤنڈ... کیسے نو پاؤنڈ؟"

میں نے کہا "جو تم نے مجھے اپنی جھوٹی کہانی سنا کے ٹھگے تھے ابھی۔"

وہ لڑکی میرے پیچھے پڑ گئی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمہاری شکل نہیں دیکھی پہلے۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ پر گھٹیا الزام لگانے کی؟"

ایک تنومند حبشی جوان جو اپنے اطوار سے خود کو بدمعاش ظاہر کرنا چاہتا تھا چیونگم چباتا اور تنومند بازوؤں کی نمائش کے لیے ہاتھ سینے پر باندھے سامنے آ کھڑا ہوا "کیا بات ہے بے بی!" اس نے الفاظ بھی چبا چبا کے کہا۔

"یہ شخص اگر شرابی نہیں ہے تو پاگل ہے۔ بڑی بے ہودہ بات کی ہے اس نے مجھ سے..." لڑکی نے باقاعدہ شکایت کی۔

میں اٹھ کھڑا ہوا "اگر تم اس کے عاشق بن کر آئے ہو تو بہتر ہے کہ بچ سلامت واپس لوٹ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں اسٹریچر پر لے جانا پڑے۔"

سردار جی بھی کھڑے ہو گئے "یا پھر پولیس کی گاڑی میں۔"

حبشی نے سردار جی کو دھکا دے کر دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا "مجھے دھمکی دیتے ہو پولیس کی..." اس کا باقی جملہ فحش تھا۔

میں نے جواب قول سے اس کو ایک مکا رسید کیا۔ مکا اس کے جبڑے پر پڑا اور وہ گھوم کے ایک میز پر گرا۔ میز الٹ گئی۔ لڑکی نے چیخ ماری۔ دوسری میز پر بیٹھے ہوئے لوگ نہ بدحواس ہوئے نہ پریشان۔ کاؤنٹر کے پیچھے سے سوٹ والا منیجر ٹائپ شخص ہماری طرف لپکا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

حبشی کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے مگر وہ ایک بار پھر اٹھ کے میری طرف بڑھا۔ اپنے لبوں پر آ جانے والا لہو آستین سے صاف کر کے اس نے مجھے گالی دی۔

میں نے کہا "آگے آؤ۔ زبان سے نہیں ہاتھ سے بات کرو۔"

"چھوڑو یار۔ یہ بدمعاش لوگ ہیں" لڑکی نے چلا کے کہا۔

مگر یار مشتعل ہو گیا تھا۔ اپنی بدمعاشی کا بھرم رکھنے کے لیے اس نے لڑکی کو ایک طرف کر دیا "میں مار ڈالوں گا انہیں..."

میں نے دوسرا مکا اس کے پیٹ میں مارا۔ وہ اناڑی تھا۔ اس نے جو ہاتھ گھمایا تھا وہ میں نے غوطہ مار کے بے مصرف کر دیا تھا۔ وہ الٹ کے گرا ہوا۔

لڑکی والے کے قریب ہو گئی "یہ لو۔ یہ لو اپنے نو پاؤنڈ۔ اور دفع ہو جاؤ۔"

سردار جی نے کہا "چار آئس کریم!" اور سردارنی کی طرف دیکھ کے ہنسے۔

منیجر نے صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے مداخلت کی "مسٹر اسپے تم فوراً معزز گاہکوں سے معافی مانگو اور باہر جا کے اپنی شکل ٹھیک کرو۔ تمہارا کام بدمعاشی کرنے والوں سے نمٹنا ہے۔ شریف لڑکوں کو پریشان کرو گے تو میں تم دونوں کی چھٹی کر دوں گا۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ پولیس نہیں آئی۔ منیجر نے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ وہ بھی غالباً ہنگامے کی صورت میں ملامتی کو تسلی دلانے کا ماہر تھا۔ ہنگامہ ختم ہوتے ہی لوگ بھی اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ منیجر کی بات سب نے سنی تھی اور سمجھ لیا تھا کہ اختلاف معمولی تھا۔

سردار جی نے میری پیٹھ پر ہاتھ مارا "اوئے بلے بلے جوانا۔ دل خوش کیا تو نے میرا یار۔ ثابت کر دیا کہ تو ہے سکندر اعظم۔"

میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا "سکندر اعظم تو بہت بڑا فاتح تھا۔ ایسی لڑائیاں نہیں لڑتا تھا۔"

سردارنی نے مجھے بڑی میٹھی مسکراہٹ سے نوازا "ہمیں غیر مت سمجھو جی۔ میں نے ہی آپ کو پہچانا تھا پہلے۔"

سردار جی نے سر ہلایا "چندر کور کی نظر ایسے ہی تاڑتی ہے بندے کو۔ اب تو خیر سے بیوی ہے میری اور کوئی خطرے والی بات نہیں۔ شادی سے پہلے ملی ہوتی تم سے تو پھر میرے ہاتھ نہ آتی۔ اس نے ہو جانا تھا مسلمان بھی۔"

چندر کور نے جس کا نام غالباً راجندر کور ہو گا خفگی سے کہا "کیا بکتے جا رہے ہو۔"

لڑکی آئس کریم لے کر آئی تو زیادہ دکھی لگ رہی تھی مگر یہ دکھ حقیقی تھا۔ "تم نے یار کو بڑی بے رحمی سے مارا۔"

میں نے مسکرا کے کہا "نہیں۔ میں نے خاصی رحم دلی سے کام لیا ورنہ کل اس کی تدفین ہوتی۔ تم نے بدلہ لینے کے لیے آئس کریم میں زہر تو نہیں ڈالا؟"

سردار جی نے قہقہہ مارا "تمہارے چالاک منیجر نے اسے بچا لیا۔"

لڑکی نے جاتے جاتے مجھ پر ایک قہر بھری نگاہ ڈالی "دس از آن دی ہاؤس" اس کا مطلب تھا کہ آئس کریم خیر سگالی کے جذبات کا مظاہرہ کرنے کے لیے ہماری طرف سے بلا معاوضہ۔

سردار جی نے کہا "ہم کل بھی آئیں گے۔ مفت کی کھانے۔"

راجندر کور نے مجھے مخاطب کیا "آپ ادھر کب آئے جی سکندر صاحب۔"

میں نے انکار کرنے کا کوئی فائدہ نہ دیکھا۔ "دو دن پہلے لیکن پلیز مجھے یہ بتائیں کہ آپ مجھے کیسے جانتی ہیں۔"

"پرانی بات ہے جی" سردار جی نے مجھے آنکھ ماری "تم ڈھاکا میں تھے اور مجھے آرڈر تھا تم کو پکڑنے کا۔ بلکہ گولی مارنے کا۔ میرا افسر تھا کرنل رام چند۔ اس نے تو گھیر لیا تھا تم کو مگر تم بچ نکلے تھے۔ واہ واہ۔ میں تو حیران رہ گیا تھا۔ سچی بات ہے کہ معاملہ نوکری کا تھا ورنہ میں خود تمہیں نکال دیتا۔"

محسن نے کہا "یہاں آپ کیا کریں گے ہمارے ساتھ؟"

"یہاں کیا کرنا ہے ہم نے۔ تم کو گھر لے جائیں گے۔ کچھ خاطر داری کریں گے اور چندر کور باتیں کرے گی تم سے۔ ہماری خیر ہے۔ ہم نے نوکری چھوڑ دی اور ادھر آ گئے۔ تم سے نہ پہلے اپنی دشمنی تھی نہ اب ہے مگر یہ چندر کور۔ اس نے تمہارے ساتھ کچھ پرانا حساب برابر کرنا ہے۔"

میں نے مغموم آواز میں کہا "پرانا حساب۔ معاف نہیں ہو سکتا؟"

"بالکل نہیں ہو سکتا" سردار جی نے کہا "میں خود جانا چاہتا

www.paksociety.com

ہول کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔"

میں نے کہا "یہ ایک نجی نوعیت کا دورہ تھا۔ ہم نے پرانے رشتے سب چھوڑ رکھے ہیں سردار جی۔"

وہ ہنس ہنس کے بے حال ہو گیا "ان چند گوروں نے ٹھیک کہتے ہیں کہ پرانے کرتوت چھوڑ دے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے بھلا کہ جنس نے جیسے تم نے رودھو کے چھوڑ دیا ہے۔ آج کل میں انڈے سے رہا ہوں۔"

میں نے محسن کی طرف اور محسن نے میری طرف دیکھا۔ ابھی تک واضح نہیں ہوا تھا کہ ایک پرانا انڈین آرمی آفیسر ہمارے ساتھ بلی چوہے والا کھیل کیوں کھیل رہا ہے۔ وہ واقعی دوست ہے یا دوستی کے بہانے دشمنی کا جال پھیلانے میں مصروف ہے۔ اس مظلوم صورت لڑکی کی دکھ بھری کہانی کا جھوٹ کھل جانے کے بعد سردار جی کی بات بھی اعتبار کے قابل نہیں لگتی تھی۔ کیا پتا یہ بھی اداکار ہو۔

میں نے اس سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا "ٹھیک ہو سردار جی۔ یہ اتفاق ہے کہ ہم آج لندن میں نظر آ رہے ہیں۔"

"اتفاق نہیں بدقسمتی" محسن نے گویا تصحیح کی۔

"ہم یہاں غیر قانونی طور پر آئے تھے" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے" سکھ بولا۔

"لیکن ہم نے یہاں کوئی گڑبڑ نہیں کی بابا جی۔"

"یہ جھوٹ ہے" وہ بولا "یہ میں نہیں کہتا۔ پولیس کہتی ہے۔"

"پولیس کہتی ہے؟ آپ کا رابطہ پولیس سے ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "براہ راست تو نہیں مگر ہے۔"

"پھر میں یہ واضح کر دوں کہ میرا گرفتار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ تو خود ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ ہم ہر طرف سے محصور ہو جانے کے باوجود کیسے نکل گئے تھے؟"

سردار نے تعریفی انداز میں سر ہلایا "ایسے نکل گئے تھے جیسے... مجھو کر جاتی... میں سے چائے نکل جاتی ہے۔"

"تو یہاں بھی یہ تماشا پھر دیکھیں گے۔ اگر کسی نے ہمارا راستہ روکنے کی بے وقوفی کی" محسن بولا۔

"اوئے بے وقوفی تو تم کر رہے ہو جو ادھر بیٹھے آئس کریم بھی کھا رہے ہو اور ساتھ ساتھ بھی شکر کرو ابھی پولیس نے بھی تو انہوں نے تم کو پہچانا نہیں ہے۔ لیکن کل صبح تمہاری خیر نہیں۔ بچے بچے کو پتا چل جائے گا کہ تم کتنے بہادر ہو۔ پھر کیا کرو گے جب ہر اخبار میں تمہاری تصویر ہوگی اور ہر بندے کے ہاتھ میں اخبار ہوگا۔"

میں نے کہا "آپ... آپ کو کیسے معلوم؟"

"یار بس معلوم ہو گیا۔ اپنے بھی سورس (SOURCE) ہیں لوجی۔ کدھر قیام ہے تمہارا؟"

میں نے کہا "ایک پاکستانی ہیں۔ ان کا اخبار ہے صدائے طوطی۔"

وہ پھر ہنس ہنس کے دہرا ہو گیا "وہ پاگل را چنڑ، بہت اچھی طرح جانتا ہوں میں اسے۔ حاجی علم دین طوطی۔ ایڈیٹر بنا پھرتا ہے۔"

"وہ ایڈیٹر ہیں" میں نے کہا "اور اس نے ہماری بہت مدد کی ہے۔ اپنے محسن کے خلاف میں کچھ سننے کو تیار نہیں۔"

"بڑا پکا پاکستانی ہے۔ پاکستان سے تو کوئی سانپ بچھو آ جائے تو وہ کہے گا کہ خوش آمدید میرے پاکستانی بھائی۔ کیسے آنے ہوا؟ بسم اللہ۔"

میں نے حیرانی سے کہا "آپ تو بہت زیادہ جانتے ہیں ان کو۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "اچھا بھی ایک بار یہ ادھر ہوا، تم اپنے طوطی صاحب کا نالصا ایڈیشن سمجھ لو۔ وہ مسلمان ہو گئے۔ باقی عقل کے معاملے میں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ یہ بات کچھ غلط ہو گئی۔ عقل میں نہیں بے وقوفی میں۔"

"آپ کا یار بھی اخبار کا ایڈیٹر ہے؟"

"آہو جی۔ اس کا نام ہے ہریام سنگھ کھوتا۔ اور جیسے تمہارے طوطی صاحب کے اخبار کا نام ہے صدائے طوطی۔ ایسے ہی جس اخبار کا ایڈیٹر ہے اس کا نام ہے 'ڈھینچوں'۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی "ڈھینچوں؟"

"کھوتے کی آواز اور کیا ہو گی۔ اور معلوم ہے وہ خود کو کیوں کھوتا کہتا ہے؟ اس کا کہنا ہے کہ یہ انگریز۔" اس نے بدلائی اور خاصی فحش گالی استعمال کی اور پھر اپنی بیوی کی طرف دیکھ کے "معاف کرنا یہ عادت کی بات ہے۔ جھ کو ویرا تمہیں پتا ہے اور ہے بھی زیادہ سواد آتا ہے ان کی نسل خراب کر کے۔"

میں نے کہا "کالی انگریزنیوں کو دی جائے تو ہم بھی خوش ہوں گے۔"

"کھوتا کہتا ہے کہ یہ ہمیں انسان نہیں کھوتا سمجھتے ہیں۔ عرصہ حکومت کی ہم کو کھوتے کی طرح ہانکتے رہے۔ کھوتے کی طرح ہم نے ان کی غلامی کی اور ڈھینچوں ڈھینچوں کرتے رہے۔ اب ادھر ولایت میں بیٹھ کے ڈھینچوں ڈھینچوں کریں گے۔ ان کے کان خراب کر دیں گے اور دماغ خراب کر دیں گے... ہے کہ سچ ہے۔ اس نے اخبار کا نام بھی ڈھینچوں رکھ لیا۔ کیسی کہی تم نے؟"

میں نے کہا "ایسا خوش گوار اتفاق ابھی تک نہیں ہوا۔"

"ایک کونے میں اخبار کا نام ہوتا ہے۔ دوسرے کونے میں کھوتے کی تصویر اور نام کے اوپر لکھا ہوتا ہے۔ رقم اشاعت ہے بجے رات... وہ منہ پھاڑ کے ہنسا "کھلے دل کا بندہ ہے۔ کہتا ہے ہمارے بارہ بجتے ہیں تو ہم ڈھینچوں ڈھینچوں کرتے ہیں۔ ادھر امرتسر میں بھی اور لندن میں بیٹھ کے بھی۔ کھوتا تو کھوتا ہی ہے ہر جگہ۔ خیر بتانے کا مقصد یہ تھا کہ اس کو خبر ملی تھی اور اس نے مجھے بتا دیا کہ لندن کی پولیس نے بڑے بڑے اخباروں میں تمہارا فوٹو کے ساتھ تمہارے سارے کرتوت بیان کیے ہیں اور ان خاکی میں اشتہار بھی لگائیں گے کل جہاں انڈین اور پاکستانی رہتے ہیں ان کے چھنٹے چھوٹے بڑے اخبار ہیں سب میں اشتہار دیا ہے۔"

"یہ تو ہے اشتہاروں کا اس لیے سب نے قبول کر لیا۔"

"حاجی علم دین طوطی نے تمہیں کیا ہوگا" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔ طوطی نے اور کھوتے نے صاف انکار کر دیا۔ اب یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ کھوتا بھی تمہارا ہمدرد ہے۔ پکا سکھ ہے اور FAN!۔ اس نے کہا کہ یہ پاکستانی بھی شیر ہے۔ اس کا نام سکھ ہونا چاہیے تھا۔ تمہیں پتا ہے سکھ کا مطلب ہوتا ہے شیر؟"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے مگر کیا ہریام سنگھ اپنا نام بدل کے کھوتا رکھ سکتا ہے۔ مثلاً شیر خان وغیرہ۔"

"اوئی فخ کرو۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ کام اصل چیز ہے۔ تم کو پولیس کل ہمارے بارہ بجنے سے پہلے پکڑ لے گی۔ سمجھے۔"

میں نے کہا "ہم اس سے پہلے ہی روپوش ہو جائیں گے۔"

"تمہارا قیام طوطی کے نقار خانے میں ہے نا۔ پولیس کو صبح پتا چل جائے گا۔ اور وہ پہنچ جائیں گے وارنٹ کے ساتھ۔ اسی لیے میں نے کہا ہے کہ ہمارے ساتھ چلو۔ ہمارے گھر سے بڑی محفوظ جگہ ہے۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھا "ہم ایسی جگہ جانے کی سوچ رہے تھے جو خاصی محفوظ ہے۔ اس شخص کے گھر جو ہمیں لندن لایا تھا۔"

"وہ کون ہے؟ کوئی پنجابی یا انگریز؟"

"ہے تو انگریز۔ مگر اس نے معاوضہ وصول کیا تھا ہم سے لانے اور لے جانے کا۔ ہمیں واپس ہی جانا ہے۔ آج نکل جاتے تو کل جہاز پر بیٹھ کے فرار ہو جاتے۔ مگر اب ایسا لگتا ہے کہ دو دن انتظار کرنا پڑے گا۔"

سردار نے کہا "سیریں جانا ہے نا تم نے؟ یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ کل صبح تک ہو جائے گا بندوبست۔ اپنے بھی کچھ سورس ہیں۔"

اب چند کور نے بھی زبان کھولی "بھائی جی، فکر کی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

سردار جی کی بات نے مجھے اور محسن کو ایک عجیب تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا۔ بظاہر اس اطلاع میں شک کی گنجائش نہ تھی اور سردار جی کی نیت میں بھی فتور نہیں لگتا تھا مگر میں نے ایڈیٹر "ڈھینچوں" کے حلقے سے پہنچنے والی خبر کی تصدیق کر لینا بہتر سمجھا۔ مکمل معذرت کے ساتھ ان سے اجازت لی "میں ایک فون کرنا چاہتا ہوں۔" کم سے کم طوطی صاحب کو معلوم ہو جائے کہ آج رات ہمارا انتظار نہ کریں اور ہم کا ورنہ وہ رات بھر خیال کے گھوڑے دوڑاتے رہیں گے اور پریشان ہوتے رہیں گے۔ میں نے سوچا مگر سردار جی کو یہ بات نہیں بتائی۔

سردار جی نے کہا "فون تو ادھر کاؤنٹر پر ہی ہوگا۔"

محسن نے کہا "مجھے اپنا سامان منگوانا ہو تو کیا پتا نا رہے۔"

"کمبخت ضروری سامان ہے؟"

"ہاں۔ اس میں پاسپورٹ ہیں اور باقی ماندہ رقم ہے جن کے بغیر ہماری واپسی مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی۔"

"یہ تو پھر ٹھیک ہے۔ چند مانگ کے بھی مل جاتا ہے مگر پاسپورٹ بنوانے کے لیے جانا پڑے گا۔ اپنے سفارت خانے اور یہ بات یقینی ہے کہ انہیں تمہارے بارے میں پہلے سے اطلاع ہوگی۔"

سردار جی نے میری تائید کی "ہاں۔ پولیس فرار کے راستے بند کرے گی تو فرانس، ہالینڈ اور جیکوسلواکیہ کی پولیس کو بھی خبردار کر دے گی۔ سب کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں۔ لیکن تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کچھ نہ کچھ انتظام ہو جائے گا۔ آخر ہمارے بھی سورس ہیں۔"

وہ جب بھی سورس کی بات کرتا تھا بڑے فخریہ انداز میں چند کور کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھتا تھا اور وہ جلدی سے سر ہلا کے مسکرا رہی تھی۔ وہ تیس سال سے کم عمر کی گوری چٹی اور دراز قد، انتہائی متناسب اور پرکشش جسم والی عورت تھی جس کی صورت کے نقوش ہی اسے پنجاب دی جٹی ثابت کرتے تھے۔ سردار جی کے مقابلے میں وہ خاموش طبع اور شرمیلی تھی۔ کوئی ولایتی بیوی ہوتی تو سورس والی بات پر اسے ضرور ٹوک دیتی کہ کیا بار بار جتانا ضروری ہے کون سے سورس ہیں تمہارے اور ہیں تو کیا تمہارے سورس اس ملک میں قانون کو اپنا فرض ادا کرنے سے روک سکتے ہیں یا دہشت گردوں کے کام نکالنے ہیں مگر مشرقی عورت اپنے خداوند مجازی کے سامنے سر اٹھا کے بھی نہیں بول سکتی۔

میں نے کاؤنٹر کے فون سے طوطی صاحب کا نمبر ملایا۔ آٹھویں یا دسویں گھنٹی کے بعد ریسیور ان کے ہونہار سپوت اول مسٹر نوروین نے اٹھایا۔ وہ طوطی کے چیف رپورٹر کے منصب اعلیٰ پر بھی فائز تھا مگر ہم سے اس کا اولیں تعارف بطور شہزادہ سلیم ہوا تھا جب وہ شاہانہ لباس پہنے کسی اسٹیج ڈرامے کے گمن گرج والے مکالمے بولتا پھرتا تھا۔

میں نے کہا "شہزادہ سلیم۔"

"ایسی کی تیسی میں گیا شہزادہ سلیم" وہ ہونی قریار کرنی آواز میں بولا "میں تو ہوا ہوں ڈائریکٹر کھوتے را کھر الو کا پٹھا۔"

میں نے کہا "بس بس۔ یہ سب ڈگریاں تمہیں مبارک ہوں مگر یہ بتاؤ کہ آخر ہوا کیا ہے۔ میں سکندر بول رہا ہوں۔"

"اوئی چھوڑو۔ آپ سکندر اعظم ہوتے تب بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میرا کہا سنا معاف کرنا۔ میں نے فون کر کے سب کو بتا دیا ہے۔" اس نے پانچ چھ نام گنوائے۔

"کیا بتا دیا ہے؟"

"یہی کہ دیوانہ رکھ تیرا رستہ سے جا رہا ہے۔ انجام زندگی کا نزدیک آ رہا ہے۔ صبح کا سورج نکلے گا تو میری زندگی کا آفتاب غروب ہو چکا ہوگا۔"

میں نے پریشانی سے کہا "یہ کیسی فضول بکواس کر رہے ہو تم خود بین۔"

"نہیں جی۔ اب میں کیسے دنیا کو منہ دکھاؤں۔ تم کیا

www.paksociety.com

اسٹائل تھا۔" اس نے دردناک آواز بنا کے کہا "اب وہاں ایک چٹیل میدان ہے جہاں میرے حسین بالوں کا چمن آباد تھا۔ میری گرل فرینڈز اس چمن میں بلبلوں کی طرح گزگزاتی تھیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "وہ بلبلیں تھیں یا مرغیاں؟ کیا واقعی تمہارے سر کی کھیتی صاف کرادی گئی ہے زبردستی۔"

"ہاں۔ ایک ظالم باپ نے اولاد کے ارمانوں کا خون کردیا ہے۔ کاش میں بھی اس کے ارمانوں کا خون کرسکتا مگر اس کے ارمان اب کہاں بچے ہیں سب تو پورے کرلیے۔ وہ دنیا کا سب سے بڑا خبیث سیالکوٹی حجام کی اولاد اس نے اور طوطی صاحب نے مجھے ایسے پکڑلیا جناب' جیسے بھیڑ کو مونڈنے کے لیے پکڑ لیتے ہیں۔ لمبا ڈال دیا جی مجھے فرش پر اور یہ میرے سگے سوتیلے بھائی بہن سارے حرامی درجۂ اول' میرے اوپر سوار ہوگئے۔ سانس نہیں لینے دیا مجھے۔ میں نے بھی کسی دن اسی طرح اس کی داڑھی صاف نہ کی تو میرا نام فردین نہیں۔"

میں نے کہا "مگر صبح تک تم یہ کام کیسے کروگے؟ آخر خودکشی بھی کرنی ہے تمہیں۔"

اس نے جز بز ہوکے کہا "وہ۔۔۔ میں ایک دو دن بعد بھی تو کرسکتا ہوں۔ ضروری تو ہے مگر ارجنٹ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ضروری بھی نہیں ہے فردین۔ بال پھر بڑھ جائیں گے۔ اور اس وقت تک تم وگ استعمال کرسکتے ہو۔ ایک سے ایک شاندار وگ ملتی ہے لندن میں نہ تمہاری تو اپنی دکان ہے جہاں سے تم نے ہمیں میک اپ کا سامان دلایا تھا۔ وگ لگا کے تم محمد برٹن بن سکتے ہو یا ولیم کلارک۔ مریں تمہارے دشمن۔۔۔"

"آپ کا مطلب ہے ابا جی تو آمین" وہ بولا مگر اس کے ساتھ ہی پس منظر میں دھماکا سنائی دیا اور پھر حاجی فردین کی مخصوص "ہائے ابا جی" کی پُردرد صدا جس سے میں نے فرض کیا کہ والد ماجد نے اپنے ولی عہد کی آمین کے جواب میں جوتی کھینچ کے ماری تھی۔ مسلسل مشق کے نتیجے میں ان کا نشانہ بے خطا ہوگیا تھا۔ چشم تصور سے میں نے فرزند حلیم کو جوتی دبا کے فرار ہوتے دیکھا۔ پھر حاجی علم دین طوطی کی گرج دار آواز سنائی دی "ہیلو۔"

میں نے کہا "طوطی۔ میں سکندر عرض کررہا ہوں۔"

"اور طوطی آپ کو ولایت کے طول و عرض میں تلاش کرتا پھر رہا ہے میرے پاکستانی بھائی۔ از کجا می آید ایں آواز دوست۔ فارسی سمجھتے ہو؟ نہیں سمجھتے۔ خیر مطلب یہ ہے کہ تمہاری آواز کہاں سے سنائی دے رہی ہے مجھے۔"

میں نے کہا "اسی دنیا سے جس میں آپ بھی قید حیات کاٹ رہے ہیں۔ ہم نے ابھی تک انتقال نہیں فرمایا۔ ولایت سے اپنے وطن مالوف کی جانب۔"

"آج کا سارا دن آپ اسی حرزاد کے ساتھ لاپتا رہے ہو۔ آخر کیا مصروفیت رہی۔ جو معلومات میں نے تفتیش کے نتیجے میں بدرجہ حاصل کی ہیں وہ بڑی افسوس ناک بلکہ شرمناک تھیں۔ آپ ادھر خانہ خراب کفار کے دام ہوس میں پھنس کے لہو و لعب اور غیر شرعی خرافات۔"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ یہ آپ کیا فرمارہے ہو طوطی صاحب۔ ہم اور لہو و لعب توبہ توبہ۔"

"فردین سب قبول کرچکا ہے کہ اس نے لندن کی ہر قابل دید چیز اور جگہ دکھائی۔ اولاد نرینہ بڑی ڈھٹائی سے بتا رہا تھا کہ وہ سوہو کے علاقے میں سیاحی کے لیے وہی لے کر گیا تھا اور پھر اس نے تم کو کس کس کی محبت سے فیضیاب ہونے کے مواقع فراہم کیے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "سوہو کے قحبہ خانوں میں۔۔۔ بالکل غلط۔"

"اور تم اس کے کتنے شکر گزار تھے اور تم نے وہاں کیا گُل کھلائے میری سرکار۔ جب وہ تم کو ان نائٹ کلبوں میں لے گیا جہاں' استغفراللہ۔ ستر پوشی ممنوع اور گناہ کا درجہ رکھتی ہے چھوڑو کلب۔"

میں نے کہا "وہ مذاق کررہا ہوگا آپ سے۔"

"مذاق۔ میرے پاکستانی بھائی' ابھی تک اس بدبخت کی یہ مجال نہیں کہ اپنے باپ سے مذاق کرے اور وہ بھی اس وقت جب ہمارے جلال کا مظاہرہ پاپوش چرمی سے جاری ہو۔ خدا کو حاضر ناظر جان کے کہو کہ کیا تم نے خود اسٹیج پر جاکے اس حالت میں رقص نہیں فرمایا کہ تن عریاں پر ہے۔ تم کہاں بھی آ اترے اگر ممکن ہو۔ افسوس' صد افسوس۔"

میں نے کہا "آپ بھی کمال کرتے ہیں طوطی صاحب۔ سنی سنائی پر یقین کرلیتے ہیں۔ اس نے بکواس کی اگر ایسا کہا۔ میرا خیال ہے آپ کے رویے کے خلاف بغاوت کی ہے اس نے۔ وہ آپ کو گالیاں تو دے نہیں سکتا تھا۔ ذہنی اذیت دے سکتا تھا۔ آپ اس کے ساتھ بہت سختی کرتے ہیں۔ جوان لڑکا ہے اور ولایت کا پروردہ۔"

غالباً طوطی صاحب کچھ شرمندہ ہوئے "اچھا؟۔۔۔ مجھے بھی کچھ شک ضرور تھا میرے پاکستانی بھائی کہ وہ شخص ناتحقیق ہر غریب پاپوش پر احتجاجاً دروغ گوئی کرتا ہے۔ جب اس کا توڑ میں نے نکالا کہ اپنے سیالکوٹی خلیفہ کی مدد سے اس کے سر پہ۔"

میں نے کہا "یہ آپ نے بڑا ظلم کیا طوطی صاحب۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ اب خودکشی کرلے گا کیونکہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔"

وہ متفکر ہوگئے "منہ دکھانے کے قابل وہ پہلے بھی کہاں تھا لیکن یہ حرام موت مرنے والی بات اس برادر خر زیر کے دماغ سے نکالنے کے لیے مجھے کچھ کرنا پڑے گا۔ بے شک وہم اور مرض کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا مگر۔۔۔"

"مگر آپ کے پاس ہے۔" میں نے طنز سے کہا "آپ کیا کریں گے۔ اس کے گنجے سر کو جوتیاں مار مار کے پلپلا کردیں گے خود والیں گے اسے تاکہ وہ شہید ہوجائے معاونت منتی کے ساتھ

حرام موت نہ مرے' قبلہ حاجی صاحب! آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ زمانہ بدل گیا ہے اور آپ جس دنیا میں رہتے ہیں وہ باقی نہیں رہی ہے۔ اس نے کسی میم سے شادی کرلی اور بھاگ گیا آپ کے گھر سے تو کیا بگاڑ لیں گے آپ اس کا؟ خدا کا شکر ادا کریں کہ ابھی تک اس نے سرکشی اختیار نہیں کی۔"

"شاید تم نے ٹھیک ہی کہا ہے میرے پاکستانی بھائی۔ لیکن اب ہم کیا کریں آخر۔"

میں نے کہا "آپ اس سے کہیں' سوری۔۔۔ غلطی ہوگئی۔ ظلم اور زیادتی یا غلطی کرنا بہت آسان ہے' کوئی بہادری نہیں مگر نادم ہونا اور اپنی غلطی کی معافی مانگنا بہت مشکل کام ہے اور اس کے لیے بہت حوصلہ چاہیے۔ آپ اس سے کہہ سکتے ہیں کہ چیئر فردین۔ غلط فہمی اور تمہاری غلط بیانی کے باعث ایسا ہوگیا۔ چل تو دل تو چھوٹا نہ کر بال پھر نکل آئیں گے۔ جیسا تیرا اسٹائل تیرا دل چاہے رکھ۔"

"چلیے۔۔۔ میں کل چھٹی دے دوں اسے۔۔۔؟"

"آپ نے ایسا نہ کیا میرے پاکستانی بھائی تو سمجھ لیں کہ کل اس کی لاش ٹیمز کے دریا کے بھنور میں ہے۔ یا گھر کے کسی پنکھے سے جھولتی ہوئی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ چلے گا اور ایفل ٹاور پر سے چھلانگ مارے گا۔ پہلے ایک غبارہ چھوڑے گا جس کے ساتھ بینر بندھا ہوا ہوگا کہ میرا قاتل میرا باپ ہے۔ پھر ہاتھ میں پاکستان کا جھنڈا لہراتا ہوا۔۔۔"

حسب توقع حاجی صاحب کا حوصلہ جواب دے گیا "نہیں نہیں' ایسا نہیں ہونے دوں گا میں۔ میں اس کو راضی کرلوں گا۔ بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں نا۔ غلطی بڑے بھی کرجاتے ہیں خیر سے۔ اگر کیا مرضی ہے اس حرام ابلیس کی کہ اپنے اصلی اور اکلوتے باپ کا سر اپنے قدموں میں جھکالے" انہوں نے ایک آہ بھری۔

میں نے کہا "ایسی بات نہیں۔۔۔ نہ وہ ایسا چاہتا ہے۔ بس آپ اس کی عزت نفس کو بھی اہم سمجھیں۔ خیر آپ خود ٹھیک کرسکتے ہیں اپنے گھر کے معاملات کو۔ میں کیا کہوں' فون میں نے کسی اور کام سے کیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ لندن پولیس نے مجھے پکڑنے کے لیے بڑی جامع منصوبہ بندی کی ہے۔ انہوں نے پوسٹر لگائے اور تمام اخبارات میں میری تلاش کے لیے باتصویر اشتہار دیا ہے۔ کیا انہوں نے آپ سے بھی کہا تھا کہ اشتہار لگاؤ۔ اور بھاری معاوضہ پیش کیا تھا۔"

طوطی صاحب نے کہا "بھاری معاوضہ کیا' وہ مجھے برطانیہ کی ملکہ کا شاہی خزانہ بھی پیش کرتے تو مجھے نہ خرید سکتے تھے اور نہ مجبور کرسکتے تھے لیکن اصل بات یہ ہے میرے پاکستانی بھائی کہ میرے پاس کوئی بھی اشتہار لے کر نہیں آیا۔"

میں نے کہا "اچھا۔ یہاں ایک سکھ ہے ہرنام سنگھ کھوتا۔ اس کے اخبار کا نام ہے جھنجھوڑ۔۔۔ آپ جانتے ہیں؟"

حاجی علم دین نے جواب میں کھرے کھرے فصاحت و بلاغت کے ساتھ وہ گالیاں دیں جو صرف سننے کے قابل نہیں سنانے کے قابل نہیں "ہاں۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ کیا یہ شوشہ اسی نے چھوڑا ہے؟"

"ہاں۔ آپ تصدیق کرکے بتائیں مجھے۔ کیا واقعی صبح کے اخبارات میں کوئی ایسا اشتہار شائع ہوگا۔ میں آپ کو کچھ دیر بعد فون کروں گا۔"

کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے منیجر نے بڑے طنزیہ انداز میں اپنی گھڑی دیکھی "میں نے تو تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ مختصر بات کرو۔"

"تم کہہ بھی نہیں سکتے تھے" میں نے مسکرا کے جواب دیا "سمجھدار آدمی ہو اپنا نفع نقصان دیکھ کے بات کرتے ہو۔"

میں واپس اپنی میز پر پہنچا تو وہاں محسن کے ساتھ سردار جی بیٹھے بڑے انہماک سے ایک انگریز عورت سے آنکھیں چار کررہے تھے۔ وہ قدرے فربہ بدن عورت تھی اور میز پر کہنیاں ٹکائے بیٹھی تھی کہ سردار جی اپنے گریبان میں جھانکنے کے بجائے اس کے گریبان کی وسعت اور گہرائی میں گم ہوگئے تھے۔ چندکور میز پر نہیں تھی۔

مجھے دیکھ کر انہوں نے عورت کو آنکھ ماری اور مسکرائے۔ جواب میں عورت بھی مسکرائی وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے "حسین تبدیلی سا نظر آیا ولایت میں کی نہیں۔"

میں نے کہا "سچ فرمایا آپ نے۔ اور دیکھنے کا ٹکٹ بھی نہیں۔ چندکور کی غیر موجودگی میں تم آنکھیں بند کرکے تو نہیں بیٹھ سکتے۔"

"چندکور ذرا ٹائلٹ تک گئی ہے۔ آجائے تو چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ چندکور کا میرے ساتھ کیا حساب کتاب ہے؟"

"وہ تمہاری احسان مند ہے۔ شاید تمہیں یاد ہو۔ ایک دفعہ تم نے اس کی عزت بھی بچائی تھی اور جان بھی۔ تم نے اس کے خاندان کی حفاظت نہ کی ہوتی تو غنڈے چندکور کو اور اس کی بہن کو اٹھا کرلے جاتے اور باقی سب کو ماردیتے۔"

میں نے ذہن پر زور دیا مگر مجھے ایسا کوئی واقعہ یاد نہیں آیا "وہ کون لوگ تھے اور یہ واقعہ کہاں پیش آیا تھا؟"

"یہ سب چندکور سے سنا۔ اس وقت کسی کو تمہارا شکریہ ادا کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ یہ افراتفری میں ایک طرف نکل گئے تھے اور تم دوسری طرف۔ مگر چندکور کو سب اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے چھ سات مسلح افراد کا آملیٹ بنادیا تھا۔ ان سب کو لمبا ڈال دیا تھا۔ پتا نہیں کتنے مرے تھے اور کتنے بے ہوش ہوئے تھے۔ تم بالکل فلمی ہیرو کی طرح نمودار ہوئے تھے اور سب کی پھینٹی بھی اسی طرح لگائی تھی۔"

چندکور خاموشی سے زیرلب مسکراتی ہوئی آکے میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ سردار جی کی نگاہوں کا مرکز بدل گیا۔ وہ اپنی دھرم پتنی کو عاشقانہ وارفتگی کے ساتھ دیکھنے لگے۔ اسے بیوی سے واقعی محبت تھی ورنہ آداب محبت کی وضع داری نبھانا اس پر فرض نہیں تھا۔

"کیا خیال ہے گھر چلیں یا آئس کریم کھانی ہے؟" سردار جی

www.paksociety.com

نے کہا۔

جندکور نے ہنس کے کہا "ابا اسی سے پیٹ بھرو گے۔"

"ارے بھلی لوک۔ بات ساری بے نیت کی۔ نیت نہیں بھرتی بندے کی۔" انہوں نے حسن قدرت کے نظارے کو آخری بار نگاہوں میں بساتے ہوئے کمرہ ورا اٹھ کھڑے ہوتے "میں بھی ذرا دیکھ آؤں ٹائلٹ کیا ہے یہاں؟"

چند سیکنڈ کے وقفے سے میں نے فربہ بدن عورت کو اٹھ کے اُدھر ہی جاتے دیکھا۔ حضرات اور خواتین کے ٹائلٹ ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ غالباً محسن نے بھی تاڑ لیا تھا کہ دل کے افسانے نگاہوں کی زبان تک پہنچے۔ بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے۔

اچانک میں نے سردارنی کے لمس کو میز کے نیچے محسوس کیا میں نے گھبرا کے اس کی طرف دیکھا تو وہ بالکل پُرسکون تھی اور میری طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ اس کا ہاتھ پہلے میرے گھٹنے پر تھا پھر میرے ہاتھ تک پہنچا تو مجھے اندازہ ہوا جیسے وہ مجھے کچھ دینا چاہتی ہے۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو کاغذ کا ایک پرزہ میرے ہاتھ میں آگیا جسے موڑ کے تعویذ جیسا بنا دیا گیا تھا۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کے اس پرزے کو میز کے نیچے ہی کھولا اور اس پر انگریزی میں لکھے ہوئے مختصر پیغام کو پڑھا "میرے شوہر پر اعتبار مت کرنا" پیغام لپ اسٹک سے لکھا گیا تھا۔ سردارنی کے سامنے وہ مجھے خبردار نہیں کر سکتی تھی چنانچہ وہ ٹائلٹ تک گئی اور ٹائلٹ پیپر استعمال کرتے ہوئے لپ اسٹک سے ایک جملہ لکھ لائی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ سردار جی اس کے آتے ہی ٹائلٹ جانے کی ضرورت محسوس کریں گے۔ اب ایک پیغام کا تبادلہ میز کے نیچے ہو گیا تھا تو دوسرے نظروں کے پیغام کو ٹائلٹ میں کسی معاہدے کی شکل دی جا رہی تھی۔

میں نے کہا "میں تمہیں کیا کہوں۔ سردارنی یا جندکور؟"

وہ چونک پڑی۔ اس نے محسن کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھا اور پھر مسکرانے لگی "جو آپ کو اچھا لگے جی۔"

میں نے کہا "جندکور یہ کیا معاملہ ہے؟"

اس نے سرگوشی میں بات کرنے سے پہلے ادھر اُدھر دیکھا "سردار تمہارا دوست نہیں ہے، دشمن ہے۔"

میں نے کہا "تم اس کے دشمن پر کیوں مہربان ہو؟"

"بس جی۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ آپ کی عزت ہے میرے دل میں۔"

میں نے کہا "جو کہانی سردار نے مجھے سنائی ہے۔ وہ بھی مجھے جھوٹ لگتی ہے۔ کیا میں نے تمہاری اور تمہاری بہن کی عزت بچائی تھی۔ غنڈے تمہیں اغوا کرنے والے تھے اور شاید تمہارے خاندان کے باقی افراد کو مار ڈالتے۔"

اس کی آنکھوں میں حیرانی کے آثار نمودار ہوئے "تم کسی بات نہیں تھی لیکن اتنا وقت نہیں ہے کہ میں آپ کو ساری بات بتاؤں۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے دشمنوں سے ملا ہوا ہے۔"

"کون سے دشمنوں سے؟ چودھری دلاور سے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "کل وہ آدمی گھر آیا تھا۔ اسے نہیں پہچانتی مگر جب میں چائے لے کر آئی تو میز پہ سارے نوٹ پڑے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بیس ہزار پاؤنڈ تھے۔ اس نے ایک جملہ کہا تھا سابق سکندر کے پکڑے جانے کے بعد۔"

میں نے اپنی نظر ٹائلٹ کی طرف رکھی "اچھا۔ سردار تم سے کچھ چھپانا چاہتے ہیں۔ کیا دلاور پہلے بھی آیا ہے؟"

"اسی ہفتے میں دو تین بار آیا ہے۔ پہلے کا مجھے علم نہیں۔ سردار نے مجھ سے کہا کہ میرا اس کے ساتھ کچھ بزنس کرنے کا خیال ہے تم ابھی سردار کو ٹال دو۔"

میں نے کہا "نہیں جندکور۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔"

"تم پکڑے جاؤ گے" اس نے پریشانی سے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شکاری خود شکار ہو جائے۔ میں تو چودھری دلاور کو پکڑنا چاہتا ہوں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ پاگل پن چھوڑو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ سردار کی باتوں میں آ کے تم پھنس جاؤ گے۔"

"تم نے ہمیں خبردار کر دیا۔ تمہارا احسان مجھے یاد رہے گا۔ باقی میری قسمت۔ میں یہ چانس لوں گا... اب کوئی اور بات کرو۔ سردار آ رہا ہے۔"

محسن نے بھی مسکرا کے کہا "تم فکر مت کرو۔ ہم اپنی حفاظت خود بھی کر سکتے ہیں اور ہمارا اصل محافظ تو خدا ہے۔"

سردار مسکراتا ہوا آیا تو نہ اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کا داغ تھا اور نہ کوٹ پر مگر اس کی نگاہوں میں خوشی اور سرمستی تھی۔ شاید وہ اپنی تقدیر پر ناز کر رہا تھا کہ ایک منافع بخش کاروباری معاہدہ چودھری دلاور سے پورا کرنے کا وقت بھی آ گیا تھا اور قدرت کے نظارے کو دیگر تفصیلات کے ساتھ دیکھنے کا وقت بھی مل گیا تھا۔

جندکور نے ایک بار پھر مجھ سے نظروں ہی نظروں میں التجا کی کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں اور ان کے ساتھ نہ جاؤں مگر میری نظریں خدشات اور خطرات کے ساتھ اپنی امیدوں کے روشن امکانات کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ ابھی تک چودھری دلاور کا سراغ لگانے میں اتنا ہی ناکام تھا جتنا لندن کی پولیس مگر اس نے ملوث اور قیاس آرائی کی بنیاد پر ایک کامیابی کا "پوائنٹ" حاصل کیا تھا۔ اس نے رستم کو دوران زہر ہلاک کیے بغیر اس کی ہلاکت کا الزام ہمارے نامۂ اعمال میں لکھوا دیا تھا۔ ہم خود اسے ایک بار دیکھنے کے باوجود ابھی تک اس کا پتا ٹھکانا معلوم نہیں کر سکے تھے۔ اچانک ملنے والی ایک خبر نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم دلاور کو خود اس کے بچھائے ہوئے جال میں گرفتار کریں؟ ہم بے خبری کا اظہار کرتے ہوئے اور انجان

بیٹے۔ پروگرام تو نے کا آخر بنے رہیں اور آخری وقت میں جب بابا جی پوری طرح مطمئن ہو کر اچھے اور مسرور کر اس نے میدان بلا ہم جوانوں کے بلند ہو گئے۔

مجھے محسن سے مشورے کا موقع نہیں ملا تھا مگر اس نے واضح کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے متفق ہے اور جان بچا کے فرار ہونے سے جان کی بازی لگا کے مقابلہ کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ نو رنگ نو جیب بھی کچھ ایسا اندازہ نہیں تھا کہ میں بیس ہزار پاؤنڈ کا نصف ایڈوانس وصول کر کے ہمیں چودھری دلاور کی خدمت میں پیش کر دینے کا معاہدہ کرنے والے دشمن کے ذہن میں کیا ہے۔ اپنے گھر لے جا کے چودھری دلاور کو مطلع کرنے سے پہلے اور اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے وہ ہمارے ساتھ کیا کرے گا۔ زیادہ امید یہی تھی کہ وہ بالائی طریقے سے ریوالور نکال لے گا اور ہمیں جھکا کے اپنے ہاتھ اوپر اٹھوا لے گا۔ تم اب میرے مہمان نہیں قیدی ہو۔ چودھری دلاور تمہیں لے جانے کے لیے آنے والا ہے۔ پھر وہ اسے فون کرے گا یا دلاور سے کہے گا کہ اس نمبر پر میرے بزنس پارٹنر چودھری دلاور کو فون کر کے بیتا مہر کہ آدھی رقم لاؤ اور اپنا مال اٹھا لو۔ اور باقی دس ہزار پاؤنڈ ملنے تک وہ خود بھی ایک ہی کا محافظ ہوگا اور ہمیں صرف سانس لینے کی حد تک حرکت کی اجازت دے گا۔ دلاور کے آنے کے بعد کیا ہوگا۔ یہ شاید خود سردار جی کو اندازہ نہ ہو۔ وہ ایفائے عہد کرتے ہوئے شکریے کے ساتھ دس ہزار مزید دے جائے گا یا ایڈوانس کے علاوہ سردار جی کے جسم سے ان کی جان بھی نکال لے جائے گا۔ ہمارے تعلق کی بنا پر ہم چودھری دلاور کی سوچ اور منصوبے کو اپنی عقل اور تجربے کے ٹیلی اسکوپ سے بہتر طور پر دیکھ اور سمجھ سکتے تھے۔ معلوم نہیں اس نے سردار جی کو کیسے بریف کیا تھا کہ دیکھو سردار تم جتنے الو بنانے کی کوشش کرو گے وہ اکرم خود تم سے زیادہ خطرناک ہے اور ہر کو الو بنانے میں تو امکان اس بات کا ہوتا ہے کہ وہ آپ کو بُرا ثابت کر دے۔ ممکن ہے اس نے سردار جی کو ترتیب بھی سمجھایا ہو کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ چودھری بڑا ہوشیار اور مکار ہے تو بے وقوفی اور غلطی مت کرنا ورنہ سکندر تمہارا ابا بن جائے گا۔

سردار جی کی مرسڈیز کار میں ہم پیچھے فٹ ہو گئے۔ سردار جی غضب ناک انداز میں پیچھے نہ دیکھنے کی ٹریفک کے بجائے ہم پر نگاہ رکھنے میں مصروف تھے۔ جندکور خاموش تھی اور اپنی پریشانی کو چھپانے کے لیے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے کھل کے اپنے شوہر کے ارادوں کی مخالفت کرنا بھی مشکل تھا اور وہ اس خیال سے بھی خوف زدہ تھی کہ ہم نے اس کی ہدایت کو اہمیت نہیں دی۔ شوہر کی زندگی اسے شوہر کے ساتھ گزارنی تھی۔ وہ ہماری احسان مند تھی لیکن شوہر کے خلاف بغاوت کا جرم کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اپنے گھر میں آباد رہنے کے لیے سلامتی اور تحفظ کے طور پر سردار جی کا ساتھ دینے کی پابند تھی۔ کوئی

عورت اصول کی بنیاد پر یا ضمیر کی آواز پر شوہر سے اختلاف کر کے اپنی ازدواجی زندگی کو داؤ پر لگانا افورڈ نہیں کر سکتی۔ سارا مسئلہ معاشی اور معاشرتی عدم تحفظ کا ہوتا ہے جو انہیں ہر ناقابل قبول صورت حال سے ایڈجسٹ کرنے اور ناقابل برداشت فیصلوں سے COMPROMISE پر مجبور کرتا ہے۔ مرد اس آزمائش اور کرب سے نہیں گزرتے۔"

"یہ گاڑی تو بڑا پرانا ماڈل ہے سردار جی!" محسن نے کہا۔

"ہوتی بھولے بادشاہو۔ ہم کون سے نئے ماڈل کے ہیں" وہ بولا "گڈی نے روٹی دوا جو ساتھ چلے اور ساتھ دے وقت پہ۔"

"پھر بھی۔ جیسی روٹی ایسی گڈی ہونی چاہیے۔ کیوں بھائی جی؟"

سردار جی خوش ہوئے "رب کرے گا تو ایسی ہی سوہنی گڈی بھی آ جائے گی بہت جلد۔"

میں نے تجاہل عارفانہ سے کہا "کتنے تک مل جاتی ہے نئی رولز رائس یا کوئی فورڈ کورٹینا۔ غریب نہیں ہزار پاؤنڈ تک۔"

میں نے سردار جی کے جسم میں تڑپ کو واضح طور پر محسوس کیا مگر اس نے جلنے کے ردعمل سے چونکنے سے گریز کیا۔

"ہاں جی۔ بس تھوڑا کم زیادہ۔ ہم رولز رائس کی بات تو کرتے نہیں۔ اب تو جو اپنی جندکور پسند کرے گی وہی اپنی پسند ہے۔"

جندکور نے اپنے جذبات پر مصنوعی مسکراہٹ کا پردہ ڈال کے سر ہلایا۔

ان کا فلیٹ بلومس بری کے علاقے میں راجہ اسٹریٹ کی ایک بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر تھا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ہی مشہور ناول نگار چارلس ڈکنز کا گھر تھا جسے قومی یادگار قرار دے دیا گیا تھا اور وہاں ایک میوزیم ہے اور لائبریری ہے جسے انگریز تمام سیاحوں کو بڑی عقیدت کے ساتھ دکھاتے ہیں۔ ادیب ہوں یا سائنس داں، موسیقار ہوں یا کھلاڑی۔ ہر قوم اپنے عالمی شہرت یافتہ ہیروز کی عزت کو باعث افتخار سمجھتی ہے۔ بدبختی کا یہ اعزاز صرف ہمارے برصغیر کے ادیبوں، فنکاروں اور موسیقاروں کا مقدر ہوا کہ اہل وطن کو چھوڑ کے سارے زمانے نے ان کی قدر شناسی کی۔

سردارنی کچھ گم صم تھی اور اس کی گھبراہٹ سوچ کے بڑھتی جا رہی تھی کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ فلیٹ میں پہنچ کے وہ ڈھیلی سی صوفے پر گر گئی۔

"کیا ہوا جندکور۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"مجھے... تھوڑا سا پانی لا دو" اس نے کہا۔

"پانی کیوں... میں گلوکوز لاتا ہوں۔ تو آرام سے بیٹھ۔ آپ کیوں کھڑے ہو میری سرکار۔ بیٹھو یہ جیسا بھی ہے اپنا گھر سمجھو اسے۔"

میں دروازے کے مقابل بیٹھ گیا جہاں سے میں اندر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ اس کمرے کے ساتھ شاید بیڈ روم تھا۔ میرے

www.paksociety.com

ہاتھ پر ایک دروازہ تھا جو باتھ روم کا ہو سکتا تھا۔ کچن اسی کمرے کے ایک گوشے میں بنا دیا گیا تھا۔ چند کور اب ہم سے نظر چرا رہی تھی اور کچھ خفا بھی لگتی تھی۔ ہم نے اس کے خلوص اور ہمدردی پر مبنی مشورے کو قبول نہ کرکے اس کو مایوس کیا تھا اور وہ خود کو گناہ بے لذت کرنے والے کی طرح احمق محسوس کر رہی تھی۔ اس نے بڑی نیک نیتی کے ساتھ اپنے شوہر کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا مگر ہم نے ناقدری سے اس کو خود اپنی نظر سے گرا دیا تھا۔

سردار جی کا رویہ ابھی تک نارمل تھا۔ نہ اس نے ریوالور نکالا تھا اور نہ وہ فون کی طرف لپکا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ چوہدری ولاور پہلے سے فلیٹ میں موجود ہو؟ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سردار سے ہماری ملاقات ایک اتفاق کا نتیجہ تھی مگر کیا یہ واقعی اتفاق تھا یا وہ ہمارے تعاقب میں تھا؟ ولاور کو اس نے فلیٹ میں انتظار کرنے کے لیے کہا ہوگا یا ملاقات کے بعد بتا دیا ہوگا کہ شکار قابو میں آگیا۔ بس اب راشد ڈالا ہوں۔ تم چیچو جال کے ساتھ میرے فلیٹ پر۔ وہ اچانک باتھ روم سے نکل آئے گا۔" ہاہا... ایسا تو ہوتا ہے اپنے سکندر اعظم صاحب اس طرح کے کاموں میں... بیبا جی۔"

سردار جی نے اپنی بیوی کو گلو کوز دیا اور پھر ہم سے مخاطب ہوا "ہاں جی۔ اب کیا پیو گے۔ گرم کہ ٹھنڈا؟"

سردارنی نے پیچھے سے انگلی ہلا کے اشارہ کیا کہ ہم کچھ نوش نہ فرمائیں اور انکار کر دیں۔ ہم نے انکار کر دیا۔ ایک خوب صورت اور دکھی عورت کی ہدایات نہیں ٹالی جا سکتی ہیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بیئر وہسکی' شمپین حرام ہے سمجھو لیکن کافی تو پانی ہے او جی میں کافی لاتا ہوں۔"

"آپ بیٹھو جی۔ میں بنا کے لاتی ہوں" چند کور تڑپ کے اٹھی۔

"او نہیں چند کور۔ تو آرام کر۔"

"میں ٹھیک ہوں' بالکل ٹھیک ہوں" اس نے خوف زدہ لہجے میں اصرار کیا "تم باتیں کرو مہمانوں سے۔"

"ہاں ہاں۔ باتیں بھی کریں گے' ساری رات پڑی ہے۔ تو بتا ان کو اپنی بات۔ کافی تو میں ہی اچھی بناتا ہوں۔ تو جانتی ہے۔ روز بناتا ہوں" اس نے زبردستی سردارنی کو صوفے پر بٹھا دیا۔

سردارنی کا رنگ اڑا ہوا تھا مگر شوہر کی تابعداری پر مسکرانا اس کا فرض تھا۔ اس کے خوف نے مجھ پر ساری صورت حال کو اظہر من الشمس کر دیا تھا۔ سردار ہمیں کافی میں کوئی خواب آور دوا ملا کے دے گا اور جب ہم اتنا نڈھال ہو جائیں گے تو بنا خوف و خطر وہ دس ہزار پاؤنڈ وصول کرنے کے لیے چوہدری ولاور کو بلا لے گا۔ اسے ریوالور نکالنے کا رسک مول لینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

سردار نے الیکٹرک کیتلی کا پلگ لگایا اور شیلف میں سے مگ نکالے۔

"ہاں بھئی' چپ کیوں ہو تم سب؟"

سردارنی نے لہجے کے ارتعاش کو چھپاتے ہوئے ہمیں بتانا شروع کیا کہ وہ کس طرح اور کب سے ہماری احسان مند تھی۔ ... نے جو واقعہ سنایا وہ بھی مجھے یاد نہیں تھا۔ ہم نے کسی ... گروہوں اور علیحدگی پسندوں کے عزائم کو ناکام بنانے کے لیے بارود کا ایک ذخیرہ تباہ کیا تھا اور اس کے نتیجے میں جو ہلاک ہوئے تھے ان میں کچھ ایسے بدمعاش بھی تھے جو سکھوں کو بھی پاکستان والوں کا ساتھی قرار دیتے تھے اور ان کے ... کیونکہ وہ یہاں ننکانہ صاحب اور حسن ابدال آتے تھے اور اپنے مقدس مقامات تک بڑی عزت احترام کے ساتھ لے جائے جاتے تھے اور پنجاب میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ انہوں نے چند کور اور اس کی بہن کو بھی پریشان کر رکھا تھا اور ان کے والد کو بھی دھمکیاں دیتے رہتے تھے کہ پہلے ذرا فوج سے نمٹ لیں' تمہاری خیر نہیں۔ لڑکیوں نے کالج کیا بازار آنا جانا بھی چھوڑ دیا تھا اور ان کے والد بھی سوچ رہے تھے کہ موقع ملے تو اپنی فیملی کے ساتھ کلکتہ پہنچ جائیں مگر ذرائع آمدورفت مسدود تھے اور بدمعاشوں کے حوصلے بڑھتے جا رہے تھے۔ ایک رات وہ ان کے گھر میں بھی کود گئے تھے مگر چیخ پکار پر فوجی آ گئے تو وہ فرار ہو گئے تھے۔ پھر انہوں نے الٹی میٹم دے دیا تھا کہ یا تو ... ہمارے حوالے کر دو۔ پھر تم جا سکتے ہو ورنہ ہم اگلی بار آئیں گے تو مغربی پاکستان کی فوج تمہیں نہیں بچا سکے گی۔ ابھی ... پورے ہوئے تھے کہ وہ سب ہلاک ہو گئے اور اس خاندان کو ... سے جان بچا کے نکلنے کا موقع مل گیا۔

سردارنی یہ بات سناتے وقت ذہنی انتشار کا شکار رہی تھی۔ ... اپنی زبان سے کر رہی تھی۔ اس کی نظر اپنے شوہر پر تھی ... کے اشاروں سے وہ ہمیں سمجھا رہی تھی کہ کافی میں زہر ہے ... اسے ضائع کر دیں یا پینے سے انکار کر دیں۔ اس نے خود ہی ... کیا کہ یہ شاید ممکن نہیں ہوگا تو اس نے ہمیں سمجھایا کہ کس طرح کپ تبدیل کر لیں۔

سردار جی ایک ٹرے میں کافی کے چار مگ لیے نمودار ہوئے۔

"ہاں جی تو پھر آگئی بات سمجھ میں۔ چند کور جی لے" انہوں نے ایک مگ پکڑا دیا پھر ایک خود اٹھایا اور ٹرے ہمارے سامنے رکھ دی۔

میں نے یا محسن نے کافی تیار ہونے کے سارے دوران میں کوئی بھی ایسی بات نوٹ نہیں کی تھی جس سے شبہ ہوتا۔ اس نے چاروں مگ شیلف پر سے اٹھائے تھے جو ایک قطار میں الٹے رکھے ہوئے تھے۔ ان سب میں ایک ہی کافی ڈالی تھی اور چینی ہمارے سامنے ڈالی تھی۔ نہ اس نے کوئی شیشی اٹھا کے ہمارے مگ میں زہر کے قطرے ٹپکائے اور نہ پڑیا کھول کے کوئی سفوف شامل کیا تھا۔

کافی کا مگ چند کور کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔ اس نے گلاس اب ٹیبل پر رکھ دیا "میرا دل نہیں کر رہا۔"

"اچھا تو نہ پی کوئی زبردستی نہیں ہے" ...

سردارنی کھڑی ہو گئی "ذرا میری بات تو سن لو۔" اس نے ... انداز میں بیڈ روم کی جانب اشارہ کیا۔

"... ادھر جو کہنا ہے ان کے سامنے کہہ۔ اچھا ابھی کون ... جی" اس نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔

... نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب میں مگ بدل سکتا تھا۔ مجھے ... لاحق تھی کہ کہیں چالاک سردار جی نے پہلے سے اس پر نظر نہ رکھا ہو کہ شک میں مبتلا ہو کے ہم مگ نہ بدل لیں۔ اس نے زہر آور کافی اپنے لیے رکھی ہو اور بعد میں ہم مگ بدل کے خود اپنی شامت کو دعوت دیں۔ تاہم یہ بھی یقینی نہیں تھا کہ ... اے تک ہو۔

جب اس نے اپنے مگ سے کافی کا ایک گھونٹ لے لیا تو میری ... ہو گئی۔ میں نے کافی کو تھوڑا سا چکھا۔ مجھے یقین تھا کہ ... سے مجھ پر کسی خواب آور دوا یا زہر کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ پھر میں نے کہا "سردار جی۔ ذرا تکلیف کرو۔ چینی کچھ کم ہے۔"

"ابھی لو جی بھولے بادشاہو۔ چینی بہت" وہ اٹھا اور پلٹ کے کچن کی طرف گیا ہی تھا کہ میں نے اور محسن نے مگ بدل لیے۔ چند کور نے خود اپنا مگ محسن کی طرف بڑھا دیا تھا اور اس سے مگ لے کر میز پر رکھ دیا تھا۔ مجھے اس کام میں بڑی پھرتی دکھانی پڑی۔

جب سردار ایک منٹ سے بھی کم وقت میں چینی کا جار لے کر آیا تو محسن مزے سے کافی پی رہا تھا۔ "مجھے تو ٹھیک لگتی ہے چینی۔"

میں نے اپنی کافی میں آدھا چمچ چینی کا شامل کیا اور ایک گھونٹ لیا تو مجھے ذائقے میں معمولی سی تبدیلی محسوس ہوئی۔ میرا ذہن الجھن کا شکار ہو گیا۔ کافی کے تلخ ذائقے میں کسی خواب آور دوا کے شامل ہونے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ یہ فرق میرا وہم ہے یا حقیقت۔ ذائقہ پہلے والے مگ کا ٹھیک تھا یا اب ٹھیک ہے؟

محسن کے بارے میں مجھے کوئی تشویش نہیں تھی۔ سردار اپنی ... کے معاملے میں رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے چند کور کو ... دی ہوگی وہ ٹھیک ہوگی۔ جو مگ محسن کے پاس تھا اسے چند کور نے ... چھوا تک نہیں تھا۔

سردار جی ایک دم مگ سے کر اٹھے "میں ذرا ایک فون کر لوں۔"

میں نے محسن سے ترکی میں کہا "تم ذرا اسے چیک ..." اور اس کے ساتھ اچانک ... لیا۔

سردارنی نے پلٹ کے کہا "مجھ سے کچھ فرمایا آپ نے؟"

محسن نے کہا "ہاں۔ یہ کافی کون سی استعمال کرتے ہو آپ؟"

"میکسویل ہاؤس" وہ بولا "آپ کو اچھی نہیں لگی؟"

محسن نے مسکرا کے کہا "مجھے کچھ پسند ہے۔"

سردار جی کچن کے قریب دیوار پر لگے فون کی جانب بڑھ گیا تو ... سے کہا "ٹھیک ہے۔"

"مجھے کوئی فرق تو محسوس نہیں ہوا ذائقے میں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور اسی مگ سے کافی پیتا رہا کیونکہ سردار کی نگاہ پھر ہماری طرف تھی۔

میں نے سردارنی سے کہا "جو بات آپ نے بتائی۔ وہ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ ہم نے اسلحے کے بہت سے ذخائر تباہ کیے تھے۔"

سردار جی نے فون پر کہا "چلو۔ اوئے بہادر سنگھ حرامی دے پتر کتنے بوہتا ایں اج کل۔ اوئے میٹر بکواس نہ کرا یہ یں۔ آہو۔ بالکل۔ ہور کی' ہاں ہاں۔ اوئے مرداں والی گل اے۔ اوئے آجا چن کھتاں اساں کتھے جاناں اے۔" اس نے آخری فحش گالی کے ساتھ ریسیور رکھ دیا۔

مجھے اب ذرا بھی شک نہیں تھا کہ بہادر سنگھ درحقیقت چوہدری ولاور ہوگا۔ جو باتیں ادھر سے سردار جی نے کی تھیں وہ محض ہمیں دھوکے میں مبتلا رکھنے کے لیے تھیں۔ اصل سوال دوسری طرف سے ولاور نے کیے تھے اور ان کا سردار جی نے مثبت جواب دیا تھا۔ "آہو' بالکل۔ ہاں ہاں" دسویں جماعت کے انگریزی کے پرچے میں ایک سوال ایسا بھی ہوتا تھا کہ جوابات دیے جاتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ وہ سوالات بتائیں جن کے یہ جواب ہو سکتے ہیں۔ وہ بچپن کا سبق اب یاد نہیں تھا مگر عقل نے بہت کچھ سکھا دیا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ ولاور نے پوچھا ہوگا کہ کیا سکندر بخت پکڑا گیا؟ اور اس نے جواب دیا ہوگا۔ آہو۔ پھر ولاور نے سوال کیا ہوگا کہ تیرے قابو میں ہے نا؟ تو اس نے کہا بالکل' ولاور نے کہا ہوگا کہ پھر میں آجاؤں تو اس نے کہا ہوگا ہاں ہاں۔

وہ فون کرتے ہوئے کافی بھی پیتا جا رہا تھا اور میں بڑے غور سے اس کے رد عمل کا مشاہدہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہر گھونٹ لینے کے بعد میں اپنی حالت پر بھی غور کر رہا تھا جیسے کوئی ڈاکٹر سوال کرتا ہے ایسے میں اپنے آپ سے مخاطب تھا۔ غنودگی تو محسوس نہیں ہوتی؟ سر تو بھاری نہیں ہو رہا ہے؟ چکر۔ متلی کی کیفیت' گھبراہٹ یا کمزوری کا احساس؟ پسینہ یا سینے میں گھٹن؟ سب کا جواب ابھی تک نفی میں تھا۔ خواب آور دوا بھی چھو منتر کا جادو نہیں ہوتی۔ اسے دوران خون میں شامل ہو کے اثر کرنے میں پندرہ بیس منٹ ضرور لگتے ہیں۔ کیا چوہدری ولاور اس سے پہلے ہی آ پہنچے گا؟

اچانک سردارنی چند کور نے کافی کا مگ اٹھا لیا "میرا خیال ہے پی لوں۔"

سردار جی خوش ہو گئے "پی لے پی لے شاوا۔ ابھی دو منٹ میں ٹھیک ہو جائے گی تو۔ کمال کافی بناتا ہوں میں۔" اس نے کہا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔

میں نے کہا "واقعی۔ لاجواب کافی ہے۔"

اس نے خالی مگ میز پر رکھ دیا اور مجھے گھورنے لگا۔

"کافی۔ کافی تو۔ ہاں مگر یہ کیا ہو رہا ہے مجھے۔ چند کور۔"

چند کور نے مگ خالی کر دیا تھا "کیا ہے جی!"

www.paksociety.com

"گوری۔ گڑبڑ ہوئی ہے۔ تُو نے دیکھا ہوگا... جب میں فون کر رہا تھا۔ تو یہ... یہ دونوں حرامی... ان کی تو..." اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

سرواسی کی زبان میں خفیف سی کیفیت محسوس کر کے میرا دل باغ باغ ہوا۔ دوا نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے سرواسی کو شانہ دبا کے وہیں بٹھا دیا۔ "چھوڑو یار سرواسی۔ اب تو تمہارے بارہ بج گئے۔"

سروار نے چلا کے کہا "چندر کور... انہوں نے مگ بدلے تھے؟ اوئے تیرا بیڑا غرق... تُو کیا دیکھ رہی تھی... پاگل کی بچی۔"

اس نے اطمینان سے کہا "مگ خود تم نے سب کو دیے تھے۔ سب نے اپنی اپنی کافی پی ہے۔ کیوں؟ کیا ہوا؟"

"میرا بیڑا غرق... بالکل غرق..." اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھلی رکھتے ہوئے کہا۔ غنودگی اس کے اعصاب پر سوار ہونے لگی تھی۔ اس نے کسی ہکلانے والے کی طرح ہمیں اپنی مادری زبان میں وہ گالیاں دیں جو درحقیقت قادری تھیں مگر اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ محاورہ پھر درست ثابت ہو گیا تھا کہ کنواں کھودنے والا خود اس میں گرتا ہے۔ وہ خود نہیں گرا تھا ہم نے اسے گرا دیا تھا مگر انت بھلا سو بھلا۔ گالیاں بکتے ہوئے اس کا سر ڈولنے لگا اور آنکھیں بند ہونے لگیں۔

چندر کور نے تشویش سے کہا "ہائے ہائے۔ کیا یہ فوت ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں' یہ سونا چاہتا ہے... بہت جلد تم بھی سو جاؤ گی۔ اس نے کافی میں خواب آور دوا ملائی تھی۔"

اس نے چلا کے کہا "سرواسی! ہائے ہائے یہ کیا ظلم کیا تم نے گھر آئے مہمانوں کو زہر دے دیا۔"

لیکن اس وقت تک سروار صوفے پر لڑھک گیا تھا اور نیند کی آغوش میں پہنچ گیا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم نے جانتے بوجھتے یہ کافی کیوں پی؟" میں نے کہا۔

"تم جیسے آپ کو بچانے کے لیے" وہ بولی "ورنہ یہ سمجھتا کہ میں نے جانتے بوجھتے کافی نہیں پی اور میں نے ہی تمہیں خبردار کر دیا تھا۔ تم نے مگ بدلے مگر میں نے اس سے یہ بات چھپائی۔"

میں نے کہا "اب تم بھی سو جاؤ گی۔ سونے سے پہلے یہ بتا دو کہ چوہدری دلاور کے دیے ہوئے دس ہزار پاؤنڈ کہاں رکھے ہیں۔"

اس نے کہا "کپڑوں کی الماری میں' کپڑوں کے پیچھے۔"

میں نے کہا "گھر میں کوئی ریوالور ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "وہ بھی وہیں ملے گا۔"

"تم نے بڑا احسان کیا ہم پر۔"

"میں نے اپنا قرض چکایا ہے" وہ بولی۔

"احسان میں یہ حساب نہیں ہوتا۔ جو ہم نے کیا وہ اپنی جگہ۔ جو تم نے کیا اس کی حیثیت اپنی جگہ۔ یہ ایک اخلاقی فرض داری تھی جس کا تمہیں احساس تھا۔ ہمیں تو کچھ علم ہی نہیں تھا۔"

"جب یہ اُٹھے گا تو مجھے بہت مارے گا۔ ہڈیاں توڑ دے گا کہ میں نے اسے دغا دی۔"

"تم کہہ سکتی ہو کہ غلطی خود اس نے مگ رکھتے یا کافی ڈالتے وقت کی ہوگی۔"

اس نے کہا "نہیں۔ یہ بات وہ آسانی سے نہیں مانے گا... تو مجھے کھانی پڑے گی۔"

"سروار ویسے تو بڑا دم بھرتا ہے تمہاری محبت کا۔"

وہ تلخی سے ہنسی "مرد باہر کچھ اور ہوتے ہیں گھر میں کچھ اور... تم کیا سمجھتے ہو مجھے... معلوم نہیں' یہ کیا نظربازی کر رہا تھا۔"

"تم نے دیکھا تھا؟"

"میں... میں تو دیکھتی رہتی ہوں... بس دیکھتی رہتی ہوں اور... اور کر بھی کیا سکتی ہوں۔ یہ حق مجھے حاصل... نہیں کہ میں... بھی... جس... کو... پسند... کروں... اس... کے... ساتھ چلی جاؤں... لیکن... تم... تم پھر آنا... تمہاری خاطر میں... دل ہتھیلی پر رکھ کے... دروازہ کھول سکتی ہوں... تو کسی رات بھی... ایسے ہی مُسکا کے... ایک بار ضرور آنا... بولو آؤ گے نا؟... تم... آئی لو یو سکندر..."

جب اس کا سر صوفے کی پشت سے لگ گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور زبان خاموش ہو گئی تو میں نے گہری سانس لے کر کہا "پاگل عورت!"

"پاگل' مجبور اور بے بس عورت۔ جو نہ جھوٹ بول سکتی ہے اور نہ سچ۔ یک طرفہ وفاداری کے عہد کی پابند" محسن بولا "یہ جملہ بولنا کتنا آسان ہے۔ ہر لڑکا' ہر مرد' ہر شوہر' ایک ہی کہانی میں ہر روز اسی طرح اظہارِ عشق کرتا رہتا ہے اور گویا زبانی اقرار کرتا رہتا ہے کہ ابھی تک میں کسی اور کو نہیں چاہتا۔ محبت ان تین لفظوں کی ادائیگی کا نام ہے۔"

"سرواسی کو بھی یہاں کے ماحول نے احساسِ محرومی کا شکار کر دیا تھا۔ شاید اس سے یہ جملہ کہنے والا کوئی نہیں تھا حالانکہ عورت بھی ایسا کر سکتی ہے۔ جس سے چاہے' جب چاہے۔"

محسن نے گھڑی دیکھی "کیا چوہدری دلاور آنے والا ہو؟"

"ہو آنے دے۔ آنے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں" میں نے ذہن میں کہا۔

"ہمیں اسٹیج پر وہ منظر پیش کرنا چاہیے جو چوہدری کی نظریں دیکھنا چاہتی ہیں" محسن بولا۔

ہم نے سرواسی کو بالکل سیدھا بٹھا دیا۔ اس کی پشت باہر والے دروازے کی جانب تھی چنانچہ اندر آنے والا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے یا سو رہا ہے۔ سرواسی کو ہم نے اٹھا کے بیڈ روم میں منتقل کر دیا اور کمبل اوڑھا کے... میں نے کپڑوں کی الماری کی تلاشی لی تو مجھے اوپر والے خانے میں احتیاط سے پھیلائے گئے دس ہزار پاؤنڈ کے نوٹ ایک شیٹ کے نیچے مل گئے جو کپڑوں کو گرد سے بچانے کے لیے...

...اس میں ایک تجوری نما چھپ خانہ بھی تھا مگر رقم اس میں نہیں تھی۔ خانہ مقفل بھی تھا۔ ممکن ہے اس میں مزید رقم ہو یا سرواسی کی جیولری۔ میں نے اسے کھول کے دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی مگر محسن نے سرواسی کی بیڈ سائڈ ٹیبل سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کے مجھے پیش کیا تو میں نے بھی سوچا کہ دشمن کے ساتھ رعایت کیسی۔ مالِ غنیمت حلال ہے تو پھر جیسا مال ویسا ہی سروار رہے گا۔

سیف کے خفیہ خانے سے بھی ریوالور برآمد ہوا۔ اس کے چیمبر میں پوری چھ گولیاں موجود تھیں۔ خانے میں فلیٹ کی ملکیت کے کاغذات تھے اور خاصی مہنگی جیولری تھی۔ انہیں میں نے ہاتھ نہیں لگایا۔ عورت کو اپنے زیورات سے بھی اتنا ہی پیار ہوتا ہے جتنا اپنے حسن و جمال سے۔ شوہر کی اور بچوں کی محبت کے بعد۔

الماری بند کر کے ہم نے دس ہزار پاؤنڈ کی رقم پولیتھین کے دو تھیلوں میں ڈالی اور یہ پیکٹ اپنی اپنی پتلون میں شرٹ کے نیچے اڑس لیا۔ پھر ہم نے دروازے کی کنڈی کھولی مگر دروازے کو بند رکھا اور خود صوفوں پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔ میری ٹانگیں صوفے پر بیٹھنے کے انداز میں لٹکی ہوئی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ میں بیٹھے بیٹھے لڑھک گیا ہوں۔ محسن نے لڑھک کر قالین پر گر جانے کو ترجیح دی۔

چند منٹ بعد میرا جسم اکڑنے لگا "یار' یہ پوز نیچرل تو ہے مگر بہت مشکل۔"

"اللہ تیری مشکل آسان کرے۔ ہم مزے میں ہیں اور بڑے آرام سے لیٹے ہوئے ہیں دوست۔ چاہو تو تم بھی گر جاؤ۔"

میں سیدھا ہو گیا۔ میرا چہرہ دروازے کی طرف تھا اور آنکھیں ادھ کھلی ہوئی تھیں۔ میرے کان باہر کی ہر آواز پر لگے ہوئے تھے۔ سرواسی کو فون کیے تقریباً آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔

"یار وہ آئے گا بھی یا نہیں۔ کیا پتا سکھ نے کسی اور کو فون کیا ہو؟" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "یہ بھی ممکن ہے لندن بہت بڑا شہر ہے۔"

"اپنے چک جھمرہ سے بھی بڑا؟"

میں نے کہا "ٹیکسی بھی ٹریفک جام میں پھنس جاتی ہے۔"

"چک جھمرہ کی طرح۔ وہاں بھی میں نے دیکھا تھا کہ ایک بیل گاڑی نے راستہ روک لیا تھا۔ دونوں طرف سائیکل سوار کھڑے تھے اور تانگے والے۔ گدھے گھوڑے' گائے بھینس اور بھیڑ بکریاں' بڑا سخت ٹریفک جام تھا۔"

دستک ہوتے ہی میرے دل نے سینے میں چھلانگ ماری اور میں یکدم ساکت ہو گیا۔ ایک آنکھ تھوڑی سی کھول کے میں نے اندر آنے والے کو دیکھا۔ چوہدری دلاور کا منحوس چہرہ دیکھ کے مجھے اس وقت وہی خوشی حاصل ہوئی جو انتظار میں سوکھنے والے عاشق کو محبوب کی صورت نظر آنے سے ملتی ہے۔ خوشی و غم سب بڑے عجیب جذبے ہیں۔ کبھی کوئی باپ کی موت پر بھی اندر سے خوشی

محسوس کرتا ہے کہ دولت' جائیداد اور مال و زر کے خزانے پر بیٹھا ہوا سانپ مر گیا بالآخر۔ اب عیش و عشرت ہے۔ کبھی حساس دل رکھنے والے زخمی کی المناک حادثاتی موت پر بھی دکھی ہو جاتے ہیں۔

چوہدری دلاور اکیلا نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ مجھے ایک اور شخص نظر آیا جو صورت سے اپنا ہم وطن ہی لگتا تھا۔ اس نے سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں میڈیکل بیگ تھا۔ چوہدری دلاور کو دیکھ کے مجھے نواب خسرو جمشید کی یاد آئی۔ اس نے کلف لگی سفید سی شلوار قمیص پر سیاہ شیروانی پہن رکھی تھی۔ سر پر کلف دار طرے والی پگڑی تھی اور اس نے بڑی بارعب قسم کی گھنی نوکیلی مونچھوں کے ساتھ سیاہ فریم والی عینک لگا کے اپنی شخصیت کو متاثر کن بنا لیا تھا۔

"لے بھئی۔ ادھر تو خیر سے معاملہ تیار ہے۔ اوئے سروارو..." چوہدری دلاور بڑے طمطراق سے قدم بڑھاتا آگے آیا۔

"سب خواب غفلت میں ہیں" ڈاکٹر نے کہا "سروار جی بھی۔"

بس وہی ایک لمحہ تھا جب میں نے مکار چیتے کی طرح شکار پر جست لگائی۔ ریوالور محسن کے پاس تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو لات رسید کی اور اسے دیوار سے لگا دیا "خبردار۔ آواز نکالی تو گولی اوپر سے جائے گی اور جان بھی... نکل جائے گی۔"

چوہدری دلاور مجھے اپنے مقابل پا کے منجمد ہو گیا تھا۔ حیرت اور صدمے کا پہلا ردِعمل بہت شدید تھا مگر اب اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

"بہت اچھے اپنے سکندرِ اعظم صاحب!" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مسکراتے ہوئے کہا "خوب چال چلی تم نے۔"

"چال تقدیر چلتی ہے چوہدری دلاور۔ آدمی کامیابی کو اپنی تدبیر سے اور عقل کی عقدہ کشائی سے منسوب کر لیتا ہے۔ ناکامی کو بدبختی کا نام دے کر مطمئن ہو جاتا ہے۔"

اس نے سروار جی کی طرف دیکھا "سکھ واقعی سکھ ہوتا ہے جی۔ بارہ بجے کا وقت تو ویسے ہی بدنام ہے۔ ان کی عقل کی گھڑی میں جو بارہ بجتے ہیں سوئیاں ایک دوسرے پر دوڑتی ہیں... ہیں جی کیا کہتے ہیں اسے "منطق۔""

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔ بات اسی وقت کی ہے۔ وقت کے اس لمحے کی ہے جس سے آدمی ساری عمر بھاگتا رہتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آدمی قسمت کو شکست نہیں دے سکتا۔ اس کا یقین تب آتا ہے جب اچانک وہ خود کو بند گلی میں پاتا ہے جیسے تم۔"

"بند گلی... یہ چنگا بھلا ٹھیک ہے جی۔ اور یہ گلی بھی..." اس نے مصنوعی شگفتگی کا سہارا لینے کی کوشش کی "یہ اپنے ڈاکٹر صاحب تو آئے تھے اپنا کام دکھانے۔"

"یہ دیکھنے کے لیے کہ کون کتنا بے ہوش ہے؟" یا...

www.paksociety.com

انجکشن وغیرہ لگا کے لمبی نیند سلانے کے لیے... محسن! اپنے ڈاکٹر صاحب کو بھی ادھر ہی لا کے بٹھا دے۔ تم بھی بیٹھو دلاور! بہت عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ یہاں مداخلت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔"

ڈاکٹر کسی مزاحمت کے بغیر اس صوفے پر بیٹھ گیا جس پر کچھ دیر پہلے میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھا۔ کسی سے اجازت لیے بغیر اس نے میز پر سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھا لیے۔

محسن نے اسے خبردار کیا "یہاں تم اس وقت سانس بھی ہماری اجازت سے لو گے۔ پھر ایسا رسک مت لینا۔"

میں نے کہا "غالباً تم ڈاکٹر شاہ ہو؟"

اس نے سگریٹ جلا کے اقرار میں سر ہلایا "اب میرے پاس برطانوی شہریت ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا۔"

محسن نے اس کے منہ پر لات ماری۔ سگریٹ اس کے منہ میں گھس گئی اور اس کا چشمہ غائب ہو گیا۔ اس نے کراہ کے اپنا ہاتھ منہ سے بہنے والے خون پر رکھا اور بولا "مجھے مار کے تم بچ نہیں سکتے۔"

محسن نے اس کو دوسری لات ماری جو اس کے پیٹ میں لگی۔ "ہم نے بہت سے بھاگنے والے کتے مارے ہیں اور ابھی تک مار رہے ہیں۔ تم جس ملک کے بھی شہری ہو اس کے لیے باعث شرمندگی ہو۔ کیا برطانوی شہری ہیں کہ تم اس ریوالور کی ایک گولی کے مستحق نہیں رہے۔ یہاں تم بے عزت موت مرو گے۔ اپنے پاکستان میں ہوتے تو میں ان سب کو دعوت دیتا جن کو تم نے وزیر خان ٹرسٹ اسپتال میں داخل کیا۔ پاگل کرنے کے لیے۔ پاگل بنا کے مار دینے کے لیے۔ میں ان سب سے کہتا اور ان لوگوں کو بلاتا جنہوں نے تمہیں اس کام کا منہ مانگا معاوضہ ادا کیا تھا اور اس کے باوجود بلیک میل ہوتے تھے۔ ان سب کے سامنے تمہیں بھوکے پاگل کتے چھوڑ دیتا جو تمہاری ہڈیاں تک چبا کے ہضم کر جاتے۔"

میں نے کہا "چوہدری دلاور! شاید اب یہ بازی تمام ہونے کو ہے۔ تمہارے ترکش میں اب کوئی تیر نہیں۔ شکار گاہ میں تم اکیلے ہو۔"

اس نے بگڑی اتار کے میز پر رکھ دی پھر مونچھیں الگ کر کے پھینک بھی اتار دی۔ "چوہدری دلاور مر گیا ہے۔ [illegible] اپنے سکندر اعظم سے بھی بات ہوئی تو تم مجھے کب کا مار چکے ہوتے اور میں نے بھی وہ ایک گولی موت سے پہلے خرچ کر دی ہوتی۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "کون سی گولی؟ چھپ... اسے مارنے والے کا نام ہوتا ہے۔ اپنے ہی ہر گولی پر مرنے والے کا نام۔ کیا تم نے کبھی سکندر رنجیت لکھا ہوا دیکھا تھا۔"

"کیا تم نے چوہدری دلاور کا نام لکھوایا ہے کسی گولی پر...؟"

"تب... یہ نام انسان کے ہاتھ میں نہیں... [illegible] لکھا ... کبھی بات ... ہے کہ میں نہیں جانتا کہ وہ گولی کہاں ہے اور

کس ریوالور میں ہے۔"

"تاہم تم کو سوچنا چاہیے کہ کہیں سواری کے ریوالور میں کوئی موجود نہ ہو" محسن نے کہا۔

"ایسی باتوں سے کیا حاصل۔ اپنے سکندر صاحب نے اپنے سارے پتے میز پر رکھ دیے۔ اب میں بھی فائدہ... چوہدری دلاور کے پاس ڈگری نہ سہی عقل ہے اور تجربہ ہے جو کہتی ہے کہ جنگل میں شکاری کو اپنی آنکھیں ہر طرف رکھنی چاہئیں۔ آگے پیچھے دائیں بائیں اوپر نیچے بھی۔ اور ہر راستے پر نیزہ ماپنا چاہیے۔ تجربہ یہ ہے کہ کسی حصار میں داخل ہونے سے پہلے اسے توڑنے کے اسباب مہیا کر لو۔ اندر جانے کا راستہ ایک ہو تو واپس باہر آنے کے دو راستے بناؤ۔"

"اس فلیٹ کا تو ایک ہی دروازہ ہے" میں نے کہا "جس سے تم اندر آئے تھے۔ دوسرا راستہ کھڑکی سے باہر چھلانگ لگانے کا ہے۔"

وہ مسکرایا "سیانا کمانڈر ساری فوج ایک ہی محاذ پر ایک بار نہیں جھونکتا۔ وہ دوسری دفاعی لائن تیار رکھتا ہے۔"

"تم مجھے بتانا چاہتے ہو کہ... [illegible] میں اور تم کو ... تو وہ توپ خانے کے ... پولیس کو مطلع ... اپنے چوہدری صاحب کو ... ہے۔ نہیں وہ وقت کر چکے ہوں۔"

"یہ تمہیں بھی اندازہ کر لینا چاہیے تھا" دلاور بولا۔

"تمہیں... مجھے بتاؤ وہ کہاں ہیں۔ میں انہیں اوپر آنے یا پھر نیچے جانے... تاکہ وہ تمہارے مقدر ... کریں۔" میں نے کہا "تمہیں معلوم تو ہونا چاہیے کہ تم کیا چاہتے ہو۔ زمین میں گاڑا جانا یا جلایا جانا۔ جلائے جانے میں تمہارا فائدہ ہے کہ بعد میں کوئی تمہارے مدفن پر آ کے تھوکے گا نہیں۔ مغفرت کی دعا کا تو سوال ہی نہیں۔ دعا مانگی جاتی ہے امید پر۔ شیطان کی بخشش کون مانگے گا۔ میں بھی یہی مناسب ... اگر تم راکھ ہو جاؤ۔ پاکستان کی پاک مٹی کو اپنے وجود سے نجس کرنے کا گناہ بعد از مرگ..."

"بند کرو یہ فضول بکواس سکندر رنجیت..." دلاور ... بالآخر جواب دے گیا "تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔"

میں نے کہا "وقت تم نے بہت ضائع کیا ہمارا اور اپنا۔ اصل کو شغل میں صرف کرتے رہے۔ وقت نے ... خدمت لیا؟ کیونکہ قدرت اپنا دستور نہیں بدلتی۔ ... ازل سے جاری ہے مگر تم کیسے ... ہو کہ آج بھی دنیا ... پرستار نہیں ہیں۔ سوائے تم جیسے مردودوں کے۔ خدا کی ... رہا تمہارا ... اور زندگی کی ہار نہیں..."

وہ ... سے مسکرایا "آپ فلسفی صاحب! ... تم ... مر کے ... رہتے ہیں ... تمہیں شرمندگی ... ان کی ... حقیقت ... کی جدوجہد ہے۔ دنیا میں ...

چھٹکارا ہے مگر سانپ اور بچھو بھی جینا چاہتے ہیں۔ خواہ سب ان کے دشمن ہوں اور انہیں مار دینا چاہتے ہوں مگر وہ زندہ ہیں۔ ہر جگہ ... بلبل کی آواز پر شاعروں نے دیوان بھر دیے تو کیا ہوا۔ ... لال کا کیڑا کام نہیں کر رہا ہے۔ پھول گلشن میں ہیں تو کانٹے ... مرتے نہیں کہ ہمارا وجود سب کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے تو کیا ... ہمارا حق بھی اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی جدوجہد ہے..."

میں نے حیرانی سے کہا "دلاور! تم بالکل نئی زبان بول رہے ہو ..."

"زبان حالات کی بولی ہوتی ہے سکندر!" دلاور نے کہا "میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا کہ آؤ ہم مل کے جینے کی راہ نکالتے ہیں۔ بے شک یہ بہت مشکل تھا اور ناممکن لگتا تھا مگر تم نے کوشش کرنے کی ضرورت کو بھی تسلیم نہیں کیا۔ میں نے تو معافی تلافی کی راہ بھی دکھائی مگر تم نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں اپنی غلطی مان چکا تھا۔ ... تم سے دست بستہ معافی مانگنے کے لیے۔ تمہارے نقصان پر ... کے لیے تمہارا نقصان پورا کرنے کے لیے اور ... کے لیے بھی تیار تھا مگر بات کیا ہے اپنے سکندر اعظم صاحب ... تم ... میرے جیسے عام انسان ہو۔ ... معاف کر ... کا زہر نہیں ... تمہارے ... اور نہ تمہاری فطرت میں عفو و درگزر کی علامت ... صرف تم جینے کا حق دے کر خود ... تم ... سوار تھا تو میں تمہارا بھوت کیسے اتارتا ... سکندر! تم بھی وہی کر رہے تھے جو ... کر رہا تھا۔ تم ... کے لیے لڑ رہے تھے تم بھی شکست سے بھاگ رہے تھے ... تھے کہ ... طاقتور زیادہ ... اپنی ... "

میں نے کہا "شاید ... تم نے مجھے ... سے قائل کیا ہے مگر اب یہ ... میں ان باتوں سے متاثر ہونے ... تم ... قانون کے حوالے کرتے ... کیا تھا میں اس پر قائم ہوں۔ قانون ... ہے۔ تم خود ای قانون کی وجہ سے بچنے کے ... بات کرتے ہو ... تمہارا اپنا قانون ہوتا ہے ... بدلہ ... قانون ... واپسی ہے۔ تم اپنے ... سے ... ہو۔ ... کے تحت اور ... کے ... حق ... سے شروع ہو جاتا ہے اور پھر ... ہے ... ہے اور کیا نہیں کرتا ہے یہ ... ہم ... ہے ... ایک ... اصول ہیں۔ تم ... رات کو ... نہیں ... ہے ... تمہارا ... ہو جاتی ہے ... زندگی ... اس سے زیادہ ...

نہیں ہوتی۔ شرائط کی خلاف ورزی پر خود انسان کے ہاتھ انسانوں کو زندگی سے بے دخل کر دیتے ہیں۔ سزائے موت قاعدے قانون اور اصول کے مطابق دی جاتی ہے۔ دفاع کرنے کا حق تمہیں حاصل رہے گا مگر تمہارا مقدمہ اس دنیا کی عدالت میں پیش ہوگا چوہدری دلاور جس سے تم نے سب کچھ حاصل کیا۔ زبردستی چھینا خود کو زیادہ طاقتور سمجھتے ہوئے کسی کو اس کے حق سے محروم کیا۔ مثلاً میرے والد کو... تم اتنے طاقتور نہیں تھے دلاور جتنا خود کو سمجھتے تھے۔ تم ساری دنیا سے دنیا کے قانون سے اور موت سے اکیلے نہیں لڑ سکتے تھے اور جب یہ حقیقت تم پر عیاں ہوئی تو تمہارے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ تم فرار کی دفاعی جنگ لڑو۔ فرار کے بعد پھر فرار۔ مگر جیسا کہ میں نے کہا بالآخر تم ایک بند گلی میں پہنچ گئے ہو کیونکہ وہ لمحہ جو فیصلہ کرتا ہے آ گیا ہے۔"

"یہ تم کیسے جان سکتے ہو۔ ایسا تم نے پہلے بھی کئی بار سوچا اور کہا تھا" دلاور نے کہا۔

"تم نے لندن تک ہمارا پیچھا کیا۔ جارج کو مروانے کی کوشش کی۔ ہمیں مجرم بنانے کے لیے خود جرم کیے۔ اس جگہ کو میری ... [illegible] ... بالآخر میں نے وصول کیا۔ باقی تم اپنے ساتھ لائے ہو گے۔ معافی کر کے وہ محسن کو دے دو۔"

"اس کے لیے مجھے جیب میں ہاتھ ڈالنے ہوں گے۔ جیب میں ریوالور بھی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم کوشش کرو ہمیں شوٹ کرنے کی۔ ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کا فرق بھی بہت ہوتا ہے۔ سو یا ہزارویں حصے کی پیمائش تو ممکن نہیں مگر شاید اسی فرق کے ساتھ محسن کی گولی سبقت لے جائے گی۔ فیصلہ تو مالک کرتا ہے۔ تمہارے دماغ نے یہ فیصلہ کرنے سے پہلے کہ مرنے سے پہلے اور وہ گولی تمہارے دماغ میں گھس کے سب کھیل ختم کر دے گی۔ تمہیں عقل دوڑانے کی مہلت ہی کہاں ملے گی۔"

چوہدری دلاور کی اس بات کو میں نے اتمام حجت قرار دیتے ہوئے قابل غور نہیں سمجھا تھا کہ اس نے کچھ ساتھی بیچھے بھی کسی اس کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں لیکن درحقیقت میں اس خیال سے مضطرب تھا کہ کہیں بچھ رہے میں وہ دندناتے ہوئے اوپر نہ آ جائیں۔ یا پولیس کو مطلع نہ کر دیں کہ دلاور کہاں ہے اور اس کو کیا ہوا ہے؟

ہم اپنے وطن میں ہوتے تو کسی مشتبہ شخص کا سراغ لگانا بھی ناممکن ہوتا کہ گروہوں کے دیس میں ہم جیسے کالے ابھی تک آئے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھے۔ ہوس دولت شہرت اور کثرت اولاد سے مسلم اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کرانے کا طویل المیعاد منصوبہ ... انگلستان کو پاکستان بنانے کا خواب ابھی تھا جیسے ایک انڈے سے مرغی اور مرغی خانے کے منافع سے ... خانہ، ... خانے کی آمدنی سے کارخانے قائم کر کے ... ساری صنعت و تجارت کا مالک بن جانے کا خیال۔ شیخ

www.paksociety.com

کے محافظ موجود تھے تو با آسانی شناخت کیے جا سکتے تھے۔

میں نے محسن سے فرنچ میں کہا "تم یہ توپ میرے حوالے کر اور ذرا نیچے جا کے گرد و پیش کا شرلاک ہومز کی نظر سے جائزہ لے۔"

"یہ خاصا مشکل ہوگا۔ وہ تو مجرم یا مُزارع کے سوا کچھ دیکھتا ہی نہیں تھا اور میری خطا کار نظر بھٹک جاتی ہے۔ کسی کافر حسینہ کے بال یا گال' خال اور چال...."

"اگر تجھے کوئی بدمعاشوں کے اسٹائل میں کھڑا دکھائی دے جو اِدھر اُدھر سے زیادہ اوپر دیکھنے میں مصروف ہو اور صورت سے ایشیائی لگتا ہو تو اس کو پیغام دینا کہ اپنے چوہدری صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ اوپر آ کے وہ بھی پائے کھاتے جیسے ڈاکٹر شاہ نے دو لاتیں کھائی ہیں۔"

"اور اگر وہ اُلٹا میرے سری پائے الگ کرنے پر آمادہ ہو؟"

"تو حافظ خدا تمہارا۔ تیرا خون رائگاں نہیں جائے گا۔ تو شہید کہلائے گا اور تیرا مزار شریف ولایت میں بنے گا۔ یہ اعزاز حاصل کرنے والا اپنے خاندان کا پہلا شخص تو ہوگا۔"

محسن نے ریوالور مجھے تھمایا اور بولا "اگر میں واپس نہ آؤں تو یہ مت سمجھنا کہ مجھے کوئی میم ورغلا کے بھگا لے گئی' گل کو بھی سمجھا دینا۔"

میں نے دلاور کو مخاطب کیا "خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اگر آج ہم لوٹ گئے ہوتے تو تم سے شرفِ ملاقات کیسے حاصل ہوتا۔ ہم جسے اپنی بدقسمتی سمجھ رہے تھے وہ تمہاری بدقسمتی تھی۔"

"کیا معلوم اب بھی قدرت کو کیا منظور ہے۔ تم کیسے جان سکتے ہو۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "سچ کہا تم نے۔ اس کے باوجود ہم سب اپنے ارادوں پر اُمید کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ اب تمہارا یہ سکھ دوست چاہتا تھا کہ اپنی پرانی موریس مائنر کے بدلے بیس ہزار پاؤنڈ میں نئی گاڑی خرید لے اور آدھی گاڑی تو خرید ہی چکا تھا۔ تمہیں یہاں لانے اور کافی پیش کرنے کے بعد کسی برانڈ نیو لگژری کار کی سواری کا لطف اس کے لیے تصور سے حقیقت بن گیا ہوگا۔ مگر اس نے تمہیں مایوس کیا۔ خیر' آج کل تمہارے ستارے گردش میں ہیں۔ ہر قدم پر مایوسی کا سامنا ہوتا ہے۔ تم نے جارج کو مارنے کی کوشش کی۔ سکندر بخت بن کے جیل میں بھی پہنچ گئے اور اسے زہر آلود سگریٹ پلانے میں بھی کامیاب رہے مگر وہ پھر بھی بچ گیا۔ یہی نہیں' اس نے تمہیں پہچان بھی لیا۔ اور آئندہ بھی تمہیں وہی ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے شناخت کرے گا۔ ہم نے تمہیں ایک مہاراجا کے روپ میں بھی شناخت کر لیا تھا۔ محسن نے تمہیں راجا گرگالی رائے آف قلاتی پور کا خطاب دیا تھا کیونکہ تم رولز رائس سے نہیں ایک ٹیکسی سے اُترے تھے مگر ہم تمہاری تلاش سے مایوس ہو چکے تھے اچھا ہوا جو تم خود ہی آ گئے۔"

"ابھی تک یہ ملاقات بے مقصد ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "ایک مقصد تمہارا تھا۔ وہ پورا نہیں ہوا۔ ہمارا مقصد ہمارے سامنے ہے۔ اللہ اس میں کامیاب کرے۔ بظاہر مشکل لگتا ہے مگر ناممکن نہیں۔"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" دلاور کے لہجے میں شکست بول رہی تھی۔

"ہمارا کوئی خفیہ منصوبہ نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم کو واپس پاکستان لے جائیں اور تم جس کی امانت ہو اس کے حوالے کر دیں۔ تم قانون کو دھوکا دے کر بھاگ آئے تھے۔ تمہیں قانون کی تحویل میں ہونا چاہیے۔"

"اور تم۔ کیا تمہاری اور میری پوزیشن مختلف ہے؟"

"ہاں۔ تم نے اپنی الزام تراشی سے جھوٹ اور فریب سے قانون کو یقین دلا دیا تھا کہ ہم بھی مجرم ہیں۔ جرم تمہارے تھے جو ہم سے منسوب کرانے میں تمہاری کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ جب محاورے کے مطابق دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگا تو ہم بھی شور مچائیں گے کہ مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے... اور تمہارے لیے پسماندگان فاتحہ پڑھیں گے۔"

وہ زہریلے انداز میں مسکرایا "اور تم یہ کارنامہ کیسے سرانجام دو گے؟ مجھے یہاں سے واپس پاکستان لے جا کے قانون کے حوالے کرنے کا؟"

"اس کے بہت سے طریقے ہیں۔ آسان کوئی بھی نہیں۔ ایک یہ کہ ہم تمہیں دلائل سے قائل کریں کہ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ آخرت کے دائمی عذاب سے اسی دنیا میں اپنے کیے کی سزا قانون کے مطابق بھگت لینا بہتر ہے۔ یہ تو فائدے کی بات تم نہیں سنو گے۔ دوسرا طریقہ ہے تم کو جادو کے ذریعے یہاں سے وہاں پہنچا دینا۔ کوئی ایسا زبردست جادوگر مل جائے جو بس ایک بار اپنی چھڑی گھمائے اور شوں۔ تم لندن کے اسی فلیٹ سے لاہور کی جیل میں۔ اسی کوٹھری میں جہاں سے تم فرار ہوئے تھے لیکن ظاہر ہے جادو وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ ابھی تک کوئی ایسا جادوگر بھی نہیں آیا جو سالم آدمی کو بلا ٹکٹ سات سمندر پار پہنچا سکے۔ چنانچہ ہم خود یہ کام کریں گے۔ تم کو کسی لوہے کی بکس یا تابوت میں پیک کر کے لے جائیں گے۔ ایک پیس میں نہ لے جا سکے تو تمہارے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کریں گے۔"

محسن نے اوپر آ کے اعلان کیا "نیچے سب لوگ مشتبہ لگتے ہیں۔ مجھے تو ان میں آدھی عورتیں ہیں جو کسی مرد کے ساتھ کہیں جا رہی ہیں اور آدھے مرد ہیں جو باقی آدھی عورتوں کے ساتھ کہیں جا رہے ہیں لیکن وہ سب ملوث لگ رہے ہیں۔ اپنے ہندوستانی پاکستانی کا کوئی نہیں' صرف ایک شخص تھا۔"

"وہ کون تھا؟" میں نے کہا۔

"میں... مگر میں بھی اب اوپر آ گیا ہوں" محسن بولا۔

ڈاکٹر شاہ نے اپنی مدد آپ کے تحت خود کو مناسب طبی امداد فراہم کی تھی اور اب دخل در معقولات نہ کرنے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ شاید اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہاں اس کا استقبال لاتوں کے بھوت کی طرح کیا جائے گا جو باتوں سے نہیں مانتے۔ مجرمانہ سرگرمیوں میں دلاور کا ساتھی ہونے کے باوجود وہ ڈاکٹر تھا اور کسی بھی مجرم کے لیے اپنا مستقبل تاریک نہیں کر سکتا تھا۔ وقتی طور پر پیسے کا لالچ کسی بھی وکیل' انجینئر' صحافی یا ڈاکٹر کو غیر قانونی معاملات میں ملوث کر سکتا ہے مگر کسی معزز پیشے سے وابستہ شخص صرف پیسے کی خاطر جرائم کی زندگی قبول نہیں کر سکتا۔ دلاور کا ساتھ دینا ڈاکٹر شاہ کی مجبوری بن گیا تھا یا اسے بہت آسانی سے ملنے والی دولت کے انبار نے اپنی اخلاقی ذمے داریوں سے دور کر دیا تھا۔ اس کا مجھے علم نہیں تھا مگر اس کا لاہور سے لندن پہنچ کے برطانوی شہریت حاصل کر لینا یہی ظاہر کرتا تھا کہ ڈاکٹر شاہ نے خود کو چوہدری دلاور کے چنگل سے آزاد کرا لیا تھا اور اس دلدل سے نکل آیا تھا جس میں اس کے پیشے کی آبرو اور خود اس کی جان کو خطرہ لاحق تھا۔

چوہدری دلاور اس وقت اکیلا اور تہی دست تھا۔ اس کی جیب میں جو کچھ تھا وہ میز پر آ گیا تھا۔ محسن نے اس کی شیروانی اتروالی تھی۔ شیروانی کی جیبوں میں سے دس ہزار پاؤنڈ کے نوٹوں کے علاوہ ایک ریوالور بھی برآمد ہوا تھا۔ ایک پاسپورٹ پر اس کی تصویر داڑھی مونچھوں اور طرۂ دستار کے ساتھ تھی۔ اس نے غیر شعوری طور پر اپنا نام بدلا تھا اور نواب خسرو جمشید کر لیا تھا۔ اپنا حلیہ آئینے میں دیکھ کے اسے بھی یہ خیال ضرور آیا ہوگا کہ اس میں اور مرحوم نواب صاحب کی شباہت میں کتنی مماثلت ہے۔

میں نے پاسپورٹ کا معائنہ کرتے ہوئے طنز سے کہا "نواب آپ مہاراجا گرگالی رائے آف قلاتی پور نہیں بلکہ نواب خسرو جمشید ہیں۔ اچھا طریقہ اختیار کیا تم نے ایک پرانے ساتھی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا۔ جعلی پاسپورٹ بنوایا تو اس کا نام لکھوایا جو اس دنیا میں ہی نہیں ہے۔"

"آپ سکندر اعظم صاحب! یہ پاسپورٹ اصلی ہے۔ غور سے دیکھو۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ نواب خسرو جمشید کا اصلی پاسپورٹ تھا۔ چوہدری دلاور نے اپنی صورت کو تصویر کے مطابق بنایا تھا۔ پانچ سال کے لیے جاری ہونے والا پاسپورٹ مزید ایک سال تک کارآمد تھا۔ یہ ہمارے دفتری نظام کا قصور کم تھا عوامی شعور کا زیادہ۔ جائیداد کی تقسیم میں وراثت کا مسئلہ نہ ہو تو کوئی ڈیتھ سرٹیفکیٹ تک حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ مرجانے والے کا نام نہ راشن کارڈ سے خارج ہوتا ہے نہ ووٹرز کی لسٹ سے۔ اس کا راشن کارڈ' پاسپورٹ' شناختی کارڈ' ڈرائیونگ لائسنس منسوخی کے لیے متعلقہ محکموں کے حوالے نہیں کیے جاتے۔ چنانچہ MISUSE بھی ہو جاتے ہیں۔ دروغ برگردن راوی۔ مشہور تو یہ بھی ہے کہ بہت سے مر کے خاک ہو جانے والوں کی پینشن جاری رہتی ہے اور خرد برد ہوتی رہتی ہے۔ ان کے نام پر واجب الادا قرض کوئی ادا نہیں کرتا مگر نئے قرضے جاری ہو جاتے ہیں اور امداد وصول کر لی جاتی ہے۔

چوہدری دلاور نے دوسرا زیادہ خطرناک اسلحہ شیروانی کے نیچے شلوار کی ڈب میں چھپا رکھا تھا۔ گھیردار شلوار میں ایک خفیہ قسم کی اضافی جیب سے سائلنسر والا آٹومیٹک ریوالور برآمد ہوا جو شاید چوہدری دلاور کی آخری امید تھا۔ اس سے محروم ہوتے ہی مایوسی کی شام کا دھندلکا ناامیدی کی تاریک رات بن کے اس کی صورت پر پھیل گیا۔

میں نے دوسرا ریوالور محسن کو دے دیا۔ اب ہم دونوں مسلح تھے۔ چوہدری دلاور کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں خالی ہاتھوں سے بھی اس کی گردن مروڑ سکتا ہوں جیسے عورت کے نازک ہاتھ دُھلی ہوئی ریشمی قمیص کو پانی نچوڑنے کے لیے مروڑتے ہیں۔

"سکندر۔ مجھے ایک موقع اور دو۔ کم سے کم میری بات سنو اور پھر سوچو۔ میرا اور تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ..."

میں نے اسے گریبان سے پکڑ کے اٹھایا اور دیوار پر دے مارا "فائدے اور نقصان کی بات بھول جاؤ دلاور۔ آج فیصلے کی رات ہے۔ یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی نہیں اور کسی کے یہاں نازل ہونے کا بھی امکان نہیں۔ اگر تم کسی کو بتا کے آئے ہو کہ تم کہاں جا رہے ہو تب بھی شاید یہاں کوئی نہ آئے۔ اگر آیا تو یہ اس کی بدقسمتی ہوگی۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔"

"مگر مجھے جلدی ہے۔ میرے پاس وقت کم ہے" دلاور نے دُکھی لہجے میں کہا۔

"شیروانی صاحب۔ اپنے چوہدری صاحب کو صبح کی فلائٹ پکڑنی ہے۔"

ڈاکٹر شاہ نے کہا "کیا میں کچھ کہہ سکتا ہوں۔"

"کہو۔ بس یہ خیال رکھنا کہ جھوٹ تمہیں نہیں بچا سکے گا" میں نے کہا۔

محسن بولا "ہم خود بھی تم سے بہت کچھ پوچھتے۔ اچھا ہے اگر تم رضاکارانہ طور پر سب سچ بتا دو۔"

"میں جھوٹ بولنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ یہ تمہاری مرضی کہ میرے سچ کو جھوٹ سمجھو" ڈاکٹر شاہ نے کہا "جب میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے اپنی شہریت بدل لی ہے تو مقصد یہ بتانا تھا کہ میں ان معاملات سے لاتعلق ہو گیا ہوں۔ جو مجھے پاکستان میں کرنے پڑے تھے۔"

"کیونکہ تم مجبور تھے" میں نے مصنوعی انداز میں اظہارِ ہمدردی کیا۔

"مجبوری کیا ہے۔ حالات کا تقاضا یا منہ زور خواہشات کا غلبہ۔ مجھے نہ کسی نے جان سے مار دینے کی دھمکی دی تھی'

www.paksociety.com

بلیک میل کیا تھا۔ دلاور کا ساتھ دینے سے پہلے میں نے ویسی ہی زندگی گزاری تھی۔ جیسی سب گزارتے ہیں۔ تم نے بھی گزاری ہوگی۔"

محسن نے اس کی تردید کی "ہم نے جو کچھ کیا' وہ سب نہیں کرتے۔"

"خیر۔ میں مجبور ہوگیا تھا' مسلسل ناکامیوں سے۔ ڈاکٹر بننے کے بعد مجھے ایک سرکاری اسپتال میں نوکری ملی۔ وہاں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں ہر نوجوان پُرعزم اور جوشیلے ڈاکٹر کی طرح میں نے اصولی' اخلاقی اور قانونی موقف اختیار کیا۔ اس کی سزا مجھے یوں دی گئی کہ ایم ایس نے میرا ٹرانسفر ایک دور افتادہ گاؤں کی ڈسپنسری میں کرادیا جو لوکل ہیلتھ یونٹ کے نام پر بنا ہوا ایک خالی کمرا تھا۔ کرسی میز کے بغیر میں کام کرسکتا تھا مگر دوائیں' آلات اور علاج معالجے کی بنیادی سہولتیں بھی فراہم نہ ہونے کے باعث وہاں میرا وجود بے مصرف تھا۔ مقامی مولوی صاحب کے 'تعویذ' پیر صاحب کے آستانے کی خاک اور نیم حکیم صاحب کے نسخے زیادہ شفا بخش مانے جاتے تھے۔ میں تین ماہ بعد لوٹ آیا۔ لاہور جیسے شہر میں اپنا کلینک بنانا اور چلانا آسان کام نہیں۔ ہر جگہ پرانے ڈاکٹر بیٹھے ہوئے ہیں جن کے ہاتھ کی شفا پر لوگوں کا اعتبار ہے یا بڑی بڑی ڈگریوں والے اسپیشلسٹ ہیں جو میرے جیسے عام ڈاکٹروں کو اپنا اسسٹنٹ بنا کے کمپاؤنڈر کا کام لیتے تھے۔ اس وقت مجھے اتنے سہارے کی ضرورت تھی جس سے میں کسی خوشحال آبادی میں شاندار اسپتال قائم کرسکوں۔ اسپتال نہ سہی ایک ایسا کلینک بنالوں جہاں آکے مریض متاثر ہوجائے کہ ڈاکٹر زبردست نظر آتا ہے۔ میری اپنی شخصیت میں کوئی کمی نہیں تھی۔ ساری بات چانس ملنے کی تھی جو تقدیر فراہم کرتی ہے۔ تقدیر نے مجھے چوہدری دلاور سے ملوادیا اور اس نے مجھے مطلوبہ رقم فراہم کرنے کی ہامی بھرلی۔"

"مطلوبہ رقم سے کچھ واضح نہیں ہوتا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ دلاور نے بھی یہی کہا تھا کہ تم میرے کہنے پر عمل کروگے تو سب کچھ پالوگے۔ عالی شان مطب' عالی شان کوٹھی۔ عالی شان کار۔ جیب میں مال ہو تو دنیا میں کامیابی بھی خریدی جاسکتی ہے اور میں نے بھی سوچا کہ اصل مقصد تو منزل کا حصول ہے۔ وہ سیدھے راستے پر چل کے ملنے کی امید نہیں تو پھر کیا بھی کیا جاسکتا ہے۔ میں نے وہ کیا جو میرے پیشے کی تقدیس کے نام پر ایسی ہی تہمت ہے جیسے عورت کے نام پر طوائف ہونے کی۔ میں بھی طوائف بن گیا۔ آبرو اگر جسم کی ہوتی ہے تو پیشے کی بھی ہوتی ہے۔ کوئی جسم بیچے' آبرو یا اصول اور ایمان۔ کیا اسے طوائف کہنا غلط ہوگا۔ ایک سال تک میں وہاں رہا جس کو میں طوائف کے کوٹھے سے زیادہ قابل نفرت جگہ کہوں گا۔ میں نے وہ کیا جس پر مجھے آج اس سے زیادہ شرم آتی ہے جتنی تمام عمر جسم فروشی کرنے والی عورت کو بڑھاپے میں آتی ہوگی۔ شاید نہ آتی ہو کیونکہ اس کا تو ... ہی مرچکا ہوتا ہے مگر میرا احساس زندہ تھا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ یوم حشر وہ سب میرا دامن پکڑیں گے جو میرے پاس لائے گئے تھے تو نفسیاتی مریض بھی نہیں تھے۔ وہ ناخلف اولاد یا بیوی بچوں کی گرمی جیسے رشتے داروں کے ہاتھوں ذہنی طور پر ... تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ یہ سب ان سے سب کچھ چھین لینا چاہتے ہیں۔ ان کی تمام عمر کی کمائی اثاثے یا ان کی جائداد پر قبضے کے لیے ان کو مارنا چاہتے ہیں۔ وہ وہم کے مریض ہوکے خود ... انہیں علاج کے لیے لانے والوں نے کہا کہ بڈھا سٹھیا گیا ہے لاکھوں دبائے بیٹھا ہے لیکن پائی پائی شمار کرتا ہے اور کروڑ بھی خرچ ہوجائے تو واویلا کرتا ہے۔ کسی کو اس کا جائز حق دینے پر آمادہ نہیں۔ کہتا ہے میری زندگی میں سب میرا ہے۔ بعد میں تم سب مل کے جو چاہو کرنا تو ڈاکٹر صاحب! اب آپ ہی کریں۔ کیا فائدہ ایسی معذوری کی زندگی کا۔ اتنی بیماریاں ہیں اور تیمار دار بھی عاجز ہیں۔ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے کہ ... سب کا ... حرام کردے... میرے حوصلہ افزا رویے کے بعد وہ کھل کے مطلب کی بات کرتے تھے۔ ایسی صورت ہو کوئی کہ ... بھی چھوٹے اور ان کی بھی۔ میں انہیں صاف بتادیتا تھا کہ قتل جرم ہے مگر ہاں' اگر یہ نفسیاتی مریض ہیں تو پھر یہ یہاں رہیں گے اور ہم انہیں سکون سے خود مرجانے کے مواقع فراہم کریں گے' آپ کے خرچ پر۔ یہ ٹھیک نہیں ہوں گے' زیادہ پاگل ہوجاتے ہیں اور ... کے ورثا قانونی طور پر حق وراثت حاصل کرسکتے ہیں۔ وہ ... اخراجات کے علاوہ میری فیس ادا کرتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ دلاور ان کو بلیک میل بھی کرتا ہے۔ میں تو آمدنی کا نصف ان کے حوالے کررہا تھا۔ وہاں ایسی وفادار شوہر پرست مگر بدصورت جاہل اور بدکردار بیویاں بھی تھیں جن کے شوہر ... خریدنا چاہتے تھے۔ وہ دولت مند ہوگئے تھے اور یہ پرانی ... کی جان نہیں چھوڑتی تھیں۔ انہوں نے ... معاوضہ ... کیا... اور یوں میں نے سب کچھ کرلیا۔ لاکھوں جمع کرلیے مگر

مجھے معلوم تھا کہ میں دلاور کے چنگل میں پھنسا ہوا ہوں اور جب ... میں نے اس سے اپنے ارادے کا اظہار کیا کہ بس بھئی اب بس ہوگیا یہ ضمیر فروشی کا دھندا۔ اب میرا اور تمہارا راستہ الگ ہے ... اسپیشلسٹ بنوں گا۔ تو دلاور کہتا کہ ایسے تم کہاں جاسکتے ہو ... شاہ۔ تو سوچ ہے کھائے کی چج کو جاسکتی ہے بھلا؟ خاموشی سے ... کام کرتے رہو... اور اس ورنہ کے خوف سے میں نے اپنے اصل عزائم کو دلاور سے پوشیدہ رکھا۔ میں نے لندن میں اپنے دوستوں کی مدد سے رائل کالج آف فزیشن میں درخواست ... نہیں جمع کرادی۔ ایک اور دوست نے اپنے وسیلے سے مجھے ... شہریت دلوادی اور میں ایک دن اچانک سارا سرمایہ سمیٹ کر ... پہنچ گیا۔ ایک ڈاکٹر! ایک پاکستانی ڈاکٹر یہاں گمنام اور ... رہ سکتا ہے۔ چوہدری دلاور نے آسانی سے میرا سراغ لگالیا۔"

میں نے کہا "کیا چوہدری صاحب لندن میں بھی ... کاروبار شروع کرنا چاہتے تھے۔ جس قسم کے مریض اور ... اپنے لاہور میں آجاتے تھے ویسے تو یہاں بھی بہت ہوں گے' ہر جگہ ہوں گے۔"

"یہاں بھی بہت کچھ ہوتا ہے مگر جتنی قانون کی گرفت سخت ہے اس سے زیادہ یہاں معاشرے کی اخلاقی گرفت ہے۔" وہ بولا۔

"پھر بھی تم بلیک میل ہونے سے انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے؟" محسن نے کہا۔

اس نے چوہدری دلاور کی آتش فشاں نظروں کو نظرانداز کردیا "یہاں میں اپنا مستقبل تباہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں ایم آر سی پی کرچکا ہوں۔ میں ... فزیشن بن گیا تو اپنے سابقہ گناہوں کی تلافی کرلوں گا۔ اگر آج یہ بات کالج کی انتظامیہ کو معلوم ہوجائے..." وہ خاموش ہوکے خلا میں گھورنے لگا۔

"تو تمہیں کالج سے ہی نہیں' شاید برطانیہ سے ہی نکال دیا جائے گا۔ چنانچہ تم نے دلاور سے کہا کہ اچھا۔ آخری بار۔ اور اس نے بھی کہا کہ ہاں یہ آخری کام ہے۔ یہ کیا کام تھا؟" میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے دلاور کی طرف دیکھ کے ٹھنڈی سانس لی "اگر میں انکار کروں تو تم بھی وہی دھمکی دوگے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ ہم زبانی دھمکی کو کافی نہیں سمجھتے۔ ہمارے پاس معقول جواز ہے تمہیں سزا دینے کا۔ تم لوگوں کی زندگی سے کھیلتے رہے' ایک ڈاکٹر ہوکے بھی انسانوں کو دکھ دیتے رہے اور انہیں دنیا کے سامنے تماشائے عبرت بناتے رہے۔ کیوں نہ تمہیں بھی عبرت ناک سزا دی جائے۔ تم جب تک جیو ایک تصویر عبرت بنے رہو۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔"

"نہیں... تم اتنے ظالم نہیں ہوسکتے۔"

"یہ ظلم نہیں' انصاف کہلائے گا۔" میں نے کہا "ہم تو ایسا کے نظام عدل میں مستقیم نہیں ہیں۔ آج تک ہم نے کسی بے گناہ کو سزا نہیں دی۔"

"اگر مجھے یہاں سے نکال دیا گیا... تو برباد ہوجاؤں گا۔"

میں نے ہنس کے کہا "تمہیں بہت پہلے برباد ہوجانا چاہیے تھا۔ آج بھی تم نے چوہدری دلاور کا ساتھ دینے کی مجبوری سے سمجھوتا کیا۔ کل پھر کروگے' مجبوری کا بہانہ بنا کے تم نہ جانے کتنی بار یہ جرم کا ارتکاب کروگے۔ کوئی بار آخری بار نہیں ہوتی۔ ہم دلاور کو تم سے زیادہ جانتے ہیں۔"

محسن نے کہا "تم خدا سے زیادہ چوہدری دلاور سے ڈرتے ہو۔ ایسے لوگوں کو ہم سے بھی ڈرنا چاہیے۔"

محسن نے کہا "یہ ہوسکتا ہے کہ ہم کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ تمہیں ..."

"تم مجھے... قتل نہیں کرسکتے۔" وہ دہشت زدہ ہوگیا۔

"بہت معمولی بات... فرض کرو ہم تمہاری آنکھوں میں کوئی ... ایسی دوائیں بہت ہیں جن سے بینائی ضائع ہوجاتی ہے۔ فوری طور پر ہم تمہاری آنکھوں کا آپریشن بھی کرسکتے ہیں۔ سبزی کاٹنے والی چھری سے۔ تاہم ایک اندھا ڈاکٹر بھی علاج کرسکتا ہے اور نسخے لکھ سکتا ہے لیکن جس ڈاکٹر کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں نہ ہوں۔"

ڈاکٹر شاہ کا رنگ پیلا پڑگیا۔ اس نے بے اختیار ہاتھ پیچھے کرلیے۔

محسن بولا "وہ بول سکتا ہے اور نسخے لکھوا سکتا ہے۔"

میں نے سوچ کے کہا "آدمی کی آواز کہاں سے نکلتی ہے؟"

"گلے سے۔ مگر گلا کاٹنا تو ظلم کہلائے گا' ہم قتل نہیں کرنا چاہتے۔"

میں نے کہا "گلے میں کیا چیز ہوتی ہے؟"

"ایک نس جسے VOCAL CHORD کہتے ہیں۔ آواز اسی کے ارتعاش سے نکلتی ہے۔ جیسے ستار یا وائلن کے تار سے نکلتی ہے۔" محسن نے وضاحت کی۔

"تو ہم ووکل کورڈ کی سرجری کرسکتے ہیں۔ اور ہم نہیں کرسکتے تو کسی سرجن سے کراسکتے ہیں۔ آخر لندن میں اپنے وہ ڈاکٹر بھی تو ہیں..."

ایسا کوئی ڈاکٹر دنیا میں کہیں نہیں تھا جو ہمارے کہنے سے ڈاکٹر شاہ کی قوت گویائی ختم کردیتا مگر میں نے یوں کہا تھا جیسے دلاور کی طرح کوئی ہمارا بھی آلۂ کار ہے۔

ڈاکٹر شاہ کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کے کہا "دیکھو۔ مجھے ایسے وحشت زدہ مت کرو۔ جس شخص کے آگے کنواں ہو اور پیچھے کھائی' وہ کیا کرسکتا ہے؟"

میں نے کہا "کنواں بہت جلد پاٹ دیا جائے گا۔ چوہدری دلاور کے لیے تنہائی کی کھائی کا کنواں جہنم براہ ہے کب سے۔ اس سے"

"مجھ سے بھی مت ڈرو۔ تم جانتے ہو ڈاکٹر کہ یہ آخری بات تھی اس سے زیادہ کی سکت کہاں ہے میرے پاس۔" دلاور بولا۔

ڈاکٹر نے اقرار میں سر ہلادیا "تمہیں بھی اب سمجھ آجانا چاہیے دلاور' دنیا کے معاملات کو پھیلانے کے بجائے سمیٹنا ضروری ہے۔"

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔ مگر میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو پہلے بھی چاہتا تھا مگر سکندر نے میری ہر پیشکش ٹھکرادی۔"

"اس وقت اور بات تھی۔" ڈاکٹر نے کہا "اب حقیقت تمہارے سامنے ہے۔"

"ویری گڈ! کیا چوہدری دلاور نے خود کو رضاکارانہ طور پر قانون کے حوالے کردینے کا فیصلہ کرلیا ہے؟" محسن بولا۔

دلاور تلخی سے مسکرایا "دلاور کی تقدیر نے یہ فیصلہ کردیا ہے ورنہ دلاور نے شکست کے لفظ کو اپنی لغت سے خارج کردیا تھا۔ وہ تقدیر سے بھی نہیں ہارا تھا۔"

میں نے کہا "تم تقدیر سے بھی لڑسکتے ہو۔ آخری وقت تک تمہارے پاس دولت ہے۔ تم ملک کے سب سے بڑے وکیل ...

www.paksociety.com

پورا پینل بنا سکتے ہو جو اعلیٰ ترین عدالت تک تمہاری بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اپنی تمام صلاحیت صرف کر دیں۔ اور ہو سکتا ہے تمہیں سزائے موت سے بچا لیں۔"

وہ خلا میں دیکھتا رہا۔ "سزائے موت تو مجھے سنائی جا چکی ہے اپنے سکندرِ اعظم صاحب! اور اس عدالت سے جس کا فیصلہ آخری ہے۔ جس کے خلاف اپیل کی گنجائش ہی نہیں۔ وہاں وکیلوں کے دلائل کام نہیں آتے۔ فیصلہ کرنے والے ہوتے ہیں بڑے بڑے ڈاکٹر۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کیا تمہیں کینسر ہو گیا ہے؟"

میں نے یہ بات بددعا کے انداز میں قطعی غیر سنجیدگی سے کہی تھی لیکن دلاور نے اس کا نوٹس ہی نہیں لیا۔

ڈاکٹر شاہ نے کہا "برین کینسر۔"

میں اور محسن بے یقینی کے صدمے کی کیفیت میں سپاٹ چہرے کے ساتھ دلاور کو دیکھتے رہے۔

"تمہیں یہ بھی جھوٹ لگتا ہے نا؟" دلاور بولا۔

ڈاکٹر شاہ نے کہا "دلاور کو برین ٹیومر ہے۔ اس کے دماغ میں ایک رسولی ہے۔ جو سامنے والے حصے سے پیچھے کی طرف پھیل رہا ہے۔"

"دماغ کی رسولی۔ یہ کب سے ہے؟" میں نے کہا۔

"کافی عرصے سے۔ مگر اس کا پتا اب چلا ہے۔ جب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "آپریشن بھی نہیں؟"

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا "فورتھ اسٹیج ہے۔ آخری اسٹیج۔ آپریشن کی گنجائش نہیں رہی۔"

میں نے کہا "تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کینسر کی آخری اسٹیج پر کوئی اتنا صحت مند کیسے نظر آ سکتا ہے۔ تمہارے کہنے کے مطابق تو یہ بسترِ مرگ پر ہے مگر یہ اسی طرح اپنے پیروں پر چل پھر رہا ہے جیسے ہمیشہ تھا۔"

ڈاکٹر نے مسکرانے کی کوشش کی "ایسا جھوٹ کوئی ڈاکٹر نہیں بولتا۔ رہی بات نظر آنے کی تو باہر سے اندر کا حال انسان کی آنکھ کیسے دیکھ سکتی ہے۔ کیا لوگ بیٹھے بیٹھے ہارٹ فیل ہونے سے نہیں مر جاتے؟ انہیں پتا بھی نہیں ہوتا کہ ان کا دل کتنا خراب ہے۔ بلڈ پریشر اور ذیابیطس جیسے امراض خاموشی سے آدمی کو اندر سے کھوکھلا کرتے رہتے ہیں۔ اسے تھوڑا تھوڑا قتل کرتے رہتے ہیں۔ وہ عملی طور پر مر رہا ہوتا ہے مگر اسے خبر نہیں ہوتی کہ ایک ایک انچ وہ موت کی سرحد کے نزدیک ہوتا جا رہا ہے۔ یہ خاموش قاتل SILENT KILLER بیماریاں کہلاتی ہیں اسی لیے۔ کینسر بھی اسی طرح شناخت نہیں ہوتا۔ برین ٹیومر کا بھی پتا اس وقت چلتا ہے بعض صورتوں میں جب زندگی کا سفر بہت مختصر رہ جاتا ہے۔"

"کس حد تک مختصر؟" میں نے کہا۔

"اگر تم دلاور کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو چند ماہ۔"

"... ہفتے۔ چھ، سات، آٹھ۔"

اس نے مایوسی سے سر ہلایا "تین... زیادہ سے زیادہ... چار۔"

"اور اس کا علاج کوئی نہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ ابھی تک ساری دنیا میں کہیں نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اگر اس کا پہلے پتا چل جاتا؟"

"تب بھی زیادہ فرق نہ پڑتا۔ شاید آپریشن ہو جاتا۔ اس سے ... میں دلاور کی بینائی ختم ہو سکتی تھی۔ یہ معذور ہو سکتا تھا۔ پھر بھی یہ رسولی کسی جگہ بھی نمودار ہو جاتی۔ کیونکہ یہ MALIGNANT ہے۔ کینسر کی رسولی کی ایک قسم ... کہلاتی ہے۔ اسے نکال دیا جائے تو ختم بھی ہو سکتی ہے۔ دوسری قسم کا ٹیومر بڑا سفاک ہوتا ہے۔ اس کو ایک جگہ سے ... جائے تو یہ دو جگہ یا دس جگہ نمودار ہو سکتا ہے۔ دماغ میں ... SECONDARY ہے وہ PRIMARY ٹیومر کا ہے۔ اس کی جڑیں سارے جسم میں پھیل جاتی ہیں۔ ریڈیو تھراپی اور کیموتھراپی سے دلاور شاید چار ماہ جی لے۔"

"اور اس کے بغیر؟"

"تین مہینے۔ یا اس سے کم۔"

افسوس اور دکھ سے بھری ہوئی خاموشی کا ایک طویل وقفہ جس میں دلاور کی نگاہیں خلا میں اپنی موت کو دیکھتی رہیں۔ شاید اس کے تصور میں آنے والا وقت تھا جب دھڑکنیں رک جائیں گی سب زیست کی راہیں۔ اور حد سے گزر جائے گا ... عقوبت اسے اپنے جان لیوا پنجوں میں جکڑے گا اور دیکھنے والے اس کی پُراذیت سانسوں کو شمار کرتے ہوئے دعا کریں گے اور یٰسین کی تلاوت کہ اللہ اس کے نزع کے عذاب کو آسان کرے۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے تقدیر کے اس فیصلے کے بعد ... عدالت سے سزائے موت حاصل کرنے کے فیصلے کا خیال چھوڑ دینا چاہیے۔ اتنے کم وقت میں تو کسی عدالت سے بھی سزا نہیں دلائی جا سکتی۔ سماعت کے مرحلے بھی بڑے لمبے ہوتے ہیں اور ایک عدالت کے بعد دوسری عدالت میں اپیل دائر کرنے والے ... سال گزار دیتے ہیں۔ اس کے بعد نظرثانی کی درخواست اور ... کی اپیل۔ بلیک وارنٹ کا اجرا اور سزائے موت کی تاریخ کا تعین ... یہ سب اچانک ناممکن ہو گیا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے تقدیر نے دلاور کو نہیں میرے ارادوں کو شکست دے دی ہے۔ ایک بار پھر مجھے حضرت علیؓ کا وہ قول ... کہ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا ... بندہ چاہے وہ ہو جائے تو پھر رب کا اختیار کیسے واضح ہو ... اپنی کوشش سے چوہدری دلاور کو سزائے موت دلوا سکتا ... اور موت کے بارے میں خدا کی مرضی والی بات ... باللہ... بے معنی ہو جاتی۔ خدا نے مجھے روک دیا تھا ... کی عدالت میں پکڑ نہیں تھی تو تم نے کیسے جان لیا اور مان ... رب کچھ نہیں دیکھ رہا اور کچھ نہیں سمجھ رہا۔ تمہاری ... کی عدالت انصاف سے اوپر بھی ایک عدالت تھی ...

فیصلہ سنا؟

دلاور اب مسکرا دیا تھا۔ معلوم نہیں اپنی بے بسی پر یا ہماری۔

میں نے کہا "مجھے اب بھی تمہاری بات تسلیم کرتے ہوئے تأمل ہوتا ہے۔ تم دلاور کے ساتھی ہو لیکن میرا خیال ہے کہ تم دلاور کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتے جتنا میں جانتا ہوں۔ یہ دشمنی کا ایک طویل دور تھا جس میں ہم نے کئی بار اسے محصور کیا اور خود کئی بار محصور ہوئے لیکن ہر بار ہم ایک دوسرے کو چکمہ دے کر نکل گئے۔ شاید تقدیر ایسے مواقع فراہم کرتی رہی لیکن اس تجربے نے چوہدری دلاور کی شخصیت کا ہر پہلو ہمارے سامنے کھلی کتاب کی طرح عیاں کر دیا۔"

"مجھ سے بھی کیا پوشیدہ ہے؟" ڈاکٹر شاہ بولا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ چوہدری دلاور میں کتنی زبردست اداکاری کی صلاحیت ہے۔ اسے اپنے اصل جذبات پر مصنوعی جذبات کا پردہ ڈالنے میں جو مہارت حاصل ہے۔ ایک شخصیت کے کئی روپ پیش کرنے کا جو کمال حاصل ہے۔ ظاہر سے باطن کا پتا نہ چلنے دینا۔ اور زندگی کی عام صورت حال میں ڈرامائی تاثر پیدا کرنا۔ یہ سب دلاور سے بہتر کون کر سکتا ہے۔ یہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنا کے دکھا سکتا ہے۔ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا سکتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر گدھے کو باپ بنا لینا اور مطلب نہ ہو تو باپ کو گدھا سمجھنا اس کی فطرت ہے۔"

ڈاکٹر شاہ نے بے چینی سے پہلو بدلا "لیکن اس وقت دلاور کے کردار کی خوبیوں اور ناکامیوں کے ذکر سے کیا حاصل...؟"

میں نے کہا "صاف بات یہ ہے کہ میں بھی اس صورت حال کو اتنا غیر معمولی اور ڈرامائی محسوس کرتا ہوں کہ مجھے تمہارے بیان کی صداقت بھی مشکوک لگتی ہے۔ جو شاک تم نے ہمیں دیا ہے اس کا مقصد کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔"

"یعنی تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟" ڈاکٹر شاہ نے کہا۔

"یہ اعتبار کا کھیل ہی نہیں تھا۔ محبت اور جنگ میں سب جائز کہا جاتا ہے اور جھوٹ، فریب، عیاری اور مکاری کا اسلحہ سب استعمال کرتے ہیں۔"

"تم ڈاکٹرز کی رپورٹ دیکھ سکتے ہو۔"

"کیا ڈاکٹرز جھوٹ نہیں بولتے؟" محسن نے کہا۔

"آخر تم بھی تو ڈاکٹر ہو؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن آلات جھوٹ نہیں بولتے۔ جدید الیکٹرانک مشینوں کو ایک آئینہ سمجھا جا سکتا ہے جس میں اندر کی تصویر نظر آتی ہے۔ ایکسرے پھیپھڑوں کے ہر داغ کو دکھا دیتا ہے۔ ای سی جی سے دل کی دھڑکن کی تصویر آ جاتی ہے تو I.V.P سے گردوں کے ... E.E.G سے دماغ کی حالت کا اندازہ کیا جاتا تھا مگر اب سی ٹی اسکین سے جسم کے کسی بھی حصے کے اندر کو ایسے دیکھا جا سکتا ہے جیسے کوئی خود اپنی آنکھ سے دیکھے۔ صرف یہی نہیں۔ بعض اوقات باہر سے داغ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ پھر آپ اسے دو حصوں میں کاٹ کر دیکھ سکتے ہیں۔ سی ٹی SCANNER اس سے بھی زیادہ تفصیل سے دماغ کے مختلف حصوں کو دکھاتا ہے۔ یوں جیسے آپ سیب کے باریک باریک قتلے تراش لیں۔ نیچے سے اوپر یا دائیں سے بائیں۔ اور پھر ہر قتلے کو دیکھ لیں۔ دماغ کو تراشے بغیر کسی بھی حصے میں واقع ٹیومر کی صحیح پوزیشن کا پتا چل جاتا ہے۔"

"رپورٹ تمہارے پاس ہے؟"

"نہیں۔ تم سینٹ تھامس اسپتال جا کے دیکھ سکتے ہو۔ وہاں ایک پاکستانی ڈاکٹر ہیں مسز زبیدہ ہارون۔ ان کے شوہر مسٹر ہارون ONCOLOGIST ہیں۔ یہ کینسر کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی رائے حتمی سمجھی جاتی ہے مگر میں نے یونیورسٹی کالج اسپتال کے ڈاکٹر فریڈرے سے بھی تصدیق کرا لی اور انہوں نے وہی کہا جو میں نے تمہیں بتایا۔ یہاں اسپتال کا ریکارڈ CONFIDENTIAL ہوتا ہے کہ صرف عدالت کے حکم پر کسی کو دکھایا جا سکتا ہے۔ مریض اور ڈاکٹر کے درمیان جو ذاتی اعتماد کا رشتہ ہوتا ہے اس کا احترام ایسے ہی کیا جاتا ہے جیسے میاں بیوی کی خلوت کا۔ چنانچہ تم یہ ریکارڈ صرف میرے ساتھ جا کے دیکھ سکتے ہو یا چوہدری دلاور کے ساتھ۔"

"مطلب یہ کہ نہیں دیکھ سکتے" محسن بولا۔

"تم ڈاکٹر فریڈرے یا ڈاکٹر زبیدہ سے بات کر سکتے ہو۔ اور یہ نام اتنے معتبر ہیں کہ تم انہیں بھی جھوٹا سمجھو گے تو انہیں گالی دو گے۔ یہاں کسی کو بھی آپ جھوٹا کہیں تو یہ گالی سے کم نہیں ہوتا۔"

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے دلاور سے کہا "یہ کتنی عجیب بات ہے کہ تمہیں اپنے انجام کی خبر تھی۔ اس کے باوجود تم وہی کرتے رہے جو کرتے تھے۔ تم نے جاسم کو قتل کرا دیا۔ رچرڈ گورڈن کی گاڑی میں بم فٹ کیا۔ اگر مجھے خدانخواستہ یہ پتا چل جائے کہ میری زندگی اتنی کم رہ گئی ہے تو میں کوشش کروں گا کہ خدا سے اور اس کے بندوں سے اپنی تمام غلطیوں کی معافی مانگوں۔ ہر غلطی کا کفارہ ادا کروں۔ رنجش اور عداوت کے جو کانٹے میں نے دوسروں کے لیے بچھائے وہ سب چن لوں۔"

"تمام زندگی کے گناہوں کی تلافی تین مہینے میں تو ممکن نہیں۔ مگر میں بھی مرنے سے پہلے کوشش کروں گا کہ مجھ پر کسی کا قرض نہ باقی رہے۔ نہ رشتوں کا، نہ جذبات کا، نہ نیکی کا نہ بدی کا۔" دلاور نے اداسی سے کہا "ڈاکٹر شاہ نے مجھے قسمت کا یہ فیصلہ بہت دیر سے سنایا۔"

"خود مجھے یہ اطلاع کل ملی تھی۔ ڈاکٹر فریڈرے سے پہلے ڈاکٹر زبیدہ ہارون نے مجھے اپنی تشخیص سے آگاہ کیا تو میں نے ڈاکٹر فریڈرے سے رجوع کیا۔ اور انہوں نے حتمی فیصلہ آج سنا دیا۔ انہوں نے وہی سی ٹی اسکین رپورٹ اپنے کمپیوٹر پر دیکھی۔ دلاور کا اصرار تھا کہ اس سے کچھ نہ چھپایا جائے۔ آج شام میں نے مجبوراً اسے سب بتا دیا۔"

www.paksociety.com

میں نے دلاور کے لیے اپنے دل میں ہمدردی سے زیادہ نفرت محسوس کی۔ اس شخص کو مرنا ہی تھا۔ اس کی موت سے زیادہ مجھے اپنی زندگی کی آرزو بھی نہیں تھی اور میں نے دن رات فرشتۂ اجل کا نامہ بر بن کے اس کا تعاقب کیا تھا مگر اس نے میرے باپ کے ساتھ اس کی زندگی میں دھوکا کیا تھا' دھوکے سے اس کی تمام عمر کی کمائی ہتھیالی تھی۔ پھر دھوکے سے اس کو مار دیا تھا اور مجھے دھوکے میں رکھا تھا۔ دھوکے سے مجھے جھوٹے مقدمات کی قانونی دلدل میں دھکیل دیا تھا اور پھر مجھے مسلسل دھوکے دیتا رہا تھا۔ ہر بار جب میں محسوس کرتا تھا کہ میں نے اس کی دھوکے بازی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ختم کر دیا ہے اور اب وہ قانون کو دھوکا نہیں دے سکے گا تو وہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل جاتا تھا اور میں پھر اس کا تعاقب کرتا تھا۔ آج جب بالآخر دستِ غیب نے اس کی دھوکے بازیوں کا یہ کھیل ختم کرنے کا اعلان اسے سزائے موت سنا کے کیا تھا تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرے ساتھ پھر دھوکا ہوا۔ تقدیر ہی نہیں مجھ پر دلاور بھی خندہ زن تھا کہ اپنے سکندرِ اعظم' تم پھر ہار گئے۔ تم مجھے نہیں ہرا سکے۔ تم مجھ سے اپنے باپ کے قتل کا انتقام نہیں لے سکے۔ تمہارے سارے دعوے باطل ہوئے۔ تم نے سب کچھ گنوا کے کچھ بھی نہیں پایا۔ جو پا گئے وہ تو میں تمہیں بہت پہلے بھی دینے پر تیار تھا۔ سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ ہاتھ میرے بھی خالی ہوں گے اور تہی دست تم بھی محسوس کرو گے کہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری نہ ہوئی۔ تم مجھے قانون کی عدالت سے سزا نہ دلوا سکے۔ مجھے تختۂ دار پر نہ دیکھ سکے۔ مجھے موت بھی ملی تو اپنی تقدیر سے۔ تمہاری تدبیر سے نہیں۔

چوہدری دلاور نے کہا "میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں سکندر۔ میں ہارنے والا نہیں تھا مگر تم ٹھیک کہتے تھے۔ نوشتۂ تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "تم بہت بڑے شکاری تھے۔ چھوٹے بڑے سب انسان تمہارے لیے خرگوش تھے یا ہرن۔ جو آسانی سے شکار ہوتے تھے' یا چیتے اور شیر تھے جن کو شکار کرنا چیلنج سمجھا جاتا ہے مگر تمہارے ترکش میں سب کے لیے تیر تھے۔ تم ہر بار نیا جال بچھا سکتے تھے۔"

"اب یہ باتیں دہرانے سے کیا حاصل۔ ایک دن موت سب کو شکار کر لیتی ہے۔ اجل سے بڑا شکاری کوئی نہیں۔ تم آج خوش ہو سکتے ہو کہ اس نے پہلے مجھے شکار کیا۔"

"مگر مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ مجھے اس نے تمہیں شکار کیا۔ ایسے میں نہیں چاہتا تھا۔"

"ایسا ہو بھی نہیں سکتا سکندر۔ کون کب کہاں اور کیسے مرتا ہے؟ اس کا فیصلہ تو خدا انسان کو زندگی دینے سے پہلے ہی کر دیتا ہے۔ تم یہ بات مانتے ہو تو پھر افسوس کیسا۔"

"میری ساری جدوجہد تو تمہیں پھانسی کے پھندے سے لٹکا دیکھنے کی تھی" میں نے کہا۔

"جدوجہد تو میری رائیگاں گئی۔ اب سے تین مہینے بعد چوہدری دلاور کا نام صرف ایک کتبے پر رہ جائے گا۔ لیکن تم اس کے بعد مزید کامیابیاں اور خوشیاں سمیٹتے رہو گے۔ اگر مجھے طبعی موت آتی، عام لوگوں کی طرح جیتا اور مرتا۔ کوئی یہ نہ کہتا کہ یہ عبرتناک موت تھی۔ تو مجھے رنج نہ ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ مجھے سزائے موت ہی سنائی گئی ہے۔ سزا سنانے والا سب سے بڑا جج ہے اور مجبوری بھی یہ ہے کہ میں نہ اپنی صفائی پیش کر سکتا ہوں۔ نہ وکیل کر سکتا ہوں اور نہ اپیل۔ اگر سپریم کورٹ سزائے موت کے خلاف میری اپیل کو مسترد کر دیتی۔ تب بھی میں ایسے ہی مرتا۔ تین مہینے تک موت کی راہ دیکھتا رہتا اور پھر ایک دن زندگی کے لیے تمام امیدیں تمام ہو جاتیں۔ ایسا ہی اب بھی ہو گا۔ تمہارے لیے اس میں بھی تسکین کا ایک پہلو ہونا چاہیے۔"

"کیا فائدہ اب ایسی باتوں سے۔ شاید سب ہی دنیا کی اس شکار گاہ میں خود کو سب سے بڑا شکاری سمجھتے ہیں۔ جب تک بچے ہیں انہیں بھی چوہدری دلاور یا چیذر جیسے شکاری ملتے ہیں۔ بازی کوئی ایک جیت لیتا ہے تو کبھی دوسرا۔ تم یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تم بڑے شکاری ہو اور میرا بھی یہی دعویٰ تھا۔ ثابت تو یہی ہوا کہ بڑا شکاری کوئی نہیں ہو پایا ہوتا ہے تو اس حد تک کہ اس نے عمر پائی۔ جس کو زندگی چھوٹی ملی وہ چھوٹا شکاری۔"

چوہدری دلاور نے ایک گہرا سانس لیا "پھر اب کیا کرو گے تم؟"

میں نے کہا "مجھے تو نہ جانے کیا کچھ کرنا ہے جب تک یہ ہے کچھ تو کرنا ہی ہے۔ تم کیا کرو گے اب؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے سکون سے مرنے دو۔ میں سب کچھ تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔ جو بھی آج میرا ہے' سب۔ اس میں سے کتنا تم میرے وارثوں کے لیے چھوڑتے ہو' ان کو عزت سے یا آرام سے زندگی گزارنے کے لیے کتنا دیتے ہو' یہ تم پر چھوڑتا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ سب میرا نہیں' اس میں تمہارے والد کا اور میر شرافت علی کا بھی حصہ تھا لیکن ایک حصہ میرا بھی تھا۔ میں نے اس ایک تہائی پر اکتفا نہیں کیا۔ اب حساب کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کہ ان اثاثوں کی تقسیم کا منصفانہ فارمولا کیا ہو گا۔ اگر میں' وزیر خان اور میر شرافت علی کے اس طرح کاروبار کو چلاتے رہتے تو تمہیں کیا ملتا اور میرے وارثوں کے حصے میں کیا آتا۔ یقیناً وہ اس سے بہت کم ہے جو میرے پاس ہے۔ اس کاروبار میں جس کو تم جائز سمجھتے ہو لاکھ کے دس لاکھ بنا لیتے تو میں نے اس سے دس کروڑ بنائے۔ اسی وقت میں وہ دس کروڑ بناتے تو میں نے دس ارب بنائے۔ وہ دوسری قسم کے لوگ تھے۔ ان کی سوچ الگ تھی۔ وہ حق حلال، جائز ناجائز اور کاروبار میں اخلاقی اصولوں کی پاسداری کے قائل تھے جیسے تم ہو۔ آج کی دنیا میں ان جیسے لوگ ترقی کو ترستے ہیں۔ وہ کچھوے کی طرح چلتے ہیں۔ میں خرگوش کی طرح دوڑنا چاہتا تھا۔ وہ میرا ساتھ دیتے تو کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا مگر انہوں نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ مجبوراً میں نے انہیں اپنے راستے سے ہٹا دیا اور پھر جو ہوا آپ جانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں نے غلط کیا۔ اخلاقی اور قانونی طور پر میرا جرم ثابت ہے۔ لیکن میں نے بھی جو سوچا تھا' جو کہا تھا وہ کر کے دکھایا۔ آگے کا فیصلہ تم کرو۔ تمہارے والد کے ساتھ کاروبار چلتا تو تمہیں آج کیا ملتا؟ آج جتنا ہے اس سے بہت کم۔ جائز ناجائز کی بات تم کرتے ہو۔ میں نے کبھی نہیں کی۔ میں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ کوئی کچھ بھی کہتا رہے۔ میں نے پروا نہیں کی۔ بڑا بن بنا' خطرات میں نے مول لیے۔ اب تم کس حساب سے اپنا حصہ لو گے؟ تمہارے والد کے سو روپے ان کے طریقے سے شاید ہزار ہوتے۔ میں نے ان سے لاکھ بنائے۔ تم ہزار لو دس ہزار یا ایک لاکھ' تمہاری مرضی۔ میر شرافت کا تو کوئی وارث ہی نہیں۔ اس کے حصے کا تم کیا کرو گے؟ میرا حصہ میرے وارثوں کو دو گے یا ان سے بھی انتقام لو گے۔"

میں بڑی مشکل میں پڑ گیا تھا "میں کیا جواب دوں دلاور۔"

محسن نے کہا "اس سوال کا جواب عدالت دے گی۔ کس کا کیا حق بنتا ہے۔ یہ فیصلہ نہ ہم کریں گے اور نہ تم کر سکتے ہو۔"

دلاور بولا "عدالت! کیا اب بھی تم عدالت جانے کا سوچتے ہو؟"

میں نے کہا "محسن نے ٹھیک کہا۔ فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی۔"

"مگر... میں تو سب تم پر چھوڑ رہا ہوں۔ تم جو فیصلہ کرو گے وہ مجھے قبول ہو گا" دلاور نے کہا۔

محسن بولا "ہم یہ اختیار نہیں رکھتے۔ ہم سے فیصلے میں غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی ایسی غلطی جس کی تلافی ممکن نہ ہو۔ انصاف کرنا تو کرسی پر بیٹھنے والے کی ذمہ داری ہے۔"

"جب عدالت میں جائے بغیر معاملات طے ہو سکتے ہیں تو...."

محسن نے اس کی بات کاٹ دی "یہ تم نے کیوں فرض کر لیا ہے کہ عدالتی معاملات ختم ہو گئے۔"

"عدالت کیا کرے گی اب۔ اتنا وقت کہاں ہے میرے پاس۔"

"تمہارے پاس تو ہے۔ اور انصاف کرنے والوں کے پاس۔ جب صرف اسی بات پر وہ تمہیں سارے مقدمات سے بری نہیں کر سکتے کہ تم کو تین چار مہینے بعد مرنا ہے تو کیس چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک تم مجرم رہو گے چوہدری دلاور۔ تمہارے جرائم کا ریکارڈ رہے گا خواہ تم رہو یا نہ رہو۔ طبعی موت سے ایک دن پہلے بھی تم کوئی قتل کرو تو اس کی ایف آئی آر درج ہو گی اور وہ مقدمہ بھی چلے گا۔"

"میرے مرنے کے بعد بھی؟" دلاور نے تلخی سے کہا۔

"البتہ تمہارے مرنے کے بعد سرکار یہ مقدمات ختم کرنے کی درخواست دائر کرے گی اور اس کی سماعت ہو گی۔ قانونی طریقہ کار کے مطابق ہر کیس کی فائل داخلِ دفتر ہو گی۔ حق وراثت کا معاملہ تمہارے وارثوں کے اور وزیر خان کے وارث کے درمیان طے ہو گا۔ قوانین وراثت کے مطابق عدالت میں سب کا دعویٰ پیش ہو گا۔ اب کسی کو اپنا حصہ چھوڑنا ہے' کتنا چھوڑنا ہے اور کس کے حق میں۔ یہ بھی عدالتی معاملہ ہے۔ زبانی کچھ طے نہیں کیا جا سکتا اور اگر میں سادہ کاغذ یا اسٹامپ پیپر لکھ دوں تب بھی اس کی قانونی حیثیت کچھ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم اس کی فکر چھوڑ دو کہ تمہارے بعد تمہاری دولت کہاں جائے گی اور کس کو ملے گی۔ تم اسے اپنے ساتھ بہرحال نہیں لے جا سکتے۔"

"ایسا کب کہا ہے میں نے؟" دلاور نے دکھی لہجے میں کہا۔

"رہا تمہارے جرائم کا معاملہ۔ تو وہ ہم کیسے ختم کر سکتے ہیں۔ تم کو عدالت میں پیش تو ہونا پڑے گا۔"

"سکندر! اتنے بے رحم مت بنو۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں دلاور۔ میں کون ہوتا ہوں تمہارے جرائم کے بارے مقدمات سے صرف نظر کرنے والا۔"

"تین مہینے میں کچھ بھی نہیں ہو گا۔"

"جو بھی ہو گا وہ ہونا چاہیے' تم ایک اقبالی بیان تو دے ہی سکتے ہو۔ تم اپنے دفاع کے حق سے دستبردار ہو سکتے ہو۔ خود کو عدالت کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتے ہو۔ تم عدالت کا بہت سا وقت بچا سکتے ہو۔ وکیلوں کے دلائل' گواہ اور شہادتیں۔ جرح اور بحث کے سارے سلسلے ختم ہو جائیں گے" میں نے کہا۔

محسن بولا "اس سے تمہارے ضمیر کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ یہ بوجھ اپنے ساتھ قبر میں مت لے جاؤ' دلاور۔"

دلاور نے سر جھکا لیا اور اچانک مجھے یوں لگا جیسے چوہدری دلاور کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ وہ واقعی رو رہا تھا۔ اتنا بڑا شکاری' اتنا طاقتور شکاری۔ اتنا مغرور شکاری' موت کی دھمکی سن کے ہی دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ وہ سب بھول گیا تھا جو اس نے کیا تھا یا سوچا تھا کہ وہ کرے گا۔ اور وہ زندگی کی مہلت دیتی تو کرتا مگر یکایک اس کا ایک وارنٹ موصول ہو گیا۔ کسی گرفتاری' ضمانت یا سماعت اور اپیل کے حق کے بغیر۔ تم چوہدری دلاور ولد فلاں... ساکن فلاں مقام... تم کو فلاں فلاں جرم میں تعزیراتِ پاکستان کی فلاں فلاں دفعہ کے تحت فلاں تاریخ کو اتنے بجے بحکم عدالتِ خداوندی سزائے موت دی جائے گی۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ وہ بھی دلاور کو بے رحم نظروں سے دیکھ رہا تھا "چوہدری دلاور۔ ہمارا خیال تھا کہ تم بڑے باہمت ہو۔"

دلاور نے سر اٹھایا "نہیں۔ میں ایک کم ہمت آدمی تھا۔ مجھ میں ہمت ہوتی تو وہ زندگی جیتا' جو تم جی رہے ہو۔ جو وزیر خان نے جی۔ محنت سے زیادہ کمانے کا حوصلہ ہوتا تو میں ان کے ساتھ رہتا۔ وہ واقعی ہمت والے لوگ تھے جو سیدھے مگر مشکل راستے پر چلتے تھے۔ صراطِ مستقیم اختیار کرنا ہر ایک کے بس کی بات

www.paksociety.com

نے شارٹ کٹ لیا۔ شارٹ کٹ غیر قانونی تھا اور ممنوعہ علاقے سے گزرتا تھا مگر میں نے اصول، قانون اور اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں ہمت والا تھا۔ میں نے دولت کمائی مگر عزت گنوا دی۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ دولت کے ساتھ عزت خود بخود آجاتی ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ عزت جو دل سے ملتی ہے وہ ایک پرائمری ٹیچر کو مل جاتی ہے جب اس کا کوئی بہت پرانا شاگرد جو پرائمری اسکول کا بچہ تھا۔ جنرل کی وردی سجائے یا وائس چانسلر کے عہدے پر پہنچ کے یا وزیر بن کے جھنڈے والی کار میں اس کے پاس آتا ہے اور کرسی پر اس کے ساتھ نہیں بیٹھتا۔ اس کے قدموں میں بیٹھنے پر اصرار کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے اسے دعا دیں۔ اور عزت ملتی ہے اس بوڑھی ماں کو جس نے برتن مانجھ کے اور جھاڑو دے کے دو وقت کی روٹی کمائی ہو اور بیٹے کو پڑھا لکھا کے ڈاکٹر، وکیل یا پروفیسر بنا دیا ہو۔ ہم جیسے عزت ترستے ہیں۔ دولت کی طاقت سے اور اختیار سے۔ مگر وہ عزت کہاں ہوتی ہے۔ دہشت ہوتی ہے یا غرض مندی ہوتی ہے کہ ہمارے سامنے دست بستہ کھڑے رہنے والے ہمیں ہاتھ اٹھا کے سلام کرتے ہیں، ان داتا اور مائی باپ کہتے ہیں۔ ہماری گالیاں سن کے سر جھکا دیتے ہیں اور ہمارے سامنے لب نہیں کھولتے۔ میرے بیوی بچے مجھ سے محبت ضرور کرتے ہیں۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ وہ ڈرتے بھی ہیں مجھ سے۔ لیکن انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کیا کرتا ہوں۔ میری آمدنی کے ذرائع اور وسائل کیا ہیں۔ وہ میرے بیوی بچے نہ ہوتے تو کیا مجھے اچھا تو کہتے۔ اتنا ہی اعتماد ہوتا انہیں اپنی عزت نفس پر جتنا ایک ایماندار صحافی، فرض شناس ڈاکٹر یا معاوضے کی پروا کیے بغیر علم کی روشنی پھیلانے والے لیکچرر کے بیوی بچوں کو ہوتا ہے؟"

وہ بول رہا تھا اور رو رہا تھا۔ رو رہا تھا اور بول رہا تھا۔ سچ پہلی بار اس کی زبان پر آیا تھا۔ احساس کی کسک پہلی بار آنسوؤں میں ڈھلی تھی۔ ضمیر کی عدالت پہلی بار سجتا دیتی تھی مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ یہ تبدیلی نہیں تھی۔ ماہیت قلبی نہیں تھی۔ یہ موت کا خوف تھا۔ یہ آخر کی جانے والی توبہ تھی جو قبول نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر شاہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "دلاور۔ ٹیک اٹ ایزی۔ اگر تم موت کی خبر بہادری سے سن سکتے ہو تو پھر عدالت میں اعتراف جرم کرنے سے کیوں ڈرتے ہو۔ تم نے اتنی بڑی حقیقت کو قبول کر لیا ہے کہ تمہارے لیے زندگی کی مہلت تین ماہ سے زائد نہیں رہی تو پھر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کیوں نہیں سوچتے؟"

دلاور نے سر ہلایا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے اب کسی کا ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ میں اس حد سے آگے نکل گیا ہوں جہاں لوگوں کی باتیں، رسوائی اور سزا کا خوف بے معنی ہو گیا ہے مگر ڈاکٹر شاہ، میری بیوی، میرے دونوں بیٹے اور ایک بیٹی۔ ان کو اسی دنیا میں رہنا ہے۔ ان کے سامنے میں اپنی زبان سے خود کو مجرم نہیں کہہ سکتا۔ یہ بھرم تو رہنا چاہیے کہ میں ان کا باپ ہوں اور وہ میری عزت بھی کرتے ہیں۔ سکندر، تم مجھے اتنی رعایت بھی نہیں دو گے کہ میں یہاں مر جاؤں، خاموشی سے۔ صرف میرے بیوی بچے میرے پاس ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "سوری دلاور۔ قانون میں کوئی رعایت ہوتی تو تم شیخ سے یہ بات کہہ سکتے تھے۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں کسی اختیار کے بغیر تم کو کیسے چھوڑ دوں۔ کیسے معاف کر دوں۔ میں صدق دل سے تم کو اپنے والد کا خون معاف کرتا ہوں۔ میں ان کو وہ سب ظلم اور بے ایمانی بھی معاف کرتا ہوں جو تم نے ان کے ساتھ روا رکھی۔ میں تم سے اپنے ساتھ کی گئی ہر زیادتی بھی معاف کرتا ہوں۔ ذاتی طور پر میں تم کو اپنے ساتھ اور اپنے دوست احباب کے ساتھ ہونے والے سب مظالم، حق تلفی اور ذہنی و جسمانی اذیت بھی معاف کرتا ہوں۔ مگر جو تم نے دوسروں کے ساتھ کیا۔ تم خود بھی شاید صحیح حساب نہ بتا سکو کہ تم نے کتنے بے گناہ اور بے قصور انسانوں کو ان کی زندگی کے حق سے محروم کیا۔ کتنے خون کیے اور کتنے قتل کرائے۔ کتنی عورتوں کو سہاگ کے بدلے بیوگی عطا کی۔ کتنے بچوں کے سر پر یتیمی کے احساس کا عذاب مسلط کیا۔ اس کے علاوہ تم وطن کے غدار ہو، باغی ہو۔ تم نے وطن دشمن اور ملک توڑنے والوں کا ساتھ دیا۔ ان کی مدد کی۔ تمہارا یہی ایک جرم اتنا سنگین ہے کہ باقی سب جرائم معاف کرنے کے قابل ہوں تب بھی اس جرم پر تمہیں دس بار سزائے موت دی جاتی۔ یہ معاملہ میرا نہیں، میرے وطن کا ہے۔ وطن کے محافظوں کا ہے۔ وطن کے قانون کی پاسبانی کرنے والوں کا ہے۔ وہ تمہیں کیسے معاف کر سکتے ہیں۔ میرا فرض ہے کہ ان کا مجرم ان کے حوالے کروں۔"

"نہیں، یہ نہیں ہو سکتا" دلاور چلایا۔

"یہ ضرور ہو گا" میں نے کہا۔

"تم مجھے مار سکتے ہو مگر مجھے زبردستی اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ تم میری لاش لے جا سکتے ہو اپنے ساتھ۔"

میں نے کہا "چوہدری دلاور، ہم تمہیں زندہ سلامت لے جائیں گے اور یہ تم دیکھو گے کہ ہم یہ کام کیسے کرتے ہیں۔"

"افسوس۔ سکندر بخت۔ تم نے یہ آخری موقع بھی گنوا دیا۔ اس وقت تم فاتح تھے۔ میں نے تمہارے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ تم مجھے معاف کر کے ایک اخلاقی فتح بھی حاصل کر سکتے تھے۔"

"معاف کرنے کی حد تک میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ مگر وہ میرا ذاتی معاملہ تھا۔ قانونی اختیار کی بات الگ ہے۔ اگر میں نے اپنا فرض ادا نہ کیا تو یہ بھی جرم ہو گا۔ میں کسی وطن دشمن کا ساتھی کہلانے کی گالی نہیں سن سکتا۔ تم پاکستان کے دشمن ہو۔ اس حوالے سے تم وہی ہو۔ اپنے چوہدری دلاور ہو۔ تمہاری موت کے بعد میں تم کو مرحوم بھی نہیں کہوں گا۔ تمہاری مغفرت کی دعا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تم پر اس طرح لعنت بھیجتا ہوں

جیسے بنگال کے میر جعفر پر اور دکن کے میر صادق پر بھیجی جاتی ہے۔ جیسے جنرل ڈائر کے مارے جانے پر کہا گیا تھا کہ وہ جہنم رسید ہوا۔ ایسے ہی تمہارے لیے کہا جائے گا۔ اور جیسے بھگت سنگھ کو مجرم ہونے کے باوجود کچھ لوگ شہید کہتے ہیں ایسے ہی میں اپنے ان دوستوں اور ساتھیوں کو شہید سمجھوں گا جو تمہارے مقابلے پر لڑے اور مارے گئے۔"

دلاور کے چہرے پر وہی پرانی نخوت، خباثت اور بدباطنی لوٹ آئی "میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر۔ اور ان سب پر جو ایسا سمجھتے یا کہتے ہیں۔ مجھے مرنے کے بعد اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ کتنے لوگ زندہ رہتے ہیں یا کون کیا بک رہا ہے لیکن مرنے سے پہلے میں یہ لعنت اور سوال کا طوق اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے میں نہیں ڈالوں گا۔ نہ تمہیں ڈالنے دوں گا اور نہ کسی اور کو۔"

"کیا کرو گے آخر تم؟" محسن نے مشتعل ہو کے کہا۔

"جو میرا جی چاہے گا۔ اور تم مجھے روک نہیں سکو گے اپنے ملک الظلم صاحب۔ چوہدری دلاور ابھی مرا نہیں ہے کہ اس کی لاش پر گدھ منڈلانے لگیں" اس کا چہرہ فرط غضب سے دہکنے لگا تھا۔

اچانک اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور ایک بٹن دبایا۔ بظاہر یہ ایک بے ضرر سی حرکت تھی۔ کچھ گھڑیوں میں بٹن دبانے سے لائٹ آجاتی ہے، کچھ میں تاریخ یا دن نمودار ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ چوہدری دلاور کا گھڑی دیکھنے کا انداز تھا جس نے مجھے چونکا دیا۔ وہ نروس تھا اور اس نے بٹن ایسے دبایا تھا جیسے اس سے کچھ ہو گا۔ کوئی دھماکا ہو گا۔ اچانک زہریلا دھواں پھیل جائے گا یا الارم بجنے لگے گا۔ یہ خفیہ بٹن اس نے ایس او ایس دینے کے لیے دبایا تھا۔ باقی سب تو خیال آرائی تھی مگر الارم اور مدد کے لیے سگنل دینے کے امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کلائی کی گھڑی میں لگا چھوٹا سا سگنل دینے والا ایف ایم ٹرانسمیٹر نصب کیا جا سکتا تھا۔ جو دو سو میٹر یا ایک کلومیٹر تک کہیں کسی ریسیور میں الارم بجا سکتا تھا یا کوئی سرخ لائٹ جل جاتی۔ چوہدری دلاور احتیاط پسند آدمی تھا۔ صرف ڈاکٹر شاہ جیسے شخص کی رفاقت پر انحصار کرنا اس کی عادت اور مزاج کے خلاف تھا۔

میں نے اٹھ کے اس کی کلائی پکڑی اور گھڑی اتار لی "کیا ہوتا ہے چوہدری صاحب یہ بٹن دبانے سے؟" میں نے اس کا بٹن دبا دیا۔

دلاور کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے بدلا پھر اس نے کہا "ایک بٹن دبانے سے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ایک بٹن ہی دبایا تھا اس نے جس نے ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا تھا۔ اور اب کہتے ہیں کہ ایک بٹن دبانے سے تیسری جنگ عظیم شروع ہو سکتی ہے۔"

"مگر اس کے ساتھ وقت ضائع مت کرو۔ ورنہ میں لحاظ نہیں کروں گا۔ ڈاکٹر تمہارا کیا ارادہ ہے، کیا کرنے والے ہو" میں نے دہاڑ کے کہا۔

"اس بٹن کے دبانے سے ناسا کا ایک میزائل اپنے ٹارگٹ پر روانہ ہو گیا ہے اور اس کا ٹارگٹ ہے تمہارا سر۔"

میں اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ڈاکٹر شاہ نے مجھے روک لیا "کسی قسم کا جسمانی تشدد یا ذہنی دباؤ اس کے بلڈ پریشر میں اضافے کا سبب بن سکتا ہے اور اگر برین ہیمرج ہو گیا تو تم پر بلاوجہ اس قتل کا الزام آئے گا۔"

میں نے کہا "اس نے کسی کو سگنل دیا ہے۔"

"دیا ہو گا۔ تم جانتے ہو دلاور کو..." ڈاکٹر شاہ نے کہا۔

"او کے۔ ان سے بھی نمٹ لیں گے ہم" محسن بولا۔

سردار جی پہلے غوں غاں کر رہے تھے اب بڑبڑانے لگے "او کے ہم بھی نمٹ لیں گے، بینڈ بجا دیں گے۔"

میں نے کہا "میں اس سکھ کو اندر پہنچا دوں پہلے۔"

محسن نے سائلنسر والے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا "ان کو میں اوپر پہنچا دوں۔ اگر کسی نے کوئی حرکت کی۔"

سکھ کو میں نے گھسیٹ کر اپنے پاؤں پر کھڑا کیا تو وہ جھولنے لگا "ہائے ظالم کیا پلا دی ہے تو نے آنکھوں سے۔"

میں نے کہا "غالباً بھنگ تھی۔ بھنگی آنکھوں سے پلائی ہو گی۔ اب چلو آگے ورنہ نیچے پھینک دوں گا سڑک پر۔"

"پھینک دو۔" وہ آگے بڑھا "میرا کیا ہے۔ مرنے کی چند گھڑیاں۔"

"اور وہ سوئی۔۔۔ جس سے تم باتھ روم میں ملے تھے۔"

"وہ۔۔۔ تم وہ نہیں ہو؟" اس نے میرے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں "تم ہی تو ہو تم سوئی ماشوق۔"

میں نے اسے ناک آؤٹ کر کے بند گودام کے قریب ہی لٹا دیا۔

پھر میں نے ڈاکٹر شاہ سے کہا "تمہارے اس میڈیکل بیگ میں کیا کچھ ہے؟"

"تم۔۔۔ کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم چوہدری صاحب کو خاموشی کا انجکشن لگا دو۔ ان کے لیے آرام ضروری ہے۔"

ڈاکٹر نے اجازت طلب نگاہوں سے دلاور کو دیکھا "وہ سلیم پین کا ایک انجکشن ہے۔"

دلاور نے غرا کے کہا "تم مجھے انجکشن نہیں لگاؤ گے۔"

"پھر میں دوسری قسم کا انجکشن دوں گا۔ تمہیں بے ہوش کرنے کا وہی طریقہ موثر ہے جو آج تک استعمال ہوتا رہا ہے۔ یہ تو میں نے رعایت دینے کی کوشش کی تھی ڈاکٹر شاہ کی سفارش پر" میں نے کہا اور اس سے پہلے کہ دلاور کچھ بولتا میں نے اس کی گردن پر ہاتھ مار دیا۔ دلاور کو تڑپنے کا موقع بھی نہیں ملا اور نپے تلے وار نے اسے کٹے ہوئے درخت کے تنے کی طرح زمین بوس کر دیا۔

ڈاکٹر شاہ نے افسوس سے سر ہلایا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔

میں نے کہا "اسے اٹھانے میں میری مدد کرو۔"

ڈاکٹر شاہ بادل ناخواستہ اٹھا "اچھا ہوتا اگر تم لوگ سمجھوتا کر لیتے ان حالات میں۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "حالات سے حقائق نہیں بدلتے۔ موسم بدلتے ہیں تو پودے پھوٹتے ہیں اور پھول کھلتے ہیں مگر جڑ تو بچھڑی رہتی ہیں۔ حرارت سے برف پگھل جاتی ہے۔ وجہ حرارت فقط انجماد سے کتنا ہی نیچے کیوں نہ چلا جائے۔ آگ تو آگ ہی رہتی ہے۔"

ولی پیٹ پر دلاور کے لیے بھی جگہ تھی مگر میں نے اسے بیڈ کے نیچے ڈال دیا اور ڈاکٹر شاہ سے کہا "اب تم کیا کرو گے؟"

[illegible] نے شانے اچکائے "جو بھی تم کہو گے۔ یہ آرڈر [illegible] آف [illegible]۔"

[illegible] کی نکال جل جائے۔ میں نے تحقیقات میں ڈاکٹر شاہ کی تلاشی لی۔ اس کی کسی جیب میں کوئی خطرناک چیز نہیں تھی "تم اس کمرے میں خاموش بیٹھے رہو گے تو محفوظ رہو گے۔ باہر کچھ بھی ہو تمہاری دخل اندازی خود تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔"

"میں یہاں خاموش ہوں" وہ بولا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

باہر سے محسن کی آواز آئی۔ اس نے آرڈر بول کے فریج میں پوچھا تھا کہ کون ہے۔ جواب میں پھر کسی نے گھنٹی بجائی اور دروازے پر لات بھی ماری۔ میں نے دوسرے کمرے میں دروازے کے پیچھے چھپ کر انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ میں حتی الامکان مار دھاڑ یا فائرنگ سے گریز کرنا چاہتا تھا۔

محسن کے دروازہ کھولتے ہی دو افراد اندر گھس آئے۔ وہ کرائے کے بدمعاش تھے۔ وہ سرمنڈے سیاہ فام جن کے قد چھ فٹ سے نکلتے تھے اور بدن سانڈ کی طرح مضبوط تھے۔ انھوں نے جینز کی تنگ پتلونیں اور رنگین چست بنیانیں پہن رکھی تھیں۔ چیونگم چباتے ہوئے انھوں نے منہ ٹیڑھا کرکے اور لہجہ بگاڑ کے کہا "وہ کہاں ہیں؟"

محسن نے بھی اداکاری کی۔ اس نے فریج میں رونا کیا اور ان کے یوں اندر گھس آنے پر احتجاج جاری رکھا۔ ان میں سے ایک نے محسن کا گلا دبوچ لیا اور بولا "تم انگریزی میں جو کہنا نہیں جانتے تو میں سمجھا سکتا ہوں۔"

"اوکے... اوکے..." محسن ہانپ کے بولا "میں کہتا ہوں۔ مگر تم کیا چاہتے ہو۔ نہ میں تم کو کاٹ رہا ہوں نہ بھونک رہا ہوں۔"

دوسرا سیدھا دوسرے کمرے میں آیا۔ اس نے کمرے میں قدم رکھنے کے بعد کسی کو نہ پاکے سر ہلایا اور اپنے ساتھی سے کہا "اس کمرے میں تو..."

وہ پیچھے ہی والا تھا کہ میں نے اسے سر پر ریوالور کا بٹ مار کے گرا لیا۔ اس نے گرتے گرتے بھی گالی دی جو ایک بے ہودہ کراہ بن گئی۔ یہ آواز اس کے ساتھی نے سنی "یہ کیا ہوا؟" اس نے محسن سے پوچھا۔

"کہاں کیا ہوا؟" محسن نے کانپتے ہوئے کہا۔

اس نے محسن کو پیچھے دھکیلا "چودھری دلاور اور ڈاکٹر کہاں ہیں؟"

[illegible] نے چودھری دلاور کا نام ایسے لیا تھا جیسے اس کی والدہ

میں رہو ہو۔ چودھری ڈی ابارا سے

"یہ کیا چیز ہوتی ہے؟" محسن نے کہا "ڈاکٹر تو میں خود [illegible] ہوں۔"

"شٹ اپ... وہ یہاں آئے تھے۔"

"تم دونوں یہاں آئے ہو۔ یہ تو میں مانتا ہوں۔"

اس نے محسن کو پیچھے دھکا دیا اور خود اپنے ساتھی کو [illegible] آگے بڑھا "ہائے بوائے...." [illegible]

دروازے تک پہنچ کے اس کے قدم رک گئے۔ اس نے [illegible] بڈی کو فرش پر بے حس و حرکت الٹا پڑا ہوا دیکھ لیا تھا "[illegible] اندر؟"

محسن نے پیچھے سے اس پر وار کیا "تمہارا اصل باپ۔"

وار کچھ ہلکا تھا یا وہ زیادہ سخت جان تھا کہ اس نے نالی [illegible] ڈکرا کے ایک جھٹکا لیا اور پھر ایڑیوں پر گھوما۔ ریوالور اس کے ہاتھوں میں بھی تھا مگر اپنے مقابل زیادہ خطرناک سا منظر [illegible] دیکھ کے اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اب میں نے اس کی [illegible] دوسری طرف سے وار کیا اور اس نے کراہ کے کہا "[illegible]" دھڑام سے گرا۔

"سیدان صاحب! کوئی اور بھی ہے؟" میں نے کہا۔

"ایک اور ہے" محسن بولا۔

"ایک اور ہے... کہاں؟"

"میں آپ کے سامنے ہوں۔ کہیں آپ کا نشانہ [illegible] ادھر نہ کر دیجیے۔"

میں نے کہا "مجھے کالا کتا ہے اندھے۔ تجھے سمجھانا کہ [illegible] جا کے دیکھ۔ کیا یہ نظر نہیں آرہے تھے؟"

"ضرور نظر آئے ہوں گے مگر میری رپورٹ درست تھی کہ کوئی ایشیائی چہرہ نظر نہیں آیا تھا۔"

میں نے کہا "کیا ہم فرض کر سکتے ہیں کہ دلاور کے بچانے [illegible] والے دلاور ہی تھے یا ان کا کوئی دلاور ساتھی بچ جاتا ہے۔"

محسن بولا "ہم فرض کیوں کریں۔ انتظار کیوں نہ کریں۔ [illegible] ہوگا سامنے آجائے گا۔ میں کافی بناتا ہوں اور دیکھتا ہوں کھانے کے لیے کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں ڈاکٹر شاہ سے بات کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر شاہ نے ایک بار جھانک کے ضرور دیکھا تھا مگر پھر خود کو اندر کر لیا تھا۔ وہ بے سدھ پڑے ہوئے پانچ افراد کے گروہ [illegible] شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے کہا "ڈاکٹر شاہ، یہ [illegible] فوراً ہوش میں نہ آئے مگر اس کی بیوی کو ہوش آجانا چاہیے۔ اس نے بھی خواب آور دوا والی کافی اپنے شوہر کے ساتھ [illegible] تھی۔ یہ تو ڈاکٹری مدد کر سکتی ہے۔ تمہارے پاس ہے کوئی [illegible] انجکشن جو اس کی غنودگی ختم کر دے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "ویسے تو بلیک کافی بھی کام [illegible] مگر وہ بھی خاتون تو وہ کافی پینے کے قابل نہیں ہیں۔"

بند کور نے حلق سے اوں اوں کی آوازیں نکال کے کروٹ لی اور بے ہوش ہو گئی۔ ڈاکٹر شاہ نے اسے ایک انٹراوینس انجکشن لگایا "پانچ دس منٹ میں یہ جاگ جائیں گی۔"

میں نے باہر جھانک کے محسن سے کہا "ایک بلیک کافی بند کور کے لیے۔"

"بند کور کے لیے بندہ جان حاضر ہے" محسن نے جواب دیا "ویسے یہاں وہ خواب آور دوا بھی رکھی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "ایک گھونٹ پی لے۔"

ڈاکٹر شاہ نے گھبرا کے کہا "ایک گھونٹ۔ اس کے چند قطرے استعمال ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "انسانوں کے لیے۔ گولی بنانے والا ایک جن ہے بے چارہ۔"

"ہم نے اکٹھے بیٹھ کے کافی پی۔ بند کور کے ہوش میں آنے سے پہلے میں نے محسن کو سمجھا دیا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ ڈاکٹر شاہ بے وقوفوں کی طرح ہمیں دیکھتا رہا اور اپنے جبڑے ہلاتا رہا۔ محسن کی دولتی نے اس کی بتیسی کو خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ وہ کافی کے ہر گھونٹ کے ساتھ "سی" کرتا تھا۔

بند کور نے آنکھیں کھولتے ہی پلکیں جھپکائیں اور پھر اپنے ساتھ بے سدھ پڑے ہوئے سردار جی کو دیکھا پھر اس کی نگاہ ہم پر پڑی۔ وہ کچھ دیر حیرت کی کیفیت میں کچھ سوچتی رہی۔ پھر شاید اسے سب یاد آگیا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے پریشان بالوں کو انگلیوں سے سنوارا اور دوپٹہ ٹھیک کیا۔ ایک زنانہ عادت کے تحت پھر اس نے کچھ شرما کے پوچھا "میں یہاں کیسے آئی؟"

"[illegible] اور خوش گوار تجربہ میرے حصے میں آیا" میں نے کہا۔

وہ خوش ہو کے مزید شرمائی۔ اس نے ڈاکٹر شاہ کی طرف دیکھا "یہ...؟"

محسن نے کہا "ڈاکٹر ہیں.... انھوں نے آپ کو ابھی انجکشن دیا تھا۔ جگانے کا انجکشن۔ یہ کافی نوش فرمائیے۔ پھر آپ سے کچھ اور [illegible]۔"

اس نے کافی لے لی "آپ نے بڑی تکلیف اٹھائی... اور [illegible]۔"

"اب ہم تو آرام سے رخصت ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ کی مدد کے بغیر شاید یہ ممکن نہیں ہو سکتا۔"

اس نے کافی کا پہلا گھونٹ لیا تو میں نے اسے اپنے ہی گھر میں سیر کے لیے [illegible] بند کور [illegible] اس نے ایک چیخ کو اور دبا کر دیکھا تو بے اختیار چیخ مار کے بولی "ہائے میں مر گئی" اور ایک ہاتھ سینے پر رکھا "[illegible]؟"

محسن نے کہا "[illegible] ساتھی ہے۔"

اس نے ایک گھونٹ ری ایکشن کے طور پر کہا "ہائے میں مر گئی" [illegible] ہونا چاہیے تھا۔ ہائے میں پھر مر گئی۔ مریں آپ کے [illegible]" میں نے کہا "اب آپ ذرا دھیان سے

میری بات سن لیں اور سمجھ لیں۔ ہم تینوں تو ابھی چلے جائیں گے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ۔"

"ہم چار...." محسن نے تصحیح کی۔

"یہ [illegible]؟ تم سردار جی کو بھی لے جاؤ گے؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "ایک بندہ آپ کے بیڈ کے نیچے بھی موجود ہے۔"

اس نے کہا "کیا وہ مر گیا ہے؟"

"وہ سو فیصد زندہ ہے" میں نے کہا۔

"آخر یہ سب کون لوگ ہیں؟ یہ کیا چکر ہے؟" وہ پریشان نظر آنے لگی۔

میں نے کہا "چکر میں آپ مت پڑیں۔ ہمارے جانے کے بعد آپ پولیس کو بلائیں۔ ڈاکٹر کو طلب کریں۔ انھیں بتائیں کہ دو بدمعاش آپ کے فلیٹ میں گھس آئے تھے۔ اگر آپ کے شوہر بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے ان کو ناک آؤٹ نہ کرتے اور اسی بہادری کے مظاہرے کے دوران میں خود بھی حریف کا ایک ہاتھ پڑنے سے ناک آؤٹ نہ ہوتے تو شاید یہ بدمعاش آپ کو لوٹ لیتے۔ آپ کو ایسی اداکاری کرنی پڑے گی جیسے یہی ہوا ہے۔"

اس نے سر ہلایا "وہ... وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کیا وہ مان لیں گے؟"

"کیوں نہیں مانیں گے۔ آخر آپ اس فلیٹ کی مالک ہیں۔ یہ آپ کے جینوئن شوہر ہیں اور یہ جینوئن بدمعاش" میں نے کہا "یہ ہے آپ کے شوہر کا وہ ریوالور جس سے انھوں نے ان دونوں کے سر پر ضرب لگائی تھی۔ یہ میں یہاں ڈال دیتا ہوں۔"

"لیکن... سردار جی ادھر لیٹے ہیں۔"

"آپ کی آسانی کے لیے میں ان کو ان بدمعاشوں کے پاس لٹا رہا ہوں" میں نے کہا "سردار جی کو بھی آپ ہی سمجھائیں گی کہ ہمارا نام اس کہانی میں کہیں نہ آئے ورنہ خود ان کے لیے مصیبت ہو جائے گی۔ پولیس ایک عام سی چوری ڈکیتی کی نیت کا کیس آسانی سے رجسٹر کرلے گی اور ملزمان کو ساتھ ہی لے جائے گی۔ ان کا سابقہ ریکارڈ اچھا نہیں ہو سکتا۔ پولیس خود دیکھ لے گی۔"

محسن نے کہا "کیوں نہ ہم یہ سب سردار جی کو خود سمجھا دیں۔ پانچ دس منٹ میں یہ بھی جاگ سکتے ہیں۔"

میں نے ڈاکٹر شاہ کی طرف دیکھا "ایک اور انجکشن ہوگا ان کے لیے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "وہ دس انجکشنوں کی شیشی ہے۔ ابھی تک میں نے تین استعمال کیے ہیں۔"

سردار جی نے ہوش میں آتے ہی زیادہ بے تکے سوالات کیے اور کافی پینے کے بعد بھی ان کی سمجھ والی پوری طرح کار آمد نہیں ہوئی۔ انھیں ہر بات سمجھانے کے لیے مجھے بار بار دہرانی پڑی۔

"آپ نے انھیں ریوالور کا بٹ مار کے ناک آؤٹ کیا۔ دروازہ آپ کی بیوی نے کھولا تھا۔ آپ کو موقع مل گیا تھا دروازے کے پیچھے چھپنے کا۔ اور ریوالور نکالنے کا۔ پہلے آپ نے ایک کے سر پر وار کیا پھر دوسرا آگیا۔"

www.paksociety.com

"یہ کون ہیں؟"

"آپ انہیں نہیں جانتے۔ یہ آپ کو لوٹنا چاہتے تھے۔"

"اچھا۔ کیا انہوں نے مجھے لوٹ لیا؟"

"آپ کو کچھ نہیں ہوا۔ ... کے سامنے آپ اخبارات میں دیکھ لیں۔ اگر آپ نے اپنے بیان میں یہ اور کہا۔ تو پولیس کو شک ہو جائے گا۔ ہمارا کوئی حوالہ نہیں دینا ہے۔ بس یہ سمجھ لیں کہ ہم یہاں آئے ہی نہیں۔ نہ آپ نے ہمیں دیکھا۔ آپ کسی چوہدری دلاور کو یا سکندر بخت کو نہیں جانتے۔"

"میں کہہ دوں گا کہ میں کسی چوہدری دلاور یا سکندر بخت کو نہیں جانتا۔"

میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "سردار جی۔ میرا مطلب تھا کہ آپ کوئی نام ہی نہ لیں جس سے پولیس سوال جواب کرنے لگے۔"

جندکور نے کہا "آپ فکر مت کریں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔"

میں نے کہا "آپ کا بیان سیدھا اور مختصر ہوگا تو کوئی الجھن پیدا نہیں ہوگی۔ آپ باہر جانے کا اور ہم سے ملاقات کا یا آئس کریم پارلر میں ہونے والے ہنگامے کا بھی ذکر نہ کریں۔ یہ کہیں کہ آج ہم گھر پر تھے اور میری طبیعت کچھ ناساز تھی۔ ہم لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ کسی نے گھنٹی بجائی۔ میں نے دروازہ کھولا تو یہ دو بدمعاش اندر آ گئے۔ میرا شوہر ایک دم اپنا ریوالور لینے لپکا کیونکہ اندر آتے ہی بدمعاشوں نے مجھے دھکا دیا تھا اور کہا تھا کہ شور مچانے کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی تھی۔ میرے شوہر نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے ایک ایک کو باری باری ناک آؤٹ کیا مگر وہ خود بھی ایک بدمعاش کے ہاتھوں ناک آؤٹ ہو گیا تو مجھے بھی چکر سا آیا اور میں بے ہوش ہو گئی۔ چند منٹ میں مجھے ہوش آیا تو میں نے پولیس کو بلا لیا اتنی دیر میں سردار جی کو بھی ہوش آ گیا۔ اور ہاں، آپ یہ ضرور بتا دیں کہ غالباً ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا مگر آپ نے اسے دیکھا نہیں، وہ بعد میں آیا ہوگا۔"

اس نے پریشان ہو کے کہا "یہ کہنا کیوں ضروری ہے؟"

"اس لیے کہ ہم بیس ہزار پاؤنڈ اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ دس ہزار پاؤنڈ تمہارے شوہر کو دلاور نے بطور ایڈوانس دیے تھے اور باقی دس اپنے ساتھ لایا تھا۔ چوہدری دلاور کا مال ہم پر حلال ہے۔ اگر یہ تمہارے گھر میں رہتا تو شاید تمہارے لیے نحوست لاتا۔ اپنے شوہر کو بھی سمجھانے کی کوشش کرنا کہ اس چکر میں نہ پڑے۔ ہم کل لندن سے پاکستان چلے جائیں گے۔ ہمارے پھر ملنے کا کوئی امکان نہیں اس لیے خدا حافظ۔ اور ہاں، یہ لو سردار جی کا ریوالور۔"

سردار جی نے ہاتھ جوڑ کے کہا "تمہارا بیڑا غرق ہو۔ واہگورو کرے تمہارا جہاز کریش ہو جائے۔"

میں نے کہا "بددعا کیوں دیتے ہو سردار جی!"

"اور کیا آشیرباد دوں۔ چنگا بھلا کام ہو گیا تھا۔ ..." پھر کے بولا "اس جندکور کے لیے اس کمبخت سوری ... گڈی آ جاتی۔ لگتا ہے ابھی کچھ دن اور یکی گاڑی ہی ... میں سواری کے لیے۔"

"یہی کرتوت رہے تمہارے تو کسی دن پولیس کی گاڑی میں سواری کرتے نظر آؤ گے" میں نے کہا "جندکور پر اور ... قناعت کرو۔ اپنی چیز اپنی ہوتی ہے۔"

لاؤنج میں فون موجود تھا۔ میں نے ایڈی کے گھر کا نمبر ... ریسیور اس کی بیوی نے اٹھایا اور بولی "ہیلو۔"

میں نے کہا "مسز ایڈی، ہم ابھی آ رہے ہیں۔"

"کون ہو تم؟" وہ بولی۔

"تمہارے گیراج میں سونے والے مہمان" میں نے کہا۔

وہ چہکنے لگی "آ جاؤ۔ میں گاڑی باہر نکال دیتی ہوں۔"

"ایک مہربانی کرنا۔ ہمارے بارے میں کسی کو کچھ مت ... ہم روپوش رہنا چاہتے ہیں۔ ایڈی ہمیں بیچ لایا تھا ... جائے گا۔"

"تم فکر مت کرو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ ... اچھی طرح۔"

میں نے اور محسن نے چوہدری دلاور کو اٹھایا اور نیچے لے گئے۔ ڈاکٹر شاہ کی گاڑی نیچے موجود تھی۔ چوہدری دلاور ... میں وہاں پہنچا تھا۔ مجھے ایک بےہودہ قسم کی لمبی چوڑی ... آئی جس کی چھت نہیں تھی اور باڈی پر نمبر سے ... لکیریں تھیں۔ یہ انہی دونوں کی گاڑی ہو سکتی تھی جو چوہدری ... کی مدد کرنے آئے تھے۔ مجھے اگلی سیٹ پر ان کا تیسرا ساتھی ... آیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا ... کے ساتھ ایک ڈبل ڈیکر قسم کی سیاہ فام گرل فرینڈ تھی اور ... دوسرے کے عشق میں دنیا و مافیہا سے بےخبر تھے۔ شاید ... اپنے دونوں ساتھیوں کے لوٹ کر نہ آنے کی اسے فکر نہیں ... اس کا وقت اچھا گزر رہا تھا مگر بہت جلد پولیس اسے بھی ... کی ڈکیتی کے الزام میں پکڑنے کے لیے آنے والی تھی۔

میں نے دلاور کو پچھلی سیٹ پر ڈالا تو ڈاکٹر شاہ نے ... "کیا مجھے بھی تمہارے ساتھ ہی رہنا پڑے گا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ ابھی تمہارا کام تمام نہیں ہوا۔"

محسن بولا "اور ہم نے ابھی تمہارے بارے میں فیصلہ ... ہے؟"

اس نے ادھر ادھر دیکھا اور چلنے لگا "آخر تم کون ہو ... فیصلے کرنے والے۔ کیا تم خدائی فوجدار ہو؟"

اس سے پہلے کہ کوئی متوجہ ہوتا یا ڈاکٹر شاہ مدد کے لیے ... لگتا، میں نے اسے خاموش کر دیا۔ محسن نے اسے گاڑی ... لیا۔ قریب سے گزرنے والی ایک بوڑھی عورت نے مجھے ... نظروں سے دیکھا اور سینے پر صلیب بنائی۔ ایک نوجوان ...

"... پوچھ کیا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "کیا تم بھی اس کے ساتھی ہو؟ ہمارے ساتھ ... اٹینشن چلو۔ تمہیں اپنے سوال کا جواب مل جائے گا اور ... ضرورت ہم بھی کریں گے۔"

اس کی ساتھی لڑکی نے جلدی سے کہا "نہیں نہیں۔ ہمارا کسی معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔" پھر وہ لڑکے کو کھینچ کر لے گئی "خواہ مخواہ ہر معاملے میں ٹانگ مت اڑایا کرو۔ ایک شام ہم پہلے بھی ... برباد کر چکے ہیں اسی طرح۔"

اب ڈرائیونگ میں نے سنبھالی۔ راستہ ایڈی کی بیوی نے سمجھایا تھا۔ پون گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ہم اس علاقے میں پہنچ گئے اور تھوڑا سا بھٹکنے کے بعد بالآخر ایڈی کا گھر بھی مل گیا۔ یہ ڈھلوان چھت والا مختصر سا مکان تھا جس کی دیواریں اور چھت سب لکڑی کے بنے ہوئے تھے لیکن کھڑکیاں اور دروازے ایلومینیم کے تھے۔ باہر سے اس کو سفید پینٹ کیا گیا تھا اور دیواروں پر کھڑکیوں کے اوپر یہاں تک کہ چھت کے کناروں پر اتنے گملے لگائے گئے تھے کہ پورا گھر سبزہ و گل کی فراوانی سے چمن زار لگتا تھا۔

ایڈی کی بیوی نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں اندر لے گئی۔ وہ جیسی تصویر میں نظر آئی تھی اس سے کہیں زیادہ موٹی اور کالی تھی مگر وہ بے حد خلیق اور خوش مزاج عورت تھی۔ اندر سے وہ گھر بہت آرام دہ تھا اور بڑی سادگی اور خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ ایڈی کے دونوں بچے سو گئے تھے۔

"تم ایڈی کے دوست سکندر ہو؟" اس نے محسن سے پوچھا۔

"سکندر میں ہوں" میں نے کہا "یہ محسن ہے۔ اور یہ تیسرا ڈاکٹر شاہ ہے۔ چوتھا شخص گاڑی میں لیٹا ہوا ہے۔"

"کیا یہ تمہیں چھوڑنے آئے ہیں؟"

"یہی سمجھ لو۔ مگر اب ہم ان کو چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

"تو کیا تم سب گیراج میں رہو گے؟"

میں نے کہا "ہم گزارا کر لیں گے۔ جتنی جگہ ایک کار گھیرتی ہے وہ چار افراد کو لیٹنے کے لیے کافی ہونی چاہیے۔"

"گیراج اتنا چھوٹا نہیں ہے۔ ایڈی کی ورکشاپ بھی اسی میں ہے۔ وہ اچھا موٹر مکینک بھی ہے۔ لوگ اس سے گاڑی ٹھیک کرانا پسند کرتے ہیں کیونکہ وہ کسی کو ٹھگتا نہیں۔ اپنی فیملی کے لیے دن رات محنت کرتا ہے۔ اسے مجھ سے بہت محبت ہے۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھا اور سر ہلایا "بے شک۔"

"وہ بڑا اچھا کارپینٹر بھی ہے۔ یہ گھر اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ ہماری شادی سے پہلے۔ دراصل اس کے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور میری شرط یہی تھی کہ شادی سے پہلے تمہارا اپنا گھر ہونا چاہیے جس کو میں اپنا کہہ سکوں۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ کتنا بڑا ہے اور آرام دہ ہے یا نہیں۔ اس نے پورا ایک سال محنت کی اور تم دیکھ سکتے ہو کہ وہ اپنے کام میں کتنا ماہر ہے۔"

میں نے کہا "اس کی مہارت سے زیادہ میں اس کی محبت کے جذبے کی تعریف کروں گا۔ وہ تو فرہاد ہے۔"

"فرہاد۔۔۔ وہ کون ہے؟"

میں نے کہا "تم نہیں سمجھو گی۔ اس نے بھی اپنی گرل فرینڈ شیریں کے لیے ایسا ہی کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ پہاڑ سے دودھ کی نہر نکالی تھی۔"

"دودھ کی نہر" وہ چہکنے لگی "تمہارا مطلب ہے کوئی ڈیری فارم قائم کیا تھا کسی پہاڑ پر۔ خیر یہ دیکھو کہ مکان بنانے کے بعد ایڈی نے اس پر خود ہی رنگ کیا۔ یہاں آنے کے بعد میں نے کہا کہ اب تمہارا کام ختم ہو گیا۔ میں نے اس کو سجایا۔ ہم یہاں بہت خوش ہیں۔ اچھا میں تم کو کمبل دیتی ہوں۔ اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔"

میں نے کہا "نو۔۔۔ تھینک یو۔"

گیراج خاصا کشادہ تھا اور مکان کی چوڑائی کے برابر اس کی لمبائی تھی۔ تقریباً اٹھارہ فٹ۔ سامنے سے یہ دس فٹ چوڑا ہوگا۔ اس کے فرش پر تیل کے داغ تھے۔ آخری حصے میں ورکشاپ کا سامان بھی نظر آ رہا تھا۔ محسن نے کمبل بچھا دیا تو میں نے چوہدری دلاور کو گاڑی سے نکالا اور فرش پر لٹا دیا۔ پھر ہم بھی جوتے اتار کے کمبل پر بیٹھ گئے۔

ڈاکٹر شاہ سخت پریشان تھا "یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟ اگر رات گزارنے کا مسئلہ تھا تو تم میرے ساتھ چلتے۔"

میں نے کہا "ہم جیسے رئیسوں کو جن کے پاس بیس ہزار پاؤنڈ ہوں قیام کے لیے فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی جگہ مل سکتی ہے لیکن یہ جگہ ہمیں بہت پسند آئی ہے۔"

"تم دلاور کی بیماری کو نظرانداز کر رہے ہو، اس کی حالت۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "اس کی حالت مجھے تو ٹھیک لگتی ہے۔ اگر وقت پر دوا نہ ملی تو کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ اس کی زندگی کچھ اور مختصر ہو جائے گی۔ اس سے نہ ہمیں فرق پڑتا ہے نہ دلاور کو۔"

"مجھ سے تم کیا چاہتے ہو آخر؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "ایک ڈیتھ سرٹیفکیٹ!"

وہ بری طرح چونکا "ڈیتھ سرٹیفکیٹ۔ کس کی موت کا؟"

"چوہدری دلاور کی موت کا" میں نے کہا۔

"کیا۔۔۔ تم اسے قتل کر دو گے؟"

میں نے کہا "قتل کرنا ہوتا تو ہم اسے بہت پہلے کر دیتے۔ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"میں ویسے ہی ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری نہیں کر سکتا۔ خواہ یہ مر جائے۔ میں یہاں اسپیشلائز کرنے آیا ہوں۔ یہ سمجھ لو کہ طالب علم ہوں۔ مجھے اجازت نہیں ہے پریکٹس کی۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "اجازت؟ صرف پاکستانی ہی نہیں لاکھوں ہندوستانی اور دوسرے ایشیائی ممالک کے رہنے والے یہاں بلا اجازت سب کچھ کر رہے ہیں۔ مثلاً ہم یہاں بلا اجازت آئے ہیں۔ ہم جیسے ہزاروں ہر سال آتے ہیں اور چوری چھپے سب کچھ کرتے ہیں' پریکٹس بھی۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "ٹھیک ہے۔ میں بھی مریض دیکھ لیتا ہوں۔ وہ سب اپنے پاکستانی یا انڈین ہوتے ہیں۔ ایک کلینک بھی ہے میرا مگر میرے پاس لائسنس نہیں ہے۔"

"لائسنس کس کے پاس ہے۔ یہ تم ضرور جانتے ہو گے۔"

"لیکن ایک زندہ آدمی کے لیے ڈیتھ سرٹیفکیٹ۔۔۔"

میں نے کہا "ڈیتھ سرٹیفکیٹ فراہم کرنے کے بعد تمہاری بخشش ہوگی۔ اس کے بغیر نہیں۔"

محسن نے کہا "جب تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو تو بحث کیوں کرتے ہو؟"

"یہ بلیک میلنگ ہے۔"

میں نے کہا "ہمیں معلوم ہے۔ سرٹیفکیٹ کون دے سکتا ہے؟"

"ایک ہندو ڈاکٹر ہے' امرناتھ۔ مگر وہ ایک ہزار پاؤنڈ مانگے گا۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں' دے دو۔"

"میں دے دوں۔۔۔؟"

میں نے کہا "بہت دولت اکٹھی کی تھی تم نے چوہدری دلاور کے ساتھ وزیر خان اسپتال میں لوگوں کو پاگل بنا کے۔ اس کا بھی حساب تو ہونا چاہیے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم ایسے ہی چھوٹ جاؤ گے۔ یہ مت بھولو کہ ہم بھی لاہور میں ہیں۔ وزیر خان اسپتال میرا ہے اور ایک دن ہم اس کا چارج سنبھالیں گے تو بہت کچھ معلوم ہو جائے گا جو ابھی ہم نہیں جانتے۔ وہ سب ریکارڈ اگر کسی تفتیشی ادارے کے سپرد کر دیا جائے۔۔۔"

ڈاکٹر شاہ کی حالت غیر ہو گئی "یہ خطرہ تو مجھے ہمیشہ لاحق رہے گا تم سے۔"

"ہم پیشہ ور بلیک میلر نہیں ہیں۔ چوہدری دلاور کے ساتھ ایک ذاتی معاملہ تھا پھر یہ حب الوطنی کا تقاضا بن گیا۔ تم نے دیکھا کہ میں نے تمام ذاتی عداوتوں کے رشتے آج ختم کر دیے۔ میں نے اسے معاف کر دیا مگر یہ پاکستان کا مجرم ہے۔ پاکستان کا قانون اسے جو سزا چاہے دے۔ تمہارے ساتھ ہمارا کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے۔ تم اس ملک کے ہزاروں بلکہ لاکھوں ضمیر فروش لالچی اور مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے معزز اور شریف لوگوں میں شامل ہو جو انسانیت کے نام پر داغ ہیں مگر ہم ایسے سب لوگوں کی اصلاح نہیں کر سکتے اور ان کے خلاف سزا کے عمل کا آغاز کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے۔ ہمارے پاس نہ اتنا وقت ہے نہ اتنے وسائل اور نہ اتنا اختیار۔"

ڈاکٹر شاہ نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "اچھا فرض کرو میں تم کو ایک ڈیتھ سرٹیفکیٹ لا دیتا ہوں۔"

"وہ جعلی نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی قانونی اور سرکاری حیثیت شبے سے بالاتر ہونی چاہیے۔"

"اس کی رجسٹریشن بھی ہوگی۔ مگر دلاور تو زندہ ہے۔"

میں نے کہا "ہم یہاں سے اس کو تابوت میں لے جانا چاہتے ہیں۔ اس طرح کہ یہ لاش نظر بھی آئے' ثبوت ہمارے ہاتھ میں ہو گا تو کون شک کرے گا۔"

وہ کچھ دیر مجھے بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا "تم خود ناجائز طور پر چھپ کے برطانیہ میں داخل ہوئے تھے۔"

"ہم اسی طرح نکل بھی جائیں گے" محسن بولا۔

"لیکن اس تابوت کے ساتھ۔ لاش کو چھپا کے لے جانا اور لاش بھی وہ جو درحقیقت لاش نہ ہو۔۔۔ یہ سب کیسے ہوگا؟" ڈاکٹر سر پکڑ کے بولا۔ "کہیں تم پکڑے گئے تو سب چکر میں آ جائیں گے۔ میں بھی' ڈاکٹر جو ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کرے گا وہ بھی۔"

میں نے کہا "تم جیسے لوگ تو ویسے ہی پکڑے جانے کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔ دل مضبوط رکھو۔ آج تک کچھ نہیں ہوا تو آئندہ بھی شاید کچھ نہ ہو۔"

"پھر بھی۔ مجھے بتاؤ تو سہی کہ تم یہ سب کیسے کرو گے؟"

"یہ سب تم کرو گے" میں نے کہا "ہے نا کمال کی بات؟"

"تم ایک ہی بار کہہ دو کہ مجھے کیا کرنا ہے" وہ بگڑ کے بولا۔

"اچھا سنو۔ ایک کام ہم نے تمہیں بتا دیا ہے۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ پر تم چوہدری دلاور کا نام' ولدیت اور پتا سب ٹھیک لکھو گے۔ یہ سب باتیں تم کو یقیناً معلوم ہوں گی۔ اس کے ساتھ تم اسپتال کا ریکارڈ لگاؤ گے۔ ڈاکٹر زبیدہ کی رپورٹ اور ڈاکٹر فرزند کی حتمی رپورٹ۔ سی ٹی اسکین کی فلمیں بھی ساتھ ہوں تو مزید بہتر ورنہ بایوپسی رپورٹ بھی کافی ہوگی۔ BIOPSY میں یقیناً یہ ہوگا کہ برین ٹیومر کی کون سی اسٹیج ہے اور یہ MALIGNANT ہے اور اس کا سبب یہی ہو تو شک کون کرے گا۔ دوسرا کام تمہیں یہ کرنا ہے کہ دلاور کے سائز کا ایک تابوت حاصل کرو۔ بازار میں ہر قسم کے تابوت دستیاب ہیں۔ زیادہ کنجوسی مت کرنا۔ تابوت شاندار ہونا چاہیے۔ تمہارا آخری کام ایسا ہے جو صرف تم کر سکتے ہو۔ تم اپنے چوہدری دلاور صاحب کو نیند کا انجکشن دو گے' طویل گہری نیند۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اس کا اثر چھ سے آٹھ گھنٹے رہتا ہے۔ اس کے بعد جیسے ہی دلاور کو ہوش آئے گا یہ شور مچائے گا۔"

میں نے کہا "چھ آٹھ گھنٹے بعد ہم اسے دوسرا انجکشن لگا دیں گے یا چار چھ گھنٹے بعد ہی نیند کی گولی دے دینا۔ اس سے نیند پکی ہوگی اور اگر اس کے بعد چار چار گھنٹے کے وقفے سے کوئی دی گئی تو امید ہے چوہدری دلاور کی آنکھ اپنے پاکستان کا کر کھلے گی۔"

"تم انڈرورلڈ کے لوگ ہو تم۔"

"انڈرورلڈ تو اول تا آخر ہے۔ رنگ کے سوا ہم کیا لے رہے ہیں یا انڈرورلڈ ہمارے لیے ہے' تمہارے لیے نہیں" میں نے کہا۔

"چوہدری دلاور کے لیے بھی ہے۔"

"اگر اسے ہمیں کیا اور تمہیں کیا؟" محسن بولا۔

"وہ مر بھی سکتا ہے۔"

محسن نے کہا "مر جائے۔ ہمیں کیا اور تمہیں کیا۔ دلاور کی موت سے اس دنیا کو تو اس کے دوستوں دشمنوں کو کوئی نقصان نہیں۔ دشمن کیا خاک دشمنی نبھائیں۔ چھ مہینے بعد اس کو مرنا ہے بڑی اذیت کے ساتھ۔ اگر یہ ابھی مر گیا تو اس کے حق میں اچھا ہوگا۔ گھر والے بھی اسے مرتا دیکھنے کے عذاب سے بچ جائیں گے۔ کل بھی ان کو رو دھو کے صبر کرنا تھا وہ آج کر لیں گے۔"

"کیسی بے رحمی کی باتیں کرتے ہو تم" ڈاکٹر بولا۔

"اگر زہریلا سانپ یا بچھو تمہیں ڈنک مارنے والا ہو تو اس کو مارتے وقت کیا تمہارے دل میں یہ رحم کا خیال آتا ہے کہ ایک بے زبان کو مارنے کا کیا فائدہ۔ ہمارا مقصد چوہدری دلاور کو لاہور لے جا کے قانون کے حوالے کرنا ہے۔ زیادہ امید یہی ہے کہ ہم اپنے مشن میں کامیاب ہوں گے لیکن ہم اسے زندہ پیش نہ کر سکے تو مردہ پیش کر دیں گے۔"

"تم اسے بائی ائر کیسے لے جاؤ گے؟ ہوائی سفر کے قواعد بہت سخت ہیں" ڈاکٹر نے کہا۔

"عام حالات میں سخت قوانین کو نرم بنانے کے لیے کرنسی کا نسخہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ اپنی قومی ائرلائن میں اپنے قومی مزاج کے مطابق اہل کار لوگ ہیں اور ان کی باکمال پرواز سے سب استفادہ کرتے ہیں مگر روٹ باہر کی تو کچھ درجہ دوم اور سوم کی ائرلائنز ہر قسم کی خدمات کے لیے مستعد رہتی ہیں۔ وہ رعایتی نرخ پر مسافروں کو فرش پر بٹھا کے ٹوائلٹ میں چھپا کے یا کریو کے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ٹکٹوں میں بھی سودے بازی چلتی ہے۔ میں نے تو ایک ائرلائن کے اسٹاف کو باقاعدہ مسافروں کو متوجہ کرنے کے لیے اسی طرح آوازیں لگاتے بھی دیکھا ہے جیسے لاہور کے تانگے والے آواز لگاتے ہیں۔ چل بھئی بھائی لاہور کی' کچھ پرائیویٹ ایجنٹ ایک جہاز "ایک ٹکٹ اور ایک بیوی فری۔" ائرلائن تو یورپ زیادہ ہوا تو کوئی چھوٹی موٹی مسافروں کو دو طاقت والی ائرہوسٹس رکھ لیں۔ یہ کام ان کی پی آئی اے بھی کرتی ہے۔"

"تم جانتے ہو یہ سب تو ٹھیک ہے' میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔"

"اب تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو" میں نے کہا "لیکن یہ ہرگز مت بھولنا کہ تمہارا مستقبل ہمارے رحم و کرم پر ہے۔ اگر تم نے ہمیں پھنسانے کی کوشش کی اور قانون کے پاسداری کے چکر میں ہمیں نقصان پہنچاؤ گے۔ دلاور نے تمہیں یقیناً ہمارے بارے میں تفصیل سے بتا دیا ہوگا۔ یہ سوچ لینا کہ کیا تم میں ہم سے دشمنی مول لینے کا حوصلہ ہے؟"

"ابھی تک میں سب کچھ تمہاری خواہش کے مطابق کر رہا ہوں اور جہاں تک ممکن ہوگا میں تم سے تعاون کروں گا۔ کیا اس کے بعد مجھے یہ امید رکھنی چاہیے کہ تم پھر کبھی مجھے بلیک میل نہیں کرو گے؟"

"اگر ہم وعدہ کر لیں اور پھر مکر جائیں۔ تو تم کیا کرو گے؟ تم کوئی ضمانت حاصل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ کسی یقین دہانی کی کوئی اہمیت ہو بھی نہیں سکتی۔ بہتر ہے کہ تم اچھے بچوں کی طرح یہ کام سعادت مندی کے ساتھ کرو اور ہمیں شکایت کا موقع نہ دو۔"

وہ سر ہلا کے رخصت ہو گیا تو محسن نے کہا "اگر ہم میں سے کوئی اس کے ساتھ چلا جاتا تو اچھا ہوتا۔"

"مجھے ڈاکٹر شاہ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ وہ پوری طرح ہماری مٹھی میں ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ رات ہم ایسے ہی گزاریں گے' جاگتے ہوئے۔ بھوکے پیاسے" محسن نے کہا۔

"میں کوشش کرتا ہوں کہ لیڈی کی زوجہ کے دل میں مہمانوں کے ساتھ حسن سلوک کے جذبات جگا دوں۔ وہ ہمیں کافی بنا دے اور کچھ کھانے کو دے دے۔ مجھے ایک فون بھی کرنا ہے حاجی نعیم دین طوطی صاحب کو۔ اپنے پاسپورٹ منگوانے ہیں اور ان سے کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔"

"تو جاؤ۔ اپنے چوہدری صاحب ہوش میں آنے لگے ہیں۔ میں ان سے تفتیش کرتا ہوں" محسن بولا۔

لیڈی کی بیوی نے میری دستک پر کہا "یس" اور میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ اپنے وسیع گوشت کے پہاڑ جیسے جسم کو لباس شب خوابی میں سمیٹے کرسی پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ یہ لباس کسی اوسط کے خیمے جتنا بڑا تھا اور اس میں سے لیڈی کی بیوی جس حد تک عیاں تھی اس کو دیکھتے ہوئے لیڈی کی محبت اور اس کی ہمت کو داد دینی پڑتی تھی۔ وہ ٹی وی پر اپنے جیسی خواتین کی فری اسٹائل کشتی دیکھ رہی تھی۔

میں نے کہا "میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟"

"نہیں نہیں۔ بیٹھو' کچھ لو گے؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "مجھے حیرت ہوتی تھی کہ لیڈی کو تم سے اتنی محبت کیوں ہے کہ ہر وقت ہر جگہ وہ تمہارے گیت گاتا رہتا ہے۔ لیکن یہاں آ کے مجھے احساس ہوا کہ میری حیرت بے جا تھی۔"

وہ بہت خوش ہوئی "اس کی کیا بات ہے مجھ میں؟"

"تم جیسی عورت ایک مرد کی زندگی کی تکمیل کرتی ہے۔ میں اس گھر کو دیکھتا ہوں تو مجھے واقعی رشک آتا ہے۔ کتنی پرسکون اور پرآسائش بنا دیا ہے تم نے لیڈی کی زندگی کو۔ اس نے مجھے بتایا کہ تم کھانا بہت اچھا پکاتی ہو۔ سینڈوچ بہت مزے کے بناتی ہو اور کافی تو اسے سوائے تمہارے ہاتھ کی کافی کے کہیں پسند ہی نہیں آتی۔"

وہ ہنسی "ایسے ہی کہتا ہے وہ۔ تم فیصلہ کرو میں تمہارے لیے

www.paksociety.com

کافی لاتی ہوں۔ سینڈوچ کھاؤ گے؟"

"کسی اچھی پیش کش کو مسترد کر کے پچھتانے سے بہتر ہے کہ میں ہاں کہہ دوں۔ مگر مسز ایڈی! میرا دوست برا مانے گا۔"

"اسے بھی بلا لو۔ میں جب اکیلی رہ جاتی ہوں تو بس ٹی وی کے سامنے بیٹھ کے ایڈی کا انتظار کرتی ہوں۔ اچھا ہے تم سے باتوں میں کچھ وقت گزر جائے گا۔"

میں نے کہا "وہ.... دراصل ہمارے ساتھ ایک بیمار شخص بھی ہے۔ میرا دوست اسے چھوڑ کے نہیں آ سکتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں اسے کافی اور سینڈوچ گیراج میں پہنچا دوں گا۔ تمہارے بچے بہت پیارے ہیں۔"

وہ پھر ہنسی "بڑے شریر ہیں' صرف باپ کے قابو میں آتے ہیں۔"

"شریر بچے ذہین ہوتے ہیں" میں نے کہا "اور جو بچہ شریر نہ ہو وہ تو بوڑھا ہوتا ہے۔ کسی روز میرے بھی ایسے ہی شوخ اور شریر بچے ہوں گے۔ میں اپنی بیوی کو تمہارے بارے میں بتاؤں گا۔ کیا میں ایک فون کر سکتا ہوں؟"

اتنی خوشامد اور تعریف کے بعد تو میں کہتا کہ مجھے خون کرنا ہے تو وہ کہتی کہ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے' میرا کر دو۔ اس نے فون کی طرف اشارہ ... اور ایک کونے میں بنے ہوئے کچن میں کافی بنانے لگی۔ میں نے حاجی علم دین طوطی صاحب کا نمبر ملایا۔

جواب میں خود ان کی آواز آئی "اوئے ابوالحراری' تیرا دماغ... ہے کہاں ہے۔ ہیلو اوئے۔ اوئے کدھر رو رہا ہے' خصر تیری تو.... ہیلو۔"

میں نے کہا "طوطی صاحب۔ میرا دماغ تو حاضر ہے۔ مگر آپ...."

"او جی۔ وہ میں اپنے فرزند سے مخاطب تھا۔ بڑی غلطی کی میں نے اس کے سر کو صاف کرا کے۔" وہ بولے "جو تھوڑی بہت عقل تھی وہ بھی اڑ گئی۔"

"اڑ گئی۔ وہ کیسے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"جیسے برف پگھل کے غائب ہو جاتی ہے جی اس پر پوری نہ ہو تو۔ اس کے سر پر بھی بالوں کا کمبل تھا تو عقل محفوظ تھی۔ اب تو خیر میں نے ٹوپی رکھوا دی ہے اس کے سر پہ۔ مجھے بھی آسانی ہے۔ جوتی ہو تو ٹوپی ہٹا کے مارتا ہوں۔ آپ سناؤ میرے پاکستانی بھائی' سب خیر ہے نا.... جیل سے تو نہیں بول رہے ہو؟"

میں نے کہا "ہم اللہ کے فضل سے بالکل محفوظ ہیں اور ابھی خبر ہے ایک۔ ہم نے چوہدری دلاور کو پکڑ لیا ہے۔"

"اوچھا! بھئی تمہیں مبارک ہو۔ کہاں سے پکڑا اور کیسے؟"

میں نے کہا "وہ خود ہی آ گیا گرفتار ہونے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ فوت ہونے والا ہے۔"

"او ہو.... یہ تو ٹھیک نہیں کیا تم نے میرے پاکستانی بھائی' قتل بڑا سنگین جرم ہے خواہ کسی قاتل کا ہو۔"

میں نے کہا "آپ نے غلط سمجھا۔ وہ قضائے الٰہی سے فوت ہونے کے قریب ہے۔ اسے کینسر ہو گیا ہے دماغ کے اندر۔ ڈاکٹر نے حتمی فیصلہ دیا ہے کہ وہ تین ماہ کے اندر اندر مر جائے گا۔ ... اسے جلد از جلد پاکستان لے جا کے قانون کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔"

"یہ تو عجیب خبر سنائی تم نے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ اللہ کی ... بے آواز ہے۔ دیکھو کیسی مار دی ہے اس نے۔ سارا قصور تو ... کے شیطانی دماغ کا ... جیسا ہو گیا۔ موذی مرض۔ کب جا رہے ہو تم؟"

میں نے کہا "ہمارے پاسپورٹ آپ کے پاس ہیں۔ اور ایک سوٹ کیس ہے۔ اسی میں ہے سب کچھ۔ وہ آپ ... پتا لکھ لیں اور نوردین کو سمجھا دیں۔ وہ صبح پہنچا دے گا۔"

"بولو" انہوں نے کہا اور میرا بتایا ہوا پتا لکھا "یہ بتاؤ کہ آپ تو خود بھی چور دروازے سے آئے تھے۔ اس مردود بیمار کو ... کو کیسے ساتھ لے جاؤ گے؟"

میں نے کہا "حاجی صاحب! ماشاءاللہ آپ کے بڑے وسائل اور تعلقات ہیں۔ آپ کے علم میں ہے کوئی ایسا پائلٹ جس کا جہاز ہو اور لائسنس ہو۔"

"لوجی۔ ادھر تو وہ حال ہے' اپنے علامہ صاحب کے ... ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو غالباً غالب نے کہا تھا؟"

"او جی چھوڑو غالب اور مغالین کو۔ کیسا جہاز چاہیے آپ کو؟"

میں نے کہا "کوئی چار یا آٹھ سیٹوں والا سیسنا یا اور کوئی چھوٹا جہاز جسے ہم چارٹر کر سکیں۔ ایسے پرائیویٹ جہاز تو ... سیکڑوں ہوں گے مگر ہمیں کسی ایسے بندے سے ملوا دیں جو ... ہو۔ یہ میرا مطلب ہے۔"

"تمہارا مطلب میں سمجھ گیا میرے پاکستانی بھائی۔ ایک بڑا ملعون ہے۔ پہلے ائیرفورس میں تھا۔ اسے شریفانہ کام ملے تو ... کرتا ہے۔ وہ صرف اسمگلنگ کرتا ہے۔ بندے لے کر ... تو معمولی بات ہے۔ وہ تو افریقہ سے ہاتھی اٹھا لائے اور ... چڑیا گھر والوں کو خرمرا کے۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ ایسا ہی آدمی کر سکتا ہے یہ کام۔ آپ اسے بھی ہمارے پاس بھیج سکتے ہیں؟"

"اگر مل گیا کسی ٹھکانے پر تو اپنا چیف رپورٹر اس کو ڈھونڈ نکالے گا اور حاضر کر دے گا۔ پیسے وہ کام دیکھ کے مانگتا ہے۔"

"معاوضہ ہم طے کر لیں گے۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"جیک۔ مگر خود کو ہائی جیک کہتا ہے۔ اور ہاں۔ ایک کام کہا تھا تم نے' میں نے پتا لگا لیا ہے۔ ابھی تک تو اخبار ... اشتہار جاری نہیں کیا گیا ہے۔ مگر یہ تجویز زیر غور ہے۔ اور میرے پاکستانی بھائی' یہاں غور کرنے میں سال مہینے نہیں لگتے ہو ... کل پرسوں تمہاری تصویر چھپ جائے۔ اگر تم اس سے پہلے نکل جاؤ تو اچھا ہے۔"

میں نے کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے ہماری بہت مدد کی۔ ان کے بغیر ہم کچھ نہ کر پاتے۔"

"اوجی ایسا مت کہو۔ طوطی بڑا گنہگار اور عاجز بندہ ہے۔ سب کام کرتا ہے وہ رب سچا سوہنا۔ شکر اسی کا ادا کرو۔"

ان سے باقی باتیں الوداعی نوعیت کی تھیں۔ میں نے فون رکھا تو ایڈی کی بیوی نے کافی کے کپ اور سینڈوچ میرے سامنے رکھ دیے "یہ تم کس زبان میں کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

میں نے کہا "یہ اردو زبان تھی۔ اپنے ایک پاکستانی دوست سے بات کر رہا تھا۔"

میں نے ٹرے اٹھا کے ایڈی کی بیوی کا شکریہ ادا کیا اور گیراج میں آ گیا۔ چوہدری دلاور کو ہوش آ گیا تھا۔

محسن نے خفگی سے کہا "اتنی دیر کیسے ہو گئی؟"

میں نے کہا "دس منٹ خاتون خانہ کی تعریف کی۔ دس منٹ اپنے طوطی صاحب سے بات کی۔ اور میں خالی ہاتھ نہیں لوٹا ہوں۔"

"دلاور کی حالت ٹھیک نہیں ہے" وہ بولا "اسے دوا کی ضرورت ہے۔ کہیں یہ مر نہ جائے۔"

"نہیں یار۔ مرنا نہیں چاہیے اسے پاکستان پہنچنے سے پہلے۔ میں نے تو نکل ہی جانے کا انتظام کر لیا ہے' بائی ائیر۔"

"بائی ائیر۔ سیدھا کراچی؟"

"نہیں یار۔ ہم لندن سے نکل جائیں گے۔ چوہدری دلاور کا تابوت بھی ساتھ ہی پیرس پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد دیکھیں گے' ... "

"دلاور نے مجھے بتایا ہے کہ اسے دن میں تین چار مرتبہ مختلف دوائیں لینی ہیں ورنہ اس پر غشی کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔" محسن نے لقمہ دیا۔

"کیا اسے دواؤں کے نام یاد ہیں؟"

"نام تو یاد ہیں لیکن عام دوائیں بھی یہاں ڈاکٹر کے نسخے کے بغیر نہیں ملتی ہیں۔ وہ خاص دوائیں ہیں۔" محسن بولا "یہ سینڈوچ تمہارا پراسرار ہونے کے سوال اور یہ کافی..."

میں نے کہا "الو کے پٹھے۔ میں نے اتنی تعریف اور خوشامد کے بعد ایڈی کی بیوی سے یہ چیزیں بنوائی ہیں۔ نخرے مت کر۔ مجھے پتا چل گیا کہ تمہیں کافی بنانی ہے۔ سینڈوچ کا نام سن کے تو وہ پوچھے گی چیز۔ سینڈوچ تو ہوتی مٹی...... وچ..... مٹی میں.... مٹی میں کیا...؟"

"عقل کو کچھ مت کہنا۔ مجھ پر ویسے ہی رقت طاری ہو رہی ہے اس کی بار سے۔"

میں نے کہا "اپنے چوہدری صاحب۔ کچھ کافی شافی پی لو۔"

دلاور نے آنکھیں کھول کے نقاہت سے کہا "تم مجھے جانتے' ... دشمن بنا دیا ہے۔ دوا نہیں لا سکتے تو پھر زہر لا دو مجھے۔"

میں نے کہا "یار محسن۔ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ کیا خیال ہے' میں کار عشق ... شاید کوئی ڈاکٹر یا کیمسٹ مہربان ہو جائے۔"

"ڈاکٹر کو یہاں لائیں گے تو وہ پہلے پوچھے گا کہ تم نے مریض کو کہاں ڈال رکھا ہے۔ اسے تو اسپتال میں ہونا چاہیے۔ کیمسٹ نسخہ مانگے گا۔"

دلاور نے کہا "اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو پتا میں بتا رہا ہوں۔ تمہیں نسخہ بھی مل جائے گا... اور دوا بھی۔"

"کیا ڈاکٹر شاہ سے فون پر بات نہیں ہو سکتی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تمہیں میرے گھر جانا پڑے گا۔ میرا ... ہے جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ کمرے کی چابی میرے پاس ہے۔"

"اور یہ کمرا کس گھر کا ہے۔ وہاں کتنے تالے ملیں گے مجھے؟"

"یہ ہوٹل کا کمرا ہے" وہ بولا "تم کہہ سکتے ہو کہ نواب خسرو جمشید کو اچانک جانا پڑا۔ تم میرا بل ادا کرو گے تو وہ سامان تمہارے حوالے کر دیں گے' تمہارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ بل مشکل سے سو سوا سو پاؤنڈ ہو گا۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھا "اگر میں اکیلا نہ جاؤں' اپنے ساتھ شہزادہ سلیم کو لے جاؤں؟"

محسن نے کہا "ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر تو جائے گا کیسے؟"

"ٹیکسی سے۔ پہلے جاتا ہوں طوطی صاحب کے نقار خانے۔ وہاں سے اپنا سامان بھی اٹھا لوں گا۔ اور اسے اپنے ساتھ بٹھا لوں گا۔ چیف رپورٹر صاحب کو۔ وہ ہوٹل میں جا کے چوہدری دلاور کا سامان لے آئے گا۔ دو گھنٹے میں سارے کام ہو جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر تو جا۔"

ٹیکسی لندن کی سڑکوں پر چوبیس گھنٹے کسی دشواری کے بغیر ملتی ہے۔ اور وہ کہیں جانے سے انکار کرتے ہیں اور نہ انتظار کرنے سے۔ کرایہ فاصلے کے مطابق رہتا ہے اور ویٹنگ چارجز میٹر کے حساب سے۔ ایک گھنٹے بعد جب میں طوطی صاحب کے نقار خانے سے اپنا سامان اٹھا کے نوردین کے ساتھ روانہ ہوا تو میرا ہنسی سے برا حال تھا۔ نوردین نے کئی بار اپنے سر پر ٹوٹ جانے والے ظلم کی داستان سناتے ہوئے بے بال ٹنڈ میرے سامنے جھکا کے بے چینی کی "اباجی کی جوتی ڈائریکٹ لگتی ہے جی۔ پہلے بال تھے تو اتنا پتا نہیں چلتا تھا۔ آواز بھی بڑی ظالم پیدا ہوتی ہے اور اندر سفر فرانی ہو جاتا ہے۔" وہ فریادی لہجے میں بولا "یہ ٹوپی پہنتا ہوں تو آئینے میں صورت دیکھ کے رونا آتا ہے۔"

میں نے کہا "اللہ تمہاری مشکل آسان کرے گا چوہدری نوردین۔ جب تک سر پہ بال دوبارہ نہ اگ آئیں' سمجھو کہ آزمائش کا دور ہے۔ اللہ اپنے نیک بندوں کو ہی آزمائش میں ڈالتا ہے۔"

وہ تقریباً خالی سڑک تھی جس پر میں نے اچانک ایک پولیس کار کا سائرن سنا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ ہمارے پیچھے کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ نہ کوئی سگنل توڑا تھا اور نہ کسی ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی ہوئی تھی۔ مجھے شک ہوا کہ پولیس ٹیکسی کا تعاقب میری وجہ سے کر رہی ہے۔ شاید کسی پولیس مین کی نظر نے مجھے تاڑ لیا تھا۔

www.paksociety.com
www.paksociety.com

میرا شک اس وقت قوی ہو گیا جب ٹیکسی کے ساتھ ہی پولیس کار بھی مڑ گئی۔ ہوٹل اب قریب ہی تھا۔ لندن کے ماہر ٹیکسی ڈرائیور پولیس کو جُل دے کر فرار ہونے کا فن بھی جانتے ہیں مگر اب اس کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

ٹیکسی ہوٹل کے سامنے رکی تو پولیس کار بھی رک گئی۔

میرا خون خشک ہونے لگا تھا اور میری صورت دیکھ کے شہزادہ سلیم پر بدحواسی طاری تھی۔ "اب کیا ہوگا جی۔" اس نے پولیس مین کو اپنی طرف آتا دیکھ کے کہا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی "وہی جو بکرے کے ساتھ ایک دن ہوتا ہے۔ خواہ اس کی ماں کتنی ہی خیر کیوں نہ منائے۔"

"ابھی وقت ہے جی۔ دوڑ لگا سکتے ہیں' آپ ایک نکالو اور اس کو اور ناک آؤٹ کر دو۔"

میں نے کہا "یہاں کی پولیس بڑی بے مروت ہے۔ ہم جیسے مہمانوں کا بھی لحاظ نہیں کرتی۔ جواب میں یہ گولی مار دے گا ہم دونوں کو۔ اپنا پاکستان ہوتا تو کچھ لے دے کے تک نکا ہو جاتا۔"

پولیس مین نے اپنی نوٹ بک نکال لی اور ڈرائیور کی کھڑکی کے پاس رک گیا "جس تیز رفتاری سے تم گاڑی چلاتے ہو اس کے لیے لندن کی سڑکیں بالکل موزوں نہیں۔ یہ ٹیکسی چلانا چھوڑ دو اور کار ریس ڈرائیور بن جاؤ یا ہوائی جہاز اڑاؤ۔" اس نے فارم بھرتے ہوئے طنزیہ مزاحیہ انداز میں کہا اور پھر ٹکٹ اسے پکڑا دیا۔

شہزادہ سلیم نے ازراہ ہمدردی کہا "آفیسر اس کا کوئی قصور نہیں۔"

وہ رک گیا "اوہ۔ پھر کیا تمہارا قصور ہے؟ تم پیچھے بیٹھ کے رفتار کنٹرول کر رہے تھے' کیسے... ریموٹ کنٹرول سے یا جادو سے۔"

شہزادہ سلیم کہنے لگا "تم مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کر سکتے' میں ایک اخبار کا چیف رپورٹر ہوں۔"

پولیس مین نے اس کا شناختی کارڈ دیکھا "پھر میں کیا کروں؟"

"میں تمہارے خلاف خبر چھاپ دوں گا۔"

"کیسی خبر؟" اس نے کارڈ واپس کر دیا "روز سیکڑوں ٹکٹ جاری ہوتے ہیں تیز رفتاری پر' اس میں کیا نئی بات ہے؟"

"دراصل ہمارا ایک دوست بیمار ہے... ہم نے اسے مجبور کیا تھا کہ گاڑی تیز چلاؤ۔"

"اوہ... گویا اصل مجرم تم ہو۔" وہ بولا "کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں گرفتار کرلوں؟ اور تمہارا دوست اتنا بیمار ہے تو تم باتوں میں وقت کیوں ضائع کر رہے ہو" وہ بولا اور واپس چل پڑا۔

افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ خود ٹیکسی ڈرائیور ٹکٹ جیب میں رکھ کے روانہ ہو گیا۔ نہ اس نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے واویلا کیا تھا اور نہ پولیس مین کی زیادتی کے خلاف احتجاج۔ الٹا وہ شہزادہ سلیم کی حماقت کو دخل در معقولات سمجھتے ہوئے اسے ناشکری سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا جرم بڑی فراخ

دلی سے تسلیم کر لیا تھا۔ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولنے کو گناہ کبیرہ سے کم قابل نفرت نہیں سمجھتے۔ کسی کو جھوٹا کہنا وہاں بہت بڑی گالی سمجھا جاتا ہے اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہاں جھوٹے لوگ نہیں ہوتے یا وہ جھوٹ کے نام سے نا آشنا ہیں۔ دراصل منافقت ان کے قومی مزاج اور کردار میں شامل نہیں اور وہ حقائق کو غیر جذباتی انداز کر تسلیم کر لیتے ہیں۔

ہوٹل کے دربان نے خوش آمدید کہنے کے انداز میں مسکرا کے "گڈ ایوننگ سر" کہا۔ یہ اس کا کام تھا جو وہ پوری دیانت داری کے ساتھ سرانجام دیتا تھا۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کے سامنے سے راجہ بھوج گزرا ہے یا گنگو تیلی۔ سرکنے سے نہ کسی کی شان بڑھتی تھی اور نہ دربان کی شان گھٹتی تھی۔ اگر ہم سلام کے جواب میں رک کر اس سے مصافحہ کرتے "اسے گلے لگاتے اور پھر اس کے بیوی بچوں کی خیریت دریافت کرتے" اس کے ابا امی سے لے کر چاچے ماے اور پھوپھی جیٹھ تک سب کا حال پوچھتے تو وہ حیران بھی ہوتا اور شاید شک کرتا کہ ہم نے زیادہ پی لی ہے۔

کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی خاتون نے جو عمر میں نوردین کی والدہ کے برابر ہونے کے باوجود اس سے زیادہ جوان نظر آنے پر آمادہ تھی اور نظر بھی آتی تھی۔ مسکرا کے سوال کیا "یس سر میں کیا کر سکتی ہوں آپ کے لیے؟"

میں نے دردناک لہجے میں کہا "بہت کچھ کر سکتی تھیں تم مگر افسوس کہ فرصت نہیں ہے تمہیں بھی اور مجھے بھی۔ ابھی تو یہ بتاؤ کہ نواب خسرو جمشید..."

اس نے پلٹ کے کی بورڈ کو دیکھا "سوری۔ وہ موجود نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "کیا عجیب اتفاق ہے' میں بھی یہی بتانے والا تھا۔"

وہ ہنس پڑی "ہمیں تو معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے دردناک صورت بنا کے کہا "نہیں' معلوم ہوتا تمہیں تو پہلے تم یہ سوال کرتیں کہ ہز ہائی نس کہاں ہیں۔ اس دنیا میں یا دوسری دنیا میں۔"

"ہز ہائی نس!"

"نواب ہماری قومی زبان اور ہمارے ملک میں ریاست کے حکمران کہلاتے ہیں۔ سلطان نہ ہوں تو راجا۔"

"جیسے راجا گوکال رائے تک قلاش ہوئے" نوردین بولا۔

اس نے کہا "کیا ہوا ہے نواب کو؟"

میں نے ایک آہ بھری "وہ سخت علیل ہیں اور کیا پتا اس وقت تک تو وہ مرحوم بھی ہو گئے ہوں۔ ان کو برین ٹیومر ہے' بالکل آخری اسٹیج پر۔"

نوردین نے کہا "تو یہ بھی ایک اسٹیج آرٹسٹ ہوں۔"

وہ فوراً نوردین کی طرف متوجہ ہو گئی "واقعی۔ کون سا ڈراما کر رہے ہو آج کل؟ کیا اگلے ڈرامے میں تم مجھے بھی مدد کر سکتے ہو؟"

میں نے نوردین کو گھور کے خاموش کیا "نواب صاحب صرف علاج کے لیے لندن آئے تھے۔ ڈاکٹر فریزر نے بھی مایوسی کا اظہار کیا ہے تو کوئی معجزہ ہی ان کو بچا سکتا ہے۔"

شہزادہ سلیم نے ایک منطقی سوال کیا "کیا آج کل بھی معجزے رونما ہوتے ہیں؟"

خاتون نے انگلی سے سینے پر صلیب بنائی "ایسا مت کہو۔ خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے' کیا وہ کسی اسپتال میں ہیں؟"

"سینٹ تھامس اسپتال میں تھے' ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو ہم انہیں گھر لے آئے تھے' میں نے کہا "ان کی حالت نازک ہے۔"

"آئی ایم ریئلی سوری۔"

میں نے افسردگی سے سر جھکا لیا "نواب صاحب کسی ہوٹل میں نہیں مرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے تو لندن آنے سے بھی انکار کیا تھا مگر ہم نے زبردستی کی۔ اب وہ ہمیں الزام دیتے ہیں کہ تم نے اپنے گھر میں بیوی بچوں کی موجودگی میں مرنے بھی نہیں دیا۔ حالانکہ اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔"

"فرق تو پڑتا ہے" خاتون نے کہا "اگر اپنے پیارے قریب ہوں تو کوئی خود کو اجنبی اور تنہا محسوس کرتا ہے۔ اس میں اور صحرا میں مرنے والے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔"

"مگر جو خدا کو منظور ہو وہی ہوتا ہے۔ نواب صاحب نے اپنی آخری خواہش بیان کی تھی۔ وہ مقروض مرنا نہیں چاہتے تھے۔"

شہزادہ سلیم نے سہلایا "ورنہ دوسری دنیا میں شرمندگی اٹھانا پڑتا ہے۔"

"دوسری دنیا میں شرمندگی؟"

"اس کا مطلب تھا یوم حساب پر' یہ ہمارا عقیدہ ہے۔ ایک قرض ٹپ کا بھی تھا۔"

وہ حیران ہوئی "میرا؟"

"آپ کے ہوٹل کا۔ وہ بل ادا نہیں کر پائے تھے۔ انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں حساب بے باق کر دوں اور کمرے سے ان کا سامان اٹھا لاؤں۔"

اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ دانتوں میں پنسل دبا کے کہا "سامان!"

"کوئی خاص سامان نہیں ہے" میں نے کہا "ایک بیمار اور قریب المرگ آدمی کے پاس ہیرے جواہرات نہیں ہو سکتے۔ ان کی دوائیں ہیں اور کپڑے ہیں اور میڈیکل رپورٹس ہیں۔ زیادہ اہم نسخے ہیں جن کے بغیر دوائیں کہیں نہیں ملتی ہیں۔"

اس نے منیجر کو بلایا۔ منیجر نے ہمدردانہ رویہ رکھتے ہوئے ہمارا مسلسل انٹرویو لیا۔ میرا پاسپورٹ دیکھا' نوردین کے کاغذات ملاحظہ کیے اور پھر ایک ڈاکٹر کو بلا لیا۔ ڈاکٹر نے چوہدری دلاور کی بیماری کے بارے میں وہ سوالات کیے جو کوئی عام شخص نہیں کر سکتا تھا۔ سینٹ تھامس اسپتال اور ڈاکٹر فریزر کے حوالے بڑے مستند تھے۔ اس نے ڈاکٹر فریزر کو فون کیا اور معلوم نہیں وہاں سے کس نے اسے مطلوبہ معلومات فراہم کر کے ہماری بات کی تصدیق کر دی تو شک کی کوئی بات نہ رہی۔ اس کے باوجود منیجر کے ساتھ خود ڈاکٹر بھی ہمارے ساتھ کمرے تک گیا اور اس نے دلاور کے سوٹ کیس میں سے برآمد ہونے والی رپورٹس دیکھیں۔ یہ پیشہ ورانہ تجسس بھی تھا کہ اس نے زیر استعمال دواؤں کو بھی دیکھا اور پھر مایوسی سے سر ہلا کے کہا "آئی ایم سوری!"

ہم نے ادائیگی کی اور سامان وصول کرنے کی رسید دی۔ اس میں نقد رقم کا ذکر الگ تھا جو زیورات چیک کی صورت میں زیادہ تھی۔ تقریباً چالیس ہزار پاؤنڈز۔ نقد رقم صرف پانچ ہزار پاؤنڈز تھی۔ ہم نے جو کہا تھا اس کا ثبوت مل گیا تھا لیکن یوں بھی اس معاشرے کے تراب میں اعتماد کرنا شامل ہے۔ جب تک کوئی صورت سے ہی خبیث اور حلیے سے لفنگا نظر نہ آتا ہو' شرابی یا مخبوط الحواس نہ ہو اسے شریف آدمی ہی سمجھا جاتا ہے اور جب تک کوئی بے سروپا غیر منطقی یا مشکوک بات نہ کرے یہ مان لیا جاتا ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

ایک اتفاق نے بھی ہماری مدد کی۔ ہم ابھی کاؤنٹر پر ہی تھے کہ ایک فرنچ جوڑا نمودار ہوا۔ وہ نئے شادی شدہ تھے اور فی الحال ان کی زندگی کا ہر موسم ہنی مون تھا مگر وہ رومانٹک جذبات کے بے پناہ مظاہرے سے ساری دنیا کو بھی مطلع کرنا چاہتے تھے کہ انہیں ایک دوسرے سے کیسی والہانہ محبت ہے اور ان کی شادی اس صدی کا عظیم ترین تاریخی واقعہ ہے۔ دیکھنے والے صرف مسکرائے تھے اور شاید انہیں وہ لطیفہ یاد آ گیا تھا کہ شادی سے پہلے وہ بولتا تھا اور میں سنتی تھی' شادی کے بعد وہ بولتی تھی اور میں سنتا تھا۔ اب ہم دونوں بولتے ہیں اور سارا محلہ سنتا ہے۔ نوجوان نے فرنچ میں کہا کہ انہیں ہوٹل کا سب سے خوب صورت کمرا چاہیے کیونکہ اس کے ساتھ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہے اور یہ ان کی زندگی کا سب سے خوب صورت وقت ہے۔ میں نے کاؤنٹر پر موجود خاتون کی مدد کی خاطر اس کا ترجمہ کر دیا مگر وہ فرنچ جانتی تھی۔ میری فرنچ نے اسے حیران بھی کیا اور خوش بھی۔

دلاور کا سامان صرف ایک سوٹ کیس اور ایک بریف کیس پر مشتمل تھا۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے ہمیں گاڑی فراہم کی۔ یہ پک اینڈ ڈراپ سروس بلا معاوضہ تھی۔ مسافروں کو ائرپورٹ سے لانے لے جانے کے لیے سب اچھے ہوٹل بہت بلکہ "بلا معاوضہ" کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اپنے بل میں وہ سب وصول کر لیتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ کمال آپ اتار لے دیں تو ہم اس میں بھس بلا معاوضہ بھر دیں گے۔

میں نے ڈرائیور کو سینٹ تھامس اسپتال چلنے کو کہا تو اس نے اصولی اختلاف کیا "میں ائرپورٹ لے جا سکتا ہوں تمہیں۔"

www.paksociety.com

میں نے کہا "او کے۔ یہ قانونی مسئلہ ہے تو پھر مجبوری ہے۔"

نورین نے خفگی سے کہا "انی رور بابا منظور ہے۔ مجھے خاص اچھا لگا تو یہاں سے بہت قریب ہے۔"

میں نے کہا "زرا نیور کو مجبور مت کرو۔ وہ اصول پرست ہے۔ اصولوں میں اختلافات کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتا۔"

وہ میرے طنز سے بھی متاثر نہیں ہوا اور ہمیں لندن کے ہیتھرو ائیرپورٹ پہنچانے کے بعد واپس جانے سے پہلے اس نے نورین کو غور سے دیکھا "تمہاری صورت مجھے دیکھی ہوئی لگتی ہے۔ تم گزشتہ ہفتے چچا کے گھر کے اندر تیر کے تجربے میں گھس گئے تھے؟"

نورین نے کہا "ہاں۔ اور مجھے تیر نے کھا لیا تھا۔ کیونکہ میں تیر کو نہیں کھا سکتا تھا۔"

وہ چلا گیا تو میں نے نورین کو محبت سے تین بار گلے لگا کے خدا حافظ کہا۔ "اللہ تمہیں یا طوطی صاحب میں سے کسی ایک کو تھوڑی بہت عقل ضرور عطا کرے تاکہ تمہارے درمیان ویسے ہی خوش گوار تعلقات قائم ہو جائیں جیسے بھارت اور پاکستان کے درمیان ہو سکتے ہیں۔ اگر مسئلہ کشمیر حل ہو جائے تو۔"

"میں اپنے بالوں کی انشورنس کراؤں گا" وہ سوچتے ہوئے بولا "آئندہ میرا بال بیکا ہوا تو انشورنس کمپنی والے ان ہی سے رقم وصول کریں گے۔ ورنہ بابا میرے سر پر استرا پھروانے کے دس ہزار پاؤنڈ تو دینے پڑیں گے۔"

میں نے وہاں سے ایک عام ٹیکسی لی اور اسے بھی تو مجھے راستے میں چھوڑ دیا۔ دوسری ٹیکسی کو میں نے ایڈی کے گھر سے سو گز دور روکا اور کرایہ ادا کر کے رخصت کر دیا۔ یہ احتیاط کا تقاضا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پولیس ہمارا تعاقب کرے اور سراغ لگانے میں ٹیکسی والوں سے مدد لے اور لندن میں ہماری آخری قیام گاہ تک پہنچ جائے۔ میں نے ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اور دوسرے میں بریف کیس اٹھا کے سو گز کا فاصلہ طے کیا اور گیراج میں پہنچا تو صبح کے تین بج رہے تھے۔

چوہدری دلاور کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے خود ہی دوا کا انتخاب کیا تھا۔ ان میں ایک درد کے احساس کو دبانے والی گولی تھی اور دوسری خواب آور۔ باقی مخصوص دوائیں کینسر جیسے لاعلاج مرض میں کیوں دی جاتی ہیں۔ یہ سمجھنا مشکل تھا۔ شاید ہر سانس کے ساتھ کم ہونے والی زندگی کو موت کے خلاف لڑنے کا نفسیاتی حوصلہ فراہم کرنے کے لیے یا صرف کیس ہسٹری کے لیے۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ کس دوا کا کس مریض پر کیا رد عمل ہوا۔ میڈیکل سائنس کے لیے ہر کینسر کا مریض ایک کیس تھا جس پر ڈاکٹر کامیابی کی امید میں مسلسل ناکام تجربات کرتے جا رہے تھے۔ اپنے مشاہدات ریکارڈ کر رہے تھے اور اپنی رپورٹیں مطالعاتی تجزیے کے لیے جمع کر رہے تھے۔

چوہدری دلاور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا تو اس سے کچھ فاصلے پر میں بھی دراز ہو گیا۔ محسن بھی کم تھکا ہوا نہیں تھا مگر اس نے ضد کر کے مجھے سونے پر مجبور کر دیا "ہم باری باری سو سکتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد میں سو جاؤں گا۔"

"ہاں۔ صبح نو بجے تک کرنے کے لیے کچھ نہیں۔ ڈاکٹر شاہ بھی دس بجے ہی آئے گا" میں نے کہا۔

"کہیں وہ پولیس کو نہ لے آئے۔ دلاور کے ساتھیوں کو نہ بتا دے۔" محسن نے خدشہ ظاہر کیا۔

میں نے کہا "اس کے لیے یہ چوہدری دلاور سے نجات حاصل کرنے کا آخری موقع ہے۔ وہ فرار ہو کے لندن پہنچا تھا مگر دلاور نے اسے تلاش کر لیا۔ اگر اس نے ہمارا ساتھ نہ دیا تو وہ دلاور کے چنگل سے کبھی نہ نکل سکے گا۔"

"کیا ہم اسے ایسے ہی چھوڑ دیں گے؟"

"ایسے ہی کیا مطلب؟" میں نے کہا۔

محسن بولا "کوئی سزا دیے بغیر۔ دیکھا جائے تو اس کا جرم بھی دلاور کے جرائم سے کم سنگین نہیں۔"

"میں تمہاری بات سے اصولی اتفاق کر سکتا ہوں لیکن عملی طور پر شاید یہ ممکن نہیں۔ ڈاکٹر شاہ کو برطانوی شہریت کا تحفظ حاصل ہے۔ اس کے پاس مجبوری کا عذر ہے۔ جو کچھ اس نے کیا تھا وہ دلاور کے ہاتھوں بلیک میل ہو کے کیا تھا۔ آج وہ ہماری مدد کرنے پر مجبور ہے مگر اس مجبوری میں ڈاکٹر شاہ کے لیے مستقبل کی بے فکری ہے۔ اگر اسے ذرا بھی اندیشہ ہوا کہ ہمارے ارادے ٹھیک نہیں اور ہم چوہدری دلاور کے بعد اسے بھی ایک شریک جرم کی حیثیت سے سزا دینا چاہتے ہیں تو پھر وہی بات ہوگی کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ وہ بڑی نیک نیتی کے ساتھ ہماری مدد کر رہا ہے۔ دلاور کے نزدیک یہ غداری ہے مگر ڈاکٹر شاہ دراصل چاہتا ہے کہ اس کی جان چھوٹ جائے۔ ویسے بھی غدار سے غداری کو جرم نہیں سمجھا جا سکتا۔ وعدہ معاف گواہ کو سزا نہیں ہوتی۔"

محسن نے سر ہلایا "چلیں اب تو بیکار اس اور اپنی آنکھیں بند کر کے میں کچھ دیر کل کے تصور سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے اس وقت پیرس میں وہ بھی میرے تصور سے ہم کلام ہے۔"

"یہ ٹیلی پیتھی ٹیلی فون کال کی پہلی علامت ہوتی ہے" میں نے کہا۔

"کس چیز کی؟"

"پاگل پن کی" میں نے کہا۔

صبح چھ بجے میں خود ہی جاگ گیا۔ محسن پوری طرح مستعد رہنے کے لیے گیراج میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے باہر جا کے نل سے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تین گھنٹے کی گہری نیند نے مجھے بڑا فائدہ پہنچایا تھا۔ میں نے محسن کو سونے کا موقع فراہم کیا اور خود ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ مجھے چائے کافی کی سخت طلب محسوس ہو رہی تھی مگر یہاں کچھ بھی دستیاب نہیں تھا۔ میں نے اپنی حالت پر غور کیا۔ ہم گھر سے اور وطن سے دور تھے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہم اس وقت ایک گیراج میں چوہدری دلاور کے ساتھ موجود ہیں اور یہ کہ چوہدری دلاور کو اچانک ہمارے انتقام سے نظام انصاف سے اور قانون کی گرفت سے اور سزا سے تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔ جو کچھ اس نے کیا اپنی مرضی سے کیا لیکن اس کے دشمن بھی اب کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی اپنے ریوالور کی ہر گولی سے ایک قتل کرنے کے بعد آخری گولی سے اپنا کام تمام کر لے۔ اسے گرفتار کرنے والے منہ دیکھتے رہ جائیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان حالات میں میرا طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔ جس شخص کو عدالت نے سزائے موت سنا دی ہو کیا اسے تختہ دار تک پہنچانے کی کوشش ایک سعی لاحاصل نہیں ہے؟ اس کے خلاف تمام جرائم کے مقدمات کی سماعت بلا تاخیر ہو اور باقاعدگی سے جاری ہو تب بھی دو سال سے پہلے چوہدری دلاور کو پھانسی نہیں ہو سکتی تھی جب کہ دلاور کی زندگی کے شاید دو ہی مہینے باقی رہ گئے تھے۔ اسے تو قتل کرنا بھی بے مقصد ہوتا۔ ... کی عدالت میں بھی اس پر مقدمہ چلانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ بہت جلد انتہائی اذیت ناک موت سے دوچار ہونے والا تھا۔ کیا ان حالات میں اس پر ترس کھانا جائز تھا؟ نہیں۔ میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوال کا خود ہی جواب دیا۔ اپنی ذاتی حیثیت میں اسے معاف کر دینے سے زیادہ میں کچھ کرنے کا اختیار ہی نہیں رکھتا۔ ایک مجرم کو قانون کے حوالے کر دینا ہمارا کام تھا۔ اس کے بعد عدالتی معاملات کیسے چلتے ہیں اور کہاں تک چلتے ہیں ان سے ہمیں سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی سزائے موت کا مستحق قیدی جیل میں طبعی موت مر جائے یا حادثاتی موت کا شکار ہو جائے اس کی تقدیر۔ دلاور کی لاش تو ورثا جیل سے ہی وصول کریں گے اس سے کیا فرق پڑے گا کہ لاش اسپتال سے لائی جاتی ہے یا جیل کے پھانسی گھاٹ سے۔

ان تمام خیالات کے باوجود میں مایوسی کا شکار تھا۔ میری کامیابی ادھوری رہ گئی تھی۔ مجھے دلاور کی خاموشی بھی ایک خنجر کی طرح لگی تھی کہ تم نے دیکھا سکندر۔ چوہدری دلاور ہی وہ طاقت تھا جو تمہارے دام میں نہ آیا۔ میں نے کہا تھا کہ نہ تم مجھے مار سکتے ہو۔ نہ قانون مجھ پر ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ نہ دنیا کی عدالت مجھے مجرم ٹھہرا سکتی ہے اور نہ یہ قانون مجھے سزا دینے پر قادر ہے۔ چوہدری دلاور کو شکست دی موت نے مگر جس سے کسی کو مفر نہیں۔ جو سب کے لیے برحق ہے۔ جس میں بے گناہ اور گنہگار کی تخصیص نہیں۔ ایک عمر گزار کے میں بالآخر بیماری سے مروں گا۔ اسی طرح جیسے ہر سال کروڑوں افراد بچے بوڑھے اور جوان مرتے ہیں۔ بیماری کچھ بھی ہو۔ ... مجھے کسی عدالت نے مجرم قرار نہیں دیا۔ کوئی نظام انصاف مجھ پر فرد جرم عائد نہیں کر سکا۔ میں تمہارے لیے ناقابل تسخیر رہا۔

میں اپنے خیالات میں گم تھا کہ مجھے چوہدری دلاور کے بیدار ہونے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔

اس نے کہا "تم نے کچھ سوچا سکندر۔"

میں چونک پڑا "سوچنے کے لیے اب کیا ہے؟"

"مگر تم سوچ رہے تھے۔"

میں نے کہا "لاحاصل سوچ کا نتیجہ بھی لاحاصل۔"

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا" وہ بولا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم کیا کہو گے۔"

"پھر بھی سن لینے میں کیا حرج ہے" وہ لجاجت سے بولا "میں جانتا ہوں کہ تم میرے دشمن ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے میں تمہارا دشمن ہوں مگر تم میں اور مجھ میں ایک فرق ہمیشہ تھا۔ تم فراخ دل اور عالی ظرف تھے۔ تم کینے نہیں ہو اور تمہاری دوستی اور دشمنی دونوں کی بنیاد معقولیت اور شرافت پر ہے۔ تم مجھے اچھے لگتے رہے ہو۔"

میں نے کہا "تم ساری عمر جھوٹ بولتے آئے ہو۔"

"لیکن یہ جھوٹ نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے" وہ بولا "مجھے بڑی خواہش تھی کہ تم مفاہمت کر لو۔"

"یہ ناممکن تھا۔"

"ہاں۔ مگر پھر بھی میں چاہتا تھا کہ کوئی راستہ نکل آتا کہ میں اور تم ایک دوسرے کو باعزت طور پر جینے اور مرنے کا موقع دینے پر متفق ہو جاتے۔ میں تم کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ تمہاری شکست سے بھی مجھے دلچسپی نہیں تھی۔ میں سمجھوتا چاہتا تھا۔ میں معافی تلافی کے لیے بھی تیار تھا۔ مگر خیر اب تو دشمنی کے لیے بھی وقت باقی نہیں رہا۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔

"بات بہت معمولی ہے اور بہت بڑی بھی۔ اس میں کسی کا فائدہ ہے اور کسی کا نقصان۔ یہ الگ بحث ہے جس میں نہ تم مجھے قائل کر سکتے ہو اور نہ میں تم سے کوئی بات منوا سکتا ہوں۔ لیکن تم غور کرو ٹھنڈے دل سے۔"

میں نے تلخی سے کہا "میرے دل میں انتقام کی آگ کب سے روشن ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی تم مجھ سے توقع کرتے ہو کہ میں ٹھنڈے دل سے تمہاری کوئی بات سن سکتا ہوں۔"

"میں نے کہا نا۔ سن لینے میں کیا حرج ہے۔ ماننے نہ ماننے کا اختیار تو تمہارے ہی پاس رہے گا" وہ بولا "فرض کرو میں ایک اقبالی بیان دینا چاہتا ہوں؟"

"یہ بیان تم عدالت میں بھی دے سکتے ہو؟"

"نہیں۔ عدالت میں میرے بیان کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ دو مہینے تو میرے خلاف چالان پیش کرنے کے لیے بھی ناکافی ہوں گے۔ میں چار چھ مہینے اپنی پہلی پیشی کو ٹال سکتا ہوں۔ میرے وکیل اس مقدمے کو جتنا طول دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔ ثبوت گواہ پیش ہونے اور فرد جرم عائد ہونے سے پہلے ہی یہ کیس ختم ہو جائے گا۔ میرے خلاف سارے مقدمات خود ہی ختم ہو جائیں گے۔ تم جانتے ہو کہ جب تک کسی پر جرم ثابت نہ ہو وہ ...

www.paksociety.com

ہے۔ الزام کی کوئی حیثیت نہیں۔ کوئی بھی کسی پر الزام لگا سکتا ہے۔ الزام تمہارے خلاف بہت ہیں اور سب دوستوں، ساتھیوں کے خلاف بھی۔"

"وہ سب جھوٹے الزامات ہیں۔"

دلاور نے کہا "ہاں۔ یہ میں مانتا ہوں اور تم جانتے ہو۔ دنیا وہ بات مانے گی جو عدالت کے فیصلے سے سچ ثابت ہوگی۔ اگر تم عدالت کا راستہ اختیار کرو گے تو تمہیں کچھ نہیں ملے گا سوائے مایوسی، حسرت اور شرمندگی کے۔ میں تم کو ایک آفر کرتا ہوں۔ میں قانونی طور پر معتبر گواہوں کی موجودگی میں ایک بیان دوں گا۔ تم اسے ریکارڈ کر سکتے ہو یا میں خود اپنے ہاتھ سے اپنے دستخط کے ساتھ یہ تحریری بیان تمہارے سپرد کر سکتا ہوں۔ اگر تم چاہو اور اس کا بندوبست کر سکو تو یہاں کے کسی مجسٹریٹ سے اس کی تصدیق کرا لو یا مجسٹریٹ کی موجودگی میں یہ بیان ہو جائے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا "مجسٹریٹ کوئی نکاح خواہ نہیں ہے کہ جہاں چاہا بُلا لیا۔ وہ بیان لے گا تو پہلے اس کا قانونی جواز پوچھے گا۔ ضرورت معلوم کرے گا اور جو کچھ بھی ہوگا اس ملک کے قاعدے قانون کے مطابق ہوگا۔ اگر تم خود عدالت میں بیان دینے گئے تو ظاہر ہے لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ تمہیں وہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔"

"مجسٹریٹ نہ سہی، دو چار ایسے گواہ ہو سکتے ہیں مثلاً وکیل اپنی فیس لے کر بیان کی تصدیق کر سکتا ہے کہ یہ بیان فلاں نے میرے سامنے دیا تھا۔ دن، تاریخ اور وقت بتا سکتا ہے۔ یہاں لوگ پادری کے سامنے جا کے بھی اعتراف کرتے ہیں اور اسے سب سچ بتا دیتے ہیں۔ وہ کسی کو کچھ نہیں بتاتا۔ تم کسی پادری کو بُلا لو۔ جو میرا بیان سنے اور پڑھے۔ میں اس کے سامنے بیان پر دستخط کروں اور یہ ہدایت کروں کہ اس بیان کو میری موت کے بعد خفیہ نہ رکھا جائے۔ ضرورت پڑنے پر کسی بھی عدالت میں پیش کر دیا جائے۔"

میں نے کہا "بے شک یہ ہو سکتا ہے لیکن یہاں کی کسی عدالت میں تمہارا کوئی مقدمہ نہیں ہے۔"

"وہ بیان یہاں سچ ہے تو لاہور میں بھی سچ مانا جائے گا۔"

میں نے جھنجلا کے کہا "آخر مقصد کیا ہے تمہارا؟"

"میں اپنے تحریری بیان میں سب کچھ قبول کرنے کو تیار ہوں۔ جو کچھ بھی میں نے غیر قانونی طور پر کیا۔ ابھی وقت ہے، میں بقائمی ہوش و حواس یہ بتا سکتا ہوں کہ میں نے وزیر خان اور میر شرافت علی کے خلاف کیا سازش کی تھی۔ انہیں کیسے مروایا تھا، تمہارے خلاف الزامات کا جال کیسے پھیلایا تھا۔ میں نے جو بھی غلط کیا، اخلاقی یا قانونی اعتبار سے، جو گناہ کیے، جو جرم کیے، ان سب کی تفصیل میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تم صرف یہ جانتے ہو کہ میں نے کیا کیا، یہ نہیں کہ کیسے کیا، کس کی مدد سے کیا۔ بہت سی باتوں کا تمہیں علم ہی نہیں۔ میں سب بتا دوں گا۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "آخر کیوں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح تم اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر سکو گے؟"

"نہیں، میرے اس بیان سے تمہارے مسائل بھی حل ہو جائیں گے اور میرے بھی۔ تم قانونی الجھنوں سے بچ جاؤ گے۔ تمہارے خلاف سارے مقدمات میرے اقبالی بیان کے بعد خود بخود ختم ہو جائیں گے ورنہ تم جانتے ہو کہ ابھی تم خود ایک مفرور مجرم ہو۔ تمہارے خلاف پرانی ایف آئی آر ختم نہیں ہو گئی۔ تمہاری ضمانت کب کی منسوخ ہو چکی ہے اور تم باقاعدہ اشتہاری مجرم قرار دیے جا چکے ہو۔ بے شک وہ مقدمات جھوٹے تھے اور ایف آئی آر میں سب جھوٹ تھا مگر عدالت میں پہلے جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے لمبی عدالتی کارروائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مانا وکیل تمہارے پاس بہت ہیں مگر نہ تم گرفتاری سے بچ سکتے ہو نہ جیل جانے سے۔ دوبارہ تمہاری ضمانت بڑی مشکل سے ہوگی اور اس کے بعد تم پہلی پیشی پر باعزت بری نہیں ہو جاؤ گے۔ یہ بھی سوچو کہ قانونی معاملات سے نمٹ کے تم وہ سب کیسے حاصل کرو گے جو آج میرے قبضے میں ہے جس کے مالک میرے قانونی وارث ہیں۔ میں تو خیر جانتا ہوں اور مانتا بھی ہوں کہ وہ سب میرا نہیں تھا۔ تمہارے والد وزیر خان اور میر شرافت علی کا حصہ بھی میں نے غصب کر لیا تھا مگر میری بیوی اور میرا بیٹا شاید یہ بھی تسلیم نہیں کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ ہمیں جو ملا چوہدری دلاور کا تھا اور ہم اس کے جائز قانونی وارث ہیں۔ چوہدری دلاور نے یہ سب کیسے اور کہاں سے حاصل کیا تھا ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اگر کوئی اور اس پر دعویٰ رکھتا ہے تو عدالت سے رجوع کرے۔ جب تمہارے اور میرے وارثوں کے درمیان دیوانی مقدمات کی لڑائی ہوگی تو وہ دو چار برس میں ختم نہیں ہوگی۔ وہ اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے پورا زور لگا دیں گے۔ تمہارے دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لیے وہ سب کریں گے جو میں نے کیا تھا۔ جو دنیا میں سب کرتے ہیں۔ ایمانداری سے کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ شرافت سے یا اصول کی بنیاد پر کوئی اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوتا۔ یہ صرف میں ہوں جو تمہارا حق مان رہا ہوں۔ تمہارے دعوے کو کسی قانونی ڈگری کے بغیر تسلیم کر رہا ہوں اور وہ تم جانتے ہو۔ اگر قدرت کی طرف سے میرے لیے سزائے موت کا اعلان نہ ہوتا تو میں یہ لڑائی جاری رکھتا۔ میں تمہیں ایک پھوٹی کوڑی نہ دیتا اور الٹا تمہیں جیل بھجوا دیتا۔ شکست مجھے تم نے نہیں میری تقدیر نے دی ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ میرے اعمال کی سزا ہے اور بھی بہت لوگ ایسی ہی بات کریں گے۔ اس سے مجھے فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ دو تین مہینے بعد چوہدری دلاور کہاں ہوگا کہ کسی کی بات سنے یا زبانِ خلق کی پروا کرے۔ آج میں تم کو ایک آفر پیشکش کر رہا ہوں۔ تم اس سے فائدہ نہ اٹھاؤ تو تمہاری مرضی۔ چوہدری دلاور تمہیں بعد میں یاد آئے گا کہ وہ دشمنی میں بھی دشمن نہ تھا۔"

میں نے کہا "تمہاری پیشکش کو میں..."

"نہیں۔ بے بنیاد مسترد مت کرو" اس نے میری بات کاٹ دی "مجھے چند منٹ دو۔ اس کے بعد تم جو کہو گے میں سنوں گا۔ اگر تم میرے بیان سے مطمئن ہو جاؤ اور تمہیں یقین آ جائے کہ اس سے تمہارے تمام قانونی مسائل حل ہو سکتے ہیں تو پھر مجھ سے سودا کر لینا۔ تمہارے اپنے حساب سے تمہارا جتنا حق بنتا ہے یا اس سے زیادہ چاہتے ہو، تم وہ تم بتانا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو تم مانگو گے اپنا حق سمجھتے ہوئے وہ سب تمہیں مل جائے گا اور اس کے بدلے میں تم سے صرف ایک چیز مانگوں گا۔"

"ایک چیز؟"

"ہاں۔ تم میرا صرف ایک مطالبہ پورا کرو گے۔ میری ایک بات مانو گے جس سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن تمہیں بہت فائدہ ہوگا" میں نے طنز سے کہا۔

"میں نفع نقصان کی حد سے گزر چکا ہوں یا بہت جلد گزر جاؤں گا۔ موت کیسے آتی ہے اور کہاں آتی ہے، بس اتنا ہی فرق پڑ سکتا ہے۔ یہ تو طے شدہ ہے کہ قانونی طریقۂ کار کے مطابق مجھے سزائے موت دینے کا وقت ہی نہیں رہا۔ چنانچہ تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہوگی کہ تم مجھے اس دنیا کے نظامِ انصاف کے مطابق سزا دلا سکو۔ اتنے کم وقت میں سماعت شروع بھی نہیں ہوگی اور قانونی موشگافیوں میں عدالت تمہاری خواہش کے مطابق عجلت اختیار نہیں کرے گی۔ تم خود مجھے مار سکتے ہو، تمہاری ایم آر ایس کی عدالت میں تو سرسری سماعت ہوئی تھی۔"

"تم یہ بھی جانتے ہو۔"

وہ ہنسی سے مسکرایا "اپنے سکندر صاحب۔ لوگ پرانی دوستی کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ان سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ ہم نے دشمنی میں ایک دوسرے کو جانا اور پہچانا ہے۔ کون سی بات ہے جو کسی سے پوشیدہ ہو، تجھ سے۔ میں بتا رہا تھا کہ ابھی تمہارے ذہن سے سوچنے سمجھنے کا وقت ہے، جذبات سے نہیں، عقل سے کام لے کر فیصلہ کرو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔"

"یہ فیصلہ ہم لاہور پہنچ کے کریں گے۔"

"نہیں۔ فیصلہ تم کو یہاں کرنا ہے۔" وہ بولا "اگر تم نے دیر کی تو تمہیں بعد میں افسوس ہوگا کہ تم نے یہ موقع گنوا دیا۔ تم جانتے ہو کہ میرا بیٹا فیصل جوان ہو گیا ہے اور اس کا خون بہت گرم ہے۔ تم جمال کی بات سے بھی واقف ہو۔ وہ بھی کوئی کم قسم کی مخلوق نہیں جسے اللہ میاں کی گائے کہا جاتا ہے۔ میرے بعد یہ جنگ جاری رہی تو تمہارے مسائل میں اضافہ ہوگا۔ وہ ایک انتقامی جذبے کے ساتھ تم سے ہر قسم کی مقدمے بازی کریں گے۔ ان کی پوری کوشش ہوگی کہ تمہیں کچھ نہ ملے اور تمہارے خلاف سارے مقدمات میں تم کو زیادہ سے زیادہ سزا ہو۔"

"اور تم یہ سب ختم کر سکتے ہو۔"

"ہاں۔ میں اپنی زندگی میں ان کے مسائل ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ صاف بات یہ ہے سکندر کہ نہ مجھے اپنی فکر ہے اور نہ تمہاری۔ فکر ہے مجھے اپنے بیوی بچوں کی۔ وہ تم سے نہیں لڑ سکتے۔ اگر یہ لڑائی جاری رہی تو زیادہ نقصان ان کا ہوگا۔ نہ جانے یہ جنگ کیا موڑ اختیار کرے اور کس انتہا تک پہنچ جائے۔ میرے اختلافات تمہارے والد سے تھے۔ ان کے بعد یہ جنگ تم نے بھی ایک انتقامی ردعمل کے طور پر لڑی۔ میرے بعد یہ جنگ میرے وارث لڑتے رہے تو سب تباہ ہو جائیں گے۔ دیوانی مقدمات دیوانہ اور دیوالیہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ شاید تمہارے بعد والی نسل کے جوان ہونے تک فیصلہ ہو جائے مگر اس وقت کیا اہمیت ہوگی اس فیصلے کی۔ کیا رہے گا کسی کے پاس۔ پندرہ بیس سال میں تمہاری زندگی کا بہت سا وقت بہت سی توانائی اور کمائی اس عدالتی جنگ میں ضائع ہو جائے گی۔ ایسا ہی میری فیملی کے ساتھ ہوگا۔ وہ خاک کاروبار کریں گے، خاک ترقی کریں گے۔ کیا پتا فیصل تم کو قتل کروا دے یا تم فیصل کو مار دو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم خود ایسا نہیں کرو گے مگر تمہیں اپنے دماغ میں سب کچھ کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی مشتعل ہو کے تم پر حملہ کرے اور خود مارا جائے۔ وجہ یہ ہے، تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بہت جلد تم بھی شادی کر لو گے۔ محسن اور غالب بھی اپنا گھر بسا لیں گے۔ تمہارے بھی بچے ہوں گے، کیا تم چاہتے ہو، یا تم پسند کرو گے کہ ان کی زندگی پر تمہارے ماضی کے یہ آسیب سائے منڈلاتے رہیں اور وہ خوف و دہشت کی فضا میں پروان چڑھیں۔ اصل مجرم میں تھا، میرے ساتھ ہی وہ سب کچھ ختم ہو جانا چاہیے جو نہ اچھا تھا نہ اچھا ہو سکتا تھا۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟"

"ہاں کچھ کچھ" میں نے کہا۔

"میں یہ جنگ ختم کرا سکتا ہوں۔ یہ اختیار میرے بعد کسی کے پاس نہیں ہوگا۔ تم نے دیر کی تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔ اگلی نسل تک پہنچنے والی خرابی کی جڑیں بہت دور تک پھیل جائیں گی۔ میں دشمنی اور نفرت کے اس درخت کو گرا دینا چاہتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ نفرت اور دشمنی کا یہ بیج میں نے ہی بویا تھا۔"

"اس کا پھل تو تمہاری آنے والی نسل بھی کاٹے گی دلاور۔ دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے" میں نے کہا۔

"تم میری اولاد کی فکر چھوڑو۔ اپنی اولاد کے لیے سوچو۔ ابھی تک تم نے رابعہ سے شادی صرف اس لیے نہیں کی کہ تمہاری زندگی ایک مسلسل فرار تھی۔ ایک ایسی جنگ تھی جس میں تمہارے ساتھ تمہارے دوست بھی شریک تھے۔ اس کا نقصان انہیں بھی ہوا۔"

"یہ نقصان پہنچانے والے تم تھے۔ اب تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری یہ جنگ بندی کی پیشکش قبول کر لوں گا؟"

"میں تمہیں کیسے مجبور کر سکتا ہوں۔ تم جو فیصلہ چاہو کرو۔ یہ احساس صرف میری زندگی تک ہے کہ میرے بعد بیوی بچوں کا کیا ہوگا۔ تم نے ٹھیک کہا کہ بیج ایک نسل بوتی ہے تو پھل دوسری نسل کھاتی ہے۔ اور باپ نے کڑوا نیم لگایا ہوگا تو اولاد کو آم نہیں ملا

www.paksociety.com

سکتے۔ ماں باپ کے گناہوں کی سزا اولاد کو بھگتنا پڑتی ہے۔ لیکن کوئی کفارہ ادا کرنا چاہے، کسی کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو کوئی تلافی کرنا چاہتا ہو......"

"آخری وقت کی توبہ قبول نہیں ہوتی" میں نے کہا۔

"میں توبہ کہاں کر رہا ہوں۔ اس دنیا کے معاملات سے نمٹنے کے بعد جو بھی ہے، میرے اور خدا کے درمیان ہے۔ اس میں کسی بندے کا کیا دخل۔ میں تو دنیا کے معاملات سلجھانا چاہتا ہوں اور تمہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ صرف میرے خاندان کے مفاد ہی میں نہیں ہے، یہ تم سب کے فائدے کی بات بھی ہے۔ جو سزا تم مجھے دینا یا دلوانا چاہتے تھے وہ مجھے مل جائے گی لیکن تم دوسروں کی زندگی کو ایک ختم نہ ہونے والی سزا بنا دو گے تو خود بھی عذاب کاٹو گے۔ میرے جرم کی سزا قانون بھی میرے بیوی بچوں کو نہیں دے سکتا۔ پھر تمہارے، محسن یا ثاقب کے بیوی بچے کیوں عذاب کاٹیں؟"

دلاور کی بات نے مجھے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا "صاف کہو کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

"ایک بات میں نے بتا دی۔ تم اپنی مرضی کے مطابق مجھ سے اقبالی بیان حاصل کر سکتے ہو۔ ایک ایسا بیان جو قانون کی نظر میں مستند اور قابل قبول ہو۔ میں اپنے ہی نہیں تمہارے بھی سارے گناہ اپنے سر لے لوں گا۔ جو کچھ میں نے کیا اس کی تمام ذمے داری میری، جو تم نے اپنے دفاع میں کیا یا جواب میں کیا اس کو بھی میں اپنی فرد جرم میں شامل کر سکتا ہوں۔ اس طرح کہ تم پر کوئی الزام نہ رہے اور تم کو انصاف ہی نہیں تمہارا حق بھی مل جائے۔ قانونی راستہ بہت لمبا اور مشکل ہے۔ میں آسانی سے اور شارٹ کٹ سے تمہیں سب کچھ دلوا سکتا ہوں۔ تم باعزت طور پر تمام مقدمات سے بری ہو کے باعزت زندگی گزار سکتے ہو۔ تم بھی اور تمہارے سب دوست بھی۔ یہ تھی ایک بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم کو مجھ سے جو کچھ وصول کرنا ہے اس کا حساب کر لو۔ مجھے بتا دو کہ تمہیں کیا چاہیے۔ اصل کے علاوہ جتنا جرمانہ یا ہرجانہ تم وصول کرنا چاہو، میں تم کو دے سکتا ہوں۔ قانونی طور پر میں اس کا اختیار رکھتا ہوں کہ تمہاری سب جائداد تمہیں لوٹا دوں۔ وہ کارخانہ تمہارے حوالے کر دوں جو اب اسپتال ہے۔ تمہارے حصے کا سب منافع اور دیگر واجبات۔ سب تمہیں مل جائیں گے۔ میں تم کو لاہور میں بھی ادائیگی کرا سکتا ہوں اور تم چاہو تو یہاں یا باہر کے کسی ملک میں۔"

"میرا باہر کے کسی ملک میں کوئی اکاؤنٹ نہیں ہے۔"

"میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ابھی میں مالک ہوں۔ جسے بھی چاہوں سب کچھ دے سکتا ہوں۔ ابھی میرے دستخط کارآمد ہیں۔ میرے بعد تمہارے لیے یہ چیک محض بے معنی ہو جائیں گے۔ میرے وارث تمہیں کچھ نہیں دیں گے اور تم وصول بھی نہیں کر سکو گے۔ ابھی میں ان سے بھی اپنی ہدایات منوا سکتا ہوں۔ انہیں بھی تاکید کر سکتا ہوں کہ وہ دشمنی کے جذبات کو فراموش کر دیں۔ اپنی زندگی جئیں اور دوسروں کو بھی جینے دیں۔ میں لاہور میں اپنے وکیل کو ہدایات جاری کر دوں گا کہ وہ کاغذات تیار کر لیں اور دستخط کے لیے مجھے بھجوا دیں۔ جتنی نقد رقم تمہیں چاہیے وہ تمہارے حساب میں جمع کرا دی جائے گی لیکن یہ سب اسی وقت ہو گا جب میرے بیوی بچے یہاں پہنچ جائیں گے۔ اور تم مجھے ان کے حوالے کر دو گے۔ میرا بیان بھی میرے وکیل ہی عدالت میں پیش کریں گے ڈاکٹر سرٹیفکیٹ کے ساتھ۔"

میں نے کہا "تم میری ساری جائداد میرے نام کر دو گے میرے حصے کا سرمایہ اور منافع میرے حساب میں جمع کرا دو گے جرمانے اور ہرجانے کی رقم بھی ادا کرو گے، اپنی زندگی میں؟"

وہ بولا "ہاں۔ یہ سب ایک ہفتے میں ہو جائے گا بلکہ اس سے بھی کم وقت میں۔"

میں نے کہا "صرف تمہارا بیان باقی رہے گا!"

"ہاں۔ وہ صرف جنگ بندی کا معاہدہ ہی نہیں۔ میرے اور تمہارے بچوں کے مستقبل کے تحفظ کی ضمانت بھی ہو گا۔"

"اور فرض کرو میں تم سے سب کچھ وصول کرنے کے بعد،"

اس نے میری بات کاٹ دی "نہیں۔ تم ایسا نہیں کرو گے۔ میں جانتا ہوں۔ تم میرے لئے قابل اعتبار ہو۔ تم جو کہو گے وہی کرو گے۔"

"اور بدلے میں تم صرف یہ چاہتے ہو کہ تمہیں قانون کے حوالے نہ کیا جائے۔ بیوی بچوں کے سپرد کر دیا جائے۔"

"ہاں۔ میں ان کے ساتھ زندگی کے آخری ایام سکون سے گزارنا چاہتا ہوں۔ میں جیل میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں عزت کے ساتھ جی نہ سکا، مگر میں عزت کی موت ضرور چاہتا ہوں۔ جب تمہیں سب کچھ مل جائے تو تم مجھے بھول جاؤ۔ مجھے یہاں چھوڑ کے واپس لاہور چلے جاؤ۔ بالآخر تمہیں خبر مل جائے گی کہ دلاور مر گیا اور معلوم ہو جائے گا کہ دلاور نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا۔ سارے قانونی اور عدالتی معاملات بھی ختم ہو جائیں گے۔ سارے جھگڑے، دشمنی اور نفرت کے سارے اسباب باقی نہیں رہیں گے جب دلاور نہیں رہے گا۔"

وہ بہت دیر سے ضبط کر رہا تھا۔ اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ ہچکیوں سے اس کا سارا بدن ہلنے لگا۔ میں نے اس کے لیے نفرت کے بجائے دکھ محسوس کیا۔ وہ بڑی اذیت میں تھا۔ اسے ہر گزرنے والے دن کے ساتھ قریب آنے والی موت کے خیال نے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اس کا سارا غرور اور تکبر بے چارگی کے احساس میں ڈھل گیا تھا۔ وہ بہت بڑا شکاری تھا جسے موت نے ایسے شکار کیا تھا کہ خبر تک نہ ہوئی تھی اور زندگی کی سڑک پر اس کی گاڑی کے سامنے اچانک وہ مقام آ گیا تھا جہاں کوئی راستہ نہ تھا۔

میں بڑی مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا۔ مجھے دلاور کی بات پر یقین تھا کہ اسے اپنی اولاد کی بقا کے لیے کوئی نہیں روک سکتا تھا اور بلاشبہ اس کی زندگی میں ہی وہ سارے معاملات طے ہو سکتے تھے جو تصفیہ طلب تھے اور دشمنی کا سبب تھے۔ اس جنگ کے اصل فریق میں اور دلاور تھے۔ باقی سب ہمارا ساتھ دینے والے تھے۔ اگر میں اس کی یہ پیشکش قبول کر لیتا تو باقی سب کی زندگی بھی پرسکون ہو جاتی مگر میں فوری فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ اپنے سب دوستوں سے مشورے کے بغیر میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔

چودھری دلاور کے رونے کی آواز نے محسن کی نیند میں خلل ڈالا تھا اور وہ اٹھ کے بیٹھ گیا تھا "اسے کیا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "خیال آ رہا ہے کہ میرے بعد بیوی بچوں کا کیا بنے گا۔ چودھری صاحب کی خواہش ہے کہ یہ جنگ جو ہمارے درمیان جاری تھی اب ختم ہو جانی چاہیے۔"

محسن بولا "جب لڑنے والا ہی نہیں ہو گا کوئی تو جنگ کیسی۔ ہاں اس کے اثرات باقی رہیں گے۔ جرمنی نے پچیس سال تک جنگی جرائم کی سزا بھگتی۔ آج بھی بھگت رہا ہے۔"

چودھری دلاور نے خود کو سنبھال لیا اور پھر دوا کی گولیاں نگل کے لیٹ گیا۔ بیماری کے آثار اس کی صورت سے عیاں تھے۔ عمر یا غم والوں نے بھی اس کی صحت کو یوں متاثر نہیں کیا تھا۔ ایک تو جان لیوا مرض بھی ایسا تھا جس میں آدمی تیزی سے گھلنے لگتا ہے پھر اس احساس نے کہ ہر سانس اسے موت کی جانب دھکیل رہی ہے اور وہ اپنی ساری دولت اور طاقت استعمال کر کے بھی موت کا راستہ نہیں روک سکتا، دلاور کو دہشت میں مبتلا کر دیا تھا۔ موت ہر فانی انسان کا مقدر ہے اور زندگی کے سفر میں کوئی بھی اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کر سکتا کہ بالآخر اس کی منزل بھی کوئی شہر خموشاں ہے جہاں اس نے متعدد بار اپنے پیاروں کو کفن لپیٹ کر مٹی کے نیچے دبایا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ کسی کو مرتا دیکھ کے اور دفنانے کے بعد آخری رسوم میں شریک ہو کے کسی پر موت کی دہشت طاری نہیں ہوتی۔ اسپتالوں میں جا کے یا حادثات میں جاں بلبوں کی حالت دیکھ کے کوئی موت کے خوف میں مبتلا نہیں ہوتا۔ قول یا دیواروں پر پڑھتا ہے "نماز پڑھو موت کو مت بھولو" یا "نماز پڑھئے قبل اس کے کہ آپ کی نماز پڑھی جائے" مگر وہ متاثر نہیں ہوتا۔ جیسے موت اگر ہے تو دوسروں کے لیے، خود اس کو فی الحال کوئی خطرہ نہیں۔ ایک سزائے موت کا منتظر قیدی اور دوسرا کسی ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہونے والا جب زندگی کے باقی رہ جانے والے دن گننے لگتا ہے۔ اب ایک مہینہ رہ گیا ہے۔ اب ایک ہفتہ۔ پھر ایک دن کے گھنٹے گزرنے لگتے ہیں۔ چوبیس، تئیس، بائیس۔ اور اس COUNTDOWN کی رفتار بڑھتی جاتی ہے۔ پہلے مہینے اگر دنوں میں گزرتے ہیں تو آخر میں گھنٹے سیکنڈوں کے اندر گزرتے ہیں۔

چودھری دلاور کی ذہنی کیفیت ایسی ہی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ تو مر رہا ہے مگر اس کے بعد بھی مقابلہ جاری رہا تو اس کے بیوی بچے عبرت ناک انجام سے دوچار ہوں گے۔ ابھی تک اس نے اپنے خاندان کو تحفظ فراہم کر رکھا تھا اور انہوں نے دولت مندی کی تمام شان و شوکت کے ساتھ پرتعیش زندگی گزاری تھی۔ اب چودھری دلاور کو یہ اندیشہ لاحق تھا کہ بعد میں ان کا مقدر ذلت و خواری ہو گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دربدر ہوں، ان کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانا بھی نہ رہے۔ ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہ ہو اور وہ نان شبینہ کے محتاج ہو جائیں۔ آدمی کے دن پھرتے ہیں تو سایہ بھی اس کا ساتھ نہیں دیتا۔

ہم اتنے کمینے نہیں تھے کہ چودھری دلاور کے اعمال کی سزا اس کے بیوی بچوں کو دیتے۔ ہم نے تو چودھری دلاور کی زندگی میں بھی انہیں عتاب کا نشانہ بنانے سے گریز کیا تھا بلکہ ایک بار چودھری دلاور کی بیوی کی جان بچانے والے ہم ہی تھے۔ ہم نے اسے اپنے ساتھ لے جا کے دلاور سے بھی ملوایا تھا۔ دلاور اس وقت ہماری قید میں تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم اس کی بیوی کو بھی یرغمال بنا لیتے اور پھر اس کے ساتھ وہ سلوک کرتے جو اس نے رابعہ کے ساتھ کیا تھا اور نازو کے ساتھ۔ اس کے مرنے کے بعد تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ہم انسانیت کے درجے سے اس حد تک گر جائیں کہ لاوارث خاندان کو اپنے انتقام کا نشانہ بنا کے خوش ہوں۔

آٹھ بجے انجی کی بیوی نے کمرے میں جھانک کے کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "ہیلو۔ ہم آپ کے انتظار میں رات بھر جاگے ہیں۔"

وہ ہنسی "یعنی تمہیں یہاں نیند نہیں آئی۔ آئی ایم سوری۔ ابھی ہمارے پاس کوئی اسپیئر بیڈ روم نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میں مذاق کر رہا تھا۔ نیند ہر جگہ آ جاتی ہے۔ ہم ابھی جاگے ہیں اور اب ناشتے کے لیے باہر جانے والے تھے۔"

"ناشتا میں نے بنا لیا تھا۔ بچوں کو اسکول چھوڑنے گئی تھی اس لیے دیر ہو گئی۔ کیا تم ناشتے سے پہلے منہ دھونا چاہو گے یا نہانے کا موڈ ہے؟"

میں نے کہا "اگر غسل کا انتظام ہے تو کیا بات ہے۔"

"انتظام کیسا۔ باتھ روم میں جاؤ اور نہا لو" وہ بولی۔

ہم نے باری باری غسل کیا۔ اس سے بڑا فرق پڑا۔ میں نے خود کو بہت فریش محسوس کیا۔ باقی کسر ناشتے نے پوری کر دی۔ ڈاکٹر شاہد ابھی تک واپس نہیں آیا تھا اور نہ اس پائلٹ کے بارے میں کوئی اطلاع ملی تھی جو ہمیں اپنے ساتھ اڑا کے پیرس لے جا سکتا تھا۔

چودھری دلاور نے بھی غسل کے بعد کپڑے بدلے تھے اور ناشتا بھی ہمارے ساتھ ہی کیا تھا۔ وہ بالکل خاموش اور ذہنی طور پر غیر حاضر تھا۔ شاید وہ ہر لمحہ اس وقت کے بارے میں سوچتا رہتا تھا جو گزر چکا تھا مگر اس کی پرچھائیاں آنے والے وقت پر سایہ فگن تھیں۔ آنے والا وقت اس کی گرفت اور دسترس سے باہر تھا اور اس کا تصور کر کے لرزتے رہنے کے سوا چودھری دلاور کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔

www.paksociety.com

یہ جگہ اور یہ وقت مجھے اپنی زندگی سے الگ کسی اجنبی خواب کا حصہ محسوس ہوئے تھے۔ کون سوچ سکتا تھا کہ میں اور محسن یوں چوہدری دلاور کے ساتھ بیٹھ کے ناشتا کریں گے اور وہ بھی ایک ایسی جگہ جہاں نہ ہم نے پہلے کبھی آنے کا سوچا تھا اور نہ پھر زندگی میں کبھی آئیں گے۔ میں لاہور میں غالب اور نازو، وقار یوسف اور گل، منظر اور اس کے گھر کا تصور کر سکتا تھا۔ وہ کہاں ہوں گے اور کیا کر رہے ہوں گے۔ لاہور کی صبح ہر روز جیسی ہوگی۔ آشنائی اور اپنائیت کے احساس سے معمور۔ حلوے پوری کی خوشبو سے۔ لسی رڑکنے کی آواز سے۔ بجتے گلے میں ڈال کے اسکول جانے والے بچوں کی چہکار سے۔ سائیکلوں کی گھنٹی اور تانگے والوں کی "چل بھئی ٹیشن تک سواری" کے شور سے بھری ہوئی۔ مگر وہاں کوئی بھی ہماری صبح کا تصور نہیں کر سکتا تھا کہ ہم کہاں، کس حال میں اور کس کے ساتھ ہیں؟ ہم سے کچھ دور پیرس کے شہر خوباں میں رابعہ اور گل موجود تھیں مگر ان کے لیے ان پھولوں، خوشبوؤں، فیشن اور آرٹ کے مرکز نگاہ میں کوئی دلکشی نہیں تھی۔ وہ ہماری طرف سے متفکر تھیں اور صبح سے شام تک اور پھر رات سے صبح تک ان کے لیے زندگی کا ہر لمحہ مسلسل انتظار تھا۔ بے بسی اور اکیلے پن کا احساس تھا اور ان کی ہر سانس میں دل کی ہر دھڑکن میں اور آنکھوں میں آنے والے ہر قطرۂ اشک میں ایک خاموش تمنا تھی، دعا تھی اور امید تھی کہ ہم خیروعافیت کے ساتھ لوٹ آئیں۔

مجھے یوں لگتا تھا جیسے ٹی وی پر کسی ڈرامے کا کلائمکس تھا کہ لائٹ چلی گئی یا فلم درمیان سے ٹوٹ گئی۔ اچانک محاذ جنگ کی گھن گرج اور چیخ پکار ختم ہو گئی ہے اور ہر طرف پھیلی ہوئی لاشوں کے درمیان، جلتے ہوئے درختوں، کھنڈر عمارتوں اور سلگی دھواں کے درمیان متحارب فوجوں کے تین کمانڈر باقی رہ گئے ہیں۔ فتح مند فریق وہ ہے جس کے دو کمانڈر زندہ ہیں۔ شکست خوردہ ٹیم کی طرف سے ہتھیار ڈالنے والا کمانڈر بھی زخموں سے چور ہے اور کوئی دم کا مہمان ہے۔ اب کوئی اسے کیا گرفتار کرے۔ اس پر کیا فرد جرم عائد کرے، کیا مقدمہ چلائے اور کیا سزا دے۔ جو تو سزا میں پڑا دم توڑ رہا ہو اسے جنگی جرائم کے ٹریبونل میں کیسے پیش کیا جا سکتا ہے، ہار کے بعد اس کی ذلت کا نظارہ بھی خوش کن نہیں اور نہ اپنی جیت کا جشن منانے کے خیال میں کوئی لطف ہے۔

ناشتے کے بعد دلاور پھر اندر جا کے لیٹ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔ میں اور محسن گیراج سے کچھ فاصلے پر گھاس کے چھوٹے سے قطعے پر بیٹھے رہے جہاں سے ہم دلاور پر بھی نظر رکھ سکتے تھے۔ میں نے محسن کو اپنی اور دلاور کی گفتگو کا خلاصہ سنایا اور اس کی رائے طلب کی۔

"بات تو چوہدری دلاور کی ٹھیک ہے۔"

"پھر میں اس سے کہہ دوں کہ مجھے یہ پیش کش منظور ہے؟" میں نے کہا۔

"ایسے نہیں۔ ہم یہاں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اس میں قانونی مسائل کی نوعیت ذرا مختلف ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم سب غیر قانونی طور پر برطانیہ میں مقیم ہیں۔ خود چوہدری دلاور نے نواب خسرو جمشید کا پاسپورٹ استعمال کیا تھا اور وہ مر چکا ہے۔ اگر کبھی کوئی قانونی بیان ریکارڈ پر لانے کی بات ہوگی تو کیا ہم سے شناخت نہیں مانگی جائے گی اور فرض کرو ہم نے کسی طرح اس کا انتظام کر لیا، کوئی مجسٹریٹ یا وکیل چوہدری دلاور کے بیان کی تصدیق پر راضی ہو گیا تو اس بیان کی قانونی حیثیت بعد میں کیا ہوگی؟ جب معلوم ہوگا کہ بیان دینے والا ایک مفرور مجرم تھا جو غیر قانونی طریقے سے برطانیہ پہنچا تھا۔ دلاور نے ہر جگہ اپنا نام خسرو جمشید لکھوایا ہوگا۔ یہ جعلسازی کا کیس ہے۔ یہ بھی مدنظر رکھنا ہوگا کہ اس معاہدے پر عمل درآمد کے دوران ہم کہاں رہیں گے اور دلاور کہاں ہوگا؟ اس میں کتنا وقت صرف ہوگا۔ دلاور کا مسئلہ ہے ایک خطرناک بیماری جس میں اس کی حالت کسی وقت بھی بگڑ سکتی ہے، اسے ہم نہیں سنبھال سکتے۔ اس کی دیکھ بھال عام ڈاکٹر بھی نہیں کر سکتا۔ اسے اسپتال میں خصوصی علاج کی ضرورت پیش آئے گی۔ پھر وہ اپنے بیوی بچوں کو بلانا چاہتا ہے۔ وہ سب کیسے آئیں گے اور کہاں رہیں گے؟ ہم ان کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتے۔ ان سے کچھ بعید نہیں کہ وہ خود تو قانونی طور پر یہاں آئیں اور موقع ملتے ہی ہمیں گرفتار کرا دیں یا چوہدری دلاور کو ہم سے چھین کر لے جائیں۔ اس کے علاوہ سارے تصفیہ طلب معاملات کا تعلق لاہور سے ہے۔ لاہور میں دلاور سب کچھ کر سکتا ہے اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہ گڑبڑ نہیں کر رہا ہے۔ خود ہمارا سامنے آنا ضروری نہیں ہوگا۔ رابعہ، منظر اور وقار یوسف ہمارے وکیل ہیں۔ وہ ہر معاملے کا قانونی پہلو دیکھتے ہوئے ایک ایسا طریقہ کار وضع کر لیں گے کہ جو ہمارا حق ہے وہ ہمیں مل جائے اور اس سودے بازی میں کوئی قانونی سقم باقی نہ رہے۔ جو پراپرٹی تمہاری ہے وہ تمہارے نام منتقل ہونے میں دیر نہ لگے۔ سارے اثاثے اور ان کی مالیت کا تعین کرتے ہوئے چوہدری دلاور سے جو بھی وصول کرنا ہے وہ آسانی سے مل جائے اور اس میں کسی کے لیے خطرے یا پریشانی کی بات نہ ہو۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "یہاں رہ کے یہ سارے کام مجھے بھی مشکل نظر آتا ہے۔"

"مشکل ہی نہیں، یہ ناقابل عمل ہے۔" محسن بولا "وہاں سے قانونی دستاویزات یہاں آئیں گی۔ یہاں دلاور دستخط کرے گا تو ان کی تصدیق بھی لازمی ہوگی۔ گواہ درکار ہوں گے۔ پھر یہ کاغذات واپس لاہور ارسال کیے جائیں گے اور کچھ وقت لگے گا قانونی عمل میں۔ خدانخواستہ کوئی الجھن پیدا ہو گئی تو دور کیسے ہوگی اور سب ہو جانے کے بعد دلاور کے بیوی بچے آئیں گے تو کیا ہوگا؟ دلاور ساتھ لے جانا چاہیں گے تو کیا ہم بھی ساتھ جائیں گے؟ اور اگر ہم ان کو بھی اپنی قید میں رکھیں گے تو کہاں؟ یہ سب بڑا لمبا چکر ہے جس میں ہمارے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ ہم صورت حال کو کنٹرول کرنے میں ناکام رہے تو مارے جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم بدستور اپنی لاہور چلیں اور دلاور کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ باقی سارے معاملات وہیں طے ہوں، جہاں کے ہیں۔"

"اور جب تک یہ معاملات طے نہ ہو جائیں اور ہمارے خلاف بنائے گئے مقدمات ختم نہ ہوں، ہم روپوش رہیں؟"

"روپوش رہتے ہوئے قانونی مقدمات کیسے ختم ہو سکتے ہیں۔ چوہدری دلاور کا بیان ہو جائے تو ہمیں خود کو عدالت میں پیش کرنا ہوگا۔ ابھی ہم مفرور مجرم ہیں۔ ہماری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے۔ اگر گیا۔ ہمیں دوبارہ درخواست ضمانت دائر کرنی ہوگی۔ بدلے ہوئے حالات میں ضمانت آسانی سے منظور ہو جائے گی اور ہمیں جیل نہیں جانا پڑے گا لیکن جانا پڑا تو وہاں زیادہ دن نہیں رہنا پڑے گا۔ عدالتی طریقہ کار ویسے تو بہت پر پیچ اور لمبا ہے مگر ہمارے وکیل بہت مستعد ہیں اور نیک نام بھی ہیں۔ ان کو بڑے وکلا کی حمایت بھی حاصل ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اب پنجے مرزا غالب کی دبدبے والی ہماری طرف داری کرے گا۔ یہ ہے تو غلط بات مگر ہم مجبور ہوں گے عدلیہ پر دباؤ ڈالنے کے لیے۔ ہمارے پاس، میرا مطلب ہے دلاور کے پاس وقت کم ہے۔ نہ جانے کب اس کی حالت اچانک بگڑ جائے۔ متاثرہ دماغ کے ٹیومر کا سبب وہ اندھا یا مفلوج ہو سکتا ہے اور کومے میں بھی جا سکتا ہے۔ انصاف کے عمل کو تیز کرنے کے لیے ہمیں کوشش کرنا پڑے گی۔ اگر ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ اس کی زندگی کے زیادہ سے زیادہ تین مہینے باقی ہیں تو درحقیقت ہم تو کم مدت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے بعد کا کچھ پتا نہیں۔"

میں نے کہا "تم نے میرے ذہن سے سارا کنفیوژن دور کر دیا۔ مگر فوری مسئلہ ہے دلاور کو لاہور لے جانے کا۔"

"ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ہم سے تعاون کرے۔ ہم اس کی بات مان رہے ہیں۔ وہ ہماری بات مان لے اور لاہور چلے۔ لاہور کے معاملات طے ہوتے ہی اسے ہماری طرف سے آزادی ہوگی کہ جہاں چاہے چلا جائے لندن یا نیویارک۔"

"کیا اب ہم نے اپنا اصولی موقف بدل لیا ہے۔ ہم اسے قانون کے حوالے کرنا چاہتے تھے، ہر قیمت پر۔"

محسن نے کہا "لیکن خود دلاور کا موقف حیرت انگیز طور پر بدل گیا ہے۔ اب وہ اپنے ساتھ ہمارے مسائل ختم کرنا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے۔ اگر یہ دیوانی اور فوجداری مقدمات ختم نہ ہوئے تو ہم چوہدری کی موت کے بعد بھی دس بیس سال پریشان رہیں گے۔ دلاور کو سزائے موت دلوانا ہمارا مقصد تھا۔ وہ قدرت نے پورا کر دیا۔ یہ معاملات عدالت میں طے ہوتے تو ہماری زندگی قانونی جنگ لڑتے گزر جاتی۔ قدرت نے آسان شارٹ کٹ سے سالوں کے معاملات دنوں میں ختم کرانے کا بندوبست کر دیا ہے تو ہم اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں؟"

"معلوم نہیں ہمارے وکیل دوستوں کی رائے کیا ہوگی؟"

"ان کی رائے مختلف کیسے ہو سکتی ہے۔" محسن بولا "اور لاہور پہنچ کے ہمیں مشورے کے لیے وقت ملے گا۔ اصل مسئلہ ہے لاہور پہنچنا۔ اگر ایڈی مل جاتا تو پیرس پہنچ جاتے۔ وہاں رابعہ اور گل کا فکر اور پریشانی سے جینا حرام ہوگا۔ نہ ہمیں ان کی خبر ہے نہ انھیں ہماری۔"

"بدمعاشی خود انھوں نے کی۔ ہم تو فون پر بات کرنا چاہتے تھے۔ خود انھوں نے کہلوا دیا ہوگا کہ وہ یہاں نہیں ہیں حالانکہ وہاں سے ان کے کہیں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" میں نے کہا۔

محسن نے سمجھایا "تو ٹھیک کہتا ہے۔ وہ وہیں ہوں گی۔ ہم نے بھی تو دوبارہ کوشش نہیں کی۔"

"اب کر لیتے ہیں۔ ان کا دماغ ٹھکانے آگیا ہوگا" میں نے کہا۔

ایڈی کی بیوی ہاتھ میں باسکٹ اور شاپنگ بیگ لے نکل تھیں "ذرا شاپنگ کے لیے ڈاؤن ٹاؤن جا رہی ہوں۔"

"ڈاؤن ٹاؤن ایک امریکی اصطلاح ہے۔"

وہ مسکرائی "میں امریکن ہوں۔ گھر کھلا ہوا ہے۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو مثلاً ٹیلی فون یا چائے وغیرہ، اندر جا کے جو چاہو کرو۔ ٹی وی دیکھو یا اخبار پڑھو اور ریڈیو پر موسیقی سنو۔"

میں نے کہا "ایڈی کی کوئی اطلاع؟"

"اس کا فون آیا تھا۔ وہ پرسوں سے پہلے نہیں آسکتا۔ اس کے ٹرک میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔"

"تم نے اسے ہمارے بارے میں بتایا تھا؟"

"ہاں۔ اور اس نے پھر کہا ہے کہ تم اس کے دوست سے رابطہ کر سکتے ہو وہ ہر طرح سے تمہاری مدد کرے گا۔ وہ بھروسے کے قابل ہے۔"

"تم اس کا نام اور فون نمبر دے جاؤ" میں نے کہا۔

ایڈی کی بیوی کی پیش کش بروقت تھی۔ میں نے محسن کو چوہدری دلاور کے پاس چھوڑا اور خود اندر چلا گیا۔ ڈاکٹر شاہ کے واپس نہ آنے سے مجھے تشویش ہو رہی تھی مگر میرا دل کہتا تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ ہم نے جو کام اس کے سپرد کیے تھے وہ آسان نہیں تھے۔ سب سے پہلے میں نے پیرس کے غریب نواز ہوٹل کا نمبر ملایا۔ ریسیور اٹھانے والی وہ آدم بیزار مرد مار بلا نہیں تھی۔ میں نے اسے رابعہ اور گل کے کمرے کا نمبر دیا "میں دس منٹ بعد دوبارہ فون کروں گا اگر آپ انھیں بلا لیں تو۔" میں نے فرنچ میں کہا۔

"کیوں نہیں موسیو" اس نے خوش دلی سے کہا "ویسے وہ بہت پریشان تھیں کسی ٹیلی فون کال کے لیے۔ بار بار پوچھنے آتی تھیں۔"

میں نے کہا "تو آپ ان سے جا کے صرف یہ کہیں کہ تمھیں جس فون کال کا انتظار تھا وہ موصول ہو گئی ہے۔"

دس منٹ کی مہلت میں نے طوطی صاحب سے فون پر بات کرنے میں صرف کی۔ معلوم نہیں یہ اتفاق تھا یا ان کا ہر وقت کا مشغلہ کہ ریسیور پر ان کی رنگ "ہیلو" سے پہلے میں نے وہ خطاب سنا جو طوطی صاحب نے اپنے ولی عہد شہزادہ سلیم کو دے

www.paksociety.com

تقسیم پر دیا تھا "اولاد و خنزیر" (جو ان کی مادری زبان میں سور کے بچے کا فارسی ترجمہ تھا)

میں نے کہا "حاجی صاحب! یہ کیا فرما رہے ہیں آپ۔"

"کون سکندر۔ یہ تم سے نہیں فرمایا تھا میں نے میرے پاکستانی بھائی" حاجی علم دین طوطی نے معذرت کی "اس نابکار سے مخاطب تھا نہ جانے کس مرے ہوئے پلید گھوڑے کے بالوں سے بنی ہوئی وگ اپنی کھوپڑی پر نجاست کے ٹوکرے کی طرح اٹھائے پھر رہا تھا اور مجھے بتانے آیا تھا کہ سنہرے بھورے بالوں میں بالکل انگریز دکھتا ہوں میں۔ لوگ ہمارے لیے تو ڈوب مرنے کا مقام ہوتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی بچہ اتنا حرامی ہو کہ صورت سے بھی پاکستانی نہ لگے۔ خیر سے بیٹے ہیں اپنے جیسی ملال ہیں، سانولے رنگ کے۔"

میں نے کہا "جی دراصل۔۔۔ مجھے ایک ضروری بات کرنی تھی۔"

"کرو نا میرے پاکستانی بھائی کس نے روکا ہے تمہیں۔ اور بات تو ضروری ہی ہوتی ہے ورنہ بات کرتا کون ہے؟"

میں نے کہا "آپ نے کسی پائلٹ کی بات کی تھی۔ جو ہمیں فرانس پہنچا سکتا ہے۔"

"ہاں بھئی وہ میرا کل رات اس سے سامنا ہو گیا۔ اتفاق سمجھو یا اپنی خوش قسمتی۔ بدبخت اپنی عاقبت اتنی خراب کر چکا ہے کہ اس کی تو سات نسلیں بھی جہنم کا ایندھن ہوں گی۔ ایک تو کافر انگریز پھر شرابی اور شبابی۔"

"شبابی! یہ کیا ہوتا ہے؟" میں نے انجان بن کے کہا۔

"ایک لت شراب کی دوسری شباب کی۔ ایک ہاتھ میں بوتل تھی اور دوسرے میں ایک بے حیا اور فاحشہ۔ لباس اس کا۔۔ الامان۔۔۔ گریبان سے دیکھو تو دامن تک دکھائی دے" پھر انہوں نے تفصیل سے اس کے ملبوس کی تنگ دامنی سے لے کر اس کے جسم کے بنیادی اعداد و شمار تک تمام خرابی کے اسباب پر روشنی ڈالی۔

میں نے کہا "بڑے غور سے مشاہدہ کیا آپ نے طوطی صاحب۔"

وہ خالص جھینپے "وہ بس۔ کیا فرمایا ہے علامہ صاحب نے کہ نظر لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے۔"

"یہ تو فیض صاحب نے فرمایا ہے۔"

"ابھی دفع کرو۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ سب اپنے پاکستانی شاعر ہیں نا۔ کہنے کا مطلب یہ تھا میرے پاکستانی بھائی کہ اس مردود سے ملاقات تو ساحت غیر شرعی ماحول میں ہوئی تھی مگر کیا کرتا۔ اس وقت تک نشہ غالب نہیں آیا تھا۔ چنانچہ اس نے میری بات بڑے دھیان سے سنی۔ بس درمیان میں کبھی ایک ہاتھ کی چیز پر منہ مارتا رہا اور کبھی دوسرے ہاتھ کی چیز پر توجہ دیتا رہا۔ آخر میں بولا کہ مسٹر طوطی۔ بات کرو ڈالر یا پاؤنڈ کی زبان میں۔ معاوضہ ادا کرو وہ تمہیں یوگنڈا کے جنگل سے گینڈا چوری کر کے ہوائی جہاز سے تمہارے صحن میں دے آئے۔ اس نے پانچ ہزار پاؤنڈ مانگے تھے۔

میں نے دہائی لگائی "بالآخر تین ہزار نو سو ننانوے پاؤنڈ پر سودا ہو گیا۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی "پورے چار ہزار کیوں نہیں؟"

"اس نے کہا کہ چار ہزار میں ایک پاؤنڈ کم نہیں لوں گا تو میں بھی اڑ گیا میرے پاکستانی بھائی کہ میں ایک پاؤنڈ کم دوں گا تو خبیث مان گیا۔ اب تمہیں بھی قسم ہے جناب پاکستان کی پورے چار مت دینا اسے۔ گن کر پورے تین ہزار نو سو ننانوے پاؤنڈ دینا۔"

میں نے کہا "چلیں یہ تو طے ہو گیا۔ اب مجھے بتائیں کہ میں اس سے کہاں اور کیسے رابطہ کروں؟"

"تم اس کا نام اور فون نمبر لکھ لو۔ فون نمبر تو اس نے دے دیے ہیں۔ یہاں نہ ملا تو فلاں کے بیڈ روم میں ملوں گا۔ وہاں نہ ملا تو فلاں کی آغوش میں اور وہاں نہ ملا تو۔۔۔" ان کی آخری بات پر مجھے ہنسی ضرور آئی مگر وہ قابل اشاعت نہیں۔

"میں آج ہی اس سے ملتا ہوں۔ اگر ہم کل یہاں سے نکل جائیں۔"

"فکر کی بات نہیں میرے پاکستانی بھائی۔ لاؤ نا کل جاؤ تو وہ بے فکر ہو گیا۔ یہاں کی پولیس تم کو پکڑ لے گی۔ میرا تو پرانا مشورہ ہے کہ تم فرانس میں بھی مت رکو۔ آگے نکل جاؤ۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔"

"یہ علامہ صاحب نے فرمایا تھا؟" میں نے کہا۔

"اور کون فرما سکتا ہے۔ تم جرمنی یا ہالینڈ چلے جاؤ۔ اٹلی چلے جاؤ۔ سب کی سرحدیں ملتی ہیں۔ ٹکٹ تمہیں لندن سے بھی مل سکتا ہے مگر تم پیرس سے ہوا لو تو بہتر ہے۔ یہ جو ہوا باز تم کو وہاں پہنچائے گا اس کو سارے خفیہ راستوں کا علم ہے۔ مگر ایک گزارش ہے نذری کی میرے پاکستانی بھائی۔"

"آپ حکم کریں۔"

"حکم یہ ہے کہ کہیں پکڑے جاؤ تو مجھے مت پکڑوانا، جیل جانے کی نوبت آجائے تو طوطی کو اپنے ساتھ مت لے جانا۔ جیسا کہ مجھے چوہدری نورالدین نے بتایا۔ تم تھامس لورلیب میں جلا دی ہے یہاں۔ اس کی تو خیر میں نے خدا کرا دی تھی۔ افسوس ہے کہ تمہاری نہیں کر سکتا۔ لیکن میرا مشورہ ہے کہ بس اپنے کام سے کام رکھو اور جتنی جلدی ممکن ہو بھاگ جاؤ اس کفرستان سے اپنا ایمان سلامت لے کر۔ ملت بیضا کی آبرو داغ آنے سے پہلے۔"

میں نے انہیں یقین دلایا کہ انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا اور خدا حافظ کہہ کے ریسیور رکھ دیا۔ دوسری بار پیرس کا نمبر ملاتے ہوئے میں نے گھڑی دیکھی تو چند منٹ ہو گئے تھے۔ رابعہ لوہ گئی تھی کاؤنٹر سے لگی کھڑی تھی۔

دوسری طرف سے رابعہ نے کہا "ہیلو۔"

میں نے خفت سے کہا "سلاما علیکم سر کیا حال ہے؟"

وہ بم کی طرح پھٹ گئی "شرم نہیں آتی تمہیں حال پوچھ

وقت زخ خیال آیا ہے ہمارا۔ تین دن ہو گئے۔"

میں نے کہا "سوری۔ آپ کی آواز سن کے دل شاد ہوا۔ ہم نے پہلے بھی کوشش کی تھی مگر ہمیں رخصا دیا گیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ وہ یہاں نہیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے غصے میں کہہ دی تھی ایک بات۔"

"ہم کو غصے پر پیار آتا ہے۔ تم کو آتا ہے پیار پر غصہ تو پھر تم کیا ہم بنتے ہیں۔۔۔ ہم گالیاں کھا کے بے مزہ ہونے والوں میں نہیں ہیں۔"

"خبیث اور بے شرم ہو تم کمینے ہو۔۔۔"

"تو یہی چہ نگ۔ ہماری انہی باطنی صفات پر فریفتہ ہوئی تھیں آپ ورنہ صورت پر تو آج بھی بہت مرتی ہیں یقین نہیں تو یہاں آکے دیکھ لو لڑکیاں مری پڑی ہیں ہر طرف۔ جدھر سے گزرتے ہیں۔"

"فضول باتیں مت کرو محسن کہاں ہے؟"

"میرے پیچھے چھپا کھڑا ہے۔ کہتا ہے کل کو بلبل کا سلام بلبل کی آواز سننے کی ہمت نہیں۔ کل سے کہو کہ جتنی گالیاں باقی ہیں وہ بھی مجھے دے کر دل ٹھنڈا ہو جائے۔"

"کل کیا بات کراؤ محسن سے۔"

"یا اور نہیں ہے یہاں گھر ہے بالکل خیر و عافیت کے ساتھ۔"

"کب تک آرہے ہو تم۔ ہماری تو نیندیں حرام ہو گئی ہیں فکر سے۔"

"ہو سے فکر کبھی۔ ہم جیسے چاہنے والے تو۔۔۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا۔"

"سکندر۔ کوٹ ورنہ میں رونے لگوں گی۔"

"واقعی" میں نے مسرت سے کہا "بہت دن ہو گئے ہیں۔ آج دکھاؤ رو کے۔ بسم اللہ کرو۔ آواز صاف آنی چاہیے۔ ناک سڑ سڑ کرنے کی الگ۔ ہچکیاں اور سسکیاں الگ۔ اور ذرا سُر میں رونا۔ بھوں بھوں کر کے ایسے مت رونا کہ لگے عبدالودود منظر فس رہا ہے۔"

وہ ہنس پڑی "اچھا تم واپس تو آؤ پھر نمٹوں گی تم سے۔ یہ کل بہت بے قرار ہے۔"

کل نے کہا "سکندر بھائی وہ کہاں ہیں؟"

"وہ کون۔ شکار پور کے مشہور اچار فروش۔ گندو خان نیازی۔"

وہ پہلے سے رونے پر کمربستہ تھی "پلیز ان کو دے دیں فون۔"

میں اس کی سنجیدگی پر حیران رہ گیا۔ میں نے باہر جا کے محسن کو کل کا پیغام دیا اور خود چوہدری دلاور کے پاس بیٹھ گیا۔

"وہ خبیث ڈاکٹر شاہ ابھی تک کیوں نہیں آیا؟" میں نے دلاور سے پوچھا۔

دلاور نے کہا "اس کے آنے نہ آنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق پڑتا ہے" میں نے کہا "ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم کو اپنے ساتھ لاہور لے جائیں۔"

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا "میں نے تم سے کہا تھا۔۔"

"زیادہ اہم وہ ہے جو ہم کہہ رہے ہیں" میں نے کہا "یہ سب معاملات یہاں طے ہونے والے نہیں ہیں۔"

"آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ جو کچھ ہے لاہور میں ہے۔ اصل مسئلہ لاہور کا ہے۔ ہمارے وکیل لاہور میں ہیں۔ عدالتی مقدمات لاہور میں ہیں۔ لندن میں بیٹھ کے کاغذی کارروائی پوری کرنے میں بھی خطرہ ہے ہمارے لیے یہاں ایک ایک دن گزارنا مشکل ہے۔ ہم غیر معینہ مدت تک قیام کا رسک نہیں لے سکتے۔ تمہارے بیوی بچوں کو بھی یہاں نہیں بلایا جا سکتا۔ تم ان سے ملنا چاہتے ہو تو لاہور چلو۔"

"نہیں۔ میں لاہور نہیں جاؤں گا" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"تم اپنی مرضی سے نہیں جاؤ گے تو ہماری مرضی سے جاؤ گے۔"

"تم۔ تم مجھے پولیس کے حوالے کر دو گے۔ تو پھر وہ سب نہیں ہو گا جو میں چاہتا ہوں۔"

"یہ بھی ہم لاہور جا کے طے کریں گے کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے محسن سے مشورہ کیا تھا اور ابھی فون پر رابعہ سے بھی بات ہوئی۔ تم جانتے ہو وہ کتنی بڑی وکیل ہے میرے تمام قانونی معاملات کی نگرانی کرتی ہے۔ اس نے سنگر اور وقار یوسف سے بھی پوچھا۔ اور ہم سب اس بات پر ضرور متفق ہیں کہ تمہاری حالت کے پیش نظر اب تمہیں پولیس کے حوالے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

دلاور کا مایوس چہرہ پھر امید سے روشن نظر آنے لگا مگر یہ روشنی ایسی تھی جیسے مٹی کی دیواروں پر چالیس واٹ کے بلب کی روشنی جو بہت کم ہو کہیں پر جل رہا ہو۔

"پھر کیا طے کیا ہے تم نے؟" دلاور بولا۔

میں نے کہا "تم ہمارے ساتھ لاہور جاؤ گے۔ وہاں تم ہمیں سارا حساب دو گے۔ پہلے کیا تھا آج کیا ہے۔ وزیر خان اور میر شرافت علی سے تم نے کتنا چھینا تھا؟ ان کے کتنے اثاثے تھے جو تمہاری تحویل میں رہے۔ پھر تم نے کیا کمایا۔ جائز ناجائز کا حساب الگ کرنا تو مشکل ہے۔ تمہیں بھی ہر بات تفصیل سے کہاں یاد ہو گی۔ تم اندازے کی بنیاد پر بتا سکتے ہو۔ دو چار ہزار یا ایک لاکھ کا فرق بھی ہم نظرانداز کر دیں گے۔ یہ سارا حساب میرے وکیل دیکھ لیں گے تو پھر تقسیم کا مرحلہ آئے گا۔ تمہارا حصہ ایک تہائی ہو گا۔ یہ تمہارے خاندان کی ملکیت رہے گا مگر اس طرح کہ انہیں نقد ادائیگی کر دی جائے گی۔ وہ تمام کاروباری معاملات سے الگ ہو جائیں گے۔ اگر وہ اپنا کاروبار کرنا چاہیں تو ان کی مرضی۔ جس گھر میں وہ رہتے ہیں وہی ان کے پاس رہے گا۔ لیکن اس کی قیمت ان کے حصے میں سے وضع کر لی جائے گی۔"

www.paksociety.com

"اور وہ حصے تم لوگے میر شرافت علی کا حصہ بھی!"

"ہاں۔ ایک حصہ میرے... وزیر خان کا ہے۔ ان کا وارث میں ہوں' دوسرا حصہ تم جرمانے یا ہرجانے کے طور پر میرے حوالے کروگے اور اس کو میں اپنے دوستوں میں تقسیم کروں گا جنہوں نے میرا ساتھ دیا تھا اور بہت نقصان اٹھایا تھا' تمہاری وجہ سے۔"

دلاور کچھ دیر سوچتا رہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سارے معاملات یہاں بیٹھ کے طے کرنے میں تمہارا کیا نقصان ہے۔ دنیا کے کاروبار' لین دین سب کسی ایک جگہ بیٹھ کے ہوجاتا ہے اور اتنگی دنیا کے ایک کونے میں ہوتی ہے' مال دنیا کے دوسرے کونے میں ڈلیور ہوجاتا ہے۔ لاہور میں بیٹھا ہوا شخص اپنی جگہ سے ہلے بغیر دنیا کے کسی بھی شہر میں جائداد خرید سکتا ہے اور بیچ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ سب میں جانتا ہوں لیکن تم جانتے بوجھتے ایک حقیقت کو نظرانداز کررہے ہو شاید۔ کہ یہاں میری وہ حیثیت نہیں ہے جو عام آدمی کی ہوتی ہے۔ پاسپورٹ پر میرا نام وقار یوسف لکھا ہوا ہے مگر وقار یوسف لاہور میں ہے۔ میں سکندر بخت ہوں' جس کو حدود برطانیہ سے بے دخل کردیا گیا تھا اور آج میں جعلی شخصیت بنا کے آیا ہوں تو یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں رہی' تمہاری عنایات کے طفیل۔ قانون مجھے یہاں ایک مدت قیام کی اجازت نہیں دیتا۔ تم یہاں بیٹھ کے قانونی معاملات طے کرنے کی بات کررہے ہو۔ بے شک میں لاہور میں بیٹھ کے لندن میں مکان خرید سکتا ہوں۔ یہاں کاروبار میں پیسہ لگا سکتا ہوں۔ میرا کوئی اتارنی یہاں بلا خوف و تردد آجا سکتا ہے مگر میں اور محسن یہاں صرف جیل میں رہ سکتے ہیں۔ میں یہ خطرہ کیسے مول لے سکتا ہوں۔ اگر تمہارے ذہن میں کچھ اور ہے مثلاً یہ کہ اس بہانے ہم لندن میں ہفتہ دس دن گزاریں گے تو پکڑے بھی جائیں گے۔ پولیس خود پکڑ لے گی یا تم کسی طرح انہیں ہم تک پہنچا دوگے۔"

"تمہیں اعتبار کرنا ہی ہوگا مجھ پر سکندر۔ اگر میں ایسا چاہوں گا تو خرابی خود میرے لیے ہوگی۔ جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں ہوگا۔"

"پھر تمہیں وہی کرنا چاہیے جو ہم چاہتے ہیں۔ ایک وعدہ میں نے تم سے کرلیا ہے کہ تم کو پولیس کے حوالے ہم خود نہیں کریں گے تمہاری حفاظت کرنا تمہارے بیوی بچوں کا کام ہے۔"

اس نے ایک آہ بھری "چلو ٹھیک ہے۔"

محسن سخت خفگی کے عالم میں نمودار ہوا "الو کی دُم۔"

میں نے کہا "بجا ارشاد۔"

"دماغ خراب ہوگیا ہے اس کا" محسن غصے میں بولا۔

"صحیح فرمایا آپ نے۔"

"خود ہم نے بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے۔"

میں ہنس پڑا "ایسا لگتا ہے کہ تجھے زیادہ بیوی ڈوز ملی ہے۔ خالی تو رابعہ نے بھی بہت نہیں کی مگر مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ یہ تم برداشت نہیں کیا تو بھی مت بھول کہ عزت آنی جانی چیز ہے۔ کان کا میل ہے۔ بندہ ذہین اور موٹی کھال والا ہو تو کوئی کچھ نہیں کرسکتا اور پھر ان عورتوں کی باتیں' ان کا کیا برا ماننا۔"

"یار' سخت شکی مزاج ہے۔ کہنے لگی کہ مجھے معلوم ہے تم لندن اکیلے کیوں گئے تھے۔ گل چھرے اڑانے کے لیے۔ کوئی غصہ کچھ کم ہوا "ہم گل چھرے اڑا رہے یا جھک مار رہے ہیں۔ جنگلی ہو کے لیے پھر رہے ہیں۔ اسے وہاں آرام سے بیٹھ کر بھی سلامتی کی فکر نہیں۔ بس یہ خیال ہے کہ میں دن بھر ایک لڑکی میں لیے پھرتا ہوں تو رات کو دوسری کی بغل میں ہوتا ہوں۔"

"بقول اپنے طوطی صاحب کے' سخت شرابی اور عیاش ہوگئے ہیں ہم لوگ۔ خیر سوچنے دے اسے ایسا ہی۔ جب ہم ایسے نہیں تو پھر برا ماننے کی کیا ضرورت ہے۔ کہہ دیتا کہ تین نکاح کرنے ہیں یہاں۔ اب تو آپنے چوہدری دلاور صاحب کو سمجھا کر ہمارا لاہور جاکے سارے معاملات طے کرنا کیوں ضروری ہے میں آتا ہوں ایک ضروری فون کرکے۔"

طوطی صاحب نے مجھے تین فون نمبر دیے تھے۔ اس کا نام جانے کیا تھا' عرف عام میں وہ جیک کہلانے لگا اور اب ہائی جیک مشہور تھا۔ غالباً اپنا پیشہ ورانہ مصروفیت کے باعث پہلے نمبر پہ ایک خاتون نے سریلی' نشیلی' رسیلی آواز میں کہا "جیک۔ اس کو رات میں نے گھر سے باہر پھینک دیا۔"

"کس جرم کی پاداش میں' ویسے کیا تم پہلوان ہو؟"

وہ ہنسی "میرا مطلب تھا' میں نے اسے بے عزت کرکے نکال دیا۔ اس کے پاس سے میری بیٹی کی تصویر برآمد ہوئی۔ ابھی وہ صرف چودہ سال کی ہے۔"

باقی بات سنے بغیر میں نے لائن کاٹ دی اور دوسرا نمبر ملایا۔ یہاں ایک غصیلی زہریلی عورت نے سوال کیا "کیا کام ہے جیک سے؟"

میں نے عیاری سے کہا "تمہارے فائدے کا کام ہے۔"

"میرے فائدے کا' جیک!" اس نے چلا کے کہا "کوئی منزہ بچہ تمہیں فون پر بلا رہا ہے۔"

"اس سے کہہ دو' جیک مرگیا" پیچھے سے آواز آئی۔

"یہ تم خود کہہ دو یہاں آکے' یہ رکھا ہے ریسیور۔"

کچھ دیر بعد جیک نے کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "ہائی جیک۔ کل تمہاری کسی سے بات ہوئی تھی؟"

"کل میری ایک ہزار لوگوں سے بات ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "ایک بزنس ڈیل تھی' تین ہزار نو سو ستانوے پاؤنڈ کی۔"

وہ ایک دم مستعد ہوگیا "بالکل ہوئی تھی' تم وہی ہو؟"

"ہاں' میں وہی ہوں" میں نے کہا۔

"کیا پروگرام ہے تمہارا؟" وہ بولا "مجھے آج کے بعد اگلے دو دن فرصت نہیں ہوگی۔ ایک فرنچ ماڈل گرل کسی شیخ کے حرم میں داخل ہونا چاہتی ہے۔ ایک شخص چاہتا ہے کہ میں اس کی بیوی کو اٹلی کے اوپر سے گزرتے ہوئے وہاں ڈراپ کردوں جہاں سمندر کی گہرائی سب سے زیادہ ہو۔"

"یہ سب مجھے مت بتاؤ" میں نے کہا "مجھے آج شام جانا ہے۔ تم اس وقت کہیں مل سکتے ہو مجھ سے؟"

"تم کہاں ہو۔ میں آجاتا ہوں۔ زیادہ بہتر ہوگا اگر تم ایئرپورٹ آجاؤ۔ تمہیں آنے میں آدھا گھنٹہ تو لگے گا۔ میں بھی اتنی دیر میں فارغ ہوجاؤں گا۔"

میں نے اس سے مصروفیت کی نوعیت نہیں پوچھی۔

میرے حساب سے وہ ایک گھنٹے کا راستہ تھا۔ میں ریسیور رکھ کے باہر آیا ہی تھا کہ لیڈی کی آواز آئی "یہ کیا ہے۔ باہر تابوت کیسا رکھا ہوا ہے' کون مرگیا ہے؟"

میں نے فوراً صورت حال کو سنبھال لیا "ابھی تو کوئی نہیں۔"

"پھر کیا وہ شخص مرنے والا ہے؟"

میں نے کہا "اس کی حالت ایسی ہوگئی تھی۔ میں نے احتیاطاً تابوت منگوالیا تھا۔ اگر ہمیں اس کی لاش لے جانی پڑتی تو تابوت ضروری تھا۔"

"ارے آئی ایم سوری' کیا اس کی حالت اتنی خراب ہے؟"

"کینسر کا مریض کسی بھی وقت مرسکتا ہے۔ خصوصاً وہ جس کو دنیا بھر سے ہو اور آخری اسٹیج ہو۔"

اس نے اپنے سینے پر صلیب بنائی "پھر وہ یہاں کیوں پڑا ہے' کیا دنیا میں اس کا کوئی نہیں؟"

"آج ہم اسے یہاں لے جارہے ہیں" میں نے کہا "ایک پرائیویٹ جہاز سے۔ جو شخص تابوت لایا ہے وہ ہمارا ہم وطن اور مریض کا دوست ہونے کے علاوہ ڈاکٹر ہے۔ وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔"

"مجھے امید ہے کہ تم سچ بول رہے ہو۔ بات یہ ہے کہ میں کسی مشکل میں پڑنا نہیں چاہتی۔ مجھے معلوم ہے کہ ایڈی کے سب دوست اچھے نہیں ہیں اور وہ کچھ غلط کام بھی کرتا ہے پیسے کے لیے۔ میں نے اسے خبردار کردیا تھا کہ تم باہر کچھ بھی کرو' میرے گھر اور بچوں پر اس کا اثر نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ بھی خیال رکھتا ہے۔"

"تم فکر نہیں کرو' ایڈی کوئی غلط کام نہیں کررہا۔"

"کوئی مرد کسی عورت کے' خصوصاً بیوی کے کہنے سے اپنی عادت اور فطرت نہیں بدل سکتا۔ یہ عورت ہے جو مرد کو سمجھتی ہے اور پھر اس کی زندگی میں فٹ ہوجاتی ہے۔ خود کو اس کی پسند ناپسند کے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ وہ جیسا بھی ہے' میرا ہے۔ کبھی باہر ادھر ادھر منہ مارلیتا ہے تو مجھے کیا۔ آخر وہ گھر سے باہر ہوٹل کا کھانا بھی تو کھاتا ہے۔ بھوکا تو نہیں رہ سکتا۔"

"خاتون۔ میں تمہاری فراخ دلی' محبت اور عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ کاش سب عورتیں تم جیسی ہوتیں" میں نے کہا "سارے مرد خوش نصیب ہوتے ایڈی کی طرح۔"

وہ خوش ہوگئی۔ یہ خوشامد ضرور تھی مگر سچ پر مبنی۔ اس کا دل ہماری طرف سے صاف ہونا ضروری تھا۔ جو عورت گھر کی سلامتی کے لیے اتنی فکرمند ہو' وہ پولیس کو فون بھی کرسکتی تھی کہ مجھے شک ہے' یہاں دال میں کچھ کالا ہے۔

ڈاکٹر شاہ کو میں نے چوہدری دلاور کا معائنہ کرتے دیکھا "تم باقاعدگی سے دوا نہیں کھارہے ہو۔"

"بکواس بند کرو اور دفع ہوجاؤ۔ مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں" دلاور نے اسے مزید گالیوں سے نوازا۔

"پہلے میں تمہاری وجہ سے مجبور تھا دلاور' اب اپنی وجہ سے مجبور ہوں۔ میں نے پہلے بھی اپنا بھلا دیکھا تھا اور آج بھی میں وہی کررہا ہوں جو میرے مفاد میں ہے۔ نہ تم کبھی میرے ساتھ مخلص تھے نہ میں تھا" ڈاکٹر شاہ نے بےرخی سے کہا۔

"کاش میں تمہیں قتل کرسکتا" دلاور نے دانت پیس کے کہا۔

"یہ خیال مجھے بھی اکثر آتا تھا۔ پتا نہیں میں نے ایسا کیوں نہیں کیا تھا۔"

میں نے کہا "اسٹاپ دس نان سنس۔ یہ بتاؤ تم نے کیا بندوبست کیا ہے۔ تابوت میں نے دیکھ لیا۔"

اس نے ایک کاغذ مجھے تھمادیا۔ "یہ ہے دلاور کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ۔"

دلاور کا چہرہ پیلا پڑگیا' وہ کانپنے لگا "ذلیل' شیطان۔"

ڈاکٹر شاہ ہنسا "میرا مشورہ تو یہ ہے سکندر کہ تم اس کی لاش ہی لے جاؤ' جیتی جاگتی لاش۔ میں ایک انجکشن لگا کے اس کا کام تمام کرسکتا ہوں۔"

میں نے کہا "فضول باتیں مت کرو ورنہ میں تمہارا کام تمام کردوں گا۔ مجھے زندہ دلاور کی ضرورت ہے۔ یہاں نہیں' لاہور میں۔"

"اس کو تم یہیں تک لاش بنا کے ضرور لے جاسکتے ہو مگر وہاں سے لاہور تک انٹرنیشنل فلائٹ پر یہ مشکل ہوجائے گا۔"

"ان مشکلات سے ہم خود نمٹ لیں گے۔ یہ بتاؤ کہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ کی صداقت کو چیلنج تو نہیں کیا جائے گا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ سو فیصد جینوئن موت کا سرٹیفکیٹ ہے۔ یہاں جعلی سرٹیفکیٹ جاری نہیں ہوتے۔"

"پھر اسے تم کیا کہوگے جو تم لائے ہو" محسن نے کہا۔

"یہ تو سرٹیفکیٹ اصلی ہے اور ایک شخص کی موت پر جاری کیا گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا نام کچھ اور تھا۔ اس کے وارثوں کے آنے سے پہلے میں نے نواب خسرو جمشید لکھوا دیا۔ ڈاکٹر نے لکھ لیا ریکارڈ دیکھے بغیر۔ عین وقت پر اسپتال میں اس کی فائل نہیں مل رہی تھی۔ جب ملے گی تو گڑبڑ کا پتا چلے گا مگر وارث خود نمٹ لیں گے۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں اور نہ تمہیں۔"

دلاور نے کہا "خدا کے لیے ایسا مت کرو۔ میں ویسے ہی تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔ میں تم سے تعاون کروں گا

www.paksociety.com

ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ہم رسک نہیں لے سکتے۔"

"رسک... یہ بھی تو ہے کہ میں لاہور پہنچنے سے پہلے مر جاؤں" دلاور نے بڑی مشکل سے کہا۔

"ہاں۔ یہ رسک تو ہے تمہارے لیے" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "لیکن ہمارا انٹرسٹ اس میں ہے کہ تم مر نہ سکو۔ ہم تمہیں زندہ رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔"

"کم آن ڈاکٹر نثار۔ تم اپنے چوہدری دلاور صاحب کو ایسے سُلا دو کہ پھر ان کی آنکھ اس دنیا میں نہ کھلے۔ میرا مطلب ہے آنکھ کھلے تو یہ پاکستان میں ہوں" میں نے کہا۔

"یا پھر دوسری دنیا میں" محسن نے انگلی سے اوپر اشارہ کیا۔

دلاور نے ڈاکٹر نثار کو بیگ کھولتے دیکھا تو اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ ہمیں خدا رسولؐ کے واسطے دینے لگا۔ قسمیں دینے لگا کہ ہم ایسا نہ کریں "وہ راستے میں خاموش رہے گا۔ جو ہم کہیں گے وہی کرے گا۔ اس کی منت سماجت رائیگاں گئی۔ میں نے اور محسن نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا اور ڈاکٹر نثار نے ایک انجکشن اس کے بازو میں گھونپ دیا۔ دلاور نے گندی گالیاں دیں مگر وہ مسکراتا رہا۔ دلاور کو شور مچانے سے باز رکھنے کے لیے میں نے اس کا منہ ایک ہاتھ سے دبا دیا۔ بالآخر اس نے مزاحمت ترک کر دی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں نے اسے چھوڑ دیا "تمہارے جیتے جاگتے یہاں کوئی تمہاری مدد کے لیے کیسے آ سکتا ہے۔ یہاں کون ہے تمہارا؟"

محسن نے کہا "تم بالکل اکیلے رہ گئے ہو دلاور۔ صرف ایک موذی مرض تمہارے ساتھ ہے جو تم پر عذاب الٰہی بن کے نازل ہوا ہے۔ اگر ہم تمہیں مار کے یہاں گاڑ جائیں تو روز قیامت سے پہلے کوئی تمہارا سراغ بھی نہیں لگا سکتا۔ نہ تمہارے بیوی بچے سوچ سکتے ہیں کہ اس وقت تم کہاں ہو، نہ امریکی ایف بی آئی اور برطانوی اسکاٹ لینڈ یارڈ کے اور دنیا بھر کے سراغ رساں اس جگہ پہنچ سکتے ہیں۔ خدا کی اتنی بڑی زمین میں ایک آدمی روپوش ہو جائے تو..."

دلاور نے کمزور آواز میں کہا "کیا فائدہ اب ایسی باتیں کرنے سے۔ میری ایک بات سن لو۔ اگر میں مر جاؤں... تو میرے بیوی بچوں سے میرا انتقام مت لینا۔ ان کو اس جرم کی سزا مت دینا کہ وہ چوہدری دلاور کے بیوی بچے ہیں۔ تم شرافت اور انسانیت کے دعوے دار ہو تو ان کو جینے کے حق سے محروم مت کرنا۔ مجرم میں تھا۔ سارے گناہ میں نے کیے تھے۔ انہوں نے اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اگر میں اس راستے پر نہ چلتا تو وہ بھی نہ چلتے۔ میں دیندار ہوتا تو میرے گھر کا ہر فرد دیندار ہوتا۔ بیوی بچے وہی کرتے ہیں جو گھر کا سربراہ چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا تمہیں یاد ہے کہ جب رابعہ تمہاری قید میں تھی تو تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ ایک بار نہیں، متعدد بار۔ مجھے ہر منظر یاد آتا ہے تو میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ تم نے ایک کمزور عورت کے جسم پر تشدد کے سارے انسانیت سوز حربے آزمائے تھے۔ تم بھولے تو نہیں ہو گے اس پنجرے کو۔ ایک سلاخوں والے کمرے میں تم نے اس کے بدن پر شہد مل کے چھوڑ دیے تھے۔ تمہیں وہ سیوریج لائن بھی یاد ہو گی جس میں تم نے اسے اور مجھے قید کیا تھا۔ ہمارے درمیان سلاخیں تھیں۔ سیوریج لائن کے غلیظ بدبودار پانی میں گوشت نوچنے والے بڑے بڑے چوہے دوڑ رہے تھے۔"

محسن نے کہا "اور تمہیں یہ بھی یاد ہو گا کہ تم نے نازو کو اور غالب کو اس اسپتال میں کتنا عرصہ قید رکھا تھا۔ کیوں ڈاکٹر نثار؟"

ڈاکٹر نثار کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں "مجھے یاد ہے۔"

محسن نے اس کے سر پر تھپکا مارا "کتنا عرصہ رہے تھے وہاں؟"

"تقریباً... تقریباً تین مہینے۔" ڈاکٹر نثار بولا۔

"اور وہاں ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ نازو کو بجلی کے جھٹکے دیے گئے تھے۔ غالب کو پاگل کر دیا گیا تھا۔"

ڈاکٹر نثار نے کہا "میں... شرمندہ ہوں۔"

"صرف شرمندگی کا اظہار کر دینے سے بات ختم ہو جاتی ہے؟ تم خود سوچو کہ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا... اور جو نازو کے ساتھ کیا تھا وہ تمہاری بہن کے ساتھ ہوتا یا بیوی اور بیٹی کے ساتھ تو تم اس شخص کو معاف کر دیتے؟"

ڈاکٹر نثار نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ میں اسے معاف کیسے کر سکتا تھا۔"

"کیا کرتے تم اس کے ساتھ؟ اگر وہ اسی طرح تمہارے سامنے بے بس کھڑا ہوتا جیسے تم ہمارے سامنے کھڑے ہو؟"

"میں اسے قتل کر دیتا" ڈاکٹر نثار نے کہا۔

"کیوں کیا تھا تم نے وہ سب۔ صرف نازو کے ساتھ ہی نہیں، ان سب کے ساتھ جو وزیر خان اسپتال میں لائے گئے تھے" محسن بولا۔

ڈاکٹر نثار نے کہا "میں بتا چکا ہوں، میں مجبور تھا۔"

"کس نے مجبور کیا تھا تمہیں؟"

"لالچ نے۔ شیطان نے ورغلایا تھا مجھے۔ میں مانتا ہوں۔"

میں نے کہا "پھر تم اور دلاور ہم سے شرافت اور انسانیت کی بات کیوں کرتے ہو؟ ہمیں EXPLOIT کرنے کے لیے تم سمجھتے ہو اپنی چالاکی اور عیاری سے تم ہمیں بے وقوف بنا لو گے؟ یہ سب کچھ کرنے کے بعد صرف "سوری" کہہ کے بچ جاؤ گے اور بات ختم ہو جائے گی" محسن نے کہا۔

"تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں نے تعاون کیا تو تم مجھے معاف کر دو گے؟" ڈاکٹر نثار نے کہا۔

"کیا وعدہ خلافی ان سب جرائم کے مقابلے میں کوئی جرم ہے جو تم نے کیے تھے؟" میں نے کہا "اور تم کون سے شریف آدمی ہو جس کے ساتھ شرافت کا رویہ اختیار کیا جائے۔ تم خود اب بتا...ز ہے کیا فائدہ۔ بتاؤ کہ راستے میں دلاور کو کیسے نیند میں رکھا جائے؟"

ڈاکٹر نثار نے فرض کر لیا کہ ہم وقتی طور پر جذباتی اشتعال کا شکار ہو گئے تھے اور اب خطرے کی گھڑی ٹل گئی ہے۔ اس نے بشاش چہرے کے ساتھ ہمیں بتانا شروع کیا "تم چھ گھنٹے بعد اسے دوسرا انجکشن لگا دینا۔ انجکشن لگانا تو آتا ہے نا تمہیں؟"

محسن نے از راہ مذاق سر ہلایا "مجھے آتا ہے۔"

میں نے پرسکون نیند میں لیٹے ہوئے دلاور کی طرف دیکھا۔ "سوال یہ ہے کہ ہمیں ایک مُردے کو انجکشن لگانے کی اجازت کون دے گا۔ جہاز میں لاش الگ رکھی جاتی ہے اور دوران پرواز مسافر وہاں نہیں جا سکتے۔"

"تابوت بھی سیل بند ہوتا ہے بلکہ ائر ٹائٹ۔ یہ دم گھٹنے سے مر جائے گا" محسن بولا۔

"تم تابوت میں سوراخ کر سکتے ہو۔ ایسی جگہ کہ نظر نہ آئے" ڈاکٹر نثار نے کہا "تمہارا سفر دس بارہ گھنٹے کا ہو گا۔ ایک انجکشن کا اثر بھی چھ گھنٹے ضرور رہتا ہے مگر دلاور کا دوسرا مسئلہ ہے اس کی بیماری۔ شاید یہ اذیت محسوس کرے تو چار گھنٹے بعد ہی جاگ جائے۔ اس کا علاج تم یہ کر سکتے ہو کہ اسے ہر چار گھنٹے بعد ایک انجکشن لگا دو۔ بے شک اس میں رسک ہے۔"

میں نے کہا "راستے میں کینسر کی دوائیں نہ ملنے سے یہ مر تو نہیں جائے گا؟"

"نہیں۔ اگر اسے دوائیں بالکل نہ دی جائیں تب بھی زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ بس اس کی زندگی کی مہلت کم ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "اور کوئی بات؟"

"نہیں۔ میرا کام ختم ہو گیا" ڈاکٹر نثار نے کہا "کیا اب میں جا سکتا ہوں؟"

"ابھی نہیں ڈاکٹر نثار" میں نے کہا "ابھی تو تم نے اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"اور... اور کیا بتاؤں میں۔ تم سب جانتے ہو" وہ بولا۔

"ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ تم کیا کرتے رہے۔ تفصیل نہیں جانتے۔ یہاں اس اسٹول پر بیٹھ جاؤ" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بٹھا دیا "فرض کر لو کہ تم کسی عدالت میں اقبالی بیان دے رہے ہو۔ اس طرح جیسے چوہدری دلاور ریکارڈ کرا کے دے گا۔"

"فرض کرنے کی کیا بات ہے۔ تم ابھی اللہ کی عدالت میں جانے والے ہو۔ تم مجرموں کے کٹہرے میں ہو" محسن بولا۔

ڈاکٹر نثار نے میری اور محسن کی صورت کو دیکھا اور خشک لبوں پر زبان پھیری "آخر... تم چاہتے کیا ہو؟"

"کچھ نہیں۔ ابھی تمہاری زبان سے وہ سب سننا چاہتے ہیں جو تم نے چوہدری دلاور کے لیے کیا۔"

"کہو نا... ہم سننے کے منتظر ہیں" محسن نے کہا۔

"کیا بتاؤں۔ تم سوال کرو، میں جواب دوں گا" وہ شکست زدہ لہجے میں بولا۔

"او کے۔ یہ بتاؤ تم نے کتنے ذہنی طور پر صحت مند لوگوں کو پاگل کیا تھا؟" میں نے کہا "اندازاً کیا تعداد رہی ہو گی ایسے لوگوں کی؟"

اس نے سوچ کے کہا "تیس... چالیس کے درمیان۔"

"ان میں کتنی عورتیں تھیں اور کتنے مرد؟"

"میرا خیال ہے۔ تعداد برابر ہی ہو گی۔"

میں نے کہا "اور انہیں پاگل بنانے کے لیے تم نے کیا طریقے اختیار کیے تھے؟"

"وہی جو... مینٹل اسپتال میں اختیار کیے جاتے ہیں... کچھ مخصوص دوائیں ہیں۔ الیکٹرک شاک، برین واشنگ، نفسیاتی تشدد اور جسمانی تشدد۔"

میں نے کہا "ہر کیس کا تم کتنا معاوضہ وصول کرتے تھے؟"

"معاوضہ مقرر نہیں تھا۔ ہر کیس کی نوعیت اور پارٹی کی مالی حیثیت کے مطابق رقم وصول کی جاتی تھی۔"

"صرف ایک بار۔"

"یکمشت رقم ایڈوانس۔ پھر ماہانہ اخراجات۔"

میں نے کہا "کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ تم نے کیا وصول کیا تھا؟"

"کم سے کم ایک لاکھ..." وہ بولا "ایک شخص نے دس لاکھ بھی دیے تھے۔"

میں نے کہا "اچھا۔ سوچ کے بتاؤ کیا دوران علاج کچھ لوگ مر بھی گئے تھے۔ دوا سے یا الیکٹرک شاک سے؟"

"ہاں۔ کبھی غلطی سے ایسا ہو جاتا تھا۔"

"غلطی سے یا جان بوجھ کے" میں نے کہا "جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کچھ لوگ یہ بھی چاہتے ہوں گے کہ ان کی جان بھی لے لی جائے۔"

اس نے ماتھے پر نمودار ہو جانے والا پسینہ صاف کیا "ہاں۔ وہ دلاور سے بات کرتے تھے۔ دو چار مہینے اسپتال میں رکھنے کے بعد کچھ لوگ ماہانہ اخراجات سے پریشان ہو جاتے تھے۔ وہ سودا کر لیتے تھے۔"

"ایسے کتنے سودے یاد ہیں تمہیں؟"

"میں نے... کسی کو نہیں مارا۔"

"اور پھر کس نے مارا۔ کیا وہ طبعی موت مر گئے تھے۔ مقررہ مقدار سے زیادہ دوا کس نے دی۔ زیادہ دیر الیکٹرک شاک کس کے کہنے پر دیا گیا۔ اتنی وولٹیج کس کے اشارے پر کی گئی؟"

"وہاں... ماتحت عملہ یہ کام کرتا تھا۔"

میں نے کہا "تمہارا ماتحت عملہ۔ بولو کتنے لوگوں کی جان لی تھی انہوں نے؟"

"تم... یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو آخر؟" وہ چلانے لگا۔

"اپنی آواز کم رکھو۔ ایسا نہ ہو تمہیں یہ آرڈر دینا پڑے۔"

www.paksociety.com

کرنی پڑے۔ سچ بتائے بغیر ہم تمہیں جانے نہیں دیں گے" میں نے کہا۔

وہ اب کانپنے لگا تھا "دس! بس... لوگ مرے ہوں گے۔"

"گویا تم اعتراف کرتے ہو کہ تم نے چوہدری دلاور کے ساتھ مل کر یا اس کے کہنے پر معاوضہ لے کر دس بارہ بے گناہوں کو قتل کیا یا کروایا۔ میں چالیس تو پاگل کیا۔ تم نے نفسیاتی اور جسمانی تشدد کا ذکر کیا تھا۔ عورتوں کے ساتھ جنسی تشدد بھی کیا گیا ہوگا۔ اگر تمہارا یہ اقبالی بیان دنیا کی کسی عدالت میں دیا جاتا تو اس عدالت سے تمہیں کیا سزا سنائی جاتی؟"

ڈاکٹر شاہ کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا "میں... نہیں جانتا۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ایک قتل عمد کی سزا موت ہے۔ تم نے دس بارہ قتل کیے۔ سوچ سمجھ کے 'ٹھنڈے دماغ' کے ساتھ۔ منصوبہ بندی کر کے 'معاوضہ لے کر'" میں نے کہا "تم نے خود ایم آر ایس کی عدالت میں اپنے ہر جرم کا اعتراف کیا۔"

"ایم آر ایس کی عدالت!" وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

میں نے اسے پھر بٹھا دیا "ہاں۔ یہ ایم آر ایس کی عدالت تھی جہاں تم بیان دے رہے تھے۔ یہ عدالت تمہیں سزائے موت سناتی ہے۔"

محسن نے کہا "تم چاہو تو کلمہ پڑھ لو۔ سزائے موت کے فیصلے پر ابھی عمل درآمد ہوگا۔"

ڈاکٹر شاہ نے چلانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اس کی گردن پر بھرپور وار کیا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز ایسے سنائی دی جیسے خشک ٹہنی ٹوٹتی ہے۔ اس نے ایک جھٹکا لیا اور اسٹول پر سے لڑھک کر فرش پر گر گیا۔ اس کا جسم کرب میں بل کھانے لگا اور اس کا سر مضحکہ خیز انداز میں لڑھکنے لگا۔

جب وہ ساکت ہو گیا تو میں نے کہا "اب ہم ایک جنٹلمین لاش لے جا سکتے ہیں ڈاکٹر شاہ کے مشورے کے مطابق۔"

"اور یہ چوہدری دلاور کیا وہ ہمارے ساتھ جائے گا؟"

"ہاں۔ اس سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ اس نے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔ وہ تعاون کرنے پر مجبور ہے" میں نے کہا۔

"یہ بڑی عجیب بات ہے" محسن بولا۔

"کون سی بات؟"

"میں بھی یہی چاہتا تھا۔ تو نے اپنا فیصلہ بدلنے سے پہلے مجھ سے بات نہیں کی" محسن بولا۔

"مجھے اچانک خیال آیا کہ ڈاکٹر شاہ کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے جرائم انتہائی سنگین تھے۔"

"اس سے پہلے کہ انڈی کی بیوی یہاں آ کے کوئی سوال کرے، ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے" محسن نے کہا۔

تابوت گیراج کی سائڈ میں رکھا ہوا تھا۔ سڑک پر سے گزرنے والا کوئی شخص اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انڈی کی بیوی نے گزشتہ اندر آتے ہوئے اسے دیکھ لیا تھا۔ میں اور محسن اسے اٹھا کر گیراج میں لے آئے۔ گیراج بنانے کا مقصد کار کو محفوظ اور کھڑا کرنا تھا مگر ہم نے اسے ایک رات کے لیے اپنا بیڈ روم بنا لیا تھا۔ انڈی کی بیوی نے گاڑی کو اپنے گھر کے سامنے سڑک کی سائڈ پر پارک کر دیا تھا۔ وہیں ڈاکٹر شاہ کی کار بھی موجود تھی۔

"ڈاکٹر شاہ سے ہم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں تھا کہ وہ تابوت کیسے لایا تھا؟" محسن نے کہا "ہم اسے کیسے لے جائیں گے؟"

میں نے کہا "تابوت لے جانے والی گاڑی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"انڈی کی بیوی کیا کہے گی؟ کیا سوچے گی؟"

"میں اسے بتا چکا ہوں کہ مریض کی حالت نازک ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ فوت ہو گیا۔ ہم اس کی لاش واپس وطن ارسال کرنے کے لیے لے جا رہے ہیں۔"

"اسے شک ضرور ہوگا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ ہم ایک کینسر کے مریض کے ساتھ یہاں آئے، رات بھر قیام کیا، صبح مریض فوت ہو گیا۔ ہم نے تابوت منگوایا اور لاش لے کر چلے گئے۔ کینسر کے آخری اسٹیج پر مریضوں کو گیراج میں نہیں رکھا جاتا۔ وہ مر جاتے تو اس کی اطلاع یہاں کے قانون کے مطابق کسی کورونر کو پولیس کو یا پیدائش و اموات کے کسی دفتر میں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ لاش اٹھا کے روانہ ہو جائیں۔"

"بات تیری بالکل ٹھیک لگتی ہے مجھے۔"

"اگر یہاں تابوت لے جانے والی سیاہ گاڑی آئے گی تو انڈی کے آس پڑوس کے بھی بہت سے لوگ دیکھیں گے۔ وہ انڈی کی بیوی سے پوچھیں گے کہ کون مر گیا تھا جس کے لیے میت گاڑی آئی تھی؟"

"پھر ہم ایسا کرتے ہیں کہ سامان لے جانے والی کوئی بند گاڑی لے آتے ہیں" میں نے کہا۔

"شاید وہ ایک تابوت میں بند لاش ڈھونے پر راضی نہ ہو۔"

"اگر اسے مناسب معاوضہ مل جائے تو اس میں کوئی قانونی قباحت نہیں پھر وہ کیوں انکار کرے گا" میں نے کہا۔

"ہم اسے کہاں لے جائیں گے؟"

"اچھا سوال کیا تو نے" میں نے کہا "ہم اس کی تدفین نہیں کرا سکتے، اسے پولیس کے حوالے نہیں کر سکتے۔ کسی کولڈ اسٹوریج میں نہیں رکھوا سکتے، اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔"

"تو بتا یار" محسن نے چٹکی بجا کے کہا "یہاں کفن دفن کا انتظام کرنے والے ادارے ہیں۔ یہ کاروباری ادارے UNDERTAKERS کہلاتے ہیں۔ کیوں نہ ہم لاش ان کے سپرد کر دیں۔ انہیں بتا دیں کہ ہم کس قسم کے انتظامات چاہتے ہیں اور تمام چارجز ادا کر دیں۔ انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ان کا بزنس ہے، وہ معمول کے مطابق سب بندوبست کر دیں گے۔ لیکن

"ابھی اس لیے نہیں ہوگا کہ ہم ایک ڈیتھ سرٹیفکیٹ دکھا سکتے ہیں۔ چوہدری دلاور کا میڈیکل ریکارڈ بھی ہمارے پاس ہے جس سے ثابت ہوگا کہ موت کا سبب برین ٹیومر تھا۔ ڈاکٹر فریدون کی رپورٹ اور جینٹ فاسٹ اسپتال کا حوالہ انتہائی مستند ہے۔"

"لیکن سرٹیفکیٹ پر نواب خسرو جمشید کا نام ہے۔"

"دوبارہ میت سے اس کا نام پوچھیں گے۔ جب ہم پیچھے رہ جانے والے افراد فرنچ میں بتائیں گے کہ مرحوم کون تھا اور ظاہر ہے ہم بے حد سوگوار بھی ہوں گے تو وہ کوئی سوال نہیں کریں گے۔ آخر اعتبار بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ قتل کے کسی بھی کیس میں یہ نہیں ہوتا کہ قاتل خود مقتول کو UNDERTAKERS کے پاس لے جائے اور اس کی شاندار تجہیز و تکفین کا بل بھی ادا کرے۔"

محسن کی بات معقول تھی۔ ہم نے ڈاکٹر شاہ کو تابوت میں ڈالا اور اس کو شریفانہ انداز میں لٹا دیا۔ اس طرح کہ گردن ٹوٹی ہوئی ہونے کے باوجود اس کا چہرہ اوپر کی طرف رہے۔ دائیں بائیں نہ ہو۔ اس کے بازو سیدھے ہوں اور دونوں ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے۔ چشمہ ہٹانے میں نے ڈاکٹر شاہ کی آنکھیں پہلے ہی بند کر دی تھیں۔ اب تابوت کے شیشے والے حصے میں سے صرف اس کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ انڈی کی بیوی نے ابھی تک مریض کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی ملاقات صرف مجھ سے اور محسن سے ہوئی تھی۔

محسن ڈاکٹر شاہ کی کار میں روانہ ہونے ہی والا تھا کہ انڈی کی بیوی گھر سے نکلی۔ اس نے کچھ ایسا لباس پہن رکھا تھا جیسے وہ کسی تقریب میں شرکت کے لیے جا رہی ہو۔

"میں پہلے بچوں کو اسکول سے لوں گی" اس نے میرے سوال پر کہا "پھر میں ان کے لیے کچھ کپڑے خریدوں گی۔ آج سہ پہر مجھے ان کو ایک برتھ ڈے پارٹی میں لے جانا ہے۔ میں شام تک واپس آؤں گی۔"

"پھر تو تم سے ملاقات نہیں ہوگی۔ ہم بھی جا رہے ہیں۔"

"اچھا! تم انڈی کی واپسی تک نہیں رکو گے؟"

میں نے کہا "دراصل ہمارے دوست کی حالت زیادہ خراب ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے فوراً وطن واپس بھیج دیا جائے۔ وہ اپنے بال بچوں کے سامنے مرنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر شاہ نے اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ شام کی کسی فلائٹ سے روانہ ہو جائیں گے۔"

"پھر تم لوگ کیا کرو گے؟" وہ بولی۔

"ہم شاید واپس نہ جائیں۔ انڈی کی مدد کے بغیر ہم پیرس نہیں دیکھ سکتے مگر اس کا کوئی دوست ہے جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔ اگر وہ مان گیا۔"

"پیرس دیکھو گے تو مانو گے کیوں نہیں۔"

میں نے کہا "ہم اس سے رابطہ کریں گے۔ تم اس کا فون نمبر دے دو۔"

اس نے فون نمبر دے کر کہا "اگر تم جا رہے ہو تو جانے رفت گھر کے دروازے کو مقفل کر جانا اور گیراج کو بھی۔ چابیاں میں اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔"

"جو کچھ تم نے ہمارے لیے کیا اس کے لیے بہت شکریہ۔"

اس نے مسکرا کے ہاتھ ہلایا اور گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہو گئی۔ میں نے اندر جا کے ہائی جیک کو فون کیا اور اسے بتایا کہ اب شاید میں ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے ائرپورٹ نہیں پہنچ سکوں گا۔

"کوئی بات نہیں" وہ بولا "میں اتنی دیر میں آئل اور فیول وغیرہ چیک کرا لوں گا۔ میں بس نکلنے ہی والا تھا۔ نکل گیا ہوتا پہلے ہی مگر اس چڑیل کے چنگل سے پیچھا چھڑانا آسان نہیں ہوتا۔"

"کسے چڑیل کہا ہے تم نے۔ میں چڑیل ہوں؟" پیچھے سے آواز آئی۔

"ہاں۔ تم چڑیل ہو، ڈریکولا ہو، خونی چمگادڑ ہو۔ چمٹ جاتی ہو تو جان نہیں چھوڑتی ہو جان لیے بغیر" وہ چلا کے بولا۔

"پھر آج ایسا ہی ہوگا۔"

ان کی گفتگو جاری تھی۔ ہائی جیک نے ریسیور کو کیبل پر نہیں رکھا تھا۔ شاید ایسے ہی چھوڑ دیا تھا چنانچہ میں ان کی گفتگو سن سکتا تھا۔ گفتگو کچھ دیر بعد "صرف بالغوں کے لیے" ہو گئی تو میں نے ریسیور رکھ دیا۔

محسن کو ٹرک لانے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ لگ گیا۔ ٹرک ڈرائیور ایک مریل اور منحوس شکل والا بوڑھا تھا جس کے منہ سے اس وقت بھی شراب کی بو آ رہی تھی۔ شاید وہ کام اسی لیے کرتا تھا کہ اسے شراب پینے کے لیے پیسے ملتے رہیں۔ جتنی دیر میں محسن نے اور میں نے تابوت کو ٹرک کے پچھلے حصے میں لوڈ کیا وہ بے نیازی سے اپنی جگہ بیٹھا وقفے وقفے سے ایک بوتل کو خالی کرتا رہا۔

"یہ اس طرح شراب پی کے گاڑی چلاتا ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ... یا چالان نہیں ہوتا؟"

"غالباً شراب اس پر اثر نہیں کرتی ورنہ چالان اور حادثات ہوتے رہتے ہوں گے۔ ٹرک کی حالت سے تو ایسا ہی لگتا ہے" محسن بولا۔

میں نے آگے جا کے اس سے سوال کیا "یہ تم کیا کر رہے ہو۔ ایسے شراب پی کے ڈرائیو کرو گے؟"

اس نے غرا کے کہا "دس سال سے کر رہا ہوں۔ آج کون سی نئی بات ہوئی ہے۔"

"ایسا نہ ہو کہ ٹرک میں سے دو لاشیں اتاری جائیں۔ ان میں ایک تمہاری ہو" میں نے کہا "میری بلا سے تم شراب پیو یا زہر۔"

محسن نے کہا "تمہارا چالان ہو گیا پھر؟"

"جرمانہ میں ادا کروں گا۔ جیل میں جاؤں گا۔ لائسنس میرا منسوخ ہوگا۔ تم کیوں پریشان ہو؟"

"یہاں کفن دفن کا کون سا اچھا ادارہ ہے؟"

"تم کتنا خرچ کر سکتے ہو؟" وہ بوتل سے ایک گھونٹ لے کر بولا "اس پر میرے جواب کا انحصار ہے۔ دو سو پونڈ سے دو لاکھ پونڈ تک تم جتنا چاہو۔ مردے کو یا خدا کو فرق نہیں پڑتا۔"

www.paksociety.com

"مثلاً" یہ معاملہ ہم خود طے کرلیں گے۔ ہم وہاں چلو جہاں لوگ شریف ہوں۔ اور جگہ زیادہ ویران ہو۔"

میں نے ایڈی کے گھر اور گیراج کو مقفل کیا اور ٹرک میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ محسن نے ڈاکٹر شاہ کی کار ہمارے پیچھے رکھی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر چوہدری دلاور اپنے پیر سمیٹے ایک کروٹ پر بے خبر سو رہا تھا۔

ٹرک ڈرائیور میری توقعات کے برعکس ہوشیار اور مستعد ثابت ہوا۔ اس کے اعصاب اور حواس پوری طرح اس کے کنٹرول میں تھے اور یہ ضروری تھا۔ ورنہ وہ لندن کی سڑکوں پر ٹرک نہیں چلا سکتا تھا۔ اس نے رفتار بھی کم ہی رکھی اور ٹریفک کے کسی ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کی۔

لندن کا کوئی بھی علاقہ میرے لیے نیا نہیں تھا مگر ٹرک ڈرائیور نے جن گلیوں کا انتخاب کیا تھا وہاں میری عقل بھی چکرا گئی۔ ایک گھنٹے بعد اس نے ٹرک ایک دکان کے سامنے روک دیا۔ یہ تہہ خانے کا ایک دروازہ تھا جس پر لکھا ہوا تھا "مارٹن اینڈ مارٹن انڈر ٹیکرز"۔

میں نے اور محسن نے تابوت اتارا اور ٹرک ڈرائیور کو رخصت کر دیا۔ ہم تابوت اٹھائے اندر داخل ہوئے تو ائر کنڈیشنڈ کی ٹھنڈک کے ساتھ ایک عجیب سی آسیب زدہ خوشبو نے ہمارا استقبال کیا۔ دروازہ عام کمرے کا لگتا تھا مگر اس کے پیچھے خاصا وسیع ہال تھا جس میں دائیں طرف والی دیوار کے ساتھ ہر قسم کے تابوت تدفین اور ڈلیوری کے لیے تیار رکھے تھے۔ بائیں طرف دفتر کا ڈیسک تھا اور انتظار کرنے والوں کے لیے صوفے لگے ہوئے تھے۔ دیوار پر ہر قسم کے تابوتوں کی رنگین تصاویر تھیں اور ان کے ساتھ قیمت درج تھی۔

اندر ایک دروازے سے پچاس ساٹھ سال کا ایک بھوت نما شخص نمودار ہوا۔ اس نے کالا کوٹ پہن رکھا تھا اور اس کا سر بالکل صاف تھا اور چہرہ یرقان کے مریض جیسا پیلا۔ وہ بہت دبلا اور لمبا تھا۔ اس کا چہرہ بھی لمبوترا تھا اور ہاتھوں کی لمبائی بھی غیر معمولی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے کسی نے دونوں طرف سے کھینچ کے لمبا کر دیا ہے۔

"یہ کام ہم بلامعاوضہ کرتے ہیں" وہ بولا "اگر تم فون کر کے ہمیں مطلع کر دیتے تو تمہیں یہ تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔"

"مگر اپنے دوست کو یہاں خود پہنچانے پر ہم نے کوئی تکلیف محسوس نہیں کی" میں نے مغموم لہجے میں فرنچ بولتے ہوئے کہا۔

"اب وہ دنیا سے چلا گیا ہے تو ہمیں اس کے لیے کچھ تو کرنا ہی چاہیے۔ دوستی کا تقاضا ہے" محسن نے بھی فرنچ میں اور رقت بھرے لہجے میں کہا۔

بھوت نے فوراً ایک بٹن دبا کے کسی کو طلب کیا۔ قصاب کی شکل، لباس اور حلیے والا ایک ہٹا کٹا سیاہ فام نیم گنجا نمودار ہوا۔

"ان انگلو فرنچ بے وقوفوں سے بات کرو۔ یہ ظاہر کرو کہ ان کو یہ بھی علم نہیں کہ لندن میں انگلش بولی جاتی ہے۔"

قصاب نے بڑے مہذب لہجے میں پوچھا "تم اس کی تدفین کرانا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ یہ ہمارا دوست ہے۔ کینسر سے اچانک مر گیا۔" محسن نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ پیش کیا۔

قصاب نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھوت کو دے دیا "کتنا خرچ کرنا چاہو گے تم اپنے دوست کی شاندار تدفینی رسوم پر؟"

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ "اس کا جنازہ تو قابل رشک ہونا چاہیے۔ ہم پانچ ہزار پاؤنڈ تک دے دیں گے۔"

"پانچ ہزار۔ اس میں قابل رشک تو نہیں ہوگا لیکن قابل تعریف ضرور ہوگا۔"

بھوت نے کہا "تم صرف دوست ہو اس کے، کوئی رشتے دار نہیں ہے؟"

"نہیں ہم ہی اس کے سب کچھ تھے" میں نے سینٹ تھامس اسپتال کا ریکارڈ اس کے سامنے رکھ دیا "دیکھو ہم نے اس کے لیے کیا نہیں کیا۔ ڈاکٹر فریزر جیسا سرطان کا ماہر اس کو نہیں بچا سکا۔ اس نے کہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تین مہینے۔ یہ دو مہینے میں ہی مر گیا۔"

محسن نے سینے پر صلیب بنائی "خدا اس کی روح کو سکون اور چین نصیب کرے۔"

بھوت نے قصاب کی معرفت کہا "ہم پوری رقم ایڈوانس لیتے ہیں۔"

میں نے خفگی سے کہا "وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ لوگ اپنے مردے وصول کریں۔ یہاں چھوڑ کر نہ جائیں۔ ہم ان پر محنت کرتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں۔ ادھار کریں تو ہمیں تدفین کے لیے قبرستان بھی جانا پڑے۔"

میں نے محسن سے کہا "اس بے اعتبار شخص کو پانچ ہزار پاؤنڈ دے دو۔ اس کی نظر کو ابھی تک اچھے ہیرے کی پہچان نہیں ہوئی۔"

محسن نے کہا "کب سے کاروبار کر رہے ہو تم؟"

بھوت نے جواب دیا "سو سال سے زیادہ ہو گئے۔ تم الزام میری نظر کو مت دو۔ قصور زمانے کا ہے۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ بتاؤ تمہیں کوئی جلدی تو نہیں ہے؟"

"یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ ہمارے پاس کام زیادہ ہے۔ اگر ارجنٹ فیس دو گے تو ہم تمہارا کام پہلے کریں گے۔ ارجنٹ فیس پانچ سو پاؤنڈ ہے۔ تم کل شام تدفینی رسوم ادا کر سکتے ہو۔"

"اور جلدی نہ ہو تو؟"

"ایک ہفتے بعد۔ ترجیح کے دن۔" اس نے کہا۔

"پانچ ہزار پاؤنڈ خرچ کرنے کے بعد ہم پانچ سو پاؤنڈ ضبط نہیں کر سکتے۔ ہم ایک ہفتہ انتظار کر لیں گے۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں" ہمارا دوست اب تنہا ہی تو ابدی نیند میں ہے۔"

"اس کا جسم ہے" محسن نے تصحیح کی "روح خدا کے پاس ہے۔"

چیک لے کر باہر آتے ہوئے میں نے محسن سے کہا "لے بھائی! یہ کام اچھا ہوگیا۔ اب ایک ہفتے تو ڈاکٹر شاہ پڑا رہے بیچارہ۔"

"اور اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دی گئی تو پولیس یہاں پہنچ جائے گی" محسن بولا۔

"کون لکھوائے گا رپورٹ؟" میں نے کہا "اور اگر دو چار دن بعد کسی کو اس کی کمی محسوس ہوئی اور اس نے پولیس سے رجوع کیا تو پولیس کیا کرے گی؟ وہ یہاں آ کے صرف ریکارڈ دیکھیں گے۔ رجسٹر میں کسی ڈاکٹر شاہ کا نام نہیں ملے گا۔"

میں ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور محسن نے ڈرائیونگ کی۔ چوہدری دلاور ابھی تک بے خبر پڑا تھا۔ "معلوم نہیں ایک ہفتے بعد یہ لوگ کیا کریں گے جب ہم تابوت واپس لینے نہیں آئیں گے۔ کتنے دن انتظار کرتے ہوں گے یہ لوگ۔"

"دو چار دن۔ تو نے پتا کیا لکھوایا ہے؟"

"سرے، ڈیکروزن کا" میں نے کہا "فون نمبر بھی اسی کا دیا ہے۔"

"دریا گنج۔ پھر ہمیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تو اس وقت ہوں گے اپنے لاہور شریف میں میرے پاکستانی بھائی۔"

"اور کتنی خوشی ہوگی اپنے لارڈ صاحب کو جب انہیں فون موصول ہوگا اس بھوت کا کہ اپنا مردہ کیوں نہیں لے جاتے۔ لارڈ صاحب بھی لارڈ صاحب ہیں۔ ایک بار تو شاید رانگ نمبر کہہ کے رکھ دیں گے۔ اس کے بعد تماشے دلچسپ مکالمے ہوں گے ان کے درمیان۔ بالآخر فرنچین "یعنی پولیس" مسٹر ریچرڈ ان کی زوجہ اور ڈاکٹر شاہ سے راز جان لیں گے کہ یہ تو دلاور "سکندر" کی پرانی کہانی کا نیا موڑ ہے۔ اگر انہیں یہ سمجھ سکتی تو میں اسے ایک شعر لکھ بھیجتا اپنے علامہ صاحب کا۔ "آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر۔"

محسن نے سوچ کے کہا "یار یہ اپنی قلعوں کی سیر انشار زیبا تو پرانا نہیں ہے؟"

"تن ہمہ تن ہے یار۔"

"پھر علامہ صاحب نے رخ زیبا، شعر کیسے کہہ دیا۔ یہ اس لارنس کی بھی یعنی جنگ عظیم سے پہلے کی چیز ہے؟"

جیک عرف ہائی جیک ائیرپورٹ سے باہر طے شدہ جگہ پر ہمارا منتظر تھا۔ وہ صورت شکل اور حلیے سے بالکل انگریزی فلموں کا مزاحیہ اداکار جیری لوئس تھا۔ اسی کی طرح ہنستا بولتا تھا اور اسی کی طرح حرکتیں کرتا تھا۔ غالباً وہ خود بھی جانتا تھا اور دیکھنے والے اسے بتاتے تھے کہ وہ جیری لوئس کی کاپی ہے۔ اس کے وجود میں اللہ نے ایک مضطرب روح ڈال دی تھی۔

اس نے محسن سے ہاتھ ملا کے کہا "انگلینڈ روڈی گریٹ مین۔"

میں نے کہا "سکندر میرا نام ہے۔"

محسن بولا "میں افلاطون ہوں۔ سکندر کا استاد۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "پھر میں ارسطو ہوں۔ تمہارا بھی استاد۔ خیر یہ بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "معاملہ بہت معمولی ہے۔ ہم ناجائز طور پر برطانیہ میں داخل ہوئے تھے۔ ہمارے ایک دوست کے مطابق ہم برطانیہ میں حرامی تھے۔"

"مگر ناجائز طور پر داخل ہونا ایک مجبوری تھی۔ برطانوی حکومت کئی سال پہلے ہمیں ناخلف قرار دے کر عاق کر چکی تھی۔ اب ہم واپس جانا چاہتے ہیں مگر پولیس کا اصرار ہے کہ ہم کچھ عرصہ جیل میں ان کے مہمان رہیں" محسن بولا۔

وہ پھر ہنسا "تم آدمی دلچسپ ہو۔"

"تم ہمیں ہائی جیک کرکے پیرس پہنچا دو۔ کسی محفوظ مقام پر اتار دو۔ لندن سے پیرس جانا بہت آسان کام ہے مگر مشکل یہ ہے کہ پولیس بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہمیں تلاش کر رہی ہے۔ ہم کسی بھی وقت پکڑے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ ہمارے بارے میں پیرس کی پولیس کو بھی بتا دیا گیا ہو۔"

اس نے کہا "پھر اتنی زحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہیں گرفتار ہو جاؤ۔"

میں نے کہا "ہماری منزل پیرس نہیں ہے۔ ہم پیرس کے راستے پاکستان سے لندن پہنچے تھے۔"

"مگر میں تو تمہیں پاکستان نہیں پہنچا سکتا۔ میرا جہاز چھوٹا ہے۔"

میں نے کہا "تم کہاں تک پہنچا سکتے ہو؟"

اس نے سوچ کے کہا "تمہیں یونان پہنچا سکتا ہوں۔ تمہیں پیرس سے روم اور پھر وہاں سے ایتھنز۔ تم وہاں سے ترکی بھی جا سکتے ہو اور ایران کے راستے پاکستان خشکی کے راستے۔"

میں نے کہا "اتنا وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ اس میں تو شاید ایک ہفتہ لگ جائے گا۔"

"یونان میں سیکڑوں شپنگ کمپنیاں ہیں۔ صرف ایک جہاز پر بحری کمپنی چلانے والے بہت ہیں جو سب دنیا بھر میں اسمگلنگ کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ تم کو اسمگل کر سکتے ہیں دنیا کے ہر حصے میں۔"

میں نے کہا "یہ بھی لمبا سفر ہے۔ کیا ہم آگے نہیں جا سکتے۔ تم تو پرانے ہائی جیکر ہو۔ خفیہ راستوں اور چور دروازوں کو تم سے بہتر کون جانتا ہوگا؟"

اس نے سر ہلایا "بے شک۔ کسی بھی راستے میں کہیں کوئی دیوار نہیں ہوتی اور ہو تو اس میں سے گزرنا مشکل ہو سکتا ہے ناممکن نہیں۔ تم کتنے افراد ہو؟"

www.paksociety.com

میں نے کہا "پانچ تم کو تین نظر آ رہے ہیں۔ ایک بیمار شخص کار میں سو رہا ہے اور اصل مسئلہ اسی کا ہے۔ ہم اسے اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ اس کا تعاقب کرتے ہوئے لندن آئے تھے۔"

"باقی دو کون ہیں؟"

"دو بہت خوب صورت لڑکیاں" میں نے کہا "جو پیرس میں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔"

"پیرس میں سب لڑکیاں خوب صورت ہوتی ہیں۔ اور جو انتظار کرتی ہیں وہ زیادہ خوب صورت لگتی ہیں۔"

"وہ ہماری بیویاں ہیں" محسن بولا۔

"کمال ہے۔ تم ان کو لڑکیاں کہہ رہے تھے" وہ بولا "اس سے بھی زیادہ حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ تمہیں خوب صورت لگتی ہیں۔ بیویاں ہونے کے باوجود۔"

"لگتا ہے تم نے شادی نہیں کی؟"

"ایک بار نہیں کئی بار کر چکا ہوں۔ وجہ یہی کہ مجھے بیوی بن جانے کے بعد نہ وہ لڑکی لگتی تھی اور نہ خوب صورت۔ اس کے علاوہ سب لڑکیاں نظر آتی تھیں اور حسین بھی۔ اب میں جھوٹ کیوں بولوں۔ خیر بات تھی پانچ افراد کے فلائی کرنے کی۔ تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"پاکستان۔ وہاں تین انٹرنیشنل ایئرپورٹ ہیں۔ کراچی، اسلام آباد اور لاہور۔"

"انٹرنیشنل ایئرپورٹ کو بھول جاؤ۔ وہاں چیکنگ سخت ہوتی ہے۔ اور ایئرپورٹ کہاں ہیں۔ جہاں ایک چھوٹا جہاز اتر جائے۔"

"ایسے تو بہت ہیں۔ ملتان۔ فیصل آباد۔ سکھر۔"

"سب سے کم فلائٹس کہاں اترتی ہیں؟"

"پتا نہیں۔ جیکب آباد، مری یا سیالکوٹ جیسے شہر بھی ہیں۔"

محسن نے کہا "ایک طریقہ اور بھی ہے۔ ہم یہاں سے ہانگ کانگ، سنگاپور یا بنکاک چلے جائیں، وہاں سے کراچی۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں" وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کے بولا "تمہارے پاس کاغذات بھی نہیں ہیں۔"

"کاغذات پورے ہیں۔" میں نے کہا "ہم پیرس سو فیصد جائز طریقے سے پہنچے تھے۔"

"پھر کیا پرابلم ہے؟"

"پرابلم یہ ہے کہ جو بیمار شخص ہمارے ساتھ ہے وہ درحقیقت سو رہا ہے" میں نے کہا۔

"وہ بیمار بھی ہے۔ کینسر سے مرنے والا ہے۔ تم اس کی میڈیکل رپورٹس دیکھ سکتے ہو" محسن بولا "لیکن وہ واپس جانا نہیں چاہتا۔ ہم اسے واپس لے جا کے پولیس کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔"

"جب وہ مرنے والا ہے تو پھر۔"

میں نے کہا "یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ ہمیں پاکستان میں اس سے کچھ حساب برابر کرنا ہے۔ ہم نے اسے انجکشن دے کر سلا دیا ہے۔ دوبارہ اسے چار چھ گھنٹے میں پھر انجکشن دینا ضروری ہوگا۔ ورنہ وہ جاگ اٹھا تو ہنگامہ کرے گا۔ اسے کینسر کی دوائیں دینا بھی ضروری ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ راستے میں ہی مر جائے ہم اس خوش فہمی کا شکار رہیں کہ وہ سو رہا ہے۔"

"کسی انٹرنیشنل فلائٹ پر تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ بہتر ہے اگر تم کوئی جہاز چارٹر کر لو۔ آٹھ افراد کا سیسنا بھی ساری دنیا گھوم آتا ہے مگر ڈائریکٹ فلائٹ نہیں ہوتی۔ اسے بار بار فیول لینے کے لیے اترنا پڑتا ہے مگر وہ پائلٹ کا مسئلہ ہے۔ ڈائریکٹ فلائٹ کے مقابلے میں وقت کچھ زیادہ لگتا ہے۔ شاید چار پانچ گھنٹے کا فرق پڑ جائے گا۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا "اور کرائے میں کتنا فرق پڑے گا؟"

"کرائے میں بہت فرق پڑے گا۔ تمہیں کم سے کم بھی پندرہ ہزار پاؤنڈز خرچ کرنے ہوں گے ویسے تو دس ہزار پاؤنڈز میں بھی تمہیں لے جانے والے بہت ملیں گے مگر ان کے جہاز ایسے ہیں کہ کچھ پتا نہیں 'منزل' پر پہنچائیں یا آخری منزل پر۔ ایک آرام دہ اور محفوظ جہاز پندرہ سے بیس ہزار پاؤنڈز میں ملتا ہے۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ پھر تم ہمارا یہ مسئلہ بھی حل کر دو چار ہزار پاؤنڈز تمہیں دینے کے بعد..."

"تین ہزار نو سو ننانوے" اس نے کہا۔

"ہمارے پاس ابھی اکیس ہزار پاؤنڈز ہی رہ جائیں گے۔ شاید کچھ رقم ہماری بیویوں کے پاس ہوگی لیکن ہمارے سفر کے اگلے مرحلے کے لیے بھی کچھ رقم ہونی چاہیے۔ پاکستان ہم پیدل تو نہیں جا سکتے۔"

"او کے۔ تمہاری صاف گوئی اور اعتماد کو میں نے پسند کیا۔ میں تمہارے لیے یہ کر سکتا ہوں کہ بیس ہزار پاؤنڈز والا ایک جہاز تم کو پچیس فیصد ڈسکاؤنٹ پر دلوا دوں۔ تم پندرہ ہزار میں شاہانہ طریقے سے بنکاک پہنچ جاؤ گے۔ ایک ہزار پاؤنڈز میری خصوصی خدمت کا معاوضہ۔ تم پھر بھی چار ہزار پاؤنڈز بچا لو گے۔"

"ہمیں کیا ضرورت ہے شاہانہ سفر کی اور تمہارا احسان لینے کی جب چند سو یا ہزار پاؤنڈز میں ہم بحفاظت پہنچ سکتے ہیں۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "تم ایک ہزار پاؤنڈز کے بدلے حاصل ہونے والے فوائد کو نظر انداز کر رہے ہو۔ یہ پائلٹ میرا دوست ہے۔ میں اسے خود بریف کر دوں گا۔ وہ فلائنگ ایجنسی کا چلاتا ہے اور اس کی فلائٹس خاص لوگوں کے لیے ہوتی ہیں جو اس کے مستقل گاہک ہیں۔ وہ اپنے خفیہ دورے اسی کے ساتھ کرتے ہیں۔ کچھ سیاست دان ہیں، کچھ تاجر اور کچھ فلم اسٹار۔ ان کا کوئی اسکینڈل نہیں ہوتا۔ وہ سب تفریح کے لیے جاتے ہیں اور تم سمجھ سکتے ہو کہ خفیہ تفریح کیا ہوتی ہے اور کہاں ہوتی ہے۔ چونکہ مسافر وی آئی پی حضرات اور خواتین ہوتے ہیں اس لیے قاعدے ضابطے بھی نرم پڑ جاتے ہیں۔ ساحل سمندر پر ایسے بہت سے فائیو اسٹار ہوٹل ہیں جن کے اپنے پرائیویٹ ہیلی پیڈ ہیں اور چھوٹے جہازوں کے رن وے بھی ہیں۔ یہ جہاز بھی کسی پبلک ایئرپورٹ پر نہیں اترے گا۔ بنکاک کے سب سے مشہور اور بدنام ہوٹل کے پرائیویٹ ساحلی رن وے پر اترے گا۔ تمہارا استقبال ایک وی آئی پی کی طرح کیا جائے گا۔ وہاں پولیس کا داخلہ ممنوع ہے۔"

"باقی چار ہزار پاؤنڈز ہم وہاں قیام کے ادا کریں؟" محسن بولا۔

"قیام ضروری نہیں۔ تم کافی پی کے کسی ٹریول ایجنسی کے ذریعے کو بتا سکتے ہو اور اس سے فلائٹ شیڈول پوچھ سکتے ہو۔ وہ خود تمہاری بکنگ کرا دے گا۔ کوئی ایکسٹرا چارج نہیں۔ اب یہ تمہاری قسمت کہ تمہیں فلائٹ کب ملتی ہے؟"

"اگر ہم کو ایک دو دن انتظار کرنا پڑا؟"

"تو وہاں کم خرچ ہوٹل بھی ہیں۔ سو پاؤنڈز والے شریفانہ ہوٹل جو کسی طرح بھی کم نہیں سروس اور آسائش کے اعتبار سے۔ دو دن میں ایک ہزار پاؤنڈ خرچ کر دو گے تو غریب نہیں ہو جاؤ گے۔ سیر تفریح بھی کر لو گے 'عیاشی' بھی۔ مگر تمہارے ساتھ تو بیویاں لگی ہوئی ہیں۔ عیاشی خاک کرو گے۔"

محسن نے آہ بھری "ہم تو نظر بازی بھی نہیں کر سکتے۔"

میں نے کہا "وہ خواب تک سنسر کر لی ہیں۔ مگر تمہاری تجویز بے حد معقول اور قابل عمل ہے۔ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"میرا پروگرام وہی ہوگا جو تمہارا؟"

"تم کتنی دیر میں روانہ ہو سکتے ہو؟" محسن نے کہا۔

"ابھی اسی وقت۔ اگر تم تیار ہو" وہ بولا۔

"ہماری تیاری مکمل ہے" میں نے کہا "ہمارا سب ضروری سامان ہمارے ساتھ ہے۔ تمہارا جہاز کہاں ہے اور وہاں تک ہم ایک مریض کے ساتھ کیسے پہنچ سکتے ہیں۔"

اس نے سمجھایا "ابھی ایک ایمبولینس آئے گی۔ اس میں اسٹریچر بھی ہوگا۔ مریض کو اس میں منتقل کرنے کے بعد پیچھے والا دروازہ بند کر لینا۔ تمہیں نرسنگ اسٹاف کی وردیاں اندر ہی ملیں گی۔ ان کو پہن کر اس میں بیٹھنا ہوگا۔ ایمبولینس تقریباً آدھے گھنٹے میں ایئرپورٹ کے اندر پہنچ جائے گی۔ اس وقت تک تم لباس بدل کے گیٹ اپ مکمل کر لینا۔ ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی اور لائٹس چمکاتی ہوئی چیک پوسٹ سے گزرے گی اور سیدھی میرے جہاز تک پہنچ جائے گی۔ ایمبولینس کو دیکھتے ہی میں انجن اسٹارٹ کر دوں گا۔ تم پیرامیڈیکل اسٹاف کی پیشہ ورانہ مہارت اور پھرتی کے ساتھ مریض کو اسٹریچر پر ڈال کے جہاز میں منتقل کرو گے۔ ظاہر یہ ہوگا کہ کسی جاں بلب مریض کو جان بچانے کے لیے کہیں شفٹ کیا جا رہا ہے۔ ایسے ہی قاعدے ضابطے نافذ کرنے والے بھی جذباتی ہو جاتے ہیں اور ایک سیکنڈ کی تاخیر کے گناہ کا الزام کوئی قبول کرنا نہیں چاہتا۔ تمہارے سوار ہوتے ہی وہ دروازہ بند کر دے گی۔"

"وہ کون؟"

"میری اسسٹنٹ' ایئرہوسٹس۔ کچھ بھی سمجھ لو۔ بڑی ہوشیار لڑکی ہے۔ تین سال سے میرے ساتھ ہے۔"

"خوب صورت اور جوان تو ہوگی؟"

"ظاہر ہے۔ اس کے بغیر میں اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اچھی بات یہ ہے کہ وہ ہر طرح سے میرے کام آتی ہے مگر طے شدہ معاوضے کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔ شادی پر اصرار نہیں کرتی حالانکہ ایک بیٹا بھی ہے ہمارا۔ ہم بھی خوش رہتے ہیں۔ تم اس سے مل کے انجوائے کرو گے۔ اب میں چلتا ہوں' ایمبولینس پندرہ بیس منٹ سے پہلے نہیں آئے گی۔ تم اسی جگہ موجود رہنا۔" ہالی جیک نے ہاتھ ملایا اور روانہ ہو گیا۔

"استغفراللہ۔ میرے پاکستانی بھائی۔ اس جہنمی شخص کے گناہوں کی سزا اور اعمال کی پاداش میں کہیں ہم نہ مارے جائیں۔"

میں نے کہا "جہاز پر یہ اکیلا نہیں' ایک بے حیا مجسم گناہ کافر حسینہ بھی ہوگی۔ اللہ ہم نوجوانان اسلام کے اخلاق و ایمان کو سلامت رکھے۔"

محسن بولا "اور جہاز کو کریش سے بچائے۔ اس پر ایک اور وزنی چوہدری ولاور بھی 'بیمار' گناہ کے ساتھ موجود ہے۔"

میں نے کہا "گستاخی معاف' آپ کون سے معصوم اور پاک باز ہیں۔"

محسن بولا "آپ کیا کم حرامی ہیں۔ اب تک نہ جانے کس کی دعائیں کام آ رہی ہیں۔"

"غالباً ان کی جو صدق دل سے ہماری سلامتی کے لیے دست بہ دعا ہیں" میں نے کہا۔

محسن نے کار میں لیٹے ہوئے ولاور کی نبض کسی ڈاکٹر کی طرح دیکھی اور مطمئن ہو کے سر ہلایا۔ میں نے ایک قریبی کیفے کا رخ کیا اور ڈسپوزیبل کپ میں کافی لے آیا۔ یہ کھانے کا وقت تھا مگر وہاں ہمارے کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ ہاٹ ڈاگ یا برگر۔ سینڈوچ اور چیز وغیرہ کے بارے میں ہمیشہ یہ اندیشہ لاحق رہتا تھا کہ ان میں کم خنزیر کی آمیزش نہ ہو۔ محسن تو چکن کے پیس کو بھی غور سے دیکھتا تھا کہ کہیں وہ سور کا گوشت تو نہیں۔ ایک مسئلہ چکن یا بکرے کے گوشت کے حلال ہونے کا بھی تھا۔ تلے ہوئے انڈے اور کیک بھی ہم نے اس دن سے کھانا چھوڑ دیے تھے جس دن طوطی صاحب نے فرمایا تھا کہ خنزیر کی چربی کا بطور روغن استعمال عام ہے۔ ہمارا گزارا صرف انڈین پاکستانی کھانوں پر تھا جہاں ذبح کیا ہوا گوشت استعمال ہوتا تھا۔ مرغی کے علاوہ مچھلی' سبزیاں' دال وغیرہ آسانی سے دستیاب تھے۔ دودھ دہی اور پھل میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چار سال لندن میں گزار کے ہمیں اس کفرستان میں ایمان کی سلامتی کے ساتھ جینا آ گیا تھا۔

ابھی ہم کافی پی رہے تھے کہ ایک پولیس کار ہمارے قریب

www.paksociety.com

آگے رک گئی۔ اس میں سے اُترنے والے سارجنٹ نے بڑی شرافت سے سوال کیا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم لوگ اتنی دیر سے یہاں کیوں رکے ہوئے ہو؟"

"کیا یہ بھی خلاف قانون ہے؟" میں نے کہا۔

"اف کورس۔ یہاں پارکنگ ممنوع ہے" اس نے ایک سائن بورڈ کی طرف اشارہ کیا اور اپنی چالان بک نکالنے لگا۔

میں نے محسن کے ساتھ فرنچ شروع کر دی "لے بیٹا۔ اب مارے گئے۔ یہ مانگے گا کاغذات ہم سے۔"

محسن نے کہا "ہم کہہ سکتے ہیں کہ نہ یہ ہماری گاڑی ہے اور نہ ہم اسے چلا کے لائے ہیں۔ جان تو چھڑانی ہے اس مصیبت سے کسی طرح۔"

سارجنٹ رک گیا "کیا مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "آفیسر ہم یہاں ایمبولینس کا انتظار کر رہے ہیں۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ پچھلی سیٹ پر ایک بیمار شخص لیٹا ہوا ہے۔"

"مجھے اس کے بیمار ہونے پر کوئی اعتراض نہیں" وہ بولا۔

"دوسری بات یہ کہ نہ ہم اس گاڑی کے مالک ہیں اور نہ ہم نے گاڑی یہاں کھڑی کی تھی۔ ہمیں یہاں ڈاکٹر شمار لے کر آئے تھے جن کی یہ کار ہے۔ تم کاغذات دیکھ سکتے ہو۔"

میں نے گلوو کمپارٹمنٹ میں سے گاڑی کے کاغذات اسے پیش کر دیے۔ اس نے انہیں سرسری نظر سے دیکھ کے سوال کیا "وہ خود کہاں ہے؟"

"وہ ایمبولینس کا بندوبست کرنے گیا ہے۔ ہم اپنے بیمار دوست کو لے کر پیرس جا رہے ہیں۔ وہ لندن میں نہیں مرنا چاہتا۔"

سارجنٹ نے خداور کو غور سے دیکھا "کہیں یہ مر تو نہیں گیا؟"

"ابھی تک تو زندہ ہے لیکن کینسر کی آخری اسٹیج پر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہم سب پیرس میں ہی رہتے ہیں۔ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ گاڑی غلط جگہ پر کھڑی ہے۔"

"گاڑی سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ ایک مریض جو تمہارے کہنے کے مطابق کینسر سے مرنے والا ہے اس طرح ایک عام گاڑی میں پڑا ہے" اس نے نوٹ بک واپس جیب میں رکھ لی "کیا اتنے سیریس مریض کو آئی سی یو میں نہیں ہونا چاہیے تھا؟"

میں نے کہا "آف کورس ہونا چاہیے۔"

"تو کون ڈاکٹر تھا جس نے تمہیں اجازت دی کہ مریض کو گاڑی کی سیٹ پر ڈالو اور لے جاؤ" اس نے پچھلی سیٹ کی کھڑکی سے سر اندر ڈالا "اور تم اسے کہاں سے لا رہے ہو؟"

میں نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی "یہ سینٹ تھامس اسپتال میں تھا۔ تم ڈاکٹر فریزر کی رپورٹس دیکھ سکتے ہو۔"

"میں ڈاکٹر نہیں ہوں کہ رپورٹس دیکھ کے سمجھ سکوں۔"

"ڈاکٹر فریزر مشہور آنکولوجسٹ ہیں۔ ان کی رائے سند سمجھی جاتی ہے" میں نے کہا۔

"یہ آنکولوجسٹ کیا ہوتا ہے؟"

"کینسر اسپیشلسٹ۔ مریض انہی کے زیر علاج تھا۔"

اس نے مجھے نظر جما کے دیکھا "مریض کا کوئی نام بھی ضرور ہوگا۔ کیا تم اپنے دوست کو اسی طرح مخاطب کرتے ہو۔"

میں نے دل ہی دل میں اس پولیس مین کو کوسا جو ٹریفک کی خلاف ورزی کا معاملہ بھول کے دوسرے مسئلے میں ٹانگ اڑا رہا تھا لیکن اس کے تجسس کو غیر معقول نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ وہ اپنا فرض ادا کر رہا تھا اور اس کے فرائض میں صرف ٹریفک قواعد و ضوابط کی پابندی کرانا شامل نہیں تھا۔ وہ قانون کا نمائندہ تھا اور یہ ان کی تربیت کا ایک نمایاں پہلو تھا کہ ان کی نظر ہر طرف رہتی تھی۔ کہیں کوئی بات خلاف معمول ہو، کوئی راز ان کی سمجھ میں نہ آئے یا کوئی شخص اپنی حرکات و سکنات سے مشتبہ محسوس ہو تو وہ نظر انداز نہیں کرتے اور منہ پھیر کے نہیں چلے جاتے کہ ہمیں کیا۔ ابھی تو کچھ ہوا نہیں ہے۔ نہ کسی نے رپورٹ درج کرائی، نہ شکایت کی۔ تھانہ کون سا لگتا ہے اور تفتیش کرنا کس کا کام ہے؟ یہ سب ہمارے ملک میں ہوتا ہے۔ یہاں کوئی پولیس مین کسی بھی جگہ شک میں مبتلا ہو تو اپنے قانونی اختیارات استعمال کرتے ہوئے اپنا شک رفع کرنے کے لیے وضاحت طلب کر سکتا ہے۔

میں نے کہا "یہ نواب خسرو جمشید ہیں۔"

"تم انڈین ہو؟"

"نہیں، میں۔۔۔ ہم سب پاکستانی ہیں" میں نے بڑے فخر سے کہا۔

"پاکستانی۔ تم لوگ ابھی انڈیا سے الگ ہوئے تھے۔"

میں نے کہا "اگر سیاست کے بارے میں کچھ جانتے نہیں تو اس موضوع پر فضول بات کرنے سے بہتر ہے کہ بات نہ کرو۔"

"او کے کیا نام بتایا تم نے۔" وہ کاغذات اور میڈیکل رپورٹ دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "نواب خسرو جمشید۔ تمہیں معلوم ہے نواب کیا ہوتا ہے۔ جیسے تمہارے ملک میں لارڈ یا کاؤنٹ ہوتا ہے پہلے انڈیا میں ریاست کا حکمران نواب ہوتا تھا یا مہاراجا۔"

"آئی سی۔ تو یہ مہاراجا کے مرتبے کا شخص ہے 'نواب' لیکن یہ کسی لاوارث فقیر کی طرح پڑا ہے۔ اس کا علاج اتنا بڑا ڈاکٹر کر رہا تھا اتنے بڑے اسپتال میں لیکن ان کو لندن سے پیرس لے جانے کے لیے کوئی بہترین موٹر رائس تک نہیں ہے۔ ایمبولینس بھی اب آئے گی۔ اصولاً تو اس کو اسپتال سے ایمبولینس میں ڈاکٹر یا نرس کے ساتھ لانا چاہیے تھا اور ایمبولینس میں ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کا پورا بندوبست ہونا بھی لازمی تھا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس بے پروائی کا ذمے دار کون ہے۔ میں اسے مجرمانہ کوتاہی سے بھی زیادہ سنگین جرم کہوں گا۔"

محسن نے کہا "تم ہمیں قصوروار نہیں قرار دے سکتے۔"

"… نہیں رہ سکتا۔ کینسر کی بات الگ ہے۔ اگر کسی کو … بخار ہو اتنا کہ وہ فوری طبی امداد نہ ملنے سے مر سکتا ہو اور … چلا کے لے جاؤ یا اپنی گاڑی میں اپنے ہی ذوال کے … رفتار سے اسپتال جاؤ تو اس کا کیا مطلب سمجھا جائے … کہ تم اسے زندہ دیکھنا نہیں چاہتے۔ جانتے بوجھتے تم ایسے … اگر یہ ہو کہ وہ راستے میں ہی مر جائے کیا یہ قتل کی … سے کم نہیں ہوگا۔"

"تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔ ایسی حالت میں مریض کے لواحقین … کھڑا کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹروں پر چیختے چلاتے ہیں اگر ذرا بھی … ہو۔ سر درد بھی ہوتے ہیں خود بھی اور دوسروں کو بھی پریشان … وجہ یہ اس اور پریشان نظر آتے ہیں۔ اگر مرنے … نظر نہ آئیں تب بھی اتنے اطمینان سے سڑک کے کنارے … گاڑی پارک کر کے گپ شپ میں مصروف نظر نہیں آتے … نہیں ہوتے کہ پیچھے کپ میں کافی پی رہے ہوں۔ سچ بتاؤ … کیا معاملہ ہے؟"

"معاملہ۔۔۔ کیسا معاملہ۔ تم نے سارا ریکارڈ دیکھ لیا؟"

"جہنم میں گیا ریکارڈ۔ تم جھوٹ بول رہے ہو" اس نے … "… ہوگا کہ جس کی میڈیکل رپورٹس تم نے دکھائی ہیں … شخص ہے۔"

"تم اس کا پاسپورٹ دیکھو گے؟"

"مجھے یہ بھی شک ہے کہ یہ شخص بیمار ہے۔ میرے خیال میں … یا پھر بے ہوش ہے۔"

"یہ سو رہا ہے اور خواب آور انجکشن کے اثر میں ہے جو اس کی تکلیف کم کرنے کے لیے دیا گیا تھا" میں نے کہا۔

… دماغ اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ … افسر اپنا شک رفع کیے بغیر نہیں ٹلے گا۔ اس نے ایک … غلطی کی بنیاد پر ہمیں پکڑ لیا تھا۔ رلاور … محسن تھا "اس … ہم اس کے لیے ذرا بھی پریشان نہیں تھے۔ ہم نے اسے … کی غلطی کی تھی۔ دوسری غلطی اس کو گاڑی کی پچھلی … ڈال دیا تھا۔ اگر واقعی ہمارا کوئی دوست یا عزیز اس حالت میں … بے دردی سے پیش نہ آتے۔ اسے رات بھر کیورانج … کے نہ رکھتے اور یوں گاڑی میں لٹا کے نہ لے جاتے۔ … یہ تھی کہ ہمارے دل میں اس کے لیے ہمدردی یا رحم … کا وجود بھی نہیں تھا۔ ہماری بلا سے وہ جیتا یا مر جاتا … ہمیں فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

… سارا کھیل بھی قسمت کا ہے۔ بازی الٹ جاتی ہے اور … سب کچھ جو ہم پیرس اور لندن میں کرتے رہے، قانون … بلیک میلنگ اور دہشت گردی کے زمرے میں آتا تھا۔ ہم نے … اسپتال تک ہر جگہ گڑبڑ پھیلائی مگر پکڑے نہیں گئے۔ بعض … پاسپورٹ پر پیرس پہنچ گئے۔ لندن میں داخل ہو گئے جہاں ہمارا داخلہ ممنوع تھا۔ چوہدری رلاور کی کوشش سے ہم پر یہ الزام بھی آیا تھا کہ سر جمشید گورڈن پر قاتلانہ حملہ ہم نے کیا تھا اور ہماری دیدہ دلیری کہ ہم نے اسی شخص کو ان پر مسلط کر دیا۔ ہم غیر قانونی طور پر آئے تھے اور ہم نے خداور کو بھی پکڑ لیا تھا۔ غیر قانونی طور پر ہماری واپسی کا انتظام بھی بہترین ہو گیا تھا۔ ہم نے ڈاکٹر شمار کو مار کے اس کی لاش سے بھی بہ آسانی نجات حاصل کر لی تھی۔ پکڑے ہم کیسے گئے تھے؟ صرف کار غلط جگہ پارک کر کے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سارجنٹ کار کے اندر نہ جھانکتا۔ جیسے سارے راستے میں کسی نے ہم سے نہیں پوچھا تھا کہ پچھلی سیٹ پر ایک آدمی کیوں لیٹا ہوا ہے۔ ہم یہاں نہ کھڑے ہوتے تو کسی کو دلچسپی نہ ہوتی۔ یہ محض بد قسمتی تھی کہ ایک سارجنٹ نے گاڑی کو غلط جگہ کھڑا دیکھا اور ہم سے سوال جواب کرنے آ گیا۔

"کیا میں اسے جگا سکتا ہوں؟" سارجنٹ نے کہا۔

"ضرور جگاؤ" محسن بولا "مگر یہ جاگے گا نہیں۔"

"وہ ڈاکٹر کہاں ہے جس کی یہ کار ہے۔ میں اس سے بات کروں گا" وہ بولا "تم نے کہا کہ ایمبولینس آنے والی ہے۔"

"ہاں۔ ہمیں فلائٹ پکڑنی ہے۔"

"کون سی فلائٹ؟" اس نے کہا۔

"چارٹرڈ فلائٹ ہے" میں نے کہا۔

"ویری گڈ" اس نے طنز سے کہا "تم چارٹرڈ فلائٹ سے جا رہے ہو۔ پیرس جانے کے لیے تم سینٹ تھامس اسپتال سے ائر کنڈیشنڈ ایمبولینس حاصل کرتے تو اب تک پیرس میں ہوتے اور وہ ایمبولینس ایک موبائل آئی سی یو ہوتی [illegible]۔"

میں نے کہا "آفیسر، بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"وہی کر رہا ہوں۔ ابھی تک مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ نہیں آئی۔ اب یا تو تم مجھے یہاں سمجھا دو ورنہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور تفصیل سے سب سمجھوں گا کہ یہ چکر کیا ہے" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"چکر کی کون سی بات ہے؟" میں نے اپنے حواس بحال رکھتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"تم نے کہا کہ تم پاکستانی ہو؟"

میں نے اپنا پاسپورٹ اسے پیش کر دیا "میں ایک وکیل بھی ہوں، خوش قسمتی سے۔"

اس نے پاسپورٹ دیکھا اور مجھے واپس کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک میرا نام اور حلیہ اس حد تک مشتہر نہیں ہوا تھا کہ ساری لندن کی پولیس میرے کارناموں سے واقف ہوتی اور مجھے شناخت کر لیتی۔

"تم نے پہلے مجھ سے انگریزی میں بات کی پھر آپس میں فرنچ بولی۔ تمہاری مادری زبان کیا ہے؟"

www.paksociety.com

"اردو۔ تم لوگ اسے ہندوستانی کہتے ہو۔"

"رائٹ۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ راز کی بات ہو تو یہاں لوگ آپس میں مادری زبان بولتے ہیں۔ تیسرا شخص نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ تم نے فرنچ کیوں بولی تھی؟"

وہ میری توقعات سے کہیں زیادہ کائیاں ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے کہا "کیا فرنچ میں بات کرنا جرم ہے؟"

"جرم کی بات مت کرو۔ میں نے کہا کہ یہ خلاف فطرت ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ تمہارا اصل مقصد مجھے چکر دینا تھا۔ یہ یقین دلانا تھا کہ تم پیرس میں رہتے ہو۔ پیرس میں رہنے والے سب انڈین ہر وقت فرنچ نہیں بولتے۔ اب مجھے شک ہے کہ تم پیرس میں نہیں رہتے۔" اس نے چند سیکنڈ کا ڈرامائی وقفہ دیا اور پھر بولا "مزید یہ کہ... جو تم نے ایک دوسرے سے کہا، وہ میں نے سمجھ لیا تھا۔ تمہاری بدقسمتی کہ میں فرنچ سمجھتا ہوں۔"

پھر اس نے وہ سب دہرا دیا جو میں نے اور محسن نے ایک دوسرے سے کہا تھا۔ میں اور محسن اس کے سامنے مجرم بن گئے تھے اور ہماری گرفتاری اب یقینی ہو چکی تھی۔

اگر یہ لندن نہ ہوتا، اپنا لاہور شریف ہوتا تو پریشانی کی کوئی بات نہ ہوتی۔ میں آخری وقت تک حوصلہ نہ ہارتا۔ میں آسانی سے قانون کے نمائندے کو نتیجہ خیز مذاکرات پر آمادہ کر لیتا اور ہم باہمی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس قانونی مشکل کا اتفاقی حل تلاش کر لیتے۔ عرف عام میں اس کو مک مکا کہا جاتا ہے۔ فریقین ہنسی خوشی پیار محبت سے دس منٹ میں قانونی معاملات طے کر لیتے ہیں جو عدالت میں دس سال میں طے نہیں ہوتے۔ پھر سب اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ اگر بدقسمتی سے وہاں بھی کوئی فرض شناس پولیس افسر مل جاتا (مشہور ہے کہ پولیس اور کسٹم جیسے محکموں میں بھی ایماندار افسر ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب) تو میرے پاس دوسرا مشکل راستہ تھا۔ میں بقول طوطی صاحب کے زور بازوئے مسلم دکھا کے نکل جاتا۔

لیکن یہاں صورت حال اس کے برعکس تھی۔ پولیس کی اکثریت اپنی تنخواہ میں گزارا کرنے کی قائل تھی چنانچہ وہ مک مکا کی کوشش کو بھی جرم بنا دیتے تھے کہ رشوت دینے کی کوشش کی حالانکہ جو نذرانہ خلوص اور محبت سے پیش کیا جائے، اسے قبول کر لینا چاہیے۔ یہ تو دو طرفہ سودا ہے۔ ہم نے آپ کو رشوت دی، آپ نے ہمیں آزادی دی کہ جاؤ عیش کرو۔ تم نے کچھ نہیں کیا۔ رشوت تک نہیں دی۔

دوسرا مشکل طریقہ یعنی زور بازوئے مسلم دکھا کے نکل جانے کا عملی طور پر خودکشی کے مترادف تھا۔ پولیس پوری طرح مسلح اور مستعد ہوتی ہے۔ وہ گولی مارنے سے دریغ نہیں کرتے اور ان پر حملہ انتہائی سنگین جرم تصور کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ وہاں بڑے بڑے بدمعاش پولیس کا نام دیکھتے ہی سیدھے ہو جاتے ہیں۔ سارے زمانے میں مار دھاڑ کرنے والے، پولیس مین پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ یہ صرف خوف کی بات نہیں، غالباً مجرم بھی قانون کا بہت احترام ضرور کرتے ہیں۔

اس وقت ایک پولیس آفیسر نے صورت حال کو کنٹرول کر رکھا تھا تو دوسرا کار میں بیٹھا ہوا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اگر یہ جرح کرنے والے کو ناک آؤٹ کرتا تو دوسرا دور ہی سے مجھے شوٹ کر دیتا۔ فرار کے لیے ڈاکٹر کی کار موجود تھی مگر پولیس کار سے ریس میں کوئی نہیں جیت سکتا۔ اس کی وجہ پولیس کا مرکزی طور پر مربوط نظام ہے۔ کوئی فرار ہونا چاہے تو ایک پیغام ہر جگہ موصول ہو جاتا ہے اور شہر کے تمام راستوں سے پولیس کی گاڑیاں ایک سمت میں روانہ ہو جاتی ہیں۔ وہ فرار کے راستے بند کرتے ہوئے فرار ہونے والے کو کہیں بھی ہر طرف سے محصور کر کے پکڑ لیتے ہیں۔

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے کہا "اچھا آفیسر! اب تم بتاؤ کہ کیا چاہتے ہو؟"

"کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے؟" اس نے طنز سے کہا "تم بے وقوف آدمی نہیں ہو۔ خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ اگر تم بے گناہ ہو تو تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ ہم مطمئن ہو جانے کے بعد تمہیں چھوڑ دیں گے۔"

میں نے کہا "لیکن اس مریض کا کیا بنے گا۔"

"اگر یہ واقعی مریض ہے تو اسے اسپتال منتقل کر دیا جائے گا۔"

"سینٹ تھامس اسپتال میں اس کا پورا ریکارڈ ہے اور وہاں ڈاکٹر فریدہ بھی ہیں" میں نے کہا "لیکن ایک بات بتانا اب ناگزیر ہو گیا ہے۔ یہ مریض ایک خطرناک مجرم ہے۔ بین الاقوامی سطح کا دہشت گرد رہا ہے اور اب بھی پاکستان میں ایک مافیا کو کنٹرول کر رہا ہے۔ ہم اس کے تعاقب میں تھے اور اب اسے گرفتار کر کے واپس لے جا رہے ہیں۔"

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "کیا تم پولیس سے تعلق رکھتے ہو؟"

"نہیں۔ لیکن پولیس کی ایک مددگار تنظیم ہے ایم آرائیں" محسن نے کہا۔

"ایم آرائیں؟! اس سے کیا بنا؟"

"وہ تم نہیں سمجھ سکو گے۔ یہ رضاکار تنظیم ہے جو معاشرے میں لاقانونیت کے خلاف جہاد کرتی ہے اور ایسے مجرموں سے اپنے طور پر نمٹتی ہے جن کے سامنے قانون بے بس ہے۔ تم یہ بات سمجھ سکتے ہو کیونکہ ایسے چالاک اور بااثر مجرم ہر ملک اور معاشرے میں پائے جاتے ہیں جو قانون کو غیر مؤثر بنا دیتے ہیں یا خرید لیتے ہیں، بے بس کر دیتے ہیں یہاں تک کہ بدل دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی مجرم تھا۔ اگر ہم اسے نہ پکڑتے اور اس کے

خلاف ثبوت اکٹھے نہ کرتے تو شاید یہ کبھی ہاتھ نہ آتا۔ ہمارے ملک میں اسکاٹ لینڈ یارڈ جیسے ادارے نہیں ہیں اور ہوتے تب بھی اپنے لوگوں کو فرق نہ پڑتا۔" محسن نے بڑے اعتماد سے کہا۔

وہ کچھ متاثر ہوا اور کچھ حیران۔ "مگر یہ تو مرنے والا ہے، تم نے بتایا۔"

"میں نے غلط نہیں بتایا۔ یہ اس وقت پکڑا گیا جب اس کے بچ جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر اس کے سارے جرائم پر اسے عدالت میں پیش کیا جاتا تو ہمارے ملک کے قانون کے مطابق اسے ہر جرم پر سزائے موت دی جاتی لیکن جس شخص کا دو مہینے سے زیادہ زندہ رہنا ممکن ہی نہ ہو اسے کون سزائے موت دے سکتا ہے۔ دو مہینے میں تو ہمارے عدالتی نظام کا پہیہ حرکت میں بھی نہیں آتا۔ اپیل اور آخری اپیل کے مسترد ہونے میں دو سال سے کم نہیں لگتے۔ چنانچہ اب یہ چاہتا تھا کہ ہم اس سے سودا کر لیں۔ یہ ہر قیمت دینے کو تیار تھا اگر اس کو پولیس کے حوالے نہ کیا جائے۔ لندن میں رہنے کی اجازت دی جائے اور پاکستان سے اس کے بیوی بچوں کو بلا لیا جائے۔ مگر ہم نے اس کی آفر قبول نہیں کی۔ ہم اسے اپنے خرچ اور انتظام پر واپس پاکستان لے جا رہے تھے۔"

اس نے سر ہلایا "اگر یہ سب درست ہے تو پھر تمہیں پولیس اسٹیشن جا کے وضاحت کرنے میں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "ہم قانون سے تعاون کرنے والے لوگ ہیں اور کبھی اپنی قانونی حدود سے تجاوز بھی کرتے ہیں تو صرف قانون کی مدد کے لیے۔ اعتراض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

محسن نے کہا "تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہم نے چار سال اس لندن شہر میں تعلیم حاصل کرتے گزارے تھے۔ یہاں ہمارے بہت سے مستند حوالے ہیں۔ بہت لوگ ہمیں جانتے ہیں۔ فرنچ ہم نے یہیں رہ کے سیکھی تھی۔"

"خوشی مجھے اس وقت ہوگی کہ جب یہ سچ ثابت ہو جائے گا۔ تمہاری وہ ایمبولینس اب تک کیوں نہیں آئی۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جو شخص مجھے یہاں انتظار کرنے کے لیے کہہ کر گیا تھا، وہ غائب ہے۔ ممکن ہے اس نے پولیس کو دور سے دیکھ لیا ہو؟"

"مطلب یہ کہ وہ اب نہیں آئے گا؟ ایسی صورت میں ہم پولیس کی ایمبولینس منگوا سکتے ہیں۔" وہ بولا "تم میرے ساتھ آؤ اور دیکھو، چالاک بننے کی کوشش مت کرنا۔"

"تمہیں یہ جملہ بولنے کی عادت ہو گئی ہے" میں نے پولیس کار کی طرف چلتے ہوئے کہا "تم شریف آدمی سے اور بدمعاش سے ایک ہی لہجے میں بات کرتے ہو۔"

"قانون میں دو لہجے 'شریفانہ اور غیر شریفانہ' نہیں ہوتے" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "ورنہ ہم کسی کی صورت سے یا باتوں سے متاثر ہو سکتے ہیں۔"

مجھے اور محسن کو پولیس کار میں بٹھانے کے بعد اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص سے کہا "ایک ایمبولینس کال کرو۔ اسے یہ لوکیشن دو۔ ایک خطرناک مریض کو فول پروف پولیس کسٹڈی میں سینٹ تھامس اسپتال شفٹ کرنا ہے۔"

ایمبولینس کے آنے تک وہ ایک لمحے کے لیے بھی ہماری طرف سے غافل نہیں ہوا۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ وہ فرنچ سمجھتا ہے، میں نے محسن سے اردو میں بات کرنا مناسب سمجھا۔

"مجھے یہ شخص نیک اور رحم دل لگتا ہے شیروانی صاحب!"

"بجا ارشاد۔ یہ تھانے لے جا کے ہماری خاطر تواضع کرے گا، ہم سے رو رو کے اپنی بے مروتی پر معافی مانگے گا اور پھر ہمیں تحفے تحائف دے کر اپنی کار میں رخصت کرنے ائرپورٹ آئے گا۔"

"میرا مطلب ہے کہ... اسے ہم پر ابھی تک یہ شک نہیں کہ ہم خود بھی مفرور مجرم ہیں اور حدود برطانیہ میں غیر قانونی طور پر قیام پذیر ہیں۔"

"لیکن اسے معلوم ہو جائے گا۔" محسن بولا۔

"جب تک اسے کچھ پتا چلے، ہمارے پاس ایک چانس ہے۔ ہم اسے تفصیل سے چوہدری دلاور کے جرائم سے آگاہ کریں۔ یہ بتائیں کہ ہمارا اس کو یہاں آ کے پکڑنا اور اپنے ساتھ لے جانا کیوں ضروری تھا۔ ہم ڈاکٹر جیلی کا حوالہ دے سکتے ہیں اور اس کے قتل سے پہلے چوہدری دلاور نے جو دوسرے قتل کی واردات کی تھی، اس کے چشم دید گواہ کو بلوا سکتے ہیں۔"

محسن نے کہا "اگر ہم یہاں کے قانونی معاملات میں ملوث ہو گئے تو پھر پھنس جائیں گے۔ ڈاکٹر جیلی مرڈر کیس کا حوالہ کافی ہے۔ اگر پولیس چاہے تو یہاں وزارت داخلہ یا خارجہ کے متعلقہ دفتر سے شہادت بھی حاصل کر سکتی ہے۔ وہ ایک برطانوی شہری تھی اور اس کے قتل کی تفتیش کے مسئلے پر دونوں حکومتوں کے درمیان سرکاری سطح پر مراسلت بھی ہوئی تھی۔ ان کو بتایا جا سکتا ہے کہ لاہور کے نامور وکیل کون ہیں۔ ایک خاتون بیرسٹر ہیں مس رابعہ قادری، وہ اتفاق سے پیرس میں مقیم ہیں۔"

"اتفاق سے" میں نے محسن سے اتفاق کیا۔

"اس کے علاوہ ایک عبدالودود منظر ہیں۔ اور وقار یوسف۔"

"بے وقوف آدمی، وقار یوسف میں خود ہوں۔"

"خوب یاد دلایا۔ میں آپ کو سکندر بخت سمجھے بیٹھا تھا۔"

میں نے اسے خونی نظروں سے دیکھا "تو کیوں مجھے اپنا قاتل بنانا چاہتا ہے آخر۔ ایسے میرا نام لینے کا کیا مقصد ہے؟"

محسن نے کہا "معاف کرنا، روانی میں زبان پر آ گیا۔"

"مجھے روانی میں پھانسی ہو جائے گی۔ پھانسی نہ سہی جیل میں چکی پیستے جوانی ضرور گزر جائے گی۔ آپ کہہ دیں گے سوری۔"

محسن نے کہا "لے بھائی، مسلح ایمبولینس آ گئی۔"

میں نے کہا "وہ خبیث وائی جیک بھاگ گیا۔"

www.paksociety.com

"اس نے تاڑ لیا ہوگا کہ دال میں کچھ کالا ہو گیا ہے۔ ہمیں اس کا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ وہ فوری طور پر ہمارے کام آسکتا ہے۔"

"ورچار سال بعد۔ جب ہم یہاں کاؤنٹی جیل سے رہا ہوں گے۔"

محسن بولا "اللہ سب ٹھیک کرے گا۔ یہ مت بھولو کہ تم ابھی تک ایم آر اٹلس کے چیف ہو' چیف کے لوگ۔ اب دیکھنا ہے کہ ہم کس حد تک اور کیسے پولیس کو متاثر کرتے ہیں۔"

میں نے مایوسی سے سرہلایا "یہ لوگ آسانی سے متاثر نہیں ہوتے۔ حقائق کچھ بھی ہوں' ان کی قانونی منطق اپنی جگہ رہتی ہے۔"

پولیس آفیسر ایمبولینس کے روانہ ہوتے ہی میرے ساتھ آ بیٹھا۔ اب اس نے ریوالور بھی نکال لیا تھا۔ محسن اگلی سیٹ پر تھا اور بہت پرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں نے غلطی کی تم کو یہ بتا کے کہ مجھے فرنچ آتی ہے" میرے ساتھ بیٹھنے والا بولا "اب تم دونوں اپنی مادری زبان پر۔"

"یہ مشورہ تم نے ہی دیا تھا۔ کوئی بات نہیں' عقل مند آدمی سے بھی غلطی ہو جاتی ہے۔" محسن مسکرا دیا "تمھارے خیال میں پولیس اسٹیشن پہنچ کے ہمیں کتنا وقت ضائع کرنا پڑے گا؟"

"پولیس کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔" وہ برا مان کے بولا "یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کتنی دیر میں خود کو بے قصور ثابت کرتے ہو۔"

"کیا جج کو بھی ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے؟" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔

"ہوتی ہے' عدالت میں۔"

پولیس اسٹیشن بڑی جدید وضع کی خوب صورت اور صاف ستھری عمارت تھی۔ ہمیں ایک علیحدہ کمرے میں بٹھا دیا گیا۔

میں نے کہا "اس سے پہلے کہ تم مجھے میرے قانونی حقوق یاد دلاؤ' میں تم کو یاد دلا دوں کہ میرا تعلق بھی قانون کے شعبے سے ہے۔ تم نے میرے پاسپورٹ پر میرا پیشہ دیکھا ہوگا۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "اور تم کیا چیز ہو؟" وہ محسن سے بولا۔

"میں وہ چیز ہوں جسے صحافی کہتے ہیں۔ میری شہرت بین الاقوامی ہے۔" محسن بولا۔

"ٹھیک ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تمھیں اپنی صفائی میں کیا کہنا ہے؟" اس نے ہمارے مقابل بیٹھ کے کہا۔

"اپنی صفائی میں؟" میں نے کہا "ہم نے کیا جرم کیا ہے کہ ہم اپنی صفائی پیش کریں آفیسر؟"

وہ مجھے گھورنے لگا "ہوشیار مت بنو۔ تم جانتے ہو کہ تم نے کیا کیا ہے؟"

میں نے کہا "تم بھی مجھے ڈرانے کی کوشش مت کرو۔ تم کسی مجرم سے نہیں' ایک معزز وکیل سے بات کر رہے ہو۔ کاؤنٹی جیل کے باہر جگہ پر گڑبڑی ہوئی تھی' میں مانتا ہوں مگر میں بتا چکا ہوں کہ وہ کوشش میری نہیں تھی۔ تم کاغذات دیکھ کے تصدیق کر سکتے ہو کہ وہ کوشش کس کی تھی۔ میں اسے جانتا بھی نہیں ہوں۔ اگر اس میں جھنجھلانا جرم ہے تو بتاؤ۔"

"تم نے ایک مریض کے بارے میں غلط بیانی کی۔"

"کیا غلط بیانی کی؟" میں نے کہا "اب تک تمھاری پولیس ایمبولینس اسپتال پہنچ گئی ہوگی۔ تم تصدیق کر سکتے ہو کہ وہ برین ٹیومر سے مرنے والا ہے۔ اس کی آخری اسٹیج ہے اور وہ ساری [illegible] اسی کی ہیں۔"

محسن نے کہا "اور جب یہ ثبوت مل جائے گا تو ہم تمھارے خلاف کیس کریں گے۔ تم نے ہمیں جھوٹا کہا' بے وجہ پریشان کیا' اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں گرفتار کر کے پولیس اسٹیشن لائے۔ یہ کہا کہ فرنچ بولنا جرم ہے' ہمیں اپنی مادری زبان میں بات کرنی چاہیے۔"

"تم کون ہوتے ہو اور کس نے اختیار دیا ہے تمھیں کہ کسی کو مادری زبان میں بات کرنے پر مجبور کرو" میں نے کہا۔

وہ سنجیدہ ہو گیا "دیکھو' بلاوجہ شور مت کرو۔"

"یہ شور ہے؟ شریفانہ گفتگو کو تم شور کہتے ہو۔ تم نے ہمیں پیرس جانے سے روکا۔ ہماری چارٹرڈ فلائٹ تھی۔ اس کا نقصان کون پورا کرے گا' پولیس ڈیپارٹمنٹ یا تم؟"

"تم نے کہا تھا کہ وہ مریض ایک خطرناک مجرم ہے۔"

"ہاں۔ کاؤنٹی جیل میں ایک قیدی ہے جارج۔ بلاشبہ جارج بہت ہوں گے مگر اس کا کیس حال ہی میں بہت مشہور ہوا تھا۔ اسے جیل کے اندر قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس نے انگریز وکیل نے' جس کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہا ہے' حکام کو نوٹس بھی دیا تھا۔ تم اس وکیل کو بلاؤ' وہ تم کو پوری اسٹوری بتائے گا چوہدری دلاور کی۔"

"یہ چوہدری دلاور کون ہے؟"

"وہی مریض جس کو تم نے اسپتال بھیج دیا۔ اس پر پاکستان کی ایک عدالت میں بھی ایک برٹش ڈاکٹر کو قتل کرنے کا کیس چل رہا ہے۔ وہ یہاں سے لاہور گئی تھی اور اسے وہیں قتل کر دیا گیا تھا۔ حال ہی میں اس کی لاش دوبارہ نکال کے پوسٹ مارٹم کیا گیا تو دلاور پر ثابت ہوا۔ وہ بھاگ کے لندن آگیا۔"

"کیا نام تھا اس لیڈی ڈاکٹر کا؟"

"ڈاکٹر شیلی" میں نے کہا "یہ دلاور لندن میں اس ڈاکٹر کو اور اس کے شوہر کی ایک گرل فرینڈ کو پہلے ہی قتل کرنے کا [illegible] ہو گیا تھا۔ ان کے شوہر کا نام جارج ہے۔ جارج خود بتا سکتا ہے اگر تم کاؤنٹی جیل جا کے پوچھو۔"

"وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم فون پر معلوم کر لیتے"

"ضرور معلوم کرو۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم جارج کے وکیل کو بلالو۔ اس کا نام غالباً الفریڈ ہے" میں نے کہا "وہ ہمیں شناخت بھی کر سکتا ہے۔"

"ایک اور مشہور شخص ہے یہاں' ایک اخبار کا مالک۔ حاجی فرحان طوطی۔" محسن بولا "میں چاہتا ہوں کہ وہ یہاں آجائے' تم نے ایک رپورٹر اور ایک جرنلسٹ کو گرفتار کیا ہے۔"

"میں نے تمھیں ابھی تک گرفتار نہیں کیا۔"

"پھر یہ کیا ہے؟ کیا ہم پولیس اسٹیشن تمھاری دعوت کھانے آئے ہیں؟ آخر یہ خبر سب اخباروں میں آنی چاہیے۔"

"ہم اس دھمکی سے میں نہیں ڈرتا کیونکہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اگر مجھے قانون کی خلاف ورزی کا شبہ ہو تو اپنا شک رفع کرنا میرا فرض ہے۔ نمبر بتاؤ اس اخبار کے مالک کا۔ کیا نام تھا اس کا؟ طوطی وزیب اور کچھ۔"

"حاجی علم دین طوطی" محسن نے نمبر لکھوا کے کہا "اگر وہ خود نہ آیا تو اسپیشل رپورٹر کو بھیج دے گا۔"

میں نے کہا "ایک نمبر اور لکھو۔ پیرس کا نمبر ہے۔ یہاں خاتون ایڈووکیٹ راجہ قاری موجود ہیں افغان سے۔"

"بالکل افغان سے" محسن نے سرہلایا۔

"وہ پاکستان کی ٹاپ رینکنگ لائرز ہیں" میں نے کہا۔

"اس قدر افراتفری کی کیا ضرورت ہے۔ تمھیں پھانسی تو نہیں دی جا رہی ہے یہاں" پولیس سارجنٹ بولا "اگر تم اپنی پوزیشن کلیئر کر سکتے ہو اور میں مطمئن ہو جاتا ہوں تو تم جا سکتے ہو۔"

"اس سے پہلے تم اسپتال فون کرو" میں نے کہا۔

مگر میری بات ختم ہونے سے پہلے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو۔ ہاں' سارجنٹ تھامسن' اسپتال سے' ہاں بولو۔"

میں نے اور محسن نے پرامید نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سارجنٹ اپنے ماتحت سے بات کر رہا تھا اور بیچ بیچ میں کوئی سوال بھی پوچھ رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد اس نے ریسیور رکھ دیا اور ہمیں دیکھنے لگا۔ اپنی شکست پر ندامت کے آثار اس کی آنکھوں سے عیاں تھے۔

"کیا معلوم ہوا؟" میں نے کہا۔

"تمھاری بات کی تصدیق ہو گئی۔ اس مریض کی حالت واقعی نازک ہے۔ اسپتال والوں نے اسے داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ کہتے ہیں کہ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کو ریڈیو تھراپی کی ضرورت ہوگی۔"

"ریڈیو تھراپی کے بارے میں ابھی ڈاکٹروں نے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا کہ کب ہوگی اور کتنی۔ ریڈیو تھراپی کی مقدار کا تعین مریض کی حالت اور قوت برداشت کے مطابق کیا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا اب تم اسے اپنے گھر رکھو گے؟" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "یا وہ ایمبولینس ہی اسے پیرس پہنچاوے گی؟"

سارجنٹ نے سوچ کے کہا "اگر تم چاہتے ہو تو یہ انتظام بھی ہو جائے گا اور میرا مشورہ ہے۔"

میں نے کہا "ہمیں تمھارے مشورے کی ضرورت ہوگی تو ہم مانگ لیں گے۔"

محسن بولا "اب تم الفریڈ کو بلالو۔"

"بہتر ہے پہلے میں کاؤنٹی جیل کے کسی افسر سے بات کر لوں' پھر تمھارے اسی مشہور جارج کا حوالہ دوں۔ اسے بلوا کے وکیل کا صحیح نام اور فون نمبر لوں اور پھر وکیل سے کہوں کہ یہاں آجائے؟"

"ہاں۔ اگر وہ گھر پر موجود ہو یا آفس میں۔ اور تمھارے حکم پر دوڑا چلا آئے" میں نے کہا۔

"میں کوشش کرتا ہوں۔"

"جب تک تم کوشش میں مصروف ہو' ہمارے لیے کھانے پینے کا انتظام کرو۔ ادائیگی ہم کریں گے۔"

"تم کچھ بھی منگوا سکتے ہو۔"

میں نے کہا "کافی اور سینڈوچ۔ الیٹ چیز اور سلاد والے جس میں گوشت نہ ہو۔" میں نے کہا "جب تم فون کر کے فارغ ہو جاؤ تو فون مجھے دینا' میں ایک دو کالیں کروں گا۔"

پھر آدھے گھنٹے تک ہم اطمینان سے بیٹھے رہے۔ کافی اور ہماری پسند کے سینڈوچ آنے تک اردو میں بات کرتے رہے اور اپنی حکمت عملی طے کرتے رہے۔

"ایک سچ تو ثابت ہو گیا" میں نے کہا "دوسرا بھی ثابت ہو جائے گا۔ جارج یا اس کا وکیل بتا دیں گے کہ چوہدری دلاور ایک قاتل ہے اور مفرور مجرم ہے۔"

"کہیں وہ یہاں کے دہرے قتل کا کیس نہ شروع کر دیں۔ اور دلاور کو یہاں نہ روک لیں۔"

"جارج انھیں بتا دے گا کہ دلاور کا لاہور کی عدالت میں پیش ہونا بھی ضروری ہے ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس میں۔ سب کچھ اس کے بیان پر ہے۔ اس نے اتنا ہی بتایا جتنا پوچھا گیا تو پھر کوئی خطرہ نہیں ہے اور اس نے شروع کر دی پوری ظلم کی داستان تو شاید معاملہ بگڑ جائے۔"

سارجنٹ فون پر بات کرتے ہوئے کن انکھیوں سے ہمیں دیکھتا جا رہا تھا کیونکہ اردو کے جملوں میں اس نے ڈاکٹر شیلی مرڈر کیس اور جارج کا ذکر بھی سنا تھا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد اس نے تھک کر ریسیور رکھ دیا۔

"میں تو ناکام ہو گیا تمھارے اس جارج سے رابطہ کرنے میں۔ اس کا پورا نام کیا ہے' نمبر کیا ہے؟"

میں نے فون خود لے لیا "کاؤنٹی جیل کا نمبر بتاؤ۔"

www.paksociety.com

کاؤنٹی جیل میں مجھے بھی اچھی خاصی بحث کرنی پڑی مگر میری اس بات کا اثر زیادہ ہوا تھا کہ میں وکیل ہوں۔ وہ مجھے جارج کا وکیل سمجھے اور جب میں نے ان واقعات کے حوالے سے بات کی جو گزشتہ تین روز میں جارج کے ساتھ پیش آئے تھے تو مطلوبہ جارج کو تلاش کرلیا گیا۔ اس کی آواز سن کے میں نے کہا "ہیلو جارج!"

"کون ہو تم؟" وہ بولا۔

"وہی جس کا نام لے کر ایک دشمن چوہدری دلاور نے تمہیں زہریلی سگریٹ پلادی تھی۔"

"سکندر بخت؟ تم سکندر بخت ہو؟" وہ چلّا کے بولا۔

"ہاں۔ مگر میں یہاں پولیس اسٹیشن پر بیٹھا ہوں۔ یہ لوگ ماننے پر تیار نہیں کہ چوہدری دلاور مجرم ہے۔ ہم اسے لاہور لے جارہے تھے۔ تم اسے صرف ڈاکٹر شبلی کے بارے میں بتاؤ" میں نے ریسیور سارجنٹ کو تھمادیا۔

اس نے جارج کی بات سنی لیکن صاف ظاہر تھا کہ اس کا جوش و خروش پہلے سے بہت کم ہوگیا ہے۔ وہ مجبوراً جارج کی گواہی سنتا رہا جس سے چوہدری دلاور واقعی خطرناک مجرم ثابت ہوتا تھا۔ میں نے "صرف" کا لفظ استعمال کیا تھا مگر مجھے کم امید تھی کہ جارج اسے نوٹ کرے گا۔ اندیشہ ضرور تھا کہ وہ اشتعال کے جذبات میں چوہدری دلاور کو گالیاں دے گا تو اس کے خلاف پوری فردِ جرم پڑھ دے گا۔

سارجنٹ کے اور جارج کے درمیان خاصے زوردار مکالمے ہوئے تھے۔ سیاہ و سفید نسلوں کے تعصب کی بنیاد پر بھی انہوں نے ایک دوسرے کو گالیاں دیں مگر سارجنٹ اپنے مطلب کی بات معلوم کرنے میں کامیاب رہا۔ اگر اسپیکر والا فون ہوتا تو ہم جارج کی بات بھی سنتے۔ سارجنٹ کے یک طرفہ مکالموں سے بھی ہم نے اندازہ کرلیا کہ جارج نے ہمارے بیان کی تصدیق کردی ہے۔

"اچھا کالے کتے اب بھونکنا بند کرو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے وکیل کا نام کیا ہے اور ٹیلی فون نمبر کیا ہے؟ بولو بکواس مت کرو" سارجنٹ نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور پھر ریسیور کو زور سے کریڈل پر مارا "باسٹرڈ۔"

میں نے کہا "تمہارا چہرہ سرخ ہورہا ہے۔ ماتھے پر پسینا ہے، کہیں تم کو ہارٹ اٹیک تو نہیں ہورہا ہے۔"

"تمہارا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا ہے بگ گن کے" محسن بولا "تم مجھے کچھ پریشان بھی نظر آرہے ہو۔"

"صرف تمہارا خیال ہے" وہ غرا کے بولا اور پھر جارج کے وکیل کا نمبر ملانے لگا۔

حسبِ توقع الفریڈ نے سارجنٹ سے بات کرنے سے انکار کردیا۔ اس کی سیکریٹری نے کہہ دیا کہ وہ کلائنٹس کے ساتھ مصروف ہے اور اسے ڈسٹرب نہیں کیا جاسکتا۔ جب وہ فارغ ہوگا تو تمہیں فون کرے گا۔

سارجنٹ نے سخت توہین محسوس کی "کیا سمجھتا ہے وہ خود کو آخر۔ میرا کون سا ذاتی کام تھا۔ اب اس کا فون آنے تک تم بیٹھو۔"

میں نے کہا "کیا میں کوشش کرکے دیکھ سکتا ہوں۔ شاید پولیس مین کے مقابلے میں وہ اپنے ہم پیشہ وکیل کی بات سننے کے لیے وقت نکال لے۔"

اس نے فون میری طرف کھسکا دیا۔ میں نے نمبر ملا کے اس کی سیکریٹری سے کہا "میں وقار یوسف ایڈووکیٹ بول رہا ہوں۔ مجھے ایک کلائنٹ کے مسئلے پر ضروری بات کرنی ہے۔ معاملہ اس کی زندگی اور موت کا ہے۔"

سیکریٹری نے لائن ملادی۔ میں نے الفریڈ کی ہیلو سنی۔

"آئی ایم سوری کہ میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ دراصل مجھے پولیس نے پکڑ لیا ہے" میں نے کہا۔

"پھر کیا تم مجھ سے توقع رکھتے ہو کہ میں کلائنٹس کو چھوڑ کے تمہاری ضمانت کرانے کے لیے دوڑا چلا آؤں۔"

"سنو لو۔ یہاں ایک سارجنٹ موجود ہے جو ہماری بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔ تم ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس کے ملزم کو جانتے ہوگے۔"

"وہ کون ہے؟"

"چوہدری دلاور۔ اسی کی وجہ سے وہ نیگرو جارج جیل میں بند ہے۔ اس نے جارج کو بھی جیل میں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"او ویل، مجھے یاد آگیا۔ اب کیا معاملہ ہے؟"

میں نے کہا "ہم چوہدری دلاور کو لاہور کی عدالت میں پیش کرنے کے لیے لے جارہے تھے جہاں ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس کی سماعت جاری ہے۔ اس کیس میں جارج کو بطور عینی گواہ پیش ہونا تھا۔"

"تھا کیا مطلب "اب اس کی ضرورت نہیں رہی؟"

"غالباً نہیں۔ ملزم کو خدا نے سزائے موت سنادی ہے۔ اس کا برین ٹیومر تشخیص ہوا ہے۔ بالکل آخری یعنی چوتھا اسٹیج۔ شاید اتنے کم وقت میں عدالت فیصلہ نہ سنا پائے۔ فیصلے پر عمل درآمد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ایک مفرور مجرم ہے اور ہم اسے پکڑنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ہم اسے خصوصی انتظامات کے تحت چارٹرڈ فلائٹ سے لاہور لے جارہے تھے کہ اس سارجنٹ نے غلط پارکنگ پر ہمیں پکڑ لیا اور یہاں لے آیا۔ کیا تم اسے بتاسکتے ہو کہ ہم نے اسے کوئی جھوٹی کہانی نہیں سنائی تھی۔"

"اسے فون دو۔"

میں نے فون سارجنٹ کو تھمادیا "مسٹر الفریڈ کا پیغام تمہارے لیے ہے۔"

ان کے درمیان خاصی تلخ کلامی ہوئی۔ پھر سارجنٹ نے فون رکھ دیا "میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔"

"تمہارے بغیر؟" میں نے کہا۔

محسن بولا "اس کے علاوہ... جہنم میں جانے کا بھی وقت مقرر ہے۔ تم نے ٹانگ نہ اڑائی ہوتی تو اس وقت ہم پیرس میں ہوتے۔ بتاؤ کہ ہمارا مجرم مریض کہاں ہے؟"

"میں نے کہا ہے کہ ایمبولینس کو یہاں بھیج دیا جائے۔"

محسن نے اردو میں کہا "الّو کا پٹھا۔ ہمارے پروگرام کا بیڑا غرق کردیا۔"

میں نے کہا "خدا کا شکر ادا کرو بھائی کہ اتنی آسانی سے جان چھوٹ گئی ورنہ مجھے تو صاف نظر آرہا تھا کہ اس کے کام سے اگر ہمارے سامان کی تلاشی لی جاتی تو بہت سے مسئلے کھڑے ہوجاتے۔ سامان میں اسلحہ بھی تھا اور..."

"اور کیا... تقدیر قسم پر کسی کا نام نہیں تھا۔ اب اس جانباز دلاور سے دوبارہ رابطہ کیسے ہوگا۔ خبیث کیسے غائب ہوگیا۔"

"اچھا کیا اس نے غائب ہوکے۔ رابطہ پھر ہوجائے گا۔ ہمارے ساتھ وہ بھی پکڑا جاتا تو پتا نہیں کیا بک دیتا۔"

"اس کو کیا پتا ہوگا جس کی وجہ سے ہم پکڑے گئے تھے۔"

میں نے یہی سوال سارجنٹ سے کیا۔

اس نے کہا "گاڑی ٹریفک رول کی خلاف ورزی کے باعث اٹھائی گئی ہے۔ کچھ دیر میں یہاں پہنچ جائے گی۔"

میں نے کہا "گاڑی تم سنبھال کے رکھو۔ مالک خود لے جائے گا۔ اس میں ہمارا جو سامان تھا۔"

"اس کی ملکیت کا ثبوت دے کر تم لے جاسکتے ہو۔"

محسن نے کہا "کیا وہ ثبوت کافی نہیں تھا۔ میں نے تمہیں دلاور کی بیماری کا سارا ریکارڈ دکھایا تھا۔ میں بتاسکتا ہوں کہ اس میں کیا دوائیاں ہوں گی اور کیسے کپڑے ہیں۔ اگر ضمانت چاہیے تو میں فلاں شخص اپنی ضمانت کو بلالیتا ہوں۔"

"یہ کیا بلا ہے آخر۔ کس اخبار کا ایڈیٹر ہے؟"

"کسی بڑے اخبار کے ایڈیٹر کو بلا کے تمہاری بلاؤں کو اپنے پیچھے لگانے کے بجائے" میں نے کہا "اس اخبار کا نام "بھوت ٹائمز" ہوگا یا "بیڈ نیوز" ہوگا۔"

"اگر وہ ذمے داری قبول کرتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

میں نے طوطی صاحب کو فون کیا "جناب عالی میں سکندرِ اعظم ہوں۔"

"کون... اچھا اچھا۔ بھئی بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم کو دوں منصف غیرستان سے اپنے پاک وطن پہنچے اور خیریت سے اپنے ... تم نے میرے پاکستانی بھائی۔"

میں نے کہا "طوطی صاحب۔ اتنے کم وقت میں تو صرف الہ دین کے چراغ کا جن ہی لاہور پہنچا سکتا تھا۔"

"اچھا تو پھر خیر سے کہاں ہو؟ پیرس سے بول رہے ہو؟"

میں نے کہا "طوطی صاحب۔ میں لندن کے ایک پولیس اسٹیشن سے..."

وہ شاید اچھلے "پولیس اسٹیشن۔ یہی کہا تم نے۔ میں نے بھی ٹھیک ہی سنا۔ تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ تم نے بھی ماشاء اللہ کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ پوری کوشش کی تھی تھانے جانے کے لیے..."

"خدانخواستہ ہم گرفتار نہیں ہوئے ہیں طوطی صاحب۔"

طوطی صاحب کو کچھ مایوسی ہوئی "کیوں نہیں ہوئے... میرا مطلب ہے پھر پولیس کی حوالات میں کیوں بند ہو میرے پاکستانی بھائی۔ یہ گرفتاری نہیں تو پھر کیا ہے؟"

"محض ایک غلط فہمی کے باعث یہ ہمیں یہاں لے آئے۔"

"تو ان کی خوش فہمی، غلط فہمی سب دور کر... باز یہاں سے فوراً گیٹ آؤٹ ہوجاؤ جتنی جلدی ممکن ہو۔"

میں نے کہا "یہ ہم سے کوئی حوالہ چاہتے تھے۔ آپ یہاں آنے کی زحمت کریں اور ہمارے ضامن بن جائیں تو بڑی مہربانی۔ ہم نے کہا کہ لندن کی ایک مشہور شخصیت ہیں طوطی صاحب ایک بہت بڑے اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ کسی کے خلاف ایک قطعہ لکھ دیں تو وہ دنیا و عاقبت میں رسوا و روسیاہ ہوجاتا ہے۔ وہ ہمیں اچھی طرح جانتے ہیں اور ابھی ضمانت دینے آجائیں گے۔"

"کیوں نہیں میرے پاکستانی بھائی۔ ضمانت کیا چیز ہے، جان بھی حاضر ہے تمہارے لیے۔ ویسے کیا مضائقہ ہے اگر میں اس نگر کے برادرِ نسبتی کو بھیج دوں۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ اپنا چڑنو میں ماشاء اللہ سفارتی چیف رپورٹر نہیں ہے۔ وہ بھی بڑا حرامی ہے۔ خوب نمٹے گا ان سے 'بے اعتبارے کہیں کے'۔"

"اگر آپ خود زحمت کرتے تو ہماری توقیر بن جاتی۔ دراصل اب ہمیں صرف اپنا سامان واپس چاہیے۔ پھر ہم دلاور کے ساتھ روانہ ہوجائیں گے۔ آپ کا جو رعب و دبدبہ ہے..."

"اچھا پھر میں ہی زحمت کرتا ہوں۔ ذرا مجھے بتاؤ کہ تم ہو کس سمت میں میرے پاکستانی بھائی۔ مجھے اپنا تاریخ جغرافیہ سمجھاؤ۔"

میں نے کہا "یہ تو آپ اس گورے صیاد سے ہی سمجھ لیں جس نے ہم طائرانِ بے وطن کو اسیر کرلیا ہے۔"

سارجنٹ نے چونک کے بدمزگی سے کہا "اگر اس شخص کو انگریزی بولنی نہیں آتی تو یہ سیکھ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "انگریز وہ انگریزی اور انگریزی' دونوں کی ایسی تیسی کرکے زیادہ خوشی محسوس کرتا ہے۔"

ڈاکٹر شام کی کار پہلے سے نمودار ہوئی۔ اسے پولیس کا ایک ڈرائیور چلا کے لایا تھا۔ اس میں سے ہمارا سامان اتار کے باہر رکھ دیا گیا۔

"یہ گاڑی کب تک پولیس کی تحویل میں رہے گی؟" میں نے

www.paksociety.com

کہا۔

"جب تک مالک خود آ کے جرمانہ ادا نہیں کرتا۔ اور اسے یہاں لانے اور رکھنے کے اخراجات کا بل ادا نہیں کرتا۔"

میں نے اپنے دل میں کہا "اس کے لیے انتظار کرو یوم حساب کا۔"

محسن بولا "اگر تم وہیں غلط پارکنگ کا ٹکٹ دے دیتے تو تمہارا بہت سا وقت بچ جاتا۔"

طوطی صاحب تو ڈیڑھ گھنٹے بعد بڑی شان و شوکت سے تشریف لائے اور آتے ہی انہوں نے میز پر چھڑی بجا کے اعلان کیا "اب اس نظام کو بدلنا ہوگا۔ تم لوگ اب بھی حاکمانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہو۔ میں اپنے اخبار کے ذریعے پولیس کے محکمے کو تہس نہس کر دوں گا۔"

"پہلے تم اپنی شناخت کراؤ" سارجنٹ نے کہا۔

طوطی صاحب نے اپنا ایکریڈیشن کارڈ لہرایا "قلم میں بڑی طاقت ہے۔ قلم پہلے تلوار سے زیادہ طاقتور تھا۔ اب توپ سے زیادہ اور ایٹم بم ہے۔"

سارجنٹ نے کہا "یہ فارم سائن کرو۔ اپنے ایٹم بم سے۔"

طوطی صاحب نے خفگی سے کہا "غالباً اس نے بات بھی نہیں سمجھی ہوتی تو ادب سے بات کرتا۔ کیا اس کی انگریزی کمزور ہے؟"

میں نے کہا "ایسا ہی لگتا ہے۔ آپ یہاں دستخط کر دیں اور کل اس بدبخت کی شان میں ایک شعلہ لکھ کے آویزاں کرا دیں در خانے پر۔ خانے میں اجازت نہ ملے تو پولیس کی گاڑیوں پر لکھوا دیں۔ آخر ہمارے پیارے پاکستان میں بھی تو ہر بس ٹرک یہاں تک کہ رکشا کے پیچھے غضب کی شاعری کے نمونے نظر آتے ہیں۔"

"ایسا ہی ہوگا میرے پاکستانی بھائی" انہوں نے رخصت ہونے سے پہلے ہمیں عید ملنے کے انداز میں تین بار گلے لگا کے دبایا۔ سارجنٹ اس جذباتی منظر سے خاصا متاثر نظر آتا تھا۔

"صدقہ دینا کالے بکرے کا" طوطی صاحب نے فرمایا "بکرا نہ سہی کالا مرغا ضرور کاٹ دینا میرے پاکستانی بھائی۔ اللہ نے تمہاری عزت بچائی اور تمہاری دیسی کھال کو ولایتی چھترول سے بچایا۔"

"چھترول؟ ہم نے کون سا جرم کیا تھا۔۔۔؟"

انہوں نے مجھے آنکھ ماری "ایسا مت کہو۔ پوچھو کہ کون سا جرم نہیں کیا۔ بس ابھی ان کی آنکھوں پر اللہ نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں آگے سے کہ دور جاؤ اور سیدھے اپنے لور شریف پہنچ کے دم لو۔ وہ حرام الحرامی کہاں ہے چوہدری والا ور؟"

میں نے کہا "ہمیں ایمبولینس کا انتظار ہے۔ ورنہ ابھی تو ہم بھی نکل . . . یں گے۔"

طوطی صاحب کے جانے کے بعد بھی ہمیں مزید ڈیڑھ گھنٹہ انتظار میں صرف کرنا پڑا۔ میں نے اس مہلت سے فائدہ اٹھائے جیک عرف ہائی جیک کا سراغ لگانے کی ناکام کوشش کی۔ اس کی خیالی محبوباؤں نے اس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ اسے آج شام پیرس جانا تھا۔

میں نے کہا "جس کے ساتھ جانا تھا میں وہی بدقسمت ہوں۔ وہ اچانک غائب ہو گیا۔ اب میں کیا کروں۔۔۔؟"

"تم اسے ائرپورٹ کے پاس چارلی کے شراب خانے میں دیکھ سکتے ہو۔ آج کل وہ ایک دوشیزہ کو اپنے سچے عشق کا یقین دلا رہا ہے جیسے اس نے مجھے دلایا تھا" اس کی غصیلی زہریلی محبوبہ نے کہا "میں نے منگنی کی انگوٹھی اس کے منہ پر ماری تھی۔"

"وہ سچ بولتی ہے۔ شادی کی پیش کش اسی کو کرتا ہوں جس کے بارے میں یقین ہو کہ وہ منگنی کی انگوٹھی منہ پر مار دے گی" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے چارلی کے شراب خانے فون کیا۔ پس منظر میں سنائی دینے والے شور کے ساتھ کسی نے کہا "ہیلو۔"

میں نے کہا "کیا جیک یہاں موجود ہے؟ ہائی جیک!"

"ہائی جیک۔ وہ یا نگت۔۔۔ میں نے اسے ابھی دیکھا تھا۔ ایک منٹ ٹھہرو" وہ بولا اور پھر اس نے چلا کے کسی سے کہا "اس ہوائی گھوڑے کا فون ہے۔"

ہوائی گھوڑا اس کا نہایت مناسب نام تھا۔ اس نے بڑی ادا سے ہیلو کہا۔

میں نے کہا "یوں لگتا ہے جیسے ٹیلی فون کا ریسیور تمہارے منہ سے تین فٹ دور ہے۔"

"بالکل ٹھیک لگتا ہے تمہیں۔ ایک فٹ کے فاصلے پر کوئی اور ہے مگر تم کون ہو؟" اس کی آواز کچھ واضح ہوئی۔

"وہی جس کو جانا تھا جہاز سے مگر جا پڑا پولیس کی کال میں۔"

"اوہ۔ میں نے تو دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ اسی لیے میں بھاگ گیا۔ خیر اب بتاؤ کتنے مہینے یا کتنے سال بعد پروگرام ہے؟"

"مہینے سال کیا مطلب۔۔۔"

"مطلب یہ کہ جیل کتنے عرصے کے لیے جاؤ گے؟ اس کے بعد ہی۔۔۔"

میں نے کہا "پرواز معمول کے مطابق آج شام ہوگی۔ تھوڑی سی دیر ضرور ہو گئی ہے۔ مگر پرواز منسوخ نہیں ہوئی۔ میں ذرا امیگریشن کو ان کی غلطی پر معاف کرنے میں مصروف ہوں تم کہاں ملو گے؟"

"وہیں جہاں تم نے فون کیا ہے" وہ بولا۔

"اتنی مت پی لینا کہ جہاز کو بحری جہاز سمجھ کے سمندر میں اتار دو۔"

وہ ہنسا "تمہیں تیرنا نہیں آتا شاید۔"

پولیس اسٹیشن کے اس کمرے میں دوسری میز پر ایک اور پولیس افسر کسی جوڑے سے الجھ رہا تھا۔ اور بھی کئی لوگ اس رپورٹ میں آئے اور کوئی بات کر کے چلے گئے۔ کمرے کی کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ برآمدے میں پولیس کے اہلکاروں کی مسلسل آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ ان میں پولیس والیوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ وہ سب اسمارٹ اور مصروف نظر آتے تھے۔ کسی کو گپ لگانے کی فرصت نہیں تھی۔ آتے جاتے کسی سے سلام دعا، ہنسی مذاق کی بات ہو گئی تو ہو گئی ورنہ ہر ایک اپنے کام میں مگن تھا۔ لوگ بھی ڈیوٹی پر تھے مگر اسی طرح جیسے اسپتال یا کسی سرکاری آفس میں۔ وہ پریشان تو نظر آتے تھے، پولیس کے پاس جانے والا پریشانی کا شکار ضرور ہوتا ہے مگر مجھے کوئی خوف میں جلتا نظر نہیں آیا۔ کسی کی صورت پر وہ وحشت کے اثرات نہیں دکھائی دیتے جو ہمارے ملک میں شریف آدمی کی صورت پر بھی تھانے میں قدم رکھتے وقت دکھائی دیتے ہیں۔ تھانے انتہائی بدنام عقوبت خانے اور بدترین ذہنی اذیت، ذلت اور رسوائی کی علامت بن کے رہ جاتے ہیں۔ یہاں قانون کے نام پر انسانیت سوز مظالم کا سلسلہ دن رات جاری رہتا ہے۔ بے گناہوں پر تشدد، رشوت خوری، ناانصافی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر اور قانون کے نام پر بددعا لگنے والوں کے لیے عقوبت خانے وار گشت رہتے ہیں۔ حوالات میں جم موٹا قیدی پڑے رہتے ہیں۔ زبونی افسر اور منشی سودوں میں مصروف نظر آتے ہیں اور باہر اندر پریشان حال مظلوم "داد خواہ" دست بستہ فریاد کناں مال لانے اور کھلانے کی کوشش میں خوار پھرتے ہیں۔

یہاں ایک دوستانہ اور پُر سکون فضا تھی۔ کسی کے ساتھ زیادتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عام شہری اس وقت تک معزز اور قابلِ احترام تھا جب تک کہ مجرم نہ ہو۔ یہ یورپی معاشرتی رویے اور صدیوں کے ذرا جمہوری نظام کے علاوہ تعلیم اور تہذیب کا عکس تھا جو صرف پولیس کے کردار میں ہی نہیں، عام لوگوں کے معاملات میں بھی نظر آتا تھا۔ اپنے ملک کے بارے میں یہی کہا جا سکتا تھا کہ جیسی روح ویسے فرشتے۔ جس قسم کے مجرم تھے ویسی ہی پولیس تھی۔ یہ فرق ضرور تھا کہ وہاں مجرم اور پولیس کے درمیان تعاون کا جذبہ اور رشتہ زیادہ فروغ پا رہا تھا اور عام آدمی دونوں کے گٹھ جوڑ کی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہا تھا۔

ثما اور محسن بے چینی سے ایمبولینس کے آنے کا انتظار کر رہے تھے جب اندر آنے والا ایک پولیس افسر مجھے دیکھ کے ٹھٹکا اور کچھ سوچنے لگا۔ اس کی نظر چند لمحوں کے لیے میری صورت پر جم گئی پھر وہ آہستہ آہستہ میری طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے" وہ بولا۔

میں نے پُرسکون اور پُراعتماد رہتے ہوئے مسکرا کے کہا "اگر تم کہو تو مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ یہ دنیا بہرحال اتنی بڑی جگہ نہیں ہے اور پھر لندن۔۔۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "تمہارا۔۔۔ سر رچرڈ گورڈن کے کسی معاملے سے تعلق تھا رائٹ؟" اس نے چٹکی بجائی۔

"سر رچرڈ گورڈن!" میں نے بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے محسن کی طرف دیکھا "اس نام کا تو کوئی فلم ایکٹر بھی نہیں۔ سر رچرڈ برٹن ضرور تھے، الزبتھ ٹیلر کے ... شوہر۔"

محسن نے کہا "مذاق کی بات نہیں۔ ہم کسی رچرڈ گورڈن کو نہیں جانتے۔"

جو سارجنٹ ہمیں اپنے ساتھ لایا تھا وہ اٹھ کھڑا ہوا "میں اب جا رہا ہوں۔ آئی ایم سوری کہ مجھ سے صورتِ حال کو سمجھنے میں غلطی ہوئی اور آپ لوگوں کا تھوڑا سا وقت ضائع ہوا۔"

"کوئی بات نہیں، ایسا بھی ہو جاتا ہے کبھی" میں نے بے حد شائستگی سے کہا۔

محسن نے بھی بھرپور اطمینان کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ "قانون سے تعاون کرنا ہر مہذب شہری کا فرض ہے۔"

ہمارے رویے کی اس تبدیلی نے اسے کچھ حیران کیا "تم چاہو تو پھر سینٹ خاص اسپتال فون کر کے معلوم کر لو۔ آخر ایمبولینس ابھی تک کیوں نہیں پہنچی۔"

میں نے کہا "تمہاری ایک تجویز تھی کہ ہم سینٹ خاص اسپتال کی خصوصی سروس ایمبولینس حاصل کر لیں اور مریض کو اسی میں یہاں لے جائیں۔"

"ہاں۔ ان کے چارجز کچھ زیادہ ہوں گے" اس نے میز پر رکھی ہوئی کیپ اپنے سر پر رکھی "تم بات کر کے دیکھ لو۔"

میرا مقصد اس گفتگو کو طول دینے سے صرف یہ تھا کہ دوسرا پولیس افسر ٹل جائے مگر وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے فوراً خالی ہو جانے والی کرسی پر قبضہ کر لیا "یہاں تم کس سلسلے میں آئے تھے؟"

میں نے کہا "ہم نے غلط جگہ گاڑی کھڑی کی تھی۔"

وہ حیرانی سے بولا "اس جرم میں پولیس اسٹیشن کوئی نہیں لایا جاتا۔ ٹکٹ جاری ہو جاتا ہے۔"

محسن بولا "گاڑی میں ایک مریض بھی تھا۔ اس کی حالت کافی خراب تھی اور ایمبولینس نہیں مل رہی تھی۔ جو آفیسر ابھی گیا ہے، اسی نے ہماری مدد کی۔ پولیس ایمبولینس منگوائی اور پھر اسے سینٹ خاص اسپتال بھیجا۔"

"اس نے تمہاری مدد کی، پھر وہ معذرت کیوں کر رہا تھا کہ اس کی وجہ سے تمہیں پریشانی ہوئی۔"

میں نے کہا "دراصل گاڑی ایک ڈاکٹر کی تھی۔ وہ ایمبولینس لینے گیا تو گاڑی غلط جگہ کھڑی کر گیا جلدی میں۔ اتنی دیر میں یہ آفیسر آ گیا۔ وہ ہم سے سوال جواب کرنے لگا۔ ہم نے کہا کہ نہ گاڑی ہماری ہے اور نہ ہم اسے چلا رہے تھے۔ ہم نے اسے کاغذات بھی

www.paksociety.com

دکھا دیے۔ پھر وہ کہنے لگا کہ مریض کی حالت نازک ہے اور تم نے اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال رکھا ہے۔ ہم نے بتایا کہ ڈاکٹر شاہ بہت دیر سے ایمبولینس کا بندوبست کرنے گئے ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں' ان کے ساتھ کیا ہوا کہ وہ لوٹ کر نہیں آئے۔ اس نے مریض کو ایمبولینس میں اسپتال بھیج دیا اور ہمیں گاڑی کے ساتھ یہاں لے آیا۔ گاڑی اب پولیس کی تحویل میں ہے اور ڈاکٹر شاہ خود لے جائے گا۔ ہماری شناخت کے لیے ایک وکیل اور ایک اخبار کے ایڈیٹر آگئے تھے۔ ظاہر ہے اس میں وقت ضائع ہوا۔ اب ایمبولینس آجائے تو ہم جائیں' ہمیں اسپیشل چارٹرڈ فلائٹ سے پیرس جانا تھا۔"

"پیرس کے لیے چارٹرڈ فلائٹ؟" وہ بولا۔

"پیرس سے ہمیں اپنی بیویوں کو ساتھ لینا نہ ہوتا تو ہم چارٹرڈ فلائٹ کو براہ راست پاکستان لے جاتے" میں نے کہا۔

"پاکستان!" وہ سوچ میں پڑ گیا "کیا لاہور پاکستان کا شہر ہے۔"

"آف کورس! ایک قدیم تاریخی اور تہذیبی شہر۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

"وقار یوسف۔ میں ایک بیرسٹر ہوں۔"

"اور میں ایک جرنلسٹ" محسن نے کہا "کیا تم بھی ہمارے پاسپورٹ دیکھو گے؟ آخر ایسا کیوں ہے۔ برطانیہ میں ہر پولیس مین پاکستانیوں کے خلاف اس قسم کے پُرتعصب رویے کا مظاہرہ کیوں کرتا ہے؟"

"یا ہم صورت سے اتنے مشکوک لگتے ہیں" میں نے خفگی سے کہا۔

"آئی ایم سوری!" اس نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا اور اٹھ کے باہر نکل گیا۔

"شیرانی صاحب! صورت حال گمبھیر ہو گئی ہے اچانک۔" محسن نے کہا "کیا کریں یار! داور کو چھوڑ کے بھی تو نہیں جا سکتے۔"

"ایمبولینس کہاں رک گئی آخر۔۔۔؟"

محسن بولا "کہیں ایسا تو نہیں کہ۔۔۔ داور جاگ گیا ہو اور ہوش میں آتے ہی اس نے ایمبولینس ڈرائیور سے کہا ہو کہ وہ راستہ بدل لے۔"

"مگر وہ پولیس کی ایمبولینس ہے۔"

"داور صرف ایک مریض ہے' کوئی ملزم نہیں۔ ایمبولینس اسے کہیں بھی پہنچا دے گی" محسن نے کہا۔

"کیوں نہ ہم چارلی کے شراب خانے پہنچ جائیں" میں نے کہا "وہاں ہائی جیک ہوگا۔ اگر اس وقت تک ایمبولینس یہاں پہنچے گی تو اس کے لیے پیغام چھوڑ جائیں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ایمبولینس وہیں آجائے گی۔ ہم اتنی دیر میں ہائی جیک سے فلائٹ کا نیا ٹائم طے کر لیں گے۔"

"یہاں سے ہم ٹیکسی سے جا سکتے ہیں" میں نے کہا۔

ہم ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کمرے میں ہمارے سوا اب کوئی نہیں تھا۔ ہمارا سامان جو درحقیقت داور کا تھا' برآمدے میں رکھا ہوا تھا۔ اچانک ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور ہم نے اسی پولیس آفیسر کی آواز سنی جو ہم پر شک کر رہا تھا کہ ہمارا رچرڈ گورڈن کے کسی معاملے سے تعلق ہے۔ وہ کسی سے فون پر گفتگو کر رہا تھا۔

میں نے اس کی زبان سے سر رچرڈ گورڈن کے الفاظ سنے۔ پھر اس نے شیشے کے پیچھے سے ہمیں دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔

اس کے اشارے کا مطلب واضح تھا۔

اگر واسطہ اپنے وطن کی پولیس سے ہوتا تو پریشانی کی انتہا میں بھی ناامیدی کی بات کوئی نہ ہوتی۔ بیشتر معاملات میں وہ خواہ مخواہ چیرہ دستانہ سوچ میں سختی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ ان کے رویے میں ایسی نرمی اور لچک پیدا ہو جاتی ہے کہ ملزم کچھ دار ہو اور استطاعت رکھتا ہو تو قانون کی آہنی فصیل میں بہت سے چور دروازے پیدا ہو جاتے ہیں۔ "جیو اور جینے دو" کے اصول پر عمل کرنے سے سب مطمئن رہتے ہیں۔ پولیس پر بلاوجہ تفتیش کا بوجھ نہیں رہتا اور وہ اپنا قیمتی وقت دیگر جرائم کی سرکوبی میں صرف کر سکتے ہیں۔ تھانے میں نئے نئے چہرے روز نظر آتے رہیں تو رونق رہتی ہے۔ پھر فریادی یا فریقین بھی عدالتی چکروں سے' اخراجات اور پیروی کے مرحلوں کی زحمت سے بچ جاتے ہیں۔ عدالتوں میں مقدمات کی تعداد نہیں بڑھتی۔ ملک کو ایسے فوائد سے ولایتی پولیس غالباً پوری طرح آگاہ نہیں تھی۔

ایسا بھی کئی بار ہوا تھا کہ مجھے ہر طرف سے نرغے میں لے لیا گیا مگر زور بازوئے مسلم سے کام لیتے ہوئے میں نے بدخواہوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بالآخر ایسے نکل گیا جیسے دوڑتی گاڑی کے اندر سے ہوا نکل جاتی ہے۔ ہوا کو کون پکڑ سکتا ہے' گاڑی رک جاتی ہے۔

یہاں صورت حال یکسر مختلف تھی۔ یہ لوگ اصولوں کے معاملے میں ذاتی رویے میں کوئی لچک نہیں رکھتے تھے اور پولیس تو ادائے فرض کو عین ایمان سمجھتی تھی۔ نہ انہیں آنکھ مار کے میں سرگوشی میں کہہ سکتا تھا کہ چھوڑو یار شاہو' آپس کی بات ہے تو بڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اور بات شروع ہوتی تو یہیں ختم بھی ہو جاتی۔ نہ میں ان کارٹونوں کے فلمی ہیرو کی طرح گھٹنوں کے بیچ لگا کے اپنے سلطان راہی اسٹائل میں تنتنا لہراتے ہوئے توڑ کر نکل سکتا تھا۔

ٹیلی فون پر بات کرنے والے سارجنٹ نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا تو مجھے رکنا پڑا۔ میرے آس پاس درجنوں پولیس والے مسلح پھر رہے تھے اور میرے لیے وہاں سے فرار کے امکانات صفر سے بھی کم تھے۔ وہ سب فراری کوشش ناکام بنانے کے لیے مستعد اور متحد ہو جاتے اور مجھے وہیں کتے کی موت مار دیتے یا مجھے پکڑ لیتے اور

میرے جرائم کی سنگینی میں سنگین اضافہ ہو جاتا۔ وہ شریف آدمی کے ناتے قانون کے مطابق برتاؤ کرتے ہیں لیکن جو مجرم قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں رہتا۔

سارجنٹ فون رکھ کے تیزی سے باہر لپکا "کیا تم کچھ دیر اندر بیٹھ کے انتظار کرو گے!" اس نے ہمیں واپس جانے کا اشارہ کیا۔

میں نے متانت سے کہا "اب کیا نئی بات ہو گئی؟"

محسن نے کہا "جس شخص نے ہمیں غلط پارکنگ پر گرفتار کیا تھا وہ مطمئن ہو گیا' تم نے گاڑی اپنی تحویل میں لے لی۔ ہم نے ضمانت فراہم کرا دی۔"

اس نے سختی سے کہا "شٹ اپ اور جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو۔"

میں نے کہا "تمہاری دخل اندازی کے باعث ہمیں پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔"

محسن نے دروازے سے باہر کمرے میں قدم رکھا "اگر مریض کو کچھ ہو گیا۔۔۔؟"

سارجنٹ ہمارے پیچھے پیچھے اندر آ گیا "کچھ نہیں ہوگا اسے۔ میں نے کہہ دیا ہے اسے سینٹ تھامس اسپتال والے نہیں رکھتے تو پولیس کی تحویل میں رکھتے ہوئے کسی بھی دوسرے اسپتال میں داخل کرا دو۔"

میں نے اپنی تھوڑی بلند رکھتے ہوئے کہا "کیا تم بتا سکتے ہو کہ آخر تمہیں کیا پریشانی ہے؟"

محسن نے بھی سہلایا "کیا شک ہے تمہیں آخر؟"

اس نے ہمارے سامنے بیٹھ کے ہمیں گھورتے ہوئے کہا "تمہاری اداکاری قابل تعریف ہے لیکن یہ تھیٹر کا اسٹیج نہیں' پولیس اسٹیشن ہے' اس لیے سچ سچ بتا دو۔"

"سچ کے علاوہ ہم کچھ بتانا پسند بھی نہیں کرتے" میں نے کہا۔

محسن بولا "لیکن تم جھوٹ پر اعتبار کر سکتے ہو تو۔۔۔"

اس نے میز پر مکا مارا "یو بلڈی سن آف اے بچ۔۔۔ تم تو کل ہی گئے تھے اپنی باتوں سے سب کو الجھا کے' میں نے بروقت تمہیں پہچان لیا۔"

میں نے کہا "اپنے جذبات کو قابو میں رکھو۔ ہمارا ضامن کوئی معمولی آدمی نہیں' ایک اخبار کا ایڈیٹر ہے۔"

"اخبار کے ایڈیٹر کیا فرشتے ہوتے ہیں؟" اس نے نفرت اور حقارت سے کہا "جوتی کی نوک پر رکھتا ہوں میں ان اخبار والوں کو۔ ان سے بڑا حرامی کوئی نہیں ہوتا۔ میرا بس چلے تو ان سب کو اخبار نکالنے کے جرم میں بند کر دوں۔"

"اخبار والے تمہیں من مانی نہیں کرنے دیتے اور سچ چھاپ دیتے ہیں اس لیے؟" میں نے کہا۔

کوتوال نے کہا "ہم تمہاری رائے سے سب اخبار والوں کو مطلع ضرور کرتا اگر موقع ملے۔ سب بلیک میلرز' رائی کا پہاڑ بنانے والے اور اسکینڈل باز' مافیا ہے ان کی بھی۔"

"یہ تم اپنے ملک کے گورے اخبار والوں کے بارے میں فرما رہے ہو تو ممکن ہے سچ ہو" میں نے کہا۔

محسن بولا "لیکن ہمارے پاکستانی صحافی ایسے نہیں ہوتے۔"

وہ بھڑک اٹھا "کیا انڈین اور کیا پاکستانی' تم سب کالے لوگ پیدائشی طور پر حرامی ہوتے ہو اور یہاں آکے تم لوگوں نے حرامی پن کی انتہا کر دی ہے۔ ہماری سوسائٹی کی ساری روایات کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔"

میں نے مشتعل ہو کے کہا "لیکن جو کچھ تمہارے آباؤ اجداد نے انڈیا میں کیا تھا یہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ غلامی سے آزادی اور جمہوریت کے دوغلے نظریات پر تم آج بھی عمل پیرا ہو۔ جنوبی افریقہ میں تمہاری نسل پرستی کے انسانیت سوز مظالم پر شیطان کو بھی شرم آتی ہوگی۔"

اس نے دہاڑ کے کہا "میں تمہیں قتل کر دوں گا اگر تم نے بکواس بند نہ کی۔"

"تھانے میں بہادر بن رہے ہو" میں نے کہا "ہمت ہے اور اپنے مرد باپ کی حلالی اولاد ہو تو یہ ریوالور رکھو ایک طرف اور مجھے قتل کرنے کی کوشش کر کے دیکھو۔ اس ریوالور کے ساتھ تو ایک نامرد اور بچہ بھی پہلوان کے مقابلے پر آجاتا ہے۔"

"او کالے کتے! میں تمہیں وہ سبق سکھاؤں گا" اس نے شدت طیش کے عالم میں کھڑے ہو کے ریوالور میز کی دراز میں رکھ دیا۔

"تمہارا تو وہ حال کروں گا میں کہ تمہاری ماں بھی پچھتائے گی کہ اس نے تمہیں پیدا ہی کیوں کیا تھا" میں نے اسے مزید غصہ دلایا۔

ہماری چیخ پکار پر ساتھ والے کمروں سے دو پولیس افسر اور دو لیڈی پولیس۔۔۔۔۔ کمرے میں آ گئی "کیا ہو رہا ہے؟" ایک پولیس مین بولا۔

میرے حریف کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا "کوئی بیچ میں نہ بولے' میں اس کالے غلام زادے کا دماغ درست کرنا چاہتا ہوں۔"

"آر یو میڈ؟ تم اس سے لڑو گے؟" ایک خاتون پولیس آفیسر نے تحکمانہ انداز میں چلا کے کہا۔

میں نے بھی آستین چڑھا کے کہا "اس سور کے بچے نے مجھے گالیاں دی ہیں' میرے باپ دادا کو گالیاں دی ہیں۔ اس نے سب کالے لوگوں کو حرامی کی اولاد کہا ہے' میں اس کی شکل ایسی کروں گا کہ یہ آئینہ دیکھنا چھوڑ دے گا۔"

وہ اچھل کر میرے مقابلے پر آ گیا "کوئی درمیان میں نہ آئے' میں اس کالے کتے کی ایسی تیسی کر دوں گا۔"

میں نے زمین پر تھوک کے کہا "تیری شکل پر لعنت سفید سور۔"

www.paksociety.com

محسن نے بھی میری حکمت عملی سمجھ لی تھی۔ اس اشتعال انگیزی اور مار دھاڑ کے نتیجے میں ہمارے قانون کی گرفت سے بچ نکلنے کے امکانات بہت کم تھے مگر جہاں کوئی راستہ نہ ہو وہاں ہلاکت خیز خطرناک راستہ بھی آزمایا جا سکتا ہے۔ ایک موہوم سی امید یہ بھی تھی کہ شاید پولیس فوراً قانونیت کا مظاہرہ کرنے کے بعد بدنامی کی تشہیر کے خیال سے معاملہ رفع دفع کرنا چاہے۔

سارجنٹ نے مجھ پر حملہ کرنے کے لیے اپنا بازو جیسے ہی کمرے میں نہیں باکسنگ رنگ میں ہیں۔ وہ یقیناً باکسر ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ بہت اچھا باکسر ہو مگر ایک تو اسے میرے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ دوسرے وہ غصے کا تیز تھا۔ کسی ملزم کے ساتھ باکسنگ کرنا ایک احمقانہ حرکت تھی۔ اس کے نام ساتھی اسے روکنے میں ناکام تھے۔ وہ اعلان کر چکا تھا کہ جو قریب آیا وہ بھی ناک آؤٹ کر دیا جائے گا۔

رنگ کا عظیم ترین باکسر بھی کسی جوڈو کراٹے جاننے والے کو شکست نہیں دے سکتا۔ مارشل آرٹ کا ماہر اپنے حریف کو نزدیک ہی نہیں آنے دے گا۔ باکسر کا پنچ اسی وقت کارگر ہو سکتا ہے جب وہ سامنے سے مارا جائے اور درمیانی فاصلہ ایک دو فٹ ہو۔ باکسر کا نشانہ سر یا پیٹ پر اس صورت میں لگ سکتا ہے جب اس کے ہاتھ وہاں تک پہنچ سکیں۔ مگر مارشل آرٹ کا ماہر لات گھما سکتا ہے اور لات کی مار ہاتھوں سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ بازوؤں کے مقابلے میں ٹانگ لمبی ہوتی ہے پھر مارشل آرٹ میں فلائنگ کک بڑا موثر وار ہے۔ باکسر ہوا میں اسے کیسے ناک آؤٹ کرے گا؟ فلائنگ کک سے باکسر گر جائے تو پھر اٹھے گا کیسے؟

اس مقابلے میں بھی یہی ہوا۔ کمرے میں پانچ چھ حضرات و خواتین جو پہلے اس متنازعہ لڑائی کے خلاف تھے اب اس کھیل میں دلچسپی لے رہے تھے۔ شاید اس یقین کے باعث کہ پولیس کے باکسر کے مقابلے میں میری عبرتناک درگت بننے والی ہے۔ میں ایک ہی مکے کی مار ہوں۔ اس کے بعد مجھ پر چودہ طبق روشن ہو جائیں گے اور دنیا میری نظروں میں اندھیر ہو جائے گی۔ میں رستم سے ٹکرا کے گروں گا تو مجھے دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوگا۔ خدا جانے یہ کسی کے ذہن میں کیوں نہیں آیا کہ مقابلے پر آنے والا بے وقوف کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

جب میں نے ایک دو وار خالی دیے اور یہ ظاہر کیا کہ میں صرف اناڑیوں کی طرح جان بچانے کی فکر میں ہوں تو خوش فہمی رکھنے والے ہنسنے لگے اور باکسر بھی مسکرانے لگا۔ وہ تھوڑا سا ایزی ہو گیا تھا کہ اب مقابلہ کیا 'بس رہ گئی ہے۔ کسی بھی وقت ایک ہاتھ مار کے کھیل ختم کر دوں گا۔ شغل کے لیے میں نے ادھر ادھر دوڑ کر بھی خود کو بچایا اور اس کے دو تین مکے میرے شانے اور سر پر رواجی سے لگے۔ میں گھومتے ہوئے وقت اور جگہ کی موزونیت کا جائزہ لیتا رہا اور جب میں نے محسوس کیا کہ میں زیادہ دیر یہ تماشا نہیں دکھا سکوں گا تو میں نے ایک ایڑی پر گھوم کے لات کو تقریباً پورا گھماتے ہوئے اس کی کمر پر رسید کیا۔ وہ سیدھا حاضرین کی طرف گیا جنھوں نے اسے سنبھال کے پھر میری طرف دھکیل دیا مگر اس ایک لات نے پل بھر میں کھیل کا نقشہ بدل دیا۔ اچانک سب نے سمجھ لیا کہ یہ اناڑی کی ٹکر نہیں تھی۔ اس میں پیشہ ورانہ مہارت، مشق اور تجربہ شامل تھا۔

دوسری طرف فوراً میں نے فلائنگ کک کا نمونہ پیش کیا۔ میرا حریف پلٹ کے فرش پر گرا مگر ہمت کر کے دوبارہ پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اچانک مسکرانے اور ہنسنے والے بے بس ہو کے خاموش ہو گئے۔ میں نے اسے اشارے سے قریب بلایا "کم آن۔ یو ڈرٹی سن آف اے....." میں نے اسے ایک گندی گالی دے کے اشتعال کی آگ پر تیل چھڑکا "میرے نزدیک آ کے دیکھو، تم مجھے قتل کرنا چاہتے تھے نا، آؤ ذرا ہاتھ لگاؤ مجھے۔"

وہ دیوانہ وار آگے بڑھا۔ میں نے اچانک ایک بار کا گھٹنا اوپر اٹھا دیا۔ گھٹنا اس کے پیٹ میں لگا۔ وہ بلبلا کے دہرا ہوا تو میں نے اس کی کمر پر کہنی ماری۔ پھر اسے کالر سے پکڑ کے کھینچا اور ان لوگوں کی طرف اچھال دیا جو اب تشویش اور اضطراب کا شکار تھے۔ وہ ان پر گرا تو اس کے ساتھ ہی دو افراد بھی گرے۔ ان میں ایک خاتون تھی۔ اس نے چیخ ماری۔

پھر پیچھے سے ایک اور شخص آگے آیا۔ اس کی وردی سے ہی ظاہر ہو گیا کہ وہ کیپٹن ہے "یہ کیا ہنگامہ ہے کیا تماشا ہو رہا ہے؟"

سارجنٹ ہانپتے ہوئے بولا "سر۔ اس کالے سور نے مجھے مارا ہے۔"

میں نے کہا "تم پھر مجھے گالیاں دے رہے ہو۔ میں نے بہت برداشت کیا تھا۔ آخر کیا سمجھتے ہو تم خود کو؟"

کیپٹن نے گرج کے کہا "شٹ اپ۔ سیدھے کھڑے ہو جاؤ دونوں۔"

ہم دونوں سیدھے کھڑے ہو گئے۔

"اب مجھے بتاؤ یہ مارپیٹ کیوں ہو رہی تھی؟"

میں نے کہا "یہ مارپیٹ نہیں تھی۔"

"پھر کیا تھا کیا میں نے خواب دیکھا تھا" وہ گرجتا رہا۔

"یہ ایک مقابلہ تھا جس کی دعوت مجھے خود سارجنٹ نے دی تھی۔ اس نے باقی سب لوگوں کو بھی مصالحت اور مداخلت سے روک دیا تھا، تم پوچھ لو ان سے۔"

"کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟" کیپٹن نے پلٹ کے سوال کیا۔

ایک لیڈی پولیس آفیسر نے اثبات میں سر ہلایا "معاملہ تو ہمیں معلوم نہیں مگر اس نے ہمیں منع ضرور کیا تھا۔"

میں نے کہا "اس نے مجھے، میرے باپ دادا کو، تمام پاکستانیوں کو اور کالے رنگ والوں کو شرمناک گالیاں دیں۔ میں اس کے خلاف احتجاج کروں گا۔ یہ ایک سنگین نسلی مسئلہ ہے۔ پولیس میں ایسے عناصر کو رہنے کا کوئی قانونی اور اخلاقی جواز نہیں جو نسلی بنیاد پر متعصب ہوں۔"

محسن نے کہا "یہ شخص انتہا پسند ذہنی مریض ہے۔ اس کا بھی ذہنی معائنہ ضروری ہے۔"

کیپٹن نے فوراً فیصلہ کر لیا "او کے۔ باقی سب لوگ جائیں اپنا کام کریں۔ تم لوگ میرے ساتھ ذرا میرے کمرے میں۔"

سارجنٹ نے فوراً یوسف لقمان میں شامل کرنے پر احتجاج کیا "کیپٹن یہ شخص ایک جعلساز ہے جو پولیس کو مطلوب ہے۔"

"یہ جو کچھ بھی ہے میں معلوم کر لوں گا۔" وہ بولا "تم کو جو کہنا ہے میرے کمرے میں چل کے کہو۔"

سارجنٹ کو پہلے موقع دیا گیا۔ اس نے کہا "سر یہ شخص غلط نام سے ہوائی سفر کرنے کے جرم میں لایا گیا تھا اور اس نے اپنی باتوں سے سب کو بیوقوف بنایا۔ ایک ایجنٹ کو بلا لیا جو اس کا ضامن بن گیا۔"

میں نے شور مچایا "ابھی یہ کہانی باقی ہے کہ تم نے اخبار والوں کے خلاف کیا شرمناک الزامات عائد کیے تھے۔"

"شٹ اپ۔ جب تمہاری باری آئے گی تو تم بولنا" کیپٹن نے کہا۔

"یہ شخص افغان ہے مگر میں نے اسے شناخت کر لیا ہے۔ یہ جو ظاہر کر رہا ہے اس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ یہ کئی سال پہلے حدود برطانیہ سے نکال دیا گیا تھا۔ دہشت گردی کے الزام میں۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ مجھے صرف ناپسندیدہ قرار دیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

کیپٹن نے کہا "کس وجہ سے؟"

"وجوہات بہت سی تھیں مگر اصل وجہ وہی ہے، نسلی تعصب۔"

"تم لوگ اس سے بہت فائدہ اٹھاتے ہو۔ قانون سب کے لیے ایک ہے مگر تم پر لاگو کیا جائے تو یہ تمہارا سیاسی نعرہ بن جاتا ہے" کیپٹن نے کہا۔

"اس کا اصلی نام بھی کچھ اور ہے سر" سارجنٹ بولا "جو مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے۔ تاہم یہ مجھے معلوم ہے کہ اس کو برطانیہ کی حدود میں داخلے کی اجازت کسی نے نہیں دی۔ یہ غیر قانونی طور پر لندن آیا ہے۔"

"مگر کیسے یہ سچ ہو تب بھی تم کو کس نے اختیار دیا ہے کہ مجھے گالیاں دو، میرے ہم وطن لوگوں کو، اخبار والوں کو اور دیگر لوگوں کو بلیک میلر، اسمگلر، دھوکے باز اور مافیا کے ایجنٹ کہو۔ تم صرف مجھے واپس بھجوا سکتے ہو۔"

محسن نے کہا "ہر سال ہزاروں افراد غیر قانونی طور پر برطانیہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جو پکڑے جاتے ہیں انہیں واپس کر دیا جاتا ہے۔"

کیپٹن نے کہا "کیا یہ ٹھیک ہے کہ تم بھی انہی میں شامل ہو؟"

میں نے اس وقت تک فیصلہ کر لیا تھا کہ میں کم سنگین الزام کو قبول کروں گا "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مجھے لندن آنا پڑا، پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر۔"

"آنا پڑا کیا مطلب....؟"

"میں ایک مجرم کی تلاش میں تھا۔ وہ پاکستان کی عدالتوں کو مطلوب ہے۔ اس نے یہاں دو قتل کیے تھے۔ پھر پاکستان میں اس نے ایک برطانوی شہری کا خون کیا۔ جو ڈاکٹر بھی تھا۔ جب گرفتاری کا وقت آیا تو وہ ملک سے فرار ہو گیا بلکہ جیل حکام کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل گیا۔"

"تم کیا ہو؟ اسے گرفتار کرنے کے لیے تم نے خود برطانیہ آنے کا رسک کیوں لیا۔ کیا یہ کام پولیس نہیں کر سکتی تھی؟" کیپٹن نے کہا۔

"نہیں۔ مجھے پولیس پر بھروسا ہوتا تو میں یہ رسک ہرگز نہ لیتا۔ میں ایک پڑھا لکھا معزز شہری ہوں۔ میں نے لندن میں چار سال رہ کے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ یہاں ایک نہیں، درجنوں معزز لوگ میرے آشنا ہیں۔ اس مجرم کے ساتھ میرا ایک ذاتی رنجش کا مسئلہ بھی تھا۔ اس نے میرے باپ کو بھی قتل کیا تھا۔ انتہائی بے رحمی سے۔ اس کے کاروبار پر، جائداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت میں لندن میں تھا۔ پھر اس نے مجھے جھوٹے مقدمات میں ملوث کرا دیا۔ پولیس کی مدد سے۔ اس نے پولیس کو بھاری رشوت دی۔ پولیس اسے کیسے پکڑ سکتی تھی۔ میں اسے گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ عدالت اس کو مفرور مجرم قرار دے چکی ہے۔ اگر مجھے برطانیہ آنے کی قانونی اجازت مل جاتی تو میں غیر قانونی طور پر یہاں نہ آتا مگر کراچی میں تمہارے ہائی کمشنر موصوف نے مجھے انکار کر دیا۔ یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ تم سن کے کیا کرو گے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ پابندی ہونے کے باوجود میں لندن آیا۔ کسی قسم کی دستاویزات کے بغیر۔ اب تم مجھے حراست میں لے کر کسی بھی فلائٹ سے واپس پاکستان بھیج سکتے ہو۔ اخراجات میں خود ادا کروں گا۔"

کیپٹن متاثر نظر آنے لگا "او کے۔ بیٹھ جاؤ یہاں اور مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیسے شروع ہوا تھا۔ سارجنٹ تم بھی اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ میں بعد میں ساری بات سن کے کوئی فیصلہ کروں گا۔"

سارجنٹ نے مجھ پر ایک قہر بھری نظر ڈالی "مجھے یقین ہے کہ اب بھی یہ سچ نہیں بول رہا ہے۔"

"سچ تم بتا سکتے ہو؟" کیپٹن نے برہمی سے کہا۔

"سچ لیڈی الزبتھ گورڈن بتا سکتی ہیں" اس نے کہا۔

کیپٹن حیران ہوا "کون۔ لیڈی الزبتھ۔ سر جارج گورڈن کی وائف؟"

"یس سر۔ ان کے شوہر نے اس شخص کے خلاف رپورٹ لکھوائی ہے۔"

کیپٹن نے کہا "الزام کیا تھا؟"

"قاتلانہ حملہ۔ دہشت گردی" سارجنٹ بولا۔

www.paksociety.com

کر سکتے ہیں۔"
"ہاں میں معلوم کراؤں گا۔"
"لیڈی الزبتھ خود آ رہی ہیں یہاں۔" سارجنٹ نے جانے جانے کہا "ویسے تک سر رچرڈ کوونان شہر میں نہیں ہیں۔ وہ ایک ہفتے کے لیے جینوا گئے ہیں کسی سرکاری وفد کے ساتھ۔"
"پھر تو ٹھیک ہے۔ صحیح صورت حال سامنے آ جائے گی۔ تم دیکھو لیڈی الزبتھ کو ریسیو کرو اور انہیں میرے کمرے میں لاؤ۔ ہم سارے معاملات کو SORT OUT کریں گے۔"
الزبتھ کے آنے کا سن کے ہی میرا دل بیٹھ گیا تھا۔ میں نے محسن سے کہا "محض اپنے شیروانی صاحب بھٹا بیٹھ گیا ہمارا۔"
محسن بولا "مجھے تو شاید وہ بخش دے، مگر تو مارا گیا۔"
کیپٹن نے میز پر ہاتھ مارا "یہ کیا بکواس ہے؟"
"یہ ہماری مادری زبان ہے" میں نے احتجاج کیا۔
محسن بولا "ہم انگریزی زبان کو بکواس نہیں کہتے تو تمہارے جذبات کیا ہوں گے۔"
"جذبات گئے بھاڑ میں۔ تم کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ اپنی مادری زبان میں باتیں کرو۔ جو کہنا ہے انگریزی میں کہو ورنہ چپ بیٹھو۔"
میں نے کہا "کس قانون کے تحت تم مجھے اپنی مادری زبان میں بات کرنے سے روک سکتے ہو۔"
"یہ میرا قانون ہے" وہ چلا کے بولا "آئی بات سمجھ میں؟"
"نہیں، لیکن ہم یہ ضرور سمجھ گئے کہ پولیس میں زیادہ تر لوگ ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا ہیں۔ اور متعصب ہیں۔"
اس نے اپنا سر پکڑ لیا "پھر وہی تعصب کی بات۔ اگر میں تم سے ہاتھ ملا کے مسکراتے ہوئے کہوں کہ جاؤ عیش کرو۔ تو میں ٹھیک ورنہ متعصب۔"
میں نے کہا "اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا ایسا نہ کہتے۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کے سچ سچ کہو۔"
اسی وقت ایک پولیس وومن نے دروازے سے سر اندر ڈال کے اعلان کیا "لیڈی الزبتھ آ گئی ہیں۔ کیا میں انہیں اندر بھیج دوں۔"
"کیا مجھے اس سلسلے میں تحریری احکامات دینے پڑیں گے۔" کیپٹن بولا۔
الزبتھ کو اپنے مقابل دیکھنے کے خیال سے ہی مجھے پسینا آ گیا۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس سے پھر ملاقات ہو گی اور وہ بھی بدلے ہوئے حالات کے اس قابل شرم ماحول میں۔ وہ آج ایک معزز برطانوی خاتون تھی اور میں جو کبھی اس کا پرستار تھا ایک مجرم بنا بیٹھا تھا۔
الزبتھ آئی تو میں اسے دیکھ کے مبہوت ہو گیا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین اور پرکشش ہو گئی تھی۔ شادی سے پہلے وہ ایک لڑکی تھی جس کی صورت پر نوجوانی کے جذبات کی شوخی اور معصومیت آمیز ادائے ناز آفرینی تھی۔ آج وہ ایک بھرپور عورت تھی جو اپنی قوت تسخیر پر غرور میں حق بجانب محسوس ہوتی تھی۔ اس کے حسن میں تھوڑی سی متانت نے زیادہ دلکشی پیدا کی تھی۔ اس کا بدن بھی بھر گیا تھا اور آج اس نے اپنی حیثیت اور مرتبے کے مطابق لباس پہنا تھا جس سے اس کی شخصیت میں وقار اور تمکنت کی دلنوازی آ گئی تھی۔ آغاز شباب کا لاابالی پن داستان ماضی ہو گیا تھا جب وہ اوٹ پٹانگ لباس پہن لیتی تھی اور صرف اپنے مخلص جذبات کو سرمایۂ حیات سمجھتی تھی۔ شاید آج وہ اپنے شعور کے اس دور کی بے پروائی پر خود کو شرمسار محسوس کرتی ہو گی اور وقت نے اسے بھی احساس دلا دیا ہو گا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ اس نے اپنے نسل اور خاندانی برتری کے احساس سے سمجھوتا کر لیا ہو گا اور آج اپنے حسب نسب، اپنے خاندانی روایات کے وارثوں، جدی پشتی اطلاقوں، اپنی معاشرتی اقدار اور اپنے بالا مرتبت شوہر پر اتنا ہی فخر محسوس کرتی ہو گی جتنا اسے اپنے بے پناہ حسن پر ناز ہو گا۔
ہم کتنی دیر خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ شاید اس کا خیال ہم دونوں کو نہیں تھا۔ وقت اچانک پیچھے چلا گیا تھا اور ایک عمر کی یادوں کا پورا البم کھل گیا تھا جس میں یادوں کے ہزار عکس تھے اور ہر عکس میں جذبات کی ساری رنگ آمیزی اور شوخی تھی۔
بالآخر کیپٹن نے کھنکار کے کہا "وہ... لیڈی الزبتھ۔ پلیز تشریف رکھیے۔ آپ بھی سر۔ آئی ایم سوری... ابھی تک میں نے آپ کا نام نہیں پوچھا۔"
الزبتھ کرسی پر بیٹھ گئی "میں بتاتی ہوں۔ اس کا نام سکندر بخت ہے۔ یہی ہے نا تمہارا نام... یا بدل گیا ہے؟"
میں نے کہا "اور سب کچھ بدل گیا ہے۔ سوائے میرے نام کے۔ تم مجھے اسی نام سے پکار سکتی ہو مگر میں تمہیں لیڈی کوونان کے بجائے الزبتھ کہوں تو شاید یہ بے ادبی شمار ہو گی۔"
"فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ بولی "دوستوں کے لیے میں الزبتھ ہی ہوں۔"
کیپٹن کو اچانک صورت حال کا احساس ہو گیا تھا۔ جس کے ساتھ وہ پولیس اسٹیشن میں ایک مجرم کا سا سلوک کر رہا تھا وہ ایک انتہائی معزز لیڈی کا پرانا دوست تھا۔ اس نے کہا "ویری گڈ۔ آپ لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہیں۔ میرا مطلب ہے پرانے دوست ہیں۔"
میں نے کہا "ہم دوست ضرور تھے، کیوں الزبتھ؟"
الزبتھ نے مجھ سے نظریں چرا کے کہا "ہاں کیپٹن۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں کچھ دیر مسٹر سکندر بخت سے۔"
"کیوں نہیں" وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا "میں بے حد معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو یہاں آنا پڑا۔ دراصل کسی کو علم نہیں تھا۔ خیر۔ کیا پینا چاہیں گی آپ؟"

دینے کے بولنے سے پہلے میں نے کہا "کافی پلیز... بلیک۔"
محسن نے بھی اٹھتے ہوئے کہا "میں ذرا کیپٹن سے گپ شپ کر لوں۔"
میں نے اردو میں کہا "اسے سمجھا دو کہ ہمارے تو خاندانی وہ ہیں اور خاتون کے والد تو بضد تھے مجھے اپنی فرزندی میں لینے کے لیے مگر ہم مشرقی لوگ اپنی وضع داری اور خاندانی روایات سے انحراف نہیں ہو سکتے۔"
"خرافات بھی مت کرو۔ ایسی گولی دیتا ہوں سب کو کہ یاد کریں، بس تو اسے شیشے میں اتار لے۔ کسی طرح اسے اتنا جذباتی کر دے کہ یہ تیری میری ساری خطائیں معاف کر دے اور..."
میں نے کہا "پلیز گیٹ آؤٹ۔"
جب دروازہ بند ہو گیا تو میں نے کہا "الزبتھ۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ تم بھی تو ایسا ہی سمجھتی ہو۔"
"کیا ایسا نہیں ہے؟" وہ بولی۔
"نہیں۔ تم بہت اچھی طرح جانتی ہو کہ اگر تمہارے نسل پرست اور متعصب باپ نے مجھے مسترد نہ کیا ہوتا... اور مجھے یہاں سے نکلوایا نہ ہوتا تو..."
"ان باتوں کو مت دہراؤ۔"
"کیوں نہ دہراؤں۔ کیا یہ غلط ہے کہ میں شادی کرنا چاہتا تھا تم سے... اور یہاں رہتا تو کون روک سکتا تھا ہمیں...؟"
"تم ایک چالاک اور کمینے شخص ہو۔ تم نے میرا جذباتی استحصال کیا تھا۔"
"ایسا گھٹیا الزام مت لگاؤ مجھ پر۔ میں تمہاری عزت کرتا تھا۔ صرف اس لیے کہ میں واقعی تم سے محبت کرتا تھا۔"
اس نے تلخی سے کہا "دیگر ایک درجن لڑکیوں کے ساتھ؟"
"نہیں۔ یہ زیادتی ہو گی اگر تم کہو کہ تمہارے معاملے میں بھی میرے جذبات وقتی تھے اور میں سیریس نہیں تھا۔"
"محبت جتاتے ہو تم۔ تم نے کتنی لڑکیوں کو پروپوز کیا تھا، کتنی لڑکیوں کو منگنی کی انگوٹھی دی تھی؟"
میں نے تلخی سے کہا "الزبتھ... وہ ایک کھیل تھا جوانی کا۔ میرے ساتھ دوسرے سب لڑکے کھیلتے تھے اور یہ بات وہ لڑکیاں بھی سمجھتی تھیں۔ میں کسی لڑکی کے ماں باپ سے نہیں ملا تھا۔ کسی کے لیے رسوا نہیں ہوا تھا۔ اتنی ذلت برداشت نہیں کی تھی۔"
"تم تو پرانی باتیں... تم جب یہاں سے گئے تو تمہارے بلاوا ایک... بھول گئے۔ تم فون کر سکتے تھے، خط لکھ سکتے تھے۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنے والد کو راضی کر لیتی۔"
"وہ کبھی راضی نہ ہوتے۔ وہ میری جان لے سکتے تھے یا اپنی جان دے سکتے تھے مگر تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں نہیں دے سکتے تھے۔"
"تم بات سے جاتے ہی اپنے خاندانی معاملات میں الجھ گئے۔"
...

جاسوسی ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ
انسان کی ترقی و تہذیب کے حیات افروز واقعات
صدیوں سے زندہ ایک پراسرار شخص کی آپ بیتی، ہوا جس کی دوست تھی، سمندر جس کے لیے آغوشِ مادر تھا، آگ اس کے بدن کو نمو دیتی تھی۔
☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
وہ کہانی جس نے اپنے وقت میں مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیے
صدیوں کا بیٹا
پانچ حصوں میں مکمل
قیمت فی حصہ ۵۰ روپے • ڈاک خرچ فی مجموعہ ۱۶ روپے
مکمل سیٹ منگانے پر قیمت صرف ۲۰۰ روپے، ڈاک خرچ معاف۔ صرف ۲۰۰ روپے کا منی آرڈر روانہ فرمائیں۔ یہ رعایت صرف منی آرڈر ارسال کرنے پر دی جائے گی۔

www.paksociety.com

تھے۔ اپنی پراپرٹی اور بزنس۔۔۔ اور خاندانی جھگڑے خون خرابا' مقدمے بازیاں اور میں کیا کہوں۔۔۔ جیسا کہ مجھے معلوم ہوتا رہا۔۔۔ تم نے کوئی دہشت گرد تنظیم بنائی تھی۔"

"خدا کے لیے الرتقہ۔ اسٹاپ دس نان سینس۔"

"کیا یہ جھوٹ ہے۔ تم جیل میں رہے اور پھر تم نے اسی وکیل سے شادی کرلی جس نے تمہارے مقدمات کی پیروی کی۔۔۔" وہ مشتعل ہوکے بولی۔

"آہستہ آہستہ بولو۔۔۔ اور پہلے میری بات سن لو۔"

"میں ساری دنیا کو غلط نہیں کہہ سکتی۔ جو کچھ تم نے کیا سب میرے علم میں تھا مگر پھر لندن آکے تم نے کیا کیا۔۔۔!"

میں نے کہا "اٹھارہ بیون سیک۔۔۔ دنیا کی تم نے سُنی' میری بھی سُن لو۔ مجھے زیادہ نہیں دس منٹ دو' یقین کرنا نہ کرنا تمہاری مرضی۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے۔"

"پھر کیا تم میری مدد نہیں کروگی؟" میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ میرا شوہر تمہیں اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ تم نے اس کی جان لینے میں کون سی کسر چھوڑی تھی۔ وہ وہاں ہوتا تو۔۔۔"

"تو پولیس اسٹیشن آکے مجھے شوٹ کردیتا؟ نہیں الرتقہ' وہ جیسا بھی ہے۔ پڑھا لکھا اور خاندانی آدمی ہے۔ اگر میں اس سے درخواست کرتا تو وہ میری بات ضرور سنتا۔ میں اس کی غلط فہمی رفع کرسکتا تھا۔ پھر وہ میرا دشمن کیسے ہوسکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے۔ ہمارے درمیان دشمنی کے جذبات کا ایک سبب تمہاری محبت تھی لیکن وہ نوجوانی کی عمر تھی۔ وہ وقت گزر گیا' زندگی میں ایسا کہاں نہیں ہوتا۔ ہر شخص کامیاب نہیں ہوتا۔ ناکامی تو میرا مقدر ہوئی۔ تمہاری محبت اسے ملی۔ میں نے اس کی خوش قسمتی پر رشک ضرور کیا مگر مجھے حسد نہیں ہے اس سے۔ نہ میں اس کا دشمن ہوں اور نہ بدخواہ۔ میں تو خود اسے مبارک باد دیتا' میں اس سے معافی بھی مانگ سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے ہی اس کا نام کاکروچ رکھا تھا۔ اسے پریشان بھی کیا تھا۔ تم اپنے شوہر کے بارے میں مجھے بتاؤ کیا وہ کینہ پرور ہے؟ کیا اس نے میرا نام لے کر کبھی۔۔۔ تمہیں کچھ کہا؟"

"نہ وہ اتنا کم ظرف ہے اور نہ کینہ پرور۔" الرتقہ نے احتجاج کیا۔

"پھر وہ ہر بات سمجھے گا۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ آج مجھ سے رقابت محسوس کرے اور اس بنیاد پر مجھ سے عداوت رکھے۔ کل ہم سب خیالی دنیا میں رہنے والے جذباتی نوجوان تھے جو زندگی کے حقائق کو نہیں سمجھتے تھے جیسے تم نہیں سمجھتی تھیں کہ عشق کتنا بھی سچا کیوں نہ ہو' معاشرتی یا سماجی حقائق سے زیادہ سچ نہیں ہوسکتا اور سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔"

"تو تم کیا کہنے کی کوشش کررہے ہو؟"

میں نے کہا "دیکھو الرتقہ۔ کھوٹ نہ میری نیت میں تھا اور نہ تمہارے جذبات میں خلوص کی کمی تھی لیکن یہ بڑی تلخ حقیقت ہے کہ وہ محبت نہیں' حماقت تھی۔"

"تم واقعی ایسا سمجھتے ہو تو پھر۔۔۔"

"پہلے میری بات پوری ہوجانے دو۔۔۔" میں نے کہا "مانا یہ کہ تم کل مجھے جتنی اچھی لگتی تھیں' آج اس سے زیادہ تم لگ رہی ہو لیکن حقیقت کا دوسرا ناگوار رخ یہ پہلو ہے کہ تم کسی اور کی امانت ہو اور میں کسی اور کے ساتھ زندگی بھر کی رفاقت قبول کرچکا ہوں۔ اب شرافت اور دیانت داری کا تقاضا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو بُری نظر سے بھی نہ دیکھیں۔ چھونا تو دور کی بات ہے۔ جو ہم کل جائز سمجھتے تھے وہ آج ناجائز ہے۔ یہ معاشرتی حقیقت ہے۔ دباؤ ہے یا ڈسپلن ہے۔ میاں بیوی کے رشتے کی تقدیس کو قائم رکھنے اور خاندان کے وجود کے لیے اس معاشرتی قانون اور ڈسپلن پر سختی سے عمل کرنے کا نام اخلاقیات یا شرافت ہے۔ کل اگر ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے تو کوئی وجہ نہیں اور کوئی حرج نہیں اگر ہم آج بھی پسند کرتے رہیں۔ کل ہمارا اپنا بھی طلب کا عنصر شامل تھا۔ قربت کی خواہش اور جسمانی طلب کے بغیر بھی محبت کا وجود ممکن ہے۔ مگر اس کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ آخر ہم اپنے دوستوں عزیزوں اور خاندان کے سب رشتوں سے محبت کرتے ہیں۔"

"تم پہلے کی طرح باتونی ہو۔۔۔ آج بھی۔۔۔"

میں نے کہا "الرتقہ۔ دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں تم سے شادی کے لیے سیریس ہونے کی کچھ وجوہات تھیں۔ تمہاری ذات میں کچھ ایسی خوبیاں تھیں۔ ایسی صفات تھیں جو مجھے کسی اور میں نظر نہیں آئیں۔ ایسا ہی تمہارے ساتھ ہوا' کتنے لڑکے اور تھے تمہارے آس پاس۔ کلاس میں اور تمہارے حلقۂ شناسائی میں لیکن مجھ میں تم کو کچھ مختلف نظر آیا جو تمہیں اچھا لگا۔ اس وقت ہم نے اپنی پسند کو زندگی بھر کی رفاقت کی بنیاد بنانے کی پوری کوشش کی تھی حالانکہ۔۔۔ ایسا ہوجاتا تو ہم دونوں بہت جلد پچھتاتے۔ ہمیں احساس ہوجاتا کہ محبت کرنا اور زندگی بھر ساتھ نبھانا' دو مختلف باتیں ہیں۔ ایک کو تم شوق کہہ سکتی ہو' دوسرے کو ذمے داری۔ میں سمجھتا ہوں' تمہارے والد اپنی عمر اور تجربے کے باعث ہم سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ وہ زندگی کی مشکلات کے عملی پہلو کو سمجھتے تھے۔"

وہ اُداسی سے مسکرائی "آج تم پہلی بار میرے والد کو اچھا کہہ رہے ہو۔"

"ہاں۔ یوں سمجھ لو کہ مجھے بھی تھوڑی بہت عقل آگئی ہے۔ حقائق نے خود کو تسلیم کروالیا ہے۔" میں نے کہا "ظاہر کا فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ گورے کالے رنگ کی بات نہیں' حسین لڑکیاں ہر رنگ میں ہر جگہ ملتی ہیں۔ اور شاید اسی طرح [illegible]

بہت ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے شوہر سے محبت کرتی ہو۔ اس سے کہیں زیادہ جتنی تمہیں مجھ سے تھی۔ اور وہ بھی تم کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہوگا۔ یہ عملی زندگی کا تجربہ ہے' خیال و خواب کی بات نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں اور تم دو مختلف دنیاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ تمہارے میرے درمیان صرف جغرافیائی فاصلوں کا مسئلہ نہیں' ہماری تہذیب و تاریخ' معاشرتی پس منظر' ماحول اور ذہن کی سوچ سب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جو ہمیں نظر نہیں آتا تھا۔ تمہارے والد سمجھ سکتے تھے کہ ہم نے شادی کرلی تو ہمیں بعد میں کس قسم کی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ میرا ماحول تمہیں قبول نہ کرتا اور تم وہاں خود کو محبوس اور پابند محسوس کرتیں۔ میں یہاں اَن فٹ ہوتا اور مجھے تحقیر کی نظر سے دیکھنے والوں سے تمہاری نوک جھونک' تم بھی کب تک۔۔۔ کا شکار رہ جاتیں۔ میں بھی کب تک برداشت کرتا۔ میں کسی نواب کا بیٹا نہیں' تم خاندانی حسب نسب کی برتری کو نظر انداز کرنا بھی چاہو تو دوسرے لوگ نہیں کرسکتے۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔"

"یہی ہیں وہ معاشرتی تلخ حقائق جو محبت سے زیادہ بے رحم ہے۔ محبت بھی جان لے سکتی ہے مگر سچ کا زہر آدمی کو تمام عمر پینا پڑتا ہے اور جینا بھی پڑتا ہے۔ اگر ہم شادی کرلیتے تو یہ شادی زیادہ نہ چلتی۔ ہماری محبت بہت جلد ایسے ہی حقائق کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھ جاتی۔ ہم بدگمان ہوجاتے اور ایک دوسرے کو الزام دیتے۔ بات اتنی خراب ہوجاتی کہ تم مجھے چھوڑ کے اپنی اس دنیا میں لوٹ آتیں جس میں تم پیدا ہوئیں' پلی بڑھیں' جوان ہوئیں۔ جہاں تمہارے سب رشتوں کی جڑیں ہیں۔ معاشرتی حقائق کی طرح سماجی حقائق بھی بڑے سفاک ہوتے ہیں۔ زندہ رہنے کے وسیلے نہ ہوں تو رومیو جیولیٹ کی کوئی داستان جنم نہیں لیتی۔ سارے کلاسیکی عشق کے افسانے ہجر کے درد کی لذت کے باعث زندہ ہیں۔ اگر یہ امر محبت کرنے والے شادی کرلیتے تو ان کا نام ان کے بچوں کے بچے بھی نہ جانتے۔"

وہ ہنس پڑی "کیسی باتیں کرتے ہو تم دھوکے باز۔"

"میں دھوکے باز ہوتا الرتقہ تو تمہیں میرا نام بھی یاد نہ رہتا۔ مجھے لندن کی بہت سی لڑکیوں کو یاد نہیں ہوگا۔ میں اس لیے اہمیت اختیار کرگیا کہ میں نے عہد وفا کی بات کی تھی۔ خواہ وہ جذباتی غلطی تھی مگر میرا عشق واقعی بے طلب تھا اور بے غرض تھا۔ ورنہ کیا تم میری دسترس میں نہ تھیں؟ مگر میں نے تم کو چاہا تو تمہیں اپنی عزت جان کے عزت دی۔ اسی سے میری عزت تمہارے دل میں پیدا ہوئی اور آج بھی ہونی چاہیے۔ تم مجھ پر ہوس پرست یا مطلبی ہونے کا الزام عائد نہیں کرسکتیں۔"

"معلوم نہیں میں یہاں کیوں آگئی" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی "مدتوں تک میں۔۔۔ سخت نفرت کرتی تھی تم سے' میرا خیال تھا۔"

"حقیقت اس کے برعکس تھی۔ تم مجھ سے نفرت کرہی نہیں سکتیں۔ پرانی محبت کی بنیادیں جھوٹ یا منافقت پر استوار نہیں تھیں۔ اس لیے آج بھی تمہارے دل میں سکندر بخت اسی طرح زندہ ہے جیسے تمہارا بچپن' جس سے خوب صورت یادیں وابستہ ہوں۔ خوب صورت یادیں کبھی بدصورتی کا احساس نہیں دلاتیں۔"

"تم نے بڑا غلط رویہ اختیار کیا تھا میرے ساتھ۔"

میں نے ہنس کے کہا "وہ غصے کی بات تھی' شکایت کا ایک احتجاجی انداز تھا۔ خود تم نے کیا فرمایا تھا؟"

"تم نے مجھے دھمکی دی تھی!"

"ہاں۔ ابھی ایک سارجنٹ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں قتل کردوں گا۔ اس کا ہرگز مجھے قتل کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ نہ وہ کرسکتا تھا۔ میں نے اسے چیلنج کردیا کہ قتل کرنا تو دور کی بات ہے' مجھے چھو کے دکھاؤ' وہ باکسر تھا۔ جذباتی ہو کے میرے مقابلے پر آگیا۔"

"اور تم نے اسے مارا!"

"ہاں۔ اس کی خوش فہمی کے مرض کا ہمیشہ کے لیے علاج ہوگیا۔ اس کے حق میں یہ اچھا ہوا۔"

الرتقہ نے کہا "تم مشکل میں بھی پڑسکتے تھے۔"

"میں کچھ وقت لینا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کی توجہ اصل مسئلے کی طرف سے ہٹانا چاہتا تھا۔" میں نے کہا "اور شاید میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ کسی نے مجھ سے میرا نام تک نہیں پوچھا۔"

"میں نے تو بتادیا۔"

میں نے کہا "بہت اچھا کیا' میں بتاتا تو شاید یہ لوگ ثبوت مانگتے۔ ابھی تک کسی نے میرے سامان کی تلاشی نہیں لی۔ ورنہ وہ جعلی پاسپورٹ' سوری پاسپورٹ اصلی ہے' اس پر میرا نام غلط لکھا ہوا ہے۔ میں یہاں وقار یوسف ایڈووکیٹ بن کے پہنچا ہوں۔"

"وقار یوسف کون ہے؟"

میں نے کہا "میرا ایک دوست۔ سکندر بخت کے نام سے میں برطانیہ میں کیسے داخل ہوسکتا تھا مگر اب صورت حال یہ ہے کہ پولیس وقار یوسف کو اور محسن کو تلاش کررہی ہے۔ تمہارے شوہر کی رپورٹ پر۔"

"تم نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا' بم رکھا تھا اس کی گاڑی میں۔"

"تم اس خرافات پر یقین کرتی ہو؟"

وہ بولی "مجھے بھی یقین دلایا گیا ہے۔۔۔ اور اسے بھی۔ تمہاری شہرت ایک دہشت گرد کی ہے۔"

"مجھے بدنام کرنے والے میرے پرانے دشمن ہیں۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں' تمہارے یقین کرنے نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رپورٹ تمہارے شوہر کی ہے میرا اس کو قائل کرنا ضروری ہے۔"

www.paksociety.com

"تم ملو گے اس سے؟"

میں نے کہا "صرف وہی بچا سکتا ہے مجھے الزبتھ۔ اور مجھے یقین ہے کہ میری پوری بات سن کے وہ قائل ہو جائے گا کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ وہ میری مدد کرے گا الزبتھ۔"

"لیکن یہ وہ تم سے نہ ملنا چاہے" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"تو سے تم سمجھا سکتی ہو۔"

"میں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ...کہ میں اس سے تمہاری سفارش کروں" وہ پریشان ہو کے بولی۔

"کیا تم اسے نہیں بتاؤ گی... کہ تم مجھ سے ملنے آئی تھیں۔"

"پتا نہیں" وہ بے خیالی میں بولی۔

"اسے بتادو۔ زیادتی ہے جو چوری کرتا ہے یا غلط کرتا ہے۔ تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ تمہارا دامن پہلے بھی صاف تھا' آج بھی رہنا چاہیے۔ تمہارے ضمیر پر کوئی بوجھ کیوں ہو الزبتھ۔ وہ تمہاری صاف گوئی کی قدر کرے گا۔ اگر اسے تم سے محبت ہے اور تم پر اعتبار ہے۔ وہ سمجھ لے گا کہ بیوی چاہتی تو مجھ سے یہ بات چھپا سکتی تھی۔ تم چھپا سکتی ہو مگر اسے بعد میں کبھی معلوم ہوا تو اس سے اعتماد کا رشتہ مجروح ہوگا۔ اس سے کہو کہ مجھے پولیس نے سکندر بخت کو شناخت کرنے کے لیے بلایا تھا۔ میں نے اسے پولیس اسٹیشن جاکے شناخت کیا۔ وہ اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنا چاہتا تھا مگر میں نے کہا کہ جو کہنا ہے میرے شوہر سے کہو۔"

"یعنی میں جھوٹ بولوں اس سے۔"

"بے وقوف لڑکی۔ ایسے چھوٹے موٹے جھوٹ تو گریس کی طرح ہوتے ہیں۔ زندگی کی گاڑی کے پہیے کو بے آواز طریقے پر رواں رکھنے کے لیے گریس تو ڈالنی پڑتی ہے۔ سچ کے ساتھ زندگی گزر سکتی ہے کسی کی؟"

"ارکے۔ میں اسے بتادوں گی۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے..... یہ بتاؤ تم ٹھہرے کہاں ہو؟"

میں نے کہا "ابی انفل ترلاک اب میں قیام رہے گا۔"

"اس سے پہلے کہاں تھے۔ کسی ہوٹل میں...؟"

میں نے کہا "سفری دستاویزات کے بغیر لندن کے کون سے ہوٹل میں ٹھہر سکتا تھا میں' بس ادھر ادھر چھپ کے رہا۔ کچھ پرانے آشنا مہربان تھے۔"

"اچھا... میں اس پولیس کیپٹن سے کہہ دیتی ہوں۔ تمہیں یہاں آرام سے رہنے کی جگہ فراہم کریں۔"

میں نے کہا "مجھے آرام سے یہاں نہیں رہنا۔ میری بیوی پیرس میں بیٹھی رو رہی ہے۔"

"کیوں رو رہی ہے؟" وہ ہنسی "کیا وہ خوش نہیں ہے تمہارے ساتھ؟"

"تمہارا کیا خیال ہے' کوئی لڑکی جو حسین بھی ہو تمہاری طرح اور تعلیم یافتہ بھی۔ وہ مجھ سے شادی کرے گی؟ اور کرے گی تو کیا خوش نہیں رہے گی؟"

"خوش تو رہنا چاہیے اسے۔ تم خوش رکھنے کا ہنر جانتے ہو۔"

"میں اسے تین دن کا کہہ کے آیا تھا۔ میں اور محسن پیرس کے راستے لندن پہنچے تھے۔ ایک شریف آدمی نے ہمیں آلو ٹماٹر پیاز کے درمیان رکھ کے اسمگل کردیا تھا۔ ترس کھا کے نہیں معاوضہ وصول کر کے۔"

"اور پھر بھی تم کہتے ہو وہ شریف آدمی تھا؟"

"ہاں۔ اس کے دل میں نیکی کا خیال تھا۔ اس نے میری مدد کی' میں اسے برا کیوں کہوں' کل رات میں نے اس کی بیوی کے ساتھ....."

"شرم آنی چاہیے تمہیں سکندر۔"

"کا جول والا تو تھا۔ اس کی بیوی کے ساتھ کا مطلب ہے اس کے گھر میں۔ گھر سے باہر گیراج میں رات سو کے گزاری تھی۔ وہ بھی بڑی نیک دل عورت تھی۔ چاہتی تو ہمیں پکڑوا دیتی" میں نے کہا۔

"پھر تم ایسا کرو' آج رات ہمارے ساتھ رہو۔"

"تمہارے ساتھ!"

"ہاں۔ ہمارے گھر آجاؤ۔ میں تمہیں رچرڈ سے ملوادوں گی۔"

میں نے کہا "تم نے تو کہا تھا؟"

"میں نے جھوٹ بولا تھا' وہ کہیں نہیں گیا۔ اس نے خود مجھ سے کہا تھا کہ جاؤ پولیس اسٹیشن سے فون آیا ہے' جاکے دیکھو وہ حرام زادہ... سکندر بخت ہی ہے یا کوئی اور۔"

"کیا اس طرح وہ تمہیں ذہنی اذیت دینا چاہتا تھا؟"

"نہیں۔ وہ شروع سے بزدل اور کم ہمت ہے۔ اس میں ہمت نہیں تھی تمہارا سامنا کرنے کی۔ اس نے منت سماجت کی میری تو میں نے اس کی بات مان لی۔"

"اس کا مطلب ہے وہ مجھ سے ملے گا... اگر تم کہو گی؟"

وہ مسکرائی "ہاں۔ وہ میری بات نہیں ٹال سکتا۔ تم تو کے ڈر پر؟"

"میں سر کے بل آؤں گا لیکن دیکھو' تمہیں دھوکے سے بلا کے قتل مت کرا دینا مجھے' اپنے رقیب کے ہاتھوں۔"

وہ ہنسنے لگی "میں ایسا کروں گی اور مجھے بعد تم آجاؤ۔ میرے سامنے ہو جائے گی ساری بات۔ رائٹ۔"

"رائٹ۔ میں اس سے دوسری بات بھی کرلوں گا۔"

وہ بولی "دوسری بات کون سی؟"

"میں کہوں گا کہ وہ قربانی دے' اپنی محبت کی۔ محبت وہی ہوتی ہے جو قربانی دے سکتی ہو۔ اگر وہ مان گیا تو میں تم سے بھی شادی کرلوں گا۔ ہمارے مذہب میں ایک ساتھ چار تک کی اجازت ہے۔"

"بدمعاش۔ میں اتنے غصے میں تپ رہی تھی" وہ بولی "تم ... کرکے آئی تھی کہ تمہیں اچھی طرح ذلیل کروں گی اور تم نے اپنی باتوں کی تو تمہارے منہ پر تھپڑ ماروں گی مگر دیکھو میں ڈر کی ماری رہی ہوں۔"

میں نے کہا "محسن بھی ہوگا میرے ساتھ۔"

"ظاہر ہے' جسم سے جان تو جدا نہیں کی جاسکتی۔ کیا میں جانتی نہیں کہ تم دونوں دیکھنے میں دو ہو' ورنہ ایک۔ میں اپنی گاڑی بھیج دوں گی۔"

"کیا تمہاری شاہی گاڑی کو یہ پولیس والے نہیں روک لیں گے" میں نے کہا۔

"تمہارا جرم کیا ہے؟ ابھی تک غلط جگہ گاڑی پارک کرنے کا الزام تھا۔"

میں نے کہا "اصل الزام تو یہ ہوگا کہ میں لندن پہنچ گیا۔ کسی طرح سفری دستاویزات کے بغیر۔"

"تم پیرس تک کیسے آئے تھے؟"

"باقاعدہ پاسپورٹ ویزا کے ساتھ" میں نے کہا "وہاں سے برلن کے راستے۔"

"پھر ٹھیک ہے" وہ بولی "سڑک کے راستے ہر ہفتے بہت لوگ آتے ہیں۔ ان کے پاس صرف شناخت کی دستاویزات ہوتی ہیں۔"

"وہ میرے پاس ہیں۔ بشرطیکہ یہ سوال نہ کیا جائے کہ تم سکندر بخت ہو یا....."

وہ بولی "یہاں میں تمہارا نام بتا چکی ہوں۔"

"مگر انہوں نے میرا پاسپورٹ نہیں دیکھا ہے اور نہ محسن کا۔ لندن میں اس کی ضرورت پڑے گی۔ واپسی کا ٹکٹ لیتے وقت۔ اگر ہم وہاں پہنچ جائیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

"تم پیرس پہنچ جاؤ گے' فکر مت کرو۔ آخر میرے شوہر کا بھی کچھ اثر و رسوخ ہے۔ وہ برطانیہ کی وزارت داخلہ کا بہت اہم افسر ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ بس جانے سے پہلے یہاں پولیس کو سمجھا دینا کہ بعد میں کوئی قانونی مسئلہ نہ کھڑا کریں۔ اور انہیں تاکید کرنا کہ حوالات میں چوہدری دلاور کا خاص خیال رکھا جائے۔ کسی کو اس سے ملاقات کی اجازت نہ دی جائے اور نہ اسے اپنی مرضی سے جانے دیا جائے' وہ زیر حراست ہے۔"

"زیر حراست کس جرم میں؟" الزبتھ نے کہا۔

"زیر حراست نہ سہی' زیر علاج سہی" میں نے کہا "ویسے تو اس کے خلاف لندن میں دوہرے قتل کا الزام ہے۔ چشم دید گواہ بھی ہیں اور عدالتی ریکارڈ پر اس کے خلاف کافی مواد ہے۔ مگر ابھی ہم اس کیس کو دوبارہ شروع کرانے کے حق میں نہیں ہیں۔ پہلے اس کا اور جانے کا ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس میں پیش ہونا ضروری ہے۔"

"یہ ڈاکٹر شبلی مرڈر کیس کیا ہے؟"

میں نے کہا "تاکہ یہ بات دوبارہ کہنے سے بہتر ہے کہ ایک بار سب کو سنادوں' تم بھی سن لو اور تمہارا وہ کاروبار بھی۔"

"سکندر' اب وہ میرا شوہر ہے" الزبتھ نے مجھے خبردار کیا۔

"سوری۔ ویسے کاکروچ تو کاکروچ ہی رہے گا۔ خواہ وہ الزبتھ کا شوہر بن جائے" میں نے کہا۔

کیپٹن خود ایک ٹرے کے ساتھ اندر آیا۔ "سوری میڈم مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ دراصل کافی بنانے والا آج بیمار ہے' یہ کام خود مجھے کرنا پڑا۔"

میں نے کہا "یہ کام بھی کرلیتے ہو تم؟"

"اگر کبھی مجھے پولیس کی نوکری سے نکال دیا گیا تو میں کسی ہوٹل میں شیف ہو جاؤں گا۔ میری بیوی اس بات کی گواہی دے سکتی ہے کہ میں ہر قسم کے کھانے کتنے اچھے پکاتا ہوں' یہ میری ہابی ہے۔ میں نے یہ فن باقاعدہ سیکھا ہے۔"

الزبتھ ہنسی "تمہاری بیوی بڑے فائدے میں ہے۔"

"مگر مجھے بڑا نقصان ہو رہا ہے" وہ کافی بناتے ہوئے بولا "مجھے اس کی فرمائش پر کھانے بنانے پڑتے ہیں۔ الٹا معاملہ ہے نا۔ وہ کھاتی ہے اور موٹی ہوتی جارہی ہے۔ اگر کسی دن میں آپ کی اور سر رچرڈ گوردن کی دعوت کروں تو کیا آپ اور سر رچرڈ آئیں گے؟"

الزبتھ نے کہا "میں یہ کچھ کہہ نہیں سکتی۔ رچرڈ بہت مصروف آدمی ہیں..... ویسے تم کو ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت نہیں میں مانتی ہوں۔"

"بات ماننے کی نہیں ہے خاتون.... میں کسی طرح ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ میں ان کا احسان مند ہوں۔ وہ بہت بڑے آدمی ہیں اور یقیناً بہت مصروف بھی ہوں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا شکریہ کیسے ادا کروں؟"

"تم فون پر شکریہ ادا کرسکتے ہو یا کسی دن گھر آکے....."

"زبانی تو میں نے شکریہ ادا کردیا تھا لیکن میری بڑی خواہش تھی کہ کسی دن.... وہ میرے گھر آئیں۔"

"آخر ایسی کیا بات ہے کیپٹن؟"

"بہت بڑی بات ہے خاتون۔ میں ایک سازش کا شکار ہوا تھا۔ حادثاتی طور پر ایک ایسے معاملے میں ملوث ہو گیا تھا جس سے میرے مخالف بدخواہ اور حاسد لوگوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ سر رچرڈ گوردن تفتیش کے نتائج سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے خود ان سب سے جرح کی جن کے بیانات سے میرا کیس اتنا خراب ہو گیا تھا کہ مجھے برطرف بھی کیا جاسکتا تھا۔ مجھے جیل بھی جانا پڑتا شاید۔ پھر انہوں نے مجھے طلب کیا اور میری ساری بات بڑے تحمل سے سنی۔ میں نے ان کو سچ بتادیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ بعض اوقات سچ ثابت نہیں ہوتا اور جھوٹ ثابت کردیا جاتا ہے۔ آف دی ریکارڈ انہوں نے مجھ سے بہت کچھ پوچھا۔ وہ انتہائی ذہین اور معاملہ فہم آدمی ہیں۔ وہ سمجھ گئے کہ اصل بات کیا ہے اور کیا بات چھپائی جارہی ہے۔ انہوں نے میرے حق میں فیصلہ دیا اور مجھے تحفظ بھی فراہم کیا۔ کچھ افسران کے اور دوسرے لوگوں کے ٹرانسفر

www.paksociety.com

کرا دیے۔ ورنہ وہ بعد میں انتقامی جذبے سے کام لیتے تو مجھے دوسرے معاملات میں ملوث کر دیتے۔ ایک پولیس مین کی زندگی بہت پُرخطر ہوتی ہے۔ کوئی بھی اس پر الزام عائد کر سکتا ہے اور اسے بدنام کرنے کے لیے مہم چلا سکتا ہے۔"

میں نے اس کی بات پر الزبتھ کو خوش ہوتے دیکھا۔ کاکروچ شرمیلا تھا اور بزدل تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ذہین تھا اور کلاس میں اس کی تعلیمی کارکردگی کا معیار ہم جیسے لوگوں کے لیے قابلِ رشک تھا۔ کوئی شخص مجموعۂ صفات نہیں ہوتا۔ یہ قدرت کا تلافی کا نظام ہے کہ وہ ایک کمی کو دوسری غیر معمولی صلاحیت سے پورا کر دیتی ہے۔ اسے انسانی فطرت کا نفسیاتی ردِ عمل بھی کہا جا سکتا ہے۔ جو لوگ احساسِ کمتری کے منفی ردِ عمل کا شکار نہ ہوں بلکہ اسے دور کرنے کے لیے اپنی دوسری صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کر کے زندگی میں نمایاں مقام حاصل کرنے کی کوشش کریں وہ کامیابی اور شہرت کی بلندیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہیلن کیلر ہے جو اندھی گونگی اور بہری تھی مگر اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اپنی قوتِ ارادی سے وہ ناموری حاصل کی جو ناممکن نظر آتی تھی۔ یہ عام زندگی کا مشاہدہ ہی ہے کہ جو دیکھ نہیں سکتے ان کی سننے کی حس بہت تیز ہو جاتی ہے۔

کاکروچ بھی سر جیفری گورڈن تو اپنے نجیب نسب سے بن گیا تھا مگر اس نے اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ اور پھر سول سروس میں نمایاں کارکردگی سے اپنی شخصیت کی ان خامیوں کا ازالہ کر لیا جن کی وجہ سے وہ کاکروچ مشہور تھا۔ اب شاید اس کا مذاق اڑانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ سب اس کی تعریف ہی کرتے ہوں گے۔ کیپٹن میرے سامنے ایک بات بتا رہا تھا اور میں سوچنے پر مجبور تھا کہ کیا سر جیفری گورڈن کی شرافت، فراخ دلی اور احسان مندی کا دوسرا گواہ خود میں ہوں گا۔

"اچھا کیپٹن! یہ میرے دوست ہیں۔ اس بات کا خیال رکھنا، انھیں کوئی شکایت نہ ہو کسی کے رویے سے۔" الزبتھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"شاید انھوں نے آپ سے اس ناخوش گوار واقعے کا تذکرہ کیا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں کیپٹن۔ میں نے الزبتھ کو کچھ نہیں بتایا۔"

الزبتھ نے کہا "تم مجھے بتاؤ کیپٹن۔ کیا ناخوش گوار واقعہ پیش آ چکا تھا میرے یہاں آنے سے پہلے؟"

کیپٹن نے کہا "دراصل یہ وہ شخص کچھ ذہنی مریض ہے۔ اسے واقعی بلڈ پریشر کی شکایت ہے اور اس کا غصہ بھی تیز ہے۔ اس کے خلاف کئی بار رپورٹ ہوئی ہے مگر میں اسے بچانے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔ ہر شخص میں کچھ خامیاں ہوتی ہیں تو کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔"

"مجھے اس سے کوئی شکوہ نہیں" میں نے کہا "وہ شخص دل کی

تھی کوئی سیریس فائٹ نہیں تھی۔"

"تمھاری فائٹ ہوئی تھی کسی سے ۔۔۔ سالم؟"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ کچھ نسلی تعصب کے باعث ایسی باتیں کر رہا تھا جو مجھے ناگوار گزریں" اس نے مجھے دھمکی دی۔"

الزبتھ نے کہا "اچھا۔ تم نے اس کا ذکر تو کیا تھا مگر یہ بات بہرحال نہیں کی تھی۔"

میں نے کہا "میرا دل بالکل صاف ہے۔ بلکہ وہ ناراض ہو گیا ہے تو میں اس سے معافی بھی مانگ لوں گا۔ میرا مقصد ہرگز اس کی دل آزاری نہیں تھا۔"

الزبتھ نے کہا "میں نے سکندر کو اور اس کے دوست محسن کو آج رات ڈنر پر بلایا ہے۔ میری گاڑی انھیں لینے آئے گی۔"

"اگر آپ بُرا نہ مانیں خاتون" تو انھیں اپنے ساتھ ہی لے جائیں" اپنی گاڑی میں ورنہ میں اپنی کار میں آپ کے ساتھ روانہ کر دیتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کوئی اور افسر کوئی نیا مسئلہ کھڑا کر دے" کوئی نیا قانونی پہلو نکال لے" تم تو جانتی ہو پولیس والوں کی عادت بال کی کھال نکالنے کی ہے۔"

الزبتھ نے کچھ سوچا "اگر ایسی بات ہے تو پھر میں ان کو اپنے ساتھ ہی لے جاتی ہوں۔"

"کیا میں ان کا سامان گاڑی میں رکھوا دوں؟"

"ہاں۔ شوفر ہے کہ وہ خود ہی رکھ لے گا۔"

کیپٹن کے باہر جانے کے بعد میں نے کہا "کیا یہ مناسب ہے" میرا مطلب ہے تمھارے شوہر کو یہ اچھا لگے گا؟"

"اچھا تو اسے بہت کچھ نہیں لگتا۔ مگر کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔ میں اس کی بیوی ہوں" غلام نہیں" وہ بولی "وہ بھی بہت کچھ کرتا ہے جو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اور پھر میں چوری چھپے کچھ نہیں کر رہی ہوں۔"

"لیکن یہ خلاف قانون تو ہے" کسی حد تک" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمھارے اور اس کے ازدواجی تعلقات میں کسی قسم کی رنجش پیدا ہو۔"

وہ ہنس پڑی "ازدواجی تعلقات ایسی چھوٹی رنجشوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ کچھ میں اس کے لیے کرتی ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ہی میرے لیے زیادہ کرتا ہے۔ بعض اوقات تو مجھے احساس بھی ہوتا ہے اپنی زیادتی کا۔ وہ پاگل ہے میرے لیے۔ میرا جائز ناجائز سب ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے۔ مجھے آج تک انکار نہیں کیا اس نے۔"

"مگر یہ معاملہ ذرا مختلف ہے۔ وہ مجھے اپنا رقیب ضرور سمجھتا ہے اور تم کچھ کرو وہ میرے لیے بھی اتنا ہی کرے۔"

"اس کا تم سے کیا تعلق؟ ہمدردی کرے گا جو میں اس سے کہوں گی۔ ویسے بھی تم اسے قائل کر لوگے اس لیے تم میرے ساتھ جا رہے ہو کہ اس کے اور تمھارے درمیان جو غلط فہمی ہے

ختم ہو جائے۔ تم بڑے اچھے مقرر تھے۔ اپنے دلائل سے دن کو رات ثابت کر سکتے تھے۔ اسی لیے تو اپنی ایکٹنگ سے ہر لڑکی کو اپنے عشق کا یقین دلا رہے تھے۔"

"سوائے ایک لڑکی کے۔" میں نے کہا "اس کے سامنے میں نے بالکل ایکٹنگ نہیں کی تھی۔ یہی تو ساری خرابی ہے۔ جھوٹ کا تو چل جاتا ہے سچ پر کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ خواہ مخواہ کی بات ہے کہ حق کا بول بالا۔"

"اچھا چلو۔ بہت سچ بول لیا تم نے" اس نے مجھے دروازے کی طرف دھکیلا۔ "اسی کا جادو ہے جو آج بھی میرے سر چڑھ کے بول رہا ہے۔ کتنا غصہ تھا میرے دل میں تمھارے خلاف" میں بھری بیٹھی تھی اور یہاں آئی تھی تم کو خوب ذلیل کرنے مگر دیکھو تم نے کتنی نادانی سے میرے ارادے خاک میں ملا دیے" الٹا میں تم کو اپنے معزز مہمان کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔"

"مجھے اپنی خوش قسمتی میں بھی شک نہیں رہا" میں نے کہا۔

سفید وردی والے سیاہ فام لمبے تڑنگے شوفر نے بڑے مؤدبانہ انداز میں الزبتھ کے لیے اس کی چم چم کرتی رولز رائس کا دروازہ کھولا۔ اس نے مجھے اور محسن کو خاصے ناپسندیدہ اور مشکوک انداز میں دیکھا لیکن اس نے اپنے رویے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ اندر سے ایک پولیس مین تیزی سے نکلا اور میری طرف بڑھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہی باکسر تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کے کہا "تم اچھے فائٹر ہو۔"

میں نے بھی خوش دلی سے کہا "تم یقیناً اچھے باکسر ہو گے۔"

"میرے پاس پولیس کا کلر ہے۔ ایک بار میں نے کامن ویلتھ گیمز میں چاندی کا تمغا لیا تھا۔ اس میں پاکستان سے بھی ایک باکسر لڑا تھا۔"

"میری خواہش ہے کہ تم گولڈ میڈل لو۔"

وہ ہنسا "خواہش تو میری بھی تھی کہ تمغا گلے کا ہار ہوتا۔ مگر میں نے اس کے بعد کامن ویلتھ گیمز اور یورپین گیمز میں چاندی کا تمغا بھی نہیں جیتا۔ اب وقت گزر گیا ہے۔ خیر مقابلہ اچھا رہا۔"

"مقابلہ دلچسپ رہا۔"

"اسے صرف مذاق یا تماشا ہی سمجھنا۔ سیریس مت ہو جانا۔ تمھارے غصے میں بہت کچھ کہہ دیا تھا: کالے رنگ اور ایشیا والوں کے خلاف۔"

میں نے اسے یقین دلایا "میں سب کچھ بھول چکا ہوں۔"

"NO HARD FEELINGS?"

میں نے کہا "NONE"

جب بالآخر رات کے آٹھ بجے کیپٹن کا شکریہ ادا کر کے ہم پولیس اسٹیشن سے باہر نکلے تو میں نے صدقِ دل سے خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھے اتنی ہی مسرت ہوئی جتنی جیل میں قدم رنجہ فرما کے رہائی کا حکم وصول کرنے والے کو ہو سکتی ہے۔ اس میں تھوڑا بہت دخل اتفاقات کو ضرور تھا۔ پولیس نے ہماری تلاشی نہیں لی تھی اور ہم سے کاغذات طلب نہیں کیے تھے ہمارے بدلے ہوئے نام والی شخصیت کا راز فاش نہیں ہوا تھا ورنہ IMPERSONIFICATION کا کیس الگ ہوتا۔ قلعہ بارنگ کی معمولی کوتاہی سے شروع ہونے والی کہانی کہاں تک پہنچی تھی۔ تفتیش ہوتی تو معاملہ صرف ہمارے غیر قانونی طور پر لندن میں داخل ہونے تک محدود نہ رہتا۔ پولیس معلوم کر لیتی کہ جس ڈاکٹر شاہ کی کار تھی وہ خود کہاں مرا ہوا پڑا ہے۔ قتل عمد کا کیس حالات اور دوا افشات کی شہادت سے ثابت ہو جاتا پھر چودھری دلاور کا کیس۔ اپنے آنا اور اس کے بعد دوسرے معاملات جن میں ہم لندن میں قیام کے دوران ملوث ہوئے تھے۔

مجھے یقین تھا کہ خدا کی مصلحت بندے کی ناقص عقل سے بہت بالاتر ہے۔ بظاہر خرابی کے اسباب رکھنے والی نگاہ اس میں پوشیدہ خوبی کو نہیں دیکھ پاتی۔ گرفتار ہو کے پولیس اسٹیشن پہنچنا ہمارے نزدیک بدقسمتی کی انتہا تھی کہ ٹوٹی کہاں کمند۔ ہم نے اپنی طرف سے سارے ۔۔۔ تھے۔ ساری مشکلات پر قابو پا لیا تھا اور تمام مرحلے کامیابی سے طے کر لیے تھے۔ ہم قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کے اڑنے ہی والے تھے کہ گرفتار ہو گئے مگر اس بدقسمتی کو دستِ قدرت نے کیسے خوش قسمتی بنا دیا۔ ذلت و رسوائی کے بدلے ہم بڑی عزت و آبرو کے ساتھ اس الزبتھ کے ساتھ اس کی گاڑی میں اس کے گھر جا رہے تھے جس کے تصور سے ہماری روح فنا ہوتی تھی۔ اس کے شوہر کا نام میرے لیے ملک الموت کا نام تھا اور مجھے یقین تھا کہ اگر اس کا اور میرا کہیں سامنا ہو جائے جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو وہ پستول سے توپ تک جو کچھ دستیاب ہوا مجھ پر داغ دے گا۔ اگر اسے یا مجھے بفرضِ محال "قانونی طور پر اجازت ہوتی کہ چلو ایک بندہ گرا دو" تو میں چودھری دلاور کو مار دیتا اور وہ شاید مجھے۔ لیکن اچانک مقدر نے پانسہ پلٹ دیا تھا۔ چودھری دلاور کسی گولی کے بغیر مر رہا تھا اور میں ملک الموت کے ساتھ ڈنر پر مدعو تھا۔

میں اندازہ کر سکتا تھا کہ خود محسن کے خیالات کیا ہوں گے۔ کوئی اور ساتھ ہوتا تو میں اور وہ بے تکلفی سے اپنی قومی اور مادری زبان میں اظہارِ خیال فرماتے اور اس کامیابی پر چلا کے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے اور نعرہ لگاتے "وہ مارا پاپڑ والے کو۔"

الزبتھ کے سامنے۔ خصوصاً اس کے شوفر کی موجودگی میں "ہم ایسی گھٹیا حرکت کرتے تو اسے کوئی شبہ نہ رہتا کہ ہم ذرا بھی خاندانی لوگ نہیں ہیں۔" یہ ادب آداب کے بھی منافی ہوتا چنانچہ ہم بڑی پُرتکلف گفتگو کرتے رہے۔ الزبتھ بھی فرنچ جانتی تھی چنانچہ کبھی انگریزی اور کبھی فرنچ میں ہم اس وقت کی باتوں کو دہراتے رہے جو بیت چکا تھا اور اس کے بعد انگریزی محاورے کے مطابق پُلی کے

www.paksociety.com

بیچ سے ٹیمز کا بہت پانی بہہ گیا تھا۔ چار سال کی رفاقت کے کُل کتنے دن تھے؟ کتنے گھنٹے منٹ اور سیکنڈ۔ میں نے ایسے ہی ذہنی مشق کرتے ہوئے حساب کیا۔ تقریباً چودہ سو اکسٹھ دن اور تقریباً پینتیس ہزار گھنٹے۔ اس سے زیادہ کا زبانی جمع خرچ میرے لیے ممکن نہ تھا۔ مگر یہ لاکھوں منٹ اور شاید کروڑوں سیکنڈ ہوں گے۔ ہر لمحہ اپنا کوئی نقش چھوڑ جاتا ہے۔ ہمارے پاس بھی یادوں کا مشترک خزانہ تھا۔ ہم اس میں سے یادگار لمحے چنتے رہے۔

گاڑی الزبتھ کے قصرِ عالی شان میں داخل ہوئی تو مجھے پھر تشویش لاحق ہونے لگی۔ اس یقین دہانی کے باوجود کہ شوہر اس کا غلام ہے مجھے اپنا الزبتھ کے ساتھ آنا ایک اشتعال انگیز کارروائی محسوس ہوتا تھا۔ میں وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ ایسی ہی صورت حال مجھے درپیش ہوتی تو میں اپنے رقیب کو بلا تامل قتل کر دیتا۔ خواہ قتل کرنے کے بعد اس کی بے گناہی ثابت ہو جاتی تو میں پچھتاتا۔

یہ گھر میرے لیے نیا نہیں تھا۔ یہ الزبتھ کے باپ کا گھر تھا۔ یہاں میں کتنی بار آیا تھا اور کئی بار بےعزت ہو کے گیا تھا۔ اگر میں الزبتھ سے سوال کرتا کہ آخر اس کا شوہر یہاں کیوں رہتا ہے؟ کیا اس کا اپنا کوئی گھر نہیں؟ ہمارے لیے تو یہ سخت باعث شرم بات ہے کہ بیوی رخصت نہ ہو شوہر رخصت ہو کے سسرال میں رہنے لگے۔ بہت سے محاورے بھی بنا رکھے ہیں ہم نے کہ بہن کے گھر بھائی کتا، ساس کے گھر جوائی کتا۔

کاکروچ اپنے رتبے اور حیثیت کے اعتبار سے الزبتھ کا ہم پلہ تھا اور شاید وہ حسب نسب میں بھی کم نہ تھا۔ اس کی سرکاری حیثیت تقریباً ویسی ہی تھی جیسی تگی کے مرحوم ابا اور وقار یوسف کے سسر نقوی صاحب کی۔ وہ بھی بڑی توپ چیز تھے۔ مگر وقار یوسف نے ان کا گھر داماد بننا بالکل قبول نہیں کیا تھا اور تگی بھی اپنے محل جیسے گھر کو چھوڑ کے وقار یوسف کے چھوٹے سے مکان میں آبسی تھی۔ یہاں معاشرتی اقدار مختلف تھیں۔ بیوی کے گھر میں رہنے سے شوہر کی ناک نہیں کٹتی تھی۔ یہ ان کے آپس میں طے کرنے والی بات تھی کہ وہ کہاں رہنا پسند کرتے ہیں۔

گاڑی جیسے ہی پورچ میں آ کر رکی آگے گیراج کی طرف چلی گئی۔ ایک اور خادم نے ہمارا سامان جو درحقیقت چوہدری دلاور کا سامان تھا، ایک شاندار بیڈ روم میں پہنچا دیا۔

"سو بھی اپنے شیروانی صاحب 'عیش کرو عیش۔"

محسن صوفے پر دراز ہو گیا "مجھے تو یہ سب خواب کی طرح لگتا ہے۔ ایسا نہ ہو آنکھ کھلے تو پتا چلے حوالات میں پڑے ہیں۔"

میں نے کہا "اسی کو کہتے ہیں قسمت الو کے پٹھے۔ چند سال تو بھی دیارِ لندن میں 'جھک ماری۔ ایک ہی محبوبہ تھی ایسی جو آج بھی سب کچھ نچھاور کرنے پر تیار ہے۔"

"نچھاور کے بچے۔ سنبھل کے بیٹھ۔ ابھی اچانک کسی ... سے تیرا قاتل رقیب نمودار ہوگا۔ ہاتھوں میں دو نالی شکاری بندوق کے ساتھ۔ ایک گولی تیرے دل ناہنجار میں مارے گا دوسری مجھے۔ میں صرف تیری رقابت میں ایسے مارا جاؤں گا جیسے گیہوں کے ساتھ گھن پس جاتے ہیں۔"

میرے مزید کچھ اور ارشاد فرمانے سے پہلے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ یہ بیک وقت محل سے باہر اور محل کے اندر آپس میں بات چیت کرنے کے کام آتا تھا۔

الزبتھ نے کہا "تم لوگ نہا دھو کے ایزی ہو جاؤ۔ میں ذرا سٹاف کو بریف کر لیتی ہوں۔"

میں نے کہا "اگر اس کا ارادہ پکا ہو اور وہ تمہاری نہ مانتے ہوئے ہمیں قتل کرنا چاہے تو ہمیں خبردار کر دینا۔"

وہ ہنسی "کیا کرو گے؟ تم بھاگ سکتے ہو یہاں سے؟"

میں نے کہا "نہیں مگر اور بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ نفل پڑھ سکتے ہیں۔ گناہ معاف کرا سکتے ہیں۔ کلمہ شہادت پڑھ سکتے ہیں اور وصیت کر سکتے ہیں کہ ہماری تدفین اس جگہ ہو جہاں سے تمہارے قدم ہر روز گزرتے ہوں۔"

وہ بولی "پاگل آدمی' اس سے کیا ہوگا؟"

"ہر روز جب تم میرے دل کو روندتی گزرو گی تو تمہیں آواز سنائی دے گی۔ تو یہ میرا دل ہے ظالم حسینہ' کوئی پتھر نہیں۔"

وہ پھر ہنسی اور فون بند کر دیا۔

محسن نے جل کے کہا "اب کوئی فائدہ نہیں مکھن لگانے کا بچے۔ وہ تمہاری رگ رگ سے واقف ہے۔"

"واقف نہ ہوتی تو اعتبار کرتی مجھ پر۔ اسی اعتبار کے صدقے میں تیری جان بھی بچ گئی ورنہ آج رات حوالات میں مچھر کھاتا۔ اب ٹھاٹ سے ڈنر کھائے گا 'ایک لارڈ کے ساتھ بیٹھ کے۔"

"مجھے اب بھی خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کھانے میں ہمیں زہر دلوا دے گا۔ اگر کھانے سے پہلے گولی نہ ماری۔"

رات نو بجے ایک باوردی بٹلر نمودار ہوا "لارڈ رچرڈ گوردان اینڈ لیڈی الزبتھ گوردان ڈائننگ ہال میں اپنے معزز مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے چشم براہ ہیں۔"

محسن نے کہا "بڑی اچھی بات ہے۔ جب ہمارے گھر کوئی مہمان آتا ہے تو ہم بھی چشم براہ رہتے ہیں۔"

میں نے اسے ڈانٹا۔ "گدھے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ تشریف لائیے۔ زیادہ بے تکلفی میں کہا جائے گا کہ کھانا کھانا ہو تو آ جاؤ نہیں کھانا تو جہنم میں جاؤ۔"

ڈائننگ ہال بڑا پُرشکوہ تھا۔ محل کے اس حصے میں آنے کا مجھے پہلے اتفاق نہیں ہوا تھا۔ جب میں الزبتھ کی محبت کے وائرس سے ہونے والے ناقابل علاج مرض میں مبتلا تھا تو میری رسائی مہمانوں کے کمرے تک تھی یا انتظار گاہ تک۔ ایک دو بار میں جان ہتھیلی پہ رکھ کر اس کے بیڈ روم تک پہنچ گیا تھا اور صاحب عزت افزائی سے

ساتھ نکالا گیا تھا۔ الزبتھ کے سخت گیر اور متعصب باپ کا میکیویلی سسٹم بہت فعال اور مضبوط تھا۔ ایک کالے ایشیائی نے اس کی حسین و جمیل بیٹی کے گورے دل میں نقب لگا کے اپنی محبت کا دیا جلا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ زیادہ چوکنا ہو گیا تھا۔ چونکہ بقول شاعر یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے۔ وہ محبت کا دیا اس وقت تک گل نہیں کر سکا تھا جب تک اسے روشن رکھنے کے لیے میں موجود تھا۔ مجھے بیک بینی و دو گوش حدود برطانیہ سے نکالنے کے بعد اس نے میرے خلاف وہی افترا پردازی اور بدنیتی پر مبنی پروپیگنڈا مہم چلانے کا میابی حاصل کی اور الزبتھ کو مجھ سے بدظن کرنے کے بعد اس کی شادی کاکروچ سے کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کے بعد دنیا میں کرنے کے لیے کچھ نہ تھا چنانچہ وہ رحلت فرما گیا۔

اس کی زندگی میں مجھے محل کے اندرونی حصوں تک کیسے رسائی حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ مجھے قتل کرانے سے پہلے اس ڈائننگ ہال میں آخری طعام پیش کر سکتا تھا اور تخریبی ابلاس کی طرح مجھ سے جان چھوٹ جانے کی خوشی میں تحریکی ڈنر بھی دے سکتا تھا مگر مجھے 'معزز مہمان' کی حیثیت سے یہاں مدعو کرنے' یہ اس کی زندگی میں ممکن نہیں تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ یہ دیکھنے سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

شاہ بلوط کی سیاہ پالش سے چمکتی ہوئی منقش اور سنہرے حاشیے والی کرسیوں کی قطار میں گھری ہوئی میز ہال کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلی ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس میز پر ایک ساتھ پچاس افراد بیٹھ کے ڈنر تناول فرما سکتے تھے۔ بعد میں یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اس پر چھبیس افراد کی گنجائش تھی۔ بارہ ایک طرف اور بارہ دوسری طرف۔ دو آمنے سامنے۔ ایرانی قالین اور کرسٹل کے نصف درجن فانوسوں سے مزین اس کمرے کے بالکل آغاز میں سر رچرڈ گوردان عرف کاکروچ سیاہ سوٹ کے ساتھ 'سیاہ بو' ٹائی لگائے 'باادب' 'باملاحظہ' ہوشیار کھڑا تھا۔ الزبتھ نے بھی اپنا لباس بدل لیا تھا اور وہ فارمل پارٹی ڈریس میں گڑیا جیسی لگ رہی تھی۔ دو افراد کے لیے نہیں ڈنر ہمیں ایسی معزز حضرات و خواتین کے اعزاز میں دیا گیا ہے۔

بڈھے کے لبوں پر خوش اخلاقی کی مسکراہٹ اس کے دل پر حکمرانی کرنے والی بیوی کے حکم کی تعمیل کے لیے تھی۔ سر تسلیم خم جیسے تو مزاج یار میں آئے۔ اس نے انتہائی شائستگی سے کہا "ویلکم ٹو انگلینڈ۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے مسٹر سکندر بخت اور آپ کا کیا حال ہے مسٹر محسن شیروانی؟"

للزبی چیپس نے بتایا اس محل کا نیا نام تھا جو الزبتھ کے نام کی مناسبت سے رکھا گیا تھا۔ الزبتھ نے اسے استقبالیہ کلمات کے لیے میرے اور محسن کے پورے نام بھی یاد دلا دیے ہوں گے اگر وہ بھولا ہوا تھا تو۔

میں نے بھی پُرتکلف لہجے میں اس سے مصافحہ کرکے کہا "فائن۔ سر رچرڈ گوردان! ہاؤ ڈو یو ڈو؟ اور آپ لیڈی الزبتھ... یو لک بیوٹی فل ایز ایور۔"

اس نے نزاکت سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا اور مسکرائی۔ میں نے اس کا ہاتھ لبوں تک لے جا کے چھوڑ دیا۔ یہ استقبالیہ آداب تھے۔ ہیرا وڈترا پینل میں آنے والے اسی طرح کی کسی پُرتکلف انداز میں دہرانے کے پابند تھے۔ ہم اتنی لمبی میز پر روایتی طریقے سے نہیں بیٹھ سکتے تھے ورنہ ایک کنارے پر سر رچرڈ گوردان نظر آتے۔ دوسرے کنارے پر الزبتھ۔ اور ہم دو دُکر آمنے سامنے بیٹھتے تو کس کے ساتھ۔ نتیجہ یہ کہ ایک طرف میزبانی کے لیے صرف الزبتھ رونق افروز ہوئی۔ اس کے دائیں ہاتھ پر خود رچرڈ رہا اور محسن اس کے ساتھ بیٹھا۔ مجھے عین رچرڈ کے مقابل جگہ ملی۔

کھانے کے دوران میں بہت رسمی قسم کی بے حد شریفانہ گفتگو ہوئی کیونکہ بٹلر اور ویٹر آہٹ پر کان دھرے دست بستہ کھڑے تھے۔ ان کے سامنے میں سر رچرڈ گوردان کے کندھے پر ہاتھ مار کے کہتا۔ یو ڈرٹی کاکروچ! سیوریج لائن کے کیڑے۔ تم بازی جیت گئے۔ میری محبوبہ پر اپنے سازشی ہتھکنڈوں سے قابض ہو گئے۔ تو نہ صرف یہ کہ اس کی خاندانی ناک جڑ سے کٹ جاتی بلکہ شاید الزبتھ اور ویٹر سب چیت سے گر کے بے ہوش ہو جاتے کہ طعام گاہ میں اس قسم کی گری ہوئی ذہنیت کی غماز 'بازاری' گفتگو اور ہائی گاڈ! ہمارے آبا و اجداد کی عالی نسل عالی نسب ارواح کو کس قدر شرمندگی ہوئی کہ ہم نے اس شرافت و نجابت کے ماحول کو کیسے لوگوں کو بلا کے خراب کیا۔ ایسا رویہ ان کے لیے اتنا ہی ناقابل تصور تھا جیسے اپنے خوب صورت اور آراستہ ڈرائنگ روم میں گندے جوہڑ سے غسل فرما کے قدم رنجہ فرمانے والی بھینس کا وجود جس کے متعفن بدن سے کیچڑ اور غلاظت بہہ رہی ہو۔

سر رچرڈ نے اور لیڈی الزبتھ نے ہم سے اور ہم نے ان سے بے حد رسمی سوال کیے۔ انڈیا کا موسم کیسا ہے۔ سوری سر میں پاکستان میں ہوں۔ یہ پہلے ہندوستان کا حصہ تھا۔ پھر مسلمانوں نے اپنی الگ حکومت قائم کر لی۔ او یس! مجھے یاد آ گیا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد انگریزوں نے اس ملک کو آزادی دے دی تھی۔ تو تم کیا کر رہے ہو وہاں؟ ابھی کوئی خاص کام نہیں۔ بس پلان کر رہا ہوں کہ اپنی جائیداد اور جاگیر کی آمدن کو کیسے اور کہاں انویسٹ کیا جائے۔ اور آپ؟ سر رچرڈ غالباً وزارت داخلہ میں ہیں۔ او یس! وقت گزاری کے لیے کچھ تو کرنا ہوگا۔ آپ نے ہمارا گھر دیکھا؟ واٹ از بیوٹی فل۔ آپ کی حسین بیوی کے شایان شان اور ان کے ذوق جمال کے مطابق۔ (اس نے دل ہی دل میں مجھے گالی دی ہوگی۔ خود کو کچھ 'طعنہ' دیتا ہے کہ محل میری بیوی کا ہے اور تو اس حال سے کیا میں مارا ہوا ہوں؟)

کھانے کے سات کورس تھے۔ جو سوپ سے شروع ہو کے کافی

www.paksociety.com

پر ختم ہوئے۔ کافی پینے کے لیے ہم اسموکنگ روم میں چلے گئے اور وہاں کھل کے بات ہوئی۔

"آج تم نے سب کے سامنے مجھے کاکروچ نہیں کہا؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "وہ پرانی بات ہے۔ جب ہم نوجوان اور نادان تھے۔"

"کیا اب تم ذہنی طور پر بالغ ہو گئے ہو؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "پتا نہیں۔ کیا تم اب کاکروچ نہیں رہے؟"

اظہر نے فوراً مداخلت کی "رہنے دو۔ سکندر کی کچھ پرابلم ہے۔"

"اچھا؟ کیا پرابلم ہے؟" اس نے سگار جلاتے ہوئے کہا "اگر میں کچھ کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "تم بہت کچھ جانتے ہو۔ مثلاً یہ کہ میں نے کراچی سے یہاں آنے کے لیے قانون کے مطابق کوشش کی تھی۔ ناکامی کے بعد میں نے ایک غیر قانونی طریقہ آزمایا تھا اور میں وقت پر فرار نہ ہوتا تو وہیں دھر لیا جاتا۔ تم نے اپنے کونسلیٹ کو میرے خلاف پوری طرح بریف کر دیا تھا۔ خیر قصور تمہارا نہیں، جو کچھ تم میرے بارے میں جانتے تھے، اس کے بعد تمہارا معاندانہ رویہ غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہم دوسری طرف نکل گئے یعنی پہلے کولمبو گئے۔ وہاں سے پیرس پہنچے اور پیرس سے چھپ کر لندن آئے۔ سوفیصد غیر قانونی طور پر۔ سفری دستاویزات کے بغیر۔ یہ رپورٹ بھی تمہارے محکمے کے تک خواہ مخواہ تمہیں دی ہوگی۔"

اس نے پہلو بدل کے کہا "ہاں، کچھ سنا تھا میں نے۔"

میں نے کہا "اس وقت مجھ سے سرچھپانے کو وطن ہی کی بات مت کرو۔ میں یہاں ایک پرانے دشمن کی حیثیت سے دوستی کا ہاتھ بڑھانے اور غلط فہمیاں رفع کرنے آیا ہوں۔ ہم پڑھے لکھے اور مہذب لوگ ہیں۔ ہمارے رویے میں فراخ دلانہ لچک اور مفاہمت کی گنجائش ہونی چاہیے۔ ہم نے چار سال ساتھ گزارے۔ ایک دوسرے کے لیے ہم صرف کلاس میٹ تھے۔ ہماری مصروفیات میں آپس کی رفاقت اور رقابت سب شامل تھی۔ یہ زندگی ہمیں آنے والے وقت کی ذمے داریوں کے لیے ایسے ہی تیار کرتی ہے۔ ہم بچپن میں اور پھر جوانی میں خواہشوں کی ناکامیوں سے اور خوابوں کی شکست سے۔ چھوٹی چھوٹی محرومیوں سے جذباتی صدمات کے بڑے بڑے دکھ اٹھانے اور آلام و مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا سبق سیکھتے ہیں۔"

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "تم فلاسفر ہو گئے ہو۔"

"نہیں، میں پریکٹیکل ہو گیا ہوں۔ جو میں کل تھا وہ آج نہیں ہوں۔ اور جو آج ہوں کل وہی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ اس وقت ہم کہاں ہیں اور ہمارے درمیان تعلق کی اصلیت کیا ہے۔ آج میں ایک دوسری دنیا سے وارد ہوا ہوں۔ ... دنیا کے مسائل کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے نہ تم ان تبدیلیوں کا اندازہ کر سکتے ہو جو میری شخصیت اور کردار میں رونما ہوئی ہیں۔ تم تسلسل کے ساتھ ایک زندگی جی رہے ہو جو کسی خلل اندازی کے بغیر وہی ہے جیسی تم نے اپنے لیے پسند کی۔ میرا معاملہ اس کے برعکس رہا۔ مجھے اس زندگی سے بے دخل کر دیا گیا۔ زبردستی، لاقانونیت اور بدمعاشی کے ذریعے۔ جس پر میرا حق تھا۔ یا میں سمجھتا تھا کہ وہ زندگی مجھے واپسی میں منتظر ملے گی۔ میں محرومی اور اندیشوں سے بے نیاز زندگی ایک موروثی جائداد کے ساتھ حاصل کروں گا۔ میرے لیے سب کچھ میرے باپ نے پہلے ہی کر دیا تھا۔ میری زندگی کے حصے کی ساری مشکلات خود اس نے جھیلی تھیں تاکہ مجھے کبھی پریشانی سے واسطہ نہ پڑے۔ یہ پرانے وقتوں کے باپ 'بوڑھے لوگ' کیسے جذباتی انداز فکر رکھتے تھے، بھلا یہ ممکن ہے کہ زندگی میں کسی کو رنج و غم دکھ اور پریشانی ہی نہ ملے۔ یہ سب زندگی کے ساتھ قبول کرنا پڑتا ہے۔ کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ اس کم اور زیادہ ہی کے لیے زندگی کی جدوجہد ہے۔ غم ہے تو اس کا مداوا بھی ہے۔ رنج کا خوگر ہونے میں خوشی ہے۔ سارا سال بہار کے پھول کھلتے تو بہار میں کیا حسن نظر آتا؟ خزاں بھی اہم ہے۔ خیر تم پھر کہو گے کہ میں فلسفہ بول رہا ہوں مگر یہ بنیادی حقائق ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا، اس میں مجھے ہمیشہ انتخاب کا حق حاصل نہیں رہا۔ میں نے وہ سب کچھ نہیں کیا تھا جو مجھ سے منسوب تھا۔ پھر میں کیا کرتا؟ جب کسی طاقتور بلاک کی طرف سے کسی چھوٹے اور کمزور ملک پر جنگ مسلط کی جاتی ہے تو وہ مجبور ہو جاتا ہے اپنے دفاع، اپنی بقا اور اپنی شناخت برقرار رکھنے کے لیے لڑنے پر۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے تمہید سے مقصد کے حصول کی جانب نمایاں پیش قدمی کی ہے۔ کاکروچ بڑی توجہ اور انہماک کے ساتھ میری بات سن رہا تھا اور متاثر بھی نظر آتا تھا۔ یہ انداز بیان سے زیادہ حقائق کا کمال تھا۔ جھوٹ اتنے اعتماد کے ساتھ کون بول سکتا ہے کہ سننے والے کے دل میں شک کا خیال تک نہ آئے۔ شاید مجھے احساس تھا کہ مجھے اپنی وکالت خود کرنی ہے تو تیج کی طاقت کا بھرپور استعمال کرنا ہوگا۔ یہ میرے لیے دہری جنگ تھی۔ ایک انا کی جنگ تھی، میں ہاری ہوئی بازی پھر جیت لینا چاہتا تھا۔ کاکروچ کے قائل ہونے کی صورت میں یہ امید تھی کہ اس کا اثر و رسوخ میری راہ میں حائل ہو جانے والی ہر رکاوٹ دور کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ دوسری جنگ ضمیر کی عدالت میں اخلاقی سند حاصل کرنے کے لیے تھی۔ میں کاکروچ کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ ادھر سے میرے تعلق کی نوعیت محض جذباتی تھی اور آج میں اس کی عزت پہلے سے زیادہ کرتا ہوں کیونکہ وہ کسی اور کی بیوی ہے۔

میں نے لندن سے واپسی کے اسباب کو بنیاد بناتے ہوئے اپنی داستان حیات کا وہ حصہ بھی سنا دیا جس کا تعلق میرے ماضی سے تھا۔ میں کون تھا، کہاں سے آیا تھا اور اپنے پیچھے کیا چھوڑ کر مستقبل میں کیا جاننے کے لیے لندن پہنچا تھا لیکن واپس پہنچ کے میں نے کیا دیکھا اور کیا پایا پھر کیا سامنے آیا اور کیسے ناپاک شیطانی عزائم رکھنے والے ہوس کے شکاری میری جان کے دشمن ہوئے۔ جب انہوں نے کیسے میرا ضمیر خریدنے کی کوشش کی اور ناکامی کے بعد کس طرح میرے گرد اپنا حصار تنگ کیا۔ صرف مجھے ہی نہیں میرے چاہنے والوں کو بھی شدید ترین ذہنی و جسمانی اذیت دے کر مجبور کیا گیا۔ میرے دو مخلص نے کس طرح خلوص کی اس آزمائش میں میرا ساتھ دیا۔ کیسے ایم آر ایس بنی۔ اس نے کیا معرکے سر کیے۔ اس راہ وفا میں کس کس نے کیا قربانی دی۔ کسی نے اپنا گھر بار لٹایا تو کسی نے جان دینے میں بھی بخل سے کام نہیں لیا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ بیان کو اتنا طول دوں اور حقیقت میں افسانوی انداز بیان سے ساحری یا شاعری کروں مگر جب بات شروع کی تو مجھے یوں لگا جیسے میں خود نہیں بول رہا ہوں، حقائق خود اپنے اظہار کے لیے الفاظ کا پیرایہ منتخب کر کے میری زبان سے ادا ہو رہے ہیں۔ یہ سینوں بلکہ برسوں کا غبار تھا جو موقع ملتے ہی ایسے نکلا جیسے پریشر ککر سے بھاپ نکلتی ہے۔ جیسے ساون کی بدلی بالآخر ٹوٹ کے برستی ہے۔ آج سے پہلے میں کسے سناتا اور کس کو بتاتا۔ جو سن سکتے تھے وہ تو خود پیش آنے والے واقعات کا حصہ تھے۔ وہ سب اس پر صعوبت سفر میں شریک سفر تھے جس کی منزل بار بار سراب ثابت ہوئی تھی مگر آج مجھے اپنے سامنے نظر آ رہی تھی۔ میں اس مرحلے پر منزل کا سراغ پھر گم کرنے کا صدمہ اور نقصان افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ میں تھک گیا تھا۔ مجھ میں پہلا سا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ میں انسان تھا، کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں تھا۔ میرے اعصاب ایک حد تک میرے عزائم کا ساتھ دے سکتے تھے۔ میں محسوس کرتا تھا کہ میری جدوجہد نے میرے دوستوں کی زندگی کے سارے خواب منتشر کر دیے ہیں۔ ان کے مستقبل پر سے ان کا اعتبار ختم کر دیا ہے۔ وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ آگے کیا ہے؟ کیا ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں؟ شکاریوں کے ترکش میں کتنے تیر باقی ہیں جن کا نشانہ ان کا یقین ہوگا۔ وہ یقین جو انہیں اپنی راستی پر ہے، اپنی دوستی پر ہے، اپنی محبت پر اور انسانیت کی عظمت پر ہے۔ عدالت پر ہے اور قانون کی بالادستی پر اور اخلاقی اقدار کی تقدیس پر ہے۔

مجھے یوں لگا جیسے میں عدالت میں کھڑا ہوں اور وہ سب بتا رہا ہوں جس کے لیے مجھ سے پہلے بھی سقراط نے زہر کا پیالہ قبول کیا۔ ابن مریم نے صلیب کو چوما۔ حسینؓ نے خاک کربلا کو آبرو دی۔ میں ان کی ہمسری تو کیا ان کی تقلید کا دعویٰ بھی کروں تو شاید یہ تکبر شمار ہو۔ میں نے وہی کہا اور کیا تھا جس کو ساری دنیا کے ہر خطے میں پیغمبروں، اولیا اور اوتار، سماجی انقلاب کے بانیوں اور اخلاقی ضابطے مرتب کرنے والوں اور معاشرتی مفکرین نے محسن انسانیت قرار دیا اور آدمیت بتایا۔ میں نے ان مظالم اور مصائب کا ذکر نہیں کیا جو میری ذات، میری زندگی اور میرے نصیب کا حصہ ہوئے۔ میں نے تو وہ بتایا جو ساری دنیا میں ہر جگہ شیطان کے پیروکار، بدی کے علمبردار، امن و آشتی کے دشمن، محبت اور دوستی اور اخوت کے انسانی رشتوں کو بے اعتبار کرنے والے کر رہے ہیں۔ یہ خیر و شر کی پرانی معرکہ آرائی کا نیا محاذ تھا جس پر میں نے ایم آر ایس کے نام پر ایک اور جنگ لڑی۔ اس کا انجام شکست پر نہیں ہو سکتا تھا۔

شاید یہ سوا میرے ذہن کی بھٹی میں پک رہا تھا اور میں غیر شعوری طور پر اس آخری معرکے کی تیاری میں مصروف تھا جو قانون کے میدان میں دلائل کے ہتھیاروں سے سر ہوگا۔ جہاں جذبات بے معنی ہوں گے۔ صرف حقائق کام آئیں گے۔ یہ وہی بیان تھا جو میں عدالت میں گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا ہو کے دیتا۔ اب اس کے لیے وقت باقی نہیں رہا تھا۔ اچانک سب سے بڑی عدالت کا فیصلہ سامنے آگیا تھا اور چوہدری ولاور نے آخری معرکے سے پہلے ہی شکست تسلیم کر لی تھی۔ میری حالت اس بچے جیسی تھی جس نے بڑے جوش و خروش اور کامیابی کے سو فیصد یقین کے ساتھ کسی مقابلے کے لیے دن رات تیاری کی ہو مگر اسے آخری وقت میں بتایا جائے کہ انعام اسے دے دیا گیا ہے کیونکہ مقابلے کے لیے دوسرا حریف کوئی نہیں۔ جو حریف تھا وہ قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا ہے۔ اس بچے کی خوشی میں کتنی مایوسی ہوگی۔ کتنا رنج ہو گا اور اس وقت جب وہ بلا مقابلہ جیتنے کے باوجود دل گرفتہ ہو تو اس کا شفیق باپ کہے کہ ہاں بھئی، ہم بھی تو سنیں کہ تم نے کیا تیاری کی تھی مقابلے کے لیے۔ اور اس وقت وہ بچہ فرض کرے کہ وہ اکیلا نہیں بول رہا ہے۔ اس کے سامنے پنڈال ہے جو سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور اس نے اپنی تقریر سے سماں باندھ دیا ہے، جادو کر دیا ہے سننے والوں پر۔

جب میں خاموش ہوا تو یہ خاموشی جاری رہی۔ اس خاموشی میں ان سب کی سوچ گونج رہی تھی جو میرے ساتھ تھے۔ عدالت کی فل بینچ فیصلہ مرتب کر رہی تھی۔ وہ غور و خوض کے بعد سچ کو جھوٹ سے الگ کر رہے تھے۔ قانونی موشگافیوں سے ادھڑی ہوئی، جھوٹے گواہوں کے بیانوں سے مسخ ہو جانے والی اور حلفیہ تضاد بیانی سے شناخت کھو دینے والی حقائق کی لاش کا معائنہ کر رہے تھے اور اصل حالات و واقعات کو مفروضات سے اخذ کر رہے تھے۔

فرق صرف یہ تھا کہ یہاں ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے جج نہیں تھے۔ فیصلہ کرنے والی ایک عورت تھی جو مجھ پر اعتبار کرتی تھی اور ایک مرد تھا جو اس عورت کا شوہر ہونے کے ناتے اور بغض و عداوت کے جذبات سے مغلوب ہو کے میرے سچ کو جھوٹ قرار دے سکتا تھا۔ لیکن اظہر نے کہا تھا کہ وہ کینہ پرور نہیں ہے۔ کیا اس نے یہ بیان محض ایک روایتی طور پر وفاداری کا تاثر برقرار رکھنے کے لیے دیا تھا؟

www.paksociety.com

سر رچرڈ کورڈان کا ردعمل حوصلہ افزا تھا۔ آہستہ آہستہ اس پر چڑھا ہوا احساسِ برتری کا ملمع اترنے لگا تھا۔ وہ سر رچرڈ کورڈان کی پُرنخوت اور مصنوعی رکھ رکھاؤ والی شخصیت کے خول سے باہر آرہا تھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ ایزی تھا اور بے تکلفی سے مسکرانے بھی لگا تھا۔ اس نے درمیان میں مجھ سے جو سوالات کیے تھے وہ اس بات کی علامت تھے کہ وہ میرے کیس کو پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ ذہن نشین کر رہا ہے۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد اس نے الزبتھ سے کہا "میرا خیال ہے کہ ہمارے دوست بھی ایک کپ کافی کی ضرورت محسوس کر رہے ہوں گے۔"

اس نے تمہارے دوست نہیں کہا تھا۔ ہمارے دوست کا لفظ استعمال کیا تھا۔ ہم تو پہلے ہی ادب آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صوفے پر دراز تھے اور پھر کشن کے ساتھ قالین پر بچھ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے بھی اپنا سرکاری فوٹو والا پوز ختم کر دیا اور ہماری طرح فری ہو کے ایسے بیٹھ گیا جیسے ہر شریف آدمی اپنے گھر میں بیٹھنا پسند کرتا ہے۔ پاؤں صوفے پر سمیٹ کر یا خود فرش پر لمبا لیٹ کر اور پاؤں صوفے پر پھیلا کے یا کشن کو گود میں اور بغل میں دبوچ کر۔

میں نے کہا "اگر میں تمہیں کاکروچ کہوں الزبتھ کے سامنے تو تمہیں بُرا لگے گا؟"

وہ ہنس پڑا "نہیں، اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میں کاکروچ نہیں ہوں، تم کو بھی میں کرسی کی ٹانگ یا گدھے کی دم کہوں تو بات ازبس اسے جوک۔"

"اس کے بعد مذاق بے لطف ہو جاتا ہے" میں نے کہا۔

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں سکندر!" اس نے کہا "کہ ویسے تو میرے پاس تصدیق کے وسائل کی کمی نہیں۔ میں تمہارا سارا ریکارڈ دیکھ سکتا ہوں۔ چوہدری دلاور سے پوچھ سکتا ہوں یا اس بگڑو جارج سے اور اس کے وکیل سے معلوم کر سکتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تم پر ویسے ہی اعتبار کر لوں۔"

"آخر کیوں؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ تمہاری بات مجھے سچ لگتی ہے۔ اصل مسئلہ یہی ہوتا ہے۔ بعض اوقات جھوٹ کو سچ بنانے والے کمال کرتے ہیں۔ وہ عقل کو قائل کر سکتے ہیں لیکن یہ جو دل کا معاملہ ہے، یہ ذرا مختلف ہوتا ہے۔ دل بہت کم گواہی دیتا ہے کہ کوئی بات مان لی جائے خواہ عقل اسے تسلیم نہ کرتی ہو۔"

"یعنی تم قائل نہیں ہوئے بس دل کے ہاتھوں مجبور ہو؟"

"نہیں۔ تمہارے معاملے میں عقل کا فیصلہ وہی ہے جو دل کا۔ میں تم پر یقین کرنا تو نہیں چاہتا تھا مگر تم نے مجھے مجبور کر دیا۔ پتا نہیں کیسے۔ اور اب میرا دل تمہاری طرف سے بالکل صاف ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ مگر کہیں تم الزبتھ کا دل رکھنے کے لیے تو ایسا نہیں کہہ رہے ہو؟"

وہ ہنسا "عورتوں کو اور خصوصاً الزبتھ جیسی بیوی کو ہم جیسے زن مریدوں پر جذباتی بالادستی حاصل رہتی ہے۔ لیکن میں نجی مسائل کو اپنے عمومی فرائض سے الگ رکھتا ہوں۔ الزبتھ کی سفارش سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ شاید الٹا نقصان ہو جاتا۔ اس نے تو صرف یہ کہا تھا کہ ایک بار تمہاری بات سن کے فیصلہ کروں۔ انصاف کا تقاضا بھی یہی تھا۔ میں تم سے رقابت کے جذبات بھی رکھتا تھا دراصل۔۔۔ تمہارا بُرا تاثر پہلے اور تھا۔ بعد میں اس تاثر کو مزید خراب کیا گیا۔ مجھے ایسی اطلاعات ملتی رہیں جو غالباً بدنیتی پر مبنی اور جانبدارانہ تھیں۔"

"مجھے خوشی ہے کہ میں تمہاری غلط فہمی رفع کر سکا۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے ساتھ اول تا آخر زیادتی ہوئی۔ الزبتھ کے معاملے میں تم بہت جذباتی تھے۔ مجھے ابھی الزبتھ نے بتایا کہ تم نے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔"

"کون سی غلطی کا؟"

"اگر تمہاری شادی الزبتھ سے ہو جاتی تو بہت خرابی ہوتی۔ اس فیصلے میں عقل کا کوئی دخل نہیں تھا اور شدید جذباتی ردعمل کا مظاہرہ تمہاری غلطی تھا جس کی بنا پر تمہیں یہاں سے نکالا گیا۔ اب تم تسلیم کرتے ہو کہ وہ ٹھیک تھا۔ الزبتھ کے باپ کی سوچ متعصبانہ نہیں پریکٹیکل تھی۔"

"ہاں۔۔۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ نہ خوش رہ سکتے تھے اور نہ وفادار۔ تم اس کے لیے موزوں ترین شوہر تھے۔ اس نے بالکل صحیح انتخاب کیا بعد میں۔ اور یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آج ہم سب اسی فراخ دلی کے باعث پرانے دوستانہ جذبات رکھتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہیں، ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھ رہے ہیں اور۔۔۔"

"اور کیا۔۔۔ بس اتنا کافی ہے۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ اس معاملے میں ملوث ہوئے بغیر میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"میرا خیال ہے کہ تم صرف نظر کر سکتے ہو۔ یعنی ہمارے قانونی مسائل ہم پر چھوڑ دو اور بس۔ ہم دلاور کے ساتھ نکل جائیں گے۔ پولیس کی دخل اندازی سے دس بارہ گھنٹے کی تاخیر ہوئی مگر وہاں کے معاملات کسی پریشانی کے بغیر طے ہو گئے۔ تم نے ہمارا نقطۂ نظر سمجھ لیا اور میں نے اپنی پوزیشن کلیئر کر دی۔ رہے یہاں کے قانونی معاملات تو بعد میں تم جیسے چاہو سیٹ کر لو۔"

اس نے سر ہلایا "تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

میں نے کہا "ہم جانا چاہتے ہیں فوراً۔"

"کوئی حرج نہیں۔ تم صبح چلے جانا۔"

میں نے کہا "وہ کیوں؟ ابھی کیوں نہیں؟"

"اس وقت۔۔۔ رات کے بارہ بجے" الزبتھ نے کہا۔

"وقت کی پابندی ان کے لیے اہم ہوتی ہے جو کسی معمول کے پابند ہوں۔ یہ ایک غیر معمولی صورتِ حال ہے" محسن نے کہا۔ "رات کے بارہ بجے اور صبح کے سات یا دس بجے میں کیا فرق ہے۔ ہم یہ پانچ گھنٹے یا دس گھنٹے بڑی ٹینشن میں گزاریں گے۔ رات بھر آرام سے سو سکتے تو شاید رُک جاتے مگر ان حالات میں نیند آنے کا تو سوال نہیں۔ ہمارے اعصاب پر ایک خوف ضرور سوار ہے کہ کہ نہ جانے اچانک کیا ہو جائے۔ چوہدری دلاور کچھ بھی کر سکتا ہے ہوش میں آنے کے بعد۔"

"پھر تقدیر جو کھیل ہمارے ساتھ کھیل رہی ہے" محسن بولا۔

"اوکے۔ جیسی تمہاری مرضی۔" رچرڈ نے کہا "میں تمہاری ہر طرح سے مدد کے لیے تیار ہوں۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "میں نے سُنا تھا کہ تم بہت اصول پرست ہو؟"

"ٹھیک سنا تھا تم نے۔ عام طور پر ایسا ہی ہوں مگر ہر شخص کے لیے جذباتی رشتوں کی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ جب وہ خود اپنے اصولوں پر کاربند نہیں رہ سکتا۔ میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں۔ بعض اوقات ملازمت میں اوپر والوں کے لیے بھی گنجائش نکالنی پڑتی ہے۔ پھر میں تمہارے لیے کیوں نہ نکالوں۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ خود میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ قانون کے نام پر لاقانونیت ہوئی اور انصاف کے نام پر ناانصافی۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا "تھینک یو ویری مچ رچرڈ۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے پریکٹیکل ہونے کا ثبوت دیا۔ اصول ضابطے اور قاعدے کی آڑ لے کر اپنی معذوری ظاہر نہیں کی۔ میں ہمیشہ تمہارا احسان مند رہوں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ ہم پھر ملیں گے تو بہت اچھے حالات میں پرانے دوستوں کی طرح۔۔۔ بہت جلد ملیں گے۔"

الزبتھ بھی خوش تھی کہ اس نے جو کہا تھا وہی سچ ثابت ہوا۔ شوہر نے اعتراف کر لیا کہ وہ الزبتھ کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔

"اس وقت تم کیسے جاؤ گے؟" الزبتھ نے کہا۔

میں نے کہا "کوئی پرابلم نہیں۔ جیسے آپ لائی تھیں، ویسے ہی باہر نکالیے۔ میں تو پہلے بھی نکالا جاتا تھا۔"

محسن نے کہا "اگر تمہاری گاڑی کے شناخت ہونے سے کوئی پرابلم پیدا ہونے کا امکان ہو تو ہمارے لیے ٹیکسی بھی طلب کی جا سکتی ہے۔"

رچرڈ نے اطمینان کا سانس لیا "ٹیکسی بہتر رہے گی۔"

میں نے کہا "شاید چوہدری دلاور کو اسپتال سے ساتھ لے جانا ذرا مشکل ہو۔ اسے وہاں پولیس نے داخل کرایا تھا اور پولیس کی تحویل میں رکھا تھا۔"

رچرڈ فکرمند نظر آنے لگا "ہاں۔ یہ پرابلم ہو سکتی ہے۔ خیر میں کچھ کرتا ہوں۔"

الزبتھ نے پوچھا "تم دلاور کو ساتھ لے کر کہاں جاؤ گے آخر؟"

میں نے کہا "یہ مجھے فون کر کے معلوم کرنا پڑے گا۔"

رچرڈ نے اٹھتے ہوئے کہا "میں بھی ایک فون کر کے آتا ہوں۔"

الزبتھ نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا "تم یہ فون استعمال کر سکتے ہو۔"

میں نے گھڑی دیکھی اور جیک عرف والی جیک کے پہلے ٹھکانے کا نمبر ملایا۔ گھنٹی مسلسل بجتی رہی مگر مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت جیک جہاں بھی ملا سوتا ہوا ملے گا اور اسے بیدار ہو کے فون اٹھانے میں کچھ دیر لگے گی۔

بالآخر ایک عورت نے ہیلو کہا اور میں نے اس کی آواز پہچان لی "آئی ایم سوری خاتون، میں نے آپ کی نیند خراب کی۔"

اس نے اخلاقاً کہا "کوئی بات نہیں۔"

"دراصل میں نے سارا دن جیک کی تلاش میں گزار دیا۔ آپ سے بھی بات ہوئی تھی۔۔۔"

"ابھی بات کرنا چاہتے ہو جیک سے۔ کیا کوئی ایمرجنسی ہے؟"

"سخت ایمرجنسی ہے۔ اگر وہ سو رہا ہے تو اسے اٹھا دو پلیز!"

"اچھا۔ میں دیکھتی ہوں کوشش کر کے۔ اگر اس کا نشہ اتر گیا ہو گا تو وہ جاگ جائے گا۔"

میں انتظار کرتا رہا۔ چند منٹ بعد جیک نے جماہی لینے والے انداز میں کہا "ہیلو۔ یہ کس کو ایمرجنسی ہے اس وقت؟"

میں نے کہا "تمہارا وہ کنٹریکٹ جو آج شام کے لیے تھا۔"

"اسے منسوخ سمجھو۔ مجھے نہ کل فرصت ہے اور نہ اس کے بعد۔"

"لیکن اس وقت تم دو گنی رقم کما سکتے ہو۔ صبح تک ہمیں پیرس پہنچا دو۔"

اس نے کہا "کیا تم پاگل ہو؟"

"ہاں۔ کیا تمہیں شک ہے۔ اور اسی لیے میں تم کو ایک ہزار پاؤنڈ اضافی پیش کر رہا ہوں۔ تم اندھیرے میں جہاز اڑا سکتے ہو نا؟"

"اندھیرے میں آنکھیں بند کر کے اڑا سکتا ہوں مگر تمہارا چکر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے مرنا منظور ہے، جیل جانا نہیں۔"

"مطمئن رہو، نہ تم مرو گے اور نہ جیل جاؤ گے۔"

"اس وقت تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"اس کا صحیح جواب تو ہے اپنے منہ سے مگر تم شاید اس وقت مذاق کو انجوائے نہیں کرو گے۔ میں انگلش جیل سے بول رہا ہوں۔"

اس نے خفگی سے کہا "اور کیا یہ مذاق نہیں ہے۔"

"نہیں۔ یہ ایک اتنی ہی ناقابلِ تردید حقیقت ہے جتنی تمہاری آج والی محبوبہ۔ جس نے تمہاری موجودگی کا اقرار کر کے بڑی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا۔ حالانکہ یہ موجودگی ہی سراسر غیر اخلاقی ہے۔"

www.paksociety.com

"ولیم شٹ اپ۔ یہ ایلزی بیلس نخر کہاں ہے۔ لندن میں میرے باپ دادا پیدا ہوئے اور مر کھپ گئے۔ میں بھی چالیس سال گزار چکا ہوں۔ مجھے کیوں معلوم نہیں ہے؟"

میں نے کسی فلاسفر کی طرح فرمایا "بعض اوقات کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ بچہ بغل میں ہے۔ وہ شہر میں ڈھنڈورا پیٹتا رہتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"مجھے امید بھی نہیں تھی کہ سمجھو گے۔ تم راستہ سمجھ لو کس جگہ سے آؤ گے۔"

اس نے مجھے اپنی جائے رہائش بتائی اور میں نے اسے ایلزی بیلس کا پتا بتایا تو وہ شور کرنے لگا "اسے ایلزی بیلس کون گدھا کہتا ہے۔"

میں نے کہا "مسٹر رچرڈ گورڈن۔ جو نگھ داخلہ کی بڑی خوب چیز ہے" الزبتھ اس کی بیوی کا نام ہے۔ یہ اسی کے نام پر ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ۔۔۔ تم اپنی گاڑی خود لاؤ گے۔"

"ہاں۔ مگر نہیں۔۔۔ مجھے ٹیکسی میں آنا چاہیے۔ ابھی تو مجھے گھنٹے تک مجھ پر نیند کا اور نشے کا اثر رہے گا۔ میں ڈرائیونگ نہیں کر سکتا۔"

"پھر جہاز کیسے اُڑاؤ گے؟"

وہ پھر ناراض ہو گیا "جہاز کے راستے میں مجھے نہیں توڑنے، زیبرا کراسنگ اور ٹریفک سگنل نہیں ہوتے۔ ہوا میں غلط پارکنگ نہیں ہوتی جہازوں کی۔ سڑکوں پر ایسی ہی چیزوں سے حادثات ہوتے ہیں اور جہاز اُڑانے تک مجھے نشہ بھی نہیں رہے گا۔ نیند تو خیر اڑ گئی ہے ابھی سے۔"

"نشہ تم۔۔۔۔ کس طرح نہیں اُتار سکتے۔"

اس نے کہا "اتار سکتا ہوں۔ میرے پاس ایسی دوا بھی ہے جس سے۔۔۔ یہ نشہ صرف بیس منٹ میں پوری طرح غائب ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی میرا دماغ اس پیشے میں پوری طرح سیٹ ہو گیا ہے۔ کاک پٹ میں بیٹھتے ہی میری حسیں تک مستعد ہو جاتی ہیں۔ میں تقریباً ایک گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے کہا "ہم تمہیں تیار ملیں گے۔"

"ہم کون۔۔۔ سب لوگ؟"

"ہاں۔ میں اور میرا دوست۔۔۔ اور ہمارا مریض۔۔۔ تم جس ٹیکسی میں آؤ گے ہم اس کو لے جائیں گے۔"

"آگے کہاں؟ پیرس۔۔۔؟"

رچرڈ نے کمرے میں داخل ہو کے گھڑی دیکھی اور مسکرایا "تمہارا وہ مسئلہ تو حل ہو گیا۔ ایک ایمبولینس تقریباً آدھے گھنٹے میں چوہدری دلاور کے ساتھ آنے والی ہے۔ مجھے خاصا لمبا چکر چلانا پڑا۔"

"میں پھر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو ہماری تقدیر کا چکر بھی بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ ہم زندگی میں جڑ ہو جائیں گے اور جب اپنے اپنے گھر آباد کر لیں گے تو پھر تمہیں مدعو کریں گے۔"

اس نے کہا "ہم ضرور آئیں گے اور تمہارے مہمان ہوں گے۔ مجھے مدت سے آرزو تھی انڈیا پاکستان جانے کی۔ میرا ایک دادا لاہور میں تھا۔ وہاں سے ایک اخبار شائع ہوتا تھا 'سول اینڈ ملٹری گزٹ'۔"

"ہاں۔ مشہور مصنف روڈیارڈ کپلنگ بھی اس کا ایڈیٹر رہا تھا۔ اس کی میں نے ایک ہی کتاب پڑھی ہے۔ ایک ناول ہے 'KID NAPPED'۔"

"رائٹ۔ میرا دادا اسی کے ساتھ تھا۔"

"ایک دادا سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ میرا حقیقی دادا نہیں تھا۔ میرے اصل دادا کے چار فرسٹ کزن تھے۔ ان میں سے ایک وہ تھا۔ اس کی ڈائری ابھی تک میرے پاس ہے۔ میرے والد نے مجھے دی تھی۔ اس نے لاہور کے بارے میں بہت دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔"

میں نے کہا "شاید اب تمہیں وہ سب نہ ملے جو سو سال پہلے تھا۔ لاہور ایک جدید شہر ہے۔ اس کے رکھ رکھاؤ بالکل لندن جیسے ہیں۔ تم دیکھنا مارچ میں آنا۔ ہم تمہیں ہارس اینڈ کیٹل شو دکھائیں گے۔ جو بہار میں ہوتا ہے اور شالیمار باغ کے میلہ چراغاں میں لے جا کے جیب اور تختہ کھلائیں گے۔"

الزبتھ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا "جیب اوب؟"

میں نے کہا "تشنہ۔۔۔ عقل عامہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور یہ بیان کرنے کی چیز بھی نہیں، کھانے کی چیز ہے۔ میلہ چراغاں کی اسپیشل ڈش۔"

دوسری بار کافی پیتے ہوئے ہم پھر پرانی باتوں میں کھو گئے مگر اب ماحول پہلے کے مقابلے میں زیادہ بے تکلفی کا تھا۔ ہم نے ان واقعات کا ذکر کیا جو شرارت اور بدمعاشی کے زمرے میں نہ تھے۔ ہم دل کھول کر ہنسے۔ ایک راز بھی رہیں، جھینپا تو دوسرے نے گورڈن۔ پھر محسن نے الزبتھ کو ایک ایسی بات بتائی جو مجھے بھی معلوم نہیں تھی اور اس نے جیسے شرماتے محسن کو مصنوعی غصے کے ساتھ کہا کہ بکواس مت کرو مگر پھر خود ہی ایک انکشاف کیا کہ محسن بھی اس پر ڈورے ڈالنے والے ناکام عاشقوں میں شامل تھا۔ لیکن یہ اس سے پہلے کی بات ہے جب میں الزبتھ پر فریفتہ ہوا تھا۔ تم نے جھینپ کر تسلیم کیا کہ اس نے تو اپنے پروگرام اور منصوبے کے مطابق اظہار محبت کا فریضہ ادا کیا تھا۔

"میں نے خاصا رسک لیا ہے ایمبولینس کو یہاں بلا کے۔ اس سے میری پوزیشن پر حرف بھی آ سکتا ہے۔ اگر کل کوئی مسئلہ پیدا

ہو جائے" رچرڈ نے اچانک کہا۔

"ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم اسے اسپتال سے اغوا کر لیتے" میں نے کہا۔

"وہ تمہارے لیے ممکن نہ ہوتا" وہ بولا "خیر کوئی بات نہیں۔ میں اتنا کر دیتا تمہیں، وہ دوسری بات تھی۔ اب تمہاری ادھوری مدد کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں نمٹ لوں گا بعد میں جو بھی ہوگا۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہوگی۔ لیکن تم یہ بتاؤ کہ اس وقت یہاں سے کیسے جاؤ گے؟"

میں نے اسے ہائی جیک کے بارے میں بتایا "یہ سب ہم نے اس پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ ایسے دھندوں میں نہ جانے کب سے پڑا ہوا ہے۔ اسے سارے چور دروازوں کا علم ہے۔"

"اور یہاں سے آگے؟"

میں نے کہا "ہائی جیک کی معرفت ایک چارٹرڈ فلائٹ سے ہم بنکاک پہنچ جائیں گے۔ ہانگ کانگ میں سنگاپور بھی جا سکتے ہیں اور وہاں سے کراچی۔"

"تم پورا جہاز چارٹر کرو گے۔ اس میں خاصے اخراجات ہوں گے" الزبتھ بولی۔

"مجبوری ہے۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتا اس مرحلے پر۔ اگر وقت ہوتا تو ہم بائی روڈ جاتے۔ اس سے جو اضافی خرچ ہے اپنی گاڑی بھی ساتھ لے جاتے جو پاکستان میں بھی کام دیتی۔ ورنہ اسے بیچ کے ہم اخراجات پورے کر سکتے تھے۔ سفر بالکل فری ہوتا اور تفریح الگ ہوتی مگر دلاور کے پاس زندگی کی مہلت بہت کم رہ گئی ہے۔ معاملہ برین ٹیومر کا ہے۔ نہ جانے کس وقت وہ اچانک COLLAPSE کر جائے یا کوما میں چلا جائے۔ جب تک اس کا دماغ کام کر رہا ہے۔ اسے بھی بہت کچھ کہنا ہے۔ اور ہمیں بھی اس سے بہت کام ہیں۔"

"I WISH YOU A SAFE JOURNEY"

"تھینک یو۔۔۔ ڈیئر کاکروچ۔ سب سے زیادہ اہم تمہاری نیک خواہشات تھیں جن کی مجھے بالکل توقع نہ تھی" میں نے کہا۔

اس نے میرے شانے پر ہاتھ مارا "ہو بلیک ژاک۔ جب میں لاہور آؤں تو مجھے کسی کے سامنے کاکروچ مت کہنا۔"

میں نے ہنس کے کہا "ہم پاکستانی اور بالخصوص پٹھان بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ مہمان ہمارے لیے فرشتۂ رحمت ہوتا ہے۔ ان کی عزت کی خاطر ہم جان تک دے سکتے ہیں۔ تم آ کے دیکھو ایک بار۔"

ایمبولینس بڑی خاموشی سے آ گئی۔ مجھے بڑا تعجب ہوا جب میں نے اس کے ڈرائیور کی جگہ اسی حبشی کو دیکھا جو الزبتھ کی کار چلا کے لایا تھا۔ الزبتھ نے مجھے بتایا کہ وہ کتنا پرانا اور وفادار خاندانی ملازم ہے۔ اس کے باپ نے ساری عمر الزبتھ کے باپ کے شوفر کی حیثیت سے گزاری تھی۔ ان کی حیثیت گھر کے ایک فرد جیسی تھی اور ان پر اتنا ہی اعتبار بھی کیا جاتا تھا۔

حبشی کو پہلے ہی تمام ہدایات دے دی گئی تھیں چنانچہ وہ ایمبولینس کو باہر ایک نسبتاً تاریک سایہ دار جگہ پر روک کے خود اس میں بیٹھا رہا۔ جب ٹیکسی آ گئی تو اس نے خود ہی چوہدری دلاور کو ایمبولینس سے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر شفٹ کیا اور پھر ایمبولینس لے کر خاموشی سے روانہ ہو گیا۔ اس نے کسی کے شکریے اور شاباش کا انتظار نہیں کیا۔

ایک اور ملازم نے سوٹ کیس اور بریف کیس ٹیکسی میں رکھ دیے۔ میں نے ہائی جیک کا تعارف مسٹر رچرڈ سے اور الزبتھ سے کرایا "یہ میرے پرانے دوست ہیں" میں نے کہا۔

جیک خاصا مرعوب ہوا۔ اس کے لیے ایک خاندانی لارڈ اور اس کی خوبصورت حسن کی مالک بیوی لیڈی الزبتھ سے ملاقات اعزاز کی بات تھی۔ خود میں اس کی نظر میں بے حد معتبر ہو گیا تھا۔ اس نے پورے رسمی اخلاق کے ساتھ کہا کہ ان سے مل کے اسے بے حد مسرت ہوئی ہے۔

رچرڈ نے کہا "ہمارے دوست کا خاص خیال رکھنا۔ ان کو کہیں کوئی پرابلم نہ ہو۔ خدانخواستہ کوئی مشکل درپیش ہو تو مجھ سے رابطہ کرنا۔"

"کوئی مشکل نہیں ہوگی یور لارڈ شپ۔ ہائی جیک ان مسائل سے بہت اوپر اڑتا ہے جن سے زمین پر رہنے والوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ ہائی جیک کی فلائٹ بہت ہائی ہوتی ہے۔"

الزبتھ نے کہا "مجھے امید ہے کہ تم ٹُن نہیں جہاز اڑا رہے ہو۔"

"بیس سال کی فلائنگ کا تجربہ ہے میرے ساتھ لیڈی الزبتھ۔ اور اس میں سے نصف ایک ہی جہاز اڑا کے حاصل کیا ہے۔ یہ میرا اپنا جہاز ہے اور ہم ایک دوسرے کے مزاج آشنا ہیں۔ ان راستوں پر میں ایسے آ جاتا ہوں جیسے آپ محل کے اندر بیڈ روم سے باتھ روم تک آ جاتی ہوں گی عادت کے مطابق۔ کیا اس میں آپ کبھی کوئی مشکل یا خطرہ محسوس کرتی ہیں؟ نہیں نا۔۔۔"

"او کے۔ اب چلو" میں نے کہا۔

رات کے دو بجے یہ سفر دوبارہ شروع ہوا۔ درمیان میں تقریباً آدھے گھنٹے کا وقفہ آیا تھا۔ شام چھ بجے پولیس ہمیں اپنے ساتھ لے گئی تھی تو میری مایوسی کے جذبات کی انتہا نہ تھی۔ مجھے اپنی بدقسمتی پر رونا آ رہا تھا کہ ایک معمولی سی غلطی نے بنا بنایا کام بگاڑ دیا۔ اتنا بڑا منصوبہ آخری مرحلے میں ناکامی سے یوں دوچار ہو گا۔ یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ پوری دیوار اٹھانے والا معمار جب آخری اینٹ رکھنے والا ہو تو دیوار دھڑام سے گر جائے، یہ کچھ ایسی ہی بدبختی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ اب کچھ باقی نہیں رہا، سب ختم ہو گیا۔ پولیس کی تحویل میں جانے کے بعد سب سامنے آ جائے گا یہ کہ ہم کون ہیں، ہماری اصل کیا ہے اور ہم کس کس جرم میں کہاں کہاں ملوث اور مطلوب ہیں۔ خدا کو کچھ ثابت کرنے کی کیا

www.paksociety.com

ضرورت۔ یہ تو ہم جیسے خدا کو بھول جانے والوں کے لیے قدرت کے دستِ غیب کا معمولی سا جھٹکا ہوتا ہے۔ میں یہ بھولا ہوا تھا کہ جیسے میری زندگی اور موت پر کسی کا اختیار نہیں' ایسے ہی میں کسی کی موت کے وقت اور مقام یا سبب کا تعین نہیں کر سکتا۔ میں تو چاہتا تھا کہ دنیاوی نظامِ انصاف کے ذریعے چوہدری دلاور کو تختۂ دار پر پہنچا کے موت سے ہمکنار کروں مگر میرے زعم اور عزائم کو شکست ہوئی تو میں نے جانا کہ میرا فیصلہ بھی شاید نمرود کی خدائی کے دعوے کی طرح تکبر کا گناہ تھا جو مجھ سے نادانستگی میں سرزد ہوا۔ کیا یہ میری بندگی کا سجدۂ ندامت اور اپنے گناہ پر خجالت کا انعام تھا کہ اس نے اپنے عفو و رحمت سے پھر وہ بندوبست کر دیا جو میری تدبیر کے حسنِ انتظام سے کہیں زیادہ مکمل اور محفوظ تھا۔ میری ناکامی دوبارہ کامیابی میں بدل گئی تھی۔ دشمن نے دوست بن کے مدد کی تھی' انہی ہاتھوں نے میرے راستے کی سب رکاوٹیں دور کی تھیں' جو رکاوٹیں کھڑی کرنے کے ذمے دار تھے۔ یہ سب کیا تھا؟ اسے میں اپنی کوشش سے کیسے منسوب کر سکتا تھا۔ اسے صرف دستِ غیب سے ظہور میں آنے والا کرشمہ یا معجزہ ہی سمجھا جا سکتا تھا۔

میں' محسن اور چوہدری دلاور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر تھے۔ دلاور ابھی تک سویا ہوا تھا جو تعجب کی بات تھی۔ نیند کے انجکشن کا اثر اتنی دیر بعد بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کو ہلا جلا کے دیکھا اور پھر اس کی نبض دیکھی' بظاہر سب ٹھیک تھا۔

محسن بولا "زندہ ہے ابھی۔"

میں نے سہلایا "پھر کیا بے ہوش ہے؟"

"بے ہوشی اور نیند میں کیا فرق ہوتا ہے' مفصل بیان کیجئے اور مثالوں سے واضح کیجئے۔"

میں نے کہا "یہ اب تک کیوں سو رہا ہے؟ انجکشن تو اسے چھ بجے سے بھی پہلے دیا گیا تھا۔ اور اگر یہ بے ہوش نہیں ہے تو پھر اسے جاگ جانا چاہیے۔ ہلانے جلانے سے' بے ہوش آدمی کے REFLEXES کام نہیں کرتے۔"

محسن نے کہا "REFLEXES ابھی چیک کر لیتے ہیں' بھائی ڈرائیور صاحب! ماچس ہوگی آپ کے پاس؟"

میں نے کہا "ولایتی ڈرائیور ہے' ولایت کی زبان سمجھے گا۔"

ماچس' جیک کے پاس تھی۔ محسن نے ایک دیا سلائی جلا کے بجھائی اور فوراً دلاور کی گردن پر لگا دی۔ دلاور کراہ کے بری طرح چونکا اور اس کا ہاتھ خود بخود گردن کی طرف بڑھا "یہ سو رہا ہے" محسن نے اعلان کیا "ممکن ہے اسپتال میں کسی نے اس کو پھر انجکشن دے دیا ہو۔"

میں نے ہائی جیک کو ماچس واپس کر دی "یہ تم کس طرف سے جا رہے ہو؟"

"تمہارے خیال میں مجھے کدھر جانا چاہیے؟"

میں نے کہا "ادھر کون سا ائرفیلڈ ہے؟"

"یہ ایک ایسا ائرفیلڈ ہے جہاں سے اسپیشل فلائٹس آپریٹ ہوتی ہیں۔" وہ بولا "جیسے یہ فلائٹ۔ ہم بتھ ائرپورٹ سے کیسے جا سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "یہ غیر قانونی ائرپورٹ کیسے چل رہا ہے آخر؟"

"غیر قانونی۔۔۔ یہ تم سے کس نے کہا ہے۔ ائرپورٹ ایک امریکن کمپنی کا ہے اور ان کے عملے کو لانے لے جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ان کا سامان بھی آتا ہے۔ یہ آئل کمپنی ہر ملک میں خصوصی مراعات حاصل کر لیتی ہے۔"

"یہ وہی کمپنی تو نہیں جس نے سعودی عرب جیسے بہت سے عرب ممالک میں تیل پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی ہے۔"

"ٹھیک سمجھے تم۔ یہاں سے ٹیک آف کرنے والے اور یہاں اترنے والے جہازوں کی تمام قانونی ذمے داری کمپنی کی ہے کہ اس میں کون اور کیا آتا جاتا ہے؟"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تم۔ تمہارا کیا تعلق ہے اس امریکن آئل کمپنی سے؟"

"وہ شاہی میں بھی ان کے لیے خصوصی خدمات سرانجام دیتا ہوں۔"

"خصوصی خدمات۔ صاف کہو نا کہ تم سی آئی اے کے ایجنٹ ہو۔"

"یہ تو ایک عام سی اصطلاح ہے۔ خیر تم ایسا ہی سمجھ لو۔ ابھی تک مجھے یہ درجہ حاصل نہیں ہوا لیکن ہو جائے گا۔ پھر میرے سارے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔"

"اس وقت تمہارے کیا مسائل ہیں؟"

"مسائل ہم سب کے ہیں۔ خواہ نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہوں۔ اب تم اس جہاز کو ہی لو' یہ کوئی اڑانے کی چیز ہے؟"

"پھر کیا ہے؟"

"یہ گلانے کی چیز ہے۔ اس ماڈل کے اور ایسے جہاز بہت کم رہ گئے ہیں اور میں تو بس کسی نہ کسی طرح اپنا فلائنگ لائسنس RENEW کرا ہی لیتا ہوں۔ جھوٹ بول کے اور غلط بیانی سے کہ جناب میرے جہاز کی کیا بات ہے۔ اس کے سامنے تو بوئنگ بھی فیل ہے۔ ماڈل بھی غلط بتاتا ہوں اور کچھ لوگ مروت میں بھی کام کر دیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں جہاز کو سمجھتا ہوں۔ اس کے پرزے نہ ہوں' بلکہ انجن نہ ہو تب بھی اڑا لے گا ہائی جیک اور کریش ہرگز نہیں ہو گا کیونکہ پرواز سے پہلے ہی اس کی آواز سن کے پرزوں کی حالت اور کارکردگی کا صحیح اندازہ کر لیتا ہوں۔ ایک نٹ بھی ڈھیلا ہو تو مجھے پتا چل جاتا ہے اور میں بھی اس وقت تک ٹیک آف نہیں کرتا جب تک میرا دل گواہی نہ دے کہ سب ٹھیک ہے۔ ہر ایک خالص ٹیکنیکل مسئلے میں دل کی گواہی۔۔۔ یہ عجیب بات ہے مگر ایسا ہوتا ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "جب آپ مشین کی نفسیات کو سمجھ لیتے ہیں' طویل رفاقت کے بعد۔۔۔ اور مشین آپ سے جھوٹ نہیں بولتی۔"

"ابھی تو میں اس کو صرف اس حد تک ٹھیک رکھتا ہوں کہ یہ اڑ جاتا ہے۔ اسے خوب صورت اور آرام دہ بنانا اور ڈیکوریٹ کرنا سب بے کار ہے۔ بوڑھی عورت کو میک اپ سے کون جوان بنا سکتا ہے۔ بہت جلد میں ایک شاندار نیا خرید لوں گا۔ اگر ممکن ہوا تو سولہ سیٹوں والا ورنہ آٹھ سیٹوں کا۔ اور پھر شریفانہ طریقے سے لندن' پیرس۔ پیرس' روم۔ روم' جنیوا۔ ایسی ہی فلائٹس آپریٹ کروں گا۔ ٹورسٹ سروس چلاؤں گا۔ لو ہم پہنچ گئے۔"

ٹیکسی ذرا سی دیر کے لیے ایک گیٹ پر رکی۔ گیٹ کا راستہ ایک بیریر نے روک رکھا تھا۔ دروازے پر چوکس کھڑے ہوئے گارڈ نے ٹارچ کی روشنی میں ٹیکسی کے اندر جھانکا اور پھر جیک کو دیکھ کے مسکرایا "ہائی جیک۔"

جواب میں اس نے بھی مسکرا کے کہا "ہائی۔ یہ میرے مسافر ہیں۔"

اس نے بیریر کھول دیا "ایک تو سو گیا ہے۔"

"ہاں۔ یہ اس کے خواب دیکھنے کا ٹائم ہے اور وہ خواب ایسے ہوتے ہیں کہ یہ مس کرنا نہیں چاہتا۔ بدمعاش میرے ساتھ شیئر بھی نہیں کرتا۔"

گارڈ ہنسا "کتنی با مزہ۔"

ٹیکسی سیمنٹ کی رن وے جیسی سڑک پر چلتی ہوئی ایک سائڈ سے مڑ گئی۔ ہائی جیک کا جہاز اچانک سامنے آ گیا۔ وہاں اس کے ساتھ تین دوسرے جہاز بھی موجود تھے جن میں ایک ہیلی کوپٹر تھا۔ باقی دو جہاز بالکل نئے اور خوب صورت تھے۔ ان کے ساتھ جیک کا تھکا ہارا خستہ حال بے رنگ جہاز مجبور کھڑا تھا۔ اسے موقع ملتا تو وہیں لیٹ جاتا یقیناً اسے جدید ترین ماڈل کے جہازوں کے ساتھ احساسِ کمتری بھی ہوگا۔

ہم نے چوہدری دلاور کو اٹھا کے جہاز میں شفٹ کیا۔ اس میں کاک پٹ کیبن اور مسافروں کا حصہ ایک ہی تھے۔ ان کے درمیان کوئی دیوار حائل نہیں تھی۔ پچھلے حصے میں ایک لمبی سیٹ تھی۔ ایسی ہی دو سیٹیں سائڈ میں لگی ہوئی تھیں۔ ان کو فولڈ کر کے اوپر بھی کیا جا سکتا تھا۔ وقتِ ضرورت ان بینچ جیسی نشستوں پر بارہ افراد بیٹھ سکتے تھے یا تین افراد لمبی تان کے سو سکتے تھے۔ بینچوں کو اٹھا کے خالی جگہ میں سامان لوڈ کیا جا سکتا تھا۔

ہم نے چوہدری دلاور کو فرش پر لٹانا بہتر سمجھا۔ اگر بینچ پر لٹاتے تو پرواز کے دوران کئی بار لڑھک کر گرتا۔ ہائی جیک نے ہمیں ایک سلیپنگ بیگ فراہم کیا جو سفری بستر سمجھا جا سکتا ہے۔

"بعض اوقات مجھے باہر رکنا پڑتا ہے۔ ایک بار سخت برف باری میں اترنا پڑا تھا۔ برف باری دو دن جاری رہی' جہاز برف میں دب گیا مگر میں اندر آرام سے لیٹا رہا۔"

"دو دن لیٹے رہے؟" میں نے کہا۔

"اور کیا کرتا' پریشان ہو کے چیخنے چلانے سے بھی کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس بیگ میں ہم دونوں بڑی مشکل سے سمائے۔"

"ہم دونوں؟"

"ہاں۔ وہ۔۔۔ دراصل ایک لڑکی بھی میرے ساتھ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ فنی خرابی کا محض بہانہ ہے' میری نیت شروع سے خراب تھی۔ تھوڑا بہت راشن بھی تھا اندر۔ تیسرے دن موسم ٹھیک ہو گیا تو میں نے خرابی دور کی۔ مگر اس وقت تک لڑکی کا دماغ خراب ہو چکا تھا۔ وہ دوبارہ مجھ سے نہیں ملی۔ خیر' روز ایک گھنٹا ملتے تو تعلقات اڑتالیس دن چلتے' ایک ساتھ اڑتالیس گھنٹے گزار لیے۔ بات تو ایک ہی ہے' تم سیفٹی بیلٹ تلاش کر رہے ہو گے؟ وہ نہیں ہے۔ سنبھل کے بیٹھو جناب اور اپنے بیمار دوست کو بھی سنبھالو۔"

جیک نے باتیں کرتے ہوئے جہاز کا اکلوتا انجن اسٹارٹ کر دیا تھا اور اس کے آر پی ایم دیکھ رہا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور انوکھا سفر تھا۔ مجھے صرف اپنے ملک کا اندازہ تھا جہاں پولیس بڑی فراخ دلی سے ہر ٹیکسی' ویگن اور بس کو فٹنس سرٹیفکیٹ جاری کر دیتی ہے خواہ اس کی ظاہری حالت ایسی ہو کہ اس میں مسافر کا منزل کے مقابلے میں آخری منزل پر پہنچنا زیادہ قرینِ قیاس لگتا ہو لیکن لندن کے اس جہاز کو دیکھ کے مجھے وہ شعر یاد آیا جو میں نے کراچی کی ایک قدیم بس کے پیچھے لکھا ہوا دیکھا تھا۔ "نہ منزل کا پتا نہ بریک پر کنٹرول' چلا جا رہا ہوں خدا کے سہارے۔" ایسے اشعار میں وزن' ردیف اور قافیے کو تلاش کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے اونٹ کی چال میں اعضا کی شاعری تلاش کرنا۔

جہاز جب اڑا تو میں اور محسن سب پیٹ کے لڑکوں کی طرح پیچھے لڑھک گئے۔ ہم نے پہلے خود کو اور پھر دلاور کو سنبھالا ورنہ وہ بھی لیٹے لیٹے مخالف سمت میں چل پڑا تھا۔ جہاز اندر سے PRESSURISED نہیں تھا چنانچہ میرے کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں اور محسن نے اپنا ہاتھ کنپٹی پر رکھ لیا تھا۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔

چند منٹ میں یہ کیفیت ختم ہو گئی۔ جہاز کی رفتار بھی ہموار ہو گئی اور پائلٹ نے ہمیں مطلع کیا کہ اس وقت ہم پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔

"صرف پانچ ہزار فٹ!" میں نے کہا۔

"تو اور کیا تیس ہزار فٹ پر لے جاؤں۔ یہ بوئنگ نہیں ہے" وہ بولا "اور اس جہاز کے لیے اتنی بلندی بھی بہت ہے۔ اتنی عمر تمہاری ہوتی تو تم پانچ فٹ پر بھی نہیں اڑ سکتے تھے۔ اس عمر کا کوئی پرندہ نہیں اڑ سکتا' شتر مرغ بھی نہیں۔"

محسن نے کہا "برا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ اگر ہم کسی اونچی عمارت یا کسی ٹاور سے نہیں ٹکرائے۔"

"ساری دنیا میں کہیں بھی اس سے آدھی بلندی کے برابر نہ کوئی عمارت ہے اور نہ ٹاور۔ اور بہتر ہے کہ تم اترنے کی تیاری

www.paksociety.com

کرو۔ جہاز نیچے جائے گا تو تم سجدے میں جاؤ گے۔"
میں نے کہا "اتنی جلدی؟ کیا تم شارٹ کٹ سے آئے ہو؟"
"جہاز ٹیکسی کی طرح لمبے راستوں پر گھوم پھر کے نہیں جاتے۔ کرایہ بڑھانے کے لیے" وہ پھر خفا ہو گیا "ہوائی جہاز کا راستہ کوّے کی پرواز جیسا ہوتا ہے یعنی CROWFLY۔ میں اس اصطلاح سے اتفاق نہیں کرتا۔ اسے کوئی کا راستہ کہنا چاہیے اگر لندن سے پیرس کی سمت فائر کیا جائے تو سیدھے گولی جاتی ہے۔"
میں نے کہا "جس اس کی رفتار کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ اس جہاز کے لیے کوّے کی چال والی مثال ٹھیک ہے۔ یہ فنی نکتہ ہے اس بات کو سمجھنے کی کوشش مت کرنا۔"
"مجھے فرصت بھی نہیں ہے دیکھو نیچے پیرس ہے۔"
محسن بولا "یہ پیرس ہے کمال ہے۔ میں تو لندن سمجھ رہا تھا۔"
"دونوں میں فرق ہی کتنا ہے۔ جتنا دو آنکھوں کے درمیان ہوتا ہے۔ بیچ میں ناک ہوتی ہے۔ ان کے بیچ میں انگلش چینل ہے۔ خدا کا شکر ہے فرانسیسی جھگڑا نہیں کرتے اور اسے فرنچ چینل نہیں کہتے۔ اس جہاز پر آخری فلائٹ ہوگی تو میں پیراشوٹ سے نیچے کود جاؤں گا۔ انگلش چینل میں۔ جہاز سیدھا نکل جائے گا۔"
میں نے کہا "تمہاری اس بے وفائی سے جہاز کو کتنا صدمہ ہوگا۔"
محسن نے کہا "کیا پتا وہ بھی تمہارے پیچھے انگلش چینل میں ڈوب مرے۔"
"پیرس میں تم کہاں جاؤ گے؟"
محسن بولا "اپنی بیویوں کے پاس۔ غریب نواز ہوسٹل میں۔ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔ کیا تم ہمارے ساتھ نہیں رہو گے؟"
"میں تم کو ڈراپ کر کے واپس اُڑ جاؤں گا۔"
"اور ہمارے لیے اسپیشل فلائٹ کون چارٹر کرے گا؟ تم نے کہا تھا کہ تم خصوصی ڈسکاؤنٹ پر اچھا جہاز دلا دو گے۔"
"یہ کام اس وقت نہیں ہوگا۔ دس گیارہ بجے کسی سے رابطہ ہو سکتا ہے اس سے پہلے مشکل ہے۔"
"کیوں مشکل ہے؟"
"آج اتوار ہے۔ لوگ سورج کے ساتھ باہر نہیں نکلتے۔ ابھی سو رہے ہوں گے" وہ بولا۔
"تمہارے پاس فون نمبر تو ہوں گے ایسے ہوا بازوں کے اور کمپنیوں کے۔ ان کے آفس بند ہوں گے مگر ان سے فون پر بات ہو سکتی ہے۔"
اس نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ ویسے یہ بے حد بداخلاقی ہے۔ سنڈے کی رات کو مختصر کرنا۔"
"ہنگامی صورت حال میں یہ اخلاقی جرم قابل معافی ہونا چاہیے۔"
جہاز نے ایک دم غوطہ مارا اور ہائی جیک نے ٹھیک۔ ہم اس مرتبہ سامنے لڑھک گئے تھے اور واقعی سجدے میں چلے گئے تھے۔ دلاور اس مرتبہ نگے کھسکا اور اس کے پاؤں ایک سیٹ کو سہارا دینے والے اسٹینڈ سے ٹکرائے مگر سیٹ بیلٹ میں ہونے کی وجہ سے وہ محفوظ رہا۔ ہم کاک پٹ کی دیوار سے ٹیک لگا کے اور مخالف سمت میں منہ کر کے بیٹھ گئے اور دلاور کو دائیں بائیں لڑھکنے سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کے دونوں جانب ٹانگیں پھیلا دیں۔
دس منٹ بعد جہاز اُتر گیا۔ لندن کے ائرفیلڈ کے مقابلے میں پیرس کا دن دے زیادہ خوب صورت اور روشن تھا۔ لیکن یہاں کوئی جہاز موجود نہیں تھا۔ کنٹرول ٹاور سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ جہاں جی چاہے اتر جاؤ۔ ہینگر یعنی عمارت کا ایک حصہ روشن تھا۔ ہینگر کے اوپر بڑی بڑی سرچ لائٹس تھیں جن سے دن دے پر دن جیسا اُجالا تھا۔ یہ دن دے ایک طویل چار دیواری کے اندر تھا۔ اس دیوار پر بھی سوڈیم اور مرکری لائٹس سے چراغاں ہو رہا تھا۔
بجلی بڑا گھری میں ملبوس ایک گنجا اور گول مٹول شخص جہاز کے رکتے ہی نمودار ہوا اور اس نے ہاتھ ہلا ہلا کے فرنچ میں جلانا شروع کیا "یہ کیا مذاق ہے۔ یہ ائرفیلڈ ہے یا تمہارے باپ کے گھر کی چھت۔ جہاں چاہا جہاز اُتار لیا۔ کل تم میرے سر پر لینڈ کرو گے؟"
جیک نس پڑا "لینڈ تو کر سکتا ہوں مگر جہاز اسٹینڈ کر کے نکل جائے گا سیدھا۔ اتنی زمین سے ہی بریک نہیں لگیں گے۔ رہے تمہارے ائر ٹریفک کنٹرولر نے کہا تھا کہ جہاں چاہو اُتر جاؤ۔ یہ میری شرافت ہے کہ میں نے جہاز اس کے ٹاور پر نہیں اُتارا۔ کم آن فرینڈز" نت نیچے تاکہ میں جہاز کو ٹھیک جگہ چھوڑ دوں۔"
میں نے اور محسن نے مل کے چوہدری دلاور کو اُتارا۔ گنجے شخص کے وجود میں ایک مضطرب اور بے چین روحا تھی۔ وہ پھر شور کرنے لگا "یہ کیا جیک تم لاش لے کر آئے ہو یہاں؟"
جیک نے کہا "ہاں۔ اس نے وصیت کی تھی کہ مجھے ائرفیلڈ پر دفن کرنا۔"
اب گنجا مجھ سے مخاطب ہوا "کون ہو تم لوگ اور یہ کیا چکر ہے؟"
محسن نے کہا "تم کیسے خاموش ہو جا بند کرتے ہو۔ پیسے لے کر یا جہاز گرا کے۔"
اس نے سوچ کے کہا "کتنے پیسے دو گے؟"
"ہم جہاز گرا دے سکتے ہیں۔ پیسے کے لیے ہائی جیک سے بات کرو" محسن نے کہا۔
ہائی جیک پانچ منٹ میں آ گیا۔ اس نے گنجے کو خاموشی اختیار کرنے کا معاوضہ ادا کیا۔ اس کا حصہ سو پاؤنڈ مقرر تھا۔ اس نے کسی پرانے معاہدے کے مطابق اسے مزید ایک ہزار پاؤنڈ دیے کہ یہ باقی لوگوں کو دے دینا۔ اس کے بعد گنجا مسکرانے لگا اور اس نے ہمیں ٹیکسی بھی دی۔ اس کے پاس سٹروئن کار تھی جو ائیر یکی کی ایسا تھا گاڑی اُٹھا کے رکھ سکتے تھے۔
میں اور محسن حیران تھے کہ یہ کیسا انتظام ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں اور کسی نے بھی پرواہ نہ کی کہ بھیا کون ہو۔ دراصل یہ پرائیوٹ ائرفیلڈ یا کسی بلڈنگ پر حکومت کی ذمہ داری صرف لائسنس جاری کرنے کی حد تک رہتی ہے۔ لائسنس انہی کو ملتا ہے جو ائرفیلڈ چلانے کا تجربہ اور ضروری اسٹاف رکھتے ہوں۔ اب یہاں سے کون آتا ہے کون جاتا ہے۔ کیا لوڈ ہوتا ہے اور کیا اَن لوڈ۔ یہ خود لائسنس لینے والوں کی ذمہ داری۔ کوئی کام خلاف قانون ہوگا تو اب تک۔ جس دن معلوم ہوگا اس دن لائسنس منسوخ۔
ائرفیلڈ سے باہر آنے کے بعد بھی ہمیں ٹیکسی کے لیے انتظار کرنا پڑا۔ ہائی جیک کے کہنے پر گنجے نے فون کر کے ٹیکسی طلب کی تھی ہم ادر اب کرانے لگا تھا اور مجھے اس کی طرف سے تشویش ہو رہی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہمارا سامان ڈکی میں رکھا اور پھر پوچھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ اسے غریب نواز ہوسٹل کا پتا سمجھانا خاصا دشوار کام ثابت ہوا۔ یہ نام تو اس ہوسٹل کو ہم نے دے رکھا تھا۔ درحقیقت وہ کوئی یوتھ ہوسٹل تھا جو سرکاری ادارے ہی چلاتا تھا۔ یہاں میں ایسے درجنوں ہوسٹل تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور بڑا تحمل مزاج تھا اس نے ہم سے بہت سے سوالات کیے اور بالآخر سمجھا کے بولا میں سمجھ گیا۔ اب تم چاہو تو سو جاؤ آرام سے۔ میں منزل پر پہنچ کے تمہیں جگا دوں گا۔"
رات بھر جاگنے سے مجھ پر غنودگی طاری تھی مگر میں آنکھیں کھولے بیٹھا رہا۔ ٹیکسی انجان راستوں سے گزرتی ہوئی پون گھنٹے بعد ایک عمارت کے سامنے رُک گئی۔
"ایک گھنٹے کا راستہ تھا۔ ہم صرف چالیس منٹ میں پہنچ گئے" ٹیکسی ڈرائیور نے بڑی مسرت کے ساتھ ہمیں مطلع کیا۔
"کہاں پہنچ گئے؟ یہ ہرگز وہ جگہ نہیں ہے جہاں ہمیں جانا تھا۔"
"اچھا!" وہ مایوسی سے بولا "پتا نہیں کیوں میرا اندازہ اکثر غلط ہو جاتا ہے۔"
میں نے کہا "میں بتا سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جب تمہاری گاڑی چلتی رہتی ہے میٹر بھی چلتا رہتا ہے۔"
"ہم ضرور صبح ہونے تک ہمیں پیرس کی سیر کراؤ گے؟ ہمارے خرچ پر" محسن نے کہا "بہتر ہوگا اگر ہم پولیس سے راستہ پوچھ لیں۔"
اس نے معذرت کرتے ہوئے پھر چند سوالات کیے اور وہی کہا جو پہلے کہا تھا مگر اس بار چالیس منٹ میں ہمیں صحیح جگہ پہنچا دیا۔
"ہمیں کیا واپس آنا پڑا" ڈرائیور نے کہا "اگر تم صحیح پتا بتاتے تو ہم صرف بیس منٹ کی ڈرائیو تک تھے۔"
"قسمت کی بات ہے سب۔ خدا کو یہی منظور تھا کہ ہم تمہاری ٹیکسی میں اتنی منٹ کی مسافت طے کریں اور تمہیں اصل سے دو گنا "زیادہ ادائیگی کریں۔"
ہم دلاور کو بڑی مشکل سے اٹھا کے ہوسٹل کے گیٹ تک پہنچے اور اسے اندر لے گئے۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ اس کی بغلوں کے نیچے سے گزار کے دلاور کو سہارا دے رکھا تھا۔ دوسری طرف سے محسن نے اس کے بوجھ کو اٹھا رکھا تھا۔ دلاور کے دونوں ہاتھ ہمارے شانوں پر تھے اس کے باوجود ہم اسے گھسیٹنے پر مجبور تھے۔
کاؤنٹر پر دری نرم خو دبلی پتلی عورت بیٹھی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا تو وہ کتاب رکھ دی جس میں شاید پڑھنے سے زیادہ دیکھنے کے قابل مواد تھا۔ "تم پھر آ گئے یہاں اور یہ کون ہے جس کو تم ایسے اٹھائے ہوئے ہو یہ تو مرنے والا ہے۔"
میں نے کہا "ہر شخص مرنے والا ہے۔ کوئی ایک گھنٹے میں کوئی ایک سال میں۔ صورت دیکھ کے تو لگتا ہے کہ تم خود مرنے والی ہو۔"
"ہم تمہیں اچھا بھلا چھوڑ کر گئے تھے۔ اچانک کیا ہو گیا؟"
اس نے خفگی سے کہا "مجھے کچھ نہیں ہوا۔"
"تمہیں بڑی خطرناک بیماری لاحق ہے۔ یہ فضول بولنے کا مرض ہے۔ اس میں عموماً آدمی زیادہ دن نہیں جیتا۔ کسی دن قتل ہو جاتا ہے" میں نے کہا۔
وہ ہمیں غضب ناک مشکوک نظروں سے دیکھتی رہی اور ہم دلاور کو اسی طرح اوپر لے گئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ رابعہ اور گل اس وقت سو رہی ہوں گی اور ہمیں اچانک سامنے پا کے ان پر بیک وقت خوشی اور غصے کے طوفانی جذبات کی یلغار ہوگی۔ کوئی بڑا ڈراما کرنے کا موقع نہیں تھا۔ ہمارے ساتھ ایک تو دلاور تھا اور دوسرا ہائی جیک۔
میں نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک ساتھ ان دونوں نے پوچھا "کون ہے؟"
میں نے کہا "کوئی نہیں ہے۔ سو جاؤ۔"
محسن بولا "تمہارے کان بج رہے ہیں۔ باہر تو خاموشی ہے۔"
رابعہ اور گل سخت غصے میں اٹھی تھیں مگر دروازہ کھولتے ہی ان کی نظر ہم پر اور ہمارے درمیان مشکل سے کھڑے ہوئے بلکہ لٹکے ہوئے چوہدری دلاور پر گئی تو ان کے منہ کھلے رہ گئے۔ وہ چیخ مارنا تک بھول گئیں اور ایک دم دروازے کے سامنے سے ہٹ گئیں۔
"یہ۔ یہ چوہدری دلاور ہے؟" گل نے کہا۔
"نہیں یہ محسن کی بیروانی ہے غور سے دیکھو" میں نے کہا۔
"بالکل غلط۔ یہ سکندر بخت ہے۔ چلو ہٹو ایک طرف۔ ایسے کیا ہونق بنی کھڑی ہو۔ کوئی تماشا ہو رہا ہے" محسن نے کہا۔
ہم نے دلاور کو اس بیڈ پر لٹا دیا جس پر رابعہ سوری تھی۔ محسن نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کے اوپر دیکھا "اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"
محسن نے کہا "شکر انہیں ادا کرنا چاہیے۔ خیر فی الحال تم جلو دوسرے کمرے میں۔ ہم آئے ہیں وہیں بچھو دو بستر۔"

www.paksociety.com

رابعہ اور گل بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھیں مگر جیک کی موجودگی کے خیال سے خاموش تھیں۔ ان کی نظریں چوہدری دلاور پر جمی ہوئی تھیں اور شاید ان کے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ ہم سچ مچ چوہدری دلاور کو اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔
میں نے جیک سے کہا "تم اس دوسرے بیڈ پر سو سکتے ہو۔"
"میں بیڈ کے نیچے بھی سو سکتا ہوں" وہ بولا "مگر اس وقت جب مجھے نیند آ رہی ہو۔ ابھی تو میرا دماغ جہاز کے انجن سے زیادہ گرم ہے، مجھے کافی چاہیے۔"
"تم ذرا اپنے چوہدری صاحب کا خیال رکھو۔ پریشانی یا خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہم آتے ہیں ابھی کینٹین سے کافی پی کے" میں نے کہا۔
رابعہ اور گل جاتے جاتے رک گئیں "اسے کیا ہوا ہے؟"
"کینسر!" محسن بولا۔
گل نے اسے یوں گھور کے دیکھا جیسے محسن نے کوئی افسوسناک جھوٹ بولا ہو پھر رابعہ نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے بھی سرہلا کے محسن کی تائید کی۔ ہم نے سامان دوسرے کمرے میں رکھا اور اسے مقفل کر کے نیچے اتر گئے۔ کینٹین میں کیفے ٹیریا میں اس وقت بھی لڑکے اور لڑکیاں کھانے پینے میں مصروف تھے۔ یہ آزاد اور بے فکرے لوگوں کی دنیا تھی جن کے لیے نہ کوئی اخلاقی پابندی اہم تھی اور نہ معاشرتی یا خاندانی قدغن تھی۔ کون کس کے ساتھ رہتا ہے اور کیوں؟ اس سے بھی کسی کو سروکار نہ تھا۔ پابندی اگر تھی تو صرف ہوسٹل میں قیام کے ڈسپلن کی۔ نگران کے قواعد و ضوابط کا تعلق بھی کسی کی نجی زندگی کے معاملات سے نہیں تھا۔ یہاں صرف وہی رہ سکتے تھے جو کرایہ ادا کر سکتے ہوں۔ ہوسٹل کی کسی چیز کو نقصان نہ پہنچائیں اور کسی کو پریشان نہ کریں۔ باقی تمام معاملات میں ہر شخص کسی معمول کا پابند نہ تھا۔ جس کا جب دل چاہے اٹھے اور جب دل چاہے سو جائے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اپنے ہی کمرے میں سوئے، کوئی اور مدعو کرے تو کیا اپنا کیا پرایا۔۔۔ ہر کمرا مخلوط کمرا ہے۔ ناشتا، لنچ اور ڈنر ان سب کا وقت وہاں مقرر ہوتا ہے جہاں انسان ایک معمول کے مطابق رہتا ہو۔ ہر کام وقت دیکھ کے کرتا ہو اور اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی کے معمولات کا بھی خیال رکھتا ہو۔ یہاں سیدھا سادہ اصول یہ تھا کہ جب بھوک لگے کچھ بھی کھالو۔
"میں تمہارا مہمان ہوں" جیک نے کہا "میرے لیے ہر اچھی چیز منگواؤ۔ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔"
محسن نے کہا "ہمارے پاس جو کچھ تھا تمہیں دے دیا۔ اب تو تم ہی ہمیں اپنے پیسے سے کھلاؤ گے اور اتنی بڑی رقم میں سے دو چار پاؤنڈ خرچ کر کے تم مر تو گے نہیں۔"
وہ ہنسنے لگا "میں اس لڑکی پر دس پاؤنڈ خوشی سے خرچ کروں گا جس نے دروازہ کھولا تھا لیکن سو پاؤنڈ۔"

"وہ میری بیوی ہے" میں نے کہا "میں تمہیں قتل کر دوں گا۔"
"خیر دوسری بھی بری نہیں تھی" اس نے خفت سے کہا۔
"وہ میری بیوی تھی۔ میں بھی تمہیں قتل کر دوں گا۔ اور وہ سب رقم چھین لوں گا جو تم نے ہمیں لوٹ کر کمائی ہے" محسن بولا۔
"لوٹ کر کیوں؟ میں نے تمہیں یہاں پہنچا دیا۔"
"اتنے سے کام کا اتنا بڑا معاوضہ وصول کرنا لوٹنے کے مترادف ہے۔ خیر تم تھامپا کے فون کرو کسی کو اور معلوم کرو کہ ہم جلد از جلد کب جا سکتے ہیں۔"
جیک نے کہا "یہ مطلب بھی بری نہیں۔ ویسے کیا تم واقعی سر رچرڈ اور لیڈی الزبتھ کے دوست ہو؟"
میں نے کہا "نہیں، ہم رشتے دار ہیں۔ میں اس کا داماد ہوں۔"
"اور میں پر داماد" محسن بولا "کوئی اعتراض؟"
ہالی جیک نے اپنی جیک پاکٹ میں سے ایک نوٹ بک نکالی اور پھر کونے کے فون بوتھ میں چلا گیا۔
میں نے محسن سے کہا "حضرت یہ بڑا لمبا سفر ہے۔ لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ ہم قانونی طور پر بڑی عزت اور شان سے واپس جا رہے ہیں۔"
"کسی وی آئی پی کی طرح چارٹرڈ فلائٹ سے۔ پورا جہاز صرف ہمارے نام سے بک ہے۔ ہم جتنے لوگوں کو چاہیں لے جائیں" محسن بولا۔
میں نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے مگر اب یہ بھی نہیں کہ ہم جہاز بھر کے لے جائیں اور منافع جیب میں رکھ لیں۔ یہ پتا چلانا ہو گا کہ مسافر کتنے ہیں؟"
"مسافر ابھی تو ہم پانچ ہی ہیں مگر میرا خیال ہے کہ دو مسافر اور ساتھ جا سکتے ہیں۔"
"اور کون جانا چاہے گا ہمارے ساتھ؟" میں نے کہا۔
"کیا خیال ہے اگر ہم ایک ڈاکٹر اور ایک نرس کی خدمات حاصل کر لیں۔ وہ ہمیں منزل تک پہنچا کے اسی جہاز میں واپس بھی لوٹ آئیں۔"
میں نے کہا "خیال تو اچھا ہے۔ کیا پتا راستے میں دلاور کو اچانک ضرورت پڑ جائے۔ ہم جیک سے بات کریں گے۔"
جیک واپس آیا تو خاصا مطمئن نظر آتا تھا۔ "بات ہو گئی ہے ایک سے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ ایک اور ٹورسٹ پارٹی نے بھی فون کیا تھا۔ جو پہلے بکنگ کرے گا میں اسے لے جاؤں گا۔"
"کیا اس فیلڈ میں وہ اکیلا ہے؟"
"اور لوگ بھی ہیں مگر یہ ٹورسٹ سیزن ہے۔ سب بک ہیں اگلے ہفتے تک" ہالی جیک بولا۔
"پھر کیا کریں؟"
"صبح ہونے والی ہے" ہالی جیک نے کہا "دوسری ٹورسٹ

پارٹی صبح بکنگ کرے گی تو پھر تمہارے لیے چانس نہیں رہے گا۔ عام طور پر نو بجے سے پہلے صبح نہیں ہوتی۔ اگر ہم اس سے پہلے ہی ادائیگی کر دیں۔"
"ہم کر سکتے ہیں" میں نے کہا "اگرچہ نیند سے میرا حال خراب ہے مگر یہ کام زیادہ ضروری ہے۔"
"تم دو گھنٹے آرام بھی کر سکتے ہو" ہالی جیک نے گھڑی دیکھی "ابھی صبح کے پانچ بجے ہیں، ہم سات بجے جا سکتے ہیں۔"
میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا "ہم چاہتے تھے کہ فلائٹ پر ایک ڈاکٹر اور نرس بھی ساتھ ہوں۔"
"یہ کوئی مشکل کام نہیں، تم چارلی سے کہہ دینا۔"
"چارلی کون ہے؟"
"وہ پائلٹ جو تمہیں بنکاک لے جائے گا" وہ بولا "میرا کام ہے تم کو اس سے متعارف کرانا۔ اور سودا کرانا۔"
"وہ کیا مانگ رہا ہے؟"
"ابھی تو نہیں مانگ رہا ہے مگر میرا خیال ہے چند روز میں مان جائے گا۔ تم اگر تھوڑی سی اور اداکاری کرو کیونکہ تم اپنے عزیز کو اس امید پر لندن لائے تھے کہ اس کا علاج ہو جائے گا مگر لندن میں تم کو ڈاکٹروں نے قلاش کر دیا اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوا۔"
"چنانچہ ہم قلاش لوگ اب چارٹرڈ فلائٹ سے واپس جا رہے ہیں یہ کیا بے تکی بات ہے۔ غریب آدمی عام جہاز کے فرسٹ کلاس سے بھی سفر نہیں کرتا" میں نے کہا۔
"جب ڈاکٹر بھی ساتھ ہو گا اور نرس بھی ہو گی تو اس سے یہ ثابت ہو گا کہ مریض کی حالت نازک ہے اور اسے عام مسافروں کی طرح لے جانا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ تم کچھ بھی اس وقت قلاش ہوتا ہے جب اس کے پاس ہزاروں بھی نہ ہوں۔ یہاں تمہارے پاس لگ بھگ چند ہزار پاؤنڈ تو ہیں۔"
"حقیقی دولت مند کبھی اور کہیں بھی قلاش نہیں ہوتے۔ وہ ادھار پیسہ منگوا سکتے ہیں۔ انہیں ادھار دینے والے بھی بہت ہوتے ہیں۔"
"خیر، تم جو چاہو کہو، یہ ایک اچھا پوائنٹ تھا۔"
"اسے ہم خود قائل کریں گے تو پھر تمہارا کمیشن ایک ہزار پاؤنڈ کس لیے؟" محسن بولا۔
"آخر میں نے تمہیں ایک راستہ بتایا اور تمہیں اس سے متعارف بھی کراؤں گا۔"
"تم بہت چالاک آدمی ہو۔ ایک گھنٹے میں اتنی بڑی رقم کما کے بھی تمہاری تسلی نہیں ہوئی۔ مروت بھی کوئی چیز ہے۔" محسن نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔
انہوں نے نفی میں سر ہلایا "کاروبار میں مروت کا کیا سوال اور جو مروت کرتا ہے وہ بزنس نہیں کر سکتا۔ رہی بات لالچ کی تو کیا تم لالچی نہیں ہو۔ کون ہے جو لالچ نہیں رکھتا۔ ایسا ہوتا تو تم یہاں وہ سب نہ کرتے پھرتے جو کر رہے ہو۔ تم لنگوٹی باندھے کسی پہاڑ کی چوٹی پر آسن جمائے بیٹھے ہوتے اور ہرے راما ہرے کرشنا کر رہے ہوتے۔"
محسن نے میز پر مکا مارا "ہم کافر نہیں ہیں۔ ہم اللہ ہو اللہ ہو کرتے ہیں۔"
میں نے کہا "تم جا کے اس کمرے میں سو جاؤ جس میں دلاور ہے۔ وہاں سے ہماری بیویوں کو نکال دینا۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی جائیں گی۔"
"اور خبردار جو انہیں بری نیت سے دیکھا" محسن بولا "ان کو اپنی بہنیں سمجھو آج سے۔"
وہ ہنسنے لگا "میری ایک۔ بس مجھے کافی ہے۔"
اس کے جانے کے بعد ہم نے آپس میں مشورے سے لاہور فون کیا۔ یہ ضروری تھا کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے مظفر اور وقار یوسف کو صورت حالات کا علم ہو جائے اور وہ ائیرپورٹ پر ہمیں ریسیو کرنے کے مناسب انتظامات کر لیں۔ صبح کے پانچ بجے بھی لائن بڑی آسانی سے مل گئی۔
ریسیور اٹھانے والا مولوی خادم حسین تھا۔ اس نے کہا "ہیلو۔"
میں نے آواز بدل کے اسے ڈانٹا۔ "کیا ہیلو، شرم آنی چاہیے تمہیں۔ السلام علیکم نہیں کہہ سکتے۔ شکل مسلمانوں کی کرتوت کافروں کے۔"
اس نے برہمی سے کہا "کون ہو جی آپ ایسے فتوے باز۔ ہیلو کہنے سے کوئی کافر ہو جائے تو پھر سب ہی کافر ہیں۔"
"اور یہ تم کیا کر رہے تھے صبح صبح مولوی خادم حسین؟"
اس کو کچھ شک ہو گیا "کیا کر رہا تھا، سو رہا تھا۔ مگر تم کون ہو جناب!"
"پہلے یہ بتاؤ کہ خواب میں کیا دیکھ رہے تھے؟ اگر تمہاری بیوی کو پتا چل جائے۔"
اس نے نعرہ لگایا "سکندر صاحب۔ الحمد للہ آپ زندہ ہو۔ ہم تو سمجھے تھے کہ مرحوم و مغفور ہو گئے۔"
"ہو جائیں گے یار۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ تم بھی تو نہیں ہوئے ابھی تک حالانکہ نیک کام میں دیر کیسی؟" میں نے کہا۔
"اچھا جی کب آ رہے ہو پھر؟ اور کیا کر رہے ہو ولایت میں؟"
میں نے کہا "یار تم رہے نا مولوی کے مولوی۔ ولایت میں آدمی کیا کرتا ہے آخر؟ اس وقت بھی ایک میم ہے ایک بغل میں اور دوسری میم دوسری بغل میں۔ بغل وہی رہتی ہے میم ہر روز بدل جاتی ہے۔ پھر ہم کیا کریں گے آ کے۔ ہمارا تو مشورہ ہے کہ تم بھی آ جاؤ۔"
"لاحول ولا قوۃ جناب! خدانخواستہ آپ نے حرام شے کو منہ تو نہیں لگایا؟" خادم حسین بولا۔

www.paksociety.com

"ارے بھو کسی سے کہنا مت..." میں نے کہا پھر ایسی آواز نکالی جیسے میں نے بوتل سے گھونٹ لیا ہو "یہ چیز بھی بس بس انسانی سے ملتی ہے۔ گناہ تو ہم نے زندگی میں بہت کیے ہیں بلکہ گناہوں کے سوا کیا ہی کیا ہے۔ ایک گناہ اور سہی۔ میں خود تو ہوں بہت بھولا بھالا اور سیدھا سادہ، یہ محسن مجھے شیطان کی طرح بہکا رہا ہے اور غلط لائن پر ڈال رہا ہے۔"

"چھوڑو بھی سکندر صاحب! اللہ نے عقل سلیم عطا کی ہے آپ کو بھی۔ اور پھر آپ کے ساتھ رابعہ بی بی ہیں۔ وہ نہیں روکتی ہیں آپ کو جناب!"

"ابے آپ جناب کے بچے! بیوی ہوتی ہے پارس کی ہوتی۔ اور ہم تمہاری طرح زن مرید نہیں ہیں کہ بیوی ہم پر حکم چلائے۔ تمہیں تو ہم جانتے ہیں، وہ کہہ دے کہ بچہ بھی تم پیدا کرو تو تم کرو گے۔ وہ کہے انڈے سے دو تو تم دو گے۔"

"اف۔ یہ کیسی واہیات بات ہے؟" آپ ضرور نشے میں ہیں۔ میں منظر صاحب کو بلاتا ہوں۔"

"ابے تم کیا کر رہے ہو منظر صاحب کے بیڈ روم میں۔ مولوی غلام حسین کہیں تم نے اس کی بیوی کے ساتھ ناجائز مراسم تو استوار نہیں کر لیے ہیں۔"

"توبہ توبہ، خدا کا خوف کریں سکندر صاحب۔ بات منہ سے نکالنے سے پہلے سوچ لیا کریں۔"

"ارے بھو جیتے منظر کو کیا ساری دنیا کو پتا چل جائے گا۔ اگر اس کے سو ہوئے بچے کا رنگ بات تن مختلف ہوا، اور اس کی صورت میں تمہاری مشابہت نکلی۔ ایسی ہی شکل..."

"اسی لیے شراب حرام قرار دی گئی ہے جناب کہ بندے کی مت ماری جاتی ہے۔ اسے نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی۔ آپ ہوش میں نہیں ہیں... انسان کے اندر شیطان گھس جاتا ہے۔ مگر آپ سے یہ امید نہیں تھی..." اس نے سخت افسوس اور پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

ایک منٹ پورا ہونے سے پہلے ہی منظر لائن پر آ گیا۔ اب صورت حال بدل گئی۔ اس نے مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا "ابے او سور کے بچے... کہاں ہے تو۔ خیال آ گیا تجھے ہمارا بھوتنی کے۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ مر کھپ گئے تم سب۔"

میں نے کہا "یار صبح صبح تو بات منہ سے نکال۔ شریف آدمی کو پہلے سلام دعا کرنی چاہیے۔"

"کون شریف آدمی... میں یا تو۔ ہم تو خیر جیسے ہیں اپنے لیے ہیں۔ تم سالے کب سے شریف ہو گئے۔ تمہارے نانا یا دادا میں شریف تھا کوئی؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ اس نام کا ہماری فیملی میں کوئی نہیں گزرا۔"

"اور وہ دوسرا... تمہارا ہمزاد بھوتنی کا... وہ کہاں ہے؟"

"تیرے ساتھ۔ تو نے عمر زار کیا یا ہم زاد؟" فضول بکواس بند کر۔ یہ بتا کہ تم لوگ ہو کہاں آخر؟ رابعہ کیسی ہے اور گل... اف، مجھے تمہاری منہ اتنا غصہ پہلے کبھی نہ آیا تھا جتنا اس وقت آ رہا ہے۔ اگر بلڈ پریشر بڑھنے سے میرا ہارٹ فیل ہو گیا تو میرے سنو بچوں کی اماں کا کیا بنے گا؟ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد۔"

میں نے قہقہہ مارا "ابے آج تو نے بھی سو فیصد کا شعر پڑھ دیا۔ تو فکر مت کر، مولوی غلام حسین کے نام اپنے وصیت نامے میں سارے بچے لکھ جانا۔ بچے پیدا کرنے کی مشین سمجھتا؟"

"قسم خدا کی۔ اب ابھی پر تم سب کے سر جوتے مار مار کے گنجے کیے تو سنو بچوں کے نام بدل دوں گا۔ سب کے نام کے ساتھ حرامی لگا دوں گا، خاندانی نام کے طور پر۔ بہت پریشان کیا تم نے سب کو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تم سے بات کیسے کریں، کیسے پتا چلائیں؟"

میں نے کہا "چل اب غصہ تھوک دے۔ ہم سب آ رہے ہیں کل۔"

"کل... واقعی؟" وہ چلایا "بجنے لگے بجے، اچھے ہی آپ ہو؟"

میں نے کہا "نہیں، ایک عدد رہ گیا ہے۔"

"بھئی مبارک ہو، بہت مبارک... کس نے پہل کی؟ رابعہ نے یا گل نے۔ تو مولود لڑکا ہے یا لڑکی؟ بھئی مولوی غلام حسین! تم ماموں بن گئے۔"

میں نے کہا "الو کے پٹھے، ہمارے ساتھ چودھری رلاور ہے۔"

"رلاور... زندہ یا مردہ؟" وہ ایک دم سیریس ہو گیا۔

"ہم قریب... ابھی تک تو زندہ ہے اور ہم چاہتے ہیں کچھ دن اور زندہ رہے" میں نے کہا۔

"تم لوگوں نے مارا ہو گا اسے۔"

"اسے اس کے اعمال نے مارا ہے" میں نے کہا "ہم کسی کو نہیں مار سکتا یار، رلاور کو کینسر ہے... ٹرمینل۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ برین ٹیومر کی آخری اسٹیج ہے۔ وہ دو مہینے سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا۔"

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے بھوتنی کے، نشے میں تو نہیں ہے؟"

"مولوی غلام حسین سے تو میں نے یہی کہا تھا کہ میں ہوش میں ہوں۔ جب ہم آئیں گے تو ساری بات بتائیں گے" میں نے کہا "رلاور کی زندگی کے مشکل سے دو مہینے باقی ہیں۔ یہاں کے ماہر ڈاکٹروں نے قطعی فیصلہ دے دیا ہے۔"

"پھر اب کیا ہو گا؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ اس نے ایک بار پھر سمجھوتے کی

پیشکش کی اور اس بار انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے مرنے سے پہلے سارے معاملات طے ہو جائیں ورنہ بعد میں مقدمے بازی چلے گی۔ کئی سال لگ جائیں گے فیصلہ ہونے تک اور تب تک یہ جائیداد اگلی نسل کو منتقل ہو جائے گی۔"

چند منٹ کی خاموشی کے بعد منظر نے کہا "دو مہینے میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا یار۔ مجھے بڑا صدمہ ہوا یہ جان کے ہماری ساری جدوجہد رائیگاں گئی۔"

"ایسا کیوں سمجھتا ہے تو۔ یہ سمجھ لے کہ قدرت نے فوری انصاف مہیا کر دیا۔ ہم دنیا کی عدالتوں میں خوار ہونے سے بچ گئے۔ ہم چودھری رلاور کو سزائے موت دلوانا چاہتے تھے، خدا نے دے دی۔ دنیا میں شاید وہ بچ جاتا۔ ایک کے بعد دوسری اپیل کرتا۔ بڑے بڑے قانونی ماہرین اس کا دفاع کرتے اور استغاثہ خود اپنے کیس میں کمزور پڑ جاتا۔ شہادتیں اور گواہی، ثبوت اور بیان، یہ سب کو بدل سکتا ہے۔ لیکن اب اس کے لیے کچھ بھی ممکن نہیں رہا۔ وہ اپنی ساری دولت لٹا دے تب بھی یہ سزائے موت نہیں ٹل سکتی۔ ہم اسے اسپیشل فلائٹ سے لا رہے ہیں۔"

"کیسی اسپیشل فلائٹ؟"

میں نے کہا "ایک جہاز چارٹر کیا ہے۔"

"پورا جہاز۔ کیا بینک آف انگلینڈ لوٹ لیا ہے بھوتنی کے!"

"فلائٹ سیدھی بنکاک جائے گی۔ وہاں سے ہم کراچی آئیں گے۔ اب یہ سوال مت کرنا کہ ہم نے سیدھا راستہ کیوں اختیار نہیں کیا۔"

"سیدھا راستہ تمہارے باپ نے اختیار کیا ہوتا بیٹے تو آج تم یوں خوار نہ ہوتے۔ تمہیں ولایت بھیجنے کے بجائے لگا دیتا اپنے کارخانے میں خراد کی مشین پر اور بیس سال میں تمہارا اپنا کارخانہ ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔"

میں نے احتجاج کیا "ہوتا کیسے نہیں۔ سات آٹھ سال میں چار پانچ بچے ہم بھی پیدا کر کے دکھاتے۔ تو اکیلا مرد ہے کیا دنیا میں۔"

وہ ہنسنے لگا "اچھا بھوتنی کے! یاد رکھنا یہ بات۔ اگلے سات آٹھ سال میں پوچھیں گے تم سے۔"

میں نے کہا "ہم نے چودھری رلاور کو منا رکھا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ آنے پر راضی نہیں تھا۔ کہتا تھا یہیں سارے معاملات طے کر لو۔ میرے بیوی بچوں کو بلا لو اور مجھے پولیس کے حوالے مت کرو۔"

"پولیس کے حوالے کرنے کا اب کیا فائدہ؟"

"ہاں۔ یہی ہم نے بھی سوچا کہ اب قانونی طریقے سے تو کچھ ملے گا نہیں، یا ملا تو مشکل طریقے سے ملے گا۔ رلاور تو سارے جھگڑے ہمارے لیے چھوڑ کے لیٹ جائے گا قبر میں۔ مگر ہم نے کہا کہ بیوی بچوں کو لندن بلانے والی بات غلط۔ لاہور چلو، جہاں کے معاملات ہیں وہیں طے ہونے چاہئیں۔"

"عقل مندی کی تم نے۔"

"عقل مندی کے سوا ہم کرتے کیا ہیں۔ بے وقوفی کے لیے تجھے آزاد چھوڑ دیا ہے اور مولوی غلام حسین کو۔"

"بھئی وہ تو اب پانچ بچے کا باپ بننے والا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ رکھو پھر گھوم رہا ہے مجھے۔ میں تو اسے سمجھاتا ہوں کہ بھوتنی کے ذرا پتا چلا کہ تیری عدم موجودگی میں کیا ہوتا ہے۔ کون کون آتا ہے، تجھے بچے کی صورت خود بتا دے گی" اس نے قہقہہ مارا "بھاگ گیا مولوی بک بک کرتا ہوا۔"

میں نے کہا "ذرا یوسف اور گل کو بھی بتا دینا کہ ہم سب بالکل خیریت سے ہیں اور اب ایک دو دن کی بات ہے۔ بنکاک سے ہم پھر فون کریں گے۔ یہ بتائیں گے کہ کب کراچی پہنچ رہے ہیں۔ سیدھا جا کے معلوم ہو گا کہ کس فلائٹ پر جگہ ملتی ہے" "خدا حافظ۔"

رابعہ اور گل بڑی بے چینی سے ہماری واپسی کی راہ دیکھ رہی تھیں اور ظاہر ہے بہت خفا بھی تھیں۔ اگلے ایک گھنٹے تک ہم نے دونوں کا موڈ خوشگوار کیا۔ ان کو منا بھی لیا اور اپنی لندن یاترا کا احوال واقعی بھی سنا دیا۔ اس میں ایسی کوئی بات نہ تھی جس کی پردہ پوشی امن عامہ کے لیے ضروری ہوتی۔ ہم پر جو گزری وہ سب ہم نے بلا کم و کاست پیش کر دیا۔

کہنے میں کامیابی سے بڑی کوئی کامیابی نہیں ہوتی۔ اگر ہم لندن سے خالی ہاتھ لوٹتے تو ساری وضاحتوں کی صداقت مِن و عَن تسلیم نہ کی جاتی۔ کہا اور سمجھا یہی جاتا کہ ہم نے جھک ماری اور وقت ضائع کیا۔ گلچھرے اڑائے اور عیش کی۔ باقی سب افسانہ طرازی، جھوٹ سچ کا ملغوبہ اور اداکاری۔ لیکن چودھری رلاور ہمارے ساتھ تھا۔ اس کی بیماری کی رپورٹس تھیں اور ایک واضح لائحہ عمل تھا جس نے ہمیں معتبر کر دیا۔

رابعہ اور گل دونوں چودھری رلاور کی جان لیوا بیماری کا سُن کے جذباتی ہو گئی تھیں۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ تھا۔ ابھی تک رابعہ کی اور ہم سب کی خواہش اور پوری کوشش یہ تھی کہ چودھری رلاور کو سزائے موت ہو اور وہ دار تک آئے کہ اپنے جرائم کی پاداش میں چودھری رلاور تختۂ دار پر نظر آئے مگر مجھے یقین تھا کہ جس دن چودھری رلاور کو پھانسی دی جاتی اس دن رابعہ، گل اور گھر کی سب تمام خواتین مغموم اور اداس نظر آتیں۔ مجھے ایسی ہی کیفیت اب بھی تھی۔ اصولاً تو انہیں بے حد مسرور نظر آنا چاہیے تھا کہ ایسے شیطان صفت درندہ "بے خبر خدا" اور ان گنت بے گناہوں کے لہو سے دامن داغدار رکھنے والے کو ایسی عبرت ناک موت مل رہی تھی، عین تقاضائے انصاف تھا مگر وہ اس کے انجام پر ملول تھیں۔

"کیا واقعی وہ دو مہینے میں مر جائے گا؟" رابعہ نے کہا۔

"ڈاکٹر یہی کہتے ہیں" میں نے کہا۔

گل نے کہا "تب... بیماریاں بھی کیسی کیسی ایجاد ہو گئی ہیں۔"

www.paksociety.com

محسن نے کہا "ملاحظہ ہو دانش وری۔ بیماری ایجاد ہو گئی۔"

"ہاں۔ پہلے کہاں تھیں یہ سب بیماریاں۔" گل بولی۔

محسن نے کہا "آپ جاہل ہیں' بیماریاں تھیں مگر ان کا علم نہیں تھا۔ اب تشخیص ہو جاتی ہے تو سب کو معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ میڈیکل سائنس کا کمال ہے۔"

"خاک کمال ہے جب بیماری کا علاج ہی نہیں" رابعہ نے کہا۔

"اگر یہ ٹھیک ہو جائے تو آپ کو خوشی ہو گی؟"

گل نے کہا "کینسر سے کون ٹھیک ہوتا ہے؟"

محسن بولا "نہیں' فرض کرو کہ کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔"

میں نے کہا "چلو چھوڑو شیروانی صاحب' یہ خواتین کے جذبات کا مسئلہ ہے۔ اس کا عقل سے کیا تعلق۔ یہ تو فلموں اور ڈراموں میں دردناک مناظر دیکھ کے آنسو بہاتی ہیں۔"

"پتھر دل نہیں ہوتے خواتین کے۔"

"آنسو دل سے نہیں نکلتے۔ یہ ہوتا ہے دماغ کا فتور۔" محسن بولا۔

رابعہ نے کہا "کیا اس کے بیوی بچوں کو معلوم ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔"

"کتنا دکھ ہو گا انہیں" رابعہ نے کہا "اچانک پتا چلے کہ کوئی امید ہی نہیں رہی۔ جیسے رحم کی آخری اپیل بھی مسترد ہو جائے اور پھانسی کی تاریخ اور وقت مقرر ہو جائے تو آخری ملاقات کرا دی جائے۔"

گل نے کہا "ان کے لیے تو آخری ملاقات ہی ہو گی جب ہم لاہور پہنچ کے انہیں بلائیں گے اور بتائیں گے کہ......"

رابعہ نے کہا "خیر یہ سب ہم نے تو نہیں کیا۔ سزائے موت اگر ہماری کوشش سے ہوتی تو اور بات تھی۔"

"ہاں اس لحاظ سے تو اچھا ہوا۔ وہ مقدمہ لڑتے اور ہار جاتے تو ہمارے خلاف دل میں انتقام کے جذبات' نفرت یا کدورت رکھتے۔ یہ تو تقدیر کا فیصلہ ہے۔"

"اگر یہ فیصلہ کچھ پہلے ہو جاتا۔"

میں نے کہا "کوئی کام وقت سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ اور وقت سے مجھے یاد آیا کہ سات بجنے والے ہیں۔ ہائی جیک صاحب نے فرمایا تھا کہ ہم آٹھ بجے تک چارلی سے مل کے اپنی ریزرویشن کرا لیں تو اچھا ہے اور اس سے مجھے مزید یاد آیا کہ چوہدری دلاور اب تک کیوں سو رہا ہے؟"

"میں نے اسے ایک اور انجکشن لگا دیا تھا۔" محسن بولا۔

"مطلب؟ میں نے تو نہیں دیکھا۔"

"جہاز کے اُڑنے سے پہلے اسے سوتے ہوئے مسلسل بارہ گھنٹے ہو گئے ہیں۔ اب اسے جاگنا چاہیے۔ ایسے کچھ کھائے پیے بغیر تو نیند میں ہی بھوک سے فوت ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "میں جاتا ہوں جیک کے ساتھ۔ تو دلاور کو سنبھال۔ وہ اٹھ جائے تو اسے کچھ کھانے پینے کے لیے دینا ہو گا۔ دوا کا مسئلہ الگ ہے۔ وہ خود ہی جانتا ہے کہ کون سی دوا کس وقت کھانی ہے۔"

"اگر وہ جاگنے کے بعد ہنگامہ کرے؟"

"کیسے ہنگامہ کرے گا یار۔ غنودگی باقی رہتی ہے اور اگر وہ اپنے حواس میں ہو تو اسے پھر سمجھانا کہ اب وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ بہتر ہے خاموشی سے تعاون کرے۔ اسی میں فائدہ ہے ورنہ ڈالر کیا ہے۔ کارٹن میں پیک کر کے بھی لے جا سکتے ہیں۔ اسے سمجھانا کہ چارٹرڈ فلائٹ کے اخراجات خود اس نے ادا کیے ہیں' اس کے باوجود وہ آرام سے نہ جائے تو بدقسمتی وہ خود۔"

محسن نے کہا "یہاں کے معاملات مجھ پر چھوڑ دے تو جلد۔"

رابعہ نے کہا "مگر میں سکندر کو ایسے نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ بار نکل گئے کسی پروگرام کے بغیر کہیں۔"

میں نے کہا "بیوی۔ اتنی بے اعتباری اپنے اکلوتے شوہر پر۔"

"تمہیں کیا معلوم ہم نے چار دن کس عذاب میں گزارے یہاں" وہ بولی "تم تو بغیر بتائے غائب ہو گئے تھے۔"

گل نے کہا "اگر ایسے ہی ہم غائب ہو جائیں پھر؟"

محسن نے خوش ہو کے کہا "ایمان سے کہو۔ ہے ایسا کوئی ارادہ؟"

میں نے بھی کہا "ہماری طرف سے اجازت ہے۔ چار دن کیا تم چار ہفتے غائب رہو۔ جب جی چاہے لوٹ آنا۔ ہم شکوہ بھی نہیں کریں گے۔"

"شکریہ ادا کریں گے کہ آپ نے ہمیں کچھ دن سکون سے رہنے کی مہلت عطا کی۔ غلام ہی سمجھتے ہیں کہ آزادی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔"

گل نے خفگی سے کہا "ہم نے غلام بنا رکھا ہے تمہیں؟ کوئی زنجیر ڈال رکھی ہے تمہارے پیروں میں۔"

میں نے کہا "شیروانی صاحب! میں تو چلتا ہوں۔ آپ خواتین کو مطمئن کریں ذرا۔ کچھ جذباتی ڈائیلاگ بولیں۔ ذہنیت ہی کے معافی مانگ لیں۔ ہاتھ جوڑ کے ناک رگڑ کے' یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

محسن نے سہلایا "قسمت آسان کام ہے۔ تم دیکھنا میں کیا بے وقوف بنتا ہوں۔ واپسی پر دونوں کی بتیسی نظر آئے گی ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار کی طرح۔"

محسن نے جاتے جاتے مجھے محفل دل لگی کے لیے پکا لیا تھا۔ جب میں جیک کے ساتھ روانہ ہوا تو ان کے کمرے سے زور زور سے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔

جیک نے کہا "کیا تمہارا وہ مریض گزر گیا؟"

میں نے کہا "وہ سو فیصد زندہ ہے۔"

"پھر یہ رونے کی آوازیں کیسی ہیں؟" جیک نے کہا۔

"یہ خوشی سے رو رہے ہیں۔"

اس نے متعجب لہجے میں کہا "تم تو بتا رہے تھے کہ تمہارے لیے شراب حرام ہے۔"

"ہاں۔ ہمیں بن پیے ہی نشہ ہو جاتا ہے۔ شراب کا نشہ ہو' محبت کا یا دولت کا' کیفیت ایک جیسی ہوتی ہے۔ آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔"

وہ ہنس پڑا "شاید ٹھیک ہی کہہ رہے ہو تم۔"

ٹیکسی نے ہمیں تو سے گھنٹے میں ایک ہوٹل کے سامنے اُتار دیا۔ جیک نے بتایا کہ اتوار کی صبح ٹریفک کا رش نہیں ہے ورنہ یہی فاصلہ ہم ایک سے تین گنا وقت میں طے کرتے۔ راستوں پر پھولوں کی افراط تھی۔ فرانسیسی حسن کے شیدائی ہیں۔ صرف پھول ہی نہیں' فیشن' خوشبو' آرٹ۔ سب میں ان کا ذوق دیگر یورپی اقوام سے بڑھ کر ہے۔ ہوٹل کے باہر ہر گیلری میں' پورچ میں اور اندر لاؤنج میں پھول ہی پھول تھے۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل تھا مگر خوب صورتی اور صفائی میں ہمارے ملک کے فور اسٹار ہوٹلوں سے بڑھ کر تھا۔

چارلی اسی وقت نیند سے بیدار ہوا تھا۔ اس نے مجھے لال لال آنکھوں سے گھورتے ہوئے مصافحہ کیا۔ وہ بھی چالیس پچاس سال کی عمر کا تنومند بھاری بھرکم شخص تھا۔ اسے بلاوجہ ہنسنے کی عادت تھی اور اس کی آواز مردانہ سے زیادہ بچکانہ تھی۔

"آج تم نے بتانا چاہتے ہو نائٹ انگیل کو؟"

میں نے بوکھلا کے کہا "نائٹ انگیل... یہ کون خاتون ہیں۔ میں تو تمہارے جہاز کی بات کرنے آیا تھا۔"

وہ خوب ہنسا اور پھر اس نے عادت کے مطابق اپنا ہاتھ آگے کیا کہ میں اس پر ہاتھ ماروں "یہ جہاز کا نام ہے' اب تم پوچھو گے کیسے؟"

"میں نہیں پوچھوں گا" میں نے کہا "یہ اپنے اپنے جذبات کا مسئلہ ہے۔ شاید تمہیں جہاز کے انجن کا شور ایسے لگتا ہو گا جیسے بلبل گا رہی ہے۔"

وہ پھر ہنسا اور مجھے پھر اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارنا پڑا "کمال کر دیا تم نے' میرے جذبات کی ترجمانی کر دی۔ بالکل یہی بات ہے' جذباتی مسئلہ ہے۔"

میں نے کہا "اب تم میرے جذبات کا معاشی مسئلہ حل کر دو۔ مجھے تمہیں پندرہ ہزار پاؤنڈ سے زیادہ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ مطالبہ ہونے تو انکار نہ کرنا۔ میں جھوٹ بولنا نہیں چاہتا تمہیں قائل کرنے کے لیے۔"

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "ٹھیک ہے۔ تم اچھے آدمی ہو اس لیے ٹھیک ہے۔ آگا دو پندرہ ہزار پاؤنڈ۔"

میں نے رقم اسے پیش کر دی "گن لو۔"

اس نے رقم اپنے سوٹ کیس میں ڈال دی "پوری ہے نا؟"

"نہیں۔ ایک پاؤنڈ کم ہے" میں نے کہا۔

وہ ہنسا "اگر ایک ہزار پاؤنڈ بھی کم ہوتے تو میں نہ گنتا۔ اب یہ بتاؤ کہ کب جانا ہے۔"

"تمہارا جہاز ٹیک آف کے لیے تیار ہے؟"

"بالکل تیار ہے۔ مجھے فلائٹ شیڈول بنا کے دینا پڑے گا۔ اپنے باپ کو تلاش کرتا ہوں۔ پتا نہیں رات وہ کہاں تھا؟"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا اس کو بتا کے اجازت لو گے؟"

وہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا "میرا باپ بھی میرا نیوی گیٹر ہے۔ اس نے مجھے فلائنگ سکھائی۔ وہ خود بڑا زبردست پائلٹ ہے۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو اور اسے کسی بھی جہاز میں بٹھا دو۔ اور پھر کہو کہ چلو کوسٹا ریکا یا ٹمبکٹو۔ تو وہ تم کو بڑی حفاظت کے ساتھ ٹھیک وقت پر وہاں اُتار دے گا۔ بس وہ کچھ آوارہ اور اوباش ہو گیا ہے جب سے اس کی بیوی مری ہے۔"

"اس کی بیوی یعنی تمہاری ماں؟"

اس نے ہنستے ہوئے کہا "او نو۔ میری ماں سے تو اس نے شادی ہی نہیں کی تھی۔ اب تم آجاؤ دو گھنٹے بعد جیک کے ساتھ۔"

جیک نے کہا "میرے ساتھ کیوں' مجھے واپس جانا ہے۔ اب تم جانو تمہارا کام۔"

میں نے کہا "مجھے بتا دو کہ ہم کہاں آئیں' کہاں آسانی ہو گی ہمارے لیے۔ دراصل ہم اس شہر کو بہت کم جانتے ہیں۔"

"پھر تم یہاں آجاؤ۔ میرے پاس ہوٹل میں" وہ بولا "میں تمہیں ساتھ لے چلوں گا۔"

ہم نے وہیں سے ہائی جیک کو خدا حافظ کہا "تم نے یقیناً ہماری بہت مدد کی۔"

اس نے کہا "مگر تم نے نیکی سمجھ کے بھی مجھے ایک ہزار پاؤنڈ نہیں دیے۔ ہزار نہ سہی پانچ سو دے دو۔"

میں نے اسے پانچ سو پاؤنڈ دے دیے۔ "بات یہ ہے کہ مال ہمارا نہیں' تم بھی عیش کرو' یہ مالِ غنیمت ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟" اس نے نوٹ جیب میں ٹھونس لیے۔

"دشمن کا مال' حرام کی کمائی۔ لاٹری کا پیسہ۔ مفت میں مل جانے والا خزانہ۔ کچھ بھی سمجھ لو۔ باپ کا مال ہوتا تو ہم ایسی بے دردی سے نہ لٹاتے' تم حقدار بھی نہیں تھے۔"

"حق کی بات مت کرو" وہ ہاتھ ملا کے بولا "حق کی راہ پر کیا تم چل رہے ہو' تم سمجھتے ہو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو' وہ ٹھیک ہے۔"

محسن نے ٹھنڈی سانس لی "یہی تو ساری خرابی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم جو بھی کر رہے ہیں' وہ غلط ہے۔ اور پھر بھی وہی کرتے رہتے ہیں۔ اگر ہم صرف اپنے قول و فعل کو ٹھیک کر لیں تو پھر خاندان' معاشرہ' ساری دنیا ٹھیک ہو جائے۔"

وہ ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا تو ہم نے واپسی کے لیے ٹیکسی لی۔

www.paksociety.com

غریب نواز ہوسٹل تک پھر آدھے گھنٹے کا سفر تھا۔

محسن نے کہا "چلو یار، خدا کا شکر ہے۔ اب کوئی مشکل مرحلہ نہیں رہا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اگر ہم پر برطانیہ میں داخلے پر پابندی نہ ہوتی تو کچھ نہ ہوتا۔ ہم قانونی طور پر جارج سے ملاقات کرنے اور لوٹ جاتے۔ یہ کولمبو سے پیرس آنے کا اور راڈی کے ساتھ لندن پہنچنے کے لیے خفیہ طریقہ استعمال کرنے کا چکر ہی نہ ہوتا۔ خدا کی رین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال۔ کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے" میں نے کہا "آئے تھے ہم جارج سے ملاقات کے لیے اور اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں چوہدری دلاور کو۔"

محسن بولا "سارا کھیل تقدیر کا ہے۔ ہر بات کا ایک وقت مقرر ہے۔ تدبیر لاکھ جتن کرے کچھ نہیں ہوتا اور جب وقت آتا ہے تو سب خود بخود ہو جاتا ہے۔ ہمارے اور چوہدری دلاور کے درمیان اختلافات اور پھر دشمنی کا نقطہ آغاز کیا تھا' اور انجام ہماری توقعات کے کتنا برعکس۔ بڑی طویل جدوجہد کی ہم نے۔ دلاور نے بھی ہمیں چاروں شانے چت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ پھر جب اس کے مہرے پٹنے لگے اور اسے شکست اپنا مقدر محسوس ہونے لگی تو اس نے کتنی بار صلح کی غیر مشروط پیش کش تک کی۔ وہ معافی تلافی کی بات کرنے لگا۔ کتنا بڑا شکاری سمجھتا تھا وہ اپنے آپ کو۔ کتنا غرور تھا اسے اپنی دولت کی طاقت پر۔"

"ہاں۔ مگر اب وہ ایک مرغ بے پرواز ہے۔ وہ پولیس کو زر خرید غلام سمجھتا تھا' قانون اس کی مٹھی میں تھا۔ اسے زعم تھا کہ کسی عدالت میں اس کے خلاف کچھ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ وہ گرفتار ہوا تو پولیس نے اسے چھوڑ دیا۔ دوسری بار وہ جیل سے فرار ہو گیا اور زندگی سلسلہ تبھی تو وہ واقعی ہار نہ مانتا۔ ابھی تو وہ اس یقین کے ساتھ ہمارے سامنے ڈٹا ہوا تھا" میں نے کہا۔

محسن بولا "ہمارے سامنے کیا' دیکھا جائے تو نظام انصاف کی مشینری کو چلانے والے سب ہی اس کی لاقانونیت اور فرعونیت کے دشمن تھے۔ وکیلوں نے اسے ہر طرف سے محصور کر لیا تھا اور پولیس کو بھی مجبور کر دیا تھا کہ وہ چوہدری دلاور پر...... قانون کے مطابق فرد جرم عائد کریں۔"

میں نے کہا "دلاور کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ ہر قسم کی عدالتی کارروائی کے لیے تیار تھا۔ اس نے نامور وکیلوں کی پوری فوج یہ قانونی جنگ لڑنے کے لیے تیار کی ہوگی۔ اسے پورا بھروسا ہوگا کہ سیشن کورٹ سے ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ تک اس کا راستہ کون روک سکتا ہے اور پھر دلاور جیسے مجرم انصاف کی راہ میں روڑے اٹکانا بھی جانتے ہیں۔ عدالتوں میں اسی لیے تصفیہ طلب مقدمات کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے کہ ہر کیس کو طول دینے کے لامحدود امکانات پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ ہفتوں کا معاملہ مہینوں پر اور مہینوں کا سالوں پر ٹالا جا سکتا ہے۔ لمبی تاریخ' سماعت پر غیر حاضری۔ بیاری کے عذر۔ ہر سمن کی عدم تعمیل جب تک کہ ناقابل ضمانت وارنٹ جاری نہ ہو جائیں۔ خود پولیس ہزاروں حیلے بہانے فراہم کر دیتی ہے۔"

محسن بولا "ہاں۔ لیکن اس کے باوجود مجرم سزا پاتے ہیں۔ پھانسی پر لٹکائے جاتے ہیں اور جیلوں میں جگہ نہیں ہے۔"

"وہ چوہدری دلاور جیسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔ غریب لاوارث جو بھی قانونی جنگ کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے رشوت' سفارش اور گواہ خرید نہیں سکتے اور جو نہیں سکتے۔ جن کے خلاف جھوٹے گواہ اور ثبوت فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ ان کو ضرور سزا ہو جاتی ہے۔ اس میں عدالت کا یا جج کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو شہادت اور ثبوت دیکھتے ہیں۔ یہی بنیاد ہے انصاف کی اور جب بنیاد غلط کر دی جائے گی تو انصاف کیسے ہوگا؟ کیا پاکستان میں بڑے بڑے خاندانی لوگ' صنعت کار اور سرمایہ دار' بیوروکریٹ اور سیاست داں جرم نہیں کرتے' کتنے بڑے تو ری ہیں جیل میں۔ وڈیرے جاگیردار اور اسمگلر کیا کچھ نہیں کرتے' یہ مجرموں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ ہیڈ ور قاتل اور ڈاکو پالتے ہیں۔ یہ جسے چاہیں 'آنجہانی' غائب کر دیں۔ پورے پورے خاندان اور گاؤں صفحہ ہستی سے مٹا دیں۔ کوئی کچھ سکتا ہے انہیں؟ زیج تک کسی نے ان بڑے مجرموں پر ہاتھ ڈالا ہے جن کو اپنے جرائم' دہشت گردی اور بدمعاشی پر اتنا ہی ناز ہے جتنا بھی خاندانی لوگ اپنی شرافت پر کرتے تھے۔ زیج تک ان میں سے کسی کو پھانسی ہوئی' کوئی سزا کاٹ رہا ہے۔"

محسن نے سر ہلایا "یہ تو ٹھیک ہی کہا تو نے۔ اسی صورت حال نے لوگوں کو مایوس کیا ہے۔ اب لوگ انصاف کے لیے آسمان کی طرف دیکھتے ہیں کہ انصاف خدا کرے گا۔ یوم حشر تک صبر کرنے پر تیار ہیں کہ یہاں نہ سہی وہاں تو داد رسی جائے گی۔ جب کچھ نہ کر پائیں تو کہتے ہیں خدا ظالم کی رسی دراز کرتا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ایسے شعر پڑھتے ہیں کہ ظلم کی ٹہنی سدا پھلتی نہیں۔ ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں۔ قدرت کے نظام انصاف پر یقین کے سہارے جیتے ہیں اور ایسی کوئی مثال مل جائے' جیسے دلاور کا انجام ہوا تو مطمئن اور خوش ہو جاتے ہیں کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ برے کام کا برا نتیجہ۔ جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔ دلاور بھی بے مثال وہ رس جگہ رہتے ہیں لیکن دوسری مثالوں پر غور نہیں کرتے جہاں چوہدری دلاور جیسے لوگ ہی دنیا میں کامیاب رہتے، عزت دار کہلاتے اور کوئی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

"دنیاوی کامیابی ہی سب کچھ نہیں۔ انہوں نے آخرت بیچ کر خسارے کا سودا کیا" میں نے کہا "بے شک سر حسین نے دنیا کو بزید نے دنیا میں رسوا ہی پائی۔ وہ ملعون و مردود ٹھہرا۔ تاریخ میں رسوا ہوا۔ اس دنیاوی زندگی کی حقیقت بھی کیا ہے۔"

ڈرائیور نے گاڑی روک کے کہا "یہی وہ جگہ ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ ہم باتوں میں ایسے کھوئے کہ تمہیں راستہ بتانا بھی یاد نہیں۔ مگر تم بالکل ٹھیک جگہ لے آئے۔"

وہ میری فرنچ سے خوش ہوا "تم بڑی روانی سے فرنچ بولتے ہو۔ اگرچہ تمہارا لہجہ سو فیصد فرنچ نہیں ہے۔"

"ہو بھی نہیں سکتا" میں نے کہا "ہم انگلش والے نہیں بول سکتے جیسے انگریز بولتے ہیں۔"

"مگر میں بولنا بھی نہیں چاہتا" اس نے کہا۔

محسن نے اچانک مجھے کہنی ماری "یہ کیا چکر ہے۔" پھر وہ ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہوا "یہاں گاڑی مت روکو' تھوڑا سا آگے چلو۔"

اس نے حیرانی سے کہا "مگر تم نے کہا تھا۔"

"ہاں۔ یہ مشہور جگہ ہے اس لیے تمہیں نشانی بتا دی۔ ہم اس عمارت میں رہتے ہیں" محسن نے کہا "وہ سفید عمارت سیدھے ہاتھ پر۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ جب محسن نے مجھے کہنی ماری تھی تو میں نے ہوسٹل کے مین گیٹ سے اندر دیکھا اور مجھے استقبالیہ کے کاؤنٹر پر رابعہ اور گل نظر آئی تھیں۔ وہ تین پولیس والوں سے نہ جانے کیا بحث کرنے میں مصروف تھیں۔ ایک پولیس کار گیٹ سے ذرا آگے کھڑی تھی' اس کا ڈرائیور بھی پولیس مین تھا اور وہ ہاتھ باندھے کار سے لگا کھڑا تھا۔ اس کی نگاہ بھی اندر تھی چنانچہ اس نے ٹیکسی کو رکتے اور پھر روانہ ہوتے نہیں دیکھا۔

محسن نے جس عمارت کی طرف اشارہ کیا تھا وہ تقریباً سو گز آگے تھی۔ ٹیکسی سے اترتے میں نے کرایہ ادا کیا اور ڈرائیور کا فرنچ میں بڑے دوستانہ طریقے پر شکریہ ادا کیا۔ ہم نے عمارت کے صدر دروازے کا رخ کیا مگر ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہی ہم رک گئے۔

"کہیں پولیس ہماری تلاش میں تو نہیں تھی؟" محسن بولا۔

"مگر وہ یہاں کیسے پہنچ سکتے ہیں؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

"ہم کو برطانوی پولیس نے فرنچ پولیس کو ہمارے نام اور حلیے سے آگاہ کر دیا ہوگا تو ان کا ہمیں تلاش کرتے ہوئے یہاں آ جانا بعید از قیاس نہیں۔ وہ شہر کے سارے ہوٹل چیک کریں گے اور ایسے ہوسٹل یا گیسٹ ہاؤس جہاں ہم جیسے لوگ قیام کر سکتے ہیں۔ ہم الرشید اور سرچڈ کی مہمانی اور مدد سے نکل تو آئے مگر پولیس کے ریکارڈ پر ہم مطلوب ملزم ہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو نئی مصیبت نازل ہو گئی۔ ہوسٹل والے ضرور بتا دیں گے کہ اس حلیے کے اور نام کے لوگ یہاں مقیم ہیں۔ ممکن ہے وہ ہوسٹل کی تلاشی لیں اور دلاور کو برآمد کر لیں' ہم نے ایک اور غلطی کی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہم نے ڈاکٹر شاہ کی تدفین کا انتظام کرنے والے ادارے کو الرشید اور سرچڈ گورڈن کا ٹیلی فون نمبر اور پتا لکھوا دیا تھا۔"

"او مائی گاڈ۔ اس وقت ہمیں کیا معلوم تھا کہ حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔ الرشید ہم سے ملنے کے لیے پولیس اسٹیشن پہنچ جائے گی اور سرچڈ گورڈن ہمارے ساتھ ایسی فراخ دلی کا سلوک کرے گا۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ انڈر ٹیکر نے رچڈ کو فون کیا ہو' کچھ پوچھنے کے لیے یا کوئی بات بتانے کے لیے" میں نے کہا۔

محسن بولا "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پولیس نے ڈاکٹر شاہ کا سراغ لگا لیا ہو۔ اس کی کار پولیس کی تحویل میں تھی۔ وہ بوت نظر آنے والا جو اس ادارے کا منتظم یا مالک تھا۔ وہ پولیس کو بتا سکتا ہے کہ لاش کو تابوت کے ساتھ وہاں چھوڑ کر جانے والے کون لوگ تھے۔ ان کی صورت شکل اور حلیہ کیا تھا۔"

"گاڈ رچڈ تو غصے سے پاگل ہو جائے گا" میں نے کہا "خود الرشید ہمیں گالیاں دے گی کہ ہم نے اسے بے وقوف بنایا۔ اس نے اور سرچڈ نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ہمیں عزت دی اور ہمارے لیے سب کچھ کیا۔ اس کا ہم نے یہ صلہ دیا۔"

"خیر یہ تو بعد کی بات۔ پھر کبھی موقع ملا تو اپنی صفائی پیش کر دیں گے۔ وہ یقین نہیں کریں گے تب بھی ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت ہم کیا کریں؟" محسن بولا۔

میں نے کہا "اگر ہم ہوسٹل میں گئے تو پکڑے جائیں گے۔"

"اگر پولیس نے رابعہ اور گل کو پکڑ لیا؟" محسن نے کہا۔

میں نے کہا "کس جرم میں؟ یہاں ایسی لاقانونیت نہیں چلتی کہ ملزم کی گرفتاری میں ناکام ہو کے پولیس اس کے باپ یا بھائی کو اٹھا لے جائے یا بیوی کو پریشان کرے۔"

ہم فٹ پاتھ پر کھڑے تھے کہ تینوں پولیس مین اندر سے باہر آئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھالی اور کار روانہ ہو گئی۔ ہم نے فوراً اپنا چہرہ مخالف سمت میں کر لیا اور اس عمارت کی سیڑھیوں کی جانب چند قدم بڑھائے جس کے سامنے ہم ٹیکسی سے اترے تھے۔

جب پولیس کار آگے نکل گئی تو ہم واپس ہوسٹل کے صدر دروازے پر کھڑے ہوئے چوکیدار نے کہا "کیا تم کسی کو تلاش کر رہے ہو؟"

میں نے فرنچ میں کہا "دراصل ہمیں کسی فون بوتھ کی تلاش ہے۔"

اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا "فون تو یہاں بھی ہے' ہال میں۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم نے ہال میں جا کے اپنے ہوسٹل کا فون نمبر ملایا۔ رابعہ کو آنے میں چند منٹ لگے۔

اس کی ہیلو سن کے میں نے کہا "رابعہ!"

رابعہ نے کہا "سکندر' تم ہو۔ کہاں ہو تم لوگ؟"

"بہت قریب۔ ہم نے تمہیں پولیس سے باتیں کرتے دیکھ لیا

www.paksociety.com

تھا۔ ہم ٹیکسی کو آگے لے گئے۔"

"بہت اچھا کیا تم نے" رابعہ بولی "پولیس تمہیں تلاش کرتی ہوئی آئی تھی۔"

"یہاں کا پتا کس نے بتایا انہیں؟"

"کسی نے بھی نہیں۔ برطانوی پولیس نے انہیں تمہارے نام اور حلیے سے مطلع کیا تھا۔ وہ ہر جگہ دیکھتے پھر رہے ہیں۔ ان کے پاس ان تمام مقامات کے پتے ہیں جہاں کوئی قیام کر سکتا ہے' ہوٹلوں کے علاوہ۔"

"وہ تم سے کیا پوچھ رہے تھے؟"

"انہوں نے ریسیپشن پر معلوم کیا تھا' شاید تصویر بھی دکھائی تھی۔"

میں نے کہا "پھر...؟ انہوں نے بتا دیا ہوگا کہ ہم یہیں ہیں۔"

"ہاں۔ انہوں نے ہمیں بُلا لیا۔ ہم نے کہہ دیا کہ تم لوگ واپس جا چکے ہو۔ انہوں نے پوچھا کہ کہاں تو ہم نے کہہ دیا کہ جہاں سے آئے تھے۔ اپنے وطن پاکستان۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ یہ کب کی بات ہے تو ہم نے کہا کہ گزشتہ ہفتے کی۔ تمہیں واپس گئے پانچ دن ہو گئے۔"

"یہ کیا بے وقوفی کی بات کی تم نے۔ ہم کل رات... بلکہ آج ہی صبح دو بجے پیرس میں وارد ہوئے تھے۔"

"رات کے وقت جو اسٹاف ڈیوٹی پر تھا۔ وہ اس وقت نہیں تھا۔ صبح کی شفٹ کے لوگ آٹھ بجے آتے تھے۔ ان میں سے کسی نے تمہیں نہ آتے دیکھا تھا اور نہ جاتے۔ انہوں نے ہمارے بیان کی تصدیق کر دی کہ چار پانچ دن پہلے انہوں نے تمہیں دیکھا تھا' بس اس کے بعد وہ چلے گئے۔"

"انہوں نے تم سے کوئی سوال نہیں کیا کہ تمہارا طلحان سے کیا رشتہ ہے؟ اور تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"پوچھا تھا مگر ہم نے کہہ دیا کہ فضول سوالات کا ہم جواب نہیں دے سکتے۔ ہمارا کوئی رشتہ ہے یا نہیں' اور ہم پیرس کیوں آئے ہیں اور کب تک یہاں رہیں گے' اس سے بھی انہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ تم نے وقار یوسف کے بارے میں پوچھا تھا وہ ہم نے بتا دیا۔ اب تم چاہو تو اپنے طور پر تصدیق کر سکتے ہو۔ ہوسٹل کی انتظامیہ نے بھی سخت رویہ اختیار کیا کہ وہ یہاں رہنے والوں کو بلاوجہ پریشان نہیں کر سکتے۔ ان کے مطلوب طلحان یہاں نہیں ہیں۔ اگر یہاں پھر نظر آئے تو پولیس کو مطلع کر دیا جائے گا۔ ان کے پاس کوئی وارنٹ نہیں تھا۔ نہ تلاشی کا اور نہ گرفتاری کا۔ وہ معذرت کر کے چلے گئے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ پھر آئیں گے۔"

میں نے کہا "ان کے پھر آنے سے پہلے تم نکل آؤ۔"

رابعہ نے کہا "کیسے نکل آئیں؟"

"منیجر سے کہو کہ حساب کرے۔ بل ادا کرو اور فوراً سامان اُٹھا کے باہر آ جاؤ۔" میں نے کہا "ہم باہر ٹیکسی میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"دلنشین دلاور...!"

میں نے کہا "رابعہ۔ عقل سے اور ہمت سے کام لو۔ کاؤنٹر پر جو بھی ہے اس کی مٹھی گرم کرو' سو دو سو پاؤنڈز دے دو تاکہ وہ خاموشی سے تمہیں نکل جانے دے۔ بعد میں پولیس پھر آئے گی تو اس پر کوئی الزام نہیں ہوگا۔ اسے کسی نے نہیں کہا تھا کہ تمہارے روانہ ہونے کی صورت میں پولیس کو مطلع کرے۔ اور نہ پولیس نے تم پر کوئی پابندی عائد کی تھی کہ پولیس کو اطلاع دیے بغیر تم کہیں نہیں جاؤ گی۔"

"یہ تو خیر ٹھیک ہے۔"

"کیا چودھری دلاور ہوش میں ہے؟ اس قابل ہے کہ اپنے پیروں پر چل سکے؟"

"ہاں۔ وہ ہم سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ہر طرح سے تعاون کرے گا۔ بس اسے نیند کا انجکشن نہ لگایا جائے۔"

"او کے۔ اسے کہو کہ تمہارے ساتھ آ جائے۔ اسے سمجھا دو کہ سکندر اور محسن باہر انتظار کر رہے ہیں' وہ چالاکی نہ دکھائے۔"

"میں اسے گن پوائنٹ پر بھی لا سکتی ہوں" رابعہ نے کہا "ایسے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ صرف دلاور کو معلوم ہوگا کہ میرے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور ہے اور میری انگلی ٹریگر پر ہے۔"

"ویری گڈ۔ یہ ایک مشکل کام ہے مگر مجھے امید ہے کہ تم ہوش و حواس برقرار رکھتے ہوئے سب کچھ کر سکتی ہو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ گل کو بھی ساری بات اچھی طرح سمجھا دو۔ پھر تم گل کو سامان کے ساتھ روانہ کر دو۔ محسن اسے ٹیکسی میں لے جائے گا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا جب تم باہر آ جاؤ گی تو میں دوسری ٹیکسی میں آؤں گا اور دلاور کو اپنے ساتھ بٹھا لوں گا۔ تم آگے بیٹھ جانا۔ اس سے پہلے کہ کوئی ٹیکسی کا نمبر نوٹ کرے۔"

"مگر ہم جائیں گے کہاں؟"

"ہم ایک گھنٹے میں نقل مکانی کر جائیں گے" میں نے کہا "ہم نے بات کر لی ہے اور سارا انتظام ہو گیا ہے۔ پولیس کو ریکارڈ چیک کرنے میں کچھ دیر لگے گی کہ گزشتہ چار پانچ ہفتوں میں کتنی فلائٹس کراچی کے لیے روانہ ہوئیں اور ان میں وقار یوسف نام کا کوئی مسافر تھا یا نہیں۔ جب تک انہیں معلوم ہوگا کہ تم نے جھوٹ بولا تھا اور وہ پھر ہوسٹل پہنچ کر تم سے مزید تفتیش کرنا چاہیں گے تم ان کی دسترس سے دور نکل جاؤ گی۔ مگر دیکھو' ہوشیاری سے اور ہمت سے سارا کام کرنا ہے۔ ہم وہاں آ کے تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے جیسے بھی ہو دلاور کے ساتھ ہوسٹل چھوڑ دو۔"

میں اور محسن بیس منٹ تک ٹیکسی میں بیٹھے گل کے برآمد ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ ہمارے پُراسرار رویے نے ٹیکسی ڈرائیور کو شک میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے بگڑ کے کہا "آخر تم

بتاتے کیوں نہیں کہ تمہیں کہاں جانا ہے' جانا ہے یا نہیں جانا ہے؟"

محسن نے پھر فرنچ کا جب استعمال کیا۔ اس نے دوستانہ رازداری کے ساتھ کہا "دراصل میں اپنی گرل فرینڈ کا انتظار کر رہا ہوں' وہ آتی ہوگی۔"

"پھر کوئی بات نہیں" وہ ڈرائیور موم ہو گیا "سے روکنے والا کون ہے۔ ویسے تو لڑکیاں وقت پر کم ہی آتی ہیں۔"

محسن نے آہ بھری "مگر اس کی راہ میں حائل ہوگا یہ ظالم سماج۔ میرا مطلب ہے اس کا قاتل باپ۔"

"قاتل۔ کس کو قتل کیا ہے اس نے؟"

"وہ مجھے قتل کرے گا" محسن بولا "اس نے اعلان کیا ہے قسم کھا کے۔ تمہارا کیا خیال ہے' میں انتظار کروں یا پہلے اسے قتل کر دوں؟"

ڈرائیور بولا "انتظار کرو۔ اگر وہ تمہیں قتل کر دے تو پھر تم بھی قتل کرنا۔"

گل کے نمودار ہوتے ہی محسن نے کہا "ہو۔ ٹیکسی آگے بڑھاؤ اور اسے بٹھاتے ہی دوڑ لگاؤ۔ یہ نہ ہو پیچھے سے گولی آئے اور میرے بجائے تمہیں لگ جائے۔"

میں وہیں اُتر گیا اور محسن نے ٹیکسی کو ہوسٹل کے گیٹ سے چند گز آگے رکھا۔ گل بڑی مشکل سے سامان اٹھا کے لائی تھی۔ ڈرائیور نے محسن کی مدد کی اور دو منٹ بعد وہ روانہ ہو گئے تو میں نے دوسری ٹیکسی پکڑی اور اس میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے بھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا "کہاں جانا ہے؟"

اس نے جزبز ہو کے مجھے دیکھا "یہ تم بتاؤ گے' میں کیا جانوں؟"

"فی الحال تو مجھے کہیں نہیں جانا۔ کیا حرج ہے اگر ہم یہیں بیٹھ کے انتظار کریں" میں نے کہا۔

"کس کا انتظار کریں؟" ٹیکسی ڈرائیور کو شک ہونے لگا تھا کہ میں نے پی رکھی ہے۔

"کسی کا بھی۔ لوگ جب ٹیکسی میں بیٹھتے ہیں تو افراتفری میں ہوتے ہیں۔ کہیں جانے کے لیے۔ آدمی کو کبھی سکون سے بھی رہنا چاہیے۔ کہیں نہ جانے کے لیے بھی ٹیکسی میں بیٹھنا ایک اچھا تجربہ ہے۔ تم کو ویٹنگ چارجز ملیں گے۔"

"لیکن میں سارا دن یہاں نہیں کھڑا رہ سکتا۔"

اسی وقت رابعہ باہر آئی۔ اس کے ساتھ ہوسٹل ہی کا کوئی شخص تھا جس نے دلاور کو سہارا دے رکھا تھا "او کے۔ چلو' دیکھو وہ خوب صورت لڑکی مشکل میں ہے۔ غالباً اس کا باپ بیمار ہے' اسے اسپتال لے چلتے ہیں۔"

ڈرائیور نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا اور ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ رابعہ کی کامیابی پر میرا دل باغ باغ ہو گیا تھا۔ وہ برآمدے کی آخری سیڑھی پر تھی جب ٹیکسی اس کے سامنے آ گئی۔ اس نے مجھے دیکھا اور میں نے فوراً پیچھے والا دروازہ کھول دیا۔ رابعہ کی شکل پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور صاف نظر آتا تھا کہ وہ نروس ہے مگر وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

دلاور میرے ساتھ بیٹھ گیا تو رابعہ آگے بیٹھ گئی "شکر ہے خدا کا" اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"سب ٹھیک؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے اثبات میں سر ہلایا "ہم بال بال بچ گئے۔"

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو سمجھایا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ مجھے ہوٹل کا نام یاد تھا۔ اس نے کہا "باقی مجھ پر چھوڑ دو۔"

دلاور نے کمزور لہجے میں پوچھا "اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے کہا "ہم واپس جا رہے ہیں' پاکستان۔"

"کیا تم اپنے ارادے پر قائم ہو؟"

میں نے کہا "نہیں۔ تم بلاوجہ ڈر رہے ہو۔ سب کچھ ویسے ہی ہوگا جیسے تم چاہتے ہو مگر لندن میں بیٹھ کے نہیں' لاہور میں تمہارے اور میرے وکیل ان معاملات کو طے کریں گے۔"

اس نے سر ہلایا اور آنکھیں بند کر کے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ وہ اپنے آپ کو تقدیر کے اور ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ چکا تھا۔ پہلے وہ محاذِ جنگ پر فوج کی کمان کرتا تھا پھر وہ اکیلا لڑنے والا سپاہی رہ گیا۔ شکست ہو جانے کے بعد بھی اس نے مزاحمت ترک نہیں کی اور گرفتاری سے بچنے کے لیے بھاگتا رہا۔ اب وہ جنگی قیدی تھا اور اس نے مکمل طور پر ہار مان لی تھی۔ اس کو شکست ہم سے زیادہ مقدر نے دی تھی۔ اگر وہ جیت سکتا تو رسی جل جاتی مگر بل نہ جاتا۔ وہ ہاری ہوئی بازی پھر جیتنے کی خواہش سے کبھی دستبردار نہ ہوتا اور حوصلہ نہ ہارتا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے کہا اور مجھے خود اپنی بات بہت عجیب لگی۔

وہ کمی سے مسکرایا "بے معنی ہے یہ سوال۔ مگر پھر بھی اچھے سکندر اعظم صاحب ٹھیک ہوں اگر تم نے پوچھا ہی ہے۔"

میں نے کہا "تم ہمیشہ اسی لہجے میں بات کرتے تھے۔ یہی انداز تھا تمہارا۔ لیکن یہ مصنوعی تھا۔ تم جان بوجھ کے ایسے بولتے تھے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا "جب دلاور نہیں رہے گا تب یاد آئیں گی ہماری باتیں۔ یہ دشمنی بھی یاد آئے گی تمہیں۔ شاید اس کے بغیر تم اپنی زندگی میں خلا محسوس کرو۔ اچانک تمہیں احساس ہو کہ دلاور نہیں رہا تو کوئی کام ہی نہیں رہا۔ تم سکون کے عادی نہیں رہے ہو۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ سب مجھے بہت عجیب لگتا ہے۔ واقعی تقدیر کے فیصلے انسان نہیں کر سکتا۔"

"میں اپنے بیوی بچوں کو اطلاع دینا چاہتا ہوں۔"

www.paksociety.com

"انہیں بھی اطلاع مل جائے گی مگر ہمارے لاہور پہنچنے کے بعد۔ کیا انہیں یہ سب معلوم ہے۔۔۔ تمہاری بیماری کے بارے میں؟"

"نہیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ قسمت کا فیصلہ تو خود مجھے ابھی چند روز پہلے بتایا گیا تھا۔" دلاور نے کہا "یہ بڑا ظلم ہوگا ان کے ساتھ۔ اچانک ان سے اُمید کا سہارا چھین لیا جائے گا۔ اگر عدالتی معاملہ ہوتا تو وہ آخری وقت تک پُرامید رہتے۔ مجھے بھی حوصلہ رہتا۔ اس یقین کے ساتھ جنگ لڑتے رہتے کہ بالآخر جیت انہی کی ہوگی۔ وہ آج تک ہارے نہیں کبھی۔ ہار تو ایک بار ہی ہوتی ہے نا۔"

وہ بہت دکھی تھا اور مایوس تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج دلاور اسے ظلم کہہ رہا ہے۔ جو کچھ وہ کرتا رہا اس کے بعد یہ کیوں اُمید رکھتا تھا کہ انجام بخیر ہوگا؟ اگر اچانک اسے کھوٹ میں قدرت کی طرف سے فرمانِ اجل جاری نہ ہوتا تو کچھ عرصے بعد ہوتا۔ آہستہ آہستہ اس کے وارث اور قانونی معاون بھی محسوس کرنے لگتے کہ ان کی شکست کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر انہیں یقین ہو جاتا کہ اب بازی انہیں مات ہو چکی۔ پھر انتظار باقی رہتا۔ کئی مایوسی اور دکھ اور بے بسی کے ساتھ دن شمار کرنے کا سلسلہ باقی رہتا۔ سزائے موت سنائی جا چکی، رحم کی اپیل بھی مسترد ہوئی۔ اب بلیک وارنٹ بھی موصول ہو گیا۔ چند دن رہ گئے "تین دن، دو دن" ایک آخری دن پھر کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو جاتا۔ اب بھی تو یہی ہوگا۔ وہ اسی طرح دن گنیں گے۔ اتنی ہی بے رحمی کے ساتھ موت دلاور کو ان سے چھین لے گی۔ وقت کچھ مختصر ہو گیا۔ قانونی جنگ ہارنے میں شاید وہ دو چار سال گزار دیتے لیکن ایک اُمید پھر بھی ان کے ساتھ ہوتی۔ اب دو ماہ کی بات ہے اور امید کوئی نہیں۔

میں اپنے خیالات میں اتنا محو تھا کہ مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ وقت پر لگا کے اڑتا گیا۔ میں نے اچانک دلاور کو ہوائی جہاز میں اپنی سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آخری مرحلے میں کسی نے ہمارا راستہ نہیں روکا۔ کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوئی۔

دلاور نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا "کیا یہ بحرِ اوقیانوس ہے؟"

میں نے کہا "یہ بحیرۂ روم بھی ہو سکتا ہے۔"

رابعہ، محسن اور گل جہاز کے پچھلے حصے میں خوش گپیاں کر رہے تھے میں ان کے ہنسنے کی آوازیں سن سکتا تھا۔ اچانک جہاز نے ایک جھٹکا لیا اور میں نے بادل کے ایک ٹکڑے کو کھڑکی سے اوپر اٹھتا دیکھا۔ مگر بادل نہیں تھا، جہاز ایک دم نیچے چلا گیا تھا۔

دلاور نے گھبرا کے کہا "یہ کیا ہوا؟"

میرے جواب دینے سے پہلے پائلٹ کی آواز سنائی دی "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! میری بات غور سے سنیں۔ جہاز میں کوئی فنی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے انجن اچانک بند ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انہیں فیول نہیں مل رہا ہے۔ خیر میں کوشش کرتا ہوں، آپ لوگ سیفٹی بیلٹ باندھ لیں۔"

جہاز نے پھر زبردست اچھال کے ساتھ جھٹکا لیا۔ میں نے رابعہ اور گل کی چیخ سنی۔ انجن بند ہونے سے جہاز میں ایک بھیانک خاموشی نے تسلط جما لیا تھا "کیا جہاز گر رہا ہے؟" رابعہ نے چیخ کر کہا۔

گل نے بھی چلا کے یہی سوال دہرایا۔ محسن نے بڑے سخت لہجے میں کہا "بے وقوف لڑکی۔ چلانے سے کیا ہوگا۔ سیٹ بیلٹ باندھو۔"

"کیا اس میں پیراشوٹ نہیں ہیں؟" دلاور نے پوچھا۔

"تمہارا مطلب ہے ہم جہاز کے گرنے سے پہلے ہی باہر کود جائیں اور جہاز کے انجن کام کرنے لگیں تو جہاز پھر اڑتا چلا جائے" ہم نیچے سمندر میں جا گریں۔"

لیکن میری بات پوری ہونے کے ساتھ ہی سب کچھ ہو گیا۔ اچانک ایسا لگا جیسے سب کچھ تہ و بالا ہو گیا ہے۔ میں منہ کے بل گرا کیونکہ ابھی تک میں نے بھی سیفٹی بیلٹ نہیں باندھی تھی۔ پائلٹ نے چلا کے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں بہت آگے جھکا ہوا تھا اور میرے کان رابعہ اور گل کی چیخیں سن رہے تھے۔ پھر ایک زبردست دھماکا ہوا اور میں ہوا میں ہاتھ پاؤں چلاتا پانی میں اتر گیا۔ اتنی بلندی سے گرنے کے بعد میں بہت گہرائی تک آ گیا۔ پھر میں نے کوشش کی اور پانی کی سطح تک آنے میں کامیاب ہو گیا۔ شک کی اب کون سی بات رہی تھی۔ جہاز حادثے کا شکار ہو کے بحیرۂ روم میں گر چکا تھا۔

سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے اپنے چاروں طرف جہاز کا ملبہ دکھائی دیا۔ کیا جہاز گرنے سے پہلے ہی فضا میں پھٹ گیا تھا؟ میں نے تیرنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔ دلاور نے اپنی ہار کو بھی اپنی جیت میں بدل دیا۔ آخری بازی اسی کے ہاتھ رہی۔ اپنے ساتھ وہ ہمیں بھی دنیا سے لے گیا۔ خود اس کو کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ مہینے بعد مرے یا دو گھنٹے بعد۔ اس نے اپنے وارثوں کو بھی بچا لیا۔ سب کچھ انہیں مل جائے گا۔ اب ان سے وراثت کی جنگ لڑنے والا ہی کون بچے گا؟

میں نے پانی کی سطح پر پھیلے ہوئے جہاز کے تیرتے ہوئے ٹکڑوں میں رابعہ، گل اور محسن کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ سمندر کا نمکین پانی میری آنکھوں میں جلن پیدا کر رہا تھا۔ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر محسن کا سر نمودار ہوا۔ میں نے اسے چیخ کے اپنی طرف متوجہ کیا "محسن۔۔۔ محسن۔۔۔ ادھر دیکھو میری طرف۔ میرا ہاتھ پکڑ لے۔"

محسن شاید گل کو تلاش کر رہا تھا۔

www.paksociety.com

اس نے کہا "پاگل ہو گیا ہے کیا، ہوش میں آ۔"

میں نے کہا "وہ۔۔ رابعہ۔۔۔ کیا وہ ڈوب گئی؟"

باہر کھڑے ہوئے محسن نے قہقہہ مارا "بھائی وہ اسی دن ڈوب گئی تھی جس دن آپ سے ملی تھی۔"

رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا "کہاں ڈوب رہے تھے تم بھی؟"

میں نے سر جھٹک کے دیکھا۔ وہ سب باہر کھڑے مجھ پر ہنس رہے تھے۔ ان میں گل اور چوہدری دلاور بھی شامل تھے۔ اب تک مجھ پر واضح ہو گیا تھا کہ میں نے خواب دیکھا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔

"یار میں سو گیا تھا" میں نے خفت سے کہا "کمال ہے۔"

"جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے" محسن بولا "کمال کی اس میں کون سی بات ہے۔ آپ کو کھو آنہ سمجھنے والا تک کھوتا ہے۔"

میں نے اپنی صفائی پیش کی "دراصل رات بھر جاگتے رہے۔ تھکن بھی بہت زیادہ تھی۔ ایسے ہی جھپکی سی آ گئی۔"

"اور تم خواب خرگوش۔۔۔ خواب خر میں گم ہو گئے۔ خر خر کرنے لگے۔ خر۔۔۔ خراٹے لینے لگے۔" محسن بولا۔

"خواب میں کیا دیکھا؟" گل نے کہا۔

"میں نے دیکھا۔۔۔ کہ جہاز سمندر میں گر گیا ہے" میں نے کہا۔

"خدا کرے کہ اس کی تعبیر یہ ہو" دلاور بولا۔

گل نے اسے گھور کے دیکھا "اللہ نہ کرے۔ ویسے خواب کی تعبیر الٹی ہوتی ہے۔"

"یعنی سمندر گرے گا جہاز پر۔" محسن بولا "آفرین ہے تم پر بیوی۔ اللہ نے تمہارے اس حسین چہرے اور گیسوئے آبدار کے نیچے والے خانے میں کیا چیز کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔"

گل نے خفگی سے کہا "تم سے زیادہ ہے۔"

"تمہارے پاس بالکل نہیں ہے جناب۔ ایک ٹکا بھی ہمارے حصے کا آپ کو مل گیا اور تمہاری عقل او عمر ڈال دی گئی" اس نے سر کو انگلی سے کھجا کے کہا "خیر آپس کی بات ہے، جو بھی ہے گھر میں ہی ہے نا۔"

رابعہ نے کہا "چلو باقی فضول باتیں بعد میں کرنا۔ ان ٹیکسی ڈرائیوروں کو جانے دو۔ میں دلاور کے ساتھ اندر جا رہی ہوں۔"

محسن بولا "ان کو میں نے کب روک رکھا ہے۔ یہ جانا چاہیں سی آف کر کے جائیں گے۔"

گل نے کہا "کرایہ دو انہیں۔ وہ شرافت سے انتظار کر رہے ہیں۔"

محسن نے جیب سے پیسے نکالے "پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں سمجھا کچھ لحاظ کریں گے مہمانوں کا۔ آخر ہم اتنی دور سے آئے ہیں ہم سے بھی کرایہ لیں گے۔ یہ سودی لگتے ہیں صورت سے ہی۔"

ایک ڈرائیور نے کہا "باجی سے تم بھی سکھ لگتے ہو۔"

محسن بھونچکا رہ گیا۔ رابعہ اور گل کی ہنسی نے اسے مزید شرمندہ کیا۔

"تم۔۔۔ اردو سمجھتے ہو۔ کسی کو مغالطے میں رکھنا اچھی بات نہیں ہے اور انگریز نظر آنا بھی اچھی بات نہیں ہے" محسن نے کہا "باقی تم رکھو۔"

اس نے کہا "باقی بچا ہی کیا ہے۔ انگریز میں اس لیے لگتا ہوں کہ میں یہاں پیدا ہوا تھا اور میرا باپ بھی انگریز تھا۔ تمہارے شکل جیسا لگنے کی کیا وجہ ہے؟"

"تمہاری عقل کی خرابی" محسن نے کہا "نظر کا قصور۔"

اس نے جاتے جاتے کہا "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم امرتسر میں پیدا ہوئے ہو اور تمہارا باپ۔۔۔"

اس نے قہقہہ مارا اور فرار ہو گیا۔ محسن سخت مشتعل ہوا۔ "اگر اس وقت دادا جان کی خاندانی بندوق ہوتی تو میں پیچھے سے اس کو گولی مار دیتا۔"

"تمہارا نشانہ خطا ہو جاتا اور واپس آ کے وہ تمہیں گولی مار دیتا۔" گل نے کہا "تم اتنا کیوں بولتے ہو؟"

محسن اب اس سے لڑنے لگا "تم سے زیادہ تو نہیں بولتا اور یہ تم کیسے کہہ رہی ہو کہ میرا نشانہ چوک جاتا۔"

"تمہارے دادا جان کی خاندانی بندوق کی نال ٹیڑھی ہوگی۔ تمہاری طرح۔" گل نے کہا "ایک اور چیز بھی ہے جو سیدھی نہیں ہو سکتی۔"

"تم مجھے کتے کی دم کہہ رہی ہو؟"

میں نے کہا "تم تو بالکل غالب اور ذوق کے اسٹائل میں لڑنے لگے ہو۔ چلو اندر ہیٹ کپر تماشا دیکھ رہا ہے" میں نے کہا۔

کشادہ اور صاف ستھرے لاؤنج کے ایک حصے میں رابعہ اور دلاور آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دلاور نے اپنا سر صوفے کی پشت سے لگا دیا تھا۔ وہ غالباً بہت تھک گیا تھا۔ رابعہ اسے پُر ترحم نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لاؤنج میں اور لوگ بھی تھے۔ ایک صوفے پر ایک نوجوان جوڑا الگ ہونے پر آمادہ نہ تھا۔

محسن نے کہا "یہ ان کی پہلی ملاقات ہے یا آخری۔"

میں نے کہا "احتیاطاً انہیں الگ کر کے دیکھ لینا چاہیے کہ کہیں اسی حالت میں طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز تو نہیں کر گیا۔"

محسن نے مجھے دوسری طرف متوجہ کیا "کون کہتا ہے مشرق اور مغرب کبھی آپس میں نہیں مل سکتے" کاجل سے زیادہ سیاہ نوجوان کے ساتھ عشق کے جذبات کی وارفتگی کا اظہار کرنے والی لڑکی خالص ولایتی تھی ڈائلم پاؤڈر جیسی سفید رنگت کی مالک تھی۔ ادھر بیٹھے ہوئے باقی سب لوگ ایک دوسرے کی صورت سے بیزار تھے۔ گرد و پیش سے بے نیاز آس پاس موجود ہر شخص سے لاتعلق اور اپنے خیالوں کی دنیا میں یا پھر اخبار میں گم۔ ان میں بیشتر انگریز تھے۔ ان کے مقابلے میں فرنچ زیادہ بننے ٹھننے والے زندہ دل اور باذوق قوم ہے۔

کاؤنٹر کے پیچھے جو طرح دار حسینہ تمام اسباب دلبری و دلربائی کے ساتھ موجود تھی وہ اپنے لباس کے فیشن اور آرائش جمال میں کسی فیشن ماڈل یا فلم ایکٹریس سے کم نہ تھی۔ فرانسیسی حُسن اور ذوقِ حسن سے مالا مال ہیں اور اس عطیۂ قدرت کی قدر بھی کرتے ہیں۔ فیشن، آرٹ، خوشبو اور پھولوں کے رنگ ان کی زندگی کا حصہ ہیں۔

میرے فرنچ پر وہ خوش ہوئی۔ کسی بھی غیر ملکی کو اپنی زبان میں بات کرتا دیکھ کے ہر فرانسیسی ایسے ہی خوش ہوتا ہے جیسے ہم انگریز، جاپانی یا روسی سے اردو میں بات کر کے۔ "میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں موسیو۔"

میں نے کہا "کاش میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا۔ ابھی تو مجھے چارلی سے ملنا ہے۔"

"چارلی۔ صرف چارلی۔۔۔" وہ بولی "ویسے تم میرے لیے کیا کر سکتے تھے؟"

میں نے کہا "کم سے کم مر تو سکتا تھا۔ چارلی پائلٹ ہے۔"

"او۔۔۔ وہ تو چلا گیا" اس نے کہا "آئی ایم سوری۔"

محسن نے چہرے پر سطیب بنائی اور داویلا کیا "افسوس کی بات تو ہے۔ ابھی اس کے جانے کے دن نہیں تھے۔"

وہ ہنس پڑی "میرا مطلب تھا کہ اس ہوٹل سے چلا گیا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" محسن بولا۔

"ایسا ہر روز ہوتا ہے۔ ہوٹل کسی کا گھر نہیں ہوتا جہاں وہ بیٹھ جائے۔"

میں نے کہا "دراصل اس کو ہمارے ساتھ جانا تھا۔"

"کیوں ایک خوب صورت لڑکی کے سامنے جھوٹ بولتے ہو۔ ہمیں اس کے ساتھ جانا تھا" محسن نے کہا۔

وہ مسکرائی "کہیں تم وہی تو نہیں جنہوں نے اس کا جہاز چارٹر کیا تھا؟"

"میں حلفیہ بیان دے سکتا ہوں کہ ہم وہی ہیں" میں نے کہا۔

محسن بولا "اور میں اس پُرکشش خوشبو کی قسم کھا سکتا ہوں جو آپ نے لگائی ہے۔"

تعریف اور خوشامد سے وہ خوش ضرور ہوئی مگر اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی "تمہارے لئے ایک پیغام ہے۔" اس نے پلٹ کے ایک خالی خانے میں سے ہوٹل کے نوٹ پیڈ پر لکھی ہوئی مختصر تحریر برآمد کی۔

اس پر انتہائی بدخط میں لکھا ہوا تھا کہ انتظار کرنے سے بہتر اس نے یہ سمجھا کہ نرس اور ڈاکٹر کا بندوبست کرنے چلا جائے۔ ہم ائیر پورٹ پہنچ جائیں اور اس کا انتظار کریں۔ میں نے وہ چٹ محسن کو دے دی۔

"کوئی بری خبر ہے؟" لڑکی نے میری صورت دیکھ کے کہا۔

"میرے لیے تو ہے" میں نے کہا "ابھی تم سے ملے دیر ہی کتنی ہوئی ہے کہ جدائی کی گھڑی آ گئی۔"

وہ ہنسی "تم پھر مل سکتے ہو مجھ سے۔ اگر اتنا ضروری ہے تو آج شام۔"

میں نے کہا "آج رات بحر اوقیانوس پر سے گزرتے ہوئے میں تم سے خواب میں ضرور مل سکتا ہوں۔"

محسن نے کہا "میں خواب میں بھی تم کو اتنی دور نہیں بلاؤں گا۔ خود تمہارے خواب میں آ جاؤں گا۔"

گل نے ہمارے لوٹتے ہی کہا "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، چارلی چلا گیا" محسن بولا۔

"صرف یہ معلوم کرنے میں اتنا وقت لگتا ہے۔ بہت ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی تھیں۔ کاؤنٹر پر اتنا جھکے ہوئے تھے آگے کی طرف۔۔۔"

"پیچھے کی طرف جھکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا" محسن بولا "اور باتیں اس کی۔۔۔ توبہ۔ مجھ سے تقریباً وہی کہہ رہی تھی جو ایک فلمی ہیروئن نے گا کے کہا ہے۔ نہ جاؤ سیاں چھڑا کے بیاں۔ قسم تمہاری میں رو پڑوں گی۔"

"وہ آپ سے نہیں مجھ سے کہہ رہی تھی" میں نے کہا۔

"خوش فہمی ہے آپ کی۔"

"غلط فہمی ہے تجھے۔ تو شادی شدہ ہے۔ تیرا عاشقانہ کیریئر ختم ہو چکا ہے۔"

"اور تو شادی شدہ نہیں ہے؟ تم نے سنا رابعہ؟"

رابعہ ہنستے لگی "میرا تو خیال ہے کہ تم دونوں آپس میں فیصلہ کر لو۔ ناس کر لو۔"

"اس کیا رابعہ باجی، انہیں شرم آنی چاہیے۔"

محسن نے کہا "تم رفتہ رفتہ روایتی بیوی بنتی جا رہی ہو گل۔ اپنے مولوی خادم حسین کی زوجہ نمبر ایک جیسی۔"

"تم خود مولوی خادم حسین جیسے بنتے جا رہے ہو" گل نے کہا "اس کی بھی رال ٹپکتی رہتی تھی مسرت نذیر اور نیلو کو دیکھ دیکھ کے۔ نقش اور دھیمے بالکل تھا۔"

"یعنی تمہارا کیا مطلب، اب بھی خادم حسین وہی ہے۔ شادی کر کے ارمان اور حسرتیں دل میں رہتی ہیں" محسن نے کہا "اور ہمارے دل کے ارمان کیا ہیں اور حسرتیں کیسی ہیں، اس پر ہم سفر کے دوران تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔"

"بس۔۔۔ فی الحال تو سامان اٹھاؤ اور چلو" میں نے کہا "چارلی ہم سے پہلے ائیر پورٹ چلا گیا۔"

"پھر ہمیں یہاں کیوں بلایا تھا؟"

"بس ذرا اس کاؤنٹر حسینہ کا دیدار تھا مقصد میں" محسن نے پلٹ کے ایک آہ بھری "خیر آج کا دن اچھا گزرے گا۔"

"گزرے گا تو میرے ہی ساتھ نا" گل نے کہا۔

www.paksociety.com

www.paksociety.com

محسن مُردہ لہجے میں بولا "پھر تو بس... گزرے گا جیسے بیتے۔"

دلاور بالکل چپ چاپ بیٹھا تھا اس کی نظریں ہم پر تھیں۔ شاید وہ ہماری باتیں بھی سن رہا تھا کیونکہ کبھی کبھی اس کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی تھی مگر اس کے خیالات بھٹک رہے تھے۔ ہر سانس کے ساتھ قریب تر آتی موت کو اس نے ایک ناگزیر حقیقت سمجھ لیا تھا اور اب شاید وہ کوشش کرتا تھا کہ جتنا وقت باقی ہے وہ اس کے بارے میں نہ سوچے نہ پریشانی اس کے وجود کا درماں تھی اور نہ خوف کے دامن میں اس کے لیے پناہ۔ جب مستقبل اچانک بے رخ ہو جائے اس طرح جیسے رات کے وقت ہر روشنی بجھا کے بند کمرے میں آنکھیں بند کر لینے کے لیے روشنی کا وجود نہیں رہتا۔ تو پھر اپنا ماضی ہی وہ دریچہ رہ جاتا ہے جس سے گزر جانے والے وقت کے ہر لمحے کو تصور میں زندہ کیا جا سکتا ہے یا پھر دوسروں کے لیے آنے والے وقت کے بارے میں سوچتا ہے کہ یوں ہی آباد رہے گی دنیا۔ رابعہ اور سکندر ایک پُرسکون اور خوابوں کو تعبیر دینے والی زندگی کی خوشیوں کے پیچھے بھاگتے رہیں گے۔ رنگین تتلیوں کی طرح اُڑنے والے لمحوں کو پکڑتے رہیں گے اور وقت ان کے لیے ایک ایسا چمن ہو گا جس کی بہاروں کے لیے خزاں نہیں۔ جوانی میں اور کامیابی کی سمت میں سفر کرنے والا تو ایسے ہی سوچتا ہے۔ خود دلاور بھی سوچتا ہو گا سوچنے سے رکھ نہیں ہوتا۔

مجھے بھی اب دلاور کی جسمانی حالت سے زیادہ اس کی ذہنی اذیت پر رحم آنے لگا تھا۔ قضا کے غیر متوقع دشمن کو شکار کرایا ہو تو اس کو دم توڑتے دیکھنے میں طمانیت اور مسرت کا احساس کوئی کیسے پیدا کر سکتا ہے جو فتح کی صورت میں اپنے ہاتھوں سے اس کا کام تمام کر کے ملتا۔ اگر وہ پانی مانگے تو اسے انکار کون کافر کر سکتا ہے۔ یہ کہہ کے کیا وہ تم نہیں تھے جس نے اپنی خون کی پیاس بجھانے کے لیے مجھے خون کے رشتے سے محروم کر دیا تھا۔

دلاور کے لیے اس احساس میں بھی اذیت تھی کہ وہ اپنوں کے نہیں رشتوں کے درمیان اور ان کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ اس سے شرافت کے ساتھ پیش آرہے تھے ابھی سے اس مقولے پر عمل کر رہے تھے کہ مرنے والے کی نیکی بدی اس کے ساتھ گئی۔ دشمن اسے معاف کر کے عالی ظرفی کا ثبوت دے رہا تھا۔ اطمینان حاصل کر رہا تھا اور ثواب کما رہا تھا۔ دشمن اس کی بے چارگی پر ترس کھا رہا تھا۔ اسے احساس دلا رہا تھا کہ کمینہ وہ تھا۔ دشمن تو شاید اس کے جنازے کو کاندھا بھی دے گا۔

میں دلاور کے قریب گیا "کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

وہ تلخی سے مسکرا دیا "طبیعت بہت اچھی ہے اپنے سکندر اعظم صاحب طبیعت کا حال کیا پوچھتے ہو۔"

"چلو پھر اٹھو بابی سب لوگ گاڑی میں بیٹھ رہے ہیں۔ کیا تمہیں سہارے کی ضرورت ہے؟"

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے نفرت کی چمک ابھری۔

وہ کہہ سکتا تھا ضرور کہتا کہ سہارا میں لوں اور وہ بھی تمہارا۔ مگر وقت نہ لائے وہ گروفت آگیا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا "میں خود ہی چل سکتا ہوں۔"

"تمہیں کسی دوا کی ضرورت تو نہیں...؟"

وہ ایک دم بھڑک اٹھا "نہیں ہے مجھے کسی چیز کی ضرورت، موت کے سوا اور وہ تم مجھے نہیں دے سکتے۔ پھر کیوں پریشان ہو تم میرے لیے۔ کیوں اتنا خیال ہے تمہیں میرا۔ اس لیے کہ کہیں میں وقت سے پہلے نہ مر جاؤں۔ فکر مت کرو، مرنا تو ہی اپنے وقت پر ہی ہے اور ابھی وقت ہے میرے پاس۔ میں تمہارے لیے تمہیں کیا اپنے، اپنے بیوی بچوں کے لیے... جیوں گا۔" وہ چلانے سے ہانپنے لگا تھا۔ پھر اس کے جذبات کا ناسور بہنے لگا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔

لاؤنج میں موجود ہر شخص کی نظر بھی اس پر مرتکز ہو گئی تھی۔ اچانک سب ہنسنا، مسکرانا اور باتیں کرنا بھول گئے تھے۔ جہاں ان کے سامنے ایک ان ہی جیسا انسان جس نے زندگی کی نصف صدی پوری کر لی تھی۔ دکھ میں جلتا تھا اور اس کا یہ دکھ اتنا شدید لا علاج تھا کہ وہ رو رہا تھا۔ لوگوں کی نظر میں ہمدردی تھی اور ایک خاموش سوال تھا کیا ہم کچھ کر سکتے ہیں، یہ دکھ بانٹنے کے لیے۔ دکھ کے اس احساس اور اذیت کو کم کرنے کے لیے۔

دلاور نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کے اپنے آنسو صاف کیے "سوری سکندر۔ ایسا تماشا نہیں کرنا چاہیے تھا مجھے یہ پچپن میں بالکل بے اختیار ہو گیا تھا۔"

میں نے سہلایا "تم میری ہمدردی کا غلط مطلب نکال کے شرمندہ ہونا چھوڑ دو۔ وہ وقت گزر گیا جب ہم دشمن تھے۔"

"ہاں... وقت گزر گیا" وہ میرے ساتھ چلنے لگا "اک وقت تھا... مگر سب گزر گیا۔ وقت بڑی بے درد اور بے رحم چیز ہے سکندر، اب پتا چلا۔"

میں نے کہا "تمہیں کچھ دیر سے پتا چلا۔ مجھے اس سے نو عمری میں معلوم ہو گیا تھا۔ اس وقت جب لندن سے واپسی پر میں نے وزیر خان کے بجائے اس کی قبر کے کتبے کو دیکھا تھا۔"

اس کا چہرہ تاریک ہو گیا "تم چاہو تو نام کے بجائے میرے کتبے پر لکھوا سکتے ہو، وزیر خان کا قاتل۔ اگر ایسے تمہیں کچھ تسکین حاصل ہو۔"

اس کی بات کا برا ماننا یا اسے جواب میں زیادہ تلخ بات کہنے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ محسن کی کوشش سے ہوٹل کی ایک بس ہمیں ائرپورٹ تک لے جانے کے لیے فراہم کر دی گئی تھی۔ دلاور اس کی سب سے پچھلی والی لمبی سیٹ پر لیٹ گیا۔ اس نے بونان کے طویل سفر میں صرف ایک بار دوا کھانے کے لیے پانی مانگا جو اسے بس ڈرائیور نے اپنی بوتل سے فراہم کیا۔ یہ پانی وہ دیڈی کی لغز میں ڈالتا تھا۔

رابعہ پہلے گل کے ساتھ بیٹھی تھی۔ پھر محسن نے اس سے کہا

"یہ سیٹ میری ہے۔ بہتر ہے آپ شرافت سے اٹھ جائیں۔"

رابعہ نے کہا "تمہاری کب سے ہو گئی یہ سیٹ؟"

"اس لیے کہ میری بیوی یہاں بیٹھی ہے جو اس کا مگر وہ میرا، جو اس کی سیٹ وہ میری ہے۔"

"اُف یہ حد ہوتی ہے بے شرمی کی محسن۔" رابعہ نے کہا اور وہاں سے اٹھ گئی۔

"بے شرمی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ حد ہوتی ہے شرم کی۔ جیسے لاقانونیت کی حد نہیں ہوتی، قانون کی حد ہوتی ہے۔" محسن بولا "ویسے بھی تم کو اپنے ذاتی میاں کے ساتھ بیٹھنا چاہیے کم سے کم زور کسی پر ہو اکم سے کم اپنے۔"

رابعہ نے مصنوعی غصے سے کہا "تم مار کھاؤ گے۔"

محسن نے شور مچایا "سکندر۔ بار ڈوب مرنے کا مقام ہے تیرے لیے۔ سارے زمانے میں سکندر اعظم بنا پھرتا ہے۔ بیوی سر عام اعلان کر رہی ہے کہ تم مار کھاؤ گے، ایمان سے میری گھر والی ایسا کہتی نا..."

"تو کیا کرتے ہی تم؟" گل نے کہا۔

"میں سر جھکا جاتا" محسن مسکینی سے بولا "کہ مار دیا ہے تم نے پہلے ہی میری زلف نے۔ چلو۔ پھر قتل کر دو مجھے دشمن جگری، خوبصورتی اے لوٹی جان۔ تیری ادائی تم پہ قربان، کوٹ پتلون تم پر قربان۔"

"پاگل ہی پاگل ہو گئے ہو تم" گل نے میری اور رابعہ کی بے اختیار ہنسی پر خفت سے کہا اور اپنا چہرہ ڈھکنے لگی۔

محسن اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد انھوں نے آہستہ آہستہ اپنی باتیں شروع کر دیں اچانک ان کے ہنسنے کی آواز آجاتی تھی۔ پھر میں نے دیکھا تو وہ سو گئے تھے۔ محسن کا سر سیٹ کی پشت سے لگا ہوا تھا اور گل کا سر اس کے کندھے پر آگیا تھا۔

میں نے کہا "تم بھی ایسے ہی سو سکتی ہو۔"

اس نے کہا "تم پھر جہاز گرا دو گے بحر اوقیانوس میں۔ مجھے لاؤ گے۔"

میں نے کہا "میں جاگتا رہوں گا۔"

"سکندر۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس سے؟ مجھ سے؟ بھئی اب تو ہمارے جملہ حقوق تمام عمر کے لیے تمہارے نام محفوظ ہو گئے۔"

"یہ دلاور۔ واقعی مر جائے گا۔"

میں نے کہا "اسے بچا کے پوچھو تو بڑی ذہانت کا سوال ہے۔"

"یہ سب کیسے اچانک اور کتنی آسانی سے ہو گیا۔ کیا یہ نا شخص جس نے ہمارے لیے جینا مشکل کر دیا تھا۔ اس جیسے شکاری کو شکار کرنا کتنا ناممکن لگتا تھا مگر دیکھو وہ کیسے چپ چاپ اور بے بس ہوا پڑا ہے۔"

"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟"

رابعہ نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا "پتا نہیں کیوں مجھے یقین نہیں آتا کہ بالآخر میرے خوابوں کو تعبیر کی منزل ملنے والی ہے۔ اندر سے ایسے فریب پہلے بھی دیے ہیں اور جب میں نے امیدوں کی بنیاد پر آرزوؤں کے محل کھڑے کرنے کا سوچا تو مایوسی اور ناکامی کے طوفان نے سب کچھ بہا دیا۔"

"اب ایسا نہیں ہو گا" میں نے اسے یقین دلایا۔

"ڈر اسی لیے لگتا ہے کہ... کیا اتنی آسانی سے ہماری سب مشکلات، ساری پریشانیاں، سب آزمائش کے مرحلے، یہ سب واقعی ختم ہو جائیں گے؟ اس میں کوئی دھوکا نہیں ہو گا اس بار تقدیر اور کوئی کھیل نہیں کھیلے گی میرے ساتھ۔"

"کیسا کھیل، سانپ سیڑھی کا؟"

"ہاں۔ کئی بار میں بہت اوپر تک چلی گئی۔ جہاں سے مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرے اور تمہارے گھر کی دہلیز تک بس اگلا قدم اور... مگر اچانک ناکامی اور نامرادی کے کسی اژدہے نے میری امیدوں کو نگل لیا اور میں پھر بہت نیچے، اپنے گھر سے بہت دور کسی ویرانے میں پہنچ گئی۔"

میں نے اس کے بالوں کو سہلایا "چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز۔ پھر ہم اپنے گھر میں ہوں گے۔"

معلوم نہیں وہ کون سا ائرپورٹ تھا۔ میں نے جہاز کا پھول اور ہوا رفتہ ڈرائیور کو تھما دیا تھا۔ اس میں غالباً اسی جگہ کی نشاندہی کی گئی تھی جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔ ڈرائیور نے رد دھولی کی چوڑی سڑک والی مگر ٹریب صورت اور آرام دہ بس روکی تو میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔

محسن نے بھی سر اٹھا کے گل کو ہلایا "چلو اٹھو لاہور آگیا۔"

گل نے آنکھیں کھول کے کہا "مجھے... نیند آرہی ہے۔"

محسن نے اسے ڈانٹا "تراجیت میں چار دن کیا رہی ہو تمہارے وجود کا ایک ڈھیلا ڈھالا سا ہے۔ یہ ایک قابلِ اعتراض غلطی سے تمہارا یوں سونا۔"

"مجھے تو بڑا مزہ آرہا تھا..." گل مسکرائی۔

"ہاں۔ تمہارے سر میں جتنی جوئیں تھیں سب مجھ پر چڑھ گئیں اور سر میں تیل کون سا انڈیلا تھا؟ ورجن آئل، سرا خون کر دیا کوٹ کا۔"

گل نے کہا "ذرا بس جا کے میں ناردے سے ہوٹل کرا لے سکیوں گی۔"

"جوئیں مارنے کے لیے؟"

"نہیں، جب تم ایسی باتیں کرو گے ناں تو تمہارا دماغ درست کروں گی" گل نے کہا۔

جہاز کا جوڑ کہیں پتا نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہوٹل کی گاڑی دیکھ کے وہ خود ہی ہمیں ریسیو کرنے آجائے گا۔ اتنے بڑے علاقے میں ہم اسے کہاں تلاش کرتے۔ مگر ڈرائیور نے کوچ کا انجن

www.paksociety.com

پسند نہیں کیا تھا کہ اسے کی چلتا رہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ایک کینسر کے مریض کو لایا ہے۔

میں نے ڈرائیور سے کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ چارلی کہاں ہو گیا۔ تمہیں یقیناً واپسی کی جلدی ہو گی۔"

میری فرنچ نے اس کے دل میں ہمدردی کے جذبات کو دوچند کر دیا "میں انتظار کر سکتا ہوں۔ کسی مریض کو سڑک کے کنارے نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

میں اور محسن آرز کے چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ میری نگاہ نے چارلی کو تلاش کر لیا۔ وہ ٹیکسی اسٹینڈ کے داخلی۔۔۔ راستے پر کھڑا ہوا تھا۔

"تم کہاں سے ٹہلتے ہوئے آ رہے ہو؟" اس نے ناراضگی سے کہا "اور پھر اتنی دیر سے۔۔۔"

میں نے کہا "ہم تو کب سے بس میں بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔"

"کس۔۔۔ کون سی بس؟" وہ بولا۔

"ہوٹل کی بس" میں نے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ تم ٹیکسی سے آؤ گے" وہ ہمارے ساتھ چل پڑا "میں یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ تم کو بس مل جائے گی۔ میں صبح سے کھڑا ہوا تھا۔"

"تم بالکل غلط جگہ کھڑے تھے" محسن نے زبردستی بحث کی "وہ فٹ پاتھ کا کنارہ تھا۔ اگر تمہارا پاؤں سلپ کر جاتا۔ تمہیں چکر آ جاتا تو تم سڑک پر گرتے اور ادھر سے آتی ہماری ٹیکسی تو نقصان کس کا ہوتا۔ ہماری چارٹرڈ فلائٹ کون لے کر جاتا۔ تمہارا باپ۔"

وہ ہنسنے لگا "ہاں۔ وہ مجھ سے کہتا اور کے تم! تمہاری فلائٹ میں لے جاتا ہوں۔ میرے واپس آنے تک مرنا نہیں۔"

چارلی ہم سب کو ایک لاؤنج میں لے گیا۔ اس نے ہم سب کے پاسپورٹ اکٹھے کئے اور ان پر ویزا اسٹامپ لگوانے چلا گیا۔ جیسا کہ اس نے بتایا تھا۔ یہ ایک ویری ڈی آئی پی فلائٹ بن گئی تھی اور مسافروں کی ذمے داری چارلی پر عائد ہو گئی تھی۔ اخلاقاً اور قانوناً بھی۔ مزید یہ کہ اب ہم فرانس سے جا رہے تھے چنانچہ اسٹیمپنگ والوں کے لیے جانچ پڑتال کی رسمی اہمیت بھی نہیں تھی۔ اگر کوئی فرانس میں داخل ہونا چاہے تو اس کی دستاویزات کو قانونی تقاضوں کی روشنی میں دیکھنا لازمی ہوتا ہے۔ پھر سب پاکستانی تھے جو فی الحال سنگاپور جا رہے تھے۔ سنگاپور سے ہم جائیں جہنم میں۔ انہیں کیا۔

چارلی کا باپ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد آیا۔ چارلی کی صورت میں اس کی شباہت تھی مگر والد صاحب کی صحت قابلِ رشک تھی اور زندہ دلی میں وہ چارلی سے زیادہ جوان تھا۔ محسن کے الفاظ میں۔ زیادہ حرامی تھا۔ اس نے سب سے باری باری ہاتھ ملایا اور پھر بغل میں سے شیمپین کی بوتل نکال کے لہرائی "تم سب خوب صورت مسافر میرے مہمان۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ لیکن ہم شراب نہیں پیتے۔"

"پھر کیا بوتل سے دودھ پیتے ہو۔" اس نے ایک گھونٹ لے کر قہقہہ مارا۔

میں نے کہا "ہمارے مذہب میں یہ حرام ہے۔"

"تو مذہب بدل لو۔ جیسے میں بدلتا تھا۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ انڈیا میں تھا تو میں ہندو بن گیا تھا۔ کیا کہتے ہیں اسے پنڈت، سر منڈوا کے ادھر تھوڑے سے بال چھوڑ دیے تھے۔ ایک لنگوٹی پہنی تھا۔ لنگوٹی بڑا زبردست ڈریس ہے۔ بہت ایزی رہتا ہے آدمی۔" اس نے پھر ایک گھونٹ لیا "سیام گیا تو بدھ بھکشو بن گیا۔ جاپانی لڑکیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ خیر یہ بھی اچھی ہیں جن کو تم سنگاپور لے جا رہے ہو۔"

محسن نے کہا "یہ بیویاں ہیں ہماری۔"

اس نے ایک اور گھونٹ لیا "کم آن۔ ڈیڑھ میں کہا جھوٹ۔"

محسن بگڑ کر بولا "جھوٹ بولنے والے پر لعنت۔"

وہ ہمیں حیرانی سے دیکھتا رہا اور پھر ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا "یاد فنی۔"

میں نے کہا "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"ایسے بے وقوف میں نے پہلی دفعہ دیکھے ہیں جو سنگاپور جا رہے ہیں اپنی بیویوں کے ساتھ۔ ہانگ کانگ، بنکاک، یہاں بیوی کے ساتھ جاتے ہیں زن مرید، شریف آدمی۔"

"ہم شریف آدمی ہیں مگر زن مرید ہرگز نہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ شریف آدمی کیوں کہلاتے وہ اگر زن مرید نہ ہو۔ میرا بیٹا چارلی اتنا شریف تو خیر نہیں ہے مگر میرے مقابلے میں۔۔۔ افسوسناک حد تک ایک ہے۔ مجھے شرمندگی ہے بعض اوقات۔۔۔ جب میں اس کی عمر کا تھا۔"

اس سے پہلے کہ وہ اپنی جوانی دیوانی کے عشقی غیر واقعات کا سلسلہ باب شروع کرتا، چارلی لوٹ آیا "ہوٹل مجھے روز نیو ورلڈ میں تمہیں ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔"

اس نے بوتل چارلی کو دے دی اور ہم سے فریاد کی "تم نے دیکھا۔ یہ میرا اپنا بیٹا۔۔۔ حرامی۔۔۔ مجھے بلیک میل کرتا ہے جانتا ہے کہ اب مجھے کوئی ساتھ نہیں رکھتا۔ حالانکہ میں دنیا کا نمبر ون پائلٹ تھا۔ مجھ سے بہ رہا تھا جیٹ۔۔۔ تک سب اڑانے والے۔ سب جانتے ہو تم؟ ایک انجن والا چھوٹا سا جہاز تھا۔ آن ملک بوڑھا اور ناکارہ ہو گیا ہوں سب کے لیے۔"

"تم ناکارہ ہوئے شراب کی وجہ سے ڈیڈ۔"

"بکواس کرتے ہیں سب جو کہتے ہیں میں ناکارہ ہوں۔ مجھے ابھی گیئر تک نہیں رکھنے دیتے۔ کل کے لونڈے جو پتنگ تک اڑانا نہیں جانتے تھے اس وقت جب میں۔۔۔"

www.paksociety.com

"ورکے اور کے' یہ ابھی تمہارے کارناموں میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتے اور ان کی بیویاں تو فرنچ بھی نہیں جانتیں۔"

وہ پھر ہنس پڑا "چارلی۔ یہ اپنی بیویوں کے ساتھ سنگاپور جارہے ہیں' کیا زمانہ آگیا ہے۔"

"ڈیڈ۔ ان کے ساتھ ایک مریض ہے جو مرنے والا ہے' اسے کینسر ہے' یہ اس کو ساتھ لے جارہے ہیں۔" چارلی نے چلا کے کہا۔

وہ ایک دم سیریس ہوگیا "اچھا۔ یہ بات ہے۔ آئی ایم سوری۔ مجھے معلوم نہیں تھا اور انہوں نے بھی نہیں بتایا مجھے۔ کہاں ہے وہ مریض۔ میں اس سے ملوں گا۔ اس سے پوچھوں گا کہ کیا ہم ایک ساتھ جہنم میں جاسکتے ہیں' کینسر مجھے بھی ہے۔"

اس انکشاف نے ہم سب کو سن کردیا۔ چارلی نے تصدیق کرنے کے لیے سر ہلایا "شراب نے کی ہے ساری خرابی۔ جگر خراب ہوا' لیور اور جسم ... کا کیس تھا۔ یہ پرہیز اور احتیاط کرتا تو ٹھیک ہوجاتا۔"

"پرہیز اور احتیاط" اس کے باپ نے حقارت سے کہا "اور اس عمر میں۔ بہت دن جی لیا میں نے۔ اس سے کہیں زیادہ جتنی مجھے توقع تھی۔ ایک پائلٹ کی زندگی اور موت کے درمیان کتنا فرق رہتا ہے۔ ایک معمولی سی غلطی یا فنی خرابی کا جس سے جہاز اس وقت بھی کریش کرسکتا ہے جب آپ کی عمر تو بھی ہو۔ میری عمر کا نصف یا اس سے بھی کم۔ میں بہت خوش قسمت تھا کوئی غلطی نہیں کی میں نے کوئی خرابی نہیں ہوئی کسی جہاز میں۔"

"چنانچہ تم نے خودکشی کرلی" چارلی نے تلخی سے کہا۔

"شٹ اپ۔ میں نے لائف کو انجوائے کیا۔ ڈر ڈر کے اور مر مر کے نہیں جیا میں.... خدا کا شکر ہے کہ جسمانی معذوری سے پہلے مجھے کینسر ہوگیا۔ ورنہ سالوں مفلوج پڑے رہتے ہیں لوگ۔ کبڑے ہوجاتے ہیں' اندھے ہوجاتے ہیں' کیا ہے وہ الیزا ایمر کی بیماری۔ جس میں دماغ بوڑھا ہونے سے پہلے مرجاتا ہے یا جواب دے جاتا ہے۔ خودکشی میں کر نہیں سکتا تھا۔ کینسر سے اچھی کیا بات ہوسکتی ہے' وہ چار ہفتے میں بخشی۔"

میں حیران تھا کہ اس شخص کو کیا سمجھوں۔ دیوانہ یا ہوشیار۔ جینے کے بھی اپنے اپنے انداز ہیں۔ ایک زندگی ولاور نے گزاری۔ ایک چارلی کے باپ نے۔ دونوں کا ایک ہی انجام ہوا لیکن جس رنج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے۔ خوف چوہدری ولاور کے رگ و پے میں' بہوں ہوں میں اور ہر قطرۂ خون میں شامل ہوگیا تھا اور اسے احساس پشیمانی مارے ڈالتا تھا کہ ایک عمر اس نے عبث گنوائی۔ ویسے تو سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے مگر وہ اپنے ساتھ احساس جرم' گناہ کا بار بھی نہیں لے گیا تھا۔ اسے ملال نہ تھا کہ زندگی رائیگاں گئی۔ ولاور نے دولت ضرور کمائی تھی مگر جینے کے بعد جینے کی طمانیت سے وہ محروم رہا۔ یہ خوشی اسے میسر نہ ہوئی کہ زندگی جس مقصد کے لیے ملی تھی وہ بطریق احسن حاصل ہوا اور اس نے دنیاوی ذمے داریوں کی حد تک کامیاب ہونے کا ثبوت دیا اور جب وقت آیا تو نہ ملال تھا نہ پچھتاوا' کہ وہ کہہ سکتا' الحمدللہ' اب دنیا میں میرے کرنے کو کچھ نہ رہا تھا چنانچہ لبیک اللھم لبیک۔ میں حاضر ہوں اے خدا۔

دوسرا چارلی کا باپ تھا جس کے پاس ولاور کی طرح دولت کی کمائی بھی نہ تھی مگر اسے زندگی سے بچھڑنے کا کوئی ملال نہ تھا ورنہ اس زندگی پر پشیمانی تھی جو اس نے دنیا میں گزاری۔ وہ مطمئن اور بے فکر تھا اور خوش تھا کہ اسے خوش قسمتی کے باعث بڑی لمبی عمر ملی جس کا اس نے بھرپور لطف لیا' یہاں تک کہ وہ اپنی موت پر بھی خوش تھا کہ وہ مجبوری اور معذوری کی طویل ذلت آمیز زندگی کے عذاب سے بچ گیا۔ وہ ایسے بات کررہا تھا جیسے لوگ جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جھٹ بیماری پٹ موت۔ کیا بات ہے!

جہاز تک پہنچنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک دھندلا سا خوف اب بھی میرے دل میں چھپ کے بیٹھا ہوا تھا کہ کہیں پھر سے 'اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے' والا معاملہ نہ ہو۔ کیا عجب کہ بھی سر جیمز گورڈن نے لائن تو کلیئر کرادی تھی مگر کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ بیچ کا فون پر دوسری طرف کسی سے مخاطب تھا یا بیوی کی خاطر ہماری مدد کا ڈراما کررہا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ہمیں کوئی حد سے زیادہ فرض شناس پولیس آفیسر مل جاتا جو ہمیں شناخت کرلیتا کہ تم تو لندن پولیس کو مطلوب ہو۔ سر جیمز گورڈن' یہ کون مسخرا ہے؟ اور وہ ہوگا لارڈ لندن میں' مجھے کیا۔ شرافت سے میرے ساتھ آجاؤ۔

جہاز میں روپوش ہوجانے کے بعد میں نے خود کو بے حد ہلکا اور آزاد محسوس کیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے ہماری باعزت اور بامراد واپسی کے امکانات اور اسباب پیدا کیے ورنہ ہم کیا' ہماری کوشش کیا' بساط کیا اور اوقات کیا۔

سوائے ولاور کے سب کا موڈ اچانک بے حد خوشگوار ہوگیا تھا۔ رابعہ اور گل بے اختیار ہنس رہی تھیں اور خوشی سے ان کے چہرے کھل اٹھے تھے۔

"ہم راضی راضی جارہے ہیں اپنے لاہور' اپنے گھر' اپنے پاکستان" گل نے جہاز میں گھومتے ہوئے کہا "مجھے یقین نہیں آتا محسن۔"

"یقین تو مجھے بھی نہیں آیا ابھی تک۔" رابعہ بولی "جہاز اڑ جائے پھر دو نفل پڑھوں گی شکرانے کے۔"

میں نے کہا "اور اگر میرے خواب کی تعبیر سچ ہوئی؟"

"کیوں بُری بات منہ سے نکالتے ہو" رابعہ بولی۔

محسن نے کہا "ہاں۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ شکل خراب ہے بے شک مگر منہ سے بات اچھی کرے۔"

لمبے اوور کوٹ اور فلیٹ ہیٹ والا ایک پادری ٹائپ

شخص جہاز میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک لڑکی تھی جس کے حسن و شباب کی تعریف میں ایک پیراگراف بھی لکھا جاسکتا ہے۔ ایک صفحہ بھی۔ اس کی زلفوں اور پلکوں' لب لعلیں اور عارض کے گلابوں سے سیاہ آنکھوں تک اور بدن کے ہر خوش رنگ خم پر غزل کہی جاتی تو ایک ضخیم دیوان مرتب ہوجاتا چنانچہ میں نے اور محسن نے دم بخود رہ جانا کافی سمجھا۔

میں نے رابعہ کے کہنی مارنے پر کہا "آپ کی تعریف۔"

رابعہ نے مجھے یاد دلایا "یہ اردو نہیں سمجھے گا۔"

گل نے بھی محسن کو کہنی ماری تھی' اس نے چلا کے کہا "تو یہ کیا حرکت ہے؟"

گل نے کہا "ذرا آپے میں رہو۔ کیا سوچے گی وہ۔ ایسے گھور رہے ہو دونوں۔ سراسر بدتمیزی ہے یہ۔"

"غلط۔ وہ خوش ہوگی" محسن بولا "جیسی تم جل کے کوئلہ بن گئی ہو۔"

میں نے کہا "غالباً آپ غلط جہاز پر سوار ہوگئے ہیں' موسیو۔"

"تم فرنچ جانتے ہو" اس نے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا "پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں ڈاکٹر پال ہوں۔ چارلی نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے کسی مریض کے ساتھ سنگاپور تک جانا ہے۔ یہاں تو مجھے کوئی بھی بیمار نہیں لگتا۔"

میں نے اس سے سب کا تعارف کرایا۔ آخر میں ولاور کی باری آئی۔

رابعہ نے کہا "اگر یہ نرس ہے تو ڈاکٹر صاحب کی رنگین مزاجی کی داد دینا پڑے گی۔"

"یہ نرس نہیں ہوسکتی" گل نے کہا "اس لباس میں۔"

محسن نے کہا "کیا ہے اس لباس میں۔ بہت خوبصورت لباس ہے جتنا بھی ہے' کفایت شعاری بھی اچھی عادت ہے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر پال۔ آپ کے ساتھ ایک نرس کو آنا تھا۔"

اس نے کہا "ہاں' یہ ہے نا۔ جینی پال۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "اچھا۔ تو آپ کی بیٹی ہی آپ کی معاون بھی ہیں۔"

اس نے ایک قہقہہ اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ مارا "[illegible]۔ بیوی ہے میری۔ میرے تین بچوں کی ماں۔ اس پر فریفتہ ہونے کی کوشش بالکل مت کرنا۔"

جینی مسکرائی "ہماری شادی کو گیارہ سال ہوگئے۔ پال میرا چوتھا شوہر ہے....."

میری عقل خبط ہوگئی "میرے حساب سے جتنی آپ کی عمر ہے' اس سے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ پہلی شادی آپ نے اسکول جانے کی عمر سے پہلے کی ہوگی۔"

جینی کا خوش ہونا لازمی تھا مگر اس کے شوہر نے بھی اسے خراج تحسین سمجھا "جینی میں اور مجھ میں صرف سات سال کا فرق ہے۔ میں ذرا سے بڑا ہوں' یہ اپنا خیال رکھتی ہے۔ نرسنگ کی ٹریننگ اس نے میرا ساتھ دینے کے لیے حاصل کی۔"

"تم پر نظر رکھنے کے لیے" وہ بولی۔

وہ ہنسا "جینی ٹھیک کہتی ہے۔ میں بہت دل پھینک تھا۔ اب بھی ہوں اور اسی لیے جینی میرے ساتھ جارہی ہے۔"

"اگر جینی نے چار شادیاں کی تھیں تو دل پھینک ہونے کا اعتراف کرنے والے ڈاکٹر پال نے کتنی کی ہوں گی" محسن بولا۔

"کیا پوچھا تمہارے دوست نے؟" ڈاکٹر پال بولا۔

میں نے محسن کا سوال دہرایا' وہ خوب ہنسا "یہ احمقانہ سوال ہے۔ دل پھینک لوگ صرف عشق کرتے ہیں' شادی نہیں۔ جینی البتہ گھر بسانا چاہتی تھی جب اسے صحیح ذوق اور ملا۔"

بالآخر چارلی نے ضابطے کی کارروائی مکمل کی اور جہاز رن وے پر دوڑنے لگا۔ یہ زیادہ بڑا جہاز نہیں تھا۔ اس میں سولہ افراد کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ عقبی حصے میں کچن اور باتھ روم کے علاوہ ایک بیڈ روم بھی تھا جس میں نیچے تین طرف پیچ کا ٹاپ گرا کے آرام دہ بیڈ تھے۔ تین فٹ اونچی دیوار کے ساتھ ساتھ چار بیڈ ایسے تھے جیسے ہماری ریلوے میں اوپر کی برتھ۔ ہر بیڈ ڈھائی فٹ چوڑا تھا۔ اس میں بیک وقت سات افراد سوسکتے تھے۔ ولاور نے نیچے والے ایک بیڈ کو ترجیح دی اور جہاز کے ٹیک آف کرتے ہی سو گیا۔

جینی لباس بدل کے نمودار ہوئی تو ہم اسے پہچان ہی نہ سکے۔ وہ نرس کی یونیفارم میں تھی۔ اس نے اپنے ڈاکٹر شوہر کو ولاور کی کیس ہسٹری بتانے کے لیے ہم سے درخواست کی کہ ہم اسے تمام میڈیکل رپورٹس' نسخے اور فلمیں دے دیں۔ رابعہ نے ولاور کا سوٹ کیس کھول دیا۔ وہ اور ڈاکٹر پال عقبی حصے میں بیٹھ کے ان کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہوگئے۔

"کیا کمال کی عورت ہے" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ جب آئی تھی تو اس کا کمال دیکھ کے تمہاری نگاہیں خیرہ ہوگئی تھیں" گل نے کہا "کمال اس کے جمال کا تھا۔"

"یہ بھی سچ کہا تم نے۔ مگر وہ مجبوری عورت اس وقت صرف ایک نرس ہے۔ کسی کی بیوی تک نہیں۔ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری میں پوری سنجیدگی اور نیک نیتی کے ساتھ منہمک۔ اب اس کی ساری توجہ کا مرکز ہے ان کا مریض۔ کیا ہے ڈسپلن کا کمال۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "ان کی زندگی بالکل الگ ہے۔"

گل نے کہا "اس میں کوئی ڈسپلن نہیں۔ جب چاہا شوہر پکڑ لیا جب چاہا چھوڑ دیا۔"

میں نے کہا "تم اسے اپنے ماحول اور اپنی ذہنی تربیت کے حوالے سے پرکھ رہی ہو۔ یہاں عورت اتنی مجبور اور بے بس نہیں ہے۔ یہ اس کی خود اعتمادی ہے۔"

رابعہ نے کہا "چار شوہر کرنا خود اعتمادی کی دلیل ہے"

www.paksociety.com

میں نے کہا "اس شوہر کے ساتھ وہ گیارہ سال سے ہے۔ اس کے تین بچے ہیں۔ وہ شوہر کی معاون نرس بھی ہے۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟"

"یہی کہ پہلے سوچے سمجھے بغیر شادیاں کرتی رہی۔"

"ہاں۔ فیصلہ غلط ہو جاتا ہے' غلط انتخاب ہو جاتا ہے مگر یہاں ایسی کوئی مجبوری نہیں کہ اب ساری عمر نبھاؤ۔ آخر اب نباہ کر رہی ہے وہ" میں نے کہا۔

محسن نے کہا "اور جو پہلے تین شادیاں ناکام ہو گئیں۔ اس کا ذمے دار صرف اسے ٹھہرانا بھی غلط ہو گا۔ جب تک کہ حقائق کا علم نہ ہو۔ کیا پتہ کیا حالات تھے' قصور وار کون تھا؟"

گل نے کہا "اتنے طرف دار بن رہے ہو اس کے' بلا کے پوچھ لو۔ پتا چل جائے گا۔"

رابعہ نے کہا "چھوڑو ہمیں کیا' وہ بُرا مانے گی۔"

"وہ بالکل بُرا نہیں مانے گی" محسن بولا۔ اس نے جین سے کہا کہ جب وہ فارغ ہو تو ان کے پاس آ جائے۔

"میں اتنی مصروف بھی نہیں ہوں ابھی" وہ فوراً آ گئی۔ "ابھی تو ڈاکٹر میس کو اسٹڈی کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "ہماری بیویاں بہت افسوس میں مبتلا ہیں کہ تمہیں ایک صحیح آدمی سے شادی کرنے کے لیے تین غلط شوہر بھی بھگتنے پڑے۔"

وہ ہنسی "اس میں افسوس کی کون سی بات ہے" وہ بولی "دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔ پہلی شادی کو میں شادی شمار نہیں کرتی۔ جب میں اسکول کے آخری سال میں تھی تو ایک لڑکے کے لیے اتنی جذباتی ہو گئی تھی کہ اس سے فوراً شادی پر راضی ہو گئی۔ جیسے یہ لڑکا ہاتھ سے نکل گیا تو دوسرا کہاں ملے گا۔ ساری عمر انتظار کرتے گزر جائے گی۔ قانونی طور پر بھی وہ شادی نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے اس کی رجسٹریشن نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک دن ہم ایسے ہی چرچ میں گئے اور ہم نے آلٹر کے سامنے جا کے کہا کہ خداوند یسوع مسیح آج سے ہم میاں بیوی ہیں اور تم کو گواہ بناتے ہیں۔ چھ مہینے بعد ہماری لڑائی ہو گئی۔"

میں اس کی بات کا ساتھ ساتھ ترجمہ کرتا جا رہا تھا۔

"دوسری شادی ضرور چل جاتی لیکن میری بدقسمتی کہ وہ جبری بھرتی کے قانون سے مجبور ہو کے ویت نام گیا اور لوٹ کے نہیں آیا۔ یہ شادی صرف چھ ماہ باقی رہی۔"

"کیا وہ لاپتا ہو گیا تھا۔۔۔ یا وہیں کسی سے شادی کر لی تھی اس نے؟"

"نہیں' وہ مارا گیا تھا۔ مجھے بعد میں اس کے ایک ساتھی نے بتایا کہ ہم خندق میں بیٹھے موم بتی جلائے تاش کھیل رہے تھے کہ ہمارے درمیان ایک دستی بم آ گرا۔ ویت نامی ایسی ہی گوریلا وار کے ماہر تھے۔ کھلی جگہ ہوتی تو ہم منہ کے بل لیٹ جاتے یا کچھ دور بھاگ جاتے۔ وہاں موقع ہی نہیں ملا۔ تین کے وہیں پرخچے اُڑ گئے۔ چوتھا میں تھا۔ میری صرف ایک ٹانگ گئی۔ میرا بچ جانا معجزہ تھا۔ خدا کے معجزے کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اس نے میرے شوہر کو کیوں نہیں بچایا آخر۔ اس کی جان نہ لیتا ٹانگ لے لیتا تو کیا تھا۔ وہ آرٹسٹ تھا۔ جنگ سے نفرت کرتا تھا۔ اسے امن سے محبت تھی۔ اتنی ہی جتنی رنگوں سے' وہ انکار کرتا محاذ پر جانے سے تو اسے جیل جانا پڑتا۔ وہ واپس آ جاتا تو ہم بہت خوش رہتے۔ میں نے اس کی موت کے بعد اس کی تصاویر کی ایک نمائش کی تھی۔ وہ بہت کامیاب رہی۔ اس کی سب تصاویر سے مجھے اتنی قیمت مل گئی کہ میں نے ایک اپارٹمنٹ خرید لیا۔ آج کل اسی میں رہتی ہوں میں۔ اس کی چار تصویریں ہیں میرے پاس۔ ایک تصویر میری پورٹریٹ ہے۔ دوسری اس نے خود اپنی بنائی تھی۔"

میں نے کہا "کیا تمہارا شوہر امریکن تھا؟"

"ہاں۔ شادی کے بعد میں بھی لاس اینجلس چلی گئی تھی۔" وہ بولی "جب مجھے اس کے سارے واجبات وغیرہ مل گئے تو میں یہاں لوٹ آئی۔ ایک سال بعد میں نے تیسری شادی کی جو ایک سال چلی۔ پھر اچانک اسے ایک مالدار بیوہ سے بڑا جان لیوا عشق ہو گیا۔ اس پر لالچ غالب آ گیا۔ وہ بہت بڑے مینشن میں رہتی تھی' اس کے پاس ایک سے ایک شاندار گاڑی تھی اور وہ حسین بھی تھی لیکن اصل بات یہ ہے کہ میرا وہ شوہر بہت ہینڈسم تھا۔ عورتیں اس پر مرتی تھیں۔ مجھے اس کو بچا کے رکھنا پڑتا تھا۔ مگر اس بیوہ کے معاملے میں اس نے خود ہی ایک غیر جذباتی سا فیصلہ کیا اور مجھے چھوڑ دیا۔ اس کی مرضی' میرے پاس تو آج بھی وہی اپارٹمنٹ ہے' میرے ساتھ اسے بھی کام کرنا پڑتا تھا تب کہیں گزارا ہوتا تھا۔ اب وہ عیش کر رہا ہے۔ خیر جو بھی ہوا اچھا ہی ہوا کیونکہ اس صدمے سے میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ میرا اعتبار ہی اُٹھ گیا تھا مردوں پر سے اور ان کی محبت سے۔ اس زمانے میں میرا علاج پال نے کیا اور میرا دل جیت لیا۔ اس نے مجھ میں پھر جینے کی امنگ پیدا کی اور میرا اعتماد بھی بحال کر دیا۔ اب گیارہ سال بعد ہم حقیقی معنوں میں ایک دوسرے کے رفیق حیات ہیں۔ گھر میں ہی نہیں' باہر بھی ہم ایک دوسرے کی ہر ذمے داری کو شیئر کرتے ہیں' میں نے نرسنگ سیکھ لی ہے۔ اس نے کہا۔"

رابعہ اس کی باتوں سے متاثر ہوئی "بڑی باہمت عورت ہے۔"

گل نے بھی تسلیم کیا "اچھی نظر تو نہیں آئی تھی مگر اچھی ہے۔"

"یہی تو ساری خرابی ہے کہ ہم ظاہر سے باطن پر فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ ابھی جو لباس اس نے پہن رکھا تھا وہ ان کی معاشرت میں معیوب نہیں سمجھا جاتا اور یہ اس کا نجی معاملہ سمجھا جاتا ہے وہ کیا پہنتی ہے کیا کرتی ہے اور کیا نہیں کرتی' دوسرے لوگ اس

بلاوجہ صحیح کی بحث میں پڑتے ہی نہیں۔ فرد مکمل طور پر آزاد ہے جب تک اس کی آزادی سے دوسرے کسی فرد کی آزادی یا جذبات متاثر نہیں ہوتے۔ اب یہاں وہ عورتیں بہت ہوں گی جو مکمل لباس پہنتی ہیں مگر وہ جین اور اس جیسی تمام لڑکیوں کے نامکمل لباس کو غیر شریفانہ نہیں سمجھیں گی۔ اپنی اپنی پسند ہے اور اس کا نام فیشن ہے۔" میں نے کہا۔

گل بولی۔ "پھر بھی تین بچوں کی ماں کو ایسے پھرنا زیب دیتا ہے؟"

"یہی تو فرق ہے سوچ کا۔ چلو یہاں کی بات چھوڑو۔ اپنے پاکستان اور بھارت جیسے ملکوں میں کیا ہوتا ہے۔ ایک الٹرا ماڈرن طبقہ ہے۔ [illegible] جس ہمارے نزدیک معیوب ہے کیونکہ ہم انہیں [illegible] اخلاقی اقدار سے پرکھتے ہیں۔ دوسرے ہم ماڈرن قسم [illegible] وہ ہمیں نچلے طبقے والے اچھا نہیں سمجھتے جس کی عورتیں برقع اوڑھے بغیر باہر نہیں آتیں۔"

محسن بولا "یہ الگ بات ہے کہ وہ سبزی والے سے یا بس کنڈیکٹر سے یا روٹی خریدنے والے سے چوڑیاں چڑھواتی ہیں۔ گلی محلوں میں جہاں سب مرد دیکھتے ہیں۔ انہیں مردوں کے ہاتھوں سے چوڑیاں پہننے یا میوہ کاندار سے سودا سلف خریدتے ہوئے پردے کا خیال تک نہیں آتا۔ تم یہاں آ کے رہنے لگو تو ایسی ہی ہو جاؤ گی۔ بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے رہو گی جب آزادی ملے گی۔"

"اب میں کس کی غلام ہوں؟" گل نے کہا۔

"تمہارے پاس اختیار ہی کیا ہے۔ اس عورت کے پاس اختیار ہے۔ ہمارے معاشرے میں تو مردوں نے عورتوں کے وہ حقوق تک غصب کر رکھے ہیں جو ان کو اسلام نے شرعی طور پر دے رکھے ہیں۔"

"تم جیسے مردوں نے؟" رابعہ بولی۔

"ہاں۔ اس معاشرے کا ایک مرد ہونے کی حیثیت سے میں یہ الزام قبول کرتا ہوں اور گل کو اجازت دیتا ہوں تمہیں گواہ بناتے ہوئے کہ وہ چاہے تو جین سے اس کا لباس مستعار لے کر یا خرید کر پہن لے۔"

گل کا چہرہ لال پڑ گیا "خدا نہ کرے۔ اسے مبارک ہو یہ بے حیائی۔"

محسن بولا "بے حیائی کیسی' تم وہی گل رہو گی۔ میرے جذبات بھی وہی رہیں گے تمہارے لیے۔ لباس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لباس تو پیکنگ ہے' بنڈل ہے۔ عورتیں شریف اور باکردار اس وقت بھی ہوتی تھیں جب چشم فلک ان کی جھلک نہیں دیکھ سکتا تھا اور آج بھی ہیں جب وہ فلک کی بلندی پر تنہا جہاز اُڑاتی پھرتی ہیں۔ [illegible] پاکستان میں۔ لباس اور پیشے کا کردار سے کوئی تعلق نہیں۔ [illegible] جتنی زیادہ باضمیر اور باکردار ہو سکتی ہے ایک

ایم اے' پی ایچ ڈی پروفیسر یا ڈاکٹر کے مقابلے میں۔"

"اب نیند نہیں آ رہی ہے تمہیں۔ ٹیکسی میں بیٹھ کے میرا جہاز بحرالکاہل میں ڈوب رہے تھے" رابعہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"یہ تمہیں سوچنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہے۔ یہ تمہاری ناتفاقی کے سبب ہے" محسن بولا۔

"کیوں۔۔۔ ہم نے منع کیا ہے سونے سے؟"

"تمہیں احساس نہیں ہے کہ تمہارے شوہران نامدار نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ تم تو ان کا دماغ کھا رہی ہو۔ بھوکے آدمی کو نیند آ سکتی ہے؟"

میں نے کہا "اس فلائٹ پر کوئی ائیرہوسٹس تو ہے نہیں۔ اب تم ہی ہمت کر دکھاؤ۔ ویسے اللہ نے تمہیں ہر صلاحیت سے نوازا ہے۔ تم جیسی حسین ائیرہوسٹس دنیا کی کسی ائیرلائن کو نصیب نہیں ہو سکتی۔"

"آ گئے فوراً خوشامد پہ۔" رابعہ بولی۔

میں نے کہا "محسن کے یاد دلانے پر مجھے شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ ہم کتنے بھوکے ہیں۔ ابھی تک کامیابی کی خوشی میں سب بھولے ہوئے تھے۔"

"ہم تو اپنے ساتھ کھانے پینے کے لیے کچھ بھی نہیں لائے تھے" گل نے کہا۔

"ٹرین کے سفر میں آدمی بندوبست کرتا ہے۔ ہم نے تو فرض کر لیا تھا کہ ائیرلائن ہی سب کچھ فراہم کرے گی" رابعہ بولی۔

"یہ کمرشل ائیرلائن نہیں ہے" محسن بولا "پرائیویٹ جہاز ہے۔"

"کرایہ تو کمرشل ائیرلائن سے بھی زیادہ لیا ہے" رابعہ نے کہا "چار چھ مسافروں کے لیے سہولت کوئی نہیں۔ ہم کیا گھر سے کھانا پکا کے لاتے اور چائے تھرماس میں بھر کے۔"

"تم جا کے بات تو کرو اس چارلی چیپلن سے" گل نے کہا "سب بھوکے بیٹھے ہیں۔ پندرہ ہزار پاؤنڈ میں سے سو پاؤنڈ خرچ کر دیتا ہم پر کیا دیوالیہ نکل جاتا اس کا۔"

میں نے کہا "لیڈیز۔ میں آپ کی ناراضگی کے جذبات سے ائیرلائن کے کیپٹن چیئرمین مالک مسٹر چارلی چیپلن کو آگاہ کرتا ہوں' مگر حاصل کچھ نہیں ہو گا۔"

"یہ فاقہ تو سنگاپور تک چلے گا" محسن بولا۔

"کیوں' راستے میں فرینکفرٹ' روم اور استنبول سے لے کر کولمبو تک نہ جانے کتنے ائیرپورٹ آئیں گے" رابعہ نے کہا "یہ کون سی نان اسٹاپ فلائٹ ہے۔ کم سے کم دو بار تو اسے فیول لینا پڑے گا۔"

"اور میں۔ تین چار گھنٹے بعد روم میں ناشتا' کیا بات ہے تمہاری بھی رابعہ' تم نے فاقہ کشی کے غم سے مرنے والوں کو بچا لیا" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

"پھر بھی تم چارلی سے بات کرو" گل نے اصرار کیا۔
میں اور محسن کریو کیبن میں گئے تو باپ بیٹا ایک دوسرے کو فحش لطائف سنا رہے تھے اور زور زور سے ہنستے ہوئے ایک دوسرے کو بے تکلفی سے حرامی بھی کہہ رہے تھے۔ ان کے نزدیک یہ گالی نہیں ایک اچھے لطیفے پر تعریف کے مترادف تھا۔ ہماری بات سن کے چارلی نے ایک اور قہقہہ مارا۔
"وہ قاتل نرس کہاں ہے جو تمہارے شوہر پر اپنے حسن کی چھری چلا رہی ہے" چارلی بولا۔
"اگر میں زندہ رہتا تو نچھاور ہونے کا اعزاز حاصل کرتا۔"
میں نے کہا "وہ ہوگی مریض کے پاس ڈاکٹر کے ساتھ۔"
"تم نے کچن دیکھا ہے؟" چارلی بولا۔
"ہاں۔ کچن تو دیکھا ہے کیا وہاں کچھ ہے؟"
"وہاں سب کچھ ہے" چارلی نے بتایا "اور یہ حسینہ صرف نرس ہی نہیں اس سفر میں پارٹ ٹائم ائیر ہوسٹس بھی ہے۔ اس کام کا معاوضہ اسے الگ دیا جائے گا۔ تم اس سے کچھ بھی مانگ سکتے ہو۔"
"اس کے خوب صورت دل کے سوا" والد صاحب نے قہقہہ لگایا "یہ غلطی کی تو ڈاکٹر تمہیں سائنائیڈ کا انجکشن لگا دے گا۔"
میں نے اور محسن نے باہر آکے دیکھا تو ڈاکٹر اکیلا چوہدری دلاور سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی بیوی نرس کی یونیفارم پر ایپرن باندھ کے کچن میں مصروف تھی۔ دروازہ کھولتے ہی آملیٹ کی اشتہا انگیز خوشبو نے میرے حواس پر حملہ کیا۔
"تم واقعی ناشتا لا رہی ہو؟" محسن نے کہا۔
"ہاں۔ تم دس منٹ انتظار کرو۔ دراصل اس مریض کو پہلے اٹینڈ کرنا ضروری تھا ورنہ اتنی دیر نہ ہوتی" وہ بولی۔
اس کے بعد صورت حال یکسر بدل گئی۔ گل اور رابعہ نے جیمن کے ساتھ مل کے تمام معاملات کو ایسے سنبھال لیا جیسے وہ جہاز میں نہیں اپنے گھر میں ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم رابعہ اور گل کو ان کی حرام خوری سے بیٹھ کر حکم چلانے اور اینٹھنے پر شرمندہ کرتے انہیں خود اکیلی جیمن کو سارے کام خندہ پیشانی سے کرتا دیکھ کے شرم آئی اور یگانگت کی فضا پیدا ہوئی تو پھر بقول علامہ صاحب بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے۔ جیمن کے خلاف خواتین کے حاسدانہ جذبات یوں بدلے کہ ان کے بس میں نہ تھا ورنہ وہ دوپٹہ بدل بہنیں بن جاتیں۔ جیمن دوپٹہ اوڑھتی ہی نہیں تھی۔
ناشتا ختم ہوا تو خمار گندم نے سب کو مدہوش کر دیا۔ ہم بیڈ روم میں جاکے پڑ گئے اور ایسے سوئے کہ شام کی خبر لی۔ جیمن جیسی فرض شناس نرس کی اور اس کے ڈاکٹر شوہر کی موجودگی نے ہمیں تمام تفکرات سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ہمیں یہ خبر بھی نہ ہوئی کہ جہاز کہاں کتنی دیر کے لیے رکا تھا۔ لندن سے سنگاپور تک ایک طویل ۔۔۔ کسی چھوٹے جہاز کے لیے بہت لمبی پرواز تھی۔ پھر ایک فرق ٹائم زون کا بھی تھا۔ چنانچہ یوں لگتا تھا جیسے یہ پرواز کبھی ختم نہیں ہوگی۔

جہاز انتہائی آرام دہ تھا۔ اس کی ائیرکنڈیشننگ اچھی تھی اور یہ پوری طرح PRESSURISED بھی تھا۔ ہمارے لیے غسل کا اور سونے کا انتظام بھی بہترین ہی سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ عام مسافر بردار طیاروں میں ہم زیادہ سے زیادہ پاؤں لمبے کرکے اور سیٹ پیچھے کرکے نیم دراز ہو سکتے تھے۔ یہاں ہم پاؤں پسار کے سوتے تھے اور ہمیں اندر گھومنے پھرنے کی آزادی اور پرائیویسی حاصل تھی۔ اس کے باوجود فضا میں معلق رہتے ہوئے پرواز کرنا ایک اعصاب شکن تجربہ تھا۔ باہر دیکھنے کو کچھ بھی نہیں تھا سوائے سمندر کے یا آسمان کی سپاٹ ویرانی کے۔ رات کو ہم نے بہت زیادہ سیاہ آسمان پر بہت زیادہ روشن ستاروں کا منظر دیکھا۔ غروب آفتاب کا منظر ہم پہلے ہی ملاحظہ کر چکے تھے۔ سورج نے ڈوبنے میں بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ طلوع ہوتے وقت اس نے اتنی ہی سستی دکھائی اور جیسے بادل ناخواستہ اوپر اٹھا۔ بمبئی اور کچھ دیر بعد کولمبو میں ہمیں باہر آنے کا موقع ملا تو سب ایسے خوش ہوئے جیسے زنداں سے رہائی ملی ہو۔ ہم باہر نہیں جا سکتے تھے مگر ائیرپورٹ کی حدود میں بھی بہت کچھ تھا۔ ہم نے کافی اور اسنیکس ضرور تناول کیے۔ رابعہ اور گل نے ڈیوٹی فری شاپ سے شوقیہ خریداری کی۔ پرفیوم، نقلی جیولری، مختلف آئٹم، ڈیکوریشن پیس۔

محسن نے ہر چیز پر اعتراض کیا "یہاں سے خریدنے کا فائدہ۔ یہ تو لاہور میں بھی ملتی ہے اب اسے اٹھائے پھرو گی۔"
گل نے تنگ آکے کہا "نہیں۔ میں جہاز سے نیچے گرا دوں گی جو بھی قصبہ یا شہر نظر آیا۔"

"کسی کے سر پر گری کوئی چیز تو یہ صورت بالائی اثر ہوگا" محسن بولا "لوگ محسن بڑے دکھ سے بتائیں گے کہ چاچا بھنڈی لینے گئے تھے اوپر سے ولایتی پرفیوم کی بوتل ماری کسی نے سر پہ۔ افسوس تو یہ ہے کہ بوتل بھی ٹوٹ گئی۔"
"نقلی جیولری ملی کسی کو والے کو تو بھینس کے گلے میں ڈال دے گا" میں نے کہا۔

"اس میں کوئی حرج نہیں۔ اللہ میاں کی گائے پہنے یا بھینس" محسن بولا۔

"آخر کیا کریں ہم اگر شاپنگ بھی نہ کریں" رابعہ نے کہا۔
"بھئی وہی کرو جو ہم کر رہے ہیں" میں نے کہا۔
"تم تو نظر بازی کر رہے ہو لفنگوں کی طرح۔"
محسن ہنسا "سب ذوق جمال کی بات ہے۔ اللہ نے کسی کو اچھی صورت دی ہو تو اسے دیکھ کے خالق کی تعریف نہ کرنا گناہ ہے۔"
میں نے کہا "یار یہ کون ہے 'حسینہ لاثانی یا زینت امان۔'"

"وہ جو ہمیں پرترغیب اشارے کر رہی ہے" محسن بولا "دراصل اسے معلوم نہیں کہ ہم نکاح شدہ خصم کے غلام ہیں۔ بے بس قیدی ہیں۔"
رابعہ ہنسی "دونوں کو چشمے کی ضرورت ہے۔ وہ تو چارلی ہے۔ واپس چلنے کے لیے ہاتھ ہلا کے بلا رہا ہے۔"
دلاور کی طرف سے اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ نہ فرار ہو سکتا تھا اور نہ ہمیں کوئی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت سوتے یا پھر خاموشی سے روتے گزرتا تھا۔ ڈاکٹر کی ساری توجہ اس پر تھی اور جیمن اس کے آرام کا پورا خیال رکھتی تھی۔ کئی بار میں اور محسن اس کے پاس جاکر بیٹھے اور اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس پر ڈپریشن طاری تھا۔ وہ بات کرنے کے موڈ میں ہی نہیں تھا۔ وہ لیٹے لیٹے تھک جاتا تھا تو ٹہلنے کے لیے باہر نکل آتا تھا یا کسی سیٹ پر بیٹھ کے کھڑکی سے باہر کا سپاٹ منظر دیکھتا رہتا تھا۔ بالآخر ہم نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔
جہاز اب سنگاپور کے بیچ پر ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے پرائیویٹ رن وے پر اترا تو مجھے ایسا لگا جیسے ساری کائنات تھم گئی ہو۔ فضا کا ارتعاش رک گیا۔ میرے پیروں کے نیچے زمین ساکت ہو گئی۔ اس کے باوجود باہر اتر کے مجھے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے میں اب بھی جہاز میں محو پرواز ہوں۔ بوئنگ جیسے بڑے جہاز میں یہ احساس نہیں ہوتا مگر چھوٹے جہاز میں انجن کی آواز اور اس کا ارتعاش کانوں کو اور اعصاب کو قدرے متاثر کرتا ہے۔
پہلے چارلی نے ہم سب سے مصافحہ کیا پھر اس کے باپ نے کہا "ہماری ذمے داری ختم ہوئی۔"
پھر یہی بات ڈاکٹر پال نے اور اس کی بیوی جیمن نے کہی "تمہارا مزاج اچھا رہا۔ اپنے مریض کی طرف سے غافل مت ہونا۔ وہ دراصل چند دن کا مہمان ہے۔"
"چند دن۔ تمہارے خیال میں کتنے دن؟" میں نے کہا۔
"زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ۔ کوئی کچھ نہیں بتا سکتا پورے یقین کے ساتھ۔ ابھی وہ ٹھیک ٹھاک ہے اچانک COLLAPSE کر جائے اور پھر ہوش میں ہی نہ آئے۔"
"ایسا کوئی طریقہ۔۔۔ یا علاج نہیں جس سے وہ کم سے کم چند دن ملنا لیے ہی گزارے" میں نے کہا۔
اس نے نفی میں سر ہلایا "اس معاملے میں میڈیکل سائنس ابھی تک بے بس ہے۔"
"پھر تو ہمیں یہاں ایک دن بھی قیام نہیں کرنا چاہیے" محسن بولا۔

"ہم ابھی دو دن ریسٹ کریں گے۔ ڈاکٹر پال اور جیمن ہمارے ساتھ ہی واپس جائیں گے" چارلی نے کہا۔
"تم اسی ہوٹل میں رہو گے؟"

"ظاہر ہے جب ان کا ائیرفیلڈ استعمال کیا ہے تو کہیں اور قیام کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہوگا کہ ہم کار پارکنگ ایک ریسٹورنٹ میں کریں اور کھانے کے لیے دوسرے میں چلے جائیں" وہ بولا۔
"تم کسی طرح آج کی فلائٹ پر ہمارے لیے بکنگ کرا سکتے ہو؟ تمہارے تعلقات ہوں گے" میں نے کہا۔
"یہ تعلقات کی بات نہیں۔ ٹریول ایجنٹ کو بلاؤ" وہ خود کرے گا تمہارا کام احسان مند ہو کے اسے کمیشن کس بات کا ملتا ہے اور میری مانو تو آج رات تم بھی رک جاؤ یہاں۔ اتنا لمبا سفر کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ کل کے لیے تمہیں بکنگ آسانی سے مل جائے گی۔"
ہوٹل کے ایک کمرے میں تین افراد نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم دو ڈبل روم کے ساتھ تیسرا سنگل روم لینے پر مجبور تھے۔ محسن اور گل ایک میں ہوتے یا رابعہ اور گل ساتھ رہنا پسند کرتیں، بہرصورت میں تیسرا سنگل روم لینا لازمی تھا۔ ہم نے وضاحت کی کہ چوہدری دلاور کی بیماری کی نوعیت سنگین ہے اور یہ ضروری ہے کہ کوئی اس کے ساتھ رہے مگر انہوں نے معذرت کر لی۔ بالآخر طے یہ ہوا کہ رات کو میں اور محسن باری باری جاگ کے چوہدری دلاور کا خیال رکھیں گے اور جسے سونا ہوگا وہ تیسرے سنگل روم کا استعمال کرے گا۔
سنگاپور خوب صورت اور قابل دید بارونق شہر تھا جہاں دنیا بھر کے سیاح بکھرے پڑے تھے مگر ان میں ہم شامل نہیں تھے۔ ہمارا ایک رات کا قیام مجبوری تھا اگر یہ ہمارے بس کی بات ہوتی تو ہم اسی جہاز کو سیدھا لاہور لے جاتے۔ مجھے دلاور کی طرف سے دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ کہیں اسے اچانک کچھ نہ ہو جائے۔ اس کے دماغ میں چھپ کر بیٹھا ہوا عفریت خاموشی سے اپنے ہلاکت خیز پنجے ہر طرف پھیلا رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے رات کے اندھیرے میں دشمن کے کمانڈوز مختلف سمتوں میں پھیل کے اپنی اپنی تخریبی کارروائی میں مصروف ہوں۔ تم ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کرو۔ تم ٹی وی اسٹیشن پر۔ تم ائیرپورٹ اور تم پاور ہاؤس پر۔ تم انٹر نیشنل ٹیلی فون ایکسچینج پر، اور اس وقت جب لوگ محو خواب ہوں یہ آپریشن مکمل ہو جائے کسی کو سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ ملے اور کام تمام۔ اس کینسر کے خلیے بھی دماغ کے مختلف حصوں پر حملہ کرنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔ ایک حصہ بصارت کا مرکز تھا۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی تھی اس کا مطلب سیاق و سباق سے سمجھانے والا کمپیوٹر۔ سماعت کا حصہ تھا جہاں ہر آواز کا ریکارڈ تھا۔ کان جو کچھ سنتے تھے کمپیوٹر فوراً اطلاع دیتا تھا کہ یہ تو فلاں کی آواز ہے۔ یہ فون کی گھنٹی ہے۔ یہ ٹیلی فون بیل۔ یہ گرج بادل کی ہے، کار برسٹ ہوا ہے یا کار کا بیک فائر ہے۔ تیسرے حصے میں پورے جسم کی حرکات و سکنات کو کنٹرول کرنے والا نظام تھا۔ چوتھا سب سے اہم سینٹرل ریکارڈ تھا جہاں وہ سب کچھ محفوظ تھا جو عمر کے کسی بھی حصے میں سنا

www.paksociety.com

دیکھا یا بڑھا گیا تھا۔ کیا جانے اندر کینسر کے خلئے اچانک کس حصے کو ناکارہ کردیں۔

ابھی رلاور کا کم سے کم مزید ایک ہفتہ ہوش و حواس میں رہنا ضروری تھا۔ قانونی سزا کا تصور اب بے معنی اور بے مقصد ہو چکا تھا۔ اب تو یہ اس کے اور ہمارے مشترکہ مفاد میں تھا کہ وہ مرنے سے پہلے صلح کے معاہدے پر دستخط کر جائے۔ نہ گنواؤ بلاک نہ ہم کٹے۔ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو کہ یہ جنگ ختم ہوئی۔ اس میں نہ کوئی ہارا نہ کوئی جیتا اور یہی جنگ کا دستور ہے۔ بالآخر ایک دوسرے کے علاقے پر قابض فوجیں لوٹ کے اپنی اپنی سرحد پر آجاتی ہیں۔ پلس رن مائنس رن بھی صفر۔ حتمی درجہ رو بھی صفر۔ رلاور کو اپنے بیوی بچوں کا تحفظ عزیز تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان میں ہم سے مقابلہ کرنے کی وہ صلاحیت ہی نہیں جو اس کی طاقت تھی۔ ایک نوجوان لڑکا اور اس کی ماں کیسے ایم ڈرالیں کو چیلنج کرسکتے تھے۔ جو رلاور کا ساتھ دینے والے تھے رکھو... ونیا سے اٹھ گئے تھے کچھ ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ ذی سوز انواب خسرو جمشید۔ اسلم چودھری اور ڈاکٹر ستار اور دان گینگ جیسے دو مجرم اور اسمگلر شیخ، زر خرید غلام اور پالتو شکاری کتے جن کی مدد سے رلاور نے اپنی بدمعاشی کی سلطنت میں اپنے نام کا سکہ چلا رکھا تھا۔ وہ سلطنت ختم ہوئی۔ اب اسے خدا یاد آیا جب موت کے فرشتے نے اچانک دروازے پر یوں دستک دی جیسے مسلسل فرار ہونے والے مجرم کو آدھی رات کے وقت پولیس چھاپا مار کے گرفتار کرنے آجاتی ہے۔ اس وقت جب وہ خود کو محفوظ تصور کرتے ہوئے کسی خفیہ ٹھکانے پر بیوی بچوں کے ساتھ سو رہا ہو۔ وہ اور کیا کرسکتا ہے ہاتھ اٹھانے کے سوا۔ دیکھو مجھے مار دو۔ نہ چکاؤ میں مجرم ہوں اور تمہیں پورا اختیار ہے۔ یہاں جو کچھ ہے سب لے لو لیکن میرے بیوی بچوں کو چھوڑ دو۔"

اب ہم خود بھی کسی حد تک رلاور کے محتاج تھے۔ اس کے اعتراف جرم کی تحریر ہمیں قانونی مسائل سے بچا سکتی تھی اور اپنی زندگی میں اسے اختیار تھا کہ وہ ہمیں جو چاہے دے جائے۔ بعد میں اس کے وارثوں سے اپنا حق وصول کرنا ایک طویل قانونی جنگ تھی جس میں بالآخر ہم جیت جاتے مگر دیوانی عدالتوں میں انتظار دیوانگی کو دعوت دیتا ہے۔ معاملات اس کے بغیر ہی طے ہو جائیں تو وکیلوں کے اور عدالتی اخراجات سے زیادہ قیمتی زندگی کا وقت بچ جاتا ہے۔

رات کو چودھری رلاور کی حالت کھانے کے بعد خاصی بہتر تھی۔ اس نے اچانک مطالبہ کردیا کہ وہ اپنے بیوی بچوں سے بات کرے گا۔

"کل ہم لاہور پہنچ جائیں گے" میں نے کہا۔

"مجھے کل کا بھروسا نہیں" وہ بولا "میرا ایک ہفتے سے ان کے ساتھ رابطہ نہیں ہوا۔ وہ پریشان ہوں گے۔"

"ایک دن اور پریشان ہونے دو" میں نے کہا۔

"نہیں، مجھے بات کرنی ہے ان سے۔"

"ایسی کون سی ضروری بات ہے آخر؟" محسن بولا۔

"ضروری میرے لیے ہے۔ تم مجھے روک نہیں سکتے۔ میں خود آپریٹر سے کہہ سکتا ہوں۔ وہ کال ملا دے گا" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اسے دھکیل کر بیڈ پر گرا دیا۔ "ہماری مرضی کے بغیر۔"

"میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔" وہ چیخ کے بولا "میں تم سے تعاون کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ ہمارے درمیان معاہدہ ہو گیا ہے اب تم میرے ساتھ یہ سلوک نہیں کرسکتے۔ اگر میں نے ہنگامہ کردیا تو ابھی پولیس آجائے گی۔ میرے ساتھ تم بھی پکڑے جاؤ گے میں جہاز میں بھی تمہاری ایسی تیسی کرسکتا ہوں۔ ائیرپورٹ پر پہنچ کے بھی۔"

میں اسے سکون سے دیکھتا رہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارے ساتھ وہ سلوک کریں جس کے تم مستحق تھے تم پر اعتبار کرنے کا رسک نہ لیں۔"

محسن نے کہا "الو کا پٹھا۔ حرام زادہ ہمیں دھمکی دے رہا ہے کہ ہماری ایسی کی تیسی کردے گا۔ اچھا ہوتا اگر ہم اسے تابوت میں لانے اور تابوت سیدھا لاہور پہنچ جاتا۔"

"اب ایسا ہی کرنا پڑے گا" میں نے سوچتے ہوئے کہا "تمہاری آواز پھر بلند ہوئی رلاور تو میں تمہیں ناک آؤٹ کردوں گا۔ جیسے پہلے کرتا تھا۔ تم بیمار ہو، مجھے اپنے ساتھ اس زیادتی پر مجبور نہ کرو۔"

رلاور کا رد عمل اشتعال انگیز کا بلبلہ ثابت ہوا۔ دراصل اس کے دماغ میں فرسٹریشن ایسے بھر گئی تھی جیسے پھوڑے میں فاسد مادہ بھر جاتا ہے۔ پھوڑا پھٹ جائے تو زخم باقی رہتا ہے مگر درد کو قرار آجاتا ہے۔ اس کے جذبات کا لاوا اچانک بہہ کے ختم ہو گیا تھا اور اب وہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

محسن نے کہا "یہ نہیں سمجھے گا سکندر۔ پھر کبھی ایسی حرکت کرے گا۔ اسے میں انجکشن لگا دیتا ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں..." رلاور کانپنے لگا "خدا کے لیے معاف کردو۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ مجھے ہوش میں رہنے دو۔ موت سے پہلے ہوش کا وقفہ کم مت کرو۔ مجھے بہت کچھ سوچنا ہے۔ بہت کچھ کرنا ہے۔ مجھے انجکشن مت دو۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں تمہارے سامنے۔ تمہارے پاؤں پکڑ سکتا ہوں۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کے محسن سے بات کرتے کرتے اچانک میرے قدموں پر گر کے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ رابعہ اور گل پر اس کا شدید جذباتی ردعمل ہوا تھا۔ وہ گم صم اور غم زدہ بیٹھی تھیں۔ خود میں سخت مشکل میں پڑ گیا تھا۔

میں نے اسے اٹھایا "رلاور۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ اٹھو مجھے گنہگار مت کرو۔"

وہ روتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا "مجھے... اُن سے بات کرنی ہے۔"

رابعہ نے کہا "اچھا کرلینا۔ دیکھو تمہاری کیا حالت ہو رہی ہے۔"

گل نے اسے پانی دیا "جو پانی پی لو۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔"

اس نے پانی کا ایک گھونٹ پی کے آستین سے آنسو صاف کیے "رابعہ بہن۔ تم سفارش کرو۔ اس قابل تو نہیں میں کہ تم کو بہن کہوں مگر بڑے بھائی بھی تو ہوتے ہیں بہنوں کے۔ مجھ سے غلطی ہوئی میں پتا نہیں کیا کہہ گیا۔"

رابعہ کا جذباتی ردعمل فطری تھا "چلو کوئی بات نہیں رلاور۔ تم صبح بات کرلینا۔"

"صبح نہیں ابھی... صبح تک... نہ جانے کیا ہو جائے" وہ بولا "نہ جانے کیوں... مجھے ایسا لگتا ہے کہ... میں صبح تک زندہ نہیں رہوں گا۔"

میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔"

رابعہ نے میری طرف دیکھا "سکندر کیا حرج ہے اگر یہ ابھی بات کرلے۔"

محسن نے جھنجلا کے کہا "بس تم ہو گئیں جذباتی۔ سکندر کیسے ٹال سکتا ہے۔ تمہاری سفارش کو۔"

اب گل نے کہا "محسن اتنے سنگدل مت بنو۔"

محسن نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "جیسے کہ نہ سکندر ہے۔ اب تاز سکندر اعظم صاحب۔"

میں نے کہا "تم دوسرے کمرے سے ٹیلی فون ریسیور نکال لاؤ۔"

"تار کاٹ کے" محسن بولا "ہوٹل کے ایکسچینج کو پتا نہ چل جائے۔"

"نہیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ ہماری کوئی کال تو نہیں گئی کہیں سے بھی اس فون کو یہاں لا کے جوڑ دو۔ ایکسٹینشن پر ہم دونوں طرف کی گفتگو مانیٹر کریں گے۔ ہر بات سنیں گے تمہیں منظور ہے رلاور؟"

"نامنظور کہہ سکتا ہوں میں؟" وہ بولا۔

جب محسن دوسرا ٹیلی فون سیٹ جوڑ رہا تھا تو میں نے رلاور سے اس کے گھر کا نمبر لیا "اب یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ رابعہ تمہاری بہن ہے اور نہ اس جذباتی حربے سے تم کو سفارش کا فائدہ حاصل ہوا ہے۔ ہم نے محض انسانی ہمدردی کی بنا پر تمہاری معافی قبول کرتے ہوئے اور تمہارے وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے یہ اجازت دی ہے۔ تم ان سے ایسی کوئی بھی بات نہیں کہو گے جس سے ہماری پوزیشن خراب ہونے کا ڈر ہو۔ تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم کہاں سے بول رہے ہو نہ شہر کا نام نہ ہوٹل کا۔"

"یہ تو پاکستان میں ٹیلی فون آپریٹر ان کو بتا دے گا کہ آپ کی کال ہے سنگاپور سے۔"

"تم یہ بتا دینا کہ میں لندن سے ایک دن کے لیے آیا تھا اور ابھی کچھ دیر بعد واپسی کی فلائٹ ہے" میں نے کہا "اگر انہیں کسی طرح بھی شک ہوا تو وہ کال ٹریس کرلیں گے۔ یہ معلوم کرلیں گے کہ تم نے اس ہوٹل سے کال کیا تھا۔"

"میں شک پیدا نہیں ہونے دوں گا۔ انہیں تو ابھی تک... میری بیماری کی نوعیت کا بھی صحیح علم نہیں... میں نے یہ کہا تھا کہ ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔"

"تم ان سے کہو گے کہ سب ٹھیک ہے۔ وہ فکر نہ کریں۔ ورنہ وہ کتنے پریشان ہوں گے۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو" میں نے کہا "تم اپنے جذبات پر قابو رکھو گے۔"

میں نے آپریٹر کو نمبر دیا اور ہم سب کال ملنے کی گھنٹی کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ ایک بوجھل خاموشی فضا پر محیط رہی۔ اعصابی کشیدگی کے آثار گل اور رابعہ کی صورت سے عیاں تھے۔ رلاور صوفے کے بازو کو مضبوطی سے پکڑے خلا میں گھورتا رہا۔

جب گھنٹی بجی تو ریسیور پہلے میں نے اٹھایا اور پھر رلاور کو اشارہ کیا کہ وہ دوسرا ریسیور اٹھالے۔ چند سیکنڈ بعد آپریٹر نے کہا "پلیز ہولڈ کریں۔" اس کے ساتھ ہی کہیں فون کی گھنٹی بجنے لگی پھر کسی نے کہا "ہیلو۔"

رلاور نے کہا "بیٹا میں بول رہا ہوں۔"

اس کے بیٹے نے چلا کے کہا "پاپا کہاں ہیں آپ... امی... پاپا کا فون ہے۔ جلدی آئیں پاپا! کیا حال ہے آپ کا؟"

"میں ٹھیک ہوں بیٹا۔"

"ایک ہفتے سے آپ نے کال نہیں کیا۔ ہم اتنے پریشان تھے۔ آپ کا کوئی فون نمبر بھی نہیں تھا۔" اس کا بیٹا اب باپ پر غصہ ہو رہا تھا۔

"آئی ایم سوری بیٹا! کچھ مجبوری تھی... میں اسپتال میں تھا۔"

"تو کیا اسپتال میں فون نہیں تھا؟ یا فون کرنے پر پابندی تھی۔ کیا ہو گیا تھا آپ کو آخر... اسپتال میں کیوں داخل تھے آپ؟"

"آہستہ بیٹا آہستہ۔ ایک ساتھ اتنے سوال؟"

"یہ بہت غلط بات ہے پاپا! آپ فون کردیتے تو ہم آجاتے۔"

"اب میں آ رہا ہوں۔ کل یا پرسوں تک... پھر سب بتاؤں گا۔ تمہاری ماں کہاں ہے فون اسے دو۔"

"وہ سب سن رہی ہیں۔ اسپیکر پر ہیں بات کریں۔"

اس کی بیوی نے روتے ہوئے کہا "کیا بات ہے یہ کس بات کی سزا دے رہے ہو ہمیں؟"

"صفیہ کیسی ہو؟ اور تم رو کیوں رہی ہو آخر...؟"

"آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے۔ آپ نے کبھی مجھے دل کی بات نہیں بتائی۔ اور کے معاملات میں بھی آپ کے لیے کیا نہیں

www.paksociety.com

کیا میں نے مگر آپ نے..."

دلاور نے کہا "چھوڑو یہ سب باتیں۔ اب گلے شکوے کرنے کا وقت نہیں رہا۔ میں مانتا ہوں کہ میں اتنا اچھا شوہر ثابت نہیں ہوا... جتنی اچھی بیوی تم تھیں۔" دلاور جذباتی ہونے لگا تھا۔

"ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا" آپ نے گھر کی خبر نہیں لی... میں کیا بتاؤں کہ پریشانی سے میرا کیا حال رہا۔ رات کو نیند نہیں آتی تھی... آتی تھی تو برے برے خواب آتے تھے۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"ہاں بھئی، مجھے کیا ہوا ہے؟"

"نہیں۔ میرا دل کہتا ہے کوئی بات ہے۔ میرا دل غلط نہیں کہتا۔"

"پاگل ہے تو بھی اور تیرا دل بھی۔ کل پرسوں تک میں آجاؤں گا تو خود ہی دیکھ لینا۔"

"اچھا اس وقت آپ کہاں ہیں، اپنا فون نمبر تو بتادیں۔ میں صبح پھر کال کروں گی۔"

دلاور نے کہا "ایک دن کے لیے سنگاپور آیا تھا میں۔ ایک گھنٹے بعد واپس لندن جا رہا ہوں۔ وہاں پہنچنے کے بعد فون کروں گا... ٹھیک۔"

"وہیں ٹھہریں گے نا آپ، ویسٹ اینڈ ہوٹل میں، جہاں ہمیشہ ٹھہرتے ہیں۔ فلائٹ کب پہنچے گی؟"

"میں نے کہا نا کہ میں پہنچتے ہی فون کروں گا اور دو دن بعد تو میں ویسے بھی آرہا ہوں۔"

"دیکھیں جی، آپ نے ہمیشہ اپنی کی، میری کبھی نہیں مانی۔"

دلاور ہنسنے لگا "یہ تو سب بیویاں کہتی ہیں۔"

میں نے اور محسن نے تائید میں سرہلا کے گل اور رابعہ کی طرف دیکھا۔

"خدا کے لیے اب سارے چکر چھوڑ دیں۔ اس کمینے سکندر کی خاطر آپ نے اپنی اور ہماری زندگی عذاب میں ڈالی۔ کیا مانگتا ہے وہ آخر۔ جو ہمارے پاس ہے سب لے لے بس ہماری جان چھوڑ دے۔"

اس نے کہا "ہو جائے گا، یہ بھی ہو جائے گا۔"

"آپ دیکھتے نہیں، بیٹا آپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ ایک ہی بیٹا ہے ہمارا تو۔ کس راستے پر ڈال دیا ہے آپ نے اسے... دو بیٹیاں بیٹھی ہیں گھر میں۔ انہیں کیا گھر میں بٹھائے رکھو گے۔ باپ بیٹے کی ایسی شہرت ہوگی اور یہ نیک نامی ہوگی تو کون آئے گا اس گھر میں ان کے رشتے مانگنے۔ کوئی شریف آدمی تو آنے کا نہیں۔ کیا وہ بھی ایسے ہی کسی گھر میں جائیں گی۔ میری طرح زندگی گزاریں گی... رو رو کے... مر مر کے۔"

"رو مت بے وقوف۔ مجھے بھی معلوم ہے سب۔ میرا اور سکندر کا معاملہ طے ہو گیا ہے۔"

"بیچ کہہ رہے ہو؟"

"ہاں۔ میرے لاہور آنے کے بعد انشاء اللہ سارے مسئلے ختم ہو جائیں گے... جو میرے دم سے تھے۔ تم سے بات کرکے تسلی ہو گئی۔ لڑکیاں کہاں ہیں...؟"

"پڑھ رہی ہیں اپنے کمرے میں... بلاؤں؟"

"نہیں رہنے دے... اچھا بائے۔"

یہ بڑا عبرت آموز انقلاب تھا۔ دلاور وہ بھلے والا دلاور نہیں رہا تھا۔ اس کی ساری رعونت ایسے ختم ہو گئی تھی جیسے چولہے میں بھڑکتی آگ اچانک پانی ڈالنے سے ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ وہ جو اپنے آپ کو ناقابل تسخیر سمجھتا تھا، موت کی دستک سنتے ہی گھٹنوں کے بل گر گیا تھا۔ اس کی ساری بدمعاشی اور اکڑفوں غائب ہو گئی تھی۔ وہ ایک عام آدمی رہ گیا تھا جو شوہر ہوتا ہے اور باپ ہوتا ہے۔ جسے فکر ہوتی ہے کہ بیٹا غلط راہ پر چل رہا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا۔ جسے جوان بیٹیوں کو دیکھ دیکھ کے ان کا گھر آباد ہونے کا خیال آتا ہے۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اب دلاور نے ذہنی طور پر اپنی شکست کو پوری طرح تسلیم کرلیا تھا۔ انگریزی میں کہتے ہیں۔

DEATH IS THE LEVELLER

موت سب کو برابر کر دیتی ہے۔ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ زیر زمین سب ایک ہیں۔ امیر غریب، بدمعاش اور نیکوکار، گورا، کالا۔ سب رزق خاک ہیں۔ اربوں سال سے انسان، حیوان اور نباتات اسی مٹی سے پیدا ہو کے اسی میں مل رہے ہیں مگر مٹی وہی ہے۔ اتنی ہی ہے۔ ہوا بھی اور پانی بھی اتنے ہی ہیں۔ کھربوں انسانوں، جانوروں، حشرات الارض۔ درختوں اور پودوں کے استعمال کے باوجود۔ سمندروں سے اٹھنے والے بخارات بادل بن کے برس رہے ہیں۔ پہاڑوں پر برف پگھل رہی ہے اور پھر جم رہی ہے۔ دریا بہہ رہے ہیں۔ زمین پانی پی رہی ہے، پانی سیکڑوں فٹ گہرے کنوئیں کی تہ تک اتر جاتا ہے۔ ندی نالوں میں بہتا ہے۔ شبنم بن جاتا ہے تو برگ گل پر چمکتا ہے اور آنکھ سے بہتا ہے تو خون جگر لگتا ہے مگر پانی وہی ہے اور اتنا ہی ہے جتنا روز ازل تھا۔ سائنس کہتی ہے مادہ کم نہیں ہوتا۔ مادہ پیدا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بس یہ ہے سوچ۔ مگر یہ آیا کہاں سے اور کیسے؟

بالآخر دلاور نے بھی فون رکھ دیا۔ میں اپنے خیالات میں گم تھا۔ میں نے نہیں سنا کہ اس نے اپنی بیٹیوں سے کیا بات کی۔ محسن نے بھی صرف دلاور کی باتیں سنی ہوں گی۔ میاں بیوی یا باپ بیٹا اور بھائی بہن کی گفتگو بہت پرائیویٹ ہوتی ہے۔ اسے چوری چھپے سننا ایک غیر اخلاقی فعل ہے۔ ہمارے بس میں ہوتا تو شاید ہم کرنے سے بھی نکل جاتے مگر اس مرحلے پر جب سارے کام ہماری مرضی کے مطابق ہو رہے تھے اور صورت حال پوری طرح ہمارے کنٹرول میں تھی، میں کسی کوتاہی کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

دلاور بہت پرسکون تھا اور اپنا سر صوفے کی پشت سے لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اسے شاید احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کے اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ اس کی شیو مسلسل بڑھنے سے داڑھی نظر آنے لگی تھی اور یہ داڑھی تقریباً سفید تھی۔ سر کے بالوں میں وہ... کلر لگاتا ہوگا۔ اب ایک سب بیماری کا تھا۔ وہ اپنی عمر سے بہت زیادہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ مذاق کی بات سچ ہے کہ دل جوان ہو تو بڑھاپا کیسا۔ آدمی کا حوصلہ اور عزم جوان ہو تو جسم بھی جوان رہتا ہے۔

میں نے کہا "بہتر ہے کہ اب تم سو جاؤ دلاور۔"

وہ چونکا "آں... ہاں... ٹھیک ہے سکندر۔ میرے دل کو اس وقت اتنا سکون ملا ہے... کہ لگتا ہے میں ٹھیک ہو رہا ہوں۔" وہ ہنسا "اس وقت میں نے تم سے بہانہ نہیں کیا تھا۔ جھوٹ نہیں بولا تھا... مجھے واقعی وہم ہو گیا تھا کہ یہ... میری زندگی کی آخری رات ہے... دماغ خراب ہو گیا ہے میرا۔ ساری خرابی ہی دماغ کی تھی۔ پہلے بھی... اور اب تو ثابت ہو گیا ہے۔"

اس نے خود ہی دوا لی اور سو گیا۔ اب وہ اکیلا سنگل روم میں تھا۔ رابعہ اور گل کو بھی ہم نے زبردستی سونے کے لیے بھیج دیا ورنہ وہ رونے کے اور باتیں کرنے کے موڈ میں تھیں۔

میں نے کہا "محسن۔ کیا دلاور کے کمرے کو باہر سے لاک کردیں؟"

اس نے سوچ کے "چھوڑو یار، اب کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو سو رہا ہے۔ ہم بھی سکون سے سو سکیں گے۔"

مگر اپنے کمرے میں آ کے ہم باتیں کرنے لگے کیونکہ سکون سے سونا فوری طور پر ممکن نہیں تھا۔ یہ گزرے ہوئے وقت کی باتیں تھیں اور اس وقت کی باتیں تھیں جو آنے والا تھا۔ جو آنے گا اور ایسے گزر جائے گا کہ کل کی بات مہینوں پرانی ہو جائے گی۔ پھر سالوں پرانی۔ ہم نے ان سب کو یاد کیا جو آج ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ دوسری دنیا میں دلاور کے منتظر تھے۔ یہ ناموں کی ایک طویل فہرست تھی۔ آشنا صورتوں چہروں کے نقوش سے سجی ہوئی پوری گیلری تھی۔ اس میں وزیر خان کے علاوہ بھی بہت سی تصویریں اب تصور کا حصہ تھیں۔ محسن کے والد شیروانی صاحب، اس کی ماں، ایس ایس پی انکل رضوی۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد تھا اور فوزیہ... ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات، یاد نہ تم کو آسکے۔ تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے۔ اس کو مجھ سے گلہ تھا، یاروں کا یار استاد شیدی، جمال ہم تینوں دشمن اور گروہ میں تو بدمعاش تھا، تم نے عزت اور محبت دی تو دیکھ لو کیا ہو گیا اور شملہ کی... وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اس کا حال بتائیں کیا۔

رات کے دو بجے ہم نے کافی طلب کی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ہم سنگاپور کی روشنیوں میں جوان رات کا نظارہ کرتے اور جیسے کالج میں رابعہ اور گل کو بتائے بغیر غائب ہو گئے تھے ایسے ہی صبح تک رونق میلہ دیکھتے مگر دل میں جوش اور امنگ کی جگہ ڈر اور اضطراب تھا۔ دکھ تھا اس لاحاصل جدوجہد کا جس میں ہم نے بھی بہت کچھ گنوایا تھا۔ اضطراب تھا آنے والے وقت کی بے یقینی کا۔

ہم صبح سوئے ہی تھے کہ جگا دیے گئے۔ دستک سن کے میں نے گھڑی دیکھی تو آٹھ بجے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا تو رابعہ اور گل اندر آگئیں۔

"صبح صبح کسی شریف آدمی کی نیند خراب کرنا سخت بدتمیزی ہے" میں نے منہ پھاڑ کے کہا۔

رابعہ نے کہا "اس میں دو باتیں غلط ہیں۔ صبح صبح اور شریف آدمی۔"

"چنانچہ ہم نے بالکل ٹھیک کیا" گل نے محسن کا کمبل کھینچ لیا۔

محسن نے آنکھیں کھولیں اور جمائی لے کر بولا "تم... تمہیں ہی دیکھ رہا تھا میں خواب میں۔"

"جھوٹ۔ اٹھتے ہی جھوٹ... آنکھ کھولتے ہی جھوٹ" گل نے تکیہ اس کے سر پر مارتے ہوئے کہا "اٹھو نہیں تو فریج سے نکال کے پانی کی بوتل سر پر انڈیلتی ہوں۔"

"توبہ توبہ۔ کیسی بھیانک بلائیں چمٹ گئی ہیں ہم مسکینوں کی جان کو" محسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں بھیانک بلا ہوں...؟"

"ہاں تم بھی اور یہ... تمہاری رابعہ باجی بھی۔ سکندر سامنے نہیں کہہ سکتا تو کیا ہوا۔ اللہ کا قہر ہو دونوں۔"

میں نے کہا "ایک شعر بھی سن لو۔ قہر ہو یا بلا ہو جو بھی ہو۔ کاش کہ تم مرے لیے ہوتے۔"

رابعہ نے کہا "اب بھی کاش کی بات ہے؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "نہیں۔ اب تو نصیب کی بات ہے۔"

میں نے چابی لگا کے تالا کھولا تو دلاور بیڈ پر نہیں تھا۔ وہ صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے مجھے شکایتی نظروں سے دیکھا مگر شکایت نہیں کی کہ ہم نے اسے مقفل کیوں کر دیا تھا۔ اس نے ہمارے سلوک کو نوشتہ تقدیر کی طرح قبول کرلیا تھا۔

میں نے کہا "تم خواہ مخواہ ڈر رہے تھے۔ دیکھ لو تم اتنے ہی زندہ ہو جتنا میں۔"

وہ تلخی سے مسکرا دیا "واقعی؟ کیا میں اتنا ہی زندہ ہوں۔"

اس کی بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اسے ناشتے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا۔ ہوٹل کے اندر ہی ایک درجن سے زائد ٹریول ایجنٹ موجود تھے۔ ان میں سے ایک مسلمان تھا اور اس نے مذہب کی بنیاد پر میرے جذبات سے کھیلنے اور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی لیکن میں اس کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے ایک غیر مسلم سے "تھائی ائر" کی بکنگ لے لی۔ یہ دن

کا نہیں دنیا کا معاملہ تھا اور کاروباری معاملات میں نیک نامی کی بنیاد ایمانداری پر رہتی ہے۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ اس حقیقت کو معاشی مسابقت کے اس دور میں بھی مسلمان پوری طرح تسلیم نہیں کر رہے تھے۔

کسی دشواری کے بغیر ہمیں ہوٹل کی پک اینڈ ڈراپ سروس نے مقررہ وقت سے پہلے ائرپورٹ پہنچا دیا۔ ٹریول ایجنسی کی نمائندگی ایک خوش اخلاق اور خوب صورت لڑکی کر رہی تھی۔ اس نے بورڈنگ کارڈز حاصل کرنے تک ہر مرحلے پر ہمارے لیے آسانی پیدا کی اور پھر خدا حافظ کہہ کے رخصت ہوگئی۔ یہ ہمارا تھائی ائر سے سفر کا پہلا تجربہ تھا جو انتہائی خوش گوار بھی رہا اور افسوس ناک بھی۔ افسوس ناک اس لیے کہ ہم اس سفر کا موازنہ اپنی قومی ائرلائن کے جہاز، عملے اور ان کی سروس کے معیار سے کرتے رہے۔ ہر شخص کی ایک قومی انا ہوتی ہے۔ وہ اپنی قوم اور اپنے ملک کو کسی طرح بھی کمتر سمجھنا نہیں چاہتا۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے میری خواہش ہوتی تھی کہ جہاں کہیں یہ نام آئے مجھے ندامت کے بجائے فخر محسوس ہو۔ ایسے ہی جہاز ہمارے پاس بھی تھے۔ ہمارے وسائل کم نہ تھے اور دعووں کی حد تک معیار بھی بلند تھے مگر حقیقت اس کے برعکس یہ تھی کہ ہم نیت کے خلوص سے محروم تھے۔ نتیجہ یہ کہ خود اہل وطن قومی ائرلائن سے شاکی تھے جہاں کوئی نیک نیتی سے کوشش ہی نہیں کرتا تھا کہ پی آئی اے کا نام دنیا میں پاکستان کا نام روشن کرے۔ ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا اور کیا نہیں ہو سکتا۔

کراچی تک کے سفر میں عملے نے دلاور کا خاص خیال رکھا۔ انہوں نے ہم سے پوچھا کہ کیا آپ میں سے کوئی ڈاکٹر بھی ہے اور ہمارے انکار پر ایک اعلان نشر کیا گیا کہ مسافروں میں کوئی ڈاکٹر ہو تو بتا دیں۔ ممکن ہے اس کی خدمات کی ضرورت پڑے۔ اعلان کا مثبت نتیجہ برآمد ہوا۔ برمودا شارٹ جو نیکر اور پتلون کے درمیان کی چیز ہوتی ہے اور افریقی شوخ پرنٹس والی شرٹ میں بھوری داڑھی والے ایک شخص نے تسلیم کیا کہ وہ ڈاکٹر ہے حالانکہ حلیہ دیکھ کے اسے ڈاکٹر تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ صورت سے بھی ہونق لگتا تھا اور اس کے ساتھ جو خاتون تھیں انہیں دیکھ کے مجھے ڈاکٹر پال اور جھن کی جوڑی یاد آئی۔ دراصل وہ دونوں ہی ڈاکٹر تھے اور گھومنے پھرنے نکلے تھے چنانچہ اپنے اپنے من پسند حلیے میں تھے۔ سیر سپاٹے میں کپڑوں کا کیا ہے۔ جو جی چاہا پہن لیا۔ جو ملا کھا لیا، یہی سیاحت کی اسپرٹ ہے۔ نہ ہم کسی کو دیکھ رہے ہیں اور کوئی ہمیں دیکھتا ہے تو ہم اسے بھی نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ہم دنیا دیکھ رہے ہیں۔ وہ کام کرتے ہیں تو کام کے سوا سب بھول جاتے ہیں مگر آرام اور تفریح کی ضرورت اور اہمیت کو نظرانداز نہیں کرتے چنانچہ ہفتے میں دو دن اور دو چار سال میں ایک دو مہینے کے لیے گھر سے نکل جانا اور معمولات سے بھاگ کے بے فکری سے گھومنا انہیں

ذہنی و جسمانی طور پر صحت مند رکھتا ہے۔

ہم سے یہ بھی معلوم کیا گیا تھا کہ دلاور کے لیے کوئی خاص خوراک تو درکار نہیں ہوگی مگر ہم نے کہا کہ پرہیز کوئی نہیں۔ ڈاکٹر نے کئی بار دلاور کو چیک کیا مگر یہ عام قسم کا معائنہ تھا۔ نبض کی رفتار، بلڈ پریشر، دل کی دھڑکن وغیرہ۔ اس نے صاف کہا کہ مرض کی نوعیت کے پیش نظر وہ علاج میں دخل اندازی نہیں کر سکتا اور دلاور کو وہی دوا جاری رکھنی چاہیے جو وہ کھا رہا ہے۔ رپورٹیں بھی اس نے صرف مرض کو سمجھنے کے لیے دیکھی تھیں۔

ڈاکٹر اور اس کی بیوی سنگاپور، بنکاک اور کوالالمپور میں دو مہینے عیش کرنے کے بعد واپس کویت جا رہے تھے جہاں دونوں ایک آئل ریفائنری کے ساتھ چار سالہ معاہدے کی تکمیل کے دو سال گزار چکے تھے۔ دونوں امریکن تھے۔ انہیں کراچی سے کویت ائر کی فلائٹ لینی تھی۔ ہمارے ساتھ ہی وہ بھی اتر گئے اور بھیڑ میں گم ہو گئے۔

"عجیب بے مروت لوگ تھے۔" گل نے کہا "جاتے وقت خدا حافظ تک نہیں کہا۔"

میں نے کہا "یہ لوگ تکلفات میں نہیں پڑتے۔ اگر ہمیں ان کی خدمات کی ضرورت پڑتی تو یہ بالکل بھول جاتے کہ وہ چھٹی پر ہیں۔"

رابعہ نے کہا "یہاں سے سفر کا تیسرا مرحلہ شروع ہوگا مگر سوال ہے کہ کب ہوگا؟"

"جواب اس کا یوں ہے بی بی کہ جب ٹکٹ کے ساتھ سیٹ مل جائے گی۔ ایسا کب ہوگا، یہ آپ انکوائری سے پوچھیں۔"

"فوراً تو بکنگ نہیں ملے گی" رابعہ بولی۔

محسن نے کہا "غلطی ہوگئی ورنہ سنگاپور سے ہی آگے لاہور تک بکنگ کرا لیتے، وہاں ٹریول ایجنٹ کے لیے یہ مشکل نہ ہوتا۔"

حسب توقع بکنگ مشکل ثابت ہوئی "ہر سول ہول کی پانچ سیٹیں۔" ایک خاتون نے کمپیوٹر کے چند بٹن دبا کے ہانپتے ہوئے کہا۔ بٹن دبانا کوئی جان جوکھوں کا کام نہیں تھا۔ ان کا اصل مسئلہ موٹاپا تھا۔

میں نے کہا "ایک بار پھر کوشش کریں۔ شاید آج ہو۔"

انہوں نے خفگی سے کہا "کیا کمپیوٹر سے کہوں کہ کوشش کرے۔"

میں نے کہا "کمپیوٹر صاحب سفارش سے تو متاثر ہوں گے۔ آخر پاکستانی کمپیوٹر ہے۔"

اس نے منہ بنا کے کہا "آپ چانس پر ٹرائی کر لیں۔"

میں نے اور محسن نے فریج شروع کی "ٹریول ایجنسی سے رجوع کرتے ہیں۔ یہ ان کو سیٹیں بیچ دیتے ہیں۔" محسن بولا۔

میں نے کہا "کیا حرج ہے رقعہ پر کاٹر لگا کے دیکھ لیں۔"

محسن نے اتفاق کیا "رشوت کے علاوہ ایک طریقہ یہ بھی ہے کام نکالنے کا۔"

میں نے کہا "میڈم۔ اگر ابھی آدھے پونے گھنٹے میں خود چیئرمین صاحب آپ سے ہمارے لیے جگہ نکالنے کی درخواست کریں۔"

محسن بولا "چیئرمین کبھی درخواست نہیں کرتا، حکم دیتا ہے۔"

فریج نے خاتون کو پہلے ہی چوکنا کر دیا تھا، وہ مستعد ہوگئی "دیکھئے، وہ مالک .... ہیں، ان کا کوٹا ہوتا ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ چیئرمین کا کوئی کوٹا نہیں ہوتا۔ خاتون کی بات کا اصل مطلب یہ تھا کہ جگہ ہے۔ "رابعہ، تم جاؤ اپنے برادران لا کے پاس۔ بھائی جی سے کہو...."

"رابعہ انہیں بڑے بھیا کہتی ہے" محسن نے تصحیح کی۔

رابعہ نے برا سا منہ بنایا "اچھا نہیں لگتا مجھے ذرا ذرا سی بات پر ان کا احسان۔ بھابی دس بار جتائیں گی۔"

"پلیز رابعہ، یہ مسئلہ ایسے ہی حل ہوگا۔"

بکنگ کلرک خاتون نے رابعہ کے روانہ ہونے سے پہلے ہی کہا "دیکھئے پلیز، اگر آپ نائٹ کوچ سے جانا پسند کریں۔"

میں نے سوچ کے کہا "اگر واقعی اور کوئی صورت نہیں۔"

"آج تو سمرود تھیں ایک فلائٹ پر لیس کی، ایک شام کو۔"

میں نے کہا "رابعہ، تم بڑے بھیا سے فون پر بات کر لو۔"

رابعہ نے پھر منہ بنایا "اب نائٹ کوچ سے جانے میں کیا تکلیف ہے۔ کچھ پیسے بھی بچ جائیں گے۔"

میں نے کہا "او کے خاتون۔ میری کفایت شعار بیوی کی خودی بہت بلند ہے۔ آپ نائٹ کوچ سے بکنگ رہنے دیں۔"

مسئلہ حل ہو گیا تو میں نے کہا "کمپیوٹر صاحب کا شکریہ ادا کر دیں ہماری طرف سے۔ اب ان کو یہ بتانے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ ہم تو چیئرمین صاحب کے نام سے بھی ناواقف ہیں۔"

محسن نے کہا "یار، کمپیوٹر صاحب برا مانیں گے۔ آخر ان کے بھی جذبات ہیں۔"

برا خاتون نے مانا۔ بدمزگی کے آثار ان کی صورت سے عیاں تھے مگر وہ ہمیں قہر آلود نظروں سے گھورنے اور دل ہی دل میں کوسنے کے سوا کیا کر سکتی تھیں۔ ہم نے اچھا ڈراما پیش کیا تھا اور سب کی اداکاری بھی اچھی تھی۔

ابھی صبح کے دس بجے تھے یعنی ہمیں کم سے کم بارہ گھنٹے کہیں گزارنے تھے۔ کراچی میں اکرام شیخ بھی تھا۔ نازو کا سگا بھائی جو کبھی ہمارا دوست اور ساتھی تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ بے وفا اور طوطا چشم بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ جب پولیس میں سب انسپکٹر تھا تو سب اسے ایس آئی کہتے تھے۔ سب انسپکٹر سید اکرام اس کی فرض شناسی اور اصول پرستی نے اس کی نوکری چھین لی تو وہ کراچی میں ٹیکسی بھی چلاتا رہا تھا۔ کاجل سے شادی کے بعد اس کے دن پھر گئے تھے۔ اس کی نظریں بھی پھر گئی تھیں۔ یہ وہی کاجل تھی جس کو ہم مشکل ترین حالات میں مشرقی پاکستان سے نکال کر لائے تھے کیونکہ وہاں اس کا کوئی بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے کراچی میں ایک چھوٹے سے اسکول سے ابتدا کی تھی اور دیکھتے دیکھتے ایک بہت بڑے انگلش میڈیم اسکول کی مالک ہوگئی تھی جس کی دو شاخیں تھیں۔ جیسا کہ محسن مذاق میں کہتا تھا۔ کاجل میں علیحدگی پسندی کا رجحان پہلے سے تھا اور اکرام شیخ میں زن مریدی کا مگر یہ حقیقت تھی۔ غالب سے معذرت کے ساتھ۔ عقد نے ہم کو نکما کر دیا۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔

اب ہم میں سے کوئی بھی اکرام شیخ سے ملنے تک کا روادار نہ تھا۔ ورنہ اس کی کوٹھی پر ایک دن گزارنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کوٹھی میں جگہ تھی مگر کاجل کے دل میں نہیں تھی۔ وہ اپنے شوہر کو ہم شرپسند عناصر سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی چنانچہ ہم بھی اکرام شیخ کو بھول گئے تھے۔

صدر کے ہوٹل جیسں میں ہم نے دن بھر کے لیے دو کمرے حاصل کرنا کافی سمجھا۔ ہمیں وہاں رات نہیں گزارنی تھی۔ یہ فلم اسٹاروں اور اداکاروں کا پسندیدہ ہوٹل تھا اور اکثر اس کے سامنے شائقین کسی بھی سنسنی خیز خبر سے اکٹھے ہو جاتے تھے مثلاً یہ کہ ابھی ابھی شبنم آئی ہے، رابن گھوش بھی ساتھ تھا۔

فرسٹ فلور پر ہوٹل کا ریسٹورنٹ اور ڈائننگ ہال وسیع اور کشادہ تھا۔ اس کے بڑے بڑے شفاف شیشوں سے نیچے وکٹوریہ روڈ کی ساری ٹریفک اور گہما گہمی کا خاموش نظارہ دیکھا جا سکتا تھا۔ کافی ہم نے اپنے اپنے کمروں میں ہی پی تھی اور کچھ دیر بعد نہا دھو کے فریش ہو گئے تھے۔ ہم خیر و عافیت کے ساتھ پاکستان لوٹ آئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ دست غیب نے ہمارے لیے ابتلا اور آزمائش کے دور کو ختم کرنے کی ذمے داری قبول کر لی ہے۔ اس میں ناخوش ہونے والی کوئی بات نہیں تھی مگر دلاور کا اچانک ٹرمینل کینسر میں مبتلا ہو جانا اس کھیل کے ایک ڈرامائی اختتام کی کڑی تھا جو برسوں سے جاری تھا اور ہنوز نتیجہ خیز تھا۔ اسے یوں بھی تو مرنا ہوتا اور یہ یقین نہ آتا کہ اب واقعی اس کی زندگی کی مدت مختصر اور محدود ہو کے رہ گئی ہے تو شاید دلاور اس کھیل کو اتنی رسوائی کے ساتھ اپنی ہار پر ختم نہ کرتا۔ اس کے سامنے دوسرا راستہ بھی قانون کی بھول بھلیوں سے گزرنے کے بعد بالآخر ایک اندھے موڑ پر ختم ہونے والا تھا۔ فرار کے راستے مسدود ہو چکے تھے اور ہم واپس پہنچنے کے بعد ڈاکٹر شکیل مرڈر کیس میں اس حبشی جارج کو طلب کر لیتے تو وہ چشم دید گواہ کی حیثیت سے دہرے قتل کی اس واردات کے مجرم کو بھی شناخت کر لیتا جو لندن سے فرار ہو گیا تھا اور جس کے جرم کی سزا وہ بے سبب کاٹ رہا تھا۔ اس کے بعد دلاور کو سزائے موت ہونی لازمی تھی۔

نہ جانے کیوں قدرت کو اس پر رحم آ گیا۔ تھانہ، کچہری اور جیل سے پھانسی گھاٹ تک جانے والا راستہ طویل تھا مگر

www.paksociety.com

ذلت و رسوائی بہت تھی جس کا خمیازہ دلاور سے زیادہ اس کے ورثا کو بھگتنا پڑتا۔ کہنے کو یہ کنبہ بھی عذاب الٰہی ہی کے نازل ہوا تھا مگر اس طرح وہ دو چار سال اسپیڈو جیم کی شکل میں گزار کے ایک عام قاتل کی طرح موت کے اندھے کنوئیں میں ادم توڑنے سے بچ گیا تھا۔ صرف دو ماہ میں وہ باعزت طور پر دنیا سے جا سکتا تھا۔ یہ زیادہ بہادرانہ موت تھی۔ وہ سب کی ہمدردیاں سمیٹ کے جاتا اور یہ بھی از مرگ رسوائی کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس کا اعتراف جرم عدالت کے ریکارڈ میں شامل ہو جاتا اور ہمارے مسائل بھی تمام ہو جاتے۔

تاہم چوہدری دلاور کے علاوہ بھی ایک کانٹا تھا جس کا وجود میرے لیے اتنا ہی ناقابل قبول تھا جتنا چہرے کا کوئی داغ جو کسی نفرت انگیز حادثے کی یاد دلاتا رہے۔ مجھے اس داغ کو بھی مٹانا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ اسی شہر میں استاد پیڈرو بھی ہے جو شیخ عمار کے نام سے باعزت زندگی گزار رہا ہے اور شاید اس خیال سے مطمئن ہے کہ اس کے ماضی کے جرائم پر وقت کی گرد پڑ گئی ہے۔ ایم آر ایس خواب و خیال ہوئی اور سکندر کے سر سے انتقام کا بھوت اتر چکا وہ اب محفوظ ہے۔ لیکن وہ ایسا سمجھتا تھا تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ چوہدری دلاور کے معاملات سے فراغت پانے ہی میں زیادہ دلچسپی کے ساتھ اس جنگی جرائم کے مرتکب آخری مفرور مجرم کو بھی ایم آر ایس کی عدالت میں اسی طرح پیش کرتا جیسے ڈاکٹر شاہ کو لندن میں سرسری سماعت کے بعد سزا دے دی گئی تھی۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے میں نے محسن سے اپنے ارادے کا ذکر کیا تو اس نے خوب خوش فرمانے کے بعد منصوبے کی منظوری دے دی "ویسے تو یہ کام فرصت ملنے پر اطمینان سے بھی کیا جا سکتا تھا مگر اس میں منفعت کے اعتبار سے عبرت کے اسباب زیادہ ہوں گے اگر چوہدری دلاور خود استاد پیڈرو کا انجام دیکھے اور اسے اندازہ ہو کہ ایم آر ایس کی عدالت میں انصاف کا عمل کتنا فوری اور موثر ہے اور مرنے سے پہلے استاد پیڈرو کو بھی پتا چل جائے کہ چوہدری دلاور کو کس عدالت سے سزائے موت دی گئی ہے۔ وہ جہنم میں جا کے بھی لڑتے رہیں کہ تو نے مجھے مروایا اور دوسرا کہے تو نے۔"

"وقت کم ہے اور استاد پیڈرو کو قابو کرنا بلکہ اغوا کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ ایک بار بچ کر نکل جانے کے بعد وہ یقیناً بہت محتاط ہوگا اور اس نے اپنے لیے حفاظتی انتظامات بھی سخت کر رکھے ہوں گے۔"

میں نے کہا "میرے ذہن میں ایک چال ہے۔ دام ہم رنگ زمیں۔"

اس نے کہا "یہ تو فارسی ہو گئی۔ اردو میں عرض کریں۔"

"وہ چال جو زمین کے رنگ کا ہو۔ شکار کو نظر ہی نہ آئے اسے دلاور بلائے۔"

محسن اچھل پڑا "کیا یہاں غیر مانہ چو مناسب رہے گا۔"

"آپ کے پاس چوٹنے کے لیے ایک منہ ہے تو ادھر اُدھر منہ مارنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"سوری۔ میں بھول گیا تھا کہ میرے جملہ حقوق رابعہ کے نام محفوظ ہیں۔ خیر میں آپ کو ذہانت کا نوبل پرائز دیتا ہوں، آپ وصول کریں" محسن نے کہا۔

"چوہدری دلاور بھی اب پیڈرو کا دوست نہیں بلکہ دشمن ہی ہے۔ اسے پیڈرو کو فون کر کے بلانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

محسن نے کہا "اور اگر اس نے انکار کیا۔؟"

"وہ کیوں انکار کرے گا؟"

"اس خیال سے... کہ مرنے سے پہلے کسی اور کو مروانے کا گناہ کیوں کیا جائے۔ آخر وہ برسوں ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔"

میں نے کہا "یہ دوستی وہ نہیں تھی جو میرے اور تیرے درمیان ہے۔ وہ غرض مندی کا تعلق تھا۔ دوستی کی عمر جتنی زیادہ ہو اس کی قدر و قیمت بڑھتی ہے۔ ان کے درمیان کینہ اور کدورت بڑھتا گیا یہاں تک کہ بات صرف ترک تعلق کی نہیں رہی، باقاعدہ دشمنی میں داخل ہو گئی۔"

جب میں نے چوہدری دلاور سے بات کی تو کچھ دیر کے لیے وہ سوچ میں پڑ گیا۔ شاید پرانے وقت کی یادوں نے اسے اسیر کر لیا تھا مگر وہ بہت جلد اس کے سحر سے نکل آیا۔ اس کے دل میں پیڈرو کے لیے صرف نفرت تھی۔

"میں اسے فون کروں گا" دلاور نے کہا "اس لیے نہیں کہ تم اسے سزا دینا چاہتے ہو بلکہ اس لیے کہ میں اسے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ میں تم پر بھروسا کر سکتا ہوں کہ تم نے وعدہ کر لیا تو تم میرے بیوی بچوں کے خلاف جذبات کو دل سے خارج کر دو گے۔ وعدہ نہ لوں تب بھی تم کینہ پروری اور کمینگی میں اس حد تک نہیں گرو گے کہ میرے بعد ان کے ساتھ دشمنی کا سلسلہ جاری رکھو۔ لیکن وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ دلاور اس دنیا میں نہیں رہا تو اس کا شیطانی ذہن کوئی خطرناک منصوبہ بنائے گا۔ انہیں بلیک میل کرنے کا یا انہیں پریشان کرنے کا۔ یہ بات میں نے پہلے بھی تسلیم کی ہے کہ تم شریف دشمن ہو۔ تم پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ پیڈرو جیسے کمینے ساتھی پر نہیں۔"

"کیا وہ تمہارے بلانے سے آ جائے گا؟"

"ہاں۔ وہ مجھے انکار نہیں کر سکتا" دلاور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"اسے یہاں بلاؤ" میں نے کہا "اپنے کمرے میں۔ اسے بتاؤ کہ تم یہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔"

میں نے کہا "تم ریسٹورنٹ کے سڑک کی جانب والے شیشوں سے دیکھ سکتے ہو۔ جب وہ اندر آنے کے لیے گیٹ میں داخل ہو تو

اس کو زینے کے پہلے موڑ پر ریسیو کرو اور یہاں لے آؤ۔"

"اگر اس نے تمہیں دیکھ لیا؟"

میں نے کہا "ہم پیچھے کسی گاڑی میں بیٹھ کے تمہارا انتظار کریں گے۔ ہوٹل سے کرائے کی گاڑی مل جائے گی۔ پیڈرو کے آنے سے پہلے تم دیکھ لینا۔ جب وہ آ جائے تو اسے کہنا کہ چلو کہیں باہر جا کے بات کریں گے۔ اسے شک ہو تو اپنی تلاشی دے دینا۔ اسے یقین دلانے کے لیے کہ تم مسلح نہیں ہو اور اکیلے ہو۔"

"ممکن ہے وہ تمہاری اس احمقانہ خود اعتمادی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کرے اور تمہیں کہیں لے جا کے ٹھکانے لگانے کا سوچے" محسن بولا۔

دلاور مسکرایا "ایسا سوچ سکتا ہے وہ۔"

دلاور نے کمرے سے پیڈرو کو فون کیا۔ اس کا نمبر مجھے یاد نہیں تھا مگر میٹروپول ہوٹل میں واقع اس کے آفس کا نمبر ڈائریکٹری میں تلاش کرنا مشکل نہیں تھا۔ ہم نے دونوں کمروں کے فون جوڑ کے ساری بات سنی۔

"مجھے شیخ عمار صاحب سے بات کرنی ہے۔"

پیڈرو نے کہا "میں بول رہا ہوں۔"

"پیڈرو۔ میں دلاور ہوں" چوہدری دلاور نے کہا۔

دوسری طرف چند سیکنڈ کی خاموشی نے پیڈرو کے ذہن کو پہنچنے والے شاک کی غمازی کی "دلاور۔ تم... کہاں ہو؟"

"یہاں کراچی میں۔ جیسس ہوٹل دیکھا ہے۔"

"دیکھا ہے۔ مجھے کیوں فون کیا ہے؟" وہ نروس ہو گیا۔

"مجھے تم سے ایک کام ہے۔ فوراً آ جاؤ۔ اسی وقت۔"

"دلاور۔ تم ایسے مجھے حکم نہیں دے سکتے۔ ابھی میں مصروف ہوں۔"

"پیڈرو۔ میں آج بھی حکم دے سکتا ہوں تمہیں اور تو دیکھ مجھے میں تم نہ آئے تو میں ایک فون کال تمہارے پارٹنر کو کروں گا۔ دوسری ایک اور شخص کو۔ وہ تمہیں یہاں لے آئے گا زندہ یا مردہ۔ ابھی نہ سہی شام تک۔"

پیڈرو کی پھنسی پھنسی آواز آئی "اچھا۔ میں آتا ہوں۔ تمہارے ساتھ اور کون ہے؟"

"کوئی بھی نہیں اور تم بھی اکیلے ہی آؤ گے۔" اس نے فون بند کر دیا۔

دس منٹ بعد محسن نے اطلاع دی "ایک نیسان مل گئی ہے۔ گرے کلر کی۔ D-1100۔"

دلاور نے کہا "نمبر بتاؤ۔"

"نمبر چھوڑو۔ سینٹرل کافی ہاؤس کے سامنے کھڑی ہے" محسن بولا "نمبر تو میں نے نہیں دیکھا۔"

"وہ اپنی گاڑی میں آئے گا" دلاور نے کہا۔

"ہاں۔ اور وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا" محسن نے کہا "ظاہر ہے کہ گاڑی وہ چلائے گا۔ تم اس کے ساتھ بیٹھو گے، ہم تمہارے پیچھے رہیں گے۔"

"میں اس کو کہاں لے جاؤں گا؟"

"اولڈ کلفٹن۔ وکٹوریہ روڈ سے سیدھے کلفٹن کے راؤنڈ اباؤٹ پر تم اس سے گاڑی رکنے کو کہو گے، کسی بھی بہانے اور اسی جگہ پہنچ کے ہم پیچھے بیٹھ جائیں گے۔ تاسف کا معاملہ ہم پر چھوڑ دو۔ اسے پتا بھی نہیں چلے گا کہ ہم تعاقب میں ہیں اور نہ وہ کچھ کر سکے گا۔ پھر ہم اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دیں گے اور پیڈرو کی گاڑی میں آگے چلے جائیں گے۔ رائٹ؟"

دلاور نے سر ہلایا "اگر تمہارے پیچھے بیٹھنے سے پہلے اس نے ریوالور نکال لیا؟"

میں نے کہا "اول تو ہم اسے اتنی مہلت نہیں دیں گے اور میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ شاید وہ ایک فائر کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ رسک میں لوں گا۔ دوسرا فائر وہ نہیں کر سکے گا۔"

محسن نے کہا "مگر فائر کی آواز سب کو متوجہ کرے گی۔"

میں نے کہا "دلاور۔ تم پیڈرو کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے۔ تم جسمانی طور پر بہت کمزور ہو چکے ہو۔ مگر تم اس کو ریوالور نکالنے سے روک سکتے ہو۔ چند سیکنڈ کی بات ہے۔ جیسے ہی گاڑی رکے گی اور ہم پیچھے سے نمودار ہوں گے اس کا ہاتھ اپنے ریوالور کی طرف بڑھے گا۔ تم اس کا ہاتھ روک دو تو اچھا ہے ورنہ جب وہ ریوالور نکال لے تو اس پر اپنا ہاتھ مار دینا۔ آخر تم بھی پرانے شکاری ہو۔"

دلاور مسکرایا "یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ پیڈرو تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔"

میں اور محسن پیچھے کھڑی ہوئی نیسان کار میں جا کے بیٹھ گئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اوپر کون سے شیشے کے پیچھے دلاور موجود ہے مگر سیاہ شیشوں کے پیچھے سے وہ ہمیں دیکھ سکتا تھا۔ ہم اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

دس منٹ بعد استاد پیڈرو اپنی سفید نئے ماڈل کی لمبی ڈاج ڈارٹ میں نمودار ہوا۔ گاڑی کو اس نے بڑی نخوت سے گیٹ کے سامنے روکا۔ اس طرح کہ قطار میں ترچھی کھڑی ہوئی بہت سی کاروں کا راستہ ڈبل پارکنگ سے بند ہو گیا۔ اگر ان کے مالک اپنی گاڑی نکالنا چاہتے تو نہیں نکال سکتے تھے۔

میں نے کہا "پیڈرو بڑا بزنس مین ہو گیا ہے۔ اس کی گاڑی بہت قیمتی ہے۔"

"اس نے سوٹ بھی پہنا ہے اس گرمی میں۔"

"جینے دو یار... قیمت ہے اس گاڑی کی۔ وہ سوٹ کیوں نہ پہنے۔ مگر سوٹ پہننے سے تمیز تہذیب نہیں آتی۔ ایسے گاڑی کھڑی کرنے والے پیڈرو جیسے تو دوسرے بہت ہوتے ہیں۔"

خلاف توقع چوہدری دلاور اور پیڈرو بہت جلد نیچے آ گئے۔

ان کے چہروں سے کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ نہ دوستی کے نہ دشمنی کے۔ پیڈرو خاصی خود اعتمادی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چوہدری دلاور کیا کرنے والا ہے۔ یہ بات اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی تھی کہ چوہدری دلاور اس وقت ہمارا آلۂ کار ہے۔ وہ ہم سے ملا ہوا ہے اور ہم اپنی جنگ ختم کر دینے والے حریفوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرکے خیرسگالی کے جذبات کو فروغ دے رہے ہیں۔

چوہدری دلاور اسے طے شدہ پروگرام کے مطابق کلفٹن کی طرف لے گیا۔ گاڑی محسن چلا رہا تھا۔ اس نے ایک راؤنڈ اباؤٹ سے دو حصوں میں تقسیم ہو جانے والی سڑک پر سفید کار کا تعاقب چھوڑ دیا۔ وہ دوسری سڑک پر چل پڑا اور اس نے رفتار ایک دم خطرناک حد تک بڑھا دی۔ میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ پٹھان اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے جو بھی کر رہا تھا ٹھیک تھا۔ شاید ان سڑکوں کے بارے میں وہ مجھ سے زیادہ جانتا تھا۔

تقریباً ایک کلومیٹر کے بعد اس نے انتہائی تیز رفتاری سے دائیں جانب موڑ کاٹا۔ سامنے سے آنے والی ایک گاڑی کو بچانے کے چکر میں خود ہماری گاڑی ایک بنگلے کی دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ اس نے بریک لگا کے گاڑی کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا اور مجھے اشارہ کیا۔ میں اور وہ دیوار کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔

سفید ڈاج کار مخالف سمت سے نمودار ہوئی۔ شاید دلاور پریشان ہو گا کہ پیچھے آتے آتے ہم اچانک کہاں غائب ہو گئے۔ پیڈرو کی نظر پیچھے عام ٹریفک کو دیکھتے ہوئے کیسے اندازہ کر سکتی تھی کہ کرے نیبت میں کون تعاقب کر رہا ہے۔

سفید گاڑی ہم سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر آہستہ ہوئی اور رک گئی۔ دلاور کا سر آگے جھکا ہوا تھا اور پیڈرو اسے تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا تھا یا اس کی طبیعت واقعی بگڑ گئی تھی۔ وہ مسلسل دباؤ اور ٹینشن کو برداشت کر رہا تھا۔

میں نے اور محسن نے مخالف سمتوں سے یلغار کی۔ پیڈرو کو اس وقت ہوش آیا جب ہم اس کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ اس نے شاک سے سنبھلنے میں بڑی پھرتی دکھائی اور اس کا ہاتھ ریوالور نکالنے میں بھی کامیاب رہا مگر پھر دلاور نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا۔ پیڈرو کا ہاتھ کھڑکی پر لگا۔ میں اور محسن پچھلا دروازہ کھول کے اندر فٹ ہو گئے۔ یہ سب مشکل سے آدھے منٹ میں ہوا اور یہ پہلا کمانڈو ایکشن اس اعتبار سے تاریخی رہا کہ اس میں ہمارا ساتھ دلاور نے بھی دیا۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ آج کے دوست کل کے دشمن اور کل کے دشمن آج کے ساتھی۔ پیڈرو کو بالا خرانی نے مروایا جس کی خاطر پیڈرو نے نہ جانے کتنے غیر قانونی کام کیے تھے۔ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے کبھی خطرناک جرائم پیشہ افراد سے اور کبھی قانون سے ٹکر لی تھی۔ دلاور کے ہر حکم پر سر جھکاتے ہوئے کسی دشمن کا سر اس کے قدموں میں لا ڈالا تھا کہ جیسا کہ محسن نے کہا تھا۔ یہ نمک حلالی اور خلوص کا تعلق نہیں تھا۔

پیڈرو کی کلائی کھڑکی پر لگی تھی اور ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ تلملا کے رہ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے چھوٹنے والا ریوالور اس کے قدموں میں کہیں پڑا ہوا تھا مگر اب وہ جھک کے اسے اٹھا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ انگارے اور زہر برساتی نظروں سے دلاور کو دیکھ رہا تھا۔

"بے غیرت کسی طوائف کے.... کی اولاد۔" پیڈرو نے پھنکار کے دلاور کو ایک گالی دی "تجھ سے یہ امید نہیں تھی مجھے تو یہ میری غلطی تھی۔"

دلاور نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پیچھے سے کہا "یہ تمہاری پہلی غلطی نہیں تھی پیڈرو۔"

"تمہاری پہلی غلطی تھی تمہارا پیدا ہونا۔" محسن بولا "اب گاڑی آگے بڑھاؤ اور سیدھے لے چلو۔"

پیڈرو بیک ویو مرر میں ہمیں دیکھتا رہا "تم لوگ کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "یہ محسن بتا چکا ہے۔"

اس نے مردہ ہاتھوں سے گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور گاڑی سست رفتاری سے چلنے لگی "تم کو سودا کرنا تھا تو مجھ سے کرتے دلاور۔"

"سودا برابر والوں سے ہوتا ہے۔ تم آج بھی کیا ہو؟" دلاور نے حقارت سے کہا "کل تک تم ایک معمولی شہدے تھے گر فورا کو بدمعاش سمجھتے تھے۔ میری غلامی میں آ کے تم دادا ہو گئے تھے گلی کے کتے کو محافظ بنا لیا جائے تو آزاد ہو کے وہ شیر نہیں بن جاتا۔"

میں نے کہا "سودا تم نے ہم سے بھی کیا تھا۔ آج ہم اسی کو فائنل کرنے آئے ہیں۔ زندگی کا بھروسا نہیں، حساب صاف رہنا چاہیے۔"

محسن نے کہا "عبداللہ شاہ غازی کے مزار سے آگے سیدھے ہاتھ پر سڑک نیچے جا رہی ہے۔"

پیڈرو سخت نروس ہو گیا تھا۔ اس کی چھٹی حس خطرے کو محسوس کر رہی تھی "تم سب میرے خلاف اکٹھے ہو گئے ہو.... تم مارنا چاہتے ہو مجھے۔"

اس نے ایک دم بریک دبا کے اسٹیئرنگ چھوڑ دیا۔ گاڑی ایک جھٹکا لے کر بند ہو گئی۔ میں اس کی کسی بھی غلط حرکت سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا جب اس علاقے میں رونق کم سے کم ہوتی ہے۔ پھر بھی مزار کے سامنے پھول بیچنے والے، فقیر اور حاجت مندوں کے علاوہ کچھ عقیدت گزار موجود تھے۔ پیڈرو چلانے لگتا تو وہ سب جمع ہو جاتے۔

میں نے پستول کے دستے سے اس کی گردن اور شانے کے درمیان کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ اس کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل کی طرف بڑھا تھا اور مجھ سے سیکنڈ کے دسویں حصے کی تاخیر ہو جاتی تو وہ باہر جا گرتا اور گرتے ہی اٹھ کے بھاگ کھڑا ہوتا۔

اچانک وہ سامنے جھک گیا۔ اس کا سر اسٹیئرنگ پر ٹھہر گیا اور اس سے ہارن کا ایک بٹن دب گیا۔ ہارن مسلسل بجنے لگا۔ میں تیزی سے نیچے اترا اور میں نے دروازہ کھول کر اس کا سر پیچھے کیا۔ ہارن کی آواز خاموش ہو گئی۔ بہت قریب کھڑے ہوئے ایک ملنگ نے استغراق کی یا چرس کے نشے کی کیفیت سے آنکھیں کھول کے دیکھا اور بولا "خیر ہے بابا۔ مرگی پڑ گئی ہے کیا؟ جوتی سنگھاؤ اس فقیر کو۔"

میں نے اس کے مفت مشورے کو نظر انداز کر دیا۔ چند دکانیں کچھ فاصلے پر تھیں جہاں موتی سیپ اور گھونگھے سے بنے ہوئے ہار بندے اور بہت سی آرائشی اشیا کی فروخت ہوتی تھی مگر سہ پہر کے وقت وہاں کوئی خریدار نہیں تھا۔ اونگھتے دکان داروں کو بھی ہارن کی آواز نے متوجہ کر لیا تھا۔

میں نے ایک دکان دار سے پانی مانگا۔ "ڈرائیور کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔"

اس نے مجھے پانی کا گلاس اور دوسرا مفت مشورہ دیا "اس کو آگے مزار کی سیڑھی پر سے تھوڑی سی مٹی چٹا دو۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "ہم قریب ہی رہتے ہیں۔ گھر پہنچ کے ڈاکٹر کو بلا لیں گے۔"

صرف دیکھنے والوں کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے پیڈرو پر پانی کے چھینٹے مارے اور پھر اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر شفٹ کر دیا۔ پھر ڈرائیونگ میں نے سنبھالی اور گاڑی کو عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار سے ذرا آگے سیدھے ہاتھ پر اترنے والی سڑک پر لے گیا۔ یہ سارا غیر آباد اور سنسان علاقہ تھا۔ جہاں یہ پتلی سی سڑک ختم ہوتی تھی وہاں شام کو کچھ گاڑیوں والے آ جاتے تھے جو سمندر کے ساتھ والی مختصر سی سڑک پر ٹہلتے تھے اور کنارے پر بنی ہوئی دیوار پر بیٹھ کے سمندر کو دیکھتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں یہاں نہ لائٹس تھیں اور نہ آبادی تھی چنانچہ چاندنی رات میں بھی لوگ زیادہ دیر نہیں رکتے تھے۔

میں گاڑی کو بائیں طرف موڑ کے کافی آگے لے گیا۔ ایک نوجوان جوڑا جو غالباً عشق کے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا موٹر سائیکل کو ساحل کی گیلی ریت پر دوڑا رہا تھا۔ کبھی کبھی پانی کی لہر نیچے آ جاتی تھی تو موٹر سائیکل کے پہیے چند انچ گہرے پانی میں چھینٹے اڑاتے تھے مگر لڑکی ایسے چیخ مارتی تھی جیسے وہ گہرے سمندر میں ڈوب رہی ہے۔ مجھے ایک اور کار بھی نظر آئی جو ساحل کی ریت پر اکیلی کھڑی تھی۔ اگر اندر کوئی تھا تو اسے بند شیشوں کے پیچھے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے کار کو ان سے ایک کلومیٹر آگے پانی کے اتنے نزدیک روکا کہ بعض اوقات لہریں سامنے والے بمپر سے اوپر ہیڈ لائٹس سے ٹکراتی تھیں تو پھوار سی ونڈ اسکرین پر بھی آتی تھی۔

پیڈرو کو تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوش آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کے محسن کو دیکھا اور پھر ایک دم اٹھ بیٹھا۔ اس کی نگاہ مجھ پر اور پھر دلاور پر گئی تو شاید اسے سب یاد آ گیا۔ اب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر نہیں تھا اور گاڑی کسی سڑک پر نہیں سمندر میں کھڑی تھی۔

اس نے پھر وہی سوال کیا "تم.... کیوں لائے ہو مجھے یہاں۔ کیا چاہتے ہو آخر تم لوگ؟"

میں نے کہا "استاد محترم پیڈرو صاحب۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔ سوالات ہم کریں گے، تم سچ جواب دے کر اپنا وقت بھی بچا سکتے ہو اور عذاب بھی۔ سچ ہم پہلے سے جانتے ہیں اس لیے جھوٹ مت بولنا۔"

محسن نے کہا "یہاں ہم سچ تمہاری زبان سے سننا چاہتے ہیں۔ ورنہ ہم کلفٹن پر تفریح کے لیے اس وقت نہ آتے اور تمہارے ساتھ تو کبھی نہ آتے۔"

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری "کیا بات پوچھنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے باہر نکل کے کہا "تم بھی باہر آ جاؤ۔ گاڑی میں پیچھے مڑ کے تم سے بات کرنا مشکل کام ہے۔"

"نہیں.... میں باہر نہیں نکلوں گا" وہ چلانے لگا۔

محسن نے اسے باہر دھکیل دیا۔ میں نے اسے کھینچ کر ریت پر گرا دیا۔ وہ اُٹھ کر بھاگنے کی ہمت ہی نہیں رکھتا تھا۔ پانی کی ایک لہر اس کے اوپر سے گزری تو وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کا سارا جسم خوف سے لرز رہا تھا۔ میں نے اسے پیچھے دھکا دے کر گاڑی کے بونٹ سے لگا دیا۔

"یہ ہو سکتا ہے کہ سچ بول کے تم اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاؤ۔ آخر دلاور سے بھی تو ہماری صلح ہو گئی ہے۔" میں نے کہا "تم دیکھ رہے ہو کہ تمہارا باس بھی ہمارے ساتھ ہے۔"

پیڈرو کے اوسان کچھ بحال ہوئے "میں تو بہت پہلے تم کو صلح کی پیش کش کر چکا تھا۔ پرانی باتوں کو بھول جانا چاہیے۔"

"اگر کسی نے تمہارے باپ کو اتنی ہی بے دردی سے قتل کیا ہوتا جیسے وزیر خان کو قتل کیا گیا تھا تو کیا تم بھول سکتے تھے؟"

"لیکن.... اسے میں نے تو نہیں قتل کیا تھا۔"

"پھر کس نے قتل کیا تھا؟" میں نے کہا "تم دلاور پر الزام عائد کرتے رہے ہو اور دلاور تم کو اصل مجرم کہتا تھا۔ آج دونوں آمنے سامنے ہو۔ دلاور کیا تم بھی باہر آؤ گے؟"

دلاور نے کہا "مجھے سمندر کے پانی سے ڈر لگتا ہے۔"

"یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے دلاور۔ اب تمہیں موت کے سوا کسی سے بھی نہیں ڈرنا چاہیے۔ یہاں تم ڈوب نہیں سکتے۔"

دلاور ٹخنوں تک آنے والے پانی میں اترا۔ اسے پانی کا ...

www.paksociety.com

رکھ کر چکر آ رہے تھے۔ وہ بونٹ پر بیٹھ گیا۔

"چوہدری دلاور۔ بالآخر وہ دن آ گیا جب تم دونوں ایک ساتھ ایم آر ایلیس کی عدالت میں حاضر ہو۔" میں نے کہا۔

"ایم آر ایلیس کی عدالت!" دلاور نے دہرایا۔ پیڈرو کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔

"مجرموں کے کٹہرے میں اسٹل پیڈرو ہے۔ اس پر وزیر خان کے قتل کا الزام ہے۔ میر شرافت علی کے اور بہت سے دوسرے لوگوں کے قتل کا الزام ہے۔ تم خود کو گواہوں کے کٹہرے میں سمجھو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میرے والد کو قتل کرانے والا کون تھا اور قتل کس نے کیا تھا؟"

"قتل کرانے والا میں تھا۔" چوہدری دلاور نے سکون سے کہا۔

"میں نے کہا تھا... میرا کوئی قصور نہیں۔" پیڈرو بولا۔

"ابھی تم خاموش رہو۔" میں نے کہا "دلاور۔ تم نے کس سے کہا تھا کہ اسے قتل کرو؟"

"ڈی سوزا اور پیڈرو سے" دلاور نے کہا۔

"تم نے اس کا معاوضہ بھی ادا کیا ہو گا؟"

"ہاں۔ یہ میرے ملازم تھے۔ دونوں کو میں نے دس دس ہزار دیے تھے مگر بعد میں۔ انعام سمجھ لو اسے۔"

"قتل کرنے والا کون تھا؟"

"پیڈرو۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا ڈی سوزا کے سامنے۔"

"مگر تم نے حکم دیا تھا مجھے۔ میں انکار نہیں کر سکتا تھا" پیڈرو چلایا۔

دلاور نے کہا "یہ جھوٹ ہے۔ تم انکار کر سکتے تھے۔ زبردستی کون کسی سے قتل کرا سکتا ہے۔ تم نے لالچ میں یہ کام کیا تھا۔"

اب میں نے پیڈرو کی طرف دیکھا "تم اقرار کرتے ہو کہ قتل تم نے کیا تھا؟"

اس کے حلق سے آواز بڑی مشکل سے نکلی "ہاں... مگر۔"

اس نے قتل کب کیا... کیسے کیا...؟ یہ سب تفصیلات سننے کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں تھا اور اب اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پیڈرو کے اعتراف جرم کے ساتھ ہی میں نے فیصلہ سنا دیا "صرف اس ایک قتل پر تم کو سزائے موت دی جاتی ہے۔"

جملہ مکمل ہوتے ہی میرا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا۔ پیڈرو کو اپنی مدافعت میں ہلنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ جلاد کی تلوار بن کے میرا ہاتھ اس کی گردن پر لگا۔ سمندر کے شور میں ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ چوہدری دلاور کی حالت غیر ہو گئی۔ پیڈرو کا جسم بونٹ کے کنارے پر لڑھک گیا اور پھر نیچے گر کے تڑپنے لگا۔ پانی کی ایک لہر اس کے اوپر سے گزری۔ اس نے میرے، محسن کے اور دلاور کے کپڑے بھگو دیے۔ ہم سب ساکت و جامد کھڑے پیڈرو کو دم توڑتے دیکھتے رہے۔ اگلی لہر کے آنے تک اس کا بے جان جسم بھی ساکت ہو چکا تھا۔

شاید چالیس سال پہلے آنکھیں کھولنے والے پیڈرو کی آنکھیں اس وقت بھی کھلی ہوئی تھیں۔ دنیا میں آتے وقت وہ جتنا اکیلا تھا اس سے زیادہ تنہا اس وقت تھا۔ اس کی اجنبی قسمت میں علیوں لاش کراچی میں بحیرۂ عرب کے ساحل کی ریت پر لاوارث پڑی تھی۔ وہ سب خون کے رشتوں کا قرض نہ کرتا تو یہ ہو سکتا تھا کہ اس کی میت اپنے گھر میں بے داغ کفن میں لپٹی ہوئی بہت سے رونے والوں کے درمیان رکھی ہوتی۔ بیوی بچے، بھائی بہن، دوست اور رشتے داری والے رونے۔ انا خرابے اور بڑے قرض کے انجام میں اتنا ہی فرق رہ جاتا ہے۔

میں نے لاش کو گاڑی میں ڈالا اور اس کے پیچھے چڑھ دیے۔ پھر گاڑی کو لاک کیا اور چابی سمندر میں اتنی دور پھینک دی جتنی دور میں پھینک سکتا تھا۔

دلاور نے کہا "یہ تم نے کیا کیا... ہم واپس کیسے جائیں گے؟"

میں نے کہا "اگر تم میں اتنا چلنے کی ہمت نہیں ہے تو تم یہاں ٹھہرو میں جا کے اپنی گاڑی لے آتا ہوں۔"

دلاور نے انکار میں سر ہلایا "نہیں میں ساتھ چلوں گا۔"

ہم ٹخنوں سے اوپر پانی میں گاڑی چھوڑ کے واپس ہوئے۔ ہماری پتلونیں اوپر تک بھیگ چکی تھیں اور گیلی ریت جوتوں کے اندر پہنچ گئی تھی۔ اس حالت میں سڑک تک پہنچنا بھی دلاور کے لیے مشکل ثابت ہوا۔

موٹر سائیکل سوار نوجوان دوبارہ ہمارے قریب سے گزرا تو لڑکی نے پھر چیخ ماری اور نوجوان نے قہقہہ مارا۔ ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ خواب ان کی آنکھوں میں مسکرا رہے تھے۔ نوجوان نے موٹر سائیکل ہمارے پاس روک دی۔

"کیا ہوا گاڑی کو؟" اس نے پوچھا۔

"خراب ہو گئی" میں نے کہا "کیا تم ہماری کچھ مدد کرو گے؟"

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"ہمارا یہ ساتھی بیمار ہے" چل نہیں سکتا۔"

اس نے کہا "مگر... میرے ساتھ تو... میری بیوی ہے۔" لڑکی کا رنگ اس دلنواز جھوٹ پر لال پڑ گیا اور وہ مسکرانے لگی۔

میں نے کہا "سڑک پر عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار تک جا کے کسی ٹیکسی والے کو یہاں لے آؤ تو تمہاری مہربانی ہو گی۔"

لڑکی نے کہا "چلو نا۔ دو منٹ لگیں گے۔"

لڑکے نے سر ہلایا "پھر ہم ادھر سے ہی نکل جائیں گے۔ ٹیکسی والے کو بھیج دیں گے۔"

دس منٹ بعد خالی سڑک پر ایک ٹیکسی نمودار ہوئی۔ وہ ہمارے پاس آ کے رک گیا۔ میں اور دلاور پیچھے بیٹھ گئے۔ "گاڑی خراب ہو گئی" اس نے بڑے افسوس سے سر ہلایا۔ "تو گاڑی کہاں ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ نئی ہوا پرانی مشین ہے۔"

"رات ہونے سے پہلے گاڑی لے جانا۔ کسی مکینک کو شام تک لا سکے تو گاڑی بچ جائے گی۔"

"ورنہ کیا ہو گا؟"

"ورنہ رات کو سمندر چڑھے گا۔ گاڑی ڈوب جائے گی۔ بنا ہے گاڑی ریت میں دھنس کے غائب بھی ہو جاتی ہے۔ دیکھو تو ایسی ریت میں جیسے فرشتے اندر چلے گئے ہیں۔ یہاں کوئی نشانی بھی نہیں ہوتی جس سے صبح سمندر اترنے کے بعد پتا چلے کہ گاڑی کہاں تھی۔"

جب وہ اپنے تجربے کی بات بتا رہا تھا تو مرزا غالب نے میرے کانوں میں کہا۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

میں ہنس پڑا "واہ چچا غالب" دلاور کا اتنی سنگین اور المیہ صورت حال میں مجھے ہنستا دیکھ کے حیران ہونا جائز تھا۔

محسن نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا "آج دنیا کچھ۔ تھوڑی سی معمولی سی بہتر جگہ محسوس ہوتی ہے۔ صرف اتنی کہ جتنی نیوٹن کو زمین اوپر اٹھی ہوئی لگی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ شاید آسمان ایک کاغذ کی موٹائی کے برابر نیچے ہوا ہے یا زمین اوپر۔ دراصل اس کی میز کے نیچے کسی نے واقعی ایک کاغذ رکھ دیا تھا۔ اس کا کہنا غلط نہ تھا۔"

میں نے کہا "یہ تھوڑا سا فرق بھی بہت ہے۔ اگر ایسے ایک ایک کر کے سب پیڈرو مر جائیں۔"

"اور سب دلاور بھی..." چوہدری دلاور بڑبڑایا۔

محسن نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تو دنیا یقیناً جنت بن سکتی ہے۔ عملی طور پر یہ ناممکن سہی نظریاتی طور پر تو غلط نہیں۔"

ہوٹل واپس پہنچ کے میں نے دلاور کو اوپر کمرے میں بھیج دیا تھا کہ وہ لباس وغیرہ بدل کے اپنی حالت ٹھیک کرے۔ جسمانی تھکن کے علاوہ اس پر پیڈرو کی موت نے دہشت طاری کی تھی۔ خود میں کوشش کے باوجود اپنے تصور سے وہ تصویر نہیں مٹا سکا تھا جس میں پیڈرو کی لاش پر سے سمندر کی لہریں اٹھکیلیاں کرتی گزر رہی تھیں۔ شاید آج رات وہ اپنے شایانِ شان آخری آرام گاہ پاتال میں پہنچ جائے گا۔ قیمت پچیس ہزار سکہ رائج الوقت کے ساتھ ہی سمندر میں غائب ہو جائے گا۔ ہمیشہ کے لیے۔ یوں جیسے وہ تھا ہی نہیں۔ پھر جب صور پھونکا جائے گا تو کیا وہ وہیں سے برآمد ہو گا؟

محسن نے کار واپس کی تو منیجر نے حیرانی سے کہا "آپ اس وقت گئے تھے سمندر میں۔ کپڑوں سمیت نہانے گئے تھے۔"

میں نے کہا "کیا کراچی کی انتظامیہ نے سمندر میں جانے کا کوئی وقت مقرر کر دیا ہے؟ ہو سکتا ہے ہم آج رات سمندر میں ڈیرا ڈال کے سوئیں؟"

محسن نے کہا "کپڑوں کے بغیر ہم اپنے گھر کے باتھ روم میں بھی نہیں نہاتے۔ آپ تو منچلے ہیں۔"

وہیں سے میں نے مظفر کو فون کیا۔ حسب توقع وہ رابعہ کے آفس میں وقار یوسف کے ساتھ موجود تھا۔ "کون بول رہا ہے؟" میں نے اس کی ہیلو پر ڈانٹ کے کہا۔

"تمہارا... باپ بھوتنی... کے کہاں ہو تم سالے" اوپر کہ نیچے؟"

میں نے کہا "ہم آج رات وارد ہوں گے لاہور میں۔ نائٹ کوچ پر ہمارے استقبال کے لیے حاضر ہو جاؤ۔ پوری برات اور بینڈ باجے کے ساتھ۔"

اس نے قہقہہ مارا "اب تو مجھنا کیا مظفر ہو گا۔ مظفر کی اولاد ہو گی ایک قطار میں۔ تیری بھابی سے ابھی کہہ دیتا ہوں کہ خیر سے مولا تو ہیں "سنوارا" بھی رات اِدھر بجے تک شامل ہو جانا چاہیے۔"

میں نے کہا "ایک مہمان خصوصی ہے ہمارے ساتھ۔ چوہدری دلاور!"

"اصلی یا نقلی" زندہ یا مردہ؟"

میں نے کہا "یہ مذاق نہیں ہے۔ ثاقب اور ناصر کو بتا دینا۔ وہ سب انتظام کر لیں گے۔ ایک تو ایمبولینس چاہیے اور حفاظتی انتظامات بھی ایسے ہونے چاہئیں جیسے کسی وی آئی پی کے لیے ہوتے ہیں۔ کسی کو پتا نہ چلے۔"

"تم سیریس ہو؟"

"اگر تو نے مجھے سیریس نہ لیا تو میں ثاقب سے بات کروں گا۔ اس وقت لمبی بات نہیں کر سکتا۔ بہت تھکا ہوا ہوں اس لیے خدا حافظ۔"

مظفر اس مختصر گفتگو پر یقیناً حیران ہوا ہو گا۔ اسے یہ پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ ہم سب لوگ کہاں ہیں لیکن نائٹ کوچ کے حوالے سے وہ سمجھ سکتا تھا کہ ہم کراچی سے وارد ہوں گے۔

شام کے وقت دلاور کی حالت کچھ بگڑی اور اس پر شدید ڈپریشن طاری ہو گیا۔ یہ پیڈرو کی موت کا رد عمل بھی تھا۔ اس کا آخری سپہ سالار بھی دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ صرف وہ بچا تھا مگر اس کے لیے بھی کوچ کا نقارہ بج گیا تھا۔ میں نے ایک ڈاکٹر کو بلایا تھا مگر دلاور نے انکار کر دیا۔

"کوئی فائدہ نہیں۔ یہ ڈاکٹر اب کیا کریں گے۔ ساری دنیا کے ڈاکٹر بھی مل کے کچھ نہیں کر سکتے۔ بکواس ہے" جھوٹ ہے" سب میڈیکل سائنس کی ترقی۔ سارے اسپیشلسٹ الو کے پٹھے ہیں۔ وہ دلاور کی زندگی میں ایک دن کا اضافہ نہیں کر سکتے تو بے کار ہیں ان کی ساری ڈگریاں۔ ان سب کو گھاس کھودنے پر لگا دینا چاہیے۔ خود میں روٹیاں لگائیں سالے ماہر کی اولاد۔ "ڈاکٹر جسٹ" وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔

وہ ڈاکٹر واقعی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ عام ڈاکٹر تھا۔

www.paksociety.com

"یہ خطرناک علامات ہیں۔" اس نے دلاور کی باتیں سن کے کہا "اس سے اگلے مرحلے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ دماغ ناکارہ ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ ہم جانتے ہیں۔ جب خرابی دماغ کے اندر ہے تو دماغ ہی ناکارہ ہوگا مگر کس حد تک۔ یہ بالکل ہو جائے گا؟ بالکل... یادداشت کھو بیٹھے گا یا ہوش و حواس؟"

"غالباً پہلے میموری متاثر ہوگی۔ جذباتی کیفیت طاری ہوگی۔ اس میں یہ VIOLANT بھی ہو سکتے ہیں۔ ابھی تو ڈپریشن ہے۔"

میں نے کہا "یہ ڈر ایک حملے کا ہے۔"

"پھر میں ان کو ایک سکون آور انجکشن لگا دیتا ہوں۔ اس سے فرق پڑا تو یہ علامات دوبارہ نمودار نہیں ہوں گی فوری طور پر۔"

ہم نے زبردستی انجکشن لگوا دیا۔ دلاور چند منٹ میں پُرسکون ہو کے سو گیا۔ ہم نے رات کا کھانا اپنے کمرے میں ہی منگوا لیا تھا۔ دلاور اس وقت ہی سویا تھا۔ ہم نے اسے نیند میں ہی اٹھا کے ایمبولینس میں منتقل کیا جو ہوٹل والوں نے منگوا دی تھی۔ ائرپورٹ پہنچنے تک وہ جاگ گیا تھا مگر پوری طرح ہوش میں نہیں تھا۔ اس نے کھڑا ہونے کی کوشش کی تو گر پڑا۔ اسے جہاز تک لے جانے کے لیے وہیل چیئر استعمال کی گئی۔ وہ اس میں سر جھکائے اونگھتا رہا۔ جہاز کے ٹیک آف کرنے تک اس کی حالت کچھ بہتر ہو گئی تو اس نے اسنیکس لیے اور پھر کافی طلب کی۔

"میں اپنے گھر فون کرنا چاہتا تھا۔" اس نے کہا "موقع ہی نہیں ملا۔"

"تمہاری طبیعت جو خراب ہو گئی تھی۔"

"فیصل آ جاتا اپنی ماں کے ساتھ مجھے ریسیو کرنے۔ میری دونوں بیٹیاں بھی آ جاتیں۔" وہ بولا "پھر لاہور ائرپورٹ سے فون کروں گا۔ ورنہ ٹیکسی لے کر اچانک پہنچ کے انہیں حیران کر دوں گا۔"

میں نے بات گول کرنے کے لیے کہا "تم نے کبھی اپنی بیٹیوں کے بارے میں نہیں بتایا۔ وہ فیصل سے بڑی ہیں یا چھوٹی؟"

"دونوں چھوٹی ہیں۔" ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک آرٹس پڑھ رہی ہے۔ شعر و شاعری کی شوقین ہے۔ اسے اچھے کپڑے پہننے اور ہلا گلا کرنے کا بہت شوق ہے۔ اس کی سہیلیاں بہت ہیں۔ آئے دن گھر میں ہنگامہ رہتا ہے۔ دوسری سائنس میں تیز ہے۔ لگتی ہے ڈاکٹر بنے گی۔ اور وہ بن جائے گی، دیکھ لینا۔ فرسٹ ایئر میں اس کے بیاسی فیصد نمبر تھے۔"

"جو آرٹس میں پڑھتی ہے وہ چھوٹی ہے؟"

"نہیں۔ وہ بڑی ہے۔ بی اے سال اول میں ہے۔ مقدر نے ان کو بہت کم وقت دیا۔ جتنی محبت مجھے تھی ان سے۔ اتنا ٹائم نہیں تھا میرے پاس اور تم جانتے ہو خود لڑکیوں کے پاس ٹائم کم ہوتا ہے۔ اٹھارہ بیس سال ہی رہتی ہیں وہ اپنے گھر میں۔ اس باپ کے ساتھ۔ باقی زندگی وہ شوہر کی ملکیت رہتی ہیں۔ شوہر اچھا ہو یا برا اپنی ملکیت سمجھتا ہے بیوی کو۔ جب وہ گھر سے رخصت ہو جاتی ہیں تو گھر سنسان ہو جاتے ہیں۔ خالی ہو جاتے ہیں۔ لڑکے تو باہر رہتے ہیں گھر سے ویسے ہی۔ پھر جب ان کی بیویاں آتی ہیں تو وہ ان کے ہو جاتے ہیں۔ بہو کبھی بیٹی کی جگہ نہیں لے پاتی۔ لے سکتی ہے مگر کبھی ہزاروں میں ایک۔ شاید وہ کمی پوری کر لی ہو جو بیٹی کے جانے سے ہوتی ہے۔ ابھی دو چار سال تھے گھر میں خود جا رہا ہوں۔ ان سے ملنے۔"

میں نے کہا "ٹھیک بات ہے۔ تم پھر رو رہے ہو؟"

"نہیں۔ یہ آنسو تو خود نکل آتے ہیں۔ ان پر اب میرا کنٹرول نہیں رہا۔ میرا دنیا کی کسی چیز پر کنٹرول نہیں رہا۔ وقت پر کنٹرول نہ رہے تو پھر ہر چیز بے قابو ہو جاتی ہے۔ ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ جہاں تم ہو اور جہاز میں کتنے لوگ ہیں۔ میرے سوا سب کا وقت ان کے ساتھ ہے۔"

رات نو بجے کے بعد لاہور ائرپورٹ پر دلاور نے وہیل چیئر استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ خود اپنے پیروں پر چل کے باہر تک گیا۔ وہاں وہ سب موجود تھے۔ منظر، غالب اور وقار یوسف۔ مولوی غلام حسین، ناز اور گل۔ ان سب کی نگاہوں کے لیے یہ بہت عجیب منظر تھا کہ ہم چوہدری دلاور کے ساتھ باہر آ رہے تھے۔ ایک موقع پر وہ لڑکھڑایا تو میں نے اسے سنبھالا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو ہم ایسی بے تکلفی کے ساتھ گلے ملتے اور ایک دوسرے کا استقبال ایسی دوستانہ گالیوں سے کرتے کہ دوسرے لوگ بھی مسکرانے پر مجبور ہو جاتے مگر اس وقت اچانک ہم سے پہلے آگے بڑھ کے دلاور نے ان سب سے ہاتھ ملایا تو ماحول بوجھل ہو گیا۔ کسی نے بھی معذرت کی حد سے بڑھ کے جذباتی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ یہ بیک وقت ایک ڈرامائی صورت کا عکس بھی تھا اور ذہنی کا عکس بھی۔ ان کے لیے اپنی آنکھوں پر اعتبار کرنا بھی انتہائی دشوار ثابت ہو رہا تھا جتنا دلاور کے طرزِ عمل کو سمجھنا۔ شاید ان کے دل میں ایک مبہم سا اندیشہ تھا کہ یہ بھی دلاور کی کوئی چال نہ ہو۔ جس کی تمام عمر مکاری، عیاری اور جھوٹ فریب سے عبارت رہی ہو۔ جو مشرق کا راستہ بتا کے مغرب کی سمت جاتا ہو۔ سیاہ کو سفید دکھا سکتا ہو اور جھوٹ کو سچ بتاتا ہو اور جس کے لیے زندگی اپنے ظاہر سے باطن کو چھپانے کی اداکاری ہو۔ وہ اپنی خاموشی اور سادگی کے ساتھ خود کو ہمارے حوالے کر دے گا۔ شاید انہیں اس میں ہماری کوتاہی یا کمزوری کا پہلو نظر آتا ہو کہ ہم اس پر اعتبار کر چکے تھے۔

لیکن وہاں نہ سوال کرنے کا موقع تھا نہ جواب دینے کا۔ سوال سب کی نگاہوں میں تھے اور چہروں پر تھے۔ وہ دلاور سے بھی بہت کچھ کہنا چاہتے ہوں گے اور مجھ سے یا محسن سے بھی مگر ہماری خاموشی اور سنجیدگی نے سب کے لب سی دیے تھے۔

دلاور نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی "سب نے مجھے ترک کر دیا... کوئی دوست یا عزیز۔ مجھے لینے صرف میرے دشمن آئے ہیں۔"

منظر سے ضبط نہ ہو سکا "اب تو بھوتنی... کے دشمن بنائے ہی کہاں تھے؟"

غلام حسین کو بھی موقع مل گیا "ہاں بھئی، یہ تو انسان کے اپنے اعمال ہیں جو اس کے سامنے آتے ہیں۔"

منظر بولا "مگر تمہارے بد اعمال تو ہمارے سامنے آ رہے ہیں مولوی غلام حسین، شامتِ اعمال ہیں کے۔"

غالب مجھ سے گلے ملنے کے بعد محسن سے مل رہا تھا۔ گل اور ناز بھی رابعہ اور گل سے مل کے خوشی کے آنسو بہا رہی تھیں۔

میں نے کہا "کیا ہو گیا یار منظر!"

"اسے یہ فکر کی مولوی، میری بیوی پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ بہت دن سے دیکھ رہا ہوں میں۔" منظر بولا "یہ آنکھ مار رہا ہے اسے۔"

"یا اللہ" غلام حسین نے اوپر منہ اٹھا کے فریاد کی "اس شرمناک الزام کا میں کیا جواب دوں۔ توبہ توبہ۔"

میں نے کہا "کیا خیال ہے، ہم چلیں۔ سب باتیں یہاں تو نہیں ہو سکتیں۔ تم ایمبولینس لائے ہو؟"

غالب نے کہا "بالکل لائے ہیں۔"

دلاور نے کہا "میں فون کر کے اپنے گھر سے فیصل کو بلا لوں؟"

میں نے کہا "کیا ضرورت ہے؟ ہم تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔"

اس نے میری، محسن کی اور غالب کی صورت کو دیکھا اور سہلا کے ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ہم تو اس کی بگڑتی حالت کو ہر لمحہ دیکھ رہے تھے مگر ان سب نے جو دلاور سے طویل وقفے کے بعد ملے تھے اس کی افسوس ناک حد تک خراب ہو جانے والی صحت کو حیرانی اور افسوس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا۔

میں نے دلاور کو غالب اور ناز کے سپرد کر دیا۔ وہ پیچھے بیٹھ گئے۔ منظر اور وقار یوسف اپنی اپنی گاڑیاں لائے تھے۔ منظر کی کار میں رابعہ اور گل کے ساتھ نگی بھی بیٹھ گئی۔ میں اور محسن وقار یوسف کے ساتھ رہے۔

وقار نے گاڑی نکالتے ہوئے کہا "یہ تو واقعی مرنے والا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ہماری خوش قسمتی ہوگی اگر اس کا ارادہ نہ بدلا اور اس نے وہی کیا جو کہا تھا۔"

محسن بولا "اور اس وقت تک زندہ بھی رہا۔"

"دماغی ناقابلِ یقین اور عبرت ناک ہے یہ شکست جیسے کوئی بلند عمارت اچانک گر کے زمین بوس ہو جائے۔"

"زلزلہ اتنا شدید ہو کہ بنیادیں ہلا دے تو یہی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

محسن بولا "اس وقت ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

وقار نے کہا "نگی نے اپنے ابا کی وہ عظیم الشان کوٹھی صاف کرا دی ہے جہاں ابھی تک ان کی بدروح بھٹکتی محسوس ہوتی ہے۔"

"نگی نہیں ہے تاؤ، زبان سنبھال کے بیٹے،" محسن نے کہا "نگی کا باپ تمہارا بھی تو سسر تھا۔ ان کو بدروح کہتا ہے بدبخت۔"

وقار بولا "یار مجھے ایسا لگتا ہے۔ یہ جذبات کا مسئلہ ہے۔ نقوی صاحب بڑی توپ چیز تھے اور انہوں نے ساری توپوں کا رخ میری طرف کر دیا تھا۔ بڑی مخالفت کی تھی کہ یہ شادی نہ ہو۔ وہ تو نگی نے میدان نہیں چھوڑا ورنہ میری کیا بساط اور اوقات تھی۔ ان کے سامنے ایسی بات میں راضی نہیں کر سکتا۔ اپنے باپ کے لیے اس کے جذبات کا احترام مجھ پر بھی لازم ہے۔"

میں نے کہا "بہت مناسب جگہ ہے۔ اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ساری قانونی کارروائی کم سے کم وقت میں پوری ہو جائے اور ہم دلاور کو اس کے لواحقین کے سپرد کر دیں۔"

وقار نے کہا "ہم نے تمام انتظامات کر لیے ہیں مگر..."

"مگر کیا؟"

"آپ خود کو قانون کے حوالے کریں گے۔ آپ بھی، محسن اور غالب بھی۔ اور ناز بھی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ تو کرنا پڑے گا۔"

"اس کا بھی بندوبست ہو گیا ہے کہ آپ لوگوں کی ضمانت فوراً منظور ہو جائے۔ ضمانت کی درخواست آپ لوگوں کی گرفتاری ظاہر کرنے وقت ہی لگا دی جائے گی۔ بار ایسوسی ایشن کی کوشش سے یہ ممکن ہوا ہے کہ ایک دو دن میں آپ لوگ رہا ہو جائیں۔"

میں نے کہا "حوالات میں بھی رہنا پڑے گا۔"

"صرف کہنے کو۔ ورنہ وہاں گھر جیسا آرام ملے گا۔ سب سے بات ہو گئی ہے۔ اخباری نمائندوں کا مسئلہ نہ ہوتا تو روزنامچے میں صرف اندراج ہوتا۔ آپ اپنے گھر میں سوتے مگر اس کیس میں پولیس ضابطے کی کارروائی کرنے پر مجبور ہوگی دکھانے کے لیے۔"

گاڑی نقوی صاحب کے پرانے قصرِ عالی شان کے گیٹ پر پہنچی تو مسلح گارڈ نے گاڑی میں جھانک کے دیکھا اور وقار کے اشارے پر گیٹ کھول دیا۔

"تم نے دیکھا سیکیورٹی کتنی سخت ہے۔ میں نہ کہتا تو وہ گاڑی کو اندر بھی نہ جانے دیتا۔" وقار یوسف بولا "دوسری گاڑی میں نگی ہے۔"

"اور ایمبولینس اندر کیسے آئے گی؟"

اس نے کہا "اب تو ہم اندر ہیں، ہم ظہیر کو بتا دیں گے۔"

میں نے گاڑی سے اتر کے جھانکا تو مجھے دوسرے گیٹ کے اندر بھی ایک مسلح گارڈ نظر آیا۔ تیسرا کلاشنکوف بردار برآمدے میں آہستہ آہستہ

www.paksociety.com

تھا۔

میں نے کہا "کیا پوری بٹالین کھڑی کردی ہے حفاظت کے لیے؟"

"یہ ڈی آئی جی صاحب کا انتظام ہے۔ وہ میرے مرحوم و مغفور سسر کے بڑے قریبی دوست تھے۔ گی نے ان سے کہا کہ انکل مجھے دھمکی ملی ہے کہ میرے میکے کو تباہ کردیا جائے گا۔ آگ لگا کے اور بم سے اڑا کے۔ یہ وہی دلاور کے ساتھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دلاور کو ہم نے غائب کیا ہے۔ ہم سے مراد ہم لوگ۔ ڈی آئی جی بھی سب سمجھتا ہے۔ اس نے رسماً پوچھا تھا کہ کیا یہ غلط ہے؟ گی نے کہا کہ آپ خود آ کے دیکھ لیں۔ میرا کیا تعلق ان کے معاملات سے۔ سنا ہے وہ سب لندن میں ہیں اور ڈی آئی جی صاحب نے فرمایا کہ سنا تو ٹھیک ہے تم نے۔"

"ایسا کہا تھا ڈی آئی جی نے؟"

"ہاں۔ تمہارے فرار کی خبر بھی مل گئی تھی پولیس کو۔ پھر لندن سے کسی نے فون کرکے بتایا تھا کہ تم لوگ وہاں کیا کررہے ہو؟"

"یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"کیا خود دلاور فون نہیں کرسکتا تھا؟" وقار بولا۔

"یہ لوگ کہاں رہ گئے؟ نکلے تو سب ساتھ ہی تھے" محسن نے کہا۔

وقار کے ساتھ ہم نے وہ کمرا دیکھا جس میں چوہدری دلاور کے قیام یا باعزت اسیری کے ایام کو زیادہ سے زیادہ محفوظ اور آرام دہ بنانے کے لیے قابل تعریف انتظامات کیے گئے تھے۔ یہ بیڈ روم سے زیادہ کسی بہت اچھے اسپتال کا وی آئی پی روم لگتا تھا۔

"ساتھ والے ایک کمرے میں ڈاکٹر سلمان ہیں۔ بہت مشہور آرتھوپیڈسٹ ہیں۔ نرس دلاور کے ساتھ ہی رہے گی، دوسری طرف سیکیورٹی والے ہیں۔"

میں نے کہا "اس ڈاکٹر نے یہاں رہنا کیسے منظور کرلیا۔ یہ صرف فیس کی بات تو نہیں ہوگی۔"

"وزارت داخلہ میں کوئی ایڈیشنل سیکریٹری ہے۔ مجھے اس کا نام اس وقت یاد نہیں آرہا ہے۔ اس نے ہماری بہت مدد کی۔ مجھے گی نے بتایا۔ کہ وہ غالباً رابعہ کا پہلا شوہر تھا۔"

"وہ نامرد۔۔۔" محسن نے کہا "وہ ایڈیشنل سیکریٹری ہوگیا۔"

میں نے کہا "محسن۔۔۔ وہ ایک شریف اور مہذب انسان تھا۔ قدرت نے اسے جیسا بنایا، اس میں خود اس کا کیا قصور۔ اس نے سخت مجبوری میں شادی کرلی تھی مگر پھر خود ہی رابعہ کو سب بتا دیا تھا۔ اسے انتہائی عزت اور احترام کے ساتھ رکھا تھا اور ماں کے مرتے ہی طلاق دے دی تھی۔ اس نے رابعہ کو چھوا تک نہیں تھا۔ یہ بات رابعہ نہ بتاتی تو مجھے بھی معلوم نہ ہوتی۔"

دونوں گاڑیاں اندر آئیں اور پھر باری باری سب لوگ اندر آ کے ڈائننگ اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ دلاور کا موڈ بہت خراب تھا۔ یقیناً اس کی راستے میں نازو اور غالب سے بات ہوئی ہوگی۔ اس نے اپنے گھر کی طرف چلنے کو کہا ہوگا اور غالب نے کہا ہوگا کہ تم ہمارے ساتھ ہو تو ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔

میں نے کہا "چوہدری دلاور۔۔۔"

وہ ایک دم پھٹ پڑا "مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی سکندر۔ کیا تم میں ہمت نہیں تھی کہ مجھ سے یہ کہنے کی کہ میں آزاد نہیں ہوں۔ اپنی مرضی سے اپنے گھر نہیں جاسکتا۔"

میں نے کہا "تم قید میں نہیں ہو۔"

"قید نہیں تو پھر یہ کیا ہے؟" وہ بولا "کیا لندن سے یہاں تک کہیں بھی میں نے تمہارے اعتماد کو دھوکا دینے کی کوشش کی تھی؟"

"نہیں۔"

"پھر میرے ساتھ یہ سلوک کیوں؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں بھاگ جاتا۔ کیا اس وقت میں بھاگنے کی پوزیشن میں ہوں؟ اگر نہیں تو پھر مجھے اپنے گھر کیوں نہیں جانے دیا گیا؟"

میں نے کہا "بس ایک دو دن کی بات ہے۔"

"سکندر۔ میں اپنے بیوی بچوں سے ملنا چاہتا ہوں" وہ رو پڑا "تم ایک دو دن کی بات کرتے ہو، مجھے ایک رو گھنٹے کا بھروسا نہیں۔"

میں نے کہا "او کے، او کے۔ ہم انہیں بلالیں گے یہاں، صبح ہونے دو۔"

"ابھی کیوں نہیں۔۔۔ یہ ظلم ہے سکندر۔ میں یہاں ہوں اور ان کو کچھ پتا نہیں۔ اگر میں ان کو پتا چلنے سے پہلے مرگیا۔۔۔"

"ایسا نہیں ہوگا" میں نے کہا "اس وقت وہ سورہے ہوں گے۔ تم اچانک ان کو بتاؤ گے۔۔۔ تو کیا حالت ہوگی ان کی صدمے سے۔۔۔ بہتر ہوگا کہ ابھی تم اپنے کمرے میں جاکے آرام کرو۔"

"اچھا میں انہیں فون کرلوں۔۔۔؟"

وقار نے کہا "یہ کوٹھی بند تھی، فون بھی بند پڑے ہیں۔"

دلاور نے بے بسی سے ہم سب کی صورتوں کو دیکھا۔ اس کی نظر میں ہم سب جیلر تھے اور یہ جیل تھی۔ دشمنی کا رشتہ ختم نہیں ہوا تھا۔ اس کی نوعیت بدل گئی تھی۔ شاید ہمارے سپاٹ اور بے حس چہروں کو دیکھ کے اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ اس پر کسی کو رحم نہیں آئے گا۔

"اچھا۔۔۔ تم کہتے ہو تو پھر ٹھیک ہے" وہ اٹھ کھڑا ہوا "مجبور میں ہوں، تم نہیں ہو۔ اس لیے وہی ٹھیک ہے جو تم کہتے ہو۔ مجھے بتاؤ اس جیل میں میرا کمرا کون سا ہے؟"

"یہ میرا گھر ہے دلاور" گی نے کہا "تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہو تو مجھے بتانا۔ تم یہاں میرے والد سے ان کی زندگی میں مل چکے ہو۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے" وہ بولا "مگر میں تمہارا مہمان نہیں ہوں۔"

اسی وقت اندر کسی کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ دلاور نے ایک قدم آگے بڑھایا اور پھر پلٹ کے ہم سب کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ اس کی نظروں نے پھر کہا۔ ٹھیک وہی ہے جو تم کہتے ہو کیونکہ تم مجبور نہیں ہو۔ ہم میں سے کسی نے اس سے نظر نہیں ملائی۔ غالب اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

محسن نے وقار یوسف کو پکڑلیا جو دوسرے کمرے سے فون سن کے آیا تھا "حد ہے آپ کی عقلمندی کی۔ جھوٹ وہ بولا جو فوراً پکڑا گیا۔"

وقار ہنسنے لگا "یار رانگ کال تھی۔"

"پھر بھی اسے معلوم ہوگیا کہ فون بند نہیں ہے۔"

وقار نے کہا "بس اسی وقت میرے ذہن میں جو بات آئی وہ میں نے کہہ دی۔ یہاں کون ہے فون کرنے والا۔"

گی نے بھی اس کی تائید کی "مہینوں سے کوٹھی بند پڑی تھی۔ فون میں بھی صرف لائن رینٹ آتا تھا جو ہم ادا کردیتے تھے تاکہ فون بند نہ ہو۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ رانگ کال نہیں تھی" وقار بولا "میرے عزیز از جان سسر مرحوم کی روح نے عالم بالا سے یاد کیا تھا، اپنی لخت جگر کو۔"

"مگر فون اٹھایا زخم جگر نے" محسن بولا۔

"وقار۔ مجھے ایسا مذاق پسند نہیں" گی بولی۔

"یہ مذاق نہیں خیال ہے میرا۔ آخر غالب کا سسر بھی تو بھوت ہے۔ نقوی صاحب کو لوگ ان کی زندگی میں جن کہتے تھے۔"

اس سے پہلے کہ گی کا موڈ مزید خراب ہوتا، منظر اور مولوی خادم حسین نے اندر قدم رنجہ فرمایا "تم سب پہنچے ہوئے۔ ابھی تک کسی نے پوچھا نہیں کہ ہم کہاں رہ گئے تھے اور اتنی دیر سے کیوں پہنچے۔"

خادم حسین نے کہا "گاڑی کا ٹائر فلیٹ ہوگیا تھا۔"

"جس سائڈ پر تم بیٹھے ہوئے تھے" منظر بولا "تمہارے گناہوں کے بارے تو ٹریکٹر کا ٹائر بھی برسٹ ہوجائے۔"

"آپ خود برسٹ ہونے والے ہیں۔ آپ کیا ٹریکٹر کے ٹائر سے کم ہیں۔" خادم حسین نے خوش دلی سے کہا اور منظر ہوہو کرکے ہنسنے لگا۔

"گی ڈارلنگ۔" وقار نے بڑے پیار سے کہا۔

گی نے اس کی نقل اتاری "پلیز کافی بنالاؤ سب کے لیے۔"

"تم تو دل کا حال جانتی ہو" وقار نے سر کھجایا۔

"میں تم کو اچھی طرح جانتی ہوں" وہ بولی "تمہارے کہنے سے پہلے ہی میں الیکٹرک کیتل کو پلگ لگا چکی تھی۔ مگر دیکھو۔۔۔ میرے آنے تک کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہیے جو پھر دہرانی پڑے، ورنہ میں نہیں جاتی۔"

رابعہ نے کہا "تم بیٹھو، میں کافی بنا کے لاتی ہوں۔"

فلسطین کی جنگ آزادی میں شامل ایک پاکستانی جاں باز کی ناقابل فراموش جدوجہد

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی

علی یار خان کی سرگزشت

مجاہد

کتابی صورت (گیارہ حصوں میں مکمل) میں تیار ہے

قیمت فی حصہ -/30 روپے۔۔۔ ڈاک خرچ -/16 روپے

گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت صرف -/450 روپے

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس 23

رمضان چیمبرز۔ طوریا اسٹریٹ (نزد دفتر اخبار جنگ) آئی آئی چندریگر روڈ کراچی۔ 74200

رات کے تین بجے صورتِ حال پر غور فرمانے کے لیے ایم آر ایس کے مرد اور زنانہ ارکان کا ہنگامی اجلاس ہوا۔ اجلاس صبح کا اجالا پھیلنے تک جاری رہا۔ اس میں مستقبل کے لائحۂ عمل پر بحث ہوئی جس میں سب سے اہم کردار وکیلوں کا تھا چنانچہ رابعہ، منظر اور وقار یوسف نے بحث میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا اور بالآخر وہ طریقہ وضع کرلیا گیا جو سب سے آسان تھا اور کم سے کم وقت میں سا ے قانونی مسائل حل کیے جاسکتے تھے۔

غالب کی موجودگی میں ہی ڈاکٹر نے دلاور کا معائنہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے انکار کردیا تھا۔ وہ دوائیں کھا کے لیٹ گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نرس بھی کمرے سے چلی جائے مگر نرس بھی سیکیورٹی سسٹم کا حصہ تھی۔ اس نے لائٹس آف کرکے زیرو واٹ کے بلب کی بجائے کم روشنی میں کرسی پر بیٹھنے کو ترجیح دی تھی۔

صبح کا ناشتا سات بجے ہی کرلیا گیا پھر منظر اور وقار یوسف رخصت ہوگئے۔ انھیں آج ایک دن میں بہت سے قانونی مسائل سے نمٹنا تھا۔ دستاویزات تیار کرنی تھیں اور بظاہر ان سب کاموں کے لیے ایک دن بھی کم محسوس ہوتا تھا مگر انھوں نے کہا کہ جیسے بھی ممکن ہوا وہ رات تک اپنا کام ختم کرکے آئیں گے۔ پھر کل رابعہ اور نگی سو گئیں۔ مولوی خادم حسین اپنی گھروالی کو لینے چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں وہ امورِ خانہ داری سنبھالنے میں معاون ثابت ہوگی۔

نیند مجھے اور محسن کو بھی آرہی تھی مگر ہم سو نہیں سکتے تھے۔ ڈاکٹر نے ایک کاغذ پر نیند بھگانے والی گولی کا نام لکھ دیا۔ یہ گولی امتحانات کے زمانے میں وہ پڑھاکو قسم کے لڑکے بھی استعمال کرتے ہیں جو سارا سال کتابیں چاٹتے ہیں یا رٹتے ہیں اور پھر بھی کوئی خاص تیر نہیں مارپاتے کیونکہ ذہانت اور سمجھ کے ساتھ یادداشت کی خدا داد صلاحیت ان کو ورثے میں نہیں ملی۔ اس گولی کے مسلسل استعمال کے مضر... رساں اثرات ہیں مگر کبھی کبھار کے استعمال سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

ساڑھے آٹھ بجے میں دلاور کے پاس گیا تو محسن اور غالب بھی میرے ساتھ تھے۔ حسبِ توقع وہ جاگ رہا تھا اور سخت چڑچڑا ہورہا تھا۔ نرس اسے ناشتا کرانے کی کوشش میں ناکام تھی۔

"جہنم میں گیا ناشتا۔ ناشتا کروں گا میں اس وقت جب میرے بیوی بچے آئیں گے۔ ان ہی کے ساتھ۔"

میں نے کہا "ہم انھیں بلاتے ہیں فون کرکے۔"

اس نے ایک گہری لمبی سانس لی "میں نے رات بڑی اذیت میں گزاری ہے سکندر۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں" میں نے اس کے سامنے ٹیپ ریکارڈر رکھ دیا۔

"اس کا میں کیا کروں؟" وہ بولا۔

"ہم کو جو بھی فون پر کہنا ہے۔ اس میں ریکارڈ کردو۔"

"وہ مشتعل ہوگیا "میں خود فون نہیں کرسکتا' آخر کیوں؟"

"آج اور زیادہ سے زیادہ کل کا دن۔ تم کو حوصلے اور صبر سے کام لینا ہے۔" میں نے کہا "اس کے بعد تم اپنی فیملی کے ساتھ جہاں بھی چاہو رہ سکتے ہو۔ تمہیں مکمل آزادی حاصل ہوگی۔ نہ تمہیں ہمارا خوف ہوگا اور نہ پولیس کا۔ زندگی تمہاری اپنی ہوگی' جتنی بھی ہے۔ کسی کو بھی تمہارے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوگا کہ تم یہاں ہو یا لندن میں یا کسی اور..."

"تم عزت کے ساتھ ہونے والے صلح کے سمجھوتے کو میری شکست کی ذلت میں بدلنا چاہتے ہو" اس نے کہا "حالانکہ یہ..."

"چپ کیوں ہوگئے تم؟ تم ابھی تک اسے شکست تسلیم نہیں کرتے؟ یہ سمجھوتا اور کیا ہے دلاور۔ عزت اور ذلت دینے والا خدا ہے" میں نے کہا "تم سمجھوتا نہ کرتے تو کیا کرلیتے۔ کیا فرق ہے تمہاری چپقلش میں اور ہتھیار ڈالنے میں۔ وقت تمہارے پاس کم ہے، ہمارے پاس بہت وقت ہے۔ تم دنیا کے سارے معاملات کو ایسے ہی چھوڑنا چاہو تو تمہاری مرضی۔ تم جیسے شکاری کو بھی ہم نے محصور کرکے شکار کرہی لیا تھا اسے کیا کہا جائے۔ یہ کس کی بدقسمتی تھی اور کس کی خوش قسمتی کہ ہم سب سے بڑے شکاری نے تمہیں ہم سے بھی چھین لیا۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنی کامیابی کا جشن مناسکتے۔"

"جشن تم اب بھی مناسکتے ہو... اور مناؤگے..." اس نے دھیمے مگر تلخ لہجے میں کہا "یہ شکست کیا تمہاری نہیں ہے کہ تم مجھے تختۂ دار تک پہنچانے میں ناکام رہے۔"

"یہ ہمارے عزائم کی اور ارادوں کی شکست ہے' اور دلاور' اس سے مجھے حضرت علیؓ کا وہ قول پھر یاد آتا ہے کہ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا۔ بندہ اپنے ہر ارادے میں کامیاب ہوجاتا تو خدا کی خدائی کو کیوں تسلیم کرتا۔ ہمیں تو اس نے بروقت خود فریبی اور گمراہی سے بچالیا ورنہ ہم تو واقعی یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم جیسے چاہیں تمہیں مار سکتے ہیں۔ اگر یہ شکست ہے تو ہم اس پر اپنے خدا کے سامنے شکرگزار ہیں۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دلاور نے کہا "مجھے بتاؤ کہ میں کیا کہوں انھیاں کیوں؟"

"تم خود سمجھدار ہو۔ ہم انھیں لے آئیں گے مگر ان کو پتا نہیں چلے گا کہ ان کو کہاں لایا گیا ہے۔ اس کے لیے ہم کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ ہم نے ابھی تک سوچا نہیں۔ ہم ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کے بھی انھیں لاسکتے ہیں اور گاڑی کے شیشوں پر کالا کاغذ بھی چپکا سکتے ہیں۔ تم انھیں سمجھاؤ کہ وہ بحث نہ کریں اور اعتراض نہ کریں۔ مشتعل نہ ہوں اور دھمکی نہ دیں۔ اگر انھوں نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو نقصان ان کا بھی ہوگا اور تمہارا بھی۔ یہاں آنے کے بعد ان کی مرضی کہ تم سے مل کر چلے جائیں یا تمہارے ساتھ ہی رہیں اور جب تمہیں قانونی معاملات سے فراغت ہو تو اپنے ساتھ لے جائیں۔ یہاں ان کو ہر آسائش فراہم کی جاسکتی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ اسی طرح رہ سکتے ہیں جیسے اپنے گھر میں رہتے تھے۔ بس ان کا باہر کی دنیا سے کوئی رابطہ نہیں ہوگا۔ ہم ان کے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک کریں گے۔ ان کی عزت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ یہاں سے جانے کے بعد وہ بالکل آزاد ہوں گے۔ ہم ان سے رازداری کا جو وعدہ کریں گے اس پر قائم رہیں گے۔"

دلاور نے سر ہلایا اور ٹیپ ریکارڈر لے لیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے ریکارڈ کرنے والا بٹن دبادیا اور بولا "بیٹا فیصل۔ یہ میری مجبوری ہے کہ میں تم سے براہِ راست فون پر بات نہیں کرسکتا۔ تم آرام سے میری بات سنو اور اپنی ماں سے بھی کہو کہ اسپیکر والے فون پر سن لیں اور سمجھ لیں۔ میں کوئی بات دہراؤں گا نہیں۔ سوال کوئی مت کرنا کیونکہ میں جواب نہیں دے سکتا۔ یہ ایک ٹیپ ریکارڈ کیا ہوا پیغام ہے۔ میں تم سے براہِ راست مخاطب نہیں ہوں اس لیے ہر بات دھیان سے سنو۔"

میرے اشارے پر اس نے وقفہ دیا۔ میں نے کہا "تم کہہ سکتے ہو کہ یہ ٹیپ انھیں دوبارہ سنایا جائے گا۔"

دلاور نے آگے بولنا شروع کیا "ابھی ابھی مجھے بتایا گیا ہے کہ ٹیپ کو پھر چلایا جائے گا' ایک بار۔ ساری بات ٹھنڈے دل اور دماغ کے ساتھ سن کے ویسا ہی کرنا جیسا میں بتاؤں۔ جذباتی یا مشتعل ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ اپنی ماں سے بھی کہہ دو کہ ان ہدایات کی ذرا بھی خلاف ورزی کی گئی تو نقصان تمہیں بھی ہوگا اور مجھے بھی۔ ہوسکتا ہے پھر یہ ملاقات ٹل جائے۔ شاید کبھی نہ ہو' اگر تم نے میری بات مانی تو پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ میں تمہارے ساتھ گھر چلوں گا۔ اپنی بہنوں کو بھی ساتھ ہی لے آنا۔ خطرے یا فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں پولیس کی تحویل میں نہیں ہوں۔ ایسا میں صرف اپنی حفاظت کے خیال سے کررہا ہوں۔"

میں نے اسے پھر اشارے سے روک دیا "ان سے کہو کہ جو بھی یہ ٹیپ لے کر آئے اس کے ساتھ آجائیں۔"

"تم فون پر نہیں سنواؤگے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ ابھی ابھی میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔"

"اس ٹیپ کو فون پر سنوانے کا ارادہ میں نے بدل دیا ہے" دلاور نے کہا "جو بھی یہ ٹیپ لے کر آئے' تم اس کے ساتھ آجانا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ وہ کون ہوگا مگر ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اسے اپنا... ہمدرد سمجھ... اس کے ساتھ... شرافت سے پیش آنا اور اس سے بحث مت کرنا اور کوئی سوال مت کرنا... کیونکہ اسے کچھ معلوم ہی نہیں ہوگا۔ اس کا کام صرف تمہیں یہاں لانا ہے۔ اگر تم نے پولیس کو یا کسی اور کو اطلاع دینے کی حماقت کی تو بہت خرابی ہوجائے گی' باقی ملاقات پر۔"

www.paksociety.com

اس نے ٹیپ ریکارڈر کو آف کر دیا "کیا تم مطمئن ہو؟"
"بالکل" میں نے کہا "خدا کرے کہ فیصل اور اس کی ماں بھی اتنی ہی سمجھداری سے کام لیں۔ اب اپنے گھر کا پتا سمجھا دو۔"
"وہ میرا گھر نہیں ہے" دلاور بولا "مگر میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ملیں گے۔"

پتا سمجھنے کے بعد میرے غالب اور محسن کے درمیان ایک اور اجلاس ہوا۔ ہم نے اتفاق رائے سے ایک طریقہ کار وضع کیا۔ دلاور کی فیملی کو لانے کے لیے غالب اور نازو جائیں گے۔ ہم پرانی گاڑی میں جو مرحوم نقوی صاحب کی رئیسانہ شان کی مظہر تھی اور اب نگی کے زیر استعمال رہتی تھی' ایک ساتھ روانہ ہوں گے۔ ریگل چوک سے غالب اور نازو ٹیکسی میں منتقل ہو جائیں گے اور دلاور کی فیملی کو لانے کے لیے بھی ٹیکسی استعمال ہوگی۔ سوا چھ بجے بڑی گاڑی پلازا سینما کے مقابل کھڑی ہو جائے گی۔ سب لوگ ٹیکسی کو چیئرنگ کراس پر چھوڑ دیں گے اور پلازا سینما تک پیدل آئیں گے۔ یہ گاڑی لی جائے گی۔"

محسن نے کہا "نگی کے ساتھ کون جائے گا' یہاں کون رکے گا؟"

میں نے کہا "نگی کے ساتھ مرزا غالب جائیں گے اور ان کی گاڑی بھی۔ یہ دلاور کی فیملی کو تیار ہونے کے لیے دس منٹ دیں گے۔ نازو اندر جائے گی اور اس بات کا خیال رکھے گی کہ فیصل کوئی احمقانہ حرکت نہ کرے۔ مثلاً فون استعمال نہ کرے۔ مسلح نہ ہو' ظاہر ہے غالب کو باہر انتظار کرنا ہوگا۔ اسے کوئی ڈرائنگ روم میں تو بٹھائے گا نہیں وہ ٹیکسی میں بیٹھا رہے۔"

نازو اور نگی کو جلد کے اس پروگرام سے اتفاق کیا گیا۔ انہیں ساری بات سمجھنے کے بعد تیار ہونے میں نصف گھنٹہ لگا۔ غالب اتنی دیر میں بازار سے ٹائپ رائٹر میں استعمال ہونے والے کاربن پیپر اور گوند کی شیشی لایا۔ یہ کاغذ اس نے کار کے شیشوں پر اندر کی طرف بڑی صفائی سے لگا کے اس نے بیچ میں سے اندر والے ہینڈل بھی نکال دیے۔ سیاہ کاغذ گاڑی کے پیچھے والے شیشے پر بھی لگا دیا گیا مگر سامنے والے شیشے کو کالا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے والے کو آگے سے سب کچھ نظر آتا تھا۔ اس مسئلے کو محسن نے یوں حل کیا کہ آگے اور پیچھے والی سیٹوں کے درمیان ڈوری سے پردہ تان دیا گیا۔ پردے کی ڈوری کا ایک کنارا پیچھے اور آگے والے دروازے کے بیچ والے حصے سے باندھا گیا اور دوسرا اسی طرح دوسری طرف۔

جب وہ روانہ ہونے لگے تو محسن نے کہا "ہم کیا کریں گے گھر بیٹھ کے؟ انڈے دیں گے۔"
"ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں' انڈے دیں یا بچے۔"
"کیوں نہ ہم ساتھ ہی چلیں۔ دوسری گاڑی میں" محسن بولا۔
"اور یہاں کون ہوگا؟"

"اسے مولوی خادم حسین اٹھا چکے ہیں۔ اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ۔ ان کے ہاتھ میں طمنچے رہے جائیں گے کہ ضرورت پڑنے پر جسے چاہیں نشانہ لے کر داغ دیں۔ یاد رہے جی' دل چاہے تو۔"
"دوسری گاڑی کون سی ہوگی؟"
"آپ کی اپنی' جو آپ کی بیوی جہیز میں لائی ہے۔ اسی رومانی داستان کا ایک ایسا ہی کردار جیسا سوہنی مہینوال کی اسٹوری میں گھڑے کا تھا۔ رابعہ کی لال عروسی فاکس ویگن۔ وہ ضرور آگئی ہے منظر کے ساتھ۔"
"پھر ٹیکسی کی ضرورت نہیں۔ نازو اور غالب فاکس ویگن میں جائیں۔"
محسن بولا "ہم نگی کے ساتھ چلتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ کا وقفہ دے کر بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ نازو ہمیں دلاور کی فیملی کے ساتھ روانہ ہونے سے پہلے فون کر کے اطلاع دے کہ سب ٹھیک ہے۔ ہم اس کے بعد جائیں۔"

غالب اور نازو کو یہ سمجھا کے فاکس ویگن دے دی گئی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے مولوی خادم حسین کو ساری صورت حال سمجھائی اور ریوالور تھما دیا۔ "اس میں چھ گولیاں ہیں۔ پانچ سے تم خودکشی کر دینا' اپنی منکوحہ کے ہاتھوں شوق سے قتل ہو جاؤ۔ ہمیں اعتراض نہیں۔ مگر ایک گولی ضرور بچانا' دلاور کے لیے۔"
"ایسی بھیانک باتیں مت کریں جی' صاحب!" وہ بولا "اللہ بچائے حرام موت سے۔"
"دلاور کو بھی ایسے ہی غصے میں مت مار دینا۔ کبھی تم اس سے کہو کہ چل سیدھے میرے پاس رہ۔ اور وہ انکار کرے تو تم دھائیں سے توپ چلا دو۔ کشتوں کے پشتے لگا دو۔"
"اور خبردار جو گولی چلانے سے کوئی شیشہ بالکل ہی ٹوٹا" نگی نے بھی اسے ڈانٹنا ضروری سمجھا "تمہارا نشانہ ایسا ہی ہے۔"
"حد کرتی ہیں جی آپ بھی..." وہ خفا ہو گیا۔
محسن نے کہا "تمہیں شادیاں کرنے کا بھی بہت شوق ہے۔ کہیں تیسری کرنے کے چکر میں دوسری کو ٹھکانے مت لگا دینا۔"
خادم حسین نے ریوالور پھینک دیا۔ "لعنت ہے ایسے کام پر جناب جس کی خاطر ایسی باتیں سننی پڑیں۔ دل خراش اور جگر خراش۔"
"گردے خراش اور پھیپھڑے خراش... اور سمع خراش۔ یار مولوی خادم حسین' تم بغیر کانوں والے خرگوش ہو۔"
"خرگوش کہتے ہیں جی فارسی میں کان کو۔ بے گوش ہوا تو خر ہوگیا۔ مجھے گدھا سمجھتے ہیں آپ؟"
"تم کو حقیقت شناس ہونا چاہیے۔ خیر اب ہم جا رہے ہیں اور اگر واپسی پر یہ ریوالور ہمیں یہیں ملا تو ہم اسے دے دیں گے تمہاری پہلی بیوی کو۔ ہمیں معلوم ہے وہ کہاں رہتی ہے۔ اسے تمہارا پتا بھی بتا دیں گے" محسن بولا۔

www.paksociety.com

مولوی غلام حسین نے فوراً ریوالور اٹھالیا "اگر اللہ مجھے ایک خون معاف کرے تا بھی تو مجھے سوچنا پڑے گا کہ منظر صاحب کو ہلاک کروں یا آپ کو۔"

میں نے کہا "معاف کر لینا یار۔ سوچنے کے لیے تو دماغ کی ضرورت پڑتی ہے۔ دس پیسے کا نکٹ مجھ سے لے لینا۔"

فون کی گھنٹی بجی تو غلام حسین کی جان چھوٹی۔ فون نازو نے کیا تھا "سب ٹھیک ہے۔ تم پہنچ جاؤ۔"

"تم عمل کیسا رہا؟" میں نے کہا۔

"جیسا متوقع تھا گھر میں نے کنٹرول کر لیا۔ ہم دس منٹ میں روانہ ہوں گے۔"

میں نے کہا "ہم سوا دس منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے تم بات ختم کر کے فون کو قتل کر دو، میرا مطلب ہے ڈیڈ کر دو۔"

"غالب باہر ہے یہ کام کرے گا" وہ بولی۔

"گھر کے ملازم چوکیدار وغیرہ سے تو اندیشہ نہیں۔"

نازو نے کہا "یہاں ایسی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ یہ ایک عام سی جگہ ہے۔ غالباً خفیہ پناہ گاہ۔ گھر میں صرف ایک ملازمہ ہے اسے کچھ پتا نہیں۔" نازو نے کہا پھر لائن کٹ گئی۔

گل نے محسن سے کہا تھا کہ گاڑی وہ چلائے مگر اس نے صاف انکار کر دیا "مجھے یہ گاڑی زعب زدہ لگتی ہے گل بُرا مت ماننا۔"

"پاگل ہو تم۔"

"نہیں۔ مگر میں نے بھی تمہاری بات کا بُرا نہیں مانا" محسن نے دانت نکال کے کہا۔

میں نے کہا "بات یہ ہے گل کہ ہم پردے میں بیٹھیں گے تم اسے ہی ضرور چلا رہنا۔ تمہیں معلوم ہے ناپلازا سینما؟"

"کیوں نہیں معلوم۔ میں نے فلم چن ماہی یا شاید ماہی منڈا دیکھی تھی۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "گل۔ وہاں انگلش فلمیں چلتی ہیں۔ پیچیز بنک کراس سے دائیں ہاتھ۔ اب یہ مت پوچھنا کہ پیچیز بنک کراس کدھر ہے؟"

ہمارے پہنچنے کے پانچ منٹ بعد رابعہ کی فاکس ویگن نمودار ہوئی اور ہماری گاڑی کے متوازن رک گئی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر دلاور کی فیملی کے چار افراد افسردگی، بے بسی اور اشتعال کے ملے جلے جذبات کی تصویر بنے بیٹھے تھے میں اور محسن بائیں جانب والے دروازے سے نکل گئے وہ چاروں دائیں دروازے سے نقوی صاحب کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ دلاور کی بیوی پہلے کچھ گداز بدن کی تھی مگر اب باقاعدہ موٹی ہوگئی تھی اور اس پر جیسے اچانک عمر نے حملہ کر دیا تھا۔ اس کا بیٹا فیصل باپ کا نقشِ ثانی تھا تو دونوں بیٹیاں ماں کے زمانۂ شباب کی تصویر اور بے انتہا حسین تھیں۔ رونے سے ان کی آنکھیں کچھ لال اور سوجی ہوئی لگتی تھیں۔

فیصل نے مجھے قاتلانہ نظروں سے گھورا مگر ماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے یاد دلایا کہ وہ خود کو کنٹرول میں رکھنے کا پابند ہے۔ دلاور کی بیوی کی آنکھوں میں مجھے صرف شکایت اور مایوسی نظر آئی۔ وہ کم ہمت عورت نہیں تھی مگر اسے رشتے نے اور نصیب نے زندگی کی بہت سی خوشیوں سے محروم رکھا تھا جو اسے مفت مل سکتی تھیں مگر انمول تھیں۔ ابھی تک اسے معلوم نہیں تھا کہ کچھ دیر میں اسے وہ خبر ملنے والی ہے جو اس کی زندگی کو ویران کردے گی اور اس کی دنیا اُجاڑ دے گی۔ اسے بیوہ اور اس کے بچوں کو یتیم کردے گی۔ اور یہ کسی جنتاری عدالت کا نہیں مقدر کا فیصلہ ہوگا جو بہت پہلے سنایا جا چکا تھا مگر وہ آج جانے گی۔

میں اور محسن فاکس ویگن میں جا بیٹھے۔ اس کی اگلی سیٹ پر سے اتر کے نازو اب گل کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ گل نے اپنی گاڑی آگے رکھی۔ غالب نے بتایا کہ کیسٹ ان کے فیصل نے ہنگامہ کیا تھا مگر اس کی ماں نے اسے کنٹرول کر لیا۔ لڑکیوں نے بہت رونا دھونا کیا تھا۔ ایک مرحلے پر فیصل غصے میں ریوالور نکالنا چاہتا تھا مگر نازو نے اسے لات مار کے دیوار سے لگا دیا تھا اور سمجھایا تھا کہ بدمعاشی بھول جائے جیسے اس کا باپ ساری بدمعاشی بھول گیا ہے۔ اس کی بیوی نے کہا کہ کم سے کم بچوں کے سامنے ان کے باپ کو ایسا مت کہو۔ نازو نے کہا پھر کیا کہوں۔ پیکرِ شرافت و انسانیت اور مجموعۂ خوبی "فرشتہ سیرت" عالی حضرت قبلہ و کعبہ جناب چوہدری دلاور حسین صاحب مدظلہ کہوں۔ ویسے اندر سے سب کی حالت خراب ہے۔ ان کو اندازہ ضرور ہوگیا ہے کہ خیر اچھی نہیں۔ دلاور کی بیوی نے پوچھا تھا کہ تم لوگوں نے دلاور کو مار دیا ہے بارہ میرے والا ہے تو مجھے بتا دو۔ نازو نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم نے اسے انگلی تک نہیں لگائی۔ کیسٹ میں اس کی آواز ہے۔ وہ کہنے لگی کہ کیسٹ سے تاریخ کا تو پتا نہیں چلتا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے نقوی صاحب کی کوٹھی کے پھاٹک سے گزر گئیں تو پھاٹک بند ہوگیا۔ اس کی فصیل نہ نوفٹ اونچی تھی اور فولادی پھاٹک بھی اتنا ہی بلند تھا۔ فیصل نے اور پھر اس کی ماں نے کار سے اترنے کے بعد ادھر ادھر دیکھا تو انہیں مسلح محافظ نظر آئے۔ دونوں لڑکیاں بہت سہمی ہوئی تھیں۔ گل اور نازو انہیں اندر لے گئیں۔

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ ایک محافظ نے فیصل کی مکمل تلاشی کے دوران ریوالور برآمد کر لیا جو اس نے اپنی جراب میں چھپالیا تھا۔ نرس نے عورتوں کے بیگ رکھے اور ان کی جسمانی تلاشی لے کر انہیں دلاور کے کمرے میں جانے کی اجازت دے دی۔

دوپہر گزر گئی۔ مولوی غلام حسین کی بیوی نے سب کے لیے کھانا تیار کیا تھا۔ دلاور اور اس کی فیملی کے لیے لنچ کی ٹرالی وہ خود اندر چھوڑ کے آئی۔ پھر ہم سب نے بھوک نہ ہونے کے باوجود کھانے کی رسمی کارروائی پوری کی۔ اس صورتِ حال نے سب پر

ایک عجیب سی بوجھل اضطرابی کیفیت طاری کردی تھی۔ میں غالب اور محسن کے ساتھ ڈرائنگ روم کے قالین پر لیٹا اور سو گیا۔ ہم سب خاموش تھے اور آنے والے دن کے بارے میں سوچ رہے تھے جب ہمیں گرفتاری پیش کرنا تھی۔ جو شاید دلاور سے ہمارے تعلق کا آخری دن تھا۔ کمرے میں صرف اے سی کی خنک سرسراہٹ تھی۔

چار بجے گل نے مجھے بیدار کیا۔ میں اُٹھا تو مجھے دلاور کی بیوی صوفے پر بیٹھی نظر آئی۔ وہ رو رہی تھی۔ دوسرے صوفے پر فیصل بیٹھا ہوا تھا اور وہ ساری رپورٹ پڑھ رہا تھا جو لندن کے ماہرین داکٹروں نے دی تھیں۔ اس کی ساری اکڑفوں ختم ہوگئی تھی اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

میں نے کہا "ڈئیر آئی ایم سوری..."

"کیوں؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے سکندر۔ تمہارے دل کی مراد بر آئی۔"

"میں نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا۔"

وہ تلخی سے بولی "اچھا۔ اس بات کا افسوس ہے تمہیں کہ دلاور تو پھانسی لگوانے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔"

میں نے کہا "اگر اس کا مقدمہ عدالت میں جاتا تو شاید وہ بچ جاتا۔ آپ اسے بچالیتیں۔ دنیا بھر کے قابل وکیل مل کے اسے بچالیتے میں جانتا ہوں۔"

فیصل خلا میں دیکھتے ہوئے بولا "اگر ہم انہیں امریکا لے جائیں؟"

میں نے کہا "ضرور لے جاؤ۔ جہاں بھی اُمید کی کوئی کرن نظر آئے وہاں ضرور جاؤ۔ تاکہ تمہیں پچھتاوا نہ رہے بعد میں کہ تم جو کچھ کرسکتے تھے وہ بھی نہیں کیا۔"

"کوئی فائدہ ہوگا اس سے...؟"

"میری معلومات اور ڈاکٹروں کی رائے پر مو قیصد بھروسا مت کرو۔ خدا کی قدرت میں کیا نہیں ہے۔ بعض اوقات دوا کارگر نہیں ہوتی دعا کام کر جاتی ہے۔ معجزے میڈیکل سائنس کی ہسٹری میں بھی درج ہوجاتے ہیں۔"

"میں نے۔ اپنی بہنوں کو کچھ نہیں بتایا ہے۔ اس بیماری کے بارے میں؟" وہ بولا۔

"جیسی تمہاری مرضی؟" میں نے کہا۔

"سکندر..." دلاور کی بیوی نے کہا اور پھر طویل خاموشی کے بعد بولی "شکریہ بولا۔"

"کس بات کا؟" میں نے کہا۔

"تم نے اسے... میرے حوالے کرنے کی بات مان لی۔"

"لیکن یہ قیمت دی ہے یہ بھی دیکھو..." فیصل بولا۔

"یہ تم قیمت کہہ رہے ہو تو وہ میرا حق تھا۔ میں سر حال لے سکتا تھا اور اگر قیمت سمجھتے ہو... تو اس کی قیمت سے اپنے بابا کی زندگی خرید کے دکھاؤ۔ مجھے فیصل! میں سب رکھوں دوں گا تمہارے لیے۔"

"اس کی بات کا بُرا مت مانو۔ یہ نوجوان ہے لیکن تم جیسا نوجوان نہیں ہے۔ اس کا خون گرم ہے ابھی۔" دلاور کی بیوی نے کہا۔

"ہم بابا کو یہاں سے لے کر جائیں گے" فیصل بولا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر سمجھتے ہو تو اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ یہ میرا گھر بھی نہیں ہے۔ پھر بھی یہ گھر ہے اور یہاں وہ سب کچھ تمہیں فراہم کیا جاسکتا ہے جو تمہارے اپنے گھر میں تھا اور ہے۔"

رابعہ اور منظر کے ساتھ رفتار یوسف شام کو ذرا سی دیر کے لیے آیا۔ پھر رابعہ رُک گئی۔ رفتار یوسف اور منظر اپنے آفس چلے گئے۔ انہیں بہت سی دستاویزات تیار کرنی تھیں۔ رابعہ نے وہیں سے فون کر کے اپنے دو وکیلوں کو ان کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے کہا۔

"آپ خود کہاں ہیں سر؟" ایک وکیل نے کہا "بہت سی باتیں آپ کے طے کرنے کی ہیں۔"

دلاور نے کہا "تم رابعہ کے چیمبر میں جاکے صرف قانونی ضرورت پوری کروگے۔ سارے فیصلے وہ خود کریں گے۔ تم کسی فیصلے پر اعتراض نہیں کروگے۔ تمہیں نہیں پوچھا جائے گی مگر تمہارے سوا کسی کو کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے ورنہ تم دلاور کو جانتے ہو نا۔ میں صرف اطاعت چاہتا ہوں... غیر مشروط۔"

"یس... یس سر" اس نے کہا۔

رات آٹھ بجے نقوی صاحب کی اسٹڈی میں ایک قانونی دفتر کھل گیا۔ وہاں دلاور کے دو سینئر وکلا موجود تھے جو منظر اور رفتار یوسف کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے۔ رابعہ ہر دستاویز کو خود بھی دیکھ رہی تھی۔ دلاور وہاں ایک گھنٹا موجود رہا اور اس نے اپنے وکیلوں کو مفصل ہدایات دیں۔ دلاور کی کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ کیوں کر رہا ہے؟ مگر دلاور نے انہیں واضح الفاظ میں بتادیا تھا کہ اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ یہاں صرف قانونی صورتِ حال کی وضاحت اور پیچیدگی دور کرنے کے لیے آئے ہیں۔ دلاور کو اچھا بُرا سمجھانے نہیں۔

خود میں نے یا محسن نے کسی معاملے میں دخل اندازی نہیں کی۔ اگر ہم کوئی بات کرتے تھے تو منظر شور مچاتا تھا "بے وقوف ہو یہاں سے بھوتنی کے، یہ قانونی معاملات ہیں، ان میں ٹانگ مت اڑاؤ۔"

"پھر کیا اڑاؤں" مولوی غلام حسین کہہ رہا ہے کہ میں آپ کے گھر چلا جاؤں... آج رات..."

"ہاں ہاں... میں تو مصروف ہوں۔ گل، تمام کام لیتا جا مجھ سے۔ جب تک مجھے فرصت نہ ہو میرے تمام ازدواجی خدمات

www.paksociety.com

اس کے..... کیوں ٹھیک ہے غلام حسین؟ قائم مقام شوہر بن جاؤ جائز طریقے سے۔ ناجائز تعلقات تو قائم کر ہی رکھے ہیں تم نے میری بیوی سے۔"

"وستغفراللہ..... استغفراللہ کس قدر گناہ کی بات ہے۔ اللہ آپ کو معاف نہیں کرے گا منظر صاحب۔ آپ تو پاگل ہیں' ذہنی مریض ہیں۔"

"پھر تو اللہ معاف کردے گا مگر جو کچھ تم بقائمی ہوش و حواس کررہے ہو۔ اس پر اسپیشل سیل میں رکھا جائے گا تم کو۔ جہنم کا شاہی قلعہ سمجھ لو۔ خصوصی چھترول ہوگی تمہاری۔"

رات گیارہ بجے تمام دستاویزات تیار ہوگئیں۔ رابعہ اور منظر نے ان کو اوکے کیا پھر دلاور نے۔ دلاور کے وکیلوں نے اس کے دستخط کرانے کے بعد قانونی شناخت اور گواہی کے طور پر اپنے اپنے سائن کیے۔ ساڑھے گیارہ بجے کال چلی گئی تو منظر باہر گیا اور واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک اجنبی تھا۔ وہ مجسٹریٹ تھا۔

دلاور کی دونوں بیٹیاں ایک الگ بیڈ روم میں سوگئی تھیں۔ ان کو دلاور نے زبردستی سونے کے لیے بھیج دیا تھا۔ فیصل اور اس کی ماں جاگ رہے تھے۔ مجسٹریٹ کو اس کمرے میں لے جایا گیا جہاں دلاور کے ساتھ نرس اور ڈاکٹر بھی موجود تھے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ ایک شخص مرنے سے پہلے مجسٹریٹ کے سامنے کوئی بیان دینا چاہتا ہے۔ وہاں جو کچھ ہو رہا تھا پہلے سے طے تھا اور یہ منظر کے علاوہ رابعہ کے دیگر ساتھیوں کی کوشش کا نتیجہ تھا مگر قانونی ضابطہ کار کے خلاف کچھ نہیں تھا۔

"تم نے یہ بیان پڑھ لیا ہے؟" مجسٹریٹ نے کہا۔

"جی' پڑھ لیا ہے اور سمجھ لیا ہے۔ میرے وکیلوں نے سمجھایا ہے۔"

"اور یہ دیگر دستاویزات؟"

"یہ بھی میری مرضی اور منشا کے مطابق تیار کی گئی ہیں۔ کسی دباؤ کے بغیر بقائمی ہوش و حواس۔"

دلاور نے دفعہ ۱۶۴ کے تفصیلی بیان پر' سیل ڈیڈ' گفٹ ڈیڈ' ٹرانسفر پیپرز اور سیٹلمنٹ کے سب کاغذات پر پہلے ہی دستخط کردیے تھے۔ مجسٹریٹ نے اپنی موجودگی میں اس سے ہر صفحے پر دستخط لیے اور پھر سارے بیانات کی تصدیق کردی۔ اس نے ہر صفحے پر مہر لگائی اور دستخط کیے۔ اس کارروائی میں رات کا ایک بج گیا۔ تاریخ بدل گئی۔ یہ ساری کارروائی مکمل خاموشی کی بوجھل فضا میں مکمل ہوئی تھی۔ کمرے میں ہم سب تھے۔ دلاور کی فیملی میں سے فیصل تھا اور اس کی ماں تھی جو مسلسل رو رہی تھی۔ خود فیصل اسے چپ کرانے کی کوشش میں باربار آنسو صاف کرتا تھا۔

درمیان میں ڈاکٹر نے دلاور کا معائنہ کیا اور نرس نے انجکشن لگائے۔ دلاور کے وکیل خاموش کھڑے رہے۔ مجسٹریٹ کے لیے یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ صورت حال سنگین ہے اور ممکن ہے یہ مریض کی زندگی کی آخری رات ہو۔ ڈاکٹر کے علاوہ وکیلوں کی موجودگی سے ثابت ہوتا تھا کہ کسی معاملے میں کوئی گھپلا نہیں۔ وہ سب وکیلوں کو ذاتی طور پر بھی جانتا تھا۔ وہ سینئر وکیل تھے۔ مجسٹریٹ رات کے ایک بجے رخصت ہوگیا۔

دلاور نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھایا "مبارک ہو سکندر بخت!"

پہلی بار اس نے مجھے اپنے سکندر صاحب یا سکندر اعظم کے بجائے سکندر بخت کہا تھا۔ اس کی بیوی نے ایک چیخ ماری اور جہاں کھڑی تھی وہیں گر کے بے ہوش ہوگئی۔

میں نے ایک لمحہ تذبذب میں گزارا پھر اس کا ہاتھ تھام لیا "یہ مبارک باد دینے کا کوئی موقع نہیں' افسوس کی بات ہے دلاور کہ جو ہوا اگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ یہ سب بہت برا ہوا' بہت برا۔ اللہ تمہیں معاف کرے۔"

دلاور کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے "تم نے مجھے معاف کردیا ہے نا؟"

"ہاں' میں نے اپنے باپ کا خون تمہیں معاف کردیا ہے" میں نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

باہر دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے لگی رابعہ رو رہی تھی۔ اسے چپ کرانے والی نگی بھی رو رہی تھی۔ گل خاموش تھی اور محسن خاموش تھا۔ نازو غائب تھی۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں روتے دیکھا۔ اسے غالب خاموش کرانے میں مصروف تھا۔ یہ عداوتوں اور نفرتوں کا لاوا تھا جو آج آخری بار بہہ رہا تھا۔ یہ لاشوں اور دکھوں کے ناسوروں کا زہر تھا جو آخری بار بہہ رہا تھا۔ یہ ندامتوں اور پچھتاووں کا سیل اشک تھا جو آخری بار بہہ رہا تھا۔ جنگ کوئی شطرنج کی بازی نہیں ہوتی۔ کرکٹ نہیں جس میں فاتح کو ورلڈ کپ مل جائے۔ ٹینس کا میچ نہیں جس میں ومبلڈن کا چیمپئن وہ کہلائے جو اپنے حریف کو ہرا دے۔ جنگ صرف جنگ ہوتی ہے۔ جنگ صرف تباہی اور خرابی لاتی ہے۔ اس کے لیے بھی جو سمجھتا ہے کہ وہ جیت گیا اور ہارنے والے کے لیے بھی۔ جنگ نفرت سے پھوٹنے والا پھول ہے جس میں صرف کانٹے نکلتے ہیں۔ یا ایھا الانسان اے آنکھیں رکھنے والو اور عقل رکھنے والو' تمہارے لیے اس میں سیکھنے کو اور سمجھنے کو بہت کچھ ہے۔ پھر تم کیوں امن اور محبت کے بیج نہیں بوتے۔ کیوں دلوں کی زمین کو ہوس سے پاک کرکے قناعت سے آبیاری نہیں کرتے کہ جب پیار کے خوش رنگ پھول کھلیں تو تم کو یہ دنیا بھی جنت ہی محسوس ہو۔

صبح ہم اپنے قانونی مشیران کے ہم رکاب اپنی اجتماعی گرفتاری پیش کرنے گئے جیسے سیاسی لیڈران سرکاری مہمان بن جاتے ہیں۔ رابعہ اور منظر نے ہمیں یقین دلایا کہ سب پہلے سے طے شدہ ہے۔ ادھر پولیس ہمیں گرفتار کرے گی ادھر عدالت میں ہماری پھر ضمانت کے لیے درخواستیں دائر کردی جائیں گی۔ عدالت عالیہ کے روبرو چوہدری دلاور کا بیان بعد میں پہنچے گا۔ پہلے اسے

ڈسٹرکٹ سیشن جج کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ ضمانت نامے تیار ہیں۔ ضامن تیار ہیں۔ وکیل سرکار کو آج ہی نوٹس جاری ہوگا اور کل تک ضمانت منظور ہوجائے گی۔

تھانہ انچارج پہلے سے یوں ہمارا منتظر تھا جیسے دلہن والے برات کی آمد کے منتظر ہوتے ہیں۔ وہ ایک پرانا پاپی تھا مگر اس کو ہر طرح سے سمجھا دیا گیا تھا۔ ملک کے عوامی طریقے سے بھی اور اوپر والوں کے اشارے سے بھی چنانچہ اس نے ہمارا استقبال بھی دلہن کے ابا کی طرح کیا۔

"آؤ جی سرکار جی' ہمارے تو نال ہی دو گئی ہے سواری" اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ پھر محسن' غالب اور نازو سے۔

میں نے کہا "ایک نہ ایک دن تو آنا ہی تھا جی لوٹ کے" میں نے کہا۔

"آپ سے بڑا شوق تھا ملنے کا۔ بڑے قصے سنے ہیں جی آپ کے۔ میں تو خیر ادھر رہتا ہوں مگر پرانے لوگ اپنے ہی ساتھی ہیں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "پہلے تم ہمیں گرفتار کرلو۔ باقی باتیں بعد میں۔"

"کیوں نہیں جی۔ جیسا حکم آپ کا۔ اوئے عزیز' کوبولو روز نامچہ لائے" اس نے بے آواز... بلند کہا "اور چائے شائے بھی۔"

باہر سے غائبانہ آواز آئی "لیس سر جی۔"

رابعہ' منظر اور وقار یوسف نے کہا "ہم تو چلتے ہیں۔ عدالت میں بھی ہمارا انتظار ہوگا۔ ہم دیر کرنا نہیں چاہتے۔"

ایس ایچ او کے اصرار کے باوجود وہ چائے پیے بغیر چلے گئے۔ ہم بھی ناشتا کرکے آئے تھے مگر تھانے دار کے خلوص اور مہمان نوازی کے جذبات کو مجروح کرنا مجھے اچھا نہیں لگا۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ مجھے وہ رات یاد آئی جب پہلی بار مجھ سے تھانے میں روایتی طریقے سے تفتیش کی گئی تھی۔ میرے سر کے اوپر بالٹی اُلٹی رکھ کے باہر سے ڈنڈوں اور سریوں سے بجایا گیا تھا اور اس شور محشر نے مجھے کئی بار بے ہوش کیا تھا۔ میرے اعصاب کا نظام وقتی طور پر مفلوج ہوگیا تھا اور میں نہ کھڑا ہوسکتا تھا اور نہ اپنی مرضی سے ہاتھ پاؤں ہلا سکتا تھا۔ مجھے پیشاب پاخانے پر کوئی کنٹرول نہیں رہا تھا۔ میں گوشت پوست کا ایک صحیح سالم نظر آنے والا بے ہنگم ڈھیر بن گیا تھا۔ وہ چوہدری دلاور کے در پر حاضری دینے والے پولیس افسران تھے جنہوں نے اس سے منہ مانگا معاوضہ لے کر مجھے دل کھول کے تختہ مشق بنایا تھا اور میرے خلاف اس کی خواہش کے مطابق مقدمات درج کیے تھے۔

آج دلاور بظاہر صحیح سالم نظر آنے والا گوشت پوست کا ڈھیر تھا مگر قانون کے محافظ اس کی طرف داری چھوڑ کے میری حمایت کررہے تھے اور میری مرضی اور خوشی کے مطابق اسی طرح پیش آرہے تھے جیسے مالک کے اشارے کو سمجھ کے کتا دم ہلاتا ہے۔ میں نے ایک ایک کرکے سارے دشمنوں کو ٹھکانے لگایا تھا اور ساری مشکلات پر قابو پالیا تھا۔

مجھے اپنی داستان حیات میں مغل شہنشاہ ہمایوں کے حالات زندگی کی واضح جھلک محسوس ہوئی تھی جس نے ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ پھر حکومت گنوائی' دربدر ہوا' جلاوطن ہوا۔ بڑی مشکل سے جان بچاکے ایران پہنچا اور پھر اپنے دوستوں کی مدد سے دوبارہ ہندوستان لوٹا۔ دشمنوں کو شکست دی اور پھر اپنی حکومت ایسے قائم کی کہ اس کا بیٹا اکبر اعظم ہوا۔ میں نے بھی سب کچھ گنوا کے پھر پایا تھا اور بڑی خواری برداشت کی تھی۔ مجھے میرا حق اور انصاف دلانے کی اس جدوجہد میں خدا کے بعد سب سے زیادہ میرے دوستوں کی مدد شامل تھی' جنہوں نے میری خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ جان و مال' عزت آبرو' مستقبل۔ ایم آر ایس تو ایک مذاق کی بات تھی مگر یہی وہ حقیقت بھی تھی جس کی طاقت نے مجھے اور میرے دوستوں کو سرخرو کیا تھا۔ یہ واقعی مائٹ از رائٹ سوسائٹی بن چکی تھی جس میں ہم اصول اور قانون کے کتابی نظریات اور پچھلی صدی کے اقوال زریں پر عمل کرکے نہیں جی سکتے تھے۔ ظلم کی کھیتی سدا چلتی نہیں۔ ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں۔ آج مشکلات کے سارے دریا اور سمندر انہی کشتیوں سے عبور ہوئے تھے جو قائد اعظم کی تصویروں والے کاغذوں سے بنی ہوں۔ ظلم کی کھیتی خوب پھل پھول رہی تھی۔ حق کا بول بالا اور دشمن کا منہ کالا' والی بات گوروں کے مہذب جمہوری اور ترقی یافتہ معاشرے میں بھی کالوں کو ان کا حق نہیں دلاتی تھی۔ اب چراغ تلے نہیں چراغ کے اوپر اندھیرا ہوتا تھا۔

ہمارے آرام کے لیے تھانے کا ایک کمرا مختص کردیا گیا تھا جہاں ویسے تو خود ایس ایچ او صاحب استراحت' تفتیش اور عیش کرتے تھے۔ حسب ضرورت۔ اس میں ایک بیڈ تھا' ایک صوفہ سیٹ اور اے سی جس کی خنکی میں اور اسی کمرے کی پرتکلف مہمان نواز فضا میں اس غلیظ' بدبودار اور اذیت ناک... حوالات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا جس میں اس وقت بھی بہت سے بدبخت اور سکندر بخت پڑے تھے۔ کچھ گزشتہ شب تفتیش کے عمل سے گزر چکے تھے۔ کچھ پر آج کی رات بھاری تھی۔ ان کے ورثا پریشانی میں دوڑ بھاگ کررہے تھے۔ نذرانے لا رہے تھے۔ سفارشیں لا رہے تھے۔ کس پر کیا فرد جرم عائد کی جائے۔ کس مجرم کے سارے گناہ معاف کرائے جائیں۔ مزید کتنے مجرم درکار ہیں۔ بھاؤ تاؤ' نرخ' سودے' تھانے کا سارا کاروبار اپنی ساری...... روایات کے ساتھ جاری تھا۔

رابعہ کے ساتھ منظر اور وقار یوسف شام کو لوٹے تو بہت خوش اور مطمئن تھے۔ چوہدری دلاور کی طرف سے تمام دستاویزات پیش کردی گئی تھیں اور قبول کرلی گئی تھیں۔ رجسٹرار کے دفتر میں بھی تمام کاغذات داخل ہوگئے تھے اور ان کی رسید مل گئی تھی۔

www.paksociety.com

مجسٹریٹ نے چوہدری دلاور کے اقبالی بیان پر نوٹ لکھا تھا کہ اسے فلاں فلاں وکیل نے رات کے وقت کسی ایک قریب المرگ شخص کا بیان لینے کے لیے کہا اور اس کی اہمیت کے پیش نظر میں نے چوہدری دلاور نام بتانے والے اس شخص کا بیان ریکارڈ کیا جس کو وکیلوں نے شناخت کیا اور اس نے میری موجودگی میں اپنے دستخط ثبت کیے۔ بیان بلاجبر کراہ اور بقائمی ہوش و حواس دیا گیا تھا اور اس کے گواہ بھی وکیل ہی ہیں۔

اسی شام چوہدری دلاور کو اس کی بیوی بچے اپنے ساتھ لے گئے اور نقوی صاحب مرحوم کی وہ کوٹھی پھر ایسے بند کردی گئی جیسے کبھی کھولی ہی نہیں گئی تھی۔ عدالت کے حکم پر جب چوہدری دلاور کی گرفتاری کے لیے پولیس نے اس جگہ چھاپا مارا تو اسے گیٹ مقفل ملا اور بعض شاہدین نے بتایا کہ مذکورہ پتے پر اب کوئی نہیں رہتا۔ اس کے مالک نقوی صاحب کے انتقال کے بعد سے کوٹھی میں کسی نے رہائش اختیار نہیں کی۔ نقوی صاحب کے ورثا کے بارے میں کسی کو علم نہیں کہ وہ کہاں ہیں... وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ چوہدری دلاور مفرور و مطلوب مجرم زیر دفعہ فلاں فلاں۔ ضابطہ فوجداری و دیوانی' ہنوز لاپتا ہے۔ پولیس اسی قسم کی رپورٹیں دیتی رہتی ہے۔ بعد میں وکیلوں نے کہا کہ سارے بیانات اور دستاویزات انہوں نے اپنے موکل کی ہدایت کے مطابق تیار کیے تھے اور یہ ہدایات انہیں ٹیلی فون پر نامعلوم مقام سے موصول ہوئی تھیں۔ ایسا فرض کیا جاسکتا ہے کہ چوہدری دلاور نے ایک دن کے لیے اس کوٹھی میں رسائی حاصل کرلی تھی جہاں مجسٹریٹ نے اس کے بیان کی تصدیق کی اور اس کے بعد وہاں سے نامعلوم مقام پر روپوش ہوگیا۔ عدالت اس کی بازیابی کے لیے نئی ہدایات جاری کرسکتی ہے۔

آن دی ریکارڈ وہ رات ہم نے حوالات میں گزاری۔ آف دی ریکارڈ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب نے وہ رات وقار یوسف کے گھر میں گزاری جہاں گل نے ہم سب کے لیے ایک شاہانہ ضیافت کا اہتمام کررکھا تھا۔ اس نے سارا دن انتظامات کے آرڈر دیتے گزارا تھا۔ اس نے اپنے گھر کی چھت پر یہ چھوٹی سی تقریب رکھی تھی۔ "یہ تمہید ہے" اس نے کہا "ان گنت شاندار تقریبات کے سلسلے کی۔ اُف۔ میں تو سوچ سوچ کے پاگل ہورہی ہوں کہ کیا مصروفیت کا زمانہ آنے والا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا یہ سب کیسے ہوگا۔ تم لوگ ایک شیڈول بناؤ۔"

میں نے کہا "کیسا شیڈول؟"

"بھئی حد کرتے ہو تم بھی۔ کتنی شادیاں ہیں جو مجھے ارینج کرنی ہیں۔ تمہاری اور رابعہ کی' غالب اور نازو کی' گل اور محسن کی۔"

"ہمارے حساب سے شادی شدہ ہیں خاتون" غالب نے کہا۔

"اجی چھوڑو۔ ایسے ہوتی ہیں شادیاں۔ شادیاں جب ہوں گی تو پتا چلے گا سارے شہر کو۔ ہاں' نمبر لگالو' قرعہ اندازی سے یا چلو پہلے تم ہی کرلو۔ مگر بھئی ایک ہفتے میں ایک شادی۔"

خادم حسین نے منمنا کے کہا "ایک میری بھی تو ہے جی۔"

"تمہاری... ہاں کیوں نہیں" گل نے کہا "تم کیا ہم سے الگ ہو۔"

اس رات ہم سب خوش تھے۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ چوہدری دلاور کہاں ہے۔ ہم سب ہنس رہے تھے' ایک دوسرے سے مذاق کررہے تھے۔ منظر اور خادم حسین لڑ نہیں رہے تھے۔ نازو اور غالب بھی نہیں لڑ رہے تھے۔ دنیا بدل گئی تھی۔ سب کے لیے یا سب نے مل کے دنیا کو بدل دیا تھا۔

○✲○

حرفِ آخر

چھ ہفتے بڑی مصروفیت کے تھے۔ میں نے لندن سے واپس آنے کے بعد ایک ایسی زندگی گزاری تھی جس میں خانہ بدوشوں کی زندگی سے زیادہ بے ترتیبی اور انتشار کی کیفیت تھی۔ کوئی معمول اور نظم وضبط نہیں تھا۔ جینے کا کوئی سلیقہ اور قرینہ نہیں تھا۔ بس ایک مسلسل جدوجہد تھی جس کا حاصل دربدری اور جلاوطنی جیسی محرومی تھا۔ پریشانی اور پشیمانی کے تعاقب کرنے والے پُرآسیب سائے تھے۔ خوف اور بے بسی تھی۔ قرار کی خواہش میں فرار تھا مسلسل فرار۔

اس زندگی کو عام لوگوں جیسی زندگی کی طرح معمولات کے دائرے میں لانا' جذبات اور خواہشات کے سارے رنگوں سے سجانا' اس میں رشتوں کی اور رفاقتوں کی ہم آہنگی اور مقصدِ حیات کا توازن پیدا کرنا یقیناً ایک مشکل کام تھا جو ہم سب نے ایک ساتھ کیا اور مل کے کیا۔ رابعہ نے اپنا آفس سنبھالا اور میں نے اپنا کاروبار منظم کیا۔

سب سے پہلے غالب اور نازو کی شادی ہوئی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دھوم دھام سے۔ پھر اس نے محسن کے ساتھ مل کے نقوی صاحب مرحوم کی پرانی کوٹھی میں رہائش اختیار کی۔ اس شرط پر کہ وہ گل کو اس کا کرایہ باقاعدگی سے ادا کریں گے۔ گل نے انتہائی مجبوری کے عالم میں اسے ناگزیر سمجھتے ہوئے قبول کیا ورنہ ظاہر ہے اسے کرائے کی معمولی رقم کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اتنی بڑی کوٹھی تھی کہ محسن اور غالب کیا دو بڑے خاندان بھی اس میں گزارا کرسکتے تھے۔ اس کے سرونٹ کوارٹر میں جو تین کمروں پر مشتمل اچھا خاصا مکان تھا خادم حسین اور اس کی بیوی نے رہنا قبول کیا۔ وہ کسی طرح بھی کوٹھی کے ایک دو کمروں میں رہنے کے لیے تیار نہ تھے۔

غالب نے اپنے اخبار سے صحافت کا آغاز تو بہت پہلے ہی کیا تھا۔ اب اسی اخبار میں نازو نے کرائم رپورٹر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔ اور بعد میں بڑی دھوم مچائی۔

میں نے محسن کے ساتھ مل کے اپنے تمام اثاثوں کی قیمت حاصل کی۔ جہاں کبھی وزیر خان نے وزیر انجینئرنگ کی بنیاد رکھی تھی جو بعد میں دلاور کے شامل ہونے سے ایم زیڈ دی کمپلیکس بن گیا تھا۔ وہاں اب ایک خیراتی شفاخانہ چل رہا تھا مگر در حقیقت یہ وہ شرمناک کاروبار تھا جو دلاور نے ڈاکٹر شاہ کے ساتھ مل کے چلایا تھا۔ ہم نے تمام مریضوں کو مینٹل اسپتال شفٹ کیا یا ماہرین نفسیات کے پاس بھیج دیا۔ ایک بار پھر یہاں زرعی مشینری کے پرزے بنانے کی فیکٹری لگانے کا فیصلہ کیا گیا۔ پرانی مشینری کا اب کسی کام کی نہ تھا۔ یہ سارا کام نئے سرے سے ہونے والا تھا۔ اس کے لیے سرمائے کی فراہمی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ محسن کے والد مرحوم شیروانی صاحب وزارت خزانہ کے فنانشل ایڈوائزر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کے دو ہی وارث تھے۔ فوزیہ اور محسن۔ فوزیہ کے انتقال کے بعد سب کچھ محسن کو ملا تھا۔ اسلام آباد میں ان کی کوٹھی تھی اور بینک میں ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والا تمام پیسہ محفوظ پڑا تھا۔ فوزیہ کا مکان اور اس کے شوہر کے تمام واجبات بھی محسن ہی کو ملے۔ وہ برابر کے سرمائے سے کاروبار میں میرا پارٹنر بنا۔ اس کا نام ہم نے اتفاق رائے سے "ایم آر ایم انجینئرنگ کمپلیکس" رکھا۔ محسن' رابعہ اینڈ سکندر اس کے پارٹنر تھے۔ رابعہ نے صرف سرمایہ فراہم کیا تھا۔ وہ ورکنگ پارٹنر نہیں تھی۔ اس نے وقار یوسف کو پارٹنر بنا کے رابعہ اینڈ وقار لاء ایسوسی ایٹس کے لیے اپنی ساری توانائیاں وقف کردیں۔

جس روز ہم اپنی ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں منتقل ہوئے اسی دن چوہدری دلاور کا سوئم تھا۔ رابعہ نے اس کوٹھی میں نیا رنگ و روغن کرایا تھا اور اسے نئے سرے سے ڈیکوریٹ کرنے میں بڑی محنت کی تھی۔ اس کام میں رابعہ کی مشیر خاص اور معاون خصوصی گل تھی جس نے عملاً ساری خریداری کی اور کام کی نگرانی بھی۔ پھر اس نے اعلان کیا کہ شادیاں تو خیر ہو گئیں مگر اب ساری شادیوں کی خوشی میں ایک عظیم الشان جشن منعقد ہوگا اور ایک ایسی ضیافت ہوگی جسے لوگ یاد رکھیں گے۔ اس معاملے میں وہ ہم سے زیادہ پُرجوش تھی اور اس کا ساتھ دینے میں نازو اور گل بھی پیش پیش تھیں۔ یہ طے ہوگیا کہ جس دن میں اور رابعہ اپنے گھر میں منتقل ہوں گے اس دن یہ تقریب ہوگی۔ اس کے لیے گل نے بہت خوب صورت دعوت نامے چھپوائے۔ لمبی چوڑی فہرست بنائی کہ کس کس کو بلایا جائے گا۔ پھر مینیو کا فیصلہ کیا کہ سروس کس کی ہوگی اور کیٹرنگ کس کی۔ یہ فہرست اتنی طویل ہوگئی کہ کارڈ کم پڑ گئے۔ گل اور خادم حسین کی بیوی سارا دن انہیں ساتھ بھرتی تھیں۔ نازو ... طور پر فارغ تھی اور رابعہ نے صاف معذرت کرلی تھی کہ ابھی اس کے پاس ان کاموں کے لیے وقت نہیں ہے۔ گل نے اس کا بہت بُرا منایا تھا اور "کام کام' جب بوڑھی ہوجاؤگی پھر وقت ملا تو کس کام کا' بھاڑ میں گیا کام۔ بس یہ تقریب ہوجائے اس کے بعد تم لوگ چاہو سری سوات' کاغان اور کھیوڑہ کہیں بھی جاتے۔ سیزن ختم ہونے سے پہلے واپس آنے کا نام لیا" اس نے ایک دن رابعہ کو اور مجھے ڈانٹا۔

میں نے کہا "تم تو مجھے ساس کا رول ادا کررہی ہو۔ ایک ساتھ چار بہوؤں پر حکم چلا رہی ہو۔ رابعہ' گل' نازو اور خادم حسین کی منکوحہ۔"

"اس کی بات میں سوچتی ہوں" وقار نے کہا۔

"کام تم لوگ کچھ کرتے نہیں' باتیں کرتے ہو۔ ابھی تک کسی نے فہرست پر ایک نظر نہیں ڈالی۔ بعد میں کہو گے فلاں کو تو بلایا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "کل شہر میں کون بچا ہے اب؟ سب کو تو تم بلا رہی ہو۔"

"صرف ایک ہزار مہمان تھے۔ اب گیارہ سو ہوگئے ہیں۔ کارڈ اور چھپوانے پڑیں گے" وہ بولی۔

"میری فکر مت کرو۔ میں کارڈ کے بغیر آجاؤں گا" وقار نے کہا۔

منظر نے کہا "اور میں بھی۔ اپنے سترہ بچوں اور ایک بیوی کے ساتھ۔ تمہارے انہیں کارڈ بچ گئے تو۔ بس اس بھوتنی کے مولوی خادم حسین کو مت بلانا' اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ میرے سترہویں بچے کی صورت اس سے کتنی ملتی ہے۔ اس کے تو داڑھی بھی نکل رہی ہے ایسی ہی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ داڑھی چھوڑیں میری' یہ سخت گناہ ہے منظر صاحب۔ آپ اتنے بے شرم ہوگئے ہیں کہ خواتین اور خود اپنی اہلیہ کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہیں' آپ کی وجہ سے میرا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔"

www.paksociety.com

جس رات یہ تقریب اپنے عروج پر تھی۔ ہماری ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ باہر مہمانوں کی کاریں صف بستہ تھیں اور میرے ساتھ رابعہ پوری دلہن بنی آنے والوں کا استقبال کرنے کے لیے کھڑی ہوئی تھی۔ ایک کار ٹین میں دروازے کے سامنے آکے رکی۔ میں رابعہ کے ساتھ آگے بڑھا۔ شوفر نے پچھلا دروازہ کھولا تو دلاور کی بیوہ نے باہر قدم رکھا۔ پھر فیصل اترا۔ حیرت سے میں اور رابعہ اپنی جگہ منجمد ہو گئے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اسے خوش آمدید کہوں یا اس سے تعزیت کروں۔ دو دن پہلے ہی ہم دلاور کی تدفین میں شریک ہوئے تھے۔ اس کے انتقال کی خبر بھی ہمیں فیصل نے دی تھی اور ہم خاموشی سے قبرستان پہنچ گئے تھے جہاں شرکا کی تعداد افسوسناک حد تک کم تھی۔

"آئیے مسز دلاور۔" میں نے بالآخر کہا۔

"کیا حال ہے فیصل!" رابعہ نے کہا۔

"میں یہ بتانے آئی ہوں سکندر!" دلاور کی بیوہ نے کہا۔

"ضرور فرمائیے مسز دلاور، پلیز اندر آ جائیے۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا "آپ کی بیٹیاں کہاں ہیں۔ انھیں کیوں نہیں لائیں آپ؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "میں ضرور لاتی۔ اگر آج ان کے باپ کا سوگ نہ ہوتا۔"

"اوہ۔ آئی ایم سوری میں بھول گیا تھا۔"

"میں ایک خاص مقصد سے آئی ہوں سکندر اور اس کے لیے یہی موقع مجھے مناسب لگا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس کے لیے میں نے خود کو کتنی مشکل سے تیار کیا۔ لیکن یہ ضروری تھا۔ ابھی میں عدت میں ہوں۔"

"آپ اندر آئیں ہم بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔"

"نہیں میں اندر نہیں جاؤں گی۔ میری مجبوری ہے۔" وہ بولی "تم میری بات سن لو۔ تم انکار کرو گے تو کسی کو پتا نہیں چلے گا اور میں لوٹ جاؤں گی۔"

میں نے کہا "رابعہ تم مہمانوں کو ریسیو کرو، میں ذرا ان سے بات کر لوں۔"

میں اس کے ساتھ گیٹ سے چند قدم دور چلا گیا جہاں ایک درخت کا سایہ تھا اور روشنی کم تھی "آپ بلاتکلف بات کریں۔ ماضی کو بھول کر جو ہوا سو ہوا۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "تمہاری بات سن کے مجھے بڑا سکون ملا اور حوصلہ بھی۔ میں اسے تمہارے سپرد کرنے آئی تھی۔" اس نے فیصل کو آگے بڑھا کے میرے ساتھ کھڑا کر دیا۔

میں نے کہا "میں سمجھا نہیں مسز دلاور!"

"میں چاہتی ہوں تم اسے ایک اچھا آدمی بنا دو۔ اپنے جیسا بنا دو۔ محسن اور غالب جیسا بنا دو۔ یہ تمہارا مجھ پر احسان ہو گا۔"

میں نے کہا "اس میں تو احسان کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"اس کا باپ نہیں ہے سکندر۔ اس کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ سمجھنے میں بڑا ہے مگر بچہ ہے ابھی۔ تاریخ اپنے آپ کو نہیں دہرائے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔ تم اسے اپنا پارٹنر بنا لو۔"

میں چونکا "کیا؟ پارٹنر بنا لوں؟"

"ہاں جیسے اس کا باپ اور تمہارا باپ پارٹنر تھے۔"

فیصل نے کہا "پلیز سکندر بھائی۔ امی کو انکار مت کریں۔ انھوں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ ہمارا دنیا میں کوئی دوست بھی نہیں ہے کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ پھر میں نے فیصل کے کندھے پر ہاتھ رکھا "ارے فیصل۔ تم ہمارے ساتھ رہو گے۔ ضمانت کوئی نہیں دے سکتا کہ تاریخ اپنے آپ کو نہیں دہرائے گی لیکن عقل مند وہی کہلاتے ہیں جو اپنی تاریخ پر صرف غور نہیں کرتے اس سے سبق سیکھتے ہیں اور ماضی میں ہونے والی غلطی پھر نہیں کرتے۔ خدا انسانی نیت میں خلوص دے۔ ہمیں حوصلہ دے اور اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا کرے۔"

"آمین۔" دلاور کی ماں نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ پھر وہ ایک دم اپنی گاڑی کی طرف بڑھی۔

"امی!" فیصل نے کہا مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم کہاں جا رہے ہو" میں نے کہا "میرے ساتھ اندر آؤ۔"

دلاور کی بیوی نے پلٹ کے دیکھا اور سر ہلایا۔ کچھ فاصلے سے بھی میں اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ سکتا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

میں فیصل کو اپنے ساتھ اندر اس جگہ لے گیا جہاں کل ہماری شادی کو تماشائے عام بنانے کے لیے اسٹیج بنوایا تھا۔ اسٹیج کے ساتھ ہی ایک آرکسٹرا نغمات مسرت بکھیر رہا تھا۔ وسیع لان میں مہمانوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ ہر طرف رنگ تھے اور خوشبو تھی اور خوشیوں کے ستارے برس رہے تھے۔

"حضرات، خواتین!" میں نے آرکسٹرا کو خاموش کرانے کے بعد اعلان کیا "میں آپ سب کو آج کے مہمان خصوصی سے ملوانا چاہتا ہوں۔ یہ ہیں مسٹر فیصل۔ مرحوم چوہدری دلاور کے ولی عہد۔ اب یہ ہمارے بزنس پارٹنر ہیں۔"

اس غیر متوقع اعلان نے چند سیکنڈ کے لیے سب پر سکوت طاری کر دیا۔ پھر اچانک تالیوں کا شور اٹھا۔

میں نے فیصل کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عزم تھا۔ ایک نئی تاریخ لکھنے کا، جس میں کوئی غداری نہیں ہو گی۔

(ختم شد)

www.paksociety.com